جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
حصہ اول

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ

ایک کفن بردوش نوجوان کی داستانِ حیرت

معاشرے کے رِستے ہوئے ناسوروں کا مرقعِ عبرت

شکاری

راوی: سکندر بخت

مصنف: احمد اقبال

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من **اردو بکس** آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

1۔ گروپ میں یا گروپ ایڈ من سے کوئی بھی بات / درخواست / فرمائش کرتے وقت **السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ** کو فروغ دیں۔

2۔ ایڈ منز یا دیگر ممبرز جو بھی اچھی پوسٹ کریں اس پر کمنٹس / شکرز / رائے لازمی کریں تا کہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دیگر ممبران کو بھی اس کتاب / پوسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

3۔ گروپ ایڈ منز سے پرسنل سوالات مت کیجئے۔ صرف کتب کے متعلق دریافت کریں یا درخواست کریں۔

4۔ ایڈ منز اور ممبرز سے اخلاق سے پیش آئیں۔ اگر ہم ادبی گروپ میں موجود ہیں لیکن ہماری اخلاقیات معیاری نہیں تو ہمیں ادبی گروپ کا ممبر کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔

5 گروپ میں یا ایڈ من کے انباکس میں وائس میسیج، ویڈیوز بھیجنے کی حرکت مت کریں ورنہ بلاک کر دیئے جائیں گے۔

6۔ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریمو کر دیا جائے گا۔

7۔ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے فری آف کاسٹ وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

7۔ ہمارا گروپ جوائن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں اور وٹس ایپ سلیکٹ کر کے جوائن کر لیں۔

1. https://chat.whatsapp.com/EFrs3uGTgEm2319kK0wfu2
2. https://chat.whatsapp.com/Koqfq0iOsCm0F88xfiaLQ1
3. https://chat.whatsapp.com/IEl5cejf7Xc0b1HjApSyxI

گروپ فل ہونے کی صورت میں ایڈ من سے وٹس ایپ پر میسیج کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔

0343-7008883 0333-8033313

اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لئے تشریف لائیں

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سلگتی راتیں آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں

زندہ کرداروں پر مشتمل روایت شکن سلسلہ

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ

اب میں بالکل مطمئن اور پرسکون تھا۔ بے یقینی، ذہنی انتشار اور خوف کے سلسلے وار مرحلوں سے گزر جانے کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس انتہائی اقدام پر تامل اور تاسف کا اب کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وقت کی بساط پر عقل کی ہر بازی مات ہو چکی تھی۔ سازگار حالات کی امید میں ستمِ ایام کو جھیلتے رہنے کا حوصلہ تمام ہو چکا تھا۔ اور خلش جو آزارِ جسم و جان بن گئی تھی تقاضا کرتی تھی کہ اس پر آشوب داستان کا آخری باب میں اپنے خون سے لکھوں۔ تقدیر نے مجھے اس کے قتل کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میر شرافت علی کی فرصتِ عمر لمحہ لمحہ تمام ہو رہی تھی۔ اور شاید میری بھی جہاز اب لاہور کی طرف مائل پرواز تھا اور یہ ثبوت تھا ایک زبردست دستِ غیب کے انتظام کا جس نے میری منزل کی مسافت کو سمیٹ کر مزید مختصر کر دیا تھا۔ بالفاظ دیگر میری شرافت کی زندگی کو مزید مختصر کر دیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے لاؤڈ اسپیکر کی زبان سے ایئر ہوسٹس نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا تو مجھے اس کی آواز خلافِ معمول مترنم، مہربان اور ریشم کی طرح ملائم لگی تھی۔ ”خواتین و حضرات ہم بے حد معذرت خواہ ہیں کہ طوفانِ باد و باراں کے سبب طیارہ اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترنے کے بجائے لاہور میں اترے گا یعنی حالات موافق ہوتے ہی ہم جلد از جلد آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم آپ سے تعاون کے طلبگار ہیں اور ایک بار پھر معذرت چاہتے ہیں۔ شکریہ۔“

”ڈیم اٹ“ میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے کالے صاحب نے کہا جو ولایت میں سات سال رہ کے خود کو گورا سمجھنے لگا تھا اور وہ کوا تھا جو ہنس کی چال چلنے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہا تھا۔ ”صاف کیوں نہیں کہتے یہ لوگ کہ پلین کریش کر رہا ہے۔“ پھر اس نے منہ بنا کے کھڑکی سے باہر دیکھا اور شاید بادلوں کے غبار سے جہاز کی بلندی کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اب تک جہاز کتنا گر چکا ہے۔ دورانِ سفر اس نے مجھ سے بصد افسوس کہا تھا کہ انڈو پاک میں مورل گر گیا ہے۔ ویلیوز گر گئی ہیں۔ آدمی کے ساتھ پیسے کی قدر گر گئی ہے پیداواری صلاحیت گر گئی ہے۔ اور اب اس کا خیال تھا کہ جہاز گر رہا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

میرے دوسرے پڑوسی ہمسفر میر پور کے اصیل باشندے تھے اور ولایت کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ڈش واشر کے منصب اعلیٰ ... پر برسوں فائز رہنے کے بعد وطنِ مالوف کو مراجعت پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیونکہ سرمنڈے گوروں کے ایک غول بیابانی نے ان کی دو پسلیاں اور دو دانت توڑ دیئے تھے اور بشرطِ زندگی بقیہ دانت اور پسلیاں توڑنے کے عزم کا اظہار بھی کیا تھا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

انکی زوجہ نے جو اللہ میاں کی بھینس تھی اور سامنے کی تین نشستوں پر بمعہ اولاد فروکش تھی اپنے لائق فائق سرتاج سے اعلان کو سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کو کہا۔ سرتاج مذکور نے فرمایا۔ "لاہور جانا تھا... پہلے کپتان کو یاد نہیں رہا۔" اور میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ میں نے ان سے بھی اتفاق کیا۔ زوجہ مذکورہ نے اس فروگذاشت پر، کفتان نامراد، بزبان میرپلو، کوسنا شروع کیا۔ بقیہ مسافروں کا ردعمل بھی اپنی اپنی ذہنی کیفیت کا عکاس تھا۔ معقول امید پرست اور پُراعتماد قسم کے لوگوں نے اس اعلان کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ کم عقل۔ قنوطی اور ناتجربے کار مسافروں نے جن کی اکثریت خواتین پر مشتمل تھی۔ واویلا شروع کیا کہ اسلام آباد کے ٹکٹ پر ان کو عدم آباد پہنچایا جارہا ہے۔ اور پھر جہاز کے علاوہ جہاز کے موجد کو اور کپتان تک سب کو ایک جیسی گالیاں دیں۔ جہاز کا واحد مسافر جسے منزل کی یہ تبدیلی بھی نوشتۂ تقدیر لگی تھی میں تھا۔ میں نے افسوس سے ان بے گناہ مسافروں کو دیکھا جو شامت اعمال کے باعث میرے ہمسفر ہوئے اور مارے گئے۔ مجھے فلموں اور جرائم کی کہانیوں کے علاوہ حقیقی زندگی کے بہت سے ڈراموں کے بہت سے واقعات یاد تھے جن میں ایک آدمی کی جان لینے کے لیے جہاز گرادیا گیا تھا۔ امکانات لامحدود تھے۔ ممکن ہے پائلٹ کو جہاز میں کسی ٹائم بم کی موجودگی کا شبہ ہوگیا ہو اور ٹائم صرف اتنا ہو کہ جہاز کو لاہور میں گرنے کو ترجیح دی ہو یا ایسی ہی کوئی نامعقول وجہ ہو۔ لیکن یہ بات میں علی الاعلان کہہ دیتا تو کالے صاحب کی نظر میں گر جاتا۔ جسے یقین تھا کہ جہاز کے ساتھ ہی وہ بھی گر رہا ہے۔

ایسا ہی خیال مجھے لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر روانگی کے وقت آیا تھا۔ یعنی یہ کہ جہاز سفر آخرت پر روانہ ہورہا ہے۔ میں حقیقت پسند آدمی ہوں اور میری سوچ میں مقتول ہونے کی نفسیاتی خواہش کو قطعی دخل نہیں تھا۔ ان تمام واقعات کے باعث جو ایک مختصر مدت میں مسلسل پیش آئے۔ مجھے ہر قدم پر خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک بار کی تو کوئی بات نہیں لیکن سانپ بار بار کاٹنے لگے تو کیا رسّی سے ڈرنے کا جواز پیدا نہیں ہوجاتا۔ بقول غالبؔ۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔ تو اس کے ذمے دار حالات ہیں۔ سرمنڈے گورے جو رنگدار ایشیائی کو ملک میں اپنی بے روزگاری کا ذمّے دار قرار دیتے تھے۔ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ کیونکہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میرا قطعی ارادہ نہ تھا کہ کسی گورے کے پیٹ پر لات ماروں۔ نسلی منافرت سے بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باعث میں نے فارغ التحصیل ہو کے واپس وطن لوٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا اور فرنگیوں کے دیس میں میرے قیام کی مدت سال بھر بھی نہ رہی تھی میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔ کثیر المقاصد منصوبے۔ ان سے بیک وقت ملک و قوم اور خلقِ خدا کے علاوہ اپنی ذات کو بھی فائدے حاصل ہوتے تھے مثلاً میں ایک تعمیراتی فرم بنانا چاہتا تھا اور اس کے منافع سے مری میں ایک گردش پزیر ریسٹورنٹ بنانا چاہتا تھا جیسے میں نے باہر دیکھے تھے کہ آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر شفاف شیشوں کی عمارت میں بیٹھے ہیں اور آپ کو قطعی احساس نہیں کہ وہ پوری عمارت کچھوے کی چال سے اپنے مدار پر گھوم رہی ہے تاکہ وہیں بیٹھے بیٹھے آپ ملاقات اور مدارات کے ساتھ مضافات کو ہر سمت سے گھوم کر دیکھ لیں۔ پھر میرا خیال اس ریسٹورنٹ کی آمدنی سے وادی کاغان میں جھیل سیف الملوک کے برفپوش رہنے والے کناروں پر ہوٹل تعمیر کرنے کا تھا اور پھر ہوٹل اور ریسٹورنٹ کے مشترکہ منافع سے کراچی میں ساحل سے دور سمندر کی تہہ میں شفاف شیشے کا واٹر پروف دیواروں والا کیفے بنانا تھا جہاں سے آبی دنیا کے حسن کا نظارہ ہو۔ علیٰ ہذالقیاس یہ سب ایک انڈے سے ملک کا سب سے بڑا پولٹری فارم بنانے کے اور کروڑپتی بننے کے خواب تھے۔ لیکن انڈا ٹوٹ گیا چنانچہ خواب بھی ٹوٹ گیا اور پھر حقیقت کا وہ روپ سامنے آیا جو موت کی طرح خوفزدہ کرنے والا اور ناقابلِ فہم تھا اور حالات و واقعات کا وہ ناقابلِ یقین سلسلہ شروع ہوا جس نے میری منزل ہی نہیں راستے بھی بدل دیے ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ آدمی خود اپنی منزل کا اور اپنے راستوں کا تعین کرنے لگتا ہے جب کہ یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ!

اگر میں دائیں بائیں بیٹھے ہوئے کالے صاحب یا معزز ڈش واشر کو بتاتا کہ میں جو صورت سے اتنا محترم اور معتبر نظر آتا ہوں بحکم سرکارِ ملکہ برطانیہ۔ بصد ذلت و رسوائی اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ولایت سے واپس بھیجا گیا ہوں اور یہ سب چکر ایک لڑکی نے چلایا تھا۔ تو کیا وہ مانتے کہ میں بے گناہ ہوں؟ اور یہ برطانوی حکومت کی لاقانونیت ہے کہ اس نے مجھے زبردستی پارسل کردیا ہے سرمنڈے گوروں کی بات الگ ہے۔ برطانوی جمہوریت میں کسی قانون کے بغیر محض رنگ دار ہونے کے جرم میں جلاوطن کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آلام و مصائب اور آفات و حادثات کا یہ سلسلہ (جس کا نتیجہ ادھوری تعلیم چھوڑ کے حدود سلطنت

برطانیہ سے میرے اخراج کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ ایک ایسی لڑکی نے شروع کیا تھا جسے میں صورت آشنا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ تقریباً چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ ہوسٹل میس میں ناشتے کی ٹرے اٹھا کر میں ہال کی ہر میز کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کہاں بیٹھوں۔ اِکّادُکّا کرسیاں تو بہت خالی تھیں لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس وقت میرے بے تکلف دوستوں میں سے کون کہاں موجود ہے۔ اچانک کسی نے چلاّ کے کہا۔ "کبیرداس..... تمہارا فون ہے۔"

میں نے پلٹ کر کبیرداس کہنے والے کو گالی دی۔ میرے قریب سے گزرنے والا میرے بچپن کا دوست سید محسن رضا زور سے ہنسا اور اس نے ٹرے میرے ہاتھ سے لے لی۔ "کبیر خان صاحب غصہ تھوک دیجئے اور بات کیجئے۔ ناشتہ میں کرتا ہوں......"

محسن نے کہا اور میں نے مجبوراً ٹرے اسے تھما دی اور اسے وہیں میز پر بیٹھ کے ناشتا کرتا چھوڑ کر منہ لبسورتا آگے بڑھا۔ سلف سروس کے اس نظام میں ٹرے اٹھا کے لائن میں کھڑے رہنا اور باری آنے پر ناشتہ لے کر آنا اور پھر جگہ بنا کے بیٹھنا یہ سب مرحلے وار عمل تھا۔ جو اب مجھے پھر شروع کرنا تھا۔ تاہم فون کال کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کون جانے شام کی ہم رقص بننے کی دعوت کس نے قبول کرلی ہو۔ درخواست تو کوئی نصف درجن کے قریب دیسی اور ولایتی لیلاؤں کے زیرِغور تھی اور میں ان سب کا اکلوتا مجنوں تھا۔ چنانچہ میں نے آخری گوشے میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے محتاط لہجے میں کہا۔ "ہیلو۔"

خلافِ توقع ایک اجنبی مردانہ آواز نے کہا۔ "تم کبیر خاں ہو! وزیر خاں کے بیٹے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تم کون ہو! میرا مطلب ہے میرے اس نام سے کیسے واقف ہو؟"

"کیوں؟" جواب ملا۔ "کیا تمہارا یہ نام نہیں تھا؟ مسٹر سکندر بخت۔"

"تھا۔" میں نے فکرمند ہو کے کہا۔ "بچپن میں تھا اور یہ بہت پرانی بات ہے۔ یہاں لوگ مجھے سکندر بخت کے نام سے جانتے ہیں۔"

"میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔" وہ ہنسا۔ "میں نے بھی کہا تھا کہ مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کبھی موج میں آکے مجھے کبیرداس یا کبیر خاں کہہ دیتا مگر لوگ اسے مذاق کی بات سمجھتے تھے۔ "خیر یہ بتاؤ بات کیا ہے۔ مگر نام پہلے۔"

"نام میں نہیں بتانا چاہتا۔ اصرار کرو گے تو کچھ بتا بھی دوں گا۔" وہ بولا۔ "تمہارے لیے یہ بات زیادہ اہم ہے۔"

"پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی دوست آشنا ہی مذاق کے موڈ میں ہے لیکن سنجیدگی سے مجھے کبیر کے نام سے مخاطب کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ سوائے میرے باپ کے جو بہت دور پاکستان میں بیٹھا اس دن کے خواب کی تعبیر کیلئے عمر کے بوجھ کو گھسیٹ رہا تھا جب میں کامیاب انجینئر بن کے لوٹوں گا اور وہ زندگی کے رہے سہے ارمان پورے کرے گا۔ گھر میں بہو لانے کے۔ پوتوں کو کھلانے کے۔ اور مرنے سے پہلے مجھے خوشحال مستقبل کی راہ پر گامزن دیکھنے کے۔ زمانہ لاکھ بدلے والدین کے خواب وہی پرانے ہوتے ہیں۔"

"میر شرافت علی کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں۔ اس حد تک کہ وہ میرے والد کا بزنس پارٹنر ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کب سے پارٹنر بنا ہے وہ؟ اور اس کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟" وہ بولا۔

"مجھے..... مجھے نہیں معلوم..." میں نے کہا۔ "مجھے والد نے یہی بتایا تھا کہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔"

"اس کا آفس کہاں ہے؟" وہ بولا۔ "میر شرافت علی رہتا کہاں ہے؟"

"دیکھو یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ میں نے اپنے والد سے قبل از وقت پوچھنی ضروری نہیں سمجھیں۔" میں نے کہا۔

"قبل از وقت؟" وہ ہنسا۔ "خدانخواستہ آج اگر تمہارے والد کو کچھ ہو جائے۔ تو تم کیا کرو گے! تم وزیر خاں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نے کبھی اس مسئلے پر غور ہی نہ کیا ہو۔"

"آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "اور یہ سب باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔......" اس نے میری بات نظرانداز کردی۔ "تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے۔"

میں الجھن میں پڑ گیا۔ عمداً... میرے والد نے تو ہمیشہ بزنس کی بات ٹال دی تھی۔..... ابھی پڑھو کبیر خاں.... عمر پڑی ہے ان فکروں کے لیے..... جب تک میں ہوں یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات واقعی عجیب تھی۔ کل کے بارے میں جانتا تو کوئی نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ مگر کل کی فکر تو سب ہی کرتے ہیں اور یہ بات اتنے وثوق کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے مقدر میں آنے والے دن کے سورج کا اجالا بھی ہے۔ جب

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آدمی وقت کی راہ گزر پر چلتا ہے تو موت کے نامہ بر لمحے کو ساتھ رکھتا ہے اور اجل کا انتظار ہر سانس کے ساتھ کرتا ہے۔

میرا تجسس اب تشویش میں بدلنے لگا تھا۔ "میں تمہارے اتنے پُراسرار اندازِ گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کروں۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ کیا ڈرامہ ہے آخر؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "اپنا نام تک نہیں بتایا ہے تم نے۔"

"نام کچھ بھی فرض کرلو... مثلاً فوما پخو۔ نام میں کیا ہے سکندر بخت۔ میری بات دھیان سے سنو۔ ورنہ بعد میں افسوس کرو گے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میر شرافت علی ایبٹ روڈ پر قدیم طرز کی ایک کوٹھی میں رہتا ہے جو متروکہ املاک تھی۔ جس ہندو نے یہ کوٹھی بنوائی تھی وہ اب شرافت علی کی میرٹھ والی کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایبٹ روڈ کی کوٹھی کا نام ہے رین بسیرا۔ کتھئی اور سفید رنگ کی۔"

"شرافت علی بھی میرٹھ سے آیا تھا۔" میں نے اس انکشاف پہ چونک کے کہا۔ "اور اس نے جائداد کا تبادلہ کرلیا تھا؟"

"ہاں اب اس کا دفتر بیڈن روڈ پر امرتسری حلوائی کی دکان سے ذرا آگے دائیں جانب ہے۔ اوپر کی دوسری منزل پر میروزیر اینڈ کو، تمہیں بورڈ نظر آجائے گا۔ اس سے تمہیں کاروبار کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے۔"

"تم بہت کچھ جانتے ہو۔" میں نے اعتراف کیا۔ "جو مجھے واقعی معلوم نہیں۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کہیں مجھ سے مل لو، ہم اطمینان سے بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

"سوری بوائے۔ میں ایئر پورٹ پر ہوں اور میرے جہاز کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں آجاتا۔"

"اچھا تو اپنا پتہ بتادو... میں تم سے خط و کتابت رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے تفصیل سے وہ باتیں لکھ کر بتا سکتے ہو..."

"میں دوبارہ کہوں گا سوری۔ میں لکھ کر کچھ نہیں دے سکتا۔ میرا اصول یا میری مجبوری۔ جو چاہو سمجھ لو۔ اور میں تمہیں صرف راستہ دکھا رہا ہوں۔ باقی سب تمہاری عقل اور ہمت پر چھوڑ رہا ہوں۔" میرے خیر خواہ نے کہا۔

"اچھا تم کس فلائٹ سے جارہے ہو؟ اور کہاں؟" میں نے مایوسی سے کہا... مجھے اب اس شخص پر اعتبار آنے لگا تھا۔

وہ ہنسا "تم واقعی ذہین ہو مگر میں بھی اتنا بیوقوف نہیں سکندر بخت۔ ایک آخری بات۔ یہ بتاؤ تمہارے والد کا آخری خط کب آیا تھا؟"

"ابھی چند روز پہلے۔" میں نے حیران اور کچھ پریشان ہو کے جواب دیا۔

"اس میں کیا لکھا تھا انہوں نے؟ کوئی قابلِ تشویش بات تھی؟"

"نہیں... بالکل خیریت کا خط تھا۔" میں نے کہا۔ "صحت اچھی ہے۔ کاروبار چل رہا ہے۔ خوش رہو اور کسی بات کی فکر مت کرو... وغیرہ وغیرہ... ان کے سب خط ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اور آخری بار تم نے انہیں کب دیکھا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کوئی سال بھر پہلے۔" میں نے جواب دیا۔ "عید... نہیں بقر عید پر گیا تھا میں۔ گویا سوا سال ہوگیا۔"

"اچھا تو نوٹ کرلو... تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور تم خود بھی محتاط رہو۔"

"کس سے محتاط رہوں؟" میں نے کہا۔ "ہیلو۔ ہیلو۔" میں نے چلّا کے کہا۔ مگر لائن کٹ چکی تھی۔ میں کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا۔ اس اجنبی کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی "تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔" اب میں اس نادیدہ خیر خواہ کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹال سکتا تھا کہ اس کو میری نجی زندگی کے بارے میں وہ باتیں معلوم تھیں جو خود میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن تصدیق کیے بغیر میں کہہ سکتا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

"میروزیر اینڈ کمپنی" کا دفتر مجھے معلوم تھا۔ مگر میر شرافت علی کے بارے میں اس کی فراہم کردہ معلومات نئی تھیں کسی خاص مقصد کے تحت اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا اور میرے تجسس کو ایک سمت عطا کر کے باقی سب مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ لہجے سے سنجیدہ اور متین آدمی لگتا تھا۔ چنانچہ میرا ذہن ہر بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

میں کچھ دیر خالی ٹرے سے دف کی طرح بجاتا رہا اور سوچتا رہا کہ اتنی خوشگوار صبح کا یہ آغاز مبارک ہے یا کسی نحوست کا پیش خیمہ۔ پھر میرے پیچھے والے لڑکے نے مجھے آگے دھکیلا...

"یہ قطار موسیقی کا ریاض کرنے کی جگہ نہیں ہے سرکار۔ آپ ایک طرف بیٹھ کے شوق سے ٹرے بجایئے۔ ورنہ ناشتا لیجیے۔" وہ ایک ہندوستانی طالب علم تھا، جس کے ساتھ میری کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ باکسر تھا تو میں جوڈو اور کراٹے کے ایک جاپانی اسکول میں تربیت کے آخری مرحلے میں تھا۔ اور آئے دن ایسی ہی فضول باتوں پر ہماری ٹھن جاتی تھی۔ پہلے میں مارکھاتا تھا مگر اب میرا پلہ بھاری تھا

"یہ طبل جنگ بج رہا تھا، طنبورے۔" میں نے کہا۔ "مگر اچھا کیا جو مجھے یاد دلا دیا کہ مجھے ناشتہ بھی کرنا ہے۔"

ناشتہ اٹھا کے میں اس میز پر جا بیٹھا جہاں محسن اب ایک ولایتی گڑیا سے چکنی چپڑی باتیں کر رہا تھا۔ "آپ کہیں اور تشریف رکھ سکتے تھے۔" اس نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"جی نہیں۔ ہم یہاں اس لیے تشریف لائے ہیں کہ نہایت اہم اور سنگین نوعیت کے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو واحد حاضر فرنگن کے عشقِ خانہ خراب سے زیادہ آپ کی توجہ کے طالب ہیں۔" میں نے کہا۔ فرنگن اردو کی گفتگو کو بدتہذیبی کی علامت قرار دیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کردیا آپ نے سب معاملہ چوپٹ۔ اب فرمایئے معاملہ کیا ہے؟" محسن نے جل بھن کے کہا۔

"معاملہ بہت عجیب ہے۔" میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "عرض کرتا ہوں۔ توجہ ذرا میری طرف رکھیے۔ تھینک یو۔"

اس کے بعد میں نے عرض کیا اور محسن سنتا رہا۔ اسی روز میں نے محسن سے طویل صلاح مشورے کے بعد ٹرنک کال بک کرائی جو لندن میں آدھی رات کے وقت اور پاکستان کے وقت کے مطابق سات بجے ملی۔ میرے والد بالکل خیریت سے تھے اور میرے بار بار پوچھنے پر کہ تشویش کی کوئی بات تو نہیں۔ خاصے تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔

"تشویش سے کیا مراد ہے بیٹا تمہاری؟" انہوں نے کہا۔ "یہ اچانک تمہاری زبان تشویش کی تکرار کیوں کرنے لگی ہے؟"

فوما پخو نے مجھے منع کردیا تھا کہ اصل سبب نہ بتاؤں چنانچہ میں نے کہا۔ "دیکھیے نا۔ آپ سے اتنی دور ہوں! تشویش تو ہر وقت رہتی ہے۔ آپ کی صحت کیسی ہے۔ کاروبار کیسا ہے؟"

"دونوں ٹھیک ہیں۔ الحمدللہ۔" والد نے کہا۔ "خرابی ہوگی تو تمہیں ہی لکھوں گا۔"

ایک شبے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں مجھے ان کے لہجے میں اعتماد کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ "آپ میری پریشانی کے خیال سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج! پیسے کی ضرورت ہے کیا؟" لہجہ بدستور کھوکھلا تھا۔ یا صرف میرے وہم کی بات تھی؟

"پیسہ؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے ابا جی۔ آج تک کوئی طے نہیں کرسکا کہ پیسے کی ضرورت ختم ہوتی ہے تو کہاں؟ معاشیات میں ضروریات کی جو تعریف ہے...؟"

"اچھا اچھا میں ڈرافٹ بھیج دوں گا۔" انہوں نے کہا پھر وقت ختم ہوگیا۔ میں نے اور محسن نے ٹاس کیا اور فیصلہ وہی ہوا جو ہم پہلے ہی کرچکے تھے یعنی میرا وہ نادیدہ خیر خواہ جس نے فون پر سنسنی خیز مکالمے بولے تھے کوئی شرپسند تھا جس کا مقصد مجھے پریشان کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مذاق میں بعض لوگ حد سے بڑھ جاتے ہیں۔

لیکن اس فیصلے کے باوجود میں چند روز اطمینانِ قلب سے محروم رہا۔ کیونکہ ایک بے نام سی خلش کا آزار ختم نہیں ہوا تھا۔ دن تو مصروفیت کی نذر ہوجاتا تھا۔ مگر جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹتا تھا تو میرے ذہن میں وہی سوالات گردش کرنے لگتے تھے جن کا جواب کہیں نہ تھا کہ وہ اجنبی کون تھا اور اگر وہ اتنا جانتا تھا تو اسے کیا ضرورت تھی مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کی۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ محتاط رہو... "تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا ہے..." جھوٹ اس نے بولا تھا یا میرے والد نے اور اگر وہ سچا تھا تو نام تک بتانے سے گریز چہ معنی دارد؟ اتنے کم وقت میں بھلا میں کیا بتاتا کہ اپنے والد کے کاروباری امور سے ناواقفیت کے اسباب کیا ہیں۔ برسوں پر محیط داستان چند منٹ میں کیسے سمیٹی جاسکتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے ملتا یا مجھے اپنا پتہ ہی دے جاتا تو صورتِ حالات کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملتی مگر وہ تو اپنی بات کہہ کر اڑن چھو ہوگیا تھا۔ ایک شعر سو فیصد حسبِ حال تھا۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا۔ کدھر گیا وہ۔ اور... اور پتہ نہیں کیا.... عجیب گمنام اجنبی تھا مجھے تو حیران کرگیا وہ۔

ایک ماہ بعد جب میں اس واقعے کو بالکل بھول چکا تھا دوسرا واقعہ پیش آیا یعنی فوما پخو کی واپسی۔ مگر مجھے ہر حال میں ایک لڑکی سے ملاقات کے لیے جانا تھا وہ ایک انتہائی خرد ماغ۔ متعصب اور تنگ نظر لارڈ کی بیٹی تھی۔ جس کا باپ غلام ہند کے کسی صوبے میں لفٹیننٹ گورنر رہ چکا تھا۔ میری اور محسن کی حکمتِ عملی کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈیڑھ سو سال ان گوروں نے ہم پر حکومت کی۔ اب ہم کو ڈیڑھ سال تک انہی کے ملک میں آکے ان کے غرور کو شکست دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ تجارت کے بہانے آئے تھے۔ ہم تعلیم کے بہانے آئے ہیں۔ اب وہ نفرت کرتے ہیں تو ہم محبت کا چکر چلائیں گے اور منزل ہماری تھی بکنگھم پیلس! اب عین اس وقت جب میں ہیلمٹ کو تاجِ شاہی کی طرح سر پر سجا کے نکل رہا تھا۔ ایک اور لڑکی نے پکار کے کہا۔ "مسٹر الیک زنڈر.... فون پلیز..." اور اس نے ریسیور کو لہرا کے مجھے بلایا اور خود بھی لہرائی۔

"پورا نام ہے الیکزنڈر دی گریٹ۔" میں نے اسے تنبیہ کی اور ریسیور لے کر انگریزی قاعدے کے مطابق کہا۔ "بخت بول رہا ہوں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"مسٹر کبیر" میرے لیے یہ مانوس آواز اس بجلی کی طرح تھی جس کا جھٹکا پہلے بھی لگ چکا ہو۔
"تم..... !" میں نے چلا کر کہا اور گالی دینے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ "تم پھر آ گئے ؟"
"ہاں" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے تم بہت بدگمان ہو۔ کیا اس لیے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا ؟"
"ہاں..... اور اس جھوٹ پر مجھے ٹرنک کال کرنی پڑی۔ میں پہلے ہی کنگال تھا۔ میرا بیڑا ہو گیا۔" میں نے برہمی سے کہا۔
"اچھا اب میں وضاحت کر سکتا ہوں" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "میرا اسٹاپ اوور ہے۔ ایک رات کے لیے۔ تم مجھ سے مل لو" اس نے مجھے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا۔
"سوری" میں نے کہا۔ "مجھے..... مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے۔ کل آ سکتا ہوں ؟"
"بے وقوف مت بنو۔ میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا تھا" وہ بولا۔ "صبح تو میری فلائیٹ سات بجے ہے" پھر فون میرے جواب سے قبل ہی بند ہو گیا۔ میں کشمکش میں پڑ گیا۔ ایک طرف اس الزبتھ ٹیلر سے زیادہ حسین اور پرکشش حسینہ کے قرب کی سدابہار آرزو تھی۔ دوسری طرف بہت سے سوالات کا جواب ملنے کی امید تھی۔ اور اس پُراسرار شخص سے مل کر وہ حالات جاننے کی خواہش تھی جن سے مجھے عمداً بے خبر رکھا گیا تھا۔ حسب معمول میں نے سید محسن رضا سے رجوع کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشیرِ اعلیٰ بھی تھے معاون و محافظ بھی تھے۔ ناصح بھی تھے غمگسار بھی تھے اور بقول شاعر ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز۔ دیارِ غیر میں تو سب ہم زباں ایک ہو ہی جاتے ہیں۔ مگر محسن سے رشتہ ایک تناور درخت تھا جس کی جڑیں گزرتے ہوئے وقت کی زمین میں ہر طرف بیس برسوں کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔
محسن کہیں جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ "مسئلہ اگر اس لفٹیننٹ گورنر کی اولاد سے آباؤ اجداد کی محکومی کا انتقام لینے کا ہے تو اس محاذ پر میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے تو جا۔"
"محسن رضا۔ مجھے اس سے سچا عشق ہونے کا اندیشہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اطلاع دینے آیا تھا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو پتہ کر لینا۔ وہ آدمی مجھے فوما نچو ناپ لگتا ہے۔ نام پوچھنا تو یاد نہیں رہا مجھے۔"
"فوما نچو آپ ہیں قبلہ۔" محسن نے کہا۔ "یہ بات اپنی سمجھ میں تو نہیں آئی کہ ایک آدمی ہوٹل کا نام کمرے کا نمبر بتا دے اور اپنا نام نہ بتائے کیا معلوم نہیں ہو سکتا اس سے..... یہ کوئی چکر ہے سکندر بخت اور مجھے تیری یہ مارگریٹ بھی بالکل پسند نہیں۔"
مجھے اپنی نادانی پر حیرت ہوئی۔ "یار یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔ مارگریٹ کا مسئلہ یہ ہے دوست کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔"
میں نیچے آیا تو چند منٹ قبل تک ہنستا بولتا فون مر چکا تھا۔ یعنی ڈیڈ تھا۔ میں نے باہر آ کے موٹر سائیکل نکالی اور ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مجھے ایک پبلک ٹیلی فون کا بوتھ خالی مل گیا میں نے ایک سکہ ڈالا اور ہوٹل کا نمبر ملایا۔ "روم نمبر تھری زیرو ٹو پلیز" میں نے آپریٹر کی نغمہ ریز آواز پر کہا۔
"واٹ ؟" آپریٹر نے یوں کہا۔ جیسے میں نے اس کو فحش ترین گالی دے دی ہو۔ "کس سے بات کرنی ہے ! کیا کام ہے ؟"
"کام میں تمہیں نہیں بتا سکتا" میں نے خفگی سے کہا۔ لیکن اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے آپریٹر نے کسی سے کہا تھا کہ کمرہ نمبر ۳۰۲ کی کال ہے۔ کیا کروں۔
میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے بول رہے ہیں ؟" ایک مردانہ آواز نے کہا جس میں ترنم نہیں تھا۔ مگر شائستگی ضرور تھی جو یہاں پولیس کی طرۂ امتیاز تھی مگر اس کے باوجود لہجہ تفتیش کی چغلی کھاتا تھا۔
"میں ---" میں نے سوچ کر کہا۔ "میں مسٹر فوما نچو کا بھانجا ہوں اور عالم بالا سے بول رہا ہوں۔"
"دیکھو بیٹے..... " ایک سخت اور کرخت آواز آئی..... "مذاق بعض اوقات خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔ اگر تم پبلک کال آفس سے نہ بول رہے ہوتے تو ہم تمہیں عملی سبق دیتے..... یہ قتل کا کیس ہے۔ سمجھے..... ؟"
"قتل !" میں نے چیخ کر کہا۔ "کس کا قتل ؟..... کمرہ نمبر تین سو دو میں رہنے والے کا ؟" مگر وہ پولیس مین جو شاید تفتیش پر مامور تھا فون پٹخ کے جا چکا تھا..... میں نے ریسیور پھینکا اور باہر نکلتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے بھاگا پولیس والے پانچ منٹ میں پبلک کال آفس بھی پہنچ سکتے تھے یہ بھی ممکن تھا کہ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ کسی کو پیغام دے چکا ہو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے واقعی بہت کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ ذرا سی عقل مندی سے کام لے کر میں بال بال بچ گیا تھا۔ خطرے کی حدود سے دور آ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ فون میں نے ہوسٹل سے کیا ہوتا تو آدھ گھنٹے بعد یقیناً سازش کے اس جال میں گرفتار ہو جاتا جو کسی نے بہت ہی چالاکی سے بچھایا تھا۔ غلطی اس سے صرف یہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ ورنہ میں سیدھا ہوٹل جاتا اور تفتیش کے چکر میں آ جاتا۔ اسی بھول نے جو نادانستگی میں ہوئی تھی مجھے بچا لیا تھا۔
موٹر سائیکل کو پارکنگ ایریا میں چھوڑ کے میں اوپر گیا تو محسن رضا کے کمرے کا دروازہ بند تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی انگریز سے اس کے دورِ حکومت کے مظالم کا بدلہ لینے جا چکا ہے۔ انگریز نے ہماری نسلوں کو۔ ہماری اخلاقی اقدار کو اور ہماری تہذیب کو خراب کیا تھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ بات میں نے اور محسن نے سرِعام اتنی بار کہی کہ بالآخر ہوسٹل کے سخت گیر۔ بوڑھے اور برطانوی قدامت پسندی کے علمبردار سپرنٹنڈنٹ تک پہنچ گئی تھی اور اس نے دو بد باطن گوروں کی تحریری شہادت پر مجھے اور محسن رضا کو تنبیہ کروا رنگ دی تھی کہ ہم نسلی منافرت اور تشدد پسندانہ سیاسی خیالات کے اظہار سے باز نہ آئے تو ہمیں ہوسٹل سے خارج کر دیا جائے گا۔ نسلی منافرت کی فضا تو تھی مگر اس کا الزام صرف ہم پر نہیں آتا تھا۔ دوسری بات سراسر لغو اور بے بنیاد تھی۔ غیر سنجیدگی سے کہی جانے والی بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ایک متعصب ذہنیت کی مذموم سازش تھی۔ دونوں بد باطن گورے گواہوں کی گوشمالی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اس کارِ خیر میں تمام اختلافات بھلا کے سب ایشیائی طالب علموں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ اگلے دن گوروں کی ایک ٹیم نے جوابی کارروائی کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نسلی فسادات پھیل جانے کے ڈر سے پرنسپل اور مقامی انتظامیہ نے مل جل کر معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ اس امکانی فساد کا ذمے دار بھی ہم ہی سمجھے گئے تھے لیکن سزا سے محفوظ رہے تھے --- ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کالج کے پرنسپل کو بھی یقین دلا چکا تھا کہ ہم دونوں خطرناک ایشیائی ہیں۔ جو برطانیہ کی ساکھ کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ اگر آج میں قتل کے اس کیس میں ملوث ہو جاتا تو میرا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر وہ دونوں اتفاقِ رائے سے تسلیم کر لیتے کہ قتل کی واردات میں ہمارے ملوث ہونے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کے میرے قدم رک گئے۔ دروازہ جسے میں قفل کر کے گیا تھا کھلا ہوا تھا۔ اس کے ڈور لاک میں ایک معمولی سی خرابی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اسے شرافت سے بند کیا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد پٹ اور چوکھٹ جدا ہو جاتے تھے۔ صحیح طرح سے بند کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ دروازے کو دھکیل کر دھڑ سے مارا جائے اس وقت پٹ اور چوکھٹ جدا تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اندر جانے والا دروازہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

بند کر کے مطمئن ہو گیا تھا اور اسے احساس بھی نہیں تھا کہ دروازہ پھر کھل گیا ہے۔ میرے کمرے کی واحد چابی میرے ہاتھ میں تھی۔ جس کے بغیر دروازہ کھل ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے پٹ کو دھکا دیا۔ دروازے کے زنگ خوردہ پرانے قبضے چرچرائے۔ اور میں اندر داخل ہوا تو ایک لڑکی جو میری میز کی درازوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی تیزی سے پلٹی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"ہیلو۔ کون ہو تم؟" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ اپنی مٹھی میں کچھ دبائے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی عمر پچیس سال سے کم تھی۔ مگر آنکھوں کے گرد قبل از وقت نمودار ہو جانے والے حلقوں۔ چہرے کی پژمردگی بھونڈے میک اپ کی دبیز تہہ سے جھانکنے والی چھائیوں کے نشانات اور ڈھلکے ہوئے جسم کے باعث وہ پینتیس سال سے زائد کی لگتی تھی۔ پھر اس کی صورت پر وہ بے باک حیا سے عاری اور گناہ آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے لباس کی طرح اسکے پیشے کا اشتہار دیتی تھی۔

میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا "میری میز کی درازوں میں سے کیا نکالا ہے تم نے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس نے اچانک دونوں ہاتھ بڑھا کے مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا اور اسٹول سے ٹکرا کے نیچے گرا۔ اس عورت نے جست لگا کے مجھ پر سے گزر جانے کی کوشش کی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ لیکن میں نے لیٹے لیٹے اس کا ایک پاؤں گرفت میں لے لیا میرے ہاتھ میں ایک زنانہ جوتا آیا۔ لیکن وہ عود منہ کے بل گر گئی۔ اس کے حلق سے ایسی زبردست چیخ برآمد ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ مگر اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں اس پر جا پڑا۔ وہ عورت بلی کی طرح مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی۔ اس کے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے چہرے پر خراشیں پڑ گئیں۔ میرے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اور میرے بال اس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشی قوت نے چند منٹ میں اسے زیر کر لیا مگر اس جدوجہد میں عورت کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور اس کے جسم پر بھی خون کی سرخ لکیریں پھیل گئیں۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس عورت کو فرار نہیں ہونے دوں گا۔ اور پولیس خود ہی معلوم کرے گی کہ یوں چوروں کی طرح وہ میرے کمرے میں کیا لینے آئی تھی۔ عورت مسلسل چیخ رہی تھی "بچاؤ۔ بچاؤ۔" اور میں ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والوں کے قدموں کی آواز سن رہا تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہو گئی۔ وہ عورت پلک جھپکتے میں میری گرفت سے نکل گئی۔ اور دروازے کی طرف بھاگنے کی بجائے میرے بستر پر جا گری۔

دروازہ دھڑ سے کھلا اور بیک وقت بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ یہ سب ہوسٹل میں رہنے والے ملکی اور غیر ملکی باشندے تھے۔ دو افراد نے مجھے قابو کر لیا کیونکہ میں پھر اس عورت کی طرف لپکا تھا اس نے آخری دلدوز چیخ ماری اور دو گوروں نے آگے بڑھ کے اسے سنبھال لیا "خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔" وہ دیوانہ وار چلائی "یہ کالا مجھے دھوکے سے لے آیا۔ یہ میری آبرو لوٹنا چاہتا تھا۔" وہ دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے بولی۔

میں خوف اور صدمے سے سن کھڑا رہ گیا۔ اس فاحشہ کو سنبھالنے والے وہی دونوں بدباطن گورے تھے جنہوں نے ایک بار ... میرے اور محسن کے خلاف تحریری شہادت دی تھی۔

میرے حمایتی وہ سب ایشیائی طالب علم تھے جو مجسم سوال بنے بے بس کھڑے تھے۔

"خدا کی قسم یہ جھوٹ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی ابھی باہر سے آیا ہوں تو یہ میرے کمرے میں گھسی ہوئی کچھ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں۔"

لیکن صاف ظاہر تھا کہ میری اس وضاحت نے کسی کو مطمئن نہیں کیا ہے۔ میری قوت آزمائی کے نشانات اس کا تار تار لباس اور خود میری حالت میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ عورت جسے یقیناً کسی نے سازش کے تحت بھیجا تھا اپنے مقصد میں کامیاب رہی کیونکہ وہ بہت اچھی اداکارہ بھی تھی۔ وہ اب ہسٹریا کی کیفیت میں چلا رہی تھی "خدا کے لیے۔ یسوع مسیح کے لیے مجھے اس کالے حیوان سے بچاؤ۔" اور اس پر واقعی بیہوشی غالب آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا یہ مکروفریب کے حربے ہیں لیکن دیکھنے والے حالات کی پوری تصویر دیکھ رہے تھے اور انہیں عورت کی مظلومیت کا اور میری فطری خباثت کا یقین آ رہا تھا۔

دونوں بدباطن گوروں نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور دانت پیس کر آگے بڑھے۔ دو ایشیائی ان کی راہ میں فوراً حائل ہو گئے عین ممکن تھا میرا وہ کمرہ نسلی فسادکی خونی آماجگاہ بن جاتا۔ مگر اسی وقت مجمع کو چیر کر ہوسٹل کا یہودی سپرنٹنڈنٹ اندر آ گیا۔ اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ معاملہ کیا ہے۔

"مسٹر بخت" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی اور رک گیا پھر اس نے پلٹ کر ایک گورے سے کہا "جاؤ اور پولیس کو اطلاع دو باقی لوگ باہر" اس نے چٹکی بجائی: "آؤٹ!"

"تھینک یو سر" میں نے تلخی سے کہا "میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے پلٹا مگر سپرنٹنڈنٹ نے مجھے روک دیا۔ کمرے سے آخری لڑکا بھی باہر نکل گیا تھا۔

"پہلے پولیس کو یہ سب کچھ دیکھ لینے دو۔ جیسا ہے۔ جہاں ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے طنز سے کہا۔ صورت حال اتنی سنگین ہو گئی تھی کہ اب میرے لیے بوڑھے یہودی کو دھکا دے کر باتھ روم میں گھس جانا۔ اور ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدلنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں برطانوی پولیس کے سامنے شریفانہ حلیے میں جانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔ سپرنٹنڈنٹ کے احکامات ملنے سے قبل ہی کوئی پولیس کو فون کر چکا تھا اور وہ برطانوی پولیس تھی۔ جائے واردات پر پہنچنے کو میں چند منٹ لینے والی۔ دروازہ اسی وقت کھلا اور دو پولیس مین اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے عادتاً ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ بھی مجھے اسی مضحکہ خیز حلیے میں لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میں نے سفارتخانے سے رجوع کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے مجھے لباس تبدیل کرنے کی اجازت دے دی۔ نہ جانے کس نے اس عورت کو بھی زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا لا دیا تھا۔ جب ہم پولیس کی معیت میں روانہ ہوئے تو چشم دید گواہوں کا ایک مجمع ہمرکاب تھا اس وقت تک میں پرسکون ہو گیا تھا اور مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہ لگی کہ مجھے فون کر کے بلانے کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا تھا۔ ایک طرف میں قتل کی واردات کی تفتیش میں پھنس جاتا۔ دوسری طرف یہ عورت اپنا کام کر کے نکل جاتی۔ اسے بھیجنے والوں کو کہاں معلوم تھا کہ میں ویسے بھی ایک معرکہ سر کرنے جا رہا تھا۔ آدھی رات سے پہلے میرے لوٹنے کا امکان نہیں تھا۔ مگر نامعلوم دشمنوں نے کمرے سے میری عدم موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے ٹیلی فون کیا تھا۔ کون جانے میں اس ہوٹل میں پہنچ جاتا تو کمرہ نمبر تین سو دو میں ہونے والے ایک ایسے شخص کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ثابت ہو جاتا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا اور جس کے نام سے بھی میں ناواقف تھا۔ قانون تو اندھا ہوتا ہے اور ثبوت شہادت کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ نہ جانے وہاں میرے خلاف کتنے ثبوت ملتے اور کتنے گواہ پیدا ہو جاتے۔ محض تصدیق کرنے کے باعث میں بچ گیا تھا اور آدھے راستے ہی سے لوٹ آیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے کمرے میں غیر متوقع طور پر پہنچ کر اس عورت کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا جو میرے کمرے میں کسی کی ہدایت پر کچھ رکھنے آئی تھی۔ یا درازوں میں سے کچھ نکال کرلے جانے کیلئے۔ خود کو محصور پا کے اس نے جو کچھ کیا تھا۔ اس کا اپنا فعل تھا لیکن انجام وہی ہوا تھا جو دشمن چاہتے تھے۔ میں اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ اور مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا انتہائی سنگین جرم تھا۔ ثابت مجھ پر قتل کا جرم بھی نہ ہوتا۔ ثابت یہ بھی نہ ہو گا کہ میں اس پیشہ ور عورت کو خود دھوکے سے اپنے کمرے میں لایا تھا۔ لیکن فیصلہ ہونے تک جتنا نقصان ہونا تھا ہو جائے گا۔

محسن کو میں نے پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد دیکھا۔ میں نے اس سے چند منٹ تخلیے میں بات کرنے کی اجازت مانگی جو مجھے تھوڑے سے تامل کے بعد مل گئی "تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟" وہ بولا۔

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتا دی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا "یہ تیرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ بس اس پراسرار شخص کے ٹیلی فون کی بات مت کرنا۔ یہ کہنا تو میرے ساتھ تھا۔"

"اور تو کہاں تھا؟" میں نے اس نکتے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

محسن نے جیب سے آپیرا کے دو ٹکٹ نکالے "وہ نہیں آئی نا..." اس نے ذرا خفت زدہ ہو کے کہا "مگر اب ہمارے پاس ثبوت ہے ہم دونوں آپیرا دیکھ رہے تھے۔ آدھا حصہ میں ابھی جا کے پھینک دوں گا۔ اور صبح ہونے دے۔ میں وکیل کے ساتھ آؤں گا۔ اس سے پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا چیف بھی آئے نا تو بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کی ایسی تیسی۔"

ضمانت کے لیے صبح مجھے ایک مقامی جج کے سامنے پیش کیا گیا سب سے پہلے میرا بیان ہوا۔ پھر پہلی گواہی ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے دی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کرنے کے بعد میرے سابقہ شورش پسند ریکارڈ کا حوالہ دیا۔

"جناب والا۔" میرے وکیل نے اعتراض اٹھایا۔ "مقدمہ زیر سماعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" عدالت نے اعتراض تسلیم کر لیا اور سپرنٹنڈنٹ کو خاصی مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد چھ گواہوں کی... فہرست پیش کی گئی۔

"جناب والا۔" وکیل صفائی نے دوسرا اعتراض کیا۔ "ان میں سے دو گواہ ناقابل اعتبار ہیں۔ ان کے اور میرے مؤکل کے درمیان عناد اور اختلافات کے اسباب پہلے سے موجود ہیں۔"

دونوں بدباطن گوروں کا نام گواہوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ باقی چار گواہ بھی صرف یہی بتا سکے جو انھوں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات کے بارے میں وہ کسی سوال کا جواب نہ دے سکے۔ جس سے ثابت ہوتا کہ میں عصمت دری کی کوشش کا مرتکب بھی ہوا تھا۔ آخری اور سب سے اہم بیان محسن رضا کا تھا۔ جس نے دو نصف ٹکٹ پیش کیے اور ثابت کیا کہ میں اور وہ آپیرا دیکھ کے.... اکٹھے واپس آئے تھے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا اور میں اپنے کمرے کی طرف۔ دو منٹ بعد ہنگامے کی آواز آئی تو دوسروں کے ساتھ پہنچ کے اس نے بھی وہی دیکھا جو سب نے دیکھا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پھر میڈیکل رپورٹ پیش کی گئی جس سے محض دست درازی ثابت ہوئی تھی یا مدافعت۔

اسکے بعد وکیلِ صفائی نے جو خود ایک پاکستانی تھا۔ اور محسن رضا کا کزن تھا۔ اپنی آتش فشانی شروع کی۔ "جناب والا میرے مؤکل کی گرفتاری کا یہ رسوا کُن اقدام سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔" اس اقدام سے میرے مؤکل کو شدید ذہنی اذیت اٹھانی پڑی ہے۔ پولیس نے ایک قانون پسند شہری کو تحفظ فراہم کرنے کی بجائے ہراساں کیا۔ پولیس نے ایک بدکردار عورت سے ناجائز طور پر میرے مؤکل کے کمرے میں داخل ہونے پر باز پرس نہیں کی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مؤکل کی تصویریں کیوں چُرانے آئی تھی۔ جو اس کے ہینڈ بیگ سے برآمد ہوئی ہے؟ صرف اس لیے کہ میرا مؤکل ایک رنگدار ایشیائی ہے اور اس پر الزام عائد کرنے والی ایک سفید فام عورت ہے کیا قانون.....؟

استغاثہ کے وکیل نے ان ریمارکس پر شدید احتجاج کیا۔

میرے وکیل نے اپنے الفاظ واپس لے کر اس عورت کو جرح کیلئے طلب کر لیا۔ اس نے اپنا نام اور پتہ خود بتایا۔ پھر وکیل کے سوالات کی یلغار نے اسے بوکھلا دیا۔ بہت جلد اس نے تسلیم کر لیا کہ اسنے جھوٹ بولا تھا۔ اور پھر مجھ پر غلط الزام لگایا تھا۔

"مجھے مسٹر بخت کی تصویریں لانے کا معاوضہ پچاس پونڈ ادا کیا گیا تھا" اس نے اعتراف کیا۔

"یہ معاوضہ ادا کرنے والا کون تھا؟" وکیل نے کہا جو اتنی جلدی کامیابی حاصل کرنے پر خوش تھا۔

"میں انہیں جانتی نہیں۔ ایک ایشیائی تھا۔ دوسرا اس کا نوکر لگتا تھا۔ انہوں نے میرے گھر آ کے مجھے ایک چابی دی اور کہا تھا یہ معمولی کام ہے۔ چابی سے کمرے کا قفل کھل جائے گا۔ انہوں نے بعد میں مزید پچاس پونڈ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا" اس نے روتے ہوئے بتایا۔

"وہ تصویر کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے؟"

"میں نے نہیں پوچھا۔ انہوں نے تو اپنا نام تک نہیں بتایا تھا اور کہا تھا اپنے کام سے کام رکھو" وہ بولی۔

"اور تم نے ناجائز ہونے کے باوجود یہ کام کرنا قبول کر لیا؟"

"میں سو پونڈ کو کیسے ٹھکراتی۔ میں غریب... عورت ہوں ....اب میری آمدنی بھی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ مسٹر بخت کے آجانے کا کوئی امکان نہیں۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مسٹر بخت پر عصمت دری کا الزام بھی تم نے ان کے کہنے پر لگایا تھا؟"

عورت نے اقرار میں سر ہلایا۔" اس نوکر ٹائپ نے کہا تھا کہ بفرضِ محال مسٹر بخت آجائیں تو میں دوسرا حربہ استعمال کروں۔ کامیابی کی صورت میں مجھے مزید سو پونڈ ملیں گے۔"

"پھر اب تم ان کے خلاف بیان کیوں دے رہی ہو؟" وکیل نے کہا۔

"اس لیے کہ وہ دونوں پچاس پونڈ دے کر غائب ہو گئے ہیں۔" وہ چلّا کے بولی "ان میں سے کوئی میری خبر لینے تک نہیں آیا۔"

عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا اور اس عورت کو جیل بھیج دیا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ وہ پچاس پونڈ کی خاطر میرے دشمنوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی۔ جسم کے خریدار ملتے تو وہ ضمیر کو کیوں بیچتی۔ اب وہ لندن کے لاکھوں ایشیائی باشندوں کی آبادی میں گم ہو گئے تھے اور ناکامی کی سزا اس کا مقدر بن گئی تھی۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا سکندر کہ وہ بدمعاش کون ہیں اور کیا دشمنی ہے ان کو تیری ذات سے۔" محسن رضا نے عدالت سے نکل کے ہوسٹل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں بھائی محسن رضا کہ اگر میں اس ہوٹل کے کمرہ نمبر تین سو دو میں پہنچ جاتا تو کیا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "کیا اس قتل کے ذمہ دار بھی وہی تھے؟"

"نہیں۔" محسن رضا نے کہا۔" اخبار میں اس قتل کی تفصیلات آچکی ہیں۔ قاتل اسی ہوٹل کا ایک ویٹر تھا جس نے کافی میں خواب آور دوا ملائی تھی۔ مقدار کچھ زیادہ ہو گئی۔ مقتول ایک جوہری تھا جسے ویٹر نے لوٹ لیا تھا۔"

"مگر مجھے وہاں بھیجنے کا مقصد کیا تھا؟ جھوٹے گواہوں سے قتل کا الزام مجھ پر ثابت کرنا؟"

محسن ہنسا۔" نہیں یار۔ اب اتنی دھاندلی بھی نہیں ہے۔ میرا تو خیال ہے وہ دونوں اسی ہوٹل میں مقیم ہیں یا تھے اور قتل کے بارے میں ان کو ہم سے پہلے اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ تُو وہاں پہنچ جاتا تو تفتیش وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا اور خاصی دیر کمرے سے باہر رہتا۔ اب لعنت بھیج سب پر۔ آئندہ کی سوچ۔ جو اس حد تک درپئے آزار ہیں۔ کیا وہ ایک ناکامی پر حوصلہ ہار کے بیٹھ جائیں گے! وہ پھر کچھ کریں گے سکندر بخت!"

اس نے موٹر سائیکل ہوسٹل کے دروازے پر روکی۔ میرا سامان دروازے کے باہر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چوکیدار سے کہا۔ حالانکہ سوال کرنے

سے پہلے ہی بات میری سمجھ میں آچکی تھی۔ چوکیدار نے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ مجھے تھما دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے مخصوص اختیارات سے کام لیتے ہوئے مجھے ہوسٹل سے خارج کر دیا ہے۔ کیونکہ میں فتنہ و فساد کا باعث اور بدنامی کا سبب ہو رہا ہوں۔

"آئی ایم سوری سر" چوکیدار نے کہا۔" میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ آپ کو کالج سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ کے مشورے پر۔ کل آپ کالج جائیں گے تو شرمندہ ہوں گے۔ لوگ ویسے بھی آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔"

"ہم اب عدالت میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔" اور اس گوراشاہی نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

لیکن کل دور تھی اور ہم جانتے تھے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی یہ طویل قانونی جنگ ہم نے جیت لی تب بھی اس کالج میں اور ہوسٹل میں رہنا شیر کے کچھار میں رہنے کے مترادف ہو گا چنانچہ ہم نے سامان اٹھایا اور محسن نے مجھے اپنے ایک ہپی دوست کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں فٹ کر دیا۔ اگلا غور طلب مسئلہ تعلیم جاری رکھنے کا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تیرے لیے کسی اور کالج میں داخلہ لینا خاصا مشکل مرحلہ ہو گا۔" محسن رضا نے کہا۔" ہاں اگر مارگریٹ تیری مدد کرے۔ اس لارڈ کی بیٹی کا باپ انڈیا کے کسی صوبے کا لفٹننٹ گورنر تھا۔ اور وہ تجھ پر مرتی ہے۔"

"مگر یہ داخلے سے بھی مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کینہ متعصب بڈھا تو مجھے برطانیہ سے نکلوا دے۔ میں ابھی اباجی کو کچھ نہیں لکھوں گا۔ بیکار رہنے کی بجائے میں کالج اور ہوسٹل سے اخراج کے خلاف اور پولیس کے خلاف مقدمات لڑوں گا۔ اور مقدمات کی فیس ادا کرنے کے لیے نوکری کرونگا۔"

اس پروگرام پر عملدرآمد کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ اگلے ایک ماہ میں میرے ساتھ مسلسل ایسے واقعات پیش آئے جو بالآخر برطانیہ سے مجھے ڈی پورٹ کرنے کے احکامات کا سبب بنے۔ سب سے پہلے تو ہوسٹل کے اس کمرے میں بم پھٹا جہاں میں مقیم تھا۔ بم معمولی تھا۔ مگر دھماکے سے قدیم سال خوردہ عمارت کی خستہ حال دیواریں گر گئیں اور دو افراد ہلاک ہوئے۔

اس سے پہلے کہ محسن یہ خبر مجھے پہنچاتا۔ پولیس کے دو سراغرساں آپہنچے۔ اور مجھے ساتھ لے گئے۔ دو دن تک وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرتے رہے کہ میری انتقامی کارروائی تو نہیں ہے۔ کچھ اخبارات نے حادثے کی خبر دیتے ہوئے۔ میرا تذکرہ بھی کر دیا تھا چنانچہ یہ تفتیش ناگزیر ہو گئی تھی۔ جب مجھے اس جج کے سامنے پیش کیا گیا تو غیر جانبدار اور فراخدل ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسٹر بخت۔ کیا اس واردات کا تمہارے ساتھ پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات سے کسی قسم کا تعلق ہو سکتا ہے؟

"یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے یور آنر۔" میں نے کہا۔" میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک باقاعدہ سازش کے تحت مجھے ان واقعات میں ملوث کیا جا رہا ہے۔"

"کیوں مسٹر بخت؟" جج نے کہا۔"کیا تمہارے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" ابھی تک میں کسی پر الزام نہیں عائد کر سکتا اور اس کا کوئی سبب بتانے سے بھی قاصر ہوں۔"

جج نے مجھے بری کر دیا لیکن اس مرتبہ باعزت طور پر نہیں۔ شک کا فائدہ دیتے ہوئے۔

میری پریشانی تو برحق تھی۔ مگر محسن مجھ سے زیادہ پریشان تھا۔

"یار سکندر..... یہ کیا چکر ہے؟" اس نے شام میرے ساتھ ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ آئے تو بتاؤں۔" میں نے کہا۔" مجھے تو اندیشہ یہ لاحق ہو رہا ہے کہ پاکستان میں میرے والد بھی کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ تجھے یاد ہے اس فوما نچو نے پہلی بار فون پر کیا کہا تھا۔ اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہارے والد بالکل خیریت سے نہیں ہیں۔ اور اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ محتاط رہو۔ اس کی یہ وارننگ غلط نہیں تھی تو وہ اطلاع کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اباجان نے مجھے صحیح بات نہ بتائی ہو۔"

"میرا خیال ہے تو واپس چلا جا۔" محسن نے کہا۔ وہ خاصا متفکر نظر آتا تھا۔

"واپس چلا جاؤں! یعنی ڈر کے بھاگ جاؤں! یہ معلوم نہ کروں کہ یہ سب کون کر رہا ہے اور کیوں؟" میں نے کہا۔

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم رات کا اندھیرا پھیل جانے تک وہیں بیٹھے مختلف خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اپنی اپنی عقل کے مطابق توجیہات تلاش کرتے رہے اور غیر یقینی مستقبل کے لیے بے بنیاد منصوبے بناتے رہے۔ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اور ہم دونوں اٹھ کر بھاگے۔ میرے کمرے تک پہنچتے پہنچتے بارش نے شدت اختیار کر لی۔ میں نے محسن کو اپنے کپڑے دیے۔ اور اس نے رات وہیں رک جانے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا مالک یعنی محسن کا وہ ہپی دوست غائب تھا۔ اور اس کے آنے یا نہ آنے کے امکانات برابر تھے۔ وہ اکثر راتوں کو غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ رات گیارہ بجے تک ہم نے فریج میں رکھی ہوئی چیزوں سے اپنا پیٹ بھرا۔ اور کافی پیتے رہے۔ ٹی وی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دیکھتے رہے۔ اور پھر سو گئے۔ محسن نے بیڈ پر قبضہ کر لیا اور مجھے صوفے کے ساتھ قالین پر جگہ بنانی پڑی۔

آدھی رات کے بعد محسن کی زبردست چیخ سے میری آنکھ کھلی میں ہڑبڑا کے اٹھا تو اندھیرے میں ایک سایہ لپکا۔ اور مجھ پر سے گزر گیا۔ میں نے دروازے کی طرف جست لگائی۔ دروازہ دھڑ سے بند ہوا۔ اور کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی۔ محسن نے صرف ایک بار چلا کے مجھے آواز دی تھی اور خاموش ہو گیا تھا۔ خوف سے ڈوبتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے میں نے لائٹ آن کی ایک لمحے کے لیے وہ کمرہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی سے زمین پر چھلانگ لگا دی ہے۔ میں نے بڑی سخت جدوجہد سے اپنا توازن بحال کیا اور دوڑ کر بیڈ تک پہنچا۔ محسن!" میں نے چیخ کر کہا۔ پھر میں نے وہ خنجر دیکھا جو محسن کے سینے میں پیوست تھا۔ لیکن نشانہ خطا ہو جانے کے باعث دل سے بہت اوپر شانے کے قریب لگا تھا۔ خون تیزی سے بہہ کر بستر کو تر کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور اسے زور زور سے بلانے لگا۔ دو منٹ بعد کسی نے کنڈی کھول دی۔ اس عمارت کے دوسرے مکین بھی شور پر متوجہ ہو کے باہر آنے لگے تھے میں نے بلا توقف نیچے کا رخ کیا جہاں ہال میں فون رکھا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کو اور پھر پولیس کو بلانے کے بعد میں واپس کمرے میں آیا۔ اس وقت تک کمرے میں چار افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے زخم پر تولیہ رکھ کے خون روکنے کی واجبی سی کوشش کی تھی۔ باقی لوگ وہ تفصیلات جاننا چاہتے تھے جو خود مجھے معلوم نہیں تھیں۔

محسن کا زخم خطرناک نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد مجبوراً میں نے اسے ہسپتال میں چھوڑا کیونکہ پولیس مجھ سے تفتیش کے لیے بے چین تھی۔ ایک بار پھر میرا واسطہ اسی سراغرساں سے پڑا جس نے مجھے پہلی مرتبہ گرفتار کیا تھا۔ "مسٹر بخت!" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا "تم شیطان کی طرح شہرت حاصل کرنے لگے ہو۔ یہ چکر کیا ہے؟"

"چکر کچھ نہیں" میں نے تلخی سے کہا۔ "لندن کی پولیس نااہل ہے تم سب کالوں کے قاتل ہو۔"

اس نے سوچے سمجھے بغیر میرے تھپڑ رسید کر دیا۔ میرا دماغ آؤٹ ہو گیا۔ اور میں نے جواب میں اس کے جوڈو کا ایک ہاتھ مار دیا۔ وہ کرسی پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ صبح میں تیسری بار اس جج کے خدمت میں حاضر ہوا جس نے مجھے دوبارہ رہا کیا تھا۔ وکیل نے یہ تو ثابت کر دیا کہ محسن پر حملہ دراصل مجھ پر حملہ تھا۔ محسن میرے کمرے میں میرے بستر پر اور میرے کپڑوں میں تھا۔ چنانچہ وہ نامعلوم حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ لیکن خوش قسمت تھا کہ زندہ بچ گیا۔ تاہم وہ عدالت کو یہ نہ بتا سکا کہ حملے کا شک کس پر کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر واقعی میں سازش کا شکار ہوں تو سازش کا مقصد کیا ہے۔ بغیر وجہ کے کوئی کسی سے دشمنی کیسے کر سکتا ہے۔ محسن کے بیان سے میری پوزیشن مزید صاف ہو گئی۔ مگر ایک پولیس افسر پر حملہ کرنے کے جرم میں مجھے ایک ماہ قید محض کی سزا سنا دی گئی۔ جسے جج نے معطل رکھا۔ اور کہا کہ اگلی مرتبہ ایسی ہی واردات میں ملوث ہونے پر مجھے سیدھا جیل بھیج دیا جائے گا۔

عدالت سے باہر آتے ہی مجھے وکیل نے روک لیا۔ "مسٹر سکندر بخت!" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ.... یہ جو کچھ ہو رہا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں تمہاری نیت کو دخل ہے..... یا تم غلط کہتے ہو۔ مگر میں آئندہ تمہارے کسی معاملے میں وکالت نہیں کر سکوں گا۔ پولیس کے پاس تمہاری فائل موٹی ہوتی جا رہی ہے اور وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کے اظہار پر کل تم نے اس پولیس افسر کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ تم واقعی شیطان کی طرح شہرت حاصل کر رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب تک تم نے میری مدد کی اس کا شکریہ۔"

"ایک اور بات۔" وکیل نے کہا۔ "میں محسن کا کزن ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے اس کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو۔ وہ کھاتے پیتے والدین کا لڑکا ہے۔ تعلیم محض شوقیہ حاصل کر رہا ہے۔ شوق کی خاطر جان سے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ میں اس کے والدین کو فون کر رہا ہوں کہ وہ محسن کو لے جائیں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"محسن میرا بچپن کا سب سے عزیز دوست بھی ہے اور محسن بھی۔ میں اعتراض کیسے کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے کہنے سے شاید وہ نہ جاتا۔ اچھا ہے۔ اس کے والد آ کے اسے زبردستی لے جائیں۔"

تین دن بعد محسن کے والد یعنی انکل شیروانی جو ڈپٹی سیکریٹری تھے محسن کو اس کے احتجاج کے باوجود اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اس کے جہاز کی پرواز کے بعد بھی ائیرپورٹ پر یوں کھڑا رہ گیا۔ جیسے میرے اردگرد سنسان جنگل ہے جس سے میرے لیے سلامتی کی منزل کا ایک ہی راستہ تھا جو اب نہیں رہا۔ پہلی بار میں نے خود کو تنہا۔ بے بس اور خوفزدہ محسوس کیا۔

آخری واقعہ دو ہفتے بعد آیا۔ میں بارش سے بے نیاز سردی میں بھیگتا ہوا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے ایک جگہ ملازمت کی کوشش میں کامیاب ہو کے لوٹ رہا تھا۔ ایک پاکستانی تاجر نے جس کا لندن میں بہت بڑا اسٹور تھا۔ اور دوسرے شہروں میں برانچیں تھیں میرے حالات سن کر مجھے سیلز مین رکھنا منظور کر لیا تھا۔ اس سے پہلے انگریز تو انگریز خود میرے ہم وطن اور بہت سے ایشیائی بڑی شرافت اور اخلاق کے ساتھ 'سوری' کہہ کے یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے لیکن یہ تاجر اثر رسوخ رکھنے والا اور جرأت مند آدمی تھا۔ اس نے کہا۔ "سکندر بخت! ابتدا میں مجھے بھی ان گوروں کی متعصب حاکمانہ ذہنیت کا سخت مقابلہ کرنا پڑا تھا لیکن اب میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں ان کے ہتھکنڈے سمجھتا ہوں۔ اس لیے مار نہیں کھاتا۔ تم فکر مت کرو۔ ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے وہ دشمن کون ہیں۔ پھر میں ان کا بندوبست کروں گا کہ سب کا دماغ درست ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے وہ کرائے کے آدمی ہیں۔ یہ چکر یہاں بہت عام ہے لیکن لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ آدمی تیرے پاس بھی ہیں سفید کتے۔ جو نوٹ دیکھتے ہی گورے کالے کا فرق بھول جاتے ہیں۔ میں اپنے خیالات میں غلطاں تیز تیز قدموں سے چلا رہا تھا کہ اچانک ایک ویران موڑ پر مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ ایک سایہ سا مجھ پر لپکا۔ میرے سر پر لوہے کی سلاخ جیسی کوئی چیز پڑی اور میں چکرا کے گر پڑا۔ ہوش کی کیفیت کا آخری احساس یہ تھا کہ مجھے زمین پر گرتے ہی اٹھا لیا گیا ہے۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے میں بالکل دوسری جگہ سڑک پر پڑا تھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو حلقہ بنائے کھڑے تھے ان سب کے ہاتھوں میں چھتری تھی۔ سوائے ایک پولیس مین کے جو میرے سر کے قریب بجلی کے کھمبے کی طرح استادہ تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک عورت سیدھی لیٹی تھی۔ اور بارش اس کے ساکت وصامت جسم پر مسلسل گر رہی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوئیں۔ پھر اسٹریٹ لائٹ کے مدھم سے دھندلے اجالے میں میری یادداشت نے ایک صورت کے خدوخال تراشنے شروع کر دیے بالآخر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے ہوسٹل میں مجھ پر عصمت دری کی کوشش کا الزام لگایا تھا اس کے آس پاس خون کا نام و نشان نہیں تھا اور اس کے جسم پر کسی زخم یا چوٹ کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ مگر اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ مر چکی ہے۔

میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اسی وقت سائرن سنائی دیے اور مجمع خود بخود چھٹ گیا۔ ایک ایمبولینس اور ایک پولیس کار میرے بہت قریب آ کے ٹھہری مستعد ہاتھوں نے پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ مجھے اسٹریچر پر ڈالا۔ اور ایمبولینس میں سرکا دیا۔ پھر دوسرا اسٹریچر اندر آیا اور ایمبولینس کا پچھلا دروازہ بند ہو گیا۔ اب میں ایک لاش کے ساتھ مسلح محافظوں کی نگرانی میں سفر کر رہا تھا۔ اور مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میری منزل کیا ہے۔ اپنی بے گناہی کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرنے تک میں قانون کی نظر میں اس عورت کا قاتل تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہ بدبخت عورت جو پچاس پونڈ کے چکر میں جان سے گئی تھی شاید مردہ خانے پہنچی۔ طبی معائنے کے دوران اور بعد میں ایک پولیس افسر اور سراغرساں ہمہ وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔

ایک ہفتے کی تفتیش کے دوران میں نئے انکشافات نہیں ہوئے۔ اس عورت کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا مگر اس کی گردن پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔ میں نے الزام کی صحت اور اعتراف جرم سے صاف انکار کر دیا لیکن اس بات کی وضاحت نہیں کر سکا کہ مجھے بیہوش کر کے لاش کے قریب ڈال جانے کی کارروائی بھی میرے خلاف سازش تھی تو سازش کے محرکات کیا تھے اور سازش کرنے والے کون تھے۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک انتہائی سرد مزاج، صورت سے بے وقوف نظر آنے والے مگر بہت ذہین اور عیار سراغرساں نے میرے خلاف تمام واقعات کی ایک ضخیم فائل مرتب کر لی تھی جس میں ترتیب وار ہوسٹل میں مقتول عورت کی ہنگامہ آرائی سے قبل تک کے تمام واقعات اور بیانات وغیرہ شامل تھے۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست بہت طویل تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" اس نے صبح موقع پاتے ہی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ہوسٹل میں نسلی منافرت اور تشدد پسندانہ خیالات کے اظہار پر وارننگ دی گئی تھی۔"

"وہ ایک تنگ نظر متعصب بوڑھے یہودی کی معاندانہ کارروائی تھی۔" میں نے کہا۔

"پھر یہ مقتول عورت کا ہنگامہ تمہارے کمرے میں ہوا جو ہوسٹل کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔" سراغرساں نے بات جاری رکھی۔

"عدالت نے مجھے اس مقدمے سے باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔ سزا مقتو... اس عورت کو ہوئی تھی۔"

"لیکن اس کے بعد پہلا شک ہم اس کمرے میں پہنچا جہاں سے تم کو نکالا گیا تھا اور تم شک کے فائدے پر چھوڑ دیے گئے۔" سراغرساں نے صفحہ پلٹ کے کہا۔ "واردات میں دو افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ہوسٹل کی تاریخ میں ایسی واردات کبھی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

میرا ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "گویا میری تاریخ ساز شخصیت..."

"پلیز شٹ اپ۔" سراغرساں نے کہا۔ "اس واردات کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بعد تمہیں نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا لیکن ہوسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ تم نے ایک منشیات کے عادی اور منشیات کے دھندے میں ملوث ہپی کے گھر میں پناہ لی۔"

"یہ میرے لیے ایک انکشاف ہے۔" میں نے کہا۔" میں اس ہپی کو جانتا نہیں تھا۔"

"وہیں تم قاتلانہ حملے کی ایک اور واردات میں ملوث ہوئے۔ پھر تم نے تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر پر حملہ کیا چنانچہ تمہیں ایک ماہ قید کی سزا دی گئی جو معطل رکھی گئی تھی۔" اس نے مزید چند صفحات پلٹ کے کہا۔

"اس پولیس افسر نے مجھے گالی دی تھی۔" میں نے چیخ کر کہا۔" اور جو شخص زخمی ہوا تھا وہ میرا عزیز ترین دوست تھا۔ حملہ مجھ پر کیا گیا تھا۔"

"تم جج کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکے تھے کہ تمہارے خلاف سازش کا جواز کیا ہے؟" وہ اسی سرد مہری سے بولا۔" اور خود تمہارے وکیل نے آئندہ کے لیے تمہاری پیروی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"اس کی خدمات رضاکارانہ تھیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اب تازہ ترین حادثہ اس عورت کا قتل ہے جس نے پہلی بار تم پر ایک سنگین الزام عائد کیا اور اس طرح وہ تمہارے ہوسٹل کے اخراج کا اور تمہارے تعلیمی کیریر کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔" سراغرساں نے فائل رکھ کے اور مجھ پر نظر جما کے کہا "کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے سامنا ہوتے ہی انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ تم اب تک یہ ثابت نہیں کر سکے ہو کہ تم پر کسی نامعلوم شخص نے جائے واردات سے دور حملہ کیا تھا۔"

"تو میرے سر پر ڈنڈا یا سریا کس نے ملا تھا؟ خود میں نے؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

سراغرساں نے نفی میں سر ہلایا اور فائل کا ایک اور صفحہ پلٹا۔" میڈیکل رپورٹ میں سریے ڈنڈے کا کوئی ذکر نہیں۔ تمہارے سر پر پتھر لگا تھا۔ غالباً یہ چوٹ گرنے سے آئی تھی۔ تم مسٹر اقبال سے واقف ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جوش سے کہا۔" وہ بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ انہوں نے مجھے سیلز مین کی جگہ دی تھی۔"

"اور تم رات گیارہ بجے کے قریب ان کے گھر سے رخصت ہوئے تھے۔" سراغرساں نے مزید صفحات پلٹے۔" ان کے بیان کے مطابق تم گیارہ بج کر پانچ منٹ پر گئے تھے۔ یہ واردات ان کے گھر سے دو سو گز کے فاصلے پر ہوئی ہے، اور میڈیکل رپورٹ میں واردات کا وقت گیارہ سے بارہ کے درمیان

متعین کیا گیا ہے۔ تمہارا کمرہ اس جگہ سے دو میل دور ہے ٹیکسی سے صرف دس منٹ کی مسافت پر۔ مگر تمہارا بیان ہے کہ تم پر حملہ بارہ بجے کے قریب ہوا۔"

"میں پیدل گیا تھا۔" میں نے کہا۔" اور ٹیکسی کی طرح دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں سیر کرنا چاہتا تھا۔"

"بارش کے باوجود؟" سراغرساں طنز سے مسکرایا۔" شاید یہ بات تمہیں یاد نہیں رہی؟"

"مجھے بارش میں پیدل چلنے کا خبط ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا میرا شوق خلافِ قانون ہے؟ ویسے میں ٹیکسی تلاش کر رہا تھا۔"

سراغرساں مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔" تم نے اس عورت کو قتل کیا ہے۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"تم کسی طرح مجھے اعترافِ جرم پر مجبور نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔" میرے وکیل نے سفارت خانے کو بھی مطلع کر دیا ہے تم اپنے تھرڈ ڈگری کے طریقے استعمال نہیں کر سکو گے۔ آخر تم لوگ شرلاک ہومز کے طریقے کیوں نہیں استعمال کرتے؟"

"تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلایا۔" سفارت خانے کی رضامندی سے برطانوی حکام تمہیں ڈی پورٹ کرنے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔"

"سفارت خانے والے ایسے کسی انتقامی اقدام کی حمایت نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"انہیں تمہاری حکومت کے ایک اعلیٰ افسر کی طرف سے یہ درخواست موصول ہوئی ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لیکر بولا۔" وہ افسر تمہاری وزارتِ خارجہ کا ڈپٹی سیکرٹری ہے اور تمہارے دوست سید محسن رضا کا باپ ہے جو پہلے ہی پاکستان جا چکا ہے۔"

یہ انکشاف واقعی افسوسناک تھا۔ محسن نے خلوصِ نیت سے میری ذلت و رسوائی کا سامان کر دیا تھا۔

"اگر تم پر یہ الزام ثابت نہ ہوا، جس کا امکان بہت کم ہے، تو تم رہائی کے فوراً بعد ناپسندیدہ شخص قرار دے کر نکال دیے جاؤ گے ورنہ جیل کاٹنے کے بعد۔" اس نے اپنے رویے کی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔" ایک بات اور بھی ہے۔ مقتول عورت سوہو کے علاقے کی ایک تھرڈ ریٹ کسبی تھی اور ایک ماہ کی جیل کاٹ کے پیرول پر رہا ہوئی تھی۔ صرف ایک دن پہلے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ سزا اس کو تم پر الزام تراشی کے جرم میں ہوئی تھی۔"

"تم نے اپنے نظامِ انصاف کی غیر جانبداری دیکھی؟" میں نے تلخی سے کہا۔" جرم مجھ پر ثابت ہو جاتا یا کر دیا جاتا تو مجھے کتنی لمبی جیل کاٹنی پڑتی؟ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ مقتول عورت نے خود ہی اقبالِ جرم کر لیا تھا مگر اس کے باوجود ایک سازش میں ساتھ دینے، میری رسوائی کا سبب بننے، میرے کمرے میں ناجائز طور پر داخل ہونے اور دیگر جرائم کی مرتکب ثابت ہونے کے باوجود اسے کم سے کم سزا دی گئی جو اس نے نصف کاٹی۔"

"کل رات دو افراد اس سے ملنے آئے تھے۔" سراغرساں نے میری بات سننے کے بعد کہا۔" پڑوس کی ایک مخبوط الحواس بڑھیا نے ان کو دیکھا تھا جس کی بصارت اور سماعت بھی قابلِ اعتبار نہیں، اس کے کہنے کے مطابق وہ دونوں ایشیائی تھے۔ ایک دراز قد اور خوشحال۔ دوسرا پستہ قد اور نوکر ٹائپ۔ جھگڑے کی آواز پر بڑھیا متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا کہ ہاں۔ میں نے سب کچھ بتا دیا ہے کیونکہ تم نے بدعہدی کی تھی۔ جواب میں دراز قد نے کہا تھا کہ ہم بہت جلد تمہارا حساب بے باق کر دیں گے۔ ان دونوں کا حوالہ مقتولہ نے مقدمے کی سماعت کے دوران بھی دیا تھا۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو۔ تمہاری ذات ان معاملات سے متعلق رہی ہے۔"

"متعلق تو اس جج کی ذات بھی رہی ہے۔ تم نے اس سے پوچھا؟" میں نے جل بھن کر کہا۔

ایک ہفتے بعد تفتیش کے مراحل تقریباً مکمل ہو چکے تھے اور مجھے فردِ جرم کے ساتھ عدالت میں پیش کرنے کے انتظامات ہو رہے تھے کہ رات کے وقت مجھے ملاقات کے لیے علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے میں صرف وکیل کو مجھ سے تخلیے میں بات کرنے کا حق حاصل تھا اور وکیل ایک بار مجھ سے ملاقات کر کے جا چکا تھا۔ اس وقت یوں بھی ملاقات خلافِ ضابطہ تھی چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے ستر برس کے دراز قامت اور دبلے پتلے انگریز کو دیکھا جس نے انتہائی بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا اور جو ہاتھ میں عصا لیے بالکل سیدھا کھڑا تھا جس کا سرخ و سفید متکبر چہرہ حاکمیت کے جلال اور دولت مندی کے ـ ـ ـ ـ نسلی برتری کے احساس کا آئینہ دار تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ سابق غلام ہندوستان کے ایک صوبے کا وہی متعصب اور تنگ نظر لیفٹیننٹ گورنر تھا۔" مسٹر سکندر بخت!" اس نے بڑی نخوت کے ساتھ مصافحہ کیے بغیر کہا۔" تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔"

"میں نے پہچان لیا ہے اور اسی لیے میں حیران ہوں۔" میں نے کہا۔" آپ کیا تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آئے ہیں؟"

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔" کاش یہ ممکن ہوتا۔" وہ بولا۔" لیکن میری ایک لڑکی ہے، صرف ایک۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس کا نام مارگریٹ ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"یہی تو میری بدقسمتی ہے۔" اس نے منہ دیوار کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔" کہ وہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں بھی ایک سینٹو پرنس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ اب زندگی میں دوسری بار میری عزت خطرے میں ہے۔"

"تم اس خطرے کا وہی تدارک کر سکتے ہو۔ پہلی بار عزت کیسے بچائی تھی تم نے؟"

اس کی صورت پر ایک تاریک سایہ پھیل گیا۔" بیوی کو میں نے باعزت طور پر دفن کرا دیا تھا۔"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں، اب بیٹی کو زیادہ باعزت طور پر دفن کرا دو۔" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔" شادی تو میں نے دوسری کر لی تھی، اب میں مجبور ہوں اتنی بڑی بیٹی کہاں ملے گی؟"

"افسوس کہ برطانیہ کے عام شہری قوانین تم کو حاکم تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔" اور تم مجھے دفن نہیں کرا سکتے۔ وہ غلام ہندوستان تھا جہاں تم حاکم تھے اور قانون سے بالاتر تھے۔"

اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ فرطِ اشتعال سے اس کا بدن لرزنے لگا تھا مگر وہ ضبط کر رہا تھا۔" سکندر بخت! میں اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ آدمی جو کرنا چاہے ہر جگہ ہر وقت کر سکتا ہے۔ کوئی قانون کسی سزا کا خوف اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کے کتنے دن باقی ہیں؟ میں تمہیں اسی وقت شوٹ کر کے خودکشی بھی کر سکتا ہوں مگر اس کا خمیازہ بھی وہی بے وقوف لڑکی بھگتے گی اور جب اسے تم سے بچانے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ تو... مگر خیر... یہ بتاؤ کیا وہ تم کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تم بھی شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

مطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب

امتحان میں کامیابی حاصل کیجیے

قیمت ۱۰ روپے ڈاک خرچ ۵ روپے

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۴۴ کراچی نمبر ا

میں نے اس کی مزید تذلیل کے لیے قہقہہ مارا۔ "میں اب غلام نہیں، آزاد ملک کا خوددار شہری ہوں سر! میں کسی بھی تم جیسے لارڈ کی بیٹی سے جوتے تو صاف کرا سکتا ہوں مگر شادی کا شوق اسے ہے۔"

"شٹ اپ!" وہ چلایا۔ "یہ مت بھولو کہ میں ایک باپ ہوں۔ میں تم سے ایک سودا کرنے آیا ہوں اور اس لیے تمہاری بکواس سن رہا ہوں کہ مجھے تم جیسے شیطان سے نجات کی دو صورتیں نظر آتی ہیں جس میں میری عزت بھی محفوظ رہے گی، اور تم پر میرا احسان بھی رہے گا۔ لک ہیئر۔ میں تمہیں اس الزام سے بچا سکتا ہوں۔ سمجھے؟"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "میں تمہارے احسان کے مقابلے میں سزائے موت کو ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ گولی مارو احسان کو۔" وہ چیخ کر بولا اور سنتری نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دروازہ بند کرکے غائب ہوگیا۔ "اگر تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس ملک سے نکل جاؤ، تو میں گواہی دے سکتا ہوں کہ جب تم پر حملہ کیا گیا تھا تو میں اُدھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے کسی کو تم پر حملہ کرتے اور پھر اٹھا کے گاڑی میں ڈال کر فرار ہوتے دیکھا تھا لیکن میں دور تھا اور پیدل تھا۔ آس پاس کوئی پولیس مین نہیں تھا اور جائے واردات پر کوئی خون وغیرہ نہیں تھا اس لیے میں خاموش رہا۔"

"ایک عیار سراغرساں تم سے پوچھے گا، سر! شاید آپ کو یاد نہیں رہا اس وقت بارش ہو رہی تھی، اور آپ لارڈ ہیں آپ پیدل کیوں تھے؟" میں نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

"مائی فٹ۔ کوئی سراغرساں مجھ سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ مجھے خبط ہے بارش میں پیدل چلنے کا۔ ستر سال کا بڈھا خبطی اور سنکی ہوتا ہے۔ اب بولو، تم یہاں جیل میں رہنا چاہتے ہو یا ڈی پورٹ ہونا؟" وہ بولا۔

"ڈی پورٹ ہونا میرے لیے باعثِ مسرت ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ مارگریٹ میرے فراق میں خودکشی نہ کرلے۔"

اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور چھڑی کو بڑے وقار سے گھماتا دروازے کی طرف بڑھا۔ "اسے میں سمجھا لوں گا۔"

"لارڈ جیمز!" دروازے کے قریب میں نے اسے روک لیا۔ "آئی ایم سوری سر!" میں نے صدقِ دل کے ساتھ کہا۔ "اور میں آپ کے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ انسانی رشتوں کی آبرو کا رنگ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کے مجھ سے مصافحہ کیا اور باہر نکل گیا۔

جب مجھے ڈی پورٹ کیا گیا تو الوداع کہنے کے لیے آنے والے افراد صرف دو تھے۔ ایک لارڈ جیمز اور دوسری اس کی بیٹی مارگریٹ۔ اور وہ اتنی افسردہ تھی کہ میرے لیے اس سے نگاہ ملانا بھی دشوار تھی۔ میرے ذہن میں وہ شام تھی جب ایک احمقانہ کمینی خواہش کے تحت میں نے اس سے اپنے آباؤ اجداد کی محکومی کا انتقام لینے کے بارے میں سوچا تھا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا جب اچانک اناؤنسر کی آواز نے ہر سمت سے مجھے پکارنا شروع کیا۔ "مسٹر سکندر بخت جہاں بھی ہوں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر آجائیں۔ ہیلو۔ اٹین شن مسٹر سکندر بخت..!!"

کاؤنٹر پر ایک نک چڑھی لڑکی نے غور سے مجھے دیکھا۔ "آپ سکندر بخت ہیں؟" وہ تقریباً ڈانٹ کر بولی۔

"جی۔ اپنا پاسپورٹ دکھاؤں؟" میں نے کہا۔ "یا حلف نامہ داخل کروں؟"

جواب دیے بغیر اس نے ایک لمبوترا سا خاکی لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "آپ کے لیے۔"

میں نے لفافہ لے لیا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا۔

"یہ کس نے دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک بچہ تھا۔" نک چڑھی لڑکی نے کہا۔ "میں نے اس کا نام نہیں پوچھا۔"

"یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کو یہ خط کس نے دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں، ویسے آپ اس کو لینے کے پابند نہیں ہیں۔" نک چڑھی لڑکی نے کہا۔

اس منطق کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس میں صرف کاغذات تھے چنانچہ تشویش کی بات کوئی نہیں تھی۔ لفافے کی بجائے پیکٹ ہوتا تو میں خود اس نک چڑھی سے کہتا کہ میں اسے لینے کا پابند نہیں اور اگر بعد میں وہ پارسل دھماکے سے پھٹ جاتا تو مجھے قطعی افسوس نہ ہوتا۔ شاید نئے کاؤنٹر پہ آنے والی نئی لڑکی زیادہ خوبصورت اور کم بد اخلاق ہوتی۔ جہاز جب برطانیہ کے قیام کی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں کی سرحد سے بھی دور نکل گیا تب مجھے وہ لفافہ یاد آیا۔

لفافے میں سے ٹائپ کیے ہوئے چند صفحات پر مشتمل

ایک خط برآمد ہوا جو مجھے مخاطب کرکے لکھا گیا تھا لیکن خط کے آخر میں لکھنے والے نے اپنا نام و نشان کچھ نہیں دیا تھا۔ چند سطور پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ ٹائپ کرنے کا مقصد اپنے ہاتھ کی تحریر دینے سے گریز کے سوا کچھ نہیں تھا۔ عبارت ٹھیک تھی مگر ٹائپ کی غلطیاں بے شمار تھیں۔ اس نے لکھا تھا:

"ڈیئر کبیر خاں!

میں نے ایک بار ٹیلیفون کرکے تمہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ تمہارے والد خیریت سے نہیں ہیں اور تمہیں فوراً وطن جاکے حالات کو سنبھالنا چاہیے لیکن تم نے میری بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ میں نے تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا، جسے تم نے اہمیت نہیں دی۔ نتیجہ یہ کہ تمہارے خلاف سازش کا جال پھیلانے والے تمہارے لیے مسلسل پریشانی کے اسباب پیدا کرتے رہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اندازوں کی غلطی اور اتفاقات کے باعث تم خیر و عافیت کے ساتھ واپس لوٹ رہے ہو۔ تاہم تمہارے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کی آزمائش کے مرحلے تمام نہیں ہوئے اور تم بدستور خطرات کے حصار میں ہو۔ اگر تم میرے دوسری بار فون کرنے پر ہوٹل کے کمرہ نمبر دو سو تین میں آجاتے تو یہ خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی اور میں بالمشافہ تمہیں بہت کچھ بتا دیتا۔ شاید بروقت اصل حقائق سے باخبر ہوجانے کے بعد تمہارے شکوک رفع ہوجاتے اور تم فوری طور پر کوئی قدم اٹھاتے تو بہتری کی صورت پیدا ہوجاتی۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے مجھے اپنا خیر خواہ تسلیم نہیں کیا۔ ممکن ہے تمہیں بدظن کر دیا گیا ہو۔ لندن سے آتے جاتے میں نے بہت سے خطرات مول لے کر تمہیں خبردار کرنا چاہا تھا مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ اب تیسری بار لندن سے گزرتے ہوئے مجھے تمہارے حالات کے مزید ابتر ہوجانے کی اطلاع ملی تو میں افسوس کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ مجبوراً یہ خط ارسال کر رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے بہت کم اُمید ہے کہ تم تک پہنچ جائے گا۔ اور اگر پہنچا تو عین ممکن ہے اس کی خبر بھی دشمنوں تک پہنچ جائے۔ خط کو پڑھ کے جلا دینا اور میرے لیے مغفرت کی دعا کرنا۔ بشرطِ زندگی تم سے کبھی نہ کبھی ملوں گا تو وہ باتیں بھی بتا دوں گا جو اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ وقت بہت کم ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ایک کرائے کے قاتل کو روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلات کا مجھے علم نہیں کہ وہ کون ہے یا اس کا حلیہ کیا ہے اور وہ اپنا کام سفر کے دوران کرے گا یا منزل پر پہنچنے کے بعد۔ بہرصورت تمہیں ہر اجنبی سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

دوسری اطلاع تمہارے لیے زیادہ افسوسناک ہے۔ تمہارے والد جن کو تم ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں چھوڑ کر گئے تھے اب اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔ وہ کوٹھی بھی ان کی نہیں ہے۔ تمہارے جانے کے بعد رفتہ رفتہ کاروبار ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہوگئے۔ مجبوراً انہوں نے کوٹھی فروخت کر دی اور خود قلعہ گوجر سنگھ کے ایک کرائے کے مکان میں اٹھ گئے۔ کوٹھی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے سکی۔ انہوں نے تمہاری تعلیم کی تکمیل کے لیے کچھ رقم ایک غیر ملکی بینک میں جمع کرا دی تھی جو ان کی ہدایات کے مطابق ہر ماہ تم کو ایک بندھی رقم بینک ڈرافٹ کی صورت میں بھیجتا رہا۔ ذاتی ضروریات کی تکمیل کے لیے انہوں نے ایک سیٹھ کے پاس چوکیدار کی ملازمت قبول کر لی۔ یہ سیٹھ ایک زمانے میں تمہارے والد کا ملازم تھا اور غبن کے بعد روپوش ہوگیا تھا۔ جب بعد میں وہ پکڑا گیا تو اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ ہوسکا اور اسی رقم سے کاروبار کرکے وہ لکھ پتی بن گیا۔ تاہم وہ قدرت کے نظامِ انصاف سے نہ بچ سکا اور جب تمہارے والد اس کے پاس نوکری کے لیے گئے تو وہ دنیا میں تنہا تھا۔ اس کے بیوی بچے مری سے لوٹتے ہوئے کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ اس نے ترس کھا کر اپنے سابق آقا کو نوکر رکھ لیا۔ بیماری کے باعث وہ کوئی سخت محنت طلب کام نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کو کمروں کی اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس کے عوض وہ نمک حرام تمہارے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

والد کو تین سو روپے دیتا تھا اور بچا کھچا کھانا انہیں وہیں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں وہ اب بھی رہائش پذیر ہوں گے۔ میری آخری اطلاع کے مطابق ایک مہینہ پہلے وہ اسی کمرے میں اور شدید علیل تھے۔ ان کو گٹھیا کا مرض لاحق تھا لیکن علاج معالجے کے لیے اچھے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرنا ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ وہ مشکل ایک سرکاری ڈسپنسری تک جاتے تھے اور اس برائے نام علاج سے فائدے کی بجائے انکو نقصان ہورہا تھا۔ یہ سب کچھ قبل از وقت جان لینا تمہارے لیے بے حد ضروری ہے تاکہ خدانخواستہ تم سیال سنگھ کالج ہوسٹل اور نواب مظفر علی قزلباش کے محل کے درمیان واقع چوہدری چراغ دین کی کوٹھی جس کے دروازے پر سی۔ سی۔ ڈین کی تختی لگی ہوئی ہے کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچو اور تمہیں معلوم ہو کہ وزیر خاں کا انتقال ہوچکا ہے اور تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ خدا کرے وہ زندہ ہوں اور تمہیں وہ سب کچھ بتا سکیں جو میں نہ بتا سکا۔ انہوں نے یہ سب کچھ تمہیں صرف اس لیے نہیں لکھا تھا کہ تمہاری تعلیم میں ہرج واقع نہ ہو اور یہ نہ ہو کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس لوٹ آؤ۔ اس طرح ان کی تمام ریاضت رائیگاں جاتی۔ ان کی زندگی کی واحد قابلِ فخر کامیابی تم ہو۔

کبیر! ان کی موجودہ حالت کا سبب صرف ایک شخص ہے، میر شرافت علی۔ جو اُن کا بزنس پارٹنر تھا۔ شاید تمہیں علم ہوگا کہ یہ شخص ۱۹۵۶ء میں پاکستان پہنچا تھا۔ اس وقت تک کاروبار کے مالک صرف تمہارے والد تھے۔ تین سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے کلیم میں ملنے والی ایک دکان کے اندر لوہا کوٹتے کوٹتے برانڈرتھ روڈ پر وہ فاؤنڈری قائم کر لی تھی جہاں لیتھ مشین کے پارٹ بنانے سے کام شروع ہوا تھا اور پھر مکمل لیتھ مشین تیار ہونے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پاور ڈرل اور متعلقہ آلات بھی بنتے تھے اور ان مصنوعات کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ انکی آمدنی سے تمہارے والد نے کلیم میں ملنے والے مکان کو چھوڑ کر کنال بنک کی کوٹھی کرائے پر لی تھی اور پھر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی خریدی تھی۔ میر شرافت علی کے آنے کے تین سال بعد میر وزیر اینڈ کمپنی ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی اور جیسے انگریز تجارت کے بہانے ہندوستان آئے تھے اور ہندوستان کے مالک بن بیٹھے تھے۔ ایسے ہی شرافت علی پارٹنر بن کے شامل ہوا اور سارے کاروبار پہ قابض ہوگیا۔ کاغذی دستاویزات میں ہر سال درج ہونے والے منافع کا آدھا حصہ تمہارے والد کو ملتا رہا لیکن صرف اس حد تک کہ وہ منافع کی وصولی کے کاغذات پر اپنے دستخط ثبت کرتے تھے۔ منافع کی رقم شرافت علی کے کسی اکاؤنٹ میں چلی جاتی تھی جو اس نے مختلف بنکوں میں اپنی بیوی کے اور بچوں کے نام سے کھول رکھے تھے۔ اس طرح میر شرافت علی پر بلیک میلنگ کرکے کوئی رقم وصول کرنے کا الزام نہیں آتا تھا۔ تمہارے والد نے ۳۰ جون ۱۹۶۵ء کو آخری بار کمپنی کے حسابات میں بحیثیت پارٹنر اپنے دستخط ثبت کیے تھے۔ نفع نقصان کی بیلنس شیٹ دیکھی تھی جس کے مطابق ان کے حصے کا منافع تمام اخراجات وضع کرنے کے بعد نقد ساڑھے تین لاکھ روپے بنتا تھا اور اپنے سرونٹ کوارٹر کو لوٹ آئے تھے۔ تیس ہزار ماہانہ کی آمدنی کا مالک تین سو روپے ماہوار پر اپنے ایک ملازم کا ادنیٰ ملازم تھا۔ تمہارے والد نے اپنے حالات کو سب سے چھپائے رکھا اور کمپنی کے نمک خوار بھی یہی سمجھتے ہیں کہ پرانے مالک بیماری کے باعث معذور ہو گئے ہیں چنانچہ سب کاروبار میر شرافت علی کے سپرد کر چکے ہیں جو غلط بھی نہیں، لیکن اصل اسباب کا کسی کو علم نہیں۔

مجھے امید ہے اسباب تم خود معلوم کرو گے اور میر شرافت علی سے اپنے والد کی حق حلال کی کمائی کے اس پیسے پیسے کا حساب لے سکو گے جس پر تمہارا حق تھا مگر جو میر شرافت علی نے بلیک میلنگ سے ہتھیا لیا۔ وقت آنے پر میں بتا دوں گا کہ تمہارا یہ خیر خواہ کون تھا۔“

جب میں یہ خط پڑھ رہا تھا تو میرا وجود اس جہاز میں دوسروں کے لیے اس نوجوان آدمی کی صورت میں ضرور باقی رہ گیا تھا جو ٹائپ کیے ہوئے چند صفحات پر نظر جمائے ساکت و صامت بیٹھا تھا۔

اور ایک بار عبارت کو آخر تک پڑھ لینے کے بعد پھر حرفِ آغاز پر آجاتا تھا۔ صدمے سے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہوگئی تھی اور میرا ذہن بھیانک حقائق کے جوالا مکھی کے پھٹنے سے جھلس رہا تھا۔ میرے خون کا ہر قطرہ تیزاب بن کے لہو میں آگ کی طرح پھیل رہا تھا اور انتقام۔ انتقام پکارنے لگا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر سڑکوں اور دنیا کو بتاؤں کہ میں وہ بدنصیب اور جہنمی بیٹا ہوں جس کے لیے دنیا و عقبیٰ میں روسیاہی کے سوا کچھ نہیں۔ خون کا یہ آخری رشتہ تھا جو سلامت رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔ ایکبار تقدیر نے جدا کیا تھا تو ملا بھی دیا تھا۔ دوسری بار میں نے اپنا مستقبل سنوارنے کی تدبیر کی اور سات سمندر پار سفید فاموں سے دو سو سال پہلے کے مظالم کا بدلہ لینے کے بہانے انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑاتا رہا۔ یہاں اپنے ہم وطن جو میرے باپ کے دشمن تھے اس پر انسانیت سوز مظالم ڈھاتے رہے۔ اس نے اپنی زندگی کے لیے تمام مصائب اور آلام قبول کیے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا کہ کہیں اس سے میرے مستقبل کے خواب پریشان نہ ہو جائیں۔ وہ مجھے باقاعدگی سے اتنی رقم بھیجتا رہا کہ جو میری تعلیم کے علاوہ میری عیاشی کے لیے بھی کم نہ تھی اور خود محرومیوں کے عذاب میں گرفتار رہا۔ بچے کھچے ٹکڑوں سے پیٹ بھرتا رہا اور اپنے نوکروں کا نوکر بن کے صبر و شکر کے ساتھ ہر ذلت برداشت کرتا رہا۔ تمہیں عمداً بے خبر رکھا گیا تھا کبیر۔ ایک نادیدہ خیر خواہ کی آواز میرے ذہن میں گونجی۔ صحت اور کاروبار دونوں ٹھیک ہیں الحمدللہ۔ میرے والد کی آواز نے ہزاروں میل کی مسافت طے کرکے ٹیلی فون کی زبان سے جھوٹ بولا۔ خدانخواستہ آج تمہارے والد کو کچھ ہوگیا تو تم کیا کرو گے۔ اس نادیدہ خیر خواہ نے کہا۔ جب تک میں ہوں یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ میرے والد نے ہنس کر ٹال دیا۔ تیس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کا مالک۔ وہ بوڑھا، جس کا اکلوتا بیٹا لندن میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کررہا تھا، وزیر خاں جو ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی سے کار میں بڑی شان سے نکلتا تھا جو میر وزیر اینڈ کمپنی کا مالک تھا۔ مالک ہہ، میر شرافت علی نے قہقہہ لگا کے کہا۔ وہ بوڑھا جو کندھے پر جھاڑن رکھے سارا دن صوفے اور میز کرسیاں، گلدان اور سامانِ آرائش، کھڑکیوں کے شیشے اور فانوس جھاڑتا پھرتا ہے، جو گٹھیا کے لیے خیراتی شفاخانے سے رنگدار پانی اور اسپرین کی گولیاں لاکے شفا کی امید رکھتا ہے، امید کیا ہے، خود فریبی کا جال۔ وہ بوڑھا اپنے اکلوتے بیٹے کے سنہرے مستقبل کے لیے زمانے کی ٹھوکروں میں رہا۔ مستقبل تو سراب تھا۔ اور ان حالات کا ذمے دار صرف ایک شخص تھا۔

بہت دیر بعد جب غیظ و غضب تاسف اور ملال اور پشیمانی و پریشانی کے جذبات کی تباہ کن لہر کا زور ٹوٹا تو میں ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا انسان تھا۔ میرے خیالات و احساسات بدل چکے تھے۔ میری ذہنی کیفیت میں وہ انقلاب آچکا تھا جس نے مجھے زندگی کے مقاصد کا نئے سرے سے تعین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے میں خوابوں کے محل تعمیر کر رہا تھا۔ اب میں بے رحم حالات کی آندھی میں منہدم ہو جانے والے گھر کے ویران کھنڈر پر کھڑا نوحہ خواں تھا۔ مجھے اسی ویرانے میں اپنی گمشدہ جنت بنانی تھی اور تعمیر کے خواب کو تعبیر دینے سے پہلے ان سب کے خون سے بنیادوں کی آبیاری کرنی تھی جو اس تباہی و بربادی اور تخریب کے عمل میں شریک تھے اور بھول گئے تھے کہ آنے والا دن یومِ مکافات بھی ہو سکتا تھا۔ میری فہرست میں پہلا نام میر شرافت علی کا تھا اور دوسرا چراغ دین کا جو اَب سی۔ سی۔ ڈین ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اس گمنام خط کے مندرجات درست ثابت ہوئے اور مجھے اپنے باپ کی قدم بوسی کے لیے سی سی ڈین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر کی بجائے اس کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کے لیے جانا پڑا تو میر شرافت علی کو اس قتل پر اپنے ہاتھوں سے سزائے موت دوں گا اور چراغ دین سے سی سی ڈین بن کے میرے باپ کی تذلیل کرنے والے کو وہ سزا دوں گا کہ اس کی ذلت کا تماشا باعثِ عبرت ہو۔ اس فیصلے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ غم و اندوہ کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے کوہ گراں کا بار اتنا ہلکا ضرور ہو گیا ہے کہ میں سانس لے سکوں۔

میرپور کے اصیل باشندے یعنی محترم ڈش واشر نے میری حالت کے تغیر کو محسوس نہیں کیا تھا یا درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا، مگر کالا صاحب میرے انہماک اور میری صورت کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ ”آر یو آل رائٹ؟“ اس نے بہت دیر بعد کہا جب میں خط کو جیب میں رکھنے کے بعد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ ”اس خط میں کوئی بہت تشویش کی بات تھی؟“ اس نے کہا۔ ”مجھے اندیشہ تھا کہیں تمہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔“

”میرا دل پتھر کا ہوگیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں خود ایک پتھر ہوں۔ شیشے کے انسانوں کو مجھ سے ڈرنا چاہیے۔“

کالے صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے باہر دیکھتے رہنے کو ترجیح دی۔ میں نے اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں سے کاٹ دیا اور باقی مسافروں پر ایک نگاہ ڈالی کہ ان میں سے کون صورت سے کرائے کا قاتل لگتا ہے، لیکن سب چہرے ایک جیسے اجنبی تھے۔ ملکی و غیر ملکی۔ سفید فام۔ گندمی رنگ والے۔ زرد رو اور سیاہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
urdusoftbooks.com

فام۔ جوان اور بوڑھے۔ سب اپنے اپنے خیالات میں محو تھے مگر کسی صورت پر قاتل کا گمان نہ ہوتا تھا اور سب قاتل لگتے تھے۔

"بائی دی وے" کالے صاحب نے اچانک کہا۔ "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" مدد کے جذبے سے زیادہ یہ تجسس کا جذبہ تھا جو اسے دخل در معقولات پر اکسا رہا تھا۔

"ہاں" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "آپ بتا دیں کہ میں نے کمرہ نمبر دو سو تین کو تین سو دو سمجھنے کی غلطی کیوں کی تھی اور اگر ادھر کا بندہ ادھر نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور کیا نہ ہوتا؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں" کالے صاحب نے چکرا کے کہا۔

"ادھر کا بندہ ادھر"

"میں بھی نہیں سمجھا تھا کہ فو ما بچو میرا خیر خواہ ہے" میں نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "کاش میں فو ما بچو سے مل لیتا۔"

راستے میں چکھنی تو در کنار میں نے سونگھی تک نہ تھی چنانچہ کالے صاحب کے لیے مجھے نشے میں فرض کرنا محال تھا۔ اس نے مجھے مخبوط الحواس قسم کا نامعقول انسان قرار دیتے ہوئے مزید گفتگو سے احتراز کرنا بہتر سمجھا۔ کئی گھنٹے بعد جب جہاز کا رخ اسلام آباد سے لاہور کی طرف کیا گیا تو انہوں نے مزید ایک جملہ ارشاد کیا تھا کہ پلین کریش کر رہا ہے تو صاف کیوں نہیں بتایا جاتا مگر مجھ سے مخاطب ہو کے نہیں۔ آخری بات لاہور ایئر پورٹ پر ہوئی جب انہوں نے ناگواری سے کہا کہ اگر میرا ارادہ جہاز ہی میں بیٹھے رہنے کا ہے تو میں ان کو گزرنے کا راستہ دے دوں اور میں نے حیران ہو کے دیکھا تو جہاز واقعی لاہور ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ سیٹ بیلٹ جو میں نے غیر شعوری طور پر باندھ لی تھی ابھی تک میرے جسم پر کسی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے سفر کو لاہور ہی میں ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب میں نے اپنا اسباب اور دستاویزات وغیرہ کو کسٹم کی چیکنگ کے لیے پیش کیا تو مجھے اپنے ساتھ چند اور مسافر بھی نظر آئے۔ ایک بوڑھا انگریز اور اس کی نسبتاً جوان بیوی۔ وہ سیاح یا ریسرچ اسکالر وغیرہ ہو سکتے تھے جو موہنجوداڑو یا ٹیکسلا کے گڑے مردے اکھاڑنے آتے رہتے ہیں۔ دوسرا ولایتی جوڑا انداز و اطوار کی بے فکری اور لاابالی پن سے ہنی مون منانے کے موڈ میں نظر آتا تھا اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ جہاز کہاں اترا ہے۔ وہ بحر الکاہل یا ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی اتنے ہی خوش نظر آتے۔ باقی دو انگریز نیشن صورت اور معزز قسم کے کار سیلری یا سفارتی عملے کے اعلیٰ ارکان ہو سکتے تھے۔ ان کو میں نے فرسٹ کلاس سے برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو کرائے کا قاتل سمجھنا بڑی غیر منطقی سی بات لگتی تھی۔ ان سے دو گنی تعداد میں پاکستانی مسافر تھے جن کو شاید میری طرح لاہور ہی آنا تھا۔ صرف تین کے ساتھ ان کا کنبہ بھی تھا۔ باقی میری طرح تنہا بھی تھے۔ میں نے بغور ان کی صورتوں کو ملاحظہ کیا مگر قاتل اگر پیشہ ور ہو تو چہرہ دوہرے نقاب میں رکھتا ہے۔ اپنی باری آنے پر میں نے کسٹم کی رسمی کارروائی پوری کی۔ میرے پاس ڈیکلیئر کرنے کو کچھ نہیں تھا۔

"کمال ہے۔ آپ تین سال لندن میں رہے اور اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے؟" عملے کے ایک رکن نے ناقابلِ یقین مشتبہ لہجے میں کہا۔

"مثلاً کیا! کوئی میم وغیرہ۔!" میں نے کہا۔ "میں نے سنا تھا۔ اس پر ڈیوٹی بہت زیادہ ہے۔ خواہ مخواہ ضبط ہو جاتی۔"

بادلِ نخواستہ انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔

"ٹیکسی سر" ایک مستعد قسم کے شخص نے مجھے گارڈ آف آنر پیش کرنے کے بعد کہا۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ صرف تین سال میں میرے ملک کے ٹیکسی ڈرائیور اتنے مہذب اور شائستہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ریلوے اسٹیشن جانے کا کرایہ اس نے سو روپے مانگا اور راز دار لہجے میں کہا کہ زرِ مبادلہ کی صورت میں پانچ پونڈ بھی قبول ہوں گے۔ تو میری خوش فہمی دور ہو گئی۔ اسی وقت دوسری ٹیکسی میرے سامنے آ رکی۔ اور ایک بار پھر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ دوسرے ٹیکسی ڈرائیور نے کوئی سودا نہیں کیا۔

"جو میٹر بتلائے گا جناب عالی وہی لیں گے" اس نے کہا۔ راستے میں اس نے ملک کو بدنام کرنے والے لٹیرے ٹیکسی ڈرائیوروں کے خلاف لیکچر دیا۔ لیکچر کا حصہ دوم جس میں رزقِ حلال کی اہمیت کا ذکر تھا۔ ابھی جاری تھا کہ ٹیکسی نے شملہ پہاڑی کا موڑ کاٹا تو میرے دل کی دھڑکن یکلخت تیز ہو گئی۔ ابھی ایک مہینہ قبل میں نے ان سے بات کی تھی اس کے بعد مجھے ڈرافٹ موصول ہوا تھا۔ محسن یہاں آ کے میرے والد سے ضرور ملا ہو گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور لکھ دیتا۔ مگر اس نے تو ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ اور خود میرے والد کا آخری خط کب آیا تھا؟

"کہاں جانا ہے آپ کو جناب عالی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے آہستہ سے بریک لگائی اور پلٹ کر کہا۔

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یکلخت میری نگاہ سیاہ پلاسٹک کی تختی پر ابھرے ہوئے سفید پلاسٹک کے روشن حروف پر گئی۔ "سی، سی، ڈین۔ میں نے زیر لب کہا۔ "بس یہیں جانا تھا۔" پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے یہاں ٹیکسی کیوں روکی! میں نے تو ریلوے اسٹیشن کہا تھا۔"

"تو ریلوے اسٹیشن لے چلتے ہیں جناب عالی" ٹیکسی ڈرائیور نے ٹھیٹھ لاہوری لہجے میں کہا۔ "ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے جہاز سے اتر کر گڈی پر چڑھنا تھا!"

میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو دو پونڈ دیے جو اصل کرائے کے دگنے سے بھی زیادہ تھے۔ چنانچہ اس نے خوشی خوشی رکھ لیے اور میرا سامان اتروا کر کوٹھی کے دروازے تک بھی لے گیا۔ ابھی میں کال بیل بجا کے کسی کے نمودار ہونے کی انتظار کر ہی رہا تھا کہ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو انجن اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بونٹ کھولتے اور بڑبڑاتے دیکھا۔ دو منٹ بعد میں نے چوتھی بار گھنٹی کا بٹن دبا دیا تو وہ بونٹ بند کر کے راہگیروں سے درخواست کر رہا تھا کہ گاڑی کو دھکا لگا دیں۔

گیٹ کے اندر کا ایک چھوٹا گیٹ کھول کر جو شخص سخت برافروختگی کے عالم میں باہر آیا اس کے کپڑوں کے داغ اور اس کے جسم سے پھوٹنے والی ہر خوشبو خبر دیتی تھی کہ وہ خانساماں ہے۔ وہ پچاس پچپن سال کا پہلوان ٹائپ شخص تھا۔

"گھنٹی پر گھنٹی۔ گھنٹی پر گھنٹی۔ بندے کو اندر سے باہر آنے میں وقت تو لگتا ہے۔ کچھ صبر بھی کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ولایت سے آ رہی ہے سواری" اس نے طنز سے کہا۔

"میں واقعی ولایت سے آیا ہوں" میں نے کہا۔ "مجھے وزیر خاں سے ملنا ہے"

اس کی صورت کے تاثرات ایک لمحے میں بدل گئے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر تمہیں معلوم ہو کے وزیر خاں کا انتقال ہو چکا ہے تو تمہارے لیے یہ صدمہ غیر متوقع نہ ہو۔ مجھے خط کے الفاظ یاد آئے مگر اس کے باوجود صدمہ غیر متوقع ثابت ہو رہا تھا۔

"کون ہو تم برخوردار؟" خانساماں نے نرمی سے کہا۔ "بڑی دیر سے آئے!"

میں نے سہارے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پھیلائے۔ میری نظروں کے سامنے سرخ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور زمین ڈوبنے لگی تھی۔ گیٹ پوسٹ کی دیوار نے مجھے سہارا فراہم کر دیا۔ "میں ان کا بدبخت بیٹا ہوں" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کون؟ سکندر بخت! جو ولایت میں پڑھ رہا تھا؟" بوڑھے خانساماں نے اپنا لہجہ ہمدردانہ رکھنے کی واجبی سی کوشش کی مگر اس لہجے میں ملامت کا رنگ غالب تھا۔ "اب آنے کی کیا ضرورت تھی برخوردار! اس غریب کو ہم ایک ہفتہ پہلے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر چکے ہیں۔"

"مجھے... مجھے بالکل معلوم نہیں تھا۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ آنسو میری آنکھوں سے نکل کر فرشِ خاک پر گرتے رہے۔ "انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"یہی تو فرق ہے زمانے کا" خانساماں بولا۔ "اس نے سارے دکھ اٹھائے اور اس لیے خاموش رہا کہ بیٹے کی تعلیم میں خلل نہ پڑے۔ بیٹا تھا کہ مزے سے ولایت جا کے بیٹھ گیا، صاحب بننے کے لیے۔ سال میں ایک بار بھی خبر لینے نہیں آیا۔ قصور وار تو مرنے والا ہی ہوا نا۔ کہ تم کو بے خبر رکھا۔ تمہارا فرض کہاں تھا اس کی خبر رکھنا" اس نے ایک گہری سانس لی اور میرے دونوں سوٹ کیس اٹھا لیے "خیر اب رونے دھونے کی بجائے اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔ چلو شاباش۔ صبر کرو۔"

میں نے آستین سے آنسو خشک کیے اور اس کوٹھی میں داخل ہو گیا جو میرے والد کے ایک نمک حرام ملازم نے غبن کی کمائی سے کھڑی کی تھی اور جہاں ملازم نے آقا کو تین سو روپے ماہانہ پر ذلیل کرنے کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ میری وجہ سے مجبور نہ ہوتا تو بے غیرتی کی اس زندگی پر بہت پہلے موت کو گلے لگا چکا ہوتا، لیکن زندگی کے سارے سہاروں کی شکست کے باوجود وہ میرے لیے زندہ رہا۔ میرے نادیدہ خیر خواہ کے خیال کے مطابق ان کی زندگی کی واحد قابلِ فخر کامیابی میں تھا۔ اس خانساماں ٹائپ شخص کے پیچھے چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میرے نام اور میرے لندن میں زیرِ تعلیم ہونے کے علاوہ اس کو حقائق کا علم کس حد تک ہے۔ کیا وہ جانتا ہے کہ وزیر خاں پہلے کیا تھا اور چراغ دین یا شرافت علی جیسے لوگوں نے ضمیر فروشی کے اس المیے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ اگر وزیر خاں نے حالات پر راضی برضا رہنے کی مجبوری کو میری وجہ سے قبول کیا تھا تو کیا اس نے یہ دکھڑا دوسروں کے سامنے رویا ہو گا؟ نہیں۔ ایسے تو بات پھیل جاتی اور کوئی چٹھی لکھ مارتا تو اس کی ریاضت واقعی رائیگاں جاتی۔

خانساماں نے کہا۔ "یہ اپنا کوارٹر ہے برخوردار۔ میں باورچی ہوں۔ سلامت شاہ۔ اسی کے ایک کمرے میں وزیر خاں میرے ساتھ رہتا تھا۔"

میں نے کوٹھی کے عقب میں بنے ہوئے ویران اور خستہ حال سرونٹ کوارٹر کو دیکھا اور اس کوٹھی کا تصور کیا جس میں میرے ولایت جانے سے پہلے میرے والد مقیم تھے۔ میرے ذہن میں ایک تصویر اتر آئی جس میں پوری کوٹھی کے ہر کمرے کا نقشہ تھا اور میرے والد کے تمام معمولات تھے۔ پرانی وضع کی کھڑکیاں۔ بلند اور نیم دائرے کی شکل کے رنگین شیشوں والے در اور روشندان۔ محرابی دروازے جن کی پالش سے دمکتی سطح پر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جڑی ہوئی پیتل کی کیلیں سونے کی لگتی تھیں۔ عشق پیچاں کی چھت تک پہنچنے والی بیلیں جن کے تنے موٹی رسیوں کی طرح آپس میں بل کھاکے الجھ گئے تھے اور جس میں نیلے پھول مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے سامنے والا لان جس پر بیٹھ کے میرے والد سبزے اور پھولوں کی مہک میں لمبے لمبے سانس لے کر بڑی فرحت محسوس کرتے تھے۔ اخبار پڑھتے تھے اور شام کی چائے پیتے تھے جو ٹرالی میں سجا کے ایک ملازم ان کے پاس چھوڑ جاتا تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ خدا کی عطا کی ہوئی ان سب نعمتوں کا احساس ان کو کتنی طمانیت اور مسرت بخشتا تھا وہ کوٹھی کو۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار کو۔ آراستہ کمروں کے پر آسائش لوازمات کو اور زندگی کے اس حسن انتظام کو دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتے رہتے تھے لیکن کبھی کبھی میں دیکھتا تھا کہ یہ مسکراہٹ یکلخت کافور ہو گئی ہے۔ یوں جیسے چودھویں شب کی چاندنی کو بادل کا ایک ٹکڑا چھپا دے۔ وہ کہتے تھے۔ "سکندر۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آج ہم دونوں کے ساتھ وہ سب بھی ہوتے۔ ان کی خوشی سے ہماری خوشی میں کتنا اضافہ ہوتا۔" وہ سب میرے بھائی بہن تھے اور میری ماں تھی اور ایک بوڑھی دادی تھی۔ موت سے کس کو رستگاری ہے مگر وقت کی اس بے رحمی کا داغ کہاں جاتا ہے جس کا ایک قاتل لمحہ زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں کو یوں سمیٹ کے لے جائے جیسے تیز آندھی خشک پتوں کو اڑا کے لے جاتی ہے۔

میں اس ویران مدفن جیسے کمرے کی سپاٹ دیواروں پر اس زندگی کا ہر عکس دیکھ رہا تھا جو خواب فردا کی طرح بے وجود ہو گئی تھی اور میرے لیے یہ تصور کرنا دشوار تھا کہ جس شخص نے اپنے عزم و استقلال سے تنہا اور بے سہارا رہ جانے کے باوجود جدوجہد کا آغاز ملبے کے ڈھیر سے کیا ہو اور کامیابیوں کی قابل رشک عمارت کھڑی کر لی ہو وہ ایسی کسمپرسی، بے چارگی۔ معذوری اور محرومی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ اس کال کوٹھری میں مفلسی کا عذاب جھیلتے چپ چاپ مر گیا۔ اس نے ایک بار بھی تو نہیں کہا کہ بیٹا اب میں بوڑھا ہوں اور بیمار ہوں اور ہر طرف سے دشمنوں کا حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ جوان بیٹا بڑھاپے کی لاٹھی ہوتا ہے۔ آؤ اب مجھے سہارا دو اور یہ محاذ سنبھالو۔ یہ توقعات تو سب ہی والدین رکھتے ہیں کہ اولاد بڑی ہو گی تو ان کے ہر دکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ سوز یر خاں تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ میں اتنے بڑے احسان کی سزا کا مستحق تو نہ تھا۔

"بس کرو برخوردار۔" سلامت شاہ نے ہمدردی سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ "آؤ ادھر میرے کمرے میں بیٹھو۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ میرے لیے چائے بنا کے لا چکا تھا اور اپنی جھلنگا چارپائی پر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کمرے میں لکڑی کی ایک ہی کرسی تھی جس پر تکیہ رکھ کے اس نے مجھے بٹھا دیا تھا۔

"میرے والد کے آخری ایام میں آپ ہی ان کے سب کچھ تھے" میں نے طبیعت سنبھل جانے کے بعد کہا۔ "آپ نے یقیناً بہت کچھ کیا ہو گا اور اس احسان کا اجر خدا دے سکتا ہے۔ میں یہ دعوے کس منہ سے کروں کہ اس کا بدلہ چکا دوں گا۔"

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "خدا کو یہی منظور تھا۔ ورنہ یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوتا تو وہ میرے کام آتا اور وہ لڑکا کیا کرتا جو ولایت میں ... کوسوں دور بیٹھا ہے۔"

میں چونکا۔ "آپ کا بھی کوئی لڑکا ہے باہر؟"

"ہاں جی۔ ایک ہی بیٹا ہے۔ ڈاکٹری کر چکا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا ہوا ہے۔" وہ فخر سے بولا اور اس کی آنکھوں میں غرور کی وہی پرمسرت چمک اتر آئی جو میں نے اپنے والد کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔ "ہمارے حالات بہت حد تک ایک جیسے تھے۔ میرا بھی اس بیٹے کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن میں نے وہ دکھ نہیں جھیلے جو وزیر خاں نے اٹھائے۔ میرا بھی ایک بیٹا جس کی ماں بدبخت میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ ایک سیٹھ کا بگڑا ہوا لونڈا اسے ورغلا کے بمبئی لے گیا تھا معلوم نہیں وہاں اس پر کیا بیتی۔ مجھے اس کا کوئی رنج نہیں۔ یوں پل بھر میں میرا پورا خاندان چٹ پٹ ہو جاتا تو میں دیوانہ ہو گیا ہوتا۔"

اس کے بعد وہ مجھے اپنے والد کے آخری ایام کی روداد سناتا رہا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جو کچھ اسے معلوم ہے وہ حقیقت کا ایک حصہ ہے۔ بے ضرر اور پردہ دار۔ جو سوال میں پوچھنا چاہتا تھا یہ تھا کہ میرے والد نے آخری ایام میں اس بے ضمیر شخص کے پاس ملازمت کیوں کی جو ان کے اعتماد کو دھوکا دے چکا تھا اور قانون کی گرفت سے بچ گیا تھا لیکن ان کا مجرم تو تھا۔ سارے شہر میں ان گنت لوگ ایسی ہی کوٹھیوں میں آباد تھے اور ان میں سے کوئی بھی ترس کھا کے ان کو گھر میں ملازم رکھ سکتا تھا۔ چراغ دین سے نوکری کی بھیک مانگنے اور کل تک اپنے ٹکڑوں پر پلنے والے ایک معمولی ملازم کے ہاتھوں ذلت قبول کرنے میں انہوں نے کیا مصلحت دیکھی تھی۔ کیا وہ چراغ دین کو سزا دینا چاہتے تھے۔ جو اس دنیا کا نظام انصاف نہ دے سکا کیونکہ شہادت ناکافی تھی۔ مگر وہ خود زبان کی نہیں دل کی گواہی سے قائل تھے کہ چراغ دین مجرم ہے اور عمر نے وفا نہ کی ورنہ اسے یہ سزا ضرور ملتی۔ میرے والد ہمیشہ کہتے تھے۔ "اعتماد کو دھوکا دینے سے بڑھ کے گناہ کوئی نہیں۔ ہمت ہے تو دن دھاڑے ڈاکہ ڈالو۔ مگر معاملہ اعتماد کا ہو تو پائی پائی کی حفاظت امانت جان کے کرو۔" چراغ دین نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ کیا انہوں نے خواہش انتقام سے مغلوب ہو کے اس کے پاس ملازمت قبول کی تھی کہ موقع ملے تو۔ اس خیال پر مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ میرے والد اس قماش کے آدمی نہ تھے۔

"سلامت چاچا۔" میں نے کہا۔ "میرے ابا جی نے کبھی یہ بتایا تھا کہ وہ یہاں آکے کیوں نوکر ہو گئے تھے؟"

"ہاں برخوردار۔ جس سیٹھ کے پاس وہ پہلے ملازم تھے اس سنگدل نے وزیر خاں کی خدمت گزاری کا یہ صلہ دیا تھا کہ گٹھیا کا عارضہ لاحق ہوتے ہی جواب دے دیا تھا۔" سلامت شاہ نے آہ بھر کے کہا۔ "پیٹ کی خاطر کہیں تو نوکری کرنی ہی تھی۔ خدا بھلا کرے چراغ دین صاحب کا۔ انہوں نے وزیر خاں کو رکھ لیا۔"

میرے دل میں ایک خلش خار خاگ اٹھی۔ "آپ کب سے ہیں یہاں؟ سیٹھ چراغ دین پہلے کیا کرتے تھے؟"

"میں سات سال سے ہوں برخوردار۔ اس سے پہلے سیٹھ صاحب ولایت میں تھے اور کوئی کاروبار کرتے تھے۔" سلامت شاہ بولا۔

"اب ان کا کیا کاروبار ہے؟" میں نے کہا۔

"پہلے شاہدرے میں تولیے اور کھیس بنانے کی فیکٹری تھی اب کپڑے کا ایک بڑا مل بھی قائم کر لیا ہے۔" سلامت شاہ بولا۔

"اچھا اگر میں تمہارے سیٹھ صاحب سے گھر پہ ملنا چاہوں تو کس وقت مل سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"آجکل تو وہ مری میں ہیں۔ ہر سال دس دن بیوی بچوں کی قبر پہ حاضری دیتے ہیں۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "ساری قبریں اُنکی کوٹھی کے احاطے میں ہیں۔ چار قبریں۔" اس نے توبہ کے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"میں نے سنا ہے چراغ دین کا سارا خاندان ایک حادثے کی نذر ہو گیا تھا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"ہاں برخوردار۔ بڑا خوفناک حادثہ تھا۔ گاڑی خود چراغ دین سیٹھ کا چھوٹا بھائی چلا رہا تھا۔ دو پیارے پیارے پھول سے بچے تھے سب کے سب اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کی ماں تھی جو ایک بہت بڑے افسر کی بیٹی تھی شیروانی صاحب کی۔ وہ بھی آج مری گئے ہوں گے۔ ایک دن کے لیے وہ بھی جاتے ہیں۔"

"شیروانی صاحب؟ کون شیروانی؟ کچھ معلوم ہے کہ کس محکمے کے افسر ہیں؟" میں نے سر اٹھا کے پوچھا۔

سلامت شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "محکمہ تو میں نہیں جانتا۔ یہ سنا ہے اب وہ کسی ملک میں سفیر ہو کے جانے والے ہیں۔"

"ان کا تعلق وزارت خارجہ سے ہے؟" میں اٹھ بیٹھا۔ "کوئی لڑکا ہے ان کا محسن رضا؟"

"ایک لڑکا ولایت میں پڑھتا تھا۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "وہاں کسی گورے نے اس کو چاقو مار دیا۔ شیروانی صاحب نے واپس بلا لیا۔ اسی کی سب سے بڑی بہن تھی۔"

میرے ذہن میں بم کا دھماکہ ہوا جس نے میرے وجود کی پوری عمارت کو اندر سے تہس نہس کر دیا۔ چراغ دین کی بیوی محسن رضا کی بہن تھی۔ کیسے کمال کی بات ہے کہ مجھے محسن کے بہنوئی کا نام معلوم نہ تھا۔ تین سال پہلے یہ اطلاع لندن پہنچی تھی کہ اس کا رشتہ ایک ٹھیکیدار سے طے کر دیا گیا ہے تو میں نے محسن سے پوچھا تھا کہ یہ رشتہ مریم کو پسند ہے؟ اور محسن رضا نے تلخی سے کہا تھا۔ "مریم کو پسند ہو نہ ہو ڈیڈی کو پسند ہے تو بات ختم۔ نہ ممی اختلاف کر سکتی ہیں نہ میں بول سکتا ہوں۔ ڈیڈی خود سر آدمی ہیں اور ان کی مرضی کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی۔ میں نے تو صرف اتنا سنا ہے کہ لڑکا اچھا ہے اور خاصا کما رہا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"یار محسن" میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا تھا۔ "مریم تو شاید اس پروفیسر کو پسند کرتی تھی جو شاعر اور کچھ افسانہ نگار وغیرہ تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔ وہ تو اس عمر میں سب لڑکیاں کسی نہ کسی تلاش دانشور، کرکٹر یا شہزادہ گلفام کو پسند کرنے لگتی ہیں کیونکہ زمانہ ناولوں کے مطالعے سے مثالی شریک حیات کی یہی تصویر بنتی ہے۔" محسن رضا نے اسی تلخی سے کہا تھا۔ "بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیتی ہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا تصور اس چیز کے بغیر ناممکن ہے جسے فقیر ہاتھ کا میل کہتے ہیں اور دولت مند اپنی جدوجہد کا انعام۔ رومانٹک ہیرو بدستور ناولوں میں خوبصورت ڈائلاگ بول رہے ہیں اور آسمان کے چاند تارے توڑ کر لانے کے دعوے کر رہے ہیں۔ ان کی سابق محبوبائیں کاروں میں گھوم رہی ہیں اور ٹھیکیدار ٹائپ شوہروں کی دولت سے گرمیوں کا سیزن مری میں گزار رہی ہیں۔"

ہم لوگ اس شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

ایک سال قبل جب ہمیں مریم کی موت کی خبر ملی تھی تو مجھے محسن کی تین سال پہلے کی بات یاد آئی تھی۔ مریم سیزن گزارنے مری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے لوٹتے ہوئے کار کے کھڈ میں گر جانے سے ہلاک ہو گئی تھی۔ بعد میں لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اس کی کار بریک فیل ہو جانے کے باعث کئی ہزار فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتی ہوئی نیچے پہنچی تھی تو اس میں آگ لگ چکی تھی۔ تلاش کرنے والوں کو اِدھر اُدھر سے لاشوں کے پرزے اور چار مختلف جسموں کے اعضا ملے تھے جن کو اکٹھا کر کے اندازے سے چار قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ محسن بہت رویا تھا۔ بڑی بہن اسے تمام بہن بھائیوں سے زیادہ چاہتی تھی۔ شادی کے کارڈ میں مریم کے ہونے والے شوہر کا کیا نام لکھا ہوا تھا۔ اس پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اہم صرف مریم کا نام تھا جس سے میری جذباتی وابستگی صرف ایک یاد سے وابستہ تھی۔

ایک بار اس نے کھانے کی میز پر سب کے درمیان بیٹھ کر مجھ سے سرگوشی میں کہا تھا۔ "سکندر! میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم اور فوزیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہو۔"

"جی!" میں اچھل پڑا تھا۔ "جی ہاں!" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اور بوکھلا کے کہا تھا۔ اس ہڑبڑاہٹ میں میرے ——— ہاتھ سے چمچہ گر گیا تھا۔ ایک گلاس الٹ گیا تھا اور نوالہ میرے حلق میں یوں پھنس گیا تھا کہ سانس رکنے سے میرے آنسو نکل آئے تھے چنانچہ سب لوگ ہنسنے لگے تھے جن میں فوزیہ بھی شامل تھی۔ جب مریم کے مرنے کی خبر ملی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا، جیسے مجھے فوزیہ سے ملانے والا ایک قابلِ اعتماد پل گر گیا ہے۔ میں نے بڑے حیلوں بہانوں سے یہ پوچھا تھا کہ مرنے والوں میں فوزیہ تو نہیں تھی۔ اور اس وقت بھی مریم کے شوہر کا نام اگر سنا تھا تو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے محسن رضا کی ایک اور بات یاد تھی۔ جو وہ بار بار کہتا تھا "یار سکندر۔ گاڑی نئی تھی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی خریدی گئی تھی۔ چند دن قبل پنڈی کی سروس ورک شاپ گئی تھی۔ اس کے بریک کیسے فیل ہو گئے؟" حقائق سے بے خبری کے باعث اس وقت میں نے روایتی جواب یہ دیا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے جو کسی طرح بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔

سلامت شاہ میرے خیالات کی رو سے بے خبر اس حادثے کی تفصیلات بتانے میں گم تھا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔

"سلامت چاچا۔" میں نے کہا۔ "میرے والد نے کچھ سامان تو چھوڑا ہوگا؟"

سلامت شاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "ہاں۔ ایک بستر اور چند کپڑے تو اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ چند دن پہلے اس نے مجھے ایک لاکر کی چابی دی تھی۔ جو میرے پاس محفوظ ہے۔ دوسری چابی صندوق کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس صندوق میں کیا تھا جو وزیر خاں کے پلنگ کے نیچے ہمیشہ مقفل رہتا تھا اگر میں نے کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"پھر کیوں نہیں دیکھا؟" میں نے غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی برخوردار۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "بہت سی باتیں ہیں۔ ایک تو یہ وزیر خاں کی صحت تو اسی نامراد گٹھیا کے عارضے سے خراب تھی۔ لیکن جوڑوں میں درد کے سوا جو سردیوں میں بڑھ جاتا تھا اور گرمیوں میں کبھی کبھار تکلیف دیتا تھا اسے اور کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔ اس کا بھی وہ عادی ہو گیا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا تھا اور سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا تھا لیکن معذور نہیں ہوا تھا۔ وہ تو سرکاری ڈسپنسری تک لاٹھی ٹیکتا پیدل ہی جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رات کو وہ بھلا چنگا سویا تھا۔ صبح کیوں مر گیا۔ مرنے والی کوئی بات تو نہ تھی۔"

میں کچھ دیر اس انکشاف پر انگشت بدنداں بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں امکانات کے ہزار در وا ہو گئے تھے جو سب شکوک و شبہات کے آسیب زدہ اندھے تہہ خانوں میں اترتے تھے۔ "چاچا سلامت۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اباجی کی موت کے اسباب طبعی نہ ہوں۔ انہیں قتل کیا گیا ہو۔"

سلامت شاہ بھونچکا رہ گیا۔ "قتل!۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو برخوردار ہے۔" اس نے گھبرائے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں قتل۔ میں پوسٹ مارٹم کروا سکتا ہوں۔ لاش دوبارہ قبر سے نکالی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ۔ توبہ۔ استغفار۔" وہ دہشت زدہ ہو کے بولا۔ "یہی سب کرنے آئے تھے تم ولایت سے! کہ مرنے کے بعد بھی اس کو چین نہ ملے۔ اس کی لاش کی بے حرمتی ہو۔ خدا کا خوف کرو سکندر۔"

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

میرے لیے سلامت شاہ سے نظر ملا کے بات کرنا دشوار ہو گیا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں لندن میں نہیں ہوں لاہور میں ہوں اور کسی سراغرساں سے نہیں ایک خانساماں سے مخاطب ہوں جس کے لیے عام آدمی کی طرح لاش کو تدفین کے بعد پھر چیر پھاڑ کے لیے نکال لینے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ میرے شکوک برقرار تھے۔ مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں اپنے ولایت پلٹ ذہن کے قابل صد ملامت خیالوں پر شرمندگی کا اظہار کر دوں۔ اگر بعد میں مجھے اس اچانک موت کو قتل ثابت کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑا اور لاش نکلوانے کے احکامات حاصل کرنے ضروری ہوئے تو یہ کام خود مجھے اپنی ذمے داری پہ کرنا ہوگا۔

"میں معافی چاہتا ہوں چاچا سلامت۔ صدمے سے میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خدا مجھے معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "تم اس صندوق کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہاں۔" سلامت شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "سوئم کے بعد اگلے دن میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو وزیر خاں کے کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں حیران اور پریشان کمرے میں گیا تو مجھے کمرے میں ہر چیز بے ترتیب نظر آئی۔ صندوق کا تالا بھی ٹوٹا ہوا تھا اور تمام سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ پرانی تصویریں تھیں ریشمی اور زری کے بیچ کام کے پرانے جوڑے تھے۔ میرا خیال ہے تمہاری ماں کے ہوں گے ان کو آج کوئی استعمال نہیں کر سکتا۔ مگر زری گوٹا خاصا مہنگا بک جاتا ہے۔ اس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ صندوق میں بہت قدیم زیورات تھے۔ پرانا سونا تو میں آنکھوں سے دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ وہ سب فرش پر پڑے تھے معلوم نہیں کوئی کیا لینے آیا تھا اور کیا لے گیا۔ تم دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی اس صندوق میں کبھی جھانکا نہیں تھا جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا تھا تو اباجی کے ساتھ یہی صندوق تھا جو پنڈت دیانا تھ نے سنبھال کے رکھ لیا تھا۔ بچا تو بہت کچھ تھا مگر اباجی نے پرانے وقتوں کی ان یادوں کو سمیٹ کر ایک صندوق میں ڈال لیا تھا اور یہ اندوختہ میری زندگی کے بعد ان کو سب دنیا سے عزیز تھا۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔"

"مجھے وزیر خاں نے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "جب بھی بیوی بچوں کی بات کی تو ایک آہ بھر کے یہی کہا کہ سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

اس کے بعد میں نے سلامت کو وہ سب بتایا جو شنیدہ بھی تھا اور دیدہ بھی۔ اس دوران میں سلامت شاہ نے کھانا بھی پکایا اور میری بات بھی سنی۔ میں نے بتایا کہ سیاہ بختی کے سائے کب سے میرے تعاقب میں ہیں اور سختی ایام کے ایک دور سے اس وقت بھی گزر چکا ہوں۔ جب میں حالات سے نمٹنا تو کیا حالات کو سمجھنے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شنیدہ یہ ہے کہ غلام ملک تقسیم ہوا تو بہت کچھ تقسیم ہو گیا۔ خاندان تقسیم ہو گئے۔ آزادی کی جنگ میں انگریز کے خلاف شانہ بشانہ لڑنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ مذہب اور اخلاق پر مبنی دوستی — ہمسائیگی اور انسانیت کے معیار تقسیم ہو گئے۔ اور جب تقسیم کا یہ عمل جشن آزادی بہ مرگ انبوہ کی صورت میں چل رہا تھا تو میں آٹھ سال کا تھا۔ میری یادداشت میں میرٹھ چھاؤنی کا وہ گھر موجود ہے جہاں میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ ایک رات بلوائیوں نے اس کٹر مسلم لیگی یعنی میرے والد کا خانہ خراب کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو مصلحت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنے کا مشورہ دینے پر برہم ہو جاتا تھا اور جان دینے پر تیار تھا مگر مسلم لیگ کا جھنڈا اتارنے پر تیار نہ تھا۔ میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کے گھر میں ریڈیو کے سامنے انگشت بدنداں بیٹھا تھا۔ ریڈیو ان دنوں بہت کمیاب تھا اور سائنس کی یہ انقلاب آفریں ایجاد صرف امرا تک محدود تھی جس میں سے سینکڑوں ہزاروں میل دور کے انسانوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی اور کوئل کی کوک سے بادلوں کی گرج تک ہر آواز برآمد ہوتی تھی۔ میری ناقص عقل کے مطابق ریڈیو کی زبان یعنی لاؤڈ اسپیکر اس اعتبار سے تخلیق کا بہتر کارنامہ تھا کہ آدمی کی زبان کبھی روسی، کبھی لاطینی انگریزی نہیں بول سکتی۔ ساز نہیں بجا سکتی اور ہر جانور کی اور ہر مشین کی آواز نہیں نکال سکتی وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ سب سے برتر وہ عقل سلیم ہے جو تخلیق کے وقت انسان کو عطا کی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ بلوائیوں نے میرے تمام خونی رشتوں کو خنجر آبدار سے منقطع کیا۔ میرے پانچ بھائی اور میری ماں سرخرو ہوئے۔ جبکہ ہماری سب سے بڑی اور اکلوتی بہن تھی جو یوں سرخرو ہوئی کہ موقع ملتے ہی آنگن کے کنوئیں میں اتر گئی اور اس کی متعفن لاش ساتویں دن نکال کے نہ جانے کس بے نشاں قبر میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس فتح و کامرانی کے بعد بلوائی جاتے وقت وہ جھنڈا اتارنا بھول گئے جس کی آبرو پر ایک خاندان نے قربان ہونا منظور کیا تھا۔

میرے والد اپنے بھائی سے ملنے دہلی گئے تھے اور خبر یہ آئی تھی کہ دہلی اسٹیشن پر والسرائے کی ٹرین آنے سے پہلے بم پھٹا جس میں وہ ہلاک ہو گئے۔ اور شنیدہ یہ بھی ہے کہ اس قتل و غارت گری کو میرے دوست کے غیر مسلم باپ نے بچشم تر دیکھا اور گھر پہنچتے ہی مجھے اس کمرے میں سلا دیا گیا جہاں میرا دوست موہن اور اس کی بہن موہنی سوتے تھے۔ میں اماں کے خوف سے واپس جانا چاہتا تھا مگر انھوں نے کہا کہ ہم بات کر آئے ہیں اور رشوت کے طور پر وہ ریڈیو اٹھا کے اس کمرے میں رکھ دیا جہاں مجھے سونا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اماں کی جھڑکیوں کا خوف دل سے نکل گیا اور رات بھر اس طلسمی ڈبے کے کان مروڑ کے ہر طرح کی آوازیں نکالنے کا شوق غالب آ گیا۔ میں اور موہن متعجب تھے کہ کیا دنیا میں رات بھر لوگ سوتے نہیں ہیں کیونکہ ہم نے جب بھی سوئی کو گھمایا کہیں نہ کہیں سے مضحکہ خیز — ناقابل فہم باتوں یا دلکش موسیقی کی آواز آنے لگی — مجھ پر موہن کے باپ پنڈت دیانا تھ کا پہلا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے خاندان کے تمام افراد کی سربریدہ خون آلود اور مسخ شدہ لاشوں کا دلدوز نظارہ نہیں کرنے دیا۔ ورنہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس بھیانک منظر کا نقش میرے ذہن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر اور بعد میں میری شخصیت پر کیا منفی اثرات مرتب کرتا۔ اُس نے تین دن مجھے اپنے گھر میں مقید رکھا۔ دُوسرے دن ریڈیو کی رشوت نہیں چل سکتی تھی چنانچہ انھوں نے طاقت استعمال کی۔ میں نے موہن کی ماں جسے میں چاچی کہتا تھا کا یہ بیان مسترد کر دیا تھا کہ میرے گھر والے مجھے چھوڑ کر دہلی چلے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ کبیر کو بعد میں بھیج دینا۔ جب میں نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کیا تو چاچا دیانا تھ نے میرے ایک چانٹا لگایا۔ میری آواز فوراً بند ہوگئی۔ وہ بڑے دبنگ قسم کے آدمی تھے۔ چھ فٹ قد۔ کسرتی بدن۔ لمبی لمبی مونچھیں۔ پولیس میں حوالدار تھے اس لیے اُن سے میں بہت ڈرتا تھا۔ "اب اگر آواز بھی نکلی تو ہتھکڑی لگا کے حوالات میں بند کر دُوں گا۔" انھوں نے گرج کر کہا۔ میری سٹی گم ہوگئی اور میں نے موہن اور موہنی کے ساتھ (اور اس ریڈیو کے ساتھ) تین دن ایک کمرے میں گزارنے کو ترجیح دی۔

پنڈت دیانا تھ بڑے میٹر آف فیکٹ قسم کے انسان تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جھوٹ زیادہ دن نہیں چلے گا اور خود اُن کے لیے مجھے چھپائے رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا۔ تیسرے دن جب میں حالات سے عارضی سمجھوتہ کیے خاصا مطمئن اور خوش تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کے بہت سی باتیں سمجھائیں۔ مثلاً یہ کہ میرے گھر والے دہلی کیوں گئے ہیں۔ "یہاں اُن کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے تھے۔" انھوں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں رہتے تو مارے جاتے۔" اُس روز شام کے وقت وہ مجھے گھر کا مقفل دروازہ دکھا کے بھی لائے جہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

"دہلی میں میرے چچا کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "ابا وہیں گئے ہیں۔"

"اچھا!" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ پتہ معلوم ہے تمھیں؟"

"جی۔" میں نے کہا۔ "تانگے میں بیٹھ کے جاتے ہیں۔ اُن کے گھر کے سامنے رنگریز کی دکان ہے۔ ہر وقت رنگ برنگے کپڑے سوکھتے رہتے ہیں۔ اور اُن کے گھر کا دروازہ نیلا ہے۔ اوپر کبوتروں کی چھتری ہے۔"

موہن جو عمر میں ہم سے بڑا تھا ہنستے ہنستے بے حال ہوگیا۔ موہنی احمقوں کی طرح دیکھتی رہی۔

"یہ نہیں بیٹا کبیر۔" چاچا دیانا تھ نے کہا۔ "نام کیا ہے اُس محلّے کا۔ یا سڑک کا۔ گلی کا اور مکان کا نمبر۔"

ظاہر ہے یہ سب مجھے یاد ہوتا تو میں ایسا اوٹ پٹانگ پتہ کیوں بتاتا۔

"اچھا اب یوں کرتے ہیں۔" چاچا دیانا تھ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تمھیں موہن کے ماما کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ وہ بہت قابل ہیں اور تمھارے چچا کا مکان تلاش کر لیں گے۔ وہ بھی دلّی میں رہتے ہیں۔ جاؤ گے نا؟"

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔" میں نے اعلان کیا۔ "موہن اور موہنی بھی میرے ساتھ جائیں گے اور یہ ریڈیو بھی۔" میں نے صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں اس رات میاں بیوی کے درمیان کانفرنس کب تک جاری رہی لیکن صبح ہوئی تو مجھے بتایا گیا کہ میری سب شرائط انھیں منظور ہیں لیکن اُن کی بھی ایک شرط ہے۔ جب تک میرے چچا کا پتہ نہیں چلے گا میں کسی کو اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ نہ یہ کہ میرے ابا کا نام کیا ہے اور چچا کون ہیں۔ بھائی بہنوں کے نام بھی کسی کو معلوم ہوئے تو وہ جو میرے گھر والوں کے دشمن ہیں فوراً پہنچ جائیں گے۔ اور وہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔ "آدمی کو مشین میں ڈال کر قیمہ نکال لیتے ہیں اور ڈبّے میں بند کر دیتے ہیں اور پھر وہ ڈبّے اِدھر اُدھر بک جاتے ہیں اور کھانے والے بکرے کے گوشت کا قیمہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔" چاچا دیانا تھ نے واضح کیا۔

میں دہل گیا اور پورا ایک سال دلّی میں موہن کے ماما کے گھر رہا۔ جو دہلی میں نہیں راستے کے ایک چھوٹے سے قصبے مراد نگر میں تھا اور ایک آرڈی نینس فیکٹری کی وجہ سے مشہور تھا۔ پوری آبادی سرکاری ملازمین کی تھی چنانچہ فتنہ و فساد سے محفوظ الگ تھلگ جگہ تھی۔ یہ باتیں میری سمجھ میں بہت بعد میں آئیں کہ میری جان بچانے کے لیے اس پورے خاندان کی مشترکہ کوشش کتنی زبردست تھی۔ موہن اور موہنی کے والدین نے سال بھر کے لیے بچوں سے دُوری قبول کی۔ خطرات مول لیے۔ میری ہر ضد پوری کی (مثلاً ریڈیو ساتھ لے جانے کی جو انھوں نے بڑی مشکل سے خریدا تھا) دونوں بچوں کے ساتھ ریڈیو کے چلے جانے سے خود اُن کا گھر سنسان ہوا مگر انھوں نے اپنے مقصد کو عزیز تر جانا اور کامیاب رہے۔ موہن کے ماما جی نے سال بھر تک مجھے بہلانا جاری رکھا اور روز نت نئے بہانوں سے میرے چچا اور ابا کی تلاش میں ناکامی کا اعتراف کرتے رہے لیکن مجھے امید بھی دلاتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے شبہات کا اظہار شروع کر دیا کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلے گئے ہوں۔ میں رو دھو کے خاموش ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا مگر سال بھر بعد موہن کے ماما جی کو یہ خطرہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں یا اعلانِ حق نہ کر دُوں چنانچہ موہن کے پتا ہم سب کو واپس لے گئے۔ مجھے بتایا گیا کہ ابا نے لاہور سے خط لکھا ہے اور وہ بہت جلد مجھے لینے آئیں گے مگر اُن کے آنے تک مجھے اپنی زبان ویسے ہی بند رکھنی ہوگی ورنہ وہ قیمہ بنا کے پیک کرنے والے دشمن ...

اِس کے بعد ایک معجزہ رُونما ہوا۔ یہ بات شنید نہیں دید ہے۔ تقریباً سوا سال بعد جب میں تقریباً ناامید ہو کے موہن کے خاندان کا ایک مستقل فرد بنتا جا رہا تھا اور اُن کی کوششوں کے طفیل بچھڑ جانے والوں کو تقریباً بھول چکا تھا۔ میرے ابا مجھے سچ مچ لینے آ گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں خود دیکھنے گیا تھا۔

"چاچا دیانا تھ ...!" میں نے چیخ کر کہا۔ "ابا آ گئے۔ ابا مجھے پاکستان سے لینے آ گئے۔" پھر میں ابا سے لپٹ گیا اور چلاّ چلاّ کے رونے لگا۔ پنڈت دیانا تھ اخبار دیکھتے دیکھتے بھاگے دُوسری طرف سے اُن کی پتنی ہانپتی کانپتی آئیں۔

"وزیر خاں ...!" پنڈت دیانا تھ کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ "تم ... تمھارے ... تو ..."

"مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔" ابا نے آنسو پونچھ کے مجھے الگ کیا۔ اور سکون سے کہا۔ "میں اپنے گھر گیا تھا۔" پھر وہ اور چاچا دیانا تھ بھوں بھوں کر کے رونے لگے۔ چاچی دور کھڑی رو رہی تھی اور ہم سب بچے دُور کھڑے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔

"تم ... تم زندہ ہو وزیر خاں۔" دیانا تھ نے بہت دیر بعد کہا۔ "ہم نے سُنا تھا تم بم کے دھماکے سے مارے گئے۔"

"دھماکہ ہوا تو میں ایک سُتون کی اوٹ میں تھا اس لیے بچ گیا تھا۔" ابا نے کہا۔ "پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو میں بھی دھر لیا گیا۔ دو سال کی قید بامشقت کاٹ کے پرسوں جیل سے رہا ہوا ہوں۔"

"ہمارے مکان میں کوئی اور رہتا ہے ابا!" میں نے کہا۔

پنڈت دیانا تھ نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کا خیال تھا میں حالات سے بالکل بے خبر ہوں مگر میں اپنی عمر کے بچوں سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار تھا۔ میں نے موہن اور اس کی بہن موہنی سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ چوری چھپے اور کسی سے نہ کہنے کے وعدے پر ... اپنی ماں سے سُنا تھا مجھے بتا دیا تھا چنانچہ میں نے بہت سے حقائق کو تسلیم کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ ہندو مسلم فسادات جس میں میرے ابا کے سوا سب مارے گئے تھے کیوں ہوئے تھے۔ میرے ابا کے بارے میں موہن اور موہنی کا خیال تھا کہ وہ واقعی پاکستان چلے گئے تھے اس لیے بچ گئے ہوں گے اور کسی نہ کسی دن ضرور واپس آئیں گے لیکن اس وقت تک مجھے چھپ کر رہنا ہو گا کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ کسی بدمعاش ہندو کو معلوم ہو گیا تو مجھے بھی مار ڈالے گا اور ایک مسلمان کو چھپانے کے جرم میں چاچا دیانا تھ کو بھی مار ڈالے گا۔ اس زمانے میں میرا نام میرے بہت کام آیا۔ کبیر کو اکثر لوگ کبیر داس سمجھتے تھے اور بعد میں تو خود مجھ میں اتنی عقل آ گئی تھی کہ کوئی اجنبی پوچھ بیٹھتا تو اپنا یہی نام بتاتا تھا۔

"تم نے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں نہیں پوچھا کبیر!" چاچا دیانا تھ نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے چاچا وہ سب مارے جا چکے ہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ ایک بار پھر ابا کا حوصلہ جواب دے گیا اور پنڈت دیانا تھ مجھے گلے لگا کے رونے لگے۔ بہت رونے دھونے کے بعد بالآخر تیسرے دن ہم رخصت ہوئے تو دیانا تھ نے وہ صندوق تانگے میں رکھا جو ابا نے بہت سی چیزوں میں سے کچھ چیزیں منتخب کر کے بھرا تھا۔ پنڈت دیانا تھ نے ہمارا زیادہ تر سامان نکال لیا تھا لیکن ابا نے کہا۔ "اب اس کا مجھے کیا کرنا ہے۔ تم نے ایک بیٹے کو بچا کے مجھے زندہ رہنے کا سہارا دے دیا ہے۔ باقی یادیں ہیں جو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ زندگی اتنی کم رہ گئی ہے اور فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں دیانا تھ کہ بس اس احسان کے بدلے کچھ کرنے کی بات بھی نہیں کر سکتا۔"

اور آج بھی وہ وقت میری نظر میں تصویر کی طرح موجود ہے جب تانگہ روانہ ہوا تھا اور میرا ماضی ان صورتوں کی طرح مجھ سے دور ہوتے ہوتے کھو گیا تھا جو دروازے میں اشکبار تھیں۔

اس وقت تک حالات بہت حد تک معمول پر آ گئے تھے اور مذہب کے مقدس نام پر انسانیت کا لہو بہانے والے درندے جو سڑکوں پر دندناتے پھرتے تھے، اب چھپ چھپا کر اِکا دُکا واردات کر رہے تھے۔ کشیدگی برقرار تھی مگر قتل و غارتگری کا پُرآشوب دَور گزر چکا تھا۔ چنانچہ ہم بخیر و عافیت لاہور پہنچے تو ایک سال پریشانیوں کی نذر ہو گیا۔ پنڈت دیانا تھ نے اپنے طور پر مجھے انگریزی حساب اُردو وغیرہ پڑھا کے اس قابل کر دیا تھا کہ میں نے دو سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ مشن اسکول کے بعد ابا نے مجھے لارنس کالج گھوڑا گلی بھیجا اور وہاں سے فارغ ہوا تو میں ولایت چلا گیا۔"

"تمھارا باپ بڑا صابر آدمی تھا۔" سلامت شاہ نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "کہتا تھا پاکستان قربانی مانگتا تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اب رونا کس بات کا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ صدمہ اُسے پاگل کر دیتا مگر اس نے جتنے حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا اور جیسے تمھیں اعلیٰ ڈگری دلوائی یہ اُسی کا دم تھا۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی برخوردار! یہ ہے کہ تم کو اس نے ہمیشہ دُور کیوں رکھا؟ ایک بیٹا تو آنکھوں کا نور ہوتا ہے تعلیم کیا لاہور کے کالج میں پوری نہیں ہو سکتی تھی کہ تم ... بابا"

"وہ ... میرا خیال ہے ابا کو کچھ شوق تھا۔ جنون کی حد تک کہ تعلیم کا معیار اعلیٰ ہو۔" میں نے وضاحت کرنی چاہی۔

"تو اپنے لاہور کا یہ گورنمنٹ کالج کیا کم ہے۔ جدھر علامہ اقبال صاحب نے پڑھا اور بڑے بڑے لوگوں نے پڑھا۔ اور ایف سی کالج ہے۔ چیف کالج سے بڑا کالج ہے کیا لارنس کالج؟ انجینئر لوگ یہاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی بن رہے ہیں۔"

اصل صورتِ حال خود مجھ پر اُس وقت عیاں ہوئی تھی جب کفِ افسوس ملنے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ ابا نے عمداً مجھے حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ چال چلی ہے تو میں لاہور سے جانے سے انکار کردیتا۔ انھوں نے مجھے مجبور کردیا... اور ماں کے جذبات کے سامنے میری عقل کی دلیل نہ چلی۔ انھوں نے کہا اعلیٰ تعلیم انسان کو بناتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ مقصد یہاں رہ کے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے اور میرا حکم ہے کہ جاؤ۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ انھوں نے کہا، کل کی فکر مت کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں اور خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میں نے یہ بات بھی مان لی۔ انھوں نے کہا سب خیریت ہے۔ میں نے یہ بات بھی مانی۔ انھوں نے کہا صحت اور کاروبار دونوں اچھے ہیں الحمدللہ۔ اور میں نے یہ بات بھی مانی وہ تنِ تنہا اپنے حالات کی مجبوریوں سے لڑے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہے اور مجھے اس جنگ کی پرچھائیوں سے بھی دور رکھا۔ آخر کیوں؟ ایسی کیا مجبوری تھی انہیں؟ کس بات کا ڈر تھا انھیں؟

رفتہ رفتہ یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ میر شرافت علی کے پاس ناقابلِ تردید حقائق کی کوئی ایسی زنجیر تھی جس میں اس نے وزیر خاں کو بری طرح جکڑ رکھا تھا اور وزیر خاں بے بس نہ ہوتا تو اس زنجیر کو توڑنے کی کوشش تو کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوشش بے سود ہوگی۔ تمام عمر کون بلیک میل ہوسکتا ہے۔ تنہا آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ زندگی یوں بھی تیدِ بامشقت تھی۔ اگر وہ میر شرافت علی کو قتل کرکے جیل یا تختۂ دار پر پہنچ جاتا تو اس طویل پُرعذاب انجام سے بچ جاتا۔ اس میں اتنی ہمت بھی تھی کہ اسے قتل کرسکتا۔ میں جانتا تھا میرے باپ کے خون میں بزدلی کے جراثیم نہیں تھے۔ پھر وہ کیوں خاموشی سے بلیک میل ہوتا رہا؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ممکن تھا کہ اسے اپنی نہیں میری زندگی عزیز تھی۔ بات کوئی ایسی تھی کہ جس کے تباہ کن اثرات میرے مستقبل پر نحوست کے سائے پھیلا سکتے تھے۔

بہت سر مارنے کے باوجود میں کبھی نہ سمجھ پایا تھا کہ میرا باپ جو اصول پرست محنتی اور ایماندار تھا کس جرم کا مرتکب ہوا تھا جس کی سزا اس کو میر شرافت علی نے دی۔ اس کی زندگی کا کون سا گناہ تھا جس کی پاداش میں وزیر خاں کو اپنا سب کچھ دے کر رازداری کا سودا کرنا پڑا۔ وہ کون سا راز تھا جو وہ اپنے ساتھ لے کر قبر میں چلا گیا۔ کیا اس راز سے پردہ اٹھانے کا نتیجہ مرنے کے بعد اس کی رسوائی اور میری تباہی کی صورت میں نکلے گا؟ کیا افشائے راز کے بعد میری نظر جس اصل وزیر خاں کو دیکھے گی وہ میرے لیے قابلِ صد احترام انسان کے برعکس کسی شیطان کا روپ ہوگا؟ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں نے طے کیا۔ وہ گردشِ حالات کا شکار ہوسکتا ہے۔ سازش کا شکار ہوسکتا ہے۔ اور غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے۔ شکاری چراغ دین جیسے لوگ تھے۔ شکاری میر شرافت علی تھا جس نے موت کی حد تک اس کا تعاقب کیا۔ اور شکاری وہ نادیدہ دشمن تھے جو اب میرے پیچھے لگ گئے تھے اور ہر طرف جال پھیلا رہے تھے۔ ان شکاریوں نے اپنے ایک مقصد میں کامیابی حاصل کرلی تھی یعنی وہ مجھے برطانیہ سے انتہائی رسواکن طریقے سے نکلوا کے اپنی شکارگاہ تک لے آئے تھے۔ جیسے ہانکا کرنے والے شیر کو گھیر کر مچان پر بحفاظت بیٹھے ہوئے شکاری کے نشانے پر لے آتے ہیں۔

اور تب وہ لمحہ میرے مقابل آ کھڑا ہوا جو فیصلے کا طلبگار تھا۔ کہ سکندر بخت فیصلہ کرو۔ کیا تم میں حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے؟ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ روزِ محشر میں وہ اپنی فردِ عمل خود پیش کرے گا۔ لیکن کیا تم انھیں معاف کردو گے جو اس کے قاتل ہیں؟ جو اس کے ہر قطرۂ خون سے کتنی مجبوری کا خراج وصول کرتے رہے۔ کیا تم آہوئے صیاد دیدہ کی طرح بھاگتے رہو گے؟ شکاری تو اب بھی تمھارے تعاقب میں ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک تمھارا وجود ان کے لیے باعثِ خطر ہے۔ وہ خود کو اسی وقت محفوظ خیال کریں گے جب تمھیں بھی شکار کرلیں گے۔ بولو تم کیا ہو؟ شکار؟ یا شکاری؟

"میں؟" میں نے اس لمحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں شکاری ہوں۔ ان سب کا جواب تک خود کو شکاری سمجھتے آئے ہیں۔ خبردار انھیں... کہ اب وہ میرا شکار ہیں۔ اب یہ کھلی جنگ ہے۔ وقت بتلائے گا کہ شکاری کون تھا اور شکار کون۔" گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ یہی ہار جیت تو زندگی ہے۔

"چاچا سلامت۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ مجھے ایک ٹرنک کال کرنی تھی اسلام آباد۔"

"شوق سے کرو۔" سلامت شاہ نے کہا۔ "ٹیلی فون کوٹھی میں ہے۔ میں چوکیدار سے کہہ کے تالا کھلوا دیتا ہوں۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد محسن رضا نے چلا کر کہا۔ "کون۔ کبیر؟ کس جہاں سے تو آگیا؟ کب آیا؟"

"آیا نہیں لایا گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج ہی پہنچا ہوں۔ مجھے ڈی پورٹ کردیا گیا تھا۔ تیرے ڈیڈی نے تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"ڈیڈی نے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔ "کیا تو نے ان کو فون پہ اطلاع دے دی تھی؟"

"نہیں۔" میں نے بات کو گول کردیا۔ "وہ خارجہ امور سے منسلک ہیں نا! میں نے سوچا شاید سفارت خانے نے ان کو مطلع کردیا ہو۔ میرا مطلب ہے ان کے محکمے کو۔"

"نہیں یار۔" محسن بولا۔ "وہ تو خود بہت حیران ہوں گے سن کے۔ کیا حالات بہت بگڑ گئے تھے؟"

"ہاں... کچھ ایسی ہی بات تھی۔" میں نے کہا۔ "جہاز موسمی حالات کی خرابی کے باعث اسلام آباد میں نہیں اتر سکا اور لاہور آ گیا ورنہ میں سیدھا تیرے پاس پہنچتا۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں تجھ سے جو فون پہ نہیں کی جاسکتیں۔ میں کل پنڈی آرہا ہوں۔ مری چلیں گے۔"

"مری؟" محسن رضا نے کہا۔ "کوئی خاص کام ہے؟"

"ہاں۔ وہ تیرے بہنوئی ہیں نا۔ سی سی ڈی ہیں۔ وہ بھی وہیں ہیں اتفاق سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے مریم باجی کی اور ان کے بچوں کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھنی ہے۔"

"یار سکندر! اپنی اس چوہدری چراغ دین سے کبھی نہیں بنی۔ اور اب تو کوئی رشتہ ہی نہیں۔ اس سے کیا ملنا پھر کبھی چلے جائیں گے جب وہ نہیں ہوگا۔" محسن رضا نے کہا۔

"نہیں یار۔ اس سے وہیں ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک پرانا حساب چکانا ہے، وہیں آکے بتاؤں گا۔"

"تیری مرضی۔" محسن نے مجبور ہو کے کہا۔ "یہ بتا ابا کا کیا حال ہے؟"

"ابا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "ان کے انتقال کو ایک ہفتہ ہوگیا سید محسن رضا!"

"کیا!" وہ چلایا۔ "وزیر چچا گزر گئے؟ کب؟ کیسے سکندر؟"

"میں آؤں گا تو سب بتادوں گا محسن! مجھے بھی یہاں پہنچنے کے بعد ہی علم ہوا۔ اگر میں نہ آتا تو شاید کوئی بھی مجھے اطلاع نہ دیتا۔" میں نے دل ندوبیمے میں کہا۔

"دیکھ سکندر! تو مجھ سے گلا کر رہا ہے؟ خدا کی قسم میرا وہ زخم ابھی تک بالکل مندمل نہیں ہوا ہے۔ اگر میں ٹھیک ہوتا تو ضرور ان سے ملتا۔" محسن نے کہا۔

"چھوڑ محسن! میں تجھ سے کیا گلا کروں گا۔ گلا زیادہ سے زیادہ تقدیر سے کیا جاسکتا ہے مگر اس سے بھی کیا حاصل۔ میں تو کہتا ہوں اچھا ہی ہوا۔ کہ تو ان سے نہیں ملا۔" میں نے کہا۔ "اب میں قبرستان جاؤں گا اور پھر میر شرافت علی سے ملنے جاؤں گا۔"

"کاروباری معاملات طے کرنے ہیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟" محسن نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"مسئلہ کوئی نہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اور ہے تو اتنا آسان نہیں کہ ایک ملاقات میں طے ہو جائے۔"

"سکندر! اس وقت تیرا دماغ ٹھکانے ہے یا نہیں؟ میری مان، تو ابھی سیدھا یہاں آجا۔ میر شرافت علی سے ملنا ہو تو میرے ساتھ چلنا۔ تو اکیلا جائے گا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔ "کیا میری باتوں سے تجھے شبہ ہو رہا ہے کہ میں ہوش میں نہیں۔"

"ان حالات میں کوئی بھی ہوش میں ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔" محسن نے کہا۔ "مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"پاگل کے بچے! ابھی وہ ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوئے جن پر خوشبو بھی آنے لگے۔ آواز یا زیادہ سے زیادہ تصویر آسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تو فکر نہ کر۔ میں صبح کی ریل کار سے آرہا ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

سلامت شاہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ سیٹھ صاحب کو پہلے سے جانتے ہیں؟"

برخوردار اور تم سے اچانک آپ پر آجانا اس کے رویے کی نمایاں تبدیلی تھی۔ "ہاں۔ بس ایسے ہی۔ اب تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے سلامت چاچا۔ وہاں سے میں چلا جاؤں گا میر شرافت علی سے ملنے۔"

"یہ میر شرافت علی کون ہے؟ تمھارے ابا کا کوئی دوست؟" سلامت شاہ نے کہا۔

"دوست؟" میں نے کہا۔ "یہ لفظ تو بہت بدنام ہوگیا ہے سلامت چاچا۔ دشمن جو سامنے آکے وار کرتا ہے اس دوست سے تو اچھا ہوتا ہے جو دوستی کا فریب دے کر مارے۔ مگر یہ بات تمھارے سمجھنے کی نہیں ہے۔"

قبرستان جاتے ہوئے میں نے سلامت شاہ سے کہا کہ وہ فی الحال بنک کے لاکر کی چابیاں بھی اپنے پاس رکھے کیونکہ وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیے بغیر میں لاکر نہیں کھول سکوں گا۔ صندوق کے بارے میں بھی میں اسلام آباد سے واپس آکے طے کروں گا کہ کیا کرنا ہے۔ میرا سب سامان یہیں رہے گا اور میں صرف ایک بریف کیس لے کر جاؤں گا۔ خیال یہی ہے کہ دو دن میں لوٹ آؤں چنانچہ کپڑوں کے دو جوڑے بہت ہوں گے البتہ صبح صبح ریل کار پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچنے کا مسئلہ ہوگا۔ وقت پر آنکھ کھل گئی تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اسٹیشن تک پیدل بھی چند منٹ کی مسافت ہے۔ سلامت شاہ نے کہا کہ وہ فجر کی نماز کے لیے الارم کے بغیر اٹھتا ہے مجھے بھی اٹھا دے گا۔ اس نے چراغ دین سے میرے تعلق کے بارے میں پھر پوچھا۔ تو میں نے بتا دیا کہ محسن جو میرا بچپن کا دوست ہے، چراغ دین اس کا بہنوئی تھا۔ سلامت شاہ نے حیرانی کا اظہار کیا کہ وزیر خاں نے کبھی یہ نہیں بتایا۔ میں میانی صاحب کے قبرستان سے نکلا تو شام کا بوجھل اندھیرا رات کے گہرے دھندلکے میں ڈھل رہا تھا۔ میں اب بہت پُرسکون تھا لیکن یہ سکون اس خاموشی کی طرح تھا جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جب میں اپنے باپ کی قبر پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا تو ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرکے میں نے ان کی صورت کا تصور کیا جو میں نے سال بھر پہلے دیکھی تھی اور اس وقت میرے کانوں میں ان کی مانوس آواز آئی۔ بالکل واضح اور صاف۔ "اپنے فیصلے پر قائم

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہنا سکندر۔ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

میں چونک پڑا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو سلامت شاہ نروس اور خوف زدہ سا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھوں میں ایک سوال تھا جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ کیا تم نے کچھ کہا؟ ارد گرد ویران قبروں پر شہر خموشاں کا سکوت طاری تھا اور ہم دونوں کے آس پاس فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ شاید آواز صرف میرا ہی وہم نہیں تھی، سلامت شاہ بھی اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔ وہم کیا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ عقل کا پھیر۔ فریبِ نظر۔ فریبِ سماعت۔ فریبِ خیال۔ کون کس سے پوچھے کہ وہ سب جو نظر آتا ہے اور سنائی دیتا ہے اور احساس بن جاتا ہے ہمیشہ سچ کیوں نہیں ہوتا اور سراب کیوں نظر آتے ہیں؟ خواب کیوں بکھر جاتے ہیں اور کیسے سچ ہو جاتے ہیں۔

اسمبلی کے پیچھے ایبٹ روڈ کے چوراہے سے میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ یہ سڑک جو آگے جا کے میکلوڈ روڈ سے مل جاتی تھی سینما گھروں کی وجہ سے نصف شب کے بعد بھی آباد رہتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھمبوں پر ٹیوب لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اور ٹریفک کی ہیڈ لائٹس سے بھی اتنی روشنی تھی کہ میں نے کیتھی اور سفید رنگ کی کوٹھی کو آسانی سے تلاش کر لیا۔ قریب جا کے دیکھنے پر مجھے گیٹ لائٹس کے نیچے آدمی کے قد سے ذرا بلند ستون پر نصب سنگِ مرمر کی تختی بھی نظر آ گئی۔ جس پر "رین بسیرا" کے حروف زیادہ نمایاں تھے۔ دوسرے ستون کی تختی پرانی تھی اور اس پر بھی حروف ہندی رسم الخط میں سابق مالک کے نام اور سنِ تعمیر کے ساتھ موجود تھے۔ آس پاس دوسری کوٹھیاں بھی ایسی ہی تھیں چار چار کنال پر پھیلی ہوئی اور پرانے درختوں میں گھری ہوئی۔ گیٹ سے ذرا فاصلے پر ٹیلی فون کا کھمبا نصب تھا اور ایک تار آٹھ فٹ اونچی فصیل کے اوپر درختوں میں سے گزرتا ہوا اندر کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بج کے بیس منٹ ہو رہے تھے۔ ٹریفک میں تھوڑا سا وقفہ آیا جب فٹ پاتھ پر بھی کوئی میرے قریب نہ تھا۔ میں ایک ہی بار میں دیوار پر چڑھ گیا۔ ٹیلی فون کی لائن اب بھی میری دسترس سے چند انچ اوپر تھی۔ دیوار کی دوسری جانب نیچے دیکھنے پر مجھے پھولوں کے تختے نظر آئے۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اوپر چھلانگ لگائی اور دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ٹیلی فون کا تار میری گرفت میں آ گیا میرے وزن سے جھولا اور جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ میں سیدھا کیاری میں اترا۔ تار کے جھٹکنے سے میرے گرنے کی رفتار کم ہو گئی تھی اور میرے قدموں سے دب جانے والے پھول نرم مٹی میں آ گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہا ورنہ میرے کپڑے مٹی میں بھر جاتے۔

لان عبور کر کے میں اطمینان سے کوٹھی کے پورچ میں پہنچا جہاں ایک مرسیڈیز بڑی رعونت سے ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جھلمل کر رہی تھی۔ ایک کتا بہت چھوٹے قد کا لمبے لمبے سفید بالوں اور لٹکے کانوں والا۔ مجھے دیکھ کر بھونکا۔ اندر سے کسی نے کہا "کیا ہے ٹامی!" پھر جالی والا دروازہ کھلا اور سفید زین کی پتلون اور بش کوٹ پہنے شوفر ٹائپ آدمی باہر آ گیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی مگر صحت میں میرے جیسے نوجوانوں سے بہتر تھا۔ "کون ہو تم؟" اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے گستاخانہ لہجے میں کہا۔

"تمھیں کیا نظر آتا ہوں، انسان یا چوپایہ؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اپنا لہجہ درست رکھو اور یہ بتاؤ مسٹر کہ اپنا یار میر شرافت علی گھر پر ہے؟"

شوفر ٹائپ آدمی محتاط ہو گیا۔ "جی۔۔ وہ تو ہیں۔۔" اس نے ایک نظر بند گیٹ کو دیکھا۔ "آپ کا نام؟"

"سیٹھ سکندر بخت لندن والا" میں نے کہا۔ "نام سنا ہے کہ نہیں۔ خیر چلو بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ جناب۔۔ میرا مطلب ہے اُن کو بتا دوں پہلے۔۔" شوفر نے تھوڑا سا تامل کیا۔

"ابے چل" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "میں اس سالے کو ذرا حیران کرنا چاہتا ہوں۔"

شوفر ٹائپ شخص میرے بعد اندر آیا۔ "آگے جا کے تیسرا کمرا انہی کا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے جناب! میرا ذکر مت کیجیے گا۔" وہ بولا اور پلٹ کر غائب ہو گیا۔ میں نے دس قدم چل کے تیسرے دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہینڈل گھما کے اندر داخل ہو گیا۔

یہ میر شرافت علی کا شاہانہ بیڈ روم تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا اور اوسط قد و قامت کا اسمارٹ سا آدمی جس نے موٹے شیشوں والی سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے سر کے بال ہیئر کلر کے استعمال سے سیاہ اور چمکیلے تھے۔ چنانچہ اس کی عمر دیکھنے میں چالیس سال بھی نہیں لگتی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر گھما کے دیکھا اور کسی نوکر کے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اس وقت مجھے چہرے پر طوطے جیسی خمیدہ ناک اور عقاب جیسی تیز آنکھوں کی چمک نظر آئی۔ چند سیکنڈ تک کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی ہلکی سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔ پھر میں نے مسکرا کے کہا۔ "انکل شرافت علی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" اور ہاتھ پھیلا کے گلے لگنے کے لیے آگے بڑھا۔

میر شرافت علی کی صورت پر ناگواری کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے مجھے روک لیا اور صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کی۔ یہ مصافحہ بھی مجبوری کے تحت یک طرفہ کارروائی تھی۔ "کون ہیں آپ؟ یوں بے تکلفی سے میرے بیڈ روم تک بہت کم لوگ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

آتے ہیں۔ اور اگر میری آپ سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی ہے تو مجھے یاد نہیں۔" اس نے میری صورت پر نظر جما کے کہا۔ پھر اس نے بیڈ سائڈ پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔

"کمال ہے انکل! میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ آپ تو مجھے پیدائش سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ایک خادم اندر داخل ہوا۔

"تم ۔۔۔ تم وزیر خاں کے بیٹے ہو؟ ۔۔۔ سکندر بخت ۔۔۔"

اس نے اچانک کہا۔ پھر وہ خادم کی طرف متوجہ ہوا۔ "مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کے مجھے اطلاع دینے کا دستور کب سے ختم ہوا ہے؟" وہ گرج کر بولا۔ "کیا اس سے پہلے لوگ بتائے بغیر سیدھے میرے بیڈ روم میں آئے ہیں؟"

حواس باختہ ملازم نے بمشکل تمام جواب دیا کہ اسے بالکل خبر نہیں شاید چوکیدار بتا سکے۔

"دروازے پر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "میں گھنٹی بجاتا رہا اور پھر گیٹ پر سے اندر آ گیا۔"

"وہ گیا ہوگا نماز پڑھنے کے لیے۔" میر شرافت علی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ "خیر۔ اب آپ تشریف لے چلیے ڈرائنگ روم میں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ کمال ہے برسوں ولایت میں رہ کے بھی تم ادب آداب کے کورے رہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ خوف سے وہ نروس ہو گیا ہے۔ خادم نے لپک کر دروازہ کھولا اور میں اس کے پیچھے پیچھے راہداری میں نکل آیا۔ جس کی بلند چھت میں تین فانوس معلق تھے۔

"بے تکلفی اور بدتہذیبی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ وہاں تو باپ بیٹا بھی دستک دیے بغیر ایک دوسرے کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے۔" وہ اس اندازِ برہمی اور پریشانی میں حق بجانب تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں سخت شرمندہ ہوں۔ ڈرائنگ روم پہلا دروازہ تھا اور وسیع و عریض ہال تھا جس میں قدم رکھتے ہی سامانِ آرائش میں نوادرات کی کثرت حیران کرتی تھی۔ خادم نے ایک بٹن دبا کے چار وال لائٹیں روشن کر دیں پھر درمیان کا عظیم الشان فانوس جلایا۔ ایئر کنڈیشنر آن کیا اور دبے پاؤں قالین پر بلی کی طرح چلتا نکل گیا۔

"بیٹھو اور بتاؤ کب آئے تم؟" میر شرافت علی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا لیکن میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔

"میں؟ ۔۔۔ میں آج ہی آیا ہوں۔" میں نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور ادھر ادھر دیکھا۔

"اپنے ۔۔۔ والد سے نہیں ملے ابھی؟" اس نے میرا خوشگوار موڈ دیکھ کر اندازے کی بنیاد پر کہا۔

"مل آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میانی صاحب کے قبرستان میں ملے تھے وہ۔"

میر شرافت علی چونکا اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے اس نے میز پر سے سگریٹ اٹھا کر جلائی۔ "تو گویا تمہیں ان کے انتقال کی خبر مل گئی تھی؟" اس نے اخروٹ کی لکڑی کا منقش باکس میری طرف کھسکا دیا۔

میں نے باکس میں سے دوسری سگریٹ اٹھائی۔ سونے کے نازک سے لائیٹر سے جلائی اور لائیٹر جیب میں رکھ لیا۔ "نہیں۔ یہ تو مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

میر شرافت علی بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ "تمہارا ۔۔۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہو گیا ہے۔ اور اب میں تمہارا دماغ درست کرنے آیا ہوں۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار پر لگی کال بیل کی طرف دیکھا جو میرے پیچھے تھی چنانچہ اس کی دسترس میں نہ تھی اور پھر چلا کر کسی کو بلانے کے لیے منہ کھولا مگر میں نے ایک جست میں اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کا بدن میرے ہاتھوں کی گرفت میں لرزنے لگا اور خوف سے اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔

"میر شرافت علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میری جیب میں بھرا ہوا ریوالور ہے۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ میں پاکستان میں ہوں۔ میں تمہیں اور تمہارے مددگاروں کو قتل کر کے صبح کی فلائیٹ سے لندن واپس جا سکتا ہوں لیکن میں ابھی ایسا نہیں کروں گا بشرطیکہ تم شرافت سے بیٹھے رہو اور جو کچھ میں پوچھوں سچ سچ بتاتے رہو۔" میں نے اسے دھکا دیا اور وہ صوفے پر گر کر ہانپنے لگا۔

"تم ۔۔۔ تم میرے گھر میں ہو ۔۔۔" میر شرافت علی نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ "اس گھر میں تین نوکر موجود ہیں اور ان میں سے ۔۔۔ کسی کو بھی شبہ ہوا تو وہ پولیس کو فون کر دے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا فون خراب ہے۔ اور اس بات کا خیال تم خود رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے ورنہ یہ ممکن ہے کہ میں انتہائی اقدام پر مجبور ہو جاؤں۔ پولیس کا ابھی کوئی کام نہیں ۔۔۔ مناسب وقت پر میں خود بھی پولیس سے ہی رجوع کروں گا اور اس وقت تم جا ہو گے کہ ایسا نہ ہوتا۔ ابھی تو میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہو گی، آفندی ریکارڈ ہو گی۔ جھوٹ بالکل نہیں چلے گا کیونکہ بیشتر حقائق وہ پردہ اٹھ جانے کے بعد سامنے آ گئے ہیں جو میری عقل پر اور نظر پر پڑا ہوا تھا۔"

"سکندر! ۔۔۔ تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میر شرافت علی نے بے بسی سے کہا۔

"چاہتا تو میں یہ تھا کہ تمہارا خون پی جاؤں۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے تم نے میرے باپ کا خون پیا۔ اس کے وجود کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا۔ تمہاری قسمت نے تمہارا بہت ساتھ دیا شرافت! لیکن تم حد سے بڑھ گئے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ میں ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں ورنہ اب تک تمہاری گردن توڑ کے جا چکا ہوتا۔ ابھی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں تاکہ تمہارا جرم دنیا پر ثابت کر سکوں اور تمہیں تختۂ دار تک پہنچنے سے پہلے ذلت و رسوائی کے طویل ترین عذاب سے گزرنا پڑے۔"

"یہ ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ۔۔۔ کسی نے غلط بتایا ہے تمہیں ۔۔۔" وہ ہکلا کر بولا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا ہوا اس شوکیس تک گیا جس پر مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

"میر شرافت علی! تم اب میر وزیر اینڈ کمپنی کے بلاشرکت غیرے مالک ہو؟"

"ہاں۔ تمہارے والد کے انتقال کے بعد ہی میں پارٹنر رہ گیا ہوں یہ مجسمہ رکھ دو ۔۔۔ بہت قیمتی ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا!" میں نے مجسمے کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "میرے والد نے حسابات پر آخری بار جون میں دستخط کیے تھے یعنی تین ماہ قبل۔ ان کے حصے کا منافع تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھا یہ رقم انہیں ادا کر دی گئی تھی؟"

"ہاں ۔۔۔ وصولیابی کے دستخط ۔۔۔"

"دستخط؟" میں نے مجسمہ دیوار پر دے مارا۔ "میں ادائی کی بات کر رہا ہوں ۔۔۔ دستخط تو تم نے بہت لیے ہیں۔"

میر شرافت علی پھر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا اور وہ مجسمے کے ٹکڑوں کو گھور رہا تھا۔ "تم ۔۔۔ تم بدمعاشی سے مجھے ہراساں کرنے آئے ہو ۔۔۔ تمہیں معلوم ہے اس مجسمے کی قیمت کیا ہے؟"

"پتھر کا مجسمہ تھا۔ جیتا جاگتا آدمی تو نہیں تھا۔ تم بتاؤ میرے باپ کی زندگی کی کیا قیمت تھی؟" میں نے جیڈ کا بنا ہوا نفیس کا مدار رتھ اٹھا لیا جس کے آگے دو منہ زور گھوڑے جتے ہوئے تھے۔

"اسے رکھ دو خبیث!" شرافت علی چلایا۔ "یہ بہت نایاب ہے۔ بیس ہزار کا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے رتھ کو اوپر اٹھایا۔ اس کا وزن دو سیر کے قریب تھا۔ "یہ ہے تو میرے باپ کا مال۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اسے تو اپنی قبر پر معمولی سنگ مرمر کا کتبہ تک میسر نہ آیا۔"

میں نے رتھ کو ماربل ٹاپ میز پر دے مارا۔ شرافت علی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ گھوم کر واپس صوفے پر گرا۔ اس کے ہونٹ کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔

"میں اپنے تمام سوالات کا جواب لیے بغیر نہ جاؤں گا اور نہ جانے دوں گا۔" میں نے کہا۔ شوفر ٹائپ شخص ایک دم دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ایک نظر میں اس نے صورتِ حال کو بھانپ لیا۔

"پکڑ لے اس بدمعاش کو شیدے!" شرافت علی نے چیخ کر کہا۔ "یہ مجھے قتل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ ۔۔۔ دیکھ کتنا نقصان کر دیا ہے اس نے کتنا تھا میرے باپ کا مال ہے۔"

شیدے نے بڑے بدمعاشوں کی طرح آستین سے منہ صاف کیا اور جیب سے ایک کمانی دار خنجر نکال لیا۔ میں اس وقت تک جیڈ کا ایک اور مجسمہ اٹھا چکا تھا۔ اگر میں خنجر کے جواب میں اس مجسمے سے وار کرتا تو شیدے کا سر پھٹ جاتا چنانچہ میں نے مجسمہ کرسٹل گلاس کے فانوس کی طرف اچھال دیا۔ ایک زبردست چھناکا ہوا اور کمرے میں ہر طرف شیشہ بکھر گیا۔ شرافت علی کے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح آواز نکلی۔ اور شیدے کے ساتھ ہی اس نے دیوانہ وار مجھ پر جست لگائی۔ میں نے شیدے کے وار کو دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے روکا اور کلائی کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ ہڈی کے چٹخنے ہی شیدا بلبلایا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نیچے گرا اور وہ درد سے دہرا ہوا تو میں نے نیچے سے گھٹنا مار کے اسکو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے الٹ کر دور پھینک دیا۔ وہ تقریباً اڑتا ہوا گیا اور شیشے کے ایک اور شوکیس سے ٹکرایا۔ شفاف شیشے کے بکھرتے ہی اندر رکھے ہوئے نوادرات اس کے اوپر گرے پھر اس کے بھاری وجود کے تصادم سے شوکیس کا توازن بگڑ گیا۔ شوکیس پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کر آگے آیا۔ اور اوپر رکھے ہوئے نوادرات سمیت شیدے پر الٹ گیا۔

شرافت علی جو میری طرف لپکا تھا صدمے سے سن پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔ اس کے نوادرات کا بیش بہا ذخیرہ جو شاید اس نے برسوں میں جمع کیا تھا پل بھر میں نیست و نابود ہو گیا تھا۔ اگر وہ ایک مجسمہ واقعی بیس ہزار کا تھا تو اس حساب سے میں نے اس کا لاکھوں کا نقصان کر دیا تھا اور یہ ذہنی اذیت اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ پھر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے لبوں سے کف جاری تھا اور اس کی زبان سے فحش ترین گالیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ میں نے اطمینان سے وہیں کھڑے کھڑے اسے ہاتھوں کے اشارے سے اوپر اٹھایا اور پھر صوفے پر پھینک دیا۔

● انجینئر بننے کے ساتھ ساتھ میں شوقیہ جوڈو اور کراٹے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی سیکھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور میں کوئی بلیک بیلٹ تو نہیں ہوں مگر ایک ماہرِ فن کا سب سے ہونہار شاگرد ضرور تھا۔ اب میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ مائی ڈیئر میر شرافت علی! تم کب سے وزیر خاں کو بلیک میل کر رہے ہو؟" میں نے شیدے کا خنجر اٹھایا... اور ایک آئل پینٹنگ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔" یہ مصوری کا شاہکار بھی بہت بیش قیمت ہوگا۔"

"سکندر! خدا کے لیے تم مجھے مار لو۔" وہ گھگھیا کر بولا۔ "میں بوڑھا آدمی ہوں۔ تمہارے باپ کا ہم سن۔ اپنے جوان بازوؤں کی طاقت سے میری ہڈیاں توڑ دو مگر ان چیزوں کو تباہ مت کرو۔"

"کیوں؟" میں نے تصویر کو نوکِ خنجر سے چاک کر دیا۔ ایک کونے سے دوسرے مخالف کونے تک وتر کی صورت میں کٹ جانے والا کینوس بوسیدہ ٹاٹ کی طرح لٹکنے لگا۔

میر شرافت علی بلک بلک کر رونے لگا۔ "یہ... یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے۔"

"میرے باپ کی تمام عمر کی کمائی کیا تھی؟ رسوائی اور ذلت۔ مفلسی اور فاقہ کشی اور بے چارگی کی موت؟ مجھے معلوم ہے میر وزیر اینڈ کمپنی قائم ہونے کے بعد اس نے اپنے حصے کے منافع پر صرف دستخط ثبت کیے ہیں۔ رقم تمہارے حساب میں جمع ہوتی رہی۔ حسابات دیکھ کر میں معلوم کر لوں گا کہ کل رقم کتنی بنتی ہے جو اس کو ملنی تھی۔ یہ رقم بمعہ سود مجھے تم سے وصول کرنی ہے۔ آج کا سارا نقصان اس میں سے منہا کر دو۔ باقی بشرطِ زندگی میں تم سے پھر لے لوں گا۔"

اُسے اپنے نقصان پر اتنے عذاب سے روتے دیکھ کر مجھے بڑی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ غالباً شور پر متوجہ ہو کے دوسرا خادم اندر آیا جو ہمیں ڈرائنگ روم تک چھوڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا میں نے ہاتھ بڑھا کے اُسے کھینچ لیا۔ وہ دہشت سے چلّایا۔ مگر میں نے اس کی کنپٹی پر ایک ہلکا سا ہاتھ مارا اور چھوڑ دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کے ڈھیر ہو گیا۔ میر شرافت علی کے حلق سے نکلنے والی آواز بند ہو گئی۔

"تم نے کوٹھی میں تین ملازموں کا ذکر کیا تھا۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "دو یہاں لیٹے ہیں تیسرا چوکیدار نماز پڑھ کے لوٹ آیا ہوگا تو دروازے پر کھڑا ہوگا چنانچہ اب کسی کی مداخلت کا ڈر نہیں رہا اور ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ قانونی طور پر تم فرم کے مالک بن چکے ہو؟"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا۔

"جھوٹ۔" میں نے خنجر سے ایک اور پینٹنگ کے پرخچے اڑا دیے۔ "یہ قانونی کارروائی اتنے کم وقت میں مکمل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد اپنی زندگی میں اس حق سے دستبردار ہوتے ہوتے تو تین مہینے پہلے حسابات پر دستخط کرنے کیوں آتے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ قانونی دستاویزات میں وہ اب بھی فرم کے ایک مالک ہیں۔"

میر شرافت علی نے اقرار میں سر ہلایا اور پینٹنگ کو گھورتا رہا۔ یوں جیسے یہ اس کے جوان بیٹے کی لاش ہو۔

"پارٹنرشپ کے معاہدے کی دستاویزات وزیر خاں کے پاس بھی ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "سر مت ہلاؤ۔ جواب دو۔"

"ہاں۔" میر شرافت علی کے حلق سے مضحکہ خیز آواز نکلی۔ "اس کی موت کے بعد..."

"اس کے قتل کے بعد۔" میں نے لات مار کر چھوٹا شوکیس گرا دیا۔ "کہو اس کے قتل کے بعد۔"

"اچھا۔ اچھا۔" میر شرافت علی تھر تھر کانپتے ہوئے بولا۔ خوف سے زیادہ یہ صدمے کا اثر تھا۔ "اس کے قتل کے بعد میں نے عدالت میں درخواست دائر کی تھی۔"

"وہ اب غیر مؤثر ہو جائے گی۔ وزیر خاں کا قانونی وارث اب تمہارا پارٹنر ہوگا یعنی میں۔" میں نے کہا۔ "انہی دستاویزات کے لیے تم نے اس کے سرونٹ کوارٹر کا تالا توڑا اور اس کے صندوق کی تلاشی لی تھی۔"

"کس سرونٹ کوارٹر کا تالا؟ کیسا صندوق؟..." اس نے جھوٹ بولنے کی فضول سی کوشش کی۔ میں نے ایک تصویر کو فریم سمیت کھینچ لیا۔ گھٹنے پر مار کے فریم کے ٹکڑے کیے اور اس کی طرف اچھال دیے۔

"بے وقوف!" وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "یہ ایک تصویر ایک لاکھ کی تھی۔"

"ایک بے جان تصویر کے لیے اتنا رونا؟" میں نے کہا۔ "اور ایک زندگی کی تباہی پر اظہارِ ندامت تک نہیں میر شرافت علی! وہ دستاویزات ایک بینک کے لاکر میں محفوظ ہیں۔ میرا وکیل عدالت میں پیش کرے گا۔ تم اس تمام نقصان کی تلافی کے لیے جانے کا مقدمہ الگ کر سکتے ہو۔ اب ایک آخری سوال۔ میرے والد کو کس بات پر تم ساری عمر بلیک میل کرتے رہے؟ کیا کیا تھا اس نے جس کی اتنی بڑی قیمت تھی؟"

میر شرافت علی نے روتے روتے سر اٹھایا اور ایک قہقہہ مارا۔ وہ صدمے سے پاگل ہو چکا تھا۔ "سکندر بخت تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے۔" وہ اچانک اٹھا اور میرے سامنے دو زانو ہو گیا۔ "جیسے چاہو مجھے قتل کر دو میرے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے پھینک دو۔ میرا قیمہ کر دو۔ لیکن یہ بات تم مجھ سے معلوم نہیں کر سکو گے۔ تم چاہو تو اس گھر کو آگ لگا دو۔ اس گھر کی ایک ایک چیز کو تباہ کر دو۔ مگر میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے پھر قہقہہ مارا۔ "یہ بات اپنے باپ کی قبر پر جا کے پوچھو۔ چلّا چلّا کے۔ شاید وہ سن لے۔"

اس کی دیوانی ہنسی کسی ویران مرگھٹ میں چڑیلوں کی ہنسی کی طرح بھیانک تھی۔ خنجر میرے ہاتھ سے گر گیا۔

"اچھا میر شرافت علی!" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اس وعدے کے ساتھ کہ میں پھر آؤں گا۔ یہ سب معلوم کر لینے کے بعد تم نے میرے والد کو قتل کیا تھا۔ اس کی سزا تمہیں قانون دے گا۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم قاتل ہو۔ میں خود تمہیں مار کے یہ موقع فراہم نہیں کروں گا کہ میرے پھانسی پر چڑھ جانے کے بعد تمہارے سارے کاروبار کے بلا شرکت غیرے مالک بن جائیں۔ میں تمہارا پارٹنر ہوں اور مجھے تم سے اپنا آبائی قرض وصول کرنا ہے۔"

میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ باہر آنے کے بعد میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند کیا اور بیرونی دروازے سے گزر کر پورچ میں پہنچا۔ اطمینان سے چلتا ہوا گیٹ تک گیا، جہاں اب چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ میر شرافت علی کے چیخنے چلّانے کی آواز گیٹ تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور وہ فون کر کے پولیس کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔

باہر نکل کے میں نے میکلوڈ روڈ کا رخ کیا جہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اب کم ہو گئی تھی کیوں کہ آخری شو شروع ہو چکے تھے۔ میر شرافت علی کی کوٹھی 'رین بسیرا' سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی جس کا ڈرائیور بونٹ اٹھائے انجن میں سر ڈالے کھڑا تھا۔

"بھئی ماڈل ٹاؤن تک جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا تو اس وقت ہوگا جنابِ عالی! جب گاڑی جائے گی۔" وہ سر نکال کے بولا۔

"تم؟" میں نے اس اتفاق پر حیران ہو کے کہا۔ "ابھی تک گاڑی دھکے پر چل رہی ہے؟"

"اب تو دھکے پر بھی نہیں چل رہی ہے جنابِ عالی! اچھی بوہنی کی تھی آپ نے۔" وہ پھر انجن میں غرق ہو گیا ——— اسی وقت ایک رکشا خالی گزرا جسے میں نے دس روپے زیادہ دینے کے وعدے پر ماڈل ٹاؤن کے لیے راضی رضامند کر لیا۔ رات کے وقت ایک رکشا ٹیکسی والے ادھر جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ عموماً انہیں خالی واپس آنا پڑتا تھا اور لٹنے کا ڈر الگ رہتا تھا۔

ساڑھے دس بجے میں سی سی ڈین کی کوٹھی کے دروازے پر اترا اور دگنا کرایہ بتانے والے میٹر سے بھی دس روپے زیادہ دے کر عقبی حصے کے سرونٹ کوارٹر میں پہنچا تو سلامت شاہ کھانا لیے بیٹھا تھا اور میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بھوک نہیں تھی مگر اس کا دل رکھنے کو میں نے چند لقمے نگلے پھر سکون آور گولیاں کھائیں اور... سلامت شاہ کو صبح جگا دینے کی ہدایت کر کے سو گیا۔ سکون بخش گولیوں کا سہارا میں نے پہلے کبھی نہیں لیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے بعد مجھے نیند نے آ لیا جو نیم بے ہوشی جیسی تھی۔

صبح سلامت شاہ نے مجھے فجر کے وقت جگایا تو میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور بدن تکان سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے بغیر دودھ کی چائے کے دو کپ پیے اور بریف کیس اٹھا کے روانہ ہو گیا۔ ریل کار کا ٹکٹ ایک قلی کی عنایت سے عین اس وقت دستیاب ہوا جب ریل کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے۔

ابھی میں سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے شیدے کے ساتھ میر شرافت علی کا دوسرا ملازم نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا مگر اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، دونوں جانب سے پولیس اندر آ گئی۔

"یہی ہے وہ شخص؟" انسپکٹر نے شیدے کو مخاطب کر کے کہا۔

"جی سر۔" شیدے نے کہا اور دوسرے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"آپ سکندر بخت ولد وزیر خاں مرحوم ہیں؟" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے؟" میں نے دوسرے مسافروں سے نظریں چرا کے کہا۔

"تم پر الزام ہے کہ تم نے گزشتہ رات میر شرافت علی کو خنجر کے وار کر کے قتل کر دیا۔" انسپکٹر نے کہا اور اپنے ساتھ آنے والوں کو اشارہ کیا کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیں۔

خواب سب دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ سچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی تشریحات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیریں کیا ہیں؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی راہنمائی سے مستقبل کی تعبیر میں کیا مدد لی جا سکتی ہے؟ کیا وہ ہماری الجھنوں کے عکاس ہوتے ہیں؟
یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں ماہرین کی کیا رائے ہے؟
خوابوں کے بارے میں مذاہبِ عالم کیا کہتے ہیں؟ یہ اور ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لئے ——— پڑھیئے!
قیمت دس روپے
خوابوں کے اسرار
ڈاک خرچ ۵ روپے
اے ایس صدیقی کے قلم سے
اردو میں پہلی بار ——— ایک بھرپور اور منفرد کتاب
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۱۴۴ کراچی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھانیدار کی آمد اور میری گرفتاری ان سب کے نقطۂ نظر سے بے حد سنسنی خیز واقعہ تھی جو مجھے بھی اپنے جیسا شریف ہمسفر سمجھے ہوئے تھے اور انھوں نے بعد میں بارہا ایک قاتل کے فرار کی ناکام کوشش کا آنکھوں دیکھا حال حاشیہ آرائی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ سنایا ہوگا اور ہر بار زیبِ داستان کے لیے ڈرامائی تاثرات کا اضافہ کیا ہوگا تو سامعین دنگ رہ گئے ہوں گے۔ تھانیدار کے ساتھ چشم دید گواہ بھی تھے چنانچہ مزاحمت بے سود تھی اور اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ قتل جیسی سنگین واردات میں ہر مشتبہ شخص سے پوچھ گچھ کرے اور پھر معاملہ نظامِ انصاف کے سپرد کر دے۔ سب انسپکٹر پینتالیس پچاس سال کا خرانٹ آدمی تھا۔ عمر کا اندازہ خاصی میلی ٹوپی کے نیچے دکھائی دینے والی ..... سفید بالوں کی جھالر سے ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت میں مونچھوں کے بعد سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اس کے پیٹ کی جسامت تھی جس کے نشیب پر نافرمان بیلٹ مسلسل پھسلتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک حوصلہ شکن بے حسی تھی جس پر بے رحمی کا گمان ہوتا تھا اور اس کی صورت کے نقوش میں وہ کرختگی تھی جو عمر کے تجربات نے عطا کی تھی جس شخص کا واسطہ ہی چور ڈاکو، قاتل اور دس نمبری بدمعاشوں سے ہو۔ وہ فرض کی ادائیگی میں تہذیب اور شائستگی کے تقاضے کیسے پورے کر سکتا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بیس پچیس سال قبل وہ کانسٹیبل بھرتی ہوا ہوگا۔ اس طویل عرصے میں اگر وہ صرف سب انسپکٹر کے عہدے تک ترقی پا سکا تو یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کی ذہانت اور کارکردگی کا معیار کیا ہوگا۔ اگر افسرانِ بالا خفا نہ ہوں تو مدتِ ملازمت کو دیکھتے ہوئے ازراہِ بندہ پروری بھی ترقی بخش دی جاتی ہے اور اس نے بھی شاید ایسے ہی ترقی پائی تھی۔

متجسس چہروں اور سوالیہ نظروں کی پروا کیے بغیر میں ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر آیا تو میری منزل بدل چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی راستے پر چلتا ہوا آیا تھا تو میرے تصور میں محسن کا مخلص چہرہ تھا اور فوزیہ کی تابانیٔ حسن تھی اور میں مرحوم جا کے مریم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے علاوہ چراغ دین سے بہت سے تصفیہ طلب امور پر گفتگو کی سوچ رہا تھا۔ اب میرے تصور میں حوالات تھی۔ دیسی پولیس کے طریقۂ تفتیش کے لرزہ خیز مناظر تھے۔ عدالتی کارروائی کے صبر آزما مرحلے تھے اور وہ انجام تھا جس کا خیال بھی روح فرسا تھا۔ میرے ہاتھوں میں اب بریف کیس نہیں تھا ہتھکڑی تھی۔ بریف کیس حوالدار نے تھام رکھا تھا جس کی پیٹی سے ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا بھی منسلک تھا۔ حوالدار اپنے باس سے عمر میں بھی کم تھا اور حجم میں بھی۔ شاید کسی بیماری کے چکر میں وہ سکڑ گیا تھا کہ وردی بھی اس کے جسم سے بہت بڑی لگتی تھی۔ کانسٹیبل بالکل نوعمر تھا اور کسی دیہات سے وارد ہوا تھا۔ شہر میں اس اعلیٰ اختیارات کے حامل منصب پر فائز ہونے سے اس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ جب تھانیدار نے اسے ٹیکسی روکنے کے لیے کہا تو اس نے بڑے بارعب انداز میں ایک ڈرائیور کو اشارہ کیا لیکن ڈرائیور بھاگ گیا۔ لاقانونیت کے اس مظاہرے پر وہ بہت جز بز ہوا اور دوسری ٹیکسی کے سامنے خودکشی کے انداز میں کھڑا ہو گیا چنانچہ ٹیکسی رک گئی۔

"تھانیدار صاحب" میں نے مصلحت کے تقاضے کو مدِنظر رکھتے ہوئے عاجزی سے کہا "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی سامنے ہی ایک کوٹھی ہے۔ اس میں ایک خانساماں سلامت شاہ رہتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے دو باتیں کر لوں۔"

"دو نہیں دس باتیں کر لینا شہزادے" تھانیدار نے ایک مونچھ کو بل دے کر میری طرف دیکھے بغیر کہا "اسے بھی تھانے منگوا لیں گے۔"

مجھے خاصی مایوسی ہوئی یہ لندن کی پولیس نہیں تھی۔ ان سے بحث نہیں کی جا سکتی تھی کسی فعل کا جواز نہیں پوچھا جا سکتا تھا اور انھیں اپنے ولایت پلٹ ہونے کا حوالہ دے کر متاثر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا ذکر ان کو جاہل کہنے کے مترادف تھا اور ولایت کی بات کرنا ان کے احساسِ محرومی میں اضافہ کرنا تھا جو مختلف قصبوں کے تھانوں کے علاوہ کہیں نہیں گئے تھے اور سب تھانے اتنے ہی بیزار کن اور ہولناک ہوتے ہیں کہ اس ماحول میں بیس پچیس سال گزارنے والا ان ملزموں کو خوش قسمت سمجھتا ہوگا جو چند دن حوالات میں یا چند برس جیل میں کاٹ کے رہا ہو گئے۔

"بندہ دیکھ لیا ہے نا چنگی طرح؟" تھانیدار نے ٹیکسی کے اگلے دروازے سے خود کو سیٹ پر گرانے کے بعد کہا۔ "نہ ہو بعد میں وخت پڑ جائے۔ چل پتر تو رکشا پھڑ لے۔" یہ آخری جملہ پانچویں سواری یعنی ٹیکسی روکنے والے جانباز کانسٹیبل سے کہا گیا تھا۔

"او جی تھانیدار صاب غلطی کیسے ہو سکتی ہے" چشم دید گواہ نے یقینِ کامل سے کہا "اس بدمعاش نے تو کل رات اپنا بھی خانہ خراب کر دیا تھا۔ آپ تو دیکھ چکے ہیں جنابِ عالی۔ کتنی چوٹیں لگی ہیں میرے۔" پھر اس نے تفصیل سے بتانا چاہا کہ میں نے "گرڈا" کہاں مارا تھا اور ہاتھ کہاں مگر میرے دائیں جانب بیٹھنے والے حوالدار نے غرا کے کہا کہ چودھری صاحب جتنی بات پوچھیں اتنا ہی جواب دیا جائے اور کتے کی طرح بھونکنے سے گریز کیا جائے۔ گواہ دم دبا کے بیٹھ گیا۔

"لو جی چودھری صاب۔ اب اس کا رکشا والے سے جھگڑا شروع ہے" حوالدار نے سر گھما کے پیچھے دیکھا۔

"اوئے یار خواجہ۔ کیا نام ہے اپنے اس منڈے کا؟" تھانیدار نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "اس کو سمجھاؤ۔ سپاہی ہوا ہے کوئی گورنر نہیں ہو گیا ہے۔ بھئی کوئی طریکا ہوتا ہے بات کرنے کا۔ بھاویں سالے شہر کر ڈک دو۔ پر طریکے سے۔ ورنہ بے عزتی خراب ہوتی ہے۔" وہ عادتاً قاف کی جگہ کاف بولتا تھا چنانچہ طریقہ اس کے لہجے کے باعث "طریکا" سنائی دیتا تھا۔

خلافِ توقع تھانے کی بجائے ٹیکسی رین بسیرا پہنچی اور گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر پولیس کی ایک جیپ۔ ایک ایمبولینس اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور باہر کھڑے گپ لگا رہے تھے۔ دو اور پولیس مین کوٹھی کے دائیں بائیں جانب کاہلی سے اس رسمی کارروائی کو دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے نئی نہ تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے میں نے ٹیلی فون کا وہ تار بھی دیکھ لیا تھا جو ٹوٹ کر باہر ہی گر گیا تھا۔ مجھے یہاں لانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ابتدائی تفتیش جائے واردات پر ہی مکمل کی جائے اور وہاں میری موجودگی کے مزید ثبوت حاصل کیے جائیں۔ میرے اندر کودنے سے کیاری کی نرم مٹی میں بننے والے نقشِ پا بالکل واضح ہو گئے۔ شاید لان پر سے ہو کے اندر جاتے ہوئے میں نے کوٹھی کے صاف فرش پر بھی قدموں کے نشان چھوڑ دیے ہوں گے۔ ان سے میرے جوتوں کا موازنہ ضروری ہوگا۔ فنگر پرنٹ تو میں نے اس خنجر کے دستے پر بھی چھوڑے تھے جو میں نے ایک حملہ آور سے چھینا تھا اور قیمتی تصاویر کا کینوس پھاڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جانے سے پہلے میں نے وہ خنجر خود ہی قالین پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے جانے کے بعد کوئی میر شرافت علی کو قتل کر دے گا اور حالات و واقعات، ثبوت اور گواہ سب مل کر قانون کی نظر میں مجھے مجرم بنا دیں گے۔

ڈرائنگ روم کی بجائے مجھے سامنے والے دروازے سے ایک ایسے کمرے میں لے جایا گیا جو مہمانوں کا بیڈ روم بھی تھا اور مقتول میر شرافت علی کا پرائیویٹ آفس بھی۔ دائیں جانب مسہری پر ایک شکن بھی نہ تھی مگر سیاہ فارمیکا والی سائڈ ٹیبل پر گرد کی تہہ تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے اس بیڈ کو کسی نے استعمال نہیں کیا۔ بائیں جانب کونے میں ٹیک وڈ کی کرسی اور لکھنے کی میز تھی جس کی سبز مخمل کی سطح پر اونیکس کا مکمل رائٹنگ سیٹ موجود تھا۔ دوسرے کونے میں باتھ روم کا دروازہ تھا اور درمیان میں دیوار کے ساتھ ساتھ اسفنج جیسے کپڑے کے کور اور فوم ربر کے گدوں والا صوفہ سیٹ تھا۔ درمیانی صوفے پر ایک جوان اور اسمارٹ آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی متانت سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ پولیس کی وردی کی بجائے اس نے دھاری دار قمیص اور فان کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔

ایس آئی چودھری نے جس کا نام اس کی وردی کی جیب پر حشمت خاں لکھا ہوا تھا پتلون کو سنبھال کے اور جوتوں کی ایڑیاں ملا کے سیلوٹ کیا۔ اس کے پیچھے رہنے والے اور مجھے لے کر آنے والے حوالدار نے زیادہ آواز سے پیر مارا۔

"ملزم حاضر ہے جناب" ایس آئی حشمت نے کہا اور اسی وقت حوالدار نے مجھے دھکیل کر آگے کیا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا شخص اسی اطمینان سے سگریٹ پیتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور پھر خاموش ہو گیا۔

"میرا نام طارق جمیل ہے" اس نے بالآخر کہا "اور میں اس علاقے کا اے ایس پی ہوں۔ اس قتل کی تحقیقات کے لیے مجھے خصوصی طور پر نامزد کیا گیا ہے۔"

"یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات ہے" میں نے انگریزی میں کہا۔

"بلاوجہ انگریزی مت بولو" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے معلوم ہے تم کئی سال لندن میں رہ کے آئے ہو۔ یہ قتل کیوں کیا ہے تم نے؟"

"میں نے یہ قتل نہیں کیا ہے" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "اور اس بیان کی صداقت تختۂ دار تک نہیں بدل سکتی۔"

"اس گھر میں تین چشم دید گواہوں نے بیان دیا ہے کہ تم نے رات کو زبردستی گھر میں گھس کے بہت توڑ پھوڑ کی۔ سب کو مارا پیٹا اور پھر میر شرافت علی کو قتل کر کے فرار ہو گئے۔" اے ایس پی نے کہا۔

"ان گواہوں نے مجھے توڑ پھوڑ کرتے یقیناً دیکھا ہوگا" میں نے کہا "میں نے مار پیٹ بھی کی تھی لیکن ان میں سے کس نے کہا ہے کہ قتل بھی میں نے کیا تھا؟ کسی نے واقعی مجھے قتل کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا یا ان کا خیال ہے کہ قاتل

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا؟"

"ان کے خیال میں قاتل تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "تمہارے خیال میں قاتل کون ہے؟"

"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کسی نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے جانے کے بعد قتل کر دیا۔"

"گویا تمہارے یہاں آنے کا کسی کو علم تھا؟ قاتل اگر اس گھر کے نوکر نہیں تھے تو وہ ہوگا جو یہ بات جانتا تھا۔"

میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "صرف دو افراد یہ بات جانتے تھے۔ ان میں سے ایک محسن رضا ہے جو لندن میں میرا کلاس فیلو تھا اور اسلام آباد میں ہے۔ اس کے والد مسٹر شیردانی ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ محسن کو یہ بات میں نے کل رات بتائی تھی۔ وہ اڑ کے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کے پاس میں نے لندن سے واپسی پر قیام کیا تھا۔ مسٹر چراغ دین کا خانساماں سلامت شاہ۔ وہ میر شرافت علی کے نام سے بھی واقف نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محسن کو اور سلامت شاہ کو میری گرفتاری کی اطلاع دے دی جائے۔ ان کے بیانات سے آپ کو بھی تفتیش میں مدد ملے گی اور مجھے بھی ان سے مشورہ کرنا ہے۔"

"ان کا پتہ لکھوا دو۔" اے ایس پی نے روکھے لہجے میں کہا۔ "اگر ہم مناسب سمجھیں گے تو بلا لیں گے۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے والد کیا کرتے تھے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی اسی چراغ دین کے ایک ملازم تھے۔" یہ سب معلومات وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

"بدقسمتی سے یہ بات ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ 'میروزیر اینڈ کمپنی' میں میر شرافت علی کے پارٹنر تھے۔" اے ایس پی کے لیے یہ انکشاف تھا۔ "پارٹنر؟ بزنس پارٹنر؟"

"جی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کاروبار میرے والد مرحوم کا ہی تھا۔ میر شرافت علی بعد میں شامل ہوا تھا۔ مرتے وقت تک وہ برابر کے پارٹنر تھے۔"

"تو اس کوٹھی میں جھاڑ پونچھ کے کام پر کیوں ملازم تھے؟" اے ایس پی نے طنز آمیز بے یقینی سے کہا۔

"جب میں انگلینڈ گیا تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں رہتے تھے جو ان کی ذاتی ملکیت تھی۔ ان کے پاس کار تھی اور خدا کا دیا وہ سب کچھ تھا جو انھوں نے مسلسل محنت سے ترقی کر کے حاصل کیا تھا۔ میں تحریری طور پر اپنے بیان میں سب کچھ بتاؤں گا کہ وہ کس زمانے میں کہاں رہتے تھے۔ ان کے پاس کون سی گاڑی تھی۔ ان کا ٹیلی فون نمبر دو ماہ قبل کیا تھا اور اب کیا ہے۔ آپ دستاویزات سے بھی تصدیق کر سکتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جو میرے والد کو جانتے تھے۔ ان میں 'میروزیر اینڈ کمپنی' کے پرانے ملازم بھی ہیں جو پچیس سال سے فرم میں ہیں۔"

اے ایس پی کی نظریں مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میری بات کس حد تک قابلِ اعتبار ہے اور یہ سب سچ ہے تو کیسے سچ ہے۔ "تصدیق تو کرنی پڑے گی کہ ایک فرم کا مالک اس عمر میں ایسی نوکری کیوں کر رہا تھا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "یہ کیا ڈراما ہے۔ وہ کار اور کوٹھی دو مہینے میں کیسے ختم ہو گئے؟ تم کہتے ہو وہ اب بھی پارٹنر تھے۔ تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی کیا تھی؟"

"جی۔ ان کا اس سال کا منافع تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد ساڑھے تین لاکھ بنا تھا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "مگر کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس شخص کو گزر اوقات کے لیے گھر کی صفائی کا حقیر کام قبول کرنا پڑا۔ وہ بیماری میں خیراتی شفاخانوں سے علاج کراتا رہا۔"

"کیوں؟" اے ایس پی نے میز پر ہاتھ مارا۔ "کہاں گئے وہ ساڑھے تین لاکھ۔ وہ کار۔ کوٹھی۔" وہ اب مشتعل ہو رہا تھا اور اس کی جھنجلاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے۔ "الو بناتے ہو مجھے؟"

"اڑا دیا ہوگا عیاشی میں جناب عالی۔" سب انسپکٹر نے پھر تیلون کر اوپر پھینکا۔ "شوقین مزاج آدمی ہوگا۔ جوئے میں ہار گیا ہوگا یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر اڑا دیے ہوں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے غصے کو ضبط کر کے کہا۔ "اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور یہ بات کسی دوسرے شخص نے کہی ہوتی تو میں۔۔۔۔"

"تو میں اس کو بھی قتل کر دیتا۔ ہیں؟" تھانیدار نے میری بات کاٹ کے میرے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ اس کے بھاری ہاتھ میں بلا کی قوت اور پھرتی تھی جو برسوں کی مشق اور مہارت کا نتیجہ تھی۔ خون کا نمکین ذائقہ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ حوالدار نے مجھے آگے دھکا دے دیا۔ اے ایس پی یوں بیٹھا رہا جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا وہ خاموش رہا۔

"میرا باپ تمام عمر نمازی اور پرہیزگار رہا ہے۔" میں نے تھانیدار کو خون آشام نظروں سے گھور کے کہا۔ "اس کو جاننے والے سب زندہ ہیں اور میری بات کو جھوٹ یا بکواس قرار دینے سے پہلے ان سب سے پوچھ لو کہ وہ کیسا آدمی تھا۔ معلوم کر لو کہ اس نے ساڑھے تین لاکھ کی آمدنی پر انکم ٹیکس ادا کیا تھا یا نہیں؟ اس کی کوٹھی کس نے خریدی ہے اور کار کس نے؟

کیا یہ سب ریکارڈ پر نہیں ہوگا۔ لاہور میونسپل کارپوریشن، محکمۂ انکم ٹیکس، موٹر وہیکل آفس اور پارٹنر شپ ڈیڈ۔ ان دستاویزات کو میرا وکیل عدالت کے سامنے بھی پیش کرے گا۔ یہ مت سمجھو انسپکٹر کہ تم کسی لاوارث، جاہل اور غریب آدمی کے ساتھ جو سلوک کرتے ہو وہی میرے ساتھ بھی کر سکو گے۔ باپ کی موت کے بعد میں قانونی طور پر 'میروزیر اینڈ کمپنی' کا مالک ہوں۔ واحد مالک۔ کیونکہ میر شرافت جو دوسرا پارٹنر تھا وہ اب نہیں ہے۔ میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کسی وظیفے پر نہیں۔ مجھے میرے والد نے اپنے خرچ پر بھیجا تھا۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ سمجھے؟ ایک معزز اور تعلیم یافتہ شہری ہوں۔"

اے ایس پی کی صورت پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔

"اس کی آواز کم کرو۔ اور اسے بتاؤ کہ یہ ولایت نہیں ہے۔" وہ سگریٹ کو مسل کر بجھاتے ہوئے بولا۔ سب انسپکٹر حشمت نے ادھر ادھر دیکھا اور باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ حوالدار نے مجھے یوں دھکیلا کہ میں منہ کے بل گرا۔

"آخر یہ کیا ہے؟ تم تشدد سے اعترافِ جرم کرانا چاہتے ہو؟" میں نے گھٹنوں کے بل اٹھ کے کہا۔ "تمھیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ عدالت میں اس بیان کی کوئی حیثیت نہیں۔" انسپکٹر حشمت اور حوالدار نے مجھے گھسیٹ لیا۔ ایک کانسٹیبل نے بڑی مستعدی سے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"اے ایس پی صاحب۔ آپ کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو چھڑانے کے لیے حشمت کو پوری قوت سے دھکا دیا۔ وہ ڈگمگا کے دیوار سے ٹکرایا۔ منحنی حوالدار کو میں نے یوں کھینچ لیا جیسے انجن کسی بوگی کو کھینچتا ہے۔ پلک جھپکتے میں ہتھکڑی سمیت میں اے ایس پی کے سامنے تھا۔ "ابھی مجھ پر الزام ہے۔ میں مجرم ثابت نہیں ہوا ہوں۔ تم نے میرا بیان تک نہیں لیا ہے۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "میں تم پر کیس کر دوں گا۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں۔ مسٹر شیردانی میرے انکل ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔"

لیکن اس سے زیادہ بولنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔ حشمت نے مشتعل ہو کے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا اور حوالدار نے زنجیر کو جھٹکا دیا تو میں پیچھے گرا۔ میرا سر بیڈ کے کنارے سے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ مجھے مردہ کتے کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ میرے جسم پر حوالدار کے خشک اور سخت لکڑی جیسے ہاتھ اور سب انسپکٹر حشمت کے گرز جیسے ہاتھ بھی مسلسل پڑ رہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے انھوں نے ہتھکڑی سے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کو پانی کے نل سے باندھ دیا۔ اس وقت میں ہوش میں آچکا تھا اور اس ذلت آمیز سلوک پر غصے سے پاگل ہو کے پولیس کو ان سے بڑھ کر گالیاں اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا لیکن وہ اس کے عادی تھے اور میں بے بس تھا۔ حوالدار نے بڑی پھرتی سے کونے میں رکھی ہوئی ٹین کی بالٹی اٹھائی اور میرے سر پر ٹوپی کی طرح الٹی رکھ دی۔ میرا منہ گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ اب میرے چلانے کی آواز اسی بالٹی میں گونج رہی تھی اور میرے کانوں تک بھی یوں پہنچ رہی تھی کہ خود میں دبے دبے شور میں کسی لفظ کو واضح طور پر نہیں سن سکتا تھا اور نہ وہ سن سکتے تھے۔

"کتے۔ ہمارے افسروں کے سامنے بھونکتا ہے۔۔۔۔؟" انسپکٹر حشمت نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ میں درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ "دھمکی دیتا ہے کیس کرنے کی۔؟" اس نے چند مغلظات کا اضافہ کیا اور تابڑ توڑ میرے پیٹ پہ مکے ملے۔ اعلان کیا کہ وہ عدالت میں لے جائے بغیر میری قبر تھانے کے احاطے میں بنا سکتے ہیں جہاں فرش کے نیچے ان گنت مردوں کے ڈھانچے ہیں۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں کہ پولیس کی حوالات سے فرار ہو کے وہ کہاں گئے۔ ابھی تک میرا حوصلہ برقرار تھا چنانچہ میں بالٹی کے اندر سے چیختا رہا کہ حبس بیجا اور تشدد کے الزام میں ان سب کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور ایک بے گناہ کو قتل کا مجرم بنانے کی اس غیر قانونی کوشش کا خمیازہ جیل جا کے بھگتنا پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر حوالدار نے میری پتلون اتارنے کی کوشش کی اور میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ وہ بلبلا کے فرش پر لڑھک گیا لیکن اس کے بعد میرے پاؤں بھی باندھ دیے گئے اور ان دونوں نے مل کر میرے کپڑے اتار لیے۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ اپنی حالت کے تصور نے مجھے خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا۔ میں کوئی معزز، قانون پرست شہری یا شریف آدمی نہیں تھا۔ پولیس کے لیے میں صرف ایک قاتل تھا اور کسی طرح بھی ایک ہسٹری شیٹر بدمعاش کے ساتھ ہونے والے سلوک سے بہتر سلوک کا مستحق نہ تھا۔ اچانک بالٹی پر کسی ڈنڈے کی ضرب پڑی اور ٹین کی چار دیواری میں اس کا شور بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور میرا دماغ سن ہو گیا۔ پھر دوسری بار بالٹی پہ ڈنڈا پڑا اور اس کے بعد بالٹی کوٹنے کا عمل تیز ہو گیا۔ شور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔" میں چلایا مگر اس شور میں میری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آواز دب کے رہ گئی۔ ہر ضرب بالشی کی بجائے مجھے اپنے سر پر محسوس ہو رہی تھی اور میرے کان کے پردوں کے درد کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں دیوانہ وار چیخنے لگا اور اچھلنے لگا مگر میرے ہاتھ بہت مضبوط زنجیر کے ساتھ لوہے کے نل سے بندھے ہوئے تھے۔ اب میں ان کو خدا رسولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔ وعدہ کر رہا تھا کہ کوئی بدتمیزی نہیں کروں گا۔ ان کی ہر بات مانوں گا اور کوئی دھمکی نہیں دوں گا لیکن وہ ایک نہیں سن رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد میرے دماغ کی کوئی رگ پھٹ جائے گی اور وہ مجھے واقعی تھانے کا فرش کھود کے گاڑ دیں گے۔ ابھی تک ریل کار میں جانے والے مسافروں کے سوا کسی کو میری گرفتاری کا علم نہیں تھا یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے گواہ صرف چار افراد ہیں، ایک اے ایس پی۔ ایک سب انسپکٹر۔ ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل۔ محسن یا سلامت شاہ کو کچھ خبر نہیں۔ یک لخت وہ شور تھم گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم لرز رہا ہے اور میں اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میں نیچے گر گیا تھا لیکن زنجیر سے بندھے ہوئے ہاتھوں کے باعث فرش پر نہیں لیٹا تھا بلکہ سر جھکائے رکوع کی حالت میں جھول رہا تھا۔ اعصاب پر دماغ کا کنٹرول ختم ہو جانے کے باعث میرے لبوں سے ٹوٹے پھوٹے مبہم الفاظ رک رک کر یوں نکل رہے تھے جیسے میری زبان پر فالج کا اثر ہے۔ جب بالشی میرے سر پر سے ہٹائی گئی تو مجھے دنیا کو پہچاننے میں بڑی دقت پیش آئی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میرا سر کدھر ہے اور میرے پیر کدھر ہیں۔ فرش نیچے ہے یا اوپر اور چھت بار بار نیچے آ رہی ہے یا فرش اوپر اٹھ رہا ہے۔

حوالدار نے مجھے دوبارہ کپڑے پہنائے تو میرے ہاتھ پیر قابو میں نہ تھے پھر آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے لگے اور میں سہارے سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سب انسپکٹر حشمت خاں کچھ دور کھڑا مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور حسبِ عادت پتلون کی بیلٹ سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ حوالدار نے میرے ہاتھوں کو پانی کے نل سے بندھی ہوئی زنجیر کھول کے آزاد کیا مگر کمر کے پیچھے ہتھکڑی سے باندھے رکھا۔

"کیوں شہزادے؟" سب انسپکٹر حشمت خاں نے کہا۔ "آواز کچھ کم ہوئی؟ سمجھ آ گئی ہے کہ یہ ولایت نہیں۔؟" میں نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔ وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کے مجھے باہر لے آئے۔ اے ایس پی بدستور اسی پوز میں بیٹھا۔ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ بند کمرے کے دروازے کے باہر پولیس کے کسی آدمی یا میر شرافت علی کے ان تین نوکروں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو سب کے سب صفِ

دشمناں میں شامل تھے چنانچہ میری فریاد و فغاں بے اثر رہی تھی۔

"یس مسٹر سکندر بخت۔" اے ایس پی نے متانت آمیز خوش دلی سے کہا۔ "کیا حال ہے اب؟ ولایت کا نشہ کچھ اترا؟"

"آئی... آئی ایم... سو... سوری... سر..." میں نے لڑکھڑاتی زبان سے الفاظ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر سخت کوشش کے بعد جملہ مکمل کیا۔ سب انسپکٹر حشمت خاں نے اپنی کارکردگی پر تعریف طلب نظروں سے اپنے افسر اعلیٰ کو دیکھا اور حوالدار خفیف سا مسکرایا۔

"آل رائٹ۔ بیٹھ جاؤ۔" اس نے لکھنے کی میز کے ساتھ پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی پر گر پڑا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے پانی کا ایک گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں نے سڑ سڑ کر کے آدھا پانی پیا اور آدھا گرایا مگر اس سے میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ میری آنکھیں اس منظر کو واضح طور پر دیکھنے لگیں جو پیشِ نظر تھا۔ میرے کان ہر لفظ کو سننے... اور سمجھنے لگے۔ میرے ذہن نے صورتِ حال کی سنگینی کو قبول کرنا شروع کیا اور مجھ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے لگی کہ میں برطانوی پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں اور یہاں کا قانون جو کتابوں میں لکھا ہے مجھے کوئی تحفظ فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ ہم ذہنی طور پر اب بھی آزاد نہیں اور دھن دھاندلی یا دھونس کے حربے قانون کی بے بسی کا آج بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ قانون تو آدمی خود اپنے آپ پر نافذ کرتا ہے۔ قانون تو اپنا ضمیر ہے اور جو اپنے ضمیر کی آواز کا احترام نہیں کر سکتا وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے جائز اور ناجائز سب طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ میں اذیت رسانی کے ان بھیانک طریقوں سے واقف تھا جو کسی میڈیکل رپورٹ سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔

"مسٹر سکندر بخت۔ کیا تم کسی عدالت میں ثابت کر سکتے ہو کہ ہم نے تم پر تشدد کیا ہے؟" اے ایس پی نے کہا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ انھوں نے ابھی صرف ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ تاکہ میں قائل ہو جاؤں۔ وہ اس سے کہیں زیادہ کرنے کے اہل تھے۔ "ویری گڈ۔ تم نے بہت جلد بات سمجھ لی۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اب ایک اور بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بیان میں افراد نے یہ بیان دیا ہے کہ تم چوکیدار کی عدم موجودگی میں دیوار پر سے کودے اور اندر آئے۔ تمھارے فنگر پرنٹ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اندر آ کے تم پہلے زبردستی میر شرافت علی کے بیڈ روم میں گھسے اور پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گئے تو وہاں تم نے بہت سے نوادرات کو تباہ کیا۔ شور سن

کر آنے والے دو خادموں کو مارا۔ اس وقت تمھارے ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس سے تم نے متعدد تصاویر پھاڑیں اور پھر اسی خنجر کے وار سے میر شرافت علی کو قتل کر کے نکل گئے۔ میر شرافت علی نے مرنے سے پہلے پولیس کو ٹیلی فون کیا تھا بتایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام سکندر بخت ولد وزیر خاں ہے اچانک لندن سے آ گیا اور اس نے کوٹھی میں گھس کے بہت ہنگامہ کیا۔ لاکھوں کے نوادرات کا نقصان کیا۔ اس نے گھر کے دو ملازموں کو بھی بہت مارا جو شور سن کے جان بچانے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور اس پر خون سوار تھا۔ اس نے جاتے جاتے قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔ میر شرافت علی نے اس اندیشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ سکندر بخت گیا نہیں ہے بلکہ ممکن ہے وہ کوٹھی کے آس پاس کہیں نہ کہیں چھپا ہوا ہو۔ تھانے سے اسے کہا گیا تھا کہ وہ باضابطہ رپورٹ لکھوا دے تو مزید کارروائی کی جا سکتی ہے اور شرافت علی نے کہا تھا کہ پہلے وہ ملازمین کے لیے ڈاکٹر کو طلب کرے گا اور پھر موقع ملتے ہی پولیس اسٹیشن آ جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور رپورٹ لکھنے والے کا خیال ہے کہ اس نے کچھ چیخنے چلانے یا کراہنے کی آوازیں سنی تھیں جو غالباً ریسیور کے لٹکے رہ جانے سے سنائی دی ہوں گی۔ رات کے ڈھائی بجے سب انسپکٹر حشمت خاں گشت سے واپس آیا تو یہ بات اسے بتائی گئی اور وہ ساڑھے تین بجے جائے واردات پر پہنچا تو ایک ملازم کو ہوش آنے لگا تھا مگر شرافت علی کی لاش خون میں لت پت شکستہ اور تباہ شدہ سامان کے درمیان پڑی تھی لاش پر خنجر کے چھ زخم تھے اور خنجر دل کے مقام پر پیوست تھا۔ خوش قسمتی سے تھانے کے محرر کو شرافت علی نے یہ بتا دیا تھا کہ تم کہاں مقیم ہو اور اس نے پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ حشمت بیگ اس پتے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ تم چند منٹ پہلے ریلوے اسٹیشن جا چکے ہو۔ تم چاہو تو میو اسپتال جا کے لاش کو دیکھ سکتے ہو۔"

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے شرافت علی کو یہ کب بتایا تھا کہ میں سلامت شاہ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

"جناب والا۔" میں نے اپنی زبان کی لکنت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لاکش کو چھوڑیے۔ کیا مجھے ایک بات پوچھنے کی اجازت ہے؟" اے ایس پی نے سر ہلایا۔ "آئی ڈونٹ مائنڈ۔"

"میر شرافت علی کا پیغام کس نے وصول کیا تھا؟ اور کتنے بجے؟" میرا لہجہ کمزور تھا مگر ایک غیر متوقع بات نے مجھے نیا اعتماد عطا کر دیا تھا۔ "نائٹ ڈیوٹی پر موجود ایک محرر نے۔" اے ایس پی نے کہا۔ "رات کے ایک بجے۔ قتل غالباً ایک اور دو بجے کے

درمیان ہوا۔"

"کیا وہ محرر میر شرافت علی کی آواز پہچانتا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور اس نے چیخنے کراہنے کی جو آوازیں سنیں۔ وہ شرافت علی ہی کی تھیں؟"

"نان سنس۔" اے ایس پی نے کہا۔ "کیا اس نے غلط سنا تھا؟"

"یس سر۔ اس نے بالکل غلط سنا تھا۔ رات نو بجے سے پہلے جب میں اس گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو میں نے باہر کی دیوار کے اوپر سے آنے والا ٹیلی فون کا تار توڑ دیا تھا۔ میر شرافت علی یہاں سے فون کر ہی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

اے ایس پی کی صورت کا تاثر یک لخت بدل گیا۔ وہ کچھ دیر میری صورت کو گھورتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے سب انسپکٹر حشمت کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ "حشمت خاں۔ کیا ٹیلی فون کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے؟"

"میں چیک کرتا ہوں جناب۔" حشمت خاں نے پتلون سنبھالی اور پلٹ کر کہا۔ "حوالدار۔ جا کے دیکھو۔" حوالدار اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

"ٹیلی فون کرنے والا میر شرافت علی نہیں تھا سر۔" میں نے کہا۔ "یہ قتل کرنے کے بعد قاتل نے کسی اور جگہ سے فون کیا۔ اور آپ کے محرر کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ وہ شرافت علی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے تو شرافت علی کو نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں مقیم ہوں۔"

"اگر شرافت علی زندہ ہوتا تو ہم تصدیق کر لیتے۔" اے ایس پی نے طنز اور تمسخر سے کہا۔

"ایک آخری سوال جناب۔" میں نے کہا۔ "قتل کی یہ واردات تو ایک بجے کے بعد ہوئی ہے۔ چشم دید گواہوں کا کیا بیان ہے؟ انھوں نے مجھے کس وقت آتے جاتے دیکھا تھا؟"

"انھیں وقت کا اندازہ نہیں۔" اے ایس پی نے کہا۔ "وہ تمھارے آنے کے کچھ دیر بعد سو گئے تھے اور پھر شور سے جاگے تھے۔"

"وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چوکیدار بتا سکتا ہے کہ جب میں گیا تھا تو وہ عشا کی نماز پڑھ کے آیا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت نو بھی نہیں بجے تھے۔ اسی نے مجھے سلام بھی کیا تھا۔"

دس منٹ بعد صورتِ حال خاصی بدل چکی تھی۔ چوکیدار نے تصدیق کر دی تھی کہ میں نو بجے کے قریب کوٹھی کے گیٹ سے باہر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتے بھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دیکھا تھا لیکن میں اس ٹیکسی میں بیٹھا نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کے سوال پر اس نے تسلیم کیا کہ میرے چوری چھپے کوٹھی میں کسی اور سمت سے کود جانے کے امکانات کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرا اعلانیہ گیٹ سے باہر جانا اور ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنا محض ڈرامہ ہو۔ تاہم حوالدار کی رپورٹ نے اے ایس پی کو مزید الجھن میں ڈال دیا۔ ٹیلی فون کی لائن ایک ایسی جگہ سے ٹوٹی تھی کہ تار کا وہ حصہ جو کوٹھی کے اندر لان پر سے اور درختوں میں سے گزرتا تھا اب بھی سلامت نظر آتا تھا اس کو کسی درخت کی شاخ نے گرنے نہیں دیا تھا۔ نسبتاً چھوٹا حصہ دیوار کے باہر پول کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ میرے نقشِ قدم دیکھنے والوں کو دیوار کے اوپر تار کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہوسکا تھا اور چونکہ کسی نے بعد میں ٹیلی فون بھی استعمال نہیں کیا تھا اس لیے اب تک یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ اے ایس پی نے اس کے باوجود یقین نہیں کیا کہ ٹیلی فون لائن نو بجے سے پہلے کٹ چکی تھی۔ "اگر میرا گھوم پھر کے دوبارہ کوٹھی میں داخل ہو جانا ممکن تھا تو کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ جیسے ہی میر شرافت علی پولیس کو فون کر کے فارغ ہوا میں نے اسے قتل کر دیا اور جاتے جاتے ٹیلی فون کا تار کاٹ گیا۔" "قتل تم نے اس وقت کیا جب تم پھر چپکے سے اندر آئے تھے۔" وہ بولا۔

میں نے ہمت نہیں ہاری۔ "ابھی ایک گواہ باقی ہے مسٹر چراغ دین کا خانساماں سلامت شاہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ میں کس وقت اس کے کوارٹر میں پہنچا تھا۔ ہم نے کھانا ایک ساتھ کھایا تھا۔"

"یہ سب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "فی الحال ہمارے پاس تمھیں گرفتار رکھنے کی معقول وجوہات ہیں۔ گواہوں کے بیانات کے علاوہ خود تمھارے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر شرافت علی کے مر جانے سے تم پورے کاروبار کے مالک بن گئے ہو۔ اگر وہ زندہ رہتا تو تم پارٹنر ہوتے۔ تم خود اعتراف کر چکے ہو کہ تم نے توڑ پھوڑ اور مار پیٹ کی۔"

"اس کی وجہ کچھ اور ہے جناب۔ میں میر شرافت علی کو سزا دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور ان سے وہ سب کچھ چھین لیا تھا جس کے وہ مالک تھے۔ کار کوٹھی۔ ساڑھے تین لاکھ کا منافع۔"

"اچھا؟ مگر بلیک میلر تو ہمیشہ مجرم ہوتے ہیں۔" اے ایس پی نے کہا۔ "خواہ یہ جرم کسی نے دانستہ کیا ہو یا اس سے نادانستگی میں سرزد ہوا ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی نے تمھارے والد کو کیوں بلیک میل کیا تھا؟"

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ اور ایسی بہت سی باتیں ابھی مجھے معلوم نہیں۔ جن کا میرے پاس ثبوت تک نہیں ہے۔"

"جب تفتیش ہوگی تو سب معلوم ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر حشمت خاں نے موقعہ پلٹتے ہی کہا اور اپنی ایک مونچھ کو بل دیا۔

"مجھے اپنا بیان ریکارڈ کرانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تفتیش کرنے والے افسر کی حیثیت سے آپ کے لیے یہ بیان بہت اہم ہوگا کیونکہ بہت سے واقعات جن کا تعلق اس واردات کے پس منظر سے ہے میں نے ابھی بیان نہیں کیے۔"

"آل رائٹ۔ مگر یہ بیان میں کل ریکارڈ کروں گا۔" اے ایس پی نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔ "ابھی مجھے ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دینی ہے۔ اور اخبار والوں کے سوالات کا جواب دینا ہے۔ وہ یقیناً اب تک پہنچ چکے ہوں گے۔ میر شرافت علی مشہور آدمی تھا۔ ایک بار پھر میں یہ پوچھوں گا کہ تم نے میر شرافت علی کو قتل کیا ہے؟ اگر تم اعتراف کر لو گے تو خود بھی پریشانی سے بچو گے اور ہمیں بھی بچا لو گے۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اسے سزا دینا چاہتا تھا اور مجھے یہ خیال بار بار آیا تھا کہ اسے قتل کر دوں مگر میں نے اسے بخش دیا تھا۔ یہ کسی اور نے مجھے مجرم بنانے کی سازش کی ہے۔ اعترافِ جرم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اے ایس پی جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "جناب اے ایس پی صاحب۔ میرے والدین اور بہن بھائی تو ہیں نہیں۔ یہاں جو کچھ ہیں مسٹر شیروانی ہیں اور سلامت شاہ ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کو اطلاع دے دی جائے۔"

"مسٹر شیروانی؟ وہی ڈپٹی سیکرٹری۔۔۔؟" اے ایس پی رک گیا۔ "اچھا کوئی فون نمبر ہے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کو دے دو۔" وہ چلتے چلتے حشمت خاں سے مخاطب ہوا۔ "کل اس سلامت شاہ کو بلا کے اس کا بیان بھی لے لو۔ اور ملزم کو مقتول کی لاش دکھا دو۔ اس کے فنگر پرنٹ وغیرہ فائل میں رکھو۔ ہوسکتا ہے آلۂ قتل کے بارے میں فنگر رپورٹ کل مل جائے۔ سائٹ پلان بالکل مکمل ہونا چاہیے۔ جائے واردات پر موجود ہر چیز کا بیان تفصیل سے ہو۔ تصاویر میں فرق نہ آئے۔" وہ دس منٹ تک تفتیش کے دیگر امور سے متعلق ہدایات دیتا رہا اور پھر باہر نکل گیا۔

جب آدھے گھنٹے بعد میں پولیس کی جیپ میں روانہ ہوا تو گیٹ پر تین فوٹو گرافرز نے میری تصویر اتاری۔ میں نے [illegible]

تصور سے اگلے دن کے اخبار کی ایک ایک سنسنی خیز سرخی دیکھی۔
"میر شرافت علی کا قاتل گرفتار کر لیا گیا۔"
"میر شرافت علی کا قاتل فرم کے ایک پارٹنر کا بیٹا ہے۔" "ریلوے اسٹیشن سے ملزم کی ڈرامائی گرفتاری۔ فرم پر قبضہ کرنے کے لیے مرحوم باپ کے پارٹنر کو قتل کرنے والا ملزم لندن سے آیا تھا۔" چشم تصور سے میں نے خبر کے ساتھ شائع ہونے والی تصویر دیکھ کر فوزیہ کو چونکتے اور خبر پڑھ کے لاش کی طرح سفید پڑتے دیکھا۔ وہ کسی شرابی کی طرح ڈولتی اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ بند کر کے وہ بستر پر اوندھی گر گئی اور دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے محسن کی ماں کو بھی دیکھا جس نے بیٹی کی حالت میں اس تشویشناک تغیر کو دیکھ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے قتل کی اس لرزہ خیز واردات کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ میں نے محسن کے پاپا کا چہرہ بھی دیکھا۔ وہ سخت متفکر تھے اور سگار لبوں میں دبائے نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی اسلام آباد والی کوٹھی کے لان میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب وہ کیا کریں۔ میں ان دونوں میاں بیوی کے خیالات کا بھی اندازہ کر سکتا تھا۔ کل تک ان کی بیٹی انگلینڈ میں زیرِ تعلیم ایک انجینئر سے منسوب تھی اور ان کے لیے بڑے فخر کی بات تھی کہ ہونے والا داماد اپنی انجینئرنگ فرم کا مالک ہوگا کیونکہ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آج ان کی بیٹی ایک مبینہ قاتل کی منگیتر بن گئی تھی۔ کچھ کہنا یا کرنا قبل از وقت تھا لیکن انھیں دنیا کو بہرحال منہ دکھانا تھا۔ جس میں حاسد زیادہ ہیں اور خیر خواہ کم ہیں جو خوشی میں دل کی کدورت پر مسکراہٹ کی روشن چھاپ ڈال کے شریک ہوتے ہیں تو دکھ میں دل کی مسرت پر غم زدہ چہرہ سجا کے ہمدردی کرنے آجاتے ہیں۔ "مسٹر شیروانی۔ میں نے سنا ہے۔ اوہ آف کورس یہ سب غلط ہوگا۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تو قانونی معاملات ہیں اور یہاں تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا کوئی مشکل نہیں۔ بس ذرا دباؤ پڑنا چاہیے پیسے کا یا سفارش کا۔ پولیس سب کچھ کر لیتی ہے۔ گواہ منحرف ہو جاتے ہیں۔ شہادت بے بنیاد ثابت ہوتی ہے اور بیانات میں تضاد نکل آتا ہے۔ وکیل اچھا ہونا چاہیے۔ فوجداری مقدمات میں اچھی شہرت ہو۔ اور سپریم کورٹ تک جا سکے۔ بے شک وہ ایک لاکھ لے گا مگر دیکھیے نا معاملہ آپ کی لڑکی کے مستقبل کا ہے۔ بائی دی وے۔ آپکا کیا خیال ہے۔ نہیں نہیں۔ خدانخواستہ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ میں جانتا ہوں آپ نے اپنی بچی سے اس کی منگنی بغیر دیکھے نہیں کی ہوگی۔ ماشاءاللہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گیا ہوا تھا۔ سنا ہے باپ کسی فیکٹری کا مالک ہے؟ نہیں بھائی ماں باپ کوئی نہیں؟ پھر تو واقعی آپ کی خوش قسمتی ہے ورنہ آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ لڑکی راج کرے گی۔ ایک طرح سے گھر داماد ہی ہوگا۔ ابھی نہیں۔ یہ میرا خیال نہیں... وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے شیخ صاحب ہیں نا۔ ابھی بڑا ہی کم ظرف آدمی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا رشتہ مانگا تھا نا؟ وہی کہتا پھرتا ہے کہ شیروانی صاحب کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر بیٹے میں کیا خرابی تھی۔ مگر ایک طرف صنعت کار ہو تو ڈاکٹر کو کون پوچھتا ہے اور سچ پوچھیے تو شیروانی صاحب یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کا جہاں رشتہ کیا وہ بھی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ وہ تو بہت خوش ہوگا۔ آئی سی... یہ مجبوری ہے۔ مبینہ قاتل آپ کے مرحوم دوست کا بیٹا ہے اور بچپن کی منگنی ہے؟ اور یہ سب لوگ جو ایک ہی قبیل کے کم ظرف اور تنگ نظر لوگ ہیں۔ بے خبر لوگ اور متعصب اور پست ذہنیت رکھنے والے لوگ جو رشتوں کو ———— دولت کے پیمانوں سے پرکھتے آئے ہیں۔ ظاہر کو باطن سے چھپائے رکھنے والے یہ ریاکار اور منافق لوگ جو اخلاق کے دوہرے معیار پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک وہ جو ان کی اپنی زندگی کے لیے ہے۔ دوسرا وہ جس پر باقی سب کو پورا اترنا چاہیے۔ ان کو بھلا کیا معلوم کہ محبت ہمارے معصوم جذبوں کی زمین سے پھوٹنے والی کونپل تھی جسے ہم نے برسوں زمانے کی ہوا سے بچا کے رکھا اور اس کی آبرو کو حاصلِ زندگی جانا۔ یہ ننھا منا پودا ہمارے خلوص کی اجلی دھوپ میں پروان چڑھا۔ اسے ہمارے ارمانوں کی برکھا نے سینچا اور ہم نے اس کے گرد خوابوں کا وہ حصار قائم رکھا جس پر ہمیں زندگی کے آخری سانس کی رفاقت تک ہر لمحے سے ایک پُرمسرت پُرسکون اور پُرامید مستقبل کی عمارت اٹھانی تھی۔ اپنے لیے۔ اپنے بچوں کے لیے۔ پھر ان کے بچوں کے لیے۔ دو بچپن کے دوستوں نے یہ منگنی طے کرتے وقت سوچا ہوگا کہ وہ دوستی کے رشتے کو ایک انشورنس پالیسی دے رہے ہیں جو پندرہ بیس سال بعد ان کی خوشیوں کو دوچند کر دے گی لیکن انھوں نے اس جذباتی فیصلے کے منفی پہلوؤں پر بھی غور کیا ہوگا۔ آنے والے دن کا کیا بھروسہ۔ لڑکا نالائق نکلے۔ لڑکی نافرمان ہو۔ دونوں اس صدی کی پیداوار ہیں ایک صدی پہلے کے دقیانوسی طریقے پر ہونے والی منگنی کو تسلیم نہ کریں۔ "آخر کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے ہمیں۔ ہم کوئی بھیڑ بکریاں تھے کہ آپ نے ہم سے پوچھے بغیر یہ سودا کر لیا۔ آپ اپنی دوستی کو اپنی ذات تک محدود رکھتے اور اپنے جذبات پر دوسروں کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

زندگی قربان نہ کرنے تو اچھا تھا۔ یہ سب باتیں اس دور میں بعید از امکان نہ تھیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ جذبات کے رشتوں کا وہ تعلق جو چھوٹی سی فوزیہ کے ساتھ تھا۔ عہدِ شباب میں محبت کا وہ لازوال خزانہ بن گیا تھا جسے میں اپنی خوش بختی کا انعام سمجھتا تھا۔ وہ ننھی منی کونپل اب ایک تناور درخت تھی جسے بڑے سے بڑا طوفان نہیں جھکا سکتا تھا۔ اس محبت نے مخالفت اور مخاصمت کے اتنے صبر آزما دور دیکھے تھے کہ اب ہر آزمائش بے معنی تھی۔ لیکن شیردانی صاحب جو اعلیٰ افسر ہیں۔ عزت دار ہیں اور زمانے کے نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں۔ کیا وہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے۔ اب تک انھیں اپنے فیصلے پر ناز تھا۔ اپنی قوتِ فیصلہ پر غرور تھا اور اپنی دوراندیشی کا ذکر وہ یوں کرتے تھے جیسے انھیں غیب کا علم تھا۔ ان کی بیوی کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی تھی کیوں کہ ان کے بھائی کا لڑکا جو پروفیسر تھا قسم کھا چکا تھا کہ اس کی شادی فوزیہ سے نہ ہوئی تو وہ تمام عمر شادی نہیں کرے گا اور اس شادی کا کوئی امکان اس لیے نہ تھا کہ میں اور فوزیہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ ہمارے والد ایک دوسرے کے تمام عمر کے رفیق تھے۔ فوزیہ کو مجھ سے بہتر شوہر اور مجھے فوزیہ سے بہتر شریکِ حیات نہیں مل سکتی تھی۔ اگر میں کسی طرح بھی معیار پر پورا نہ اترتا۔ بالفرضِ محال میں اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دولت مند۔ اکلوتا لڑکا اور دنیا کے نقطۂ نظر سے ہینڈسم اور اسمارٹ نہ ہوتا تو کسی ایک خامی پر بھی وہ مجھے مسترد کرکے فوزیہ کا ہاتھ اپنے مرحوم بھائی کے بیٹے ایاز کے ہاتھ میں دینا پسند کرتیں جس کو فوزیہ سے محبت بھی تھی بس وہ تنخواہ دار کم آمدنی والا شخص تھا مگر یہ خامی ایسی نہ تھی کہ قابلِ درگزر نہ ہو۔ پروفیسر کی تنخواہ معقول ہوتی ہے اور تنخواہ دار تو شیردانی صاحب بھی تھے بلکہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو وہ درجہ دوم کے اکاؤنٹ آفیسر تھے۔ میرے لیے ایک لمحۂ فکریہ شیردانی صاحب کی بیگم کا خیال تھا۔ کیا اب وہ موقعے سے فائدہ نہیں اٹھائیں گی۔ شیردانی صاحب کو قائل نہیں کرسکیں گی کہ چھوڑو بچپن کی منگنی کا احمقانہ خیال۔ اس کو تو پھانسی ہونی ہی ہے۔ ہماری بیٹی کیوں سولی چڑھے۔ کل پرسوں تک دو بول پڑھاؤ اور رخصتی کردو۔ غضب خدا کا۔ پہلے ولایت جاکے بیٹھ گیا۔ اب آیا تو قتل کے الزام میں پکڑا گیا۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔ یہ مقدمہ نہ جانے کتنے سال چلے اور انجام پھانسی نہ ہوا عمر قید تو ہوگا۔ کیا اس وقت تک فوزیہ بیٹھی رہے گی؟ آج تو ایاز بھی کہتا ہے کہ عمر بھر شادی نہیں کریں گا مگر آدمی کے جذبات ہمیشہ ایک نہیں رہتے۔ سال دو سال بعد وہ بھول گیا یہ بات اور اس نے فوزیہ کا خیال چھوڑ دیا تو رشتہ نہیں ملے گا۔ سب کہیں گے لڑکی منحوس ہے۔ شادی سے پہلے ہی منگیتر کو پھانسی لگوادی جس گھر پر اپنا نحس سایہ ڈالے گی وہاں قبرستان بنائے گی۔ عورتوں کی زبان اور عورتوں کی منطق اور ان کی باتیں۔ کیا شیردانی صاحب ان دلائل کا مقابلہ کرلیں گے۔ مصلحت کے تقاضوں کو جذباتی رشتے پر قربان کردیں گے؟ حقیقت سے نظریں چرا کے ایک موہوم سی امید کا دامن تھامے بیٹھے رہیں گے؟ زمانے کی ہرزہ سرائی اور انگشت نمائی سے خوف زدہ نہیں ہوں گے؟ میں نے محسوس کیا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے ایک خلا میں تبدیل ہوگئی ہے اور میں اس سنسان۔ تاریک اور لامحدود خلا میں گرتا جارہا ہوں۔ میرا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہیں اور میری مدد کی پکار بے صدا ہوگئی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ تھانے جاتے ہوئے میں اپنے انجام کے بارے میں نہیں، اپنی محبت کے انجام کے بارے میں سوچ سوچ کر خوف زدہ ہو رہا تھا۔

ہم تھانے پہنچے تو سب انسپکٹر حشمت خاں کے رویّے میں ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی جس کا اثر دوسروں کے رویّے پر بھی پڑا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ میر شرافت علی کے گھر میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ تھانے میں اس سے کہیں زیادہ ہوسکتا تھا۔ تھانہ چودھری حشمت خاں کی سلطنت تھی جہاں اس کا حکم قانون تھا اور تھانے میں آنے والے خراج گزار رعیت تھے جو اس کی طاقت اور دبدبے کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ میر شرافت علی کے گھر میں ایک افسرِ اعلیٰ کے سامنے وہ مکمل طور پر بااختیار نہ تھا مگر اس کے باوجود حشمت نے مجھ پر چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ مجھے امید تھی کہ اپنی تمام سرکشی۔ گستاخی اور خوش فہمی کی اصل سزا اب مجھے تھانے کی حدود کے اندر اور قانون کی دسترس سے باہر ہوجانے کے بعد ملے گی۔ لیکن گاڑی رکنے کے بعد تھانے دار نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیجیے حوالدار صاحب۔ ذرا ان کو ادھر لاؤ۔ کیا نام ہے ان کا۔ اپنے سکندر صاحب کو۔" اور سیدھا چلتا ہوا پیچھے کے ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ حوالدار نے زنجیر کھینچ کر مجھے تصورات کی اور غیر موجود اندیشوں کی دنیا سے حقائق کی زمین پر اتار لیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گاڑی سے نکلا تو مجھے تھانے کی آسیب زدہ ہیبت ناک اور خستہ حال عمارت نظر آئی۔ پولیس اسٹیشن میں نے لندن میں بھی دیکھے تھے جہاں لوگ مدد کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ آتے تھے۔ یہ سوچ کے قدم نہیں رکتے تھے کہ دیکھو اب نکلنا کب ہو، کیسے ہو اور لانے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ وہاں بچے آتے تھے کہ "آفیسر! میری گیند جھاڑیوں میں گم ہوگئی ہے اور میرا ہاتھ اوپر تک نہیں پہنچتا۔ کیا تم میری مدد کرسکتے ہو؟" عام گھریلو عورتیں آتی تھیں کہ "آفیسر۔ مجھے اچانک جانا پڑ رہا ہے۔ میری عدم موجودگی میں ڈرائی کلینر کپڑے لائے گا۔ وہ لے کر رکھ لینا۔ میں واپسی میں لے لوں گی۔۔۔۔ رات کو مجھے ایک ہفتے کے لیے باہر جانا ہے۔" ان سب باتوں کا تصور یہاں کتنا افسانوی اور مبالغہ آمیز لگتا تھا۔

تھانے کی سیڑھیوں کے پاس ایک کانسٹیبل دقیانوسی رائفل کے سہارے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے قطعی لفٹ نہیں دی۔ برآمدے میں دائیں جانب بیٹھے ہوئے محرر اور ایک اے ایس آئی نے دو زیرِ حراست قیدیوں کو مرغا بنا رکھا تھا اور ان کے پھٹے ہوئے کپڑے اور پریشان بال گواہی دیتے تھے کہ ان سے تفتیش کی گئی ہے۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے تین افراد نے جو خود بھی سہمے ہوئے تھے اور شکایت کنندہ معلوم ہوتے تھے مجھے قابلِ رحم نظروں سے دیکھا۔ یہی لوگ جو عام زندگی میں ہر چور ڈاکو اور بدمعاش کے دشمن تھے تھانے میں ان کی حالت دیکھتے تھے تو ان پر ترس کھاتے تھے اور ان کے ہمدرد بن جاتے تھے۔ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دو افراد گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ایک مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور دوسرا فرش پر یوں پڑا تھا جیسے مر چکا ہو۔ بہت جلد مجھے بھی انھی کے درمیان پہنچنا تھا اور آج کی رات اپنے پریشان کن خیالات کی رفاقت میں بسر کرنی تھی۔ حوالدار نے چق اٹھائی اور میرے ساتھ اندر قدم رکھا۔ نیم تاریک کمرے میں بھدی سی میز کی دوسری طرف سب انسپکٹر کا بھاری بھرکم وجود ایک چرچراتی کرسی میں پھنس چکا تھا۔ حوالدار نے سامنے کی دو کرسیوں میں سے ایک اپنے لیے منتخب کی اور دوسری پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تسلی سے بیٹھو اپنے سکندر صاحب" حشمت خاں نے ٹوپی اتار کے میز پر رکھی۔ "اب تھانے تو پہنچ ہی گئے ہیں۔ ہوتی رہے گی تفتیش بھی۔ یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے؟ صبح سے یہ وخت ہوگیا۔"

"ہاں جی۔ دھکے کھائے ہیں ۔۔۔ خاصی مار کھائی ہے اور گالیاں کھائی ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور بھی مقدر میں جو ہے وہ ضرور ملے گا۔" میں اتنا کند ذہن نہیں ہوں کہ ان کی بات نہ سمجھ پاتا۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ بتاؤ کیا کھلا پلا سکتے ہو؟

"بات کو سمجھنے کی کوشش کریں سکندر صاحب" حشمت خاں نے برا مانے بغیر کہا۔ "اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے ہم بھی مجبور ہوتے ہیں ورنہ ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ کسی شریف آدمی کی بے عزتی خراب کریں۔ اب اپنے حوالدار صاحب۔ یہ جو اپنے اے ایس پی صاحب ہیں نا۔ کتنے سخت آدمی ہیں۔ اونچی بات بھی نہیں سنتے۔ کیا کہا تھا آخر انھوں نے؟ کوئی گالی تو نہیں دی تھی۔ مگر ان کا پارا چڑھ گیا۔ ہم تو اشارہ سمجھتے ہیں ان کی نظر کا۔ ماتحت جو ہوئے۔"

"ہاں چودھری صاحب۔ نوکری تو کرنی ہے جی۔ بیوی بچوں کی خاطر" حوالدار نے ایک سرد آہ بھری۔

"چلو جی مٹی پاؤ۔ اپنے سکندر صاحب کے لیے چائے وائے کا انتظام کرو۔ بھئی یہ بڑے آدمی ہیں ولایت سے آئے ہیں اور بے چارے یہاں آتے ہی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔" تھانیدار کا لہجہ ناقابلِ یقین حد تک دوستانہ ہوگیا تھا اور میں اس کا سبب سمجھ رہا تھا۔ "کیا نام بتایا تھا جی آپ نے کون سی کمپنی کے مالک ہیں آپ؟"

"میرو زیر اینڈ کمپنی۔ لیتھ مشین۔ ہینڈ پریس اور ڈرل مشین وغیرہ کا کارخانہ ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں وقار پیدا کیا۔

"اچھا اچھا۔" اس نے یوں سر ہلایا جیسے۔ سمجھ گیا ہو۔ "لیجیے حوالدار صاحب۔ اوئے یار ان کے ہاتھ تو کھول دو۔ یہ کیا نس چلے ہیں۔"

بات صرف اعتبار کی نہیں تھی۔ میں نس کے یعنی بھاگ کے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ میری راہ میں متعدد رکاوٹیں تھیں۔ خود حشمت خاں کے پاس ریوالور تھا۔ جسے وہ ضرورت پڑنے پر بلاتردد استعمال کرسکتا تھا اور ایک سپاہی باہر بھی مسلح کھڑا تھا۔ حشمت خاں نے ایک قاتل کو فرار کے مواقع فراہم کرکے معطل ہونے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس نے حفاظتی انتظامات کو کافی سمجھتے ہوئے مجھے یہ رعایت اس لیے دی تھی کہ اب مجھ سے سودا کیا جاسکتا تھا۔ تھانے میں کوئی تکلیف اٹھائے بغیر زیرِ تفتیش رہنے کا معاوضہ وصول کیا جاسکتا تھا اور بہتر رویّے کی قیمت مانگی جاسکتی تھی۔ ان کے نقطۂ نظر سے میں موٹی آسامی تھا۔ سونے کا انڈا دینے والی مرغی۔ چنانچہ وہ "باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی" والے مقولے پر عمل پیرا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں ہوٹل سے بہترین کھانا منگوا کے کھا چکا تھا اور کھلا چکا تھا جو حوالدار سائیکل پر جاکے لایا تھا اور اس قدر واہیات تھا کہ اسیری کی مجبوری نہ ہوتی تو میں بھوکا رہنے کو ترجیح دیتا مگر میں نے سوچا کہ دوبارہ نہ جانے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کب موقع ملے۔ زندہ تو رہنا ہی ہے اور تفتیش کا سامنا بھی کرنا ہے۔ ذہن کے ساتھ جسم کی توانائی بھی برقرار رہنی چاہیے۔ میں نے پچاس روپے کا بل ادا کرتے ہوئے سوچا کہ یہ کھانا 'لارڈز' یا شیزان سے تو نہیں آیا تھا؟ پھر مجھے خیال آگیا کہ تھانے میں ہر چیز کی قیمت میں سو دو سو یا ہزار فیصد تک 'رعایتی سرچارج' بھی تو شامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے بریف کیس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ ایک لفافے میں ڈال کے سب انسپکٹر حشمت خاں کو اور ایسے ہی دو نوٹ حوالدار کو پیش کیے کہ آپ نے آج جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اور میرا جو حشر کیا ہے اس کی خوشی میں یہ حقیر نذرانہ بچوں کی مٹھائی کے لیے حاضر ہے۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف۔ اس کے بعد میں نے اطمینان سے تھانے کے فون پر پہلے محسن سے بات کی۔

"کبیر داس" محسن نے کہا "خبیث میں تیرے انتظار میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔"

"دیکھ محسن۔ میں صبح ریل کار سے پنڈی جانے کے لیے روانہ ہونے والا تھا مگر ایک آفت میں پڑ گیا" میں نے تمہید کے طور پر کہا۔

"آفت؟ پھر کوئی آفت آگئی۔ ؟"

"ہاں محسن۔ مجھے ریل کار میں پولیس نے گرفتار کرلیا"

"گرفتار کرلیا؟" وہ چلایا "وہ کیوں؟ کس الزام میں؟"

"مجھ پر الزام ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کر دیا ہے" میں نے سکون سے کہا۔

"سکندر۔ خدا کی قسم مجھے کچھ ہوگیا ہے میرے کان غلط سننے لگے ہیں۔ دیکھ یہ مذاق ہے تو...."

"محسن میں مذاق نہیں کر رہا ہوں" میں نے کہا "میں اس وقت پولیس کی تحویل میں اور زیر تفتیش ہوں"

"اوہ۔ اور سکندر" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ لائن کٹ گئی "تو نے یہ قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ میں اس سے ملنے ضرور گیا تھا اور میں نے اس کے دو ہاتھ بھی رسید کیے تھے۔ بالکل معمولی سے ہاتھ جن سے اس کے خراش تک نہیں آئی تھی اور جب میں رخصت ہوا تھا تو وہ سو فیصد زندہ اور تندرست و توانا تھا۔ یہ حرکت کسی نے بعد میں کی اور مجھے پھنسا دیا۔ تو سارے حالات سے باخبر ہے۔ مجھے یہ وہی پرانا چکر لگتا ہے میں تفصیل سے فون پر نہیں بتا سکتا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت بھی ہے اس لیے تو فوراً آجا۔ تیرا زخم ٹھیک ہے نا۔ چلنے پھرنے میں کوئی خرابی تو نہیں ہوگی؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ سکندر اس وقت چار بجے ہیں۔ اگر میں پانچ بجے والی بس یا ویگن پکڑ دوں تو رات بارہ بجے لاہور پہنچ کے تجھ سے مل سکتا ہوں" محسن نے کہا اور میں نے اسے متعلقہ تھانے کا نام پتہ لکھوایا "اچھا سکندر۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تو بے گناہ ہے تو کوئی تیرا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ ہم اوپر تک جاسکتے ہیں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ تک جھوٹ سچ سامنے آجاتا ہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوسکتی۔ بس ذرا صبر و تحمل سے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

"صبر و تحمل کے علاوہ مقابلے کے لیے مالی وسائل بھی غیر محدود ہونے چاہئیں" میں نے کہا "نیچے سے اوپر تک قدم قدم پر پیسہ چلتا ہے۔ جتنا بڑا وکیل ہوگا اتنی بڑی فیس لے گا۔ ابھی تو اپنی پوزیشن یہ ہے کہ تقریباً پانچ ہزار میں نکال لایا تھا۔ کچھ پرانا زیور ہے وہ بیچ دوں گا۔ وراثت کا سرٹیفکیٹ ملنے کے بعد تو 'میر وز برادرز اینڈ کمپنی' میری ہوگی اور میں اس کے اکاؤنٹ میں سے جتنا پیسہ چاہوں گا نکلوا لوں گا لیکن یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے ہائی کورٹ میں الگ درخواست دینی ہوگی اور وقت بہرحال لگے گا۔"

"ان سب باتوں کو چھوڑ۔ بعد میں سوچیں گے۔ ابھی تو بنک بند ہیں مگر میں چیک دے کر ادھار لے سکتا ہوں میرے حساب میں تقریباً چودہ ہزار ہوں گے۔ میں پندرہ ہزار کا بندوبست کرکے آؤں گا" محسن نے کہا "صبح میں سارے معاملات کو سنبھال لوں گا۔ تجھے شاید علم نہیں۔ وہیں لاہور میں اپنے دو کلاس فیلو بڑے اونچے وکیل ہیں۔ ایک تو لڑکی تھی ہمارے ساتھ رابعہ۔ اب رابعہ فاری ہے۔ دوسرا وہ ہماری یونین کا شعلہ بیاں مقرر اور صدر عبدالودود منظر ہے۔ یاد آیا اس مخلص سے۔ ان سے بات کریں گے تو امید ہے فیس وغیرہ کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔ دنیا کا خون سفید ہوگیا ہے مگر دوستی کا نام ابھی زندہ ہے۔"

"محسن میں لمبی بات نہیں کرسکتا۔ یہ بتا... فوزیہ تو نہیں ہے آس پاس؟"

"فوزیہ؟" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "نہیں۔ کچھ کہنا ہے اس سے؟"

"نہیں... مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ جو کہنا ہے تو خود کہہ دے۔ اسے بتا دے کہ میں بے گناہ ہوں اور یہ بھی بتا دے کہ میرے ساتھ کیا چکر ہے۔ کل وہ اخبار میں میری تصویر اور خبر دیکھ لے گی۔ اسے زیادہ صدمہ ہوگا۔ تو آج ہی اسے سمجھا دے اور یقین دلا دے کہ میں نے واقعی کچھ نہیں کیا ہے۔"

"الو کے پٹھے۔ میرے یقین دلانے یا نہ دلانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر ساری دنیا ایک طرف ہو کے کہے کہ تو نے قتل کیا ہے تب بھی وہ نہیں مانے گی۔ ان لڑکیوں کی عقل ایسی ہی ہوتی ہے۔ خیر میں اسے بتا دوں گا" محسن نے کہا۔

"بتا دینا کافی نہیں۔ اسے اعتماد اور حوصلے سے کام لینے کی تاکید کرنا۔ اس کی دعا ہر دوا سے زیادہ کارگر ہوگی۔"

محسن ہنسا "اچھا ڈائلاگ ہے۔ یہ بھی سنا دوں گا اسے۔ مگر یار سکندر یہ جو کچھ ہوا۔ غلط اور بے بنیاد ہی سہی۔ اچھا نہیں ہوا۔"

"تو اپنی ممی کی بات کر رہا ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"ہاں۔ بات میرے دل میں تھی اور تو نے سمجھ لی؟" محسن نے حیرانی سے کہا "میں واقعی سوچ رہا ہوں کہ اب وہ کیا کریں گی۔"

"یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ مگر مجھے فوزیہ پر۔ تجھ پر اور تیرے پاپا پر اعتماد ہے" میں نے کہا "ابھی اس فکر میں مبتلا ہونے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوگا۔ تو اپنے پاپا سے بات کرلے اور ان سے کہہ کہ وہ اپنے تعلقات اور اثر و رسوخ کو کام میں لائیں۔ کم سے کم یہاں تفتیش میں کسی کا رویہ مخالف نہ رہے اور میرے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔ تو جانتا ہے ثبوت و شہادت کے مرحلے کیسے سر ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ وہ میں کرلوں گا" محسن نے کہا "اب باقی باتیں ملاقات پر۔ اور کچھ تو نہیں کہنا ہے نا؟"

"نہیں۔ تجھ سے بات ہوگئی۔ آدھا غم دور ہوگیا۔ تو آجائے گا تو میں اکیلا نہیں رہوں گا ورنہ یہاں کون ہے میرا۔ خدا حافظ" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"آپ نے تو سو روپے کی ٹرنک کال کرلی سکندر صاحب" تھانیدار حشمت خاں نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک میری گفتگو کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔

میں نے فوراً سو کا ایک نوٹ شکریے کے ساتھ آگے بڑھا دیا اور دوسرا نمبر ملانے لگا۔

"ہیلو" کسی نے تیسری گھنٹی بجنے کے بعد ریسیور اٹھایا۔ "کی رسی سٹڑین" چراغ دین مری سے واپس آگیا تھا۔

"مسٹر ٹڑین" میں نے محتاط ہو کے کہا "آپ کے بنگلے میں ایک خانساماں ہے سلامت شاہ۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"کون ہو تم؟" چراغ دین نے کہا "کیا نام ہے تمھارا؟"

"میں؟ میرا نام ہے کبیر" میں نے سوچ کر کہا اس امید میں کہ شاید میرے والد نے اپنی داستانِ حیات کے اوراق سے اقتباسات سناتے ہوئے سلامت شاہ کو یہ بھی بتا دیا ہو کہ میرا پیارے کا نام کبیر تھا "میں اس کا بھتیجا ہوں۔"

"اپنا نمبر بتاؤ۔ وہ بات کرلے گا" چراغ دین نے کہا۔ "بازار گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو میں بتا دوں گا۔"

سلامت شاہ کا فون آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد آیا۔ اس نے کبیر کو پوچھا اور حشمت خاں نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"سکندر بخت" اس نے کہا "تم تو اسلام آباد گئے تھے مگر صبح پولیس تمھیں پوچھتی ہوئی آئی تھی۔ تمھارے جاتے ہی۔ کیا...."

"ہاں چاچا" میں نے کہا "میری بدقسمتی ہے کہ جا نہیں سکا۔ اس وقت تھانے میں بند ہوں۔ تم پتہ لکھ لو اور فوراً آجاؤ۔ کوئی ایسا بہانہ کرو کہ چراغ دین کو شبہ نہ ہو۔ یہاں آؤ گے تو سب بتا دوں گا۔ اور ہاں اپنے ساتھ وہ چابیاں لیتے آنا۔ وہی جن کے بارے میں پہلے میں نے کہا تھا کہ ابھی اپنے پاس رکھو۔ ہاں۔ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اپنی تو آج دہری ڈیوٹی ہوگئی ہے" سب انسپکٹر حشمت نے منہ پھاڑ کے جماہی لی "آٹھ دن وخت پڑ جاتا ہے اس بیگار کا۔ میری جگہ میر محمد کو آنا تھا مگر ہے کہیں اس کا پتا؟ او یار حوالدار۔ او دیکھ میاں میر محمد صاحب کیوں نہیں آئے؟ آج کون مر گیا ہے ان کا۔ ماما کہ مامے کا ماما" اس کی پکار پر ایک نئے حوالدار نے چق اٹھا کے جھانکا اور غائب ہوگیا۔

"بس جی آپ کی قسمت اچھی ہے کہ ہم بیٹھے ہیں" حشمت خاں نے کہا "میر محمد ہوتا تو آپ کو کب کا اندر کر چکا ہوتا اور دو بٹا.... ہے" اس نے ایک فحش گالی سے میر صاحب کا تعارف مکمل کیا "وہ اپنے باپ کو کسی سے نہ ملنے دے۔ یہ جو آپ کا دوست آرہا ہے نا اپنے اسلام آباد سے اس کو بھی ڈک دیتا۔ اور تمھارے چاچا سلامت شاہ کو بھی۔ اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ پہلے سب کو ڈک دو۔ جو سامنے آئے بند کردو۔ بعد میں چھڑانے والے کیا کرلیں گے۔ زیادہ سے زیادہ چھڑا کے لے جائیں گے۔ تو ایسے ہی یہ ہے کہ پہلے سب کو ڈک دو۔ آزادی کی قیمت دیں گے تو لے جائیں گے۔ منہ کو حرام لگ گیا ہے اس کے سکندر صاحب۔ اللہ معاف کرے" اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو چھوا۔

ساڑھے پانچ بجے مجھے سلامت شاہ کا متوحش چہرہ نظر آیا۔ اس وقت تک میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی تھک چکا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سلامت شاہ نے ڈرتے ڈرتے تھانیدار کو دیکھا اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ "مائی باپ! اسے کیوں پکڑ لیا ہے آپ نے؟" اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔

"تو یہ ہے تمہارا چاچا سلامت شاہ!" تھانیدار نے سلامت شاہ کو بغور دیکھا۔ "اسی نے تو ہمیں بتایا تھا کہ تم ریلوے اسٹیشن گئے ہو۔"

میں نے سلامت شاہ کو مختصراً وہ سب کچھ بتادیا جو میرے نقطۂ نظر سے اس پر اپنی گرفتاری کے اسباب واضح کرنے کے لیے ضروری تھا۔ تقریباً یہی باتیں میں نے ٹیلی فون پر محسن سے بھی کی تھیں اور ان میں کوئی بات تھانیدار کے لیے نئی نہ تھی چنانچہ وہ بیزار ہو رہا تھا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آگیا کہ میں ایک معمولی خانساماں کے ساتھ مل کر فرار ہونے کا کوئی منصوبہ نہیں بنا رہا ہوں تو اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر میرے ہاتھوں کو پھر مقفل کیا اور کہا کہ ایس ایچ او صاحب کا کیا ہے کسی وقت بھی آجائیں۔

"ایس ایچ او کون ہے؟" میں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ آگے بڑھا کے کہا۔

"آج کل تو دھاندلی میں میر محمد بنا ہوا ہے۔" وہ ہتھکڑی کا قفل لگا کے مطمئن ہو گیا۔ "اصل ایس ایچ او کو لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔"

"لائن حاضر؟" میں نے اس اصطلاح سے بے خبری کے باعث کہا۔ "یعنی معطل؟ کیا غلطی ہوئی تھی ان سے؟"

"غلطی تو کوئی نہیں ہوئی تھی، تفتیش کے دوران ایک بندہ مر گیا تھا۔ وہ تھا بھی اتنا کمزور اور بیمار۔ اخبار والوں نے کیس خراب کر دیا۔" اس نے ٹوپی اٹھا کے سر پر جمائی۔ بہ آوازِ بلند حوالدار سے کہا کہ باہر بیٹھ کے حرام خوری کرنے کی بجائے اندر آ کے بیٹھے اور خود باہر نکل گیا۔

میں نے چند منٹ کے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ "چاچا! وہ چابیاں لائے ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

سلامت شاہ نے اقرار میں سر ہلایا اور جیب سے چابیاں برآمد کیں۔ "تم اپنے پاس رکھو گے؟"

"سب نہیں۔" میں نے کہا اور صرف لاکر کی چابیاں اٹھا کے اپنی پینٹ کی سامنے والی خفیہ جیب میں رکھ لیں۔ اسی وقت حوالدار اندر آگیا اور سب انسپکٹر حشمت خاں کی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ نیا آدمی تھا اور اسے کوئی نذرانہ نہیں ملا تھا چنانچہ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔

"یہ چابیاں تم اپنے ہی پاس رکھو۔" میں نے کہا۔ "اس میں صندوق کی چابیاں ہیں نا۔ کل صبح تم صندوق میں سے سب پرانا زیور نکال کے بیچ دو اور رقم اپنے پاس رکھو۔"

"کیسا زیور؟" حوالدار نے کہا۔ "مال مسروقہ تو نہیں ہے جسے ٹھکانے لگا رہے ہو؟"

"زیور میری ماں کا ہے اور اسے میری دادی نے بنوا کر دیا تھا۔ وہ دونوں فوت ہو چکی ہیں۔" میں نے سکون سے کہا۔ "ورنہ معلوم ہو جاتا۔"

اسی وقت حشمت خان جیپ اٹھا کے اندر آیا۔ اس نے اپنی نوکری کو ایک غلیظ گالی دی اور ٹوپی اٹھا کے میز پر دے ماری۔

"چلو بس کرو۔" وہ گرج کے بولا۔ "چل بڈھے! دفع ہو جا، بہت باتیں کر لیں۔ اور کل صبح تھانے حاضر ہو جانا۔ اسے ایس پی صاحب کے سامنے بیان ہوگا۔ آجائے گا یا ڈنڈا ڈولی کرا کے اسی وقت؟"

"آؤں گا کیوں نہیں مائی باپ! آنکھ کھلتے ہی سیدھا آجاؤں گا۔" سلامت شاہ نے عاجزی سے کہا۔ وہ پولیس والوں کے عتاب سے محفوظ رہنے کا گر جانتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اس کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ناشتہ وغیرہ بنا کے اسے زیور فروخت کرنا تھا چنانچہ وہ دس گیارہ بجے سے پہلے حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ وہ سات بجے تک آجائے اور ایک بار پھر اسے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب!" میں نے اس کی واپسی اور بوکھلاہٹ دیکھ کے کہا۔

"تمہارا باپ ایس ایچ او آرہا ہے۔" اس نے غرا کے کہا۔ "اٹھ اوئے بدمعاش ادھر سے۔ چل ملزم کو لے جا اور حوالات میں بند کر دے۔" اس نے حوالدار کو مخاطب کر کے کہا۔ خلوت میں نذرانے کی بدولت حاصل ہونے والی مراعات کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب میں سکندر صاحب سے پھر ملزم بن گیا تھا۔ سلامت شاہ نے مجھے خدا حافظ کہا اور بڑی عجلت میں روانہ ہو گیا۔ تھانیدار اسے بند کر دیتا تو کام خراب ہو جاتا۔

"تھانیدار صاحب! میرا یہ بریف کیس۔۔۔" میں نے کہا۔ "یہ کس کی تحویل میں رہے گا؟"

"اسے امانت خانے میں رکھوا دیتے ہیں۔" اس نے بریف کیس کو دلچسپی سے دیکھا جس میں سے اس کے سامنے میں نے پانچ جمع دو پورے سات سو کے نوٹ نکالے تھے اور اب بھی کم سے کم دس گنا مالیت کے نوٹ ایک گڈی کی صورت میں موجود تھے۔

"اس میں چار ہزار تین سو روپے ہیں۔ میرا پاسپورٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو، کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتی۔ یہ تھانہ ہے، مخول نہیں۔" وہ مونچھ پر ہاتھ پھیر کے بولا اور پھر حوالدار پر گرجا۔ "چل تو کیا منہ دیکھ رہا ہے سالے ابھی وہ میر محمد آگیا تو سب کا خانہ خراب کر دے گا۔"

چند منٹ بعد میں حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا اور فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے یوں بیٹھا تھا جیسے لندن میں اپنے فلیٹ کے قالین پر دوستوں کے ساتھ مل کر تاش کی بازی جمانے کے لیے بیٹھتا تھا۔ میری جیب میں چالیس پینتالیس روپے تھے اور سگریٹ کا آدھے سے زیادہ پیکٹ تھا۔ میں نے سگریٹ جلانے کا ارادہ کیا اور ترک کر دیا۔ کون جانے میر محمد کو یہ بھی ناگوار گزرے اور وہ سگریٹوں کا پیکٹ بحق سرکار ضبط کرے تو رقم بھی ساتھ جائے۔ رات گزارنے کا یہ سہارا ابھی نہ رہے اور رات کے کھانے کا بل تو شاید ادا ہو جائے۔ مگر ایک پیکٹ سگریٹ کا منگوانا پڑا۔ اور وہ بھی رات کے وقت تو شاید بیس کا ملے اور مجھے بریف کیس میں سے مزید رقم نکلوانی پڑے۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ بریف کیس سرکاری تحویل میں چھوڑ کے میں نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کم سے کم نوٹوں کی وہ گڈی مجھے اپنی جیب میں رکھ لینی چاہیے تھی مگر اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سب انسپکٹر میر محمد جو قائم مقام ایس ایچ او بھی تھا، حشمت خاں کے مقابلے میں جوان آدمی تھا چنانچہ مجھے حشمت خاں کی معاندانہ گفتگو اور دھاندلی کی شکایت کا سبب معلوم ہو گیا۔ میر محمد بہت مضبوط قد اور کاٹھی کا جلاد صفت آدمی تھا جس کی صورت سے کمینگی ٹپکتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کے خلاف بغض، حسد اور عداوت کے جذبات سے اس کی آنکھوں میں نفرت کا ایک جوالا مکھی بھڑک رہا ہے جس کے تاریک سایوں نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔

اس نے حوالات میں موجود سب لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ روزنامچے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اس کمرے میں گھس گیا جس پر 'ایس ایچ او' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد میں نے حشمت خاں کو ٹوپی جما کے اور بیلٹ کس کے اسی کمرے میں جاتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میر اب میرے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ پھر آدھے گھنٹے تک میں گرد و پیش کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وہ دونوں زیرِ تفتیش ملزم جو مرغا بنے ہوئے تھے اب اندر دھکیل دیے گئے تھے۔ دنگا فساد اور مار پیٹ کے مقدمات لے کر آنے والوں کے دو گروہ اجتماعی طور پر ایک سو سات ستر کے تحت رپورٹ لکھوا کے زیرِ دفعہ ایک سو اکیاون بند ہوئے مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی فرق نہ رہا اور میں اس نظامِ انصاف کا مزید قائل ہوا جس میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ کا یعنی حوالات میں رکھے ہوئے ڈرم کا پانی پی رہے تھے۔ دو افراد ایک سو نو میں آوارہ گردی کے ملزم بن کر مہمانِ سرکار ہوئے اور رات ہونے تک اس حوالات میں جملہ حاضرین کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہو گئی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے جس شخص کو مرغے کی طرح پڑا دیکھا تھا وہ چوری کے شبے میں تین دن سے زیرِ 'تفتیش' تھا۔ جو حضرات گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے سٹہ کھیلتے پکڑے گئے تھے اور وہ جو مزے سے سگریٹ پی رہا تھا بنک ڈکیتی کی ایک واردات میں ملوث تھا۔ سنگین ترین جرم یعنی قتل کا اعزاز میرے ہی حصے میں آیا تھا اور جب میں نے دوسری سگریٹ سلگائی تو بنک ڈکیتی کے ملزم نے مجھ سے دوستانہ مراسم استوار کرتے ہوئے ایک سگریٹ مانگا۔ مجھ سے پوچھا کہ مجھ پر کیا الزام ہے اور قتل کی بات سن کے متاثر ہوا۔ تاہم عذرِ بے گناہی پر اس نے کہا کہ یہ تو سب کو کہنا پڑتا ہے مگر جو کچھ ان۔۔۔ کو کہلوانا ہوتا ہے۔ اس نے اسمِ صفت کے طور پر پولیس کے لیے اپنی لغت سے ایک نئی گالی کا استعمال کیا۔ وہ یہ کہلوا لیتے ہیں اور اگر آدمی سادے کاغذ پر انگوٹھا لگا دے تو بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ اس نے مجھے بہت سے مفید مشورے بھی دیے جو سابقہ تجربات کا حاصل تھے اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا بریف کیس چار ہزار تین سو روپے سمیت پولیس کے امانت خانے میں رکھوا دیا ہے تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

"اوئے بھولے شہنشاہو! یہاں سالم بندا بلبلے کی طرح غائب ہو جاتا ہے، تمہارا بریف کیس کیا ہے۔ اوئے کھوتے۔۔۔ وہ چار ہزار تو اپنے سامنے میر کو دیتا تو تیری مشکل آسان ہو جاتی۔ تو آج رات تفتیش سے بچ جاتا۔" وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔

"تو کیا وہ امانت خانے میں محفوظ نہیں رہے گا؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کیسا امانت خانہ کہاں کا امانت خانہ۔ وہ دونوں۔۔۔ کے خصم آپس میں بانٹ لیں گے۔" وہ بولا۔ "ساتھ سو حوالدار کے، باقی تھانیدار کے۔ تیرے پاس کیا ثبوت ہے پیارے کہ تو کوئی بریف کیس لایا تھا، اور لایا تھا تو اس میں رقم بھی تھی؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میرے اندیشے بہت جلد درست ثابت ہو گئے تھے۔
"کیا یہاں رات کو بھی تفتیش ہوتی ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

ڈکیتی کا ملزم پھر ہنسا۔"کہاں سے آ رہا ہے تُو پاگل دے پتّر؟ ولایت سے؟ اوئے تفتیش رات کو نہیں تو کیا دن میں ہوگی سب کے سامنے؟"

اس گرگِ باراں دیدہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ حشمت خاں کے جانے کے بعد میر ایک گھنٹے بیٹھا ضابطے کی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ گشت پر جا رہا ہے اور ایک گھنٹے کے بعد آئے گا۔ ایس پی یا ڈی ایس پی صاحب کا فون آئے تو انہیں بتا دیا جائے کہ ڈکیتی کے باقی ملزموں کے بارے میں ایک مخبر کی اطلاع پر کہیں گئے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب حوالاتیوں کا کھانا آیا جسے کسی نے کھانا قبول نہیں کیا۔ بیشتر لوگوں نے گھر سے آئے ہوئے کھانے بھی لوٹا دیے جو ان کے عزیزوں نے رشوت دے کر اندر پہنچائے تھے۔ پکڑے جانے والوں کے عزیز و اقارب مسلسل آتے جاتے رہے اور تھانے کے باہر جمع رہے۔ ساڑھے نو بجے میر پھر نمودار ہوا اور اس نے بہت سے افراد کو شرفِ باریابی بخشا۔ ڈکیتی کے ملزم نے مجھے مطلع کیا کہ یہ آج رات تفتیش سے بچانے کے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دس بجے کے قریب میں نے ایک شخص کو اندر جاتے دیکھا جس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا مگر وہ برآمدے کا زینہ چڑھ رہا تھا تب مجھے اوپر لگے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں ایک لمحے کے لیے اُس کی صورت دکھائی دی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ جب دس منٹ بعد وہ چق اٹھا کے باہر نکلا تو میں نے اس کی صورت پھر غور سے دیکھی۔ وہ پھر چہرہ چھپا کے تیزی سے برآمدہ عبور کر گیا تھا مگر اب میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو مجھے ایئرپورٹ سے چراغ دین کی کوٹھی تک لے گیا تھا اور پھر میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر نظر آیا تھا تو میں اسے اتفاق سمجھا تھا۔ یکلخت میری آنکھوں پر سے وہ پردہ ہٹ گیا جو مفروضات اور حقائق کے درمیان حائل تھا۔

"سنتری! روکو اس شخص کو۔" میں نے حوالات کی سلاخوں کو تھام کر چلاتے ہوئے کہا۔ تھری نٹ تھری کی رائفل کو لاٹھی کی طرح تھام کر کھڑا ہوا سنتری اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ حوالات میں موجود بہت سے لوگوں نے دیوانگی کے اس مظاہرے پر سہم کر مجھے دیکھا۔ "محرّر صاحب!" میں پھر چلایا۔"یہ شخص کون تھا... یہ جو ابھی ابھی نکلا ہے؟"

"حوالدار!" میر شیر کی طرح کمرے میں سے دہاڑا۔"کون کتا بھونک رہا ہے؟" پھر وہ چق اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔ کچھ پوچھے بغیر اس نے باہر سے ہی میرے منہ پر ایک مکا رسید کیا۔ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ جب میں اٹھا تو میری ناک سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ میری قمیص پر ٹپک رہا تھا۔

"یہ کس گستاخی کی سزا ہے؟" میں نے خون کو ہاتھ سے صاف کیا۔"میں نے یہی تو پوچھا تھا کہ جو شخص ابھی ابھی آپ کے پاس سے اٹھ کر گیا ہے وہ کون تھا؟"

"کیوں پوچھا تھا؟ کون ہے تو؟ میرا باپ یا افسر؟" میر نے حسبِ ضرورت درمیان میں گالیوں کا اضافہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

"اس شخص کا میرے مقدمے سے براہِ راست تعلق ہے۔" میں نے کہا۔"مجھ پر قتل کا الزام ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اصل قاتل یہ ہے۔"

میر نے مجھے ایک درجن خوفناک گالیاں دیں۔"تو سمجھ کیا ہے خود کو... تفتیشی افسر ہے تو یا ملزم؟ تیرے کہنے سے میں تھانے میں آنے والے ہر معزز شریف آدمی کو پکڑ کے بند کر دوں؟ تیرا کیا ہے، تو ڈی ایس پی صاحب کو کہہ دے گا کہ یہ اصل قاتل ہے۔"

"کیا یہ شخص ڈی ایس پی تھا؟" میں نے کہا۔ ڈکیتی کے ملزم نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے خاموش ہو جانے کا سگنل دیا۔

"کون شخص؟" وہ دہاڑا۔"یہاں تو میں پچاس آدمیوں سے مل چکا ہوں اور پچاس ابھی باہر کھڑے ہیں۔"

"یہ جو بھاری بدن والا، گھنگھریالے بالوں اور تلوار مارکہ مونچھوں والا ابھی ابھی نکلا تھا، جس نے ایک کان میں مندری پہن رکھی تھی۔ کالی لال دھاریوں والی قمیص اور شلوار۔" میں نے بضد رہتے ہوئے کہا اور خطرے کے سگنل نمبر دو کو بھی نظر انداز کر دیا۔"کیا نام تھا اس کا؟ میں اسے جانتا ہوں، یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے اور اس کی ٹیکسی کا نمبر ہے فور تھری فور تھری۔ ایل ای..."

میرے سر پر کوئی چیز توپ کے گولے کی طرح لگی۔ میرے قریب سے گزرنے والے ایک کانسٹیبل نے لکڑی کا ڈنڈا لے کر اتنی پھرتی سے کھینچ مارا تھا کہ مجھے حیران ہونے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے اندھیرے کے سوا کچھ نہ رہا۔ میر کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔"اس... کو لاؤ ذرا... یہ کیا کہتا ہے۔ ذرا ہم اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی بات بھی سمجھا دیں۔"

حوالات کا قفل کھلا اور دو ہاتھوں نے مجھے اٹھا لیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور دھندلکا کچھ کم ہوا۔ ڈکیتی کے ملزم کی آواز آئی۔"اوئے کھوتے! کتنی دیر سے سمجھا رہا تھا میں۔ پہلی بار تھانے آیا ہے کچھ اپنی عقل سے نہیں تو دوسروں کی عقل سے کام لے۔"

میں نے محسوس کیا کہ حوالات میں رہ جانے والوں کی دہشت زدہ نظریں مجھے یوں دیکھ رہی ہیں جیسے مجھے تختۂ دار کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ سفر کا انجام نیم روشن برآمدے کے آخری دروازے پر ہوا جو ایک طرح سے تفتیش کی ریسرچ لیبارٹری تھی اور جو سامان میں نے وہاں مستقل دیکھا اگر وہ لندن کے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں بھی دیکھتے تو ہماری پولیس کی ذہانت، جدّتِ طبع اور صلاحیت پر دنگ رہ جاتے۔ مجھے وہاں لانے والے کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل سادہ کپڑوں میں تھے اور اپنی صورت شکل سے بالکل آدم خور لگتے تھے۔ انہوں نے مجھے دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ یہ لوہے کی مضبوط کرسی تھی جس کے پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ میرے احتجاج اور سوال کرنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گالیاں ان کے لیے زبان و کلام کا ناگزیر جزو تھیں، اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ فحش زبان استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر مکّوں اور تھپڑوں کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ اگر میں مشتعل ہو جاتا تو جوڈو کے ایک معمولی سے داؤ سے ان دونوں کو لمبا لٹا دیتا مگر اس کے بعد میرے لیے اس عذاب سے کہیں مفر نہ تھا جس کا معمولی سا نمونہ میں دیکھ چکا تھا۔ میں تھانے سے نکل کے بھاگ نہیں سکتا تھا اور بفرضِ محال بھاگ جاتا تو چھپ کے کہیں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے تمام کپڑوں سے محروم کر کے کرسی کے ساتھ یوں جکڑ دیا گیا کہ سر کے سوا میں جسم کے کسی حصّے کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ سرِعام بے لباس ہوتے ہی آدمی خود اپنی نظر میں کتنا بے آبرو ہو جاتا ہے، کتنا گر جاتا ہے اور عزتِ نفس نہ رہے تو خود اعتمادی بھی نہیں رہتی۔ بے عزت کر کے ننگا کر دینے کا یہ نفسیاتی حربہ کسی بھی شریف آدمی کی ذہنی قوتِ مزاحمت کو شکست دے سکتا ہے۔ بات صرف جگہ کی یا رویے کی ہے ورنہ کسی ڈاکٹر کے سامنے میڈیکل چیک اپ کے لیے کپڑے اتارنے والا میرے جیسا شخص اپنے صحت مند جسم پر کسی احساسِ ندامت میں نہیں احساسِ تفاخر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کمرے میں دو کرسیاں اور بھی تھیں جو ایک چھوٹی سی میز کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وسط میں بینچ ٹائپ لمبی سی میز تھی اور اس کے پائے بھی فرش میں پیوست تھے۔ ایک کونے میں خون آلودہ رسّیاں اور زنجیریں پڑی تھیں۔ وہیں ایک گز لمبے دستے والا ایک چمچہ بھی کھڑا تھا۔ چمچے کی جگہ اس کے آخری حصّے میں لوہے کا گول پیالہ تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کے چھوٹے بڑے پتلے اور موٹے، لچکدار اور چکنے ہر قسم کے ڈنڈے رکھے تھے۔ دیوار کی جانب مجھے لوہے کی چار بالٹیاں بھی معلق نظر آئیں جن کے سُرخ پینٹ پر سفید رنگ سے 'فائر' لکھا ہوا تھا مگر ان میں سے کسی میں ریت نہ تھی اور پانی نہ تھا کہ ان کو آگ بجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ یہ سب 'سامانِ تفتیش' تھا، جس کا تھانے کے باہر سڑک پر گزرنے والا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے فرش اور دیواروں پر مختلف قسم کے داغ نظر آئے جو اس نیم روشن کمرے کے آسیب زدہ ماحول میں مجھے لہو کے داغ لگے۔ ان سب کا لہو جو یہاں تفتیش کے لیے لائے اور لے جائے گئے۔ مُردہ یا نیم مُردہ۔ اسٹریچر پر یا مرے ہوئے کتّے کی طرح ٹانگ سے گھسیٹ کر۔ مجھے دیواروں کے وجود میں ان گنت چیخوں اور کراہوں کے خونی ٹکڑے دفن نظر آتے۔

اسی وقت میر اندر آیا اور اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ میں اب ذہنی طور پر تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے بعد محسن آ جائے گا۔ اس کے باپ نے اب تک یقیناً کسی نہ کسی کو فون کر دیا ہوگا اور نہ محسن خود کسی کے نام رقعہ لے کر آئے گا۔ صبح وکیل آ جائے گا اور لاقانونیت کا یہ سلسلہ میرے لیے تمام ہو جائے گا۔ دوسروں کے لیے چلتا رہے گا۔

"میر صاحب!" میں نے کہا۔"صبح تک آپ کو معلوم ہو جائے گا..." ابھی میرا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ میرے منہ پر پڑا۔ میرا سر جھٹکے سے کرسی کی پشت پر لگا اور کمرہ میرے سامنے ڈولنے لگا۔

"ہاں بھئی، کیا پتہ چل جائے گا؟" وہ بولا۔ اس نے زمین پر سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور اپنے دونوں مددگاروں کو اشارہ کیا جو اس کی خاموش زبان کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے دونوں ہاتھوں سے میری ناک اور ٹھوڑی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو کھینچ کر میرا منہ کھولا۔ میر نے وہ ڈنڈا میرے حلق میں ٹھونس دیا۔
"ہاں بول استاد! کیا معلوم ہوگا؟ صبح تو بہت دور ہے ابھی بتادے...!" وہ ڈنڈے پر دباؤ بڑھاتا گیا۔ ڈنڈا اب میرے حلق میں پھنس گیا تھا اور اذیت سے میرا جسم اینٹھ رہا تھا۔ ڈنڈے کا سرا گول اور چکنا تھا چنانچہ میرے حلق میں کہیں زخم نہیں آیا تھا مگر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے معدے سے ہر چیز حلق کے راستے باہر آجائے گی۔ ایک منٹ بعد اس نے ڈنڈا واپس کھینچا تو میں نے گہرا سانس لیا اور بے سدھ ہوگیا۔ تھک کر میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا جیسے میں نے چلچلاتی دھوپ میں پہاڑ کی چوٹی تک سفر کیا ہے۔

"میر محمد...!" میں نے کہا۔ "تمہیں کتنا پیسہ چاہیے... بولو اس آدمی کا نام بتانے کی قیمت کیا ہے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور...!"

"میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "کون ٹیکسی ڈرائیور؟ آج کوئی مندری والا، کوئی لال کالی دھاری دار قمیص والا مجھ سے ملنے نہیں آیا۔" اس نے میرے منہ پر تھوک دیا۔

"تم جان بوجھ کے اس کی پشت پناہی کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جتنا پیسہ اس نے دیا ہے میں اس سے دگنا دوں گا۔"

اس کے بعد میرے ساتھ وہ ہوا جس کا ذکر ہی ذلت آمیز ہے۔ غصے اور صدمے سے میرا دماغ ماؤف ہوگیا۔ میں نے خود کو اس غلاظت سے بچائے رکھنے کی بھرپور جدوجہد کی مگر میں بندھا ہوا تھا اور میرا چہرہ میر کے ماتحت گوریلے نے اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں بھول گیا کہ میں لندن میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا فوزیہ کا ہونے والا شوہر، میر وڈ اینڈ کمپنی کا ہونے والا مالک ہوں۔ میں حیوانیت کی نچلی سطح سے بھی نیچے ہوگیا جب یہ سزا تمام ہوئی تو الٹیاں کرنے سے میرا سارا جسم غلاظت سے لتھڑ چکا تھا اور میرے جسم کی توانائی اس حد تک زائل ہوچکی تھی کہ میرے لیے سر کو سیدھا رکھنا دشوار تھا۔

"ہاں بھئی! کس کا پوچھ رہا تھا تو؟" میر نے اطمینان سے سگریٹ جلائی اور جلتی ہوئی تیلی کو میری ٹانگوں کے درمیان لے آیا۔ میرے نتھنوں میں بال جلنے کی بو آئی۔

"وہ... میں... اسے بس... اسے میں پہچانتا ہوں میر صاحب...!" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا تھا تو نے؟" وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "کیا دشمنی تھی تیری، اور کون تھا تیرا ساتھی؟"

"کوئی... کوئی نہیں... وہ... وہ میرے باپ کا، قاتل... تھا... بلیک میلر تھا... مگر میں نے اسے نہیں مارا۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

لوہے کی ایک بالٹی میرے سر پر آگئی۔ میں نے کسی پاگل کتے کی طرح رونا شروع کیا۔ میں جانتا تھا اب کیا ہوگا اور اس بے بسی کے عالم میں گالیاں اور دھمکیاں دینے کے سوا میں کیا کرسکتا تھا لیکن اس مرتبہ کسی نے بالٹی کو نہیں کوٹا اور میں پہلی ضرب کے انتظار میں ہی رہا۔ مگر چند منٹ کا انتظار ایک گھڑی کا اندوہناک عذاب بن گیا۔ پھر ایک عجیب سی بو آئی۔ بالٹی کے کنارے میرے کندھوں تک آگئے تھے چنانچہ میں اس کنگ سائز، فولادی ترکی ٹوپی کے اندر سر کو ادھر ادھر گھمانے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور مجھ پر کیا تازہ ستم ٹوٹنے والا ہے۔ پھر وہ ایک لمبے دستے والا چمچہ عین بالٹی کے نیچے آگیا جس میں سے دو انگارے... دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں سیدھا اوپر اٹھا اور بالٹی میں بھرنے لگا۔ کڑچھے کے دہکتے ہوئے انگاروں کی حدت میرے چہرے تک پہنچ رہی تھی اور میں سرخ انگاروں کی چمک دیکھ بھی رہا تھا لیکن سر کو ادھر ادھر ہلا کے دھوئیں سے بچنا محال تھا۔ اس دھوئیں کی بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالٹی میں دھواں ہی دھواں ہوگیا تو تازہ ہوا کی جدوجہد میں میرا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ میرا جسم دم گھٹنے سے اینٹھنے لگا اور میں سر کو اس قاتل دھوئیں سے بچانے کے لیے... پٹخنے لگا جیسے مجھ پر حال طاری ہو لیکن اس طرح اپنے سر کو بالٹی کے اندر بچانے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ یا شاید میری زندگی کا چراغ گل ہونے لگا۔ اس نزع کے عالم میں ایک آواز مسلسل مجھ سے سوال کر رہی کہ میں نے میر شرافت علی کو کیوں قتل کیا؟

چند منٹ بعد مجھے پھر ہوش آیا تو وہ بدبودار دھواں ختم ہوچکا تھا مگر بالٹی اسی طرح میرے سر پر سوار تھی۔ وہ بدبو میرے حواس پر چھا گئی تھی اور میرے دماغ میں اس طرح بس گئی تھی کہ مجھے متلی سی محسوس ہوتی تھی لیکن میرے پیٹ میں جو کچھ تھا وہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور میں "اوق... اوق..." کر کے ابکائیاں لے رہا تھا۔

"میر صاحب... میر صاحب...!" میں نے بالٹی کے اندر گنگنا کر کہا۔ "قسم خدا کی... اس کے رسولؐ کی اور اس کی کتاب کی... اگر آپ مسلمان ہیں... تو یقین کیجیے میں نے میر شرافت علی کو قتل نہیں کیا...!" ہر لفظ میں نے رک رک کر بڑی کوشش سے ادا کیا تھا۔

جواب میں مغلظات کا سیلاب امڈ آیا۔ "یہی بکواس کیے جاتا ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور تحریری بیان نہ دے پوچھ گچھ جاری رکھو اور اگر تو نے اقبال جرم نہ کیا تو اندر باہر سے فرق نہیں پڑتا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

"یہ دھمکی ہے یا اے ایس پی صاحب کا حکم ہے؟" میں نے اپنی ذہنی توانائی کو مجتمع کرکے سوچا۔ کیوں؟ کیا انہیں علم نہیں کہ زبردستی حاصل کیے جانے والے اس اعترافِ جرم کی کوئی اہمیت نہیں؟ اور انہیں صرف اقبالِ جرم ہی سے کیوں دلچسپی ہے اصل قاتل کی گرفتاری سے کیوں نہیں...!

"میں... میں بات کروں گا... میر صاحب... آپ بتائیں...!" میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "کیا کہنا ہے... کیا لکھنا ہے مجھے؟"

بالٹی میرے سر پر سے اتر گئی اور میں نے دیکھا کہ کمرے میں اب چار ملزم اور بھی لائے گئے ہیں جو کھڑے کانپ رہے ہیں۔ ان میں دو وہی تھے جن کو میں نے مرغا بنا دیکھا تھا اور دو میری آمد کے وقت حوالات میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

میر محمد نے ایک پیر کرسی کی بجائے میری ران پر رکھا۔ "میر شرافت علی تیرے باپ کو بلیک میل کرتا تھا اس لیے تو نے اسے قتل کر دیا۔ یہ بیان نہیں چلے گا۔ بیان یہ ہوگا کہ میں پوری فرم کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اس کے سوا ایک لفظ نہیں۔ کسی کا نام کسی کا حوالہ نہیں۔"

اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنی قابلِ رحم حد تک مضحکہ خیز حالت کے احساس نے مجھے پھر مشتعل کر دیا۔ "میر صاحب!" میں نے کہا۔ "یہاں آپ دس بار مجھ سے اپنی مرضی کا بیان لے لیں، عدالت میں میرا بیان وہی ہوگا جو حقیقت پر مبنی ہوگا اور اس میں بہت سے نام اور بہت سے حوالے آئیں گے۔ بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوگا۔ میرے باپ کو بلیک میل ہی نہیں قتل بھی کیا گیا ہے۔ میں یہ بھی معلوم کروں گا کہ وہ مندری والا کون تھا جس کی تلوار مارکہ مونچھیں تھیں اور جو سرخ سیاہ دھاریوں کی قمیص پہن کے آیا تھا۔ میں اس کی ٹیکسی کا نمبر نہیں بھول سکتا...!"

میر بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ وہ میری ساری بات یوں سنتا رہا جیسے میں کوئی دلچسپ لطیفہ سنا رہا ہوں اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے اچانک سر کے بال پکڑ کے مجھے جھٹکے دینے شروع کیے اور میرے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکرانے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے میرے جسم کے حصوں کو شکنجے کی طرح جکڑ کے مروڑنا شروع کیا۔ میں بری طرح بلبلایا، لیکن اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میرے سر کے بال ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آجائیں گے اور میں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا اور جانتا تھا کہ آدمی کی قوتِ برداشت کہاں تک ساتھ دیتی ہے۔ میں بری طرح چیخنے اور اچھلنے لگا تو کسی تیسرے ہاتھ نے میرے حلق سے نکلنے والی آوازوں کو روکنے کے لیے میرے منہ میں کوئی چیز ٹھونس دی۔ میں نے دیکھا تو وہ گوبر سے بنے ہوئے خشک اپلے تھے جو تھانے میں حقہ گرم کرنے کے علاوہ اس دوسرے کام کے لیے بھی جمع رہتے تھے۔ خشک گوبر میرے حلق سے سانس کی نالی میں بھی اتر گیا اور میں سانس لینے کی جدوجہد میں بری طرح کھانسنے چھینکنے لگا۔ پھر وہ عذاب ایک دم تمام ہوگیا۔

جب میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں جہنم میں جنت کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ صحرا میں پیاس سے دم توڑنے والے کو بھی تو پانی نظر آتا ہے، جب کہ اس کی حدِ نگاہ میں جھلستی ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے آنکھیں پھر بند کرلیں اور دوبارہ کھولیں تو منظر وہی تھا۔ میں اس کمرہ تفتیش میں لکڑی کی بینچ پر الٹا پڑا تھا اور میر محمد کے دونوں معاون پانی کی بالٹی سے لوٹا بھر بھر کے مجھ پر ڈال رہے تھے۔ یہ نیم گرم پانی تھا جو میرے درد سے ٹوٹتے بدن کو بڑی راحت دے رہا تھا اور میرے بندھے ہوئے جسم کے وہ اعضا جو کرب میں زور لگانے سے پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھتے تھے اس غسلِ صحت سے شفا پا رہے تھے۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے میرے جسم سے ساری غلاظت دھو ڈالی۔ پھر ایک نے کسی زیرِ تفتیش ملزم کے کپڑوں سے رگڑ کے میرے بدن کو خشک کیا۔ میں نے ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت نہیں کی۔ میرا ناک منہ چہرہ سب صاف ہوگئے تھے لیکن میرے احساس میں ہر بدبو اور تمام غلاظت بدستور موجود تھی۔ میں خود کو آدمی کے بجائے گٹر کے گندے پانی کا کیڑا سمجھ رہا تھا اور قطعی بے حسی کے ساتھ اس انسانیت سوز منظر کو دیکھ رہا تھا جو میرے روبرو تھا۔ آہنی کرسی پر اب میری جگہ دوسرا شخص بیٹھا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ ہوچکا تھا وہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

میر جا چکا تھا اور تفتیش کا یہ سلسلہ اب ایک نئی ٹیم کی نگرانی میں چل رہا تھا جس کی قیادت رات کے آخری حصے میں ڈیوٹی پر آنے والے ایک باریش اے ایس آئی نے سنبھال رکھی تھی۔ اس کمرے کے دوسرے کونے میں بیک وقت دو افراد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے تفتیش ہو رہی تھی۔ یہ وہی دونوں تھے جن کو میں نے مُرغا بنا دیکھا تھا۔ تفتیش کے اس عمل میں پسی ہوئی سُرخ مرچ، سرسوں کا تیل اور موڈنڈے جس طرح استعمال ہو رہے تھے اس کو دیکھ کر ہی میرے بدن میں لرزہ طاری تھا مگر وہ جو تختۂ مشق بنے ہوئے تھے چلا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے منہ میں کچھ ٹھونس دیا گیا تھا اور ان کو بالکل گٹھری بنا کے باندھ دیا گیا تھا۔ یوں کہ ان کے پیر ان کی گردن کے ساتھ جا لگے تھے اور جب انھیں چھوڑا جاتا تھا تو وہ فرش پر لوٹن کبوتر ہو جاتے تھے۔

میرے مددگار اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک کپڑے لے کر آیا۔ دوسرے نے جیب سے دو گولیاں نکالیں اور پانی کے ایک گلاس کے ساتھ ہتھیلی پر رکھ کے آگے بڑھائیں۔ میں نے ہاتھ مار کے گلاس اور گولیاں نیچے گرا دیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی ایسا زہر ہو گا جس سے میرے جسم کے اندرونی اعضا کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا یا میں ان کو کھا کے سخت اور ناقابلِ برداشت قسم کی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ کانسٹبل نے مجھے گندی گالی دی اور پھر پانی کا گلاس بھر کے لایا۔ جیب سے مزید دو گولیاں برآمد کیں اور اس بار میرے جبڑے کھول کے زبردستی حلق سے یوں اتار دی گئیں جیسے جانوروں کو دوا دی جاتی ہے۔

"یہ زہر نہیں اسپرین ہے۔ درد مٹانے والی گولی" دوسرے شخص نے نسبتاً معقولیت سے کہا جو میرے کپڑے اٹھا کے لایا تھا۔ میرے سامنے اس نے جیبوں کی تلاشی لے کر تمام رقم اپنی جیب میں منتقل کی۔ سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اس نے دوسرے ساتھی کو پیش کر کے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں کپڑے پہن لوں۔ وہ دونوں میری ڈبیہ سے ایک ایک سگریٹ سلگا کے کھڑے ہو گئے اور میں نے نقد رقم پر بھی لعنت بھیجی کیونکہ اصل چیز یعنی لاکر کی چابی بچ گئی تھی اور میری کلائی کی گھڑی موجود تھی۔ ابھی میں کپڑے پہن ہی رہا تھا کہ ایک شخص چائے کی ٹرے لیے اندر آیا۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ "یہ کھا پی لو فٹافٹ" وہ بولا۔

کپڑے پہنتے ہی میری حالت میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔ میں ایک بار پھر خود کو آدمی سمجھنے لگا۔ معزز، تعلیم یافتہ اور شریف آدمی۔ اسپرین کی گولیوں کے اعجازِ مسیحائی نے بھی اپنا اثر دکھایا اور میرے جسم کا درد کم ہونے لگا۔ میں نے بدذائقہ بسکٹ نگلے اور گرم چائے ایک سانس میں چڑھا گیا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تیزی سے بحال ہونے لگی اور جب میں نے گھڑی دیکھی تو 'تفتیش' کے تمام ہو جانے کا اور

اس مہمان نوازی کے بدلے ہوئے انداز کا مطلب میری سمجھ میں آ گیا۔ رات کے ایک بج کر دس منٹ ہوئے تھے یقیناً محسن آ پہنچا تھا اور اب پولیس مجھے اس کے سامنے بالکل تر و تازہ اور صحت مند حالت میں پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی۔ یہ ان کے روز کا معمول تھا اور میرے جیسے لوگ جو کبھی اس عقوبت خانے میں نہیں پہنچے تھے اس وقت بھی اپنے اپنے گھروں میں چین سے سو رہے تھے یا بڑے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں بیٹھے تھے یا کسی لالہ رُخ کے کاشانے میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ کاروں میں ان خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ گھوم رہے تھے جن کے رنگِ پیرہن سے رات کا ہر لمحہ رنگین تھا اور جن کی زلفوں کی مہک سانسوں میں نشہ بن کے اترتی تھی۔ معصوم بچے سوتے میں خواب دیکھ کر ہنس رہے تھے اور ٹرینوں میں خوابیدہ مسافر، ہوائی جہازوں میں محوِ پرواز مسافر اور سمندری جہازوں پر محوِ تماشا مسافر سب اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے — کارخانوں کی نائٹ شفٹ چل رہی تھی، ہسپتالوں میں انسان مر رہے تھے اور جنم لے رہے تھے اور یہ سب کل بھی ایسے ہی تھا جیسے آج ہے یا پھر کل ہو گا۔ سوائے ان سب کے لیے جو زیرِ تفتیش نہیں یہ دنیا بدستور خوبصورت اور یہ زندگی جینے کی آرزو کے قابل ہے۔

میرے جسم پر ایک خراش بھی نہیں تھی۔ کسی چوٹ کا نشان نہیں تھا اور کوئی نیل نہیں پڑا تھا۔ میرے بالوں میں کنگھی کر دی گئی تھی۔ میں اپنے کپڑوں میں بالکل وہی سکندر بخت تھا جسے ریل کار سے اتارا گیا تھا۔ جب میں دو محافظوں کی معیت میں اس کمرے سے نکلا اور برآمدے میں آیا تو میرے ہاتھوں پر ہتھکڑی تھی۔ وہ مجھے حوالات کی طرف لے جانے کی بجائے ایس ایچ او کے آفس کی طرف لے گئے، جہاں میری توقعات کے عین مطابق محسن رضا موجود تھا۔ وہ بڑی بے تابی سے اٹھا اور میرے گلے لگ گیا۔ "سکندر! تو ٹھیک ہے نا... ؟" اس نے مجھے اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ "تجھے کچھ ہوا تو نہیں ہے نا؟ میں ذرا دیر سے پہنچا لیکن تو فکر نہ کر۔ میں نے سب ٹھیک کر لیا ہے..." وہ مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر بولتا جا رہا تھا اور اس کی حرکات و سکنات سے اس کی دلی بے قراری کا اظہار ہوتا تھا۔ "آخر یہ ہوا کیا ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ پریشان تھے۔" میر نے بڑی عیاری سے مسکرا کے کہا۔ "ہم پر خواہ مخواہ گرم ہو رہے تھے۔ دیکھ لیا کچھ نہیں ہوا ہے ان کو۔"

"محسن!" میں نے اطمینان اور سکون کی گہری سانس لے کر کہا۔ "جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے وہ میں تجھے بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ تو آ گیا، یہ میرے لیے سب سے بڑا سہارا ہے ورنہ اتنے بہت سے موذی اور سفاک درندوں اور بے ضمیر دشمنوں کے درمیان میں بہت اکیلا تھا۔ میں ان سب سے قانونی جنگ لڑ سکتا ہوں اور وہ سامنے آ کے مقابلہ کریں تو اکیلا ہی دس سے نمٹ سکتا ہوں مگر وہ دوسرے ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔ سازش کا مقابلہ سازش اور جوڑ توڑ کا مقابلہ جوڑ توڑ سے کیا جا سکتا ہے لیکن جس شخص کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے وہ آدھا آدمی بھی نہیں ہے بلکہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے صرف ملزم ہے۔ تو ابھی باہر ہے اور آزاد ہے چنانچہ تجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ آج تو میں مجبور تھا۔ کل ہم بھی دھن، دھونس اور دھاندلی کی طاقت آزمائیں گے اور قانون کا سہارا لیں گے، پھر پتہ چلے گا کون سورما ہے اور کون کتنے پانی میں ہے۔"

میر بالکل بے تعلق بیٹھا زیرِ لب مسکراتا رہا جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا ہے اور یہ بات نہیں سُن رہا ہے جس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے ہے۔ میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر وہ درد و کرب اتر آیا تھا جو تفتیش کے عذاب نے دیا تھا اور یہ بات محسن سے چھپی نہ رہ سکی۔

"مسٹر میر محمد!" وہ بولا۔ "نظر ملا کے بات کرو۔ کیا تم نے سکندر پر تشدد کیا ہے؟ قسم خدا کی... !"

"رہنے دے محسن!" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اور تو اب اپنی توانائی کو اور اپنی صلاحیت کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھ۔ یہی کیا کم ہے کہ میں اس وقت زندہ سلامت تیرے سامنے موجود ہوں اور تجھے سب کچھ بتا سکتا ہوں ورنہ میرے باپ کی قبر نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ تجھے بھی میری لاش مُردہ خانے میں ملتی تو کیا بتاتی۔ حشمت کی طرح میر صاحب بھی یہی کہیں گے کہ افسرانِ بالا کے حکم کے سامنے ہم مجبور ہیں اور نہیں بھی نوکری تو کرنی ہے۔ اپنا پیٹ اور بیوی بچوں کو تو پالنا ہے۔ ان سے کچھ نہ پوچھو۔ یہ بے چارے ہم سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں۔ ناحق ان مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — الزام ہے تھانیداری کا۔"

"مسٹر میر محمد! میں سکندر بخت سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" محسن نے اسے گھور کے کہا۔

میر نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک ملزم ہماری تحویل میں ہے قواعد و ضوابط۔"

"کون سے قواعد و ضوابط؟" محسن نے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور ایک ہاتھ سے دبا لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ ٹیلیفون کی طرف گیا۔ "فیصلہ کر لو کہ کیا چلے گا، یہ... یا یہ؟"

میر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے اطمینان سے نوٹ جیب میں رکھا، زیرِ لب مسکرایا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"انسپکٹر میر محمد!" میں نے کہا۔ "جب میں یہاں آیا تو میرے پاس ایک بریف کیس تھا جو میں نے سب انسپکٹر حشمت خاں کے کہنے پر امانت خانے میں رکھوا دیا تھا اس میں چار ہزار تین سو روپے نقد تھے، میرا پاسپورٹ تھا اور کچھ کپڑے تھے۔"

میر رک گیا اور اس کی صورت چغلی کھانے لگی کہ چار ہزار تین سو کی خطیر رقم نہ ملنے کا اور حشمت خاں کے ہاتھ لگ جانے کا اسے کتنا صدمہ ہوا ہے۔ "تھانے میں تو کوئی امانت خانہ نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "حشمت صبح آ جائے گا، اسی سے پوچھ لینا۔"

"اس کا جواب غالباً یہ ہو گا کہ وہ بریف کیس گھر تو نہیں لے گیا تھا، تھانے ہی میں تھا۔ میر سے پوچھو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے ایک قانون شکن مجرم نے بتا دیا تھا کہ یہاں کا قانون کیا ہے اور مجھے اب اس رقم سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں، لیکن ذرا اپنے ان دونوں آدمیوں کو بلاؤ جو مجھے لائے تھے۔"

میر نے بادلِ ناخواستہ ان کو طلب کیا۔ "اس شخص کی جیب میں وہ رقم ہے جو میری اس جیب میں تھی۔" میں نے اشارے سے واضح کیا۔ "اور اس دوسرے کی جیب میں میرا سگریٹ کا پیکٹ ہے لیکن میں دونوں چیزوں کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کروں گا کیونکہ ان پر میرا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان کو چور ثابت کرنے کے لیے وہ سگریٹ لائٹر ضرور مانگوں گا جس پر میرا نام ہے۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "لاؤ۔"

آہستہ آہستہ اس شخص کا ہاتھ جیب میں گیا اور اس نے لائٹر نکال کے مجھے تھما دیا۔ میر نے ان سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ جاتے جاتے وہ ایک حوالدار کو حکم دے گیا کہ دروازے پر موجود رہے اور کسی قسم کا اندیشہ محسوس کرے تو لحاظ کیے بغیر گولی مار دے۔ ایک گھنٹے بعد ملزم کو واپس حوالات میں پہنچا دے اور صبح رپورٹ دے۔ میر محمد آسانی سے مرعوب ہو جانے والا آدمی نہیں تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، مجھے دبانے کے نفسیاتی حربے آزما

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے حوالدار کو طلب کیا۔ سو کے ایک اور نوٹ کے عوض اس نے ایک گھنٹے کے لیے میرے ہاتھوں کو آزاد کر دیا اور ہمیں کہیں سے 'اسپیشل' چائے بھی منگوا دی۔ ہم نے اسے یقین دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ ہم فرار ہونے کی کوشش کر کے اس کی نوکری کو خطرے میں ڈالنے کی قطعی نیت نہیں رکھتے اور اتنے احسان فراموش نہیں کہ اس کی 'شرافت' کا بدلہ یوں دیں۔ ہم نے یہ بھی وعدہ کیا کہ میر صاحب یا کسی اور صاحب کے آنے کی خبر پاتے ہی از خود ہتھکڑی اپنے ہاتھوں میں ڈال لیں گے۔

محسن کی دی ہوئی سگریٹ سلگا کے میں نے اپنی بپتا یعنی گذارشِ احوالِ واقعی شروع کی اور وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے سلامت شاہ سے سنا تھا۔ جو گزشتہ رات چراغ دین کے گھر سے محسن کو فون کرنے کے بعد پیش آیا تھا اور ریل کار میں اپنی گرفتاری سے اب تک کے یہ سب واقعات بیان کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہو گیا۔ حوالدار نے اس دوران میں صرف ایک بار جھانک کے دیکھا اور ہماری طرف سے "سب خیریت ہے" کا سگنل پا کے لوٹ گیا۔ ساری بات سننے کے بعد محسن بہت دیر تک خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

"سکندر"! اس نے بالآخر کہا۔ "تیرا کیا خیال ہے قتل اس مُندری والے ٹیکسی ڈرائیور نے کیا ہے؟ وہ جو میر محمد سے ملنے آیا تھا؟"

"سو فیصد یقین کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس مندری والے کا اس واردات سے اور تمام معاملات سے قریبی تعلق ہو سکتا ہے۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی تھانے آنے کی اور میر کیوں انکار کرتا ہے کہ اس حلیے کا کوئی آدمی ہی نہیں آیا۔ اگر وہ کہتا کہ ایک ایسا شخص آیا تو تھا لیکن مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا، تو شاید مجھے شبہ نہ ہوتا۔ صرف مایوسی ہوتی، لیکن اس صریح انکار سے اور اس سفید جھوٹ سے تو میرے شبہات اور بڑھ گئے ہیں۔"

"کیا شناخت میں غلطی کا کوئی امکان نہیں، ممکن ہے وہ ملتی جلتی صورت کا کوئی آدمی ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے اسے ایک ہی دن میں دو بار دیکھا۔ ایکبار اس کی ٹیکسی میں ایئرپورٹ سے چراغ دین کی کوٹھی تک گیا، اس سے باتیں کیں اور جب اس نے میرا سامان اتار کے رکھا اور میں نے اسے کرایہ ادا کیا تب بھی اس کی صورت مجھے روزِ روشن میں صاف نظر آئی تھی۔ دوسری بار میں نے اسے رات کے وقت دیکھا تھا۔ مرکری لیمپ کی روشنی میں تھا اور میں نے پھر اس سے بات کی تھی تو اس نے بونٹ سے سر نکال کے دیکھا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ آج بھی میں نے اس کی صورت دیکھی ہے۔ ایکبار اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے، دوسری بار باہر نکلتے وقت۔ پیتل یا سونے کی مندری اس کے دائیں کان کی لَو میں ہے۔ اس کی مونچھیں تلوار مار کہ بنی ہوئی ہوئے گال، تھوڑی سی کنجی آنکھیں، مکرانیوں جیسے بال، یہ سب کچھ میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اب میں غور کرتا ہوں تو مجھے بہت سی باتیں جو پہلے غیر اہم تھیں انہی واقعات کے سلسلے کی کڑیاں لگتی ہیں۔ مثلاً ایئرپورٹ پر اس ٹیکسی والے کا رضاکارانہ طور پر آگے آ کے جائز کرایہ طلب کرنا کہ میں بے پس و پیش اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاؤں۔ پھر اس کا عین چراغ دین کے بنگلے پر رک جانا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پہلے سے ایئرپورٹ پر اسی لیے موجود تھا؟" محسن نے کہا۔ "اسے کیسے معلوم ہوا کہ تو لاہور آ رہا ہے؟"

"کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً معلوم تھی۔" میں نے کہا۔ "گمنام مسٹر فومانچو نے اپنے خط میں مطلع کیا تھا کہ ایک قتل کا قاتل جہاز میں میرے ساتھ ہے۔ غالباً اس کی معلومات غلط تھیں یا انتظامات بدل گئے۔ جہاز پر دشمنوں کا ایک مخبر تھا جس نے راستے میں مجھ پر نظر رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں اسلام آباد سے لاہور جاؤں گا۔"

"تجھے پاکستان پہنچنے سے پہلے یہ خبر کہاں تھی کہ چراغ دین خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں نہیں ہیں بلکہ چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ہیں، یہ اطلاع تجھے جہاز میں ایک گمنام خط کے ذریعے ملی لیکن جو کچھ اس خط میں لکھا تھا وہ تو تیرے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔" محسن نے کہا۔

بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "کالا صاحب" میں نے کہا۔

"کالا صاحب؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "کون کالا صاحب؟"

"وہ جہاز میں میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب میں خط پڑھ رہا تھا تو وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو بھی محسوس کیا تھا اور میری خیریت بھی پوچھی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن! میرا خیال ہے اس نے بھی پورا خط پڑھ لیا تھا۔ دوسری جانب تو وہ میرے ہی کاؤنٹر واشر تھا جسے بیوی کے نخروں اور بچوں کی شرارتوں پر باغ باغ ہونے سے فرصت نہ تھی لیکن وہ کالا صاحب میری طرف متوجہ تھا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور جب میں خط پڑھ رہا تھا تو خط میرے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً سب کچھ دیکھا ہوگا۔ دو گھنٹے پہلے ہی یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ جہاز اسلام آباد میں نہیں اتر سکے گا۔ ممکن ہے اس نے لاہور ایئرپورٹ پر پیغام بھجوا دیا ہو۔ کسی بھی کوڈ میں۔ مثلاً یہ کہ مال لاہور پہنچ رہا ہے اور اگر کوئی شخص اسلام آباد میں مال کی وصولیابی کے لیے نامزد کیا گیا تھا تو یہ انتظام بے مصرف ہو گیا تھا۔ فوری طور پر لاہور میں میرے استقبال کے لیے وہ انتظامات کیے گئے جو شاید چند گھنٹے بعد کیے جاتے، جب میں دوسری فلائٹ سے لاہور پہنچتا۔ آنا مجھے بہرصورت لاہور تھا۔ فرض کرو کالے صاحب نے یہ بھی بتا دیا کہ مال اب ماڈل ٹاؤن نہیں چراغ دین کی کوٹھی پر جائے گا اور شاید اس کے بعد میر شرافت علی کے گھر۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے سیدھا ریلوے اسٹیشن نہیں لے گیا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے گول مول جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دراصل میں اپنے خیالات میں محو تھا اور ٹیکسی ڈرائیور پریشانی میں مبتلا ہو گیا کہ چراغ دین کی کوٹھی تو گزرنے والی ہے اور سواری چپ بیٹھی ہے۔ اس نے ٹیکسی روک کے جلد بازی سے اپنی حماقت کا ثبوت دیا ورنہ وہ سیدھا اسٹیشن چلا جاتا تو کیا تھا۔ میں کہتا کہ سوری بھئی واپس چلو، اور پھر لوٹ کر چراغ دین کی کوٹھی پر ہی آتا۔ اس کے بعد وہیں ٹیکسی کا خراب ہو جانا بھی بے سبب نہیں تھا۔ اسے مجھ پر نظر رکھنی تھی۔ وہ یقیناً رات تک کسی نہ کسی بہانے آس پاس ہی منڈلاتا رہا اور میرا خیال ہے قبرستان تک اس نے ہمارا تعاقب کیا۔ پھر چراغ دین کی کوٹھی تک میرے پیچھے پیچھے گیا۔ مجھے شبہ ہوتا تو میں دھیان دیتا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ عین ممکن ہے اس نے پہلے چراغ دین کی کوٹھی کے اندر گھس کے میری اور سلامت شاہ کی ساری باتیں سنی ہوں اور اس کے بعد میر شرافت علی کی کوٹھی میں کسی کھڑکی سے لگا سب دیکھتا اور سنتا رہا ہو۔ جب میں باہر نکلا تو وہ پھر ٹیکسی کے بونٹ میں منہ چھپائے کھڑا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں بونٹ اٹھا ہوا دیکھوں گا تو ٹیکسی کو خراب دیکھ کے اس کی طرف جاؤں گا ہی نہیں لیکن اس کی بدقسمتی کہ میں نے اردگرد کوئی ٹیکسی نہ دیکھی تو اس سے بات کرنے چلا گیا۔ اس امید پر کہ ٹیکسی دھکا دینے سے یا کسی معمولی خرابی کے دور ہو جانے سے اسٹارٹ ہو جائے تو اچھا ہے۔ اور میں نے اسے پہچان لیا۔ اس سے وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہوگا لیکن یہ بات اس نے اپنی ذات تک محدود رکھی ہوگی۔ اگر اس کی خدمات حاصل کرنے والے شکاریوں کو معلوم ہو جاتا کہ شکار نے صیاد کو پہچان لیا ہے تو ٹھیکہ منسوخ ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو میر شرافت علی کے قتل کا معاوضہ نہ ملتا اور عین ممکن ہے اس کا اپنا کام تمام کرنے کا سامان کیا جاتا۔ اس کا وجود شکاریوں کے لیے خطرے کی بات ہے۔ میں اب اس کو جہاں دیکھوں گا پہچان لوں گا مگر یہ بات شکاری نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کا مقصد پورا ہوا اور جس شخص کو معاوضہ ادا کیا گیا تھا اس نے اپنا کام بحیر و خوبی انجام دیا۔ یوں کہ موردِ الزام میری ذات ہو گئی۔ ہر شہادت میرے خلاف ہے۔ آلۂ قتل پر میرے فنگر پرنٹ موجود ہوں گے۔ وجۂ قتل جو خود میں نے فراہم کی تھی یعنی یہ کہ میر شرافت علی میرے والد کو بلیک میل کر رہا تھا اپنی جگہ۔ ایک وجہ وہ پہلے ہی ایجاد کر چکے تھے یعنی یہ کہ میں پورے کاروبار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میر شرافت علی کا قتل کیا جانا طے تھا۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، اگر اس نے میرے والد کو بلیک میل کیا اور مجھے ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنایا تو دوسری طرف کچھ اور لوگ بھی تھے جو میر شرافت علی کو قتل کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ ایک شکاری میرے پیچھے تھا اور اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ دوسرے زیادہ عیار شکاری اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میر شرافت علی کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا یعنی میرا خاتمہ۔ دوسرے شکاری یہی مقصد بہتر طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی میر شرافت علی کا قتل اور اس قتل میں میری پھانسی۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جب میں خود میر شرافت علی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں پاکستان آ پہنچا ہوں۔ لیکن کچھ لوگ یقیناً یہ جانتے تھے، اور اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ غالباً انہی لوگوں نے پولیس سے بھی رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ اے ایس پی کا رویہ اس بات کا غماز ہے۔ میر محمد نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اے ایس پی صاحب کیا چاہتے ہیں۔ اعترافِ جرم۔ تھانے میں بھی اور باہر بھی۔ بصورت دیگر مجھے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ ایک غیر جانبدار پولیس افسر یہ دھمکی کیوں دے گا؟"

"ہم ان سب سے نمٹ لیں گے۔" محسن نے کہا۔ "میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رابعہ قاری سے ملتا ہوں اور منظر سے بھی۔ صبح مجسٹریٹ کے سامنے پولیس تیرا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ہم جوڈیشنل ریمانڈ پر زور دیں گے۔ پھر ضمانت کی درخواست داخل کریں گے اور چالان پیش ہونے تک صورت حال اور واضح ہو جائے گی۔ مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر ہم یہ سارے حقائق عدالت کے سامنے رکھیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ قتل رات ایک بجے کے قریب ہوا ہے تو دس بجے چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں واپس پہنچ چکا تھا اور اس کی گواہی سلامت شاہ دے گا۔ باقی معاملات وکیل سنبھال لیں گے۔"

"محسن! عدالت شخصی ضمانت مانگے گی اور نقد بھی۔۔"

میں نے تذبذب سے کہا "تو کتنی رقم لایا ہے؟"

"پندرہ ہزار۔" محسن نے کہا "تیرے پاس کچھ ہے؟ ہو سکتا ہے نقد پچاس ہزار کی ضرورت پڑے۔"

"میرے پاس ابھی تو کچھ نہیں۔ وہ چار ہزار گئے۔ سلامت شاہ سے امید ہے کہ میری ماں کے پرانے زیورات بیچ کر دس ہزار ضرور لے آئے گا۔" میں نے مایوسی سے کہا "ویسے تو لاکھوں کا مالک ہوں مگر اس وقت نہیں۔"

"اچھا تو فکر نہ کر۔ میں پاپا سے بات کروں گا، ورنہ ایک اور ذریعہ بھی ہے۔ پہلے میں وکیلوں سے بات کروں۔" محسن نے کہا۔

"ان سے دو اور مقدمات کی بات بھی کر لینا۔" میں نے کہا "ایک یہ کہ مجھے وراثت کا سرٹیفکیٹ چاہیے۔ فوراً۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اس سے مجھے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ میں کمپنی کے حسابات میں سے رقم نکلوا سکوں گا۔ دوسرا یہ کہ وہ لاکر کھول سکوں گا جس کی چابی سلامت شاہ کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔ اس لاکر میں بہت اہم دستاویزات ہو سکتی ہیں۔"

"اور دوسرا، بلکہ تیسرا مقدمہ؟" محسن نے کہا اور ایک سگریٹ جلا کے باقی پیکٹ مجھے تھما دیا۔

"تیسری درخواست کل ہی لگائی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا "مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی ان کو قتل کیا گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قبر کھود کے لاش نکالی جائے اور پوسٹ مارٹم کیا جائے۔"

محسن کا چہرہ فکر و تردد کا آئینہ بن گیا "سوچ لے سکندر! یہ بہت۔۔۔ مشکل اور خطرناک کام ہے۔۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے اور میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

حوالدار نے دوسری بار یاد دہانی کے لیے اندر جھانکا ... کے نوٹ کی تاثیر ختم ہونے لگی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب ... لاکر کی چابی نکالی اور محسن کے ہاتھ پر رکھ دی "یہ میں ... سلامت شاہ سے لی تھی۔ تجھے معلوم کرنا ہوگا کہ یہ ... کس برانچ کا ہے۔ میرا خیال ہے قریب ہی کی برانچ ہوگی ... بحفاظت اپنے پاس رکھنا یا وکیل کے پاس رکھوا دینا ... رقم اپنے پاس رکھ۔ سلامت شاہ جو کچھ لائے گا وہ بھی ... تجھے دے دوں گا۔ اس سب رقم کو ساتھ لے کر مت ... بیڈن روڈ پر میرا ایک بہت پرانا اکاؤنٹ ہے میرے ... نام سے۔ نمبر یاد نہیں لیکن برانچ حبیب بینک کی ہے ... میں نے اسی زمانے میں کھولا تھا جب۔۔۔ باجی مریم کی ... ہوئی تھی، بلکہ ہونے والی تھی۔"

"لیکن ہم تو شادی میں شریک نہیں ہوئے ..." وہ اداسی سے بولا۔

"ہاں ہم مارچ میں گئے تھے۔ شادی ستمبر میں ہوئی ... سکندر بخت نام کے دو چار ہی اکاؤنٹ ہولڈر ہو سکتے ... کوشش کرنے سے کوئی نہ کوئی تجھے وہ اکاؤنٹ نمبر بتا دے ... رقم اس میں جمع کرا دینا تاکہ محفوظ رہے اور اس دوسرے ... سے بھی کوشش کر لینا۔" میں نے کہا۔

"دوسرا ذریعہ؟" اس نے خالی خالی نظروں سے ... دیکھا اور پھر چونک کر خفت سے مسکرایا "ہاں۔۔۔ ہاں ... وہ میں کر لوں گا۔"

"محسن! شخصی ضمانت کا کیا ہوگا؟" میں نے کہا ... پاپا نے کیا کہا ہے؟"

"ایک ضامن تو خود پاپا ہوں گے۔" محسن نے کہا ... "دوسرے کا انتظام وہ یہاں آ کے کریں گے۔ وہ کل آ ... گے یعنی صبح۔ انہوں نے مجھے ایس ایس پی ضامن رضوی کا ... دیا تھا۔ یہاں آتے ہی میں نے ان سے بات کی، ورنہ ... تو بہت سخت بدمعاش ہے۔ خود رضوی صاحب سے بات ... کرکے اور جھاڑ کھا کے سیدھا ہوا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں ... اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی جس پر صبح کے ساڑھے چار ... رہے تھے۔ "یہ سو روپے اپنے پاس رکھ، اور یہ رضوی ... کا نمبر۔" اس نے نوٹ اور اپنے والد کا کارڈ مجھے تھما دیا ... ایسی ویسی بات ہو تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا ... وقت کم ہے، میں عدالت میں ملوں گا۔" وہ دروازے تک ... گیا اور واپس آیا "ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ فوزیہ ... کہا ہے۔ ایسی کی تیسی۔ کہا کیا ہے یہ رقعہ دیا ہے۔" اس نے پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور نکل گیا۔ اس پر فیض کا ایک قطعہ لکھا ہوا تھا ؎

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چند روز خدائی تو کوئی بات نہیں
جُدا ہیں آج اگر، ہم تو کل بہم ہوں گے
یہ چار دن کی جُدائی تو کوئی بات نہیں

جب حوالدار نے مجھے پھر ہتھکڑی لگائی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ فولاد و آہن کی زنجیر گراں بار نہیں کچے سُوت کے دھاگے ہیں اور اب مجھ میں اتنی قوت ہے کہ دیوارِ زنداں اور طوق و سلاسل مجھے اس زندگی سے جدا نہیں کر سکتے جو میرا حق ہے۔ جو انصاف کی علامت ہے اور فوزیہ کی محبت ہے۔ میں اب اکیلا نہیں تھا۔ محسن رضا، مسٹر شیرازی ڈپٹی سیکرٹری ایس ایس پی ضامن رضوی۔ میرے دو کلاس فیلو جو ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں۔ رابعہ قاری اور عبداو دود منظر۔ سلامت شاہ کی گواہی۔ وہ سب رقم جو میری دسترس میں ہے، میر فندیر اینڈ کمپنی کا حق وراثت اور فوزیہ کا نامۂ تجدید وفا۔ ایک پُرعذاب شب کی سحر ہونے تک میں کتنا طاقتور ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے خلاف سازش کرنے والے اور ان کے زر خرید سب بہت حقیر اور بہت چھوٹے محسوس ہو رہے تھے۔

علی الصبح میں نے پچاس روپے کے عوض ناشتہ حاصل کیا۔ حوالات میں شب بھر کے درماندہ، وہ سب جو مراعات کا استحقاق خرید نہیں سکے تھے، نیم جاں لائے جا رہے تھے اور سنگین فرش پر سسک رہے تھے۔ ڈکیتی میں ملوث ملزم لمبی تان کے سو رہا تھا اور بالکل بے فکر تھا۔ میں نے محسن کے دیے ہوئے سگریٹ پھونک کے صبح کی اور اپنے کان اور اپنی آنکھیں ان سب کی طرف سے بند کر لیں جو میرے اردگرد ظالم و مظلوم کے فرق کو کسی ثبوت کے بغیر ثابت کر رہے تھے۔ سات بجے دن کا اجالا حوالات کی ستم رسیدہ دنیا کے مکینوں پر بھی اترا اور نئی امیدوں کے ساتھ وہ دن شروع ہوا جس سے آنے والی رات کا دامن بندھا ہوا تھا۔ میری طرح اور بھی تھے جو عدالت کے روبرو پیش ہونے کی آس لگائے وقت گزار رہے تھے۔ میر محمد اچانک نمودار ہوا۔ اس وقت وہ قمیص پتلون کی بجائے پوری وردی میں تھا۔ اس نے سیدھا حوالات کا رخ کیا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"چلا گیا تمہارا وہ حمایتی تیس مار خاں؟" وہ طنز سے بولا۔

میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور اس کی طرف دھواں چھوڑ دیا "ابھی وہ انتیس مار خاں ہے۔" میں نے کہا "تیسواں نمبر تمہارا ہے۔"

"سکندر بخت! اس نام کی خوش فہمی کا شکار مت رہنا۔" وہ آگ بگولا ہو کے بولا "سکندر دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا مگر جب دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میں ایک بار پھر اے ایس پی صاحب کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ تم اعتراف جرم کر لو گے تو تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی اور تمہیں کم سے کم سزا ملے گی۔ جیل میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بصورت دیگر تمہارا انجام بُرا ہوگا۔"

"تم اپنی کہہ چکے؟" میں نے کہا "اب دفع ہو جاؤ اور اپنے اس اے ایس پی سے کہہ دو کہ یہی بات عدالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہے اور اگر کل کو خدانخواستہ تمہاری یا خود اے ایس پی کی نوکری نہ رہے تو میرے پاس آ جانا۔ میر فندیر اینڈ کمپنی میں جھاڑو دینے کے لیے رکھ لوں گا، سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔" وہ خون آشام نظروں سے مجھے گھور کر بولا "تم زندہ رہنا نہیں چاہتے۔" اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد حشمت خاں نمودار ہوا اور میں نے ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی۔ نزاع کا سبب میرا بریف کیس تھا۔ ابھی یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ اے ایس پی کی جیپ تھانے کے احاطے میں داخل ہوئی اور رائفل والے کانسٹیبل نے اسے پیر بجا کے زبردست سیلوٹ جھاڑا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دس منٹ بعد مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا آج وہ وردی میں تھا مگر اس کی پُرسکون متانت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ شاید یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ تفتیش کی شکست و ریخت کے آثار تو کہیں نظر نہیں آتے۔

"تو تم اپنے موقف پر قائم ہو۔" اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے دونوں کنارے ٹھونکتے ہوئے کہا۔ یہ سوال نہ تھا بلکہ اظہار عدم اطمینان تھا۔ "کہ تم نے قتل نہیں کیا۔ کسی اور نے قتل کر کے تمہیں پھنسا دیا ہے۔؟"

"جی۔ اور اگر سب انسپکٹر میرا اس شخص کا نام پتا بتا دیں جو کل شام اندھیرا ہونے کے بعد ان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو دائیں کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہنے ہوئے تھا۔ گہرا سانولا رنگ۔ کنجی آنکھیں تلوار جیسی مونچھیں۔ کمزاہیوں جیسے بال۔ کالی لال دھاریوں کی قمیص پہنے ہوئے۔ تو شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میرے خلاف سازش کرنے والے کون ہیں۔"

اے ایس پی طارق جمیل نے اسی پُرسکون انداز میں میر محمد کی طرف دیکھا۔ "یہ کون شخص تھا؟"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو نہیں معلوم سر۔ ابھی سنا ہے میں نے اس کی زبان سے پہلی بار۔ مجھ سے کل تو کوئی ایسا آدمی نہیں ملنے آیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو جھوٹ بولتے ہو۔" میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے جس کی ٹیکسی کا نمبر میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"تمہیں اس کی ٹیکسی کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟" اے ایس پی نے کہا۔ "اور ای کے بعد کیا ہے۔؟"

"اس کے بعد اے بی سی ڈی۔ کچھ تھا جو مجھے یاد نہیں۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فور تھری فور تھری نمبر ہر سیریز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ موٹر سائیکلوں کی اور پرائیویٹ کاروں کی سیریز الگ ہے کمرشل گاڑیوں میں بھی آپ کو صرف ٹیکسی دیکھنی ہے۔ بس یا ٹرک اور ویگن نہیں۔ لاہور میں شاید اس نمبر کی ایک ہی ٹیکسی ہوگی۔ دو یا بالفرض محال چار بھی ہوئیں تو میں ان سب کے ڈرائیوروں کو دیکھ کر اندھیرے میں بھی بتا سکوں گا کہ وہ شخص کون ہے۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ۔ میر یہ حلیہ اور یہ نمبر لکھ لو۔"

"ایک منٹ سر۔" میر نے سر پر یوں ہاتھ رکھا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "اس نمبر سے مجھے شبہ ہوتا ہے شاید ہمارے پاس چوری کی ایک رپورٹ ہے۔ مزنگ میں رہنے والا کوئی حاجی تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چند روز قبل اس کی ٹیکسی ہمارے علاقے میں چوری ہو گئی ہے۔ میں روزنامچہ دیکھتا ہوں۔" وہ واقعی اچھا اداکار تھا۔ اسے شروع سے معلوم تھا کہ اس ٹیکسی کی چوری کی رپورٹ تھانے میں ہوئی ہے مگر یہ بات اس نے مجھے نہیں بتائی۔ یہ ترپ کا پتا اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا تاکہ میری چال کو ناکام بنا سکے۔

"حشمت خاں! تم نے سلامت شاہ کا بیان لیا؟" اے ایس پی نے میر شرافت علی کے قتل کی فائل دیکھتے ہوئے کہا۔ "ملزم نے اس کا حوالہ دیا تھا اور ملزم اس کے پاس ٹھہرا ہوا بھی تھا۔"

"وہ۔ دراصل سر۔ سلامت شاہ تو کل آیا تھا مگر میں نے اسے تاکید کی کہ صبح آجائے اور آپ کے سامنے بیان دے۔" حشمت نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تمہیں بیان لینا نہیں آتا؟" اے ایس پی نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "کتنی نوکری ہو گئی ہے تمہاری؟"

"سر تفتیشی افسر تو آپ ہیں۔" حشمت خاں نے کہا۔ "اس بڈھے نے کہا تھا کہ وہ آنکھ کھلتے ہی سیدھا تھانے آئے گا۔"

"گڈ۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور کتنے بجے کھولتا ہے وہ آنکھ؟ یہ پوچھا تھا تم نے؟"

حشمت نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سات بجے پہنچ جائے۔"

"اب کیا وقت ہوا ہے حشمت خاں؟" اے ایس پی نے کہا اور فائل رکھ کے میر محمد کی طرف متوجہ ہو گیا جو خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

"وہ مجھے غلط فہمی ہوئی سر۔ کیس ہمارا نہیں تو لکھا تھانے کا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں پوچھتا ہوں۔"

اس نے ٹیلی فون نمبر ملانا شروع کیا۔ حشمت خاں نے مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک حوالدار اور ایک کانسٹیبل کو روانہ کر دیا تھا کہ اس خبیث بڈھے کو باندھ کر جوتے مارتے ہوئے اٹھا لائیں۔ باہر سے اس کی آتش فشانی کا تھوڑا سا شور اندر بھی پہنچ رہا تھا۔

میر نے نمبر ملا کے کہا کہ اے ایس پی طارق جمیل صاحب بات کریں گے اور ریسیور آگے کر دیا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد جو حقائق سامنے آئے وہ میرے اندازے سے مختلف نہ تھے ٹیکسی کا اصل مالک ساٹھ سال کا ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ بوڑھا تھا جو ظہر کے وقت نماز پڑھنے کی غرض سے ٹیکسی مسجد کے دروازے پر کھڑی کر گیا تھا مگر واپس آیا تو ٹیکسی غائب تھی ٹیکسی کا ابھی تک سراغ نہیں ملا تھا۔

"اے ایس پی صاحب۔" میں نے ٹیلی فون کی گفتگو ختم ہوتے ہی کہا۔ "آپ خود بھی ایک ذہین پولیس افسر ہیں۔ اتنا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ٹیکسی کسی نے ایک واردات کے لیے چوری کی تھی اور کل پرسوں تک کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ میں اس ٹیکسی کے مالک کی نہیں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو ٹیکسی چلا رہا تھا جس کا حلیہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔"

اے ایس پی نے ایک دم اٹھ کے میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور پھر فوراً بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور چالاک آدمی ہو۔ واقعات ہی نہیں کردار بھی بنا لیتے ہو۔ اس خوش فہمی کے باعث کہ اس طرح تفتیش کو غلط رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔"

"غلط رخ؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تفتیش کا صرف ایک رخ ہوتا ہے اور اس کا عملی مظاہرہ کل رات کے بعد آپ نے ابھی کیا ہے۔"

"اگر تم چاہو تو ایس ایس پی ضامن رضوی کو بتا سکتے ہو کہ میں نے تمہیں تھپڑ مارا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے یہ تھپڑ تم نے خود اپنے منہ پر مارا ہے۔ یہ تمہاری بے بسی کا مظہر ہے کیونکہ کل کے اور آج کے سکندر بخت میں بہت فرق ہے۔ آج تم سکندر بخت کا منہ بند نہیں کر سکتے کیونکہ وہ لاوارث نہیں۔ میری پیروی کے لیے دو بہت بڑے وکیل پیش ہوں گے۔ رابعہ قاری اور عبدالودود منظر۔ وہ پچاس ہزار تک نقد ضمانت داخل کر سکیں گے اور شخصی ضمانت دینے والا ایک تو ہو گا ڈپٹی سیکرٹری حکومت پاکستان۔ دوسرا ضامن شاید اس سے بھی بڑا ہو۔ سلامت شاہ کے بیان کے بعد یہ کیس کتنے دن چلے گا لیکن کچھ اور کیس چلیں گے جن کی تفصیل میں فی الحال تمہیں بتاؤں گا۔"

"یو باسٹرڈ۔" اے ایس پی نے چیخ کر کہا۔ "تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟ کیا کر دو گے تم؟ ہتک عزت کا کیس لے جاؤ گے۔ ذہنی و جسمانی اذیت کے ہرجانے کا دعویٰ؟ مجھے نوکری سے نکلوا دو گے؟ جیل بھجوا دو گے؟ مائی فٹ۔ تم ہو کیا؟"

"میں میرو وزیر اینڈ کمپنی کا مالک ہوں جس میں تمہارے برابر تنخواہ پانے والے دربان ہیں اور فراش ہیں۔" میں نے غرور سے کہا۔

اے ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اسے یوں ذلیل کر کے مجھے بڑی تسکین ملی۔ گذشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران جتنی ذلت اور بے آبروئی میں نے برداشت کی تھی۔ یہ اس کے عشر عشیر کا عشر عشیر بھی نہیں تھی مگر تسکین اس احساس میں تھی کہ وقت کی بساط پر میں اب کوئی بے حیثیت پیادہ نہیں ہوں۔ حشمت خاں نے واپس آ کے مطلع کیا کہ سلامت شاہ بہت جلد حاضر کر دیا جائے گا مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ "میر محمد۔" اے ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دو اور اس کا چودہ دن کے لیے جسمانی ریمانڈ حاصل کر لو۔ اس وقت تک تفتیش مکمل ہو گئی تو چالان پیش کر دیا جائے گا ورنہ ریمانڈ مزید چودہ دن کے لیے بڑھایا جا سکتا ہے۔"

"جناب اے ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "کل گرفتاری کے وقت میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں پانچ ہزار روپے نقد تھے۔"

"پانچ ہزار۔" حشمت خاں نے غیر ارادی طور پر کہا اور پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا۔

"ہاں۔" میں مسکرایا۔ "مگر شام تک میں سات سو روپے خرچ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس میں چار ہزار تین سو بچے تھے۔ اس میں میرا پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات، کپڑے اور سامانِ ضرورت تھا۔ یہ بریف کیس آپ کے سب انسپکٹر حشمت خاں نے مجھ سے امانت خانے میں رکھوانے کے لیے لیا تھا۔ مجھے یہ بریف کیس کسی تحریری درخواست کے بغیر نہیں واپس دیا جائے گا یا اس کے لیے بھی عدالت سے رجوع کرنا ہوگا؟"

"واٹ نان سنس؟" اے ایس پی نے کہا۔ "یہاں کوئی امانت خانہ نہیں ہوتا۔ امانت خانے کی کوئی رسید ملی تھی؟"

"نہیں۔ مگر آپ کے انسپکٹر حشمت خاں نے تو کہا تھا کہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے بریف کیس اسی کے حوالے کیا تھا۔"

"حشمت خاں۔" اے ایس پی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا چکر ہے؟"

"بریف کیس۔ وہ... میرا خیال ہے۔؟" حشمت خاں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تھا تو سہی ان کے پاس۔ جب میں گیا تو یہاں میز پر رکھا تھا۔"

میر محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں نے چارج لیا تو میز پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم تسلیم کرتے ہو حشمت خاں کہ بریف کیس ان کے پاس تھا۔" اے ایس پی نے کہا۔ "اور ملزم لاک اَپ میں تھا؟"

"یس۔۔ یس سر۔" حشمت خاں کو لبوں سے نکل جانے والے غلط لفظ پر افسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ میں شام تک اس کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ میں نے وہیں کھانا کھایا اور کھلایا تھا۔ وہیں سے فون کیے تھے اور سلامت شاہ بھی وہیں ملا تھا۔

"حشمت خاں۔ دیکھو وہ بریف کیس کہاں ہے۔" اے ایس پی نے مختصراً کہا۔

"بریف کیس کہاں جائے گا سر۔" حشمت خاں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر یہ دس کہتے تو ہم دس بریف کیس ان کو دیدیتے۔" مطلب صاف ظاہر تھا۔ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے مجھے نیا بریف کیس خرید کے دینا بھی کیا مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس ہزاروں کی رقم میں سے دو سو خرچ ہو جاتے۔ فائدے میں بہر صورت حشمت خاں رہتا۔ باہر سے ایک کار کے رکنے اور پھر دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز آئی۔ چند منٹ بعد دروازے کی چق ہلی اور ایک عورت اندر آگئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا اور سنہرے فریم کی نازک سی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ تیس سال کی بھرپور عورت تھی جس کے بدن کی اٹھان اس کار دباری قسم کے غیر دلکش لباس میں بھی نمایاں تھی۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ صحت مند چہرہ میک اَپ کے بغیر بھی حسین تھا۔ بے داغ رخسار کی جلد اتنی صاف اور ریشمی تھی کہ حسن افزا صابن بنانے والے اسے فخر سے اپنے اشتہار میں پیش کر سکتے تھے۔ غیر معمولی طور پر سیاہ روشن آنکھیں اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑی تھیں مگر اس کے کندھوں تک پہنچ کے خم کھا جانے والے پھسلتے، سرسراتے، چمکیلے کالے بالوں سے بہت میچ کرتی تھیں۔ میری یاد داشت سے اس صورت کے نقوش مٹ چکے تھے مگر اس کے پیچھے پیچھے محسن کو آتے دیکھ کر میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ رابعہ قاری ہے۔ اے ایس پی سمیت تھانے کا تمام عملہ یکلخت چوکنا ہو گیا۔

"رابعہ قاری۔" میں نے مسرت سے کہا۔ یوں جیسے میرے اور اس کے تعلقات بے تکلفانہ ہیں۔ اس حد تک کہ میں اس کو مس یا مسز کہنے کا تکلف بھی نہیں کرتا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں معلوم ہی نہ تھا اور نہ یہ کہ قاری اس کا باپ تھا یا شوہر ہے۔

"سکندر بخت۔" اس نے عینک ہٹا کے کہا۔ "تم نے پہچان لیا مجھے، ناٹی بوائے۔ تم کلاس میں مانیٹر ہونے کا سب سے زیادہ رعب مجھ پر جھاڑتے تھے۔" اس کے لہجے میں اعتماد، خلوص اور یگانگت کی، خوش دلی تھی۔ محسن کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ میں ہنس پڑا۔ "اچھا!۔ مجھے یاد تو نہیں لیکن تم کہتی ہو تو اب سوری۔ شرارتوں کا انجام دیکھ لو۔" میں نے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

"ویل ٹرائٹ۔" وہ بولی۔ "یہ سب ٹھیک ہو جائے گا کل تک۔" پھر وہ اے ایس پی سے مخاطب ہو گئی۔ "طارق جمیل صاحب۔ آپ اس کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ ملزم کی گرفتاری کو چھبیس گھنٹے سے زائد ہو گئے ہیں۔ مجسٹریٹ کے سامنے کیس کیوں نہیں پہنچا؟"

"ایف آئی آر میں کیا وقت لکھا ہے میر۔" طارق جمیل نے سکون سے کہا۔ "وکیل صاحبہ کے سوال کا جواب دو۔"

"ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے سر۔" میر محمد نے کہا۔ "گرفتاری گیارہ بجے عمل میں آئی تھی۔ بارہ بجے کا اندراج ہے ایف آئی آر میں۔"

"انسپکٹر حشمت۔ تم نے رپورٹ میں یہ تو یقیناً لکھا ہے کہ ملزم کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ ریل کار سے پنڈی فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔" رابعہ نے اپنی قیمتی کلائی گھڑی دیکھی۔ "اس وقت ساڑھے نو ہو رہے ہیں۔"

"ریل کار کا میں نے ذکر کیا ہے۔" حشمت خاں نے کہا۔ "پلیٹ فارم نمبر کا حوالہ بھی ہے۔"

"ویری بیڈ۔" رابعہ نے اے ایس پی کی طرف دیکھا۔ "میر محمد آپ کے سامنے جھوٹ بولتا ہے اے ایس پی صاحب۔ ایک ریل کار صبح جاتی ہے۔ جس کے حساب سے چوبیس گھنٹے ہو چکے۔ دوسری دوپہر کے بعد جاتی ہے جو ایف آئی آر کے اندراج کے مطابق بعد میں گئی۔ اب آپ بلا تاخیر ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں۔ ورنہ ہم حبس بیجا کی رٹ دائر کرتے ہیں۔" اس نے بریف کیس میز پر رکھ کے کھولا اور ایک کاغذ نکالا۔ "سکندر یہ وکالت نامہ ہے۔ دستخط کر دو۔" اس نے مجھے اپنا قلم پکڑایا اور میں نے جھک کر بدقت وکالت نامے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

حشمت خاں کا رنگ اڑ گیا تھا اور اے ایس پی اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جہاں نہ سہی کسی مرحلے پر ان کے لیے یہ وضاحت مشکل ہو گی کہ ملزم کو صبح گرفتار کیا گیا تھا تو ایف آئی آر میں دوپہر کا وقت کیوں ہے۔ رابعہ نے وکالت نامے کو فائل میں لگایا اور فائل پھر بریف کیس میں رکھ لی۔ "دوسرے وکالت نامے پر مجسٹریٹ کے سامنے دستخط کر دینا۔" وہ بولی۔ "منظر صاحب تمہاری طرف سے ضمانت کی درخواست فائل کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے سامنے پیش کر دی جائیگی۔ محسن رضا نے مجھے خاصی معلومات فراہم کر دی ہیں جو کیس کے لیے اس مرحلے پر کار آمد ہیں۔ باقی تفصیلات بعد میں۔ اب میں چلتی ہوں۔ اے ایس پی صاحب آپ کتنی دیر میں علاقہ مجسٹریٹ کے پاس پہنچ رہے ہیں؟"

"میں تو شاید نہ آؤں مس قاری۔" طارق جمیل نے شائستگی سے کہا۔ "میر محمد ایک گھنٹے تک ملزم کو لے آئے گا۔"

رابعہ نے اطمینان سے سر ہلایا۔ مسکرا کے میری طرف دیکھا اور ساتھ ہلا کے باہر نکل گئی۔ "یہ تو بالکل نہیں بدلی یار۔" میں نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔

"مگر وہ منظر تو بالکل گینڈا ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "منظر اینڈ کمپنی بنالی ہے۔ چھ ماتحت وکیل ہیں اور چھ ہی بچے ہیں اس کے۔ مگر درخواست ضمانت کی پیروی کرنے وہ خود آئے گا۔"

عین روانگی سے قبل سلامت شاہ کو ہائی جیک کرنے لانے والی پولیس پارٹی لوٹ آئی اور اس حوالدار نے جو گذشتہ روز میری گرفتاری میں پیش پیش تھا اپنے مشن کی ناکامی کا اعلان کیا۔ "وہ۔۔۔۔ صبح صبح تالا مار کے کہیں بھاگ گیا ہے۔ چراغ دین کو بھی معلوم نہیں جس کے پاس وہ کام کرتا ہے۔"

"اس سے ہم نمٹ لیں گے۔" انسپکٹر حشمت خاں نے فلمی ولن کی طرح کہا۔ "بچ کے کہاں جائے گا۔ تم دیکھو ملزم کا بریف کیس کہاں ہے۔ اے ایس پی صاحب کا حکم ہے کہ فوراً لایا جائے۔" اس نے لفظ حکم پر زور دے کر کہا۔ حوالدار نے مجھ پر ایک نگاہ قہر و غضب ڈالی اور چند منٹ بعد بریف کیس لیے نمودار ہوا۔ بریف کیس کو اس نے برآمد ہونے والے مال مسروقہ کی طرح سب کے درمیان میز پر رکھ دیا۔

"پہلے پہچان لیجیے یہی ہے آپ کا بریف کیس؟" اے ایس پی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بظاہر تو میرا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کھول کر دیکھے بغیر میں یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ بازار میں ایسے بریف کیس عام ہیں۔"

بریف کیس میں سب کچھ تھا سوائے نقد رقم کے۔ "اس میں چار ہزار تین سو روپے کم ہیں۔" میں نے کہا۔ "حسب توقع۔"

"تم نے بہت بڑے وکیل کیے ہیں۔" اے ایس پی نے چلتے چلتے کہا۔ "اگر وہ عدالت کے سامنے اس بے وسٹ گنا رقم کی موجودگی بھی ثابت کر سکے تو میں یہ رقم خود ادا کر دونگا۔ وہیں چیک کاٹ دوں گا تمہیں۔"

"یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عدالت شاید پوچھے کہ ایک اے ایس پی نے اتنی کم مدت ملازمت میں اتنا کیسے پس انداز کر لیا تو ممکن ہے کہ تنتالیس ہزار مجھے دے کر تم محاسبے کے چکر میں آجاؤ۔ اس لیے میں یہ پیشکش مسترد کرتا ہوں۔"

مجسٹریٹ کے سامنے میری پیشی کا جلوس تین ٹیکسیوں میں روانہ ہوا۔ پہلی ٹیکسی میں دونوں انسپکٹر ان کے ساتھ ملزم یعنی یہ خاکسار تھا اور ایک مسلح سپاہی تھا جس نے ہتھکڑی کو اپنی بیلٹ سے باندھ رکھا تھا۔ دوسری ٹیکسی محسن رضا نے کی تھی۔ اس میں حوالدار کے ساتھ ایک اور کانسٹیبل بھی بیٹھ گیا تو محسن اتر گیا اور اس نے تیسری ٹیکسی کر لی۔ محسن رضا ساری رات جاگا تھا اور معلوم نہیں اس نے ناشتہ بھی کیا تھا یا ایسے ہی کھائے پیے بغیر بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ تھکن اور ذہنی کشیدگی کے آثار اس کی صورت سے ہویدا تھے۔ چار پانچ گھنٹوں میں اس نے دونوں وکیلوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ شاید اسے منہ اندھیرے ہی دونوں کے گھر جانا پڑا ہو گا۔ پرانی دوستی کے نام پر یا بعد میں منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے وعدے پر اس نے دونوں وکیلوں کو تیار کر لیا ہو گا کہ وہ میرے کیس پر فوری توجہ دیں۔ اسی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ رابعہ پولیس اسٹیشن آپہنچی تھی اور منظر نے گیارہ بجے تک ضمانت کی درخواست سیشن کورٹ میں پیش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"ملزم سکندر بخت۔" انسپکٹر حشمت خاں نے ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی زہر آلود لہجے میں کہا۔ "اے ایس پی صاحب کے سامنے تم نے پانچ ہزار روپے کا مسئلہ اٹھا کے اچھا نہیں کیا۔"

"مسئلہ چار ہزار تین سو کا تھا۔" میں نے کہا۔ "سات سو تو خرچ ہوئے تھے۔ خرچ کی نوعیت میں نے کہاں بتائی؟"

"تم اے ایس پی کو گدھا سمجھتے ہو؟" حشمت خاں برافروختہ ہو کے بولا۔ "ملزم جو لاک اَپ میں بند ہو سات سو روپے کہاں خرچ کر سکتا ہے۔ اس شکایت کا انعام ہم تمہیں واپسی پر دیں گے۔ آج رات بھی تو تم ہمارے مہمان رہو گے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"آج ہی کیوں" میر بولا "ریمانڈ مہینے بھر کا ضرور ملے گا۔ چودہ دن کا اور پھر مزید چودہ دن کا۔ اس عرصہ میں تمہیں سچ بولنا آ جائے گا۔ تمہارے اتنے بڑے وکیل تمہاری مدد نہیں کر سکیں گے سکندرِ اعظم۔"

"ہم نے بڑے بڑے طرم خاں دیکھے ہیں۔ چالان پیش ہونے تک ان کا سارا کس بل نکل جاتا ہے۔" حشمت خاں نے کہا۔ "اور چالان کا کیا ہے۔ ہم دو دو سال پیش نہیں کر پاتے تفتیش ہوتی رہتی ہے۔ جوڈیشل ریمانڈ پر تم جیل کاٹتے رہو گے۔"

"سال سال تو ہم حاضری نہیں دیتے" میر محمد نے غرور سے کہا۔ "عدالت سمن جاری کرتی رہتی ہے جو وصول نہیں ہوتے۔ پھر وارنٹ نکال دیتی ہے جو دو چار مہینے بعد ناقابل ضمانت ہو جائیں تو ہم ایک پیشی بھگت لیتے ہیں کہ تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔"

"اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا کہ تمہاری ضمانت ہو جائے گی۔" حشمت خاں نے کہا۔

"یہ تم دونوں کیا قوالی گا رہے ہو مل کے۔" میں نے تنگ آ کے کہا۔ "دیکھو ٹیکسی والے نے کیا حسب حال شعر لکھا ہے۔

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

ضلع کچہری کے پُر ہجوم احاطے میں تینوں ٹیکسیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ زیرِ سماعت مقدمات میں پیش ہونے والے ملزموں کے گواہوں، ضامنوں، وکیلوں اور خیر خواہوں کا ہر عدالت کے سامنے اژدہام تھا۔ ان سب نے صرف ایک بار مجھے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بے نیاز ہو گئے۔ جو اس ماحول کے عادی تھے ان کے لیے ایک اور زنجیر بدست ملزم کی تشریف آوری کوئی واقعہ ہی نہ تھی۔ باقی لوگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ مجھے برآمدے میں چھوڑ کے انسپکٹروں کی جوڑی عدالت کے آفس میں داخل ہو گئی۔ محسن نے ریڈر سے معلوم کیا اور پانچ روپے کے عوض اس نے یہ اطلاع فراہم کر دی کہ مس رابعہ قاری ساڑھے گیارہ کا ٹائم لگوا کے گئی ہیں۔ میرے محافظ سخت بیزار کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "یہ سلامت شاہ نہیں آیا ابھی تک۔"

"آ جائے گا۔" محسن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور دو سگریٹیں جلانے لگا۔ ایک اس نے میرے منہ میں لگا دی۔ "آج کون سی گواہی ہے اس کی۔"

"یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ وہ چار دین کو بتائے بغیر کہاں گیا ہو گا۔ اسے میری ماں کا وہ سونا بیچنا تھا جو میرے باپ نے اس پرانے صندوق میں چھوڑا تھا۔"

"اتنی جھیج سناروں کی دکانیں کہاں کھلتی ہیں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سونا ویسے ہی کوئی خرید لے" میں نے کہا۔ "پرانا سونا ہے جس میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا یا ہوتا تھا تو ایک آنہ دو آنہ۔ بیٹیوں کا جہیز بنوانے والے شوق سے خریدتے ہیں۔ سنار بنوائی اور گلائی وغیرہ کے حساب سے کافی رقم کاٹ لیتے ہیں۔"

"پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "اچھا ہے اگر زیادہ پیسے مل جائیں۔"

"یار تو سمجھتا کیوں نہیں۔ سلامت شاہ کو تھانے بھی پہنچنا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ بعد میں پہنچا تو وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں وہ اس کو دس جوتے مار کے ڈک دیں گے۔ اور پھر اس رقم کا وہی انجام ہو گا جو میری بریف کیس والی رقم کا ہوا۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ ابھی آتا ہوں اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا۔ "میں نے تھانے فون کیا ہے کہ سلامت شاہ آئے تو اسے سیدھا عدالت بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا میں میر محمد بول رہا ہوں۔" اس کی نقل کی تھی جو کامیاب رہی تھی۔ اس نے دانت نکال کے کہا۔

دونوں انسپکٹر ایک طرف سے منظر اور رابعہ قاری دوسری طرف سے نمودار ہوئے۔ عبدالودود منظر کلاس میں میرا بہت بے تکلف دوست تھا اور قدرِ مشترک تھی ہم دونوں کی چلبلی طبیعت جس سے سب عاجز تھے مگر ہماری متحدہ قوت کے سامنے کسی کی نہ چلتی تھی۔ جب ہم لڑتے تھے تو میرا پلہ بھاری رہتا تھا۔ چنانچہ ہمارے درمیان طاقت اور سرمائے کے استعمال کا ایک ایسا معاہدہ طے پا گیا تھا جس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ وہ امیر ماں باپ کا بیٹا تھا اور میری عیاشی کے اخراجات بھی برداشت کر سکتا تھا۔ عیاشی یعنی کھانا پینا، تفریح چائے اور سینما۔ میں مانیٹر تھا اور جسمانی طور پر اس کی حفاظت کے علاوہ اس کے دشمنوں کی گوشمالی کر سکتا تھا۔ اور میں نے اسے نالائقی کے باوجود سیکنڈ مانیٹر بھی بنوا لیا تھا۔ بچپن کی یہ سیاست اب مجھے عملی زندگی میں ہر قدم پر کارفرما نظر آتی تھی۔ منظر اب واقعی بہت پھیل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے حلق سے خاصی دبنگ آواز نکالی۔ "ابے سکندر۔ مانیٹر کی دُم۔" پھر اس نے قہقہے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "یہ کیا رونی شکل بنا رکھی ہے۔ قتل کر دیا ہے؟ پھر کیا ہوا قتل مرد ہی کرتے ہیں۔ چھوڑ نکر بھونی کے پہلے تو نہیں بچاتا تھا۔ اب دیکھ ہم احسان کا بدلہ کیسے چکاتے ہیں۔" محسن اور رابعہ پاس کھڑے مسکراتے رہے۔ میر محمد اور حشمت خاں اپنی متانت اور دبدبے کو برقرار رکھنے کی بے سود کوشش میں مصروف رہے۔ عدالت میں جانے سے پہلے منظر نے وکالت نامے پر میرے دستخط لیے۔

بڑے وکیلوں کی موجودگی چھوٹی عدالت میں کیا نفسیاتی اثر ڈالتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے پیشی کے بعد ہوا۔ ان کے مقابل بھی ایل ایل بی تھا مگر وہ پراسیکیوشن سب انسپکٹر ہونے کے باعث اسے اپنی بدبختی سمجھتا تھا کہ وہ پولیس کے سانچے ہے۔ اس نے واجبی سے دلائل دیے جو رابعہ اور منظر نے چٹکیوں میں اڑا دیے۔ پی ایس آئی میں برابر کا مقابلہ کرنے کی نہ ہمت تھی اور نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا کیونکہ حکومت اسے تنخواہ دیتی تھی فیس نہیں۔ میر محمد اور حشمت خاں پیچ و تاب کھاتے رہے اور خون کے گھونٹ پیتے رہے کیونکہ میں نے اپنے بیان میں بتا دیا تھا کہ حوالات میں مجھ پر کس قسم کا غیر انسانی تشدد کیا گیا تھا۔ کس طرح میری رقم خرد برد ہو گئی تھی اور مجھے کیسی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ میر محمد نے ان الزامات کی صحت سے انکار کیا اور میرے وکیلوں نے کہا کہ ثبوت ناکافی ہونے کے باعث ان تمام الزامات کے تحت ہم کسی قسم کی قانونی کارروائی کا ارادہ تو نہیں رکھتے مگر ان حالات میں ملزم کو پولیس کے ریمانڈ پر رکھنا ظلم ہو گا اور اگر ایسا کیا گیا تو اس کے خلاف سیشن کورٹ کے بعد ہائی کورٹ میں بھی درخواست ضرور دی جائے گی۔ نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے اور مجسٹریٹ نے مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ بریف کیس محسن کے حوالے کر دیا گیا۔

"مجھے افسوس ہے انسپکٹر میر اور حشمت خاں کہ تمہیں مایوسی ہوئی اور آج تمہیں میری میزبانی کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔" میں نے باہر آتے ہی کہا۔ "انشاء اللہ کل پرسوں تک میری ضمانت کے بعد تمہاری وہ سب قوالی بکواس ہو جائے گی جو تم نے راستے میں کی تھی۔"

"ابے چھوڑ۔ ان کے منہ مت لگ۔" منظر نے فوراً مداخلت کی۔ "مجھ سے بات کر۔ تیری ضمانت کی درخواست کا وقت ساڑھے بارہ بجے ہے۔ انشاء اللہ آج ہی اے پی پی کو نوٹس جاری ہو جائے گا۔ آج کی رات ذرا جیل دیکھ آ۔ کل سماعت ہو گی اور اس کے بعد ضمانت۔ محسن نے سب انتظام کر لیا ہے۔"

"درخواست میں کیا لکھا ہے منظر؟" میں نے کہا۔

"ابھی دوں گا ایک چھانپڑ۔ یہ وکیلوں کے معاملات ہیں۔ ہم پر چھوڑ دے۔" منظر بولا۔ "مختصراً بتا دیتا ہوں۔ بنیاد تیرے خلاف ایک سازش کو بنایا گیا ہے جس کا مقصد تجھے سزائے موت یا عمر قید دلانا ہے اور ناکامی کی صورت میں قتل کر دینا ہے اور اس ضمن میں مختلف واقعات کا حوالہ ہے جو لندن میں پیش آئے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تیرے والد کو بلیک میل کے بعد قتل کیا گیا اور یہ بھی انھی سازشی عناصر کی کارروائی تھی جو ہنوز روپوش ہیں اور اس ضمن میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ لاش کو نکلوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست الگ سے ڈی ایم کی عدالت میں پیش کی جا رہی ہے۔ تیسرا نکتہ سلامت شاہ کی گواہی کا ہے جو سب سے اہم ہے اور جس کے مطابق واردات کے وقت تیرا جائے واردات سے بہت دور ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

"منظر صاحب، یہ سب مفروضات ہیں۔" میر محمد نے مداخلت کی۔

"یار تھانیدار بادشاہ۔" منظر نے پلٹ کر کہا۔ "تم دخل در معقولات مت کرو۔ سمجھے۔ تمہیں کیا معلوم کیا ہو گا کیا نہیں۔ اگر ابھی خواہ مخواہ تمہارے خلاف تشدد، حبس بے جا، غبن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی عدالتی تحقیقات کا چکر چل گیا تو لائن حاضر ہو گے۔ کیا فائدہ اس تھانیداری سے بھی جاؤ گے۔ جاؤ عیش کرو۔" اس کے بعد ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ منظر مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں بتاتا رہا۔ خصوصاً اپنی بیوی کے بارے میں جو بقول اس کے شادی سے پہلے نقش چغتائی تھی تو اب تجریدی آرٹ کا نمونہ۔ "غضب خدا کا یار۔ شادی کو ہوئے ہیں صرف پانچ سال۔ پہلے جوڑی لڑکوں کی۔ پھر دو لڑکیاں۔ پچھلے سال ڈبل لڑکے۔ حجم میں اور وزن میں میری برابری پر آمادہ ہے چنانچہ مستقبل سخت مخدوش ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے ہلکان ہوتا ہوں۔ بیویاں شادی کے بعد بیس تیس سال تو ساتھ نبھا ہی جاتی ہیں۔" محسن، میں اور رابعہ ہنستے رہے۔ "ہنستے ہو؟ کچھ شرم کرو یار۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ ارے بھائی آپس میں ہی ٹاس کر لو۔ اچھی خاصی فلمی مثلث ہے۔ ہیرو۔ ہیروئن۔ ولن۔"

ساڑھے بارہ بجے سیشن جج کی عدالت میں میری پیشی ایک رسمی کارروائی تھی جس کے بعد اے پی پی کو نوٹس جاری کرنے کے احکامات صادر ہو گئے اور جیل سے سماعت کے لیے ملزموں کو لے کر آنے والی گاڑی مجھے بھی لے کر روانہ ہو گئی۔ محسن نے کہا کہ وہ سلامت شاہ سے رابطہ قائم کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ شام کو اسے اپنے پاپا سے بھی ایئرپورٹ پر ملنا تھا اور پھر دوسرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ضامن کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے اسے پھر یاد دلایا کہ اس نے ایک اور ذریعے سے رقم کی فراہمی کا ذکر بھی کیا تھا۔ نہ جانے کیوں پھر محسن کا چہرہ اتر گیا اور اس نے صرف اقرار میں سر ہلا یا۔ اس سے اگلے دن صبح عدالت میں ہی ملاقات کا امکان تھا مگر رابعہ نے کہا کہ وہ شام کو مجھ سے جیل میں ملے گی۔ اور اس پورے کیس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے گی۔ پھر دیو ہیکل بس ٹائپ ٹرک کا آہنی دروازہ بند ہو گیا جس کے باہر دو مسلح سپاہیوں پر مشتمل گارڈ بیٹھی تھی اور پھر دوسرا دروازہ تھا۔ اس ڈبے میں بیس کے قریب قیدی بھر دیئے گئے تھے اور گرمی سے سب کا برا حال تھا۔ ہوا کا راستہ ان آہنی جالیوں کے سوا کہیں نہ تھا جو آٹھ فٹ لمبے چھ فٹ چوڑے اور مشکل سے پانچ فٹ اونچے ڈبے کی چھت کے ساتھ ساتھ چند انچ چوڑے روشندانوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ اگر قیدیوں کے دم گھٹ کے مر جانے کا ڈر نہ ہوتا تو شاید اتنا تکلف بھی نہ کیا جاتا۔ جب در زنداں کھلا اور لاری سے باہر آ کے میں نے کھلی ہوا میں سانس لیا اور کمر سیدھی کر کے دیکھا تو مجھے جیل کا احاطہ دکھائی دیا۔ وقتی طور پر تھانے کی عقوبت گاہ کے مقابلے میں یہ پناہ گاہ ضرور تھی مگر فوری طور پر جو خیال مجھے آیا وہ کم لرزہ خیز نہ تھا۔ کون جانے اس جیل ہی میں کسی صبح سورج کے طلوع ہونے سے قبل تختۂ دار پر میری زندگی کا سفر تمام ہو اور میری لاش اندھے کنوئیں سے نکال کے محسن رضا کے حوالے کر دی جائے۔ کہ صفِ دشمناں کو خبر کر دو مرے چارہ گر کو نوید ہو۔ اور فوزیہ سے کہو کہ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہی قرض آج چکا دیا۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو ایک عمر ان ہی دیواروں کے بے رحم حصار میں گذر جائے۔ وہ عمر جو زندگی کا سب سے گراں مایہ ٹکڑا تھی اور جس کا ایک ایک لمحہ خواہشات کا خزینہ تھا۔ خواہش ستاروں پر کمند ڈالنے کی۔ خواہش خوشبوئے گل کو زیر دام کر لینے کی۔ خواہش قوس قزح کے رنگ سمیٹ لینے کی۔ ہر وہ خواہش جو صرف جواں دل میں گھر کرتی ہے اس عمر کے گذر جانے کے بعد کہاں ہو گی۔ کسی اور دل میں جیسے فوزیہ کسی اجنبی گھر میں ہو گی اس گھر سے بالکل مختلف گھر میں جس کی حسرت تعمیر ہمارے خوابِ عشق کا حاصل تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے پناہ مانگی پناہ ان خیالات کی جلادی سے۔ پناہ اندیشوں سے اور وسوسوں سے جو مجھے تنہا پاتے ہی شیاطین کے لشکر کی طرح مجھ پر یلغار کریں گے۔ مجھے سکون دے یقین دے اور استقامت دے میرے معبود۔!

شام کو چار بجے جب میں جیل کی روٹی کا ذائقہ چکھ کے سوچ رہا تھا کہ ابھی سورج کو آسمان کی کتنی مسافت طے کرنی ہے اور کل کا دن کتنی صدیوں کے فاصلے پر ہے مجھے جیلر کے آفس لے جایا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر رابعہ بیٹھی تھی۔ صبح کی اور اس وقت کی رابعہ میں اتنا فرق تھا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اس نے گلابی ساڑی باندھ رکھی تھی جس میں آتشیں سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ شعلہ رنگ بلاؤز اس کے گداز صحت مند جسم پر خوب سج رہا تھا۔ اور اس کا مرمر جیسا بے داغ رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا اور نظر کی عینک کی جگہ ہلکے سبز رنگ کے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایسا وقار اور ایسی تمکنت تھی کہ عام آدمی اس کے رعب حسن کے مقابل گستاخ نگاہی کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پیشے نے تعلیم نے اور اعلیٰ خاندانی پس منظر نے اس کے انداز و اطوار میں بے پناہ اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے مقابلے میں فوزیہ کا تصور کیا جو ایک بہت گھریلو قسم کی۔ سادہ لوح و سادہ دل۔ خوبصورت خوابوں سے بہل جانے والی۔ بے بنیاد اندیشوں پر رو دینے والی۔ تخیلات و تصورات کی دنیا میں گم رہنے والی۔ جذباتی۔ بزدل اور کم ہمت جس کے لیے گھر کے باہر ہوس پرست شکاری مردوں کی دنیا ایسی ہی تھی جیسے معصوم ہرنی کے لیے خونخوار بھیڑیوں کا جنگل۔ رابعہ حسین ہونے کے باوجود فوزیہ کا پاسنگ بھی نہ تھی کم سے کم میری نظر میں۔ مگر یہ حسن کے انداز کا فرق تھا۔ فوزیہ بے ضرر اور پالتو سیامی بلی تھی جو گود کی پناہ میں دبک کے صرف پیار پیار مانگتی ہے۔ رابعہ جوان شیرنی تھی جو اپنے رنگ روپ کی چمک دمک۔ چال کے بانکپن اور قوت تسخیر کے غرور میں کسی طرف نظر اٹھا کے دیکھ لے تو اسے مسحور کر کے شکار کر لے.... فوزیہ بارش کی رات میں طوفانی ہواؤں سے محفوظ گھر کی دیواروں میں نرم روشنی دینے والی موم بتی کا اجالا تھی۔ رابعہ اسی رات کے آسمان پر کوندنے والی بجلی۔

"ایسے کیا منہ اٹھائے کھڑے ہو۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہیں۔" میں نے ہمت سے کام لے کر سچ بول دیا۔ "صبح کی اور اس وقت کی رابعہ کا فرق دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں وہ لوگ کتنا غلط سوچتے ہیں جن کا خیال ہے کہ وکالت اکاؤنٹس اور انجینئرنگ جیسے پیشوں سے عورت کی نسوانیت کا حسن مجروح ہوتا ہے۔"

اس نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور میں اس کے سامنے

بیٹھ گیا۔ "شاعری پھر کبھی کر لینا۔ میں تم سے مفصل گفتگو کرنے کے لیے آئی ہوں۔ ذرا اپنے جانے اور نکالے جانے کا قصہ سناؤ۔ آخر یہ سازش کا کیا چکر ہے۔"

ایک گھنٹے تک میں بولتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ میں نے ان تمام واقعات کا ذکر کر دیا جو میرے ساتھ لندن میں پیش آئے تھے اور جن کی ابتدا میرے کمرے میں ایک اجنبی لڑکی کی ہنگامہ آرائی سے ہوئی تھی اور انتہا میرے لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے پر۔ میں نے اس شبہے کا اظہار بھی کیا کہ وہ لڑکی میری تصویر لینے ہرگز نہیں آئی تھی۔ "تصویر ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہو سکتی اور راہ چلتے یوں کھینچی جا سکتی تھی کہ مجھے خبر ہی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "غالباً وہ میرے خطوط کی تلاش میں تھی۔"

"تمہارے خطوط سے اس کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"رابعہ اگر میں یہ فرض کر لوں۔ میرے پاس تو یقین کرنے کی وجوہات بھی معقول ہیں کہ میرے والد کو بلیک میل کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا۔" میں نے کہا۔ "تو ذرا مجرموں کے نقطۂ نظر سے سوچو۔ کسی مجبوری یا کمزوری۔ ماضی کی کسی ایسی غلطی کے باعث جس کا اثر مستقبل پر بھی پڑ سکتا ہو۔ خواہ یہ غلطی دانستہ ہوئی ہو یا نادانستگی میں سرزد ہوئی ہو۔ مجرم میرے والد کا لہو چوستے رہے میرے والد فرشتہ نہیں تھے انسان تھے چنانچہ کسی داغِ گناہ سے ان کے دامن کی آلودگی کو میں ناممکن نہیں سمجھتا لیکن جو بات غور طلب ہے وہ بلیک میلنگ پر ان کی خاموشی ہے۔ انہوں نے کسی قابل اعتماد دوست پر مثلاً شیروانی صاحب پر۔ کیا مجھ پر بھی اعتماد نہیں کیا۔ جو شخص زندگی میں ایک مقصد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہو اور جدوجہد آزادی کو اپنے تمام تر رشتوں کا لہو دے چکا ہو اور اتنا باہمت ہو کہ اتنا بڑا صدمہ جھیل کے پاگل نہ ہوا ہو بلکہ نئے سرے سے زندگی کی دوڑ میں شریک ہو گیا ہو اور جو اپنی دنیا کو ایک بار مکمل تباہی سے دوچار ہوتے دیکھ کر بھی مایوسی کا شکار نہ ہوا ہو اور جس نے گردش روزگار سے شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ جو تعمیر نو کے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکا ہو اسے بے بسی کے ساتھ سب کچھ ہار دینا کیوں قبول ہو گا؟ اس لیے کہ وہ بزدل تھا یا اسے اپنی زندگی سے بہت پیار تھا؟ نہیں رابعہ۔ نہ وہ بزدل تھا اور نہ خود غرض۔ اس کی جدوجہد کا حاصل اور اس کا سرمایۂ حیات میں تھا۔ اس عمر میں اسے اپنا نہیں میرے مستقبل کا تحفظ عزیز ہو سکتا تھا۔ وہ یوں مرنے کی بجائے ایک ہی بار مرنے یا مارنے کو ترجیح دیتا وہ اپنی بدنامی اور رسوائی کے خیال سے یا اپنے ماضی کے کسی جرم کے افشا ہونے کے احساس سے یا کسی گناہ کی تشہیر کے خوف سے بھلا کیوں بلیک میل ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی خاموشی کا سبب ہی یہ تھا کہ وہ مجھے بچائے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے یہ منظور نہیں تھا کہ اس کے ماضی کا آسیب میری زندگی پر سایہ فگن ہو یہی وجہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے سے دور رکھا۔ اگر میں قریب ہوتا تو یہ سب کچھ کہاں برداشت کرتا اور دشمنوں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا خاموش تماشائی کیسے بنا رہتا۔ میں اس سے پوچھتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ مجھے پتا نہ چلتا۔ وہ نہ بتاتا تو میں خود معلوم کر لیتا۔ اسی مجبوری کے باعث اس نے مجھے بہت دور کے کالج میں پڑھایا اور انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے برطانیہ بھیج دیا۔ ذرا خود سوچو۔ کیا لاہور میں اچھے کالج نہ تھے اور اب وہ پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے رئیس زادے ولایت چلے جاتے تھے۔ اب زیادہ سے زیادہ تعلیم کے مواقع ملک میں ہی حاصل ہیں۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم بھی ملک ہی میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہت اعلیٰ سطح پر ڈاکٹر یا انجینئر کسی فیلڈ میں اسپیشلائز کرنے کی خاطر تو باہر چلے جاتے ہیں مگر میں نے تو انجینئرنگ کی سند بھی حاصل نہیں کی تھی۔ صرف بی ایس سی کیا تھا کہ ابا نے مجھے چلتا کیا۔ بہانہ یہ کہ اعلیٰ تعلیم کا جو معیار اور تصور وہاں ہے یہاں نہیں۔ میں کم عقل اور ناتجربہ کار تھا اور میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہیں تھا جو آج ہے کہ مجھے باہر بھیجنا حالات سے لاعلم رکھنے کی سازش ہے۔ میں لالچ میں آ گیا کہ چلو ولایت میں عیش کریں گے اور دنیا دیکھیں گے آج یہ سوچ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کہ میرے باپ نے کس طرح میری زندگی کے لیے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل ہونا قبول کیا۔ اس نے اپنی ساری کمائی لٹا دی اور مجھے خبر نہ ہونے دی۔ اس کا منافع ایک دستخط پر دوسروں کے کھاتے میں چلا گیا۔ وہ مجھے لکھتا رہا "سب خیریت ہے۔" اس کی کوٹھی کار سب بک گئے۔ اس نے لکھا مگر کوئی بات نہیں۔ وہ ایک نمک حرام خادم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے ملازم ہو گیا مگر اس نے مجھے لکھا کہ ٹیلی فون بدل گیا ہے نوٹ کر لو۔ وہ گھر میں جھاڑ پونچھ کرتا رہا۔ بچے کھچے ٹکڑے سمیٹتا رہا اور گٹھیا میں مبتلا ہونے کے باوجود علاج کو ترستا رہا مگر اس نے مجھے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے رابعہ کہ کوئی شخص اتنا بڑا راز سینے میں لے کر قبر میں جا سوئے۔ مجھے یقین ہے ابھی اس کا مرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جب اجل کے نامہ بر کے آنے کا وقت ہو گا اور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگے گی تو وہ اپنے بیٹے کے سامنے اعتراف کرے گا کہ اس نے تمام عمر اسے بے خبری کے اندھیرے میں کیوں رکھا۔ یہ وقت اس کے خیال میں ابھی دور تھا۔ میری تعلیم کا زمانہ پورا نہیں ہوا تھا اور اس کی بیماری کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ کچھ دن اور اسی زندگی کو اور اس کی مجبوری کو لے کر نہ چلتا رہتا۔ وہ اس وقت تک مجھے کچھ نہ بتاتا جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہوتی اور ظاہر ہے کہ میں واپس آتا تو وہ کیسے چھپاتا کہ اس نے اپنا سب کچھ کہاں اور کیسے ہار دیا۔ اسے ڈر ہوگا کہ ابھی یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میرا ردعمل انتقامی ہوگا اور میں تعلیم اور مستقبل پر لعنت بھیج کر اس کے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤں گا۔ ایسی صورت میں اس کا مشن ادھورا رہ جاتا اور یہ اس کی سب سے بڑی ناکامی ہوتی۔ لیکن اس کے دشمن بہرحال اس اندیشے میں مبتلا ہوں گے کہ بڈھے نے خاموشی کے وعدے کے باوجود کہیں اپنے بیٹے کو سب کچھ نہ لکھ مارا ہو۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ جب آدمی کے پاس ہارنے کو کچھ نہ رہے تو وہ زندگی بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ لڑکی یہی دیکھنے آئی ہوگی کہ کہیں میرے خطوط میں کوئی ایسی تحریر تو نہیں جس میں بلیک میلنگ کا شکار ہونے والے نے شکاری کا کچا چٹھا بیان کر دیا ہو۔ اگر میرے والد کو موت کا یقین ہوتا تو وہ مجھے لکھ دیتے کہ ان سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی جس کی انہوں نے اتنی بھاری قیمت ادا کی۔ زندگی میں نہ سہی مرنے سے پہلے باپ اپنے بیٹے کو یہ راز بتا کے اپنی روح پر کوئی بارِ گناہ نہ رکھتا۔ مگر ان کی موت اچانک واقع ہو گئی۔ کیوں؟ کیسے؟ ان سوالوں کا جواب تو دوبارہ پوسٹ مارٹم سے مل ہی جائے گا۔ باقی سوالات کا جواب میں بشرطِ زندگی خود معلوم کر دوں گا کہ ان کی زندگی کا وہ کون سا راز تھا جسے انہوں نے مجھ پر بھی افشا نہ کیا۔ اگر وہ بدترین جرم یا گناہ ہوا تب بھی ان کی عزت و توقیر میری نظر میں کم نہ ہوگی کیونکہ ایک باپ کی حیثیت سے جو کچھ انہوں نے میرے لیے کیا وہ بہت خوش نصیب بیٹوں کا مقدر ہوتا ہے اور ایسے باپ بہت کم ہوتے ہیں۔ شاید نہیں ہوتے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں جیلر نے دوسری بار سر اندر ڈال کے اور کھنکار کے یاد دلایا کہ وقت بہت دبا جا چکا ہے۔ رابعہ نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تمہارے مفروضات کے منطقی جواز سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں۔ واقعات کو دیکھتے ہوئے اسباب کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم ان خونخوار درندوں کو تلاش کر لو گے جنہوں نے تمہارے والد کی جان لی۔ تم بڑے شکاری ہو اور تمہارے ساتھ قدرت کے نظامِ انصاف کی قوت ہے۔ خیر و شر کی ازلی و ابدی جنگ میں اگر آخری فتح خیر کی نہ ہوتی تو آج اس دنیا کا وجود نہ ہوتا۔ میں اپنی بساط، استطاعت اور استعداد کے مطابق تمہاری مدد کروں گی۔"

"میرے لیے سب سے بڑا سہارا یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ میرے ساتھ محسن ہے۔ تم ہو، منظر ہے اور سلامت شاہ ہے۔"

"سلامت شاہ تمہارا ٹرمپ کارڈ ہے۔" وہ بولی۔ "اس کی گواہی تمہیں بے گناہ ثابت کر سکتی ہے ورنہ اب تک حالات کی اور واقعات کی تمام شہادت تمہارے خلاف ہے۔ یہ تو تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ آلۂ قتل پر تمہارے فنگر پرنٹ ہوں گے پھر رہ کیا جاتا ہے۔ وجہ قتل تک بالکل واضح ہے۔ کل تمہاری ضمانت ضرور ہو جائے گی۔ میں نے اپنے طور پر اس کو یقینی بنا دیا ہے۔ میرے ڈیڈی کے بھی کچھ تعلقات تھے۔ وہ لوگ ابھی زندہ ہیں اور پرانے تعلق سے مجھے بیٹی بھی سمجھتے ہیں۔ پرانے وضعدار لوگ ہیں نا۔ ان کی کوشش اضافی مدد ہے۔ پھر ہم سپریم کورٹ تک لڑیں گے۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ رابعہ۔" میں نے کہا۔ "زندہ رہا تو تم سب کے احسانات کا بدلہ ضرور چکا دوں گا۔"

وہ مسکرائی۔ "زندہ تو خیر تم رہو گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے احسان کا بدلہ نہ ادا کر سکو۔"

"ایک بات پوچھوں رابعہ۔ بلکہ دو باتیں؟" میں نے کہا۔ "ان کا تعلق تمہاری ذات سے ہے۔"

"پوچھو۔" وہ بولی۔ "میرا خیال تھا تمہارا کبھی مجھ سے ذاتی تعلق نہیں رہا۔ اسکول اور کالج تک بہرحال نہیں تھا۔ یا تھا تو یک طرفہ۔"

میں نے اس کی صورت کو غور سے دیکھا۔ "یہ بتاؤ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟ مجرم یا بے گناہ؟"

"اگرچہ میرا اپنا یقین کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن میری نظر میں تم قاتل نہیں ہو۔ یہ میرا ایمان ہے اور ایمان کا جواز عقل سے نہیں ملتا۔" وہ بولی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ احساس بھی بڑی نعمت تھا کہ میرا ساتھ دینے والے مجھے گناہگار نہیں سمجھتے۔

"اب جلدی سے وہ دوسری بات بھی پوچھ لو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"دوسری بات" میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا۔ "تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی کہ تم نے کسی کو یا کسی نے تمہیں پسند نہ کیا ہو۔ تمہاری خوش قسمتی شبہے سے بالاتر ہے۔"

"یہ لمبی کہانی ہے۔" اس کی صورت پر بادل کے سائے کی طرح اداسی کا آسیب پھیلا اور گزر گیا۔ "اب میں کیسے کہوں کہ تم سو فیصد صحیح کہتے ہو اور سو فیصد غلط بھی یہی بات ہے۔ ابھی ذہن کو اس معمے میں الجھانے کی ضرورت نہیں۔ کسی روز میں خود ہی بتا دوں گی۔ اور یہی سوال تم سے بھی کروں گی۔"

"شب بخیر۔ آج کی رات میں جیل کیا کانٹوں کی اور انگاروں کی سیج پر بھی سکون سے سو سکتا ہوں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور چھوڑ دیا۔

پھر درِ زنداں بند ہوا اور رات آئی۔ اپنی تنہائی کا حصار قائم کر کے میں نے خوبصورت لمحوں کی اور حسین یادوں کی۔ خیالوں کی اور تصورات کی انجمن سجائی اور میں نے دیکھا کہ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔ ہر نقشِ خیال تھا کہ فروزاں ہوا۔ ہر احساس کی شمع تھی کہ جل اٹھی۔ وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں۔ وہ قربتوں کے اجلے لمحے۔ محبتوں کے امین اجالے۔ سب کنجِ زنداں میں اتر آئے۔ اندھیرا کہیں نہ رہا۔ نہ مایوسی کا نہ ذلت کا نہ بے کسی کا۔ سوتے جاگتے میں نے خواب دیکھے۔ فوزیہ ایک گھڑی کی مہمان رہی۔ میں نے کہا۔ "میری فردِ جرم دیکھو۔ دیکھو کہ میرے ہاتھوں میں زنجیر ہے اور میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔" وہ ہنسی اور بولی۔ "جہاں پر ہم تم کھڑے ہیں دونوں سحر کا روشن افق یہیں ہے۔ سحر جو شب سے عظیم تر ہے۔ یقیں جو غم سے کریم تر ہے۔" پھر رابعہ نے آ کے ہاتھ ہلایا اور کہا۔ "تمہارا تو کبھی مجھ سے ذاتی تعلق نہیں رہا یا رہا تو یکطرفہ۔ نائی لوائے۔ تم کلاس میں مانیٹر ہونے کا سب سے زیادہ رعب مجھ پر جھاڑتے تھے۔ اور اب؟ آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں۔ بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے۔" رات کے آخری پہر میں جیلر نے کہا۔ "تمہارا بلیک وارنٹ موصول ہو گیا ہے۔ کل تمہارے لواحقین سے آخری ملاقات کرا دی جائے گی اور صبح طلوعِ آفتاب سے قبل تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں کوئی وصیت کرنی ہے؟"

میں چونک کر جاگا تو پسینے میں تربتر تھا اور میرا وجود دہشت سے کانپ رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں نے ذہن سے اس بھیانک خواب کو جھٹکنے کی کوشش کی جس کی تعبیر بعید از قیاس نہ تھی۔ جب آج کے دن پیش ہونے والے قیدیوں کو بھر کے گاڑی پھر جیل خانے سے روانہ ہوئی تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اسیری کتنی پُرعذاب مجبوری ہے۔ یہ صرف ایک رات تھی جس نے مجھے آزاد انسانوں کی دنیا سے الگ کر دیا تھا۔ اگر یہ بات عمر قید کی حد تک پھیل گئی تو کیا باہر آنے کے بعد میں دنیا کو پہچان سکوں گا یا دنیا مجھے پہچانے گی؟ عدالت کے ہجوم میں سب سے پہلے مجھے محسن کا منتظر مضطرب چہرہ دکھائی دیا۔ میری نگرانی پر مامور محافظ بدل چکے تھے چنانچہ اس نے مجھے عدالت کی کینٹین پر لے جا کر ناشتہ کرایا۔ وہاں جو کچھ دستیاب تھا جیل کے ناشتے سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ محافظوں نے ناشتے میں برابری کی شرکت کے بعد اپنا نذرانہ وصول کیا اور مجھے واپس عدالت کے برآمدے میں لے گئے۔ محسن نے بتایا کہ ڈیڈی آ گئے ہیں اور ایمبیسڈر ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ دس بجے تک اپنے کسی دوست کے ہمراہ آئیں گے۔ جو ریلوے ہیڈ کوارٹرز آفس میں کوئی بڑا توپ قسم کا افسر ہے۔ وہ دونوں میرے ضامن ہوں گے۔

"رابعہ نے بھی کوئی چکر چلایا ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔ "وہ کل شام جیل میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کے لیے آئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ ضمانت ہو جائے گی۔ لیکن یار وہ نقد رقم کی پوزیشن کیا ہے؟"

"نقد رقم کی پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔" وہ سوچ کے بولا۔ "سلامت شاہ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ ملا نہیں تھا تو اس کے لیے پیغام چھوڑ دینا تھا کہ سیدھا عدالت آ جائے۔"

"آج صبح یہ پیغام تو چھوڑ آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "مگر چراغ دین نے بتایا ہے کہ وہ ابھی تک لاپتا ہے۔ چوبیس گھنٹے سے اس کے کوارٹر میں تالا پڑا ہوا ہے اور اس کی خیر خبر بھی نہیں ملی۔"

"یہ تو تشویشناک بات ہے۔ سلامت شاہ ایسے کہاں جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے پیسے کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ ضرورت سنگین نہ ہوتی تو میں وہ زیور بیچتا جو میرے پرکھوں کی نشانی تھا اور میری ماں نے چھوڑا تھا۔"

"یار یہ نہیں ہو سکتا کہ سلامت شاہ کی نیت خراب ہو گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "وہ زیور لے کر بھاگ گیا ہو۔"

"ناممکن تو دنیا میں کچھ نہیں مگر میرا دل کہتا ہے سلامت شاہ بے ضمیر آدمی نہیں۔ دس پندرہ ہزار کے زیور کی خاطر وہ نوکری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چھوڑ دے گا اور مجھے مصیبت میں چھوڑ کے بھاگ جائیگا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے زیادہ امکانات مجھے یہ نظر آتے ہیں کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔ ٹریفک کا حادثہ نہیں وہ حادثہ جو میرے کسی بھی مددگار کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ خصوصاً اس گواہ کے ساتھ جس کی گواہی پر مقدمے کے فیصلے کا دار و مدار ہو۔ اس کا پتا آج نہیں تو کل تک بہرحال چل جائیگا یہ بتا پندرہ ہزار کے علاوہ کتنے ہوئے؟"

"دس ہزار ڈیڈی نے دیے ہیں۔" وہ بولا۔ "اور کہا ہے کہ تمہاری ممی کو پتا نہ چلے۔" وہ طنز سے ہنسا۔ "یہ ہوئے پچیس ہزار۔"

"تو نے اپنے کسی ذریعے کا ذکر بھی کیا تھا" میں نے کہا۔

محسن کا رنگ ایک بار پھر متغیر ہوا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ "اس ذریعہ سے بھی دس ہزار مل گئے ہیں۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"محسن" میں نے کہا "مجھ سے نظر ملا کے بات کر۔ یہ ذریعہ کون ہے؟ اس کے ذکر سے تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑنے لگی ہیں۔ تو نے قرض لیا ہے کسی سود خور پٹھان سے؟ کوئی چیز گروی رکھی ہے۔ کچھ بیچا ہے؟ تجھے قسم ہے اس دوستی کے رشتے کی۔ سچ بتا بات کیا ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "قسم مجھے فوزیہ نے بھی دی تھی۔ ایسی کی تیسی تم دونوں کی قسم کی۔ آخر میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔ تو مجھے بتا دے۔ میں فوزیہ کو نہیں بتاؤں گا کہ تو نے اس سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑا۔" میں نے کہا۔

"اچھا" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ "قسم کھا۔ فوزیہ کی میری دوستی کی۔ یہ بات تیرے اور میرے درمیان رہے گی۔"

"میں قسم کھاتا ہوں" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "اس کا ذکر تک کسی کے سامنے نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے مجھے اپنا تمام زیور دے دیا تھا۔" وہ منہ پھیر کے بولا۔ "اور کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر سب بیچ دوں مگر تجھے نہ بتاؤں۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک آتشیں تیر میرے دل میں پیوست ہو گیا ہے اور اس کی انگارہ نوک میرے دل میں ٹوٹ گئی ہے میں نے صدمے اور اشتعال کے آتش فشاں کا دہانہ بڑی سخت جدوجہد کے بعد بند کیا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں محسن سے لڑ پڑوں اور اس رقم کی ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دوں اس سے کہوں کہ وہ واپس جائے اور دس کے بارہ پندرہ دیکر بھی فوزیہ کا زیور واپس لے آئے۔ "محسن۔" میں نے کہا۔

"تو قسم کھا چکا ہے سکندر۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ہم تینوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔"

اسی وقت میں نے ہجوم میں ایک آشنا صورت دیکھی۔ "محسن" میں چلایا۔ "وہ دیکھ، اُدھر۔ وہ۔ وہ جو زرد جرسی اور جبا کلیٹی پتلون میں ہے۔ یہ وہی ہے۔ پکڑ اسے" میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ زرد جرسی والے نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے مکرانیوں جیسے بالوں اور کنجی آنکھوں سے زیادہ اس کے دائیں کان میں پڑی ہوئی سونے کی مندری دیکھ کے محسن چونکا۔

مندری والا یکلخت خطرے کے احساس سے مغلوب ہو کے بھاگا۔ محسن نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور لوگوں سے ٹکراتا۔ دھکیل کر بھیڑ میں سے راستہ بناتا اور راستے کی رکاوٹوں کو پھلانگتا اس کی جانب لپکا مگر مندری والا ٹیکسی ڈرائیور بہت پھرتیلا تھا اور کچہری کے پُرپیچ راستوں سے واقف تھا۔ وہ لوگوں کی اور عدالت کے اہلکاروں کی پروا کیے بغیر مختلف کمروں سے گزرا اور محسن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دس منٹ بعد محسن کو ایک حوالدار نے پکڑ لیا اور وہ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کے واپس ہوا۔ عدالتوں کو بطور ریس کورس استعمال کرنے کا ہرجانہ پچاس روپے ادا کرنے کے بعد "وہ نکل گیا یار۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "اگر تو خاموشی سے بتا دیتا تو میں اس کو پیچھے سے جا کے دبوچ لیتا۔"

"بس میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ اب میرا شبہ ایک ناقابل تردید حقیقت میں ڈھل چکا تھا کہ اس مندری والے کا میرے معاملات سے کوئی قریبی تعلق ضرور ہے۔ وہ عدالت کے ریڈر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ریڈر کے گرد پانچ چھ آدمی کھڑے تھے چنانچہ اسے موقع نہیں مل رہا تھا کہ آگے جا کے بات کرے میں ذرا ضبط سے کام لیتا اور محسن کو اشارا کر دیتا تو وہ چپکے سے پیچھے جا کھڑا ہوتا۔ یہ بھی سن لیتا کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور پھر اسے پکڑ لیتا۔ خود ریڈر کو بتانا پڑتا کہ وہ کیا چاہتا تھا مگر میری غلطی سے اس کو فرار کا موقع مل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم اسے پہچانتے ہیں۔ اب وہ حلیہ بدل لے گا یا غائب ہو جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔

دس بجے شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ کار سے اترے اور انہوں نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے تسلی دی کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بات ایک رسمی ضرورت کے تحت سب کو کہنی پڑتی تھی۔ ان کو بھی جو واقعی مخلص تھے اور انہیں بھی جو نہ دوست تھے نہ دشمن۔ مگر یہ بات ہر بار میرے حوصلے کو تھوڑا سا بڑھا دیتی تھی۔ گیارہ بجے رابعہ اور منظر ایک ساتھ نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ درخواست ضمانت کس ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں ہے۔ اے پی پی نے بارہ بجے کا وقت دیا تھا اور رابعہ نے مجھے چپکے سے بتایا کہ اس سے بات ہو گئی ہے۔ اس کے بعد عبوری ضمانت تو آج ہی ہو جائے گی۔ توثیق ہوتی رہے گی۔ ایک مہینے بعد ہو یا دو مہینے بعد۔ یہ بڑی حوصلہ افزا خبر تھی جو ایک گھنٹے بعد سچ ثابت ہوئی۔ اے پی پی نے بھی بے دلی سے مخالفت کی اور بالآخر رابعہ اور منظر کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے اعتراضات واپس لے لیے۔ عدالت نے مجھے ۲۰ ہزار روپے کی مالی ضمانت کے ساتھ دو افراد کی شخصی ضمانت فراہم کرنے کا حکم دیا۔ نقد رقم اسی وقت جمع کرا دی گئی اور شیروانی صاحب اور ان کے دوست نے ضمانت نامے داخل کر دیے۔ دستاویزات کی تصدیق اور تکمیل ہونے تک میں قید رہا اور ہتھکڑی سمیت عدالت کے باہر محسن کے ساتھ کھڑا رہا۔ بالآخر یہ قانونی کارروائی مکمل ہوئی اور میرے ہاتھوں سے وقتی طور پر وہ زنجیر جدا ہو گئی جس نے اڑتالیس گھنٹے تک میری آزادی کو سلب رکھا تھا۔ مٹھائی کے پیسے لے کر محافظ رخصت ہوئے۔

"جا بھئی عیش کر۔ ایک قتل اور کر دے۔" منظر نے عدالت سے باہر آتے ہی میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اسے دوسری عدالت میں جانا تھا۔

پھر مجھے میر محمد نظر آیا جو اے ایس پی کے ساتھ جیپ میں بیٹھنے جا رہا تھا۔ ان دونوں کی صورت شکست خوردگی کے احساس کی غماز تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ "اسلام علیکم حضرات،" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔ اگر رابعہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اس سلام کے جواب میں وہ مجھے گالی دیتے اور مجھ سے مصافحہ کیے بغیر نکل جاتے۔ "آپ میں سے کسی نے مجھے ضمانت پر رہا ہونے کی مبارک باد نہیں دی۔"

"مسٹر سکندر بخت۔" اے ایس پی نے متانت سے انگریزی میں کہا۔ "عبوری ضمانت سے باعزت رہائی کی منزل بہت دور ہے۔ بہرحال تم اصرار کرتے ہو تو۔ مبارک ہو۔" وہ جیپ میں بیٹھا اور اسی اطمینان سے کسی طرف دیکھے بغیر عدالت کے احاطے سے نکل گیا۔ شیروانی صاحب اپنے دوست کے ہمراہ چلے گئے اور تاکید کر گئے کہ میں محتاط رہوں کسی مرحلے پر عدم دلچسپی اور عدم توجہی کا ثبوت نہ دوں اور شام کو ان سے ہوٹل کے کمرے میں مل لوں۔ وہ رات کی فلائٹ سے واپس چلے جائیں گے رابعہ نے مجھے بتایا کہ ابھی دو مقدمات اور دائر کرنے ہیں۔ وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ وہ خود فائل کرے گی۔ والد کی لاش کو نکلوا کے دوبارہ پوسٹمارٹم کرانے کا کیس منظر نے لیا ہے چنانچہ میں بلا ناغہ دونوں سے رابطہ قائم رکھوں۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دینے کے بعد یہ بھی کہا کہ مجھے جب بھی فرصت ملے میں اس سے گھر آ کے ملوں۔ شام سات آٹھ بجے تک وہ اپنے آفس میں رہتی ہے جو کوٹھی کے ایک حصے میں ہے مگر اس کے بعد عموماً فارغ ملتی ہے اس کے دو ماتحت وکیل ہیں جو اس کی ہدایات کی روشنی میں اگلے دن کے لیے کیس تیار کرتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خود اسے بھی رات تک ان کے ساتھ لگ کے کام کرنا پڑے۔ میں نے اور محسن نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی اور شرمندہ ہوئے۔ وہ اپنی گاڑی میں ہمیں مال پر چھوڑ کے چلی گئی۔

دُنیا کے حیرت انگیز فنِ تحریر شناسی کی مدد سے
دوسروں کی شخصیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھیں،
تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر و رہنما کتاب
تحریر اور شخصیت
قیمت ۱۰/- روپے
ڈاک خرچ ۲/- روپے
○ آپ کو بتائے گی کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔
○ آپ کن صلاحیتوں کے مالک ہیں ○ تحریر کے ذریعے اپنی کمزوریاں اور خامیاں کیسے دُور کی جا سکتی ہیں؟
ملنے کا پتہ مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"یار محسن" میں نے ــــــــ مجرمانہ ماحول سے نجات پا کے ماں کی خوبصورت دنیا میں سانس لیتے ہی کہا۔ "یہ دنیا کتنی بدل گئی ہے بلکہ میں نے تو محسوس کیا ہے کہ دنیا ہر روز بدلتی رہی ہے۔ جب میں لندن سے واپسی پر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا تو یہ دنیا کچھ اور تھی۔ صرف ایک گھنٹے میں دنیا وہ نہ رہی۔ اس سے اگلے دن جب میں حوالات میں تھا تو دنیا کا رنگ کچھ اور تھا اور آج پھر یہ دنیا عجیب سی لگ رہی ہے۔"

"یہ احساس کی عینک کا کمال ہے" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "بچپن میں ہم ایک سیدھے سادھے کھلونے میں یہی تماشا دیکھتے تھے۔ بڑا مشکل سا نام ہے اس کا۔ کلیڈاسکوپ' مگر وہ ہے کیا۔ وہ نلکی جس کے اندر شیشے کے رنگین ٹکڑے بھر دیئے جاتے ہیں اور اس نلکی کے تین طرف آئینہ ہوتا ہے رنگ برنگے بے ترتیب کناروں والے شیشے کے ٹکڑوں سے تینوں آئینوں کا عکس ایک جیسا نظر آتا ہے تو کیسا خوبصورت پیٹرن بنتا ہے۔ ادھر نلکی ذرا سی گھمائی اور پیٹرن بدل گیا۔ نئی ترتیب سے نیا ڈیزائن۔ . . . تو برادر یہ دنیا وہی کلیڈاسکوپ ہے۔ اور واقعات و گردش حالات سے پیٹرن بدلتے ہیں تو دنیا کبھی کچھ لگتی ہے کبھی کچھ۔"

میرا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور میں آزاد تھا مگر اس آزادی کے احساس میں اعتماد کا فقدان تھا۔ رسن و دار کے سائے میرے ہمرکاب تھے اور وقت کا نقیب صدا دیتا تھا کہ یہ مہلت بے ثبات ہے۔ میرے سامنے بہت سے چیلنج تھے۔ مجھے زندگی کا حق ہی نہیں حاصل کرنا تھا۔ نظروں سے اوجھل رہ کے میرے لیے ہر قدم پر دام تعزیر بچھانے والے شکاری کو بھی تلاش کرنا تھا۔ مجھے ثبوت فراہم کرنا تھا کہ میرا باپ ان ہی کی شیطانی چالوں کا شکار ہوا اور شاید پھر اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ شرافت علی انہی کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا، جنہوں نے اس کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلائی تھی۔ چنانچہ اب مجھے وزیر خاں کے . . . . قاتلوں کو تلاش کرنا تھا اور ان سے پوچھنا تھا کہ وہ وزیر خاں کو کیوں ڈراتے تھے اور اب اس کے بیٹے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دار و گیر۔

"کیا سوچ رہا ہے سکندر؟" محسن نے کہا۔ "چل کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ پھر میں فوزیہ کو فون کروں گا اور اس کے بعد ہم سلامت شاہ کی خبر لینے چلیں گے۔ شام کو ڈیڈی کا لیکچر بھی سننا ہے۔"

"رات کو ہم سی سی ڈین سے ملیں گے۔" میں نے کہا۔ کہاں رہے گا اپنا؟"

ابھی محسن نے میرے سوال کا جواب بھی نہیں دیا تھا، بچہ پیچھے سے دوڑتا ہوا آیا۔ "بوٹ پالش سر۔" وہ قریب آ کر بولا۔ اس نے کندھے پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق رکھا تھا اور بارہ چودہ سال کے اس بچے کے میلے کپڑوں اور جسم سے پالش کی بو اٹھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ جوتے اس قابل نہیں" مگر وہ بچہ ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم اب بیڈن روڈ پر تھے "پالش کرا لیجیے صاحب۔ صرف ایک روپیہ۔ اچھا آٹھ آنے" وہ بولتا گیا۔ پھر اچانک اس نے جیب سے ایک رقعہ نکالا "لیں صاحب۔"

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بس ذرا سی دیر رک جائیے آپ کے جوتے مفت پالش کرتا ہوں۔"

محسن اور میں ٹھٹک کر رک گئے۔ اس نے بڑے سے اپنا باکس گلے سے اتار کے نیچے رکھا اور جوتے پالش کرنے کا سامان نکال لیا۔ "یہ رقعہ ایک صاحب نے دیا تھا جو ٹیکسی کے چلے گئے۔" اس نے محسن کے پاؤں کو جوتے سمیت باکس پر رکھا۔ "انہوں نے کہا۔ وہ جو صاحب جا رہے ہیں ان کو یہ دو مگر راز داری سے کسی کو پتا نہ چلے۔ انہوں نے مجھے پچاس روپے دیا۔ میں نے کہا آپ خود کیوں نہیں دیتے۔ میں غریب آدمی ہوں کوئی چکر تو نہیں ہے یہ؟ انہوں نے کہا بیٹا مجھے تم سے کیا دشمنی ہے۔ اس میں کوئی خطرے کی بات نہیں۔ بس میری سلام دعا نہیں ہے ان صاحب سے۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے انہوں نے جھوٹ بولا تھا صاحب۔ لائیے دوسرا پیر۔ دیکھیے کیا لشکارا مار رہا ہے جوتا۔ پچاس روپے کا نوٹ بہت بڑا ہوتا ہے اور بلاوجہ کوئی نہیں دیتا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

میں اور محسن ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے "وہ جوان تھے۔ صحت مند۔ کان میں مندری۔ گھنگھریالے بال"

"نہیں صاحب۔" لڑکے نے زور زور سے جوتا رگڑتے ہوئے کہا۔ "ساٹھ ستر سال کا دبلا پتلا بڈھا تھا۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں۔ کارٹون لگتا تھا۔ آپ جانتے ہیں ان کو؟ وہ کون صاحب تھے۔ میں کسی مشکل میں تو نہیں پڑ جاؤں گا یہ پچاس روپے لے کر۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔" محسن نے رقعہ لے لیا۔ "وہ بڑے اچھے آدمی تھے اور ان سے واقعی ہماری سلام دعا نہیں تھی۔"

محسن کی آڑ میں رقعہ لے کر میں نے یوں کھولا کہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس پر صرف تین سطریں بال پوائنٹ سے گھسیٹی گئی تھیں۔

"آج رات کو دس بجے دھرم پورے سے باغبانپورہ جانے والی نہر کے اس کنارے پر ملو جس پر محکمہ انہار کے دفتر ہیں۔ ملاقات ہوئی یا نہ ہو سکی، بہر صورت کل کی ڈاک سے چراغ دین کے چوکیدار محبت خاں کی معرفت تمہیں ایک لفافہ ملے گا جس پر تمہاری بجائے گلاب خاں کا نام ہوگا چوکیدار سے یہ لفافہ لے لینا مگر اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو . . . . . . فومانچو!"

میں نے رقعے کو منہ میں رکھ لیا اور چیونگم کی طرح چبانے لگا۔ "تم بہت اچھے ایکٹر ہو بیٹا! اس لیے تم کسی مشکل میں نہیں پڑو گے۔" میں نے کہا۔

"کدھر اچھے ایکٹر ہیں صاحب! اچھے ایکٹر ہوتے تو جوتے پالش کرتے؟ ہیرو نہ بن جاتے۔" وہ محسن کے جوتوں پر پالش ختم کرتے ہوئے بولا۔ "دن بھر میں دس جوڑے پالش کرتے ہیں تو مشکل سے دس روپے ملتے ہیں۔ پچاس کا نوٹ دیکھ کر لالچ میں پڑ گیا ورنہ انکار کر دیتا۔"

میں نے اپنا پاؤں اس کے باکس پر رکھ دیا۔ "اب اچھے بچوں کی طرح اس پر پالش کرو اور بعد میں ہم جو کچھ دیں وہ سلام کر کے رکھ لینا۔"

"جی صاحب!" وہ بولا اور پورے انہماک سے جوتوں پر پالش لگانے لگا۔ "بدمعاشی کے دھندے تو بہت ہیں جو میرے جیسے لڑکے کرتے ہیں۔ راکٹ گولی اور سفید چڑیا بیچتے ہیں چرس کے سگریٹ فراہم کرتے ہیں اور دوسرا مال بھی۔ مال سمجھتے ہیں نا صاحب آپ؟ مگر وہ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ میں پکڑے جانے سے ڈرتا ہوں۔ اندھی ماں ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے اسکول میں پڑھتا ہے۔"

محسن نے اسے سو کا نوٹ یوں تہہ کر کے دیا کہ ایک کا نوٹ نظر آئے۔ "یہ تو تمہارا انعام۔ اس نوٹ پر ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کبھی ضرورت پڑے تو بات کر لینا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ ملازمت کا رہائش کا تعلیم کا۔"

"اچھا صاحب۔" لڑکے کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "بس آپ اتنا کرا دیں کہ ہمیں اپنی کوٹھڑی سے کوئی نہ نکالے۔ باپ کے مرنے کے بعد بدمعاش ہماری جگہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو شریف آدمی کہلاتے ہیں مگر بدمعاش ہی ہوتے ناجی! بیوہ اور یتیم کو پریشان جو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پانچ سو ہزار لے لو گھر خالی کر دو۔ ہمیں اپنے گھر کو بڑا کرنا ہے۔ گیراج نکالنا ہے۔ ہم پانچ سو ہزار لے کر کہاں جائیں گے صاحب! وہ دھمکی دیتے ہیں کہ شرافت سے جگہ نہ دی تو بند کرا دیں گے۔ چوری کا الزام لگا دیں گے۔ آپ کچھ مدد کر سکتے ہیں صاحب؟"

"تم فون پر بات کر سکتے ہو نا؟ بات کر لینا۔ تمہارا گھر تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" محسن نے کہا۔ لڑکے نے پالش ختم کی سلام کیا اور لوٹ گیا۔ اس لڑکے نے ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنے آپ کو بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"فومانچو۔" میں نے محسن کے ساتھ 'کیری ہوم' ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "شیروانی اور ترکی ٹوپی والا کارٹون، کتنی عجیب بات ہے یار محسن رضا! بڈھا زندہ دل ہے۔ کیا فرضی نام بتایا تھا اپنا۔ خود کو ابن بطوطہ یا حاجی لق لق بھی تو کہہ سکتا تھا۔"

"ہاں۔ آدمی وضعدار بھی ہے۔ وضعدار لوگ عموماً مسخرا بھی ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "آج رات مل کے معلوم ہو جائیگا۔"

"اسی سڑک پر ذرا آگے میری کمپنی کا، بلکہ یوں سمجھیے محسن

صاحب کہ میرا آفس ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں نا کہ میں میر وزیر اینڈ کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ میرا خیال ہے اس کا نام اب وزیر اینڈ سنز کر دیا جائے اور آپ کو وائس چیئرمین بنا دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کبیر اس کہ تمہاری عقل تو پہلے ہی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ تم بھی چلے جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ کھانا کھاؤ اور چلو۔"

چراغ دین کہیں گیا ہوا تھا چنانچہ ہمیں چوکیدار سے بات کرنے کا موقع مل گیا اور اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ صورت سے تو مجھے پہچانتا ہے کیونکہ اس نے سلامت شاہ کے کہنے پر کوٹھی کا تالا کھول کے مجھے فون کرنے کا موقع فراہم کیا تھا مگر اسے بعد کے واقعات کا کچھ علم نہیں۔ سلامت شاہ کے غائب ہو جانے پر وہ تھوڑا سا فکرمند تھا۔

"چہ ہمارا سمجھ میں نہیں آتی صاب کہ شاہ جی کدھر گیا۔" اس نے کہا۔ "ادھر تو اس کا باپ بھائی چاچا، کوئی نہیں۔"

"خاں صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ پہلے کبھی اس طرح بغیر بتلائے کہیں گیا ہے؟"

محبت خاں نے نفی میں سر ہلایا اور ہمیں مزید معلومات فراہم کیں مثلاً یہ کہ گزشتہ تین سال کے عرصے میں جب سے وہ ملازم ہوا ہے سلامت شاہ سال کے سال بری امام صاحب کے مزار پر حاضری دینے ضرور جاتا رہا ہے مگر اور کہیں نہیں گیا۔ اس کا لاہور میں کوئی دوست رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس وہ قیام کر سکے۔ میری بجائے محسن نے کہا کہ کل گلاب خاں کے نام اس کی معرفت ایک خط آئے گا اسے وہ سنبھال کے رکھے کیونکہ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں۔ میں نے مزید وضاحت یوں کی کہ گلاب خاں ایک لین دین کے مقدمے میں پیش ہونے کے لیے پنڈی سے آیا تھا اور یہاں اس کا کوئی ایسا پتہ نہیں جس پر وہ ڈاک منگوا سکے۔ چند کاغذات رہ گئے تھے جو اس نے ڈاک سے منگوانے کے لیے میرا پتہ دے دیا تھا مگر مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا چنانچہ میں نے سلامت شاہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا محبت خاں کی معرفت منگوا لو۔ ڈاکیہ آتا ہے تو گیٹ پر ہی ڈاک دے جاتا ہے۔ محبت خاں مطمئن ہو گیا اور اس نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کاغذات بالکل محفوظ رہیں گے۔ اس نے محسن سے بحیثیت گلاب خاں مصافحہ بھی کیا۔ پھر میں نے کہا کہ میں ایک نظر سلامت شاہ کا کوارٹر دیکھنا چاہتا ہوں۔ محبت خاں نے کہا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں۔

کوارٹر بدستور مقفل تھا۔ صحن کی دیوار کے اوپر سے جھانکنے کے لیے میں نے منڈیر تھام کر خود کو اوپر کھینچا۔ اندر سلامت شاہ کا کمرہ بھی کھلا پڑا تھا اور وہ کمرہ بھی جو وزیر خاں کا کمرہ تھا کھلے دروازے سے مجھے وہ صندوق بھی نظر آیا جو میرے والد نے چھوڑا تھا۔ فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ میں چند منٹ میں اندر جا کے سونے کا وہ زیور لے کر واپس آ سکتا ہوں جو میری ماں کی ملکیت تھا۔ قانونی طور پر میں اس کا مالک تھا اور اپنی ہی چیز کو جائز ضرورت کے لیے حاصل کرنے کا یہ طریقہ غلط ضرور تھا مگر اسے چوری یا کوئی اخلاقی جرم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ چوکیدار پر نگاہ رکھے اور خود اندر کود گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں واحد خیال یہ تھا کہ میں اس زیور کے بدلے فوزیہ کا زیور واپس حاصل کر لوں تو میرے ضمیر پر رکھا ہوا دس ہزار کی رقم کا یہ بوجھ اتر جائے۔ اگر میں اپنی ماں کی یہ نشانی تحفے میں فوزیہ کو دے سکتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی لیکن یہ ابھی ناممکن تھا چنانچہ اس زیور کا بہترین استعمال یہی ہو سکتا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ فوزیہ کا زیور لینے والا بخوشی یہ پرانا سونا قبول کر لیتا جس کی مالیت بھی کہیں زیادہ تھی۔ خلاف توقع مجھے قفل کھلا نظر آیا اور مجھے ایک لمحے کے لیے مایوسی ہوئی۔ کیا سلامت شاہ زیور نکال کر لے جا چکا ہے۔ میں نے بے خیالی میں ڈھکنا اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ بدبو کا ایک بھبکا میری ناک سے ٹکرایا اور میں بے تحاشا بھاگا دروازے تک پہنچ کے رکا اور واپس گیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے رومال نکالا اور اس صندوق کے ہینڈل کو صاف کر دیا پھر اپنی متلی کے احساس کو روکتا واپس ہوا اور دیوار پر سے کودنے کی کوشش میں بھد سے نیچے گرا۔ محسن نے دوڑ کر مجھے اٹھایا۔

"سکندر..." وہ میری صورت دیکھ کے بولا۔ "کیا... کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے تجھے؟"

میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "محسن... چل... یہاں سے نکل... اندر... اندر لاش... سلامت شاہ کی لاش..."

"کیا؟" محسن نے مجھے جھنجھوڑا۔ "تو ہوش میں ہے نا؟"

"ہاں..." میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سلامت شاہ کی لاش اس صندوق میں ہے... جو میرے والد نے چھوڑا تھا... میں نے ڈھکنا کھول کے دیکھا تھا۔ وہ... وہ مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا سر... ہاتھ پیر الگ تھے..."

چند لمحے ہم دونوں پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہے پھر محسن نے کہا۔ "دیکھ، اگر چوکیدار تیری یہ حالت دیکھے گا تو اسے شک ہو جائے گا۔" زیادہ دیر ٹھہرنا بھی ہمارے حق میں خطرناک تھا۔ میں نے کپڑوں کی گرد جھاڑی۔ ایک نل سے چند گھونٹ پانی کے پیے اور اپنے دلی جذبات کو شگفتہ مسکراہٹ کے نیچے چھپا کے محبت خان کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ دس قدم سکون سے چلنے کے بعد مجھے اسٹیشن کی طرف سے خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "باغ جناح۔" محسن نے کہا اور ڈرائیور نے اتنے تھوڑے سے فاصلے کی تھوڑی سی آمدنی کو ناکافی سمجھتے ہوئے واضح کیا کہ دس روپے ہوں گے۔ محسن کا اور میرا موڈ سخت قاتلانہ ہو رہا تھا چنانچہ چڑیا گھر کے دروازے پر اتر کے ہم نے اس کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھے اور ابھی اس نے احتجاج کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے پھاڑ کھانے کے انداز میں کہا کہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ ہم ماریں گے اور یہ پانچ روپے بھی چھین کر تھانے میں بند کر دیں گے تو ایک ایک سو کا پتا لیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور بھاگ لیا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ آج اس نے پولیس افسروں سے کرایہ لینے کے علاوہ بدتمیزی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بہت سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ میں اور محسن شملہ پہاڑی کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اوپن ایئر ریسٹورنٹ کی آخری میز پر چلے گئے۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہمارے علاوہ صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت دور پہاڑی کے دامن میں بیٹھے تھے۔ خلوت کی ضرورت انہیں بھی تھی اور ہمیں بھی گو اسباب جدا تھے۔

"یار محسن!" میں نے بالآخر لب کھولے۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہمیں پہلے ہی اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ سلامت شاہ دفاع کا سب سے اہم اور شاید واحد گواہ تھا۔ میر شرافت علی کے نوکر ویسے ہی دشمن ہو رہے ہیں۔ ان سے سچ کی توقع عبث ہے۔ وہ پولیس کے لیے چشم دید گواہ بھی بن جائیں گے، اور شاید پولیس کے دباؤ میں یہ بیان تک دینے پر مجبور ہو جائیں کہ انہوں نے تجھے جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا ہے۔"

"مجھے تو تیری فکر لاحق ہو رہی ہے محسن! تو بہت بڑھ چڑھ کے میری مدد کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مدد تو بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "مگر وہ اصل مجرموں کے لیے خطرے کا سبب نہیں بن سکتے۔ سلامت شاہ بہت سی ایسی باتیں جانتا ہو گا جو کسی کو معلوم نہیں مثلاً یہ کہ آخری دنوں میں چچا وزیر خان سے کون لوگ ملنے آتے تھے۔ وہ انہیں شناخت کر سکتا تھا۔ اس کی موت کا فوری سبب بہرحال یہ ہے کہ صفائی کا واحد گواہ نہ رہنے دیا جائے۔"

چشم تصور سے میں ابھی تک اس صندوق میں بند لاش کے ٹکڑے دیکھ رہا تھا اور میرے دماغ میں سڑنے والی لاش کا وہ تعفن بس گیا تھا جس کا پہلا مقید جھونکا صندوق کھولتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ "میرا خیال ہے محسن کہ پرسوں رات جب سلامت شاہ مجھ سے تھانے میں مل کر گیا تو قاتل اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے سلامت شاہ سے پوچھا ہو گا کہ وہ مجھ سے کیوں ملا تھا اور اس نے مجھے کیا کچھ بتا دیا ہے۔ اسی رات وہ قتل کے بعد سلامت شاہ کو صندوق میں ڈال گئے ہوں گے اور وہ سب زیور بھی لے گئے ہوں گے جو سلامت شاہ کو فروخت کرنا تھا۔ اس صندوق کا سامان نکالے بغیر اس میں لاش نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ وہ سامان ان کے کام کا نہیں تھا، ممکن ہے وہیں پلنگ کے نیچے ڈھیر ہو۔ میں نے دیکھا نہیں۔ میں تو لاش دیکھتے ہی بدحواس ہو کے بھاگا تھا۔ غنیمت ہے مجھے فنگر پرنٹ صاف کر دینے کا خیال رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قتل پر سے پردہ کب اٹھے گا؟ جب لاش کا تعفن پھیلے گا اور گرد و نواح میں بسنے والوں کو بھی محسوس ہونے لگے گا؟"

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل میں چراغ دین اپنے خانساماں کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے اور پولیس وہاں جا پہنچے۔"

"ہمارا پھر وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر محبت خاں نے آج ہی چراغ دین سے ذکر کر دیا تو بعد میں ہمارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ اور کل ہم گلاب خان معرفت محبت خان کے پتے پر آنے والا خط کیسے وصول کریں گے؟"

ویٹر کو آتا دیکھ کر محسن خاموش ہو گیا۔ جب وہ چائے کے برتن رکھ کے چلا گیا تو محسن نے کہا۔ "خط کے سلسلے میں تو اب کوئی نیا چکر چلانا پڑے گا۔ یا تو ڈاک خانے جا کے سارٹنگ میں اس علاقے کے پوسٹ مین کا پتا کرنا پڑے گا اور جھوٹ بولنا پڑے گا کہ میں گلاب خان ہوں۔ میرا ایک خط ہو گا ڈاک میں وہ دے دو۔ مجھے ابھی ٹرین سے کراچی جانا ہے۔ دس بیس خرچ کر کے کام چل جائے گا ورنہ یہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ ڈاک کی تقسیم کے وقت اس کا انتظار کرنا ہوگا۔ چراغ دین کا چوکیدار دروازے پر موجود نہ ہوا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم گیٹ پر خود ڈاک وصول کر لیں گے۔ وہ موجود ہوا تو پوسٹ مین کو راہ میں روک لیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کل تک قتل کا راز افشا نہیں ہوگا۔"

"اور اگر ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "گلاب خان تو بچ جائے گا، سکندر بدبخت کیا دوسرے مقدمۂ قتل میں ملوث ہو جائے گا؟"

محسن نے اچانک چٹکی بجائی۔ "ابے تو بچ گیا۔ صاف بچ گیا۔ کیسا گلاب خان اور کہاں کا گلاب خان۔ چوکیدار محبت خان نشے میں ہوگا۔ میرا نام ہے سید محسن رضا۔ میں کسی جائداد کے مقدمے میں پنڈی سے نہیں آیا۔ شام کو ڈیڈی سے ملنا ہے۔ انہیں یہ صورتِ حال بتا دیں گے۔ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ان کا نام پتا لکھا ہوا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ دوپہر دو بجے سے رات تک ہم وہیں تھے۔ وہ خفا تو ہوں گے کہ ہم کیا ہر مشکل کو گلے لگاتے پھرتے ہیں مگر ہمارا کیا قصور ہے یار۔ کیا ہمیں معلوم تھا کہ سلامت شاہ ہمیں اس صندوق میں ٹکڑے ٹکڑے ملے گا۔ وہ معاملے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ضرورت پڑنے پر بیان دے دیں گے کہ عدالتی کارروائی کے بعد رہائی پاتے ہی میں ان کے بیٹے محسن رضا کے ساتھ گیا تھا۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا تھا اور رات کی فلائیٹ سے ان کے اسلام آباد واپس جانے تک ہم انہی کے ساتھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اِدھر اُدھر نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ یا منظر سے یہ بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"جھوٹ بھی بعض اوقات باعثِ رحمت بن جاتا ہے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "اب ایک بات اور سُن لے۔ انکل شیروانی سے بھی فومانچو کے رقعے اور اس کی دعوت کا بالکل تذکرہ مت کرنا ورنہ وہ کہیں گے کوئی ضرورت نہیں اس سے ملاقات کے لیے چوری چھپے جانے کی۔ پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ وہ فومانچو کو اٹھا لائے گی اور پھر جو کچھ اس سے پوچھنا ہے پوچھ لیا جائے گا لیکن محسن رضا! پولیس کی موجودگی میں وہ سچ کہاں بولے گا۔ وہ سب کچھ کہاں بتائے گا جس کے بتانے سے زندگی کے لالے پڑ جائیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ کوئی عقلمندی ہے؟" محسن بولا۔ "میرا مطلب ہے ان حالات میں ہمارا اس ویران علاقے میں جانا اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ اگر یہ دشمن کی چال ہوئی تو ہماری لاشیں کل نہر سے برآمد ہوں گی۔"

"مجھے یہ چال اس لیے نہیں لگتی کہ وہ رقعہ فومانچو کی اپنی تحریر تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تاہم کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں خطرہ درپیش ہوگا۔ خدا نخواستہ کسی نے فومانچو کو بھی دیکھ لیا ہوگا تو ہمارے پہنچنے سے پہلے قصہ پاک ہو جائے گا اور ہم بہادر بن کے شیر کی طرح ... گے تو مچان پر مورچہ قائم کرنے والے شکاری کی طرح ... بڑی بہادری سے مار ڈالیں گے۔"

"کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ۔" میں نے ارشاد ...
"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔"

"علامہ مرحوم نے ذکر کیا ہے مومن کا جو سپاہی ... آپ چشم بد دور کچھ نہیں ہیں۔ پچیس فیصد احمق ہیں۔ پچیس فیصد مجنوں ہیں اور باقی پچیس فیصد انجینئر ہیں تو پچیس ... شاعر وغیرہ۔" محسن رضا نے جل کے کہا۔

"تو نے بلیک بیلٹ کے نمبر بالکل نہیں دیے ..." میں نے کہا اور ہاتھ کو سیدھا کھڑا کیا۔ "جو مجھے ملی تو نہ ... مگر مل سکتی تھی۔ اگر اجازت ہو تو مظاہرہ کروں۔ ایک ... میں میز کے دو ٹکڑے۔"

"میں نے پچیس فیصد حماقت کے نمبر دے دیے ... اس لیے مظاہرے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "آ ... ڈیڈی کی ڈانٹ ڈپٹ سن آئیں اور انہیں سی آف ... ایئرپورٹ سے واپسی پر سوچیں گے۔"

"ایک دو مسائل اور بھی توجہ طلب ہیں۔" میں ...
"مثلاً ایک تو یہی کہ ہمیں یا کم سے کم مجھے غیر مسلح نہیں ... لیکن ریوالور سے پہلے لائسنس حاصل کرنا آسان کام نہیں ... بغیر لائسنس کا ریوالور لے کر پھرنا جرائم میں ایک اور جرم کا اضافہ کرنا ہے۔ دوسرا مسئلہ قیام کا ہے۔ تیسرا مسئلہ ... کہ سلامت شاہ کے بعد کون گواہی دے گا کہ میرے ... قبر کون سی ہے؟"

"آج رات تو ہم بھی ایمبیسیڈر ہوٹل میں قیام کر ..." محسن نے کہا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ کمرہ گزشتہ دن سے ... نام بک نہ ہو سکے تو آج دوپہر سے بک دکھا دیا جائے ... آج ایک بجے کے بعد کوئی نیا مسافر نہیں آیا ہوگا تو یہ کو... نہیں ہوگا اور بعد میں ہمارے لیے ایک دستاویزی ثبوت بن جائے گا۔ ہم ثابت کر سکیں گے کہ عدالت سے سید... یہاں آئے تھے۔ رات کو میں ایئرپورٹ پر دیکھوں ... واقف مل گیا تو ہمارا گواہ بن جائے گا۔ قیام کا مستقل ... ہے کہ کہیں کوئی کرائے کی جگہ دیکھی جائے۔ جب تک ... چلے گا ہمیں یہاں رکنا ہوگا اور اس پتے سے عدالت ...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مطلع کرنا ہوگا۔ ہم ہیں چھڑے چھانٹ۔ کوئی شریف آدمی جس کی بیوی یا لڑکی جوان اور خوبصورت ہوگی وہ ہمیں کب کرایہ دار رکھے گا۔ یہ مسئلہ منظر یا رابعہ حل کر سکتے ہیں۔ ریوالور کے حصول میں ایس ایس پی ضامن رضوی سے مدد لی جا سکتی ہے۔ قبر کی نشاندہی کرنے والے تین گواہ جنازے کے شرکا ہوتے ہیں۔ ان کے نام چراغ دین بتا سکتا ہے۔"

شیروانی صاحب کے پاس ہم لنچ کے لیے کمرہ بک کرا کے پہنچے۔ محسن نے انہیں لندن کے واقعات بھی تفصیل سے بتائے تھے اور جو کچھ لاہور پہنچنے کے بعد ہوا تھا وہ بھی بتا دیا تھا مگر ان کے نقطۂ نظر سے بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔ میرے والد کی موت کے بارے میں انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ "اگر وہ بندۂ خدا مجھے اشارہ بھی کر دیتا کہ ... کہ اس کے حالات اس حد تک دگرگوں ہیں تو میں کچھ نہ کچھ کرتا۔"

"میرا خیال ہے انکل کہ اس صبر و تحمل کے ساتھ تمام مصائب کو اکیلے رہ کر جھیلنے کی کوئی معقول وجہ ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ انہوں نے مجھے یا آپ کو بھی اعتماد کے قابل کیوں نہیں سمجھا؟ میرا مطلب ہے وہ اعتماد کرتے ہوئے کیوں ڈرتے تھے؟ آپ انہیں ایک زمانے سے جانتے ہیں۔ کیا آپ کے علم میں کوئی ایسی بات ہے؟ مثلاً یہ کہ ان سے کبھی نادانستگی میں کوئی ایسی غلطی ہوئی ہو جس کا کفارہ ادا نہ ہوا ہو؟ اور ان کے پرانے بدخواہ یہ بات جانتے ہوں کہ وہ غلطی کیا تھی؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وزیر خاں نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اور محسن ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔ لیکن میں اسکے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کرتا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے اور بعض اوقات حالات اس کے خلاف سازش کر لیتے ہیں تو سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانے والے کی عقل بھی ساتھ نہیں دیتی۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیا غلطی تھی جو اس نے مجھ سے بھی چھپائی۔"

"آپ ان کے پرانے دوست احباب کو اور ملنے والوں کو جانتے ہوں گے۔ ان میں سے پاکستان آنے والے کون تھے اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔ "مثلاً میر شرافت علی کے بارے میں آپ کی معلومات کیا ہیں؟"

"زیادہ نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ "میرٹھ میں بھائی وزیر خان مرحوم کے پاس آتا جاتا تھا لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے تھے، کمینہ آدمی تھا مگر کیا کرتے، گھر آئے ہوئے کو دھتکارا بھی تو نہیں جا سکتا۔"

"اس تعلق کی نوعیت کیا تھی، میرا مطلب ہے وہ کہیں پاس پڑوس میں رہتا تھا۔ والد مرحوم کے ساتھ کام کرتا تھا یا انکے کسی دوست کا دوست تھا؟ سنا ہے میرٹھ میں اس کی کریانے کی دکان تھی؟"

"ہاں کوٹھی تو تھی۔" شیروانی صاحب نے کہا "اور باقی کا مجھے اس لیے علم نہیں کہ میرٹھ میں میرا قیام سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بہت مختصر رہا۔ پھر میری ایک ہندو افسر سے لڑائی ہو گئی اور اس نے مجھے دہلی ٹرانسفر کرا دیا۔ نئی نئی ملازمت تھی۔ ہندو اعلیٰ ملازمتوں پر قابض تھے اور ان کی حکومت تھی چنانچہ میں عملاً فٹ بال بنا رہا۔ ایک کک میں ادھر دوسری میں ادھر۔ ہر سال بستر باندھنا پڑتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک انگریز افسر کی مداخلت پر یہ چکر ختم ہوا۔ تقریباً چھ سال بھائی وزیر خان مرحوم سے کوئی تعلق نہ رہا۔" پھر انہوں نے میرٹھ کے چند لوگوں کے نام بتائے جو والد صاحب کو جانتے تھے۔ ان میں سے دو مر چکے تھے۔ ایک کے بارے میں انہیں خبر تھی کہ ہانگ کانگ چلا گیا۔ باقی نہ جانے کہاں تھے کہ پھر کبھی نہیں ملے۔ انہوں نے میرے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے خیال کو پسند نہیں کیا لیکن میں نے کہا کہ دوبارہ کیا ان کا تو سرے سے پوسٹ مارٹم ہوا ہی نہیں تھا اور قبرستان میں گورکن کے رجسٹر میں موت کی وجہ "ہارٹ فیل" لکھی ہوئی ہے جو بظاہر غلط ہے اس لیے کہ والد مرحوم کو گٹھیا کا عارضہ تو تھا مگر بلڈ پریشر جیسی کوئی شکایت نہ تھی۔ تو شیروانی صاحب نے کہا۔ "پھر ٹھیک ہے۔" اس کے بعد میں نے تازہ ترین واردات سے پیدا ہونے والے مسئلے کا ذکر کیا۔ وہ حسب توقع پہلے توجہ سے سنتے رہے اور پھر برہم ہوئے کہ آخر اس حماقت کی کیا ضرورت تھی۔ موجودہ حالات میں تو تمہیں نامعقولیت سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے اور تجربات سے سبق حاصل کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ پھر انھوں نے کہا کہ اب مجبوری ہے تو وہ جھوٹ بھی بولیں گے، خواہ اس سے فائدہ ہو یا نہ ہو۔

"مجھے تو بہت افسوس ہے کہ تم نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔" انہوں نے کہا۔ "محسن خود اپنی ضد سے گیا تھا کیونکہ تم والد کی ضد سے مجبور تھے۔ میں اس کو ہرگز واپس نہ بلاتا مگر اس کی ماں ... تم جانتے ہو عورتوں کے لیے منطق بے معنی چیز ہے۔ اس کو یقین تھا کہ محسن لندن میں رہا تو قتل ہو جائے گا۔ پھر میں کیا کرتا۔ وہ تو اب بھی مصر تھی کہ واپسی میں لڑکے کو ساتھ لے آنا مگر میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تم دونوں نے رہائش کا کیا انتظام کیا ہے؟"

ہم نے انہیں مطلع کیا کہ آج رات تو اسی ہوٹل میں قیام

کریں گے۔ کل بندوبست ہو جائے گا۔ ایک دوست کے مکان کا اوپر والا حصہ خالی ہے۔" محسن نے ان کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور جب شیروانی صاحب نے پتا نہیں مانگا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر گھڑی دیکھ کے انہوں نے روم سروس سے تین افراد کا کھانا طلب کیا اور جب کھانا آ گیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے دوسرا مسئلہ بیان کیا۔ خلاف امید وہ خفا نہیں ہوئے اور کہا کہ ان حالات میں اپنی حفاظت کا انتظام ضروری ہے ... "لائسنس کے لیے میں ضامن رضوی سے بات کر لوں گا۔" انہوں نے کہا۔ "مگر ریوالور ہاتھ میں آ جائے تو دنادن گولیاں مت چلاتے پھرنا۔ جب آدمی کے ہاتھ میں طاقت ہو تو اسے زیادہ محتاط رہنا پڑتا ہے۔" اس کے بعد ہم انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ گئے اور چلتے چلتے انہوں نے پھر تاکید کی کہ ہم عقل اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ وکیلوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائیں اور انہیں وقتاً فوقتاً فون کرتے رہیں۔ جب جہاز ٹیک آف کر گیا تو ہم واپس ہوئے ایئرپورٹ پر تلاش کرنے کے باوجود کوئی آشنا نہ ملا جسے ہم گواہ بنا سکتے۔

"یار سکندر!" محسن نے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ کے کہا۔ "واقعی اس وقت ڈیڈی کو بتاتے کہ خیر سے واپسی پر ہم ایک اور معرکہ سر کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں تو وہ ضامن رضوی کو فون کرتے اور کہتے کہ ان دونوں کو آج رات کہیں بند رکھو اور اس فوجداری کو اٹھوا لو۔ مگر اب یہ سوچ لے۔ خدانخواستہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ڈیڈی کی حمایت حاصل نہیں رہے گی۔"

"اب یہ جتنے باپ ہوتے ہیں سب باہر سے سخت ہوتے ہیں اندر سے ان کا دل اولاد کے لیے موم ہوتا ہے۔ بالکل تربوز کی طرح۔" میں نے کہا۔ "ان کی سب سے بڑی مجبوری ہی یہ ہوتی ہے کہ اچھے ہوں یا برے کسی بیٹے کو چھوڑ نہیں سکتے اور اس کمزوری کے باعث بلیک میل بھی ہوتے ہیں۔"

"مگر وہ بھی ہوتے ہیں جو بوجہ نافرمانی جائداد منقولہ غیر منقولہ سے عاق کر دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"نہ وہ انکل شیروانی جیسے والد ہوتے ہیں اور نہ ہم جیسے بیٹے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت میری نگاہ میر پر پڑی جو ٹیکسی میں بیٹھنے والا تھا۔

"ارے میر صاحب!" میں نے چلا کر کہا اور اس کی طرف یوں دوڑا جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست سے بغلگیر ہونا چاہتا ہوں۔ میر محمد ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ فرار ہونا چاہتے تھے لاہور سے؟"

"فرار تو واقعی ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر لاہور سے نہیں لاہور کی طرف۔ یہاں محسن کے والد کو سی آف کرنے آئے تھے۔ وہی جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ وہی شیروانی صاحب جو میرے ضامن نمبر ایک تھے۔ دیکھا تو جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اچانک تم نظر آ گئے اور ہمارا مسئلہ حل ہو گیا۔ ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دینا۔ ہم وہیں مقیم ہیں۔ مہنگا ہے مگر اچھا ہوٹل ہے۔ بڑے لوگ وہیں ٹھہرتے ہیں۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھ کے بولا۔ "ایمبیسیڈر ہوٹل تک مارچ کرنے سے بڑے لوگوں کی صحت بھی اچھی رہتی ہے۔"

ٹیکسی کے جاتے ہی میں نے قہقہہ مارا اور محسن سے ہاتھ ملایا۔ "کیسی بے سر و پا بکواس کی میں نے، سوچتا ہوگا نشے میں ہیں یا محض چھیڑ خانی کر رہے ہیں، مگر میں نے سب کچھ بتا دیا۔"

"یار یہ قابل اعتبار گواہ نہیں۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن چالاکی سے کام لے کر اس کی گواہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی معتبر شخص کے سامنے اس سے پوچھیں کہ رات کو ایئرپورٹ پر کیوں گھوم رہے تھے؟ یہ چڑ جائے گا اور جواب کچھ بھی دے مگر وہ اعتراف کے مترادف ہوگا کہ ہم سے ایئرپورٹ پر ملا تھا اور اگر ہم کہیں کہ ... ہمیں ایمبیسیڈر ہوٹل چھوڑ دیتے تو کیا ٹیکسی گھس جاتی؟ ظاہر ہے وہ کہے گا تمہارے جوتے گھس گئے کیا؟ یا ایسی ہی کوئی بات۔ مگر وہ معتبر شخص گواہ ہوگا تو میر کیسے انکار کرے گا کہ ہم سے ایئرپورٹ پر ملا ہی نہ تھا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے اور بعد کی بات ہے۔" میں نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بلا اجازت بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کی فکر کرو۔"

"کہاں جانا ہے جی آپ کو؟" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "پہلے پوچھ لینا چاہیے . . ."

"پوچھیں گے تم سے بعد میں۔" میں نے غرا کر کہا۔ "چلو دھرمپورہ پولیس اسٹیشن۔ اور میٹر ڈاؤن کر لو۔"

سو دو سو روپے کی سواری اٹھانے کی امید میں کھڑے ہوئے ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کرتے ہوئے تقدیر کو یقیناً کوسا ہوگا کہ ملے بھی تو پولیس والے، اور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ اصول پسند تھے ورنہ میٹر کا کرایہ دینے کی بجائے کسی بہانے اپنا نذرانہ بھی وصول کر لیتے۔ دھرمپورہ پولیس اسٹیشن پر ڈرائیور کو بیس روپے دے کر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ بہت پہلے میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آتا تھا۔ یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے دھرمپورہ کے بازار کو عبور کیا جو چھوٹی سی تنگ سڑک تھی۔ پھر ایک لق و دق میدان آگیا جس میں لکڑی کی ایک ٹال موجود پا کے میں نے اپنی سمت کے صحیح ہونے کا اندازہ کیا۔ موڑ پر مجھے رتن اسٹریٹ نمبر ۱۹ کا نیلا بورڈ نظر آیا جس پر سفید حروف چمک رہے تھے۔ ہم پرانی اینٹوں کے فرش والی گلی سے گزرے۔ محسن کچھ تشویش کا شکار تھا کہ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں مگر میں نے کہا کہ یہ راستہ شارٹ کٹ ہی نہیں کہ ہمارے لیے بہت محفوظ بھی ہے۔ اگر ہمارے دشمن منتظر ہوئے تو سڑک پر ہوں گے۔ ہم پیچھے سے ان کو جا لیں گے۔ گلی کے اختتام پر بائیں جانب دیوار تھی جو نہر کے دفاتر کے عقبی حصے کو دھرمپورے کی اس آبادی سے جدا کرتی تھی مگر بیرون جو بچے رہنے والوں نے اس دیوار میں ایک شگاف بنا لیا تھا اور اس غار کے دہانے جیسے شگاف سے گزر کے وہ براہِ راست سڑک پر طلوع ہوتے تھے، جہاں سے دن میں رکشہ وغیرہ مل جاتے تھے۔ کبھی نہر کے محکمے والے مستعد ہوتے تھے تو شگاف بند کر دیا جاتا تھا اور لوگوں کو تقریباً پون میل چل کے سڑک تک پہنچنا پڑتا تھا لیکن خود نہر کے محکمے کے اپنے ملازم جو سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے چند روز بعد دیوار کی اینٹیں پھر نکال دیتے تھے کیونکہ خود انہیں دھرمپورے کے بازار تک پہنچنے کے لیے دیوار پر سے کودنا یا ایک میل کا چکر کاٹنا گوارا نہ تھا۔

میں اور محسن سر جھکا کے دیوار کے خلا سے گزر گئے۔ دور دیہ سرونٹ کوارٹرز کی پتلی سی گلی کو طے کر کے ہم عین اس جگہ پہنچے، جہاں فومانچو نے ہمیں بلایا تھا۔ نہر کے دفاتر بند تھے اور لوگ باہر چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔ نہر کا گدلا پانی جس میں سارا دن بچے بڑے نہاتے تھے اور ہوا بھری ٹیوب پہ تیرتے تھے اب سکون سے بہہ رہا تھا۔ مخالف کنارے پر صرف ایک آدمی تھا جس نے تن کے کپڑے دھو کر پھیلائے تھے اور خود اندھیرے کی ستر پوشی سے مطمئن بیٹھا تھا۔ میں نے دائیں جانب چلنا شروع کیا۔ آگے نہر کا کنارہ بالکل سنسان ہو جاتا تھا اور پکی سڑک پر جھاڑ جھنکاڑ بڑھ جاتے تھے۔ مغلپورہ جانے والے دوسرے کنارے کی بڑی سڑک پر سفر کرتے تھے۔ فومانچو نے ملاقات کے لیے بہت محفوظ اور بہت خطرناک جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ الگ ہو جائے اور دس قدم پیچھے چلے۔ میں اب بہت محتاط تھا اور کوئی غیبی آواز یا میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ترکی ٹوپی اور شیروانی پہننے والا وضعدار بوڑھا فومانچو۔ جو آج دیکھنے والوں کو کارٹون لگتا ہے مجھے مل سکتا ہے زندہ یا مردہ۔ رات بالکل سیاہ اور ویران تھی۔ اوپر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور نیچے چند جھاڑیوں میں جگنو یوں دمک رہے تھے جیسے آسمان سے گر کے ستارے پتوں میں الجھ گئے ہیں۔ خاموشی میں جھینگروں کے وائلن بجانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کہتے ہیں جھینگر کی آواز لمبی مونچھ کو مونچھ پر رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور آدمی نے اسی کو دیکھ کر وائلن ایجاد کیا۔ اچانک پیچھے سے محسن نے چلا کر مجھے پکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر حملہ آور جو نہر کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے ایک جست میں اتنے قریب آگئے تھے کہ محسن نے وارننگ دینے میں ایک لمحے کی تاخیر کی ہوتی تو وہ مجھے بے خبری میں پیچھے سے آلیتے اور مجھے مقابلے کی مہلت نہ ملتی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر محسن کا دس قدم پیچھے چلنا ہماری زندگی کا ضامن بن گیا تھا۔ محسن کی آواز پر ان تینوں میں سے ایک لٹو کی طرح گھوما اور محسن کی طرف لپکا۔ دو نے مجھے یوں گھیرا کہ ایک میرے دائیں ہاتھ پر تھا تو دوسرا بائیں جانب اور میرے پیچھے ڈم ڈم کی جھاڑی تھی۔ اندھیرے میں ان کی صورتوں کے نقوش واضح نہ تھے۔ ان میں سے ایک نے اچھل کے میری گردن دبوچنی چاہی۔ میں نے اس کو غوطہ مار کے ایک ہاتھ سے اوپر اچھالا اور وہ نہر کے کنارے پر گرا۔ دوسرے نے لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑ جاتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا دانت ہل جاتے مگر تھوڑا سا جھک جانے کے باعث بوٹ کی ٹھوکر میرے شانے پر لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو مگر میں نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس شخص کی ٹانگ پکڑ لی۔ پنجہ گرفت میں آتے ہی میں نے اسے پوری قوت سے گھمایا اور وہ شاٹ پٹ کے گولے کی طرح اپنے اس ساتھی سے ٹکرایا جو نہر کے کنارے سے اٹھ کر مجھ پر پیچھے سے حملہ کرنے آیا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے اور ان کے اٹھنے تک میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا۔ اس کا حریف کچھ بھاری پڑ رہا تھا اور محسن پسپا ہونے لگا تھا۔ میرے دونوں حریف بجلی کی طرح پھر اٹھے اور ان میں سے ایک نے ہاتھ گھمایا تو مجھے اندھیرے میں بھی خنجر کے آبدار پھل کی دبی دبی چمک نظر آئی۔ میں نے اس کے وار کو کلائی پر روکا اور اپنی لات نصف دائرے میں گھمائی جو اس کے دوسرے ساتھی کے پیٹ پر پڑی۔ وہ کراہ کر پیچھے گرا اور میں نے خنجر بدست حملہ آور کے شانے پر کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار کیا۔ وہ

درد سے بلبلایا... خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور میں نے پاؤں کی ٹھوکر ماری تو خنجر غڑاپ سے پانی میں ڈوب گیا۔ وہ دونوں اچھل کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور مجھے نرغے میں لینے کے لیے میرے گرد گھومنے لگے۔ اب دوسرے بدمعاش نے اپنا خنجر نکال لیا تھا۔ اس نے زمین پر تھوک کے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ "تم اس منشی سے ملنے آئے تھے نا؟" وہ حقارت آمیز تمسخر سے بولا۔ "وہ تو گیا۔ نمک حرام۔" اور اس وقت میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر سیاہ جالی دار نقاب چڑھے ہوئے ہیں۔

"اور یہ خط دے گیا۔" دوسرے نے میری نظروں کے سامنے ایک لفافہ لہرایا۔ "ہمت ہے تو چھین لو۔"

"لفافے کی فکر مت کرو۔" میں نے ان پر نظر رکھتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ باتوں میں لگا کے میری توجہ نہ بٹانا چاہتے ہوں۔ "اس کی ایک نہیں دو نقلیں کل ڈاک سے مل جائیں گی۔" میں سمجھ گیا تھا کہ منشی سے ان کی مراد فومانچو سے تھی۔ کنکھیوں سے میں نے محسن کو دیکھا۔ اس نے اپنے مدمقابل کو ایک بار پیچھے دھکیل دیا تھا مگر دوسری بار اس نے سر جھکا کے محسن کو بیل کی طرح ٹکر ماری۔ محسن ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور نہر میں جا گرا۔ اسی وقت وہ دونوں پھر ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ خنجر لے کر چھلانگ لگانے والا ذرا آگے تھا۔ میں نے عین وقت پر غوطہ مارا اور وہ میرے سر پر سے گزرتا ہوا جھاڑی میں جا گرا۔ دوسرے کا مکا میرے سر پر لگا اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ پھر میں نے سر کو جھٹکا اور اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ کراہ کر دوہرا ہوا تو میں نے دونوں ہاتھ ملا کر اس کی ٹھوڑی پر نیچے سے اوپر کی جانب ضرب لگائی۔ وہ اچھلا اور سر کے بل نہر میں گیا۔ جھاڑی میں گھس جانے والا اب محتاط تھا اور خنجر کی نوک سامنے کیے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا گیا تاکہ محسن کے قریب ہو سکوں جسے اس کا حریف نہر کے پانی سے نکلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ جیسے ہی وہ کنارے کی طرف آتا تھا وہ لات مار کے محسن کو پھر پانی میں گرا دیتا تھا۔ شاید محسن نے اس کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا جوتا اتر گیا تھا ورنہ جوتوں سمیت ہر ٹھوکر سے محسن کا حلیہ بگڑ جاتا۔

خنجر والے نے اچانک جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ "یہ... یہ دیکھو..." وہ خباثت سے بولا۔ "کیا ہے یہ؟"

میرا خیال تھا اس نے زمین پر سے کوئی پتھر اٹھایا ہے اور میں نے خود کو ضرب سے بچانے کے لیے سر کے سامنے ایک ہاتھ کو ڈھال بنا لیا تھا مگر میری نظروں کے سامنے دو ہاتھ تھے۔ ایک ہاتھ میرے دشمن کا تھا۔ دوسرا ہاتھ کسی کا بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ہاتھ تھا، کلائی کے پاس سے کٹا ہوا۔ میں نے نظر جما کے دیکھا۔ شاید مجھے ایک کے دو نظر آنے لگے ہیں مگر یہ نگاہ کا دھوکا نہیں تھا۔ میرے مدمقابل کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس نے انگلی کی پور سے ایک سالم انسانی ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ ہاتھ جو کسی بازو سے منسلک رہا ہوگا اور وہ بازو کسی جسم کا حصہ ہوگا اور وہ جسم کسی میرے جیسے ہی انسان کا ہوگا۔ مگر اب میری نظر کے سامنے وہ ایک ہاتھ تھا جو نقش فریادی تھا۔ انصاف کا طالب تھا۔ ظلم و بربریت پر نوحہ کناں تھا۔

"کس کا ہاتھ ہے یہ... پہچانا؟" وہ بولا۔ "یہ ایک غدار نمک حرام کا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ سے اس نے خط لکھا تھا۔ تمہیں رقعہ پہنچایا تھا۔" وہ ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ آسمان کی طرف اٹھا، فریاد کرتا ہوا، احتجاج کے انداز میں۔ مدد کے لیے۔ پھر نیچے آیا اور پانی میں یوں گرا کہ آواز پہ مجھے قہقہے کا گماں ہوا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ میں صرف ایک ہاتھ ہوں۔ ستر سال تک میں نے منشی گیری کی۔ قلم سے ہی کماتے لکھتا رہا۔ اعداد و شمار سے نفع و نقصان کے گوشوارے بناتا رہا۔ میں نے کسی کا حق نہیں چھینا، کسی کی عزت نہیں لوٹی اور کسی کی جان نہیں لی۔ میں سقراط کا ہاتھ ہوں جس نے سچ بولنے پر زہر کا پیالہ اٹھایا تھا۔ میں نے یہی جرم کیا تھا کہ سچ لکھا تھا۔ سچ کیا ہے۔ یہ تم کل جان لو گے۔ مگر کل صرف تمہارے لیے آئے گی یا ان کے لیے جنہوں نے مجھے جسم سے اور جسم کو جان سے جدا کیا۔

صدمے اور اشتعال کی ایک لہر نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں بجلی کی طرح اس سفاک درندے پر ٹوٹ پڑا جس کے ہاتھ میں ایک انسانی ہاتھ کسی آدم خور بھیڑیے کے منہ میں دبا ہوا نظر آتا تھا۔ مجھے خنجر کی نوک اپنے شانے سے بازو تک خراش ڈالتی ہوئی محسوس ہوئی، لیکن اب وہ میری گرفت میں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کلائی پر سے موڑا اور اس کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ چلایا اور میں نے اس کی پسلیوں پر گھٹنا مارا۔ "خونی، درندے۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا اور پلک جھپکتے میں اس کو سر پر سے گھما کر نیچے دے مارا۔ میرے متواتر مکوں نے اسے نیم جان کر دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اب اس کے سینے پر سوار تھا اور عین ممکن تھا کہ میں اس وحشت کے عالم میں اس کا گلا گھونٹ دیتا یا اس کی گردن توڑ دیتا، مگر اسی وقت محسن نے چلا کے مجھے پکارا اور میں ہوش میں آگیا۔ محسن زمین پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کا حریف گھٹنوں سے اس کی کمر دبائے محسن کا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو محسن کی گردن ٹوٹ جاتی۔ میں نے گھما کر اس کے سر پہ لات ماری اور وہ بھد سے منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے مُردے کی طرح ساکت پڑا دیکھا اور محسن کو اٹھایا۔

"تو... تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کو پھر زمین پر لٹا کے میں نے پیچھے دیکھا خنجر لے کر حملہ کرنے والا پہلا شخص نہر میں گرا تھا تو پھر نہیں نکلا تھا۔ وہ ڈوب گیا تھا یا پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتا ہوا فرار ہو گیا تھا۔ دوسرا شخص مہلت سے فائدہ اٹھا کے نہر میں کود گیا تھا اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو سیدھا کر کے لٹایا اور اس سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں، وہ میرا یہیں انتظار کرے۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے بیہوش پڑے ہوئے شخص کو جھاڑی کے پیچھے ڈالا اور محسن کو دوسری جھاڑی کے پیچھے لٹایا۔ اب اتفاق سے کسی گزرنے والے کو کچھ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ پھر میں نہر میں کود گیا۔

وہ شخص نہر کے دوسرے کنارے پر اتر کے سڑک عبور کر چکا تھا اور اس میدان کی طرف بھاگ رہا تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک پرانے مقبرے کی خستہ حال عمارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک کمرہ اور اس پر ایک گنبد۔ دروازوں کی جگہ خلا اور پرانی اینٹوں کی بوسیدہ دیواریں جن کا مسالہ نکلتا جا رہا تھا اور اینٹوں کے درمیان گہری لکیریں سی نمودار ہو رہی تھیں۔ یہ جگہ میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ مقبرہ کس کا ہے جسے آثارِ قدیمہ والوں نے بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس ویرانے میں رات کے وقت وہ تنہا عمارت بھوتوں کا مسکن لگتی تھی اور اندھیرے میں مجھ سے سو قدم کے فاصلے پر وہ شخص دوڑ رہا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہی مندری والا ہے۔ اس کے چہرے کی نقاب میرے مکوں سے پھٹ گئی تھی اور جب میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا تھا تو مجھے وہ بال گھنگھریالے لگے تھے۔ ایک بار مجھے یہ شبہ بھی ہوا تھا کہ میرا ہاتھ کان کی لو پر کسی دھات سے ٹکرایا ہے جو کانوں کے مقابلے میں ٹھنڈی تھی۔ یہ دھات وہی پیتل یا سونے کی مندری ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں نظر نہ آنے والے ایک گڑھے میں گرا۔ میرے پیر میں موچ آگئی تھی یا گھٹنے کے قریب سے پیر مڑ گیا تھا کہ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹیس نے میری ٹانگ کو مفلوج کر دیا۔ میں مشکل تمام سے نکلا اور اس ویران مقبرے کی طرف بڑھا۔ دشمن اگر کی تاریکی میں نہیں تھا تو فرار ہو چکا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر مجھے مقبرے کے سیاہ وجود میں دھندلے سے اجالے کا ہوا جو اس کے بغیر پٹ والے دروازے کے خلا میں پھیلا تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چبوترے پر چڑھا تو شبے کی کوئی بات مقبرے میں کسی موم بتی کا یا دیے کا اجالا تھا۔ اندر سے چمگادڑوں کے چلانے اور پھڑپھڑا کے اڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یاد آیا کہ آج جمعرات ہے۔ یہ کسی فقیر کا مسکن تھا یا کسی نے اپنی مراد مانگنے کے لیے اس قبر پہ ایک دیا لا کے جلا دیا تھا۔

دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دیا آخری گوشے میں روشن تھا اور ایک لاش کے سرہانے رکھا تھا جو فرشِ خاک پر گھاس پھوس، تنکوں اور اینٹوں پر چت لیٹی تھی۔ یوں جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر سکون کی گہری نیند میں ہو۔ ساٹھ ستر سال کے اس بوڑھے نے میلی سیاہ شیروانی پہن رکھی تھی جس کے بٹن ادھڑے ہوئے تھے۔ علی گڑھ کٹ پجامہ اور پالش سے بے نیاز براؤن جوتے، سر کو ڈھانپے رکھنے والی ترکی ٹوپی ڈبے کے قریب پڑی تھی اور لاش کا دایاں ہاتھ غائب تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا اور میری رگوں میں دوڑنے والا لہو بھی منجمد ہو گیا۔ وقت ساکت ہو گیا اور اچانک اس لاش نے ٹنڈ منڈ کلائی اٹھا کے کہا۔

"السلام علیکم جناب سکندر بخت صاحب! آپ نے کمال کر دیا۔ یعنی یہ خوب ہے کہ کمرہ نمبر دو سو تین کی بجائے آپ تین سو دو سمجھتے رہے۔ بھئی خوب سمجھے ماشاء اللہ۔ یہ دو ہی کا کیس تھا۔ خوب رہی یہ ملاقات بھئی۔ اجی آپ کیا سوچ رہے ہیں حضت؟ پہچان نہیں پائے مجھے شاید؟ خاکسار کو نوما بخو کہتے ہیں۔ منشی بھی کہتے تھے لوگ۔ دیکھ لیجیے تھا پورا کارٹون۔ ہا ہا ہا... کیا خیال ہے آپ کا؟ قبلہ میں پلٹ کر بھاگا۔ چمگادڑیں چیخ چیخ کر مجھ پر ہنسنے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی کہ کہیں وہ دشمن پھر بے خبری میں مجھ پر حملہ نہ کر دے مگر وہ تو رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو چکا تھا۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے نہر تک کا فاصلہ طے کیا اور ایک بار پھر چند گز کا فاصلہ تیر کر طے کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچا جہاں محسن آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ میں دھڑام سے اس کے پاس گر گیا۔

"سکندر!" اس نے مجھے جھنجھوڑا۔ "سکندر... کیا بات ہے... تو زخمی ہے؟" اس نے میرے بازو سے ہاتھ پر لگ جانے والے خون کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس بحال ہونے لگے۔ میں نے اپنے وجود کو گھسیٹ کر نہر کے قریب کیا اور سبزے پر پیر پھیلا دیے۔ "محسن!" میں نے کہا۔ "محسن انہوں نے... انہوں نے نوما بخو کو بھی مار دیا۔"

"مار دیا؟" محسن کے حلق سے دہشت آمیز سرگوشی نکلی۔ "کب... کہاں...؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں تعاقب کی روداد سنا دی۔ "میرا خیال ہے محسن! یہ وہی مندری والا ٹیکسی ڈرائیور تھا۔"

محسن خاموش بیٹھا رہا۔ میرے اور اس کے خیالات، وسوسے اور اندیشے ایک تھے جن کی بازگشت ہمارے کان ہر سمت سے سن رہے تھے۔ "اس خط کا کیا ہوا سکندر جو... جو نوما بخو ہمیں دینا چاہتا تھا؟" اس نے بالآخر کہا۔

"وہ... وہ لے گیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے مجھے خط دکھایا تھا... اور نوما بخو... اس غریب منشی کا ہاتھ۔ صرف ہاتھ۔ اگر وہ میرے ہاتھ آ جاتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔"

دس منٹ بعد ہم نے مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ تین دشمنوں میں سے ایک نہر میں ڈوب گیا تھا یا تیر کر نکل گیا تھا۔ دوسرا مقبرے کی جانب فرار ہوا تھا اور تیسرا ابھی تک کنارے پہ بے ہوش پڑا تھا۔ میرے شانے پر گہری خراش آئی تھی جس میں سے اب بھی لہو رِس رہا تھا اور میرے کپڑوں کو تر کر رہا تھا۔ محسن کو بھی چوٹیں آئی تھیں اور اس کا ایک بازو بے کار ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرا ایک پاؤں بے کار ہو گیا تھا۔ ہمارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور اس حالت میں ہم سڑک تک چل کے جاتے تو یقیناً پکڑے جاتے۔ کوئی گشت کرنے والا سپاہی یا چوکیدار ہماری حالت دیکھ کر ہمیں سیدھا تھانے لے جاتا۔ ہمارا کسی رکشہ میں بیٹھ کے ایمبیسیڈر ہوٹل جانا بھی ناممکن تھا۔ رکشہ بھی ہمیں علامہ اقبال روڈ پر پل تک پہنچے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس رابعہ کا کارڈ ہے۔ اسے فون کرنا ممکن ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا مگر اس وقت قرب و جوار میں فون کہیں نہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے محکمۂ نہر کے دفتروں کو دیکھا جن کے دروازے بند پڑے تھے اور برآمدوں میں بلب جل رہے تھے۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "ان دفتروں کا کوئی چوکیدار ضرور ہوگا اور اس کے پاس کمروں کی چابی ہوگی۔ کسی افسر کے کمرے میں ٹیلیفون بھی ہوگا۔ میں چل نہیں سکتا۔ تو ہمت کر اور کسی چوکیدار کو دیکھ۔ وہ کسی برآمدے میں پڑا سو رہا ہوگا۔ اسے پچاس روپے یا سو روپے دے اور کسی افسر کا کمرہ کھلوا۔ میرے بریف کیس میں رابعہ کا کارڈ ہے، اسے فون کر دے۔ آدھے گھنٹے تک گھنٹی بجنے دینا۔ کوئی تو اٹھے گا۔ اگر رابعہ خود آئے تو اس کو بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں ورنہ اسے بلوا لینا۔ کہنا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے... وہ کار لے کر آ جائے گی اور ہمیں لے جائے گی۔ اس کے سوا ہمارے یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔"

محسن نے بریف کیس کھولا لیکن اندھیرے میں ایک کارڈ کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بریف کیس ساتھ لے جائے اور برآمدے کی روشنی میں اطمینان سے کارڈ تلاش کرے۔ اس نے سر ہلایا اور بریف کیس بند کر کے چل پڑا۔ میں اسے سو گز دور نہر کے دفتر کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب رابعہ آئے گی تو ہم اسے کیا بتائیں گے؟ اپنی اس حالت کا کیا سبب بیان کریں گے؟ کیا اسے تمام واقعات سے باخبر رکھنا دانشمندی ہوگی؟ کہتے ہیں ڈاکٹر سے اور وکیل سے بات چھپائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے۔ رابعہ خاموش رہنے پر رضامند نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ وہ پولیس کو فون کرے گی کہ فلاں جگہ مقبرے میں ایک لاش پڑی ہے۔ فلاں جگہ دیکھو شاید نہر میں ایک آدمی ڈوبا ہوا ملے۔ وہیں کنارے پر تیسرا آدمی بے ہوش پڑا ہوگا۔ پھر پولیس آئے گی، تفتیش شروع ہوگی اور ہم کیا بتائیں گے کہ ہم اس میں کیسے ملوث ہوئے۔ شیروانی صاحب تو بعد میں پوچھیں گے کہ مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی۔ پہلے پولیس سوال کرے گی کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ اگلا مرحلہ سلامت شاہ کی لاش کے بارے میں انکشاف کا ہوگا۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ میں اس گھر میں کودا تھا اور محبت خان گواہی دے گا۔ پھر اس خط کا کیا بنے گا جو کل کی ڈاک سے آنے والا ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ سوالات کی بھرمار سے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا ہے۔

میں نے اٹھ کر اس شخص کو دیکھا جو میری لات لگنے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ اس کی نبض ساکت تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی خاموش تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت بھی بند تھی۔ دنیا میری نظروں کے سامنے یوں گھومنے لگی جیسے میں چکر کھانے والے ہنڈولے میں بیٹھا ہوں۔ پھر میں نے اپنی حالت پر قابو پایا اور لنگڑاتا ہوا اس جگہ سے دور بھاگنے لگا جہاں میرے ہاتھوں مارے جانے والے کی لاش پڑی تھی۔ ایک قتل کا الزام مجھ پر پہلے ہی تھا۔ یہ دوسرا قتل میں نے واقعی کیا تھا۔ اپنے دفاع میں کیا جانے والا قتل بھی تو قتل ہی ہوتا ہے۔ صفائی تو بعد میں پیش ہوگی۔ پہلے تو میری ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور میں پھر جیل میں بند ہو جاؤں گا۔ محسن مجھے راستے میں ملا۔ "وہ آرہی ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔ "چوکیدار نے سو روپے لیے ہیں۔"

"تو نے اسے تفصیلات تو نہیں بتائی ہیں؟" میں نے کہا۔ محسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ بدمعاشوں سے مقابلے میں ہم زخمی ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ کچھ بتانا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص جو نہر کے کنارے پڑا تھا نا... وہ مر گیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا یار!" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اگر وہ نہر میں گرنے والا بھی ڈوب گیا ہوگا تو یہ دونوں قتل ہماری فردِ جرم میں شامل ہو جائیں گے۔"

"ہماری نہیں صرف میری۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کی موت کا سبب میں ہوں۔"

"فضول باتیں مت کر۔" محسن نے کہا۔ "حملہ ہم دونوں پر ہوا تھا۔ ہم نے اپنا دفاع کیا۔ جنگ میں دشمن کی جان لینے میں قانون کے خوف سے تامل کرنے کا مطلب ہے خودکشی۔ جیسے تو نے میرے دشمن کو مار کے میری جان بچائی ایسے ہی یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے موقع ملتا تو میں تجھ پر دشمن کو غالب پاتا تو اس کو مار دیتا، یا انہیں موقع ملتا تو صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور اس وقت ہم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوتیں۔ ہمارے دشمن ایک تھے۔ ان کے خلاف ہماری جنگ بھی ایک تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بچ جانے والا بے گناہ ٹھہرے اور بچانے والا مجرم بن جائے۔"

"تیری دلیل مان لی جائے تب بھی دفاع میں قتل کرنے پر قانون کی رعایت حالات کی شہادت پر ملتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ثابت ہوگا کہ ہم پر حملہ کیا گیا تھا اور ... کے دوران وہ مارے گئے؟ کون گواہ ہوگا اس بات کا ... اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ہم یہاں ... سیدھے تھانے جائیں۔ تمام واقعات بیان کریں اور ... کو قانون کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد قانونی کارروائی ... سلسلہ شروع ہوگا اور پولیس کا ہی نہیں پریس اور پبلک ... ردِعمل کیا ہوگا؟ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل نے ضمانت ... رہا ہونے کے چند گھنٹے بعد دو افراد کو موت کے گھاٹ ... دیا۔" اس بار میری ضمانت نہیں ہو سکے گی محسن! اس کے ... بعد مقدمے کی سماعت کے دوران میرا سابقہ ریکارڈ ... کے سامنے رکھا جائے گا۔ میری وجہ سے لندن میں ایک ... قتل ہوئی اور میں ایک گواہ کی معتبر شہادت پر بچ گیا ... ہوسٹل کے کمرے میں بم رکھنے کا الزام ناکافی ثبوت کی بنا ... ثابت نہ ہو سکا۔ مجھے لندن سے ڈی پورٹ کیا گیا اور ... پہنچتے ہی میں نے میر شرافت علی کے گھر میں گھس کر مار پیٹ ... کے بعد اسے قتل کر دیا۔ انصاف کرنے والے مجھے کس ... سے نہیں دیکھیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہاں سے دھواں ... اٹھتا ہے وہاں آگ تو ہوتی ہی ہے۔ آخر میرے ساتھ ... درپے یہ واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟ کیا ان سے میری معصومیت ... کی دلیل ملتی ہے؟ شریف آدمی تو بلاوجہ ایسے معاملات ... ملوث نہیں ہوتے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "رابعہ کو کچھ نہ بتانا ... بھی مشکل ہے، اور بتانا بھی۔"

"میرے ذہن میں نجات کی ایک ترکیب ہے۔" ... نے کہا۔ "ہم اس دوسرے شخص کو بھی نہر میں ڈال دیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔ "لاشیں تو پولیس ... کو کل ایک ساتھ مل جائیں گی۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا ... قتل ایک ہی وقت میں ہوئے۔"

"ہاں، مگر کسی نے قتل ہوتے تو نہیں دیکھا۔" ... نے کہا۔ "کسی نے ہمیں لڑتے ہوئے تو کیا آج سے پہلے ہم ... ان کے ساتھ تک نہیں دیکھا۔ اگر ان کے جسم پر ہمارے ... پرنٹ وغیرہ ہوں گے تو پانی میں مٹ جائیں گے۔ دوسری ... بات یہ کہ کسی خنجر پر ہمارے فنگر پرنٹ نہیں ہیں۔ ایک ... خنجر نہر کے کنارے پڑا ملے گا تو اس پر انہی میں سے ایک ... کے فنگر پرنٹ ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ ان میں سے کوئی ... خنجر کے یا گولی کے زخم سے ہلاک نہیں ہوا۔ ایک مار پیٹ ... کے دوران نہر میں جا گرا اور دوسرا غالباً سر کی اندرونی چوٹ سے مرا۔ پوسٹ مارٹم میں یہی بات سامنے آئے گی کہ دونوں کے جسم پر مار پیٹ کے نشانات پائے گئے۔ غالباً ان کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوا جس میں ایک نے خنجر بھی نکالا مگر اسے حریف نے وار کامیاب نہ ہونے دیا اور کلائی کی ہڈی توڑ دی۔ پھر ان میں سے ایک پانی میں جا گرا اور شاید دوسرا سر کی چوٹ سے بے ہوش ہوا اور کیونکہ وہ کنارے پر تھا اس لیے مرا تو نہر میں گر گیا۔ نہ ان کے پاس ہماری کوئی چیز تھی اور نہ جائے واردات پر ہماری موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ پولیس جو نتیجہ چاہے اخذ کرے جس شخص کے پاس فوما پخو کا خط تھا وہ تو خط لے کر بھاگ گیا ہے اور ظاہر ہے ہمارے خلاف رپورٹ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وہ سامنے آنے پر مجبور ہوگا اور یہ معاملات اس کے گلے پڑ جائیں گے۔"

"کل صبح تین لرزہ خیز قتل ہونے کی خبر خاصی سنسنی پھیلائے گی۔ اور اگر سلامت شاہ کی لاش بھی مل گئی تو چار قتل۔"

"میرا خیال ہے پہلے یہی دو لاشیں نہر سے ملیں گی۔" میں نے کہا۔ "فوما پخو کی لاش شاید کل نہ ملے، یا دیر سے ملے تو خبر شاید کل نہ آسکے۔ یہی صورتِ حال سلامت شاہ کی ہے۔ ہو سکتا ہے کل پرسوں تک کسی کو تعفن کا احساس نہ ہو۔ لاش صندوق میں بند ہے اور کوٹھیاں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ان چاروں کے درمیان پولیس کوئی تعلق قائم نہ کر سکے گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "تو چلیں پھر اسے ٹھکانے لگا دیں۔ رابعہ آتی ہی ہوگی۔"

ہم دونوں واپس ہوئے۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ شخص ابھی تک جھاڑیوں کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کے نہر میں پھینکا اور وہ لکڑی کے لٹھے کی طرح پانی میں گرا۔ ہم نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی چنانچہ وہ کنارے سے کچھ دور ہو گیا تھا اور اب نہر کے خاموش، بہتے پانی کے رحم و کرم پر تھا جو دوسری لاش کو بہا کر آگے لے جا چکا تھا۔ واپس ہونے سے پہلے میں نے خنجر تلاش کیا اور اسے بھی نہر میں پھینک دیا۔

"رابعہ کو اب صرف یہ بتانا ہے کہ حملہ آور ہمیں لوٹنا چاہتے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے اور ہم نے مقابلہ کیا تو بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔

"اور پرسوں صبح کے اخبار میں وہ دیکھے گی کہ دو لاشیں وہیں سے دستیاب ہوئی ہیں جہاں سے وہ ہمیں لے گئی تھی تو کیا اسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ دونوں مقتول وہی ہیں جو ہمیں لوٹنا چاہتے تھے؟" محسن نے کہا۔ "اسے شک نہیں ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا؟ اور ڈاکو فرار نہیں ہو سکے تھے بلکہ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب دونوں لاشیں ایک جگہ نہیں رہیں گی۔ آدھے پونے گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے بہتی جا رہی ہیں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک لاشیں اس آباد علاقے سے گزر کے چھاؤنی کی طرف جانے والی نہر میں ایک دو میل ضرور جا چکی ہوں گی۔ اور دریافت ہونے تک نہ جانے کہاں ہوں گی۔ یہاں ہر شخص اتنا فرض شناس اور قانون پرست شہری نہیں ہے کہ لاشوں کو دیکھتے ہی سیدھا پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ کرے۔ زیادہ تر لوگ دہشت زدہ ہو کے بھاگ لیں گے اور خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑنے سے گریز کریں گے۔ بالآخر لاشیں مال روڈ کے پل کے جنگلے میں اٹک جائیں گی اور وہاں مجمع اکٹھا ہوگا تو کوئی پولیس کو بھی بلا لے گا۔ پولیس سے یہ توقع مت رکھ کہ وہ نہر کے ساتھ ساتھ کئی میل واپس آ کے ایک ایک انچ کا علاقہ اس امید میں چھان مارے گی کہ کہیں جدوجہد کا سراغ ملے۔ لہو کے داغ یا شکستہ جھاڑیاں اور روندی ہوئی زمین دکھائی دے تو وہ اصل جائے واردات کا تعین کر لے گی۔ نہر میلوں لمبی ہے اور دونوں کنارے ملا کر سینکڑوں میل کا علاقہ خوردبین سے نہیں دیکھا جا سکتا۔"

"میرا خیال ہے اس سے آگے جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے رکتے ہوئے کہا۔ "نہر کا پل اب مشکل سے سو گز دور رہ گیا تھا۔" رابعہ ادھر آئے گی تو کار کی ہیڈ لائٹس میں ہمیں دیکھ لے گی۔"

"مجھے تو فوما پخو کی موت کا افسوس ہے۔" میں نے رکتے ہوئے کہا۔ "آخر وہ دشمنوں کے ہتھے کیسے چڑھ گیا۔"

"انہوں نے یقیناً عدالت سے ہمارا تعاقب کیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ ضمانت پر رہائی کے بعد ہم کدھر جاتے ہیں۔ ہم رابعہ کی کار میں تھے۔ شاید فوما پخو ٹیکسی میں ہمارے پیچھے تھا اور وہ فوما پخو کے پیچھے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ فوما پخو نے ہمیں کوئی پیغام دیا ہے اور وہ اسے پکڑ کے لے گئے ہوں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو ہماری لاشیں بھی وہیں پر ملتیں۔ وہ دیا انہوں نے اسی لیے روشن کیا ہوگا کہ ہمیں اس ویرانے میں لے جا کر اذیت دیں۔ ہم سے پوچھیں کہ ہم کیا کچھ جانتے ہیں اور پھر قتل کر کے چھوڑ جائیں۔ اس دیے کی روشنی باہر سڑک پر سے گزرنے والا کوئی شخص دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہماری فریاد و فغاں کسی کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کانوں تک کہاں پہنچتی ہے؟"

"معلوم نہیں نوما یجو مرحوم کس کا منشی تھا؟" محسن نے کہا "اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو کچھ پیش رفت ہو سکتی ہے۔"

اسی وقت گڑھی شاہو کی طرف سے ایک کار نمودار ہوئی جو اس سے پہلے نظر آنے والی اکا دکا کاروں کی طرح دھرمپورے کی طرف جانے کی بجائے نہر کا پل عبور کرتے ہی بائیں جانب مڑ گئی اور میں نے پل پر لگی ہوئی اسٹریٹ لائٹ کے اجالے میں رابعہ کی سرخ فاکس ویگن کو پہچان لیا۔ ہم دونوں نے کار کے قریب آتے ہی سڑک کے وسط میں آ کے ہاتھ کا اشارہ دیا اور کار ہمارے پاس آ کے رک گئی۔

رابعہ سوتے سے اٹھ کر آئی تھی چنانچہ اس کی آنکھوں میں نیند کا اثر باقی تھا۔ سیٹ کیے ہوئے بالوں کو برش کیے بغیر وہ سادہ سوتی شلوار قمیض میں چپل پہن کے نکل آئی تھی۔ کار کو پچاس پچپن سال کا ایک بوڑھا شوفر چلا رہا تھا۔

"تم... تم تو زخمی ہو... بہت زیادہ چوٹ آئی ہیں کیا؟" وہ اترتے ہی بولی۔ پھر اس نے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لیا جو مار پیٹ میں کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں گھر لے چلو۔ پھر سب بات بتا دیں گے۔"

"میں تمہیں گھر لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "مگر مجھے یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟"

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش تھے ہمیں لوٹنا چاہتے تھے۔"

"مگر تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے تھے؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولی۔ "اور وہ بدمعاش کہاں گئے؟"

"ہم نے مقابلہ کیا تو بھاگ گئے۔" محسن نے کہا۔ "انہوں نے دور سے ایک تانگہ آتے دیکھ لیا تھا۔"

"یہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم محسن کے ڈیڈی کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ واپسی پر اس سے ملنے چلے گئے تھے۔"

رابعہ نے دروازہ کھول کے سیٹ آگے کی اور ہم دونوں پیچھے والی نشست پر بیٹھ گئے تو رابعہ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ "زخم خطرناک نہیں ہیں تب بھی پولیس میں رپورٹ لکھوانی ضروری ہے۔" وہ بولی۔ "پولیس سرجن سے میڈیکل رپورٹ لینی ہوگی۔"

"نہیں مس رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"لیکن سکندر! یہ رہزنی اور اقدام قتل کا کیس ہے" وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں مگر مجھے نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ میری آج ہی... میرا مطلب ہے گزشتہ روز ہی میری ضمانت ہوئی ہے۔ اب میں کسی کیس میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔ تمہارے گھر میں ڈیٹول وغیرہ تو ہوگی۔ ہم خود مرہم پٹی کر لیں گے۔"

وہ مطمئن نہیں ہوئی لیکن خاموش ہو گئی۔ میں اور محسن اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ باہر رات کے آخری پہر میں شہر کی فراواں مخلوقِ فکرِ فردا و غمِ دوش سے بے نیاز لذتِ خوابِ سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گڑھی شاہو کی دکانوں کے تھڑوں پر چارپائیاں ڈال کے لیٹے ہوئے لوگ، کوچہ و بازار کے بام و در، سائن بورڈ اور اسٹریٹ لائٹ کے ٹمٹماتے بلب۔ درخت اور ٹیلی فون کے کھمبے — فٹ پاتھ، گلیاں اور چوراہے سب سوتے پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی دودھ کے ڈرم لے جانے والا کوئی ریڑھا گزر جاتا تھا جس کے گھوڑے کے سُموں کی آواز خالی سڑک پر دیر تک گونجتی رہتی تھی۔ جا بجا آوارہ کتے اور فقیر فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے تھے۔ بس سروس کی ایک بس دھواں چھوڑتی کھڑکھڑاتی گزر گئی۔ گشت کرنے والے دو سپاہی رائفلیں اٹھائے ٹہلتے نظر آئے۔ دو نوجوان سڑک خالی پا کے سائیکل پر تیز رفتاری کے مقابلے میں مصروف بڑے جوش و خروش سے پیڈل چلاتے گزر گئے۔ دونوں اخبار فروش لگتے تھے۔ کار کراؤن سینما کے چوک سے بائیں جانب مڑی۔ سینما کی رنگین روشنیوں سے جگمگانے اور تماش بینوں کے اژدہام سے گونجنے والی اور پُرکشش پوسٹروں سے مزین عمارت سنسان پڑی تھی اور احاطے میں صرف ایک لائٹ جل رہی تھی۔ کار فرلانگ بھر چلنے کے بعد ایک کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کے بند پھاٹک کھولا، کار کو آگے لے گیا۔ اتر کے واپس پھاٹک بند کرنے گیا اور کار کو پورچ میں لے جا کر روک دیا۔

"بابا!" رابعہ نے شوفر سے کہا۔ "دیکھو مہمانوں کا کمرہ صاف کر دیا گیا ہے یا نہیں۔" اور نیچے اتر گئی۔ پھر اس نے سیٹ کو آگے کیا اور باری باری باہر آ گئے۔ رابعہ کا گھر پرانی وضع کی کوٹھی تھی۔ پورچ کے دونوں طرف تین تین کمرے تھے۔ ہر کمرے کی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ دروازے پر محراب سی بنی ہوئی تھی جس کے نیچے رنگین شیشے کے ٹکڑوں سے بنے نصف دائرے جیسے روشن دان تھے۔ اوپر کی منزل شاید بعد میں تعمیر ہوئی تھی چنانچہ نقشہ بھی تھا مگر اوپر کے ہر کمرے میں لوہے کی گرل والی اور بڑے بڑے شیشوں کے پٹ والی جدید طرز کی ایک ایک کھڑکی تھی۔ پوری عمارت کا رنگ ایک ہی تھا یعنی ہلکا نیلا مگر کہیں کہیں سے نیچے کا پرانا پیلا رنگ جھانکنے لگا تھا۔ پورچ میں ایک ٹیوب لائٹ تھی جس کا اجالا سامنے پھیلے ہوئے مختصر سے باغ اور لان پر بھی پھیل گیا تھا۔ نیچے کے دو اور اوپر کے ایک کمرے میں بھی ٹیوب لائٹس ہی روشن تھیں۔ کار کی آواز پر پچاس پچپن برس کی ایک فربہ بدن اور صحت مند عورت باہر آئی جس نے سر کو پیشانی تک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔

"یہ میری ماں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور ماں! یہ دونوں اسکول اور کالج میں میرے ساتھ تھے۔ یہ محسن ہے۔ اس کے ڈیڈی وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکرٹری ہیں۔ اور یہ سکندر ہے۔ اس کے والد میر وزیر اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ یہ دونوں لندن میں تھے۔"

ہمارے سلام کا شفقت سے جواب دے کر رابعہ کی ماں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رات کے آخری پہر میں وارد ہونے والے مہمان جیل سے فرار ہونے والے قیدی نہیں ہیں یا کوئی سنگین جرم کر کے اس کی وکیل بیٹی کے پاس مدد کے لیے پہنچنے والے لوگ نہیں بلکہ اچھے گھروں کے شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ اس کی ابتدائی تشویش بے وجہ نہ تھی۔ رابعہ کتنی ہی بڑی وکیل کیوں نہ سہی، تھی تو ایک جوان لڑکی اور اگرچہ ابھی تک یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی لیکن اندازہ یہی تھا کہ رابعہ کا باپ نہیں ہے۔ ہوتا تو سامنے ضرور آتا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن اس کے دوسرا گھر بسانے کے بعد پہلی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ دینے کے خیال کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رابعہ نے وکالت شروع کی، یہ بھی کہ وہ مر گیا اور رابعہ کے سوا ماں کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کا ایک بھائی تعلیم کے لیے لندن گیا تھا مگر اس نے روایت نبھاتے ہوئے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہیں آباد ہو گیا تھا۔ بوڑھے شوفر کی بیوی بھی اسی گھر میں ملازم تھی اور باورچی خانہ سنبھالتی تھی۔ گھر کی صفائی دونوں مل کر کرتے تھے — اکثر رابعہ یا اس کی ماں بھی ان کا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ دونوں میاں بیوی بیس برس سے اسی گھر کا نمک کھا رہے تھے چنانچہ بے حد قابلِ اعتماد تھے۔ اور ان کی حیثیت بھی نوکروں کی نہیں گھر کے افراد جیسی تھی۔

رابعہ روانگی سے پہلے ہی کہہ گئی تھی کہ مہمانوں والا کمرہ کھول کے صاف کر دیا جائے۔ رابعہ کی ماں خود ہمیں کمرے میں پہنچانے گئی اور ہم سے کہا کہ پہلے ہم غسل وغیرہ کر لیں اور کپڑے بدل لیں۔ رابعہ ڈاکٹر کو فون کرنے گئی ہے۔ ہم نے واجبی سا احتجاج کیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس نے کہا کہ معمولی زخموں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر یہ زخم کیسے آئے۔ جب وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی تو میں نے محسن سے کہا۔ "یار کپڑوں کا تو مسئلہ ہوگا۔ میرے بریف کیس میں صرف دو جوڑے ہیں۔ ایک پتلون قمیض، ایک شلوار قمیض۔"

"پھر مسئلہ کیسا؟" محسن نے کہا۔ "شلوار قمیض مجھے دیدے، تیرے میرے سائز میں فرق تو نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے بریف کیس کھول کے کہا۔ "اس کے بعد کیا ہوگا؟ میرا تمام سامان تو سلامت شاہ کے کوارٹر میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں اب ہے یا نہیں۔ خیر جا پہلے تو نہا لے۔" میں نے اسے شلوار قمیض تھما کے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا اور بریف کیس میں سے اپنا شیونگ کا سامان بھی نکالا۔

"پہلے تو جا کے اپنے اس زخم کو دھو۔" محسن نے کہا۔ "دیر کی تو خراب ہو جائے گا۔ شاید اندر ڈیٹول ہوگی ورنہ صابن سے صاف کر لینا۔ ابھی ڈاکٹر آ ہی رہا ہوگا۔ میرا خیال ہے رابعہ نے سوچ سمجھ کے کسی قابلِ اعتبار آدمی کو ہی بلایا ہوگا۔"

غسل خانے میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے نل الگ الگ تھے۔ میں نے کپڑوں کو جسم سے الگ کیا تو قمیض کی آستین بازو پر خون کے خشک ہو جانے سے چپک گئی تھی۔ میں نے اسے گرم پانی ڈال کے الگ کیا اور آہستہ آہستہ مل کے خون کے سارے داغ دھو ڈالے۔ میرا زخمی ہاتھ درد کے باعث پوری طرح حرکت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ مجھے غسل کے دوران ایک ہی ہاتھ پر انحصار کرنا پڑا۔ باتھ روم میں ڈیٹول موجود تھی۔ اس جراثیم کش محلول سے زخم کو دھوتے ہوئے میں نے زخم کی کیفیت دیکھی۔ خنجر کی نوک نے شانے کے گوشت کو تقریباً آٹھ انچ تک بڑی صفائی سے کاٹ دیا تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خنجر کی دھار شیونگ بلیڈ کی طرح تیز تھی۔ زخم کی گہرائی آدھے انچ کے قریب تھی۔ گوشت کے دونوں جدا ہونے والے حصے انجمادِ خون کے بعد آپس میں مل گئے تھے۔ دھونے سے زخم کا منہ پھر کھل گیا اور خون رسنے لگا۔ میں نے اتاری ہوئی قمیض میں سے کپڑے کی ایک پٹی پھاڑ کے واش بیسن میں دھوئی، اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈیٹول کے پانی میں بھگو کے ہاتھ پر مضبوطی سے باندھ لی۔ تھوڑا سا خون پٹی کے باہر تک پہنچا مگر اس کے بعد لہو کے واضح کا پھیلاؤ رک گیا۔ میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اب تک مجھے اندازہ نہ تھا کہ گزشتہ تین دن میں میرا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ میری شیو بڑھنے سے باقاعدہ داڑھی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے اور میرے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں گرد کے علاوہ خس و خاشاک نظر آتے تھے۔ واہ میاں سکندر بخت! دیکھو کہ فلک کج رفتار کی گردش نے تمہیں کیا سے کیا کر دیا اور کہاں پہنچا دیا۔ عبرت پکڑو کہ تم خود دنیا کو تماشا گاہ اور خود کو تماشائی سمجھتے تھے، آج خود تماشہ ہو اور سوچو کہ آنے والے دن کے لیے تقدیر کا نوشتہ سرخروئی ہے کہ روسیاہی!

شیو اور غسل کے دوران میں مجھے فوماچو یعنی ملنشی کی لاش کا خیال بھی آیا جو ایک مجرم ہاتھ سے محروم بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ سچ پر پڑا ہوا پردہ اٹھا جاتا تھا۔ محض اس لیے کہ بچپن میں ماں باپ نے کہا تھا "بیٹا ہمیشہ سچ بولو"، بزرگوں کا قول تھا کہ "سچ عبادت کا درجہ رکھتا ہے"۔ مذہب نے حق گوئی کو جہاد قرار دیا تھا اور کتابوں میں لکھا تھا کہ سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔ اگر وہ مذہب و اخلاق کی تعلیمات کا علمبردار اور عقل و دانش کے اقوالِ زریں پر یقین نہ رکھتا تو وہ مرنے والوں کی بجائے مارنے والوں میں شامل ہوتا۔ اس کی شیروانی بوسیدہ اور اس کی قمیص پھٹی ہوئی نہ ہوتی اور وہ اس وقت بہترین سوٹ پہنے کار میں زر خرید سیم تن کے ساتھ مال پر سے گزر رہا ہوتا یا فلیٹیز جیسے کسی ہوٹل کے لاؤنج میں ایک نئے، پرمسرت اور کامیاب دن کے آغاز کا جام تجویز کر رہا ہوتا یا اپنے عالی شان گھر کی آراستہ خواب گاہ میں سویا پڑا ہوتا۔ مگر اس نے سچ بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اسے سچ کا کوئی انعام نہ دے سکوں گا۔ کوئی خلعت یا جاگیر عطا نہیں کروں گا اور یہ کارنامہ اس کی لوحِ مزار پر سنہرے حروف سے نہیں لکھا جائے گا۔ اس سے میرا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا اور اسے میرے یا میرے آبا و اجداد کے کسی احسان کا قرض نہیں چکانا تھا، مگر اس نے سچ بولا۔ اور اب میرے لیے اسے عام آدمی کی طرح عزت و احترام کے ساتھ آغوشِ لحد کے سپرد کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب اس حق پرست کی لاش سڑنے لگے گی اور اس پر چیل کوے منڈلانے لگیں گے تو پولیس اپنے ساتھ بھنگی لے کر آئے گی جو اس کوڑے کو سمیٹ کر گاڑی میں ڈال دیں گے اور پوسٹ مارٹم کی قانونی یا کاغذی کارروائی کے بعد لاوارث لاش میڈیکل کے ان طلباء کے حوالے کر دی جائے گی جو مستقبل کے انسان کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے جد و جہد اور تحقیق میں مصروف ہیں۔ اگر ان کو لاش دے گئے تو بہ امر مجبوری تدفین میں شریک ہونے والے عزیز پکڑیں گے اور منہ بھر کر کہیں گے کہ بھائی آدمی کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ملتی ہے۔ خدا معاف کرے مگر مرنے والے کو دیکھو کہ موت آئی تو کہاں اور کس حال میں۔ ہم فانی انسان جو بصیرت نہیں رکھتے نیکی و بدی کے فتوے کتنے اعتماد سے دیتے ہیں۔ خیال مجھے اس بوٹ پالش کرنے والے لڑکے کا بھی آیا۔ اور میں نے خدا سے دعا مانگی کہ ایک اندھی ماں اور ایک چھوٹے بھائی کی پرورش کرنے والا وہ چھوٹا سا جوانمرد زندہ رہے۔ مجھے یہ امید ضرور تھی کہ محض ایک رقعہ پہنچانے پر میرے دشمن اس کی جان نہیں لیں گے جسے یہ بھی علم نہ تھا کہ مکتوب کیا ہے اور مکتوب الیہ کون ہے۔ اسے کون بھیج رہا ہے اور کون دیکھ رہا ہے۔

جب میں نے لباس بدلنے کے بعد پھر آئینہ دیکھا تو اپنے آپ کو پہچان کر خوش ہوا۔ پرانا سکندر بخت جو گرد و غبار اور جھاڑ جھنکاڑ کے صاف ہو جانے کے بعد غسل خانے سے برآمد ہوا کمرے میں موجود کم سے کم دو افراد یعنی رابعہ اور محسن کے لیے بھی باعثِ حیرت و مسرت بنا۔ رابعہ مسکرائی اور محسن نے ہنس کر کہا۔ "کبیر داس، تو پھر شریف آدمی نظر آنے لگے۔"

"نظر آنے لگا ہوں کا کیا مطلب؟" میں نے خوشدلی سے احتجاج کیا۔ "کیا میں ہوں نہیں؟"

کمرے میں موجود تیسرے شخص کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا جو اپنی متانت سے ہی نہیں انداز اور ساز و سامان سے بھی ڈاکٹر لگتا تھا۔ وہ محسن کا معائنہ کر چکا تھا اور اس کا تجویز کردہ نسخہ میز پر رکھا تھا۔ اب اس نے مجھے اس کے زیادہ تفصیل سے دیکھا کیونکہ میں واقعی زخمی تھا۔ اس نے بازو پر لپٹی ہوئی پٹی کی فرسٹ ایڈ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور پھر نئے سرے سے زخم کی صفائی کے بعد کوئی پاؤڈر غالباً "نیومائی سین" چھڑک کے باضابطہ قسم کی صاف ستھری پٹی باندھی۔ ایک انجکشن گھونپا اور اپنے بیگ میں سے ایک شیشی نکال کے نسخے پر رکھ دی۔ شیشی میں کیپسول تھے جو میرے اندازے کے مطابق اینٹی بایوٹک تھے اور زخم کے زہریلے اثرات کو جسم میں پھیلنے سے روکنے کیلئے تھے۔ پھر اس نے چاندی کی طرح چمکتا ہوا ایک انگلی جتنا لمبا المونیم کا ٹیوب نکالا جس کے شفاف پلاسٹک کور میں دس گولیاں مقید تھیں۔ یہ محض سکون آور "ڈائزا پام" فائیو ملی گرام کی گولیاں

تھیں۔ میرا اور محسن کا نسخہ ایک ہی تھا۔ چلتے چلتے اس نے عادتاً کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، اور چند دن کی باقاعدہ ڈریسنگ سے زخم ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ اس دوران میں نے قوتِ بازو کا غیر ضروری مظاہرہ نہ کیا۔ وہ انتہائی کم گو، خلیق اور صورت سے قابلِ اعتماد نظر آنے والا بوڑھا آدمی تھا۔ رابعہ نے مجھے بعد میں بتایا کہ یہ ڈاکٹر اس کے والد کا دوست تھا جسے وہ بچپن سے "ڈاکٹر انکل" کہتی آئی تھی، چنانچہ رابعہ کا فون ملتے ہی وہ آ پہنچا تھا اور رابعہ کے اس بیان سے مطمئن ہو گیا تھا کہ ہم اس کے دوست ہیں جو راہ چلتے ایک مظلوم کی حمایت کے لیے لڑائی میں کود پڑے تھے اور اب خود بھی مظلوم تھے تاہم غنیمت ہے کہ مقتول نہیں تھے۔

محسن باتھ روم سے نکلا تو رابعہ نے بورڈ پر لگی ہوئی ایک گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ گھنٹی شاید باورچی خانے میں بجی جہاں اس کی ہدایات کے مطابق کافی پہلے ہی تیار تھی۔ چند منٹ کے بعد شوفر کی زوجہ "ماسی" ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی، اور درمیان کی میز پر رکھ کے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے پھر ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور زیرِ لب وظیفہ پڑھنے کے انداز میں کوئی بات کی جو یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ہوتے خدائی خوار دن دیکھیں نہ رات منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اور کوئی دعائے خیر بھی۔ کافی وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، جسے میں نے اسپرین نگلنے کے لیے بھی استعمال کیا۔ پھر میں نے رابعہ سے معذرت کی کہ ہم ایسے غلط وقت پر اس کے لیے باعثِ زحمت بنے اور اس کی مدد اور مہمان نوازی پر شکر گذاری کا اظہار کرنے کے بعد میں نے تجویز کیا کہ صبح تو ہونے والی ہے مگر ایک دو گھنٹے آرام کر لینا ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔ رابعہ نے اپنی اعصابی مریض ماں کو پہلے ہی سلا دیا تھا۔ وہ ناشتے کی میز پر دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہوئی اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کا شکر بجا لایا جس نے ہمیں تحفظ و عافیت کے ساتھ اس گھر کی چھت کے نیچے پہنچایا اور آسمان پر نہیں اٹھایا۔

"مسٹر محسن رضا!" میں نے بیڈ پر نیم دراز ہو کے سگریٹ سلگایا اور تکیے کو سر کے نیچے ایک فٹ اونچی بیڈ سائڈ پر رکھ لیا۔ "کتنی خوشی کی بات ہے کہ اس وقت تمہاری لاش نہر میں بہتی ہوئی نہیں جا رہی ہے۔"

"جی۔" محسن نے دوسری طرف کی بیڈ سائڈ پر دوسرا تکیہ رکھ کے میری تقلید کی اور پیر میری طرف پھیلا دیے۔ اب ہم آمنے سامنے اور ایک دوسرے کے متوازی نیم دراز تھے۔ "یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ تمہاری لاش اس ویران مقبرے میں فوماچو کی لاش کے ساتھ نہیں لیٹی ہوئی ہے۔"

"اب ہم فوری توجہ طلب مسائل پر مذاکرات کا آغاز کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اب تک ہم نے سو فیصد جھوٹ بولا ہے اور ہر جھوٹ بولنے والے کی طرح اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ سب سچ لگتا ہے۔ رابعہ اتنی نادان نہیں ہے۔ ہمیں اس جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کرنی ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" محسن نے کہا۔ "یعنی اب نئے بیان میں تسلیم کرنا ہوگا کہ حملہ آور ایک تھا؟ یا یہ کہ حملہ ہم میں سے ایک پر ہوا تھا؟"

"جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کا مطلب بات میں پچاس فیصد صداقت کا اضافہ ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت غور و خوض کے بعد میں نے طے کیا ہے کہ صبح پہلے تو رابعہ کے سامنے ڈھٹائی سے تسلیم کیا جائے کہ اس وقت ہم ہوش میں نہیں تھے اور مصلحت کے غلط تقاضے کے پیشِ نظر ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہوگا کہ بعد میں ہم جو کچھ برقائمی ہوش و حواس کہیں گے رابعہ کے لیے واقعی سچ بن جائے گا۔ اب اصل کہانی یوں ہوگی کہ ہم نے سلامت شاہ سے کہا تھا کہ وہ زیورات فروخت کر کے رقم ہمیں پہنچا دے۔ پھر ہم فوماچو کا حلیہ بیان کر کے کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم دوپہر کا کھانا کھانے جا رہے تھے تو بیڈن روڈ پر اس نے ہمیں پک اپ کیا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو بجائے سلامت شاہ کے تین افراد ہمارے منتظر تھے اور بظاہر وہ ہمارے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ ایک زبردست معرکے میں ہماری مشترکہ کمان نے وہ دادِ شجاعت دی کہ دشمن فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ دشمنوں میں سے ایک شخص کو ہم نے پہچانا۔ وہ گھنگھریالے بالوں، کنجی آنکھوں اور دائیں کان میں پیتل یا سونے کی مندری پہننے والا ٹیکسی ڈرائیور..."

"زبردست۔" محسن نے کہا جو میری بات بہت غور سے سن رہا تھا۔ "یہ کثیر المقاصد بیان واقعی خوب رہے گا۔"

"ہاں۔ ایک تو اس سے سلامت شاہ کے نہ آنے پر تشویش کا اظہار کرنا ممکن ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور بعد میں آج کل یا پرسوں جب بھی اس کی لاش ملے گی تو رابعہ کو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس حادثے اور ہمارے بیان میں مطابقت نظر آئے گی۔ دوسری بات یہ کہ جب فوماچو کی لاش ملے گی تو رابعہ قیاس آرائی کی بنیاد پر سمجھے گی کہ وہ کیوں مارا گیا، ورنہ ہم سمجھا دیں گے کہ فوماچو کو ہمارے خلاف سازش کرنے والے دشمنوں نے آلۂ کار بنایا اور مقصد پورا ہونے کے بعد اس لیے مار دیا کہ وہ سازشیوں کو پہچانتا تھا، یا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سازشی عناصر کے عزائم کیا ہیں چنانچہ اس کا وجود یقیناً باعثِ خطر تھا۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مندری والا ٹیکسی ڈرائیور اس قاتلانہ حملے کا ایک ملزم قرار پائے گا۔ ہم بتائیں گے کہ وہ کس سمت میں فرار ہوا تھا۔ اسی سمت سے فوماچو کی لاش کی دستیابی ہمارے مفروضات کی صداقت کا ثبوت بن جائے گی، لیکن ان حالات کے پیشِ نظر ہم رابعہ سے کہہ سکیں گے کہ فی الحال کسی قانونی چارہ جوئی کی ضرورت نہیں۔ ہم پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں مارا کوئی نہیں گیا۔ گزشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط۔"

"اور ان دو لاشوں کا کیا بنے گا جو نہر سے برآمد ہوں گی؟" محسن نے کہا۔

"وہ پولیس کا کام ہے کہ واردات کو جو رنگ چاہے دے۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ان سے کیا تعلق۔ جب فوماچو کی لاش ملے گی تو مدعی خود پولیس ہوگی اور رابعہ رضاکارانہ طور پر بیان دے کر لینے لیے اور ہمارے لیے قانونی الجھن پیدا کرنے سے گریز کرے گی۔ اس کے بعد سلامت شاہ کی لاش دریافت ہوگی تو اسباب رابعہ کے سامنے ہوں گے مگر ہمارا موقف یہ رہے گا کہ وہ صفائی کا واحد گواہ تھا چنانچہ ہمارے دشمنوں نے اسے مروا دیا۔ پولیس کو زیورات وغیرہ کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ یہ تو تھا مسئلہ نمبر ایک اور اس کا قابلِ تعریف حل۔ دوسرا مسئلہ ہے ستر پوشی کا۔ میرے سارے کپڑے سلامت شاہ کے کوارٹر میں رکھے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ ابھی لے آؤں۔ اسی وقت جا کے۔"

"تجویز یہ بھی قابلِ تعریف ہے۔" محسن نے طنز سے کہا۔ "جاتے وقت آپ رابعہ کو بتا جائیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ سی سی ڈین کے دروازے پر آپ کو محبت خان نام کا ایک چوکیدار ملے گا اور چونکہ چراغ دین مری سے واپس آ چکا ہے اس لیے وہ بقلم خود آپ کے استقبال کے لیے حاضر ہوگا۔ آپ عرضِ مدعا کیجیے اور وہ آپ کو بڑی نیاز مندی سے سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر میں لے جائے گا۔ آپ اس کے سابق آقا کے فرزندِ ارجمند ہیں نا۔ آپ کے بارے میں اخبارات کی باتصویر خبروں کا دو نہیں دے گا۔ آخر مروت اور اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ آپ کا تمام اسباب وہ خود اپنی کار میں رکھے گا۔ اگر کریں گے تو وہ صندوق بھی جو چچا نذیر خان مرحوم گئے تھے کہ سلامت شاہ کا تابوت بنے، اور آپ چھوڑ کر ہنسی خوشی لوٹ جائے گا۔"

"بکواس بند کرو" میں نے کہا۔ "ابھی پانچ سات بجے سے پہلے چراغ دین بھی سو کر نہیں اٹھے گا۔ بھی عموماً رات کو گیٹ کے پاس یا برآمدے میں ڈال کے سو جاتے ہیں۔ بفرضِ محال وہ فرض شناس ڈنڈا لیے دروازے پر کھڑا ملا تو میں ساتھ والے گھر داخل ہو جاؤں گا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے گھر میں۔ ضروری تو نہیں کہ ہر گھر میں چوکیدار گیٹ پر موجود ملے۔ چراغ دین کے گھر اور ساتھ والے دونوں کے بیچ میں دائیں بائیں دو دیواریں حائل ہیں۔ میں دیوار کے آخری حصے کو پھاند کر کوٹھی کے عقبی حصے عین سلامت شاہ کے کوارٹر کے قریب لینڈ کروں گا۔ کوارٹر کے اندر اترنا ذہنی طور پر نہ سہی جسمانی طور پر زندہ سلامت شاہ کسی کے لیے کچھ نہ کر سکا تو اس کا بے جان اور مقید جسم کیا کرے گا۔ ویسے میں ادھر دیکھوں بھی نہیں اور سلامت شاہ مرحوم کے کمرے سے اپنا سوٹ کیس چرا کے بھاگ آؤں گا۔ آنے جانے کا راستہ ایک ہی ہوگا اور دس منٹ بعد بھی حالات ویسے ہی ملیں

"اگر تو ساتھ والے گھر میں پکڑا گیا تو کس تھانے ملاقات ہوگی؟" محسن نے کہا۔

"پکڑے گا کون؟" میں نے کہا۔ "کوٹھیوں کے مکین مالک تو سوئے پڑے ہوں گے۔ نوکر ہوئے تو باورچی میں ہوں گے۔ کسی کتے یا چوکیدار کا احتمال ہے تو فکر مت میں اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھوں گا۔"

"اور رابعہ سے کیا کہا جائے گا؟ یہ سوٹ کیس دے گیا ہے وہی حملہ آور؟"

"اب بیچ میں بولا تو جھانپڑ دوں گا۔" میں بھنا کر کہا۔ "پہلے پوری بات سن لے۔ ریلوے کا کلرک صبح پانچ بجے کھلتا ہے اور چراغ دین کی کوٹھی سے کلرک پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ رابعہ سے کہا جائے گا کہ پنڈی جانے سے پہلے فاضل سامان کلاک روم میں رکھ دیا تھا تو یہ بالکل منطقی بات ہوگی۔ ہم آج دن میں کسی

سوٹ کیس اٹھا لائیں گے۔ فی امان اللہ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کھڑکی کھول کے باہر اتر گیا۔

باہر رات کا اندھیرا اب بھی صبح کے لشکر کی یلغار روکے ہوئے تھا۔ میں نے گیٹ تک کا فاصلہ کسی آہٹ کے بغیر طے کیا اور چار فٹ کی دیوار پر سے سڑک پر کود گیا۔ وائس کراؤن سینما والی سڑک سے علامہ اقبال روڈ کے چوک تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ لگے۔ پھر اسٹیشن کی سمت جانے والے ایک رکشا نے اس تھوڑے سے فاصلے کے عوض پانچ روپے کی شرط پر مجھے بٹھا لیا اور مزید دس منٹ بعد میں سی سی ڈین کی کوٹھی سے چند قدم کے فاصلے پر جا اترا۔ سڑک پر ٹریفک کچھ بڑھ گئی تھی مگر زیادہ تر رکشا اور تانگے اسٹیشن کی جانب رواں تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وقت تھا جب میں راولپنڈی جانے کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ اس گھر سے نکلا تھا۔ جس میں اب مجھے چوروں کی طرح داخل ہونا تھا اور وہ سلامت شاہ جس نے مجھے جگا کر چائے بنا کر دی تھی صرف تین دن قبل فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تھا تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے لیے کتنی بھیانک موت گھات میں ہے۔ میں نے سڑک سے ہٹ کے فٹ پاتھ کے بعد ہر کوٹھی کے احاطے کے سامنے پھیلے ہوئے گھاس کے تنگ قطعے پر چلنا شروع کیا جس میں جھاڑیاں اور درخت بے ہنگم طریقے پر اگے ہوئے تھے۔ اب میں سڑک سے کافی دور تھا اور دیوار کے سائے میں ہونے کے باعث... نمایاں نہ تھا۔ چراغ دین کے گھر سے پہلے والے گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر کوٹھی میں مکمل سکوت تھا اور اندھیرا تھا۔ پورچ میں کھڑی ہوئی کار بھی سوئی سوئی لگتی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قریب کی مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ آؤ نیکی کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔ کوٹھی کے پورچ میں ایک لائٹ جلی اور دروازہ کھول کے تہبند اور کرتے میں ملبوس ایک سفید ریش شخص سر پہ کپڑے کی گول ٹوپی رکھے نمودار ہوا۔ میں تیزی سے واپس ہوا، اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ چراغ دین کی کوٹھی کے بند گیٹ اور احاطے کی دیوار کو عبور کر کے میں نے گھوم کر دیکھا وہ شخص جو نماز کے لیے مسجد جانے کے ارادے سے نکلا تھا دروازے کے باہر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک اجنبی کو گیٹ کے اندر آتے اور پلٹ کر جاتے دیکھ لیا ہوگا اور شبے میں پڑ گیا ہوگا کہ آنے والا چور تھا یا غلطی سے اندر آ گیا تھا۔ نماز قضا ہو جانے کے خیال نے اسے میرے تعاقب یا ہنگامہ آرائی سے باز رکھا اور وہ سڑک عبور کر کے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اس وقت تک میں چراغ دین کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ گیٹ کے اوپر سے جھانکنے پر مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آیا۔ گیٹ کے اندر بکرے جتنا السیشین کتا بڑے وقار سے ٹہل رہا تھا۔ تقریباً اتنے ہی وقار سے لان پر ایک پہلوان ٹائپ شخص ورزش میں مصروف تھا۔ میں فوراً واپس ہوا اور اب میں نے چراغ دین کے گھر کے پھاٹک کی جھری میں سے اندر جھانک کے دیکھا۔ محبت خان برآمدے میں چارپائی پر ہاتھ کا تکیہ بنائے دیوار کی طرف منہ کیے سو رہا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ تھک کر لیٹا ہے یا گہری نیند میں ہے۔ ہمت کر کے میں گیٹ کے ستون پر چڑھا اور کوئی آواز کیے بغیر اندر اتر گیا۔ پھونک پھونک کر ہر قدم رکھتے ہوئے میں نے چند قدم کا وہ فاصلہ طے کیا جو خطرناک علاقہ تھا۔ کوٹھی کی سائڈ میں پہنچ کے میں چوکیدار کی نظر کے راڈار سے محفوظ ہو گیا اور کسی پریشانی کے بغیر سلامت شاہ کے سرونٹ کوارٹر تک جا پہنچا۔ صبح کاذب کا اجالا مٹنے لگا تھا، اور چند منٹ میں اس رات کی سحر کا آغاز ہونے کو تھا۔ میں نے بلا تذبذب کوارٹر کی دیوار پھاندی اور چند سیکنڈ صحن میں کھڑا رہا۔ میرے سامنے دونوں کمروں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ ایک دروازے میں سے مجھے وہ صندوق بھی صاف نظر آ رہا تھا جس میں آباؤ اجداد کی نشانیوں کی جگہ سلامت شاہ کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ گھر میں گونجنے والا آسیب میرے رگ و پے میں کمزوری کی لہر بن کے پھیلنے لگا۔ تاریکی میں سلامت شاہ کا ہیولا سا ابھرا اور دروازے کے فریم میں ٹھہر گیا۔ "سکندر بخت!" اس نے کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو؟ اس گھر کے دروازے اسی لیے تو کھلے چھوڑ رکھے ہیں میں نے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔ ان دونوں کمروں میں سے کسی میں داخل ہونے کے لیے تمہیں کسی کی اجازت مطلوب نہیں۔ ایک میں تمہارا باپ رہتا تھا، دوسرے میں اس کا دوست، رازدار اور تمہارا چچا۔ اب یہ دونوں کمرے خالی ہیں۔ ایک کا مکین لحد میں اتار دیا گیا ہے۔ دوسرا اس کے انتظار میں ہے۔ تم اپنی امانت سمیٹو اور جاؤ۔ دیر مت کرو۔ تمہیں ہمارا نہیں اپنی زندگی کے وقت کا ساتھ دینا ہے۔" میں چونکا اور آگے بڑھا۔ سلامت شاہ کے کمرے کی دیوار کے ساتھ میرے دونوں سوٹ کیس کھڑے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان دونوں کو اٹھایا۔ کمرے کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ویرانی میں اس کی تاریک دیواریں مجھ پر جھک آئیں اَنگنت غیر مرئی آنکھیں ہر سمت سے مجھے گھورنے لگیں اور باہر اچانک پرندوں نے ہر درخت کی شاخ سے چلانا شروع کیا۔ چور... چور۔ چور، قاتل... پکڑو۔ پکڑو۔ میں سوٹ کیس لے کر بھاگا اور یکے بعد دیگرے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے عین پیچھے کوئی میرے تعاقب میں تھا اور مجھے گردن سے دبوچنے ہی والا تھا میں نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسرے لمحے میں اس مُردہ خانے کی حدود سے باہر تھا۔ سوٹ کیس اٹھا کے میں نے کوٹھی کی طرف دیکھا ایک باتھ روم کے روشن دان میں لائٹ نظر آ رہی تھی جس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ چراغ دین جاگ گیا ہے اور یہ بھی کہ چوکیدار باتھ روم میں گیا ہو۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ چوکیدار چارپائی پر بیٹھا چلم والا پشاوری حقہ سلگا رہا تھا اور اس کی نگاہ گیٹ کی طرف تھی۔

پوری احتیاط کے ساتھ میں واپس ہوا۔ سوٹ کیس سرونٹ کوارٹرز کی دیوار کے ساتھ رکھ کر میں نے ساتھ والی پہلی کوٹھی کی دیوار پر سے جھانکا جس میں سے نکل کے ایک شخص نماز پڑھنے گیا تھا۔ وہ مجھے دس منٹ پہلے ملا تھا۔ دس منٹ میں اس کا مسجد تک جانا وضو کرنا، نماز پڑھنا اور واپس آنا۔ نہیں... میں نے حساب لگایا۔ وہ بیس منٹ سے پہلے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ باقی کوٹھی پر آغازِ صبح کا سکوت طاری تھا اور درختوں میں چہچہانے والے پرندوں کے سوا کوئی آواز کہیں سے سنائی نہ دیتی تھی۔ بظاہر اس ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ شخص کے سوا دوسرے گھر والے ہنوز خوابِ غفلت میں تھے۔ میں نے دونوں سوٹ کیس دیوار پر رکھے اور دوسری طرف کود گیا۔ پھر خشک پتوں اور سوکھی ٹہنیوں پر سے سوٹ کیس لے کر گزرا اور ایک جھاڑی کے پیچھے چلنے لگا جو قد آدم انتہائی گھنی اور ہموار تراشی ہوئی تھی۔ گیٹ تک میں سرسبز دیوار کے پیچھے چل سکتا تھا ابھی میں گیٹ سے چند قدم دور تھا کہ میں نے اسی ٹوپی والے سفید ریش شخص کو سڑک عبور کر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میں سانس روک کر منجمد ہو گیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاخوں اور پتوں کی گھنی چادر کے پیچھے بھی اس نے مجھے دیکھ لیا ہے لیکن بالکل قریب آ کے وہ مڑ گیا۔ اس نے تازہ کھلے ہوئے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسے سونگھتا ہوا ٹہلتا ہوا اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں جھاڑی کے پیچھے سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ آخری وقت تک مجھے دھڑکا لگا رہا کہ کہیں پیچھے سے کوئی چلانے نہ لگے یا چراغ دین کا چوکیدار گیٹ کھول کر باہر نہ آ جائے۔

پچاس قدم دور آ جانے کے بعد میں نے خود کو محفوظ تصور کیا اب میں ایک مسافر نظر آتا تھا جو فاصلہ کم ہونے کے باعث کوٹھی سے نکلا تھا اور اسٹیشن کی جانب پیدل روانہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تین دن پہلے کی وہ صبح یاد آئی جب میں ایسے ہی صرف اپنا بریف کیس لیے آ پہنچا تھا اور آفات و حادثات کے ایک ایسے جال میں گرفتار ہو گیا تھا جو بڑے شاطر، مکر و فریب کے ہتھکنڈوں سے آشنا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا شکاری نے بچھایا تھا یہ سامنے آ کر مقابلہ کرنے والا نہیں چھپ کر وار کرنے والا کینہ پرور شکاری تھا جسے ہر ناکامی نے جھنجھلاہٹ کے اشتعال میں زیادہ خطرناک بنا دیا تھا مگر شکاری خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں ذرا سی بھول چوک کے نتیجے میں وہ خود شکار نہ ہو جائے۔

کلرک روم تک دس منٹ میں پیدل پہنچ جانے کے بعد، میں سامان کو محسن رضا کے نام سے جمع کرا کے اور رابعہ کا پتہ لکھوا کے باہر نکلا تو افق پر سورج کے اجالے کا پرلول رنگ شفق کے سنہرے اودے قرمزی بادلوں کے رنگ میں اتر رہا تھا۔ میں نے رسید سنبھال کے جیب میں رکھی اور پھر پانچ کے نوٹ کی ضمانت پر ایک رکشا والے کو گڑھی شاہو تک چلنے پر رضامند کیا۔ عین رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر اترنے کی بجائے میں نے کراؤن سینما سے ذرا آگے رکشا رکوا لیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کرتے ہوئے احتیاطاً سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا۔

جب میں نے رابعہ کے گھر کی دیوار پھاندی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ رابعہ کو لان میں ٹہلتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے نظر اٹھا کے مجھے حیرانی سے دیکھا اور دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سنہرے دھاگے جیسی سیل کے کنارے کو کھینچ کر بیرونی شفاف پلاسٹک کی جھلی کو الگ کیا۔ رابعہ نے وہی رات والے کپڑے پہن رکھے تھے اور قریب پہنچ کے میں نے دیکھا کہ اس کے چپل لان کے کنارے ساتھ ساتھ یوں رکھے تھے جیسے سبز گھاس پر سفید کبوتروں کا جوڑا بیٹھا ہو۔ اس کے گلابی پاؤں شبنم کی نمی سے بھیگے ہوتے تھے۔ "میں ذرا سگریٹ لینے چلا گیا تھا" میں نے معذرت اور وضاحت کے طور پر کہا۔

"میں تو سمجھی تھی تم سو رہے ہو۔" وہ بولی۔ "آنے جانے کے لیے لان میں گیٹ کا استعمال آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے کیا؟"

"وہ... دراصل..." میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا رات کو سب کی نیند خراب ہوئی، اب صبح صبح پھر کال بیل بجا کے سب کو جگا دینا مناسب نہیں۔"

اخلاقاً وہ خاموش ہو گئی۔ یہ میرے دل کا چور تھا یا اس کی خاموشی سے واقعی یہ تاثر ملتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ قابلِ یقین تو نہیں مگر وہ بے یقینی کے اظہار کو ادب آداب، مصلحت یا ضرورت کے تقاضوں کے خلاف سمجھتی ہے۔ "تم ہر روز اسی وقت اٹھتی ہو؟" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔ "عموماً سات بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلتی۔ بس، نیند نہیں آئی بعد میں۔"

"کیوں؟ کیا سوچتی رہیں؟" میں نے کہا۔ "اور کس کے بارے میں؟"

وہ میرے لہجے کی شوخی سے متاثر نہیں ہوئی اور اسی متانت کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ "سکندر! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟"

"دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد نصف درجن بھی نہیں جن کی کسی بات کا میں برا مان ہی نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔ "ان میں ایک تم ہو۔"

"میرا خیال ہے سکندر، تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" وہ رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "حقیقت وہ نہیں جو تم نے بیان کی تھی۔"

"اس شک کی وجہ؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا، اور شبنم سے مہکتی گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح ٹہلتی رہی۔

"وجہ۔ وجہ بظاہر تو کوئی نہیں۔" وہ بولی۔ "احساس بعض اوقات بے سبب بھی ہوتا ہے۔ بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے لہجے میں قائل کر دینے والی صداقت نہیں ہے بڑے لوگ مثلاً میرے ابا کھرے کھوٹے چاندی کے سکے کو اچھال کے آواز سے پہچان جاتے تھے۔ تمہاری آواز میں کھرے ہونے کی وہ کھنک نہیں ہے۔ یا شاید میرے کان فریبِ سماعت کا شکار ہیں مگر میں نے تم سے جیل میں ملاقات کے دوران ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔"

"قصور تمہارے کانوں کا نہیں ہے۔" میں نے چند سیکنڈ کے بعد ایک طویل کش کا دھواں خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری جھوٹ سچ کو پرکھنے کی اس صلاحیت کا اعتراف نہ کروں تو یہ ایک اور جھوٹ ہوگا۔ اس صلاحیت کی بدولت تو تم کو فوراً معلوم ہو جاتا ہوگا کہ اپنی بے گناہی کا مقدمہ تمہارے پاس لے کر آنے والا کوئی موکل جھوٹا ہے یا سچا۔"

وہ ہنسی۔ "ایسی بات بھی نہیں ہے۔ دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔"

میں نے اس کی بات میں چھپے ہوئے لطیف سے طنز کو محسوس کر لیا۔ "وسیع تر فلسفیانہ نقطۂ نظر شیکسپیئر کا تھا جس نے کہا تھا کہ دنیا اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹرز ہیں، لیکن جھوٹ بولنے والے اور ایک ایکٹر میں فرق ہے۔ ایکٹر یہ اصرار تو نہیں کرتا کہ اس کے ڈائیلاگ کو سچ سمجھ کے قبول کر دیں میں ایکٹر نہیں ہوں۔ جھوٹ میں نے عمداً بولا تھا۔ اس وقت ذہنی طور پر میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے جھوٹ بولنے سے فائدہ ہوگا یا نقصان اور میں اس جھوٹ کو نبھا بھی سکوں گا یا نہیں، جو بات میں نے سوچے سمجھے بغیر کی غلط تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہ بے ضرر سا جھوٹ بولنے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں تمہیں قائل نہ کر سکا۔ خود مجھے بعد میں احساس ہوا کہ تمہارے اعتماد کے جواب میں یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ بہت نامناسب ہے۔ اس کا ذکر میں نے محسن سے بھی کیا تھا اور اس نے مجھے شرمندہ کیا چنانچہ میں نے محسن سے وعدہ کر لیا تھا کہ صبح ناشتے کی میز پر یا بعد میں موقع پاتے ہی تمہیں اصل حالات بتا دوں گا۔"

"ڈاکٹر اور وکیل کو حقیقت نہ بتائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے۔ یہ بات تو سنی ہوگی تم نے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ اور اسی لیے میں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

پھر میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق جھوٹ میں پچاس فیصد تخفیف کی اور وہ کہانی سنائی جو سچ اور جھوٹ کے تانے بانے سے تیار کی گئی تھی۔ یہ کہانی سناتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں ایک جھوٹ پر دوسرے سوچے سمجھے بہت بہتر قسم کے جھوٹ کا پردہ ڈال رہا ہوں، اور مجھے اعتماد سے بے وقوف بناتے ہوئے شرم بھی آئی لیکن میں نے مصلحت کے تقاضے کو پیش نظر رکھا اور خود کو اس دلیل سے مطمئن کیا کہ ناگزیر حالات میں انتہائی مجبوری کے تحت ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال سمجھنے میں کوئی گناہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں ہوتا۔ رابعہ انتہائی ذہین عورت تھی اور اس کی زندگی کے شب و روز سچی کہانیوں میں جھوٹ اور جھوٹے واقعات میں سچ کے عنصر کی تلاش کا عملی تجربہ کرتے گزر رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ کتنے ہی ایک جو اپنی مظلومیت اور معصومیت کو صورت سے اور لہجے سے ثابت کرتے ہیں۔ دراصل کتنے سفاک اور بے ضمیر مجرم ہوتے ہیں اور کتنے گواہ جو عملاً کتاب مقدس کو ہاتھ میں لے کر بڑے خشوع و خضوع سے حلف اٹھاتے ہیں کتنے جھوٹے ہوتے ہیں اور کتنے بے گناہ ہوتے ہیں جو ایسی ہی شہادتوں کے باعث ہر نگاہ میں مجرم ٹھہرتے ہیں میں نے اداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا اور اپنی آواز میں کھرے پن کی کھنک بھی پیدا کی۔ اس نے پوری توجہ اور یقین کے ساتھ میری بات سنی۔ تاہم میرے یقین میں آئینے کی طرح بال تھا اور جب بھی میں رابعہ کی آنکھوں سے خود کو دیکھتا تھا تو رابعہ کے الفاظ کی بازگشت سنائی دینے لگتی تھی دنیا میں ایک سے ایک ایکٹر پڑا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ جیسے ہی گردش ایام نے مہلت دی میں رابعہ سے صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ معافی مانگ لوں گا کہ یہ عدم اعتماد کا مظاہرہ نہیں مجبوری کی بات تھی اور میں کمینہ، کم ظرف یا احسان فراموش نہیں ہوں۔ رابعہ عام عورت نہیں۔ وہ مجبوری کی ہر ضرورت کے تقاضے کو سمجھنے کی اہل ہے۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ مجھ سے کچھ دور بیٹھی گھاس کا تنکا چباتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

"تمہارے خیال میں سلامت شاہ کے نہ آنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟" اس نے بالآخر کہا۔

"حقیقت جسے تسلیم کرتے ہوئے میرا دل ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "سلامت شاہ کی پراسرار گمشدگی بے سبب نہیں، ہو سکتا ہے مجھ سے تھانے میں ملاقات کے بعد رات کو وہ گھر پہنچا تو یہی لوگ اس کے انتظار میں ہوں جو آج ہمیں منتظر ملے تھے۔ وہ کسی بہانے سے یا زبردستی سلامت شاہ کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس سے پوچھ لیا۔ بوڑھے آدمی کی قوت برداشت زیادہ نہیں ہوتی۔ شاید انہوں نے سلامت شاہ سے ایک پیغام لکھوایا اور اپنے نامہ بر کے ہاتھ ارسال کر دیا۔ گمان غالب یہ ہے کہ بعد میں سلامت شاہ اور وہ نامہ بر دونوں ختم کر دیے گئے۔ اس لیے کہ ان کا بے مصرف وجود باقی رکھ کے خطرہ مول لینے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ امکان مجھے بہت کم نظر آتا ہے کہ سلامت شاہ زندہ ہو اور کہیں محبوس ہو۔ وہ آج تک بتائے بغیر یوں غائب نہیں ہوا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"میں نے چراغ دین سے فون پر بات کی تھی۔" میں نے کہا اور اپنا لہجہ بالکل نارمل رکھا۔ اگر میں فوراً ہی یہ نکتہ نادانستگی میں لبوں سے نکل جانے والے غلط الفاظ میرے جھوٹ کی قلعی کھول دیتے۔ "کل شام کو اور پھر آج صبح، اگر تو ہمیں دوپہر کے بعد ملا تھا۔"

اس نے سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "سلامت شاہ ہمارا سب سے اہم گواہ ہے۔ اس کے بیان کے بغیر استغاثہ کے خلاف ہمارا موقف بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مصلحت کے پیش نظر غائب ہو گیا ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں خوش فہمیوں سے امید کا دامن باندھنے کو دور اندیشی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک معمولی ملازم ہے، کوئی سیاست داں نہیں۔" ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر کی طرف چلنے لگے۔

"اگر... اگر فی الحقیقت ویسا ہی ہوا۔" اس نے تھوڑا سے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "جیسا تم نے سوچا ہے... تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں آج حق وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کا کیس تیار کر لوں گی اور کل یہ کیس فائل کر دیا جائے گا۔ منظر صاحب بھی آج کل میں ایس ڈی ایم کے سامنے قبر کھدا کے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی درخواست لگا دیں گے مگر یہ سب کیس ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا لاکر سے کوئی ایسی دستاویز برآمد نہیں ہو سکتی جس سے میرے والد کے اور میرے خلاف سازش کا اور سازش کرنے والوں کا پتہ چل جائے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے قتل ثابت ہو گیا تو یہ زبردست واقعاتی شہادت ہوگی۔"

وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ "امی جاگ گئی ہوں گی۔ ناشتہ تو آٹھ بجے کے قریب ہوگا۔ کہو تو تمہارے لیے بھی چائے بھجوا دوں۔ یا کافی؟" وہ مہمانوں کے بیڈ روم کے دروازے پر رک کے بولی۔ میں نے کہا کہ چائے کافی ہوگی اور اسے متوازن قدم اٹھاتے، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ راہداری سے گزر کے مڑتے اور زینے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ گھر میں عام عورت کی طرح رہنے والی مگر ادائے حسن اور عالم شباب میں عام عورت سے کہیں زیادہ پرکشش نظر آنے والی یہ حسین و جمیل لڑکی ابھی سفید شلوار قمیض پر سیاہ کوٹ پہن کے اور بریف کیس میں فائلیں لے کر عدالت میں حاضر

ہوگی تو چوہدری ڈاکے قتل، اغوا اور آبروریزی کے مقدمات پر مدلل بحث کرے گی۔ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کے اقتباسات پیش کرے گی اور دنیا بھر کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے مقدمات کو نظیر بنا کے لائے گی۔ وکیل استغاثہ کی ہر دلیل پر اعتراض اٹھائے گی اور اپنے موکل کے خلاف پیش ہونے والے ہر گواہ کے جھوٹ کا اپنی جرح سے پورا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دے گی۔ شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تصوراتی عورت سے اور فلموں کی تخیلاتی ہمہ صفت محبوبہ سے یہ عورت کتنی مختلف ہے جو زندگی کی عملی جدوجہد میں شریک ہے مگر کیا اس سے رابعہ کی نسوانیت کی دلآویزی اور حسن کی ساحری اور فطرت کی خوبصورتی کا طلسم مجروح ہوا؟ نہیں، اگر کسی کو علم نہ ہو کہ وہ اتنی سینئر ایڈووکیٹ ہے تو وہ اس کے عشق میں اتنا ہی رسوا و خراب ہو سکتا ہے جتنا کہ لیلیٰ کے لیے مجنوں ہوا۔ میں نے اس کمال بے مثال اور جمال باکمال کے اعتراف کے طور پر سر ہلایا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ محسن یوگا کے آسن میں آلتی پالتی مارے بستر پر سیدھا بیٹھا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جو دھواں اس کے نتھنوں سے خارج ہو رہا ہے سگریٹ کا نہیں اس کے دل سے اٹھ رہا ہے۔

"یہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو چھپ کر دیکھ رہا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ صبح صبح باغ میں کیا شوٹنگ ہو رہی تھی؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کیا نظر نواز فلمی سیٹ تھا۔ عالم خلوت ہے، سبز شبنمی گھاس ہے، شفق کا سنہرا اجالا ہے۔ رنگ پیراہن ہے اور عارض کے گلاب ہیں۔ میں تنگ آ گیا ہوں ایسے رنگین فلمی مناظر کو دیکھ دیکھ کر۔ ایک گھنٹے سے برداشت کر رہا تھا میں۔"

"یہ مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ اور ملزم سکندر بخت کی سو فیصد قانونی اور جائز ملاقات تھی۔" میں نے کہا۔ "جو بدقسمتی سے جیل کی بجائے صحن چمن کے روح پرور ماحول میں ہو گئی۔ قصور رابعہ کا ہے کہ جب میں اندر کودا تو وہ لان پر ٹہل رہی تھی۔"

"اور اس نے تجھے پکڑ لیا، رنگے ہاتھوں، پوچھا تو ہوگا کہ یہ کیا غیر شریفانہ آمد و رفت ہے؟" محسن اچانک نارمل ہو گیا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور اسے ساری بات بتا دی۔ اس دوران "ماسی" نمودار ہوئی اور چائے کی ٹرے بیچ میں رکھ کے پھر زیر لب کچھ کہتی ہوئی چلی گئی۔ محسن کا خیال تھا کہ وہ کوئی وظیفہ پڑھتی ہے۔ میں نے کہا کہ وظیفہ نہیں ہم پر خفگی

عمل کرتی ہے۔ اسے ہماری صورت اچھی نہیں لگی۔"

"سوٹ کیس تو اب میں لے آؤں گا۔" محسن نے چائے پیتے ہوئے فرمایا۔ "لیکن برادر نسبتی! اس خط کا حصول مسئلہ ہوگا۔"

"سالار جنگ!" میں نے کہا۔ "یہ خیال مجھے بار بار آ رہا تھا کہ ابھی تک ہم نے رابعہ کو اس خط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا حالانکہ وہ خط ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ اگر ہم اس کے حصول میں کامیاب رہے تو رابعہ سے کیا کہیں گے کہ خط کہاں سے آیا اور کیسے آیا؟ فوما پخو اگر دشمن کا نامہ بر بنا تھا تو ہمارا مددگار کیوں ہوا؟"

"پیسہ۔" میں نے کہا۔ "اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ فوما پخو غریب مگر باضمیر آدمی تھا۔ کچھ لوگوں نے پیسے کا لالچ دے کر اسے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کیا مگر اس نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کی مہلک غلطی کی۔ خط ہمیں ہوٹل میں ملا۔ تو یہ بھول رہا ہے کہ ایمبیسیڈر ہوٹل میں ابھی تک ہمارا کمرہ بک ہے۔"

"مگر مقفل پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور کسی اسٹیج پر ہم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ گزشتہ شب ہم ہر جائے واردات سے دور اپنے ہوٹل کے کمرے میں مقیم تھے۔ ہمیں آج قیام کا مستقل بندوبست بھی کرنا ہے۔ ہم یہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"رابعہ کی ماں نے ہمارا استقبال بڑی شفقت اور محبت سے کیا تھا۔" محسن بولا۔

"جب کسی ماں کی بیٹی رابعہ کی عمر کی ہو جائے اور اس کا گھر آباد نہ ہو تو ہم جیسے ہر مہمان کی ایسے ہی پذیرائی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تیری تو ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کے مکان پر "ٹو لیٹ" کا بورڈ آویزاں ہے۔"

"TO LET" کے بورڈ پر بیچ میں آئی لگا دے۔" میں نے کہا۔ "پھر شاید کوئی آ جائے، ویسے تو مشکل ہے۔"

ناشتے کی میز پر رابعہ کی ماں سے پھر ملاقات ہوئی اور اس نے تفصیل سے ہمارا حسب نسب پوچھا۔ مختصراً وہ بھی سنی جو ہم پر بیت چکی تھی اور گزشتہ شب کی واردات کا احوال بھی دریافت کیا۔ پھر گفتگو الگ الگ ہونے لگی۔ رابعہ نے مجھے بتایا کہ منظر صاحب کو کیس فائل کرنے کے لیے تین افراد کے حلف نامے درکار ہوں گے جو تدفین میں شریک رہے ہوں اور قبر کی نشاندہی کر سکیں اور یہ کام ایس ڈی ایم

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں۔"

شیخ موجودگی میں ہوگا۔ میڈیکل بورڈ جس میں پولیس سرجن کے علاوہ بھی دو ڈاکٹر ہوں گے عدالت نامزد کرے گی اور وہ وہیں قبرستان میں پوسٹ مارٹم کریں گے جس کی رپورٹ بعد میں براہ راست عدالت کو دی جائے گی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فنگر پرنٹ کی رپورٹ عموماً چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تیار کرلی جاتی ہے مگر اس کے بعد کاغذی کارروائی کا سلسلہ لامتناہی بھی ہوسکتا ہے تاہم کوشش سے کیا نہیں ہوتا۔ رپورٹ سماعت کی اگلی تاریخ پر چالان کے ساتھ بھی پیش کی جاسکتی ہے بشرطیکہ چالان چودہ دن میں مکمل ہوجائے جس کا امکان بہت کم ہے۔ اگر ایک مہینے کے بعد چالان پیش کرانا مقصود ہو تو اس کے لیے خصوصی وسائل کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ محسن اس عرصے میں رابعہ کی ماں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جب ہم متوجہ ہوئے تو وہ میری اور فوزیہ کی نسبت کا ذکر بڑی معصومیت سے کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا مقصد شوشہ چھوڑنے کے سوا کچھ نہیں لیکن اس کا ردِعمل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سب سے پہلے تو میں نے رابعہ کی صورت کے تغیر کو محسوس کیا۔ اس کا نکھرا ہوا گلابی رنگ صرف ایک لمحے کے لیے بے رنگ ہوا۔ یوں جیسے برقی رو کے دباؤ میں کمی سے بلب کی روشنی کم ہو اور بڑھ جائے۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرائی۔

"کمال ہے امی!" وہ بولی "ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے اعتراف نہیں کیا تھا کہ دوستی کے علاوہ بھی ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "اور اس کا موقع بھی کہاں ملا۔"

رابعہ اپنی ذہنی و جذباتی کیفیت کو چھپانے پر پوری طرح قادر تھی اور اب اس کی صورت یا اس کے رویے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا مگر میں اس ایک ثانیے کے تغیر پر غور کر رہا تھا اور دبانے کی پوری کوشش کے باوجود ایک سوال میرے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔ کیا یہ مایوسی کا ردِعمل تھا اور رابعہ کو اس اطلاع سے صدمہ ہوا تھا؟ اس ایک سوال کے کشکول میں بہت سے سوال تھے جو سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے بڑھ رہے تھے۔ یہ مایوسی کیوں؟ یہ صدمہ کیسا؟ کیا اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کرلی تھیں؟ نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں فقط ایک ملزم زیرِ سماعت ہوں۔ اس کا ایک موکل۔ ماہ و سال کے پرانے رشتوں کے درمیان وقت کی خلیج حائل ہے۔ تمہارا مجھ سے کوئی ذاتی تعلق کبھی نہ تھا؟ رابعہ نے کہا تھا، یا تھا تو یکطرفہ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ یکطرفہ تعلق ختم نہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کیا تجدیدِ تعلق کے لیے کوئی ان نامساعد حالات سے بھی تائید اور جواز حاصل کرسکتا ہے۔ رابعہ نے کورٹ جانے کے لیے تیاری کرنے کا عذر پیش کیا اور اٹھ گئی۔ رابعہ کی ماں کی دلچسپی کا محور محسن کی ذات ہوگئی تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا جو محسن کی شرارت سے یک لخت سامنے آگئی تھی۔ لیل پر کوئی شریر بچہ اچانک پردہ کھینچ کر چوری چھپے کسی ولن سے اجنبی کو دیکھنے والی لڑکی کو بے نقاب کردے۔ مجھے جیل میں رابعہ سے اپنی ملاقات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ تم سو فیصد ٹھیک بھی کہتے ہو اور غلط بھی۔ اس بات کا کیا مطلب تھا؟ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ لمبی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔ قیاس آرائی کی مدد سے اس لمبی بات کا اندازہ کرنا محال تھا۔ میں نے محسن کی اس حرکت کو دوسرے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ کہیں محسن سچ مچ رابعہ میں دل چسپی تو نہیں لینے لگا ہے؟ صبح اس نے مجھے اور رابعہ کو ایک گھنٹے تک باتیں کرتے دیکھا تھا تو کوفت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ کس ردِعمل کی غماز تھی؟ کیا اسے اپنی بہن کے منگیتر اور محبوب کا کسی دوسری حسین و پرکشش عورت سے ایسے ماحول میں بات کرنا ناگوار گزرا تھا۔ اسے فوزیہ کا خیال تھا یا خود اپنا؟ لاحول ولا قوۃ۔ میں نے ذہن کے فاسد خیالات پر لعنت بھیجی۔ یہ کیا فلمی مثلث بن رہی ہے۔ خدانخواستہ یہ اندیشے غلط نہ ہوں تو کتنی افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہوگی۔ محسن کو احساس ہوگا کہ رابعہ میری وجہ سے اس کو نہیں چاہتی۔ رابعہ کو احساس ہوگا کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اس کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں دے سکتا۔ فوزیہ کو احساس ہوگا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی عورت ہے جو برسوں سے مجھے چاہتی ہے۔ ذہانتوں کے احساس سے نیتوں کے خلوص میں رخنے پڑ سکتے ہیں۔ بدگمانیوں کے الاؤ بھڑک سکتے ہیں اور نفرتوں کی بادِ سموم انھیں ہوا دے سکتی ہے۔ نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ صرف میرے غیر متوازن ذہن کے بے سروپا خیالات کی بے عناں پرواز ہے اور میری غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے جس کا سبب میری پریشانی ہے۔

اور کچھ دیر بعد جب محسن نے کمرے میں داخل ہوکے ہنستے ہنستے کہا۔ "او بھیا سکندر بخت۔ بھاگ لے یہاں سے ورنہ قسمت کا ہوا میرا جھٹکا۔ وہ بڑھیا تو مجھ پر ایسی فریفتہ ہوئی ہے کہ بس چلے تو اپنا نکاح پڑھوالے مجھ سے۔" تو میں نے تمام اوٹ پٹانگ خیالات جھاگ کی طرح ختم ہوگئے اور میں یہ سوچ کر شرمندہ ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں کیا سوچ رہا تھا۔

"شرم کرو محسن۔" میں نے کہا۔ "وہ تیری اماں سے بھی بڑی ہے۔ اور رابعہ بھی تیری مریم باجی کے برابر تو ہوگی۔" معلوم نہیں یہ آخری بات میں نے کیوں کہی۔ محسن سے مریم صرف دو سال بڑی تھی لیکن رابعہ کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ وہ محسن سے دو سال بڑی ہے یا دو سال چھوٹی۔

رابعہ روانہ ہونے سے پہلے خدا حافظ کہنے آئی تو اس نے پوچھا کہ آج ہمارا پروگرام کیا ہے۔

"سب سے پہلے تو مجھے لاک روم سے اپنا سوٹ کیس لینا ہے۔ محسن کا سوٹ کیس بھی وہیں جمع ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد میرا ارادہ ہے کہ چراغ دین سے شرفِ ملاقات حاصل کریں۔"

"وہ کس لیے؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔ "کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنی ہے؟"

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا ہے کہ والد مرحوم کے جنازے میں کون لوگ شریک تھے؟ سلامت شاہ بتا سکتا تھا اور ایک گواہ بھی بن سکتا تھا مگر وہ لاپتہ ہے۔ مجھے ایک بار وہی میانی صاحب کے قبرستان لے گیا تھا اور وہ بھی شام کے وقت جب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شاید میں خود دوبارہ وہاں نہ پہنچ سکوں۔ قانوناً بھی میری نشاندہی کی کوئی حیثیت نہیں۔"

"اس کے علاوہ ہمیں اپنی مستقل رہائش کے لیے بھی جگہ تلاش کرنی ہے۔" محسن نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بولی۔ "یہاں کوئی تکلیف ہے تمہیں؟ گھر میں جگہ ہے۔ اور امی کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن ہمارا یہاں رہنا ناممکن ہے۔ یہ عقل کے اور مصلحت کے تقاضوں کے سخت خلاف ہوگا اور اخلاقاً بھی یہ غلط سی بات ہے۔ جتنی مدد تم نے کی اور آیندہ کرو گی وہی بہت ہے۔ ہم اس سے زیادہ تمہارے لیے باعثِ زحمت نہیں بن سکتے۔"

"تم رسمی باتوں کے ایکسپرٹ ہو۔" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے یہ باتیں بالکل بناوٹی لگتی ہیں۔"

"دیکھو رابعہ۔" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔ "ہمارا تعلق کاروباری رہے تو اچھا ہے۔ ہم سب کا مفاد اسی میں ہے۔"

"شاید تم ہی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "اس کاروباری دنیا میں مفاد پرستی کے سوا تعلق کی کوئی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔" وہ پلٹی اور ایک بار پھر سے مجھے حیرانی اور پریشانی میں مبتلا چھوڑ کے نکل گئی۔ اس مرتبہ اس کے طنز کی تلخی اتنی واضح تھی کہ خود محسن بھی ہکا بکا کھڑا رہا۔ بظاہر اس نے اپنی پیش کش مسترد کیے جانے پر برا مانا تھا لیکن اس بات سے متعدد مفہوم اخذ کیے جاسکتے تھے۔ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی تھیں اور ان گنت مشکل مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ جذباتی۔ معاشرتی یا قانونی مسائل چنانچہ ہم نے اتفاقِ رائے سے اپنے فیصلے پر قائم رہنا منظور کیا خواہ اس سے رابعہ کی یا اس کی ماں کی حوصلہ شکنی ہو یا دل آزاری۔

پہلا اہم ترین مسئلہ اس خط کے حصول کا تھا جو "گلاب خان معرفت محبت خان" ارسال کیا گیا تھا۔ اصل خط وہ مندری والا لے کر بھاگ گیا تھا اور منشی مرحوم یعنی قوما نجو نے جو کچھ بھی لکھا تھا وہ ہمارے دشمنوں کو ہم سے پہلے معلوم ہو گیا تھا۔ قوما نجو کی دانش مندی اور دور اندیشی شبہے سے بالاتر تھی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے خط کی ایک نقل بنا کے ہمیں ڈاک سے بھیج دی تھی لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ قوما نجو اپنی ذات کو درپیش خطرات سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے رقعے میں ملاقات نہ ہونے کے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ حصار کو اپنے گرد تنگ سے تنگ تر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ شاید کسی مرحلے پر اس کا راز افشا ہوگیا تھا اور اس کی کسی حرکت نے دشمنوں پر واضح

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

سونگھاٹ کا پجاری

قیمت:- ۱۵/= روپے ○ ڈاک خرچ:- ۵/= روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مرگیا تھا لیکن اس کی لاش مندر کے تہہ خانے میں اصلی حالت میں موجود تھی۔
- سونگھاٹ کے علاقے پر اس مردہ پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ ہر جگہ نظر آتا تھا۔
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آکر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کرلیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟
ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

انکا (مکمل، دو حصے)	اقابلا (مکمل، دو حصے)	غلام روحیں (مکمل)
قیمت فی حصہ ۱۰ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت فی حصہ ۱۵ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے	قیمت ۱۰ روپے، ڈاک خرچ ۵ روپے

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ کراچی۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے مل گیا ہے۔ اس نے صرف دو بار مجھے فون کیا تھا اور وہ بھی لندن میں۔ کیا اس وقت کوئی سن رہا تھا اور کیا سننے والے کو محض فوما نچو کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔؟ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خود فوما نچو بھی دشمنوں کا ایک ادنیٰ کارکن اور نچلی سطح کا مہرہ تھا۔ ایک بہت بڑی مشینری کا بہت چھوٹا سا حقیر پرزہ۔ معاشی مجبوری یا کسی اور دباؤ کے باعث وہ ان کے لیے کام کرنے پر مامور تھا اور لندن میں اس کے آقا وہ تھے جو میرے لیے تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کا سامان فراہم کرنے پر مامور تھے۔ شاید انھی میں سے کسی نے اس کی گفتگو سن لی تھی اور منشی زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ منڈی والے ٹیکسی ڈرائیور نے اسے دو بار نمک حرام کہا تھا شاید ایک بار غدار بھی کہا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو لندن ہی میں اس کو سزا دے سکتے تھے اور جیسے اب اس کی لاش ایک گمنام ویران مقبرے میں سامانِ عبرت بنی پڑی ہے۔ ایسے ہی لندن کی کسی سڑک پر بھی کچلی ہوئی مل سکتی تھی مگر شکاری چالاک تھے۔ انھوں نے منشی کو جال کے طور پر استعمال کیا۔ اسے موقع فراہم کیا کہ وہ ہم سے رابطہ قائم کرے اور اس پر نگاہ رکھی۔ ٹھیک وقت پر انھوں نے منشی کو اٹھا لیا اور اس سے سب کچھ پوچھ لیا۔ اس کے بعد جال کی ضرورت نہ رہی اور منشی کا مقدر وہ سزا ہوئی جو ایک ضرورت کے باعث التوا میں تھی۔

دو افراد کے عملے پر مشتمل ایک ڈاک خانے سے ہمیں اس پوسٹ آفس کا پتہ معلوم ہوا جہاں سے علاقے کی ڈاک تقسیم ہوتی تھی۔ ہم نے اس پوسٹ آفس میں قدم رکھا تو ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کاؤنٹر سے ہٹ کر دائیں جانب ایک دروازے سے اترنے والا زینہ میل سارٹنگ آفس کا راستہ ثابت ہوا۔ نیچے ایک خاصے بڑے ہال میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے خانوں والے شیلف لگے ہوئے تھے جو بالکل کبوتر خانے لگتے تھے۔ شیلف کے ساتھ ساتھ میز کی اونچائی کے برابر کاؤنٹر تھا جو کمرے کی تین دیواروں پر محیط تھا۔ اس کاؤنٹر کے سامنے لکڑی کے اسٹولوں پر بوسیدہ میلی اور خاکی رنگ کی وردیوں والے درجنوں پوسٹ مین بیٹھے تھے اور ڈھیروں خطوط کو ادھر سے ادھر خانوں میں ڈال رہے تھے یا نکال رہے تھے اور ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھے۔ ان کی باتوں کے شور سے کمرہ گونج رہا تھا اور جب ہم ان کے درمیان سے گزرے تو کسی نے نظر اٹھا کے بھی ہماری طرف نہیں دیکھا حالانکہ اوپر زینے کے شروع میں ہی لکھا تھا کہ غیر متعلقہ افراد کا داخلہ منع ہے۔ ایک چڑچڑے پوسٹ مین نے چلا کر دوسرے چڑچڑے پوسٹ مین سے کہا۔ "یار محمد بھائی۔ یہ تمھارے علاقے کا خط پھر ادھر آ گیا۔ ابھی میں نے ادھر رکھا تھا" اور محمد بھائی نے خط کے پتے کو اپنے علاقے میں تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ان کی بحث کا آغاز ہونے سے پہلے ہی میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "وہ پوسٹ مین کہاں ہے؟ کیا نام ہے اس کا۔ وہ جو ادھر ڈاک لے جاتا ہے۔" میں نے چراغ دین کی کوٹھی کا پتہ بتایا۔

"بالو" محمد بھائی نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کے کہا۔ "وہاں دیکھو۔" اس نے انگلی سے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جو اسٹول کے برابر تھا ہم اس کونے میں پہنچے اور ہم نے قبل از وقت فارغ ہو جانے والے یا سرے سے کام شروع ہی نہ کرنے والے اس پوسٹ مین کو مخاطب کیا جو اسٹول کے مختصر سے تختے پر آلتی پالتی مارے اور اپنا توازن برقرار رکھے۔ بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں مطلع کیا کہ بالو جا چکا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اس وقت ڈاک تقسیم کر رہا ہو گا۔ اگر وہ کینٹین میں نہ ہوا تو مستری سائیکل والے کے پاس اخبار پڑھ رہا ہو گا۔ ڈاک تو وہ بارہ بجے دے گا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے باعث تشویش ہونے لگی تھی۔ کینٹین میں بالو نام کا کوئی پوسٹ مین نہیں ملا تو ہم نے مستری سائیکل والے سے دریافت کیا۔ اس نے قسم کھا کے کہا کہ بالو ادھر کا رخ بھی کرے تو وہ اس کی ٹانگیں "بائٹ" کر دے۔ "اخبار پڑھنے کے بہانے چیزیں مارتا رہا۔ پانے غائب ایک پلاس۔ تین پیچ کس۔ تو جی لو۔ اچھا ہے۔ نیکی کر اور نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال۔" مستری نے ارشاد کیا۔ اس بیان سے بالو ڈاکیے کی فطرت کا ایک پہلو سامنے آ گیا یعنی یہ کہ وہ کوئی ایمان دار خدا ترس قسم کا آدمی نہیں ہے اور ایسا آدمی دس بیس روپے کے عوض آسانی سے وہ خط راستے ہی میں دے دے گا۔ شاید سو روپے لے کر ساری ڈاک دے دے کہ جاؤ عیش کرو۔ ہم بھی گھر جا کے سوتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔

ہم نے مزید وقت ضائع کیے بغیر چراغ دین کی کوٹھی کا رخ کیا۔ دو گھنٹے میں یہ میرا دوسرا پھیرا تھا اور ابھی تک کے آثار ناپید تھے۔ سلامت شاہ کی لاش دریافت نہیں ہوئی تھی ورنہ کوٹھی کے دروازے پر پولیس کی ایک آدھ جیپ ہوتی یا کوئی کانسٹیبل کھڑا ہوتا اور اندر آنے جانے والوں کے علاوہ دروازے کے سامنے پر تجسس اور بیکار لوگوں کا اجتماع ہوتا۔ محسن کو چراغ دین کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ "تم اندر جا کے اس سے بات کرو۔" وہ بولا۔ "میں باہر پوسٹ

مین کا انتظار کرتا ہوں۔ اول تو راستے ہی میں خط اچک لوں گا ورنہ محبت خان کے سامنے جا کے لے لوں گا۔ محبت خان تو مجھے گلاب خان ہی سمجھے گا نا۔ اس کا خیال تو یہ ہے کہ میرا چراغ دین سے کوئی رشتہ نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ رشتہ واقعی نہ ہوتا۔" اس نے نفرت کے زہر سے بھری نظر اس کی کوٹھی پر ڈالی۔ پھر ہم دونوں پچاس قدم دور خشک گھاس پر بیٹھ گئے۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "جب یہ رشتہ ہو رہا تھا تو تو اتنا مشتعل نہیں تھا۔ اعتراض اگر تجھے تھا تو صرف اس بات پر کہ شادی مریم کی پسند سے نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس نے مریم کو کسی قسم کی ذہنی اور جسمانی اذیت نہیں دی اور مریم کو بھی اس سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ خود تو نے ایک بار حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ خوش ہے۔ اب یہ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد چراغ دین کے خلاف تیرے دل میں کیا کدورت آ گئی ہے۔ اس کے نام پہ تو نفرت کے اتنے شدید ردِعمل کا شکار کیوں ہو جاتا ہے۔"

محسن خلا میں دیکھتا رہا۔ "مجھے شک ہے کہ چراغ دین نے اسے قتل کیا تھا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تیرا دماغ جرائم کی فلموں اور جاسوسی ناولوں نے خراب کر دیا ہے۔ آخر شک کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے۔"

"لوگ بیویوں کو کیوں قتل کرتے ہیں۔؟" وہ بولا۔ "میرے ذہن میں اس کے تین ہی اسباب آتے ہیں ایک یہ کہ وہ خود کسی دوسری عورت کے چکر میں پڑ جائیں دوسرے یہ کہ بیوی کو بدچلن سمجھتے ہوں۔ چراغ دین کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں ہوتا تو اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا۔ کیا تیرے خیال میں مریم باجی کے کردار کی خرابی اس کا سبب ہو سکتی ہے؟"

"ناممکن۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ کتنے مضبوط کردار کی عورت تھی۔ اس کا اپنی ذات پہ اعتماد قابلِ رشک تھا۔"

"اگر یہ ناممکن ہے تو تیسری وجہ وہی رہ جاتی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔" محسن بولا۔ "مریم باجی کی زندگی کا بیمہ پچاس ہزار روپے کا تھا حادثاتی موت کی صورت میں رقم دگنی یعنی پورے ایک لاکھ۔ گاڑی کا اس نے الگ پورا بیمہ کرا رکھا تھا۔ تھرڈ پارٹی انشورنس نہیں۔ چنانچہ کمپنی نے اسے نئی کار لے دی۔ ایک لاکھ کیا ہوتے ہیں مگر تو چراغ دین کو جانتا ہے۔ پیسے کے لیے اس نے وزیر خاں چچا کے ساتھ کیا کیا؟"

"مگر محسن۔ اس حادثے میں چراغ دین کا اپنا بھائی بھی ہلاک ہوا تھا۔" میں نے اس کی دلیل کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک اتفاق تھا۔ جسے قدرت کے نظامِ انصاف کا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔" محسن تلخ لہجے میں بولا۔ "اس حادثے کے بعد شوفر نے روتے روتے مجھے بتایا تھا کہ مالک مجھ بدبخت کو حادثے کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اس کی بدبختی یہ تھی کہ پروگرام کے مطابق جس روز انھیں روانہ ہونا تھا وہ ملیریا میں مبتلا ہو گیا۔ اس کو ایک سو چار درجے بخار تھا لیکن ملیریا تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سفر ایک دن کے لیے ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ چراغ دین کا بھائی صرف دو دن کے لیے مری گیا تھا۔ اس نے خود کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا اور اصل شوفر سے کہہ دیا گیا کہ وہ بعد میں بس سے آ جائے۔ چراغ دین بعد میں اس بات کو روتا تھا کہ بھائی نے یہ حماقت کیوں کی اور اس نے شوفر کو بہت گالیاں دی تھیں۔ اور پھر اسے برطرف کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کا قصور کوئی نہ تھا۔ بیمار وہ اپنی مرضی سے تو نہیں ہوا تھا مگر چراغ دین نے اس سے چیخ چیخ کر کہا کہ مرنا تجھے تھا بڈھے۔ قضا تیری آئی تھی۔ تو نے میرے جوان بھائی کی جان لے لی میرے بچوں کو مار ڈالا۔ اس نے شوفر کو مریم کی موت کا ذمے دار قرار نہیں دیا۔ بعد میں مجھے ایک اور عجیب بات معلوم ہوئی۔ چراغ دین نے بھائی کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ بچوں کو نتھیا گلی تک لے جائے اور وہ سب دو دن بعد بس یا ویگن سے لاہور آ جائیں۔ شوفر کو حکم تھا کہ وہ تمام سامان سمیت صرف مریم کو لے کر روانہ ہو۔ شوفر کی بیماری سے پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔ نتھیا گلی جانا اتنا اہم نہیں تھا۔ مریم نے اور چراغ دین کے بھائی نے کہا کہ چلو آیندہ سال سہی اور وہ نوجوان سب کو لے کر چل پڑا۔ اسے نئی کار کو مری سے لاہور لانے کا بہت شوق تھا کہتے ہیں کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ بچوں کے اور چراغ دین کے بھائی کی جگہ شوفر بس سے آیا اور بچ گیا۔ جن کو چراغ دین بچانا چاہتا تھا وہ مارے گئے۔ یہ بات مجھے خاص طور پر کھٹکتی ہے کہ جب سیزن ختم ہو رہا تھا تو چراغ دین نے اپنے بھائی کو نتھیا گلی کا خصوصی پروگرام بنا کے کیوں بھیجا۔ پھر یہ کہ اس نے صرف بچوں کو نتھیا گلی لے جانے کی بات کیوں کی۔ اگر مریم بھی دو چار دن کے لیے نتھیا گلی ہو آتی تو کیا ہوتا۔ سامان واپسی میں بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ کوٹھی کا کرایہ پندرہ ستمبر تک کا ادا کیا گیا تھا مگر سیزن کے لیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کوٹھی لینے والے دو چار دن اوپر گزار لیں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ وہ کوٹھی اس نے بعد میں خریدی تھی۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس نے پورے سیزن میں مریم سے نہیں کہا کہ چلو نتھیا گلی گھوم آئیں یا یہ کہ تم بچوں کو نتھیا گلی دکھا لاؤ۔ مریم باجی خود بھی بہترین ڈرائیونگ کرتی تھیں آخری دنوں میں یہ پروگرام بنانے کا مقصد آخر کیا تھا؟ میری سمجھ میں صرف ایک بات آتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بچانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے بھائی کو بھیج دیا تھا۔ مریم اور شوفر حادثے کا شکار ہو جاتے تو اس کے لیے صدمے کی بات نہ ہوتی۔ جو کار نیچے گر کر چورا ہو جائے اس کے بارے میں کون ماہر یہ رپورٹ دے سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ چراغ دین کو یہ بات کس نے بتائی؟ بچنے والا تو کوئی تھا نہیں۔"

"یہ سوال تو نے کبھی چراغ دین سے کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس سے پہلے میں نے شوفر سے پوچھا تھا۔"

محسن بولا۔ "وہ خود حیران تھا کہ بریک کیوں فیل ہوئے۔ پولیس کی تفتیش میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا اور صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مری سے راولپنڈی آتے ہوئے سترھویں میل کے قریب کار حادثے کا شکار ہوئی جس کا عینی گواہ کوئی نہیں مگر دو منٹ کے وقفے سے دوسری کار آئی جس میں ایک اور فیملی مری سے لوٹ رہی تھی۔ انھوں نے کار کو قلابازیاں کھاتے نشیب کی طرف جاتے دیکھا۔ ظاہر ہے وہ اوپر سے یہ دہشت ناک منظر دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ چند منٹ میں مخالف سمت سے دوسری کار نمودار ہوئی جو مری جا رہی تھی۔ اس کے مسافروں نے مری پہنچتے ہی پولیس کو اطلاع دی اور پولیس وہاں حادثے کے ایک گھنٹے بعد پہنچی تو کچھ نہیں بچا تھا۔ پہلی کار اس وقت تک پنڈی پہنچ گئی تھی اور وہاں بھی پولیس کو مطلع کر دیا گیا تھا چنانچہ دوسری پولیس پارٹی پونے دو گھنٹے بعد پہنچی۔ یہ سب تو رپورٹ میں ہے۔ وقت، تاریخ، دن اور نقشے کے مطابق حادثے کا صحیح مقام۔ حادثے کے عینی شاہدوں کے بیانات۔ انشورنس کمپنی کی سروے رپورٹ حادثے کے ممکنہ اسباب۔ لیکن کہیں بھی یقین کے ساتھ بریک فیل ہو جانے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ یہ بات صرف چراغ دین نے کہی۔ جب میں نے اس سے پہلی بار پوچھا تھا کہ حادثہ کیسے ہوا تو اس نے دلوار کو گھورتے ہوئے کہا تھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا سکندر۔ حادثے کے ممکنہ اسباب تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی تیز رفتاری کے باعث بے قابو ہو جائے۔ آگے کا کوئی ٹائر برسٹ ہو جائے۔ ٹائی راڈ کھل جائے۔ اگر ٹوٹ جائے۔ جب کسی نے حادثے کے سبب کا تعین کیا ہی نہ تھا تو چراغ دین نے کیسے کہہ دیا کہ بریک فیل ہو گئے تھے۔ یہ اس کے ذہن میں یہ بات تھی جس کا اسے پورا یقین تھا کہ حادثہ کیوں ہوا اور غیر شعوری طور پر اس نے میرے سامنے یہ بات کہہ دی۔ میں نے ڈیڈی سے ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ حادثے کا اصل سبب کیا تھا۔ جو ہونا تھا ہو گیا اور موت ایسے ہی بہانے ڈھونڈتی ہے۔ شوفر جو بدبخت نہیں خوش قسمت تھا برطرفی کے بعد کہیں اور ملازم ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا پتا ہی نہ ملا کہ میں اور کچھ پوچھتا۔ تفتیش کرنے والوں نے قتل کے امکان کو مدنظر رکھا ہی نہ تھا چنانچہ لاشوں کی تدفین ہو گئی۔ گاڑی کا ملبہ انشورنس کمپنی والے اٹھا کے لے گئے اور اس کے پرزے کباڑیے کو فروخت کر لے گئے۔ کیس ضروری رسمی کارروائی کے بعد ختم ہو گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد اور قصاب ہم مر گیا۔"

یہ بات جواب تک محسن کے دل میں کانٹے کی خلش کی طرح موجود تھی آج اچانک اس کی زبان پر آ گئی تھی اور اب بھی اس حادثے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ چراغ دین کے خلاف نفرت کا لاوا میرے دل میں بھی پک رہا تھا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ ایسے ہی نفرت کے ببول محسن کے دل کی زمین پر بھی پھیلے جا رہے ہیں۔ میری نظر میں وہ اس لیے مجرم تھا کہ میرے باپ کی پیٹھ میں سب سے پہلے خنجر گھونپنے والا ہاتھ اس کا تھا اور اس کا یہ ٹھاٹھ باٹھ اسی پیسے کی بدولت تھا جو میرے باپ کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے چراغ دین نے اس کی تجوری سے چرایا تھا۔ وہ قانون کے سامنے چور ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن اس سے چراغ دین کے جرم کی سنگینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ محسن کی نگاہ میں وہ اس کی بڑی بہن کا قاتل تھا جس نے اس کی زندگی کے عوض لاکھ روپے وصول کر لیے تھے۔ قدرت نے اسے بہت بڑی سزا دی تھی لیکن دنیا کی نظر میں وہ بدستور معزز اور معتبر تھا۔ ہماری نگاہ میں وہ اتنا ہی بے گناہ تھا جتنے ہم مگر ہم سمجھتے تھے کہ وہ بدترین سزا کا مستحق ہے۔ چراغ دین کے بارے میں ہماری جذباتی کیفیت ایک جیسی تھی۔ ہم دونوں کو اس کے لبوں سے اعتراف جرم سننا تھا اور پھر وہ حساب بے باق کرنا تھا جو کسی کتاب میں نہ تھا۔

"محسن" میں نے کہا۔ "ابھی تو میں چراغ دین سے یوں ملوں گا جیسے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے اس کی کمزوریوں کا پتا ہے اور عیار آدمی کے خلاف موثر حربہ عیاری کا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر میں نے کھل کر اس سے عداوت کا اظہار کیا تو وہ میرے دشمنوں میں شامل ہو جائے گا۔ ابھی اس کو میری ذات سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس سے ملوں گا تو یہ تاثر دوں گا جیسے میں کچھ نہیں جانتا۔ پہلے درجے کا بے وقوف ہوں اور حالات کا تجزیہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اپنے عاجزانہ لہجے اور مسکین صورت سے میں اسے اپنے بے ضرر ہونے کا پورا یقین دلا دوں گا تو وہ بہت سی باتیں بتائے گا جو اس کے نقطۂ نظر سے غیر اہم ہوں گی۔ وہ حتی الامکان میری مدد سے بھی گریز نہیں کرے گا لیکن وہ بدک گیا تو مجھ سے بات تک کرنے کا روادار نہ ہو گا اور الٹا مجھے پھنسا دے گا۔ جو شخص پہلے ہی ملزم و گناہگار ہو اس پر کون پتھر نہیں اٹھا سکتا۔ مناسب وقت پر ہم اس سے ایک ساتھ ملیں گے اور وہ حقیقت کا اعتراف خود کرے گا۔ اب پوسٹ مین کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں چراغ دین کو باتوں میں لگائے رکھنے کی کوشش کروں گا۔ محبت خان کو بھی الجھائے رکھوں۔ تو خط لینے میں کامیاب ہو جائے تو انتظار مت کرنا۔" میں نے اپنی پتلون کی جیب میں سے لاک روم کی رسید نکال کر اسے دے دی۔ "دونوں سوٹ کیس لے کر رابعہ کے گھر پہنچ جانا۔ میں فارغ ہو کے سیدھا وہیں آؤں گا۔ شام کو سلطان کا انتظام نہ ہوا تو ایک دن ایمبیسیڈر ہوٹل میں اور سہی۔ مگر شام کو ایس پی ضامن رضوی صاحب سے مل کر دونوں باتیں کر لیں گے ریوالور کے لائسنس کی بھی اور رہائش کے مسئلے کی بھی۔ وہ با اثر رسوخ والے آدمی ہیں۔ کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔"

جب میں پورے اعتماد سے مارچ کرتا ہوا سی سی دین کی نیم پلیٹ والی کوٹھی پر پہنچا تو میوزیکل کال بیل کے جواب میں خود محبت خان دروازہ کھولنے آیا۔ "آؤ آؤ" اس نے بڑے اخلاق سے کہا۔ "تم اس چٹھی کا واسطے آیا ہے نا؟ ابھی وہ خانہ خراب بالو پوسٹ مین نہیں آیا۔ مرضی کا بادشاہ ہے۔ خو ابھی آ جائے گا۔ تم بیٹھو۔" وہ مجھے برآمدے میں لے گیا۔

"محبت خان" میں نے کہا۔ "وہ چٹھی گلاب خان خود لے جائے گا۔ میں تمھارے صاحب چراغ دین سے ملنے آیا ہوں۔" محبت خان کی صورت پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ "دین صاحب سے ملے گا؟ تم جانتا ہے اس کو؟ کیا کام ہے؟"

"کام میں انھی کو بتا دوں گا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم انھیں بتا دو سکندر بخت آیا ہے۔"

"خو کیسے بتائے کس کو بتائے۔" وہ بولا۔ "دین صاحب کدھر ہے کہ بتائے۔ ابھی رو بی کا واسطے آئے گا تو بتائے گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "لنچ کے وقفے میں آئیں گے وہ۔ اچھا سلامت شاہ سے مل لیتا ہوں میں۔ وہ کچن میں ہو گا نا؟" محبت خان نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "کچن میں؟ خو مارا سلامت شاہ کا کس کو پتا ہے۔ غریب زندہ ہے کہ مر گیا۔ کتنا روز ہو گیا آج اس کو؟" اس نے انگلیوں پر گن کے حساب لگایا۔ "دین صاحب نے اس کا کوارٹر میں دیکھا۔"

"اچھا!" میں نے چونک کر کہا۔ "کوارٹر میں تو تالا پڑا ہوا تھا۔" اور چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ وہ ہم کو بولا۔ ہم اوپر سے دیکھا۔ سب سامان موجود۔ دروازہ کھلا پڑا ہے۔ ہوتا تو سامنے نظر آتا۔ خو آدمی ہے جو ہے کا۔ بچہ تو نہیں ہے۔ ہم صاب کو بولا صاب پولیس کو بولو اس کا پتا چلائے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ ورنہ غریب لوگ لاری کے اور ویگن کے یا کار کے نیچے آ کے مرتا ہے۔ غریب کا نساماں کا لاش مردہ گھر میں پڑا ہو۔ لاوارث ہم ادھر کب تک انتظار کرے گا۔" محبت خان اپنی رو میں بولتا گیا۔ "دین صاحب نے کہا آج پرچا کٹائے گا۔"

میں نے محسوس کیا جیسے یہ ضرورت سے زیادہ عقل مند بننے کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ میں خود چل کے خطرے کے اس حصار میں داخل ہو گیا ہوں اور پولیس کسی بھی لمحے پہنچ سکتی ہے۔ اگر چراغ دین نے فون کیا ہو گا تب بھی وہ کوارٹر کو ایک نظر دیکھنے ضرور آئیں گے اور اندر قدم رکھتے ہی تعفن خود سلامت شاہ کی لاش کا پتا دے گا۔ آنے والے اسی تھانے کے لوگ ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہیں۔ وہ پھر مجھے لے جائیں گے۔ شبہے میں نہ سہی عینی گواہ بنا کے۔ میرا بیان لینے کے لیے۔ وہ سوالات سے میری زندگی عذاب کر دیں گے۔ تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟

ائیرپورٹ سے تم سیدھے سلامت شاہ کے پاس پہنچے تھے۔ کیا سامان تھا تمھارے ساتھ؟ وہ سامان اب کہاں ہے؟ گرفتاری کے وقت تو تمھارے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ لاک روم والی بات نہیں چلے گی۔ اس پر محسن رضا کا نام اور آج ہی کی تاریخ ہے۔ میں انکار بھی نہیں کر سکتا کہ لندن سے صرف بریف کیس لایا تھا۔ محسن رضا تو بعد میں آیا تھا۔ سامان اس کے پاس کیسے پہنچا؟ آج لاک روم میں سامان رکھنے کا کیا مقصد تھا؟ اب تک یہ سامان کہاں تھا؟

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس صندوق میں لاش ہے وہ تمہارے والد کی ملکیت تھا۔ اس میں کیا سامان تھا؟ تم نے نہیں دیکھا تھا؟ صندوق مقفل تھا تو چابیاں۔ چابیوں کے بارے میں تو شاید میں نے تھانے میں بھی بات کی تھی۔ محبت خان بتائے گا کہ میں ایک روز پہلے بھی گلاب نامی ایک شخص کے ساتھ سلامت شاہ کے کوارٹر کی طرف گیا تھا۔ گلاب خان بعد میں محسن رضا ثابت ہوگا تو اس جھوٹ کا ہم کیا جواز پیش کریں گے۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ سوالات مشین گن سے فائر ہونے والی گولیوں سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ نکلتے چلے آ رہے تھے اور میرے لیے دلی خوف و اضطراب کی کیفیت کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ چراغ دین خود پولیس کے ساتھ نمودار ہونے ہی والا ہے۔ میں نے ایسے وقت میں یہاں آ کے سخت حماقت کی تھی۔ اب بچت کی یہی ایک صورت تھی کہ میں بھاگ جاؤں اور بعد میں ہر بات سے صاف انکار کر دوں۔ نہ میں نے والد کا چھوڑا ہوا صندوق دیکھا۔ نہ سلامت شاہ نے اس کی بات کی اور نہ میں نے تھانے میں اس کی چابیوں کا ذکر کیا۔ نہ میں بعد میں یہاں آیا۔ میں کسی گلاب خان کو نہیں جانتا۔ میرا سامان اسی روز محسن نے سلامت شاہ سے لے کر ہوٹل میں رکھ لیا تھا۔ آج کمرہ خالی کرنا تھا۔ اس لیے لاک روم میں عارضی طور پر رکھوایا تھا۔

"خانہ خراب ابھی تک نہیں آیا۔" چوکیدار نے داڑھ میں نسوار دبا کے کہا۔

"کو... کون؟" میں چونک پڑا لیکن محبت خان نے مجھے چونکتے نہیں دیکھا۔ وہ نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ بابو۔" محبت خان نے نسوار کی ڈبیا واسکٹ میں رکھ کے کہا۔ "اب نہیں آئے گا۔ تمہارا بھتیجی۔"

"میرا نہیں خان۔ وہ گلاب خان کا بھتیجی ہے۔ مجھے اس سے کیا۔" میں نے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ محبت خان میری بات پر تبصرہ کرتا کار کا ہارن بجا اور میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ "آ گیا دین صاحب۔" محبت خان دروازہ کھولنے لپکا۔ جب کار میں وہ اکیلا اندر آیا تو میری جان میں جان آئی۔

"السلام علیکم جناب۔" میں نے آگے بڑھ کے چراغ دین سے مصافحہ کیا اور پھر عقیدت سے ایک ہاتھ سینے پر رکھا۔

"وعلیکم السلام۔" چراغ دین نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے

کہا۔ "تم... تم سکندر بخت ہو؟ وزیر خاں...... کے بیٹے...؟"

"جی جناب عالی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں شکریہ ادا کرنے بھی آیا تھا۔"

"شکریہ؟" چراغ دین نے مشتبہ لہجے میں کہا۔ "کس بات کا شکریہ...؟"

"جی۔ وہ آپ نے آخری دنوں میں والد صاحب کی بہت مدد کی...۔" میں نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "ان کو چھپنے کی جگہ دی۔ وہ آپ کی شرافت کے بہت قائل تھے۔ میرے پاس لندن میں ان کے خط آتے رہتے تھے۔ لکھا تھا کہ اس پریشانی کے زمانے میں ایک شخص کے سوا کوئی کام نہ آیا۔ دوستوں نے بھی نظریں پھیر لیں۔ مگر وہ شخص جس کو میں نے ہمیشہ غلط سمجھا میرا سہارا بنا۔"

چراغ دین کے لیے یہ سب باتیں بہت ناقابلِ یقین تھیں مگر وہ میری صورت یا میرے لہجے سے کسی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سب اداکاری ہے میں طنز اور تمسخر سے ایسی گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ سخت ندامت کا شکار تھا۔

"پریشانی تو بہت اٹھائی انھوں نے۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "تمھیں اور کیا لکھی تھا۔ اپنی پریشانی کے بارے میں؟"

"یہی کہ کاروبار چوپٹ ہو گیا ہے اور گھر کے علاوہ ایک ایک چیز قرض خواہوں کی نذر ہو گئی ہے۔ تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں بچا اور اوپر سے بیماری نے آ لیا ہے۔ ایک پرانے نمک خوار نے دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو جگہ دے دیا ہے اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ جسے میں کوڑا سمجھا تھا وہ ہیرا تھا اور جن کو ہیرے کی طرح عزیز رکھا تھا وہ پتھر تھے۔" میں نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔ "انھوں نے لکھا تھا کہ بیٹا میرا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ میں تمھارے اخراجات کہاں سے پورے کروں۔ جتنا زیور تمھاری ماں کا تھا سب بیچ کے پیسہ ہمیشہ تمھیں بھیجا لیکن اب کوئی صورت نہیں رہی۔ تم واپس آ جاؤ۔ میں نے واپسی میں کچھ دیر کی۔ کیا خبر تھی...۔" میں نے سُبک سُبک کر کے خشک آنکھیں...

"اچھا اچھا۔" چراغ دین نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "صبر کرو۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ آؤ۔" وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تھا کہ مجھے یہاں کے حالات کی رتی بھر خبر نہیں اور میرے والد نے عمداً کچھ نہیں بتایا۔ نہ اپنے بارے میں اور نہ اس چراغ دین کے بارے میں جو غبن کر کے نوکر سے آقا بن گیا تھا۔ وہ سمجھتا رہا کہ وزیر خان نے اپنا دکھ اپنی ذات تک محدود رکھا اور اپنے بیٹے کو اپنے مصائب کے اصل اسباب اور زندگی کے آخری پُرآشوب دور کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تاکہ بیٹا تفکرات سے محفوظ رہے۔ اسے میری اور سلامت شاہ کی گفتگو کا یا میری، میر شرافت علی سے آخری ملاقات میں ہونے والی باتوں کا کیسے علم ہو سکتا تھا۔

"وہ... میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔" اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر کہا۔ "تم پر کوئی مقدمہ وغیرہ قائم ہو گیا ہے میر شرافت علی کے قتل کا۔ اور تم نے کہا ہے کہ میر شرافت علی نے تمھارے والد کو بلیک میل کیا تھا۔ اور یہ کہ ان کی موت بھی طبعی نہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"میں کیا عرض کروں جناب عالی۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔ "مجھے لوگوں نے پھنسا دیا۔ معلوم نہیں کسی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ جب میں لندن سے روانہ ہونے والا تھا تو ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ صورت سے بھلا مانس لگتا تھا۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی لگا کے آیا تھا۔ بوڑھا آدمی تھا پھر بھی بے لحاظ لڑکے اس کے حلیے پر ہنسنے لگے۔ اس نے قسم کھا کے مجھ سے کہا کہ میر شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کر کے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے۔"

"تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ میر شرافت علی نے کیسے بلیک میل کیا۔ کوئی وجہ تو ہو گی۔"

"میں نے پوچھا تھا جناب۔ مگر اس نے کہا وجہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ "وہ یہاں تھانے میں بھی مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے ہی کہا تھا کہ تمھارے والد کو قتل کیا گیا ہے۔ اس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ یہ بات جھوٹ نہیں۔"

"اور اس شخص کے کہنے پر تم نے عدالت میں بیان دے دیا؟" چراغ دین نے مجھے افسوس سے دیکھا۔

"اور میں کیا کرتا۔ مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام جو لگا دیا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے قسم کھا کے ایک بات کہی تھی میں نے وہی بات کہہ دی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ تم تو عقل سے بالکل پیدل ہو بابا۔" چراغ دین بولا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو والد تمھیں نہ لکھتے۔ تم نے تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ قتل کی ایک وجہ فراہم کر دی ہے۔ قسم کیا چیز ہوتی ہے۔ اور قتل کا کیا سوال۔ تمھارے والد بیمار تھے۔ میں خود گواہ ہوں اس بات کا کہ ان کی موت بیماری کا نتیجہ تھی۔ عمر کون سی کم تھی ان کی — جب میرے پاس آئے تو ان کی حالت تباہ تھی۔ میں جانتا تھا ایک زمانے میں وہ مجھ سے کتنے بدگمان تھے۔ شاید تمھیں علم نہیں کہ بدخواہوں کی باتوں میں آ کے انھوں نے مجھ پر کتنا سنگین الزام عائد کیا تھا مگر اب اس کا کیا ذکر۔ میں نے ان کا نمک کھایا تھا۔ سب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ یہ تو وقت کا انقلاب ہے۔ عزت اور ذلت۔ تقدیر کے کھیل ہیں۔ میں اس شخص کو کیسے دھتکار دیتا جو میرے پاس پناہ کے لیے آیا تھا۔ میں نے ان سے کہا یہ گھر حاضر ہے شوق سے رہیے مگر وہ خوددار آدمی تھے اور خیرات لینا قبول نہ کرتے تھے چنانچہ مجبوراً میں نے ان کو گھر میں معمولی سا جھاڑ پونچھ کا کام دے دیا اور اس کے عوض وہ مجھ سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ قبول کرتے رہے...۔"

میں نے دل ہی دل میں اس جھوٹ پر چراغ دین کو رقم سے بڑی گالی دی۔

"..... اس کے علاوہ بھی مجھ سے جو بن پڑا۔ میں نے کیا... دوا علاج... ہمدردی... حوصلہ افزائی۔" وہ بولتا رہا۔ "مگر ان کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ سلامت شاہ سے چھپ کر میں انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا... مجبوری تھی... دوسرے نوکر اصل بات کہاں جانتے تھے۔ وہ اس سلوک کی توقع رکھتے تو غلط ہوتا۔ تاہم مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے دن پورے ہو چکے ہیں... میں نے انھیں مشورہ دیا کہ اب بیٹے کو بلوا لو... کچھ تو سہارا ہو گا۔ یہ سب بکواس ہے کہ انھیں قتل کیا گیا۔ تم کیسے ثابت کرو گے؟ لاش نکلواؤ گے؟... توبہ کرو یار توبہ۔ لاش کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ ان کی مغفرت کی دعا کرو۔" اچانک اسے کچھ خیال آیا؟ "محبت خان" اس نے صدا لگائی۔

محبت خان نے دروازے میں سے جھانکا۔ "کیا ہے صاحب جی؟"

"دیکھو وہ گاڑی میں کھانا رکھا ہے۔ وہ یہاں ہم دونوں کے لیے نکال لاؤ۔ سلامت شاہ کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں صاب۔ آج ہم ادھر کوارٹر کا طرف گیا تو ہم کو بدبو آیا۔" محبت خان نے کہا۔ "خبر نہیں کوئی کتا بلی مر گیا ہے۔ اُدھر یا کوارٹر میں سے آتا ہے۔ کل تھانے سے ایک آدمی اس کو بلانے کو آیا تھا۔ بیان کا واسطے۔"

"اچھا؟" چراغ دین نے تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔ "مجھے یاد نہیں رہا۔ اب واپسی پر پہلے پولیس اسٹیشن جاؤں گا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت نہ نازل ہو جائے۔" اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کالفظ یہ ظاہر کرتا تھا کہ میرا لندن سے سیدھا اس کے پاس آنا پہلی مصیبت تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں نے بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "آپ تو والد مرحوم کی تدفین میں شریک ہوئے ہوں گے جناب۔"

"میں؟ نہیں یار۔" وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اس لیے میرے سوال پر چونک پڑا۔ "بدقسمتی سے میں مری جا چکا تھا۔ اسی روز۔"

"محبت خان تو جنازے میں شامل ہوگا!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے کہا۔ وہ کچھ چوکنا ہوگیا تھا۔

"وہ جناب عالی۔ ابھی تک والد کی قبر پہ حاضر نہیں ہوسکا۔ کیسا بدبخت بیٹا ہوں جسے باپ کی قبر کا بھی علم نہیں۔ سوچا تھا اگلے روز سلامت شاہ کے ساتھ چلا جاؤں گا مگر اس کا موقع ہی نہ ملا۔ اب موقع ملا ہے تو سلامت شاہ غائب ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑی عجیب بات ہے۔ محبت خان نے مجھے اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ادھر سے بدبو آ رہی ہے ابھی میں خود جا کے دیکھتا ہوں۔ کہیں کسی نے اسے مار کے اندر نہ ڈال دیا ہو۔"

"کیا جی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور یہ ظاہر کیا کہ لقمہ میرے حلق میں پھنس گیا ہے۔ میں نے فوراً پانی کے دو گھونٹ لیے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم... نہیں سمجھتے یار۔ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "میرا خیال ہے میرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔ پولیس خود دیکھ لے گی۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ رپورٹ لکھوانے میں دیر کی۔ خیر میں ابھی فون کرتا ہوں۔"

میں نے آخری لقمہ نگل کے پانی پیا اور کھڑا ہوگیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ جنابِ عالی۔" میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کے اس کا ہاتھ تھاما اور مصافحے کے بعد ایک ہاتھ پھر سینے پر رکھا۔ "آپ اجازت دیں تو میں محبت خان کو اپنے ساتھ قبرستان لے جاؤں۔؟"

"ابھی؟ ۔ اسی وقت؟ ۔ خیر لے جاؤ۔" وہ بولا۔ "مگر دیکھو۔ اس سے کہنا کہ تمھیں قبر تک پہنچا کے فوراً لوٹ آئے۔ میں اب واپس نہیں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے پولیس فوراً آجائے۔"

میں وہاں سے جان بچا کے نکلا تو میری پریشانی بہت کم ہوگئی تھی۔ اب اس بات کے امکانات پیدا ہو چلے تھے کہ چراغ دین میرے آنے کا پولیس سے ذکر ہی نہ کرے۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا اور محبت خان کو ساتھ لے جانے کے لیے تاکہ اپنے والد کی قبر تک پہنچ سکوں۔ اس بات کا سلامت شاہ کی لاش کے ملنے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چراغ دین یا محبت خان میں سے کسی کو یہ خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اس اندوہناک واقعے کی پہلے سے خبر تھی۔ پولیس کے سامنے یہ بیان کہ میں اسے پوچھتا ہوا آیا تھا کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے لیے صفائی کا واحد گواہ تھا میرے والد کے آخری ایام کا ساتھی تھا اور یہاں اس کے سوا میرا کوئی نہیں تھا چنانچہ اس کی گم شدگی سے میں بھی پریشان تھا۔ مجھ پہ الزام آنے کا کیا سوال۔ اس کے قتل سے میرے خلاف سازش کے موقف کی تائید ہوگی۔ ابھی میں برآمدے میں ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور پھر چراغ دین کی۔ "کون۔ سب انسپکٹر حشمت خان۔" یہ نام سنتے ہی میرے قدم رک گئے۔ "ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔" چراغ دین نے کہا۔ "ہاں کل کوئی آیا تھا۔ نہیں میں موجود نہیں تھا۔ مجھے چوکیدار نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ ایسے یار تھانے دار صاحب۔ ٹھیک ہے آپ کو بیان لینا ہے مگر میں اسے کہاں سے بھیج دوں۔ ہاں۔ ابھی تک اس کا کوئی پتا نہیں۔ میں تو خود رپورٹ لکھوانے کے لیے آ رہا تھا۔ اچھا کیا آپ نے فون کر لیا...."

میں تیزی سے آگے بڑھا اور محبت خان کے پاس جا پہنچا جو کار کی غیر ضروری صفائی سے فارغ ہوا ہی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ دین صاحب سے میری بات ہو گئی ہے اور انھوں نے اجازت دے دی ہے کہ میں چوکیدار کو قبرستان تک اپنے ساتھ لے جاؤں کیونکہ مجھے اپنے والد کی قبر معلوم نہیں۔ اس نے واسکٹ میں سے پھر نسوار کی ڈبیا نکالی اور ایک چٹکی نسوار کی داڑھ میں دبائی۔ آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی اور کچھ سوچتا رہا۔ "خو یارا۔ تم سلامت شاہ کے ساتھ نہیں گیا تھا قبرستان؟" میرے انکار پر اس نے تعجب کا اظہار کیا اور بدستور تذبذب میں مبتلا رہا۔ اندر چراغ دین مسلسل اونچی آواز میں ٹیلی فون پر حشمت خان کو رپورٹ لکھوا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ محبت خان کا اجازت نامہ منسوخ نہ کردے۔ پولیس والے ٹیلی فون پر رپورٹ کہاں لکھتے ہیں۔ وہ چراغ دین سے کہیں گے تھانے آؤ۔ میں نے محبت خان کو بتایا کہ دین صاحب کا واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے اور اسی لیے انھوں نے تمھیں یہ اجازت دی ہے۔ اس نے سر ہلایا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ محبت خان کو میری بات کا یقین آگیا۔ وہ تصدیق کے لیے جاتا تو چراغ دین یقیناً اسے روک لیتا اور کہہ دیتا کہ کل چلے جانا۔ سڑک پر آ کے میں نے اپنے سامنے سے ایک رکشا کو گزرتے دیکھا اور چلا کر اسے روکا۔ رکشا ابھی روانہ ہوا ہی تھا کہ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے چراغ دین نظر آیا جو کوٹھی کے دروازے پر کھڑا تھا اور اس میں شبہے کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ چوکیدار کو منع کرنے آیا تھا۔ اس کے بعد بھی مجھے اندیشہ لاحق رہا کہ کہیں وہ کار لے کر ہمارے پیچھے نہ آئے مگر ٹریفک میں جس طرح رکشا آگے نکلتا ہے کار نہیں نکل سکتی شاید یہی سوچ کے وہ رک گیا۔ اسے یہ بھی امید ہوگئی کہ چوکیدار ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔

قبرستان کے طویل راستے کو طے کر کے۔ ہار پھول اور اگربتیاں خرید کے میانی صاحب کے وسیع و عریض قبرستان میں آخری گوشے تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ اس ایک گھنٹے میں محبت خان سے مجھے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں مثلاً یہ کہ میرے والد آخری وقت تک کس ڈاکٹر کے زیرِ علاج رہے تھے۔ وہی ڈاکٹر اس روز صبح کے وقت آیا ہوگا جب وزیر خان کی موت کا انکشاف ہوا تھا لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ڈاکٹر کو لانے والا سلامت شاہ تھا اور اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ کفن دفن کا انتظام ان دونوں نے مل کر کیا تھا اور تدفین شام کے وقت ہوئی تھی۔ عصر سے ذرا پہلے۔ چراغ دین اسی روز صبح سات بجے مری جانے کے لیے راولپنڈی گیا تھا۔ ایک حادثے کے بعد وہ کار میں مری جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وزیر خان کی موت کا پتا آٹھ نو بجے چلا تھا۔ پھر سلامت شاہ نے فون کیا تھا اور جنازے میں جو لوگ شریک ہونے آئے تھے۔ ان میں سے محبت خان کسی کو نہیں پہچانتا تھا کیونکہ وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ سب کسی کمپنی کے لوگ تھے جو بہت افسردہ تھے۔ محبت خان نے ایک دو کو روتے بھی دیکھا تھا۔ اکثر لوگ افسوس کر رہے تھے کہ بیچارے کا بیٹا بھی لندن میں بیٹھا ہے۔

"محبت خان" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "جنازہ کہاں سے اٹھایا گیا تھا۔ کوٹھی سے کہ سرونٹ کوارٹر سے؟"

"کوٹھی سے۔" محبت خان نے جواب دیا جو میری توقعات کے عین مطابق تھا۔ "دین صاب تو ادھر تھا نہیں۔ سلامت شاہ نے خود ہی میت کو ادھر رکھوایا۔ بولتا تھا ادھر جگہ کم ہے۔"

سلامت شاہ سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے مرنے والے کی عزت کا بھرم نہیں ٹوٹنے دیا۔ اس کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے آنے والے بھی سمجھے ہوں گے کہ میرو زیرا اینڈ کمپنی کا ایک پارٹنر جو مدت سے بیمار تھا اور دفتر یا کارخانے میں نظر تک نہیں آیا تھا اب اس کوٹھی میں مقیم تھا اگر وہ اسے سرونٹ کوارٹر میں دیکھتے تو یقیناً شکوک میں مبتلا ہو جاتے اور تجسس انھیں مجبور کرتا کہ وہ وزیر خان کی زبوں حالی کے اسباب معلوم کریں مگر......

وہ ایک شایانِ شان کوٹھی میں مرا تھا چنانچہ وہ سب مطمئن ہو کے لوٹ گئے تھے کہ بیماری کی خبریں بے بنیاد نہ تھیں۔ اگر کسی نے گیٹ پر "سی سی ڈین" کے نام کی تختی دیکھی ہوگی تو کیا سمجھا ہوگا کہ یہ وہی نمک حرام چراغ دین ہے شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ وزیر خان نے اتنی بڑی کوٹھی کو اپنی ضروریات سے زائد سمجھتے ہوئے اس کا ایک حصہ کسی انگریز یا کرسچین اینگلو انڈین کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ تاہم اس سے ایک بات ثابت ہوتی تھی۔ وزیر خان نے سلامت شاہ کو بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ چراغ دین کون تھا اور حالات کے کس انقلاب نے اسے نوکر کا نوکر بنا دیا ہے۔ ممکن ہے بلیک میلنگ والی بات نہ بتائی ہو اور اپنی تباہی کو اپنی حماقت سے ہونے والے کاروباری نقصان کا نتیجہ قرار دیا ہو مگر یہ بات سلامت شاہ کو یقیناً معلوم تھی کہ وزیر خان اب بھی اس کمپنی کے مالکوں میں شامل ہے گو عملی طور پر اس کی حیثیت کچھ نہیں۔ سلامت شاہ نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا تھا تو اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وزیر خان نے اسے سخت قسم کی قسم دے رکھی تھی کہ اس بات کو وہ اپنی ذات تک محدود رکھے گا پھر بھی مرنے کے بعد وزیر خان کا جنازہ اسی شان سے اٹھا جس شان سے مالکوں کے جنازے اٹھتے ہیں۔ کوٹھیوں میں جھاڑ پونچھ کرنے والوں کے نہیں۔ ایک بار پھر مجھے سلامت شاہ کے ناقابلِ تلافی نقصان کا شدت سے احساس ہوا۔

محبت خان مجھے قبر تک پہنچا کے اور فاتحہ پڑھ کے رخصت ہوگیا تو میں ایک پختہ قبر کے کنارے پہ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ تدفین میں شریک ہونے والوں سے رابطہ کیسے قائم کروں۔ اگر میرو زیرا اینڈ کمپنی کا دفتر مقفل نہ ہوتا تو میں خود

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہاں پہنچ جاتا یا فون پر بات کر لیتا اور وہاں زیادہ تر میرے ہمدرد تھے۔ وہ میری مدد کرتے ہوئے نہ ہچکچاتے۔ شرافت علی کی موت کے بعد کمپنی لاوارث ہو گئی تھی اور تاوقتیکہ نئے وارث انتظام نہ سنبھالیں آفس اور فیکٹری کے ملازمین اپنے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کا شکار رہیں گے۔ ان میں سے بیشتر عمر کی اس حد سے گزر چکے ہوں گے کہ کسی نئی ملازمت کے لیے اہل متصور کیے جائیں۔ قانونی طور پر وہ برطرف بھی نہیں ہوئے تھے اور اپنے واجبات وصول کرنے کے مجاز تھے لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے عدالت سے رجوع کرنے کا سوچا بھی نہیں ہوگا۔ انھیں امید ہوگی کہ منیجر وغیرہ پھر کاروبار کو سنبھال لیں گے جو بڑے منظم خطوط پر چل رہا تھا اور ایک میر شرافت علی کے نہ ہونے سے اس نظام کا شیرازہ نہیں بکھر سکتا تھا جس سے سب کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ انھیں یہ بھی امید ہوگی کہ میں لندن سے واپسی پر وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے کاروبار کی نگرانی کی ذمے داری سنبھال لوں گا مگر میں نے آتے ہی اس شخص کو بھی قتل کر دیا تھا جو اکیلا کاروبار کو چلا رہا تھا اور اب ضمانت پر رہائی کے بعد لاپتا تھا۔ میر شرافت علی کا کوئی دور کا وارث ہے یا نہیں۔ اس کا علم مجھے نہیں تھا تو ملازموں کو کیا ہوگا۔ وہ دعا کرتے ہوں گے کہ بیوی بچے نہیں تو شرافت علی کا کوئی بھائی ہوگا چچا تایا ہوگا یا رشتے کا بھائی ہوگا۔ کوئی تو سامنے آئے گا۔ ممکن ہے اسی امید میں وہ ہر روز یہی دیکھنے آتے ہوں کہ کسی نے تالہ بندی ختم کی یا نہیں۔ یہ خیال بڑا حوصلہ افزا تھا۔ میں دفتر کے اوقات میں میر وزیر اینڈ کمپنی کے دروازے پر یا سامنے کھڑا رہ کے ان پر نظر رکھ سکتا تھا۔ عموماً دفاتر آٹھ سے نو بجے کے درمیان شروع ہوتے ہیں۔ آٹھ سے دس بجے تک انتظار کرنے میں ایک دو افراد سے ملاقات یقینی تھی۔ ان سے دوسرے ساتھیوں کے پتے معلوم کیے جا سکتے تھے اور یہ پوچھا جا سکتا تھا کہ آخری رسوم میں کون شریک ہوا تھا جو بطور گواہ پیش ہو کے وزیر خان کی قبر کی نشان دہی کر سکے۔

مسئلہ حل ہو گیا تھا چنانچہ میں نے قبر کی جائے وقوع کو ذہن نشین کیا اور پھر قبروں کے درمیان سے طویل پرپیچ راستہ طے کرتا میانی صاحب کے بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔ جہاں پھول بیچنے والوں کی بہت سی دکانیں تھیں اور رکشہ آ آ کے ٹھہر رہے تھے۔ ایک میت گاڑی سے جنازہ اتارا جا رہا تھا۔ دوسرا لوگوں کے کندھوں پر اندر مسجد میں نماز کے لیے پہنچ چکا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن کو میرا انتظار کرتے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس میں شبہے کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ بابو پوسٹ مین سے خط حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میری واپسی میں تاخیر سے وہ یقیناً اندیشوں کا شکار ہوگا۔ اب مجھے لاحق ہونے لگی کہ کہیں وہ چراغ دین کی کوٹھی پر نہ جہاں پولیس پہنچ گئی ہوگی تو سلامت شاہ کی لاش کی دریافت سے کہرام بپا ہوگا۔ میں نے رکشہ پکڑا اور سیدھا رابعہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ رابعہ کی کار اندر پورچ میں کھڑی بعد رابعہ لان پر کرسی ڈالے خاموش بیٹھی کسی سوچ میں تھی۔ کوٹھی کا رخ مشرق کی جانب تھا چنانچہ سرِ شام منزلہ عمارت کا سایہ لان پر پھیل جاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور میں نے اسے سرتاپا زرد لباس میں دیکھا پر سرخ نیلے اور گلابی شگوفے کھلے ہوئے تھے تو مجھے سر گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی یاد لباس کے رنگ کا عکس اس کی صورت پر محسوس ہوتا رنگ بڑے نظر فریب ہوتے ہیں۔ بے داغ سفید طہارت، پاکیزگی اور معصومیت کا احساس جگاتے گہرے سرخ رنگ حیوانی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ شاید لیے کہ یہ رنگِ حنا اور لباسِ عروسی کا رنگ ہے۔ نیلا فرحت اور تازگی عطا کرتا ہے تو سیاہ رنگ حسن کے اور متانت کے تاثر کو گہرا کرتا ہے ۔۔ یہ میرے ذاتی تجربات کی بات تھی۔ زرد رنگ میں رابعہ مجھے کچھ زیادہ ہی اداس لگی "میں سخت تھکا ہوا ہوں اور فوراً نہ ملی تو۔۔۔ تو پانی پی کے گزارا کروں گا۔" میں نے دوسری کرسی پر گر کے کہا۔

وہ ہنس پڑی "میں بھی چائے کا ہی انتظار کر ہوں۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"قبرستان سے" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے مختصر بتایا کہ میں چراغ دین سے کیسے ملا تھا۔ وہ ہنستی رہی ذکر میں سے میں نے خط کی اور سلامت شاہ کی بات گول کر دی۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ میں جنازے میں شریک ہونے والوں سے کیسے رابطہ قائم کروں گا پھر میں نے محسن کے بارے میں پوچھا اور مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہ دوپہر کے کھانے کے لیے آیا تھا مگر دو بجے ایمبیڈر ہوٹل چلا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ منظر صاحب نے قبر کھد پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست لگا دی ہے اور اس کی سماعت کل ہی ہو جائے۔ ایک گواہ اگر محبت خان

تو باقی گواہ مجھے کل ہی تلاش کر لینے چاہئیں جو عدالت میں حاضر ہو کے بیان اور حلف نامہ دے سکیں۔ دو تین دن میں جب میڈیکل بورڈ پوسٹ مارٹم کرے گا تو ان سب کو گورکن کے ہمراہ قبرستان میں موجود رہنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ انشاءاللہ کل صبح مجھے گواہ مل جائیں گے اور ممکن ہے عدالت کے ذریعے میں اس ڈاکٹر کو بھی طلب کروں جس نے میرے والد کا علاج اور آخری بار معائنہ کیا تھا۔ آخر قبرستان کے رجسٹر میں یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ انتقال حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث ہوا۔ پھر میں نے رابعہ سے کہا کہ میں جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا ہوں چنانچہ چائے پھر سہی۔ میں اس خط کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔

"یہ کیا افراتفری ہے؟" وہ حیران ہو کے بولی "محسن ایسے بھاگا جیسے یہاں پولیس چھاپہ مارنے والی ہے۔ تم ابھی کہہ رہے تھے کہ فوراً چائے نہ ملی تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ اب چائے چھوڑ کے بھاگنا چاہتے ہو۔ ایسی کیا جلدی ہے؟"

"اچھا" میں نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ "اس سے فون پر تو بات کر لوں۔ اس کے بعد جب تک تم نہیں کہو گی میں نہیں جاؤں گا۔"

"ابھی وقت ہے اپنے الفاظ واپس لے لو" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "تم یہ قول نبھا نہیں سکو گے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ رابعہ نے میرے الفاظ کے جال میں مجھے فوراً بند کر لیا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کے سوال کو پڑھ لیا اور اس بات کو سمجھ لیا جو الفاظ کے پردے میں نہاں تھی۔ اگر میں نے نہ کہا تو؟ ۔ تو کیا تم یہیں رہ جاؤ گے؟ مطلب بالکل صاف تھا اور میرے لیے اپنے الفاظ کو واپس لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

"میرا مطلب صرف آج سے تھا" میں نے خفت سے ہنس کے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

وہ ہنسی "ذہین تو تم شروع سے ہو۔ بڑی جلدی فرار کی راہ نکال لی۔ اچھا جلدی سے بات کر آؤ۔ بابا چائے لاتا ہی ہوگا۔"

اندر جا کے میں نے ماسی سے پوچھا کہ ٹیلی فون کس کمرے میں ہے اور اس نے کہا "اوپر بھی ہے بی بی کے کمرے میں اور نیچے ڈرائنگ روم میں بھی ہے" اور ہاتھ سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس دروازے کی طرف جانے سے پہلے میں نے حسبِ عادت ماسی کو زیرِ لب کچھ کہتے سنا۔ وہ غالباً خود کلامی کی عادی تھی اور ہر بات منہ سے کرنی ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ کے مطمئن ہو جاتی تھی۔ ایمبیسیڈر ہوٹل کا نمبر ملا کے میں نے آپریٹر سے کمرہ نمبر تین سو تیرہ مانگا۔ ایک منٹ بعد محسن نے ہیلو کہا۔

"محسن۔ میں سکندر بول رہا ہوں۔ رابعہ کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تو ہوٹل کیوں بھاگ گیا۔"

"میں نے مناسب سمجھا کہ لاک روم سے سامان سیدھا ہوٹل پہنچا دوں۔ رابعہ کو تنگ ہی نہ ہو" وہ بولا۔

"وہ خط مل گیا ہے نا تجھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں" وہ بولا "خط آج کی ڈاک میں نہیں تھا۔ بابو پوسٹ مین کا خیال ہے کہ وہ خط دیر سے پوسٹ کیا گیا ہوگا۔ آج نکلے گا تو کل ملے گا۔ تو بتا وہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں" میں نے سوچ کر کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ جو ہے وہ میں ملاقات پر بتاؤں گا۔"

"ابھی آنے کا ارادہ نہیں ہے کیا۔؟" وہ بولا "وہاں کیا کر رہا ہے تو؟"

"رابعہ سے باتیں" میں نے کہا "سوفی صدف نوفی مسائل پر۔ اس کے بعد مجھے ایک ڈاکٹر سے ملنے جانا ہے۔ میں رات تک آؤں گا۔ ظاہر ہے تو کمرے میں قید نہیں رہ سکتا۔ تو ضامن رضوی صاحب سے ملنے چلا جا۔ دونوں باتیں کر لے۔ میں آٹھ بجے سے نو بجے کے درمیان ضرور آ جاؤں گا۔"

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ رابعہ کی آواز آئی "یہ دوسری عہد شکنی۔ ابھی کہا تھا کہ مطلب آج سے تھا۔ آج کا دن آٹھ نو بجے تو ختم نہیں ہوتا۔"

میں نے خفت سے سر کھجایا "غلطی ہو گئی۔ میں بھول گیا تھا کہ عہد ایک وکیلن سے کیا تھا۔ بقولِ چچا کے۔ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔"

وہ ہنسی "چلو اب زیادہ باتیں مت بناؤ۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اور یہ بات کہتے ہوئے اس کے رخسار کا رنگ گلابی ہوا تو میں اسے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔ آخر اس اچھی بھلی ذہین۔ باشعور۔ سنجیدہ اور ہوش مند عورت کو کیا ہو رہا ہے؟ یہ آغازِ شباب کا پہلا عشق کرنے والی لڑکی کی طرح میرے الفاظ کو غلط معانی کیوں پہنانے لگی ہے اور باتوں کا وہ مطلب کیوں نکالنے لگی ہے جو میرے ذہن میں نہیں مگر اس کے دل میں ہے۔ کیا عورت واقعی عورت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہتی ہے۔ جذباتی طور پر آتش فشاں جو برسوں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے اور کسی روز اچانک پھٹ پڑتا ہے۔ ذہنی برتری کے تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود جذباتی طور پر بے حد کمزور۔ دل کے معاملات میں عقل کو بالائے طاق رکھ دینے والی۔ نکہت و نور اور رنگ روپ کی دہکتی آگ جس کی تپش قریب آنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرتی اور بے خطر اس آگ میں بھی کود پڑنے پر مجبور کرتی۔ وہ وکیل ہو۔ ڈاکٹر انجینئر۔ جنرل یا خلا نورد۔ خود سپردگی کے سیلِ بے عناں میں فقط عورت ہے۔ اس کے ساتھ واپس لان پر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہے تو کیا غلط ہے۔ جنس تو ایک حیوانی جذبہ ہے۔ آبرو ریزی کے واقعات کی خبریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس جذبے کی درندگی سے مغلوب اور عقل و ہوش سے بیگانہ ہو جانے والے وہ سب کر گزرتے ہیں جس پر انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے مگر جنسی تشدد کے واقعات میں عورت کی ذات کہاں ملوث ہوتی ہے۔ اسے تو اپنے جذبات کی سرکشی پر پورا اختیار حاصل ہے مگر اس کے باوجود وہ مجبور بھی ہے۔ پھر میں نے کہا میاں سکندرِ اعظم۔ ہوش کے ناخن لو۔ یہ تم کیا خود کو یوسفِ ثانی اور زبردست "لیڈی کلر" سمجھ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ سب تمہاری اپنی عقل و نظر کا پھیر ہو۔ بھلا رابعہ تم پر کیوں مرنے لگی۔ اس پر مرنے والے کیا کم ہوں گے۔

تجدیدِ تعلق کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ پھر مجھے یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ وہ برسوں سے جس یوسفِ گم گشتہ کی بازدید کے لیے چشم براہ تھی وہ میں ہی ہوں۔ میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں۔ یہ تبسم یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو!

ان دلائل کے بعد میری عقل جو گھاس چرنے چلی گئی تھی لوٹ آئی۔ میں نے رابعہ سے کہا۔ "تمہاری امی نظر نہیں آ رہی ہیں؟"

"ان کو کبھی کبھی ڈیپریشن کا دورہ پڑتا ہے۔" وہ بولی۔ "قنوطیت۔ مایوسی۔ بے زاری اور مکمل عدم دلچسپی۔ یہ سب کیفیات مل کر بھی اس ایک لفظ کا متبادل فراہم نہیں کرتیں۔ ڈیپریشن۔"

"کب سے ہے یہ شکایت؟" میں نے رسماً پوچھا۔ "اس کی وجوہات تو صرف نفسیاتی ہوتی ہیں۔"

"ہاں۔ وہ نفسیاتی وجہ میں ہوں۔" وہ بولی۔ "اور یہ شکایت انہیں اس وقت سے ہے۔ خیر چھوڑو۔" اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

"پوری بات کرتے ہوئے تم کس سے ڈرتی ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "مجھ سے یا اپنے آپ سے؟ آخر تم ان کے مرض کی وجہ کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ بامحاورہ اردو کے مطابق ابھی تک میرے ہاتھ پیلے نہیں ہوئے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"اگر مرض یہ ہے تو علاج کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "تم کو اچھی طرح معلوم ہے۔ قصور پھر کس کا ہے؟"

"ہاں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قصور پھر کس کا ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔ "یہ سوال اکثر عدالت میں اٹھایا جاتا ہے۔ عدالت میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں۔ اغوا اور آبرو ریزی کے بھی۔ اور ان سب کی پیروی کرتے ہوئے میں صرف وکیل رہ جاتی ہوں۔ بڑی بے شرمی سے میں اپنے موکل کا دفاع کرتی ہوں اور میرے دلائل سن کے مرد دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں اور بڑی بے حیائی سے ہنستے ہیں اور ایک دوسرے کو فحش اشارے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اور وکیل کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ حقائق کو بے لباس کر کے تلاش کرنا پڑتا ہے اور دوسروں کو بھی دکھانا پڑتا ہے۔ تم نے جو سوال کیا ہے اس میں اپنی موکل میں خود ہوں اور اپنا کیس تمہاری عدالت میں ایک وکیل کی طرح پیش کروں تو مجھے کہنا ہوگا کہ حضور والا۔ میں ایک بہت فرماں بردار۔ نیک اور مشرقی ماحول کی پروردہ لڑکی تھی جس کی شادی میرے والدین نے روایتی طور پر مجھ سے پوچھے بغیر طے کر دی تھی اور میں نے ان کے فیصلے کو بلا چوں و چرا قبول کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی میں وکیل تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ منگنی کے ایک سال بعد میرا نکاح ہوا۔ پھر دوسرا سال گزر گیا۔ پھر تیسرا... پھر چوتھا مگر رخصتی کی نوبت نہ آئی۔ پانچویں سال میں اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیوں۔؟ اس کا دماغ خراب تھا؟"

"نہیں مائی لارڈ۔ وہ بہت ذہین سی ایس پی افسر تھا۔ اس نے بعد میں بہت ترقی کی۔ اس کا دماغ خراب کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ اسی سپاٹ اور تند لہجے میں بولتی گئی۔ "مدعا علیہ کے اس انداز کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ اسے یہ شادی یعنی میری موکلہ پسند نہ تھی۔ اسے میری موکلہ کے کردار کے بارے میں شرانگیز اطلاعات فراہم کی گئیں۔ بدخواہوں نے سفلی عمل کے ذریعے علیحدگی کرا دی۔ مدعا علیہ کسی اور سے عقد کرنے کا خواہش مند تھا۔"

"لیکن ان میں سے ایک وجہ صحیح ہوگی۔" میں نے کہا۔

"صحیح وجہ یہ ہے جنابِ والا کہ مدعا علیہ شادی کے قابل ہی نہیں تھا۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تا اطلاعِ ثانی اس نے عقدِ ثانی بھی نہیں کیا ہے۔ ماں باپ کے دباؤ میں آ کے اس نے یہ شادی کی تھی اور اس وقت وہ ذہنی طور پر اتنا بالغ نہیں تھا کہ اس حقیقت کا اعتراف کر سکتا۔ وہ رخصتی کو ٹالتا رہا یہاں تک کہ ماں باپ اسی حسرت کو دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر اس نے میری موکلہ کو طلاق دے دی۔ ویسے وہ شریف آدمی تھا کہ اس نے بہت جلد مجھے آزاد کر دیا۔" اس نے اپنا لہجہ بدل لیا۔ "اس نے کہا کہ ابھی چند روز پہلے میں نے اسے فون کیا تھا۔ تمہاری ضمانت کے سلسلے میں مجھے اس کے اثر و رسوخ سے کام لینا تھا۔ اس نے یہ کام کر دیا۔"

میں اس انکشاف پر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ "اس طلاق کے بعد......!"

"اس کے بعد میں شادی کے نام سے متنفر ہو گئی۔" وہ بولی۔ "یہ ایک قدرتی ردعمل تھا۔ میرے لیے کتنے پیغام آئے جو میں نے مسترد کر دیے اور اب بھی میں کسی رشتے کو نامنظور کرتی ہوں تو ماں پر ڈیپریشن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"کیا آج بھی تم نے کوئی رشتہ نامنظور کیا ہے؟" میں نے ہمت سے کام لے کر پوچھ لیا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ماں نے کہا تھا محسن اچھا لڑکا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"محسن واقعی اچھا لڑکا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہترین رفیقِ حیات بن سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر اس نے کہا میری تو نسبت طے ہو چکی ہے۔" وہ تلخی سے ہنسی۔ "اس نے جھوٹ بولا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ بتاؤ قصور کس کا ہے؟"

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "رابعہ۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔" اور وہاں سے بھاگ آیا۔ میں نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا کہ قصور کس کا ہے۔ قصور کبھی کسی کا نہیں ہوتا۔ تقدیر کا بھی نہیں کیونکہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ناگزیر ہے اور اٹل ہے۔ رابعہ۔ اس کی ماں۔ اس کا سابق شوہر۔ محسن اور میں۔ سب اپنی اپنی مجبوریوں کے باعث قصوروار ہیں۔ کیا میں خود رابعہ کی ماں کا ڈیپریشن ختم نہیں کر سکتا تھا؟

لیکن میرے پاس فوزیہ سے جذباتی وابستگی کا عذر تھا۔

محسن کے پاس عذر تھا کہ یہ مسئلہ وہ اپنے والدین خصوصاً اپنی ڈکٹیٹر ٹائپ ماں کی رضامندی کے بغیر خود طے کرنے کا مجاز نہیں اور ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ رابعہ کی عمر کو اور اس کے پیشے کو طوعاً و کرہاً قبول کرتیں تو اس لڑکی کو کبھی قبول نہ کرتیں جسے شوہر نے گھر بیٹھے بیٹھے طلاق نامہ بھیج دیا ہو۔ شاید یہ سچ بھی ان کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتا کیونکہ اس معاشرے میں قصوروار صرف عورت ہے۔ رابعہ میں ہوگی کوئی نہ کوئی ایسی خامی اور بے حیا اب اپنے منہ کی سیاہی اس کی صورت پر ملتی پھرتی ہے۔ سارے زمانے کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لیے۔ ان کا حتمی فیصلہ ہوتا۔ محسن نے رابعہ کو یقیناً پسند کیا تھا مگر وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ اس انکشافِ حقیقت نے اسے فرار پر مجبور کر دیا۔ مجھے رابعہ پر ترس آیا۔ ترس کھانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ اس نے متعدد عدالتوں میں دوسروں کی مظلومیت کے مقدمات جیتے ہوں گے حق دار کو اس کا حق دلوایا ہوگا اور ناانصافی کا مرتکب ہونے والے کو سزا دلوائی ہوگی مگر خود اپنے حق کی خاطر وہ کسی عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جا سکی۔ اپنی زندگی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کسی کو فریق بنا کے ملزموں کے کٹہرے میں نہ لا سکی۔ مجھے اس کی بزدلانہ بے بسی پر سخت جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیوں خاموش رہی۔ معاشرتی اقدار کی ان زنجیروں کو توڑ کے اس سی ایس پی افسر کا گریبان کیوں نہیں تھاما اور اسے کھینچ کر عدالت تک کیوں نہیں لے گئی؟ اس نے پانچ سال کے انتظار کے کرب کا ہرجانہ کیوں نہیں وصول کیا؟ اس کو دنیا کے سامنے ننگا کیوں نہیں کیا جس نے اپنی عزت پر جھوٹا پردہ ڈالے رکھنے کے لیے منگنی اور نکاح کا جھوٹا ڈراما کیا اور پانچ سال لوگوں کی امیدوں سے ارمانوں سے اور جذبات سے کھیلتا رہا۔ لوگ جن میں اس کے اپنے ماں باپ رابعہ اور اس کی ماں سب شامل تھے۔ شاید رابعہ اپنی ماں کی وجہ سے مجبور تھی ورنہ کسی گناہ کے بغیر پانچ سال کی نظربندی کے خلاف آواز ضرور اٹھاتی۔ یہی تو مشرقی عورت کا المیہ ہے۔ ہوتی امریکی معاشرے کی کوئی لڑکی تو اسے شوٹ کر دیتی اور معاشرہ اس فعل کے جواز کو تسلیم کرتا۔ رابعہ کہتی ہے کہ وہ شریف آدمی ہے۔ کون شریف ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر اس کی سند دینے والوں کے معیار ہی غلط ہیں تو پھر خود یہ غلطی کیوں کرتی ہے۔ میں نے رابعہ کو بہت سی مروجہ گالیاں دیں۔ احمق۔ عاقبت نااندیش۔ بزدل۔ عورت ذات فاترالعقل۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وغیرہ وغیرہ۔

جب میں نے ریلوے ہوسٹل کے اس ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں قدم رکھا جس نے آخری ایام میں میرے والد کا علاج کیا تھا تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اس کا یہ کلینک گڑھی شاہو کی ایک بغلی سڑک پر اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں واقع تھا۔ ابھی مریضوں کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا یا اس کی پریکٹس ہی کم چلتی تھی کہ کمرے میں صرف ایک عورت اپنے بچے کو دکھا رہی تھی۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس نے مجھے دوسرا مریض سمجھ کے اپنے قریب پڑے ہوئے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسٹول پر بیٹھ کے میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اچھا اچھا" وہ سر ہلا کر بولا "تم پر تو قتل کا ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے۔ میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ مگر تم نے یہ کیا احمقانہ بیان دیا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا اور ان کی موت طبعی نہیں تھی"

"ڈاکٹر صاحب" میں نے سکون سے کہا "عدالت کا فیصلہ ہونے سے قبل کسی مقدمے پر ایسا تبصرہ توہین عدالت کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے درخواست دی ہے۔ ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ میرا خیال احمقانہ تھا یا نہیں" اس کے جارحانہ رویّے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں بھی شرافت کو بالائے طاق رکھ دوں۔

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غصّے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا میرے والد وزیر خان مرحوم کو گٹھیا کے سوا بھی کوئی عارضہ لاحق تھا!" میں نے کہا۔

"اگر تھا تو اس کا علاج میں نہیں کر رہا تھا" وہ بولا۔

"آپ کے خیال میں گٹھیا سے کسی کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہارٹ فیل کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ گٹھیا کی کوئی شرط نہیں" اس نے عمداً اصل بات کے اعتراف سے گریز کیا۔

"مجھے ان ایک ہزار ایک اسباب سے سروکار نہیں" میں نے سخت لہجہ اختیار کیا "مجھے یہ بتاؤ کہ کیا گٹھیا کے باعث کسی کی حرکت قلب بند ہو سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے یہ بیماری بھی ابتدائی مرحلے میں تھی اور وہ خود چل کے آپ کے پاس آتے تھے"

"میرے پاس نہیں۔ ریلوے کے ہسپتال" وہ طنز سے بولا "تمھارے سوال کا جواب ہے کہ نہیں۔ گٹھیا ہارٹ فیل ہونے کا سبب نہیں بن سکتا"

"ان کے انتقال کے بعد آپ ہی ان کو دیکھنے گئے تو آپ کے خیال میں ان کی موت کا سبب کیا تھا؟"

"میں نے کوئی رائے نہیں دی تھی۔ موت کو دو گھنٹے ہو چکے تھے"

"قبرستان میں یعنی لاہور میونسپل کارپوریشن کے دفتر پیدائش و اموات کے ریکارڈ پر موت کا سبب ہارٹ فیل درج ہے"

"وہ میں نے نہیں لکھا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں"

"اس بات کے گواہ موجود ہیں" میں نے اسے یاد دلایا "ہو سکتا ہے تمھیں عدالت میں وضاحت کرنی پڑے"

"جب وقت آئے گا تو میں عدالت کو جواب دے لوں گا" وہ چراغ پا ہو کے بولا "تم کون ہوتے ہو مجھے دھمکی دینے والے۔ گیٹ آؤٹ" میں نے اس کی گردن دبوچ لی "میں مرنے والے کا وارث ہوں۔ اس کا بیٹا"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی "تم ایک قاتل ہو۔ اور بدمعاش" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں میرے کلینک میں آ کے غنڈہ گردی"

میں نے لات مار کے ٹیلی فون کا تار توڑ دیا "میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد اس تار کو جوڑ کے پولیس سے جو چاہے کہنا۔ خودکشی کر کے کہہ دینا کہ وزیر خان کا بیٹا قتل کر گیا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد میں بالکل محفوظ ہوں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے دو بہت سینئر وکیل گواہی دیں گے کہ میں ان کے پاس بیٹھا اپنے کیس کی بات کر رہا تھا۔ ایس ایس پی ضامن رضوی بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ تھا کیونکہ وہ میرے انکل کے دوست ہیں جو وزارت خارجہ کے ڈپٹی سیکرٹری اور میرے ضامن ہیں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت "فلیٹیز" کے سوٹ نمبر چار میں موجود ہوں" میں نے عمداً ہوٹل کا نام غلط بتایا اور اسے چھوڑ دیا "اگر تمھارے حلق سے آواز نکلی تو بات سمجھ لو۔ میں جوڈو جانتا ہوں۔ ایک معمولی سا ہاتھ رسید کروں گا اور تم آدھے گھنٹے کے لیے جام ہو جاؤ گے۔ اس لیے اب میں چلتا ہوں۔ پھر کورٹ میں ملیں گے"

میرا خیال ہے وہ واقعی ڈر گیا تھا چنانچہ وہ مجھے جاتے دیکھ کر بھی نہیں بولا اور میرے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اس نے چیخ پکار نہیں مچائی ورنہ مجھے واقعی جوتے بغل میں دبا کے بھاگ

پڑتا اور شاید وہاں میری موجودگی کے عینی گواہ پیدا ہو جاتے۔ وہ بہت خبیث آدمی تھا اور اسی سلوک کا مستحق تھا۔ میں نے خطرناک علاقے سے نکل کے طے کیا اور کراؤن سینما کے راستے رابعہ کی کوٹھی کے سامنے سے گزر کر پیدل چلتا ہوا ایمبیسیڈر ہوٹل تک گیا۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بہت سے لوگ موجود تھے مگر مجھے ان میں محسن کا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ وہ اوپر کمرے میں بھی موجود نہیں تھا اور کاؤنٹر کلرک نے بورڈ پر نگاہ ڈال کے مجھے مطلع کیا کہ وہ چابی چھوڑ کے کہیں گئے ہیں۔ میں نے کھانے کا فیصلہ کیا اور ڈائننگ ہال کے ایسے حصے میں جا بیٹھا جہاں سے میں باہر بھی دیکھ سکتا تھا اور دروازے سے اندر آنے والوں کو بھی۔ دن بھر کی مشقت کا حاصل جسمانی تھکن اور کوفت کے سوا کچھ نہ تھا۔ چراغ دین نے کوئی کام کی بات نہیں بتائی تھی۔ محسن کو وہ خط نہیں مل سکا تھا جو گلاب خان کے نام پر آنے والا تھا۔ رابعہ کی داستان حیات کا المیہ مجھے بھی ڈپریشن میں مبتلا کر رہا تھا اور اب اس ڈاکٹر نے عملاً انکار کر دیا تھا کہ وزیر خان نام کے کسی مریض کو اس نے وفات سے پہلے اور وفات کے بعد کبھی دیکھا ہی نہیں۔ "اپنا غم تیرا غم جہاں کا غم۔ ہم بھی رکھتے ہیں زادِ راہِ عدم" اپنی کیفیت کے حسب حال یہ شعر یاد کر کے میں نے سوچا کہ منزل عدم کی فکر میں مبتلا ہونے سے مسافتِ عدم میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ آنے والے دن سے کیا ملے گا۔ رنج یا راحت۔ دکھ سکھ — امید اور ناامیدی — کامیابی یا ناکامی — یہ آج کیسے طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ خط پوسٹ ہوا تھا یا نہیں۔ پوسٹ ہوا تھا تو کل کیسے ملے گا۔ نہیں ملا تو ہمارے ذہن میں الجھن پیدا کرنے والے سوالات کا کوئی جواب فراہم کرے گا یا نئے سوالوں کو جنم دے گا۔ رابعہ جو خواہشوں کے طلسم اور خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے اس حقیقت کو تسلیم کرے گی کہ ڈپریشن کا شکار اس کی ماں نہیں وہ خود ہے اور آخر کب تک وہ سرابوں سے جذباتی رشتے استوار کرتی رہے گی؟ سلامت شاہ کی عدم موجودگی میں (جس کی لاش شاید اب تک صندوق سے نکال کے مردہ خانے کی کسی میز پر ڈھیر کر دی گئی ہوگی) کیسے ثابت کروں گا کہ وزیر خان کا علاج کرنے والا اور موت کے بعد ان کی موت کے غلط اسباب کا تعین کرنے والا ڈاکٹر کون تھا۔ اور بالآخر یہ ثبوت کیسے فراہم کروں گا کہ جس وقت میر شرافت علی کا قتل ہوا میں سلامت شاہ کے ساتھ تھا۔ ذہن پر یلغار کرنے والے یہ سوال دشت کی تنہائی میں اکیلے مسافر کو گھیر لینے والے غولِ بیابانی کی طرح تھے جو فراغت کی گھڑی دیکھتے ہی لاشعور کے ہر نہاں خانے سے نمودار ہو جاتے تھے اور ان کا سلسلہ سرطان کے خلیوں کی طرح پھیلتا تھا۔ ایک سے دو۔ دو سے چار۔ چار سے آٹھ۔ سولہ۔ بتیس۔ پھر چونسٹھ۔ میرے لیے اماں کہیں نہ تھی اور اپنے دفاع کی سب سے موثر صورت یہ تھی کہ خود کو مصروفیت کے حصار سے باہر نہ آنے دوں۔ بقول انگریز کے۔ خالی دماغ شیطان کی ورکشاپ بن جاتا ہے۔ تو دماغ کو حتی الامکان کام سے لگائے رکھوں۔ میں نے مینو کا یوں مطالعہ شروع کیا جیسے اوّل تا آخر حفظ کرنے کا ارادہ ہے اور جب مشرق و مغرب کے طعام پر چینی کھانوں کی ترجیح کا فیصلہ ہوا تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ آرڈر کی تعمیل تک میں نے صورتوں کا مطالعہ کیا۔ ہر چہرہ ایک کتاب تھا۔ کچھ کتابی چہرے تھے۔ کچھ آفتابی۔ چشم و ابرو میں اور رنگ لب و رخسار میں لندن، پیرس اور نیویارک کے میک اپ کا طلسم تھا۔ سولہ سنگھار جب محاورے تھے تو مبالغہ سمجھے جاتے تھے۔ اب ہیلن کرٹس۔ الزبتھ آرڈن۔ میکس فیکٹر اور درجنوں سامان آرائش بنانے والوں کی مصنوعات کی فہرست حیران کرتی ہے۔ پیر کی چھوٹی انگلی سے لے کر زلفوں تک سنگھار کے سولہ سو اسباب۔ سولہ سو رنگ۔ سولہ سو انداز۔ ایک بار کسی کیٹلاگ کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ کیا یہ سب اشیاء ایک عورت استعمال کر سکتی ہے اور پھر کسی تقریب میں شرکت کے لیے چوبیس گھنٹے میں تیار ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی احمقانہ خیال مجھے کھانے کا اور محسن کا انتظار کرتے ہوئے پھر آیا۔ کہ کاش میرے لیے کسی غیبی قوت کے ذریعے ہر چہرہ پڑھنا ممکن ہوتا اور میں دیکھ سکتا کہ ہر شوخ ادا کے پیچھے کتنا کرب ہے اور ہر مسکراہٹ کے پیار میں نفرت کا کتنا زہر ہے اور مسرت میں کھوئی آنکھوں میں ستارۂ سحری کی طرح جھلملاتی ہے کتنے دکھوں کا نوحہ ہے۔ باوردی مہذب ویٹر بڑی مستعدی سے ہر ٹیبل پر سے برتن ہٹا رہے تھے اور بیرے آرڈر پر یس سر کرتے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ کوئی ان کی صورت نہیں دیکھتا تھا۔ ہر ٹیبل کا ایک نمبر تھا اور یہ نمبر... پلاسٹک کے رنگین تکونے ٹکڑوں سے بنے چھوٹے سے اسٹینڈ پر سفید حروف میں نمایاں تھے۔ بارہ نمبر ٹیبل پر کون ہے!۔ ویٹر۔ ویٹر۔ ادھر چوبیس نمبر کا آرڈر کس نے لیا تھا!۔ معاً مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی آرڈر دیے ہوئے دس منٹ تو ہو چکے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ معلوم نہیں کون تھا وہ — آخر یہ سب بیرے وردی میں ایک جیسے کیوں ہو گئے ہیں۔ بس یہ احساس سا رہتا ہے کہ بہت لمبا ہے۔ یا موٹا ہے اور لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔ نگاہ مینو پر رہتی ہے۔ ایک چکن کارن سوپ۔ ایک چکن۔ نہیں فرائیڈ پران اینڈ رائس۔ ابھی اگر میں اس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے پوچھتا کہ میاں ذرا اپنا نام تو بتا دیجیے کہ پھر بلانا ہو تو کیسے پکاریں۔ تو ویٹر کتنے افسوس سے سر ہلاتا کہ ایسے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں کیسے کباڑی لوگ آنے لگے ہیں۔ ایک دم پینڈو۔ کیا آواز لگانے کا خیال ہے کہ بھیا اسلم۔ اتے بھئی چودھری اسلم صاحب۔ وہ میں نے کچھ فرمائش کی تھی۔ ابھی آرڈر دیا تھا آپ کو۔ کیا بھول گئے!" اب وہ بھول بھی گیا تھا تو میرے لیے میز پر چمچہ بجانے اور "ویٹر ویٹر" پکارنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ عین اسی وقت ویٹر نے میز پر کھانا لگانا۔۔ شروع کیا اور میں نے نیپکن گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے ویٹر سے تاخیر کی شکایت کہنے کی بجائے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے مجبور ہو کے چھری کانٹے کا اسلحہ اٹھایا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا بہت اچھا تھا چنانچہ میری نظر گرد و پیش پر نہ رہی۔ میں نے شیشوں سے باہر بھی نہیں دیکھا اور دروازے پر بھی نگاہ نہیں رکھی جس سے مجھے محسن کے آنے کا علم ہوتا۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو ساڑھے نو ہو چکے تھے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ محسن میرے خیال کے مطابق ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے ملنے گیا تھا۔ جو اس کے ڈیڈی کے دوست تھے۔ عین ممکن ہے انھوں نے کام کی بات سننے کے بعد محسن کو کھانے پر روک لیا ہو۔ دس ساڑھے دس بجے تک اس کا انتظار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کے سگریٹ سلگائی اور ویٹر کو کافی کے لیے کہا۔ ہال میں اب پہلے جتنے لوگ نہیں رہے تھے مگر اس کے باوجود آدھے سے زیادہ ہال بھرا ہوا تھا۔ یہ سب سوسائٹی میں اعلیٰ مقام رکھنے والے شریف لوگ تھے جو نجی اور کاروباری ہر قسم کی گفتگو میں مصروف تھے اور کسی کو کسی دوسرے کے معاملات سے سروکار نہ تھا۔ میرے جیسے نہ ہونے کے برابر تھے جو اکیلے بیٹھے تھے چنانچہ دوسروں کو دیکھ رہے تھے دوسروں کی سن رہے تھے اور دوسروں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

دس منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے ویٹر کو یاد دلایا کہ میں نے کافی کے لیے کہا تھا۔ اس نے شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ دوسری ٹیبل کا ویٹر ہے تاہم وہ چوبیس نمبر کو بتا دے گا۔ مزید دس منٹ کے بعد میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ "آخر یہ کیا بدنظمی ہے۔ بیس منٹ پہلے میں نے کافی کا آرڈر دیا تھا۔ کیا کافی برازیل سے امپورٹ کی جائے گی؟" میں نے مینیجر کے شفاف شیشوں والے کیبن میں جا کے کہا اور ہاتھ اٹھا کے انگلی سے اس میز کی طرف اشارہ کیا جہاں میں بیٹھا تھا۔ لیکن پلٹ کر دیکھتے ہی مجھے کافی میز پر رکھی ہوئی

نظر آئی۔ میں نے تھوڑا سا خفیف ہو کے کہا کہ غالباً ویٹر منتظر تھا کہ میں شکایت کرنے اٹھوں اور وہ کافی رکھ دے اور مینیجر نے میری مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا کے رسماً اظہار کیا کہ مجھے زحمت ہوئی۔ واپس لوٹتے ہوئے میں نے کاؤنٹر کلرک کے پیچھے نمبروں والے اس بورڈ پر نگاہ ڈالی جس کے خانوں میں کچھ لوگوں نے اپنے کارڈ لگا دیے تھے تاکہ کسی کو علم نہ ہو تو ہو جائے کہ فلاں صاحب کس کمرے میں مقیم ہیں۔ وہیں خالی کمروں کی چابیاں لٹک رہی تھیں اور وہ چابیاں بھی جو مہمان جاتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ محسن کے کمرے کی چابی اب غائب تھی جس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ آیا اور ڈائننگ ہال پر نگاہ ڈالے بغیر سیدھا اوپر چلا گیا۔ اور کھانا تو وہ کھا کے آیا ہوگا چنانچہ اب بستر پر لیٹا چھت کو ملاحظہ کر رہا ہوگا اور میری طرح انتظار کر رہا ہوگا۔ سبحان اللہ۔ کیا بے خبری ہے کہ ایک چھت کے نیچے موجود ہے دوسرا چھت کے نیچے اور دونوں ایک دوسرے کے باہر سے واپسی کے منتظر ہیں۔ میں نے خاصی عجلت سے کافی ختم کی جو عجیب بدذائقہ جوشاندے جیسا مشروب تھا۔ یہ اتنے اچھے ہوٹل کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی تھی مگر میں نے مینیجر کو اور ساری انتظامیہ کو معاف کر دیا۔ آدمی خطا کا پتلا ہے۔ کیا معلوم کافی برازیل کی بجائے کھٹمنڈو سے منگوائی گئی ہو اور بنانے والے نے عشق یا کسی ذہنی عارضے میں مبتلا ہو کر اس میں سفید زیرہ بھی ڈال دیا ہو۔ "ویٹر" میں نے چلا کے کہا۔ "بل لاؤ۔" اور چونکہ ویٹر کا اس وقت کہیں وجود نہ تھا اس لیے متعدد افراد نے لاؤڈ اسپیکر کو پھر مجھے گھورا۔ کافی ٹھنڈی تھی۔ خیر۔ کھٹمنڈو سے آنے والی کافی اور کیا ہوگی۔ برفانی علاقے کی کافی تھی۔ میں نے کاؤنٹر کا رخ کرتے ہوئے طے کیا۔ پھر میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا موضوع تھا ویٹر نمبر چوبیس جو چوبیس منٹ بعد کافی اس وقت لایا تھا جب میں حکام بالا سے رجوع کر چکا تھا۔ پھر جو کافی وہ لایا اگر وہ واقعی برازیل کی تھی تو اس سے چین کے اور برازیل کے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور اب میں بل کے لیے گلا پھاڑ رہا ہوں مگر چوبیس نمبر نے ابھی تک لبیک نہیں کہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کاؤنٹر کلرک نے روایتی شائستگی سے معذرت چاہی اور کہا کہ بل مسٹر محسن کے کمرے میں بھجوا دیا جائے گا۔ انشاء اللہ آئندہ رات

محسن کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن مقفل نہیں تھا اور اندر لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے قفل کے گول دستے کو

گھمایا اور دروازہ کسی تردد کے بغیر وا ہو گیا۔ "مسٹر محسن رضا۔" میں نے جوتوں سمیت بستر پر دراز ہو کے کہا۔ "تو نے رابعہ کا رشتہ نامنظور کر دیا۔ ناخلف۔" محسن رضا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ باتھ روم میں تھا اور واش بیسن میں ہاتھ یا منہ دھو رہا تھا۔ "قطع نظر اس بات کے کہ رابعہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ بہت اچھی وکیل بھی ہے اور ہمارا انکار کرنا بہت سے قانونی مسائل پیدا کر سکتا ہے مثلاً یہ ہتک عزت کا کیس ہے۔ دھوکا دہی کا کیس بن سکتا ہے کہ تو نے اسے ورغلا کے شادی کا جھانسا دیا اور بھاگ گیا۔ وہ ذہنی اذیت کا ہرجانہ طلب کر سکتی ہے۔ اور چاہے تو دیگر ناشائستہ الزامات کے تحت تم پر دو مقدمات قائم کر سکتی ہے جو مجھ پر بھی نہیں۔ پھر ہم تم ساتھ ہوں گے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" آخر یہ کیا چکر ہے کہ میں مسلسل بکواس کر رہا ہوں اور اندر مسلسل پانی گر رہا ہے مگر نہ محسن باہر آتا ہے۔ نہ اس کا جواب آتا ہے۔ میں نے اٹھ کے غسل خانے کا رخ کیا۔ ابھی میں باتھ روم کی دہلیز پر ہی تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے دھکا دیا اور میں روم کے اندر گیا تو پیچھے کھٹ سے دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے خود کو تصادم سے بچانے کی خاطر زبردست بریک لگائے مگر غسل خانے کا فرش چکنا اور گیلا تھا۔ میں پھسلتا ہوا گیا اور دیوار پر منطبق ہو گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے جسم میں پیچھے کی طرف کولہے کے پاس چبھن سی محسوس ہوئی۔ میں نے سنبھلنے کے لیے ہاتھ پھیلائے اور شاور کو پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پیشانی کو سہلاتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو باتھ روم میں محسن کی جگہ مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ وہ تقریباً میرا ہم عمر آدمی تھا جو صورت سے بن مانس لگتا تھا اس کی صحت بھی مجھ سے بہت بہتر تھی اور وہ یقیناً پھرتیلا بھی تھا۔ جیسے ہی میں دیوار سے ٹکرا کے واپس ہوا تھا اس نے انجکشن سرنج کی سوئی آگے کر دی تھی اور سوئی خود ہی گوشت میں اتر گئی تھی میرے پلٹ کر دیکھنے تک اس نے انجکشن کا زہر میرے جسم میں اتار دیا تھا۔ بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ اس کا ایک ساتھی کمرے میں موجود تھا اور شاید کسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس نے دبے پاؤں میرے پیچھے آ کے ٹکر ماری تھی۔ دوسرا باتھ روم کے اندر کھلے دروازے کے پیچھے انجکشن سے مسلح کھڑا انتظار میں تھا کہ پانی گرنے کی آواز اور محسن کا جواب نہ ملنے پر میں باتھ روم میں جھانکنے آؤں تو میرے قدم رنجہ فرماتے ہی وہ اپنا کام کر گزرے۔ ان دونوں کے کمرے میں داخل ہونے کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ پچھلی جانب

سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کے کمرے میں کود جاتے مگر اس میں پکڑے جانے کے خطرات بھی تھے چنانچہ زیادہ جرأت اور چالاکی سے کام لے کر انھوں نے رش میں کاؤنٹر کلرک سے چابیاں لے لی تھیں جو یوں بھی محسن رضا کو کہاں شناخت کر سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ محسن رضا کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے اور اسے ٹھکانے لگا کے میرا انتظار کرتے رہے۔ ٹھکانے لگانے کا مطلب اسے بے ہوش یا بے بس کر کے بیڈ کے نیچے یا الماری میں ڈالنا بھی ہو سکتا تھا اور اس کا خاتمہ بھی۔

یہ سب خیالات چند سیکنڈ کی پیداوار تھے۔ جیسے بہت سی جزئیات پر مشتمل ایک منظر لمحہ بھر کے لیے ٹیلی وژن کے اسکرین پر دکھائی دے اور غائب ہو جائے۔ پھر مجھے محصور ہو کے مرنے سے پہلے مار دینے کی حیوانی جبلت نے مغلوب کر لیا۔ مجھے احساس ہوا کہ دشمن بالآخر اپنی چالاکی سے مجھے اسیر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ زہر میرے وجود میں خون کی گردش کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ میری زندگی کے صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں اور میں کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں پکار سکتا کیونکہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ میرے چلانے کی آواز دوسرے کمروں کے مکینوں تک نہیں پہنچے گی اور کون جانے ساتھ والے کمرے خالی ہیں کہ مکین باہر گئے ہوئے ہیں۔ دروازہ توڑ کے باہر نکلنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور میرے لیے چند منٹ کی مہلت بہرحال اتنی کم تھی کہ نہ میں خود اپنی کوئی مدد کر سکتا تھا اور نہ کوئی دوسرا۔ میں نے اس وحشی درندے کی طرح حملہ کیا جس کے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہوں مگر شکاری سامنے ہو۔ شکاری کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی مگر وہ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے خود کو بچا لیا اور میں اپنے ہی زور میں باتھ ٹب کے اندر جا گرا جو لبالب بھرا ہوا تھا اور اسی میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جس پر مجھے گمان گزرا تھا کہ محسن منہ ہاتھ دھو رہا ہے۔

شکاری نے قہقہہ لگایا۔ "اگر ٹب خالی ہوتا تو تمھارا سر پھٹ جاتا۔ تمھیں شکر گزار ہونا چاہیے ہمارا۔"

میں نے اسے ایک غلیظ گالی دی اور ٹب میں سے نکل آیا۔ میری حالت سوٹ بوٹ سمیت سوئمنگ پول میں غوطہ مارنے والے شخص کی طرح ہو رہی تھی۔ پانی میری جیبوں میں۔ میرے جوتوں میں اور بالوں میں بھر گیا تھا اور سوٹ گیلا ہونے کے بعد بھاری ہو کے میرے جسم سے چپک گیا تھا چنانچہ میرے لیے آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس کے باوجود نہ میرا حوصلہ کم ہوا تھا اور نہ اعتماد۔ گڑبڑ اس وقت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوئی جب میں نے اچانک قدموں کے نیچے زمین کو ہلتا محسوس کیا اور مجھے زلزلے کا خیال آیا۔ میں نے پھر ہاتھ پھیلائے اور گرنے سے بچ گیا۔

شکاری پھر ہنسا۔ "آؤ۔ ہمت ہے تو کرو حملہ۔" اس نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں نے پھر جست لگائی مگر خود میں نے یہ محسوس کیا کہ میری حرکت سلوموشن کا نمونہ تھی۔ اتنی مضحکہ خیز کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے ہاتھ پیر میرے قابو میں نہ رہے تھے اور کرکٹ کی اصطلاحات کے مطابق میری "لینگتھ اور ڈائریکشن" دونوں غلط ہوگئی تھیں چنانچہ میرے حریف نے بولڈ ہونے کی بجائے مجھے زبردست فلائٹ لگایا اور میں بال بن کے باؤنڈری کی طرف بڑھا جو باتھ روم کی دیوار تھی اور اس سے ٹکرا کے رک گیا۔ زمین کے ساتھ ساتھ اب آسمان بھی ہلنے لگا تھا اور دیواریں شرابی کی طرح جھوم رہی تھیں "انجکشن کا اثر اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے سوچا۔ اگر "انٹروینس انجکشن ہوتا یعنی دوا براہِ راست کسی شریان میں داخل کردی جاتی تو ڈھائی تین منٹ میں دورانِ خون مکمل ہونے تک میرا کام تمام ہوجاتا مگر گوشت میں اتنی سرعت سے نہیں ہوتا۔ میں آہستہ آہستہ پلٹا۔ باتھ روم کے میدان کارزار میں ہم دو ہی حریف تھے۔ نہ کوئی ریفری تھا نہ امپائر اور میں "فاؤل پلے" کا شکار ہوا تھا لیکن فاؤل کون دیتا۔ کافی۔ مجھے اچانک خیال آیا۔

"سؤر کے بچے.... تم.... تم نے کافی میں کچھ ملایا تھا۔" میں نے مکا تان کے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

شکاری میری لڑکھڑاتی چال پر ہنسا۔ "ہاں۔ اچھا ہوا تم خود ہی اٹھ کے آگئے ورنہ ہم تمہیں محسن کا پیغام دے کر بلواتے۔ یہ انجکشن تو اضافی تھا۔ کسی وجہ سے تم نے کافی نہ پی ہوتی تو تم کو یہاں قابو کیا جا سکتا تھا۔"

"اوہ۔ اوہ محسن۔ کیا تم نے.... اسے...." اب میری زبان بھی لڑکھڑانے لگی تھی۔

جواب میں اس کا ایک اور قہقہہ سنائی دیا۔ باتھ روم کا بلب میری نظروں کے سامنے جلنے بجھنے لگا اور میں ڈگمگایا۔ میرے ہاتھوں نے کسی غیر موجود شے کو تھامنے کی بے سود کوشش کی۔ فرش تیزی سے اوپر آیا اور میں نے گرتے ہوئے آخری جدوجہد اپنے سر کو ضرب سے بچانے کے لیے کی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھا اور چیت ہوگیا۔ چھت آسمان سے بھی اوپر نکل گئی اور میرے گرد وہی رات محیط ہوگئی جو بابر مشرق اور مغرب میں اور شمال و جنوب میں سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخری احساس یہ تھا کہ منزلِ راہِ عدم آگئی جس کے بارے میں ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ کل کی بات ہے تو اس کے لیے زادِ راہ کا تردد کیوں۔ اپنا غم، تیرا غم جہاں کا غم۔ زادِ راہِ عدم.....

جب مجھے رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا جنازہ میرے لواحقین کے کندھوں پر ہے اور مجھے تدفین کے لیے تابوت میں ڈال کے شہرِ خموشاں کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ مگر تابوت چہ معنی دارد۔ میں عیسائی تو نہیں تھا اور میری وفات لندن میں نہیں ہوئی تھی۔ اصولاً مجھے کفن پوش ہونا چاہیے۔ ایسے سلنڈر نما شب کفن جن کو پھاڑ کے میں بول بھی نہ سکے کہ عزیزا ابھی تو میں جوان ہوں اور بقید حیات ہوں۔ کفن ایسے ہرگز نہیں ہوتے۔ میں نے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی لیکن میں واقعی سلنڈر میں ملفوف تھا۔ ملفوف اس لیے کہ وہ سلنڈر ٹین کا یا کسی دھات کا نہیں تھا بلکہ کوئی ریشمی قسم کی ساخت کا تھا جسے میرے گرد یوں لپیٹ دیا گیا تھا کہ میں الف کی طرح سیدھا لیٹا تھا۔ اور الف نما تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو میں نے اپنی وفات کے خیال کو رد کیا اور اس خیال سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے یک لخت بیدار ہوگئے۔ بہ کا منظر میرے تصور سے غائب ہوگیا جو عجیب لایعنی منظر تھا کہ آگے سیاہ جنازہ گاڑی ہے جس کے گھوڑے اور کوچوان تک سب سیاہ ہیں اور تابوت کے گرد اعزا کی عدم موجودگی میں فوزیہ اور رابعہ ہیں۔ سیاہ لباس میں ان کے حسن کی روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے اور دوسری طرف محسن ہے اور شیرازی صاحب ہیں۔ جنازہ گاڑی کے دونوں جانب پھول ہیں یا طباق جیسی پھولوں سے بنی ہوئی چادریں آویزاں ہیں۔ ماتم کنندگان بشمول منظر صاحب۔ چراغ دین۔ بابو پوسٹ اور حشمت خان اینڈ کمپنی پیچھے سرنگوں چل رہے ہیں۔ یہ تصور میں تصور لندن کے قیام کا تھا جس میں ایسے ہی منظر اکثر دیکھنے کو ملتے تھے۔ اب میں نے آوازوں پر غور کیا۔ آواز انجن کی تھی جو کار کا انجن نہیں ہو سکتا تھا اور ہیلی کاپٹر یا جہاز کا بھی نہیں۔ یہ ٹرک کا انجن تھا۔ میں ایک قالین میں لپٹا ہوا تھا اور قالین ٹرک میں رکھا تھا اور ٹرک نہ جانے کدھر جا رہا تھا۔ سمت کا یا وقت کا تعین ناممکن تھا۔ میں کیسے اندازہ کرتا کہ میں اس حالت میں کتنا سفر کر چکا ہوں۔ میں نے منتشر خیالات کی سپاہ کو منظم کیا اور واقعات کو ترتیب کے مطابق یاد کرنے کی کوشش کی۔ دشمنوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں کہاں قیام پذیر ہوں۔ انھوں نے دو یا زیادہ افراد کو میرے اغوا پر مامور کیا۔ ان افراد نے مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی۔ ایمبیسیڈر ہوٹل کا عملہ اس میں براہِ راست ملوث نہیں

ہو سکتا تھا چنانچہ یہ حرکت کسی ضمیر فروش نے بھاری معاوضہ لے کر کی یا کسی نے نظر بچا کے کافی میں دوا ڈال دی۔ باورچی خانے میں یا نیچے تک کافی کے پہنچنے سے قبل۔ انھی افراد نے محسن کے کمرے تک رسائی حاصل کی۔ ناجائز طریقے سے تالا کھول کے یا زبردستی۔ محسن کو خاموش کرنے کے بعد انھوں نے مجھے بلوانے کا انتظام کیا تھا مگر شامتِ اعمال کے باعث میں خود ہی کمرے میں اور پھر باتھ روم میں جا پہنچا۔ کمرے کے کسی پردے کے پیچھے پوشیدہ ایک فرد نے مجھے غسل خانے میں دھکیلا اور باہر سے دروازہ بند کیا تو دوسرے نے مجھے انجکشن دیا لیکن اس وقت کافی کی دوا کا اثر ہو چکا تھا چنانچہ میں مقابلہ نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ کہ اب مجھے قالین میں لپیٹ کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سوالات تھے۔ نمبر ایک یہ کہ کیا محسن بھی دوسرے قالین میں میرے ساتھ ہی ٹرک میں لیٹا ہے نمبر دو کیا وہ بھی ہوش میں ہے یا مر چکا ہے۔ نمبر تین۔ یہ ہوٹل کے قالین ہیں تو ہوٹل والوں نے ان کی برآمدگی کیوں نہیں۔ اتنے بڑے قالین کسی کی نظر بچا کے کیسے نکالے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ قالین جن میں سالم آدمی لپیٹے گئے ہوں اور ہر آدمی کا وزن پونے دو سو پونڈ ہو۔ ایسے ایک قالین کو اٹھانے کے لیے اور نیچے سے اتار کے ٹرک میں چڑھانے کے لیے بھی چار آدمی بہرحال درکار ہوں گے اور یہ جلوس کاؤنٹر کے سامنے سے ضرور گزرے گا۔ ہوٹل کے عملے کا اس سازش میں شریک ہونا بعید از قیاس تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ انھوں نے قالین کی قیمت ادا کر کے قالین لے جانے کی اجازت حاصل کرلی ہو۔ ایسے تو جس کو جو چیز پسند آئے گی کمرے سے اٹھا کے لے جائے گا اور معاوضہ ادا کردے گا۔ ہوٹل والے روز سامان خرید کے کمروں کی آرائش کرتے رہیں گے۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ انھوں نے ریوالور دکھا کے یہ "اسباب" نکالا ہو۔ ہوٹل کے اندر اور باہر اتنے لوگ ہوتے ہیں اور سڑک تک اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ یہ کام اسٹین گن کی مدد سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بنک لوٹنے والے صرف ایک راستے کو کنٹرول کرتے ہیں اور ایک ہال کے محدود سے عملے کو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟۔

اب میں پوری طرح ہوش میں تھا چنانچہ میں نے ممکنات اور ناممکنات کے اسباب پر غور ملتوی کیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب غور طلب مسئلہ مستقبل کا تھا۔ یعنی کیا ہونے والا ہے۔ کیا اغوا کرنے والے مجھے اور محسن کو قتل کردیں گے۔ نہیں۔ قتل کرنا مقصود ہوتا تو کافی میں بے ہوش کرنے والی دوا کی جگہ زہر بھی ملایا جا سکتا تھا۔ اور انجکشن سے ہلاک کرنے کے بعد تو لاشیں اٹھانے کا تردد بھی فضول تھا۔ وہ مجھے وہیں باتھ روم میں چھوڑ کے رخصت ہوجاتے۔ محسن کا مسئلہ ہنوز غیر یقینی تھا۔ کہیں وہ مزاحمت کرتا ہوا نہ مارا گیا ہو یا چشم دید گواہ ہونے کے باعث سزائے موت کا مستحق نہ ٹھہرا ہو۔ اصل شکار میں تھا اور شکاری مجھے بالآخر زیرِ دام لانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ مجھے مارنا نہیں زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ مجھے زندہ رکھنے کا بھی کوئی مقصد یقیناً ہوگا۔ تفتیش یا تصدیق ــ کہ مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں معلوم۔ یا کسی دستاویز پر میرے دستخطوں کا حصول۔ مجھے کسی بات کے اقرار پر مجبور کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے انجام کے بارے میں آخری فیصلہ بھی انھی کا تھا اور علمِ غیب سے محرومی کے باعث میں قبل از وقت معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ اگر میں شروع سے ہوش میں رہتا تو شاید وقت کی مدد سے اندازہ کرسکتا کہ مجھے ایمبیسیڈر ہوٹل سے کتنی دور لے جایا گیا ہے اور ممکن ہے ٹرک کے دائیں بائیں مڑنے سے اندازہ کرسکتا کہ ٹرک کس سڑک سے گزر کے کس سمت رواں ہے۔ مگر اپنی موجودہ کیفیت میں یہ سب اندازے میرے اختیار کی بات نہ تھے۔ میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ہر مجبور انسان سے امید کا دامن باندھے رکھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا اور مارنے والے سے بچانے والے کے ہاتھ کے زبردست ہونے پر یقین رکھنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں چلا تک نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

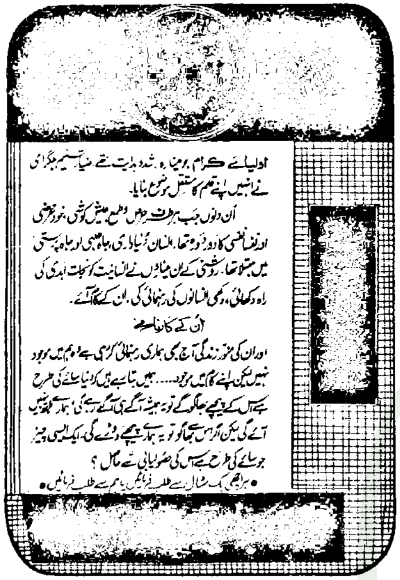

ٹرک بالآخر رک گیا اور مجھے اس خول سمیت گھسیٹا گیا جس کے اندر میں یوں بند تھا۔ جیسے ریشم کا کیڑا کوئے میں۔ قالین کو آگے پیچھے سے اٹھایا گیا تو میں کمان ہوگیا۔ قالین بھد سے نیچے گرا اور بیک وقت دو افراد نے ایک دوسرے کو حرام خوری کا الزام دیا۔ قالین کی کئی تہوں میں لپٹے ہوئے ہونے کے باعث مجھے چوٹ نہیں آئی تھی۔ کسی تیسرے شخص نے غرا کے کہا کہ یہ وردیاں نہیں کاشانی قالین ہیں اور دوسری بار مجھے اٹھایا گیا تو اس نے درمیان میں سہارا فراہم کیا۔ میں نے قلوپطرہ کا تصور کیا جسے اسی طرح قالین میں لپیٹ کر شاہی دربار میں پیش کیا گیا تھا۔ قالین کو ایک کنارہ تھام کے جھٹکا دیتے ہیں قلوپطرہ لکڑی کے لٹھے کی طرح لڑھکتی ہوئی عین شاہ کے قدموں میں پہنچی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ بعد مجھے پوری احتیاط کے ساتھ فرش پر رکھ دیا گیا اور مجھے لانے والوں نے اجرت پر احتجاج کیا۔ وہ کرائے کے ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو سو کے بجائے دو سو کا مطالبہ کر رہے تھے۔ "اتنا قیمتی قالین ہے بادشاہو۔ اپنے تو مونڈھے بھی وزن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ کچھ نکل آیا ہے۔ لتاں ڈنگیاں ہوگیاں ہے۔" انھوں نے عاجزی سے دلائل اور فریاد کا سلسلہ دراز کیا تو انھیں سو سو کا نوٹ بھی مل گیا۔ مجھے اسمگل کرنے والے اب جلد از جلد ان سے نجات پانا چاہتے تھے۔ کسی نے ٹھوکر مار کے قالین کو دھکیلا اور میں گھومنے لگا۔ آخری بل کھلتے ہی میں نے دیکھا کہ میں ایک کوٹھی کے برآمدے میں لیٹا ہوا ہوں۔ برآمدہ عقبی حصے کا تھا کیونکہ مجھے وہ سیڑھیاں نظر نہ آئیں جن کے سامنے ٹرک رکا تھا۔ مجھے اٹھانے والوں نے تین زینے طے کیے تھے۔ کہیں نہ کہیں وہ دروازہ بھی ہونا چاہیے تھا جس سے گزر کے ٹرک اندر آیا تھا۔ اس برآمدے کے گرد لکڑی کا جنگلا سا تھا جو خاصا پرانا اور بے رنگ تھا۔ اوپر چھت میں گول ٹیوب لائٹ کا روشن حلقہ تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر وہی شخص ریوالور لیے کھڑا تھا جس نے مجھے باتھ روم میں انجکشن لگایا تھا۔ بائیں جانب کھڑا ہوا شخص فلموں اور کارٹونوں میں دکھائے جانے والے الہ دین کے طلسماتی چراغ کے جن کا نسبتاً چھوٹا ماڈل تھا لیکن اس کے باوجود دیوزاد لگتا تھا۔ اس کا قد سوا چھ فٹ کے لگ بھگ تھا اور وزن کسی صورت ساڑھے تین سو پونڈ سے کم نہ تھا یعنی مجھ سے دگنا۔ وزن اور قد کی مناسبت سے اس کے جسمانی اعضا بھی جناتی قسم کے تھے۔ مزید نفسیاتی تاثر کے لیے اس نے محض ایک جانگیا پہننے پر اکتفا کی تھی چنانچہ اس کا لق و دق چٹان جیسا سینہ۔ مشک جیسا پیٹ۔ کسی رومن عمارت کے ستونوں جیسی ٹانگیں اور گرز جیسے ہاتھ بہت نمایاں تھے۔ اس نے سر منڈوا کے خود کو ٹنڈ بنالیا تھا کیونکہ اتنے بڑے جسم پر اتنا چھوٹا سا سر بہت عجیب لگتا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں اور ٹھوڑی تک محدود داڑھی نے اسے بچوں کے لیے تو واقعی خوفناک بنادیا تھا مگر مجھے وہ ایک کارٹون لگا۔ ریوالور والے کے اشارے پر وہ آگے بڑھا اور اس نے دانتوں میں دبے ہوئے خنجر کو ہاتھ میں تھام کے ایک وار سے وہ رسیاں کاٹ دیں جو میرے ہاتھوں اور پیروں کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ بھی ڈراما تھا اور میں سمجھ گیا کہ یہ گورِ رجّ محض نمائشی چیز ہے۔ اس کا بدن ٹھوس نہیں تھا۔ اس کے جسمانی غدود بچپن سے زیادہ فعال رہے ہوں گے چنانچہ عمر ڈھلنے کے بھی وہ بہت پھیلا تھا۔ اس جسمانی پھیلاؤ کو بیماری کہا جاسکتا ہے جو آدمی کو جن بنادیتا ہے۔ گوشت کا یہ پہاڑ خوراک کا ذخیرہ نگلنے سے قائم تھا۔ جب اس نے میرے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا تو میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے ہاتھوں پیروں پر رسی کے بل سے پڑ جانے والے نشانات کو ملتا ہوا میں اٹھ بیٹھا۔ میرے جسم پر لباس کا ایک تار تک نہ تھا چنانچہ میں کھڑا نہیں ہوا۔ "ہیلو" میں نے ریوالور والے سے کہا۔ "یہ کیا دوسرا اُونڈیاں ہوگا۔ آؤ گے میری طرح میدان میں!"

ریوالور والے نے مجھے گالی دی۔ "دوسرا اُونڈ تمھارے باپ سے ہوگا۔"

"اس کے لیے تمھیں قبر میں کا ڈنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "میانی صاحب کے قبرستان میں۔"

"ٹائیگر" وہ دیوزاد سے مخاطب ہو کے بولا۔ "اس کو سنبھالنا۔ میں اس کے کپڑے لاتا ہوں۔" وہ برآمدے کے ایک دروازے سے اندر چلا گیا۔ اندر کسی کمرے میں اسٹیریو بج رہا تھا۔ پھر کوئی عورت کھل کھلا کے ہنسی۔ میں نے اندازہ میں آس پاس کی آبادی کا تعین کرنا چاہا مگر تاحدِ نظر ویرانی اور تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا اور رات کا سکوت اتنا گہرا تھا کہ دور سے ایک مینڈک کے ٹرّانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

"ٹائیگر" میں نے کہا۔ "یہ کیا نام ہوا بھلا؟ تم پہلے سرکس میں تھے کیا؟"

"بھونکنے کی ضرورت نہیں۔" ٹائیگر نے مجھے خوں خوار نظروں سے گھورا۔

"ٹائیگر میرے ایک کتے کا نام تھا۔ جو خارش میں مبتلا ہوا اور پاگل ہو کے مرا۔" میں نے کہا۔ "وہ بالکل تمھارا ہم شکل تھا۔ اس کی روح تم میں سما گئی ہے شاید۔ تم غرّاتے بھی ویسے ہی ہو۔ مروگے بھی ویسے ہی۔"

"بکواس بند کرو نہیں تو تھپڑ مار کے بتیسی منہ میں رکھ دوں گا۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

چونکہ میرا مقصد ہی اسے مشتعل کرنا تھا اس لیے میں نے کہا۔ "ویسے وہ بھی دیکھنے ہی دیکھنے کا تھا۔ بزدل اتنا تھا کہ بلی سے ڈرتا تھا۔ اور اس بلی سے نہیں جو شیر کی خالہ تھی۔ بلکہ وہ جو نو سو چوہے کھا کے حج کو گئی تھی۔ تم بھی اس چوہے سے ڈرتے ہو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"دلاور۔" ٹائیگر نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور آگے بڑھا۔ بے خیالی میں وہ مجھے نام بتا چکا تھا۔

"گینڈے کے بچے۔ قریب آیا تو مکا مار کے یہ ڈھول جیسا پیٹ پھاڑ دوں گا۔" میں نے اسے چیلنج کیا۔

وہ یک لخت مجھ پر لپکا اور اس کے حلق سے حقے جیسی آواز نکلی۔ میں بالکل تیار تھا۔ ابھی وہ مجھ تک پہنچا ہی تھا کہ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا اور میں نے اس کے پورے وجود کو دونوں ہاتھوں پر سنبھال کے سر سے گزار دیا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے گیا اور برآمدے کی دیوار سے ٹکرایا۔ دھماکے سے دیوار ہل گئی اور ٹائیگر کے حلق سے جو کراہ بلند ہوئی وہ بھینسے کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ وہ دو فٹ کی بلندی سے فرش پر گرا اور ساکت ہوگیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" دلاور نے اچانک دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "مجھے حکم ہے کہ بلا تامل گولی مار دوں۔"

"ضرور مارو دلاور بھائی۔" میں نے ٹائیگر کی طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھ سے شرط لگا رہا تھا کہ سر کی ٹکر سے دیوار گرا سکتا ہے۔ غنیمت ہے یہ جھوٹ تھا ورنہ ابھی تم اندر ملبے میں دفن ہوجاتے۔"

"میں تمھاری بات کر رہا تھا۔" دلاور نے میرے کپڑے میرے منہ پر کھینچ مارے۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کپڑے کیچ کیے اور پہننے لگا۔ "گولی میں ریوالور ہے۔ گولی میں ریوالور؟ لاحول ولا قوۃ۔ دماغ الٹ گیا ہے میرا۔ ابھی اگر قمیص کی جگہ پتلون اور پتلون کی جگہ قمیص پہن لوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بتاؤ میرا محسن کہاں ہے؟"

"تمھارا کون محسن ہے۔ ہم کسی محسن کو نہیں جانتے۔ زیادہ کامیڈین بننے کی ضرورت نہیں۔" دلاور چراغ پا ہو کے بولا مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ محسن سے واقف نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن خیریت سے ہے اور جب مجھے لایا گیا اس وقت تک وہ آیا ہی نہیں تھا۔

"سوری مسٹر دلاور۔" میں نے کہا۔ "اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟ یہ مجھے اور میرے کپڑوں کو الگ الگ کیں لایا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ کپڑوں کے بغیر تم راستے میں کہیں فرار نہیں ہوسکتے تھے۔" دلاور بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے نہ ہوتے تو تمھارا اندازہ غلط ہوجاتا۔ میں بغیر کپڑوں کے میراتھن ریس لگاتا تو پوری انارکلی اور پوری مال روڈ پر سے گزر جاتا۔ اب لگانے ہو شرط؟"

دروازہ پھر کھلا اور اس بار جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر میں ساری شوخی بھول گیا۔ میرا خیال تھا کہ ٹائیگر سے نمٹنے کے بعد دلاور کو بھی چکر دیا جاسکتا ہے مگر منڈی والے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں پیشہ ور اور سفاک قاتلوں کے ٹھکانے پر ہوں جہاں میری موجودگی کی خبر کسی کو نہیں اور نہ ہوگی۔ یہ شہر کی چار میں سے کسی ایک سمت کا مضافاتی علاقہ تھا جہاں ایک کوٹھی کا دوسری سے فاصلہ بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کوٹھی کے ارد گرد محض جنگل ہو اور صبح کا اجالا پھیلنے کے باوجود اس ویرانے میں امید کی ایک کرن بھی نہ ملے۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

جسے قارئین آج تک نہیں بھولے

طالوت

۳ حصوں میں (مکمل)

قیمت فی حصہ ۱۵/۰۰ روپے | ڈاک خرچ فی حصہ ۵/۰۰ روپے

- پُراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے
- طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لیے
- جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لیے

ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!

کتابی شکل میں تیار ہے

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں

تینوں حصے ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

"ٹانگر کو کیا ہوا ہے؟" منڈری والے نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا۔

"اس نے دیوار کو ٹکر ماری تھی۔ خود لوٹ گیا" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور میں غیر ارادی طور پر جھک گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ منڈری والے نے عمداً میرا نشانہ نہیں لیا تھا یا غوطہ ملنے سے گولی سیدھی نکل گئی۔ اس وقت مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ جیسے منڈری والے نے مشتعل ہو کے میرے سر پر گولی چلا دی تھی میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ منڈری والا آگے بڑھا۔ اس کی کنچی آنکھیں نفرت سے دہکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرا خیال تھا ابھی وہ اسی رفتار سے دو قدم اور اٹھائے گا مگر اس نے اچانک اچھل کے میرے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ مارا۔ میرا گال جلنے لگا۔ ٹانگر نے کراہ کر کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ اندر اسیٹریو بند ہو گیا۔

"چودھری دلاور کے سامنے اتنی ہی بات کرنا ہے جتنی ضروری ہو" منڈری والا بولا۔ "چلو اندر"

تھپڑ کے ردِ عمل کے طور پر میں اپنا ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گیا۔ ایک نہیں دو دو ریوالوروں کی سرد سفاک نالیں مجھے گھور رہی تھیں اور ان کے اندر اشارے کی منتظر بیٹھی ہوئی ہر گولی میرے دل اور میرے سر میں اتر جانے کے لیے تیار تھی۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا اور وہ دونوں میرے پیچھے ہو گئے۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ چودھری دلاور وہ ہے جس کے سامنے مجھے اب پیش ہونا ہے۔ وہ نہیں جسے میں دلاور سمجھے ہوئے تھا ٹانگر نے میری بات کا مطلب غلط سمجھا تھا وہ سمجھی تھی میں کوٹھی کے مالک کا نام پوچھ رہا ہوں اور اس کے آقا کو چوہا کہہ رہا ہوں۔ لکڑی کا پالش کیا ہوا بیرونی دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اندر کے جالی والے فلائی پروف دروازے کو دھکیل کر میں نے خود کو ایک خواب گاہ میں پایا جس کی تزئین و آرائش سے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ کا پتا چلتا تھا لیکن اس بیڈ روم میں کوئی نہیں تھا۔ میں کمرے کے وسط میں رک گیا۔

"سیدھے آگے چلو دائیں جانب" منڈری والے نے حکم دیا جو مجھ سے چار قدم پیچھے تھا۔

میں نے دائیں ہاتھ کے دروازے کا پردہ ہٹایا اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس میں ... میر شرافت علی کے ڈرائنگ روم کی طرح نوادرات کا ذخیرہ تو نہ تھا مگر قالین، فرنیچر، فانوس اور دوسرا سب سامان انتہائی بیش قیمت تھا۔ ڈرائنگ روم کا آخری حصہ کچھ دائیں جانب پھیلا ہوا تھا اور یہ کچھ انگریزی حرف ایل کی شکل بنتی تھی۔ چھوٹے حصے میں کھانے کی طویل میز کے گرد کمرے کی کرسیاں تھیں۔ دونوں حصوں کو ایک محرابی دروازہ جدا کرتا تھا اور اس میں بڑے بڑے رنگین منکوں کی مالائیں پردے کے طور پر استعمال کی گئی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ" منڈری والے نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اس بات کا خیال رکھو کہ تم چودھری دلاور کی کوٹھی میں ہو۔ اگر ہیرو بنو گے تو کتے کی موت مارے جاؤ گے اور تمہاری بوٹیاں کتوں کو ڈال دی جائیں گی"

"گویا تم تینوں مل کے مجھے کھا جاؤ گے۔ دیری بیڈ!" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب بھی آدم خوروں سے ہیں؟"

منڈری والا ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی قریب آ کے مجھ پر حملہ کرے۔ میں اسے ڈھال بنا کے باقی سب سے نمٹ لوں مگر وہ میرے عزائم کو سمجھ گیا تھا اور اگر وہ حکم سے مجبور نہ ہوتا تو کب کا مجھے قتل کر چکا ہوتا۔

"تم نے سلامت شاہ کا انجام نہیں دیکھا ابھی" منڈری والا بولا۔ "مگر منشی کا حشر دیکھ چکے ہو"

"ہاں اور اسی لیے میں حشر سے نہیں ڈرتا" میں نے کہا۔ "میدانِ حشر میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہو گی"

منڈری والے نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ سامنے آ جائے۔ ٹانگر میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ منڈری والے نے ان سے کہا کہ اگر میں صوفے سے اٹھنے کی کوشش بھی کروں تو مجھے گولی مار دی جائے یا ٹانگر ڈنڈے سے میرا سر پھاڑ دے۔ ڈنڈا شاید اس نے ہوش میں آنے کے بعد اندر آتے ہوئے اٹھا لیا تھا یا اس کا حوالہ محض مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری دلاور کے حکم کے بغیر وہ مجھے نہیں مار سکتے ۔۔۔ چودھری دلاور نے کسی خاص مقصد کے تحت مجھے ملاقات کے لیے بلوایا تھا اور اس مقصد کو حاصل کیے بغیر مجھے قتل کرنا ہوتا تو وہ اتنا تردد ہی کیوں کرتے۔

"یار میں غلط سمجھا تھا۔ تم تو ذرا بھی دلاور نہیں ہو" میں نے ریوالور والے سے کہا۔ "چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کے پھینک دوں اس توپ سمیت مگر مجھے اب چودھری صاحب سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے یہ سب ڈھونگ ہے۔ تمہیں اختیار ہی نہیں کہ مجھ پر گولی چلا

سکو۔ اور اس تربوز کا ڈنڈا تو میں ..." میری بات نامکمل رہ گئی۔ منڈری والا ایک سرچ لائٹ اٹھائے ہوئے نمودار ہوا جو اس نے مخالف دیوار کے پلگ سے لگا دی۔ ایسی لائٹس میں نے فلموں کے سیٹ پر اسٹوڈیوز میں دیکھی تھیں یا فوٹو گرافروں کی دکان پر۔ سرچ لائٹ ایک اسٹینڈ پر نصب تھی اور جب منڈری والے نے اس کو اوپر نیچے کرنے کے بعد صحیح زاویے پر لا کے آن کیا تب مجھے یوں لگا جیسے آدھی رات کو سورج سوا نیزے پر آگیا ہو۔ اس روشنی کے پیچھے کیا، اس کے دائیں بائیں بھی اب مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ منڈری والے نے چند منٹ کے بعد دوسری سرچ لائٹ کمرے کے دوسرے کنارے پر لگائی اور میرے سامنے دونوں گوشوں سے امڈنے والے بے رحم روشنی کے اس سیلاب نے مجھے اندھا کر دیا۔ روشنی میری آنکھوں میں یوں چبھنے لگی جیسے آنکھوں میں شیشے کا بُرادہ پڑ گیا ہو۔ ان کی تمازت مجھے چند فٹ دور تک محسوس ہونے لگی اور اگرچہ کمرہ ایئرکنڈیشنڈ تھا مگر میرے جسم پر پسینہ اتر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سجے سجائے ڈرائنگ روم میں نہیں لق و دق صحرا کی تپتی دھوپ میں تنہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ "بس ایسے ہی بیٹھے رہو گے تو کچھ نہیں ہو گا" ایک اجنبی نے کہا جس کا لہجہ ٹھہرا ہوا، پُراعتماد اور واضح تھا۔

"تم چودھری دلاور ہو؟" میں نے کہا۔ "یا اُن کے نقیب؟"

"میں ہی چودھری دلاور ہوں" وہ بولا۔ "کیا تم نے کبھی میرا نام سنا ہے؟"

"دلاوروں کا نام تو اکثر سنا ہے" میں نے کہا "مگر تم صرف نام کے دلاور ہو۔ درحقیقت بزدل جو اندھیرے کی پناہ میں رہتا ہے اور روشنی سے ڈرتا ہے"

کوئی چیز گولی کی طرح میرے سر سے ٹکرائی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اس کو روشنی کے اس بحرِ ذخار میں کسی سیاہ چٹان کی طرح سایہ بن کے نمودار ہوتے دیکھا اور یہ سایہ ایک لمحے کے سویں حصے کے لیے میری بند آنکھوں کے سامنے پھیلا۔ سرچ لائٹس کی روشنی آنکھیں بند کر لینے کے باوجود پپوٹوں کے سامنے اجالے کی ایک دیوار کی طرح موجود تھی اور یہ سیاہ ہیولا اسی میں ابھرا تھا۔ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے دماغ کے اندر دھماکا سا ہوا اور وہ سب مادہ جو قدرت نے کاسۂ سر میں بھرا تھا اچھل کے اِدھر سے اُدھر ہو گیا۔ اگرچہ ایسا ہونا ناممکن ہے مگر مجھے ضرب کے بعد یہی لگا تھا کہ میرا مغز اندر تک ہل گیا ہے۔ میں نے آنکھوں کے سامنے رنگین عکس بنتے دیکھے جو ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ اس طرح

جیسے دنیا کے نقشے میں ملکوں کی نشان دہی الگ الگ رنگوں سے کی جاتی ہے مگر مجموعی تاثر بے ہنگم اور بے ترتیب رنگین دھبوں کا ہوتا ہے۔ میرے کانوں میں شور گونجنے لگا۔ پتھروں پر ٹین کے صندوق گھسٹنے کا شور، طوفان کی رات میں پاگل ہوا کے شاخوں سے الجھتے ہوئے گزرنے کا شور، زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارتوں کا شور اور مکینوں کی آہ و بکا کا شور۔ بریک لگانے سے جام ہونے والے گاڑیوں کے آہنی پہیوں کی ریلوے لائن پر رگڑ کا شور اور تصادم میں تباہ ہو جانے والی گاڑیوں کے مسافروں کی چیخ پکار کا شور۔ میں خلا میں قلابازیاں کھاتا رہا۔ جیسے ساری کائنات کسی قیامت آفریں زلزلے سے تہ و بالا ہو رہی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ آوازوں کا ہجوم مٹنے لگا، رقص کرتے ہوئے رنگ ساکت ہونے لگے اور زمین و آسمان ٹھہر گئے۔ صرف وہ روشنی باقی رہی جو مٹائی نہیں جا سکتی تھی۔ ایک اور چیز تھی جو اس روشنی میں سے پل بھر کے لیے ابھرتی تھی اور زن سے میری آنکھوں پر سایہ کرتی گزر جاتی تھی میرے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے سے۔ یہ سخت قسم کے ربر کی ٹھوس گیند تھی جو کرکٹ کی بال سے کچھ چھوٹی ہو گی اور اس کا رشتہ نائلون کی ایک مضبوط ڈور سے قائم تھا۔ روشنی کے پیچھے کوئی ہاتھ اس گیند کو مسلسل دائرے میں حرکت دے رہا تھا اور بال کے زور سے ڈور تنی ہوئی تھی۔ یہ دو متضاد قوتوں کا توازن تھا۔ ایک وہ جو بال کو دور پھینکتی ہے اور دوسری وہ جو اسے ایک محدود دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ بال مجھے صرف آدھے چکر کے دوران نظر آتی تھی جب سرچ لائٹس کے پیچھے سے روشنی میں طلوع ہوتی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے سے تیرتی ہوئی پھر اسی تیرگی میں ڈوب جاتی تھی۔ بال کو گھمانے والا ہاتھ بڑا طاقتور تھا اور زبردست نشانے باز اور ماہر تھا کہ بعض اوقات گیند چھ انچ کے فاصلے سے گزرتی رہتی تھی اور یہ فاصلہ نہ ایک سوت کم ہوتا تھا نہ زیادہ۔ پھر اچانک گھٹ کر دو انچ رہ جاتا تھا لیکن میں سر کو پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا کیونکہ سر کے پیچھے صوفے کی پشت تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ متحرک گیند جس کی ضرب شاید باکسنگ کے عالمی چیمپئن کے مکے سے بھی زیادہ تباہ کن تھی صرف دو انچ دور ہے اور اگر میں ذرا بھی ہلا تو میری ناک کا چورا ہو جائے گا یا میرے جبڑے ٹوٹ جائیں گے اور میرے ایک طرف کے دانت جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ پھر اچانک بال کی گردش ختم ہو گئی۔

"کیا حال ہے اب؟" دلاور کی آواز آئی۔ "میں نے تم

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے شرافت کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"میں نے بھی کوئی غیر شریفانہ جواب نہیں دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہی کہا تھا کہ دلاور ہو تو سامنے آکے بات کرو۔"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "تمہیں اب تک بخوبی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میں سامنے آئے بغیر بھی کیا کچھ کرسکتا ہوں۔"

"ہاں۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ تم نے سب کچھ نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ مجھے اٹھوانے کے بجائے تم نے میرا جنازہ نہیں اٹھوایا۔" میں نے کہا۔

"بات ضرورت کی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کوئی غیر ضروری قدم نہیں اٹھاتا۔"

"تمہارا میرے سامنے نہ آنا قطعی غیر ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ میں تمہیں جانتا ہوں نہ پہچانتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تمہارا اصل نام چودھری دلاور ہے یا نہیں اور یہ جگہ کون سی ہے، جہاں تم نے ملاقات کا اتنا اہتمام کیا۔"

"میرے نقطۂ نظر سے جو کچھ میں کر رہا ہوں وہی ضروری ہے۔" اس نے اصرار سے کہا۔ "آج تم واقعی نہ مجھے جانتے ہو نہ پہچانتے ہو لیکن کل کا کیا بھروسہ کہ تم غلط جگہ اور غلط وقت پر مجھے پہچان لو۔"

"تم اتنے طاقتور ہو۔ پھر یہ ڈر کیسا؟ اگر میں تم کو شناخت کرلینے کی غلطی کروں تو کیا تم مجھے سزا نہیں دے سکتے؟"

"سکندر بخت۔" وہ چڑ کے بولا۔ "میں نے تمہیں فضول بحث کے لیے نہیں بلایا ہے۔ تم ابھی جوان ہو اور جذباتی ہو۔ زندگی کے بہت سے فیصلے نفع نقصان دیکھ کے کرنے پڑتے ہیں۔ آج اگر تمہیں انتخاب کا ایک موقع دیا جائے کہ ایک طرف تمہاری زندگی ہے جو بہت کم گزری ہے اور بہت سی باقی ہے۔ اور دوسری طرف وہ سب کچھ ہے جو آج تمہارے پاس ہے۔ تو تم کیا دینا پسند کرو گے...؟"

"غالباً زندگی۔" میں نے غور کرنے کے بعد کہا۔ "اس لیے کہ زندگی بے ثبات، غیر یقینی اور اختیار سے باہر ہے۔ اس کا لینا دینا بھی مشکل ہے۔ اگر وہ لمحہ جسے کاتبِ تقدیر نے نقطۂ اختتام رکھا ہے تمہارے تصرف میں ہے تو میں اپنے انتخاب سے جینے کا حق نہیں پاسکتا اور اگر وہ وقت ابھی دور ہے تو میرے دینے کے باوجود تم میری زندگی نہیں لے سکتے۔"

"تم فلسفی، جھکی اور احمق ہو۔" دلاور نے برہمی سے کہا۔ "مجھے سیدھا صاف جواب چاہیے۔ ورنہ..." اس نے عمداً بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ٹھوس ربر کی سخت گیند اندھیرے میں سے اچانک نمودار ہوئی اور میری طرف بڑھی۔ میں نے بے اختیار سر نیچے کرنا چاہا مگر گیند تیر کی طرح سنسناتی ہوئی میری کنپٹی [illegible] کر گزر گئی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دوبارہ روشنی میں آئی [illegible] زیادہ برق رفتاری سے میرے بالوں کو مس کرکے نکل گئی [illegible] شش۔ وہ گیند ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے جھلک دکھاتی اور غائب ہو جاتی تھی۔ ہر بار اس کی رفتار مجھے پہلے سے زیادہ لگتی تھی اور مجھے اتنی مہلت نہ ملتی تھی کہ میں الٹی قلابازی کھا کے صوفے کے پیچھے جا گروں۔ تاکہ کھلانے والے [illegible] لپیٹ میں لے لوں اور اس شخص سے نمٹ لوں جو [illegible] لیے کھڑا تھا اور مجھے ایمبیسڈر ہوٹل سے لانے کا ذمے دار [illegible] اس میں خطرہ یقیناً تھا اور اس کے ریوالور کی گولی میرا [illegible] کرسکتی تھی مگر نشانہ خطا ہو جانے کی صورت میں بچ جانے کے امکانات بھی تھے۔ اس کے برعکس میرے اوپر پیچھے [illegible] اس گیند کا میرے سر، منہ یا سینے پر لگ جانا یقینی تھا۔ [illegible] بار جو ضرب لگی تھی وہ شدید نہیں تھی ورنہ سر کی اندرونی [illegible] سے نکلنے والا خون میری کھوپڑی میں منجمد ہو جاتا تو میں بے ہوشی کے عالم میں دو چار گھنٹے دو چار دن یا ہفتے گزار کے [illegible] جاتا۔ سینے پر چوٹ لگتی تو صرف پسلیاں ہی نہیں اندر [illegible] تک سب ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ پیٹ پر پڑتی تو معدہ [illegible] آنتیں ناقابلِ استعمال ہو جاتے۔ چنانچہ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ گیند کی حرکت جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی [illegible] ہی ختم ہو گئی۔ میری آنکھیں بند رہیں مگر مجھے اس کا [illegible]

"تم چاہتے ہو کہ میں ہیروز یا اینڈ کمپنی پر حق وراثت [illegible] دعوے سے دستبردار ہو جاؤں؟" میں نے اطمینان کا سانس لینے کے بعد کہا۔ "یہ تم نے پہلی معقول بات کی [illegible] اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔" دلاور نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ روشنی ایک دم بہت کم ہو گئی جس سے میری آنکھوں کو بڑا سکون ملا لیکن اس کے باوجود میں روشنی کے پیچھے [illegible] کی صورت دیکھنے سے قاصر رہا۔

"اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر تم نے مجھے [illegible] ڈیپورٹ کرا کے یہاں بلوایا تھا؟" میں نے کہا اور [illegible] دکھتی ہوئی آنکھیں ملیں۔ "یہ بہت سے نتائج تم اپنی عقل سے اخذ کر سکتے ہو۔" دلاور نے کہا۔

"کیا میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ [illegible] مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میرے والد کو قتل کیا گیا؟" میں نے کہا۔

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہو جانے کا کہ [illegible] تمہارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟" وہ سکون سے بولا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اس تکلیف دہ روشنی کو گل کردو اور مجھے دہشت زدہ کیے بغیر مذاکرات جاری رکھو۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولا اور اس کے ساتھ ہی دونوں سرچ لائٹس آف ہو گئیں۔ کمرے میں صرف وال لائٹس کی نرم روشنی رہ گئی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں بند رکھیں۔ جب میں نے پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو مجھے یہ جان کے اطمینان ہوا کہ میری بصارت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا ہے۔ میں اب اپنے سامنے بالکل صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ کمرہ وہی تھا جیسا میں نے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا تھا مگر بیچ کے محرابی دروازے کی لڑیوں کے سامنے ایک اسکرین رکھ دیا گیا تھا۔ لکڑی کے فریم کا وہ اسٹینڈ جسے عموماً پارٹیشن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک لائٹ آخری دیوار پر بھی تھی چنانچہ دلاور کا سایہ اس سفید نائلون کے اسکرین پر صاف پڑ رہا تھا اور میں اس کے جسمانی خدوخال کو اور حرکات و سکنات کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اوسط قد و قامت کا مالک تھا۔ وہ بازوؤں والی کرسی پر سیدھا بیٹھا تھا لیکن اس کا سر پشت کے سائے سے زیادہ اوپر نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش لیا اور راکھ جھاڑی تو سفید اسکرین پر سیاہ سائے کی ایک ایک حرکت کا تاثر ڈرامائی طور پر نمایاں رہا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو، انگلیوں کو اور چہرے کو حرکت کرتے صاف دیکھا اور پھر دھوئیں کا مرغولہ سا اسکرین کے اوپر نمودار ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دلاور انتہائی عیار اور خطرناک حد تک ذہین شخص ہے جو ہپناٹزم یا مسمریزم کرنے والوں کے کلینک کی مخصوص نفسیاتی فضا پیدا کرنے کے حربے جانتا ہے اور زبان یا ہاتھ کی قوت سے کام لینے اور طاقت سے یا تشدد سے مطلب نکالنے کے بجائے اپنے حریف کو ذہنی طور پر مفلوج، کمزور اور بے بس بنا کے فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔

سرچ لائٹ کے پیچھے اس شخص کا کہیں پتا نہ تھا جو موت کا بگولا گھما رہا تھا لیکن مندری والا موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

"مسٹر دلاور۔" میں نے بالآخر کہا۔ "تمہارے خیال میں ایک آدمی کی زندگی کی قیمت کیا ہوتی ہے؟"

"یہ سوال احمقانہ ہے۔" دلاور نے کہا اور کرسی پر پہلو بدلا۔ "فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے فالج زدہ بھیک مانگنے والے لاوارث بوڑھے کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ تمہاری زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ میرے پیمانے سے میری اپنی زندگی تمہارے مقابلے میں زیادہ بیش قیمت ہے اور یقیناً ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کی زندگی مجھ سے کہیں زیادہ قیمت کی ہے۔"

"اچھا۔ میں براہِ راست ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ سودا تم میرے باپ سے نہیں کرسکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"کرسکتے تھے۔ اگر وہ رضامند ہو جاتا تو اپنے لیے تمہارے لیے اور ہمارے لیے بہت سے مسائل پیدا نہ کرتا۔" دلاور نے کہا۔ "مگر وہ ضد پر قائم رہا کہ سب کچھ دے سکتا ہوں مگر وہ کاروبار نہیں دے سکتا جس سے میرے بیٹے کا مستقبل وابستہ ہے۔"

"چنانچہ تم نے اسے قتل کرا دیا؟" میں نے اچانک کہا۔

"اس سوال کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔" وہ اسی سکون سے بولا۔ "اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

"میں بے معنی مفروضات پر کیا جواب دوں۔" میں نے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"اچھا تو بامعنی مفروضات پر بات کرو۔" وہ طنز سے بولا اور غالباً مسکرایا۔ "تم کیا کرو گے؟ فرض کرو انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہو۔"

"میں وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یعنی انکار۔ میں اپنے دعوے سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارا ابھی یہی خیال ہے کہ تمہارے مستقبل کا دارومدار اس کاروبار پر ہے؟" دلاور نے سگریٹ کا کش لیا اور چٹکی بجا کے راکھ جھاڑی۔

"میں تقدیر کو تدبیر سے وابستہ رکھنے کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اقرار کا مطلب ہوگا میرے والد کی روح کے لیے شکست کا وہ صدمہ جو انہوں نے زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا پابند ہوں خواہ یہ نقوش مجھے بھی اسی منزل تک لے جائیں۔"

"اس نے تو صرف اپنی زندگی گنوائی تھی۔" دلاور نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کیونکہ اس کے پاس گنوانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ تم زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مثلاً تمہارا ایک دوست ہے۔ محسن رضا۔ اگر تمہیں اس کے جنازے کو کندھا دینا پڑا؟"

میرے ذہن میں ایک تصویر بنی اور مٹ گئی۔ اس کے باوجود میں خاموش رہا۔

"اور بفرضِ محال تم نے جواں مردی سے یہ صدمہ بھی جھیل لیا۔" دلاور نے مناسب وقفہ دے کر کہا۔ "تو وہ لڑکی ہے جس سے تم واقعی محبت کرتے ہو۔ فوزیہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ ہم اسی اسٹیج پر اس کو تمہارے سامنے پیش کریں ۔ اور تمھیں وہ مناظر دیکھنے کو ملیں کہ تم ہزار بار مرنے کی آرزو میں کرو اور موت نہ آئے۔"

میرے دل کی دھڑکن رک گئی اور میری نظریں پھرا گئیں۔ اسی وقت دونوں سرچ لائٹس جل اٹھیں اور میں نے بے اختیار دونوں آنکھیں بند کرلیں مگر وہ مناظر جن کا ذکر دلاور نے کیا تھا میرے تصور میں زندہ رہے اور دہشت سے میرے جسم کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ فوزیہ کی جگر خراش چیخوں سے میری روح کے عذاب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے ضمیر سفاک درندوں کے ہاتھ میں تھی اور میں اتنا بے بس تھا کہ نہ اسے قتل کر سکتا تھا نہ اپنی جان دے سکتا تھا اور نہ ان شیطان صفت جلادوں کا کچھ بگاڑ سکتا تھا جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر فوزیہ پر ہر انسانیت سوز، ناقابلِ بیان حد تک شرمناک اور موت سے زیادہ عذاب دہ ظلم کر رہے تھے۔ وہ اسے جلا رہے تھے، نوچ رہے تھے، کاٹ رہے تھے اور اس کے حسن و شباب کے آئینے کو کرچی کرچی کر رہے تھے۔ خوب صورت، نازک اندام اور گل بدن فوزیہ ایک مکروہ بدہیئت اور مسخ شدہ لاش بن رہی تھی۔ زوم ۔ زوم ۔ زوم ۔ وہ گیند میری ناک کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی ۔ میں بے حسی کی برف کے نیچے دفن ہونے لگا تھا۔ عقل نے بروقت جذبات پر قبضہ حاصل کرلیا تھا۔ سوچو سکندر سوچو۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ بہادر دشمن کا مقابلہ ہو تو بہادری کام آتی ہے۔ دشمن مکر و فریب کے سب جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا ہو اور اخلاقیات کے اصولوں کو جنگ میں حماقت قرار دیتا ہو تو بہادری کے روایتی معیار سے ہٹ کے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیا تمہارے پاس عیاری کا اسلحہ نہیں ہے؟ تم کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہیں آتا؟ تم ذہانت سے اور سیاست سے کام نہیں لے سکتے؟ مصلحت کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے؟؟؟

لائٹس یک لخت گل ہو گئیں اور جب میں پھر دیکھنے کے قابل ہوا تو دلاور اسی طرح سایہ بن کے اسکرین پر موجود تھا۔

"دلاور" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "فیصلہ تم اسی وقت چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دے سکتے؟"

"نہیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن غور کرنے کے لیے قابلِ غور مواد بھی تو ہونا چاہیے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھانا ہے تو چند تجاویز اور حقائق کو سامنے رکھو۔ ایک یہ کہ میروز یر اینڈ کمپنی سے دستبرداری کی صورت میں تمہارے خلاف تمام مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ نمبر دو یہ کہ تمھیں پانچ لاکھ روپے نقد یا اس کے مساوی غیر ملکی کرنسی اور شہریت کے حقوق دلوا دیے جائیں گے۔ مسٹر ... واپس لندن جا کے تعلیم مکمل کرنا چاہو تو اس کا انتظام ... گا اور بعد میں تمہارے لیے وہیں ملازمت اور قیام کا ... رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"اگر میں اپنے قانونی دعوے سے دستبردار ہو گیا تو ... کاروبار تمہارے ہاتھ میں کیسے آئے گا؟" میں نے کہا۔

"ہم میر شرافت علی کا ایک وارث سامنے لے آئیں گے ... وہ ہمارا اپنا آدمی ہے۔" دلاور نے کہا۔

"تم جمع کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "... مطلب کیا ہے۔؟"

"ہم کا مطلب ہے ہم ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" اس نے کہا۔ "تیسری بات یہ کہ تم کاروبار سے الگ ہو جانے کے ... بھی کاروبار میں شریک رہ کے اس سے کہیں زیادہ کما سکتے ہو ... میروز یر اینڈ کمپنی کے مالک کی حیثیت سے کماؤ گے۔ تم لندن میں ہماری نمائندگی کر سکتے ہو اور سالانہ دس لاکھ ... منافع حاصل کر سکتے ہو۔ مگر یہ ہماری رضامندی کی بات ہے ... تم خاموشی سے الگ بھی رہ سکتے ہو۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ "میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے ... پانچ لاکھ ... دے کر الگ بھی کرنا چاہتے ہو اور مجھے دس لاکھ روپے ... منافع کمانے کی پیش کش بھی کر رہے ہو۔ جہاں تک میری ... کا تعلق ہے میرے والد کو ان کے حصے کا منافع ساڑھے ... لاکھ روپے ملتا تھا جو ایک چال باز دستاویزات پر ان کے ... لے کر ہضم کر گیا۔ اب یہ منافع بڑھ کے دس لاکھ فی کس ہو ... جائے گا اور تم دس لاکھ تو مجھے دینے کی بات کر رہے ہو ... منافع کم سے کم دگنا تو ضرور ہو گا۔ بیس لاکھ فی کس معلوم ... ہم سے تمہاری مراد کیا ہے مگر میں فرض کرلوں کہ تمہارا ... ایک ساتھی اور ہے تو اس کے بیس لاکھ ملا کر سالانہ منافع ... کم سے کم پچاس لاکھ ہو جاتا ہے۔ یہ کاروبار اتنا بڑا تو نہیں ..."

"تم نے ابھی تک صرف کتابیں پڑھی ہیں۔" وہ ...

"اور کتابی علم صرف راستہ دکھاتا ہے۔ منزل تک پہنچنے کے لیے راستے پر چلنا پڑتا ہے جو عملی تجربہ ہے اور اس کے بغیر ... بے مصرف ہے۔ یہ دنیا بھی ویسی نہیں ہے جیسی تمھیں نظر ... ہے۔ ایک دنیا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے اور یہ دنیا ویسی ... ہے جیسا دنیا کو ہونا چاہیے۔ دوسری دنیا کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا اور اس میں تم نے ابھی تک قدم نہیں رکھا۔ یہ وہ دنیا ہے جو عملاً تمہارے اردگرد موجود ہے۔ میروز یر اینڈ کمپنی کے نام کی بڑی اچھی ساکھ ہے۔ گڈول ۔ اس انجینئرنگ فرم کے تیار کردہ آلات کی مانگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میروز یر اینڈ کمپنی کے روابط دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل رہے ہیں لیکن انجینئرنگ کے آلات میں ہم کیا کما سکتے ہیں۔ ہمارے مقابل جاپان ہے۔ جرمنی اور فرانس ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ ان کی ساکھ ہم سے بہت بہتر ہے اور معیار کے علاوہ یہ مسائل سیاسی تعلقات کے ہیں۔ ہم دنیا کے بازار میں نیک نام ضرور ہیں مگر اپنا مال ان کی قیمت پر نہیں بیچ سکتے۔ خریدار کے سامنے ایک ہی قیمت ہو تو وہ جرمن یا انگلش سامان کو معیار کی بنیاد پر ترجیح دے گا۔ قیمت کا مسئلہ ہو گا تو ہمیں جاپان سے بھی پیچھے جانا پڑے گا ۔ یہ مقابلہ دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے لیکن فائدہ اٹھانے کے مواقع ان کے لیے کم نہیں جو فائدہ اٹھانا جانتے ہوں۔ اس کاروبار کے روابط سے اور اپنی ساکھ سے ہم دیگر بے شمار فوائد حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور کر رہے ہیں۔ میروز یر اینڈ کمپنی کا نام ایک جائز کاروبار کا پردہ ہے۔ اس کی آڑ میں زیادہ منافع بخش کاروبار چلتے ہیں۔"

"اسمگلنگ؟" میں نے چلا کر کہا۔ "تم اسمگلر ہو! ۔ میروز یر اینڈ کمپنی کے نام پر اسمگلنگ کرتے ہو؟ اور مجھے بھی اپنا پارٹنر بنانا چاہتے ہو۔ کیا اسمگل کرتے ہو تم؟ سونا؟ منشیات؟ اسلحہ؟؟"

وہ ہنسا۔ "تم واقعی بچے ہو۔ عمر کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ اس حقیقت کی زندہ مثال ۔ تمھیں ابھی معلوم ہی نہیں کہ اسمگلنگ کسے کہتے ہیں ۔ میں نے تو زیادہ منافع بخش کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ تمہارا ذہن اسمگلنگ کی طرف کیوں چلا گیا؟ کاروبار تو صرف کاروبار ہوتا ہے۔ اس میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا۔ یہ تفریق کا معیار ہر جگہ الگ ہے نیکی بدی یا حسن کے معیار کی طرح ۔ مثلاً ترکی میں افیون کی کاشت حکومت کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ بہت سے ممالک میں شراب کی کشید اور فروخت پر پابندی نہیں۔ مونٹی کارلو میں دنیا کے سب سے بڑے جوئے خانے ہیں جو حکومت کی اجازت اور سرپرستی میں چلتے ہیں اور اس چھوٹی سی ریاست کی بیشتر آمدنی جواریوں کی بدولت ہے ۔ بہت سے ممالک میں طوائفوں کو کاروبار کے لیے باقاعدہ لائسنس جاری کیے جاتے ہیں ۔ لیکن کیا ہمارے اور دنیا کے بیشتر ممالک کے نقطۂ نظر سے یہ کاروبار جائز ہیں۔ اخلاقاً، مذہباً اور قانوناً افیون کی پیداوار، شراب کی کشید، جوا اور عصمت فروشی ممنوع ہیں۔ یہی صورتِ حال عام کاروبار کی ہے ۔ ایک ملک کی تجارتی یا معاشی پالیسی میں کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر پابندی عائد ہو تو کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔ پالیسی بدل جائے تو جائز کہلانے لگتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ سب بکواس ہے ۔ اس نے اندازہ کرنا چاہا تھا کہ میں اس ناجائز کاروبار میں شرکت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو سکتا ہوں یا نہیں لیکن میں ایک دم بدک گیا۔ یہ میری غلطی تھی ۔ اگر میں عیاری سے کام لیتے ہوئے دل چسپی کا اظہار کرتا تو شاید وہ کاروبار کی اصل نوعیت بتانے پر بھی رضامند ہو جاتا مگر بُرا ہو میری تربیت کے مزاج کا۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند ۔ میری اخلاقیات میں دلاور کے اصولوں کے لیے صرف نفرت تھی چنانچہ میں نے جس ردِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ غیر ارادی تھا ۔ دلاور نے فوراً سمجھ لیا کہ میں اپنی سوچ کے اعتبار سے کبھی اس کا ہم خیال نہیں ہو سکتا۔ اس نے بدنما حقیقت کو خوب صورت لفظوں کے ہیر پھیر میں گم کر دیا اور اصل بات گول کر گیا جواب بھی وہی تھی یعنی میروز یر اینڈ کمپنی کے جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز

بچوں کے مشہور ادیب شکیل انجم کی مقبول ترین کتابیں

آئندہ ماہ کے ناول

کرنل پرویز سیریز نمبر ۱۹
بین الاقوامی سازشش پر مبنی سنسنی خیز ناول
پکارتی لاشیں
کیا لاشیں پکار سکتی ہیں۔ جی ہاں! لاشیں پکار رہی تھیں۔ اس عمارت میں زبردست دھماکہ ہوا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ سدّو بھائی کو ایک شخص نے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔ ایک خوبصورت لڑکی جو زہریلی ناگن تھی!!!

کرنل پرویز سیریز نمبر ۲۰
خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہولناک ناول
جہنم کی بلائیں
فیصل، زریں اور سدّو بھائی جہنم کی بلاؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس ویران حویلی میں ایک بہت بڑا اژدھا برآمد ہوا اور سدّو بھائی کو اپنی مٹھی میں دبا کر لے گیا۔ سدّو بھائی کا کیا حشر ہوا یہ بات تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے!!

قیمت فی کتاب/۶ روپے

قالوط سیریز نمبر
مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور
مسٹر چکرم
وہ عجیب شخص تھا جو سر کے بل کھڑا ہو کر کتے کی طرح بھونکتا تھا۔ قالوط بھی اس بھونک میں شریک ہو گیا۔ بشیر محمود، فرحانہ لوڈو سب ہی بھونکنے لگے۔ قہقہوں کا طوفان جو آپکے پیٹ میں بل ڈال دے ... آپ بھی ...

قالوط سیریز نمبر
قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول
تیسرا روپ
اس کے تین روپ تھے اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف اور سنسنی خیز۔ انسپکٹر خورشید مرزا اس ہولناک مجرم کی تلاش میں ۔ سنجیدہ اغوا ہو گئی۔ اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔
... قیمت نوٹ ...

کتابیات پبلی کیشنز ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ۔ کراچی ۱

کاروبار چل رہا تھا اور اس انکشاف کے بعد بہت سی باتیں اظہر من الشمس ہوگئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وزیر خان کی عملی طور پر کاروبار سے علیحدگی کا سبب کیا تھا۔ وہ کاروبار میں مختارِ کُل بن کے رہنا چاہتے تھے اور وزیر خان کی اخلاقی اقدار کو اپنے منافع کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ شاید انھیں ڈر تھا کہ وزیر خان کو حقیقت کا علم ہوا تو وہ ان کا دھندا چوپٹ کردے گا۔ اس کا وجود کروڑوں روپے سالانہ کی آمدنی کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ وزیر خان کے تسکوک ہی اس کی بے وجہ اور ناوقت موت کا سبب بنے ہوں۔ تاہم ایک بات اب بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دلاور نے یہی فراخ دلانہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی تھی۔

"دلاور!" میں نے کہا۔ "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ عملی زندگی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ یہ بتاؤ مجھے پانچ لاکھ دے کر الگ کردینے کے بجائے تم مجھے ایک پارٹنر کیوں نہیں بنا لیتے۔ تم مجھے دس لاکھ سالانہ لندن میں دے سکتے ہو تو یہاں کیوں نہیں دے سکتے؟"

"تمھیں آم کھانے سے غرض ہونا چاہیے۔ پیڑ کے گننے سے نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں تم سے ایک رعایت ہی تو مانگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ میں کاروبار سے مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوتا۔ تمھیں اپنے ساتھ شریک کرلیتا ہوں خود ایک تہائی یا ایک چوتھائی مالک رہ جاتا ہوں۔ تم بھی مالک ہو جاتے ہو اور میں بدستور ایک بے ضرر مالک بن کے تمھارا ساتھ دیتا رہتا ہوں۔ اس میں کیا قباحت ہے۔ خواہ میرا منافع دس لاکھ ہی رہے مگر ذہنی طور پر مجھے یہ احساس تو رہے گا کہ میں تمھارا ملازم یا کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ جو کچھ مجھے ملے گا میرا حق ہوگا اور یہ میرے لیے تھوڑے سے اطمینان کی بات ہوگی۔"

اسکرین پر سائے نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کاروبار سے عملی طور پر تمھارا کوئی تعلق ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں۔ ایک فیصد بھی نہیں۔"

"پھر مجھے واقعی سوچنا پڑے گا کہ دونوں تجاویز میں سے میرے لیے کون سی زیادہ قابلِ قبول ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یعنی میں دس لاکھ روپے سالانہ کے منافع پر تمھارے لیے کام کروں۔ یا پانچ لاکھ لے کر لندن واپس چلا جاؤں۔ اگر پانچ کی جگہ دس لاکھ ہوتے تو میں ابھی قبول کرلیتا۔"

"دس لاکھ!" اس نے کہا۔ "گویا تم دگنی رقم مانگ رہے ہو۔ خیر۔ اس پر غور کریں گے۔ میرا خیال تھا پانچ کی بجائے چھ یا سات تک تو ممکن ہے۔ شاید میں بھی اسی وقت فیصلہ کرلیتا۔ مگر دس لاکھ کے مسئلے پر مجھے مشورہ کرنا ہوگا۔"

"میرا خیال ہے ہمارے درمیان مذاکرات تسلی بخش طور پر آگے بڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آیندہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی؟"

"تمھیں سوچنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت کافی ہوگی۔" فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد ہم خود تمھیں بلالیں گے۔ جہاں مناسب سمجھیں گے۔"

"ایک دو باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ کاروبار سے باعزت طور پر علیحدہ ہونے کی یہ پیشکش میرے والد کو کیوں نہیں کی گئی تھی؟ اگر وہ پانچ لاکھ لے کر میرے پاس لندن آجاتے تو کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم میر شرافت علی سے ان کی کیا بات ہوئی تھی۔" دلاور نے کہا۔ "اور حقیقت یہ ہے کہ میرا ان سے کبھی براہِ راست تعلق ہی نہیں رہا۔ ممکن ہے اس پیشکش کو وہ مسترد کرچکے ہوں۔"

"اور خطرے کا باعث بن گئے ہوں۔؟" میں نے کہا۔ "چنانچہ میر شرافت علی نے انھیں قتل کرادیا تاکہ بات چھپی رہ سکے۔"

"میں نے کہا نا کہ میر شرافت علی اور وزیر خان کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔" وہ عیاری سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "اگر اس نے قتل کرایا ہوگا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم نے تو اس پر بلیک میلنگ کا الزام بھی عائد کیا ہے۔"

"دلاور۔ تم ایسے انجان بن رہے ہو جیسے میر شرافت علی کی اصلیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔" میں نے کہا۔ "جب تمھارے اور اس کے درمیان اتنا قریبی کاروباری تعلق تھا تو کیا یہ باتیں تم سے پوشیدہ تھیں؟"

"ہمارا میر وزیر اینڈ کمپنی کے اصل کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا اور چونکہ وزیر خان بھی غیر متعلق رہا اس لیے مجھے یہ سب واقعی معلوم نہیں۔" دلاور نے کہا۔ "میر شرافت علی زندہ ہوتا تو بتا سکتا تھا۔ وہ ہمارا ایک بزنس پارٹنر تھا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسے قتل کرنے والا میرے علاوہ کون ہوسکتا ہے؟" میں نے اچانک کہا۔

سائے نے پھر انکار میں گردن ہلائی۔ "میری معلومات اخبار کی حد تک ہیں۔ اور اخبارات سے پتا چلتا ہے کہ قتل تم نے کیا ہے۔"

"کیا کاروباری رقابت میں قتل ناممکن ہے؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خود تم نے قتل نہیں کیا؟"

"ثبوت تو کوئی نہیں۔" وہ سکون سے بولا۔ "نہ میرے پاس نہ تمھارے پاس لیکن یہاں تمھارے سامنے مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ نہ میں تم سے ڈرتا ہوں نہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے اعترافِ جرم کا کوئی گواہ پیدا ہوجائے گا۔ اس لیے میں یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میر شرافت علی کو نہ میں نے قتل کیا ہے نہ قتل کرایا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی شکایت یا پرخاش نہیں تھی۔ کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔"

"اگر وہ زندہ ہوتا تو خود مجھ سے بات کرتا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ میرا تو تم سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔" دلاور نے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے اس کے جھوٹ نے نہیں، اس کے اعتماد نے حیران کیا۔ جتنے اعتماد سے اس نے جھوٹ بولا تھا اتنے یقین کے ساتھ میں سچ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ میر شرافت علی کے لیے میری آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اگر وہ مجھے بلوانے والوں میں شامل ہوتا اور اسے مجھ سے یہی بات کرنا ہوتی جو دلاور نے کی تو وہ اس کے لیے تیار ملتا۔ اب میرے لیے یقین مشکل تھا کہ دلاور کی بات میں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا؟ اس نے سب جھوٹ بولا تھا۔ وہ یقیناً جانتا تھا کہ وزیر خان کیوں مارا گیا۔ اسے علم تھا کہ قاتل کون ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ میر شرافت علی کو قتل کس نے کیا۔ اور کیوں؟ مگر وہ بہت شاطر آدمی تھا اور اپنی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر اتنا ہی غور کرتا تھا جتنا شطرنج کا کھلاڑی کسی چال پر کرتا ہے۔ اس کا کھیل دفاعی نوعیت کا اور محتاط تھا۔ وہ کاروباری بات کے علاوہ کوئی بات کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ بتانے سے گریز کررہا تھا۔ وہ بہت خطرناک دشمن تھا۔

"گویا میر شرافت علی کا قتل تمھارے لیے بھی غیر متوقع تھا۔" میں نے کہا۔ "میں بھی تمھارے سامنے بے خوفی سے ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ میں نے شرافت علی کو قتل نہیں کیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔ تمھیں اس کے دوستوں کا اور دشمنوں کا علم ہوگا۔ کاروبار میں اس کی رقابت کس سے تھی۔ اس کا حریف کون تھا۔ کیا کبھی اس کے کاروبار سے کسی کے مفادات مجروح ہوئے تھے؟ کسی کے دل میں اس کے خلاف رنجش تھی؟"

"میرا خیال ہے میر شرافت علی کا قتل ذاتی دشمنی کا نتیجہ تھا اور اس کے اسباب نجی ہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "مجھے اس کے نجی معاملات کی زیادہ خبر نہیں تھی۔ کاروبار میں نہ اس کی کسی سے رنجش تھی اور نہ دشمنی۔ حریف تو سب ہی ہوتے ہیں اور دنیا میں کسی کاروبار پر ایک ہی فرد کی اجارہ داری نہیں ہے مگر وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے۔"

دلاور سے سچ اگلوانا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس کے منہ پر اسے جھوٹا کہنا۔

"تم نے ابھی کہا تھا کہ میں نے تمھاری تجاویز سے اتفاق کیا تو مجھے ایک فائدہ ہوگا کہ میرے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے جب کہ تم نہ اصل قاتل سے واقف ہو نہ قتل کے اسباب سے۔"

"میں تمھیں پھر مشورہ دوں گا کہ آم کھانے سے غرض رکھو، پیڑ مت گنو۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ میں اپنے قول و فعل کی وضاحت بھی کروں۔ ہر بات کا جواز بھی فراہم کروں اور تمھیں مطمئن کرنا لازمی سمجھوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس گفتگو کا حوالہ کہیں نہیں دو گے تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ تم دیکھ چکے ہو کہ میری رسائی ہر جگہ ہے۔ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمھیں لندن سے کھینچ لائے۔ تم مجھ سے بچ کے کہیں نہیں جاسکتے اور کرۂ ارض پر تمھیں چودھری دلاور کے عتاب سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ایک مہینہ بہت ہوتا ہے تم آج کی بات کے ہر لفظ پر اچھی طرح غور کرسکتے ہو۔ اور مجھے امید ہے تمھارا حافظہ اچھا ہے۔ اس لیے تم کوئی لفظ بھولو گے نہیں۔" وہ ایک دم پلٹا۔ پھر پیچھے والی روشنی گُل ہوگئی اور اسکرین پر سے اس کا سایہ بھی مٹ گیا۔ وہ اندھیرے ہی میں کہیں گم ہوگیا اور میرے سامنے وہ منڈی والا کھڑا رہ گیا۔ جیسے پیچھے الہ دین کے چراغ کا جن تھا اور وہ شخص جو مجھے انجکشن لگا کے لایا تھا۔

"کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "سنا نہیں چودھری صاحب کا حکم۔؟ ہمیں اسی تزک و احتشام کے ساتھ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے۔" پھر میں نے اطمینان سے سگریٹ نکالی اور جلانے کے بعد دیا سلائی کو پھونک مار کر بجھانے ہی ٹائیگر کے پیٹ میں لگا دیا۔ وہ بلبلایا اور اپنے عظیم الشان پیٹ کو یوں ملنے لگا جیسے اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی املاک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "ابھی یہ غبارہ پھٹ جاتا۔" "خیر۔ پھر کبھی سہی" مندری والے نے آگے بڑھ کے میرے لبوں سے سگریٹ نکال لی اور فرش پر ڈال کے مسل دی۔ "بڑے بد اخلاق لوگ ہو تم۔ نہ چائے کو پوچھا اب سگریٹ بھی چھین لی۔"

"چلو۔" اس نے مجھے گالی کے ساتھ ایک دھکا دیا۔ "یہ نہ ہو میں تمھاری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش کر دوں۔"

"چودھری دلاور کے کتے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "تو صرف بھونک سکتا ہے۔ مجھے کاٹ نہیں سکتا۔ ٹائیگر تو تیرا نام ہونا چاہیے۔ یہ دوسرا تو گینڈا ہے اور وہ کمپاؤنڈر صاحب! اس کی شکل بن مانس سے ملتی ہے۔" مندری والے نے پیچھے سے میرے ایک زبردست لات رسید کی۔

"افسوس یہ ہے۔" میں نے رک کر اور گھوم کر کہا۔ "کہ میں لڑنے بھڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں ورنہ چودھری دلاور کو ریفری بناتا اور تم تینوں کتوں کو ایک ساتھ لڑنے کی دعوت دیتا۔ ویسے تم میرے ہاتھوں پٹنا چاہو تو تمھاری مرضی۔ کہاں پٹو گے؟ یہاں یا باہر؟"

مندری والے نے تیسری بار حملہ کیا تو میں بالکل تیار تھا۔ پلک جھپکنے میں وہ قالین پر چت پڑا تھا۔ "چلو اٹھ جاؤ۔ شاباش۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میرے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ جب تک میں ان کی جان کے لیے خطرہ نہ بنتا۔ وہ میری جان نہیں لے سکتے تھے۔

خلافِ توقع واپسی پر میرا سفر لباسِ قدرت میں نہیں ہوا۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی لیکن میرے ہاتھ باندھے گئے اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا گیا۔ میں نے قطعی مزاحمت نہیں کی۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور میں اس کی پچھلی سیٹ پر بن مانس ٹائپ کمپاؤنڈر اور مندری والے کے ساتھ تشریف رکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں غور سے کوٹھی کے محلِ وقوع کو دیکھا اور فوری طور پر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ مجھے جانتے بوجھتے چودھری دلاور کی کوٹھی کا راستہ دیکھنے کا موقع کیوں فراہم کر رہے ہیں۔ وہ مجھے بے لباس نہ سہی آنکھوں پر پٹی باندھ کے تو لا سکتے تھے۔ جواب فوراً میری سمجھ میں آگیا۔ یہ کوٹھی چودھری دلاور کی ہرگز نہیں تھی۔ شاید ان میں سے کسی کی بھی نہیں تھی۔ انھوں نے کسی بھی خالی کوٹھی پر قبضہ کر لیا تھا جس کے مکین کراچی یا مری یا بیرونِ ملک کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ اگر کوئی چوکیدار ہوگا تو صبح بندھا پڑا ملے گا لیکن میں کسی کو ساتھ لے کر آیا تو وہ مجرم کہیں نہ ہوں گے۔ میں خود مجرم بن جاؤں گا۔ ہاتھوں پیروں کا باندھنا ضروری تھا تاکہ میں راہ میں ان کے لیے مسئلہ نہ بنوں اور میرا منہ بند رکھنا بھی ضروری تھا کہ میں شور نہ مچا سکوں مگر میری آنکھیں بند رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کے لیے مجھے ہوٹل سے نکال کے لانا مشکل تھا۔ یہاں سے واپس ہوٹل بھیجنا مشکل کام نہ تھا۔ ٹیکسی جن راستے سے بھی گزری وہ میرے ذہن میں رہا مگر اب ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ ملتان روڈ کی اس کوٹھی سے مجھے لوٹ کر نہیں آنا تھا۔ ٹیکسی شملہ پہاڑی کی طرف سے گزری تو ریڈیو پاکستان کی عمارت سے ذرا آگے ایک ویران جگہ رک گئی۔ مندری والا باہر نکلا اور اس نے مجھے باہر گھسیٹ کر سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی ہوا ہو گئی۔ میں نے سر اٹھا کے اس کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ٹیکسی کی لائٹس آف تھیں۔ مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور سڑک بالکل سنسان تھی لیکن مجھے امید تھی کہ چند منٹ میں کوئی نہ کوئی ادھر سے ضرور گزرے گا۔ میں نے خود کو گھسیٹ کر فٹ پاتھ پر لانے کے بجائے سڑک پر ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایک موڑ پر تھا اور اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی گاڑی مجھ پر سے گزر جائے۔

تقریباً دس منٹ بعد ریڈیو پاکستان کی پرانی عمارت کی جانب سے ایک کار نمودار ہوئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سیدھی مجھ پر پڑی اور جب کار سیدھی آ کے میرے قریب پہنچی اور آہستہ ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کار سے اترنے والا نوجوان کچھ دیر مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ کار میں ایک لڑکی یا نوجوان عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ "گاڑی کیوں روک لی۔ خواہ مخواہ کوئی مشکل نہ گلے پڑ جائے۔" وہ سہم کر بولی۔

"تم بیٹھو ڈارلنگ۔" نوجوان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ "میں دیکھتا ہوں یہ کیا گڑبڑ ہے۔" پھر اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے میرے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھولنے سے پہلے میرے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ میں نے ایک طویل گہری سانس لی۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "میں کسی فرشتۂ غیب کے نمودار ہونے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔" عورت نے پھر شوہر سے کہا۔ "خاتون سے کہہ دیجیے پریشانی کی کوئی بات نہیں بس میرے ہاتھ کھول دیجیے اور جائیے پھر اس بات کو بھول جائیے۔" اجلو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو میں یاد رکھوں گا۔"

نوجوان کچھ نروس سا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میرے ہاتھوں کو آزاد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی بیوی یا محبوبہ آدھی رات کے وقت اس سنسنی خیز منظر سے خاصی پریشان اور دہشت زدہ تھی اور اسے بار بار مجبور کر رہی تھی کہ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلو، معلوم نہیں یہ کیا چکر ہے۔ میری بات سن کے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ جلد از جلد جائے واردات سے فرار ہوجائے۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور اس حرکت کے ذمّے دار کون لوگ ہیں۔ بظاہر میں نہ زخمی تھا اور نہ بیمار کہ وہ مجھ سے مزید ہمدردی کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے رکتا۔ میں نے اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور وہ کار میں بیٹھ کے رخصت ہوگیا۔ میں نے عمداً رسمی تکلفات سے گریز کیا، نہ اس کا نام پوچھا اور نہ اسے اپنا نام بتایا۔ پیروں کو آزاد کرتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب ترین ٹیلی فون، ریڈیو پاکستان میں تھا مگر وہاں داخلہ مشکل تھا۔ میں نے رسّی کو باہر ایک جھاڑی کے پیچھے پھینکا اور دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار سے کہا کہ مجھے ایک انتہائی ضروری فون کرنا ہے۔ اس نے پہلے تو پس و پیش کیا کہ یہ سرکاری ٹیلی فون ہے اور عام لوگوں کے لیے نہیں ہے مگر میں نے کہا کہ بھیّا ایک موت کی خبر دینا ہے۔ آخر تم بھی تو مسلمان ہو۔ تمھیں بھی تو مرنا ہے ہم سب کی طرح۔ تو اس نے میرے ساتھ جا کے قریب کے ایک آفس کا دروازہ کھول دیا لیکن خود میرے سر پر سوار رہا۔ میں نے ایمبیڈر ہوٹل کا نمبر ملایا اور محسن کے کمرے کی لائن مانگی۔ مجھے امید تھی کہ وہ جاگ رہا ہوگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"محسن" میں نے کہا۔ "میں تمھارا ماما بول رہا ہوں، سکندر بخت۔"

"سکندر بخت" محسن نے چلا کر کہا اور جواب میں دو ناقابلِ تحریر گالیاں دیں جو چوکیدار نے نہیں سنیں۔ "کہاں مر گیا تھا تو۔؟"

"بیٹا میں یہاں ریڈیو پاکستان سے بول رہا ہوں۔" میں نے غم زدہ لہجے میں اداس صورت بنا کے کہا۔

"ریڈیو پاکستان!" محسن نے کہا۔ "اے بھائی یہ رات دو بجے کون سی محفل چل رہی ہے، دن میں کوئی موقع نہیں دیتا کہ رات کو گانے بیٹھ گیا ہے بے وقت کا راگ؟ معلوم ہے میں کتنا پریشان ہوں۔ رابعہ کتنی پریشان ہے۔ اور"

"ہاں بیٹا۔ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اللہ بھلا کرے یہ ریڈیو پاکستان کے سنتری صاحب ہیں۔ انھوں نے اجازت دے دی کہ تم سے فون پر بات کروں۔ اپنے وہ سہاگ شاہ کے چچا تھے نا میر شرافت علی۔ وہ فوت ہوگئے ہیں۔"

"سکندر۔ تو ہوش میں ہے نا۔؟" محسن کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "یہ کسی نے کچھ کھلا پلا دیا ہے؟ یا مارا ہے؟"

"نہیں سکندر۔ میر شرافت علی صاحب کا وقت پورا ہوگیا تھا۔" میں نے کہا "بس بیٹھے بیٹھے چھینک آئی، پٹ سے زمین پر گرے اور ختم۔ اب تو ایسا کر کہ گھر آجا۔ ہاں ہاں ریڈیو پاکستان سے ذرا آگے ڈین صاحب کی کوٹھی سے تیرا مکان۔ ہاں۔ میں وہیں ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا۔ سکندر سمجھ گیا تھا کہ میرا مقصد اسے بلانا ہے اور کوئی بات ایسی ہے جو میں ٹیلی فون پر نہیں کر سکتا۔ چوکیدار نے میرے شکریے کے جواب میں زور سے "انا للہ" پڑھا اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ کچھ حیران ضرور تھا کہ وہ بھانجا کتنا بڑا ہے جسے میں نے بڑے بوڑھوں کی طرح بیٹا کہہ کے فون کیا تھا۔ میں خود بڑا بوڑھا کہاں لگتا تھا۔ باہر آ کے میں نے وہ رسّی پھر اٹھا لی۔

سکندر آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا جب میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ذرا دیر پہلے گشت کرنے والے دو سپاہی گزرے تھے۔ اگر وہ مجھے بے مقصد کھڑا دیکھ لیتے تو دفعتاً ایک سو نو میں چالان کر کے حوالات پہنچا دیتے۔ محسن پیدل آیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اپنے اغوا کی، چودھری دلاور سے مذاکرات کی اور واپسی کی روداد کم سے کم الفاظ میں سنا دی۔ وہ غور سے سنتا رہا اور خاموشی سے میرے ساتھ اسٹیشن کی جانب رواں رہا۔ اسٹیشن کے ایک معمولی سے ہوٹل میں بیٹھ کے ہم نے وہ چائے پی جو عام حالات میں ہمارا معدہ کبھی قبول نہ کرتا لیکن اس وقت یہی گرم چائے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ محسن میرے اغوا کے بعد پہنچا تھا اور اسے حیران پریشان کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ چابیاں تو ابھی کچھ دیر پہلے آپ لے گئے تھے۔ محسن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بعد میں سکندر صاحب نے کہا تھا کہ کھانے کا اور کافی کا بل کمرے میں بھجوا دیا جائے لیکن ویٹر بل لے کر گیا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا چنانچہ وہ لوٹ آیا۔ پھر کلرک خود محسن کے ساتھ گیا اور جب محسن کو اطمینان ہوگیا کہ اس کی کوئی چیز غائب نہیں ہے تو اس نے کلرک کی درخواست قبول کر لی کہ اس بات کا ذکر مینیجر سے نہیں کیا جائے گا۔ اس کا عذر قابلِ قبول تھا کہ ہم سب مسافروں کو صورت سے کہاں پہچان سکتے ہیں اور پھر رش سے میں کوئی بھی آدمی اطمینان سے کسی کا نام لے کر چابی مانگے، چابی موجود ہو اور نام نمبر بھی درست ہوں تو یہ شبہہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چابی مانگنے والا غلط آدمی ہے۔ اس کے علاوہ چابیاں بھی کمرے میں موجود تھیں جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ کسی نے عمداً شرارت کی یا کرنا چاہتا تھا مگر کسی وجہ سے ناکام لوٹ گیا۔ بخیر گزشت والی بات تھی۔ محسن نے کہا کہ جاؤ معاف کیا لیکن بعد میں کمرے کے اندر کوئی ٹائم بم پھٹے تو تم بھی مغفرت کی دعا کرنا۔ حواس باختہ کلرک شکریہ ادا کر کے لوٹ گیا تھا۔ محسن کو قطعی اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ مجھے اس کمرے سے ہائی جیک کیا گیا ہے۔

"سوچنے کی بات یہ ہے محسن کہ وہ مجھے قالین میں لپیٹ کر کیسے لے گئے؟" میں نے کہا "وہ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرے ہوں گے۔ کسی نے ان کو دیکھا بھی ہوگا۔ پھر ان کو روکا کیوں نہیں گیا۔ اس کا جواب صرف ایک ہوسکتا ہے۔ وہ قالین اُن کا اپنا تھا اور وہ پہلے سے ہوٹل کے کسی کمرے میں موجود میرا انتظار کر رہے تھے۔ اب میں ثابت کیسے کر سکتا ہوں کہ قالین کے اندر میں بھی تھا۔ اور ثابت کرنے کا فائدہ بھی کیا لیکن مجھے دوسری بات معلوم کرنا ہے۔ آخر کافی میں بے ہوشی کی دوا کس نے ملائی تھی اور کس کی مدد سے ملائی تھی۔ اس میں مجھے کسی ویٹر یا کسی باورچی خانے کے کارکن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے پیسے کے لالچ میں یہ حرکت کی۔ یا اس حرکت سے چشم پوشی کی۔"

"ہوٹل والے کبھی نہیں مانیں گے۔" محسن نے کہا "ان کی نیک نامی متاثر ہوتی ہے۔"

"لیکن میں معلوم کر کے رہوں گا۔ اسی لیے میں نے تجھے بلایا ہے ورنہ آزادی کے بعد تو میں خود بھی ہوٹل پہنچ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ ابھی ڈیوٹی پر وہی لوگ ہوں گے جو رات کے وقت تھے۔ ویٹر، کلرک، مینیجر سب کی شفٹ صبح چھ بجے سے پہلے ختم نہیں ہوسکتی۔ اب تو ایک کام کر۔ ہم اکٹھے چلتے ہیں۔ تو مجھے کسی گمنام گوشے میں باندھ کے ڈال دینا اور اپنے کمرے میں جا کے سو جانا۔ اگر نیند نہ آئے تب بھی لائٹ آف رکھنا۔ میں اپنی رسٹ واچ اور پرس وغیرہ سب تیرے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ کیا ڈراما ہے برادر نسبتی؟" محسن رضا نے سگریٹ نکال کے مجھے پیش کی۔

"سالارِ اعظم۔ ذرا صبر و تحمل سے کام لیجیے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟" میں نے سگریٹ لے کر کہا۔ "جو ہوگا آپ کے سامنے آجائے گا۔"

"برادرِ نسبتی۔ میں ایسے کسی ڈرامے میں کوئی پارٹ نہیں لے سکتا جس کے پلاٹ کا مجھے علم نہ ہو۔ اور انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو" محسن نے کہا۔ "اگر وہ کوئی طبعی حماقت ہوئی جسے آپ اپنی ذہانت سمجھ رہے ہیں تو کیا ہوگا۔ ابھی تو میں صحیح مشورہ دے سکتا ہوں۔ بعد میں رونا عبث ہوگا۔ میں نے بتا دیا کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ پلاٹ سے مطمئن ہو کے محسن نے ہاتھ ملا کے مسرت سے کہا۔ "ونڈرفل" اور میرے ایک دھپ رسید کیا۔ پھر ہم دونوں نے کچھ اور سیر کی یعنی ایمبیڈر ہوٹل تک مارچ کیا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے اور یہی وقت تھا جب ہمیں رابعہ نے نہر کے پل پر سے پک اپ کیا تھا۔ محسن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم اسی طرح علی الصبح سیر کرتے رہے تو خدا ہمیں صحت، عقل اور دولت سب عطا کرے گا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ انگریزی محاورے کے مطابق عقل مند، دولت مند اور صحت مند بننے کے لیے صبح دم جاگنا ہی نہیں، سرِ شام سو جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ایمبیڈر ہوٹل میں داخلے کے لیے ہم نے شریفانہ راستہ اختیار نہیں کیا۔ دروازے پر سلیوٹ کرنے والا دربان موجود تھا جو ہمیں اتنی صبح غلط سمت سے آنے اور غلط سمت میں جانے دیکھتا تو شکوک میں مبتلا ہو جاتا۔ ہم نے ایک دیوار پھاندی اور باغیچے میں گرے جہاں اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا۔ تھوڑا سا سرچ کرنے کے بعد میں نے "جائے واردات" تلاش کی اور برضا و رغبت لیٹ کر محسن کو موقعہ فراہم کیا کہ وہ مجھے باندھ دے اور میرے منہ میں میرا ہی رومال بھی ٹھونس دے۔ محسن نے دو منٹ میں یہ کارروائی مکمل کی اور غائب ہوگیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اسے کاؤنٹر کلرک کو فون کرنا تھا کہ سکندر نام کے جو مہمان اس کی عدم موجودگی میں آئے تھے اور اپنا بل بھجوانے کے لیے کہہ گئے تھے کیا وہ جاتے وقت کوئی پیغام دے گئے تھے۔ اور کلرک کا جواب سن کے اسے حیرانی، پریشانی اور تشویش کا اظہار کرنا تھا اور سو جانا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ مجھے امید تھی کہ چھ بجے تک صبح کا اجالا نمودار ہوجائے گا اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی مجھے ضرور دیکھ لے گا۔ لان پر لیٹنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے خصوصاً پھولوں کے درمیان صبح کی شبنمی فضا میں جو مہک ہوتی ہے اس کا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مقابلہ کوئی فرنچ پرفیوم اور لیوڈی کلون نہیں کر سکتے مگر اس حالت میں لیٹنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ جسے قطعی خوش گوار نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے خود ہی محسن سے کہا تھا کہ رعایت نہ برتنے ورنہ ڈراما حقیقی نہیں رہے گا چنانچہ اس نے میری مشکیں ویسی ہی کسی تھیں جیسے فرمانِ شاہی پر معتوب حضرات کی کسی جاتی ہوں گی۔ اتنا سخت تو مجھے چودھری دلاور کے چمچوں نے بھی نہیں باندھا تھا لیکن اب مجھے یہ ایک گھنٹہ اسی کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں گزارنا تھا۔ اس رات کا تجربہ بھی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھا سوائے ان کے جو میری زبان پر اعتبار کرتے تھے کوئی یہ نہ مانتا کہ میں نے یہ رات کہاں اور کیسے گزاری۔ نہ کوئی اس بات کا گواہ تھا کہ مجھے اغوا کر کے کیسے لے جایا گیا تھا اور نہ اس بات کا شاہد تھا کہ چودھری دلاور سے میری کیا بات ہوئی تھی اور کس ماحول میں ہوئی تھی۔ میں پھر اسی ہوٹل کے کمرے میں پہنچ جاتا تو یہ بھی ثابت نہ ہوتا کہ میں کمرے سے گیا تھا۔ میں پولیس کو رپورٹ کرتا تو پولیس میری رہنمائی میں ملتان روڈ کی اس کوٹھی تک جاتی لیکن وہاں کون ملتا جو میری کہانی کو سچ مانتا۔ اگر مجھے اس ٹرک کا نمبر یاد ہوتا جس میں قالین لے جایا گیا تھا اور پولیس اسے ڈھونڈ نکالتی تو وہ ڈرائیور اور کلینر کب تسلیم کرتے کہ قالین میں کوئی آدمی بھی تھا۔ وہاں لیٹے لیٹے میں نے یہ بھی سوچا کہ مندری والے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے ایک رات پہلے کے واقعات کے بارے میں کوئی بات کیوں نہیں کی۔ شاید ابھی خود اسے بھی معلوم نہ ہو کہ اس کے ساتھ آنے والے دو چمچے نہر میں ڈوب مرے ہیں۔ فومانچو یعنی منشی کے اور سلامت شاہ کے حشر کا حوالہ اسے دھمکی کے طور پر ضرور دیا تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ سلامت شاہ کی لاش دریافت ہو چکی ہے اور یہ خبر بھی پھیل گئی ہے یا مندری والے کو علم ہے کہ میں لاش دیکھ چکا ہوں۔؟ مگر اسے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ شاید وہ بھی یہی دیکھنے گیا ہو کہ لاش موجود ہے یا غائب ہو گئی؟ اور اس نے میرا سامان غائب پایا ہو تو سمجھ گیا ہو کہ میں آیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ کوارٹر میں داخل ہونے والا لاش دریافت نہ کرے۔"

میں خیالات کی رو میں بہتا جا رہا تھا کہ کوئی چیز دھڑام سے مجھ پر گری، اگر میں بندھا ہوا نہ ہوتا تو اچھل پڑتا اور میرا منہ بند نہ ہوتا تو میرے حلق سے کوئی صدائے احتجاج بھی بلند ہوتی۔ اسی طرح جیسے مجھ سے ٹکرا کے سجدہ ریز ہو جانے والے نے بلند کی تھی۔ وہ ہوٹل کا ہی کوئی ملازم تھا جو ہاتھ پر چائے کی ٹرے اٹھائے نہ جانے کس کو بیڈ ٹی پہنچانے کے لیے شارٹ کٹ سے کہیں جا رہا تھا۔ ٹھوکر لگتے ہی ٹرے اس کے ہاتھ سے اڑ گئی اور برتن ایک چھناکے سے بکھر گئے۔ چمچے کپ اور پرچ زمین پر پھیل گئے۔ ایک کپ میرے سر پر لگا۔ چائے دانی مجھ سے چند فٹ دور اوندھی ہو گئی اور میرے نتھنوں میں مہکتی چائے کی دل نواز خوشبو آئی۔

"یا میرے مولا" گرنے والے نے سنبھل کے کہا اور مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے زور سے "ہو" کی۔ اگر رات کا اندھیرا ہوتا تو یہ "ہو" ایک چیخ بن جاتی۔ وہ سمجھا کہ اس کی راہ میں کوئی لاش حائل ہو گئی ہے لیکن میں دیدے کھولے اسے پٹر پٹر دیکھ رہا تھا۔

"او... او بھائی صاحب... آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" وہ ہکلا کے بولا۔ پھر اسے اپنے احمقانہ سوال کا احساس ہوا "میرا مطلب ہے کہ جناب... یہاں کیوں پڑے ہیں کس نے باندھ کے ڈالا ہے آپ کو؟..." بدحواسی کے باعث سوال اس کے لبوں تک آ گئے تھے اور اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ میں جواب دے ہی نہیں سکتا۔ بقولِ شاعر۔ واں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں - یاں ایک خامشی مری سب کے جواب میں۔ اس کا ہاتھ رسیوں کی طرف بڑھا پھر میرے منہ کی طرف۔ کپڑا نکلتے ہی میں نے تیسری بار سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بہت مناسب گواہ فراہم کیا۔

"یس... تھینک یو" میں نے کہا "کون ہو تم...؟ ابھی رسیاں مت کھولو"

"جی... ؟ میں ویٹر ہوں سر۔ عبدل" اس نے میرے تحکمانہ لہجے سے مرعوب ہو کے کہا۔

"اچھا عبدل۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "جاؤ اپنے مینیجر صاحب کو خاموشی سے بلا لاؤ۔ فوراً۔ کسی اور نے دیکھا تو ہوٹل کی بدنامی ہو گی۔ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ اور کاؤنٹر کلرک سے کہو مسٹر محسن رضا کو بھی لے آئے۔"

"یس... یس سر..." حواس گم کردہ عبدل نے دوڑ لگائی اور چند منٹ میں مینیجر کے ساتھ آ پہنچا۔ یہ وہی مینیجر تھا جس سے میں نے گزشتہ رات کافی دیر سے آنے کی شکایت کی تھی۔

"آپ؟... یہ کیا معاملہ ہے سر؟..." مینیجر نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا "دیکھو عبدل کوئی

آ تو نہیں رہا ہے۔ آخر آپ بندھے رہنے پہ کیوں مصر ہیں سر؟"

"میں یہ چاہتا تھا کہ پہلے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو" میں نے برہمی سے کہا "اب تم میری رسیاں کھول سکتے ہو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تمہیں کیا، میں پولیس کو بتاؤں گا۔ وہ خود معلوم کر لیں گے۔"

"اوگاڈ" مینیجر نے مزید پریشان ہو کے کہا "عبدل۔ عبدل ایڈیٹ۔ صاحب کی رسیاں کھولو"

ابھی وہ دونوں رسیاں کھول ہی رہے تھے کہ محسن اور کاؤنٹر کلرک آ پہنچے۔ مسٹر سکندر بخت۔ محسن نے چلّا کے کہا "یہ کیا؟"

"پلیز۔ پلیز... ذرا آہستہ..." مینیجر نے کہا "مہمان جاگ چکے ہیں۔ کوئی آ جائے گا... اوگاڈ" اس نے آخری گانٹھ محسن کے ساتھ مل کر کھولی "آئیے... آئیے میرے آفس میں" وہاں بتائیے مجھے کہ بات کیا ہے۔ اس کے بعد پولیس کی ضرورت محسوس ہوگی تو میں خود طلب کروں گا۔ مگر پہلے مجھے..."

"یہ پولیس کیس ہے" محسن رضا نے چراغ پا ہو کے کہا۔ "مسٹر سکندر بخت رات کو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ یہ کلرک جانتا ہے۔ انھوں نے کھانا بھی کھایا تھا۔ اور کہا تھا کہ بل میرے کمرے میں بھجوا دیا جائے" اس آخری بات پر کلرک کا رنگ فق ہو گیا۔

"یس سر۔ یس سر... مجھے سب معلوم ہے... لیکن اندر چل کے۔ پلیز... یہ گڈ ول کا معاملہ ہے۔ ہوٹل کی بدنامی ہوتی ہے اگر کوئی اسکینڈل بنے۔ میں آپ کو پوری طرح مطمئن کروں گا... جیسے آپ چاہیں گے" مینیجر نے کہا۔ "میں آپ سے پوری طرح تعاون کروں گا۔ آپ مجھ سے تعاون کیجیے۔ یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔ آئی ایم ویری سوری... ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا..."

دو منٹ بعد ہم مینیجر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں شیشے کا بہت زیادہ استعمال ہوا تھا۔ چنانچہ اندر آواز باہر سنائی نہ دیتی تھی۔ عبدل کو کافی اور سینڈوچ لانے کا حکم دے کر اس نے کلرک سے کہا کہ وہ کاؤنٹر سنبھالے اور ہم سے مخاطب ہوا "یس سر۔ اب بتائیے۔ آپ کے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی؟"

"مینیجر" میں نے کہا "شاید تمہیں یاد ہو گا کہ میں تمہارے پاس ایک شکایت لے کر آیا تھا"

"یس۔ کافی آنے میں کچھ تاخیر کا مسئلہ تھا" اس نے کہا "مگر کافی آ گئی تھی"

"یس۔ کافی آ گئی تھی۔ اس کافی کا ذائقہ بہت عجیب تھا" میں نے کہا "بالکل جوشاندے کی طرح۔ جوشاندہ پیا ہے کبھی؟"

"یس... یس سر... مگر ہم تو بہترین کافی استعمال کرتے ہیں۔ میکسویل ہاؤس"

"ہاں۔ آپ لوگوں کی کافی ہمیشہ بہت اچھی ہوتی ہے کل اس کے بدذائقہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دی گئی تھی" میں نے اطمینان سے کہا۔

مینیجر اچھل پڑا "بے ہوشی کی دوا۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن"

"ہاں" میں نے میز پہ ہاتھ مارا "مجھے کافی میں بے ہوشی کی دوا دی گئی تھی۔ تم چیلنج کرتے ہو تو میں ابھی پولیس کو رپورٹ ـــــ کرتا ہوں۔ وہ مجھے میو ہسپتال بھیج دیں گے۔ وہاں میرے معدے میں موجود غذا کا کیمیائی تجزیہ ہو گا تو یہ ثابت ہو جائے گا..."

"نو۔ نو سر" مینیجر نے بوکھلا کے کہا "میں قطعی چیلنج نہیں کر رہا ہوں میرا مطلب تھا یہ کیسے ممکن ہے۔ خیر! میں ابھی پوچھتا ہوں... آپ آگے بتائیے... اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد مجھے کاؤنٹر کلرک نے بتایا کہ مسٹر محسن رضا آ گئے ہیں۔ اس نے خود مسٹر محسن رضا کو چابیاں دی ہیں چنانچہ میں اوپر گیا اور کمرے میں جا کے بے ہوش ہو گیا" میں نے کہا "میرا مطلب ہے مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی"

"میں رات کو گیارہ بجے آیا تھا تو کاؤنٹر کلرک نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی۔ وہ میرے ساتھ کمرے تک گیا بھی تھا مگر میرا نقصان کوئی نہیں ہوا تھا اور چابیاں بھی موجود تھیں اس لیے میں نے شکایت نہیں کی" محسن نے کہا "وہ بے چارا معمولی کلرک ہے"

"مگر یہ اصولاً غلط ہے" مینیجر نے ایک بٹن دبایا اور کاؤنٹر کلرک کو انٹر کام پر بات کر کے طلب کیا۔ "دیکھیے نا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اچھا ہوا۔ لیکن فرض کیجیے وہ چابیوں کے پرنٹ لے گئے۔ یا فرض کیجیے وہ ٹائم بم لگا جاتے۔ آپ کو رپورٹ کرنا چاہیے تھی"

"فرض کرنے کی بات چھوڑو" میں نے کہا "جو ہوا ہے اس کی بات کرو۔ کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ وہ مجھے ایک قالین میں لپیٹ کر باہر لے گئے۔ میں نہیں جانتا وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کون لوگ تھے مگر کاؤنٹر کلرک نے ان کو یقیناً دیکھا ہوگا۔ ایک قالین جس میں سالم آدمی لپٹا ہوا ہو معمولی سا پارسل نہیں ہوتا کہ کوئی جیب میں ڈال کے گزر جائے۔"

مینیجر نے پھر انٹر کام کا بٹن دبایا۔ "یو باسٹرڈ۔ میں تمھیں برطرف نہیں کروں گا، گولی مار دوں گا۔ ابھی تک آئے نہیں تم؟"

"باہر ایک ٹرک تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "قالین ٹرک میں رکھا گیا اور ٹرک مجھے لے گیا۔ معلوم نہیں کہاں۔ اس وقت تک مجھے کچھ کچھ ہوش تھا۔ دوبارہ ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ میں ہوٹل کے باغیچے میں لیٹا ہوں۔ میری جیب میں دس ہزار روپے تھے جو اب نہیں ہیں۔ علاوہ رسٹ واچ کے اور کچھ رقم کے جو پرس میں تھی۔ تقریباً بچاس ساٹھ روپے۔ مجھے شک ہے کہ اس ڈکیتی میں وہ ویٹر شامل ہے جس نے مجھے چوبیس نمبر ٹیبل پر سرو کیا تھا۔"

"کیا؟" مینیجر ایک دم اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے آخری جملے کا اثر بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں ہوا تھا۔ "چوبیس یس... مجھے یاد ہے آپ نے چوبیس نمبر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ او گاڈ۔ یہ سب کیا ہے... وہ... وہ تو غائب ہے۔ بالکل غائب ہے۔"

کاؤنٹر کلرک مجرموں کی طرح اندر داخل ہوا اور سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت عبدل کافی اور سینڈوچ لے کر اندر آیا۔ "غائب ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا مطلب؟" "عبدل۔ چوبیس نمبر ٹیبل پر رات کون تھا؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس واقعے کے فوراً بعد غائب ہوگیا۔ بغیر بتائے کہیں چلا گیا۔" مینیجر نے سر تھام کے کہا۔ "تم جاؤ۔" اس نے عبدل کو اشارہ کیا۔ پھر وہ کلرک پر برس پڑا۔ "گدھے۔ نالائق آدمی کو دیکھے بغیر چابی تھما دی۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔ کون تھے وہ۔ ہوٹل میں ڈکیتی۔ مائی گڈنس۔ کسی بھی مہمان کے کمرے میں جو چاہے گا گھس جائے گا؟؟"

"میرا خیال ہے اس کا قصور نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت رش تھا۔ میں کل ہی آیا ہوں۔ یہ مجھے پہچانتا نہیں۔" کاؤنٹر کلرک نے شکر گزار ہو کے محسن رضا کو دیکھا۔ "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا سر۔ اور آئندہ بھی نہیں ہوگا۔"

"یہ بتاؤ تمھارے سامنے سے کوئی قالین لے کر گزرا تھا لپٹا ہوا قالین۔۔؟" مینیجر نے کہا۔

"کاؤنٹر کلرک بولا۔ "ایک صاحب صبح آئے تھے۔ دوپہر کو شاپنگ کے لیے گئے تو کارپٹ خرید کے لائے تھے۔ اوپر کمرہ نمبر تین سو دس میں پہنچایا تھا۔ وہ رات کو کمرہ خالی کر گئے۔ جاتے وقت قالین بھی لے گئے تھے۔ چار لوگوں نے اٹھا رکھا تھا۔ دو کسی ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے۔ چہرہ میں نے نہیں دیکھا۔ قالین کے دوسری طرف تھا۔"

میری کہانی، واقعات کی شہادت اور گواہوں کے بیان سے درست ثابت ہو رہی تھی۔ "اچھا تم جاؤ۔" مینیجر نے کاؤنٹر کلرک سے کہا۔ "اس بار صاحب کے کہنے پر معاف کیا۔ اور ذرا چوکیدار کو بلاؤ۔ اور دیکھو وہ شریف کہاں ہے۔ رات کو چوبیس نمبر ٹیبل پر تھا۔ اس کا کچھ پتا چلا کہ نہیں۔ اس کے گھر بھیجو۔"

بعد میں چوکیدار نے بھی تصدیق کردی کہ ایک ٹرک میں خاصا بڑا لپٹا ہوا قالین لے جایا گیا تھا لیکن اس نے ٹرک کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ویٹر جس کا نام شریف تھا۔ بدستور غائب تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ جب وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر گیا تھا تو کسی نے اس کو جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے یوں غائب ہو جانے سے سروس میں خلل پڑا تھا تو مینیجر برہم ہوا تھا اور اس نے سب سے پوچھا تھا لیکن کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ شریف کا کوئی مہمان آیا تھا نہ پیغام۔ اور آتا بھی تو وہ اتنا غیر ذمے دار بہرحال نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر لعنت بھیج کے چل دیتا۔

میں نے مینیجر کو مشورہ دیا کہ باہر کے بجائے شریف ویٹر کو بھی تلاش کیا جائے اور اگر کمرہ نمبر تین سو دس خالی ہے تو اس کے باتھ روم میں بھی جھانک لیا جائے۔

مینیجر نے تشویش سے میری تجویز پر غور کیا۔ ایک بار پھر کاؤنٹر کلرک کو طلب کیا اور اسے مکمل رازداری کے ساتھ کمرہ نمبر تین سو دس کا جائزہ لینے کا اور پھر خاموشی سے رپورٹ دینے کا حکم دیا۔ "مجھے بھی اب دال میں کالا نظر آنے لگا ہے۔ وہ جو آپ کو لے گئے تھے۔ انھوں نے ویٹر شریف کی وردی پہن لی۔ پھر کافی میں دوا ملائی۔ اپنے قالین میں آپ کو لپیٹا اور۔ مگر سوال یہ ہے سر کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے کافی کے ساتھ سینڈوچ آگے بڑھائے۔

"کیا اب بھی شک کی گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔"

"لوٹنے کا یہ طریقہ بہت عجیب... اور ذرا مشکل ہے۔ خدانخواستہ آپ کے کوئی دشمن تو نہیں تھے؟" وہ بولا۔

"دشمن ہوتے تو مجھے زندہ چھوڑتے؟" میں نے کہا۔ "میں نہ کسی قبیلے کا سردار ہوں۔ نہ سیاسی د... نہ بدمعاش... میرا دشمن کون ہوگا۔ یہ صرف ڈکیتی کی منظم واردات تھی۔ انھوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کیا۔ شاید ان کا طریقہ واردات ہی یہ ہوگا۔ یہ کیس بہت سنگین ہے اور پولیس کو نہیں اسپیشل پولیس کو اس کی تحقیقات کرنا چاہیے۔ آدمی خطا کا پتلا ہے۔ کون جانے ویٹر شریف یا کوئی اور ان سے مل گیا ہو۔ لالچ بڑی بلا ہے۔ عموماً گھر کے بھیدی لنکا ڈھاتے ہیں۔"

مینیجر نے بڑے اصرار سے نفی میں سر ہلایا۔ "ویٹر شریف واقعی شریف ہے۔ پرانا آدمی ہے۔ اور ہم آدمی دیکھ کر رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے عملے کا کوئی رکن یہ جرأت نہیں کر سکتا۔"

"پولیس خود معلوم کر لے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "بعض اوقات اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھیے۔ یہی میں عرض کر رہا ہوں۔" مینیجر نے جلدی سے کہا۔ "پولیس اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی۔ آپ کے لیے اور میرے لیے مزید پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ بدمعاش تو گئے۔ پولیس انھیں کہاں تلاش کر سکے گی۔ آپ تو جانتے ہیں، پولیس والے کتنے بدنام ہیں۔ خود مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ بفرضِ محال، پولیس نے انھیں پکڑ لیا تب بھی مال کہاں برآمد ہوگا۔ اور ہوا تو آپ کو کہاں ملے گا۔ نو سر۔ میں ذاتی طور پر اس کے حق میں نہیں کہ پولیس کو رپورٹ کی جائے۔ وہ تو شریف ویٹر کو ہی نہیں کاؤنٹر کلرک کو بھی پکڑ کے لے جائیں گے۔ بے چارا معمولی کلرک ہے۔ اور پولیس تو آدمی اٹھاتی ہے۔ وہ مجھے بھی لے جائیں گے۔ باورچی خانے والوں کو بھی اٹھا لیں گے جتنے آدمی پکڑے جائیں گے اتنا ہی ان کا فائدہ ہے۔ ہوگا کچھ نہیں، وہ سب کو حسبِ حیثیت جوتے مار کے اور پیسے لے کر چھوڑ دیں گے اور کیس داخلِ دفتر کر دیں گے مگر اس پکڑ دھکڑ میں ہوٹل کی کتنی بدنامی ہوگی۔ اور مالک کو علم ہوگا تو عتاب مجھ پر نازل ہوگا۔ آپ اگر اتفاق کریں تو... تو میری ایک تجویز ہے۔ باہمی مفاد کی بات ہے۔ میں آپ کا سب نقصان پورا کر دیتا ہوں۔ کتنی رقم تھی، دس ہزار۔ رسٹ واچ اور پرس کی رقم ملا کے مزید ایک ہزار، کل گیارہ ہزار۔ اگر میں چیک پیش کر دوں تو؟"

"اور جو پریشانی مجھے اٹھانا پڑی۔ لاقانونیت، غنڈہ گردی اور بدنظمی کے باعث۔" میں نے میز پر ہاتھ مارا۔

"وہ... وہ میں... میں اس پر معافی کا خواستگار اور بے حد شرمندہ ہوں۔ بس بات یہیں ختم کیجیے۔" مینیجر نے کہا۔ "آپ کے قیام و طعام کے تمام اخراجات ہمارے ذمے۔ جب تک آپ کا دل چاہے رہیے۔ میں آپ کو دوسرا بہتر کمرہ دے دیتا ہوں۔ پورا سوئٹ۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔" میں نے گویا اس کی مجبوری کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ جیسے لوگ بدنامی کے خوف سے پولیس کیس نہیں بننے دیتے۔ اور وہ بدمعاش اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب کسی اور ہوٹل میں چلے گئے ہوں گے۔ پاکستان میں ایک ہزار ہوٹل تو ہوں گے۔ سب میں واردات کریں گے۔ خبر ایک بھی نہیں آئے گی۔ سب کہیں گے آج تک ایسا نہیں ہوا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر... لیکن ہماری مجبوری بھی دیکھیے۔ سارا کاروبار متاثر ہوتا ہے۔ اور پھر یہ اخبارات والے جو صرف سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں۔ خیر، میں چیک پیش کرتا ہوں۔" اس نے کھٹ سے دراز کھول کے چیک بک نکالی اور گیارہ ہزار کی رقم کا بیرر چیک بنا کے مجھے پیش کیا جسے میں نے محسن کی طرف دیکھ کر بادلِ ناخواستہ اور قدرے تامل کے ساتھ قبول کیا۔ مینیجر ہمارا بہت احسان مند بھی ہوا مگر میں جانتا تھا کہ اتنی بڑی واردات پر اپنی سمجھ بوجھ کے باعث پردہ ڈال دینے کا انعام وہ مالک سے وصول کرے گا اور مالک اس کی معاملہ فہمی اور تدبر کا مزید قائل ہو جائے گا کہ گیارہ ہزار میں ہوٹل کی ساکھ بچالی۔ میں نے چیک جیب میں رکھا ہی تھا کہ کاؤنٹر کلرک یوں کمرے میں آیا جیسے اس کے تعاقب میں بھوت ہو۔ بمشکل تمام اس نے بتایا کہ ویٹر شریف واقعی کمرہ نمبر تین سو دس کے باتھ روم میں سو رہا ہے یا بے ہوش پڑا ہے یا وفات پا چکا ہے۔ وردی اوپر لٹک رہی ہے۔ خود نیچے لیٹا ہے۔

ویٹر شریف صرف بے ہوش تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ کمرہ نمبر تین سو دس میں رہنے والوں نے اسے طلب کیا تھا۔ معلوم نہیں انھیں نام کس نے بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ چوبیس نمبر ٹیبل پر سروس کر رہا ہے تو اسے کہا گیا کہ بل کی رقم کمرے سے ملے گی۔ وہ لوگ کھانا کھا کے اٹھے ہی تھے چنانچہ شریف دو منٹ بعد ان کے کمرے میں جا پہنچا۔ انھوں نے سو کا نوٹ دیا اور پھر کہا کہ کافی لاؤ۔ اس نے شریف سے کہا کہ چوبیس نمبر ٹیبل پر جو صاحب کھانا کھا رہے ہیں ان کو کافی پہنچاتے ہی وہ روم سروس سے کافی کے لیے کہہ دے گا اور بل کی باقی رقم بھی بھجوا دے گا۔ اتنا سنتے ہی ان میں سے ایک نے شریف کو دبوچ کے بے قابو کر دیا اور فرش

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر لٹا دیا۔ دوسرا اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ پہلے نے شریف کا منہ دبا رکھا تھا کہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ دوسرے نے جیب سے انجکشن سرنج نکال کے شریف کا بایاں بازو دبا لیا اور اس کی نس میں کوئی انجکشن لگا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور ہوش آیا تو باتھ روم میں تھا۔ اس کی وردی اوپر ٹنگی ہوئی تھی اور کمال یہ کہ اس میں وہ سو کا نوٹ بھی تھا۔ ویٹر شریف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ یہ غیر شریفانہ سلوک کیوں کیا گیا اور منیجر یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ باورچی خانے میں یا ہال میں کسی نے ویٹر کی صورت پر غور کیوں نہیں کیا۔ میں نے اسے سمجھانے کے لیے شریف سے ایک سوال کیا اور شریف نے تسلیم کیا کہ ان میں سے ایک اپنے قد و قامت اور رنگ کے اعتبار سے شریف جیسا تھا۔ اس کی مونچھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ یہ بات منیجر اپنے تجربے کے باعث جانتا تھا کہ رش کے اوقات میں کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ سب کے ہاتھ پر ٹرے اس طرح رکھی ہوتی ہے کہ پورا چہرہ نظر بھی نہیں آتا اور بالکل ایک جیسی وردی میں اسی قد و قامت اور رنگ کا آدمی آجائے تو غور سے صورت دیکھے بغیر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ رات کے کھانے کے دوران جب ہال بھرا ہوا تھا، لوگ آ جا رہے تھے اور ویٹر مصروف تھے، کمرہ نمبر تین سو دس والے میرے قریب ہی بیٹھے رہے چنانچہ انھیں بھی شریف ویٹر نے ہی سرو کیا۔ میں اپنے خیالات میں اتنا منہمک تھا کہ میں نے کسی پر توجہ نہیں دی۔ میرا مطلب ہے سوائے ان چہرں کے جو توجہ کے مستحق تھے۔ کافی دیر میں آنے کا سبب ہی یہ تھا کہ ویٹر تبدیل ہوا۔ پھر اس جعلی ویٹر نے کافی میں دوا ملائی اور میری عدم موجودگی میں کافی میز پر رکھ کے چلا گیا۔ وہ اسی انتظار میں رہا کہ میں تاخیر کی شکایت کرنے اٹھوں تو وہ ٹرے رکھ جائے۔ اس نے دس منٹ کے لیے شریف کی وردی استعمال کی۔ پھر واپس اپنے کمرے میں جا کے لباس بدلا اور شریف کی وردی وہیں باتھ روم میں رہ گئی۔ انھوں نے شریف کو بھی باتھ روم میں پہنچایا اور میرے کمرے میں جا پہنچے۔

مجھے بے ہوش کرنے کے بعد وہ یقیناً اپنے کمرے میں اٹھا کے لے گئے ہوں گے جہاں انھوں نے دن میں ایک قالین لا کے رکھ دیا تھا۔ اپنے کمرے سے سامان اور قالین اٹھا کے وہ کمرہ خالی کر گئے اور جس نے چارج لیا اس نے کمرے پر ایک نگاہ ڈال کے کمرہ مقفل کر دیا۔ جب کاؤنٹر کلرک نے مجھے بتایا کہ کمرہ چودھری دلاور کے نام سے بک کرایا گیا تھا تو مجھے فوراً ایک خیال آیا لیکن میں نے بات کو زبان تک آنے سے پہلے روک لیا۔ جب اس تمام بک بک جھک جھک سے فارغ ہو کے ہم کمرے میں پہنچے تو صبح کے پورے آٹھ بج رہے تھے۔ منیجر نے اپنے طور پر تمام معاملات طے کر لیے تھے اور بہت مطمئن تھا۔ فرداً فرداً اس نے عملے کو، شریف کو اور کاؤنٹر کلرک کو بھی سمجھا دیا کہ انھوں نے کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ بات وہ خود بھی سمجھتا تھا، چنانچہ منیجر کے لیے تشویش کی کوئی بات نہ رہی تھی۔

"واہ برادر نسبتی" محسن نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی ایک زبردست قہقہہ اور دھپ مار کے کہا "اب تو عیش سے ہو عمر بھر۔"

"سالارِ اعظم" میں نے کہا "عقل مندوں نے کہا ہے، لالچ بڑی بلا ہے۔ سامان اٹھائیے اور خیریت سے نکل جائیے۔"

"کیوں؟" محسن نے حیرانی سے کہا "ہم نے کوئی دھوکے بازی نہیں کی۔ اس ہوٹل میں تجھے جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اس کا معاوضہ گیارہ ہزار کچھ نہیں۔"

"یہ بات نہیں" میں نے کہا "تجھے کچھ اندازہ ہے کہ شریف کی وردی پہننے والا کون ہو سکتا ہے؟ وہی مہندی والا۔"

"تم نے تو دیکھا ہی نہیں، تجھے کیسے معلوم ہوا؟" محسن نے کہا۔

"آخر وہ میرے سامنے آنے سے کیوں گریز کر رہا تھا" میں نے کہا "اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اسے شناخت نہ کر لوں اور یہ ڈر صرف ایک ہی شخص کو ہو سکتا تھا جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ انجکشن لگانے والا تو میرے لیے اجنبی تھا البتہ مہندی والا اپنے دل کے چور سے ڈر رہا تھا۔ اس کی مہندی، ویٹر کی پگڑی کے نیچے آگئی ہوگی۔ ورنہ وہ فوراً نمایاں ہو جاتا مگر اس کے باوجود وہ انتظار کرتا رہا کہ میری آنکھوں تو کافی رکھی جائے۔ وہی میرے کمرے میں پردے کے پیچھے چھپا ہوا کھڑا رہا ہوگا اور اس نے ہی مجھے دھکا دے کر باتھ روم میں کیا ہوگا۔"

"تیری بات سمجھ میں آتی ہے" محسن نے کہا "لیکن اب فرار ہونے کا مقصد!"

"میں بہت گمنام آدمی نہیں ہوں محسن" میں نے کہا "میرا نام اور میری تصویر اخبارات کی زینت بن چکے ہیں۔ آج اگر سلامت شاہ کے بارے میں خبر آئی تو عین ممکن ہے کوئی رپورٹر اس کا رشتہ ڈھونڈ ڈھ نکالے اور پھر تصویر چھاپ دے کہ میر شرافت علی کے مبینہ قاتل کو پناہ دینے والا قتل کر دیا گیا یا اس مقدمے کے سب سے اہم گواہ کو قتل کر دیا گیا۔ غنیمت ہے کہ اب تک کسی نے مجھے نہیں پہنچانا مگر مزید خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی ٹرمپ کارڈ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم واک آؤٹ کر جاتے ہیں کہ جس ہوٹل میں شرفا محفوظ نہیں، وہاں ہم مفت نہیں رہ سکتے۔ نو بجے چیک آؤٹ کرا دو اور چلو کسی دوسرے ٹھکانے پر۔ ہمارے جانے کے بعد سب ہمیں بھول جائیں گے مگر یہاں رہتے ہوئے پولیس آگئی تفتیش کے لیے تو سب کھیل بگڑ جائے گا۔ حشمت خان اینڈ کمپنی کا کوئی اعتبار نہیں۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم تیار ہو کے کاؤنٹر پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں صبح کی شفٹ میں آنے والا کلرک بیٹھا تھا۔ صبح کی شفٹ کا منیجر بھی اپنے کمرے میں موجود تھا اور انھیں ساری بات بتائی گئی تھی یا نہیں مگر اتنا ضرور بتا دیا گیا تھا کہ ہم انتظامیہ کے مہمان ہیں چنانچہ ہم ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔ ٹیکسی نے نو بجے ہمیں بینک کے دروازے پر اتارا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور محسن دس منٹ بعد کیش لے کر نمودار ہوا تو ہم نے ٹیکسی کو پوسٹ آفس کی طرف لے چلنے کا حکم دیا۔ فاصلے بہت کم تھے چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ انتظار اور ہمارا تحکمانہ لہجہ بہت گراں گزر رہا تھا مگر وہ اسی لہجے کے باعث دبا ہوا تھا۔ پوسٹ آفس پہنچ کے ہم نے اسے دس کا نوٹ دیا تو اس کی شکایت رفع ہو گئی اور اس نے ہمیں سلام بھی کیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ہم گزشتہ روز آئے تھے۔ میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ بابو پوسٹ مین پھر نہ نکل گیا ہو مگر وہ موجود تھا۔ ایک پوسٹ مین نے اِدھر اُدھر دیکھ کے ایک دبلے پتلے نوجوانی میں بوڑھا نظر آنے والے پوسٹ مین کی طرف اشارہ کیا جو سارے زمانے سے بیزار اسٹول پر اکیلا بیٹھا تھا اور کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

"ارے بابو بھائی" میں نے قریب جا کے کہا "ہم کل بھی آئے تھے۔"

بابو نے سر گھما کے ہمیں دیکھا اور محسن کو پہچان لیا۔

"ہاں ہاں۔ کل بھی ملے تھے تم۔ اسی چٹھی کے لیے آئے ہو گے۔"

"بابو بھائی یہ کیا ہوا؟" میں نے اس کی سوجی ہوئی ناک اور آنکھ کے نیچے نظر آنے والے نیل کی طرف اشارہ کیا "مستری سائیکل والے سے جھگڑا ہو گیا کیا؟"

"اچھا" وہ چونکا "اس نے تمھیں بھی بتا دیا؟" پھر اس نے خاصی بامحاورہ گالی دی۔

"وہ بڑا کمینہ ہے بابو بھائی" میں نے کہا "کہتا تھا بابو اخبار پڑھنے کے بہانے پانے، پلاس اور پیچ کس وغیرہ مارتا ہے۔ ہم نے کہا جانے دو استاد۔ بابو شریف آدمی ہے اگر اسے معلوم ہوا تو تمھیں چھوڑے گا نہیں۔"

بابو نے مستریِ سائیکل والے کو مزید بے نقط سنائیں اور دعوے کیا کہ وہ اس کا ملبہ کرا لیا ہے۔ ہم نے اس دعوے کی صداقت کو چیلنج نہیں کیا اور کہا کہ زمانہ شرافت کا نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم بابو کو چائے پلانے کے لیے کینٹین لے گئے اور مجبوراً اس کے ساتھ غلیظ ٹیبل پر بیٹھ کے وہ بد ذائقہ محلول زہر مار کیا جسے سب لوگ چائے سمجھ کر نوشِ جان کر رہے تھے۔ اس مرحلے کے بعد بابو بھائی سے ہمارے مراسم اتنے اچھے ہو گئے کہ ہم نے صرف دس روپے دے کر وہ خط حاصل کر لیا اور ابھی ہم دھڑکتے دل کو سنبھالے لفافہ بریف کیس میں رکھ کے فرار ہونے ہی والے تھے کہ بابو بھائی نے ایک انکشاف کیا "ابھی کوئی اور بھی آیا تھا اسی خط کے لیے۔ مگر میں نے کہا چلو چلو۔ ہم ایسے ڈاک نہیں دیتے پھرتے۔ گھر پر مل جائے گی رجسٹری۔"

ہمارے قدم رک گئے۔ میں نے محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "اس نے اپنا نام بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا "پوچھ رہا تھا، گلاب خان معرفت محبت خان جو رجسٹری ہے وہ کس کے پاس ہے مجھے شریف آدمی نہیں لگا۔ ڈاکے والی کا کام ہے نا جی۔"

"اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" میں نے کہا "دراصل ایک دوست ہے جو یہ حرکت کر سکتا ہے۔ غلط قسم کا آدمی ہے۔"

بابو بھائی نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ میرا خون خشک

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے

مفرور ۔ ۱۰ حصے مکمل
طالوت ۔ ۳ حصے مکمل
صدیوں کا بیٹا ۔ ۵ حصے مکمل

کتابی شکل میں تیار ہیں

آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

کر دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ حلیہ اس مندری والے ٹیکسی ڈرائیور کا تھا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اکیلا یا اپنے ساتھیوں سمیت باہر ہمارے انتظار میں ہوگا۔ خط لینے میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں آتا دیکھ چکا ہوگا اور وہ ہر قیمت پر یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ وقت بہت کم تھا اور ہم مشورہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ محسن بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ اب ہم اس راستے سے نہیں جا سکتے جس راستے سے آئے تھے۔ ہمارے لیے اندر انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دس منٹ بعد میں نے بابو بھائی سے کہا کہ وہ ہماری وجہ سے کام کا حرج نہ کریں۔ ہم تو ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھ کے انتظار کریں گے اسی بدمعاش دوست کا۔

بابو بھائی نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"محسن" میں نے موقع پاتے ہی کہا "اس کینٹین سے نکلنے کا دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ تو بریف کیس لے کر پیچھے سے نکل جا۔"

"اور اگر وہ ادھر بھی موجود ہوئے تو؟" محسن نے کہا۔

"تو کہیں پناہ لے لینا۔ کسی بھی دکان میں، دفتر میں گھس جانا۔ رکشا ٹیکسی جو نظر آئے پکڑ لینا" میں نے کہا۔ "تجھے جان بچا کے بھاگنا ہے۔ جو مناسب ہو کرنا۔ تو خود بھی عقل مند ہے۔"

"اور تو۔ تو کیا کرے گا" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں واپس ڈاک خانے میں جاتا ہوں" میں نے کہا "انھیں یہ تاثر دینے کے لیے کہ ابھی خط ہمیں نہیں ملا۔ ہم یہاں خط کی بات کر رہے تھے۔ اگر یہ چال کامیاب رہی تو میں بھی کسی اور طرف سے نکل آؤں گا۔ اس وقت ہم مقابلے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں تو خود کو اور خط کو بحفاظت نکال کے لے جانا ہے اور رابعہ کے گھر پہنچنا ہے۔"

مگر ایسے نہیں کہ کوئی تعاقب میں ہمارے ساتھ پہنچے۔ خدا حافظ میں کینٹین سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر پھر ڈاک خانے کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے مندری والا نظر آ گیا۔ وہ بابو بھائی سے بات کر رہا تھا اور غالباً اس نے کوئی دھمکی دے دی تھی کہ بابو بھائی برہم تھے۔ مستری سائیکل والے نے یقیناً ان کی ڈیوٹی لگا دی ہوگی۔ چنانچہ مندری والا پہلی بار ناکام لوٹا تھا مگر ہم نے چالاکی سے کام لے کر پہلے بابو بھائی کا موڈ ٹھیک کیا تھا اور پھر خط لے لیا تھا۔ میں فوراً الٹے قدم واپس ہوا۔ مندری والے کے گرد دو سکر لوپسٹ مین جمع ہونے لگے تھے اور ہنگامہ بڑھ جاتا تو مندری والا ممنوع علاقے میں داخل ہونے پر پھنس جاتا۔ اس نے بھی کھسکنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے آنے والے زینے پر دیکھ لیا۔ میں بے تحاشا بھاگا۔ مندری والا میرے پیچھے دوڑا۔ تاہم اب میرے لیے فکر کی بات نہیں رہی تھی۔ مجھے یہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ محسن خط سمیت بخیر و عافیت نکل گیا۔ میں خالی ہاتھ بھی تھا اور تھوڑا سا آگے بھی تھا۔ دیر میں مندری والا زینے چڑھ کر اوپر آیا میں بہت سے لوگوں سے ٹکراتا۔ ایک شخص کو چت کرتا اور ہنگامے کو نظر انداز کرتا باہر آ چکا تھا۔ سڑک عبور کرتے ہی مجھے ایک بس اپنے سامنے سے گزرتی دکھائی دی۔ میں بس کے پیچھے دوڑا اور ڈنڈا پکڑ کے چلتی بس میں سوار ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے اس طرح جان پر کھیل کے بس پکڑنے پر شرمندہ کیا لیکن کوئی اصل بات کو نہیں سمجھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو مجھے مندری والا سڑک پر کھڑا نظر آیا۔ وہ رکشا ٹیکسی کی تلاش میں تھا یا دیکھ رہا تھا کہ میں کدھر غائب ہو گیا ہوں۔

"شاہ نور اسٹوڈیو" میں نے کنڈکٹر کو پانچ کا نوٹ تھما کے کہا۔ مجھے معلوم تھا بس آر اے بازار جا رہی ہے۔

"لو جی کر لو بات۔ کدھر ہے شاہ نور اسٹوڈیو۔ نہ دیکھے ہیں نہ پوچھتے ہیں اور چڑھ جاتے ہیں" کنڈکٹر نے جھلا کر کہا "اگلے اسٹاپ پر اتر کے دوسری طرف مڑ جانا" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ میں نے نخوت سے ان سب کو دیکھا جو مجھے احمق سمجھ رہے تھے اور اگلے اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہیں ایک اخبار فروش اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔ میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی لے لی۔ پھر میں ایک تانگے میں بیٹھ گیا اور مزے سے اخبار پڑھنے لگا۔ مغلپورہ نہر سے دو لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔ پولیس کا بیان ہے کہ دونوں جرائم پیشہ تھے۔ ایک اخبار نے ان کو ہسٹری شیٹر بھی لکھا تھا۔ سلامت شاہ کی لاش ملنے کی خبر شاید اخبار چھپنے تک کسی کو نہیں ملی تھی اور فوما یعنی غنی کی لاش بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوئی تھی۔ رابعہ کے گھر کے سامنے میں نے تانگہ روک لیا۔ اندر محسن میرا منتظر تھا اور رابعہ کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔ مجھے اس کی صورت پر وحشت کے آثار دکھائی دیے۔

"یار سکندر بخت" وہ آہستہ سے بولا "اس لفافے میں تو سادہ کاغذ ہیں۔ کورے فل اسکیپ سائز کے کاغذ۔"

"سادے کاغذ؟" میں نے بے یقینی کے ساتھ کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

رابعہ کی ماں کچھ فاصلے پر حیران کھڑی ہم دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی محسن نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی، اور میری طرف یوں لپکا تھا جیسے میری صورت اسے برسوں بعد نظر آئی ہے یا میں کوئی بدتمیز بھک منگا ہوں جو صدا لگانے کے بجائے سیدھا اندر آ گیا ہو۔ محسن کا یہ ردِ عمل فطری تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی سکون سے نہ کھڑا رہتا۔ اس کے ذہن کو پہلا صدمہ تو لفافے سے برآمد ہونے والے سادہ کاغذ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ پھر وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں دشمنوں کو دھوکا دے کر یا ان سے مقابلہ کر کے نکل آنے میں کامیاب ہوتا ہوں کہ نہیں۔

"یہ تم دونوں نے کیا کانفرنس شروع کر دی ہے" رابعہ کی ماں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے" میں نے آہستہ سے کہا اور ہم لوٹ کر رابعہ کی ماں کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمیں اندر لے گئیں۔

"اس وقت رابعہ تو ہوتی نہیں" وہ بولی "پھر تم کیسے آ گئے؟"

"بس ایسے ہی" میں نے کہا "ادھر سے گزر رہے تھے، سوچا آپ سے ہی مل لیں۔"

"جھوٹ" وہ بولی "مجھ بڑھیا سے کون ملنے آتا ہے۔"

"رابعہ نے بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے" محسن نے یقین دلانے کے لیے کہا۔

"طبیعت کا کیا ہے بیٹا!" وہ سرد آہ بھر کے بولی "عمر کے روگ ہیں۔ ایک بار لگ جاتے ہیں تو جان لیے بغیر کہاں چھوٹتے ہیں۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں" میں نے کہا۔ "ابھی آپ کی اتنی زیادہ عمر تو نہیں ہوئی ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گے بیٹا!" وہ بولی "عورت جب اکیلی رہ جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ زندگی کا ایک دن گزرتا ہے تو اس کی عمر کے دو دن گھٹ جاتے ہیں۔ رائی جتنا صدمہ اسے پہاڑ جتنا لگتا ہے۔ مرد کا ساتھ حوصلہ دیتا ہے اور پناہ دیتا ہے۔ جوان بیٹا ہوتا تو شاید میں بہت سکھی ہوتی۔"

"آپ کی رابعہ دو جوان بیٹوں سے زیادہ باہمت اور نڈر ہے" میں نے کہا "بیٹے نکمے اور ناخلف ہوں تو بہت دکھ دیتے ہیں۔"

"تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے میری طرح جوان بیٹی کے باپ ہو" وہ تلخی سے مسکرائی "تمہارے لیے باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ یہ بتاؤ کیا عورت کو ذمے داریوں کا ہی بوجھ اٹھائے رکھنا چاہیے۔ کیا مجبوری کو خوشی سمجھنے سے مجبوری ختم ہو جاتی ہے؟ میری تو جیسے گزرنا تھی گزر گئی کہ میں نے ایک وقت رابعہ کے باپ کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی اٹھایا لیکن مجھے بتاؤ کیا رابعہ کے لیے کامیاب زندگی کا تصور یہی ہے کہ وہ اپنے پیشے میں کامیاب ہے؟ وہ کل اگر ہائیکورٹ کی جج بن گئی اور پھر سپریم کورٹ کی تو اس کی خوشیوں کی تکمیل ہو جائے گی؟ کیوں؟ کیا وہ عورت نہیں ہے۔ اس پیشے میں کامیاب مردوں کو دیکھو، کیا ان کے گھر نہیں ہیں؟"

میں اور محسن ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور ایک دوسرے سے اور رابعہ کی ماں سے نظریں چراتے رہے پھر میں نے جانتے بوجھتے انجان بن کے ڈھٹائی سے کہا۔

"رابعہ جیسی لڑکی کو رشتوں کی کمی تو ہونا نہیں چاہیے۔ ہاں ایسا شخص جو ہر لحاظ سے اس جیسی خوبیوں کا مالک ہو۔"

"بیٹا! مرد میں عورت جیسی خوبیاں کہاں تلاش کرتا ہے کوئی" رابعہ کی ماں بولی "مرد کو تو مرد ہونا چاہیے۔ وہ عورت کا ساتھ دے سکے۔ اس کی حفاظت کر سکے، گھر بنا سکے عزت دار ہو اور عزت کرنا جانتا ہو۔ رشتے مل جائیں گے مگر رابعہ بھی مانے۔"

یہ جھوٹ قابلِ احترام تھا کیونکہ یہ حالات کا المیہ تھا۔ معاشرے کی ناانصافی کا شکوہ تھا اور اپنی بے چارگی کا اعتراف تھا چنانچہ یہ ضروری تھا کہ ہم اس کا بھرم رکھیں اور کچھ نہ کہیں۔ ہم خود مسائل کی دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہم سے دستگیری کی توقع کسی راہ گم کردہ مسافر سے منزل کا پتا پوچھنے کے مترادف تھی۔ شاید خود رابعہ کی ماں نے بھی محسوس کر لیا کہ ہم رابعہ کے کلاس فیلو اور اس کے موکل ہیں جو اس سے مدد لینے آئے ہیں، اس کی مدد کرنے نہیں۔ اس نے خفت آمیز ہنسی میں اپنے جذبات کو چھپا لیا۔

"میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی۔ تم آئے ہو گے اپنے کسی کام سے" وہ اٹھتے ہوئے بولی "میں تمہارے لیے چائے منگواتی ہوں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا "محسن وہ خط کہاں ہے؟"

محسن نے بریف کیس کھولا اور لفافہ نکال کے مجھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھما دیا۔ یہ تقریباً دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا براؤن پیپر کا لفافہ تھا جس پر اضافی وزن کے لیے عام رجسٹرڈ لفافے سے زیادہ کی مالیت کے ٹکٹ لگائے گئے تھے۔ اس کے اندر سے فل اسکیپ سائز کے کاغذات کا پلندہ برآمد ہوا جو دوہرے کر کے لفافے میں ڈالے گئے تھے۔ کاغذات کو دائیں جانب اوپر کے کونے پر اسٹیپل کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ تحریر ہوتی تو اردو میں ہوتی۔ لیکن تمام صفحات اوّل تا آخر کورے تھے۔ میں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا مگر مجھے کہیں پنسل سے لکھی ہوئی سطر بھی دکھائی نہ دی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ لکھنا ختم کرنے سے پہلے کوئی صفحات کو اسٹیپل نہیں کرتا اور مخصوص تعداد میں صفحات اسٹیپل کر کے کوئی لکھنا شروع نہیں کرتا۔ سادہ اسٹیپل کیے ہوئے صفحات کو دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ یہ اصل مسودے کی جگہ لفافے میں اس لیے ڈالے گئے ہوں گے کہ جب لکھنے والا رجسٹری کرانے جائے تو اسے وزن یا حجم کے فرق کا پتہ نہ چلے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نوما یحو یعنی نلشی مرحوم نے تقریباً اتنے ہی صفحات میں کوئی سرگزشت لکھی تھی اور لفافہ بند کر دیا تھا؟ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس نے رات کو مضمون مکمل کیا اور سو گیا۔ یا مضمون مکمل کر لینے کے بعد وہ نامعلوم اسباب کی بنا پر خط کو فوراً پوسٹ نہ کر سکا اور درمیانی وقفے میں کسی نے موقع پا کے اصل تحریر کی جگہ سادہ کاغذ رکھ دیے اور لفافہ پھر پہلے کی طرح بند کر دیا۔ میں نے اور محسن نے ایسے ہی متعدد مفروضات پر بحث کی اور بالآخر کاغذات کو واپس لفافے میں ڈال دیا۔

"غور طلب بات یہ ہے محسن کہ جب لفافے میں کچھ بھی نہیں تھا تو ہمارے دشمن اس کے حصول کے لیے اتنے پریشان کیوں تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یار!" محسن نے کہا۔ "اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت سے وہ بھی بے خبر ہیں۔"

"ہاں۔ اور اسی لیے وہ بدستور ہم سے یہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور ہماری زندگی اس خط کے باعث بدستور خطرات کے حصار میں رہے گی۔" محسن نے کہا۔ "اور بفرضِ محال وہ ہمیں پکڑ کے لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہم سے خط کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں یا ہم سے پوچھتے ہیں کہ اس خط میں کیا تھا تو ہم انہیں کیا بتا سکیں گے؟"

"وہ کبھی نہیں مانیں گے کہ اس تمام جدوجہد کا مقصد سادہ کاغذوں کے ایک پلندے کا حصول تھا۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "خواہ سچ اگلوانے کی کوشش میں وہ ہماری جان لے لیں انہیں کبھی اعتبار نہیں آئے گا کہ ہم سچ بول رہے ہیں۔"

"خط میں یقیناً کوئی ایسی بات لکھی گئی تھی جس نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ ہم سے زیادہ فکر مند تھے کہ خط انہیں مل جائے۔" محسن نے کہا۔ "اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ ہمیں اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک خط ان کو نہیں مل جاتا اور ہم انہیں دھوکے میں رکھ سکتے ہیں کہ ہمیں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے، اور صرف ہمیں ہی نہیں ہماری زبانی دوسروں کو بھی اصل حالات کا علم ہو چکا ہے۔"

"جبکہ اصل حالات ایک رازِ سربستہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاہم یہ تاثر دینا کہ خط حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ہمارے تحفظ کی ضمانت بھی ہو سکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خط ان کی دسترس سے باہر ہے اور بالکل محفوظ بھی۔ اس کی ایک نہیں دس نقلیں بنوا کے دس جگہ فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ہم اس خط کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"لیکن سکندر! یہ جوا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ طے کر سکتے ہیں کہ پہلے ان دونوں کا کام تمام کیا جائے۔ دوسروں سے بعد میں نمٹ لیا جائے گا۔ [illegible]"

"یار محسن!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تیرے نکل آنے کے بعد اس مندری والے نے مجھے بس میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اگر اس نے تعاقب کیا ہوگا تو... تو اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہم کہاں ہیں اور خط کہاں ہے۔ اور عین ممکن ہے وہ باہر ہمارے منتظر ہوں۔ ہم نے اپنے ساتھ رابعہ کے لیے بھی خطرات پیدا کر دیے ہیں۔"

"انہیں پہلے سے علم ہوگا کہ ہمارے مراسم رابعہ سے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور رابعہ سے ہی کیا۔ عبدالودود مظفر صاحب سے ہیں۔ ضامن رضوی ایس ایس پی سے ہیں۔ مگر یہ سب معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہیں۔ میں اور تو عام آدمی ہیں جو اغوا بھی ہو جاتے ہیں اور قتل بھی ہو جائیں تو متعلقہ اخبار کے صفحے پر دو سطروں کی خبر لگتی ہے لیکن سپریم اور ہائی کورٹ کے کسی ایڈووکیٹ کا مسئلہ ہو تو ہر جگہ بار ایسوسی ایشن ہنگامہ برپا کر سکتی ہے اور پریس کے ذریعے بھی حکومت اور پولیس کے اعلیٰ حکام پر زبردست دباؤ پڑتا ہے۔ ضامن رضوی جیسے سینئر پولیس آفیسر پر بھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے پھر ہم خط یہیں رکھوا دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ ایک بے نام سی خلش تھی جو کہتی تھی کہ حیثیت

سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عورت تو عورت ہی رہتی ہے مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اسی وقت رابعہ کی ماں ایک خادمہ کے ساتھ چائے کی ٹرے لے کر آئی اور ہم نے جلد از جلد چائے ختم کی۔ محسن نے وہ لفافہ بند کر کے رابعہ کی ماں کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے بحفاظت رابعہ کو دے دیا جائے۔

"اتنی جلدی کیا تھی؟" رابعہ کی ماں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ لیا۔ "رابعہ کچھ دیر میں آ جائے گی۔ تم خود ہی دے دیتے۔"

"ہمیں ایک ضروری کام نہ ہوتا تو ضرور ٹھہر جاتے۔" میں نے کہا۔ "اس لفافے کے بارے میں رابعہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص فون پر بھی پوچھے تو لاعلمی کا اظہار کیجیے۔ کوئی تمہارا نام لے کر مانگنے آئے یا ہمارا رقعہ لے کر، یہ لفافہ کسی کو واپس نہیں کرنا ہے۔ لینا ہوگا تو ہم دونوں میں سے کوئی آئے گا۔"

رابعہ کی ماں نے صرف سر کو ہلایا اور کسی تجسس یا تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بات مجھے بڑی عجیب لگتی تھی کہ رابعہ کی ماں نے کبھی ہم سے ہمارے مسائل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ یہ نہیں پوچھا کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کس چکر میں ہیں۔ یقیناً اسے رابعہ نے منع کر دیا ہوگا کہ ہم سے براہِ راست کچھ نہ پوچھے۔ موکل کے اور وکیل کے درمیان کاروباری اعتماد کا وہی رشتہ ہوتا ہے جو ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں مکمل رازداری شرطِ اوّل رہتی ہے۔ گیٹ تک آتے ہوئے میں نے محسن سے کہا۔ "اگر وہ مندری والا باہر موجود ہوا تو ہمارے لیے اس کو شناخت کرنا مشکل نہیں ہوگا مگر اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی ہوئے تو ہم انہیں نہیں پہچان سکیں گے۔ وہ ہمارا تعاقب کریں گے۔ ان کو غچہ دے کر نکلنے کی ایک صورت ہے۔ ہم کراؤن سینما کے چوک تک اکٹھے پیدل جائیں گے۔ وہاں عموماً رکشا کھڑے مل جاتے ہیں۔ اگر ایک ہی رکشا ہوا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اکٹھے نکل جائیں گے لیکن دو رکشا ہوں تو ہم الگ الگ اور مخالف سمتوں میں روانہ ہوں گے۔"

ہم دونوں بے نیازی سے چلتے ہوئے باہر آئے اور اپنے اپنے طور پر ہم دونوں نے ماحول کا خوردبین نظروں سے جائزہ لیا۔ بظاہر سب خیریت تھی اور دنیا کے کاروبار معمول کے مطابق چل رہے تھے مگر خطرے کا احساس تو ہمارے دل میں تھا چنانچہ ہمیں ہر گام پر خطرہ صدا دیتا سنائی دیتا تھا۔

"اگر اتفاق سے تین رکشے یا کوئی ٹیکسی بھی موجود ہو تو انتظار کرنا تاوقتیکہ دو سواریاں نہ رہ جائیں اور جب ہم روانہ ہوں تو تعاقب کرنے والوں کو فوراً کچھ نہ ملے۔ ہم دوبارہ ٹاؤنشپ مارکیٹ کے اسٹاپ پر ملیں گے مگر وہاں پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ مت اختیار کرنا۔"

"برادرِ نسبتی! میں بچہ نہیں ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اپنی عقل کا اسٹاک ایسے ہی مت ضائع فرمائیے۔ میں ان کو چکر دے سکتا ہوں۔"

"سالارِ اعظم! تقدیر کا چکر بُرا ہے۔ احتیاط اور مشورہ اچھی چیز ہے۔" میں نے کہا اور ایک دکان سے سگریٹ لینے کے بہانے رک گیا کیونکہ چوک پر ایک قطار میں تین رکشے کھڑے تھے۔ سگریٹ لینے اور پیکٹ کھول کے ایک ایک سگریٹ جلانے تک ایک رکشا کم ہو گیا۔ محسن اور میں ایک ساتھ آگے بڑھے۔ محسن نے ایک رکشا پر قبضہ کیا اور مجھے نہیں معلوم اس نے رکشا والے سے کہاں چلنے کے لیے کہا۔ میں دوسرے رکشا میں بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے ایک اور شخص تیزی سے آگے آیا اور مجھے تقریباً دوڑ کر رکشا میں سوار ہونا پڑا۔ "مغلپورہ۔" میں نے کہا۔

"ایئرپورٹ۔" دوسرے شخص نے مایوس ہونے کے باوجود کہا اور رکشا والے نے ایئرپورٹ کی سواری کو زیادہ فاصلے کے باعث اور میٹر سے زیادہ کرائے کی امید میں ترجیح دینے کی کوشش کی، لیکن میں اڑ گیا۔ رکشہ والے نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ میں نے بیٹھنے سے پہلے اس سے پوچھا کیوں نہیں تھا۔ "دیکھو پہلے میں بیٹھا تھا، اور میں اس لیے بیٹھا تھا کہ تم میٹر اپ کیے کھڑے تھے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی، سمجھے؟ شرافت سے چلو۔ میں تمہیں ایئرپورٹ کا کرایہ دے دوں گا۔" میرے لہجے اور میری پیش کش کے بعد رکشا والا مجبور ہو گیا اور اس نے رکشا کو اسٹارٹ کر کے موڑا۔ میں نے ناکام ہو جانے والے شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اضطراب کے عالم میں اس نے دونوں طرف سے آنے والے ہر رکشا کو دیکھا مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہر رکشا اس کے اشارے کے باوجود سیدھا گزر گیا۔ نہر کے پل پر پہنچ کے میں نے رکشا والے سے کہا کہ وہ سیدھا چلے اور انفنٹری روڈ کے راستے مال روڈ پر فورٹریس اسٹیڈیم سے سیدھے ہاتھ گھوم جائے۔ رکشا والے نے صرف ایک بار حیرانی سے مجھے دیکھا اور ذہن میں آنے والے سوالات کو غیر ضروری قرار دے کر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ رکشا نے وہ پل عبور کیا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس پر سے بائیں جانب لاہور کینٹ کا پورا اسٹیشن نظر آتا تھا، اور پھر مال روڈ کی پوری مسافت طے کر کے ٹالنٹن مارکیٹ پہنچا تو محسن میرا منتظر تھا۔ رکشا والے کو اب کوئی شکوہ نہ تھا کہ میں نے منکیورہ جانے کا ارادہ کیوں ترک کیا اور لتنے لمبے راستے سے انارکلی جانے میں کیا مصلحت دیکھی۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے ملتان روڈ جانے کے لیے ٹیکسی لی اور کئی بار پلٹ کر دیکھنے کے بعد بالآخر ہمیں یقین آیا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ راستہ میری یادداشت میں محفوظ تھا، اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ کوٹھی دکھائی دی جہاں مجھے قالین میں لپیٹ کر لایا گیا تھا میں اسے پہچان لوں گا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے رفتار کم رکھنے کے لیے کہا اور غور سے دونوں جانب کی کوٹھیوں کو دیکھتا رہا۔ مطلوبہ کوٹھی پر نگاہ پڑتے ہی میں نے محسن کا ہاتھ دبایا اور ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر چلتا کیا۔ پھر ہم ویران سڑک پر پیدل چل کے اس کوٹھی تک پہنچے جس کے گیٹ پر سیاہ بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔ دروازے پر سرخ پلاسٹک کی دو انچ چوڑی پٹی پر ڈیڑھ انچ کے سفید حروف سے صاحبِ خانہ کا نام لکھا گیا تھا۔ مجھے یہ نام کچھ مانوس لگا۔ ذہن پر زور دینے سے مجھے یاد آیا کہ یہ فلمی دنیا کے ایک نامور کیمرہ مین کا نام ہے جو ترقی کر کے ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی بن گیا تھا اور بلاشبہ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کی عکاسی میں اس کے کمالِ فن کا ثانی نہیں تھا مگر یہ دور تمام ہوا تو رنگین عکاسی میں دوسرے لوگ زیادہ کامیاب ہوئے اور اس نے فوٹوگرافی چھوڑ کے ہدایت کاری کو اپنا لیا۔ اس میدان میں بھی وہ کئی کامیاب فلمیں بنا کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ کوٹھی کے اندر فلیش لائٹس کی موجودگی کا سبب مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید بھی ہوتی تھی کہ دلاور نے کوٹھی کو خالی پا کے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اب اس کے یہاں ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہدایت کار شاید کسی لوکیشن شوٹنگ پر گیا ہوگا اور دلاور کو اطمینان ہوگا کہ اس کی ڈرامائی کارروائی میں خلل انداز ہونے کے لیے کوئی نہیں آسکتا۔ بڑے گیٹ میں ایک چھوٹا گیٹ اکیلے آدمی کے آنے جانے کے لیے تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی چوکیدار اس کو اندر سے بند کیے بیٹھا ہو۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ کوٹھی کے اندر کہیں سے گھنٹی جیسے دو سُریلے بول سنائی دیے لیکن دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا۔ میں نے چھوٹے گیٹ کو آہستہ سے دھکیلا۔ گیٹ کھل گیا اور اس پٹ کے وا ہو جانے سے بڑے گیٹ میں دو فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا۔ میں نے پہلے محسن کی طرف اور پھر آس پاس دیکھا۔ الیکن یہی ویران نظر آنے والی کوٹھیوں، ایک پھل فروش اور چند راہ گیروں کے سوا جو بہت دور تھے، سڑک پر کوئی نہ تھا اور ہماری طرف کون متوجہ ہوتا جبکہ ہم صورت اور حلیے سے شریف اور معزز نظر آتے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے گیٹ اندر سے بند کر دیا۔ پورچ کی سیڑھیوں کے بعد برآمدے میں وہ دروازہ تھا جس سے گزر کے میں گزشتہ شب باہر لایا گیا تھا۔ بظاہر بند نظر آنے والا یہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اور محسن چوروں کی طرح محتاط اور گوش برآواز تھے لیکن کوٹھی میں ایسی خاموشی تھی جو آسیب زدہ لگتی تھی۔ اچھے خاصے آراستہ کمروں کی دیواریں بھی مجھے سوگوار لگیں۔ اس گھر کی دیواروں کی طرح جہاں سے کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ یہ سب مجھے اپنے ذہن کی ناخوشگوار یادوں کی کرشمہ سازی محسوس ہوئی۔ محسن کے ساتھ میں نے ایک ایک کمرہ دیکھا۔ میں نے وہ قالین بھی پہچان لیا جس میں لپیٹ کر مجھے لایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کا اور "L" کی شکل کے ڈائننگ روم کا پورا نقشہ وہی تھا اور میں نے محسن کو وہ صوفہ بھی دکھایا جس پر بیٹھ کے میں نے دلاور سے بات کی تھی اور وہ جگہ بھی دکھائی جہاں سرچ لائٹس لگی گئی تھیں اور دلاور بیٹھا تھا۔ اندر ایک خواب گاہ نے مجھے عالی شان ڈبل بیڈ کی سبز ریشمی چادر پر ہر شکن گزشتہ رات کا افسانہ سنانے لگی کیونکہ وہیں سرہانے کی میز پر جام و سبو رکھے تھے۔ پی کے داد عیش دینے والے اس زندگی کے عادی تھے چنانچہ انہوں نے مفت کی سمجھ کے بے حساب نہیں پی تھی۔ ایک بوتل آدھی سے کچھ زیادہ اور دوسری کچھ کم تھی۔ کانچ کے دو ساغر بھی پہلو بہ پہلو رکھے تھے۔ مخالف گوشوں میں وہ اعلیٰ قسم کے اسپیکر بھی رکھے تھے جن کی آواز میں نے رات کو سنی تھی۔

ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا اور ایک خالی پیکٹ چُرمُر کر کے ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جاسوسی کی کہانیوں میں اکثر پڑھا تھا کہ جائے واردات پر ملے والے کسی ایک سگریٹ کے ٹکڑے یا کسی ٹوٹے ہوئے بٹن سے سراغرساں نے مجرم کو پکڑ لیا۔ حقیقی زندگی میں صورتِ حال مختلف تھی۔ نہ میں پولیس کو بلا کے بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور نہ ان کے لیے دلاور کا سراغ لگانا ممکن تھا۔ سگریٹ ولز فلٹر تھے جو ہر قدم پر ہر گاؤں اور شہر کی ہر دکان پر ملتے تھے۔ چند ٹکڑوں پر لپ اسٹک کا رنگ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شراب کی بوتلوں پر اور شیشے کے جام پر انگلیوں کے واضح نشانات موجود ہوں گے لیکن اوّل تو پولیس کے پاس ہر چھوٹے بڑے جرم میں ملوث ہونے والے کا کوئی ایسا ریکارڈ نہیں جیسا ایف بی آئی یا اسکاٹ لینڈ یارڈ جیسے اداروں کے پاس ہے اور لاکھوں فنگر پرنٹس میں سے ایک نکالنا ہو تو یہ کام کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں انجام دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دلاور یا وہ مندری والا کسی جرم میں پکڑے ہی نہیں گئے ہوں گے تو ان کا نام پتا اور حلیہ بھی پولیس کی کسی فائل میں نہیں ملے گا۔ اور آخری بات یہ کہ پولیس ان کو پکڑے گی ہی کیوں؟ بڑے مجرم تو رائے عامہ کے مطابق خود پولیس کی سرپرستی میں اپنا کاروبار جاری رکھتے ہیں اور اس چشم پوشی کا معاوضہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر جوئے اور سٹے کے اڈے چلانے والے، منشیات کا دھندا کرنے والے، اسمگلر اور نامی گرامی بدمعاش، پولیس ان کا دیا کھاتی ہے چنانچہ ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پکڑے جاتے ہیں چھوٹے موٹے چور، اٹھائی گیرے، لفنگے اور لاوارث، یا وہ شریف آدمی جو اپنے جان و مال یا عزت و آبرو کی خاطر مرنے مارنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر محو تھا کہ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی تو یہی سمجھا کہ محسن ہوگا جو ساتھ والے کمرے کا سرسری جائزہ لے رہا تھا اور اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ ہمارا تجسس بے سود ہے۔ معمولی مجرم بھی کہیں اتنے واضح سراغ نہیں چھوڑتے کہ ان کی نشاندہی کر دیں اور پولیس مارچ کرتی ہوئی سیدھی ان کے دروازے پر دستک دینے آجائے۔

"میرا خیال ہے محسن کہ یہاں مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی غیر قانونی طور پر اندر داخل ہونے کا جرم کر چکے ہیں۔ کوئی آگیا تو مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔"

"وہ تو تم ہو چکے ہو۔" ایک اجنبی آواز نے پیچھے سے کہا، اور میں تیزی سے پلٹا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ اس کا منہ سر چادر میں لپٹے ہوئے تھے اور آنکھوں کے سوا اس کے چہرے کا کوئی حصہ نظر نہ آتا تھا لیکن میں نے اسے کپڑوں سے شناخت کر لیا۔ میں نے آج ہی صبح اس کو پوسٹ آفس میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی پر سائلنسر فٹ تھا۔ سوچے سمجھے بغیر اس پر حملہ کر دینا خودکشی کے مترادف ہوتا، چنانچہ میں نے اپنے حواس کو قابو میں رکھا اور اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تو تم یہاں بھی آگئے!" میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کے بغیر کہا۔ "منہ چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کو میں اتنی مرتبہ دیکھ چکا ہوں کہ اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"وہ خط کہاں ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"خط بھی مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے کچھ باتیں ہو جائیں۔ آج ہی تو موقع ملا ہے مجھے اور تمہیں آمنے سامنے ہو کے اکیلے میں بات کرنے کا۔"

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" وہ غرا کے بولا۔ "سیٹھ دلاور نے کہا ہے کہ خط واپس نہ کیا گیا تو ایک مہینے کی مہلت نہیں ملے گی۔ فیصلہ آج کسی وقت ہو جائے گا۔"

"اچھا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے معلوم نہیں تم کس خط کی بات کر رہے ہو؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ لہجے کو خطرناک بنا کے بولا۔ "جب تم نے بابو پوسٹ مین سے خط لیا تھا تو ہم دیکھ رہے تھے۔ یہ تم جانتے ہو۔"

"وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔"

"استاد پیڈ۔۔" ساتھ والے کمرے کے دروازے میں نمودار ہونے والا یکلخت رک گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے مندری والے کا نام نکلنے والا تھا۔ "وہ حرام زادہ تو یہاں نہیں ہے۔"

مندری والے نے اسے ایک گالی دی۔ "زبان پر قابو رکھ۔ تیرا باپ اندر آیا تھا تیرے سامنے یا نہیں؟"

"آیا تو تھا استاد!" گالی کھانے والے نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "مگر اب نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن کسی اجنبی کی آواز سنتے ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ وہ مسلح تو نہیں تھا لیکن عقل سے کام لینا جانتا تھا۔ "استاد پیڈرو!" میں نے نامکمل نام کو مکمل کیا اور مندری والے کو چونکتے دیکھا۔ بہت پہلے میں نے اس نام کی ایک ہندوستانی فلم دیکھی تھی جس میں شیخ مختار نے استاد پیڈرو کا کردار ادا کیا تھا، اور یہ نام خاصا مقبول ہوا تھا۔ "اب تو تمہارا نام بھی معلوم ہو گیا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ مسکرایا لیکن اس کا پتا صرف آنکھوں کے بدلے ہوئے ناظر سے چلتا تھا۔ "تم اتنے چالاک نہیں ہو جتنا خود کو سمجھتے ہو۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں اس سے کچھ زیادہ ہی چالاک ہوں۔ طبیعت میں انکساری ہے اس لیے بڑائی نہیں جتاتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا اصل نام کچھ اور ہو، مثلاً مختار یا شیخ مختار۔ عرف استاد پیڈرو۔" میں نے محسوس کیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ مندری والا کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"جا کے دیکھ اسے وہ کہاں ہے۔" وہ اپنے ساتھی پر برس پڑا جو اپنی غلطی کے نتائج پر حیران پریشان کھڑا تھا۔ "وہ آدمی ہے، جن بھوت نہیں کہ دیوار میں گھس گیا۔ باہر بھی وہ جانے سے رہا۔ گیٹ کے اندر...." یہ جملہ اس کے ہونٹوں پر نامکمل رہ گیا۔ کوئی چیز توپ کے گولے کی طرح اس کے سینے پر لگی۔ اس کا سانس رک گیا اور وہ لڑکھڑا کے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ یہ وقفہ مجھے متحرک کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور ایک گولی میرے سر کے اوپر سے گزر کے شیشے کے بہت بڑے گلوب پر لگی جو عین وسط میں چھت سے معلق تھا۔ استاد پیڈرو یعنی مندری والے کے اور میرے درمیان چند قدم کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے لڑنے والے بیل کی طرح اس کے پیٹ میں ٹکر ماری اور پلک جھپکتے میں پیڈرو کو اوپر اٹھا کے پھینک دیا۔ وہ دیوار سے لگ کے نیچے گرا اور ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ اس نے بیڈ کے سرہانے سے شراب کی ایک بوتل گردن سے پکڑ کے اٹھائی اور پوری قوت سے میرے سر کا نشانہ لے کر پھینکی۔ پیڈرو جیسے بھاری بھرکم آدمی کو پھینکنے کے لیے مجھے خاصی جسمانی قوت صرف کرنا پڑی تھی اور قدرتی طور پر میں خود بھی جھٹکے سے پیچھے ہو گیا تھا۔ شراب کی بوتل راکٹ کی طرح سنسناتی ہوئی میری ناک کے قریب سے گزری اور دیوار سے ٹکرا کے پاش پاش ہو گئی۔ شراب کے چھینٹے میرے منہ پر بھی آئے اور کمرے میں گلوب کے ٹکڑوں کے ساتھ ہی مئے ارغوانی کی بوتل کے ٹکڑے بھی پھیل گئے۔ اس شخص نے بیڈ سائڈ سے لکڑی کا ٹیبل لیمپ اٹھا لیا اور اس کا تار کھینچ کر توڑ دیا۔ ٹیبل لیمپ کا نچلا حصہ لکڑی سے تراشا گیا تھا لیکن بالکل چٹان کی طرح نظر آتا تھا۔ اوپر کا حصہ قصے کہانیوں کی طرح اک روایتی مخلوق جیسا تھا جسے انگریزی میں "مرمیڈ" کہتے ہیں اور جس کا آدھا نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے تو اوپر کا آدھا جسم کسی انتہائی حسین عورت کا۔ مجھ پر حملہ کرنے والے نے ٹیبل لیمپ کا بلب نکال کے پھینک دیا تھا جو موم بتی جیسا تھا اور وہ ٹیبل لیمپ کو الٹا پکڑ کے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ مجھ پر وار کرے تو چٹان کی طرح نظر آنے والے لکڑی کے نچلے حصے کی ضرب ہتھوڑے کی طرح پڑے۔

پیڈرو فرش پر گرتے ہی قلابازی کھا کے بیڈ کے پیچھے ہونا چاہتا تھا مگر محسن اسی دروازے میں سے نمودار ہوا جس میں سے پیڈرو کا ساتھی اندر آیا تھا اور اس نے ایک جست بیڈ پر لگائی۔ اگر ریشمی چادر پر اس کا پیر نہ پھسلتا تو وہ دوسری جست میں بیڈ عبور کر کے پیڈرو پر جا پڑتا لیکن پیر پھسل گیا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نہایت بے ڈھب طریقے پر پیڈرو کے سامنے جا لیٹا۔ پیڈرو نے پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور میں نے محسن کے کراہنے کی آواز سنی۔ پیڈرو کا ساتھی پینترا بدل کے آگے آیا لیکن میں اس سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا اور اگر مجھے اس پر ایک بھرپور وار کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کا کام تمام ہو جاتا لیکن پیڈرو نے مسہری کے نیچے سے گولی چلائی جس کا نشانہ یقیناً میں تھا۔ پیڈرو کا ساتھی نزدیک ہونے کے باعث بروقت سامنے آ گیا اور گولی اس کے شانے میں لگی۔ اس نے کراہ کر دونوں ہاتھ بلند کیے اور ٹیبل لیمپ اس کے ہاتھ سے چھٹ کر کھڑکی کی طرف گیا۔

"بس۔" میں نے کھڑکی کا شیشہ بکھرنے کی آواز کے ساتھ ہی پیڈرو کی آواز سنی۔ "اب تم نے ذرا بھی حرکت کی تو سر میں سوراخ کر دوں گا۔" میں جہاں تھا وہیں منجمد ہو گیا اور پیڈرو مسہری کے نیچے سے نکل کے میرے مقابل آ گیا۔ اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا اور مندری والے ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ اب میرے سامنے بے نقاب تھا۔ اس کا ساتھی شانے کے زخم سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھا اور اس نے ایک ٹیبل کور کھینچ کر زخم پر رکھ کے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ اس کے حلق سے درد کی ٹیس کے ساتھ خود بخود سسکی نکل جاتی تھی۔

"زیادہ نخرے مت کر۔" پیڈرو نے غرا کے کہا۔ "معمولی سا زخم ہے۔ مرے گا نہیں تو۔ ادھر آ کے کسی چیز سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دے۔" اس نے بے ہوش پڑے ہوئے محسن کی طرف اشارہ کیا۔

بازو کی تکلیف کے باوجود اس کے ساتھی نے پیڈرو کے حکم کی تعمیل کے لیے ریشمی چادروں کو لمبی پٹیوں کی شکل میں پھاڑا۔ گولی اگر شانے کی ہڈی میں لگی ہوتی تو وہ ا

ہاتھ کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا لیکن زخم غالباً بیرونی گوشت تک محدود رہا تھا۔ ریشمی چادریں بہت مضبوط تھیں مگر اس نے کناروں کو ڈریسنگ ٹیبل پر سے بلیڈ لے کر کاٹا اور کونے کو پیر کے نیچے دبا کے اس ہاتھ سے کھینچ لیا جو زخمی نہیں تھا۔ ان پٹیوں سے جو ریشم کی رسی جیسی تھیں اس نے محسن کے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کر کے کئی بل دیے پھر دوسری پٹی سے پیروں کو ملا کر باندھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے علاوہ پیڈرو نے بھی اس تمام کارروائی کو بغور دیکھا تھا لیکن ایک لمحے کے لیے بھی وہ دوسری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

"اب تم اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔" پیڈرو نے حکم دیا۔ "مجھے قتل کرنے کا حکم نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنی جان دے کر تمہیں بچاؤں۔ دیر مت کرو۔"

میں نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ "تمہیں یقین تھا کہ ہم یہاں آنے کی حماقت ضرور کریں گے؟"

"ہم اس وقت سے تمہارے پیچھے ہیں جب سے تم وہ لفافہ لے کر فرار ہوئے تھے۔" وہ بولا۔

"اب تمہارا سیٹھ دلاور اس لفافے کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہے۔ اس میں جو کچھ تھا وہ تو ہمیں معلوم ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"اچھا؟" پیڈرو نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "چلو پھر تو تمہارے لیے بھی وہ خط اہم نہیں رہا۔ لاؤ وہ لفافہ ہمیں دے دو۔"

"تم بھی اسے لے کر کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "اس کی ایک ایک نقل بہت سے لوگوں کے پاس پہنچ چکی ہے۔"

"وہ کون کون لوگ ہیں؟" پیڈرو نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"تم مذاق سمجھ کے خوش ہو نا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک نقل ہے ہمارے وکیل... مسٹر منظر ایڈووکیٹ کے پاس۔ ایس ایس پی ضامن رضوی کو ایک نقل شام تک پہنچ جائے گی۔"

"گولی مارو نقلوں کو۔" وہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "سارے شہر میں بانٹ دو اس کی نقلیں۔ ہمیں اصل چاہیے۔"

"اصل... وہ تو ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محسن سے پوچھ کے دیکھو۔"

"جب یہ اندر داخل ہوتے تھے تو محسن کے پاس بریف کیس تھا۔" پیڈرو نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "تو ادھر آ کے اسے سنبھال۔ میری طرف سے کھلی چھٹی ہے۔ اگر یہ سر گھما کے بھی دیکھے تو گولی چلا دینا۔"

میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ پیڈرو سے اس کا نائب زیادہ خطرناک ہے۔ ایک تو اسی وجہ سے کہ وہ مجھے بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وہ نسبتاً نوآموز تھا۔ ناتجربہ کار اور نوجوان آدمی جیسے اپنے جذبات پر بیڈرو کی طرح قابو رکھنے کی مشق نہ تھی۔ وہ ذرا بھی مشتعل ہوتا تو بیڈرو کے عطاکردہ خصوصی اجازت نامے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شوٹ کر دیتا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انتظار کا ایک ایک منٹ ایک گھنٹے کے برابر ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ کیا بیڈرو بریف کیس تلاش کرے گا۔ محسن کو اتنا وقت ضرور ملا تھا کہ اجنبی آواز سنتے ہی وہ ساتھ والے کمرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ کسی پردے کے پیچھے۔ بیڈ کے نیچے یا وارڈروب میں اور بیڈرو کے ساتھی نے پوری کوٹھی کے ہر کمرے میں سرسری نگاہ ڈال کے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ اگر وہ تفصیل سے اور اطمینان سے تلاشی لیتا تو محسن کہاں چھپا رہ سکتا تھا یہی اس کے ناتجربہ کار ہونے کی دلیل تھی۔ محسن نے بالکل مناسب وقت پر ایش ٹرے پھینکی تھی جو بیڈرو کے سر میں لگتی تو اس وقت وہ لیٹا ہوتا۔ اس کا نشانہ خطا گیا تھا یا اس نے عمداً سر کو نشانہ نہیں بنایا تھا کہ کہیں سر پھٹنے سے وہ مر ہی نہ جائے۔ اس کی کارروائی کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تھے تو یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ بریف کیس چھپانے کی مہلت اسے کہاں ملی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اور میرا خیال درست تھا۔ اسی وقت بیڈرو نمودار ہوا اور اس نے محسن کا بریف کیس بیڈ پر الٹ دیا۔ کاغذات کے الٹنے پلٹنے اور اس کے بڑبڑانے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ لفافہ نہ ملنے پر وہ جھنجلا کا شکار ہے۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے دیوار کو مخاطب کر کے کہا۔ "لفافہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

بیڈرو نے مجھے گالی دی اور میرے پیچھے آ کے میرے سر پہ مکا رسید کیا۔ میری پیشانی دیوار سے ٹکرائی اور ذرا سی دیر کے لیے مجھے اپنا وجود اندھیرے میں ڈوبتا محسوس ہوا زمین میرے قدموں کے نیچے ہلنے لگی تو میں نے ہاتھ پھیلا کے دیوار کا سہارا لینا چاہا۔ اسی وقت بیڈرو نے میرے سر پہ ریوالور کا دستہ مارا اور میں کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح فرش پر گرا۔ اس ضرب نے پل بھر میں مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ یہ میرا تجسس تھا جس نے میرے ساتھ محسن کو بھی گرفتار بلا کیا تھا۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ موسلادھار بارش ہو رہی ہے اور پانی مجھے اور میرے کپڑوں کو تر کرتا ہوا جسم پہ بہہ رہا ہے رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا اور یہ بارش نہیں تھی باتھ روم کے شاور کا پانی تھا جو مجھ پر گر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا ... نے مجھے سہارا دینے کی کوشش کی اور شاور کو بند کر دیا۔ "... حال ہے برادرِ نسبتی؟" محسن بولا۔

"حال... ٹھیک ہے۔" میں نے سر کے ناقابل ... درد کو دباتے ہوئے کہا۔ "مگر سالارِ اعظم..." میں نے ادھر ... دیکھا۔

"سوالات کی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "جوابات ... ہیں۔ ہم اسی کوٹھی کے باتھ روم میں تشریف فرما ہیں۔ استاد بیڈرو اور اس کے دونوں رفیق جاتے وقت ... بند کر گئے تھے۔ پہلے میں بیہوش ہوا تھا اس لیے ... بھی پہلے آیا۔ تم آدھے گھنٹے بعد..."

"اس کے ساتھ دو آدمی تھے؟" میں نے کہا۔ "... کون تھا؟"

"وہ باہر موجود رہا تھا۔" محسن بولا۔ "جب انہوں ... مجھے گھسیٹ کر اندر ڈالا تو مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش آ ... تھا۔ میں نے باہر سے اس کی آواز سنی تھی۔ غالباً وہ جیپ چلا کے لایا ہوگا۔ باہر سے جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی آئی تھی۔"

"تیرے تو ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔" میں ...

"اور اس سور کے بچے نے باندھا بھی بہت سخت تھا۔"

"میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا۔" محسن نے کہا۔ "... کے گرد سیمنٹ کے کنارے خاصے تیز ہیں۔ میں دروازے سے پشت لگا کے ہاتھوں کو اوپر نیچے رگڑتا رہا۔ تھوڑی ... کھال بھی چھل گئی مگر کپڑا تھا، جلد کٹ گیا۔ ایک بل ... پڑا تو ہاتھ خود ہی آزاد ہو گئے۔"

"اور اب کیا پوزیشن ہے؟" میں نے کہا۔ "ہمارے ... کے امکانات کیا ہیں؟"

"امکانات بہت روشن ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک ... صورت تو یہ ہے کہ ہم روشن دان میں منہ ڈال کے ... شروع کریں۔ ہماری آواز کسی نہ کسی کے کانوں تک ضرور ... جائے گی اور فی الحال تو ہمیں آزادی مل جائے گی۔ ... بات ہے کہ اس کے بعد ہمیں حوالات جانا پڑے اور ... کرنا پڑے کہ ہم اس باتھ روم میں کیسے بند ہوئے ... طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی دیوار توڑ کے نکل جائیں یا دروازہ اکھاڑ دیں لیکن ہم دونوں میں سے کوئی ٹارزن نہیں ... کسی کے پاس کوئی مافوق الفطرت قوت نہیں۔ دروازے کو باہر سے ٹکر مارنے سے اندر کی چٹخنی نکل جاتی ہے ... کھل جاتے ہیں مگر اندر سے ٹکر مار کے تو پوری چوکھٹ ...

گرانا پڑتی ہے جو ناممکن ہے۔"

"روشندان میں یہ سلاخ نہ ہوتی تو ہم اس میں سے گزر سکتے تھے۔" میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ "کیا اس سلاخ کو پھر نکالا نہیں جا سکتا؟"

محسن نے مایوسی سے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ مسئلہ عقل سے حل ہوگا طاقت سے نہیں۔" اس نے باتھ روم کیبنٹ کو کھولا۔ "اس میں کچھ دوائیں ہیں۔ میں نے سر کے زخم پر ٹنکچر آیوڈین لگا لی ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تیرے سر پہ صرف گومڑ بنا ہے۔" اس نے ایک پیکٹ میں سے اسپرین کی تین گولیاں نکالیں اور ہتھیلی پہ رکھ کے مجھے پیش کیں۔ "یہ لیجیے اور مگ سے پانی نوش فرمائیے۔ میں کھا چکا ہوں اور یقین کیجیے اس وقت یہ جادو کی گولیاں بڑی مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔"

اسپرین نگلنے کے بعد میں نے اور محسن نے دیوار سے ٹیک لگا کے پیر فرش پر پھیلا دیے اور ایک دوسرے کو سگریٹ پیش کی۔ دوپہر کے بعد اب سہ پہر بھی ڈھلنے لگی تھی۔ خالی پیٹ میں سگریٹ کا تلخ دھواں تیر کی طرح لگا۔ مجھے بھی یہ فکر نہیں تھی کہ ہم اس قید خانے سے کیسے نکلیں گے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ گھر کے مکین لوٹ آئے تو کمرے کی حالت دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ ان کی عدم موجودگی میں وہاں عیش و عشرت اور جنگ و جدل کے کیسے کیسے مناظر کی شوٹنگ ہوئی ہے اور اس کے بعد ہمیں پولیس نکالے گی تو پھر بند کرنے کے لیے۔ میں نے باتھ روم کے اسباب کا جائزہ لیا۔ روشندان والی دیوار کے مقابل دوسری دیوار کے ساتھ باتھ ٹب تھا، جس پر گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں نصب تھیں۔ فلاہبٹ کے ایک اور نل تھا اور شاور۔ اس کے سامنے واش بیسن اور واش بیسن کے اوپر پلاسٹک کے سلائیڈنگ ڈور والا باتھ کیبنٹ، باتھ کیبنٹ میں بھی صابن، شیمپو اور ٹوتھ پیسٹ جیسی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کوئی ہتھوڑی کلہاڑی یا سریے جیسی چیز سرے سے مفقود تھی۔ بلیڈ یا ریزر سے نہ دروازہ کاٹا جا سکتا تھا اور نہ دیوار میں شگاف کیا جا سکتا تھا پھر کیبنٹ کے اوپر ہاتھ ڈال کے ٹٹولنے سے مجھے انگلیوں پر لوہے کے سرد لمس کا احساس ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے وہ چیز اتاری اور کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کا ریوالور آ گیا تھا۔

"محسن..." میں نے کہا "یہ... یہ تو اصلی ریوالور ہے؟" میں نے کہا اور ریوالور اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اور بھرا ہوا ہے۔"

"ہاں یار!" محسن نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "کسی نے خاصی محفوظ جگہ سمجھ کے چھپایا تھا۔"

"سوال یہ ہے کہ کس نے؟" میں نے کہا۔ "خود صاحبِ خانہ نے یا اس کے گھر کے کسی فرد نے، کسی ملازم نے یا آنے جانے والے کسی نے؟"

"اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ریوالور کس کا ہے۔" وہ بولا۔ "فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ جائز ملکیت ہے یا ناجائز۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بغیر لائسنس کا ہوگا اور اسی لیے باتھ روم میں چھپایا گیا تھا۔ لائسنس ہو تو لوگ ریوالور ساتھ رکھتے ہیں یا دراز میں مقفل کر کے۔"

"اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اسے لے جا سکتے ہیں۔ اس سے مالک کو مالی نقصان کے سوا کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"بلکہ ہو سکتا ہے صاحبِ خانہ کو علم ہی نہ ہو کہ اس کے گھر میں ناجائز اسلحہ پوشیدہ ہے۔" محسن بولا۔

"ہم اسے پریشانی سے بچا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر یہ اسی کا ہوا تو اس کے لیے نہ مسئلہ پیدا ہوگا نہ پریشانی ہوگی۔" محسن بولا۔ "وہ دوسرا حاصل کر لے گا۔" ہم نے ہنس کے ہاتھ ملایا۔ اس وقت جب ہم معمولی خنجر کی جستجو کر رہے تھے ایک ریوالور کا مل جانا ایسا ہی تھا کہ ہم آگ لینے کو جائیں اور پیمبری مل جائے۔ دستِ غیب نے ہمیں بن مانگے اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے مسلح کر دیا تھا۔ حوصلے کے ساتھ طاقت بھی دے دی تھی اور غیر متوقع خطرات کے خلاف تحفظ کا ایک وسیلہ فراہم کر دیا تھا لیکن میرے اور محسن کے ذہن میں یہ احساس بھی تھا کہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے ہم اخلاقی اور قانونی طور پر خود بھی مجرم بن رہے ہیں۔ ہم کسی اور کے گھر میں تھے جہاں ہم اس نیت سے ہرگز نہیں آئے تھے کہ صاحبِ خانہ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اٹھا لے جائیں۔ قطع نظر اس سے کہ ریوالور کسی نے جائز طور پر اور جائز مقصد کے لیے حاصل کیا یا نہیں ہم خود بھی اس کو ناجائز طریقے پر حاصل کرنے کی سوچ رہے تھے۔

شرافت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ ہم نے اسے جہاں سے اٹھایا ہے پھر وہیں رکھ دیں اور بھول جائیں۔ دوسری طرف ہمارے حالات تھے جو سنگین تر ہوتے جا رہے تھے اور ہمارے مقابل خطرناک مجرم تھے جن کا مقابلہ خالی ہاتھ اور شرافت سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضامن رضوی کی سفارش کے باوجود میں ریوالور کا لائسنس ملنے کے بارے میں بہت زیادہ پُرامید

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں تھا۔ ایسے ہی یہ ریوالور ملنا غیبی امداد کے سوا کیا سمجھا جا سکتا تھا۔ اتفاقات کا یہ طویل سلسلہ کس کا انتظام تھا جس نے ہمیں دوبارہ اس کوٹھی میں آنے پر مجبور کیا۔ دشمنوں کو ہمارے تعاقب میں پہنچایا۔ وہ جاتے ہوئے ہمیں اسی جگہ بندھا ہوا نہیں چھوڑ کر گئے جہاں سے ہم ہوش میں آتے ہی اٹھ کر باہر جا سکتے تھے اور انہوں نے ہمیں قید بھی کیا تو اسی باتھ روم میں۔

میرا ذہن ان دلائل کو تسلیم کرنے پر بضد تھا لیکن ایک خلش سی باقی تھی کہ کوئی جواز ہمارے جرم کو بے گناہی کی سند نہیں دے سکتا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں چوری اور ناجائز اسلحہ رکھنے کی سزا پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ شاید میں ریوالور کو واپس وہیں رکھ دیتا مگر محسن نے اچانک کہا "یار سکندر! میرا خیال ہے یہ وہی ریوالور ہے جو استاد پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ تونے تو زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ سائلنسر لگا دیا جائے تو یہ وہی ریوالور ہے۔"

"اتنا تو مجھے بھی خیال ہے کہ وہ اعشاریہ تین دو کا کچھ اسی قسم کا ریوالور تھا۔" محسن نے کہا اور ریوالور میری طرف بڑھایا۔ "بس سائلنسر ہٹا لیا گیا ہے۔"

میں نے ریوالور کو غور سے دیکھا۔ "اس نے دو گولیاں چلائی تھیں۔ اگر اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہوئیں تو یہ ایک ثبوت ہوگا۔" لیکن چیمبر کھول کر دیکھنے پر مجھے دو کی جگہ تین گولیاں کم نظر آئیں۔ پھر میں نے ریوالور کا دستہ دیکھا تو مجھے اس پر خون کا ہلکا سا نشان نظر آیا۔ یہ خون مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کو انگلی سے چھو کر دیکھا اور میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میری انگلی پر ایک بال بھی آ گیا جس کا رنگ ہلکا بھورا تھا بالکل محسن کے بالوں جیسا۔

"یہ ہم بعد میں سوچیں گے محسن کہ وہ لوگ ریوالور یہاں کیوں چھپا گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ریوالور وہی ہے۔"

"اس سے وہ مسئلہ تو حل نہیں ہوتا جو فوری طور پر درپیش ہے یعنی بخیر و عافیت باہر نکلنے کا۔" محسن نے کہا۔

"دو فائر کر کے نٹ بولٹ اڑائے جا سکتے ہیں۔" میں نے جھوٹ موٹ کا نشانہ لیا۔ "اس سے باہر کی کنڈی ٹوٹ جائے گی لیکن فائر کی آواز پر کوئی آ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہمیں خاموشی سے نکلنا ہے اور باہر سے اپنا سامان بھی سمیٹنا ہے وہ سب کچھ جو انہوں نے لفافے کی تلاش میں بریف کیس میں سے بیڈ پر الٹ دیا تھا۔"

"تیرا کیا خیال ہے وہ سب چیزیں وہیں پڑی ہوں گی؟" محسن نے کہا۔ "وہ نقد رقم تو ضرور لے گئے ہوں گے۔"

"یہ سب تو باہر نکل کے پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔ "اس دروازے کی ساخت پر غور کر۔ اس میں نیچے سے اوپر تک بارہ پینل بنے ہوئے ہیں۔ پورا پٹ ایک نہیں ہے۔ ہر پینل تقریباً ایک فٹ لمبا اور چوڑا ہے۔ درمیان میں سے ابھرا ہوا اور کناروں پر سے کچھ گہرا۔ اگر ہم کنڈی کے نیچے یا اوپر والے کسی پینل کو توڑ سکیں تو ہاتھ باہر نکال کے کنڈی کھول سکتے ہیں اور پینل کے کنارے کچھ پتلے ہیں۔"

"ہاں۔ مگر اس کے باوجود مکا مارنے سے نہیں ٹوٹیں گے۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمارے پاس کوئی چیز ہوتی..." اس کی نظر غسل خانے کا طواف کرتے ہوئے ایک جگہ ٹھہر گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ "ڈبلیو سی" کے اوپر فلش ٹینک اسٹین لیس اسٹیل کا تھا۔ محسن نے اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا تو ٹینک کا پانی تیزی سے خارج ہوا۔ ڈھکن خاصا وزنی تھا اور اس کے نیچے کی طرف ربر کے واشر والا وہ پسٹن جیسا اسٹاپر تھا جو ایک بلر ہینڈل گھمانے سے اٹھتا تھا تو ٹینک کا پانی نیچے والے پائپ سے بہنے لگتا تھا۔ خالی ہو جانے کے بعد یہ پسٹن پھر سوراخ کو بند کر دیتا تھا اور ٹینک دوبارہ بھرنے لگتا تھا۔ اندر والے حصے میں لمبی سی ڈنڈی سے منسلک وہ المونیم کا ہلکا پھلکا گولا بھی تھا جو پانی کی سطح کے ساتھ بلند ہوتا تھا اور ایک خاص سطح تک اٹھنے کے بعد ٹونٹی بند کرتا تھا مگر اس نازک سی چیز کو مگدر کی طرح استعمال کیا جاتا تو گولا پچک جاتا۔ فلش ٹینک کا ڈھکنا موزوں ترین چیز ثابت ہوا۔ محسن نے اس کے ہینڈل جیسے حصے کو موڑ دیا اور ڈھکن کو لمبائی کے رخ پکڑ لیا۔ اس کے مڑے ہوئے کناروں نے ڈھکن کو خاصی مضبوطی عطا کر دی تھی۔ محسن نے ناپ تول کے پہلی ضرب لگائی اور اس سے اتنی آواز پیدا ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے ہم خود ٹھٹھک کر رک گئے۔ پھر میں نے پینل کو دیکھا۔ اس کی لکڑی پر چوٹ سے نشان پڑ گیا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ شور تو ہوگا لیکن تذبذب میں تاخیر ہوگی اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ محسن نے سر ہلایا اور پوری قوت کے ساتھ لکڑی کے پینل پر حملہ آور ہوا۔ پینل درمیان میں سے کریک ہوا اور پھر اس کا آدھا حصہ نکل کے باہر جا گرا۔

محسن نے جلدی سے ڈھکن نیچے رکھا اور باہر ہاتھ نکال کے کھٹ سے کنڈی کھول دی۔ شور نے ابھی تک کسی کو متوجہ نہیں کیا تھا۔ ہم نے تیزی سے بیڈ کا رخ کیا جس پر بریف کیس اوندھا پڑا تھا اور تمام سامان بکھرا ہوا تھا خلافِ توقع وہ سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔ استاد پیڈرو وہ مجرم تھا جو ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کام کرتے ہیں اور ایک وقت میں ایک مقصد کے لیے۔ اس کو لفافے کی جستجو تھی نوٹوں کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا ہوتا تو جاتے جاتے مالِ مفت ضرور سمیٹ کر لے جاتا۔ میں نے سب چیزوں کو بریف کیس میں ڈالا اور ہم اس کمرے سے نکل آئے جو زلزلے کے بعد کی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ بیرونی دیوار اور کوٹھی کی دیوار کے درمیان پتلی سی گلی تھی جس میں رنگین طوطوں کے دو پنجرے تھے لیکن ایک پنجرہ خالی تھا۔ دوسرے میں زرد اور نیلے پروں والا ایک ہی طوطا اداس بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں وہ نر تھا یا مادہ تھی جس کا ساتھی داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ مرزا غالب نے مجھے یاد دلایا۔ اسیر ہم سب ہیں۔

"السلام علیکم!" کسی نے تیز باریک آواز میں یوں کہا کہ میں اچھل پڑا۔ مگر سلام کرنے والا ایک دیسی طوطا تھا جو گنبد نما پنجرے میں جھول رہا تھا۔ اس نے جواب نہ پا کے پھر حیرت انگیز طور پر انسانی آواز سے ملتی جلتی آواز میں کہا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" میں نے پنجرے کے قریب جا کے کہا۔ "کیا حال احوال ہیں جناب کے؟"

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے فوراً جواب دیا۔ کسی نے بڑی محنت سے یہ جملے رٹائے تھے۔

"اس طوطے کو ریسپشن پر بیٹھ کے آنے جانے والوں کو ٹالنے کی تربیت دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا حافظ۔" طوطا بولا۔ "گھر پر تو کوئی نہیں ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "کمال ہے یار!" میں نے کہا۔ "دروازے کے باہر کوئی سنے تو یہی سمجھے کہ انٹرکام پر کوئی بچہ بول رہا ہے۔"

"ہاں بہت سے لوگ کال بیل کے ساتھ ہی یہ سسٹم رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ گیٹ تک بلاوجہ نہ آنا پڑے اندر ہی سے سب پوچھ لیا جائے۔ یہ کام یہاں طوطا کر رہا تھا۔" ہم دونوں آگے چل پڑے۔ طوطے نے مزید کچھ نہیں کہا۔

"لیکن یار! آج جب ہم اندر آئے تھے تو اس نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔" محسن بولا۔ "میں نے تو اس کی آواز بھی نہیں سنی۔"

"میرا خیال ہے پنجرہ پہلے گیٹ کے پاس ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل رات ولارڈ اینڈ کمپنی نے اس کو وہاں سے ہٹا کے ادھر لٹکا دیا ہوگا۔ طوطے نے ان سے بھی بات کی ہوگی۔" نالے میں چلتے چلتے رک گیا۔ آٹھ فٹ چوڑی گیلری میں انڈر گراؤنڈ ٹینک بھی تھا لیکن اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا جو غیر معمولی بات تھی۔ لوگ ٹینک کے پانی کو گرد و غبار اور کوڑے کچرے سے صاف رکھنے کے لیے ہمیشہ بند رکھتے ہیں۔ میں نے دو فٹ کے مربع سوراخ سے اندر جھانکا تو مجھے پانی میں آسمان کی نیلاہٹ اور درختوں کی سرسبزی کے درمیان اپنا عکس دکھائی دیا۔ پھر میرے ذہن کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنی صورت کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ وہ میرا چہرہ نہیں تھا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تو جھانک کے دیکھ اس میں، یہ میری نظر کا دھوکا ہے یا..."

محسن نے جھک کر دیکھا اور میں نے اس کی صورت کے تغیرات کو دیکھا۔ ایک منٹ بعد وہ سیدھا ہوا تو میں نے پھر جھانکا اور اس مرتبہ مجھے پانی میں تیرتے ہوئے شخص کا چہرہ صاف دکھائی دیا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس نے خاکی رنگ کی واسکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ ٹینک چھ فٹ گہرا تھا مگر اس میں پانی کی گہرائی آدھی بھی نہ تھی چنانچہ اس کی لاش بڑے مضحکہ خیز انداز میں تہہ سے جا لگی تھی۔ یوں کہ اس کے دونوں پیر ایک دیوار پر ٹک گئے تھے اور پانی سے باہر تھے۔ غور سے دیکھنے پر مجھے پانی کا رنگ بھی سرخی مائل نظر آیا اور میں نے اس کی کنپٹی کے پاس سیاہی مائل سرخ دھبہ سا دیکھا۔ چیمبر میں تین گولیاں کم ہونے کی وجہ اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ پہلی گولی کا نشانہ گزشتہ رات یہ چوکیدار بنا تھا جو خالی کوٹھی کی حفاظت پر مامور تھا۔

"السلام علیکم۔" طوطے نے کہا اور ہم یوں چونکے جیسے اس نے نہیں گھر کے کسی فرد نے ہمیں اس فرض شناس جانثار کی لاش کا تماشا کرتے پکڑ لیا ہے۔ ہم تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف لپکے۔ "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" طوطے نے چلا کر کہا۔ ہم گیٹ کھول کر باہر آ گئے اور خاموشی سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سڑک پر چلنے لگے۔ دور سے طوطے کی آواز آئی "گھر پر کوئی نہیں ہے۔" "ہاں۔ گھر پہ کوئی نہیں ہے۔ سوائے ایک لاش کے۔"

"اب تو ساری بات صاف ہو گئی ہے۔" محسن نے کافی دور نکل آنے کے بعد کہا۔ "کہ دلاور نے اتنی بے خوفی کے ساتھ یہاں تمہارے ساتھ ڈرامہ کیسے کیا تھا۔ چوکیدار کو شاید مزاحمت کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔ کسی نے پیچھے سے آ کے اسے دبوچ لیا ہوگا اور کنپٹی پر ریوالور رکھ کے فائر کر دیا ہوگا۔ غریب کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی ہوگی۔"

"اور ریوالور کو باتھ روم میں چھپانے کا مقصد بھی اب سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے چوکیدار کو مار کے ٹینک میں ڈال دیا اور ریوالور باتھ روم میں ایسی جگہ رکھ گئے کہ لاش کی دریافت کے بعد پولیس تلاشی لے تو آلۂ قتل برآمد ہو جائے۔ الزام کسی پر نہ آئے۔ گھر کا مالک تو ثابت کر سکتا ہے کہ وہ کہاں لوکیشن شوٹنگ میں مصروف تھا اور اس کے کتنے گواہ ہیں۔ پولیس عموماً ذاتی دشمنی کا کیس بنا کے نامعلوم قاتلوں کو تلاش کرتی ہے اور واجبی سی کارروائی کے بعد داخلِ دفتر کر دیتی ہے۔"

"دلاور کو یہ بات معلوم ہوگی کہ صاحبِ خانہ کے کب تک لوٹنے کا امکان نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "عموماً فلمی صفحے پر اخبارات مختصر خبر دے دیتے ہیں کہ فلمی دنیا کی مصروفیات کیا ہیں۔ شاید اس ہدایت کار کے بارے میں بھی خبر ہوگی کہ ان کا یونٹ کہاں گیا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ کسی نے ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیڈ رسوا اور اس کے ساتھی ناکام ہو کے جاتے وقت ہمیں قتل بھی کر سکتے تھے یا ہمیں اس طرح باندھ کے جا سکتے تھے کہ ہم ہل بھی نہ پاتے اور پولیس آ جاتی۔ وہ جانتے ہوں گے کہ ہم ہوش میں آ کے نکل جائیں گے لیکن فوراً نہیں۔"

"دلاور نے مجھے ایک مہینے کی مہلت دی ہے۔ آدمی قول کا پکا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ ایک فرلانگ سے زیادہ پیدل سفر کرنے کے بعد ہمیں جھونپڑے جیسا ایک تندور ملا جو ایک خالی پلاٹ پر ناجائز قبضہ کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ عارضی قسم کی دیواریں جو دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور ٹین کی پرانی چادروں کی چھت جس پر خالی کریٹ، پرانے ٹائر اور خشک پتوں کے ڈھیر تھے۔ تندور کے مالک کو تجربہ ہوگا کہ کبھی نہ کبھی پلاٹ کا مالک کوٹھی کا نقشہ لے کر آ پہنچتا ہے تو تعمیر سے پہلے تخریب کا عمل شروع ہوتا ہے اور بزنس کو کسی

دوسرے خالی پلاٹ پر لے جانا پڑتا ہے چنانچہ بائیں لکی تزئین و آرائش پر وقت، توانائی اور پیسہ صرف کرنا فضول ہے۔ اس نے ایک ٹین پر "خانہ بدوش ہوٹل" بقلم خود لکھ کر دیا تھا۔ باقی اشتہار وہ خود تھا۔ جب ہم نے اس جائے سرائے فانی میں قدم رکھا تو مزدور اور فقیر ٹائپ لوگ ناشتہ فرما کے جا چکے تھے اور اندر مکمل تخلیہ تھا۔ بنچوں پر آمنے سامنے بیٹھ کے ہم نے مدہوش شرابی کی طرح ڈولتی میز پر رکھے جگ کا میلا جگ اٹھایا اور اس سے پیچ کرتے ہوئے گلاس میں پانی پیا جسے مالک ہوٹل ہٰذا نے ہینڈ پمپ سے تازہ تازہ برآمد کیا تھا۔ وہاں بچی ہوئی نیم گرم روٹیاں اور چنے کی "دال فرائی" کھا کے ہمیں جو لطف آیا وہ اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ میں پُرتکلف لنچ کھا کے نہیں آیا تھا۔ بھوک سے ہمارا حال بُرا تھا اور نفسیاتی محاذ پر دشمنوں کو ایک شکست دے کر ہم خاصے مطمئن تھے۔ ہم ایک خطرناک صورتِ حال سے نکل آئے تھے اور اب نہتے بھی نہیں تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی جس میں ہر چیز خوب تھی۔ اسے خوب ابالا گیا تھا۔ اس میں خوب چینی ڈالی گئی تھی اور خوب دودھ ڈال کے مضرِ صحت ہونے کے بجائے ایک ٹانک بنا دیا تھا۔ ہم نے چائے کی جگہ مجبوراً یہ ٹانک پیا جس کی حرارت ہمارے جسم میں منتقل ہوئی تو ہم نے خود کو بہت تازہ دم محسوس کیا۔ اس دوران ہم نے دن بھر کا مسلا ہوا کھنچا سمیٹا ہوا سمیٹ کر کھولا ہوا داغ داغ، شکن شکن اور خستہ تن اخبار دیکھا اور میں نے محسن کی توجہ ان دو بدمعاشوں کی نہر سے برآمد ہونے والی لاشوں کی خبر کی طرف دلائی۔ محسن نے خبر کو دو مرتبہ غور سے پڑھا اور اخبار رکھ دیا۔

"یار سکندر! وقت کتنا ستم ظریف ہے۔" محسن نے اداس ہو کے کہا۔ "کتنے دن کی بات ہے کہ ہم بے فکری سے ولایت میں تعلیم کے نام پر عیش کرتے تھے اور اپنی خوش بختی پر ناز کرتے تھے۔ انگریز لڑکیوں سے معاشقے لڑاتے تھے اور فردا و غمِ دوش، دونوں سے ناآشنا تھے۔"

"ہاں۔" میں نے گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے جنگل میں گم ہو کے کہا۔ "اور اب میں ایک قاتل ہوں۔ قانون کی نظر میں صرف ایک میر شرافت علی کا، لیکن درحقیقت کتنے لوگوں کا خونِ ناحق میری گردن پر ہے۔ سلامت شاہ میرے ہاتھ سے مارا گیا۔ منشی جسے ہم کسی آشنائی کے بغیر بے تکلفی سے مذاق میں فوما چو کہتے رہے میری خاطر جان سے گیا۔ یہ دو بدمعاش بھی انسان تو تھے جو میرے ہاتھوں قتل ہوئے

وہ چوکیدار جس کی لاش اس وقت بھی۔۔۔"

"سکندر! دل چھوٹا نہ کر اور مایوسی کی باتیں نہ کر۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "حالات پر کس کا اختیار ہے۔ ہم مجبور تھے یا کر دیے گئے تھے۔ بقا کی جنگ ہو تو ہر قانون ہمیں اپنے تحفظ کے لیے جدوجہد کا حق دیتا ہے، خواہ وہ ملک کا ہو یا معاشرے کا۔ اخلاقی ہو یا مذہبی۔ ہم آج بھی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو، ظالموں کو سزا ملے اور ہمیں ہمارا حق ملے۔ کیا ہم غلط کر رہے ہیں؟ ہم نے کب چاہا تھا کہ اس زندگی کی روش بدلے جو اچھی گزر رہی تھی۔ آج بھی اگر کوئی غیبی قوت اس سب کو بے وجود اور بے حقیقت کر دے جو ہو چکا ہے اور ہمیں وہی زندگی لوٹا دے۔ سب پھر ویسا ہی ہو جائے جیسا تھا۔ آنکھ کھلے تو ہم دیکھیں کہ اسی ہوسٹل کے کمرے میں ہیں اور صبح ہو چکی ہے۔ چیپل کے گھنٹے بج رہے ہیں اور شبِ گزشتہ کا خواب پریشان ہو چکا ہے۔ تو کیا اس احساس سے حاصل ہونے والے اطمینان کی مسرت سے بڑی دولت کوئی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں، یہی تو ہمارا عذاب ہے کہ ہم خواب سے نہیں گزر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تو آنے والے دن سے بہت ڈرنے لگا ہوں محسن۔ معلوم نہیں مقدر کی یہ سختی اور آزمائش و ابتلا کا یہ دور مستقبل پر کہاں تک محیط ہے۔"

"ہماری نیت صاف ہے اور ہمارے عزائم غلط نہیں۔ ہم اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہیں لیکن سفاک خون آشام درندے نہیں بنے ہیں۔ ہم اندر سے آج بھی وہی ہیں۔ ہمارے یقین اور اعتقاد کے سب معیار پرانے ہیں اور ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔"

"اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے مت دیکھ۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھ کہ دنیا کو ہم کیا نظر آتے ہیں اور دنیا ہمیں کس نظر سے دیکھتی ہے۔ تیرا تو پھر بھی ایک گھر ہے اور تجھے رشتوں کا تحفظ حاصل ہے۔ میری دنیا کیا ہے۔ خوف اور بے یقینی اور عدمِ اعتماد۔ اگر میں اپنے آپ کو قانون کی نظر میں بے گناہ ثابت نہ کر سکا تو یہ سہارے بھی سوت کے دھاگے ثابت ہوں گے، جو آج میسر ہیں۔ سزائے موت شاید

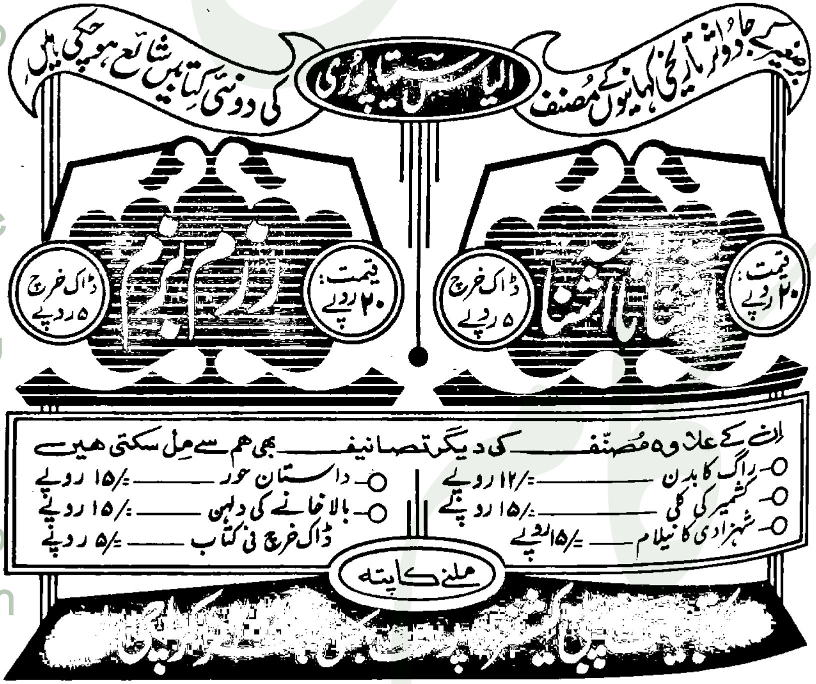

تجھے نہ ہو عمر قید یا سات سال کی قید با مشقت تو ضرور ہو گی۔ سات سال تک کون سا رشتہ استوار رہے گا۔ ایک تیری دوستی کا، تو مجھ سے ملنے آتا رہے گا۔ ہفتے میں ایک بار، پھر مہینے میں ایک بار، پھر سال چھ مہینے میں ایک بار، اور جب بالآخر میری رہائی کا دن آئے گا تو میں باہر کی دنیا میں آ کے سوچوں گا کہ اب کدھر جاؤں۔ تو اپنے گھر میں آباد ہو گا۔ تجھے تیرے بیوی بچوں کے سامنے شرمسار کروں؟ نہیں۔ فوزیہ اپنے شوہر کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہی ہو گی اور سکندر بخت کے خیال سے خوف زدہ رہنا بھی بھول گئی ہو گی۔ اس کے سامنے جا کے اسے دہشت زدہ کروں؟ نہیں۔ عبدالودود منظر ہائیکورٹ کا جج ہو گا۔ سزا کاٹ کے جیل سے نکلنے والا مجرم اس سے چیمبر میں جا کے برسوں پرانے تعلق کی بنیاد پر گلے ملنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ نہیں۔ اور رابعہ۔ اس کی ماں نے کہا تھا وہ بھی تو عورت ہے۔ اگر اسے کوئی شریک سفر نہ ملا تو وہ پتھر کی چٹان بن چکی ہو گی۔ جذبات سے عاری اور بے حس۔ پی ایل ڈی کی ایک جلد۔ ضابطۂ فوجداری و تعزیرات کی دفعات کا چلتا پھرتا مجموعہ۔"

"چل اٹھ یہاں سے۔ تجھ پہ شدید قنوطیت کا دورہ پڑ گیا ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"قنوطیت؟ کیا تیرا خیال ہے میں حقیقت کی بات نہیں کر رہا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟" میں نے اسے روک لیا۔ "یا نہیں ہو گا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "ہو سکتا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ "لیکن پُرامید رہنا اچھا ہے کہ ہو گا نہیں۔"

شام تک ہم اس سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گئے جو ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی کے عقب میں گیراج کے ساتھ واقع تھا۔ دو کمروں کے اس کوارٹر میں تمام ضروریاتِ زندگی فراہم تھیں۔ ایک کمرہ پہلے سے ان کے ڈرائیور کے تصرف میں تھا چنانچہ ہم دونوں کو ایک ہی کمرے میں دو چارپائیاں لا کے ڈالنا پڑیں، گدے اور تکیے خریدنے پڑے۔ اپنی ضرورت کا بہت سا اسباب ہم نے رات ہونے سے پہلے فراہم کیا جس میں چائے وغیرہ بنانے کا سامان شامل تھا۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے طے کیا کہ ناشتہ خود بنائیں گے اور دونوں وقت کا کھانا باہر کھائیں گے۔ ضامن رضوی کا ڈرائیور ایک کانسٹیبل تھا جو رات تک غیر حاضر رہتا تھا اور اس کا کھانا پینا شاید رضوی صاحب کے گھر پر تھا چنانچہ باورچی خانہ خالی تھا۔ ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ان پر بوجھ بنیں۔ وہ اخلاقاً ہمیں جگہ دینے پر رضامند ہو گئے تھے لیکن ان سے زیادہ توقعات [illegible] کرنا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال ایک ذمے دار پولیس [illegible] تھے اور اپنی حدود سے تجاوز کر کے ہمارے لیے کچھ نہیں [illegible] سکتے تھے۔ کھانے پکانے کا جھنجھٹ ہمارے بس کی بات نہ تھی لیکن ناشتہ آسان تھا اور وقت بے وقت چائے [illegible] یا کافی کی خاطر دور کہیں جانے سے باورچی خانے تک [illegible] کے اپنی ضرورت پوری کرنا بھی آسان کام تھا۔ کوٹھی اس [illegible] پُرسکون چھوٹی سی سڑک پر واقع تھی جسے کچھ لوگ بالسون [illegible] والی سڑک بھی کہتے تھے اور جو دھرمپورہ ریلوے کراسنگ [illegible] بعد دائیں طرف نکلتی تھی تو سیدھی گورنر ہاؤس تک جاتی تھی۔ اس سڑک پر سب کوٹھیاں وسیع و عریض باغ یا لان اور چار دیواری کے حصار میں تھیں اور سڑک کے بائیں [illegible] پر واقع تھیں۔ دائیں جانب میو گارڈن کی سرسبز فصیل تھی جس میں خاردار تاروں کی باڑھ الجھی ہوئی تھی اور یہ ریلوے کے اعلیٰ افسروں کی سرکاری رہائش گاہوں کا علاقہ تھا۔ [illegible] صاف ستھری سڑکوں پر مرکری لائٹس جلتی تھیں اور داخل ہونے والے ہر راستے پر "پرائیویٹ روڈ" یا پھر "یہ شارع عام نہیں ہے" کے بورڈ نظر آتے تھے۔ قریب ترین چائے خانہ بھی دو فرلانگ دور اسکواش کورٹس کے پاس تھا اور گڑھی شاہو کا بازار تقریباً ایک میل دور تھا۔ تاہم یہ جگہ رابعہ کے گھر ریلوے اسٹیشن اور مال روڈ سے دور نہیں تھی اور تھوڑا سا چل کے ہمیں ضلع کچہری جانے کے لیے سواری مل سکتی تھی۔

رات نو بجے کھانے سے فارغ ہو کے میں نے محسن سے کہا کہ کیوں نہ رابعہ کو فون کر لیں۔ اس وقت جانا تو کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دو جگہ سے مایوس ہونے کے بعد ایک کیمسٹ نے ہمیں ایک روپیہ لے کر فون استعمال کرنے کی اجازت دی۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا لیا [illegible] میں نے اپنا نام بتایا تو رابعہ کو دے دیا۔ "سکندر!" وہ بولی۔ "عجیب آدمی ہو تم بھی، تمہیں اس طرح غائب نہیں ہو جانا چاہیے۔ اگر مجھے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کروں؟"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "دن میں جب میں آیا تھا تو بہت جلدی میں تھا۔"

"کیوں؟ آج کہاں بیٹھی تھی؟" وہ بولی۔ "میرا مطلب ہے کون سا معرکہ سر کرنا تھا؟"

"مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب [illegible] ضامن رضوی ایس ایس پی کی کوٹھی میں ہوں۔ تم فون پہ رابطہ قائم کر سکتی ہو۔"

"یہ بتاؤ اس لفافے کا کیا چکر ہے جو تم امی کے پاس چھوڑ گئے تھے؟" وہ بولی۔ "اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں بظاہر کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسے پھاڑ کے پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔"

"کیوں؟ تمہارے خیال میں اس پر نظر نہ آنے والی سیاہی سے کچھ لکھا ہوا ہے؟" رابعہ نے کہا۔

اس بات نے کچھ دیر کے لیے مجھے مبہوت کر دیا۔ "یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ یہ تو واقعی ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے۔"

وہ ہنسی۔ "مگر اس میں کوئی نظر نہ آنے والی تحریر بھی نہیں ہے۔ میں اسے گرم کر کے دیکھ چکی ہوں۔ عموماً لوگ پیاز کا عرق استعمال کرتے ہیں جو گرم کرنے سے براؤن ہو جاتا ہے۔"

"تم نے تو میرے ذہن کو اس مسئلے کا حل بتا دیا ہے جو اک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔" میں نے کہا۔ "اب میں دوسرے امکانات پر بھی غور کر رہا ہوں۔"

"ٹیلی فون لائن پر کب تک غور کرو گے؟" وہ ہنسی۔ "یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ ہم دونوں مل کے غور کریں گے۔"

جس انداز سے اس نے "ہم دونوں" کے الفاظ استعمال کیے تھے وہ ایک واضح اشارہ تھا کہ دعوت صرف مجھے دی گئی ہے اور عقلمند را اشارہ کافی است، چنانچہ مجھے محسن کو ساتھ نہیں لانا چاہیے، لیکن میں اس قسم کی صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کہا۔ "اس وقت؟ تمہیں کوئی کام نہیں ہے یا نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"دونوں باتیں ہیں۔" وہ بولی۔ "امی کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ شاید مجھے رات بھر جاگنا پڑے۔"

"اچھا۔" میں نے مجبور ہو کے کہا۔ "میں آتا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دکان سے باہر آ کے میں نے محسن سے کہا کہ مجھے رابعہ نے بلایا ہے۔

محسن ذہین آدمی ہے اس نے نوٹ کر لیا کہ میں نے "ہمیں" کے بجائے "مجھے" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس نے صورت سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"تو چلا جا بھیا۔" اس نے جماہی لے کر کہا۔ "ہم تو تھک گئے ہیں لمبی تان کے سوئیں گے۔ ویسے بھی وہ لڑکی تیرے چکر میں ہے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ "کیا چوہد کی داڑھی اور تنکے والا کیس ہے؟ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے صرف تجھ سے کام ہے۔"

"نہیں، تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ شک مجھے بھی ہے کہ رابعہ میرے چکر میں ہے۔"

"یہ بڑا غلط چکر ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو پہلے ہی بہت سے چکروں میں ہے۔ مجھے تو اعتماد ہے تجھ پر لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا محسن؟" میں نے کہا۔ "لیکن کے بعد کیوں رک گیا تو؟ اس کے بعد بھی جو کہنا تھا کہہ دے۔ تجھے ڈر ہے کہ میرے حوصلہ شکن رویے کا اثر مقدمے پر پڑے گا؟ اول تو یہ بات بعید از قیاس ہے کہ رابعہ مجھ سے مایوس ہو تو مجھے بچانے کی کوشش ترک کر دے اور خدانخواستہ اس کی محبت نفرت میں بدل جائے تو وہ میری دشمنِ جاں ہو جائے۔ بلاشبہ عورت ذات سے اس قسم کے انتقامی ردِعمل کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن برادر اوّل تو رابعہ اس قسم کی لڑکی نہیں۔ اس کے علاوہ، مرد ہو یا عورت، کوئی وکیل اپنے ذاتی جذبات کو اپنی اخلاقی و قانونی ذمے داریوں پر حاوی نہیں آنے دیتا۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ پھر بھی تیرے لیے ایک جذباتی الجھن تو پیدا ہو سکتی ہے؟"

"الجھن ہمیشہ قوتِ فیصلہ یا خود اعتمادی میں کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی تک کسی الجھن کا شکار نہیں۔ جب تک خود فوزیہ کی طرف سے یا اس کے والدین کی طرف سے الجھن پیدا کرنے والی بات نہیں ہو گی میں یہ سوچوں گا بھی نہیں کہ کل کیا ہو گا۔ سیدھی صاف بات ہے محسن کہ میں اس معاشرے کے ہر فرد کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ میں کسی سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ —— مروجہ اخلاقی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دے۔ مجھے سزا ہو گئی تو یہ قصور میرا ہو گا۔ ایک سزا یافتہ شخص سے کوئی بھی عہدِ وفا استوار رکھنے کا پابند نہیں۔ کچھ رشتوں کی آبرو ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کی خاطر بھی نہیں۔"

"تیری حقیقت پسندی پہ مجھے رشک آتا ہے سکندر! تو ہر صدمہ جھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خوابوں کی جنت میں رہنے والے عملی زندگی کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو جی نہیں پاتے۔" محسن نے کہا۔ "ایک بات کہتا ہوں جو تیرے مفاد میں ہے۔ اس سے کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ ابھی رابعہ کے جذبات کی دنیا پر اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم مت پھینکنا۔ یہ دنیا، کوئی بھی دنیا جب تک آباد رہے اچھا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ اسے جھوٹی امیدوں کے طلسم میں گرفتار

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رکھوں۔ میں نے یہ دھوکا دینا نہیں سیکھا محسن!"

"کوئی جھوٹی امیدوں کے آسرے پر زندہ ہو تو اسے قبل از وقت ناامیدی کا زہر دے کر مارنے سے کیا حاصل۔ سرطان کے مریض کو یہ کون بتاتا ہے کہ اسے اب کتنے دن اور جینا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور کیا جھوٹی امیدوں کا سچ ہونا اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا؟"

وہ اچانک پلٹا اور چلا گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کی بات کا صحیح مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالباً اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ فوزیہ نہیں ہو گی تو رابعہ میرا سہارا بن سکے گی۔ فوزیہ کا نہ ہونا بعید از امکان نہیں۔ محسن کے الفاظ میں اتنا ناممکن نہیں جتنا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ مجھے محسن پر ترس آیا جو دوستی کے رشتے اور خون کے رشتے کی کشاکش میں خود کو سلامت رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، بیوقوف۔ دنیا کی سوچ کا دھارا حالات کے ساتھ بدلتا ہے۔ اس کا ذمے دار وہ خود کو کیوں سمجھتا ہے۔

رابعہ کے گھر میں اوپر کے ایک کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ نیچے اس کے آفس اور اسٹڈی روم میں روشنی تھی مگر وہ خود لان پر کرسی ڈالے اور دوسری کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔ برائے نام اجالے میں جو ادھر ادھر سے منعکس ہو رہا تھا میں نے اسے دیکھا ہی نہیں اور سیدھا اندر جانے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے آواز دی تو میں چونک کر پلٹا اور لان پر جا پہنچا۔

"یہ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "گیان دھیان یا فکرِ سخن؟"

"اس وقت تو دل چاہ رہا تھا کہ بالکل خالی الذہن ہو کے بیٹھوں۔" وہ ہنسی۔ "آدمی کبھی کبھی اپنے خیالات سے بھی نجات چاہتا ہے۔"

"لوگ تو زندگی کے مسائل سے گھبرا کے خیالوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ان کے خیالوں کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں سارا دن جن مسائل پر سوچتی ہوں وہ ذہن کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ جب ان مسائل سے فرصت ملتی ہے تو میرے پاس کوئی بھی دوسری زیادہ خوبصورت خیالات کی دنیا نہیں ہوتی جو مجھے پناہ دے سکے۔ تنہائی میں ذہن پر یلغار کرنے والے خیالات کون سا سکون دیتے ہیں یا خوشی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اس سے تو کچھ نہ سوچنا اور خالی الذہن رہنا کہیں بہتر رہتا ہے۔ ویسے بھی مجھے اندھیرے سے پیار ہے۔"

"اس عمر میں تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگ… رابعہ!" میں نے کہا۔ "اندھیرا خود تم نے اپنے گرد مسلط کر رکھا… اجالا اگر تمہاری دسترس میں ہے تو اسے کیوں دور سمجھتی… نکل کے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے اور خوبصورتی… کی نعمتوں کا نام ہے جو تمہیں میسر ہیں۔ عزت، دولت… سارا زمانہ ان چیزوں کے حصول کے لیے دیوانہ وار سرگرداں… ہے۔ تمہارے پاس کار ہے، کوٹھی ہے، ذہانت ہے، حسن ہے… تمہاری خوش قسمتی پر حسد کرتے ہوں گے۔ تم نے یہ راہبانہ… کیوں اختیار کر لی ہے؟"

"اپنی زندگی کے تجربات کے آئینے میں میری ز… کا عکس مت دیکھو سکندر!" وہ بولی۔ "تم مرد ہو۔ تمہارے لیے اکیلا رہنا آسان ہے۔ میرے ارد گرد کی دنیا میں اکیلی… کی حیثیت بھیڑیوں میں گھر جانے والی بھیڑ جیسی ہے۔ میں… کروں۔ کار لے کر سڑکوں پر آوارہ گردی کروں؟ کیلی کسی… میں جا بیٹھوں؟ کسی کلب میں لاوارث پھروں۔ میں نے… ایک بار یہ غلطی کی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ… فراخدل ہوتے ہیں اور عورت کی عزت کر سکتے ہیں۔ میرے… کچھ ہم پیشہ افراد واقعی تعلیم یافتہ، روشن خیال اور شریف… ان کے ساتھ میں نے کبھی شام کی چائے پی لی یا رات کا کھا… کسی ہوٹل میں کھا لیا تو کیا بہت غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ حرکت کی؟ کیا انہوں نے اخلاقاً اپنا فرض سمجھتے ہوئے بل ادا کر دیا تو اس کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ مجھے توفیق… لیکن مشہور یہی ہوا، گویا میں نے خود کو ایک وقت کے کھانے کے عوض بیچ دیا۔ کمینے لوگوں نے جو باتیں کیں مت پوچھو۔ مجھ پر انکشافات ہونے لگے کہ میرے فلاں جج سے اور فلاں جج کے وکیل بھائی سے مراسم ہیں، اس لیے میں فلاں مقدمہ جیت گئی۔ اس کے علاوہ ہمارے جاہل اور دولت مند… ہیں۔ میرے فرسٹ اور سیکنڈ کزن۔ انہوں نے کبھی… نہیں لگایا تھا اور میں ان کے کردار سے بخوبی واقف… بعد میں وہ ڈھیٹ بن کے آ پہنچے اور میں نے ان کو دھتکا… نہیں۔ ان کی ہر ممکن مدد کی اور ان کے وقت بے وقت… جانے کا برا نہیں مانا۔ اس حوصلہ افزائی کا غلط نتیجہ یہ نکلا… ان کی مائیں پیغام لے کر آ گئیں۔ ان کے گھروں کا ماحول… کہ وہاں میں شوہر کے پاؤں کی جوتی ہوتی۔ ساس کی… کی خانہ جنگی کا شکار ہوتی اور دو چار سال بعد دو چار… جاتے تو شوہر بہادر حکم صادر فرماتے کہ بس بہت ہو… وکالت۔ اب گھر کی ذمے داریاں سنبھالو۔ وہ وعدہ…

ے لیے نہیں تھا کہ پریکٹس پر پابندی نہیں ہو گی۔ میں کیا کرتی؟ اپنا طلاق کا حق مہر کا اور بچوں کی ملکیت کا مقدمہ لڑتی ہو وکالت کے یے سب کو چھوڑتی یا سب کے لیے وکالت کو؟ ان سب کو انکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پہلے سے زیادہ ہماری عزت کے دشمن ہو گئے اور جس نے جو چاہا مشہور کیا۔ میں نے کسی کی تردید نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اکیلی رہوں گی۔"

"میں اس فیصلے کے خلاف نظرِ ثانی کی اپیل دائر کرتا ہوں۔" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی واقعی مظلوم اور میری مدد کی مستحق ہے۔ یہ قنوطیت اس کو دنیا نے عطا کی تھی اور اس کو رہبانیت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پند و نصائح اور نفسیاتی عوامل کا زبانی تجزیہ کرنے کے بجائے اسے عملی طور پر زندگی کے حسن کا احساس دلانے کی ضرورت تھی۔ میرے اس فیصلے کا محرک کوئی جذباتی ردعمل نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال عقل کی پوری توانائی اور منطقی استدلال کی ساری قوت کے ساتھ ابھر آیا تھا۔ اگر یہ عورت کسی غرض کے بغیر تمہاری زندگی بچانے کی بھرپور جدوجہد کر رہی ہے تو کیا تم اس کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کرو گے؟ میں اتنا خود غرض اور احسان فراموش نہیں تھا کہ اس سوال سے روگردانی کر سکتا اور اس ذمے داری سے بچ سکتا۔

رابعہ نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "تم؟ تم یہ اپیل کیوں کر رہے ہو؟ اور فیصلہ تو خود میری اپنی عدالت کا ہے۔"

"آئی سی۔" میں نے کہا۔ "یہ قانونی نکتہ ہے۔ گویا سماعت تم خود نہیں کرو گی۔ آل رائٹ۔ میں تمہاری طرف سے اپیل دائر کرتا ہوں اور خود اس مقدمے کی سماعت کرتا ہوں۔ تو مسماۃ رابعہ قاری! تم ہو مدعی اور مدعا علیہ۔ یہ بتاؤ تم دنیا سے کیوں ڈرتی ہو۔ اس دنیا کے چند بے ضمیر، کمینے اور گھٹیا کردار کے مالک افراد نے تمہیں بدنام کیا۔ کیا اس بدنامی سے تم نے کچھ کھویا؟ اپنی نظر میں اپنا مقام؟ اپنا عزم اور حوصلہ؟ اپنی ذہانت اور صلاحیت؟ اپنے ضمیر پر اعتماد؟"

"نو مائی لارڈ!" رابعہ ہنسی۔ "مجھے اس قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ یہ بدنامی بے بنیاد تھی۔"

"رائٹ۔ مسماۃ رابعہ قاری! کیا کتوں کے بھونکنے سے قافلہ رک جاتا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر تم کتوں کے بھونکنے کو نظر انداز کر دیتیں؟"

"مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا مائی لارڈ۔" وہ مسکرائی۔ "خصوصاً بھونکنے والے کتوں سے۔"

"گویا تمہیں علم نہیں تھا کہ جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہارا اس بات پر اعتقاد نہیں کہ عزت، ذلت منجانب اللہ ہے اور چاند پر تھوکا جائے تو تھوک اپنے منہ پر آتا ہے؟ دنیا میں کون ہے جس کی کامیابی پر حسد کرنے والوں کی تعداد خوش ہونے والوں سے زیادہ نہیں؟ لیکن بدخواہوں کی بددعا میں اثر ہوتا تو کسی ماں کا بیٹا زندہ نہ رہتا۔"

"تجربہ بہت بڑا استاد ہے یور آنر! سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔"

"وہ غلط کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ نفسیاتی مریض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ مجھے رسی نے کاٹ لیا ہے اور میں زہر پھیلنے سے مر رہا ہوں تو دنیا اسی پر ہنستی ہے لیکن وہ واقعی مر جاتا ہے۔ کیا تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ رسی سے ڈرنا چھوڑ دو؟ بھونکنے والے کتوں سے ڈر کے پیچھے مت ہٹو۔ آگے بڑھ کے ان کو دھتکار دو۔ وہ سب بھاگ جائیں گے۔ بدنام کرنے والوں سے کہو تھینک یو ویری مچ۔ مجھے نیک نامی نہیں چاہیے۔ وہ سخت مایوس ہوں گے۔ اپنی نظر آسمان کے ستاروں پر رکھو۔ زمین کے کیڑوں کی طرف مت دیکھو۔ دنیا پر ثابت کر دو کہ اکیلی عورت بھی معاشرے میں اپنا مقام خود پیدا کر سکتی ہے، اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ تم اکیلی بھی کہاں ہو۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" رابعہ نے کہا۔ "ان باتوں کا مقصد کیا ہے، محض باتیں؟"

"نہیں، دراصل آج مجھ پر بھی قنوطیت سوار تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کا احساس مجھے محسن نے دلایا۔ یہاں آ کے دیکھا تو تم قنوطیت میں مبتلا ہو۔ دو منفی قوتیں مساوی ہیں، ایک مثبت قوت کے۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ ایک مدت سے میں نے بھی دنیا کے حسن کو نظر بھر کے نہیں دیکھا۔" میں نے بہت ہمت کر کے یہ بات کہہ دی تھی۔ "ان اندھیروں کو یہیں چھوڑ دو۔"

رابعہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "اندھیرا تو کل بھی ہو گا۔"

"صاف کہتے ہوئے ڈرتی ہو کہ تمہیں اتنی رات گئے ایک غیر مرد کے ساتھ جانا منظور نہیں۔" میں نے کہا۔ "اعتماد تمہیں کس پر نہیں ہے؟ مجھ پر یا اپنے آپ پر، ایڈووکیٹ رابعہ قاری؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے، لیکن..."

"لیکن باہر کوئی دیکھے گا کہ رابعہ قاری ایک ایسے شخص کے ساتھ پھر رہی ہے جو قتل کے الزام میں ملوث ہے..."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بہت ڈر چکی ہیں دنیا سے۔ اور تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اسی طرح ڈرتی رہی تو رسی کے کاٹنے سے بھی مر جاؤں گی۔ چلو، لیکن ایک نظر ماں کو دیکھ لوں اور ذرا یہ کپڑے بھی بدل لوں۔"

"ماں کو کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "اسی ڈپریشن کا شکار ہیں۔"

"ماں کی طبیعت دو بار بگڑ چکی ہے۔ دل گھبراتا ہے اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے ویلیم دے کر سلا دیا ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔"

میں نے انتظار میں دس منٹ صرف کیے اور ایک سگریٹ ختم کی۔ میرے جذبات کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے فوزیہ میرے سامنے کھڑی مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جو چھلکنے ہی والے ہیں۔ 'بے وقوف لڑکی! یہ جو کچھ کر رہا ہوں میرا فرض ہے۔ اس کا تعلق دماغ سے ہے دل سے نہیں۔ وہ آدمی قابلِ نفرت ہوتا ہے جو خود غرضی کے باعث چاہتا ہے کہ سب اس کے لیے سب کچھ کریں مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔' میں نے فوزیہ کو سمجھایا۔ 'تمہارے حقوق الگ ہیں مگر اس احسان کے بدلے جو رابعہ مجھ پر کر رہی ہے اس کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔' فوزیہ نے بالکل زنانہ بات کی۔ 'تم کیا جانو رابعہ جیسی عورتیں غرض کے بغیر کوئی احسان نہیں کرتیں۔' میں نے کہا۔ 'لاحول ولا قوۃ۔ مجھے ہو جائے گی جیل تو رابعہ کو مجھ سے کیا ملے گا؟ اسے تو فیس ملنے کی امید بھی نہیں۔' وہ کہنے لگی۔ 'خواہ مخواہ یہ فرض اور محبت کا چکر مت چلاؤ۔ یہ دماغ اور دل کے رشتے ایک ہی ہو جاتے ہیں۔' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ 'اچھا دیکھوں گا تم میرا انتظار کرتی ہو یا نہیں سات سال تک۔'

"کس سوچ میں ہیں جناب؟" رابعہ نے کہا اور میں چونکا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اتنے کم وقت میں وہی ساڑھی باندھ لی ہے جو باندھ کے وہ مجھ سے جیل میں ملنے آئی تھی، اور میں پھر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا اور جب میں کار میں اس کے ساتھ بیٹھا تو مجھے ایک سحر آفریں خوشبو کا احساس ہوا۔ گاڑی سڑک پر آ گئی تو رابعہ نے کہا۔ "کہاں چلیں؟"

"کہاں چلیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ باغ جناح چلو۔ وہاں اچھا موسم ہوگا۔ یا ایسے ہی سڑک پر چلتی رہو۔"

وہ ہنسی۔ "مجھے اپنی ہنسی بھی اجنبی لگ رہی ہے نہیں کیوں۔ کبھی تمہیں ایسا احساس ہوا ہے زندگی میں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک متعصب انگریز لارڈ مجھ سے کاؤنٹی جیل میں ملنے آیا تھا اور کیسے اس نے مجھ سے ایک سودا کیا تھا۔ "اس وقت مجھے اپنی ہنسی اجنبی لگی تھی۔ معلوم نہیں میں اپنے آپ پر ہنس رہا تھا یا اس لارڈ کے غرور کی شکست پر۔"

"تمہیں اس کی بیٹی سے واقعی محبت تھی یا سوال الٹ ہو؟"

"اس کی بیٹی مجھے واقعی چاہتی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن... لیکن ہندوستان میں رہنا تھا۔ تمام زندگی میں ان متعصب اور تنگ نظر لوگوں کے درمیان کیسے گزار سکتا تھا جو میرے رنگ سے نفرت کرتے تھے اور وہ لڑکی اس ماحول میں نہیں رہ سکتی تھی۔" میں بولتا رہا، وہ سنتی رہی۔ پھر وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ ہم نے گاڑی باغ جناح میں پارک کی اور اس کی ٹھنڈی مہکتی سڑکوں پر چلتے رات کا حسن جواں ہوتے دیکھتے رہے۔ وہاں ہم جیسے اور بھی تھے لیکن ہم سب کے درمیان اور سب سے الگ باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے اپنی گزشتہ زندگی کی یادوں کے البم سے ان گنت تصویریں نکال کے دکھائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت عرصے بعد آج اسے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ بولتی تو وہ ہر روز تھی اور ہر عدالت میں بے تکان بولتی تھی مگر باتیں کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باتیں میں محسن سے کر لیتا تھا اس کے دل میں جمع ہو رہی تھیں برسوں کا غبار تھا جو آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور میں اس کے اعتماد کا اہل ثابت ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اسے فوزیہ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ میں اس سے منسوب ہوں اور اس اندیشے کا اظہار بھی کر دیا کہ یہ نسبت اب خطرے میں پڑ گئی ہے اور میں فوزیہ سے یہ توقع بالکل نہیں رکھتا کہ وہ فلمی ہیروئن کی طرح ظالم سماج کے یا والدین کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرے گی۔ رات کے بارہ بجے ہم ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل کے ریستوران میں گئے اور اوپن ایئر گارڈن لاؤنج میں بیٹھ کے کافی پیتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ غلط فہمی پیدا کیے بغیر میں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب رہا ہوں۔

رابعہ خوش تھی اور اس خوشی کا آئینہ دار رابعہ کا چہرہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے

والی مسرت کی چمک تھی۔ مسرت جس کا سرچشمہ دل کی گہرائی سے پھوٹتا ہے عورت کی ہر ادا میں رنگ بھر دیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف ایک عورت تھی حسین اور جوان۔ پُرکشش اور نازک ادا۔ صرف خوشبو اور رنگ اور نغمگی، اپنی قوتِ تسخیر پر نازاں، پُراعتماد۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش سے مغلوب اور حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے والی ہر نگاہ سے آشنا۔ اس وقت کوئی رابعہ سے پوچھتا کہ تم کون سی عورت رہنا چاہو گی؟ وہ جو تم اس وقت ہو، یا وہ جو سیاہ کوٹ پہن کے قانون کی ضخیم کتابوں کے حوالے دیتی ہے اور اپنے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دلائل اور اپنے زورِ خطابت سے، اپنی صلاحیت اور اپنی استعداد سے اور اپنی ذہانت سے سب پر چھا جاتی ہے۔ تو وہ یقیناً اس لمحے کی سب کو مسحور کر لینے والی فاتح عورت بننا پسند کرتی۔ وہ عدالت میں اپنی کامیابی پر اس کامرانی کو ترجیح دیتی جس نے اسے ایک بھولی بسری مگر بہت خوبصورت مسرت عطا کی تھی۔ جو اس کا حق تھی مگر اس نے اپنے احساسِ محرومی کو اپنا مقدر جان کے قبول کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی سطح پر وہ عام عورت سے بہت اوپر ہے۔ شاید اسی لیے وہ نک چڑھی، خر دماغ اور مغرور مشہور تھی۔ اس کی کلاس فیلوز نے ہمیشہ اسے افلاطون بننے کا طعنہ دیا اور اپنے احساسِ کمتری کے باعث اس کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ یہی صورتحال اس کے خاندان کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہوئی جو بی اے ایم اے کر کے بھی فلم اور فیشن سے آگے بات ہی نہیں کرتی تھیں۔ بعد میں یہ لڑکیاں دولت مند گھروں میں بیاہی گئیں اور ان کی زندگی کے زاویے کچھ اور بدل گئے چنانچہ ان کے اور رابعہ کے درمیان فاصلہ بھی بڑھ گیا اور وہ تنہا رہ گئی۔ مرد اسے ہمیشہ وہ ملے جن کے لیے طوائف سے لے کر ہائیکورٹ کی ایڈووکیٹ تک ہر عورت ان کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ محکوم تھی اور ان سے کمتر درجے کی مخلوق تھی۔ مرد کا یہ فطری احساسِ برتری اس معاشرے کی اقدار پر حاوی تھا اور جو عورت اس کو قبول نہیں کرتی تھی وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کے تو رہ سکتی تھی مگر ہر خوشی کو اپنا حق سمجھ کے نہیں حاصل کر سکتی تھی۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" اس نے واپسی پر کہا جب ہم باتیں کر کے تھک چکے تھے اور خاموشی سے اپنے اپنے خیالات کی زبان میں محوِ گفتگو تھے۔ "برسوں میں ذہنی ہم آہنگی اور رفاقت کا یہ احساس مجھے کبھی نہیں ہوا جو تم سے برسوں بعد مل کے اور تین گھنٹے تک تم سے باتیں کرنے کے بعد آج ہوا ہے۔ کیا یہ احساس کل بھی باقی رہے گا جب میرے اور تمہارے درمیان صرف وکیل اور مؤکل کا رشتہ رہ جائے گا؟"

"کیوں نہیں رہے گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "کیا احساس کبھی فنا ہو سکتا ہے؟ میں اور تم تو وہی ہوں گے جو اس وقت ہیں۔"

"تھینک یو۔" وہ میرے ایک بازو پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "میں یہی چاہتی ہوں۔ تم مجھے صرف ایڈووکیٹ نہ سمجھو۔ مجھے ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے۔ میرا دوست کوئی نہیں۔ مجھے کوئی اپنا نہیں سمجھتا۔ بس ایسے ہی کبھی کبھی مجھ سے باتیں کر لیا کرو۔ میری سن لیا کرو اور جب مجھ پر مایوسی اور قنوطیت طاری ہو تو اسی طرح سہارا فراہم کر دیا کرو جیسے آج کیا۔ میں اس سے زیادہ تم سے کچھ نہیں طلب کروں گی۔ اور اس سرحد کو عبور کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی جہاں سے فوزیہ کی ملکیت کی حد کا آغاز ہوتا ہے۔ میں تم سے فوزیہ کو نہیں چھینوں گی۔ وعدہ!"

"مگر کیا یہ ممکن ہوگا؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ 'میں تو اس وقت بھی رابعہ کی گرفت میں ہوں مگر فوزیہ میری گرفت سے دور ہونے لگی ہے۔ حالات میرے گرد مکڑی کے جالے کی طرح مجبوریوں کا جال بُن رہے ہیں۔ محسن نے کہا تھا ابھی رابعہ کے جذبات کی دنیا پر اپنی حقیقت پسندی کا ایٹم بم نہ پھینکنا۔ رابعہ وعدہ کر رہی ہے کہ وہ مجھ سے فوزیہ کو نہیں چھینے گی۔ وہ کسے دھوکا دے رہی ہے اور کیوں؟ محسن کسے دھوکا دے رہا ہے۔ میں کسے دھوکا دے رہا ہوں؟' میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کے ساتھ آ کے میں نے ایک جذباتی حماقت کی ہے۔ مجھے صرف اپنی زندگی سے سروکار رکھنا چاہیے تھا۔ انگریزی محاورے کے مطابق دو کشتیوں میں قدم رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔

گاڑی پھر رابعہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو میں چونکا۔

"یہ تم... میرا مطلب ہے اگر مجھے راستے میں ڈراپ کر دیتیں تو اچھا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی [illegible] دیکھی جس میں رات کے دو بج رہے تھے۔

"اگر تمہیں ایک رات بھی گیسٹ بیڈ میں گزارنے پر شدید اعتراض ہے تو میں تم کو چھوڑ آتی ہوں۔" وہ کچھ بُرا مانتے ہوئے بولی۔ اور میں نے ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو جانے کے سوا چارہ نہ دیکھا، لیکن گاڑی کے رکتے ہی خادمہ بدحواسی کے عالم میں باہر نکلی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"چھوٹی بی بی! کہاں چلی گئی تھیں آپ؟" اس نے ملامت آمیز خفگی سے کہا۔ "بیگم صاحبہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔"
میں نے رابعہ کے دمکتے ہوئے شگفتہ چہرے کو یوں مرجھاتے اور بے رنگ ہوتے دیکھا جیسے پھول کو شاخِ گل سے جدا کر کے انگاروں پر پھینک دیا جائے۔
"کیا ہوا ہے امی کو؟" اس نے خادمہ کو جھنجھوڑا جو دوپٹے کے پلّو سے آنکھوں کے آنسو صاف کر رہی تھی۔
"پتہ نہیں جی۔ ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ آپ دیکھ لیں اوپر جا کے۔" وہ بولی۔
رابعہ مجھے بھول کے اندر لپکی اور میں اس کے ساتھ رہا۔ زینے سے اوپر جاتے ہوئے ایک بار اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس ایک نظر میں سوال بھی تھا کہ کیا میں نے مسرت کے تین گھنٹے مانگ کے کوئی گناہ کیا تھا جس کی سزا قدرت اب دے رہی ہے؟ اس نظر میں التجا بھی تھی کہ مجھے سہارا دو۔ ندامت بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ پریشانی بھی تھی اور پشیمانی بھی۔ میں نے فقط سر ہلایا اور اس کے ساتھ ساتھ اوپر چلتا گیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کے وہی ڈاکٹر باہر آیا جس نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی تھی۔ اس نے ایک نظر ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔
"فون کرو اور ایمبولنس طلب کرو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تمہاری امی پہ دل کا دورہ پڑا ہے۔"
"دل کا دورہ؟" رابعہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
"شدید یا معمولی؟"
"میں اسے معمولی بھی نہیں کہہ سکتا۔" وہ اسی خشک لہجے میں بولا۔ "اہمیت اس بات کی ہے کہ ان کو جلد از جلد ہوسپٹل پہنچا دیا جائے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ بے وقوف لڑکیوں کی طرح رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"فون کدھر ہے؟" میں نے کہا اور رابعہ نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اسے اپنی ماں کی خوابگاہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور رابعہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ ٹیلیفون اس کے بیڈ سائڈ کی ٹیبل پر رکھا تھا۔ دوسری طرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ میں نے ایک ٹیوب لائٹ جلا کے اور رابعہ کے بستر پر بیٹھ کے وہ ڈائریکٹری اٹھائی جو ٹیلی فون کے نیچے والے خانے میں رکھی تھی۔ کمرے میں عجیب سی فضا قائم تھی۔ اس کے ریشمی پردوں کے رنگ۔ قالین اور اندازِ آرائش میں نسوانیت کا سحر انگیز تاثر تھا اور حواس پر چھا جانے والی نرم و لطیف خوشبو بسی ہوئی تھی۔ وہی جو رابعہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے شروع کے صفحات پر ایمرجنسی کا نمبر دیکھے اور ایک نمبر ڈائل کر کے ایمبولنس طلب کی۔ پھر میں رابعہ کی ماں کے کمرے میں پہنچا تو رابعہ بستر کے سرہانے کھڑی رومال سے آنسو خشک کر رہی تھی اور ماں کو دیکھ رہی تھی جو آنکھیں بند کیے سیدھی لیٹی کراہ رہی تھی۔
"ایمبولنس ابھی آجاتی ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ "ماں ٹھیک ہو جائے گی۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔"
اس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "یہ سب تو میری غلطی ہے سکندر! مجھے ماں کو اس حالت میں ہرگز چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں ماں کو چھوڑ کے گھومنے نکل گئی حالانکہ مجھے معلوم تھا ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اب آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا اور اس کا بازو تھام کے جھٹکا دیا۔ •
"رابعہ! تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اس وقت میں تمہیں سنبھالوں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تمہارا فرض ہے کہ میرے ساتھ مل کے ماں کو سنبھالو۔ کیا میں چلا جاؤں؟"
"نہیں نہیں۔" وہ فوراً سنبھل گئی۔ "آئی... آئی ایم سوری... ہونے والی بات تو ہوتی ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "لیکن سکندر! خدانخواستہ ماں کو کچھ ہو گیا تو کیا میں تمام عمر اپنی اس کوتاہی پر خود کو موردِ الزام نہیں سمجھوں گی؟"
"پھر وہی حماقت کی بات۔ زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم اپنے کمرے میں سوتی پڑی رہ جاتیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں یہ تو ہوا کہ خادمہ نے ماں کا خیال رکھا اور ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اب دعا کرو اور خدا سے نیک امید رکھو۔"
بیس منٹ بعد جب ہم نے رابعہ کی ماں کو اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولنس میں منتقل کیا تو وہ بدستور بے ہوش تھیں۔ ایمبولنس نے سائرن بجاتے ہوئے لاہور کی سڑکوں پر دوڑنا شروع کیا۔ یہ آواز سکوتِ شب میں بالکل موت کی بھیانک پکار بن کے گونجنے لگی اور ویران راستوں سے پہلے گزرنے کا حق مانگنے لگی۔ ڈرائیور نے عادتاً سائرن کو آن کر دیا تھا ورنہ اس وقت زندہ اور صحت مند انسان ایمبولنس کی راہ میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ اس سے فضا کچھ اور دہشت ناک ہو رہی تھی اور یہ بین کرتی ہوئی آواز خود میرے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی۔ بالآخر ایمبولنس میو ہوسپٹل میں ایمرجنسی کے روشن سائن بورڈ والے دروازے پر جا رکی۔ رابعہ قادری کے نام سے زیادہ اس کے کارڈ پر لکھے ہوئے "ایڈووکیٹ ہائیکورٹ" کے الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ ایک کے بعد دوسرے ڈاکٹر نے "ای سی جی" کا معائنہ کیا اور آدھے گھنٹے بعد رابعہ کی ماں کو داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت تشویشناک ہے، چنانچہ چوبیس گھنٹے تک انہیں خصوصی توجہ اور مشاہدے کے وارڈ میں رکھا جائے گا اور اگر اس مدت میں کوئی شدید تر دورہ نہ پڑا تو ان کے جانبر ہونے کے خاصے روشن امکانات ہوں گے۔ تاہم اس کے بعد بھی ان کو بہت عرصے تک مکمل آرام اور علاج کی ضرورت ہو گی۔ اس وارڈ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ رابعہ نے ڈاکٹروں کو اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور ہم ہسپتال سے نکلے تو صبحِ کاذب کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے رابعہ سے کہا کہ مجھے ضامن رضوی کی کوٹھی پر ڈراپ کر دے۔ مجھے احساس تھا کہ محسن میری رات بھر کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہو گا۔
"میں آج شاید کورٹ نہ جا سکوں۔" وہ مجھے اتار کے بولی۔ "آج تمہارا حقِ وراثت کا کیس فائل کرنا تھا۔"
"وہ سب ہوتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تم چلو۔ ہم دونوں ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر آتے ہیں۔ پھر ہسپتال چلیں گے۔"
اس نے احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ میں اس کی گاڑی کو خالی سڑک کے آخری موڑ تک جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر اندر چلا گیا۔ حسبِ توقع محسن جاگ رہا تھا۔
"برادرِ نسبتی! پھر ایک برمحل سفر یاد آ گیا ہے۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ "یہ اڑی اڑی سی رنگت..."
"یار کیا بتاؤں۔" میں نے دوسری چارپائی پر دھم سے گر کے کہا۔ "رابعہ کی ماں پہ میری موجودگی میں ہی خاصہ شدید دل کا دورہ پڑ گیا اور اب اسے ہسپتال میں داخل کرا کے آ رہا ہوں۔"
"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔" محسن سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر بڑی بی کو کچھ ہو گیا تو رابعہ اکیلی رہ جائے گی۔"
"یہ خیال اب آیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں نہیں آیا۔ اس وقت تو جان بچا کے بھاگ آیا تھا جب بڑی بی نے..."
"دیکھ سکندر!" محسن نے میری بات کاٹ دی۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ رابعہ سے اچھی رفیقِ حیات مجھے نہیں مل سکتی لیکن ایک تو انتخاب کا حق مجھے حاصل نہیں۔ میرے پاپا سے زیادہ میری ماما کو ہے۔ اس کے علاوہ کیا رابعہ سے کسی نے پوچھا ہے کہ اس کے ذہن میں مثالی شوہر کا تصور کیا ہے؟"
"کتابی فلسفہ مت جھاڑ۔" میں نے جھنا کر کہا۔ "کیا اب تجھے مثالی شریکِ حیات ملے گی؟ تیری اماں تجھ سے پوچھے بغیر کسی کا ہاتھ بھی تیرے ہاتھ میں تھما دیں گی کہ لے بیٹا! اب گزار مثالی ازدواجی زندگی۔ یہی رابعہ کی ماں نے کیا تھا۔ اور جب تجھ میں ہمت نہیں ہے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق مانگنے کی تو لڑکیوں سے کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کر سکتی ہیں۔ نہ فوزیہ نہ رابعہ۔ یہ سب اللہ میاں کی گائے سے زیادہ بے بس اور بے زبان مخلوق ہیں اور ان کی خرید و فروخت کے جملہ حقوق بحقِ والدین محفوظ ہیں۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے بات کر۔ میں بات کرتا ہوں انکل خیر دانی سے اور وہ بات کریں گے رابعہ کی ماں سے۔ رابعہ کی ماں بات پکی کر دے گی اور اس کے بعد میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین رفیقِ زندگی بنو گے اور تمہاری ازدواجی زندگی پر دنیا رشک کرے گی۔ بول منظور ہے؟"
محسن کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "نہیں سکندر! مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہے۔"
"جب تک تو لندن میں تھا تیرے خیالات کچھ اور تھے۔" میں نے کہا۔ "مریم کی شادی پر تو نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور احتجاجاً شریک بھی نہیں ہوا تھا۔ تو کہتا تھا کہ شادی کے بعد والدین کتنے دن ساتھ رہتے ہیں۔ دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس بیس سال۔ پھر وہ خود تو قبر میں جا لیٹتے ہیں اور والدین کی پسند کا عذاب بھگتنے کے لیے بیٹا پچاس سال تک ان کو دعائیں دیتا رہتا ہے۔"
"میرے خیالات اب بھی وہی ہیں سکندر! لیکن حالات وہ نہیں ہیں۔" محسن بولا۔ "اب میں مجبور ہوں ورنہ تیری بات مان لیتا۔"
"تجھے کیا مجبوری ہے۔ تو لڑکی ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "بیٹے تو ضد کر کے بھی ماں کو منا لیتے ہیں۔"
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ان سے ضد کر کے کوئی حق نہیں چھین سکتا۔ جو بات مجھے یہاں آ کے معلوم ہوئی ہے اس نے مجھے ہی نہیں ہم سب کو، ہمارے گھر کے سب افراد کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری چند ایّام میں ان کو ہر خوشی فراہم کریں۔"
"آخری چند ایّام؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا ہوا ہے انہیں؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"وہی مرض جس کا علاج نہیں اور جس میں مسیحا کوئی بھی ہو امیدِ شفا نہیں دیتا، یہ بتا دیتا ہے کہ رخصتِ سفر باندھنے کے لیے قدرت زیادہ سے زیادہ کتنی مہلت دے سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممی کو دو ماہ قبل قطعی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ ان کو مہلک قسم کے سرطان کا عارضہ لاحق ہے اور ان کی زندگی کے چھ مہینے باقی ہیں۔ آٹھ بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ دو مہینے تو گزر چکے ہیں اور باقی ہیں وہی چھ ماہ۔ وہ سخت گیر ماں اور گھر میں ڈکٹیٹر قسم کی حاکم ضرور رہی ہیں مگر انہوں نے ہم سب کے مفادات کی نگرانی نہ کی ہوتی تو ہم سب وہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔ ڈیڈی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے اچھے افسر یقیناً ہوں گے لیکن ایک فائل اور ایک گھر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو گھر کی ذمے داریوں سے سبکدوش کر کے دفتری امور کو یکسوئی سے نمٹانے میں بھی ممی کی مدد شامل تھی۔ پاپا گھر کی طرف سے ہمیشہ بے فکر رہے اپنے کام میں لگے رہے اور ترقی کرتے گئے۔ ہمیں کبھی توجہ یا محبت کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ اب ممی چاہتی ہیں کہ وہ اپنا آخری فرض بھی اپنی زندگی میں ہی پورا کر دیں تو ہم انہیں کیسے روک سکتے ہیں؟ یہ تو خود غرضی اور کمینگی کی انتہا ہو گی کہ جب تک وہ ہم سب کی زندگی سنوارنے کی جدوجہد کرتی رہیں اور ہمارے لیے مستقبل کی خوشی کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں رہیں ہم نے ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا۔ اور اب وہ مرنے سے پہلے ایک خوشی مانگتی ہیں تو ہم یہ سوال کریں کہ تم مر رہی ہو تمہیں زندہ رہنے والوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا کیا اختیار ہے؟"

میں ہکا بکا بیٹھا رہا۔ محسن کی صورت پر اس کا سارا دکھ سمٹ آیا تھا۔ "تو نے اب تک مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی۔" محسن نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کسی نے ممی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میری نظریں حقیقت کو روزِ روشن کی طرح دیکھنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی مجبوری کے سامنے میں خود بھی بے بس ہوں۔ فوزیہ، محسن اور شیروانی صاحب کی طرح میں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ محسن نے کہا تھا کہ ہم یہ سوال کیوں کریں۔ اس نے اپنی ہی بات نہیں کی تھی۔ اپنے ساتھ فوزیہ کی بات بھی کی تھی۔ میں اس بات کا مطلب سمجھ گیا جو محسن نے گزشتہ شب کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک بات کہتا ہوں جو تیرے مفاد میں ہے۔ اس نے کہا تھا سرطان کے مریض کو یہ کون بتاتا ہے کہ اسے اب کتنے دن اور جینا ہے۔

"صاف بات یہ ہے سکندر کہ ممی نے میری اور فوزیہ کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "اس فوری فیصلے کا سبب یہ نہیں کہ ان کو اپنے انجام کی خبر مل گئی ہے۔ اگر تو ان الجھنوں میں نہ پڑتا اور تیرے لیے قانونی مسائل زندگی کو لاحق خطرات اور رسوائی کے اندیشے نہ ہوتے تو اس سال اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹ آنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق سب کچھ ہوتا مگر اب ان کا ذہن حالات سے خوف زدہ ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ انکل وزیر خان کا انتقال کسمپرسی کے عالم میں اور ایسے پراسرار حالات میں ہوا کہ تجھے قتل کا شبہ ہے اور اسی پر بس نہیں، خود تجھ پر قتل کا الزام ہے اور ممی سارے معاملات کو میری یا تیری نظر سے نہیں ایک بیٹی کی ماں کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ انہیں یقین نہیں کہ تو سزا سے بچ جائے گا لیکن وہ کہتی ہیں کہ سزا چاہے نہ ہو رسوائی تو ہو چکی۔ لوگ تمام عمر میری بیٹی کو طعنے دیں گے کہ اس کا شوہر قاتل تھا۔ دنیا میں کتنے ہی قاتل ثبوت نہ ہونے کے باعث یا جھوٹی شہادتوں سے اور دس حیلے بہانے کر کے قانون کی گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر فوزیہ کی شادی پروفیسر ایاز سے کرنے کا فیصلہ اسی لیے کیا ہے۔ تین مہینے کے اندر اندر۔ ابھی تک فوزیہ کو اس فیصلے کا علم نہیں مگر ممی جانتی ہیں کہ وہ اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھا ہی نہیں سکتی۔ تیرے خلاف دینے کے لیے ان کے پاس دلائل کی کمی نہیں اور فوزیہ کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ پروفیسر ایاز میں کوئی خامی ہے۔ ابھی تو انہوں نے میرے کندھے پر بندوق رکھ کے چلائی ہے یعنی میرے رشتے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ لڑکی والے اس شرط پر راضی ہیں کہ منگنی اور شادی سب فوراً کر دی جائیں۔ تیاری لڑکی والے کرتے ہیں۔ ممی یہ شرط قبول کر لیں گی مگر یہی شرط بہانہ بن جائے گی فوزیہ کی ڈولی بھی ساتھ ہی اٹھانے کا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بہن بیٹھی رہ جائے اور بھائی کی برات آ جائے۔ دونوں کام ایک ساتھ نمٹائے جائیں گے۔ دِس از فائنل، نو آرگومنٹ۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ "ظاہر ہے ہم جو حقیقت سے زیادہ باخبر ہیں اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے۔ یہ وقت ہے جو آدمی کو بزدل بناتا ہے اور قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود ایسا کون چاہتا ہے۔"

ہر نئے دن کا سورج پہلے بھی ان گنت انسانوں کی زندگی کا فیصلہ کرتا تھا۔ آج کے دن کے سورج نے مجھے خبر دی کہ

کس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا۔ فوزیہ کی ممی کے علاوہ اور بھی بہت سے فیصلے ہو چکے تھے جن سے میں بے خبر تھا۔ ان میں فوزیہ بھی تھی اور میں خود بھی تھا، محسن بھی تھا۔ شاید رابعہ بھی تھی اور اس کی ماں بھی تھی۔ وقت کے منصف نے یہ فیصلہ محفوظ کر لیا تھا لیکن شبہے کی کوئی بات نہ تھی کہ یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس کے رسمی اعلان کا انتظار باقی تھا مگر اس کے خلاف اپیل کی گنجائش باقی نہ تھی۔ میں بہت دیر تک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا رہا اور چھت کو گھورتا رہا جو سینما کے اس خالی اسکرین کی طرح رہ گئی تھی جس پر فلم ٹوٹ جانے سے بالکل حقیقی زندگی کی طرح دکھائی دینے والا رنگین منظر یکلخت غائب ہو جائے اور ذہن ایک جھٹکے سے تاریکی میں خلا کی ویرانی پر مرتکز رہ جائے۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ اب اس کا کیا ذکر کہ کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔ آدمی اگر اپنے نوشتۂ تقدیر کو خود پڑھ سکتا، تو خدا ہوتا۔ اس کی خدائی کو نہ مانتا۔ وہ صرف لمحۂ گزراں کی شناخت کر سکتا ہے۔ کسی کمپیوٹر سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آنے والا لمحہ اس کا دوست ہے یا دشمن۔ قاتل ہے یا مسیحا۔ بس میں تقدیر کے اس فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ میں آنے والے لمحے سے بچ کے نہیں نکل سکتا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ ستنہ دل آزردہ، اور شرمندہ بیٹھا تھا۔ آہستہ سے اس نے ایک قطرۂ اشک کو انگلی پر لے کر جھٹک دیا۔

"محسن!" میں نے کہا۔ "تجھے کیا ہوا ہے بھائی؟ یہ سب یوں ہونا تھا تو یوں ہی ہونا تھا۔ تو نے تو کچھ نہیں کیا جو رلاتا ہے۔"

محسن زبردستی مسکرایا۔ "میں کہاں رو رہا ہوں۔ مجھے تجھ پر اعتماد تھا۔ میں نے کل کہا تھا نا کہ تجھ میں ہر صدمہ جھیلنے کی قابلِ رشک صلاحیت ہے۔ میں نے سوچا تھا رات کو تو واپس آئے گا تو تجھے سب بتا دوں گا۔"

"سوری یار! میں نے رات بھر تجھے انتظار کے عذاب میں مبتلا رکھا۔" میں نے دل شکستگی کے عدد کو دبا کے خوش دلی سے کہا۔ "بہتر ہوتا اگر تو اس اعتماد کا اظہار دیر سے نہ کرتا۔ ہم نے تو ہمیشہ دکھ بانٹے ہیں۔ تو غم کے اس پہاڑ کو اکیلا کیوں اٹھائے پھرتا رہا۔ میرے ستارے گردش میں تھے اور مجھے پہلے سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ تقدیر میرے ساتھ آخری سنگین مذاق کیا کر سکتی ہے اس لیے میں یہ صدمہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھا۔ جینے والوں کے لیے سکھ کے پھول اور دکھ کے کانٹے چننا اپنے اختیار کی بات نہیں۔ چل اب بھول جا اس بات کو۔ یہ بتا وہ بدبخت کون ہے جس پر تجھے تھوپا جا رہا ہے؟"

محسن مسکرایا۔ "مجھے نہیں معلوم یار! ہو گی کسی ڈپٹی سیکریٹری کی یا امپورٹر ایکسپورٹر کی بیٹی۔ انہی کے حلقے میں سے کوئی۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ ممی کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ پہلے خاندان پھر شکل صورت، پھر تعلیم اور سلیقہ وغیرہ۔ اب میں کیا بولوں؟"

"انہیں خوش رکھنا ایک مقدس فریضہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں تھوڑی سی شرکت میں بھی چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ ان کے دل میں فوزیہ کے معاملے میں میرے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی کا احساس بھی نہ رہے اور خود فوزیہ کے دل میں یہ خلش نہ رہے کہ وہ میرا ساتھ نہ نبھا سکی۔ میں تو ہوں میٹر آف فیکٹ قسم کا آدمی۔ لڑکیاں، خصوصاً فوزیہ جیسی لڑکیاں خلش کو روگ بھی بنا لیتی ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے تو؟" محسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں سمجھا نہیں؟"

"ڈرامہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی فوزیہ کو تیری ممی کے فیصلے کا علم نہیں ہے نا۔ کسی طرح اس کو بتا دے کہ میں رابعہ کے چکر میں پڑ گیا ہوں۔ اپنی ممی سے فون پر بات کرتے ہوئے یہ بات کہہ دے۔ وہ خود فوزیہ کو بتا دیں گی۔ فوزیہ تجھ سے بات کرے گی۔ یا مجھ سے۔ اور میں یہ کہہ دوں گا کہ سوری۔ شریکِ حیات کے بارے میں میرے تصورات بدل گئے ہیں۔ اور میں گھریلو ٹائپ دیسی لڑکیوں سے الرجک ہو گیا ہوں جو امورِ خانہ داری کے سوا کچھ نہیں جانتیں اور شوہر کو مجازی خدا اور خود کو اس کے پاؤں کی جوتی سمجھتی ہیں۔ مائی فٹ! مجھے الٹرا ماڈرن قسم کی بیوی چاہیے۔ بیسویں صدی کا تازہ ترین ماڈل جس کے ساتھ مجھے کہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ تو کہہ سکتا ہے کہ رابعہ کس قماش کی عورت ہے۔ وکیل ہے، کار چلاتی ہے۔ بس اتنا کافی ہو گا۔ یہ پرانا مجرب نسخہ ہے جو ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ مورد الزام ہو گی میری ذات مگر ایک عورت کی زندگی پُرسکون رہے گی، دوسری کی موت۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔"

"ہاں۔" محسن نے بے خیالی میں دہرایا۔ "یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

"چل اب رابعہ کی خبر لینی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ماں کی فکر کے ساتھ یہ بھی فکر تھی کہ میرے وراثت کے سرٹیفکیٹ کا مقدمہ آج فائل نہ ہو سکے گا۔ اخبار دیکھنا ہے کہ سلامت

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شاہ کیس کا کیا بنا۔ منظر صاحب سے پوچھنا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرانے کے کیس کا کیا بنا۔ لیکن سب سے پہلے آج مجھے میر وزیر اینڈ کمپنی جانا ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکلیں گے تو ساتھ ہی، پھر تو رابعہ کے ساتھ ہسپتال چلے جانا، میں وہیں آجاؤں گا اور اس کے بعد باقی پروگرام۔"

ساتھ والے کمرے سے کانسٹیبل اٹھ کے ہم سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے آیا اور اس نے پندرہ منٹ تک ہمیں اپنے نام، جائے سکونت، تعدادِ ازدواج و پیداوار، بحیثیت ڈرائیور ایس پی صاحب کے پاس اپنی اہمیت اور اپنی نظر میں ہماری حیثیت کے بارے میں غیر ضروری معلومات فراہم کیں۔ یہ کہا کہ وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر ڈیوٹی کا عذر پیش کر کے اس نے ہمیں بخشا اور غسلخانے میں گھس گیا جہاں سے اس کے حلق میں سے برآمد ہونے والی عجیب و غریب آوازیں پندرہ منٹ تک سنائی دیتی رہیں۔ صفائی کے اس پُرشور عمل سے فارغ ہو کے اس نے کمرہ مقفل کیا اور ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم بھی تیار ہو کے نکلے تو وہ جیپ کے قریب ٹہل رہا تھا، اور سگریٹ کو چلم کی طرح انگلیوں میں پھنسا کے کش لے رہا تھا۔ اسی وقت ضامن رضوی صاحب برآمد ہوئے اور انہوں نے ہمیں بلا لیا۔ بڑے مشفقانہ انداز میں ہاتھ ملانے کے بعد انہوں نے شکایت کی کہ کل سے اب تک ہم ملنے کیوں نہیں آئے۔ یہ پوچھا کہ ہم نے کھانے کا کیا انتظام کیا ہے اور خفا ہوئے کہ ہم نے باہر... کھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہماری ایک نہ چلی — انہوں نے اپنے خانساماں کو طلب کیا اور اسے احکامات جاری کیے کہ ہمارے ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کا بندوبست رکھے۔ ناشتہ تو صبح پہنچا دے اور کھانا جس وقت بھی ہم آئیں طلب کیے بغیر لے جائے۔ میں نے ایک مرتبہ نظر بچا کے گھڑی دیکھی۔ ہمیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے بیس منٹ ہو گئے تھے۔ ان کے دو بچے بستے لیے نکلے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ ضامن رضوی صاحب نے ان کو ڈانٹا کہ انکل کو سلام نہیں کیا۔ بچوں کو اور شوہر کو سی آف کرنے کے لیے ان کی بیگم نکلیں تو ہم نے آداب کیا — ضامن رضوی صاحب نے کہا کہ اس وقت تو انہیں جانا ہے مگر وہ شام کو ہم سے مفصل ملاقات کریں گے چنانچہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ ان کے گھر پر کھائیں۔ پھر انہوں نے ہمیں بھی ساتھ بٹھایا اور رابعہ کے گھر کے دروازے پر ڈراپ کر کے سیدھے نکل گئے۔ اس وقت تک ان کا کانسٹیبل ڈرائیور ان تمام حالات پر نظر ثانی کر چکا تھا جن کا اظہار اس نے نادانستگی میں صبحدم کیا تھا۔ اب حیثیت اور اہمیت کے بارے میں اپنی معلومات کے اس حد تک ناقص ہونے پر سخت شرمندہ تھا۔ آسمان پر اب گہرے سیاہ بادل پھیل گئے تھے اور بارش کے آثار تھے۔

میں نے رابعہ سے ہسپتال میں ملنے کا وعدہ کیا اور محسن کو وہیں چھوڑ کے بیڈن روڈ پہنچا۔ رکشا کو میں نے میر وزیر اینڈ کمپنی والے کنارے پر روکا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اس جگہ پہنچا جس کے سامنے "میر وزیر اینڈ کمپنی" کا سائن بورڈ آویزاں تھا۔ دفتر ایک دو منزلہ عمارت کے اوپر والے حصے میں واقع تھا۔ نیچے چار دکانیں تھیں جو ابھی بند تھیں۔ دروازہ ان کے بیچ میں سے نکالا گیا تھا۔ اس طرح کہ دو دکانیں ایک طرف تھیں تو دو دوسری طرف۔ زینے میں کھلنے والے دروازے کا ایک پٹ تھا جو جدید قسم کا فلش ڈور تھا۔ اوپر کا آدھا پٹ شفاف شیشے کا تھا جس کے گرد بالشت بھر چوڑا لکڑی کا حاشیہ تھا اور اس کی لکڑی کے رنگ کے فارمیکا والی سطح پر پالش چمک رہی تھی۔ ڈور لاک بھی خودکار ٹائپ تھا لیکن حفاظتی انتظامات کی تکمیل باہر کی جانب لوہے کی سمٹنے والی گرل لگا کے کی گئی تھی جو اس وقت مقفل تھی۔ پرانی عمارت میں یہ نیا انتظام بالکل الگ نظر آتا تھا۔ اوپر کی منزل میں بھی کھڑکیاں تبدیل کی گئی تھیں۔ یہی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں کی جگہ پہلے پرانی طرز کی لکڑی کے پٹ والی اور سلاخوں والی کھڑکیاں ہوں گی جو آس پاس کی دوسری عمارتوں میں اب بھی موجود تھیں۔ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے دفاتر کے باہر گرل لگائی گئی تھی جس پر سلور کلر تھا۔ کسی امپورٹ ایکسپورٹ کمپنی کے آفس میں یہ غیر معمولی حفاظتی انتظام مجھے غیر معمولی لگا۔ شاید اس کی وجہ وہ شکوک تھے جو کاروبار کی نوعیت کے بارے میں پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھے۔ سائن بورڈ آفس کی کل طوالت کے برابر اور کھڑکیوں کی دہلیز تک چوڑا تھا۔ گہرے نیلے رنگ پر چمکنے والے فلورسینٹ زرد رنگ کے حروف میں کمپنی کا نام تھا نیچے سائز میں آدھے اور سفید رنگ کے حروف سے "امپورٹرز اینڈ ایکسپورٹرز۔ ٹولز اینڈ مشینری" لکھا گیا تھا۔ بارش پھر شروع ہوئی اور میں نے ایک بند دکان کے پھیلے ہوئے سائبان کے نیچے پناہ لی جو اس زینے کے بالکل مقابل تھا۔

دس منٹ تک میں اپنے سامنے سے گزرنے والے

سائیکل اور موٹر سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھتا رہا جو سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے۔ بارش سے بچنے کے لیے کسی کی طرف دیکھے بغیر جلد از جلد منزل تک پہنچنے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر اُدھر پناہ لے رہے تھے۔ پھر ایک شخص میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ نوجوان تھا لیکن اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ پِٹتے ہوئے چہرے پر بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ کچھ بیمار سا لگتا تھا۔ اس نے لنڈا بازار کی دھاری دار قمیص اور سرج کی گہرے نیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس بات سے خاصا مطمئن تھا کہ دونوں چیزیں اس کو فٹ آنے کے بعد دیکھنے والوں کو لنڈا بازار کی نظر نہیں آتی ہوں گی۔ ہم نے صرف ایک بار ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنے جیسا پناہ گزیں سمجھ کے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں مایوس ہونے لگا۔ یہ محض مفروضہ تھا کہ میر وزیر اینڈ کمپنی کے ملازم آتے ہوں گے اور چلے جاتے ہوں گے۔ اگر کسی کو آنا ہوتا تو اب تک ضرور آتا۔ نو بجے کے بعد تو کوئی دفتر نہیں کھلتا۔ "کیا مصیبت ہے۔" میرے قریب کھڑے ہوئے نوجوان نے بڑبڑا کے اپنے آپ سے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا مگر وہ سامنے کے مقفل گرل والے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ اسے میرا بات کرنا بھی ناگوار گزرا۔ اس نے جھنجھلا کے نفی میں سر ہلایا اور اس کا متفکر اور پریشان چہرہ دیکھ کر مجھے فوری طور پر ایک خیال آیا۔

"میرا خیال ہے آپ اس کمپنی میں کام کرتے ہیں؟" میں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

"کرتا تھا جی۔" وہ مایوس اور شکایت آمیز لہجے میں بولا۔ "بڑی مشکل سے یہ نوکری ملی تھی۔ چھ مہینے بھی نہیں رہی۔"

"کیوں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا تاکہ میرے شوق اور تجسس سے وہ شک میں مبتلا نہ ہو۔ "نکال دیا ہے تمہیں؟"

"نہیں جی! کمپنی ہی بند ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ پرچون کی دکان ہے۔ مالک مر جاتے ہیں تو کوئی کمپنی بند ہوتی ہے؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مالکوں کے وارث چلاتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ منیجر ہوتے ہیں۔ مالک ہوتا ہو، کاروبار جاری رکھتے ہیں۔"

"یہی تو مصیبت ہے جی۔" وہ بولا۔ میرے ہمدردانہ لہجے نے اسے اپنی پریشانی بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔ "منیجر صاحب دو ہفتے کے دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ یہاں مالک کا کسی نے خون کر دیا۔ منیجر کو کل آجانا چاہیے تھا مگر یہاں تو تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

"تم تو خواہ مخواہ مایوس ہو رہے ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "منیجر آجائے گا آج کل میں۔"

"رب جانے جی۔ آفس کی چابیاں ان کے پاس ہوتی تھیں یا منیجر کے پاس۔" وہ بولا۔ "ایک چلا گیا باہر، دوسرا اوپر۔ میں گھر چلوں۔ کل دیکھوں گا۔" اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش کچھ کم ہو گئی تھی۔ اس نے سر جھکایا اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا ہو گا کہ اسے ایک اور شخص نے روک لیا جو نسبتاً عمر رسیدہ تھا۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات کی۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور چل پڑا۔ دوسرا شخص تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ وہ چالیس سے زیادہ عمر کا فربہ بدن آدمی تھا۔

"آپ مجھے پرانے آدمی لگتے ہیں۔" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "کب سے ملازم ہیں یہاں؟"

وہ شخص چونکا۔ "جی... جی ہاں، سات سال ہو گئے ہیں مجھے۔ میں یہاں اکاؤنٹنٹ ہوں۔" وہ شخص مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا منیجر کو کسی نے اطلاع نہیں دی کہ مالک کے انتقال کے بعد آفس بند پڑا ہے۔ اسے اپنا دورہ مختصر کر کے واپس آجانا چاہیے تھا۔" میں نے بڑے وقار اور متانت کے ساتھ اپنے لہجے کو کچھ تحکمانہ رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگ آ کے واپس جا رہے ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا اکاؤنٹنٹ صاحب؟"

"غلام علی... غلام علی جناب!" وہ بولا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور یہ سب... میرا مطلب ہے آپ کا ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" وہ حد سے زیادہ تابعدار قسم کا غریب اور مسکین نظر آنے والا منکسر مزاج شخص تھا۔ کچھ نروس ٹائپ۔

"اس کمپنی کے ایک مالک تھے وزیر خان۔" میں نے نگاہ روبرو رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سے واقف ہیں آپ؟"

"کیوں نہیں جناب۔ وہ تو بڑے مہربان تھے۔ میرے محسن تھے اللہ جنت نصیب کرے ان کو۔ مجھے انہوں نے بڑے برے وقت میں سہارا دیا تھا۔" غلام علی نے کہا۔ "میں بے روزگار تھا۔ دس سال کی ملازمت کے بعد ایمانداری کے جرم میں مجھے نکال دیا گیا تھا۔ میں پی ڈبلیو ڈی میں ملازم تھا۔ میری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بدقسمتی کہ مجھے اسٹور میں بھیج دیا گیا، میرے انکار کے باوجود۔ میں جانتا تھا یہ سازش ہے۔ وہاں سب کھاتے تھے اور خوب غبن کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ایمان کبھی نہیں بیچا تھا۔ میں نے کھانے والوں کی شکایت کی نیچے سے اوپر تک سب کو بتایا ۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ الٹا میرے خلاف محاذ بن گیا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے متعدد الزامات میں ملوث کردیا اور تحقیقات ان کے سپرد ہوئی جو نیچے والوں سے لے کر کھاتے تھے۔ انہوں نے مجھے خطرناک سمجھتے ہوئے بدعنوانی کا مرتکب قرار دیا اور برطرف کردیا۔ میں نے مرحوم وزیر خان کو سب کچھ بتادیا۔ وہ آدمی کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے کہا فکر نہ کرو غلام علی! بندے کا خدا جب تک ہے اس کا رزق کون بند کر سکتا ہے۔ اگلے دن سے مجھے اتنی ہی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔"

"آپ ان کے جنازے میں تو شریک ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اب اتنا بھی ہم نہ کرتے تو لعنت ہمارے انسان ہونے پر۔" اس نے الفاظ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "آدمی احسان مند ہو، نمک کھایا ہو اس نے اور اس میں اتنی شرافت بھی نہ ہو تو اس سے کتا ہونا اچھا۔" وہ ضرورت سے زیادہ باتونی اور جذباتی آدمی تھا اور غالباً بلڈ پریشر کا شکار۔

"اچھا غلام علی صاحب! مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں، کہیں بیٹھ سکے۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ غائبانہ طور پر مجھ سے ضرور متعارف ہوں گے۔ میں سکندر بخت ہوں۔ مرحوم وزیر خان کا بیٹا۔"

"آپ ... ؟" وہ چلایا اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ لندن سے آئے ہیں ... مگر میں نے تو سنا تھا ..."

"آپ نے ٹھیک سنا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ سنا تھا اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے آپ ایک سازش کا شکار ہوئے تھے ایسے ہی میں بھی ایک سازش کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ اور مجھے شبہ ہے کہ میرے والد مرحوم بھی کسی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ میں اصل حالات پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور خاصا پُرامید بھی ہوں کیونکہ مجھے والد کے مخلص دوستوں کا تعاون حاصل ہے اور کچھ میرے ہمدرد بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے؟"

"کیوں نہیں جی۔ اپنے سکندر صاحب! مجھ پر تو ایک احسان کا قرض ہے۔ میرا بال بال اس قرض میں بندھا ہوا ہے اور میرے بیوی بچے بھی دعا دیتے ہیں اس نیک بندے کو، جس نے مجھے ایسے وقت میں پناہ دی جب سارا زمانہ سمجھتا تھا کہ میں بے ایمان اور بدنیت ہوں اور مجھے چپراسی کی جگہ رکھنے کو بھی تیار نہ تھا۔ کسی کو مجھ پر اعتبار نہ تھا۔" غلام علی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہی پوزیشن آج میری ہے غلام علی۔" میں نے کہا۔

کونٹی نینٹل شیزان قریب ترین ریسٹورنٹ تھا۔ چند منٹ بعد ہم اس کی پرسکون فضا میں مہکتی گرم چائے کا لطف اٹھا رہے تھے اور میں اسے بتا رہا تھا کہ میرے اور میرے والد کے خلاف سازش کی نوعیت کیا ہے۔ میں نے اسے تمام واقعات نہیں سنائے بلکہ وہی باتیں بتائیں جن کا تعلق میر وزیر اینڈ کمپنی کے حالات سے تھا۔ میں نے بتایا کہ کس طرح میر شرافت علی نے کاروبار میں ایک شریک کی حیثیت سے داخل ہو کے تمام کاروبار پر قبضہ کیا کیسے میرے والد کو کسی نامعلوم طریقے پر بلیک میل کیا اور انہیں عضوِ معطل بنا کے الگ کردیا۔ ان کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ وہ بیماری کے باعث معذور ہیں اور ان سے جعلسازی پر دستخط لے کر ان کا منافع ہضم کرلیا گیا۔ کسی کو یہ بات معلوم نہ ہوسکی مگر وزیر خان مرحوم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو کے اس کوٹھی میں معمولی ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے جہاں سے ان کا جنازہ اٹھا۔ اس پرانے نمک خوار کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین ثابت ہوئی کہ وہ کوٹھی جہاں وزیر خان کا انتقال ہوا تھا ان کی ملکیت نہیں تھی۔ تاہم میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں آگیا ہوں تو سب معلوم کر لوں گا کہ ایسا کیوں ہوا۔ جیت اگر سچ کی ہوتی ہے تو مجھ پر قتل کا جھوٹا مقدمہ کرنے والے ناکام ہوں گے اور میں نمک حراموں کو بے نقاب کر کے عبرت ناک سزا دوں گا۔ مجھے اب شک نہیں یقین ہے کہ وزیر خان مرحوم کے انتقال کا سبب گٹھیا کا مرض نہیں تھا جیسا کہ اب ان کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے لیے میں نے عدالت میں درخواست دی ہے کہ لاش کو قبر سے نکال کے اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے۔ عدالت میں مجھے تین گواہ پیش کرنے ہوں گے جو حلفیہ بیان دے سکیں کہ وہ تدفین کے وقت موجود تھے اور قبر کی نشاندہی کریں۔ ایک گواہ چراغ دین کا چوکیدار ہے۔ اگر دوسرا گواہ غلام علی ہو جائے تو صرف ایک اور گواہ کی کمی رہ جاتی ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ جنازے میں اور کون لوگ شریک تھے اور کس کی گواہی

پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ غلام علی نے کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، کمپنی کے تمام پرانے نمک خوار میرے ساتھ ہوں گے، اور مقررہ تاریخ پر گواہی کے لیے بھی حاضر ہو جائیں گے۔ غلام علی کے لیے یہ انکشاف اتنا سنسنی خیز اور ناقابلِ یقین تھا کہ وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا اور بار بار مجھے اس کو توجہ کرنا پڑتا تھا کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ایکبار اس نے کہا۔ "گولی مار دو جی چائے کو سکندر صاحب! میرا تو خون کھول رہا ہے۔" میں نے اس سے کہا کہ یہ مسئلہ جذبات پر قابو رکھ کے اور عقل سے کام لے کر حل ہوگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ یہ سارا چکر اس لیے چلایا گیا تھا کہ مجھے اس کاروبار سے الگ کردیا جائے۔ مرحوم وزیر خان کے بعد میں ہی کاروبار کا وارث ہوں اور کچھ لوگ جو اس جائز کاروبار کی آڑ میں ناجائز کاروبار کر رہے ہیں اس لیے خوفزدہ ہیں کہ کہیں مجھے اس ناجائز کاروبار کی نوعیت کا علم نہ ہو جائے۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ شک آپ کو کیسے ہوا جناب کہ کمپنی کوئی ناجائز کاروبار کر رہی ہے؟" غلام علی نے کہا۔

"مجھے ایک پیشکش کی گئی تھی۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "کہ میں کاروبار پر اپنے قانونی حق سے دستبردار ہو جاؤں تو مجھے ایک معقول رقم دی جائے گی۔ مجھے واپس لندن جا کے رہنے کا موقعہ فراہم کردیا جائے گا اور میرے خلاف تمام مقدمات بھی ختم کردیے جائیں گے۔"

"کس نے کی تھی یہ پیش کش؟ میر صاحب نے؟" غلام علی رازدارانہ انداز میں آگے جھک کے بولا۔

"ہاں۔" میں نے پھر سوچ کر کہا۔ "یہی سمجھ لو۔"

"اور اس کے بعد ان کو قتل کرا دیا گیا۔ سنا یہی بات؟" وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے دلاور کے ذکر کو گول کردیا۔ "عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مجھے تو لندن میں پارٹنر بننے کے لیے بھی کہا گیا تھا۔ یعنی میں مالک نہ رہوں، ان کا ایجنٹ بن کے ان کے ناجائز کاروبار میں شامل ہو جاؤں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کردیا اور اب میں وراثت کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے مقدمہ کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد کمپنی ویسے ہی چلے گی جیسے مرحوم وزیر خان کے زمانے میں چلتی تھی۔ یہ بتاؤ میر شرافت علی نے کس کس کو برطرف کیا تھا۔ تمہارے سامنے وہ اپنے کون کون سے آدمی لایا؟ وہ کیسے لوگ ہیں؟"

"لوگ تو میر شرافت علی کے رویے سے بھی نالاں تھے۔" غلام علی نے کچھ دیر بعد بات شروع کی۔ "وہ ان کے ساتھ بہت ذلت کا سلوک کرتا تھا۔ وفاداری کا مطلب اس کے نزدیک غلامی تھا۔ وزیر خان مرحوم کہتے تھے تم سب اس عمارت کے ستون ہو۔ وہ سب کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے ملازم نہیں۔ ان کے زمانے میں مینجر تھے علوی صاحب۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد یہ مینجر آیا۔ یہ بھی بس میر شرافت علی ہی ہے۔ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا۔ کسی کی عزت نہیں کرتا۔ ظاہر ہے اس کی عزت بھی کچھ نہیں۔ سب ڈرتے ضرور ہیں مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں۔ جوان اور اسمارٹ آدمی ہے لیکن عیاش ہے۔ پینے پلانے کا شوقین۔ شادی نہیں کی ہے مگر ہر وقت کسی نہ کسی کو ساتھ رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں رہتی ہے۔ سیکریٹری بن کے۔ سال بھر بعد رخصت کردی جاتی ہے۔ بہت سے قصے مشہور ہیں کہ کس کس نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔"

"اچھا؟" میں نے دلچسپی اور حیرانی سے کہا۔ "کس بات پر بلیک میلنگ کرنے پر اتر آتی تھیں وہ؟"

"بہت بھولے ہیں آپ سکندر صاحب۔" وہ ہنسا۔ "اجی جب ایک جوان خوبصورت سیکریٹری ہر وقت کمرے میں رہے گی تو آخر کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ کس بات پر بلیک میلنگ کرے گی وہ؟"

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔ کیا نام ہے ان مینجر صاحب کا۔ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "اور کتنا عرصہ ہوا ہے ان کو آئے ہوئے؟"

"ان کو آئے ہوئے دو سال ہوئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔" غلام علی نے کہا۔ "گوا کے رہنے والے ہیں۔ مسٹر ڈی سلوا۔ اسی زمانے میں پاکستان آئے تھے جب انڈین گورنمنٹ نے گوا کا الحاق کیا تھا۔ چھاؤنی کے علاقے میں کہیں رہتے ہیں۔"

"اچھا غلام علی! مجھے تم سے مل کر اس لیے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم صحیح معنوں میں قابلِ اعتماد دوست ہو۔ باضمیر انسان ہو اور معاملات سے خاصے باخبر ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اگر تم واقعی اس احسان کا قرض اتارنا چاہتے ہو جو میرے والد نے تم پر کیا تھا تو مجھ پر احسان کر کے اتار سکتے ہو۔ وقتاً فوقتاً مجھے تم سے رابطہ قائم کرنا ہوگا اور وہ باتیں معلوم کرنا ہوں گی جو میں براہ راست معلوم نہیں کر سکتا۔ آفس میں یقیناً ایسے لوگ ہوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گے جو وہاں میری موجودگی برداشت نہیں کریں گے تاوقتیکہ میں قانونی طور پر مالک بن کے قدم نہ رکھوں۔ اب تم ایک کام کرو۔ مجھے تمام نئے پرانے کارکنوں کے نام اور پتے لا دو۔"

"لیکن آفس تو بند پڑا ہے سر!" اس نے پہلی بار مجھے سر کہا۔ ذہنی طور پر اس نے مجھے وزیر خان کی طرح کمپنی کا مالک مان لیا تھا۔

"بھئی غلام علی صاحب! یہ سر وغیرہ نہیں چلے گا میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "آپ والد کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ وہ آپ پر اعتماد کرتے تھے اور آپ وفادار اور وضعدار آدمی ہیں۔ میرے لیے آپ قابل تعظیم ہیں۔ مجھے صرف سکندر کہیے۔ آفس تو ایک دو روز میں کھل جائے گا۔ ہر دفتر کی طرح یہاں اسٹاف کے بارے میں تمام کوائف کسی رجسٹر میں موجود ہوں گے۔ میرا خیال ہے یہ رجسٹر شروع سے اب تک وہی ہوگا۔ اس کی نقل بنانا ویسے تو مشکل ہوگا۔ اگر آپ فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوا لیں تو آدھے گھنٹے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔ آپ کو رجسٹر باہر لانے میں دشواری تو نہیں ہوگی؟"

"دشواری کیسی سکندر صاحب!" وہ بولا۔ "سب میرے پاس ہے۔"

"اس میں ان لڑکیوں کے نام بھی ہوں گے نا؟" میں نے کہا۔ "جو منیجر کے ساتھ رہیں اور پھر بدنام ہو کے چلی گئیں یا نکالی گئیں۔"

"سب ہے جناب! نام پتا، تقرری کی تاریخ، دفتر چھوڑنے کی تاریخ اور اسباب۔ استعفیٰ، برطرفی یا انتقال وغیرہ۔ یہاں تک کہ تاریخ پیدائش اور ولدیت بھی ہے۔" غلام علی نے کہا۔

"اب میرا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ایک نمبر ہے ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے گھر کا، دوسرا مسٹر عبدالودود منظر کا اور تیسرا مس رابعہ قاری کا۔ یہ دونوں ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ ہیں اور میرے مقدمات کے وکیل ہی نہیں، میرے کلاس فیلوز اور دوست بھی ہیں۔"

"واہ سکندر صاحب! اتنے بڑے بڑے لوگ آپ کے ساتھ ہیں، آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" اس نے جیب سے ایک پرس نکالا۔ اس میں سے ایک خستہ حال ٹیلی فون نمبر بک برآمد کی اور بہت سے نمبروں کی قطار کے آخر میں میرا نام اور میرے دیے ہوئے نمبر لکھ لیے۔ پھر اس نے ایک پرزے پر اپنا نام پتا لکھ کے میرے حوالے کیا۔ "میں تو غریب آدمی ہوں جی!

گھر پر کوئی فون نہیں لیکن میں نے جو فون نمبر لکھا ہے وہ ... کے قریب ایک کیمسٹ کا ہے۔ یہ میرے بھائی کی دکان ..."

میں نے پرزے کو دیکھا اس پر "انعام کیمسٹ" کا فون ... جو کرشن نگر میں سودی بلڈنگ کے پاس تھا۔ وہیں غلام ... کا مکان بھی تھا۔ میں نے پرزے کو احتیاط سے جیب ... رکھ لیا۔ پھر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

"غلام علی! یہ کمپنی اب کس قسم کی مشینیں اور آلات ... رہی ہے؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کہاں ہے۔ فیکٹری تو بند ... ہوگی۔"

"فیکٹری کیوں بند ہوگی جناب!" غلام علی ... کے مالک تو فوت نہیں ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔ "فیکٹری کا مالک کو... اور ہے؟"

"آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس نے حیرانی سے ... دیکھا۔ "جناب فیکٹری اب شاید ... میں ہے لیکن ... دو سال پہلے فروخت کر دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ... گیا۔ پہلے ہم خود اپنی مشینیں اور آلات بناتے تھے اور ... بھیجتے تھے۔ خراد مشین، ڈرل مشین اور ان کے پرزے ... آلات۔ اب ہم صرف برآمد کرتے ہیں اور ایک طرح ... ڈسٹری بیوٹر رہ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے فروخت کے معاہدے ... میں کوئی ایسی شق ہو کہ کمپنی کے سوا کوئی ان مشینوں کو فروخت ... برآمد نہیں کرے گا۔"

"اگر فیکٹری واقعی بک چکی ہے تو معاہدے میں ایسی کوئی ... نہیں رکھی جا سکتی جس کی رو سے نیا مالک اپنا مال ہمارے ... سے نکلوانے کا پابند ہو۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ممکن ... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ بیچنے کے بجائے فیکٹری کو کسی ... پارٹنر کے سپرد کر دیا گیا ہو جو اپنے طور پر فیکٹری کے امور ... ہو۔ فرض کرو میر شرافت علی نے کاروبار کے تین حصے ... اور ہر حصے کا نگراں الگ کر دیا۔ پروڈکشن الگ، سیلز الگ، ... اکاؤنٹس الگ۔ سیلز، مارکیٹنگ اور سیل پروموشن کا ... اس نے اپنے پاس رکھا ہو اور اکاؤنٹس کا ذمے دار میرے ... والد مرحوم وزیر خان کو بنا دیا ہو۔ صرف دستاویزات ... حسابات پر دستخط کرنے کے لیے کیونکہ اکاؤنٹس کے ... پاس اپنی میز پر بیٹھ کے جمع تفریق کے اعداد و شمار ... رہنے کے سوا کچھ کام نہیں ہوتا اور یہ کام بھی ماتحت ... ہیں یا مشینیں کرتی ہیں۔ اہم شعبے پروڈکشن اور سیلز کے ... سیل پروموشن کے نام پر وہ دنیا میں ہر جگہ جا سکتا تھا ...

ایجنٹ مقرر کر سکتا تھا اور اس طرح اپنے رابطے استوار کر سکتا تھا تاکہ اس کا ناجائز کاروبار پھیلے۔ پروڈکشن والے مشینوں کی جگہ کچھ اور باہر بھیجتے ہوں گے۔ ناجائز کاروبار اسمگلنگ کا ہی ہو سکتا ہے اور یہاں سے یورپ اور امریکہ کیا اسمگل کیا جا سکتا ہے؟"

"میری عقل تو اندازہ کرنے سے قاصر ہے جناب!" غلام علی نے خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "بلکہ ماؤف ہے۔ کتنے اطمینان سے میں یہاں ملازمت کر رہا تھا اور خوش تھا کہ رزق حلال کھا رہا ہوں۔ بدبختوں نے اپنے ساتھ میری عاقبت بھی خراب کی۔ اسمگلنگ! توبہ توبہ۔"

"تم نے نادانستگی میں ایسا کیا تھا غلام علی! خدا نیت کو دیکھتا ہے اور تم اسمگلنگ میں ملوث نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نہ سونے کی اسمگلنگ ہوتی ہے نہ ملکی مصنوعات کی، نہ آرٹ کی اور نہ نوادرات کی۔ ملک دشمن عناصر کرنسی کی اسمگلنگ کرتے ہیں اور سماج دشمن بلکہ انسانیت دشمن عناصر منشیات کی اسمگلنگ۔ منشیات میں خطرات زیادہ ہیں مگر یہی کاروبار اتنے منظم پیمانے پر ہوتا ہے اور اس میں منافع بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ چرس، حشیش، ہیروئن کے دھندے میں لاکھوں سے کروڑوں بنائے جاتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ مشینوں کے کریٹ کسی طرح منشیات باہر بھیجنے کے لیے استعمال ہو رہے ہوں۔"

"یا میرے معبود!" غلام علی نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے فریادی لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر آفت سے بچا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا والی وارث تو ہی ہے۔"

"گھبراؤ نہیں غلام علی! اطمینان سے کام کرتے رہو جیسے آج تک کرتے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تک تم بے خبری کے اندھیرے میں تھے۔ اب خدا نے تمہیں ہوش دیا ہے کہ اس برائی کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی عقل اور توانائی کا صحیح استعمال کر سکو۔ تم میرے ہاتھ مضبوط کرو۔ انشاء اللہ تم کو اس کا صلہ ملے گا۔ خدا کی طرف سے بھی اور میں... میں اسے صلہ تو نہیں کہوں گا لیکن میں کامیاب ہوا تو مجھے پرانی "وزیر خان اینڈ کمپنی" قائم کرنے کے لیے ایک مخلص، ایماندار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت ہوگی جس کی کمان تم کرو گے۔ تقدیر نے ساتھ دیا اور میں مالک بنا تو تم منیجر بنو گے۔"

غلام علی کا چہرہ فرط جذبات سے تمتمانے لگا۔ "انشاء اللہ جی! انشاء اللہ۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"میں نے جو کام بتائے ہیں یاد رکھنا۔ فون تم کسی بھی وقت کر سکتے ہو اور پیغام چھوڑ سکتے ہو۔ اگر میں نہ ملوں" میں

نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ بتاؤ تمہیں کچھ معلوم ہے فیکٹری کا مالک کون ہے؟"

"جی...!" اس نے پھر جیب میں سے وہی اڑے ہوئے رنگ والا چرمی پرس نکالا۔ "ان کا یہ کارڈ ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ نام پتا فون نمبر۔"

کارڈ پر نظر ڈالتے ہی میری نگاہوں کے سامنے ایک خیرہ کن روشنی آ گئی۔ پھر دوسری سرچ لائٹ کی چکا چوند نے میرے سامنے اندھیرے کی چادر تان دی اور اس چادر سے ایک ہاتھ نکلا جو نائلون کی ڈور سے بندھی ہوئی کارک کی سخت گیند کو بڑی مہارت سے ایک دائرے میں گردش دے رہا تھا۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ "چوہدری دلاور۔ پروپرائٹر ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"سکندر صاحب!" غلام علی کی پرتشویش آواز آئی۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں فوراً سنبھل گیا۔ "ہاں... طبیعت کو کیا ہونا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کارڈ کو جیب میں رکھ لیا۔ "دراصل مجھے خیال آ گیا کہ ہم بل ادا کیے بغیر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے بات تو کچھ نہیں مگر سبکی ہوتی ہے۔"

نروس ٹائپ غلام علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آسانی سے شک میں مبتلا ہو جانے والا شخص تھا اور اتنا سادہ دل اور سادہ لوح کہ آسانی سے مطمئن بھی ہو جاتا تھا۔ جب ویٹر بل کی بقایا رقم لانے گیا ہوا تھا تو یکلخت مجھے ایک اور خیال آیا اور میں نے کارڈ نکال کے دیکھا۔ "غلام علی! یہ ایم ڈبلیو تو پہلے بھی تھا۔ میر وزیر۔ ڈی اس میں دلاور کے نام کا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایم ڈبلیو ڈی ایک ہی کمپنی ہے اور یہ تینوں اس کے حصے دار ہیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ تم اپنا کام کل تک مکمل کر لو گے نا؟"

"وہ تو جناب منیجر کے آنے پر ہے۔" غلام علی نے کہا جو میرا اندازہ درست ہونے سے بھی متاثر ہوا تھا۔ "دیکھ لیتے ہیں اگر وہ آج آ گیا تو کل تک فہرست آپ کو مل جائے گی۔"

منیجر آ گیا تھا۔ جب ہم واپسی پر "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے سامنے سے گزرے تو نیچے سڑک کے کنارے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن گاڑی کھڑی تھی۔ غلام علی نے مجھے بتایا کہ یہ چاروں دکانیں جو آفس کے نیچے ہیں اپنی ہی ہیں اور گودام کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ پہلے ان کو کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ پھر خاصی قیمت دے کر خرید لیا گیا لیکن ان کو آج تک کھلتے بند ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ غالباً آفس کے اندر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہی سے کوئی راستہ ہے نیچے اترنے کا۔ میں نے یہ بات نوٹ کرلی اور غلام علی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے بعد آئے کیونکہ میں منیجر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ غلام علی سیدھا نکل گیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر زینے پر قدم رکھا اور اوپر پہنچا۔ زینے کے دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ دونوں ایک جیسی پالش کی ہوئی پلائی وڈ کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں میں اوپر صرف ایک فٹ چوڑا شیشے کا فریم تھا۔ بائیں جانب کے شیشے پر سرخ رنگ سے لکھا ہوا تھا "آفس" اور دائیں طرف والے دروازے پر "ڈائریکٹرز"۔ میں نے ڈائریکٹر کے کمرے کا دروازہ دھکیلا اور اندر سے بند پاکے دستک دی۔ دو منٹ بعد ایک لڑکی نے دروازہ کھول کے مجھے حیرانی اور خفگی سے دیکھا۔ وہ کوئی اینگلو انڈین تھی یا گوا کی رہنے والی۔ اسکرٹ پہنے ہوئے بائیس چوبیس سال کی سانولی سی اور بھرے بھرے بدن والی لڑکی جس کے لیے لباس بدن کی نمائش کا ذریعہ تھا۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے اور کسی ماہر ہیئر ڈریسر کی محنت سے بنا ہوا مصنوعی ریشم کا ڈھیر تھے جو پھسل کر پھیلتا تھا اور سر کی ایک جنبش سے پھر سمٹ جاتا تھا۔ اس نے لپ اسٹک ابھی ابھی ٹھیک کی تھی۔

"یس؟" وہ انگریزی میں بولی۔ "کیا چاہیے تمھیں؟"

"مجھے مسٹر ڈی سلوا سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری۔ وہ ابھی یورپ کے دورے سے واپس آئے ہیں اور آج کسی سے نہیں مل سکتے۔" وہ بولی۔ "لیکن میں ان سے پوچھ کے آپ کو کل کے لیے اپائنٹمنٹ دے سکتی ہوں۔ آپ یہاں انتظار کریں گے؟"

"کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا اور وہ تھوڑا سا مسکرا کے واپس ہوئی۔ دس سیکنڈ بعد میں اندر داخل ہو گیا اور اس طرح کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا میں تقریباً اس کے ساتھ ہی ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈی سلوا گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے پاؤں میز پر رکھے تھے۔ اس نے کوٹ اتار کے کرسی کی پشت پر لٹکا دیا تھا اور ٹائی ڈھیلی کرکے قمیص کا اوپر والا بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی سیکرٹری نے ایک داجبی سی چیخ ماری جو برہمی، افسوس اور پریشانی کی علامت تھی۔ وضاحت کرنا چاہی کہ مجھے اس نے روکا تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی کہ میں نے نامعقولیت کا ثبوت کیوں دیا۔ پھر ڈی سلوا نے اسے روک دیا۔ میز پر سے پیر نیچے کیے اور سیدھا بیٹھ گیا۔ "تم پڑھے لکھے اور مہذب آدمی نظر آتے ہو۔" اس نے ایک گلاس کے باقی ماندہ مشروب کو حلق سے اتار کر کہا۔ "تمھیں تجربہ نہیں ہوا کبھی کسی بزنس ایگزیکٹو کے کمرے میں جانے کا؟"

"اکثر ہوا ہے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں چار سال انگلینڈ میں بھی رہا ہوں اور میں نے یہی دیکھا ہے کہ مالک کبھی اپنے ماتحتوں کے کمرے میں جانے کے لیے ان سے اپائنٹمنٹ نہیں لیتے۔"

"ناؤ لک ہیئر مین!" اس نے برا سا منہ بنایا۔ "مجھ سے کوئی کام ہے مجھ سے تو بولو۔"

"مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی بے نیازی کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی۔ "مجھے یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ آفس بند ہے، اشتہار نمائب ہے۔ کیا تمھیں دلاور نے اطلاع نہیں دی تھی کہ شرافت علی کو قتل کر دیا گیا ہے اور تمھیں فوراً واپس آجانا چاہیے۔ اگر نہیں دی تھی تو وہ سخت غیر ذمے دار آدمی ہے اور دی تھی تو تم...."

"واٹ از آل دس نان سنس؟" وہ میز پر مکا مار کے بولا۔ "ہو دی ہیل آر یو؟"

"ٹیک اٹ ایزی مسٹر ڈی سلوا!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔ وزیر خان کا بیٹا سکندر بخت۔"

حسبِ توقع یہ ڈرامائی اعلان بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا سانس رک گیا اور اس کی آنکھیں مجھ پر جمی رہ گئیں۔ اس کی سیکرٹری کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے فوراً مراجعت اختیار کی اور نکلتے ہوئے دروازہ بند کر گئی۔ ایئر کنڈیشنر ابھی ابھی چلایا گیا تھا چنانچہ کئی دن بند رہنے والے آفس میں محبوس ہوا کا اثر باقی تھا۔ "تمھیں یقین نہیں آ رہا ہے کیا؟" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ڈی سلوا ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور مسکرایا۔ "نہیں، یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں مسٹر سکندر!" اس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھایا۔ "ویلکم ٹو پاکستان۔" وہ بڑا اچھا اداکار بھی تھا۔

"اوہ نو۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کاش میں پاکستان نہ آیا ہوتا۔ میر شرافت علی کا قتل...."

"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "جب ہمبرگ میں مجھے دلاور کا کیبل ملا کہ اس کو کسی نے قتل کر دیا ہے تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔ اس کا تو کوئی دشمن نہیں تھا۔ ویری نائس مین۔ پرفیکٹ جنٹل مین۔ مگر میں فوراً واپس نہیں آسکتا تھا۔"

میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اس کے قتل کا الزام مجھ پر ہے؟"

ڈی سلوا اچھل پڑا۔ "آپ پر.... اوہ نو!" اس نے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا لیکن اداکاری اچھی ہونے کے باوجود میں سمجھ گیا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بن رہا ہے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ تو لندن میں تھے؟"

"ہاں، وہ پرانی بات ہے۔ تازہ ترین بات یہ ہے کہ پولیس نے قتل کا الزام مجھ پر عائد کیا تھا اور مجھے گرفتار کر لیا تھا لیکن میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور اب مقدمہ چلے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ میں اس کمپنی کا مالک ہوں۔"

"آف کورس...." وہ بولا۔ "لیکن مسٹر سکندر! آپ میری قانونی مجبوریوں کو درگزر کریں گے۔ اگر آپ نے قانونی کارروائی کے بعد عدالت سے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہے تو میں آپ کو مالک تسلیم کرتے ہوئے آپ کا ہر حکم ماننے کا پابند ہوں۔ آپ وہ سرٹیفکیٹ مجھے دکھا دیجیے۔ اس کی عدم موجودگی میں اگر میں آپ کو اس دفتر کی حدود میں قدم رکھنے سے بھی روکنا چاہوں تو اس کا مجاز ہوں۔"

"آف کورس۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "میں خود کوئی غیر قانونی کام پسند نہیں کرتا اور اس فرض شناسی کے مظاہرے کا بالکل برا نہیں مانوں گا۔ ویسے تمھاری اطلاع کے لیے.... وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے۔ اس میں وقت تو لگے گا مگر زیادہ نہیں۔ بہت سینئر ایڈووکیٹ میری پیروی کر رہے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "آپ کے حقِ ملکیت کو کوئی چیلنج نہیں کر رہا ہے، لیکن وہ مرڈر چارج بہت سیریس ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ میری خواہش ہوگی کہ آپ باعزت طور پر بری ہو جائیں مگر یہ قانونی معاملہ ہے۔ کوئی بات قبل از وقت آپ بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"ہاں پھانسی ہو گئی تو اور بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عمر قید کی صورت میں بھی مالک میں رہوں گا۔"

"تاہم میں کسی الجھن یا قانونی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آج تو آپ سیدھے اندر آگئے لیکن اگلی مرتبہ یہ خیال رکھیے کہ وراثت کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں ہونا چاہیے ورنہ آپ کو ٹریس پاس کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"ایک موقع کیوں دے رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اسی وقت کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جھک کر کھلی دراز میں سے کوئی چیز اٹھائی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں ایک ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کو میز پر رکھ دیا۔ "ناؤ۔ پلیز گیٹ آؤٹ۔" وہ بولا۔

"جیسی تمھاری مرضی۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یو آر دی باس۔"

میرا لہجہ اتنا نارمل اور شریفانہ تھا کہ میں نے اچانک میز الٹی تو وہ سنبھل نہ سکا۔ ریوالور پھسل کر نیچے گرا اور میز کا کونا لگنے سے وہ کرسی سمیت پیچھے گیا مگر کرسی کے گھوم جانے سے گرا نہیں۔ میز پھر سیدھی ہو گئی لیکن اس پر رکھا ہوا تمام سامان ٹیلیفون سمیت نیچے گیا تو آوازوں کا ملا جلا شور بلند ہوا۔ ڈی سلوا نے چیخ کر کہا۔ "یو باسٹرڈ۔" لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔ میں میز کے گرد گھوم کر اس کے مقابل جا کھڑا ہوا تھا اور اس نے جھک کر پھر ریوالور اٹھانا چاہا تو میں نے اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے اس ہاتھ کو پکڑ کے جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر کرسی کے پیچھے جا گرا۔ اسی وقت دروازہ دھماکے سے کھلا اور اس کی سیکرٹری بدحواسی کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔ ڈی سلوا نے اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور اٹھتے ہوئے.... میرے پیٹ میں مکا مارا جو کسی پیشہ ور باکسر کا مکا تھا اور کسی عام آدمی کے پیٹ پر پڑتا تو وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا لیکن میں بروقت یہ وار سہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے بدستور اپنے قدموں پر کھڑا دیکھ کے ڈی سلوا حیران ہوا۔ اسی وقت میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے اس کے شانے پر وار کیا۔ وہ کراہا اور اس کا دایاں آدھا جسم درد کی شدت سے مفلوج ہو گیا۔ وہ سہارے کے لیے جھکا اور کرسی پر گر گیا۔ اس کی سیکرٹری کو اچانک احساس ہوا کہ اس کے فرائض چیخ مارنے پر ختم نہیں ہو جاتے۔ وہ واپس پلٹ کے بھاگنے والی تھی کہ میں نے اس کو جا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اس نے دوسری چیخ بلند کی جو بالکل حقیقی خوف کی وجہ سے نکلی تھی۔ وہ میز سے ٹکرائی اور قالین پر گر گئی۔ "تمھاری سیکرٹری نازک اور نااہل ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کو باہر کے کمرے سے ہی پولیس کو فون کرنا چاہیے تھا اور تم مالکوں کو کبھی شہزادہ مت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سمجھو مسٹر منیجر! بعض مالک اپنی حیثیت کو قانون کی مدد ... کے بغیر بھی تسلیم کرانا جانتے ہیں۔ زورِ بازو سے۔ میں نے بلیک بیلٹ کے لیے کوشش نہیں کی ورنہ لے سکتا تھا مگر میں ہتھیار کے بغیر لڑنے کے فن سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"مجھے اب یقین آگیا ہے کہ تم نے میر شرافت علی کو ضرور قتل کیا ہوگا۔" وہ مجھے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا۔ "لیکن میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"

"اور میرا نام سکندر ہے۔ ایکزنڈر دی گریٹ کے نام پر۔" میں نے ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم اگر اس یقین کی بنیاد پر عدالت میں میرے خلاف بیان دینے کے لیے آنا چاہو تو ضرور آنا۔ تمہاری یہ سیکرٹری دس منٹ میں اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس وقت تک تم بھی ہلنے جلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ چاہو تو پولیس کو فون کر دینا۔ تمہارے لیے کچھ ثابت کرنا ذرا مشکل ہوگا کیونکہ اس وقت میں دوسری جگہ ہوں جہاں میری موجودگی کے گواہ وکیل اور ڈاکٹر قسم کے معتبر لوگ ہیں۔" میں نے ریوالور کو خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈالیں۔ ریوالور کو رومال سے صاف کیا اور ڈی سلوا کی طرف پھینک دیا۔ اعشاریہ بتیس کی یہ گولیاں ہمارے کام آسکتی تھیں مگر اس وقت میں نے ان کو مٹھی میں یوں رکھا جیسے میرا ارادہ باہر جا کے ان کو پھینک دینے کا ہے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے نیچے اتر گیا۔ مال روڈ چند قدم کے فاصلے پر تھی اور ریگل کے بس اسٹاپ پر مجھے رکشا مل گیا جس نے گیارہ بجے مجھے میو ہسپتال پہنچا دیا۔ ہسپتال کے اندر پھرنے والے ایک بچے سے میں نے دو اردو کے اور ایک انگریزی کا اخبار خریدا اور امراضِ قلب کے وارڈ میں پہنچا تو مجھے محسن اور رابعہ برآمدے میں کھڑے دکھائی دیے۔

"ابھی تک تو سب خیریت ہے۔" رابعہ نے میرے پوچھنے پر کہا۔ "ڈاکٹر چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے قبل کوئی بات یقین کے ساتھ بتانے کے لیے تیار نہیں اور نہ ایک نظر دیکھنے کی اجازت دینے کے لیے۔"

"میرا خیال ہے تم گھر جاؤ۔ کچھ دیر آرام کر لو۔" میں نے کہا۔ "رات بھر جاگتی رہی ہو۔ شام کو آجانا۔"

"جاگتے تو تم بھی رہے ہو۔" وہ بولی۔ لیکن میرے اور محسن کے اصرار پر وہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ہم ابھی تو یہاں موجود ہیں اور اگر گئے بھی تو ایک ساتھ نہیں جائیں گے یا وقفے وقفے سے چکر لگاتے رہیں گے۔"

اس کے جانے کے بعد محسن اور میں برآمدے کے سامنے مختصر سے پارک میں لگی ہوئی بینچ پر جا بیٹھے جس کے اوپر ایک درخت چھتری کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اخبار دینے کے بجائے میں نے اسے ڈی سلوا سے اپنی مڈبھیڑ اور غلام علی سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بتایا۔ "پہلے شک تھا اب یقین ہے کہ منیجر اسی گروہ کا ایک رکن ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر شرافت علی اور دلاور مل کر یہاں کے معاملات کو سنبھالتے تھے تو ڈی سلوا آگے لائن ملاتا اور کلیئر رکھتا تھا۔ وہ یورپ کا دورہ کر کے لوٹا ہے جو ظاہر ہے اپنے ناجائز کاروبار کے فروغ کے لیے ہوگا۔ اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یار! جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ اسے دلاور کا کیبل ہیمبرگ میں ملا تھا جس میں قتل کی اطلاع دی گئی تھی تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ واپس آکے وہ دلاور سے نہ ملے۔ تفصیلات نہ پوچھے اور اطمینان سے اپنے پرائیویٹ آفس میں شراب و شباب کے شغل فرمانے لگے۔ مجھے ڈی سلوا بھی دلاور سے کم خطرناک نہیں لگتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا نوجوان اور جوشیلا ہے، دلاور ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی ہے۔ اگر اس نے فون کر کے دلاور کو بتایا کہ سکندر سے مارپیٹ ہوگئی ہے تو دلاور اسے ہی قصوروار ٹھہرائے گا کہ مشتعل ہونے کی کیا ضرورت تھی اور وہ معاملے کو آگے نہیں جانے دے گا۔ ڈی سلوا سے ملنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ غلام علی نے جو کچھ بتایا ہے اس کی تصدیق ہو جائے۔"

"ہاں یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ جھوٹا آدمی ثابت ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "مگر غلام علی سے ملنا بہت اچھا رہا۔ میں نے یہاں سے فون پر بات کی تھی منظر صاحب نے بتایا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے لیے کیس فائل کر دیا گیا ہے اور ایک دو دن میں سماعت ہوگی۔ گواہ تیار رہیں۔ ویسے سکندر! جانے کیوں یہ مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ ایک اندیشہ ہے کہ پوسٹ مارٹم سے کچھ ثابت نہیں ہوگا۔ اور فرض کرو ... بھی تو قتل کا شبہ کس پر ظاہر کیا جائے گا؟ میر شرافت علی تو مر گیا۔ دلاور یا ڈی سلوا وغیرہ کو براہِ راست ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں۔ ... بھی زیادہ پرامید نہیں۔"

"مسئلے کے دو پہلو ہیں محسن!" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ متوفی وزیر خان کی موت طبعی اسباب کا نتیجہ تھی یا نہیں اور دوسرا یہ کہ موت طبعی نہیں تھی تو قاتل کون ہے۔ دوسرے سوال کا جواب اتنا اہم نہیں جتنا ایک سازش کے وجود کو ثابت

کرنے کے لیے میرے والد کی موت کا قتل ثابت ہونا۔ اس سے میرے کیس کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ ایک لکھ پتی کیسی غربت میں مرا اور کس طرح مالک کے پرانے نمک خواروں کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ اس کا ذمے دار کوئی تو تھا؟"

"ہاں! اور جب یہ طے ہو جائے گا کہ میر شرافت علی تھا تو یہی تیرے خلاف انتقامی کارروائی کے الزام کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی بن جائے گا تو یہ سوچ کہ جس بیٹے کو اچانک معلوم ہو کہ ایک شخص نے بلیک میل کر کے اس کے بوڑھے باپ کو لکھ پتی سے فقیر کر دیا۔ ذلت و رسوائی کی اس حد تک پہنچایا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مظلوم میرا باپ بھی تھا اور میں بھی ہوں۔ ظالم کی رسی کہاں تک دراز ہوگی؟"

محسن نے مزید کچھ نہیں کہا اور مجھ سے ایک اخبار لے لیا۔ دوسرا اخبار میں نے دیکھا۔ اس میں شہر کی خبروں کے صفحے پر دو خبریں تھیں۔ ایک میں چراغ دین کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر سے ملنے والی سلامت شاہ کی لاش کا ذکر سیاق و سباق کے حوالے سے تھا چنانچہ اس میں میرا نام بھی آیا تھا تاہم مجھ پر کسی قسم کے شبہے کا اظہار نہ پولیس نے کیا تھا جن کے نزدیک وہ صفائی کا سب سے اہم گواہ تھا اور نہ چراغ دین نے۔ اس نے اور گلاب خان چوکیدار نے اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ متوفی بہت ہی شریف النفس انسان تھا اور اس سے کسی کی دشمنی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حسبِ معمول پولیس نے نامعلوم قاتلوں کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ دوسری بہت مختصر خبر ایک گمنام مزار کے کھنڈر سے ملنے والی کسی فقیر کی مسخ شدہ لاش کے بارے میں بھی تھی جس کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ فقیر۔ نومانجو نے میرے کان میں کہا۔ "فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔ لوگ ہمیں ملنگی اور ہم خود کو نومانجو کہتے تھے۔ ویسے تھے فقیر۔ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ مالی طور پر بھی۔ حلیے سے بھی، صورت سے بھی۔ بے نوا مر کے ہم جو رسوا تو کیا ہوا۔ زندگی میں کون سے عزت دار تھے۔"

"سکندر!" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ "تو نے دلاور کی صورت تو نہیں دیکھی تھی نا! پھر تو اسے کیسے پہچانے گا؟"

"پہچان لوں گا۔ وہ آواز سے شناخت ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "بے شک وہ اس وقت آواز بنا کے بول رہا ہوگا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں لہجہ چغلی کھائے گا۔ اس کے علاوہ میں دیکھوں گا کہ وہ کس حد تک شاک پروف ہے۔"

"میرا خیال ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اوّل تو مجھے تیرا یہ دعویٰ مبالغے پر مبنی نظر آتا ہے کہ تو اسے آواز اور لہجے کی کسی لغزش سے پہچان لے گا۔ پھر یہ کہ تو نے اسے پہچان لیا اور اس نے مان لیا کہ میں ہی چوہدری دلاور ہوں، فرمایئے آپ کی کیا خدمت کروں تو تو کیا کہے گا اس سے کہ ذرا چلیے تھانے آپ سے کچھ اعترافِ جرم کرانا ہے؟ کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ اس رات تجھے ہوٹل سے اٹھا کے لے جانے والا یہی چوہدری دلاور تھا۔ وہ کہے گا جناب آپ بہکے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اس رات میں فلاں جگہ پر تھرڈے پارٹی میں شریک تھا اور اس ہدایت کار کی کوٹھی کا کیا! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نام کا کوئی ہدایت کار ہے۔ ہدایت کار ہوتا کیا ہے ویسے؟ کیا جواب دے گا تو اسے؟ اگر حماقت میں آپ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہا کہ بدمعاش! اس چوکیدار کو کس نے مارا تھا جس کی لاش انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں پڑی ہے تو وہ کہے گا اچھا؟ آپ نے دیکھی ہے؟ پھر تو فوراً پولیس کو بتانا چاہیے۔"

میں ہنس پڑا۔ "یہ سب امکانات میرے ذہن میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ میں اس سے خود کو متعارف کراؤں گا۔ اسی طرح جیسے میں نے خود کو ڈی سلوا سے متعارف کرایا تھا۔ اس سے معلوم کروں گا کہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے حصے داروں کی قانونی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے کتنے مالک ہیں یا تھے۔ اور وزیر خان مرحوم اگر پارٹنر تھے تو ظاہر ہے ان کا وارث میں ہوں اور میں اس لیے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے لیے کیس فائل کر دیا ہے۔ اداکاری مجھے کرنی ہے اور اسے یقین دلانا ہے کہ میں جانتے بوجھتے اسے یہ بتانے آیا ہوں کہ میرا حقِ وراثت سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اس کی دی ہوئی ایک مہینے کی مہلت کی پرواہ نہیں کرتا چنانچہ میں نے حقِ وراثت کا کیس فائل کر کے اسے چیلنج کر دیا ہے کہ اب وہ جو چاہے کرے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ وہ مشتعل ہوگا، اور اس کا ردِعمل فوری ہوا تو وہ وہیں مجھے بتا دے گا۔ دوبارہ مجھے دھمکی دے گا کہ برخوردار! میں نے کہا تھا، کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ایک بار یہاں سے نکل گئے تو ہماری دسترس میں نہیں رہو گے۔ قانون کا تحفظ تمہیں بچا لے گا یا تم اپنی ذہانت اور چالاکی سے کام لے کر بچ جاؤ گے۔ وہ اپنا کمرہ بند کر کے مجھ سے یہ بات کہہ سکتا ہے لیکن وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے گا تو اس وقت کچھ ظاہر نہیں ہونے دے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گا مگر آج کل میں پھر کوئی قدم اٹھائے گا۔"

"یعنی تو چاہتا ہے کہ استاد پیڈرو اینڈ کمپنی تجھے پھر اٹھا لے جائے اور ایک مرتبہ پھر وہی سبق بہتر طور پر دے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ پہلی بار انہوں نے بے خبری میں مجھے آ لیا تھا۔ اور میں خالی ہاتھ تھا۔" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ میں ان کا انتظار کروں گا اور میرے پاس بھی بھرا ہوا ریوالور ہوگا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ناجائز طور پر حاصل ہونے والا اسلحہ استعمال کرنے سے ایک اور مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے چنانچہ میں اس سے فائر کروں گا بھی تو کسی کو نشانہ نہیں بناؤں گا مگر فائدہ پورا اٹھاؤں گا ہاتھ میں ریوالور ہو تو گولی چلائے بغیر بھی حریف پر غلبہ حاصل رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ان میں سے کوئی میرے ہاتھ لگ جائے تو میں بھی اس سے کچھ پوچھوں۔ وہ سب باتیں جو میرے لیے جواب طلب ہیں۔ قانون کی مدد سے میں ان کو کسی اعترافِ جرم پر مجبور نہیں کر سکتا اور ان کو کسی انصاف کی عدالت میں کھینچ کر نہیں لے جا سکتا اس لیے کہ میرے پاس ثبوت، شہادت اور گواہ نہیں۔ میں ان کو انہی کے طریقے آزما کے زیرِ دام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ بڑا شکاری کون ہے۔ اگر ملاقات کے دوران میں خود دلاور نے اپنے آپ کو مجھ پر ظاہر کر دیا تو یہ کھلی جنگ ہوگی ورنہ اگلی مرتبہ کی شوٹنگ کہیں اور ہوگی محسن! کردار جگہ بدل لیں گے۔ استاد پیڈرو کی جگہ تو لے سکتا ہے۔ دلاور کی جگہ میں اور میری جگہ دلاور۔ ہم بھی کوئی خالی کوٹھی تلاش کریں گے۔"

"تو دلاور کو اغوا کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے؟" محسن نے کہا۔ اس کی دلچسپی اچانک بڑھ گئی تھی۔

"ابھی تک بنایا تو نہیں مگر بنایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے میں اسے پہچان لوں۔ شکاری کو بہت محتاط ہو کے جال پھیلانا چاہیے اور اپنے شکار کی نفسیات کو سمجھ کے وقت اور مقام کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ وہ خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی ہے جو شکار اور شکاری کے درمیان آخری معرکے تک چلتی ہے۔ پہلے میں شکار تھا اب شکاری ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زبردست ہوں۔ دلاور چیتے کی طرح چالاک، عیار اور سفاک ہے لیکن میں خود کو اس سے کمتر نہیں سمجھتا۔ وہ نہ سہی استاد پیڈرو میرے ہاتھ آ جائے۔ تفتیش کے سارے طریقے میں جانتا ہوں۔ دیکھ چکا ہوں اور بھگت چکا ہوں۔ کتابوں میں پڑھ چکا ہوں اور ایجاد کر سکتا ہوں۔ قسم خدا کی اگر وہ پتھر کا مجسمہ بھی ہو تو میں اسے سچ بولنے پر مجبور کر دوں گا۔ ان حرامزادوں نے ایک بوڑھے بیمار کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے بعد شرافت کے کسی سلوک کی گنجائش کہاں رہی ہے۔" میں بات کرتے ہوئے سخت مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے کانوں کی لویں گرم ہو گئی تھیں اور خون کے سر میں کھنچ کر آ جانے سے میرا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

"تیرے دماغ کا ریڈی ایٹر گرم ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایسے گاڑی نہیں چلے گی۔ بات کرتا ہے عقل اور ذہانت کے کھیل کی، اور جذبات کی لہر آتی ہے تو خود پر قابو نہیں رہتا۔ شکاری کی دم! پہلے اپنی نفسیات تو ٹھیک رکھ۔ کسی اور کی نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ تیری اپنی کمزوری کیا ہے ورنہ وہی ہوگا کہ شکار کھیلنے کو گئے شکار ہو کے چلے۔"

"معاف کرنا یار! آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کبھی مجھے مشتعل ہوتے دیکھا تو نے؟ مگر آدمی ہوں۔ بھول خطا سے مبرا نہیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سالارِ اعظم اقبال نے فرمایا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔ تو میرا پاسبانِ عقل ہے۔"

"مگر اگلے مصرعے میں شاعر نے فرمایا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ تو برادرِ نسبتی! دلاور سے ملنے آپ اکیلے جائیں گے۔ اسے براہِ راست مجھ سے خطرہ نہیں اور تیرے ساتھ جا کے میں اعلانیہ اس جنگ میں شریک ہونا اچھا نہیں سمجھتا۔"

"میں جاؤں گا کھانے کے وقفے کے بعد۔" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "ابھی ایک بجا ہے۔ چل ہم بھی کہیں ماحضر تناول فرماتے ہیں۔ اس کے بعد تو واپس ہسپتال آ جانا میں شاہدرہ چلا جاؤں گا مگر پہلے بڑی بی کے بارے میں پوچھ لیں۔"

ہم نے ایک ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ اس نے کہا کہ صورت حال زیادہ تبدیل تو نہیں ہوئی ہے لیکن کچھ امید پیدا ہو چلی ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ رات تک افاقہ جاری رہا تو کل صبح ان کو اس یونٹ سے پرائیوٹ وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک نظر دیکھنے کی اجازت ہوگی مگر بات کرنے کی نہیں۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شاید دس دن بعد ان کی حالت اس حد تک بہتر ہو جائے کہ وہ بات کر سکیں لیکن کم سے کم ایک مہینے تک ان کو بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ مدت چھ ماہ بھی ہو سکتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے، وزن اٹھانے، محنت مشقت کا کوئی کام کرنے اور فکر و غم سے بچنے کی احتیاط تو تمام عمر کرنی ہوگی۔

میں اور محسن ہسپتال کے عقبی دروازے سے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف والی سڑک سے نیلا گنبد تک گئے۔ نعمت کدہ پہنچنے کے لیے انارکلی کے دوسرے کنارے تک جانے کے بجائے میں نے پاک ٹی ہاؤس کو ترجیح دی اور ہم بائیں جانب ہوسٹل کی عمارت کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بنک اسکوائر کی طرف سے کاریں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں پلٹ کر نیلے رنگ کی اس ٹویوٹا کراؤن کار کو دیکھنے لگا جو چند سیکنڈ میں مال روڈ کی طرف سے آ کے سیدھی انارکلی کے چوک کی طرف نکل گئی تھی۔ آگے بھیڑ تھی چنانچہ میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ کار دائیں جانب مڑی یا سیدھی اس سڑک پر گئی جو لاء کالج کے سامنے سے گزر کے ضلع کچہری والی سڑک سے جا ملتی تھی اور پھر بائیں طرف وہی راستہ تھا جو بادشاہی مسجد اور منٹو پارک کی طرف سے راوی کے پل کی طرف جاتا تھا۔ پل کے دوسری طرف سے شاہدرہ کا علاقہ شروع ہوتا تھا جہاں "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلکس بھی تھا۔

"کیا بات ہے؟" محسن نے اخبار لپیٹ کر ڈنڈے کی طرح میرے شانے پر بجایا۔

"ابھی ایک کار گزری تھی، نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن۔" میں نے کہا۔ "غالباً وہ ڈی سلوا کی کار تھی۔ ڈی سلوا کو میں نہیں دیکھ سکا مگر مجھے شک یہ ہوا کہ اس میں پیڈرو بیٹھا تھا۔"

"نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن؟ ایسی گاڑیاں تو شہر میں دو چار ہی ہوں گی۔ اگر ایک ہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔" محسن بولا۔ "نمبر یاد نہیں؟"

"نمبر یاد تو ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت نہیں دیکھ سکا۔"

دو بجے میں نے محسن سے کہا کہ آنے جانے اور چوہدری دلاور سے ملاقات کرنے میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے صرف ہوں گے اور میں شام پانچ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ امید ہے اس وقت تک رابعہ بھی آ جائے گی اور ہم رات کو رابعہ کو اس کے گھر پر چھوڑ کے ضامن رضوی صاحب سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق رات کا کھانا ان کے گھر پر ان کے ساتھ کھا سکیں گے۔ پھر محسن واپس چل پڑا اور میں نے وہیں سے رکشا لیا۔ رکشا والے نے فراخدلانہ پیش کش کی کہ میں پچیس روپے سکہ رائج الوقت علاوہ کرایہ کے ادا کروں تو وہ مقبرۂ جہانگیر کے باہر ایک گھنٹہ میرا انتظار کرے گا مگر میں نے کہا کہ مجھے شاہدرہ میں چھوڑ کے وہ جب تک چاہے جہانگیر کے مقبرے کے باہر کا چاہے انتظار کرے۔ چونکہ مجھے جہانگیر کے مقبرے جانا ہی نہیں، اس لیے میں کرایہ بمطابق میٹر نذر کر سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔ بعد میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میٹر کی رفتار رکشا کی رفتار سے کتنی زیادہ تھی اور میٹر کس حد تک مالک کے ذہن کے تابع تھا۔ اس نے جو کرایہ ظاہر کیا وہ اصل سے تقریباً پچیس روپے زیادہ ہی تھا۔ ابھی میرا احتجاج اور اس احتجاج پر ڈرائیور کا احتجاج شروع ہی ہوا تھا کہ ایک سارجنٹ نمودار ہوا جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ "ارے حشمت خان!" میں نے صدا لگائی اور ڈرائیور نے بہ عجلت تمام فرار ہونے میں بہتری دیکھی۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ حشمت خان نے اس بے تکلفی سے پکارے جانے کا کتنا برا منایا ہے۔ اس نے دھواں دھار بھاری بھرکم موٹر سائیکل ایک طرف روک لی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خالص تھانیداری لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہاری خیریت پوچھنی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے رکشا والے کو نقصان ہو گیا۔ جائز کرایہ تک چھوڑ کے بھاگ گیا ورنہ پچیس روپے زیادہ مانگ رہا تھا۔"

حشمت خان نے رکشا والوں کی شان میں چند الفاظ کہے۔ مجھے خوشخبری دی کہ انشاءاللہ چودہ دن بعد چالان پیش کر دیا جائے گا اور امید ظاہر کی کہ اب فیصلے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اسے سلامت شاہ کے مارے جانے کے بعد میرے تختۂ دار تک پہنچنے کے امکانات خاصے روشن نظر آنے لگے تھے۔ پھر چلتے چلتے اس نے پوچھا کہ میں کہاں پھر رہا ہوں اور میں نے کہا "مقصد ایصالِ ثواب و فاتحہ خوانی ہے کہ مزار مبارک میرے جدِ امجد کے آقائے ولی نعمت، فرمانروائے اقلیم ہند، شیخو عرف سلیم پسرِ جلال الدین الموسوم بہ۔۔۔"

"اچھا اچھا۔" حشمت خاں نے کہا۔ "بابا شیخو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ یہاں کسی سے پوچھ لو۔ مجھے تو معلوم نہیں۔" اور روانہ ہو گیا۔ میں نے مقبرۂ جہانگیر کے پرشکوہ میناروں پر نگاہ ڈالی جن کی سربلندی درختوں کی سرسبزی اور سرفرازی میں بھی نمایاں تھی اور ہندوستان کے اس عظیم انصاف پرور شہنشاہ کی روح سے معذرت چاہی کہ اگر بیسویں صدی کا ایک تھانیدار اتنا جاہل ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر میں نے "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلکس کی جستجو کا آغاز کیا۔ اکثر لوگ پی ڈبلیو ڈی کا پتا بتانے پر آمادہ ہوئے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیکن بالآخر ایک خضرِ راہ نے میری منزل تک رہنمائی کی اور مجھے تقریباً ایک ایکڑ پر محیط کارخانے کے دروازے تک پہنچا گیا۔ فیکٹری آدھے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور مخروطی چھت والی چار لمبی لمبی بیرکوں کے علاوہ سرخ اینٹوں کی ایک عمارت پر مشتمل تھی۔ جس کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ بند گیٹ کے اوپر نیم دائرے کی صورت میں سائن بورڈ نصب تھا اور بائیں طرف کی دیوار پر "کوئی جگہ خالی نہیں ہے" کا بورڈ آویزاں تھا جو کال بے حسی کے ساتھ تمام بیروزگار اور تلاشِ معاش میں سرگرداں لوگوں کو کسی اور در پر جانے کا مشورہ دے رہا تھا جہاں اسی قسم کے دوسرے بورڈ پہلے سے موجود تھے۔ گیٹ کے باہر آٹھ فٹ لمبا چوڑا پختہ کیبن تھا جس کی کاؤنٹر ٹائپ کھڑکی کے پیچھے ایک اسمارٹ نوجوان بیٹھا جیمز بونڈ کا نیا ناول پڑھ رہا تھا۔

"مجھے چوہدری دلاور سے ملنا ہے۔" میں نے صاحب کے لفظ کو عمداً گول کر دیا اور بلاوجہ مسکرایا۔

نوجوان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے ناول رکھ کے انگریزی میں کہا۔ "اور کام کیا ہے ان سے؟"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "ذرا اردو میں یا پنجابی میں بتاؤ۔ مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اپنی بات دہرائی اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"نام اور کام بتلائے بغیر ملاقات نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی یہاں نیلے رنگ کی ایک کار آئی تھی ٹویوٹا کراؤن؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا جو نشانے پر بیٹھا۔

"وہ ڈی سلوا صاحب کی گاڑی تھی۔ وہ چلے گئے۔" نوجوان نے مجھے مطلع کیا۔ میرا رویہ اس کے لیے پُراسرار ہونے لگا تھا۔

"ہاں۔ ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ تم نے دیکھا تھا؟" میں نے اپنے پُراسرار رویے کو برقرار رکھا۔

"کوئی تھا تو سہی۔ میں نے غور نہیں کیا کون تھا۔" نوجوان بولا۔

"تمہیں غور کرنا چاہیے۔ تمہیں یہاں اسی لیے بٹھایا گیا ہے۔ آئن فلیمنگ کے جاسوسی ناول ضرور پڑھو مگر غور ضرور کرو۔ وہ آدمی میں تھا۔ کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

نوجوان نروس ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ نکال

کے چوکیدار کو آواز دی کہ صاحب کو جانے دو۔ میں ... گیٹ کے درمیان کھل جانے والے چھوٹے گیٹ ... احاطے میں داخل ہوا اور لیٹے ہاتھ پر بنی ہوئی ... کی سرخ عمارت کے برآمدے میں چلنے لگا جس ... کے دروازے پر "ڈائریکٹر" کا بورڈ تھا۔ میں نے دروازے ... کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے ... کسی آواز کے بغیر آہستہ آہستہ خود بند ہو گیا۔ کمرہ ... ہال کے چوتھائی حصے کے برابر لمبا تھا جسے لکڑی اور ... والے دار اندھے شیشے کی پارٹیشن سے چوڑائی کے ... گیا تھا اور میرے سامنے پندرہ فٹ تک پھیلا ہوا ... خروج کے حصے میں قالین والے فرش پر دیوار کے ساتھ ... ساتھ ایک صوفہ سیٹ تھا اور اس کے مقابل ... آخری حصے میں چھ فٹ چوڑی گلاس ٹاپ ٹیبل پر ... کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور دو ٹیلی فون رکھے تھے ... انٹر کام تھا اور ایک ٹائپ رائٹر۔ ٹیوب لائٹ میز کے ... وسط میں چھت سے آویزاں تھی۔ خود میز پر بیٹھنے والا ... تھا۔ اس کی خالی کرسی کے پیچھے اسٹیل کی ایک الماری ... دو فائل کیبنٹ تھے۔ میں نے پارٹیشن وال کے درمیانی ... سے بقیہ تین چوتھائی ہال میں قدم رکھا جو اب پندرہ فٹ ... چوڑا اور بیس فٹ لمبا کمرہ بن گیا تھا۔ اس کمرے میں ... ٹو وال کارپٹ تھا جس کا رنگ زرد تھا اور اس میں ... پھول تھے۔ کھڑکیوں اور دروازے پر گہرے نیلے ... تھے جن میں سرخ لکیروں سی جھلملاتی تھیں اور اوپر ... رنگ کی جھالر تھی۔ بائیں ہاتھ کے گوشے میں لمبی سی ... ٹیبل کے گرد دو صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور میز ... گل دستہ رکھا تھا ——— بائیں گوشے میں قوس ... تین فٹ چوڑی میز تھی جس کی شکل کچھ انسانی گردے ... ملتی جلتی تھی۔ اس قوس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی ... تھی اور دوسری طرف مہمانوں کے لیے چھ کرسیاں نیم ... بناتی تھیں۔ ایک شخص میز پر ہاتھ رکھ کے جھکا ہوا اس ... کو کچھ سمجھا رہا تھا جو کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ... نے باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ جو شخص کھڑا تھا سیکر... ہی ہو سکتا تھا یعنی باہر کے کمرے میں بیٹھنے والا۔ کرسی ... ہوئے شخص نے اطمینان سے پشت کا سہارا لے لیا۔

میرے ذہن میں دلاور کی صورت کا کوئی تصور ... میں نے صرف اس کا متحرک سایہ دیکھا تھا جس کی حرکا... سکنات واضح تھیں۔ اس کے سگریٹ پینے، سر ہلانے ...

کرنے کا اور پہلو بدلنے کا انداز میرے ذہن میں تھا اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا شخص قد و قامت اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہی چوہدری دلاور ہے۔

"چوہدری دلاور؟" میں نے اس کے سوالیہ نشان بن جانے والے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

کلین شیو سرخ و سفید صحت مند چہرے پر آہستہ آہستہ مسکراہٹ پھیلی اور وہ اطمینان بلکہ کاہلی سے تھوڑا سا اٹھا۔ "آیئے آیئے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کے نیم خواندہ پنجابی لہجے میں کہا۔ "ابھی ابھی اپنے وہ آئے تھے۔ کی ناں اے اوناں دا، ڈی سلوا صاحب؟" اس نے میز پر ہاتھ مارا اور نام بروقت یاد آ جانے پر داد طلب نظروں سے سیکرٹری کو دیکھا۔ "وہ آخ گئے تھے۔ بوت کچھ۔ کیوں بھئی؟" سیکرٹری نے اقرار میں سر ہلایا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ شکایت کرنے آئے ہوں گے۔"

دلاور بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "شکایت تو سارے زمانے کو سارے زمانے سے ہے۔ کیوں بھئی؟" اس نے سیکرٹری کی طرف دیکھا اور وہ عادی معلوم ہوتا تھا چنانچہ اس نے فوراً سر ہلا کے تائید کی۔ "چھڈو پراں۔ میں نے کہا اوئے تو بھی تو بڑی گرمی کھاتا ہے۔ تھوڑی نرمی بھی رکھ مزاج میں۔ پر وہ تھوڑا اثر ور میں تھا۔ سمجھ گئے ناں آپ؟ اپنا دیسی صاب ہے نا۔ چسکی مسکی لگا لیتا ہے کبھی۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "چسکی اور مسکی دونوں سے دفتر ہی میں شوق کر رہے تھے۔ غالباً یورپ میں للاؤ رکھتے رہے۔"

دلاور نے فلک شگاف قہقہہ مارا۔ "او بھئی کمال گل کیتی لے۔ روزے۔ ہاہاہا... چسکی اور مسکی۔ ہاہاہا۔" پھر ہنسی اچانک یوں بند ہوئی جیسے بجلی جانے سے ریڈیو بند ہوتا ہے۔ "تو کی سن رہیا ایں بھئی؟ جا پتر! اپنا کام کر باہر بیٹھ کے اور کوئی لسی پانی بھیج اندر۔ کیوں بھئی لپنے سکندر صاب! آپ تو ادھر ولایت سے آئے ہو۔ لسی تو ہم دیسی بندے پیتے ہیں۔ آپ بولو چلائے چلے گی کہ کافی؟"

"اگر کافی مل جائے تو..." میں نے سیکرٹری کی طرف دیکھ کے کہا جو روانہ ہو کے رک گیا تھا۔ میری بات سن کے وہ پھر چل پڑا۔

"اس کو سمجھا دیا ہے میں نے۔ آپ بالکل فکر مت کرو۔" دلاور نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میں نے کہا او یار! پہلے ہی آپنی تھانہ کچہری ہو رہی ہے اس غریب کے ساتھ۔ چھڈ پراں۔ بات ختم کرنی چاہیے۔ اب اپنی سمجھ میں تو کچھ آتی نہیں۔ قانونی معاملہ ہے۔" قانونی معاملہ اس نے یوں کہا کہ مجھے کنونی ماملا سنائی دیا۔ "ہم کیا بولیں۔ کیوں جی؟ وہ جو آپ کے والد صاب تھے نا۔ ان سے اپنی بس ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر میر صاب مرحوم کے دفتر میں۔ بھلے مانس لگے ہمیں تو اور لوگ بڑی تعریف کرتے تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ بڑا افسوس ہوا تھا ان کے فوت ہونے کا۔ اور ابھی کتنے دن کی بات ہے۔ اس کے بعد میر صاب۔" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ "آدمی کا کچھ بھروسہ نہیں جی۔ شام کو ہے، صبح نہیں ہے۔ جو مرضی مولا کی ہو تو بندہ کیا کرے۔"

دلاور کے بارے میں پہلی ملاقات کے دوران میرا تاثر یہ تھا کہ وہ بڑا اچھا اداکار ہے اور اس نے جس پُراسرار ڈرامائی ماحول میں ڈرامائی انداز میں مکالمے بولے تھے، وہ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا ثبوت تھے۔ اگر یہ دلاور وہی تھا تو میرا تاثر بھی پھر وہی تھا کہ اس کے بولنے کا، ہنسنے کا، آہ بھرنے کا، بے تکلف گفتگو کا اور نیم خواندہ لہجے میں بات کرنے کا سارا انداز اس کا اصل انداز نہیں بلکہ اداکاری ہے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اگر وہ اداکاری تھی تو یہ اداکاری نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک شخص جو فیکٹری میں مالک کی حیثیت رکھتا ہو ہر روز اپنے تمام ماتحت ملازموں کے سامنے اداکاری کیوں کرے گا۔ عملاً یہ ناممکن سی بات تھی۔ اور قطعی غیر ضروری بھی۔ دلاور کی اصل شخصیت یہی تھی جو اس وقت میرے سامنے تھی۔ اگر اس نے اپنے سیکرٹری کے سامنے اچانک لہجہ، آواز یا انداز بدلے ہوتے تو سیکرٹری ضرور حیران ہوتا مگر وہ بالکل نارمل رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جس دلاور کا تاثر میرے ذہن میں تھا اس پر میرے مقابل بیٹھے ہوئے دلاور کی شخصیت کسی زاویے سے منطبق نہیں ہوتی تھی۔ میری ساری خوش فہمی رفع ہو گئی تھی۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں انداز و اطوار کی ذرا سی مماثلت بھی دیکھوں گا تو چوہدری دلاور کو شناخت کر لوں گا۔ اس نے میرے دعوے کو مبالغہ آمیز قرار دیا تھا اور یہ بات صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ اگر اس رات دلاور نے اپنی شخصیت بدلی تھی تو یہ تبدیلی ناقابلِ یقین حد تک مکمل تھی۔ اس رات مجھ سے پس پردہ رہ کے بات کرنے والے دلاور کی شخصیت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سو فیصد مختلف تھی۔ وہ مہذب، تعلیم یافتہ، پرسکون رہ کر نرم، ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بات کرنے والا دلاور تھا۔ اس کی کوئی جھلک مجھ سے مخاطب دلاور میں نہیں تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس رات چوہدری دلاور نے اداکاری کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا یا کسی اور کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ مؤثر طریقے پر مجھے سب سمجھا دے یا وہ کوئی اور تھا جس نے چوہدری دلاور کا نام استعمال کیا تھا۔ لیکن کوئی اور چوہدری دلاور مجھ سے یہ مطالبہ کیوں کرے گا کہ میں حقِ وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔ دو مالک مر گئے تھے۔ ان میں سے ایک لاوارث تھا۔ چوہدری دلاور کے بلاشرکتِ غیرے کاروبار پر قابض ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسرے واحد وارث کو راستے سے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے یا بہ جبر ہٹا دیا جائے۔

"لو جی اپنے سکندر صاب! آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری ماعری کرتے ہو گے۔" دلاور ہنسا۔ "ہم تو چٹے ان پڑھ لوگ ہیں، لوہا کوٹنے والے۔"

"معاف کیجیے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے والد صاحب کا ذکر کیا تو مجھے ان کی یاد آ گئی۔ اب یہ تمام کاروبار آپ ہی کو سنبھالنا پڑ رہا ہو گا؟ آپ کی ذمے داریوں میں تو بہت اضافہ ہو گیا ہے۔"

"دِقت پڑ گیا ہے جی! اپنے وزیر خان مرحوم حساب کتاب دیکھ لیتے تھے۔" اس نے کافی بنانی شروع کی جو نہ جانے کون اندر رکھ کے چلا گیا تھا۔ "میر صاب تھے، باہر کا سارا بزنس سنبھالتے تھے۔ ہم اِدھر مزے سے فیکٹری کو دیکھتے تھے اور بس۔ اب معلوم نہیں کیا ہو گا؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کی مدد کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ چوہدری دلاور نے حیران، سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ آپ پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ مجھ پر تو قتل کا مقدمہ چل رہا ہے، میں کاروبار کیسے سنبھال سکتا ہوں۔ آپ کا اندیشہ بجا لیکن مجھے میرے وکیلوں نے یقین دلایا ہے کہ کیس بوگس ہونے کی وجہ سے اتنا کمزور ہے کہ سزا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بے شک پیشہ ور وکیل موکل سے ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں۔"

"ہاں جی۔" وہ ہنسا اور اس نے کافی میرے سامنے رکھی۔ "وہ ایک لطیفہ ہے نا جناب کہ تھا کوئی ہمارے جیسا پینڈو اور اسے وکیل مل گیا کوئی چلتا پرزہ۔ تین سو سات کا کیس تھا جو اس کی پیروی سے تین سو چار کا بن گیا۔ موکل نے دہائی دی تو اس نے کہا دیکھو اپیل میں کیا ہوتا ہے۔ اپیل میں تین سو دو کا کیس ہو گیا اور پھانسی کی سزا ہو گئی تو موکل چلانے لگا۔ وکیل نے کہا: او بے وقوف! تیرے سامنے میری کوشش سے پانچ نمبر کم ہو گئیں۔ ذرا مہلت اور ملتی تو باقی دفعات بھی ختم کرا دیتا مگر تیرا ٹائم اور تیری فیس دونوں ختم ہو گئے۔"

جب وہ لطیفہ سنا رہا تھا تو میں نے اس کی پہلی غلطی پکڑی۔ ابھی وہ خود کو "چٹا ان پڑھ" کہہ رہا تھا اور لطیفے میں اس نے قانون کی دفعات کے حوالے بڑی روانی سے دیے۔ تین سو سات کا مطلب تھا اقدامِ قتل۔ تین سو چار غیرارادی قتل اور تین سو دو قتلِ عمد کی دفعات تھیں۔ مگر بالکل جاہل شخص ان سے کیسے واقف ہو سکتا ہے اور لطیفے میں حوالے کے طور پر کسی غلطی کے بغیر کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ لطیفہ وہ بعد تو کسی کو نہیں سناتا ہو گا مگر یہ کوئی ایسی مؤثر دلیل نہ تھی جس سے میری بے یقینی ختم ہو جاتی۔

لطیفہ ختم ہوا تو میں یوں ہنسا جیسے میں نے واقعی یہ لطیفہ پہلی بار سنا ہو۔ "مرا اصل وکیل، میرے بچپن کے دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "دونوں ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے وکیل ہیں اور فیس دینے کا کیا سوال۔ میں فیس کی بات بھی کروں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔" اس نے عدم دلچسپی سے اخلاقاً کہا۔ "اچھا ہے جی، آپ آ جاؤ تو کچھ کام بنے۔ آپ ولایت رہ آئے ہو۔ ماشاءاللہ نوجوان اور پڑھے لکھے ہو۔ ڈی سلوا تو ہے ملازم۔ آپ کی بات اور ہے۔ رب کرے یہ سب جھوٹ ہو۔"

"دلاور صاحب!" میں نے کہا۔ "جب میں انگلینڈ گیا تھا تو کاروبار کے دو شریک تھے۔ میرے والد اور میر نزاکت علی۔ آپ تیسرے شریک کی حیثیت سے اس کاروبار میں کب شامل ہوئے۔ پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

چوہدری دلاور کا چہرہ یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت کے تغیر کا سبب میرا ادھورا سوال ہے۔ "وہ جی میں نے کہا تھا نا کہ ہم تو لوہا کوٹنے والے بندے ہیں۔ تو یہی بات ہے کہ لوہا کوٹتے کوٹتے مستری بن گئے۔ فورمین ہو گئے۔ سب اللہ کی دین ہے کہ جو دیکھتے ادھر فٹ ہو جاتے تھے۔" اس نے سر کو انگلی سے بجایا۔ "مشینوں کے پرزے ایک دفعہ کھول کے ڈال دیے تو دوبارہ جوڑنے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ لونڈے جو انگریزی کی

موٹی کتابیں پڑھ کے انجینئر صاب بن جاتے ہیں، میرے جوتے صاف کرنے کے قابل نہیں تھے۔ مشین بگڑ جائے تو ان کو دیکھنی پڑتی ہیں کتابیں۔ نقشے، چارٹ اور ڈایاگرام۔ پھر یہ ٹکمی پر ٹکمی مارتے ہیں، خراب پرزے کی جگہ نیا پرزہ لگا دیا۔ پرزہ تو خود ایک مشین ہوتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کی شکل صورت، ناک نقشہ بدل کے اچھا کیا جا سکتا ہے جس سے کام اور اچھا ہو۔ کبھی پرزہ نخرے کرتا ہے تو اس کی مدد کے لیے اپنی طرف سے کوئی پرزہ بھی جوڑنا پڑ جاتا ہے۔ جیسے گدھا اڑ جاتا ہے اکیلا چلتے ہوتے۔ کیا کہتے ہیں اس کو۔ ردوبدل۔ ہاں جی ہم نے مشینوں میں ردوبدل کر کے اصل سے بہتر بنا دیا۔ سوچو ذرا ہزاروں قسم کے ماڈل اور سائز ہیں مختلف ملکوں کی مختلف مشینوں کے۔ سب تجربے اور اللہ کی مہربانی سے سمجھ میں آتے تھے۔ آپ دیکھ لیں۔ یہ جو پرانے استاد ہوتے ہیں نا موٹر میکنک۔ جو بچپن سے گیراج میں جوتیاں سیدھی کرنی شروع کرتے ہیں اور مار کھا کھا کے پیچ کستے کستے ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ ہر ماڈل کی کار کا انجن تصویر کی طرح ان کی کھوپڑی میں رہتا ہے۔ یہ پڑھے لکھے بابو ٹائپ آؤٹ انجینئر کہلانے والے لونڈے ان کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جی جیسے... جیسے بچے۔" اس کے دماغ میں فوراً کوئی مناسب تشبیہ نہیں آئی تھی۔ "تو جناب ہم نے بھی ایسے ترقی کی تھی۔ میر صاحب نے کہا ادھر فیکٹری لگائی ہے، کچھ مال ہے تو نکالو۔ بس جی ہم نے جو تھوڑا بہت بچایا تھا وہ دے کر پارٹنر بن گئے۔"

میں بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرا وہ یقین متزلزل ہو چکا تھا کہ میں اسی دلاور سے ہمکلام ہوں جس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ جو ایک نامعلوم شخص کی کوٹھی پر چوکیدار کو قتل کر کے قابض ہوا تھا۔ جو اس رات اسٹیریو سن رہا تھا اور کسی عورت کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا، اور جس نے مجھے انتہائی خطرناک انداز میں کھلی دھمکی اور ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔ یہ سیدھا سادا۔ مستری سے فورمین اور بالآخر "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلیکس کا مالک بن جانے والا ان پڑھ اور صاف گو آدمی کوئی اور تھا۔

"چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "پہلے آپ نے کہاں کہاں سے تجربہ حاصل کیا تھا؟ میرا مطلب ہے آپ مستری کہاں تھے، فورمین کہاں تھے؟"

اس سوال کا جواب وہ اپنی باتوں میں گول کر گیا تھا "اب کیا پوچھتے ہو سکندر صاب! پرانی باتیں ہیں۔ جہاں کا آب و دانہ تھا وہاں رہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ لاہور، فیصل آباد، کراچی۔" اس نے بڑی صفائی اور پورے اعتماد کے ساتھ سابقہ حوالے بتانے سے گریز کیا۔ یہ شک پیدا کرنے والی دوسری بات تھی۔ اتنی صاف بات کرنے والا کہہ سکتا تھا کہ میں فلاں فونڈری میں اتنے سال مستری رہا۔ پھر اس نے 'بیکو' یا 'اتفاق' جیسے اداروں میں بحیثیت فورمین کام کیا ہوتا یا ورکشاپ میں رہا ہوتا تو فخر سے بتاتا مگر نام لینے سے اس کا ماضی کریدا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کا سراغ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اور میں یہ بات اس سے زبردستی نہیں پوچھ سکتا تھا۔

"ڈی سلوا صاحب کو کون لایا تھا؟" میں نے کہا۔ "کوالیفیکیشن کیا ہے ان کی؟"

"میں نے سنا ہے کہ وہ ڈگری ہے۔ کی ناں اے لعدا... ہاں۔ ایم بی اے۔" وہ بولا۔ "اپنے میر صاحب لائے تھے۔"

پھر وہ بات ہوئی جس نے ایک دم میرے شکوک کی توثیق کر دی۔ "ابھی ان کے ساتھ کوئی آیا تھا؟"

"ہاں جی، وہی مُسکی۔" وہ ہنس کے بولا اور میں نے فوراً اس کا جھوٹ پکڑ لیا۔ میں نے بنک اسکوائر کی طرف سے آنے والی نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن گاڑی کو اِدھر ہی آتے دیکھا تھا اور مجھے اس میں پیڈرو کی صورت دکھائی دی تھی۔ گیٹ پر جیمز بونڈ کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے تصدیق کی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی تھا۔ چوکیدار نے یقیناً گاڑی کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور گاڑی رکے بغیر سیدھی گزر گئی تھی۔ ڈی سلوا کے ساتھ غیر متعلقہ شخص اندر کیسے جاتا اور جاتا تو چوہدری دلاور یہ بات کیوں چھپاتا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے کوئی دوست تھے، میں نہیں جانتا۔ لیکن اس نے جھوٹ بولا، جانتے بوجھتے۔ میں نے گیٹ پر روکنے والے نوجوان سے کہا تھا کہ وہ شخص میں ہوں اور اس نے مان لیا تھا۔ وہ صورت نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس نے بچشمِ خود دیکھا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مرد تھا۔ اگر لڑکی ہوتی تو وہ مجھے میرے جھوٹ پر بے عزت کر دیتا۔ چوہدری دلاور نے اپنی طرف سے ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا۔ آخر منیجر کے ساتھ کون آئے گا؟ اس کی سیکرٹری جسے چُپکی مُسکی کے ذکر پر میں نے چُپکی سے الگ کر کے مُسکی کہا تھا تو وہ بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ اب میرے لیے شک کی قطعی گنجائش نہ رہی کہ میری آنکھوں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ ڈی سلوا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے ساتھ پیڈرو آیا تھا اور دلاور نے یہ بات چھپالی تھی۔ بے شک میں گیٹ کے چوکیدار سے پوچھ کے مزید تصدیق کر سکتا تھا مگر میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"اچھا دلاور صاحب! میں ایک نظر فیکٹری دیکھنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا بناتے ہیں کیسے بناتے ہیں؟"

"جم جم دیکھو جی۔ آپ مالک ہو، پوچھنا کیسا۔" وہ بولا۔

"مگر آج نہیں۔ میں نے اپنی وومنٹی سے کہا تھا کہ جلدی آجاؤں گا تو اس کو داتا صاحب لے جاؤں گا۔ اس نے چادر چڑھانی ہے۔ آپ کل پرسوں جب دل کرے آؤ۔ ویسے بھی اب چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے... مطلب ہے کہاں قیام ہے آپ کا؟ اگر گاڑی نہیں ہے تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

بے شک میں مشینوں کی تیاری۔ پیکنگ، اسٹور اور گودام کے تمام شعبے دیکھ کر اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ گڑبڑ ہو رہی ہے تو کہاں مگر ملاقات کا اصل مقصد کچھ اور تھا جو پورا ہو چکا تھا۔ دوسرا مقصد اب پورا ہو سکتا تھا کہ میں چوہدری دلاور کا گھر دیکھ لوں۔

"یہ تو بڑا اچھا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا گھر بھی دکھا دیں اور پھر مجھے میرے گھر پہ ڈراپ کر دیں۔ میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔" کنکھیوں سے میں نے اس نام کا ردعمل دیکھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"وہ کہاں رہتے ہیں؟" اس نے میز کی دراز میں سے گاڑی کی چابیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"بانسوں والی سڑک پر، میو گارڈن کے پیچھے۔" میں نے کہا اور اس نے فقط سر ہلایا۔ باہر آکے اس نے سیکرٹری کو ٹھیٹھ لاہور کی پنجابی میں بتایا کہ وہ گھر جا رہا ہے اور دفتر بند کر کے وہ بھی جانا چاہے تو چلا جائے۔ "اور دیکھ پتر! اوہ ڈرائیور کتھے اے۔ اونوں لب کے لیا۔" اس نے چابیاں سیکرٹری کی طرف اچھال کے کہا۔ "اوس نواب دے پتر نے سٹے آنا اے اپنے ٹیم تے۔" اور سیکرٹری نے پانچ بجے گاڑی لے کر آنے والے ڈرائیور کو چار بج کے دس منٹ پر حاضر کر دیا۔

میں دلاور کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جب گیٹ کھلا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوکیدار کے علاوہ جیمز بونڈ کا ناول پڑھنے والے نوجوان نے بھی بڑی مستعدی سے اٹھ کے سلام کیا اور یہ دیکھا کہ میں واقعی

کوئی وی آئی پی ہوں جسے چوہدری صاحب اپنی گاڑی اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور وہ بھی قبل از وقت۔ یقین تھا کہ آئندہ کوئی ان میں سے میرا راستہ نہیں... میری یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب زم زمہ... بھنگیوں کی توپ کی طرف سے کار مال روڈ پر آئی تو دلاور نے اپنے شوفر کو حکم دیا کہ سیدھا چلے اور کشمیر روڈ کی طرف جائے۔ پہلے سکندر صاحب کو چھوڑنا ہے۔ صاف ظاہر... کہ وہ مجھے ٹالنا چاہتا ہے چنانچہ میں نے بھی اس کا گھر دیکھنے... اصرار نہیں کیا۔ یہ کسی سے بھی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ... صاحب کی رہائش کہاں ہے۔ جب کار مجھے ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر چھوڑ کے سیدھی نکل گئی... میں واپس ہوا اور چوک تک پہنچا بھی نہ تھا کہ پیچھے سے ایک خالی رکشا آیا جسے میں نے گزرنے سے پہلے روک لیا اور میو ہوسپٹل چلنے کے لیے کہا۔ رکشہ کی سواری کرنا خاصی جسمانی مشقت کا صبر آزما کام تھا مگر لاہور میں ٹیکسیوں کی تعداد... ہونے کے برابر تھی۔ کم سے کم مجھے کبھی ضرورت پڑنے پر ٹیکسی نظر ہی نہیں آئی۔

ہسپتال میں مجھے محسن کو تلاش کرنا پڑا کیونکہ ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہو چکا تھا اور میو ہسپتال کے ہر وارڈ میں سینکڑوں کے حساب سے ہر بیمار کو دیکھنے کے لیے آنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا، جو برآمدوں میں بھی جمع تھے۔ محسن نے خود ہی مجھے دیکھ لیا اور تیر کی طرح میری طرف آیا۔ "رابعہ نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیری ملاقات ہو گئی چوہدری دلاور سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے غلط نہیں دیکھا تھا۔ نیلی کار میں جوڈی سلوا کی تھی وہی استاد پیڈرو بیٹھا تھا۔" پھر میں نے اسے چوہدری دلاور سے ملاقات کا حال... سے سنایا۔ اس وقت وہ بنچ خالی نہیں تھی جس پر ہم... کے وقت بیٹھے تھے۔ لان پر بھی حضرات اور خواتین براجمان تھے جو نسبتاً صحت مند مریضوں کو وارڈ سے باہر کھینچ لائے تھے اور انہیں درمیان میں بٹھا کے ان سے اپنی اپنی... اور اپنی اپنی لائی ہوئی چیزیں کھلانے میں مصروف تھے۔ میں اور محسن ان سے دور ایک درخت کے گرد بنی ہوئی اینٹوں کی دو فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی بنچ پر بیٹھے رہے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور نرسنگ آرڈرلی سیٹیاں بجا بجا کے... کو روانگی اختیار کرنے کا حکم دینے لگے۔ اکثریت معقول لوگوں کی تھی جو سیٹی سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ڈھیٹ قسم کے لوگ اس وقت تک ٹکے رہے جب تک کہ ہسپتال کے عملے نے ان کو بے عزت کرنا شروع نہیں کیا۔ دو چار نے جواب میں گرمی دکھائی لیکن بالآخر تمام مریض وارڈوں میں پہنچ گئے اور ہسپتال خالی ہو گیا۔ میں نے اور محسن نے اندر رہنے کا آسان طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے لڑکے صبح ہر وقت وارڈوں میں پھرتے تھے۔ کیس ہسٹری دیکھنا، اور ڈاکٹروں کی مدد کرنا ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا ایک حصہ تھا۔ زائد از نصاب سرگرمی وہ نرسوں کے انتخاب میں دکھاتے تھے جو چالاک ہوتی تھیں وہ فائنل ایئر کے لڑکوں میں سے کسی کو پھانس کر شادی کرنے میں کامیاب ہوتی تھیں تو باقی عمر عیش کرتی تھیں۔ ناتجربہ کار اور بے وقوف قسم کی نرسیں اسی امید میں کبھی ایک کے ساتھ اور کبھی دوسرے کے ساتھ دل لگی کے اسباب پیدا کرتی تھیں اور دل لگی ختم ہوتی تھی تو روتی تھیں کہ ؎

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

انہی کی حوصلہ افزائی کے باعث وہ لڑکے بھی بے مقصد گھومتے پھرتے نظر آتے تھے جو پہلے یا دوسرے سال کے طالب علم ہوتے تھے اور ان کی کسی وارڈ میں ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی۔ میں اور محسن صورت شکل، حلیے اور عمر کے باعث بہت سینئر طلبا میں شامل ہو سکتے تھے چنانچہ جب بھی کسی نے پوچھا تو ہم نے ہنس کے ٹال دیا کہ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ اس وقت بھی ایک چوکیدار ٹائپ شخص نے ہمارے قریب آکے کہا۔ "ٹائم ختم ہو گیا ہے جی، آپ جائیں۔"

"کہاں جائیں، ہوسٹل؟" میں نے کہا۔ "تم ڈاکٹر صاحب کو جواب دے دینا کہ میں نے اپنے حکم سے ان کی چھٹی کر دی۔" وہ کچھ شرمندہ ہو کے دانت نکالتا ہوا چلا گیا۔ "یار سکندر! رابعہ کیوں نہیں آئی؟"

"ٹیلیفون کرتے۔" میں نے کہا۔ "کسی وارڈ سے ڈائریکٹ لائن تو ملے گی نہیں۔ ہسپتال کا ایکسچینج ملائے گا۔"

ہم دونوں امراض قلب کے جنرل وارڈ میں گئے۔ ایک نرس نے ہمیں گھور کے دیکھا مگر جس اعتماد سے ہم نے اسے بغیر فون اٹھایا تھا اس سے وہ کشمکش و پنج میں... اور خاموش رہی۔ نمبر مانگ کے ہم نے نرس سے کہا کہ کال ملے تو ہمیں بلالے اور بلاوجہ وارڈ کا ایک چکر لگایا۔ جب ہم واپس آئے تو نرس نے ہمیں مطلع کیا کہ نمبر نہیں ملا۔ ایکسچینج کہتا ہے کہ رنگ جا رہی ہے ریسیور کوئی نہیں اٹھاتا۔

ہم نے سر ہلایا اور باہر چلے گئے۔

"رابعہ کے نہ آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" محسن نے باہر آکے کہا۔

"میری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "وہ ماں کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند تھی۔ ہو سکتا ہے خود اس کی اپنی طبیعت بگڑ گئی ہو۔"

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "اس خط کی وجہ سے۔"

"مجھے بھی ایک خلش سی ہے کہ یہ اتحادِ ثلاثہ بے مقصد نہیں۔ ڈی سلوا، پیڈرو اور دلاور..." میں نے کہا۔ "ان کا یہ ہنگامی اجتماع چہ معنی دارد؟"

میں اور محسن فکروں اور اندیشوں کا شکار، ٹہلتے ہوئے کنٹین تک گئے اور دگنی قیمت پر چائے کہلانے والا ایک گرم مشروب پی کے لوٹ آئے۔ رابعہ ابھی تک نہیں آئی تھی اور ہمارے لیے خود گھر جا کے اس کی خیریت پوچھنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔

"میں رابعہ کی طرف جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو گھر جا اور ریوالور لے آ۔ ذرا احتیاط سے چھپا کے۔"

"ریوالور تو میرے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور میں نے کتنی احتیاط سے چھپا رکھا ہے اسی سے اندازہ کر لے کہ خود تجھے معلوم نہیں۔"

ایک بار پھر ہم نے رکشا میں تہہ و بالا ہوتے ہوئے میو ہسپتال کے دروازے سے کراؤن سینما تک کا سفر کیا اور سینما کے باہر شوق نظارۂ جمال رکھنے والوں کے ہجوم میں شامل ہو کے ایک دروازے سے اندر گئے اور دوسرے سے باہر آگئے۔ چند قدم پیدل چلنے کے بعد ہم نے رابعہ کی سرخ فاکس ویگن دیکھی جو اپنی کوٹھی کے گیٹ سے تقریباً سو گز دور فٹ پاتھ سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی کے احاطے کے سامنے کھڑی تھی۔ اسکے آگے پرائیویٹ ڈاٹسن کار تھی اور پیچھے ٹویوٹا کرولا کے نئے ماڈل کی ٹیکسی۔ فاصلے سے اندازہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ کار بعد میں آگے آکے رکی تھی۔ ٹیکسی البتہ چند انچ کے فاصلے پر تھی چنانچہ ظاہر تھا کہ بعد میں فاکس ویگن کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کسی گاڑی میں نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی کے گیٹ پر لکھے ہوئے نمبر کو اور نام کی تختی کو دیکھا اور میں گھنٹی کا بٹن دبا کے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ مس رابعہ یہاں ہیں؟ ہیں تو انہیں بتا دیجیے کہ سکندر بخت صاحب اور محسن صاحب ہسپتال سے آئے ہیں اور وہ جب بھی فارغ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوں اپنے گھر آجائیں۔ مگر اسی وقت محسن نے مجھے روک لیا۔

"سکندر! یہ دیکھو" اس نے چاروں طرف نگاہ ڈال کے مجھے بلایا اور میں نے دوسری طرف جاکے بند شیشے سے جھانکا تو مجھے محسن کی تشویش کا سبب معلوم ہوگیا۔ چابیاں کار ہی میں تھیں اور اگنیشن سوئچ سے جھول رہی تھیں "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا مطلب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ رابعہ چابیاں نکالنی بھول گئی ہو" میں نے کہا۔

محسن نے انکار میں سر ہلایا "گاڑی بند کرکے چابی نکال لینا ایک لاشعوری عادت بن جاتی ہے۔ ذہنی پریشانی میں بھی چابیاں کوئی نہیں بھولتا۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پیچھے والی ٹیکسی میں جھانکا اور جب مجھے اس کی چابیاں بھی سوئچ سے لگی ہوئی نظر آئیں تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب بجا طور پر یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے میں اور محسن کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا ذہن اس خیال کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ رابعہ اغوا ہو گئی ہے لیکن آثار یہی تھے کہ وہ اپنے گھر سے نکلی تو کسی نے ٹیکسی میں اس کا پیچھا کیا اور اسے یہاں رکنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ٹیکسی چوری کی تھی چنانچہ اغوا کرنے والے اسے بھی چھوڑ گئے اور کسی تیسری گاڑی میں رابعہ سمیت روانہ ہو گئے جو پروگرام کے مطابق یہاں موجود ہوگی۔ یہ سب کچھ اتنے کم وقت میں ہوا ہوگا کہ کسی نے کچھ نہیں دیکھا ہوگا یا دیکھا ہوگا تو غیر اہم سمجھ کے نظر انداز کر دیا ہوگا۔ آمنے سامنے صرف کوٹھیاں تھیں چنانچہ کچھ دیکھنے والے راہرو ہی ہوسکتے تھے۔ کاروں والے ڈرائیونگ کرتے ہوئے نگاہ سڑک پر رکھتے ہیں اور ان کو عموماً گردوپیش کی خبر نہیں ہوتی۔ پیدل چلنے والے یا سائیکل سوار کار کا تعاقب کرنے کی سوچتے بھی نہیں۔ دال میں کالا نظر آئے تب بھی کوئی کسی کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔

"کیا خیال ہے محسن! اس کوٹھی والوں سے پوچھیں؟" میں نے کہا "لیکن اس طرح بات پھیل جائے گی۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ کون رابعہ قاری ایڈوکیٹ۔ جن کی یہ کار ہے؟ اور وہ نہ ہوئی تو مسئلہ الجھ جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟" محسن بولا "انتظار کریں یا پولیس سے رابطہ قائم کریں؟ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔"

"ہاں لیکن پولیس کو ابھی ہم کیا بتا سکتے ہیں۔ ہمارے مفروضات ان کے لیے حقائق تو نہیں ہوسکتے۔"

"اغوا، وہ بھی ایک عورت کا، اور عورت بھی وہ جو ایڈووکیٹ ہے۔ مسئلہ بہت سنگین ہو جائے گا اور ہم سے ایسے سوالات کے جوابات دینے پڑیں گے جو ابھی ہمیں معلوم نہیں مثلاً یہ کہ وہ گھر سے کب نکلی تھی؟ ساتھ تھی؟ گھر پر اسے کوئی پیغام ملا تھا یا کوئی گھنٹہ بھر پہلے کی بات ہوتی تو پولیس ہمیں صبر کرنے کا دے گی۔ آتنی جلدی اغوا کا کیس درج کرانے آ پہنچے آپ لوگ؟ کیوں؟ کس نے دیکھا تھا اغوا ہوتے؟ آپ کو کس طرف سے اندیشہ تھا؟ کسی نے دھمکی دی تھی؟ دی تھی تو کیوں نہیں بتایا؟ یہ لمبا چکر ہے محسن! اور خطرناک بھی"

"ہاں" محسن نے سوچتے ہوئے کہا "اگر واقعی اسے اغوا کر لے گئی ہے تو پولیس کی مدد لینا خطرناک ہو سکتا ہے مگر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تو نہیں رہ"

"میرا خیال ہے اغوا کنندہ وہی ہوتے تو بہت جلد ہم سے رابطہ قائم کریں گے" میں نے کہا۔

باہمی صلاح مشورے کے بعد میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ میری ناک میں رابعہ کی خوشبو کے بجائے ایک عجیب سی ناگوار گزرنے والی چبھتی ہوئی تیز بو آئی "یہ کیسی بو ہے محسن؟" میں نے چابیاں نکال کے کہا۔

"کلوروفارم" محسن نے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی بو اس کے نتھنوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسٹیئرنگ کے نیچے کلچ پیڈل کے پاس سے ایک رومال اٹھایا۔ وہ خشک ہوچکا تھا لیکن یہ مردانہ رومال تھا اور وہ تیز بو اس میں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ رومال رابعہ کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی پوری روداد سنا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کار ہمیں مقفل کر دیتے ہیں" میں نے کہا "اور گھر چل کے خادم سے پوچھتے ہیں، لیکن ابھی اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" محسن نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو مجھے رابعہ کے ہینڈ بیگ نے متوجہ کر لیا جو معمول کے مطابق ساتھ والی سیٹ پر نہیں بلکہ پیچھے رکھا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور خود اس سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محسن گھوم کر دوسری طرف سے آیا اور آگے والی سیٹ کو جھکا کے پیچھے جا بیٹھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور احتیاط سے یوٹرن لے کر گھمائی۔ کوٹھی کے سامنے ٹھہرنے کے بجائے میں کار کو مخالف سمت میں سو گز دور لے گیا۔ محسن نے اس اثنا میں ہینڈ بیگ کھول لیا تھا۔

دیکھتے ہی اس نے ایک کاغذ کا پرزہ آگے بڑھایا "یہ ہینڈ بیگ میں سے نکلا ہے" محسن نے کہا "باقی سب چیزیں موجود ہیں۔"

میں نے کاغذ پر پنسل سے لکھے ہوئے پیغام کو پڑھا۔

"رابعہ ہماری تحویل میں ہے اگر تم نے ہماری ہدایات پر عمل کیا اور پولیس سے رجوع نہ کیا تو رابعہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہدایات کی خلاف ورزی کروگے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے اور رابعہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ تمہارے مقابلے میں اس کی ذات دہرے خطرات سے دوچار ہے جان کے اور آبرو کے۔ کس کا نقصان ناقابلِ تلافی ہے؟ امید ہے تم جرأت اور ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کروگے جو بعد میں حماقت ثابت ہو۔ سکون سے رابعہ کے گھر بیٹھ کے ہمارے دوسرے پیغام کا انتظار کرو۔"

میں نے پیغام کے مضمون کو اتنی مرتبہ پڑھا کہ اس کا ایک ایک لفظ مجھے ازبر ہوگیا۔ میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں آگیا اور آتشِ غضب سے میرا چہرہ دہکنے لگا۔ میرے کانوں کی لویں جلنے لگیں اور کنپٹی پر ایک رگ پھڑکنے لگی۔ میں کاغذ کے اس پرزے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا اور وہ چار انچ چوڑا چھ انچ لمبا سفید کاغذ پھیل کے سینما کا اسکرین بن گیا۔ میرے تصور میں ایک پروجیکٹر چلنے لگا اور میں نے وہ مناظر دیکھنے شروع کیے جو میں نے جرائم کی اور تشدد کی فلموں میں دیکھے تھے اور میرے لاشعور کا ایک حصہ تھے۔ زیرِ زمین نم آلودہ، متعفن اور تنگ و تاریک تہہ خانے سنسان پہاڑوں کے اندر پھیلے ہوئے خوفناک غار جن کی سیلہ بھری دیواروں پر بڑے بڑے عقرب رینگ رہے تھے، اور دہشت ناک مکڑیاں جالے بنتی ہوئی چل رہی تھیں سائیں سائیں کرتے ہوئے ویران جنگل جن میں بدروحیں اور عفریت شیطانی رقص کرتے ہیں... اور رابعہ... دیوارِ زنداں کے طوق و سلاسل میں اسیر۔ فرشِ خاک پر بے لباس، کسی درخت سے بندھی ہوئی۔ خاموش۔ فریاد بلب۔ نیم جاں۔ مناظر بدلتے گئے۔ ہر منظر ایک سلائیڈ کی طرح آتا تھا اور غائب ہوجاتا تھا "تم ہماری مٹھی میں ہو ہیرو" چوہدری دلاور نے اپنی پُرسکون آواز میں اور ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے سائے نے کرسی پر پہلو بدلا "ہم تمہیں حقیر چیونٹی کی طرح مسل دینے پر قادر ہیں۔ چوہدری دلاور نے تمہیں ایک مہینے کی مہلت دی تھی۔ تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس لیے تمہیں یہ دوسرا سبق دینا ضروری ہوگیا تھا" سائے کی جگہ دوسرے حقیقی چوہدری دلاور نے لے لی "تو جی اپنے سکندر صاب!" اس نے قہقہہ مار کے کہا "آپ بھی کس خیال میں گم ہو گئے۔ کوئی شاعری مارتی کرتے ہو گے۔ ہم تو جٹے ان پڑھ ہیں۔ لوہا کوٹنے والے۔ مگر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ کیوں بھئی؟" سیکرٹری نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔ اسکرین پر پھر ڈی سلوا نمودار ہوگیا "یو باسٹرڈ! میں تم سے سمجھ لوں گا۔ میرا نام ڈی سلوا ہے۔"

"حرامزادو۔ سور کے بچو۔ نامرد بزدلو! عورت کو ڈھال بنا کے لڑتے ہو" میں نے چیخ کر کہا۔

"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجوڑ کے کہا "پاگل ہوگیا ہے تو! کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ ہوش میں آ"

میں ہوش میں آگیا۔ میرا بدن غصے سے لرز رہا تھا اور میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا "میں ان سب کو قتل کردوں گا محسن!" میں نے کہا۔

"کر دینا، لیکن وہ ہیں کہاں؟ کون ہیں؟" محسن نے کہا "پہلے یہ تو معلوم ہو جائے۔ یہ چیخنے چلانے سے معلوم نہیں ہوگا۔ تیری آواز ان کے کانوں تک کیا راہ گیروں تک بھی نہیں پہنچی۔ عقل اور اعصاب پر قابو رکھ۔ ہم ابھی بالکل بے بس ہیں۔ کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان رابعہ اٹھائے گی۔ فی الحال خاموشی سے انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ چل اندر چلتے ہیں۔"

"اگر ان کو ہم سے وہ خط ہی حاصل کرنا تھا تو رابعہ کو یرغمال بنائے بغیر بھی کر سکتے تھے" میں نے کہا۔

"خط تو وہ رابعہ سے یہیں لے سکتے تھے" محسن نے کہا "اس کو ساتھ لے جانا ضروری نہیں تھا"

"ہاں، اور ابھی تک تو وہ خط بھی ایک معمہ ہی ہے۔ بظاہر سادہ کاغذ۔ اس پر نظر نہ آنے والی کوئی تحریر ہے تو ابھی تک ہم اسے پڑھنے کا راز معلوم نہیں کر سکے" میں نے کہا "پھر وہ رابعہ کو کیوں لے گئے؟"

"ہوسکتا ہے رابعہ نے یہ راز معلوم کر لیا ہو۔ اگر رابعہ کا وجود ان حقائق سے آگاہی کے بعد ان کے لیے باعثِ خطرہ ہوگیا ہے تو اب وہ اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لیں گے" محسن نے کہا "ہمیں بلانے کا مقصد بھی یہی ہوسکتا ہے کہ تشدد کے ذریعے ہم سے سچ اگلوایا جائے۔ رابعہ نے تو کہا ہوگا کہ انہیں کچھ نہیں معلوم مگر وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کب اعتبار کریں گے۔ وہ ہم سے ہی پوچھیں گے۔"

"ابھی تک رابعہ کو اس خط کی تحریر پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔" میں نے کہا۔" اس نے مضمون پڑھ لیا ہوتا یا اسے طریقہ معلوم ہو جاتا تو وہ مجھ سے ذکر نہ کرتی؟ میرا تو خیال ہے اس نے خط دینے سے انکار کیا ہوگا۔ یہ کہا ہوگا کہ خط کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔" محسن بولا۔" رابعہ نے خط کو کہیں چھپا دیا ہوگا یا کہا ہوگا کہ خط اس نے واپس کر دیا۔ اگر یہ بات ہوگی تو معلوم ہو جائے گی۔ انہوں نے رابعہ کو لے جانے سے پہلے گھر کی تلاشی ضرور لی ہوگی۔"

"اور ناکام ہو جانے کے بعد ہی طے کیا ہوگا کہ رابعہ کو یرغمال بنا کے لے جائیں اور پھر ہم سے سودا کریں۔" میں نے کہا۔" لیکن محسن! خود ہمیں بھی تو معلوم نہیں کہ رابعہ نے خط کہاں رکھا ہے۔ ہم کیا بتائیں گے انہیں؟"

"اس کی تو یہی ایک صورت ہے کہ ہم رابعہ سے ملیں اور اسے کہیں کہ وہ خط کی خاطر جان کی بازی نہ لگائے اور خط واپس کر دے۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ سے کیسے ملیں؟" میں نے کہا۔" ہمیں کیا معلوم وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں۔" اور گاڑی سے اتر آیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔

"ہاں، مگر انہوں نے پیغام میں کہا ہے کہ وہ پھر رابطہ قائم کریں گے۔" محسن نے کہا۔" اس کی ایک صورت تو یہی ہے کہ وہ فون کریں۔ یہاں وہ برطانیہ، امریکہ کی پولیس تو ہے نہیں کہ ٹیلیفون کال سے تین منٹ میں ملزم کو جا پکڑے۔ وہاں بھی اغوا کرنے والے ہیں جو بھاری معاوضے طلب کرتے ہیں ورنہ جان سے مار دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ وہ کہیں سے بھی کال کریں، ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ٹیلی فون ایکسچینج والے فوراً پولیس کو بتا دیں گے کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا اور قریب ترین پولیس کار کو وائرلیس پر پیغام ملے گا تو وہ بات ختم ہونے سے پہلے مجرم کو جا لے گی۔"

"یہ سب یہاں کہاں محسن؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اول تو ٹیلی فون والے ہی اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک پولیس نہیں کہے گی۔ پولیس رپورٹ لکھے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوگی۔ رپورٹ ہم لکھوا نہیں سکتے۔ پھر ضامن رضوی سے مدد لیں تب بھی کیا ہوگا۔ جب وہ فون کریں گے تو ٹیلی فون ایکسچینج میں آپریٹر سوتے رہ جائیں گے۔ نمبر نوٹ کر لیا انہوں نے تو پولیس کو بتانے سے کیا ہوگا۔ وہ کون سے وائرلیس پر ہدایات جاری کر دیں گے۔ تھانے میں کسی نے سنی بھی تو آدھے گھنٹے بعد ہل کر کرسی سے نکلنے کے قابل ہوگا اور کمرے سے نکلا تو سڑک پر کھڑا ہو جائے گا کہ بیگار میں کسی رکشا، ٹیکسی کو پکڑے۔ تھانیداروں تک کے پاس گاڑی نہیں۔ کسی کے پاس اپنا پرائیویٹ اگر نظر آ جاتا ہے ورنہ سرکاری موٹر سائیکل ہے بھی تو ٹریفک کے کسی کسی سارجنٹ کے پاس۔ میرا خیال ہے وہ بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں ہوں گے اور اطمینان سے فون پر ہی بات کریں گے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" ہم دونوں رابعہ کے گھر کی طرف چلنے لگے۔

"کمال ہے کہ یہاں کے مجرم ذہانت میں غیر ملکی مجرموں سے کم نہیں۔" محسن نے چلتے چلتے کہا۔" وہ جدید ترین وسائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ پبلک شور مچاتی ہے کہ فلموں سے اور ٹی وی سے جرائم کا رجحان پھیل رہا ہے اور غیر ملکی لٹریچر سے نوجوانوں کے ذہن متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ سوال کوئی نہیں کرتا کہ پولیس متاثر کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ جرائم کی فلموں میں سدِباب کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور پولیس یا سراغرساں جس طرح کام کرتے ہیں اس سے پولیس میں بہتری کا رجحان کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ دن بدن زیادہ نااہل اور بدعنوان کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا وہ فلمیں نہیں دیکھتے اور ان کے گھروں میں ٹی وی نہیں ہیں؟ ہے نا الٹی بات کہ مجرم تو بہت کچھ سیکھ رہے ہیں اور پولیس وہ بھی بھول رہی ہے جو اسے سکھایا گیا تھا۔"

گھنٹی بجانے کے دو منٹ بعد رابعہ کی خادمہ نے دروازہ کھولا۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کا رنگ اڑ گیا۔" آپ... صاحب جی؟ خیریت تو ہے، بڑی بی بی... آپ ہسپتال سے آئے ہیں نا؟" وہ ایک طرف ہو گئی اور ہم گزر گئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اس کو تسلی دی۔" وہ خیریت سے ہیں۔ رابعہ بی بی کہاں ہیں؟"

اس کی صورت پر پریشانی کی جگہ حیرانی کی خبر دینے لگی۔

"وہ بھی ہسپتال گئی ہیں۔ آپ کو نہیں ملیں؟ ایک گھنٹہ ہو گیا۔"

"ہم چار بجے ایک کام سے چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔" اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ تم ایک کام کرو۔ چائے بنا کے لاؤ اور اگر کچھ کھانے کو ہے تو وہ بھی۔ ہم نے دوپہر کو کچھ نہیں کھایا۔"

"ہم اوپر بڑی بی بی کے کمرے میں ہیں۔ ممکن ہے ہسپتال سے کوئی فون آئے۔" محسن نے کہا۔

خادمہ کے لیے شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ ہماری حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہے اور اس وقت ہم ہی حالات کو سنبھال رہے ہیں۔ گھر کی خادمہ ہونے کے باعث اسے یہ معلوم نہ تھا کہ گھر میں ہماری آمد و رفت کیوں شروع ہوئی اور رابعہ سے رابطے کے اسباب کیا تھے۔ وہ یہ کیسے فرض کر سکتی تھی کہ مجھ پر قتل کا الزام ہے اور رابعہ میری وکیل ہے۔ وہ پُرتجسس شکی مزاج اور کوئی چالاک قسم کی عورت نہیں تھی جو معاملات کو کریدنے اور جاننے کی کوشش کرے کہ اچانک نمودار ہو کے اتنی اہمیت حاصل کرنے والے یہ اجنبی کون ہیں؟ اگر اس نے پوچھا ہوگا تو اسے مطمئن کر دیا گیا ہوگا اور جو بات بھی اسے بتائی گئی ہوگی اس نے بلاچوں و چرا قبول کر لی ہوگی۔

جب وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تو میں نے آہستہ سے رابعہ کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ جلانے سے پہلے ہی میری نظر نے کمرے کی حالت دیکھ لی تھی۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تھی اور سارا سامان بڑی بے دردی سے تباہ کیا گیا تھا۔ میز کی درازیں کھینچ کر نیچے الٹ دی گئی تھیں۔ سب درازیں اور درازوں کا تمام سامان قالین پر بکھرا ہوا تھا۔ بک شیلف کی تمام کتابیں باری باری کھول کے دیکھی گئی تھیں کہ ان کے درمیان وہ خط نہ چھپا دیا گیا ہو۔ کتابوں کے گرد پوش تک پڑے تھے اور تمام کتابیں کسمپرسی کے عالم میں بے قدروں کے ہاتھوں اپنی توہین پر نوحہ کناں تھیں۔ تلاشی لینے والوں نے بستر ہی نہیں الٹا تھا اس کا استر تک ادھیڑ دیا تھا۔ تکیوں کے غلاف بھی پھاڑ دیے گئے تھے کہ ان میں وہ صفحات چھپائے گئے ہوں تو برآمد ہو جائیں۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور ان کا ذہن تلاشی کے دوران میں پوری طرح مستعد رہا تھا۔ انہوں نے تمام امکانات کو مدنظر رکھا تھا اور چند صفحات پر مشتمل ایک خط کو چھپانے کی ہر ممکنہ جگہ کو دیکھ لیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے قالین کے نیچے کسی خفیہ خانے کی موجودگی کو بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا تھا۔

"وہ لوگ کافی دیر یہاں مصروف رہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔" آخر کس وقت؟ اگر رابعہ کو واپس گھر آنے کے بعد یہ نقشہ نظر آتا تو وہ فوراً پولیس کو رپورٹ نہ کرتی، ہمیں ضرور بتاتی۔ خادمہ سے تو پوچھتی، لیکن خادمہ کو کسی بات کی خبر نہیں۔"

"ہاں، اور اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ جب وہ یہ کارروائی کر رہے تھے تو رابعہ ان کے قبضے میں تھی۔" محسن نے کہا۔" گن پوائنٹ پر یا بیہوش یا بندھی ہوئی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" کلوروفارم والا رومال ہمیں گاڑی میں ملا تھا۔ وہ اسے یہاں سے بے ہوش کر کے کیسے لے جا سکتے تھے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب رابعہ گھر سے نکلی تو باہر نکلتے ہی اسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ شاید وہ شخص جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا پہلے سے گاڑی کی پچھلی سیٹ کے اور اگلی سیٹ کے درمیان فرش پر موجود تھا۔ فاکس ویگن میں اتنی جگہ تو نہیں ہوتی، مگر جلدی میں کوئی پیچھے نگاہ ڈالے بغیر ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ جائے تو اسے معلوم نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہو جاتا تب بھی وہ شخص رابعہ کو دبوچ لیتا۔ اب اس نے باہر جا کے اطمینان سے اپنا کام کیا ہوگا۔

باقی لوگ بھی اگر پہلے سے گھر میں موجود تھے تو رابعہ بے خبر تھی۔ اتنے بڑے گھر میں جہاں صرف دو عورتیں ہوں کوئی بھی چھپا رہ سکتا ہے یا جو شخص رابعہ کے ساتھ تھا وہ رابعہ کو دوسروں کے سپرد کر کے لوٹ آیا۔ رابعہ کو وہ اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے اور تلاشی لینے والے اطمینان سے اپنا کام کرتے رہے۔ خادمہ کچن میں نہ ہو تو اپنے کمرے میں رہتی ہے جو کچن کے ساتھ ہی ہے۔ اتنی احتیاط انہوں نے ضرور کی ہوگی کہ آواز نہ ہو۔ دو افراد ایک گھنٹے میں پورا گھر الٹ کے دیکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی کیفیت دوسرے کمروں کی بھی ہوگی۔"

"ہاں اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک خادمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔" محسن بولا۔" کیوں نہ ہم اس کی حالت درست کر دیں۔"

"اگر ہم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو ہماری ان سے ملاقات ہو سکتی تھی۔" میں نے افسوس سے کہا۔" یہیں تصفیہ ہو جاتا۔"

محسن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ایک دراز میں بکھرا ہوا سامان ڈالنا شروع کیا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور خادمہ اندر آ گئی۔ اس وقت میں سوچ ہی رہا تھا کہ محسن کو اس کام میں وقت ضائع کرنے سے منع کر دوں۔ اس سے زیادہ آسان تو یہ ہوتا کہ ہم تمام کمرے مقفل کرا دیتے۔ خادمہ اسے حفاظتی انتظام سمجھتی اور بعد میں کمرے کھول کر کبھی نہ دیکھتی۔ اب رابعہ کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی جو منظر اس نے دیکھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ اسے دہشت زدہ کردینے کے لیے کافی تھا۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کی حالت دیکھتی رہی۔

"صاحب جی...!" وہ چلائی "یہ... یہ آپ نے کیا... کیا چاہیے آپ کو؟" اس کے بے ربط الفاظ اس کی گھبراہٹ کا نتیجہ تھے مگر یکلخت مجھے احساس ہوا کہ وہ اس تمام کارروائی کا ذمے دار ہمیں سمجھ رہی ہے۔ اور اس کا ایسا سمجھنا جائز بھی تھا۔ گھنٹہ بھر پہلے رابعہ نے جاتے وقت اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس دوران میں کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ ہم غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ ہم نے اسے چائے کے بہانے کچن میں بھیجا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ ہم بڑی بی بی کے کمرے میں ہوں گے لیکن ہم رابعہ کے بیڈروم میں گھس آئے تھے۔ اصولاً ہمیں ڈرائنگ روم یا آفس میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ فون وہاں بھی تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محسن ایک دراز لیے سامنے رکھے بیٹھا تھا اور اسکے ہاتھ میں رابعہ کے زیورات تھے جو خط کی جستجو میں آنے والوں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے نکال کے باہر پھینک دیے تھے کیونکہ انہیں اس مال کی ضرورت نہیں تھی۔ محسن نے پہلے انہی چیزوں کو سمیٹ کر محفوظ کرنا چاہا تھا مگر خادمہ نے دیکھا تو وہ اس کو زیورات رکھنے کی بجائے نکالتا ہوا دکھائی دیا۔ خادمہ کے آتے ہی محسن منجمد ہو گیا تھا اور میں اپنی جگہ بت بنا رہ گیا تھا۔ ہماری حالت اچانک پکڑے جانے والے چوروں سے مختلف نہیں تھی۔

"آپ... آپ لوگ چوری کر رہے ہیں؟" خادمہ نے ہسٹریا کے عالم میں چلاتے ہوئے کہا۔ "گھر کے مالک مر رہے ہیں اور گھر کے بھیدی ڈاکا ڈال رہے ہیں۔ ہمدرد بن کے لوٹ رہے ہیں۔ بے غیرتو! شیطانو! ڈوب مرو شرم سے۔ اس گھر میں ایک بڑھیا بیوہ ہے۔ وہ بھی ہسپتال میں پڑی ہے۔ اسی لیے لے گئے تھے تم اسے۔ اس کی بیٹی پر اسی لیے ڈورے ڈال رہے تھے۔ مار ڈالو اب مجھے...!"

وہ دھاڑیں مار کے رونے لگی تھی۔ اسے سمجھانے کے لیے کوئی دلیل موثر ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے تمام شکوک اور اندیشے الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آرہے تھے۔ وہ گھر کی پرانی نمک خوار تھی لیکن اسے احساس تھا کہ وہ خود بھی ایک بوڑھی اور بے بس عورت ہے جو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہسٹریا کا سیلاب اس کی عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بہائے گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے اسکے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا اور وہ نیچے گر گئی۔ اس کی آواز ایک دم بند ہوگئی اور وہ قالین پر گر کے اٹھی تو اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو...!" وہ گڑگڑا کے بولی۔

"معاف کرنا ماسی!" میں نے کہا۔ "تم نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے غصہ آگیا۔ تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا اور اس قسم کی بات کہنے پر پچھتانے کے لیے اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ تم بوڑھی عورت ہو اس لیے یہ تھوڑا سا خیال رہا۔ تم بہت وفادار اور نمک خوار ہو مگر ہم گھر کے مالک ہیں۔ اگر شک ہے تو چھوٹی بی بی سے یا ان کی امی سے واپسی پر پوچھ لینا۔"

"مجھے... مجھے معاف کردیں صاب جی! غلطی ہو گئی۔ میں غلط سمجھی تھی۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

میں نے اسے بازو پکڑ کے سہارا دیا اور بستر پر بٹھا دیا۔ محسن کی نگاہیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ اس عورت کو جسے حالات کی خبر ہی نہیں مطمئن کرنے کے لیے کس قسم کی وضاحت مطلوب ہوگی۔

"دیکھو ماسی! جو تم نے کہا غلط تھا اور ہم نے سن لیا۔ غلطی میں نے بھی کی مگر اب جو کچھ میں بتانا چاہتا ہوں وہ بھی غور سے سنو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اوپر آتے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ کیا اتنی دیر میں ہم یہ سب کچھ کر سکتے تھے جو تمہیں نظر آرہا ہے، یہ سب تمہارے رابعہ بی بی کے جانے کے بعد کسی نے کیا تھا۔ ہم دروازہ کھلا دیکھ کر رک گئے تھے۔ پھر ہماری نظر نے کمرے کی یہ حالت دیکھی۔ ہم نے ابھی دوسرے کمرے نہیں دیکھے۔ تم نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ بڑی بی بی کے کمرے، ڈرائنگ روم اور رابعہ بی بی کے آفس کی حالت بھی ایسی ہی ہوگی۔ ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ جب یہاں کچھ لوگ یہ کام کر رہے تھے تو تم نہیں آئیں۔ اگر تم آجاتیں تو اس وقت کسی کمرے میں سامان کے درمیان تمہاری لاش بھی پڑی ہوتی۔"

خادمہ کے بدن میں ایک لرزش ہوئی۔ "وہ... کون لوگ صاب جی! کون آیا تھا یہاں؟" وہ کانپتے ہوئے بولی۔

وہ ایک وکیل کی خادمہ تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس کی مالکن قتل جیسے معاملات میں ملوث لوگوں سے ملتی ہے، لاشیں دیکھنے جاتی ہے اور کہیں قتل ہوجائے تو وہ وہاں ہونے والی چیزوں کا معائنہ کرتی ہے۔ چوروں ڈاکوؤں

مقدمات لڑتی ہے اور مجرموں کو بچانا اس کا پیشہ ہے جس کی خاطر وہ مجرموں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہے مگر یہ خیال اس کے لیے انتہائی روح فرسا تھا کہ اسی کے گھر میں مجرم دن دہاڑے یہ تباہی پھیلاتے رہے اور وہ گھر میں موجود ہو کے بھی بےخبر رہی تھی۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ وہ کون لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے دوسرے کمروں کی حالت دیکھ لو تاکہ تمہیں یقین آجائے کہ ہم نے غلط نہیں کہا۔" وہ اب خاصی شرمسار تھی مگر میں اسے اپنے ہمراہ رابعہ کی ماں کے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو نظارہ اس نے دیکھا وہ رابعہ کے کمرے کے نظارے سے مختلف نہیں تھا۔ پھر ہم نیچے گئے اور میں نے اسے ڈرائنگ روم کی حالت دکھائی۔ تلاشی کے دوران توڑ پھوڑ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر سامان کے الٹنے پلٹنے سے ترتیب و آرائش کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ سب سے بری حالت آفس کی ہونی چاہیے تھی مگر رابعہ نے آفس کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔ لکڑی کا فلش ڈور ہی بہت مضبوط تھا۔ پھر اس میں خودکار قفل تھا اور باہر کی طرف لوہے کی پھیل جانے والی گرل تھی جس میں سیاہ رنگ کا مضبوط تالا نظر آرہا تھا۔ باقی کھڑکیوں میں بھی اندر کی طرف گرل تھی، چنانچہ تلاشی لینے والے لائبریری میں داخل ہی نہیں ہوسکے تھے۔ ان کے لیے زیادہ دیر ٹھہرنا بھی مشکل تھا۔ رابعہ کے معمولات پر نگاہ رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ شام کو رابعہ کا ایک معاون وکیل اس سے اگلے دن پیش ہونے والے مقدمات کی فائلوں پر بریفنگ لینے آتا ہے۔ رابعہ کا چیمبر جہاں مؤکل اس سے رابطہ قائم کرتے تھے ہائیکورٹ کے سامنے ایک کمرشل بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا اور وہاں اس کے دو معاون وکیل اور عملے کے دیگر ارکان ہر شام پانچ بجے سے نو بجے تک موجود رہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو خادمہ کو اور شام کے بعد آنے والے مددگار وکیل کو قابو میں کر کے لائبریری کی تلاشی بھی لے سکتے تھے مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ لائبریری میں سینکڑوں مجلد اور ضخیم قانونی کتب کے علاوہ بہت سی فائلوں کے ڈھیر تھے جو الماریوں میں بند تھے اور درازیں تھیں جو کاغذات سے پر تھیں۔ انہوں نے مجبوراً وہ مشکل لیکن موثر طریقہ اختیار کیا جس میں کامیابی یقینی ہوجاتی تھی۔ اس کا بندوبست وہ کر کے آئے تھے لیکن ان کو مطلوبہ چیز مل جاتی تو شاید وہ رابعہ کو لے جانے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ خادمہ کو دہری شرمندگی تھی۔ ایک سوچے سمجھے بغیر بولنے پر اور دوسری مجھ سے ایک چھانپڑ کھانے پر۔ اس نے بمشکل تمام وضاحت کی کہ وہ تو ہم سے چائے کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اور یہ اس کی بے وقوفی تھی کہ اس نے غلط سمجھا اور اس کی سزا بھی بھگت لی۔ اب اس بات کا ذکر رابعہ بی بی اور بڑی بی بی سے نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ تو معمولی بات تھی زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

"تم جانتی ہو ماسی کہ رابعہ بی بی عدالتوں میں مجرموں کی پیروی کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "یعنی ان کو چوری ڈاکے قتل اور اغوا کے علاوہ ایسے ہی بہت سے الزامات سے بچاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ الزامات درست ہوتے ہیں تو مجرموں کو سزا ہوجاتی ہے اور وہ بے گناہ ہوں تو بچ جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی مجرم دشمنی میں شریف آدمیوں کو بھی پھنسا دیتے ہیں۔ شہر میں دو بدمعاش ہوں تو ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا نہ رہے۔ یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ رابعہ بی بی ایک ایسے شخص کو بچا رہی ہیں جس کے پیچھے بدمعاش لگے ہوئے ہیں اور جو ثبوت رابعہ بی بی کو ملے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کی کامیابی یقینی ہے۔ وہ بدمعاش اسی لیے آئے تھے کہ چند اہم کاغذات چرا کے لے جائیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ کاغذات دوسرے دفتر میں تھے یا اس دفتر میں جو محفوظ رہا۔ چوری کچھ نہیں ہوا ہے اس لیے پولیس کو رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ رابعہ بی بی تو آج راولپنڈی گئی ہیں۔"

"رابعہ بی بی پنڈی گئی ہیں؟" خادمہ نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔ "مجھے کیوں نہیں بتایا انہوں نے؟"

"نہیں بتایا؟" میں نے بے حد تعجب کا اظہار کیا۔ "کمال ہے۔ بھول گئی ہوں گی جلدی میں۔ وہاں ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو لے کر آئیں گی۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹر صاحب ایکدم نہ آسکیں۔ کل کے بجائے پرسوں آئیں۔"

"مگر صاب جی! میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟" خادمہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم رات کو ہسپتال چلے گئے تو تم بالکل اکیلی رہ جاؤ گی۔ یہ بتاؤ تمہارا کوئی رشتے دار ہے یہاں؟"

"میرا داماد ہے جی!" وہ بولی۔ "میں اس کے پاس چلی جاتی ہوں دو دن کے لیے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلے وہ چائے، جس سے ہمارا برا حال ہے۔ اور ایک بار پھر معافی۔ تم میری ماں کے برابر ہو۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کے جانے کے بعد میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ خواہ مخواہ کی مصیبت گلے پڑی۔" محسن بولا۔

"شکر کرٹل گئی۔" میں نے کہا۔ "ماسی کی سمجھ میں آ گئی ورنہ ایک مسئلہ بن جاتا۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے کوئی تدبیر تو کرنی ہی تھی۔ خواہ اسے دعوتِ اسٹو میں بند رکھنا پڑتا۔"

"اس سے بڑا مسئلہ رابعہ کی ماں کا ہے سکندر!" محسن نے کہا "جب وہ ہوش میں آئے گی تو پوچھے گی کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ ایک دن تو ٹال سکتے ہیں۔ دوسرے دن کیا بہانہ کریں گے کہ وہ کیوں نہیں آئی؟"

"مجھے امید ہے کہ دوسرے دن کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اس سے پہلے لوٹ آئے گی، یا پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

"فرض کرو اس میں تین چار دن لگ گئے؟" محسن نے کہا۔

"ایک ہفتہ لگ گیا۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو ہم ڈاکٹروں سے مدد لیں گے۔ بڑی بی کوئی صدمہ جھیلنے کے قابل کہاں ہیں۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ انھیں سلائے رکھیں۔ اگر ڈاکٹر نہ مانے تو کسی نرس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ڈائزی پام کا ایک انجکشن روز۔ کبھی صبح، کبھی دوپہر، کبھی شام، اور جب وہ مسلسل کئی گھنٹے سونے کے بعد یہ سوال کریں تو ان سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح یا شام آئی ہے، ابھی ابھی گئی ہے۔ اگر جائز طریقے سے یہ کام نہ ہوا تو میں ناجائز طریقے سے کرا لوں گا ورنہ خود کر لوں گا۔ مجھے انجکشن دینا آتا ہے۔ ڈائزی پام کے زیرِ اثر سوتے رہنے سے نقصان نہیں فائدہ ہو سکتا ہے۔ جاگ کے تشویش میں مبتلا ہونے سے نقصان یقینی ہے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس وقت بڑی بی کو اغوا کی خبر ملے تو اسی وقت ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میں یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہوں؟"

"سکندر!" محسن نے کان لگا کے کہا۔ "لائبریری میں گھنٹی بج رہی ہے فون کی۔ گھنٹی اوپر بھی بج رہی ہوگی۔"

گھنٹی واقعی بج رہی تھی لیکن ہمارے اوپر پہنچنے تک خاموش ہو گئی۔ میں نے مایوسی سے محسن کی طرف دیکھا۔ "دیر ہو گئی ہمیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ وہ پھر فون کریں گے۔" محسن نے کہا اور ہم رابعہ کے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ گدے کا استر پھٹا ہوا تھا لیکن اندر کا فوم سلامت تھا۔ مجھے یاد آیا گزشتہ رات دو بجے میں نے اسی کمرے میں قدم رکھا تھا تو مجھے اس کی نظر نواز فضا نے اور دلنواز مہک نے کس طرح مسحور کر لیا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ

کچھ دیر پہلے میں محسن کے ساتھ آیا تھا تو مجھے اس خوشبو کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ ساری بات احساس کی کرشمہ سازی ہے۔ اس وقت میرے حواس پر مختلف کیفیت کا غلبہ تھا۔ میرا دھیان رابعہ اور اس کی سحر آفریں خوشبو کی طرف نہیں ۔۔۔ اب پھر مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ محسن کسی اور خیال میں گم ہے۔ وہ خوشبو کے ۔۔۔ نہیں اس پیغام کی نوعیت پر غور کر رہا تھا جو موصول ہونے والا تھا۔ رابعہ کے گھر میں دو ٹیلیفون تھے۔ ایک جو ۔۔۔ قاری ایڈووکیٹ کے نام پر تھا، نیچے آفس میں لگا ہوا تھا اور اسی کی ایکسٹینشن اوپر رابعہ کے بیڈ روم تک تھی ۔۔۔ رابعہ کے والد کے نام پر تھا جو ان کے گھر کا پرائیوٹ ۔۔۔ تھا اور اس کی دو لائنیں ڈرائنگ روم اور رابعہ کی ۔۔۔ کمرے میں تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کے انتظار میں ہم دونوں کی نگاہ بار بار اس بے جان آلے کی طرف جاتی تھی ۔۔۔ نے یکلخت زندگی اور موت کے نامہ بر کی حیثیت اختیار کر لی تھی لیکن فون خاموش تھا۔ وقت۔ سیکنڈ، منٹ، گھنٹے۔ دن ہفتے اور ماہ و سال۔ سب احساس کے پیمانے ہیں جو ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیت کا نام ہے جیل ۔۔۔ پھانسی کی تاریخ کا انتظار کرنے والے کے لیے وقت پر لگا کے اڑتا ہے۔ محبوب کے ایفائے عہد کی امید میں چشم براہ منتظرِ دید کے لیے وقت کتنا سست خرام ہو جاتا ہے ۔۔۔ جب وصل کی ساعتِ نایاب میسر آتی ہے تو وہی وقت یکلخت برق رفتار ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ محسن نے ایک اور سگریٹ سلگا ۔۔۔ خادمہ چائے کی ٹرے رکھ گئی جس میں حلوہ تھا جو اس نے ابھی ابھی بنایا تھا۔ شاید وہ یہی پوچھنے آئی تھی کہ اور کھانے کی کوئی چیز نہیں جو چائے کے ساتھ رکھی جا سکے ۔۔۔ نے چائے بنائی اور محسن کو دی۔ محسن نے بُرا سا منہ بنایا اور چائے میں چینی ڈالنے لگا۔ جب میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا تو میں نے بھی بُرا سا منہ بنایا۔ محسن کے کپ ۔۔۔ چینی بھی میں نے اپنے ہی کپ میں ڈال لی تھی۔ ۔۔۔ وہ شیرا پی لیا اور دوسرا کپ بنایا۔ ٹیلی فون کی نہیں بجی۔

"کیا مصیبت ہے۔" محسن نے کہا اور خود بھی چائے کا ایک اور کپ تیار کرنے لگا۔ چائے پینا وقت گزارنے کا ایک ذریعہ بھی تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے دوسرا کپ خالی کر کے ۔۔۔

پھر گھڑی کے بعد ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ اسی وقت گھنٹی بجی اور ہم دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ بڑھایا لیکن ریسیور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ "کراچی سے خیبر میل وقت پر آ رہی ہے؟" کسی عورت نے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ محسن کا چہرہ اتر گیا۔ میں ایسی اعصابی کشیدگی کا شکار تھا کہ عورت نہ ہوتی تو میرے منہ سے گالی نکلتی۔

خادمہ اسی وقت اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ "یہ دے گیا ہے کوئی صاب جی!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کون؟" میں نے لفافہ جھپٹتے ہوئے کہا۔ "کب آیا تھا؟ کیا کہا تھا اس نے کسے دینا ہے لفافہ؟ ہمیں کیوں نہیں بتایا تم نے؟"

خادمہ بوکھلا گئی۔ "وہ... صاب جی! مجھے وقت ہی نہیں ملا۔ کوئی بچہ تھا دس بارہ سال کا۔ مجھے تو نوکر لگتا تھا کسی کا۔ اس نے لفافہ دے کر کہا کہ یہ رابعہ بی بی کے لیے ہے۔ وہ نہ ہوں تو گھر میں کسی کو بھی دے دینا۔"

"اچھا۔ آیندہ اجنبی ہو تو خود اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ پکڑا جائے گا کوئی بم اور تم لے لو گی۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

خادمہ کی پوزیشن اور خراب ہو گئی تھی۔ "صاب جی! اب اجازت دیں تو میں جاؤں، اپنے داماد کے گھر۔ میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی ہے۔

"جاؤ۔" میں نے کہا۔ "چابیاں دے جاؤ تا کہ ہم کو جانا ہو تو گھر کھلا نہ پڑا رہے۔"

سادے لفافے پر کسی کا نام نہیں تھا۔ اس کے اندر سے کاغذ کا دوسرا پرزہ برآمد ہوا جو اسی چار انچ چھ انچ سائز کا تھا اور اس پر پنسل سے وہ تحریر تھی جس کا نمونہ پہلے پیغام میں تھا۔ لکھائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی نے عمداً اپنے سیدھے ہاتھ کے بجائے الٹے ہاتھ سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ خط کسی تمہید کے بغیر شروع ہوتا تھا۔

"ابھی تک تم نے عقل سے کام لیا ہے اور پولیس کو رپورٹ نہیں کی، اس لیے رابعہ بھی خیریت سے ہے۔ غلطی سے بھی فون کا غلط استعمال مت کرنا ورنہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ جو بات ابھی تک رابعہ کی ماں کو معلوم نہیں وہ اسے معلوم ہو جائے گی۔ خدانخواستہ اس کا دل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا تو رابعہ قصوروار تمھیں سمجھے گی۔

اب تک تم نے اندازہ یقیناً کر لیا ہوگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ لفافہ چاہیے جو تم نے بابو پوسٹ مین سے ہتھیا لیا تھا۔ اس میں سے سادہ کاغذات برآمد ہوئے تھے نا؟ کوئی بات نہیں۔ وہی سادے کاغذات ہمارے حوالے کر دو۔ رابعہ پر آنچ نہیں آئے گی ورنہ یہ سمجھ لو کہ وہ تمھارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے اور پولیس کیا، جتنے بھی سراغ لگانے والے ادارے ہیں سب مل کر بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تم نے ضد میں رابعہ کی ماں کو اور رابعہ کو قربان کر دیا تب بھی یہ کامیابی عارضی ہوگی۔ ہم وہ لفافہ بعد میں حاصل کر لیں گے جس کے بارے میں ابھی تک تمھیں کچھ نہیں معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تمھاری وہ بات مضحکہ خیز تھی کہ بہت سے لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں اور تم نے اس کی نقلیں بنوا کے تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی ہے۔ اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی سادے کاغذات کے سوا کیا ہوگی جس پر کچھ لکھا ہوا نظر ہی نہ آتا ہو۔ منشی مرحوم نے مرتے وقت اعتراف کیا تھا کہ اس سے ایک بھول ہو گئی تھی یعنی وہ لفافے میں پرچہ ترکیبِ استعمال ڈالنا بھول گیا۔ یہ بھول کی بات نہیں تھی۔ وہ شاید تمھیں ٹیلی فون پر بتا دیتا یا الگ خط ڈالتا۔ تاہم اس نے وہ بات ہمیں بتا دی جو تمھیں نہیں بتا سکا تھا۔ تم اسے اب بھی کسی کیمسٹری کے پروفیسر یا کسی کیمیکل لیبارٹری میں لے جاؤ تو وہ یقیناً پورا مضمون پڑھنے میں تمھاری مدد کر سکیں گے لیکن اب وقت نہیں رہا۔ رابعہ کے کہنے کے مطابق وہ خط گھر میں ہی موجود ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں سوائے دفتر اور لائبریری کے ہم نے گھر کا کونا کونا دیکھ لیا تھا۔ ہمارا خیال ہے تم رابعہ سے بہتر طور پر پوچھ سکتے ہو کہ خط لائبریری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں ہے تو کہاں ہے اور اگر وہاں بھی نہیں ہے تو اس نے کس کے پاس رکھوایا ہے۔ بہتر ہم نے اس لیے کہا کہ ہمارے پوچھنے کے طریقے ذرا مختلف ہیں۔ رابعہ سمجھتی تو ہے مگر وہ بہادر بن رہی ہے اور اسے خوش فہمی ہے کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ تم سب کے مفاد میں ہے کہ پڑھے بغیر وہ لفافہ ہمیں دے دو۔

گھر سے نکل کے رابعہ کی فاکس ویگن تک جاؤ جو کراؤن سینما کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔ اس کے پیچھے ایک ٹیکسی ہے۔ ٹیکسی میں چابیاں موجود ہوں گی۔ اس ٹیکسی کو گڑھی شاہو کی طرف لے جاؤ اور دائیں طرف مڑ کے ریلوے کراسنگ تک سیدھے جاؤ۔ پھر نہر کے بائیں کنارے پر اسی شکستہ مزار کی طرف بڑھو جہاں سے پولیس کو منشی کی (ایک گمنام فقیر کی مسخ شدہ) لاش ملی تھی۔ اس سڑک پر دو افراد تمہیں روکیں گے۔ ان کے لباس ایک جیسے ہوں گے۔ کسی اور کو بٹھاؤ گے تو قدرتی طور پر ہم شک میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مزید ہدایات وہ دونوں مسافر دیں گے۔

یہ مت بھولنا کہ تم ہر لحظہ ہماری نگاہ میں ہو۔"

میں نے خط کو محسن کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ کا پرزہ دونوں طرف لکھنے سے بھر گیا تھا لیکن میری طرح محسن نے بھی اس عبارت کو پانچ منٹ میں دوبار پڑھ لیا۔ "یہ لوگ ڈاج کر رہے ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انہیں علم نہیں کہ رابعہ کی فاکس ویگن اب وہاں نہیں ہے جہاں یہ لوگ سمجھ رہے ہیں۔ ان کے کسی آدمی کی ہم پر نگاہ نہیں۔ یہ سب ہمیں نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ٹیلی فون بھی کوئی ٹیپ نہیں کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیونکہ فون یا تو ایکسچینج میں ٹیپ ہوتا ہے یا گھر کی قریب ترین لائن سے مگر اس کے لیے پول پر چڑھنا پڑتا ہے اور پول پر کوئی کب تک لٹکا رہ سکتا ہے۔ یہ تو ہم فوراً باہر نکل کے بھی دیکھ سکتے ہیں۔"

"فون ٹیپ کرنے کے بہت سے سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "لائن کے علاوہ جنکشن باکس بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ باہر کہیں فون کی لائن سے تار تو نہیں جوڑ رکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے خط بھی رابعہ کی فاکس ویگن کے ... پہلے لکھا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم خطرات مول لینے ... میں نہیں رہے محسن! انہوں نے ایک دھمکی اور ... کہ رابعہ کی ماں کو رابعہ کے اغوا کے بارے میں بتا ... گا۔ وہ واقعی مر جائے گی اور آج ظلم کے خلاف سینہ ... والی رابعہ کو بھی کل یہ خیال ضرور آئے گا کہ اس نے ... کو اپنی ضد پر قربان کر دیا۔"

"بعض اوقات حصولِ مقصد میں کامیابی یقینی ... آدمی اپنی پیاری سے پیاری چیز قربان کر کے بھی ..." محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ محسن کی بات کا مطلب کیا ہے۔ "رابعہ کا دماغ خراب ہو رہا ہے تو کیا۔ میں تو ہوش میں ہوں" میں نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" محسن نے کہا۔ "یہ بتا رابعہ نے ... نہ مانی۔ لفافے کا پتا نہ بتایا تو کیا ہوگا؟"

"یہ میں جانے سے پہلے ہی کیسے بتا سکتا ہوں ..." نے کہا۔ "تو میرا یہیں انتظار کرنا۔ صبح تک۔ اس کے بعد ..."

"اس سے پہلے یا اس کے بعد جو کچھ کرنا ہوگا وہ ... اپنی پرائیویٹ عقل کی مدد سے کروں گا۔ آپ تشریف ... جائیں۔" محسن چڑ کے بولا۔

"صاب جی! میں جا رہی ہوں۔" خادمہ نے ... میز پر رکھ کے کہا۔ وہ اپنا بوسیدہ برقع اور میلی پوٹلی ... دبائے کھڑی تھی۔

"تمہارا داماد کہاں رہتا ہے ماسی؟" محسن نے اس ... سے دیکھ کے کہا۔ "کیسے جاؤ گی؟"

"چلی جاؤں گی بس سے۔ وہ صدر میں رہتا ہے ... کے پیچھے والی گلی میں۔" وہ بولی۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم سکندر صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ تمہیں ٹیکسی میں لے جائیں گے۔"

"اس تکلیف کی ضرورت نہیں صاب جی! ... آتی جاتی رہتی ہوں۔" خادمہ نے عاجزی سے کہا۔

"تکلیف کیسی۔ یہ بھی ادھر ہی جا رہے ہیں ..." نے کہا۔ "سکندر، ماسی کو عین ان کے گھر کے دروازے تک پہنچانا ہے۔ آج تم نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی ..." کا انداز تحکمانہ اور فیصلہ کن تھا۔ خادمہ کی نظر بچا کے

نے مجھے آنکھ ماری تو میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں کچھ اور ہے۔ میں اسے منع بھی کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی چکر میں نہ پڑے اور پوچھنا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کیا سوچا ہے لیکن میں مجبور تھا کہ خاموشی سے اس کی بات مانوں۔ نہ وہ ماسی کے سامنے کچھ بتاتا اور نہ میرے منع کرنے سے مانتا۔ میں نے ماسی کو ساتھ لیا اور کوٹھی سے باہر آیا تو وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔ اس خیال سے کہ شاید میں کسی گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روکوں لیکن میں نے کہا اپنی ٹیکسی آگے کھڑی ہے تو وہ پھر چل پڑی۔

محسن نے ماسی کو کیا سوچ کے میرے ساتھ کیا تھا، یہ میں ابھی طے نہیں کر سکا تھا۔ شاید اس کا مقصد نگرانی کرنے والوں کو گمراہ کرنا تھا۔ اگر وہ واقعی دیکھ رہے ہوں گے تو فوراً چوکنے ہو جائیں گے اور تعاقب کیا تو صدر تک جا کے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیا محسن اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکا ہے؟ یقیناً بات یہی ہوگی۔ میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا۔ ماسی کو پیچھے والی سیٹ پر بٹھا کے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کیا۔

یہ احساس بہت عجیب تھا کہ میں ایک چوری کی ٹیکسی میں اتنے اعتماد کے ساتھ دن دہاڑے شہر کی سڑکوں پر رواں ہوں۔ چوری کی رپورٹ اب تک درج کرا دی گئی ہوگی۔ باعثِ اطمینان پولیس کا وہی نااہل انتظام تھا۔ ابھی چوری ہونے والی ٹیکسی کا نمبر ہر تھانے کو بتایا جائے گا اور وہ مجبوراً لکھ لیں گے۔ گشتی پولیس اور ٹریفک پولیس کی چوکیوں میں آرام سے بیٹھ کے گپ لگانے والے بھی نمبر نوٹ کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ فوراً سڑک پر نکل کھڑے ہوں اور سڑک پر سے گزرنے والی ہر ٹیکسی کا نمبر پڑھیں۔ لیکن ان کے پاس تو ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو ہر روز چوری ہونے والی اور بہت کم پھرنے والی کاروں کی تعداد کے باعث طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا ذہن کون سا خودکار کمپیوٹر ہے کہ سارے نمبر یاد رکھے اور جیسے ہی کوئی مسروقہ کار سامنے سے گزرے کھٹ سے سگنل دے دے۔ خود کوئی موٹر سائیکل سوار ٹریفک سارجنٹ دیکھ کر پیچھے لگ جائے تو الگ بات ہے ورنہ چوراہوں اور ادھر ادھر کھڑے ہوئے عام سپاہی تو دیکھ کر بھی منہ پھیر لینے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔ تاہم ایک اندیشہ اپنی جگہ تھا کہ میں پکڑا گیا تو کیا جواب دوں گا۔ ماسی کی نظر میں تو میری حیثیت مصدقہ خطرناک مجرم کی ہو جائے گی۔ پولیس والے گمشدہ کار کی تلاش ہمیشہ اس امید کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ چوری یا تو کسی لونڈے نے ایڈونچر کی خاطر کی ہوگی یا پیشہ ور مجرموں نے کسی خاص مشن کی خاطر اور کار کہیں نہ کہیں لاوارث کھڑی مل جائے گی۔ پچاس فیصد صورتوں میں ان کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔ باقی پچاس فیصد اندازوں کے غلط ہونے کے بعد وہ مالک کو شہر کی سڑکوں اور گلیوں کی سیر کراتے ہیں اور خود بھی پھرتے ہیں چنانچہ کھانے اور چائے، سگریٹ، پان وغیرہ کے اخراجات شکایت کنندہ سے وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آدمی خالی پیٹ رہ کے بغیر تو گشت نہیں کر سکتا۔ مشین بھی آرام اور ایندھن مانگتی ہے۔ جو گاڑیاں نہ ملیں وہ مشتبہ طور پر غیر علاقے پہنچا دی جاتی ہیں یا ان کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو کے بصورت اسپیئر پارٹ چور بازار میں پہنچ جاتے ہیں اور مالک کو صبر کرنے یا دوسری گاڑی خریدنے کا سنہری مشورہ دے کر پولیس اپنے فرائض منصبی سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔

"بس بیٹا ادھر ہی روک لینا ٹیکسی۔" ماسی نے پیچھے سے کہا اور میں نے ٹیکسی روک لی۔ ماسی کے اترتے ہی ایک بالشتیے بڑے میاں اپنے مچھندر بیٹے کے ساتھ لپکے۔ دونوں میں فرق صرف عمر اور مونچھوں کا تھا۔

"ابے اسٹیشن جانا ہے۔ چھاؤنی کے اسٹیشن۔" بڑے میاں نے کہا اور چیخ کر اپنے مچھندر بیٹے سے کہا کہ وہ ٹین کے صندوق کا بوجھ اپنے سر پر سے ٹیکسی کی چھت پر رکھ دے لیکن بیٹا ابھی سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔

"میں ٹیکسی ڈرائیور نظر آتا ہوں تمہیں؟" میں نے غرا کے کہا۔ بڑے میاں نے منہ دوسری طرف کر کے صدا لگائی۔ ایک فارغ کھڑا ہوا سپاہی ڈنڈا ہلاتا، وقت گزاری اور آمدنی کا وسیلہ پیدا ہونے پر مسکراتا آگے آیا۔ مچھندر بیٹے نے اتنی دیر میں ٹین کا صندوق چھت پر پھینک دیا تھا۔

"اے! ہٹاؤ اس مصیبت کو۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "ورنہ اسے بھی لے جاؤں گا۔"

"کیا؟" بڑے میاں نے چیخ ماری۔ "دیکھ رہے ہیں آپ سنتری صاحب! یہ دیدہ دلیری۔ مسافر کو بٹھانے سے انکار۔ اور پھر یہ دھمکی۔"

"اٹھاؤ۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔ "مجھے ایس ایس پی جناب رضوی کی بیگم کو لینے جانا ہے۔ یہ ان کی ٹیکسی ہے۔ تمہارے باپ کی کار نہیں ہے۔"

سنتری کی پیش قدمی اور جارحانہ عزائم کا خاتمہ ہو گیا۔ "ارے چچا! ہم دلواتے ہیں آپ کو دوسری ٹیکسی۔" اس نے خود باکس اتارتے ہوئے کہا اور اس کی یہ بات نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سنی کہ گھنٹے بھر کے بعد تو ایک ٹیکسی آئی تھی وہ دوسری کہاں سے دلوائے گا۔ میں نے میٹر ڈاؤن کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر طوفانی رفتار سے ٹیکسی موڑی۔ حالات کی سنگینی کے باوجود مجھے اس ایک ایکٹ کے چھوٹے سے مزاحیہ ڈرامے پر ہنسی آئی۔ واپس دھرمپورے کی طرف مڑتے ہی مجھے ریلوے کراسنگ پر انتظار کرنا پڑا۔ یہ پھاٹک شاذونادر ہی بند ہوتا تھا۔ دس منٹ بعد جب مال گاڑی کے چند ڈبوں کو بادلِ ناخواستہ کھینچ کر لے جانے والا کالا انجن دھواں چھوڑتا گزر گیا تو میں پھر آگے بڑھا۔ اگلا ریلوے کراسنگ جس پر سے کراچی جانے اور آنے والی گاڑیاں گزرتی تھیں، پھر بند تھا مگر مجھے اس سے پہلے ہی سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جانا تھا۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اب شام کا دھندلکا گہرا ہونے لگا تھا اور کچھ گاڑیاں پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی تھیں۔ میں نے اپنی نگاہ سڑک پر رکھی جس پر پیدل چلنے والے ناپید تھے۔ سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی اور زن دم سے گزر گئی۔ باغبانپورے یا مغلپورے جانے والا ٹخ ٹخ کرتا ایک تانگہ پیچھے رہ گیا۔

وہ دونوں مخالف سمت سے نمودار ہوتے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے دو درخت تھے۔ وہ انہی کے پیچھے چھپے کھڑے تھے۔ مجھے بے ساختہ ہنسی بھی آئی اور مجھے فوراً بریک بھی لگانے پڑے۔ ان کے ایک جیسے لباس پرانی وضع کے سفید لٹھے کے شٹل کاک ٹائپ برقعے تھے اور وہ سڑک کے بیچ میں کھڑے ہوتے بھوت نظر آتے تھے۔ پلک جھپکتے میں وہ دونوں کار کے پچھلے دروازے کھول کے بیٹھ گئے۔

"چلتے رہو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "پلٹ کر مت دیکھنا۔"

"مہذب ٹیکسی ڈرائیور پردہ نشیں بیبیوں کو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔" میں نے کہا۔ "ریوالور کی دھمکی کی ضرورت نہیں۔"

یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ پہلے سے برقعے اوڑھے کھڑے تھے۔ ہر راہ گیر سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی خواتین کو دیکھ کر شک میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ برقعے بغل میں دبا کے کھڑے ہوں گے۔ ٹیکسی کو دیکھتے ہی انہوں نے پیراشوٹ کی طرح کھٹ سے برقع کھول کے سر پر ڈال لیا۔ جدید وضع کا ٹوپیس برقع ہوتا تو ان کو بند باندھنے پڑتے، اور بٹن بند کرنے پڑتے۔ یہ فوراً کام آنے والا آسانی سے دستیاب ہونے والا اور پوری طرح چھپا لینے والا لباس ہر قسم کے نقاب یا ماسک سے بہتر تھا جو ہمارے ملک کے اور یورپ کے مجرم استعمال کر رہے تھے۔ شالیمار سے مجھے ٹکسال کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔ ٹکسال سے پہلے اسی قسم کے برقعے والی ایک خمیدہ کمر بڑی بی نے مجھے روکنا چاہا جو کوئی پوٹلی یا باسکٹ رکھے کھڑی تھیں۔ "ارے اماں!" میں نے کہا۔ "ایک نہ شد دو شد والا کیس پہلے ہی ہے۔ تم تیسری کیا کرو گی۔" داروغہ والا کا علاقہ گزر گیا۔

"ٹیکسی کو یہیں سڑک کے کنارے روک لو۔" مجھے حکم ملا۔ "چابیاں اسی میں چھوڑ دو۔"

داروغہ والا کے بعد آبادی اب بہت کم رہ گئی تھی اور جو گھر بنے ہوئے تھے وہ بھی دور دور تھے۔ ان میں جدید وضع کی کوٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی ہدایات کے مطابق میں نے آگے آگے چلنا شروع کیا۔ برقع پوش خواتین میرے پیچھے رہیں کہ شرفاء کا قاعدہ یہی ہے۔ اگر یہاں مجھے اپنا کوئی لندن کا دوست دیکھ لے تو بھونچکا رہ جائے کہ وہ یہاں جو روشن خیالی اور آزادی کا اتنا بڑا مبلغ تھا اپنے وطن جا کے کیا ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو عورتیں عین قدامت پسندی کا شاہکار بنی چل رہی تھیں۔ مائی گڈنس۔ ان میں سے ایک تو اس کی بیوی ہو گی اور کون جانے دونوں ہوں۔ اولڈ فیشن مسلم چار بیویوں پر یقین رکھتے ہیں آج بھی۔ اوہ مائی لارڈ شاید میری انگریز کلاس فیلو لڑکیاں صدمے کی شدت سے بیہوش ہو جاتیں اور اس لارڈ کی بیٹی کا کیا حال ہوتا۔ اس کا باپ کہتا دیکھو! یہ حشر ہوتا تمہارا اس بلڈی نیٹو کے ساتھ جا کے اصل صورتِ حال کتنی مختلف تھی۔ یہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بندۂ مجبور کے پیچھے اس کی زوجگان نہیں، اس کے قاتل ہیں اور برقعے کے اندر مؤنث نہیں مذکر ہیں اور وہ بھی مسلح۔ کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہ تھا اور میرے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دے کر ان کو بے نقاب کرنا محال تھا۔ میں روبوٹ کی طرح ان کے اشارے پر دائیں بائیں ہوتا گیا اور کھیتوں کی منڈیر پر چلتا گیا۔ انہوں نے وسیع میدان کے وسط میں کھڑی ہوئی ایک کوٹھی کے نامکمل ڈھانچے کی پہلے ہی نشاندہی کر دی تھی۔ کوٹھی کا نچلا حصہ مکمل تھا لیکن اس پر پلاستر کی نوبت نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اپنی خباثت کے مظاہرے کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ ہر لحاظ سے موزوں تھی۔

کوٹھی کے گیٹ کے اندر داخل ہو کے بھی انہوں نے برقعوں کے نقاب نہیں اٹھائے۔ میرے سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا جس کے دونوں دروازے بند تھے۔ کوٹھی کے بائیں ہاتھ پر سامنے کی طرف جو جگہ لان کے لیے چھوڑی گئی تھی اس میں دیوار کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی دو سو سے زائد بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سریا پڑا تھا جو ابھی استعمال ہونا باقی تھا اور درمیان میں پانی کا وہ عارضی تالاب تھا جو تعمیر کے لیے پانی ذخیرہ رکھنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔ اس طرف نچلی منزل میں کھڑکیوں کی چوکھٹ موجود تھی لیکن پٹ لگنے باقی تھے چنانچہ خالی کمروں کا اندھیرا اور پلاسٹر کا رنگ ایک نظر آتے تھے۔ اوپر کی منزل پر سریے دیواروں میں اگے ہوئے لگتے تھے اور ایک جانب چھجے کی شٹرنگ کو سہارا دینے والے بدنما لکڑی کے ستون نہ جانے کب سے ایسے ہی کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ تعمیر کا کام رکا ہوا ہے۔ اکثر لوگ عمارت بنواتے وقت جو تخمینہ ذہن میں رکھتے ہیں وہ تکمیل کے آخری مراحل طے کرتے کرتے غلط ہو جاتا ہے اور پھر مزید سرمایہ فراہم ہونے تک تعمیر کے عمل کو ایسے ہی روکنا پڑتا ہے۔ کوٹھی کا مالک اپنی پریشانی میں مبتلا ہو گا اور شاید دن میں ایک بار چکر لگا کے نامکمل گھر پر حسرت کی نظر ڈال کے لوٹ جاتا ہو گا۔ وہ ملک سے ہی باہر ہوا تو یہاں اس کے بھائی، ماں باپ یا بیٹے خط پہ خط ڈال رہے ہوں گے کہ جو پیسہ تم دے گئے تھے وہ تو ختم ہوا اب اور بھیجو کہ باقی رہ جانے والا کام بھی پورا ہو۔ لیکن باہر رہ کے کمانے والے بھی ڈاکا تو نہیں ڈال سکتے۔ انہیں مزید کما کے بچانے میں وقت لگتا ہے۔

"سیدھے ہاتھ والے دروازے سے اندر چلو۔" ایک برقع پوش نے مجھے دھکیلا اور میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا، کیونکہ فرش بہت ناہموار تھا اور ادھر ادھر آدھی پوری اینٹوں کے علاوہ پتھر بھی پڑے تھے۔

"اندر آٹھ عدد دروازے ہیں۔ چار ایک طرف چار دوسری طرف۔ تم الٹے ہاتھ کے آخری دروازے سے اندر جاؤ گے۔" دوسرے نقاب پوش نے کہا۔

میں نے راستے میں بھی ان کی آواز پر اور لہجے پر غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان میں سے ایک یقیناً استاد بیڈرو ہے لیکن وہ بھی اصل آواز اور لہجے میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے کے بارے میں ابھی تک میں بے یقینی کا شکار تھا کہ وہ دلاور یا ڈی سلوا میں سے کوئی ہے یا بیڈرو کا سابقہ مددگار۔ برقعے نے ان کی صورت کو ہی نہیں قد و قامت کو بھی بڑی خوبی سے چھپا لیا تھا اور ان کے لباس کو بھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو ریوالور لے کر دائیں طرف کی گلی میں جاتے دیکھا اور دروازے کے قریب رک کے پیچھے نگاہ ڈالی۔ ایک برقع پوش مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ریوالور کا رخ میری طرف کیے فائر کرنے کی پوزیشن میں تیار کھڑا تھا۔ اگر میں چاہتا تو راستے میں کوئی موقع پیدا کر سکتا تھا۔ یہی برقع جس نے ان کو چھپائے رکھا تھا ان کے لیے وبالِ جان بن جاتا اور وہ اس میں الجھتے تو آسانی سے قابو میں آ جاتے مگر میں نے عمداً ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس سے رابعہ کو فائدے کے بجائے نقصان ہو سکتا تھا۔ اگر میں ان دونوں کو یرغمال بنا لیتا تب بھی بے کار تھا۔ وہ دونوں بے وقعت لوگ تھے جن کی خدمات منہ مانگے معاوضے ادا کرنے کے بعد حاصل کی جاتی ہیں۔ تحفظ کی کسی ضمانت کے بغیر۔ اگر وہ مارے جائیں تو کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ ان کی جگہ دوسروں کی خدمات حاصل ہو جاتی ہیں۔ جو ان کا نعم البدل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت اشیائے صرف سے زیادہ نہیں ہوتی جو خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ ٹوٹ جاتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور ناکارہ ہوں تو بدل دی جاتی ہیں لیکن میرے لیے رابعہ صرف رابعہ تھی۔ اس کے بدلے میں دلاور سمیت ایک ایک بدمعاش کو چن چن کے مار ڈالتا تب بھی رابعہ کا نقصان پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ خواہ وہ جان کا ہو یا آبرو کا۔ چنانچہ میں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور جرأت یا ذہانت کا کوئی ایسا مظاہرہ نہیں کیا تھا جو میری حماقت کا ثبوت بن جاتا۔ میں مسکرایا اور ہینڈل گھما کے اندر داخل ہو گیا۔ اب میرے سامنے ایک نیم تاریک گلی تھی۔ اس کاریڈور میں جو کوٹھی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا تھا واقعی آٹھ دروازے تھے جو سب کے سب بند تھے۔ کاریڈور کی اونچائی کمروں کی چھت کے برابر یعنی بارہ فٹ تھی لیکن چوڑائی صرف چھ فٹ تھی۔ بجلی کے پوائنٹ یہ ظاہر کرتے تھے کہ بعد میں راہداری کو دن میں بھی سیلنگ لائٹ سے روشن رکھنا ضروری ہو گا۔ ابھی سیمنٹ کے سیاہ رنگ کے باعث بھی روشنی کم ہو گئی تھی۔ اس راہداری کے آخر میں بھی ایک دروازہ تھا جو کھلا پڑا تھا اور عقبی حصے کے مختصر سے صحن کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ دوسرا برقع پوش جو دائیں جانب چلا گیا تھا اب گھوم کر اس دوسرے دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے برقعے کے اندر ہی سے ریوالور میری طرف تان رکھا تھا۔

میں نے کسی اور دروازے کو کھول کر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اور بائیں ہاتھ کے آخری دروازے کے ہینڈل کو گھما

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے اندر داخل ہوگیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا جس میں چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ابھی میں اس تاریکی سے مانوس ہونے کی کوشش ہی کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کمرے میں اتنی تاریکی کیوں ہے کہ ایک ہاتھ نے مجھے آگے دھکیلا۔ میرے پیچھے دروازہ کھٹ سے بند ہوگیا اور میں نے محسوس کیا جیسے دن کے اجالے سے ایک دم میں آدھی رات کی ایسی تاریکی میں دھکیل دیا گیا ہوں جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ماچس نکالی اور دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے میں نے گہری سانس لے کر سونگھا لیکن کمرے میں صرف تازہ پلاسٹر کی نمی اور چھیلی ہوئی لکڑی کی خوشبو تھی، کسی گیس کی بو نہیں تھی۔ اندھیرا یقیناً مصنوعی تھا اور کھڑکی دروازے بند کرکے اور شیشوں پر سیاہ پردے یا رنگ پھیلا کے پیدا کیا گیا تھا ورنہ ایسا کمرہ کون بناتا ہے جس میں صرف ایک دروازہ ہو۔ میں نے ایک دیا سلائی روشن کی۔ اس کی مدھم روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں واقعی روشندان کے سوا یا اس دروازے کے سوا باہر کے اجالے کے اندر آنے کی کوئی راہ نہیں۔ دروازہ بند ہوگیا تھا اور شاید باہر سے مقفل بھی کردیا گیا تھا۔ روشندان میں چوکھٹ پر تختے جڑ دیے گئے تھے۔ پہلی دیا سلائی بجھ گئی۔ میں نے دوسری تیلی جلائی۔ کمرہ آٹھ فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا اسٹور تھا جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ شیلف بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے آخر میں دروازے جیسا خلا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھائے اور تیلی بجھنے سے پہلے اس خلا تک پہنچ گیا۔ خلا سے تہہ خانے میں سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ میں تیسری تیلی جلانے ہی والا تھا کہ کسی نے صاف آواز میں کہا۔ "نیچے اتر جاؤ، رابعہ تمہاری منتظر ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ آواز کی گونج بتاتی تھی کہ مجھ سے بات کرنے والا کوئی انسان نہیں، لاؤڈ اسپیکر ہے۔ اور یہ لاؤڈ اسپیکر میرے سر پہ روشندان میں نصب تھا۔ میں نے اوپر دیکھا اور پھر تیسری دیا سلائی کی روشنی میں تہہ خانے کی بغیر پلاسٹر والی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ زینے پر ایک موڑ آیا اور دیا سلائی ختم ہوگئی۔ میں نے باقی زینہ مکمل اندھیرے میں سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتے ہوئے طے کیا۔ آخری زینے سے فرش پر قدم رکھتے ہی میں نے کہا۔ "رابعہ!" اور میری آواز اس تہہ خانے میں گنبد کی طرح گونجی۔ "رابعہ!" میں نے پھر کہا اور ماچس جلائی مگر وہ تیلی خراب تھی۔ "کیا بات ہے رابعہ، جواب دو۔ کدھر ہو تم؟"

"ابھی تک تمہاری نظر رابعہ کو نہیں دیکھ سکی؟" لاؤڈ اسپیکر نے میرا استہزا اڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے خوف کی سرد لہر کو ریڑھ کی ہڈی میں اترتے محسوس کیا اور دوسری تیلی روشن کی۔ یکلخت میری نظروں نے رابعہ کو دیکھ لیا۔

وہ فرشِ خاک پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مجھے پہلی نظر میں ہی اس کے تار تار لباس پر خون کے دھبے نظر آگئے۔ "رابعہ!" میں چلایا اور میری آواز کی بازگشت کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر بڑی خباثت سے ہنسا۔ میں نے دوڑ کر چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور نیم پختہ فرش کی گرد پر بیٹھ گیا۔ "رابعہ! رابعہ! میری جان! کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اندھیرے میں اس کے گالوں کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ "رابعہ… دیکھو میں سکندر ہوں۔" لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور پھر کان لگا کے دیکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ٹھیک تھی۔ پھر میں نے اس کی نبض دیکھی۔ یوں جیسے میں واقعی نبض دیکھ کے اس کی حالت کا صحیح اندازہ کرلوں گا۔ میرے ہاتھوں پر اس کے خون کی نمی آگئی اور میری انگلیاں چپکنے لگیں۔ میں نے رابعہ کا سر آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ اس کے پریشان بال خاک میں پہلے ہی اٹے ہوئے تھے۔ پہلی نظروں میں مجھے رابعہ کی ظاہری حالت کے صدمے نے وقتی طور پر دیوانہ کردیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ وہ مرچکی ہے۔ اس کے پھٹے ہوئے کپڑے اور خون میں لتھڑے ہوئے جسم کو لاش کی طرح پڑا دیکھ کر میں اور کیا اندازہ کرسکتا تھا۔ اب مجھے یکلخت یہ اطمینان حاصل ہوگیا کہ وہ زندہ ہے اور یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔

"کیا بات ہے؟ رابعہ نے کچھ بتایا نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟" لاؤڈ اسپیکر بولا۔

"حرامزادو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم نے مجھے بتایا تھا کہ رابعہ خیریت سے ہے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس پر آنچ نہیں آئے گی۔"

"تو ہم نے کون سی وعدہ خلافی کی ہے؟" لاؤڈ اسپیکر نے جواب دیا۔ "رابعہ صحیح سالم اور زندہ ہے۔"

"تم سب نامرد ہو۔ عورت پر یہ ظلم کرکے خود کو دلاور کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور، استاد پیدا کون ہے جو سامنے آکے مجھ سے بات کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ بے ضمیر شیطانو! تم خود کو بدمعاش کہتے ہو۔ بدمعاش سمجھتے ہو۔ بدمعاشی کے لیے بہت بڑا دل چاہیے، ظرف چاہیے اور حوصلہ چاہیے۔ کیا ملا تمہیں اس عورت کے ساتھ یہ سلوک کرکے۔ کیا مقابلہ اس کا اور تمہارا؟"

"کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ بات ہم نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" لاؤڈ اسپیکر ہنسا۔ "مگر عورت ذات ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنے آپ کو بدمعاش نہیں سمجھتے۔ کیا ہم نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے۔ اگر یہ ہم سے تعاون کرتی تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ ہم کبھی اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کرتے۔"

میں نے سخت جدوجہد کے بعد پاگل کردینے والے جذبات کی سرکش لہر پہ قابو پایا۔ "کیا چاہتے تھے تم لوگ؟"

"ہم چاہتے تھے کہ ہمیں وہ لفافہ واپس مل جاتے۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "لفافہ رابعہ کے پاس ہی تھا نا؟"

میں نے محسوس کیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اسی چوہدری دلاور کی آواز ہے۔ اس نے پہلے بھی مجھے نفسیاتی طور پر متاثر کرنے کے لیے ایک ڈرامائی طلسماتی ماحول پیدا کیا تھا۔ اب پھر اس نے مجھے ایک دہشت زدہ کرنے والے ماحول میں بات کرنے کے لیے قید کرلیا تھا۔ اس کا پُرسکون ٹھہرا ہوا پُراعتماد لہجہ وہی تھا۔ آواز کا فرق اس لیے محسوس ہوتا تھا کہ وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب نہ تھا۔ لاؤڈ اسپیکر سے نکلنے والی آواز خاصی بدل جاتی ہے۔ تہہ خانے اور کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ اندر ایک کنکر بھی نہ تھا جو میں لاؤڈ اسپیکر پر مار سکتا۔ میری آواز باہر کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور میں دلاور کی اجازت کے بغیر اس قید خانے سے تاقیامت نہیں نکل سکتا تھا۔ محسن کو اور دنیا میں میرے یا رابعہ کے کسی جاننے والے کو معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ انہوں نے ٹھیک لکھا تھا کہ رابعہ تمہارے خیال کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے تو ہم یہیں بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مرجاتے اور ہماری لاشیں نہ جانے کب دریافت ہوتیں، لیکن میں جانتا تھا ان کا مقصد ہمیں قتل کرنا نہیں ہے۔

"وہ لفافہ میں نے رابعہ کی والدہ کو دیا تھا۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ رابعہ بھی یہی کہتی ہے کہ لفافہ امّی کے پاس ہے۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے تسلیم کیا ہے کہ لفافہ اور سادے کاغذ ماں نے اسے دیے تھے۔ اس نے کاغذات کو گرم کرکے پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی اور تم سے اسی موضوع پر بات بھی کی تھی لیکن اسے یا تمہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ان کاغذات پر کوئی نظر نہ آنے والی تحریر ہے تو ہم ابھی تک اسے پڑھ نہیں سکے ہیں۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے اور تمہاری خوش قسمتی ہے، ورنہ تمہیں جو ایک ماہ کی مہلت ملی تھی، وہ آج تمام ہوجاتی۔" لاؤڈ اسپیکر بولا۔ "بہتر یہی ہے کہ پڑھے بغیر وہ خط ہمیں واپس کردو۔"

"میں کوشش کرسکتا ہوں کہ رابعہ ہوش میں آجائے تو اس کو لفافہ اور وہ کاغذات واپس کرنے پر رضامند کرلوں۔ اور مجھے امید ہے، رابعہ مان جائے گی۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ جتنا سچ ہم اس سے اگلوا سکتے تھے ہم نے اگلوا لیا۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "اب رابعہ کہتی ہے کہ لفافہ اس نے اپنی ماں کو واپس دے دیا تھا حفاظت سے رکھنے کے لیے۔"

"تمہارا خیال ہے، رابعہ جھوٹ بول رہی ہے؟" میں نے خلا سے مخاطب ہوکے کہا۔

"نہیں، رابعہ سچ بول رہی ہے۔" اسپیکر نے کہا۔ "اس کے لیے جھوٹ بولنا ممکن ہی نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ رابعہ کی ماں سے لفافہ کیسے حاصل کیا جائے اور اسی لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔ تم اس بڑھیا سے پوچھ سکتے ہو کہ لفافہ کہاں رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جیسے ہی اسے ہوش آیا میں اس سے یہ بات معلوم کرلوں گا۔ کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ اس کے بعد ہمیں رہا کردو گے اور جب تک میں تمہیں لفافہ لاکر نہ دوں، تم رابعہ کا خیال رکھو گے؟ اسے میڈیکل ایڈ دو گے؟"

"رابعہ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ واپسی پر وہ تمہیں مسکرا کے خوش آمدید کہے گی۔" لاؤڈ اسپیکر نے کہا۔ "اس کے بعد تم جاسکو گے۔ ہم خود تمہیں بحفاظت پہنچا دیں گے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔" کسی اور کی آواز نے کہا۔ "میرا خیال ہے نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہاتھ ذرا اوپر رکھو۔"

میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی نے اس تہہ خانے میں بم پھینک دیا ہو کیونکہ یہ تیسری آواز محسن کی تھی!

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میری ذہنی کیفیت اس مسافر سے مختلف نہ تھی جس کی پیاسی آنکھیں تاحدِ نظر پھیلے ہوئے ریگ زار میں پانی کے سراب کا شکار ہوں۔ کیا یہ آرزو کا فریب ہے، مایوسی کی اس تاریکی میں کہیں امید کی ایک کرن اب بھی روشن تھی کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو، تائیدِ ایزدی سے اچانک کوئی فرشتہ غیب بن کے پہنچے جو مجھے اس بے بسی کی قید سے اور اس بےکسی کے دام سے چھڑا کے لے جائے، لیکن اس وقت یہاں کسی کا میری مدد کے لیے آجانا اتنا ہی بعید از امکان تھا جتنا ان دیواروں کو قوتِ ارادی سے گرا کے رابعہ سمیت اس زندان سے نکل جانا۔

"کون ہو تم؟" مجھ سے گفتگو کرنے والے نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ بدستور پُرسکون رہا۔ "اس طرح منہ اٹھا کے کسی کے گھر میں گھس آنے اور اس لہجے میں بات کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں ان دونوں برقع پوش خواتین کی والدہ ہوں جن کے ساتھ سکندر بخت دس منٹ پہلے یہاں پہنچا ہے۔" محسن نے کہا۔

"تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔" اس شخص نے کہا۔ "ہم یہاں ایک سودا کر رہے تھے۔ تمہارے دخل در معقولات سے خرابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا اگر تم اُلٹے قدم لوٹ جاؤ اور ہمیں معاملے کی بات کرنے دو۔"

"شریفانہ معاملات پر شرافت سے بات کی جا سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کے لیے ہم باہر کہیں بھی بیٹھ کے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں بلاؤ گے تو ہم سر سے کفن باندھ کے بھی آئیں گے اور سر کے بل بھی۔ اور تم غریب خانے کی عزت بڑھانے آؤ گے تو ہمیں چشم براہ پاؤ گے لیکن جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے وہ نامردوں کا طریقہ ہے اور ہم اپنی عزت و غیرت کے بدلے کوئی سودا کر ہی نہیں سکتے۔ تم سکندر بخت اور رابعہ کو نکل جانے دو، پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

"تم آخر کیا ہو؟ سکندر بخت کے وکیل؟" اس شخص نے تحقیر اور تمسخر کے ساتھ کہا۔ "یہ دعویٰ کس ضمانت اور کس بوتے پر ہے؟ تم ہو کون؟"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ضمانت جان کی ہے۔ میری زبان پر اعتبار کرو گے تو میں سکندر اور رابعہ کے جاتے ہی ہتھیار ڈال دوں گا اور خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ سکندر اس سودے کا پابند ہوگا جو تم مجھ سے کرو گے۔ قولِ مرداں جان دارد۔"

وہ شخص ہنسا۔ "اور اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں؟ تمہیں یقین ہے کہ تم بچ کے نکل جاؤ گے؟"

"اپنی زندگی کے بارے میں تو تمہیں بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "تم اس وقت بھی میرے ریوالور کی زد میں ہو اور مجھے اس بات کی بالکل فکر نہیں ہے کہ بعد میں میرا اپنا انجام کیا ہوگا۔ ممکن ہے تمہارے ساتھی مجھے مشین گنوں سے بھون کے رکھ دیں لیکن وہ تمہیں اس گولی سے نہیں بچا سکتے جو تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا چکی ہوگی۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے ہلنے کی یا غیر ضروری تشدد کا مظاہرہ کرنے کی حماقت مت کرنا۔ اگر تم نے کسی کو مدد کے لیے پکارا یا اشارہ کیا تو میں بلا تامل تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ جہاں میں ہوں وہاں سے تم میری آواز تو سُن سکتے ہو لیکن سامنے آئے بغیر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک میرے ریوالور میں گولیاں ہیں کوئی میرے سامنے آ کے زندہ نہیں بچ سکتا۔ میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا۔"

میں دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ محسن یہاں کیسے آیا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ محسن کو دخل در معقولات سے روکوں اور کہوں کہ وہ لوٹ جائے۔ یہ لوگ جیسے بھی تھے اپنی بات کے پکے تھے۔ دلاور نے مجھے ایک ماہ کی مہلت دی تھی اور بظاہر اس مہلت کے تمام ہونے سے پہلے دلاور کا ارادہ میرا کام تمام کرنے کا نہیں تھا۔ رابعہ کے بدلے وہ مجھ سے اس خط کی واپسی چاہتے تھے اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ خط واپس کر دوں گا۔ اس خط کے اسرار و رموز میرے لیے رابعہ کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں تھے لیکن ایک تو محسن کے آجانے سے بلا مقابلہ شکست تسلیم کر لینے کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ محسن کے پُراعتماد لہجے نے میرا اعتماد بحال کر دیا تھا اور اگر وہ دشمن کے مقابلے میں بہتر پوزیشن لیے بیٹھا تھا تو یہ میرے لیے اطمینان اور مسرت کی بات تھی کہ اس کی اپنی زندگی کو خطرہ درپیش نہیں اور دشمن اپنی تمام تر عیارِ فطرت اور بے ضمیری کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہماری زندگی لینے سے پہلے دشمن کو اپنی زندگی داؤ پر لگانی ہوگی۔ محسن نے ایک کمال یہ کیا تھا کہ اپنی باتوں سے ہی دشمن کو نفسیاتی طور پر مرعوب اور دہشت زدہ کر دیا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ اس کا نشانہ اتنا بے خطا نہیں۔ مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ محسن نے پہلے کبھی ریوالور چلایا ہے۔ اس نے شکار کے دوران میں میرے ساتھ شکاری رائفل ضرور چلائی تھی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ریوالور اور بندوق میں کتنا فرق ہے۔ تاہم دشمن اپنی بے خبری کے باعث محسن کی دھمکی کو سچ ماننے پر مجبور تھا۔

"ہم اس مکان کو بم سے بھی اُڑا سکتے ہیں۔" دشمن نے قدرے توقف کے بعد کہا لیکن یہ لہجہ کھوکھلا تھا۔

"اپنا بُرا بھلا تم خود سوچ سکتے ہو۔" محسن نے بے نیازی سے کہا۔ "ہم ایک ساتھ دفن ہو کے مر جائیں گے ورنہ ملبے سے نکال کو بچا لئے گئے تو قانون کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ تم نے سوچ لیا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے تم بلف کر رہے ہو مسٹر ہشیار احمد خاں! تم نے اس زیرِ تعمیر کوٹھی پر بھی عارضی اور ناجائز قبضہ کیا ہے جو تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ تمہارے پاس خنجر اور ریوالور کے علاوہ زیادہ سے زیادہ سب مشین گن ہو سکتی ہے۔ تم کچھ نہ کرنے کے باوجود گرفتار ہوئے تو ناجائز اسلحہ رکھنے کے علاوہ ایک عورت اور بہت سینئر وکیل کے اغوا اور اسے حبسِ بے جا میں رکھنے کے سنگین جرائم میں ملوث ہو گے۔ سکندر بخت کا اغوا، حبسِ بے جا، کسی اور کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا، تشدد، قتل کی دھمکی اور ایسے ہی متعدد دیگر جرائم کے مقدمات الگ ہوں گے۔ اس کے برعکس اپنے دفاع میں گولی چلانا۔۔۔"

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا اور تہہ خانے میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے فائر کی آواز پہنچی۔

"محسن۔۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون؟ سکندر!" محسن کی آواز آئی۔ اسے میری آواز نے حیران کر دیا تھا۔ "تو کہاں ہے؟"

"میں ایک تہہ خانے میں ہوں۔ رابعہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہاں، مجھے کیا ہونا ہے۔ میں نے وارننگ فائر کیا تھا۔" محسن بولا۔ "شاید ان حرامزادوں کو غلط فہمی ہو گئی تھی کہ میرے پاس ریوالور نہیں ہے یا میں اس کھلونے کا استعمال نہیں جانتا۔" پھر وہ میری بجائے ان سے مخاطب ہو گیا جن کی کامیابی کا سارا غرور اس غیر متوقع دخل اندازی سے ناکامی میں ڈھل گیا تھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میری عقل ٹھکانے رہی اور میں نے عمداً نشانہ لے کر فائر کرنے سے گریز کیا ورنہ اس وقت تمہاری جگہ فرش پر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ دوسری غلطی کو میں غلطی شمار نہیں کرتا چنانچہ معاف بھی نہیں کرتا۔"

"تم۔۔۔ تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر بیٹھے ہو۔" وہ بولا۔ "جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔"

محسن ہنسا۔ "میں کھلی چھت پر ہوں اور روشندان میں سے تمہیں دیکھ سکتا ہوں تو اپنے اردگرد دو فرلانگ تک اڑتی چڑیا کے پر بھی گن سکتا ہوں۔ اگر تمہارا کوئی آدمی ہیلی کاپٹر لے کر آجائے تو الگ بات ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ رابعہ اور سکندر بخت کو اس کمرے میں میری نظروں کے سامنے لاؤ۔ دیر کرو گے تو نقصان میں رہو گے۔ ابھی گھنٹے، آدھے گھنٹے میں کوئی میرے قریب سے گزرا تو میں چلا کے اسے متوجہ کر لوں گا اور کہوں گا کہ ایس پی ضامن رضوی صاحب کو فون کر دے۔ فون نہ کر سکے تو کسی بھی پولیس مین کو بتا دے کہ ایس پی ضامن رضوی کے بیٹے کو یہاں ڈاکوؤں نے قید کر رکھا ہے ان کو آنے میں اور تمہیں محصور کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

"رابعہ اور سکندر بخت جس تہہ خانے میں قید ہیں وہاں گیس چھوڑی جا سکتی ہے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ زندگی اور موت کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں۔" محسن نے غرا کے کہا۔ "اگر وہ دونوں بخیر و عافیت نہ ملے تو تمہارے بعد میں ایک ایک کو چُن چُن کر ماردوں گا۔ تم نہیں، یہ جو زیرے کی اولاد تمہارے سامنے موجود ہے، دھاری دار بنیان والا، اس سے کہو ان دونوں کو لے آئے۔ تم اسی طرح لیٹے پڑے رہو۔ اٹھنے کی کوشش بھی کی تو دنیا سے اُٹھ جاؤ گے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ محسن کے پہلے فائر کے ساتھ ہی وہ شخص فرش پر گر گیا تھا جس سے محسن مخاطب تھا۔ یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا مگر اب وہ اسی حالت میں لیٹا ہوا خود کو زیادہ بے بس محسوس کر رہا ہوگا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بھی نمٹ لوں گا۔" اس نے جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ "آج تم بچ کر نکل گئے تو کیا۔ اس شہر، اس ملک اور اس پوری دنیا کے کسی بھی گوشے میں تم ہماری دسترس سے دور نہیں رہ سکتے۔ تمہیں یہ بہادری بہت مہنگی پڑے گی۔ پیڈرو! جا ان دونوں کو لے آ۔ میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔" اس نے ماں کی گالی دی۔

صورتِ حال ڈرامائی طور پر بدل گئی تھی۔ بظاہر محسن کا مورچہ بہت مضبوط تھا اور اس نے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اس کے باوجود میرے دل کے کسی گوشے میں خوف کے مہیب سائے اب بھی منڈلا رہے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا کہ عارضی کامیابی کا یہ طلسم جھوٹا ہے اور فریبِ خیال ہے۔ صورتِ حال جو ہمارے حق میں ہے یکلخت ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ محسن کی آواز کچھ ہلکی سنائی دیتی تھی۔ شاید اسی طرح محسن بھی میری آواز دور سے سن رہا ہوگا۔

"سکندر!" محسن نے کہا۔ "اپنے استاد پیڈرو تیرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پاس آ رہے ہیں۔ ہوشیار رہنا اور کسی قسم کی گڑبڑ ہو تو..." اس کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ ایمپلی فائر بند کر دیا گیا تھا اور اب میرا محسن سے مواصلاتی رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ استاد پیڈرو کی نیت میں فتور ہے اور وہ محسن کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ہمیں اس کمرے تک پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اب دوسرے محاذ پر مجھے اپنی عقل اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔ یہ تو محسن نے بھی سمجھ لیا ہو گا کہ براہِ راست گفتگو کے ذریعے سے محروم کرنا کسی شر انگیز کارروائی کا پیش خیمہ ہے اور اپنے طور پر اس نے بھی طے کر لیا ہو گا کہ دھمکی کارگر نہ ہوئی تو اسے کیا مؤثر جوابی اقدامات کرنے ہوں گے۔ یہ گھر ایک ایسا جنگل تھا جس میں خون آشام درندے ایک دوسرے کی گھات میں تھے۔ یہ تقدیر کا کھیل تھا اور فنا و بقا کی جنگ تھی جس کے کوئی اصول نہیں ہوتے۔ وہ فیصلہ کن لمحہ کسی کی گرفت میں نہ تھا اور ہنوز سفر میں تھا جسے فیصلہ دینا تھا کہ شکار کون ہوا اور شکاری کون بنا۔ میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور اوپر کی طرف جانے والے زینے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین تھا کہ پیڈرو کو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی قابو کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ میں تہہ خانے میں بے بس و لاچار اور بیہوش رابعہ کو سنبھالے ہوئے ملوں گا۔ وہ محتاط ہو گا بھی تو زینے سے اترتے ہوئے لیکن زینے پر اس کی نگاہ مجھے بلندی سے دیکھے گی۔ اگر اس کے پاس ٹارچ لائٹ بھی ہوئی تو میں براہِ راست اس کے ریوالور کی زد میں آ جاؤں گا۔ میں نے دیا سلائی جلائے بغیر ایک جست میں دو دو سیڑھیاں طے کر لیں۔ جب میں تہہ خانے میں اترا تھا تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی نہیں تھیں اور مجھے آگے بڑھتے ہوئے ہر قدم پر تاریکی گہری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اب معاملہ برعکس تھا اور مجھے اوپر کے خلا سے اترنے والی روشنی کے پس منظر میں راستہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ ابھی میں دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ پیڈرو اندر آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ مجھ سے براہِ راست تصادم کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے غوطہ مارا اور پیڈرو سمیت دروازے سے جا لگا۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا اور اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی کی آواز کے ساتھ مل کر یہ دھماکہ اس ویران کمرے کی اور تہہ خانے کی دیواروں میں یوں گونجا جیسے دستی بم پھٹ گیا ہو۔ پیڈرو نے خود کو سنبھالا اور میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا چاہا۔ میں نے پیڈرو کو سر کے اوپر سے اچھال کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے ریوالور کی ضرب میری کمر کے نچلے حصے پر پسلیوں کے قریب پڑی اور درد کی شدت سے مجھے یوں لگا جیسے میری ہڈی چور چور ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا سانس رک گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے اڑنے لگے۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے درد کو نظر انداز کیا اور تمام جسمانی قوت کو مجتمع کر کے پیڈرو پر جا پڑا جو پکے فرش پر چت گرا تھا اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑ جاتی تو اس کے دانت باہر آ گرتے لیکن اس نے بروقت سر کو بچا لیا اور ایک ہاتھ سے میرے پنجے کو پکڑ کے کھینچ لیا۔ میں اپنے ہی زور میں اس کے سامنے گرا اور خود بخود میرے ہاتھ نے اس کی کلائی تھام لی۔ ایک جھٹکے میں وہ بل کھا کے الٹا ہوا اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اس کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں میرے ہاتھ میں آ گئیں اور وہ درد سے بلبلایا۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنا چاہا مگر اس کا دوسرا ہاتھ بیچ میں آ گیا اور ضرب اس کی کہنی سے ذرا نیچے پڑی۔ وہ ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا اور اس نے اپنا گرز جیسا مکا میرے پیٹ پر رسید کیا۔ میں پیچھے گرا تو وہ لپک کر اوپر آیا۔ میں نے دونوں پیر ہوا میں اٹھائے اور پیڈرو کے وجود کو اپنے اوپر سے یوں گزار دیا کہ وہ اپنے ہی زور میں تیرتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور ایک کونے میں جا گرا تھا۔ میں نے ایک جست میں اس پر قبضہ کیا اور تیزی سے اس کا رخ پیڈرو کی طرف کر دیا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیڈرو کے ساتھیوں نے ایمپلی فائر آف کر دیا تھا ورنہ مار پیٹ اور فائرنگ کی آوازیں میرے دوست اور دشمن دونوں سن لیتے۔ نہ جانے محسن ان آوازوں کا کیا مطلب نکالتا اور مشتعل ہو کے کیا کر بیٹھتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو کو حکم دینے والا اپنی چال کے ناکام ہو جانے کے بعد کوئی انتہائی قدم اٹھاتا، لیکن اب فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ دشمن یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ پیڈرو اپنے زورِ بازو اور اپنے ریوالور کی مدد سے مجھے بہ آسانی زیر کر لے گا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا جاتا جہاں محسن مجھے دیکھنا چاہتا تھا لیکن رابعہ کو شاید وہ کسی دوسرے کمرے میں لے جاتے جہاں اس پر وحشت اور بربریت کے تمام انسانیت سوز حربے آزمائے جاتے اور اسے ہوش میں لانے کے بعد اس کی دلخراش چیخوں کی

آواز سنوا کر محسن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ ایک عورت کے ساتھ حیوانیت کے مظاہرے میں آدمی شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ میں خود رابعہ پر ہونے والے لرزہ خیز مظالم کی تاب نہ لا کے محسن سے کہہ دیتا کہ وہ چلا جائے۔ وہ دھمکی دیتے کہ ہم رابعہ کے بدن کو جلا جلا کے راکھ کر دیں گے یا اس کے ہاتھوں کی اور پیروں کی انگلیاں کاٹتے جائیں گے اور رابعہ کو ماریں گے نہیں لیکن اسے تمام عمر کے لیے جینے کا عذاب سہنے کے لیے ٹوٹے پھوٹے بدوضع اور نامکمل اعضا پر مشتمل گوشت کا ڈھیر بنا کے پھینک دیں گے تو اس دھمکی کے بعد یہ ناممکن تھا کہ میں مزاحمت کر سکتا۔ میں اپنی جان پر یہ ظلم جھیل جاتا مگر رابعہ کو اپنے دشمنوں کے جذبۂ انتقام کی بھینٹ کبھی نہ چڑھنے دیتا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں دشمن کا یہی منصوبہ تھا جسے میں نے ناکام بنا دیا تھا۔

ریوالور کو جیب میں اڑس کر میں پھر تہہ خانے کا رخ کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے دو منٹ کے اندر اندر پیڈرو کے کپڑے پہنے۔ پہلے اس کو اپنے کپڑے پہنانے کا سوچا، پھر اسے تضیعِ اوقات سمجھ کے چھوڑ دیا۔ تاہم میں نے اپنی قمیص کو پھاڑ کے دو حصے کر دیے۔ ایک سے میں نے پیڈرو کے پاؤں باندھے اور دوسرے سے اس کے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کس دیا۔ پھر میں تہہ خانے میں اترا اور بے ہوش رابعہ کو اپنے بازوؤں پر سنبھال کے اوپر لے آیا۔

اچانک اسپیکر جاگ اٹھا۔ "پیڈرو! کیا بات ہے؟ دیر کس لیے؟" ایک فائر کی آواز آئی اور پیڈرو کو مخاطب کرنے والے نے گالی دی۔ میں نے پیڈرو کی آواز پہلے بھی سنی تھی۔ مائکروفون کے راستے ایمپلی فائر تک پہنچنے والی آواز لاؤڈ اسپیکر سے نشر ہوتی ہے تو کسی حد تک بدل جاتی ہے۔ اس کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ "استاد..." میں آواز کو اور لہجے کو پیڈرو کی آواز میں بنا کے کربناک طریقے پر چلایا۔ پھر حلق سے یوں آواز نکالی جیسے زبردست وار سے وہ بات پوری نہیں کر سکا اور کراہنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"تیری اور تیرے استاد کی ایسی تیسی۔" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔ "آج ہی سب معلوم ہو جائے گا۔" پھر میں نے پیڈرو کی آواز بنا کے ہائے کی۔ دروازہ کھول کے دھڑام سے بند کیا۔ "بھاگ گیا سور کا بچہ۔" میں نے اپنی آواز میں کہا اور پکارا۔ "محسن! پیڈرو مجھے بند کر کے نکل گیا ہے۔" جواب میں خاموشی رہی۔ لاؤڈ اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ بتاتی تھی کہ ایمپلی فائر اب بھی آن ہے۔ "محسن!" میں نے چلا کے کہا۔ خاموشی کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا کہ کیا محسن ان مکار مجرموں کی کسی سازش کا شکار ہو گیا ہے۔ میں نے دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ کوٹھی کے نیم تاریک در و دیوار کا سناٹا کسی ویران مقبرے کی طرح لگتا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں فائر کے لیے بالکل تیار تھا۔ پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش پر مٹی میں لکڑی کے گول سفید چھلکے سے پڑے تھے اور خالی دیواریں جو انتظار میں تھیں کہ گھر کے مکین آئیں، دیواروں کو خوبصورت رنگوں، روغنی تصاویر اور ——— پھولوں سے سجائیں — گھر کو اجالا اور زندگی کا احساس دیں۔ وہ اب اجنبی دشمنوں کو ایک خونی کھیل کھیلتے دیکھ کر دکھ اور حیرت سے دم بخود کھڑی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کیا اور مقابل کے دوسرے دروازے کو کھول کے اندر جھانکا۔ اس میں دیواروں کے ساتھ ساتھ سیمنٹ کی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ میں تیسرے دروازے کی طرف لپکا اور پھر چوتھے کی طرف جو تقریباً وسط میں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں یوں رک گیا جیسے دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ کمرے کے درمیان میں ایک خون آلودہ لاش پڑی تھی۔ سامنے کی دیوار کی کھڑکی کے قریب فرش پر ایک چھوٹا سا ایمپلی فائر ریسیور سیٹ رکھا تھا اور اس کی تاریں کھڑکی سے باہر جا رہی تھیں۔ یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ تاروں کا سلسلہ اس کمرے کے مائکروفون اور اسپیکر سے جا ملتا ہو گا جہاں سے میں نے پہلے دشمنوں سے اور پھر محسن سے گفتگو کی تھی۔ میں نے جھک کر لاش کی صورت کو غور سے دیکھا۔ میرے لیے اس کی صورت اجنبی تھی۔ یہ شاید انہی دونوں میں سے ایک تھا جو برقعے پہن کر مجھے اغوا کر لائے تھے۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر اس کے پاس سے کسی قسم کا اسلحہ یا کاغذ کا ایک پرزہ تک برآمد نہ ہوا۔

خطرے کی گھنٹی مجھے صاف سنائی دینے لگی تھی۔ وہ رابعہ کو چھوڑ گئے اور محسن کو لے گئے۔ ایک خطرے کے مقابلے میں میرے لیے ان دونوں کی زندگی کا کوئی مول نہ تھا۔ دشمن جانتے تھے کہ مجھے رابعہ کی طرح محسن کی دوستی بھی کتنی عزیز ہے۔ "تم کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ تم خود بھی میرے ایک آدمی کے نشانے پر بیٹھے ہو جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔" ان الفاظ کی بازگشت ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھی۔ محسن نے اسے کھوکھلی دھمکی سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ خلوص، وفا اور دوستی کے نام پر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جان کی بازی لگا دینے والا محسن بے خطر آتشِ نمرود میں کود گیا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں ہے۔ شاید اس کی جگہ میں بھی یہی کرتا اور میرا انجام بھی یہی ہوتا۔ اس کی نظر چھپ کر حملہ کرنے والے کو نہ دیکھ سکی ہوگی۔ یہ میرے صبر، حوصلے اور استقامت کا ایک اور سخت ترین امتحان تھا۔ محسن دنیا میں میرا سب کچھ تھا۔ بھائی، دوست، ناصح، غمگسار، راز داں، اور راہ نما۔ وہ فوزیہ کا بھائی تھا اور شیردانی صاحب کا بیٹا تھا، جن کو میں بچپن سے انکل کہتا آیا تھا اور جو میرے محسن بھی تھے۔ میں اتنا کمینہ اور خود غرض نہیں تھا کہ جان سلامت لے کر رابعہ کے ساتھ نکل جاتا تو خدا کا شکر بجا لاتا اور فکر کے سوا محسن کے لیے کچھ نہ کرتا۔ میں اس کے بدلے بہ خوشی اپنے آپ کو پیش کر سکتا تھا اور اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں۔ اب ایک طرف مجھے رابعہ کی فکر لاحق تھی جو اسٹور روم کے ٹھنڈے، سخت اور مٹی سے اَٹے ہوئے فرش پر لیٹی تھی اور میری نظر میں اس کے لہو آلودہ پیرہن کا ہر تار تھا جو زخموں سے لالہ زار بدن پر ڈھائے جانے والے مظالم کی پوری تصویر پیش کرتا تھا۔ کمرے سے باہر آ کے میں نے چند سیکنڈ تذبذب اور کشمکش میں گزارے۔ پھر میں نے اوپر جا کے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ گفتگو سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ محسن چھت پر ہے اور کسی روشن دان سے دشمن کو نشانے پر رکھے اردگرد دو فرلانگ تک دیکھنے کی پوزیشن میں ہے۔ رابعہ نہ جانے کب سے بے ہوش تھی اور اس کے سانس کی اور نبض کی رفتار دیکھ کے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی حالت تشویشناک نہیں۔ اسے چند منٹ اور اسی حالت میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ راہداری سے باہر آ کے میں نے اوپر جانے کا راستہ تلاش کیا۔ آر سی سی کے زینے کا اسٹرکچر مکمل تھا اور باقی کے مختصر سے عارضی تالاب کے بعد عمارت کے آخری گوشے میں نظر آ رہا تھا۔ وہیں سیمنٹ کی کم سے کم دو سو بوریاں ایک دیوار کی طرح چنی ہوئی تھیں۔ میں اینٹوں اور سریوں کو پھلانگتا آگے بڑھا۔ ابھی میں نے زینے کا پہلا موڑ ہی کاٹا تھا کہ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر نیچے دیکھا لیکن کراہنے والا مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے باقی ماندہ زینہ طے کیا اور اس چھت پر پہنچا جو پلستر سے محروم سیمنٹ کی ناہموار کھردری سطح تھی اور جس میں جگہ جگہ عمارت کو سنبھالنے والے ستونوں کے سریے کسی صحرا میں اُگے ہوئے کیکٹس لگتے تھے۔ چھت کے چاروں طرف چھجے کا دو فٹ چوڑا حاشیہ تھا لیکن روشن دان کوئی نہیں تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ ایک روشن دان تو خود میں نے دیکھا تھا جس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ تھا۔ دوسرا کون سا تھا جس میں سے محسن ریوالور نکالے دشمن کو زد پر اسے اپنے احکامات کی تعمیل پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے لیٹ کے نیچے جھانکا اور اپنی عقل پر ماتم کیا۔ چھجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ روشن دان بارش کی بوچھاڑ سے رہیں۔ چھجے کے نیچے ہر کمرے کا کھلا روشندان ایک خلا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے وہ تار بھی نظر جو ایک کھڑکی سے نکل کے اسٹور روم کے روشندان تک پہنچ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ کھڑکی اسی کمرے کی تھی جہاں ایک شخص کی لاش پڑی تھی۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے اسی کمرے کے روشندان سے جھانک کے دیکھنا چاہا نیچے جھکتے ہی مجھے اس جگہ محسن کی موجودگی کے ثبوت مل گئے ناہموار سطح پر تقریباً اتنی ہی جگہ صاف نظر آ رہی تھی جتنی ایک آدمی کا جسم گھیرتا ہے۔ محسن اسی جگہ لیٹا تھا اور کے بعد سر جھکا کے کمرے کے روشندان میں سے کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عملی تجربے سے میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ روشن دان میں سے مجھے وہ لاش نظر آ گئی جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ محسن کھلی چھت پر تھا۔ غالباً وہ روشن دان پر جھکا ریوالور سے دشمن کو زد میں لیے لیٹا رہا تھا۔ اس کی نظر میں بھی تھا۔ چنانچہ اسے یقین تھا کہ کوئی اس تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا اور یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ اردگرد دو فرلانگ تک کا منظر دیکھ سکتا تھا لیکن محسن نے ایک امکان کو نظرانداز کر دیا تھا کہ زینے کے علاوہ بھی چھت پر چڑھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ شاید کوئی پچھلی طرف سے رسی کا پھندا ستون کے اوپر نکلے ہوئے سریوں میں ڈال کر چھت پر جا پہنچا تھا اور لیٹے ہوئے محسن کو خبر بھی نہ ہو سکی تھی۔ نے تقریباً ڈھونڈتے ہوئے چھت کے دوسرے کناروں کو دیکھا اور ایک جگہ مجھے وہ رسی نظر آ گئی جس کا پھندا ابھی مضبوطی سے کونے والے ستون کے دو سریوں میں پھنس گیا تھا۔ رسی ابھی تک لٹک رہی تھی لیکن محسن غائب تھا۔ قیاس کی بنیاد پر میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ محسن کو حملہ آور کے آنے کی خبر بہت دیر سے ہوئی اور اسے اٹھنے یا پلٹ کر گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔

مزید وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں زینے سے اترنے لگا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز پھر سنائی دی اور اس مرتبہ میں آواز کی سمت کا تعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آواز سیمنٹ کی بوریوں سے بنی ہوئی پشتے جیسی دیوار

کے پیچھے سے آئی تھی۔ آخری سیڑھی سے کود کر میں سیدھا گزر گیا اور سیمنٹ کی بوریوں پر چڑھنے لگا۔ بوریوں کو اس طرح چنا گیا تھا کہ آخری گوشے کی دو دیواریں مل گئی تھیں اور پیچھے ایک تکونی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ جیومیٹری کی زبان میں دو دیواریں ایک زاویہ قائمہ بنانے والی مثلث کے دو ضلعے تھیں تو سیمنٹ کی بوریوں نے تیسرے ضلعے یعنی وتر کو مکمل کیا تھا۔ اوپر سے دیکھنے پر مجھے محسن نظر آیا جو ریت کے ڈھیر پر پڑا تھا۔ اس تکونی خالی جگہ کو چھنی ہوئی ریت جمع رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور محسن کو اوپر سے اچھال دیا گیا تھا لیکن ریت پر گرنے سے جو تقریباً چار فٹ کی اونچائی تک پھیلی ہوئی تھی، اسے چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نیچے کودنے ہی والا تھا کہ نامکمل عمارت کے اندر ہی سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر عمارت کے عقبی حصے سے ایک نیلے رنگ کی ٹویوٹا کراؤن کار گولی کی طرح نکلی اور کھلے گیٹ سے سیدھی گزر گئی۔ میں نے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر سے چھلانگ لگانے سے پہلے ریوالور نکال کے فائر کیا مگر گولی گیٹ سے ٹکرائی اور میرے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے کار کچے راستے پر دوڑتی ہوئی اتنی دور جا چکی تھی کہ میں اس کے عقبی حصے کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نمبر پلیٹ موجود ہی نہ تھی اور ہوتی بھی تو میں اتنے فاصلے سے نمبر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کار کے شیشوں پر پردے نہیں تھے مگر بند شیشوں کے اندر اجالا کم تھا چنانچہ میں کسی کی صورت کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ کار میں چار افراد تھے اور اب میں بے وقوفوں کی طرح ریوالور ہاتھ میں لیے سڑک پر پہنچ جانے والی کار کو نگاہوں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔ چالاک مجرم مجھے دھوکا دے کر نکل گئے تھے اور میں خود کو قصوروار سمجھ رہا تھا جس نے ان کو یہ مہلت فراہم کی۔ میں محسن کو دیکھنے کے لیے اوپر نہ جاتا تو انہیں خاموشی سے ساری کارروائی مکمل کر کے فرار ہونے کا موقع کہاں ملتا، لیکن یہ بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ رابعہ کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں محسن کی خیر خبر نہ لیتا۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا اور اس کا ردِعمل اتنا شدید تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ "رابعہ!" میں چلایا اور اس دروازے میں سے طوفان کی طرح گزر گیا جو راہداری میں کھلتا تھا۔ آخری کمرے تک کا فاصلہ مجھے ایک جنت کا فاصلہ لگا۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا اور خود کو یقین دلانے کی ناکام کوشش کی کہ میں گھبراہٹ اور پریشانی میں وہ دیکھ رہا ہوں جو حقیقت نہیں ہے اور یہ میرا خوف ہے جو غیر یقینی اور بے بنیاد خیالات کا عکس بن کے سامنے آ گیا ہے مگر اٹل اور بے رحم سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ رابعہ اور پیڈرو کو نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جیسے کسی نے آتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا ایسے ہی کسی نے ان کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کسی نے دور سے ایک نیلے رنگ کی کار دیکھی بھی ہوگی تو وہ کیا بتائے گا کس کو شناخت کرے گا اور کیسے شناخت کرے گا؟

وہ اپنی موجودگی کے تمام آثار بھی مٹا گئے ہوں گے۔ بازار میں ملنے والے ایک عام قسم کے ایمپلی فائر اور اسپیکر سے کسی کے جرم کی گواہی تو نہیں ملتی۔ فنگر پرنٹس اول تو ملیں گے نہیں، اور ملے تو ان کا موازنہ کس کے فنگر پرنٹس سے کیا جائے گا؟ پولیس کے ریکارڈ پر دلاور، پیڈرو یا ڈی سلوا کے فنگر پرنٹ تو ہونے سے رہے۔ لاش پھر کسی لاوارث غیر معروف سے بدمعاش کی ثابت ہوگی جس کی خدمات معاوضے پر حاصل کی گئی ہوں گی۔ رپورٹ کے بغیر پولیس اس مکان میں آئے گی نہیں اور زیرِ تعمیر مکان پر چھاپہ مار کے انہیں کیا ملے گا۔ اصل مالک کے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوگی کہ اس کے گھر میں کیا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا ہے۔ کسی ثبوت کے بغیر نہ دلاور کے خلاف رپورٹ لکھوائی جا سکتی ہے نہ ڈی سلوا کے خلاف۔ وہ با اثر اور پیسے والے لوگ ہیں۔

محسن کی کوشش کے باوجود بازی مات ہو گئی تھی۔ میں شکست خوردہ اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا واپس ہوا۔ میرا ذہن یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ محسن نے مداخلت کر کے اچھا کیا یا برا۔ اس کی نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے آ جانے سے وہ بات ختم ہو گئی تھی جو نتیجہ خیز ثابت ہو رہی تھی۔ رابعہ کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا کہ تصادم کی راہ چھوڑ کے ان کے جائز و ناجائز ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس خط کے بعد وہ جان بھی مانگیں تو نذر کر دوں۔ شاید وہ مجھ سے معاہدہ کر لیتے کہ میں ہسپتال جا کے رابعہ کی ماں سے اس خط کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور اپنے وعدے کے مطابق کسی کو اطلاع دیے بغیر واپس آ کے خط ان کے حوالے کر دوں تو وہ بھی ایفائے عہد کرتے ہوئے مجھے رابعہ کے ساتھ نکل جانے دیں گے۔ میرا اُن سے مقابلہ کرنے کا یا پولیس سے مدد حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا چنانچہ مجھے قوی امید تھی کہ خط مل جانے کے بعد وہ رابعہ کو یرغمال نہیں رکھیں گے کیونکہ اس سے انہیں مزید کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

الٹا اس بات کا خطرہ تھا کہ ایک سینئر خاتون ایڈووکیٹ کی پُراسرار گمشدگی کا مسئلہ کوئی سنگین صورت حال پیدا نہ کر دے لیکن اب بات پھر وہیں آ پہنچی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ پھر رابعہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور جاتے جاتے ایک لاش چھوڑ گئے تھے۔ محسن کے دامن پر ایک قتل کا داغ آ گیا تھا اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانے میں ہی خیریت تھی۔ اس کے بعد ہمیں پھر انتظار کرنا تھا۔ انتظار کہ وہ ہمیں ایک موقع اور فراہم کریں۔ ہم سے پھر رابطہ قائم کریں اور ملاقات کے لیے سخت تر شرائط پیش کریں۔ اور زیادہ محفوظ مقام کا انتخاب کریں۔

میں گیٹ بند کر کے واپس آیا۔ محسن اسی طرح پڑا تھا، لیکن اس کے کراہنے اور ہلنے جلنے سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کچھ ہوش میں آنے لگا ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کے سیمنٹ کی بوریوں کے اوپر رکھنے کی کوشش کی مگر دیوار بہت اونچی تھی۔ میں نے محسن کو پھر ریت پر لٹا دیا اور دوبارہ سیمنٹ کی بوریوں کی دیوار پر چڑھا۔ ایک قطار کی سب سے اوپر والی بوری کو دھکیل کر گرانے سے اس کی بلندی تقریباً ایک فٹ کم ہو گئی۔ چار بوریاں گرانے سے اس دیوار میں ایک کھڑکی سی بن گئی جو ریت کی سطح سے تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ دوسری کوشش آسان ثابت ہوئی اور میں محسن کو کندھے پر ڈال کے پانی کے ٹینک کے کنارے لے آیا جس کے اوپر پانی کا نلکا موجود تھا۔ کھولنے پر نلکے سے صاف پانی بہہ کر ٹینک میں گرنے لگا۔ میں نے محسن کے منہ پر پانی ڈالا اور اسے اپنے چلو سے پانی پلانے کی کوشش بھی کی۔ اس کی بے ہوشی کا سبب سر کی چوٹ تھی، اور پچھلی جانب ہاتھ لگانے سے بالوں کے درمیان اُبھار سا محسوس ہوتا تھا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ سر کی چوٹ سے خون نہیں نکلا تھا۔ عدم اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ اندرونی چوٹ سے دماغ کے متاثر ہونے کی صورت میں سنگین نتائج چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ محسن نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ دیر مجھے اجنبی نظروں سے تکتا رہا، جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"محسن؟" میں نے کہا۔ "میں سکندر ہوں۔ پہچانا مجھے؟" میں نے اس کے گالوں کو تھپکا۔

محسن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر... سوری یار..." اس نے کراہ کر اپنا سر تھام لیا۔

"ایسی باتیں مت کر۔ وہ لوگ جا چکے ہیں اور اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔" میں نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"وہ... رابعہ... رابعہ کہاں ہے...؟" اس نے لمبے لمبے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا اور بظاہر درد کے سوا چوٹ کے اثرات زائل ہونے لگے تھے۔

"وہ بدمعاش پھر اسے لے گئے محسن!" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک کی لاش اندر پڑی ہے۔ تو نے مارا ہے اسے؟"

محسن نے پھر سر ہلایا۔ "میں اور کیا کرتا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی... اتفاق ہے کہ اسے گولی لگ گئی۔"

"میں نے پیڈرو کو قابو کر لیا تھا۔" میں نے ریوالور کی نال ... کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ذرا سی چوک ہو گئی۔ میں تجھے تلاش کرنے نکلا تھا، وہ عقبی حصے میں ڈی سلوا کی گاڑی لیے موجود تھے۔ وہ دوسری طرف سے پیڈرو اور رابعہ دونوں کو اٹھا کے لے گئے۔ انہوں نے رابعہ پر بہت تشدد کیا ہے محسن! اس کا سارا جسم لہولہان تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔"

"تو نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی؟" خاموشی کا مختصر سے سوگوار وقفے کے بعد محسن نے سر اٹھایا۔

"کی تھی۔ نشانہ خطا ہو گیا۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کر سکا۔"

"میں بھی کچھ نہیں کر سکا یار!" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہ جانے کس نے اچانک پیچھے سے آکے مجھ پر وار کر دیا۔"

"وہ پچھلی طرف سے رسی کے سہارے اوپر آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "رسی ابھی تک موجود ہے۔"

اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا۔

"سائیں... او سائیں! کی گل اے بھئی... اج بوا بندل؟"

"یہ سائیں کون ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ یہ سوال نہیں تھا، خیال تھا جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔

"سائیں شاید کوئی بدنصیب چوکیدار ہو گا۔" محسن نے ... اظہار خیال کیا۔

"اچھا تو ٹھہر۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور ... رک گیا۔ میں نے پیڈرو کے کپڑے پہن رکھے تھے اس غیر ... لباس میں اعتبار قائم کرنا مشکل کام تھا۔ میں نے محسن کی طرف ... اور وہ سمجھ گیا کہ میں کس تذبذب کا شکار ہوں۔ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور گیٹ تک لے گیا۔ اس عرصے میں گیٹ ... والا مسلسل سائیں کو پکارتا رہا اور دروازہ بند ملنے پر تعجب کا اظہار کرتا رہا۔ محسن نے گیٹ کھول کے باہر جھانکا۔

"کیا بات ہے بھئی! کس سے ملنے آئے ہو؟" محسن نے متانت اور وقار سے کہا۔ "کیا ہنگامہ ہے یہ؟"

"وہ... وہ جی میں سائیں چوکیدار..." ملاقاتی نے بوکھلا کر مؤدب اور معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ شہر گیا تھا جناب!"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا جی معاف کرنا۔ میں نے سوچا تھا بڑے شاہ صاحب کی خیریت معلوم کروں۔ اللہ شفا دے۔ بڑی لمبی بیماری لگ گئی ہے ان کی جان کو۔" وہ بولا۔ "آپ کا کیا رشتہ ہے جی بڑے شاہ صاحب سے؟"

"میں ان کے بھائی کا لڑکا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ولایت میں تھا۔ میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"معاف کرنا جی! تسلی ضروری ہوتی ہے۔ چھوٹے شاہ صاحب کو دیکھتے ہی رہتے ہیں یہاں۔ آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔ "اچھا جی سلاما لیکم۔"

ہم اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ "گویا بڑے شاہ صاحب اس زیرِ تعمیر کوٹھی کے مالک ہیں۔" میں نے گیٹ بند کر کے کہا۔

"اور تعمیر کے رک جانے کا سبب ہے ان کی طویل علالت۔ ان کا کوئی بیٹا وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے۔"

"اور سائیں چوکیدار ہے۔ سائیں اگر اس کا نام پڑ گیا ہے تو وہ یقیناً عمر رسیدہ آدمی ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "آدمی نمک حلال ہو گا کہ یہاں سے شہر جا کے مالک کی خیریت معلوم کرتا ہے۔"

"اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بیوی بچے ہوتے تو وہ اس خالی کوٹھی میں اپنے ساتھ رکھ سکتا تھا جس کی فنش باقی ہے تاہم اس میں رہائش اختیار کی جا سکتی ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو سا... صاحبزادے!"

نہ جانے کیوں پہلی مرتبہ اس کو سالارِ اعظم کہتے ہوئے میری زبان رک گئی۔ میں نے لاشعور پر غالب آ جانے والے اس خیال کو ...سا کہ محسن اب صرف میرا دوست رہ گیا ہے۔ یہ بہت بڑا، بہت مقدس اور بہت مضبوط رشتہ تھا مگر اس احساس کو میں کیسے جھٹلاتا کہ اب فوزیہ میری منگیتر نہیں رہی تھی وہ اب کبھی میری شریکِ حیات نہیں ہو گی اور محسن اور میں سالے بہنوئی کے رشتے سے ایک نہیں ہوں گے۔ میں نے زبان کے لڑکھڑا جانے کے باوجود بات بنانی چاہی تھی لیکن یہ احساس مجھے فوراً ہو گیا کہ بات بنی نہیں۔ محسن نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور ہم گیٹ سے باہر آ کے ویران کھیتوں کے پگڈنڈی جیسے راستوں پر چلنے لگے۔

رکشا ہمیں سڑک پر پہنچتے ہی مل گیا اور چالیس منٹ بعد ہم رابعہ کی کوٹھی میں تھے۔ ہمارے آنے سے پہلے بھی اس گھر میں رہنے والوں کی زندگی نفسیاتی مسائل کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی مگر یہ مسائل ہی تو زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے آنے کے بعد زندگی گھر والوں سے روٹھ گئی۔ آباد گھر ویران ہو گیا اور اب اس پر موت کے آسیب زدہ سایوں کا راج تھا۔ وہ عورت جس نے یہ گھر بنایا تھا زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہسپتال کے بستر پر لیٹی تھی اور ان تمام واقعات سے بے خبر تھی جو اس کی بے ہوشی کے دوران میں پیش آئے۔ اگر وہ ہوش کی کیفیت میں اپنی بیٹی کے اغوا کی خبر سن لیتی یا اپنی آنکھوں سے اس کی وہ حالت دیکھ لیتی جو میں نے دیکھی تھی تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا اور کسی مسیحا کی چارہ گری سے پہلے ہی وہ دکھ کی آخری سرحد سے گزر جاتی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اگر خدا کو منظور ہوا تو اسکے گھر لوٹنے سے پہلے ہی بیٹی بھی گھر واپس آ جائے گی۔ بصورتِ دیگر ہم تمام عمر اس دہرے قتل کا بار اپنے ضمیر پر لیے پھرتے رہیں گے اور اس احساس سے دامن نہ چھڑا سکیں گے کہ جو بھی ہوا ہماری وجہ سے ہوا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں سہی مگر نہ جانے یہ ہمارے کون سے اعمال کی سزا تھی کہ ہم تباہی و بربادی کے نامہ بر ہوئے۔ میں نے محسن کو ٹیلی فون کے قریب بٹھا دیا۔ دشمنوں کی طرف سے دوسرا پیغام کسی بھی وقت موصول ہو سکتا تھا۔ میں نے واپسی پر اس شبہے کا اظہار کیا تھا کہ ان کے کسی آدمی نے ہمارا تعاقب ضرور کیا ہو گا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم کدھر جاتے ہیں اور محسن نے اتفاق کیا تھا مگر دارو غہ والا سے شالیمار تک ہمارے پیچھے اتنی ٹریفک تھی کہ کسی رکشا، ٹیکسی یا کار پر شبہ کرنا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چل کے علامہ اقبال روڈ سے ملنے والی سڑک پر ٹریفک بہت کم رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود ایک ٹیکسی نے ہمیں اوور ٹیک کیا اور ایک رکشا تقریباً فرلانگ بھر کے فاصلے سے پیچھے چلتا رہا۔ دوسرا اس سے بھی سو گز پیچھے آیا اور جب ہم ریلوے کراسنگ کی طرف مڑ گئے تو پھر ریلوے اسٹیشن اور صدر کی طرف سے آنے اور جانے والی ٹریفک کے رش میں سب گڈمڈ ہو گیا۔

"اگر انہوں نے ہمیں رابعہ کے گھر میں آتے دیکھ لیا ہو گا تو یہ خبر بہت جلد اوپر پہنچا دی جائے گی۔" میں نے ہسپتال کا ٹیلیفون نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ "اور وہ ہم سے فون پر بات کریں گے۔ انہیں علم ہو گا کہ گھر میں ہمارے سوا کوئی نہیں اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہم پولیس اسٹیشن بھی نہیں گئے۔ وہ ہم سے ایک بار پھر سودا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور اب ہم سودا کرنے پر پہلے سے زیادہ مجبور ہوں گے۔" محسن نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔" میں نے کہا۔ "دیکھیے میں کارڈیالوجی میں ڈاکٹر آن ڈیوٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آپریٹر کے جواب دیتے ہی کہا۔ "مجھے نہیں معلوم اس وقت جو ڈاکٹر موجود ہے اس کا نام کیا ہے۔"

"اس وقت تو بہت سے ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہیں سر!" جھکی آپریٹر نے بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے انٹینسو کیئر یونٹ کا نمبر دے دو۔" میں نے جھلا کر کہا۔ "میں خود بات کروں گا۔"

خصوصی نگہداشت کے شعبے میں ریسیور فوراً اٹھا لیا گیا۔

"دیکھیے مجھے ایک خاتون کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ وہ مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ——— کی والدہ ہیں۔ انہیں دل کے شدید دورے کے بعد داخل کر لیا گیا تھا۔ میں ان کے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"آئی سی! میں ڈاکٹر درانی بول رہا ہوں۔ کیا نام بتایا آپ نے اپنا؟"

"سوری۔ میں نے ابھی تک نام نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بخت ہوں۔"

"تو مسٹر سکندر بخت!" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "مجھے آپ لہجے سے معقولیت پسند اور تعلیم یافتہ آدمی لگتے ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ صاف بات سننا پسند . . . میرا مطلب ہے صاف بات سننے کو ترجیح دیں گے۔ فیکٹ از فیکٹ۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ "آپ کا مطلب یہ تو نہیں . . . کہ خدانخواستہ . . ."

"نہیں، وہ ابھی زندہ ہیں اور ہوش میں بھی ہیں۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "لیکن آئی ایم سوری۔ ان کی حالت انتہائی نازک ہے۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً یہ کہنا درست ہوگا کہ اب انہیں دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے۔"

"ڈاکٹر درانی!" میں نے چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا میں . . . ہم ان سے بات کر سکتے ہیں؟"

"میں اجازت تو نہیں دے سکتا۔ اگر آپ خطرہ مول لینا چاہتے ہیں تو . . . ویل . . . اٹ از اے میٹر آف چانس۔" وہ بولا۔

"میں سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب! لیکن انتہائی مجبوری کے باعث میں یہ درخواست کر رہا ہوں۔ دراصل یہ ایک قانونی [illegible] کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے مختصراً کہا۔ "آپ آجائیے۔" [illegible] ریسیور رکھ دیا۔

"تقدیر کی کیا ستم ظریفی ہے محسن!" میں نے ریسیور [illegible] کے کہا۔ "ماں مر رہی ہے اور بیٹی اس کو مرنے سے پہلے دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

"قصور میرا ہے سکندر! اگر میں مداخلت نہ کرتا تو شاید اس وقت تک وہ رابعہ کو رہا کر چکے ہوتے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ تقدیر کے نوشتے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اگر رابعہ کی ماں بتا دیتی کہ خط کہاں ہے اور بفرض محال میں وہ خط ان کو پہنچا دیتا تب بھی اس بات کی ضمانت کوئی نہیں تھی کہ وہ مجھے اور رابعہ کو چھوڑ دیتے۔ اگر وہ قتل نہ کرتے تب بھی بے ہوش کر کے ضرور ڈال جاتے تاکہ ہم ان کا تعاقب نہ کر سکیں اور پھر کون جانے ہم کتنی دیر وہیں کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ اگر ہمارے ہوش میں آنے سے پہلے سائیں جوکیدار آجاتا تو پولیس کا لمبا چکر پڑ جاتا جس سے پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تیرے آنے سے یہ تو ہوا کہ ہم بخیر و عافیت نکل آئے اور ان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم آسانی سے شکار ہونے والے نہیں۔"

"یہ اندازہ تو ان کو پہلے بھی تھا۔" محسن بولا۔ "لیکن اب رابعہ کی زندگی کو لاحق خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔"

"رابعہ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اس پر ظلم و تشدد کر سکتے تھے سو کر چکے اور انہیں معلوم یہ ہوا کہ رابعہ کو کچھ معلوم نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہے تو رابعہ کی ماں کو۔ اب وہ رابعہ کو اس خط کے حصول کا ذریعہ ضرور بنائیں گے لیکن اسے قتل نہیں کریں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک سینئر ایڈووکیٹ کا قتل ایسا معاملہ نہیں ہوگا جسے دبایا جا سکے۔ فی الحال وہ مجھے بھی قتل نہیں کریں گے۔ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو بلا وجہ ٹیڑھی انگلیوں سے کیوں نکالا جائے۔ اگر میں اپنی مرضی سے یا دباؤ میں آکر اپنے قانونی حق وراثت سے دستبردار ہو کر [illegible] قبول کر لیتا ہوں یا ان کا پارٹنر بن کے لندن میں رہنے [illegible] منظور کر لیتا ہوں تو ان کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ بصورت دیگر ان کو ایک جھوٹا وارث پیدا کرنا پڑے گا اور اسے سچا ثابت کرنا ہوگا۔ یہ معاملہ اتنی آسانی سے [illegible] نہیں ہوگا چنانچہ وہ مجھے مہلت دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اور ان کے فائدے کو دیکھتے ہوئے اس غیر قانونی کاروبار میں ان کا معاون و مددگار بن جاؤں۔ وہ نفسیاتی طور پر دباؤ بڑھاتے جا رہے ہیں اور مجھ پر اپنی طاقت ——— کی دہشت بٹھا کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ میں اتنی آسانی سے خوفزدہ ہونے والا نہیں ۔۔ مجھے وہ قتل تو کر سکتے ہیں لیکن اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ پہلا مسئلہ رابعہ کی رہائی کا ہے۔ میں اب ہسپتال جاتا ہوں اور بڑی بی سے پوچھتا ہوں کہ خط کو انہوں نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ خدا ان کو زندگی کی اتنی مہلت دے اور اتنی قوت گویائی ضرور عطا کرے کہ وہ چند الفاظ بول کے اپنی بیٹی کو اس مصیبت سے نجات دلا سکیں جس کے ذمے دار ہم ہیں۔ تو یہاں لیٹا رہ۔ وہ آج ہی پھر بات کریں گے۔ ان کو بتا دینا کہ میں کہاں اور کس کام سے گیا ہوں۔ جانے سے پہلے میں دیکھتا ہوں کچن میں چائے کافی اور کھانے پینے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔"

کچن میں سب کچھ تھا۔ میں نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگایا اور سلائیڈنگ ڈور والی کیبنٹ میں سے دو مگ نکالے۔ کافی کی شیشی تو مجھے فوراً نظر آگئی۔ چینی کے لیے مجھے کئی ڈبے کھول کر دیکھنے پڑے۔ فرج میں انڈے تھے جو ابالے جا سکتے تھے یا فرائی کیے جا سکتے تھے مگر میں نے آدھی بچی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کو ترجیح دی۔ مجھے الماری میں سے کریم ویفرز کا ایک پیکٹ بھی مل گیا۔ یہ سب سامان میں نے ایک ٹرے میں سجایا اور محسن کے پاس آگیا جو رابعہ کے بیڈ پر لیٹا تھا۔

"محسن!" میں نے کافی بناتے ہوئے اور میکسویل ہاؤس کی تازگی بخش مہک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "تو وہاں کیسے آ پہنچا تھا؟ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"جب تو شالیمار سے آگے نکل گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "تو ایک برقع پوش عورت نے تجھے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ یاد ہے، خمیدہ کمر بڑھیا تھی۔ ایک ٹوکری رکھے کھڑی تھی۔"

"ہاں۔" میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ تو تھا؟"

محسن ہنسا۔ "ہاں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ تجھے باغبانپورے کی طرف نہیں لے جا سکتے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی سے آگے کا تمام علاقہ آباد ہے لیکن دوسری طرف شالیمار باغ سے آگے، پاکستان منٹ اور دارو غہ والا کی جانب آبادی کم ہونے لگتی ہے۔ میں تیرا تعاقب کر سکتا تھا لیکن تعاقب آسان نہ تھا۔ وہ فوراً مجھے پہچان جاتے اور اپنا پروگرام بدل دیتے۔ رابعہ کی فاکس ویگن میں پیچھا کرنا بھی ناممکن تھا۔ بھیس بدلنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ تجھ سے میں نے اس لیے ذکر نہیں کیا کہ تو میرے ارادے کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کرتا۔ رابعہ کے گھر کے بکھرے ہوئے کپڑوں کا اور سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک برقع بھی باہر پڑا دیکھا۔ سفید خیمہ ٹائپ برقع جو پرانے وقتوں کی بڑی بی پہلے استعمال کرتی ہوں گی۔ تجھے رابعہ کی خادمہ کے ساتھ بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دشمن جو تجھ پر نگاہ رکھے کھڑے ہوں تیرے پیچھے پیچھے صدر تک جائیں۔ ان کے لیے تشویش کی بات تو ہوگی کہ تو ایک برقع پوش کے ہمراہ کہاں روانہ ہو گیا ہے مگر تو نے ماسی کو اس کے گھر کے دروازے پر اتار کے واپسی اختیار کی ہوگی تو ان کی تشویش دور ہو گئی ہوگی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے رابعہ کی ماں کا برقع سر پر ڈالا اور گھر سے نکل آیا۔ اپنی مردانہ چال اور جوتوں کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ میں بوڑھی عورتوں کی طرح کمر جھکا کے چلوں۔ باہر آتے ہی مجھے رکشا مل گیا اور میں نے اس سے باغبانپورے کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ شالیمار باغ سے ذرا آگے جا کے رکشا روک لوں گا اور اسے دس بیس روپے کا لالچ دے کر انتظار کرنے کو کہوں گا اور جب تیری ٹیکسی گزرے گی تو رکشا والے سے کہوں گا کہ چل بھائی۔ رکشا والا مجھے کوئی خبطی بڑھیا سمجھتا۔ میری بلا سے۔ فکر کی بات یہ تھی کہ کہیں وہ میرے بناتے ہوئے زنانہ لہجے سے شک میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن بوڑھی عورتوں کی آواز میں وہ نرمی، لوچ اور شعلہ سا لپک جاتے ہے آواز تو دیکھو والی بات کہاں ہوتی ہے ——— ابھی میں نے نہر کے کنارے کنارے جانے والی سڑک آدھی طے کی تھی کہ مجھے ایک رکشا سڑک کے کنارے رکتا دکھائی دیا۔ رکشا میں کوئی سواری نہیں تھی اور رکشا والا حاجت رفع کرنے کی غرض سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں نے اپنا رکشا روک لیا اور رکشا والے کو دس کا نوٹ دے کر چلتا کیا۔ وہ حیران تو ہوا مگر دو روپے کی جگہ دس روپے کا نوٹ مل جانے کی خوشی اس حیرت پر غالب آگئی۔ وہ بھی کچھ اپنے کام سے کام رکھنے والا ہبکا ہبکا قسم کا شخص تھا ——— اس نے دس کا نوٹ جیب میں رکھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے ایک فرلانگ دور چلے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو سڑک سے نیچے اتر جانے والا رکشا ڈرائیور ایک جھاڑی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں رکشا اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ رکشہ والا ازار بند تھامے شور مچاتا دوڑا مگر فوری طور پر اس کی مدد کرنے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بعد میں کسی نے اسے لفٹ دی ہوگی یا کسی ہم پیشہ رکشا ٹیکسی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈرائیور نے اس کی فریاد سنی ہو گی تو وہ تھانے گیا ہو گا۔ سڑک پر رکشا کون تلاش کرتا پھرتا ہے۔ تھانے والوں نے اسے گھنٹہ بھر تو بٹھائے رکھا ہو گا اور بڑی مشکل سے اس کی بات پر یقین کیا ہو گا کہ ایک بڑھیا اس کا رکشا لے گئی جو سفید لٹھے کا شٹل کاک برقع اوڑھے کھڑی تھی۔ رکشا میں بیٹھتے ہی میں نے برقع سر سے ہٹا کے پیچھے ڈال دیا اور گولی کی طرح باغبانپورے سے شالیمار جانے والی سڑک پر جا پہنچا۔ شالیمار سے آگے جہاں تو نے مجھے دیکھا تھا میں نے رکشا کو سڑک سے دور ہٹا کے کھڑا کیا اور ادھر دیکھ کر موقع ملتے ہی پھر برقعے میں روپوش ہو گیا۔ ٹوکری تو گھر سے لے کر نکلا تھا۔ جب میں نے تجھے ٹیکسی میں آتے دیکھا تو تجھے روکنا چاہا مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں بھی میرے جیسی ہی دو برقع پوش خواتین تشریف فرما ہیں۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ برقعے میں مسلح افراد ہیں۔ اس اتفاق پر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دشمن بھی بھیس بدلنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کریں گے جو میں نے کیا، اور ان کو بھی خیال تک نہ آیا ہو گا کہ انہی کی طرح میں برقعے میں چھپ کر سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ جب ٹیکسی گزر گئی تو میں پھر رکشا کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت کوئی مجھے دیکھ رہا تھا یا نہیں۔ میں نے برقع ہٹا کے رکشا کو دوڑایا اور چند منٹ میں ٹیکسی کو جا لیا۔ جب ٹیکسی رکی تو میں سو گز پیچھے تھا۔ میں نے تجھے اتر کے دونوں برقع پوشوں کے آگے جاتے دیکھا۔ بخدا یہ اتنا نیچرل منظر تھا کہ کوئی شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک شریف آدمی دو شریف پردہ نشیں بیبیوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے، مرد آگے ہی چلتے ہیں۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا کہ مرد آگے چلنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور پیچھے برقعے کے اندر دو مرد ہیں جو ریوالور تانے ہوئے ہیں۔ ان کی چال فدا بھی زنانہ نہیں تھی لیکن وہاں اس بات پر غور کرنے والا کون تھا اور جو تھا اس نے دیکھا نہیں۔ ادھر ادھر نگاہ ڈال کے میں نے جیسے ہی موقع پایا دوبارہ برقع اوڑھ کے میں اسی راستے پر ہو لیا جس پر تو گیا تھا۔ مجھے تھوڑی سی دیر اس لیے ہوئی کہ میں سو گز پیچھے تھا اور روانہ بھی اس وقت ہوا جب تو اس زیر تعمیر گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر ایک شخص نے، جو برقع پہن کے باہر آ رہا تھا مجھ سے پوچھا تھا کہ تم کون ہو مگر میں نے غرا کے کہا 'تمہارا باپ' تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے باہر نکل جانے کے بعد میں نے عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ نیلی کار دائیں طرف گلی کے آخر میں موجود تھی ـــــ کمال ہے کہ تو نے نہیں دیکھی تھی ـــــ نہ جانے کیوں مجھے خیال ـــــ آیا کہ اندر داخل ہونے کے بجائے میں چھت پر جا کے اندر اترنے کا راستہ تلاش کروں یا اوپر مورچہ قائم کروں تا کہ وہ رابعہ کو اور تجھے لے جانے کی کوشش کریں یا فرار ہونا چاہیں تو میں خود محفوظ رہتے ہوئے ان کا راستہ روک سکوں۔ اوپر سے اندر اترنے کا راستہ تو مجھے نہیں ملا مگر ایک روشن دان میں سے مجھے آواز سنائی دی۔ میں نے جھک کر دیکھا اور تاروں کو کھڑکی سے نکل کر دوسرے روشن دان تک پہنچتے دیکھا تو سب سمجھ گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تو جانتا ہے۔"

اس سرگزشت کے دوران کئی بار مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود ہم نسوانیت کے پردہ دار برقعے کے اس مردانہ استعمال پر محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ کافی اور اسپرین نے محسن کو نارمل کر دیا تھا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ رات کا کھانا ہمیں عثمان رضوی صاحب کے ساتھ کھانا تھا، جس کے لیے انہوں نے ہمیں خصوصی تاکید کی تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ ہم اب بھی پہنچ سکتے تھے اور دیر سے پہنچنے پر کوئی معقول سا عذر پیش کر کے معافی مانگ سکتے تھے مگر بات صرف کھانے کی نہیں تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ کھانے کے بعد جو نشست چلے گی وہ گھنٹوں برخاست نہیں ہو گی اور ہمارے پاس سب سے اہم مسئلہ وقت کا تھا۔ ٹیلیفون کال تو محسن بھی ریسیو کر سکتا تھا اور "ایک آخری موقع" فراہم کرنے والوں کو بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت اسی کام سے ہسپتال گیا ہوا ہے لیکن دوسری طرف رابعہ کی ماں کی فرصتِ عمر تمام ہو رہی تھی اور یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ میرے پہنچنے سے پہلے ان کی آخری سانسوں میں ہوش و حواس کس حد تک ان کا ساتھ دیں گے۔

میں ہسپتال پہنچا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر درانی کے بارے میں دریافت کیا اور اپنا نام بتایا۔

"اوہ مائی گڈنس۔" ڈاکٹر نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ "آپ نے اتنی دیر کیوں کی؟"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ "کیا... ؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"نہیں نہیں، آپ آیئے میرے ساتھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "رابعہ کون ہے؟"

"رابعہ قاری۔ وکیل۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

"اوہ یس، مگر وہ خود کہاں ہیں؟" ڈاکٹر نے برآمدے میں میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "بیہوشی میں وہ کتنی بار ان کو یاد کر چکی ہیں۔"

"بدقسمتی سے وہ ایک قانونی معاملے میں اپنے مؤکل کے لیے راولپنڈی چلی گئی ہیں۔" میں نے مجبوراً جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں نے فون تو کر دیا تھا لیکن ان کا کل سے پہلے آنا مشکل ہے۔"

ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اچھا ہوتا اگر آخری وقت میں بیٹی بھی ماں کے سرہانے ہوتی۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی؟"

میں نے ناامیدی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نو ہوپ۔" اور انتہائی نگہداشت وارڈ کا دروازہ کھولا۔ ہر بستر پر لیٹے ہوئے مریض صبح کے انتظار میں تھے لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ آنے والی صبح کا سورج کسے دیکھنا ہے اور اس کے بعد وہ کون سی ایسی ہی رات ہو گی جس کا سورج سب کے لیے طلوع ہو گا۔ سوائے ان کے۔ ہر بستر پر موت سایہ فگن تھی۔ ان کی زندگی مانگنے والوں کی ملتجی، پُرامید اور دل زدہ نظروں سے بے نیاز۔ میں دونوں جانب کھنچے ہوئے پردوں سے نظر آنے والے مناظر دیکھتا چلا گیا۔ خون، گلوکوز اور آکسیجن دینے والے آلات کامل بے حسی کے ساتھ ہر جگہ ایستادہ تھے۔ ان کی اندھی آنکھوں نے ان گنت مریضوں کو انہی گنے چنے بیڈز پر آتے جاتے دیکھا تھا۔ اس وارڈ میں آنے والوں میں بہت کم ہوتے تھے جو اپنے جسم و جاں کا رشتہ سلامت لے جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ بیشتر کے صرف جسم لے جائے جاتے تھے۔

ڈاکٹر درانی رک گیا۔ اس نے پردہ کھینچا اور برابر کر دیا۔ رابعہ کی ماں آکسیجن ماسک چڑھائے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے رکھی ہوئی ایک الیکٹرانک مشین کے گول ڈائل پر روشنی کا ایک نقطہ اوپر نیچے ہوتا، بائیں سے دائیں جانب سفر کرتا ہوا دل کے ہنوز زندہ اور مصروفِ کار ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ "بیپ بیپ... بیپ..." کی ہلکی سی آواز اس خبر کو نشر کر رہی تھی۔ ڈاکٹر درانی نے چارٹ اور گراف دیکھے۔ نرس سے کچھ کہا اور جھک کر رابعہ کی ماں کی آنکھوں کے بند پپوٹے کھول کر دیکھنے لگا۔

"مسٹر سکندر بخت! میں ایک رسک لے رہا ہوں۔ کیا آپ مجھے اپنی مجبوری کی نوعیت بتا سکتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"میں تفصیل میں تو نہیں جا سکتا۔" میں نے تھوڑے تذبذب کے بعد ڈاکٹر کے سامنے جزوی حقیقت کا اعتراف کرنے کا فیصلہ کیا۔ "ان کے پاس ایک خط ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ خط انہوں نے کہاں رکھا ہے۔ ہم پورے گھر میں ہر جگہ تلاش کر چکے ہیں۔ اس خط سے ان کی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کا تحفظ وابستہ ہے۔ کچھ لوگ اس خط کو حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ اگر اس خط کے بارے میں کچھ بتائے بغیر ان کا انتقال ہو گیا تو رابعہ کے لیے بہت خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ خط انہوں نے کہیں چھپا رکھا ہے یا بصورتِ دیگر جلا دیا ہے تو یہ ہمارے لیے خاصے اطمینان کی بات ہو گی۔ ہم وہ خط جلا دیں گے۔ مگر خط ہمیں نہ مل سکا تو ممکن ہے دشمن اس کا سراغ لگا لیں۔"

"آپ کا ان سے اور مس رابعہ قاری سے کیا رشتہ ہے؟" ڈاکٹر درانی نے یکلخت سوال کر دیا جو میری بات بڑے غور سے سن رہا تھا۔

اور تب مجھے وہ جھوٹ بولنا پڑا جو ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر ڈاکٹر درانی میری مدد کرنے کے لیے کوئی رسک لینے پر تیار نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ "میں مس رابعہ کا منگیتر ہوں اور فرسٹ کزن۔ چار سال انگلینڈ میں رہ کے ابھی کچھ عرصہ پہلے واپس آیا ہوں۔"

ڈاکٹر درانی کو میرے جواب نے پوری طرح مطمئن کر دیا۔

"انگلینڈ میں کاروبار تھا آپ کا؟"

"نہیں، میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرا بزنس یہیں ہے۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔"

"آپ کو اندیشہ ہے کہ وہ خط غلط لوگوں کے ہاتھ میں پڑ گیا تو وہ مس رابعہ قاری کو بلیک میل کریں گے؟" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ ہیں۔ کیا پولیس ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی؟"

"بدقسمتی سے وہ وکیل ایک عورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہماری اخلاقی اقدار کے پیمانے مرد اور عورت کے لیے الگ الگ ہیں۔ عورت کی عزت شیشہ ہے جس میں بال بھی پڑ جائے تو نہیں جاتا۔ پھر ہمارے ملک کی زرد صحافت کے علمبردار ہیں، جو خبر میں تشہیر کے سامان تلاش کرتے ہیں یا فراہم کر دیتے ہیں۔ رابعہ کے ساتھ ایک مسئلہ اس کی پریکٹس کے متاثر ہونے کا بھی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "اور اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس خط میں کیا ہے۔ ہم سب انسان خطاکار ہیں اور کبھی کبھی حالات کی سازش کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔"

اسی وقت نرس اندر آئی اور اس نے ڈاکٹر کو ایک انجکشن تھما دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب آپ اچھی طرح ایک بات سمجھ لیجیے مسٹر سکندر بخت!" اس نے انجکشن سرنج کو اوپر کی طرف کرکے پسٹن کو تھوڑا سا دبایا۔ "میں آپ کی مدد کر رہا ہوں، آپ پر اعتماد کرتے ہوئے۔ اس انجکشن کے بعد تین منٹ کے اندر اندر یہ ہوش میں آجائیں گی اور آپ سے چند منٹ باتیں کر سکیں گی، بقائمی ہوش و حواس۔ لیکن یہ چند منٹ کا وقفہ ان چند گھنٹوں کے بدلے ملے گا جن کے بعد خاتون کو بہرحال جینے کے حق سے دستبردار ہونا ہی تھا۔ میں ان کی نزع کی تکلیف کے چند گھنٹوں کو سمیٹ کر مختصر کر رہا ہوں۔ ایک مقصد کے حصول کے لیے۔"

"اور چند منٹ بعد؟" میں نے کہا۔ "ہوش کے اس وقفہ کے بعد؟"

"فوری خاتمہ۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "انتخاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جلدی بولیے۔ اگر ان کی بیٹی صبح تک پہنچ سکتی ہیں اور یہ رسک لیے بغیر کام چل سکتا ہے تو اس انجکشن کی ضرورت نہیں۔"

فرشتۂ اجل نے میری بے بسی پر قہقہہ لگایا۔ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ وقت کا تعین تو بہت پہلے ہو چکا تھا مجھے روح قبض کرنے کا حکم تو بہت پہلے دیا جا چکا تھا۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ کیا زندگی اور موت تمہارے قبضۂ قدرت میں ہے؟

"آل رائٹ۔" میں نے رابعہ کی ماں کی موت کے فرمان پر دستخط ثبت کر دیے۔ زندگی کے یہ چند بے مصرف لمحات اگر اس عورت کی اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے کام آسکتے ہیں تو تذبذب کیسا۔ رابعہ کے لیے آخری وقت میں ماں کے برابر نے موجود ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ شاید اولاد کو ممتا کا یہ آخری نذرانہ دے کر اس کی روح کو سکون ملے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا۔

"آپ اگر اکیلے میں بات کرنا چاہیں تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔" ڈاکٹر درانی نے نرمی سے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ گواہ رہیں کہ میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

پپ... پپ... پپ... ہر لمحہ صدا دیتا گزرتا گیا۔

دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ اس مشین نے بہت پہلے ایک نوزائیدہ بچے کے جسم میں خون پمپ کرنا شروع کیا تھا۔ اب اس کی مشینری پرانی اور ناقص ہو چکی تھی۔ ناقابلِ مرمت اور ناکارہ قرار دی جا چکی تھی۔ اب یہ مشین بند ہونے والی تھی۔ ایک بار میں نے اپنے دوست سے سنا تھا کہ اس کے باپ نے نیویارک سے ایک بحری جہاز خریدا ہے جو بمبئی پر مال اتار کر کراچی آرہا ہے جہاں گڈاپ میں اسے توڑ کر پرزہ پرزہ کر دیا جائے گا اور میں نے حیران ہو کے کہا تھا۔ اچھے بھلے چلتے ہوئے جہاز کو توڑ دیا جائے گا۔ اس میں کون سی عقلمندی ہے۔ شد... میرے دوست نے مجھے سمجھایا تھا کہ عالمی قواعد و ضوابط کے مطابق ہر بحری جہاز کی ایک لائف ہوتی ہے۔ جب لائف پوری ہو جائے تو اس کا وجود ختم کر دیا جاتا ہے خواہ وہ ابھی مزید دس سال کے لیے سفر کے قابل ہو۔ یہ دل بھی اسی جہاز کی طرح تھا۔ اس کی لائف پوری ہو چکی تھی۔ یہ دل آخری چند گردش کے لیے خون کو جسم کی شریانوں کے سفر پر روانہ کر چکا تھا۔ وہ وقت بہت دور نہیں تھا۔ جب یہ مشین رک جائے گی اور خون کا ہر ذرہ جہاں ہوگا وہیں ٹھہر جائے گا۔

رابعہ کی ماں نے حرکت کی اور کراہی۔ ڈاکٹر درانی نے آکسیجن ماسک ہٹا دیا۔ "اب آپ ان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"آنٹی!" میں نے جھک کر کہا اور فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے کانوں کے قریب اپنے منہ کو کر لیا۔ "میری طرف دیکھیے... دیکھیے میں سکندر بخت ہوں...!"

رابعہ کی ماں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ "سکندر..." اس نے سرگوشی میں کہا۔ "رابعہ...!"

"دیکھیے آنٹی! رابعہ آنے والی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے آپ کو ایک خط دیا تھا... وہ خط کہاں ہے؟ سنا آپ نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ آپ کو معلوم ہے وہ خط کہاں ہے؟ یاد کیجیے... مجھے بتائیے۔"

رابعہ کی ماں نے کرب میں سر کو ادھر سے ادھر ہلایا۔ "رابعہ... میری بچی! اسے بلاؤ... رابعہ کو بلاؤ۔"

"رابعہ... رابعہ!" میں نے پکار کے کہا۔ "یوں جیسے وہ باہر کھڑی ہے۔" "دیکھو امی بلا رہی ہیں تمہیں..." "وہ آرہی ہے آنٹی! آپ نے سنی اس کی آواز؟" اس نے کہا ہے ابھی آتی ہوں۔ اب مجھے بتائیے وہ خط..."

"رابعہ...!" رابعہ کی ماں چلائی۔ اس آواز میں درد تھی۔ شکایت تھی اور مایوسی تھی۔ میں یکلخت اٹھا اور باہر نکل آیا۔ "ڈاکٹر درانی!" میں نے کہا۔ "ایک منٹ پلیز!"

ڈاکٹر درانی پردہ ہٹا کے نمودار ہوا۔ "یس!" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "ٹائم از ویری شارٹ۔"

"آئی نو۔" میں نے کہا۔ "پلیز میری تھوڑی سی مدد کیجیے۔ آپ نے اتنا کچھ کیا ہے تو یہ بھی سہی۔ آپ جانتے ہیں رابعہ یہاں نہیں ہے مگر وہ رابعہ کے سوا کسی کو کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ کیا آپ کسی رابعہ کو لا سکتے ہیں؟"

"کسی رابعہ کو؟" ڈاکٹر درانی نے مجھے غور سے دیکھا... "واٹ ڈو یو مین؟"

"ہر لڑکی رابعہ ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید اس وقت وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز نہیں کر سکیں گی۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ پہچان جائے۔ آخری وقت میں اس سے جھوٹ بول کے اسے دکھ پہنچانے سے کیا فائدہ؟"

"اٹ از لے میٹر آف چانس؟" میں نے ڈاکٹر ہی کے الفاظ میں کہا۔ "میں یہ رسک لینا چاہتا ہوں۔ پلیز، کسی نرس یا کسی مریض کی وارث کوئی عورت یہاں آکر ایک جملہ بولنے پر تیار ہو جائے۔ وہ پوچھ لے۔ امی وہ خط کہاں ہے؟"

ڈاکٹر خاموش کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "میں کسی نرس کو یہ حکم نہیں دے سکتا۔ تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں ایک لڑکی کے بارے میں بتا دوں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "باہر برآمدے میں ایک لڑکی کھڑی ہے۔ وہ بیس نمبر کے ساتھ ہے مگر اسے اندر آنے کی اجازت نہیں۔ وہ نیک دل لڑکی ہے۔ اس سے بات کر کے دیکھو۔ اگر وہ آجائے تو مجھے اعتراض نہیں۔"

میں باہر بھاگا۔ وارڈ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ چار منٹ گزر چکے تھے۔ وہ لڑکی برآمدے کے آخر میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کچھ نروس ہو گئی۔

"خاتون! آپ بیس نمبر کے ساتھ ہیں نا؟" میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"جی ہاں جی۔" وہ بولی اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "وہ میرے والد ہیں۔"

"انیس نمبر پر میری والدہ ہیں۔" میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کسی قسم کے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ "ان کا آخری وقت آگیا ہے۔ وہ چار منٹ باقی ہیں اور وہ اپنی بیٹی کو یاد کر رہی ہیں۔ میں آپ کو انسانیت اور شرافت کا واسطہ دیتا ہوں کہ چل کر ان سے صرف ایک بات کر لیجیے۔ ڈاکٹر درانی اندر موجود ہیں۔ وہ آپ کو بعد میں ساری بات بتا دیں گے۔ آپ جا کے صرف اتنا کہہ دیجیے کہ ماں! میں رابعہ ہوں۔ وہ پہچاننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ان سے اتنا پوچھ لیجیے کہ وہ خط کہاں ہے۔ پلیز۔ آئیے۔" میں نے بدحواسی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی تذبذب کا شکار تھی مگر میں اسے گھسیٹ کر لے گیا، اور اس نے معمولی سی کوشش کے بعد مزاحمت ترک کر دی۔ سچائی میرے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی اور اس نے پڑھ لی تھی۔

"ویری لیٹ۔" ڈاکٹر درانی نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "سات منٹ ہو چکے ہیں۔"

میں نے پردہ ہٹایا اور اس اجنبی وحشت زدہ لڑکی کو رابعہ کی ماں کے بیڈ پر بٹھا دیا۔ "رابعہ آگئی ہے۔ یہ دیکھیے۔"

"امی!" لڑکی نے میرے ساتھ جھک کر کہا۔ "میں آگئی ہوں... آپ کی بیٹی رابعہ... مجھے بتائیے وہ خط کہاں ہے؟"

رابعہ کی ماں نے آنکھیں کھولیں۔ اب اس کی سانس اکھڑ چلی تھی۔ اس نے نظر جما کے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اس کی کھلی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آخری سانس جسم سے رخصت ہوئی۔ آخری جھوٹ رائیگاں گیا۔ دنیا کے تمام ماہرین جو الیکٹرانک آلات سے بال کی کھال نکال لیتے ہیں اور ذرے کا دل چیر کے دیکھ لیتے ہیں اور آدمی کے وجود میں یوں جھانک لیتے ہیں جیسے کھلی کھڑکی سے تاروں بھری رات کا ہر ستارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نفسیات داں، دنیا کے سارے علوم پر عبور رکھنے کا دعویٰ کرنے والے اس آخری لمحے میں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ رابعہ کی ماں نے مرتے وقت اپنے مقابل کسے دیکھا تھا۔ رابعہ کو یا ایک اجنبی لڑکی کو جو رابعہ کا نام لے کر اسے دھوکا دینا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی یکلخت اٹھی اور ہسٹریا کی کیفیت میں روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

"آئی وش... کہ تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "یہ جھوٹ کس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا؟"

میں نے اپنا سر بستر پر ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ "مجھے معاف کر دینا آنٹی! مجھے معاف کر دینا میرے معبود!"

"میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر درانی نے کہا۔ "لاش تم لے جاؤ گے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ڈاکٹر کو پردے پار کر کے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پانچ منٹ بعد جب دو نرسنگ آرڈرلی ایک اسٹریچر لیے نمودار ہوئے تب بھی میں اسی طرح بیٹھا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں رو رہا ہوں۔ انہوں نے رابعہ کی ماں کو بستر پر سے اٹھا کے اسٹریچر پر لٹایا اور بے آواز قدموں سے اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ میں خالی بستر پر نظریں جمائے کھڑا رہ گیا۔ میں نے رابعہ کی ماں کی زندگی کے آخری چند گھنٹوں کو سمیٹ کر چند منٹوں میں ختم کر دیا تھا۔ میں نے ایک عورت کو مرتے وقت دھوکا دینے کی کوشش کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھی۔ میں نے ایک اجنبی اور بے گناہ لڑکی کو ایک ایسا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا بوجھ وہ ہمیشہ اپنے ضمیر پر محسوس کرے گی۔ میں نے ایک شریف النفس ڈاکٹر کو خلافِ اصول مدد پر آمادہ کر لیا تھا اور احساسِ جرم و پشیمانی کے سوا کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ایک نرس آ کے بستر کو ٹھیک کرنے لگی۔

"آپ کو ڈاکٹر درانی بلا رہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اپنا سامان ساتھ لیتے جائیے۔"

میں نے سر ہلایا اور آفس کی طرف چل پڑا۔ جب میں رسمی کارروائی کے بعد ڈیتھ سرٹیفکیٹ لے کر باہر نکلا تو لاش ایمبولینس میں رکھی جا رہی تھی اور وہ اجنبی لڑکی اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں تھکے تھکے قدموں سے اس کی طرف گیا۔ "مجھے معاف کر دینا بہن! خدا نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ میرے گناہ کی سزا تم کو نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ وہ اسی طرح بت بنی کھڑی خلا میں دیکھتی رہی۔ میں آج بھی تصور میں ایک منجمد صورت کو دیکھتا ہوں۔ نہ جانے وہ لڑکی کب تک اس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہی ہوگی۔ میں سوچتا ہوں، پتھر کی دیواروں نے اسے کب تک سہارا دیا ہوگا۔

ایمبولینس کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا مگر اسٹریچر لانے والے کچھ سوگوار اور کچھ پرامید نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اوہ! مجھے بروقت خیال آ گیا اور میرا ہاتھ پرس نکالنے کے لیے جیب میں گیا۔ پرس میں ایک ایک کے دو نوٹ تھے اور سو کا ایک نوٹ تھا۔ میں نے رابعہ کی ماں کا ہینڈ بیگ کھولا جسے میں تھرماس اور ایک باسکٹ میں موجود دوسری چیزوں کے ساتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس میں سے دس دس کے نوٹ نکالتے ہوئے مجھے اچانک کسی بھاری سے پیکٹ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے نکال کے دیکھا۔ یہ وہی خط تھا۔ میں چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر میں نے دونوں اسٹریچر لانے والوں کو دس دس کا ایک ایک نوٹ دیا۔ اور ایمبولینس میں آ کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بار پہلے بھی میں نے رابعہ کے ساتھ آدھی رات کے بعد شہر کی ان ویران سڑکوں پر اسی ایمبولینس میں سفر کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس روز ایمبولینس کا سائرن چلا چلا کے راستہ مانگ رہا تھا کیونکہ بلاخیر میں ایک زندگی کے زیاں کا امکان تھا۔ اب سائرن خاموش تھا۔ اس خاموشی میں میرے ساتھ صرف میرے خیالات تھے۔

وہ خط میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر رابعہ کی ماں بقائمی ہوش و حواس بتا دیتی کہ خط اس کے ہینڈ بیگ میں ہے اور میں سب کے سامنے خط نکال لیتا تو کیا ہوتا

شاید میں فوراً اندر کے کاغذات بھی نکال کے دیکھتا اور جب ڈاکٹر درانی دیکھتا کہ اس لفافے میں سادہ کاغذ ملے کے سوا کچھ بھی نہیں تو وہ مجھے کیا سمجھتا؟ جھوٹا، دھوکے باز یا پاگل؟

لاش کو اتروانے کے بعد میں نے اور محسن نے اس ہنگامی صورتِ حال پر غور کیا۔ حسبِ توقع ایک ٹیلیفون کال موصول ہوئی تھی اور محسن نے جواب میں وہی کہہ دیا تھا جو میں نے بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پھر رابطہ قائم کریں گے لیکن اس بات کو دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگر اب ان کا پیغام موصول ہو جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا جس میں ہماری پوزیشن بہت عجیب تھی۔ ہم اب کفن دفن کے انتظامات کی ذمے داری قبول کر چکے تھے۔ ہمارا کام تھا کہ رابعہ کے اور اس کی ماں کے تمام رشتے داروں کو اطلاع دیں۔ ان سے رابعہ کی ماں کے تعلقات اچھے تھے یا برے۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کو بتائے بغیر ہم تدفین کرا دیں لیکن ہمیں ان میں سے کسی کا نام پتہ معلوم نہ تھا۔

"ان کی ملازمہ کو خبر کرنی بھی ضروری ہے۔" محسن نے فکر مندی سے کہا۔ "اس کی نظر میں ہم پہلے ہی مشتبہ کردار ہیں۔"

"خصوصاً میں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کی ماں کو جس رات دل کا دورہ پڑا تھا رابعہ اس کے پاس موجود نہ تھی۔ اسے میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور زبانی عقیدہ اپنی جگہ کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار کی بات ہے۔ وہ موت کا یہی سبب بتائے گی کہ بڑی بیگم صاحبہ کو وقت پر ہسپتال نہیں پہنچایا گیا تھا ورنہ وہ بچ جاتیں۔"

"رابعہ کے تعلقات ہمسائے میں کس کس سے تھے؟" محسن بولا۔ "یہ بھی خادمہ ہی بتا سکتی ہے اور تم اسے لا سکتے ہو۔ شاید اسے ایک آدھ رشتے دار کا گھر بھی معلوم ہو۔ اس سے آگے دوسروں کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ رابعہ کہاں ہے؟ کس کس سے جھوٹ بولیں گے اور کیا سب ہمارے جھوٹ کو تسلیم کر لیں گے؟ رابعہ بہت بڑی وکیل ہے۔ اس کے ماتحت وکیل بھی ہیں اور ان کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ ہمیں بہرحال ہم پیشہ وکیلوں کو اطلاع دینی ہوگی۔ صبح نو بجے کے بعد جب کورٹ کے بار روم میں یہ خبر پہنچے گی تو وہ ہم سے پوچھیں گے کہ تدفین کس وقت ہوگی۔ ان میں سے بہت سے مقدمات کی پیشی لے کر جنازے میں شرکت کے لیے آ جائیں گے۔ اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر ہم صبح ہوتے ہی تدفین کے انتظامات شروع کریں تب بھی دوپہر سے پہلے تدفین مشکل ہے۔ سب لوگوں سے پہلے تو ہمسائے آ جائیں گے۔ دوسرے سب لوگوں سے تو یہی کہا جا سکتا ہے جو ڈاکٹر درانی سے کہا تھا کہ رابعہ کسی کیس کے سلسلے میں راولپنڈی گئی ہے مگر اس کے ماتحت وکیل سمجھ جائیں گے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ان کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ انہیں ہر شریف آدمی مجرم نظر آتا ہے اور ذرا بھی شک ہو تو ان کے لیے پولیس کو بلا کے تفتیش کا چکر چلانا مشکل نہیں ہوتا۔ ہم پہلے ہی اتنے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں کہ مزید چکروں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"اگر ہم وکیلوں کو اطلاع ہی نہ دیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کہہ دیں کہ آخری رسوم میں خاندان کے افراد شریک تھے۔"

"خاندان کے افراد کا مسئلہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر صبح سے پہلے پہلے ہم خط دے کر رابعہ کو لانے میں کامیاب ہو گئے پھر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میں رابعہ کو اس کے کمرے میں سلا دوں گا۔ میں ڈاکٹر کو بلا کے بتا دوں گا کہ ابھی رابعہ کو ماں کی موت کا علم نہیں ہونا چاہیے اور بہتر یہی ہے کہ وہ سوتی رہے۔"

"بات آ گئی سمجھ میں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "رابعہ اپنے کمرے میں سوتی رہے گی۔ ہم کسی کو اس کے کمرے میں نہیں جانے دیں گے کہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رابعہ پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

میں کچھ دیر محسن کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "لیکن رشتے دار خواتین، پاس پڑوس کی عورتیں یا خادمہ اگر کمرے میں جا کے صرف ایک نظر دیکھنے پر مصر ہوئیں تو کیا ہوگا؟"

"ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دوسرے جھوٹ کا سہارا تو لینا ہی پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ تو جھوٹ ایک ہے۔ کیا بڑا کیا چھوٹا۔ ہم کمرے کا دروازہ کھول کے بھی دکھا سکتے ہیں۔ یوں کہ دور سے دیکھنے والوں کو رابعہ واقعی سوتی ہوئی نظر آئے۔"

"رائٹ۔" میں نے چٹکی بجا کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔ ہمیں کام فوراً شروع کر دینا چاہیے۔"

رابعہ کے بیڈروم کو سیٹ کر دینے کے بعد میں نے کسی فلم کے ہدایت کار کی طرح سوچنا شروع کیا جو غیر حقیقی مناظر کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ دیکھنے والے اسے حقیقت سمجھ کے تسلیم کرتے ہیں جیسے باغ میں پانی دینے والے فوارے سے بارش کا منظر دکھانا۔ رابعہ کے بیڈ پر چادر کے نیچے تکیے اور دوسرے کپڑے رکھ کے یہ تاثر دینا بہت آسان تھا کہ یہ رابعہ ہے جو چادر اوڑھے لیٹی ہے۔ ہم یہ بھی دکھا سکتے تھے کہ وہ چادر میں منہ سر لپیٹے سو رہی ہے مگر میں نے زیادہ حقیقی تاثر دینے کا انتظام کیا۔ رابعہ کی وارڈروب میں سے میں نے ایک وگ نکالی۔ اس میں مصنوعی بالوں کے بنے بنائے جوڑے بھی رکھے تھے جو رابعہ نے میرے سامنے تو کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ شاید یہ اس دور کی یادگار تھے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف شادی جسے خانہ آبادی ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہر سہاگن کی طرح وہ سولہ سنگھار کرتی ہوگی۔ بالوں کی آرائش کے انداز بدلتی ہوگی اور خود کو آئینے میں دیکھ کے اپنے حسن کی قوتِ تسخیر پر غرور کرتی ہوگی اور اپنے خیالوں، خوابوں اور تصورات کا عکس دیکھ کے شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہوگا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

میں نے ایک سرد آہ بھر کے لمبے سیاہ چمکیلے بالوں کی وگ کو پھیلایا۔ کچھ تکیے پر کچھ چادر کے اوپر۔ وگ کے نیچے ایک جوڑا رکھا اور چادر کا کونا تھوڑا سا آگے کھسکایا۔ پھر میں نے دروازے کے قریب جا کے دیکھا۔ محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ تاثر مکمل تھا۔ دن میں سارے پردے برابر ہوں گے اور ٹیبل لیمپ بھی آف ہوگا تو کمرے کا دروازہ کھول کے اندر آنے والے کو بھی یہی نظر آئے گا کہ رابعہ کروٹ لیے اور منہ دیوار کی طرف کیے سو رہی ہے۔ کیا کہا تھا امیر خسرو نے۔ "گوری سوتے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس۔ چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس۔" رابعہ اٹھ بیٹھی۔ یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ رابعہ نہیں ہے۔ یہ سب دامِ خیال ہے اور میں نے کہا۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

محسن نے میرا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "کس سوچ میں پڑ گیا ہے سکندر! وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔"

میں چونکا۔ "ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہاں۔ ہم سب کے پاس وقت نہیں ہے۔ نہ جینے کا نہ مرنے کا۔"

محسن نے فائنل ٹچ یہ دیے تھے کہ رابعہ کی ایک ساری اور بلاؤز بیڈ کے قریب کرسی پر یوں ڈال دیے تھے جیسے سونے سے پہلے رابعہ نے اسی لباس کو بدلا تھا۔ بیڈ کی دوسری جانب ساڑھی سے میچ کرتے ہوئے سینڈل رکھ دیے تھے جو دروازے میں سے داخل ہونے والے کو سامنے نظر آ جائیں۔ بیڈ کے سرہانے ٹیبل لیمپ کے ساتھ ہی ایک ہینڈ بیگ رکھا تھا اور کلائی کی ایک گھڑی رکھی تھی۔ یہ سب کچھ محسن نے وارڈروب میں سے نکالا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کھینچ لیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ ڈرامہ چل جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ اگر انہوں نے چھ گھنٹے کے اندر اندر رابعہ کو واپس کر دیا تو ہم خیالی رابعہ کی جگہ حقیقی رابعہ کو سُلا دیں گے۔ باقی انتظامات اپنے ہی ہیں گے یعنی ہم رابعہ سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دیں گے اور رابعہ کو بھی معلوم نہیں ہونے دیں گے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔"

"وہ بیٹی کو رخصت کرنے کے لیے زندہ تھی۔" میں نے کہا۔ میرا موڈ سخت قنوطی ہو رہا تھا۔ "اور اب بیٹی زندہ ہے، ماں رخصت ہو رہی ہے۔"

"یہ تقدیر کے کھیل ہیں سکندر!" محسن نے کہا۔ "خدا جانتا ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں، خلوص، نیک نیتی اور راستی کے ساتھ کر رہے ہیں۔"

"رابعہ مجھے معاف کر دے گی محسن؟" میں نے کسی بچے کی طرح سوال کیا جس سے نادانستگی میں کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

"نہیں۔" محسن بولا۔ "معاف تو اسے کیا جاتا ہے جس پر کوئی الزام ہو۔ کیا تُو نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ تجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ تیری خاطر دنیا کو الزام تو دے سکتی ہے مگر ساری دنیا کے کہنے سے بھی تجھے موردِ الزام نہیں سمجھ سکتی۔"

میں ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ گیا [illegible] بالائی کمرے کی طرف چلنے لگا، جہاں اس کا جسدِ خاکی اپنے اور رابعہ کے، اور سارے جہاں کے اندیشوں سے بے نیاز، انتظارِ سفر میں تھا۔ میں نے محسن کی آواز سنی جس نے کہا تھا کہ وہ کچن سے کافی بنا کے لا رہا ہے اور میں ٹیلیفون کا خیال رکھوں۔ پُرآسیب ماحول کی کشیدگی نے مجھے ذہنی جسمانی طور پر بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں ایک کرسی پر گر پڑا اور اپنے پیر دراز کر کے دوسری کرسی پر رکھ دیے۔ سر سے پیر تک سفید چادر میں چھپی ہوئی لاش میرے بائیں ہاتھ پر تھی اور ٹیلی فون دائیں جانب اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ دونوں کی خاموشی کا انداز ایک جیسا اعصاب شکن تھا۔ کمرے کا سناٹا اتنا بوجھل تھا اور میں اپنے خیالات میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ رابعہ کا تصور ایک آرزو میں ڈھل گیا اور میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔" میں نے کہا اور اس وقت مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔

"دیکھیے، مجھے سکندر بخت سے بات کرنی ہے۔" ایک عورت نے کہا۔ "کیا وہ یہاں ہیں؟"

میں نے ریسیور کو ہٹا کے غور سے دیکھا حالانکہ اس میں ریسیور کا کوئی قصور نہیں تھا۔ "میں۔۔۔ میں بول رہا ہوں۔"

"سکندر! میں نے پہلے ضامن رضوی صاحب کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا وہ تو غائب ہے۔ رات کے کھانے کا وعدہ کر کے گیا تھا مگر آیا نہیں۔ پھر انہوں نے یہ فون نمبر دیا۔"

"اس وقت ایسی کون سی ضروری بات کرنی تھی آپ کو؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آدھی رات کو۔۔"

"وہ بات ایسی ہی تھی سکندر کہ میں تیرے انکل کے سامنے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔ مجھے۔۔۔ مجھے محسن سے معلوم ہوا تھا کہ۔۔۔ کہ تو۔۔۔ تجھے فوزیہ کا رشتہ منظور نہیں۔" شیروانی صاحب کی بیگم نے کہنا شروع کیا۔ بظاہر ان کے لہجے سے بہت دکھ کا احساس ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ دکھ جھوٹا ہے۔ "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اگر تیرے انکل کو معلوم ہو جاتا تو بہت بُرا ہوتا۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے ہیں۔ میں نے محسن سے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ میرا ذہنی توازن برقرار نہیں تھا۔ میں دل زدہ اور پشیمان، رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کے سامنے مجرم بنا بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس وقت رابعہ پر کیا بیت رہی ہوگی، وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ میرے لیے یہ خیال ہی محال بلکہ ناممکن تھا کہ ایسے وقت میں ہزار میل کے فاصلے سے ایک آواز میرے دل کے ان زخموں میں انگارے بھرنے آ جائے گی جن کی کسک کو بدلے ہوئے حالات اور وقت نے دبا رکھا تھا۔ مجھے ایک جنازہ اٹھانے سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہوگا اور اس محبت کو دفن کرنا ہوگا جسے میں نے خود اپنے ہاتھوں موت کی نیند سُلا دیا تھا۔

"بولو سکندر! کیا یہ سچ ہے؟" فوزیہ کا چہرہ ویرانیٔ شب میں سولھویں رات کے چاند کی طرح ابھرا۔ افسردہ اور مضمحل اجالے سے ہولے ہولے دمکتا ہوا۔ پھر اس کی جگہ رابعہ کی صورت نے لے لی۔ "بولو سکندر! کیا یہ سچ نہیں ہے۔ تم مجھے چاہتے ہو نا؟"

"نہیں سکندر! تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور کرتے رہو گے۔" فوزیہ نے بضد ہو کے کہا۔

"سکندر! کہہ دو اس لڑکی سے کہ یہ صرف اس کا خیال تھا۔" رابعہ نے پرخون آلودہ تارِ پیراہن کو لہرا کے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ سکندر اور میں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔" فوزیہ کا چہرہ اب بھی پُر اعتماد تھا۔

"سچ یہ بھی ہے کہ میں نے تم سے پہلے سکندر کو چاہا۔"

رابعہ نے اس کی دلیل مسترد کر دی۔

"بولتے کیوں نہیں لڑکے! کون ہے یہ رابعہ؟" فوزیہ کی ماں نے کہا۔ "کیا تو واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہے؟"

"جی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں واقعی اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ میں کہہ دوں گی، میں اپنی بیٹی کی شادی سکندر سے نہیں کروں گی۔۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کہنے سننے کو اب کچھ نہیں رہا تھا۔ میرے دل پر رکھا ہوا سنگِ گراں ایک کوہِ گراں میں ڈھل گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے ایک معصوم سیرت، محبت کی تقدیس پر ایمان رکھنے والی اور اعتماد کے رشتوں کا دامن تھام کے اپنے خوابوں کے ہفت رنگ آسمان پر اڑنے والی لڑکی سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کر دیا ہے جس میں وہ خود کو سارے زمانے کی دسترس سے دور، میری محبت کے سایۂ تحفظ میں، تمام اندیشوں سے بے نیاز سمجھے بیٹھی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے صرف اس ظلم کا احساس تھا جو فوزیہ پر ہوا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے جھوٹ بولا۔ جھوٹ کیا ہے؟ سچ کیا ہے؟ وقت اور حالات کے بدلتے ہوئے پیمانے۔ پھر کیا ازلی و ابدی سچائی کچھ نہیں، کہیں نہیں؟ اس ایک رات میں سچ اور جھوٹ کا مفہوم کتنی بار بدلا تھا۔ ہر جھوٹ، سچ تھا۔ سچائی کو کس نے پہچانا ہے۔ گوتم بدھ نے؟ سقراط نے؟ ولیوں اور پیغمبروں نے؟ میں نے محسوس کیا کہ خیالات کا انتشار مجھے پاگل کر دے گا۔

"کس کا فون تھا؟" محسن نے کافی کے دو مگ لے کر اندر آتے ہوئے کہا۔

"رانگ نمبر۔" میں نے ہیپناٹزم کے زیرِ اثر بولنے والے کی طرح کہا۔ "رانگ کال، ٹو رانگ پرسن۔ ایٹ رانگ ٹائم۔"

"پھر تو کیا باتیں کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" محسن نے حیران ہو کے کہا۔

"کچھ نہیں، دامن چھڑا رہا تھا۔" میں نے کہا اور کافی کا مگ لے لیا۔ کن ارادوں کو کامیاب کہوں؟ کس حقیقت کو نایاب کہوں؟ خونِ فرہاد بر سرِ فرہاد۔ ہر تمنا کو بے ثواب کہوں؟ کہنے کو اب کچھ بھی نہیں رہا۔

ایک بار پھر ٹیلیفون پکارنے لگا۔ میں نے اس کمینے، بدصورت آلے کو دیکھا جس نے فاصلوں کو بیکراں کر دیا تھا۔ محبتوں میں لامحدود اور دوریوں کو لازوال کر دیا تھا۔ جو محبتوں کا قاتل تھا اور دلوں میں نفرتوں کا زہر گھولتا تھا۔ جو نحوست کی زبان تھا اور اجل کی آواز تھا۔ جس نے مقدس رشتوں کو قتل کیا تھا، اور خواب سے خوبصورت جذبوں کو بے رحم حقائق کی لحد میں اتار دیا تھا۔ مگر یہ سب میری اپنی ذہنی کیفیت کا عکس تھا۔ کیا اسی ٹیلی فون پر لوگ اظہارِ محبت نہیں کرتے اور دائمی رفاقتوں کے عہد و پیمان نہیں کرتے؟ خوشیوں کے سندیسے نہیں دیتے۔ امید، حوصلہ اور اعتماد عطا کرنے والے الفاظ نہیں سنتے اور دُور ہو کے بھی اپنوں کے قریب نہیں رہتے؟ ریسیور محسن نے اٹھایا تھا لیکن مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"سکندر!" محسن نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے؟ لے بات کر، وہی حرامزادے ہیں۔"

میں چونکا تو کرسی کے بازو پر رکھا ہوا کافی کا مگ نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ "ہیلو۔" میں نے میکانکی انداز میں کہا۔

"دیکھو سکندر بخت!" ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ "میں نے پہلے بھی فون کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات کرنے سے پہلے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے رابعہ کی ماں کی موت کا افسوس ہے۔"

"اچھا؟" میں نے کہا۔ "وہ کیوں؟ تم تو رابعہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو۔"

"نہیں، ہم یہ بالکل نہیں چاہتے۔" وہ بولا۔ "اگر ہم ایسا چاہتے تو تمہیں رابعہ کی جگہ اس کی لاش ملتی اور ہم نہ ملتے۔ ہم ایک آخری موقع دینا چاہتے ہیں۔ ہم سے سودا کر لو۔ صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔ اگر وہ خط ہم تک پہنچ جاتے تو رابعہ اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"خط میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ ہمارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "تم خط لے کر آ جاؤ اور اسے لے جاؤ۔ لیکن اپنے اس بے وقوف دوست سے کہو کہ بلاوجہ ٹانگ اڑا کے تمہارے اور رابعہ کے لیے مشکلات پیدا نہ کرے۔ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ خود کشی پر کیوں کمربستہ ہے؟"

"وہ مداخلت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے اور یہ وعدہ میں رابعہ کی ماں کی لاش کے سامنے بیٹھ کے کر رہا ہوں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی شرافت اور انسانیت ہے تو۔۔"

"سکندر بخت! ڈائیلاگ مت بولو۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "یہ عقل کا سودا ہے، جذبات کا نہیں۔ خط تمہیں مل گیا ہے تو دیر مت کرو۔ اکیلے، خالی ہاتھ اور پیدل روانہ ہو جاؤ، کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ راستہ وہی ہوگا۔ ہم تمہیں پک کریں گے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے۔۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ضمانت کسی بات کی نہیں دی جا سکتی۔ جیسے خیرات اپنی مرضی سے نہیں ملتی۔" اس نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں رابعہ کو لینے جا رہا ہوں محسن۔" میں نے جیب سے پیڈ رو کاریوالور نکال کے اس کے حوالے کیا۔ "میرے پیچھے مت آنا۔" پھر میں باہر نکل آیا۔ سڑک سنسان تھی اور دور دور تک میرے سوا کوئی راہ گیر نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ذرا بھی نروس نہیں ہوں اور بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے کسی خطرے کے وجود کا احساس نہیں اور یہ فکر نہیں کہ میرے بڑھتے ہوئے قدم مجھے کس منزل پر پہنچائیں گے۔ جال پھیلانے والے بہت ہوشیار شکاری تھے۔ اور انہیں اپنی ذہانت اور طاقت پر ناز تھا تو بجا تھا۔ میں جانتے بوجھتے شکار ہونے کے لیے جا رہا تھا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے کے خیال سے قطعی پریشان نہیں تھا۔ اس اطمینان کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی۔ اگر دشمنوں نے خط لینے کے بعد مجھے اور رابعہ کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا تو نہ ہم ہوں گے نہ غم ہو گا۔ ہمارے ساتھ دنیا جو چاہے کرے اور ہمارے بغیر جو چاہے کرے۔ بصورتِ دیگر انہوں نے وہ منحوس خط لے کر رابعہ کو واقعی آزاد کر دیا تو یہ میری کامیابی ہو گی، ناکامی نہیں۔

میں کراؤن سینما کے سامنے سے گزرا اور دائیں طرف گھوم کے سڑک کے کنارے کنارے چلتا گیا۔ ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا گیا، اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں کھویا ہوا قدم بڑھاتا گیا۔ ریلوے کراسنگ کے بعد نہر آ گئی۔ اس کا خاموش گدلا پانی آہستہ آہستہ دونوں کناروں کی قید میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں لہو کی سرخی تھی جسے صرف میری نگاہ دیکھ سکتی تھی۔ ایک رات اس کے دوسرے کنارے پر رابعہ مجھے لینے آئی تھی، اور اس وقت میں لہولہان تھا۔ اب میں رابعہ کو لینے آیا تھا اور میرے تصور میں اس کا وہی لہو سے لالہ زار بدن تھا جسے میں نے ایک تہہ خانے کے اندھیرے میں فرشِ خاک پر سے اٹھایا تھا۔ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔

میرے سامنے دور سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ روشنی تیزی سے میری طرف آئی۔ میں رک کر انتظار کرنے لگا مگر کار سیدھی نکل گئی۔ میں کچھ دیر اندھیرے کو گھورتا رہا اور پھر چل پڑا۔ دوسری بار ایک اور کار کی روشنی میرے پیچھے جھلملائی۔ میں نے گھوم کر ایک نظر دیکھا لیکن میرے قدم نہیں رکے۔ یہ کار بھی میرے پاس سے گولی کی طرح گزر گئی۔ جب پچاس گز دور جا کے کار نے زبردست بریک لگائے تو مجھے یقین آیا کہ یہی کار ہے جو پہلی بار سامنے سے آئی تھی۔ کار کی پیچھے والی سفید روشن ہوئیں اور کار تیزی سے ریورس گیئر میں میری طرف چند سیکنڈ بعد کار کے رکتے ہی اس کا پچھلا دروازہ کھلا ایک شخص نے نیچے اتر کے دروازہ تھام لیا۔ وہ شخص کا پتلا لگتا تھا۔ اس نے چست پتلون اور بنیان کے ساتھ جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے منہ پر سیاہ نقاب تھی بلا تامل بیٹھ گیا۔ سیٹ پر ویسا ہی دوسرا سیاہ پوش لگا بیٹھا تھا۔

دروازہ کھولنے سے کار کے اندر کوئی لائٹ نہیں غالباً اس کی سیلنگ لائٹ کا کنکشن نکال دیا گیا تھا پوش کے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔ مجھے کار کی اگلی سیٹ بھی بالکل انہی جیسے کالی مٹی کے مجسمے رکھے دکھائی دیے سب کے مسلح ہونے کے بارے میں مجھے قطعی کوئی

"خط لائے ہو؟" میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا۔ طرف بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے ایک تیز دھار والا لمبا سا خنجر میری پسلیوں کے درمیان، دل کے مقام پر رکھ دیا کے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ خنجر کو میرے دل میں پیوست کر سکتا لفافہ اس شخص کو دے دیا گیا جو آگے ڈرائیور کے ساتھ والی پر بیٹھا تھا۔ اس نے کھولے بغیر لفافے کو ڈیش بورڈ کے رکھ دیا۔ کار تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتی رہی۔

"تم دیکھو گے نہیں کہ یہ وہی لفافہ اور خط ہے" میں نے کہا۔

"دیکھیں گے۔" اس شخص نے میری بات کاٹ دی "تمہاری موجودگی میں دیکھیں گے۔ مگر یہاں کیا دکھائی نظر آئے گا یہاں؟"

وہ جانتے تھے کہ لفافے میں سادے کاغذ ہیں پر لکھی ہوئی تحریر نظر نہیں آتی۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے سیاہ پوش نے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک سیاہ کپڑا نکالا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ تم راستہ نوٹ کرو یہ نقاب ڈالو گے چہرے پر اپنی مرضی سے، یا ہم زبردستی آنکھوں پر پٹی باندھ دیں؟"

"تم کو پٹی باندھنے کی اجازت ہے۔" میں نے کہا اس وقت راستہ نوٹ کرنے سے قطعی دلچسپی نہیں ہو گی تو میں پٹی باندھ کے یہ راستہ تلاش کر لوں گا۔ رہنمائی اس کی چھٹی حس کرتی ہے۔ اور شکار خود اپنا سراغ

جاتا ہے۔" دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ صرف حرکت کا احساس باقی رہ گیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے جو میرے ساتھ بیٹھے تھے، وہی کپڑا میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ میں نے کار کو بائیں طرف موڑ کاٹتے محسوس کیا اور اندازہ لگایا کہ اس مرتبہ وہ شالیمار کی طرف نہیں بلکہ باغبانپورے کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کے بعد کار نے اتنے موڑ کاٹے اور اس کی رفتار میں اتنی مرتبہ کمی بیشی ہوئی کہ میرے تمام اندازے خلط ملط ہو گئے۔ تین بار مجھے ایسا لگا جیسے کار مسلسل دائیں طرف گھومی ہے اور کسی ایک مقام سے دوبارہ گزری ہے۔ دس منٹ بعد کار ایسے ہی تین مرتبہ بائیں جانب مڑی۔ وہ باغبانپورے کی خالی گلیوں میں سے گزر رہے تھے اور غیر ضروری پرپیچ راستہ اختیار کر رہے تھے تاکہ میں وقت یا رفتار سے فاصلے کا اندازہ نہ کر سکوں اور یادداشت کی مدد سے موڑ کاٹتا ہوا اس کے قرب و جوار میں بھی نہ پہنچ سکوں، جہاں وہ مجھے لے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود میں سمت کا تعین کرنے اور کسی حد تک فاصلے کا حساب رکھنے کی کوشش میں مصروف رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم گھوڑے والے پیر کے مزار سے آگے نکل آئے ہیں۔ گھوڑے والے پیر کا مزار انسان کی لامحدود خواہشات اور بے حساب تمناؤں کا مظہر ہے۔ وہ سب جو اپنی کوششوں سے بامراد نہ ہوتے اور دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے کے اندیشے میں مبتلا ہوتے، اس مزار پر ایک گھوڑا لے کر حاضر ہوتے۔ ہر گھوڑا ایک منت کا مادی پیکر تھا۔ یہ زندہ گھوڑے نہیں، دو ڈھائی انچ کے ننھے منے کھلونے تھے۔ مٹی سے لے کر سونے چاندی تک ہر چیز کے بنے ہوئے ـــ سونے چاندی کے گھوڑے میں نے دیکھے نہیں تھے۔ شاید مجاور ان کو اپنی تحویل رکھتے ہوں گے۔ مٹی کے لاکھوں گھوڑے مزار کی دیوار کی ہر منڈیر پر، ہر گوشے، ہر کنارے، ہر محراب اور ہر دروازے پر، سایہ دار دیوار میں اور فرش پر ڈھیر نظر آتے تھے۔ انگلی کے برابر، چار پیروں اور ایک گردن نما حصے پر مشتمل جسے علامتی طور پر گھوڑا فرض کر لیا جاتا تھا ورنہ وہ چوپایا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کتنے من کی مراد پا کے شادکام ہوئے اور وہ کون سا گھوڑا تھا جس کی نذر قبول ہوئی۔

کار یکلخت رک گئی۔ میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹاتے ہی دونوں سیاہ پوش بڑی پھرتی سے نکل کے باہر کھڑے ہو گئے۔ اگر میں چاہتا تو ان کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر حیت کر دیتا جب وہ سر جھکا کے دروازے سے اتر رہے تھے تو دونوں ہاتھ کے ایک ایک وار سے ان کی گردنیں بھی توڑی جا سکتی تھیں اور

ایک بار ان کا ریوالور ہاتھ میں آ جاتا تو آگے بیٹھے ہوئے دونوں سیاہ پوش کچھ نہ کر پاتے کیونکہ ان کو اترنے میں وقت لگتا تھا مگر اس سب کا نتیجہ رابعہ کے حق میں برا نکلتا۔ میں ایک وعدہ کر چکا تھا اور تاوقتیکہ دشمن بد عہدی کا مرتکب نہ ہو، میں وعدہ خلافی کا گنہگار ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ وعدہ میں نے دلاور جیسے کسی بدمعاش کو نہیں، بلکہ رابعہ کی ماں کے بے جان جسم کو گواہ بنا کے کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رابعہ جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جائے تاکہ اس کی عدم موجودگی سے شکوک و شبہات پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے۔ میرے اردگرد رات کی تاریکی میں کسی احاطے کی دیوار پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے میں مختلف قسم کے وزن اٹھانے والے ٹرک، فورک لفٹ ٹرک، ڈمپ ٹرک، کرین اور کنکریٹ مکسر کھڑے تھے جو اندھیرے میں سائنس فکشن فلموں کی عجیب و غریب اعضا والی مخلوق دکھائی دیتے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ خالی ڈرم، ناکارہ ٹائر اور تعمیراتی ساز و سامان کا ڈھیر تھا۔ یہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا یارڈ تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا جغرافیائی اندازہ غلط ہو گیا تھا اور چار دیواری کے باعث گرد و پیش کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کار کو میں نے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہ ڈی سلوا کی نیلی ٹویوٹا کراؤن یا دلاور کی گاڑی نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ جگہ بھی ان کی نہیں۔

"یہاں بھی کوئی چوکیدار تو ہو گا؟" میں نے طنز سے کہا۔ "تمہارے آنے سے پہلے۔"

"اب بھی ہے۔" کار چلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "یہ چوکیدار زیادہ سمجھدار ثابت ہوا اور ہم سے تعاون کرنے پر تیار ہو گیا۔ جاتے وقت ہم اسے معقول انعام دے کر جائیں گے۔ بفرضِ محال تم دوبارہ یہاں آئے تو چوکیدار آج کی رات کے تمام واقعات سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرے گا۔"

وہ اس بیرک کی طرف چلنے لگے جو تقریباً احاطے کے وسط میں بنی ہوئی تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبی اور نو دس فٹ چوڑی جس کے دو حصے تھے اور اس پر ٹین کی عارضی چھت ڈال دی گئی تھی۔ دو بند کھڑکیاں شاید دو کمروں کی تھیں اور ان میں سے ایک کے شیشے روشن تھے۔ دروازہ بجانے پر کسی نے اندر سے سوال کیا۔ "کون ہے؟" اور اسے جواب ملا۔ "تمہارے باپ۔" دروازہ کھل گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر ایک چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر سے تمام سامانِ ضرورت ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ سب سامان اب میز کے نیچے فرش پر پڑا تھا۔ کھانے پکانے کے چند برتنوں اور مٹی کے تیل سے جلنے والے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک چوہے کے ساتھ۔ کمرے میں اس شخص کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جس نے دروازہ کھولا تھا اور وہ بھی ویسا ہی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا جیسا مجھے ساتھ لانے والے چار افراد نے پہن رکھا تھا۔ اس میں ان کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے رابعہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور اس بند مقفل دروازے کو دیکھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ایک سیاہ پوش نے کہا۔ اب یہ تخصیص بھی نہ رہی تھی کہ ان میں سے کون میرے ساتھ بیٹھا تھا اور کون کار کی اگلی سیٹوں پر تھا۔ وہ سب قد و قامت میں بھی برابر تھے اور مجھے شک یہ تھا کہ سب کو آواز بدل کے بات کرنے کی ہدایت تھی چنانچہ ان کی شناخت محال تھی۔ "جب ثابت ہو جائے گا کہ خط وہی ہے جو تمہیں منشی نے بھیجا تھا تو رابعہ بھی آجائے گی۔"

"یہ کیسے ہوگا؟" میں نے کہا۔ "اور کتنی دیر میں ثابت ہوگا؟"

"آنجہانی منشی نے ویسے تو زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہوں گی۔" ایک سیاہ پوش نے لفافے میں سے کاغذات کا پلندا نکالا۔ "مگر مرتے وقت جس غلطی کا ان کو بہت ملال تھا وہ یہی تھی کہ انہوں نے پرانے نسخے آزما کر ایک تحریر تو لکھ دی جسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا مگر وہ یہ چیز ترکیبِ استعمال ارسال کرنا بھول گئے۔ وفات سے قبل انہوں نے علاوہ دیگر باتوں کے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ دوسرا خط بھی پوسٹ کر دیتے جس میں خفیہ تحریر کو پڑھنے کی ہدایات ہوتیں اور تمہیں فون پر مطلع کر دیتے کہ خط آرہا ہے۔ مگر اس میں خود کو الزام دینا تو غلط ہے کہ یہ سب باتیں انہوں نے ہمیں بتائیں اور مر گئے۔ یہ سب تو نوشتۂ تقدیر تھا اور ایسے ہی ہونا تھا۔ اب تم دیکھو، ہم منشی کے آخری الفاظ پر عمل کر کے تمہارے سامنے جادو کا کیا کھیل دکھاتے ہیں۔"

اس نے خط کے صفحات دوسرے سیاہ پوش کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے ایک بیگ کھولا جسے میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ یہ ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والا سیاہ چمڑے کا ڈبے جیسا بیگ تھا۔ اس نے بیگ میں سے ایک اسپرٹ لیمپ نکالا اور میز پر رکھ کے روشن کر دیا۔ پھر اس نے ایک شیشی نکالی جس میں کوئی بے رنگ محلول تھا۔ محلول کو اس نے ایک فرائی پان میں انڈیل دیا، جو چوکیدار کے ساز و سامان میں شامل تھا لیکن اس مقصد کے لیے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ چند منٹ میں محلول اُبلنے لگا اور کمرے میں عجیب سی ناگوار بُو پھیل گئی۔ سائنسی تجربہ کرنے والے نے بیگ میں سے صاف روئی اور ایک چمٹی نکالی۔ چمٹی کی مدد سے روئی کو محلول میں ڈبو کر اس نے کاغذات کا پلندا میز پر رکھا اور پہلے صفحے پر بڑی احتیاط سے روئی پھیرنے لگا۔ اس سے کاغذ گیلا نہیں ہوا۔ وہ کیمیائی محلول بہت تیزی سے اڑ کر خشک ہوتا جا رہا تھا۔ کاغذ پر ابھی تک کسی تحریر کے نقوش نمایاں نہیں ہوئے تھے لیکن وہ سب صبر و سکون اور خاصی دلچسپی کے ساتھ یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے دو میرے دائیں بائیں پہرا دینے کے لیے بھی کھڑے تھے اور ان کو یقیناً حکم ہوگا کہ گڑبڑ کی صورت میں بلا تامل مجھے شوٹ کر دیں۔ درمیان میں ایسے متعدد وقفے آئے جب میں نے نوٹ کیا کہ ان کی توجہ مجھ پر نہیں ہے مگر میں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر مجھے رابعہ کے دوسرے کمرے میں بحفاظت موجود ہونے کا یقین ہوتا تو میں زندگی کی بازی لگا کر یہ جوا ضرور کھیلتا اور شاید جیت بھی جاتا۔ اس کے لیے تو میں اب بھی تیار تھا کہ خدانخواستہ میں نے کسی کی نیت میں فتور دیکھا تو مرنے سے پہلے ایک ایک سے نمٹنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کمرے میں کل پانچ آدمی تھے۔ دونوں مسلح محافظ میرے ہاتھوں اور پیروں کی ایک جنبش میں لیٹ جاتے۔ باقی کو اپنا اسلحہ نکالنے میں کچھ وقت لگتا اور اس بات کے امکانات ففٹی ففٹی تھے کہ میں ان کی گولی کا نشانہ بن جاتا یا وہ اس سے پہلے ہی میرا شکار ہو جاتے۔ مجھے گولی لگنے کی صورت میں بھی صرف زخمی ہونے کے امکانات پچاس فیصد تھے چنانچہ یہ خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ لیکن رابعہ نہ جانے کہاں تھی۔ میری ایک غلط حرکت کا خمیازہ اسے نہ جانے کیا بھگتنا پڑتا اور بات بنتے بنتے ایک بار بگڑ جاتی تو شاید پھر بنائے نہ بنتی۔

سائنسی تجربے میں مصروف سیاہ پوش نے احتیاط سے اسپرٹ لیمپ کو بجھایا۔ فرائی پان کے باقی محلول کو واپس بوتل میں ڈالا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر فرائی پان کو تھوڑا سا پانی ڈال کے کھنگالا اور پانی کو بھی بوتل میں ڈال دیا۔

"یہ سب بعد میں بھی ہوتا رہے گا۔" اس سیاہ پوش نے غرا کے کہا جس نے کاغذات کا وہ پلندا لیا تھا۔

"یس... یس باس!" سائنسداں سیاہ پوش بولا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ بس اب دو منٹ کی بات ہے۔" اس نے فرائی پان کو بھی بیگ میں ٹھونسنا چاہا مگر اس کا ہینڈل اَڑ گیا۔ اس نے ہینڈل کو موڑ کے کام چلایا اور بیگ میں سے ایک اور بوتل نکالی۔ اس کا منہ بند کرنے والا کارک ہٹا کے اس نے تھوڑی سی روئی کو منہ پر رکھا اور بوتل کو اُلٹا۔ پھر اس نے بھیگی ہوئی روئی کو انہی کاغذوں پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا اور میرے دیکھتے دیکھتے

کاغذات پر سطریں نمایاں ہونے لگیں۔ یوں جیسے ہموار زمین کے سینے پر ہل کے چلنے سے لکیریں بنتی جاتی ہیں۔ دس منٹ بعد وہ کاغذات اس شخص کے ہاتھ میں آگئے جسے باس کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے پلنگ پر بیٹھ کے پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ دُور سے میں سُرخی مائل سبز روشنائی سے لکھے ہوئے باریک حروف کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اگر تمہارا ارادہ یہ داستانِ امیر حمزہ پڑھ کے فیصلہ کرنے کا ہے..." میں نے کہا۔

باس ہنس پڑا۔ "اتنے بے تاب کیوں ہو۔ میرے لیے بھی اس میں کوئی نئی اور دلچسپی کی بات نہیں۔" اس نے ایک صفحہ اُلٹ کے چند سطریں پڑھیں۔ پھر دوسرا اور تیسرا صفحہ اُلٹ کے محض ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ "پاگل کا بچہ۔" اس نے زیرِ لب کہا۔ یہ بات اس نے منشی مرحوم کے بارے میں کہی تھی۔ "وقت اور عمر دونوں کو ضائع کیا۔" اس نے جیب سے لائٹر نکالا اور ایک ایک کاغذ کے کونے کو الگ الگ کر کے جلانے لگا۔ کاغذ کے پورا جل جانے تک وہ انتظار کرتا تھا اور پھر راکھ کو جوتے سے مسل دیتا تھا۔

تو یہ تھا انجام۔ اس تمام جدوجہد کا جو منشی مرحوم نے ہمیں ماضی کے رازہائے سربستہ سے آشنا کرنے کی خاطر کی تھی۔ نہ جانے منشی نے کتنا عرصہ ذہنی کشمکش، خلفشار، بے یقینی اور خوف کے عالم میں گزارا ہوگا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا شخص تھا جسے اب اس کا ضمیر پریشان کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے وہ وزیر خان مرحوم کے نمک خواروں میں شامل نہ ہو اور ان کا دوست بھی نہ ہو۔ وہ کسی لالچ یا مجبوری کے باعث وزیر خان کے خلاف سازش کا جال پھیلانے والوں کا ساتھی رہا ہو مگر ظلم کی انتہا اور وزیر خان کی قابلِ رحم موت نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہو کہ خدا ظالم کی رسی کہاں تک دراز کرے گا اور یومِ حساب سے پہلے دنیا میں ہی یومِ مکافات آگیا تو اس کا انجام کتنا عبرتناک ہوگا۔ یہ عمر کا تقاضا تھا یا حالات کی تبدیلی جس نے اسے عاقبت کے خوف میں مبتلا کر دیا ہو اور وہ سوچنے لگا ہو کہ کسی طرح اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی اور اپنے بارِ گناہ کو کچھ تو کم کر لے۔ اور جب اس نے یہ فیصلہ کیا ہوگا تو اسے یہ خیال بھی ضرور آیا ہوگا کہ یہ نیکی اس کا جرم بن گئی تو افشائے راز کو غداری سمجھنے والے اسے کیا سزا دیں گے اور اس کے باوجود سابقہ غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کا جذبہ غالب رہا ہوگا تو اس نے سوچ سمجھ کے عملی قدم اٹھایا ہوگا۔ ایک بار اس نے مجھے فون کیا اور میں اس سے نہ مل سکا۔ دوسری بار وہ ہوٹل میں میرا انتظار کرتا رہا اور کمرے کا نمبر غلط یاد رہ جانے کے باعث اس سے رابطہ قائم نہ ہوا۔ پھر اس نے طے کیا ہوگا کہ ماضی کی کتاب میں سے تمام یادداشتوں کے اقتباسات ترتیب کے ساتھ لکھ دینا بہتر ہوگا جن سے مجھے اپنا حق حاصل کرنے، اپنا تحفظ کرنے اور ظالموں کے خلاف انصاف کے عمل کو مؤثر بنانے میں عملی مدد مل سکے۔ اس نے تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں مگر ایک چھوٹی سی بھول نے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ جب جسمانی تشدد کی تاب نہ لا کے اس نے اعترافِ جرم کیا ہوگا تو اس کے لیے یہ ذہنی عذاب کتنا شدید ہوگا کہ وہ سب جدوجہد رائیگاں گئی جو اس نے دیر آید درست آید کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے کی تھی اور مرتے وقت اُسے یقین ہوگا کہ جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا وہی دنیا میں اس کے اعمال کی سزا تھی۔ جس سے بچا نہیں جا سکتا تھا۔ آخرت کا عذاب اس زندگی کے بعد شروع ہونا تھا۔

مجھے وہ تمام تگ و دو یاد آئی جو ہم نے اور ہمارے دشمنوں نے اس خط کے حصول کی خاطر کی۔ جس میں بابو پوسٹ مین سے رابعہ قاری ایڈووکیٹ تک، سب نے ہمارا ساتھ دیا مگر انجام کیا ہوا۔ اس سعیٔ لاحاصل اور گزرے ہوئے وقت کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش میں منشی اور بہت سے دوسرے رزقِ خاک ہوئے۔ ان کا نشان بھی ایسے ہی مٹ گیا تھا جیسے اس بے نشان تحریر کا اور فرش پر سہ جانے والے سیاہ راکھ کے دھبے کسی کے لہو کا سراغ نہیں دے سکتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے فوزیہ یاد آئی جس نے لکھا تھا ؎

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چند روزہ خدائی تو کوئی بات نہیں

کتنا حوصلہ عطا کیا تھا مجھے اس کی بات نے۔ ناکامیوں سے دل آزردگی کیسی۔ خدا کی خدائی میں دیر تو ممکن ہے، اندھیر ممکن نہیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ اس خط میں لکھا تھا وہ ہمیں کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "یا یہ کہ ہمارے پاس اس کی دوسری نقل موجود نہیں ہے؟"

"ہاں۔" سیاہ پوش بولا۔ "منشی میں جھوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت بہت پہلے جواب دے گئی تھی۔ بعد میں اس نے جو کچھ بتایا اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے سوا یہ باتیں تمہارے کسی خیر خواہ کو معلوم نہیں۔ اس نے کسی اور کو نہیں بتائیں کہ تمہیں بعد میں بتا دے اور اس خط کی نقل کوئی بنا ہی نہیں سکتا۔"

"اس اطمینان کے بعد تمہارے لیے رابعہ کو یرغمال رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اگر ہم اپنے وعدے سے پھر جائیں تو تم کیا کرو گے؟" سیاہ پوش نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"زندہ رہوں گا تو یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "مرنا پڑا تو اکیلا نہیں مروں گا۔"

سیاہ پوش ہنس پڑا۔ "فکر مت کرو۔ ہم بزدل نہیں ہیں کہ وعدہ خلافی کریں۔ ہم نے ویسے بھی تمہیں ایک مہینے کی مہلت دے رکھی ہے۔" اس نے سائنسی تجربات کرنے والے کو اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر! اپنا سامان اٹھاؤ اور باہر گاڑی میں میرا انتظار کرو۔ یہ دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔" اس نے دونوں سیاہ پوشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ بیٹھ کر آیا تھا اور ریوالور لیے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ دوسرا شاید گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ تین سیاہ پوش نکل گئے۔ کمرے میں ایک تو وہی رہ گیا جسے سب باس کہہ کے مخاطب کر رہے تھے۔ دوسرا میرے بائیں ہاتھ پر ریوالور لیے کھڑا رہا۔

"تم نے پیڈرو کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔" باس کہلانے والے سیاہ پوش نے کہا۔ "انہیں اتار دو۔"

"انہیں اتار دوں؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور خود کیا کروں؟ ننگا کھڑا رہوں؟"

"ہم پیڈرو کو بھی ننگا ہی لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔ "تمہارے کپڑے وہیں پڑے ہیں، جہاں سائیں کی لاش پڑی ہے۔"

"سائیں کی لاش؟" میں اچھل پڑا۔ "اس کمرے میں تو کوئی لاش نہیں تھی۔ تم نے مار دیا تھا اسے؟"

"ہاں، لاش دوسرے کمرے میں تھی جہاں سے ہم بات کر رہے تھے، جہاں امیلی فائر پڑا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن اب اسٹور میں پڑی ہے۔"

میرا خون خشک ہونے لگا۔ صبح کے بعد جب اس چوکیدار کی لاش ملے گی تو پولیس میرے کپڑوں کو بھی قبضے میں لے لے گی۔ ان کپڑوں میں میرا پتہ دینے والی کوئی چیز نہیں تھی، سوائے میرے بدن کی بو کے۔ شہر میں مسلسل ہونے والی قتل کی پُراسرار وارداتوں کے بعد پولیس نے اتنا واویلا مچایا تھا کہ پولیس کی خصوصی ماہرین پر مشتمل ٹیم ان کا سراغ لگانے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اگر انہوں نے تربیت یافتہ کھوجی کتے استعمال کیے تو وہ کپڑوں کی بو سونگھ کے میرا نشان تلاش کر لیں گے۔ میں نے سنا تھا کہ پولیس کے پاس ایک مخصوص قسم کے ایسے کتے ہیں جو تین دن بعد بھی آدمی کی بو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ آدمی سیکڑوں کے مجمع میں سے گزر کے میلوں دور کیوں نہ چلا گیا ہو۔ یہ انتہائی تشویشناک بات تھی تو دوسری طرف قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ جو شخص مارا گیا تھا، وہ محسن کی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ غالباً اس کا نشانہ خطا گیا تھا اور وہ شخص بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے محسن ریوالور کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ مرنے والا چوکیدار سائیں تھا جسے خود وہ لوگ مار آئے تھے۔

"تم اگر صبح تک ایسے ہی کھڑے سوچتے رہو گے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" سیاہ پوش بولا۔

میں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس امید میں کہ شاید بعد میں مجھے پہننے کے لیے چوکیدار کے کپڑے مل جائیں لیکن انہوں نے عمداً وہاں سے سب کپڑے ہٹا دیے تھے۔ کوئی اُڑنی، چادر، میز پوش یا پردہ تک نہیں چھوڑا تھا۔ مقصد صاف ظاہر تھا۔ میں بغیر کپڑوں کے ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا اور کار کے پیچھے سڑک پر دوڑ نہیں لگا سکتا تھا۔

"تم نے... تم نے یہاں کے چوکیدار کو بھی مار دیا ہوگا؟" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

سیاہ پوش ہنسا۔ "تمہیں شاید یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے ہم سے تعاون کیا ہوگا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ پہلوان سے مل لو۔" وہ درمیانی دروازے کی طرف بڑھا اور اس کے قفل کو ایک چابی سے کھول دیا۔ کنڈی کھول کے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "آجاؤ بھئی پہلوان! ہمارا کام ختم ہو گیا۔"

دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک شخص تھر تھر کانپتا اندر آگیا جسے پہلوان کہنا "برعکس نہند نام زنگی کافور" والی بات تھی۔ اس کا اصل نام یقیناً کچھ اور ہوگا اور سیاہ پوش اسے تمسخر، تضحیک سے پہلوان کہہ رہا تھا۔ وہ بائیس، چوبیس سال کا انتہائی لاغر اور پستہ قامت، مختصر قسم کا نوجوان تھا جس کی جوانی بھی بچاؤ کے لیے باعثِ شرم تھی مگر اس سے زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

"دیکھا تم نے؟" سیاہ پوش نے قہقہہ مارا۔ "اس سے زیادہ کوئی کیا تعاون کرے گا۔"

"جنابِ عالی!" پہلوان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب تو میرے کپڑے دے دیں۔"

"کیا کرو گے اب تم کپڑوں کا پہلوان!" سیاہ پوش نے جیب سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "البتہ یہ انعام لے لو۔"

اس نے نوٹوں کی گڈی اپنے پیروں کے پاس ڈال دی۔ "پورے دس ہزار ہیں۔ نئے کپڑے بنوا لینا۔" اس کے لہجے میں کوئی بات ایسی تھی جس نے مجھے چونکا کر دیا۔ میں نے چلا کر اس بے وقوف، عاقبت نااندیش اور لالچی نوجوان کو خبردار کرنا چاہا مگر وہ آگے بڑھ چکا تھا اور اس کی پُرہوس نظریں دس ہزار کی گڈی پر جم کے رہ گئی تھیں۔ وہ گڈی اٹھانے کو جھکا ہی تھا کہ سیاہ پوش کا ہاتھ بجلی کی طرح اس کی گردن پر پڑا۔ میں نے واضح طور پر گردن کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز سنی اور اس جواں مرگ کو فرش پر لڑھکتے دیکھا۔ صدمے سے میرا ذہن ماؤف ہو گیا اور میں نے کچھ کر گزرنے کی خواہش پر بڑی سخت جدوجہد کے بعد قابو پایا۔ لیکن اس قتل نے میرے اندر کے اس آدمی کو جھنجھوڑ دیا جو اب تک رابعہ کی خاطر مصلحت کے تقاضے اور مجبوری کے باعث خاموشی سے ہر جائز و ناجائز بات مان رہا تھا۔ کمرے میں اب دو ہی آدمی تھے اور ان کو چابکدستی سے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنی یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ رابعہ بھی یہیں دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ یہ بات مجھے فوراً ہی معلوم ہو گئی۔

"رابعہ کو لے جانے میں تم خود دیر کر رہے ہو۔" چوکیدار کا قاتل سیاہ پوش سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ وہ ماں کا آخری دیدار کر لے اور کسی کو کچھ معلوم بھی نہ ہو تو جاؤ، رابعہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ مگر ایسے نہیں، اپنے کپڑے ہمارے حوالے کر جاؤ۔"

میں نے تعمیل کا ارادہ کیا اور آہستہ آہستہ جرسی اتارنے لگا۔

"لاؤ ادھر پھینک دو احتیاط سے۔" سیاہ پوش نے کہا۔

میں نے جرسی کے بعد بنیان کو اس کی طرف اچھال دیا اور اس عرصے میں میرا ذہن مسلسل مصروفِ عمل رہا لیکن حالات کے سامنے میں بے بس تھا۔ ایک شخص ریوالور کا رُخ میری طرف کیے ذرا سے شبے پر مجھے شوٹ کر دینے کے لیے پہلے تیار کھڑا تھا۔ اور اب اس کے باس نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ میں نے پتلون اتار کے اس کی طرف پھینکی جو اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر اُچک لی۔ اب میرے جسم پر ایک مختصر سا انڈرویئر رہ گیا تھا یا میرے جوتے تھے۔ انڈرویئر سے پہلے میں نے جوتے اور موزے اتارے۔ ابھی تک میرے دماغ میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی جس سے میں ان پر غلبہ حاصل کر سکتا اور اس کے مواقع بھی ناپید تھے۔ مگر اسی وقت باس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھا اور میرے جوتوں اور کپڑوں کی گٹھری لے کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے اس نے اپنے آخری ساتھی کو حکم دیا کہ وہ مجھ سے میرا انڈرویئر بھی لے لے اور پھر دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کے آجائے۔ ماتحت نے ریوالور کا رخ میری طرف رکھا اور گھوم کر دروازے کی سمت آگیا جہاں سے اس کا باس نکل کر باہر جا چکا تھا۔

"دیکھو، کچھ تو شرم و حیا کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ ایک کپڑا تو چھوڑ دو میرے جسم پر۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ باس جو کہہ گیا ہے، وہی ہوگا۔" سیاہ پوش غرایا۔ باس کے جاتے ہی وہ خود باس ہو گیا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے تھوڑا سا جھکتے ہوئے اپنا انڈرویئر بھی اتارا اور یہ دیکھا کہ وہ کچھ جھینپ گیا ہے۔ اس کی نظر ایک پل کے لیے ہٹی تھی کہ میں نے انڈرویئر اس کے منہ پر کھینچ مارا اور غوطہ لگا گیا۔ باہر سے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ریوالور کے فائر کے ساتھ ہی سنائی دی۔ سیاہ پوش نے بینیٹر ابیل کے کونے کی طرف ہونا چاہا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔

"یہ کیا ہے...؟" باہر سے کسی نے چیخ کر جملے کا اختتام ایک غلیظ گالی پر کیا۔ اس وقت تک میں نے سیاہ پوش کو اوپر اٹھا لیا تھا۔

میں نے ایک غلیظ تر گالی دی۔ "ابھی بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہے...!" میں نے سیاہ پوش کے کچھ بولنے سے پہلے چلا کر کہا۔ سیاہ پوش نے ایک اور گولی چلائی جو زمین پر لگی۔ میں نے سیاہ پوش کو اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ بلبلایا۔ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ باہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے باقی افراد نے فرض کر لیا کہ ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔

"گاڑی چلاؤ۔" اسی شخص نے چیخ کر کہا جو باس بنا ہوا تھا۔ "مرنے دو اس حرامزادے کو۔"

گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سنتے ہی پیچھے رہ جانے والے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ دیوار کے پاس لاش کے قریب جا گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ وہ عوامل بہت سے تھے جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا۔ میرے ذہن میں رابعہ پر ہونے والے تشدد کی یاد بھی تھی۔ وہ صدمہ بھی تھا جو رابعہ کی ماں کے بیٹی کو دیکھے بنا مر جانے سے ہوا تھا۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا ردِعمل بھی تھا۔ اپنی بے حجابی سے ہونے والی تذلیل کا احساس بھی تھا۔ میں نے اس پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ لاتیں اور گھونسے مار مار کے میں نے اسے تقریباً مار ڈالا تھا کہ اچانک میرے ایک وار سے وہ اچھل کر ریوالور کے قریب جا پڑا۔ لیکن ریوالور پر قبضہ کرتے ہی اس کے ہاتھ نے میرا انہیں خود اپنا نشانہ نہ لیا۔ میں اس وقت بھی حرکت میں تھا اور اس پر جست لگا چکا تھا۔ اس نے خود کو میرے مقابلے میں بہت کمزور اور بے بس و تنہا پا کے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے مگر میں نے اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں ہونے دی۔ جو گولی وہ اپنی کنپٹی پر چلانے والا تھا وہ میرے اس پر جا پڑنے سے شانے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں لگی۔ ریوالور پھر اس کی گرفت سے نکل گیا — میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے فرش پر مارا۔ وہ آخری بار کراہا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

میری وحشت اور دیوانگی اس خیال کے ساتھ ہی کافور ہوگئی کہ وہ مر چکا ہے — میں اسے چھوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ اس کے شانے کے زخم سے بہنے والا لہو میرے بے لباس بدن پر لگ گیا تھا اور خود سیاہ پوش کے لبادے کو تر کر رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے گرم انسانی خون کی مہک سے ابکائی آئی اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک گھڑونچی پر چھوٹا سا مٹکا اور ڈھکنے پر سلور کا مگ رکھا تھا۔ میں نے مگ سے پانی نکالا اور اپنے جسم پر سے خون کو دھو دیا۔ نشان نہ رہنے کے باوجود وہ بُو میرے دماغ میں بسی رہی۔ پھر میں نے انڈرویئر پہنا اور اس سیاہ پوش کو جھک کر دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور گولی سے صرف شانے کا گوشت اُدھڑا تھا۔ میں نے پھر گھڑونچی کے پاس آکے ایک مگ بھرا اور دو گھونٹ پانی پی کے باقی سے اپنے منہ پر چھینٹے مارے۔ میرا دہکتا ہوا چہرہ ٹھنڈا پڑنے لگا اور میں سر جھٹک کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ ایک کھڑکی سے یوں بندھی بیٹھی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ باندھ کے کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ جکڑ دیے گئے تھے۔ پیر دوسری رسی سے باندھے گئے تھے اور دوسری رسی کا آخری سرا ایک دروازے کے ہینڈل میں بندھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا اور غالباً دوسری طرف سے باہر جانے کا راستہ تھا۔ اس پوزیشن میں رابعہ کے لیے دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھنا ہی ممکن تھا۔ نہ وہ لیٹ سکتی تھی اور نہ کھڑی ہوسکتی تھی۔ اس کے منہ میں ایک میلا سا کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا چنانچہ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی لیکن سب سے زیادہ شرمناک اور باعثِ ذلت بات یہ تھی کہ وہ رابعہ کو بھی بے لباس چھوڑ گئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے جسم پر نام کو ہی سہی ستر پوشی کے لیے کچھ تو ہے ورنہ میرے لیے رابعہ کا سامنا کرنا کہیں زیادہ دشوار ہوتا۔

اس کمرے میں آنے والی روشنی وہی تھی جو دوسرے کمرے سے دروازے کے راستے پہنچ رہی تھی۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رابعہ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہا جو میں نے نہیں سنا۔ میں لپک کر واپس دوسرے کمرے میں جا پہنچا تھا۔ وہاں میں نے میز کے نیچے پڑے ہوئے سامان میں سے چھری اٹھائی اور واپس بھاگا۔ ذرا سی دیر میں ساری رسیاں کٹ گئیں۔ جس بات نے مجھے حیران کیا وہ یہ تھی کہ رسی کی ہر گرہ تو سخت تھی مگر کلائی پر یا ٹخنوں کے پاس رسی ڈھیلی رکھی گئی تھی۔ صرف اس حد تک کہ جلد پہ نشان نہ پڑیں مگر حلقہ اتنا بڑا بھی نہ ہو کہ رابعہ زور لگا کے ہاتھوں یا پیروں کو نکال لے۔

"رابعہ! میری جان!" میں نے بے اختیار اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "مجھے معاف کردو۔ میری وجہ سے تمہیں بڑا ظلم سہنا پڑا۔ بہت دکھ اٹھانے پڑے۔ میں سخت گنہگار ہوں، تمہارا مجرم ہوں۔"

"سکندر..." وہ آہستہ آہستہ سسکتے ہوئے بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہارا کیا قصور ہے اس میں؟"

"یہ سب میرا قصور ہے۔ میری وجہ سے تم پر سب آفات آئیں۔ نہ میں تمہارے پاس آتا نہ یہ سب کچھ ہوتا۔" میں نے اس کی بند آنکھوں سے بہتے ہوئے خاموش آنسوؤں کو نرمی سے صاف کیا۔ اس وقت ہم میں سے کسی کو احساس تھا تو اپنے اپنے جذبوں کی صداقت کا اور اپنے خلوص کا اور اپنی نیک نیتی کا۔ ہمارے جذبات میں پاکیزگی اور طہارت کی خوشبو تھی اور وہ آلائش کہیں نہ تھی جو جسموں کے بے حجابانہ اتصال سے جنم لیتی ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں نے رابعہ کی زندگی بچالی اور خود اپنی نظر میں رسوا نہیں ہوا۔

"میں تمام عمر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔" میں نے اس کے سر کو تھپکا۔ "میری وجہ سے تم پر اتنا ظلم ہوا۔ لیکن رابعہ! خدا کی قسم! میں تمہارے جسم سے بہنے والے ہر قطرۂ خون کا انتقام لوں گا۔ میں ان درندوں کو معاف نہیں کروں گا۔"

رابعہ نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تم جذبات میں پاگل ہو رہے ہو۔ مجھ پر کسی نے تشدد نہیں کیا۔ انھوں نے دو مرتبہ مجھے کلوروفارم سنگھا کے بیہوش ضرور کیا تھا۔ ایک اغوا کرتے وقت ایک مرتبہ بعد میں۔ یا اس وقت..." اس کا چہرہ لال ہوگیا۔ "مگر اس وقت بھی انھوں نے باندھنے کے سوا کچھ نہیں کیا اور وہ بھی بہت معذرت کے ساتھ۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "گزشتہ بار میں نے تمہیں دوسری جگہ دیکھا تھا۔ اُدھر دارو محمد والا کی طرف ایک زیرِ تعمیر کوٹھی کے تہہ خانے میں، تو تم لہولہان تھیں!"

"لہولہان؟" وہ مجھ سے زیادہ حیران ہو کے بولی۔ "انھوں نے تو مجھ پر انگلی بھی نہیں اٹھائی۔ مجھے بہت آرام سے رکھا اور بار بار معافی مانگتے رہے کہ وکیل صاحب ہم اس خط کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو لانے پر مجبور تھے۔ خط مل جائے گا تو ہم آپ کو گھر بھی چھوڑ آئیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سکندر پر کسی طرح دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا۔ میں نے تو انھیں بتا دیا تھا کہ سکندر اس طرح دباؤ میں نہیں آئے گا مگر تم تو ذرا مزاحمت نہیں کرسکے۔"

"مزاحمت میں کیسے کرتا رابعہ!" میں نے پلکیں جھپکاتے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تمہارا لباس تار تار تھا اور خون میں تر تھا۔"

"تمہیں دھوکا ہوا ہوگا سکندر!" وہ بولی۔ "یا انھوں نے تمہیں دھوکا دینے کے لیے مجھے بے ہوش کرنے کے بعد مجھ پر رنگ، سرخ روشنائی یا کسی جانور کا خون وغیرہ ڈال دیا ہوگا۔ مجھے تو جب دوبارہ ہوش آیا تھا تو میں وہیں لیٹی تھی جہاں مجھے پہنچایا گیا تھا اور میرے کپڑے بھی وہی تھے۔ بالکل صاف۔ میرے جسم پر یا لباس پر خون کا ایک داغ تک نہیں تھا۔"

'ڈرامہ!' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ 'یہ سب مجھے دہشت زدہ کرکے اپنی بات منوانے کے لیے کیا گیا تھا۔' ایسا ڈرامہ دلاور کا شاطر ذہن ہی اسٹیج کرسکتا تھا۔ وہ نفسیاتی طریقے استعمال کرکے ذہن پر مسلط ہونا جانتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بار بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ زیادہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔

"وہ خط تو میں نے ان کو دے دیا۔" میں نے کہا۔

"خط دے دیا؟" رابعہ نے کہا۔ "لیکن خط تو امی کے پاس تھا۔"

"میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ممانے ان... ان سے لے لیا تھا، اور اب اس کی راکھ بھی نہیں۔"

"لیکن کیوں سکندر!" وہ میرا ہاتھ تھام کے بولی۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں مجبور تھا رابعہ!" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے تمہارے احساسات کا احساس تھا۔ بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تمہیں صرف تمہاری خاطر چاہنے لگا ہوں تمہیں اگر یقین نہیں آتا تو ایک دن ضرور آجائے گا۔ ایک بار میں نہ سہی، ایک سال میں — ایک سال میں نہ سہی، ایک عمر میں۔ کل تک مجھے بھی اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا مگر آج میں یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم تھا ایک دن تمہیں یہ احساس ضرور ہوگا۔" وہ آنکھیں بند کرکے بولی۔ "لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ ایسے غلط وقت اور ایسی غلط جگہ پر ہوگا۔"

میں خفت زدہ ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "وہ لوگ جاتے وقت میرے اور تمہارے کپڑے بھی لے گئے ہیں تاکہ ہم فوراً ان کا تعاقب کرنے کے لیے نہ نکل سکیں۔"

"یہاں کوئی چیز تو ہوگی؟" رابعہ نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں ایک چوکیدار تھا۔ وہ اسے بھی مار گئے ہیں اور اس کے کپڑوں کے علاوہ بالشت بھر کا رومال تک چھوڑ کر نہیں گئے تھے، لیکن میں نے تھوڑی سی ہمت کرکے ان کا ایک آدمی رکھ لیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کپڑے پہن کے میں باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں تھا اور یہ لباس بھی اب خون آلودہ ہے۔ مجھے پولیس گھیر کر تھانے لے جائے گی تو خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔"

"اور اس لباسِ فاخرہ میں باہر نکلو گے تو کوئی کچھ نہیں کہے گا؟" وہ بولی۔

"نہیں۔ وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ اب تم اطمینان سے یہاں بیٹھو، میں آدھے پون گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کمرے میں مت جانا، وہاں ایک لاش پڑی ہے اور ایک یرغمالی بیہوش پڑا ہے۔ اس کا میں بندوبست کر جاؤں گا۔"

میں نے سیاہ پوش کو انھی رسیوں سے باندھا جو میں نے رابعہ کے ہاتھوں اور پیروں پر سے کھولی تھیں۔ اس کے زخم سے رسنے والا خون منجمد ہو کے رک گیا تھا اور اس کی موت کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ وہ ہوش میں آجائے تو فرار ہونے کی کوشش کرے یا اس کے وہ ساتھی جو افراتفری میں فرار ہوگئے تھے لوٹ کر اس کی لاش لے جانے کے لیے نہ آجائیں۔ جلدی میں انھوں نے فرض کرلیا تھا کہ وہ مارا گیا۔ بعد میں ان کو خیال آسکتا تھا کہ وہ مرا نہ ہو، صرف زخمی ہوا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اسے زندہ یا مُردہ ہر صورت میں ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے، اور لے جا نہ سکے تو مار جائیں گے مگر پولیس کے یا ہمارے ہاتھ نہیں پڑنے دیں گے کہ وہ کسی ساتھی کے بارے میں کچھ بتا نہ سکے۔ میں نے اس کا ریوالور لیا اور پھر رابعہ کے پاس آگیا۔

"افسوس یہ ہے کہ یہاں تاریکی کے سوا تمہارے لیے کوئی لباس نہیں۔" میں نے کہا۔ "اندھیرے میں تمہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن تم باہر دیکھ سکتی ہو۔ یہ بتاؤ، ریوالور چلانا آتا ہے؟"

"آتا ہے۔" وہ بولی۔ "میرے پاس اپنا ریوالور بھی ہے اور لائسنس بھی۔"

"تو یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں نے ایک کرسی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی جلدی سی کرسی گھسیٹ کر کہا۔ "یہاں سے تم گیٹ پر نظر رکھ سکتی ہو۔ اگر وہ اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے آئیں گے، تو گاڑی میں آئیں گے اور اسی راستے سے آئیں گے۔ میں باہر سے دروازہ مقفل کر جاؤں گا تاکہ وہ آسانی سے اندر نہ آسکیں۔ جو بھی دروازے کے قریب آنے کی اور تالا توڑنے کی کوشش کرے اسے بے دریغ گولی مار دینا۔ غنیمت ہے کہ اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے ورنہ اب تک تو یہاں مجمع لگ چکا ہوتا۔ نشانہ کیسا ہے تمہارا؟"

"ٹارگٹ شوٹنگ کلب کے مقابلوں میں گزشتہ سال میرا دوسرا نمبر تھا۔" وہ بولی۔

"تو یہ دیکھنا کتنے آدمی آئے ہیں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ریوالور میں چار گولیاں ہیں۔ اگر دو ہی آدمی آئے تو تم باقی دو گولیاں گاڑی کو ناکارہ بنانے میں صرف کرنا۔ دو ٹائر فلیٹ کر دینا کم سے کم۔ تین ہوں تو ایک ٹائر پھاڑ دینا۔ ویسے تو مجھے امید ہے کہ ایک کے گرتے ہی وہ بھاگنے کی کوشش کریں گے لیکن گاڑی کو روکنا بے حد ضروری ہے۔ وہ اگر مارے نہ جائیں اور زخمی ہو کے گر جائیں تو مزید بہتر۔ یہ تمہاری ٹارگٹ شوٹنگ پریکٹس کا امتحان ہوگا۔ جرأت اور ہمت تو تم میں اچھے اچھے مردوں سے زیادہ ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ واپسی پر سب انتظام کر کے لوٹوں گا۔ اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ اگر پانچ کے بجائے چھ بھی بج جائیں تو گھبرانا نہیں۔ میرا خیال ہے آٹھ نو بجے سے پہلے یہاں کوئی نہیں آتا ہوگا۔"

لائٹ آف کرنے کے بعد جب میں چوکیدار کی چابی سے دروازے کو مقفل کر کے باہر نکلا تو میں نے آسمان پر صبح کے ستارے کو روشن دیکھا۔ "خداوندا!" میں نے دعا مانگی۔ "تیری مدد سے میں ایک آزمائش سے کامیاب گزرا۔ مجھے استقلال اور استقامت دے کہ میں اس امتحان میں پورا اتروں جو مجھے درپیش ہے۔ ابھی رابعہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے اور اسے یہ صدمہ برداشت کر لینے کی توفیق دینے والا بھی تو ہی ہے۔ اسے زندگی کے لیے حوصلہ اور صبر دے اور مجھے اس کا ساتھ دینے اور اس کی حفاظت کرنے کے قابل بنا۔" دعا مانگ کے میں نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے کھڑکی کے اندھے خلا میں ایک سائے کے وجود کا احساس ہوا جو محض میرے تصور کا کرشمہ تھا ورنہ وہاں پر کچھ نظر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے لیے رابعہ کا حوصلہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ اتنا کچھ برداشت کر لینے کے بعد بھی وہ کسی خوف کے مہٹریا میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔

اور اس وقت بھی ایک اندھیرے اور مقفل کمرے میں ... اور ایک زخمی مجرم کے ساتھ جس حالت میں بیٹھی تھی اور ... مزاجی اور قوتِ برداشت کے ساتھ اس دہشت ناک ... حال کا مقابلہ کر رہی تھی، وہ کسی عام عورت کے بس کی بات ... تھی جو اِن حالات میں خود بیہوش پڑی ہوتی۔ عورت ... خاصے مردوں کی اس وقت گھگھی بندھ جاتی ہے لیکن ... لیے مسلح ہو کے آنے والے دشمنوں سے اکیلی نمٹنے کے ... بیٹھی تھی۔ بے بس آدمی کا اعتماد کتنا کم ہو جاتا ... تلخ تجربہ ایک رات مجھے ہو چکا تھا۔ رابعہ عورت تھی ... لیے یہ کہیں زیادہ صبر آزما مرحلہ تھا مگر اس نے حقائق ... کر لیا تھا کہ یہ فنا اور بقا کی جنگ ہے جس میں وہ بھی ... ایک فریق ہے، اور ہم دونوں میں اب کوئی فرق نہیں ...

احاطے سے نکلتے ہوئے مجھے ایک اور خیال آیا ... نے گیٹ کو اندر سے بھاری کنڈی لگا کے بند کیا اور ... دروازے کے اوپر سے باہر کود گیا۔ اب کوئی گاڑی لے کر ... گا تو سیدھا اندر نہیں جا سکے گا۔ اسے روک کر دروازہ کھولنا ... ہوگا اور رابعہ کو تیار ہونے کے لیے وقت مل جائے گا ... پر آ کے میں نے دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔ تاحدِ نظر کوئی ... ذی روح متحرک نہ تھا۔ صرف میں تھا جو ایک اندھیرے میں ... ننگے پیر تارکول کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چل رہا تھا۔

ابھی میں نے سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے ... کا کھمبا نظر آیا۔ میری نظر نے ٹیلیفون لائن کے ساتھ ... لائن ایک دو منزلہ مکان تک گئی تھی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا ... میں نے ہمت کر کے کال بیل دبائی۔

"ڈِنگ ڈانگ ..." اندر سے میوزیکل بیل کے ... بول سنائی دیے۔ پھر خاموشی پہلے کی طرح مسلط ہو گئی ... کال بیل کے بٹن کو بار بار دبایا۔ بالآخر اوپر کی منزل پر ایک ... کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے۔ کسی نے ایک پٹ کھولا ...

"کون ہے اس وقت بھائی؟ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ..." لہجہ کچھ جھلایا ہوا اور بیزار گانہ تھا۔

بولنے والا لوہے کی گرل میں سے سر نکال کے ... سکتا تھا ورنہ میری ہیئت کذائی دیکھتے ہی وہ مجھ ... پولیس کو فون کر دیتا۔ "مجھے ڈاکٹر صاحب سے نہیں ملنا ... ایک ضروری فون کرنا ہے۔" میں نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی پبلک کال آفس ... آ گئے شریفوں کی نیند حرام کرنے۔" کھڑکی دھڑ سے بند ... میں نے پھر پش بٹن کو دبایا۔ کھڑکی سخت برہمی کے عالم ...

کھولی گئی۔ "اب جاتے ہو یا ... "

"حضور مجھے کسی کے انتقال کی خبر دینی تھی۔" میں نے بزرگوار کے کچھ اور ارشاد فرمانے سے پہلے کہا۔

انہوں نے بڑی قرأت کے ساتھ اناللہ پڑھی اور لہجہ بدل کے بولے۔ "معاف کرنا بھائی! فون خراب ہے۔ ذرا آگے تھانیدار حشمت خان رہتا ہے۔ اس کے گھر سے کر لو۔" کھڑکی پھر بند ہو گئی۔

تھانیدار حشمت خان؟ وہی خبیث؟ وہ یہاں رہتا ہے۔ میں نے اس انکشاف پر حیران ہو کے سوچا۔ ان بزرگوار نے دوسرا ناقابلِ تردید اور معقول عذر پیش کر کے مجھے فون تو نہیں کرنے دیا تھا مگر بڑی کارآمد بات بتا دی تھی۔ اب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ حشمت خان کا پتہ معلوم کیا جا سکتا تھا اور اس کے گھر سے سو گز دور وہ یارڈ تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ اس وقت حشمت خان کو جگانا مناسب ہوگا یا نہیں؟ وہ فون تو کرنے دے گا مگر تفتیش بھی کرے گا اور بہت سی باتیں جو میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا، اسے بتانی پڑیں گی۔

میں نے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ کوئی شریف آدمی نظر آ جائے تو اسے اپنی "بپتا" سنا کے اس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن سڑک پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میرے کانوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی سی آواز سنی۔ آواز قریب ہوتی گئی اور پھر اندھیرے میں گھڑسوار گشتی پولیس کے دو سپاہی نمودار ہوئے۔ میں کمر پر ہاتھ رکھ کے سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ چوکنے ہو گئے۔

"کون ہے میاں؟" ان میں سے ایک نے قریب آ کے اترتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے تکلفاً رائفل کا رخ میری طرف رکھا۔

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آدمی یا گھوڑا؟"

"بک بک کرتا ہے حرامی۔" نیچے اتر آنے والے نے مشتعل ہو کے کہا۔ "صورت سے ہی چور لگتا ہے۔"

"آج ہاتھ آیا ہے۔" دوسرے نے بڑی موٹی گالی دے کر کہا کیونکہ اس کا عہدہ ایک لال فیتے کے برابر اونچا تھا۔ "ہم بھی کہتے تھے، اس علاقے میں اچانک چوری کی وارداتیں کیوں بڑھ گئی ہیں۔"

"اور تمہیں افسوس ہوگا کہ یہ کون ہے جو تمہارا حصہ نہیں پہنچا رہا ہے؟" میں نے طنز سے کہا۔ "بڑا زبردست اور کامیاب چھاپہ مار کر تم نے بالآخر اسے گرفتار کر ہی لیا۔ آفرین ہے تمہاری ذہانت اور فرض شناسی کو۔"

اب ہیڈ کانسٹیبل بھی نیچے اتر آیا۔ "بھونکتا ہے کتے۔" اس نے رائفل کا بٹ اٹھایا۔

"بکواس بند کرو۔" میں ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ "اور مجھ سے ہوش میں رہ کے بات کرو۔ میں ایس پی ضامن رضوی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تھانیدار حشمت خان یہیں رہتا ہے۔ اس سے پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ لو۔ یہ میں تم سے بعد میں پوچھوں گا کہ تم گشت کر رہے تھے یا کہیں سو رہے تھے۔"

ان دونوں نے بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھا۔ "کوئی واردات ہو گئی ہے جناب؟" کانسٹیبل نے لہجہ فوراً بدل لیا۔

"جی جناب!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس سڑک پر وڈا کو راہ گیروں کو ایک گھنٹے تک لوٹتے رہے۔ انہوں نے میرے کپڑے تک اتروا لیے۔ تم اتنی دیر تک کہاں رہے؟ اور اب آتے ہو تو ایک شریف آدمی کو گالی دے کر بات کرتے ہو؟"

"ہم ... ہم معافی ... معافی چاہتے ہیں جنابِ عالی!" ہیڈ کانسٹیبل کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے فوراً اپنی لال پٹی کے اتر جانے اور اپنے دوبارہ کانسٹیبل کے عہدے پر مراجعت کے خیال نے ہراساں کر دیا تھا۔ "ہم آپ کی کیا مدد کریں؟"

"کچھ نہیں، بس مجھے تھانے لے چلو۔ مجھے گھر فون کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فوراً مجھے اپنا گھوڑا پیش کیا لیکن میں نے اس کے پیچھے بیٹھنا بہتر سمجھا۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے غلط رویے کی کسی سے شکایت نہ کروں۔ "ہم بیوی بچوں والے ہیں۔ نوکری سے جائیں گے تو فاقے کرنے پڑیں گے۔" ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "محنت مزدوری کرتے شرم آتی ہے کیا؟ یا تن آسانی اور حرام خوری کی عادت ہو گئی ہے؟"

"آپ کا جتنا نقصان ہوا، ہم پورا کر دیتے ہیں جناب عالی! بس ہمیں معاف کر دیں۔" ہیڈ کانسٹیبل پر رقت طاری ہونے لگی اور میں نے انتہائی فراخدلی سے کام لیتے ہوئے ان کو معاف کر دیا۔

دس منٹ بعد میں جس شان سے تھانے میں اترا، اس نے ڈیوٹی پر متعین عملے کو بھی حیران کیا اور اندازہ تو انہوں نے بھی یہی ــــ لگایا تھا کہ گشتی پولیس کے مستعد جوان کسی شرابی آوارہ گرد یا چور کو پکڑ لائے ہیں مگر مجھے لے کر آنے والوں نے نظروں ہی نظروں میں ان کو ایسا اشارہ کیا جو میں نہ دیکھ سکا اور استقبال کے لیے آگے بڑھنے والے یکلخت محتاط ہو گئے۔ میں نے سیدھا ایس ایچ او کے کمرے کا رخ کیا جہاں ایک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ مجھے یوں بے باکانہ اور اس حلیے میں اندر آتے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ گیا مگر میں نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟" وہ غرا کے بولا۔

"ایس پی ضامن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ملاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "میں ان کا بھائی ہوں۔" سب انسپکٹر کا موڈ مجھ سے فون نمبر پوچھنے کے بعد بدلا۔ نمبر ملا کے اس نے ریسیور مجھے تھما دیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

تقریباً تین منٹ بعد رضوی صاحب نے ریسیور اٹھایا اور ان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "ضامن رضوی۔"

"میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سکندر!" وہ چونک کر بولے۔ "کہاں سے بول رہے ہو اس وقت...؟"

"میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ باغبانپورہ..."

"آخر یہ کیا مصیبت ہے؟" ان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "آدھی رات کو تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ شام سے رات تک ہم کھانے پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ اسلام آباد سے شیروانی صاحب کی وائف نے فون کیا تھا۔"

"وہ جوڈیشل سیکرٹری ہیں۔" میں نے سب انسپکٹر کو سنانے کے لیے ایک احمقانہ بات کی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اور کتنے شیروانی ہیں جن کی بیویاں مجھے فون کر کے تمہارا پتہ پوچھیں گی؟"

"ان سے بات ہو گئی تھی میری۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے موقع ہی اب ملا ہے آپ کو اطلاع دینے کا کہ میں رات کو کھانے کے وقت گھر کیوں نہیں پہنچ سکا۔ آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ سے واقف ہیں نا — ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ دو بجے اٹھایا جائے گا۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" ضامن رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کیسے؟"

"ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال میں تھیں۔ میں لاش لے کر گھر بہت دیر سے پہنچا مس رابعہ کے گھر۔" میں نے کہا۔

"اور اب وہاں تھانے میں کیا کر رہے ہو؟"

"مجھے مجبوراً یہاں آنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "آپ کو فون کرنے کے لیے۔ میں انتقال کی اطلاع دینے آیا تھا ادھر۔ واپسی پر سواری نہیں ملی اور ایک چھوٹی سی واردات ہو گئی۔"

"کیسی واردات؟" وہ پریشانی سے بولے۔ "تم خیریت سے ہو نا؟"

"جی میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ دو بدمعاشوں نے مجھے اکیلا پا کے لوٹ لیا تھا۔"

"تو میں گاڑی بھیج دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"نہیں آپ گاڑی نہ بھیجیں۔ میں محسن سے کہہ دیتا ہوں، وہ رابعہ کی گاڑی لے کر آ جائے گا۔ بس آپ کو اطلاع دینی مقصود تھی۔" میں نے کہا۔ "میں یہاں سے رابعہ کے گھر جاؤں گا اور تدفین تک وہیں رہوں گا۔ آپ آئیں گے؟"

"میں تدفین میں ضرور آؤں گا۔ کون ہے ڈیوٹی پر۔ فون دو ذرا اسے۔"

"ایس پی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ واردات کے ذکر سے ہی وہ پریشان ہو گیا تھا۔ ریسیور لیتے ہی وہ بوکھلا گیا اور معلوم نہیں رضوی صاحب نے اس سے کیا کہا۔ اس کے حلق سے "یس سر" کے سوا کچھ نہ نکلا۔

ریسیور رکھ کے اس نے اطمینان کا سانس لیا اور مجھ سے واردات کی تفصیل پوچھنی چاہی تاکہ رپورٹ لکھی جا سکے لیکن میں نے کہا کہ میرا ارادہ کوئی رپورٹ لکھوانے کا نہیں ہے۔ ایک کپڑوں کے جوڑے اور ڈیڑھ سو یا دو سو روپے کی خاطر میں کسی جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کی اجازت کے بغیر رابعہ کے گھر کا نمبر ملایا۔

"محسن!" میں نے ریسیور اٹھانے کی آواز سنتے ہی کہا۔

"میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر!" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا، کہاں ہے تو؟ رابعہ ملی؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اب تو ایسا کر کہ رابعہ کی گاڑی لے کر آ جا، چابیاں گاڑیاں میں موجود ہوں گی۔ آتے وقت میرے لیے کپڑوں کا ایک جوڑا لیتے آنا اور ایک جوڑا زنانہ کپڑوں کا بھی۔ کتنی دیر میں آئے گا تو؟"

"میں؟ میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ۔ بشرطیکہ گاڑی وہیں ملی جہاں کھڑی تھی اور چابیاں بھی موجود ہوئیں۔ بصورت دیگر ٹیکسی لینے میں دیر ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

محسن کے آنے تک تھانے میں خاصا ہنگامہ رہا۔ سب انسپکٹر نے گشت کرنے والے سپاہیوں کو ان کی غفلت پر جھاڑ پلا کے اپنی افسرانہ ذمے داری پوری کی۔ پھر میرے لیے اسپیشل چائے منگوائی۔ مجھے یہ پیش کش بھی کی گئی کہ میں چاہوں تو یہیں سے گاڑی کا اور ضرورت کی تمام چیزوں کا بندوبست کر دیا جائے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ شاید تھانے کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہو گا جب ایک ننگ دھڑنگ شخص کے ساتھ یہ وی آئی پی

جیسا سلوک کیا گیا اور اس کی واقعی عزت افزائی ہوئی ورنہ مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب میں انتہائی شریفانہ اور معزز حلیے میں حشمت خان اینڈ کمپنی کے ہاتھوں دوسرے تھانے میں ذلیل ہوا تھا۔

محسن ٹھیک چالیس منٹ بعد فاکس ویگن کو ریس کار کی طرح دوڑاتا تھانے میں داخل ہوا تو آواز پر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر محسن بھونچکا رہ گیا۔ لیکن میں نے اسے تسلی دی کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ لباس تبدیل کیا اور سب انسپکٹر سے ہاتھ ملا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اب ادھر۔" میں نے محسن کو اشارے سے بتایا۔ "رابعہ کو لینا ہے۔ ریوالور لایا ہے تو؟"

"ہاں۔ کوئی خطرے کی بات ہے کیا؟" وہ بولا۔

"ہو بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ فاکس ویگن اتنی دیر میں یارڈ تک پہنچ چکی تھی۔ خلاف توقع مجھے بیرونی پھاٹک کھلا ہوا نظر آیا۔ "بلکہ شاید ہے۔ تو کار یہیں روک لے، اور ریوالور مجھے دے دے۔"

"آخر بات کیا ہے؟" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔

"بات لمبی ہے، پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ریوالور لے کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اندر اترتے ہی مجھے وہ گاڑی دکھائی دی جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ گاڑی ایسی پوزیشن میں کھڑی تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا گاڑی میں آنے والوں نے بھاگنا چاہا تھا مگر اگلا ٹائر برسٹ ہونے سے گاڑی بے قابو ہو گئی اور جھاڑیوں میں سے گزر کے خالی ڈرم کے ڈھیر میں گھس گئی۔ اگر اس میں کوئی ہوتا تو مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا کیونکہ میں کھلے میدان میں تھا اور صبح کاذب کے اجالے میں صاف نظر آتا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے کار کے اندر بھی کوئی نہیں ملا۔ میں نے اس کا کلوز کمپارٹمنٹ کھولا اور اس میں سے تمام کاغذات نکال لیے۔ پھر میں گیٹ سے باہر گیا اور محسن کے ساتھ کار میں اندر پہنچا۔ بیرک کا دروازہ بدستور مقفل دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رابعہ نے شاید اپنی فاکس ویگن دیکھ لی تھی۔ اس کی روشنی بہت کم تھی لیکن پھر بھی مجھے دروازے کے قریب خون نظر آ گیا اور میں سمجھ گیا کہ رابعہ نے "ٹارگٹ شوٹنگ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی نہ کسی حملہ آور کو زخمی کر دیا ہو گا۔ باقی جان بچا کے بھاگ گئے اور انہوں نے دام بہ منجھ کے نکل جانے کی کوشش کی۔ مگر رابعہ نے اُن کی یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔ قفل کھول کے اندر جانے کے بعد جب میں نے لائٹ جلائی تو محسن بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے رابعہ کے کپڑے دروازے میں سے اندر پھینک دیے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" محسن نے کہا اور فرش پر سے دس ہزار کے نوٹوں کی گڈی اٹھا لی۔

"ایک تو وہ لالچی ہے جو انہی نوٹوں کی خاطر مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ جاتے وقت یہ رقم اٹھانا بھی بھول گئے ہیں۔ خیر... حق بحقدار رسید۔ ہم معلوم کریں گے کہ چوکیدار کے لواحقین کون ہیں اور یہ رقم ان کو پہنچا دیں گے۔ دوسرا شخص اب تک شکاری تھا لیکن اب ہمارا پہلا شکار ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم اپنے طریقۂ تفتیش سے کیا کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

رابعہ کپڑے پہن کر دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ اب بھی حیا سے لال ہو رہا تھا۔

"وہ آئے تھے اپنے ساتھی کو لے جانے کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "میں نے ایک کی ٹانگ میں گولی ماری، باقی اسے لے کر بھاگ گئے۔ ٹائر برسٹ ہو جانے کے باوجود وہ نکل گئے۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "اگر اس وقت میں یہ کہوں کہ رابعہ سے زیادہ حوصلہ مند عورت میں نے نہیں دیکھی تو یہ مبالغہ قطعی نہیں ہو گا۔ اب ذرا میری مدد کر۔ پہلے تو جنگی قیدی کو شفٹ کر دیں اور پھر خود بھی فوراً نکل جائیں۔"

"اسے ہم رکھیں گے کہاں؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم پولیس کے پاس تو جا نہیں سکتے۔"

"میرے خیال میں رابعہ کا گھر کافی بڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کے دل کی طرح۔ مگر اسے وہاں رکھنا ٹھیک نہیں۔"

"دل میں تو کوئی خوش قسمت ہی رہ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "گھر میں بھی چوری کا مال رکھنا شاید ایک وکیل کے اصولوں کے خلاف ہو۔"

"عمر کے ایک دور میں ہر شخص اصولوں کے معاملے میں بڑا آئیڈیلسٹ ہوتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں بھی سمجھتی تھی کہ اصول ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور دنیا اصولوں پر ہی چل رہی ہے، بے اصول لوگ بہت کم ہیں، چنانچہ قوت ارادی اور استقامت سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں کتنی کتابی ہیں۔ اس کا تجزیہ عملی زندگی میں آ کے ہوا۔ زندگی صرف اپنی ذات کے مفادات کے تحفظ کی جنگ ہے اور آدمی ایک خود غرض حیوان سے زیادہ کچھ نہیں جسے اپنی بقا سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب اصول خارج از نصاب ہو جاتے ہیں۔ وہ غلط نہیں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہتے۔"

"باالفاظِ مختصر، مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ کو یہ مالِ غنیمت اپنے گھر میں رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔" محسن نے کہا۔

"مجھے یہ تو بتا دو کہ تم اس شخص کا کرو گے کیا؟ میرا مطلب ہے تفتیش کے بعد؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک بار میں ڈیرہ اسماعیل خان گیا تھا۔" میں نے کہا "وہاں شکاری کھیتوں سے تیتر پکڑتے ہیں اور اس کے لیے بڑے دلچسپ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تربیت یافتہ مادہ کو پکڑ کر کھڑی فصلوں میں چھپ جاتے ہیں اور یہ مادہ وہ آوازیں نکالتی ہے جس سے نر تیتر متوجہ ہوتے ہیں اور شکاری کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پھر نر تیتر اپنی آواز سے ترغیب دیتا ہے اور مادہ تیتر اس پُرفریب آواز کا شکار ہونے آجاتی ہیں، تو ہم بھی تفتیش کے بعد اس سے وہی کام لیں گے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے شکاری استعمال کرتے ہیں۔ اس پر شکار کو بُلائیں گے۔ یہ خطرناک کام ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارے دام میں نہ آئیں۔ اُلٹا اسے چھڑا کر لے جانے کے لیے طاقت کا استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ ہم چوبیس گھنٹے قلعہ بند ہو کے مورچہ سنبھالے تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے سکندر یا کہ ان کے لیے یہ آدمی غیر اہم ہو۔" محسن نے کہا۔ "نچلی سطح کا کوئی معمولی سا کارکن ہو جسے اوپر والوں کے بارے میں زیادہ معلوم ہی نہ ہو؟"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ اسے چھڑا کے لے جانے کے لیے دوبارہ آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو یہی بہتر ہوگا کہ ہم اسے کل کہیں اور شفٹ کر دیں۔" محسن نے کہا۔ "آج تو وہ لوگ آنے سے رہے۔ کل تک دیکھیں گے کہ کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ آج اسے میڈیکل ایڈ وغیرہ کی ضرورت بھی ہوگی۔"

آج کے ذکر پر مجھے خیال آیا کہ آج کے دن ہمیں رابعہ کی ماں کو سپردِ خاک کرنا ہے اور یہ خبر رابعہ کو دینی ہے۔ پھر اور بہت سے لوگوں کو دینی ہے۔ وقتی کامیابی کی خوشی میں ہم یہ بھول گئے تھے کہ رابعہ کے گھر میں بھی ایک لاش پڑی ہے جس کو سفرِ آخرت درپیش ہے اور ہمارے لیے آج کا دن بہت سی اعصاب شکن آزمائشوں کا دن ہے۔ صبحِ صادق کا اُجالا پھیلنے لگا تھا اور ہمیں جلد از جلد گھر پہنچنا تھا۔

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "تم نے ابھی تک اپنی امی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔"

"اس لیے کہ تم خود اس ذکر سے گریز کر رہے تھے۔" رابعہ نے سکون سے کہا۔ "تم نے بھی بہت کچھ کہا مگر ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ جانتے بوجھتے۔ کیا ان کی حالت بہت بگڑ گئی ہے؟"

میں نے مجرموں کی طرح محسن کی طرف دیکھا اور ہم دونوں نے سر جھکا لیا۔ خاموشی کا ایک طویل سوگوار وقفہ آیا۔

"تو گویا وہ اب دنیا کے غم و اندوہ، ساری مصیبتوں اور تمام الجھنوں سے نجات حاصل کر چکی ہیں۔" رابعہ نے بالآخر اس سکوت کو توڑا اور ایک بار پھر ہماری خاموشی کو سمجھ لیا۔ "خدا کو یہی منظور تھا سکندر، ڈاکٹروں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی چانس نہیں ہے۔"

"تمہیں ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم نے اصرار کیا ہوگا؟"

"میں جھوٹی تسلیوں کی قائل نہیں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "جب تک میں اسیر رہی مجھے ہر لمحہ ان کا خیال تھا اور میں نے ان سے صرف ایک درخواست کی تھی۔ ان کے شریفانہ طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے۔ اور انھوں نے میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے فون پر ڈاکٹر سے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کوئی ڈاکٹر درانی تھا۔ میری اس سے نو بجے کے قریب بات ہوئی تھی۔"

میں احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ "تم نے کیا بتایا تھا اسے۔ تم کہاں سے بول رہی ہو اور کون ہو؟"

"میں نے اسے اپنا صحیح نام بتایا تھا۔ رشتہ بھی بتایا تھا اور یہ بھی کہ میں گھر سے بات کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "وہ بڑا اچھا آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھ میں ہر تلخ اور سنگین حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت ہے، اس لیے بے خوف و خطر مجھے سچ بتا دو۔ میں ہسٹریا میں مبتلا نہیں ہوں گی اور اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ وہ رات نہیں کاٹ سکیں گی۔ اس کے بعد میں نے کہہ دیا تھا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر میں شاید ہسپتال نہ جا سکوں۔ اگر خدانخواستہ امی کا انتقال ہو جائے تو سکندر بخت یا محسن نام کے کسی بھی شخص کو لاش دے دی جائے۔ اس نے پوچھا تھا یہ آپ کے کون ہیں۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ میرے کزن ہیں۔"

میں ہکّا بکّا کھڑا رہا۔ ڈاکٹر درانی کو سب معلوم تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور خود ہی سب کچھ سمجھ لیا مگر اپنے رویے سے کسی شک کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ کچھ لوگ کتنے معقولیت پسند اور اعتماد کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے بلا چوں و چرا ہمیں بھی قانونی وارث مان لیا تھا۔ لیکن اپنی تسلی کے لیے یا محض تجسس کے باعث یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کا مس رابعہ سے کیا رشتہ ہے اور میں نے جو رشتہ بتایا تھا وہ رابعہ نے نہیں بتایا تھا، تاہم اس نے یقین اس لیے کر لیا تھا کہ لڑکیاں ایسی باتیں خود نہیں بتاتیں اور کزن بھی منگیتر ہو سکتے ہیں۔ نو بجے وہ رابعہ کو سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جو رابعہ نے نہیں بتایا تھا اور وہ انجان بنا رہا جیسے وہ کچھ نہیں جانتا اور جاننا چاہتا بھی ہے تو صرف مدد کرنے کے لیے۔ عجیب آدمی تھا۔ رابعہ نے بھی اس سے کہا تھا کہ میں گھر سے بول رہی ہوں۔ میں نے بھی کہا تھا کہ مس رابعہ کے گھر سے بول رہا ہوں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں نہیں آسکتی اور میں نے کہا تھا وہ راولپنڈی چلی گئی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے میرے اور رابعہ کے بیانات کے درمیان مطابقت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ باقی باتیں اس کے لیے غیر اہم تھیں مگر کسی نتیجے پر پہنچ کے وہ میری مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"اب کیا سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"میں؟ کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوچ رہا تھا کہ تمہارا یہ رُوپ کتنا مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی غیر جذباتی انداز میں بھی سوچ سکتی ہو اور تمہارے اعصاب اتنے مضبوط ہیں۔ میرا خیال تھا تم وکیل ہونے کے باوجود ایک کمزور اور جذباتی لڑکی ہو۔"

"یہ تو ایک حیوانی جبلت ہے۔" وہ بولی۔ "خطرے کے وقت اور ہنگامی حالات میں قدرت کا فراہم کردہ دفاعی نظام ہماری مدد کرتا ہے۔ بلی بھی شیر ہو جاتی ہے۔"

ہم تینوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ میں نے عمداً دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور بیرونی گیٹ بھی تاکہ لوگ جلد از جلد متوجہ ہو جائیں اور اس نوجوان کی لاش بے گور و کفن نہ پڑی رہے جس نے جانے کتنی آرزوؤں کو تکمیل کا رنگ دینے کے لیے دس ہزار روپے سمیٹنے چاہے تھے اور جب وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر کو دسترس میں دیکھ رہا تھا تو تقدیر اس پر خندہ زن تھی۔ پلک جھپکتے میں وہ دس ہزار کی رقم تک پہنچتے پہنچتے مادی خواہشات کی اس دنیا سے دور وہاں پہنچ گیا جہاں کوئی آرزو، کوئی احساس، کوئی اُمید نہیں ہوتی۔ رابعہ ڈرائیونگ کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے اجازت نہیں دی اور وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ محسن پچھلی سیٹ پر اس سیاہ پوش کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو اب کراہنے لگا تھا اور ہوش میں آ رہا تھا۔ محسن نے اسے سیدھا پکڑ رکھا ورنہ وہ آگے کو ڈھلک جاتا۔

"ہم پہلے رابعہ کو گھر پر چھوڑیں گے۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو کسی ایسی جگہ بند کریں گے جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے اور جہاں سے اس کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ پھر تم گھر ٹھہرنا اور میں خادمہ کو لینے جاؤں گا۔ خادمہ کو رابعہ کے پاس پہنچا کے ہم دونوں ذرا سی دیر کے لیے وہیں جائیں گے۔ داروغہ والا سے آگے اسی زیرِ تعمیر کوٹھی میں۔"

"وہ کیوں؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی نئی مشکل میں گرفتار ہونے کے لیے؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

"دراصل میں نے ایک حماقت کی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے کپڑے وہاں چھوڑ آیا تھا۔ وہاں ایک لاش پڑی ہے جو سائیں چوکیدار کی ہے۔ میرے کپڑوں کا وہاں موجود ہونا میرے لیے مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔"

"وہ... وہ سائیں چوکیدار تھا؟" محسن نے پیچھے سے کہا۔ "تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے انھی لوگوں نے بتایا تھا جو اسے قتل کر کے ڈال گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "جو ہر جگہ یہی کرتے ہیں۔ تو نے جس کو فرار ہوتا دیکھ کر گولی چلائی تھی وہ تو بچ کے نکل گیا تھا۔"

گھر پہنچنے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ اس وقت تک اُفق پر صبح کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور اُجالا پھیل گیا تھا۔ آسیب زدہ نظر آنے والی کوٹھی پر موت سایہ فگن تھی۔ در و دیوار سوگوار دکھائی دیتے تھے اور لان میں درخت بھی اداس اور سرنگوں کھڑے تھے۔ میں رابعہ کو اوپر لے گیا اور محسن نے سیاہ پوش کو اتارا جس کی صورت نقاب ہٹ جانے کے بعد سامنے آگئی تھی لیکن ہمارے لیے اجنبی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی رابعہ کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ بے اختیار ماں کی لاش پر گر گئی اور اس سے چمٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ اس کے اعصاب کی کشیدگی اسی طرح کم ہو سکتی تھی۔ اس نے بڑی ہمت سے جسمانی و ذہنی عذاب برداشت کر لیا تھا مگر انسانی جسم فولاد کی مشین نہیں ہے کہ متاثر ہی نہ ہو۔ قوتِ برداشت سے کام لے کر ہر سختی جھیل جانا واقعی بہادری ہے مگر غم سے ذہن کو متاثر نہ ہونے دینا گوشت پوست کے بنے ہوئے آدمی کے لیے ناممکن ہے۔ رابعہ کے دل میں بھی غم اور رنج و الم کے جذبات کا آتش فشاں ابل رہا تھا جو بالآخر پھٹ گیا اور وہ روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اس کے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" محسن دروازے سے نمودار ہوا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "شدتِ غم سے بیہوش ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر، کافی بنا لا اور رابعہ کے لیے چینی کی بجائے گلوکوز ڈال کے لانا۔ شاید کچن یا فرج میں ہو۔ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔"

محسن کے کافی لے کر آنے سے پہلے ہی رابعہ کو ہوش آگیا۔ میں نے زبردستی کی حد تک اصرار کر کے اسے کافی پلائی جس سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کی طبیعت فوری طور پر سنبھل گئی۔ "سکندر میں بہت بدبخت ہوں۔ ماں نے آخری وقت میں مجھے یاد تو کیا ہوگا؟"

میں نے کسی تذبذب کے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں انتقال کے وقت وہیں تھا۔ انہیں ہوش آیا ہی نہیں۔" یہ جھوٹ اس کے احساسِ غم میں اضافہ کرنے والے سچ سے بہتر تھا اور مجھے یقین تھا کہ خدا نے اسے جھوٹ شمار نہیں کیا ہوگا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"تو نے اس شخص کو کہاں رکھا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کے نکل بھاگنے کا تو کوئی امکان نہیں؟"

"میں نے اسے اسٹور میں ڈال دیا ہے ہاتھ پیر باندھ کے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اسے علاج معالجے کی ضرورت ہے سکندر۔ اور نہ وہ ہمیں کچھ بتانے سے پہلے ہی مر جائے گا۔"

"یہ تو بڑا مسئلہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر آئے گا تو بہت سے سوالات کرے گا۔"

"ڈاکٹر کو میں بلا لیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "ہم اسے جو کچھ بتائیں گے وہ مان لے گا۔ بشرطیکہ وہ خود نہ بولے۔"

"اس کو خاموش رکھا جا سکتا ہے اگر مارفیا وغیرہ کا ایک انجکشن دے دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"مارفیا تو نہیں لیکن ڈائزی پام کا انجکشن ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "سرنج وغیرہ بھی ہے۔ جب امی پر ڈپریشن کا شدید دورہ پڑتا تھا اور وہ سو نہیں پاتی تھیں تو... تو میں لگا دیتی تھی۔ وہ کسی حد تک اس کی عادی ہو گئی تھیں۔ میں مجبور تھی۔"

میں نے اور محسن نے نیچے آ کے اس سیاہ پوش کے کپڑے بدلے اور اسے شریفانہ لباس میں لاتے ہوئے ہمارے ہاتھ منجمد خون میں بھر گئے۔ یہ خون محسن کی قمیص کے شانے پر بھی تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ رابعہ کی گاڑی کی سیٹ پر داغ نہ آئے اور اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شخص اب بولنے لگا تھا اور ہماری منت سماجت کر رہا تھا کہ وہ اسے جانے دیں لیکن اس کے لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو... وہ مجھے مار ڈالیں گے..." کے سوا وہ کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں نے اس کو بڑی احتیاط سے انجکشن دیا اور وہ چند منٹ کے اندر اندر بے سدھ ہو گیا۔ میں نے محسن نے اسے گیسٹ بیڈ میں منتقل کیا اور اتفاقِ رائے سے ایک کہانی تیار کی۔ یہ شخص ہمیں دروازے پر اسی طرح پڑا ملا تھا۔ معلوم نہیں کوئی اسے وہاں ڈال گیا تھا یا وہ خود چل کے رابعہ کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ ہوش میں آئے گا تو معلوم ہوگا کون ہے؟

پولیس کو ہم اس لیے رپورٹ نہیں کرنا چاہتے کہ آج ہمیں تمام دن رابعہ کی ماں کے کفن دفن کے انتظامات میں گزارنا ہے۔ کل تک یہ ہوش میں آ جائے گا تو خود ہی بتا دے گا۔

رابعہ اس عرصے میں اپنے کچھ رشتہ داروں کو فون کر رہی تھی اور ان سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ اپنے قریب رہنے والے دوسرے لوگوں کو اطلاع کر دیں۔ جب ہم پھر اوپر اس کے بیڈروم میں پہنچے تب بھی وہ فون کر رہی تھی۔

"اب میں جا کے ماسی کو لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے آنے جانے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا اور اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بجے ہیں۔ سات بجے اگر میں اور محسن گئے تو آٹھ ساڑھے آٹھ تک واپس آ جائیں گے۔"

"میرا تو خیال ہے تم غلطی کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "پکڑ دھکڑ سے کیا ہوتا ہے؟"

"جس انداز سے انہوں نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ ہم یہ بات پولیس کو بتا سکتے ہیں اور پولیس کھوجی کتوں کی مدد سے سیدھی یہاں آ سکتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ایک شخص ہمیں وہاں دیکھ چکا ہے۔ اس نے محسن سے باتیں بھی کی تھیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "جاؤ، مگر دیکھو خدا کے لیے عقل سے کام لینا۔ اس وقت میں کوئی اور صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔"

"یہ کیسی باتیں شروع کر دیں تم نے؟" میں نے کہا۔ "تم تو ہماری مددگار ہو۔ ہمیں بچا رہی ہو۔"

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس شخص کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔" وہ بولی۔ "وہ خود معلوم کر لیں گے کہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والے کون تھے۔"

"وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پوچھیں گے مثلاً اغوا کا مقصد۔ اور ہمیں بہت سی ایسی باتیں بتانی پڑیں گی جو ہم بتانا نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔ "خطرے کا معاملہ ختم ہوا۔ تم بخیر و عافیت واپس آ گئیں۔ اب تمہیں بلاوجہ خبر کا عنوان بنانے سے کیا حاصل ہوگا۔ اگر پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑا تو ہم کوئی اور کیس بنا دیں گے جس میں تمہارا نام نہ آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے دشمنوں کا آدمی ہے اور اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کو زخمی چھوڑ کے فرار ہو گئے۔ ابھی تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہاری ذات کو فی الحال کوئی خطرہ لاحق نہیں اور یہی بہت اطمینان کی بات ہے۔ ہم نے وہ خط تمہارے پاس

رکھوا کے غلطی کی تھی اور تمہیں بھی اپنے ساتھ براہِ راست ملوث کر لیا تھا۔ میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔ کل میں اس کو کسی ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا، ممکن ہوا تو آج ہی شام کو، جہاں وہ آسانی سے نہ پہنچ سکیں اور تم محفوظ رہو۔ تم عدالت کی حد تک میرے قانونی معاملات کی مشیر رہو گی۔ باقی معاملات سے تمہارا دور ہی رہنا اچھا ہے کیونکہ جو کھیل ہم کھیل رہے ہیں وہ بہت خطرناک ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح تم خطرات کے اس جنگل سے نکل آؤ۔" رابعہ بولی۔ "عزت اور حفاظت کے ساتھ۔"

"اگر یہ میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں تمہارا حکم نہ ٹالتا۔" میں نے کہا اور یہ نہیں دیکھا کہ محسن مجھے کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ "جتنی ضرورت تمہیں میری ہے اتنی ہی مجھے تمہاری بھی ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ابھی تمہیں معلوم نہیں۔ کسی دن میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا لیکن ابھی نہیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں۔ نہیں، میں تمہارے لیے مزید پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں ناگزیر مجبوریوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہوں اور یہ معاملات ایسے ہیں جن میں قانون میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اپنی مدد میں آپ کر سکتا ہوں چنانچہ مجھے یقین ہے کہ خدا میری مدد کرے گا۔ بات صرف صبر، حوصلے اور استقامت کی ہے۔"

"اب تو جا۔" محسن نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ میں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"محسن!" میں نے دروازے کے قریب رک کر کہا۔ "عین ممکن ہے وہ ہمارے تعاقب میں آئے ہوں یا ان کے کسی آدمی نے ہمیں دروازے سے کار میں اندر آتے دیکھا ہو اور انہیں اطلاع کر دی ہو۔ اگر وہ میری عدم موجودگی میں آئیں تو حالات کو سنبھال لینا اور رابعہ کو محفوظ رکھنا۔"

"میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔" رابعہ نے سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے ریوالور نکالا۔ "اور میرا نشانہ محسن سے اچھا ہے۔"

"اگر قتل و خونریزی نہ ہو آج تو بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آس پاس کے گھروں میں ابھی اطلاع کرا دو۔ کچھ لوگ آ جائیں گے تو ان کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہ ہو گی۔"

"تم باہر جاتے ہوئے ساتھ والی دونوں کوٹھیوں میں بتا جاؤ۔" رابعہ نے کہا۔ "جب ماسی آ جائے گی تو میں باقی گھروں میں بھی خبر پہنچا دوں گی۔"

پندرہ منٹ بعد میں نے ماسی کے دروازے پر کار روکی۔ وہ اتنی صبح مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ میرے آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ جب میں نے اس کے خدشات کی تصدیق کی تو اس نے رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ گھر کی دیگر عورتیں بھی ایک جواں سال لڑکے کو لے کر کار میں بیٹھ گئیں۔ ماسی تمام راستہ روتی رہی اور اس کے ساتھ آنے والی ایک ہم عمر اور ایک نوجوان عورت اسے تسلی دیتی رہی۔ میں نے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ باقی لوگ کون ہیں اور دس منٹ بعد ان کو رابعہ کی کوٹھی پر اتار دیا جہاں ابھی خیریت تھی۔ ماسی کے رونے پیٹنے کی آواز سے گھر کی فضا یکلخت ماتمی ہو گئی۔ اندر مجھے دو اجنبی خواتین کے چہرے بھی دکھائی دیے جو غالباً پاس پڑوس سے آئی تھیں۔

محسن مجھے نیچے ہی ملا اور گیسٹ بیڈروم میں لے گیا جہاں ڈاکٹر ہمارے جنگی قیدی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔

"یہ... یہ تو گولی کا زخم ہے۔" ڈاکٹر نے ہم میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم دونوں خاموش رہے۔ "لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں ہے کہ دروازے پر خون کا کوئی داغ نہیں۔ کس نے اٹھایا تھا اسے؟"

"میں نے۔" محسن نے کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا تھا۔ اس وقت اندھیرا ابھی تھا۔"

"رابعہ نے مجھے فون پر یہی بتایا تھا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔ "چنانچہ میں نے آتے وقت دروازے کو غور سے دیکھا تھا۔"

ہمارے بیان کی ایک فاش غلطی کو ڈاکٹر نے پکڑ لیا تھا۔ لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ گھر کا ڈاکٹر تھا۔ اس سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہم سے بات کیے بغیر پولیس کو فون کرے گا۔ ہم نے کہا کہ اصل بات کچھ اور ہے جو ہم بعد میں بتائیں گے کیونکہ آج اس کا موقع نہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ اس سے رابعہ کی بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس نے ناگواری سے سر ہلایا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کا بیگ لے کر دروازے تک گیا۔ محسن میرے ساتھ رہا۔

"تھینک یو۔" اس نے کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "ایک بات یاد رکھو۔ ڈاکٹر اور وکیل سے حقیقت چھپائی جائے تو کیس بگڑ جاتا ہے اور وہ صحیح مدد بھی نہیں کر سکتے۔ میں پھر آؤں گا دو بجے۔ جنازے میں شرکت کے لیے۔" اس نے کار کو بیک کیا اور ابھی اس کی گاڑی باہر نکلی ہی تھی کہ ایک ٹیکسی اندر آ گئی۔ اس میں رابعہ کے کچھ رشتے دار آئے تھے۔ میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔ محسن نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں رابعہ کی کار دے کر جاؤں گا۔ کار کو سڑک پر چھوڑ دوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گا اور گھوم کر پچھلی طرف سے اس زیرِ تعمیر کوٹھی میں جاؤں گا۔ تو ٹیکسی میں میرے پیچھے رہنا لیکن رکنے کی بجائے ٹیکسی کو آخر تک لے جانا۔ ڈرائیور کچے راستے پر جانے کے لیے تیار نہ ہو تو اسے کچھ دے دینا۔ دس بیس اوپر۔ مسلح ہم دونوں ہوں گے۔"

"اس کا فائدہ؟" محسن نے کہا۔ "تیرا خیال ہے وہاں اب بھی کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں، میں نے رابعہ کے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے سامنے تو میں نے کہا تھا کہ دشمنوں نے دھمکی کے انداز میں بات کی ہے لیکن حقیقت مجھے برعکس لگتی ہے۔ انہوں نے جال پھیلایا ہے۔ میرے ذہن سے کپڑوں کا خیال نکل گیا تھا۔ انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میرے کپڑے ایک چوکیدار کی لاش کے پاس پڑے ہیں۔ یہ یاد دلانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ یہی کہ میں اپنے کپڑے لینے جاؤں اور پکڑا جاؤں۔ انہیں یقین ہوگا کہ اب میں ضرور آؤں گا اور وہ میرے منتظر ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔"

"الگ الگ جانے میں کون سی عقلمندی ہے؟" محسن بولا۔ "ایک ساتھ ہوں گے تو مقابلہ کر لیں گے۔"

"میں ایک چانس لے رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "ان کو بھی خیال ہوگا کہ میں آیا تو صبح دم آؤں گا۔ اس سے پہلے کہ دن چڑھے اور کوئی اندر آ کے لاش کو دیکھے۔ آٹھ بجے تک کوئی خطرہ نہیں، اور ہم وہاں آٹھ بجے تک ہی پہنچیں گے۔ وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اور جب رابعہ کی فاکس ویگن کو سڑک پر رکتے اور مجھے گاڑی سے اتر کر اکیلا آتے دیکھیں گے تو مطمئن ہو جائیں گے کہ میرے ساتھ اور کوئی نہیں۔ انہیں یہ خیال بھی آئے گا کہ محسن کو میں نے رابعہ کے پاس یا اس جنگی قیدی کی حفاظت کی خاطر پیچھے چھوڑا ہے۔ ایسے میں اگر تیری ٹیکسی بعد میں نمودار ہوئی اور کچے راستے پر چل کے ادھر آئی تو انہیں یہ شک نہیں ہوگا کہ اس میں تو ہو گا۔ ادھر دوسرے گھر بھی ہیں جو ذرا فاصلے پر ہیں۔ وہاں بھی لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ تو ٹیکسی کو کسی اور مکان کی طرف لے جانا اور پھر وہاں سے سیدھا دروازے کے راستے اندر۔ امید ہے میں نیچے ہی مذاکرات میں مصروف ملوں گا یا پھر اپنے کپڑے سمیٹ کر نکلنے والا ہوں گا۔ خدا نے چاہا تو ہم نو بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

روانہ ہونے سے پہلے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنا ریوالور خالی کیا اور محسن نے اپنا ریوالور پورا لوڈ کر لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے اندیشے درست ثابت ہوئے اور دشمن مجھے منتظر ملا تو اندر قدم رکھتے ہی مجھے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ میرا ارادہ ایک چھوٹا سا جوا کھیلنے کا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں اندر جاتے وقت ریوالور ہوا تو وہ سب سے پہلے مجھے مجبور کریں گے اور پھر کہیں گے ریوالور پھینک دو۔ ممکن ہے وہ شخص جو اپنے ریوالور کی زد پر مجھے اس حکم کی تعمیل پر مجبور کرے۔ میرا ریوالور اٹھا لے۔ دونوں ہاتھوں میں دو ریوالور کون رکھتا ہے۔ اگر اس نے اپنا ریوالور جیب میں ڈال لیا اور میرا اسلحہ میرے ہی خلاف استعمال کر کے اسے اپنی فتح سمجھا تو دھوکے میں مارا جائے گا۔ عملاً وہ غیر مسلح ہوگا لیکن یہ بات اسے گولی چلانے کی نوبت آنے تک معلوم نہیں ہو گی۔ میں یا محسن تب تک محفوظ رہیں گے اور جتنی دیر میں اسے ریوالور کے خالی ہونے کا احساس ہوگا اور کوئی دوسرا اپنا ریوالور نکالے گا ہمیں کافی مہلت مل جائے گی۔ میرے حریف جوڈو یا کراٹے کے داؤ پیچ نہیں جانتے تھے جو میں جانتا تھا۔ میں دو منٹ میں چار افراد کو کسی بے ضرر طریقے پر لٹا بھی سکتا تھا اور کسی مہلک وار سے ختم بھی کر سکتا تھا۔

دوسری احتیاط محسن نے کی۔ اس نے اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل لیا۔ گھر کے اندر ہی اسے چارخانے کی ایک لنگی مل گئی جسے اس نے پتلون کے اوپر لپیٹ لیا۔ جوتوں کی جگہ اس نے چپل پہن لیے۔ رابعہ پڑھتے وقت عینک استعمال کرتی تھی۔ محسن نے اس کے شیشے توڑ کے خالی فریم کو ناک پر فٹ کر لیا اور یہ زنانہ فریم اس کے مردانہ چہرے پر بہت مضحکہ خیز نظر آنے لگا۔ اس کے بعد قمیص اتار کے وہ صرف بنیان میں رہ گیا۔ یہ ساری کارروائی اس نے تمام لوگوں سے چھپ کر گیسٹ بیڈ روم میں کی۔ یہاں تک کہ رابعہ کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ پھر وہ بڑی پھرتی سے ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میں نے بڑے رعب سے ٹیکسی ڈرائیور کو پچاس روپے کا نوٹ دیا اور اسے بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ "باقی پیسے رکھ لینا۔" میں نے بے نیازی سے کہا اور ڈرائیور کے ہکا بکا چہرے کو نہیں دیکھا جس کے لیے ٹپ کی رقم کرائے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

میں نے ایک کام یہ بھی کیا کہ اپنے اسیر کو دوبارہ اسٹور روم میں شفٹ کر دیا اور اسے باندھنے کے علاوہ اس کے حلق میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تاکہ خدانخواستہ وہ ہوش میں آ جائے تو چلانے نہ لگے۔ اس کے سیاہ نقاب اور خون آلودہ لباس کو جوتوں سمیت میں نے ردی کاغذ میں لپیٹا اور مٹی کے تیل میں بھگو کے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے راہ میں جہاں موقع ملا نذرِ آتش کر دوں گا۔

جب میں کار لے کر نکلا تو ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔ محسن کا حلیہ بہت اطمینان بخش تھا۔ بنیان، چارخانے کی دھوتی، چپل اور عینک میں وہ وہیں کا کوئی مزدور نظر آتے گا اور اس وقت تک نہیں پہچانا جائے گا جب تک سامنے آ کے ریوالور نہیں نکال لے گا۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے ایک مختصر وقفہ ایسا آیا جب مجھے آگے پیچھے کوئی گاڑی دکھائی نہ دی۔ میں نے فاکس ویگن روکی۔ نیچے اتر کے کپڑوں کی تھیلی سڑک سے ذرا دور رکھی اور ماچس کی تیلی دکھاتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد جب میں نے کار اسٹارٹ کی تو مجھے دور بنے ہوئے ریلوے کے افسروں کے ایک بنگلے میں سے کوئی شخص اس آگ کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ مگر خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ فاکس ویگن اتنی دور جا چکی تھی کہ وہ نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے پہنچنے تک آگ کا سب کچھ جلا کے خاک کر دینا یقینی تھا۔

بیس منٹ بعد میں نے سڑک پر ایسی جگہ کار روکی جہاں سے وہ زیرِ تعمیر عمارت صاف نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہو چلا تھا کہ دشمن کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ کسی دریچے کسی روزنِ دیوار یا کسی دروازے کی جھری سے شکاری کی نظریں اپنے شکار کو دامِ فریب میں گرفتار ہونے کے لیے قدم قدم آگے بڑھتا دیکھ کر مطمئن ہیں۔ ایک یرغمالی کو ہم چھڑا کے لے گئے تھے اور اب الٹا دشمن کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں تھا۔ اس کی رہائی کے لیے وہ مجھے یا محسن کو رکھ کے یہ سودا کر سکتے تھے کہ تم ہمارا آدمی چھوڑ دو۔ ہم تمہارا آدمی چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ محسن کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے رابعہ کے گھر پر چند ضروری امور کو نمٹانے میں اور پھر راستے میں رک کر کپڑوں کے بنڈل کو جلانے میں تھوڑا سا اضافی وقت لیا تھا لیکن اس چند منٹ کی دیر نے مجھے بچا لیا۔ اگر میں نے ٹیکسی کے ساتھ اپنی کار دوڑائی ہوتی تو میں اور محسن تقریباً ساتھ ساتھ اس نامکمل گھر میں پہنچتے جہاں سائیں چوکیدار کی لاش پڑی تھی، لیکن ہوا یہ کہ محسن وہاں پہلے جا پہنچا اور اس نے خطرے کو فوراً محسوس کر لیا۔ ابھی میں فاکس ویگن سے اتر کے چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اسے تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ بدلے ہوئے حلیے کے باعث میں اسے فوراً نہ پہچان سکا۔ پھر کوٹھی کے اندر سے ایک مختصر سا جلوس برآمد ہوا جس میں چار پولیس والوں سمیت شکل سے درجن بھر افراد ہوں گے۔ وہ محسن کے پیچھے پیچھے سڑک کی طرف بڑھے۔ محسن نے ایک بار پلٹ کے دیکھا اور اپنی رفتار تیز تر کر دی۔ میں بھی اب رک گیا تھا اور محسن کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے واپس جانے کا اشارہ کیا اور میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ میرے بیٹھتے ہی محسن نے بھی کار کا دوسرا دروازہ کھولا۔ "چل یہاں سے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ان لوگوں نے قریب سے ہمیں دیکھا تو پہچان جائیں گے۔"

میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن ایک دفعہ ہلکے سے غرّایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار میں بھی میری کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ محسن نے تشویش سے میری صورت کو اور پھر جلوس کو دیکھا جو آہستہ آہستہ سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چابی گھمانے کا عمل جاری رکھا لیکن اس سے بیٹری کمزور پڑنے لگی۔ انجن اسٹارٹ ہوتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "غالباً اوور ہو گئی ہے۔" پیٹرول کی بو سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا۔

"ٹھہر جا، سیلف مارنے سے بیٹری بالکل بیٹھ جائے گی تو دھکے سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔" محسن نے اترتے ہوئے کہا۔ پولیس والے اور چار دیگر افراد اب اتنے قریب آ گئے تھے کہ میں ان کی صورتوں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ پولیس والوں نے ایک ایسے شخص کو ہتھکڑی ڈال رکھی تھی جو میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور دیوانہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے جٹا دھاری بال جو الجھے ہوئے اور دھول سے خاکستری ہو رہے تھے، داڑھی کے بالوں سے جا ملے تھے اور بالوں کے اس خودرو جنگل میں اس کے وحشت زدہ چہرے پر متحرک آنکھیں بہت بے قرار لگتی تھیں۔

"دے داتا۔" دیوانے نے اچھل کے ایک نعرۂ مستانہ لگایا۔ "سب نوں دے۔" معلوم نہیں وہ دینے والے سے سب کے لیے کیا طلب کر رہا تھا۔ یہی دیوانگی، جس نے اسے فکر و غم سے بیگانگی عطا کی تھی۔ دولتِ فقر جس کی نگاہ میں شانِ سکندری کچھ نہیں۔ سنگ و دشنام اور ذلت کا آزار دینے والوں کے لیے بھی یہی آزار ہے یا ان سب کے لیے عفو و درگذر جو نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟

محسن نے دھکا لگایا اور چھوٹی سی کار سڑک کے معمولی سے نشیب پر روانہ ہو گئی۔ میں نے کلچ چھوڑا تو کار نے ایک جھٹکا لیا۔ انجن کھانسا اور پھر یوں گرجا کہ کار نے ایک دم اسپیڈ پکڑی۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھا اور محسن دوڑتا ہوا آ کے پھر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے سر گھما کے دیکھا۔ مجھے اپنے سامنے لگے ہوئے شیشے میں نظر آ رہا تھا کہ ایک دیوانے کو قاتل سمجھ کے پکڑ لینے والے سڑک تک پہنچ چکے تھے۔ وہ اب کسی ٹیکسی کے انتظار میں تھے۔

"دے مولا... سب نوں دے۔" دیوانے کی صدا آئی اور زنجیر نے کھنک کر اس کا ساتھ دیا۔ وہ اب رقص کے انداز میں پیر پٹخ رہا تھا۔ مجھے اس کی دیوانگی پر رشک آیا جسے نہ الزام کی خبر تھی نہ انجام کا اندیشہ۔ نہ غمِ دوش تھا نہ فکرِ فردا تھی اور جسے زندگی کے متاعِ بے بہا ہونے کا احساس ہی نہ تھا کہ موت کا ڈر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوتا۔ کار گھوم کے تیزی سے ان کے سامنے سے گزر گئی اور اس ایک لمحے میں جب کسی کی نظر مجھے دیکھ سکتی تھی ہمارے درمیان ایک ڈبل ڈیکر بس حائل ہو گئی جو دارو غہ والا کی طرف سے آئی تھی۔

"اس پاگل کو پکڑ لیا ہے قتل کے الزام میں ۔" میں نے خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد کہا۔ " اس لیے کہ وہ میرے کپڑے پہن چکا تھا۔"

" ہاں ۔" محسن بولا۔ " جس شخص نے تجھ سے بات کی تھی اس نے کپڑے دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ بندہ تو وہی لگتا ہے۔ پولیس کو خدا موقع دے اپنی کارکردگی اور مستعدی دکھانے کا۔ اسی گواہی پر ان کے لیے ضابطے کی کارروائی پوری ہو گئی اور انہوں نے گویا قاتل کو جائے واردات پر ہی پکڑ لیا حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اگر یہ شخص پاگل ہے تو عدالت سے اسے کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص نے کہا بھی تھا کہ یہ تو پاگل ہے۔ کل تک ننگا گھومتا تھا۔ پولیس والوں نے کہا تھانے میں سب معلوم ہو جائے گا۔ ایسے تو سب ہی پاگل بن کے ہمیں پاگل بناتے ہیں۔ شامت کا مارا ہونے کے لیے اندر جا گھسا ہو گا اور کپڑے پڑے دیکھے ہوں گے تو اٹھا کے پہن لیے ہوں گے۔"

" مگر پولیس کا اس وقت موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ قتل کی اطلاع انہیں بہت پہلے نہیں دی گئی ہے۔ اندازاً دو گھنٹے قبل۔" میں نے کہا۔ " اور میرا خیال ہے کہ رابعہ کو اسیر رکھنے والوں نے فرار ہونے کے بعد کہیں سے پولیس کو فون کیا ہو گا۔ ان کو یقین ہو گا کہ میں اپنے کپڑے لینے پہنچوں گا تو میر شرافت علی کے بعد قتل کے اس دوسرے الزام میں ملوث ہو جاؤں گا۔ یک۔ نہ شد دو شد والی بات ہو گی۔ مجھ پر دباؤ بڑھ جائے گا اور میرے لیے تمام مقدمات ختم کرا دینے کی پیشکش کو قبول نہ کرنا دشوار تر ہو جائے گا مگر ایک دیوانے نے ہماری بلا اپنے سر لے لی۔"

رابعہ کے گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور لان پر جمع تھے۔ میں نے کار کو دروازے کے سامنے روکا تو بہت سے لوگوں کی نظریں اٹھیں۔ وہ رابعہ کی کار کو پہچانتے تھے لیکن مجھے نہیں جانتے تھے۔ خود میرے لیے سب نا آشنا چہرے تھے جن میں رابعہ کے عزیز، ہمسائے جان پہچان رکھنے والے اور رفقائے کار سب شامل ہوں گے۔ میں کسی کی طرف دیکھے بغیر رسماً اور اخلاقاً " السلام علیکم " کہتا گزر گیا۔ سوالیہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں کہ گھر کے ایک فرد کی طرح گھر میں گھس جانے والا یہ شخص کون ہو سکتا ہے جسے پہلے کبھی گھر میں نہیں دیکھا گیا۔ پانچ منٹ کے وقفے سے محسن آیا جو ابھی تک بنیان اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ میری طرح وہ بھی سلام کرتا گزرا مگر قابلِ غور نہیں سمجھا گیا کیونکہ حلیے سے وہ گھر کا ملازم لگتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اپنے جنگی قیدی کے زندان میں موجود ہونے کا یقین کیا اور پھر محسن کے ساتھ مل کر تجہیز و تکفین کے انتظامات کی طرف متوجہ ہوا لیکن ہماری عدم موجودگی میں وارد ہونے والے دو بوڑھوں اور دو نوجوانوں کی کمیٹی تشکیل پا چکی تھی اور فیصلے انہوں نے اپنا اولین حق سمجھتے ہوئے سنبھال لی تھی۔ بڈھے کسی رشتے سے رابعہ کے چچا اور ماموں ثابت ہوتے اور نوجوان دور کے کزن جن کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مجھے خود رابعہ نے فراہم کی تھیں۔ اس فرض سے سبکدوشی ہمارے حق میں بہتر تھی۔ اب ہم پس منظر میں رہ کر آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔ مجھے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ مجمعِ عام میں وہ لوگ بھی شامل نہ ہو جائیں جو جنازے میں شرکت کے بہانے اپنے قیدی کو چھڑا کر لے جانا چاہتے ہوں تاہم ان لوگوں کو شناخت کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی ثبوت کے بغیر ان کو الگ کر کے نکالنا۔ ہر شخص زیادہ سے زیادہ غمزدہ نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا اور آنے والوں کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ تعزیت کس سے کریں کیونکہ رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور خادمہ کے سرکاری اعلان کے مطابق صدمے کے باعث اس کی حالت غیر تھی چنانچہ ڈاکٹر نے اسے انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ بلاشبہ رابعہ ذہنی جسمانی اذیت کے جس دور سے گزری تھی وہ ایک عام عورت کے اعصاب کو اس حد تک متاثر کر سکتا تھا کہ اس کا ہسٹریا عارضی طور پر دماغ کی خرابی کا سبب بن جاتے مگر رابعہ نے غیر معمولی عقل، جرأت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اس میں ہر ایک سے ملنے، ان کو اول تا آخر ماں کی موت کے اسباب و واقعات اور علاج معالجے کی تفصیلات بار بار سنانے اور سب کے ساتھ رونے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اسے کمرے میں محصور کر کے چابی اور اسیر ان فراہم کی۔ دونوں چیزیں مجھے باہر سے لانی پڑیں۔ وہ اکیلی پڑھتی رہی تھی اور دو گھنٹے بعد کمرے سے نکلی تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔

محسن نے اسٹور روم کے آس پاس پہرہ دینا جاری رکھا۔ مجھ پر ہوا کی دیوار ہوا ہوا اور اس کے پاس تھا۔ وہ ادھر ادھر کے کمروں سے کسی دیوار کی اوٹ سے یا ٹہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ تعزیت کے لیے جمع ہونے والوں میں سے کون گھر کے اس دور افتادہ حصے تک آتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے ریو الور مجھے تھما دیا اور خود ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ ہم میں سے کوئی اپنی مسلسل غیر موجودگی سے شبہات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ محسن نے اپنے پرانے کپڑے پہن لیے تھے اس شریفانہ لباس میں دیکھ کر بہت سے لوگ چکرائے ہوں گے کہ یہ وہی خادم ٹائپ شخص ہے جو بنیان اور دھوتی پہنے گزرا تھا یا اس کا کوئی ہمشکل۔ دو نوجوان جو تدفین کمیٹی کے رکن تھے آؤٹ ڈور ڈیوٹی کے لیے موٹر سائیکل لے کر جا چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کفن دفن کا سامان لانے کے لیے انہیں رابعہ کی کار مل جائے مگر چابی کا مسئلہ پیدا ہوا تو انہیں نہ ملا۔ چنانچہ وہ بادلِ نخواستہ اپنی پرانی موٹر سائیکل پر گئے۔ ضامن رضوی صاحب اور رابعہ کے ماتحت وکیل کے آنے کے بعد ہماری پوزیشن بہتر ہو گئی۔ انہوں نے ہم سے تفصیلی معلومات حاصل کیں جو دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ رفتہ رفتہ جملہ حاضرین پر واضح ہو گیا کہ رابعہ کی ماں کی تیمارداری اور خبر گیری میں شروع سے آخر تک ہماری خدمات کیا تھیں۔

جنازے کی روانگی میں کچھ وقت باقی تھا۔ جب میں نے ایک شخص کو خاصے پُراسرار انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں قید خانے کے طور پر استعمال ہونے والے اسٹور روم کے سامنے والے کمرے کا دروازہ نیم وا کیے کھڑا تھا کہ وہ شخص دبے پاؤں آیا اور اس نے مقفل دروازے سے کان لگا کے کچھ سننے کی کوشش کی۔ تالے کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ میں نے اس کی صورت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میں اسے مزید کارروائی کا موقع دینا چاہتا تھا اور میری عین خواہش تھی کہ وہ قفل کھولے تو اسے بے خبری میں جا لوں۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکلتی اور وہ سر اشکار ہاتھ آ جاتا لیکن اسی وقت کہیں کھٹکا ہوا اور کسی کی آواز یا سنائی دی کہ وہ چونک کر پلٹا اور جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی غائب ہو گیا۔ میں نے پوری احتیاط برتی اور اس کو نکل جانے کا موقع دیا۔ جب میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ لان پر کھڑا ایک وکیل سے بات کر رہا تھا۔

ان کے بہت قریب ہو جانے کے باوجود میں ان کی باتیں نہ سن سکا۔ وہ بہت آہستہ بول رہے تھے لیکن ماحول ایسا تھا کہ سب ہی دبے دبے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ میں نے کچھ اور قریب ہونا چاہا لیکن عبدالودود منظر کی مداخلت نے مجھے روک دیا۔ وہ رابعہ سے ملنا چاہتا تھا چنانچہ میں اسے اوپر لے گیا۔ دیگر تفصیلات اور دوسرے مسائل پر بات کرنے کا نہ وقت تھا اور نہ موقع۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا اور منظر رابعہ کی ماں پر پڑنے والے جان لیوا دل کے دورے کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یک لخت مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور پھر چل پڑا۔

" منظر!" میں نے کہا۔ " ابھی پیچھے نہ دیکھنا۔ ہمارے پیچھے لان پر ایک شخص کھڑا ہے۔ تقریباً وہیں جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی قمیص اور پتلون پہن رکھی ہے۔ اس کے مقابل ایک وکیل کھڑا ہے۔ تم اس وکیل کو جانتے ہو ؟ نام سے یا صورت سے پتہ"

منظر نے سر ہلایا اور برآمدے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ بڑی صفائی سے پہلو بدل کے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور بظاہر مجھ سے محوِ گفتگو رہا مگر اس کی آنکھوں نے لان کا سروے کر لیا۔

" میں نے اسے بار روم یا کسی کورٹ میں تو نہیں دیکھا۔" منظر بولا۔ " لیکن ایسے تو بہت سے نئے وکیل آتے رہتے ہیں اور میں سب کو نہیں پہچانتا۔ دو چار سال پرانے ہوں تو صورت آشنا ضرور ہو جاتے ہیں۔"

" میرا خیال ہے کہ بھیڑ کی کھال اوڑھ کے بھیڑیے بھی آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ " صرف کالا کوٹ پہن لینے کے بعد ان وکیلوں میں کوئی بد معاش آ جائے تو یہ کیا مشکل ہے۔"

" ہے تو مشکل۔" منظر بولا۔ " مگر ناممکن نہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے اسے۔ رابعہ کے ماتحت وکیلوں سے پوچھتا ہوں، وہ بھی اپنے دوستوں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ فراڈ ہو گا تو دھر

ہیں گے بعد میں۔ پہلے ذرا رابعہ سے مل لوں۔"
رابعہ کے پاس دس منٹ ٹھہرنے کے بعد منظر نیچے آگیا۔ میں اسے ٹہلتے ہوئے اِدھر سے اُدھر جاکے مختلف لوگوں سے بات کرتے دیکھتا رہا۔ ان میں سے بیشتر وکیل ہی تھے۔ مزید دس منٹ بعد میں اور وہ ایک دوسرے کے سامنے سے گزرے تو اس نے کہا۔ "ابھی تک تو کسی نے اسے شناخت نہیں کیا ہے۔ تمہارا خیال ٹھیک ہی لگتا ہے مجھے، وہ کوئی جعلساز ہے۔" میں صورت سے کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر مخالف سمت میں نکل گیا اور گیٹ کے بالکل سامنے سے فاکس ویگن ہٹا کے لوٹ آیا۔ دوبارہ دیکھنے پر مجھے وہ سلیٹی پتلون قمیص والا اور نقلی وکیل ایک دوسرے سے بہت دور بالکل اجنبی کی طرح کھڑے نظر آئے۔
اچانک کسی نے میری قمیص کی آستین پکڑ کے کھینچی۔ میں نے گھوم کے دیکھا تو وہ آٹھ دس سال کا بچہ تھا۔ تعزیت کے لیے آنے والی بہت سی عورتوں کے ساتھ بچے بھی آئے تھے۔
"کیا بات ہے بیٹے؟" میں نے جھک کر کہا۔ بچے نے جواب دینے کے بجائے کاغذ کا ایک پرزہ میری طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنا فرض پورا کرکے جانے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ اس غیر متوقع گرفتاری سے وہ کچھ گھبرا گیا۔
"ایک بات بتاؤ بیٹے!" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کے نرمی سے کہا۔ "کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟" بچے نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس عرصے میں میرے ہاتھ نے پرچے کو کھول لیا۔ اس میں لکھا تھا:۔
"اگر جنازہ اٹھنے سے پہلے ہمارے آدمی کو نہ چھوڑا
گیا تو ہم گھر کو اڑا دیں گے۔"
میں نے پرچہ جیب میں رکھ لیا اور بچے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر کالے کوٹ والوں پر جا رہی تھی مگر اس صورت کو تلاش کرنے سے قاصر تھی جس نے اسے یہ پیغام پہنچانے کی خدمت سونپی تھی اور غائب ہو گیا تھا۔ شاید اس نے بچے کو ایک روپیہ دیا ہوگا کہ وہ دیکھو، وہ جو سفید پتلون اور گہری نیلی قمیص والے انکل کھڑے ہیں نا، یہ ان کو دے آؤ شاباش۔ اور اب بچہ پریشان تھا کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ میں نے اس کو تھپکی دی۔ "جاؤ کھیلو، کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ بچے نے اطمینان کا سانس لیا اور اوپر بھاگ گیا۔ میرا ذہن ایک ایک لفظ کو دہراتا رہا اور صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتا رہا۔ جنازہ اٹھنے سے پہلے؟ یہ کسے معلوم ہے کہ جنازہ اٹھنے میں کتنی دیر ہے؟ پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹہ... اور یہ مہلت اسی تناسب سے بہت کم رہ گئی تھی۔ "اڑا دیں گے" سے بھی کچھ واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کریں گے۔ کیا وہ اس کے ڈائنامیٹ لگا چکے ہیں۔ باہر کاریں ہی کاریں کھڑی تھیں۔ بہت سے لوگ بریف کیس لے کر آئے تھے اور ان میں وہ جعلی وکیل بھی تھا۔ اس گہما گہمی میں کسی کا کوٹھی کے کسی حصے میں چھپ کے اپنی کارروائی میں مصروف رہنا ناممکن نہیں تھا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ دستی بم پھینک کے نکل جائیں گے اور ان کا آدمی کچھ بتانے سے پہلے ہی نیست و نابود ہو جائے گا مگر اس کے ساتھ یہ گھر، اس کے سوگوار وارث، وارثوں کے ہمدرد، میں اور محسن، یہ سب بھی نیست و نابود ہوں گے۔ رابعہ کی ماں کا جسدِ خاکی عزت و آرام کے ساتھ اپنی ابدی آرام گاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی پرزہ پرزہ ہو کے بکھر جائے گا۔ میرے لیے اس منظر کا تصور ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ چند سیکنڈ میں مفلوج کھڑا رہا۔ وقت بہت کم تھا اور میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نہ حفاظتی اقدامات، نہ نگرانی، نہ مقابلہ اور نہ بات چیت۔ انہوں نے واضح الفاظ اور دو ٹوک لہجے میں قطعی الٹی میٹم دیا تھا اور رعایت کی بالکل گنجائش نہیں رکھی تھی۔ ضامن رضوی صاحب کا چہرہ امید کی کرن بن کے میرے سامنے آگیا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑے سگار جلانے میں مصروف تھے۔ میں نے کوئی بات کیے بغیر پرچہ ان کے سامنے کر دیا۔
"تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا انکل!" میں نے کہا۔ "لیکن آپ اسے مذاق یا محض دھمکی نہ سمجھیں۔ کچھ لوگ گھر کے اندر موجود ہیں اور انہوں نے ایک بچے کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا ہے۔ ان میں سے دو کو میں شناخت کر سکتا ہوں۔ ان کا آدمی ہمارے پاس قید ہے۔"
ضامن رضوی پرانے، ذہین اور جہاندیدہ پولیس آفیسر تھے اور ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ فوری فیصلے کرنے اور صحیح قدم اٹھانے کی قابلِ رشک صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے میری صورت سے میری پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے سگار جلانے کا عمل جاری رکھا مگر ایک سطر کی وہ عبارت پڑھ لی جسے میں نے ذرا سی دیر کے لیے پھیلا کے سمیٹ لیا تھا۔
"تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والوں سے کہو جنازہ ایک گھنٹے کے بعد اٹھے گا۔" انہوں نے بالآخر سگار سلگا لیا۔ "اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی کے آ جانے کے بعد۔ یہ پھیلا دو۔ فون کہاں ہے؟"
"اوپر رابعہ کے کمرے میں۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ بظاہر اتنے کم وقت میں نہ میں نے ان کو کچھ دکھایا تھا اور نہ بتایا تھا لیکن ضامن رضوی صاحب نے بھی کمال کیا تھا کہ صورت سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پانچ منٹ بعد بھی میں نے دیکھا تو وہ اسی جگہ منہ میں سگار دبائے کھڑے تھے اور بجانے کس سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہ غائب تھے۔ میں نے قریب ہی حلقہ بنا کے کھڑے ہونے والوں سے کہا۔ "آپ لوگ تشریف رکھیں نا۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "بس اسلام آباد کی فلائٹ پہنچنے ہی والی ہے۔"
"کون آ رہا ہے اسلام آباد سے؟ کوئی عزیز؟" ایک شخص نے سوال کیا۔ کچھ اور لوگ بھی متوجہ ہوئے۔
"اسلام آباد سے مسٹر اور مسز شیروانی پہنچ رہے ہیں۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "محسن کے والدین۔ بس انہی کا انتظار ہے۔"
"اس کا مطلب ہے گھنٹہ بھر تو اور لگے گا۔" کسی نے اظہارِ خیال کیا۔ پھر کسی اور نے پوچھا کہ کیا ابھی ایک گھنٹہ اور لگے گا؟ میں نے پھر وضاحت کی۔ بات اب لان پر پھیلنے لگی تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم کا رُخ کیا اور اسی معذرت آمیز انداز میں تاخیر کی وجہ بیان کی۔ تجہیز و تکفین کمیٹی کے دو بزرگ ارکان میں سے ایک نے مجھے آ لیا۔ "میاں برخوردار! کیا نام ہے تمہارا؟ یہ تم سے کس نے کہا ہے؟ جنازہ تو تیار ہے۔"
"مگر چچا! رابعہ اجازت نہیں دے گی۔ جب تک انکل شیروانی نہیں آ جاتے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "اور پھر ایک گھنٹے کی تاخیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
تدفین کمیٹی کے دوسرے عمر رسیدہ رکن نے تدفین میں جلدی کرنے کے مسائل کا حوالہ دیتے ہوئے شرع کے مطابق اس کے فضائل بیان کیے۔ میں نے سعادت مندی سے اتفاق کرتے ہوئے اختلاف جاری رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام آباد سے آنے والوں کا انتظار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر موقع پاتے ہی میں نے محسن سے رابطہ قائم کیا اور اسے پوری بات بتائی۔
"یار اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ "ایک گھنٹے کی مہلت سے کیا ہوگا۔ ہمیں رابعہ کو نکالنا ہے، خود نکلنا ہے مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب میت کے ساتھ باقی سب لوگ بھی گھر سے نکل جائیں۔"
"اس کے بعد بھی گھر میں عورتیں موجود ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "وہ جاتے جاتے ہی جائیں گی۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں کہ ہم ان کے آدمی کو نکال کر کہیں اور لے جائیں اور خطرہ یہاں سے ٹل جائے۔ میں نے انکل رضوی سے بات کی ہے۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔"
رضوی صاحب نے اچانک کمرے میں قدم رکھا۔ "ان

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ہوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔
****
وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے
صدیوں کا بیٹا
پانچ حصوں میں مکمل
قیمت فی حصہ/۲۰ روپے ✱ ڈاک خرچ فی حصہ/۵ روپے
مکمل سیٹ منگانے پر قیمت صرف/۸۰ روپے، ڈاک خرچ/۶ روپے۔ کل/۸۶ روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سکا وہ آدمی کہاں ہے ؟ اسٹور میں ؟ ہوش میں ہے ؟"

"جی۔" میں نے کہا۔" اور میرا خیال ہے اسے یہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ مثلاً آپ اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔"

" میں یہی کر رہا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔" لیکن یہ بتاؤ کہ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ کیا کریں گے ؟ ظاہر ہے وہی جس کی انہوں نے دھمکی دی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ دو افراد کو شناخت کر سکتے ہو۔ اگر ان سے رابطہ قائم کیا جائے ؟"

" ان میں سے ایک تو دکیل ہے۔ بظاہر جعلی، دوسرا اصل آدمی ہے۔" میں نے کہا۔" وہ مجھے نظر آیا تو میں سامنے آئے بغیر اسی بچے کے ذریعے یا کسی اور بچے کے ہاتھ جواب ارسال کر کے ردِ عمل دیکھ سکتا ہوں۔"

" ابھی کچھ دیر بعد سادہ کپڑوں والے پولیس مین ہر طرف پھیل جائیں گے۔" رضوی صاحب نے کہا۔" وہ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ سکیورٹی والے جو حفاظتی انتظامات کے وقت پورے مجمع پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ذرا سی مشتبہ حرکت بھی ان سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ تم اس آدمی کو لے کر جاؤ۔ اگر ممکن ہو تو پیغام دے دو کہ اپنے آدمی کو کہیں وصول کر لیں۔ ظاہر یہی کرو کہ تم دھمکی سے ڈر کے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو۔ وہ تمہارے پیچھے آئیں گے اور تم انہیں دور لے جاؤ گے۔ آگے میرے آدمی ہوں گے۔"

" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ابھی تک ہمیں پوچھ گچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے مگر وہ پولیس کے پاس ہوگا تو ان کی دسترس میں نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔

" یہاں گولی چلانے والا بچ کے نہیں نکل سکے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔" وہ تم کو مجھ سے بات کرتے دیکھ چکے ہیں۔ سادہ کپڑوں کے باوجود وہ سکیورٹی والوں کو پہچان جائیں گے اور یہ حماقت نہیں کریں گے کہ ایک کو چھڑانے آئیں تو چار پکڑے جائیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا باہر کچھ دور جا کے کریں گے۔ جب وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ واقعی کوئی ان کا پیچھا نہیں کر رہا ہے اور یہ اطمینان دلانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے میرے آدمی تمہارے جانے کے بعد اندر آئیں گے۔ وہ دو کام کریں گے۔ ایک تو یہ چیک کریں گے کہ گھر میں کہیں آتش گیر مادہ تو موجود نہیں، دوسرا یہ کہ جنازہ فوراً باہر پہنچا دیں گے۔ تم نے ایک گھنٹے کی بات کی ہے، جنازہ پندرہ منٹ بعد باہر ہوگا۔ باقی لوگوں کے روانہ ہو جانے کے بعد وہ خواتین سے گھر خالی کرا لیں گے۔ رابعہ کو میں لے جاؤں گا۔ میرا مطلب ہے شوفر میرے گھر لے جائے گا۔"

" اور میں اس شخص کو لے کر کہاں جاؤں ؟" میں نے پوری

اسکیم پر غور کرتے ہوئے کہا۔

" ایمبیسڈر ہوٹل کی طرف۔ ذرا آگے کوڑے کا ایک ٹرک سڑک کے کنارے الٹا پڑا ہے۔ میرے آدمی اس کے اندر ہوں گے اور ٹھیک وقت پر باہر نکلیں گے، جب انہیں یقین ہو گا کہ اب تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ملزم بھی با آسانی حراست میں لیے جا سکتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔" وہ اندر ٹرانسمیٹر ریسیور لیے بیٹھے ہوں گے اور ہر بات سنتے رہیں گے۔ ملزموں کا راستہ اور آگے روکا جائے گا جب وہ اپنے آدمی کو لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ تمہیں بھی لے جائیں تو محتاط رہنا اور اپنی جان بچانے کی خود بھی کوشش کرنا۔ بس اب دیر مت کرو اور ہاں... اسے یعنی اپنے قیدی کو ذرا چھپا کے نکالنا۔ یوں کہ صرف دیکھنے والے دیکھ سکیں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

" یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔" اگر ہم معاملات کو اپنے ہاتھ ہی میں رکھتے تو بہتر تھا۔"

" سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر... ایک تو مجھے یہ مشکل لگا۔ پھر میں نے رضوی صاحب سے بات کر لی... اب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔" بظاہر تو کوئی خامی نہیں مگر دشمن بھی بے وقوف نہیں۔ یہ ففٹی ففٹی کا چانس ہے جو لینا ہی پڑے گا۔"

میں نے دو سطر کا جوابی پیغام لکھا۔

" ہم اس وقت مجبور ہیں۔ تمہارا آدمی رہا کیا جا رہا ہے۔ کوئی ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

گھر میں بہت سے بچے ایسے بھی تھے جو ماحول سے اور بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بے نیاز کھیل کود میں مصروف تھے۔ فطرتاً ان کے لیے نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ ایک بچہ زینے کی ریلنگ پر گھوڑے کی طرح سوار پھسلتا ہوا نیچے آیا۔ یہ وہی بچہ تھا۔ ریلنگ کے آخری کنارے پر اس نے بریک لگائی اور لکڑی کے ستون سے نہیں ٹکرایا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ بچے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں بھی دوسروں کی طرح سرکس کا مظاہرہ کرنے پر اسے سرزنش کروں گا۔ لیکن میں نے کہا۔" تم تو بڑے سمجھدار بچے ہو۔" پھر میں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا۔" یہ لو مگر ابھی ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ یہ پرچہ ایک آدمی کو دینا ہے مگر اسے کچھ نہیں بتانا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

بچہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑا۔ دکیل کی صورت مجھے کہیں دکھائی نہ دی لیکن سلیٹی رنگ کے کپڑوں والا نظر آ گیا۔ وہ لان کے آخری حصے پر کھڑا کوٹھی کے عقبی حصے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بچے نے اس مرتبہ چالاکی سے کام لیا اور پرچہ اس کو تھماتے ہی بھاگ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ سلیٹی کپڑوں

والے نے ایک سطر کے جواب کو پڑھا اور کاغذ کو جیب میں ڈال لیا پھر اس نے سر ہلایا۔ شاید اس کے ساتھی بھی وہیں تھے اور یہ اشارہ ان کے لیے تھا کہ جواب مثبت ہے۔ یا وہ مجھے بتانا چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں لوٹ کر اندر گیا۔ رضوی صاحب کی دی ہوئی پندرہ منٹ کی مہلت میں سے پانچ منٹ گزر چکے تھے۔

میں کاریڈور میں کھڑا رہا اور محسن نے اسٹور کا دروازہ کھولا۔ میری نگاہ ہر طرف تھی اور خالی ہاتھ ہونے کے باوجود میں پوری طرح چوکس تھا۔ اگر دشمن اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تو انہیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا اور بات وہی ہوتی جو رضوی صاحب نے کہی تھی یعنی وہ ایک کو چھڑا کے لے جانے کے بجائے کم سے کم دو کو ہاتھوں بیروں سے معذور یا بیہوش چھوڑ جاتے۔ شاید یہ بات وہ بھی سمجھتے تھے کہ آتشیں اسلحہ استعمال کیے بغیر وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکتے تھے لیکن فائرنگ سے وہ سب کو متوجہ کر لیتے تو محصور ہو جاتے۔ یہاں سب دہشت زدہ اور سراسیمہ ہو کے بھاگنے والے نہیں تھے۔

چند منٹ بعد ہمارا اجنبی قیدی دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ اب ہوش میں تھا مگر اس کے لیے سیدھا کھڑا رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ محسن اسے مقابل کے کمرے میں لے گیا اور ریوالور نکال کے کھڑا رہا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔" دیکھو تمہارے ساتھی تمہیں لینے آئے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ جمع ہیں، لیکن ان کو شناخت کرنے والا کوئی نہیں۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ تم کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس گھر کو اڑا دیں گے۔ یہاں ایک میت تیار رکھی ہے اس لیے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہاتھ منہ دھو لو اور اطمینان سے اپنے پیروں پر چل کے باہر جاؤ۔ تمہارے آگے یا پیچھے ہم ہوں گے۔ باہر سرخ رنگ کی ایک فاکس ویگن کار کھڑی ہے۔ تم کو اس میں لے جایا جائے گا۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس سے صورتِ حال مشتبہ ہو جائے۔"

" لیکن... لیکن وہ... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ لڑکھڑا کے دہشت زدہ لہجے میں بولا۔" میں... نہیں جاؤں گا۔"

میں نے سوالیہ نظر سے محسن کو دیکھا۔ یہ بات قطعی غیر متوقع تھی مگر غلط نہیں تھی۔" تمہارے ساتھ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں یہاں امن و امان رکھنا ہے، اس لیے تم کو جانا پڑے گا۔"

" میں نہیں جاؤں گا۔" وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح بلبلایا اور دروازے کی طرف لپکا۔ محسن نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگ اڑا دی اور وہ منہ کے بل گرا۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔

اس کے حلق سے دوسری آواز نہ نکل سکی۔ میں نے ایک وار میں اس کو پھر عالم بے ہوشی میں پہنچا دیا اور اسے بے حس و حرکت پڑا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ عام حالات میں ہم اسے زبردستی جلادوں کے حوالے نہ کرتے لیکن ہم اس سے زیادہ مجبور اور بے بس تھے۔

" اب تو اسے اٹھا کے ہی لے جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔" اور سب کے بیچ میں سے گزار کے۔"

" پچھلے حصے میں ایک طرف تو کچن ہے۔" محسن نے کہا۔" دوسری طرف ماسی کا کمرہ ہے اور اس کا ایک دروازہ پیچھے کھلتا ہے۔ اس گلی میں جو مشکل سے دو گز چوڑی ہے۔ اس کے بعد ساتھ والے گھر کی دیوار ہے۔ اگر میں اس کو لے کر دوسری طرف اتر جاؤں اور ساتھ والی کوٹھی کے دروازے سے نکلوں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"

" ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے تو دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔" اگر کسی نے شور مچا دیا ؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔" وہ سب یہاں موجود ہوں گے۔ کوئی نوکر دیکھ سکتا ہے مگر یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔"

" ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔" میں ادھر سے آتا ہوں۔ سب کے بیچ میں سے گزر کے، جو لوگ ایفائے عہد کے منتظر ہیں، وہ دیکھ ہی لیں گے اور تیار ہو جائیں گے۔ اتنی دیر میں تو اس حرامزادے کو لے کر آ جائے تو میں خاموشی سے روانہ ہو سکتا ہوں۔"

مین گیٹ سے نکل کر میں گلی میں آیا۔ اس دوران محسن اسے گلی میں لے آیا تھا۔ اس نے بیہوش آدمی کو میرے حوالے کر دیا۔ درمیانی دیوار آٹھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ محسن اس پر سے پلک جھپکتے میں کود گیا۔ میں نے اس کی سیٹی سنی جو" آل کلیئر" کا سگنل تھی۔ میں نے کندھے پر جھولنے والے شخص کو اوپر اٹھایا اور اچھال دیا۔ وہ تقریباً دیوار کو چھوتا ہوا گیا اور میں نے اس کے دوسری طرف دھپ سے گرنے کی آواز سنی۔ پھر میں پلٹا اور تیزی سے دروازہ بند کر کے راہداری کو عبور کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر ڈرائنگ روم سے گزر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ دشمنوں کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہوں گی اور انہوں نے مجھے مین گیٹ سے باہر جاتے دیکھا ہوگا۔ میں نے فاکس ویگن کا دروازہ کھولا جو اب ساتھ والی کوٹھی کے گیٹ سے قریب تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اتنی کاریں کھڑی تھیں اور ان میں اتنے لوگ مصروفِ انتظار تھے کہ میں کسی کو ہوشیار ہوتے نہ دیکھ سکا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ دوسرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گیٹ سے محسن نمودار ہوا۔ فاصلہ بہت کم تھا پھر بھی بہت سی نظروں نے ایک بے ہوش آدمی کو رابعہ کی گاڑی میں ڈالنے کا منظر دیکھا۔

"محسن!" میں نے کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر رضوی صاحب کے آدمی جنازہ بخیر و عافیت اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں تو سب سے پہلے رابعہ کی فکر کرنا۔ اسے رضوی صاحب کی گاڑی میں پہنچانا تیرا کام ہے۔ ہم تدفین میں شرکت کی کوشش کریں گے لیکن بدقسمتی کے باعث شرکت نہ ہو سکے تو کوئی بات نہیں، دوسرے لوگ بہت ہیں۔ تجھے میری واپسی کا انتظار کرنا ہے۔"

محسن نے سر ہلایا اور سیدھا نکل گیا۔ میں نے کار کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن صبح کی طرح غرایا اور خاموش ہو گیا۔ دوسری اور تیسری بار کی کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ میں نے پریشانی سے اپنے ہمسفر کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر لاش کی طرح پڑا تھا اور گاڑی کو دھکا نہیں لگا سکتا تھا۔ گاڑی میں اسٹارٹنگ کی کوئی معمولی سی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نیچے اترا اور آگے پیچھے کی گاڑیوں کا جائزہ لیا۔ ایک گاڑی خالی تھی۔ دوسری میں دو نوجوان پیچھے والی سیٹ پر براجمان سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور انہوں نے مجبوراً دھکا لگایا۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ رضوی صاحب کی دی ہوئی مہلت سے بھی پانچ منٹ زیادہ گزر چکے تھے۔ کلچ چھوڑتے ہی انجن نے جھٹکا لیا، اور اسٹارٹ ہو گیا۔ جنازہ ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ میں نے کار کو سڑک کے وسط میں روکا۔ نیچے اترا اور ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہانے مزید دو منٹ ضائع کیے۔ جب میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے پیڈل دبایا تو فاکس ویگن آگے بڑھی اور اسی وقت مجھے سامنے کے آئینے میں پیچھے کا منظر دکھائی دیا۔ جنازہ باہر آ گیا تھا اور لوگ بڑی عجلت میں کاروں سے نکل نکل کے ان لوگوں میں شامل ہو رہے تھے جو رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے ہجوم کی شکل میں نکل رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کار آگے بڑھائی۔ جنازے کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانا تھا چنانچہ سب خالی کاریں وہیں کھڑی رہ گئی تھیں۔ سوائے ایک کار کے جو قطار میں سے نکل کے میرے پیچھے آئی تھی۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا تھا کیونکہ وہاں کھڑی ہوئی سب کاریں جنازے میں شرکت کے لیے آنے والوں کی نہیں تھیں۔

میں نے محسن سے بھی نہیں کہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک خود مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کروں گا لیکن میرے ذہن میں محسن کی بات ٹوٹ کر رہ جانے والے کانٹے کی خلش بن کر موجود تھی۔ خود میں بھی محسن کا ہم خیال تھا کہ معاملات اگر ہمارے ہاتھ میں رہتے تو بہتر تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی کہتا تھا کہ رضوی صاحب کے حفاظتی اقدامات آخری وقت میں بے کار ثابت ہوں گے۔ اب جنازہ آبرو کے ساتھ اٹھ چکا تھا اور مجھے یقین آنے لگا تھا کہ محسن نے بھی رابعہ کو نکال لیا ہو گا۔ کسی بہانے سے۔ قائل کر کے یا زبردستی۔ اور باقی رہ گئی ہوں گی وہ عورتیں جو سوائے چند ایک کے خود بھی رونا رو رہی ہوں گی۔

میں نے اس کار کو دیکھا جو میرے پیچھے آ رہی تھی ۔۔۔ میں اس کا نمبر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا تھی۔ سامنے سے میں نے کارپوریشن کے کوڑا اٹھانے والے اس ٹرک کو بھی دیکھا جو نہ جانے کب سے ایسے ہی سڑک کے کنارے الٹا پڑا تھا۔ کسی لاوارث لاش کی طرح۔ فیصلہ میرے ذہن میں یوں آیا جیسے زلزلہ آتا ہے کہ لمحہ بھر پہلے زمین ساکت اور پرسکون ہوتی ہے اور دوسرے ہی لمحے دستِ غیب سب کچھ تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ میں نے گاڑی کو تیزی سے ایک کوٹھی کے گیٹ میں موڑ لیا۔ سفید ٹویوٹا نے یک لخت رفتار میں اضافہ کیا اور گولی کی طرح میرے پیچھے آئی۔ کوٹھی کا صرف ایک ہی گیٹ تھا۔ پرانی وضع کی ایک منزلہ کوٹھی کے برآمدے میں دو عورتیں بید کے فرنیچر پر درمیان میں چائے کے برتن رکھے بیٹھی تھیں۔ ان دونوں نے بیک وقت حیرانی و پریشانی سے سرخ فاکس ویگن کو دیکھا لیکن میں پورچ تک جانے والے راستے کو چھوڑ کر دائیں طرف گھوم گیا۔ اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں پھولوں کو بیدردی سے روندتا ہوا لان پر سے گزرا جو گھر کی مناسبت سے مختصر تھا۔ عورتوں نے بیک وقت خوفزدہ ہو کے چیخ ماری اور میں نے آنکھیں بند کر کے ایکسیلیٹر کو دبا دیا۔ کار نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ جست لگائی اور اس کا انجن زبردست طاقت کا اظہار کرتے ہوئے گرجا۔ گاڑی توپ سے فائر ہونے والے گولے کی طرح بڑھی اور میں نے خود کو سنبھال کے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ احاطے کی دیوار سے تصادم کی آواز کے ساتھ ہی مجھے جھٹکا لگا مگر بمپر نے پرانی دیوار کو بلڈوزر کے بلیڈ کی طرح گرا دیا تھا اور اینٹوں کے ڈھیر ہونے سے پہلے گاڑی اگلی سڑک پر آ چکی تھی۔ اس وقت میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اگلے یا پچھلے حصے پر اینٹوں سے کتنے ڈینٹ پڑے ہیں اور پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے شخص کا کیا حال ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اور ونڈ اسکرین سلامت رہا تھا ورنہ اس کا شیشہ بکھرتا تو

مجھے زخمی کر سکتا تھا اور میرے چہرے پر لگتا تب مجھے اندھا بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے سفید ٹویوٹا کو اسی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتے دیکھا اور مسکرایا۔ ان کے راستے میں ٹوٹی ہوئی دیوار کا ملبہ حائل تھا اور ان کے لیے باہر نکلنے کے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ ریورس گیئر میں واپس ہوں اور پھر گیٹ سے نکلیں۔ یا دوسری جگہ سے دیوار شق کر کے میری تقلید کرتے ہوئے سڑک پر آ جائیں لیکن میرے مقابلے میں ان کی مشکلات زیادہ تھیں۔ لان پر پانی دیا گیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ ریورس گیئر میں گاڑی کے پہیے دھنس جائیں اور وہیں گھومنے لگیں تو کار پھنس جائے۔ فاکس ویگن کے پہیے بڑے تھے اور میں پوری رفتار سے گزر گیا تھا۔ ٹویوٹا کے ڈرائیور نے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور رک کر واپس ہونا چاہا تو شاید کامیاب نہ ہو۔ اگر اس نے بھی دیوار میں سے گزرنا چاہا تو میرے مقابلے میں ان کے لیے خطرات پھر زیادہ ہوں گے۔ ٹویوٹا لمبی کار تھی اور اس کی پک اپ فاکس ویگن جتنی نہیں تھی کہ ملبا اوپر گرنے سے پہلے کار عبور کر جائے۔ اس کا ونڈ اسکرین ٹوٹنے اور توازن بگڑنے کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ مجھے فاکس ویگن کے بمپر نے بھی بچایا تھا جو کافی آگے نکلا ہوا ہوتا ہے اور ایک فائدہ مجھے یہ بھی حاصل تھا کہ انجن پیچھے تھا جسے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ٹویوٹا کا انجن آگے تھا چنانچہ تصادم کے بعد اس کا بند ہو جانا بھی ممکن تھا۔ ان باتوں کے علاوہ مجھے یقین تھا کہ عورتیں فاکس ویگن کا نمبر تو شاید نہ دیکھ سکی ہوں مگر ٹویوٹا کا نمبر وہ یقیناً دیکھیں گی گھر میں فون ہوا تو فوراً اندر بھاگ گئی ہوں گی۔ دشمن کی کار پھنس گئی تو وہ اس کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوں گے اور مجھے کچھ مہلت مل جائے گی۔ کسی کا برا میں نے کبھی نہیں چاہا لیکن اس وقت بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی جو بددعا تھی کہ کاش ان کی گاڑی پھنس جائے اور وہ زخمی ہو جائیں۔

جب میں ٹیڑھی میڑھی کار کو دوڑاتا ہوا واپس جا رہا تھا تو مجھے سڑک کے کنارے ایک سپیرا نظر آیا۔ وہ مزے سے بین بجاتا اپنی پٹاری کمر پر ڈالے پیدل جا رہا تھا۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے بریک لگا کے گاڑی کو بالکل اس کے پاس روک لیا۔ وہ کچھ سہم کر ایک طرف ہو گیا اور اس کی بین رک گئی۔

"دیکھو، ادھر آؤ۔" میں نے اسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا۔ "یہ جو سانپ ہیں تمہارے پاس، یہ خطرناک ہیں؟"

سپیرا ڈرتا ڈرتا قریب آیا۔ "نہیں بادشاہو! ہم پیٹ پالنے کے لیے تماشا کرنے والے جوگی ہیں۔ سانپ کا زہر پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ بچوں کو بڑوں کو ہم سے اور ہمارے سانپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور ہمارے پاس تو ایک ہی سانپ ہے سرکار!" وہ مجھے مجسٹریٹ یا پولیس افسر وغیرہ سمجھ کے وضاحت کر رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی ایسا سانپ نہیں جس سے کسی کی جان جانے کا اندیشہ ہو۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کتنے میں بیچو گے اسے؟ مجھے ایک ہی سانپ چاہیے۔"

وہ کچھ دیر ہکا بکا کھڑا میری صورت دیکھتا رہا۔ "بیچتے نہیں ہم جوگی۔ یہ تو اپنی روزی ہے۔"

"ارے بابا! تم دوسرا لے لینا، جہاں سے بھی ملے تمہیں معلوم ہو گا کہاں ملتے ہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ "قیمت بتاؤ۔" "دو سو چار سو..." اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے سانپ جنگل سے پکڑا ہو گا اور وہ دوسرا بھی آسانی سے حاصل کر لے گا۔

لیکن اس نے دیکھا کہ میری ضرورت اشد ہے اور میں منہ مانگی قیمت بھی دے سکتا ہوں۔ "نہ دو نہ چار بادشاہو! پورے ایک ہزار۔" اس نے انگلی اٹھائی۔

میں نے اپنا پرس نکالا۔ اس میں صرف سات سو روپے تھے۔ حرامزادہ ۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ پھر مجھے اس شخص کا خیال آیا جو پیچھے لیٹا تھا۔ جب ہم اسے قیدی بنا کے لائے تھے تو محسن نے دس ہزار کی ایک گڈی بھی اٹھا لی تھی۔ یہ رقم ہمیں مقتول چوکیدار کے وارثوں کو ارسال کرنی تھی۔ محسن نے یہ گڈی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دی تھی۔ ایک منٹ بعد میں سو سو کے دس نوٹ دے کر اور پٹاری لے کر پھر روانہ ہو چکا تھا اور سپیرا ہاتھ میں نوٹ پکڑے وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ ایک فضول سے بے ضرر سانپ کے بدلے اسے منہ مانگی دولت مل گئی تھی۔ جتنی شاید وہ پورا مہینہ جھک مار کر بھی نہ کما پاتا۔ اسے افسوس ہو رہا ہو گا کہ کاٹھ کا الو پھنسا تھا اور اس نے دو ہزار یا دس ہزار حاصل کرنے کا سنہری موقع گنوا دیا۔

گاڑی کو پھر اسی جگہ روک کے میں نے پیچھے دیکھا۔ کوئی شکستہ حال ٹویوٹا سڑک پر دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے اس شخص کو گھسیٹا اور کندھے پر ڈال کے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ قدرت خود سازگار حالات فراہم کر رہی تھی۔ باہر کوئی نہیں تھا اور مجھے اس بیہوش شخص کو جھاڑیوں کے پیچھے ڈالتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے سے اکا دکا خواتین باہر آ رہی تھیں میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھر باہر بھاگا۔ کار کا بونٹ پچک گیا تھا اور ہاتھ لگاتے ہی اٹھ گیا۔ فاضل ٹائر اور جیک وغیرہ کے علاوہ اس میں سے مضبوط نائلون کی رسی بھی برآمد ہوئی جو شاید اس لیے رکھی گئی تھی کہ کہیں گاڑی بالکل ہی جواب دے جائے تو اس کو کسی دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر لایا جا سکے۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیہوش شخص کی مشکیں کسیں اور پٹاری سمیت رابعہ کے گھر میں کود گیا۔ رضوی صاحب کے آدمی اگر پوزیشن سنبھال چکے تھے تو شاید کمرے میں اور کوٹھی کے سامنے والے حصے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے اوپر جاتے دیکھا اور میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھر کا آدمی ہوں اور وہ ضامن رضوی صاحب کی ہدایات کے مطابق اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ حوالہ مجھے معتبر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ پٹاری کو میں نے پیچھے کر لیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس میں کتنا بڑا سانپ ہے لیکن وزن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانپ چھوٹا ہی ہے۔ تاہم اس کی دہشت خواتین کے مجمع کو جتنی جلدی منتشر کر سکتی تھی اتنی جلدی اسٹین گن بھی نہیں کر سکتی تھی۔ موقع ملتے ہی میں نے رابعہ کے کمرے کا دروازہ کھولا اور سانپ کو باہر نکالا۔ وہ مٹیالے سے رنگ کا چار فٹ لمبا اور ایک انچ سے کچھ موٹا سانپ تھا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور اس کی دُم کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کے باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سانپ کو رابعہ کے کمرے کی سمت اچھال دیا جہاں سب خواتین جمع تھیں۔ صرف ایک منٹ بعد کسی عورت نے دہل کر دل ہلا دینے والی چیخ ماری۔ "سانپ۔۔" اس کا ساتھ دیگر دو عورتوں نے دیا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ سانپ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن عورتیں اپنے بچے اور برقعے سمیٹ کر سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہو رہی تھیں۔ تاہم کچھ خوف کے باعث کمرے سے ہی باہر نہیں آ رہی تھیں۔ میں اطمینان سے آگے بڑھا اور میں نے خواتین کے سامنے سانپ کو لات مار کے دور پھینک دیا۔

"اب آپ لوگ نکل جائیں۔" میں نے سانپ کے اور دروازے کے درمیان کھڑے ہو کر کہا۔ چند منٹ میں گھر کے اندر ماسی سمیت کوئی عورت نہیں رہی تھی۔ صرف ضامن رضوی صاحب کے چار آدمی مجھے گھور رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے سانپ کا چکر کیوں چلایا تھا۔

"کہیں کوئی آتش گیر مادہ، ٹائم بم یا ڈائنامیٹ ملا؟" میں نے اطمینان سے پوچھا جیسے میں ان کا افسر ہوں۔

ایک شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ دوسرے نے کہا "ہم نے چیک کر لیا ہے۔"

"اچھا، تو آپ لوگوں کا کام ختم۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ دھمکی جھوٹی ثابت ہو گئی تھی۔"

میرے لہجے سے وہ کچھ دب گئے۔ "کیا ہم باہر موجود رہیں جناب؟"

"نہیں، تم لوگ جاؤ۔" میں نے مزید تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ "میں کوٹھی کو لاک کر رہا ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نیچے اتر گئے۔ میں نے نیچے جا کے دیکھا تو وہ دروازے پر کھڑے ہوئے لوگوں کو بھگا رہے تھے جو حواس باختہ خواتین کو فرار ہوتے دیکھ کر تجسس کے باعث رک گئے تھے۔ محسن نے ان کے نکلتے ہی گیٹ بند کر دیا۔

"تو نے رابعہ کو نکال دیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

"اسے تو رضوی صاحب کا شوفر لے گیا۔" وہ بولا۔ "تو نے یہ کیا ڈرامہ کیا ہے؟"

"میں سب کو چکر دے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "قیدی بدستور ہمارے پاس ہے۔ برابر والی کوٹھی میں جھاڑیوں کے پیچھے پڑا ہے۔ وہ۔۔۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، کوٹھی کی دیوار پر یکے بعد دیگرے تین افراد نمودار ہوئے۔ ان میں وہ سلیٹی پتلون قمیص والا بھی تھا لیکن اس کے چہرے پر خون کی لکیریں سی نظر آ رہی تھیں۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے بھی میری طرح گاڑی نکالنی چاہی تھی مگر ناکام رہے تھے اور شاید ان کے اتنی دیر سے پہنچنے کا سبب یہی تھا کہ وہ پیدل دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے چلا کر محسن سے بھاگنے کو کہا مگر ہمارے بھاگنے سے پہلے سلیٹی قمیص والے کے لبوں سے ایک غلیظ گالی نکلی اور اس نے اندر کودتے کودتے ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ اگلے فائر سے پہلے ہم اندر پہنچ چکے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور محسن نے پلک جھپکنے میں ریوالور مجھے تھما دیا۔ میں نے کھلے دروازے سے ایک فائر کیا جس کا مقصد محض دشمن کی پیش قدمی کو روکنا تھا۔ پھر میں زینے کی طرف لپکا۔ میں آدھے راستے میں تھا کہ وہ اندر آ گئے۔ محسن بالکل دروازے کے پیچھے تھا۔ اس نے پہلے شخص کو ٹانگ اڑا کے گرا دیا۔ وہ چہرے کے بل فرش پر یوں گرا کہ اس کے پیچھے آنے والا بھی نہ سنبھل سکا۔ لیکن پہلے والے نے فوراً اٹھ کر میرا نشانہ لیا اور میں نے دو زینے کود کے گولی چلائی۔ وہ چیخ کے ساتھ تیورا کے گرا۔ دوسرے نے محسن کی طرف گھومنا چاہا تھا کہ میں نے نشانہ

کر فائر کیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور اس کا اپنا نشانہ خطا ہو جانے سے محسن کی جان بچ گئی۔ محسن بھاگا اور اس نے پہلے چت ہو جانے والے کے ریوالور کو فٹ بال کی طرح کک ماری۔ ریوالور چکنے فرش پر بڑی آواز کے ساتھ دور تک پھسلتا گیا۔ میں نے دھیں پوزیشن سنبھال کے محسن کو بچانے کے لیے دوسرے کا نشانہ لیا جو ایک شانہ زخمی ہو جانے کے باوجود ریوالور اٹھا رہا تھا۔ اگر وہ حرکت نہ کرتا تو گولی اس کے دوسرے شانے میں لگتی مگر اس کے لڑکھڑا جانے کے باعث گولی اس کے سر میں گھس گئی۔ محسن سیدھا نکل گیا تھا اور میں سمجھ گیا کہ وہ پھر آخری حصے میں ماسی کے کمرے سے عقبی گلی میں نکل جائے گا اور پھر ساتھ والی اسی کوٹھی میں کود جائے گا جہاں ہمارا قیدی بندھا پڑا تھا لیکن اب صورت حال خاصی مخدوش ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز سڑک تک ضرور پہنچی ہو گی۔ عین ممکن ہے ساتھ والی کوٹھی میں رہنے والے بھی باہر نکل آئیں اور محسن کو اندر کودتا دیکھ لیں۔ "اس کا راستہ تو شاید کوئی نہ روکے مگر اس قیدی کو وہاں سے نکالنا مسئلہ بن جائے گا۔" میں نے سوچا۔ اسی وقت ایک اور شخص اندر آیا۔ یہ سلیٹی رنگ کی قمیص پتلون والا تھا۔ اس نے کاریڈور میں دوڑ لگائی اور میں نے زینے پر سے جھک کے فائر کیا مگر وہ اسٹور روم کے دروازے تک جا پہنچا تھا جو پھر مقفل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے غلط فہمی ہے۔ اس کے خیال میں ان کا آدمی ابھی تک اس قید خانے میں موجود تھا۔ تالہ توڑنا یا کھولنا ناممکن تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ وہ گولی چلا کے تالے کو اڑا دے گا مگر گولی کی آواز کے بجائے ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ گرد اور دھوئیں کا طوفان سا اٹھا اور مجھے اس گھر کی دیواریں گرتی نظر آئیں۔ میں دوسری طرف بھاگا۔ دھماکہ دستی بم کا تھا جس نے اسٹور روم اور اس سے ملحق کمروں کی چھت بٹھا دی تھی۔ میں ایک کھڑکی میں سے باہر لٹک گیا جو رابعہ کے کمرے سے نچلی منزل کے چھجے پر کھلتی تھی۔ اسی وقت دوسرا دھماکہ ہوا اور میرے ہاتھ خود بخود چھوٹ گئے۔ میں بارہ فٹ کی بلندی سے نیچے گرا۔ میری نظروں کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا پھیل گیا۔ گرد اور دھوئیں میں مجھے سانس لینا دوبھر ہونے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر بھاگا اور سوچے سمجھے بغیر ساتھ والے گھر کی دیوار پھاند گیا۔ رابعہ کا گھر اب شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ افشائے راز کے خوف اور ایک آدمی کے لیے دشمنوں نے ایک گھر تباہ کر دیا تھا مگر مجھے کامیابی نے نیا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ میت اپنے مدفن کی طرف پورے سکون کے ساتھ محوِ سفر تھی۔ رابعہ ضامن رضوی کے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی اور دشمن جس نے اپنے تین آدمی گنوا دیے تھے ایک اسیر کو چھڑانے میں ناکام رہا تھا۔

دوسری طرف کودتے ہی مجھے محسن نظر آیا۔ ہم ایک ساتھ گیٹ کی طرف لپکے۔ کوٹھی کے مکین شاید خوفزدہ ہو کے اندر جا چھپے تھے میں نے جھاڑیوں کے پیچھے پڑے ہوئے شخص کو رسی تھام کے گھسیٹ لیا۔

"خیال رکھنا محسن! جو قریب آئے گولی مار دینا۔" میں نے ریوالور اس کی طرف اچھال دیا اور اس شخص کو اٹھا کے گاڑی کی طرف دوڑا۔ رابعہ کی کوٹھی کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا اور شعلے مزید بلند ہو گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہوتا، میں اور محسن اپنے جنگی قیدی کو لے کر محاذِ جنگ سے فرار ہو چکے تھے۔ رابعہ کے گھر کے کھنڈر کو شعلے کھا رہے تھے لیکن اس کو اب یہاں لوٹ کے کب آنا تھا۔

"تو نے رابعہ کو سب بتا دیا تھا؟" میں نے خطرے کی حدود سے نکلتے ہی کہا۔

"مجبوری تھی۔" محسن بولا۔ "وہ تیرے بارے میں متفکر تھی۔ کہنے لگی کہ سکندر کا جانا کیا ضروری تھا۔ ضامن رضوی صاحب کا کوئی آدمی بھی تو یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ شاید دشمن اعتبار نہ کرتے۔ پولیس کے درمیان میں پڑنے سے شکوک پیدا ہو جاتے۔ تو اب کیا وضاحت پیش کرے گا؟ تدفین کے بعد یہ لوگ واپس جائیں گے اپنی اپنی کار لینے تو وہ گھر جہاں سے جنازہ اٹھا تھا جل کے راکھ ہو چکا ہو گا۔"

"میں قبرستان میں رضوی صاحب سے بات کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ وہ اور ہم سب کسی سے کچھ نہ کہیں۔ پولیس کو تفتیش کرنے دیں۔ حقائق جو سب کے سامنے آئیں گے، ہمیں بھی معلوم ہو جائیں گے۔"

"لیکن انہوں نے فون پر احکامات دیے تھے۔"

"اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بعد وہ مجبور ہوں گے کہ ان احکامات سے بھی لاتعلقی ظاہر کریں۔" میں نے کہا۔ "جو انہوں نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جاری کر دیے تھے۔ سرکاری طور پر ان احکامات کا جواز پیش کرنا ان کے لیے اختیارات کے ناجائز استعمال کا مسئلہ بھی کھڑا کر دے گا۔ وہ اور ان کے ماتحت ملوث ہونے سے گریز کریں گے۔ یہ معاملات ہی ایسے ہیں۔"

میں نے گاڑی کو میاں میر صاحب کے قبرستان جانے والے انفنٹری روڈ کی طرف موڑنے کے بجائے اس کا رخ دھرم پورہ والی سڑک کی طرف کر دیا۔ فائر بریگیڈ والوں کی دو گاڑیاں گھنٹی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بجاتی ہمارے سامنے سے نمودار ہوئیں اور سیدھی گزر گئیں۔ میں نے جگہ دیکھ کر کار کو موڑا اور ایک بنک کے بند دروازوں سے چند قدم کے فاصلے پر دیوار سے یوں لگا کے کھڑا کیا کہ محسن کو میری طرف والے دروازے سے باہر آنا پڑا۔ کار کسی گھر کے سامنے نہیں تھی اور سڑک سے بھی دور تھی۔ ہمارا قیدی اگلی اور پچھلی سیٹوں کی درمیانی جگہ پر بندھا پڑا تھا اور فوری طور پر اس کے ہوش میں آنے کا خطرہ نہیں تھا — تاوقتیکہ بلاوجہ کوئی بند شیشوں سے ناک چپکا کے نہ دیکھتا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ الگ تھلگ کھڑی ہوئی خستہ حال کار میں کوئی آدمی بھی پڑا ہے۔ مزید احتیاط میں نے یہ کی کہ پچھلی سیٹ کو نکالا اور الٹا کر کے رکھ دیا اور پھر کچھ آگے بڑھا کے آگے والی سیٹوں سے ملا دیا۔ ہمارا قیدی اس کے نیچے آ گیا اور گاڑی یوں نظر آنے لگی جیسے زیرِ مرمت ہے۔ سیٹ کے اسپرنگ دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے سے بیٹری نمودار ہو گئی تھی اور سامنے کی ٹوٹ پھوٹ دیکھ کر مجموعی تاثر کچھ ایسا ہوتا کہ گاڑی مدت سے چلی نہیں۔ میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا لیکن اس سے کام نہ بنا۔ ایک گلی سے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہوئے مجھے مسجد نظر آئی اور میں وضو کرنے والی جگہ سے ہاتھ منہ دھو کے لوٹا تو وہ گرد و غبار صاف ہوا جو رابعہ کے گھر میں میرے چہرے اور بالوں پر بیٹھ گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے بالوں میں کنگھی پھیری اور ہم چند منٹ بعد انفنٹری روڈ پر طلوع ہوئے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی ہمیں دو جگہ اجتماع دکھائی دیے۔ دور کے اجتماع میں کالے کوٹ نمایاں تھے۔ میں اور محسن خاموشی سے لحد کے گرد حلقہ بنا کے کھڑے ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔

میری نظر نے ضامن رضوی صاحب کو تلاش کیا۔

وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ رضوی صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ نامعلوم طریقے پر وہ پیچھے ہٹے اور ان کی نظر کا اشارہ پا کے میں بھی پیچھے ہوا اور گھوم کر ان کے قریب جا پہنچا۔ اب ہم لوگوں سے چند قدم دور کھڑے تھے۔ "سوری انکل!" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "آپ کا انتظام فیل ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور دونوں ہاتھ باندھے پیر پھیلائے سکون سے کھڑے رہے۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نکلتے ہی آ لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سفید رنگ کی ٹویوٹا کار تھی۔ مجھے روکنے کے لیے انہوں نے فائرنگ کی تو مجھے جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔"

"تم وہاں تک بھی نہیں پہنچے جہاں میرے آدمی موجود تھے؟ اس لیٹے ہوئے ٹرک تک؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس سے پہلے ایک کوٹھی میں گھس گیا تھا۔ اس کا دوسرا گیٹ ہی نہیں تھا۔ مجھے دیوار توڑ کے نکلنا پڑا کیونکہ وہ بھی تعاقب میں اندر آ گئے تھے۔ غالباً ان کی کار وہیں پھنس گئی۔ میں واپس گھر گیا۔"

"وہاں بھی کوئی نہیں تھا؟" رضوی صاحب کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

"وہاں چار آدمی تھے۔ میں نے انہیں رخصت کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ کوٹھی میں ایک سانپ نکل آنے سے عورتیں خوفزدہ ہو کے بھاگ گئی تھیں۔"

"سانپ؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا۔ "سانپ کہاں تھا؟"

"اوپر، جہاں میت رکھی تھی۔ وہیں برآمدے میں کسی عورت نے دیکھا تھا۔ بے ضرر سا سانپ تھا۔ میں نے مار دیا، مگر عورتیں چلی گئیں تو میں نے مناسب سمجھا کہ گھر کو لاک کر دوں۔"

"اور وہ آدمی؟ جسے وہ مانگ رہے تھے؟" رضوی صاحب کا ذہن تمام صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے کوشاں تھا۔

"وہ ہمارے پاس ہی تھا... ہے...؟" میں نے کہا۔ "ہم چلنے ہی والے تھے کہ وہ اندر آ گئے۔ انہوں نے گھر تباہ کر دیا۔ غالباً دستی بم مارے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔"

فکر و تردد کے آثار رضوی صاحب کی صورت سے عیاں تھے۔ "یہ معاملہ تو بہت سنگین ہو گیا ہے۔ مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے۔" ان کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

"کچھ نہیں انکل! آپ نے زبانی احکامات دیے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ بعد میں پہنچے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے بھی دشمن کی چال کہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی پوچھے تو قطعی لاعلمی کا اظہار کر دیجیے۔ کسی نے آپ کی آواز بنائی ہوگی۔"

"بالفاظِ دیگر میں جھوٹ بولوں۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "قصوروار ماتحتوں کو بتا دوں کہ وہ تصدیق کیے بغیر کیوں آ گئے۔ یا پھر ان سے بھی کہوں کہ وہ میرے احکامات اور تعمیل کرنے کے معاملات سے لاعلمی کا اظہار کریں۔ سکندر! تم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

"دشمن تو وہ میری جان کے ہو رہے ہیں انکل! آپ کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے جانتے بوجھتے برا ماننے کے انداز میں کہا۔ "اگر آئندہ میں آپ سے مدد کی درخواست کروں تو آپ انکار کر دیں۔" میں آگے بڑھ کے لوگوں میں شامل ہو گیا۔ غالباً رضوی صاحب کو بعد میں احساس ہوا کہ قصوروار میں نہیں اور جو کچھ ہوا اس کا اندازہ تو وہ خود بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب تدفین سے فارغ ہو کے لوگ واپس ہو رہے تھے تو وہ عمداً پیچھے رہے۔ "سکندر!" انہوں نے میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میں تم سے بے تعلق بھی نہیں رہ سکتا۔ گھر چل کے تم مجھے تفصیل سے بتاؤ گے کہ یہ آدمی تمہارے ہاتھ کیسے آیا۔ کون ہے اور اب اس کا کیا کرو گے؟"

"اسے تو میں اب آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ آپ کے گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اب وہ لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ وہ آدمی رابعہ کی کوٹھی میں ہی ہلاک ہو گیا۔ جل گیا یا دفن ہو گیا۔ یہ تو آپ کو رابعہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے سب معلوم ہے۔"

وہ مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن مجھ سے مزید گفتگو کو انہوں نے لاحاصل سمجھا۔ محسن نے مجھے اور ان کو باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور دور دور چلتا رہا تھا۔ رضوی صاحب کے جدا ہوتے ہی وہ قریب آیا لیکن دوسری طرف سے منظر نے مجھے پہلے ہی آ لیا۔

"یار! میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ وہ اتنا پیدل چلنے کا عادی نہیں تھا اور اپنے بھاری بھرکم وجود کا بوجھ گھسیٹنا اس کے لیے محنت طلب کام تھا۔ "رابعہ کے گھر پر موقع نہیں تھا، لیکن یہ تو دنیا کے معاملات ہیں۔ ایسے ہی چلتے ہیں۔ تمہارا وہ کیس تھا نا، دوبارہ والد مرحوم کا پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست، اس پر احکامات صادر ہونے سے پہلے تمہارا بیان ہوگا اور تین گواہ...."

"گواہوں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو چراغ دین کا چوکیدار ہے گلاب خان، دوسرا ایم ڈبلیو ڈی کا ایک اکاؤنٹنٹ مل گیا ہے غلام علی، وہی تیسرا گواہ بھی لائے گا۔"

"پی ڈبلیو ڈی کے اکاؤنٹنٹ کا اس کیس سے کیا تعلق؟" منظر بولا۔ "کوئی جاننے والا تھا؟"

"پی ڈبلیو ڈی نہیں، ایم ڈبلیو ڈی سی۔" میں نے کہا۔ "میر نذیر دلاور اینڈ کمپنی۔ فرم میں ایک تیسرا پارٹنر بھی شامل ہو گیا تھا۔ میر شرافت علی، وزیر خان اور چوہدری دلاور۔ فرم اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کہلاتی ہے اور شاہدرہ میں ہے۔"

منظر نے سر ہلایا۔ "پرسوں کی تاریخ پڑی ہے۔ تم کو گواہوں سمیت حاضر ہونا ہے۔ ان کی نشاندہی پر قبر کھودی جائے گی۔"

"کہاں حاضر ہونا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور کس وقت؟"

"صبح نو بجے ڈی ایم کی کورٹ میں۔" وہ بولا۔ "پھر عدالت میڈیکل بورڈ تشکیل دے گی اور ایس ڈی ایم کی موجودگی میں وہیں قبرستان میں دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے تاریخ دی جائے گی۔ دو چار دن کے اندر اندر۔"

ہم سب سے پیچھے تھے۔ آگے چلنے والے رابعہ کے مکان پر پہنچے تو وہاں ایک ہجوم تھا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا فائر بریگیڈ کو آگ سمیٹتے دیکھ رہا تھا۔ پورا گھر ایک جلا ہوا کھنڈر بن کے رہ گیا تھا جس کے گرد پولیس نے محاصرہ قائم کر رکھا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ہوا لیکن جواب دینے والا صرف وہی پولیس انسپکٹر تھا جس کی کمان میں ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل آئے تھے۔ وہ سب قریب آنے والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے تاکہ آگ بجھانے والوں کے کام میں خلل نہ پڑے لیکن اب انسپکٹر اچانک وکیلوں کے مجمع میں گھر گیا تھا اور اس کی نفری کے لیے ان کو ڈنڈے مار کے بھگانا مشکل تھا۔ اسے بار بار بتانا پڑ رہا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم، وہ نہیں جانتا کہ مکان کس کا ہے اور مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ اندر تھیں یا نہیں۔ اسے تو اطلاع ملی تھی کہ کراؤن سینما سے ذرا آگے ایک کوٹھی میں گولیاں چلی ہیں اور دو دھماکے ہوئے ہیں اور یہاں آ کے اس نے دیکھا تو فائر بریگیڈ پہنچا ہی تھا۔ اس وقت آگ ہی آگ تھی جو غنیمت ہے کہ دور تک نہیں پھیلی ورنہ یہاں اتنی گاڑیاں کھڑی تھیں کہ ایک کا پٹرول ٹینک پھٹ جاتا تو دوسری کا بھٹہ بیٹھ جاتا اور دوسری سے تیسری کا کھنڈر ہو جاتا۔ بظاہر اسے یہ شکایت تھی کہ آخر لوگوں کے پاس اتنی گاڑیاں کیوں ہیں اور آگ سے ہونے والے نقصان کی فکر نہیں تھی۔ پھر اس نے ضامن رضوی صاحب کو دیکھ لیا اور اس کا رویہ "اٹن شن" والا ہو گیا۔ رضوی صاحب کی نظریں ملبے کا جائزہ لے رہی تھیں اور خاموشی کے باوجود میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کو تشویش تھی، ان کو پریشانی بھی تھی اور غصہ بھی تھا۔ ان پر جو لاقانونیت کا یہ مظاہرہ کر کے قانون کو چیلنج دے گئے تھے، مجھ پر اور محسن پر جنہوں نے اپنی "حماقت" سے اس مصیبت کو دعوت دی تھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور کچھ اپنے انتظامات کے ناکافی ثابت ہونے پر انہوں نے لوگوں کو مطمئن کیا کہ غالباً رابعہ کو ان کا شوفر لے گیا ہوگا، کیونکہ انہیں اپنی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے اور رابعہ کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے وہ ہدایات دے گئے تھے کہ وہ ان کی واقف کے ساتھ چلی جائے۔ ایک ہمسائے نے تصدیق کی پیشکش کی اور رضوی صاحب نے اسے اپنے گھر کا نمبر بتایا۔ دس منٹ بعد یہ بات سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ مس رابعہ خیریت سے ہیں۔ جانے والے اب سو باتیں کر رہے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ اس موقعے پر یہ انتقامی کارروائی انتہائی شرمناک حرکت ہے اور غالباً ذمے دار کوئی ایسا مؤکل ہوگا جس کا مقدمہ رابعہ جیت نہیں سکی ہوگی۔ ممکن ہے کسی پھانسی پر لٹک جانے والے قاتل کے وارثوں نے وکیل صاحبہ کو ان کی نااہلی کی سزا دی ہو جن کو فیس اس لیے دی گئی تھی کہ مؤکل کی جان بچائیں۔ وکلاء کی برادری کا نقطۂ نظر اور مطالبہ تقریباً ایک ہی تھا اور وہ بار کے اجلاس میں احتجاج کی اور پریس کانفرنس کی غنڈہ گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات کی، پولیس کی نااہلی کے مقابلے میں قانون شکن عناصر کی روزافزوں وارداتوں کی باتیں کرتے رخصت ہو رہے تھے۔

دوبارہ ضامن رضوی صاحب کے روبرو ہونے سے بیشتر ہمارا غائب ہو جانا بہتر تھا۔ سب لوگوں کی طرح ہم بھی حیرت اور غم و غصے کے اظہار میں پیش پیش تھے اور ان معتبر گواہوں کی تعداد کافی تھی جو پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ ہم تدفین سے پہلے یہاں موجود تھے۔ ہم وقتِ جنازہ سے کے ساتھ رہے اور سب کے ساتھ واپس آئے تھے۔ ضامن رضوی صاحب اب تفتیش کے لیے ہدایات جاری کر رہے تھے اور ایک اخبار کے رپورٹر سے بھی الجھ رہے تھے جو خبر پا کر یا محض اتفاق کے باعث آ پہنچا تھا۔ میں اور محسن ان کی نظر بچا کے ایک وکیل کی کار میں بیٹھ گئے۔ "ہمیں ذرا نہر کے پل پر اتار دیجیے گا۔" میں نے کہا۔ اس شریف آدمی کو جانا تو مخالف سمت تھا لیکن اتنے کم فاصلے کے لیے وہ اخلاق اور مروت کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

نہر کے پل پر اتر جانے کے بعد ہم نے تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کیا اور اس مقام تک پہنچے جہاں ہم نے رابعہ کی فاکس ویگن چھوڑی تھی۔ اس کو نمایاں کرنے والا ایک ٹماٹر جیسا چمکتا ہوا گہرا لال رنگ تھا۔ اب سامنے سے بمپر کے پچک جانے بونٹ کے دب جانے اور مڈگارڈوں کے بدنما ہو جانے سے اس کار کو شہر میں ہر جگہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا۔ کار وہیں

موجود تھی اور اسی حالت میں کھڑی تھی، جس طرح ہم نے چھوڑا تھا۔ دروازہ کھولنے تک مجھے یہ شک نہیں ہوا کہ کسی نے کار کا دروازہ کھولا ہوگا۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور کار کے بند شیشوں سے اندر کا منظر نسبتاً کم روشنی کے باعث دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے اور محسن کو تشویش لاحق ہو چلی تھی کہ ہمارا قیدی زخمی ہونے کے علاوہ صبح سے بھوکا پیاسا بندھا پڑا ہے اور گھبرا جا رہا ہے کچھ بتانے سے پہلے ہی سختی کی تاب نہ لا کے دم توڑ دے، لیکن سیٹ کو اٹھاتے ہی شبہے کی گنجائش نہ رہی۔ میں نے پلٹ کر محسن کو دیکھا اور میری صورت دیکھتے ہی محسن سمجھ گیا کہ ہمارے اندیشے سچ ہو گئے ہیں۔ میں نے سیٹ کو سیدھا کر کے فٹ کیا اور محسن نے میری جگہ آ کے وہ خون دیکھا جو اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بچھے ہوئے قالین پر جمع ہو گیا تھا۔

خون اس زخم سے نکلا تھا جو دل کے مقام پر نظر آ رہا تھا اور اب بھی رس رہا تھا۔ زخم اس خنجر کا تھا جس کا صرف دستہ سینے کے باہر تھا۔ اس کا پھل سینے سے گزر کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔ عالمِ بےہوشی میں ہی دستِ قاتل اپنا کام کر گیا تھا۔

"یہ حرکت کسی نے ابھی ابھی کی ہے سکندر!" محسن نے کہا اور جھک کے دیکھنے لگا۔ "یہ... یہ ابھی مرا نہیں ہے۔" وہ کچھ دیر بعد چلایا۔ "بس اب یہاں سے بھاگنے کی کر۔ کوئی دیکھ لے گا تو ہم مارے جائیں گے۔"

محسن نے انجن میں چابی گھمائی اور انجن فوراً اسٹارٹ ہو گیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے ہم جان بچا کے اور اس قیدی کو لے کر رابعہ کے گھر سے فرار ہوئے تھے تب بھی کار کو دھکا لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی حالانکہ صبح سے دو بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ نقص جو وقتی تھا دور ہو گیا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وفادار گاڑی صورتِ حال کی نزاکت سمجھتی ہے اور وقت کے تقاضے کے مطابق ساتھ دیتی ہے۔ محسن نے کار کو نہر کے کنارے سے بائیں جانب موڑ دیا۔ ہمارا پہلا مقصد اس جگہ سے دور نکل جانا تھا۔

"گھر کو تباہ کر دینے کے باوجود وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" محسن نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بعد میں بھی ہمارا تعاقب جاری رکھا۔" میں نے کہا۔

"لیکن یار! میں نے کسی کو پیچھے آتے دیکھا نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"انہوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ بھاگ کر ہم کہاں جا سکتے

ہیں۔" میں نے کہا۔ "باقی سب لوگ اپنی گاڑیاں چھوڑ کر پیدل گئے تھے۔ ہم یہ گاڑی لے کر قبرستان جاتے تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی واحد کار کو سب دیکھتے اور پہچان کے حیران بھی ہوتے۔ شاید انہوں نے ہمیں پیدل قبرستان تک جاتے بھی دیکھا ہو، معمولی سی تلاش سے کار ان کو مل گئی ہوگی۔"

"پھر وہ اپنے آدمی کو کیوں نہیں لے گئے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ان کے لیے یہاں اس کار میں سے کسی دست و پا بستہ آدمی کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ ٹریفک آتی ہے کہ مجمع اکٹھا ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ ان کو یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے زیادہ آسان کام خنجر گھونپ کے نکل جانا تھا۔ اس آدمی کا وجود ان کے لیے خطرناک ہو گیا تھا۔ جسے دیکھا تو ہم نے ہی تھا مگر دشمن کا خیال ہوگا کہ پولیس والے بھی دیکھ چکے ہیں اور ہو سکتا ہے تصویریں اور فنگر پرنٹ لے چکے ہوں۔ ایسے بےمصرف اور بےوقعت آدمی کے زندہ رہنے میں خطرہ تھا مگر اسے مار کے یہ خطرہ بھی ختم کیا جا سکتا تھا اور ہمارے لیے ایک مصیبت بھی کھڑی کی جا سکتی تھی۔"

"تیرا مطلب ہے وہ پولیس کو فون کر چکے ہوں گے؟" محسن نے چونک کر کہا۔ "کہ فلاں جگہ گاڑی میں لاش پڑی ہے؟"

"دشمن کو بےوقوف سمجھنا بےوقوفی ہے محسن! اتنے تجربات کے بعد بھی ان کی فطرت کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم وہاں سے فرار نہ ہوتے تو ذرا سی دیر میں پولیس پہنچ جاتی۔ پھر کیا وضاحت کرتے۔ سارا زمانہ دیکھ چکا ہے کہ صبح سے ہم یہ گاڑی لیے پھر رہے ہیں۔ ہم کیا بتاتے کہ باندھ کر قتل کرنے کے بعد ہم یہ لاش کہاں لے جانا چاہتے تھے اور ہم نے اسے مارا کیوں تھا؟"

"ارمانی گاڈ! ہم تو اس شخص کا نام بھی نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ذرا دیکھ، ہمارے پیچھے کوئی ہے؟"

ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے محسن کو سڑک کے کنارے گاڑی روک لینے کے لیے کہا۔ سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی تھی ورنہ سڑک ویران ہی تھی۔ میں نے اور محسن نے اس شخص کو اٹھا کے باہر نکالا اور کار کے پیچھے زمین پر لٹا کر اس کی رسیاں کھول دیں۔ وہ قریب المرگ تھا اور لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں دوڑ کر نہر تک گیا اور دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر لایا۔ ایک کار میرے پیچھے سے گزر گئی۔ کسی نے مڑ کے پیچھے کا منظر نہیں دیکھا۔ میں نے زخمی شخص کے حلق میں پانی ٹپکایا اور باقی اس کے منہ پر گرنے دیا۔ وہ کراہنے لگا اور دو چار بار سر کو ادھر سے ادھر جھٹکنے کے بعد اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"دیکھو... میری بات سنو... میری آواز آ رہی ہے نا؟" میں نے جھک کر کہا۔ اس شخص نے بمشکل تمام اقرار میں سر ہلایا۔

"ایک بات سمجھ لو... تم بہت زیادہ زخمی ہو... تم جانتے ہو کہ تمہیں مارنے والے کون ہیں... ہم تمہارا انتقام لے سکتے ہیں۔ ہمیں ان کا نام بتا دو۔ کون لوگ ہیں وہ؟ تمہارا بچنا بہت مشکل ہے... لیکن مرنے سے پہلے تم ایک نیکی کر سکتے ہو۔"

ایک بار پھر اس نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت کو مجتمع کیا۔ اس کے لب کانپے مگر الفاظ اس کے حلق سے خرخراہٹ بن کے نکلے۔ ایک مرتبہ پھر میں پانی بھر کے لایا مگر میرے ہاتھوں کے کاسۂ گدائی کا پانی موت سے مزید مہلت حاصل نہ کر سکا۔ محسن نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور میں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ پانی خشک زمین میں جذب ہو گیا۔ اس خون کی طرح جو ایسے ہی خاک راہ گذر کو سیراب کر رہا تھا۔ ایک آدمی کے خون سے کبھی کہیں زمین کی پیاس بجھتی ہے۔ زمین توازل سے ہر جگہ، ہر وقت کے ذرے پر وہ خون پیتی رہی ہے جو آدمی نے بہایا اور آدمی کا تھا۔ پتھر کے زمانے سے ایٹم بم کے زمانے تک لاکھوں کروڑوں اربوں مرنے والوں کا خون مٹی کا رنگ تک نہیں بدل سکا۔

"کچھ نہیں بتایا اس نے؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"بتایا ہے۔" محسن بولا۔ "معلوم نہیں میں نے غلط سنا یا صحیح۔ اور وہ دمِ آخر ذہن میں آنے والے بےربط خیالات تھے یا ان الفاظ سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک لفظ تو راج یا راجہ تھا۔ راج گڑھ یا راجہ گڑھ۔"

"راج گڑھ ایک محلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور؟"

"کرامت... دوسرا لفظ مجھے کرامت سنائی دیا تھا۔ تیسرا لفظ غالباً سراج تھا۔ سرج تو ہو نہیں سکتا۔ سراب بھی مشکل ہے۔"

"کرامت اور سراج؟" میں نے کہا۔ "یہ تو نام ہو سکتے ہیں مگر راج گڑھ تو بہت بڑا علاقہ ہے۔ وہاں صرف نام سے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں وہاں کتنے کرامت علی، کرامت حسین اور کرامت دین ہوں۔"

سڑک کو خالی پا کے ہم نے لاش کو وہیں چھوڑا اور کار لے کر چل پڑے۔ یہ کار بھی اب ہمارے لیے چلتا پھرتا خطرہ بن گئی تھی۔ ایک اندیشہ یہ تھا کہ دشمنوں نے پولیس کو فون کیا ہوگا تو کار کا نمبر وغیرہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ دوسرا اندیشہ یہ بھی تھا کہ ہم جس بنگلے کی دیوار توڑ کے نکل آئے تھے وہاں بھی خواتین نے نمبر دیکھ لیا ہو۔ اس خطرے سے نجات کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ گاڑی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ میں نے اسے تقریباً دو میل آگے لے جا کر سڑک سے نیچے اتار دیا۔ اس کے گلوز کمپارٹمنٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں سے نو ہزار رُپے کی گڈی کے علاوہ ہم نے کچھ نہیں نکالا تاکہ پولیس کو مالک کا سراغ لگانے میں آسانی ہو۔

رابعہ نے ضامن رضوی صاحب کو اپنے اغوا کیے جانے کی اور بازیابی کے لیے ہماری کوششوں کا تمام ماجرا بتا دیا تھا۔ ہم رکشا سے اترے تو سورج غروب ہو چکا تھا مگر رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے۔ بالکل اکیلے اور اپنے خیالات میں غرق۔ ان کے سامنے کی تین کرسیاں خالی تھیں اور میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ رابعہ آرام کر رہی ہے۔ اور بہتر ہوگا اگر ہم اسے مزید پریشان کرنے کے بجائے ہاتھ منہ دھو کے یا غسل کر کے چائے کے لیے حاضر ہو جائیں۔ چائے کا تو بہانہ تھا، وہ ہمیں جھاڑ پلانا چاہتے تھے جس کے ہم مستحق تھے چنانچہ میں نے اور محسن نے سعادت مندی سے "جی" کہا اور اندر چلے گئے مگر نہانے دھونے کے بجائے رابعہ کے پاس جا پہنچے۔ اس وقت رضوی صاحب سے کہنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ کی کار کے چوری ہونے کی رپورٹ لکھوانے میں ہماری مدد کریں۔ رابعہ ہماری بات سمجھ سکتی تھی اور رضوی صاحب کو سمجھا سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے اور کپڑے بدل کے حاضر ہوئے تو رابعہ بھی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور تازہ چائے آ چکی تھی۔ رضوی صاحب نے ٹیلی فون کر کے اپنے علاقے کے ایک تھانیدار کو بلوا لیا تھا اور بہت برہم تھے۔ ان کی تمام برہمی کا نشانہ ہم ہی بن سکتے تھے۔ وہ خوب گرجے برسے "مذاق بنا لیا ہے قانون کو، ہیرو ہو گئے ہیں کل کے لونڈے صرف فلمیں دیکھ دیکھ کے۔ ہم نے جھک ماری ہے۔ کیا ضرورت تھی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ہے وہ خط اگر فوراً پولیس کے حوالے کر دیا جاتا تو لیبارٹری میں کوئی نہ کوئی اسے پڑھ لیتا۔ معلوم ہو جاتا کہ یہ کیا اسٹنٹ ہے۔ سب دھر لیے جاتے۔ کیا ہلا طرم خاں بننے سے رابعہ کا گھر تباہ ہو گیا، ایک اسکینڈل کھڑا ہو گیا، کل اخبارات میں سنسنی خیز سرخیاں بھری پڑی ہوں گی۔ تحقیق و تفتیش کرنے والے جھک مارتے رہیں گے۔ ہم جانتے بوجھتے حقائق کی پردہ پوشی کریں گے۔ آئندہ کے لیے نوٹ کر لو۔"

ایک اے ایس آئی نے مؤدبانہ سیلوٹ مار کے ہماری جان بخشی کرا دی۔ رضوی صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آخری رپورٹ جو چوری کے بارے میں تھی وہ نج کر دس منٹ پر درج کی گئی تھی۔ رابعہ کی کار کی چوری کی رپورٹ کا وقت تین بجے کے قریب لکھا گیا۔ کار جنازہ اٹھ جانے کے بعد رضوی صاحب کے گھر کے دروازے پر سے چوری ہوئی تھی دوسرے واقعات بعد میں پیش آئے تھے۔ رپورٹ خود مس رابعہ نے لکھوائی تھی۔ اے ایس آئی نے رابعہ کے دستخط لیے، سیلوٹ کیا اور رخصت ہو گیا۔

"ایک اور جھوٹ" رضوی صاحب نے چراغ پا ہو کر کہا۔ "یہ چکر بڑا غلط ہے۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ایک جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو جھوٹ کا پورا قلعہ ریت کی دیوار کی طرح گر پڑتا ہے۔" وہ بولتے رہے۔ میں اور محسن یہ سوچتے رہے کہ جب رضوی صاحب کو معلوم ہوگا کہ کار میں قتل ہوا ہے اور جو خون اس میں سے ملا ہے وہ اسی شخص کا ہے جس کی لاش نہر کے کنارے پڑی ملی تھی تب کیا ہوگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ یہ بات ان سے چھپانا اپنی پوزیشن کو ان کی نظر میں بھی مشتبہ بنانے کے مترادف ہوگا اور ہمیں ان کی مدد کی آئندہ بھی ضرورت تھی۔ میں نے ہمت کر کے اس بدقسمت شخص کے انجام کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"آئی سی" انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس شخص کو لے کر نہر کی طرف بھاگنے کے بجائے کسی ہسپتال لے جاتے۔ شاید اس کی جان بچ جاتی اور پولیس کو تم بتا دیتے جو سچ تھا۔"

"اس کی جان بچنے کا امکان ہوتا تو ہم یہ حماقت واقعی نہ کرتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمارے سچ سے نقصان کسے ہوتا؟ اور فرض کیجیے وہ شخص ہوش میں آ کے ہمارے خلاف بیان دے دیتا۔ مرنے والے کا بیان سچ سمجھا جاتا ہے۔ قانون ہم پر فرد جرم عائد کر دیتا۔ رابعہ کے اغوا کی کہانی بھی سنسنی خیز صحافت کو فروغ دینے والے نمک مرچ لگا کے چھاپتے۔ زیب داستاں کے لیے بھی بہت کچھ ملاتے اور رائی کا پہاڑ بنا دیتے۔ میں یا آپ کس کس کی تردید کرتے۔ کس کس کو ہتک عزت کا نوٹس دیتے اور کیا یہ اسکینڈل نجی زندگی کے علاوہ رابعہ کی پیشہ وارانہ ساکھ کو ختم نہ کر دیتا۔ میرا کیا ہے۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے سے ہے، دشمن ویسے بھی میرے پیچھے لگے ہوتے ہیں اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دشمن میں نے خود پیدا کیے ہیں۔ حقیقت حال سے واقف ہونے کے باوجود آپ سمجھتے ہیں کہ میری مدد سے آپ کی نیک نامی متاثر ہوگی تو صاف بتا دیجیے۔ میں اپنا سامان اٹھا کے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ضامن رضوی صاحب کھڑے ہو گئے۔ چلتے چلتے انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نوجوان جوشیلے اور جذباتی ہو۔ میری بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جاؤ جو دل چاہے کرتے پھرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ قانونی، اخلاقی اور گھریلو، بس ان کا لحاظ کرو۔ اور مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔" وہ جانے کے لیے مڑے اور پھر رک گئے۔ "یہ غلام علی کون ہے؟ دو مرتبہ فون آ چکا ہے اس کا۔ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

"میرا ایک دوست ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں خود بات کر لیتا ہوں۔"

اندر جا کے میں نے غلام علی کے کیمسٹ بھائی کی دکان کا نمبر ملایا۔ "انعام کیمسٹ۔" کسی نے کہا۔

"مجھے مسٹر غلام علی سے بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا جی! بڑا اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ بھائی جان پھر آئے بیٹھے تھے، آپ سے بات کرنے کے لیے۔"

"سکندر صاحب!" چند سیکنڈ بعد غلام علی نے فرط جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے وہ سب مل گیا ہے۔"

"اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے ضامن رضوی صاحب کو موجود پا کے گول مول بات کی۔ "کل پھر کہاں مل رہے ہو؟"

"جہاں آپ کہیں سر! میں تو آج ہی حاضر ہو جاتا مگر آپ سے بات ہی نہ ہو سکی۔"

"ہاں بھئی، وہ ہمارے ایک عزیز ہیں، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ سارا دن وہیں گزر گیا۔ خیر کل 'گارڈینیا' میں آ جاؤ... ہاں... شام کا وقت رکھ لو یا صبح کا... گیارہ بجے ٹھیک رہے گا... تو پھر خدا حافظ۔" اگرچہ اس کے بعد غلام علی نے ریسیور رکھ دیا تھا مگر میں نے ظاہر کیا کہ بات جاری ہے۔ "ہاں... اچھا! کل ہی چلے جاؤ گے؟ ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار... گنجائش نہیں؟ پھر تو مجبوری ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ رضوی صاحب مطمئن ہو کے جا چکے تھے۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ غلام علی واقعی کوئی ایسا دوست ہے جو رخصت ہونے سے پہلے آخری ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں باہر آیا تو رابعہ اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی وہیں بیٹھی تھی اور اکیلی تھی۔

"محسن کہاں گیا؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا لیکن رابعہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ الفاظ کی تسلی بے معنی تھی۔ اس سے نہ نقصانات کی تلافی ہو سکتی تھی اور نہ دل کے درد کو درماں ملتا تھا۔ وقت کے یہ زخم وقت کی بجلی سے ہی مندمل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ یہ خاموشی بھی لاتعلقی یا بے حسی نہیں تھی۔ رفاقت اور غمگساری کے، ایک دوسرے کے دکھ کو سمجھنے اور اپنانے کی خواہش کے اور ذہنی ہم آہنگی کے احساس نے ہمیں جذبات کی زبان میں بات کرنا اور سمجھنا سکھا دیا تھا۔ یہ زبان صدا نہیں سکوت مانگتی تھی جس میں دل کا ہر خیال وسیلہ اظہار کے بغیر دوسرے کے دل میں اتر جائے۔ بقول شاعر ؎

'میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'——

والی بات ہو—— میری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ میں بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اگر میں کہتا کہ رابعہ مجھے معاف کر دو، تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں ہوں۔ میں نے وہ خط تمہارے پاس پہنچایا تھا جس نے ہمیں ذہنی و جسمانی اذیت میں مبتلا کیا۔ تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں مر گئی اور ابھی جسد خاکی ابدی قیام گاہ تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ وہ گھر نہ رہا جس میں اس کی زندگی کا سب سے طویل اور عزیز دور گزرا۔ اس سب کی سزا مجھے ملنی چاہیے تھی نہ کہ تمہیں۔ تو رابعہ کہتی کہ سکندر! کیا (نعوذ باللہ) تم دعویٰ کر رہے ہو کہ میرا نوشتۂ تقدیر تمہاری تحریر تھا یا تم اس کو بدلنے پر قادر تھے۔ کیا میں فرض کر لوں کہ تمہاری نیت کے خلوص میں کھوٹ ہے اور تم میرے خیر خواہ نہیں تھے؟ معافی مانگ کے تم مجھے اور دکھی دیکھنا نہیں چاہتے تو ایسی فضول باتیں کیوں سوچتے ہو؟ میں نے کہا احساس کے عذاب سے میں کیسے نجات پاؤں؟ وہ بولی۔ "کوئی بات کرو۔ کب تک چپ بیٹھے میری صورت دیکھتے رہو گے؟" اس نے اب اپنے آنسو سمیٹ لیے تھے۔

"تم نے کچھ سوچا ہے، رہائش کے مسئلے پر؟" میں نے کہا۔

"سوچا تھا، لیکن رضوی صاحب نے مجبور کر دیا کہ مت سوچو۔" وہ بولی۔ "وہ مجھے اس گھر سے جانے نہیں دیں گے۔"

"اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "یہاں تم محفوظ رہو گی۔"

"جب یہ تفتیش وغیرہ ختم ہو جائے گی اور حالات معمول پر آ جائیں گے تو میں اس گھر کا ملبہ صاف کرا دوں گی۔" وہ بولی۔ "ایک نہ ایک دن میں وہاں پھر اپنا گھر بناؤں گی۔ بنا تو کل بھی سکتی ہوں لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

'ہاں' میں نے پھر زبانِ خامشی میں کہا۔ جب اس کی ضرورت پیدا ہوگی تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ وہ تمہارا نہیں ہمارا گھر ہوگا۔

اس رات میں اور محسن لائٹ آف کیے اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم اپنے اپنے خیالات کے جنگل میں بھٹک رہے تھے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ محسن کیا سوچ رہا ہے اور محسن کو یہ بتانا ضروری نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا کہ میرے خیالات کا دھارا کس سمت میں بہہ رہا ہے۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا "یار سگریٹ ختم ہو گئے" اور محسن نے کہا تھا "ہاں یار! سگریٹ ختم ہو گئے۔" ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور باہر آ گئے۔ نصف شب کی چاندنی اپنا جادو جگا رہی تھی مگر میرا تصور ویرانوں میں بھٹک رہا تھا۔ مجھے چاندنی ایک قبر کے مرجھاتے ہوئے پھولوں پر نظر آئی، میں نے چاندنی کو ایک جلے ہوئے مکان کے کھنڈر پر روتے دیکھا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے دوسری منزل پر خواب گاہ کی ایک کھڑکی کھلی نظر آئی۔ اس کے فریم میں ایک سایہ رابعہ کے خدوخال کی خبر دے رہا تھا۔ شاید وہ بھی چاندنی کو وہیں دیکھ رہی تھی اور ویسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے میں نے دیکھا تھا۔ میں اور محسن مضمحل اور بے حد تھکے ہوئے تھے اور ہمارے جسم سکون کی نیند مانگتے تھے مگر نیند تو ذہن کے دریچوں سے اترتی ہے اور یہ دریچے منتشر خیالات کی کثرت سے بند تھے۔ افریقہ کے جنگلوں کی زمین کی طرح جہاں درختوں اور شاخوں پر برگ و بار کی کثرت سورج کی ایک کرن کو بھی راہ نہیں دیتی۔ ہم ریلوے اسٹیشن تک گئے۔ چائے کے دو کپ پی کر بھی بنچوں پر بیٹھے رہے اور پھر سگریٹ کے پیکٹ خرید کے لوٹ آئے۔

میری آنکھ لگی تو دور سے صبح کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے دو حصے ہو گئے۔ پہلے حصے میں فوزیہ نے میرے سامنے آ کے کہا: "سکندر! کیا یہ سچ ہے کہ تم رابعہ کو چاہنے لگے ہو؟" دوسرے حصے میں فوزیہ کی جگہ رابعہ آ گئی۔ "آخر تم کب تک جھوٹ بولتے رہو گے اور بھاگتے رہو گے۔ آگے تو راستے بھی بند ہیں۔" اور مؤذن نے کہا: "دل کے راستے بند نہیں ہیں۔ آؤ بھلائی کی طرف آؤ... آؤ بھلائی کی طرف، سچائی کی طرف۔ اس کی رحمت کے دروازے تو کھلے رہتے ہیں۔" میں اٹھ بیٹھا۔ وضو کر کے قبلہ رو ہو گیا۔ اس روز نماز کے اعجازِ مسیحائی نے مجھے وہ سکون دیا جس کا میں طالب تھا اور جو مجھے کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا خواہ اس کے اختیار میں تمام دنیاوی وسائل ہوتے۔

ساڑھے دس بجے میں ریگل کے اسٹاپ پر اترا تو زندگی کی ہر رونق اور تمام گہما گہمی عروج پر تھی۔ گزرے ہوئے دن اور یادِ رفتگاں کا خیال کسی کی راہ میں حائل نہ تھا اور میں نے بھی سڑک عبور کی تو میں صرف غلام علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "گارڈینیا" کے شفاف شیشوں والے دروازے پر ابھی تک پلاسٹک کی سفید تختی آویزاں تھی جس پر سرخ حروف سے "کلوزڈ" لکھا ہوا تھا۔ اس معیار کے ریستوران ساڑھے گیارہ بجے تک ہی کھلتے ہیں۔ میں ایک بک اسٹال پر کتابیں دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد میں نے ہر اخبار کی ایک ایک کاپی طلب کی تو دکاندار نے مجھے غور سے دیکھا اور زیرِ لب مسکرایا۔ میں پروا کیے بغیر مخالف سمت کے بس اسٹاپ پر مردانہ حصے کی بنچ پر جا بیٹھا۔

اخبارات نے شہر کے مشہور وکیل کے مکان میں دھماکوں اور آتش زدگی کا ذکر کیا تھا۔ تصاویر شائع کی تھیں اور حالات کے پُراسرار ہونے پر تبصرہ کیا تھا کیونکہ یہ سب کچھ وکیل رابعہ قادری کی والدہ کا جنازہ اٹھتے ہی ہوا تھا اور اتفاق سے وہ خود گھر سے جا چکی تھیں۔ اخبار میں رابعہ کی تصویر تھی۔ ضامن رضوی صاحب کی تصویر بھی ایک اخبار نے الگ چھاپی تھی کہ انہوں نے تفتیش کے موقع پر نگرانی کی اور مس رابعہ قادری سردست انہی کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ مزید تصویریں تین سوختہ لاشوں کی تھیں جو ملبے سے برآمد ہوئی تھیں اور پہچانے جانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ گولیاں چلنے کا ذکر کہیں نہیں تھا اور یہ جناب رضوی صاحب کی ذاتی کوشش کے طفیل ممکن ہوا تھا۔ اخبارات نے اسے بے ضمیر لوگوں کی انتقامی کارروائی قرار دیا تھا اور حکومت سے سخت اور فوری اقدامات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ صرف ایک اخبار نے رابعہ قادری ایڈووکیٹ کی کار کے چوری ہونے کی خبر کے ساتھ کار کی تصویر بھی چھاپ دی تھی اور قیاس آرائی کی بنیاد پر کار میں ملنے والے خون کے نشانات کو اس لاش سے منسوب کر دیا تھا جو پولیس کو اسی سڑک پر دو میل دور ملی تھی۔ رپورٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ حملہ آور بھاگتے وقت گاڑی بھی لے گئے اور کسی آپس کے اختلاف کے باعث انہوں نے اپنے ہی ایک ساتھی کو بھی قتل کر کے پھینک دیا۔ صرف ایک اخبار نے اس بنگلے کی تصویر چھاپی تھی جس میں ایک چوری کی سفید ٹویوٹا میں آنے والے ایک سرخ فاکس ویگن کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچے تھے لیکن کار چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

جب میں نے اخبار سمیٹے تو گیارہ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے۔ "گارڈینیا" کے بند دروازوں پر وہی تختی پلٹ دی گئی تھی اور اب "اوپن" کے الفاظ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ میں نے اخبار کو وہیں چھوڑا اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا جہاں اندھیرے اجالے کا نرم امتزاج بڑا سکون بخش تھا۔ ہر میز خالی تھی اور میں اندر قدم رکھنے والا پہلا شخص تھا۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا غلام علی مجھے انتظار کرتا ملے گا مگر وقت کی پابندی نہ کرنا ہماری قومی عادت ہے۔ خود میں بھی دس منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ غلام علی کو آدھے گھنٹے کی دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے چائے کا ایک کپ ختم کیا اور سگریٹ جلائی تو ساڑھے گیارہ میں پانچ منٹ کم تھے۔ میری نظر شیشوں سے گزر کے مال روڈ کی ٹریفک پر چلی گئی اور اچانک میں نے غلام

علی کو دیکھا۔ وہ سڑک پار کرنے کے لیے ایک بس کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی بغل میں زرد رنگ کا زِپ والا بیگ تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے آدھی سڑک عبور کی اور ایک کار کو گزر جانے کا موقع دینے کے لیے رک گیا۔ میری نظروں کے سامنے اس کار نے یکلخت رخ بدلا اور غلام علی کو خبر تک نہ ہوئی۔ کار نے اسے ٹکر مار کے اچھالا، وہ مضحکہ خیز طریقے پر اوپر گیا اور پھر سڑک پر گرا۔ کار پلک جھپکتے میں اس کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جیب سے ایک نوٹ نکال کے رکھا اور باہر بھاگا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ دس کا نوٹ تھا یا سو کا۔ میرے پہنچنے سے پہلے غلام علی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا تھا لیکن وہ کار غائب ہو چکی تھی۔

ادھر ادھر سے دوڑ کر آنے والے بے بسی سے خاک و خون میں غلطاں اس ٹوٹے پھوٹے، بدنما گوشت کے پھڑکتے ہوئے ڈھیر کو دیکھ رہے تھے جو ابھی چند لمحے پہلے انہی کی طرح سو فیصد جیتا جاگتا آدمی تھا مگر اسے قطعی خبر نہ تھی کہ ان خوبصورت چمکتی دمکتی اور قیمتی کاروں میں سے ایک "فرشتۂ اجل" کا دھوکا دینے والا روپ ہے۔ موت اتنی مکار اور بدصورت ہوتی ہے۔ وہ خود کو اور ان بہت سی کاروں کو دیکھ رہے تھے جو اب بھی بچ بچ کے گزرتی جا رہی تھیں۔ یہ کون سوچ سکتا ہے کہ آدمی کی قاتل کار ہو سکتی ہے۔ شمشیرِ براں، خنجر، بھالے، بم، بندوق، زہرِ ہلاہل یا خون آشام درندوں سے تو موت کا تصور ابھرتا ہے مگر کار، جس میں خوش نصیب خوش پوش اور خوش باش لوگ، خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ پھرتے ہیں اور جسے خریدنے کے لیے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کرنے پڑتے ہیں، جائز و ناجائز ذرائع کا خیال کیے بغیر، اور جس سے آدمی کو عزت اور خود پر غرور کی مسرت ملتی ہے، اس کار میں اور دل میں پیوست ہو جانے والے خنجر میں اور سر کو پاش پاش کرنے والی گولی میں کوئی فرق نہیں۔ کچھ لوگ اسے حادثہ کہہ رہے تھے۔ جیسے ہر روز ہر گاڑی سے منزل تک پہنچنے والے ہزاروں مسافروں میں سے ایک اسی گاڑی کے نیچے آ جائے یا کوئی اسی بجلی کے جھٹکے سے ہلاک ہو جائے جو آپریشن تھیٹر میں جان بچانے والوں کے لیے چراغ روشن رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے بھی دیکھا تھا اور ان کا خیال تھا کہ غلام علی نے جلدی کی چنانچہ مرنے کی غلطی کی۔ حالانکہ آدمی مرنے میں اس وقت تک جلدی نہیں کرتا جب تک کہ اس کا خیال خودکشی کا نہ ہو۔ خیال ہی نہیں عزمِ مصمم نہ ہو۔ باقی لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ بالآخر پہلے سے طے شدہ وقت پر سب کو ایسے ہی اچانک نازل ہو کر راستہ روک لینے والے لمحے کے سامنے زندگی کا سفر ختم کرنا ہے جو کہیں بھی آ سکتا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آدمی منتظر ہے یا نہیں اور بستر پر لیٹا مستقبل کے خواب دیکھ رہا ہے یا سڑک پر چل رہا ہے۔ بہت سے لوگ کار والوں کو گالیاں دے رہے تھے کہ اندھے ہو کے چلاتے ہیں اور آدمی کو زمین پر رینگنے والا کیڑا سمجھتے ہیں اور افسوس کر رہے تھے کہ کسی نے کار کا نمبر تک نہیں دیکھا تھا۔

اس مجمع میں شاید میرے سوا کوئی نہیں تھا جس کو یقین ہو کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ غلام علی نے وہ کار دیکھ لی تھی اور رک گیا تھا۔ کار والے نے غلام علی کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ دونوں نے وہی کیا جو ان کو کرنا تھا۔ میرے پہنچنے تک سڑک کے وسط میں بیس پچیس افراد جمع ہو چکے تھے۔ موٹر سائیکلوں پر گزرنے والے گردن بڑھا کے ذرا سی دیر کے لیے پاؤں ٹیک کے رکتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ سڑک پر لوگوں کا مرنا معمول ہے۔ کسے فرصت ہے کہ غمزدہ ہو یا غمگساری اور تعزیت کرتا پھرے۔ مغفرت کی دعا مانگے یا لواحقین کے لیے صبرِ جمیل۔ آدمی کا آدمی سے رشتہ ایک نظریاتی بات ہے۔ آفس وقت پر پہنچنے کی ضرورت ایک عملی حقیقت ہے۔ میں نے ایک سارجنٹ کو دیکھا جو ٹریفک میں پڑنے والے خلل سے پریشان تھا اور لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے بھگا دینا چاہتا تھا۔ "چلو دفع ہو جاؤ، کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے گرج کے کہا۔ تماشا تو تھا مگر خدا سمجھے ان پولیس والوں سے جو نہ جینے دیتے ہیں، نہ مرنے دیتے ہیں۔ مرنے کا تماشا تک مفت نہیں دیکھنے دیتے۔

پسپا ہونے والوں میں ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا، جس کی ناک طوطے کی طرح تھی۔ اس کی بغل میں مجھے زرد رنگین کا زِپ والا بیگ نظر آیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ہماری نگاہیں ملیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ نامعلوم طریقے پر مجمع سے الگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو وہ بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ تقریباً دوڑنے لگا۔ اس کی نگاہیں کسی رکشا یا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اس کے پیچھے دوڑا تو وہ بے تحاشا بھاگا۔ مجھ سے بیس قدم آگے ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ایک بس میں چڑھ گیا جو روانہ ہونے کے بعد رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی مجھے لفٹ دینے کو بھی تیار نہ تھا۔ پھر ایک موٹر سائیکل والے نے رفتار کم کی۔ "کہاں تک جانا ہے؟" اس نے کہا۔ اس کی موٹر سائیکل بہت پرانے ماڈل کی تھی۔

"بس زمزمہ تک پہنچا دیں۔ میری بس نکل گئی ہے۔" میں نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جواب دینے سے پہلے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹالنٹن مارکیٹ کے اسٹاپ تک پہنچا سکتا ہوں" وہ بولا اور موٹر سائیکل نے دو افراد کا بوجھ اٹھا کے دوڑنا شروع کیا تو مجھے اس کی رفتار سے مایوسی ہوئی لیکن ٹالنٹن مارکیٹ سے پہلے اس بس کو کم سے کم دو جگہ رکنا پڑا جبکہ میری فلائیٹ نان اسٹاپ تھی۔ جی پی او کے اسٹاپ پر موٹر سائیکل اور بس ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ پھر بس پیچھے رہ گئی اور میں نے سر گھما کے دیکھا۔ اترنے والوں میں وہ شخص نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے سامنے ٹالنٹن مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر میں پہلے پہنچا اور جب ایک ہجوم بس پر حملہ آور ہوا تو میں نے ادب و آداب کو بالائے طاق رکھ کر بہ زورِ بازو جگہ بنائی اور دروازے کے قریب کھڑے رہنے کی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بس کو سمن آباد تک جانا تھا چنانچہ میں نے آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لے کر اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی پنجوں کے بل اونچا ہو کر دیکھنے سے بھی میرے لیے سب کے سر بس پر سے آخری سیٹ تک ہر چہرہ دیکھنا مشکل ثابت ہوا۔ مزید یہ کہ لوگ مخالف سمت میں یعنی ادھر ہی منہ کیے کھڑے تھے جدھر بس جا رہی تھی۔ اسٹاپ گزرتے گئے۔ میں نے اوپر سے آنے والوں پر بھی نگاہ رکھی اور اس گول عدسے کی طرح بنے ہوئے آئینے میں بھی جھانکا جس سے اوپر کی منزل کی ہر سیٹ دکھائی دیتی تھی۔ میں کچھ مایوس ہونے لگا تھا کہ وہ اچانک اوپر سے نیچے آیا اور میں دبک کر پیچھے ہو گیا کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ وہ اگلے اسٹاپ پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا اور مطمئن تھا کہ مجھے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہ خیال اسے ضرور ہوگا کہ میں رکشا یا ٹیکسی لے کر تعاقب کر سکتا ہوں چنانچہ وہ محتاط تھا۔

اس نے بس کے رکنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی اور میں عین وقت پر دو پہلوان ٹائپ افراد کے درمیان پھنس گیا۔ جو میری راہ میں چٹان کی طرح کھڑے تھے اور ہلنے پر آمادہ نہ تھے۔ میں نے غوطہ مار کے ان کے فربہ بدن کی دیوار کو شق کیا۔ دونوں طرف کہنی مار کے مزید گنجائش پیدا کی۔ ایک پہلوان نے ہنکار کے کہا۔ "اوئے کون اے سُوہ دا تخم؟" اور دوسرے نے کہا۔ "خیر ہووے پہلوان جی!" اور مجھے دبوچنے کی فضول سی کوشش کی۔ ایک مخنی نوجوان کو دھکیل کر میں نے دروازے میں سے چھلانگ لگائی تو بس کافی آگے جا چکی تھی۔ "سالا جیب کترا!" مخنی نوجوان نے کہا۔ میرے اترنے کا انداز واقعی جیب کتروں جیسا تھا میں سڑک پر گرا اور قلابازی کھا کے کھڑا ہو گیا۔ زرد بیگ والا چالیس قدم پیچھے مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بھاگا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا، جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گلی میں سو گز کی دوڑ لگانے کے بعد درمیانی فاصلہ آدھا ہو گیا تھا کہ وہ گھوم گیا۔ میں اس موڑ تک پہنچا تو وہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے ہوا میں تحلیل ہو چکا ہو۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی گھر میں گھس گیا ہے۔ ایک منٹ کے فرق سے وہ زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا لیکن میرے لیے شروع کے گھروں کا دروازہ بجا کے پوچھنا بھی ناممکن تھا کہ یہاں کوئی زرد بیگ والا آیا ہے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں گلی کے موڑ پر جس مکان کے سامنے کھڑا ہوں وہ مقفل ہے اور غیر آباد لگتا ہے۔ گلی میں ایک طرف دو بچے کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف ایک سبزی والا اپنی ریڑھی کو دھکیلتا اپنی آمد کا اعلان کرتا جا رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا لیکن کسی بھی دروازے سے کوئی عورت سبزی خریدنے نکل سکتی تھی۔

میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اوپر سے نیچے آنے والے زنگ خوردہ لوہے کے پائپ کو دیکھا اور دو منٹ بعد چھت پر پہنچا۔ نیچے گلی میں سبزی والے کو دو عورتوں نے گھیر لیا تھا مگر ان کی توجہ آلو بینگن وغیرہ کی طرف تھی۔ اردگرد چھتوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ میں نے فوراً کونے کی تین دیواروں کے حصار میں پناہ لی جو بیت الخلا تھا اور لاہور کے اکثر پرانے مکانوں کی طرح چھت پر اوپن ایئر بنایا گیا تھا۔ گلی کی طرف کی دیوار کے ایک موکھے سے میں نے زرد بیگ والے کو سر نکال کر جھانکتے دیکھا۔ وہ دو گھروں کے درمیان واقع چھوٹی سی مسجد میں گھس گیا تھا۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی کہ تعاقب کرنے والا یکلخت چھلاوہ بن کے کہاں غائب ہو گیا۔ میں دلچسپی سے اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ چند منٹ بعد جب اسے یقین آنے لگا کہ میں واپس جا چکا ہوں تو وہ مسجد کے محرابی دروازے کی پناہ سے نکلا۔ میں نے موقعے کا خیال کیے بغیر پھر پائپ کی مدد سے لینڈ کیا چڑھنے کی نسبت اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ کسی نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا مگر میں پھر زرد بیگ والے کے پیچھے دوڑا اور اس ریس میں دخل انداز ہونے کی کوشش سب سے پہلے سبزی والے نے کی لیکن آگے والا بلا کا پھرتیلا تھا۔ سبزی والا ایک دھکے میں نیچے گرا، زیادہ مشتعل ہو کے اس نے ریڑھی کی مدد سے میرا راستہ بلاک کرنا چاہا۔ مجبوراً مجھے ریڑھی الٹ کے راستہ بنانا پڑا۔ وہ چیخ پکار کرتا ہوا ایک دو قدم دوڑا پھر رک گیا۔ وہ ریس میں شریک ہو کے ناکام واپس لوٹتا تو تمام گھریلو خواتین سیلف سروس کر کے ایک دن کی بھاجی مفت پکانے کے لیے لے جاتیں۔

وہ ایک بغلی سڑک پر طلوع ہوا اور میں نے ایک فرلانگ

تک اس کا پیچھا کیا۔ اس کا اسٹیمنا بھی کمال تھا کہ ایک میل سے زیادہ دوڑنے کے باوجود تھکن سے اس کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی، مگر میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ بغلی سڑک ایک اور سڑک سے جا ملی جو کچھ بڑی تھی اور پھر ایک دلچسپ اتفاق ہوا۔ وہ شخص ایک موٹر سائیکل سے بچنے کی کوشش میں کھمبے سے ٹکرایا اور گر گیا۔ موٹر سائیکل دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی "ٹرائمف" ملٹری ماڈل تھی اور اسے ایک پولیس والا چلا رہا تھا جس نے موٹر سائیکل روک کے مشتبہ طور پر فرار ہونے والے کو روک لیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پولیس مین حشمت خان تھا۔ تھانے سے باہر غیر معمولی حالات میں میری اس سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ وہ اب زرد بیگ والے نوجوان سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اور اس کا زرد بیگ ہاتھ میں لے چکا تھا۔ زرد بیگ والے نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سخت تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے لیے آگے کھائی پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ پھر شاید پولیس کو بڑی مصیبت سمجھتے ہوئے اس نے مجھ سے نمٹنے کو ترجیح دی۔ میرے اشارے کا مطلب کچھ یہی نکلتا تھا کہ انسپکٹر کو کچھ معلوم نہ ہونے پائے اور اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ میں اسے پولیس سے نجات دلانے کے موڈ میں ہوں۔ وہ ہم دونوں کا مشترکہ دشمن تھا اور ہمارا وقتی اتحاد اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا۔ زرد بیگ والے نے یہ بات سمجھ لی۔ گر وہ الٹا مطلب نکالتا اور تعاون نہ کرتا تو مجھے کوئی نقصان نہ ہوتا۔ میں پاس جا کے کہا۔ "ہیلو حشمت خان! بھئی خوب ملے۔ کیا حال ہے؟" حشمت خان سودا کرنے والا آدمی تھا اس سے بیگ کا سودا کیا جا سکتا تھا اور اس چور کو بند کرنے کا بھی۔

جب میں نے حشمت خان کو پیچھے سے دبوچا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مار کے بے سدھ کر دیا تو اسے بالکل خبر نہ ہوئی کہ حملہ آور کون تھا۔ بیگ قابو میں کر کے میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ "بیٹھو میرے ساتھ ورنہ دونوں پکڑے جائیں گے۔" میں نے چلا کر کہا اور حشمت خان کی موٹر سائیکل پر جا بیٹھا جس کا انجن چل رہا تھا۔ نوجوان خوفزدہ اور ہکا بکا کھڑا تھا اور گلی میں پڑے ہوئے حشمت خان کے ڈھیر کو گھور رہا تھا۔ دوسری طرف سے دو آدمی ہڑبڑ مچاتے آ رہے تھے۔ "پاگل کے بچے مجھے بھی مروا دو گے۔" میں نے موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈالا اور نوجوان اچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔ اس عجیب الخلقت موٹر سائیکل کو سنبھالنا اور چلانا آسان نہیں تھا مگر میں نے اسے جان ہتھیلی پر رکھ کے یوں چلایا جیسے بازیگر موت کے گولے میں چلاتے ہیں۔ سمت کا خیال کیے بغیر میں تین میل دور نکل گیا۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان نو آموز ہے، پیشہ ور نہیں ورنہ اب تک وہ خنجر، پستول نکال چکا ہوتا۔ ایک سنسان جگہ موٹر سائیکل روک کے میں نے اس نوجوان کو دیکھا۔

"تم نے اس پولیس والے کو کچھ بتایا تھا اپنے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف نام، مگر وہ بھی غلط تھا۔" وہ بولا۔ "خدا کے لیے یہ بیگ مجھے دے دو۔"

"خدا کے لیے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "خدا کو اس بیگ کی کیا ضرورت ہے۔ جن کو ضرورت ہے ان کو خدا کہنا کفر ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے وہ کون لوگ ہیں اور اس بیگ میں کیا ہے؟"

"مجھے... مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ بولا۔

"جھوٹ بولو گے تو اس سے زیادہ برا حشر کر دوں گا۔" میں نے حشمت خان کے حوالے سے کہا۔ "ایک وار میں گردن بھی توڑ سکتا ہوں میں۔ وہ تو اٹھ کھڑا ہوگا تھوڑی دیر میں۔ تم یہیں پڑے رہ جاؤ گے۔" میں نے ایک درخت کی خاصی موٹی شاخ کو جھکایا اور اس پر ہاتھ مارا۔ شاخ درمیان سے ٹوٹ گئی۔

وہ خوف سے کانپنے لگا۔ "قسم خدا کی، میں کسی کو نہیں جانتا، کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے تو ایک آدمی نے کہا تھا کہ ریگل کے بس اسٹاپ پر کھڑے رہنا، ساڑھے دس بجے۔ وہاں ایک حادثہ ہوگا۔ جو شخص حادثے کا شکار ہوگا اس کے پاس ایک فائل ہوگی۔ فائل کسی بیگ یا بریف کیس میں بھی ہو سکتی ہے۔ تم کو وہ فائل لے کر کھسکنا ہے۔ کامیاب رہے تو دس ہزار روپے ملیں گے۔"

"کہاں ملیں گے؟ کون دے گا؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اسی کے پاس جا رہے تھے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس نے کہا تھا ہم خود تمہارے گھر آ کے فائل لے لیں گے مگر میں نے کہا، میں گھر کا پتہ نہیں بتا سکتا۔ وہاں ایک تو میرا چھوٹا بھائی ہے جی! اسے پولیو ہو گیا تھا اور ٹانگیں بیکار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے کہا علاج سے کوئی فائدہ نہیں۔ بیٹھ کے کرسیاں بُن لیتا ہے۔ ایک ماں ہے۔ میری آمدنی سے گزارا نہیں ہوتا ـــ" وہ رونے کے قریب ہو گیا تھا۔

"تم خود کچھ نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"صبح اخبار تقسیم کرتا ہوں جی! اس کے بعد کالج چلا جاتا ہوں، شام کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اور یہ دس ہزار لے کر تم کیا کرتے؟" میں نے کہا۔

"بھائی نے کہا تھا دکان لے دو۔ کام زیادہ چلے گا تو زیادہ آمدنی ہوگی۔ تم پڑھتے رہنا۔" وہ رونے لگا۔ "اب وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے بیگ کی زپ کھولی۔ اس میں کوئی فائل نہیں تھی۔ ساٹھ ستر فل اسکیپ سائز کے صفحات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تھیں۔ فوراً مجھے وہ ترکیب سوجھ گئی جس سے کالج میں پڑھنے والے اس ناتجربہ کار اور کم عقل لڑکے کا مستقبل اور اس کی زندگی سب محفوظ رہتے تھے اور ہم دونوں کے مقاصد بھی پورے ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے پھر موٹر سائیکل پر بٹھایا اور دس منٹ بعد ہم ایک فوٹو اسٹیٹ مشین شاپ کے سامنے جا رکے۔ میں نے تمام صفحات کی دو دو نقلیں بنوائیں۔ ایک نقل اسی زرد بیگ میں رکھی جس کے بدلے نوجوان کو دس ہزار مل سکتے تھے۔ "اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تمہارے گھر آئیں گے اور یہ کاغذات لے جائیں گے۔ تمہارے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں تمہارے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ ان کو ہر سوال کا جواب پورے اعتماد کے ساتھ نفی میں دینا ہے۔ کسی نے بیگ اٹھاتے دیکھا تھا، نہیں۔ غائب ہوتے دیکھا تھا، نہیں۔ کوئی تعاقب میں آیا تھا، نہیں۔ تمہیں کوئی پولیس سارجنٹ نہیں ملا، میں نہیں ملا۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی ریس نہیں ہوئی۔ سب گول۔ بس تم ریگل سے بس پر سوار ہوئے اور گھوم پھر کے گھر آ گئے اور تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ تم نے اپنے طور پر تسلی کر لی تھی کہ کوئی بھی پیچھے نہیں آیا ہے۔ اس امتحان میں پورے اترے تو دس ہزار مل جائیں گے، کسی پریشانی کے بغیر۔ لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ خوش نصیبی بار بار ساتھ نہیں دیتی اور خدا ایک غلطی کو ضرور معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ بندہ صدق دل سے اس کا اعادہ نہ کرنے کا عہد کرے۔ پھر ایسے کسی معاملے میں پڑو گے تو بوڑھی ماں اور معذور بھائی کو اپنے سہارے سے خود محروم کرو گے۔ تم مارے نہ گئے تو جیل جاؤ گے اور وہ مارے جائیں گے۔ محنت کرتے رہو گے تو کامیابی دیر سے ہوگی مگر باعزت ہوگی اور بے خطر ہوگی۔ اب جاؤ، بھاگ جاؤ۔"

"یس... یس سر!" اس نے بیگ لیا اور ایک قدم چل کے رکا۔ "مگر وہ تھانیدار جناب... وہ مجھے دیکھ چکا ہے۔"

"اس کا باپ بھی صرف ایکبار کسی کی صورت دیکھ کر اس شہر میں اسے تلاش نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہونا تو میں ایک فون نمبر بتا رہا ہوں۔ اسے حرف یاد رکھو، لکھنا نہیں۔ کہنا..." میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کمانڈر کبیر سے بات کرنی ہے۔ میں نہ ملوں تو پیغام چھوڑ دینا کہ زرد بیگ کی بات کرنی تھی۔ میں سمجھ جاؤں گا اور جو ہو گا وہ کروں گا۔ گڈ لک۔"

میں اسے ڈگمگاتے قدموں سے چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار مجھے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری ملاقات کا علم دشمن کے کسی ایجنٹ کو نہیں۔ اگر ریگل بس اسٹاپ پر کوئی تھا تو وہیں سے مطمئن ہو کے چلا گیا تھا کہ لڑکا بس میں نکل گیا اور میں رہ گیا۔ اس کے گھر کا پتہ میں نے اسی لیے نہیں پوچھا تھا کہ بعد میں میرا اور اس کا تعلق اس خاندان کے لیے مصیبت کا باعث نہ بنے جو بڑی ہمت کے ساتھ سخت حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس سبق کے بعد یہ محنت کرنے والا لڑکا کبھی لالچ میں آ کے صراطِ مستقیم کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ دس ہزار تو اسے ملنے ہی چاہئیں۔ اس نے حماقت ضرور کی تھی مگر خطرہ بھی مول لیا تھا اور محنت بھی کی تھی۔ واپس آتے ہوئے مجھے حشمت خان کا خیال کر کے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں اس پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آ کے اٹھے گا تو اسے اپنے گرد تمسخر اڑانے والے چہرے نظر آئیں گے جو ہمدردی بھی کریں گے تو یوں کہ بے عزتی محسوس ہو۔ وہ چیخے گا، چلائے گا اور گالیاں دے گا، میں جانتا ہوں اس علاقے کے ایک ایک بدمعاش کو۔ مجھے معلوم ہو جائے گا یہ کون حرامزادہ تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

حشمت خان سے ہٹ کے میرا دھیان غلام علی کی طرف چلا گیا۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہم جو خلوص اور جذبۂ احسان مندی کے اظہار کے مجرم تھے۔ پاس وفا رکھتے تھے، دشمن کسی کے نہ تھے۔ حقِ نمک کا قرض تھا جو ہم نے اس خون سے ادا کر دیا جس میں وہ نمک شامل تھا۔ غلام علی کے انجام نے مجھے اداس کر دیا تھا اور یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ دشمن کو اس کی اور میری ملاقات کا اور مقصدِ ملاقات کا علم کیسے ہوا ہے۔ کیا وہ غلام علی پر نظر رکھے ہوئے تھے؟ ڈی سلوا کو شک ہو گیا تھا کہ پرسنل فائلیں آفس سے باہر لے جائی گئی ہیں۔ کیسے؟ غلام علی نے جذباتی ہو کے احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ کسی نے اسے فائلیں واپس لاتے ہوئے اور اپنی اپنی جگہ رکھتے دیکھ لیا ہو جس کی اسے خبر نہ ہوئی ہو۔ یہ سب قیاس آرائی تھی مگر جو بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا، یہ تھی کہ ضامن رضوی صاحب کا فون ٹیپ کیا گیا ہے ورنہ کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ آج صبح گیارہ بجے میں نے کسی کو "گارڈینیا" میں ملنے کا وقت دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ فکر کی بات یہ تھی کہ میرے لیے گواہوں کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ غلام علی وہ گواہ تھا جس نے مزید گواہ لانے کا وعدہ کیا تھا جو مجھے اگلے ہی روز پیش کرنے تھے۔ یہ انتہائی خود غرضانہ سوچ تھی اور مجھے اپنی کمینگی پر شرم بھی آئی۔ غلام علی اپنی جان سے گیا اور وہ بھی میری خاطر، وزیر خان مرحوم کی خاطر جن کا وہ احسان مند تھا اور مرتے مرتے اپنا فرض بھی چکا گیا لیکن مجھے خیال تھا تو ایک گواہ کے نہ رہنے کا۔ حقیقت بہرحال ناقابلِ تردید تھی۔ غلام علی کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ کم نہ تھا مگر مجھے آنے والے دن کی فکر بھی کرنی تھی۔ گلاب خان چوکیدار کے علاوہ بھی مجھے دو گواہ مطلوب تھے۔ میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں 'ایم ڈبلیو ڈی' کے آفس جاؤں اور علی الاعلان پوچھوں کہ وزیر خان مرحوم کے جنازے میں کون کون نمک حلال شریک ہوا تھا۔ جواب سامنے آنے کی ہمت رکھتا ہو۔

لیکن ڈی سلوا مجھے دھمکی دے چکا تھا کہ قانونی حقِ ملکیت کی سند کے بغیر میں نے دفتر میں قدم رکھا تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اس جیسا شخص مجھے واقعی دفعہ چار سو اکیاون ضابطہ فوجداری کے تحت بند کرا سکتا تھا۔ تو ہے کوئی کاٹ؟ تاہم میرے دل کی آواز نے کہا۔ جائز ذرائع سے جائز کام کا حق بھی نہ ملتا ہو تو ناجائز ذرائع بھی جائز ہیں۔

میں گھر پہنچا تو محسن رات بھر جاگنے کے بعد اب سو رہا تھا۔ بستر کو دیکھ کر خود میرا دل بھی چاہتا تھا کہ آنکھیں موند کر لیٹ جاؤں مگر میں جانتا تھا کہ آنکھ لگ گئی تو وہ وقت سونے میں گزر جائے گا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خود داری بھی کوئی بڑی چیز تھی۔ میں نے محسن کو جگایا اور اسے غلام علی کی المناک موت کی خبر دینے کے بعد اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ گھر کے اندر جا کے کھانا کھانے سے پہلے میں نے باہر کا ایک چکر لگایا اور ٹیلیفون لائن کا معائنہ کیا۔ ٹیلیفون لائن سے ایک کنکشن زیرِ زمین لے جایا گیا تھا۔ تار ایک درخت کی کوئی چھال سے چپکا ہوا تھا اور اوپر شاخوں میں گم ہو گیا تھا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ ضروری تھا کہ رضوی صاحب خود اپنی آنکھوں سے یہ "حسنِ انتظام" دیکھ لیں۔

سوا دو بجے ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ غلام علی کے فراہم کردہ کاغذات کی ایک نقل ہمارے پاس تھی، دوسری کو میں نے رضوی صاحب کی رائٹنگ ٹیبل کی سب سے نیچے والی دراز میں ڈال دیا تھا۔ محسن نے اخبارات دیکھ لیے تھے اور گھوڑے والے پیر سائیں کے قریب واقع کمپنی کے یارڈ سے ملنے والی چوکیدار کی لاش کا احوال بھی پڑھ لیا تھا۔ اس نے دس ہزار روپے ایک لفافے میں ڈال لیے تھے۔

"بیڈن روڈ پر تیرا کام بہت مختصر ہے۔" میں نے کہا۔ "تو اوپر جا کے یہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات ڈی سلوا کی سیکرٹری کو دے دینا کہ صاحب کو پہنچا دے۔ جتنی دیر میں وہ اندر جا کے آئے تو غائب ہو جانا۔ وہ تجھے نہیں پہچانتی۔ اس کے بعد تو یہ دس ہزار اس چوکیدار کے گھر دینے چلے جانا۔ وہاں کے معاملات میں طے کروں گا۔"

"میں کچھ دیر نیچے انتظار کروں گا، چھپ کر۔" محسن بولا۔ "خطرے کی کوئی بات ہوئی..."

"خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "مجھے اپنے والد کے پرانے وفاداروں سے ہی تو ملنا ہے۔"

ساڑھے تین بجے محسن نیچے اترا تو میں نے بیڈن روڈ کے ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ سے ڈی سلوا کا نمبر ملایا۔

"ڈی سلوا صاحب!" میں نے اس کی آواز پہچان کے کہا۔ "کیا حال ہے۔ میں نے ایک تحفہ ارسال کیا تھا، مل گیا؟"

"کیا مقصد ہے اس کا؟" ڈی سلوا نے غصے سے پھٹتے ہوئے کہا۔ "بلیک میلنگ؟"

"وہ بعد میں دیکھی جائے گی۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ابھی تو یہ تمہارے رویے پر منحصر ہے۔ اس مرتبہ میں نے احتیاطاً اتنی کاپیاں بنوالی ہیں اور ایسی ایسی جگہ رکھوا دی ہیں جہاں تمہارے خیال کی بھی رسائی نہیں۔"

"فضول بکواس کے بجائے یہ بتاؤ کہ چاہتے کیا ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ابھی میں آفس میں قدم رنجہ فرماؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان مرحوم کے پرانے ملازموں سے ملاقات کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ تم خوش آمدید کہو نہ کہو۔ اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم کیوں ملنا چاہتے ہو ان سے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"بات میں تمہاری موجودگی میں بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم کرنا ہے کہ میرے والد کے جنازے میں کون کون شریک ہوا تھا اور کچھ نہیں۔"

"یہ معلوم کر کے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟" وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ "تمہارے ارادے کچھ اور معلوم ہوتے ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے شرافت سے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں تو تم مجھے زبردستی غلط سمجھنے پر تلے ہوئے ہو۔" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "میں آ رہا ہوں اور دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک روپیہ اس باکس میں ڈال اچود کا نذرانہ اسی مقصد کے لیے رکھا تھا۔ اس شرح پر وہ یقیناً فائدے میں رہتا ہوگا خواہ ٹیلیفون والے بھی بل بناتے ہوئے اپنے حقِ خود ارادیت کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ پانچ منٹ بعد میں نے زینے پر قدم رکھا اور میر وزیر اینڈ کمپنی کے آفس میں دائیں طرف مڑنے کے بجائے بائیں دروازے سے داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ نہیں ہال تھا جس میں میزوں کی دو قطاریں تھیں۔ بالکل اسکول میں لگی ہوئی ڈیسکوں کی طرح۔ ان سب کا رُخ دروازے کی طرف تھا۔ آخر کی ایک میز غالباً انچارج کے لیے تھی کہ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا تاکہ وہ اپنی قطار کے برماتحت پر نظر رکھ سکے۔ میزوں پر دس کلرک مصروفِ کار تھے مگر انچارج ٹائپ شخص ایک ہی تھا۔ اس کے ساتھ والا دوسرا انچارج موجود نہیں تھا۔ اور اس کی عدم موجودگی کے اسباب ابھی صرف میں جانتا تھا۔ دوسرے انچارج کی مسخ شدہ لاش میو ہسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی تھی اور چند قدم دور ریگل بس اسٹاپ پر اس کے لہو کا ہر داغ تارکول کی سیاہ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی رگڑ سے مٹتا جا رہا تھا۔

بیک وقت کئی نظریں سوالیہ انداز میں میری طرف اٹھیں۔ ان میں انچارج کی نظر بھی شامل تھی۔ میں کچھ دیر تذبذب اور گومگو کی کیفیت کا اظہار کرتا رہا اور ہاتھ باندھے ہر طرف اس دیہاتی کی طرح دیکھتا رہا جو بیل گاڑی سے اتر کے کاروں کے شوروم میں گھس گیا ہو۔ دیکھنے کی وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ ماحول کسی بھی آفس سے مختلف نہ تھا۔ فائلیں، فائل کیبنٹ اور الماریاں۔

"جی؟" انچارج سے بالآخر صبر نہ ہو سکا۔ "کیسے تشریف لانا ہوا؟" اس کے طنزیہ مسخر آمیز انداز پر اس کے ماتحت مسکرائے۔

"یہاں ایک غلام علی صاحب ہیں۔" میں نے خالی کرسی کی طرف دیکھا۔ "آج ان کا انتقال ہو گیا۔"

کاروں کے شوروم میں داخل ہونے والے دیہاتی نے یکلخت فائر کر کے سب کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور کرسی پر بیٹھنے کے بجائے واحد انچارج کے سامنے اس کی میز پر ٹک گیا۔

"یس جنٹلمین!" میں نے ان سب کو مخاطب کیا جو میری طرف منہ اٹھائے بیٹھے تھے۔ "وہ ایک حادثے میں مارا گیا۔ گڈ مین دی لالٹین۔ ریگل پر ایک کار کے نیچے آ گیا۔ ایسے آدمی عموماً ایسے ہی مارے جاتے ہیں۔"

پیچھے کا دروازہ کھلا اور پلٹ کر دیکھنے پر مجھے ڈی سلوا کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی خون آشام نظریں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اسے قطعی نظر انداز کر دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "خیر یہ بات تو آپ کو آج نہ سہی کل معلوم ہو جاتی۔" میں نے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ جس وقت غلام علی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تو میں وہاں موجود تھا۔ وہ میرا رشتے دار یا دوست کچھ نہیں تھا۔" میں ڈرامائی طور پر گھوم کر ڈی سلوا سے مخاطب ہوا۔ "مسٹر ڈی سلوا! آپ کو نہ حیرانی ہوئی ہے نہ صدمہ ہوا۔ کیا آپ غلام علی کو نہیں جانتے؟ یا مہلک حادثے کا مطلب نہیں سمجھتے؟ آپ نے حادثے کی نوعیت بھی نہیں پوچھی؟"

ڈی سلوا کا رنگ لمحہ بھر کے لیے اڑا اور بحال ہو گیا۔ "مجھے پولیس نے فون کر کے بتا دیا تھا۔"

"اچھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اور یہ اتنی غیر اہم اطلاع تھی کہ آپ نے اپنی ذات تک محدود رکھی۔ اس کے ساتھیوں کو نہیں پہنچائی؟"

دفتر والوں کے لیے ڈی سلوا کے ساتھ میرا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ ڈی سلوا نے محسوس کیا کہ چیخنے دھاڑنے سے سب کے سامنے اس کی اور سبکی ہوگی۔ اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنا لہجہ پُرسکون رکھا۔ "میں بتانے ہی والا تھا۔ مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔"

"خیر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا اس لیے میں خود بتا دیتا ہوں۔ میں فرم کے سابق مالک وزیر خان کا واحد وارث ہوں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔" صورتوں کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ یہ دوسرا دھماکا پہلے انکشاف سے زیادہ سنسنی خیز رہا۔ "اپنی قانونی حیثیت میں اب میں بھی ایک مالک ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اور حقِ وراثت کے لیے۔۔۔"

"کیا تم یہی اعلان کرنے آئے تھے؟" ڈی سلوا نے میری بات کاٹ دی۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ "میں مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ خاموش نہیں رہ سکتے تو اپنے کمرے میں جا کر بیٹھیے۔" میں پھر عملے سے مخاطب ہو گیا جو میرے "مالکانہ" رویّے سے پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے حقِ وراثت کے لیے قانونی کارروائی کا آغاز کر دیا ہے اور میرے مشیرانِ قانونی اس رسمی سی کاغذی کارروائی کو بہت جلد مکمل کر لیں گے۔ تاہم اس وقت آنے کا مقصد یہ اعلان کرنا بھی نہیں تھا۔" اعلان کے لفظ پر میں نے ذرا سی دیر کے لیے ڈی سلوا کو دیکھا۔ "وزیر خان کے انتقال کے وقت میں لندن میں زیرِ تعلیم تھا اس لیے جنازے میں شرکت نہ کر سکا۔ آپ لوگ تو یقیناً گئے ہوں گے؟"

"بالکل سر!" میرے پیچھے سے انچارج نے کہا۔ اس خوشامد پرست ابن الوقت کا لہجہ اب قطعی مختلف تھا۔ "ہم سب گئے تھے۔"

"اچھا۔ جانا بھی چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "خیر کی تدفین میں شرکت کا بھی ثواب ہے۔ کیا نام ہے آپ کا؟" میں نے نوٹ بک نکالی۔ "ذرا پتہ بھی لکھوا دیجیے۔"

اس وقت کسی کو اندازہ نہ تھا کہ نام پتے لکھ کے میں کیا کروں گا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ میں سب سے واقفیت حاصل کرنے یا ان کے بارے میں مفصل معلومات رکھنے کے موڈ میں ہوں۔ صرف ڈی سلوا جانتا تھا کہ اس کارروائی کا مقصد کیا ہے لیکن وہ مجھے روک نہیں سکتا تھا۔ مقصد کا اعلان میں نے نوٹ بک جیب میں رکھنے کے بعد کیا۔

"اب میں آپ میں سے صرف تین حضرات کو زحمت دوں گا۔" میں نے کہا۔ "کل مجھے ڈی ایم کے سامنے تین گواہ پیش کرنے ہیں جو کہہ سکیں کہ وہ آخری رسوم میں شریک تھے اور قبر کی نشاندہی کر سکیں۔ دراصل میں نے عدالت سے لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کروانے کی درخواست کی تھی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے بلکہ ان کو قتل کیا گیا تھا۔"

یہ دھماکا سب سے بڑا تھا۔ میرے سامنے اسے افراد منجمد بیٹھے تھے۔ ان سب کا رنگ اڑ چکا تھا اور آنکھوں سے زیادہ ان کے لیے اپنے کانوں پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ غلام علی کی ہلاکت، وزیر خان کا قتل، قبر سے لاش نکالنا، یہ سب بہت ہولناک باتیں تھیں۔۔۔ ابھی میرے اس کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے وہ کتنے انہماک اور اطمینان سے اپنی روزمرہ کی کلرکی میں مصروف تھے۔

"آپ لوگوں کے لیے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس گواہی کے بعد آپ میں سے کسی کو کہیں بیان نہیں دینا ہوگا اور کسی عدالت میں نہیں جانا پڑے گا۔ اخلاقاً بھی قتل کی تفتیش میں مدد کرنا آپ کا فرض ہے اور قانوناً بھی آپ سب بذریعہ سمن تعمیل کرائے جا سکتے ہیں۔ اس سے تاخیر تو ہو سکتی ہے ایک دو دن کی مگر تعاون نہ کرنے والے کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں رہے گی۔"

"کسی کو دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔" ڈی سلوا کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

"تم عادی معلوم ہوتے ہو مالکوں کی بات کاٹنے کے اور غالباً وزیر خان کے شریفانہ رویّے نے تمہیں بدتمیز بنا دیا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں ڈسپلن مانگتا ہوں مسٹر ڈی سلوا۔"

"آج تمہیں یہاں حکم چلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"یہ حق مجھے بہت جلد حاصل ہو جائے گا اور اس وقت تم فائدے میں نہیں رہو گے مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں چار سال لندن میں رہ کے آیا ہوں۔ دو باتوں کی کوشش کبھی مت کرنا۔ ایک مجھ سے بہتر انگریزی بولنے کی، دوسری مجھے بے عزت کرنے کی۔ میں ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر نہیں کرتا، موقع پر فیصلہ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اس کا عملی ثبوت مانگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

ڈی سلوا کا رنگ غصے اور ذلت کے احساس سے زرد پڑ گیا۔ وہ پلٹا اور دروازہ دھڑام سے مار کے چلا گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت غالب رہا۔ میں پھر ان سب سے مخاطب ہوا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "ایک تو آپ تشریف لے آئیے۔" میں نے انچارج سے کہا۔ "اور آپ۔۔۔ آپ اور آپ۔۔۔" میں نے چٹکی بجا کے تین افراد کو کھڑا کر لیا۔ "ایک کا زیادہ ہونا بہتر ہے۔ میں صبح گاڑی لے کر آؤں گا اور یہیں ملوں گا۔ آپ فکر مت کریں۔ عدالت میں حاضری ڈیوٹی شمار کی جاتی ہے۔"

ڈی سلوا کی غیر موجودگی نے ماحول کی کشیدگی کو کم کر دیا تھا۔ پہلے انچارج نے اور پھر دوسرے لوگوں نے باری باری اٹھ کے مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ سب بہت سے سوالات کرنے کے لیے بے تاب تھے مثلاً یہ کہ مجھے اپنے والد کی موت پر قتل کا شبہ کیوں ہے اور کس پر ہے۔ میرے بارے میں جو کچھ اخبارات میں آ چکا ہے کس حد تک درست ہے کہ میں نے میر شرافت علی کو قتل کیا۔ کیا مجھے میر صاحب پر ہی شک تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور بہت کچھ بتانا بھی چاہتے تھے مثلاً یہ کہ مرحوم وزیر خان مدت سے بیمار تھے اور کمپنی کے معاملات سے بے تعلق ہو چکے تھے اور سنا ہے وہ کوٹھی ایک نمک حرام چراغ دین کی تھی جہاں ان کا انتقال ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور کہا کہ وقت آنے پر حقائق سب کے سامنے آ جائیں گے کیونکہ معاملات عدالت میں زیرِ سماعت ہیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس لیے ان پر اظہارِ رائے بھی توہینِ عدالت کے زُمرے میں آتا ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد حالات درست ہو جائیں گے اور میں کمپنی کو بہتر خطوط پر منظم کروں گا۔ مالی حالات کا جائزہ لوں گا اور انشاء اللہ منافع کما کے دینے والوں کو اس میں سے زیادہ حصّہ ملے گا۔ بونس کے علاوہ میں گرانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے تنخواہوں میں بھی کمپنی کی مالی استطاعت کے مطابق معقول اضافہ کروں گا۔ ان سب باتوں کا مجموعی تاثر خوشگوار ہوا اور جب میں ان سے رخصت ہوا تو وہ ذہنی طور پر مجھے ایک اچھا مالک تسلیم کر چکے تھے۔

میں باہر نکلا ہی تھا کہ ڈی سلوا کی خوش شکل، خوش لباس اور خوش اطوار سیکریٹری نے ریشم جیسے ملائم لہجے میں مجھ پر برقِ تبسم گراتے ہوئے درخواست کی کہ میں مسٹر ڈی سلوا سے ملاقات کر کے جاؤں۔ ڈی سلوا نے اسے دروازے پر اسی کام کے لیے مامور کر رکھا تھا کہ میں نکلنے نہ پاؤں۔ میں نے اس کو بے رُخی کے انداز میں یکسر نظرانداز کرتے ہوئے متانت سے سر ہلایا اور دوسرے کمرے سے گزر کے ڈی سلوا کے پاس جا پہنچا۔ اس کا رویّہ سابقہ ملاقات کے رویّے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے مہذب بلکہ مودّب طریقے پر مجھے ریسیو کیا اور تشریف رکھنے کو کہا۔ پھر انٹرکام پر چائے کے لیے کہا اور اس وقت غیرارادی طور پر وہ ایک غلطی کر بیٹھا جس نے مجھے ہوشیار کر دیا کہ یہ تبسم یہ تکلّم عادت کی بات نہیں بلکہ شکاری نے میرے لیے جال پھیلایا ہے۔ انٹرکام پر بات کرنے کے لیے سیٹ کا ایک بٹن دبانا پڑتا ہے اور جب اسے چھوڑا جاتا ہے تو ہلکی سی آواز آتی ہے۔ ایک شبہ تو مجھے یہ ہوا کہ ڈی سلوا نے بٹن دبایا ہی نہیں۔ پھر مجھے آواز سنائی نہیں دی اور میں نے ڈی سلوا کی نظر بچا کے دیکھا تو مجھے انٹرکام کا وہ بٹن ایک پیپر ویٹ سے دبا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے میرے سامنے فائلوں کا انبار رکھ دیا تھا کہ مجھے یہ انتظام نظر نہ آئے اور میں بے خوف ہو کے جو کچھ کہوں اس کی دلرُبا سیکریٹری اپنے کمرے میں سُنے اور ریکارڈ کر لے۔ مجھے سیکریٹری کی "یس سر" کے بعد کوئی آواز سنائی نہ دی۔ کوئی آہٹ بھی نہیں تھی، وہ دم سادھے خاموش بیٹھی تھی۔

"مسٹر سکندر بخت!" ڈی سلوا نے بڑی نرمی سے کہا۔ "آخر ان کاغذات کو بھجوانے کا مقصد کیا تھا؟"

"کاغذات؟" میں نے حیران لہجے میں کہا۔ "کون سے کاغذات؟"

"وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات جو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ملے ہیں۔ جن کے بارے میں آپ نے فون بھی کیا تھا۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی کیسی مسٹر سکندر!" وہ بولا۔ "آپ میری سیکریٹری کو وہ کاغذات دے کر غائب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد آپ نے فون پر پوچھا تھا۔"

"نان سنس۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہ میں یہاں پہلے آیا اور نہ میں نے آج تم سے فون پر بات کی۔ کدھر ہے تمہاری وہ سیکریٹری۔ بلاؤ اسے۔ میرے سامنے بات کرو اس سے۔"

سیکریٹری فوراً حاضر ہو گئی۔ "کیا میں تمہیں کچھ دیر پہلے کاغذات دینے آیا تھا، مسٹر ڈی سلوا کے لیے؟ غور سے دیکھ کر بتاؤ کیا وہ آدمی میں ہی تھا؟"

سیکریٹری کے لیے مجھ سے نظر ملا کے جھوٹ بولنا مشکل تھا۔ "نو... نو سر... آپ تو نہیں آئے تھے۔ ایک اور شخص تھا۔"

"ڈیم اِٹ۔" میں نے میز پر مکا مارا۔ "میں نے صرف اپنے بارے میں پوچھا تھا۔ یہ نہیں کہ آج کون آیا، کون گیا۔ جاؤ۔"

سیکریٹری کا رنگ فق ہو گیا تھا کیونکہ وہ ڈی سلوا کی آنکھوں کی شرر افشانی بھی دیکھ چکی تھی۔

"تم چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" ڈی سلوا غرّایا۔

"وانٹ ٹو پلے اے ڈرٹی ٹرک..."

"شٹ اپ۔" میں نے کہا۔ "مجھے دکھاؤ وہ کون سے کاغذات ہیں؟"

عالمِ اشتعال میں ڈی سلوا نے لفافہ میری طرف پھینک دیا۔ "تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں پولیس کو رپورٹ کر دوں گا۔"

میں نے لفافہ اٹھایا۔ پھر خود اٹھا اور ہاتھ مار کے میں نے انٹرکام پر رکھا ہوا پیپر ویٹ ہی نہیں انٹرکام بھی نیچے گرا دیا۔ "یو ڈرٹی سوائن۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے ٹریک کرنا چاہتے تھے۔ ہاں میں نے یہ کاغذات بھجوائے تھے لیکن اس مقصد کے لیے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے فون پر کہا تھا وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ تم نے غلام علی کو مروا دیا مگر تمہارے سیاہ کارناموں کی تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والا آدمی نہیں ہوں جس روز تم عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں پہنچو گے تو تمہیں اپنے خلاف گواہی دینے والے سب بتا دیں گے۔" میں کھڑا ہوا تھا، اور بالکل مستعد تھا۔ ڈی سلوا سمجھ گیا تھا کہ اس کی چال ناکام ہو گئی ہے لیکن وہ ایک بار پہلے جسمانی مقابلے کا انجام دیکھ چکا

تھا۔ تب وہ اکیلا تھا مگر اس وقت دوسرے کمرے میں پورا اسٹاف موجود تھا۔ ان سب کے سامنے وہ تماشا بننا نہیں چاہتا تھا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی زبان کے سوا کچھ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے دروازے کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تمہاری نازک ہڈیاں توڑ دیتا۔ اور مسٹر ڈی سلوا کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ تمہاری مدد کے لیے آتا یا تمہارا گواہ بنتا۔"

میں باہر والے کمرے میں آیا اور سیکریٹری نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ اس کی میز پر ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ "تم کو بہت جلد فیصلہ کر لینا چاہیے مس! کہ تم اس آدمی سے وفادار رہنے کو ترجیح دو گی یا فرض سے وفاداری کو۔" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا اور باہر نکل گیا۔ پھر اندر آیا اور وہ لفافہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ "یہ اپنے باس کو دے دینا۔ چاہے تو مزید فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بنوا لے۔ یہ اسی کا ریکارڈ ہے جو میری تحویل میں نہیں۔ اس سے میرے خلاف کوئی کیس نہیں بنتا۔"

واپسی پر میں نے گلاب خان سے ملاقات کی اور بتایا کہ اسے گواہی کے لیے جانا ہے۔

"ہم جائے گا، ضرور جائے گا۔ جائے گا کیسے نہیں۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اس خانہ خراب کو پھانسی ہوگا تو ہمارا دل کو ٹھنڈک پڑے گا اور ہم اس سے پوچھے گا خنزیر! تیرا کیا نقصان کیا تھا وزیر خان نے۔ وہ بڈھا آدمی اِدھر اکیلا رہتا تھا۔ پنج وقت نماز پڑھتا تھا۔ وہ کسی کا دل بھی نہیں دکھایا اور سلامت شاہ، اللہ مغفرت کرے۔ وہ اتنا نیک آدمی۔ جس شیطان داؤس نے اس کو مارا وہ ہم کو مل جائے تو خدا کا قسم ہم اس کا بھی ٹکڑے کر دے۔ تم نہیں دیکھا سکندر بابو! ہم اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا۔" اس نے توبہ کے انداز میں دونوں کانوں کو چھوا۔ "ہم بزدل نہیں ہے صاحب! دشمن کا سینے میں گولی مار سکتا ہے۔ ہمارا باپ دس فرنگی قتل کیا، سب کو جہنم میں بھیجا، پھر شہید ہو گیا۔ گلاب خان کے سامنے آئے کوئی بہادر ہے تو۔ بھلا ایسا کرتا ہے، چھپ کر بوڑھا آدمی کو ایسے ذبح کرتا ہے، جیسے وہ جانور ہے۔ اس کا ٹکڑا کر کے بکس میں ڈال دیا اور بھاگ گیا، خانہ خراب ہووے اس کا۔ اِدھر ہمارا ساتھ دو آدمی تھا، اب ہم اکیلا ہے۔ ہم کو یہ دل تنگ کرتا ہے۔ بولتا ہے گلاب جانا، تم اِدھر بندوق لے کر گدھے کی طرح کھڑا رہا اور ایک کے بعد ایک دو آدمی کا قتل ہو گیا۔ لعنت تمہارا دوستی پر اور تمہارا بندوق پر۔" وہ سخت مشتعل اور جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ خدا انصاف کرنے والا ہے اور ظلم کی رسّی دراز نہیں ہوگی۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی اس کا پھل بھی پاتا ہے۔ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی۔ پولیس نے گلاب خان کو بھی بہت پریشان کیا تھا مگر چراغ دین نے اس کی جان بچائی تھی کہ یہ آدمی قابلِ اعتماد اور بھروسے کا ہے۔ چراغ دین گھر پر نہیں تھا۔ گلاب خان نے مجھے مطلع کیا کہ ہمارا اصاب شادی کر رہا ہے۔

"چراغ دین شادی کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "دوسری شادی؟ خود اس نے بتایا ہے تم کو؟"

"ہاں۔ اچھا ہے نا۔ ابھی کتنے دن اکیلا رہے گا۔" گلاب خان بولا۔ "پہلا بی بی مر گیا، اللہ کا مرضی۔" اس نے سر اوپر اٹھا کے کہا۔ "شادی تو سنّتِ رسولؐ ہے۔ گناہ سے بچاتا ہے۔ گھر آباد ہوگا تو ہم بھی خوش ہوگا۔ ابھی تو ہم سارا دن دیواروں کی رکھوالی کرتا ہے۔ بی بی ہوگا تو ہم خدمت کرے گا۔ پھر اس کا بچہ ہوگا تو ہم اس کو کھلائے گا۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلے گا۔ ہمارا روح خوش ہوگا۔ ابھی ہمارا روح بہت دکھی ہے۔ ہم قبرستان کا چوکیدار ہے۔ اِدھر کوئی زندہ نہیں رہا۔ ہم گھر میں رہنا چاہتا ہے۔ جدھر کوئی انسانوں کا آبادی ہو، رونق ہو۔"

چوکیدار کی جذباتی آزردگی بجا تھی۔ خود کو قبرستان کا چوکیدار کہہ کے اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ گھر کی مالکن اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اس کے بچے بھی لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ دو نیک دل بوڑھے اس کی تنہائی کے رفیق تھے۔ وہ بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ گئے تو وہ اس گھر کی ویرانی، نحوست اور آسیب کی طرح ڈرانے والی یادوں کے درمیان اکیلا رہ گیا۔ اکیلے آدمی کے لیے دکھ کا عذاب بھی شدید تر ہوتا ہے۔ اب خانہ آبادی چراغ دین کی ہو رہی تھی اور خوش چوکیدار تھا۔ وہ مجھے چائے پلانے پر بھی مصر تھا مگر میں ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا آیا۔ ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ مجھے گلاب خان نے آواز دی اور واسکٹ کی جیب میں کچھ ٹٹولتا میری طرف بڑھا۔

"ہم باتوں میں بھول گیا صاب!" وہ ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کا نام یہ خط دے گیا تھا ایک شخص، گاڑی میں آیا تھا۔ بولتا تھا صرف انہی کا ہاتھ میں دینا ہے۔"

میں نے جیب میں پڑے رہنے سے چُرمُر ہو جانے والے لفافے کو دیکھا۔ اس پر میرا ہی نام لکھا ہوا تھا۔ اندر سے ایک لیٹر پیڈ کا کاغذ برآمد ہوا۔ یہ اسی ڈاکٹر کا لیٹر پیڈ تھا جس نے میرے والد کی وفات پر "ڈیتھ سرٹیفکیٹ" جاری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کیا تھا۔ گڑھی شاہو کا وہ بدتمیز اور بدزبان ڈاکٹر جس نے دیکھے بغیر لکھ دیا تھا کہ موت طبعی حالات میں ہوئی ہے۔ اس کا پیغام چند سطروں پر مشتمل تھا۔ انگریزی میں اس نے لکھا تھا:۔

"ڈیئر مسٹر سکندر!

مجھے اپنے اس دن کے رویے پر افسوس ہے۔
کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ایک بار پھر زحمت
کریں۔ میرا خیال ہے ہم اس مسئلے پر مصالحانہ
گفتگو کر سکتے ہیں۔"

"حرامزادہ!" میں نے خط پڑھ کے اسے بے اختیار گالی دی۔ اس نے اب بھی عیاری سے کام لیا تھا۔ حوالہ "اس دن" کا تھا۔ ذکر صرف "مسئلے" کا تھا اور اس نے اپنے دستخط بھی نہیں کیے تھے۔ خط ٹائپ کیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی ایسی تحریر نہیں دینا چاہتا تھا جسے میں کسی بھی مرحلے پر قانون کی جنگ میں اس کے خلاف استعمال کر سکوں۔ اس کے باوجود وہ "مصالحانہ گفتگو" کرنا چاہتا تھا جس کا مطلب تھا مجھ سے سودے بازی۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لاش واقعی دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے نکالی جا رہی ہے۔ میں نے اس خط کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔ پھر ان پرزوں کو چُنا اور لفافے میں ڈال کے حیرت زدہ چوکیدار کو وہ لفافہ تھما دیا۔

"اب وہ آئے نا تو اس سے کہنا کہ یہ ہے خط کا جواب اور میری طرف سے اجازت ہے کہ اسے بے عزت کر کے بھگا دو۔" میں نے کہا۔

محسن مجھ سے پہلے گھر پہنچ چکا تھا۔ جتنی دیر میں میں غسل سے فارغ ہوا اس نے مجھے چوکیدار کے گھر جا کے دس ہزار روپے دینے کی افسوسناک روداد سنائی۔ ایک آدمی کتنے کا ہوتا ہے؟ ایک بار کسی سائنسدان نے حساب لگا کے بتایا تھا کہ ڈھائی روپے کا۔ اس میں جسم کے فاسفورس، کیلشیم، فولاد، دیگر معدنیاتی اجزاء اور چربی وغیرہ سب کی قیمت شامل تھی۔ پھر وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کے لیے لوگ وہی آدمی مانگتے ہیں، ڈھائی روپے کا۔ اس کے عوض ڈھائی لاکھ ڈھائی کروڑ کچھ قبول نہیں کرتے۔ نہ روپے نہ ڈالر نہ پونڈ۔ محسن کو وہ دس ہزار دینے کے لیے جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ یہ مرحوم کی امانت تھی جو انہوں نے اسی خیال سے رکھوائی تھی کہ بیوی بچوں کے کام آئے۔ بنک میں اس لیے نہیں رکھی تھی کہ وہ سود کے قائل نہیں تھے۔

میں غسلخانے میں محسن کی آواز سنتا رہا جو ایک خاندان کی تباہی کا نظارہ کر کے لوٹا تھا اور بہت اداس تھا۔ باہر آ کے میں نے ڈی سلوا سے ملاقات کی روداد سنائی اور ہم تھوڑا سا ہنسے۔ اور اس ہنسی پر حیران بھی ہوئے اور شرمندہ بھی۔ زندگی کے کتنے دن سوگ اور غم کے گزرے تھے کہ ہم ہنسنا تک بھول گئے تھے اور ہنسنے پر شرمندہ ہوتے تھے۔ جتنی دیر میں محسن نے اپنے پرائیویٹ کچن میں چائے بنائی، میں نے اسے چراغ دین کے چوکیدار سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور یہ اطلاع دی کہ چراغ دین دوسری شادی کر رہا ہے۔

محسن نے اسے بے اختیار گالی دی "کس بدبخت کی شامت آئی ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا "ورنہ میں اس لڑکی کو بتا دیتا کہ نیک بخت کوئی اور بر دیکھ لے۔ چراغ دین تو وہ مجرم ہے جو قانون کی آڑ لے کر بچ گیا۔ مگر مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا وہ۔ یہ نہ ہو کہ سزا ملے چراغ دین کو اور گھر خراب ہو اس سے شادی۔۔"

"کس کی شادی کی بات ہو رہی ہے؟" رابعہ نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "کہاں ہو تم دونوں صبح سے؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کل کی نسبت آج اس کی حالت بہت بہتر تھی، مگر اس کے حسن میں سوگواری کا تاثر دل پر اثر کرتا تھا۔ جیسے سولھویں اور سترھویں شب کو طلوع ہونے والے ماہ کامل کا بجھا بجھا چہرہ۔ جس کی چاندنی برف باری کی رات میں سنسان پہاڑوں پر اترے۔

"ہم آج مصروف رہے۔" میں نے سنبھل کر کہا "ابھی ابھی آئے ہیں۔ بیٹھو، تم بھی چائے پیو۔"

وہ ایک پلنگ پر بیٹھ گئی "گھر میں سوئم کے لیے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ان سے نہیں ملو گے؟"

"کل ہو گا نا سوئم۔" محسن نے کہا "میرا خیال ہے جان پہچان والے محدود لوگوں کو بلایا جائے۔"

"جان پہچان والے ہی ہوں گے۔" وہ بولی "مثلاً جو ابھی اسلام آباد سے پہنچے ہیں۔"

"امی اور پاپا؟" محسن نے کہا "وہ آ گئے ہیں اور کون آیا ہے؟"

"مسٹر اور مسز شیروانی آئے ہیں اور فوزیہ آئی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ چائے کا مگ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

رابعہ نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور محسن سے مخاطب ہوئی "تمہاری یہ چھوٹی بہن مجھے بڑی پیاری لگی۔ بڑی محبت کرنے والی۔"

محسن چونکا "ہاں۔۔۔ ہاں۔" اس نے میری طرف دیکھا میں ٹوٹے ہوئے مگ کے ٹکڑے چن رہا تھا۔ "سکندر بھائی ذرا ممی اور پاپا کو سلام کر آئیں۔"

مجھے جواب کا موقع دیے بغیر وہ نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس صورت حال سے فرار چاہتا تھا۔ جذبات کا بھنور جو میرے گرد رہ گیا "خود غرض" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ اگر مجھے اکیلا نہ چھوڑتا تو کیا تھا۔ میں نے دوسرے مگ کو چائے سے بھرا۔ خاموشی گہری اور طویل ہوتی گئی۔ برف کی طرح اندر باہر جمتی گئی۔ شیشے کی دیوار کی طرح اٹھتی گئی۔ احتیاط! مبادا ایک غلط لفظ کا پتھر دلوں کے شیشے توڑ دے۔ اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ خاموشی پھر زبان بن گئی۔ رابعہ نے کہا "یوں چپ کیوں بیٹھے ہو۔ کچھ تو کہو۔" میں نے کہا "مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اعتراف جرم کر اقرار وفا۔ محبت کیا ہے؟ خزاں کی باد سموم جو امیدوں کی فصل اجاڑ دیتی ہے یا خزاں رسیدہ تمناؤں کے ہر نخل کو بہار نو کا سندیسہ دینے والی ہوا؟" رابعہ ہنسی "کیا عجیب سوال ہے۔ پوچھ رہے ہو کہ محبت زہر ہے یا امرت۔" میں نے کہا "ہاں ہاں۔ یہی پوچھ رہا ہوں۔ بقائمی ہوش و حواس پوچھ رہا ہوں۔ آدھے سوال کا جواب فوزیہ ہے تو باقی آدھے کا تم۔ غلط نہ تم کہو گی نہ وہ بتائے گی۔ آزمائش تو میری ہے جو پل صراط کے درمیان ہے اور نہیں دیکھ سکتا کہ میرے لیے جنت کدھر ہے اور جہنم کس طرف۔" رابعہ نے کہا "ہر آدمی کی اپنی جنت ہے اور اپنا جہنم ہے۔" میں نے جھلا کر کہا "یہ مجھے معلوم نہیں ہے اور یہی خیال تو مجھے کچھ کہنے نہیں دیتا۔ تم کہتی ہو کچھ کہو۔"

وقت اگر احساس کا نام ہے تو اس کا احساس نہ مجھے تھا نہ رابعہ کو۔ ہم ایک مختصر سے کمرے میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے رہے تھے اور اندھیرا چپکے چپکے ہمارے گرد حصار قائم کرتا گیا تھا۔ اچانک دروازے کے فریم میں ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کے خدوخال جانے پہچانے تھے۔ اس کے سراپا کی خوشبو اس کے وجود کی طرح منجمد ہو گئی تھی۔ وہ پلٹ کر جانے ہی والی تھی کہ میں نے کہا "فوزیہ!" اور سوئچ دبا کے لائٹ آن کر دی۔ فوزیہ رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ کوئی شکایت تھی نہ سوال تھا۔ "آ کے جا رہی ہو؟"

"مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔۔۔" فوزیہ نے کہا اور سنبھل گئی "میرا مطلب ہے انکل نے بتایا تھا تم یہاں ملو گے۔"

رابعہ نے خالی مگ نیچے رکھا۔ اس کا چہرہ اپنے جرم کی تفسیر سے دہکنے لگا تھا۔ "آؤ فوزیہ۔۔۔ میں تو بس جا ہی رہی تھی۔"

میں نے بھی اپنا خالی مگ نیچے رکھا اور کہا "میں بھی بس آنے ہی والا تھا فوزیہ۔"

رابعہ یوں نکل گئی جیسے وہ غلطی سے کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہو گئی ہو۔ وضاحت بے سود تھی۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ فوزیہ نے ہمیں اندھیرے میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ گفتگو بھی سن لی تھی جو ہم دل کی زبان میں کر رہے تھے۔ فوزیہ کے دل میں بھی جذبات کی لہروں کو ریسیو کرنے کا بڑا حساس نظام تھا جس کی فریکوئنسی بدلی نہیں تھی۔ فوزیہ دیر میں صحن میں کھڑی رہی۔

"وہ۔۔۔ بس اتنی دیر ہو گئی۔" میں نے خفت سے کہا "اور معلوم ہی نہیں ہوا۔"

"مگر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔" فوزیہ نے دوپٹے کو انگلی پر بل دے کے لپیٹتے اور کھولتے ہوئے کہا "واقعی بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"فوزیہ!" میں نے درد کی ٹیس سے تڑپ کر کہا "اور شرمندہ کرنے آئی ہو؟"

"نہیں سکندر!" وہ سر جھکا کے بولی "اب تو میں اپنے وجود سے بھی شرمندہ ہوں۔"

"ایسا مت کہو فوزیہ! زندگی کے دکھوں کے ساتھ جینا سیکھو۔ آدمی خود اپنی تقدیر کا خالق نہیں ہے۔ دکھ سب کا ورثہ ہیں۔"

"دکھ کے کنکر مارنے والوں کو تو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔" وہ اسی کھوکھلے لہجے میں بولی "سنگسار کرنے والوں سے معافی نہیں مانگی جا سکتی۔ غم کا پہاڑ اگر اتنا بڑا ہو کہ آدمی اس کے نیچے دب کر سانس بھی نہ لے سکے تو جینے کی آرزو سے کیا ہوتا ہے۔"

"تم کو جو کچھ کہنا ہے صاف کہو۔" میں نے دل کے ایک نامعلوم خوف کو دبا کر کہا۔

"صاف بات ہے سکندر کہ میں تمہاری بے وفائی کا صدمہ جھیل کر اکیلی تو جی سکتی تھی۔ اس خیال سے کہ میں نہ سہی تم تو خوش ہو، لیکن میں چراغ دین سے شادی نہیں کروں گی۔ میں مر جاؤں گی سکندر! مر جاؤں گی، تم دیکھ لینا۔" اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ دیوار پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صدمے نے مجھے زلزلے کے پہلے جھٹکے کی طرح مفلوج سا کر دیا تھا۔ "چراغ دین؟" میں نے جھپٹ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

"ہاں، چراغ دین۔ اس نے میرا رشتہ مانگا تھا۔" فوزیہ نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اور تمہارے ممی پاپا؟ انہوں نے منظور کر لیا؟" میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ "تم نے..."

فوزیہ نے خود کو چھڑا لیا۔ "تم بھول رہے ہو کہ میں وہ لڑکی ہوں جس کی نسبت ٹوٹ چکی ہے۔ ٹھکرائی ہوئی بے وقعت چیز۔"

"لیکن تمہاری ممی اس پروفیسر کو مجھ پر ترجیح دیتی تھیں۔"

"ترجیح دینے والوں کا معیار کس آسمانی صحیفے میں ہے؟" وہ تلخی سے بولی۔ "چراغ دین سب سے بہتر ہے کیونکہ وہ زیادہ دولت مند ہے۔ وہ میری بڑی بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ اب تک اس کی قبر کا مجاور ہے۔ اس سے زیادہ محبت مجھ سے کون کرے گا۔ مریم بہت خوش تھی۔ میں بھی بہت خوش رہ سکتی ہوں۔"

"اس... اس حرامزادے کے ساتھ؟ جس نے نمک حرامی کی، غبن کیا، میرے باپ کو لوٹا۔ جس تھالی سے کھاتا تھا اسی میں چھید کیا اور آج اس کی دولت باعث فخر ہے؟" میرے غصے کا آتش فشاں یک لخت پھٹ گیا۔ "وہ عزت دار ہے جس نے میرے باپ کی عزت کو خاک میں ملانے، اسے تباہ کرنے اور قتل کرنے والوں کی قیادت کی۔ جس نے اس پر پہلا وار کیا۔ مریم خوش تھی؟ مجھے تو اس کے دامن پر مریم کے خون کے داغ بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا فوزیہ! میں اسے قتل کر دوں گا۔"

"تم پاگل ہو رہے ہو سکندر!" وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔"

"نہیں فوزیہ! مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں فوزیہ کہ جو کچھ مجھے کرنا ہے، وہ میں ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے آزمائش میں مت ڈالنا کہ ایک طرف میرے باپ کے لہو کا قرض ہو اور دوسری طرف تمہارے سہاگ کی آبرو اور میں فیصلہ نہ کر پاؤں۔"

"فیصلہ تو میں کر چکی ہوں اور تمہیں یہی بتلانے آئی تھی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ "میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔"

وہ دوڑتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میری حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت آپس میں جڑ گئے تھے۔ نفرت کے زہر سے میرا بدن سلگ رہا تھا۔ یہ خبر تو مجھے چراغ دین کے چوکیدار گلاب خان نے ہی دی تھی۔ اس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جس دوسری شادی کا ذکر کر رہا ہے، وہ فوزیہ سے ہونے والی ہے۔ نہیں گلاب خان! تم اگر قبرستان کے چوکیدار نہیں رہ سکتے تو کسی دوسرے گھر کی دربانی کرو۔ تم جس مالکن کی خدمت کرنا چاہتے ہو وہ فوزیہ نہیں ہو سکتی جن بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو، جن بچوں کو کھلانا چاہتے ہو وہ چراغ دین اور فوزیہ کے بچے نہیں ہو سکتے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ابھی اس کی باری نہیں لیکن اب مجھے پہلے اس سے ہی نمٹنا ہوگا اس سے پائی پائی کا حساب پہلے لینا ہوگا جو اس نے میرے باپ کی محنت کی کمائی سے چرائی اور جس سے اس نے انصاف خریدا، عزت خریدی اور مریم کے بعد اب فوزیہ کو خریدنا چاہتا ہے۔

اس فیصلے کے بعد میں پُرسکون ہونے لگا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ صحن سے باہر قدم رکھتے ہی میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اندھیرے میں سیاہ پتھر کا بت نظر آتا تھا۔

"محسن!" میں نے اس کا کاندھا ہلا کے کہا۔ "تو کب سے کھڑا ہے؟"

محسن چونکا۔ "میں؟ بہت دیر سے۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "تم باتیں کر رہے تھے۔ میں رک گیا۔"

"تو... تو نے وہ سب سن لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ فوزیہ نے کہا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سکندر! میری ایک ہی بہن ہے۔ اس کی زندگی میری زندگی ہے اور میں جانتا ہوں وہ کتنی ضدی لڑکی ہے۔ اسے ضدی میں نے بنایا ہے۔ اس کی ہر بات مان کے، ہر خواہش پوری کر کے۔ اس نے جو مانگا میں نے اسے دیا۔ اگر وہ میری جان بھی مانگتی تو میں انکار نہ کرتا لیکن اب وہ موت مانگ رہی ہے۔ حد سے بڑھ گئی ہے۔"

"فکر کیوں کرتا ہے محسن! فوزیہ میرے لیے نہ سہی تیرے لیے زندہ رہے گی۔" میں نے اس کے شانے پر اعتماد کے ساتھ ایک ہاتھ رکھا۔

"ہاں سکندر! اگر وہ بے بس اور بے زبان ہے تو کیا میں تو بے بس نہیں ہوں۔ چل آ، ممی اور پاپا سے مل لے۔ انہوں نے ہی مجھے بھیجا تھا کہ تجھے بلا لاؤں۔" محسن نے کہا۔ "تیری صورت سے کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔"

جب میں نے رابعہ اور فوزیہ دونوں کی موجودگی میں انکل شیروانی اور ان کی بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کے آداب عرض کیا تو میری صورت سے واقعی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ میری آواز اور میرا لہجہ نارمل تھے اور میں بالکل پُرسکون تھا۔ مسز شیروانی بڑے غور سے مجھے اور رابعہ کو دیکھتی رہیں۔ رابعہ کے چہرے پر اداسی کے سوا کوئی تاثر نہ تھا۔ میرے جذبات کا اندازہ کرنے کی کوشش بھی رائیگاں گئی اور وہ کچھ دیر بعد اٹھ گئیں۔ اگر موقع ہوتا تو وہ خود مجھے بتاتیں کہ انہوں نے فوزیہ کے سلسلے میں کتنا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے کہ انہوں کو صرف فوزیہ کی خوشی کے لیے چھوڑ دیا اور چراغ دین کو قبول کر لیا۔ مریم کی جدائی کے زخم کا مرہم فوزیہ کو بنا دیا اور فوزیہ کا مقدر بھی سنوار دیا۔ تعزیتی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ کسی اور موضوع پر بیان نہیں دے سکتی تھیں تاہم مجھے یقین تھا کہ واپسی سے قبل وہ مجھے یہ "خوشخبری" میرے منہ پر جوتا مارنے کی نیت سے ضرور سنائیں گی۔ کھانے کے بعد رابعہ اور فوزیہ نے اپنے بیڈروم کا رخ کیا۔ میں اور محسن، رضوی صاحب اور شیروانی صاحب نصف شب تک ان تمام مسائل پر اظہارِ خیال کرتے رہے جو میری واپسی سے پیدا ہوئے تھے۔ بہت سی باتیں شیروانی صاحب کے لیے انکشاف سے کم نہ تھیں مثلاً چوہدری دلاور کا کردار، ڈی سلوا کی حیثیت۔ خصوصاً ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام پر ہونے والے ناجائز کاروبار کی نوعیت۔ باتیں ساری رات میں ختم نہ ہوتیں مگر مجھے صبح عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ میں نے رضوی صاحب سے کہا کہ مجھے ایک دن کے لیے گاڑی چاہیے۔ اپنے گواہوں کو لانے لے جانے اور وقت پر حاضر کر دینے کے لیے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ سرکاری جیپ میں چلے جائیں گے لیکن کار کو ان کا شوفر ڈرائیو نہیں کرے گا۔ اس شرط کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ قانون کی نگاہ میں میں ایک مجرم تھا اور اگر ایس ایس پی کا پولیس مین کی وردی والا ڈرائیور مجھے لے کر پھرتا تو رضوی صاحب کی پوزیشن جو پہلے ہی خراب تھی، مزید خراب ہو جاتی۔ انہوں نے مجھے جگہ دے رکھی تھی اور رابعہ کو بھی لے آئے تھے جو میری وکیل تھی۔ کسی اخبار والے کے لیے جو ان کو بدنام کرنا چاہتا، یہ اجتماع ایک سنسنی خیز انکشاف اور دلچسپ خبر کا عنوان بن سکتا تھا۔ رضوی صاحب وضعدار، بااصول اور جرأت مند آدمی تھے کہ انہوں نے ملازمت کے تحفظ پر رشتوں کی آبرو کو قربان نہیں کیا۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اور کوئی غلط کام بھی نہیں کیا تھا اس لیے مخالفت یا بدخواہوں کے خوف سے بے نیاز تھے۔

اچانک مجھے ٹیلی فون کو ٹیپ کرنے والے تاروں کا خیال آیا جو میں نے اور محسن نے دریافت کیے تھے۔ اس خیال سے میرا دل ڈوبنے لگا کہ ممکن ہے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ ان کے کانوں نے سن لیا ہو جن کے بارے میں ہم بے خوفی سے اظہارِ خیال کر رہے تھے۔

"انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا فون ٹیپ ہو رہا ہے؟"

"نہیں بھئی! معلوم تو نہیں تھا مگر آج شام محسن نے بتایا۔" وہ بولے۔ "میں تو حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے متعدد بار ایسا ہوا تھا کہ میں نے خفیہ طور پر ہدایات جاری کیں اور وہ مخبر متعلقہ لوگوں تک پہنچ گئیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اس درخت پر کیا تھا جس پر تار جا رہا تھا؟ کوئی ٹرانسمیٹر؟"

"ہاں۔ بہت چالاکی سے سب کیموفلاج کیا گیا تھا۔" وہ بولے۔ "نہ تار نظر آتے تھے، نہ پتوں میں چھپا ہوا چھوٹا سا ٹرانسمیٹر۔ اور نہ اس کا ایریل جو درخت کی چوٹی کے قریب تھا۔ اس سے ٹرانسمیٹر کی رینج بہت بڑھ گئی ہوگی۔ دس میل کے دائرے میں وہ کسی بھی ریڈیو ریسیور پر ٹیلی فون کے ذریعے ہونے والی سب گفتگو سن سکتے تھے۔ تم دیکھو گے، صبح میں پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔" انہوں نے ایک شوکیس پر رکھا ہوا چھوٹا سا پورٹیبل ٹرانسمیٹر درمیان میں رکھ دیا۔ اس کا ایریل ٹرانسسٹر ریڈیو کے ایریل کی طرح تھا کہ کھینچنے سے ایک میٹر سے زیادہ باہر نکل آتا تھا۔

"یہ یہاں تو نہیں ملتا۔" شیروانی صاحب بولے۔ "اور اس کا رکھنا بھی سخت جرم ہے۔"

رضوی صاحب ہنسے۔ "تو بھائی یہ ہے بھی کسی مجرم کا۔ وہ کیا چیز اسمگل کر کے نہیں لا سکتے۔" شیروانی صاحب نے اشتیاق کا مظاہرہ کیا تو رضوی صاحب نے اسے آپریٹ کر کے دکھایا۔ "تم دوسرے کمرے میں جا کے سنو، ٹرانسسٹر ریڈیو پر۔ وہ رکھا ریڈیو۔"

میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور انکل شیروانی کو ٹرانسسٹر ریڈیو کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میں نے ٹرانسسٹر ریڈیو کو ٹیون کیا۔ ایک جگہ اچانک رضوی صاحب کے بولنے کی آواز آئی، پھر محسن ہنسا، شیروانی صاحب بچوں کی طرح خوش ہوئے۔

"بڑے کام کی چیز ہے۔ وائرلیس فون ایسے ہی کام کرتے ہوں گے۔" انہوں نے کہا اور میں نے ان سے اتفاق کیا۔ جب وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف جا رہے تھے تو میں نے اجازت لی اور باہر جانے کے لیے مخالف سمت کے دروازے کی طرف بڑھا۔ شیروانی صاحب کے نکلتے ہی میں پلٹا اور میں نے میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے وہ فوٹو اسٹیٹ کاغذات نکال لیے جن کی قیمت غلام علی نے جان دے کر ادا کی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے مجھے وہ ڈائیلاگ یاد آئے جو میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے یکطرفہ طور پر بولے تھے۔ غلام علی اس وقت ریسیور رکھ چکا تھا جب میں رضوی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے بول رہا تھا "کل ہی چلے جاؤ گے۔ ایک آدھ دن اور ٹھہر جاتے یار! گنجائش نہیں ہے پھر تو مجبوری ہے۔" رات کے سناٹے میں یہ الفاظ بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجنے اور خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ میرا کہا سچ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس واقعی ایک دن اور اس دنیائے آب و گل میں رکنے کی گنجائش نہ تھی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ گزشتہ رات بھی پلک جھپکائے بغیر گزری تھی اور آج مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی۔ شاید میں کوشش کرتا تو کچھ دیر بعد فوزیہ اور رابعہ کے تصور سے اور تمام پریشان کن خیالات سے دامن چھڑا کے سو بھی جاتا۔ میں نے سگریٹ نہیں جلائی تھی اور لائٹ آف کر کے لیٹتے ہی آنکھیں موندلی تھیں مگر یکلخت ایک خیال مجھے ایسا آیا کہ نیند کا خیال غائب ہو گیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور بہت دیر تک سوچتا رہا۔ تمام دلائل جو میرے ذہن نے دیے تھے میرے حق میں تھے۔ پھر میں قائل کیسے نہ ہوتا۔ میں دوبارہ اس وقت لیٹا جب مجھے باہر سے محسن کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ "سکندر!" محسن نے اندر آکے کہا۔ "سو گیا کیا؟"

میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اب میں چاہتا تھا کہ محسن بھی سو جائے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ سگریٹ جلائے لیٹا رہا۔ پھر میں نے اسے کروٹ بدل کے سوتے دیکھا اور انتظار کرتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اٹھا تو چارپائی چرچرائی لیکن محسن نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں نے سگریٹ کا پیکٹ میز پر سے نیچے گرایا۔ محسن بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر میں نے اسے آواز دی لیکن وہ سو رہا تھا۔ میں دبے پاؤں اٹھا اور آہٹ کیے بغیر باہر نکل گیا۔ سرونٹ کوارٹر سے کوٹھی تک میں اطمینان سے چلتا گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں میزبان اور مہمان سب سو چکے تھے۔ میری توقع کے مطابق وہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا جس سے میں باہر آیا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ وہ کسی آواز کے بغیر وا ہو گیا۔ اندر کاریڈور میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی اور اس کا مدھم سا اجالا اس کمرے تک بھی پہنچ رہا تھا۔ روشنی رضوی صاحب کے کمرے میں بھی تھی اور فوزیہ کے کمرے میں بھی لیکن باہر سے نظر نہیں آتی تھی۔ غالباً فوزیہ جاگ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اچانک رضوی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ لباس شب

خوابی میں باہر آئے۔ میں کاریڈور سے پلٹا اور پھر اسی کمرے میں چلا گیا۔ رضوی صاحب نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ باتھ روم مخالف سمت میں تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ لوٹے اور ان کے کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔ میں اطمینان سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ وہ پورٹیبل ٹرانسمیٹر پھر وہیں رکھا جہاں سے اس کو رضوی صاحب نے اٹھایا تھا۔

ٹرانسمیٹر کو پلاسٹک شیٹ میں یا سیلوفین میں لپیٹنا ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے ڈرائنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی شیٹ استعمال کی جو ٹرانسمیٹر سے سو گنا بڑی تو ہو گی لیکن میرے نقطہ نظر سے فائدہ مند تھی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو اس میں اچھی طرح لپیٹ لیا اور بغل میں دبا کے ڈرائنگ روم کے اس دروازے سے باہر آگیا جو برآمدے کی جانب کھلتا تھا۔ یہ ڈبل دروازہ تھا۔ ایک فلائی پروف جالی والا اور دوسرا فلش ڈور۔ فلائی پروف دروازے اندر کی طرف کھلتے تھے، چنانچہ ان کی چٹخنی عموماً نہیں لگائی جاتی تھی لیکن اسی کی وجہ سے باہر کے فلش ڈور کی کنڈی کا کھلا رہ جانا بعید از امکان نہ تھا۔ مجھے اپنے نقش قدم کا خیال آیا۔ پھر مجھے اس بات سے اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب صبح اٹھتے ہی ڈرائنگ روم میں نہیں آئیں گے اور ان کے آفس جانے سے پہلے خادمہ پورے فرش کو گیلا کپڑا مار کے صاف کر چکی ہو گی۔

اب مجھے زمین کھودنے کے لیے کسی اوزار کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ لوہے کی سلاخ ہی کیوں نہ ہو۔ عقبی حصے میں دیوار کے ساتھ باغبانی کے آلات موجود تھے۔ میں نے صرف ایک کھرپی لی اور سرونٹ کوارٹر کے پیچھے چلا گیا۔ نرم زمین تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شاید پہلے کسی نے اس حصے میں دھنیا پودینا وغیرہ کاشت کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں اب صرف گھاس رہ گئی تھی یا ٹماٹر کے پرانے بے ثمر پودے۔ میں نے پوری احتیاط کے ساتھ زمین کھودنی شروع کی۔ ایک فٹ گہرا گڑھا لمبائی میں ڈیوڑھا اور چوڑائی میں تقریباً اتنا ہی تھا۔ پلاسٹک شیٹ کے کفن میں لپٹے ہوئے ٹرانسمیٹر کو اس لحد میں اتار کے میں نے مٹی برابر کی اور پیروں سے دبا کے اوپر خشک پتے بکھیر دیے۔ اب نیچے کی نم آلود مٹی صبح سورج طلوع ہونے کے بعد ایک گھنٹے میں باقی زمین سے الگ نظر نہیں آسکتی تھی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کے میں نے اس جگہ کی نشانی تلاش کی۔ سرونٹ کوارٹر کی عقبی دیوار کے ایک کنارے سے یہ پندرھویں اینٹ کے سامنے کی جگہ تھی۔ دیوار سے چار فٹ کے عمودی فاصلے پر۔

کھرپی کو صاف کر کے اپنی جگہ رکھنے کے بعد میں کوارٹر میں ... آیا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں اطمینان سے باتھ روم ... گیا اور ہاتھوں کو دھو کر صاف کیا۔ باتھ روم کی روشنی میں ... جوتوں اور کپڑوں پر سے مٹی جھاڑی۔ اب کسی کے جاگ اٹھنے ... سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ رات کو کسی کا سوتے سے اٹھ کر باتھ ... روم جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تولیے سے ہاتھ صاف کر کے ... کمرے میں واپس پہنچنے تک میں بہت مطمئن اور خوش تھا۔ جو ... کامیابی میں نے حاصل کی تھی وہ بے حد کارآمد تھی کسی مرحلے پر ... بدنام رسائی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی اور بالکل ... کامیاب تھی۔ مجھ پر کسی کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چوری کو انہی سے منسوب کیا جائے گا جو غائبانہ ... مجرم تھے۔ رضوی صاحب ایک منطقی نتیجہ یہ اخذ کریں گے ... کہ ٹرانسمیٹر کی نشریات کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی وہ سمجھ گئے ... ہوں گے کہ یہ فنی خرابی کا نتیجہ نہیں، ان کے آلات برآمد کر ... لیے گئے ہیں اور وہ تصدیق کے لیے آتے ہوں گے تو گھر کی تلاشی ... کے دوران انہیں مطلوبہ چیز صاف سامنے رکھی ہوئی مل گئی ... ہو گی۔ وہ خود کو قصوروار سمجھیں گے کہ انہوں نے ایسی چیز کو بحفاظت ... مقفل کر کے کیوں نہیں رکھا اور پھر شامت آئے گی نوکر کی، ... جس نے کنڈی کھلی چھوڑ دی یا سنتری کی جو حرامخوری کے ... باعث سوتا رہ گیا۔ تاہم ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ ان کو سزا ... نہیں ملے گی۔ وہ عادتاً قسم کھانے کو تیار ہو جائیں گے کہ ان ... سے کوئی غفلت نہیں ہوئی۔ ویسے آدمی خطا کا پتلا ہے۔ اتنا تو ... رضوی صاحب بھی سمجھتے ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میری نظر محسن کے بستر پر گئی۔ ... میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میرے قدم رک گئے۔ یہ میری ... نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ محسن کا بستر واقعی خالی پڑا تھا۔ اس کے ... کپڑے موجود تھے مگر جوتے نہیں تھے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے؟ میں ... نے بستر پر بیٹھ کے سوچا۔ کیا اس کے ذہن میں بھی یہ خیال ... آیا ہے کہ ایک ٹرانسمیٹر حاصل کرنے کا یہ مناسب ترین موقع ... ہے؟ نہیں۔ اگر وہ بھی اسی نیت سے نکلا ہوتا تو اب تک ... لوٹ آیا ہوتا۔ اگر اتفاق سے میں اور وہ کوٹھی کے اندر نہیں ... ملے تھے تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ بعد اس کو لوٹ آنا چاہیے ... تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ ابھی تک کوٹھی کے ایک ایک کمرے ... کو سونگھتا پھر رہا ہو۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو دفن کرنے میں آدھا ... گھنٹہ تو لگایا ہی تھا۔ مجھے غائب پا کے اس کا حیران ہونا اور ... میری واپسی کا انتظار کرنا لازمی تھا۔ مجھ سے چھپ کے وہ ... کہاں جا سکتا ہے؟ ایک جگہ، صرف ایک جگہ۔ کسی غیبی آواز

نے کہا: "اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ اپنی بہن کے لیے زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے جا سکتا ہے۔ وہ چراغ دین کو آج رات ہی قتل کر دے تو کیا عجب۔ اس کی جذباتی کیفیت کا بحران خطرناک تھا!"

اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ حالانکہ میں خود بھی یہی کرنا چاہتا تھا مگر میں محسن کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ چراغ دین میرا دشمن تھا اور اس کی دشمنی مجھے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے ناپاک وجود کو ختم کرنے کا حق پہلے مجھے ملنا چاہیے۔ محسن کا حق میرے بعد آتا ہے۔ وہ چراغ دین کو اس کے ارادے کی سزا دینا چاہتا تھا جس کی تکمیل ایک جان کے زیاں کا سبب بن سکتی ہے۔ میں اسے ایک جرم کی سزا دینا چاہتا ہوں جو ایک جان کے زیاں کا سبب بن چکا ہے۔ اسے ایک خطرے کا انسداد کرنا ہے۔ مجھے ایک ظلم کا انتقام لینا ہے۔ وہ مجھ سے میرا حق کیسے چھین سکتا ہے۔ میں بگولے کی طرح اٹھا اور طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ ڈھائی میل کی مسافت میرے قدموں نے آدھے گھنٹے میں طے کی۔ پونے چار بجے میں چراغ دین کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ گلاب خان برآمدے میں چارپائی پر سو رہا تھا۔ چراغ دین کی کار پورچ میں کھڑی تھی، اور کوٹھی پر مکمل سکوت تھا۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی جس سے میں کوٹھی کے اندر چراغ دین کے زندہ یا مردہ ہونے کا یقین کر سکوں۔ میں چوکیدار کو جگا کے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جاؤ دیکھو تمہارا صاحب سو رہا ہے یا مر چکا ہے۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ چراغ دین کی خواب گاہ کون سی ہے اور وہاں تک میری رسائی ممکن ہے یا نہیں۔ بفرض محال میں خواب گاہ میں داخل ہو جاتا تب بھی چراغ دین کو جگائے بغیر کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کی نیند نہیں سو چکا ہے۔

طریقہ مجھ پر وحی کی طرح نازل ہوا۔ چند قدم کی مسافت پر ریلوے اسٹیشن تھا اور وہاں ایک پبلک بوتھ تھا۔ ٹیلیفون نمبر مجھے یاد تھا۔ اس نمبر کو اپنے والد کی کوٹھی کا نمبر سمجھتے ہوئے میں نے لندن سے کئی بار ٹرنک کال کی تھی۔ ٹیلی فون بوتھ کے باہر "آؤٹ آف آرڈر" کا نوٹس آویزاں نہیں تھا جو بڑی غیر معمولی بات تھی۔ ایک غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ پلیٹ فارم ٹکٹ کے کاؤنٹر سے مجھے ایک روپے کا نوٹ لے کر خوش اخلاقی کے ساتھ سکے بھی دے دیے گئے حالانکہ میری معلومات کے مطابق ریلوے کوئی "ہفتہ خوش اخلاقی" نہیں منا رہی تھی۔ میں نے چراغ دین کا نمبر ملایا اور ریسیور تھامے کھڑا رہا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پورے دو منٹ بعد چراغ دین کی آواز آئی۔ "سی۔ سی ڈین۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"چراغ دین!" میں نے آواز بدل کے کہا۔ "تو زندہ ہے ابھی تک چور۔ آج تیری زندگی کی آخری رات تھی۔"

"یہ... یہ کیا بکواس ہے۔" چراغ دین نے نروس لہجے میں کہا۔ "کون الو کا پٹھا ہے؟"

"تمہارا باپ۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "اور تمہارا قاتل ان چیف۔" پھر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک قتل نہیں ہوا تھا اور اب اس کا صبح تک قتل ہونا بھی ناممکن تھا۔ میں جانتا تھا اب وہ سو نہیں سکے گا۔ میں نے محسن کے عزائم کو ناکام بنانے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ یا محض غلط فہمی کے باعث میں نے ایک بے مقصد حرکت کی تھی؟ محسن اگر ادھر نہیں آیا تو کدھر گیا تھا۔ یہ سوال واپسی پر میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔

مزید حیرانی مجھے اس وقت ہوئی جب واپس پہنچتے ہی مجھ پر محسن نے سوال داغ دیا۔ "کس مشن پر تشریف لے گئے تھے جناب؟" وہ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"تمہیں ڈھونڈنے گیا تھا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔ "جناب کی سواری آدھی رات کو کہاں گئی تھی؟"

"میں؟ میں تو کہیں بھی نہیں گیا تھا۔" محسن نے حیران ہو کے کہا۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تیرا بستر خالی تھا۔ مجھے تشویش لاحق ہو رہی تھی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بستر تیرا خالی تھا۔" محسن نے کہا۔ "میں دیکھنے اٹھا تھا۔ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، تو باتھ روم میں تھا۔ میں باہر گھوم کے لوٹ آیا اور بس، تب سے جاگ رہا ہوں اور انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی چائے بنائی ہے، گرم ہو گی۔" میں نے سر ہلایا اور باورچی خانے میں جا کے اپنے لیے چائے بنانے لگا۔ اس کی وضاحت سے مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ میں واقعی باتھ روم میں تھا اور عین اسی وقت محسن باہر نکل گیا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ واپسی پر میں نے اسے ٹرانسمیٹر کے حصول کے مشن میں کامیابی کی اطلاع دی۔ اس نے بے حد مسرت کا اظہار کیا۔

"اب ہم باقاعدہ جیمز بانڈ ایجنٹ زیرو زیرو سیون ہیں۔" اس نے اعلان کیا۔ "میڈ اِن پاکستان۔ ہمارے پاس ریوالور بھی ہیں اور خفیہ پیغام رسانی کے لیے ٹرانسمیٹر بھی۔"

"اس کے بعد ضرورت رہ جاتی ہے ایک کوڈ کی۔" میں نے چائے پیتے ہوئے ارشاد کیا۔ "ایک خفیہ زبان ایجاد کرنی پڑے گی تاکہ ہمارا سگنل کہیں اور ریسیو ہو جائے تو مجذوب کی بڑ معلوم ہو۔ یہ مسئلہ سنجیدگی سے غور طلب ہے مگر آسان نہیں ہے۔"

"ہاں، کافی ریسرچ اور غور و خوض کرنا پڑے گا۔" محسن نے تائید کی۔ "رازداری کی شرط بھی بے حد اہم ہے۔ ہم دونوں کے سوا کسی کو اس کوڈ کا پتہ نہیں چلنا چاہیے اور ہمیں بھی کوڈ یاد ہونا چاہیے۔ تحریر کے چوری ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔"

محض وقت گزارنے کے لیے ہم صبح کا اجالا پھیلنے تک کوڈ کے چند عامیانہ نمونے کے طور پر پیش کرتے رہے مثلاً میں نے کہا "سکندر اعظم مقدونیہ کا رہنے والا تھا چنانچہ میں پیغام دیتے وقت کہہ سکتا ہوں۔ ریڈیو مقدونیہ۔"

"اور ٹرانسمیٹر میرے پاس ہو پھر؟" محسن نے کہا۔

میں نے غور فرمانے کے بعد کہا "تو شیروانی ہے۔ اس کی جگہ تو اچکن کہہ سکتا ہے، یا ٹرکش کوٹ۔" اس غیر سنجیدہ گفتگو کا مقصد یہ تھا کہ ہم سنجیدہ مسائل پر بات کرنے سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ یہ مسائل غنیم کے لشکر جرار کی طرح ہمارے گرد حصار قائم کرتے جا رہے تھے۔ میر شرافت علی کا قتل، وزیر خان کی موت، ایم ڈبلیو ڈی کے معاملات، رابعہ کے گھر کی تباہی۔ فوزیہ کا مستقبل، پوسٹ مارٹم۔ بے فکری کی پرانی زندگی خواب و خیال ہو گئی تھی۔

آٹھ بجے میں ضامن رضوی صاحب کی کار لے کر روانہ ہوا تو شیروانی صاحب میرے ساتھ تھے۔ پہلے ہمیں گلاب خان کو لینا تھا چنانچہ چراغ دین کی کوٹھی میں صورت حال بڑی عجیب ہو گئی۔ شیروانی صاحب جو سابق سیشن جج تھے، ایک بار پھر اس منصب پر فائز ہونے کی سوچ رہے تھے اور سالے بہنوئی کا جو رشتہ میرے اور محسن کے درمیان قائم ہونے والا تھا وہ اب دوبارہ محسن اور چراغ دین کے درمیان قائم ہو رہا تھا۔ کم سے کم اس کی تجویز ضرور زیر غور تھی۔ چراغ دین نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہ شیروانی صاحب کے قدموں میں لوٹنے کو تیار تھا اور میں محسن کی صورت کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہا تھا۔ چائے پینے کے لیے وقت نہیں تھا جس کا سی ڈین کو بڑا ملال تھا۔ اس نے کہا کہ جناب آپ نے بڑی غیریت برتی کہ آنے کی اطلاع تک نہیں دی۔ میں لینے حاضر ہو جاتا اور یہ آپ کس کی گاڑی میں پھر رہے ہیں، گھر کی گاڑی ہے۔

اس سے پہلے کہ شیروانی صاحب انکار کرتے میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے انکل! ایس ایس پی کی کار بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ اسے واپس کر دیتے ہیں۔ چراغ دین صاحب کی گاڑی لے لیتے ہیں۔" چراغ دین کی پیشکش رسمی اخلاق کا مظاہرہ تھی مگر شیروانی صاحب قائل ہو گئے۔ محسن نے مجھے حیرانی سے دیکھا مگر خاموش رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس بات کا بھی کوئی مقصد ضرور ہے۔ میں نے چراغ دین سے چابیاں لیں اور اپنے ساتھ شیروانی صاحب کو اور پیچھے گلاب خان کو بٹھا لیا۔ محسن سے میں نے کہا کہ وہ رضوی صاحب کی گاڑی گھر چھوڑ کے سیدھا کورٹ آ جائے۔ اس کے بعد میں کار کو سیدھا شملہ پہاڑی کی طرف لے گیا۔ دائیں ہاتھ گھوم کر ہم واپڈا ہاؤس اور اسمبلی کے پیچھے سے مال روڈ پر طلوع ہوئے۔ بیڈن روڈ سے صرف دو گواہ بیٹھے۔ باقی دو اپنی باڈی سلوا کی مرضی سے آفس ہی نہیں آتے تھے۔ ان میں وہ ابن الوقت انچارج بھی شامل تھا تاہم مجھے تین ہی گواہوں کی ضرورت تھی جو فراہم ہو گئے تھے۔

عبدالودود منظر نے قانونی کارروائی کے مراحل میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا اور دوپہر کے بعد عدالت سے ڈاکٹر نامزد کر دیے گئے اور اگلے روز صبح نو بجے پوسٹ مارٹم کے لیے احکامات صادر ہوئے۔ ایک اے سی ایم کی موجودگی میں گواہوں کو قبر کی نشاندہی کرنی تھی۔ اور ڈاکٹروں کو قبرستان میں ہی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم مکمل کرنا تھا۔ جب ہم عدالت سے نکلے اور گواہ رخصت ہو گئے تو مجھے فضا بدلی بدلی سی لگی۔ سوگوار اور ماتم کناں سکوت جس میں موت کی ہیبت تھی۔ درختوں کی سرسراہٹ میں آسیب پکارتے تھے، گاڑیاں بے آواز گزر رہی تھیں اور لوگ سہمے سہمے چل رہے تھے۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا اور میرے تصور میں اپنے باپ کا وہ چہرہ تھا جو میں نے آخری بار دیکھا تھا لیکن یہ چہرہ ایک جھلک دکھا کے اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا۔ پھر اندھیرے میں ایک ڈھانچہ جھولنے لگتا تھا۔ اس کی ہڈیاں روشن نظر آتی تھیں۔ کڑکڑاتی تھیں۔ یوں جیسے وہ ڈھانچہ بول رہا ہو۔ تم نے پہچانا مجھے سکندر! میں ہی تمہارا باپ ہوں، جب تک زندہ تھا۔ اب تو میں وہی ہوں اور ویسا ہی ہوں جیسے میرے اردگرد رہنے والے شہر خموشاں کے باسی ہیں۔ بچپن میں قبرستان کتنے پراسرار لگتے تھے اور دھنسی ہوئی قبریں جن کے تاریک خلا میں جھانکنے پر شوق مجبور کرتا تھا اور خوف منع کرتا تھا۔ پرانی قبروں میں رات کو روشنی نظر آتی ہے۔ ہڈیوں کا فاسفورس چمکتا ہے۔ یہ بکواس ہے جی۔ میاں اعمال نیک ہوں تو قبر میں اجالا رہتا ہے، ورنہ گناہوں کا اندھیرا۔ روحوں کے قصے، سر کٹے گورے کی روایت، بزرگوں کی قبر جو تقریباً ہر شہر قصبے میں دستیاب تھی اور اب یہ سانحہ کہ بیٹا خود سرہانے موجود ہو گا۔ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں لاش نکلوائے گا اپنے باپ کی۔ اکثر لوگوں کے نقطۂ نظر سے لاش اکھیڑنا بے حرمتی۔ مرنے والے کی روح کے لیے عذاب مگر قانون کی نظر میں ایک ضرورت۔ کیسا اسرار اور کہاں کا آسیب — جو حقیقت زمین میں دفن ہو گئی تھی اب عیاں ہو گی بے شک ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

یہی اداسی اور بوجھل پن سب کے مزاج پر حاوی تھا۔ محسن چپ تھا اور شیروانی صاحب اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ میری طرح وہ بھی ان یادوں کی پرچھائیوں میں گم تھے جو مرنے والے اور خود ان کے اپنے ماضی کا مشترک سرمایہ تھیں۔

"سکندر! تم نے یہ سب نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔" وہ اچانک بولے۔ پھر انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ "خیر!" وہ خاموش ہو گئے۔

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا صاب!" گلاب خان نے کہا۔ "ہمارا علاقہ میں اب بھی یہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ ہم سب کو معافی دے۔"

حسب توقع ضامن رضوی صاحب اپنے گھر میں ہونے والی چوری پر برافروختہ تھے۔ انہوں نے چوری کی باقاعدہ رپورٹ درج کرائی تھی۔ اور تفتیش کرنے والوں نے ہر جگہ دیکھی تھی۔ وہ جہاں سے تاروں کو ٹیپ کیا گیا تھا، وہ جہاں سے تار زمین میں دبائے گئے تھے اور وہ درخت جہاں سے ٹرانسمیٹر برآمد ہوا تھا۔ تلاشی لینے والوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ رضوی صاحب نے مقفل الماریوں اور صندوقوں کے سوا ان کو ہر جگہ دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ الماریاں اور صندوق انہوں نے خود دیکھے تھے مگر کہیں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ ان کی بیگم، پولیس افسر کی بیوی ہونے کی

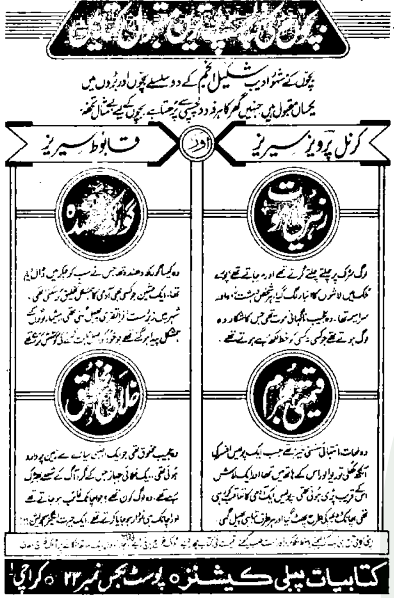

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وجہ سے ضابطے کی کارروائی کو سمجھتی تھیں لیکن شیروانی صاحب کی بیوی حیران تھیں کہ ٹیلی فون جیسی کوئی چھوٹی سی چیز گم ہو گئی ہے تو اتنا ہنگامہ کس لیے۔ بازار میں مل جائے گی اور اب تو خیر سے باہر کی ہر چیز دستیاب ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں سرونٹ کوارٹر کی تلاشی بھی لی گئی تھی جس کا ہمیں ڈر تھا چنانچہ ہم ریو اور اپنے ساتھ چھپا کے لے گئے تھے۔ رابعہ کو کچھ شک تھا چنانچہ اس نے مجھ سے علیحدگی میں پوچھا بھی تھا کہ یہ حرکت ہماری تو نہیں ہے۔ میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ میں کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہوں۔ میں ٹرانسمیٹر کا کیا کروں گا۔"

اس نے کہا "تم ہو ناورا ہیرو ٹائپ۔ ایڈونچرس۔"

میں نے کہا "ہاں، وہ تو ہم ہیں لیکن فلمی ٹائپ نہیں ہیں۔ دل کا ٹرانسمیٹر استعمال کرتے ہیں اور ٹیلی پیتھی سے وائرلیس کا کام لیتے ہیں جس سے دل ملا ہوا ہو اس سے بات ویسے ہی ہو جاتی ہے۔" جب وہ مسکرائی تو مجھے دلی مسرت ہوئی۔ رابعہ ایک گھر میں تھی اور اپنوں میں تھی۔ اگر اس کا پرانا گھر جل کے خاک نہ ہوتا تب بھی وہ اکیلی وہاں رہتی تو پاگل ہو جاتی۔ اس کی کار مل گئی تھی مگر ابھی پولیس کے قبضے میں تھی۔ اے سی ایم سے ریلیز آرڈر دو چار دن میں مل جانے کے بعد وہ اس کو ڈینیٹ بینیٹ کرنے کی سوچ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ نئی لے لو تو بولی میں ذرا قدامت پسند ہوں خصوصاً رشتوں کے معاملے میں خواہ وہ انسانوں سے ہوں یا چیزوں سے۔ اس کا ایک ثبوت میں خود بھی تھا جس سے اپنے جذباتی رشتے کو وہ برسوں سے دل میں یوں چھپائے بیٹھی تھی جیسے تہہ آب میں کوئی صدف ایک موتی لیے برسوں سے موجود ہو مگر کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔

وہ اعلیٰ پولیس افسر اس سے تفتیش کے سلسلے میں بیان لینے آئے تھے اور دو گھنٹے تک اس سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتے رہے تھے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں کسی پر شک نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ملبے سے برآمد ہونے والوں کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔ فوزیہ اور اس کی ماں نے یہ کارروائی دیکھی اور سنی تھی چنانچہ بعد میں فوزیہ کی ماں نے رابعہ کے بارے میں کہا تھا کہ کمال عورت ہے۔ کیسی فر فر انگریزی بولتی ہے اور پولیس والوں سے کیسے بات کرتی ہے جیسے ان کی افسر ہے۔ رضوی صاحب کی بیگم نے اس میں تعریف کے پہلو کو نوٹ کیا تھا اور کہا تھا کہ اتنی بڑی وکیل ہے ڈرے گی کیوں اور ساتھ ہی رابعہ کی شرافت، نیکی اور سادگی کی خوبی کو سراہا تھا جس کا مسز شیروانی نے مزید برا مانا تھا۔ ان کے لیے رابعہ کو آوارہ، بدکردار اور بے شرم سمجھنے اور

کہنے کے مواقع تو ختم ہو ہی گئے تھے۔ بحیثیت شریک حیات اس کو میرے مقدر کی خرابی قرار دینا بھی ممکن نہ رہا۔ اسی فرائیڈے کو تھا جس میں عورتوں کے لیے اندر اور مردوں کے لیے لان میں انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ شریک ہونے والے مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر ان میں سب وکیل ہیں خواتین میں بھی وکیل اور دو جج تھیں لیکن خود رابعہ کے خاندان نے سوئم کا مکمل بائیکاٹ کیا تھا صرف اس لیے کہ اپنوں کے ہوتے ہوئے رابعہ غیروں کے گھر کیوں منتقل ہوئی۔ رابعہ نے افسوس کے بجائے اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ آتے تو اپنی جہالت اور تنگ نظری کے مظاہرے کے سوا کیا کرتے۔ ان کی بے سر و پا قیاس آرائیوں پر مبنی باتیں سن کے دلآزاری کے سوا کیا حاصل ہوتا اور طعنوں کے سوا وہ کیا دیتے۔

تعزیت کے لیے آنے والوں میں ہائی کورٹ کے معزز جج صاحبان بھی تھے جو آ نہیں سکے تھے انہوں نے ٹیلی فون پر اظہار ہمدردی کیا تھا۔ رابعہ کو دوستوں اور مخلص مددگاروں کی کمی نہ تھی۔ مسز شیروانی اس سے مرعوب ہونے کے بعد اپنی فوزیہ کے بارے میں شدت سے احساس کمتری کا شکار ہو گئیں۔ ان کو میرا فوزیہ کو چھوڑ کے رابعہ کو اپنانے کا فعل غیر شریفانہ تو لگا مگر بے جواز نہیں، چنانچہ انہوں نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔ وہ فوزیہ کو چراغ دین سے بیاہ دینے کی خبر ایسے سنانا چاہتی تھیں کہ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو اور میں خود کو بے عزت محسوس کروں لیکن معاملہ الٹا نکلا تھا۔ ان کے معیار سے رابعہ بہت اعلیٰ و ارفع ثابت ہوئی تھی۔ تعلیم، دولت، حسن صورت و سیرت میں انہوں نے رابعہ کو فوزیہ سے برتر دیکھا۔ یہ ان کی عقل کا قصور تھا۔ نہ میں انہیں سمجھا سکتا تھا کہ دل کے معاملات میں عقل کے معیار نہیں چلتے اور نہ اپنا دل چیر کے دکھا سکتا تھا کہ وہ میری مجبوریوں کو اپنی نظر سے دیکھ لیں۔ وہ لوگ رات کی فلائٹ سے جانے والے تھے۔ محض فوزیہ کے مقابل نہ ہونے کی خاطر میں گھر سے نکل گیا اور قبرستان جا پہنچا۔ بوڑھے گورکن نے ہمیشہ کی طرح انعام کی امید میں قبر پر پانی کا ایک ٹین چھڑکا اور میں نے اسے دس روپے دیے۔ پھر میں نے گلاب کے پھولوں کی پتیاں قبر پر ڈالیں۔ اگر بتیاں سلگائیں اور دست بدعا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں عالم استغراق میں آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔ یہ ایک وجدانی ذہنی کیفیت تھی جس میں میرا رابطہ مادی دنیا کے گرد و پیش سے کٹ گیا تھا اور میں مکاں سے لامکاں میں پہنچ کے اپنے والد سے ہمکلام تھا۔ ان سے اس گستاخی پر معافی کے لیے خواستگار تھا کہ میں نے انہیں مرکے بھی چین نہ لینے دیا۔ زندگی میں بھی میں ان کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ خدمت گزاری کی سعادت

کا وقت آنے سے پہلے وہ دنیا سے اور مجھ سے بہت دور چلے گئے تھے۔ میرے والد کا خیالی پیکر میرے مقابل تھا اور وہ مجھے تسلی دے رہے تھے حوصلہ دے رہے تھے اور سمجھا رہے تھے کہ انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ انہیں مجھ پر فخر ہے۔ بوڑھے گورکن نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں اسی قبرستان میں قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ یہ میرے اپنے دل کی بات تھی جو تصور میں ڈھل گئی۔ میں یہ کیسے فرض کر سکتا تھا کہ وہ برہم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ خبردار جو قبر میں مجھے چھیڑا۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر سے پھسل کر قبر کی مٹی پر گر رہے تھے۔

"چلو بیٹا!" بوڑھے گورکن نے کہا "صبر کرو۔ مُردے کے سرہانے رونے سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔"

"یہ میرے والد تھے بابا! میں اپنی بدقسمتی پر رو رہا ہوں کہ ان کی خدمت نہ کر سکا۔" میں نے کہا۔

"چلو اب ان کی مغفرت کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو سب کو ہی یہ احساس ہوتا ہے۔ زندگی میں بیٹے بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔" گورکن بولا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے حالات سے واقف ہے۔ جانتا ہے کہ میں کیا کر سکتا تھا جو میں نے نہیں کیا۔

صبح نو بجے پولیس نے قبر کے گرد قناتوں کی عارضی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ساڑھے نو بجے پہنچا اور اس نے متعلقہ گواہوں کو قبر کی نشاندہی کے لیے کہا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی آنکھوں سے قبر کھودنے والوں کو ایک ڈھانچہ نکالتے دیکھوں اور تمام عمر اس کے تصور کی اذیت اٹھاؤں چنانچہ میں قنات سے باہر محسن کے ساتھ کھڑا رہا۔ دو ڈاکٹروں میں سے ابھی ایک پہنچا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ گلاب خان، پولیس والے اور مجسٹریٹ کے علاوہ دونوں غربت زدہ سہمے ہوئے گواہ قنات کے اندر تھے۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا "میں آپ کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں مداخلت نہیں کر سکتا اور نہ آپ کی رائے پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ صرف معلومات کے لیے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

نوجوان ڈاکٹر بڑی بے نیازی سے سگریٹ پی رہا تھا کہ اس کے لیے یہ کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا۔ "پوچھیے" وہ بولا۔

"اس قسم کے پوسٹ مارٹم میں" میں نے کہا "جہاں صرف ہڈیاں رہ گئی ہوں۔ اگر کسی مہلک ضرب وغیرہ کا نشان مل جائے تو اور بات ہے لیکن کیا موت کے دیگر اسباب کا تعین بھی آسانی سے ہو جاتا ہے؟"

"میڈیکل سائنس اب بہت ترقی کر گئی ہے۔" وہ بولا۔ "ہمارے پاس جدید ترین طریقے ہیں۔ آدمی کے ناخون اور بال بہت عرصے تک باقی رہتے ہیں اور زہر خورانی وغیرہ کا پتہ دے سکتے ہیں مثلاً آرسینک کے اثرات۔"

"کتنے عرصے تک؟" میں نے کہا۔

"پانچ سے دس سال بعد تک۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔" وہ بولا۔ اسی وقت دوسرا ڈاکٹر نمودار ہوا۔ پھر گورکن کی تلاش شروع ہوئی۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ ایک کانسٹیبل قبرستان میں اس کے خستہ حال مکان تک گیا اور گورکن کے بجائے ایک نوجوان کے ساتھ واپس آیا۔ "یہ گورکن کا لڑکا ہے جناب۔" کانسٹیبل نے مجسٹریٹ سے کہا۔ "وہ بڈھا تو معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔"

"کیوں؟" مجسٹریٹ نے جبیں بر جبیں ہو کے کہا۔ "کیا اسے احکامات نہیں پہنچائے گئے تھے کہ قبر کھودنی ہے؟"

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او یہ بہتر طور پر بتا سکتا تھا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ گورکن کا لڑکا آگے آیا۔ "بابا کا شام کو جی خراب تھا سرکار! وہ دوا لینے شہر گئے تھے۔ رات ہو گئی تھی۔ حکم ہو تو میں۔۔۔"

"تم کر سکتے ہو یہ کام؟" مجسٹریٹ نے دست بستہ نوجوان کی طرف دیکھا۔ سر کے اشارے سے اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

"اب تو میں ہی کرتا ہوں سرکار! بابا بوڑھے ہو گئے ہیں۔" نوجوان نے گورکنی کے آلات سنبھالتے ہوئے کہا۔ مٹی پر پڑنے والی کدال کی ہر ضرب مجھے اپنے دل پر محسوس ہوتی تھی۔ محسن نے کئی بار مجھے ہمت سے کام لینے کی تاکید کی حالانکہ اس کی اپنی حالت غیر تھی۔

آدھے گھنٹے تک مکمل خاموشی میں صرف قبر کے کھودے جانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیخ سنائی دی۔

پُرسکُوت

قبرستان کے دہشت زدہ کردینے والے ماحول میں یہ چیخ مجھے زیادہ بھیانک محسوس ہوئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں نے حیران ہو کے سوالیہ نظروں سے محسن کو دیکھا۔ جو لوگ اس کارروائی میں شریک تھے، عاقل و بالغ تھے اور اگر ان کو یہ کام آدھی رات کے ویران سناٹے میں کرنا پڑتا تب بھی کسی قبر میں سے برآمد ہونے والے ڈھانچے کو دیکھ کر کوئی اس طرح چیخ نہ مارتا۔ پھر ایک گورکن کا جوان بیٹا جو اسی شہرِ خموشاں کا ایک مکیں تھا اور جس کا پیشہ ہی انسانوں کو سپردِ خاک کرنا تھا، کس بات سے خوفزدہ تھا؟

میں اور محسن ایک ساتھ قنات کی عارضی چار دیواری میں داخل ہوئے تو میں نے مجسٹریٹ اور ڈاکٹروں کو تازہ مٹی کے ڈھیر پر سے قبر میں جھانکنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ انکی حیرت اور تجسس کے جذبات ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ نوجوان گورکن کا متوحش چہرہ مجھے ان کی ٹانگوں کے درمیان دکھائی دیا۔ وہ باری باری اوپر سے جھانکنے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پوری احتیاط کے ساتھ ایک ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے مجھے قبر کے اندر کی گہرائی صاف نظر آتی تھی۔ زمین ابھی مشکل سے تین فٹ کھودی گئی تھی اور مٹی میں سے دو انسانی ہاتھ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ کسی ڈھانچے کے نہیں، جیتے جاگتے انسان کے ہاتھ لگتے تھے۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے اور بے کفن۔ ہاتھوں سے عمر کا یا رنگ کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جلد پر مٹی کی تہہ تھی جس نے ان ہاتھوں کو ہم رنگِ زمیں کر دیا تھا۔

نوجوان گورکن ابھی قبر کے تختوں پر کھڑا تھا چنانچہ مجھے اس کے خوف کا سبب جاننے میں دیر نہ لگی۔ یہ میرے والد کی نہیں کسی اور شخص کی لاش تھی جسے اس قبر میں ڈال کے مٹی میں دبا دیا گیا تھا۔

"میں... میں نے تو پہلے ہی کہا تھا جنابِ عالی..." گورکن نے فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "کہ مٹی نرم ہے..."

ایک ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "گھبراتے کیوں ہو، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کیا چکر ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے بات کر رہا تھا۔ "مجسٹریٹ صاحب موجود ہیں۔"

"گواہوں نے قبر کی شناخت میں غلطی کی ہے۔" مجسٹریٹ نے گویا فیصلہ صادر کیا۔

"اس کا فیصلہ تو بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے آپ یہ تو دیکھیے کہ برآمد کیا ہو رہا ہے اور کس طرح؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

مجسٹریٹ نے اپنے وقار اور متانت میں فرق نہیں آنے دیا۔ "ہاں ہاں۔ پہلے اسے نکالو، یہ جو بھی ہے۔ لیکن ذرا احتیاط سے۔"

"بیلچہ رکھ کے باقی مٹی ہاتھ سے ہٹاؤ۔" دوسرے ڈاکٹر نے حکم دیا۔ گورکن نے تعمیل کی۔ ہاتھوں کے آس پاس سے مٹی کے ہٹتے ہی ایک انسانی سر نمودار ہوا جس پر بالوں نے بھی مٹی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ابھی مجھے یہ خیال ہی آیا تھا کہ نوجوان گورکن چلایا۔

"یہ تو... یہ تو میرا بابا ہے۔" اس نے سر کو اوپر اٹھایا۔ پھر وہ پوری قوت سے چیخا۔ "بابا!" اور دیوانہ وار مٹی ہٹانے لگا۔ بوڑھا گورکن قبر کے ایک گوشے میں یوں بیٹھا تھا کہ اس کا گھٹنوں پر تھا اور گھٹنے سینے کے قریب تھے۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے سر پر یوں اٹھا کے رکھ لیے تھے جیسے سر کو مٹی پتھر کے بوجھ سے اور ضربات سے بچانا چاہتا تھا۔ مجسٹریٹ کے حکم پر دونوں سپاہیوں نے گورکن کی مدد کی اور ان سب نے مل کر بوڑھے کو اوپر کھینچا۔ اس کے جسم، کپڑوں اور بالوں میں مٹی یوں بھر گئی تھی کہ وہ مٹی کا مجسمہ لگتا تھا، لیکن اس کا چہرہ صاف رہا تھا کیونکہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ حیرانی مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ بوڑھے کی لاش اکڑ کر سخت نہیں ہوئی تھی اور جب اسے اٹھایا گیا تو وہ یوں اٹھا جیسے وہ مرا نہیں ہے صرف بے ہوش ہے۔ چند منٹ بعد دونوں ڈاکٹروں نے اس بات کی تصدیق کر دی۔ بوڑھے کی نبض اور سانس کی رفتار بہت مدھم تھی لیکن وہ زندہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ سب جو ایک پرانی لاش کا ڈھانچہ نکالنے اور اس کی موت کے اسباب کا تعین کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، سب کچھ بھول کے اس ناقابلِ یقین حد تک سنسنی خیز واقعے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان گورکن جو باپ کی موت پر چلا چلا کے رونے لگا تھا اب اس کو زندہ پا کے خوشی سے رو رہا تھا اور گھٹنوں کے بل زمین پر ڈاکٹروں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا، التجا کر رہا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی بچا لی جائے۔ بالآخر ڈاکٹروں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا۔

"اگر تم نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا تو یہ مر جائے گا۔" ایک ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔ "زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو یہ اب تک کب کا مر چکا ہوتا۔" سوائے ان دو ڈاکٹروں کے جو بوڑھے کو بچانے کے لیے واقعی کوشاں تھے باقی سب اس غیر متوقع صورتِ حال پر حیران و پریشان کھڑے تھے۔ تینوں گواہ بوڑھے گورکن کے قبر میں سے زندہ نکلنے کو خدا کی قدرت کا معجزہ قرار دے رہے تھے لیکن دل کی بات کو زبان پر لانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے صحیح قبر کی نشاندہی کی ہے مگر وزیر خان مرحوم کی لاش سے پہلے ایک زندہ لاش کا نکلنا چہ معنی دارد؟ کیا اس سے میرے شبہات کی تصدیق نہیں ہوتی؟ اور کیا مجھے اپنے والد کے انتقال پر قتل کا جو گمان تھا وہ بے سبب تھا؟ اس پُراسرار واردات نے ایسے بہت سے سوالات کو جنم دیا تھا جو میرے ذہن سے بالواسطہ طور پر دوسروں کے ذہن میں منتقل ہو گئے تھے۔

ڈاکٹروں نے ہنگامی طور پر ایک زندگی کو بچانے کے اقدامات کیے اور انہوں نے اپنے ماتحت عملے کو حکم دیا کہ گورکن کو فوراً گاڑی میں پہنچا دیا جائے۔ نگرانی کرنے والے مجسٹریٹ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد باقی لوگوں کو انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود بھی ڈاکٹروں کے ساتھ ہو لیا۔ "باقی کارروائی آج ہی مکمل ہو گی۔" اس نے چلتے چلتے کہا۔ "ہم ابھی واپس آ جائیں گے۔"

"ہم یہ کیس ایمرجنسی کے سپرد کرنے سے پہلے واپس نہیں آ سکتے۔" ایک ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد لنچ کا وقت ہو جائے گا۔"

"مجھے بھی تو ایمرجنسی وارڈ میں پولیس کا پہرہ بٹھانا ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "تاکہ کوئی غیر متعلقہ شخص اس کے قریب نہ جائے اور نہ اس سے بات کرے۔ اس مقدمے کی تفتیش الگ ہو گی۔"

"پولیس سرجن اپنی ذمے داریاں سمجھتا ہے۔" اسی ڈاکٹر نے کہا۔ ان کے درمیان یہ اختلافِ رائے صرف اس بات پر تھا کہ مجسٹریٹ بھی ڈاکٹروں کے ساتھ جانے پر مصر تھا۔ میں ان کے پیچھے ہو لیا اور ساتھ چلنے لگا۔

"میں عینی شاہد ہوں۔ مجھے پولیس سرجن کو نہیں متعلقہ ایس ایچ او کو ہدایات دینی ہیں، ایف آئی آر کے سلسلے میں۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ یہ راستے میں یا ہسپتال میں پولیس کے آنے سے پہلے مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے کوئی بیان دینا چاہا تو میرے سامنے دے سکے گا۔"

"مجسٹریٹ صاحب!" میں نے کہا۔ "جس نے بھی اس بوڑھے گورکن کی جان لینی چاہی تھی وہ ہسپتال میں بھی اس کو قتل کر سکتا ہے، یا کرا سکتا ہے۔ خدا کرے یہ زندہ بچ جائے تاکہ چند صورتوں کو شناخت کر سکے۔"

"کن صورتوں کو؟" مجسٹریٹ نے میرے دخل در معقولات پر برا مان کے کہا۔ "تم جانتے ہو کسی کو؟"

"فی الحال میں کسی کا نام نہیں لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ زندہ رہا اور اس کی جان کی حفاظت کے انتظامات غیر موثر ثابت نہ ہوئے تو میں کچھ لوگوں کو یا ان کی تصویر پیش کر سکوں گا۔"

"واٹ نان سنس۔" ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "ہسپتال میں قتل کرنا اور کرانا، یہ سب فلموں میں ہوتا ہے۔"

"دس از ناٹ آل نان سنس۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اصل حقائق کا علم ہوتا تو آپ کبھی ایسی بات نہ کہتے لیکن آپ کا کیا قصور، آپ نے صرف فلمیں دیکھی ہیں یا پوسٹ مارٹم کیے ہیں جن سے زندگی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔"

"ٹھہر جائیے مسٹر سکندر!" مجسٹریٹ نے اپنے قانونی اختیارات استعمال کیے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان حالات کا علم نہیں جن کی وجہ سے یہ قبر دوبارہ کھودنے کے احکامات جاری کیے گئے تھے، لیکن ذرا عقل سے کام لیجیے۔ ہسپتال میں پولیس کی موجودگی میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جو حفاظتی انتظامات کروں گا وہ کیسے غیر موثر ہو سکتے ہیں؟"

"اس کا بہتر جواب ایس ایس پی ضامن رضوی دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجسٹریٹ اور جج صاحبان بھی دے سکتے ہیں جنہوں نے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے گھر کی تباہی کا منظر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے خبر تو آپ نے پڑھی ہوگی؟"

"آل رائٹ۔" مجسٹریٹ نے لاجواب ہو کے کہا۔ "کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"جو کچھ میں چاہتا ہوں، بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو بعد میں زندہ رکھنا آپ کی ذمے داری ہے۔ یہ خود اپنے کیس میں اور میرے کیس میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہے۔ اور اسی لیے مجھے اندیشہ ہے کہ قاتل پھر کوشش کریں گے۔"

"کس کے قاتل، کون قاتل؟" مجسٹریٹ نے کہا۔ "نام لو ان کا۔ میں ان کو ہسپتال بلوا لیتا ہوں، تمہاری موجودگی میں۔"

ایک ڈاکٹر کی کار بوڑھے گورکن کو لے کر جا چکی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر نے مجسٹریٹ کے لیے اپنی کار کا دروازہ کھول رکھا تھا اور انجن اسٹارٹ کیے منتظر تھا۔ میں نے اشارے سے اس کو جانے کے لیے کہا۔ "میں مجسٹریٹ صاحب کو اپنی گاڑی میں لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجسٹریٹ نے تھوڑا سا منہ بنایا مگر ڈاکٹر نے فوراً دروازہ بند کیا اور کار روانہ ہو گئی۔

"میں ڈاکٹر کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمام واقعات کا خلاصہ پیش کرنا بھی ناممکن ہے لیکن میں ایک بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے والد کے قاتل اور گورکن کو زندہ درگور کرنے والے ایک ہی ہیں۔ اس کا ثبوت میں بعد میں دوں گا اور گورکن زندہ رہا تو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عین ممکن ہے ان کو پہچان بھی لے۔ میں ان کے نام آپ کو لکھ دوں گا اور آپ اگر قانون کی طاقت اور تمام وسائل استعمال کر کے انہیں گورکن کے سامنے لے آتے۔۔۔"

"اگر کا کیا سوال ہے؟" مجسٹریٹ نے چڑ کر کہا۔

"مجسٹریٹ صاحب! میں بڑے تلخ تجربات کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اوّل تو وہ آئیں گے نہیں، شاید ملیں گے ہی نہیں اور اگر ملیں گے تو اس وقت جب وقت گزر چکا ہوگا۔ وہ گورکن کی زندگی میں اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ وہ اس کے مرنے کے بعد تو آ سکتے ہیں مگر اس سے پہلے نہیں۔ اب آپ کوشش کر دیکھیے۔ گورکن کو زندہ رکھنے کی اور انہیں بلوانے کی۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں دیر تو آپ کو ہو ہی گئی ہے۔ چند منٹ کی تاخیر اور سہی۔"

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ لوگ ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی یہیں کھڑا ہوں۔"

"میں آپ کو بلاوجہ نہیں روک رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو اہمیت دیں اور یہ سمجھ لیں کہ معاملات کتنے سنگین ہیں۔ اس بات کو اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ حفاظتی انتظامات مس رابعہ قاری کے گھر کو بچانے کے لیے بھی کیے گئے تھے اور بظاہر بہت اطمینان بخش تھے۔ نامعلوم افراد نے دھمکی دی تھی کہ وہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی والدہ کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی گھر کو اڑا دیں گے اور یہ دھمکی خاموشی سے دی گئی تھی چنانچہ حفاظتی انتظامات بھی رازداری سے کیے گئے تھے لیکن وہ سب بے سود ثابت ہوئے۔"

"تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟" مجسٹریٹ اب برہم ہونے لگا تھا۔ "میں خود توپ لے کر کھڑا ہو جاؤں یا فوج کو طلب کر لوں؟"

"یور آنر! آپ ایک نظر قبر میں جھانک لیں۔" میں نے یکلخت لہجہ بدل کے کہا۔ "میرا خیال ہے پھر آپ کو واپس نہیں آنا پڑے گا اور یہ لوگ بھی بھوکے پیاسے قبرستان میں کھڑے رہنے اور بلاوجہ انتظار کرنے کی تکلیف سے بچ جائیں گے۔ قبر میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

مجسٹریٹ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری ذہنی کیفیت کے نارمل ہونے پر شبہ ہے۔ "قبر تقریباً کھودی جا چکی ہے۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "ایک تختہ ہٹا کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میری بات کس حد تک درست ہے اور اس کے بعد آپ

کے لیے میرے اندیشوں پر اعتبار کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ تمہارے والد کی لاش قبر میں نہیں ہوگی۔۔۔"

"جی۔" میں نے کہا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گزشتہ رات کچھ لوگ گورکن کے پاس آئے، انہوں نے نقد و بازور سے گورکن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قبر کھودے اور میرے والد کی لاش کا ڈھانچہ ان کو نکال دے۔ ان کو خبر مل چکی ہوگی کہ صبح قانونی طور پر لاش کو نکال کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا کہ میرے والد کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ ان کو واقعی قتل کیا گیا تھا۔ گورکن نے ایک دو تختے ہٹا کے ڈھانچہ کفن سمیت کھینچ لیا ہوگا اور ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہوگا مگر بوڑھا گورکن خود باہر نہ آ سکا۔ اگر یہ کام اس نے لالچ میں کیا تھا تو انعام کی جگہ اس کو یہ صلہ ملا کہ اپنے ہی بیلچے کی ایک ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا اور مارنے والے اس پر مٹی ڈال کے اور قبر کو پھر برابر کر کے چلے گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ گورکن خود ہی مر جائے گا، مگر قدرت کے کسی معجزے نے اسے زندہ رکھا۔ عین ممکن ہے گورکن سے یہ کام زبردستی کروایا گیا ہو، ریوالور دکھا کے۔ جب وہ ہوش میں آئے گا تو اس کا بیان میرے خیال کی تائید کرے گا۔ مگر اس کا ہوش میں آنا اور زندہ رہنا یقینی نہیں، کم از کم میرے لیے۔ لیکن قبر میں دیکھنے کے بعد تو آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہوں۔"

مجسٹریٹ کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا اور تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ "بات ایک نظر دیکھنے کی ہے تو میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔" اس نے قبرستان کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ جو لوگ ہمارے قبرستان سے رخصت ہو جانے کے بعد مایوسی اور ناگواری کے جذبات کا شکار تھے اور یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب دو گھنٹے سے پہلے ہماری واپسی کا کوئی امکان نہیں کچھ حیران ہوئے۔ ان سب کی موجودگی میں قبر کے دو تختے ہٹائے گئے جن پر سے گورکن کو ہٹایا گیا تھا نیچے کے نسبتاً کم چوڑے اور زیادہ تاریک خلا میں جھانکنے والا پہلا شخص خود مجسٹریٹ تھا۔ اس نے چند منٹ اندھیرے میں گھورنے کے بعد جیب سے لائٹر نکال کر سلگایا اور ہاتھ کو نیچے لے گیا۔ پھر اس نے سر کو خالی جگہ میں ڈالا۔ یوں کہ وہ خود گھٹنوں کے بل اوپر کے تختوں پر رہا

۔۔۔ کے ایک ہاتھ نے قبر کی دیوار کا سہارا لیے رکھا اور اس نے ۔۔۔ لائٹر کے لائٹر کی روشنی میں باقی ماندہ تختوں کے نیچے ۔۔۔ جھک کر دیکھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ باہر آ کے اس نے میری طرف ۔۔۔ دیکھے بغیر صرف سر ہلایا اور دوسرے گواہوں کو طلب کیا۔

"آپ لوگوں کے حلفیہ بیان کے مطابق یہ قبر وزیر خان مرحوم ۔۔۔ رئیس خان مرحوم کی ہے۔" اس نے فائل میں سے پڑھنا شروع ۔۔۔ جو پیشکار نے آگے بڑھا دی تھی۔ "لیکن واقعاتی شہادت سے ۔۔۔ بات ثابت نہیں ہوتی۔ میں دیکھ چکا ہوں اور اب آپ ۔۔۔ باری باری نیچے اتر کے میری طرح دیکھ سکتے ہیں کہ قبر میں ۔۔۔ کی مدفون نہیں ہے۔"

باقی کارروائی دس منٹ میں پوری ہو گئی۔ مجسٹریٹ نے فائل ۔۔۔ مختصراً لکھا کہ عدالت کے حکم پر وزیر خان ولد رئیس خان کی ۔۔۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے قبر کھودی گئی۔ میڈیکل بورڈ کے ۔۔۔ علاوہ قبر کی نشاندہی کرنے والے تینوں افراد کی موجودگی میں ۔۔۔ پہلے قبر کے اندر سے گورکن برآمد ہوا جسے بظاہر کسی نے قبر کھود کے ۔۔۔ دبا دیا تھا۔ وہ زندہ پایا گیا چنانچہ ہسپتال لے جایا گیا اور اس ۔۔۔ واقعے کے سلسلے میں مزید کارروائی جاری رکھی گئی جس کے نتیجے ۔۔۔ تمام گواہوں نے وزیر خان مرحوم ولد رئیس خان مرحوم ۔۔۔ کی لاش کو غیر موجود پایا چنانچہ پوسٹ مارٹم کے احکامات ۔۔۔ منسوخ کیے جاتے ہیں۔ لاش کی عدم موجودگی اور گورکن پر اقدام ۔۔۔ قتل کے سلسلے میں نامعلوم افراد کے خلاف تفتیش اور مقدمہ درج ۔۔۔ کرنے کے احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔

فائل پر باری باری ہم سب نے اپنے دستخط ثبت کیے ۔۔۔ لیکن سب سے پہلے محبت خان نے کہا۔ "قسم خدا کا، ہم پاگل ۔۔۔ ہو ہے مگر ہو جائے گا۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے۔ بندہ ۔۔۔ غلطی کر سکتا ہے لیکن ہم تو رات کا وقت بھی اس قبر پہ آیا ہے۔ ۔۔۔ اندھیرے میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔" تقریباً انہی خیالات کا اظہار ۔۔۔ بعد میں دوسرے گواہوں نے بھی کیا لیکن محبت خان زیادہ ہی ۔۔۔ ہو رہا تھا۔ اس نے مجسٹریٹ کی طرف سے کارروائی ختم ۔۔۔ ہونے کا اعلان سن کے بھی بولنا جاری رکھا۔ "او یارا! قیامت ۔۔۔ آئے گا۔ وزیر خان مر گیا، سلامت شاہ قتل ہو گیا اس کو ۔۔۔ ظالموں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکس میں ڈال دیا۔ اب وزیر خان ۔۔۔ کی لاش لے گیا۔ ملعون، خنزیر، شیطان کا بچہ۔ قسم خدا کا ہم کو ۔۔۔ کہیں بھی مل جائے تو ہم اس کا ایک ہزار ٹکڑا کر دے، اس کی ۔۔۔ کتوں کو ڈال دے، اس کا خون پی جائے، اس کا سارا خاندان ۔۔۔ خانہ خراب ہو۔۔۔"

دوسرے لوگوں نے اسے خاموش رکھنے کی بے سود کوشش کی مگر مجسٹریٹ نے اس کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دھمکیاں ذہن کے شدید صدمے سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں۔ وہ سیدھا صاف دل، صاف گو آدمی تھا جو مصلحت کے تقاضے سمجھنے سے زیادہ اپنے حقیقی جذبات کے اظہار پر مجبور تھا۔ اس کا دل انسان کی بے ضمیری اور اخلاقی دیوالیہ پن پر خون کے آنسو رو رہا تھا تو وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔

دوسری بار قبرستان سے باہر آ کے میں نے اپنے گواہوں سے معذرت چاہی کہ میں ان کو واپس کار میں نہیں لے جا سکتا کیونکہ مجھے مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ میں نے انہیں ٹیکسی کا کرایہ پیش کیا اور شرمندہ ہوا۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور توبہ توبہ کرتے چلے گئے۔ قبرستان میں پولیس والے قناتیں سمیٹ رہے تھے اور باہر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور محسن نے ڈرائیونگ شروع کی۔ میں مجسٹریٹ کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر اس لیے بیٹھا تھا کہ مجھے اس سے باتیں کرنی تھیں۔

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ذہین آدمی ہو۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ذہین یا بدقسمت؟" میں نے تلخی سے کہا اور ہنسا۔ "کس باپ کے بیٹے نے یہ ذہنی اذیت برداشت کی ہوگی۔"

"میرا مطلب کچھ اور تھا۔" مجسٹریٹ نے جلدی سے کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے اندازے غلط نہیں ہیں۔ اب مجھے اس گورکن کی حفاظت کے لیے واقعی سخت اقدامات کرنے پڑیں گے۔"

"خود توپ لے کر بیٹھنا پڑے گا یا فوج کو طلب کرنا پڑے گا۔" میں نے طنز سے مجسٹریٹ کے الفاظ دہرائے۔

"تم مجھے وہ نام تو بتا دو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ مشتبہ افراد کو گورکن کے ہوش میں آتے ہی طلب کروں۔" مجسٹریٹ نے خفت سے بچنے کے لیے میری بات کو نظرانداز کر دیا۔ "اگر تم ایف آئی آر میں ان کے نام لکھوانا چاہو۔۔۔"

"نو سر!" میں نے کہا۔ "میں کسی کا نام ایف آئی آر میں نہیں لکھواؤں گا۔ اس لیے کہ مجھے اپنی توانائی اور ذہنی و جسمانی صلاحیت، مزید مشکلات اور الجھنوں میں پڑنے کی خاطر صرف کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں جانتا ہوں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہوگا وہی جو میں بتا چکا ہوں۔ یہ علم غیب کا دعویٰ نہیں، قیاس آرائی کی بات ہے۔ نام میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو پتہ بھی نوٹ کر لیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں۔ میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قبرستان میں نہ باہر آ سکے۔ میں تو آپ کے ساتھ کار میں بھی اس لیے بیٹھ گیا تھا کہ مجھے بھی ہسپتال جانا تھا اور محسن میرا دوست آج صبح کسی سے یہ کار مانگ لایا تھا۔"

"پھر میں کسی کو کیسے بلا سکتا ہوں۔" مجسٹریٹ نے بے بسی سے کہا۔" میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پہ وحی نازل ہوئی تھی۔"

"اگر وہ گورکن ہوش میں آجائے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ نام خود دیے تھے اور اس نے ایک کار کا نمبر بھی یاد رکھا تھا جو آپ نے نوٹ کر لیا۔ آپ چند منٹ اس کے ساتھ اکیلے رہ کے باہر آ سکتے ہیں۔ کوئی آپ کی بات کو غلط نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔

مجسٹریٹ نے نفی میں سر ہلایا۔" گورکن کہہ سکتا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے کیونکہ نہ اس نے کسی کا نام لیا تھا نہ کسی کار کا نمبر بتایا تھا۔ پھر میں کیا جواز پیش کروں گا؟" مجسٹریٹ نے سگریٹ جلائی۔" کہ میں نے ان لوگوں کو کیوں بلایا تھا۔ اگر تم بلاوجہ مشکل میں پڑنے سے ڈرتے ہو تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اپنے اختیارات سے تجاوز کا خطرہ مول لوں گا۔ میں سرکاری ملازم ہوں لیکن اس سے پہلے میں ایک منصف ہوں۔ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ تم انصاف مانگ سکتے ہو اگر تم میں ہمت ہو۔ ہمت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خود اپنی بات پر یا اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے۔ پھر میں تم پر کیسے اعتبار کروں؟"

منطقی اعتبار سے مجسٹریٹ کی بات غلط نہیں تھی میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ جوا کھیلنے سے پہلے ہار جیت کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہوا تو کیا ہوگا؟ اگر ڈی سلوا، چوہدری دلاور یا استاد پیڈرو سامنے آگئے اور گورکن نے ان کو شناخت نہ کیا۔ جانتے بوجھتے بھی وہ انکار کر سکتا ہے۔ اسباب وہی ہو سکتے ہیں یعنی وہ بک گیا ہو یا خوف سے مجبور ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تینوں نے چہرہ چھپا کے رکھا ہو یا وہ خود واقعی سامنے نہ آئے ہوں۔ انہوں نے کسی اور کو بھیجا ہو۔ آخر وہ تینوں کیا کریں گے؟ یہی کہیں گے کہ میں نے ذاتی دشمنی کی بنا پر ان کا نام لیا؟ زیادہ سے زیادہ مجھ پر ہتک عزت کے ہرجانے کا ایک اور کیس کر دیں گے۔

"آپ نام پتہ نوٹ کر لیں۔" میں نے اچانک کہا۔" میں اس کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔ میں ایف آئی آر میں بھی ان کا نام مشتبہ افراد کی فہرست میں لکھوانے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ ہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ حرکت انہی میں سے کسی کی ہو سکتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے والد کو قتل کروانے والوں میں بھی وہی لوگ شامل ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو مجھے دنیا کے سامنے اور عدالت میں اپنی انگلی اٹھا کے ان پر یہ الزام عائد کرنا ہی ہے۔ خواہ میں نظامِ انصاف کے تقاضوں کے مطابق ان کو ملزم ثابت نہ کر سکوں۔"

"کسی بھی معزز اور شریف یا بے قصور آدمی پر الزام عائد کرنا اور ثبوت پیش نہ کرنا بھی جرم بن جاتا ہے مسٹر سکندر۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔" لیکن مجھ پر تو قتل کا الزام ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ جرم کیا ہے۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔"

"سکندر۔" محسن نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔" کوئی لاش کو لے کر کہاں جا سکتا ہے؟"

"کہیں بھی جا سکتا ہے۔ ہڈیاں دریا میں بہائی جا سکتی ہیں، جلائی جا سکتی ہیں، دبائی جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا ہو تو مشکل طریقہ کوئی اختیار نہیں کرتا۔" محسن بولا۔" آدھی رات کو دریائے راوی کے کسی ویران کنارے پر جانا یا کسی جگہ ہڈیوں کا الاؤ روشن کرنا دونوں مشکل کام ہیں۔ دفن کر دینا زیادہ آسان ہے اور اگر کھدی ہوئی قبر مل جائے تو یہ بوجھ ڈھونے کی بھی کیا ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ انہوں نے ہڈیاں اسی قبرستان میں دفن کر دی ہوں گی؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی تھی۔" محسن نے سڑک پر نظر رکھی۔" جب تو کچھ دیر کے لیے باہر آ گیا تھا تو میں ٹہلتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا سب لوگ دو گھنٹے سے پہلے کیا واپس آئیں گے۔ آگے دو تیار قبریں ہیں۔ کھدی ہوئی مگر خالی۔ یوں سمجھ لے کہ ریڈی میڈ قبریں۔ اگر اچانک کوئی میت آجائے یا کوئی قبر کھدوانے کے لیے آئے تو اسے دکھا دی جائیں۔ گورکن فارغ ہوں تو یہ کام کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات تمام دن خالی گزر جاتا ہے۔ کسی روز چار چھ جنازے آجاتے ہیں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اوسطاً ساڑھے چھ فٹ لمبی قبریں تھیں۔ یہ بات گورکن بتا سکتا ہے کہ کل شام ریڈی میڈ قبروں کی تعداد کیا تھی، تین یا دو؟"

کار کے میو ہسپتال کے احاطے میں داخل ہونے تک ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ محسن نے جو کچھ کہا تھا بالکل واضح تھا۔ میرے والد وزیر خان مرحوم کی لاش ان کی قبر سے نکال کے دوسری جگہ دفن کر دی گئی تھی لیکن اس دوسری قبر کو کھودنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ صرف قیاس آرائی کی بات تھی۔ میرے یا محسن کے یقین سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تین گواہ حلفیہ بیان دے کر وزیر خان کی قبر کی نشاندہی کر چکے تھے۔ دوسری قبر کے بارے میں حلفیہ بیان دینے کون آتا کہ یہ بھی وزیر خان کا مدفن ہے۔ میں کیسے ثابت کر سکتا تھا کہ لاش منتقل کر دی گئی ہے۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے، شہادت طلب کرتی ہے اور قانون بہرحال ضابطوں کا پابند ہے۔ بالفرضِ محال یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے تو اس دوسری قبر سے نکلنے والے ڈھانچے کو وزیر خان مرحوم کون ثابت کرتا اور کیسے؟ باہر کے ملکوں میں تو ماہرین کے پاس ریکارڈ ہوتا ہے۔ فنگر پرنٹ زندگی میں ثبوت فراہم کرتے ہیں تو مرنے کے بعد ہڈیوں کے خاک ہونے تک دانتوں کی ساخت سے شناخت کی جاتی ہے اور ہر شخص کے دانتوں کی ساخت کی فلمیں اس کے ڈینٹسٹ کے پاس رہتی ہیں بلکہ جدید طریقہ فنگر پرنٹ کا نہیں، "ڈینٹل اسٹرکچر" کے ریکارڈ کا ہے۔ یہاں کامیاب دندان ساز فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہیں اور بی ڈی ایس گھاس کھودتے ہیں۔ طلسماتی منجن بھی اس وقت لگایا جاتا ہے جب دانت کا درد رات بھر دوسروں کو جگاتے رکھے۔ پولیس کے پاس فنگر پرنٹس کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ نہیں۔ میں نے "ڈینٹل اسٹرکچر" کی بات کی تو اچھے خاصے معقول لوگ شرمندہ کریں گے کہ میاں لندن میں نہیں بیٹھے ہو۔

محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دی تو میں چونکا۔ کار ایمرجنسی وارڈ کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی اور مجسٹریٹ باہر کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔" محسن!" میں نے کہا۔" وہ جو بات کی تھی نا تو نے، تین ریڈی میڈ قبریں تھیں کل رات یا دو؟ اس کو بھول جا۔ میں تجھے بتا سکتا ہوں کہ کل رات تین قبریں تھیں مگر فائدہ؟ جھوٹ تو خود بخود ثابت ہو جائے گا مثلاً یہ کہ لاش کسی نے دوسری قبر میں منتقل نہیں کی لیکن یہی بات سچ ہو تب بھی سچ نہیں ثابت کی جا سکتی۔"

"آف دی ریکارڈ۔" مجسٹریٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میرا بھی خیال یہی ہے کہ تمہارے دوست نے صحیح سمت میں قیاس آرائی کی ہے، لیکن... یہ میرے لیے اطمینان کی بات ہے کہ تمہیں میری مجبوریوں کا احساس ہے۔ آئی وش... کہ میں کچھ کر سکتا۔" وہ اچانک پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا اندر غائب ہو گیا۔ وہ بھی عام انسانوں کی طرح اچھا آدمی تھا چنانچہ مجبور تھا۔

بوڑھے گورکن کو اس عرصے میں صاف ستھرے بستر پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کے جسم کی ساری غلاظت صاف کی جا چکی تھی اور اس کا غلیظ لباس اتار کے اسے ہسپتال کے کپڑے پہنا دیے گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کی جان بچالی تھی اور اسے آکسیجن دی جا رہی تھی۔ وہ ایک علیحدہ کمرے میں تھا جہاں دو ڈاکٹروں کی مدد کے لیے تین نرسیں موجود تھیں اور ان میں سے ایک گلوکوز کی ٹیوب لگانے کے بعد اسٹینڈ سے معلق تھیلی کو ٹھیک کر رہی تھی۔ دونوں ڈاکٹروں میں سے ایک پولیس سرجن تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب! پولیس کو طلب کیا ہے آپ نے؟" مجسٹریٹ نے کہا۔" میں اس علاقے کا مجسٹریٹ ہوں۔"

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔" میں نے حالات معلوم ہوتے ہی کیس درج کر لیا تھا، لیکن یہ آپ کے تھانے والے... میں نے یہاں فون کیا تو جواب ملا کہ واردات میانی صاحب کے علاقے میں ہوئی ہے۔ وہاں کے تھانے میں رپورٹ درج کرائی جائے۔ ابھی تک تو کوئی آیا نہیں ہے۔"

"ان کو میں بلوا لیتا ہوں ابھی۔" مجسٹریٹ نے کہا۔" یہ بتائیے مریض کی کیا پوزیشن ہے؟"

"اوہ، ہی از آؤٹ آف ڈینجر۔" ڈاکٹر نے کہا۔" بڈھا بہت سخت جان ہے۔ شام تک بات کر سکے گا۔"

"آپ کے خیال میں یہ کتنی دیر تک دفن رہا؟" میں نے انگریزی میں کہا۔" اور بچ کیسے گیا؟"

ڈاکٹر نے پلٹ کر مجھے غور سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں کندھے ہلائے۔" کیا کہا جا سکتا ہے اسے؟ معجزہ؟ خدا کی قدرت؟ ایسے غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں جن سے آدمی کو زندگی اور موت پر اپنا اختیار نہ ہونے کا احساس ہے۔ زلزلے میں عمارت مسمار ہو جاتی ہے اور ملبے میں سے ایک بچہ انگوٹھا چوستا برآمد ہوتا ہے جسے خراش تک نہیں آتی۔ گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور سب کچھ جل کے راکھ ہو جاتا ہے سوائے ایک قرآن مجید کے۔ اس کیس میں بھی عقل کی مدد سے کوئی یقینی وضاحت ناممکن ہے صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین میں کہیں کسی جانور نے سرنگ بنا رکھی تھی، مثلاً بجو نے یا نیولے نے، یا کسی چوہے نے یا گرگٹ نے بل بنا لیا تھا جس میں سے تازہ ہوا پہنچتی رہی، لیکن اصل مدد تقدیر نے کی۔ اس کا چہرہ صاف تھا اور مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ کس پوز میں بیٹھا تھا۔ اس کے منہ پر مٹی نہیں پڑی تھی اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سانس لینے کے لیے اس کی ناک اور منہ کے راستے کھلے رہے تھے۔ اگر یہ قبر میں سیدھا کر کے بل لیٹا ہوتا تو چند منٹ میں دم گھٹنے سے ہلاک ہو جاتا مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ سو دیٹ از دیٹ۔"

"میں فون کہاں سے کر سکتا ہوں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا "میرے آنے تک آپ کسی کو یہاں مت آنے دیں۔"

"میں نے ابھی تک کسی کو نہیں آنے دیا ہے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ "فون باہر کاؤنٹر پر بھی ہے اور میرے کمرے میں بھی۔"

"میں مسلح گارڈ طلب کر رہا ہوں۔" مجسٹریٹ نے کہا "یہ بہت سیریس کیس ہے۔ کسی غیر متعلقہ شخص پر شبہ بھی ہو تو۔۔۔"

"یہاں کوئی غیر متعلقہ شخص نہیں۔ آپ لوگوں سے تو میں ناواقف ہوں۔" پولیس سرجن نے میری اور محسن کی طرف دیکھا۔ "مگر آپ مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ آئے ہیں تو متعلقہ افراد ہی ہوں گے۔ باہر ایک شخص خود کو اس کا بیٹا بتاتا ہے۔ بظاہر غلط نہیں کہتا۔ یہاں میرے ساتھی دوسرے ڈاکٹرز ہیں۔ ان کو میں دو سال سے جانتا ہوں۔ باقی رہیں دو نرسیں۔"

"تین نرسیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں کمرے میں آیا تھا تو یہاں تین نرسیں تھیں۔"

"یہ غلط ہے۔" پولیس سرجن نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایک نرس شہلا گل ہے، دوسری شمیم، تیسری کوئی نہیں۔ کیوں ڈاکٹر صدیقی کیا میں غلط بیانی کر رہا ہوں؟" دوسرے ڈاکٹر نے جو زیادہ عمر رسیدہ تھا حیرانی سے انکار میں سر ہلایا۔

"غالباً یہ ٹھیک ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "میں نے بھی تین نرسیں دیکھی تھیں۔"

"اوکے۔ وہ تیسری نرس کون تھی، کہاں گئی؟ یہاں تو ان دو کے سوا کوئی نہیں اور ہم نے صرف دو ہی کو ساتھ رکھا تھا۔ شاید ان دونوں میں سے کسی نے دیکھا ہو مس شمیم! مس شہلا! اور کون آیا تھا یہاں؟" پولیس سرجن نے برہمی سے پوچھا۔

"ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا سر!" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا اور مسکرائیں۔

"آپ سب کی توجہ مریض پر مرتکز تھی۔ آپ نے نہیں دیکھا مگر پیچھے وہ تیسری نرس گلوکوز کی تھیلی ٹھیک کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگوں نے اس لیے بھی نوٹ نہیں کیا کہ آپ سب کے لباس ایک جیسے ہیں مگر میں اپنے اندیشوں کا اظہار کر چکا ہوں۔ آپ مریض کو پھر دیکھیے، پلیز۔" میں نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا اور اس نے میرے لہجے سے مجبور ہو کے میری تائید میں سر ہلایا۔ اور اس وقت اچانک مجھے خیال آیا کہ اس تیسری نرس کو دیکھتے ہی مجھے ایسا کیوں لگا تھا جیسے اس کی صورت میں نے پہلے بھی دیکھی ہے۔ سب نرسیں اپنی سفید وردی میں ایک سی لگتی ہیں اور میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بہت کم واقعی حسین ہوتی ہیں۔ وہ تیسری نرس بلاشبہ حسین تھی، مگر وہ کون تھی، صورت آشنا کیوں لگی تھی اور اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ میں سوچنے پر مجبور تھا اور میرے اندیشے یقین میں ڈھل رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے با دل ناخواستہ بیڈ کا رخ کیا۔ "ڈاکٹر صدیقی ابھی چند منٹ پہلے ہی تو ہٹے ہیں بیڈ کے پاس سے مگر آپ لوگ مصر ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پولیس سرجن نے کہا۔ دونوں نرسیں خود بخود بیڈ کے دوسرے کنارے کی طرف ہو گئیں اور میں پیروں کی طرف کھڑا رہا۔ مجسٹریٹ فون کرنے کے لیے جا چکا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ جسم گرم ہے یا نہیں لیکن میری نظریں گورکن کے ساکت جسم پر تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور کمبل کے نیچے اس کے سانس کا خفیف سا زیر و بم بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ پولیس سرجن نے گورکن کی نبض دیکھنے کے لیے اس کی کلائی پر انگلیاں رکھیں۔ پھر اس نے ڈاکٹر صدیقی کی طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے کمبل ہٹا دیا۔ "اسٹیتھوسکوپ سے چیک کیجیے۔" پولیس سرجن نے کہا۔ تشویش کے آثار اس کی صورت سے بھی عیاں تھے اور اس کے لہجے سے بھی۔

دوسرے ڈاکٹر نے جھک کر سینے کے اندر دھڑکنے والے دل کی آواز سننے کی بے سود کوشش کی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ آواز خاموش کی جا چکی ہے۔ نرسوں نے بھی اندازہ کر لیا تھا کہ صورت حال یکلخت بدل گئی ہے۔ ان کی وہ مسکراہٹ کافور ہو گئی جو ایک بے بنیاد اعتماد کی مظہر تھی۔ ڈاکٹروں کے یقین کی طرح وہ کسی تیسری نرس کی موجودگی سے یکسر منکر تھے لیکن وہ تیسری نرس اپنا کام کر گئی تھی جسے صرف میری نگاہ نے دیکھا تھا یا مجسٹریٹ کی آنکھوں نے۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم اچانک اور غیر متوقع طور پر آ پہنچے تھے۔ اگر ہم دو چار منٹ بعد آتے تو ہم بھی دو ہی نرسوں کو دیکھتے۔ اسے کمرے سے جاتے ہوئے ہم بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ میرے لاشعور نے ہنگامی طور پر ایک تصویر کو ذہن کے پردے پر پھیلا دیا۔

"ہی از ڈیڈ۔" پولیس سرجن نے کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہا۔ کمرے میں خاموشی کے چند ہولناک سیکنڈ ان الفاظ کی باز گشت بن کے موجود رہے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"آپ نے چند منٹ پہلے کی بات کی تھی ڈاکٹر صاحب!" میں نے انگریزی میں کہا۔ "آدمی تو چند سیکنڈ میں بھی مر جاتا ہے۔"

"ہاؤ ڈی ہیل۔۔۔" وہ ایک دم میری طرف پلٹا۔ یوں جیسے میں نے اس کی تذلیل کر دی ہو۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ "وہ تیسری نرس کون تھی۔ میں معلوم کروں گا اور تم اسے شناخت کرو گے۔ میں پورے ہوسپیٹل کی تمام نرسوں کو، ٹڈوائفوں، ٹرینی اسٹاف، ہر وارڈ کی بھنگن تک کو لائن اپ کر دوں گا۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "وہ ان میں نہیں ملے گی۔ وہ جان بچانے والوں میں سے نہیں تھی۔ جان لینے والوں کی آلۂ کار تھی۔ وہ اپنا کام کر کے جا چکی ہے۔ دو بے حد فرض شناس ڈاکٹروں اور دو بے حد اسمارٹ نرسوں کی بے حد چوکس آنکھوں میں دھول جھونک کے۔ تمہارا خیال تھا کہ وہ میری نظر کا دھوکا تھی؟ میں "ہیلوسی نیشن" (HELLUCINATION) میں مبتلا نہیں تھا ڈاکٹر صاحب! اور ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ اس گلوکوز کی تھیلی کو اتار لو اور تجزیے کے لیے بھیج دو۔ لیکن رپورٹ ابھی اسی وقت مجھ سے لو۔ اس میں کوئی مہلک زہر شامل کر دیا گیا تھا جو قطرہ قطرہ گلوکوز کے ساتھ خون میں شامل ہوتا رہا۔ پانچ سی سی کا ایک انجکشن اگر سائنائڈ ہو تو کتنی دیر میں ایک آدمی کی جان لے سکتا ہے؟ فوراً اور اس محلول میں شامل ہو تو؟ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ۔"

پولیس سرجن نے گلوکوز کی تھیلی اتار لی۔ "آر یو اے ڈاکٹر؟" وہ خفت زدہ لہجے میں بولا۔

"نو۔ بٹ آئی ایم ناٹ این ایڈیٹ آئدر۔" میں نے کہا۔ "چیک اٹ۔ کیا اس میں کوئی سوراخ ہے انجکشن کا اور کیا اس محلول میں سے کڑوے باداموں کی بُو آ رہی ہے؟ یہ قتلِ عمد کا کیس ہے اور قتل آپ سب کی موجودگی میں ہوا ہے لیڈیز اینڈ جنٹلمین!"

سوراخ ڈاکٹر صدیقی نے دریافت کیا۔ ننھا سا یہ سوراخ محلول کی سطح سے ذرا اوپر تھا۔ پولیس سرجن نے تھیلی کا کنارہ کاٹ کے محلول کو سونگھا۔ "سائنائڈ۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ دونوں نرسوں کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔

"تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے مس شہلا اور مس شمیم کہ میں نے اس تیسری نرس کو دیکھ لیا تھا ورنہ یہ قتل کا الزام تم پر ہی آتا۔" میں نے کہا۔ "کسی ڈاکٹر پر نہیں۔"

اسی وقت میں نے مجسٹریٹ کو دیکھا۔ وہ دروازے میں منجمد کھڑا تھا۔ اس نے میری بات سن لی تھی اور ایک نظر میں مجموعی صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔ اس کی صورت پر بھی شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اسے قبل از وقت بتا دیا تھا کہ بوڑھے گورکن کی جان کو ہسپتال میں کیے جانے والے حفاظتی انتظامات کے باوجود خطرہ لاحق رہے گا اور میری بات پر ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہسپتال میں قتل کرنا یا کرانا صرف فلموں میں ممکن ہے۔ اب وہ حفاظتی انتظامات کے لیے اپنے اختیارات استعمال کر کے اور احکامات جاری کر کے لوٹا تھا مگر ان پر عمل درآمد سے پہلے ہی بوڑھا گورکن قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ تقدیر کا کتنا بے رحم مذاق تھا کہ وہ مُردوں کی طرح دفن کیے جانے کے باوجود زندہ رہا، اس لیے کہ کاتبِ تقدیر نے اس کی زندگی کے اختتام کا جو وقت مقرر کیا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کو چند گھنٹے بعد مرنا تھا چنانچہ وہ مرا تو وہاں جا کے جہاں فانی انسان ہر زندگی کو بچانے کی جدوجہد ہمہ وقت جاری رکھتے ہیں اور کامیابی کو اپنی صلاحیت سے منسوب کرتے ہیں تو ناکامی کو مشیتِ ایزدی سے۔

"پولیس آ رہی ہے۔" مجسٹریٹ نے اندر آ کے کہا۔ "حفاظت کا مقصد تو ختم ہوا لیکن اس قتل کے مقدمے کی رپورٹ باقی ہے اور میں ایف آئی آر میں آپ چاروں کا نام لکھوانے پر مجبور ہوں جن کی غفلت کے باعث قاتل کو موقع ملا۔"

"یہ زیادتی ہے مجسٹریٹ صاحب!" پولیس سرجن نے کہا۔ "ہم اپنے کام میں اتنے منہمک تھے۔۔۔ ہم پر غفلت کا الزام کیسے آ سکتا ہے؟ یہ قتل ایک نرس نے کیا ہے جسے آپ نے بھی دیکھا تھا۔" اس نے مختصراً مجسٹریٹ کو گورکن کی موت کا سبب بتایا۔

"مگر وہ نرس کہاں ہے؟ کیا نام تھا اس کا؟ آپ نے تو اس کے وجود سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اگر وہ مل جاتی ہے تو فردِ جرم اس پر عائد کرنے کے بعد یہ ثابت کرنا استغاثہ کا کام ہے کہ وہ قاتل تھی لیکن وہ نہ ملی تو الزام کس پر عائد کیا جائے گا؟ یہ طبعی موت تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہدایات دیں۔ نرسوں نے گلوکوز لگایا، اس میں آپ کی تجویز کردہ دوائیں شامل کیں اور یہ سب آپ کی نگرانی میں ہوا۔ سائنائڈ کہاں سے آیا اور کیسے گلوکوز میں شامل ہو گیا، اگر کسی غیر متعلقہ فرد نے یہ حرکت کی تو آپ لوگوں نے دیکھا کیوں نہیں؟ اسے منع کیوں نہیں کیا؟ اسے جانے کیوں دیا؟ آپ نے میرے سامنے دو غلط اور متضاد بیانات دیے ہیں۔ ایک یہ کہ کمرے میں کوئی غیر متعلقہ شخص نہیں آیا۔ دوسرا یہ کہ کمرے میں صرف دو نرسیں تھیں۔ بعد میں آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ضرور ملے گا لیکن اس وقت میں حقائق سے روگردانی نہیں کر سکتا۔" مجسٹریٹ نے وقار اور متانت کے ساتھ کہا۔ پھر وہ مجھ

سے مخاطب ہوا۔ "میں نے ابھی مسٹر ڈی سلوا کو فون کیا تھا۔ وہ استاد بیڈرو نام کے کسی شخص سے واقف نہیں لیکن وہ خود آ رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ قانون کی مدد کے لیے ہر وقت، ہر جگہ حاضر ہو سکتا ہے۔"

"پرفیکٹ۔" میں نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "ہر مہذب، شائستہ اور تعلیم یافتہ شخص کی طرح وہ قانون سے تعاون کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ اب قانون سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ مجسٹریٹ صاحب میرے لیے سمن وارنٹ کچھ نہیں، پھر مجھے فون پر طلب کر کے کیا آپ اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کر رہے؟"

"اس نے کوئی سوال نہیں کیا، نہ کیس کی تفصیلات کے بارے میں اور نہ میرے بارے میں۔" مجسٹریٹ بولا۔ "کہ میں مجسٹریٹ ہوں بھی یا نہیں۔ یہ بات میرے لیے واقعی حیران کن تھی۔ اس نے مجھے چوہدری دلاور کے آفس کا نمبر بھی دیا۔"

"اور چوہدری دلاور نے بھی کہا ہوگا کہ جنابِ عالی ہم تو حکم کے غلام ہیں لیکن یہ استاد بیڈرو کیا بلا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ ان کے کردار۔۔۔ میرا مطلب ہے ان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" مجسٹریٹ بولا۔

"اگر میں دعویٰ کروں کہ مجھ سے بہتر نہ ان کو کوئی جانتا ہے نہ جان سکتا ہے تو اس میں قطعی مبالغہ نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد جب لاش مُردہ خانے پہنچائی جا چکی تھی اور پولیس والے ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھے تو پہلے ڈی سلوا نمودار ہوا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور میچ کرتی ہوئی ٹائی بڑے سلیقے سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کار کی چابیاں گھماتا، پُراعتماد انداز میں قدم اٹھاتا، بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہمارے قریب آ کے رک گیا۔

"تم؟" اس نے تھوڑا سا حیران ہو کے کہا۔ "تم مجسٹریٹ کب سے بن گئے؟ تم نے یہ فون کا بیہودہ مذاق کیا تھا؟"

"مجسٹریٹ میں ہوں۔ میں نے فون کیا تھا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔

"اوہ۔" وہ تیزی سے پلٹا۔ "معاف کیجیے گا، میں سمجھا آپ ڈاکٹر ہوں گے۔ یہ تو کوئی پولیس کیس لگتا ہے۔"

"جی۔ دراصل یہاں ایک مریض کو کسی نے دوا میں زہر ملا کے ہلاک کر دیا ہے۔" مجسٹریٹ بولا۔ "وہ ایک بوڑھا گورکن تھا جسے کل رات کسی نے قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آج اس قبر کو کھودا گیا تو وہ زندہ نکلا۔ چنانچہ اسے یہاں بھیج دیا گیا تھا۔"

"یہ تو معجزہ ہو گیا۔" ڈی سلوا بولا۔ "قبر کس سلسلے میں کھودی گئی تھی؟"

"مسٹر سکندر بخت کے والد کی لاش نکال کے پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔" مجسٹریٹ بولا۔ "لیکن لاش نہیں ملی۔"

"نہیں ملی کا کیا مطلب؟" ڈی سلوا نے اپنا سکون اور بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔ "وہ کسی اور کی قبر تھی؟"

"چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق قبر کی نشاندہی غلط نہیں ہوئی تھی۔" مجسٹریٹ بولا۔ "ان کو اب بھی یقین ہے کہ قبر وہی تھی۔ کسی نے اس میں سے لاش۔۔۔ یوں سمجھ لیجیے چرالی اور یہ کام گورکن سے کرانے کے بعد اس کو دفن کر دیا۔"

"آئی سی۔" ڈی سلوا نے حیرت سے سیٹی بجائی اور چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اس کی اداکاری اور خود اعتمادی کا دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ خوفزدہ یا پریشان ہونا تو در کنار، وہ بہت زیادہ حیران تک نہ تھا۔ اس کی حیرت واجبی سی تھی، جیسے یہ روز ہونے والے جرائم میں سے ایک جرم کی خبر ہے۔ لوگ ہر روز قتل ہوتے ہیں اور کرتے ہیں۔ حادثات میں مارے جاتے ہیں اور اندر کے صفحے پر اخبار میں چند سطور کی خبر کسی کے لیے صدمے، تعجب یا دلچسپی کا باعث نہیں ہوتی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اس کا لہجہ اینگلو انڈین سے زیادہ برطانوی نژاد انگریز کا تھا۔ "مجھے مسٹر سکندر بخت سے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ بتائیے، مجھے کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے؟"

"مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے کہا۔ "یہ سوال آپ نے فون پر کیوں نہیں کیا تھا؟"

"کیوں نہیں کیا تھا؟" وہ ماتھے پر شکن ڈال کے بولا۔ "کیا میں نے غلطی کی تھی؟ اگر میں اختیارات یا جواز کا مسئلہ اٹھائے بغیر یہاں آ گیا تو کیا میرا یہ تعاون قانونی طور پر کوئی جرم بھی بن سکتا ہے؟"

"نتیجہ آپ اخذ کر رہے ہیں مسٹر ڈی سلوا!" مجسٹریٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہر شخص جو آپ کی طرح ذہین اور تعلیم یافتہ ہوگا قدرتی طور پر اپنا اطمینان کیے بغیر ڈرائیونگ کر کے اتنی دور نہیں جائے گا۔"

"آل رائٹ! میں نے غلطی کی۔ آئی ایم اے فول۔" ڈی سلوا نے بھی لہجہ بدل لیا۔ "اب مجھے مطمئن کر دیا جائے۔"

"مسٹر سکندر بخت نے الزام عائد کیا ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے کیا ہوگا۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ ماحول کی کشیدگی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور یہ تلخ گفتگو سب کے اعصاب کو متاثر کرنے لگی تھی۔

"سب کچھ کیا؟" ڈی سلوا نے گھوم کر ایک بار مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور پھر مجسٹریٹ سے مخاطب ہو گیا۔

"یہ... لاش کی چوری، گورکن کو مار کر دفن کرنا اور یہاں اس کو قتل کروانا۔" مجسٹریٹ کچھ پریشان ہو گیا۔

ڈی سلوا قہقہہ مار کے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر، حقارت اپنی طاقت کے غرور اور ہماری بے بسی پر مسرت کے جذبات شامل تھے۔ "یور آنر! کیا آپ جانتے ہیں کہ مسٹر سکندر کے دل میں میرے لیے کس قسم کے جذبات ہیں؟ ان پر اپنے والد کے پارٹنر کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اور دوسرا مقدمہ یہ چلا رہے ہیں کہ ہم نے یعنی باقی بزنس پارٹنرز نے مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور قتل کر دیا، یا کرا دیا۔ انگلینڈ میں تعلیم کے بہانے جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں، اس کا ریکارڈ الگ ہے لیکن میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ تاہم یہ گلی میں مرنے والے کتے سے لے کر سڑک پر کار کے نیچے آنے والے کسی آدمی کی موت کا ذمے دار بھی مجھے قرار دیں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ یہ الزام آپ تو لگنے سے رہے۔ ابھی ہماری فرم کا ایک اکاؤنٹنٹ غلام علی حادثے میں مارا گیا تھا۔ یہ الزام عائد کر سکتے ہیں کہ مار کے بھاگ جانے والا ڈرائیور میں ہی تھا۔"

"دِس از لے ڈیم فیکٹ۔" میں نے شدتِ جذبات سے بے قابو ہو کے کہا۔ "اور فرم تمہاری نہیں ہے۔ تم پارٹنر نہیں، ملازم ہو۔ سمجھے؟"

"مگر فیکٹ؟ جو تم کہتے ہو وہ فیکٹ ہوتی ہے؟" وہ پھر حقارت سے ہنسا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ حقیقت کی تعریف اب یہ ہو گئی ہے کہ جو کچھ مسٹر سکندر بخت فرمائیں۔"

"آپ دونوں بکواس بند کریں۔" مجسٹریٹ نے برہمی سے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! میں جانتا ہوں کہ حقیقت کا ثبوت ملنا چاہیے اور کسی کے الزام عائد کر دینے سے کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ مجھے صرف جوابی بیان چاہیے۔ یس یا نو؟"

"نو... سو مرتبہ نو۔ ایک ہزار مرتبہ نو۔" ڈی سلوا نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"واہ جی واہ۔ سو مرتبہ نو ہو گئے نو سو۔ سو مرتبہ ہزار ہو گئے کتنے؟ ہاں، نو ہزار۔" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود ہے۔ کسی کو اس کے اندر آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی اور میرا اپنا خیال ہے کہ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی اسکرین کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ ہسپتال کے عملے نے لاش کے گرد لگری کی لکڑی اسٹینڈ والا پردہ کھڑا کر دیا تھا جو لاش کے مُردہ گھر جانے کے بعد بھی موجود تھا۔ نہ جانے کب سے وہ تمام گفتگو سن رہا تھا اور بالکل صحیح وقت پر اس نے ڈرامائی انداز میں سامنے آ کے یہ ظاہر کیا جیسے وہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔ اس کردار کی طرح جو پس پردہ ڈائیلاگ سنتا رہے اور عین اس وقت نمودار ہو، جب اس کے ڈائیلاگ بولنے کی باری آ جائے۔ "کیا قصہ چل رہا ہے یہاں؟ اوہ۔" اس نے اوہ کو کھینچ کر حیرانی اور مسرت کا اظہار کیا۔ "یہاں تو اپنے سکندر صاحب بھی موجود ہیں۔ مجسٹریٹ پھر آپ ہی ہوں گے، کیوں جنابِ عالی؟"

مجسٹریٹ نے وہی سوال دوبارہ دلاور سے پوچھنے کی غلطی نہیں کی جو اس نے ڈی سلوا سے کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سنجیدہ رہ کے بھی غیر سنجیدگی سے بات کرنے والا یہ شخص اس کو چٹکیوں میں اڑا دے گا۔ اس نے کم سے کم الفاظ میں بتا دیا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔

وہ کچھ دیر یوں کھڑا رہا جیسے بات کو ذہن میں بٹھانے کی سخت کوشش کر رہا ہے اور وہ معمولی عقل و ذہانت کا مالک شخص ہے جس کے لیے غیر معمولی بات کو سمجھنا مشکل مسئلہ بن جاتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف پلٹا۔

"اپنے سکندر صاحب! مجسٹریٹ صاحب نہ ہوتے تو میں کہتا آپ بکواس فرما رہے ہیں۔ مگر یہ گستاخی میں ان کی شان میں کیسے کر سکتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں رک رک کے بولا۔ "پھر بھی آپ سے تو پوچھ سکتا ہوں بندہ پرور! کہ غلام کے بارے میں آپ نے یہ کیسے فرما دیا؟ یہ رائے ہے آپ کی میرے بارے میں؟ آپ تو میرے برابر کے پارٹنر ہیں، میرے خلاف یہ عدم اعتماد کا اظہار؟" اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ مجھے معاف کرے کہ خلقِ خدا مجھے کیا سمجھتی ہے اور آپ کو... آپ کو بھی معاف کرے۔ معلوم نہیں کس نے آپ کو ورغلایا ہے تاکہ شراکت ٹوٹ جائے۔ یا آپ خود اتنے عاقبت نااندیش ہیں۔ میں اتنا ذلیل اور بے ضمیر نہیں ہوں اپنے سکندر صاحب!" اس کا دکھ بھرا لہجہ اور رقت آمیز اندازِ گفتگو ڈرامہ تھے، اس کی پوری شخصیت ایک ڈرامہ تھی مگر اس کو حقیقت سے الگ کر کے دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجسٹریٹ اب مجھے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کو یقین آنے لگا تھا کہ میں واقعی ایک کم عقل، نوجوانی کے جذبات سے مغلوب ہو جانے والا کینہ پرور آدمی ہوں۔ اس وقت مزید مشتعل ہونا اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

"دلاور صاحب! یہ جذبات کا نہیں قانون کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں ہمارے ذاتی تعلقات یا کاروباری تعلقات کہیں نہیں آتے۔ ایک بیان میں نے دیا تھا، دوسرا آپ نے دے دیا۔ یہ صرف ابتدائی تفتیش ہے۔ آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ مجھ پر ہتکِ عزت کے ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیں۔ مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے ثبوت اور دفاع کے معاملات کو بعد پر چھوڑ دیں۔" پھر میں مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے اب آپ مجھے اجازت دیں گے۔ ضابطے کی اس کارروائی میں میری موجودگی کی اب ضرورت نہیں رہی۔" محسن نے جو بالکل خاموش اور الگ تھلگ کھڑا رہا تھا، میرے اشارے کے جواب میں سر ہلایا اور ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔

"مجسٹریٹ صاحب!" محسن نے دروازے میں رک کر کہا۔ "میں نے ابھی ایک نرسنگ آرڈرلی سے سنا ہے کہ گورکن کی جیب میں سے ایک ہزار روپے نکلے ہیں۔ سو سو کے دس نوٹ۔ آپ ان کو سائن کر دیں کیونکہ ہو سکتا ہے ان پر فنگر پرنٹ مل جائیں۔"

بیک وقت ڈی سلوا اور چوہدری دلاور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے ان دونوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔

"اور اگر فنگر پرنٹ ملیں تو موازنے کے لیے آپ تیسری نرس کے وجود کو ذہن میں رکھیں۔" میں نے اس انسپکٹر سے کہا جو محسن کی بات پر ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "ہو سکتا ہے اک زنانہ فنگر پرنٹ مسٹر ڈی سلوا کی سیکرٹری کے ہوں جو کسی سرنج یا گلوکوز کے بیگ یا کمرے میں اور دروازے کے ہینڈل پر مل جائیں۔ کیا نام ہے اس کا ڈی سلوا صاحب؟ ذرا بتا دیجیے گا پولیس کو۔ خدا حافظ۔"

میری آخری بات کے ردِ عمل کو مجسٹریٹ نے بھی نوٹ کیا۔ چوہدری دلاور کو اپنے اعصاب پر زیادہ قابو تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا لیکن اس کا چہرہ ویران ہو گیا تھا۔ ڈی سلوا چونکا اور اس کی آنکھوں میں آتشِ غضب کا کوندا سا لپکا۔ ان دونوں کی نگاہوں نے دہلیز کے باہر قدم رکھنے تک میرا تعاقب کیا۔ میرے لاشعور کے نہاں خانوں سے نکل کر وہ تصویر اچانک سامنے آ گئی تھی جس کی تلاش میں حافظہ سرگرداں تھا۔ مجھے اس تیسری نرس کی صورت سے آشنائی کا احساس بے سبب نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈی سلوا کی نظر نواز سیکرٹری تھی اور نرس کا لباس پہن کے نرسوں میں یوں شامل ہو گئی تھی جیسے بھیڑ کا لبادہ اوڑھ کے بھیڑیا گلے میں شامل ہو جائے اور میں اسے فوراً اسی لیے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ بے وقوف لڑکی! میں نے افسوس سے سوچا۔ اپنی جذباتی کمزوری کے باعث ڈی سلوا جیسے گرگِ باراں دیدہ کی آلۂ کار بن گئی تھی اور قتل جیسا سنگین جرم کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شاید اسی ایک وعدے پر جو ڈی سلوا پہلے بھی ایسی ہی عاقبت نااندیش لڑکیوں سے کئی بار کر چکا تھا اور کئی بار توڑ چکا تھا مگر اسے یہ سب کہاں معلوم ہو گا۔ اسے تو یقین ہو گا کہ اگر وہ اپنے باس کو نہیں، اپنے مستقبل کے شریکِ حیات کو دشمنوں سے بچانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کا انعام بہت بڑا ہو گا۔ شاید ڈی سلوا نے کہا ہو گا کہ ڈارلنگ تم یہ کام کر دو تو سارے بگڑے کام بن جائیں اور اس خطرے کے دور ہوتے ہی ہم جیون ساتھی بن جائیں۔ ہنی مون کے لیے پیرس روانہ ہو جائیں یا تمہیں سوئٹزرلینڈ پسند ہو تو... یا ممکن ہے اس نے اپنی سیکرٹری کو کسی سابقہ جذباتی غلطی کے حوالے سے بلیک میل کیا ہو۔ دیکھو ڈیئر! ابھی تک تو کسی کو معلوم نہیں کہ تم ایک جرم پہلے بھی کر چکی ہو اور معلوم ہو گا بھی نہیں اگر تم یہ آخری بات مان لو۔ بس اس کے بعد ہم اور تم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ وہ مجبور ہو گئی ہو گی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا سکندر!" محسن نے اچانک ڈرائیونگ کرتے کرتے کہا۔ "اب تو وزیر خان چچا کی قبر بھی نہیں رہی۔"

میں اپنے خیالات سے چونکا۔ "قبر؟ قبر کیا ہوتی ہے محسن! ٹوٹے ہوئے جذباتی رشتوں کو استوار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آدمی کے ساتھ تو اس کے اعمال جاتے ہیں اور رہ جاتی ہے تو یاد۔ مگر وہ قبر میں نہیں، دل میں رہتی ہے۔ یاد دل میں نہ ہو تو قبر پر بھی لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ مٹی کے ان ڈھیروں کا کیا ہے جو بارش میں بیٹھ جاتے ہیں اور زلزلوں سے مٹ جاتے ہیں۔ لندن سے واپس آنے کے بعد اگر مجھے کسی غلط قبر پر لے جا کر کھڑا کر دیا جاتا تو میں پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ وہیں دست بدعا رہتا۔ باپ کی مغفرت کے لیے دعائیں اب بھی کرتا رہوں گا اور میرا وہ عہد قائم رہے گا جو میں نے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے کیا ہے۔ البتہ مجھے بوڑھے گورکن کی موت کا افسوس ہے۔"

"مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ اپنے لالچ کے باعث اس انجام کو پہنچا۔ یہ کتنی بے ضمیری کی بات ہے سکندر کہ انسان اب مُردوں کے ساتھ بھی دھوکا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کرنے لگا ہے۔ ہزار روپے میں ان کی ہڈیاں اور اپنا ایمان بیچ دیتا ہے۔ دوسرے پیشوں میں تو بد معاشی ہوتی ہی تھی، یہ گورکن بھی اب کتنی برائیوں میں ملوث ہو گئے ہیں۔ قبر کی زمین کے لیے ایک کے ہزار وصول کرنا، ایک ہی قبر کو کئی کئی بار فروخت کرنا، لاشیں میڈیکل کے طلبہ کو بیچنا، کفن چرانا بیشک اکثریت اب بھی خدا سے ڈرتی ہے مگر ایسے بھی کم نہیں جن کے گناہ دیکھ کر شیطان کا سر بھی شرم سے جھک جائے۔"

"میرا خیال ہے محسن کہ اب ڈی سلوا سیکرٹری کی زندگی غیر یقینی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"کیا ہم یہ بات اسے بتا کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ ہم پر اعتماد کر لے۔"

"اگر اس نے اعتماد کر لیا تو وہ بہت سی ایسی باتیں بتا سکے گی جو ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور استغاثہ کی ایک اہم گواہ ہو جائے گی۔"

"اسے یقین دلایا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری نہ مانی تو اس کا انجام کیا ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہمارے پاس دستاویزی ثبوت ہیں۔ ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ اب تک ڈی سلوا کتنی بار سیکرٹری بدل چکا ہے۔"

"میں نے ابھی تک وہ فائل دیکھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر غلام علی نے جو کچھ زبانی بتایا تھا، غلط نہیں تھا۔ اگر ہم کسی طرح ان لڑکیوں سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔۔۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کچھ نہیں مانیں گی وہ اپنے گنہگار ماضی سے تمام رشتے توڑ چکی ہیں اور اس ماضی کے آسیب سے نکل چکی ہیں۔ شاید ان میں کچھ نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہوں گی اور نئی امیدوں کے ساتھ نئے ہمسفر منتخب کر چکی ہوں گی۔ وہ یہ خطرہ کیوں مول لیں گی کہ ہم گڑے مردے اکھاڑ کے ان کے مستقبل کا خانہ خراب کر دیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن کہ ان میں سے کچھ آرزوِ انتقام سے مغلوب ہوں لیکن اپنی بے بسی اور کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکی ہوں۔ اگر انہیں اعتماد ہو کہ۔۔۔ کہ ہم سے تعاون میں ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور ہم ان کی مدد سے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔۔۔ تو شاید وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ کہہ سکیں۔" میں نے کہا۔ "اب تو نے ایک بات کہی ہے تو اس سے مجھے ایک لائن مل گئی ہے۔ فرض کرو میں کسی طرح ڈی سلوا کی سیکرٹری سے رابطہ قائم کرتا ہوں، کسی طرح اسے تنہائی میں ایک بار ملنے پر رضامند کر لیتا ہوں۔ خوفزدہ وہ یقیناً ہو گی کیونکہ اس نے ایک قتل کیا ہے اور وہ ایک نادان لڑکی ہے، کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ ایک بار وہ ملنے آ گئی تو میں اسے بہت کچھ بتا دوں گا، مثلاً یہ کہ میں نے اسے نرس کے روپ میں بھی شناخت کر لیا تھا اور اب اس کی ذات کو کتنے سنگین خطرات درپیش ہیں۔ ڈی سلوا کے کردار کو بے نقاب کر کے میں اسے سمجھا سکتا ہوں کہ اب خدا کے بعد ہمارے سوا اس کو بچانے والا کوئی نہیں۔ اگر اس نے اعتبار نہ کیا تو میں اس کو ڈی سلوا کی کسی سابقہ سیکرٹری سے ملوانے کا انتظام کر لوں گا اور اس کے بعد وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہو گی۔"

"اور ہم اسے تحفظ، یا تحفظ کی ضمانت کیسے فراہم کریں گے؟"

"یہ بعد میں سوچیں گے۔" میں نے کہا۔ "خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ ایک لڑکی کو چھپانا مقصود ہو تو ایک گوشہ کافی ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ ویسے بھی مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا ہے۔ ہم نیک نیتی سے اس لڑکی کو بچانا چاہتے ہیں جو نادانی کے باعث سفاک اور پیشہ ور مجرموں کے جال میں پھنس گئی ہے اگر ہم اس کی مدد سے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے ہیں تو یہ بھی کوئی غلط مقصد نہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اس نے ہی اب تک ہماری حفاظت کی ہے ورنہ ہم کیا کر سکتے تھے۔ وہ ہمارا مددگار ہو گا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد محسن کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ چراغ دین کی کوٹھی میں کار داخل ہوئی تو میں نے سب سے پہلے گلاب خان کو دیکھا اور پھر چراغ دین کو جو برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور گلاب خان سے قبرستان میں پیش آنے والے واقعات سن رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت اپنے رقیبِ روسیاہ کی صورت بھی نہ دیکھوں مگر وہ ہمیں زبردستی ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ محسن نے بہت کوشش کی وہیں سے کار کی چابی اس کے حوالے کر کے نکل جائے لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ چراغ دین دوبارہ سالے کے منصب پر فائز ہو جانے والے محسن کی خاطر مدارت پر کمربستہ تھا۔ طوعاً و کرہاً ہم نے چائے پی اور اس دوران میں چراغ دین کے سوالات کے جوابات بھی مجبوراً دیے۔ وہ سخت حیرانی اور پریشانی کا اظہار کرتا رہا۔ محسن کا موڈ چراغ دین کے خوشامدانہ اخلاق کے باعث زیادہ خراب ہوتا جا رہا تھا

اور خود میں نفرت کے دہرے جذبات کا شکار تھا۔ اس شخص نے میرے باپ کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ وہ دنیا میں اس کی خرابی، رسوائی اور تباہی کا ذمہ دار بنا تھا لیکن میرے سامنے اپنی شرافت کا ڈھونگ رچا کے اپنے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے باپ کی کمائی سے غبن کر کے یہ سب کچھ کھڑا کیا تھا جو دنیا میں شرافت اور عزت کی سند تھا اور پھر اس نے اپنے آقا کو اپنا ملازم بنا کے مزید تحقیر و تذلیل کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا اور اب میری محبت کا خون کرنا چاہتا تھا۔ بے شک فوزیہ کو ایک بار اپنی زندگی پر اختیار سے محروم کرنے کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں رہتا تھا کہ اس کے مستقبل کے کسی فیصلے کی راہ میں حائل ہو سکوں مگر فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ مجھے بھول کے جینے کی مجبوری کو قبول کرے گی مگر چراغ دین سے شادی کر کے جینا قبول نہیں کرے گی۔ میں نے فوزیہ کے ارمانوں کا خون کیا تھا تو ایک عظیم تر مقصد کی خاطر لیکن میں کسی اور کو فوزیہ کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میرے باپ کے بعد چراغ دین کو فوزیہ کی جان لینے کی مہلت دینا میرے لیے ناممکن تھا۔ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا تھا کہ چراغ دین کو سزا کیا دی جائے کیونکہ اس سے پہلے دوسرے مجرم تھے جن سے پہلے نمٹنا ضروری تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ چراغ دین کی سزا کو التوا میں رکھنا بھی مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ محسن کے جذبات بھی مجھ سے مختلف نہ تھے اور وہ صاف کہہ چکا تھا کہ فوزیہ کو زندہ رکھنے کے لیے وہ چراغ دین کو قتل کر دے گا۔ ابھی تک اس نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ وہ اس مسئلے سے کیسے نمٹنا چاہتا ہے مگر اس کے عزائم بھی خطرناک تھے۔

اچانک محسن نے گلاب خان کو دس کا نوٹ دے کر کہا۔ "ایک پیکٹ سگریٹ کا لے آؤ ذرا۔ معلوم ہے نا میں کون سے سگریٹ پیتا ہوں۔ تھری کاسل۔ بیس کا پیکٹ ملے گا دس کا نہیں۔"

"تھری کاسل؟" گلاب خان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "ادھر تو شاید ہی ملے۔"

"تو اسٹیشن تک ہو آؤ۔" محسن نے کہا۔ "تکلیف تو ہو گی تمہیں۔۔۔"

بات تکلیف کی نہیں تھی۔ سگریٹ میری جیب میں موجود تھے۔ تھری کاسل ان دنوں نایاب ہو گئے تھے چنانچہ محسن کا مقصد صرف چوکیدار کو گھر سے رخصت کرنا تھا۔

"مسٹر چراغ الدین!" محسن نے چوکیدار کے جاتے ہی کہا۔ "مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی اس لیے میں نے گلاب خان کو باہر بھیج دیا ہے۔"

چراغ دین پہلے تھوڑا سا برا ماننے کے باوجود مسکرایا پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ سالے کا مذاق نہیں تھا اور محسن کے لہجے کی متانت اور اس کی صورت دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے محسن میاں؟"

"میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "اس لیے صاف بات سن لو۔ مجھے فوزیہ سے تمہاری شادی منظور نہیں۔" چراغ دین کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر محسن کو یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر آ کے ٹھہر گئی لیکن اسے زیادہ مایوسی ہوئی۔ میری آنکھوں میں اس کے لیے نفرت کے جذبات شدید تر تھے۔

"میں تمہاری بات سمجھا نہیں محسن میاں!" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ وہ اب سنبھل گیا تھا۔

"مسٹر سی ڈین! میں نے انگریزی میں تو بات نہیں کی۔" محسن نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"سوال یہ ہے مسٹر محسن کہ آپ کون ہوتے ہیں یہ رشتہ منظور یا نامنظور کرنے والے؟" چراغ دین نے تیز ہو کر کہا۔

"میں فوزیہ کا بڑا بھائی ہوں۔" محسن نے سکون سے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"لیکن تم اس کے سرپرست نہیں ہو، تم والدین کے فیصلے کو نہیں بدل سکتے اور نہ میرے فیصلے کو۔ سمجھے؟" چراغ دین بولا۔

"سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اور تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ مریم کے معاملے میں بھی مجھے والدین سے اختلاف تھا مگر میں چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ خود مریم کو اعتراض نہیں تھا لیکن اب فوزیہ کو یہ رشتہ منظور نہیں، اس لیے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔"

"فوزیہ کو رشتہ منظور نہیں!" چراغ دین نے اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں۔ یہ بات خود اس نے مجھ سے کہی ہے کہ وہ مر جائے گی لیکن تم سے شادی نہیں کرے گی۔ اس لیے میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں تم کو قتل کر دوں گا لیکن یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اپنی بہن کی زندگی بچانے کے لیے والدین سے نافرمانی کا الزام اور پھانسی دونوں منظور ہیں۔"

چراغ دین کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "تم۔ تم نے ہی مجھے ٹیلیفون پر بھی دھمکی دی تھی؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ٹیلی فون پر؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "کیوں چراغ دین! کیا میں تم سے ڈرتا ہوں؟ میں یہ دھمکی تمہارے منہ پر دے رہا ہوں اور یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اسے خالی دھمکی مت سمجھنا۔"

میں اور محسن اسے پتھر کے بت کی طرح منجمد بیٹھا چھوڑ کے باہر آ گئے۔ میں نے اپنی زبان بند رکھنے کی سخت جدوجہد کی تھی اور کامیاب رہا تھا ورنہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس سے دل کی بات صاف صاف کہہ دوں۔ اسے بتا دوں کہ بالفرضِ محال محسن نے تمہیں بخش بھی دیا یا خود تم نے زندگی کو اس رشتے سے عزیز تر سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا تب بھی میرے ارادے میں فرق نہیں آئے گا۔ میں نمک کا وہ قرض ضرور وصول کروں گا جو میرا باپ وصول نہ کر سکا۔ سارے زمانے کو چھوڑ کر اس نے تم جیسے نمک حرام کی ملازمت کی ذلت قبول کی تھی تو اس کی صرف ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ تمہیں سزا دینا چاہتا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اب اس کا وارث میں ہوں تو یہ سب ذمہ داریاں بھی مجھ کو ہی پوری کرنی ہیں جو میرا باپ پوری نہ کر سکا۔ میں نے اس بات کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھنا بہتر خیال کیا کیونکہ یہ لمبی بات تھی اور گلاب خان آنے ہی والا تھا۔ جب ہم کوٹھی سے نکلے تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔

رابعہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ دوپہر کے بعد ضامن رضوی صاحب نے پولیس سرجن کو فون کیا تھا اور انہیں تمام واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ شام سے پہلے ہی انہوں نے رابعہ کو فون کر دیا تھا مگر وہ خود کسی مصروفیت کے باعث ابھی تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ ان کی بیگم لان کی گارڈن چیئرز پر بیٹھی تھیں۔ میں ہاتھ کو سرہانے رکھ کے گھاس پر لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی وسعت کو گھورنے لگا۔ محسن نے خواتین کو ہسپتال میں پیش آنے والے واقعات بتانے شروع کیے جو بیگم رضوی کے لیے سنسنی خیز کہانی کی طرح تھے اور رابعہ کے لیے ایک قانونی الجھن۔ اس کا سارا دن اپنے گھر کی آتش زدگی اور کار کی چوری کے معاملات کی تفتیش کرنے والوں کے سوالوں کے جواب اور بیانات دیتے گزر گیا تھا۔ میرے اپنے سر میں شدید درد تھا چنانچہ جب چائے آئی تو میں نے پوچھا کہ کیا گھر میں اسپرین مل سکے گی؟ نوکر نے مجھے اسپرین لا کے دی جو میں نے پانی کے پورے گلاس کے ساتھ نگل لی اور پھر وہیں بیٹھا چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد بیگم رضوی معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ وہ کم گو اور کم آمیز مگر طبعاً نیک دل خاتون تھیں جو نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی شوہر کے تمام ذاتی کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں اور اس وقت بھی ان کو دیکھنا تھا کہ رضوی صاحب کا جو سوٹ ڈرائی کلین ہو کے آیا ہے اس پر استری ٹھیک ہے یا نہیں، انہیں رات کو کسی تقریب میں شرکت کے لیے جانا تھا۔

محسن کے بھی سر میں درد تھا مگر وہ اسپرین کے استعمال کے خلاف تھا اور اس کا علاج نیند سے کرتا تھا۔ میں اپنے منتشر خیالات سے بچنے کی جدوجہد میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور سکون چاہتا تھا۔ سر کا درد کم ہوا تو تھکن کا احساس غالب آ گیا اور نہ جانے کیسے میری آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھوں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بڑے جادوگر ہوتے ہیں، کبھی حال کے رشتے ماضی سے جوڑ دیتے ہیں تو کبھی مستقبل سے۔ خواب پر ریسرچ کرنے والوں نے یہ تو معلوم کر لیا کہ خواب تشنہ کام آرزوؤں کا روپ ہوتے ہیں مگر یہ سوال اب بھی جواب طلب ہے کہ خوابوں میں وقت کتنا صرف ہوتا ہے۔ گھنٹوں یا دنوں پر محیط مناظر کو خواب میں دیکھتے ہوئے چند منٹ لگتے ہیں تو کیسے اور ایک رات میں ایک عمر کے خواب کیسے سما جاتے ہیں؟

میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف حدِ نگاہ تک سرسوں کے زرد پھولوں کا ایک سمندر سا ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میرے سر پر شوخ نیلا آسمان ہے جس میں صرف ایک بادل کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ پھر وہ ٹکڑا نیچے اترا اور میرے گرد پھیل گیا۔ وہ خوشبو کا بادل تھا اور یہ خوشبو ہوا کے جھونکے کی طرح مجھے اڑا کے لے گئی۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں رابعہ کا ہاتھ ہے اور وہ بھی میرے ساتھ بادل پر بیٹھی ہے، اداس اور دل گرفتہ۔ "تم!" میں نے کہا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"اور کہاں جاؤں؟" وہ بولی۔ "میرا کوئی گھر موجود نہیں ہے۔"

"تمہارا کوئی بھی گھر نہیں ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ "تو کیا اب تم بادلوں میں رہو گی؟ پہلے کہاں رہتی تھیں تم؟"

رابعہ نے نیچے دیکھا۔ "وہاں۔" اس نے انگلی سے دھوئیں کے ایک مرغولے کی طرف اشارہ کیا جو اوپر اٹھتا چلا آ رہا تھا۔ "دیکھو سکندر! یہ دھواں مجھے نگل لے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ چلائی۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ "مگر یہ دھواں کیسا ہے؟ کیا تھا یہاں؟"

"یہاں میرا گھر تھا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"جھوٹ۔" میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "تمہارا گھر تو وہ ہے۔" میں نے انگلی سے دوسری جانب اشارہ کر کے کہا۔

"وہ سفید اجلی دھوپ میں جگمگانے والا بے داغ گھر جس کے شفاف شیشوں والے دریچوں کے پیچھے ریشمی پردے پڑے ہیں۔ جس کے گرد ہفت رنگ پھولوں کی جھالر ہے اور سبزے کا قالین بچھا ہوا ہے۔ جہاں وہ دونوں شریر بچے ہیں خصوصاً لڑکی۔"

"مگر... مگر یہ تو گھر تمہارا ہے..." رابعہ نے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھا نہیں، اس بچی کی صورت تم سے کتنی ملتی ہے۔" میں نے دلیل دی۔

"لیکن لڑکا تو ہو بہو تم جیسا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

پھر خواب ختم ہو گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ خوشبو کا بادل اب بھی میرے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور یہ خوشبو مجھے مقید کیے ہوئے تھی۔ رابعہ میرے قریب لان پر بیٹھی تھی اور اس کا ایک ہاتھ میری پیشانی پر تھا۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا اس پر نیلے رنگ کی زمین میں سرسوں جیسے زرد پھول چمک رہے تھے۔ یہ سب کچھ مل کے میرا خواب بن گئے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "کتنی دیر تک سوتا رہا ہوں میں؟" میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ پہلے محسن سونے گیا تھا تب بھی میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

"تم سو رہے تھے؟ میں سمجھی سر میں زیادہ درد ہے۔" وہ خفت سے بولی۔ "اندر جا کے سو جاؤ، تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔"

"سکون تو ایسے زیادہ مل رہا تھا۔" میں نے کہا اور رابعہ کے چہرے کو سرخ پڑتے دیکھا۔ "سر کا درد ٹھیک ہو گیا ہے اور سونا میں چاہتا نہیں ہوں ابھی۔ مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ ضروری یا غیر ضروری، جو چاہو سمجھ لو۔"

"اچھا۔" وہ بولی۔ "تو یوں کرتے ہیں باہر چلتے ہیں، ہمت ہے ساتھ دینے کی؟"

بات کے ذو معنی ہو جانے کا احساس رابعہ کو دیر سے ہوا۔

"میری ہمت تو تمہارے ساتھ رہنے کا ہی نام ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بتاؤ؟"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ہمت آزمانے والے ہی ملے ہیں جب ملے ہیں۔ تم بھی آزما لو۔"

"تم سیریس ہونے لگی ہو۔" میں بھی کھڑا ہو گیا۔ "میں تو تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ ابھی میں کتنا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا۔ بالکل فلمی۔"

"تم بھی خواب دیکھتے ہو؟ اور وہ بھی... فلمی قسم کے؟" وہ مسکرائی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہارے لبوں پر بھی مسکراہٹ آئی۔"

میں نے کہا۔ "یہ بڑی نیک فال ہے۔ گردشِ حالات کا شکار ہم دونوں ہیں رابعہ! اور تقدیر کے عطا کردہ زخم ہم دونوں کا ورثہ ہیں۔ کون جانے ابھی اس کے ترکش میں کتنے تیر باقی ہیں مگر جو کچھ ہونا ہے اس سے مفر نہیں اور نہ قبل از وقت پریشانی اس کا علاج ہے۔ اب ایک شاعر نے تو فرمایا ہے کہ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں۔ جو میرے خیال میں وقت اور انرجی ضائع کرنے والی بات ہے۔ چنانچہ دوسرا نقطۂ نظر مثبت ہے یعنی عرض کیا ہے ؎

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بُن سکیں

رابعہ ہنس پڑی۔ "تم بھی کمال آدمی ہو کہ ان حالات میں شاعری سوجھ رہی ہے۔ مگر اب چلو گے بھی یا...؟"

"بس دو منٹ۔ ذرا میں شیو کر لوں اور کپڑے بدل لوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟"

"میں جانا چاہتی تھی خاکِ آشیاں دیکھنے سکر گئی تھی جس پہ کل بجلی۔"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گزرے ہوئے دن پر آنسو بہانے کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم امید کی جانب سفر کریں گے۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کے۔ تم یہاں بیٹھو، میرا خیال کہیں اور جانے کا ہے۔"

غسل کے دوران ہی میں نے شیو بنائی اور بیس منٹ بعد کپڑے پہن کے تیار ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے خیالات کا محور رابعہ کی ذات رہی۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی لڑکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے تن تنہا اپنے حالات کا مقابلہ کیا تھا بلکہ میرا ساتھ دینے کی سزا کو بھی انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ہی اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا مگر وہ ان صدمات سے پاگل نہیں ہوئی تھی اور اتنی پرسکون تھی کہ اس کا حوصلہ میرے لیے عزم و امید کا رختِ سفر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ رابعہ جو باہر سے دنیا کو ایک کامیاب وکیل اور پتھر کی چٹان جیسی سخت جان لگتی تھی اندر سے ایک عام عورت تھی۔ جو اپنے وجود کی زمین میں پیار کو یوں چھپائے رکھتی ہے جیسے صدف کی آغوش میں کوئی درِ شہوار۔ اور انتظار کرتی رہتی ہے کہ کوئی آئے اور اس کے دل کی گہرائی میں اتر کے اس گوہرِ نایاب کو حاصل کرے۔ جیسے زمین اپنی کوکھ میں بیج دبائے منتظر ہو کہ برکھا برسے اور دھوپ اترے تو نخلِ آرزو پھوٹے۔ زندگی کے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بے سمت سپاٹ صحرا میں چلتے چلتے رابعہ کو یکلخت میں نے ایک نخلستان کا ٹھنڈا پُرسکون سایہ فراہم کر دیا تھا اور اب وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔ میری خوشی کے لیے اس نے اپنا غم بھلا دیا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ مجھ سے زیادہ اسے اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں۔ اگر اندر سے اس کا دل رو رہا تھا تب بھی وہ میری خاطر مسکرا رہی تھی۔ وقت ہر دکھ کا درماں ہے مگر وقت کو چارہ گری کا موقع ہی کہاں ملا تھا۔ رابعہ کو میرے مصائب و آلام کا اندازہ تھا اور وہ مجھے ہر احساسِ جرم و پشیمانی سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ وہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس میں ہر صدمہ جھیلنے کا حوصلہ ہے اور یہی حوصلہ مجھ میں بھی ہونا چاہیے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے مایوس کر دوں۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اس وقت رابعہ کے ساتھ باغِ جناح کے کسی معطر اور سرسبز گوشے میں، کسی پہاڑی پر نصب نیل گوں روشنی بکھیرنے والے کھمبے کے نیچے پتھر کی بنچ پر جا بیٹھوں، ریلوے کے کنارے چاندنی اور درختوں کے سایوں میں ٹھہری ہوئی کشتی لوں اور دریا کی نرم لہروں پر بہتا کامران کی بارہ دری کے طلسماتی جزیرے پر جا اتروں جس کے ہر طرف راوی بہتی ہے۔ یا کسی روشنی سے جگ مگ کرتے قہقہوں سے معمور اور نکہت و رنگ سے مخمور فضاؤں والے ہوٹل کی گہما گہمی میں کھو جاؤں۔ لیکن وقت کے تقاضے تلوار بن کے میرے سر پر لٹک رہے تھے۔ محسن گہری نیند میں تھا۔ میں نے غلام علی مرحوم کی دی ہوئی فائل نکالی اور اس کے چند اوراق پر سرسری نگاہ ڈالی۔ اس نے بہت سی کارآمد معلومات کو یکجا کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی اور وفاشناسی میں احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ خود کو مقروض سمجھتا تھا کیونکہ میرے باپ نے اس کے ساتھ ایک نیکی کی تھی۔ اب نیکی کا یہ قرض وہ مجھ پر چھوڑ کے مر گیا تھا۔ ابھی میں کاغذ کے ایک پرزے پر ضروری تفصیلات نوٹ کر رہی رہا تھا کہ رابعہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

"ابھی تک جناب کے دو منٹ پورے نہیں ہوئے؟"

وہ بولی اور میں جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا اور وہی ساری باندھ لی تھی جو اس نے پہلی بار مجھ سے جیل میں ملاقات کرتے وقت باندھی تھی اور جسے دیکھ کر موسمِ گل، صبحِ بہاراں اور صحنِ گلشن جیسے استعارے ذہن میں آتے تھے۔ پھول ہی پھول کھل اٹھے میرے ویرانے میں جیسے شعر یاد آتے تھے اور گلبدن، گل پیرہن جیسے مفہوم واضح ہوتے تھے۔

"ایسی حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "ہم عورتیں تو تیاری کے معاملے میں خواہ مخواہ بدنام ہیں۔"

"تم میں جو بات ہے وہ کچھ اور ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور تیار کیا ہم نہیں ہیں؟"

رابعہ کو ابھی تک کار واپس نہیں ملی تھی۔ اسے سی ایم سے ریلیز آرڈر رد یہ سے ملے تھے اور پولیس کوشش کے باوجود اسی دن ضابطے کی کارروائی پوری نہ کر سکی تھی۔ کار کا حلیہ تو ٹکریں مارنے سے بگڑ چکا تھا اور ڈینٹنگ پینٹنگ کرائے بغیر اس کو دن کے وقت چلانا لوگوں کو خاصی تفریح فراہم کرتا مگر رات کو یہ کار وسیلۂ سفر بننے کے علاوہ خلوت فراہم کر سکتی تھی۔ کار میں بیٹھا ہوا آدمی ہجوم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرنے لگتا ہے جتنا اپنے کمرے کی چار دیواروں پر قائم چھت کے نیچے۔ ہم باہر نکلے اور میں نے احتیاطاً خالی سڑک پر دونوں جانب نگاہ ڈالی لیکن رات کا اندھیرا اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ رابعہ سے چھپا کے میں نے بھرا ہوا ریوالور ساتھ رکھا تھا مگر کوئی بے خبری میں آ لیتا تو یہ حفاظتی انتظام بے مصرف ثابت ہوتا۔ اسی احتیاط پسندی کے باعث میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو غور سے دیکھا، جس نے ہمیں دیکھ کر ٹیکسی روک لی تھی۔ رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ کے میں نے ڈرائیور کو نسبت روڈ چلنے کے لیے کہا اور اگرچہ وہ صحیح راستے سے جا رہا تھا لیکن میں ریوالور نکالنے کی پوزیشن میں مستعد بیٹھا رہا۔ جب وہ ہمیں نسبت روڈ پر اتار کے اور کرایہ لے کر رخصت ہو گیا تب بھی میں ٹیکسی کو دور جاتے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔ "راستے بھر تم بہت خاموش اور کشیدگی کا شکار رہے ہو؟"

"سانپ کا کاٹا رسّی سے ڈرتا ہے۔ یہ بات بڑے تلخ تجربات کا نچوڑ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک ڈر تو اپنی جان کا تھا، دوسرا جانِ جاناں کا۔"

"کیا اس بات کو نسبت روڈ سے کوئی نسبت ہے؟ میں نے راستے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"یہاں ہم کسی سے ملنے آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی سے جو پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔"

"بہت خوبصورت تھی کیا؟" رابعہ نے شوخی سے کہا اور ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ "یہ عالم شوق کا۔"

"خوبصورت تو یقیناً ہوگی ورنہ ڈی سلوا کی سیکرٹری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔" لیکن دیکھے بغیر میں یہ شرط بہرحال لگا سکتا ہوں کہ تم سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دیکھنا اب یہ ہے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ممکن ہے وہ کسی کی بیوی ہو۔ یا ایک بھولی بسری کہانی کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے کوئی دہرانا بھی گوارا نہ کرے۔ جب اسے ڈی سلوا نے رخصت کیا تھا تو اس کے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ سجا دیا تھا کہ سند ہے۔ لوگ وفادار اور طابعدار ملازم کو الگ کرتے ہیں تو کوئی سرٹیفکیٹ ضرور دیتے ہیں لیکن ڈی سلوا کی عطا کردہ سند نے اس لڑکی کو کیا دیا؟ بدنام مستقبل کا اکیلا پن یا بے غیرتی کی موت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمجھداری سے کام لیا ہو تو اس لڑکی نے کلنک کے ٹیکے کو ملنے کا جھومر بنا لیا ہو اور اپنے ماضی سے دامن چھڑا کے بھاگ گئی ہو کسی ایسی جگہ جہاں اس ماضی کی پرچھائیاں بھی نہ پڑیں۔ لیکن وہ مل جائے تو اچھا ہے۔ میں اس سے مکمل رازداری کے وعدے کیساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ڈی سلوا نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا تھا۔ اس کا سارا کچا چٹھا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا خیال ہے وہ تمہیں فوراً بتا دے گی؟"

"نہیں، مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔" میں نے کہا۔" اسی لیے میں تم کو ساتھ لایا ہوں۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"بالفرضِ محال اس نے بتا دیا کہ ڈی سلوا شیطان ہے اور اس کی خباثت کی داستان بھی سنا دی تو اس کا فائدہ؟"

"میں اس کو بطور گواہ استعمال کروں گا۔ کسی قانونی عدالت میں نہیں، ایک اور لڑکی کے سامنے، جو اب ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے۔" میں نے کہا۔" مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی زندگی کا انجام بھی بدتر ہوگا بلکہ بدترین ہوگا۔ وہ کل تک زندہ رہی تو ڈی سلوا کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ جائے گی کہ اس نے بیوقوفی یا نادانستگی میں ڈی سلوا کے لیے ایک قتل کر دیا ہے مگر ڈی سلوا نے اس سے محبت کے نام پر جو وعدے کیے ہیں، وہ کتنے بے حیثیت ہیں۔ اور جیسے لوگ آلہ قتل کو فوراً ٹھکانے لگانے کی فکر کرتے ہیں، ایسے ہی ڈی سلوا کے لیے اس کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ میں نے اسے شناخت کر لیا تھا بلکہ شدتِ جذبات میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔"

"سکندر، تم اس لڑکی، ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری کو ابھی خبردار نہیں کر سکتے۔" رابعہ پریشان ہو کے بولی۔" تمہیں پتہ معلوم ہے اس کا؟"

"اس کا نام ہے شہلا۔ معلوم نہیں کرسچین ہے، ہندو ہے یا مسلمان۔ ماں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ گلبرگ میں رہتی ہے۔ باپ شاید مر چکا ہے یا الگ ہو گیا ہے۔" میں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا جس پر دونوں پتے لکھے ہوئے تھے۔" اگر ہم الماس یعنی اس سابقہ سیکرٹری سے بات کرنے میں کامیاب ہو گئے تو گلبرگ بھی چلے جائیں گے۔ وہاں بھی تمہیں آگے جا کے بات کرنی ہوگی۔ مجھے تو وہ دیکھتے ہی بدک جائے گی۔ لڑکی سمجھ لو کہ میں بھی تمہیں آلۂ کار ہی بنا کے ساتھ لایا ہوں مگر میرے مقاصد نیک ہیں۔ اگر ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری شہلا اس سے بدظن ہو گئی تو وہ ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہوگی اور ایسی بہت سی باتیں بتا سکے گی جو ڈی سلوا کو بے نقاب کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ بشرطیکہ ہم اسے تحفظ کی ضمانت فراہم کر سکیں اور یقین دلا سکیں کہ ہم واقعی اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آج تمہارا موڈ تفریح کا تھا اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ان مسائل سے دامن چھڑا کے تمہارے ساتھ رہوں اور دوسری باتیں کروں۔ مگر یہ بات ایک لڑکی کی زندگی اور موت کے درمیان حائل ہے۔ اگر میں یہ کام کل پر اٹھا کے رکھتا تو شاید میری محنت رائیگاں جاتی۔ مجبوراً میں تفریح کے ساتھ اس مقصد کو شامل کر رہا ہوں۔"

"پھر تمہاری وضاحت میں معذرت کا انداز کیوں ہے؟" رابعہ نے کہا۔" تفریح ایک زندگی کو بچانے کے مشن سے زیادہ اہم تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے تمہیں پہلے یہاں آنے کے بجائے شہلا کے پاس جانا چاہیے تھا۔ فوری خطرہ تو اس کی ذات کو لاحق ہے۔ اگر تم اسے شناخت کر چکے ہو تو ڈی سلوا کو پہلے اس کی طرف سے تشویش لاحق ہوگی۔ الماس ابھی محفوظ ہے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔" کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن شہلا مجھے جانتی ہے۔ وہ تمہیں بھی جانتی ہے۔ اگر کسی طرح الماس خود اس سے بات کرنے پر رضامند ہو جائے تو ہماری کامیابی کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔"

"مگر کوشش کر لینے میں کیا ہرج ہے؟" وہ میرا بازو تھام کے بولی۔" دلائل دینا تو میرا پیشہ ہے اور تم بھی قائل کرنا جانتے ہو۔ وہ ذرا بھی سمجھدار ہوگی تو یقین کرے گی کہ اس کی پوزیشن کتنی خراب ہو گئی ہے۔ وہ ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے، اس کے کردار کو پہچانتی ہوگی۔"

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔" میں یہ چانس لیتا ہوں، لیکن میری صورت دیکھتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تو؟"

"یہ اس کی بدبختی کی دلیل ہوگی۔ ہم لوٹ آئیں گے۔" رابعہ بولی۔" ویسے تدبیر چارہ گر ہو تو ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے۔"

رابعہ نے میری سوچ کی سمت بدل دی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ خطرے میں شہلا کی زندگی ہے تو مجھے پہلے اس کی فکر کرنی چاہیے۔ ابھی الماس کی طرف ڈی سلوا کا دھیان کیسے جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی شہلا کو قائل کرنے کے لیے ضروری تھی لیکن یہ ناممکن نہیں تھا کہ شہلا اس کے بغیر ہی قائل ہو جائے۔ بصورتِ دیگر ہم الماس کو شہلا کے روبرو کر سکتے ہیں۔ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کے گلبرگ جاتے ہوئے میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ دروازہ بند پا کے لوٹ آنے کا خیال میرے لیے ناقابلِ قبول تھا لیکن میں نے اس کا اظہار رابعہ پر نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور ہم ایک "بائی لین" تک پیدل گئے۔ متمول لوگوں کی یہ بستی ویران پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں انسان نہیں رہتے کاریں رہتی ہیں جو ہر گھر کے سامنے کھڑی تھیں اور مسلسل آ جا رہی تھیں۔ بستی کے مکیں اپنے پرتکلف، پرآسائش گھروں کے بیڈ روم میں محوِ استراحت تھے۔ ڈائننگ روم میں انواع واقسام کے کھانوں سے ڈنر ٹیبل سجائے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی مدارات کر رہے تھے یا ٹیلی وژن پروگرام دیکھنے میں محو تھے۔ ایک ایک اور دو دو کنال کی شاندار کوٹھیاں مکمل..... لاتعلقی اور غرور کے ساتھ ایک دوسرے سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ان کے اندر رہنے والے ہمسائیگی کے احساس سے دور تھے۔ کسی فرم کے منیجر کی سیکرٹری کا اپنی قلیل تنخواہ کے ساتھ یہاں رہنا بعید از قیاس تھا لیکن شہلا کے بارے میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس کے اخراجات کی عاشقانہ ذمے داری ڈی سلوا نے قبول کر رکھی ہوگی یا خود شہلا کو بھی اس ناجائز کاروبار کی آمدنی میں شریکِ کار کی حیثیت سے معقول منافع مل رہا ہوگا۔ شہلا کا گھر دس مرلے پر تھا مگر اس کے باوجود نیا اور خوبصورت تھا۔ گیٹ لائٹس آف تھیں لیکن پورچ میں روشنی تھی جہاں ہنڈا سوک اور ایک پرانی فیئٹ کار کھڑی تھی۔ دروازے کے باہر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی مگر کال بیل کا بٹن موجود تھا۔

"معلوم نہیں یہ کار کس کی ہے؟" میں نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا۔" اگر مہمان موجود ہوئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"کار شہلا کی بھی تو ہو سکتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ میں نے سر ہلایا اور پش بٹن پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈ بعد گیٹ

سلسلے کتابی شکل میں

شیخ کرامت کی سرگزشت جو اس نے بسترِ مرگ پر بیان کی
ہمزاد
(مکمل)
قیمت ۲۰ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے
○ ایک پُراسرار شخصیت کی کہانی جس کیلیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا
○ اُس شخص کا قصہ جس کے چہرے کی عمر ۱۳۰ سال تھی اور بقیہ جسم کی عمر ۲۵ سال
○ ہمزاد مسخر کرنے کے طریقے۔

ہر دل عزیز شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے ایک سنسنی خیز سرگزشت
جال
(مکمل)
قیمت ۱۵ روپے
ڈاک خرچ ۵ روپے
○ ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔
○ جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔
○ دُنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں۔
○ اس پر نہ کوئی گولی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

دونوں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

لائٹ جل گئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گھنٹی کی آواز جو باہر سنائی نہیں دی تھی اندر کسی نے سن لی ہے۔ پھر میں نے کار کے عقب سے شہلا کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میں پیچھے ہٹ گیا اور رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکال لیا۔ شہلا نے گیٹ کو تھوڑا سا کھول کے رابعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ رابعہ نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔" شہلا نے کارڈ کو دیکھ کر کہا۔ "آپ سکندر بخت کی وکالت کر رہی ہیں نا؟ پھر یہاں کس لیے تشریف لائی ہیں؟"

"مجھے تم سے بات کرنی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور بات ایسی تھی کہ...!"

"بات کچھ بھی ہو۔" شہلا نے کہا۔ "میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"لیکن اس بات کا تعلق سکندر بخت سے نہیں، تمہاری اپنی ذات سے ہے۔ یہ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

"میں کوئی بات یہاں کرنے کے لیے تیار نہیں۔" شہلا نے بے رخی سے کہا۔ "نہ نفع کی نہ نقصان کی۔ تم چاہو تو کل دفتر آسکتی ہو۔"

"یہ بات دفتر میں کرنی ہوتی تو میں تمہیں گھر سے فون کر لیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔" شہلا نے کہا اور گیٹ بند کرنا چاہا۔ اسی وقت میں سایۂ دیوار سے نکل آیا اور میں نے اس کی کوشش ناکام بنادی۔ گیٹ کو ذرا سا دھکیلنے سے شہلا پیچھے ہٹی۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا اور میرے ایک ہاتھ نے اس کی آواز کو حلق سے نہیں نکلنے دیا۔ میرا یہ اقدام رابعہ کے لیے بالکل غیر متوقع تھا مگر اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گیٹ کو اندر سے بند کر دیا۔

"ہم بات کرنے آئے ہیں تو بات کر کے ہی جائیں گے مس شہلا!" میں نے کہا۔ "تم جانتی ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں۔"

اسے یقیناً میری اور ڈی سلوا کی ملاقاتیں یاد آگئی ہوں گی کیونکہ اس نے خود کو چھڑانے کی معمولی سی جدوجہد کے بعد مزاحمت ترک کر دی۔

"میں اس شخص کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں جسے آج تم نے زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔" میں نے شہلا کے منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے بغیر کہا۔ "میں نے تمہیں نرس کے لباس میں بھی پہچان لیا تھا مس شہلا! ابھی تک یہ بات کسی کو معلوم نہیں لیکن تم نے میری بات نہ سنی تو زمانہ سنے گا، پولیس سنے گی اور وہ بدمعاش بھی سنے گا جس کی خاطر تم نے عاقبت نااندیشی کا یہ ثبوت دیا ہے کیونکہ تمہیں یقین تھا کہ وہ تمہیں بچالے گا۔ وہ تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا مس شہلا! مجھ سے بات کر کے تم بچ سکتی ہو ورنہ وہ خود تمہیں مار ڈالے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے، میں نے تمہیں شناخت کر لیا ہے۔ اگر تم اطمینان سے میری بات سننے کا اور شور نہ مچانے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں ورنہ یقین کرو میں تم کو یہیں سے اٹھا کے لے جاؤں گا اور وہ سب کچھ ضرور کہہ دوں گا جو مجھے کہنا ہے۔"

شہلا نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس پر اپنی گرفت کم کی۔ شہلا نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ پھر اس نے سر کو ایک سرکش ادا سے جھٹک کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "تم واقعی بہادر ہو۔ افسوس یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے جو زورِ بازو سے تمہیں منہ توڑ جواب دے سکے۔ اس لیے یہ وعدہ کرو کہ بات زبان سے کرو گے، ہاتھوں سے نہیں۔"

"اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے تم سے یا کسی اور سے خطرہ محسوس ہوا تو میں اس کا سدِباب ضرور کروں گا۔" میں نے اطمینان سے ریوالور نکالا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔ "میرے حفاظتی اقدامات مکمل ہیں، اس لیے تم اپنی یا کسی اور کی زندگی کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہ کرنا۔ ہم ایسے دوستانہ ماحول میں بھی بات کر سکتے ہیں کہ تمہاری ماں اور چھوٹے بھائی کو بھی پتہ نہ چلے اور تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ ان کو کچھ معلوم نہ ہو ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔"

ریوالور دیکھتے ہی شہلا کا رنگ فق ہو گیا تھا اور خود رابعہ چلتے چلتے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ "ہم تمہارے دوست بن کر آئے ہیں شہلا! دشمن بن کر نہیں۔" رابعہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یقین کرو یا نہ کرو۔"

شہلا کے ساتھ ہم ایک ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے جو زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر خوبصورت اسبابِ آرائش اور فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ "یہاں کسی کے آنے کا امکان تو نہیں ہے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میری ماں یا بھائی جاگ رہے ہوتے تو ضرور آتے۔" شہلا مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "بھائی سرِشام سو جانے کا عادی ہے، ماں بیمار ہے۔"

"باہر سے بھی کوئی آئے گا تو تم سے پہلے ہم دیکھیں

گے کہ آنے والا ڈی سلوا تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم بہت بے وقوف ہو مس شہلا! وہ یہاں آئے گا تو تمہیں قتل کرنے کے لیے کیونکہ اس کے لیے تمہاری افادیت ختم ہو چکی ہے۔ الٹا تمہارا وجود اس کے لیے باعثِ خطر ہے۔"

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے ڈی سلوا سے بدظن نہیں کر سکتے۔" شہلا نے کھڑے کھڑے کہا۔ "اس سے حسد کرنے والے بہت ہیں اور تم تو اس کے دشمن ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں مگر میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اور نہ تم دشمنی کا سبب ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو جذبات نے اندھا کر دیا ہے، اس لیے تم ڈی سلوا کا اصل چہرہ دیکھنے سے قاصر ہو۔ تمہیں اس کی محبت کے وعدوں پر یقین ہے لیکن ایسے ہی وعدے وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں سے کر چکا ہے۔ میں تمہیں ان سب سے ملوا سکتا ہوں۔ وہ تمہیں بتائیں گی کہ ڈی سلوا نے ان کے ساتھ کیا دھوکا کیا، کس طرح ان کو سنہرے خوابوں اور میٹھی میٹھی باتوں کے جال میں گرفتار کیا اور ان کو عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو گئیں۔ پھر تمہاری طرح ان سے بھی کوئی ایسا جرم سرزد ہوا کہ ڈی سلوا نے ان کو بلیک میل کیا۔ وہ اپنے تمام وعدوں سے پھر گیا اور ان لڑکیوں کو نکال باہر کیا۔ وہ رونے دھونے کے سوا کچھ نہ کر سکیں کیونکہ وہ مجبور تھیں۔ ڈی سلوا کا آلۂ کار بن کے وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہو گئی تھیں۔"

"لیکن... لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ "مجھے کوئی کیسے بلیک میل کر سکتا ہے؟"

"یہ جھوٹ تم اتنی بے باکی سے میرے سامنے تو بول سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن پولیس کے پاس اقبالِ جرم کرانے کے لیے صرف ہاتھ نہیں ہوتے اور وہ باتوں یا لاتوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے، مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ تم تو ایک عورت ہو، تمہاری قوتِ مزاحمت تو ریت کی دیوار سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہو گی۔ وقتی طور پر تم نرس کے لباس میں ان سب کی نظروں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئی تھیں جنہوں نے تم کو پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن تمہاری بدقسمتی کہ عین وقت پر میں پہنچ گیا اور میں نے تمہیں ارتکابِ جرم کرتے دیکھ لیا۔ تم نے اس بوڑھے گورکن کو دیے جانے والے گلوکوز میں سائنائیڈ ملا دیا تھا، ایک انجکشن کے ذریعے۔ بڈھا مر چکا ہے اور اس کی موت کا سبب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ تمہارے جائے واردات سے فرار ہونے کے بعد بڈھے کی موت ایک معمّا بن گئی تھی اور الزام ان پر آرہا تھا جو اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ یقیناً کامیاب ہو جاتے۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو ڈی سلوا تمہیں ایسے سنگین اقدام پر مجبور نہ کرتا۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" شہلا نے بازو کا سہارا لیا اور صوفے پر ٹک گئی۔ "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔"

"غلط فہمی؟" میں ہنسا۔ "پہلے تو مجھے یاد ہی نہیں آیا تھا کہ ایک نرس کی صورت مجھے جانی پہچانی کیوں لگی تھی اور جب وہ نرس پُراسرار طور پر غائب ہو گئی جس کا عملے سے کوئی تعلق نہیں تھا تو مجھے اچانک یاد آگیا کہ نرس کے بھیس میں تم اپنا کام کر گئی ہو۔ اب تک اس کمرے میں سے سب کے فنگر پرنٹ لے لیے گئے ہوں گے۔ اگر ان میں تمہارے فنگر پرنٹ بھی ملے تو تم کیسے انکار کرو گی کہ تم نے اس کمرے میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے اپنے شک کا اظہار کر دیا تھا، اس لیے پولیس موازنے کے لیے تمہارے فنگر پرنٹ لینے ضرور آئے گی۔"

"پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" شہلا نے ہسٹریائی لہجے میں کہا۔ "تم ڈی سلوا کو نہیں جانتے۔"

"میں یا اسے تم نہیں جانتیں مس شہلا!" میں نے طنز اور تلخی سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اب تک وہ تم کو یہ سب کچھ بتا چکا ہو گا لیکن وہ ابھی تک آیا نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پورا بندوبست کر کے آئے۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا مس شہلا! کیا ضرورت ہے اسے اپنی سیکرٹری کے لیے بدنام ہونے کی۔ وہ اپنا اثر و رسوخ، اپنے تعلقات اور اپنی دولت تم جیسی لڑکیوں کو بچانے میں کیوں صرف کرے گا جو ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں؟ پہلے بھی ملتی رہی ہیں اور آئندہ بھی ملتی رہیں گی۔ وہ اپنا دامن بچائے گا اور اس کے لیے تمہارا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"تم جھوٹ کہتے ہو، تم مجھے دہشت زدہ کرنے آئے ہو۔ ڈی سلوا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شادی کے بعد ہم اس ملک سے ہی چلے جائیں گے۔ ڈی سلوا کو ہر جگہ بڑی اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔" وہ ہسٹیریا سے مغلوب ہونے لگی تھی۔ "تمہارے یا پولیس کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم اعتبار نہیں کرو گی۔ اعتبار تو تمہیں اس وقت آئے گا جب ڈی سلوا خود تمہارے خلاف گواہی دے گا۔" میں نے اپنے لہجے کے طنز کو برقرار رکھا۔ "وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ لگا کہ مجھے تو اس لڑکی کے کردار پر ابتدا ہی سے شبہ تھا اور میں اسے برطرف کرنے والا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے ایک بوڑھے گورکن کو کیوں قتل کیا۔ یہ نرس کا لباس کہاں سے لائی اور اس نے سائنائڈ کیسے حاصل کرلیا۔ میرا تو اس سے تعلق دفتری معاملات کی حد تک تھا اور اب وہ بھی نہیں۔ آپ کو اختیار ہے جیسے چاہیں تفتیش کریں۔ مس شہلا! وہ عزت دار آدمی ہے۔ اپنے اثر ورسوخ اور اپنے پیسے کی طاقت کو اپنی عزت داری کا بھرم رکھنے کے لیے استعمال کرے گا، تمہارے بچاؤ کے لیے نہیں۔ کل تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی لے لے گی، جیسے تم سے پہلے بہت سی آئیں اور چلی گئیں اور وہ ان سب کو بھول گیا۔ اب شاید اسے کسی کا نام تک یاد نہ آتا ہوگا۔ ایسے ہی تم بھی اس کے لیے ایک داستانِ ماضی بن جاؤ گی۔ تمام عمر اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتی رہو گی جو پوری نہ ہوئیں اور اپنی جذباتی حماقت پر احساسِ پشیمانی میں مبتلا رہو گی اور ایک جھوٹے دغاباز اور مکار آدمی سے انتقام لینے کی خواہش میں تڑپتی رہو گی مگر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی۔ مگر یہ سب کچھ بھی اس وقت ہوگا جب تمہیں جینے کی مہلت ملے۔ سب سے پہلے تو خود ڈی سلوا تمہارے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا لیکن اس نے کچھ نہ کیا تب بھی قانون کے لمبے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچ جائیں گے اور ڈی سلوا... وہ قانون کے ساتھ ہوگا تمہارے ساتھ پیرس یا سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون نہیں منا رہا ہوگا۔"

میں نے نوٹ کرلیا تھا کہ شہلا کے ذہن کی مزاحمت بھی ختم ہونے لگی ہے اور جذبات پر عقل کے دلائل غالب آنے لگے ہیں۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تلخ حقائق کو سمجھنے اور قبول کرنے کی بھرپور سعی کر رہی تھی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ، جذبات سے عاری اور لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں وہ بیہوش نہ ہو جائے۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا کہ... کہ جو کچھ تم نے ڈی سلوا کے بارے میں کہا ہے وہ تمہاری ذاتی دشمنی کے جذبات پر مبنی نہیں ہے؟" اس نے بمشکل تمام کہا۔ "میں کیسے مان لوں؟"

"ثبوت تو وہ لڑکیاں بھی فراہم کرسکتی ہیں جو ڈی سلوا کی بے ضمیری کا شکار ہوئیں، لیکن تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہت جلد۔ شاید آج ہی رات کو وہ خود تمہیں ثبوت فراہم کرنے آئے گا۔"

اور اس وقت ایک حیرت انگیز اتفاق ہوا۔ باہر سے کسی کار کے اندر آ کر رکنے کی آواز آئی۔

"غالباً وہ آگیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اسے بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یہاں ہیں۔ اگر تم تھوڑے سے صبر و تحمل سے کام لو تو وہ خود ان سب باتوں کی تصدیق کردے گا۔"

"تم اس ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ۔ خدا کے لیے جلدی کرو۔" شہلا گھبرا کے بولی۔

"یہ بات یاد رکھنا کہ ڈی سلوا کے آنے کا مقصد غلط بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے رابعہ کے ہمراہ ساتھ والے کمرے میں غائب ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن ڈرنا نہیں اور بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کرنا۔ ہمارے ہوتے ہوئے ڈی سلوا تمہیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔" شہلا نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھی جس پر ڈی سلوا مسلسل دستک دے رہا تھا۔ وہ اسی طرح خود گیٹ کھول کر اندر پہنچ جانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب شہلا نے دروازہ کھولا تو ہم ڈرائنگ روم سے متصل کمرے کی تاریکی میں روپوش ہو چکے تھے لیکن ڈرائنگ روم کا پورا منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد و مقبول سلسلہ
شکاری
دوسرا حصّہ

سوئیاں تھے پیوست گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

○ ○

معاشرے کے ان ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سلگتی راتیں۔ یاس و یاس خوف و ہراس۔ شیریں خواب تلخ حقیقتیں

○

نئی سوچ، نیا رنگ، نیا لہجہ، نیا آہنگ

"کیا بات ہے؟" ڈی سلوا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "تم سو رہی تھیں یا رو رہی تھیں؟ یا دونوں کام ایک ساتھ کر رہی تھیں؟"

"میں... دراصل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" شہلا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور زبردستی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"تمہاری حالت سے تو یہ لگتا ہے کہ تم برسوں کی بیمار ہو۔" ڈی سلوا بے تکلفی سے ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ "یا خدانخواستہ کوئی بھوت وغیرہ دیکھ لیا ہے۔"

"پریشانی تو مجھے تمہارے چہرے پر بھی نظر آ رہی ہے۔ خیریت تو ہے نا؟" شہلا بولی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی، ورنہ وہ ڈی سلوا کے اندر قدم رکھتے ہی اس کو ہمارے بارے میں بتا دیتی تو مجھے فوراً سامنے آنا پڑتا۔ میری باتوں نے شہلا کو اس حد تک ضرور قائل کر لیا تھا کہ وہ خود ڈی سلوا کی زبان سے کچھ سننا چاہتی تھی۔

"پریشانی تو پیدا ہو گئی ہے ڈیئر!" ڈی سلوا نے جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ اس کے ماتھے پر تفکرات کی ہر شکن اس کے ذہنی انتشار کی آئینہ دار تھی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بناتا رہا اور انہیں اوپر اٹھ کے ہوا میں بکھرتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"پریشانی بہت بڑی ہے شہلا ڈارلنگ! اس الو کے پٹھے نے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" شہلا نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود معصومیت سے کہا۔

"وہ بدمعاش سکندر بخت۔" اس نے پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں وہ ہسپتال کیسے آ پہنچا اور اس نے عین وقت پر تمہیں دیکھ لیا۔"

"میں تو اس کے آتے ہی نکل گئی تھی۔" شہلا نے گھبرا کے کہا۔ "اس کی طرف میری پشت تھی۔ اس نے میری صورت کہاں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ میرا لباس..."

"یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے۔" ڈی سلوا نے برہمی سے کہا۔ "وہ بہت چالاک شخص ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہوا، لیکن اس نے تمہارے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لی اور پہچان گیا۔ زیادہ گڑبڑ اس لیے ہوئی کہ اس کمرے میں ڈاکٹروں کے ساتھ صرف دو نرسیں تھیں۔ تیسری کوئی نہیں تھی لیکن سکندر نے اور اس کے ساتھ آنے والے مجسٹریٹ نے اصرار کیا کہ نرسیں تین تھیں۔ تمہارے غائب ہو جانے سے معاملہ اور پُراسرار ہو گیا۔ میں سکندر بخت کو تو جھٹلا دیتا مگر اس مجسٹریٹ کو کیسے جھٹلاتا۔ اب قتل کا مقدمہ درج کر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیا گیا ہے، جس میں ہسپتال کے عملے کے ساتھ میں اور تم بھی ملوث ہو گئے ہیں۔"

"وہ کیسے ڈی سلوا؟" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اب وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی خوفزدہ تھی۔

"وہ ایسے کہ سکندر نے براہِ راست مجھ پر شبے کا اظہار کیا۔" ڈی سلوا کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ اس کی حرکات و سکنات سے شدید بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔ "مجھ پر وہ کیا ثابت کرے گا لیکن تمہارا نام لے کر اس نے مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے اور تمہارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے اور یہ سب تمہاری تھوڑی سی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے۔ کیا تم یہ کام جلدی ختم کر کے وہاں سے نہیں نکل سکتی تھیں؟ کیا ضرورت تھی اتنی دیر کرنے کی؟" اس کے لہجے پر جھنجھلاہٹ غالب تھی۔ "دو منٹ کا کام تھا۔"

"لیکن ڈی سلوا میں سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم کیسے اٹھاتی؟" شہلا نے کہا۔ "دو منٹ کا کام بھی اتنا آسان تو نہیں تھا۔ میں مناسب موقع کے انتظار میں رہی۔"

"خاک انتظار میں رہیں۔" ڈی سلوا مشتعل ہو کے بولا۔ "اگر تمہیں موقع کا خیال ہوتا تو تم ایسے وقت میں نہ جاتیں جب وہاں پہلے سے دو نرسیں موجود تھیں۔ اگر دو کے بجائے تین کا چکر نہ ہوتا تو الزام تمہارے بجائے ان دونوں نرسوں یا دونوں ڈاکٹروں پر آجاتا مگر اب وہ شک کی بنا پر صاف بچ گئے ہیں کیونکہ ایک تیسری نرس کی موجودگی کا گواہ خود مجسٹریٹ ہے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ فرائض میں غفلت برتنے کا یا بے پروائی کا الزام آجائے گا لیکن میں جانتا ہوں اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ نرسوں کی حمایت ڈاکٹر کریں گے اور ڈاکٹروں کے خلاف قتل کا الزام ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ پھنس جاؤ گی تم، جس کا نام سکندر نے لکھوا دیا ہے۔"

"لیکن کسی کے کہنے سے تو کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ قتل کے الزام کو ثابت بھی کرنا پڑتا ہے۔" شہلا نے مردہ آواز میں کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" ڈی سلوا نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کر جوتے کی ایڑی سے مسل دیا۔ "ایک قانون وہ ہے جو کتابوں میں لکھا ہے۔ دوسرا قانون پولیس کا اپنا وضع کردہ ہے انہیں اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں شک میں پکڑ لیں، اور تفتیش کے لیے تھانے لے جائیں، خصوصاً قتل جیسے سنگین کیس میں۔ تمہیں معلوم ہے تھانہ کیا ہوتا ہے اور وہاں تفتیش کیسے کی جاتی ہے؟ وہاں وہ لندن یا امریکی پولیس کے افسر در سراغ رساں نہیں بیٹھے ہیں، جلاد بیٹھے ہیں جو کسی بھی شخص سے کسی بھی جرم کا اعتراف کرا سکتے ہیں۔ تم کیا اور تمہاری اوقات کیا۔ بڑے بڑے جی دار اور پیشہ ور قسم کے بدمعاش ایک رات کا عذاب نہیں جھیل سکتے۔ تم فوراً سب کچھ تسلیم کر لو گی اور اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گی۔"

"لیکن... لیکن تم نے تو... تم نے تو کہا تھا کہ پولیس کچھ نہیں کر سکتی۔" شہلا پر بُری طرح دہشت سوار تھی۔ "تم نے کہا تھا کہ میرے بہت تعلقات ہیں اور میں پیسے سے سب کا منہ بند کر سکتا ہوں۔"

"ہاں لیکن اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اپنی حماقت کے باعث سکندر بخت کے سامنے آجاؤ گی۔" ڈی سلوا نے مشتعل ہو کے کہا۔ "میں نے تمہیں ایک نرس کی یونیفارم فراہم کی۔ زہر لا کے دیا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھے اگر تم نے ذرا بھی عقل اور احتیاط سے کام لیا ہوتا..."

"میں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط کی تھی۔" شہلا نے دونوں ہاتھوں میں منہ کو چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ سکندر ایک مجسٹریٹ کے ساتھ وہاں پہنچ جائے گا۔ مجھے تم پر بھروسہ تھا۔"

"دیکھو یہ رونے دھونے کا ڈرامہ مت کرو۔" ڈی سلوا چراغ پا ہو کے بولا۔ "تمہاری وجہ سے میں بھی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اس کیس میں میرا نام بھی آجائے گا تو میری کتنی بدنامی ہو گی۔ ایف آئی آر سے نام خارج کرانا کوئی آسان کام ہے؟"

"یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ معاملہ الٹا گلے بھی پڑ سکتا ہے۔" شہلا نے روتے روتے سر اٹھایا۔ "مجھے بتاؤ کہ اس بڈھے گورکن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو ویسے بھی لبِ گور تھا؟"

"اگر میں اسے نہ مرواتا تو خود مارا جاتا اور پہلے خود میں نے ہی کوشش کی تھی مگر وہ خبیث قبر میں دفن ہونے کے بعد بھی زندہ نکل آیا اور میرے لیے جان کا خطرہ بن گیا۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"چنانچہ تم نے اپنی جان کا خطرہ میری جان کو منتقل کر دیا۔" شہلا نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "میں نے تمہارے لیے سب کچھ کیا اور اب تم مجھے ہی الزام دے رہے ہو کہ غلطی میں نے کی؟ مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ تمہیں ایف آئی آر میں سے اپنا نام خارج کرانے کی فکر ہے لیکن میرے انجام کی فکر نہیں ہے۔ نہیں ڈی سلوا! یہ قتل تمہارے ایما پر ہوا ہے۔ تم بھی برابر کے شریکِ جرم ہو۔ پھانسی کے تختے تک تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

میں اور رابعہ دم سادھے یہ سب گفتگو سن رہے تھے اور اس جھری میں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے جو نیم وا دروازے کے درمیان تھی۔ نتائج میری توقعات سے بہتر نکلے تھے اور مجھے افسوس تھا تو ایک ٹیپ ریکارڈر کے موجود نہ ہونے کا، ورنہ میں اس پورے اعتراف جرم کو ریکارڈ کر لیتا۔ شہلا کی بات کا ردعمل فوراً ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑ گیا مگر اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ "دیکھو ڈیئر! یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے ایسے حل نہیں ہو گا۔" وہ شہلا کے پاس بیٹھ کے بولا۔ اب اس کا لہجہ قطعی بدلا ہوا تھا۔ اس کا غصہ کافور ہو گیا تھا اور یہ تبدیلی بے سبب نہیں تھی۔ ڈی سلوا جانتا تھا کہ شہلا کا ایک بیان اسے تباہ کر سکتا ہے۔ "تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے آنے سے پہلے پولیس یہاں نہ پہنچ چکی ہو۔ میں نے اور دلاور نے کہہ دیا تھا کہ دفتری فائلوں میں مس شہلا کا پرانا پتہ لکھا ہوا ہے۔ حال ہی میں وہ بادامی باغ کے علاقے سے گلبرگ کی طرف کہیں چلی گئی ہے جو کوئی غلط بات بھی نہیں مگر یہ پولیس والے بڑے کائیاں لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں وہ اسی وقت نارمل ہو جائیں۔ میری کار باہر کھڑی ہے، میں کیا جواز پیش کروں گا اس وقت یہاں اپنی موجودگی کا؟ میں تو کہہ چکا ہوں کہ مجھے مس شہلا زیدی کا پتہ معلوم نہیں ہے اور میرا ان سے تعلق بھی دفتر کی حد تک ہے۔"

"شہلا زیدی؟" رابعہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ تو مسلمان ہے۔"

"عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" میں نے جواباً کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "خدا کے لیے خاموش رہو۔"

"تمہارے پاس آج رات کی مہلت ہے شہلا۔" ڈی سلوا نے دوسری سگریٹ جلا کے اپنی بات جاری رکھی۔ "ظاہر ہے کہ تم صبح دفتر آؤ گی تو گرفتار ہو جاؤ گی اور معاملہ سنگین ہو جائے گا۔ کیونکہ جہاں تک مجھے یقین ہے تم نے اسپتال میں اس کمرے کے اندر کہیں نہ کہیں اپنے فنگر پرنٹ ضرور چھوڑے ہوں گے۔ تم نے دستانے پہننے کی احتیاط جو نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ دفتر کے کچھ لوگ تمہارے نئے پتے سے ضرور واقف ہوں گے۔"

"نیا پتہ تو خود میں نے اپنی پرسنل فائل پر لکھ دیا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ صبح پولیس یہاں بھی آپہنچے گی۔" ڈی سلوا نے فکرمندی سے کہا۔ "دفتر کھلنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تم غائب ہو جاؤ۔"

"غائب ہو جاؤں؟" شہلا نے بے یقینی سے دہرایا۔ "کہاں؟ اور کیسے؟ میں اکیلی تو نہیں ہوں۔ میرے ساتھ وہ بھی ہیں جن کو میں اپنی ماں اور اپنا بھائی کہتی ہوں۔"

"مگر تم جانتی ہو کہ وہ تمہارے کچھ بھی نہیں ہیں۔" ڈی سلوا نے چڑ کر کہا۔ "تمہیں ان کی فکر کیوں ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنی جان بچاؤ۔ وہ تمہارے والدین کے ادنیٰ ملازم تھے۔"

"میں اتنی کم ظرف اور بے ضمیر نہیں ہوں ڈی سلوا۔" شہلا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس وقت جب دنیا میں میرا کوئی نہ تھا، سوائے میری جان کے دشمنوں کے جو میری جائداد ہتھیانا چاہتے تھے، تو انہی نمک خواروں نے میری جان بچائی اور مجھے زندہ رکھا۔ آج بھی جب میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں اور بالغ ہو چکی ہوں، میں ان سہاروں کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ تمہارا یہ مہذب معاشرہ اکیلی عورت کو عزت سے جینے کا حق نہیں دیتا۔ انہوں نے مجھے ماں کا اور بھائی کا پیار ہی نہیں دیا تحفظ بھی فراہم کیا ہے۔ مجھے بتاؤ اگر میرے آس پاس رہنے والے شریف اور عزت دار لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں ایک نوکرانی اور اس کے لڑکے کے ساتھ اس کوٹھی میں اکیلی رہتی ہوں تو کیا وہ مجھے یہاں اسی طرح رہنے دیتے؟ کبھی نہیں۔ اب تک نہ جانے کتنے ہوس پرست ہاتھ میرے دامنِ عزت کو تار تار کرنے کے لیے بڑھ چکے ہوتے۔ مشہور کر دیا جاتا کہ میں بدکردار اور فاحشہ ہوں۔ قحبہ خانہ چلاتی ہوں اور نوکری کے نہیں عزت بیچنے جاتی ہوں اور یہ جائداد جو میرے باپ نے چھوڑی تھی حرام کی کمائی کا نتیجہ ہے حالانکہ اس کی مالک بھی میں انہی کے طفیل ہوں جن کے بارے میں تم کہہ رہے ہو کہ میں ان کو چھوڑ کے اپنی فکر کروں۔ مجھے بتاؤ کیا بعد میں پولیس ان کو پریشان نہیں کرے گی؟ محلے والے تو کہیں گے کہ یہ شہلا کی ماں ہے اور اگر میں ان سب کے ساتھ غائب ہو جاؤں تو غائب ہو کے کہاں جاؤں؟ مجھے مفرور قرار دے دیا جائے گا۔ پولیس آفس سے میری تصویر حاصل کرے گی اور ہر اخبار میں دے دے گی۔ میں کب تک چھپی رہ سکوں گی؟"

ڈی سلوا کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ "پھر تم کیا کرو گی؟ انتظار کرو گی کہ پولیس آئے اور تمہیں لے جائے؟"

"اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "باقی تو تمہیں کرنا ہے جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔" ڈی سلوا نے بھڑک کر کہا۔

غیر متوقع طور پر اور اچانک شہلا کا تھپڑ ڈی سلوا کے چہرے پر پڑا۔ "ذلیل... کمینے... اتنی جلدی سارے وعدے بھول گیا؟" لیکن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈی سلوا کا بھرپور ہاتھ شہلا کے منہ پر لگا اور وہ صوفے سے نیچے جا گری۔ اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرایا۔

"ذلیل لڑکی!" ڈی سلوا نے حقارت اور نفرت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ "تجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میرا اپنی سیکرٹری کی نجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔"

شہلا زخم خوردہ ناگن کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی۔ "بدمعاش کتے! میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس قتل پر تو نے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا سکتی ہوں..."

ڈی سلوا نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور دیوار سے ٹکرائی۔ سنبھلنے کی کوشش میں اس کا ہاتھ کونے کے اونچے اسٹول پر لگا جس پر وینس کا مجسمہ بڑے وقار، اندازِ تمکنت اور بے حسی کے ساتھ استادہ تھا۔ پلک جھپکتے میں شہلا نے گرتے ہوئے مجسمے کو پکڑ لیا اور ڈی سلوا پر کھینچ مارا مگر اس کا نشانہ خطا گیا اور دیوار سے ٹکرانے والا مجسمہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ ڈی سلوا اتنی دیر میں ریوالور نکال چکا تھا۔ "بھونکنے سے پہلے ہی میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا کتیا! اور پولیس میرے بیان پر یقین کرے گی کہ کسی آشنا نے تجھے رقابت میں یا انتقام کی خاطر مار ڈالا ہوگا کیونکہ تو اپنی نوکرانی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔"

"بس مسٹر ڈی سلوا!" میں نے دروازے کے پیچھے سے کہا۔ "اب اپنا ریوالور نیچے پھینک دو کیونکہ تم براہِ راست میرے نشانے کی زد میں ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو میں تمہاری کھوپڑی کے پرخچے اڑا دوں گا اور یہاں سے نکل جاؤں گا۔ یہ معمہ بعد میں پولیس حل کرتی رہے گی کہ تم اپنی کار میں اکیلے یہاں کیوں آئے تھے۔ قانوناً مس شہلا کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عزت پر حملہ آور ہونے والے کسی بھی شخص کو گولی مار دیں۔ میرے ہاتھ میں جو ریوالور ہے وہ مس شہلا زیدی کا ہی ہے۔" یہ آخری بات جھوٹ تھی مگر یہ جھوٹ ناگزیر تھا۔ ڈی سلوا میری آواز پر یوں اچھلا تھا جیسے بے خبری میں کسی نے اس کے کان کے پاس فائر کر دیا ہو اور پھر اس طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا، جیسے وہ آدمی نہیں پتھر کا بے جان مجسمہ ہے۔ شہلا کے گھر میں میری موجودگی کا تصور کرنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اسے بہت دیر تک یقین نہ آیا کہ میری آواز اور میرے الفاظ اس کے کانوں کا دھوکا نہیں ہیں۔ پھر اس نے شہلا کو مسکراتے دیکھا۔ اس مسکراہٹ میں نفرت کا جتنا زہر تھا اور جتنی حقارت تھی اس نے ڈی سلوا کو اس تمام صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کے سوا کیا سمجھ سکتا تھا کہ شہلا نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ میرے ورغلانے پر یا از خود ڈی سلوا کی اصلیت کو سمجھ لینے کے بعد وہ اس کے دشمنوں سے مل گئی ہے مگر اب وہ نہ شہلا سے کوئی شکایت کر سکتا تھا اور نہ اسے کسی قسم کا الزام دے سکتا تھا۔ پہل خود اس نے کی تھی اور تقدیر کی ایک غلط چال نے صورتحال کو یک لخت اس کے خلاف کر دیا تھا۔ صیاد خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور میں دروازے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ پھر وہ ہوا جس کی مجھے ذرا بھی امید نہ تھی۔ ڈی سلوا نے انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک جست لگائی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اگر مجھے ریوالور کے فائر کی آواز سے دوسروں کے متوجہ ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بلا تامل اسے گولی مار دیتا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ کے فرق سے وہ پہلے نکل گیا اور جاتے جاتے دروازے کو باہر سے بند کر گیا۔ میں اپنے ہی زور میں دروازے سے ٹکرایا۔ سنبھل کر اٹھنے اور کھڑکی کھول کر باہر کودنے میں مجھے مزید تیس سیکنڈ لگے ہوں گے مگر اتنی دیر میں ڈی سلوا اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا اور جب میں دوڑتا ہوا باہر نکلا تو اس کی کار کسی راکٹ کی طرح گیٹ کا رخ کر رہی تھی۔ ایک بار پھر میں نے ریوالور اٹھایا کہ کار کے پچھلے ٹائر کو برسٹ کر دوں مگر مجبوری کے خیال سے رک گیا۔ اگر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میرے لیے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے۔ میرے لیے شہلا کے گھر میں اپنی موجودگی کی وضاحت کرنا مشکل ہو جاتا اور ناجائز طور پر حاصل کردہ ریوالور سے ڈی سلوا پر گولی چلانے کی ضرورت کا جواز پیش کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہوتا۔

جب میں واپس کمرے میں آیا تو رابعہ نے شہلا کو سنبھال لیا تھا جو اس جذباتی بحران سے گزر کے اپنی تمام ذہنی و جسمانی توانائی زائل کر چکی تھی اور اب اس پر ہسٹریا کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور وہ آنکھیں موندے صوفے پر لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے۔"

میں نے ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ "کیسی عجیب بات ہے۔ شہلا کے گھر میں اتنا ہنگامہ ہوا اور کوئی دیکھنے تک نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "شہلا کی ماں نے بھی نہیں دیکھا۔"

"شہلا نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔" رابعہ بولی۔ "میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں تم یہاں شہلا کے پاس ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اندر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

ایک کمرہ تو وہی تھا جس میں رابعہ اور میں چھپے رہے تھے۔ لائٹ جلا کر دیکھنے پر مجھے دو دروازے نظر آئے۔ بائیں طرف کا دروازہ باہر کھلا ہوا تھا مجھے رات کا اندھیرا ہر سو محیط دکھائی دیا۔ میں نے اسے بند کیا اور دوسرے دروازے سے ایک بیڈ روم میں داخل ہوا جو غالباً شہلا کا بیڈ روم تھا۔ خوبصورت، پر تکلف اور حسن و آرائش کا مرقع۔ بالکل رابعہ کے کمرے کی طرح زنانہ استعمال کے سامان کی خوشبو سے بھرا ہوا۔ نسوانیت کے لطیف احساس سے معمور۔ کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ دو میں سے ایک دروازہ غالباً باتھ روم کا تھا۔ دوسرے دروازے کے نیچے روشنی کی ایک لکیر چمک رہی تھی۔ میں نے اس دروازے کو کھولا اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ یہ بھی ایک بیڈ روم تھا مگر اس میں ایک ضعیف عورت آنکھیں کھولے یوں پڑی تھی کہ پہلی ہی نظر میں اس کا وجود زندگی کی ہر علامت سے محروم لگتا تھا۔ وہ کم سے کم ستر سال کی تھی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اس کے بال بالکل سفید اور چاندی کے تار ہو گئے تھے اور عمرِ گزشتہ کا ہر سال اس کی صورت پر ایک شکن چھوڑ گیا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ مفلوج تھا چنانچہ وہ کسی سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر معذوروں والی وھیل چیئر موجود تھی۔ خوف اس کی کھلی آنکھوں میں ایک سوال بن گیا تھا۔

"تم... تم کون ہو؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری شہلا کہاں ہے؟"

"شہلا بالکل خیریت سے ہے ماں جی!" میں نے گھٹنوں کے بل اس کے پاس جھک کر کہا۔ "میں شہلا... کے پاس کام کرتا ہوں۔"

"کیا... عدنان آگیا ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔ "ابھی... ابھی میں نے کچھ آوازیں سنی تھیں۔"

"عدنان کون ہے ماں جی؟ ابھی تو ڈی سلوا آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔" میں نے اس کی کار کی آواز سنی تھی۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولی۔ "میں سمجھی عدنان پھر پی کے آ گیا ہے... خدا اسے ہدایت دے۔ میں اسے بددعا بھی تو نہیں دے سکتی۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ شہلا نے مجھ سے یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ گھر میں صرف اس کا بھائی ہے جو سرِ شام سو جانے کا عادی ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ گھر میں اس کے سوا صرف ایک معذور عورت ہے۔ وہ بھائی تھا یا نہیں تھا مگر وہ گھر کے اندر اس کی موجودگی کا نفسیاتی سہارا لینا چاہتی تھی۔ ایک معذور عورت اور اس کا بدچلن شرابی بیٹا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتا تب بھی کسی کا کیا بگاڑ لیتا مگر اس نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ اس کا محافظ بھائی گھر میں موجود ہے اور کسی بھی وقت اٹھ کے آ سکتا ہے۔ ہر غیرت مند بھائی کی طرح وہ بہن کی آبرو کا رکھوالا ہے۔ یہ تھا خوش شکل، خوش پوش اور خوش باش نظر آنے والی شہلا زیدی کی خوبصورت زندگی کا پس منظر۔ خون کے رشتے ختم ہو جانے کے بعد اس نے جذبات کے رشتوں کو استوار رکھا تھا مگر یہ رشتے بھی سوت کے دھاگے تھے۔ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ ناقابلِ اعتماد اور جھوٹے۔ مگر اس نے انہی

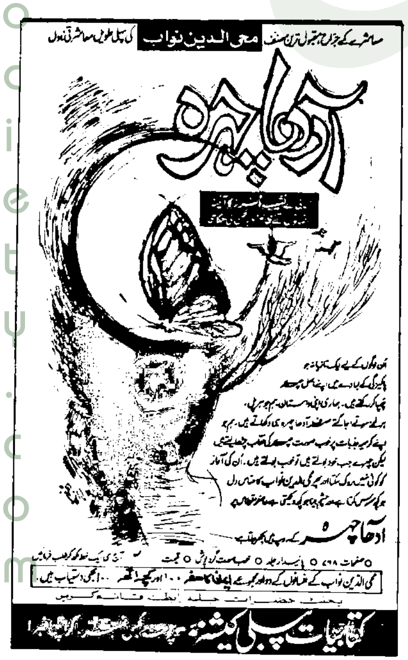

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کا بھرم رکھ کے زندگی سے مفاہمت کر لی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے خوبصورت گلرنگ اور ریشمی پردہ ہٹا کے گندی گلی کا منظر دیکھ لیا ہے جہاں غلاظت، تعفن اور پست ترین سطح پر جینے والی مخلوق کی زندگی کی تمام بدصورتی موجود ہے۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "کیا عدنان کو معلوم ہے کہ شہلا اس کی بہن نہیں ہے؟"

"کون کہتا ہے شہلا اس کی بہن نہیں ہے؟" میری بات نے جیسے اس بوڑھی عورت کے زخمِ دل پر انگارہ رکھ دیا۔ "وہ میری بیٹی ہے تو عدنان کی بہن ہی ہوئی نا۔" سمجھنے کا کیا مطلب؟ میں سمجھ گیا تھا کہ زندگی کے اس راز کو شہلا نے ڈی سلوا کے سوا کسی پر افشا نہیں کیا تھا۔ وہ ڈی سلوا پر کتنا اعتماد کرتی تھی اور ڈی سلوا کے بعد یہ بات صرف مجھے اور رابعہ کو معلوم ہوگئی تھی۔

"تم... اس نے بتا دیا ہے تم کو۔ یہ... شہلا نے اچھا نہیں کیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ بات معلوم ہو اگر ممکن ہوتا تو میں شہلا کو بھی پتہ نہ چلنے دیتی۔ جب اس کے والدین گھر میں آگ لگ جانے سے مر گئے تھے تو وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ عدنان چار سال کا تھا مگر شہلا کی عمر دس سال تھی۔ اسے سب یاد ہے حالانکہ تیرہ سال بیت چکے ہیں اس بات کو۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس عظیم عورت کی محبت اور مامتا کے جذبات کو سلام کیا۔ اس نے شہلا پر اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا اور شاید اسی لیے عدنان کے ہاتھوں شہلا کی عزت محفوظ رہی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں شراب کا عادی ہو جانے والا عدنان یقیناً صحبتِ بد میں تباہ ہوا تھا۔ اسے بُرے بھلے کی تمیز کہاں ہوگی۔ شاید وہ اس کوٹھی کو اور اس گھر کی ہر چیز کو باپ کی ملکیت سمجھتا ہوگا اور بہن کی کمائی پر اینڈتا ہوگا۔ قابلِ تعریف شہلا کا حوصلہ اور ظرف بھی تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو صاف جواب دے کر بڑی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ماں جی!" میں نے کہا۔ "آپ کو چند دن کے لیے یہاں سے جانا ہوگا، میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" وہ چلائی۔ "میں شہلا کو، اپنی بیٹی کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"شہلا آپ کے ساتھ چلے گی۔ ہمارے ساتھ رہے گی ماں جی! یہاں کچھ بدقماش لوگ اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔"

دروازے میں رابعہ کے ساتھ شہلا نمودار ہوئی۔ رابعہ نے اتنی دیر میں اس کو خاصا سنبھال لیا تھا اور شاید اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ ان حالات میں اس کا یہاں رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں! ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔" شہلا نے کہا۔ مایوسی اور افسردگی اس کی صورت سے بھی عیاں تھی۔

"مگر کیوں؟ آخر ہم کہاں جائیں گے؟" شہلا کی ماں نے ایک ہاتھ کے سہارے پر اٹھنا چاہا۔

اس وقت تک میں طے کر چکا تھا کہ شہلا کو اور اس کی ماں کو کہاں چھپایا جا سکتا ہے۔ رابعہ کی خادمہ کا گھر اس کے لیے موزوں ترین جگہ تھی۔

"میں نے شہلا سے کہا ہے کہ وہ ماسی کے گھر میں بالکل محفوظ رہے گی۔ رابعہ نے جیسے میرے خیالات کو پڑھ لیا۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈی سلوا واپس بھی آ سکتا ہے۔"

"لیکن مجھے کچھ تو بتاؤ کہ یہ دشمنی کرنے والے کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟" بوڑھی عورت نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اگر خطرہ کی کوئی بات ہے تو پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتے؟ ایسے گھر بار چھوڑ کے بھی کوئی بھاگتا ہے؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے ماں جی!" میں نے کہا۔ "اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ہم پر اعتماد کیجیے جیسے ہی حالات ٹھیک ہوئے ہم واپس آ جائیں گے۔"

"اور عدنان؟ اس کا کیا ہوگا؟ وہ کہاں جائے گا؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

یہ مسئلہ میرے ذہن میں بھی تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ ماں اپنے بیٹے کو خطرات میں تنہا چھوڑ کے جانے پر رضامند نہیں ہوگی اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا۔ "میں یہاں عدنان کا انتظار کروں گا۔" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اور اسے بعد میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ آپ رابعہ کے ساتھ جائیں۔"

"یہ تمہاری بیوی ہے؟" شہلا کی ماں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں وضاحت یا تردید کرتا، شہلا نے کہا۔ "ہاں اماں! اور یہ بہت بڑی وکیل ہیں۔" پھر اس نے ہماری طرف یوں دیکھا جیسے ضرورت کے تحت بولے جانے والے اس جھوٹ کی اہمیت ہم پر واضح کرنا چاہتی ہے۔ اس نے پرانے وقتوں کی اس بوڑھی عورت کی نظروں میں ہماری عزت کم نہیں ہونے دی تھی اور ہمیں زیادہ اعتبار کے قابل بنا دیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس گھر میں پہلی بار نظر آنے والے اجنبی مرد کے ساتھ ایک غیر شادی شدہ لڑکی آئی ہے تو ہم دونوں کا کردار اس کے اخلاقی معیار کے مطابق مشکوک ہو جاتا۔

"نئی نئی شادی ہوئی ہے کیا؟" شہلا کی ماں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "بہت شرماتی ہے۔"

"شہلا تم ایک سوٹ کیس میں ضرورت کا تھوڑا بہت سامان لے لو۔" میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "اگر زیورات یا نقد رقم ہے تو یہاں مت چھوڑنا اور ایسے کاغذات بھی لے لینا جو اہم ہوں۔ اپنی اسناد، چیک بک، ڈائری اور خطوط وغیرہ۔"

بیس منٹ بعد میں شہلا کی معذور ماں کو گود میں اٹھا کر شہلا کی پرانی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا چکا تھا۔ شہلا نے گھر کی چابیاں میرے حوالے کیں اور انجن اسٹارٹ کیا۔

"سکندر! تم اس لڑکے عدنان کے لیے کوئی پیغام چھوڑ دیتے۔" رابعہ نے کار میں بیٹھنے سے پہلے کہا۔ "مجھے تمہاری طرف سے پریشانی رہے گی۔ تم یہاں اکیلے ہو۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "عدنان کے آتے ہی میں بھی روانہ ہو جاؤں گا۔"

"اور اس سے پہلے ڈی سلوا یا اس کے آدمی آگئے...؟"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں رابعہ!" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "خالی ہاتھ بھی میں ان سے نمٹ سکتا ہوں اور میرے پاس بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔"

"زیادہ شیخی میں مت آؤ سکندر!" وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں تم بڑے ہیرو ہو لیکن تم پر پہلے ہی کم آفات نہیں ہیں کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"بزدل تو تم نے مجھے بھی بنا دیا ہے۔ پہلے میں صرف اپنے لیے جیتا تھا اور اکیلا آدمی مرنے سے نہیں ڈرتا۔" میں نے جذباتی ہو کے کہا۔ "لیکن اب میں تمہاری خاطر زندہ رہوں گا۔ تمہیں میری خاطر کسی نئی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے کار میں بٹھا کے دروازہ بند کر دیا اور کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے گیٹ کو کھلا چھوڑ دیا اور اندر لوٹ آیا۔ ڈرائنگ روم کی لائٹس آف کر کے میں نے شہلا کے بیڈ روم کی ہر لائٹ جلائی۔ ٹیلیوژن آن کر کے اس کی آواز اتنی اونچی کر دی کہ باہر سنی جا سکے۔ نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ ڈی سلوا پھر آئے گا۔ اس کے لیے خطرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا جس کا فوری تدارک ضروری تھا۔ میری موجودگی میں اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی تاہم اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ میں جاتے وقت شہلا اور اس کی ماں کو بھی لے جاؤں گا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ پھر آیا تو بہت زیادہ قوت کے ساتھ حملہ آور ہوگا اور مجھ ہوتے ہوئے صرف جرأت سے ہی نہیں ہوشیاری سے بھی کام لینا ہوگا۔ میں باہر ایک تاریک گوشے میں بیٹھا بے چینی سے عدنان کی واپسی کا منتظر رہا۔ اگر وہ بے وقوف لڑکا آ جاتا تو میں اس کے ساتھ بحفاظت نکل سکتا تھا پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ اگر میں عدنان کے ساتھ چلا گیا اور حملہ آور بعد میں آئے تو انہیں سخت مایوسی ہوگی اور مایوسی کے ردِعمل کا نتیجہ انتقامی کارروائی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شہلا کے گھر کو بھی اسی طرح تباہ و برباد کر دیں جیسے انہوں نے رابعہ کے گھر کو نیست و نابود کیا تھا۔ گھر میں ٹیلیفون ہوتا تو میں ضامن رضوی صاحب کو بتا دیتا اور وہ کوئی نہ کوئی حفاظتی بندوبست کر دیتے یا میں پولیس اسٹیشن فون کر دیتا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا تو اسٹریٹ لائٹس کے اجالے میں مجھے ٹیلی فون کے تار کی مدھم سی سیاہ لکیر دکھائی دی جو ساتھ والے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ وقت کم تھا اور سوچنے میں نہیں گنوایا جا سکتا تھا۔ درمیان کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے خود کو تھوڑا سا بلند کیا اور دوسری طرف جھانکا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا، لیکن دو کنال کی اس کوٹھی کے ویران احاطے میں سوائے دو کاروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ گھوم کر جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا چنانچہ میں دیوار پر سے کود گیا۔

اندر والے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی میری ملاقات سولہ سترہ سال کے ایک لڑکے سے ہو گئی جو چابیاں گھماتا باہر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ساتھ والے گھر سے آیا ہوں اور میرا ٹیلی فون خراب ہے۔ نوجوان جلدی میں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک فون اندر کوریڈور میں رکھا ہے اور میری طرف دیکھے بغیر نکل گیا۔ حسبِ توقع یہاں رہنے والے اپنے ہمسائے کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نوجوان کو یہ کہاں معلوم ہوگا کہ ساتھ والے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں اور فون ہے یا نہیں۔ اس نے یقین کر لیا کہ اتنے اعتماد سے اندر آ جانے والا اور حلیہ سے شریف اور معزز دکھائی دینے والا ہمسایہ ہی ہو سکتا ہے۔ ٹیلیفون کوریڈور میں دیوار پر نصب نازک سے اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اندر کسی کمرے میں اسٹیریو بج رہا تھا اور دھمک بتاتی تھی کہ اسپیکر سو سو واٹ کے ضرور ہیں۔ کسی اور کمرے میں کوئی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوریڈور میں آویزاں فانوس کی روشنی میں دو نوکر ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں غائب ہو گئے لیکن کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوا۔ میں نے اطمینان سے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور شہلا کے گھر کا نمبر دیا۔ میں نے کہا کہ میں شہلا کا ہمسایہ بول رہا ہوں اور میں نے ابھی ابھی اس گھر میں فائرنگ کی آوازیں سنی ہیں۔ وہاں ایک مفلوج عورت اپنی بیٹی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر پولیس چیک کرے تو اچھا ہے۔ مجھ سے بات کرنے والے پولیس انسپکٹر نے میرا نام پوچھا اور میں نے کہا کہ میں ایس ایس پی ضامن رضوی کا "چھوٹا بھائی" ہوں۔ میں نے ٹیلیفون نمبر بھی ضامن رضوی صاحب ہی کا دیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ تصدیق کرتا یا اس رپورٹ کو نظر انداز کرتا۔ گلبرگ میں رہنے والے یوں بھی عام لوگ نہیں ہوتے کہ ان کی شکایت پر ایکشن میں تاخیر ممکن ہوتی۔ میں ٹیلی فون کے ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر کسی کا شکریہ ادا کیے بغیر باہر نکلا اور دیوار پھلانگنے کے بجائے گیٹ سے باہر آیا۔ شہلا کے گھر کے دروازے تک پہنچنے میں مجھے مشکل سے پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ کچھ سوچ کر میں دروازے پر ہی رک گیا۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی تو ہیڈلائٹس سے بچنے کے لیے میں گیٹ پوسٹ کے پیچھے ہو جاتا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک کار سیدھی اندر آئی اور پورچ میں رک گئی۔ یہ ایک ٹیکسی تھی جس میں چار افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کی جگہ انجن اسٹارٹ کیے بیٹھا رہا اور تین نیچے اتر آئے۔ ان سب نے چہرہ چھپانے کے لیے منہ پر اسکارف لپیٹ رکھے تھے اور وہ سب سیاہ رنگ کی پتلونوں پر چست سیاہ بنیانیں پہنے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ اندر ہی ہے۔" ڈرائیور نے باہر منہ نکال کے کہا۔ "اور جاگ رہی ہے۔ احتیاط سے کام لینا ورنہ وہ شور مچا دے گی۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔" اس کا تحکمانہ لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ان بدمعاشوں کا لیڈر ہے۔

"فکر کی کوئی بات نہیں استاد!" ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

"ہم ابھی ان سب کو سمیٹ لاتے ہیں۔" دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی اور وہ تین مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ ایک سامنے والے دروازے سے اندر چلا گیا۔ باقی دو نے دائیں بائیں جانب سے گھر کو حصار میں لینے کی کوشش کی۔ گھر کے دونوں طرف ساتھ والی کوٹھیوں کی دیواریں چند فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ چنانچہ دونوں طرف گلیاں سی بن گئی تھیں اور آخری حصے میں دونوں طرف بیڈروم، کچن اور اسٹور کے دروازے کھلتے تھے۔ میں دبے پاؤں بائیں طرف چلنے لگا۔ ٹیکسی میں آنے والا ایک شخص مجھ سے دس قدم آگے تھا اور میرے لیے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو خود کو بچانے کے لیے مجھے اس پر گولی چلانی پڑتی ورنہ یہ دس قدم کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی وہ مجھے شوٹ کر دیتا چنانچہ میں بہت محتاط تھا۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا لیکن تیز رفتاری کے باوجود اسے میرے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر میرے پیروں کے نیچے ایک خشک پتہ چرچرایا اور اس سکوت میں وہ آواز بادل کی گرج کی طرح لگی۔ ہم دونوں ایک ساتھ رکے اور اس نے بجلی کی طرح پلٹ کر فائر کیا۔ میں اس کے لیے تیار تھا اور جسم کے خودکار دفاعی نظام نے مجھے بروقت غوطہ مار کر گولی کے راستے سے ہٹا دیا اور اسی کے ساتھ جوابی فائر پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص گلا پھاڑ کے چلایا اور پلٹ کر پیچھے گرا۔ اسی وقت وہ دروازہ کھلا جو کچھ دیر پہلے میں نے ہی کھولا تھا۔ سیدھا اندر داخل ہو جانے والے شخص نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا ہے؟" اور مجھے صرف اس کا سر دکھائی دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور ضرور ہوگا اور اسے ایک لمحے کی مہلت دینا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میں نے پوری قوت سے جست لگائی اور اپنے حریف کو کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع دیے بغیر باہر کھینچ لیا۔ میرے ہاتھ اس کے بالوں پر پڑے تھے۔ ایک جھٹکے میں وہ سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ میں اس کی گردن توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن عجلت میں ہاتھ سخت پڑ گیا یا اس کی گردن ایسے زاویے پر آ گئی کہ میں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ افسوس کرنے کی فرصت نہ تھی کیونکہ ابھی دو دشمن باقی تھے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یکے بعد دیگرے ہونے والے دو فائروں کی آواز سے وہ بھی مقابلے کے لیے دوڑ پڑے ہوں گے۔ میں کھلے دروازے کے اندر پہنچ گیا۔ کمرے میں بدستور اندھیرا تھا۔ میں پوری قوت کے ساتھ اس شخص سے ٹکرا گیا جو دوڑتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا تھا اور غالباً یہ وہی شخص تھا جو دائیں طرف سے گھر میں گھسا تھا۔ ہم ایک ساتھ گرے۔ اس نے اندھیرے میں ایک کرسی اٹھا کے مجھ پر پھینکی جو میرے شانے پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ پھر میں نے اس شخص کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر اوپر اٹھایا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ شاید اس کا ریوالور تصادم کے وقت اس کی گرفت سے نکل گیا تھا ورنہ وہ کرسی پھینک کر مارنے کے بجائے مجھے گولی مار دیتا۔ اب وہ دیوار کے قریب الٹا پڑا تھا اور مجھے اس آخری آدمی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں جو ان کا لیڈر تھا اور جسے میں نے ٹیکسی میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ اگر میں لائٹ جلاتا تو وہ سیدھا ادھر آ جاتا۔ میں نے اندھیرے ہی میں ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتے ہوئے فرش پر ریوالور تلاش کیا اور کامیاب بھی رہا لیکن جو ریوالور میرے ہاتھ میں آیا وہ میرا نہیں تھا بلکہ اس دوسرے

شخص کا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں ڈالا اور اپنا ریوالور ڈھونڈتا رہا۔ اس پر میرے فنگر پرنٹ تھے اور میں اسے یہاں چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چوتھا آدمی اپنے ساتھیوں کو پکارتا آگے بڑھ رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ پھر اس کا سایہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا اور میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کمرے کے اسباب کے درمیان میرے وجود کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن خفیف سی حرکت بھی میری موجودگی کی خبر دے سکتی تھی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے میرا نشانہ لے کر مجھے کتے کی موت مار سکتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ تک بے حس و حرکت کھڑا اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ پھر شاید اسے یقین آ گیا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے پلٹ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے اپنا ریوالور مل گیا اور میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اسی وقت میرے کانوں میں ٹیکسی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی۔ وہ میری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔ اپنے کسی ساتھی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نادیدہ دشمن کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں یا گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس نے مقابلے کا ارادہ ترک کر کے فرار ہو جانا بہتر سمجھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو ٹیکسی دروازے سے نکل رہی تھی، میں نے فائر کیا۔ گولی ٹائر میں لگنے کی بجائے ٹیکسی کے پچھلے شیشے پر لگی۔ شیشہ بکھر گیا لیکن ٹیکسی غائب ہو گئی۔ میں نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا صرف اس لیے کہ ٹیکسی میں سے کسی کے فنگر پرنٹ مل سکتے تھے ورنہ میں جانتا تھا کہ ٹیکسی چوری کی ہوگی اور پولیس کو ایک دو روز بعد کہیں نہ کہیں لاوارث کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ میں ابھی ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا واپس اندر جانے اور گھر میں پڑے ہوئے تین افراد کی جامہ تلاشی لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے پولیس کی ایک جیپ کو دروازے پر رکتے دیکھا۔ تین پولیس والے رائفلیں اٹھائے اطمینان سے اترے اور دروازے سے اندر کی طرف آنے لگے۔ تھوڑی سی دیر کے لیے میں تذبذب کا شکار ہوا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں سامنے جا کر کہہ سکتا تھا کہ فون میں نے کیا تھا۔ میری رپورٹ درست ثابت ہو چکی تھی لیکن شہادت اور بیان سے میں نئے چکروں میں پڑ جاتا اور مجھے رابعہ کی بات یاد تھی جو اس نے رخصت ہوتے وقت کہی تھی کہ مجھ پر پہلے ہی کم آفات نہیں ہیں چنانچہ میں نے تمام واقعات سے بے تعلق رہنا بہتر سمجھا اور اس سے پہلے کہ پولیس کی نگاہ مجھ پر پڑتی میں اسی کوٹھی میں کود گیا جہاں سے میں نے فون کیا تھا۔ دو کنال کے رقبے کی وجہ سے یہ کوٹھی شہلا کے گھر سے کافی دور تھی۔ درمیان میں باغ کا وسیع علاقہ حائل تھا۔ اس کے علاوہ کوٹھی کے رہنے والے اپنے اپنے کمروں میں اسٹریو اور ٹی وی لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں تک فائرنگ کی آواز پہنچی بھی ہوگی تو انہوں نے طے کر لیا ہوگا کہ یہ کسی کار کے بیک فائر کی آواز ہے۔ یوں بھی اپنی تفریح چھوڑ کے ایسی باتوں پر توجہ دینے کی فرصت یا ضرورت کسے ہوتی ہے۔

میں اطمینان سے چلتا ہوا دوسری بار گیٹ سے نکلا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد مجھے وہ ٹیکسی سڑک کے ایک کنارے پر کھڑی ہوئی نظر آئی جس کا پچھلا شیشہ گولی سے ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے کا خلا شفاف جلد پر زخم کے بدنما داغ کی طرح لگتا تھا۔ ٹیکسی کو یہاں تک لانے والا اسے چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ اپنی موجودہ حالت میں یہ ٹیکسی پولیس کو فوراً متوجہ کر لیتی۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے فٹ بورڈ کے پاس خون کے قطرے نظر آئے۔ میں نے رومال نکالا اور اس سے ہینڈل کو تھام کر دروازہ کھولا۔ خون کے داغ سیٹ کی پشت پر بھی تھے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ میری گولی شیشے سے گزرنے کے بعد ڈرائیور کے شانے میں دائیں طرف لگی ہوگی اور اس کے لیے ڈرائیونگ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہوگا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور روانہ ہو گیا۔

ایک ٹیکسی نے مجھے صدر بازار میں اتارا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سڑک سے گلی میں داخل ہو کے میں نے ماسی کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خود ماسی نے کھولا اور ایک طرف ہو گئی۔ دو کمروں کا یہ چھوٹا سا غریب خانہ، ان کوٹھیوں سے زمین اور آسمان کے فرق کا نمونہ پیش کرتا تھا جن کے رہنے والے اس وقت یہاں پناہ گیر تھے۔ رابعہ کی خادمہ یعنی ماسی کے لیے اپنی چھوٹی بی بی کا آنا اور خدمت کا موقع فراہم کرنا ایک سعادت سے کم نہ تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق وہ میزبانی کے سارے آداب نبھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اس نے شہلا کی ماں کو ایک بستر پر نئی چادر بچھا کر لٹا دیا تھا اور اب کھانے کے اہتمام میں لگی ہوئی تھی۔ بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی، میرے نہ آنے سے رابعہ اور شہلا دونوں ہی پریشان تھیں مگر ان کے لیے عدنان کی ماں کو مطمئن رکھنا زیادہ مشکل مسئلہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ پوچھ رہی تھی جس کا جواب نہ رابعہ دے سکی تھی اور نہ شہلا۔ میں نے طے کیا کہ اس وقت تمام واقعات کو گول کر کے ایک جھوٹ سے سب کو مطمئن کرنا مصلحت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اتنی دیر کیوں کی تم نے؟" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی "عدنان کیوں نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکرا کے پُرسکون لہجے میں کہا "عدنان آیا تھا اور میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہماری ماں اور بہن ایک ضرورت کے تحت میرے گھر چلی گئی ہیں اور شاید چند روز باہر ہی رہیں گی لیکن اس نے میرے ساتھ آنے کے بجائے اپنے کسی دوست کے گھر جانا پسند کیا۔"

شہلا کی ماں کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے "تم نے اچھا کیا کہ اسے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے اس بوڑھی عورت کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جواب نے رابعہ اور شہلا کو شک میں ڈال دیا ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہم کھانے کے رسمی تکلف سے فارغ ہو گئے تو شہلا نے سوٹ کیس میں سے دوائیں نکال کر ماں کو دیں۔ غالباً ان میں کوئی خواب آور دوا بھی تھی کہ بیس منٹ بعد وہ مفلوج عورت سو گئی۔ میں نے شہلا اور رابعہ کو دوسرے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ چونکہ ماسی وہیں بیٹھی چائے بنانے میں مصروف تھی پھر بھی میں نے انگریزی میں بات کی، اور ان دونوں کو وہ سب واقعات سنا دیے جو ان کی روانگی کے بعد پیش آئے تھے۔

"اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا "شہلا بی بی تم کسی کے سامنے یہ ذکر نہیں کرو گی کہ میں اور رابعہ تمہارے گھر آئے تھے اور ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں۔ تمہیں ڈی سلوا کے آنے اور اس سے ہونے والی گفتگو کا حوالہ دینے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم یہاں خاموشی سے گمنامی میں رہو۔ پولیس خود یہ مفروضہ قائم کرے گی کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے کیونکہ ان کو پہلے سے فائرنگ کی رپورٹ مل گئی تھی۔ وہاں ایک آدمی تو یقیناً مر گیا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن تیسرا صرف بے ہوش ہوا۔ پولیس اپنے طور پر تفتیش کر کے جو معلوم کرنا چاہے گی معلوم کرے گی اس سے اصل پریشانی ڈی سلوا کو ہو گی جس نے وہ آدمی بھیجے تھے اور دیکھنا یہ ہے کہ اب وہ کیا کرتا ہے... اور تم رابعہ بی بی!" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا "تم آج رات یہیں رہو گی۔"

"لیکن اس سے رضوی صاحب کو شک نہیں ہو گا؟" رابعہ بولی۔

"شک کس بات کا؟ میں اور تم ایک ساتھ نکلے تھے۔ تم نے ایک نظر اپنے گھر کو دیکھا اور ہم کچھ دیر وہاں رک کر اس کی تعمیر نو کے مسائل پر بات کرتے رہے۔ پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانا ہم نے لارڈز میں کھایا۔ تم نے کھانے کے بعد خواہش ظاہر کی کہ ماسی سے ملنا ہے اور نو بجے میں تمہیں یہاں لے آیا جہاں ماسی نے اصرار کر کے تمہیں روک لیا اور میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ معلوم ہے اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ رضوی صاحب یقیناً پریشان ہوں گے اور ہم اس وقت اکٹھے پہنچے تو خواہ کہانی کچھ بھی سنائیں، وہ ہمارے آدھی رات تک باہر پھرنے کو سخت معیوب سمجھیں گے اور ناراض بھی ہوں گے۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں کہ تم رات کو ماسی کے گھر رہیں یا میں فلم کا آخری شو دیکھنے چلا گیا۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

"لیکن عدنان کا کیا بنے گا؟" شہلا نے کھوکھلی آواز میں کہا "وہ تو آتے ہی پولیس کے جال میں پھنس جائے گا۔"

"اگر وہ پہلے سے جائے واردات پر موجود ہوتا تو یقیناً مشکل میں پڑ جاتا۔" میں نے کہا "لیکن وہ پولیس کی موجودگی میں آئے گا تو اس کی بے خبری ہی اس کی بے گناہی کا ثبوت بن جائے گی۔ اس کے علاوہ کہیں نہ کہیں اس کی موجودگی کے گواہ بھی ہوں گے۔ خواہ وہ گواہ کچھ بھی کر رہے ہوں۔ یہ تو بتا سکیں گے کہ عدنان کب سے کب تک ان کے ساتھ تھا۔"

"وہ... وہ بے راہ رو اور نو عمر ہی نہیں، احمق بھی ہے۔" شہلا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مس شہلا! تم اس کو واقعی بھائیوں کی طرح چاہتی ہو ان تمام خرابیوں کے باوجود جو اس کی ذات سے منسوب ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

"آپ نہیں جانتے اسے سکندر صاحب! وہ بُرا ہے تو دنیا کے لیے۔ میرے لیے وہ بالکل ویسا ہی بھائی ہے جیسے دنیا میں بہنوں کے بھائی ہوتے ہیں۔ وہ دل کا بڑا اچھا ہے لیکن یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ قدم بہت جلد بھٹک جاتے ہیں اور جو ایک بار غلط راستوں پر چل نکلیں وہ اس وقت تک صراطِ مستقیم کی طرف نہیں لوٹتے جب تک انہیں کوئی تلخ تجربہ نہ ہو جائے۔ اور... اور ان کے اعمال کی سزا اس دنیا ہی میں نہ ملے۔ میں اس دن سے ڈرتی ہوں..." وہ یکلخت چپ ہو گئی۔

"کس دن سے؟" میں نے کہا "جب زندگی اسے کوئی سبق سکھائے گی؟ اور وہ شرافت کی راہ اختیار کرے گا؟"

"یہ سزا بہت سخت بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ مجھ سے نظر ملائے بغیر بولی۔

ماسی نے ہمارے درمیان ابلتی چائے رکھ دی۔

"خدا سے نیکی کی توقع رکھو۔" میں نے شہلا سے کہا "وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ آج بھی ہم تمہاری طرف آنے کے بجائے الماس کی طرف جانے والے تھے۔ الماس پہلے ڈی سلوا کی سیکرٹری تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اسے گواہ بنا کر لائیں تاکہ تم کو ہماری بات کا اعتبار آ جائے مگر عین وقت پر انہوں نے مجھے روک لیا اور کہا پہلے شہلا کی فکر کرنی چاہیے اور یہ خدا کی مصلحت نہیں تھی تو کیا تھا کہ ہم الماس کے دروازے تک پہنچ کے لوٹ آئے۔ یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتی ہو کہ ہم نہ آتے تو کیا ہوتا۔"

"آپ دونوں نے مجھے تباہی کی دلدل سے نکال لیا۔ میں اس احسان کا بدلا تمام عمر کیسے ادا کروں گی کہ ہر قسم کا خطرہ مول لے کر بھی آپ نے محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مجھے ڈی سلوا کا اصلی چہرہ دکھا دیا۔" شہلا نے جذباتی ہو کے کہا۔

"اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "تمہارے بارے میں نام سے مذہب کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم شہلا زیدی ہو۔ تم نے ڈی سلوا کے وعدوں پر کیسے اعتبار کر لیا۔ میرا مطلب ہے..."

"اس نے ایک وعدہ یہ بھی کیا تھا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔" شہلا نے نظر جھکا کے کہا۔

"چلو اب بھول جاؤ ان سب باتوں اور وعدوں کو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "یہی تجربات تو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔"

جب میں اجازت لے کر رخصت ہوا تو ماسی اس مسئلے پر سخت پریشان اور شرمندہ تھی کہ وہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے سونے کا کیا انتظام کرے۔ گھر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی اور اتنی رات گئے پاس پڑوس کے کسی گھر سے چارپائی مانگنا مشکل تھا۔ رابعہ اور شہلا نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ وہ ایک رات فرش پر بستر بچھا کے بھی سو سکتی ہیں اور اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ میں باہر نکلا تو سڑک پر ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں گھروں کے ہر دریچے کی ہر روشنی گل ہو گئی تھی۔ دنیا سکون کی گہری نیند میں تھی۔ سڑک پر صرف رات کے پہریدار نظر آ رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ اب گھر تک دو میل کا فاصلہ مجھے پیدل ہی طے کرنا ہو گا لیکن آرائے بازار کی طرف سے ایک رکشا کی آواز آئی۔ اتفاق سے رکشا خالی تھا اور میرے اشارے پر ڈرائیور نے رکنے کی زحمت بھی گوارا کر لی۔ تاہم مجھے منزل تک پہنچانے کا معاوضہ اس نے دس روپے طلب کیا اور میرے احتجاج پر کہ مشکل سے دو میل جانے کا وہ دگنا کرایہ لے تب بھی کم بنتا ہے" اس نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا کہ "وقت ہی دولت ہے اور آدمی جو کچھ کرتا ہے، اپنے آرام کی خاطر کرتا ہے۔ اگر مجھے پیسہ بچانا ہے تو میں اسی طرح چلتا رہوں، دس منٹ کے بجائے پون گھنٹے میں پہنچ ہی جاؤں گا بشرطیکہ مجھے راستے میں پولیس نے آوارہ گرد سمجھ کے بند نہ کیا اور پاگل کتے نے نہ کاٹا۔"

اس بات تونی شخص کے دلائل میں بڑا وزن تھا مگر وہ خود ان دلائل سے زیادہ وزنی تھا چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ گیا۔ رضوی صاحب کے گھر کے دروازے پر اتر کر میں نے کہا "اس وقت میں نے تمہاری بات کا جواب اس لیے نہیں دیا تھا کہ میں مجبور تھا، معذور نہیں۔ میں پیدل چل سکتا ہوں مسلسل دس میل، مگر میں آج واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے فلسفے کے مطابق وقت بچاؤ گے یا پیسہ؟ کیونکہ یہ دروازہ ایس پی ضامن رضوی کے گھر کا ہے۔" پھر میں نے باری باری دونوں جیبوں سے ریوالور نکالے۔ "میرے پاس دینے کے لیے یہ کرایہ بھی ہے چنانچہ یہاں تم مجبور ہو۔"

رکشا ڈرائیور کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کے حلق سے "حجور، حجور..." کے سوا کچھ نہ نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھا اور اسے دفع ہو جانے کو کہا "میں صرف اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں ورنہ جیسے تم لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو ایسے ہی میں تم کو وہ سبق دے سکتا تھا جو تمہیں عمر بھر یاد رہتا۔"

وہ سلام کر کے بُری طرح بھاگا اور میں اتنی خونریزی اور پریشانی کے واقعات سے بھرپور شام کے بعد اس چھوٹے سے لطیفے پر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ رضوی صاحب واقعی پریشان تھے۔ میں نے ان کو مطمئن کیا اور اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا جہاں محسن میرے انتظار میں سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"کہاں مر گیا تھا تو؟" وہ بولا "اپنے ساتھ رابعہ کو کیوں لے گیا تھا؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ جب میں گیا تھا تو جناب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ اب مجھے اجازت ہو کہ باقی ماندہ گھوڑے گدھے بیچ کر سو جاؤں کیونکہ میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ صبح بشرطِ زندگی پوری بات عرض کر دوں گا۔" میں نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"صبح میں پنڈی جا رہا ہوں۔" وہ بولا "نادر شاہی حکم جاری ہوا ہے کہ فوراً گھر آ جاؤ، ورنہ ہم پاپوش لے کر حاضر ہوتے ہیں۔"

میں اٹھ بیٹھا "یہ... یہ اسی چراغ الدین کی کارستانی ہے۔"

"ہاں۔ اس بدمعاش نے فون پر میری ماں سے بات کی اور بہت نمک مرچ لگا کے بتایا کہ کس طرح میں تمہارے ساتھ گیا اور اس کو قتل کی دھمکی دی۔ سارا الزام اس نے تم پر عائد کیا ہے کہ میں نے تمہارے بہکانے پر یہ حرکت کی۔ ڈیڈی تو اس سے کہتے کہ میاں میرا بیٹا عاقل و بالغ ہے کوئی بچہ نہیں کہ بہکانے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سے بہک جاتے، لیکن ممی کو تم جانتے ہو۔ اس وقت وہ جرائد ین کی حمایت کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دنیا کے سب سے کمینے آدمی ہو۔ انہوں نے یہاں انکل رضوی کو فون کیا اور مجھ سے تو بات نہیں ہوئی مگر رضوی صاحب سے انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ یہ بھی کہ وہ لڑکی رابعہ کچھ اچھے کردار کی معلوم نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں رضوی صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔ میرے بارے میں ممی نے کہا کہ اسے سکندر تباہ کر رہا ہے، کیا وہ اس کے ساتھ پھانسی چڑھنے کا ادستی میں ہے؟ اسے فوراً گھر بھیج دیا جائے۔"

"آئی سی۔" میں نے غور فرمانے کے بعد کہا۔ اب میری نیند پھر اڑ گئی تھی چنانچہ میں نے سگریٹ جلالی۔ "اور تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بتا تو چکا ہوں کہ صبح گھر جا رہا ہوں۔" محسن بولا۔ کچھ دیر میرے اترے ہوئے مایوس چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر مسکرایا۔ "لیکن میں کل ہی واپس بھی آ جاؤں گا۔ مجھے دو یا تین باتیں لگی لپٹی رکھے بغیر کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ فوزیہ کی شادی میرے جیتے جی چراغ دین سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری یہ کہ میں سکندر بخت کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد خواہ مجھے عاق کر دیا جائے، ناخلف اور نافرمان قرار دے کر یا گھر چھوڑنا پڑے، میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گا۔ مجھے معلوم ہے ممی چیخ پکار مچائیں گی۔ طعنے اور کوسنے دیں گی اور شاید مر جانے کی دھمکی بھی دیں لیکن ڈیڈی زیادہ معقول رویہ اختیار کریں گے۔ وہ نرم مزاج، جمہوریت پسند اور اصول پرست آدمی ہیں۔ بے شک بیوی سے دبتے ہیں مگر اتنے بھی نہیں کہ مجھے عاق نامہ تھما دیں۔ وہ زبردستی نہیں کریں گے۔ نہ فوزیہ کے معاملے میں اور نہ تیرے معاملے میں۔ اس لیے مجھے امید ہے کل شام یا رات تک میں پھر حاضر ہو جاؤں گا ورنہ پرسوں تو یقینی ہے۔"

اس کے بعد میرے لیے وہ سب واقعات دہرانا ضروری ہو گیا جو شہلا کی کوٹھی میں پیش آئے تھے۔ اس نے بے حد اطمینان کا اظہار کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ شہلا کو چھپائے رکھنے کے لیے احتیاط سے کام لوں۔ خود ادھر نہ جاؤں تاکہ کوئی بے خبری میں میرا تعاقب کرتا ہوا اس ٹھکانے تک نہ پہنچ جائے اور رابطے کے لیے ماسی کی خدمات سے استفادہ کروں۔ اس کا مشورہ معقول تھا اور احتیاط پسندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ میں نے محتاط رہنے کا وعدہ کیا اور سو گیا۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ محسن جا چکا تھا اور میں کئی دن کی تھکن دور کر کے اب بالکل تازہ دم تھا۔

میں غسل کر رہا تھا کہ رابعہ آ پہنچی۔

"ہیلو۔" میں نے باتھ روم میں سے کہا۔ "گڈ مارننگ۔ براہ کرم آپ بیڈ روم کو ڈرائنگ روم سمجھ کے تشریف رکھیں بلکہ بہتر ہوگا کہ کچن میں جا کے چائے بنانے کا عملی تجربہ حاصل کریں۔"

وہ ہنسی۔ "مسٹر سکندر اعظم! شرط یہ ہے کہ وہ تجرباتی چائے آپ کو بھی پینی پڑے گی خندہ پیشانی سے۔"

"خندہ پیشانی سے ہم حقے کا پانی بھی پی سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ آپ کے دست عنایت سے مسکراہٹ کے ساتھ پیش کیا جائے۔"

میں باتھ روم سے نکلا تو رابعہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی۔ وہ خود تو ماسی کے گھر سے ناشتہ کر کے آئی تھی مگر یہ بھوک سے برا حال تھا۔ میں نے اسے رضوی صاحب کے گھر سے کھانے کی کوئی چیز لانے بھیج دیا اور خود وہ اخبار دیکھنے لگا جو رابعہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ چونکہ اخبار والوں کو قبرستان پہنچنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے میرے والد کی لاش کے غائب ہونے کی خبر کہیں نہ تھی۔ صرف ایک اخبار کا رپورٹر گھومتا پھرتا ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ جا پہنچا تھا اور اس نے گورکن کی موت کی خبر چھاپ دی تھی۔ گورکن کے لڑکے نے اسے بتایا تھا کہ اس کا باپ کس طرح قبر سے زندہ برآمد ہوا تھا اور کس طرح ہسپتال میں مر گیا تھا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے انٹرویو لیا تھا اور قتل کی بقیہ تفصیلات حاصل کر لی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ اگلے شمارے میں وہ اس سنسنی خیز خبر سے متعلق دیگر حقائق کو بھی بے نقاب کر دے گا۔ دوسری زیادہ اہم خبر شہلا کے گھر میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ تین میں سے دو افراد مارے گئے تھے۔ ایک کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور دوسرے کے سر میں گولی لگی تھی مگر تیسرا اپنے ... کو زندہ مل گیا تھا لیکن وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑا تھا اور پولیس اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے ڈی سلوا کی سیکرٹری مس شہلا زیدی کا نام نہیں لکھا تھا اور ایک دن پہلے ہونے والے گورکن کی مبینہ قاتل نرس کی مس شہلا سے مشابہت کا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا لیکن میں جانتا تھا یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مجھے ڈی سلوا کا خیال آیا۔ نہ جانے یہ خبر پڑھ کے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ ان کرائے کے بدمعاشوں کی موت کے بعد زیادہ مشتعل ہوگا یا محتاط ہو جائے گا۔

رابعہ ایک ٹرے میں بہت سی چیزیں رکھ کے لے آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے صفحہ پلٹا اور میری نظر نے ایک چھوٹی سی مگر اہم خبر پڑھ لی۔ کسی جگہ جوا کھیلتے ہوئے ایک شخص ہلاک اور ایک زخمی ہو گیا۔ جھگڑے میں چار افراد ملوث تھے۔ پولیس کو دو گرفتار ہونے والے جواریوں سے معلوم ہوا تھا کہ مرنے والا ایک بدقماش نوجوان تھا اور اس کا نام عدنان تھا۔ نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ عدنان ایسا نام نہیں تھا جو بہت عام ہو۔ میں نے وہ خبر رابعہ کو دکھائی۔

"اب کیا ہوگا؟" رابعہ نے پریشان ہو کے کہا۔ "اس کی ماں تو مر جائے گی۔"

"میرا خیال ہے ابھی اسے کچھ نہ بتایا جائے۔" میں نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔ "شہلا کو بتا دیا جائے، وہ جیسا مناسب سمجھے گی کرے گی۔ اگر پولیس کو عدنان کے بارے میں تفصیلات مل گئیں تو وہ اس کے گھر پہنچیں گے اور یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ عدنان کے قاتلوں کا اس گھر میں مارے جانے والوں سے کوئی تعلق ضرور ہے۔"

اسی روز شام کے وقت میں اور رابعہ پھر نسبت روڈ پہنچے۔ الماس ایک دو منزلہ مکان کے اوپر والے حصے میں کرائے پر رہتی تھی۔ رابعہ کو مالک مکان سے جھوٹ بولنا پڑا کہ وہ الماس کے بچپن کی کلاس فیلو ہے۔ الماس کا شوہر کراچی گیا ہوا تھا۔ الماس نے ہمیں بڑے اخلاق سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی گود میں دو سال کا ایک شریر بچہ بھی تھا۔ گھر کے اسباب سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ خوشحال نہیں۔ تاہم ایک قناعت پسند روایتی مشرقی بیوی کی طرح الماس اپنے گھر میں یقیناً خوش تھی۔

"دراصل مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ ایک ضروری بات کرنی تھی جس کے لیے مجھے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔ میں آپ سے کبھی نہیں ملی۔ میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ آگے بڑھا دیا۔

الماس کی صورت سے پریشانی جھلکنے لگی۔ "دیکھیے، آپ پھر کبھی آ جائیے گا۔ دو چار دن بعد...."

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو بات مجھے کرنی تھی وہ آپ کے شوہر کے سامنے نہیں کی جا سکتی۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں ورنہ مجھے پھر کسی وقت آپ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے بہانہ اور موقع تلاش کرنا پڑتا۔"

الماس اب نروس ہو گئی تھی۔ "آپ.... آپ لوگ کون ہیں؟ ایسے کیوں آئے ہیں؟"

"میں کل پھر آ سکتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "کل تک آپ میرے بارے میں جو تحقیق و تفتیش کرنا چاہیں کریں، مثلاً یہ کہ میں واقعی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ہوں یا نہیں؟ یہ بات آپ کا اطمینان ہو جانے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے مگر اتنا ضرور سمجھ لیجیے کہ آپ کے شوہر کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑی تو خود آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"یہ تو آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟" الماس نے تیز ہو کر کہا۔ "اگر آپ کو ایسی ہی پرائیویٹ بات کرنی تھی تو کیا آپ اکیلی نہیں آ سکتی تھیں؟ اور پھر مجھ سے آپ کبھی ملی نہیں تو میرے بارے میں ایسی کون سی بات معلوم ہو گئی ہے آپ کو؟ کس نے بتائی ہے یہ بات؟ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر آنے کا کیا مقصد ہے؟" گھبراہٹ میں وہ جواب کا موقع دیے بغیر سوالات کرتی جا رہی تھی اور شاید یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ ہم کوئی نوسرباز ہیں جو اس کے شوہر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر میں گھس کے کوئی غلط کام کرنا چاہتے ہیں۔

"الماس! میں بھی تو کسی گھر میں رات کے وقت اکیلے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔" رابعہ نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھیے خاتون! میں ان کا شوہر نہیں ہوں۔" میں نے بروقت مداخلت ضروری سمجھی ورنہ الماس چلانے لگتی۔ "حقیقت یہ ہے کہ مجھے ڈی سلوا کے بارے میں بات کرنی تھی۔ آپ ایک زمانے میں اس کی سیکرٹری تھیں۔ بات کا تعلق اسی زمانے میں پیش آنے والے واقعات سے ہے۔ اگر میں اکیلا آتا تو آپ سے بات کیسے کرتا؟ آپ کے اطمینان کے لیے میں ایک عورت کو ساتھ لایا ہوں اور وہ عورت بھی عام عورت نہیں ہے، ایک بیرسٹر ہے جس کی شرافت اور نیک چلنی کی ضمانت جج صاحبان تک دے سکتے ہیں۔"

ڈی سلوا کا نام سنتے ہی الماس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور اب یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ "تم.... تم لوگ مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی مگر اب اس کی آواز بہت پست تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ ساکت و صامت بیٹھی رہی اور سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی گود میں ہمکنے والا بچہ دودھ کی بوتل منہ میں لیے لیے سو گیا تھا۔

"میرے ساتھ ڈی سلوا نے کوئی زیادتی نہیں کی۔" وہ اپنے ہسٹریا سے لڑتے ہوئے بولی۔ "اور اگر کی تھی تو میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ میں کسی ڈی سلوا کو نہیں جانتی۔ میں کبھی اس کی سیکرٹری نہیں رہی۔ میں وہ سب باتیں بھلا چکی ہوں اور بھولے سے بھی ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لانا چاہتی جس سے میرا گھر برباد ہو جائے۔ میرے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔"

"یہ تو میں بھی نہیں چاہتا اور اسی لیے میں آج کے موقعے کو مناسب ترین سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "سوال ایک اور لڑکی کی زندگی کا ہے جو اب ڈی سلوا کی سیکرٹری ہے اور اس کے خوبصورت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وعدوں کے جال میں گرفتار ہو کے بہت سی غلطیاں کر چکی ہے۔"

"تمہیں کیوں ہمدردی ہے اس لڑکی سے؟" الماس نے کہا۔ "تمہاری کیا لگتی ہے وہ؟"

"کچھ نہیں، مگر ایک انسانی جان بچانا بھی بڑا ثواب ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اپنے ثواب اور عذاب سے غرض رکھو اور میرے ثواب عذاب میرے لیے چھوڑ دو۔ اس لڑکی نے بھی اگر حماقت کی ہے تو کوئی تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔ غلطی پر سزا تو ملتی ہی ہے۔ پھر تم کیوں فکرمند ہو۔ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں کیوں ہے؟" الماس بولتی گئی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ "میں اس وقت آؤں گا جب تمہارا شوہر بھی موجود ہو گا اور میں ڈی سلوا کو ساتھ لے کر آؤں گا تاکہ تمہیں بھی اس غلطی کی سزا مل جائے جس سے تم اب تک بچی ہوئی تھیں اور بچی رہ سکتی تھیں۔ میں دیکھوں گا کہ ڈی سلوا کے سامنے تم اس سے تعلق سے کیسے انکار کرو گی۔ مجھے یہاں آنے اور بات کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ بعد میں یہ ایک قانونی معاملہ بن جانے گا۔ ڈی سلوا کی موجودہ سیکرٹری نے ایک قتل کر دیا ہے۔ اس نے یہ غلطی نادانستگی میں کی ہے اور میں ڈی سلوا کا دشمن ہوں کیونکہ ڈی سلوا میرے باپ کے قاتلوں میں شامل ہے۔ اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا فرض یہ بھی ہے کہ شہلا کی زندگی بچاؤں۔ شہلا اس لڑکی کا نام ہے جس کو ڈی سلوا نے آلۂ کار بنایا۔ اس کا یہ راز فاش ہو چکا ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے وہ شہلا کو ختم کر دے، مگر میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ ڈی سلوا کے خلاف گواہی دینے کے لیے آ سکے اور زندہ رہے۔" میں نے رابعہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھہرو۔" الماس چلائی۔ "مجھے یہ تو بتاتے جاؤ کہ کیا مجھے بھی کسی عدالت میں گواہی کے لیے آنا پڑے گا؟"

"اگر تم اس وقت ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو گی جو تم جانتی ہو تو اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔" میں نے کہا۔ "مجھے ڈی سلوا کے خلاف ثبوت چاہیے۔ تم اپنا دامن بچا کے ثبوت فراہم کر سکتی ہو۔ تمہارے بعد اور بھی بہت سی لڑکیاں اس کی ہوس اور شیطانی فطرت کے جال میں پھنس کے نقصان اٹھا چکی ہیں اور میں ان سے بھی ملوں گا۔"

"خدا کے لیے مجھے بخش دو۔" وہ منت کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "اگر میرے شوہر کو معلوم ہو گیا؟"

"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہو گا الماس! یہاں سے مجھے شہلا کے پاس جانا ہے اور اسے بھی قائل کرنا ہے کہ وہ کتنی خطرناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ اسے احساس نہیں لیکن اس کی زندگی تک کو خطرہ لاحق ہے۔ مجھے اس کو بتانا پڑے گا کہ ڈی سلوا پہلے کتنی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کر چکا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

الماس نے بچے کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بستر پر لٹایا۔ میں نے اسے بچے پر کمبل پھیلا کے اس کے ماتھے پر ممتا کی مہر ثبت کرتے دیکھا۔ اس نے وہ آنسو خشک کیے جو اس کے ارادے کے بغیر آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ اس نے خود کو دورے کی اولین اور تند ترین لہر کے زور سے بچا لیا تھا اور ازدواجی زندگی کو لاحق خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ یہ اس کے لیے سخت ترین آزمائش تھی۔ وہ اعتراف سے بھی ڈرتی تھی اور خاموشی کے نتائج سے بھی۔ جب وہ کمرے میں لوٹ کر آئی تو ایک بار پھر مجھے اور رابعہ کو اپنی نیک نیتی اور اس کے مستقبل کو تحفظ کی ضمانت حاصل ہونے کا یقین دلانے کی سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"دیکھو الماس!" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے بعد وہ بہت لڑکیوں کو ذلیل و خوار کر چکا ہے۔ وہ سب بزدل ہیں یا کمزور، اس سے انتقام نہیں لے سکیں مگر سکندر بخت کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے جب ڈی سلوا نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ان کے والد کو بلیک میل کیا اور ان کا سب کچھ چھین کر انہیں مرنے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ پاکستان آئے اور انہیں اصل حالات کا علم ہوا تو ان کو قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں پھانس لیا گیا اس لیے کہ ڈی سلوا اور اس کے ساتھی پیسے والے، اثر و رسوخ کے مالک اور بدمعاش تھے۔ ان کے مقدمات میں پیروی میں کر رہی ہوں اور میرے ساتھ دوسرے وکیل منظر صاحب ہیں۔ عبدالودود منظر۔ ہم تینوں بچپن میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جو لڑکیاں تمہارے چلے جانے کے بعد اس کی سیکرٹری بنیں، ان کا کیا انجام ہوا۔ ایک نے خودکشی کی اور دوسری پراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ تیسری کا پتہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس سے بھی ملیں گے۔ شاید وہ بھی کچھ بتا سکے اور پھر ہم شہلا کے پاس جا کر اس کو خبردار کر سکیں۔ اسے بتائیں کہ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے اور اپنی جان بچا کے نکل جائے ورنہ اس کا انجام زیادہ برا ہو گا۔ ڈی سلوا اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری بات نہ مانے۔ عشق میں آدمی اندھا بہرا اور پاگل ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے سمجھا کہ ہم ڈی سلوا کی دشمنی میں ایسی باتیں کہہ

رہے ہیں تو ہم اسے تمہارے پاس لے آئیں گے اور اس دوسری لڑکی سے بھی ملوا دیں گے۔ پھر وہ یقین کرنے پر مجبور ہو گی اور ہمیں ڈی سلوا کے بارے میں وہ سب باتیں بتا دے گی جو صیغۂ راز میں ہیں۔ سکندر بخت نے اس بدمعاش سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔ کیا تمہیں اس سے انتقام لینے کی خواہش نہیں ہے؟ یقیناً ہو گی مگر تم مجبور ہو۔ تمہارا گھر آباد ہو چکا ہے اور تمہارے شوہر کو کچھ معلوم نہیں۔ ظاہر ہے تم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتیں مگر تم اتنا تو کر سکتی ہو کہ..."

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" الماس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس کو تباہ کر سکتی ہوں۔ اسی طرح جیسے اس نے مجھے دھوکا دیا اور خراب کیا۔ میں بے وقوف اور جذباتی تھی کہ اس کی باتوں میں آ گئی اور اس کے لیے وہ کچھ کرتی رہی جو قانون کی نظر میں جرم ہے۔ مذہب کے لیے گناہ اور معاشرے میں ناقابلِ معافی۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ میں مر جاؤں یا اس شیطان کو مار دوں، لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے میری غلطیوں کو معاف کر کے مجھے جینے کے مواقع فراہم کر دیے۔ وہ باتیں بہت پرانی ہو چکی ہیں لیکن میں کچھ بھی نہیں بھولی ہوں۔ زخم اگر مندمل ہو گئے ہیں تو کیا۔ ان کے داغ بہت گہرے ہیں..."

وہ اب مخالف جذبات کی رو میں بہنے لگی تھی اور اپنے تمام اندیشوں اور وسوسوں کو بھول کر ہمیں ہر بات بتانے کے لیے تیار تھی کیونکہ ہم اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ تقریباً پانچ سال پہلے اس کی ملاقات ڈی سلوا سے ہوئی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال بچپن میں ہو چکا تھا چنانچہ اس کی پرورش حقیقی چچا نے کی تھی۔ چچا کو مرحوم بھائی کے احسانات کا بہت پاس تھا۔ بڑے بھائی نے باپ بن کر ان کو پالا تھا۔ انہوں نے الماس کو محبت اور شفقت دی۔ اس کی ضروریات کو اپنا پیٹ کاٹ کے پورا کیا اور اسے بی اے تک تعلیم دلوائی۔ یہ سب چچی کو سخت گراں گزرتا تھا، چنانچہ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی تھی۔ اسے ڈائن کہتی تھی جو ماں باپ کو کھا کے ان کے گھر میں آ گھسی ہے۔ اس کے بچوں کا حق مارنے آ گئی ہے اور ایسے منہ پھاڑ کے ہر چیز مانگتی ہے جیسے اس کا باپ خزانہ چھوڑ گیا تھا۔ مرتے وقت چچا کے مالی حالات کبھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے اور الماس کے باپ نے واقعی کچھ نہیں چھوڑا تھا چنانچہ چچی کی باتیں اس کے دل پر تیر کی طرح لگتی تھیں۔ ان باتوں کا اثر گھر کے بچوں پر بھی تھا۔ وہ چھوٹے ہونے کے باوجود اسے بے عزت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ اسے منحوس، مصیبت اور بلا کہتے تھے۔ بات بات پر احساس دلاتے تھے کہ یہ ہمارے باپ کا گھر ہے، تمہارے باپ کا نہیں۔ الماس نے دو ایک مرتبہ ان کو اس بدتمیزی پر ہلکا سا تھپڑ رسید کر دیا تو انہوں نے کہرام مچا دیا اور چچا کے سامنے یہ کہا گیا کہ الماس نے بچوں کو بلا وجہ انتہائی بے رحمی سے مارا ہے۔ چچا بہت کچھ سمجھنے کے باوجود بہت سی باتیں نہیں سمجھتے تھے مثلاً یہ کہ بیوی تو الماس کے خلاف جھوٹا الزام عائد کر سکتی ہے مگر بچے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب چچا نے بھی غصے میں اسے لعن طعن کی۔ گو بعد میں انہوں نے پیار سے تلافی بھی کی مگر الماس کے دل میں یہ احساس جڑ پکڑتا گیا کہ اسے اپنا گھر بنانا ہے۔ سارا دن پورے گھر کی نفرت کا شکار رہنے کے بعد شام کو گھر آنے والے چچا کی شفقت اس کے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔

پانچ سال پہلے وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جو سڑک کے کنارے بازار میں تھا۔ وہ اکثر بالکونی میں آ کھڑی ہوتی تھی اور بازار کی چہل پہل دیکھتی رہتی تھی۔ بالکونی کے عین مقابل سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک بنک تھا۔ ایک روز وہ حسبِ عادت باہر دیکھ رہی تھی کہ بینک کے سامنے سیاہ رنگ کی لمبی سی کار آ کے رکی۔ جس چیز نے الماس کو متوجہ کیا، وہ کار کے شیشے تھے جن میں سے اندر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے تین افراد کار کے پچھلے دروازے کھول کر اترے اور چوتھا انجن اسٹارٹ کیے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ الماس یہ دیکھ کر اور حیران ہوئی کہ تینوں افراد نے ایک جیسے بریف کیس اٹھا رکھے تھے، ایک جیسے لباس پہن رکھے تھے اور ان کا حلیہ بھی تقریباً ایک جیسا تھا۔ انہوں نے ملیشیا کی گھیردار شلواریں اور لمبے لمبے کرتے پہن رکھے تھے۔ سب کے سروں پر پگڑیاں تھیں اور وہ ایک ہی عمر کے صحت مند جوان مرد تھے جن کے پُررعب چہروں پر مشت بھر سیاہ داڑھی تھی۔ ان کی صورتوں اور حلیوں کی مماثلت دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ وہ تینوں بھائی ہیں۔ الماس کے سامنے وہ تینوں بنک میں داخل ہوئے اور دروازے پر کاہلی سے کھڑے ہوئے گارڈ نے بھی ان کو محض دلچسپی سے دیکھا۔ ابھی مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ بنک میں سے گولیاں چلنے کی آواز آئی اور الماس کی دہشت زدہ نگاہوں نے گارڈ کو باہر گرتے دیکھا۔ وہ بندوق جس کو گارڈ سہارے کے لیے بطور لاٹھی استعمال کر رہا تھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر گر گئی۔ بنک کے اندر ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی اور دروازے کے باہر وہ گارڈ تڑپ رہا تھا جس کے سینے میں کم از کم دو گولیاں لگی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھیں۔ اس کا خون پکّے ٹائل کے فرش پر بہہ رہا تھا اور چھینٹے بنک کی بیرونی دیوار پر بھی نظر آ رہے تھے۔ بازار میں بھی لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ وہ شخص جو کار میں بیٹھا رہا تھا، فوراً باہر نکل آیا اور بنک کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مشین گن تھی اور وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو خبردار کر رہا تھا کہ قریب کوئی نہ آئے۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا اور اتنا غیر متوقع تھا کہ الماس خوف اور حیرت سے سُن کھڑی رہ گئی۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ وہ دوڑ کر ساتھ والے گھر میں جائے اور پولیس کو فون کر کے بنک میں ڈاکا پڑنے کی اطلاع کر دے۔ اس نے دیکھا کہ وہ چوتھا آدمی جو مشین گن لیے باہر کھڑا تھا صورت شکل اور حلیے میں باقی تین افراد سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر سفید دھاریوں والی سرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ اور گہرے سیاہ شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ شاید کار سے اترنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ تاوقتیکہ صورتحال ہنگامی نہ ہو جائے۔ تین چار منٹ میں اندر جانے والے دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ سیاہ چشمے اور سرخ جرسی والا نوجوان پھر کار کی طرف لپکا اور اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اس کے باقی تینوں ساتھی ایک کے پیچھے ایک بھاگتے آ رہے تھے۔ الماس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو کسی سنسنی خیز فلم کی طرح تھا مگر حقیقی زندگی کا منظر تھا۔ اچانک دم توڑتے ہوئے گارڈ نے جسم کی ختم ہوتی ہوئی قوت مجتمع کر کے دونالی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت تک ایک ڈاکو کار کا پچھلا دروازہ کھول کے بیٹھ چکا تھا۔ گارڈ نے دوسرے پر گولی چلائی اور وہ وہیں سڑک پر گر گیا۔ الماس نے نوٹ کیا کہ واپسی پر بریف کیس تینوں کے ہاتھ میں نہیں تھے اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ ان میں اسلحہ اندر لے گئے تھے۔ غالباً وہ سب مشین گن جس کے ٹکڑے الگ کیے جا سکتے ہیں اور ان کو جوڑ کر پھر پوری مشین گن بنائی جا سکتی ہے۔ واپسی پر کار میں سب سے پہلے بیٹھنے والا بھی بریف کیس کے بجائے مشین گن لیے نکلا تھا اور اس کا دوسرا ساتھی بھی جو مارا جا چکا تھا۔ بریف کیس صرف ان کے تیسرے ساتھی کے ہاتھ میں تھا جو سب سے پیچھے تھا۔ خون میں لت پت گارڈ نے ایک بار پھر بندوق اٹھائی اور دوسری گولی چلائی مگر اس کے ہاتھوں کی قوت جواب دے رہی تھی اور شاید اس کی نظر بھی دھندلا چکی تھی کہ وہ نالی کو پورا نہ اٹھا سکا اور گولی بریف کیس والے شخص کی ٹانگ میں لگی۔ مالِ غنیمت یقیناً بریف کیس میں تھا۔ وہ ایک بار گرا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ کار میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے بدحواسی میں چلا کر اسے جلدی کرنے کو کہا اور گاڑی آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ اس کا ایک پچھلا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ زخمی ٹانگ کے ساتھ بھاگنے والے شخص نے کار تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا کے گر گیا۔ تاہم اس نے بریف کیس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ ڈاکوؤں میں سے ایک نے چیخ کر اسے گالی دی اور بریف کیس پھینکنے کے لیے کہا مگر رہ جانے والا جانتا تھا کہ اس نے بریف کیس پکڑا دیا تو اس کے ساتھی خود اسے گولی مار کر یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا لیکن بریف کیس کو پیچھے رکھا۔ کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار میں گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن کار کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ بریف کیس والا سڑک پر گر گیا پھر اچانک ہوا کے زور سے کار کا دروازہ بند ہو گیا اور سامنے سے پولیس کی ایک جیپ نمودار ہوئی۔ الماس کا خیال بھی یہی تھا کہ پولیس ڈاکے کی اطلاع پا کر آئی ہے مگر وہ کہیں چھاپہ مارنے جا رہے تھے۔ ڈاکو ان کو دیکھتے ہی ایسے بدحواس ہوئے کہ انھوں نے ایک شیشہ کھول کر مسلسل ہوائی فائر کیے۔ پولیس کی جیپ فوراً ایک گلی میں گھس گئی اور بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیاہ، تیزی سے بڑھی اور بریف کیس والا سڑک پر پڑا رہ گیا۔ ساتھیوں کو بے وفائی کر کے اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہوتے دیکھ کر پاگل ہو گیا اور اٹھ کر بے تحاشا ان کے پیچھے چلاتا ہوا دوڑا۔ "خدا کے لیے... مجھے چھوڑ کے مت جاؤ..." اسے وہ ٹرک بھی دکھائی نہ دیا جو سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے وسط میں اپنی زخمی ٹانگ کا لہو پھیلاتا، دیوانہ وار چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی مگر ٹرک کی رفتار بہت زیادہ تھی، پلک جھپکتے میں ٹرک اس کے اوپر سے گزر گیا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے اور لاش کے گرد ایک جمگھٹا لگ گیا۔ الماس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے ایک چکر سا آیا اور وہ اندر کی طرف بھاگی۔ بستر پر گر کے وہ ذرا سی دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی۔ دہشت سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ٹھنڈا پسینہ اس کے جسم پر پانی کی طرح بہنے لگا تھا اور اس کے خشک حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس کا چچا آفس میں تھا۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور چچی شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی کچھ دیر بعد جب الماس کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے سوچا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر ہوگا ورنہ وہ مشکل میں پھنس جائے گی۔ اسے بیان کے لیے تھانے جانا پڑے گا اور نہ جانے کب تک

کے لیے عدالت میں حاضری دینی پڑے گی، اس کے چچا اور چچی کو یہ ہرگز منظور نہ ہوگا کہ پولیس ان کے گھر کے چکر لگائے اور آئے دن عدالت کا بیلف سمن لیے دروازے پر موجود ہو۔ سیاہ چشمہ اور سرخ جرسی والے ڈرائیور کی صورت اس کے دل میں نقش ہو گئی تھی۔ باقی تین جانتے بوجھتے ایک جیسا حلیہ بنا کے آئے تھے تاکہ کسی کے بارے میں کوئی بھی چشم دید گواہ واضح بیان نہ دے سکے۔ دیکھنے والے بہت تھے چنانچہ الماس نے طے کیا کہ وہ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑے گی بلکہ واپسی پہ چچی نے پوچھا تو وہ کہہ دے گی کہ میں سو رہی تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ باہر کیا ہو گیا۔

مگر اسی وقت الماس کو یوں لگا جیسے کوئی دھم سے صحن میں کودا۔ صحن کا ایک دروازہ پچھلی طرف کی تنگ گلی میں بھی تھا۔ وہ کمرے سے نکلی اور نیچے اتری۔ نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پچھلی منزل کے باورچی خانے کے سامنے سے گزر کے کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ اچانک کسی نے اس کو باورچی خانہ میں گھسیٹ لیا۔ الماس کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔ اس کی آنکھوں نے ایک اجنبی کو دیکھا جس کے دوسرے ہاتھ میں تیز دھار والا لمبا اور پتلا خنجر تھا۔ خنجر باورچی خانہ کی کم روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی نوک الماس کے حلق سے چند سوت کے فاصلے پر تھی۔

"اگر آواز نکالی تو یہیں ذبح کر دوں گا۔" وہ بولا اور اس نے الماس کو آزاد کر دیا۔ الماس سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ "تمہارے سوا گھر میں کون کون ہے؟" اس شخص نے پوچھا۔ وہ تیس چالیس سال کا تندرست آدمی تھا۔ کلین شیو اور سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے۔ الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کوئی... کوئی نہیں۔" الماس نے حلق میں پھنس جانے والے الفاظ کو بڑی مشکل سے ادا کیا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بولا۔ "دیکھو لڑکی! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ بس تم اپنی زبان بند رکھو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں کچھ دیر تک کہاں چھپا رہ سکتا ہوں؟"

"ایک... ایک گھنٹے بعد اسکول سے بچے آ جائیں گے۔" الماس نے کانپتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک تمہیں کوئی خطرہ نہیں... لیکن تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ درشتی سے بولا۔ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔ آج کے بعد بھولے سے بھی اس بات کا تذکرہ کسی سے مت کرنا۔ پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی لیکن میں رات کو سوتے میں اس خنجر سے تمہاری یہ نازک اور خوبصورت گردن کاٹ جاؤں گا... ایسے۔" اس نے ہوا میں خنجر کو حرکت دی۔ "تمہارے بھائی بہن، ماں باپ سب کے سر تن سے جدا کر جاؤں گا۔"

دہشت سے الماس کی حالت غیر ہو گئی۔ اجنبی نے اسے وہیں چھوڑا اور باہر نکل کر دروازے کی کنڈی لگا گیا۔ الماس سوچنے لگی کہ کیا وہ چلا گیا ہے مگر اس نے تو ایک گھنٹہ چھپے رہنے کی مہلت مانگی تھی۔ اگر وہ مجھے اسی طرح چھوڑ گیا تو میں چچی کو کیا بتاؤں گی کہ مجھے باورچی خانے میں کس نے بند کیا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا اور الماس نے اجنبی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا۔ "تم واقعی سمجھدار لڑکی ہو۔" وہ بولا۔ "میں تمہیں آزما رہا تھا کہ موقع ملنے کے بعد تم شور مچاتی ہو یا نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے ایک گھنٹہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی گلیوں کی طرف سے نکل جانے میں خطرے کی بات نظر نہیں آتی۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور الماس کی نظر اس بریف کیس پر تھی جو اب اجنبی کے ہاتھ میں تھا۔ چند منٹ کے اندر یہ بریف کیس وہ باہر سے نہیں لا سکتا تھا۔ بریف کیس گھر میں ہی موجود تھا اور شاید اس نے خود اندر کودنے سے پہلے صحن میں پھینک دیا تھا۔ یہ وہی بریف کیس تھا جو ٹرک کے نیچے آ جانے والے ڈاکو کے پاس تھا۔ اس کی ساخت اور اس کا رنگ بالکل وہی تھا۔ اس پر سڑک کی کھردری سطح پر گھسیٹے جانے سے خراشیں پڑ گئی تھیں اور براؤن رنگ کی شارک اسکن جیسی بیرونی سطح کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صاف کر دینے کے باوجود اس پر اب بھی خون کے داغ تھے۔ جب وہ چلا گیا تو الماس بہت دیر تک منجمد کھڑی رہی۔ اپنی انتہا کو پہنچ کر خوف ختم ہو گیا تھا اور یہ قدرت کی عطا کردہ حیوانی جبلت کا کرشمہ تھا جو ایسے ہی حالات میں زندہ رہنے کے لیے قوت اور حوصلہ فراہم کر دیتی ہے۔ جسم میں جمع شدہ ایڈرینالین خون میں شامل ہو کے بلّی کو بھی شیر کے مقابلے پر آ جانے کی ہمت دیتی ہے۔ الماس کی سوچنے سمجھنے کی قوت اچانک بحال ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ بریف کیس اجنبی کے پاس کیسے پہنچا۔ جب ڈاکو ٹرک کے نیچے آیا تو سب کی توجہ حادثے کی طرف تھی، سوائے اس اجنبی کے، جس کی نگاہ نے بریف کیس کو دور گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بریف کیس میں کیا ہے چنانچہ وہ مجمع کی نظر بچا کر اور بریف کیس اٹھا کر بھاگ نکلا۔ سب سے پہلا گھر الماس کا تھا، جس کی دیواریں کچھ نیچی تھیں۔ اسے ڈر ہوگا کہ لوگ اس کو بریف کیس سمیت بھاگتا دیکھ چکے ہوں گے اور ممکن ہے اس کے تعاقب میں بھی آئے ہوں۔ وہ اس گھر میں چھپ گیا اور جب یہ اندیشہ نہ رہا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے تو وہ بریف کیس لے کر اطمینان سے نکل گیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

الماس کی آنکھوں نے ستم ظریف تقدیر کا وہ تماشہ دیکھا تھا جو ایک درسِ عبرت تھا۔ اس دولت کی خاطر ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنانے والے اور جان دینے والے لوگ دوسرے تھے مگر یہ دولت ایک ایسے شخص کی جھولی میں آگری تھی جس نے حادثے کے وقت سے چند سیکنڈ قبل بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی دولت کا مالک بننے والا ہے۔

الماس اس بات کو بھول گئی اور اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں یہ اس لیے بھی مشکل ہو گیا کہ اسے چچا اور چچی کی ناراضگی کا ڈر تھا جو اس بات پر یقیناً خفا ہوتے کہ اس نے اتنی بڑی بات جھوٹ بول کر کیوں چھپائی۔ وہ ان دنوں بی۔ اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی اور نتیجے کا انتظار کر رہی تھی۔ چونکہ اسے پاس ہو جانے کا یقین تھا اس لیے چوری چھپے اس نے کئی جگہ ملازمت کی درخواستیں بھجوا رکھی تھیں۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ وہ اس گھر کے رسوا کُن احسانات کا بار جلد از جلد اتار دے۔ وہ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی آرزو مند تھی کیونکہ اس میں ذلت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ تقدیر نے اس کی مدد کی اور ابھی نتیجہ آیا بھی نہ تھا کہ اس کو میروزیر اینڈ کمپنی کی طرف سے ملازمت کا پروانہ مل گیا۔ نجانے کیوں ڈی سلوا کو دیکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ پہلے بھی اس کی صورت کہیں دیکھ چکی ہے۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ ایک روز دفتر میں ایک شخص ڈی سلوا سے ملنے آیا جس کا استقبال ڈی سلوا نے بڑی گرمجوشی سے کیا۔ اس شخص کا نام چوہدری دلاور تھا۔

”چوہدری دلاور!“ میں نے بے اختیار کہا اور اتنی اونچی آواز میں کہ الماس نے مجھے تشویش سے دیکھا۔ ”کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟“

الماس نے کسی دشواری کے بغیر مجھے چوہدری دلاور کے بارے میں تمام تفصیلات فراہم کر دیں اور میرے لیے شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ چوہدری دلاور وہی ہے جو بعد میں میروزیر اینڈ کمپنی کا تیسرا پارٹنر بنا۔ صاف ظاہر تھا کہ کاروبار میں وہ اس مالِ غنیمت کی وجہ سے شامل ہوا تھا جو لاٹری کے انعام کی طرح اسے غیر متوقع طور پر مل گیا تھا۔ الماس کے بیان کے مطابق بنک لوٹنے والے فرار ہو گئے تھے اور اپنے دو ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ گئے تھے جن سے پولیس کچھ معلوم نہیں کر سکی ہو گی۔ پولیس کے ریکارڈ سے ڈکیتی کی اس واردات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ اخبارات کی بہت سی فائلیں دیکھنے سے بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا کہ ڈاکو کتنی رقم لے گئے تھے اور ان کے باقی ساتھی بعد میں گرفتار ہوئے تھے یا نہیں۔

لیکن اس سے یہ ثابت کرنا یقیناً بہت مشکل تھا کہ چوہدری دلاور کا سرمایہ اسی رقم پر مشتمل تھا جو بنک سے لوٹی گئی تھی۔ اس نے میر شرافت علی کو یا میرے مرحوم والد کو اپنی دولت مندی کی جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا ہو گا اور یہی کہا ہو گا کہ اس نے یہ دولت اپنی محنت سے کمائی ہے یا باپ سے ورثے میں حاصل کی ہے۔ تاہم بہت سی باتیں واقعاتی شہادت کا حصہ بن سکتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس زمانے میں جب ڈکیتی کی یہ واردات ہوئی تو چوہدری دلاور کہاں قیام پذیر تھا اور یہ کہ وہ کتنے سرمایہ سے کاروبار میں شریک ہوا تھا۔ الماس کو بعد میں چشم دید گواہ کے طور پر سامنے لایا جا سکتا تھا لیکن ابھی سے اس کا نام لینا دانشمندی نہ ہوتا اور الماس کی زندگی کے لیے فوری خطرات پیدا کر دیتا۔ جب رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے کہا کہ وہ اس ملاقات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے۔ اپنے شوہر سے بھی نہیں۔

”ان سے میں کوئی بات کیسے کہہ سکتی ہوں۔“ وہ شرمندگی سے نظر جھکا کر بولی۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ آپ میرے یا رابعہ قاری کی سے آشنائی کا حوالہ بھی نہ دیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو ظاہر ہے کہ آپ اپنے اور ڈی سلوا کے تعلقات کے بارے میں اپنے شوہر کو کچھ نہیں بتائیں گی مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی حوالے سے بنک میں پڑنے والے ڈاکے کی بات نہ کریں بالکل اسی طرح جیسے اس وقت آپ نے اپنے گھر میں تذکرہ نہیں کی تھی۔ بعد میں کسی مرحلے پر آپ کی گواہی چوہدری دلاور کی شناخت کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں کسی عدالت میں کوئی بیان نہیں دینے جاؤں گی۔“ وہ نروس ہو کے بولی۔

”میں نے یہ کب کہا ہے؟“ میں نے فوراً اس کو مطمئن کر دیا۔ ”یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی پولیس افسر ڈکیتی کی واردات میں ملوث سمجھے جانے والے مشتبہ افراد کی تصویریں لے کر آجائے جن میں چوہدری دلاور کی تصویر بھی ہو اور آپ اسے شناخت کر لیں۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک بار آپ کو عدالت کے سامنے بھی ملزم کو شناخت کرنے کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اپنے شوہر سے بھی آپ کہہ سکتی ہیں کہ خوف کے باعث اس واردات کا ذکر آپ نے کبھی کسی کے سامنے نہیں کیا تھا۔ ویسے آپ چاہیں تو اپنے شوہر کو واپسی کے بعد کسی بھی بہانے یہ واقعہ بتا سکتی ہیں۔ اس طرح ان کو عدم اعتماد کی شکایت بھی نہیں رہے گی اور اگر آپ کو گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا بھی پڑا تو ان کو صدمہ یا اعتراض نہیں ہو گا۔ اس گواہی میں ڈی سلوا کا نام کہیں نہیں آئے گا لیکن آپ اپنے شوہر کو کچھ بتائیں تو یہ ضرور سمجھا دیں کہ رازداری کتنی اہم ہے۔“

وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی اور کچھ پشیمانی کے احساس کا شکار نظر آتی تھی کہ اس نے اتنی جلدی ہم پر اعتبار کیوں کر لیا اور ہمیں اپنی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع کیوں فراہم کر دیا۔ میری نیت بالکل صاف تھی اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا مستقبل کسی طرح بھی اس کے ماضی کے آسیب کا شکار ہو۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی گواہی کے بغیر بھی میں چوہدری دلاور کو قانون کے حوالے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے بلاوجہ ان معاملات میں ملوث نہیں کروں گا لیکن مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ڈی سلوا سے کیوں ڈرتی ہے اور اس کے خلاف انتقامی جذبات کے اسباب کیا ہیں۔ کیا ایسی کوئی بات ہے جسے ڈی سلوا بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر سکتے؟ میرا یہ سوال ہی غلط تھا کیونکہ ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو الماس کے لیے ڈرنے کی کوئی وجہ بھی نہ ہوتی مگر خود اپنی زبان سے جرم کا اعتراف کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”دیکھو الماس! زندگی میں کون غلطی نہیں کرتا۔ جو غلطی نہ کرنے کا دعویٰ کرے وہ فرشتہ تو ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ ہم ہر قدم پہ ہر روز غلطی کرتے ہیں اور ان تجربات کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ غلطیوں سے ہم سبق سیکھتے ہیں۔ اور کامیاب وہ رہتے ہیں جو ایک ہی غلطی دو بار نہیں کرتے۔ اس کے باوجود معاف کر دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور انسانوں میں شیطان بھی ہیں جو دوسروں کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا لیتے ہیں۔ تم نے صرف یہ غلطی کی کہ ڈی سلوا کی باتوں پہ اعتبار کیا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ کوئی غلطی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ڈی سلوا فریبی اور دھوکے باز آدمی ہے۔ خود تم نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا اس لیے تم سمجھتی تھیں کہ دنیا میں کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ یہ قصور ہمارے معاشرے کا ہے جہاں عورت کی چھوٹی سی غلطی تمام عمر کے لیے بہت بڑی سزا بن جاتی ہے۔ مرد حاکم ہے اور زبردست ہے۔ وہ چاہے تو سو بار بھی مجبور لڑکیوں کی عفت و عصمت کا دامن تار تار کر دے مگر خود اس کا دامن داغدار نہیں ہوتا۔ وہ کنوارا ہے کہ آ... کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور اسے کوئی خوف نہیں ہوتا کہ ان مجبور لڑکیوں میں سے کوئی اسے بلیک میل کر سکے گی۔ کیونکہ وہ آخری لڑکی جو اس کی بیوی بنتی ہے وہ بھی تو آخر مجبور ہی ہوتی ہے اور کسی کا ذکر کیا خود اپنے ماں باپ کے گھر کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ کہیں نہیں جا سکتی، کسی سے انتقام نہیں لے سکتی اور شوہر کیسا بھی ہو صبر و شکر کے ساتھ اس کا ہر ظلم سہنے اور اسی کی پناہ میں رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تمہارا بھی یہی کیس ہے لیکن تم خوش قسمت ہو اور عقلمند ہو کہ سنبھل گئیں مگر ان سب کا سوچو جن کی ایک غلطی کو کسی نے معاف نہیں کیا اور وہ اب تک اس کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ان کے گھر آباد نہیں ہو سکے کیونکہ انہوں نے خاندانی شرافت کے لباس پر اپنی بدنامی کا داغ لگا دیا تھا۔ وہ خود یا ان کے خاندان والے، قانون کے محافظ اور انصاف کرنے والے سب مل کر بھی اس داغ کو مٹا نہیں سکتے۔ تم کہو گی کہ مجھے ان سے کیا، ان کی خاطر میں اپنا گھر کیوں برباد کروں۔ ٹھیک ہے تم کچھ مت کرو جو کچھ کرنا ہے وہ میں خود کر لوں گا اور تم پر آنچ نہیں آئے گی۔ ڈی سلوا جیسے آدمی نے صرف گناہ ہی نہیں جرم بھی کیے ہوں گے۔ ایسے جرائم جن کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں ہو گا۔ اگر تم مجھے کوئی بھی بات بتا سکو تو باقی سراغ میں لگا لوں گا اور انجام تم خود دیکھ لو گی۔ ابھی تو میرے پاس بھی ثبوت نہیں ہے کہ وہ میرے والد کے قاتلوں میں شامل ہے لیکن قانون کی عدالت میں یہ جرم اس پر ثابت نہ ہو سکا تب بھی میں تہیہ کر چکا ہوں کہ اپنے یقین کی بنیاد پر خود اپنے ضمیر کی عدالت میں ہر مجرم کو کھینچ لاؤں گا اور انصاف خود کروں گا۔“

میں نے الماس کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنا تمام زورِ بیان صرف کر دیا تھا۔ مجھے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ الماس نے پہلے تو وہ کہانی سنائی جس میں کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ یہ آپ بیتی کسی بھی الماس کی ہوسکتی تھی۔ ڈی سلوا نے اسے دو درجن لڑکیوں میں سے صورت دیکھ کر منتخب کیا تھا۔ ابتدائی چند ہفتوں میں ڈی سلوا نے خود کو ایک سنجیدہ مزاج، شریف اور قابلِ اعتماد باس ثابت کرنے کے لیے احتیاط سے کام لیا تھا، الماس کے کام سے کام رکھا تھا، اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا تھا اور دفتری امور میں اس کی رہنمائی کے لیے مشفقانہ رویّہ اختیار کیا تھا جو بعد میں ہمدردانہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دوستانہ۔ پھر بالکل نامعلوم طریقے پر یہ رویّہ عاشقانہ ہوا اور ڈی سلوا نے الماس کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لیا۔ اس میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک فلمی ہیرو میں ہوتی ہیں اور جب لڑکی کو زندگی میں کوئی مرد ایک مثالی شوہر نظر آنے لگے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتے ہوئے وہ مصلحت کے تمام تقاضوں کو بھول کر دنیا کی انگشت نمائی کی پروا نہیں کرتی اور اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کے بعد الماس کے پاس ندامتوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ آنکھ سے فلمی ہیرو نظر آنے والا عملی زندگی میں ولن ثابت ہوا تھا اور وہ جس نے زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، الماس کو ناامیدی اور دل شکستگی کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ گیا تھا جہاں خوابوں کے سراب تھے، پاؤں کے پُرخار کیکٹس تھے اور بدنامی کی کڑی دھوپ تھی اگر ایک فرشتۂ رحمت اس کا ہاتھ نہ تھامتا تو وہ اس صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے مر جاتی۔ الماس کا شوہر واقعی فرشتہ سیرت تھا اس نے کبھی الماس کے ماضی کو نہیں کریدا تھا لیکن وہ بہرحال ایک مرد تھا جو شادی کے بعد عورت کو صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور نیا کہہ کر اسے سکنڈ ہینڈ مال دے دیا گیا ہے تو اس کی سزا بھی وہ اصل مجرم کو نہیں، بیوی کو ہی دیتا ہے۔ مرد کی فطرت کا یہ تضاد کتنا عجیب ہے کہ وہ پاکباز اور وفا شعار بیویوں کو چھوڑ کر طوائفوں کو گھر میں ڈال لیتے ہیں مگر بیوی کے بارے میں بدخواہوں کی زبان سے جھوٹ بھی سن لیں تو ان کی غیرت و حمیّت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ الماس نے اعتراف کیا کہ ڈی سلوا سے جذباتی وابستگی کے زمانے کی چند تصویریں اور الماس کے خطوط اب بھی ڈی سلوا کے پاس ہیں۔ اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ تصویریں کس قسم کی ہیں مگر الماس کی صورت گواہی دیتی تھی کہ ان کا ذکر بھی اسے شرم سے پانی پانی کر رہا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں یہ تصویریں اور خط واپس لینے کی پوری کوشش کروں گا مگر یہ کوشش اسی قدر کامیاب ہوسکتی ہے جب میرے ہاتھ میں بھی کوئی ٹرمپ کارڈ ہو۔

بہت سوچ کر الماس نے مجھے ایک بات بتائی۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے ایک سال ہونے والا تھا اور یہ زمانہ وہ تھا جب الماس پوری طرح ڈی سلوا کے قبضے میں تھی۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ ایک مہینے بعد وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ ڈی سلوا نے الماس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام قبول کرے گا اور جیسے ہی اس کے والدین یورپ کے دورے سے واپس آئیں گے وہ ان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا۔ اس کے ماں باپ روشن خیال اور فراخدل ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈی سلوا کے والدین کا کوئی وجود بھی نہیں۔ ڈی سلوا کا ماضی ایک تاریک خلا کی طرح تھا جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے دروازہ خود الماس نے کھولا تو اسے اپنے سامنے ایک اجنبی نظر آیا۔ ”مس الماس!“ وہ شخص آہستہ سے بولا۔ ”یہ خط ڈی سلوا صاحب نے دیا ہے۔“ خط لانے والا ایک عمر رسیدہ اور حلیے سے غریب نظر آنے والا شخص تھا۔ الماس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے بڑی آسانی سے الماس کو پہچان لیا تھا۔ خط میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ ڈی سلوا نے ایک ہنگامی ضرورت کے باعث الماس کو طلب کیا تھا اور مکمل رازداری کی ہدایت کی تھی۔ الماس بڑی الجھن میں پڑ گئی۔ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی لیکن اسے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ہنگامی ضرورت کیا ہے؟ اسے کہاں جانا ہے اور کتنی دیر کے لیے جانا ہے۔ آدھے گھنٹے کی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس سے زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنا اس کے گھر والوں کے لیے باعثِ تشویش ہوسکتا تھا۔ وہ رات کو کبھی اکیلی باہر نہیں گئی تھی لیکن خط میں رازداری کی شرط تھی، چنانچہ وہ چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ اس بوڑھے نے بھی الماس کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ... ڈی سلوا نے صرف خط دینے کی تاکید کی تھی۔ اس نے کہا کہ گاڑی گلی کے آخر میں سڑک پر کھڑی ہے اگر وہ ڈی سلوا صاحب کی گاڑی کو پہچانتی ہے تو آجائے وہ آدھے گھنٹے تک انتظار کرے گا اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا اور الماس نے دوبارہ بند کر کے دو سطروں کے پیغام کو جلا کر راکھ کر دیا خط کا مضمون اسے ازبر ہو چکا تھا اور وہ شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ عقل کے تقاضے دل کی آواز سے برسرِ پیکار رہتے اور اسے جلد فیصلہ بھی کرنا تھا کہ وہ گھر والوں کو دھوکا دے کر ایک اجنبی کے ساتھ کیسے جاتے؟ بالآخر جیت دل کی ہوئی۔ اس نے بڑی چالاکی سے ساتھ والے گھر جاکر اپنی ایک قابلِ اعتماد سہیلی کو فون کیا کہ وہ فوراً آجائے، ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر کیونکہ بات ایسی ہے جو فون پر نہیں بتائی جاسکتی۔ یہ سہیلی الماس کی رازدار تھی اور پہلے بھی کتنی بار ڈی سلوا اور الماس کی ملاقاتوں کا وسیلہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں گھروں کے تعلقات بہت قریبی تھے اس لیے شک کی کوئی نوبت نہیں آئی تھی۔ ڈی سلوا نے اب آدھے گھنٹے کا وقت دیا تھا جو تیاری کے علاوہ مناسب بہانہ بنانے کے لیے بھی کم تھا۔ الماس بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔ اس کی سہیلی بیس منٹ بعد نمودار ہوئی۔ مزید دس منٹ الماس کے والدین کو یہ سمجھانے میں لگ گئے کہ وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے الماس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہے۔ اس کا ذکر وہ اس سے اس لیے نہیں کر سکی تھی کہ وہ خود بے حد مصروف تھی۔ مزید دس منٹ بعد جب وہ دونوں سڑک تک پہنچیں تو الماس کا خیال تھا کہ وہ شخص جا چکا ہوگا کیونکہ اس نے آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا تھا اور الماس چالیس منٹ بعد پہنچی تھی لیکن ڈی سلوا کی کار موجود تھی اور وہ شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اتنی دیر میں الماس نے اپنی سہیلی کو تمام صورتِ حال سمجھا دی تھی تاکہ اسے واپسی میں دیر ہو جائے تو بات نہ بگڑے۔ ڈی سلوا سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے الماس کبھی خوف میں مبتلا نہ ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس روز یہ احساس غالب تھا کہ اس طرح گھر سے نکل کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی الماس کو معلوم ہو گیا کہ یہ گاڑی باہر سے دیکھنے میں بالکل ڈی سلوا کی گاڑی جیسی تھی مگر اندر سے بالکل مختلف۔ کار کے کسی دروازے میں شیشے اتارنے چڑھانے یا دروازہ کھولنے کے لیے ایک بھی ہینڈل نہیں تھا چنانچہ یہ دروازے صرف باہر سے کھولے جاسکتے تھے اور بند شیشوں سے الماس کے چلّانے کی آواز بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ خوف سے الماس بالکل مفلوج بیٹھی تھی اور گاڑی کو مختلف راستوں سے گزرتا دیکھ رہی تھی۔ اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ راستے اس کے ...۔ اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوتا کہ گاڑی غلط

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و
تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص
کی آپ بیتی، ہَوا جس کی دوست
تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر
تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت
کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصّوں میں مکمّل

قیمت فی حصہ ۴۰/ روپے ✱ ڈاک خرچ فی حصہ ۱۲/ روپے

راستے پر جا رہی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتی مثلاً وہ پیچھے سے ڈرائیور کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے گاڑی روکنے پر مجبور کرتی خواہ اس سے گاڑی کے بے قابو ہونے، الٹ جانے یا کسی سے ٹکرا جانے کا خطرہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ یا وہ کسی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی کوشش کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ کی ضرب سے اس شیشے کو توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے جو سامنے کے شیشے میں سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا صرف ایک بار کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ ڈی سلوا صاحب نے اپنی گاڑی بھیجی ہے؟" الماس بولی۔

"جھوٹ کہاں ہے بی بی؟ کیا تم کار کے ماڈل اور رنگ سے واقف نہیں ہو؟" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ "اور میں غلط آدمی تو نہیں ہوں؟"

"یہ مجھے کیا معلوم۔ میں نے تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" الماس نے کہا۔

"ابھی تم نے دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "تمھاری عمر ہی کیا ہے۔"

"لیکن میں نے ڈی سلوا صاحب کی کار دیکھی ہے۔ اس کے اندر سارے سینڈل وغیرہ موجود تھے۔"

"ضرور ہوں گے۔ مگر ضرورت کے وقت یہ چیزیں ہٹائی بھی جا سکتی ہیں۔" وہ بولا۔ "آدھے گھنٹے میں پھر سب لگ جاتی ہیں اور چیزیں ہی کیا آدمی بھی بدلے جا سکتے ہیں اور ایسے غائب کیے جا سکتے ہیں کہ دنیا کو نظر نہ آئیں۔ سب ضرورت کی بات ہے۔"

الماس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن وہ ان باتوں سے مزید دہشت زدہ ہو گئی۔ "اچھا تم مجھے یہ بتا دو کہ جانا کہاں ہے؟ ڈی سلوا صاحب کے گھر؟ میں خود پہنچ جاؤں گی کسی ٹیکسی میں۔"

"کار کے ہوتے ہوئے ٹیکسی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟" بڈھے نے خشک لہجے میں کہا۔

"ضرورت ہے یا نہیں۔" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کار کا نمبر دیکھنا چاہتی ہوں۔ کہیں تم نے میرے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا؟ آخر کیا ضرورت تھی مجھے ایسے قید کر کے لے جانے کی؟ اگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ نمبر وہی ہے تو مجھے تمھارے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو لڑکی میرے ساتھ کار تک آئی تھی اسے سب معلوم ہے اور وہ بہت ذہین لڑکی ہے... اس نے نمبر ضرور دیکھا ہوگا۔ اس کا باپ پولیس میں ہے۔" الماس اب خوف کے ہاتھوں مبتلا تھی اسے یقین آ چکا تھا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ جھوٹ سچ بول کر اس بڈھے ڈرائیور کو ڈرانے کی بے سود کوشش میں مصروف تھی لیکن وہ بڈھا بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور گاڑی روکنے کے لیے تیار نہ تھا۔

"تم بہرے ہو گئے ہو کیا؟" الماس نے چیخ کر کہا۔ "میں کہتی ہوں کہ گاڑی روکو۔ میں ڈی سلوا صاحب کے گھر فون کروں گی اور تصدیق کروں گی۔"

"کیا تصدیق کرو گی؟ کیا وہ تحریر کسی اور کی تھی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"کسی اور کی نہیں تھی تو تمھیں ڈر نہیں ہونا چاہیے۔" الماس نے لرزتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو اس دکان میں فون ہے" لیکن کار کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ کار کا رخ اب بھی سلوا کے بنگلے کی طرف تھا۔ الماس کو یہ شبہ بھی نہیں تھا کہ وہ خط ڈی سلوا کی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نہیں ہے مگر اسے یقین آ چکا تھا کہ خود ڈی سلوا بھی کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔ عین ممکن ہے کسی نے اس سے یہ تحریر زبردستی حاصل کر لی ہو۔ وہ یک لخت ڈرائیور پر حملہ آور ہوئی۔ گاڑی اب بازاروں سے گزر کے شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ ڈرائیور اس حملے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے ایک دم بریک لگائے تو زبردست جھٹکے سے الماس آگے آ گری۔ اس کا ایک ہاتھ کار کے اسٹیئرنگ پر لگا جس سے گاڑی بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی لیکن اس نے بڑی مہارت سے اسے روک لیا اور ایک کوٹھی کی دیوار سے نہیں ٹکرانے دیا۔ الماس کا سر ڈیش بورڈ سے لگا تھا اور وہ آگے یوں گری تھی کہ اس کا سر ہی نیچے جھکا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اس کے سر پر کسی بھاری چیز کی ضرب پڑی جس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔

جب اس کی آنکھ کھلی اور اس نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر اس کا سارا خوف مٹ گیا کہ وہ ڈی سلوا کے بنگلے میں اور اس کے بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے کی کوئی بھی چیز الماس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کے دیوار، سامانِ آرائش۔ قالین اور پردے، بیڈ اور نائٹ لیمپ کا نرم اجالا، خواب آفریں فضا کا اندھیرا اور ریشمی چادر کا سحر آفریں لمس... سب الماس کو پہچانتے تھے۔ کہیں کوئی چیز بدلی ہوئی نہ تھی۔ الماس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا۔ خطرہ محض فریبِ خیال ثابت ہوا تھا اور اس کے

تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔ وہ بڈھا ڈرائیور کوئی غلط ارادہ نہیں رکھتا تھا سب شکوک اسکے اپنے ذہن کی پیداوار تھے لیکن وہ گاڑی.....!

وہ اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کی نگاہ وال کلاک پر چلی گئی۔ کچھ دیر وہ گھڑی کی سوئیوں کو بے یقینی کے ساتھ دیکھتی رہی۔ کیا یہ بھی نظر کا دھوکا ہے؟ گھڑی میں صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چھ گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک بے ہوش رہی ہے۔ الماس کا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔ یہ پوری رات اس نے گھر سے باہر گزار دی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے اس کے لیے گھر پہنچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں گھر والوں میں سے کوئی اس کی سہیلی کے پاس پہنچا یا نہیں اور پہنچا تو کیا وہ انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب رہی؟ ڈی سلوا کہاں گیا؟ اس نے تو مجھے ایک ہنگامی ضرورت کے تحت بلایا تھا۔ اس ضرورت کی وضاحت کیے بغیر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا کو آواز دی لیکن اس مختصر سے بنگلے کی خاموشی میں کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوسرے کمروں میں جھانکا اور باتھ روم تک دیکھ ڈالے لیکن ڈی سلوا کہیں ہوتا تو ملتا۔ الماس پھر بیڈ روم میں لوٹ آئی۔ ایک بار پھر خوف کے سرد بے رحم ہاتھ اس کے دل کو جکڑنے لگے۔ الماس نے سب دروازے اندر سے بند کیے اور شدید اعصابی کشیدگی کا شکار اور ان گنت نئے اندیشوں کی یلغار سے ہراساں بیٹھی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈی سلوا کسی کام سے باہر گیا ہو تو لوٹ آئے۔ رفتہ رفتہ پردوں کے پیچھے کھڑکی کے شیشوں پر صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ اور الماس کا یہ شک یقین کی صورت اختیار کرنے لگا کہ ڈی سلوا کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ الماس کو بلواتے اور اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کے غائب ہو جائے۔ تاہم اس کا ذہن واقعات سے حقائق کا اندازہ لگانے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

دن کی روشنی کے پھیلتے ہی وہ گھر کو کھلا چھوڑ کے فرار ہو گئی۔ اپنی راز داں سہیلی کے گھر پہنچ کے اس کی جان میں جان آئی۔ الماس کے گھر سے کوئی بھی کچھ پوچھنے نہیں آیا تھا۔ سہیلی کے گھر والے اتنی صبح الماس کو دیکھ کے بہت حیران ہوئے لیکن الماس نے ان کو مطمئن کر دیا اور اپنی سہیلی کے ساتھ واپس گھر پہنچی۔ ناشتا انہوں نے ایک ساتھ کیا اور پھر الگ الگ اپنے کام پر روانہ ہو گئیں۔

ڈی سلوا آفس میں بھی نہیں تھا۔ الماس نے گیارہ بجے تک اس کا انتظار کیا پھر اس نے غلام علی کو بلایا جو اسی فرم میں اکاؤنٹنٹ تھا اور اس سے ڈی سلوا کے بارے میں پوچھا۔ غلام علی کے جواب پر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ڈی سلوا تو دو دن پہلے فرم کے کسی کام سے لندن جا چکا ہے اور شاید ایک ہفتہ بعد واپس آئے گا۔ غلام علی خود بھی حیران ہوا کہ ڈی سلوا اپنی سیکرٹری کو کچھ بتا کر کیوں نہیں گیا۔ معاملات الماس کی سمجھ سے باہر تھے اور حالات کے اس معمے کا کوئی حل نہ تھا۔ خود ڈی سلوا ہی سے کسی وضاحت کی امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس میں بھی الماس نے خود اپنے لیے ایک مشکل پیدا کر لی تھی۔ اس نے ڈی سلوا کی طرف سے موصول ہونے والے پیغام کو جلا دیا تھا۔ اب اس کے پاس اپنے یقین کے سوا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں رہا تھا کہ وہ تحریر ڈی سلوا ہی کے ہاتھ کی تھی۔ وہ کوئی تحریر شناسی کی ماہر نہیں تھی اور جلدی میں اس نے تحریر پر بہت زیادہ غور بھی نہیں کیا تھا چنانچہ جعلسازی کے امکانات کو یکسر مسترد کرنا بھی مشکل تھا۔ بنانے والے تو سب کچھ بنا لیتے ہیں۔ تحریر کیا چیز ہے کرنسی نوٹ تک چھاپ لیتے ہیں۔ دوسری طرف اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ الماس کو دھوکے سے ساتھ لے جانے والے، اسے بخیر و عافیت ڈی سلوا کے بیڈ روم میں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ شام کو الماس نے ٹرنک کال بک کرائی اور لندن میں ڈی سلوا سے بات کی۔ اس نے بے حد ندامت کا اظہار کیا کہ وہ عجلت میں الماس کو اپنی روانگی کے پروگرام کے بارے میں مطلع نہ کر سکا لیکن الماس نے اس سے اور کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف اس بات کا یقین کرنا چاہتی تھی کہ ڈی سلوا واقعی لندن میں ہے۔ اس کی واپسی پر الماس نے پہلی فرصت میں اس کو تمام واقعات سنائے۔ وہ سخت حیران ہوا اور تشویش کا شکار بھی کیونکہ اس نے الماس کو بلوانے کے لیے کوئی تحریری پیغام نہیں بھیجا تھا۔

"بھلا مجھے ایسی کون سی ہنگامی ضرورت لاحق ہو سکتی تھی؟" ڈی سلوا نے کہا۔ "اور ہوتی تو کیا میں خود نہیں آ سکتا تھا؟ لیکن میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔"

"اور تمھارا گھر؟ وہ کیوں کھلا پڑا تھا؟" الماس نے بیوقوفوں کی طرح کہا۔

"کھلا پڑا تھا؟ گھر کو میں مقفل کر کے چابیاں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔" ڈی سلوا نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "واپسی میں مجھے گھر اسی طرح مقفل ملا جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔"

"کیا دروازوں کے ہر قفل کی دوسری چابی تمھارے پاس تھی؟" الماس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ایک کے ساتھ دوسری چابی اپنے پاس بے وقوف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رکھتے ہیں۔" ڈی سلوا بولا۔" دوسرا سیٹ میری آفس ٹیبل کی دراز میں رہتا ہے۔" ثبوت کے طور پر اس نے چابیوں کا ایک گچھا اپنی جیب سے اور دوسرا میز کی سب سے نیچے والی دراز میں سے نکال کے رکھ دیا۔ اس نے الماس کو لانے والے کسی بڈھے ڈرائیور کے بارے میں بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ جاتے وقت وہ اپنی گاڑی کو گیراج میں بند کر کے اور شٹر گرا کے مقفل کر گیا تھا چنانچہ وہ گاڑی دوسری ہوگی جسے رنگ، ماڈل اور ساخت کی یکسانیت کے باعث الماس پہچان نہ سکی۔ الماس اسے جھوٹا نہیں کہہ سکتی تھی۔ دنیا میں ڈی سلوا سے زیادہ قابل اعتماد کون ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ایک خلش سی تھی جیسے کوئی کانٹا نکل جائے مگر نوکِ خار ٹوٹ کر رہ جائے اور نظر نہ آنے کے باوجود باعثِ آزار بنی رہے کیونکہ اس کی سہیلی نے واقعی کار کا نمبر نوٹ کیا تھا اور یہ نمبر ڈی سلوا کی کار کا تھا لیکن وہ مزید سوالات کرتی تو زیادہ بے وقوف بنتی۔ ڈی سلوا کہتا کہ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میری نمبر پلیٹ کوئی اپنی گاڑی پر کیسے لگا سکتا ہے جبکہ میری گاڑی بدستور گیراج میں کھڑی رہی اور کسی نے قفل کو چھوا تک نہیں۔ الماس کیا کہتی کہ خرابی میرے دماغ کی نہیں بلکہ اتفاق سے نمبر ایک تیسرے شخص نے نوٹ کیا تھا۔ الماس کی سہیلی نے عادت کے مطابق احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا تھا اور مطمئن ہونے کے باوجود الماس کو ایک اجنبی کے ساتھ گاڑی میں رخصت کرتے وقت ایک نظر نمبر پلیٹ پر بھی ڈال لی تھی۔ کوئی منطقی نتیجہ اخذ کرنا یا عقل کے دلائل سے کچھ ثابت کرنا ناممکن تھا۔ حد سے زیادہ الجھن اور پریشانی کا انجام تعلقات میں کشیدگی کا سبب بنتا۔ مجبوراً وہ خاموش ہو گئی۔

ایک ہفتہ بعد وہ صبح دفتر پہنچی تو ڈی سلوا نے اسے کمرے میں بلوا لیا اور اندر سے دروازہ بند کرنے کے بعد ٹیلی فون پر اپنے ماتحت غلام علی سے کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملے گا اور اگر ٹیلی فون پر بھی اسے کوئی پوچھے تو کہہ دیا جائے کہ ڈی سلوا صاحب نہیں آئے۔ غلام علی کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ڈی سلوا جب بھی "ضروری کام" میں مصروف ہوتا تھا تو ایسی ہی ہدایات جاری کر دیتا تھا لیکن الماس کے لیے ڈی سلوا کی گھبراہٹ اور پریشانی ایک نیا تجربہ تھی۔ وہ سخت بدحواس اور بوکھلایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہاتھ منہ دھوئے بغیر اور ناشتہ کیے بغیر آفس آ گیا ہے اور شاید رات بھر جاگتا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، بال پریشان تھے اور کپڑے بے ترتیب تھے۔ اس نے الماس کو حوصلہ رکھنے اور سکون سے پوری بات سننے کی تاکید کی حالانکہ خود اسے سکون اور حوصلہ کی ضرورت تھی۔ وہ الماس کے سامنے بیٹھا آدھی آدھی سگریٹوں کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھاتا رہا اور پھر نئی سگریٹ جلاتا رہا۔ اس کی ہر حرکت سے دلی اضطراب عیاں تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے بات کرنی مشکل ہو رہی ہے۔ بالآخر جو کچھ اس نے بتایا وہ ہیروشیما پر گرنے والے پہلے ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔

اس نے بتایا کہ ایک ہفتہ پہلے الماس کو اغوا کر کے لانے والے اس کے پرانے کاروباری حریف تھے جنہوں نے اس کے ذاتی دشمنوں سے الحاق کر کے ایک سازش کی تھی۔ انہوں نے ڈی سلوا کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کے دروازوں کی چابیاں بنوائیں، گیراج سے اس کی کار بھی نکال لی اور اس کی تحریر بنا کر الماس کو ایک پیغام ارسال کر دیا۔ الماس کو لانے والا دیکھنے میں بڈھا لگتا ہے مگر وہ بہت سے جوانوں سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور ہے اور جوڈو کراٹے کے علاوہ خنجر کے استعمال میں بھی ماہر ہے۔ وہ لوگ ایک خاص مقصد کے تحت الماس کو لائے تھے۔ الماس چھ گھنٹے بے ہوش نہیں رہی تھی بلکہ اسے خواب آور دوا کے زیر اثر بے ہوش رکھا گیا تھا ورنہ چوٹ سے تو وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جاتی۔ بے ہوشی کے اس وقفے میں انہوں نے الماس کی بہت سی تصویریں اتار لیں۔ یہ تصویریں ایسی ہیں کہ کوئی شریف آدمی ان کو ایک نظر دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے نہ جانے کب وہ اسی بیڈ روم میں سوتے ہوئے ڈی سلوا کی تصویریں لے چکے تھے۔ چونکہ ڈی سلوا کے گھر میں اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا اور خود اسے بھی یاد۔ کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں ہے اس لیے خاص زاویے سے لی ہوئی یہ تصاویر بھی قابلِ اعتراض سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسی پر بس نہیں۔ کیمرہ ٹرک اور فوٹوگرافی کے کمال سے ڈی سلوا اور الماس کی چند تصویروں کو یکجا کر کے کچھ ایسی تصویریں بھی بنا لی گئی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو تصویریں الگ الگ ہیں ان میں بھی بیڈ روم ایک ہی ہے اور جعلسازی کوئی نہیں چنانچہ باقی تصویروں کو جعلی ثابت کرنا آسان کام نہیں ہے جو کسی ماہر فوٹوگرافر نے تیار کی ہیں۔ جعلی ثابت کرنے کے لیے بھی مقدمہ کرنا پڑتا ہے اور عدالت میں فیصلہ ہونے تک ساری دنیا نقل کو اصل مان چکی ہوتی ہے چنانچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خود اپنی رسوائی کا سامان کرنے کے مترادف ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

جب الماس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بے شمار سوالات کیے اور ان کے جواب میں ڈی سلوا نے بتایا کہ دشمن الماس نے فدیہ اسے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈی سلوا سے رابطہ قائم کیا تھا کہ وہ فرم کے کام سے باہر رہتا ہے اگر اس دفعہ وہ اپنے ساتھ ایک سوٹ کیس لے جائے تو اس کو یہاں دس لاکھ روپیہ نقد ادا کیا جا سکتا ہے یا اس کے نام سے باہر ایک لاکھ ڈالر کا اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے معاوضے کی پیشکش پر ڈی سلوا کو شک ہونا لازمی تھا اور تصدیق کرنے پر معلوم ہو گیا کہ سوٹ کیس میں ایک کروڑ روپے کی ہیروئن ہے۔ ڈی سلوا نے ان کو پکڑوانے کی غرض سے حامی بھر لی لیکن دوسری طرف کسٹم والوں کو اس کی اطلاع دے دی۔ کسٹم والے سب ایماندار اور فرض شناس تو نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس رپورٹ کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی جنہوں نے آخری وقت میں سوٹ کیس بدل دیا۔ ایئرپورٹ پر دوسرا سوٹ کیس لانے والا پکڑا گیا مگر سوٹ کیس میں سے پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں نکلا اور وہ شخص بھی بے گناہ ثابت ہوا جو سوٹ کیس لایا تھا۔ وہ کسی کو چھوڑنے آیا تھا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اسے سوٹ کیس دیا اور اشارے سے بتایا کہ وہ صاحب جلدی میں بھول گئے تھے اور اس شخص نے کسی شک و شبہ کے بغیر سوٹ کیس ڈی سلوا کے حوالے کر دیا۔

"اب ان ہی لوگوں کا پیغام مجھے ملا ہے۔" ڈی سلوا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔" ان کے ایک آدمی نے کل رات مجھ سے لفٹ مانگی اور اترتے وقت سیٹ پر ایک لفافہ چھوڑ گیا، جسے میں نے گھر پہنچ کے دیکھا۔ یقین کرو کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے رہ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں ان تصویروں کو دیکھتا رہا جو لفافے میں سے برآمد ہوئی تھیں۔ میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ غصے اور صدمے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ رات کے ایک بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور کسی بدمعاش نے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا تصویریں پسند آئیں؟" میں نے جواب میں اس کو سیکڑوں گالیاں دیں اور کہا کہ میں ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ مگر وہ ہنستا رہا۔ اور کہنے لگا کہ ڈی سلوا صاحب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اسی کی سزا تھی۔ اب تم وہی کام کرو گے لیکن بلا معاوضہ۔ اور انکار کرو گے تو اپنے ساتھ الماس کی زندگی بھی خراب کرو گے۔ بے حیائی کی زندگی تم گزار سکتے ہو کیونکہ تم تو کہیں بھی جا سکتے ہو لیکن الماس لیمن ذرف خودکشی ہی کر سکتی ہے یا بالآخر کسی کوٹھے پر بیٹھ سکتی ہے۔ میرا دماغ الٹ گیا اور میں نے دیوانگی میں ٹیلی فون کو زمین پر دے مارنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا مگر صبح ہوتے ہوتے میری عقل ٹھکانے آ گئی اور میں نے ایسے اوچھے ہتھیاروں کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنے کے بجائے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسی عبرتناک سزا دوں جو ان کو تمام عمر یاد رہے۔"

الماس کے لیے اس فیصلے کی مخالفت کرنا بھی مشکل تھا اور حمایت بھی۔ اسے ہر صورت میں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا کیونکہ اس مقابلے میں جیت بھی ہار تھی۔ الماس نے کہا کہ مصالحت کی کوئی صورت سب سے بہتر رہتی مگر ڈی سلوا نے اس کی بات کو مسترد کر دیا۔ مصالحت شریف لوگ کرتے ہیں یا مجبور لوگ اور اس مرحلے پر مصالحت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ شب ملنے والی تصویریں تو اس نے جلا ڈالیں تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نیگیٹیو دشمن کے پاس ہیں جن سے وہ جتنی نقلیں چاہے تیار کر سکتا ہے اور یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہوگا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے چنانچہ بدمعاشی کا جواب بھی بدمعاشی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اس نے الماس کو بتایا کہ اس بڈھے کی ایک بیٹی ہے جو کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ باقی بات الماس خود ہی سمجھ گئی۔

"اب تم بھی یہی کرو گے؟" وہ دیوانوں کی طرح چلائی۔" تم بھی اسے دھوکے سے اٹھا کر لاؤ گے؟ تم بھی اس کی تصویریں اتارو گے؟ کیا تم بھی انتقام کے جذبے میں شیطان بن گئے ہو؟ تمہارا ضمیر بھی مر گیا ہے کیا؟ سڑک پر پاگل کتا تمہیں کاٹ لے گا تو کیا تم بھی پاگل کتے کو کاٹنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑو گے؟"

"تم نے ابھی میری پوری بات نہیں سنی۔" ڈی سلوا نے سخت لہجے میں کہا۔" تم پاگل ہو رہی ہو...؟"

"ہاں میں پاگل ہو رہی ہوں۔" الماس چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" مجھے پاگل ہی ہو جانے دو۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور اب مجھے ذلت اور رسوائی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم مجھے عزت سے قتل کر دو۔ میرے مرنے کے بعد اگر کوئی رسوائی بھی ہوئی تو کیا ہوگا۔ کوئی مجھ سے کیا چھین لے گا لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے جیتے جی میری وجہ سے ایک ایسی لڑکی کی زندگی خراب ہو جس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور جو بالکل بے قصور ہے۔ ہر غیرت مند لڑکی اتنی رسوائی پر موت کو ترجیح دے گی مگر میں اس کی موت کا الزام قبول کر کے کیسے زندہ رہوں گی؟ میرے لیے تو یہ دوسری سزا ہوگی کہ ایک جنازہ میری خاندانی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

عزت و ناموس کا اٹھے اور دوسرا اس ٹیچر کا... نہیں ڈی سلوا! تم اسے بخش دو۔ مجھے مر جانے دو اور اسے جینے دو۔ ایک کی جگہ دو قتل مت کرو...“

ڈی سلوا نے پانی کا گلاس الماس کے منہ پر پھینک دیا جس کا ہسٹریا ایک جنونی کیفیت اختیار کرنے لگا تھا۔ ”تم صرف اپنی بات کیوں کرتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گا؟ دوسری صورت یہ ہے کہ میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جو تمہاری عزت سے کھیلنا چاہتے ہیں لیکن پہلی صورت پر تم نے غور نہیں کیا۔ اس صورت میں ہم سب زندہ رہ سکتے ہیں اور عزت و آبرو کے ساتھ۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اس لڑکی کو اغوا کر کے اس کی بھی ویسی ہی تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم نے نتائج اخذ کر لیے اور مجھے بے ضمیر، شیطان سب کچھ کہہ دیا۔ بیوقوف لڑکی! اگر اس دنیا میں طاقت کا توازن بگڑ جائے تو امن قائم نہیں رہ سکتا۔ دشمن اسی وقت وار کرتا ہے جب اسے یقین ہو کہ دوسرا حریف اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ گولی چلانے والے کو معلوم ہو کہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی بندوق ہے تو اس کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ مگر دوسرا فریق خالی ہاتھ ہونے کے باوجود یہ تاثر دے سکے کہ وہ بھی مسلح ہے تو بھی دشمن آسانی سے کامیاب نہیں ہوتا۔“ پھر جیسے جیسے الماس کا ہسٹریا کم ہوتا گیا ڈی سلوا کی باتیں اس کی سمجھ میں آتی گئیں۔

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی بہانے اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔“ ڈی سلوا نے اپنی اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایک ہفتے کے اندر اندر تم اس سے دوستی بڑھا سکتی ہو اور اسے ایک ایسی جگہ لا سکتی ہو جہاں تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور باقی کام میرا ہوگا۔ میں چند گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک دن اس لڑکی کو قید میں رکھوں گا۔ قید کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو باندھ کر رکھوں گا یا اس پر کوئی ظلم کروں گا۔ وہ آرام سے ایک گھر میں رہے گی اور تم اس کے ساتھ رہو گی۔ تم دیکھو گی کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کروں گا اور اس کی کوئی تصویر نہیں اتاروں گا۔ لیکن میں اس کے باپ سے فون پر یہی کہوں گا کہ جو جیسا بوتا ہے ویسا کاٹتا ہے۔ اس نے کسی کی بیٹی کی عزت کا سودا کرنا چاہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بھی ایک جوان بیٹی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے اسٹوڈیو میں موجود ہے اور ہم زیادہ اچھی فوٹوگرافی کر رہے ہیں۔ اس نے تو ساکت تصویروں پر ہی اکتفا کی تھی لیکن ہم فلم بنا رہے ہیں جسے دیکھ کر اس کی اور دیگر شائقین کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ فلم ریلیز نہ ہو تو وہ تمام نیگیٹو اور پرنٹ لے کر آ جائے اور اس بات کو ذہن میں رکھے کہ بے ایمانی کا خیال اگر اسے آیا تو دوسرے کو بھی آئے گا۔ اگرچہ ہوگا کچھ بھی نہیں لیکن اس دھمکی کے بعد بڈھے کے لیے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔“

غور کرنے پر الماس کو اس پورے منصوبے میں بدی کا کوئی پہلو دکھائی نہ دیا۔ صرف دھمکی دینے سے بگڑے ہوئے معاملات سنور سکتے ہوں تو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ پہل تو اس بڈھے نے ہی کی تھی۔ اسے اتنی سزا ضرور ملنی چاہیے کہ آئندہ دوسروں کے دامنِ عزت پر ہاتھ نہ اٹھانے سے پہلے اپنا دامن بچانے کی فکر کرے۔ ڈی سلوا نے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا کہ وہ جارحانہ عزائم بالکل نہیں رکھتا اور جو کچھ وہ کر رہا ہے، صرف اپنا دفاع ہے۔ باقی تفصیلات سمجھ لینے کے بعد الماس نے اس کی مدد کی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس نے بڈھے کی لڑکی سے دوستی کر لی۔ یہ لڑکی جس کا نام ”گل رخ“ تھا طبعاً بہت سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس سے تعلقات بڑھانے میں الماس کو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ایک بار ڈی سلوا کی جوابی کارروائی میں شریک ہونے کے بعد خود الماس کے جذبات انتقامی ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ کون سا شریفانہ سلوک ہوا تھا کہ وہ رعایت کرے۔ اگر وہ خودکشی کر لیتی تو گل رخ کے باپ کا کیا نقصان ہوتا؟ اسے یہ سبق کون دیتا کہ جیسے کو تیسا ضرور ملتا ہے۔ اس نے ڈی سلوا پر اعتبار کر لیا تھا کہ اس تمام کارروائی کا مقصد اور کچھ نہیں۔ وہ ڈی سلوا کی ذہانت اور جرأت کی زیادہ قائل ہو گئی تھی جس نے صرف اس کی خاطر ہار نہیں مانی تھی۔ غلط کام نہیں کیا تھا اور گل رخ کے ساتھ بھی وہ کوئی زیادتی نہ کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ ایک رات اپنی بیٹی گھر سے غائب رہے گی تو اس خبیث بڈھے کا دماغ درست ہو جائے گا۔ غصے سے الماس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ پھر غصہ اتر جاتا تھا اور وہ خود اپنے تصور کی ہر تصویر دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ خوف سے کانپنے لگتی تھی کہ بات پھیل گئی یا ڈی سلوا کی چال ناکام رہی تو کیا ہوگا۔ ایک ہفتے کے دوران میں الماس کو بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ گل رخ کی شادی اب تک اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ جو اس کا پیغام لے کر آتا اس کی کسی چھوٹی بہن کو پسند کر لیتا تھا لیکن اب اس کے سوا گھر میں کوئی نہیں رہا تھا اور خدا نے والدین کی دعائیں قبول کرتے ہوئے اس کے لیے بھی ایک رشتہ بھیج دیا تھا چنانچہ اس سال کے آخر تک وہ شادی کے بعد اسکول میں پڑھانا چھوڑ دے گی۔ اس کا شوہر اعلیٰ سرکاری افسر ہے اور والدین کے پاس بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے چونکہ الماس کو ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے کبھی گل رخ کے ہونے والے شوہر کا نام نہیں پوچھا اور یہ نہیں پوچھا کہ اس کا باپ کیا کرتا ہے۔ اپنے بارے میں بھی اس نے گل رخ کو ہر بات غلط بتائی۔ اپنا نام بھی اپنے خاندان اور گھر والوں کے بارے میں بھی۔ ڈی سلوا نے کہا تھا کہ نہ وہ اس کے گھر جائے نہ اسے اپنے گھر یا دفتر کا پتہ بتائے ورنہ بعد میں گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ الماس اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی اور بہت محتاط تھی۔

بالآخر ایک روز وہ گل رخ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ طے شدہ مقام پر ڈی سلوا کی کار موجود تھی۔ وہ گل رخ کے ساتھ قریب سے گزری تو اچانک دروازہ کھلا اور دو زبردست ہاتھوں نے تقریباً ایک ساتھ ان کو اندر گھسیٹ لیا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی چل رہا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ گل رخ کے حلق سے چیخ نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک ہاتھ نے اس کے منہ پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ اندر گرتے ہی الماس نے دیکھ لیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر دو آدمی ہیں جو ایک جیسے تنومند ہیں اور دونوں نے چہرے پر جوکر کی وہ رنگین تصویر چڑھا رکھی ہے جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ اس کے سوراخوں میں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتے تھے مگر خود ان کی صورت "گتے" کی تصویر کے پیچھے نظر نہیں آتی تھی۔ الماس کا خیال تھا کہ یہ سب ڈرامہ ہے چنانچہ اندر گرنے کے بعد بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی مگر دوسرے ہاتھ نے اس کو دبوچ کر اس کی ناک پر بھی رومال رکھ دیا تو ہوش کے آخری لمحے میں حقیقت اس پر یوں عیاں ہوئی کہ وہ خوف سے ہی بے ہوش ہو گئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس کے اندر کوئی ہینڈل نہ تھا اور گاڑی چلانے والا وہی بوڑھا تھا، جو الماس کو لے گیا تھا۔

ہوش میں آنے پر اسے سخت متلی اور سر درد کا احساس ہوا۔ اس نے خود کو بالکل اجنبی جگہ دیکھا۔ یہ گودام جیسی سیمنٹ کی بیرک تھی جس میں گل رخ اس کے قریب ہی سخت فرش پر پڑی تھی۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں وہ بڈھا شامل نہیں تھا۔ الماس نے ڈی سلوا کے بارے میں سوال کیا۔

”ڈی سلوا!“ ایک نقاب پوش نے قہقہہ لگایا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے۔ کیا پوری طرح ہوش نہیں آیا ابھی؟“ اس کے اشارے پر دوسرے نے ٹھنڈے پانی کی بھری ہوئی بالٹی الماس پر

”تم... تم لوگ کون ہو؟“ وہ ہانپتے اور سردی سے کانپتے ہوئے بولی۔ ”ڈی سلوا تم کو قتل کر دے گا جب اسے معلوم ہوگا...“

الماس کے منہ پر زبردست طمانچہ پڑا۔ ”یہ نام پھر مت لینا۔“ پہلے شخص نے کہا اور الماس کی طرف ایک لفافہ پھینک دیا۔ ”یہ ہیں تمہاری تصویریں۔ باقی تصویریں ابھی بن کے آ جائیں گی۔“

”باقی تصویریں؟“ الماس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری۔ ”کیا تم نے اس کی بھی...؟“ اس نے فرش پر لیٹی ہوئی گل رخ کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ ہم نے اس کی بھی کچھ تصویریں بنا لی ہیں۔“ وہ شخص بولا۔ ”اس کا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ ہمیں اس سے ایک کام لینا تھا۔ تم نے ہماری مدد کی۔ اب تم برابر کی شریکِ جرم ہو۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ الماس نے ڈوبتی آواز میں کہا مگر اس کو جواب دینے کے لیے خود ڈی سلوا اندر آ گیا۔ وہ بے اختیار ڈی سلوا کی طرف بھاگی۔ ”ڈی سلوا! یہ سب کیا ہے؟“

”تمہاری عقل کا فتور۔ تمہاری تقدیر کا چکر۔ تمہاری شامتِ اعمال۔“ ڈی سلوا نے اسے دھکیل دیا۔ ”میں نے تم سے سب جھوٹ بولا تھا۔ تم کو میرے ایما پر میرے ہی آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تم کو اس معاملے میں کوئی خوش فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ میں تمہیں ایک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا مقصد تم سے نجات حاصل کرنا تھا۔ تم مجھ سے شادی کے معاملے میں سیریس ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی دن بھی کہہ سکتی تھیں کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔“

”حرامی... کمینے...“ وہ اس پر حملہ آور ہوئی۔ ”کیا یہ جھوٹ ہوگا؟ میں تجھے قتل کر دوں گی۔“ مگر ڈی سلوا کے تھپڑ سے وہ پھر نیچے جا گری۔

”اگر کچھ ہوگا بھی تو وہ جھوٹ سمجھا جائے گا۔“ ڈی سلوا نے حقارت سے کہا۔ ”اس لیے کہ میں اسے جھوٹ کہوں گا اور دنیا میری بات تسلیم کرے گی۔ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ تو کیا ہے؟ دو ٹکے کی چھوکری... فاحشہ... یہ تصویریں تیرے ہی خلاف ثبوت فراہم کریں گی۔ پھر ان میں میری کوئی تصویر نہیں ہوگی۔ بیڈ روم کا وہ سب سامان اور رنگ روغن بدلا جا چکا ہے جو تصویر میں نظر آتا ہے اور یہ تصویریں بھی دوسرے لوگوں کے پاس ہوں گی۔ تیرے خلاف یہ لڑکی بھی گواہی دے گی کہ تو اسے ورغلا کے یہاں لائی تھی اور تو نے اپنا نام، پتہ سب غلط بتایا تھا تو تو خودکشی بھی نہیں کر سکتی کیونکہ اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے تیرے گھر والوں کی عزت پر آنے والا بدنامی کا داغ نہیں مٹے گا۔ تیرے بعد دنیا تیرے ماں باپ کے منہ پر تھوکے گی اور تیری بہنیں ساری عمر کنواری بیٹھی رہیں گی۔"

فرش پر پڑی ہوئی الماس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ سب باتیں سنیں۔ تقدیر کی اس بے رحمی پر اور اپنی بے بسی پر روتے روتے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے اور ڈی سلوا کی دغا بازی پر خودکشی سے قتل تک لے تمام اقدامات کو ناقابلِ عمل سمجھنے کے بعد اس نے ڈی سلوا کے لیے کام کرنا منظور کر لیا۔ ڈی سلوا نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس نے کوئی حماقت اور حکم عدولی نہ کی تو اسے معاف کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف تمام ثبوت ختم کر دیے جائیں گے۔ پھر ڈی سلوا نے اسے گل رخ کے منگیتر سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا جو کسٹم آفیسر تھا اور ڈی سلوا کو خاصا نقصان پہنچا چکا تھا۔ رشوت قبول نہیں کرتا تھا اور دو مرتبہ ڈی سلوا کے آدمیوں کو مار کے بھگا چکا تھا۔

الماس اس کے پاس ایک مخبر بن کے پہنچی۔ کسٹم آفیسر بہت ذہین آدمی تھا۔ اس نے سب سے پہلے الماس سے یہی پوچھا کہ بظاہر وہ ایک شریف لڑکی نظر آتی ہے۔ اس کا اسمگلروں سے کیا تعلق ہے؟ اور اسے ان کے بارے میں معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟ الماس نے کہا کہ وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے مگر اس کا بھائی صحبتِ بد میں پڑ کے خاندان کی عزت کو خاک میں ملانے پر تل گیا ہے۔ اس کے پاس مشکوک چال چلن اور صورت سے بد قماش نظر آنے والے افراد کا آنا جانا ہے۔ وہ ان کے ساتھ جاتا ہے تو کئی کئی دن لوٹ کر گھر نہیں آتا اور آتا ہے تو نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لے کر آتا ہے۔ شروع میں والدین نے سختی سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے اور اتنا پیسہ کہاں سے لاتا ہے مگر اس نے کہا کہ آم کھانے سے غرض رکھو پیڑ مت گنو۔ اب والدین بھی حرام کی اس کمائی سے عیاشی کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن چند روز سے وہ دیکھ رہی ہے کہ سادہ کپڑوں میں کچھ لوگ مسلسل ان کے گھر کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ بھائی کو نہیں گھر کی عزت کو بچانا چاہتی ہے۔ وہ چند افراد کو بھی شناخت کر سکتی ہے اور ان کے ٹھکانے سے بھی واقف ہے جو اس کے خیال میں وہ اڈا ہے جہاں سے سامان آتا جاتا ہے۔ کسٹم آفیسر پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا کہ ایسی صورت میں پولیس سے رجوع کرنے کے بجائے وہ اس کے پاس کیسے آ گئی؟ الماس کے پاس بہت معقول جواب تھا۔ وہ گل رخ کی سہیلی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ گل رخ نے کہا تھا کہ تھانے جاؤ گی تو خود بھی مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ میرا منگیتر کسٹم آفیسر ہے۔ اسے اطمینان سے ساری بات بتا دو۔

گل رخ کا حوالہ آتے ہی کسٹم آفیسر کا رویہ بدل گیا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ الماس کی مدد کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فرض شناسی اور مستعدی کے مزید ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ اس نے الماس کو حراست میں نہیں لیا۔ اپنے آدمی اس کے پیچھے نہیں لگائے اور رات کو اس سے ایک مقررہ جگہ پر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ الماس جب واپس پہنچی تو گل رخ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈی سلوا نے اسے بتایا کہ وہ بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ چکی ہے اور اسے بھی اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ عدم تعاون یا پولیس کے پاس جانے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کسٹم آفیسر اس سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ اسے نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دے گی۔ اس نوکری میں ہر وقت جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے کیونکہ واسطہ پڑتا ہے اسمگلروں سے جو انتہائی مجبور ہو جائیں تو ایک کی جگہ دس کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ گل رخ اسے کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرے گی اور اس کسٹم آفیسر سے صاف کہہ دے گی کہ وہ نوکری اور شادی میں سے ایک کا انتخاب کرے۔

اگر وہ اس کو قائل کر کے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کی تمام تصویریں واپس کر دی جائیں گی لیکن وہ ناکام رہی تو ہم یہ تصویریں اس کی شادی کے بعد استعمال کریں گے۔ ابھی تو خود گل رخ کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی تصویریں اتاری گئی ہیں اور اسے کچھ معلوم ہونا بھی نہیں چاہیے۔

الماس خود کو چالاک سمجھنے اور لتنے تلخ تجربات سے گزر کے محتاط ہو جانے کے باوجود ڈی سلوا کے پھیلائے ہوئے دوسرے جال میں گرفتار ہو گئی۔ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ جو شخص ایک بار اپنے کیے ہوئے تمام وعدے اتنی ڈھٹائی سے توڑ سکتا ہے وہ دوسری بار بھی ایسا کر سکتا ہے۔ اس کا ذہن ویسے بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا اور اس کی تمام تر خواہش یہ تھی کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ جلد از جلد اس دلدل سے نکل جائے۔ اسے اپنی رسوا کن تصویریں اور ان کے نیگیٹو مل جائیں اور وہ خطرہ ٹل جائے جو اس کی، خاندان کی اور چھوٹی بہنوں کی زندگی تباہ کر سکتا تھا۔ یہ فنا اور بقا کی جدوجہد کا مسئلہ تھا چنانچہ الماس نے خود غرض بن کے تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اب گل رخ پر کیا گزرتی ہے، اس کسٹم آفیسر کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں خود کو موردِ الزام سمجھنے کی شرمندگی بھی نہیں رہی تھی۔ ڈی سلوا کے آدمی الماس کو اور اس کسٹم آفیسر کو کسی نامعلوم جگہ لے گئے جہاں ایک بار پھر الماس کے ساتھ وہ ہوا جو پہلے بھی ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ بیڈ روم بدل گیا تھا اور اس کا پارٹنر ایک کسٹم آفیسر تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد الماس نے دیکھا کہ وہ کسٹم آفیسر ایک کرسی پر بیٹھا ہے، ڈی سلوا اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ عقل سے کام لے اور ان کی مدد کرے تو اس میں دونوں کا فائدہ ہے ورنہ نقصان صرف کسٹم آفیسر کا ہوگا۔ اسے الماس کی پہلے والی تصویریں دکھا کر یقین دلا دیا گیا تھا کہ جو عورت اسے پھانس کر لائی ہے وہ ایک بدکردار طوائف ہے جس کے شریفانہ حلیے سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس کی چند قابلِ اعتراض تصویریں اتار لی گئی ہیں جن سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ عیاش اور بد قماش آدمی ہے۔

"ان تصویروں پر اور تمہاری باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔" کسٹم آفیسر بولا۔

ڈی سلوا ہنسا۔ "دنیا برائی پر بہت جلدی یقین کر لیتی ہے۔ تمہاری منگیتر گل رخ بھی ضرور یقین کرے گی۔ الماس نے اس کو اپنا نام پتہ سب غلط بتایا تھا۔ کیا کوئی شریف لڑکی بغیر وجہ کے ایسا کرتی ہے؟ جب وہ الماس کی سابقہ تصویریں دیکھے گی جو کسی اور مرد کے ساتھ کسی اور گھر میں لی گئی تھیں تو شبے کی گنجائش کہاں باقی رہے گی۔ تم کیا بتاؤ گے کہ تم کہاں گئے تھے؟ اگر یہ کہو گے کہ مخبری کرنے یا چھاپہ مارنے کے لیے اسمگلروں کے اڈے کا سراغ لگانے گئے تھے تو پوچھنے والے پوچھیں گے کہ وہ اڈا کہاں تھا؟ کس کا تھا؟ اور وہاں تمہیں کیا ملا؟ جب یہ تصاویر تمہارے محکمے کو ارسال کی جائیں گی تو تمہارے چھاپہ مارنے کی کہانی سفید جھوٹ بن جائے گی۔ اتفاق سے یہ گھر بھی ایک پرانے کسٹم آفیسر کا ہے جو زبردست راشی اور عیاش تھا۔ تمہارا اس کے گھر میں ملنا خود تمہارے خلاف ثبوت فراہم کرے گا کہ تم بھی مختلف نہیں تھے۔ جس کا یہ گھر ہے وہ متعدد مقدمات میں ماخوذ ہونے کے بعد روپوش ہو گیا ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا وہ تمہارا دوست تھا۔ دوست نہیں تھا تو تمہیں گھر کی چابیاں کیسے سونپ گیا تھا کہ تم وہاں ایک جھوٹی کہانی گھڑ کے عیاشی کے لیے جا پہنچے۔ پولیس تمہیں بھی تفتیش میں شامل کرے گی... لیکن تمہارے خلاف سب سے بڑا اور ناقابلِ تردید ثبوت تمہارا بینک اکاؤنٹ ہوگا۔ تمہاری ملازمت شروع ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا لیکن اس میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ نقد رقم جمع ہے۔"

"جھوٹ ہے۔" کسٹم آفیسر نے کہا۔ "میرے اکاؤنٹ میں صرف دو ہزار روپے ہیں۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" ڈی سلوا بولا۔ "کسی کے حساب میں سے رقم نکلوانا مشکل کام ہوتا ہے۔ رقم جمع کرنے کے لیے صرف اکاؤنٹ نمبر معلوم ہونا کافی ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں لیکن گزشتہ ماہ کی گیارہ، سترہ اور چوبیس تاریخ کو تم نے بالترتیب پچیس ہزار، پینتیس ہزار اور چالیس ہزار جمع کرائے۔ ان کا تم کیا حساب دو گے؟ نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ نئی نوکری تھی اس لیے تم پہلے محتاط رہے اور کچھ فرض شناسی کا مظاہرہ بھی کرتے رہے لیکن بعد میں تجربہ کار ہو گئے تو اسی رنگ میں رنگ گئے جس میں دوسرے بھی رنگے ہوتے تھے۔ سب اوپر والے ہمارے ساتھ ہیں اور تم اگر ہمارے کاروبار کو نقصان پہنچا رہے ہو تو ان کی آمدنی میں بھی رکاوٹ ڈال رہے ہو۔ انہیں صرف بہانہ چاہیے کہ تمہیں بدعنوانی کے مقدمات میں الجھا کر الگ کر سکیں۔ چشم دید گواہ وہ خود بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ہم بھی انہیں فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم تمہیں مار بھی سکتے تھے لیکن ہم گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ ملازمت چھوڑ دو اور کاروبار کرو۔ جانا چاہو تو ملک سے باہر چلے جاؤ۔ ہم تمہاری مدد بھی کریں گے۔ بصورتِ دیگر نہ تمہاری ملازمت رہے گی نہ تم گل رخ سے شادی کر سکو گے اور نہ اس کو رسوائی سے بچا سکو گے۔ ابھی تم جوان ہو۔ اصول پرستی کے چکر میں مت پڑو۔ خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو کا فلسفہ سب سے اچھا ہے۔"

اس کے بعد کسٹم آفیسر کے لیے مخالفت کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے فائدے کا سودا کیا اور وہیں سب کچھ طے ہو گیا — ڈی سلوا نے اسے مزید دو لاکھ فراہم کرنے اور گل رخ سمیت لندن میں سکونت اختیار کرنے کی گارنٹی دی اور کہا کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جانے کے بعد تصاویر نیگیٹو کے ساتھ واپس کر دی جائیں گی اور آئندہ ان کا کسی سے یا کسی کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ جب وہ کسٹم آفیسر چلا گیا ڈی سلوا نے الماس سے کہا کہ وہ اس کے کام سے بہت خوش ہے اور اس کی تمام تصویریں اور نیگیٹو اس کے حوالے کر دیے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جلا دے۔ الماس نے تسلیم کیا کہ تصدیق کی خاطر اس نے تصویریں دیکھی ضرور تھیں لیکن یہ بات کہتے ہوئے احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے ماتھے پر عرقِ ندامت کی نمی آ گئی۔ اس کے بعد الماس کا ڈی سلوا سے کوئی رابطہ نہیں رہا اور تین بعد جب اس کی شادی ہوئی تو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وہ اپنے بھیانک ماضی کی ہر یاد کو ذہن کے نہاں خانوں کی انتہائی گہرائی میں دفن کر چکی تھی۔ اس کا دل اپنے پروردگار کے لیے شکر کے جذبات سے معمور تھا جس نے الماس کی توبہ قبول کرلی تھی اور اسے باعزت زندگی گزارنے کا موقع عطا کیا تھا۔ الماس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ گل رخ اور اس کسٹم آفیسر کا بعد میں کیا ہوا، لیکن ڈی سلوا سے انتقام کی آرزو کبھی نہیں مری تھی۔

میں اور رابعہ دم بخود بیٹھے تھے اور الماس نے خود ہی اپنی داستانِ ماضی کا ہر حرف دہرا دیا تھا۔ ہم نے ان زخموں کو چھیڑ دیا تھا جو بظاہر وقت کی چارہ گری سے مندمل ہوگئے تھے، جب دل کے یہ ناسور پھر رسنے لگے تو ہر قطرۂ خوں نے اپنی داستانِ الم خود کہہ دی۔

"تمہیں اس کسٹم آفیسر کا نام معلوم ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"نام؟" الماس نے کہا۔ "اب تو یاد نہیں۔"

"اچھا گل رخ کے گھر کا پتہ تو تمہیں معلوم ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم وہاں سے پوچھ لیں گے۔"

الماس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ڈی سلوا نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا۔"

"سکندر!" رابعہ نے اچانک کہا۔ "اس اسکول سے تو گل رخ کا پتہ مل ہی سکتا ہے جہاں وہ پڑھاتی تھی۔"

"تم اسے یہاں لاؤ گے؟" الماس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اول تو اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ تمہارے سامنے آ بھی جائے گی تو کچھ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہ تمہارے اصل نام سے واقف نہیں اور تم اسے پہچاننے سے صاف انکار کرسکتی ہو۔ اس کے علاوہ جتنی خوفزدہ تم ہو اتنی ہی وہ بھی ہوگی کہ کہیں تم نہ مل جاؤ۔ البتہ تمہیں ضرورت پڑنے پر یہ باتیں ایک ایسی لڑکی کو بتانی ہوں گی جو آج تک ڈی سلوا کے فریب کا شکار رہی تھی۔"

"خدا کے لیے مجھے ان معاملات سے الگ رکھو۔" الماس ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"ہم پہ اعتبار کرو الماس!" رابعہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "میری کوئی بہن نہیں لیکن یقین کرو تمہارا ازدواجی مستقبل بھی مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا اپنی سگی بہن کا ہوتا۔ ہم پر اعتماد نہیں تو خدا پر بھروسہ رکھو جس نے اب تک تمہاری حفاظت کی اور آئندہ بھی کرے گا۔"

ہم رات کا اندھیرا پھیلنے سے بہت پہلے آتے تھے اور جب رخصت ہوئے تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں نے رابعہ کو ضامن رضوی کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور خود غائب ہوگیا۔ میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ رضوی صاحب کی نظر میں ہماری پوزیشن خراب نہیں ہونی چاہیے۔ اگر وہ پوچھیں تو رابعہ کہہ دے کہ میں آفس چلی گئی تھی اور مجھے سکندر کا پتہ نہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا اور انہوں نے مجھ سے پوچھا تو اپنی وضاحت خود پیش کردوں گا۔ رابعہ کی شکستہ حال سرخ ویگن بھی کوٹھی کے احاطے میں کھڑی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ رضوی صاحب کے اثر و رسوخ کے باعث پولیس نے کار کو اصل مالک تک پہنچانے میں بڑی مستعدی کا ثبوت دیا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی سو بنی تھی، باقی گاڑی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اور اس کی کوئی چیز بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اس کا رنگ و روغن بڑا چمکیلا تھا اور اس پر ایک خراش بھی نہ تھی۔ اب دو چار ہزار خرچ کیے بغیر اس کو دوبارہ اپنی اصل حالت پر لانا مشکل تھا۔ جب رابعہ اندر چلی گئی تو میں اسی ٹیکسی میں صدر پہنچا۔ حسبِ معمول میں نے ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور اِدھر اُدھر اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس گلی میں داخل ہوگیا جس میں شہلا مقیم تھی۔ وہ تمام دن سخت اضطراب اور بے چینی کا شکار رہی تھی لیکن باہر جاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے اخبار میں وہ سب واقعات پڑھ لیے تھے جو اس کے گلبرگ والے گھر میں پیش آئے تھے۔ صبح کے اخبارات کو زیادہ تفصیلات نہیں مل سکی تھیں مگر شام کے ایک اخبار نے ان لاشوں کی تصویریں بھی چھاپ دی تھیں جو پولیس کو گھر کے اندر اور باہر سے ملی تھیں۔ یہ سب بدمعاش اور ہسٹری شیٹر تھے چنانچہ پولیس نے یہ مفروضہ قائم کیا تھا کہ وہ ڈاکا ڈالنے آئے تھے اور غیر متوقع طور پر ان کو کسی ایسے شخص سے مقابلہ کرنا پڑا جو اُن سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے تینوں کو ٹھکانے لگا دیا مگر خود بھاگ گیا۔ یہ نامعلوم شخص کون تھا؟ اس کے بارے میں پولیس کئی نظریات رکھتی تھی۔ ایک یہ کہ وہ چوکیدار تھا جسے گھر والے کہیں جاتے وقت حفاظت کے خیال سے چھوڑ گئے تھے اور وہ پولیس کی کارروائی سے بچنے کے لیے روپوش ہوگیا۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ واردات کے وقت گھر میں کوئی مہمان موجود تھا جس نے ڈاکوؤں کو ٹھکانے لگا دیا اور گھر والوں کو ساتھ لے گیا تاکہ وہ ان واقعات سے اپنی بے خبری اور لاتعلقی ثابت کرسکے۔ ابھی تک مکینوں کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ آس پاس کے رہنے والوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ گھر میں ایک مفلوج بڑھیا اپنی غیر شادی

شدہ لڑکی اور نوجوان داوباش لڑکے کے ساتھ رہتی تھی اور ان کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا۔ پولیس کے لیے پریشانی کے اور بھی سبب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹیلیفون پر رپورٹ دینے والے نے خود کو ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کا چھوٹا بھائی بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ پڑوس میں رہتا ہے لیکن تفتیش کرنے پر یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ ضامن رضوی صاحب گلبرگ میں نہیں رہتے۔ انہوں نے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی کوئی نہیں ہے چنانچہ یہی بات زیادہ قابلِ اعتبار لگتی ہے کہ فون بھی اسی نامعلوم شخص نے کیا ہوگا جس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور انہیں مارنے کے بعد اپنی اور گھر والوں کی جان بچا کر صاف نکل گیا لیکن یہ نامعلوم شخص گھر میں رہنے والی مس شہلا زیدی کا نوعمر بھائی نہیں ہوسکتا۔ پولیس کو رپورٹ دینے کے بجائے روپوش ہوجانے کا مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ کوئی اس گھر میں اپنی اس وقت موجودگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے معلوم تھا کہ اگلے دن کے اخبارات مزید بال کی کھال نکالیں گے۔ یہ معلوم ہوجائے گا کہ مس شہلا زیدی کہاں کام کرتی تھی۔ جوا کھیلتے ہوئے قتل ہوجانے والے عدنان کی خبر کو شہلا کے گھر پہ حملے کی خبر سے مربوط کردیا جائے گا اور تفتیش سے کچھ اور نتائج سامنے آئیں گے۔ اگر ضامن رضوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے شہلا کو کہاں چھپا رکھا ہے تو وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ جس نامعلوم نوجوان نے تین ڈاکوؤں کو مار دیا اور پھر ضامن رضوی صاحب کا نام لے کر پولیس کو فون کیا وہ میرے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ وہ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ مارے جانے والے ڈاکا ڈالنے نہیں آتے تھے بلکہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ اس کے بعد ان کے لیے سخت ترین آزمائش کا مرحلہ درپیش ہوگا۔ یعنی وہ فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پولیس کو حقائق سے آگاہ کردیں یا خاموش رہیں کیونکہ میرے اور رابعہ کے انکار کی صورت میں کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا لیکن اب تک جو کچھ انہوں نے میرے لیے اور رابعہ کے لیے کیا تھا وہ سب خاک میں مل جاتا اور یہ نیکی برباد گناہ لازم والی بات ہوتی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مسلسل چشم پوشی سے کام لیں اور ایک کے بعد ایک میری ہر مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ کے قبول کرتے جائیں۔ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ میرے ساتھ محسن کو رکھا تھا، پھر رابعہ کو اپنے گھر میں بیٹی کی طرح جگہ دی تھی۔ اب شہلا اور اس کی مفلوج ماں کا بار ان پر ڈالنا ظلم ہوتا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کو التوا میں رکھنا مناسب سمجھا کیونکہ فوری مسئلہ عدنان کا تھا جس کے بارے میں شہلا نے ابھی تک ایک اخبار کی چھوٹی سی خبر کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ یہ اخبار بھی اس نے ماسی کے ذریعہ پڑوس کے کسی گھر سے منگوائے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ عدنان کی لاش اس وقت سرکاری مردہ خانہ میں بہت سی لاوارث لاشوں کے درمیان پڑی ہوگی اور پولیس منتظر ہوگی کہ کوئی وارث آئے تو اسے تفتیش کے جال میں جکڑ لے۔ شہلا کا وہاں جانا بعید از قیاس تھا کیونکہ ہمیں تو ظاہر کرنا تھا کہ حملہ آور اس کو اغوا کرکے لے گئے تھے اور مناسب وقت تک اس کو چھپائے رکھنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ عدنان کی لاش حاصل کرکے اس کی تدفین کی جائے ورنہ بہت سی لاوارث قرار دی جانے والی لاشوں کی طرح یہ لاش بھی میڈیکل کالج کے طلبہ کو فروخت کردی جاتی کہ جن کو تکمیل و تحصیلِ علم کے لیے وہ تجربات کرنے پڑتے ہیں جو زندہ انسانوں پر نہیں کیے جاسکتے مگر جن پر مردے کبھی معترض نہیں ہوتے۔ میں عدنان کا وارث نہیں تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ میں عدنان کی ماں کو پہلے یہ جان لیوا خبر سناؤں اور پھر اسے ساتھ لے کر ہسپتال جاؤں۔

شہلا کی ماں گولی کھا کے سو چکی تھی۔ میں نے شہلا سے انگریزی میں کہا کہ وہ ماسی کو بھی سو جانے دے اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑی خبر سننے کے لیے تیار کرلے۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے صرف ایک پیالی چائے پی، اور ماسی سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں شہلا کی ماں کے پاس سو جائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شہلا کی حالت غیر ہو رہی ہے اور وہ جلد از جلد وہ بڑی خبر سننا چاہتی ہے۔

"بات یہ ہے شہلا!" میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ "کہ زندگی میں ہر آدمی کو ناقابلِ تصور صدمات جھیلنے پڑتے ہیں۔ ہر بار وہ سمجھتا ہے کہ یہ صدمہ برداشت سے باہر ہوگا لیکن وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ وہ صدمہ جھیل کر زندہ رہتا ہے بلکہ کچھ عرصے بعد اس کے نقش تک مٹ جاتے ہیں مثلاً والدین کے لیے اولاد کا صدمہ یا بہن کے لیے اکلوتے بھائی کی موت کا صدمہ......"

"صاف کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "کیا میرا صبر و حوصلہ آزما رہے ہو؟"

"نہیں۔ صبر اور حوصلہ تو تم میں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میں نے کل دیکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت بھی تم اسی حوصلے سے کام لو۔ اس کمرے کے باہر کسی کو پتہ نہ چلے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کہ میں نے کیا کہا ہے۔"

"اگر عدنان کو کچھ ہوا ہے تو بتا دو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "بُری صحبت کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ پہلے بھی میں عدنان کے بارے میں ہر بُری خبر سننے کے لیے تیار رہتی تھی اور اب بھی سُن سکتی ہوں۔ کیا پولیس ...؟"

"نہیں شہلا! وہ اب پولیس کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ سزا و جزا اور نیکی و بدی کی اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ اب تو تم صرف اس کی مغفرت کی دعا مانگ سکتی ہو۔" میں نے اخبار اٹھا کے اندر کے صفحات کی ایک چھوٹی سی خبر پر انگلی رکھ دی۔ شہلا نے خبر پڑھی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خبر کے بے رحم الفاظ کو گھورتی رہی، پھر اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور یاد دلایا کہ اپنی ماں سے اس خبر کو چھپانا اس کا فرض ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز ماسی کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ابھی تک میں نے انگریزی میں بات کی تھی چنانچہ ماسی پریشان تھی کہ میں نے شہلا سے کیا کہہ دیا ہے کہ اس کی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ مجبوراً مجھے اس کو بھی ساری بات سنانی پڑی۔

رفتہ رفتہ شہلا نارمل ہو گئی اور میں نے اسے سمجھا دیا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ عدنان کی ماں سے حقیقت کو چھپائے رکھنے کے لیے ایک ایسی عورت کا تعاون درکار ہو گا جو وقتی طور پر ماں کا کردار نبھا سکے۔ اس کام کے لیے مناسب ترین عورت رابعہ کی خادمہ ماسی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ صورت سے اور عادات و اطوار سے اتنی سیدھی سادی اور بے وقوف لگتی تھی کہ مجھے اس کی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی۔ ماسی کے لیے حقیقی ماں کی طرح اکلوتے بیٹے کے اس طرح مارے جانے پر غم کا اظہار کرنا اور اپنی المیہ اداکاری سے کسی پر اصلیت ظاہر نہ ہونے دینا بہت مشکل کام تھا لیکن میں نے غور و خوض کے بعد اس کا بھی ایک آسان سا حل تلاش کر لیا۔ ماسی کو سمجھانے اور اطمینان دلانے میں مجھے خاصی دشواری کا سامنا ہوا مگر بالآخر وہ سمجھ گئی اور میں نصف شب کے بعد رخصت ہوا۔ رضوی صاحب سو چکے تھے۔ میں کوٹھی کے دروازے سے سیدھا گزر کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ سرونٹ کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں نے رضوی صاحب کے ڈرائیور کانسٹبل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا جس کی نظر میں ہماری حیثیت پہلے ہی بہت پُراسرار تھی اور کسی حد تک خطرناک ہو گئی تھی۔ وہ مجبور تھا تو صرف

اس لیے کہ رضوی صاحب ہمارا لحاظ کرتے تھے اور ہم پر بہت مہربان تھے ورنہ وہ کب کا ہمیں نکال باہر کر چکا ہوتا۔ تاہم اس نے اب سلام دعا تک بھی ترک کر دی تھی جس کی ہمیں بھی پروا نہیں تھی۔

اندھیرے میں جگنو سا چمکتا دکھائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ محسن لوٹ آیا ہے اور اپنی یا میری پریشانی کے باعث جاگ رہا ہے اور انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے بستر پر لیٹا سگریٹیں پھونک رہا ہے۔ اپنی بات کہنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اس کی سنوں۔ حسبِ توقع وہ گھر سے ایک زبردست جنگ لڑ کے آ گیا تھا اور اپنے پیچھے ایک شدید جذباتی بحران چھوڑ آیا تھا۔ والدین اس کی باغیانہ روش پر بے حد دکھی اور برافروختہ تھے لیکن کوئی انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے اسے عاق بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بیٹا ان کی ضرورت بھی تھا اور مجبوری بھی۔ لیکن اس تمام فساد کا ذمے دار میں ٹھہرا تھا جس نے پہلے بھی فوزیہ کی زندگی تباہ کی تھی اور اب بھی اس کے مقدر میں کوئی خوشی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے محسن کو بھڑکایا تھا۔ فوزیہ ایک ناسمجھ، ناتجربے کار اور جذباتی لڑکی تھی۔ محسن اسے سمجھا سکتا تھا اور اسے حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا مگر اس نے جو کچھ کیا برعکس کیا۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ اب شیروانی صاحب کو میری سرپرستی سے فوراً ہاتھ کھینچ لینا چاہیے کیونکہ میں کمینہ اور احسان فراموش ثابت ہوا ہوں۔ شیروانی صاحب اس زنانہ منطق سے قائل نہیں ہوتے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں قطعی غیر جانبدار رہیں گے۔ جس کا جو دل چاہے کرے۔ وہ خود بھی کسی کے کہنے سے مجبور ہو کے کچھ نہیں کریں گے۔ یہ محسن کے نقطۂ نظر سے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ شیروانی صاحب نے فوزیہ پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرنے سے انکار کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ سے وہ تعلق ختم کرنا بھی منظور نہیں تھا جس کی بنیاد میرے والد کی اور ان کی نصف صدی پرانی دوستی کے رشتوں پر تھی۔ مجموعی صورتِ حال سے محسن خوش اور مطمئن تھا۔ شیروانی صاحب نے پہلی بار بیوی کی بات ماننے سے انکار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بھی شوہر ہیں، بیوی کے غلام نہیں۔ چنانچہ اکیلی فوزیہ کی ماں اب اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر نے ان کا ساتھ دیا ہوتا تو محسن کو یقیناً شکست ہو جاتی اور فوزیہ کے مستقبل کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔

میں نے اپنی بات کم سے کم الفاظ میں کہی کیونکہ رات بہت بیت چکی تھی اور میں اگلے دن تازہ دم اٹھنے کے لیے نیند کی کمی پوری کرنا چاہتا تھا۔ محسن نے میرے منصوبے سے

اتفاق کیا اور اپنے خدشات کا اظہار بھی کیا کہ پول کھل گئی تو ہمارے ساتھ ماسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی مگر مصیبت کا مفہوم بھی ہمارے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔ 'مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں' والا معاملہ تھا۔ صبح نو بجے پھر رابعہ نے مجھے بیدار کیا۔

"مانا کہ جناب گھوڑوں کا تمام اسٹاک بیچ کر سوتے تھے۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "مگر اب جاگنے کا خیال نہیں ہے کیا؟"

"جاگ تو میں رہا تھا۔" میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "لیکن منتظر تھا کہ تم آ کے جگاؤ۔ اگر ہر صبح اسی طرح تمہارے آفتابِ حسن کی دید سے طلوع ہو...!"

رابعہ کا چہرہ شفق رنگ ہو گیا اور اس نے گھبرا کے محسن کی طرف دیکھا جو سر تک چادر تانے مردے کی طرح سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ محسن سن لے گا...!"

"فکر مت کرو۔ محسن سو رہا ہے۔" محسن نے بلے جلے بغیر کہا اور رابعہ بے اختیار پلٹ کر بھاگی۔ محسن قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔ "یار! یہ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟ پڑھی لکھی ہوں یا جاہل... چہ خوب...! یہ باتیں سننا بھی چاہتی ہیں اور فرماتی ہیں کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اگر اس رومانٹک سین کو آپ کچھ دیر اور چلنے دیتے تو کیا تھا؟" میں نے تکیہ اس کی طرف پھینکا۔ "اور جس دن تجھے عشق ہوا نا کسی سے، اس روز میں پوچھوں گا کہ یہ باتیں کیسی لگتی ہیں!"

"سچا عشق ہمیں زکام کی طرح اکثر ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔ "علاج دونوں کا نہیں۔ خدا شفا دیتا ہے ورنہ بندہ نکاح فرما لیتا ہے۔"

صبح کا آغاز اچھا ہوا تھا۔ ضامن رضوی صاحب ڈیوٹی پر جا چکے تھے چنانچہ ہم نے کوٹھی میں ناشتہ کیا اور بہت سی چیزوں کے ساتھ بیگم رضوی کی جھاڑ بھی کھائی۔ ان کو ہماری شب و روز کی مصروفیت پر سخت تشویش لاحق تھی کہ ہم کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ ان کا ہمارے معاملات سے بے خبر اور بے تعلق رہنا ہی بہتر تھا اس لیے ہم باتوں کو مذاق میں ٹال گئے۔ پھر میں نے موقع پا کے مُردہ خانے فون کیا اور عدنان کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھ سے دس منٹ بعد دوبارہ فون کرنے کو کہا گیا۔ دس منٹ بعد فون اٹھانے والے نے بہت سے سوالات کیے کہ میں کون ہوں اور عدنان سے میرا کیا رشتہ ہے۔ بات کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں عدنان کا فیملی ڈاکٹر

ہوں اور اس کی فالج زدہ ماں کا علاج کر رہا ہوں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ عدنان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس خبر سے اس کی ماں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ جسمانی طور پر وہ پہلے ہی مفلوج تھی اب اس کا ذہن بھی مفلوج ہو گیا ہے۔"

"دیکھیے جناب! یہ پولیس کیس ہے۔" مجھ سے بات کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے ہمدردی ضرور ہے لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں چاہتا تھا کہ لاش کو اسپتال ہی میں غسل اور کفن وغیرہ دے دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "اور وہیں سے تدفین کے لیے قبرستان پہنچا دیا جائے۔ اگر لاش گھر لائی گئی تو ممکن ہے اس کو دیکھتے ہی عدنان کی ماں مر جائے۔"

"آئی ایم سوری۔ آپ نے دیر سے فون کیا۔" وہ بولا۔ "عدنان کی لاش کو وارث لے جا چکے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ لاش اس کی بہن کے حوالے کر دی گئی ہے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا کوئی اور قانونی وارث نہیں ہے۔"

"مجھے تو یہ معلوم ہے کہ کل ایک صاحب آئے تھے اور یہی وقت تھا، چنانچہ میری ہی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے بھی یہ بات کہی تھی کہ عدنان کی ماں مفلوج ہے اس لیے خود نہیں آ سکتی اور بہن اس صدمے سے بے ہوش پڑی ہے، اس لیے وہ بھی نہیں آ سکتی۔ پھر انہوں نے پولیس سے بات کی اور لاش لے گئے۔ غالباً وہ لڑکی کے چچا تھے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"چچا؟" میں نے کہا۔ "کیا نام اور پتہ دیا تھا انہوں نے؟"

"نام تو تھا چوہدری دلاور۔" ڈاکٹر بولا۔ "پتہ میں آپ کو دیکھ کر بتا دیتا ہوں۔"

ایک تو وہ کچھ معقول اور شریف آدمی تھا۔ پھر یہ کہ مجھے اپنا ہم پیشہ سمجھ کے اس نے تعاون کیا ورنہ وہ یہ کہہ کر بات ختم کر سکتا تھا کہ متعلقہ تھانے سے معلوم کیجیے۔ اس نئی صورتِ حال نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ چوہدری دلاور کے عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شہلا روپوش ہو گئی ہے اسے یہ شک بھی ہو گا کہ شہلا کے گھر میں بدمعاشوں کا مقابلہ کرنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اور یقین ہو گا کہ بھائی کی خبر پاتے ہی شہلا سامنے آنے پر مجبور ہو گی۔ وہ اسپتال پہنچے گی تاکہ پوسٹ مارٹم کے بعد بھائی کی لاش لے جا سکے۔ چوہدری دلاور اس سے پہلے ہی لاش لے گیا اور اپنا پتہ چھوڑ گیا کہ شہلا اسپتال سے سیدھی اس کے گھر جائے اور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ شہلا کا وجود اب ان کے لیے خطرناک ہو گیا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو کھلم کھلا دھمکی دی تھی اور اس خطرے کا سدِ باب ضروری تھا۔ اس کے پاس دولت کی طاقت تھی اور اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا جس سے وہ پولیس کو خرید بھی سکتے تھے۔ شہلا ایک بار ان کے جنگل میں گرفتار ہو جاتی تو اس کے لیے رہائی اور نجات کے سارے دروازے بند ہو جاتے۔ میں نے فوراً محسن سے مشورہ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" محسن نے کہا۔ "تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ اگر تیرے خلاف ہی تفتیش کا چکر شروع ہو گیا تو نئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"خطرہ مجھے صرف ایک شخص سے ہے۔" میں نے کہا۔ "جب میں ساتھ والے گھر میں فون کرنے گیا تھا تو ایک نوجوان باہر نکل رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں شہلا کا پڑوسی ہوں۔ وہ مجھے پہچان سکتا ہے، لیکن تجھے نہیں پہچان سکتا۔"

"اس کے علاوہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مار دھاڑ کرتے ہوتے نادانستگی میں تو نے کہیں اپنے فنگر پرنٹ وغیرہ چھوڑ دیے ہوں۔ ڈی سلوا نے تجھے وہاں دیکھا تھا فرض کر لو بعد میں اس نے پولیس کو اپنا نام بتلائے بغیر ٹیلی فون کر دیا ہو۔ اس امید میں کہ پولیس شہلا سے یا اس کی ماں سے تیری موجودگی کا اعتراف کرائے گی۔ پولیس اب بھی وہاں ہو گی مگر مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ میرے فنگر پرنٹ لے کر بھی کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔"

"تجھے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو رابعہ کی گاڑی لے جا۔ جیسی بھی ہے، چلتی تو ہے۔ ماسی کو کمبل وغیرہ لپیٹ کر پیچھے کی سیٹ پر لٹا دینا اور چوہدری دلاور کے گھر پہنچ جانا۔ میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کو نہیں پہچانتا ہو گا۔ ماسی کچھ نہیں بولے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے، صدمے کا اثر اس کے دماغ پر ہو گیا ہے اور اس کی زبان بھی گنگ ہو گئی ہے۔ تدفین کے انتظام کی ذمہ داری تو چوہدری دلاور قبول کر ہی چکا ہے۔ شہلا کے بارے میں اس کی امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ میں شہلا کے پاس جا کے اسے اس نئی صورتِ حال سے خبردار کرتا ہوں۔"

میں اور محسن ایک ساتھ ہی شہلا کے پاس پہنچے جہاں سے محسن تو کچھ دیر بعد ماسی کو لے کر روانہ ہو گیا مگر میں شہلا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بیٹے کے لیے بہت پریشان تھی۔ اور یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ آخر کب تک وہ اپنے گھر واپس جا سکے گی۔ میں نے رابعہ نے اور شہلا نے مل کر حالات کی جو وضاحت کی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ عدنان کو ایک بحری جہاز پر بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے چنانچہ وہ اپنے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات کے حصول کی کوشش میں لگا ہوا ہے اور اسی مصروفیت کے باعث آ نہیں سکا۔ جہاز کل روانہ ہو گا مگر عدنان جانے سے پہلے ملنے کے لیے ضرور آئے گا۔ عدنان کی ماں کی صورت پر میرے جھوٹ سے اطمینان اور مسرت کے جذبات جتنے نمایاں ہوتے جا رہے تھے میرا ذہنی کرب اتنا ہی بڑھ رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

"تم خود ملے تھے اس سے؟ خود اس نے تم سے کہا تھا کہ وہ ملنے کے لیے ضرور آئے گا؟ شاید خدا نے میری دعا سن لی ہے۔ وہ بری صحبت سے بچ گیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔" پھر وہ مجھ سے مزید سوالات کرنے لگی۔ "اسے یہ نوکری تو پسند ہے نا؟ دور تو جانا ہی پڑتا ہے اپنے فائدے کے لیے اور وہ کون سا ہمیشہ کے لیے دور جا رہا ہے۔ کب تک آئے گا مجھ سے ملنے کے لیے؟"

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا مگر میں جواب دیتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں چلنے لگا تو شہلا میرے ساتھ دروازے تک آئی۔

"یہ تم نے کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"اس مسئلے کا یہی سب سے آسان حل تھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "آج یا کل، جس وقت بھی ماں سوئے تو اس کے جاگنے کے بعد کہہ دینا کہ عدنان آیا تھا اور بیٹھا رہا۔ مگر اس نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"سکندر بھائی!" وہ میرے شانے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ "یہ جھوٹ کب تک چلے گا؟ عدنان تو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ماں کب تک اس کا انتظار کرے گی؟"

یکلخت میں جذباتی ہو گیا۔ "تم نے مجھے بھائی کہا ہے نا شہلا! اس لیے کہ یہ رشتہ تمہارے لیے بہت مقدس تھا۔ تمہیں بہت عزیز تھا اور تم اس سہارے سے محروم ہو کے خود کو تنہا محسوس کرتی ہو۔ پاگل! مجھے دیکھو۔ میں تو شروع سے تنہا ہوں۔ میرے بھی بھائی بہن تھے اور میری بھی ویسی ہی ماں تھی جیسی سب کی ماں ہوتی ہے۔ ان سب رشتوں کو تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے توڑ ڈالا۔ میرا باپ بہت باہمت تھا جس نے اس وطن کے لیے اتنی بڑی قربانی دی مگر حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے گھر کو اجاڑنے والے تو غیر تھے اور دشمن تھے مگر اس کو مارنے والے اپنے کہلاتے تھے۔ اب میں اکیلا ہوں مگر تم نے بہن کا رشتہ قائم کر کے میرے اس احساس کو ختم کر دیا ہے۔ اب ہم دونوں اکیلے نہیں۔ سمجھ لو کہ میں سکندر نہیں بلکہ عدنان ہوں اور میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکرمند ہونے کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن میرے بھائی! مجھے بھی تو بتاؤ کہ ہم ماں کو کیسے دلاسہ دیں گے؟"

"وہ میں نے سوچ لیا ہے۔" میں نے شہلا کے آنسوؤں کو اسی کے دوپٹے سے صاف کر دیا۔ "سمندر پار سے عدنان کے خطوط برابر آتے رہیں گے اور ان میں یہی ہو گا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے اور خوش ہے اور تم یہ خط پڑھ کے ماں کو سناتی رہو گی۔ کبھی کبھی وہ تمہارے لیے اور ماں کے لیے تحائف بھی بھیجے گا۔"

"یہ سب کیسے ہو گا بھیا؟" وہ نظریں جھکا کے بولی۔ "اب تو میری نوکری بھی نہیں رہی ہے۔"

"میری چھوٹی سی بہن!" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ کر لوں گا۔ بس مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

باہر آ کے سڑک تک پیدل جاتے ہوتے میں سوچ رہا کہ سب کیسے ٹھیک ہو گا۔ شہلا اس گھر میں کیسے واپس جائے گی اور واپس نہیں جائے گی تو یہاں کب تک رہے گی؟ کیا بھائی کی حیثیت سے میں اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر سکوں گا؟ میں تو خود مسائل کے جال میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا اور میرے مسائل بہت بڑے تھے۔ انتہائی خطرناک تھے اور میرے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ شکاری میری جان کے درپے تھے اور مجھے چن چن کر ہر شکاری کو شکار کرنا تھا یا خود شکار ہو جانا تھا۔ شکاری میرے لیے جال پھیلا رہے تھے اور میں خود کو بچاتا ہوا ہر شکاری کی تاک میں تھا۔ میری ایک غلطی یا ایک غلط قدم میری شکست کا سبب بن سکتے تھے لیکن یہ شکست صرف میری نہ ہوتی کیونکہ اس جنگ میں رابعہ بھی شریک تھی، محسن بھی شامل تھا۔ شہلا اور الماس بھی فریق بن گئی تھیں اور ایک لڑکی گل رخ بھی آ گئی تھی جسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا اور جس کے بارے میں مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اسی چاہنے والے کسٹم افسر کے ساتھ شاد و آباد ہے یا اپنی غیرت کے ساتھ کسی بے نشان مدفن میں سو چکی ہے۔ مجھے سلامت شاہ، منو ماچو، غلام علی اور دوسرے بہت سے لوگ یاد آئے جو میری وجہ سے مارے گئے یا میرے ہاتھوں مارے گئے۔

ایک کیمسٹ کی دکان پر میں نے ڈائریکٹری میں اسکول کا نمبر تلاش کیا۔ ہیڈ مسٹریس اب بھی وہی تھی اور اسے گل رخ یاد تھی۔ "ٹیچرز تو آتی جاتی رہتی ہیں۔" وہ بولی۔ "ملازمت چھوڑ دی یا ٹرانسفر ہو جاتی ہیں اور کبھی لوٹ کر نہیں آتیں مگر گل رخ کی بات اور ہے، وہ اب بھی کینیڈا سے آتی ہے تو مجھ سے ضرور ملتی ہے۔"

"کینیڈا سے؟ کیا آج کل وہ کینیڈا میں ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، شادی کے بعد وہ کینیڈا چلی گئی تھی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"جی... دراصل میں خود کئی سال باہر رہا۔" میں نے کہا۔ "جس لڑکے سے اس کی شادی ہونے والی تھی، وہ کسٹم میں افسر تھا اور میرا دوست تھا۔"

"نعیم۔ تم نعیم کے دوست ہو؟" ہیڈ مسٹریس بولی۔ "اچھا اچھا۔ گل رخ کی شادی اسی سے ہوئی تھی مگر شادی سے پہلے نعیم نے کسٹم کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ شادی کے بعد وہ لندن چلے گئے تھے اور وہاں نعیم نے کوئی اسٹور وغیرہ کھول لیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے سب بیچ دیا اور اچانک معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا میں ہے۔ پتہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر سے معلوم کر لوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" ہیڈ مسٹریس نے خاصی دیر بعد کہا۔ "اس کا گھر بھی اب کہاں ہے! آئی ایم سوری کہ مجھے یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔ گل رخ کا باپ بہت نیک اور مذہبی قسم کا خدا ترس انسان تھا۔ مولوی کہلاتا تھا۔ بیٹی کی شادی کے چند ماہ بعد بے چارے کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ ایک رات اس نے تیل چھڑک کر گھر میں آگ لگا لی۔ گل رخ کی ماں بھی اس حادثے میں جل کر مر گئی تھی۔ پڑوس کے ایک رہنے والے نے آگ لگنے سے پہلے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں اور اسی نے یہ بیان پولیس کو بھی دیا تھا۔ غالباً پوسٹ مارٹم میں بھی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مولوی محبوب نے پہلے بیوی کو گولی ماری، پھر گھر کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو بھی شوٹ کر لیا۔ اسی واردات کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ نعیم اور گل رخ برطانیہ سے کینیڈا چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہاں رہنے والے پاکستانی یا سفارت خانے والے ان کا پتہ چلانے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔"

"جی... وہ میں معلوم کر لوں گا۔ میں خود بھی کینیڈا سے ہی آیا تھا۔ تھینک یو۔" میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا اور فون کال کے پیسے دے کر دکان سے باہر آ گیا۔ واقعات کی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں اور میرا ذہن اندازوں کی بنیاد

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پر کچھ نتائج اخذ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ کسٹم آفیسر نعیم نے دباؤ کے تحت ملازمت سے دستبردار ہونا قبول کر لیا تھا اور گل رُخ کے ساتھ لندن میں آباد ہو گیا تھا۔ شاید گل رخ کو معلوم بھی نہ ہو گا کہ جو لوگ اسے زبردستی گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے وہ کون تھے اور اسے کیوں لے گئے تھے صرف نعیم جانتا تھا کہ ان بدمعاشوں نے گل رُخ کی تصویریں بھی اتاری ہیں۔ ان کی دھمکی کو نظرانداز کرنا واقعی مشکل تھا۔ وہ اس کی محبت چھین بھی سکتے تھے۔ ملازمت بھی اور شاید زندگی بھی۔ چنانچہ وہ گل رخ کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ تاہم اسے معلوم ہو گا کہ بلیک میل کرنے والے اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہتے اور کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لندن پہنچ جانے کے بعد وہ مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے کینیڈا چلا گیا۔ ممکن ہے ڈی سلوا نے دوبارہ اس سے رابطہ قائم کیا ہو اور اس پر دباؤ ڈالا ہو کہ وہ ان کے لیے کام کرے ورنہ اس کی ازدواجی زندگی تباہ کر دی جائے گی اور اس دھمکی کے بعد نعیم نے روپوش ہو جانا بہتر سمجھا ہو گا۔ وہ لندن میں کسی کو بتا کر نہیں گیا ہو گا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ شاید اس نے مشہور کیا ہو گا کہ وہ لوٹ کر وطن جا رہے ہیں لیکن کینیڈا پہنچ گئے ہوں گے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف نام کی مدد سے کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ ڈی سلوا کے آدمی اسے پاکستان میں ڈھونڈتے پھرتے ہوں گے یا انہوں نے برطانیہ ہی کے دوسرے شہروں میں تلاش کیا ہو گا اور انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے خیالات کا سلسلہ پھر جوڑا۔ نعیم اور گل رُخ کے کیس میں سب سے افسوسناک پہلو گل رُخ کے والدین کی ہلاکت کا تھا۔ کیا واقعی مولوی محبوب کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا؟ یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا کہ دیوانگی کے آثار مولوی محبوب کی شخصیت میں پہلے سے نمایاں ہو چکے تھے یا وہ اچانک بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ اگر وہ شروع سے خبطی یا جنونی قسم کا آدمی ہو گا تو یہ بات اس سے ملنے جلنے والے ضرور جانتے ہوں گے لیکن وہ متوازن ذہن کا مالک تھا تو دیوانگی کے اس دورے کا سبب کوئی فوری صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ڈی سلوا یا اس کے آدمی مولوی محبوب کے پاس پہنچے ہوں اور اس سے پوچھا ہو کہ تمہاری بیٹی اور داماد برطانیہ سے غائب ہو کر کہاں گئے ہیں؟ شاید مولوی محبوب کو بھی خبر نہ ہو گی کہ وہ روپوش ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہو گا تو پتہ پوچھنے والوں نے سنگین ... دھمکی دی ہو گی اور اس سے بھی مقصد پورا نہ ... گل رُخ کی یا نعیم کی تصویریں سامنے

رکھ دی ہوں گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دیوانگی کا نام دے دیا گیا۔ مولوی محبوب جو اپنی پارسائی اور نیکی کے باعث مشہور تھا، بے حیائی اور بے غیرتی کے ان نمونوں کو دیکھ کر واقعی پاگل ہو سکتا تھا اور رسوائی کے تصور سے ڈر کے اپنی اور بیوی کی زندگی کا خاتمہ اسی طرح کر سکتا تھا کہ گھر کی آگ میں جل مرے لیکن یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ اس طرح گھر کو آگ لگانے سے پہلے اس نے بیوی کو گولی کیوں ماری اور آگ لگانے کے بعد اپنے آپ کو شوٹ کیوں کیا؟ کیا اسے ڈر تھا کہ آگ میں جل کے راکھ ہونے سے پہلے ہی ان کو بچا لیا جائے گا اور وہ زندہ رہنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا؟ سوال یہ ہے کہ مولوی کہلانے والے کسی انتہائی شریف آدمی کے پاس ریوالور کہاں سے آیا؟ اس ملک میں بغیر لائسنس کا ریوالور سیٹھ یا بدمعاش قسم کے لوگ رکھ سکتے ہیں اور لائسنس کے تحت صرف ضرورت مند۔ مولوی محبوب جیسا آدمی نہ لائسنس لے سکتا تھا اور نہ بغیر لائسنس کا اسلحہ رکھ سکتا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا نظر آتا تھا کہ تصویریں دیکھتے ہی مولوی محبوب کا دماغ الٹ گیا اور اس نے دھمکی دینے والوں کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی اور نتیجے میں خود مارا گیا۔ اس کی بیوی بھی شوہر کے قاتلوں کی گولی کا نشانہ بنی جو اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے گھر کو آگ لگا کے فرار ہو گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ آگ سے جل جانے کے بعد لاشوں پر گولی کے زخم کیسے نظر آئیں گے۔ مگر فائرنگ کی آواز ایک پڑوسی نے سن لی۔ اس نے اپنے بیان میں بھی فائرنگ کا ذکر کیا تھا چنانچہ پولیس کے لیے پوسٹ مارٹم کرانا ضروری ہو گیا۔ شاید وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اب بھی کہیں پرانے ریکارڈ سے نکل آئے یا پولیس کی رپورٹ اور ہمسائے کا بیان مل جائے۔ نعیم اور گل رخ کا پتہ بعد میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہیڈ مسٹریس کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ کینیڈا میں ہیں اور کسی کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا۔ ہیڈ مسٹریس کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ گل رُخ، کینیڈا جانے کے بعد بھی پاکستان آئی تھی۔ اسے اپنے والدین کے المناک انجام کی خبر یقیناً ہو گی۔ شاید نعیم نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہو گا کہ یہ وہی دشمن ہیں جن کے خوف سے اس نے ملازمت چھوڑی بھی چلا وطن ہو کے برطانیہ گیا تھا اور وہاں سے بھاگ کر کینیڈا میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ اسی طرح آئے ہوں گے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور چند روز وطن میں گزار کے لوٹ گئے ہوں گے۔ ممکن ہے یہاں نعیم کے والدین یا بہن بھائی رہتے ہوں۔ میں نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے سوچا اور اس کے ساتھ ہی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ کہیں نعیم کے دورے کا مقصد ڈی سلوا کے خلاف انتقامی کارروائی کے مواقع تلاش کرنا تو نہیں تھا؟ انتقام کی آگ میں تو وہ دونوں ایک ہی طرح جل رہے ہوں گے۔

میروز اینڈ کمپنی کے دفتر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے میں بہت پُراعتماد تھا۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود۔ کیونکہ اب میرے پاس حقائق تھے جن سے ڈی سلوا کے لیے مفر نہ تھا۔ اچانک میری نظر نے ٹیلی فون کے اس تار کو دیکھا جو زینے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کسی کو نہ پاکے میں نے اپنا جیبی چاقو نکالا اور تار پر رگڑ دیا۔ سخت تار کے مقابلے میں یہ چاقو بہت چھوٹا تھا مگر تھوڑی سی قوت صرف کر کے میں تار کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ غور سے دیکھے بغیر لائن کے کٹے ہوئے حصے کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ دونوں الگ ہو جانے والے ٹکڑے اسی طرح سیدھے اور آپس میں ملے ہوئے لگتے تھے۔ میں چاقو جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ بائیں طرف کا دروازہ کھلا اور ایک شخص نیچے جانے کے لیے اترا۔

"سکندر صاحب!" اس نے مجھے دیکھتے ہی حیرانی سے کہا اور مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "آپ یہاں کیسے؟" وہ سرہلا کے سرگوشی میں بولا۔ "آپ کی تلاش میں تو پولیس یہاں آئی تھی۔"

"یہاں! کیا میں یہاں رہتا ہوں؟ یا یہاں کام کرتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ "خیر یہ بتاؤ کہ کس سلسلے میں آئی تھی پولیس؟"

"وہ... دراصل ڈی سلوا صاحب... ان کی ایک سکریٹری ہوتی تھیں، مس شہلا زیدی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "ان کے گھر پر کچھ ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ خود بھی غائب ہیں اور ہمیں تو ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا کہ..."

"اچھا اچھا۔ ڈی سلوا صاحب نے بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان سے تو میں خود پوچھ لیتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

وہ کیبن خالی پڑا تھا جہاں میں نے اس سے پہلے شہلا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ فرض اور محبت کے تقاضوں سے مغلوب وہ بے وقوف لڑکی ڈی سلوا کی خاطر مجھ سے دشمنی پر آمادہ تھی جبکہ بہت نقصان اٹھانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ دشمن تو وہ تھا جس پر اس نے متاعِ دل و جاں نثار کر دی تھی۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا... میں نے ڈی سلوا کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چچا غالب کو یاد کیا اور ڈی سلوا کو فائل پر سے نظر اٹھا کر چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ فوراً دراز کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ اس نے میرے تیور دیکھ لیے تھے اور اندازہ کر لیا تھا کہ میں اسے جارحانہ کارروائی کی مہلت نہیں دوں گا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے صلح جُو لہجے میں کہا۔ "میں صرف باتیں کرنے آیا ہوں اور باتیں ہی کروں گا۔ بشرطیکہ تمہیں بھی اس پر اعتراض نہ ہو۔"

"میں تم سے کسی قسم کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔" ڈی سلوا سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم بھلا کیوں چاہو گے۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ باتیں کروں اس لیے میں باتیں ضرور کروں گا اور اگر تم جواب نہیں دو گے تو تمہاری خاموشی کو اقرار سمجھ کے بولتا رہوں گا۔ رائٹ؟ ویسے تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ مجھے وہ دوسرا کام بھی آتا ہے۔ لاتوں کے بھوت کو باتوں سے منوانا یا اس کے برعکس باتوں کے بھوت کو لاتوں سے قائل کرنا۔ مگر مجھے امید ہے کہ تم مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرو گے کیونکہ تم سمجھدار آدمی ہو۔ ضرورت سے بہت زیادہ سمجھدار۔" ڈی سلوا مجھے گھورتا رہا اور خاموشی سے میرے ہاتھوں کو میز کا سامان ہٹا کر ایک طرف کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ یہ مورچہ بندی حفاظتی نوعیت کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر میں ڈی سلوا کو فوراً قابو کر سکوں۔ "آج تمہارا یہ دفتر کچھ اجڑا اجڑا سا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری وہ جانِ بہار سکریٹری نظر نہیں آ رہی ہے جس کے عکسِ جمال سے یہ انجمن روشن تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ شہلا زیدی۔ میں نے تو سنا ہے... دشمنوں کے کان بہرے... کہ وہ غائب ہو گئی ہے؟ جیسے گدھے کے سر سے محاورے کے مطابق سینگ۔ سینگ کے ساتھ گدھا کتنا خوبصورت لگتا ہو گا۔ اتنا ہی جتنا پہلے یہ دفتر لگتا تھا۔ خیر یہ بتاؤ تم نے اسے رکھا کہاں ہے؟ مجھے حیرانی ہے کہ تم جیسا آدمی اتنا قدامت پرست اور تنگ نظر شوہر ثابت ہو گا کہ شادی کے بعد بیوی کو ملازمت نہیں کرنے دے گا۔ تم تو اس کی خاطر مذہب تک بدل رہے تھے؟"

ڈی سلوا کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ "یہ بکواس شہلا نے بہت سے لوگوں کے سامنے کی تھی۔" وہ حقارت سے بولا۔ "لیکن میں نے اس سے شادی کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ مذہب بدلنے کا کیا سوال؟"

"ہاں مذہب بدلنے کا کیا سوال۔" میں نے اتفاق کیا۔ "مذہب کی بنیاد ہے انسانیت پر اور اس لیے تمہارا مذہب ہی کہاں کہ بدلو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں آئی تھی؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شہلا کے گھر میں وہ تین آدمی کس طرح مارے گئے تھے۔"

"ہاں۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "مگر یہ پولیس والے بے وقوف یہ کچھ نہیں جانتے۔ مثلاً یہ نہیں جانتے کہ میں ایس ایس پی حنان رضوی کے گھر میں رہتا ہوں۔ وہ مجھے پوچھتے ہوئے وہاں نہیں گئے مگر یہاں آ گئے۔ ہے نا کمال کی بات؟ وہ ایک شخص تھا تمہارے جیسا افلاطون۔ اس کی سوئی گھر میں کھو گئی تھی مگر وہ باہر سڑک پر ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ گھر میں اندھیرا تھا۔ ویسے نہ میں سوئی جتنا ہوں اور نہ میرے گھر میں اندھیرا ہے کہ میں نظر نہ آؤں۔ اندھیرا ان پولیس والوں کی کھوپڑی میں ہے۔ انہوں نے تم کو تو پریشان نہیں کیا؟ اس رات تم بھی تو آئے تھے اور وہ سکریٹری بھی تمہاری تھی؟"

"لک ہیر۔" ڈی سلوا تیز لہجے میں بولا۔ "میں یہاں فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر تم یہی فضول باتیں کر کے میرا وقت ضائع کرنے آتے ہو..."

"آئی ایم ساری۔" میں نے پھر ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میں بالکل بھول گیا تھا کہ تمہارا وقت قیمتی ہے حالانکہ یہ میرا وقت ہے اگر تم غور کرو۔ میں مالک ہوں اور تم ملازم، چنانچہ میں حکم دے سکتا ہوں کہ مسٹر مینجر کام پر لعنت بھیجو اور میری فضول بکواس کو غور سے سنو۔ مگر تم پھر وہی اعتراض اٹھاؤ گے کہ ابھی میں مالک نہیں بنا۔ اس لیے میں اصل بات پر آتا ہوں۔ مجھے تم سے ایک شخص کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے کسٹم انسپکٹر تھا اور اس کا نام تھا نعیم۔"

بڑی تیزی سے ڈی سلوا نے اپنی صورت کے بدلتے رنگ پر قابو پایا۔ "تم غلط جگہ آ گئے ہو۔"

"کیسی لطیفے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے باپ کا دفتر ہے۔ پھر میرے لیے غلط جگہ کیسے ہو گئی؟"

"میرا مطلب تھا کہ تمہیں کسٹم آفس والوں سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔ "اوہ! نو مسٹر ڈی سلوا! کسٹم میں تو وہ بہت پہلے تھا۔ پھر اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور لندن چلا گیا تھا۔ اپنی بیوی گل رخ کے ساتھ۔ وہاں اس کا ایک اسٹور تھا۔"

"وہاٹ نان سینس۔" ڈی سلوا نے سنبھل جانے کے بعد پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر یہ سب کچھ تمہیں معلوم ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میں کسی نعیم کو نہیں جانتا۔ کسی گل رُخ کو نہیں جانتا ہوں۔"

"وہاٹ نان سینس۔" میں نے بالکل ڈی سلوا کے لہجے میں دہرایا۔ "وہ مجھے لندن میں ملا تھا تو اس نے تمہارا ذکر کیا تھا۔"

"کیا ذکر کیا تھا؟" ڈی سلوا نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا لیکن وہ اپنے لہجے سے ظاہر ہونے والی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"ذکر یہی کہ تم سے اس کی دوستی تھی یا شناسائی تھی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "میں نے بات کی تھی میروز اینڈ کمپنی کی اور اس نے تمہارا نام لیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ تم گل رخ کی فیملی کو بھی جانتے ہو۔"

ڈی سلوا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ "اس نے بکواس کی تھی۔"

"اچھا؟" میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ "تم مولوی محبوب کو نہیں جانتے؟ وہ جو پاگل ہو کر گھر کو آگ لگانے کے بعد بیوی کے ساتھ جل مرا تھا؟ اور میں نے سنا ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ..."

"شٹ اپ!" ڈی سلوا نے میز پر مکا مارا اور چیخ کر کہا۔ "شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

"ضرور بلاؤ۔" میں نے ٹیلی فون اس کی طرف کھسکا دیا اور اپنے ظاہری سکون اور اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا۔ "بلکہ بہتر یہ ہو گا کہ تم دو جگہ سے پولیس کو طلب کرو۔ ایک تو انہی کو جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے تھے، دوسرے اس تھانے والوں کو بھی جن کے پاس مولوی محبوب اور اس کی بیوی کی پُراسرار موت کی رپورٹ ہے۔"

ڈی سلوا نے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر دھڑ سے دے مارا۔ "تو یہ بات ہے؟"

"آہستہ۔ مسٹر ڈی سلوا! ٹیلی فون ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ آفس کی ملکیت ہے تمہارے باپ کی نہیں..."

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈی سلوا نے ٹیلیفون اٹھا کر مجھ پر پھینکا۔ اس کا ہاتھ ریسیور پھینکنے کے بعد ٹیلی فون سے الگ ہوا ہی نہ تھا چنانچہ میں تیار تھا۔ میں نے ہاتھ مار کے ٹیلی فون کو ایک طرف گرا دیا۔ ٹیلی فون میز کے شیشے پر گرا اور شیشے کو توڑتا ہوا فرش پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ڈی سلوا نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر دراز کھینچی مگر میں نے لات مار کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ ہاتھ کو جھٹکا لگنے سے دراز باہر آ گری اور ریوالور جو کاغذات میں سب سے اوپر رکھا تھا اچھل کر ڈی سلوا کے پیروں کے پاس جا پڑا۔ ڈی سلوا کرسی سے ٹکرا کر سنبھل ہی رہا تھا کہ ریوالور کو اپنی دسترس میں دیکھ کر وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تیزی سے جھکا۔ اس کا ہاتھ اور میرا پاؤں تقریباً ایک ساتھ ریوالور تک پہنچے۔ ڈی سلوا کا ہاتھ سیکنڈ کے دسویں حصے کے فرق سے پہلے پہنچا تھا چنانچہ میرے جوتے کے نیچے آگیا اور میں نے اس پر اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ میرے ہاتھوں نے اس کا دوسرا بازو جکڑ لیا۔ کرسی اور میز کے درمیان اس کی گردن اس طرح آگئی کہ میں دوسرے پیر کا گھٹنا مارتا تو میز کے کنارے سے اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ چنانچہ میں نے اس کو جھٹکا دے کر اٹھایا اور کرسی میں فٹ کر دیا۔ ابھی تک ان آوازوں نے دفتر کے دوسرے حصے میں کام کرنے والوں کو متوجہ نہیں کیا تھا کیونکہ ہمارے درمیان دو کمروں کی پارٹیشن اور ایک زینے کی دو دیواریں حائل تھیں۔ اس کے علاوہ نیچے بیڈن روڈ کی ٹریفک کا شور و غل تھا۔

"مسٹر ڈی سلوا! میں نے تمہیں خبردار کیا تھا،" میں نے اسے حرکت کا موقع دیے بغیر کہا۔ "اور اب پھر خبردار کرتا ہوں، میں بات کرنے آیا تھا۔ مجھے ہاتھ چلانے پر مجبور مت کرو۔ میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ ایک ہاتھ سے تمہارے ہوش رخصت کر دوں اور تمہارے کپڑے اتار کے تمہیں اس پنکھے سے الٹا لٹکا دوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے ماتحت یہ تماشہ دیکھیں؟ تمہارے لیے یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا کہ میں یہاں آیا تھا، لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے اس دفتر سے نکلنے کی مہلت نہیں دو گے اور شور مچاؤ گے تو سارا عملا اکھٹا کر لو گے۔ اس لیے میں جانے سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور کروں گا۔ انتخاب میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم وہ طریقہ پسند کرو گے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا؟ یا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس کرسی سے باندھ جاؤں اور تمہارا منہ بند کر جاؤں تماشہ تو یہ بھی ہوگا مگر زیادہ بُرا نہیں۔ تم عقل مندی سے کام لو تو اس شخص کو خاموش بھی رکھ سکتے ہو جو تمہیں نجات دلانے آئے۔"

ظاہر ہے انتخاب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے باندھنے کے لیے ٹیلی فون کا تار استعمال کیا جو میز سے دیوار کے ساتھ ساتھ سیکرٹری کے کمرے میں سے گزرتا زینے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے تار میرے ہاتھ میں آگیا اور دوسرے جھٹکے میں دیوار کے آخری موڑ کے پاس سے ٹوٹ گیا۔ یہ تقریباً پانچ گز لمبا ٹکڑا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کے دونوں ہاتھ کرسی کی پشت سے مضبوطی سے باندھے پھر اس کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس سے موڑ کر کرسی کے گھومنے والے حصے کے پیچھے کیا اور باقی تار سے باندھ دیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی ڈی سلوا کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ خود بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کر کے ... سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مزاحمت کو خود اپنی زیادہ بے ... بنانے سے گریز کیا۔ میں نے اس کا منہ بند رکھنے کے لیے ... منہ میں کاغذوں کی گیند سی بنا کر دبا دی۔ اس کے سوا ... بھی ایسی چیز دستیاب نہ تھی۔ پھر میں نے اس کے منہ پر ... رومال باندھا۔ اس تمام کارروائی میں میرے پانچ سات ... ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ... میں عملے کا کوئی فرد مینجر کے کمرے میں کوئی کام لے کر نہیں آیا ...

"گڈ بائی، ڈی سلوا!" میں نے اس کی جیب ... نکالتے ہوئے کہا۔ "اینڈ گڈ لک۔ آج کی ملاقات کے بعد ... نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اب میں اتنا کمزور اور بے بس نہیں ہو ... جتنا لندن سے ڈی پورٹ کیے جانے کے وقت تھا۔ ... اصل کمزوری اور بے بسی کا سبب میری لاعلمی تھی۔ آئندہ ... تک مجھے اور بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جائیں گی جن پر ... تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے کچھ اور ثبوت مل جائیں گے ... دیکھو گے کہ ہمارے لیے خطرات کا مفہوم ایک ہی ہو گیا ... پھر ایک وقت آئے گا جب تم کمبل کو چھوڑنا چاہو گے ... کمبل تمہیں نہیں چھوڑے گا اور تمہارا کفن بن جائے گا۔ ... میری خوش فہمی نہیں ہے میرا ایمان ہے کہ خدا ظالم کی رسی ... کو زیادہ دراز نہیں کرتا اور جیت بالآخر سچائی کی ہوتی ہے ... قدرت کا یہ نظامِ انصاف نہ بدلا ہے اور نہ بدلے گا۔"

میں نے نیچے پڑے ہوئے ریوالور پر ڈی سلوا کا رومال ... اور اسے نالی کی طرف سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پوری احتیاط سے ... نے ریوالور کو رومال سمیت ایک لفافے میں منتقل کیا۔ ڈی ... بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے خوف ... پریشانی کے جذبات عیاں تھے مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا ... میں کمرے سے نکل کر اطمینان سے چلتا ہوا نیچے اتر گیا۔ ڈی سلوا جس کرسی سے بندھا ہوا تھا وہ بہت بھاری تھی وہ خود ... آزاد نہیں کرا سکتا تھا اور کرسی سمیت باہر بھی نہیں جا سکتا ... لیکن یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ میرے اترتے ہی اس کا ... ماتحت اس کا نجات دہندہ بن کے آپہنچے۔ ڈی سلوا ... حقیقت بتائے یا کوئی کہانی سنائے بہر صورت اس کا میرے ... تعاقب میں آنا یقینی تھا کیونکہ میں اس کا ریوالور لے آیا تھا ... جس پر اس کے فنگر پرنٹ تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر ... کوئی سواری نظر نہ آئی۔ میں "کیری ہوم" ریسٹورنٹ کے ... سے اندر داخل ہو گیا جہاں لنچ کے وقفے کا رش تھا ... کوئی جگہ خالی نہ تھی لیکن آخری حصے میں ایک میز پر صرف ایک شخص بیٹھا تھا اس سے اجازت لے کر میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی چنانچہ کوئی بھی اندر ... کی ایک نظر میں مجھ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد جب میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف جا رہا تھا تو میں نے ڈی سلوا کو چند فٹ کے فاصلے پر دوسری میز پر لنچ میں مصروف دیکھا اور صرف ایک بار ہماری نظریں چار ہوئیں۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھا۔ میں نے ہاتھ دھونے کا ارادہ ترک کیا۔ بل کی ادائیگی کا مرحلہ ابھی باقی تھا اور میں انتظار نہیں کر سکتا تھا اگر میں کاؤنٹر پر بل ادا کرنے جاتا تو مینجر اس ویٹر کو بلاتا جس نے مجھے سرو کیا تھا لیکن کاؤنٹر دروازے کے پاس تھا ورڈ ڈی سلوا مجھ سے پہلے وہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے رُخ کاؤنٹر کی طرف رکھا۔ چار قدم چلنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ ڈی سلوا زیادہ تیز رفتاری سے کاؤنٹر کا رُخ کر رہا ہے تو میں اچانک پلٹا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ اچانک میرے سامنے ویٹر آ گیا۔ میں نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکالا اور اس ٹرے پر رکھ دیا جس میں وہ کسی اور کے لیے کھانا لے کر جا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بل پچیس روپے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باقی رقم میں نے ویٹر کو ٹپ کے طور پر بخش دی اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے دروازے کی طرف گیا جو باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ میرے آنکھ مارنے سے ویٹر سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے ٹپ نہیں، رشوت دی ہے۔ ابھی تک میں نے دوڑ نہیں لگائی تھی ورنہ بھگدڑ مچ جاتی لیکن اس دروازے سے گزرتے ہی جس پر لکھا تھا "اندر آنا منع ہے" میں بھاگا۔ مجھے اپنے پیچھے خاصی ہڑبونگ سنائی دی غالباً ڈی سلوا میرے پیچھے دوڑا تھا۔ میں نے دو بیروں کو ڈاج کیا، ایک کو کھانے کی ٹرے اور برتنوں سمیت چت کیا اور کچن میں نمودار ہوا جہاں پلیٹوں اور دیگچوں اور دوسرے برتنوں کی آوازوں کے علاوہ بیروں اور خانساموں کی چیخ و پکار کا ملا جلا شور تھا اور مینو کارڈ پر لکھے ہوئے سب کھانوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے مجھے دیکھا مگر بیشتر نے نظر انداز کر دیا۔ کچھ حیران بھی ہوتے مگر صرف ایک فرض شناس خانساماں کنگ سائز چمچہ لے کر میری طرف لپکا۔ اس کو یقین تھا کہ میں بل ادا کیے بغیر فرار ہو رہا ہوں۔ اس نے چمچے کو گرز کی طرح گھما کر مارنا چاہا مگر میں غچہ دے کر دروازے سے نکل گیا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا ... میں آ گیا۔ ایک رکشا والا سواری اتار کے پیسے لے رہا تھا کہ میں رکشا میں جا بیٹھا۔ حسب توقع اس نے بلا اجازت بیٹھنے کا بُرا منایا اور حسب معمول دگنے کرایے کی پیشکش پر چل پڑا۔ ابھی میٹر میں کرایہ بدلا بھی نہیں تھا کہ میں نے روک لیا۔ گن کر ایک روپیہ بیس پیسے اس کے ہاتھ پر رکھے جو واقعی اصل کرایہ سے دوگنے تھے مگر اس کی توقعات سے بہت کم تھے۔ وہ پانچ کے دس یا دس کے بیس لینے کی سوچ رہا تھا۔ اتنی ایمانداری سے اس کو دھوکا دے کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں اسے بڑبڑاتا چھوڑ کر سامنے سے گزرتی ہوئی بس میں چڑھ گیا۔ رکشا ڈرائیور کے نکتۂ نظر سے میں نے پیسے بچائے لیکن درحقیقت میں نے سفر کا زیادہ محفوظ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اب محسن کی واپسی تک مجھے کوئی کام نہ تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ شام سے پہلے پلٹ کر نہیں آئے گا۔ مجھے اس کی طرف سے تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اسے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی مگر میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رابعہ کے ساتھ میں اس کے آفس گیا جہاں اس نے دو گھنٹے صرف کیے۔ اس کے ماتحت جونیئر وکیل نوجوان تھے مگر ذہین تھے اور رابعہ کے ساتھ بہت مخلص تھے۔ انہوں نے رابعہ کی عدم موجودگی میں بھی اپنا کام بڑی لگن اور محنت سے جاری رکھا تھا اور مقدمات کی پیروی میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ ان سب کو رابعہ سے دلی ہمدردی تھی کیونکہ وہ رابعہ کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ان کی ٹیم اسپرٹ نے مجھے بہت متاثر کیا جس کی سربراہی رابعہ کرتی تھی۔ انہوں نے رابعہ کو یقین دلایا کہ وہ آفس کی طرف سے بے فکر رہے اور اپنے حالات کو سنبھالنے پر پوری توجہ دے۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے، جب میں اور رابعہ آفس سے نکلے ... شیزان میں چائے پینے بیٹھ گئے۔

"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے،" میں نے کہا، "کہ تمہارے ساتھ کام کرنے والے اتنے اچھے لوگ ہیں۔"

"ان حالات میں خوش قسمتی کا لفظ کتنا اجنبی لگتا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر ایسے وقت میں جمی جمائی پریکٹس کا بیڑہ غرق ہو جاتا تو آمدنی کے ذرائع بھی نہ رہتے۔ یہ لوگ واقعی اچھے ہیں اور ان کی ہمدردی بہت بڑا سہارا ہے۔ میری غیر حاضری میں موکلوں نے بیس ہزار روپے ادا کیے تھے جو انہوں نے میرے حوالے کر دیے۔"

"اس آمدنی میں سے تم ان لوگوں کی تنخواہ بھی ادا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"نہیں۔ تنخواہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پہلے میں نے ان کو معاہدے کی بنیاد پر ملازم رکھا تھا بعد میں ان کے تعاون اور نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے پارٹنرشپ پیش کی۔ آمدنی میں سے چالیس فیصد میرا اور باقی ساٹھ فیصد میں سے تینوں کا حصہ برابر ہے۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔ مجھے کبھی ماہانہ بیس ہزار سے کم نہیں ملے اور ان کو بھی دس دس ہزار ضرور ملے۔ الگ پریکٹس کرکے بھی یہ اتنا کما لیتے مگر بہت عرصہ سخت محنت کرنے کے بعد۔ ٹیم ورک میں کام آسان ہو جاتا ہے اور آمدنی بھی نسبتاً تیزی سے بڑھتی ہے۔" بات کرتے کرتے اچانک اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور براؤن پیپر کا ایک پیکٹ سا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ رقم تم رکھ لو۔ تمہیں ضرورت ہوگی۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ "تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"سچ بتاؤں؟" وہ نظر جھکا کر بولی۔ "مجھ سے یہ بات میرے دل نے کہی ہے۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دل کی بات غلط نہیں ہوتی لیکن بیس ہزار لے کر میں کیا کروں گا؟"

"جو تمہارا دل چاہے کرنا۔" وہ بولی۔ "میں تم سے حساب نہیں مانگوں گی۔"

"جانِ من!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "قرض تو قرض ہی ہوتا ہے۔"

"اگر تم نے قرض کا لفظ دوبارہ استعمال کیا تو میں ابھی واک آؤٹ کر جاؤں گی۔" وہ برہمی سے بولی۔

"اچھا بابا دھمکی مت دو۔" میں نے وہ پیکٹ اٹھا لیا۔ "لیکن ایک بات بتاؤں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم اتنی فراخدل نہیں رہو گی اور میں نے ذرا بھی فضول خرچی کی تو بیلن جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاؤ گی۔"

وہ میرا مطلب فوراً سمجھ گئی کیونکہ اس کا رنگ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں جیسا ہو گیا جن کا عکس افق کے کسی کنارے سے ایک شیشے میں جھلکنے لگا تھا۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔ "پس انداز کرنا تو ایک زنانہ صفت ہے۔ تمہاری آمدنی معقول رہی ہے یہ بتاؤ کہ اب تک تم نے کتنا بچایا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اور کوئی گھر بنوا سکتی ہو؟ گڑھی شاہو کے اس کھنڈر کو اب بھول جاؤ۔ ماضی کی یادیں پُرعذاب ہوں تو ان کو ذہن سے خارج کر دینا ہی اچھا ہے۔ وہ زمین بہت مہنگی ہے اس کو فروخت کرکے تم آدھی قیمت پر کسی ماڈرن علاقے میں اتنی ہی جگہ حاصل کر سکتی ہو۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن کسی ماڈرن ... میں بھی میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"تم اپنے ساتھ ماسی کو رکھ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "... جب تک میرے حالات درست نہیں ہوتے۔"

"شہلا بھی اسی طرح رہتی تھی۔" رابعہ بولی۔ "ماڈ... علاقے کے ماڈرن لوگ اسے نہیں بچا سکے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں کسی پرانی آبادی میں کوئی پرانا مکان خرید لوں ... ہر طرف حقوق ہمسائیگی کو سمجھنے والے وضع دار لوگ ... اس عمارت کے ایک حصے میں خود رہوں اور باقی حصے ... پر اٹھا دوں۔ کسی بھی شریف فیملی کے ساتھ میں زیادہ محفوظ رہوں گی۔ بہت ضروری ہوا تو میں ایک ڈرائیور بھی لوں گی جو وہیں رہے اور چوکیداری بھی کرے۔ چوکیدار ... بھی لے اور رہنے کے لیے جگہ بھی۔ میں خود بھی زیادہ ... تک ضامن رضوی صاحب کی مہمان بن کے رہنا نہیں ..."

"جو کچھ تم نے سوچا ہے بہت مناسب ہے۔" میں ... چٹکی بجا کر ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ "مسئلہ ... کا، وہ بھی وہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی اور مجھے ڈر ہے کبھی نہ کبھی دشمن اس کا سراغ لگا لیں گے۔"

"دشمن تو کبھی نہ کبھی سب کا سراغ لگا لیں گے ... کا، گل رُخ کا، یا میرا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "تمہیں صرف ... فکر کیوں ہے کہ وہ کہاں رہے گی؟"

"تمہیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج ... نے یہ ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے اور عذان کی جگہ لے لی ..."

"یہ تم کیا کر رہے ہو سکندر؟ اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکو گے؟"

"میں اکیلا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ میری بہن ہے ... میرا دوست محسن ہے۔" میں نے کہا۔ "... اور تم ہو۔ میرا ... ہے اور میرا خدا ہے۔ آؤ اب چلیں۔"

جب ہم گلبرگ پہنچے تو اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اند... کمروں میں روشنی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن آ... میں کچھ فاصلے پر رک گیا اور میں نے لفافے میں سے ریوالور نکالا جو رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ "اسے احتیاط سے اپنے ... میں رکھ لو۔ اس کے چیمبر میں دو گولیاں کم ہیں اور ساخت کے اعتبار سے یہ ویسا ہی ریوالور ہے جیسا حملہ آور لے کر آئے تھے مگر اس پر ڈی سلوا کے فنگر پرنٹ ہیں۔ محسن ... گھر میں کسی جگہ پر ڈال دے گا جہاں سے اسے فوراً تلا...

نہ کیا جا سکے۔ اس رومال کے ایک کونے پر ڈی ایس کے حروف ڈی سلوا کے خلاف ایک اور شہادت فراہم کریں گے۔ رومال کو بھی گھر میں ہی ڈالا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے محسن نے یہاں شہلا کو لانے کی حماقت نہیں کی ہوگی اور اسی کو گھر چھوڑ کے شہلا کی اصل ماں کو یہاں لے آیا ہوگا۔ تم وکیل ہو اور عورت ہو اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ اندر جا سکتی ہو۔ اگر پولیس ابھی تک موجود ہوئی تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں، تم کہہ سکتی ہو کہ میرا شہلا کے گھر آنا جانا تھا اور ان کے خاندان پر نازل ہونے والی مصیبت کی خبر پڑھ کے تم خیریت بھی معلوم کرنے آئی ہو اور قانونی امداد کی خاطر بھی۔ پولیس والوں کو اندر بلا کر ریوالور اور رومال دونوں دکھا دینا اور انہیں جھاڑنا کہ وہ خاک تفتیش کرتے ہیں۔ یہ چیزیں انہوں نے کیوں نہیں دیکھیں؟ اور اب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ فنگر پرنٹ ضائع ہو جائیں۔"

"میں سمجھ گئی۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم یہاں انتظار کرو لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ... مشتبہ حالت میں کھڑا ہوا دیکھ کر ہمارے آنے سے پہلے ہی پکڑ کر نہ لے جاتے۔"

میں آہستہ سے ہنسا اور اسے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ دو میں سے ایک گیٹ لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے دور سے ایک پولیس والے کو گیٹ سے باہر آتے اور رابعہ سے باتیں کرتے دیکھا۔ پھر رابعہ اندر چلی گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں اس چھوٹی سی سڑک پر اکیلا ٹہلتا رہا اور ہر پانچ منٹ کے بعد گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھتا رہا۔ میں سڑک سے دور درختوں کے پیچھے تھا جہاں اندھیرا زیادہ گہرا تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے اکا دکا راہگیروں نے اس طرف دیکھا بھی نہیں۔ جب بھی کوئی کار نمودار ہوتی تھی، میں درخت کے تنے کی آڑ میں ہو جاتا تھا۔ ایک گاڑی اس کوٹھی میں سے بھی نکلی جہاں سے میں نے فون کیا تھا اور جب وہ میرے سامنے سے گزری تو میں نے کھڑکی میں سے ایک جھلک اس نوجوان کی دیکھی جس نے مجھے فون کرنے کی اجازت دی تھی۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو میرے لیے مصیبت کا باعث بن جاتا۔ انتظار کا عذاب کتنا سخت ہوتا ہے، اس کا تجربہ تو مجھے کئی بار ہو چکا تھا لیکن سابقہ تجربات میں انتظار کے ساتھ اشتیاق ہوتا تھا، اضطراب ہوتا تھا یا تجسس ہوتا تھا لیکن خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا، اندیشے نہیں ہوتے تھے اور خطرات کی یہ سنسنی خیزی نہیں ہوتی تھی۔ دروازے پر ایک موٹر سائیکل آ کے رکی اور ایک پولیس انسپکٹر اندر چلا گیا۔

میں نے طے کیا کہ انسپکٹر کے آنے کے بعد بھی رابعہ اور محسن کو ضابطے کی کارروائی کے مطابق بیان دینے اور ریوالور اور رومال اس کے حوالے کرنے میں کم سے کم پندرہ بیس منٹ ضرور لگیں گے۔ خدا کرے وہ اپنی ذہانت سے کام لیتے ہوئے انسپکٹر کو یقین دلا سکیں کہ دونوں چیزیں انہوں نے اتفاقیہ دریافت کی ہیں اور اسے یہ شک نہ ہو کہ ڈی سلوا کو ملوث کرنے کی نیت سے دونوں چیزوں کو وہاں لا کر ڈالا گیا ہے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ میں نے ایک شخص کو دروازے کے سامنے رک کر چند سیکنڈ بعد پھر روانہ ہوتے دیکھا۔ بظاہر یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہ گھر گزشتہ چند دن میں غیر معمولی ہنگامہ آرائی کے باعث سب کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ پاس پڑوس میں رہنے والا کوئی بھی شخص دروازے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس شخص کو پچاس قدم کے فاصلے سے لوٹ کر آتے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر دروازے کے سامنے سے گزرا اور اس مرتبہ رکنے کے بجائے اس نے گیٹ کے اوپر سے جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ گھر کے اندر کے حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر وہ سپاہی موجود ہوتا جس نے رابعہ کے لیے دروازہ کھولا تھا تو اس شخص کو اتنی مہلت نہ دیتا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کو تفتیش میں مدد دینے کی خاطر اندر چلا گیا تھا۔ میں غور سے اس شخص کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ گیٹ پر چڑھا اور اندر اتر گیا۔

بریف کیس کو وہیں چھوڑ کر میں دروازے کی طرف بڑھا میرے اور گیٹ کے درمیان چالیس قدم کا فاصلہ ضرور تھا مگر میں نے یہ فاصلہ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں طے کیا۔ جب میں نے اوپر سے جھانکا تو وہ شخص کہیں نہ تھا۔ پھر میں نے اسے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر دوسرے درخت کی اوٹ میں جاتے دیکھا۔ وہ خود کو چھپاتا ہوا گھر کے قریب ہونے لگا تھا۔ پلک جھپکتے میں خود میں بھی گیٹ پر سے اندر اتر گیا۔ میں گیٹ کے اس طرف تھا جدھر لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا سا تھا۔ لوہے کے گیٹ پر میرے چڑھنے اور اترنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں اندر اترتے ہی فرش پر لیٹ گیا تھا۔ اس شخص نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا تو اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب اس شخص کے سامنے لان کے کنارے پر لگی ہوئی مشکل سے دو فٹ اونچی جھاڑیوں کی وہی دیوار تھی جس کے پیچھے میں پناہ گزیں تھا اور جو گیٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے شروع ہو کے پورچ تک جاتی تھی۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکلا اور ان جھاڑیوں کے دامن میں لیٹ گیا۔ اس کی نگاہ گھر کی طرف تھی چنانچہ میں آہستہ سے اٹھا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پہلے درخت کے پیچھے پہنچ گیا۔ دوسرا درخت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پورچ کی لائٹ لان پر پڑ رہی تھی مگر وہ شخص سرسبز ہموار تراشی ہوئی جھاڑیوں کے سائے میں لیٹا ہوا اندھیرے کا ایک جزو لگتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گیٹ کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

میں دوسرے درخت کی آڑ میں اس کے بہت قریب جا پہنچا۔ اب مجھے اس کی صورت تو صاف نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند اور دراز قد آدمی ہے۔ اس نے گہرے رنگ کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی۔ لباس کے رنگ کا اندازہ بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اس شخص کے پاس خنجر یا ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کرنا مگر اتنا یقینی تھا کہ وہ کمزور حریف نہیں ہے اور شاید جسمانی طور پر مجھ سے بہتر قد و قامت اور زیادہ وزن کا مالک تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خالی ہاتھوں سے مقابلہ کرنے کا اہل ہو۔ میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔ میں بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور بالکل صحیح فاصلے سے اس کے اوپر جا پڑا۔ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل پائی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا اور وہ خود میرے وزن کے نیچے حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ میرے دوسرے ہاتھ کے وار نے اس کو ہوش سے بیگانہ کر دیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کو وہیں سیدھا لٹا کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی شلوار کے نیفے میں سے ایک کمانی دار خنجر برآمد ہوا۔ اس کی جیب میں دو سو بیس روپے تھے اور ایک کنگھی مگر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

اب میں نے بھی وہیں لیٹ کر انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ دس منٹ بعد انسپکٹر اندر سے باہر آیا۔

"معلوم نہیں آپ لوگ پولیس میں سب کو اتنا نااہل کیوں سمجھتے ہیں۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"اگر تم غیر معمولی طور پر ذہین ہو تو خود کو اس رائے سے مستثنیٰ سمجھو۔" رابعہ نے کہا۔ "برا ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ بھی تو بہت عقلمند اور تجربہ کار لوگ سمجھے جاتے ہوں گے جن کو اس واردات کی تفتیش پر مامور کیا گیا تھا... اور ان کا ریکارڈ یقیناً اچھا ہو گا مگر ثبوت تمہارے سامنے ہے کہ انہوں نے اپنی عقل اور اپنے تجربے سے کیا تیر مارا ہے۔"

انسپکٹر نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اپنے ماتحت کو چوکس رہنے کی تاکید کرتا ہوا گیٹ سے نکل گیا حسبِ توقع چند منٹ کے بعد کانسٹیبل بھی اپنے افسر کو سیلوٹ کر کے رخصت کرنے کے لیے گیٹ سے باہر گیا۔ یہی وقت تو جب ہم اپنے قیدی کو اندر لے جا سکتے تھے۔ رابعہ اور محسن پورچ میں کھڑے تھے۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن پورچ سے ذرا آگے تھی۔ میں نے ہلکے سے سیٹی بجائی اور محسن کو نے دیکھا۔

"اِدھر نورِ چشم!" میں نے اٹھ کے ہاتھ ہلایا اور اپنی طرف متوجہ کیا۔ "جلدی۔"

دو منٹ میں محسن کی مدد سے میں نے اس بھاری بھرکم شخص کو اندر منتقل کر دیا۔ اس کا وزن دو سو پونڈ سے زیادہ ہی تھا۔ مجھے اس شخص کے ساتھ چھوڑ کے رابعہ اور محسن نکل گئے۔ میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ یہ ڈرائنگ روم جس میں ایک ہی بیڈ شل لیمپ روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اپنی تمام کارروائی دوسرے کمرے میں پوری کی۔ یہ دوسرا کمرہ شہلا کی ماں کا بیڈ روم نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ شہلا کا کمرہ تھا کیونکہ گھر میں دو ہی بیڈ روم تھے۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اس اجنبی کو باندھنے کے لیے پرانا طریقہ اختیار کروں یعنی ایک پردہ پھاڑ لوں مگر ابھی اس کے ہوش میں آنے کا فوری خطرہ نہیں تھا چنانچہ کمرے کی آرائش کو خراب کرنا غیر ضروری تھا۔ بعد میں گھر کے اندر سے کوئی بھی رسی وغیرہ تلاش کی جا سکتی تھی۔ باہر محسن کی آواز آئی۔ وہ کانسٹیبل کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہوشیار رہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چائے پینے نکل جائے یا سو جائے اور کوئی اندر آ گھسے۔ جواب میں کانسٹیبل نے کہا کہ اندر کیا لینے آئے گا مگر چائے اور کھانے کا مسئلہ حل ہو جائے تو وہ گیٹ پر اٹینشن کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس کا مقصد صاف ظاہر تھا چنانچہ رابعہ نے کہا کہ کھانے کا انتظام تو مشکل ہے مگر اسے چلتے چلتے پیٹ بھرنے کے لیے کچھ بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی، کیونکہ اب کانسٹیبل کے اندر آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو صوفے پر ڈال دیا تھا اور ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی صورت پہلے بھی کہیں دیکھی ہے یا نہیں۔ محسن اور رابعہ ایک ساتھ اندر آئے تو میں نے مختصراً بتایا کہ میں نے اس شخص کو کیسے گرفتار کیا تھا۔

"اس کی صورت دیکھ کر تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ تمہارے ہر سوال کا جواب شرافت سے دے۔" محسن بولا۔

"شرافت سے تو شریف آدمی ہی جواب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ شخص مجھے کسی زاویے سے شریف نہیں لگتا۔ ہمیں اس کو بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے غیر شریفانہ طریقے ہی اختیار کرنے ہوں گے۔"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس گھر میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اندر ایک بیمار اور مفلوج عورت لیٹی ہوئی ہے اور باہر قانون کا محافظ کھڑا ہے۔ اگر اس نے چیخ پکار مچائی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کو یہاں سے لے جانا پڑا تو پھر وہی مسئلہ پیدا ہو گا۔ پہلے تو رابعہ کی کوٹھی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ ماسی کے گھر میں بھی کام نہیں ہو سکتا۔ وہ انتہائی گنجان آباد علاقہ ہے۔ ہمارا اپنا کمرہ بڑی مناسب جگہ تھی بشرطیکہ ساتھ والے کمرے میں کانسٹیبل نہ ہوتا جس کے ساتھ ہمارے سفارتی مراسم سخت کشیدہ ہیں۔"

"میرا آفس اس وقت خالی ہو گا۔" رابعہ نے پہلی بار دخل دیا۔ "بلکہ وہ عمارت ہی تقریباً خالی ہو گی کیونکہ اس میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔ ہوئے تو دو چوکیدار ہوں گے مگر وہ مجھے پہچانتے ہیں۔"

"یہ تجویز قابلِ عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اس شخص کو یہاں سے نکال کر وہاں کیسے لے جائیں۔ تم اتنی دیر میں باورچی خانہ تلاش کرو۔ دیکھو کہ ہماری اور سنتری بہادر کی خاطر مدارت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔"

میری اپنی سرگزشت میں کوئی اہم بات نہیں تھی چنانچہ میں نے محسن سے پوچھا کہ اس کا مشن کیسا رہا اور ایک صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

"میرا مشن بے حد کامیاب رہا۔" اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں میز پر پھیلا دیے۔ "چوہدری دلاور نہ مجھے پہچانتا تھا اور نہ شہلا کی ماں کو۔ اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ شہلا ہمارے ساتھ نہیں ہے مگر چوہدری دلاور زبردست ایکٹر ہے۔ ہماری آمد سے وہ پریشان ضرور ہوا ہو گا مگر اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

ہم نے بھی یہ ظاہر کیا کہ ہمیں تمام حالات کا علم نہیں۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اور اس کو بتایا کہ رشتے میں میں شہلا کا ایک کزن ہوں اور میں اس کی ماں کو چند دن کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تین دن بعد ہم راولپنڈی سے واپس آتے اور گھر پہنچے تو گیٹ پر کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا اور صرف اتنا بتایا کہ کوٹھی میں قتل کی واردات ہوئی ہے۔ ہم پولیس اسٹیشن گئے اور وہاں سے ہسپتال۔ ہسپتال والوں نے بتایا کہ عدنان کی لاش اس کے چچا لے گئے ہیں۔ چنانچہ ہم ادھر آ گئے ہیں۔ چوہدری دلاور کو یقین تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ ڈی سلوا کی زبانی اس کو معلوم ہوا ہو گا کہ حملے کی رات گھر میں کون کون موجود تھا۔ ڈی سلوا نے بتایا ہو گا کہ شہلا اور اس کی ماں کے علاوہ گھر میں سکندر اور رابعہ بھی موجود تھے۔ میرا بیان غلط تھا، مگر چوہدری دلاور اسے غلط کیسے کہتا۔ وہ خود بھی تو غلط بیانی کر کے عدنان کی لاش لے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ شہلا کہاں ہے اور میں نے انجان بن کر کہا کہ یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا تھا۔ آپ بھی تو کسی رشتے سے شہلا کے چچا ہیں۔ چوہدری دلاور بہت عیار اور مکار شخص ہے۔ اس نے کہا کہ شہلا کے والد سے انتہائی قریبی دوستانہ مراسم کے باعث شہلا بچپن میں اسے چچا کہتی تھی، اسی خیال سے وہ ہسپتال پہنچا تھا کہ شہلا کی مدد کرے مگر معلوم ہوا کہ شہلا کا کوئی پتہ نہیں چنانچہ وہ لاش اپنے گھر لے آیا۔ اس نے پولیس اسٹیشن سے بھی رابطہ قائم کیا تھا اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے اور وہ سمجھا تھا کہ شہلا اپنی فالج زدہ ماں کو لے کر کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ چوہدری دلاور یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں اس مفلوج عورت کو شہلا کی ماں اور خود کو اس کا کزن ثابت کروں۔ ماں کے بارے میں اسے یقین آ گیا تھا کہ حقیقی ماں ہے کیونکہ ماسی بالکل فالج زدہ عورت کی طرح پڑی رہی تھی۔ میں نے چوہدری دلاور کو سمجھایا کہ عدنان کے قتل کی خبر شہلا کی ماں کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوئی ہے چنانچہ اب وہ زبان تک بھی نہیں ہلا سکتی۔ اس سے دلاور کو یقیناً تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا ہو گا کہ شہلا کی ماں اس کے دعوے کی نفی نہیں کر سکتی اور یہ نہیں کہہ سکتی کہ چوہدری دلاور کبھی بھی شہلا کے باپ کا دوست نہیں رہا تھا۔ مجبوراً اس نے یہ جھوٹ تسلیم کیا کہ شہلا کی ماں تین دن بعد راولپنڈی سے لوٹی ہے اور میرے ساتھ شہلا کی گمشدگی پر تشویش میں شریک رہا۔ وہاں پولیس والے بھی تھے لیکن وہ شہلا کی ماں سے یعنی ماسی سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیا پوچھتے جو بالکل بول نہیں سکتی تھی؟ اسے اندر پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ بڑی ہمت سے بستر پر سیدھی لیٹی رہی اور چھت کو گھورتی رہی۔ یہ واقعی قابل تعریف بات ہے کہ ان حالات میں ماسی کا نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوا حالانکہ وہ خاصی عمر کی عورت ہے اور اتنی زیادہ چالاک بھی نہیں لگتی لیکن اس کے اعصاب واقعی مضبوط ہیں۔ پولیس والوں نے مجھ سے کچھ سوالات ضرور کیے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ میں نے اپنا نام غلط اور پتہ درست بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میرے والد راولپنڈی کے بہت بڑے اور مشہور ڈاکٹر ہیں۔ اس کے بعد چوہدری دلاور کو مقتول کے چچا کا رول پورا کرنا پڑا۔ اور عدنان کی تدفین کا تمام انتظام اطمینان بخش طریقہ پر ہو گیا۔ چوہدری دلاور کے گھر میں صرف دو نوکر تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کو اس نے کہیں بھیج دیا تھا تاکہ وہ اس ڈرامے کو دیکھ کر حیران پریشان نہ ہوں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ڈی سلوا وہاں دکھائی نہیں دیا حالانکہ یہ اسکیم اسی نے بنائی ہو گی جو فیل ہو گئی۔ ان کا مقصد شہلا کو پکڑنا تھا۔ شہلا تو ہاتھ آئی نہیں۔ اس کے بھائی کے کفن دفن کی ذمہ داری خواہ مخواہ چوہدری دلاور کو قبول کرنی پڑی۔ اس نے ٹیلی فون پر ڈی سلوا کو گالیاں دی ہوں تو کچھ عجب نہیں۔"

"اگر اس نے بارہ بجے کے بعد فون کیا ہو گا تو لائن نہ ملنے پر اس کو مزید کوفت ہوئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ٹیلیفون آتا بھی تو میں ریسیو کرتا کیونکہ دو بجے تک میں وہاں موجود تھا لیکن میں نے اندر جانے سے پہلے لائن کاٹ دی تھی۔ پوری بات میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم بتاؤ کہ بعد میں کیا ہوا؟"

"بعد میں کیا ہونا تھا۔" محسن بولا۔ "سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ چوہدری دلاور نے پاس پڑوس کے لوگوں کو جمع کیا اور ایک گاڑی کا انتظام کیا جس میں میت کو میانی صاحب کے قبرستان لے جایا گیا۔ پیچھے صرف ایک نوکر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا ماسی نے کمبل ہٹایا اور فرار ہو گئی۔ معلوم نہیں چوہدری دلاور نے اسے واپسی پر غفلت کی کیا سزا دی ہو گی۔ میں بھی قبرستان تک ساتھ تھا اور نماز جنازہ میں بھی شریک تھا مگر جب میت کو لحد میں اتارا جا رہا تھا تو مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر دوسری قبر کے لیے ایک اور جنازہ لایا گیا جس کے ساتھ سو ڈیڑھ سو آدمی تھے اور وہ ہمارے ساتھ مل گئے۔ میں اس بھیڑ میں گم ہو گیا اور باہر نکل آیا۔ ڈی سلوا قبرستان کے دروازے پر اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ یقیناً چوہدری دلاور کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ بعد میں دونوں کو شدت سے اپنے بیوقوف [illegible] کا احساس ہوا ہو گا۔"

اس دوران میں رابعہ چائے لے کر آ گئی تھی۔ گھر پر آدھی ڈبل روٹی ملی تھی اور کچھ انڈے۔ اس نے آملیٹ [illegible] کر ڈبل روٹی اور چائے دروازے پر کانسٹیبل کو پہنچا [illegible] تھے، جسے یہ ڈنر دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا [illegible] تھا کہ کوٹھی میں کیک یا بسکٹ، مکھن یا پھل سب کچھ [illegible] گے۔ ایک کانسٹیبل اگر گلبرگ کی معمولی سی کوٹھی میں موجود [illegible] تو رئیسانہ زندگی کا یہی تصور کر سکتا ہے۔ جتنی دیر میں چا[ئے] ختم ہوئی رابعہ نے محسن سے وہ بات پھر سنی جو میں سن چ[کا] تھا اور محسن کو سنانی پڑی۔ اس کی روداد ختم ہونے پر میں نے اس اجنبی شخص کو باندھا، لپیٹا اور اچھی طرح پیک [کیا] کر کے اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ سنتری دروازے کے [پاس] بیٹھا آدھی ڈبل روٹی کو آملیٹ کے ساتھ نگلنے میں مصروف تھا۔ میں نے رابعہ کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور جنگی [illegible] کو آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال [دیا] پھر میں گیٹ کی طرف گیا۔

"کیوں بھئی! کھانا کھا لیا پیٹ بھر کے؟" میں نے [illegible] خوشدلی سے پوچھا۔

"کھانا کدھر تھا صاحب جی! ناشتہ تھا۔" وہ [illegible] سے بولا۔

"چلو گزارا تو ہو گیا۔" میں نے ٹرے اٹھاتے ہوئے [کہا]۔ "ویسے بڑے افسوس کی بات ہے کہ پولیس والوں کو [illegible] سمجھا جاتا۔ ڈیوٹی پر کھڑا کر دیتے ہیں اور کھانے پینے کو [نہیں] پوچھتے۔" میرے شریفانہ لہجے اور ہمدردانہ رویے سے [وہ] متاثر ہوا اور اس کا ذہن شکوک کا شکار نہیں ہوا ورنہ [وہ] پوچھ سکتا تھا کہ جناب آپ کون ہیں اور کب تشریف لا[ئے]۔ میں گھر کے اندر سے آیا تھا تو ظاہر ہے گھر کا ہی آدمی [تھا]۔ بصورت دیگر الزام اسی پر آتا تھا کہ اس کی غفلت کے با[عث] کوئی تیسرا شخص اندر کیسے پہنچ گیا۔ اس نے فرض کر لیا ہو[گا] جب گاڑی اندر گئی تھی تو اس میں دو مرد تھے اور دو [خواتین] تھیں۔ یا اس نے کچھ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں [کی] ہو گی۔

دس منٹ بعد ہم نے گاڑی کو بیک کیا جسے رابعہ [چلا] رہی تھی اور گاڑی گیٹ کی طرف بڑھی۔ سنتری اپنی جگہ [کھڑا] رہا اور دروازہ کھولنے کے بجائے گاڑی کی طرف آیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ کوئی بھی آئے تو اسے روک لو۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ ہمارے جانے کے بعد کوئی بھی آئے تو اسے یہیں روک لو۔" رابعہ نے کہا۔ "ہم سب دروازوں کو لاک کر کے جا رہے ہیں۔ کوئی زبردستی گھسنا چاہے تو اسے گولی مار دو۔ ریوالور ہے نا؟"

سنتری نے ادھر ادھر دیکھا اور جواب دینے سے گریز کیا کیونکہ اس کے پاس ریوالور کی جگہ وہی دقیانوسی بھاری بھرکم رائفل تھی جس کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل تھا کہ ضرورت پڑنے پر فائر کرے گی یا نہیں اور کرے گی تو گولی آگے سے نکلے گی یا پیچھے سے۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ آرڈر تھا آنے والوں کے لیے لیکن ہم تو جا رہے تھے چنانچہ اس نے دروازہ کھول دینا بہتر سمجھا۔ گھر والوں کو صاحب دیکھ چکا تھا اور اس نے جاتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ ان کو بھی گھر میں قید رکھنا۔ پھر اس کی کیا ذمہ داری؟

گاڑی ابھی باہر نکلی ہی تھی کہ میں نے رابعہ کو رک جانے کے لیے کہا۔ پھر میں نیچے اتر کر درخت تک گیا اور اس کے نیچے رکھا ہوا بریف کیس اٹھا لایا۔

شہلا کی ماں بدستور سو رہی تھی۔ ضرورت کے تحت شہلا نے اسے دو خواب آور گولیاں دے دی تھیں ورنہ وہ اس کارروائی میں دخل اندازی کرتی۔ عدنان کے بارے میں سوالات کرتی یا وہ گفتگو سن لیتی جو رابعہ، محسن اور پولیس انسپکٹر کے درمیان ہوئی تھی۔ شاید خود انسپکٹر اسے ہوش میں دیکھتا تو اس سے کچھ پوچھتا اور ہمارا جھوٹ کھل جاتا جو ہم نے عدنان کے بارے میں بولا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اتنے بڑے جھوٹ کے بعد وہ اتنے بڑے سچ کا صدمہ برداشت کر سکتی۔ محسن نے انسپکٹر سے بھی وہی کہا تھا جو چوہدری دلاور نے کہا تھا۔ شہلا کی ماں سوتے میں اپنے گھر میں جا پہنچی تھی اگر اس کی نیند ٹوٹی ہو گی تو اس نے سمجھا ہو گا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں اور پھر سو گئی ہو گی۔ ہم نے طے کیا کہ اسے واپس شہلا کے پاس پہنچا دیا جائے اور وہاں سے ہم رابعہ کے آفس جائیں۔ یہ بڑا لمبا راستہ تھا چنانچہ ڈرائیونگ میں نے سنبھال لی۔ رابعہ کی شکستہ حال فاکس ویگن کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے انجن کو پانی کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی اور فیول میٹر کی سوئی بتا رہی تھی کہ پٹرول ٹینک اب بھی آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ ہم نے شہلا سے کہا کہ لمبی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم واپسی میں سب کچھ بتا سکیں گے۔ فی الحال وہ مطمئن رہے کہ سب خیریت ہے اور کسی بات کی فکر نہ کرے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رابعہ کے آفس پہنچے۔ رابعہ اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد محسن کار سے اتر کے بلڈنگ کے دروازے تک پہنچا اور اس نے چوکیدار سے رابعہ کے آفس کا پتہ پوچھا۔ چوکیدار اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ موقع پاتے ہی میں نے چادر میں لپٹے ہوئے اس شخص کو کندھے پر ڈالا اور خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ حسب توقع عمارت کی زیریں منزل اس وقت ویران تھی۔ میں زینے کے نیچے کی خالی جگہ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نیچے اترا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں زینے کے نیچے سے نکلا اور کوئی آہٹ کیے بغیر اوپر چڑھ گیا۔ دو سو پونڈ کے آدمی کو اٹھا کر اتنی احتیاط کے ساتھ چلنا آسان کام نہیں تھا پھر مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ اوپر سے کوئی نہ آ جائے۔ رابعہ کا آفس گراؤنڈ فلور کے اوپر تھا اور مجھے اس فلور پر دو جگہ روشنی نظر آئی تھی۔ سب سے اوپر والی منزل پر بھی کچھ لوگ دفتر کھولے بیٹھے تھے یا رہائش پذیر تھے۔ پانچ منٹ کے اس وقفے میں میری ملاقات کسی سے نہیں ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور رابعہ کے آفس میں پہنچتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ آفس کے دو حصے تھے۔ باہر کے حصے میں مؤکلوں کے لیے ویٹنگ روم بنایا گیا تھا۔ یہ حصہ کچھ چھوٹا تھا اس میں قالین پر دو صوفہ سیٹ تھے اور ایک سینٹر ٹیبل پر اخبار اور رسالے پڑے ہوئے تھے۔ اندر والے حصے کو پھر دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ رابعہ کا آفس ویٹنگ روم کے برابر لکڑی اور شیشے کی پارٹیشن سے بنا ہوا کمرہ تھا۔ پارٹیشن کے دوسری جانب والا حصہ ہال ٹائپ تھا جس میں تین وکیلوں کے کیبن ایک طرف تھے اور درمیان میں کلریکل عملے کی میزیں تھیں۔ ٹائپ رائٹر، فائل کیبنٹ اور الماریاں تھیں جو چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بنائی گئی تھیں۔ الماریوں کے شفاف کھسکنے والے شیشوں کے پیچھے قانونی ضابطوں، حوالوں اور پی، ایل، ڈی جیسی ضخیم کتابوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ میں نے اپنے بوجھ کو رابعہ کے آفس میں پہنچ کر [illegible] کیا اور اسے صوفے پر ڈال کے ایک گہری سانس لی۔

"مس رابعہ قادری ایڈووکیٹ!" میں نے کہا۔ "ویسے تو آپ بھی ہر غیر قانونی کارروائی میں ہمارے ساتھ شامل رہی ہیں لیکن ایک تو آپ جانتی ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اپنے دفاع کے لیے کر رہے ہیں اور ضابطوں کی کارروائی سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بچنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد قانون شکنی نہیں ہے تاہم جو کچھ ہم نے کیا اسے غیر قانونی ہی کہا جائے گا۔"

"اس تمہید کی اس وقت کیا ضرورت پڑ گئی؟" رابعہ نے کہا۔ "صاف بات کیوں نہیں کرتے؟"

"صاف بات یہ ہے بی بی کہ ہمیں اس شخص سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا اور ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جسے تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے۔ تم اپنی مرضی سے موجود رہنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ تمہیں وہ مناظر دیکھنے پڑیں گے جنہیں دیکھ کر عام طور پر خواتین بے ہوش ہونا پسند کرتی ہیں۔"

رابعہ کا رنگ اڑ گیا۔ "کیا یہ ضروری ہے؟ ممکن ہے یہ شخص ویسے ہی کچھ بتا دے۔"

"حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ شخص محض آلۂ کار ہے۔ اگر اس کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اپنے مشن میں ناکام رہا ہے اور ہمارے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تب بھی اس کی جان بخشی مشکل ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا کہ یہ خود اپنی زبان سے اعترافِ جرم کرے اور ان کے بارے میں کچھ بتائے جنہوں نے اس کو بھیجا ہے۔ یہ خود بھی جانتا ہے کہ افشائے راز کی قیمت اسے اپنی جان دے کر ادا کرنی پڑے گی۔ ہم اسے پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ہم نے شہلا اور اس کی ماں کی زندگی بچانے کے لیے جو کوشش کی تھی وہ رائیگاں جاتی اور ہمارے لیے اپنی پوزیشن کی وضاحت مشکل ہو جاتی۔ تم جانتی ہو کہ قانون کے محافظ تمہاری حفاظت کرنے میں کس طرح ناکام رہے تھے۔ ہمارے مقابل وہ لوگ ہیں جو قانون اور پولیس کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اگر ہم نے قانون سے مدد لی تو شہلا یا اس کی ماں کی زندگی کی ضمانت کوئی نہیں دے سکے گا۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو ہم خود۔ تمہاری پوزیشن بہت عجیب ہے کیونکہ تم وکیل بھی ہو اور عورت بھی۔ ایک طرف تمہارے پیشے کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے رشتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو یا تمہاری ذہنی کشمکش تمہارے لیے عذاب بن جائے۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" رابعہ بولی۔ "اب میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے تمہاری نیت پر اعتماد ہے۔ عملی زندگی میں قانون کی بے بسی کا تماشہ میں نے تم سے زیادہ دیکھا ہے اور خود بھی تماشہ بن چکی ہوں۔ تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ میں ایک عورت ہوں۔ کیا مجھے ایک عام عورت کی طرح دشمنوں سے انتقام لینے کا حق بھی حاصل نہیں؟ عقل دلائل سے میں جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ اگر کبھی وہ لوگ میرے سامنے آ جائیں جنہوں نے میرا گھر تباہ کیا میں انہیں اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دوں۔ میرے لیے ناممکن ہو گا کہ میں انصاف حاصل کرنے کے لیے انہیں عدالت لے جاؤں اور پھر بے بسی سے دیکھتی رہوں کہ ثبوت شہادت نہ ہونے کے باعث وہ ہر سزا سے بچ گئے۔ میں تمہیں کس طرح روکوں۔ جبکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے جذبات کی شدت اور حدت کہیں زیادہ ہے اور تم مجھ سے زیادہ مظلوم ہو۔"

میں نے اور محسن نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف جو ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کر دیا لیکن اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا انہیں نکالا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کی نظروں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں بالکل اس کے سر پہ سوار کھڑا تھا کہ وہ ذرا بھی جارحانہ حرکت کرے تو اس کو روک دوں لیکن وہ بہت سہما ہوا اور خوف زدہ تھا۔

"اگر تم مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو بتا دو۔" میں نے ہاتھ [illegible] کے کہا۔ "ایک تجربہ تو تمہیں ہو چکا ہے۔"

اس شخص نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ کا کپڑا نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کی آنکھیں سوال کر رہی تھیں کہ ہم اس کے ساتھ اب کیا سلوک کریں گے۔

"اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو تو تمہیں اجازت دی جا سکتی ہے کہ یہ کپڑا منہ سے نکال لو۔" میں نے کہا۔ "اس بات کا خیال رکھنا کہ تم نے غلط حرکت کی تو میں غلطی کروں گا۔ میرا ہاتھ بھی غلط حرکت نہیں کرتا اور تمہارے حلق سے ذرا بھی آواز بھی نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہو گی۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور آہستہ آہستہ اپنے منہ سے کپڑے کو یوں ـــ نکالنے لگا جیسے اسٹیج شو میں جادوگر نکالتے ہیں۔ پھر اس نے اطمینان سے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم لوگ کون ہو؟" وہ بولا۔ "پولیس کے آدمی ہو؟"

میں نے اور محسن نے صرف ایک لمحے کے لیے نظروں ہی نظروں میں تبادلۂ خیالات کیا۔ کیا یہ مکاری ہے؟

اتنا ڈرا ہوا کیوں ہے اور کیا واقعی ہمیں نہیں پہچانتا؟ اس کو پولیس کا ڈر کیوں ہے؟

"ہم اپنے بارے میں بعد میں بتائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم بتاؤ کہ اس گھر میں تمہیں کس نے بھیجا تھا؟"

"مجھے... کسی نے... کسی نے بھی نہیں۔" اس نے بمشکل تمام تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ "میں خود گیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "چوری کرنے یا ڈاکا ڈالنے؟ کون ہو آخر تم؟"

"میں... میں ٹیڈی ہوں — یہ میرا نام نہیں ہے مگر میرا نام کوئی نہیں لیتا۔ استاد ٹیڈی کہتے ہیں سب۔" وہ بولا۔

"ہم نے بہت سے استاد دیکھے ہیں اور استادوں کے استاد دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم کس قسم کے استاد ہو؟"

"وہ... وہ اپنا یار تھا... جوڈی..." وہ بولا۔ "میں اس کی بہن سے ملنے گیا تھا۔"

"جوڈی کون؟" میں نے کہا۔ "وہاں کسی جوڈی کی بہن نہیں رہتی۔ جھوٹ بولو گے تو..."

"قسم مولا کی۔" وہ بے اختیار پیچھے ہٹا۔ "ہم اسے جوڈی کہتے تھے۔ ہم لوگ ایسے ہی نام دیتے ہیں سب کو۔ اس کا نام عدنان تھا۔ جب وہ آیا تھا تو خود کو مسٹر زیدی کہتا تھا۔ لوگ بہت ہنستے کہ مسٹر زیدی کیا ہوا بھلا، جوڈی چلے گا۔ میرا نام بھی علم دین تھا۔ پہلے ٹیڈی ہوا۔ اب استاد ٹیڈی ہوں۔ جوڈی بھی دو چار سال میں استاد جوڈی ہو جاتا۔"

ان ناموں کے ساتھ ہی میرے ذہن میں استاد پیڈرو کا خیال آیا تھا۔ یہ اس دنیا کے باسی تھے جہاں اصل نام سے زیادہ ان کی عرفیت مشہور ہو جاتی ہے اور وہ اسی پر فخر کرتے ہیں۔ میں، رابعہ اور محسن اس کی باتوں پر یقین کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا جذباتی لہجہ اس کی صداقت کا گواہ تھا۔ اسے اپنے یار کی موت کا صدمہ تھا۔

"تم عدنان کے دوست تھے؟" میں نے کہا۔ "اس کی بہن کے پاس تعزیت کے لیے گئے تھے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جوڈی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں اپاہج ہے اور بہن نوکری کرتی ہے۔ میں ایک دن پہلے بھی گیا تھا لیکن وہاں کوئی واردات ہوئی تھی۔ ادھر ادھر رہنے والوں نے مجھے بتایا کہ بدمعاشوں نے حملہ کیا تھا اور اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ میں نے ان کی تصویریں اخبار میں دیکھی تھیں۔ قسم مولا کی۔ وہ یوں نہ مرتے تو اب تک استاد ٹیڈی کے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے۔ میں دوبارہ گیا تھا اور دروازے پر موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تو اندر چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ان کا کوئی اور ساتھی گھر میں گھسا ہے۔ روشنی دیکھ کر مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ جوڈی کی بہن واپس نہ آ گئی ہو۔"

"یہ شک تمہیں کیوں ہوا تھا کہ عدنان کی بہن واپس آ گئی ہو گی۔ اغوا کرنے والے تو کسی پر رحم نہیں کھاتے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو ہے۔ مگر... مگر میں نے سوچا ممکن ہے وہ گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔" وہ بولا۔ "حملہ کرنے والے تینوں ایسے لوگ نہیں تھے۔ میرا مطلب ہے اغوا قسم کی واردات میں انہوں نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اکیلی عورتوں کو اٹھا کر لے جانے کو بدمعاشی کون کہتا ہے۔ وہ بدمعاش تو تھے مگر بے غیرت نہیں تھے اور بزدل بھی نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں۔"

"گویا بدمعاش بھی غیرت مند ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ کسی گروہ کے آدمی تھے؟"

"کسی خاص گروہ کے نہیں تھے۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی دوسرے کے ساتھ۔ دو تو سگے بھائی تھے۔" وہ بولا۔

"اچھا آج کل وہ کس کے ساتھ تھے؟" میں نے پوچھا۔ محسن اور رابعہ بیٹھ چکے تھے مگر میں اب بھی کھڑا تھا۔

"آج کل؟ میں نے کچھ سنا نہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "لیکن میں معلوم کر لیتا۔"

"تم نے استاد پیڈرو کا نام سنا ہو گا؟" میں نے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ صورتِ حال یکلخت بدل گئی تھی۔ وہ دشمن کے کیمپ کا نہیں ہمارا طرفدار ثابت ہوا تھا۔

"استاد پیڈرو کا نام تو سارا جہان جانتا ہے۔ قسم مولا علی کی، کیا بدمعاش تھا۔"

"تھا کا کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "کیا بدمعاشی چھوڑ دی ہے اس نے؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ وہ مارا گیا تھا۔" ٹیڈی نے ہماری کم علمی پر افسوس سے ہمیں دیکھا۔ "پولیس سے مقابلے میں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "کب کی بات ہے؟"

"سال بھر سے اوپر کی۔" وہ بولا۔ "ادھر قصور سے آگے بارڈر کراس کر رہا تھا کہ دونوں طرف سے فائرنگ ہو گئی۔ معلوم نہیں کس کی گولی لگی تھی۔ اس کا ایک ساتھی پکڑا گیا تھا مگر اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔ دوسرا نکل گیا تھا۔"

"تم ان سب کو پہچان سکتے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا۔ "میرا مطلب ہے اگر تمہیں استاد پیڈرو کی تصویر دکھائی جائے یا اس ساتھی کی جو فرار ہو گیا تھا۔ کیا نام تھے ان کے۔ حلیہ ہے کچھ ذہن میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سرغنہ تو پیڈرو ہی تھا۔ باقی دو گمنام لوگ تھے۔ ابھی مشہور نہیں ہوئے تھے۔ لیکن میں استاد پیڈرو کو پہچان سکتا ہوں۔ اس کا حلیہ بھی بتا سکتا ہوں۔" پھر اس نے یادداشت کی مدد سے جو حلیہ بتایا اسے ہم نے بہت غور سے سنا۔ یہ استاد پیڈرو کا حلیہ نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا۔ اگر وہ استاد پیڈرو جس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہ پولیس سے مقابلے میں مارا گیا اپنی مونچھیں صاف کر دے، بال چھوٹے کرا لے اور ان کا رنگ بدل لے، کانوں میں مُندریاں پہن لے تو جسامت، قد و قامت اور وزن کے مطابق وہی استاد پیڈرو بن سکتا تھا جس کا ہم سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ہم سب کے خیالات کی سمت ایک ہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ پولیس کے مقابلے تو فرضی بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس صورتِ حال کو مختلف زاویے سے دیکھا جائے، مثلاً کیا یہ ممکن نہیں کہ استاد پیڈرو روپوش ہو گیا۔ پھر اس نے کسی وجہ سے سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا لیکن در پردہ کام کرتا رہا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بدمعاش کے بارے میں بدمعاشوں کو بھی خبر نہ ہو۔ اس کا وہ ساتھی جو بچ نکلا تھا، کیا وہ چوہدری دلاور ہو سکتا ہے؟

"اچھا استاد ٹیڈی! ہم تمہیں بعد میں دو چار چہرے دکھائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ عدنان کیسے مارا گیا تھا؟"

"جُوا کھیل رہا تھا۔ کسی کو شک ہو گیا کہ وہ سٹے بازی کر رہا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"کسی کو؟ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ مارنے والا کون تھا؟" میں نے کہا۔ "تم خود کو استاد کہتے ہو اور عدنان کا دوست بھی؟"

"مجھے سب معلوم ہے۔" وہ طنز کے اس دُہرے وار پر مشتعل ہو کے بولا۔ "مگر وہ بدمعاش چھپا ہوا ہے۔ قسم مولا علی کی، وہ پولیس سے بچ سکتا ہے۔ استاد ٹیڈی کے خنجر سے نہیں بچ سکتا۔"

"گویا تمہیں قاتل کے بارے میں تو معلوم ہو چکا ہے مگر تم کسی کو بتانا نہیں چاہتے۔ پولیس کو بھی نہیں؟" رابعہ بولی۔

"پولیس کیا کرے گی۔ اپنے یار کا بدلہ ہم خود لیں گے۔ انصاف ہم خود کریں گے جی۔" وہ بولا۔ "آپ دیکھ لینا۔"

"تم یہ بات ہمارے سامنے کر رہے ہو۔ اگر ہم تمہیں گرفتار کر لیں؟ فرض کرو ہم پولیس والے ہوتے؟" میں نے کہا۔

"آپ لوگ پولیس والے نہیں ہیں۔" وہ بولا۔ "پولیس والے ہم سے اس طرح بات نہیں کرتے اور میں نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کر لیں گے۔ قسم مولا! وہ میری زبان سے اس کا نام نہیں اگلوا سکتے جس سے ہم نے یار کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ وہ خود سٹے باز ہے سالا بھوڑو! کبھی سٹے بازی نہیں کی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں۔"

"تم عدنان کی بہن کو پہچانتے ہو؟" میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

ٹیڈی دھوکا کھا گیا۔ "آپ؟ آپ اس کی باجی ہیں؟" وہ حیرت سے منہ کھول کے بولا۔ اس کے لہجے میں بڑا احترام تھا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بھئی! میں تو ایک وکیل ہوں۔"

ٹیڈی کا چہرہ بجھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "اس گھر میں... آپ ڈی سلوا صاحب ہیں؟" اسے یکلخت کچھ یاد آیا۔

"اچھا! تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "سلوا میں نہیں ہوں۔ مگر تمہیں یہ نام کس نے بتایا ہے؟"

"خود... جوڈی نے کہا تھا... کہ اس کی بہن کی شادی ہونے والی ہے... اور یہ ڈی سلوا صاحب بہت بڑا آدمی ہے اور بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

"اچھا استاد ٹیڈی! اب تم نے ہمیں مطمئن کر دیا ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تمہیں بھی ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تمہارے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہمارا خیال ہے کہ تم ہمارے کام آ سکتے ہو۔"

"آپ لوگوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ مشتبہ لہجے میں بولا۔ "ان کے سوا۔" اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"ہم اپنے بارے میں تفصیل سے تو پھر کبھی بتائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی صرف یہ سمجھ لو کہ میرا نام سکندر بخت ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام ہے محسن اور یہ رابعہ قاری وکیل ہیں بہت بڑی اور یہ انہی کا دفتر ہے۔ یہ شہلا زیدی کی سہیلی ہیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں گیا تھا اور میں بھی سمجھا تھا کہ تم انہی بدمعاشوں کے ساتھی ہو۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے تمہارے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہو گئی۔ مگر ہم اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔ ہم تمہیں ایک اچھی خبر سنا سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ بات تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارے دوست کی بہن اغوا نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے اسے چھپا رکھا ہے۔ ہمیں بروقت معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ بدمعاش اس کے گھر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہم اسے اور اس کی ماں کو نکال کر لے گئے تھے۔"

"کون بدمعاش ہیں وہ؟ قسم مولا علی کی، نام بتا دیں مجھے۔ ایک ایک کو ٹھکانے نہ لگا دیا تو نام بدل دوں گا۔" وہ اینڈ کر بولا۔ درحقیقت وہ اتنا بڑا بدمعاش نہیں تھا جتنا بڑا خود کو ظاہر کرتا تھا لیکن وہ ہمارے لیے بہترین مخبر بن سکتا تھا اور ہمارا ایجنٹ بن کے دشمن کی صفوں میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس کی سڈی بدمعاشی تو میں نے ایک وار میں ختم کر دی تھی اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خود کو بہت بانکا کہنے والا وہ کتنا ڈر گیا تھا۔ پہلے وہ ہمیں پولیس کا آدمی سمجھ کے خوفزدہ ہو گیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ پولیس کیا چیز ہے۔ اس میں اتنی جرأت بھی نہ رہی تھی کہ اپنی مرضی سے ہاتھ ہلا کے وہ رومال ہی نکال لیتا جو ہم نے اس کے منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور اس نے دھمکی سے ڈر کے فوراً وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو اب بڑھ چڑھ کے بولنے لگا تھا۔ تاہم وہ اپنے دوست کی موت کے معاملے میں سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ قاتل بھی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہی تھا کہ روپوش ہو گیا تھا۔ شاید استاد ٹیڈی اس کو واقعی مار دیتا۔ لیکن ڈی سلوا اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں سے مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اعتراف کر ہی لیا تھا کہ پیڈرو بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ خود لمبے چوڑے جسم سے تو واقعی بڑا بدمعاش نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی اصلیت جان لی تھی۔ اسے بڑ مارنے کی زیادہ عادت تھی۔

"ان کا نام ہمیں بھی معلوم نہیں۔" میں نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "لیکن ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں اور تم اس کام میں یقیناً ہماری مدد کر سکتے ہو تاکہ تمہارے یار کی بڑی بہن اور ماں کی جان کو خطرہ لاحق نہ رہے۔ جب تک یہ خطرہ موجود ہے، ہم کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کہاں ہیں۔ لیکن ہم تمہیں لے چلیں گے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب!" وہ بولا۔

"استاد ٹیڈی!" محسن نے کہا۔ "کیا تم اپنے دوست کے جنازے میں شریک ہوئے تھے؟"

ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ کی صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔"

"میں نے غور نہیں کیا تھا۔" محسن بولا۔ "وہاں سب اجنبی لوگ تھے۔"

"میں کوٹھی کے اندر نہیں گیا تھا۔" وہ بولا۔ "باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ جب میت گاڑی روانہ ہونے لگی تھی تو چپکے سے پیچھے بیٹھ گیا تھا لیکن میں نے قبرستان میں اپنے یار کی صورت آخری بار دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد پھر غائب ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟ کس کا ڈر تھا تمہیں؟" محسن نے پوچھا۔

"ڈ... ڈر تو کسی کا نہیں تھا... مگر وہاں پولیس تھی۔ وہ مجھے خواہ مخواہ پکڑ لیتے کہ مشکوک حالت میں وہاں پھر رہا تھا۔ ان کا یہی طریقہ ہے جو ہاتھ آ جائے اسے پکڑ کر لے جاؤ۔ اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے دس بیس چھوٹے موٹے جواری پکڑ لیے ہوں گے اور ان سے زبردستی معلوم کریں گے کہ قاتل کون تھا۔ اب یا تو کوئی بتا دے گا ورنہ وہ دو دن انہیں حوالات میں رکھ کے چھوڑ دیں گے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "معلوم تو مجھے بھی ہے مگر یہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ کوٹھی کس کی تھی جہاں سے عدنان کا جنازہ اٹھایا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اس کے چچا کا گھر تھا۔ چوہدری دلاور حسین کا۔" وہ بولا۔ اس [illegible] نے چوہدری دلاور کا نام بڑی عزت سے لیا تھا جس کا مطلب [illegible] انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں یہ نام بہت بڑا سمجھا [illegible]

"[illegible] ان کو جانتے تھے؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی یہ نام سنا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سیٹھ دلاور کا نام تو سنا تھا، چوہدری دلاور حسین کا نہیں۔"

"اور اس سیٹھ دلاور کو تم نے کبھی دیکھا نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"اسے تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ سیٹھ دلاور کا صرف نام چلتا ہے۔" وہ بولا۔

میرے شبہات کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی۔ چوہدری دلاور جیسے لوگوں کی کبھی ایک شخصیت نہیں ہوتی۔ ہر شخصیت کا چہرہ جُدا ہوتا ہے۔ جہاں وہ رہتا تھا وہاں اس کی حیثیت ایک شریف اور معزز آدمی کی تھی۔ چوہدری دلاور حسین لیکن یہی شخص دوسرے حلقے میں سیٹھ دلاور ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں وہ صرف دلاور ہو۔ پھر استاد دلاور بن گیا ہو اور اب برسوں بعد وہ سیٹھ دلاور تھا۔ مایا تیرے تین نام۔ اس کے سیٹھ بن جانے کے اسباب بھی مجھے معلوم تھے۔ اب وہ سامنے نہیں آتا تھا مگر بقول استاد ٹیڈی، اس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ میں ایسے بہت سے سیٹھوں کو جانتا تھا جن کے نام روایت بن گئے تھے اور پبلک کے سامنے وہ اتنے بڑے بدمعاش تھے کہ ان کا یارانہ اعلیٰ پولیس افسروں سے اور سرکاری حکام سے تھا اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ان کو بدمعاشی کی مملکت میں بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل تھی مگر ان کی سماجی حیثیت اتنی بلند تھی کہ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "استاد ٹیڈی نے تو خود ہی سب کچھ بتا دیا ہے اور بہت سی کام کی باتیں بتا دی ہیں جو ہمارے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ "استاد! ہم سے رابطہ قائم کرنے کا ایک پتہ تو یہی ہے۔"

رابعہ نے ہینڈ بیگ میں سے اپنا کارڈ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ "اس پر آفس کا فون نمبر بھی ہے اور گھر کا بھی۔ مگر گھر کا فون کٹ گیا ہے۔ یہاں تم شام کے وقت میرے نام پیغام دے سکتے ہو... اور ان کے نام بھی۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"لیکن تم سے رابطہ قائم کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟" میں نے سوال کیا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں جی۔" وہ کارڈ کو جیب میں رکھ کے بولا۔ "بس میں خود ہی آجاؤں گا۔"

"تم دیکھ سکتے ہو کہ تمہاری سب چیزیں جیب میں موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "سوائے ایک چیز کے۔" میں نے جیب میں سے کمانی والا خنجر نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ یہاں سے انارکلی زیادہ دور نہیں ہے۔"

ٹیڈی کے چلے جانے کے بعد بھی ہم کچھ دیر بیٹھے رہے اور ان خیالات کا اظہار کرتے رہے جو ہمارے ذہن میں تھے، مگر ٹیڈی کے سامنے یہ باتیں کرنا مناسب نہ تھا۔ ہم سب اس مسئلے پر ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ٹیڈی سے سب کے سامنے ملنا ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سب سے بہتر صورت یہی تھی کہ وہ ہمارا جاسوس بن کے کام کرے اور جو معلومات ہم خود حاصل نہ کر سکیں، وہ ٹیڈی کے ذریعے حاصل کریں۔ ممکن ہو تو اس کو ڈی سوا یا چوہدری دلاور کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کریں مگر یہ کام خطرناک تھا۔ اگر ان دونوں کو شک بھی ہو جاتا کہ ٹیڈی ہم سے بھی ملتا ہے تو ٹیڈی جان سے جاتا۔ ابھی اس مہرے کو اتنا آگے بڑھانا عقلمندی نہ ہوتی۔

رات کے دس بجنے والے تھے۔ ہم نے نیچے اتر کے کسی معقول ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے لائٹس آف کیں اور محسن نے دروازے لاک کیے۔ ہم ساتھ زینے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت نیچے سے چوکیدار کی آواز آئی۔ وہ کسی کو روک رہا تھا۔ جواب میں کسی نے اس کو گالی دی۔ چوکیدار پھر چلایا لیکن اس مرتبہ یہ چیخ بلند تھی۔ یہ کسی مجروح آدمی کی چیخ تھی جس میں درد و کرب تھا اور تھی۔ اس کے بعد جو آواز ... ئی دی اس نے ہم سب کو ... کر دیا۔ یہ سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔

"رابعہ! اس عمارت سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ...؟" میں نے رابعہ کو روک لیا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "عمارت کے دوسری ... پر بھی ایک زینہ ہے۔ پچھلی طرف۔"

"تم محسن کے ساتھ جاؤ، جلدی کرو۔" میں نے کہا۔ لوگ زینے پر بھاری قدم رکھتے اوپر آرہے تھے۔

"اور تم... تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے پریشان ہو...

"جاؤ۔" میں نے اسے دھکیل دیا اور محسن نے ... گھسیٹ لیا۔ نیچے سے آنے والے اب بہت قریب ... چکے تھے۔

معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ میں نے سوچا اور کیا چا... ہیں۔ لیکن یہ بھی شکاری ہیں تو

دھاوا بولنے سے پہلے انہوں نے فرار کے سب راستے بند کر... ہوں گے اور میرا خیال غلط نہیں تھا۔ محسن اور رابعہ برآ... آخری حصے تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ وہ دونوں طرف ... ہوئے یعنی اس زینے کی جانب سے جو ہم نے آتے وقت ا... کیا تھا اور اس دوسرے عقبی زینے کی طرف سے بھی جد... رابعہ اور محسن نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ا... ایک جیسے قد و قامت کے اور شلوار قمیص پہنے ہوئے ... کے چہروں پر ایک جیسی داڑھیاں تھیں اور لمبی لمبی مونچھیں ... جو نقلی ہونے کے باوجود دور سے اصلی لگتی تھیں۔ ان سب ... اپنے چہروں کو غیر نمایاں اور ناقابل شناخت بنانے کے لیے بڑی ... گول ٹوپیاں بھی سر پر رکھی تھیں جن سے پیشانی کا آدھا حصہ ... گیا تھا۔ یہ ان کا بہت کامیاب حربہ تھا کہ وہ ایک جیسے حلیے ... آتے تھے اور یہ کنفیوژن چھوڑ جاتے تھے کہ ان کی تعداد کیا تھ... وقت بھی دونوں دروازوں کے چوکیداروں نے دو ہی افراد کو ... جاتے دیکھا ہوگا اور بشرطِ زندگی وہ بعد میں کوئی بیان دی... تو دو کا ذکر کریں گے۔ اوپر کسی نے دیکھ لیا تو اسے چار نظر... آئیں گے مگر حلیہ بیان کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ایک آدمی تھا۔

رابعہ اور محسن انہیں دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے اور غیر ارادی طور پر محسن نے رابعہ کو اپنے پیچھے کر لیا تھا لیکن مجھے انتہائی حیرت ہوئی جب آنے والوں نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ چاروں میری طرف بڑھتے آرہے تھے۔ اوپر پہنچنے تک وہ خالی ہاتھ تھے لیکن جب میرے اور ان کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تو باری باری ان سب نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ میں مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اگر وہ خالی ہاتھ کیا خنجر اور لاٹھی لے کر بھی آتے تو میں ان چاروں سے نمٹ لیتا مگر چار سمتوں سے آنے والی چار گولیوں سے مقابلہ ناممکن تھا۔ محسن اور رابعہ راستہ صاف دیکھ کر غائب ہو چکے تھے۔ شاید اس خیال سے کہ خاموش تماشائی بن کر کھڑے رہنے سے وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے لیکن اس عمارت سے باہر جا کے وہ یقیناً کچھ کر سکتے تھے۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟" میں نے ان سب کو براہِ راست مخاطب کیا۔

"سکندر بابو!" ان میں سے ایک نے چند قدم کے فاصلے پر رک کر کہا۔ "ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"زندہ یا مردہ۔" بائیں طرف اتنے ہی فاصلے پر رک جانے والے دوسرے شخص نے کہا۔

"لیکن ہم کشت و خون نہیں چاہتے۔" تیسرے نے دائیں طرف سے کہا۔

"کیونکہ حکم بھی یہی ہے کہ تم کو زندہ لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔" چوتھے نے پھر بائیں طرف سے بات کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹیج کے اداکار ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسے کس وقت کیا ڈائیلاگ بولنا ہے۔

"گڈ۔" میں نے اطمینان سے دونوں ہاتھ باندھ کر سینے پر رکھے اور مسکرا کے کہا۔ "میں نے تم سب کی سن لی۔ اب مجھے صرف دو سوالوں کا جواب چاہیے۔ ایک یہ کہ حکم دینے والا کون ہے؟ اور دوسرا یہ کہ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"ہم کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔" پہلے نے کہا۔

"اس لیے کہ جواب خود ہمیں معلوم نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ فضول باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر چل پڑو۔" تیسرا بولا اور میں نے چوتھے کی طرف دیکھا۔

"تاکہ ہم بلاوجہ مداخلت کی حماقت کرنے والے کو گولی مارنے پر مجبور نہ ہوں۔" چوتھے نے کہا۔

"میں بھی کسی بے گناہ کا خون ہوتے دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم پوری تیاری اور مصمم ارادے کے ساتھ آئے ہو۔ میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ مجھ سے تقریباً چھ فٹ دور ایک نیم دائرے کی شکل میں حصار قائم کیے کھڑے تھے۔ اگر اس وقت کوئی نیچے اترنے والا دور سے دیکھتا تو اسے کسی قسم کا شک نہ ہوتا اور یہی نظر آتا کہ چار افراد مجھ سے کسی کاروباری مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ وہ مجھے وکیل سمجھتا اور ان کو میرا موکل اور ہم پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر گزر جاتا۔ جو ریوالور ان کے ہاتھوں میں تھے وہ پشت کی جانب سے نظر نہیں آسکتے تھے۔ میرے ارادے کا اظہار ہوتے ہی انہوں نے مجھے راستہ دے دیا اور میرے پیچھے ہو گئے۔ زینے سے اترتے ہی میں نے چوکیدار کو تلاش کیا۔

"تم نے اس غریب چوکیدار کو مار ڈالا ہے؟" میں نے رک کر کہا۔

"نہیں۔" کسی نے مجھے دھکیل کر جواب دیا۔ "وہ صرف بیہوش پڑا ہے۔ زینے کے نیچے۔"

باہر بہت سی گاڑیوں کے درمیان ان کی کار بھی موجود

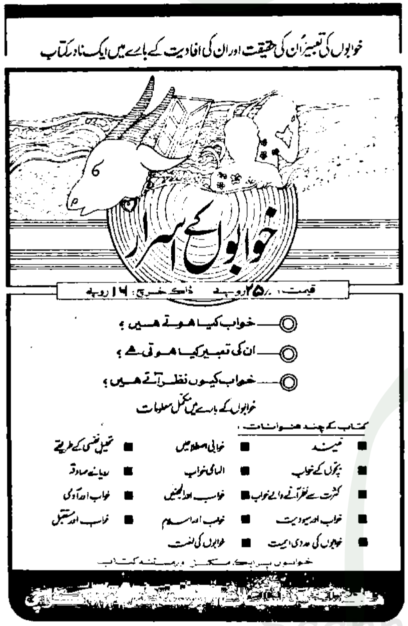

تھی۔ جب انہوں نے مجھے اس گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی لیکن نمبر پلیٹ کی لائٹ بجھی ہوئی تھی اور گاڑی اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا بعد میں معلوم ہوتا کہ نمبر پلیٹ نقلی تھی یا گاڑی چوری کی تھی گاڑی میں ڈرائیور کی جگہ ایک شخص اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجھے ڈرائیور والی سیٹ پر آگے بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ دو افراد میرے پیچھے سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی کے ڈرائیور نے انجن کو پہلے سے اسٹارٹ کر دیا تھا۔ دروازے بند ہوتے ہی گاڑی چل پڑی اور ہائیکورٹ کے چوک سے گھوم کر مال پر آگئی۔ خلاف توقع مجھے یہ دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ اندر کی جانب شیشے اور دروازے کھولنے کے لیے ہینڈل موجود ہیں لیکن میں نے احمقانہ جرأت کے مظاہرے سے گریز کیا۔ یہ بات یقینی نظر آتی تھی کہ پیچھے بیٹھے ہوئے شکاری مجھے اپنے دام سے نکلتا دیکھیں گے تو بلا جھجک گولی مار دیں گے۔ اپنے اور ڈرائیور کے درمیان لگے ہوئے آئینے میں پیچھے آنے والی ٹریفک کے بجائے مجھے ان دونوں کے چہرے نظر آرہے تھے جو بالکل ایک جیسے لگتے تھے۔ ابھی تک نہ انہوں نے ٹوپیاں اتاری تھیں اور نہ داڑھی مونچھیں۔ پھر بھی ان کی آنکھیں اور ان کے ناک کان دیکھ کر میں تصور کی مدد سے ایک ایسی خیالی تصویر بنا سکتا تھا جس میں ان کی صورت کے اصل نقوش داڑھی مونچھوں کے بغیر نظر آتے ہوں۔ گاڑی اب نئی اور پرانی انارکلی کے چوک سے گزر چکی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر پنجاب یونیورسٹی کی خوبصورت عمارت تھی جس کے طرزِ تعمیر میں مشرقی روایات کا تمام حسن تھا۔ قدامت کی باوقار شان و شوکت تھی اور علم و عرفان کی ساری عظمت تھی۔ دوسری طرف عجائب خانہ جو کئی صدیوں کی تاریخ کے گم گشتہ اوراق کا خزینہ تھا اور پنجاب پبلک لائبریری تھی جس کی لاکھوں کتابیں انسان کی عقل، علم و آگہی اور تجربات کے بے کراں سمندر کی طرح موجود تھیں مگر میں ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں دشمن کہاں گئے جو میرے ساتھ نہیں آئے تھے۔ جواب فوراً میرے ذہن میں آگیا وہ دوسرے دروازہ پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر پیچھے آرہے ہوں گے۔ کیا اس کا مطلب یہ نکالا جا سکتا ہے کہ انہوں نے رابعہ اور محسن کو بھی بے بس کر کے دوسری گاڑی میں ڈال لیا ہو گا؟ میں نے سوچا اور جھک کر آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ کیا ہمارے پیچھے بھی کوئی گاڑی ہے۔ پیچھے کوئی ایک گاڑی ہوتی تو الگ بات تھی۔ ہمارے پیچھے تو گاڑیوں کی ایک قطار تھی اور رات کے وقت صرف ان کی ہیڈ لائٹس نظر آتی تھیں۔ پیچھے بیٹھے شخص نے مجھے سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا اور میں نے تعمیل کی۔ انہوں نے میری آنکھوں پر کوئی پٹی نہیں باندھی تھی اور مجھے بے خبر رکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں بند شیشوں سے باہر کو دیکھتا جا رہا تھا جو میرے جانے پہچانے تھے۔ اپنی دانست سے میں اپنے محافظوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں [illegible] ان سے تعاون کر رہا ہوں اور میری بے نیازی کا انداز [illegible] کرتا تھا کہ میں خوف زدہ بھی نہیں ہوں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم تھی جس کی کامیابی کا دار و مدار حالات پر تھا۔ میں ناکامی کے نتائج کا تصور [illegible] تو خوف کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

اب گاڑی اُن سڑکوں پر دوڑ رہی تھی جو غیر آباد تھیں۔ دونوں جانب اونچے اونچے گھنے درخت تھے اور [illegible] کے کھمبے تھے جن کے زیادہ تر بلب فیوز تھے اور جو روشن تھے وہ بھی وولٹیج کی کمی کے باعث دیے کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سڑک سے دور نئی آبادی میں تعمیر ہونے والی چھوٹی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ شروع کے حصے میں آبادی زیادہ تھی اور [illegible] گھر میں روشنی نظر آرہی تھی۔ پھر خالی پلاٹوں کی تعداد [illegible] لگی۔ جن میں کہیں مکمل اور کہیں نامکمل کوٹھیاں ایک [illegible] سے الگ نظر آتی تھیں۔ یہ حالات خاصے امید افزا تھے میری اسکیم کے لیے سازگار تھے۔ ایک موڑ پر رفتار [illegible] پلک جھپکتے میں دائیں ہاتھ سے میں نے اسٹیئرنگ کو [illegible] اور بائیں ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور اگر فوراً [illegible] نہ لگاتا تو گاڑی الٹ جاتی۔ مگر فوراً بریک لگنے [illegible] دو فائدے ہوئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد ایک [illegible] آگے گرے اور میں نے کھلے دروازے سے چھلانگ لگا[illegible] مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ نیچے گرتے ہی میں نے قلابازی [illegible] اور اٹھ کر ایک درخت کے تنے کی پناہ لینے بھاگا۔ [illegible] سن کے میں نے پیچھے دیکھا۔ گاڑی دوسرے کنارے کے درخت سے ٹکرا گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے [illegible] کار کو عین اپنے پیچھے رکتے ہوئے دیکھا۔

میری اسکیم فیل ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں اپنے پیچھے [illegible] والی اس دوسری گاڑی کے وجود سے بے خبر تھا جو لائٹس آف کیے پہلی کار کی ٹیلی لائٹ کا تعاقب کر رہی [illegible] انہوں نے بڑی چالاکی سے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اگر وہ [illegible] روشن رکھتے تو کسی ویران سڑک پر پیچھے کی ونڈ اسکرین [illegible] آنے والی روشنی دیکھ کر میں سمجھ جاتا کہ دوسری گاڑی [illegible] ساتھ ہی چل رہی ہے ان کو بھی اندیشہ ضرور تھا کہ میں راستے میں گڑبڑ کروں گا اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے انہوں نے جو انتظام کیا تھا قابلِ تعریف تھا۔ ابھی میں پوری طرح درخت کے پیچھے چھپا بھی نہیں تھا کہ دوسری کار میں سے پیچھے رہ جانے والے دونوں افراد ایک ساتھ نکلے اور انہوں نے درخت کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔

"تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔"

"چلو اس دوسری گاڑی میں۔" دوسرے نے کہا جو گھوم کر میرے پیچھے آچکا تھا۔ وہ دونوں مشتعل تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کے پاس بہانہ بھی تھا چنانچہ وہ مجھے اس ویرانے میں قتل کر کے آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ دونوں ہاتھ اٹھائے اور دوسری گاڑی کی طرف چلنے لگا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ پہلی گاڑی کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کیونکہ تصادم کے وقت اس کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور چوٹ سے اس لیے بچ گیا تھا کہ آخری وقت میں اس نے ٹکر کو ناگزیر سمجھتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کر لیا تھا۔ پیچھے والوں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور اب وہ بھی باہر آچکے تھے۔ چند منٹ بعد میں بالکل اسی طرح دوسری گاڑی میں بیٹھا تھا اور کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پہلی کار اسٹارٹ ہو گئی ہے لیکن پیچھے آنے کے بجائے واپس شہر کی طرف جا رہی ہے۔ میرے محافظ بدل گئے تھے اور اب میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جب وہ چاروں رابعہ کے دفتر کی عمارت کے باہر مجھ سے بات کر رہے تھے تو ہدایات کے مطابق سب نے اپنی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ اب ایک ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوئی تو ان کو یہ بات یاد نہ رہی۔ ایک آواز کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ یہ ڈی سلوا کی آواز تھی۔ جب انہوں نے مجھے کار میں بٹھانے کے لیے دروازہ کھولا تو اندر خود بخود ایک لائٹ جل گئی اور میں نے معمولی سی روشنی میں ذرا سی دیر کے لیے ان کے چہرے دیکھے۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نہ تھا مگر میں نے پھر اپنے تصور سے مدد لی اور ایک چہرے میں سے داڑھی مونچھوں کو الگ کر کے دیکھا۔ آواز کی شناخت کے بعد اس صورت کے اصلی نقوش کو پہچاننا مشکل ثابت نہ ہوا۔ میرے دونوں محافظوں میں سے ایک یقیناً ڈی سلوا تھا۔ اس یقین کے بعد میں محتاط رہا۔ ڈی سلوا ایسا دشمن تھا جسے بے وقوف یا کمزور سمجھنے کا انجام میری موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

گاڑی ایک ویران اور اندھیرے گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ ڈی سلوا اور اس کا ساتھی مجھ سے پہلے اترے اور انہوں نے مجھے بھی باہر آنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور بدستور انجن اسٹارٹ کیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

"پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر دروازہ کھولو۔" ڈی سلوا نے کہا۔ وہ پھر آواز اور لہجہ بنا کے بول رہا تھا۔

"یہ کس کا گھر ہے مسٹر ڈی سلوا؟" میں نے کہا۔ "تمہارے کسی باپ کا؟"

"شٹ اپ۔" ڈی سلوا نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ "تم سے جو کچھ کہا جائے وہی کرو۔"

"لیکن اس کی چابی؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ دروازہ مقفل لگتا ہے۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" ڈی سلوا کے ساتھی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ میں نے سنبھل کر دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور مجھے باہر سے ڈور لاک میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے میں تین دروازے اور بھی تھے لیکن میں کوشش کیے بغیر اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے مقفل ہوں گے یا باہر سے بند ہوں گے۔ میرے کانوں میں گاڑی کے دروازے بند ہونے کی اور پھر روانہ ہونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد یہ آواز بھی نہ رہی اور میرے ارد گرد ایسی خاموشی کا احساس رہ گیا جس میں انگریزی محاورے کے مطابق پن کے گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ دشمن مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جا چکے تھے۔

اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کسی نئے مکان کا خالی کمرہ تھا جس کی دیواروں پر رنگ و روغن تک ہو گیا تھا لیکن سامان نام کی کوئی چیز ابھی تک نہیں رکھی گئی تھی۔ سوائے اس ٹرانسمٹر ریڈیو کے جو کمرے کے عین درمیان میں ہونڈا ٹیک کے فرش پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک پین ٹارچ پڑی تھی۔ جسے بہت پہلے روشن کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ چنانچہ سیل کمزور پڑ گئے تھے اور روشنی برائے نام رہ گئی تھی۔

"سکندر بخت!" ریڈیو اچانک بولا۔ "تمہیں یہاں لانے کا مقصد تم سے باتیں کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہماری گزشتہ ملاقات تین ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہم نے تمہیں ایک ماہ کی مہلت دی تھی۔"

میں اس آواز کو سُن کر چونکا ضرور تھا لیکن حیران نہیں ہوا۔ آواز اسی شخص کی تھی جس نے پہلی بار خود کو چوہدری دلاور کہہ کر متعارف کرایا تھا لیکن اس رات میں صرف چوہدری دلاور کا سایہ دیکھ سکا تھا اور اس کے سائے سے ہی باتیں کرتا رہا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اب بھی میں اس کی آواز سن رہا تھا لیکن اسے دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ شاید اسی گاڑی میں جو مجھے لے کر یہاں تک آئی تھی اور کسی پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر کے ذریعہ بات کر رہا تھا۔ ریڈیو پہلے سے آن کر کے اور ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی پر ٹیون کر کے رکھ دیا گیا تھا چنانچہ ریڈیو اس کی آواز کو صاف ریسیو کر رہا تھا۔ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والی آواز کی لہروں کا دائرہ پچاس گز ہوگا۔ اور اس محدود دائرے میں اس وقت کون ریڈیو لگائے بیٹھا ہوگا۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو وہ اپنی پسند کے مطابق کسی اسٹیشن سے خبریں سن رہا ہوتا یا فرمائشی گانے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی عین اسی جگہ ریڈیو کی سوئی لے آئے اور یہ گفتگو سننے لگے۔

"کیا میری آواز تمہیں سنائی نہیں دی؟" چوہدری دلاور نے کہا۔ "تم حیران ہو رہے ہو یا کسی سوچ میں ہو؟"

"حیرانی کی میرے لیے کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "سوچ میں یہ رہا تھا کہ بات چیت کا یہ انتظام یک طرفہ تو نہیں ہے؟ میری آواز بھی تمہارے کانوں تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟"

"یہ انتظام دو طرفہ ہے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "میں تمہاری آواز سن رہا ہوں اپنے ریڈیو پر۔"

"تم نے مجھے ایک مہینہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے ہی دوسری ملاقات کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"اس عرصے میں بہت سی باتیں ایسی ہوئی ہیں جن سے مجھے تمہارے عزائم کا اندازہ ہوتا جا رہا ہے۔" چوہدری دلاور بولا۔ "اور میرا خیال ہے کہ تم نے اس ایک ماہ کی مہلت کو سوچ بچار میں صرف نہیں کیا۔"

"تمہارے اندازے غلط بھی تو ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی مجھے بلا لیا۔ میں بھی تم سے بہت سی باتوں کی وضاحت چاہتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ تم خود کو چوہدری دلاور کہتے ہو۔ ایک چوہدری دلاور کو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کی شخصیت اس کا لب و لہجہ اور اس کے انداز و اطوار سب مختلف ہیں۔ یا تو اسے اداکاری کا کمال سمجھا جا سکتا ہے یا تمہارا جھوٹ...."

"کیوں؟ کیا دنیا میں ایک نام کے دو فرد نہیں ہو سکتے؟" وہ بولا۔ "اور یہ سوال قطعی غیر اہم ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آئندہ ایک ہفتے میں تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو تم حق وراثت کا کیس واپس لے کر قانونی طور پر اپنے والد کی جائداد پر ملکیت کے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ اور اس کے بدلے ہمارا پیش کردہ معاوضہ لے کر واپس لندن چلے جاؤ۔ اگر رابعہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔ ہمارا تم سے بعد میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے گا اور تم بھی ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے جس کا تمہارے ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ دوسری پیش کش کا انحصار تمہاری ہمت اور تمہاری مرضی پر ہے۔ تم لندن میں بیٹھ کر کام کر سکتے ہو اور عیاشی سے زندگی گزار سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے معاملات کی سزا دوسرے لوگوں کو کیوں دی جا رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ کر رہے ہو تم خود کر رہے ہو۔" وہ بولا۔ "ہم نے تمہیں ہمیشہ پہلے خبردار کیا اور فیصلہ کرنے کی مہلت دی۔ غلط فیصلہ کرنے والے خود تم تھے۔ اگر تم ہمارے آدمی کو چھوڑ دیتے تو رابعہ کا گھر یوں تباہ نہ ہوتا۔ یہ بھی تمہاری حماقت تھی کہ تم نے اس آدمی کو رابعہ کے گھر میں رکھا اور پھر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی، نقصان کس کا ہوا؟ ہمارا یا تمہارا...؟"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ نقصان میں کون رہا۔" میں نے کہا۔

"وقت تو سب کچھ بتا چکا ہے۔" وہ ہنسا۔ "کیا تم ریثابت کر سکے کہ تمہارے والد کو قتل کیا گیا تھا؟ یا تمہیں معلوم ہے کہ اب ان کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں؟ کیا تمہاری مدد کر کے غلام علی کو کوئی فائدہ ہوا؟ ایک عورت بیوہ ہو گئی اور اس کے بچے یتیم ہو گئے۔ اس سے پہلے منشی نے ہم سے نمک حرامی کی تھی اور تمہیں معلوم ہے اس کا کیا انجام ہوا؟ یہی انجام شہلا کا بھی ہوگا۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ کبھی نہ کبھی اس کا سراغ بھی مل جائے گا۔ آخر تمہارا رشتہ کیا ہے اس سے کہ تم اس کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے ہو؟"

"چوہدری دلاور! تمہاری کسی دھمکی سے ڈر کے میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رشتوں کی بات رہنے دو۔ رشتے تو دیواروں سے بھی استوار ہو جاتے ہیں۔ لوگ ایک درخت کو اتنی ہی محبت اور توجہ سے بڑا کرتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو اور اپنے کتوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔ شہلا سے بھی میرا ایک جذباتی رشتہ ہے۔"

"پہلے فوزیہ سے، پھر رابعہ سے اور اب شہلا سے... تم کس کس کے جذباتی رشتوں کی حفاظت کرو گے؟" وہ طنز سے بولا۔ "ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بس یہ سب تمہارے جذباتی رشتوں کی بھینٹ چڑھ جائیں گی اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ تمہاری ضد کی سزا محسن کو بھی مل سکتی ہے۔ اس کے گھر کے ہر فرد کو مل سکتی ہے۔ اس ایس پی کو مل سکتی ہے جسے تم ڈھال بنائے بیٹھے ہو۔"

"تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میں یہ سمجھوں گا کہ میری وجہ سے ان کو نقصان پہنچ سکتا ہے جن کا مجھ سے کوئی جذباتی تعلق ہے تو میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر میں نے تمہاری دونوں شرطوں کو قبول نہ کیا تو میں اس کی اطلاع دینے کے لیے ڈی سلوا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود تختۂ دار تک پہنچنے سے پہلے میں ان سب کو چن چن کر قتل کر دوں جن کو میں اپنی تمام مشکلات اور مصائب کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ الزام ایک میر شرافت علی کے قتل کا ہو یا تم جیسے دس بدمعاشوں کے قتل کا، کوئی مجھے دس بار پھانسی نہیں دے سکتا۔ تم نے مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری یہ بات بھی سمجھ لو کہ میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تو زندہ رہ کے تم بھی پچھتاؤ گے۔ میں ایک ایک کے گھر کو اور کاروبار کو اسی طرح راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہوں جیسے تم نے رابعہ کے گھر کو بنایا تھا۔ میرے حق وراثت کو تم مجھے مار کر بھی نہیں چھین سکتے۔ میں نے اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا ہے کہ عدالتی فیصلے سے قبل ہی خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو رابعہ کو میرا وارث تصور کیا جائے۔ رابعہ نے ایک وصیت نامہ کی رو سے کسی اور کو وارث بنا دیا ہے۔ یہ بڑا لمبا سلسلہ ہے۔ تم ایک کے بعد ایک کو مارتے جاؤ۔ کوئی نہ کوئی وصیت نامہ کی رو سے وراثت کا حق حاصل کرنے کے لیے موجود رہے گا۔"

اس کی خاموشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری دھمکی رائیگاں نہیں گئی۔

"ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "عقل سے کام لو سکندر بخت اور سب کا فائدہ دیکھو۔"

"تمہارے اور میرے نقطۂ نظر میں فرق نہ ہوتا تو اختلاف کی گنجائش ہی کہاں تھی۔" میں نے کہا۔ "جسے تم فائدہ سمجھتے ہو میں بھی اسے فائدہ مان لیتا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔"

"تمہاری یہ احمقانہ اصول پرستی بہت سی جانوں کا نذرانہ لے چکی ہے۔" وہ بولا۔ "اور آئندہ اس ضد پر کس کس زندگی کو قربان ہونا ہے یہ تم بھی نہیں جانتے۔ کیا حساب کے کسی قاعدے سے تم صرف ایک زندگی کی قیمت بتا سکتے ہو؟ اور اس کے بعد یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد لے کر فائدے میں رہے؟ تم اپنے آپ کو قائل کر سکو گے کہ تمہارے اصول ان سب کی زندگی سے زیادہ اہم تھے جو ناحق مارے گئے؟"

"یہ بڑی لمبی بحث ہے چوہدری دلاور!" میں نے کہا۔ "انسانی تاریخ کے ایسے بہت سے باب ہیں جو لہو کی سرخی سے لکھے گئے اور یہ لہو ایسے ہی لوگوں کا تھا جو سمجھتے تھے کہ سچائی کا سودا نہیں ہو سکتا۔ اصول فروخت نہیں کیے جا سکتے اور ضمیر کی آواز دبائی نہیں جا سکتی۔ ایسے لوگ کبھی اکیلے نہیں رہے اور ان کا ساتھ دینے والے بھی مارے گئے لیکن خیر و شر اور نیکی بدی کی یہ جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک چلتی رہے گی۔ تم جیسے لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس دنیا کا وجود اور انسان کی زندگی کی بقا کا مسئلہ کبھی انسان کے اختیار میں نہیں رہا۔ تم آج کے دن کی فتح اور آج کا فائدہ شمار کرتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ کل سرخرو کون ہوں گے۔ اس لیے تم میرے نفع و نقصان کو اپنے پیمانے میں مت دیکھو۔ تم اپنی فکر کرو۔ میرے بارے میں یا میرا ساتھ دینے والوں کے انجام کے بارے میں مت سوچو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں آخری موقع فراہم کیا تھا۔" وہ بولا۔ "ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ ان سب سے بھی مشورہ کر لو جو تمہارے قریب ہیں لیکن غیر جذباتی ہو کے سوچ سکتے ہیں۔"

"اب مجھے یہ بھی بتا دو کہ میری رہائی کی کیا صورت ہے؟" میں نے کہا۔

"تم نے خود اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "چابی تمہاری دسترس میں ہے اور تمہارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ اور ویران تھیں اور ان دیواروں میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں چابی چھپائی جا سکتی۔ میں نے پین ٹارچ کی برائے نام روشنی میں ہر گوشۂ دیوار کا جائزہ لیا اور موزائیک فلور پر بھی دیکھا لیکن چابی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔

"تلاش کر چکے؟" اس کا شیطانی قہقہہ سنائی دیا۔ "تم ذہین آدمی ہو۔ تمہاری نظر بھی کمزور نہیں ہے اور میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ چابی واقعی اسی کمرے میں ہے اور تم آسانی سے حاصل بھی کر سکتے ہو۔"

"اب صرف ایک جگہ رہ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "چابی اس ریڈیو کے نیچے یا اس کے اندر موجود ہو سکتی ہے۔ پین ٹارچ بہت چھوٹی ہے۔ اس میں چابی آ ہی نہیں سکتی۔"

"میں ایک بار پھر تمہاری ذہانت کا اعتراف کرتا ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ "ٹرانزسٹر کے پچھلے حصے میں سیل ڈالنے کے لیے ایک چھوٹا سا خانہ ہے جس میں چھ سیل پڑتے ہیں۔ تم یہ سیل نکال کر دیکھو گے تو تمہیں چابی مل جائے گی۔"

چابی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس نے بتایا تھا لیکن سیل نکالنے کے لیے میں نے ٹرانزسٹر اٹھایا اور اس کے پیچھے وہ خانہ تلاش کیا جو ہموار سطح پر دکھائی بھی نہ دیتا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ ٹرانزسٹر کچھ زیادہ بھاری ہے۔ اس سائز کے کسی بھی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ٹرانزسٹر ریڈیو کا وزن اس سے آدھا بھی نہ ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ اسی ٹرانزسٹر میں کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بھی پوشیدہ تھا جس کے ذریعے میری آواز چوہدری دلاور تک پہنچ رہی تھی مگر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے دشمن بے وقوف نہیں تھے۔ اگر ان کو صرف اس ٹرانزسٹر پر بات کرنی ہوتی تو وہ اتنی مشکلوں سے مجھے یہاں تک اٹھا کے کیوں لاتے۔ اس سے کہیں آسان تو یہ ہوتا کہ وہ یہی ریڈیو، ٹرانسمیٹر کسی طرح میرے کمرے میں رکھ آتے یا اس وقت رابعہ کی گاڑی میں چھوڑ دیتے جب ہم ادیرا آفس میں بیٹھے تھے۔ انہیں چار مسلح افراد کو بھیجنے کی، ایک چوکیدار کو زخمی کرنے کی اور دو گواہوں کی موجودگی میں مجھے زبردستی اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کیا ایسے بے ضمیر دشمن سے اصول پرستی کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک ماہ کی مہلت دے کر وہ اس وعدے پر قائم رہے گا؟ جب مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا تو بہت سی باتیں مجھے معلوم نہیں تھیں اور دشمنوں کا خیال تھا کہ اپنے مخصوص حربے آزما کر وہ مجھے ہراساں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے ہر طرف سے خطرے کی دیوار کھڑی کر کے مجھے محصور کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تھے۔ اب تو انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میرے عزائم خطرناک ہیں۔ میں نے ان کی پیش کش پر غور کرنے کے بجائے تین ہفتے ان سے محاذ آرائی میں گنوا دیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ میں ان کی پیش کش کو قبول کرنے کا اور اپنی شکست تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ابھی ابھی میں نے ان پہ دوبارہ یہ واضح کر دیا تھا کہ مجھے اپنے نفع و نقصان کی پروا نہیں۔

میرا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا اور خود بخود نتائج اخذ کرتا جا رہا تھا۔ "نہیں،" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اس میں بھی کوئی چال ہے۔ اگر وہ مجھے اتنی آسانی سے نکل جانے کی اجازت دے رہے ہیں تو کیوں؟ اس لیے کہ میں باہر نکل کے ان کے لیے مزید مشکلات اور پریشانی کا سبب بنوں؟" میں نے ڈی سلوا کو بتا دیا تھا کہ میری معلومات کا ذخیرہ کس حد تک خطرناک ہو چکا ہے۔ میرے پاس کتنے ثبوت ہیں اور کتنے گواہ ہیں۔ اس نے یہ بات فوراً آگے پہنچائی ہو گی اور انہیں یقین آ گیا ہو گا کہ میرے بارے میں ان کے سارے اندازے غلط ہو گئے ہیں۔ اب میں وہ سکندر نہیں رہا جو لندن میں ایک خوش باش اور بے فکرا طالب علم تھا۔ نوجوان اور شوقین مزاج اور ہر قسم کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آزاد نوجوان جس کو وہ گھیر کر اپنی شکارگاہ میں لے آئے تھے۔ وہ اس خوش فہمی کے غرور میں مبتلا تھے کہ جسے چار سال تک گھر کے حالات سے واسطہ ہی نہ رہا ہو وہ ان کا حریف کیسے بن سکتا ہے؟ ان کی پیش کش بہت بڑی تھی اور وہ بہت طاقتور لوگ تھے چنانچہ ان کو یقینی نظر آتا تھا کہ میں اپنی جان بچانے کی کوشش کروں گا اور ان کی فراخدلانہ پیش کش کے لالچ سے قائل نہ ہوا تو انجام کے خوف سے ضرور بھاگ جاؤں گا لیکن اب صورتِ حال اس کے برعکس تھی کیا اب وہ مجھے زندہ رہنے کی مہلت دیں گے؟ اس سوال کا جواب نفی میں آتا تھا۔ جتنا میں نے سوچا اتنا ہی خطرے کا احساس بڑھتا گیا۔ وہ چھٹی حس جو خطرے سے اسی طرح خبردار کرتی ہے جیسے جہاز کا راڈار بہت آگے کے موسم کی خرابی سے آگاہ کرتا ہے، مجھے ہوشیار کرنے لگی کہ میں دشمن کی آخری بات کا یقین نہ کروں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے بہت کچھ جھوٹ بھی بولا ہے مثلاً یہ کہ حقِ وراثت کے کیس میں رابعہ کے وارث ہونے کا کوئی ذکر نہیں تھا اور رابعہ نے کوئی وصیت نامہ مرتب نہیں کیا تھا، جس کی رو سے ایک کے بعد ایک وارث پیدا ہوتا جائے۔ دشمنوں کے وسائل اتنے زیادہ تھے کہ وہ وراثت کے مقدمے کی پوری فائل دیکھ چکے ہوں گے۔ "یہ شکاری ہیں" میری چھٹی حس پکارنے لگی۔ "ان کے جال میں مت پھنس جانا سکندر! یہ تم سے آخری بار پوچھنا چاہتے تھے کہ تم مقابلے سے دستبردار ہو کے ان کی شرائط کو قبول کر رہے ہو یا نہیں اور تم نے ابھی ابھی ان کو دو ٹوک الفاظ میں صاف جواب دے دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی شک کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تمہیں اٹھا کے یہاں لانے کا مقصد کیا تھا!"

میں نے کور ہٹا کے پچھلے حصے کے سیل والے خانے کا معائنہ کیا۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن میرے ذہن میں کئی خیال آئے مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ سیل نکالتے ہی کوئی دھماکا ہو اور ٹرانزسٹر کے اندر پوشیدہ کوئی بم ڈی فیوز ہو کے پھٹ جائے یا میں قفل میں چابی گھماؤں تو کوئی کنکشن ٹوٹ جائے اور دروازے پر رکھا ہوا بم پھٹ جائے۔ انگریزی میں اس قسم کے نظام کو 'بوبی ٹریپ' کہا جاتا ہے مگر اردو میں اس کے لیے کوئی متبادل لفظ نہیں لیکن یہ نظام کہیں بھی بہت آسانی سے نصب کیا جا سکتا ہے۔ میرے شبہات کو تقویت پہنچانے والی بات یہ بھی تھی کہ دشمن مجھے تنہا چھوڑ کے فرار ہو گئے تھے اور اب چوہدری دلاور کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ چوہدری دلاور، جو قریب ہی کسی گاڑی میں ٹرانسمیٹر لیے بیٹھا تھا اب جا چکا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ رہائی کے دوسرے امکانات کا جائزہ لیتا رہا مگر یہ امکانات صفر تھے۔ نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں جو میری مدد کے لیے آ جاتا اور نہ میں زورِ بازو سے اپنا راستہ بنا سکتا تھا۔ کمرے کے تینوں دروازے اتنے مضبوط تھے کہ ان کا ٹوٹنا محال تھا اور مدد کے لیے میری فریاد و فغاں بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اب میرے لیے زندگی کو داؤ پر لگا کے قسمت آزمانے کے سوا کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ میں نے ایک ایک سیل کو پوری احتیاط کے ساتھ نکالنا شروع کیا۔ اوپر والے تین سیل جو ایک ہی قطار میں تھے باہر آ گئے اور کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ چابی اب بھی نظر نہ آئی تھی اور میرے لیے باقی تین سیل نکالنا بھی ناگزیر تھا جو نیچے والی قطار میں دوسرے رُخ لگے ہوئے تھے۔ خدا کا نام لے کر میں نے ان کو بھی الگ کر دیا کہ زندگی ہو گی تو دشمن کی کوئی چال مجھے تقدیر کی عطا کی ہوئی آخری سانس لینے سے پہلے نہ مار سکے گی لیکن کاتبِ تقدیر نے اتنی ہی فرصتِ عمر بخشی ہو گی تو اپنی تمام کوشش اور احتیاط سے بھی میں اس میں ایک پل کا اضافہ نہ کر سکوں گا۔ جب خانہ خالی ہو گیا تو مجھے ایک چابی نظر آئی جو اسفنج کی پتلی سی تہہ کے اوپر رکھی تھی۔ سپن ٹارچ کی روشنی برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس کو چابی پر مرتکز کرنے سے مجھے وہ بات معلوم ہو گئی جس نے مجھے مرگِ ناگہاں سے بچا لیا۔ چابی کے دونوں کناروں کو باریک تاروں سے باندھ رکھا تھا۔ ایک تار چابی کے گول سوراخ والے حصے پر لپٹا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا خانے میں دائیں جانب پن جتنے سوراخ میں غائب ہو گیا تھا۔ دوسرا تار چابی کے اس حصے پر جوڑا گیا تھا جو ڈور لاک کے اندر داخل ہوتا ہے اور اس تار کا دوسرا کنارہ خانے کے بائیں حصے میں نظر نہ آنے والے چھوٹے سے سوراخ میں جا رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ٹرانزسٹر ریڈیو میں کوئی بم موجود ہے تو یہ چابی ہی اس کا فیوز ہے۔ اگر میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتا اور ہدایات ملتے ہی احتیاط کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیل نکال کر چابی کو اٹھانے کی کوشش کرتا تو جھٹکے سے وہ باریک تار ٹوٹ جاتے جو سرسری نگاہ ڈالنے پر دکھائی نہ دیتے تھے۔ پھر شاید ایک دھماکا ہوتا اور میرا وجود ہی باقی نہ رہتا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دشمنوں کے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو جاتا۔

میں نے اس ربِ کریم کا شکر ادا کیا جس نے مجھے زندہ رکھا اور زندہ رہنے کی جدوجہد کے لیے عقل سے کام لینے کی توفیق عطا کی۔ پوری احتیاط سے میں نے تمام سیل سابقہ پوزیشن کے مطابق اسی خانہ میں فٹ کر دیے اور بیک کور کو برابر کر دیا۔ اس کامیابی نے میرا حوصلہ دشمنوں کے عزائم سے کہیں زیادہ بلند کر دیا تھا۔ میرے لیے دامِ اجل بچھانے والے شکاری تدبیر کر چکے تھے کہ میرا کام تمام کر دیا جائے اور انہیں یقین بھی ہو گا کہ وہ میرا پتا کاٹ دیں گے۔ بعد میں دوسرے مسائل پیدا ہوں گے مثلاً رابعہ اور محسن میرے قتل کو واقعات کے پرانے سلسلے کا نتیجہ قرار دیں گے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش بھی کریں گے کہ میرا برطانیہ سے اخراج، وزیر خان کی پُراسرار موت، مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کا الزام اور بالآخر میرا قتل ایک ہی سازش تھی اور یہ سازش کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کو بلا شرکتِ غیرے اپنی ملکیت میں لینا چاہتے تھے تاکہ وہ ایک جائز کاروبار کے نام پر اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکیں لیکن یہ سب کچھ ثابت کرنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ کٹھن کام ثابت ہوتا۔ بالفرضِ محال وہ ہر جرم کا ثبوت فراہم کر دیتے اور ہر مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیتے تب بھی یہ ان کی شکست ہی ہوتی کیونکہ اس سے نہ مجھے میری زندگی واپس مل سکتی تھی اور نہ وہ حق حاصل ہوتا تھا جس کے لیے ہماری سب جدوجہد تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جدوجہد کو جاری رہنا چاہیے خواہ میں خود رہوں یا نہ رہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک جھوٹ بولا تھا کہ میرے بعد حقِ وراثت خود بخود رابعہ کے نام منتقل ہو جائے گا اور رابعہ کی وصیت کے مطابق کسی تیسرے شخص کو اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گا اب میں نے محسوس کیا کہ یہ انتظام مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسا دفاعی نظام تھا جو دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا سکتا تھا۔ اب تک وہ سمجھتے تھے کہ مجھے ہراساں کر کے، لالچ دے کر یا اپنے راستے سے ہٹا کر وہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں لیکن ان کو یقین آ جائے کہ وزیر خان مرحوم کے وارث کے بعد بھی وارث کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ایک کے بعد ایک خود کو حقدار ثابت کرنے کے لیے آتے رہیں گے تو پورے کاروبار پر قابض ہونے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو قتل کر کے فائدہ کچھ نہ ہوا تو مشکلات میں اضافہ کرنے سے کیا حاصل؟ اس کے بعد رابعہ آ جائے گی۔ اگر انہوں نے رابعہ کو ٹھکانے لگا دیا تو محسن میدان میں اترے گا۔ محسن کے بعد شہلا آ سکتی ہے اور دشمن یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میرے وارثوں اور خونِ ناحق کے دعویداروں کا سلسلہ کہاں تک دراز ہو گا۔ جب انہیں احساس ہو گا کہ ان کے مقابل ایک سکندر بخت کے بعد ان گنت سکندر بخت ہیں تو یہی ان کی شکست ہو گی اور یہی میرے لیے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہو گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو پہلا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کام یہی کروں گا کہ اپنا وصیت نامہ بنوا کے رجسٹرڈ کروا لوں گا محسن یا رابعہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے بعد اپنا وارث بنا جاؤں گا اور ان سے بھی کہوں گا کہ وہ میری پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے وصیت نامے کے مطابق کسی کو وارث بنائیں۔ اوّل تو دشمن خود ہی جان جائیں گے کہ ہم نے اپنے دفاعی حصار کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا ہے ورنہ ہم خود اس کی تشہیر کر کے یہ بات ان تک پہنچا دیں گے۔ انہیں سوچنا پڑے گا کہ سکندر بخت کو مارنا بے سود ہے۔

فوری مسئلہ یہ تھا کہ رہائی کی کیا صورت ہو۔ میں نے ٹرانزسٹر کو ایک طرف رکھ دیا لیکن آف نہیں کیا۔ اس کے ڈائل پر سوئی بھی وہیں رہی۔ اگر میں اسے چھیڑ دیتا تو دشمنوں سے دوبارہ مواصلاتی رابطہ قائم ہونے کے امکانات بالکل ختم ہو جاتے۔ ٹرانزسٹر کی صورت میں میرے پاس دشمن کا ایک ایسا خطرناک ہتھیار بھی آ گیا تھا جسے میں ضرورت پڑنے پر خود دشمن کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور اس امید میں "کوئی ہے ۔۔ کوئی ہے" چلاتا رہا کہ شاید کوئی قریب ہو تو میری آواز سن لے یا خالی کوٹھی کا چوکیدار آ گیا ہو تو متوجہ ہو جائے لیکن میری پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ کمرے میں ایک کیل تک نہ تھی جسے ڈور لاک میں گھما کر میں دروازہ کھولنے کی کوشش کر سکتا یا دیوار کھرچ کے پلاسٹر ہٹانے کے بعد ایک اینٹ نکال سکتا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ ایک کیل سے دیوار میں شگاف کرنا حوصلے، مستقل مزاجی اور وقت کی بات تھی۔ چوبیس گھنٹے کی محنت سے یہ کام ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسری جنگِ عظیم میں قید خانوں سے فرار ہونے والوں کی ناقابلِ یقین مگر سچی کہانیاں پڑھی تھیں جو کھانے کے ایک چمچے، ٹین کے ایک ٹکڑے جیسی چاقو، یہاں تک کہ صرف ناخنوں کی مدد سے مہینوں کی محنت کے بعد سرنگ بنا کے نکل گئے تھے۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر دیوار کا سہارا لیا۔ فرش پر پاؤں پھیلائے اور سگریٹ جلا کے اپنے مسائل اور وسائل کا جائزہ لینے لگا۔ پین ٹارچ ختم ہونے کے قریب تھی اور میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ ماچس کی چند تیلیوں سے میں دروازے میں آگ نہیں لگا سکتا تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے ڈور لاک کے اسکرو کھولے جا سکیں۔ یہ امید رکھنا فضول تھا کہ محسن یا رابعہ مجھے تلاش کرتے ہوئے آ جائیں گے۔ زیادہ امید اس بات کی تھی کہ وہ خود بھی کسی نامعلوم مقام پہ قید ہوں گے۔

"سکندرِ اعظم!" ٹرانزسٹر ریڈیو کے اسپیکر نے اچانک کہا۔ "کیا اب بھی زندگی کی آس لگائے بیٹھے ہو؟ جہاں تم ہو وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں جواب دیتے دیتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ دوبارہ رابطے کی کوشش کا مقصد اس بات کی تصدیق کرنا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ ہوں یا ان کی پُرفریب سازش کا شکار ہو چکا ہوں۔ اگر میں بول پڑتا تو انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کی چال ناکام ہو گئی ہے اور میں ٹرانزسٹر ریڈیو میں پوشیدہ بم کے راز سے واقف ہو چکا ہوں یا میں نے ابھی تک ٹرانزسٹر کھول کے چابی نکالی ہی نہیں ہے۔

"کیا بات ہے سکندر بخت! بات کرنا نہیں چاہتے؟"

"مُردے بات نہیں کرتے۔۔۔" دوسری آواز میں کسی نے گالی دی اور ایک قہقہہ سنائی دیا۔

"بکواس مت کرو۔ کیا معلوم وہ جان بوجھ کر خاموش بیٹھا ہو۔" یہ آواز ڈی سلوا کی تھی۔

"یہ ناممکن ہے استاد۔۔۔ اس نے فوراً چابی نکالی ہو گی دروازہ کھولنے کے لیے۔"

"فرض کر اس نے۔۔۔" ڈی سلوا بولا۔

"فرض کیا کرنا استاد! چابی نظر آنے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ اس کا خیال کسی اور طرف گیا ہو۔" دوسرے نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "دھماکے کی آواز نہیں آئی۔"

"ارے استاد! تو بھی کس چکر میں پڑ گیا خواہ مخواہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے چابی نہ اٹھائی ہو اور بعد میں خیال آیا ہو گا کہ چابی کے ساتھ تار بھی بندھے ہوتے ہیں تو اس خیال سے پہلے ہی تار ٹوٹ چکے ہوں گے۔ تار بہت باریک اور کمزور تھے۔ ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جانے والے۔ اسے مہلت ہی کہاں ملی ہو گی کہ چابی واپس رکھ دے۔"

"اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میں فرض کرنے کا قائل نہیں۔ ہمیں خود جا کے دیکھنا پڑے گا۔" ڈی سلوا اپنی بات پر اڑا رہا۔

"تمہاری یہی مرضی ہے تو چلو۔"

آوازیں کم سے کم تین افراد کی تھیں۔ میری خاموشی نے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تو دلا دیا تھا لیکن ان کا استاد کچا کام کرنے کے خلاف تھا۔ اب وہ دیکھنے آ رہے تھے کہ کیا خاموشی کا مطلب کامیابی ہے اور ان کا ٹرانسمیٹر ریسیور دھماکے کے بعد نیست و نابود ہو چکا ہے یا اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے؟

دیکھنا اب یہ تھا کہ وہ کتنے قریب آ کر تصدیق کرتے ہیں۔ آخر ٹرانزسٹر میں کتنا بڑا بم رکھا جا سکتا ہے؟ اس کے اندر خالی جگہ زیادہ نہیں ہوتی اور اس میں اتنا آتش گیر مادہ نہیں بھرا جا سکتا جو آر سی سی پر بنے ہوئے کمرے کی دیواریں ڈھا دے لیکن ایک آدمی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں خصوصاً اس شخص کو جو ٹرانزسٹر ہاتھ میں لیے کھڑا ہو۔ پھر کیا وہ اندر آ کے دیکھیں گے؟ نہیں۔۔۔ وہ دور ہی سے اندازہ کر لیں گے کہ دھماکا ہوا کہ نہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ دھماکے سے دیواریں نہ گریں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ دھماکا آس پاس نہ سنا جائے اور لوگوں کو متوجہ نہ کرے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ویران کوٹھی بدستور ویران پڑی ہے اور آس پاس لوگ جمع نہیں ہیں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور یا تو میں عمداً خاموش رہا تھا یا میں نے مواصلاتی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ سیل نکال کر، سوئی آگے پیچھے کر کے یا صرف ٹرانزسٹر ریڈیو کو آف کر کے رابطہ ختم کیا جا سکتا تھا۔

یہ خیال بہت حوصلہ شکن تھا کہ دشمن دور ہی سے لوٹ جائیں گے۔ اگر وہ اندر آتے تو ان سے مقابلہ کر کے باہر نکلنے کا راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس مقابلے میں میرا مارا جانا بھی ممکن تھا لیکن یہ موت زیادہ قابلِ قبول تھی۔ بصورتِ دیگر مجھے اسی اسٹور روم کی ویرانی میں بھوک اور پیاس کا طویل عذاب جھیل کر مرنا تھا۔ ایک بار پھر میرا ذہن ٹرانزسٹر کی طرف گیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس میں جو بم یا آتش گیر مادہ بھرا ہوا ہے۔ اس کی ہلاکت کا دائرہ بھی محدود ہے، اس سے وہ شخص یقیناً ہلاک ہو سکتا ہے جو اس کے بہت قریب ہو لیکن اگر وہ خود دور ہو پھر؟ اچانک میں نے آزادی کی روشنی کو یوں پھیلتے دیکھا جیسے صبحِ کاذب کے دھندلکے میں صبحِ صادق کا اجالا پھیلتا ہے۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ایک کرن روشن ہو گئی۔ ذہن کے بند دروازے کھلتے گئے اور ایک قابلِ عمل خیال نے میرے ذہن میں جگہ بنا لی۔

جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ بھی پُرخطر تھا۔ جان جانے کے امکانات اس میں بھی تھے مگر یہ امکانات صفر سے بڑھ کر پچاس فیصد ہو گئے تھے۔ کچھ کیے بغیر مرنے سے کچھ کر کے مرنا بہتر تھا۔ پہلے میں نے اپنی قمیص اتاری لیکن کچھ سوچ کے اس کو پھاڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پتلون کے نیچے میں نے انڈرویئر پہن رکھا تھا جس میں دو فٹ سے زیادہ لمبا الاسٹک تھا۔ میں نے پتلون کو بغیر انڈرویئر کے پہنا اور اس کا الاسٹک نکال لیا۔ یہ پتلا سا الاسٹک کھینچنے سے دوگنا لمبا ہو جاتا تھا۔ قمیص کو پھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی صفائی سے بنیان کو پھاڑا اور اسکی گولائی سے انچ چوڑی کئی پٹیاں نکالیں۔ ان سب پٹیوں کو گرہ لگا کر آپس میں جوڑنے سے ایک اتنی لمبی پٹی بن گئی جو کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ گئی۔

اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا جو سب سے زیادہ خطرناک تھا لیکن کامیابی کی امید نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد کر دیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ٹرانزسٹر ریڈیو کا سیل والا خانہ کھولا اور سارے سیل نکال دیے۔ ڈور لاک کی وہ چابی میرے سامنے آ گئی جو زندگی کے راستے کھول سکتی تھی مگر مجسم موت تھی۔ بہت آہستہ آہستہ چابی کو ذرا بھی ہلائے بغیر میں نے اس کے نیچے سے اسفنج کی پتلی تہہ کو نوچ کر ہٹانا شروع کیا۔ نرم ربر کے بستر پر یہ چابی کسی لاش کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بنانے والی کمپنی نے یہ نرم تہہ اس لیے بچھائی تھی کہ سیل سے پلاسٹک کی باڈی کو نقصان نہ پہنچے۔ میں ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے تھوڑا تھوڑا فوم ربر نوچتا رہا۔ تقریباً دس منٹ تک میری جان سولی پر اٹکی رہی۔ اگر غلطی سے بھی میری انگلی سے چابی کو جھٹکا لگ جاتا تو کوئی نہ کوئی تار ٹوٹ جاتا۔ بالآخر میں چابی کے درمیانی حصے کے نیچے سے فوم ربر صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب چابی کے نیچے تین سوت کا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے انڈرویئر میں سے نکلنے والے گول الاسٹک کا ایک سرا اس خلا میں سے گزارا۔ خالی جگہ تقریباً اتنی ہی تھی جتنی الاسٹک کی گولائی۔ آہستہ آہستہ دبانے سے الاسٹک کا سرا دوسری جانب بڑھتا گیا۔ جب اس کی لمبائی چار انچ کے قریب ہو گئی تو میں نے سرے کو تھام کر باقی الاسٹک کے ساتھ وہ گرہ لگائی جو کھینچنے سے کھلنے کے بجائے اور ٹائٹ ہو جائے۔ جب کام مکمل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اس وقت مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی کا احساس ہوا۔ میرا آدھے سے بھی کم رہ جانے والا بنیان قریب ہی پڑا تھا۔ اس سے میں نے ہاتھ اور منہ صاف کیے اور آخری مرحلے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے ٹرانزسٹر کو ایک دروازے سے ملا کر رکھا اور الاسٹک کے لمبے حصے کے ساتھ وہ ڈوری بھی منسلک کر دی جو میں نے بنیان پھاڑ کے بنائی تھی۔ پوری احتیاط کے ساتھ میں اس ڈوری کو مخالف سمت میں آخری گوشے تک لے گیا۔ اب میرے اور اس بم کے درمیان تقریباً بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ زمین پر الٹا لیٹ کر میں نے وہ پوزیشن اختیار کی جس سے میرا چہرہ، سر اور بازو محفوظ ہو گئے۔ میں اب کونے میں منہ دیے سجدے کی حالت میں پڑا تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے ڈوری کو کھینچنا شروع کیا۔ ڈوری میں بہت لچک تھی۔ بنیان کے ٹکڑے بھی الاسٹک کی طرح کھنچ رہے تھے۔ میں ڈوری کو ایک ایک انچ تک کھینچتا گیا۔ ہر بار میرا دل بڑے زور سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دھڑکتا تھا اور میں چند سیکنڈ کے بعد ڈوری کو کچھ اور کھینچ لیتا تھا جب دھماکہ ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ خالی کمرے میں اس کی گونج زیادہ سنائی دی تھی مگر اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ سب خیریت ہے۔ نہ میں زخمی ہوا ہوں اور نہ مجھ پر کمرے کی دیواریں گری ہیں۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ بم زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اگر ٹرانزسٹر میرے ہاتھ میں ہوتا تو میرا حشر بھی وہی ہوتا جو اب دروازے کا ہوا تھا۔ اس کا نچلا حصّہ صاف اڑ گیا تھا۔ قبضے اور لاک کے نکل جانے سے دروازہ صرف اوپر کے ایک قبضے پر قائم رہ گیا تھا اور ٹیڑھا ہوگیا تھا آتش گیر مادے سے چوکھٹ کی خشک لکڑی نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور پٹ ... جل رہا تھا۔ بم کے ٹکڑے قریب کی دیوار پر خراش ڈالتے ہوئے گزرے تھے لیکن آخری کونے تک پہنچتے پہنچتے ان کی قوت کچھ کم ہوگئی تھی اور جو ٹکڑے وہاں تک پہنچے تھے وہ بھی بہت اوپر کے حصّے میں لگے تھے۔ ٹرانزسٹر یا اس ٹرانسمیٹر ریڈیو کا نام و نشان تک نہ رہا تھا۔ میں نے آدھی بنیان کے ٹکڑے کو بھی جلتے دیکھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ چوکھٹ اب آگ کا ایک حلقہ تھی اور میری راہ میں دروازے کا وہ پٹ بھی ایک رکاوٹ تھا جس کی خشک لکڑی سے شعلے اٹھ رہے تھے لیکن میں نے دوڑتے ہوئے جست لگائی اور اس آگ میں سے سرکس کے بازیگر کی طرح صاف گزر گیا۔ باہر گرتے ہی میں پھر اٹھ کر بھاگا۔ دھماکے نے آس پاس کھلبلی مچادی تھی۔ مجھے تین طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے نظر آئے چنانچہ میں نے چوتھی طرف کا رُخ کیا۔ آگ کے پورے مکان میں پھیلنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کیونکہ دروازے کے آس پاس صرف دیواریں تھیں۔ دوسرے دروازے اور کھڑکیاں شعلوں کی دسترس سے دور تھے مگر اندھیری رت میں یہ آگ بھی کسی الاؤ کی طرح سب کو متوجہ کرتی تھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک مختصر سا ہجوم ہوگیا۔ ہجوم میں زیادہ تعداد نوکروں کی تھی جو آس پاس کی کوٹھیوں میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں دروازے کی آگ بجھا دی۔ نہ جانے کہاں سے ان کو پینٹ کے خالی ڈبے مل گئے تھے اور یہ ڈبے انہوں نے اندر ہی کے نلکوں سے بھر لیے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ دھماکا کیسا تھا؟ آگ کیسے لگی ہے؟ یہاں تو نہ آدمی ہے نہ آدم زاد۔

سڑک پر دو تین گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اچانک میں نے رابعہ کی سُرخ خستہ حال فوکس ویگن کو بھی سڑک پر رکتے دیکھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور ابھی وہ دونوں گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ میں ان کے پاس جا پہنچا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

"تم!" ان دونوں نے غیر ارادی طور پر ایک ساتھ کہا۔

"ہاں میں!" میں نے اگلی سیٹ اٹھا کر پیچھے کی سیٹ پر جمپ لگاتے ہوئے کہا۔ "پہلے یہاں سے نکل چلو پھر بات کریں گے۔"

وہ فوراً اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور محسن نے گاڑی چلا دی پیچھے کھڑی ہوئی ایک سفید کار میں سے کوئی شخص چلایا "رُکو اسے!" لیکن پھر کسی کا انتظار کیے بغیر وہ گاڑی لے کر ہمارے پیچھے دوڑا۔ اس نے مجھے کوٹھی میں سے بھاگ کر آتے دیکھا تھا۔ فوکس ویگن صرف ایک منٹ کے لیے رکی تھی اور مجھے لے کر روانہ ہوگئی تھی چنانچہ وہ شخص یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ میں ہی دھماکے اور آتش زنی کا ذمہ دار ہوں اور وہ میرے ساتھی تھے جو عین وقت پر مجھے لے کر فرار ہو رہے تھے۔

"اس کی تو ایسی کی تیسی!" محسن نے کہا۔ "ہم سے دوڑ لگائے گا!" اس نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ ٹوٹی پھوٹی نظر آنے کے باوجود فوکس ویگن اپنے انجن کی کارکردگی کے اعتبار سے بہت بہتر تھی۔ رات کے وقت سڑکیں خالی ہونے کا فائدہ بھی ہوا۔ دس منٹ میں محسن نے دائیں بائیں کئی موڑ کاٹے۔ اس وقت تک ہمارے تعاقب میں آنے والا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور شاید مایوس ہو کر 'مجرموں' کو پکڑنے کا ارادہ بھی ترک کر چکا تھا۔ محسن نے سامنے کے آئینے میں دیکھ کر اپنا اطمینان کیا اور رفتار کم کر دی۔

"سکندر تم زخمی ہو!" رابعہ نے پیچھے مڑ کر تشویش سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں!" میں نے بشاشت سے کہا۔ "تم نے مجھے دوڑتے نہیں دیکھا تھا؟"

"لیکن تمہارے ہاتھوں پر خون کے داغ ہیں!" رابعہ نے کہا۔ "اور تمہارے کپڑوں پر بھی!"

"وہ معمولی خراشیں ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں!" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ اس فلمی طریقہ پر تم دونوں وہاں کیسے پہنچے؟"

"ہم تو بہت دیر سے ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے!" محسن بولا۔ "جب دھماکا ہوا تو ہم دوسری سڑک پر تھے۔ رابعہ نے کہا کہ محسن یہ دھماکا کیسا تھا؟ اور میں نے اندازے سے گاڑی ادھر موڑ لی۔ پھر مجھے آگ لگی ہوئی نظر آ گئی!"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم اس علاقے میں کیسے پہنچے" میں نے پوچھا۔

"ہم رابعہ کے آفس سے نیچے تو اتر آئے تھے!" محسن نے کہا۔ "مگر نیچے ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس میں ایک شخص ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ پھر اس گاڑی میں دو آدمی آ بیٹھے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ ہمیں دوڑ کر اپنی کار تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی لیکن میں نے گاڑی پیچھے لگا دی تھی۔ گاڑی کا نمبر تو میں نے نوٹ نہیں کیا تھا لیکن دو نشانیاں دیکھ لی تھیں۔ ایک یہ کہ سیدھے ہاتھ کی ٹیل لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے اور دوسری یہ کہ اس کا رنگ لال ہے۔ زمزمہ کے پاس میں نے اس گاڑی کو پہچان لیا۔ وہاں پیچھا کرنا آسان تھا کیونکہ آس پاس بہت سی گاڑیاں تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ گاڑی زیادہ رفتار سے نہیں جا رہی تھی اور مسلسل ایک دوسری گاڑی کے پیچھے چل رہی تھی۔ میں نے دونوں گاڑیوں کے نمبر دیکھ لیے اور آگے جا کے تصدیق ہوگئی کہ وہ دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ ہیں۔ جب غیر آباد علاقہ آیا تو لال گاڑی نے اپنی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور ہمارے لیے بھی کم فاصلے سے پیچھے لگے رہنا مشکل ہوگیا۔ ہم تقریباً ایک فرلانگ دور رہے اور ہم نے بھی ہیڈ لائٹس بند رکھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کچھ شک ہوگیا تھا۔ وہ ہمیں ڈاج دے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم اس علاقے میں تو پہنچ ہی گئے تھے۔ اچانک ایک گاڑی ہمارے سامنے سے نمودار ہوئی اور سیدھی گزر گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں ٹکر ہو جاتی، چنانچہ میں نے لائٹس جلا دیں۔ آخری وقت میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو وہی گاڑی ہے جو لال گاڑی کے آگے آگے چل رہی تھی لیکن اب وہ واپس جا رہی تھی اور اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ میرے کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل ہی وہ غائب ہوگئی۔ اس کا کہیں ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا؟"

"ہاں اس کا ذمے دار میں ہوں!" میں نے کہا۔ "گاڑی روکنے کی کوئی اور صورت نہیں رہی تھی!"

"اس طرح گاڑی روکنے سے پہلے آپ نے غور فرما لیا تھا کہ آپ خود بھی ٹوٹ پھوٹ سکتے ہیں؟" رابعہ نے کہا۔

"غور فرما لیا تھا!" میں نے کہا۔ "لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ میرے لیے یہ خطرہ مول لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا اور خطرات تو اب زندگی کا ایک ایسا جزو بن گئے ہیں کہ خوف کا کوئی مفہوم نہیں رہا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جس روز ہماری زندگی کے حالات معمول پر آ گئے اور کوئی خطرہ باقی نہ رہا اس روز یہ زندگی بالکل بے کیف اور سپاٹ ہو جائے گی۔ بالکل عام لوگوں کی زندگی کی طرح کہ ع

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یونہی تمام ہوتی ہے!"

"تمہارے لیے عام آدمی کی زندگی بے مصرف اور غیر دلچسپ ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ معمولات کے مطابق جیتے ہیں؟ ان کے لیے جینے میں کوئی مسرت کی بات نہیں ہے کیونکہ اس میں خطرات کی سنسنی خیزی نہیں ہے؟ کیسا عجیب فلسفہ حیات ہے تمہارا۔ لوگ تو قدم قدم پر خوشیوں کے خزانے تلاش کر رہے ہیں کیونکہ خوشی تو صرف ایک احساس کا نام ہے۔ تمہاری بات کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ خوبیٔ تقدیر سے تم زندہ رہے تو بڑی بدبختی یہ ہوگی کہ تمہارا احساس مر جائے گا!"

"یہ وکیلوں کی طرح الفاظ سے غلط مطلب اخذ کرنے کا کمال دکھایا ہے تم نے!" میں نے کہا۔ "حالانکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آدمی ہوں مشین نہیں چنانچہ میں جذبات سے محروم نہیں، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سنسنی خیز مسرت کا وہ احساس مجھے نہ ہو جو ہر کامیابی عطا کرتی ہے، وہ محبت عطا کرتی ہے جس میں دردِ فرقت کے بعد شبِ وصل کی راحت کا یقین ہو۔ جو تخلیق کے غرور سے ملتی ہے۔ نقطہ ساز سے، رنگ سے اور خوشبو سے۔ یہاں تک کہ ایک ایٹم بم گرا کے لاکھوں انسانوں کو مار دینے کے بعد فتح کے اعلان سے ملتی ہے!"

"تم دونوں خبطی اور جھکی ہو!" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔ "ذرا موقع ملا اور پٹڑی سے اتر گئے۔ ملاحظہ ہو کہ بات کیا ہو رہی ہے سارے بابا یہ سوچو کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!"

"تو نے تو مجھے حیران کر دیا یار!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم لوگ غصّے میں انگریزی بولتے ہیں تو فارسی بولتا ہے!"

"ابھی یہ انگریزی فارسی سب دھری رہ جائے گی!" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔ "جب رضوی صاحب یہ پوچھیں گے کہ آخر سواری کہاں سے تشریف لا رہی ہے اور جناب کا یہ حلیہ کیا ہو رہا ہے؟"

"ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچتے ہی تم دونوں فرار ہو جاؤ!" رابعہ نے کہا۔ "میں اتر کر اندر چلی جاؤں گی اور میرا بیان صاف ہوگا کہ آفس سے آ رہی ہوں۔ تم دونوں شریفانہ حلیہ بنا کے کچھ دیر بعد آ سکتے ہو۔ بہلانے بنانے تو تمہیں آتے ہی ہیں!"

"بجا ارشاد!" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو رضوی صاحب

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

ہمیں باہر ہی مل گئے۔ انتظار اور اضطراب میں ٹہلتے ہوئے تو گاڑی سے اترتے ہی وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور پھر وہی ہوگا یعنی مجھ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ ہمارا جھوٹ نہیں چلے گا، اس لیے میں ترکیب نمبر دو عرض کرتا ہوں۔ یعنی مس رابعہ کے پروگرام پر عمل درآمد کا موقع نہ ملا تو پھر سب سے مناسب یہی ہوگا کہ حقیقتِ حال عرض کر دی جائے۔ اس میں آخر نقصان ہی کیا ہے۔"

"میں اتفاق کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "لیکن حقیقتِ حال میں سے استاد ٹیڈی کو خارج کر دیا جائے۔ باقی سب وہی ہو جو ہوا اور سب نے دیکھا۔ رضوی صاحب جانتے ہیں کہ ہمارے دشمن کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، اب تک کیا کر چکے ہیں اور آئندہ کیا کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ہم نے تعاقب کیا، باقی سکندر خود بتا دے گا۔"

رضوی صاحب باہر نہیں تھے ان کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ کوئی اور گاڑی ہوتی تو ہم خاموشی سے اتر کے ترکیب نمبر ایک پر عمل کر لیتے مگر فوکس ویگن تو دور سے اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ ابھی ہم نے گاڑی روکی بھی نہیں تھی کہ وہ باہر نکل آئے۔

"آ گئے آپ لوگ؟" انہوں نے ہمیں مجرموں کی طرح خاموش کھڑا دیکھ کر کہا۔ "وقت کیا ہو رہا ہے؟"

ہم نے باری باری ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ سب کی صورت پر بارہ بج رہے تھے مگر گھڑیوں میں ایک بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔

"ہم ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے انکل!" رابعہ نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

"یہ اندازہ تو سکندر کا حلیہ دیکھ کے بھی ہو جاتا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولے۔ "مصیبت یہ ہے کہ تم لوگ مصیبت سے دامن بچا کے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ خود مصیبت میں گرفتار ہونے چلے جاتے ہو۔ آج کیا ہو گیا تھا؟ خیر بعد میں بتانا۔ پہلے اندر آؤ۔ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"

"بس آج خدا نے بچا لیا ہم کو۔" رابعہ نے اندر پہنچنے کے بعد کہا۔ "کچھ لوگ سکندر کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"اچھا تم جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔" رضوی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "کھانا وغیرہ کھایا ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو دھکے ہی کھائے ہیں۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اور اب آپ کی جھاڑ کھا رہے ہیں۔"

رضوی صاحب مسکرائے۔ "اچھا تم بھی جاؤ اور دیکھو! کھانے پینے کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ میں محسن سے بات کرتا ہوں۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نہا دھو کر خراشوں کو ڈیٹول سے صاف کر کے اور کپڑے بدل کے واپس پہنچا تو محسن خاموش بیٹھا تھا اور رضوی صاحب ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور دوسرے ہاتھ میں پائپ لیے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ رضوی صاحب نے اپنا سارا غصہ محسن پر اتار لیا ہے۔ پانچ منٹ بعد رابعہ ٹرے اٹھائے اندر آئی اور ہم بلا تکلف کھانے میں لگ گئے۔ رضوی صاحب نے آدھی کہانی محسن کی زبانی سن لی تھی۔ اپنے قید ہونے اور قید سے نکلنے کا احوال میں نے کھانے کے دوران میں بتا دیا۔ رضوی صاحب سنتے رہے اور کمرے میں ٹہلتے رہے۔ رابعہ کچن میں چائے کے لیے پانی رکھ آئی تھی۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔

"تم دوبارہ اس مکان تک پہنچ سکتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"براہِ راست تو نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ رات کا وقت تھا اور وہ نئی آبادی ہے۔ سب سڑکیں ایک جیسی لگتی ہیں لیکن گھوم پھر کر دیکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ میں کوٹھی کو دیکھ کر پہچان لوں۔ اس کے علاوہ آس پاس کے رہنے والوں سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ دھماکا دور تک سنا گیا تھا اور بہت سے لوگوں نے دروازے کی آگ بھی دیکھی تھی۔"

رضوی صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جہاں تک میرا خیال ہے دونوں کاریں چرائی گئی ہوں گی یا ان کی نمبر پلیٹ بوگس ہوگی۔ مکان کے اصل مالک سے کچھ پوچھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا لیکن جائے واردات پر۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کمرے میں سے بم کے ٹکڑے مل سکتے ہیں اور ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بم کس کا تھا۔ ہمارے ریکارڈ پر بہت سے ماہرین کے نام ہیں جو پسِ پردہ رہ کر مجرموں کی مدد کرتے ہیں مثلاً جعلی دستاویزات بنانے والے۔ خصوصاً پرانی تاریخوں کے اسٹامپ پیپر فروخت کرنے والے۔ عدالتوں کی مہریں اور دستخط بنانے کے ماہر۔ ہر قسم کی روشنائی تیار کرنے والے۔ جھوٹے گواہ اور ضامن فراہم کرنے والے۔۔۔ لیکن یہ کچھ دہشت گردی کا کیس ہے۔ ہمارے ملک میں تو کوئی دہشت پسند تنظیم موجود نہیں مگر دوسرے ملکوں میں ہر نظریے کے یا حکومت کے حامی اور مخالفین کی خفیہ تنظیم ہے مثلاً بلیک ستمبر یا بلیک سنڈے۔ اور ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ ان کے پاس اتنے فنڈز ہیں کہ وہ ہر قسم کا اسلحہ اور ماہرین کی خدمات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ قتل و خونریزی تو ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہے لیکن اس کے بیشتر اسباب وہی پرانے ہیں یعنی زر، زمین اور زن کے جھگڑے جن میں روایتی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ لاٹھی، خنجر یا بندوق اور ریوالور مگر ٹرانزسٹر ریڈیو کے اندر بم چھپانا تو خصوصی فنی مہارت کا کام ہے۔ ریڈیو کو دو طرفہ مواصلاتی رابطے کے قابل بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بھی اچھا ریڈیو مکینک عام پرزوں کی مدد سے ریڈیو بھی اسمبل کر سکتا ہے اور ٹرانسمیٹر بھی۔ لیکن ٹرانسمیٹر رکھنا ہمارے قوانین کے مطابق بہت سنگین جرم ہے۔ یہ بڑی آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نشریات کہاں سے جاری ہیں۔ ہمارے پاس آلات ہیں جو ریڈیو کی لہروں کی اسی طرح نشاندہی کر دیتے ہیں جیسے قطب نما کی سوئی شمال کی نشاندہی کرتی ہے اس لیے یہاں کوئی شخص ٹرانسمیٹر بنانے یا رکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ تاہم یہ آسان کام ہے۔ اس کے اندر بم چھپانا اور فیوز لگانا دوسری قسم کی مہارت ہے۔ یہ کام کوئی سابق فوجی ماہرِ اسلحہ کر سکتا ہے لیکن میں وطن کے محافظوں سے ایسی ضمیر فروشی کی توقع نہیں رکھتا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ سرحد پار سے ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ آ گئے ہوں لیکن ابھی تک تخریب کاری کی کوئی واردات بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"آپ ایک حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کا رابطہ باہر کی دنیا سے بھی ہے اور وہ خود بھی باہر آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سامان وہ باہر سے لایا ہو۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے پاس مزید تباہ کن اسلحہ موجود ہے۔ تمہیں یقین ہے کہ تم نے ڈی سلوا کی آواز پہچان لی تھی؟"

"مجھے کوئی شبہ نہیں۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ "دوسری گاڑی میں ڈی سلوا ہی تھا۔"

رابعہ چائے لے کر اندر آ گئی اور رضوی صاحب بھی بیٹھ گئے تھے۔ تفکرات کے آثار ان کی صورت سے عیاں تھے۔ چائے پیتے ہوئے بھی وہ کچھ سوچتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ محسن کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ اسے میں نے رضوی صاحب کی ناراضگی کا نتیجہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم کو اس واقعے کی رپورٹ پولیس کو لکھا دینی چاہیے۔" رضوی صاحب نے کسی فیصلے پر پہنچ کے کہا۔ "تمہیں یقین ہے تو صاف کہو کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ مکان تو ایک گھنٹے میں مل جائے گا اور وہاں گواہ بھی ہوں گے۔ اگر بم کے ٹکڑے دستیاب ہو گئے تو ہماری لیبارٹری کے ماہرین بم کی ساخت کے بارے میں قطعی رپورٹ دے سکیں گے۔ اس کے بعد تفتیش کا رُخ موڑا جا سکتا ہے اور ڈی سلوا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ بیرونِ ملک وہ کہاں کہاں جا چکا ہے اور اس کا رابطہ کن افراد سے رہا ہے۔ پیرس بہت ہی دہشت پسند سرگرمیوں کا مرکز ہے کیونکہ وہاں ہر جلا وطن کو پناہ مل جاتی ہے اور قوانین کچھ ایسے ہیں کہ جب تک فرانس کو یا عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو ہر شخص کو سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ اگر تفتیش کے دوران ڈی سلوا خود ہی قبول کرے کہ وہ باہر سے اس قسم کا ممنوعہ سامان لایا تھا اور یہ سامان برآمد ہو جائے تو اسے عمر قید تک ہو سکتی ہے۔ اگر تم رپورٹ لکھوانے کے لیے تیار ہو تو اسی وقت چلے جاؤ۔ رپورٹ میں دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ صبح پولیس اسے طلب کرے گی اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گی تاکہ تم جائے واردات کی نشاندہی کر سکو۔"

"رپورٹ لکھوانے سے تو میں نہیں ڈرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو پولیس کا طریقۂ تفتیش۔۔۔ اس میں بہت وقت ضائع ہوگا۔ ڈی سلوا اپنے پیسے اور اثر و رسوخ سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ تفتیش کرنے والے، اسلحہ کی رپورٹ دینے والے اور گواہی دینے والے سب اسی معاشرے کے فرد ہیں جس میں رشوت کا مرض کینسر کی طرح جڑ پکڑ چکا ہے۔ معلوم نہیں کتنے سچ سے مکر جائیں گے اور اگر کوئی سچ بولنے والا ہر قسم کے دباؤ کے باوجود اڑا رہا تب بھی یہ مسئلہ فوراً حل نہیں ہوگا۔ کیس عدالت میں چلتا رہے گا اور فیصلہ معلوم نہیں کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری خاطر آپ پولیس پر دباؤ ڈالیں اور خواہ مخواہ اختیارات کے ناجائز الزام سے بدنام ہوں۔ اب بھی دشمنوں کا خیال ہے کہ میں آپ کو ڈھال اور تلوار بنا کے استعمال کر رہا ہوں۔ سازشی ذہن رکھنے والے آپ کے افسرانِ بالا کی رائے کو متاثر کر سکتے ہیں کہ آپ میری پشت پناہ بنے ہوئے ہیں حالانکہ مجھ پر قتل کا الزام ہے۔"

"اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "میں عدالت کے معاملات میں تو دخل نہیں دے رہا ہوں۔ مقدمے کا جو فیصلہ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ فرض کرو قتل کا الزام میرے بیٹے یا بھائی پر ہوتا تو کیا میں اسے گھر سے نکال دیتا؟"

"آپ کو کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"لیکن مجھ سے آپ کا سہارا چھیننے کی خاطر یہ تو کر سکتا ہے کہ آپکو اس شہر سے ٹرانسفر کرا دے اور آپ کے لیے پریشانی پیدا ہو جائے یہاں آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو رہنے کے لیے اچھی جگہ ملی ہوئی ہے اور آپ کے بچے ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کو ایس پی سانگھڑ بنا کے بھیج دیا جائے، آپ کیا کریں گے؟ اکیلے جائیں گے تو ایک مستقل مسئلہ گھر سے عدم موجودگی کا اور آنے جانے کا۔۔۔ سب کو ساتھ لے جائیں تو مزید پریشانی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے معاملات سے بالکل بے تعلق رہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک میں اس گھر میں رہوں گا، آپ کے لیے بے تعلق رہنا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"فیصلہ میں نے کیا ہے۔" مجھ سے پہلے رابعہ نے جواب دیا۔ "سکندر میرا مؤکل ہے اور اس سے میرا کیس خراب ہو سکتا ہے۔ اگر وکیل استغاثہ یہ نکتہ اٹھا دے کہ ملزم کو اعلیٰ پولیس آفیسروں کی حمایت حاصل ہے جو ناجائز دباؤ ڈالتے ہیں تو ضمانت تک منسوخ ہو سکتی ہے اور آپ کے لیے بھی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سکندر کرائے پر مکان لے لے اور محسن کے ساتھ رہے۔"

"اس شہر میں لوگ عموماً اکیلے آدمی کو مکان نہیں دیتے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"مکان خریدا بھی جا سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "زیادہ بڑا نہ سہی کوئی چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"چھوٹے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کسی پرانی، غلیظ اور گنجان بستی میں دو کمرے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلاشبہ وہاں بھی انسان رہتے ہیں اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان میں انسانیت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن کیا سکندر اس ماحول کا پروردہ ہے؟ خود تم اور محسن کس ماحول کے عادی ہو؟"

"ضرورت کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں کسی ایسی ہی گمنام آبادی میں رہوں۔" میں نے کہا۔ "اور خود رابعہ بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ اسباب وہی ہیں جو رابعہ نے بتلائے۔"

"مجھے کچھ ایسے لگتا ہے کہ اتفاق رائے سے تم کوئی فیصلہ کر چکے ہو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "رابعہ بھی جانا چاہتی ہے۔ تم بھی جانا چاہتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ فی الوقت تمہارے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ مکان خریدنے کی سوچ سکو، لیکن رابعہ کے پاس یقیناً ہوگا۔ اگر تم دونوں نے شادی کر کے نیا گھر آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے صاف بتا دو۔"

رابعہ نے فوراً چائے کے برتن سمیٹے اور کمرے سے نکل گئی اور میں نے دیکھا کہ رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"ایک تو وہی پرانا محاورہ ہے کہ کچھ چیزیں چھپائی نہیں جا سکتیں۔" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر زیر لب مسکرا کے کہا۔ "پھر کچھ اپنی عمر کا تجربہ، کچھ ملازمت کی نوعیت اور کچھ حالات ایسے ہیں کہ مجھے دو اور دو چار نظر آتے ہیں۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ چار ہی ہوتے ہیں۔ ایک طرف رابعہ کی ضروریات ہیں مثلاً ایک ذاتی مکان جو پہلے تھا اور اب نہیں ہے مگر وہ چاہے تو بنا سکتی ہے۔ احساسِ عدم تحفظ وغیرہ۔۔۔ دوسری طرف تمہاری ضروریات ہیں اور تمہارا مستقبل ہے۔ کمی تم کو بھی کسی چیز کی نہیں ہوگی۔ روپیہ پیسہ تعلیم سب ہے۔"

"بس بس انکل!" میں نے کہا۔ "میں آپ کی بات سمجھ گیا لیکن میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ابھی شادی یا خانہ آبادی کے کسی پروگرام پر کسی نے غور نہیں کیا اس لیے کہ دوسرے مسائل زیادہ اہم ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد کیا ہوگا، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے میں باعزت طور پر بری ہو جاؤں لیکن منزل کے امکانات کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے تو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ ہونے سے پہلے کسی لڑکی کے مقدر کا فیصلہ کروں۔ خود پھانسی لٹک جاؤں یا عمر قید پا کے جیل کی دیواروں کے پیچھے بند ہو جاؤں تو اسے بیوہ کر جاؤں یا دنیا میں رسوا، لاوارث اور تنہا چھوڑ دوں۔ فیصلہ ہونے میں زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔ کون بدبخت ہوگی جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ ادھورا سہاگ قبول کرے گی اور مانگ کی افشاں بھرنے سے پہلے بیوگی کے خیال کو گلے لگائے گی۔ کم از کم رابعہ کو میں ایسی سزا نہیں دے سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بیوی بن کر وہ میرا مقدمہ لڑے اور ہار جائے تو میری وارث بن کے کسی روز صبح دم میری لاش لینے جیل کے دروازے پر انتظار کرے۔ دو اور دو واقعی چار ہو سکتے ہیں لیکن آج نہیں۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم دونوں بالغ ہو اور سمجھدار ہو، اپنے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے کے مجاز بھی ہو کیونکہ تمہیں کسی سے اجازت نہیں لینی۔ تمہارے والدین، حقیقی چچا، ماموں وغیرہ کوئی نہیں جو اپنی بزرگی کی ٹانگ اڑا سکیں۔ اگر ہیں تو ہم جیسے رشتے کے انکل۔ میں یا شیروانی صاحب۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"آپ مجھے بے عزت کر رہے ہیں انکل!" میں نے آزردہ ہو کے کہا۔ "کیا میرے رویے سے آپ کو کبھی یہ احساس ہوا کہ میں سرکش اور نافرمان ہوں یا والد کے بعد اب آپ کو اپنا سرپرست نہیں سمجھتا؟ ایک آپ اور ایک انکل شیروانی میرے بزرگ، چچا یا ماموں جو کچھ ہیں آپ ہیں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں گے کہ رابعہ سے شادی مت کرو تو۔۔۔"

"میں یہ حکم کیسے دوں؟" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "غالباً وہ وقت گزر چکا ہے جب میں یہ حکم دے سکتا تھا اور تم سے تعمیل کی امید بھی رکھ سکتا تھا لیکن اب میں یہ حکم نہیں دوں گا۔ تم مجھے اختیار دے چکے ہو، اس کے باوجود نہیں دوں گا۔"

ان کے لہجے میں اچانک دکھ اور بے بسی کا کرب اتر آیا تھا۔ وہ اعصابی کشیدگی کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ پائپ جسے وہ مضبوطی سے پکڑے بیٹھے تھے بہت دیر پہلے بجھ چکا ہے۔ ان کا دوسرا ہاتھ سختی سے کرسی کے بازو پر جما ہوا تھا اور نظریں میری بجائے محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر میں نے محسن کو دیکھا۔ وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور وہ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی تھی جو ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھی۔ شاید اس وقت جب میں اپنا حلیہ ٹھیک کرنے گیا ہوا تھا اور رابعہ کھانا لینے باورچی خانے چلی گئی تھی۔

"انکل رضوی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "محسن۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"محسن تمہاری بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔" رضوی صاحب نے پائپ کی راکھ کو ایش ٹرے میں ڈالا اور پائپ کو کھرچ کر صاف کرنے لگے۔ "تم ایک سوال کا جواب ایمانداری سے دو گے؟" انہوں نے پائپ میں تمباکو بھر کے انگوٹھے سے دبانا شروع کیا اور میز سے ماچس اٹھائی۔ "تم نے فوزیہ سے شادی نہ کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں کیا وہ درست ہیں؟"

"یہ اسباب تو میں نے کبھی آپ کے سامنے بیان نہیں کیے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، مگر آج میری شیروانی صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔" انہوں نے پائپ کے تمباکو پر جلتی ہوئی دیا سلائی رکھی اور ایک کش لیا۔ "انہوں نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اطلاع دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ پریشان تھے۔ میں نے شیروانی صاحب کو زندگی میں پریشان ہوتے تو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج وہ ٹیلی فون پر بات کرتے رو پڑے۔ یونہی جب کوئی پچاس سال کی عمر کا آدمی جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو، رونے پر مجبور ہو جائے اور وہ آدمی دوست ہو، جیسے محسن تمہارا دوست ہے۔ بھائی سے زیادہ عزیز ہو۔۔۔ تو دل ٹوٹنے لگتا ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ فوزیہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ صرف کوشش۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی مگر ناکام رہی۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ شیروانی صاحب اس کیس کو دبانے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں۔"

مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا کہ محسن کب اٹھ کر چلا گیا۔ "انکل رضوی!" میں نے کہا۔ "آپ کے سوال کا جواب محسن بہتر طور پر دے سکتا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اصل مجرم تو میں ہوں اور مجھے بھی تقدیر نے مجرم بنا دیا ہے۔ زندگی حالات کے اس موڑ پر لے آئی ہے جہاں میں اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس جرم کی سب سے سخت سزا صرف میرے لیے ہے۔ میرے لیے ایک نہیں، عذاب کے دو جہنم ہیں۔ میں یہ فرض کرنے پر بھی مجبور ہوں کہ مجھے ایک جنت آباد کرنی ہے۔" میں نے ان کو وہیں بیٹھے چھوڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی چل رہی تھی اور مجھے محسن کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو محسن اپنے دونوں ہاتھ تکیے پر سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا اور چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "فوزیہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں محسن جس سے میں مطمئن ہو جاؤں کہ خطرہ ٹل گیا۔" میں نے بستر پر بیٹھ کے کہا۔ "اگر کوئی جینا نہ چاہے تو اسے مرنے سے کون روک سکتا ہے۔ ایک کوشش کی ناکامی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی دوسری کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔"

"یار! یہ لڑکیاں بہت جلد ہمت ہار دیتی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "فوزیہ نے ناز و نعم میں پرورش پائی۔ زندگی میں اسے وہ سب کچھ ملا جو اس نے چاہا۔ اس نے حالات کی سختی کبھی نہیں جھیلی۔ ناکامی کا صدمہ نہیں اٹھایا اور محرومی کے آزار سے ہمیشہ بچی رہی لیکن ایسی لڑکیاں تو بہت ہیں۔ خوشحال گھرانوں کی ہر فکر و غم سے ناآشنا اور زندگی کو صرف خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے والی، کیا وہ سب اتنی ہی بزدل ہوتی ہیں اور خودکشی کو مسائل کا حل سمجھتی ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں محسن کہ سارا قصور میرا ہے۔۔۔"

"نہیں یار!" محسن اٹھ بیٹھا۔ "یہی تو میں بتانا چاہتا تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ فوزیہ جیسی لڑکی نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا؟ وہ میری بہن ہے اور میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تصور وار میں بھی ہوں۔ وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتی ہے اور اسے یقین ہے کہ میں ان حالات میں اس کو سہارا دے سکتا ہوں۔ ممی اپنے آگے کسی کی نہیں چلنے دیتیں اور ڈیڈی خود کو مجبور دیکھتے ہیں تو کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں بند ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی بلا سے، کچھ بھی ہوتا رہے۔ آج جب میں نے ٹیلی فون کیا... ابھی کچھ دیر پہلے جب تو کپڑے بدلنے گیا ہوا تھا تو میری بات ممی سے ہوئی۔ حسب توقع انہوں نے کہا: فوزیہ مرتی ہے تو مر جائے۔ تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں تم ہماری فکر کیوں کرتے ہو؟ اچھا ہوا کہ فون ڈیڈی نے لے لیا۔ میں نے کہا کہ مجھے فوزیہ سے بات کرنی ہے تو انہوں نے سی۔ ایم۔ ایچ کا نمبر دیا۔ اس وقت لائن فوراً مل جاتی ہے نا۔ دو منٹ بعد میں نے ہسپتال کا نمبر ملایا اور بتایا کہ میں فوزیہ کا بھائی ہوں اور لاہور سے بول رہا ہوں تو انہوں نے چیک کیا اور فوزیہ کے کمرے کی لائن دے دی۔ وہ جاگ رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی رونے لگے گی بلکہ مجھے تو ڈر تھا کہ اس جذباتی بحران کی کیفیت میں کہیں اس پر ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے لیکن وہ بہت پر سکون تھی۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا کہ بھائی جان مجھے سکندر سے کوئی گلہ نہیں۔ ان کی خوشی میری خوشی ہے۔ میرا ہرگز ان کو دکھ پہنچانے یا احساس جرم میں مبتلا رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں ان کے بغیر زندہ رہ سکتی تھی لیکن میں چراغ دین سے شادی کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر میں چاہوں تب بھی یہ ناممکن ہے۔ وہ مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا۔ معلوم نہیں اس بات کا کیا مطلب تھا جو میں فوراً نہ سمجھ سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ فوزیہ بس اتنی سی بات تھی۔ مجھ سے یہ وعدہ کر کہ دوبارہ ایسی کوئی حماقت نہیں ہو گی اور چراغ دین کی طرف سے بے فکر ہو جا۔ اگر وہ چراغ الدین بھی لے آئے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گا۔ میرے جیتے جی تجھ پر کوئی جبر نہیں کر سکتا اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ پھر کوئی بے وقوفی نہیں کرے گی۔ اسے مجھ پر کتنا اعتماد ہے سکندر...!"

میں نے محسوس کیا کہ احساس جرم و پشیمانی، مایوسی اور بے چارگی اور رنج و الم کا ایک پہاڑ جتنا بوجھ کم ہونے لگا ہے جس کے نیچے میری روح بھی کراہنے لگی تھی۔

"اس سے زیادہ میری بات نہ ہو سکی۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ اطمینان ہی کیا کم تھا کہ اس نے خود ٹیلی فون اٹھا کے مجھ سے بات کی اور مجھ سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ زندہ رہے گی لیکن اس وقت سے میں سوچ رہا ہوں کہ فوزیہ کی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ماضی کو بھول کر بھی زندہ رہ سکتی ہے لیکن چراغ دین کے ساتھ نہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ دین کے بجائے کوئی اور ہوتا تو وہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی؟ یعنی وہ کسی بھی معقول آدمی سے شادی کر کے گزارا کر سکتی ہے مگر چراغ دین اسے قطعی ناقابل قبول ہے۔ اس حد تک کہ وہ اس کے مقابلے میں موت کو ترجیح دے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ اسے تو چراغ دین کے بارے میں وہ سب باتیں معلوم نہیں جو مجھے یا تجھے معلوم ہیں۔ ایک عام لڑکی کے نقطۂ نظر سے چراغ دین میں کیا خامی ہے۔ وہ بدکردار اور عیاش بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان خرابیوں کا شکار نہیں جو دولت سے خریدی جا سکتی ہیں۔ فوزیہ تو یہ بھی جانتی ہے کہ وہ مریم باجی سے کتنی محبت کرتا تھا اور خود مریم اپنی ازدواجی زندگی سے کتنی مطمئن اور خوش تھی پھر چراغ دین سے اتنی شدید نفرت کیوں؟"

"تیرے خیال میں فوزیہ کی چراغ دین سے اس نفرت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے تمام حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نفرت نہیں ہے سکندر، خوف ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہی بات تو میں تجھے سمجھانا چاہتا تھا۔ فوزیہ نے کہا تھا کہ وہ چراغ دین کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی لیکن دوسرے جملے میں یہ بات زیادہ واضح ہو گئی۔ اس نے کہا کہ چراغ دین مجھے زندہ ہی نہیں رہنے دے گا۔ اس سے نفرت کا نہیں خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر اسے یہ ڈر کیوں ہے کہ چراغ دین اسے مار ڈالے گا؟ عورت کی فطرت میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ وہ جس مرد کے ساتھ گزارا کرنا چاہے کر سکتی ہے وہ ہر ماحول سے مطابقت کرنا جانتی ہے اور خود اپنے حالات کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صلاحیت فوزیہ میں بھی ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ چراغ دین کو فرشتۂ اجل کے روپ میں دیکھتی ہے اور ڈرتی ہے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے کہا۔ "آخر ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے۔ مجھے تو چراغ دین سے ایک پرانا حساب چکانا ہے۔ میری نفرت اور دشمنی کے جذبات کا ایک سبب ہے۔"

"یہی بات تو میرے لیے الجھن بنی ہوئی ہے۔" محسن نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں ایک بار پھر فوزیہ سے بات کروں اور اس سے وضاحت طلب کروں کہ یہ کیا چکر ہے۔"

میں فوزیہ سے وعدہ کر چکا ہوں جو مجھے بہر صورت پورا کرنا ہے۔ مجھے فوزیہ کی زندگی کے لیے ہزار چراغ دین بھی قتل کرنے پڑیں تو میں کروں گا۔ اس کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اس نے پہلے بھی میری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس روز بھی میں نے سوچا تھا کہ یہ جھگڑا ختم کر دوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اس کو قتل کرنے گیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "تو صبح صبح غائب ہو گیا تھا اور واپسی پر تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔"

"ہاں۔ اس دن مجھے موقع نہیں مل سکا۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ میں نے اس لیے بولا تھا کہ کہیں تو میرے ارادوں کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔"

اب صبح ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں تھوڑا سا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ میں کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور پھر دہلیز پر بیٹھ گیا۔ میری کمر چوکھٹ کے ایک کنارے سے لگی ہوئی تھی اور میرے پاؤں دوسرے کنارے کو چھو رہے تھے۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر میں نے ٹکڑے کو فضا میں اچھال دیا اور یہ ٹکڑا دم دار ستارے کی طرح اندھیرے میں ایک روشن لکیر بنا کے غائب ہو گیا۔ میری نظر صبح کے ستارے پر گئی اور مجھے فوزیہ کا خیال آیا کہ اگر وہ مر گئی ہوتی تو کیا صبح کا یہ ستارہ مجھے ایسے ہی روشن نظر آتا؟ اس کے بعد آسمان کتنا تاریک اور ویران ہوتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ کیا وہ بھی جاگ رہی ہو گی؟ اور ہسپتال کے پرائیویٹ روم کی کھڑکی سے اسی طرح ستارۂ صبح کو دیکھ رہی ہو گی؟ مجھے ٹیگور کی بات یاد آئی۔ میرا محبوب بہت دور ہے۔ پھر میں چاند کو کیوں نہ دیکھوں، اسی جگہ تو میری اور اس کی نظریں ملتی ہیں...؟ سونے کا اب کوئی امکان اور فائدہ نہ تھا۔ شاید محسن نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی کیونکہ وہ بستر سے اٹھ کر چائے بنانے کے لیے کچن میں چلا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک میدان کارزار تھا، جس میں ہر طرف سے خیالوں کے غنیم یلغار کر رہے تھے۔ میرے اپنے مسائل پیچھے ہٹ گئے تھے اور فوزیہ کی زندگی کا مسئلہ، چراغ دین کی موت کے مقابل آ گیا تھا یہ انتہائی اہم اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ غلام آقا بن گیا تھا اور آقا غلام اور غلام نے اپنے پرانے آقا کو ذلت اور بے بسی کی موت عطا کی تھی۔ اسی چراغ دین نے برسوں پہلے مریم نام کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جو محسن کی بڑی بہن تھی اور اچھا جا محسن اس شادی میں شریک نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مریم کے ساتھ زور زبردستی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی اور کو چاہتی تھی لیکن بعد میں سب کچھ بھول بھال گئی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کسی کو چاہے اور فراغت کی زندگی میسر ہو تو اس چاہت کو بھول جائے؟ کیا یہ ناممکن ہے کہ مریم بعد میں بھی اس سے ملتی رہی ہو جسے وہ چاہتی تھی اور اس کی حادثاتی موت حادثے کا نتیجہ نہ ہو؟ محسن نے ابھی اپنے ایک دوست کا عجیب واقعہ سنایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس کے ذہن میں بھی کہیں شک کا کوئی زہریلا سانپ سر اٹھا رہا تھا کہ چراغ دین نے اپنی بیوی کو مروا دیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مریم کے بچے اس کے نہیں ہیں؟ فوزیہ اور مریم میں فطرت کے اعتبار سے زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ مریم انتہائی ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دولت اور عزت کے درمیان بقائے باہمی کا کوئی سمجھوتہ طے پا گیا ہو؟ چراغ دین نے مریم کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی ہو؟ میں نے محسوس کیا کہ میں اسی طرح سوچتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے خیالات کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میرے مفروضات بے بنیاد تھے اور میری سوچ کی راہ واہموں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ حقائق کی دنیا میں ان کی کوئی قیمت نہ تھی۔ چراغ دین پر غبن کا الزام کسی عدالت انصاف میں ثابت نہیں ہوا تھا۔ پھر محسن کیا ثابت کرے گا؟ اسے تو قتل کرنا پڑے گا۔ اس نے نہ کیا تو یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔ مجھ پر ایک قتل کا الزام پہلے ہی ہے۔ دوسرے قتل کا الزام بھی کسی نہ کسی کو اٹھانا ہو گا کیونکہ قتل ثابت ہو جاتا ہے۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا۔ انجام وہی رسوائی، دکھ اور پشیمانی، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ چراغ دین مجرم تھا لیکن اس نے عقل سے کام لیا تھا چنانچہ وہ محفوظ رہا تھا۔ ہم جذبات سے کام لیں گے تو کونسی عقل مندی کریں گے۔ دشمن بہادر ہو تو بہادری سے مقابلہ کرنے میں مزہ ہے لیکن عیاری اور مکاری کے جواب میں بہادری کے جوہر دکھانا بے وقوفی ہے۔"

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں محسن!" میں نے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔ "کہ میرا اور تیرا مسئلہ جذبات سے نہیں، عقل سے کام لے کر حل ہو گا۔ سانپ کو مرنا چاہیے اور لاٹھی کو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ اس وقت تو بھی مشتعل ہے اور میں بھی انتقامی ردعمل کا شکار ہوں۔ یہ کام بالکل اسی طرح ہونا چاہیے جیسے چراغ دین نے کیا تھا۔ وہ آج تک کسی بھی گرفت میں نہیں آیا۔ اس کا پتا ایسے صاف ہونا چاہیے کہ خود اسے بھی خبر نہ ہو اور ہم میں سے کسی پر حرف نہ آئے۔"

"تیری بات جی کو لگتی ہے لیکن سوچ بچار میں وقت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے ہاتھ سے نکل جانے کا ڈر ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کہا۔" اس پر عمل درآمد میں وقت ضائع ہونے کا کوئی سوال نہیں بشرطیکہ ایک شخص ہماری مدد کرے اور وہ شخص ہے استاد ٹیڈی۔ مجھے امید ہے وہ آج شام کو رابعہ کے آفس آئے گا یا کہیں سے ٹیلی فون کرے گا۔ اپنے مقتول دوست کے معاملے میں وہ سخت جذباتی ہو رہا ہے اور اس کی بڑی بہن سے مل کر تعزیت کرنے کے علاوہ اسے یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ قاتل سے انتقام ضرور لے گا۔ اگر شہلا اس سے کہے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔"

"سب کچھ کیا؟" محسن نے کہا۔" ان معاملات میں اسے کیوں لاتا ہے؟"

"مجھے ذرا سوچنے دے۔" میں نے کہا۔" شاید شام تک میں تفصیل سے بتا سکوں۔ آج مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو مجھے رابعہ کے ساتھ جا کے کوئی مناسب سا مکان دیکھنا ہے وہ ایک مکان خریدنا چاہتی ہے جو اس کی اور ہماری ضروریات پوری کر سکے۔ اس کا گرا ہوا مکان تو ملبے کا ڈھیر ہے لیکن وہ زمین بہت قیمتی ہے۔ کچھ نقد سرمایہ رابعہ کے پاس بھی ہے۔ ہم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کریں گے جتنی رقم نقد ہے وہ لے لے اور مکان کا قبضہ فوراً دلا دے۔ باقی رقم رابعہ کے گھر کی زمین کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دی جائے گی۔ اس پلاٹ کو بکنے میں دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ مجھے پوری امید ہے کہ ہر پراپرٹی ڈیلر — یہ سودا بہت خوش ہو کے کرے گا۔ ڈبل کمیشن کا معاملہ ہے نا۔ پہلے مکان کی خرید پر پھر پلاٹ کی فروخت پر اور سودا بھی' اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے' والا ہے۔ جس میں دیر کا کوئی امکان نہیں۔"

"اور دوسرا کام؟" محسن بولا۔" اس کے لیے آج وقت ملے گا؟"

"وقت کا مسئلہ واقعی ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "البتہ ہم کام تقسیم کر لیں تو مشکل حل ہو سکتی ہے مثلاً رابعہ اپنے مکان کے انتخاب کا مسئلہ مجھ پر چھوڑ دے۔ اسے میری پسند پر اور قوتِ فیصلہ پر اعتبار ہے اس لیے وہ مان جائے گی۔ وہ خود چلی جائے شہلا کی طرف۔ شہلا کی ماں کو بھی بتا دے کہ وہ اب ہمارے ساتھ رہیں گی اور ماسی کو بھی تیار کرے۔ ہو سکتا ہے کل تک ادائیگی ہو جائے اور ہم سب نئے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ ایک نیا خاندان وجود میں آ جائے۔ ماں' بیٹے' بہن' بھائی کے سارے مقدس رشتوں کی

بنیاد پڑ جائے جو خون کے رشتوں سے زیادہ استوار ثابت ہوں' زیادہ پر خلوص ہوں اور زیادہ سچے ہوں۔ تجھے پتہ ہے شہلا نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا ہے؟"

"اب تک تو معلوم نہیں تھا' مگر اب ہو گیا ہے۔" محسن بولا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ خواب میں ہو۔" یار سکندر! رشتوں کی آبرو بھی کیا چیز ہے۔ کیسی جنت ہوگا وہ گھر جس میں کوئی رشتوں کا بھرم رکھنے پر مجبور نہیں ہوگا اور جذبے سچے ہوں گے۔ سو فیصد خالص اور بے غرض جہاں کوئی اپنے شجرہ نسب کی بات نہیں کرے گا۔ الگ الگ راستوں سے ایک منزل پر جمع ہو جانے والوں کی کامیابی کتنی مکمل ہوگی۔ شاید بہت جلد آلام و مصائب کا یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا اور رابعہ کا گھر تیرا گھر کہلائے گا.....؟"

"اسٹاپ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔" خواب سے واپس حقیقت کی دنیا میں آ جا اور سن کہ دوسرا کام کیا ہے۔ تجھے الماس کے والدین کی موت اور ان کے گھر میں آتشزدگی کے بارے میں پولیس کی رپورٹ وغیرہ دیکھنی ہے اور اگر ممکن ہو تو اس کی نقل بھی حاصل کرنی ہے۔ متعلقہ تھانے کا عملہ اب تک بدل چکا ہوگا اس لیے کام دشوار نہیں۔ کسی محرر یا تھانیدار کو سو کے نوٹ دکھانا، وہ داخلِ دفتر ہو جانے والے کیس کی فائل تیرے حوالے کر دے گا۔ بعد میں کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑی تو الزام کسی پر بھی نہیں آئے گا کہ فائل کس نے گم کی۔ جانے والوں نے یا آنے والوں نے۔"

"نو پرابلم۔" محسن نے کہا۔" یہ کام ہو جائے گا۔"

"اب ایک مسئلہ ایسا ہے جو صرف رابعہ حل کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔" اس کو شہلا سے ایک بات پوچھنی ہے جو میں نہیں پوچھ سکتا۔ جس رات میں اور رابعہ پہلی بار اس کے گھر پہنچے تھے تو ڈی سلوا نے وہاں آ کے شہلا سے کچھ باتیں کی تھیں ان کی خلش ابھی تک میرے دل میں باقی ہے اور حالات کے زیادہ خراب ہونے سے پہلے کوئی نہ کوئی بندوبست ایسا ہونا چاہیے کہ شہلا مزید رسوائی سے بچ جائے۔"

"میں تیری بات سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔" لیکن میں رابعہ سے کیا کہوں اور کیسے کہوں؟"

"زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" ویسے بھی وہ وکیل ہے اور اس مسئلے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ تو اس سے کہنا کہ تلخ کلامی کے دوران میں ڈی سلوا نے شہلا پر کچھ الزامات عائد کیے تھے اور شہلا نے بھی کسی حد تک اعترافِ جرم کیا تھا۔ اس بات میں کس حد تک صداقت ہے کہ خدانخواستہ وہ ماں بنی تو ڈی سلوا کی باتوں میں آ کے گمراہ ہو جانے کی سزا ہو گی۔ رابعہ نے ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ خود اپنے طور پر معلوم کرے گی۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔"

ساتھ والے کمرے میں سے کانسٹیبل جماہیاں لیتا برآمد ہوا اور ہماری طرف دیکھے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ دس منٹ تک ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔ کانسٹیبل غسل کرتے ہوئے یہ آوازیں حلق' ناک اور منہ سے نکال رہا تھا۔ جب وہ اپنی وردی پہن کر چلا گیا تو ہم نے تیاری شروع کی۔ میں نے شیو اور غسل سے فارغ ہو کے ناشتہ بنانے کا عمل شروع ہی کیا تھا کہ کانسٹیبل پھر نمودار ہوا۔

"صاحب نے یہ خط دیا ہے۔" اس نے ایک لفافہ آگے بڑھایا اور واپس جانے لگا۔

"میاں تھانیدار صاحب!" میں نے کہا۔" ذرا توقف فرمائیے۔ شاید کوئی جواب طلب بات ہو۔" میں نے لفافہ کھولا۔ اسی وقت محسن بھی باتھ روم سے نکل آیا۔" کون تھانیدار؟ یہ اپنے ہمسائے تھانیدار ہو گئے ہیں؟ بھئی بہت بہت مبارک۔" محسن نے زبردستی کانسٹیبل سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ وہ تولیہ لے جانا بھول گیا تھا، کانسٹیبل کی ساری وردی بھیگ گئی۔

"آپ بڑے غلط لوگ ہیں۔" اس نے خود کو چھڑا کے کہا۔" ہمیشہ غلط کام کرتے ہیں۔"

میں نے لفافے میں سے برآمد ہونے والے پرچے کو دیکھا اس پر ہال روڈ کی ایک دکان کا پتہ اور ایک شخص کا نام لکھا ہوا تھا۔

"اچھا ہم ایک صحیح کام کرتے ہیں۔" محسن نے مذاق جاری رکھا۔" ہم صاحب سے کہہ کے تمہیں واقعی تھانیدار بنوا دیتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ صاحب ہمارا کتنا خیال کرتے ہیں۔"

کانسٹیبل نے بے یقینی سے محسن کو دیکھا۔" میں تھانیدار بن سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے رقعہ جیب میں رکھ کے کہا۔ "ہماری خدمت کرو اور ہمیں خوش رکھو۔ ہم تمہاری سفارش کر دیں گے۔"

"جنابِ عالی! بندہ تو ویسے ہی آپ کا غلام ہے۔" کانسٹیبل نے عاجزی سے کہنا شروع کیا۔" بس آپ حکم دیں۔" ترقی پا کے تھانیدار بن جانے کا خیال اس کے لیے معراج سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سابقہ رویے پر شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور ہمارے قدموں میں لوٹنے کے لیے تیار تھا۔

"حکم تو ابھی کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔" بس خدمت کے لیے تیار رہو۔ ہر خدمت کے لیے۔ اب جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم ہنستے رہے اور سوچتے رہے کہ اس شخص سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں نے محسن کو وہ نام اور پتہ بھی دکھایا جو رضوی صاحب نے لکھ بھیجا تھا۔ ہم دونوں کی رائے ایک ہی تھی۔ ہال روڈ کا یہ ریڈیو مکینک رضوی صاحب کی نظر میں تھا تو یقیناً ہمارے لیے بھی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد رابعہ آ گئی اور اس بات پر بہت ناراض ہوئی کہ ہم یہاں اکیلے ناشتہ کر رہے ہیں۔ ادھر گھر میں بھی سب ناشتہ کر چکے ہیں لیکن ہمارے انتظار میں وہ بھوکی بیٹھی ہے۔ ہم نے کہا کہ خفگی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہم دوبارہ اس کے ساتھ بھی ناشتہ کر لیں گے۔ رضوی صاحب جا چکے تھے۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ رات بھر سوئے نہیں اور جانے سے پہلے انہوں نے ٹیلی فون پر اسلام آباد میں شیروانی صاحب سے بات کی تھی اور پھر سی۔ ایم۔ ایچ کے کسی کرنل سے۔ فوزیہ آج گھر واپس چلی جائے گی۔ یہ اطلاع دینے کے بعد انہوں نے ہمیں اطمینان سے ناشتہ کرنے کے لیے کہا اور خود کسی کام کا عذر پیش کر کے چلی گئیں۔ رضوی صاحب کی بیگم بالکل ویسی ہی عورت تھیں جو کسی اعلیٰ پولیس افسر کی بیوی بن کے بھی خوش رہ سکتی ہو۔ اس کی تمام توجہ اور دلچسپی اپنے گھر شوہر اور بچوں تک محدود تھی۔ گھر سے باہر کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے، یہ اس نے کبھی اپنا دردِ سر نہیں سمجھا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کو ہمارے معاملات کی خبر ہی نہ ہو لیکن اس کے لیے ہم گھر کے فرد تھے یا مہمان تھے چنانچہ وہ میزبانی کے فرائض سے سروکار رکھتی تھیں اس نے کبھی تجسس ظاہر نہیں کیا تھا اور ہماری پُراسرار مصروفیات اور معاملات کے متعلق کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم پر کبھی بزرگی یا سرپرستی کا رعب ڈال کر ہمیں شرمندہ کرنے کی اور راہِ راست پر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بے نیازی میں بے رخی کا دخل بالکل نہیں تھا۔ شائستگی اور اخلاق اس کے مزاج کا حصہ تھی اور اس کا مزاج تغیر سے ناآشنا تھا۔

ہم سنجیدگی سے دوبارہ ناشتہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے لیکن رابعہ نے کہا۔" تمہاری سزا یہی ہے کہ پورا ناشتہ ختم کرو خواہ بدہضمی ہو یا پیٹ پھٹے۔" بعد میں محسن نے دوسرے کمرے سے اپنے گھر فون کیا اور شیروانی صاحب سے بات کرتا رہا۔ اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وقفے میں میں نے رابعہ سے مکان کی خریداری کے مسئلے پر بات کی۔ اس نے کہا کہ مرضی کا کیا سوال' اسے میری پسند اور میرے فیصلے پر اعتماد ہے' بس میں جیسا چاہوں کروں۔ پھر محسن آگیا اور میں ٹیلیفون کرنے کے بہانے چلا گیا، لیکن میں نے کسی کو فون نہیں کیا۔ مجھ میں فوزیہ سے اس کی خیریت معلوم کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کی ماں سے بات کرتا تو گالیاں اور کوسنے سنتا اور شیروانی صاحب سے کہتا تو کیا کہتا؟ میں دروازے سے لگ کر محسن اور رابعہ کی گفتگو سننے لگا۔

"بات یہ نہیں ہے رابعہ!" محسن کہہ رہا تھا۔ "کہ سکندر تمہیں ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔ اسے فوزیہ کی حماقت یا رضوی صاحب کی بات سے دکھ ضرور ہوا ہے، لیکن تمہارے لیے اس کے جذبات میں فرق نہیں پڑا ہے۔"

"ایک بات کہوں محسن' بُرا مت ماننا۔" رابعہ نے کہا۔ "تم جیسا بھائی اور تم جیسا دوست میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سارے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود تم دونوں رشتوں کو نبھا رہے ہو۔ انگریز کہتے ہیں کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوب جاتا ہے۔ تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تم انصاف نہیں جبر کر رہے ہو۔"

محسن کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں رابعہ! جبر کا احساس مجھے اس لیے نہیں ہوتا کہ میں زندگی کے تقاضوں کو جذباتی مسائل نہیں بناتا۔ آدمی کی پسند اور ناپسند کا معیار عمر کے جذبات کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے کیونکہ اس کی شخصیت بدلتی ہے۔ سکندر بخت کو جتنے قریب سے میں نے دیکھا ہے کسی اور نے نہیں دیکھا ہے۔ اس کے باپ نے بھی نہیں جس نے سکندر کو ہمیشہ دور رکھا اور یہ ہی دعویٰ میں اپنی بہن کے بارے میں کروں تو غلط نہیں ہوگا۔ ان دونوں کے بارے میں میرا یہ فیصلہ قطعی غیر جانبدارانہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ دن تو خوش رہ سکتے تھے۔ تمام عمر خوش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ دونوں کی فطرت کے تقاضے الگ ہیں جو بالآخر جذبات پر غالب آجاتے۔ شاید وہ ذمہ داریوں کے بوجھ کو گھسیٹتے رہتے اور خوش دکھائی بھی دیتے... شاید وہ الگ ہو جاتے اور ایک دوسرے کی زندگی میں دکھ کے کانٹے بھر جاتے۔ اب جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ آج کا چھوٹا سا صدمہ ایک عمر کے روگ سے بہتر ہے۔"

دروازے کے پیچھے میں منجمد کھڑا تھا۔ محسن جھوٹ بول رہا تھا یا سچ ہ اگر وہ فریب دے رہا تھا تو کیسے ہ رابعہ کو یا اپنے آپ کو ہ ہر صورت میں محسن اپنے آپ پر جبر کر رہا تھا اور سب کو خوش رکھنے کے لیے خود قربان ہو رہا تھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ تمہیں ایک اور کام کرنا [illegible] تمہیں آج شہلا کے پاس جانا ہے۔ وہاں پہلے تو تم [illegible] اس کی ماں کو یہ بتاؤ گی کہ اب وہ ہمارے ساتھ رہیں گی [illegible] یہ معلوم نہیں کہ کہاں لیکن آج کل میں کوئی بندوبست ہو [illegible] گا۔ ان کا جو سامان پُرانے گھر میں ہے وہ بعد میں کسی [illegible] نکال لیا جائے گا۔ شہلا مان گئی تو اس کی ماں کیسے نہیں [illegible] گی۔ وہ اس کی حقیقی ماں تو ہے نہیں' پھر تم ماسی کو رضا [illegible] کرو گی لیکن اس سے زیادہ اہم کام جو تمہیں کرنا ہے [illegible] ہے... یعنی تمہیں شہلا سے اکیلے میں رازداری کے ساتھ [illegible] کرنی ہے۔ اس کے اور ڈی سلوا کے تعلقات... کی [illegible] کے بارے میں۔"

"وہ تو تم بھی جانتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "میں [illegible] موضوع پر کیا بات کروں۔"

"نہیں' وہ باتیں میں نے نہیں سنی ہیں جو تم نے [illegible] تھیں۔" محسن بولا۔ "اس رات سکندر بخت تمہارے [illegible] تھا نا۔ جب دونوں شہلا کے گھر گئے تھے ــــ پھر [illegible] ڈی سلوا آگیا تھا اور کچھ گرما گرمی ہوئی تھی۔ ڈی سلوا نے [illegible] شہلا نے ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دیا تھا۔ [illegible] ہو کہ الزام کیا تھے اور اب تمہیں شہلا سے پوچھنا ہے کہ [illegible] کہ معاملات کس حد تک آگے بڑھ چکے تھے۔ اور [illegible] سچ تھے یا... جھوٹ ہیں۔"

"میں معلوم کر لوں گی۔" رابعہ نے کہا اور اسی وقت [illegible] اندر آگیا۔

رابعہ کو صدر بازار میں ماسی کے گھر ڈراپ کر کے [illegible] نے شام پانچ چھ بجے تک لوٹ آنے کا وعدہ کیا اور [illegible] کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اسے پولیس اسٹیشن کے قریب [illegible] کے میں روانہ ہونے لگا تو محسن نے اِدھر اُدھر دیکھ کے جیب [illegible] ریوالور نکالا اور مجھے تھما دیا۔

"اسے اپنے ساتھ رکھو، حالات زیادہ خطرناک ہو [illegible] جا رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "ویسے بھی میرا ناجائز اسلحہ لے [illegible] پولیس اسٹیشن میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔" میں نے ریوالور [illegible] کو احتیاط سے چھپایا اور ہال روڈ کی طرف چل پڑا۔ [illegible] بیشتر دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ میں نے گاڑی کو [illegible] جگہ روک دیا اور رضوی صاحب کا دیا ہوا پتہ تلاش [illegible] لگا۔ وہ دکان نسبتاً بہت چھوٹی تھی اور بڑے سائن [illegible] بورڈ والی الیکٹرانکس کی دکانوں کے درمیان دکھائی نہ دیتی تھی لیکن دوسرے چکر میں میری نظر نے وہ چھوٹا سا سائن بورڈ دیکھ لیا جس پر لکھے ہوئے حروف صاف طور پر پڑھے بھی نہ جاتے تھے۔ دکان بند تھی لیکن دس منٹ بعد نئے ماڈل کی ایک خاصی مہنگی کار دکان سے کچھ دور رُکی کار کو ایک عورت چلا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مرد کو خدا حافظ کہا اور گاڑی میں سیدھی نکل گئی۔ مرد نے سڑک پار کر کے دکان کا دروازہ کھولا۔ باہر لوہے کی گرل تھی جو سمٹ کر ایک طرف ہوگئی۔ ایک پٹ کا شیشے والا دروازہ سامنے آگیا جس میں عام قسم کا ڈور لاک تھا۔ پانچ منٹ بعد میں دکان میں جا پہنچا۔

"امین صاحب!" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "کیا حال ہے آپ کا ہ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

امین ابھی جھاڑ پونچھ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ فرش پر اور الماریوں میں ناکارہ، نامکمل اور خراب ٹی وی اور ریڈیو ٹرانزسٹر، ان کے فاضل پرزے اور مرمت میں کام آنے والے آلات بھرے پڑے تھے۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہاتھ ملا کے کچھ سوچتا رہا۔

"معاف کیجیے، میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔" وہ بالآخر حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"ارے بھائی امین صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ بھلا ہمیں کیوں پہچاننے لگے۔ ویسے بھی آپ اس شہر میں سب کو پہچاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ پہنچنے والے پہنچ ہی جاتے ہیں۔" میرے لہجے نے اس کو چوکنا کر دیا۔

"کوئی کام ہے آپ کو ہ ریڈیو' ٹی وی ٹھیک کرانا ہے؟" وہ بولا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے کہا۔ "یہ کام تو سب کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے ہم آپ کو تکلیف دیں گے؟"

"اور کیا کام ہے؟" وہ محتاط ہو کے بولا۔ اس کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔

"امین صاحب! میں دس ہزار تک دینے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تین دن میں کام ہو جائے گا؟"

"میں سمجھا نہیں آپ کیا چاہتے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "دس ہزار کس کام کے؟"

"دیکھو مسٹر امین! یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "کام وہی ہے جو تم پہلے بھی کر چکے ہو۔"

"میں صرف ریڈیو اور ٹی وی ٹھیک کرتا ہوں۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"تم کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے' یہ سب مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری گاڑی کا رنگ کیا ہے اور نمبر کیا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کی یہ گاڑی تم نے کب خریدی اور کیسے خریدی۔ جن لوگوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے سب بتا دیا ہے۔"

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" وہ اب نروس ہو رہا تھا۔ "تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"مجھے ڈی سلوا نے بھیجا ہے۔" میں نے اچانک سنجیدہ ہو کے کہا۔ "اب سمجھے؟ تم نے اس کے لیے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو اور ٹرانسمیٹر کا یونٹ بنایا تھا اور اس میں ایک بم رکھا تھا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"میں فضول بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے ریوالور نکال کر سامنے رکھ لیا۔ "اگر معاوضہ کم ہے تو منہ سے بکو کتنا چاہیے لیکن کام تین دن میں ہوگا ورنہ" میں نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح لہجے کو خطرناک بنا کے ریوالور کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ "بھیجنے والے خود تم سے نمٹ لیں گے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پرسوں شام کو آجانا۔" اس نے اداکاری چھوڑ کے یکلخت کاروباری لہجہ اختیار کر لیا۔ اس کا یہ خوف دور ہوگیا تھا کہ یہ پولیس کا پھیلایا ہوا جال نہ ہو۔ ناجائز کاروبار کرنے والوں کے لیے اپنا اطمینان ضروری ہوتا ہے اور شاید ان کی بھی کوئی چھٹی حس ہوتی ہے جو بتا دیتی ہے کہ خطرہ موجود ہے یا نہیں ہ

میں نے ریوالور جیب میں رکھا۔ جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ یوں نکالے جیسے ان کی حیثیت ردی کاغذ سے زیادہ نہیں اور اس کے سامنے پھینک دیے۔ "یہ آدھی رقم ہے' باقی کام کرنے پر۔" میں نے کہا۔

اس نے نوٹوں پر ایک نگاہ ڈالی لیکن ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "کام ہو جائے گا لیکن یہ ڈی سلوا کون ہے؟" وہ بولا۔

"ڈی سلوا تمہارا باپ ہے اور کون۔" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے غرا کے کہا۔ میرے باہر نکلنے تک وہ اسی طرح بیٹھا تھا اور بعد میں بھی مجھے دیکھنے کے لیے باہر نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آیا۔ اسے یقین آ چکا تھا کہ میں کسی بہت بڑے بدمعاش کا نمائندہ ہوں۔ ڈی سلوا کے نام پر اس کی حیرانی جائز تھی۔ وہ سمجھا ہوگا کہ یہ بھی کوئی بڑا بدمعاش ہی ہے کیونکہ ڈی سلوا نے بھی کسی اور کو ہی بھیجا ہوگا۔ یہ بعید از قیاس بات تھی کہ ڈی سلوا نے خود آ کے اپنے آپ کو صحیح نام سے متعارف کرانے کا خطرہ مول لیا ہو۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا تھا۔ رضوی صاحب کو شہر بھر کی خبر تھی اور انہوں نے مجھے ایک نام پتہ فراہم کر دیا تھا۔ انہیں میری ذہانت پر اتنا اعتماد ضرور تھا کہ میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکوں گا۔ ڈی سلوا نے بھی ایمن کی خدمات حاصل کی تھیں یا نہیں اور فنی مہارت کے ایک کام کا کیا معاوضہ دیا تھا، یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ تاہم میرا اندازہ میرے کام آیا اور دس ہزار میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ خود کو بہت زیادہ چالاک اور طاقتور سمجھنے والے دشمن کی خوش فہمی دور کرنا اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ اگر وہ شکاری تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مجھے آسانی سے شکار کر لیں گے تو میں ان پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شکاری میں بھی ہوں اور ان کو انہی کے ہتھیاروں سے شکار کر سکتا ہوں۔

اس کامیابی نے میرے حوصلے کو ہمالیہ پہاڑ سے بھی اونچا کر دیا تھا۔ یہ سب خدا کی مدد تھی کہ لندن سے ڈی پورٹ ہو کے وطن لوٹنے والا، لاوارث اور لاعلم سکندر آج اتنے اعتماد کے ساتھ دشمنوں کے خلاف صف آرا تھا اور اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا دشمن جو سمجھتے تھے کہ سکندر کو چوہے دان میں پھنسنے والے چوہے کی طرح شکار کیا جا سکتا ہے، پریشانی اور خوف کا شکار ہونے لگے تھے۔ میں نے حالات کی ہر سختی جھیلی تھی اور ہر قربانی دی تھی لیکن امید کا دامن کبھی نہ چھوڑا تھا۔

دوپہر کے بعد میں نے تین مکان دیکھے۔ ان میں سے صرف ایک فوری طور پر دستیاب تھا اور کسی حد تک ہماری ضروریات کو بھی پورا کرتا تھا لیکن میں نے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ شام تک تلاش جاری رکھنے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے میں نعمت کدہ گیا۔ وہاں معمول کے مطابق تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مجھے کچھ دیر کوئی سیٹ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک اور شخص میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، سرخ و سفید چہرہ، قابل رشک صحت، سیاہ شیروانی اور کلف دار طرے والی پگڑی۔ ہاتھ میں عصا اور انداز میں رعونت۔ بالکل کسی روایتی نواب یا والئی ریاست یا بہت بڑے جاگیردار کی جیتی جاگتی تصویر۔ میں نے صرف ایک بار اسے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی نظریں میرا جائزہ لے رہی ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے سارا شہر اسی وقت ولیمہ کھانے آ گیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

ولیمے کے نام پر مجھے بھی ہنسی آئی کیونکہ لوگ ندیدوں کی طرح کھا رہے تھے۔ "در اصل معقول نرخ پر اچھا کھانا ہر جگہ نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔ "باقی جگہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والی بات ہے۔"

اسی وقت ایک میز خالی ہوئی اور میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے اس والئی ریاست کا خیال آیا اور میں نے پلٹ کر کہا۔ "آپ بھی آ جائیے۔ میرا خیال ہے دو شریف آدمی ایک میز پر کھانا تو کھا ہی سکتے ہیں۔" اس نے فقط سر ہلایا اور میرے مقابل بیٹھ گیا۔ ہم نے اپنی اپنی پسند کے مطابق آرڈر دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی کوئی بات نہیں کی۔ شرمندگی مجھے اس وقت ہوئی جب اس نے دونوں بل اٹھا کر ویٹر کو سرکا کر تھما دیا۔

"یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اپنی بات یاد کرو۔" وہ دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بولا۔ "یہ زیادتی کیسے ہو گئی۔ بھئی ہم دونوں شریف آدمی ہیں۔ دونوں نے ایک جگہ بیٹھ کے کھانا کھا لیا۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ تم نے اپنی پسند کا کھایا اور اپنے ہاتھوں سے کھایا۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ سارا بل آپ نے کیوں ادا کیا۔" میں نے خفت سے کہا۔

"اور کیا آدھا بل دیتا؟ ایک طرف خود کو شریف آدمی کہتے ہو۔ دوسری طرف بیس بائیس روپے کی بات شمار کرتے ہو۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے یہ بہت چھوٹی بات ہے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ اخلاقاً میں نے کہا۔ "میں تو اب اجازت چاہوں گا کیونکہ مجھے شام تک سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈنا ہے۔ اگر آپ کو کہیں جانا ہو"

"میری گاڑی وہ کھڑی ہے۔" اس نے چھڑی سے اشارہ کیا اور میں اس کی چمکتی دمکتی شاندار مرسڈیز کو دیکھ کر مزید شرمندہ ہوا۔ "تم کیا اپنے لیے کرائے کا مکان تلاش کر رہے ہو؟" وہ بولا۔

بات بالکل غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل گئی۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ "جی نہیں، میں کوئی مکان خریدنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں!" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کتنی مالیت کا؟ صرف اپنے لیے چاہیے یا فیملی بھی ہے؟ در اصل میں خود اپنا ایک مکان بیچنا چاہتا ہوں۔ بہت دن سے خالی پڑا ہے۔"

"مجھے مکان چاہیے جس میں کم سے کم چار بیڈ روم ہوں۔ پانچ یا چھ بھی ہوں تو مضائقہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ڈرائنگ ڈائننگ وغیرہ کے۔ اگر دو منزلہ ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ دو یا کم سے کم ایک گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ہو اور بہتر ہے کہ کسی نئی آبادی میں ہو۔ فاصلے کی کوئی قید نہیں۔"

"واہ میاں واہ۔" وہ شخص اپنی بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "یہ تم اپنی پسند بتا رہے ہو یا میرے مکان کا نقشہ بیان کر رہے ہو؟"

"میرے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس رقم کچھ کم ہے لیکن ایک پلاٹ ہے جو محل وقوع کے اعتبار سے کمرشل بن سکتا ہے۔ کراؤن سینما والی سڑک پر، سینما سے چند قدم دور۔ مجھے امید ہے کہ اس کی بڑی اچھی قیمت ملے گی اور وہ کھڑے کھڑے بک جائے گا۔ باقی رقم پلاٹ کی فروخت کے بعد ادا کی جا سکتی ہے۔ میں ہر قسم کی شخصی ضمانت بھی فراہم کر سکتا ہوں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہوا؟" اس نے چھڑی کو عادت کے مطابق گھمانا شروع کیا۔ "تم میرے ساتھ چلو اور مکان دیکھ لو۔ پسند آ جائے تو کل جو کچھ ہے لے آنا، مکان تمہارا، باقی پھر سہی۔ مجھے کوئی جلدی تو نہیں ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے قدرت میری مدد پر آمادہ ہے اور میری تلاش آج ہی ختم ہو جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس شخص کے ساتھ جانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں، اس کی شاندار گاڑی کے مقابلے میں چھکڑا نظر آنے والی گاڑی لے کر پیچھے چل پڑوں یا اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں کہ اس نے مجھے بازو تھام کے کھینچ لیا۔

"اپنی گاڑی اسی جگہ رہنے دو۔" وہ بولا۔ "میرا شوفر تمہیں پھر یہاں چھوڑ جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں رکشا ٹیکسی لے کر آ جاؤں گا۔" ابھی تک میں نے اس کے شوفر کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم گاڑی کے قریب پہنچے تو وہ دروازہ کھولنے کے لیے اچانک نمودار ہوا اور میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ سو فیصد اپنے آقا کی تصویر تھا۔ ان کے ناک نقشے، قد و قامت، حلیے اور لباس میں سرمو فرق نہ تھا۔ عام دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ جڑواں بھائی ہیں اور ان میں اتنی محبت ہے یا ان کی پسند بھی اتنی ملتی ہے کہ دونوں ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ میں اپنے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے تو میں کسی فرق سے مالک یا شوفر کو پہچان سکتا۔ وہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ شوفر پیچھے والی سیٹ ک [illegible] زہ تھامے باادب کھڑا رہا۔

"بات در اصل یہ ہے میاں!" ا [illegible] پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ کر [illegible] م ری [illegible] لوگ ہیں۔ گاؤں کے رہنے والے مگر جدی پشتی [illegible] راز ہیں۔ میرے آبا و اجداد کو انگریزوں نے ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک قانون بنایا تھا کہ کسی راجہ مہاراجہ یا نواب کا وارث نہیں ہوگا تو اس کی موت کے بعد ریاست خود بخود برطانوی سلطنت کا حصہ بن جائے گی۔ یہ قانون الحاق تھا۔ اس کے نفاذ سے پہلے راجے مہاراجے اور والیان ریاست کسی کو گود لے لیتے تھے تو بعد میں وہ تخت و تاج کا مالک ہو جاتا تھا۔ انگریز نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ بعد میں کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہوئے کہ وائسرائے ہند نے ہمارے دادا کو تقریباً اتنی ہی بڑی جاگیر بخش دی جتنی بڑی ریاست تھی اور دلی دربار میں ان کی پذیرائی ہوئی۔ یہ وفاداری کا انعام تھا یا غداری کا صلہ، جو چاہو سمجھ لو، کیونکہ یہ الگ ایک کہانی ہے۔ جو جاگیر ان کو ملی وہ بدقسمتی سے پہلے کسی ہندو راجہ کی ملکیت تھی۔ وہ خود بغاوت کے دوران مارا گیا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن کو توپ دم کر دیا گیا۔ تین بیٹوں کے سات لڑکے تھے جو اس زمانے میں شیر خوار تھے چنانچہ ان کی جان بچ گئی۔ بیوہ ہو جانے والی تینوں عورتیں جان بچا کے نکل گئیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں رہیں۔ لیکن سفر کے دوران میں رانی بھی مر گئی اور مرتے مرتے انتقام کی وصیت کر گئی۔ یہی اس کے سات پوتوں کی ماؤں نے کیا۔ ان تینوں نے مرتے وقت بیٹوں کو قسم دی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں سے اور دشمنوں سے انتقام ضرور لیں۔ یہ ساتوں لڑکے جب بڑے ہوئے تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ ان کے پاس پرانے وقتوں کی دستاویزات تھیں۔ وہ اپنا مقدمہ عدالت میں لے گئے اور میری جاگیر پر اپنا حق ملکیت ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ہر بڑے وکیل کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ تقسیم سے پہلے کی باتیں ہیں۔ نوجوان لڑکے انگریز سے دشمنی کے جذبات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو بھول کر صرف جاگیر کے چکر میں تھے اور ان کا دشمن میں بن گیا تھا حالانکہ جو کچھ ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے پاس بھی حقِ ملکیت کی کوئی بنیاد نہیں تھی مگر تم جانتے ہو وکیل آدمی کو کیسا چکر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھاری فیس وصول کی اور یقین دلایا کہ ان کا حق ضرور ملے گا۔ اتنی فیس انہوں نے کیسے ادا کی اور زندگی کیسے گزاری؟ اس کے بارے میں عام قیاس یہی تھا کہ رانی اور اس کی ہر بہو کے پاس بے حساب سونا تھا اور زر و جواہر تھے جو انہوں نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے پہلے ہی کہیں گاڑ دیے تھے۔۔۔ قصہ مختصر، مقدمہ خارج ہو گیا۔ انہوں نے ہائیکورٹ میں اپیل کی اور ہار گئے۔ فیڈرل کورٹ میں ان کی اپیل زیرِ سماعت تھی کہ یہ جاگیر جو مغربی پنجاب میں تھی، پاکستان میں شامل ہو گئی۔ انڈین سپریم کورٹ کے دائرہ سماعت سے باہر ہو گئی اور دوسرے ملک کے قانون کے تحفظ میں آ گئی۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا ہوں کہ حالات نہ بدلتے تب بھی وہ مقدمہ خارج ہو جاتا جو ایک فضول سے آئینی نکتے پر چل رہا تھا۔ لیکن ان ساتوں بھائیوں نے جو آپس میں کزن تھے، اپنی شکست کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے تلسی کے پتے پر قسم کھائی کہ جاگیر ان کے خاندان کی نہ رہی تو میرے خاندان کی بھی نہیں رہے گی۔ وہ سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے۔ انہوں نے مسلمانوں جیسے نام رکھ لیے۔ دل سے وہ اب بھی ہندو مت کے عقائد پر قائم ہوں گے۔ میں اپنے خاندان کا ایک ہی وارث رہ گیا ہوں۔ مجھ سے بڑا بھائی آج کل آسٹریلیا میں ہے اور مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا۔ سب سے چھوٹا بہت جوشیلا اور بانکا نوجوان تھا۔ اس نے فوج میں کمیشن لیا اور کشمیر میں جنگ بندی لائن پر شہید ہو گیا۔ اب میرے دو بچے ہیں جن کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ ایبٹ آباد میں زیرِ تعلیم ہیں۔ میرے وہ سات دشمن کئی بار مجھ پر قاتلانہ حملے کر چکے ہیں لیکن میں بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوں۔ میرے مزارعے مجھ سے بہت خوش اور مطمئن ہیں اور صحیح معنی میں جاں نثار ہیں۔ کوئی اجنبی وہاں آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ میں خود مسلح پھرتا ہوں اور اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ ضرور رکھتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے اپنے سامنے شوفر کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ دشمنوں کو دھوکا دینے کا پرانا طریقہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہٹلر بھی کسی ہم شکل کو ساتھ رکھتا تھا اور خدا جانے یہ سچ ہے کہ جھوٹ کہ کئی بار وہ ہٹلر کی جگہ پبلک کے سامنے

بھی چلا گیا اور کوئی اسے نہ پہچان سکا۔ فیلڈ مارشل ر[...] رومیل میں سے بھی کوئی ایسا ہی کرتا تھا۔" وہ ہنسا۔ [...] اب میں کر رہا ہوں۔ اس سے زندگی اور موت کے ففٹی ففٹی ہو جاتے ہیں۔ میرے اس ہمشکل جان[...] مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے لیکن گاڑی بلٹ پروف [...] لیے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ تم کہو گے یہ تو بڑا کمینہ[...] اور خود غرضی ہے کہ اپنی زندگی پر میں نے کسی اور کی ز[...] پر لگا رکھی ہے لیکن برادرِ عزیزم! دنیا میں بہت [...] اپنی زندگی سے جوا کھیلتے ہیں۔ عجیب و غریب کا[...] سرانجام دیتے ہیں۔ کسی کو ماؤنٹ ایورسٹ سر کر[...] ہے تو کسی کو نیاگرا فال میں کودنے کا، لیکن یہ ذرا[...] دے دی میں نے... عام آدمی جب چوری کرتا ہے [...] ڈالتا ہے یا اسمگلنگ وغیرہ کرتا ہے تو کیا وہ قسمت [...] بھروسہ کر کے جوا نہیں کھیلتا؟ وہ مارا بھی جا سکتا ہے [...] یا تختہ قبول کرنے والے زندگی کے ہر مرحلے پر جوا کھیلتا ہے [...] میں نے اس شخص سے ایک معاہدہ کر رکھا ہے۔ اگر [...] خاطر مارا گیا تو اس کے بیوی بچوں کی کفالت میرے [...] ہو گی۔ کفالت کا مطلب دال روٹی دینا نہیں [...] لیے اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام ہو گا، خواہ وہ ولایت [...] پڑھیں۔ بیٹیوں کی ویسی ہی شادی ہو گی جیسی میری [...] اور مرضی کے مطابق ہو۔ رہائش کا بندوبست الگ [...] اخراجات کے لیے میں دس ہزار روپیہ ماہانہ بطور [...] ہوں۔ وہ ان کو حسبِ سابق ملتا رہے گا۔ کیا اتنی [...] کافی نہیں اور یہ سو فیصد اختیاری معاہدہ ہے۔ اس [...] کو ذرا بھی دخل نہیں۔"

میں نے اس کی پوری کہانی بہت دلچسپی اور [...] سے سنی اور اس کی منطق پر غور کرتا رہا۔ وہ یقیناً [...] آدمی تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز متاثر کرتا تھا اور [...] اس نے جو حوالے دیے تھے وہ اچھے مطالعے کا [...] لیکن جس بات نے مجھے ہوشیار کر دیا تھا وہ ایک [...] جو اس سے نادانستگی میں سرزد ہوئی۔ نعمت کدہ میں [...] ملاقات کے بعد کھانا کھاتے ہوئے وہ بالکل خا[...] تھا اور بعد میں بھی جو گفتگو ہوئی اس میں کہیں [...] اپنا نام نہیں لیا تھا، لیکن اس نے اپنی داستان کے [...] ہی مجھے نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ میرے حالات [...] مجھ کو بہت زیادہ حساس اور شکی مزاج بنا دیا تھا۔ [...] غلطی کو کیسے نہ پکڑتا؟ اور اس کے بعد یہ فرض [...]

مجھے پہلے سے جانتا تھا اور اس کا نعمت کدہ میں آ جانا اتفاق نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے میری پسند اور شرائط کے مطابق ایک مکان بھی پیش کر دیا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

"تم کچھ سوچ میں پڑ گئے ہو؟" وہ بولا اور میں نے دیکھا ہماری گاڑی شہر کے مضافات میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہے۔

"در اصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ نے مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"یہ خوب رہی۔" وہ ہنسا۔ "جو کام سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا یعنی تعارف کا، وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ کبھی لوگ مجھے مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں جیسے خلاّم زارعے [...] قسمت کا مالک کہتے ہیں تو آکسفورڈ کے زمانے کے دوست مجھے جمی کہتے تھے لیکن ہوں میں خسرو جمشید۔" وہ پھر ہنسا۔ "یہ [...] نام رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟ یہ میں نے اپنے والد سے [...] کبھی نہیں پوچھا۔ مجھ سے چھوٹا جو شہید ہو گیا وہ خسرو پرویز تھا۔ خیر تم آؤ مکان دیکھو۔ بھئی معاف کرنا میں نے پھر تعارف کا سلسلہ ادھورا چھوڑ دیا۔" وہ چلتے چلتے رکا۔ "مجھے تم سے تمہارا نام بھی تو پوچھنا چاہیے۔"

"مجھے سکندر بخت کہتے ہیں جناب!" میں نے معصومیت سے کہا۔ "میرے ساتھ ایک بہن ہے، ایک بھائی ہے، ایک مفلوج ماں ہے، ایک خادمہ ہے اور...."

"میں سمجھ گیا۔" وہ بے ساختہ ہنسا۔ "ان کے علاوہ ایک بیوی ہے، ایک بچہ ہے۔ سب ایک...."

مکان میری توقعات سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا۔ لیکن اس سے میرے شکوک پختہ ہو گئے۔ مکان نیا بنا ہوا تھا اور اس کا رنگ و روغن بتاتا تھا کہ ابھی تک اس میں کسی نے رہائش اختیار نہیں کی۔ ایک کنال رقبہ پر بنے ہوئے اس مکان میں چار کمرے نیچے تھے اور دو اوپر تھے۔ اوپر کے دونوں کمروں کے درمیان خاصا کشادہ اور جدید قسم کا باتھ روم تھا اور ایک چھوٹا سا کچن گویا اوپر کا حصہ بھی ایک مکمل رہائشی یونٹ تھا۔ پچھلے حصے میں جو گیراج تھا اس میں دو گاڑیاں ساتھ ساتھ کھڑی کی جا سکتی تھیں اور ایک سرونٹ کوارٹر تھا جسے انیکسی بھی کہا جا سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مکان دوگنی قیمت کا تھا اور جمشید نے جو قیمت مانگی وہ ہماری قوتِ خرید کے برابر تھی لیکن اصل قیمت سے آدھی تھی۔

"جمشید صاحب!" میں نے کہا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر آپ کو اس مکان میں رہنا نہیں تھا تو آپ نے بنایا کیوں تھا۔ اس کے علاوہ اب جو قیمت آپ مانگ رہے ہیں وہ میرے اندازے کے مطابق بہت کم ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے میں اور آپ اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کو نام اور صورت سے بھی نہیں جانتے تھے...."

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میاں سکندر!" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں اچانک بڑی تھکن اور اداسی اتر آئی ہے۔ "دنیا میں کوئی ایسا نہیں کرتا اور اگر کرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ پاگل ہو گیا ہے۔ بات صرف سمجھنے کی ہے۔ جو آدمی کو اور اس کے حالات کو نہیں سمجھتے وہ کچھ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ مکان میں نے واقعی رہنے کے لیے بنوایا تھا لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا تھا اس نے ساتھ نہیں دیا۔ اب وہ ایک ایسے گھر میں رہتی ہے جو اس سرونٹ کوارٹر کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایک تنگ و تاریک گلی میں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "خدا اسے خوش رکھے۔ آدمی کو رہنا بھی وہیں چاہیے جہاں دل کی خوشی ملے۔ خوشی بڑا عجیب پودا ہے۔ کبھی اسے جھونپڑے کی آب و ہوا راس آتی ہے تو کبھی یہ محلوں کی دیواروں میں بھی سوکھ جاتا ہے۔"

"میں آپ کے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "لیکن میرے دوسرے سوال کا جواب آپ نے نہیں دیا؟"

"اس کا میں کیا جواب دوں؟" وہ دونوں ہاتھ چھڑی پر رکھے بولا۔ "اس کی بھی ایک جذباتی وجہ ہے جو میں نہیں بتا سکتا، نہ تم یقین کرو گے اور نہ یہ سمجھو گے کہ میں پاگل ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ اس قیمت پر ایسا مکان تمہیں کہیں مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں مل سکتا۔ اس سودے میں تمہارا فائدہ ہے۔ پھر سوال و جواب کی کیا ضرورت ہے۔ میری چیز ہے میں ایک روپے میں بیچ دوں یا کسی کو تحفے میں دے دوں۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ کوئی جرم نہیں۔"

"بات یہ ہے جنابِ عالی کہ نواب صاحب کا چھوٹا بھائی جو شہید ہو گیا تھا۔" شوفر نے پہلی بار ہمت کر کے لب کھولے۔ "اس کی صورت بالکل آپ جیسی تھی۔ آپ تصویر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ میری تصویر ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" جمشید چلایا۔ "اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے بے شک تم خسرو پرویز ہو.... لیکن وہ تو شہید ہو چکا ہے۔ کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا۔ بس میں یہ مکان

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمہیں اسی قیمت پر دینا چاہتا ہوں۔۔۔ تم لو گے یا نہیں؟"
اس کی آواز کانپ رہی تھی، لیکن وہ مشتعل نہیں تھا صرف جذبات کی شدت سے مغلوب تھا اور اپنی اعصابی کش مکش کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اس سودے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جو نقد رقم ہے وہ کل آپ کو ادا کر دی جائے گی۔ باقی وعدے کے مطابق۔ قبضہ کل مل جائے گا؟"

"قبضہ؟" جمشید نے یہ لفظ دہرایا۔ "قبضہ لے لو ابھی لے لو۔۔۔ یہ لو۔" اس نے چابی مجھے تھمانے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "مجھے اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ میں آپ سے چابی کل لے لوں گا۔ یہ بتائیے کہ آپ کہاں ملیں گے؟"

"تمہاری مرضی۔" اس نے چابی واپس جیب میں رکھی۔ "اگر تم کل شام کو آؤ تو میں اسی جگہ ملوں گا۔ تم جتنی رقم لا رہے ہو اس کا بنک ڈرافٹ یا پے آرڈر بنوا لانا۔ باقی سیل ڈیڈ، دوسرے قانونی اور کاغذی مرحلے بعد میں طے ہو جائیں گے۔" وہ شوفر کی طرف پلٹا۔ "جاؤ سکندر صاحب کو چھوڑ آؤ۔ میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ شوفر میرے پیچھے آ رہا ہوگا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ غائب تھا مگر چند سیکنڈ بعد وہ بھی نمودار ہو گیا۔ اب میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چند سیکنڈ کے اس فرق میں کیا ہوا، جب میں ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کیا خسرو جمشید نے اپنا عصا شوفر کو تھما دیا اور خود شوفر بن کے میرے پیچھے چل پڑا یا اس نے واقعی شوفر کو بھیج دیا۔ اگر میں ان پر نگاہ رکھتا تو یہ دھوکا نہ ہوتا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ عقل کی دلیل یہ تھی کہ جمشید نے شوفر کی جگہ لے لی ہو گی۔ آخر اسے شہر سے اتنی دور ایک بالکل خالی گھر میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ میرے ساتھ بھی آ سکتا تھا مگر اس کا ارادہ یہ ہوگا کہ میرا تعاقب کرے اور اگر میں اس کا تعاقب کروں تو دیکھ لے۔ ڈرائیور کی عقل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنی جائے رہائش سے بے خبر رکھنا چاہتا ہے اور اسی لیے سودا کرنے کے لیے اپنے آفس یا گھر کے بجائے اس نے شام کے وقت مجھے مکان پر پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ بنک ڈرافٹ اور پے آرڈر کی بات میرے اطمینان کے لیے تھی تاکہ رقم لے جانے کی صورت میں لٹ جانے کا اندیشہ [نہ رہے] لیکن اب میرا اگلے روز شام کے وقت پہنچنا یقینی [تھا] اور ان کو یہ مہلت کوئی دامِ اجل بچھانے کے لیے [کافی تھی]۔

شوفر خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا اور میں [اپنے خیالوں] میں کھویا ہوا تھا لیکن میری نظر مل راستے پر تھی۔ [مجھے] یقین تھا کہ شوفر کی جگہ خود جمشید گاڑی چلا رہا ہے [اور وہ] خالی مکان کو مقفل کر کے کسی رکشا ٹیکسی میں گھر [جائے] گا۔ جمشید ابھی تک اپنے ڈرامے میں کامیاب تھا اور [اسے] بالکل احساس نہ تھا کہ قبل از وقت میرا نام لینے کی غلطی نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ میں بھی یہ سمجھنے میں بجانب تھا کہ جمشید نیا شکاری ہے جو نیا جال لے کر آیا ہے۔ چوہدری دلاور، ڈی سلوا، خسرو جمشید۔۔۔ کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ہے جو ابھی تک پسِ پردہ ہوگا۔ [میں نے] سوچا مگر اس سوال کا جواب صرف وقت ہی دے [سکتا تھا]۔ چال اچھی تھی اور صحیح سمت میں تھی۔ دشمن سوچ رہا [ہوگا] کہ رابعہ کب تک بدلتے گھر میں رہے گی۔ اس کے پاس پیسہ ہے، وہ مکان تو خریدے گی لیکن اکیلی نہیں رہ سکتی۔ یہ تو تقریباً طے تھا کہ میں اور محسن اس کے ساتھ ہوں گے لیکن ہمارے معاشرے میں ایک جوان اور خوبصورت غیر شادی شدہ لڑکی دو جوان کنوارے مردوں کے ساتھ [نہیں رہ] سکتی ہے جن سے کوئی رشتہ بھی نہ ہو۔ انہوں نے اندازہ [لگایا] ہوگا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے رہے گی اور اندھیرے [میں] تیر چلایا تھا کہ شاید ہم اچانک غائب ہو جانے والی [لڑکی] اور اس کی ماں کو بھی ساتھ رکھیں گے۔ وہ جانتے تھے [کہ رابعہ] کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ ہم نے حالات سے [مجبور] ہوتے اسے چھپا دیا ہے۔ ایک سستا مکان پیش [کر کے وہ] جوا کھیل رہے تھے کیونکہ وہ اور کسی طرح سے شہلا کا [سراغ] لگانے میں بھی ناکام رہے تھے اور میری ایک بات [نے] میرے قتل کی کوشش کو بے فائدہ بنا دیا تھا۔ اب [ان کے] نقطۂ نظر سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ میں اور [ہم] سب وارث رابعہ، محسن اور شہلا، ایک مکان میں [جمع ہو] جائیں تو اس مکان کے نیچے بارود بچھا کے سب کا [نام و نشان] مٹا دیا جائے۔

گاڑی ایک بار پھر نعمت کدہ کے سامنے جا رکی۔ [میں نے] نیچے اتر کے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا جو میرے لیے دروازہ مؤدب کھڑا تھا لیکن دروازہ بند کر کے بھی وہ دالان [کی طرف]

کسی جگہ پر نہیں بیٹھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر سگریٹ پینے کے بہانے ایک پان فروش کے کھوکھے کی طرف بڑھا جہاں پہلے سے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہونے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میرے پاس فیصلے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ میں نے آہستہ سے آگے والا دروازہ کھولا، چابیاں سوئچ میں لٹک رہی تھیں۔ آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں چابی کھینچ کر میں نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ وہاں ٹریفک کا اتنا شور تھا کہ اشارے پر بند ہونے والے دروازے کی آواز ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں چند قدم چل کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے سڑک پار کرنے کے لیے ٹریفک کے رکنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی وقت میں نے جمشید کو سگریٹ خرید کر واپس آتے ہوئے دیکھا اور اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ پھر میں نے آدھی سڑک پار کی اور درمیان کی فٹ پاتھ جیسی جگہ پر رک گیا۔ جو سڑک کو آنے اور جانے کے لیے دو حصوں میں جدا کرتی تھی۔ [میں] سوچ رہا تھا کہ پیچھے دیکھنے پر مجھے جمشید تھوڑا سا بدحواس نظر آیا۔ وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے دیکھ رہا تھا اور شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اترتے وقت انجن بند کرنے کے بعد اس نے چابیاں نکالی تھیں یا نہیں۔ مجھ پر شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے لیے دروازہ خود اس نے کھولا تھا۔ اس کے لیے یہ فرض کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں چند سیکنڈ کے وقفے میں کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا سکتا ہے۔ میرے سامنے وہ دو بارہ پان والے کے کھوکھے تک گیا اور جب میں نے اپنی فاکس ویگن اسٹارٹ کی تو وہ گاڑی سے کھوکھے تک کے فاصلے کو غور سے دیکھتا، بار بار بلا ارادہ [اپنی] جیبوں پر ہاتھ مارتا اور پان والے کی دکان پر کھڑے ہوتے لوگوں پر شک کی نظر ڈالتا واپس آ رہا تھا۔ پان والے کی دکان پر اب دوسرے لوگ آ گئے تھے۔ اسے یہ خیال بھی آیا ہوگا کہ جو لوگ پہلے کھڑے تھے ان میں تو کوئی چابی اٹھا کے نہیں چل دیا۔ بے خیالی میں خود اس کا چابیاں نکال لینا اور ذرا دیر کے لیے دکان پر رکھ دینا بعید از قیاس نہ تھا۔ بعد میں اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ کہیں یہ میری حرکت نہ ہو مگر اس وقت تک میں بہت دور جا چکا تھا۔

یہ صورتِ حال دلچسپ بھی تھی توجہ طلب بھی۔ محسن اور رابعہ سے مشورہ کے بعد اس صورتِ حال سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔ میرے لیے آج کا دن بہت کامیاب گزرا تھا اور میں یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ محسن نے اور رابعہ نے دن بھر میں کیا کیا؟ اپنے وعدے کے مطابق میں پانچ بجے رابعہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ اور شہلا باتوں میں مصروف تھیں اور نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بھئی؟" میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "ہم بھی تو سنیں کہ ہنسنے کی کون سی بات ہے؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی جان!" شہلا نے کہا۔ "کیا ہنسنے پر بھی پابندی ہے؟" اس کی بات پر مجھے عدنان کا خیال آیا۔ اگر وہ شہلا کا حقیقی بھائی ہوتا تو اس کی المناک موت کے بعد شہلا اس طرح کبھی نہ ہنستی لیکن وہ ایک ملازمہ کا بیٹا تھا جسے شہلا نے اپنی ضرورت کے لیے بھائی بنا لیا تھا۔ ضرورت ختم نہیں ہوئی تھی مگر شہلا کو بن مانگے دوسرا بھائی مل گیا تھا چنانچہ اس نے عدنان کو فراموش کر دیا۔ وہ ایک خادمہ کا بیٹا تھا اور ذاتی کردار کے اعتبار سے شہلا کا بھائی بننے کے قابل نہیں تھا لیکن اس شخص نے بھی بہن کے رشتے کا تقدس مجروح نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ اسے نیکی بدی کی تمیز نہ رہی تھی۔ یہ خیال بڑا دل شکن تھا۔ رشتے جو ضرورت اور مصلحت کی بنیادوں پر استوار کیے جائیں، کبھی حقیقی رشتوں کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ ایسے رشتوں کی جڑیں دلی جذبات کی گہرائی میں نہیں ہوتیں چنانچہ وہ سوت کے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا میرے خلوص کا انجام بھی یہی ہوگا؟ شہلا اسی طرح مجھے بھی بھلا دے گی اور میرے مرتے ہی بھائی کی خالی آسامی کو پھر کوئی پُر کر دے گا۔

"تم ایک دم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے ہو؟" رابعہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی تم دونوں پر رشک کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "کتنے اطمینان سے گھر میں بیٹھی دانت نکال رہی ہو۔ ایک ہم ہیں کہ خوار پھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں محسن کس حال میں ہے۔"

رابعہ مسکرائی۔ "وہ بالکل خیریت سے ہے۔ واپس آنے کے بعد گھنٹہ بھر اس معرکے کی روداد سناتا رہا جو اس نے تھانے میں سر کیا تھا۔ ابھی ابھی اپنے گھر فون کرنے گیا ہے۔ ہم اسی کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔"

"ہنستے وقت آپ کو اس بڑھیا کا خیال نہیں آیا؟" میں نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ خفت سے شہلا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"امی سوئی ہوئی ہیں اور وہ اونچا سنتی ہیں۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"اس کے علاوہ ہمارا نارمل نظر آنا بھی ضروری ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رابعہ نے فوراً بات بنائی۔ "انہیں تو ایسے ہی یقین آئے گا کہ ان کا بیٹا باہر چلا گیا ہے۔ اگر وہ کسی کو روتا دھوتا دیکھ لیں گی تو ٹوٹ جائیں گی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ چلو اب تم تیار ہو جاؤ۔"

"میں بھی ساتھ چلوں گی۔" شہلا نے کہا۔ "میں ایسے یہاں نظر بند نہیں رہ سکتی۔"

"پاگل مت بنو۔" میں نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ باہر تمہارے لیے کتنا خطرہ ہے۔"

محسن اندر آیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "میں ابھی ابھی دیکھ کے آیا ہوں۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ زمین پر۔ آسمان پر، درختوں پر اور سڑک پہ جہاں بھی نظر جاتی ہے خطرے کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔"

"یار، یہ لڑکی ضد کر رہی ہے کہ میں بھی باہر چلوں گی۔" میں نے کہا۔ "تو سمجھا اسے۔"

"مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" شہلا بولی۔ "خطرہ ہے تو ہوا کرے۔ میں اس قید سے بھی تنگ آ گئی ہوں۔"

"یہ بات تو ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر مجھے اس طرح قیدِ تنہائی میں رہنا پڑتا تو میں کہتا خطرے کی ایسی تیسی۔ پاگل ہو کے مرنے سے کیا فائدہ۔ موت برحق ہے اور اس کا ایک دن متعین ہے۔ پھر ڈرنا کیسا؟"

"آپ بھک مارتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "چلو بھئی شہلا تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تمہارے حق میں بھی ایک ووٹ ہے۔"

"اس کے علاوہ مس شہلا!" محسن نے ہاتھ سینے پر رکھا اور نہایت عاشقانہ انداز میں جھکا۔ "خطرہ میری لاش پر سے گزر کے آپ تک پہنچ سکتا ہے۔ کیسا ہے یہ ڈائیلاگ؟" اس نے تعریف طلب نظروں سے ہم سب کو دیکھا۔

شہلا کو ساتھ لے جانے کے لیے ہمیں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کرنے پڑے۔ وہ سڑک تک ماسی کے برقع میں گئی جو بڑی مضحکہ خیز حالت میں تھا۔ پھر رابعہ بھی ایک پھٹی پرانی اور میلی چادر میں منہ چھپائے جاہل بوڑھی عورتوں کی طرح باہر آئی اور شہلا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ آخر میں میں اور محسن نکلے اور میں نے واپس ہونے کے بجائے گاڑی کو اسی سڑک پہ سیدھا جانے دیا۔ بازار ختم ہوتے ہی سڑک خالی رہ گئی۔ ہمارے پیچھے صرف ایک ٹیکسی تھی لیکن تانگہ اسٹینڈ کے پاس سے اور گلوب سینما سے کچھ پہلے ہم سیدھے ہاتھ مڑے تو یہ ٹیکسی ایئرپورٹ کی جانب چلی گئی۔ اب ہم فوری طور پر کسی خطرے سے دوچار نہیں تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ سامنے سے ڈی سلوا کی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کا گھر گلوب سینما کے پاس ہی تھا۔ وہ ہمیں دیکھ لیتا تو کیا سمجھتا مگر وہ آفس سے آ رہا تھا اور بہت تیزی سے گزرا۔ اس کی نظریں سامنے تھیں اور وہ اکیلا تھا۔ اس کی گاڑی سیکنڈ میں ہمارے قریب سے گزر گئی لیکن فورٹریس اسٹیڈیم تک میری نگاہ بار بار آئینے میں پیچھے آنے والی گاڑیوں پر رہی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ رات کی مدد ہمارے حق میں تھی اور اس مرحلے پر اپنی کار کا پورا فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مال روڈ کا پل عبور کر کے گاڑی کو سیدھا لے جاؤں۔ یہ بعد میں طے کیا جا سکتا تھا کہ ہمیں رابعہ کے دفتر میں بیٹھ کر بات کرنی ہے یا کسی اور جگہ جا کے۔ مال روڈ پر بہت سے اچھے ریسٹورنٹ ہیں تھے لیکن وہ جگہ خطرناک بھی تھی وہاں کسی سے غیر متوقع ملاقات ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ چنانچہ میں نے پل سے پہلے گاڑی کو بائیں جانب نیچے جانے والی چھوٹی سی سڑک پر موڑ لیا۔ کینٹ اسٹیشن کے سامنے سے گزر کر میں نے دائیں ہاتھ کی سڑک کی ریلوے کراسنگ عبور کی اور گلبرگ کے اس حصے میں جا پہنچا جہاں چار نمبر بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ آدمی کو ایسے دو کام کرنے ہوں یعنی ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا ہو اور وقت بھی ضائع کرنا ہو تو اطمینان سے روٹ نمبر ۴ کی ڈبل ڈیکر میں جا بیٹھے۔ بس خراماں خراماں چلتی تقریباً آدھے شہر کی سیر کرانے کے بعد بالآخر ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گی۔ چار نمبر بس کی وجہ شہرت پاگل خانہ ہے جو اس کے راستے میں پڑتا ہے۔ کوئی بے سر و پا بات کرے تو لوگ کہتے ہیں چار نمبر بس میں بٹھا دو۔ جیسے کراچی میں لوگ کہتے ہیں گزری بھیج دو۔

گاڑی کو میں نے گلبرگ کے مرکزی علاقے میں لبرٹی سینما کے قریب روکا۔ یہ مارکیٹ تو قبے میں چھوٹی لیکن انتہائی ماڈرن اور فیشن ایبل شاپنگ سینٹر تھی۔ لڑکیوں نے اپنے نقاب گاڑی میں چھوڑے اور ہم ایک بہت ائیر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے فیملی روم میں جا بیٹھے۔ یہاں لارڈز یا شیزان والا رش نہیں تھا۔ ہال کی برائے نام روشنی میں بہت کم لوگ دور دور بیٹھے تھے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ مال روڈ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"تو اپنے آپ کو میرے برابر عقل مند ثابت کرنا چاہتا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

رابعہ اور شہلا ہمارے سامنے ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

"حالانکہ عقل مند تم دونوں میں کوئی بھی نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"بجا ارشاد۔" محسن نے فوراً دفاع کیا۔ "عقل مند تو صرف آپ ہیں یا آپ سے بڑھ کر یہ خاتون۔" اس نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑائی کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے آپ ایک کام کریں۔" میں نے رابعہ سے کہا۔ "کاؤنٹر پہ ٹیلی فون ہو گا۔ آفس فون کر دو۔ ہمارا استاد ٹیڈی آئے تو اسے یہاں بھیج دیا جائے۔ ہم تین گھنٹے تک یہیں ملیں گے۔"

"اور اگر ریسٹورنٹ والوں نے تنگ آ کے نکال دیا تو سامنے والی فٹ پاتھ پر پڑے ہوں گے۔" محسن بولا۔

"کس کی مجال ہے کہ آدھی رات کو ریسٹورنٹ کے بند ہونے سے پہلے ہمیں اٹھنے کے لیے کہے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو عرب کے اونٹ ہیں۔ ایک بار خیمے میں جا گھسے تو عرب باہر۔ ابھی ہم چائے پئیں گے۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈنر تناول فرمائیں گے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے تین گھنٹے تو یقیناً بیٹھیں گے۔"

رابعہ چند منٹ میں فون کر کے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ویٹر بھی نمودار ہوا اور چائے کا سامان رکھ کے چلا گیا۔ "پہلے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ گلبرگ کے اس ہاتھی کی داستان کا آغاز کرتا ہے۔" محسن نے کہا اور قمیص کے اندر سے ایک فائل برآمد کی جسے دہرا کر کے اس نے پتلون کی بیلٹ میں پھنسا رکھا تھا۔ "یہ ہے ساری روداد ایک شریف آدمی اور اس کے گھر کی تباہی کی۔ الماس کے والدین کے گھر میں آگ لگی تھی اور وہ اسی میں جل کے مر گئے تھے۔ پولیس کا ابتدائی موقف یہ تھا کہ مولوی کا دماغ چل گیا تھا لیکن بعد میں ان کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اس میں ایک نہیں فردوس میں رہنے والے دو افراد کے بیانات ہیں۔ دونوں پڑوسی زندہ ہیں اور وہیں رہتے ہیں اس کے علاوہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ہے اور وہ ڈاکٹر اب پرائیویٹ پریکٹس کرتا ہے جس نے یہ رپورٹ دی تھی۔ میں نے سب کا پتہ چلا لیا ہے اور اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ پہلے الماس کے والدین کو قتل کیا گیا پھر قاتل گھر میں آگ لگا کے فرار ہو گئے۔ دونوں ہمسایوں نے صاف کہا ہے کہ فائرنگ کے بعد مگر آگ لگنے سے پہلے انھوں نے پٹرول کی بہت تیز بو محسوس کی تھی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ فائل تمھیں کیسے ملی؟"

محسن نے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں پھیلا کے دکھائیں۔ "وہاں ایک بہت خبیث تھانے دار بیٹھا تھا۔ تھانہ بڑے اچھے اور منافع بخش علاقے میں ہے نا۔ میں نے ایک سینچری کی بات کی تو بڑا چز بز ہوا کہ یہ تھانہ ہے یا سبزی منڈی۔ آلو ٹماٹر کا سودا کر رہے ہو؟۔ دو ہزار کا مال ایک سو میں لے جانا چاہتے ہو؟ لوٹ مچی ہے کیا؟ ملاحظہ ہو اس کا سوال۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ لوٹ مچی ہے کیا؟ جیسے اس کے باپ کی حلال کی کمائی تھی جس کے وہ دو ہزار سے کم لیتا تو اس کی حق تلفی ہو جاتی۔ خیر میں نے بھاؤ پانچ تک بڑھا دیا مگر یار تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ پانچ سو روپے اس کے لیے پانچ پیسے کی طرح بے وقعت ہیں یا وہ مجھے اتنا احمق اور مجبور سمجھ رہا تھا کہ میں دو ہزار چوری کر کے بھی پورے کروں گا۔ میں نے بھی منت سماجت کے بعد کہا کہ اچھا جی گھر والی کا کچھ زیور ہے، وہ بیچ کر لاتا ہوں۔ اگر میں اسے ترڑی دیتا کہ بیٹا فائل تو میں لے لوں گا۔ تو وہ فائل غائب کر دیتا۔ میں باہر آ کے انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی موٹر سائیکل پر کہیں دفع ہو گیا تو میں پھر اندر گیا۔ محرر مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ اس نے چوری چھپے ساری گفتگو سن لی تھی اور فائل نکال کے دراز میں رکھ لی تھی۔ اس نے پانچ سو جیب میں ڈالے اور فائل میرے ہاتھ میں دے کر کہا کہ بھاگ جاؤ۔ تھانے دار صاحب کو پتہ نہ چلے۔ سب ہی حرام کی کھاتے ہیں نا، اس لیے ایک دوسرے کو بھی کاٹ دیتے ہیں۔ اب تھانے دار بیٹھا ہے دو ہزار کی آس لگائے اور ڈھونڈتا پھرے فائل۔"

"یہ ثبوت اور گواہ تو بعد میں کام آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "جب کیس سماعت کے لیے عدالت کے سامنے آئے گا۔ اس سے پہلے میں دو کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کام میں استاد ٹیڈی ہماری مدد کرے گا۔ امید ہے اس سے چراغ دین کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور یہ کام اس طرح ہو گا کہ ہم دونوں بالکل محفوظ رہیں گے۔ استاد ٹیڈی کو آمادہ کرنے کے لیے ہمیں شہلا کی مدد درکار ہو گی۔"

"میری؟" شہلا نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ چراغ دین کون ہے اور اس کا مسئلہ کیا ہے، نہ میں کسی استاد ٹیڈی کو جانتی ہوں۔"

"وہ عدنان کا جگری یار تھا۔" میں نے کہا۔ "اور سخت جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ وہ تمھیں عدنان کی بڑی بہن سمجھتا ہے لو تم سے مل کر تمھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ عدنان کے قاتلوں سے انتقام ضرور لے گا۔ تم اس سے صرف یہ کہنا کہ بھائی، عدنان کا معاملہ انصاف پہ یا خدا پہ چھوڑ دو۔ اگر کر سکتے ہو تو میرا ایک کام کر دو۔ کام کیا ہے یہ سکندر بھائی بتائیں گے۔ وہ انکار نہیں کرے گا اور ہم اسے بعد میں سب کچھ سمجھا دیں گے۔"

"دوسرا پروگرام کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"اس کے لیے دوسرا درویش آپ بیتی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کلیجہ تھام لو پہلے، سنو پھر داستان میری۔"

"خواتین کی کلیجی ہوتی ہے دوسرے درویش۔" محسن نے لقمہ دیا اور شہلا ہنسی۔ میں نے دن بھر کی سرگزشت کو امین کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ملاقات سے شروع کیا اور خسرو جمشید کو چکما دے کر نکل آنے کی واردات پر ختم کیا۔ میں بہت آہستہ بول رہا تھا اور فصاحت کے جوہر بھی نہیں دکھا رہا تھا مگر میری بات میں چالیس منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں صرف ایک وقفہ آیا جب محسن نے دوسری بار گرم چائے منگوائی۔

"تمھارا دوسرا پروگرام یہ ہے کہ امین تم کو ڈیڈ بوٹرانسمیٹر میں بم فٹ کر دے تو اس سے ڈی سلوا کو اڑا دو؟" رابعہ "میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گی سکندر!" رابعہ بولی۔

"تم ذہین ہو یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ وکیل ہونے کے باوجود عورت ہو۔ ابھی تک تم نے ہمیشہ وکیلِ صفائی کی حیثیت سے دلائل دیے ہیں۔ آج اگر تم کو جج بنا دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ تم سفاک ترین قاتلوں کو سزائے موت نہیں دے سکو گی۔"

"یہ غلط ہے۔" رابعہ نے احتجاج کیا۔ "وہ قانونی معاملہ ہے۔"

"اور وہ جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "جب وہ تمھیں اغوا کر کے لے گئے تھے، جب انھوں نے تمھاری ماں کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ایک دھمکی دی تھی؟ اس وقت قانون تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ انھوں نے تمھارے آبائی گھر کو بم سے اڑا دیا، میرے باپ کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش تک چرا لی۔ عدنان کو اور نہ جانے کتنے لوگوں کو مار دیا یا مروا دیا۔ قانون نے بے بسی سے تماشا دیکھنے کے علاوہ کچھ کیا؟ اور وہ ایسا ہی بم تھا جو میری جان لے سکتا تھا لیکن خدا کو میری زندگی منظور تھی کہ میں نے چابی سے دروازہ نہیں کھولا ورنہ آج اس وقت یہاں میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کے بجائے آپ سب لوگ میری قبر پہ فاتحہ پڑھ رہے ہوتے۔ اور آئندہ کا کیا ہے۔ کیا میں، تم، شہلا اور دوسرے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں؟ انھوں نے تو کھلی دھمکی دی ہے کہ خمیازہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔ محسن کے گھر والوں کو، شہلا کی ماں کو اور رضوی صاحب کے بیوی بچوں کو۔ تم قانون سے مدد لے کے دیکھو۔ خود رضوی صاحب ایک بار کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔"

"یہ... یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر۔" رابعہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ "لیکن کیا یہ غلط طریقہ نہیں ہے؟"

"ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن صحیح طریقے صرف قانون کی کتابوں میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان کو ہمارے دشمن بھی نہیں پڑھتے اور ان کی پروا بھی نہیں کرتے۔ غلط اور صحیح کے معیار کبھی نہیں بدلتے لیکن عملی زندگی کے تقاضے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ جینے کا حق کسی عدالت سے نہیں ملتا اور ظلم منوا نہیں دلاتی رابعہ! یہ حق خود لینا پڑتا ہے۔ یہ دنیا طاقت ور کی ہے جس میں کمزور فریق کی کوئی جگہ نہیں۔ دشمن کو جب تک یہ احساس نہیں ہوگا کہ مقابل بھی اس کا ہم پلہ ہے، وہ جارحیت سے باز نہیں آئے گا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پڑتا ہے۔ ورنہ تم یہ دیکھو کہ ایک طرف تو بدمعاش ہوں جو قانون، اخلاق اور معاشرے کی ساری قیود سے آزاد ہوں۔ شہر میں یوں پھرتے ہوں جیسے جنگل میں خون آشام درندے، اور دوسری طرف ہم قانون کی دفعات دیکھتے رہیں۔ تھانوں میں رپورٹ لکھوائیں، انصاف کی دہائی دیں یا حاکم سے فریاد کریں۔ اخبارات میں لکھیں، اپیل بنام آئی جی یا گورنر صاحب سے فریاد اور امداد کی درخواست کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ بعد میں سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے تو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم سب کو رہنے کی جگہ چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور رابعہ کی طرف دیکھا وہ نظر جھکائے دانتوں سے اپنے ناخن کاٹ رہی تھی۔ "صبح میں نے تین مکان دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے لیے بہت موزوں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ خسرو جمشید کو مایوسی نہ ہو۔"

"لیکن جانتے بوجھتے ہم اس مکان میں رہنے کے لیے کیسے جا سکتے ہیں؟" محسن نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بہتر یہی ہو کہ مکان تو ہمیں مل جائے مگر نیا مہرہ ہے اسے یہیں پیٹ دینا چاہیے۔ اس کی ایک صورت تو میرے ذہن میں آتی ہے مگر اس پر عمل ذرا مشکل ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ لاکھ کا مکان ہمیں ڈھائی تین لاکھ میں پیش کر رہے ہیں۔ مقصد صاف ظاہر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سودا فوراً کر لیں گے اور ہمیں ظاہر بھی یہی کرنا چاہیے کہ لالچ کے باعث ہم ان کی چال میں آ گئے ہیں۔ ابھی تک انھیں یقین ہو گا کہ ڈراما کامیاب جا رہا ہے۔"

"لیکن چابیاں نکال کے تو نے ان کو شک میں ڈال دیا ہوگا۔" محسن بولا۔

"یہ شک تو میں آسانی سے دور کر سکتا ہوں۔" "فرض کرو میں کل شام کو شہلا کے ساتھ وہاں پہنچ جاؤں۔ جتنی رقم ادا کرنی ہے وہ کر دوں۔ کل صبح سے شام تک رجسٹری کی سیل ڈیڈ وغیرہ تیار ہو سکتی ہے۔ شہلا کو دیکھ کر انھیں یقین آ جائے گا کہ ہم پھنس گئے اور مکان کا قبضہ ملتے ہی ہم سب خودکشی کے لیے پہنچ جائیں گے۔ وہ جلد از جلد کاغذی کارروائی مکمل کر کے مکان ہمارے نام کر دیں گے۔ دو ڈھائی لاکھ میں ان کو یہ سودا بہت سستا لگے گا کہ سارے چکر ختم۔ کوئی والی وارث نہیں۔ نہ کسی سے مقابلے کا ڈر ہے اور نہ یہ اندیشہ کہ وہ بے نقاب ہوں گے۔ میر شرافت علی مارا گیا اور صاف ظاہر ہے کہ اسے بھی ان لوگوں نے مروا کے الزام میرے سر تھوپ دیا، ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ وزیر خان پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ حقِ ملکیت کا کوئی بھی دعوے دار باقی نہ رہے تو کاروبار کا تنہا مالک چودھری دلاور رہ جاتا ہے، پھر وہ اطمینان سے اپنے ناجائز کام کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کو کروڑوں کا فائدہ ہوگا۔ اس کے لیے دو لاکھ کا گھاٹا تو کچھ بھی نہیں، اس سے بہیں زیادہ کی پیش کش وہ مجھے کر چکے تھے۔ یہ مکان وہ ہمیں مفت بھی دے دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ ہم کھٹک جاتے۔ اب انھوں نے کیا زبردست جواز رکھا ہے۔ جمشید ایک جذباتی ہستی ہیں۔ ہے جسے پیسے کی پروا نہیں۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو شہید ہو گیا اور میں سو فیصد اس کا ہم شکل ہوں چنانچہ مجھے دیکھ کر وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ جذبات کا کوئی مول نہیں۔ خود اس نے کہا تھا کہ میری مرضی، میں یہ مکان کسی کو ایک روپے میں دے دوں۔ یہ اتنا معقول جواز ہے کہ اگر میں نے اس کی منتی نہ پکڑی ہوتی تو میں بھی جذباتی ہو جاتا۔ تم نو رقم کا ہونا تو مجھ پر رقت طاری ہو جاتی۔ خیر اب فرض کرو ہم وہ مکان لے لیں۔ ڈھائی لاکھ میں وہ مکان مل جائے گا۔ صورت کوئی ایسی ہو کہ مکان تو ہمیں مل جائے مگر اس کے بعد ہم غائب ہو جائیں، سامنے آئے بغیر ساڑھے پانچ لاکھ کے مکان کو ساڑھے چار لاکھ میں بیچ دیں تو دو لاکھ کا کھرا فائدہ ہے۔ بس ایک ہاتھ سے خریدنے اور دوسرے ہاتھ سے بیچنے کی بات ہے اس میں کوئی دھوکا نہیں اور زبردستی نہیں۔ یہ سارا چکر دوبارہ سامنے نہ آنے کا ہے۔ ایک ہفتے بعد ڈھائی کے بجائے ہم ساڑھے چار لاکھ کے مالک ہو سکتے ہیں۔"

رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔" وہ بولی۔ "کل شام تم ڈیڑھ لاکھ کا بنک ڈرافٹ لے جاؤ۔ میں فروخت کے معاہدے اور سیل ڈیڈ وغیرہ کا انتظام کر ہی لوں گی۔ گرچہ تنہا ہو والا پلاٹ میرا ہے۔ اس لیے یہ معاہدہ بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا کہ میں باقی رقم پلاٹ کے فروخت ہوتے ہی ادا کر دوں گی، دوسرے الفاظ میں مکان میں خریدوں گی۔ تم یہ کر سکتے ہو کہ خسرو جمشید کو میرے پاس لے آؤ۔ شہلا تمھارے ساتھ ہوگی۔ میں دن میں رضوی صاحب سے کہہ کے کوئی ایسا بندوبست کروا لوں گی کہ عمارت کے چاروں طرف سادہ کپڑوں میں پولیس موجود ہو جو بغیر شناخت کے کسی کو اندر نہ جانے دے۔ اس سے کل کسی کی مداخلت یا ہنگامہ آرائی کا خطرہ ٹل جائے گا۔ وہاں میرے پاس دستاویزات کے دو سیٹ ہوں گے۔ میں تجویز پیش کروں گی کہ خسرو جمشید صاحب! اگر آپ مناسب سمجھیں تو بات اسی وقت ختم کر دیں۔ میں ڈیڑھ لاکھ نقد دیتی ہوں اور پلاٹ آپ کے نام ٹرانسفر کر دیتی ہوں۔ اس کے ایک لاکھ آپ کو ضرور ملیں گے۔ زیادہ بھی مل سکتے ہیں اور آپ اگر چاہیں تو وہاں دوسرا مکان بنا سکتے ہیں۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ اگر تمھارا یہ خیال درست ہے کہ وہ ہر قیمت پہ مکان دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو میری تجویز بھی ان کے لیے قابلِ قبول ہوگی۔ پلاٹ اور ڈیڑھ لاکھ نقد کے بدلے مکان میرا۔ رجسٹری وغیرہ کے سارے مرحلے میں پرسوں ہی ختم کر دوں گی۔ اگر انھوں نے میری بات نہ مانی تو میں کہوں گی کہ جمشید صاحب آپ انتظار کیجیے، میں تو مکان میں اس وقت تک نہیں آؤں گی جب تک کل رقم ادا نہ ہو جائے اور مکان واقعی میرا نہ ہو جائے۔ آگے جو خدا کو منظور۔ پلاٹ ایک ہفتے میں بکے یا ایک مہینے میں۔ جلدی ان کو ہے۔ وہ تاخیر قبول نہیں کریں گے۔ میری تجویز قبول کر لیں گے۔ پرسوں رجسٹری وغیرہ کے عدالتی معاملات ختم ہوتے ہی میں اپنی طرف سے کسی کو بھی مختارِ عام مقرر کر دوں گی۔ مختارِ عام میرے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے اور محسن بھی یا پھر رضوی صاحب۔ اس کے بعد ہمیں سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جس کے پاس بھی جنرل پاور آف اٹارنی ہوگی، وہ اگلے روز ہی مکان فروخت کر سکتا ہے۔ اس میں اطلاعِ عام کی رسمی سی کارروائی میں دقت لگتا ہے اور اخبار میں اشتہار وغیرہ دینا پڑتا ہے کہ کسی کو اعتراض ہو تو اتنے دن میں حاضر ہو کے بتائے لیکن یہ اشتہار کوئی نہیں پڑھتا۔ لوگ خرچ بچانے کے لیے کم سے کم اشاعت والے اخبار میں اشتہار دے کر کاغذی کارروائی پوری کرتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ عدالت میں کچھ لوگوں نے اخبار کے نام کے ڈیکلریشن لے رکھے ہیں، ان میں کوئی خبر نہیں چھپتی اور نہ کوئی ان کا نام جانتا ہے۔ کورٹ نوٹس وغیرہ کے سوا ان میں کچھ نہیں ہوتا اور یہ محض ریکارڈ کے لیے فائل میں لگا دیے جاتے ہیں۔ ہم انھی سے کام چلائیں گے۔"

"ویری گڈ بی بی!" محسن نے کہا۔ "مکان ہم نے ڈھائی لاکھ میں لے لیا اور سامنے آئے بغیر ساڑھے چار لاکھ میں بیچ بھی دیا۔ اب اس خاکسار کے چند سوالات۔ پہلا یہ کہ کل شام کو سکندر اگر شہلا کو لے کر گیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ یہ دونوں زندہ سلامت لوٹ کر آئیں گے اور ساتھ خسرو جمشید کو بھی لے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آئیں گے۔ سوال نمبر دو یہ کہ ہم غائب ہو کے کہاں جائیں گے؟ مکان کے خریدنے اور بیچنے میں کچھ وقت لگے گا اور پیسہ ہمارے پاس ہو گا نہیں کہ دوسرا مکان خرید لیں۔ جہاں ہم گمنامی میں رہ سکیں۔"

"گمنامی میں تو ہم اب بھی رہتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "رہا سوال رضوی صاحب کے گھر سے منتقل ہونے کا تو میرا خیال ہے کہ ہمیں مکان خریدنے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مکانوں کے مالک تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ کرایہ دار کو تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کرایہ نامے کا ریکارڈ کہیں نہیں ہوتا اور کرایہ نامے میں نام کسی کا بھی لکھوایا جاسکتا ہے۔ اب تو ہمیں کرائے کے مکان میں ہی رہنا چاہیے لیکن دشمن بے وقوفی میں ہمیں فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو یہ منافع بخش سودا ضرور کرنا چاہیے تاکہ سارا نقصان پورا ہو جائے۔"

"سوال نمبر ایک کا جواب اب بھی باقی ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ حفاظتی انتظامات کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہم خود بھی کر سکتے ہیں اور رضوی صاحب بھی۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ مکان رابعہ خرید رہی ہے تو انھیں حیرت نہیں ہو گی اور رابعہ کہے کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کا حشر بھی پہلے والے مکان جیسا ہو گا تو وہ اس مرتبہ مکان کی حفاظت کو یقینی بنا سکتے ہیں۔ سابقہ ناکامی کی تلافی کے لیے۔"

میری نظر نے استاد ٹیڈی کو دروازے سے اندر آتے دیکھا۔ دروازے پر ہی ایک ویٹر نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ غالباً اس کا حلیہ اس ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا تھا اور ریسٹورنٹ والے "حقوقِ داخلہ محفوظ ہیں" کی آڑ میں بدمعاش نظر آنے والے ہر شخص کو شرفا میں شامل ہونے سے روک سکتے تھے۔ صورتِ حال کو ناخوش گوار ہونے سے بچانے کے لیے میں فوراً آگے بڑھا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ سوائے شہلا کے ہم سب اسے پہچانتے تھے۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کے اس اجتماع میں سب سے الگ نظر آتا تھا اور اسی احساسِ اجنبیت کے باعث کچھ نروس تھا۔ میں نے اسے شہلا کے بارے میں بتایا کہ یہ عدنان کی بڑی بہن ہیں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانا اور کھانا منگوا لیا۔ میری یہ تدبیر کام کر گئی۔ کھانا ختم ہونے تک ہم لوگوں کی بے تکلف گفتگو اور ہمارے حوصلہ افزا رویے نے استاد ٹیڈی کی وہ جھجک ختم کر دی جو اس پر احساسِ جرم کی طرح سوار تھی۔ وہ زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے عدنان کے بارے میں انھی جذبات کا اظہار کیا جو ہمارے سامنے کر چکا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ قاتلوں کا سراغ لگائے گا اور ان کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ عدنان اس کا جگری یار تھا۔ چنانچہ وہ شہلا کو بھی بڑی بہن ہی سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"دیکھو بھیّا!" شہلا نے اچانک کہا۔ "تقدیر کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا اور ہر شخص کو اپنے اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے، یہاں بھی اور وہاں بھی۔ میں جانتی ہوں کہ عدنان کیسا آدمی تھا اور اس کا اٹھنا بیٹھنا کیسے لوگوں میں تھا۔ میں اس کے اسی انجام سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ مجھے اس کی موت کا دکھ تھا لیکن اس پر حیرانی نہیں ہوئی تھی۔"

میں استاد ٹیڈی کی صورت کے بدلتے ہوئے تاثرات بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔" شہلا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ایک خرابی کے بعد دوسری خرابی سے کیا حاصل ہو گا؟"

"آپ کہہ رہی ہیں کہ میں ان کو بخش دوں؟" استاد نے یوں کہا جیسے مجرم اس کے قبضے میں ہوں۔ "قسم مولا کی..."

"خواہ مخواہ قسمیں مت کھاؤ۔" شہلا نے کہا۔ "تم کو خدا کے نظامِ انصاف پر بھروسہ نہیں ہے۔ خدا کے وجود کو تو مانتے ہو؟"

"یہ کیا بات کہی جی آپ نے؟" ٹیڈی بولا۔ "میں کافر تو نہیں ہوں۔"

"تو میرے بھائی خدا پر بھروسہ رکھو۔" شہلا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ وہ ظالموں کے ساتھ نہیں ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ سزا اور جزا کو اس پر چھوڑ دو۔ وہی ہمارا انصاف کرے گا اور اس کی گرفت سے بچ کر کہاں جائیں گے۔ تم خدا کی خدائی میں دخل مت دو اور دیکھو ظالموں کا انجام کیسا عبرت ناک ہوتا ہے۔"

"آپ کی بات تو دل کو لگتی ہے جی۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "لیکن یہ کتنا ظلم ہے کہ ہم یاری کی بات تو کریں مگر یار کے لیے کچھ نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہتا ہوں عدنان کے لیے۔"

"تم اس کی مغفرت کی دعا کرو اپنی نیکی سے اسے ثواب پہنچاؤ۔" شہلا بولی اور میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت آہستہ اور بڑی مہارت سے ٹیڈی کے ذہن کا رخ بدل رہی تھی اور اس کے خیالات پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی جارہی تھی۔ رابعہ یا محسن اسے نیکی کی تلقین کرتے تو بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہوتی۔ ٹیڈی جیسے لوگ جو صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں اور شیطان کے راستے پر چلنے لگتے ہیں، وہ انسان کی ہمدردی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لوگ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ اب خدا ہی انھیں نیکی کی توفیق دے تو دے۔ مگر کچھ لوگ کوشش جاری رکھتے ہیں۔ خواہ وہ بے سود ہو۔ ماں باپ کے بعد بڑی بہن اور کبھی کبھی بڑا بھائی بھی انھیں سمجھانے کا فرض پورا کرتے ہیں۔ شہلا نے اس وقت بڑی بہن کی ذمہ داری قبول کر لی تھی اور ٹیڈی کو نیکی بدی اور گناہ و ثواب پر لیکچر دے کر سچ مچ بڑی بہن کا برتر مقام حاصل کر لیا تھا اور ٹیڈی مجبور ہو گیا تھا۔ وہ شہلا کو پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ یہ تو دنیا کا قاعدہ ہے..."

"لیکن باجی!" اس نے جذباتی ہو کے کہا۔ "مجھے کچھ کرنے دیں۔ قسم مولا کی۔ اگر میں آپ کے کام بھی نہ آسکا تو لعنت میری یاری کے رشتے پر۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کچھ لوگ آپ کو بھی پریشان کر رہے ہیں۔"

"ہاں بھئی۔" شہلا متفکر ہو کے بولی۔ "یہ معلوم نہیں کسی کو ہم سے کیا دشمنی ہے۔ میں تو ان کے ڈر سے باہر بھی نہیں نکل سکتی اور اپنے گھر میں بھی نہیں رہ سکتی۔"

"آپ اپنے گھر میں رہیں جی۔" وہ سینہ تان کے بولا۔ "ٹیڈی آپ کی حفاظت کرے گا۔ ٹیڈی کی لاش پر سے گزرے بغیر کون مائی کا لال ہے جو بُری نیت سے اندر قدم بھی رکھے۔ جہاں آپ کا جی چاہے جائیں۔ ٹیڈی کے ساتھ آپ کو کوئی ڈر نہیں۔ یا مجھے بتا دیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ قسم مولا کی ایک ایک کو ٹھنڈا نہ کر کے دم لوں تو..." وہ پھر بڑ مارنے پر اتر آیا تھا اور اپنی بساط سے بڑھ کر بات کر رہا تھا۔

"ابھی تک صرف ایک آدمی کا پتا چلا ہے۔" شہلا نے سوچ کر کہا۔ "کیوں سکندر بھائی؟"

"ہاں؟ ہاں۔" میں نے چونک کر کہا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے اچانک سوال کر دیا تھا۔ "وہ تو ٹھیک ہے شہلا لیکن ہمارے یقین سے تو بات نہیں بنتی نا۔ عدالت تو ثبوت اور گواہ مانگتی ہے اور وہ معزز آدمی کہلاتا ہے۔ کون مانے گا کہ عدنان کے قتل میں درپردہ یہی شخص تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے عدنان کو مروانا چاہتا تھا۔ استاد ٹیڈی کو معلوم ہے کہ عدنان پر سٹے بازی کا الزام جھوٹا تھا۔ بس انھوں نے بہانہ بنا لیا۔"

"آپ مجھے بتائیں جی کون ہے وہ۔" بلا ارادہ اس نے ایک غلیظ گالی دی مگر اسے احساس نہیں ہوا۔

"میرا خیال ہے رابعہ! تم شہلا کے ساتھ جاؤ۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا جس میں دس بجے تھے۔ "ہم بات کر کے آتے ہیں۔ آپ لوگوں کی موجودگی میں ہم کھل کے بات نہیں کر سکتے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ مردانہ معاملات ہیں۔" محسن نے میری تائید کی۔ رابعہ نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ اور شہلا ہمیں جلد پہنچنے کی تاکید کر کے چلی گئیں۔ بالکل روایتی بیویوں کے انداز میں۔

"اب بات یہ ہے استاد ٹیڈی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ عدنان کو قتل کرانے کے لیے پیسہ کس شخص نے خرچ کیا تھا۔ ہماری نظر میں اصل مجرم وہی ہے اور ہم اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم اس کام میں ہماری مدد کرو گے؟"

"لو جی آپ نے بھی کیا بات کی۔ قسم مولا کی جان بھی مانگو تو..."

"نہیں۔ جان کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے قتل کرنا ہوتا تو ہم تم سے کہہ دیتے۔"

"اور تم اپنے خنجر سے اس کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"لیکن ہم تو اسے زیادہ سخت سزا دینا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب دیکھو کہ عدنان تو مر کے دنیا کے جھگڑوں سے ہی نکل گیا۔ سزا کسے ملی؟ پیچھے رہ جانے والوں کو۔ اس شخص کو مار دیا گیا تو سزا ملے گی بے گناہ بیوی بچوں کو۔ ہم نے کچھ اور سوچا ہے جس میں وہ خود سزا کاٹے اور اس کا سب کچھ چھن جائے۔ اس کی دولت۔ اس کا غرور۔ طاقت کا نشہ اور اثر و رسوخ۔ اسے بہت لمبی قید ہو اور جب وہ باہر نکلے تو دنیا میں اس کا کوئی نہ ہو۔ وہ فقیروں سے بھی بدتر ہو۔"

میری بات کا بہت آہستہ آہستہ اثر ہوا۔ ٹیڈی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ تو آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ سزا اسی کو ملنی چاہیے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تم بات سمجھ لو گے۔" میں نے کہا۔ "اب میرے چند سوالات کا جواب دو۔ مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ تم کس حد تک مددگار ثابت ہو سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمھاری جان پہچان کتنی ہے؟"

"قسم مولا کی استاد ٹیڈی ان سب کو جانتا ہے جن کو آپ نہیں جانتے۔"

"تم منشیات کا دھندا کرنے والوں سے واقف ہو؟"

"ایک تو وہ ہیں جو گلی گلی چرس بھرے سگریٹ اور راکٹ گولی، پڑی یا ملکہ اسپرٹ والی شراب بیچتے ہیں۔" ٹیڈی نے زور دے کر کہا۔

"ہاں۔ ایسے لوگوں کے علاوہ تم خریداروں سے بھی واقف ہو گے؟"

"خریدار تو بہت۔ وہ خود ہی اڈوں پر پہنچ جاتے ہیں کسی نہ کسی کی معرفت۔" ٹیڈی نے کہا۔

"ان میں پولیس کے چھوڑے ہوئے آدمی بھی ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہیں جی مگر وہ اپنا بھتہ وصول کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔" ٹیڈی نے پھر کہا۔ "مخبری وہ اس وقت کرتے ہیں جب کوئی ان کے ساتھ بدمعاشی کرے یا ان کو حصہ کم دے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یا نرمی سے۔"

"گویا تم منشیات فروخت کرنے والوں کو بھی پہچانتے ہو، خریداروں کو بھی اور مخبروں کو بھی۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے کتنے تمہارے دوست ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جو کام آسکتے ہوں۔"

"کام کیا ہے؟" ٹیڈی نے پوچھا۔ محسن کی طرح ابھی تک وہ بھی میرے سوالوں سے پریشان تھا۔

"کام میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو کچھ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ یہ نشہ آور چیزیں آتی کہاں سے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ جو لوگ یہ چرس بھرے سگریٹ، راکٹ، ہیروئن اور مینڈ ریکس کی گولیاں بیچتے پھرتے ہیں یہ لوگ مال کہاں سے لیتے ہیں؟"

"اس کے دو چار ٹھکانے ہیں۔" ٹیڈی سوچ کر بولا۔ "وہ بڑے خاص لوگ ہیں۔ خود سامنے نہیں آتے۔"

"تم ایسے کسی خاص آدمی کے ٹھکانے سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو میں تم سے کہوں کہ مجھے وہاں لے چلو۔"

"آپ کو!" وہ ہنسا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں جی! میں آپ کو کیسے لے جا سکتا ہوں؟"

"اچھا چلو، مجھے نہ لے جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ تم خود ان خاص لوگوں تک جا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کوئی سودا کرنے کے لیے۔ مثلاً دس بیس ہزار کا مال اٹھانا ہو میرے لیے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جی؟" ٹیڈی نے مجھے غور سے دیکھا لیکن میں بالکل سنجیدہ تھا۔ "میرا یہ دھندا نہیں تو آپ یہ مال لے کر کیا کریں گے؟"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرے ہر سوال کا ایک مقصد ہے۔ تم صرف جواب دو، مجھ سے سوال مت کرو۔ میں ابھی اسی وقت بیس ہزار روپے کی چرس یا چرس کے سگریٹ یا ہیروئن خریدنا چاہتا ہوں۔ تم دلوا سکتے ہو؟ ہاں یا نہیں؟"

ٹیڈی نے بہت دیر بعد اقرار میں سر ہلایا۔ "میں خود مال نہیں لا سکتا۔ وہ ہر ایک کو مال نہیں دیتے۔ انھی کو دیتے ہیں جن کا دھندا ہو اور جن پر اعتبار ہو۔ میرا ایک یار ہے۔ وہ لا سکتا ہے۔ مگر وہ پوچھے گا۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ اب تمہارا بھی یہی دھندا کرنے کا ارادہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے وہ تمہارا یار ہے تو اس کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس دھندے میں ادھار یا چیک نہیں چلتا۔" ٹیڈی نے کافی دیر بعد کہا۔

"میں نقد رقم دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم گن بھی سکتے ہو اور اپنے اس یار کو دکھا بھی سکتے ہو کہ نوٹ پرانے ہیں [illegible] میں نہیں ہیں اور ان پر کوئی نشان نہیں ہے۔"

"فرض کریں جی میں نے مال لا دیا۔" ٹیڈی بولا۔ "بتائیے کام جو اس کے بعد ہوگا؟"

"یہ ہوئی نا بات۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف [illegible] سکتے ہو۔" میں نے اس کے جذبات کو ہوا دی۔ "اگر تم ہمیں مال لا دو۔ وقت کی کوئی بات نہیں بارہ بج [illegible] صبح کے دو بج جائیں۔ چار بجے صبح تک بہرحال یہ کام [illegible] چاہیے۔ اس مال کو ہم ایک خاص جگہ پہنچا دیں گے [illegible] شخص کے گھر میں چھپا دیں گے جس نے عدنان کو قتل [illegible] کے لیے بدمعاشوں کو پیسہ دیا تھا۔ یہ ہمارا کام ہے جس [illegible] میں تم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہم اس گھر کے نقشے [illegible] طرح واقف ہیں۔ یہ سارا مال اگر دو تین گتے کے ڈبوں [illegible] تو بہت ہی اچھا ہو۔ ان ڈبوں میں ہم اوپر کچھ اور [illegible] مثلاً صابن یا ٹوتھ پیسٹ وغیرہ اور اس شخص کے گھر میں [illegible] جگہ رکھیں گے کہ خود اسے بھی معلوم نہ ہوگا مگر پولیس [illegible] لے گی تو ڈبے سامنے رکھے نظر نہیں آئیں گے معلوم یہی [illegible] انھیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔"

"ابھی تک آپ نے مجھے اس شخص کا نام نہیں بتایا۔" [illegible] نے نرم لہجے میں کہا۔

"اس کا نام ہے چراغ دین۔" میں نے کہا۔ "اب [illegible] دوسرا حصہ سنو۔ منشیات کا ایک چھوٹا سا پیکٹ الگ [illegible] جس کی مالیت پانچ سو روپے کے لگ بھگ ہونی چاہیے [illegible] چونکہ بھاؤ معلوم نہیں اس لیے ہم خود پیکٹ بنانے کا [illegible] کر سکتے ہیں۔ اس پیکٹ کو ہم چراغ دین کے پاس رکھوا [illegible] کل صبح تم ایک گاہک اس کے گھر بھیجو گے۔ وہ پانچ [illegible] دے کر یہ پیکٹ خریدے گا۔ سو سو کے ان پانچ نوٹوں پر [illegible] والوں کے دستخط ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس گاہک کو بھیجو گے، وہ پولیس کا مخبر ہوگا۔ چراغ دین صبح دس بجے [illegible] پر ہی ملتا ہے۔ یہ گاہک ساڑھے نو بجے پہنچ جائے گا [illegible] ایک اصل گاہک بھی وہاں پہنچے گا۔ اس کے پاس اپنا [illegible] لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں ساتھ پہنچیں، تاکہ ایک [illegible] گواہ بن سکیں۔ ٹھیک وقت پر پولیس یا اینٹی کرپشن والے [illegible] والے کسی مجسٹریٹ کے ساتھ چھاپہ ماریں گے اور مال برآمد [illegible] دستخط شدہ نوٹ چراغ دین کی جیب میں سے نکلیں گے [illegible] ہونے کا کوئی امکان نہیں، وہ پانچ نوٹ گنے گا اور جیب [illegible] لے گا۔ یہ تو ہوگا ایک سودے کا ثبوت۔"

"لیکن جناب اس میں وہ گاہک بھی تو پکڑا جائے گا جس نے سودا کیا ہوگا۔" ٹیڈی بولا۔

"بھئی وہ تو سرکاری آدمی ہوگا۔ فرضی گاہک بنا کے بھیجا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اسی لائن کا آدمی ہونا چاہیے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن مخبر کسی لالچ کے بغیر کام نہیں کرتے۔" ٹیڈی بولا۔ "ان کی آمدنی کا ذریعہ بند ہو جاتا ہے اور پھر وہ اعتبار کے قابل نہیں رہتے۔ بڑا دھندا کرنے والے بھی ان کے دشمن ہو جاتے ہیں اور خود پولیس والے بھی۔ اگر سارے مخبر ایمان داری سے کام کرنے لگیں تو یہ دھندا ختم نہ ہو جائے۔" وہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگا۔ "البتہ ایک آدمی ہے میری نظر میں ظاہر میں تو میرا دوست ہے مگر دوست وہ کسی کا بھی نہیں ہے۔ ایک بار تو اس نے مجھے مروا دیا تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ وہ اپنے یار کو قتل کرنے والوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔ وہ ان کا چمچہ تھا۔"

"پھر تو یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ایسے شخص کو تو چھوڑنا نہیں چاہیے بس تم اسی کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلاؤ۔ کل صبح ہم تمہیں سو سو کے پانچ نوٹ دیں گے۔ دستخط شدہ۔ تم اسے ساتھ لے کر چراغ دین کے گھر پہنچنا اور اسے کہنا کہ یہ نیا ٹھکانا ہے۔ یہاں مال سستا ملتا ہے اس لیے منافع ہونے کی زیادہ امید ہے تم چونکہ اس دھندے میں نہیں ہو اس لیے وہ ضرور سوال کرے گا کہ تمہیں کس نے بتایا؟ اور پہلے تم کیوں دبے رہو؟ تم کہنا کہ بتانے والوں نے بتا دیا ہے اور لوگ تو نہ جانے کب سے مال اٹھا رہے ہیں۔ اپنا بھی کچھ خیال ہے دو چار پیسے کمانے کا۔ پرانے ٹھکانے کی بات ہوتی تو وہ تم سے کہتا کہ میاں، مجھے بیچ میں کیوں لاتے ہو۔ جاؤ مال اٹھاؤ اور بیچو۔ لیکن وہ مخبر ہے اور نئے ٹھکانے کا مطلب ہے آمدنی کا نیا ذریعہ۔ وہ تمہارے ساتھ ضرور جائے گا۔ نوٹ تم اس کو آخری وقت میں پکڑانا یعنی گھر کے قریب پہنچ کر بلکہ عین دروازے پر۔ دروازے پر ایک چوکیدار ہوگا۔ اس سے صرف یہ کہنا کہ صاحب کو بتا دے۔ وہ پیکٹ لینے والا آگیا ہے۔ وہ سمجھ جائے گا اور باقی جو کچھ ہوگا سب کے سامنے ہوگا۔ وہ مخبر اور دوسرا خریدار ایک دوسرے کو یقیناً پہچان لیں گے اور بعد میں یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ منشیات فروش ہیں۔ ایک گواہ تم بھی بن سکتے ہو۔ پھر چراغ دین اندر اور منشیات اسمگلنگ کرنے کے الزام میں ساری جائداد کی ضبطی۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی اس شخص کی سزا بھی ہونی چاہیے۔"

محسن کے اختلاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ استاد ٹیڈی کچھ شش و پنج کا شکار تھا لیکن وہ عدنان سے یاری کے بہت بڑے دعوے کر چکا تھا اور شہلا کو زبان دے چکا تھا۔ رات کے گیارہ بجے وہ ہمارے ساتھ اس ریسٹورنٹ سے نکلا۔ ہم نے ٹیکسی والے سے یہ معاملہ طے کیا کہ رات کو ہمیں شہر میں مختلف جگہ جانا ہے۔ اسے انتظار بھی کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ میٹر کی بات نہ کرے، رات بھر کی اجرت طے کر لے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ٹیکسی والے نے منہ پھاڑ کے رقم مانگی اور ہم نے دو سو روپے ایڈوانس ادا کر دیے۔ ٹیکسی پہلے ایک جنرل اسٹور کے قریب رکی۔ وہاں سے میں نے چائے کے اور دودھ کے ڈبے خریدے اور دکان دار نے مجھے یہ سامان تین گتے کے ڈبوں میں پیک کر کے دیا۔ ایک ڈبا ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبوں کا دوسرا صابن کا اور تیسرا جلے ہوئے زخموں پر لگانے والے مرہم کا۔ یہ زیادہ جگہ گھیرنے والا سامان تھا چنانچہ میرے دو سو روپے بھی خرچ نہیں ہوئے۔ آگے ایک اور دکان پر ٹیکسی رک کے میں نے ٹوتھ پیسٹ کی — بارہ ٹیوبیں خریدیں جن کا نام گتے کے ڈبے پر لکھا ہوا تھا۔ اسی طرح دو درجن صابن اور زخم پر لگانے والے مرہم کی ٹیوبیں لیں۔ آتنی رات گئے اس دکان پر ایسا سامان پہلے کس نے خریدا ہوگا۔ دکان دار کچھ حیران تو تھا مگر آخری وقت میں ہونے والی بکری سے خوش بھی تھا۔ پہلے والے تین ڈبوں کے سامان کو ہم نے ٹیکسی میں فرش پر اس طرح خالی کیا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ دو سو روپے کما کے بہت خوش تھا اور دو سو کا سامان ہم نے گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ اس کے لیے پریشانی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

استاد ٹیڈی ہمیں بہت سی اندھیری گلیوں میں لے گیا۔ اس کو کئی جگہ مایوس بھی لوٹنا پڑا۔ ہماری ملاقات پراسرار قسم کے لوگوں سے ہوئی اور عین اس وقت جب ہم استاد ٹیڈی کی طرف سے مایوسی کا شکار ہونے لگے تھے۔ ہماری جدوجہد بارآور ہوئی۔ ہم ٹیکسی میں آدھے گھنٹے سے اس کی واپسی کے منتظر تھے کہ وہ اچانک بہت جوش کے عالم میں نمودار ہوا اور تینوں خالی ڈبے لے گیا جس میں ہم نے پوری رقم رکھ دی تھی ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ ابھی آدھا گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے ہم صورت سے شریف آدمی لگتے تھے۔ وہ گاڑی کی چابیاں لے گیا اور اسی ریسٹورنٹ میں چائے پینے بیٹھ گیا جس کے سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیڈی صرف دس منٹ بعد آگیا۔ وہ مال لے آیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے آنے سے پہلے ہم نے گتے کے تینوں ڈبوں کے اوپر ٹوتھ پیسٹ اور صابن وغیرہ رکھ دیے۔ پانچ سو کا پیکٹ بنا بنایا مل گیا تھا جو خوردہ فروشوں کے لیے تیار رکھا جاتا تھا۔ ہم ٹیکسی لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچے اور استاد ٹیڈی سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پھر میں اور محسن گتے کے ڈبے بغل میں دبا کر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چراغ دین کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے۔

"دروازے پر محبت خاں ہوگا۔" میں نے محسن سے کہا۔ "لیکن اس وقت سو رہا ہوگا۔ اندر پہنچ کے ان چیزوں کو چھپانے کا مرحلہ زیادہ سخت ہے۔ اگر سب دروازے اور کھڑکیاں بند ہوئے تو کیا ہوگا؟"

"اندر کا نقشہ مجھے معلوم ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور کھڑکی بھی کھولی جا سکتی ہے۔ شاید کوئی شیشہ ٹوٹا ہوا مل جائے۔ لیکن زیادہ الجھن کی بات یہ ہے کہ تو نے چھوٹے پیکٹ کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ چراغ دین اسے کیوں رکھے گا اور صبح کسی سے پانچ سو روپے لے کر اسے کیوں دے گا؟"

"اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے محسن!" میں نے کہا۔ "خدا نے چاہا تو چراغ دین کے ساتھ کل تک میرا اور تیرا سب حساب بے باق ہو جائے گا۔ پھر میں دیکھتا ہوں شیر دانی صاحب اسے بیٹی کا رشتہ کیسے دیتے ہیں۔ وہ تو بھول بھی چکا کہ اس نے وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ اور قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا چنانچہ وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھ، بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھا ہے کہ اب تو۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد۔ قصاب ہم مرد۔ حرام کی کمائی کا ایک ایک پیسہ نہ اگلوا لیا تو سکندر نام نہیں۔"

"اے بابا! یہ سب کچھ ہو جائے گا مگر مجھے بھی تو بتا کہ ہو گا کیسے؟"

"دیکھ ابھی تو ہم یہ مال اس کے گھر میں چھپانے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر محبت خان یا چراغ دین میں سے کوئی جاگ اٹھا تو اس سے پہلے کہ وہ ہنگامہ کرے یا ہمیں پہچانے، میں اس کو ناک آؤٹ کر دوں گا۔ مال کو چھپانے کا کام تیرا۔ ان دونوں پر نظر رکھنا میرا۔ اندر جانے سے پہلے مین سوئچ آف کر دیں گے۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو تو وہ لائٹ نہ جلا سکیں۔ ہم اندھیرے میں ان کو مٹا کے نکل جائیں گے۔ ایک آدھ گھنٹے میں ان کو ہوش آ جائے گا تو ظاہر ہے وہ پہلے گھر کا جائزہ لیں گے۔ اگر کوئی چیز غائب نہ ملی تو پولیس کو رپورٹ کرنے کا سوال ہی نہیں۔ چراغ دین اپنے چوکیدار پر تھوڑا سا بگڑے گا اور بات ختم۔"

"نوٹوں پر دستخط کون کر کے دے گا؟" محسن بولا۔ "اور دستخط کروانے کون جائے گا؟"

"دستخط کون کرے گا؟ یہ تو انسداد منشیات والے بتا سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ دستخط ہی نے سے جو مجھے جانا پڑے گا اور میں اپنا حلیہ تھوڑا سا بدل کے جاؤں گا۔ جب پکڑ کا پورا انتظام ہو جائے گا تو میں ان کے ساتھ چراغ دین کے گھر تک جاؤں گا۔ میرے ساتھ استاد ٹیڈی ہوگا اور چھاپہ مارنے والے تھوڑے سے وقفے کے بعد آئیں گے۔ میں نوٹ ٹیڈی کو دے کر خود نکل جاؤں گا۔ ٹیڈی بھی خود تو نہیں جائے گا وہ اس خریدار کو آگے کرے گا۔ جب چھاپہ مارنے والے پہنچیں گے تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا پھر وہاں کیا ہوتا ہے ہماری جانے بلا۔ وہاں جتنے ہوں گے سب دھر لیے جائیں گے اور مال ضرور برآمد ہوگا۔"

دروازے پر رک کے میں نے اندر جھانکا۔ محبت خان برآمدے میں چارپائی پر سویا پڑا تھا۔ میں اور محسن باری باری اندر داخل ہو گئے اور گاڑی کی آڑ میں سیدھے نکل گئے۔ اندر کے سب کمروں میں اندھیرا تھا اور باہر بھی کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی لیکن ہر طرف سے منعکس ہو کر پہنچنے والی معمولی سی روشنی میں کوٹھی کا ہر حصہ صاف نظر آتا تھا۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے مگر غور سے دیکھنے پر ہمیں پیچھے کی طرف ایک کھڑکی کے پٹ کا سب سے اوپر والا شیشہ غائب نظر آیا۔ محسن کے اندازے کے مطابق یہ باورچی خانے کی کھڑکی تھی چنانچہ باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہ ہوا تو گھر میں داخل ہونا آسان ہو جائے گا۔ میں نے منڈیر پر قدم جمائے اور اوپر چڑھ کے شیشے میں ہاتھ ڈالا چٹخنی آسانی سے کھل گئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ آواز کیے بغیر وا ہو گئے۔ ہم دونوں باری باری اندر اتر گئے۔

"اگر ہم کوئی پین ٹارچ لے آتے تو کام آسان ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔

"تو لائٹر جلا لے اور اپنا ہاتھ سامنے رکھ۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "روشنی کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔"

باورچی خانے کا دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ ہم ایک مختصر سے کوریڈور میں طلوع ہوئے۔ باورچی خانے کے بالکل سامنے اسٹور روم تھا۔ تین ڈبے چھپانے کے لیے جگہ کی کمی نہ تھی۔ چراغ دین کو ہفتوں کیا مہینوں معلوم نہ ہوتا کہ اتنے بڑے گھر کے ساز و سامان میں راتوں رات گئے کے تین ڈبوں کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس مال کا ایسی جگہ سے دستیاب ہونا ضروری تھا کہ تلاش کرنے پر آسانی سے نہ ملے اور پولیس یہ یقین کرنے پر مجبور ہو کہ خود چراغ دین نے مال کو بڑی چالاکی سے چھپایا تھا۔ اسٹور روم کا دروازہ بند کر کے محسن نے لائٹر جلایا اور ہم نے سارے فالتو سامان کا جائزہ لیا جو بے مصرف ہونے کی وجہ سے یہاں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کاٹھ کباڑ میں کوئی ڈبا چھپانے سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوں گے۔ پولیس دو منٹ میں ڈبے کو تلاش کر لے گی اور چراغ دین بھی اپنے دفاع میں یہ ضرور کہہ سکے گا کہ کسی نے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ ڈبوں کو ایسی جگہ چھپانا ضروری تھا جہاں چراغ دین کے سوا کسی اور کی رسائی نہ ہو۔ ایسی ایک جگہ وہ بیڈ روم ہو سکتی تھی جو اب مقفل رہتا تھا۔ جب تک مریم زندہ تھی چراغ دین بھی اسی بیڈ روم میں سوتا تھا۔ اس کی موت کے بعد چراغ دین نے مریم کے ذاتی استعمال کی چیزیں مقفل کر دی تھیں۔ ایک ٹرنک میں ریشمی لحاف گدے اور تکیے وغیرہ تھے۔ مریم کے تمام کپڑے اور جوتے وارڈروب میں بھرے ہوئے تھے اور یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث چراغ دین کی زندگی اس گھر میں صرف اپنے بیڈ روم اور باتھ روم تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صبح کا گیا شام کو لوٹتا تھا دن میں بھی اگر آتا تھا تو صرف لنچ کے لیے۔ مریم کے بیڈ روم کو کھولنے کی نہ اسے فرصت تھی اور نہ ضرورت رہی تھی۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد میں اور محسن اس نتیجے پر پہنچے کہ مریم کا بیڈ روم موزوں ترین جگہ ہو سکتی ہے لیکن اس قفل کو کھولنا آسان نہیں تھا جو دروازے میں مہینوں سے پڑا ہوا تھا۔ شاید ہماری جگہ کوئی پیشہ ور نقب زن ہوتا تو اس کے لیے بھی یہ کام مشکل ہوتا۔ اس کے بعد اندر کے ٹرنک اور وارڈروب کے تالے کھولنے کا مرحلہ تھا اور بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔

"یار محسن!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ سب چابیاں ایک ہی جگہ ہوں گی۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سوال یہ ہے کہ کہاں؟"

"یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ممکن ہے اس نے چابیاں کسی میز کی دراز میں ڈال دی ہوں۔ یا کہیں لٹکا دی ہوں۔ اس وقت ہم پورے گھر میں چابیاں تو تلاش نہیں کر سکتے۔"

"مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ چراغ دین جو چابیوں کا گچھا اٹھائے پھرتا ہے، اس میں دس بارہ چابیاں ہیں۔"

"اس میں دکان کی چابیاں ہوں گی اور اگر گھر کی بھی ہوں گی تو اس وقت وہ گچھا اس کے کوٹ کی جیب میں، بیڈ سائڈ ٹیبل پر یا تکیے کے نیچے کہیں بھی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔" محسن نے کہا۔ "چراغ دین تو سویا پڑا ہے۔"

"خراٹوں کی آواز تو مجھے بھی آ رہی ہے۔" میں نے اس تجویز کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بہت خطرناک کام ہوگا اگر وہ جاگ اٹھا تو اسے اندھیرے میں ناک آؤٹ کر دینے کے سوا فرار کی کوئی صورت نہ ہوگی۔"

"اگر ہم اپنے چہرے چھپا لیں تو وہ ہمیں کیسے پہچان سکتا ہے؟" محسن نے کہا۔ "بالفرض محال وہ اٹھ جاتے تو بیشک اس ناک آؤٹ کے پروگرام پر عمل کرنا اور اس کی آواز نہ نکلنے دینا صبح ہوش آنے پر وہ گھر کا جب جائزہ لے گا تو مطمئن ہو جائے گا کہ چور آئے تھے لیکن کچھ لے کر نہیں جا سکے۔ مریم باجی کا کمرہ بدستور مقفل ہوگا اور چراغ دین کو ہر چیز اپنی جگہ پر ملے گی تو وہ خدا کا شکر بجا لائے گا۔ محبت خان کو جاگتے رہنے کے احکامات پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید کرے گا اور بہت کیا تو کل سے بھرا ہوا ریوالور تکیے کے نیچے رکھ کر سوئے گا کہ آج تو ہوش ہی گئے تھے کل کو جان نہ چلی جائے۔"

"بشرطیکہ کل رات بھی چراغ دین کو اسی بیڈ روم میں سونا نصیب ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا قیام سرکاری مہمان خانے میں نہ ہوا تو۔۔"

چراغ دین کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اور محسن نے تھوڑا سا جھانک کے دیکھا۔ چراغ دین نے کروٹ لی اور اٹھ بیٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے کے باوجود اس نے میرا سایہ دیکھ لیا ہو۔ میں اور محسن ایک ساتھ پیچھے ہٹے اور دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد بیڈ روم سے ملحق باتھ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ چراغ دین ذیابیطس کا مریض تھا چنانچہ اس کو رات کے دوران کئی بار اٹھنا پڑتا تھا۔ بجلی کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور ایک نائٹ لیمپ کی مدھم سبز روشنی تھی دروازے سے بیڈ تک چند قدم کا فاصلہ میں نے ایک سانس میں طے کیا۔ میری نظر نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی مختلف چیزوں کو الگ الگ دیکھا۔ اس پر صرف تین چیزیں تھیں سگریٹ کا ایک پیکٹ، ایک لائٹر اور ایک نظر کا چشمہ۔ میں نے فوراً تکیہ اٹھایا۔ اس کے نیچے پرس تھا اور چابیوں کا گچھا تھا۔ چراغ دین کے باتھ روم سے باہر آنے تک میں یہ گچھا مٹھی میں دبا کے پلنگ کے نیچے غائب ہو چکا تھا۔ چراغ دین نے باتھ روم سے باہر آ کے نائٹ لیمپ آف کیا اور سو گیا۔ بیڈ کے نیچے میں نے اس

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے دھڑام سے گرنے کی اور کچھ دیر بعد خراٹے لینے کی آواز سنی۔ دس منٹ بعد میں رینگتا ہوا بیڈ کے نیچے سے نکلا تو دروازے تک پہنچنا میرے لیے مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ اب کمرے کا نقشہ مکمل طور پر میرے ذہن میں تھا۔ میرے ہاتھ میں چابیاں دیکھ کر محسن نے مجھے اس طرح تھپکی دی جیسے کوئی استاد اپنے ہونہار شاگرد کو پہلے ڈاکے میں کامیابی کے بعد دیتا ہے لیکن کامیابی کے یقین کی منزل ابھی نہیں آئی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ درجن بھر چابیوں میں سے کوئی بھی چابی اس تالے کی نہ ہو جو مریم کے بیڈروم کے دروازے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے ساری چابیوں کو مضبوطی سے مٹھی میں دبائے رکھا اور اندازے سے قفل میں پہلی چابی لگائی۔ تالے کی ساخت کے مطابق آٹھ میں سے صرف تین چابیاں آزمائی جاسکتی تھیں۔ تیسری چابی فٹ بیٹھی اور میں نے مسرت سے محسن کی طرف دیکھا۔ تالے کو اوپر سے تھام کے میں نے آہستہ سے چابی گھمائی اور کھٹکے والے تالے کو آواز کیے بغیر کنڈی کے ہک سے نکال لیا۔ تقدیر کچھ یاور لگتی تھی کہ کنڈی سخت نہیں تھی ورنہ مہینوں بند رہنے والی کنڈی جام ہوجاتی تو ذرا سا ہلانے پر چلانے لگتی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کرلیا۔ محسن نے تینوں ڈبے فرش پر رکھے اور جیب سے لائٹر نکال کے جلایا۔ قبر کی طرح تاریک کمرے میں ایک آسیب زدہ روشنی پھیل گئی تھی۔ میں اور محسن کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ میرے سامنے یادوں کا ایک قبرستان تھا جس میں وقت کا ہر گزرا ہوا لمحہ کسی لوحِ مزار کی طرح اداس نظر آتا تھا۔ ایسا ہی اجالا میں نے ایک گمنام قبر کے کھنڈر میں دیکھا تھا۔ جس کے ایک گوشے میں منشی مرحوم عرف فوما پنجو کا بے جان جسم فرشِ خاک پر بے گور و کفن پڑا تھا اور پکار رہا تھا کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ اور میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو۔ کہ وضعداری نے مجھے کارٹون بنا دیا ہے اور وفاداری نے مجرم! کمرے میں اس وقت کی بازگشت تھی جب یہ گھر مریم کے دم سے آباد تھا۔ وہ مریم جو بہت دور مری کے پہاڑوں پر مسلط سیاہ رات میں ایک قبر کے نیچے صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی اور ہم جو اجنبی نہیں تھے اس کی خلوت گاہ میں چوروں کی طرح کھڑے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ہر سمت سے مریم کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ محسن کے خیالات مجھ سے مختلف نہ تھے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک صاف نظر آئی لیکن اس نے درد کی لہر کو قطرۂ اشک کے گرنے نہ دیا۔

"ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے سکندر!" وہ بولا اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹرنک کا قفل کھولتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اور محسن کو اپنا دل پتھر کرنا پڑا۔ ٹرنک میں سے ایک خوشبو کا جھونکا آیا جو ابھی تک زندہ تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے سامان ہٹایا اور مریم کے ذاتی استعمال کی چیزوں میں دو ایسے ڈبے رکھ دیے کہ مریم زندہ ہوتی تو ڈبے کے اندر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہوجاتی۔ اس وقت میرے ذہن میں چراغ دین سے انتقام کی آرزو پر مریم کی یاد غالب تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اس کی قبر پر پھولوں کے بجائے غلاظت بکھیرنے کا گناہ کر رہا ہوں۔ پھر میں نے خود کو یاد دلایا کہ میرا مقصد کیا ہے اور چراغ دین کون ہے۔ چراغ دین مارِ آستین ہے جس نے اپنے پالنے والے کو ڈسا۔ اب اس سانپ کا پھن نہ کچلا گیا تو یہ فوزیہ کو بھی ڈس لے گا اور شاید یہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جانے والا ایک اور جرم ہوگا جس کی سزا سے وہ خود کو بالکل محفوظ سمجھتا ہے۔ اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی اور باقی کام میں نے اپنی جذباتی کمزوری پر قابو پا کے چند منٹ میں ختم کرلیے۔ میں نے ٹرنک میں پھر تالا لگایا اور اپنے رومال سے تالے کو اچھی طرح صاف کردیا۔ کمرے کی ہر چیز پر گرد کی تہہ تھی اور اس قفل پر میرے فنگر پرنٹ نمایاں ہوسکتے تھے۔ اسے صاف کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ اب معمولی سی عقل رکھنے والا کوئی پولیس افسر یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس گرد آلودہ کمرے میں تالا بالکل صاف ہے اور آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتا تھا کہ تالا اکثر کھولا اور بند کیا گیا ہے چنانچہ اس پر گرد نہیں ہے۔ تیسرا ڈبا وارڈروب میں کپڑوں کے پیچھے چھپا کر میں نے کمرے کو باہر سے تالا لگایا اور اپنے رومال سے دروازے کے ہینڈل تک کو صاف کردیا۔ اب آخری مرحلہ چابیوں کو واپس تکیے کے نیچے رکھنے کا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ نکل جائے اور ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی میں انتظار کرے۔ استاد ٹیڈی ہماری واپسی میں تاخیر سے پریشان ہوسکتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ چراغ دین ایک بار پھر باتھ روم جانے کے لیے ضرور اٹھے گا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے چابی پھر تکیے کے نیچے رکھ آنا مشکل نہ ہوگا۔

محسن کے جانے کے بعد میں چراغ دین کے بیڈروم کے دروازے سے لگا کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ صبح ہونے تک وہ نہ اٹھا تو میں کیا کروں گا یا صبح کے قریب اٹھ کے پھر نہ سویا تو یہاں سے کیسے نکلوں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہر صورت میں وہ اٹھتے ہی تکیے کے نیچے چابیوں کی موجودگی کی تصدیق نہیں کرے گا بلکہ پہلے باتھ روم جائے گا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور گڑبڑ ہوگئی۔ دور ہی جائے گا۔ آدھے گھنٹے بعد ایک اور گڑبڑ ہوگئی۔ دور سے اذان کی آواز آئی اور میں نے محبت خان کو کلمہ پڑھ کے اٹھتے سنا۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندر آ رہا ہے۔ میرے لیے اب چھپنے کی ایک ہی جگہ رہ گئی تھی۔ میں چراغ دین کے بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ نیچے سے ہی میں نے محبت خان کو اندر آ کے دروازے میں رکتے دیکھا، وہ چند سیکنڈ کھڑا رہا اور پھر سیدھا نکل گیا۔ اسی وقت چراغ دین نے جماہی لی اور اٹھ کے باتھ روم میں گیا۔ میں نے چابی تکیے کے نیچے رکھی اور اس کے بیڈروم سے نکل آیا۔ اب میں باورچی خانے کی کھڑکی کے راستے باہر نہیں جاسکتا تھا لیکن اب وہ دروازہ کھل گیا تھا جدھر سے محبت خان گھر میں آیا تھا۔ ایک منٹ بعد میں باہر آ چکا تھا۔ پھاٹک کے اوپر سے کود کر سڑک پر آتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری اسکیم کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا تھا لیکن ابھی بہت سے مرحلے باقی ہیں... میں نے خود کو یاد دلایا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ محسن اور استاد ٹیڈی بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ استاد ٹیڈی ٹیکسی کے بونٹ پر بیٹھا تھا اور محسن ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی محسن پیچھے والی سیٹ پر آ گیا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر جگہ سنبھال لی۔

"اب کدھر جانا ہے بادشاہو؟" ٹیکسی ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔

"کیوں استاد!" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا "وہ چراغ دین کے دونوں بہنوئی کہاں ملیں گے؟ ہم نے کہا تھا ناکہ صبح ان کو بھیجنا ہے۔" میں نے اس کو پلٹ کر دیکھنے پر آنکھ ماری۔

"ایک تو داتا دربار کے پیچھے موہنی روڈ کی گلی میں ملے گا۔" ٹیڈی نے بات سمجھنے کے بعد سوچ کر کہا۔ "دوسرے کا پتہ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا تو پہلے موہنی روڈ کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔ "ایک سے تو بات ہوجائے۔"

"یار سکندرِ اعظم!" محسن نے مجھ سے انگریزی میں کہا۔ "دستخطوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ میرا مطلب ہے ان پانچ کاغذات پر کس کے دستخط ہوں گے؟"

"یہ معاملہ ایسا ہے برادرِ عزیز!" میں نے انگریزی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں کہا۔ "کہ ہمیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ وطنِ عزیز میں تعلیم کی صورتِ حال ایسی ہے کہ ان پڑھ نظر آنے والے گریجویٹ ثابت ہوتے ہیں۔"

"میری فرنچ میں اتنی ہی فصاحت و بلاغت ہے جتنی گوروں کی اردو میں تھی۔" محسن نے بھی فرنچ میں کہا۔

"دیکھیے نا! ہم دونوں کی زبان دانی میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے کی گرامر اور تلفظ کی غلطیاں معاف کرسکتے ہیں کیونکہ مشکل وقت میں راز کی بات کہنے کے لیے آدھی ادھوری فرنچ سے بہتر کوئی زبان نہیں۔"

اپنے لندن کے چار سال کے قیام کی مدت میں ہم دونوں نے ایک ساتھ فرنچ پڑھی تھی۔ کچھ خود، کچھ بے قاعدہ کورس کرکے لیکن اس زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ہم نے اپنے ہم مکتب ساتھیوں اور دوست احباب کی مدد سے حاصل کی تھی۔ انگریز کے لیے لاطینی اتنی اہم تھی جتنی پہلے اردو پر عبور حاصل کرنے والوں کے لیے عربی تھی لیکن وہ دور گزر چکے تھے۔ اب انگریز کوئی دوسری زبان جانتے تھے تو فرنچ، بالکل اسی طرح جیسے اپنے ملک میں فارسی کی آج بھی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔

"سو سو کے پانچ نوٹوں پر کسی مجسٹریٹ کے دستخط حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اینٹی کرپشن والوں کے پاس بھی جب تک باقاعدہ رپورٹ درج نہ کرائی جائے وہ چھاپہ نہیں مارتے اور یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا کیس ہے۔ رپورٹ نہ میں لکھا سکتا ہوں، نہ تو یہ کام کرسکتا ہے، نہ اپنا استاد۔ میری سمجھ میں ایک ہی صورت آتی ہے کہ ہم کسی پولیس انسپکٹر سے رابطہ قائم کریں اور اپنا زورِ بیان صرف کرکے یقین دلائیں کہ مسمّی چراغ دین کوئی شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے گھر میں واقعی خاصی مقدار میں منشیات کا ذخیرہ ہے۔"

"ہمارے زورِ بیان سے قائل ہو کے کون مشکل میں پڑنا پسند کرے گا؟" محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس ہر شریف آدمی کے گھر پر ایسے چھاپہ مارنے لگے تو کوئی گھر محفوظ نہ رہے۔ ان کو ڈر ہوتا ہے کہ کوٹھی والا ان پر بعد میں ہتکِ عزت اور ہرجانے کے مقدمات دائر کردے گا تو ان کی نوکری بھی جائے گی۔"

مطالعہ کرنے امتحان دینے اور یاد داشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب

قیمت ۵ روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۴۴ کراچی نمبر ۱

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"یہ کام مشکل ضرور ہے محسن، لیکن ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "نعرۂ بیان دہلا تو زرِ نقد چلے گا۔ ہم کسی پولیس انسپکٹر کی ذہانت پر بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ مجرموں کو پکڑنے کے معاملے میں جتنے کند ذہن نظر آتے ہیں، کسی کو مجرم بنانے میں اپنی ذہانت سے اتنا ہی کمال دکھاتے ہیں۔ آدمی کو پھانسنے کے طریقے وہ خود ایجاد کر لیتے ہیں۔"

"ایک ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "چھاپہ مارنا تو قانونی مسئلہ ہے اور اس کے لیے جو طریقۂ کار ہے اس میں ہم مداخلت نہیں کر سکتے لیکن پولیس کسی کو سرِ راہ منشیات فروخت کرتے پکڑ لے تو یہ ان کے دائرۂ اختیار میں ہے اور اس کے بعد خانہ تلاشی کے انتظامات وہ خود کر سکتے ہیں۔ سرِ راہ کا مطلب ہے گھر سے باہر اور باہر کا مطلب یہ نہیں کہ سڑک پر یا بازار میں۔ گھر کی حدود سے نکلنے کے بعد کوئی واقعہ دروازے سے ایک فٹ دور بھی پیش آئے تو یہ گھر سے باہر کی بات ہے۔"

"چشمِ بددور!" میں نے محسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "تو نے سوقت ذہانت کا بے مثل مظاہرہ کیا ہے۔ خریدار اگر چراغ دین کے گھر میں داخل نہ ہو اور گیٹ سے باہر ہی کھڑا رہے تو چراغ دین اسے وہ پیکٹ باہر آکر دینے پر مجبور ہوگا جیسے ہی خریدار رقم ادا کرے انسپکٹر اسے گرفتار کر لے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے کسی انسپکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ہمارا تو کوئی دوست بھی نہیں۔"

"یہ کام تو متعلقہ تھانے کا کوئی انسپکٹر ہی کر سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس ہونے کے لیے کہا۔ وہ تھوڑا سا حیران ضرور ہوا لیکن پریشان نہیں ہوا۔ اسے رات بھر کا معاوضہ توقع سے زیادہ مل گیا تھا اور ہماری فرانسیسی اس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں۔ میری ہدایات کے مطابق گاڑی تھانے کی حدود سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔ میں نے محسن کے بجائے یہ کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اُتر کے واپس گیا اور پچاس قدم چل کے موڑ کاٹتے ہی تھانے میں داخل ہو گیا۔ تھانے کا سارا عملہ رات بھر "تفتیش" میں مصروف رہنے کے بعد اب آرام میں مصروف تھا۔ حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے شب گزیدہ ملزمان ایک ہی جیسی حالت میں پڑے تھے۔ ایس ایچ او کا کمرہ خالی تھا۔ دوسرے کمرے میں دو افراد چارپائیوں پر سوئے پڑے تھے جو یقیناً عملے میں شامل تھے مگر بنیان اور دھوتی یا ایک جیسی مونچھوں سے ان کے عہدے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ محرر کہنیوں پر کرسی پر رکھے سر لمبے کی حالت میں تھا۔ میں نے کندھے ہلا کر اسے ہوشیار کیا۔ اور پوچھا "تھانے میں کوئی انسپکٹر کیوں نہیں ہے اور ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟"

"کمال ہے بھئی!" محرر نے دخل در معقولات کے علاوہ میرے سوال کو گستاخی سمجھتے ہوئے کہا۔ "میں کیا بتاؤں کہ کیوں نہیں ہے۔ افسر لوگ ہیں، کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں اپنی مرضی سے آتے جاتے ہیں۔"

"مرضی کے بچے!" میں نے محرر کو کرسی پر سے اٹھا کے زمین پر کھڑا کر دیا۔ "معلوم ہے میں کون ہوں؟"

محرر اس سلوک کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بھونکا رہ گیا اور فوراً سنبھل گیا۔ اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ تھانے میں ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے والا اور اس لہجے میں گفتگو کرنے والا یا تو کوئی مجسٹریٹ ہو سکتا ہے یا کوئی نیا پولیس افسر۔

"ایس آئی شیخ... سید اکرام شیخ ڈیوٹی پر ہیں جنابِ عالی!" محرر نے اٹینشن ہو کے کہا۔ "ابھی سگریٹ لینے گئے ہیں۔"

"ایس آئی... ایس آئی شیخ؟" میں نے تلخی سے زیرِ لب مسکرا کے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ سگریٹ خرید کے پیتے ہیں؟"

محرر کا رنگ اڑ گیا۔ "ہم تو ماتحت ہیں سرکار! افسر کو کیا بولیں کہ حرام مت لو۔ خود کبھی کسی سے لے کر بیڑی بھی پی ہو تو آپ معلوم کریں۔"

جو بات مجھے معلوم کرنی تھی معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ "میں ابھی کچھ دیر میں پھر چکر لگاؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا اور تھانے کی حدود سے باہر آ گیا۔ محرر میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال کرتا۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگا۔ اگر شیخ صاحب سے باہر ہی ملاقات ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے، میں نے سوچا۔

ڈبل ایس آئی شیخ صاحب پندرہ منٹ بعد نمودار ہوئے۔ وہ میرے سامنے سے گزر کے تھانے میں داخل ہونے کی نیت سے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے نام لے کر پکارا۔ وہ چونک کر رکا اور آہستہ آہستہ میری طرف آیا۔

"کون ہو تم؟" وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

"تم نے مجھے پہلے کہیں نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ تھانے میں، نہ عدالت میں، نہ جیل میں۔ میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں لیکن اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں، تمہیں کس حد تک فائدہ ہو سکتا ہے، اس کا انحصار تمہاری ہمت اور صلاحیت پر ہے۔"

"میں ذرا موٹی عقل کا آدمی ہوں۔" وہ بولا۔ "ایسے گھما پھرا کر بات مت کرو۔"

"تمہارے علاقے میں ایک شخص منشیات کا کاروبار کر رہا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ابھی تک اس کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ میں اس شخص کو پکڑوانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے گرفتار کر کے مال برآمد کرنے میں کامیاب رہے تو فائدہ تمہیں ضرور ہوگا۔ یہ کارنامہ تمہارے ریکارڈ پر آ جائے گا۔"

"ہاں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "لیکن تم میرا فائدہ کیوں چاہتے ہو؟ تمہاری کوئی دشمنی ہے اس شخص سے؟"

"ہاں۔ وہ ایک بار میری بیوی کو ورغلا کے لے گیا تھا۔ میں نے دوسری شادی کر لی۔ اب وہ دوسری کو بھی لے جانا چاہتا ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔" تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے پورا مسئلہ سمجھ لیا ہو۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟"

"اگر تم اس کو گرفتار کرنا چاہو تو میں ہر ثبوت ایک شرط پر فراہم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل سامنے نہیں آؤں گا۔ میں دو افراد کو اس کے پاس بھیجوں گا جو اس سے مال خریدتے ہیں۔ تم اسے عین وقت پر پکڑ سکتے ہو۔"

"لیکن اس قسم کا چھاپہ مارنے کے لیے مجسٹریٹ کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔" سب انسپکٹر بولا۔

"تمہیں اس کے گھر پر چھاپہ نہیں مارنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے سڑک پر سے گرفتار کرنا ہے۔ ٹھیک نو بجے میں ایک گاہک کو اس کے پاس بھیج سکتا ہوں جو پولیس کے لیے مخبری بھی کرتا ہے۔ اسی وقت دوسرا گاہک بھی پہنچے گا جو اکثر اس سے مال لیتا رہتا ہے۔ اگر تم مجھے سو سو کے پانچ نوٹوں پر دستخط کر کے دے دو اور نو بجے سے پہلے اپنے آدمی سادہ کپڑوں میں دروازے کے پاس کھڑے کر دو تو تم ان تینوں کو پکڑ سکتے ہو۔ وہ شخص مال دینے کے لیے باہر نکلے گا۔ جیسے ہی وہ مال دے کر نوٹ جیب میں ڈالے تم اسے گھیر لو اور اندر مت جانے دو۔ تم نے ایک مجرم کو سرِ عام منشیات فروخت کرتے دیکھا۔ اس کی اطلاع تمہیں کسی نے ٹیلیفون پر دی تھی۔ دونوں خریدار تمہارے گواہ ہوں گے اور آسانی سے اعترافِ جرم کر لیں گے۔ منشیات فروخت کرنے والوں کے حلقے میں دونوں مشہور ہیں۔ اس کے بعد تم گھر پر چھاپہ مارنے اور خانہ تلاشی کے وارنٹ لینے کا انتظام خود کر سکتے ہو۔ مجھے تو اس سے ایک بدلہ لینا ہے۔ تم سوچ لو کہ یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔"

"نوٹ نکالو۔" سب انسپکٹر نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔

میں نے اس کو پانچ نوٹ پیش کیے۔ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے میری پاکٹ ڈائری پر رکھے۔ اس نے اپنے قلم سے ہر نوٹ پر دستخط کیے اور تاریخ ڈال کر میرے حوالے کر دیے۔ میں نے نوٹوں کو واپس جیب میں رکھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر تاکید کی کہ وہ نو بجے سے پہلے پہلے اپنی نفری کے ساتھ پہنچ جائے اور پوری طرح چوکس رہے اور آخر میں اسے چراغ دین کا پتہ بتا کے روانہ ہو گیا۔ پچیس منٹ بعد میں واپس پہنچا تو صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے محسن کو یہ خوشخبری سنائی کہ دوسرا مرحلہ بھی سر ہو گیا۔ اگر استاد ٹیڈی کسی طرح دو آدمی ٹھیک نو بجے چراغ دین کے دروازے پر پہنچا دے تو سمجھو کھیل ختم۔ آج کے دن کا سورج چراغ دین کے لیے اس دنیا میں یومِ حساب لے کر طلوع ہوگا۔ برسوں پہلے اس نمک حرام نے جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھا کہ اس نے بڑی صفائی سے ایک شخص کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ بڑی ذہانت سے غبن کیا اور بچ نکلا۔ اس نظامِ انصاف میں اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا اور اب برسوں بعد اسے یہ بات یاد بھی نہ آتی ہوگی کہ دنیا میں اس نے جتنی عزت اور دولت کمائی اس کا جائز حق نہیں تھی اور انتقام مظلوم کی دوسری نسل کو لینا تھا۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ عیّاری سے اس نے بھی کام لیا تھا اور یہی ہتھیار میں نے بھی آزمایا ہے۔ پکڑا وہ بھی نہیں گیا تھا اور میرے پکڑے جانے کا بھی کوئی امکان نہیں اور جس طرح میں جانتا تھا کہ چراغ دین مجرم ہے اسی طرح ایک دن وہ بھی جان لے گا کہ باپ کا انتقام لینے والا وزیر خان کا بیٹا سکندر بخت ہی تھا۔ اس خیال سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قرض کا بار بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ سوچا تو شاید میرے والد نے بھی یہی کچھ تھا کہ اس مکار، نمک حرام کو ایسی سزا دی جائے جو اس کو قانون نہ دے سکا۔ لیکن ان کو اتنی مہلت ہی نہ ملی۔

"سکندر بخت صاحب!" محسن نے کہا۔ "میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "معاف کیجیے گا میں کہیں اور تھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

”خریدار سے تو بات ابھی ہو جائے گی۔“ محسن نے کہا ”ہم اب بھی اپنی لنگڑی لولی فریج چلا رہے ہیں۔“ ابھی تک وہ مال چراغ دین کو نہیں ملا ہے جو خریدار لینے جائے گا۔ میری مراد اس پانچ سو کے مال والے پیکٹ سے ہے۔“

میرے جواب دینے سے پہلے ٹیکسی موہنی روڈ پر رک گئی تھی۔ تپلی سی سڑک پر دونوں طرف دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ خصوصاً دودھ دہی کی دکانوں پر بچے جمع تھے جو ہاتھوں میں ڈول، چھوٹی چھوٹی بالٹیاں، چینی کے پیالے اور ہر قسم کے برتن لیے آخری کونڈا ختم ہونے سے پہلے دہی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے علاوہ صبح دم لسی پینے والے تھے جو الگ آوازیں لگا رہے تھے۔

”پہلوان جی! ذرا جلدی کرنا۔“ مگر پہلوان جی سارے شوروغل سے بے نیاز اطمینان سے کام کر رہے تھے۔ بعض جگہ کمیٹی کے نلکوں پر جہاں لکھا تھا ”یہاں نہانا سخت منع ہے۔“ دو دو تین تین افراد بڑی فراغت سے وہیں مل مل کے غسل کرنے میں مصروف تھے۔ سڑک پر سے تانگے اور ریڑھے والے مسلسل آوازیں لگاتے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن کو نہ آوازوں کی پروا تھی اور نہ بظاہر اپنی جان کی۔ مجھے یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرانی ہوتی تھی کہ ایک ہارس پاور کی گاڑی چلانے والے یہ کوچوان کتنے ماہر ہیں کہ اسٹیئرنگ اور بریک نہ ہونے کے باوجود، ہجوم میں سے راستہ نکال لیتے ہیں اور کوئی حادثہ نہیں ہوتا۔ پیرس کے ٹیکسی ڈرائیوروں کے بعد دوسروں کی جان ہتھیلی پر رکھ کر گاڑی چلانے کا فن اگر جانتے تھے تو لاہور کے کوچوان۔ یہ اس شہر کا مزاج تھا جو دنیا کے ہر بڑے شہر کی طرح سب سے جدا تھا۔

استاد ٹیڈی ہمیں چھوڑ کر ایک گلی میں چلا گیا تھا اور ہم بڑے سسپنس میں مبتلا تھے۔ ہماری ساری اسکیم کا دارومدار ٹیڈی کے کامیاب لوٹنے پر تھا۔ فرضی گاہک تو پولیس بھی بھیج دیتی ہے مگر میں چاہتا تھا کہ گاہک اصلی ہوں تاکہ بعد میں شک شبے کی گنجائش ہی نہ رہے اور چراغ دین یہ نہ کہہ سکے کہ اس کے خلاف سازش کا جال پھیلایا گیا ہے۔ وہ مال دیتے ہوئے اور قیمت وصول کرتے ہوئے پکڑا جائے گا۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں گاہک اس پیشہ میں پرانے ہیں اور بعد میں مزید مال چراغ دین کے گھر سے برآمد ہوگا۔ ایک ایسی جگہ سے جس کا خود چراغ دین بھی تصور نہیں کر سکتا۔ وہ بڑے اطمینان سے خانہ تلاشی کے لیے تیار ہو جائے گا اور پولیس کو چابیاں بھی دے دے گا۔

”میرا پروگرام بالکل سیدھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر یہاں سے دو گاہکوں کا بندوبست ہو گیا تو میں ساڑھے سات بجے چراغ دین کے پاس جاؤں گا اور یہ پیکٹ اس کے حوالے کر دوں گا۔ محبت خان کی عدم موجودگی میں، میں اسے بتا دوں گا کہ شیروانی صاحب نے بھجوایا ہے۔ اس میں کچھ پرانا زیور ہے جس کے بدلے ایک سنار نئے ڈیزائن کے مطابق کچھ بنا کر دے گا۔ کیا بنا کر دے گا، یہ مجھے نہیں معلوم لیکن جو شخص آئے گا وہ اپنا نام بتائے گا اور پانچ سو روپے بھی دے گا۔ یہ شیروانی صاحب کا کوئی حساب کتاب ہوگا جو وہ خود ہی جانتے ہیں۔۔۔“

”اور اگر اس نے پوچھا کہ یہ پیکٹ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ محسن نے میری بات کاٹ دی۔ ”شیروانی صاحب نے محسن کو کیوں نہیں بھیجا؟“

”اس کا جواب بھی سیدھا سادا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں کہوں گا کہ یہ سب باتیں آپ شیروانی صاحب سے پوچھیے گا۔ محسن سے تو آج کل وہ ناراض ہیں اور شاید اسی لیے انھوں نے یہ کام محسن کو نہیں سونپا۔ صبح میرے پاس ایک شخص آیا تھا اور جو کچھ اس نے پیکٹ دینے کے بعد کہا وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ باقی باتیں شیروانی صاحب سے ٹیلیفون پر پوچھ لیجیے گا مجھے تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آٹھ بجے سٹی کورٹ پہنچنا ہے۔ اب آپ غور فرمایئے محسن میاں کہ بعد میں کیا ہوگا؟ مسٹر چراغ الدین کا ذہن فوراً شادی کے انتظامات کی طرف جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ شیروانی صاحب زیور کے لیے کچھ بنوا رہے ہوں گے اور یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ ورنہ جیولرز تو پنڈی میں بھی کم نہیں ہیں۔ وہ خوشی خوشی ڈبا رکھ لے گا۔ ہم ٹیکسی والے کی چھٹی کریں گے اور آٹھ بجے گھر۔ گویا ہم رات بھر سو کے اٹھے ہیں اور ہمارے گواہ ہوں گے ہمارے پڑوس میں رہنے والے کانسٹیبل صاحب جن کو ہماری سفارش سے تھانیدار بننا ہے۔“

”اس کا تو باپ بھی کہے گا کہ ہم رات کو اپنے کمرے میں سوتے رہے ہیں۔“ محسن نے قہقہہ لگا کے کہا۔

”اب آگے سن!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اگر ڈبل ایس آئی شیخ نے چراغ دین کو پکڑ لیا تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ میں اس بدمعاش سے اس وقت ملاقات کروں گا جب وہ جیل پہنچ جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس کا جھوٹ یوں بھی ثابت ہو جائے گا کہ آج مجھے کسی مقدمے میں کہیں نہیں حاضر ہونا۔ وہ اپنے بیان میں کہے گا کہ سکندر نے یہ کہا تھا اور وہ کہا تھا۔ نہ شیروانی صاحب تصدیق کریں گے اور نہ پولیس ملنے گی۔ ہم آٹھ بجے اطمینان سے رضوی صاحب کے گھر میں ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ نو بجے تک گپ شپ لگائیں گے اور تھانے سے آنے والے کسی ٹیلیفون کا انتظار کریں گے۔ رضوی صاحب کی بیگم کو کوئی خواب سنائیں گے جو ہم نے گزشتہ رات دیکھا ہو اور اگر اس عرصے میں ٹیلیفون آ گیا تو خود بات بھی کریں گے۔“

”لیکن فرض کرو، وہ ڈبل ایس آئی اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔“ محسن بولا۔ ”اگر اس نے کہہ دیا کہ اطلاع دینے والا یہی شخص تھا؟“

”وہ کہہ سکتا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ سکندر بخت تو ایس ایس پی ضامن رضوی کے گھر کا کوئی فرد ہے تو وہ بہتر یہی سمجھے گا کہ مجھے نہ پہچانے اور کہہ دے کہ اطلاع دینے والا کوئی اور شخص تھا۔ ویسے اس کے وعدہ خلافی کرنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ڈبل ایس آئی صاحب! فتور آپ کی آنکھوں میں ہے یا آپ کے دماغ میں۔ اس کا علاج ضرور کرایئے اور اگر چھاپہ ناکام رہا جس کا امکان بہت کم ہے تو پھر کچھ اور سوچیں گے کیونکہ مال تو چراغ دین کے گھر میں ایسی جگہ رکھا ہے کہ خود اس کو بھی نظر نہیں آ سکتا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ چراغ دین کی گرفتاری کا منظر اپنی آنکھ سے دیکھتا لیکن مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم دور رہیں۔ کل تک اس کی رسوائی کی ساری داستان اخبار میں ہوگی۔“

استاد ٹیڈی اچانک گلی میں سے نمودار ہوا۔ اس کا دمکتا مسکراتا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ شدتِ جذبات میں وہ کوئی غلط بات کہہ دیتا جس سے ٹیکسی ڈرائیور کو شک ہو جاتا لیکن میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ ٹیڈی خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اب ہمارا کام ختم ہو چکا ہے چنانچہ ہمیں ٹیکسی کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنا اپنا راستہ لینا چاہیے۔ ٹیکسی والا خود بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ رات بھر کا معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے اسے بوہڑ والے چوک پر رخصت کیا اور وہ دائیں طرف گھوم کر غالباً پھر ریلوے اسٹیشن جا پہنچا۔ صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ ٹیکسی میں ہی رہ گئے تھے اس لیے یہ ہو سکتا تھا، ممکن ہے کوئی سواری راستے ہی میں مل جائے اور وہ اپنی ایمانداری ثابت کرنے کے لیے ہمارے پیچھے آتے لیکن جس راستے پر وہ گیا تھا یکطرفہ تھا اور اب وہ اگلے چوک سے گھوم کر جی ٹی ایس کے اڈے کے سامنے والی سڑک پر سے گزر کر اور ریلوے اسٹیشن کے پورے راؤنڈ اباؤٹ کا چکر لگائے بغیر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ہم اس سامان کو لے کر کیا کرتے اور کہاں لے جاتے؟ میں نے ٹیڈی سے کہا کہ وہ شام کو ہمیں رابعہ کے آفس میں ملے اور فی الحال خود بھی روپوش رہے کیونکہ دونوں خریدار جو چراغ دین کے پاس جائیں گے پولیس کے سامنے بیان میں یہ ضرور کہیں گے کہ ان کو بھیجنے والا استاد ٹیڈی نام کا شخص تھا۔ ٹیڈی نے سڑک پار کی اور ایک ویگن میں بیٹھ گیا۔ محسن مخالف سمت میں گڑھی شاہو کی طرف جانے والی بس پر سوار ہو گیا اور میں نے واپسی اختیار کی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں جی ٹی ایس کے اڈے کے ایک دروازے سے داخل ہوا اور مختلف شہروں کو جانے والی بسوں اور مسافروں کے ہجوم میں سے گزرتا ہوا دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ جہاں سے چراغ دین کی کوٹھی کا فاصلہ ایک فرلانگ بھی نہیں تھا۔ جو پیکٹ میرے پاس تھا وہ عام سائز کے بیس سگریٹوں کے پیکٹ سے کچھ بڑا تھا۔ گتے کے اس پیکٹ پر چاروں طرف سفید کاغذ اس طرح چپکایا گیا تھا کہ پیکٹ ہر طرف سے بند نظر آتا تھا۔ میں نے پیکٹ کو قمیص اور بنیان کے اندر ڈال کر پتلون کی بیلٹ سے دبا رکھا تھا۔ میں محبت خان سے ملاقات کی صورت میں بالکل خالی ہاتھ اندر جانا چاہتا تھا۔

محبت خان گیٹ پر یا گیٹ کے اندر موجود نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ باورچی خانے میں خانساماں کے فرائض انجام دے رہا ہوگا اور ناشتہ بنا رہا ہوگا۔ گھنٹی بجانے کے بجائے میں سیدھا اندر چلا گیا اور دروازے پر دستک دی۔ چراغ دین نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔

”سکندر۔۔۔!“ اس نے کسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ کیے بغیر کہا۔ ”تم اس وقت یہاں کیسے؟“

”میں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔“ میں نے پیکٹ برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ”شیروانی صاحب نے اسلام آباد سے یہ سامان بھجوایا تھا آپ کے لیے۔“

”کیا ہے اس میں؟“ اس نے کسی شک کے بغیر پیکٹ لے لیا۔ ”کون لے کر آیا تھا؟“

”لے کر تو خود محسن آیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور شیروانی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ آپ کو پہنچا دے لیکن معلوم نہیں کیوں یہ کام اس نے میرے سپرد کر دیا حالانکہ میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا، مجھے ساڑھے آٹھ بجے ایک مقدمے کے سلسلے میں ڈسٹرکٹ کورٹ پہنچنا تھا۔" میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے عجلت ظاہر کی۔

چراغ دین معنی خیز طریقے سے مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کے دو مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ محسن کے نہ آنے کی وجہ سمجھتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرے مقدمات کے پس منظر سے واقف ہے۔

"اس میں کچھ پرانے زیورات ہیں۔" میں نے انجان بن کے کہا۔ "شیروانی صاحب ان سے نئے ڈیزائن کا کچھ زیور بنوانا چاہتے ہیں۔"

"کمال ہے، اس کے لیے انہیں راولپنڈی کا کوئی جیولر پسند نہیں آیا۔" چراغ دین ڈبے کو الٹ پلٹ کر بولا۔

"یہاں ان کا کوئی جاننے والا ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ آج ہی یہ پیکٹ آپ سے لے جائے گا۔"

"مگر میں اسے کس طرح پہچانوں گا؟ نام کیا ہے اس کا؟" چراغ دین نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ شکوک کے بجائے اس پر خوش آئند تصورات کا غلبہ ہے۔ حسبِ توقع چراغ دین سمجھ رہا تھا کہ شیروانی صاحب شادی کے لیے زیور بنوا رہے ہیں۔

"اس کا نام بھورا ہے اور اس نام کی وجہ بھوری آنکھیں ہیں۔" میں نے ٹیڈی کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر کہا۔ "لیکن اصل بات یہ ہے کہ پہلے آپ کو اس سے پانچ سو روپے لینے ہیں۔ اس کے بغیر یہ پیکٹ نہیں دینا ہے۔ یہ شیروانی صاحب کا کوئی پرانا حساب کتاب ہے جس کی رو سے اس شخص کے ذمے پانچ سو روپے نکلتے ہیں۔"

"میں وصول کر لوں گا۔" چراغ دین نے کہا۔ وہ ابھی تک مجھ سے دروازے میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ عمداً اس نے مجھ سے نہ اندر بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور نہ اخلاقاً ایک کپ چائے کے لیے پوچھا تھا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے بے عزت کر رہا تھا لیکن اس بدبخت کو معلوم نہیں تھا کہ اس طرح وہ میری کتنی مدد کر رہا ہے اور خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ اگر وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھاتا اور میری خاطر تواضع کرتا تو اپنے حق میں اچھا کرتا۔ محبت خان مجھے دیکھ لیتا اور بعد میں یہ گواہی دیتا کہ سکندر صاحب صبح صبح

آ تے تھے۔ اب اس بات کا کوئی گواہ نہیں رہا تھا۔ ... نے ایک بار پھر عدالت میں حاضری کا ذکر کیا۔ معذ... چاہی کہ میں بیٹھ نہیں سکتا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو... پندرہ منٹ بعد ایک رکشا نے مجھے رضوی صاحب... کوٹھی کے دروازے پر اتار دیا۔ میں تیر کی طرح سیدھا... کوارٹر کے اس کمرے میں گیا جہاں محسن بستر پر بیٹھا... ساتھ کے کمرے میں رہنے والا کانسٹیبل بھی وہیں موجود...

"آپ بھی آ گئے جنابِ عالی!" وہ مجھے دیکھ کر...

"آ گئے کا کیا مطلب ہے؟" محسن نے اسے ڈانٹ...

"معلوم ہوتا ہے کہ تم تھانیدار نہیں بننا چاہتے۔ کیا... تھا تمہیں ابھی؟ ہم دونوں کل رات کو دس بجے سو گئے... رات کو تم دو مرتبہ اٹھے۔ ایک مرتبہ پانی پینے اور د... مرتبہ حاجت کرنے۔ دونوں مرتبہ تم نے ہمیں سوتا ہوا... اور اٹھنے کے بعد بھی ہم گھر میں ہی تھے۔ یہی ہے... اسے اچھی طرح یاد کر لو اگر ایک لفظ بھی بھولے تو... ہم رضوی صاحب سے تمہاری کوئی سفارش نہیں کریں گے...

"بالکل نہیں کریں گے۔" میں نے تائید کی اور... جوتے اتارنے لگا جن پر آخری بار دو ہفتے پہلے پالش... تھی اور اب ان پر گرد اور کیچڑ اس طرح بیٹھ گئے... جوتوں کے اصل رنگ کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ محسن کے بالک... جگ مگ کرتے جوتوں کے مقابلے میں میرے جوتے... کسی دیہاتی کے دس سال پرانے جوتے لگتے تھے۔ ... گھنٹہ پہلے خود محسن کے جوتوں کی بھی یہی حالت تھی۔

"اچھا اب تم جاؤ، مگر اپنا سبق یاد رکھ..." کانسٹیبل کی مسکین صورت پر بے اختیار ہنسی آ رہی...

"ورنہ ہم ایسا سبق دیں گے کہ یاد رکھو گے تمام عمر۔"

"ہم تمہاری پوسٹنگ ٹنڈو الہ یار کرا دیں گے۔" ... نے کہا۔

"جہاں اللہ کے سوا تمہارا یار کوئی نہیں ہوگا۔" ... اس کو مزید دہشت زدہ کیا۔

جب وہ چلا گیا تو ہم دل کھول کر ہنسے۔ تھا... بننے کے چکر میں کانسٹیبل عملی طور پر ہماری جوتیاں ... رہا تھا حالانکہ ہم تھانیدار تو کیا اس کو ہیڈ کانسٹیبل بھی... بنوا سکتے تھے۔ ہنستے ہنستے میں نے محسن کو چراغ دین... والی گفتگو سنائی۔ ابھی ہم ہنس ہی رہے تھے کہ رابعہ آ گئ...

"تم دونوں یہاں پڑے دانت نکال رہے ہو؟"... نے کہا۔ "ادھر رضوی انکل تمہارے دانت توڑنے کی...

کر رہے ہیں۔"

"اچھا؟ ہمارا خیال تھا کہ وہ پولیس افسر ہیں، دندان ساز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ ہمارے دانت بالکل ٹھیک ہیں۔ اچھی بھلی چیز کو توڑنے کی کیا ضرورت ہے؟" محسن نے کہا۔

"یہ سب کچھ ان سے ہی پوچھ لینا۔" رابعہ نے کہا۔ "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر دونوں کو ناشتے کے لیے حاضر کر دو۔ چار منٹ ہو چکے ہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھ کر دوڑے اور رابعہ سے پہلے رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہم دونوں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ ہمارے بال بکھرے ہوئے تھے اور رات بھر جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن معلوم یہی ہوتا تھا کہ ہم ابھی ابھی سو کر اٹھے ہیں اور ہماری آنکھوں میں نیند کا خمار ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہو۔"

"کیا کریں انکل!" میں نے کہا۔ "ہمیں حکم ملا تھا کہ پانچ منٹ میں حاضر ہو جائیں۔"

"اور چار منٹ گزر چکے تھے۔" محسن نے گردن ہلائی۔ "ہاتھ منہ دھونے یا جوتے پہننے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔"

"ہم تو ابھی سو کر بھی نہیں اٹھے تھے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ شاید ابھی تک سو رہے ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم سوتے میں ہی ناشتہ کر لیں گے۔"

ہم نے رضوی صاحب کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہماری باتوں سے ان کی بیگم کو بڑی ہنسی آئی جو ابھی ناشتہ لگانے میں مصروف تھیں۔ پھر رابعہ اندر آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ دونوں بہت بدمعاش ہیں۔" رضوی صاحب مسکرائے۔ "ہر وقت کوئی نہ کوئی ڈرامہ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ کوئی شرارت کر کے آئے ہیں۔" انہوں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے سوال کیا۔

ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ رضوی صاحب سب کچھ جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے چراغ دین کے ساتھ کیا ڈرامہ کیا ہے لیکن یہ خیال میرے وہم کی پیداوار تھا۔ اسی وقت کانسٹیبل اندر آیا۔ سیلوٹ کر کے اس نے رضوی صاحب کو مطلع کیا کہ گاڑی تیار ہے جنابِ عالی!

"اب آپ اس سے پوچھ لیں۔" میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "شرارت کا کیا سوال۔ ہم کل رات دس بجے سوئے تھے اور ابھی اٹھے ہیں۔ مجال ہے جو رات کو خواب بھی دیکھا ہو۔ نیند سے فرصت ہی نہیں ملی۔"

"بالکل جنابِ عالی!" کانسٹیبل نے کہا اور ہماری تائید میں پورا بیان فرفر پڑھ دیا۔

"اچھا اچھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم جاؤ باہر ٹھہرو، میں ناشتہ کر کے آتا ہوں۔"

"انکل رضوی!" میں نے زور سے کہا۔ "آپ اسے تھانیدار بنا دیں نا۔"

"ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ نالائق تھانیدار دیکھے ہیں۔" محسن نے فوراً کہا اور کانسٹیبل نے باہر جاتے جاتے رک کر ہمیں شکر گزار نظروں سے دیکھا لیکن اس نے رضوی صاحب کا جواب نہیں سنا۔

رضوی صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ صبح اسلام آباد فون کر چکے ہیں۔ فوزیہ بالکل خیریت سے ہے اور گھر پہنچ چکی ہے لیکن یہ اطلاع تمہید کے لیے تھی۔ اصل بات انہوں نے اس کے بعد کی۔

"مجھے رابعہ نے بتایا ہے کہ تم نے اس کے لیے کوئی مکان پسند کیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور آج اس کی ادائیگی کرنی ہے۔ یہ مکان کہاں ہے؟ مجھے ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔"

میں نے ان کو مکان کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کیں اور یہ بھی بتایا کہ وہاں ہمارے ساتھ کون کون رہے گا۔ میں نے شہلا کا نام بھی لیا مگر ان کو نہیں بتایا کہ وہ ڈی سلوا کی سیکرٹری رہ چکی ہے اور عدنان کی بہن ہے۔ میں نے کہا کہ وہ رابعہ کی کوئی پرانی جاننے والی ہے۔ اس کی مفلوج ماں بھی رابعہ کی ماں کو جانتی تھی اور ان کے حالات پہلے بہت اچھے تھے لیکن اب ان کے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔" اخبارات میں جرائم کی اور قتل و غارت گری کی خبریں ہر روز شائع ہوتی تھیں۔ ان کو شہلا کے نام سے کچھ یاد نہیں آیا۔

"چلو، یہ انتظام کسی حد تک بہتر ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ورنہ میں رابعہ کے یہاں سے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ رابعہ کی خادمہ بھی ساتھ رہے گی اور وہ دوسری فیملی بھی تو کوئی ہرج نہیں۔ تم دونوں اوپر والے بیڈ روم میں رہو گے؟"

"خیال تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈر صرف یہ ہے..."

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "رابعہ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں چند روز

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے لیے حفاظت کے خصوصی انتظامات کردوں۔ میں اس مکان کے گرد سادہ کپڑوں میں چار مسلح آدمی کھڑے کر رہا ہوں جو ایک ہفتے تک نگرانی کریں گے۔ ان کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی لیکن یہ انتظام غیر سرکاری قسم کا ہوگا یوں سمجھ لو کہ میں ذاتی طور پر کروں گا۔"

"اور آفس کے لیے؟" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"آفس کی بلڈنگ کے دو دروازے ہیں نا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور دونوں پر چوکیدار بھی رہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ ریوالور کے لائسنس کے لیے درخواست دے دیں۔ میں کل تک لائسنس دلوا دوں گا۔ بلڈنگ میں رہنے والے ان کو ریوالور فراہم کر سکتے ہیں۔ دونوں دروازوں پر آج ہی نوٹس لگوا دو کہ اندر جانے والوں کو شناخت کرانی ہوگی اور غیر متعلقہ افراد اندر جائیں گے تو دروازے پر اپنا نام پتہ لکھوا کر جائیں گے۔ میں وہاں بھی گارڈ رکھ دیتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اس عمارت میں وکیلوں کے دفتر ہیں۔ پولیس نے ان کو روکا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ چوکیدار جن لوگوں کو ذاتی طور پر پہچانتے ہوں ان کو جانے دیں۔ نیا آدمی ہو تو روک لیں۔ اس انتظام پر کوئی قانونی اعتراض نہیں کر سکتا۔ اگر کرے تو رابعہ کہہ سکتی ہے کہ کچھ لوگ اسے ٹیلیفون پر دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر وکیل جانتا ہے کہ رابعہ کے پرانے گھر میں کیا ہوا تھا اور سب کو رابعہ سے ہمدردی بھی ہے اس لیے وہ رابعہ سے تعاون کریں گے اور اگر ان کے موکلوں کو اوپر آنے سے پہلے اپنی شناخت کرانی پڑی تو کوئی وکیل اس کو اپنے کاروبار میں رخنہ اندازی نہیں سمجھے گا یا خود ہی موکل کو مطمئن کر دے گا۔ آفس کے اندر دو آدمی موجود ہوں گے جو ضرورت پڑنے پر تمہاری حفاظت کرنے کے پوری طرح اہل ہوں گے۔ یہ تمہارے آفس کے اندر کا معاملہ ہے کہ تم انھیں جہاں چاہے کھڑا رکھو یا بٹھاؤ۔ کلرکوں میں شامل کر دو یا چپراسی بنا لو۔ وہ پرانے تجربہ کار اور بہت اچھا ریکارڈ رکھنے والے لوگ ہیں اور اگر میں یہ کہوں کہ آدمی کو صورت سے تاڑ جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔" انہوں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ "میں تو اب چلتا ہوں، پہلے ہی کچھ دیر ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے آج؟"

"ابھی تو کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس بینک ڈرافٹ بنوانے جانا ہوگا۔"

رضوی صاحب کے جانے کے بعد بھی ہم ہیں بیٹھے گپ لگاتے رہے اور ان کی بیگم کو گزشتہ رات کے خواب سناتے رہے جن کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ ہم رات بھر اپنے کمرے میں سوتے رہے ہیں لیکن بیگم رضوی ہنستی رہیں لیکن انھوں نے کہا کہ بس اب شادی کر لو۔ یوں کب تک خوابوں پر گزارا کرو گے۔ پھر ہمیں تلقین کی کہ ہم سگریٹ پینا چھوڑ دیں اور کسی کام سے باہر چلی گئیں۔ ہم اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے اٹھنے والے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ریسیور اٹھا کے بھاری آواز میں کہا۔ "ہیلو!"

"جناب ایس پی خان رضوی صاحب سے بات کرنی تھی۔ میں انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں۔" جواب ملا۔

"بولو بولو۔" میں نے اسی بارعب لہجے میں کہا۔ "میں رضوی بات کر رہا ہوں۔"

"جناب ایس پی صاحب!" انسپکٹر نے انتہائی مؤدب لہجے میں کہا۔ "آپ کے گھر میں کوئی سکندر بخت صاحب ہیں؟"

"ہاں میرا چھوٹا بھائی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کام ہے اس سے؟"

"کام تو جناب ایسا کوئی خاص نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "دراصل ہم نے ایک مجرم پکڑا ہے جو منشیات کا دھندا کرتا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ اس علاقے میں کوئی شخص یہ دھندا کر رہا ہے۔ ہم نے اطلاع دینے والے کو دستخط کیے ہوئے نوٹ دے دیے اور مجرم کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ پانچ سو کا مال دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا گاہک بھی گرفتار ہو گیا ہے۔"

"کیا نام ہے مجرم کا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"چراغ دین جناب!" انسپکٹر بولا۔ "ویسے تو اس نے دھوکا دینے کیلیے صدر میں جنرل اسٹور کھول رکھا ہے جو ہم نے ابھی دیکھا نہیں ہے۔ وہاں بھی دیکھنا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس کو پھنسایا گیا ہے۔ ہم ابھی خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر مجسٹریٹ کے ساتھ اس کے گھر میں سے بھی مال برآمد کریں گے۔ لیکن وہ بدمعاش آپ کے چھوٹے بھائی پر الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے آج صبح سات بجے یہ پیکٹ اسے دیا تھا۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔" میں نے اسی افسرانہ لہجے میں کہا۔ "سکندر رات کو گھر پر تھا اور صبح تو اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا ہے بلکہ اس وقت بھی وہ باتھ روم میں موجود ہے۔"

"وہ بالکل بکواس کرتا ہے جناب!" انسپکٹر نے فوراً کہا۔ "یہ سب پکڑے جاتے ہیں تو ایسے ہی کہتے ہیں۔ ہم تفتیش کریں گے تو سچ معلوم کر لیں گے لیکن آپ کسی وقت بھی سکندر صاحب کو تھوڑی سی دیر کے لیے بھیج دیں۔ ان کا بیان تو لینا ہی پڑے گا۔"

"ہاں ہاں، سکندر آجائے گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "لیکن تم نے گھر پہ کیوں فون کیا ہے انسپکٹر؟"

"پہلے آفس کیا تھا سر! معلوم ہوا جناب ابھی گھر پہ ہیں... غلطی ہو گئی۔" انسپکٹر نے کہا اور میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ریسیور رکھ دیا۔ محسن اور رابعہ سوال بنے بیٹھے تھے۔

"ہم بڑے شکاری نہیں ہیں بھائی محسن!" میں نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔ "یہ ہمارا پہلا شکار تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم نے جو جال پھیلایا تھا وہ ٹھیک تھا۔" محسن نے قہقہہ مار کے کہا اور رابعہ نے حیرانی سے ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے کہا کہ اپنے غریب خانے کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ہم میں سے ایک شیو اور غسل کرے گا تو دوسرا تمہیں رات کی بات سنائے گا اور بات لمبی ہو گئی تو دوسرا تیاری کرے گا اور پہلا باقی بات بتا دے گا۔

محسن پہلے باتھ روم میں گھس گیا اور میں نے رابعہ کو اول تا آخر ایک پوری رات کی کارگزاری کا حال سنا دیا۔ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے بی بی!" میں نے اضطراب کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لیے بڑے اطمینانِ قلب کی بات ہے کہ میں نے ایک عیار شخص کو اس کی عیاری کی سزا عیاری سے دی۔ اس نے میرے سیدھے سادے اصول پرست، شریف اور اعتماد کرنے والے باپ کو دھوکا دیا تھا۔ امانت میں خیانت کی تھی اور غبن کر کے سمجھا تھا کہ وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ ثبوت واقعی نہیں تھا کیونکہ جب کوئی کسی پر اعتماد کرتا ہے تو دل سے کرتا ہے لیکن عدالت دل کی گواہی نہیں مانگتی، دستاویزی شہادت مانگتی ہے۔ اس بدمعاش نے میرے باپ کو لوٹا، اس کی حلال کی کمائی پر ڈاکا ڈالا لیکن سزا سے محفوظ رہا۔ اسی غبن کے طفیل وہ عزت دار بن گیا اور بزنس مین ہو گیا۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے میرے باپ کو گھر میں نوکر رکھا، اس کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جو میرے باپ نے کبھی کسی کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو ملازموں کو اپنا دوست کہتا تھا۔ اس نمک حرام نے پرانے احسانات کا بھی خیال نہیں کیا اور میرا باپ اس کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں ذلیل اور رسوا ہو کر مرا۔ اس حالت میں کہ اس کے پاس علاج کرانے کے لیے بھی پیسہ نہ تھا اور وہ سرکاری ہسپتال سے خیرات میں ملنے والی دوائیں لینے پہ مجبور تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ ایک الگ کہانی ہے لیکن میرے باپ کی تباہی اور بربادی کی ابتدا اسی شخص نے کی تھی، میں نے اسی کو سب سے پہلے شکار کیا۔ میرے سینے میں نفرت اور انتقام کے جذبات کا جو آتش فشاں ابل رہا ہے رابعہ! وہ ابھی سرد نہیں ہوا۔"

رابعہ نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے بٹھایا۔ "تم جذبات کی شدت سے مغلوب ہو رہے ہو۔"

"ہاں۔ اس لیے کہ ان گنت ناکامیوں کے بعد میرے حصے میں آنے والی یہ پہلی کامیابی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ بات کرتے کرتے میں چلانے لگا ہوں اور میرا چہرہ گرم ہو کے سرخ پڑ گیا ہے۔ "یہ پہلی سزا ہے جو میں نے پہلے مجرم کو دی ہے۔ اس سے پہلے سزا صرف میرے باپ نے جھیلی لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ اس کا احساس بھی ایک سزا ہے لیکن اس کے بعد بھی میرے علاوہ کتنے لوگوں کو سزا مل چکی ہے؟ کیا جرم کیا تھا ان سب نے؟ اور کیا اختیار تھا ان لوگوں کو سزا دینے کا؟"

دس بجے کے قریب ہم ایک ساتھ نکلے۔ میں نے محسن کو رابعہ کے ساتھ کر دیا کہ ایک بجے تک وہ خسرو جمشید کے نام سے ڈیڑھ لاکھ روپے کا پے آرڈر بنوا لے یا بنک ڈرافٹ۔ پھر رابعہ کو لے جا کر صدر میں شہلا کے پاس چھوڑ دے۔ وہاں اگر میں پہلے سے نہ ملوں تو پولیس اسٹیشن سے میری خیریت معلوم کرے۔ رات بھر جاگنے کا اثر غسل کے بعد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میرا جسم کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ سر بھاری تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میں چراغ دین کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میری سوچ کی کوئی سمت نہیں تھی۔ میں اپنی مہم کے نتائج جاننے کے لیے سخت بے چین تھا۔ تصور میرے سامنے دو تصویریں پیش کرتا تھا۔ ایک میں چراغ دین پولیس اسٹیشن میں نظر آتا تھا، دونوں ہاتھوں میں زنجیر پہنے ہوئے اپنی ذلت اور رسوائی کے خیال سے ہراساں اور میری سازش پر برہم... غصے میں کھولتا ہوا، مجھ سے بدلہ لینے کی

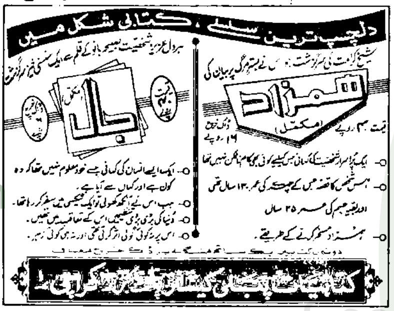

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آرزو اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کی فکر میں مبتلا، کچھ رقم دے کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش میں مصروف اور اس خبر کو پھیلنے سے روکنے کی تدبیر سوچتا ہوا۔ ممکن ہے اسے یہ خیال بھی ہو کہ آج اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے کرنی کا پھل ہے اور اسے وہ وقت یاد آ رہا ہو۔ جب اس نے وزیر خان کے ساتھ دغا کی تھی۔ آج تقدیر نے دغا دے کر ثابت کر دیا ہے کہ خدا کی خدائی میں دیر ضرور ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ دوسرا منظر اس سے بالکل مختلف تھا کہ اب تک چراغ دین 'باعزت' طور پر اپنے گھر واپس جا چکا ہو گا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے، بگڑے کام سنوارے جا سکتے ہیں۔ اس نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی عزت بچانے کے لیے تھوڑی سی دولت قربان کر دی ہو گی۔ انگریزی محاورے کے مطابق تھانیدار میرا حصہ دے کر خاموشی سے لوٹ گیا ہو گا اور اسی طرح دوسرے چھاپہ مار۔ رہ گئے گواہ یعنی وہ خریدار تو جان بچ جانے کو غنیمت شمار کرتے ہوئے بھاگ لیے ہوں گے۔ اس وقت چراغ دین ٹیلیفون پر شیروانی صاحب کو بتا رہا ہو گا کہ سکندر خبیث نے اس کے خلاف کیسی ناپاک سازش کی تھی جو خدا کی مہربانی سے ناکام رہی ورنہ وہ دنیا و دین میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور اب میں تھانے جاؤں گا تو وہ بات سچ ہو گی کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے اور تھانیدار کہے گا کہ آپ ہیں ایس پی رضوی صاحب کے چھوٹے بھائی؟ اور آپ نے ایک شریف اور معزز آدمی پر ایسا گھناؤنا الزام عائد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ تم جیسے لونڈوں کی چالبازی کو نہ سمجھ سکیں؟ اور پھر تفتیش کا ایک نیا سلسلہ...

تھانے میں داخل ہونے تک میری ذہنی کیفیت قدیم یونان کے اس غلام سے مختلف نہ تھی جسے بھوکے شیر سے لڑنے کے لیے اریناں میں دھکیلا جا رہا ہو اور جسے یہ علم نہ ہو کہ وہ شیر کو مار کر آزاد ہو جائے گا اور عام معزز رومن شہری بن کے زندہ رہے گا یا تماشا ختم ہونے تک رزم گاہ میں صرف اس کا لہو اور کاسۂ سر رہ جائے گا اور باقی جسم بھوکے شیر کا پیٹ بھر چکا ہو گا۔ میں نے بہت خطرناک قدم اٹھایا تھا اور اپنی ناکامی کا خیال ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میں رضوی صاحب سے کیا کہوں گا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ شیروانی صاحب، ان کی بیگم اور فوزیہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ وہ کہیں گے سکندر! ہم تمہیں اتنا گھٹیا آدمی نہیں سمجھتے تھے کہ رقابت میں تم اخلاقی پستی کی اس انتہا تک پہنچ جاؤ گے۔

تھانے میں پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی، وہ محرر موجود نہیں تھا جو گزشتہ رات ڈیوٹی پر تھا۔ ایس ایچ او کے کمرے میں ڈبل ایس آئی شیخ کے علاوہ ایک انسپکٹر بھی موجود تھا جو شیخ سے زیادہ عمر رسیدہ، تجربہ کار اور خرانٹ نظر آتا تھا۔ اس کی نظر بچا کر شیخ نے مجھے آنکھ ماری تو اس کا مطلب سمجھ کر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"فرمایئے؟" شیخ نے بالکل اجنبی بن کے کہا۔ "کیا کام ہے آپ کو؟"

"یار کی مصیبت اسے۔" انسپکٹر نے بڑی ناگواری سے آدم بیزار لہجے میں کہا۔ "جس کا دل چاہتا ہے بیل کی طرح منہ اٹھائے اندر آجاتا ہے... ہیں؟... اوئے یہ کوئی پرچون کی دکان ہے میاں؟ باہر کوئی نہیں بیٹھا ہے ان کو روکنے والا؟"

"انسپکٹر صاحب غور سے دیکھیے، میں بیل نہیں ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ "میرا نام سکندر رضوی ہے اور مجھے ٹیلیفون کر کے بلوایا گیا تھا ورنہ تھانے میں سیر کرنے کوئی شریف آدمی نہیں آتا۔"

انسپکٹر کا چہرہ، پوز اور رویہ سب ایک دم بدل گئے۔

"اچھا اچھا۔" اس نے خاصی کوشش کے بعد اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ اپنے ایس پی صاحب کے کیا ہیں...؟"

"برادرِ نسبتی۔" میں نے سکون سے کہا۔ اس امید پر کہ تھانیدار اتنی فارسی سمجھا ہی نہیں ہو گا۔

"اوئے یار شیخ!" انسپکٹر نے دوبارہ کرسی میں فٹ ہو کر کہا۔ "چنگی طرح ویکھ لے... یہ"

"دیکھنا کیا ہے جی!" شیخ بولا۔ "وہ بدمعاش بکواس کرتا ہے جو بندہ مجھے اطلاع دینے آیا تھا وہ خاصی عمر کا آدمی تھا کم سے کم پچاس سال کا۔ سر کے سارے بال سفید تھے، پھٹی قمیص اور چارخانے کی لنگی باندھے تھا اور صورت سے جاہل ان پڑھ لگتا تھا... اور سکندر صاحب آپ کے سامنے ہیں، فرق آپ خود دیکھ لیں۔"

"تو نے بھی کمال کیا یار شیخ!" انسپکٹر نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "اوئے اُس بندے کو جانے نہیں دینا تھا۔ وہ جو مخبر بن کر آیا تھا۔ اپنا کوئی آدمی اس کے پیچھے لگا دینا تھا۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اگر اس کی اطلاع غلط ہوتی تو اور بات تھی مگر دیکھیں نا، مجرم پکڑا گیا، مال ہمارے پاس ہے اور نوٹ بھی جن پر میرے دستخط ہیں۔ اور کیا چاہیے؟"

"چاہیے کیسے نہیں۔" انسپکٹر نے غصے سے کہا۔ "سب سمجھے بغیر کام کرتے ہو۔ کسی ایرے غیرے نے کہہ دیا اور تم نے اعتبار کر کے چھاپہ مار دیا۔ اوئے شیخ پُتّر! یہ قانونی معاملات ہیں۔ اس میں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے اور پہلے اپنے افسروں سے بات کرنی چاہیے۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی ایف۔ آئی۔ آر کاٹنے کی۔ اوئے میرا انتظار تو کیا ہوتا..."

"کیا میں نے مجرم کو گرفتار کر کے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے؟" نوجوان سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "آپ آتے ہیں دس بجے۔ میں اگر نو بجے چھاپہ نہ مارتا تو یہ سب لوگ کیسے پکڑے جاتے؟ اب آپ کے پاس چالان پیش کرنے کے لیے ہر چیز ہے مجرم اور گواہ۔ برآمد ہونے والا مال اور دستخط شدہ نوٹ۔ پھر میں ایف آئی آر کیسے نہ کاٹتا۔ اس میں واردات کا وقت بھی تو لکھنا تھا۔"

میں نے محسوس کیا کہ چراغ دین کی گرفتاری کے معاملے میں ان دونوں کے درمیان شدید قسم کا اختلافِ رائے ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایس آئی شیخ مل گیا جو ایماندار اور فرض شناس تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی وہ ایک جذباتی جوشیلا نوجوان تھا جو ترقی کرنا چاہتا تھا اگر اس کی جگہ انسپکٹر ہوتا تو صورتِ حال وہی ہوتی جس کا میں نے تصور کیا تھا یعنی چراغ دین پیسہ دے کر معاملے کو دبا دیتا اور الٹا مجھے پھنسا کے نکل جاتا۔ انسپکٹر کو افسوس تھا کہ آمدنی کا اچھا خاصا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا ماتحت شیخ اپنے افسر کی عادت اور فطرت سے بخوبی واقف تھا چنانچہ اس نے ایف آئی آر کاٹنے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک اچھا کام یہ بھی کیا تھا کہ ایف آئی آر میں میرا نام کہیں نہیں لکھا تھا لیکن چراغ دین سے سودا کرنے والوں کو پکڑ کر بند کر دیا تھا اور چراغ دین کے ساتھ انہیں بھی مجرموں میں شامل کر دیا تھا۔ محبت خان اس ہنگامے میں خواہ مخواہ ملوث ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مالک کی حمایت میں بولا تھا اور شیخ نے اسے ایک گواہ بنا کے طلب کر لیا تھا۔ محبت خان نے اپنے بیان کو حقائق تک محدود رکھا تھا یعنی یہ کہ وہ صرف چوکیدار ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن وہ مالک کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ چراغ دین سے جو لوگ ملنے آتے تھے، وہ کیسے آدمی تھے۔ اس کے بیان نے میری پوزیشن بھی بہت بہتر کر دی تھی اگر وہ کہتا کہ صبح کے وقت وہ باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہا تھا اور معلوم نہیں اس وقت سکندر صاحب آئے تھے یا نہیں تو صورتِ حال مختلف ہوتی مگر اس نے جلدی میں یہی کہا کہ میں نے تو صبح سکندر بخت صاحب کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ آتے تو صاحب ان کو گھر میں ضرور بٹھاتے اور ان کی آواز بھی آجاتی تو میں پہچان لیتا کہ لیجیے سکندر صاحب آئے ہیں۔ یہ چراغ دین نے اپنی حماقت کی سزا پائی تھی۔ اس نے مجھے دروازے پر کھڑا رکھا تھا اور باہر سے ہی رخصت کر دیا تھا، اب وہ یقیناً پچھتا رہا ہو گا کہ مجھے بے عزت کر کے اسے فائدے کے بجائے الٹا یہ نقصان ہوا کہ وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد گواہ سے محروم ہو گیا۔

میں نے چراغ دین کا پورا بیان پڑھا اور محبت خان کا بھی۔ چراغ دین نے صرف ایک عقلمندی کی تھی کہ فوزیہ کا نام نہیں لیا تھا لیکن مجھے اپنا دشمن قرار دیا تھا اور احسان فراموش کہا تھا کہ اس نے بُرے وقت میں میرے والد کو پناہ دی اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا کیونکہ میں لندن میں تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ میرے والد کی موت اور بیماری طبعی حالات کا نتیجہ تھی لیکن میں نے اسے خطاوار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور شاید میں چراغ دین پر بھی شک کرتا تھا کہ وہ بھی قتل کرنے والوں میں شامل ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکا تھا چنانچہ میں نے انتقام لینے کی نیت سے اس کے خلاف سازش کی ہے۔ چراغ دین نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا کہ کئی سال پہلے اس کو غبن کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن میرے والد وزیر خان مرحوم الزام کو عدالت میں ثابت کرنے سے قاصر رہے تھے چنانچہ چراغ دین باعزت طور پر بری ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے وزیر خان کے بیٹے کے ذہن میں یہ پرانی بات بھی ہو کیونکہ وہ نوجوان اور جذباتی آدمی ہے۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا ہو گا کہ عدالت سے انصاف نہیں ہوا تھا چنانچہ اب وہ مجھے سزا دینا چاہتا ہو۔ حسبِ توقع چراغ دین نے میر شرافت علی کے قتل کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ یہ بتایا تھا کہ میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ بہت سی باتیں وہ اپنے وکیل سے مشورہ کرنے کے بعد عدالت میں بتائے گا۔

"تو جناب سکندر صاحب!" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا خیال ہے آپ کا اس بیان کے بارے میں؟"

"اس میں کچھ باتیں سچ ہیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ چراغ دین میرے والد کی فرم کا معمولی ملازم تھا۔ وہ غبن کر کے بھاگ گیا تھا۔ عدمِ ثبوت کی بنا پر اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا تھا لیکن اس وجہ سے میں چراغ دین

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عدالت نے حقائق کی بنیاد پر جو فیصلہ دیا تھا درست تھا چنانچہ آج کئی سال بعد اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں عدالت کے فیصلے کو غلط کہوں اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لیکر چراغ دین کو خود سزا دینے کے لیے سازش کروں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ میرے والد نے زندگی کے آخری ایام چراغ دین کے ساتھ گزارے لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ چراغ دین نے ان کو پناہ دی تھی اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا تھا۔ اس نے میرے والد کو نوکر رکھا تھا۔ ان کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا تھا اور انہیں سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا تھا۔ میں نے ابھی تک یہ تسلیم نہیں کیا ہے کہ میرے والد کی موت کا سبب ان کی بیماری تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کو قتل کیا گیا تھا لیکن میں نے کبھی کسی کے سامنے چراغ دین پر قتل کا شبہ ظاہر نہیں کیا۔ میں چار سال تک برطانیہ میں زیر تعلیم رہا اور خصوصی حالات کے باعث اپنی تعلیم کا سلسلہ نامکمل چھوڑ کر واپس آنے پر مجبور ہوا۔ جب میں گیا تھا تو میرے والد کا شمار دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ میں ان حالات کا پتہ چلانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں جو میرے والد مرحوم کی تباہی کا اور موت کا سبب بنے۔ ایک دولت مند اپنے ہی سابقہ ملازم کے گھر میں ادنیٰ خادم کی حیثیت سے رہنے پر کیوں مجبور ہوا؟ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں رہنے والا ' ایم۔ ڈبلو ڈی انجینیئرنگ کمپلیکس کا پارٹنر بھی تھا جسے اعداد و شمار کے مطابق لاکھوں روپے کا منافع بھی ہوا تھا لیکن اس بات کا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھ پر اسی کمپنی کے ایک پارٹنر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے لیکن الزام جب تک ثابت نہ ہو، جرم نہیں کہلاتا۔ میں ارتکاب جرم کرتے ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا لیکن چراغ دین کی گرفتاری عین اس وقت ہوئی ہے جب وہ دو افراد کو منشیات فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک کو فروخت بھی کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت سب انسپکٹر شیخ کے وہ دستخط شدہ نوٹ ہیں جو چراغ دین کی جیب میں سے نکلے تھے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ جو لوگ چراغ دین سے منشیات خریدنے گئے تھے وہ اس دھندے میں ملوث ہیں یا نہیں، کیا انہوں نے بھی کہا ہے کہ میں نے انہیں چراغ دین کے پاس بھیجا تھا؟"

"وہ کسی استاد ٹیڈی کا نام لیتے ہیں۔" انسپکٹر سے پہلے سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "کہ وہ صبح سویرے ان کے پاس آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ مال ملنے کا ایک نیا ٹھکانا پیدا ہو گیا ہے جہاں سے مال اٹھانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ استاد ٹیڈی کوئی چھوٹا موٹا بدمعاش ہے۔ وہ خود بھی منشیات کی فروخت کا دھندا کرنا چاہتا تھا لیکن خود کچھ ڈرتا تھا چنانچہ وہ پانچ سو روپے دے گیا تھا کہ اس کے لیے بھی تھوڑا سا مال اٹھا لیا جائے۔ انہوں نے دیکھا ہی نہیں کہ نوٹ دستخط شدہ ہیں اور مال لینے پہنچ گئے تھے۔ ابھی انہوں نے رقم ادا کر کے مال لیا ہی تھا کہ سڑک پر آس پاس ٹہلنے والے سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والوں نے ان کو گھیر لیا تھا۔"

"استاد ٹیڈی سے کچھ معلوم ہوا؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"وہ ابھی ہاتھ ہی کہاں آیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اس کا پتہ ٹھکانہ کسی کو معلوم ہی نہیں۔ ہم نے حلیہ مشتہر کر دیا ہے۔"

"اصل بات تو یہ ہے کہ ہم نے ایک شخص کو سرِ راہ منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "مجھے اطلاع دینے والا استاد ٹیڈی تھا یا کوئی اور یہ میں نہیں جانتا۔ اس نے خود کو پولیس کا مخبر کہا تھا اور میں نے اسے سو سو کے پانچ نوٹ، دستخط کر کے دے دیے تھے۔ نوٹ بھی میرے نہیں تھے اور مجھے یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھائے گا لیکن اس شخص کا حلیہ استاد ٹیڈی کے حلیے سے بالکل نہیں ملتا۔" وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ چراغ دین کا کوئی دشمن ہو پتر!" انسپکٹر نے کہا۔ "تمہیں چاہیے تھا کہ اس کو روکتے۔"

"کیا چراغ دین بھی استاد ٹیڈی نام کے کسی شخص سے واقف ہے؟" میں نے اسی معصومیت سے سوال کیا۔ "اور وہ دونوں جو خریدار بن کر آئے تھے، وہ کیا کہتے ہیں؟ کیا ان کی استاد ٹیڈی سے کوئی دشمنی تھی؟"

"او نہیں بابا۔۔" انسپکٹر نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اور یہی تو کمال کی بات ہے۔ آخر چراغ دین صرف تمہارا نام کیوں لیتا ہے؟"

"یہ بات میں بھی اس سے پوچھنا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات اور ہے جو آپ کے نقطۂ نظر سے اہم ہو سکتی ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے چراغ دین کے خانساماں سلامت شاہ کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ ہی کے تھانے کا کیس ہو گا۔"

"ہاں ہاں" انسپکٹر نے بادلِ ناخواستہ تسلیم کیا۔ "اس کی لاش کے ٹکڑے ایک بکس میں بھر دیے گئے تھے اور اس کا پتہ بہت دنوں بعد چلا تھا جب لاش کے سڑنے گلنے کی بدبو ہر طرف پھیلی تھی۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"سلامت شاہ کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ انتہائی نیک آدمی تھا اور اس نے زندگی کے آخری ایام میں میرے والد کی بہت مدد کی تھی۔ یہ بات آپ محبت خان سے پوچھ سکتے ہیں کہ سلامت شاہ کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ ایسے آدمی کا دنیا میں کون دشمن ہو گا جو سب کا دوست ہو۔ اس کا قتل انتہائی لرزہ خیز اور افسوسناک واقعہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملا لیکن اب یہ سوچا جا سکتا ہے کہ خود چراغ دین نے اپنے خانساماں کو قتل کیا یا کرایا؟" میں شک کا بیج بونے میں کامیاب رہا تھا۔

"یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا؟" انسپکٹر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر صاحب! محبت خان کو اس لیے کچھ نہیں معلوم کہ وہ چوکیدار ہے، باہر کھڑا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن خانساماں گھر کے اندر رہتا تھا۔ ممکن ہے اس نے کچھ سن لیا ہو یا کچھ دیکھ لیا ہو اور اس کا وجود چراغ دین کے لیے خطرناک بن گیا ہو!"

"گھر کے اندر کچھ ہو گا تو ابھی ایک گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔" سب انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "خانہ تلاشی کے وارنٹ لے کر ہم مجسٹریٹ کے ساتھ دوپہر تک پہنچ جائیں گے۔ ہم نے دروازے پر گارڈ بٹھا دیے ہیں۔"

"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ دھندا کوئی گروہ چلاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کیجیے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گیا۔۔"

"ہم نے ابھی تک کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونے دیا۔" شیخ نے بڑے فخر سے کہا۔ "ان کو الگ الگ رکھا ہے اور سب سے الگ الگ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ اگر ان کا کوئی ملاقاتی آیا تو ہم اسے بھی دھر لیں گے۔ باقی رہا گروہ کا سوال تو کل یہ خبر اخباروں میں آ جائے گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سے پہلے ہی چراغ دین گروہ کے باقی لوگوں کے نام بتا دے۔ کل تک ہم اسے تفتیش کے لیے رکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد بھی عدالت سے جسمانی ریمانڈ لے سکتے ہیں۔"

شیخ کی بات سے مجھے عذاب کی وہ رات یاد آ گئی جب میر شرافت علی کے قتل کی 'تفتیش' کے لیے مجھ کو تھانے میں رکھا گیا تھا۔ تشدد کا ہر غیر انسانی طریقہ آزمایا گیا تھا۔ جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ یہ طریقے جن کا عام آدمی تجربے کے بغیر تصور بھی نہیں کر سکتا، پولیس کے طریقۂ تفتیش میں شامل ہیں۔ "کیا چراغ دین آج رات تفتیش کی یہ سختی اور ذلت جھیل سکے گا؟" میں نے سوچا۔ اس خیال نے ایک وحشیانہ تسکین دی کہ مجھ پر ہر ظلم روا رکھنے والوں میں سے ایک آج خود ظلم سے آشنا ہو گا۔ بلاشبہ یہ ایک رات کا عذاب اُس عذاب کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو میرے والد مرحوم نے برداشت کیا تھا اور میں نے جھیلا تھا لیکن یہ احساس ہی کیا کم تھا کہ بساط الٹ گئی ہے۔ کم سے کم ایک شخص جو کل تک اپنی ذہانت اور عیاری کے مقابلے میں انصاف کی قوت کو کچھ نہیں سمجھتا تھا، جو خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا تھا وہ آج خود گردشِ حالات کا شکار تھا اور اس کی خوش فہمیوں کے سارے جال ٹوٹ گئے تھے۔

"غالباً میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر چکا ہوں۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "چراغ دین کا الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں۔ چور کی داڑھی میں تنکا نہ ہو تب بھی اس کا ہاتھ تو تنکا نکالنے کے لیے اٹھتا ہے۔ محبت خان کہہ چکا ہے کہ اس نے آج صبح مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر ایس پی ضامن رضوی صاحب بتا چکے ہیں کہ کل رات سے صبح ٹیلیفون آنے تک میں گھر سے نکلا ہی نہیں۔ میں تو ابھی سو کے بھی نہیں اٹھا تھا کہ رضوی صاحب نے ناشتے پر بلا لیا۔ میں نے ان کی فیملی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ گھر میں چند اور افراد بھی میری موجودگی کے گواہ ہیں مثلاً بیگم رضوی، ایک ایڈووکیٹ ہیں مس رابعہ قاری جو آج کل رضوی صاحب کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری ہیں مسٹر شیروانی ان کا لڑکا محسن بھی گھر میں ناشتے کے وقت موجود تھا۔ ایک ایس پی صاحب کا ڈرائیور کانسٹیبل ہے۔۔۔ اتنے گواہ ہوں تو کسی کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر بھی میں چراغ دین سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے میرا نام کیوں لیا۔۔۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں یہی بات اس سے اکیلے میں پوچھ لوں؟"

"اگر ہمارے سامنے پوچھ لیں تو کوئی ہرج ہے؟" انسپکٹر نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ میرے حوالوں نے اس کو مرعوب کر لیا تھا۔

"آپ میری تلاشی لے لیں۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ جیبی چاقو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تک نہیں ہے اور نہ کوئی ٹیپ ریکارڈر قسم کی چیز ہے۔ دراصل پولیس کے سامنے ہر بات نہیں بتائی جاسکتی۔ آپ لوگ اپنے طریقوں سے پوچھ لیں تو اور بات ہے۔ رضا کارانہ طور پر اپنی خوشی سے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا۔ میرے سامنے وہ بے خوف ہو کے بات کر سکتا ہے۔"

انسپکٹر کے قائل ہو جانے کے بعد شیخ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ "دیکھیے سکندر صاحب! میں نے آپ کو کتنی صفائی سے بچالیا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی تو اتنی ہی صفائی سے میں آپ کو گرفتار بھی کر لیتا۔"

"تمہارے ایس ایچ او صاحب کے رویّے سے ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ کارنامہ انہیں پسند نہیں آیا۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"سکندر صاحب! اس محکمے میں فرض شناسی اور ایمانداری کسی کو پسند نہیں آتی۔" وہ بولا۔ "کچھ تو ہم بدنام ہیں، کچھ ہماری بدنامی کی تشہیر زیادہ ہوتی ہے اور عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پولیس کے سارے محکمے میں کوئی حلال کی کھانے والا یا اصول پرست اور فرض شناس نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ یہاں سارا جل اتنا گندہ ہے کہ کوئی مچھلی اس میں زندہ نہیں رہ سکتی اگر میں نے مجرموں کو صرف گرفتار کیا ہوتا، رپورٹ نہ لکھی ہوتی اور معاملات کو ایس ایچ او صاحب کے آنے تک اٹھا رکھتا تو میرے کارنامے سے وہ بہت خوش ہوتے۔ وہ بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کا سودا کر لیتے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار معذرت کے ساتھ اپنا حصہ لینے سے انکار کر دیا تو کسی نے تعریف نہیں کی تھی بلکہ سب پریشان ہو گئے تھے کہ تھانے میں یہ ایماندار کہاں سے آن ٹپکا۔ یہ تو نہ خود کھائے گا اور نہ ہمیں کھانے دے گا۔ اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ میں نے کسی کی اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھایا ہے کیونکہ یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے اور اس سے سروکار نہیں کہ دوسرے کیا کرتے ہیں، لیکن میں نے خود اپنے ساتھ اصولوں پر کبھی سودا نہیں کیا اور اپنے آپ سے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ جسے رشوت نہ ملتی ہو وہ رشوت کے قانونی، مذہبی اور اخلاقی پہلو پر سب کو لیکچر دے سکتا ہے لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ آج صبح میں نے ایک لاکھ روپے کمانے کا نادر موقع جانتے بوجھتے گنوا دیا۔ ایس ایچ او صاحب کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوتا اور ایک لاکھ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتے۔ اس بات کا گواہ کون ہوتا کہ میں نے ایک مجرم کو چھوڑ دیا۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ مجرم ... تھی اور وہ مخبر بھی شاید نہیں تھا۔"

ہم دونوں ایک برآمدے کے درمیان ... کر رہے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے شیخ صاحب نے آپ کو ایک لاکھ روپے کی رشوت ... تھی؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "اور آپ نے ... انکار کر دیا؟"

"ہاں۔" شیخ بولا۔ "اسی بات کا ایس ... کو ملال ہے۔ ان کی نگاہ میں مجھ سے بڑا بے وقوف ... صبح انہوں نے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش ... نوجوان، جذباتی اور احمق ہوں۔ اصول اور فرض ... آدمی کا پیٹ نہیں بھرتے، سارا کھیل پیسے ... جس کے پاس دنیا میں پیسہ نہ ہو، وہ آدمی نہیں ... جاتا ہے... انہوں نے حساب لگا کے بھی ... ایک لاکھ میری کتنے برسوں کی تنخواہ کے برابر ... بھی کہ میں اپنی موجودہ تنخواہ میں سے بچانا شروع ... ریٹائرمنٹ کی عمر تک بھی ایک لاکھ جمع نہیں ... مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر مل سکتے تھے ... مسوری سر! میں تو اس عظیم شخصیت کا حقیر سا مقلد ... نے کہا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے، تب بھی میں سچ بولنے سے ... رہ سکتا۔ میں نے ایف آئی آر بھی کاٹ دی ... چراغ دین کے خلاف ایک جرم کا اضافہ بھی کر ... نے مجھے ایک لاکھ روپے رشوت کے طور پر دینے ... تھی۔"

میں حیرانی سے اس نوجوان پولیس افسر کو ... نے واقعی سخت ترین آزمائش میں بھی صراطِ مستقیم ... چھوڑا تھا۔ اس عمر میں کسی نوجوان کو بن مانگے ... بغیر ایک لاکھ روپے مل جائیں تو وہ بہت اونچا ... ایک لاکھ سے دس لاکھ اور دس لاکھ سے ایک ... اور اپنے لیے پُرمسرت اور سارے خوابوں کی تعبیر ... مگر یہ نوجوان اسی زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے ... پر ہوس کی آندھی میں بڑے بڑے اصولوں کے ... بکھر جاتے ہیں مگر وہ رزقِ حلال پر زندہ رہنے کا ... خواہ اس کے لیے زندگی کی ہر سختی جھیلنی پڑے ... بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ "مجھے تم سے مل کر ... ہے شیخ! اگر میرے حالات کی آزمائش درمیان ... کہہ سکتا تھا کہ ہم دوست بن سکتے ہیں۔"

شیخ ہنسا۔ "تم الٹی بات کہہ رہے ہو۔ حالات کی آزمائش میں جو دوستی پروان چڑھتی ہے وہی دوستی ہوتی ہے۔ معلوم ہے کل رات میں نے تمہیں اتنی آسانی سے دستخط کیوں کر دیے تھے؟ اس لیے کہ تمہاری صورت دیکھ کر مجھے اعتبار آگیا تھا۔ مخبری کرنے والے ایسے بات نہیں کرتے، وہ سودا کرتے ہیں۔ جتنی بڑی اسامی ہو اتنا ہی بڑا انعام طلب کرتے ہیں۔ تم نے تو وہ نوٹ بھی اپنی جیب سے نکالے تھے۔ اگر تمہاری جگہ کوئی پیشہ ور مخبر ہوتا اور میری جگہ ایس ایچ او صاحب ہوتے تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی۔ لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے ایس ایچ او صاحب لے جاتے، باقی دوسرے لوگوں میں ان کی حیثیت کے مطابق تقسیم ہوتے تو مخبر کو بھی دس ہزار ضرور مل جاتے۔"

"میں سمجھا تھا کہ ترقی پانے کے خیال سے تم فوراً راضی ہو گئے ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ترقی؟" وہ تلخی سے ہنسا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ڈی آئی جی صاحب مجھے تعریفی سند اور پانچ سو روپے کی گراں قدر رقم بطور انعام ادا کر دیں اور اخبار میں ان کی تصویر بھی آ جاتی لیکن اب میرا یہاں سے ٹرانسفر یقینی ہو گیا ہے۔ شاید مجھے پھر کبھی کسی تھانے میں پوسٹ نہ کیا جائے کہ مسٹر ایماندار! ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر کلرکی کرو اور شوق سے رزقِ حلال کماتے رہو۔ خیر اب تم جا کے اس سے مل لو۔" شیخ نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "خانہ تلاشی کے وارنٹ اور مجسٹریٹ صاحب آ گئے تو مشکل ہو جائے گی۔" اس نے آہنی سلاخوں والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جو برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور دروازے میں کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا کہ مجھے اندر جانے دیا جائے۔

چراغ دین گھٹنوں میں سر دیے فرش پر بیٹھا تھا۔ دروازے کا قفل کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ سنتری مجھے تفتیش کرنے والا سی آئی اے کا کوئی افسر سمجھ کے دروازے سے دور ہٹ گیا تھا۔

چند سیکنڈ تک میں اور چراغ دین پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خلافِ توقع مجھے دیکھ کر چراغ دین مشتعل نہیں ہوا تھا اور مجھ پر حملہ کرنے نہیں دوڑا تھا۔ وہ انتہائی شکست خوردہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "تم نے یہ کیوں کیا سکندر؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے دیوار کا سہارا لے کر اطمینان سے سگریٹ سلگائی۔ "میرا تم نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔"

"تم خود فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کر چکے تھے۔" وہ بولا۔

"فوزیہ کا نام یہاں مت لو۔" میں نے بڑی پھرتی سے اس کے لات رسید کی۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ "اس معاملے کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے پھر سکون سے کھڑے ہو کر کہا۔

چراغ دین گرد آلود فرش پر پڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ دہشت سے اس کی آواز بند ہو گئی تھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میں فرشتۂ اجل ہوں۔ چند سیکنڈ بعد وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح ہاتھوں اور پیروں کے بل اٹھا اور دیوار سے کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ "پھر... پھر تم نے مجھ سے یہ دشمنی کیوں کی؟" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا میرے باپ نے تم سے کوئی دشمنی کی تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جو کچھ تم نے کیا اس کے بعد تو میں تمہیں قتل بھی کر سکتا تھا لیکن میں تمہیں موت سے زیادہ سخت سزا دینا چاہتا ہوں۔ خوش قسمتی ہمیشہ آدمی کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اکثر تو انسان اپنی بدبختی کو بھی اپنی خوش قسمتی فرض کر لیتا ہے، جیسا کہ تم نے کیا۔ جب خوش قسمتی نے میرے باپ کا ساتھ چھوڑا تو اس نے تم جیسے لوگوں پر اعتماد کیا اور اپنے نوکروں کا نوکر بننے پر مجبور ہوا۔ تمہاری بدبختی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو گی کہ جس شخص نے تمہیں گرفتار کیا اسے تمہاری دولت بھی نہیں خرید سکی۔ خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ یہ پولیس آفیسر لاکھوں میں ایک تھا جس نے تمہارے ایک لاکھ روپے پر تھوک دیا۔ تم اسے دس لاکھ یا دس کروڑ دے کر بھی نہیں بچ سکتے تھے کیونکہ تمہارے لیے سزا کا وقت آ گیا تھا۔ سزا تو تمہیں اسی وقت مل جانی چاہیے تھی جب تم نے نمک حرامی کی تھی اور میرے والد کی دولت میں غبن کیا تھا مگر اس وقت تم بچ گئے تھے۔ تم اس دولت میں دن رات اضافہ ہوتے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ تمہیں خیال ہی نہیں آیا کہ اسی تناسب سے تمہاری سزا بھی بڑھ رہی ہے۔ غبن کے الزام میں شاید تمہیں سال چھ مہینے کی سزا ہوتی۔ اب تمہیں سات سال کی سزا بھی ہو سکتی ہے، عمر قید بھی اور پھانسی بھی۔"

"تم اپنے باپ کے قتل کا جرم بھی مجھ پر عائد کرو گے؟" چراغ دین طنز سے بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"نہیں۔ ان کی موت کو اب قتل ثابت کرنا مشکل ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارا ساتھ دینے والا اب کوئی نہیں رہا۔ شیروانی صاحب تمہارا نام بھی سننا گوارا نہیں کریں گے۔ میں اور محسن سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم اپنا پیسا اور اثر و رسوخ سب کچھ استعمال کر کے تمہارے خلاف ثبوت اور شہادت بھی لا سکتے ہیں۔ دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ میرے باپ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، اس لیے کہ وہ اکیلا تھا۔۔۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے چراغ دین کہ میں سلامت شاہ کے قتل کا الزام تم پر عائد کرنے کے لیے کچھ نہ کروں اور تم تختۂ دار تک پہنچنے سے بچ جاؤ۔ اس کے لیے تم دو سوالوں کے جواب دو گے۔"

"کون سے دو سوال؟" چراغ دین نے نظر اٹھا کے پُرامید لہجے میں کہا۔

"پہلا سوال یہ ہے چراغ دین کہ آخر میرے والد نے سارے شہر کو چھوڑ کر تمہارے گھر میں ملازمت کیوں کی تھی؟" میں نے کہا۔ "ایسی نوکری تو وزیر خان کو ہر گھر میں مل جاتی پھر وہ تمہارے پاس کیوں آیا جبکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تم وہی ذلیل آدمی ہو جس نے سب سے پہلے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ اس دہری ذلت کو اس نے کیوں قبول کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ قسم خدا کی، مجھے معلوم ہوتا تو تم کو ضرور بتا دیتا۔" چراغ دین مردہ آواز میں بولا۔ "وہ میرے پاس آیا تو تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا سارا کاروبار ختم ہو چکا ہے اور وہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے۔"

"کیا تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا؟" میں نے کہا۔ "کاروبار بدستور چل رہا تھا بلکہ بہت پھیل گیا تھا۔ اس کے تین پارٹنر ہو گئے تھے جن میں سے ایک میر شرافت علی تھا۔"

"وہی میر شرافت علی۔۔۔ جس کے قتل کا تم پر الزام ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں وہی میر شرافت علی۔" میں نے کہا۔ "وزیر خان بھی آخری وقت تک قانونی طور پر ایک مالک تھا اور حسابات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے منافع میں سے جو حصہ ملا تھا اس کی رقم کئی لاکھ تھی۔"

"ہو سکتا ہے تم جو کہہ رہے ہو، وہ ٹھیک ہو لیکن میں کیسے تصدیق کرتا؟ اور مجھے کیا ضرورت تھی تصدیق کرنے کی؟ جو اس نے جو کچھ کہا میں نے سچ مان لیا۔ میں فرض کر سکتا تھا کہ لاکھوں کا مالک میرے پاس پناہ لے کر آئے گا۔"

"تم نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں ۔۔۔ نے کہا۔ "اس لیے میں دوسرا سوال کرتا ہوں۔ کیا مر۔۔۔ اس لیے مروایا تھا کہ تم اس کے بچوں کو اپنے بچے سمجھتے تھے؟"

اس سوال کا ردِعمل ایسا تھا جیسے میں نے ۔۔۔ میں چنگاری پھینک دی ہو۔ "تم جھوٹ بولتے ۔۔۔ کرتے ہو، بھونکتے ہو کتے۔۔۔ ذلیل۔۔۔" وہ دیوا۔۔۔ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے منہ سے جھاگ کے سا۔۔۔ سے ایک گندی گالی نکل رہی تھی۔ میں نے اس ۔۔۔ ایک مکا رسید کیا اور وہ دور جا گرا لیکن وہ پھر پاگ۔۔۔ طرح جست لگا کر آیا۔ میں نے زیادہ قوت سے دو۔۔۔ رسید کیا لیکن اس دوران میں شور سن کر سپاہی اند۔۔۔ چراغ دین کے دوسری بار اٹھنے سے پہلے مجھ باہ۔۔۔ اور سنتری نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

"یاد رکھنا چراغ دین کہ تم نے میرے دو۔۔۔ کا جواب نہیں دیا ہے۔" میں نے سلاخوں کے باہ۔۔۔ اور چل پڑا۔ دوسری طرف سے مجھے ایس ایچ او ۔۔۔ سب انسپکٹر شیخ بھی اپنی طرف بڑھتے ہوئے نظ۔۔۔ وہ سب خاصے پریشان تھے۔

چراغ دین اب دروازے کے پیچھے کھڑا ۔۔۔ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا اور گالیاں بک رہا ۔۔۔ "الو کے پٹھے۔۔۔ کمینے۔۔۔ بدمعاش۔۔۔ میں تجھ۔۔۔ لوں گا۔ تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا تو ۔۔۔ ہے۔۔۔ تو سمجھتا ہے چراغ دین کو جیل ہو جائے ۔۔۔ پاگل کے بچے۔۔۔ تجھے کیا معلوم چراغ دین کون ۔۔۔ کیا ہے؟ میرے پاس الٰہ دین کا وہ چراغ ہے جس ۔۔۔ دنیا غلام ہے۔۔۔ میرے پاس پیسہ ہے پیسہ۔۔۔"

"تمہیں تو اس شخص کو پاگل خانے میں رکھ۔۔۔ تھا۔" میں نے ایس ایچ او سے کہا۔ "جیل خانے ۔۔۔

"ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہ۔۔۔ جانتے ہیں۔" ایس ایچ او غرایا۔ "اب یہاں ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔"

دروازے پر کھڑا ہوا سنتری اس صورت حا۔۔۔ بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے تفتیش کرنے وا۔۔۔

سمجھنے کی غلطی کی تھی اور دور کھڑا ہو گیا تھا اور اب اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے اس قیدی کے ساتھ کیا بات کی تھی جس سے وہ اتنا مشتعل ہے۔ اسے ایس ایچ او کے تیور بھی خطرناک اور بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے مگر سب انسپکٹر شیخ نے صورتِ حال کو فوراً سنبھال لیا تھا۔

"چراغ دین!" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم نے یہ ہنگامہ اور دیوانگی کا مظاہرہ جاری رکھا تو میں تم کو زنجیروں سے باندھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"تم یہاں میرے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہو۔" چراغ دین نے چلا کے کہا۔ "لیکن عدالت میں تم میرا منہ بند نہیں کر سکتے۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک معمولی سب انسپکٹر ہو، حاکم نہیں ہو۔ میں بڑے سے بڑا وکیل کر سکتا ہوں۔۔۔"

اس سے پہلے کہ بات بڑھ جاتی، میں نے وہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ ایس ایچ او کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح تھا۔ درمیان میں اگر ایس ایس پی ضامن رضوی کا حوالہ نہ ہوتا تو مجھے وہ اسی وقت بند کر دیتا کہ میں نے حوالات میں قیدی کے ساتھ مارپیٹ کی اور تھانے میں فساد کا موجب بنا۔ شیخ تو ماتحت تھا اور اس کی حمایت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تھانے سے نکل کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ اگر محسن اور رابعہ کے گھر پر ملنے کا امکان ہوتا تو میں واپس چلا جاتا اور باقی دن ان کے ساتھ رہتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بینک ڈرافٹ بنوانے کے لیے نکل چکے ہوں گے۔ قرب و جوار میں ایسا کوئی ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں میں سکون سے بیٹھ کے کچھ سوچ سکتا۔ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چراغ دین میرے دوسرے سوال پر کیوں بھڑک اٹھا تھا۔ کیا میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگارہ رکھ دیا تھا؟ کیا مریم کے بارے میں قیاس آرائی میں حقیقت کو دخل تھا؟ محسن نے مجھے ایک سچا واقعہ سنایا تھا، اس کے باوجود میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ ازدواجی زندگی میں مریم جیسی عورت اور چراغ دین جیسا مرد ایک دوسرے کا بھرم رکھنے کے لیے اور باعزت طور پر کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اتنا غیر اخلاقی سمجھوتا کرنے پر مجبور تھے۔ مجبوری تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ چراغ دین نے اپنی مرضی سے اور بڑے جتن کر کے مریم سے شادی کی تھی اور بظاہر مریم نے مشرقی عورت کی روایت پر عمل کرتے ہوئے والدین کی خوشی پر اپنی محبت کو قربان کر دیا تھا۔ کیا یہ بھی فریبِ خیال تھا؟ مریم نے والدین کی خوشی کو بہانہ بنا کے دولت مند چراغ دین کو قبول کر لیا تھا اور اپنے مخلص پرستار کو چھوڑ دیا تھا؟ بلاشبہ مریم اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت مختلف تھی لیکن میرے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے ایک ایسے شخص کے ساتھ نباہ کیا جو ہرگز اس کا شوہر کہلانے کے قابل نہ تھا۔ وہ اتنی گری ہوئی عورت بہرحال نہیں تھی۔ اگر حصولِ دولت ہی اس کا مقصد ہوتا تو شادی کے بعد وہ کسی بھی وقت الگ ہو سکتی تھی۔ ایک لاکھ کا حق مہر تو اس کا قانونی حق تھا مگر وہ چراغ دین سے ذہنی اذیت کا ہرجانہ بھی وصول کر سکتی تھی۔ کسی عدالت میں جائے بغیر چراغ دین اس کو سب کچھ دے دیتا۔ مریم کو عدالت میں جانے سے بھی کون روک سکتا تھا۔ میں نے چشمِ تصور سے مریم کے بچوں کو دیکھا جو اپنی ماں کے ساتھ ہی ابدی نیند سو چکے تھے۔

دو نمبر بس میں سوار ہونے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے دائیں اور بائیں ہاتھ پر کھڑے ہوئے مسافر ایک طرح سے مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں۔ اگرچہ بس میں اتنی بھیڑ نہیں تھی کہ کھڑے ہونے والے آپس میں چپکنے پر مجبور ہوں لیکن وہ دونوں مجھ سے چپکے کھڑے تھے اور ان میں سے ایک اس پوزیشن میں تھا کہ مجھے بس سے نہ اترنے دے اور میرے خنجر گھونپ کر چلتی بس سے کود جائے۔ ڈبل ڈیکر بس کی رفتار بہت زیادہ نہیں ہوتی مگر اتنی بڑی چیز کو فوراً روکا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ شخص ذرا بھی پھرتی دکھاتا تو کسی کے تعاقب میں آنے سے پہلے غائب ہو جاتا۔ ان دونوں کی صورتوں پر احساسِ جرم کی تحریر تھی یا میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ میں نے ان کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ جسمانی طور پر وہ کسی طرح بھی مجھ سے کم نہیں تھے اور اگر ان سے براہِ راست مقابلے کی نوبت آ جاتی تو کسی کو خبر ہونے سے پہلے میرا کام تمام ہو جاتا۔ ان کے اس قدر قریب ہونے کا مطلب بھی بہت واضح تھا۔ وہ جانتے تھے آزادی سے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا موقع ملا تو میں آسانی سے دونوں کو چت کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے میرے لیے ہلنے کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ دونوں طرف سے میرے سینے میں خنجر اتار کے فرار ہو سکتے تھے۔ خنجر کو مہارت سے استعمال کرنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو خود مرنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ کسی نے کب اور کیسے پیٹ چاک کر دیا اور یہ خنجر کی دھار کے علاوہ ہاتھ کی صفائی کا کمال ہوتا ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خطرے کا احساس ہو جانے کے بعد دیر کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ شملہ پہاڑی پر بس نے موڑ کاٹا تو میں ایکدم پیچھے کی طرف ہٹا اور سعود سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی گود میں جا لیٹا۔ ان میں سے ایک سفید ریش بزرگوار تھے جن کے ساتھ کھڑکی والی سیٹ پر ان کی بیٹی یا بیوی بیٹھی تھی ابھی ان کے منہ سے "سُور دا پتّر" ہی نکلا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن اٹھتے اٹھتے میں نے دونوں ٹانگیں مخالف سمتوں میں اس طرح پھیلائیں کہ خنجر آزمائی کے مناسب موقعے کا انتظار کرنے والوں کے قدم اکھڑ گئے۔ میرے دونوں بوٹ ان کے ٹخنوں پر بڑے زور سے لگے تھے اور اس سے دوسرے پیر کی بنیادیں بھی ہل گئی تھیں۔ وہ سیٹوں کے درمیان منہ کے بل گرے ادھر بزرگوار کی بیٹی یا بیوی نے بھی واویلا شروع کیا اور مجھے "مشٹنڈا۔ بے شرم" کہا۔ میں نے الزام ڈرائیور کو دیا جس نے اتنی رفتار سے موڑ کاٹا۔ کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی حمایت کرتے ہوئے میرے الزام کی پرزور الفاظ میں تردید کی اور یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ میرے دشمن میری چال کو سمجھ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مشتعل کرنے کے لیے بہت گندی سی گالی دی مگر میں نے مسکرا کے کہا: "معاف کرنا پہلوان جی۔۔" مجھے معلوم تھا کہ ایک بار جھگڑا شروع ہو گیا تو دونوں طرف سے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس تنگ جگہ میں جو افراتفری پھیلے گی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دونوں میں سے کوئی اپنا کام کر جائے گا۔ میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خنجر باز ہیں۔ ان کے پاس ریوالور بھی ہو سکتا تھا۔ بس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کودنے کی صورت میں میری گردن یا ٹانگ ٹوٹنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ مزید یہ کہ وہ دونوں اٹھتے ہی دروازے کے قریب راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ایک قدم ان کی طرف بڑھایا اور پھر اچانک مڑ کر زینے پر چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل پر جگہ زیادہ تھی۔ عام طور پر کنڈیکٹر اوپر کسی کو کھڑا ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس وقت بھی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں اور میں مایوس ہو کے واپس نیچے آنے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ بیک وقت دو مسافر اٹھے میں فوراً ان کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے لپکا نیچے وہ دونوں اب بھی دروازے میں کھڑے تھے لیکن زینے کے اوپر لگے ہوئے گول شیشے میں مجھے بیٹھا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اس شیشے میں کنڈیکٹر کو اوپر کی منزل کی ہر سیٹ صاف نظر آتی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی پڑی تھی۔ جب میں نے سر گھما کے دیکھا تو ان میں سے ایک

اوپر آ چکا تھا اور میں اسے اپنے ساتھ بیٹھنے سے منع… کر سکتا تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی چنانچہ… پہلے کی نسبت زیادہ ٹائٹ پوزیشن میں تھا۔

"کیا چاہیے تمہیں؟" اس شخص کی طرح میں… اپنے ظاہری سکون اور اعتماد میں فرق نہیں آنے دیا…

"بھاگنے کی کوشش سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا…" میری طرف جھک کے آہستہ سے بولا اور ایسے مسکرایا… اس نے مجھ سے کوئی بہت پُرلطف بات کی ہو۔ میں… مسکرا کے اسے دیکھا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کا ہاتھ… میں گیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ریوالور کو تھوڑا سا… اور مجھے ایک جھلک دکھا کے واپس اندر کر دیا۔ میرے… کسی نے بھی اس چھوٹے سے آٹومیٹک ریوالور کی… اور سفاک چمک کو نہیں دیکھا تھا۔ سڑک کے کنارے… ہوئے درختوں کی آگے بڑھ آنے والی شاخیں بس کی… ٹکرائیں اور کچھ پتے اڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ مجھے یوں… جیسے کسی نے میرے گال پر چانٹا مار دیا ہے۔ امید کی… کرن اچانک جاگ اٹھی۔ بائیں طرف پیتل کی وہ… جیسی سلاخ نہیں تھی جو بس کے ایک کنارے سے… کنارے تک ہر کھڑکی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی… کی موجودگی میں کوئی اپنا سر کھڑکی سے باہر نہیں نکال… ہر کھڑکی تقریباً ڈھائی تین فٹ لمبی اور سوا فٹ… اونچی تھی۔ بیشتر شیشے جو ایک بار ٹوٹ گئے تھے دوبارہ… گئے تھے۔ چنانچہ میرے بائیں ہاتھ پر شیشے اور سلاخ کی… موجودگی کے باعث باہر نکلنے کا راستہ پیدا ہو گیا تھا… چلتی ہوئی ڈبل ڈیکر بس کی دوسری منزل سے سڑک… لگانا اقدام خودکشی کا کیس بن سکتا تھا۔ مقابلے کے… جان لینا تو دشمنوں کی خواہش کی تکمیل کے مترادف تھا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ تم مجھے بھاگنے نہیں دو گے۔"… بھی آہستہ سے کہا۔ "تمہارے پاس ریوالور ہے تو… ہو گا اور تمہیں چلانا بھی آتا ہو گا۔ خیر ایک بات… کام کا معاوضہ کون ادا کرے گا؟ ڈپٹی سلوا یا چوہدری… میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ میرا مقصد بھی… سی دیر کے لیے اس کا ذہن اپنی ساری توجہ مجھ پر… کیونکہ میری نظر ان درختوں پر تھی جن کی شاخیں… بانہوں کی طرح میرے قریب سے گزر رہی تھی… میرے قاتل ہمسفر کو جواب سوجھا بھی نہ تھا کہ میں… سے ایک درخت کی شاخ کو قریب آتے دیکھ…

میں نے شاخ کو گرفت میں لے لیا۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور میں بس سے باہر نکل کر ہوا میں معلق رہ گیا۔ اگر مجھ سے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو دست گیری کے لیے کھڑکی تک پہنچنے والی شاخ گزر جاتی اور میں سڑک پر گرتا تو اگلے روز کے اخباروں میں چراغ دین کی گرفتاری کے علاوہ میری خودکشی کی خبر بھی شائع ہو جاتی۔

بس تن سے آگے نکل گئی تھی۔ میری ٹانگوں پر کھڑکی سے ٹکرا کر چوٹ آئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جھٹکا بہت شدید ہو گا اور اگر میں نے شاخ پر گرفت قائم نہ رکھی تب بھی لاش کی طرح نیچے گروں گا۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ جھٹکے سے میرا شانہ اتر جاتے یا میں نیچے گروں تو کوئی گاڑی مجھ پر سے گزر جائے۔ اچھے سے اچھا ڈرائیور زمین پر چلنے والوں کو بچا سکتا ہے، آسمان سے ٹپکنے والوں کو کیسے بچا سکتا ہے۔ جب میں نے خود کو صحیح سالم حالت میں پکے ہوئے پھل کی طرح ڈال سے لٹکا ہوا دیکھا تو۔۔۔۔ خدا کا شکر ادا کیا جسے میری زندگی منظور تھی۔ اس کیفیت میں بھی میرے کانوں نے اس فائر کی آواز سن لی تھی جو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے سوچے سمجھے بغیر بدحواسی کے عالم میں کر دیا تھا۔ بس میں پہلے ہی بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن اس ہنگامے کی خبر نیچے پہنچنے میں کچھ وقت لگا اور جب ڈرائیور نے بس روکی تو میرے اور بس کے درمیان سو گز سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ شاخ بہت لچکدار تھی ورنہ ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ میرے وزن کو شاخ نے تقریباً دوہرا کر دیا تھا اور میرے پیر زمین سے پانچ چھ فٹ اوپر رہ گئے تھے۔ ہاتھ چھوڑتے ہی میں پیراشوٹ سے اترنے والے کی طرح زمین پر پہنچا۔ بس میں سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی قیادت میں بہت سے جوشیلے تماشائی بھی میری طرف بھاگتے چلے آ رہے تھے اور ان میں وہ بدمعاش بھی شامل تھا جو نیچے دروازہ روکے کھڑا تھا۔ اوپر والے کے بارے میں فرض کیا جا سکتا تھا کہ باقی مسافروں نے اسے قابو کر لیا اور اب وہ پولیس اسٹیشن پہنچا دیا جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا اور ایک زیرِ تعمیر عمارت میں داخل ہو کر مال روڈ پر نکلا۔ وہاں سے پھر میں نے دوڑ لگا کے ٹریفک کی پروا کیے بغیر سڑک پار کی اور باغِ جناح کے لیڈیز پارک میں گھس گیا۔ وہاں اس وقت بھی سات سال سے سترہ سال تک کی "لڑکیاں" جھولا جھول رہی تھیں۔ انہوں نے احتجاجی چیخ ماری اور میں دائیں طرف دوڑتا ہوا جم خانہ کی عمارت میں داخل ہو گیا جو سو من طرف کے لمبے لمبے [illegible] اور بڑے بڑے دروازوں اور مخروطی چھت والی عمارت تھی۔ عام حالت میں کوئی شخص جو ممبر نہ ہو اندر قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اس وقت وہاں ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا جو معمول کے مطابق جھاڑ پونچھ اور آرائش کے کام میں مصروف تھے۔ میں نے پہلے اس عمارت کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ اندر نہ جانے کتنے کمرے اور ہال تھے مجھے تین ویٹر ٹائپ لوگوں کو ناک آؤٹ کرنا پڑا جو مختلف کمروں میں ملے کیونکہ وہ شور مچانے پر آمادہ تھے۔ میں نے ان کو صوفوں کے پیچھے قالین پر اس طرح لٹا دیا کہ کوئی اندر آ جائے تو اسے کچھ دکھائی نہ دے۔ وہ تینوں آدھے گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں گے، یہ میں جانتا تھا۔ مجھے باہر نکلنے کے راستے یا سمت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے چوتھے کمرے میں کوئی نہیں تھا اور یہ کمرہ کارنر کا تھا۔ میں نے دروازے اندر سے بند کیے اور کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ زیادہ مشتعل مزاج لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے مال روڈ تک تو آ گئے تھے لیکن اب حیران، پریشان کھڑے ہوئے دائیں بائیں گزرتی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ دوسرا بدمعاش بھی تھا جو بس کے پائدان پر میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ غالباً دوسرے لوگوں کی طرح اس کو بھی یقین آنے لگا تھا کہ میں کسی رکشا یا ٹیکسی میں نکل گیا ہوں۔

دس منٹ بعد سب لوگ واپس جا چکے تھے۔ یہ سوچ کر میں بہت محظوظ ہوا کہ جب بس دوبارہ روانہ ہوئی ہو گی تو مسافروں کے درمیان اس سنسنی خیز واقعہ پر کیا کیا تبصرے نہ ہوئے ہوں گے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں۔ شاید کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہو کہ میں سرکس کا بازی گر تھا یا کوئی بہت خطرناک قسم کا مجرم۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ فائر کرنے والا اگر پکڑا نہیں گیا ہو گا تو اس ریوالور کی مدد سے لوگوں کو دہشت زدہ کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہو گا اور عین ممکن ہے کہ وہ فائر اس نے مجھ پر نہ کیا ہو لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے کیا ہو۔ میرے حق میں بھی یہی بہتر تھا کہ وہ فرار ہو جائے ورنہ پولیس والے مار مار کے اس سے پوچھیں گے کہ وہ خود کون ہے اور جس پر اس نے گولی چلائی تھی وہ کون تھا۔ اگر ڈی سلوا یا چوہدری ملاوا نے ان کو بھیجا ہو گا تو اسے میری تصویر دکھائی ہو گی یا بتایا ہو گا کہ میں کہاں ملوں گا۔ ان کا ناکام لوٹ جانا خود ان کے حق میں بھی بہتر تھا۔ وہ ایک بار اور کوشش کرنے اور کامیاب ہونے کا دعویٰ کر کے بچ سکتے تھے لیکن ان کا پولیس کے ہاتھوں میں پڑ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جانا ڈی سلوا اور چوہدری حلاور کو بہت مہنگا پڑتا۔ یا تو وہ انہیں نقد معاوضہ ادا کر کے چھڑانے پر مجبور ہوتے یا افشائے راز کی صورت میں ان کا خاتمہ کرنے پر۔

اب مجھے اس کمرے سے کھڑکی کے راستے باہر جانا تھا۔ جانے سے پہلے میں نے ایک گوشے میں رکھا ہوا فریج کھولا کیونکہ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پھر مجھے فریج کے اندر بہت اعلیٰ قسم کی فیرنی کے پیالے نظر آئے۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے جو ایک دوسرے کے اوپر الٹا کر رکھ دیے گئے تھے۔ میں نے پیالوں کے تین جوڑے صاف کیے ان کو پھر اسی طرح رکھا اور باہر آگیا۔

باہر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی لیکن میری نگاہ ہر اجنبی صورت کو دیکھتی جا رہی تھی۔ میں مصنوعی آبشار کے پاس سے گزرا اور اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے پاس سے گھوم کے سیدھا چلنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر مسجد اور سبزہ زار تھے اور اس سے ذرا آگے پہاڑی کے اوپر کہیں اوپن ایئر تھیٹر تھا جو درختوں کے حصار میں نیچے سے دکھائی بھی نہ دیتا تھا یہ درخت سڑک کے دونوں کناروں پر کسی جنگل کی طرح اُگے ہوئے تھے اور بہت پرانے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس باغ میں علم نباتات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ سب درخت لگائے گئے تھے جو یہاں کی آب و ہوا میں پرورش پا سکتے تھے۔ ہر درخت پر ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ عام فہم زبان کے نام نہیں تھے بلکہ بوٹنی کے انتہائی مشکل لاطینی نام تھے۔ شام کو اس سڑک پر تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا مگر اس وقت پورے باغ پر ایسی خاموشی اور ویرانی کا تسلط تھا کہ فضا بھی سونی سونی لگتی تھی۔ چڑیا گھر کے جنگلے میں تیرتی ہوئی بطخوں پر نظر ڈالتا ہوا میں اس گمنام مزار کے پاس سے گزرا جہاں ہر جمعرات کی شام قوالی ہوتی تھی اور مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا اہتمام کسی خاتون کی طرف سے ہوتا ہے۔ میں اپنے خیالات میں محو تھا، اس کے باوجود میں نے اچانک اپنے پیچھے نمودار ہونے والی گاڑی کی آواز سنی۔ چڑیا گھر کے دروازے کے سامنے دو چار گاڑیاں اس وقت بھی کھڑی تھیں اور کچھ لوگ بیوی بچوں کے ساتھ ٹکٹ لے کر اندر جا رہے تھے۔ مجھے متوجہ کرنے والی انجن کی غیر معمولی آواز تھی کیونکہ مال روڈ کی طرف سے آنے یا جانے والے سڑک کے اس مختصر سے حصے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتے جہاں ہر وقت بچے موجود رہتے ہیں۔

چنانچہ میں نے سر گھما کے دیکھا کہ اتنی تیزی سے گاڑی کر ـــــ کون روانہ ہوا ہے اور بالکل آخری وقت پر مجھے کسی خونخوار جانور کی طرح چند گز کے فاصلے پر نظر آئی۔ اس کے ریڈی ایٹر کے سامنے کی جالی کسی خون آشام درندے کے جبڑوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور بجھی ہوئی ہیڈ لائٹس میں اس کی سفاک آنکھوں کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ میں نے خود بخود ایک زبردست چھلانگ لگائی اور ایک طرف گرا۔ گاڑی تقریباً میرے جسم کو چھوتی ہوئی گزری اور ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میرے کانوں میں شیشے کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ٹکڑے میرے آس پاس بھی گرے۔ میں گرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا بے اختیار میری نظر گاڑی کے اندر گئی۔ گاڑی کے اندر وہی دونوں موجود تھے جو کل میرے ساتھ تھے۔ ڈرائیونگ وہ شخص کر رہا تھا جو میرے تعاقب میں دوڑا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے گاڑی کو پیچھے کر لیا تھا۔ گاڑی درمیان میں سے دب گئی تھی۔ ریڈی ایٹر کے ٹوٹنے سے سارا پانی بہہ گیا تھا۔ دونوں لائٹس کے چکنا چور ہو جانے کے بعد گاڑی کسی زخم خوردہ اندھے حیوان کی طرح لگتی تھی لیکن درخت سے تصادم کے بعد بھی اس کا انجن بند نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا ریڈی ایٹر کے انجن کو ٹھنڈا رکھنے والے پانی کے خرچ ہی گاڑی صرف چند منٹ چل سکے گی۔ پھر اس کا انجن گرم ہو کے جل جائے گا۔ میں بے تحاشا بھاگا لیکن دروازے کے بجائے میں نے اس طرف جانا بہتر سمجھا جہاں آلو چھولے، گپے چاٹ اور آئس کریم بیچنے والے قطار بنائے کھڑے تھے۔ ان سب نے گاڑی کو درخت سے ٹکراتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ حادثہ ہے چنانچہ وہ مدد کے لیے لپکے۔ پھر انہوں نے گاڑی کو میرے پیچھے یوں آتے دیکھا جیسے شکاری کتا کسی خرگوش کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ سب بھی اپنی جان بچا کے بھاگے۔ مجھے یہ علم تھا کہ دونوں شکاری مسلح ہیں۔ کم از کم ایک کے پاس یقیناً ریوالور ہے۔ میں نے چھولے اور دہی بڑے کی دو ریڑھیوں کے درمیان میں سے راستہ بنایا اور گزرتے گزرتے تیسری ریڑھی کو پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے اپنے پیچھے ایک ہنگامہ سنا۔ کار کی ٹکر سے ریڑھیاں الٹ گئی تھیں اور سارا مال سڑک پر یا گاڑی پر گر گیا تھا۔ ریڑھی کے مالک چلا رہے تھے اور ان کی مدد کو لوگ ہر طرف سے جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے صرف پلٹ کر دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی جواب دے چکی

تھی۔ وہ دونوں اب لوگوں کے نرغے میں آچکے تھے مشتعل ہجوم والوں نے ڈرائیور کو باہر گھسیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک ریوالور نکال لیا اور ایک ہوائی فائر کیا۔ لوگ واپس بھاگے۔ چڑیا گھر کے دروازے پر عورتوں اور بچوں نے چیخنا شروع کیا اور اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ریوالور والا میری طرف دوڑا لیکن میں اس وقت تک ایک درخت کے پیچھے پناہ لے چکا تھا۔ دوسری گولی درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی پھر کسی نے پیچھے سے پتھر مارا جو اس کے سر پر لگا اور وہ ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ایک جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے گھٹنے پر پڑی، اور وہ ایک چیخ مار کے نیچے گر گیا۔ اس کے گھٹنے کے اوپر کی نرم ہڈی یقیناً ٹوٹ چکی تھی اور وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھی کو نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ لوگ میری طرف آئے۔ میں نے جوڈو یا کراٹے کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک عام آدمی کی طرح اس شخص کو مکے مار کے زمین پر گرا لیا۔ ذرا سی دیر میں وہ بھی اسیر ہو گیا۔ اسیر کرنے والے وہی تھے جن کا مالی نقصان ہوا تھا۔ گول گپے اور دہی بڑے جو ان کو رات تک فروخت کرنے تھے، ضائع ہو گئے تھے اور ان کی ریڑھیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں اگر ان کو نقصانات کی تلافی کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ مشتعل ہجوم ان دونوں کو مار ڈالتا۔ جس میں متاثر ہونے والے افراد کے علاوہ دیگر ہم پیشہ اور کچھ جوشیلے تماشائی بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک بڈھے نے جو لنگی باندھے ہوئے تھا دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا کہ اب میں نئی ریڑھی کہاں سے لاؤں گا اور کاروبار کیسے شروع کروں گا۔ کسی اور نے تسلی دی کہ۔ بابا! نقصان تو اس کا باپ بھی پورا کرے گا۔

کار کو میرے پیچھے آتے اور مجھے جان بچا کر دوڑتے سب نے ہی دیکھا تھا اب وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا چکر ہے؟ میں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے کار سے کچلنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ میں تو ان کی صورت سے بھی آشنا نہیں ہوں۔"

"کوئی بات تو ضرور ہو گی۔" ایک نوجوان نے کہا جو زمین پر پڑے ہوئے ریوالور کی حفاظت کر رہا تھا اور پولیس کے آنے سے پہلے کسی کو ریوالور اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ قانونی ذہن کا مالک تھا۔

"یہ تو انہی سے تھانے جا کر پوچھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ایک پولیس مین نمودار ہوا جسے غالباً چیئرنگ کراس سے لایا گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی آوازوں میں چلا کے اس سنسنی خیز واقعے پر اظہارِ خیال کیا اور میں سوچتا رہا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں۔ میں اس وقت تھانے جا کر کسی نئی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ ضرور تمہارے کوئی دشمن ہوں گے۔" پولیس مین نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "ایسے ہی راہ چلتے لوگوں پر تو کوئی گاڑی نہیں چڑھاتا۔"

"قسم خدا کی حوالدار صاحب! میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتا۔" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا۔

"تھانے چل کے سب معلوم ہو جائے گا۔" سپاہی نے دھمکی کے انداز میں سر ہلایا۔ "تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

"میں... میرا نام ہے جی...!" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ "منشی قلندر بخش حیران امرتسری۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں اور حیران تخلص کرتا ہوں۔"

کسی کے کچھ اور کہنے سے پہلے مجمع کو چیرتا ہوا ایک معزز شخص آگے آیا۔ "میری گاڑی وہاں سے کس نے ہٹائی ہے؟" وہ رعب دار لہجے میں بولا۔ پھر اس نے حیرت زدہ لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے پیچھے سے گاڑی کا جائزہ لیا۔ "اوہ... مائی گڈنس۔ اس کا تو بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔ کس کی حرکت ہے یہ؟"

صورتِ حال لوگوں پر واضح ہو چکی تھی مگر وہ بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی گاڑی چڑیا گھر کے دروازے پر کھڑی کی تھی اور اپنی فیملی کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ باہر نکلنے پر اسے گاڑی نظر نہ آئی تو پوچھنے پر لوگوں نے مجمع کی طرف اشارہ کیا جو کار کو گھیرے کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فرار ہونے کے لیے اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ گاڑی والا اپنی تباہی کو رو رہا تھا تو ریڑھی والا اپنی بربادی کو اور لوگ میری طرف متوجہ نہیں رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور اس حلقے سے نکل گیا۔ سڑک پر ایک ٹیکسی والا ایسا بھی تھا جو اس سارے تماشے سے بے نیاز اسٹیئرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی اس کا کندھا ہلایا اور کہا۔ "کرشن نگر۔" ڈرائیور نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ایک خود کار عمل کے تحت انجن اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ طویل فاصلے کی سواری مل جانے کے بعد اس کے اعتراض کرنے کا یا قیلولہ جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ مال روڈ والے گیٹ پر پہنچ کے میں نے پیچھے دیکھا۔ مجمع ابھی تک میری عدم

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

موجودگی سے بے خبر تھا۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیکسی کی سیٹ سے پشت لگا کے اپنا سر پیچھے رکھ لیا۔ ٹیکسی مال روڈ پر سے گزر رہی تھی اور ٹیکسی والا پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور اپنے منتشر خیالات کو منظم کیا۔ اس وقت اگر میں نے حاضر دماغی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ دونوں بدمعاش میرا کام تمام کر جاتے۔ جو اب گرفتار ہو چکے تھے۔ اب وہ جانیں اور پولیس جانے سکندر بخت کچھ نہیں جانتا۔ اس نے تو آج باغِ جناح میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان دونوں بدمعاشوں نے بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا تھا اور خاموشی اختیار کر لی تھی۔ تھانے پہنچ کر وہ پولیس کی پناہ میں آ جائیں گے تو پبلک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ شاید وہ سکندر بخت کا نام بھی نہیں لیں گے۔ ان کو اس مشن پر بھیجنے والے معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے۔ گاڑی والے کا نقصان پورا کر دیا جائے گا اور ضروری ہوا تو ریڑھی والوں کا بھی۔ فریقین کو عدالتی چکروں سے بچانے اور رپورٹ لکھے بغیر فیصلہ کرنے کا جو نذرانہ کوتوال صاحب لیں وہ ان کی مرضی اور خوشی کے مطابق ادا ہو جائے گا تو جھگڑا کہاں رہے گا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کرشن نگر کہہ دیا تھا لیکن ٹیکسی کرشن نگر پہنچی تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس وقت سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں نے ٹیکسی سُوری بلڈنگ کے پاس رکوائی۔

انعام کیمسٹ کی دوکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ انعام تقریباً پچاس سال کا مگر صحت مند اور شکل سے چالیس سال کا نظر آنے والا اسمارٹ آدمی تھا۔ اپنا اصل نام بتاتے بتاتے میں ایک اور خیال سے رک گیا۔ فوری طور پر مجھے دوسرا کوئی نام نہ سوجھا۔

"میں منشی قلندر بخش حیرانؔ امرتسری ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کے بھائی غلام علی مرحوم میرے دوست تھے۔"

میرے مضحکہ خیز نام سے جو مسکراہٹ انعام کے چہرہ پر نمودار ہوئی تھی، وہ غلام علی کے ذکر پر کافور ہو گئی۔ "تشریف رکھیے حیرانؔ صاحب۔" اس نے ہاتھ ملا کر مجھے کاؤنٹر کے پیچھے بلا لیا اور خود بھی میرے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"غلام علی اور میں پی ڈبلیو ڈی میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ایک ساتھ، ایک ہی جرم میں نکالے گئے تھے۔ یعنی ایمانداری کے جرم پر۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔"

"بھائی صاحب مرحوم نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ بولا۔

"دراصل ان کو تو ایک فرم میں بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے بہت ٹھوکریں کھائیں۔ کچھ عرصے مشرقی پاکستان میں بھی رہا۔ مجھے کل ہی ان کی وفات کا علم ہوا۔ انہوں نے کئی بار آپ کا ذکر کیا تھا۔ بس اتفاق ہے کہ ملاقات ہوئی بھی ہے تو تعزیت کی خاطر۔"

اتنے مستند حوالوں کے بعد انعام کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اپنے حالات تو مجھے خود غلام علی نے برسوں سے پہلے بتائے تھے۔ انعام نے دو گاہکوں کو نمٹایا اور ایک لڑکے کو چائے وغیرہ لینے بھیجا جو ابھی زیر تربیت سیلزمین تھا۔ میں نے اپنی گفتگو میں میروزیر اینڈ کمپنی کا ذکر بھی کیا اور انعام نے کہا کہ وزیر خان مرحوم تو غلام علی کے لیے آدمی کے روپ میں فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔ اپنی باتوں کے دوران وہ مجھے مسلسل حیرانؔ صاحب کہہ کے مخاطب کرتا رہا اور جتنی باتیں غلام علی نے مجھے اپنے بارے میں بتائی تھیں، ان کے ذکر سے میں نے ثابت کر دیا کہ ہم واقعی ایسے دوست تھے جن سے ایک دوسرے کی زندگی کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے عرضِ مدعا کی۔

"میرے حاضر ہونے کا ایک اور بھی مقصد تھا انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "مشرقی پاکستان سے آنے کے بعد میں مکان کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ کاروبار تو اللہ کے فضل سے اچھا چل رہا ہے۔"

"آپ کا کیا کاروبار ہے؟" انعام نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میں کنٹریکٹر ہوں۔" میں نے کہا۔ "جنرل آرڈر سپلائر۔ سرکاری محکموں کو ہر قسم کے سامان کی فراہمی کے ٹھیکے لیتا رہتا ہوں۔ تاہم ابھی اپنا ذاتی مکان بنوانے کی استطاعت نہیں۔ پہلے ایک مکان کا آدھا حصہ کرائے پر لیا تھا۔ باقی آدھے حصے میں بڑے غلط قسم کے لوگ رہتے تھے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں... بڑے غلط دھندے تھے اُن کے۔ دوسرا مکان لیا ہے تو مالک مکان بڑا خردماغ ملا ہے کہ آزادی سے سانس بھی نہیں لینے دیتا۔ خود نیچے رہتا ہے تو ہم سے توقع رکھتا ہے کہ ہم چلتے وقت بھی فرش پر قدم نہ رکھیں کیونکہ اس سے دھمک پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کی دوسری بیوی کو دردِ سر اور تیسری بیوی کو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ دیوار میں کیل نہیں ٹھوکنے دیتا۔ اب کپڑے ہوا میں معلق کرنا تو میں جادوگر نہ ہوتا۔"

انعام بے ساختہ ہنسا۔ "یہ تو بالکل ساس بہو کا جھگڑا ہے جو ہر جگہ اسی طرح چلتا ہے۔ اب ایک مکان تو ہے" وہ کچھ سوچنے لگا۔ "لیکن ذرا بڑا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا کرایہ شاید میرے کہنے سے سات یا ساڑھے سات ہو جائے۔ آٹھ سو روپے ہے۔ کیونکہ مالک مکان ایک بیوہ عورت ہے۔ عورت کیا میری پھوپھی ہے۔ وہاں آپ کو اس قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا۔"

"مجھے اور کچھ نہیں چاہیے انعام صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس وقت تو میں ہزار دے کر بھی گویا قید خانے میں ہوں۔ یہ بتایئے کہ ایڈوانس کی رقم کتنی ہوگی؟"

"ایڈوانس کیا حیرانؔ صاحب۔" انعام بولا۔ "آپ تو بھائی کے دوست ہیں اور کوئی ہوتا تو میں کرایہ نامہ وغیرہ بھی بھروا تا لیکن یہ بتایئے آپ اکیلے ہیں؟"

"خدا نہ کرے دنیا میں کوئی اکیلا ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک مفلوج خالہ ہیں اور ان کی بیٹی ہے۔ ایک بھتیجی ہیں اور چچازاد بھائی بہن ہیں۔ یہی ہے اپنا کل خاندان۔"

"یعنی آپ کے اپنے والدین اور بھائی بہن یا بیوی بچے نہیں ہیں؟" انعام نے کہا۔

"شادی ابھی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "والدین اللہ کو پیارے ہو گئے، بہن بھائی تھے ہی نہیں۔ ایک بھتیجی اور خالہ بھی بیوہ ہیں چنانچہ ہم سب مل کے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوتے ہیں۔"

انعام نے سیلزمین کو دوکان کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور خود میرے ساتھ چل پڑا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ہم ایک گلی میں مڑ گئے۔ انعام نے مجھے ایک منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود ایک گھر میں گھس گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک چابی تھی۔ ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کیا اور تقریباً اس جگہ جا پہنچے جہاں پہلے دو نمبر بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ وہ مکان گلی کے آخر میں تھا۔ اس کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے جن میں سبزی کی کاشت ہو رہی تھی۔ مکان میری توقع سے زیادہ بڑا نکلا۔ اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے آٹھ سو روپے ماہانہ بہت کم کرایہ تھا لیکن اس کی وجہ شہر سے دوری تھی۔ یہی مکان کسی فیشن ایبل یا بارونق آبادی میں ہوتا تو ڈیڑھ ہزار سے کم کرائے میں نہ ملتا لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے یہ مکان موزوں ترین تھا۔ اس میں ہم سب کے لیے جگہ تھی۔ یہاں ہم گمنام رہ سکتے تھے اور ایک طرف کھلے کھیت جہاں صحت بخش ماحول فراہم کرتے تھے وہاں ہنگامی حالت میں فرار کے راستے بھی مہیا کرتے تھے۔ انعام کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ ایک طرف مکان اس کی بیوہ پھوپھی کا تھا جسے وہ زیادہ سے زیادہ کرائے پر اٹھانے کا آرزومند تھا۔ دوسری طرف اس کے مرحوم بھائی کا دوست تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اتنے کرائے پر میں آبادی سے اتنا دور رہنا پسند نہ کروں لیکن میں نے فوراً اسے ایک ماہ کا کرایہ ایڈوانس ادا کر دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں واپس ہوئے تو مکان کی چابی میری جیب میں تھی اور میں بہت مطمئن تھا کہ ایک بہت بڑا مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا۔

شام چار بجے میں نے کرشن نگر سے رکشا لیا جس نے مجھے پونے پانچ بجے صدر پہنچا دیا۔ رابعہ اور محسن روانگی کے لیے تیار تھے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شہلا اکیلی رہ جانے کے خیال سے کچھ افسردہ تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ صبر اور انتظار کی آزمائش کا زمانہ بہت جلد ختم ہو جائے گا اور یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ ایک دو روز میں ہم سب دوسرے بہت بڑے، کشادہ اور آرام دہ مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کوشش کریں گے کہ گلبرگ کا سامان بھی نکال لائیں اور اسے کوئی مصروفیت بھی فراہم کر دیں۔ رابعہ کی گاڑی پیچھے والی گلی میں کھڑی تھی۔

"تمہاری یہ گاڑی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک تو اس کا رنگ بہت نمایاں ہے پھر اس کا حلیہ۔"

"شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ حلیہ بگاڑنے کا کارنامہ آپ نے ہی سرانجام دیا تھا۔" رابعہ خفگی سے بولی۔ "اب اسے خطرناک کہتے ہو۔"

میں ہنسا۔ "بُرا ماننے کی تو کوئی بات نہیں بی بی! جو خطرناک ہے وہ خطرناک ہے اور جو محض ناک ہے وہ محض ناک ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گاڑی کا رنگ اور حلیہ بدلا جائے یا گاڑی بدلی جائے کیونکہ ہر جگہ یہ گاڑی تمہاری پہچان بن جاتی ہے۔"

"یہ کیا فضول بات پر لڑنا شروع کر دیا ہے اس وقت۔" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتا کہ سارا دن کہاں جھک ماری۔ میں نے تھانے فون کیا تھا تو کسی نے کہا کہ چلے گئے۔"

"تھانے میں چراغ دین سے بڑی دلچسپ ملاقات ہوئی۔" میں نے کہا اور ان کو اوّل تا آخر ہر بات بتا دی۔ وہ دونوں خاصے متفکر اور پریشان نظر آنے لگے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب وہ براہِ راست حملوں پر آ گئے ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ سکندر بخت کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی دی ہوئی مہلت بھی ختم ہو رہی ہے۔"

"ہاں اور انہیں یقین آ چکا ہے کہ میں ان کی شرائط قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔

"پہلی صورت میں تم کہیں بھی محفوظ نہیں ہو سکندر!" رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "تم شہلا کی طرح گھر میں چھپ کے نہیں بیٹھ سکتے اور سڑک پر ایک آدمی کی جان لینا ان جیسے لوگوں کے لیے کیا مشکل ہے!"

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ میرے تحفظ کی ضمانت صرف ایک صورت میں ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یعنی وصیت ناموں کا ایک پورا سلسلہ مرتب کیا جائے اور اس کی اطلاع دشمنوں تک پہنچا دی جائے کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہوا تو محسن میرا وارث ہوگا۔ محسن کے بعد رابعہ... رابعہ کے بعد شہلا... صرف اسی ترکیب سے دشمن پر یہ واضح کیا جا سکتا ہے کہ وزیر خان کا ایک نہیں، ان گنت وارث ہیں اور چوہدری دلاور نے پورے کاروبار پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ ایک سکندر کے نہ ہونے سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلا مقصد کوئی قتل نہیں کرتا اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کی امید نہیں رہے گی تو وہ مجھے راستے سے ہٹانے کا خیال بھی چھوڑ دیں گے۔ انہیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ وہ نئی شرائط پیش کریں گے یا مصالحت کا کوئی اور فارمولا تلاش کریں گے... جان بچانے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میری ضمانت منسوخ ہو جائے اور میں جیل چلا جاؤں۔"

"جو لوگ ہسپتال کے اندر پہنچ سکتے ہیں اور قتل کر سکتے ہیں، وہ جیل میں بھی تمہیں مروا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جیل کے اندر خصوصی انتظامات کیے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس میں رضوی صاحب کے تعلقات کام آ سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں پھانسی پانے والے مجرموں کو رکھا جاتا ہے وہاں کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔"

"یہ کیسی باتیں کرتے ہو تم؟" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ مجھ پر بھی قتل کا الزام ہے اور قاتلوں کی آخری منزل کال کوٹھری ہوتی ہے جو عدم آباد کی سرحد پر واقع ہوتی ہے۔ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

جب میں نے تسلی دینے کے لیے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ وصیت ناموں کا ... ناقابلِ عمل ہے۔ مجھے دو چار دن کی مہلت دو ... صاحب مل کر سب کر لیں گے۔ رجسٹریشن کے بعد ... ناموں کی ایک ایک نقل ان لوگوں کو پہنچا دی ...
نے کہا۔

"اچھا اچھا... میں تمہیں خوف زدہ نہیں ... تھا۔" میں نے رابعہ کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "کال ... تو زندہ لاشیں رہتی ہیں اور ظاہر ہے ایسی ہولناک ... خوشی سے پناہ نہیں لیتا۔ وہ آخری صورت تھی ... پہلے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے محسوس کیا ... الفاظ کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے چنانچہ میں نے ... بدل دیا۔ "یار محسن! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ شہلا سے ... بات معلوم کرنی ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ لہجہ ... ہوتا تھا کہ میں نے اس کا موڈ بھی خراب کر دیا ہے ... نے محض ڈی سلوا کو دھمکی دی تھی اس لیے کہ وہ کچھ ... بعد میں اس کا یہ ڈر بے بنیاد ثابت ہوا۔ اس سے ... وضاحت ممکن نہیں تھی۔

"شہلا سے ایک بات اور پوچھنی تھی۔" میں ...

"اس کا تعلق میرے شک سے ہے۔ ہسپتال میں ... گورکن کو زہر دینے والی تیسری نرس مجھے شہلا کی ...

"اب اس کا کیا ذکر۔" رابعہ نے ... میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ڈی سلوا نے وہ کیس ہی دبا دیا ..."

گاڑی اس عمارت کے سامنے جا رکی جس میں را... آفس تھا۔ دروازے پر پرانا چوکیدار موجود تھا لیکن ... سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجھے ... ایسے نظر آئے جن کی صورت اور نظریں دیکھ کر سمجھا جا... تھا کہ وہ سادہ کپڑوں میں مسلح پولیس کے آدمی ہیں جو ر... صاحب کی ہدایت پر وہاں پوسٹ کیے گئے ہیں۔ ا... وردی والا اے ایس آئی بھی موجود تھا۔ اس نے ہمیں ... کر کہا کہ ہم اپنی شناخت کروائیں لیکن چوکیدار نے ... کی اور اسے بتایا کہ یہی مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں ... دفتر کو کسی نے بم سے اڑانے کی دھمکی دی تھی اور ا... یہ حفاظتی انتظامات کیے گئے ہیں۔ اے ایس آئی نے ... سے ہمارے بارے میں پوچھا اور پھر اپنی خفت مٹانے ... لیے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آس پاس کوئی غلط آدمی ... بھی نہیں سکتا۔" رابعہ نے اس سے کہا کہ ابھی کچھ دیر ...

... نام کے ایک صاحب آئیں گے۔ سیاہ شیروانی، طرے دار سفید پگڑی اور سفید شلوار۔ بھاری بھر کم چہرہ اور بڑی بڑی مونچھوں والے، ان کو اوپر آنے دیا جائے لیکن ان کی تلاشی مزید لی جائے۔ اس طرح کہ ان کو اپنی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

میں نے رابعہ کو آفس میں چھوڑا پھر بنک ڈرافٹ لے کر میں اور محسن اس کوٹھی میں پہنچے جو میں نے گزشتہ روز خسرو جمشید کے ساتھ جا کر دیکھی تھی۔ مجھے اس کی شاندار مرسڈیز دور سے ہی نظر آ گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے گاڑی روک لی تو مجھے وہ شوفر کی جگہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا حلیہ بالکل وہی تھا۔ قریب پہنچ کر میں گاڑی سے اترا اور اس کی طرف بڑھا۔ "السلام علیکم" میں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر کہا۔ "یہ بتلائیے کہ آپ کون ہیں؟ شوفر یا خسرو جمشید صاحب؟"

"وعلیکم السلام۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "رقم لے آئے ہیں آپ؟"

میں چکر میں پڑ گیا لیکن جال فوراً میرے ذہن میں آ گئی۔ "ہاں، مگر تم تو شوفر ہو۔" میں نے رکھائی سے کہا اور یوں دروازے کی طرف بڑھا جیسے مجھے خسرو جمشید کے اندر ملنے کا پورا یقین ہو۔

ابھی میں چند قدم دور ہی گیا تھا کہ وہ ہنسا۔ "برخوردار! ایسی نظر ہوتی تمہاری تو تم دنیا میں کہیں دھوکا نہ کھاتے۔" وہ مونچھوں کو بل دے کر بولا۔

"خسرو صاحب!" میں نے شرمندہ ہو کے اس سے ہاتھ ملایا۔ "میں بنک ڈرافٹ لے آیا ہوں لیکن آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا کیونکہ مکان کی اصل خریدار ایک خاتون ہیں۔ مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ آپ نے ان کا نام تو سنا ہوگا؟"

خسرو جمشید کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "نام کچھ سنا ہوا ضرور لگتا ہے۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ اپنے آفس میں آپ کی منتظر ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک دوست آیا ہے۔ مس رابعہ کے آفس میں کاغذی اور قانونی کارروائی آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔ ادائیگی تو میں اس وقت بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے اسے بنک ڈرافٹ پکڑا دیا۔ جتنی دیر میں اس نے بنک ڈرافٹ کو دیکھا، میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تاکہ رضوی صاحب کے حفاظتی انتظامات دیکھ سکوں لیکن مجھے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ان کے آدمی اگر کہیں تھے تو چھپ کر نگرانی کر رہے تھے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" خسرو جمشید نے بنک ڈرافٹ مجھے واپس کر دیا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں گے یا اپنی گاڑی میں؟"

"آپ کے ساتھ تو آپ کا شوفر بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی ہی گاڑی میں زیادہ محفوظ رہوں گا۔ آپ تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور دشمنی نبھاتے ہیں۔ میرا ابھی تک کوئی دشمن نہیں۔" میں نے بالکل غیر سنجیدگی کے ساتھ مذاق میں یہ بات کی تھی لیکن خسرو جمشید کا ردِعمل بہت عجیب تھا۔ اس کے ماتھے پر ناگواری کے آثار شکن بن کے پھیل گئے تھے۔ یوں جیسے میں نے اس پر طنز کیا ہو۔

"میں اکیلا ہی چلوں گا۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ "آپ آگے چلیں۔"

"اور آپ کا شوفر؟" میں نے گھر کی طرف دیکھا۔ "کیا وہ یہاں اکیلا آپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہے گا؟"

"نہیں۔ جب وہ دیکھے گا کہ میں جا چکا ہوں تو وہ بھی چلا جائے گا۔" خسرو نے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو اندر جا کے اسے مطلع کر دوں؟" میں نے کہا۔ "ایسے بیچارہ کب تک..."

"میں نے کہا نا مسٹر سکندر بخت کہ وہ چلا جائے گا۔" خسرو جمشید نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب آپ چلیے۔"

شک مجھے پہلے بھی تھا، اب یقین آ گیا کہ کوٹھی کے اندر شوفر موجود ہی نہیں۔ باہر سے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آتے تھے اور خسرو جمشید کا اکیلے جانا اس کے سابقہ بیانات کی نفی کرتا تھا کہ زندگی اور موت کے امکانات کو ففٹی ففٹی کرنے کے لیے وہ اپنے ہی جیسے شوفر کو ساتھ رکھتا ہے۔ میں نے اسے بزدلی کا طعنہ نہیں دیا تھا اور یہ چیلنج نہیں دیا تھا کہ ہمت ہے تو اکیلے جا کر دکھاؤ۔ اس کے علاوہ شوفر واقعی موجود ہوتا تو خسرو جمشید اسے بے سبب چھوڑ کے کیوں جاتا۔

میں نے اپنے شبہ کا اظہار محسن پر کیا۔ "یہ شخص جو ہمارے پیچھے آ رہا ہے خسرو جمشید نہیں ہے بلکہ اس کا شوفر ہے۔"

"یہ شک جناب کو کیسے ہوا؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

"شک کے بہت سے اسباب ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہی کہ ہمیشہ اپنے ہمزاد قسم کے شوفر کو ساتھ رکھنے کی احتیاط اگر ضرورت یا عادت ہوتی تو اس وقت وہ اکیلا نکلا نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے شوفر کے اندازِ گفتگو میں اعتماد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ کل میری بات خسرو جمشید سے ہوئی تھی چنانچہ میں یہ فرق محسوس کر سکتا ہوں۔ غالباً یہ بھی مجھے قتل کرنے کی ایک سازش تھی۔ خسرو جمشید کا خیال ہوگا کہ سارے معاملات یہیں طے پا جائیں گے۔ اس نے کہا تھا کہ کاغذی اور قانونی کارروائی بعد میں مکمل ہوتی رہے گی۔ وہ تو مجھے کل بھی قبضہ دینے پر تیار تھا۔ آج اس نے شوفر کو بھیج دیا کہ وہ مجھ سے بنک ڈرافٹ لے لے اور چابی میرے حوالے کر کے لوٹ آئے۔ بنک ڈرافٹ کو کیش کرانا اس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ بعد میں کیا ہوتا؟ یا تو میں اسی وقت چابی لگا کر دروازہ کھولتا اور اندر دیکھتا یا ہم سب ساتھ جاتے بہر صورت یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ چابی لگاتے ہی دھماکا ہوتا اور انجام بخیر۔ شوفر جا کر خسرو جمشید کو بتا دیتا کہ مشن کامیاب رہا۔ ابھی تک کسی نے مجھے خسرو جمشید کے ساتھ نہیں دیکھا اور اس سودے کا کوئی گواہ نہیں جو ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ کون جانے وہ خسرو جمشید تھا یا کوئی اور۔ اور اس کوٹھی کا مالک بھی تھا یا نہیں۔ یہ سب تو ملکیت کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا۔ جائداد کی خرید و فروخت کہیں ایسے ہوتی ہے کہ میں نے نقد رقم ادا کی اور اس نے چابی مجھے دے کر کہا کہ جاؤ میاں آج سے تم مالک اس گھر کے۔ اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک جذباتی وجہ بتائی تھی اور کاغذی قانونی کارروائی کے لیے کہا تھا کہ بعد میں ہوتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کارروائی کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"اگر اس گھر کی چابی واقعی ہلاکت خیز ہے تو کیا یہ بات معلوم نہیں کی جا سکتی؟" محسن نے کہا۔

"رضوی صاحب ان ماہرین کو بھیج سکتے ہیں جو آتش گیر یا دھماکے سے پھٹنے والی چیزوں کو ناکارہ بنا دیں۔" میں نے کہا۔

"ایک اور سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید اس مکان کا مالک نہیں اور اس کی جگہ شوفر صرف چابی دینے آیا تھا تو اب وہ کاغذات پر دستخط کیوں اور کیسے کرے گا؟" محسن نے کہا اور میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ مرسڈیز کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہم اپنی باتوں میں مصروف رہے اور خسرو جمشید کا ڈرائیور موقع پاتے ہی غائب ہو گیا۔ کیونکہ کسی وکیل کے آفس میں جا کر اپنے مالک کی جگہ قانونی دستاویزات پر دستخط کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آئینے میں دیکھا تھا تو وہ گاڑی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔" محسن نے مایوسی سے کہا اور فوکس ویگن کو سڑک کے ایک کنارے پر روک لیا۔ "ہم پانچ ... انتظار کر لیتے ہیں۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے نفی میں ... سب ڈرامہ تھا بلکہ فراڈ تھا۔ خسرو جمشید اور اس کا ڈرائیور، دونوں بوگس تھے اور اب دوبارہ کہیں ... گے۔ ان کا مقصد ہمیں لالچ دے کر موت کے ... جانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اس شوفر نے ... سے پوچھا کہ آپ رقم لے آئے ہیں، پھر اس نے مجھے جانے سے روک دیا۔ اس کو ہدایات تھیں کہ بنک ڈرا... خسرو جمشید کی طرف سے چابی مجھے پیش کرے اور رخصت ... جائے۔ جاتے جاتے کہہ دے کہ خسرو جمشید صاحب کل آپ سے ملیں گے اور یہیں ملنے آئیں گے... لیکن میں نے اسے بتا دیا کہ خریدار میں نہیں ہوں۔ وہ ... بن گیا لیکن بنک ڈرافٹ دیتے ہی میں نے نیا مسئلہ ... کہ سودا طے کرنے کے لیے اور قانونی دستاویزات پر ... کرنے کے لیے اسی وقت ایک وکیل کے آفس میں ... وہ غائب نہ ہوتا تو کیا کرتا؟ اس وقت وہ اپنے آقا ... دے رہا ہوگا کہ مشن کیوں ناکام رہا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آقا فوراً اسکیم پر ..." محسن نے پانچ منٹ بعد ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

مجھے محسن کے خیال سے اختلاف نہیں تھا ... مشکل نظر آتا تھا کہ خسرو جمشید کوئی فوری قدم اٹھا... سے ناکامی کے اسباب کا مداوا ہو سکے۔ میں نے اور محسن نے ... کے آفس کے نیچے اپنی گاڑی روکی تو رات کے آٹھ بجے تھے لیکن خلافِ معمول عمارت کے آس پاس کا وہ علاقہ ہمیشہ اندھیرا نظر آتا تھا، آج روشن تھا۔ گاڑیوں کی قطار ... بعد گھنے سایہ دار درختوں کی قطار تھی اور پھر مال روڈ ... ٹریفک کا رش رہتا تھا اور روشنی کا انتظام بھی ... اچھا تھا لیکن یہ روشنی درختوں کی وجہ سے اس ... نہیں پہنچتی تھی جہاں اس عمارت کے سامنے بھی پتلی سی ... تھی۔ آج اس عمارت کے اوپر دونوں طرف سرچ لائٹ نصب تھیں اور یہ حفاظتی انتظامات کی ایک کڑی ... میں نے اوپر جا کر رابعہ کو اپنی ناکامی کا احوال سنایا اور ... خدشات کا بھی ذکر کیا جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے ... کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا خیال بے بنیاد اور خبطی ہونے کی دلیل ہے۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا ... جب ٹرانسمیٹر پر مجھ سے کہا گیا تھا کہ چابی میری ...

... آزادی حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر میں نے ... میں آسانی سے ... اس چابی سے قفل کھولنے کی کوشش کی ہوتی تو بات میرے ساتھ وہیں پر ختم ہو جاتی اور یہ دوسری چابی پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ایک چابی باہر آنے کے لیے تھی تو دوسری ... کے لیے لیکن دونوں دروازے عدم کی دنیا میں ... تھے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس بار بھی وہ اپنے عزائم میں ناکام رہے۔" رابعہ نے بنک ڈرافٹ کو اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا۔ "لعنت بھیجو اس مکان پر۔"

"لیکن یہ دیکھنا تو چاہیے کہ آخر اس کوٹھی کا مالک ... ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید اس سے خسرو جمشید بن کر آنے ... کا کچھ پتہ چل سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ کیا وہ بھی کوئی ... شکاری ہے؟"

"کوٹھی کس کی ہے یہ تو کل ہی معلوم ہوگا۔" محسن بولا۔ "لیکن سکندر کے اندیشوں کی تصدیق اسی وقت کی جا سکتی ہے۔ رضوی صاحب نے کہا تھا کہ وہ اپنے آدمی وہاں ___ حفاظت کے لیے پوسٹ کر دیں گے۔ وہ لوگ دروازے کے بجائے کسی کھڑکی یا روشن دان سے اندر چلے جائیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ سامنے والے واحد مقفل دروازے کے پیچھے ... تباہ کاری کا انتظام ہے یا نہیں۔ باقی دروازے اور کھڑکیاں ... اندر سے چٹخنی لگا کے بند کیے گئے ہوں گے۔ وہ بم وغیرہ کو غیر مؤثر بنا دیں گے۔"

"میں انکل سے بات کرتی ہوں۔" رابعہ نے رضوی صاحب کے گھر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے باہر اس کے معاون وکیل کے کیبن میں جا کر دوسرے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دونوں کا ایک ہی نمبر تھا چنانچہ میں رابعہ کی اور رضوی صاحب کی گفتگو سن سکتا تھا۔

"رابعہ؟ کیا بات ہے؟ کہاں سے بات کر رہی ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"اپنے آفس سے انکل۔" رابعہ نے خوش دلی سے کہا۔ "اس مکان کی بات کرنی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ دونوں بدمعاش کہاں ہیں؟" رضوی صاحب نے کہا۔ وہ خاصے پریشان لگتے تھے۔

"آپ کا مطلب ہے محسن اور سکندر؟ وہ دونوں اس وقت بھی میرے ساتھ آفس میں موجود ہیں۔" رابعہ ہنسی۔

"اچھا... لیکن سارا دن وہ کہاں تھے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"دس گیارہ بجے تک ہم گھر پر ہی تھے۔" رابعہ نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "محسن گھر سے نکلنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہا۔ سکندر نے کہا تھا کہ اس کو پولیس اسٹیشن جانا ہے۔ چراغ دین نام کا کوئی شخص منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا..."

"کوئی شخص؟" رضوی صاحب نے رابعہ کی بات کاٹ دی۔ "ارے بھئی اس شخص کی شادی پہلے محسن کی بڑی بہن مریم سے ہوئی تھی اور اب اس کی چھوٹی بہن فوزیہ سے طے پائی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

"مریم کے بارے میں تو معلوم تھا۔" رابعہ نے معصومیت سے کہا۔ "فوزیہ کی نسبت کب طے ہوئی؟"

"نسبت طے نہیں ہوئی تھی، بس شادی ہونے والی تھی۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "خدا نے بچا لیا۔ وہ تو منشیات کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اس کے گھر سے لاکھوں کا مال برآمد ہوا ہے۔ میں ابھی شیروانی صاحب سے بات کرتا ہوں لیکن اس بدمعاش نے سکندر کا نام کیوں لیا؟"

"میں تو خود حیران تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "کچھ ذاتی دشمنی یا رقابت کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ سکندر آج صبح تو گھر سے نکلا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے جگایا تھا تو وہ سوتے سوتے ہاتھ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے آ گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ایسی باتوں سے سکندر کو کیا نقصان ہو سکتا ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ یہ وہی رقابت اور رنجش کا چکر ہے لیکن اس کے باوجود عجیب چکر ہے۔ یہ بدمعاش چراغ دین اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر پہلے ہی انکار کر چکا ہے..."

"لیکن انکل!" رابعہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "فوزیہ نے ابھی خودکشی کی جو کوشش کی تھی، اس کا سبب غالباً یہی انکار تھا۔ اس سے چراغ دین نے تذلیل محسوس کی ہوگی اور اس کے دل میں سکندر کے خلاف..."

"ہاں۔ چھوڑو اس قصے کو۔" رضوی صاحب نے عمداً اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ "کیا تم نے اس مکان کے سلسلے میں فون کیا تھا؟ کیا سودا ہو گیا؟"

"نہیں انکل!" رابعہ نے کہا۔ "سکندر اور محسن بنک ڈرافٹ لے کر گئے تھے لیکن پارٹی نہیں آئی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ دھوکے باز تھے۔ اس کے علاوہ ابھی کسی نامعلوم شخص کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک دروازہ مقفل ہے۔ اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے پیچھے ایک بم رکھا ہے جو تالے میں چابی گھماتے ہی پھٹ جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ کیا آپ چیک کرا سکتے ہیں؟"

"لاحول ولاقوۃ ۔ بھئی شہر میں مکانوں کی کمی ہے کیا؟" رضوی صاحب ناراض ہو کے بولے "اور جہاں میں رہتا ہوں وہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟ کیا ضرورت ہے خطرہ مول لینے کی؟"

"انکل! وہ مکان آدھی قیمت پر مل رہا ہے" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا "اور میرا ارادہ وہاں رہنے کا نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟ پیسہ برباد کرنے کا؟"

"میں اسے ایک ہفتے کے اندر اندر فروخت کر دوں گی" رابعہ نے کہا "اور خود سامنے آ کر سودا نہیں کروں گی، اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ آپ کو میرے فائدے کی خاطر بس ایک ہفتہ تک ہی حفاظت کرنی ہے۔"

"اچھا بھئی ۔ میں بھیجتا ہوں کسی کو مگر تم اب گھر آجاؤ اور ان دونوں کے ساتھ۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ خراب ہے لیکن وہ رابعہ کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں۔ اس گفتگو میں جو میں نے چوری چھپے سنی، میرے لیے خوشی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ چراغ دین پیشیات کا اسمگلر ثابت ہو گیا اور دوسرا یہ کہ ابھی تک کسی کو اس معاملے میں میرے ملوث ہونے کا بالکل یقین نہیں۔ لاکھوں کے مال کا حوالہ دے کر رضوی صاحب نے کچھ مبالغے سے کام لیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ابھی تک جو اطلاعات ان کو ملی تھیں وہ سنی سنائی تھیں اور سنانے والوں نے زیب داستان کے لیے ہزاروں کی رقم کو بڑھا کے لاکھوں تک پہنچا دیا تھا۔ میں رابعہ کے آفس کی طرف جا رہا تھا کہ ویٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور خسرو جمشید اندر آ گیا۔

"بھئی معاف کرنا ۔ میاں سکندر بخت!" وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا "میری گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا لیکن تم نے تو مڑ کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"پھر آپ یہاں کیسے آ پہنچے؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ وہ چالیس منٹ بعد آیا تھا۔ ٹائر بدلنے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر تو ممکن تھی مگر چالیس منٹ میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شوفر نے آقا کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا ہو اور آقا خود گاڑی لے کر چل پڑا ہو۔ ٹائر کے فلیٹ ہونے کی کہانی صرف درمیانی وقفے کو پورا کرنے کے لیے گھڑی گئی ہو۔

"ایک ٹیلیفون ڈائرکٹری میں نام اور پتہ ... پڑا" خسرو جمشید نے کہا۔ میں نے اس دلیل کو ... خسرو جمشید کو اپنے ساتھ لے گیا۔ محسن نے یقیناً ... سن لی تھی اور رابعہ کو ہوشیار کر دیا تھا۔ چنانچہ ... نے حیران ہوتے بغیر بڑے تپاک سے خسرو ... کیا "کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ہم تو سمجھے گر ..." نے کہا۔

"بھئی ان کا ... میرا مطلب ہے ان کی ... ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔" میں نے محسن کو مطلع کیا ... تعارف کے بعد مکان کی خرید و فروخت پر ... بات شروع ہوئی "خریدار یہ ہیں ۔ مس راب... ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔"

"آپ کا مکان سکندر بخت صاحب د... رابعہ نے کہا۔ "اور کاروباری جھوٹ بولنے کی ... ہے۔ سچ یہ ہے کہ آپ کا مکان انہیں بہت ... آیا ہے۔"

"لیکن خریدار آپ ہیں" جمشید نے کہا "آپ ... تو پسند آنا چاہیے۔"

"مجھے ان کی پسند پر اعتماد ہے" رابعہ نے کہا ... مختلف نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا اچھا" جمشید نے معنی خیز طریقے پر مسکر... ہلا کے کہا "میں سمجھ گیا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے سرخ پڑ گیا ... جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا اور بینک ڈرافٹ نکالا ... "یہ ڈیڑھ لاکھ تو نقد حاضر ہیں" رابعہ نے کہا "باقی رقم ... میں سکندر صاحب آپ کو بتا چکے ہیں کہ جیسے ہی میرا ... فروخت ہوا۔ آپ کو ادا کر دی جائے گی ۔۔۔۔ لیکن ... خیال آیا کہ ایک متبادل صورت بھی ہے۔ جو ممکن ہے ... کے لیے قابلِ قبول ہو۔ فرض کیجیے میں وہ پلاٹ ... نام کر دوں، آپ فروخت کریں گے تو نقصان میں ... رہیں گے اور نہ آپ کو زیادہ انتظار کرنا پڑے گا ... جلدی نہیں تو پچاس ہزار زیادہ بھی مل سکتے ہیں لیکن ... فروخت نہ کرنا چاہیں تو وہاں رہائشی یا کاروباری ... ہو سکتی ہے کیونکہ وہ جگہ ہر اعتبار سے بہت اچھی ..."

"آپ کی تجویز بے حد معقول ہے" جمشید نے ... "یہ پلاٹ کس جگہ ہے اور کتنا بڑا ہے؟"

اس کا رقبہ دس مرلے ہے" رابعہ نے کہا "اور اگر آپ کراؤن سینما سے تھوڑا سا آگے جائیں تو سیدھے ہاتھ پر سڑک کے کنارے ہی واقع ہے۔"

ان کی گفتگو کے درمیان میں بڑے غور سے خسرو جمشید کا جائزہ لے رہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میں نے جو مفروضہ قائم کیا تھا، وہ سو فیصد حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ پہلے مجھے واقعی شوفر ملا تھا لیکن اب اصل خسرو جمشید میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ شوفر نے غائب ہو کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا اور مالک فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ درمیانی وقفے کو ٹائر فلیٹ ہو جانے کی کہانی سے بڑی ذہانت کے ساتھ پُر کیا گیا تھا مگر اصل اور نقل کا فرق مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش رائیگاں گئی تھی۔ ظاہری حلیے سے دشمنوں کی نظر دھوکا کھا سکتی تھی سامنے بیٹھ کر بات کرنے والا اس فریب کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ حاکم اور محکوم کے انداز و اطوار کا فرق خود چغلی کھاتا تھا کہ خسرو جمشید کون ہے اور اس کا شوفر کون ہے؟

خسرو جمشید نے کسی تذبذب کے بغیر رابعہ کی تجویز سے اتفاق کیا۔ رابعہ نے کہا کہ اسے یہی امید تھی۔ چنانچہ اس نے جو دستاویزات تیار کی ہیں، وہ اسی تجویز کے مطابق ہیں۔ جمشید نے اعتماد کے اس مظاہرے پر رابعہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد اپنے بریف کیس میں سے مکان کی ملکیت کے کاغذات نکالے، رابعہ نے اور اس کے ماتحت وکیلوں نے ان کا بغور معائنہ کیا اور انہیں ہر لحاظ سے تسلی بخش پایا۔ میں اور محسن خاموش تماشائی بنے سیل ڈیڈ اور سیل ایگریمنٹ پر دستخطوں کی کارروائی کو دیکھتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے یہ کارروائی پوری ہو گئی تو خسرو جمشید نے مکان کی چابیاں ہمارے حوالے کیں۔ ہمیں مبارک باد دی اور ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ عدالتی کارروائی کے لیے اس نے صبح گیارہ بجے ڈسٹرکٹ کورٹ میں ملنے کا وعدہ کیا اور جاتے جاتے ہمیں مدعو بھی کر گیا۔

ہم کچھ دیر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خسرو جمشید نہ فراڈ تھا اور نہ یہ نام بوگس تھا۔ تمام دستاویزات کی رو سے خسرو جمشید بلا شرکتِ غیرے اس مکان کا مالک تھا۔ جو اس نے آدھی قیمت پر ہمیں بیچ دیا تھا۔ اس کا رہائشی پتہ ماڈل ٹاؤن کا تھا اور اس کے کارڈ پر دو ٹیلی فون نمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔

"ہمارے تو سب اندازے غلط ہو گئے" محسن نے بالآخر پہلی بات کہی۔

"غلط ہوئے نہیں ۔۔۔ کر دیے گئے" میں نے کہا "اور یہ کوئی نظر ثانی کیا ہوا منصوبہ ہے۔ جال اپنی جگہ موجود ہے اور شکاری بھی نہ مایوس ہیں اور نہ غافل۔ انہوں نے کچھ انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"مجھے اب بھی دال میں کالا ہی کالا نظر آ رہا ہے" محسن بولا۔ "اگر رات زیادہ نہ گزری ہوتی تو میں اسی وقت ماڈل ٹاؤن جا کے دیکھتا کہ یہ پتہ صحیح ہے یا غلط۔"

"پتہ تو ٹھیک ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ قصرِ جمشید بہت عالی شان کوٹھی ہے۔ خصوصاً اس کا باغ سب کو متوجہ کرتا تھا جس میں ہر موسم میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو رابعہ نے ریسیور اٹھا لیا "جی، جی ہم آ رہے ہیں ۔ بس ابھی چند منٹ میں اٹھنے ہی والے تھے۔ دراصل وہ پارٹی یہاں پہنچ گئی اور سودا بھی ہو گیا ۔۔۔۔۔ جی ۔۔۔؟" اس کی صورت پر حیرانی پھیل گئی۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک منٹ تک صرف سنتی رہی۔ آخر میں اس نے پھر کہا "ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"بڑی دلچسپ خبر ہے حضرات!" رابعہ نے مسکرا کر کہا "رضوی صاحب نے بم ڈسپوزل والوں کو بھیجا تھا۔ وہاں ان کو پولیس نے روکا جو سادہ کپڑوں میں متعین تھے۔ جب انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو پولیس والے حیران اور پریشان رہ گئے کہ اگر آپ بم ڈسپوزل والے ہیں تو وہ کون تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے آئے تھے۔ انہیں تو اندر کچھ بھی نہیں ملا تھا۔"

"اور ظاہر ہے جب اصل لوگ گئے ہوں گے تو انہیں بھی کچھ نہیں ملا ہو گا" میں نے کہا "اگر پولیس والے شناختی کارڈ دیکھنے پر اصرار کرتے تو پہلے پہنچنے والے پکڑے جاتے لیکن یہاں مجرموں کو پورا اعتماد ہے کہ پولیس والے ذہانت میں ان کے بالکل برابر نہیں ہیں۔"

"یہ خوب لطیفہ ہے کہ مجرم تو غیر ملکی فلموں سے اور کہانیوں سے پورا استفادہ کرتے ہیں" محسن نے کہا "لیکن وہی فلمیں دیکھ کر پولیس کی کارکردگی کا معیار بہتر نہیں ہوتا۔ جرائم میں جدید ترین وسائل برتے کار لائے جا رہے ہیں لیکن سراغ رسانی کے لیے نہیں۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وہ لوگ پہلے کیسے پہنچ گئے؟" رابعہ نے کہا "کس کا ٹیلی فون ٹیپ ہو رہا ہے؟ میرا یا انکل کا؟"

"رضوی صاحب کا ٹیلی فون ٹیپ ہونے کا پتہ ہم ایک بار لگا چکے ہیں" محسن نے کہا "ہو سکتا ہے اسی طرح تمہارا ٹیلی فون بھی ٹیپ ہو رہا ہو۔"

"تو نے اچھا یاد دلایا محسن!" میں نے کہا "میں تو اس چیز کو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بالکل بھول ہی گیا تھا۔ خیر اَب گھر چل کے بات کریں گے۔ زیادہ دیر ہوئی تو رضوی صاحب کی جھاڑ پڑے گی۔" مجھے ایک نیا خیال آیا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اور محسن سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بات رابعہ کے سامنے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رابعہ اپنے خیالات میں مگن تھی۔ ورنہ وہ ضرور پوچھتی کہ میں کس چیز کا ذکر کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کا موڈ اچھا نہیں تھا اور اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ ایک معاملہ چراغ دین کا تھا۔ جس کی شادی فوزیہ سے ہونے والی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ فوزیہ کی وجہ سے میں اور محسن اس شادی کے خلاف ہیں۔ خصوصاً میری مخالفت ناقابلِ فہم تھی کیونکہ میں فوزیہ سے شادی کرنے سے بھی انکار کر چکا تھا۔ دوسرا مسئلہ رابعہ کا تھا۔ رابعہ ان کو دلی ہمدردی تھی اور وہ رابعہ کو پسند بھی کرتے تھے لیکن ان کو رابعہ کا میرے ساتھ ہر وقت کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ وہ میرا ساتھ دینے کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکی تھی۔ مزید یہ کہ وہ ان کے گھر کو چھوڑ کے ہم سب کے ساتھ رہائش اختیار کرنے پر آمادہ تھی۔ جس کا مطلب تھا مزید مصیبت۔ اس کی حیثیت گھر کے ایک معزز فرد سے کم نہیں تھی اور رضوی صاحب کے ساتھ رہ کر وہ زیادہ محفوظ بھی تھی۔ خواہ اندیشہ دشمنوں کا ہو یا رسوائی کا۔ نئے مکان میں منتقل ہونے سے پہلے ہی خطرات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور تازہ ترین واقعہ جس پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار تھے ان کی نگراں فورس کی نااہلی تھی جس کے سبب پولیس کے بمب ڈسپوزل والوں سے پہلے نامعلوم افراد اپنا کام کر گئے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ معاملات دن بدن الجھتے جا رہے ہیں۔ اس کے ذمہ دار بھی ہم تھے لیکن رضوی صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ گھر سے باہر ہماری مصروفیات کیا ہیں اور ہم کیا چکّر چلاتے رہتے ہیں۔

ان حالات سے وہ کب تک چشم پوشی کرتے اور برداشت سے کام لیتے۔ ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ کیا ہم لوگ کھانا کھا کے آئے ہیں؟ اور رابعہ نے کہا کہ انکل ہم تو دفتر میں خسرو جمشید کے ساتھ سر کھپا رہے تھے۔ کھانا کہاں سے کھاتے۔ وہ خاموش ہو گئے اور کھانے کی میز پہ ہمارے ساتھ بیٹھے اپنا پائپ پیتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن ان کے ماتھے کی شکنوں کو اور پریشان چہرے کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے اور غصّہ پہ قابو پانے کی کوشش میں مصروف ہیں تاکہ ہم سے پُرسکون رہ کر بات کر سکیں۔ یہ اندازہ ہم سب کو ہو گیا تھا کہ وہ بعد میں کوئی بات ضرور کریں گے اور بات کا تعلق انہی مسائل سے ہو گا جو اُن کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسلام آباد فون کیا تھا۔" انہوں نے کھانے کے بعد کہا۔ اس وقت رابعہ برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی طرف جا چکی تھی۔ "شیروانی صاحب کو چراغ دین کے بارے میں بتانا تھا۔"

"چراغ دین کے بارے میں آپ کی اطلاع ان کے لیے یقیناً ایٹم بم کا دھما کا ثابت ہوئی ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں ـــ شیروانی صاحب نے تو حد کر دی کہ میری آواز تک پہچاننے سے انکار کر دیا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور معلوم ہے انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم آواز بدل کر بول رہے ہو۔ تم اگر محسن نہیں ہو تو سکندر ہو اور تمہارا مقصد مجھے چراغ دین سے بدظن کرنا ہے۔ خیر! میں نے انھیں سمجھایا کہ بھائی عقل سے کام لو۔ میں اپنے گھر سے بات کر رہا ہوں اور وہ نہ جانے کہاں ہیں، تمہیں یقین نہیں آتا تو میں فون بند کر دیتا ہوں۔ تم میرے گھر کا نمبر ڈائل کر لو۔ پانچ منٹ بعد شیروانی کا فون آیا تو میں نے اسے بتایا کہ چراغ دین واقعی منشیات کا اسمگلر تھا۔ وہ منشیات کا ایک پیکٹ دے کر پانچ سو روپے لے چکا تھا کہ پولیس نے اسے دھر لیا اور اس کی جیب میں سے وہ رقم بھی برآمد کر لی جس پر ایک پولیس افسر نے دستخط کیے تھے۔ بعد میں خانہ تلاشی کے وقت مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کے گھر میں سے لاکھوں روپے کی ہیروئن اور چرس نکلی۔"

"لاکھوں روپے کی بات آپ نے کیسے کہہ دی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟"

"یہ کیسا احمقانہ سوال ہے؟" رضوی صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "ارے بھئی! میں ایس ایس پی ہوں۔ مجھے رپورٹ مل جاتی ہے۔ یہ تو معاملہ ہی ایسا تھا کہ میرے پاس محکمہ انسدادِ منشیات کے ایک افسر کا فون آیا۔ اس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں پوچھا کہ سکندر نام کا کوئی شخص آپ کے ساتھ رہتا ہے؟ میں نے کہا کہ رہتا ہے۔ وہ بولا کہ آپ کو کچھ معلوم ہے کل رات سے آج صبح سات بجے تک وہ کہاں تھا۔ میں نے کہا۔ گھر پہ تھا اور کہاں تھا۔ کیونکہ سو کے اٹھا تو اس نے میرے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ نو بجے میں آفس کے لیے روانہ ہوا تو تب بھی وہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن یہ کیا چکّر ہے ـــ اور تم سکندر کے بارے میں یہ تصدیق کس لیے کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ ابھی صرف تصدیق کرنی تھی۔ اس لیے آپ کو زحمت دی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ معاملہ ایسا ہے کہ ہم فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کے باوجود میں پریشان رہا۔ گھر پہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم جا چکے ہو۔ دوپہر کے بعد مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ چراغ دین نام کے ایک شخص کو پولیس نے منشیات فروخت کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے متعلقہ تھانے میں فون کیا۔ چھاپہ مارنے والا ایک نوجوان افسر ہے، ایس آئی شیخ۔ ایس آئی اس کے نام کا حصّہ ہے اور میں نے سنا تھا کہ وہ بہت جوشیلا، ایماندار اور فرض شناش افسر ہے۔ چنانچہ اس کی دوسروں سے نہیں بنتی۔ اس نے مجھے تفصیلات فراہم کیں کہ چراغ دین کے گھر میں سے تقریباً بیس لاکھ روپے کی ہیروئن برآمد ہوئی ہے اور اس سے آدھی مالیت کی چرس۔"

رابعہ بھی واپس آ چکی تھی اور ہم سب احمقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے۔ "آپ کا مطلب ہے تیس لاکھ کی منشیات اس نے اپنے گھر میں چھپا رکھی تھیں؟" میں نے تھوک نگل کر کہا۔ میرا یہ سوال محسن کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتا تھا کہ ہم نے تو بیس ہزار داؤ پہ لگائے تھے۔ پولیس نے تیس لاکھ کا مال کیسے برآمد کر لیا؟

"لیکن...... لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ سب اس لڑکے شیخ کا کمال ہے۔" رضوی صاحب نے پائپ کو چوتھی بار سلگایا۔ "چراغ دین نے اس کو ایک لاکھ روپے کی رشوت دے کر بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے وہ اور پھنس گیا۔ اینٹی کرپشن والوں نے شیخ کی رپورٹ پہ ایک مقدمہ الگ قائم کر دیا ہے۔"

"اتنا مال اس نے گھر میں کہاں چھپا رکھا تھا؟" میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا کے کہا۔

"شیخ نے بتایا ہے کہ کچھ مال تو دیواروں میں سے نکلا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کپڑوں کی ایک الماری کے پیچھے خفیہ خانہ تھا جس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو گیا۔ دو کمروں کی درمیانی دیوار کی موٹائی کا ایسے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب یہ دیوار ہے......" انہوں نے پائپ سے اشارہ کیا۔ "اس میں تمہیں ایک الماری نظر آ رہی ہے اور باقی دیوار صاف ہے۔ اِدھر سے دوسرے کمرے میں جاؤ گے تو یہی نقشہ ملے گا۔ تم غور نہیں کرو گے کہ دیوار کی موٹائی اتنی ہی ہے، جتنی عام طور پر رکھی جاتی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ چراغ دین نے درمیانی دیوار تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی رکھی تھی جو بالکل اسی طرح نظر آ رہی تھی مگر وارڈ روب کے ساتھ دیوار کا خالی حصّہ محض ایک پردہ تھا۔ یوں سمجھو کہ دونوں طرف سیمنٹ کی دو انچ موٹی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جو رنگ ہونے کے بعد کمرے کی باقی دیواروں جیسی نظر آتی تھی لیکن بیچ میں تقریباً سوا فٹ کا خلا رہ گیا تھا۔ وہ خانہ کپڑوں کے پیچھے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دیوار کے خلا میں زیادہ تر مال بھرا ہوا تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ تھوڑا سا مال جو مشکل سے پچیس ہزار کا ہو گا۔ چراغ دین کی پہلی بیوی کے بیڈروم میں سے بھی نکلا۔"

"مریم باجی کے بیڈروم میں سے ـــ؟" محسن نے چونک کر کہا۔

"ہاں ـــ چراغ دین نے اس کے ذاتی استعمال کا سب سامان مقفل کر دیا تھا اور وہ کمرہ بھی ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ظاہر ہے یہ بھی دھوکا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہاں بھی وہ لاکھوں کا مال رکھتا ہو گا مگر اس وقت صرف یہی بیس پچیس ہزار کا رہ گیا تھا۔"

"یقین نہیں آتا انکل! کہ چراغ دین اتنا بڑا مجرم تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا۔" محسن دیوار پہ نظر جما کے بولا۔

"تمہاری طرح تمہارے والدین کو بھی بڑی مشکل سے یقین آیا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اطلاع دینے والا میں تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "ان کی بیگم نے تو رونا دھونا اور دشمنوں کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ جنہوں نے جھوٹا الزام لگا کے چراغ دین کو پھنسا دیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ تفتیش کے بعد جھوٹ سچ سامنے آ جائے گا لیکن مجھے یہ کسی کی سازش نہیں لگتی۔ اس پہ انہوں نے ایک عجیب بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ خدا غارت کرے سکندر کو اس نے فوزیہ کو کہیں کا نہ رکھا۔ شیروانی صاحب نے ان کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنے دیا اور فون بند کر دیا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نظر چرانے کی اور اپنے پریشان کن خیالات سے بچنے کی بے سود کوشش کرتے رہے۔ میری اور محسن کی سوچ ایک ہی تھی۔ ہم اس غیر متوقع کامیابی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے، بے شک ہم نے چراغ دین کو سزا دلوانے کے لیے سازش کی تھی مگر ہم سے پہلے قدرت اس کو سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے نامۂ اعمال میں وہ سب جرائم بھی شامل تھے جو اس نے تدبیر پر تکیہ کرتے ہوئے کیے اور تقدیر کو نظر انداز کیا۔ یہ بھول گیا کہ ہر شخص کے لیے زندگی میں خوش بختی کا، خوشیوں اور کامیابیوں کا ایک کوٹہ ہے۔ جو اعمال کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے تو کہیں کم۔ اور زیادہ خرچ کرنے سے یہ کوٹہ ختم ہو جاتا ہے تو مقدر میں صرف دُکھ، محرومی اور ناکامی رہ جاتی ہے۔ اس نے میرے والد کی دولت میں سے غبن کیا تھا اور سزا نہ پا کے یہ سمجھا تھا کہ خوش قسمتی اس کے ساتھ ہے اس کے بعد بھی وہ اسی خوش قسمتی پہ بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا، ترقی کرتا رہا اور دولت مند بن گیا۔ یہاں تک

www.pakistanipoint.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ وہ دن طلوع ہوا جب اس کے پاس خوش قسمتی کے خزانے میں ایک تنکا بھی نہ رہا جو اسے ڈوبتے وقت سہارا دے سکتا اور یک لخت وہ بدبختی کے دشمن اندھیرے میں تنہا محصور ہو گیا۔ وقت کی بساط پر دستِ قدرت نے ہمیں صرف ایک پیادے کی طرح آگے بڑھایا تھا اور شاطر چراغ دین کو مات ہو گئی۔ جو کچھ ہم نے کیا وہ بہانہ بن گیا ورنہ چراغ دین کے انجام کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ ہماری جگہ کوئی اور بھی ایک چنگاری پھینک کر چراغ دین کی دنیا کو نیست و نابود کر سکتا تھا لیکن قدرت نے یہ موقع مجھے اور محسن کو اس لیے فراہم کیا کہ ہم ہی مردم گزیدہ تھے اور چراغ دین کے معاملے میں انصاف کے طالب تھے ——

رابعہ شاید فوزیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی اور خود بھی احساسِ جرم و پشیمانی کا شکار تھی۔ فوزیہ کی ماں نے جذباتی بحران کی کیفیت میں کہہ دیا تھا کہ میں نے فوزیہ کو کہیں کا نہیں رکھا۔ رابعہ کو یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ اس جرم میں وہ بھی برابر کی شریک ہے اگر اس نے مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار نہ کیا ہوتا اور مجھ سے تعلقات کو کاروباری معاملات تک محدود رکھا ہوتا تو میرے اور فوزیہ کے درمیان فاصلے کی کوئی خلیج نہ ہوتی۔

"چراغ دین کی گرفتاری پر مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔" رضوی صاحب نے بالآخر سکوت توڑا۔ "مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا —— لیکن جس بات نے مجھے حیران کیا، اسے اتفاق پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو خود چراغ دین نے سکندر کا نام لیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری معلومات کی حد تک اس نے جھوٹ بولا۔ پھر یہی بات مسز شیروانی نے کہی —— اور چند منٹ پہلے شیروانی صاحب نے بھی اتنا ضرور کہا تھا کہ تم انھیں چراغ دین سے بدظن کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس کی وجہ بالکل صاف ظاہر ہے۔" میں نے ہمت سے کام لے کر ہر شخص کے سامنے سچ کے زہر کا پیالا رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ "میری منگنی بچپن ہی سے طے کر دی گئی تھی۔ اس کا احساس ہمیں نہ دلایا جاتا تو اچھا تھا لیکن ہمارے بزرگ مطمئن تھے کہ انھوں نے غلط فیصلہ نہیں کیا۔ انہیں ہم سے نافرمانی کی امید بھی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے اس فیصلے کو پوشیدہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کا نتیجہ ایک جذباتی تعلق کی صورت میں نکلا جو میرے اور فوزیہ کے درمیان شروع سے رہا۔ میں اس کو محبت نہیں کہوں گا، اُنس کہوں گا۔ حد سے زیادہ اُنس۔ اتنا ہی جتنا مجھے اب محسن سے ہے یا اپنے والد سے تھا۔ اس وقت تک مجھے محبت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میرے جذبات نے اُنس کو محبت سمجھ لیا تو اس میں کچھ قصور کم عمری کے خیالات کا تو کچھ حالات کا بھی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ فوزیہ مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے بہت اچھی لڑکی ہے اور محبت کرنے کے قابل لیکن اس شخص کے لیے جسے فوزیہ سے محبت ہو جائے۔ یہ دقیانوسی فلسفہ آج بھی غلط نہیں ہے کہ محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جا سکتی۔ وہ شخص بہت خوش قسمت ہوگا جسے فوزیہ جیسی بیوی ملے گی لیکن میں خود کو دلائل سے قائل نہیں کر سکتا کہ میں کسی اور کو کیوں چاہتا ہوں اور میں فوزیہ کو تمام عمر محبت کے فریب میں خوش رکھنے کی قسم بھی نہیں کھا سکتا۔ اس لیے میں نے سب کو سچ بول کے ناراض کر لیا ہے۔ حالانکہ میں نے صرف فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کیا ہے۔ میں اس کی خوشیوں کا دشمن نہیں ہو گیا ہوں۔ آج بھی اگر کوئی اسے زندگی کی کسی خوشی سے محروم کرنے کی کوشش کرے تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"فوزیہ نے چراغ دین کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔" رضوی صاحب نے پائپ کو خالی کر کے کہا۔ "آخر کیوں؟ اسے یہ ڈر کیوں تھا کہ چراغ دین کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکے گی؟ خوف کا یہ احساس اس کے دل میں کس نے پیدا کیا؟ تم اور محسن اس معاملے میں چراغ دین کے دشمن تھے لیکن....!" انھوں نے پائپ کی ڈنڈی کو میری طرف انگلی کی طرح اٹھا کے کہا۔ "تمہاری دشمنی کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ اس دشمنی کا فوزیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"کیا آپ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ واقعی میں نے چراغ دین کے خلاف سازش کی ہے؟" میں نے کہا۔

"ارے.... اگر تیس لاکھ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ تم نے انتقامی کارروائی کی ہے۔" رضوی صاحب نے دوبارہ پائپ میں تمباکو بھرنا شروع کیا۔ "کیس صرف مریم کے کمرے سے بیس پچیس ہزار کی چرس برآمد ہونے کا ہوتا تو شاید میں بھی سمجھتا کہ تم نے سازش کی ہے۔ تمہارا ذہن سازشی ہے —— یہ میں بُرے معنی میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہاری منفی ذہانت —— غالباً اس کو منفی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تم ذہین ہو لیکن تمہاری ذہانت کسی تعمیری مقصد کے لیے استعمال نہیں ہو رہی ہے۔ تم اپنا دفاع بھی کر رہے ہو اور ایک ایسی قانونی جنگ لڑ رہے ہو جس میں مدعی بھی تم ہو اور منصف بھی۔ تم وکیلِ استغاثہ کی حیثیت سے اپنے آپ کو دلائل دیتے ہو، فیصلہ سناتے ہو اور اس پر عمل درآمد بھی کرتے ہو۔ گویا تم نے پولیس سے لے کر عدالت اور جیلر تک سب کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں —— آپ کی رائے میرے حالات کا بڑا صحیح تجزیہ کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کچھ مجھے اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی پولیس مجھے تحفظ فراہم نہیں کر سکتی۔ آپ کا نظامِ انصاف کبھی مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کسی قاتل کو تختۂ دار تک نہیں پہنچا سکتا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں بھی اسی طرح ذلت و رسوائی اور بے بسی کی موت مر جاؤں جو میرے والد کا مقدر ہوئی تھی؟ آپ سب حالات سے باخبر ہونے کے باوجود مجھ سے توقع رکھتے ہیں....؟"

"میں تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹ دی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم انتقام کے چکر میں نہ پڑو۔ معاف کر دینے میں بڑائی ہے اور فلاح ہے۔"

"لیکن انکل صرف چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "میں کسے معاف اور کیسے معاف کر دوں؟ کیا کسی نے مجھے یہ موقع فراہم کیا ہے؟ یہ کہا ہے کہ سکندر جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ؟ میں خود بھی عام آدمی کی طرح سکون سے جینا اور مرنا چاہتا ہوں مگر کوئی اس کی اجازت بھی تو دے —— میری جدوجہد کا مقصد اور کیا ہے؟"

"مگر اس جدوجہد سے حاصل کیا ہو رہا ہے؟" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "ہر روز ایک نئی پریشانی۔ ہر قدم پر اک نئی الجھن مثلاً یہ بتاؤ کہ جس روز رابعہ کی امی کا جنازہ اٹھنے والا تھا، تم نے اسی گھر میں ایک شخص کو یرغمالی کیوں بنا رکھا تھا؟ تم نے اسے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا تھا؟ تم پھر وہی عدم اعتماد کی بات کرو گے لیکن تم مجھ پر تو اعتماد کر سکتے تھے اور اگر یہ بھی ناممکن تھا تو صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے اس وقت خاموشی سے اسے چھوڑ سکتے تھے۔ تمہارے ہیرو بننے کی سزا کسے ملی؟ رابعہ کا گھر تباہ ہو گیا اور اب تم پھر وہی حماقت کر رہے ہو؟" وہ اچانک رابعہ سے مخاطب ہو گئے۔ "مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ! اس وقت آپ کو ایک ایسا مکان خریدنے کا مشورہ کس عقل مند نے دیا ہے جس کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کا وہاں خیریت سے رہنا ناممکن ہے۔ آپ کے وہاں جانے سے قبل ہی اس مکان میں بم رکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں آپ محفوظ تھیں، آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ پھر اس حماقت کا مقصد تو صرف یہی ہوا نا کہ آپ سکندر کے دشمنوں کو بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔ آپ سامنے آئے بغیر اسے دو ڈھائی لاکھ کے منافع میں بیچنے میں تو کامیاب ہو جائیں گی لیکن کیا اس سے آپ دشمنوں کے عزائم خاک میں ملا دیں گی؟ دو ڈھائی لاکھ کا گھاٹا کھا کے وہ خاموش بیٹھ جائیں گے؟ آپ کی ذہانت اور سکندر اعظم کی جرأت سے شکست کھا جائیں گے؟ آپ سکندر کے ساتھ ایک ہی محاذ پر لڑ رہی ہیں۔ اس کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کے۔ فرق صرف یہی ہے کہ آپ قانونی طریقوں سے لڑ رہی ہیں اور سکندر کے طریقے غیر قانونی ہیں۔ آپ کو انجام کی فکر نہیں لیکن دوسری طرف آپ نے اور سکندر نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا ہے —— شادی کے معاملے میں آپ مجھے قدامت پرست سمجھ لیں یا جاہل لیکن میں اس چیز کو بالکل پسند نہیں کرتا، میرا مطلب ہے کہ آپ سب کی مشترکہ سرگرمیوں کو —— میں آپ سب پر اعتماد کرتا ہوں اور اس اعتماد کی شکست سے ڈرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ لوگ باہر کیا گُل کھلاتے پھرتے ہیں لیکن اب میں نے حالات سے باخبر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے ہر روز آپ لوگوں کی نقل و حرکت کی رپورٹ ملنی چاہیے اور اس کا انتظام بھی کر لیا ہے۔" وہ ہم سب کو خاموش اور ساکت و صامت چھوڑ کے باہر نکل گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمیں سکون سے سو جانا چاہیے۔" رابعہ نے فوراً کہا۔ "صبح تک رضوی صاحب کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم بھی ٹھنڈے دماغ سے سوچ سکیں گے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"

رات بہت ہو چکی تھی اور ہم میں سے کوئی بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اور محسن نے گزشتہ رات بھی جاگ کے گزاری تھی۔ وہ تو پڑتے ہی سو گیا۔ کہتے ہیں کہ نیند خیالات سے فرار کا راستہ ہے۔ یہ راستہ نہ ملے تو آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ نیند کے خواب، خیالات کا دباؤ کم کرتے ہیں اور سیفٹی والو کا کام کرتے ہیں۔ سیفٹی والو نہ ہو تو پریشر مضبوط سے مضبوط بوائلر کی دیواروں کو پھاڑ دیتا ہے۔ میں خود بھی نیند کی پناہ چاہتا تھا لیکن مجھے رات کی تاریکی میں ایک کام کرنا تھا جو دن کے اجالے میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دس منٹ تک میں نیند کی یلغار کو آنکھیں کھولے روکتا رہا۔ پھر میں خاموشی سے اٹھا اور سرونٹ کوارٹر کے عقبی حصے میں پہنچ کے ایک جگہ سے زمین کھودنے لگا۔

اپنے اندازے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں نے سیلوفین میں لپٹا ہوا پیکٹ برآمد کیا اور اس میں سے وہ چھوٹا سا ریڈیو ٹرانسمیٹر نکال

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیا جو رضوی صاحب کے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ دبے پاؤں واپس آ کے میں نے ہاتھ دھوئے اور ریڈیو ٹرانسمیٹر کو سرہانے کی طرف بستر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ تھکن سے میری حالت اتنی غیر ہو رہی تھی کہ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں ایسی گہری نیند میں گم ہو گیا جسے بیہوشی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ صبح نو بجے بھی میں اس وقت جاگا جب محسن نے میرے اوپر پانی سے بھری ہوئی بالٹی الٹ دی۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے؟" میں نے بڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے حضور والا! سیلاب آ گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ پھر وہ اور رابعہ میری حالت دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے۔

"سیلاب ہے کیسا سیلاب ہے، سیلاب بلا؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد ہے اگر میں ڈوب جاتا تو کیا ہوتا؟"

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟" محسن بولا اور داد طلب نظروں سے رابعہ کو دیکھنے لگا۔

"ہوتا یہ کہ — ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔" میں نے تولیہ اٹھا کے باتھ روم کا رخ کیا اور ان دونوں کے ہنسنے کی پروا نہیں کی۔ جب میں نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے باہر آیا تو رابعہ میرے گیلے بستر کو کوارٹر کی دیوار پر دھوپ میں ڈال چکی تھی اور محسن ریڈیو ٹرانسمیٹر کا معائنہ کر رہا تھا۔

"چلا گیا اس میں بھی پانی؟" میں نے کہا۔ "اب اس ڈبے کو پھینک دے۔"

"ڈبا بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اس وقت گڑے مردے کو اکھاڑنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مقصد بہت نیک ہے اور آج شام تک واضح ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"رضوی صاحب پہلے ہی بہت خفا ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ بتا چکے ہیں کہ آئندہ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہو گی۔ خدا کے لیے کوئی نیا ہنگامہ کھڑا مت کرنا۔"

"زندگی ایک مسلسل ہنگامہ ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اسی لیے چچا مرحوم نے کہا تھا ع ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو رضوی صاحب کو احساس ہو گا کہ ہمارے دم سے یہاں کتنی رونق تھی۔ باقی رہی نگرانی کی بات تو اس سے کیا ڈرنا۔

ہم ایسے غائب ہوں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"پھر بھی رہیں گے تو اسی شہر میں؟" رابعہ نے کہا۔

"اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہم شہلا کی طرح روپوش ہو کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتے۔ مجھے اور تمہیں اپنے اپنے مقدمات کے سلسلے میں حاضر ہونا ہی پڑے گا۔ میں تو آفس آنا جانا بھی چھوڑ سکتی ہوں مگر تمہارے لیے تاریخ سماعت پر غیر حاضر ہونا ناممکن ہے۔ تمہاری ضمانت منسوخ ہو جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے کل میں خود بھی اپنی حفاظت کے لیے ضمانت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کروں۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ ہو گا لیکن آج مجھے اور تمہیں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ تمہیں کورٹ جا کر خسرو جمشید سے ملنا ہے اور مکان کی خریداری وغیرہ کے قانونی معاملات طے کرنے ہیں۔ محسن کو یہ دیکھنا ہے کہ شہلا کے پرانے گھر میں سے سامان نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ پھر اگر ممکن ہو تو محسن آج شام تک کسی بھی وقت شہلا کی ماں کے پاس جائے اور اسے عدنان کا کوئی خط پڑھ کر سنائے تاکہ اسے کچھ قرار آ جائے۔ خط کا کیا ہے، محسن چند منٹ میں لکھ لے گا۔ خط کے ساتھ بیٹے کی طرف سے ماں کو پانچ سو روپے بھی پہنچا دیے جائیں تو وہ بہت خوش ہو گی۔"

"لیکن ہم اسے کب تک ان جھوٹی خوشیوں سے بہلاتے رہیں گے؟" رابعہ نے اداسی سے کہا۔

"جب تک یہ ہمارے اختیار میں ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی سے سچ کا زہر دے کر مارنے سے کیا فائدہ؟ جھوٹی اگر ہیں تو ہمارے نقطۂ نظر سے اس کے لیے ہر خوشی سچی ہو گی اور جب تک وہ جیے گی ان سچی خوشیوں کو جمع کرتی رہے گی لیکن میرا خیال ہے وہ زیادہ دن نہیں جیے گی۔"

"تو نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو کس محاذ پر ہو گا؟"

"میں ابھی کچھ دیر بعد شہلا کے پاس جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمہیں وہیں ملوں گا اگر نہ ملوں تو میرا انتظار کرنا۔ بالفرض محال انکل رضوی نے کسی کو ہماری نگرانی پر مامور کیا ہو گا تو وہ کس کے پیچھے جائے گا؟ ہم تینوں مختلف اوقات میں روانہ ہوں گے۔ ہماری منزلیں اور راستے جدا ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ رابعہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے اگر تجھے کوئی اپنے تعاقب میں نظر آئے جو صورت سے پولیس کا آدمی لگتا ہو تو جُل دے کر اپنی جان چھڑا لینا۔ میں خود بھی یہی کروں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

ناشتہ کرتے ہوئے ہم نے اخبارات دیکھے اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چراغ دین کے متعلق رضوی صاحب کی فراہم کردہ معلومات سو فیصد درست ثابت ہوئیں۔ اس کے گھر میں سے واقعی لاکھوں کا مال برآمد ہوا تھا۔ ہم اسے ایک سازش کر کے منشیات کا اسمگلر ثابت کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ چراغ دین واقعی اسمگلر ہے۔ قدرت پہلے ہی اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہم تو محض ایک ذریعہ بن گئے تھے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق ملزم چراغ دین نے بہت سی باتوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ مثلاً یہ کہ جب وہ پلاسٹک کے کھلونے بناتا تھا تو ان کھلونوں میں منشیات باہر بھیجتا تھا اور اس کا طریقہ کار بہت محفوظ تھا۔ وہ سینکڑوں میں سے ایک کھلونا اس مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور چیکنگ کے دوران ایک کھلونے کے پکڑے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اس کا ایک کاروباری شریک دشمن ہو گیا تو چراغ دین نے یہ فیکٹری بھی بند کر دی اور ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تلاشی کے دوران چراغ دین کے گھر سے تین ٹبس ایسے ملے تھے جو دیکھنے میں صابن یا ٹوتھ پیسٹ سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے لیکن ان میں نیچے منشیات کی خاصی بڑی مقدار موجود تھی۔ "خاصی بڑی مقدار" والی بات پولیس نے یا پھر اخبار والوں نے زیب داستاں کے لیے گھڑی تھی ورنہ ہم بھی جانتے تھے کہ وہ مقدار کچھ بھی نہیں۔ خصوصاً منشیات کی اسمگلنگ کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے — اخبار میں یہ بھی تھا کہ ابھی تفتیش جاری ہے اور پولیس کچھ ناموں کو صیغۂ راز میں رکھ رہی ہے اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ خبر تقریباً ہر بڑے اخبار میں صفحۂ اول پر چراغ دین کی تصویر کے ساتھ موجود تھی۔

بہت عرصے بعد یہ پہلی خبر تھی جو میرے دل کے لیے تسکین کا سامان بنی۔ کل تک جو شکاری تھا وہ آج شکار ہو چکا تھا اور اس پہلی کامیابی نے میرے عزم و حوصلے کو دو چند کر دیا تھا۔ ہم ابھی اس موضوع پر گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اسلام آباد سے محسن کے والد کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ اتفاق سے رابعہ نے ریسیور اٹھایا اور ہم نے اسے اشارے سے سمجھا دیا کہ شیروانی صاحب ہمارے بارے میں پوچھیں تو کہہ دے کہ ہم دونوں موجود نہیں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ شیروانی صاحب نے کھل کے رابعہ سے بات کی۔ شیروانی

صاحب بہت خوش تھے کہ چراغ دین کی گرفتاری سے اس کی شخصیت بروقت بے نقاب ہو گئی اور فوزیہ کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ فوزیہ نے اس خبر سے کوئی خاص تاثر قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کی ماں کا صدمے سے برا حال تھا کہ خدا نخواستہ یہ شادی ہو جاتی تو ان کی کتنی بدنامی ہوتی اور مریم کی ناگہانی موت کے بعد فوزیہ پران کی زبردستی کے باعث کوئی آفت پڑ جاتی تو وہ جیتے جی مر جاتیں یہ بات بھی باعثِ اطمینان تھی کہ ہمارے بارے میں محسن کے والدین کے خیالات میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میری اور محسن کی چراغ دین سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی اور ہم فوزیہ سے اس کے رشتے کی مخالفت کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم کو اصل حالات کا علم تھا لیکن کسی مجبوری کی بنا پر ہم اصل حقائق بیان کرنے سے گریز کرتے تھے — مجموعی طور پر میری کوشش کا نتیجہ میری خواہشات کے مطابق رہا تھا۔ چراغ دین بالآخر قانون کی گرفت میں آ گیا تھا اور جس سزا سے وہ پہلے محفوظ رہا تھا وہ اب اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ اس نے میرے والد کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اس کو بھی مجھ پر اعتماد کرنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ چراغ دین نے میرے والد کو ذلت کا عذاب سہنے پر مجبور کیا تھا اور اب خود بھی عذاب میں مبتلا تھا۔ اس نے جتنا غبن کیا تھا اس میں حرام کی کمائی سے ہزار گنا اضافہ کر لیا تھا لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا اور اس طرح برسوں بعد انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ چراغ دین کی دنیاوی عزت اور وقتی کامیابی سے حاصل ہونے والی دولت کا غرور خاک میں مل گئے تھے۔ فوزیہ کی زندگی بچ گئی تھی اور میرے ساتھ محسن کو بھی تمام تفکرات سے اور سب اندیشوں سے نجات مل گئی تھی جو فوزیہ کی ذات سے وابستہ تھے۔

رابعہ کے کورٹ چلے جانے کے بعد میں نے محسن کو اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

"تو نے ڈی سلوا کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" محسن بولا۔ "میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اس طرح کرنا ہے کہ اس سے قانون کی راہ میں حائل دشواریاں دور ہو جائیں اور انصاف ہو سکے۔ مجرموں کو سزا مل جائے جنہوں نے اپنے چالاک ذہن کی مدد سے اپنے جرم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ ہمیں اپنا حق حاصل کرنا ہے اور انصاف حاصل کرنا ہے اور ظالموں کو بتانا ہے کہ ہم بھی لڑنے کا حوصلہ رکھتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں مگر مجرم نہیں بننا ہے۔"

"یہی میرا نظریہ بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ ہم نے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں اور ہم طاقت میں بھی کم نہیں۔ چراغ دین کو جیل پہنچانا تھا، ہم نے اسے جیل پہنچا دیا اور اسے جو سزا ملے گی اتنی ہی ہوگی جس کا وہ مستحق تھا۔ قتل کرنا کیا مشکل ہے، میں ان سب کو ٹھکانے لگا سکتا ہوں جن کو مجرم سمجھتا ہوں لیکن اس طرح میں خود بھی مجرم کہلاؤں گا۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا لیکن قانون کے ہاتھ اتنے مضبوط ضرور کردوں گا کہ ہر مجرم کی گردن تک پہنچ سکیں۔ اگر میں نے شروع ہی سے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہوتا تو دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے اور ان کی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اگر میں ضمیر فروش ہوتا تو اس وقت لندن میں عیش کر رہا ہوتا لیکن میں عہد کر چکا ہوں کہ ظالموں سے ظلم کے ایک ایک لمحے کا حساب لوں گا اور اپنے حق سے دست برداری کبھی قبول نہیں کروں گا خواہ اس میں میری جان ہی چلی جائے۔"

"لیکن تو نے جو انتظام کیا ہے اس میں ڈی سلوا کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔" محسن بولا۔

"اس نے بھی میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس طرح میں بچ کر نکل آیا تھا اگر بچ سکا تو وہ بھی نکل آئے گا۔ مقصد تو اس کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہم بھی اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے کم نہیں اور برابر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ غرور ختم ہو جانا چاہیے کہ وہ جب چاہے ہمیں حقیر کیڑے کی طرح مار سکتا ہے اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کھیل میں زندگی اور موت کے امکانات دونوں فریقوں کے لیے برابر ہیں۔ شکاری اگر وہ ہے تو ہم بھی ہیں اور کسی طرح بھی اس سے کم نہیں ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔" محسن نے کہا۔ "شہلا کے پرانے گھر سے سامان نکالنے کا مسئلہ اتنا اہم یا مشکل نہیں، ہم دونوں وہاں جا کے یہ کام کل بھی کر سکتے ہیں۔ زیادہ خطرناک کام وہ ہے جو تو اکیلے کرنا چاہتا ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔" میں نے کہا۔ "اصل کام تو شہلا کا ہے جو زیادہ مشکل نہیں ہے اگر وہ ہماری ہدایات کے مطابق ڈی سلوا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تو باقی کام میں سنبھال لوں گا۔"

"تو بہت سے خطرات کو نظر انداز کر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "احتیاط اچھی چیز ہے۔ میں دور رہ کر نگرانی کر سکتا ہوں اور کوئی غیر متوقع بات ہو تو مدد کے لیے پہنچ سکتا ہوں۔"

دوپہر کے قریب ہم شہلا کے پاس پہنچے۔ محسن نے چند سطروں پر مشتمل ایک خط تحریر کر لیا تھا۔ عذرا کی ماں اگر اندھی نہ ہوتی تو یقیناً اس جعلسازی کو پکڑ لیتی کہ تحریر اس کے بیٹے کی نہیں ہے مگر اس نے محسن کی بات پر اعتبار کیا اور اس خط کے مضمون کو کئی بار سنا۔ اس کی صورت پر مسرت اور اطمینان کے جذبات اور مامتا کی روشنی دیکھ کر محسن کے احساسِ جرم و پشیمانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ پانچ سو روپے اس طرح دیے جیسے بیٹے نے ولایت سے اس کے بیٹے نے ماں کے نام اتنی رقم کے پانچ سال ارسال کر دیے ہوں۔ یہ احساس کی دولت تھی۔ تقدیر کا یہ ستم بھی عنایت سے کم نہ تھا کہ آنکھوں کی روشنی نہ رہی۔ اب وہ صرف چشمِ تصور سے دیکھ رہی تھی کہ بیٹا لندن میں خوشحال ہے اور... ہے۔ آنکھیں ہوتیں تو صرف وہ قبر دیکھتیں جس میں ... کی جگہ صرف اس کی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

دوسرے کمرے میں میں نے شہلا سے بات کی۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ آفس لے جاؤں گا۔"

وہ چونک پڑی۔ "کون سے آفس؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں ہنس پڑا۔ "وہی آفس جہاں تم ڈی سلوا صاحب کی وفادار ... گزار سیکرٹری تھیں۔"

شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ "اگر یہ مذاق ہے تو میں سمجھ نہیں سکی۔"

"یہ مذاق ہرگز نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ آفس کے دروازے تک میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن اندر تم کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ نیچے ... تمہاری واپسی کا منتظر رہوں گا۔ دفتر میں تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے۔ چنانچہ ڈی سلوا تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکتا۔ وہ تمہیں زبردستی اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ اگر اس نے کوشش کی تو میں اس کا راستہ روک لوں گا۔ میں بھی وہاں اکیلا نہیں رہوں گا، کچھ فاصلے پر محسن بھی موجود ہوگا۔"

"لیکن... لیکن یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" شہلا نے کہا۔ جواب بت بنی میری صورت کو دیکھ رہی تھی۔

"میں ڈی سلوا سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں لیکن وہ میرے بلانے پر نہیں آئے گا۔"

"پھر وہ میرے بلانے پر کیسے آ جائے گا؟" شہلا نے کہا۔ "وہ میری جان کا دشمن ہو رہا ہے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ ہم نے تمہیں چھپا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ ابھی تک کسی نے تم کو ہمارے ساتھ آتے جاتے نہیں دیکھا ہے اور کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ تمہیں ڈی سلوا کو یقین دلانا ہوگا کہ تم محض پولیس کے ڈر سے روپوش تھیں اور اسی لیے لوٹ کر اپنے گھر نہیں گئیں کہ وہاں قتل و خون ریزی ہو چکی تھی۔ پولیس کی تفتیش کے علاوہ تم ان لوگوں سے بھی خوفزدہ تھیں جن کے ساتھی مارے گئے تھے۔ تم ڈی سلوا کو یقین دلا سکتی ہو کہ بعد میں ہمارا بھی تم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"وہ پوچھے گا نہیں کہ اب میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

"ضرور پوچھے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ مجھے پناہ کی ضرورت ہے اور ملازمت بھی چاہیے کیونکہ اس طرح چھپ کر میں کب تک زندگی گزاروں گی اور بیمار ماں کے علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں گی۔ تمہاری کامیابی کا دارومدار تمہاری اداکاری پر ہے۔ ڈی سلوا کو اعتبار آ جانا چاہیے کہ تم اس کے پاس واقعی مدد حاصل کرنے کے لیے آئی ہو۔"

"وہ سوال کر سکتا ہے کہ تمہارے حمایتی کہاں گئے؟" شہلا نے پریشان ہو کے کہا۔

"ہاں ڈی سلوا یہ بات پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ حمایتی کسی کی کیا مدد کریں گے جو خود چھپتے پھرتے ہوں، مقدمات میں ملوث ہوں اور زیرِ ضمانت ہوں۔ بات یہ ہے شہلا کہ غیر متوقع سوال کا جواب تمہیں طوطے کی طرح نہیں رٹایا جا سکتا۔ تم خود بھی ذہین ہو۔ تمہیں ڈی سلوا کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ یہ سمجھانا ہے کہ تمہارے دل میں کوئی رنجش نہیں اور تم ماضی کی ہر تلخی کو فراموش کر چکی ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ صرف ڈی سلوا ہی تمہیں بچا سکتا ہے کیونکہ وہ طاقتور ہے، دولت مند ہے اور اثر و رسوخ کا مالک ہے۔"

ڈی سلوا کو زیرِ دام لانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا جو کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اپنی زبان سے شہلا کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ میں نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس کے ایک صفحے پر لکھا۔ "ڈی سلوا کو یہ تاثر بھی دینا کہ تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو لیکن تمہارا ارادہ اس کو بلیک میل کرنے کا ہرگز نہیں ہے بلکہ تم یہ چاہتی ہو کہ ڈی سلوا تمہیں اس پریشانی سے نجات دلا دے۔"

شہلا غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید تذبذب کے آثار میری صورت سے بھی عیاں تھے۔ وہ حیران تھی کہ بات کرتے کرتے میں کیا نوٹ کرنے لگا ہوں۔

"ڈی سلوا کے آفس میں داخل ہونے سے پہلے یہ بھی پڑھ لینا۔" میں نے صفحے کو نوٹ بک سے پھاڑ کر الگ کیا اور کئی بار موڑ کے تعویذ کی طرح کر دیا۔ "ابھی اس کو اپنے بیگ میں ڈال لو۔ یہ تمہارا ٹرمپ کارڈ ہے اگر تم نے عقل سے کام لیا تو ڈی سلوا تم سے ملنے ضرور آئے گا۔ جہاں بھی تم کہو گی۔ اس کے پیشِ نظر ایک مقصد تو یہ ہوگا کہ کسی طرح اپنی پریشانی ختم کرے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں آلۂ کار بنا کے ہمارے خلاف استعمال کرنے کی سوچے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم پر قطعی اعتبار نہ کرے۔ یہ سمجھے کہ تمہارا آنا ایک سازش ہے اور تم اسے بیوقوف بنا کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو۔ ایسی صورت میں وہ تمہیں بے وقوف بنا کے ہر طرح سے تمہاری مدد کا وعدہ کرے گا لیکن درحقیقت تمہارا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہے گا۔ ہر صورت میں وہ تمہارے بلانے پر ضرور آئے گا۔ تم اسے آج شام یا رات کے وقت کسی بھی ایسی جگہ ملنے کے لیے کہہ سکتی ہو جہاں اس کے لیے خطرہ کی کوئی بات نہ ہو۔ مثلاً مال روڈ پر کسی جگہ بھی۔ باغِ جناح میں یا میوزیم کے سامنے۔"

"مجھے اس کے سامنے جاتے ہوئے خوف آتا ہے سکندر بھائی!" شہلا نے کہا۔ "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کیا یہ بات میں نہیں جانتا؟" میں نے تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا۔ "اور تم کیا یہ سمجھتی ہو کہ میں جانتے بوجھتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمہیں خطرات میں دھکیل رہا ہوں یا تمہیں اعتماد نہیں ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں تمہاری حفاظت کر سکوں گا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" شہلا نظر جھکا کر بولی۔ "دنیا میں میرا کون ہے۔ حقیقی رشتوں کا میرے لیے کوئی مفہوم نہیں۔ خطرہ میرے لیے کیا ہے... اگر یہ تنہا، بے مصرف اور دکھ بھری زندگی ختم ہوتی ہے تو ہو جائے، مجھے اس سے اتنا پیار نہیں ہے۔"

"پھر وہی بے وقوفی کی باتیں۔" میں نے اس کو بڑے بھائی کی طرح ڈانٹا۔ "حقیقی اور غیر حقیقی رشتے کیا ہوتے ہیں؟ رشتوں کا تعلق صرف جذبات سے ہے۔ تمہاری مراد خون کے رشتوں سے ہے تو دیکھو، میرا بھی کسی سے کوئی رشتہ نہیں اس کے باوجود میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے، محسن کے لیے، تمہارے لیے اور رابعہ کے لیے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے لیے۔ جن سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ ہر رشتہ ایک زنجیر ہے جسے میں نہیں توڑ سکتا۔ پھر تم کیوں کہتی ہو کہ زندگی کا کوئی مصرف نہیں اور تمہارا کوئی نہیں ہے۔ جب میں تمہارا بھائی ہوں تو میرے تمام رشتے بھی تمہارے ہیں اور ہم سب کے لیے تمہاری زندگی بے حد اہم ہے۔ ہم تمہیں اس زندگی سے پیار کرنا بھی سکھا دیں گے۔"

شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن وہ مسکرائی۔ "مجھے معاف کر دیجیے بھائی جان! میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے زندگی میں دکھ ہی دکھ دیکھے ہیں۔ آہستہ آہستہ مجھے اپنے آپ پر اور دوسروں پر اعتماد کرنا آ جائے گا۔"

ہم تینوں گھر سے نکلے تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تھی ٹیکسی کو ہم نے مال روڈ پر چھوڑ دیا۔ محسن نے بیڈن روڈ تک ہمارا ساتھ دیا اور میں نے چند قدم پیچھے رہ کر میروزیرا اینڈ کمپنی کے دروازے تک شہلا پر نظر رکھی۔ یہ بہت غیر دانشمندانہ فعل تھا اگر ڈی سلوا یا اس کے آفس کا کوئی آدمی ہمیں آگے پیچھے دیکھ لیتا تو فوراً سمجھ جاتا کہ ہم ایک ساتھ آئے ہیں۔ شہلا نے آخری بار پلٹ کر مجھے دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں سیدھا گزر گیا اور بیس قدم دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ بھرا ہوا ریوالور محسن کے پاس بھی تھا اور میرے پاس بھی اور ہم نے دونوں طرف سے ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن اس کے باوجود میرا ذہن وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا تھا کہ ڈی سلوا اپنے آفس میں شہلا کا کام تمام نہ کر دے۔ اگر کسی نے بھی شہلا کو اس کے آفس میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا تو اس کے قتل کا گواہ کون ہوگا؟ پھر وہ رات کو کسی وقت اکیلا آ کر لاش کو ٹھکانے لگا دے گا۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد تھا۔ اگر ہم چھٹی کے وقت تک انتظار کرنے کے بعد دیکھتے کہ ڈی سلوا اکیلا اترا ہے تو ہم اسے کہاں جانے دیتے؟ لاش کوئی پن تو ہوتی نہیں کہ وہ دفتر میں چھپا دے یا راستے میں کو گم کر دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شہلا اپنی اداکاری سے ڈی سلوا کو قائل کرنے میں ناکام رہی تو صورت حال زیادہ سنگین ہو جائے گی۔ ڈی سلوا یقیناً شہلا کو سزا دینے کی سوچے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کس کے ایما پر اسے چکر دینے آئی تھی۔ ممکن ہے وہ خود شہلا کا تعاقب کرے یا وعدہ کرنے کے باوجود شام کو خود ملنے کے لیے نہ آئے بلکہ اس کے آدمی شہلا کو اٹھا لے جائیں۔

اندیشے بے بنیاد نہیں تھے چنانچہ یہ ضروری تھا کہ میں قبل از وقت حفاظتی اقدامات پر غور کر لوں۔ ڈی سلوا کو شہلا کے تعاقب سے روکنے کا طریقہ فوراً میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کی گاڑی سڑک پر زینے سے تقریباً ملی ہوئی کھڑی تھی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے پر مجھے کتابوں اور کاپیوں کی چھوٹی سی دکان نظر آئی۔ دو روپے میں مجھے ایک معمولی سی پرکار مل گئی۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا ڈی سلوا کی گاڑی تک پہنچا۔ دیوار اور گاڑی کے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا فاصلہ تھا اور ایک صاحب ابھی ابھی ازار بند باندھتے اور خفت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نکلے تھے۔ ان کی جگہ میں نے لی تو کسی نے مجھے نہیں ٹوکا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر آگے اور پیچھے کے دونوں پہیوں کو پرکار کی نوک سے پنکچر کر دیا اور ایک منٹ بعد دور کھڑا ہو کے دو پہیوں کی ہوا نکل جانے کے بعد گاڑی کو دیوار کی طرف جھکتا ہوا دیکھتا رہا۔ ایک ٹائر فلیٹ ہو جائے تو دس منٹ میں اس کی جگہ دوسرا اسپیئر وہیل لگایا جا سکتا ہے لیکن ایک ہی وقت میں دو ٹائر بدلنا مسئلہ بن جاتا ہے اور گاڑی کو جیک پر چھوڑ کے پنکچر لگوانے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ میں دل ہی دل میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب ڈی سلوا نیچے آ کر دیکھے گا کہ ٹائر فلیٹ ہیں اور یک نہ شد، دو شد والا مسئلہ ہے۔ شہلا کو اوپر گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور میری رسٹ واچ میں تین بج کر دس منٹ ہو رہے تھے جب وہ نیچے اتری اور مال روڈ کی طرف پیدل روانہ ہو گئی۔ آگے محسن موجود تھا چنانچہ میں وہیں کھڑا رہا۔ دو منٹ بعد ڈی سلوا نیچے آیا اور اس نے شہلا کی طرف دیکھا جو ابھی تیزی سے زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ پھر اس نے جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں۔ ایک قدم آگے بڑھا اور رک گیا۔ اس کی نظر نے دونوں بیٹھے ہوئے ٹائروں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس کے ہونٹوں کی جنبش سے میں نے اندازہ کر لیا کہ حسب عادت اس نے کوئی گالی بکی ہے پھر اس نے ایک موٹر سائیکل کا ہینڈل ہلا کر دیکھا جو شاید اس کے کسی ماتحت کی تھی اور واپس اوپر گیا۔ وہ دوسری بار نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابیاں تھیں لیکن موٹر سائیکل کا لاک کھولنے اور اسے کک مار کے اسٹارٹ کرنے میں مزید تین منٹ صرف ہو گئے۔ میری طرح وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ شہلا نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے اگر اس نے شہلا کی بات پر اعتبار نہیں کیا ہوگا تو اس کو یہ شک بھی ہوا ہوگا کہ شہلا نے ہی اوپر آنے سے پہلے ہوا نکال دی تھی۔ وہ موٹر سائیکل لے کر گیا اور پانچ منٹ بعد لوٹ آیا۔ ناکامی کی کوفت اس کی صورت سے عیاں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو پھر اسی جگہ چھوڑ کے آفس میں داخل ہو گیا تو میں نے وہاں رکنا فضول سمجھا۔ غصے اور پریشانی میں ڈی سلوا نے چابیاں بھی موٹر سائیکل میں لگی چھوڑ دی تھیں تھوڑی سی تفریح کی خاطر میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہوا ہو گیا۔

محسن اور شہلا شیزان میں میرے منتظر تھے۔ شہلا کے روپوش ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ وہ چند قدم کے فاصلے پر واقع شیزان میں گھس جاتے۔ اگر وہ سڑک پر رک کر رکشا یا ٹیکسی کا انتظار کرتی تو ڈی سلوا اس کے پیچھے لگ جاتا۔ اس نے مال روڈ تک آ کے دیکھا ہوگا اور شہلا دور دور تک نہ ملی ہوگی تو فرض کر لیا ہوگا کہ اتفاق سے شہلا کو فوراً کوئی سواری مل گئی اور وہ نکل گئی۔ شہلا نے مجھے بتایا کہ بظاہر مشن کامیاب رہا ہے۔ ڈی سلوا پہلے اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر بہت لال پیلا ہوا تھا مگر شہلا نے میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ مجبور ہو کے مدد مانگنے آئی ہے اور اسے پناہ کے علاوہ ملازمت کی ضرورت بھی ہے جو صرف ڈی سلوا ہی فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ڈی سلوا کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور اس نے شہلا کو تسلی دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس میں اگر کوئی دھوکا ہوا تو شہلا کا انجام بُرا ہوگا۔ اس نے شہلا کو ڈرایا بھی تھا کہ پولیس اس کو ہر جگہ تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ایک کیس تو پرانے گھر کا ہے جہاں تین بدمعاش قتل ہوئے تھے اور پولیس یہ جاننا چاہتی ہے کہ شہلا کا ان سے کیا تعلق ہے؟ پولیس کو عدنان کے قتل کے سلسلے میں بھی اس کا بیان لینا تھا لیکن سب سے زیادہ سنگین مسئلہ اُس تیسری نرس کا تھا جس کے بارے میں سکندر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ شہلا تھی اور اسی نے بوڑھے گورکن کو اسپتال میں زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ ڈی سلوا اس کیس کو دبا چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے گورکن کی موت کو زندہ دفن کیے جانے کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کا ذکر تک نہ تھا لیکن شہلا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس نے جان بوجھ کے یہ بات چھپا لی۔ ڈی سلوا نے شام کو اپنی مصروفیت کے باعث ملنے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اگلے روز صبح آفس آ جائے۔ وہ پولیس کے معاملات بھی ختم کرا دے گا اور دوسرے معاملات بھی۔ دوسرے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے شہلا کا رنگ لال ہو گیا تو میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ میری تحریری ہدایات کا حوالہ دے رہی ہے۔ اب اگلے روز صبح نو بجے شہلا کو ڈی سلوا سے صدر کے راذنڈا باوٹ پر ڈاکٹر فیاض کے کلینک کے سامنے ملنا تھا۔ شہلا نے غلطی سے اسے بتا دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے اور ڈی سلوا نے کہا تھا کہ پھر تو کوئی مسئلہ نہیں، میں گلوب سینما سے مال روڈ کی طرف جانے کے بجائے صدر کی طرف سے آ جاؤں گا اور اس کو گھر سے لے لوں گا۔ اس بہانے وہ شہلا کا گھر دیکھنا چاہتا تھا مگر شہلا نے کہا کہ وہ بہت اندر گلی میں رہتی ہے اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ سڑک کے کنارے ڈی سلوا کا انتظار کرے گی۔

گفتگو کے دوران ہم نے دو مرتبہ چائے پی اور کھانے پینے کی چیزوں کا اسٹینڈ خالی کر دیا کیونکہ ہم نے دوپہر کو کچھ نہیں کھایا تھا اور اب شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کے اندر روشنی برائے نام تھی اور ابھی شام کا رش بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اتفاق رائے سے ہم نے شہلا کو واپس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

"محسن تمہیں ٹیکسی میں بٹھا دے گا۔" میں نے کہا۔ "فوری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

طور پر تمہارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"
"آپ دونوں کا پروگرام کیا ہے؟" شہلا نے کہا۔
"میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"
"مجھے اور محسن کو کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔
"اور تم ہمارے ساتھ نہیں پھر سکتیں۔"
"ایسی کون سی ضروری چیز خریدنی ہے آخر؟" شہلا بولی "گھر پہ رابعہ باجی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"دیکھو جی! ہم تمہاری رابعہ باجی کو نہیں جانتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں۔ کیوں سکندر اعظم؟"
"سچ کہا اچکن صاحب آپ نے... معاف کیجیے گا۔ شیروانی صاحب۔" میں نے تائید کی۔
"انتظار کرنا خواتین کا فرض ہے۔" محسن بولا۔ "دادی جان آج بھی انتظار کر رہی ہیں مگر دادا جان نے چالیس سال پہلے دریا میں غوطہ مارا تھا اور ابھی تک نہیں نکلے وہ بھی مرضی کے بادشاہ تھے۔"
"شادی کے بعد ہماری بیویاں ہاتھ باندھے ہمارا انتظار کیا کریں گی۔" میں نے کہا۔
"اور وہ ان جیسی ہوئیں تو ہم ہاتھ باندھے انتظار کریں گے۔ ہم حکم کے غلام بھی ہیں۔" محسن بولا۔
ہماری باتوں پر شہلا کو بے اختیار ہنسی آئی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ ان باتوں کا کوئی مقصد نہیں اور ہم اسے ٹالنا چاہتے ہیں مگر محسن کی آخری بات پر اچانک اس کی ہنسی تھم گئی۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے محسن کو دیکھا جو زیر لب مسکرا رہا تھا مگر شہلا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ محسن نے شہلا سے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا اور شہلا نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ الفاظ بڑے بازی گر ہیں کبھی ایک پورا دفتر رموز کائنات کی چھوٹی سی گتھی نہیں سلجھا سکتا تو کبھی چند الفاظ ایک زندگی کا افسانہ کہہ دیتے ہیں۔ ان گنت خواہشات، لامحدود دعاؤں اور بے حساب امیدوں سے تعمیر ہونے والے مستقبل کا عنوان بن جاتے ہیں اور جذبات کے سمندر کو سمیٹ لیتے ہیں۔
جب شہلا ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تو میں نے کہا۔
"محسن! اب اس پروگرام کا سب سے خطرناک مرحلہ درپیش ہے۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر امین کی دکان ہے جس نے مجھے آج شام کا وقت دیا تھا لیکن احتیاط کا تقاضہ ہے کہ میں وہاں نہ جاؤں۔ کیا خبر اس نے بعد میں پولیس کو اطلاع دے دی ہو اور وہ سادہ کپڑوں میں آس پاس ہی موجود ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ہر آنے جانے والے کا حلیہ اور شکل بڑے غور سے دیکھ رہے ہوں گے اور میں اگر قرب و جوار میں نظر آیا تو پکڑا جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے امین نے رابعہ کی سرخ فاکس ویگن دیکھ لی ہو جس میں بیٹھ کر میں یہاں پہنچا تھا اور اب وہ سرخ رنگ کی ہر گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی مستعد ہو جاتے ہوں۔"
"امین کے مراسم بدمعاشوں سے بھی ہوں گے۔" محسن نے سر ہلا کے کہا "اور ہم سارے شہر کے بدمعاشوں کو نہیں پہچانتے۔"
"ابھی مسئلہ یہ ہے کہ امین مجھے پہچانتا ہے اور اس نے کوئی انتظام کیا ہوگا تو میرے لیے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ کام تجھے کرنا ہوگا۔ ریوالور تیرے پاس ہے۔ تو موٹر سائیکل پر سیدھا اس کے سامنے جا کے رکنا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اندر داخل ہو جانا۔ تجھ پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ اندر امین کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ اندر زیادہ جگہ نہیں ہے لیکن ایک آدھ آدمی ہو تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ تجھے دیکھ کر ہوشیار نہیں ہوں گے بلکہ یہی سمجھیں گے کہ کوئی گاہک کسی کام سے آیا ہے۔ پھر تو اچانک ریوالور نکال لینا۔ پانچ ہزار روپے ان کے سامنے پھینک دینا اور ان سے کہنا کہ یہ ہے باقی رقم۔ پانچ ہزار تمہیں پہلے مل چکے ہیں۔ وہ چیز نکالو جو ڈی سلوا نے بنوائی تھی۔ ظاہر ہے وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے اور وہ چیز تیرے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد بحفاظت نکلنا تیرا کام ہے۔ نکلنے سے پہلے ان کو بتا دینا کہ حلق سے آواز بھی نکلی تو اچھا نہیں ہوگا۔ باہر ہمارے آدمی موجود ہیں جن کے پاس دستی بم بھی ہیں۔ مجھے امید ہے اس دھمکی کے بعد وہ گڑبڑ نہیں کریں گے۔ تو اس چیز کو قمیص کے اندر چھپا کے باہر آنا اور موٹر سائیکل پر روانہ ہو جانا۔ اگر کوئی نگرانی کر رہا ہوگا تو تیری طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ ان کے ہوشیار ہونے تک تیرا مشینی گھوڑا بہت دور جا چکا ہوگا۔ انگلستان میں ہم نے موٹر سائیکل چلانے کی جو مشق کی تھی وہ اب کام آنی چاہیے۔ موٹر سائیکل کا تعاقب بھی مشکل ہوتا ہے۔"
"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو کچھ مجھے کرنا ہے وہ میں کر لوں گا لیکن یہ جو آپ بار بار موٹر سائیکل کا حوالہ دے رہے ہیں یہ کہاں سے آئے گی؟"

"فکر مت کر بچہ!" میں نے محسن کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "فقیر کے پاس سب کچھ ہے۔ آ میرے ساتھ۔"
موٹر سائیکل ان سیکڑوں اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں کے درمیان کھڑی تھی جو بیڈن روڈ کے شیزان والے کونے سے الفلاح بلڈنگ تک پارکنگ کے لیے مخصوص پتلی سی سڑک پر ایک قطار میں موجود تھیں اسی صف میں سائیکلیں بھی تھیں۔ چنانچہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پولیس نے اسے برآمد کر لیا ہوگا۔ اس کا بد نصیب مالک پہلے تو ڈی سلوا کے سامنے رویا پیٹا ہوگا جس کی غلطی کے باعث موٹر سائیکل گئی۔ ڈی سلوا نے اسے غصے میں گالیاں دی ہوں گی کہ جاؤ پولیس میں رپورٹ لکھا دو یا ضبط سے کام لیا ہوگا تو کہا ہوگا کہ رپورٹ کر دو اگر نہ ملی تو میں دوسری لے دوں گا۔ چنانچہ ابھی تو اصل مالک تھانے تک ہی پہنچا ہوگا۔ رپورٹ لکھنے کے بعد پولیس کچھ بھی نہیں کرے گی۔ ہر روز گاڑیاں گم ہوتی ہیں۔ کچھ مل جاتی ہیں جو نہ ملیں ان کی خاطر گلی کوچوں کی خاک کوئی نہیں چھانتا اور سارے شہر کی ناکہ بندی نہیں ہوتی۔ ان کے مالک صبر کے میٹھے پھل کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔
"اس موٹر سائیکل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ اسے بحر ظلمات میں بھی دوڑا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہارس پاور کی موٹر سائیکل کو آپ گھوڑا سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ کسی نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تو الزام ہم پر نہیں آئے گا۔ اس کا مالک ڈی سلوا کا کوئی ماتحت ہے، اسے ہم کل فون پر بتا دیں گے کہ میاں رونا دھونا بند کرو اور فلاں جگہ سے اپنی موٹر سائیکل اٹھا لو اگر کوئی چکر پڑا تو مالک کہہ دے گا کہ موٹر سائیکل تو ڈی سلوا صاحب لے گئے تھے اور خدا معلوم واپس لائے تھے یا نہیں۔ ادھر امین بھی کہے گا کہ وہ ڈی سلوا کے آدمی تھے۔ چنانچہ ڈی سلوا پھنس جائے گا۔"
"اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن نے قہقہہ مارا۔ "لیکن یار سکندر! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ امین جو چیز میرے حوالے کرے گا اس میں کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ ہمارے دس ہزار ضائع نہ ہو جائیں۔"
"تو اس کو سمجھا دینا کہ جن کا پیسہ ہے وہ آدمی کو ضائع کر سکتے ہیں پیسہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ تو جوا ہے۔ ہار گئے تو اگلی چال چلیں گے۔ اب تو جا، میں یہیں کھڑا ہوں۔"
محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "تیرے یہاں کھڑے رہنے کا فائدہ کچھ نہیں۔ معلوم نہیں مجھے کس راستے سے فرار ہونا پڑے

ویسے بھی تو میری مدد کرنے کے لیے وہاں نہیں آ سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچ جاؤں گا... شہلا کے گھر۔"
"رند اگر مے خانے نہیں پہنچے گا تو کہاں جائے گا۔" میں نے کہا اور محسن کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
میں گھر پہنچا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ رابعہ مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھی اور شہلا سے ہماری مصروفیات کی رپورٹ بھی لے چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے اس سے پوچھ لیا کہ خسرو جمشید سے مکان کا سودا ہوا کہ نہیں؟
"سودا تو ہو گیا۔" رابعہ نے کہا "لیکن خسرو جمشید خود نہیں پہنچا۔ اس کی جگہ ایک وکیل حاضر ہوا جس کے پاس مختار نامہ تھا۔ حقوق ملکیت حاصل ہو گئے ہیں لیکن ضابطے کی کارروائی کے مطابق منتقلی میں کچھ وقت لگے گا۔ اس کو بیچنے کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔"
"اس کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ خسرو جمشید نے خود آنے سے کیوں گریز کیا؟"
"اس کے وکیل نے صرف یہ کہا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر جمشید صاحب حاضر نہیں ہو سکے۔ بعد میں میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی ورنہ میں کچھ اور معلوم کرتی۔" رابعہ نے کہا۔
"خسرو جمشید بھی بہت بڑا فراڈ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کون ہے اور اس کی کہانی میں حقیقت کو کتنا دخل ہے لیکن یہ سب کچھ بعد میں ہوتا رہے گا۔ ابھی محسن آ جائے تو اس کے بعد ہمیں پہلا کام یہ کرنا ہے کہ اپنا ٹھکانہ بدلنا ہے۔"
"اس وقت! اتنی جلدی یہ کام کیسے ہوگا؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟"
"یہ احتیاط کا تقاضہ ہے۔" میں نے کہا۔ "شہلا نے ڈی سلوا کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ صدر میں رہتی ہے۔ اگر ڈی سلوا نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس کا ہم سے کوئی

مطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب
قیمت ۲۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۴۴ کراچی نمبر ۱

تعلق ہے یا نہیں تو اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ شہلا کو یہاں آتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ لوگ اس کے نام یا اس کی صورت سے واقف نہیں لیکن تمہاری سرخ فاکس ویگن اکثر یہاں دکھائی دیتی ہے۔ وہ انجان بن کے پوچھ سکتا ہے کہ یہاں ایک خاتون وکیل رہتی ہیں جن کی چھوٹی سی لال رنگ کی گاڑی ہے۔ میرا خیال ہے بہت سے لوگ کہیں گے کہ انہوں نے گاڑی بھی دیکھی ہے اور گاڑی چلانے والی خاتون کو بھی دیکھا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں کار چلانے والی عورت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ شاید کوئی یہ بھی بتا دے کہ تمہارا کس گھر میں آنا جانا ہے۔ آج تو وقت نہیں رہا لیکن کل ڈی سلوا تفتیش کر سکتا ہے۔"

"لیکن میرا یہاں آنا نئی بات نہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "ماسی ہماری پرانی خادمہ ہے اور میں گزشتہ کئی سال سے یہاں آ رہی ہوں۔"

"اس میں تو کوئی ہرج نہیں۔ ابھی ماسی یہاں رہے اور تم پہلے کی طرح اس کے پاس آتی جاتی رہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن شہلا اور اس کی ماں کو راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کل کسی کو یہاں ان کا سراغ بھی نہ ملے۔ مکان ہمارے پاس ہے اور ایسی جگہ پر ہے جہاں ڈی سلوا کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔ تم اب گھر جاؤ تاکہ انکل رضوی کچھ مطمئن ہو جائیں۔ محسن کے آتے ہی میں شہلا اور اس کی ماں کو کرشن نگر پہنچا دوں گا۔ ہم ضرورت کا تھوڑا سا سامان لے جائیں گے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ گلبرگ میں شہلا کے پرانے گھر سے سب سامان اٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ آج کی رات شہلا کو اپنی ماں کے ساتھ اس گھر میں اکیلے بسر کرنی ہوگی۔ کل ہم سب رضوی صاحب سے اجازت لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن صبح نو بجے تو میں نے ڈی سلوا کو ٹائم دیا ہے کہ مجھے پک اپ کرے۔" شہلا نے کہا۔

"اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں صبح نو بجے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ ہم خود وہاں موجود ہوں گے۔"

"مجھے معلوم نہیں سکندر کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" رابعہ بولی۔ "اور جو کچھ تم کر رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط۔ تم نے اس خطرناک کھیل میں شہلا کو بھی گھسیٹ لیا ہے۔"

"شہلا کو کل صبح نو بجے صرف چند منٹ کے لیے اپنی صورت دکھانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈی سلوا کی ۔ گاڑی کے رکتے ہی شہلا کا کام ختم ہو جائے گا۔ معاملات میں اور محسن سنبھال لیں گے۔ شہلا اس کے بعد سے گھر لوٹ جائے گی۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "ڈی سلوا کو لے جاؤ گے اور قتل کر دو گے؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے؟" میں نے ... "میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ ڈی سلوا سے کچھ باتیں کروں۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ وہ آسانی سے ... بتائے گا۔ اس لیے مجھے جبر بھی کرنا پڑے گا ... سمجھانا پڑے گا کہ وہ ہمیں کمزور یا بزدل نہ سمجھے ... کے مسئلے میں تو اپنی حفاظت مقدم ہے اور اپنی جان ... کے لیے دشمن سے برابر کا مقابلہ کرنا کوئی جرم نہیں ... ارادہ ڈی سلوا کو قتل کرنے کا ہرگز نہیں ہے لیکن یہ ... ہے کہ میں اسے جینے کی رعایت دوں اور وہ مجھے ...

"تم کچھ بھی کرو سکندر!" رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ نہیں چاہتی کہ تم کسی نئی مصیبت میں پڑ جاؤ ... تو یہی خواہش ہے کہ جیسے بھی ہو تم مصائب کی اس دلدل سے نکل جاؤ تاکہ ہم باقی زندگی عام انسانوں کی طرح چین ... سکون سے بسر کر سکیں۔"

جب وہ چلی گئی تو میں سوچتا رہا کہ میں الٰہ دین ... چراغ جیسی وہ طلسماتی قوت کہاں سے لاؤں جو ہر خواہش کی تکمیل کا سامان بن جاتے اور یہ زندگی اسی سانچے میں ڈھل جائے جو رابعہ کے تصور میں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ... انسانوں کی طرح سکھ چین کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ا... میرے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی سکھ چین مانگا تھا لیکن ... کسے کہتے ہیں؟ عام آدمی کیسا ہوتا ہے... یہ کتنے ... اور آسان سوال تھے اور کیسی عجیب بات تھی کہ میرے ... ان کا جواب دینا ممکن نہ تھا۔

شہلا مجھے اپنے خیالات میں محو چھوڑ کے دوسرے کمرے میں ماں کے پاس چلی گئی تھی۔ دروازے پر موٹر سائیکل رکنے کی آواز آئی تو میں چونکا پھر محسن اندر آیا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بال پریشان تھے۔

"کیا ہوا محسن؟" میں نے ایک دم اٹھ کے کہا۔ "کسی سے جھگڑا وغیرہ ہو گیا ہے؟"

"جھگڑا تو ہوا تھا لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا اور دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر بیٹھ گیا۔ "یہ کپڑے تو موٹر سائیکل سلپ ہو جانے سے پھٹے ہیں۔"

"تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟" میں نے پریشانی سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کی خراشیں دیکھ کر کہا۔

"نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "میں وہ چیز لے آیا ہوں، دیکھو۔"

"اس چیز کی بات چھوڑ۔ جا پہلے نہا دھو کے زخم صاف کر اور کپڑے بدل۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کوئی دوسری بات۔"

محسن نے وہ ریڈیو ٹرانزسٹر میرے سامنے رکھ دیا جو درحقیقت بم تھا اور ہنسا۔ "میرے کپڑے یہاں کہاں ہیں؟ اس حالت میں گھر گیا تو انکل رضوی کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی ایسے ہی چلنے دے۔ بس میں ذرا ہاتھ منہ دھو لوں۔"

جتنی دیر میں شہلا نے چائے بنائی اور محسن نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا میں بازار سے اسپرین لے آیا۔ محسن کی پتلون گھٹنے کے پاس سے اور قمیص، آستین پر سے پھٹ گئی تھی لیکن صاف ستھرا ہو جانے کے بعد اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اس سے میری تشویش خاصی کم ہو گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ دکان میں داخل ہوا تو امین اکیلا تھا اور حسب توقع وہ محسن کو دیکھ کر پریشان نہیں ہوا لیکن محسن نے اچانک ریوالور نکال لیا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ پانچ ہزار لے کر اس نے ریڈیو ٹرانزسٹر محسن کے حوالے کر دیا مگر اسے بتا دیا کہ اس چیز کو اپنے ساتھ لے کر وہ زندہ نہیں جا سکے گا۔ محسن سمجھ گیا کہ باہر اس کا راستہ روکنے والے موجود ہیں۔ وہ محسن کو پہچانتے نہیں تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ محسن کے باہر نکلتے ہی امین چلا کر انہیں خبردار کر دے اور وہ ان کے نرغے میں پھنس جائے۔

"میرے لیے اس خبیث کو خاموش رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔" محسن نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلا کے کہا۔ "میری جگہ تو ہوتا تو ایک ہاتھ مار کے اس کو لٹا دیتا مگر ہمیں یہ جوڈو کراٹے وغیرہ کے داؤ تو آتے نہیں۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ میں اسے باندھ کر ڈال دیتا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا۔ مجبوراً میں نے اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ ہاتھ کچھ ٹھیک پڑا اور وہ آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ پہلے تو میں ڈر گیا تھا کہ چوٹ خطرناک ہوئی تو وہ مر جائے گا لیکن وہ صرف چکرا گیا تھا۔ میں دکان سے نکل رہا تھا کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کے باہر ایک گرل ہے۔ میں نے سوچا اسے بند کر دوں حالانکہ مقفل کیے بغیر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بس غلطی ہو گئی۔ گرل بند کرتے دیکھ کر ایک شخص میری طرف لپکا جو سڑک کے دوسرے کنارے پر جیپ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کک لگا کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور قسمت اچھی تھی کہ ایک تو موٹر سائیکل فوراً اسٹارٹ ہو گئی دوسرے وہ شخص پہلے تو ٹریفک میں پھنس گیا تھا پھر اس نے مجھے جاتے دیکھا تو پاگلوں کی طرح ٹریفک کو نظر انداز کر کے بھاگا۔ اس کی ٹکر ایک رکشا سے ہو گئی مگر اتنی دیر میں وہ گاڑی غلط سمت سے موڑ کاٹ کے مال روڈ پر پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے اس میں دو آدمی تھے۔ انہوں نے مجھ پر فائر بھی کیے لیکن میری رفتار زیادہ تھی اور میں دو مرتبہ بال بال بچا۔ پھر میں نے سیدھا چلنے کی بجائے موٹر سائیکل کو لہرا کے چلانا شروع کیا۔ وہاں خاصی افراتفری پھیل گئی تھی۔ کچھ لوگ تو فائرنگ پر چونکے تھے۔ کچھ یہ سوچ رہے تھے کہ میں کوئی شوقین مزاج اور احمق نوجوان ہوں جسے نہ اپنی جان کی پروا ہے اور نہ اپنی بازی گری سے ڈسٹرب ہونے والی ٹریفک کا خیال ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں یہ کرتب نہ دکھاتا تو کوئی گولی مجھے ضرور لگ جاتی کیونکہ وہ گاڑی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں پرانی انارکلی کی طرف نکل گیا اور جو گلی سامنے آئی اس میں مڑتا گیا۔ گاڑی کے لیے تنگ گلیوں میں تیز رفتاری سے میرا پیچھا کرنا مشکل تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں بالکل محفوظ تھا اور اردو بازار کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔ بس اچانک ایک بھینس سامنے آ گئی۔ بھینس گلی میں سے نکلی، اس کے پیچھے مالک دھوتی سنبھالتا شور مچاتا آیا۔ میں بھینس سے تو بچ گیا مگر بھینس والے کو بچاتے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک نجومی کے بورڈ سے ٹکرا کے نجومی پر گرا۔ اسے بھی کافی چوٹیں آئیں۔ ظاہر ہے قصور یا تو بھینس کا تھا یا نجومی کا جو سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ وہ بہت چیخا چلایا مگر میں نے کہا کہ سڑک تمہارے بیٹھنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ ایسے ہی نجومی ہوتے تو آج کسی اور جگہ بیٹھ جاتے۔"

مجھے اور شہلا کو محسن کے ایڈونچر کا حال سن کر بے اختیار ہنسی آئی۔ شہلا کی آنکھوں میں تو ہنستے ہنستے آنسو آ گئے حالانکہ یہ ہنسنے کا نہیں شکر کرنے کا مقام تھا۔ ایک بھی گولی لگ جاتی تو محسن نہ جانے کہاں ہوتا۔ کسی اسپتال میں یا مردہ خانے میں۔ لیکن میری طرح محسن کا ذہن بھی حقیقت پسند تھا۔ خطرے کا وجود برحق مگر خطرہ ٹل جائے تو اسے یاد کر کے دہشت زدہ ہونے کا کیا فائدہ۔ ساری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بات رونے کی ہے۔ محسن کی طرح یہی بات مزے لے کر ہنستے ہنستے سنانے کے بجائے لرزتے اور کانپتے ہوئے بھی سنائی جا سکتی تھی مگر اس سے صرف ہمارا حوصلہ کم ہوتا مسائل کم نہ ہوتے۔ میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو آن کیا۔ بظاہر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کو ٹیسٹ کرنا مشکل تھا۔ دس ہزار رے کرامن نے ہمیں صرف ریڈیو ٹرانسمیٹر دیا تھا یا اس کے اندر ویسا ہی بم بھی فٹ کیا تھا جیسا ایک بار میرا قصہ پاک کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ ابھی ہم نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ میں نے اسے رکھ کر محسن کو نقل مکانی کے پروگرام سے آگاہ کیا۔ شہلا کو اور ماسی کو جلد از جلد ضروری سامان باندھنے کی تاکید کر کے میں اور محسن پھر موٹر سائیکل پر روانہ ہو گئے۔ اب موٹر سائیکل میں چلا رہا تھا اور محسن اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کو بغل میں دبائے پیچھے بیٹھا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم اسی طرح لندن میں بے فکری سے گھومتے تھے آج مدت بعد ان گزرے ہوتے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہم دونوں کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ہمیں یہ احساس فدا بھی پریشان نہیں کر رہا تھا کہ ہمارے پاس کیسی ہلاکت خیز چیز موجود ہے۔ جب تک اس کا خصوصی فیوز سلامت تھا' یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر بالکل بے ضرر تھا۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے پاس چوری کی موٹر سائیکل بھی ہے۔ ہماری نیت چوری کی ہرگز نہیں تھی چنانچہ ہم مطمئن تھے۔ صبح مالک کو فون کریں گے تو اس ذہنی اذیت کی معافی بھی مانگ لیں گے جو ہماری وجہ سے اس کو اٹھانی پڑی۔ موٹر سائیکل کو ہم نے رضوی صاحب کے گھر سے دور ہی کھڑا کر دیا اور پیدل چلتے ہوئے اندر گئے۔ یہ دیکھ کر ہمیں مزید اطمینان حاصل ہوا کہ رضوی صاحب موجود نہیں لیکن وہ کچھ دیر بعد آ گئے۔ اتنی دیر میں ہم نہا دھو کے فارغ ہو گئے تھے اور رضوی صاحب کو ہم نے یہی تاثر دیا کہ آج ہم شریفانہ طریقے پر سرِشام ہی لوٹ آئے ہیں۔ ان کا غصہ پہلے ہی اتر چکا تھا اور انھوں نے اخبار میں چراغ دین کی گرفتاری کی تفصیلات دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں گھر میں موجود پا کے انھوں نے مزید اطمینان کا اظہار کیا اور اگر ان کو کسی دعوت میں نہ جانا ہوتا تو وہ کھانے کے بعد بھی ہم سے باتیں کرتے رہتے۔

رضوی صاحب کے دعوت میں جانے سے ہمیں ایک طرح سے نقل و حرکت کی آزادی مل گئی۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ جب بھوک لگے گی ہم بلا تکلف کھانا مانگ لیں گے مگر ان کے رخصت ہوتے ہی میں اور محسن بھی روانہ ہو گئے۔ ہماری موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی جہاں ہم نے اس کو چھوڑا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہم شہلا کے گھر پہنچے جو ماسی کے ساتھ مل کر بیشتر سامان پیک کر چکی تھی۔ ہم نے اس کی مدد کی اور آدھے گھنٹے بعد سب سامان ایک ٹرک پھر لدوا جا چکا تھا۔ شہلا کی ماں کو ٹرک میں آگے بٹھانے کے بجائے میں نے پیچھے کے کھلے حصے میں چارپائی ڈال کے لٹا دیا اور ماسی بھی اس کے ساتھ ہی سامان پر ٹک گئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور سے میں نے رفتار کم رکھنے کی درخواست کی اور اسے دس روپے زیادہ دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن وہ شریف آدمی تھا اس نے کہا کہ بیمار کو آرام سے لے جانے کے لیے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ دس پندرہ منٹ کی دیر کوئی بات نہیں۔ محسن آگے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے شہلا کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس قافلے کی رہنمائی کی۔ میری ہدایات کے مطابق ماسی نے آس پاس کے رہنے والوں کو بتا دیا تھا کہ وہ ماڈل ٹاؤن میں کچھ دن کے لیے اپنی بہن کے گھر جا رہی ہے جو کہ کرشن نگر سے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ رات کے دس بجے ہم سامان کو شہلا اور اس کی ماں کے ساتھ اپنے نئے گھر میں پہنچا چکے تھے۔ ماسی بہت حیران اور پریشان تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے مگر وفاداری اور دوسروں پر اعتماد اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اس نے خود کو حالات کے اور ہمارے سپرد کر دیا تھا اس یقین کے ساتھ کہ ہم اس کے حق میں جو کچھ کریں گے اچھا ہی کریں گے لیکن بُرا بھی ہوا تو وہ تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کر لے گی۔ شہلا کی ماں کا وجود اور عدم وجود برابر تھا اور وہ شہلا کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ شہلا اس نئے ماحول سے خوفزدہ تھی۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ آج ہی رات کی بات ہے۔ وہ کھڑکیاں دروازے بند رکھے اور کسی اجنبی کے اندر داخل ہونے سے پہلے فرار ہو جائے۔ فرار کے لیے پچھلا راستہ تھا جہاں اندھیرے میں پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ چلتے چلتے میں نے شہلا کو یقین دلایا کہ یہ مکان بہت محفوظ جگہ پر ہے اور کسی دشمن کے یہاں پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کرشن نگر سے گلبرگ کا فاصلہ کافی تھا اور ہمیں شہلا کے پرانے گھر تک پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ موٹر سائیکل دور چھوڑ کے میں اور محسن باتیں کرتے اجلبی بن کے گھر کے سامنے سے گزرے۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ضابطے کی کارروائی کے مطابق تفتیش کرنے

کے بعد پولیس والے بھی اس گھر کو بھول چکے تھے۔ تین مرتبہ سامنے سے گزر کر ہم نے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ تھوڑی سی احتیاط سے کام لے کر ہمارے لیے سامان اٹھانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ گھر کی چابیاں میرے پاس تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر میں چار فٹ اونچی دیوار پر سے اندر کود گیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ چند منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ احتیاطاً ہم نے باہر کی کوئی لائٹ نہیں جلائی اور اندر بھی کھڑکیوں کے پردے شیشوں پر پھیلا کے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ باہر کسی کو روشنی نظر نہ آئے۔ گھر میں اتنا سامان تھا کہ ایک پورا ٹرک بھر جاتا اور ٹرک بھرتے بھرتے رات گزر جاتی جبکہ ہمیں یہ کام کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ باہمی مشورے سے ہم نے طے کیا کہ بھاری سامان اور غیر ضروری فرنیچر، پردے اور قالین وغیرہ چھوڑ دیے جائیں۔ لیکن شہلا کے ذاتی استعمال کی سب چیزیں، کپڑے اور سوٹ کیس اور تھوڑا بہت فرنیچر ساتھ لے جایا جائے۔ برتن سمیٹنا فضول تھا۔ کچھ برتن ماسی اپنے ساتھ لے گئی تھی اور باقی بازار سے بھی خریدے جا سکتے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ آس پاس کی کوٹھیاں دور تھیں اور بظاہر ویران نظر آتی تھیں لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی روشنی دیکھے تو سمجھے کہ شہلا اور اس کی ماں واپس آ گئی ہیں۔ لوگ عام طور پر یہاں ایک دوسرے سے بے تعلق رہنا پسند کرتے تھے مگر شہلا کا گھر غیر معمولی ہنگامہ آرائی کا مرکز رہا تھا چنانچہ کوئی بھی تجسس میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ تاہم تھوڑا بہت خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے محسن کو سامان اکٹھا کر کے دروازے کے قریب لانے کے لیے کہا اور خود ٹرک لینے چلا گیا۔

اتنی رات گئے ٹرک آسانی سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں ایک میل تک پیدل چلتا گیا۔ جو ٹرک میرے قریب سے گزرتے تھے وہ سامان سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ بالآخر مجھے سڑک کے کنارے ایک جھونپڑی جیسے ہوٹل کے قریب خالی ٹرک کھڑا نظر آیا۔ میں ڈرائیور کے چائے پی کر واپس آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ میں دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ٹرک ڈرائیور میری بات پر بہت حیران ہوا۔ رات کو ٹرک ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان چلتے ہیں مگر آدھی رات کو گھر کا سامان کوئی نہیں اٹھاتا۔ میری مجبوری کی بات سن کر اس نے جو معاوضہ طلب کیا وہ عام شرح سے چار گنا تھا لیکن میں نے یہ بھی قبول کر لیا اور ٹرک ڈرائیور کو مزنگ چلنے کے لیے کہا۔

ڈرائیور حد سے زیادہ باتونی اور بے پروا تھا۔ ایک میل دور نکل جانے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ ٹرک کی چال میں فرق کیوں پڑ گیا ہے؟

"مجھے تو اپنے یلد کی چال میں کوئی فرق نہیں لگتا۔" ڈرائیور نے بے فکری سے کہا۔

"فرق تو ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "کہیں پچھلے پہیے کی ہوا تو کم نہیں ہو گئی ہے؟"

"اپنے ٹرک میں ہوا' پانی' تیل' پٹرول سب فُل رہتا ہے بابو!" وہ فخر سے بولا۔

میں نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور پیچھے والے پہیے کو دیکھا۔ "عجیب ڈرائیور ہو تم۔" میں نے کہا۔ "پیچھے والے پہیے میں آدھی ہوا بھی نہیں رہی ہے اور تمہیں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ابھی پہیہ بالکل بیٹھ جائے گا تب مانو گے۔"

ڈرائیور کو اپنی مہارت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے گھور کر مجھے دیکھا، گیئر کو نیوٹرل کر کے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ پلک جھپکتے میں اس کی جگہ میں نے لی۔ ٹرک ڈرائیور گھوم کر پچھلے پہیے کی طرف گیا ہی تھا کہ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور ٹرک کو گیئر میں ڈال دیا۔ ڈرائیور چلایا مگر اس کے لیے ٹرک کا تعاقب کرنا ناممکن تھا۔ دو فرلانگ دور جا کر میں نے راستہ بدلا اور ایک گھنٹے بعد مخالف سمت سے گلبرگ جا پہنچا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹرک ڈرائیور پولیس اسٹیشن گیا ہو گا تو اس نے مزنگ کی بات کی ہو گی اور پولیس گئی بھی ہو گی تو مزنگ کی طرف جو کسی طرح ہمارے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے لیے ٹرک کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم ٹرک کو کہیں بھی چھوڑ سکتے تھے۔ جب میں ٹرک کی لائٹ آف کر کے اس کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اندر لے گیا تو محسن بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم نے ضروری سامان ٹرک پر لادنا شروع کر دیا۔ معمولی آوازیں کسی کے کانوں تک نہیں جا سکتی تھیں مگر ہم محتاط رہے۔ سامان نکالنے اور چڑھانے کی کارروائی خاموشی سے سرانجام دیتے رہے۔ ایک گھنٹہ بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھکن سے ہماری حالت غیر ہو رہی تھی مگر ابھی تک کسی نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے اندر بڑی بڑی الماریاں، بیڈ، صندوق، ڈریسنگ ٹیبل اور فرج وغیرہ رہ گئے تھے۔ جن کو اٹھانا مشکل تھا۔ باقی سب کچھ ہم نے سمیٹ لیا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہم ٹرک لے کر روانہ ہوتے ہی تھے کہ ٹرک پر گیٹ کے سامنے ایک موٹر سائیکل آ کے رکی۔ میں نے محسن کو خبردار کیا کیونکہ موٹر سائیکل سے اترنے والا کوئی انسپکٹر تھا یا سب انسپکٹر۔ شاید وہ گشت پر تھا اور اسے معلوم ہی تھا کہ یہ گھر کس کا ہے۔ ٹرک کو روانہ ہوتے دیکھ کر اس کا شک میں مبتلا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ ابھی وہ گیٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں اس کی موٹر سائیکل کو ناقابلِ استعمال بنا دوں۔ وہ خود تو عین وقت پر چھلانگ مار کے ایک طرف ہو گیا لیکن اس کی موٹر سائیکل ٹرک کی ٹکر سے دور تک گھسٹتی ہوئی گئی۔ جواب میں اس نے فائر کیا لیکن گولی ٹرک کے ٹائر پر لگنے کے بجائے اس کی سائڈ میں لگی۔ محسن نے پیچھے سے اس کے فائر کا جواب دیا اور بہت عقل مندی کا ثبوت دیا کیونکہ اس طرح انسپکٹر کو بھی ہمارے مسلح ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ اگلا فائر کرنے سے پہلے اس نے کسی محفوظ جگہ کی پناہ لی ہو گی۔ تیسری گولی تقریباً ایک منٹ بعد ہمارے پیچھے آئی مگر ٹرک کو چھوئے بغیر گزر گئی۔ ہم فوری طور پر اس کی زد سے باہر ہو گئے تھے اور وہ موٹر سائیکل لے کر ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ کرشن نگر پہنچنے سے پہلے ہم نے ایک اور حرکت کی۔ محسن نے کہیں سے ایک کوئلہ تلاش کیا اور ٹرک کی نمبر پلیٹ کو تھوڑا سا بدل دیا۔ یعنی ایک کو سات بنا دیا اور تین کو آٹھ۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اتنی رات کو سامان اتارنے والے ٹرک کا نمبر کوئی دیکھ لے تو بعد میں چوری ہونے والے ٹرک کے نمبر سے نہ ملے۔

دو چار لوگوں نے ہمیں سامان منتقل کرتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ حیران بھی ہوئے ہوں گے لیکن ہم سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے میں نے شہلا سے اجازت لی اور کہا کہ صبح آٹھ بجے وہ میرا انتظار کرے۔ نئی جگہ پر وہ کچھ نروس تھی چنانچہ ہم نے اسے ٹرک حاصل کرنے اور پولیس سے مڈبھیڑ ہو جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ورنہ وہ پریشان ہوتی۔ واپسی پر مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے ٹرک کو میکلوڈ روڈ کی طرف سے لے جا کر بیڈن روڈ پر میر دیر اینڈ کمپنی کے سامنے عین اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں — ڈی سلوا اپنی گاڑی کھڑی کرتا تھا۔ ہم نے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں ہمارے فنگر پرنٹ ملنے کے امکانات تھے۔ پھر ہم نے نمبر پلیٹ کو صاف کیا۔ سات کا ہندسہ دوبارہ ایک نظر آنے لگا اور آٹھ کا ہندسہ پھر تین بن گیا۔ شہر کے اس علاقے میں رات کے ایک بجے بھی رونق تھی ورجن سے نادر سینماؤں کے آخری شوز ابھی ابھی ختم ہوئے تھے اور واپس گھروں کو جانے والے سگریٹ پان کی دکانوں پر موجود تھے چنانچہ ہم پر کسی کو شک نہیں ہوا۔ ویران اور غیر آباد علاقے میں چوکیدار یا پولیس والے پوچھ گچھ ضرور کرتے۔ اس وقت وہ رکشا بھی دستیاب تھے جو سواری نہ ملنے کے باعث خالی لوٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے صرف پانچ روپے زیادہ لے کر ہمیں پہنچا دیا جہاں ہماری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ شہلا کا ... آ گئے تھا اس لیے ہم محفوظ تھے۔ صبح تین بجے کے ... پھر اپنے کوارٹر میں تھے اور موٹر سائیکل ... سڑک سے ہٹ کے دو گھروں کی مشترک دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس طرح کہ کسی بھی کوٹھی میں رہنے والے کی نظر پڑے تو وہ سمجھے کہ موٹر سائیکل ساتھ والے گھر کی ہے۔

ہمارا پڑوسی کانسٹیبل بھی خوابِ غفلت میں تھا۔ اسے ہمارے آنے جانے کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ خود رضوی صاحب کے گھر کا اندھیرا اور سکوت مکینوں کے خوابیدہ ہونے کا ثبوت تھا۔ میں نے وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھایا جسے زمین سے نکالا تھا اور محسن نے دوسرا ریڈیو ٹرانسمیٹر اٹھایا جو ہمارے خیال کے مطابق بم تھا۔ اس کا پتہ تو آزمائش کے بعد ہی چل سکتا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں ہوا۔ محسن کا خیال دونوں کو ایک ہی فریکوئنسی پر ٹیون کرنے کا تھا لیکن یہ کام گھر کے اندر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک خطرہ تو یہ تھا کہ ہیلو ہیلو کی آواز ہمارے کانسٹیبل کی نیند میں خلل انداز ہو گی۔ دوسرے ہمیں ٹیون کرنے کے بعد کم سے کم ... کے فاصلے سے بات کرنی تھی اور یہ دیکھنا تھا کہ دونوں طرف آواز ایک جیسی سنائی دیتی ہے یا نہیں۔ یہ کام ہم رضوی صاحب کی کوٹھی کے اندر رہ کر مخالف سمت کے گوشوں سے ... سکتے تھے بلکہ مواصلاتی رابطے کا فاصلہ بڑھانے کے لیے ... جا سکتے تھے۔ ہم نکلنے ہی والے تھے کہ صحن کا دروازہ کھول کر رابعہ اندر آ گئی۔ پرانے قبضوں کے چرچرانے سے ہم چونک پڑے اور کچھ دیر یوں کھڑے رہے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس وقت یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

"کچھ نہیں، بس آپ دونوں کی خیریت نیک مطلوب ہے۔" رابعہ نے بھی آہستہ سے کہا۔ "اس سے پہلے میں چکر لگا کے جا چکی ہوں۔ مجھے تم دونوں کی طرف سے سخت تشویش لاحق تھی۔"

"اچھا اب آپ کی تشویش رفع ہو گئی ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھ لیا کہ ہم خیریت سے ہیں؟"

"اب آپ تشریف لے جائیے اور سو جائیے۔" محسن نے کہا۔ "انکل رضوی اٹھ گئے اور انہوں نے دیکھا کہ آپ غیر موجود ہیں تو سکندر کا چالان ہو جائے گا۔"

"میں جاتی ہوں۔" رابعہ بولی۔ "مگر یہ بتاؤ تم لوگ اب تک کہاں تھے؟"

"دیکھو بی بی! یہ باتیں صبح بھی ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم جاؤ، سو جاؤ۔"

"جب تک تم بتاؤ گے نہیں، مجھے نیند نہیں آئے گی اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"اُف۔ بھئی ہم گئے تھے شہلا کا سامان نئے گھر میں پہنچانے۔" میں نے کہا۔

"یعنی اس کے پرانے گھر میں سے نکال لینے کے لیے۔" رابعہ نے لقمہ دیا۔ "خیر... کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تو نہیں مگر ہو جائے گی۔ اب خدا کے لیے تم جاؤ۔" میں نے آہستہ سے اس کا رُخ پلٹ دیا۔

"ایک آخری بات۔" رابعہ نے پھر پلٹ کر کہا۔ "اس وقت آپ دونوں کہاں جا رہے ہیں اور یہ بغل میں کیا ہے؟"

"بغل میں بچہ ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹنے ہم شہر جا رہے ہیں۔" میں نے جھنجھلا کے کہا۔

"یعنی حد ہو گئی... آپ تو رضوی صاحب سے بڑھ کے تھانیدار ہیں خاتون!" محسن بولا۔ "اب دیکھیے نا سیدھی سی بات ہے۔ آپ کو نیند نہیں آ رہی تھی تو آپ ادھر کے چکر لگا رہی تھیں۔ کیا کہا جائے گا اسے؟ کوئے جاناں؟ خیر... ہمیں بھی بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے چنانچہ ہم باغ میں بیٹھ کر گانے سننا چاہتے ہیں۔ آپ کو اعتراض ہے؟"

"اور چونکہ مجھے پکے گانے پسند ہیں اور محسن کو کچے گانے، اس لیے ہم ایک ساتھ دو ٹرانزسٹر لیے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اعتراض ہے؟"

"آپ بھی جائیں اور کوئی اچھا سا سرعام ناچ دو گانے والا خواب دیکھیں۔" محسن نے کہا۔

"تم دونوں جھکی اور خبطی ہو۔" رابعہ نے واپس جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ "جب کسی بات کا صحیح جواب دینا نہیں چاہتے تو فضول بولنا شروع کر دیتے ہو۔"

اتنی دیر میں محسن نے دونوں سیٹ ٹیون کیے۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ صبح ہمیں کیا کرنا ہے۔ مختلف سمتوں سے ریڈیو ٹرانسمیٹرز کی کارکردگی کو آزمانے کے بعد ہم لوٹ آئے۔ پچاس سے سو گز کے درمیان دو طرفہ گفتگو کا ہر لفظ بالکل صاف سنائی دیتا تھا۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا مگر اس وقت بھوک پر تھکن غالب تھی اور چند گھنٹے کی نیند بے حد ضروری تھی۔ میں نے سات بجے کا الارم لگایا اور کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کے سو گیا تاکہ ہمارا پڑوسی کانسٹیبل اٹھے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ہم واقعی کمرے میں سوئے پڑے ہیں۔ نیند اتنی گہری تھی کہ الارم کلاک کی آواز نے صبح سات بجے ہم دونوں میں سے کسی کو بیدار نہیں کیا لیکن ہماری سفارش پر کانسٹیبل سے تھانیدار بن جانے کی امید رکھنے والے رضوی صاحب کے ڈرائیور نے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ساڑھے سات بجے ہمیں جگا دیا اور مطلع کیا کہ الارم تو آدھا گھنٹہ پہلے بج کے خاموش ہو چکا ہے۔ اس طرح کانسٹیبل موصوف نے ہماری نیند میں خلل اندازی کی گستاخی کرنے پر اپنی وضاحت پیش کی اور رخصت ہو گیا۔ میں نے بڑی عجلت میں تیاری کی اور ٹھیک وقت پر ناشتہ کرنے پہنچ گیا۔ رضوی صاحب روانگی کے لیے تیار تھے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتا دیا کہ محسن بھی آنے ہی والا ہے۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کے چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ انہیں ہماری شب بیداری اور رات بھر کی کارروائی کا علم نہیں۔ رضوی صاحب جیسے ذہین اور تجربہ کار پولیس آفسر کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ ہماری طرف سے شکوک میں بھی مبتلا تھے چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے طور پر ہماری نگرانی کرتے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں نکلنے ہی والا تھا کہ رابعہ آنکھیں ملتی نمودار ہوئی۔

"جنابِ سکندرِ اعظم!" اس نے چند کاغذات میرے سامنے رکھ کے کہا۔ "اس وصیت نامے پر دستخط کرتے جائیے۔"

"وصیت نامہ؟" بیگم رضوی نے چونک کر کہا۔ "کس کا وصیت نامہ ہے؟ تمہارا؟"

"جی۔" میں نے مسکین صورت بنا کے کہا۔ "دیکھیے نا، دوراندیشی کا تقاضہ ہے کہ کل کی فکر آج کی جائے۔"

"آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔" محسن نے اندر آ کے بیٹھتے ہوئے افسوس سے کہا۔ "سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے اس بے موقع بات پر اسے گھور کر دیکھا اور جہاں جہاں رابعہ نے کہا وہاں اپنے دستخط کر دیے۔

"اس میں کیا انگریزی لکھی ہے؟" میں نے کہا۔ "ذرا پڑھ کے تو سنا دو وکیل صاحبہ!"

"ہاں۔ اس بے چارے کو تو انگریزی آتی نہیں۔ چار برس ولایت میں رہ کے بھاڑ جھونکا۔" محسن نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کی ہدایات کے مطابق اس میں آپ کے متعدد وارث مقرر کر دیے گئے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے تاج و تختِ برطانیہ کے وارث ترتیب وار موجود رہتے ہیں۔ بالفرضِ محال آپ نہ رہے تو اس دنیاوی مال و متاع کا پہلا حقدار محسن ہوگا۔ دستِ اجل نے اس کو بھی نہ بخشا تو یہ بندی کام آئے گی اور اس کے بعد وراثت کی جنگ خواتین ہی لڑیں گی۔ میرے بعد شہلا اور شہلا کے بعد فوزیہ۔۔۔۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔۔۔ یہاں تک کہ ساتویں نمبر پر استاد ٹیڈی کا نام آجاتا ہے جس کو ہم اپنی حد تک ایک مخلص اور قابلِ اعتماد ساتھی سمجھ سکتے ہیں۔"

"تم سب پاگل ہو گئے ہو کیا؟" بیگم رضوی نے کہا۔ "آخر اتنا لمبا چکر کس لیے؟"

"دور اندیشی بیگم رضوی!" میں نے کہا۔ "کیا بھروسہ ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔"

"اس پر گواہوں کے دستخط اور تصدیق وغیرہ کا کام آج ہو جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "اور کل اسے رجسٹریشن کے لیے داخل کر دیا جائے گا۔ اس کی ایک مصدقہ نقل ایک بنک لاکر میں رکھوا دی جائے گی اور اسے کھولنے کا حق اصل مالک کے بعد صرف اسے حاصل ہوگا جو چابی کے ساتھ عدالت کا جاری کردہ وراثت کا سرٹیفکیٹ لائے گا۔ ایک نقل میرے آفس میں بھی موجود رہے گی۔"

"یہ تم نے ایسا زبردست کام کیا ہے کہ مجھے اپنے گرد ایک ناقابلِ تسخیر حصار محسوس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی فاضل نقل ہے؟"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور چند منٹ بعد مجھے ایک مکمل نقل تھما دی جو گلابی رنگ کے پیپر پر تھی لیکن اس پر تصدیق کی مہر اور میرے دستخط نہیں تھے۔ میں نے اس کو تہہ کر کے جیب میں رکھا۔ محسن اتنی دیر میں ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ رابعہ نے ابھی منہ بھی نہیں دھویا تھا چنانچہ ہم لوٹ آئے اور بیگم رضوی بھی یہی سمجھیں کہ ہم کوارٹر کی طرف گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق محسن کمرے میں رہا اور میں پچھلی طرف سے نکل کے اس جگہ ... موٹر سائیکل رات بھر لاوارث کھڑی رہی تھی۔ اس کا علم لوگوں کو صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد اس وقت جب کوئی باہر آیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ ڈیڑھ پہلے۔۔۔ چوبیس گھنٹے بعد تو کوئی بھی پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا کہ نہ جانے کون اس نمبر کی ایک موٹر سائیکل چھوڑ گیا ہے مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں کسی کو شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کرشن نگر پہنچا تو سات بجنے والے تھے۔ شہلا کو تیار دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ عورتوں کی طرح وہ دو منٹ کہہ کے تیار ہونے میں ... صرف کر دیتی تو سارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا ... کچھ اپنے خوف کے باعث وہ رات بھر سو نہیں سکی ... نے اسے وارننگ دی کہ پیچھے بیٹھ کر نیند پوری کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ میرا ارادہ موٹر سائیکل کو ریس کی طرح چلانے کا ہے۔ وہ کہیں پیچھے پڑی رہ جائے اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوگا۔"

پچیس منٹ کے ریکارڈ ٹائم میں میں نے اسے اس جگہ پہنچا دیا جہاں اس کو ڈی سلوا سے ملنا تھا ... نے موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا ... شہلا سے چند قدم دور راؤنڈ اباؤٹ کے پاس آگیا ... وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی چنانچہ میں نے آسان ... اختیار کیا اور ایک اخبار خرید کے اپنے چہرے کے سامنے ... لیا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اخبار میں ایک چھوٹا ... کروں اور اس میں سے سامنے کی پوری سڑک کو دیکھوں ... کیونکہ ڈی سلوا کی گاڑی کو ادھر سے ہی آنا تھا لیکن ... اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈی ... کی گاڑی میرے بہت قریب آ کے رکے گی اور ڈی ... بھی شہلا سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرے گا۔ چند ... اس مختصر سے وقفے میں ہی مجھے اپنا کام دکھانا ہوگا ... اخبار کھولے خبریں پڑھتا رہا لیکن درحقیقت ... آنکھیں الفاظ کو بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میرے ... صرف آواز پر لگے ہوئے تھے۔ نو بج کے پانچ منٹ پر ایک گاڑی نے بریک لگایا اور رک گئی۔ میں ... ڈی سلوا کی آواز سنی جس نے بڑی خوش دلی کے ... کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ گاڑی صدر کی طرف سے ... اس لیے آگے والی سیٹ کا دوسرا دروازہ مخالف ...

راؤنڈ اباؤٹ کی طرف تھا اور ڈی سلوا بھی اب ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ شہلا نے گن کر چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ میں پیچھے سے گھوم کر دروازے تک جا پہنچا۔ اس سے پہلے کہ ڈی سلوا صورتِ حال کو سمجھتا یا سنبھلتا، میں اس کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کر چکا تھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ ریوالور گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نیچے تھا چنانچہ باہر سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"واٹ اِز آل دِس؟" ڈی سلوا نے کچھ دیر بعد اپنے حواس پر قابو پا کے کہا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں مسٹر ڈی سلوا؟" میں نے بلاوجہ مسکرا کے کہا۔ "میں تمہارا دوست سکندر بخت ہوں اور تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، تم کچھ اور کرنا چاہتے ہو۔" ڈی سلوا بولا۔ "ایسے کوئی بات نہیں کرتا۔ بات کرنی ہوتی تو تم مجھے ٹیلی فون کرتے یا دفتر آجاتے لیکن اس غیر شریفانہ طریقے پر میرا راستہ نہ روکتے۔"

"اگر تم اتنے سمجھدار ہو تو دیر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی تک لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تم مجھے لفٹ دینے کے لیے رکے ہو۔ کسی کو شک ہونے سے پہلے گاڑی آگے بڑھا دو اور واپس چلو۔ انکار کرو گے تو۔۔۔"

"تو تم مجھے گولی مار دو گے؟" وہ نفرت اور حقارت سے تلخ لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے، مار دو گولی۔ میں دیکھوں گا کہ تم بچ کر کہاں جاتے ہو۔ ایک قتل کا الزام تم پر پہلے ہی ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے بھی کام لینا جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔" وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا اور اس کا مقصد صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک وہیں الجھائے رکھے۔ ریوالور میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اتنی پھرتی سے حرکت میں آیا کہ ڈی سلوا کوشش کے باوجود نہ بچ سکا اور ضرب گردن کے سامنے والے حصے پر پڑی جس نے اسے مفلوج کر دیا۔ میں فوراً باہر آیا اور سامنے سے گھوم کر ڈی سلوا کی طرف پہنچا۔ اخبار اڑ کے دور جا چکا تھا۔ موٹر سائیکل وہیں کھڑی تھی اور شہلا میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کے ڈی سلوا کو آگے دھکیلا اور خود اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی کہ راؤنڈ اباؤٹ کا چکر کاٹ کے گزرنے والوں میں سے کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا لیکن نیوٹرل تھا۔ میں نے پورے اطمینان سے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا سر پیچھے کیے نیم دراز تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کیے آرام کر رہا ہو۔ نہر کے پل پر محسن سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ اس نے ڈی سلوا کو پیچھے والی سیٹ پر ڈال دیا۔ پل سے ہم بائیں طرف گھوم گئے اور سیدھے چلتے گئے۔ میری آنکھوں نے وہ مقام بھی دیکھا جہاں ایک شخص سڑک کے کنارے ہمیں کچھ بتانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے دو الفاظ اب بھی مجھے یاد تھے۔ ان میں سے ایک سراج تھا لیکن دوسرے کا مطلب ہنوز غیر واضح تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ راج۔ راجہ یا راجگڑھ۔ یہ جگہ اس وقت بھی غیر آباد تھی۔ اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ کبھی کوئی سائیکل سوار گزر جاتا تھا۔ ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ ہوش میں آنے لگا ہے۔ گاڑی روک کے میں نے ڈکی کھولی مگر اس میں کوئی رسی یا تار کا ٹکڑا نہیں تھا جس سے ڈی سلوا کے ہاتھ پیر باندھے جا سکتے۔ سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے کی ربر لائننگ کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر الگ کیا۔ اس کے دو ٹکڑے بہت کارآمد ثابت ہوئے اور میں نے ڈی سلوا کو نیچے سے اوپر تک اس طرح باندھا کہ شاید اس کے ہاتھ پیروں کی خون کی گردش بھی رک گئی ہوگی۔ اس کے منہ میں رومال ٹھونس کر ہم پھر چل پڑے۔ ربڑ لائننگ کے نکل جانے سے دروازے بند ہونے کے باوجود کھڑکھڑانے لگے تھے۔ ابھی ہمارے ذہن میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ڈی سلوا کو اسیر رکھا جا سکتا لیکن ہم جانتے تھے کہ مضافات میں ہمیں بھی کوئی نہ کوئی نامکمل خالی کوٹھی مل جائے گی۔ ماڈل ٹاؤن کے علاقے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اپنا گھر دیکھا جو اب میرا نہیں تھا۔ اس کی پُرآسائش مسرت بخش اور اپنائیت کے احساس سے معمور فضا میں میرے لیے ایک سوگوار اجنبیت تھی۔ میں ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا۔ اگلے موڑ پر میرے پیر نے خود بخود بریک پیڈل کو دبا دیا اور گاڑی کے پہیے جام ہو گئے۔ محسن نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"یہ قصرِ جمشید ہے۔" میں نے کہا۔ "خسرو جمشید کا گھر۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس کے پاس سے گزرتا تھا اور جو چیز مجھے سب سے زیادہ پرکشش لگتی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھی وہ پھولوں کے رنگ تھے۔"

"لیکن اب تو یہاں دھول اڑ رہی ہے" محسن نے کہا۔" معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی رہتا بھی نہیں۔"

میں نے نیچے اتر کے دیکھا۔ زرد پتھر کے اونچے گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی پیتل کی لائٹس کی آب و تاب ختم ہو چکی تھی۔ سنگِ مرمر کی تختی پر لکھے ہوئے قصرِ جمشید کے حروف بھی ماند پڑ گئے تھے اور وسیع و عریض لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے بنا ہوا گیٹ بند تھا۔ اس کے دونوں پھاٹک آپس میں ملا کے لوہے کی زنجیر سے باندھ دیے گئے تھے اور زنجیر میں پرانے وقتوں کا بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ زنگ کا رنگ سب پر غالب تھا لیکن مجھے جس چیز نے متوجہ کیا وہ پھاٹک کے نیچے کی زمین تھی۔ اس پر دونوں جانب بارش سے بہہ کر آنے والی مٹی جمع ہو گئی تھی اور اس مٹی میں گھاس اُگ آئی تھی۔ پھاٹک کے دونوں پٹ اب زمین میں پیوست نظر آتے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ برسوں سے کوئی بھی اس دروازے سے نہیں گزرا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ تین فٹ اونچی دیوار کی فصیل تھی اور اس فصیل پر گیٹ کے ڈیزائن کی گرل نصب تھی۔ کسی دشواری کے بغیر میں اور محسن اندر اتر گئے اور گیٹ سے حویلی جیسے مکان تک جانے والے ویران راستے پر چلنے لگے۔ باغ کسمپرسی کے عالم میں تھا۔ لان کی جگہ خودرو گھاس لہرا رہی تھی اور پھولوں کی جگہ جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے گول محرابی روشن دان والی کھڑکیاں تھیں جو سب بند تھیں اور ان کے شیشے جابجا ٹوٹے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہم دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا اور اس کا جواب قصرِ جمشید کی خانہ ویرانی تھی۔ خسرو جمشید نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ یہاں رہائش پذیر ہوتا تو اس گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ محض تجسس سے مجبور ہو کے ہم نے اس خانہ ویران کے گرد ایک چکر لگایا۔ اس خاموشی میں جہاں ہمارے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی صدا نہ تھی۔ ہمارے کان کسی انسانی آواز کے منتظر نہ تھے چنانچہ کسی نے ہمارے پیچھے نمودار ہو کر بات کی تو ہم دونوں اچھل پڑے۔

"کا ہا دیکھت ہو سرکار؟" ایک بوڑھے نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ضرور ہو گی لیکن وہ صحت مند آدمی تھا جس کا گٹھا ہوا سیاہ بدن دھوپ میں چمک رہا تھا اور وہ صرف دھوتی میں ملبوس تھا۔

"ہم خسرو جمشید صاحب سے ملنے آتے تھے" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"نواب صاحب سے؟" بوڑھے کی ... جمی رہیں۔" ہمار سنگ مجاک کرت ہو بابو؟"

"مذاق کی اس میں کون سی بات ہے؟"

"کیا نواب صاحب یہاں نہیں رہتے؟"

"رہت ہیں حجور!" اس نے طنز ... ہاتھ سے اشارہ کیا۔" مالک ہیں... تو گھر ..."

میری اور محسن کی آنکھوں نے ایک ... جہاں ایک مختصر سی شکستہ چاردیواری کے ... مرمر سے ڈھکی ہوئی قبر نظر آ رہی تھی۔ چاروں ... سے آٹھ فٹ اونچے ستون کھڑے تھے ... ایک چھت قائم تھی۔ میرے ذہن میں خسرو ... کے ہم شکل کا حلیہ تھا اور وہ سب باتیں تھیں ... مجھ سے کی تھیں۔

"اگر یہ نواب خسرو جمشید کی قبر ہے" میں ... ہوئے کہا۔" تو اس محل کا موجودہ مالک کون ... پرویز؟"

بوڑھے نے آہستہ آہستہ اقرار میں سر ہلایا ... آپ تو نواب جمشید سے ملنے آئے تھے سرکار؟"

"وہ کچھ غلط فہمی ہو گئی" میں نے کہا ... غلط بتا دیا۔ خیر، یہ خسرو پرویز صاحب کہاں ...

"چھوٹے نواب تو دس سال سے ولایت ... ہیں" وہ اسی مشکوک لہجے میں بولا۔

"عجیب بات ہے۔ کیا گزشتہ ہفتے ... نہیں تھے پاکستان میں؟"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا شک ... میں بدلنے لگا تھا۔" چھوٹے نواب ادھر ہوتے ... معلوم نہ ہوتا؟ وہ ادھر بیاہ کر لیے ہیں کسی میم ... سال پہلے آئے تھے، پھر نہیں آئے۔"

"اور تم یہاں چوکیداری کر رہے ہو؟" محسن نے ... مطلب ہے ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ خیر تم ... ضرورت نہیں۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔ صرف ... اور پوچھنی تھی کہ مرحوم نواب خسرو جمشید کا حلیہ ... اس نے کم سے کم الفاظ میں خسرو جمشید کا وہ حلیہ ... ہم نے دیکھا تھا۔ بوڑھا دربان حیرانی سے ... ہم اس کے لیے بہت پُراسرار اجنبی بن گئے ... یہ معلوم نہیں تھا کہ خسرو جمشید کو مرے ہوئے ... ہے اور ان کا بیٹا خسرو پرویز ولایت میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے جو حلیہ بیان کیا تھا وہ سو فیصد مرحوم نواب کی تصویر تھا۔ دربان کو حیرانی تھی کہ ہم نے ان کو کہاں دیکھ لیا ہے۔ ہماری تو اپنی عمر بھی اتنی نہیں تھی جتنا عرصہ نواب خسرو جمشید کے انتقال کو ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس کو یہ اطمینان دلا دیا کہ ایک زمانے میں میرے والد کی کوٹھی بھی قریب ہی تھی اور میں قصرِ جمشید کو گلشن کی طرح آباد دیکھ چکا ہوں تو دربان نے ایک سرد آہ بھر کے تسلیم کیا کہ اس زمانے میں چھوٹے نواب یہیں رہتے تھے اور وہ اپنے والد کا نقشِ ثانی تھے مگر وہ کسی میم کے چکر میں ایسے اسیر ہوئے کہ آزادی کے بعد اس کے ساتھ چلے گئے کیونکہ وہ کالے لوگوں کی اس دنیا میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ انہوں نے ولایت جا کے ہی شادی کی اور سنا ہے اب ان کا لڑکا جوان ہے۔ وہ میم ان کو چھوڑ چکی ہے۔

"کیا مرحوم نواب کی یا ان کے بیٹے کی کسی سے جانی دشمنی تھی؟" میں نے کہا۔

"دوست دشمن تو سب کے ہووت ہیں سرکار!" دربان بولا۔" پر ہمارے بڑے نواب کا جانی دشمن؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔" اُن کی جان کا دشمن کوئی کیسے ہو گا جو انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔"

اس بوڑھے سے کچھ اور کہنا سننا بے کار تھا۔ ہم نے اس سے شریفانہ انداز میں معذرت چاہی اور باہر نکل آئے۔

"کسی نے ہمارے ساتھ بہت بڑا فراڈ کیا ہے محسن!" میں نے گاڑی کے قریب رک کر کہا۔" اس نے ہماری لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نواب خسرو جمشید کا بہروپ اختیار کیا۔ ایک جھوٹی کہانی سنائی اور وہ جائیداد ہمیں فروخت کر گیا جو خسرو جمشید کی ہرگز نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ رابعہ کا سب پیسہ ڈوب گیا؟" محسن نے کہا۔" اور اس کا پلاٹ بھی ہاتھ سے گیا؟"

"نہیں۔ جو مکان نقلی خسرو جمشید نے اونے پونے بیچ دیا ہے وہ اس کی اپنی ملکیت ہے کیونکہ اس کے کاغذات جعلی نہیں تھے" میں نے کہا۔" صرف کاغذات میں مالک کا نام اور پتہ غلط تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آج اگر میں کوئی پلاٹ خرید کے مکان تعمیر کر دوں تو میں بھی اپنا نام خسرو جمشید اور یہی پتہ لکھوا سکتا ہوں۔ لیز اور رجسٹری کرنے والوں کو شک کیوں ہونے لگا؟ انہیں کیا معلوم کہ شہر میں کتنے خسرو جمشید ہیں اور کہاں کہاں رہتے ہیں۔ سیکنڈ کی رقم تو گئی مگر پلاٹ کی منتقلی روکی جا سکتی ہے۔ معاہدے پر خسرو جمشید نے خود دستخط کیے تھے چنانچہ اس کا اتنی اعتراض نہیں اٹھا سکتا۔ خلاف ورزی پر قانونی کارروائی کے لیے خسرو جمشید کو خود سامنے آنا پڑے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دھوکا دہی کی اس واردات کا مقصد کیا تھا؟" محسن نے کہا۔" نقصان میں آخر کون رہا؟"

"تو صرف دو چار لاکھ کے نقصان کی بات کر رہا ہے" میں نے کہا۔" انہوں نے تو جوا کھیلا تھا اگر وہ جیت جاتے تو انہیں کتنا فائدہ ہوتا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود ہم اس گھر میں رہنے کے لیے نہیں گئے ورنہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں سب کا قصہ پاک ہو جاتا۔ پلاٹ کی منتقلی کو روکنے سے قانونی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ رابعہ اُس مکان کو فروخت کر کے دوگنی قیمت وصول کر لے۔ اپنی ناکامی کا احساس دشمنوں کو جب ہو گا جب ہماری بجائے وہاں کوئی اور رہائش اختیار کرے گا۔ اگر انہوں نے مکان کے نیچے ہر کمرے میں بارودی سرنگ بچھا رکھی ہوں گی تو ان کا سارا انتظام بے مصرف ہو گا۔ وہ کسی غیر متعلق اور بے گناہ شخص سے اپنی ناکامی کا انتقام نہیں لیں گے۔"

میں نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ماڈل ٹاؤن سے باہر نکل آئے۔

"ان کی اسکیم تھی بہت شاندار" محسن بولا۔" پلاٹ بھی اچھا تھا اور اس کے دو مرکزی کردار اپنا رول بہت اچھی طرح نبھا گئے لیکن وہ تھے کون؟"

"قیاس آرائی سے اس سوال کا جواب دینا" میں نے کہا۔" بہت مشکل ہے جب حالات سے پردہ اٹھے گا تو یہ کردار بھی اپنے اصل چہروں کے ساتھ سامنے آ جائیں گے۔ ابھی ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ بھی شکاری تھے۔"

"ڈی سلوا، چوہدری دلاور یا سیٹھ دلاور کے گروہ کا بیرون ملک تعلق تو ثابت ہے" محسن نے کہا۔" انہوں نے کوشش کی تھی کہ سابق کسٹم آفیسر نعیم لندن میں ان کے لیے کام کرے مگر وہ شریف اور بزدل آدمی تھا کہ روپوش ہو گیا۔ ایک پیشکش وہ تجھ کو بھی کر چکے ہیں جسے تو نے مسترد کر دیا۔ کیا یہ بات خارج از امکان ہے کہ لندن میں رہنے والا نواب خسرو جمشید کا بیٹا ان کا آلۂ کار بننے پر رضامند ہو گیا ہو یا مجبور ہو گیا ہو۔۔۔ بہت سے نواب

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ولایت میں جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور نوابی ٹھاٹ برقرار رکھنے کے لیے ضرورت مند رہتے ہیں۔"

"تُو نے کمال ہی کر دیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سخت حسد محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی۔ یہ واقعی ہو سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی کردار خسرو پرویز ہو اور اسی نے خسرو جمشید کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرنے کے علاوہ یہ رول بھی ادا کیا ہو۔ اس کے پاس یقیناً لندن کی شہریت ہوگی چنانچہ ہم پاکستانی سفارت خانے سے زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے لیکن برطانوی ہوم آفس شاید ان کا موجودہ پتہ بتا سکے ورنہ یہ تو معلوم ہو ہی سکتا ہے کہ خسرو پرویز نام کے کسی مسافر نے پی آئی اے یا بی اے او سی کے کسی طیارے سے سفر کیا ہے یا نہیں اگر انہوں نے اصل نام سے سفر کیا ہوگا تو پاسپورٹ سے دوسری تفصیلات بھی حاصل ہو جائیں گی ورنہ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ لندن سے کراچی تک تو ہر ایئر لائن آتی ہے۔"

آبادی اب خال خال رہ گئی تھی۔ میں اور محسن باتوں کے ساتھ یہ بھی دیکھتے جا رہے تھے کہ کون سی جگہ ہمارے مقصد کے لیے موزوں ہے۔ بہت سی کوٹھیوں میں زنگ آلود تالے پڑے ہوئے تھے مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کا محافظ بھی کوئی نہیں ہے۔ بہت سی کوٹھیاں زیر تعمیر تھیں اور بہت سی نامکمل بھی رہ گئی تھیں مگر ان کے آس پاس آبادی تھی۔ بالآخر مجھے ایک دو منزلہ عمارت کا ڈھانچہ نظر آیا۔ آثار بتاتے تھے کہ مدت سے اس میں ایک اینٹ کا اضافہ بھی نہیں ہوا۔ نیچے والی منزل تقریباً مکمل تھی مگر رنگ و روغن سے عاری دروازے اور بغیر شیشوں والی کھڑکیوں کے پٹ کھلے پڑے تھے۔ میں نے اندر گھوم پھر کے اور "کوئی ہے" کی صدا لگا کے اطمینان کر لیا کہ اندر واقعی کسی فقیر کا ڈیرا بھی نہیں۔ ہم گاڑی کو اندر لے گئے اور ڈی سلوا کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ اب ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کھول کے سیدھا بٹھا دیا اور اس کے منہ میں سے رومال نکال دیا۔ وہ کچھ دیر لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ہمیں خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔

"اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں لاتے ہو۔" اس نے عادتاً انگریزی میں کہا۔ "تو جلد از جلد اپنا کام ختم کرو۔"

میں نے اس کے ایک لات رسید کی اور وہ فرش پر گر گیا۔ "یہاں بھی حکم چلاتا ہے ہم پر۔ حکم کے غلام۔" میں نے کہا۔ "کیا اب بھی یہ بات سمجھانی ضروری ہے کہ ... مالک ہوں اور تم نوکر ہو۔"

"اس کے علاوہ ہم جلدی میں کوئی کام کرنے کے قائل نہیں مسٹر ڈی سلوا!" محسن نے بالوں سے پکڑ کر ... بٹھا دیا۔

"ہم تمہیں ماریں گے بھی تو آہستہ آہستہ ..." اس کے دوسری لات ماری اور وہ پھر گر گیا۔ "... ہمیں تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور قبول کروانا ..."

"حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح ... کیے جانے والے اعتراف جرم کی قانونی حیثیت ... ہوگی۔" محسن نے اسے پھر بٹھا دیا۔ "لیکن تم لاتوں ... بھوت ہو، تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ..."

"پھر بھی ہم تمہاری زبان سے ان سب ... کی تصدیق چاہتے ہیں جو ہمیں معلوم ہو چکی ہیں ..." پھر اسے لات مار کر گرا دیا۔ "لیکن تم سمجھتے ہو کہ ہم ... معلوم۔" میں نے لات مارتے وقت یہ خیال رکھا ... سخت نہ پڑے ورنہ پہلی دفعہ میں اس کے جبڑے اور ... ٹوٹ جاتے۔ دوسری بار اس کی پسلیاں ٹوٹ جاتیں ... اور تیسری لات سے وہ جہنم رسید بھی ہو سکتا تھا۔ ... بھی وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کی حالت غیر ہو ... تھی۔ وہ کچھ دیر فرش پر پڑا ہانپتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ... ہاتھوں کے بل پر خود ہی اٹھ بیٹھا۔

"ایک بار یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا ... رابعہ کے ساتھ بھی۔" میں نے کہا۔ "تقدیر یاور تھی اور ... میں نے خداداد ذہانت سے بھی کام لیا، اس لیے میں ... رہا۔ آج میں تمہیں اپنی قسمت آزمانے کا موقع فراہم کروں ... گا۔ تم خود کو بہت ذہین بھی سمجھتے ہو۔ ہم دیکھیں گے ... تم بھی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوتے ہو یا نہیں ... حالات بالکل وہی ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ... چیخنے چلانے سے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا، تمہاری ... لیے کوئی نہیں آئے گا اور ہم بہت دور ہوں گے ... بچ نکلے تب بھی ہم پر کوئی الزام ثابت نہیں کر ..."

محسن اتنی دیر میں سوٹ کیس لے آیا تھا ... کندھے پر چڑھ کے اس نے بارہ فٹ اونچی چھت ... وسط میں لگے ہوئے لوہے کے ہک کو پکڑ لیا جو پنکھا ... لٹکانے کے لیے لگایا گیا تھا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ... میں بندھی ہوئی پتلی سی نائلون کی ڈوری کو ہک ... نیچے اتر آیا۔ رسی کافی لمبی تھی۔ اس کے دوسرے ... سرے کو تھام کر اس نے ایک بار پھر مجھے سیڑھی کے ... طور پر استعمال کیا اور رسی کو روشن دان میں سے باہر پھینک دیا۔ ڈی سلوا اس تمام کارروائی کو دہشت زدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ محسن نے مجھے بتایا کہ اس ڈوری کے ساتھ ساتھ تانبے کا باریک سا تار بھی لپٹا ہوا ہے جو ایریل کا کام کرے گا اور آواز کی لہروں کو تقریباً سو گز نصف قطر کے دائرے میں نشر کرنے اور ریسیو کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر اب کمرے کے فرش پر ہک کے بالکل نیچے رکھا ہوا تھا لیکن روشن دان سے گزر کے باہر جانے والی رسی کو کھینچا جاتا تو وہ چھت سے جا لگتا لیکن ابھی محسن کو اس میں کچھ کام کرنا تھا جس میں میری موجودگی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ وہ سوٹ کیس میں اپنے لیے سینڈوچ اور گرم چائے سے بھرا ہوا تھرماس بھی لے کر آیا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے اجازت دی کہ میں اطمینان سے اپنا کام کر آؤں۔

"ہو سکتا ہے مجھے دو تین گھنٹے لگ جائیں۔" میں نے روانگی سے پہلے کہا۔ "یا اس سے بھی زیادہ۔ میری طرف سے بے فکر رہنا لیکن اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔" میں نے ڈی سلوا کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہاتھ پھر کمر کے پیچھے کر کے باندھ دیے۔

"اگر اس نے گڑبڑ کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" محسن نے ریڈیو کا پچھلا حصہ کھولتے ہوئے کہا اور ڈی سلوا کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"مار دینا۔" میں نے بھی اسی بے نیازی سے کہا۔

"گولی کی آواز سننے والا کون ہے۔"

"لاش کہاں دفن کریں گے؟" محسن بولا۔ "کسی کھنڈر میں؟"

"ہاں۔ کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں ابھی فرش بھی کچا ہے اور دوسرے کمرے میں تو ریوڑی بھی ایک طرف پڑی ہے قبر کھودنے میں آسانی رہے گی۔"

"مگر اس کے لیے بیلچے وغیرہ تو لانے پڑیں گے؟" محسن اپنے کام میں مصروف رہا۔ اتنے پُرسکون لہجے اور انداز بے نیازی کے ساتھ گفتگو کرنے کا مقصد ڈی سلوا کو دہشت زدہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ "لاش کا کیا ہے۔ کسی گٹر یا کنوئیں میں بھی ڈالی جا سکتی ہے۔"

"پاگل ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "لاش بُو دینے لگے گی تو پولیس والے گدھ کی طرح آ جائیں گے۔"

"پھر کیا ہوا۔" میں نے کہا۔ "بس کپڑے اتار لیں گے یا زیادہ سے زیادہ سر کاٹ کے کہیں اور گاڑ دیں گے۔ پولیس کا باپ بھی شناخت نہیں کر سکتا۔"

"تم دونوں... مجھے ختم کر کے... تم بچ نہیں سکو گے۔" ڈی سلوا دہشت سے چلایا۔ "تمہیں بھی پھانسی ہوگی..."

میں ہنسا اور باہر نکل گیا۔ چابیاں ابھی تک ڈی سلوا کی گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے بیک کیا اور اسی راستے پر چل پڑا جس راستے سے ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں نے ہر موڑ کی نشانی کو ذہن میں رکھا تاکہ واپسی آسان ہو اور میرے بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ گاڑی بہت شاندار تھی اور اشارے پر یوں چلتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اڑ رہی ہے۔ میں نے شیشے چڑھا کر اس کا ایئر کنڈیشنر آن کر دیا۔ مجھے اب شہر کے دوسرے کنارے تک جانا تھا۔ پینتالیس منٹ کے اس راستے کو طے کرتے ہوئے میں نے کار کے ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے ریڈیو کو آن کیا اور کہیں سے موسیقی کا کوئی پروگرام سننے کی کوشش کی مگر لاہور سے پنجابی فلموں کے بے سرے یا اشتہاری پروگرام نشر ہو رہے تھے۔ جالندھر امرتسر سے عورتوں کے پروگرام میں بے مقصد زنانہ گفتگو چل رہی تھی اور جموں سری نگر سے دیہاتی بھائیوں کو مفید مشورے دیے جا رہے تھے۔ باقی اسٹیشن چلتی ہوئی کار کے شور میں صاف سنائی ہی نہ دیتے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے میں نے راوی کا پل عبور کیا اور "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" پہنچنے تک لاہور سے ایک غزل سننے میں کامیاب ہو گیا۔ میری توقع کے عین مطابق چوکیدار نے گاڑی کو دور سے دیکھا اور یہ غور کیے بغیر کہ اس میں کون بیٹھا ہے گیٹ پورا کھول دیا۔ گاڑی زن سے گزر گئی اور کسی کو میری ایک جھلک بھی نظر نہ آئی۔ میں نے گاڑی کو آفس کے بالکل سامنے روکا تو کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ ڈی سلوا مالک نہیں تھا مگر اس کا رُتبہ مالکوں سے کم بھی نہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ گاڑی کو وہاں پارک نہ ہونے دیتا۔ میں کار کے اندر بیٹھا مناسب موقعے کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے چوہدری دلاور کے سیکرٹری کو اس کے کمرے سے نکل کر ورکشاپ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ڈی سلوا کی گاڑی کو پہچان کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تھوڑا سا حیران ہوا مگر میرے قریب نہیں آیا۔ برآمدہ خالی پا کے میں دوسرے دروازے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں اندر جا پہنچا۔

میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دلاور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ خوف سے منجمد بیٹھا ہوا مجھے دیکھتا رہا جب اسے یقین آ گیا کہ میرا ارادہ اس کو فوراً گولی مار کے فرار ہو جانے کا نہیں ہے تو اس نے سخت جدوجہد کے بعد خود کو سنبھال لیا۔

"یہ کیا ڈراما ہے اپنے سکندر صاحب!" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کوئی خطا ہو گئی ہے ہم سے جنابِ عالی جو ایسے گولہ بارود لے کر حملہ کیا ہے آپ نے تو جیسے خدانخواستہ ہم آپ کے دشمن ہیں۔ جان چاہیے تو ویسے ہی حاضر ہے۔"

"تمہاری جان میرے کس کام کی ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن سیٹھ دلاور! ڈراما ابھی کہاں شروع ہوا ہے۔ یہ تو پہلا سین ہے۔ اصل ڈراما دیکھنے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے ریوالور سے اس کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس کا رنگ فق ہو گیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"میں سمجھا نہیں جنابِ عالی!"

"اچھا تو میں تم کو آسان زبان میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے مناظر تم نے فلموں میں بھی دیکھے ہی ہوں گے۔ میں صرف دس تک گنوں گا۔ اتنی دیر میں تم کو دروازے تک پہنچنا ہے۔ قتل میرے پروگرام میں شامل نہیں ہے لیکن تم خودکشی کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ کسی کو آواز دے کر دیکھو یا مقابلہ کرو۔ تمہارے قتل کا الزام ڈی سلوا پر آئے گا۔ کیسے اور کیوں؟ یہ تو جنابِ عالی! یہ بھی آپ باہر نکلتے ہی سمجھ جائیں گے۔ ایک... دو... تین... چار..." شاید میرے ارادے کی مضبوطی کا اندازہ اس نے میرے لہجے سے لگا لیا تھا کہ وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور ابھی میں نے نو تک ہی گنا تھا کہ دروازے تک جا پہنچا۔ خود میں بھی جوا کھیل رہا تھا اور ہر لمحہ مجھے کسی کے آ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ حل میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا اگر کوئی آ جاتا تو منظر بالکل بدل جاتا۔ ریوالور غائب ہو جاتا اور میرے ہاتھ میں میرے وصیت نامے کی نقل آ جاتی۔ سننے والا یہی سنتا کہ میں چوہدری دلاور کو یہ نقل دینے کی بات کر رہا ہوں اور چوہدری دلاور کے لیے ثابت کرنا ناممکن ہو جاتا کہ میں اس کو زبردستی اغوا کر کے لے جا رہا ہوں۔ میں اس کو کیوں اغوا کر رہا ... کیسے... دن دہاڑے فیکٹری میں سے فیکٹری ... کو اٹھا کر لے جانا کوئی سمجھ میں آنے والی بات ... منٹ کے وقفے میں کوئی بھی حائل نہیں ہوا۔ خطرہ آخری سرحد برآمدہ تھا جہاں کوئی بھی مجھے دیکھ ... گڑبڑ ہو جاتی چنانچہ میں نے صرف ایک آدمی کو ... مخالف سمت میں جاتے دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا ... پہلے چوہدری دلاور کو اور پھر مجھے گاڑی میں داخل ... نہیں دیکھا۔

"گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے دروازہ بند کر ... حکم دیا۔ "اور اطمینان سے گیٹ کی طرف چلو۔ ایک ... کو ذہن میں رکھنا کہ گیٹ پہ کسی کو شک نہیں ہو ... ورنہ میں خود بھی گاڑی چلانا جانتا ہوں۔ تمہیں شوٹ ... بھی میں گاڑی نکال لے جاؤں گا لیکن دیکھنے والے ... دیں گے کہ تمہیں ڈی سلوا نے گیا ہے۔"

"آپ بڑے بھولے ہیں اپنے سکندر صاحب!" ... نے کہا۔ "کسی کے کچھ بھی کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ڈی ... اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہو گا اور اس کے گواہ ... ہوں گے۔"

"عجیب بات ہے دلاور!" میں نے کہا۔ "کہ ڈی سلوا آفس پہنچا ہی نہیں حالانکہ وہ گھر سے آفس جانے کے ہی لیے نکلا تھا اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو ... کرتا اور آپ ٹیلی فون کر کے تصدیق کر لیتے لیکن ... گاڑی چلائیے جنابِ عالی!"

چوہدری دلاور کو یقین آ گیا کہ میں جھوٹ نہیں ... رہا ہوں اور اس کے خلاف سازش کا یہ جال بہت ... ہے۔ اس نے گاڑی کا رخ دروازے کی طرف موڑا ... بالکل تیار تھا کہ وہ ذرا بھی غلط حرکت کرے تو گولی ... بجائے ریوالور کا دستہ مار کے کام چلاؤں۔ چوکیدار ... گیٹ کھولا اور چوہدری دلاور کو گاڑی چلاتے دیکھا ... بھی کیا۔ سبز رنگ کے شیشوں میں سے اس نے ... کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھی ہو گی۔ میں دوسری طرف ... اور ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنا چہرہ بھی مخالف ... میں کر لیا تھا۔ گاڑی پھاٹک میں سے گزر گئی تو میں ... دلاور سے کہا۔ "اس وقت تم نے عقل مندی سے کام ... کر اپنے بچوں کو یتیم ہونے سے بچا لیا۔"

"ہم عقل مند ہوتے ناجی سکندر صاحب!" اس نے ... کہا۔ "تو اس وقت تک سمجھ گئے ہوتے کہ یہ سب کیا ... ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟"

"آہستہ آہستہ سب باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔" میں ... نے کہا۔ "معاملات کو سمجھنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ ... اب ... بھی دیکھیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ولایت سے آئے ... بہت سی باتوں کو اور بہت سے انسانوں کو ... سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کامیابی ابھی تک نہیں ... ہے مثلاً میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میر شرافت علی ... کس نے قتل کیا... وزیر خان کے قاتلوں کے بارے میں ... مجھے معلوم ہے کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ بس میں ... ان کو کسی عدالت میں نہیں لے جا سکتا۔ میری سمجھ میں یہ بھی ... نہیں آتا کہ جس شخص نے آپ کے ایک بزنس پارٹنر کی حیثیت ... سے سال گزشتہ کا منافع ساڑھے تین لاکھ روپے وصول ... کیا علاوہ سرکاری اسپتال سے ملنے والی مفت دوائی کے ... وہ تمہارا پارٹنر تھا۔ اس نے تمہیں اس قابل ... کیوں نہیں سمجھا... ؟"

"تم بھی تو اس کی ایک ہی اولاد تھے۔" دلاور نے ... میری بات کاٹ دی۔ "اس نے تمہیں قابلِ اعتماد کیوں نہیں سمجھا؟"

"قابلِ اعتماد" یہ لفظ ایک طمانچے کی طرح تھا جو ... میرے منہ پر پڑا۔ اس طمانچے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن میں اس ... کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ عدم اعتماد ... نہیں ... بات نہیں تھی۔ خوف تھا یا اندیشہ تھا جس نے وزیر خان ... کو ... رکھا۔ خوف کس کا تھا اور اندیشہ کس سے تھا ... اس کے لب کھولنے سے خطرہ میری زندگی کو لاحق ہوتا ... تھا یا اس کی اپنی زندگی کو؟ یہ اور ایسے ان گنت سوالوں کا ... جواب بھی معمائے زندگی تھا اور میری ساری جدوجہد اس ... کے لیے وقف تھی۔

"وقت نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے سیٹھ دلاور!" ... میں نے کہا۔ "وقت تمہیں بھی بہت کچھ بتا دے گا۔ دیکھنا یہ ... ہے کہ وقت سے لڑنے کا حوصلہ کس میں زیادہ ہے۔ اس ... کے تمام ہونے سے پہلے تمہیں بھی بہت سے ایسے تجربات ... ہوں گے جو تمہارے گمان میں بھی نہیں ہیں۔ گاڑی کو ماڈل ... ٹاؤن کی طرف جانے دو۔ ان راستوں سے تم اچھی طرح ... واقف ہو۔"

ماڈل ٹاؤن پہنچنے کے بعد میں نے دلاور کی راہنمائی کی۔ اتنی دیر میں دلاور نے بھی صورتِ حالات کو سمجھ لیا تھا۔ اس کا خوف زدہ ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن وہ بہت اچھا اداکار تھا۔ اس کے نمونے میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ایک رات وہ بیابان کر مجھ سے ہمکلام ہوا تھا۔ دوسری بار میں نے اس کی آواز فرشتۂ اجل کی طرح ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر سے سنی تھی لیکن کسی بھی موقع پر وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ قصرِ جمشید کے سامنے پہنچ کر میں نے اسے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

"یہ ویران حویلی ایک ایسے شخص کی ہے جو مجھ سے اپنی موت کے چالیس سال بعد ملا۔" میں نے کہا۔ "یہی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کا ہمزاد بھی تھا۔"

"یہ قصے کہانیاں مجھے سنانے کا کیا مقصد ہے اپنے سکندر صاحب!" وہ بولا۔

"کچھ لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہر شخص کا ایک ہمزاد بھی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اسے قابو بھی کیا جا سکتا ہے۔ روحوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات واقعی قابلِ غور ہے کہ چالیس سال بعد اگر نواب خسرو جمشید کی روح کو دنیاوی معاملات میں دخل دینا ہی تھا تو اس نے اپنے ہمزاد کو بلاوجہ کیوں زحمت دی۔ کیا ہمزاد کی کوئی اپنی روح بھی ہوتی ہے؟"

میں نے قہقہہ مارا۔ "تم تو مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے میں فارسی بول رہا ہوں۔ حالانکہ جو بات ہے وہ تم سمجھ گئے ہو۔" وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا چنانچہ میرے اچانک وار سے وہ خود کو بچانے کی کوشش بھی نہ کر سکا اور وہیں سیٹ پہ لڑھک گیا۔ اس کی جگہ ڈرائیونگ سنبھال کے میں گاڑی کو پھر وہیں لے گیا جہاں محسن میرے انتظار میں اور اپنے کام سے تقریباً فارغ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر نئے شکار کو دوسرے کمرے میں منتقل کیا اور بے دست و پا کر کے ڈال دیا۔

محسن نے کمال مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اصل وسیر ریڈیو ٹرانسمیٹر میں بھی فیوز کا نظام تقریباً ویسا ہی تھا جیسا پہلی بار مجھے ختم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پیچھے والے خانے میں سیل اوپر تھے اور نیچے ڈبور لاک کی چابی استعمال نہیں کی گئی تھی۔ تقریباً دو انچ لمبا لوہے کا ٹکڑا تھا جس کے آخری کناروں سے دونوں طرف بال جیسے باریک تار بندھے ہوئے تھے اور یہ تار بھی باڈی کے اندر غائب ہو جاتے تھے۔ محسن نے پھیلی بیٹری کی ڈور کا ایک سرا پوری احتیاط سے مضبوطی کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ صرف ایک جھٹکا دینے سے وہ ٹکڑا سیلوں کے ساتھ باہر آ گرتا اور دونوں کناروں سے منسلک باریک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تاروں کے ٹوٹتے ہی بم پھٹ جاتا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کا پچھلا حصّہ محسن نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور دو قطاروں میں لگے ہوئے آٹھ نئے سیل صاف نظر آتے تھے۔ ڈور کا دوسرا کنارہ ایسے ہی جھول رہا تھا لیکن محسن نے پرانی وضع کی ایک گھڑی اپنے سوٹ کیس میں سے برآمد کی۔ اس نے ڈور کو ٹائم پیس کے پیچھے والے حصّے میں ایک چابی سے لپیٹ کر دکھایا۔

"اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔" محسن نے گول ٹیبل کلاک کا رخ میری طرف کیا۔ گھڑی چل رہی تھی اور خالی کمرے میں اس کی ٹک ٹک صاف سنائی دیتی تھی —— اس میں الارم بجنے کے لیے اس دوسری چابی کو دائیں سے بائیں گھمانا پڑتا ہے۔ یوں۔" اس نے مجھ سے زیادہ ڈی سلوا کی معلومات کے لیے عملی مظاہرہ کیا۔ "اب فرض کیجیے آپ دو بجے کا الارم سیٹ کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور ڈور کو اس چابی سے باندھ کر گھڑی کو اتنے فاصلے پر رکھ دیتے ہیں کہ ڈور کھنچی رہے تو ٹھیک دو بجے کیا ہوگا؟"

"الارم بجنے لگے گا اور چابی مخالف سمت میں گھومے گی یعنی بائیں سے دائیں۔" میں نے کہا۔

"رائٹ۔ اور جب چابی گھومے گی تو ڈور اس پر لپٹنے لگے گی۔ الارم کے اسپرنگ کی قوت خاصی ہوتی ہے اور ڈور کو ایک ہلکے سے جھٹکے کی ضرورت ہے۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بار چابی کے گرد لپٹنے سے ڈور کا تناؤ بڑھ جائے گا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر چھت کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا ہے اور ڈور اسے نہیں کھینچ سکتی۔ ڈور ٹوٹ بھی نہیں سکتی لیکن لوہے کے ٹکڑے کو کھینچ سکتی ہے۔ سارے سیل ایک ساتھ فرش پر گریں گے اور اس کے ساتھ ہی لوہے کے ٹکڑے کا تاروں سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر دھماکا۔" اس نے اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ "جاتے وقت ہم اس گھڑی کو روشن دان میں رکھ جائیں گے۔"

"جانے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ مسٹر ڈی سلوا اپنا وصیت نامہ پڑھ لیں۔" میں نے کہا۔ اور جیب سے اپنے وصیت نامہ کی ایک نقل برآمد کی جو میں نے رابعہ سے حاصل کی تھی۔ یہ نقل میں نے ڈی سلوا کے سامنے رکھ دی جس کی حالت اس شخص سے مختلف نہ تھی جو دیکھ رہا ہو کہ اسے پھانسی دینے کے انتظامات مکمل کیے جا رہے ہیں۔

"یہ... یہ تو تمھارا وصیت نامہ۔" وہ سرد آواز میں بولا۔

"کمال ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! وصیت نامہ ہمیشہ مرنے والے چھوڑتے ہیں۔ بفضلِ خدا میں صحیح سالم اور تندرست ہوں۔ نہ میری مرنے کی عمر ہے اور نہ میرا ارادہ خودکشی کا ہے۔ خوف نے تمھاری عقل خبط کر دی ہے۔ ایک بار پھر

ڈی سلوا کی عقل واقعی خبط ہو چکی تھی۔

وہ دوبارہ وصیت نامے کو نہ دیکھتا۔ اس میں سات علاوہ بھی بہت سے نام تھے مگر ڈی سلوا کا نام کہیں نے وہ نقل اٹھا لی اور پھر اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی بات کی سے یونہی آباد رہے گی دنیا۔ تم نہ ہو گے کوئی تم سا ہوگا۔"

"وقت بہت کم ہے۔ خدا سے اپنے تمام گناہوں کی مانگو۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ تم سکون سے مر سکو۔"

اس کے بعد محسن نے میرے کندھے پر چڑھ کر روشن دان میں رکھا لیکن ڈی سلوا کو بتائے بغیر الارم کا وقت بجے سے بڑھا کے رات کے آٹھ بجے کا کر دیا۔ ڈی سلوا تھا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا اور چیختا چلاتا دونوں بندھے پیروں پر ایک ساتھ اچھلتا ہوا ہماری طرف آیا۔ محسن رہا اور جب وہ قریب پہنچا تو اپنی ٹانگ سیدھی کی۔ جوتے کی ایڑی ڈی سلوا کے منہ پر لگی اور وہ بلبلا کے گر گیا۔ محسن گھڑی رکھ کے نیچے کود گیا۔

"دو چار باتیں اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے اپنے کپڑوں سے گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تو یہ کہ دور تک تمھاری پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم خود اپنے پیر نہیں کھول سکتے۔ کھڑکیوں میں سلاخیں ہیں اور دروازہ باہر سے بند ہے۔ بالفرضِ محال تم آزاد ہو گئے تب بھی تم نکل سکتے اور تمھارا ہاتھ نہ چھت تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کمرے کی سپاٹ دیواریں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ کمرے میں ایک تنکا تک نہیں ہے کہ تم گھڑی کو یا ریڈیو ٹرانسمیٹر کو تباہ کر سکو۔ گھڑی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے الارم کا وقت آدھ گھنٹے آگے بڑھا دیا ہے۔ یہ فیصلہ تم خود کر سکتے ہو کہ کتنی زندگی باقی ہے اور یہ وقت تمھیں کیسے گزارنا ہے۔"

اسے وہیں پڑا چھوڑ کے ہم باہر آ گئے۔ محسن کے بیگ میں اب صرف ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تھا جس میں کوئی بم نہیں تھا۔ باہر آتے ہی محسن نے اس کو آن کیا اور ڈی سلوا کے کمرے کی آواز صاف سنی۔

"ہمت سے کام لو مسٹر ڈی سلوا۔" میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کے کہا۔ "تم تو بہت بہادر بنتے تھے۔ موت کو سامنے دیکھ کر تمھاری حالت خود تمھارے لیے باعثِ شرم ہونی چاہیے۔" مجھے یقین تھا کہ کمرے میں چھت سے لٹکے ہوئے ریڈیو نے میری آواز ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچا دیا ہوگا۔

"یہ تمھارے لیے ایک آخری اطلاع ہے۔" محسن نے کہا۔ "آج کا دن تم نے کہاں اور کیسے گزارا، اس کے معتبر گواہ موجود ہیں۔ اس لیے پروفیسر کی موت کا الزام ہم پر نہیں آئے گا۔"

"آج تم نے ایک بہت ہی غلط کام کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی گاڑی میں فیکٹری گئے اور فیکٹری کے مالک کو اٹھا لائے۔ بہت سے لوگ اس بات کے گواہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اب تک تمھارے خلاف رپورٹ بھی لکھوا دی جائے گی۔ افسوس ہے کہ پہلے تو تم ملو گے نہیں اور ملو گے تو اس حال میں کہ کوئی جواب نہیں دے سکو گے۔ اگر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مالک بھی نہ ملا تو پولیس کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ وہ ذرا آسان پسند لوگ ہوتے ہیں اور بلاوجہ معاملے کو طول نہیں دیتے ہیں۔ وہ فرض کر لیں گے کہ تم سیٹھ دلاور کو لے گئے تھے اور ذاتی عداوت کی بنا پر تم نے اسے کہیں لے جا کر قتل کر دیا۔ پولیس کے پاس ایک کیس رہ جائے گا کہ تمھیں کس نے مارا تو یہ معما بھی آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔"

"فار گاڈ سیک۔" ڈی سلوا کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ "مجھے مت مارو۔ میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔"

"تم کسی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں تو نہیں کھڑے ہو ڈی سلوا!" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا فائدہ اس اعتراف کا جس کی قانونی اہمیت کچھ نہیں۔ اس وقت تو تم صرف خدا سے معافی مانگ سکتے ہو کیونکہ دنیا کے قانون کو تم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ اب یہ بھی دیکھ لو کہ قدرت کا نظامِ انصاف کیا ہے۔ تم مجھے حقِ وراثت سے محروم کرنا چاہتے تھے تاکہ سیٹھ دلاور کے لوٹے کا دولت کا مالک بن جائے لیکن اب صرف میں اس کا واحد مالک رہ گیا ہوں۔"

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" ڈی سلوا بلبلایا۔ "میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ میں تمھارا ساتھ دوں گا۔"

"مسٹر ڈی سلوا! ساتھ دینا کیسا؟ تم ایک تنخواہ دار ملازم تھے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ تم سے زیادہ قابل، فرض شناس اور وفادار منیجر مل جائے گا۔ بے روزگاری اتنی زیادہ ہے کہ جتنی تنخواہ تم لیتے تھے، اس سے آدھی بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اچھا اب ہم جا رہے ہیں۔ تمھارے پاس پورا آدھا گھنٹہ ہے۔ گڈ لک اینڈ گڈ بائی۔"

محسن نے کار اسٹارٹ کی تو میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کا تار کھڑکی سے نکال کر لونٹ پر لگے ہوئے ایریل سے باندھ دیا کیونکہ انجن کے شور کے باعث ڈی سلوا کے چیخنے چلانے منت سماجت کرنے اور رو رو کے دیوانہ وار پکارنے کی آوازیں صاف سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ہم نے بیس منٹ میں آس پاس کی کچی پکی سڑکوں پر سو گز دور جا کے بھی دیکھا۔ مواصلاتی رابطہ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا۔ ڈی سلوا نے یقیناً گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز سن لی تھی اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ اب وہ رو بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق دس منٹ میں اس کا کام تمام ہونے والا تھا۔

"یار محسن۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "کہیں یہ ڈھائی بجے سے پہلے ہی نہ مر جائے۔"

"اگر مر جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قتل کا کیس ہی نہیں بنے گا۔ یہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پھر کبھی کام آئے گا۔ کچھ دیر بعد لوٹ کر جائیں گے تو دیکھ لیں گے لیکن وہ جو دوسرے کمرے میں بڑا اسمگلر قید ہے......"

"وہ زیادہ سے زیادہ فرش پر لوٹ لگا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا ڈی سلوا کے چیخنے چلانے کی آواز سن سکتا ہے مگر وہ اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا تو ڈی سلوا کی کیا مدد کرے گا۔ چل کہیں کھانا کھا کے آتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہم گھر جا کے کھانا کھائیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "بیگم رضوی سیدھی سادی عورت ہیں۔ ان کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ ہم دو گھنٹے سے اپنے کوارٹر میں ہی تھے۔ کھانے کے بعد قیلولہ کریں گے اور انکل رضوی کے آ جانے کے بعد اطمینان سے فلم دیکھنے کے بہانے گھر سے نکلیں گے۔"

"اور یہ گاڑی۔ ابھی تو ہمیں اس کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"اس کو گھر سے دور باغِ جناح میں پارک کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "دس منٹ کا راستہ پیدل طے کر لیں گے۔"

بیگم رضوی ہمیں دیکھ کر خاصی حیران ہوئیں۔ انھوں نے بہت آسانی سے یقین کر لیا کہ ہم سوئے پڑے تھے اس لیے ٹھیک کھانے کے وقت نہیں پہنچ سکے۔ خانساماں کو ایمرجنسی میں طلب کر کے دو افراد کا کھانا حاضر کرنے کا حکم دیا گیا اور کھانا آنے تک ہم نے بیگم رضوی کو اپنی باتوں سے خوب ہنسایا۔ شوہر کی مستقل مصروفیت کی وجہ سے وہ زیادہ وقت گھر میں تنہا گزارتی تھیں اور انھیں کوئی بات کرنے والا بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب سنجیدہ مزاج تھے۔ بیگم رضوی کو اس بات کا ملال تھا کہ ہم نے الگ مکان لے کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر رابعہ بھی ہمارے ساتھ چلی گئی تو انھیں گھر سونا سونا لگے گا۔ پھر انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ رابعہ سے شادی کر لو اور اسی گھر میں رہو۔ میں نے اٹھتے اٹھتے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اس وقت تو نیند آ رہی ہے اور رابعہ بھی نہیں ہے۔ "شام کو چٹ منگنی پٹ بیاہ اور فٹافٹ۔ ایک کے بعد ایک۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "خدا نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چاہا تو یہ گھر جہاد کیمپ بن جائے گا۔" میں نے ان کو ہنستا چھوڑا اور ہم دونوں اپنے کمرے میں آ کے پڑ گئے۔ آنکھ کھلی تو پورے پانچ بجے تھے ہم نے جلد از جلد تیار ہو کے انکل رضوی کی خدمت میں حاضری دی جو لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے شاید بیگم رضوی نے دوپہر کی باتیں سنائی تھیں کہ اچھے موڈ میں نظر آتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور ان کو اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔ جب ساڑھے پانچ بجے ہمیں ان سے اجازت ملی تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ ساتھ نہیں ہو لیے یا بیگم رضوی نے اچانک فلم کا پروگرام نہیں بنایا ——

باغ جناح تک پہنچتے پہنچتے ہمیں چھ بج گئے۔ ڈرائیونگ میں نے سنبھالی اور گاڑی کو ستر اسی میل کی رفتار سے دوڑایا۔ دو جگہ ہم نے جلتے بجھتے سگنل توڑے اور ٹریفک سارجنٹ کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ بنک اسکوائر کے سگنل پر ایک سارجنٹ نے اپنی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر ہمارے تعاقب کا ارادہ کیا۔ وہ ہمارے پیچھے لگ جاتا تو ہمیں گاڑی چھوڑ کے بھاگنا پڑتا مگر اس کی موٹر سائیکل اسٹارٹ نہیں ہوئی اور ہم چند منٹ میں مال روڈ کے ختم ہوتے ہی ضلع کچہری کے پاس بائیں طرف گھوم گئے۔ ساڑھے چھ بجے تھے جب میں نے گاڑی کو پھر اسی کوٹھی کے اندر کھڑا کیا جہاں ہمارے دونوں اسیر موجود تھے۔ میں آ کے باری باری دونوں کمروں میں گیا۔ ڈی سلوا اسی طرح دست و پا بستہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ چند گھنٹوں میں اس کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن وہ زندہ تھا اس امید پر کہ موت کا وقت ٹل گیا ہے۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور چودھری دلاور کو اٹھا لایا۔ محسن کار کی ڈکی کھولے کھڑا تھا۔ میں نے چوہدری دلاور کو اسپیئر وھیل، جیک اور وھیل اسپینر کے ساتھ ہی لٹا دیا۔ دلاور کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کی خاموشی بھی التجا بن گئی تھی۔ بنڈل کی طرح بھوکے پیاسے پڑے رہنے کا اثر اس کی صورت سے عیاں تھا اور شاید سر کی چوٹ کا اثر بھی کافی تھا۔

"ہم نے تمھیں بہت مہلت دی تھی سیٹھ دلاور۔" میں نے ایک پیر پچھلے بمپر کے اوپر رکھ کے کہا "یہ غور کرنے کے لیے کہ طاقت کا غرور کتنا بے معنی ہوتا ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ وہ ان سب کے لیے کہا ہے جن کا ذکر "آدمی نامہ" میں آیا ہے ظالم اور مظلوم، محمود و ایاز، غریب و امیر، میں اور تم سب پانی کے بلبلے ہیں۔ ابھی تمھیں اندازہ ہوا ہے نا، بہت جلد تمھیں اس کا یقین بھی آ جائے گا۔ تمھیں معلوم ہے یہ گاڑی ڈی سلوا کی ہے۔ مجھے تمھارے آفس میں آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور دیکھنے والوں کو یقین ہو گا کہ تم کو ڈی سلوا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ جب تمھاری لاش اس میں سے برآمد ہو گی تو قتل کا الزام کس پر آئے گا؟ میرے باپ کا قاتل کوئی اور تھا مگر حالات نے مجھے ملزم بنا دیا، حالات ہی ڈی سلوا کو تختۂ دار پر لے جائیں گے۔ یہ بڑا عجیب کھیل ہے چوہدری صاحب جو آپ اب تک کھیلتے رہے۔ آپ قانون سے کھیلتے رہے۔ اب تقدیر آپ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ ڈی سلوا اور تم دونوں مل کر ہر جرم کرتے رہے ... کی گرفت سے محفوظ رہے کیونکہ تم تدبیر سے کام لیتے تھے ... اپنے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں چھوڑتے تھے ... وقت کبھی تم نے سوچا تھا کہ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ؟"

میں نے اس کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا۔ "تم دوسروں کی کمزوری کا اور قانون کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے اور ہنستے رہے۔ انگریز کہتے ہیں کہ ہنسنے والوں کو ہنسنے دو۔ دیکھنا یہ ہے آخری بار کون کس پر ہنستا ہے — اور کون کس کو روتا ہے۔"

"سکندر صاحب!" چودھری دلاور نے پڑے پڑے کہا۔ اس کی آواز کا سارا غرور اور اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ "مجھے مار کے تمھیں کیا ملے گا؟"

"یہ تم پوچھ رہے ہو؟" میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "مجھے وہی سب کاروبار ملے گا اپنے چوہدری صاحب! جس کے مالک آپ بننا چاہتے تھے۔"

محسن نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈکی بند کر دی اور ہم باہر نکل آئے۔ اس علاقے میں غیر آباد مکانوں کی کمی نہ تھی اور رات کے وقت تاریکی دیکھ کر یہ اندازہ کرنا اور بھی آسان ہو جاتا تھا کہ کون سا مکان لاوارث پڑا ہے۔ ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر میں نے ایک ایسے گھر کو منتخب کیا جو خالی پلاٹوں کے درمیان اکیلا کھڑا تھا اور بالکل ویران تھا۔ انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کیں اور پیدل چل کے دروازے تک پہنچا۔ بار بار کال بیل بجانے کے باوجود دروازہ کھولنے کوئی نہیں آیا تو میں نے محسن کو اشارہ کیا اور وہ ریڈیو ٹرانسمیٹر لے کر گاڑی سے اتر آیا۔ ہم دونوں دیوار پھاند کے اندر پہنچے اور پچھلے حصے کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ محسن نے ایریل کے تار کو ایک درخت کی شاخ سے باندھ کے ریڈیو ٹرانسمیٹر آن کیا۔ ہمیں صرف ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جو ڈی سلوا کے قید خانے سے زیادہ دور نہ ہو اور جہاں ہمیں کوئی بھی آتا جاتا نہ دیکھ سکے۔

"مسلسل آن رہنے سے دوسرے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے سیل ختم تو نہیں ہوئے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اتنی جلدی سیل ختم نہیں ہو سکتے۔" محسن بولا۔ "کچھ کمزور پڑ سکتے ہیں۔ اس سے صرف یہ ہو گا کہ آواز ہلکی سنائی دے گی اور زیادہ دور تک نہیں جائے گی۔"

میں نے ٹرانسمیٹر والا بٹن دبایا اور چند سیکنڈ تک کوئی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا لیکن ڈی سلوا خاموش بیٹھا تھا۔ اسیری کے پانچ گھنٹوں میں اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ ہماری مرضی کے بغیر اس کا یہاں سے زندہ بچ نکلنا مشکل ہے۔ ڈھائی بجے اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ بس اب چند سیکنڈ میں الارم بجنے لگے گا جو کوچ کا نقارہ ہو گا۔ معلوم نہیں اس نے سولی پر لٹکنے والے شخص کی طرح جان لیوا عذاب کے چند لمحے کس طرح کاٹے ہوں گے۔ ہر لمحہ عذاب کی ایک گھڑی بن گیا ہو گا۔ مگر اس وقت کے گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ خوف اور بے یقینی کے ساتھ امید بھی بیدار ہونے لگی ہو گی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم بلف کر رہے تھے۔ ہمارا ارادہ اس کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ ہم صرف اسے دہشت زدہ کرنا چاہتے تھے اور یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ان کا ہر ناجائز حربہ ہم بھی استعمال کر سکتے ہیں اور یہ مقابلہ برابر کا ہے لیکن یہ خوف ہر وقت اس پر سوار رہا ہو گا کہ نہ جانے کب الارم اچانک چلانے لگے۔ ڈھائی بجے کے بجائے ہم نے وقت کچھ اور رکھا ہو اور ہمارا مقصد اس کے لیے نزع کے کرب کو زیادہ سے زیادہ طول دینا ہو۔

"ہیلو مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا "کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو؟"

محسن نے اتنی دیر میں ریڈیو ریسیور سے ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر بھی جوڑ دیا تھا تاکہ ڈی سلوا کی ہر بات ریکارڈ بھی ہو جائے۔

"آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" ڈی سلوا نے سرسری آواز میں کہا۔

"اصل بات یہ ہے مسٹر ڈی سلوا کہ ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا "جواب دینے کے لیے تمھارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے اور اس مرتبہ شک کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ الارم کا وقت ہم نے ڈھائی بجے نہیں، آٹھ بجے کا رکھا تھا۔ انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم ٹھیک دس منٹ پہلے تمھیں نکال لیں گے۔ ورنہ دس منٹ پہلے یہاں سے چلے جائیں گے جہاں سے ہم بات کر رہے ہیں۔ یہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمارا رابطہ شارٹ رینج کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کے ذریعہ قائم ہے اس لیے ہماری آواز کوئی اور نہیں سن سکتا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تمھیں بتا دوں۔" ڈی سلوا کی آواز آئی۔

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آن کرنے کا اشارہ کیا اور اس کے مائیکرو فون پر رومال ڈال کے کہا "کیا تمھیں معلوم ہے کہ میر شرافت علی کو کس نے قتل کیا تھا — اسے کس نے قتل کروایا تھا اور کیوں؟" اب میری آواز نشر بھی ہو رہی تھی اور ریکارڈ بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈی سلوا کے کانوں تک پہنچنے والی آواز میں کوئی فرق نہ تھا لیکن مائیکرو فون پر پڑے ہوئے رومال کے باعث ریکارڈ ہونے والی آواز بالکل بدل گئی تھی۔

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ قتل کرنے والا استاد پیڈرو تھا۔" ڈی سلوا نے کہا "مجھے یہ نہیں معلوم کہ پیڈرو کو حکم دینے والا کون تھا۔ چوہدری دلاور اور میر شرافت علی ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور انھوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ پہلے وزیر جان کو اور پھر تمھیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ تاکہ ان کا کاروبار چلتا رہے۔ میر شرافت علی نے تمھارے والد کو راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنائی تھی معلوم نہیں خود اسے راستے سے ہٹانے کی اسکیم بنانے والا کون تھا۔"

"تمھارے خیال میں چوہدری دلاور کے علاوہ بھی کوئی شخص یہ کر سکتا تھا؟"

"ہاں۔ خود تمھارے والد میر شرافت علی کی جان کے دشمن تھے۔" ڈی سلوا بولا۔ "ان کے علاوہ دلاور کے دوسرے ساتھی تھے اور کاروباری حریف تھے۔ مجھے ان کے نام نہیں معلوم کیونکہ میں تو صرف دفتر میں رہتا تھا۔"

"تم بیرون ملک دوروں پر بھی جاتے رہتے تھے۔"

"ہاں۔ صرف رقم وصول کرنے کے لیے۔ مجھے معلوم نہیں رقم دینے والے کون لوگ ہوتے تھے۔" وہ بولا۔

"باہر تمھارا رابطہ جن لوگوں سے رہا ان میں خسرو پرویز نام کا کوئی شخص بھی تھا جو لندن میں رہتا ہے۔"

"خسرو پرویز مجھے لندن میں ملا ضرور تھا مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔"

"کیا خسرو پرویز ان دنوں پاکستان آیا ہوا ہے؟"

"ہاں۔ اسے دلاور نے ایک خاص کام سے بلایا تھا۔"

"وہ خاص کام کیا تھا؟ ہم سب کا قتل؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک دہشت پسند بھی آیا تھا ——" ڈی سلوا نے پھر کہا "اس نے خسرو پرویز کے کسی مکان کے نیچے بارودی سرنگیں بچھانے کا کام کیا تھا اور اس کا معاوضہ بھی لیا تھا۔ بعد میں یہ مکان رابعہ کو فروخت کے لیے پیش کر دیا گیا تھا۔"

"رابعہ کے پہلے مکان کو دھماکے سے تباہ کرنے والا بھی یہی شخص تھا؟ تم اس کا نام جانتے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ رابعہ کا گھر اسی نے تباہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیا تھا؟"

"دونوں کو پاکستان بلوانے والا کون تھا؟ سیٹھ دلاور؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کسٹم کے ایک پرانے اور ایمان دار آفیسر نعیم سے لندن میں کس نے رابطہ قائم کیا تھا؟"

"مسٹر ڈی پرویز نے۔" ڈی سلوا بولا۔ "لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

"جس کے بعد اس کی بیوی کے والدین کو قتل کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ نعیم یا اس کی بیوی کا پتہ بتلانے سے قاصر تھے اور ان کے گھر کو آگ لگا کے قتل کے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی۔ یہ کارنامہ تم نے سرانجام دیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے اس کا علم بعد میں ہوا۔"

"لیکن تم نے جرم کرنے والوں کا ساتھ تو دیا۔" میں نے کہا۔ "تم نے ایک نہیں دو لڑکیوں کو بلیک میل کر کے ان کی مدد کی۔ تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے ڈی سلوا اور وقت کم ہے۔ اس لیے میں تم سے آخری تین سوال کروں گا اور اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ میرے والد کی لاش کہاں گئی؟"

"لاش کسی جگہ دفنا دی گئی ہے لیکن مجھے وہ جگہ نہیں معلوم۔ میرا کام صرف لاش حاصل کرنا تھا اور مجھے اس کا معاوضہ پچاس ہزار روپے دیا گیا تھا۔ رقم مجھے اپنے گھر کے لیٹر بکس میں ملی تھی اور یہ کام کرانے والے نے مجھ سے ایک دن پہلے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔"

"میرا دوسرا سوال۔ ایم ڈبلیو ڈی انجنیئرنگ کمپلیکس کے نام پر چلنے والا ادارہ کس ناجائز اور غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے اور اس میں دلاور کے علاوہ کون لوگ شامل ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "کیونکہ وہ لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ میں آج نہ مارا گیا تو ان کے ہاتھوں کل مارا جاؤں گا۔ میں فقط ان کا آلۂ کار ہوں۔ وہ مجھے نقد معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں اور دباؤ ڈال کے مجھے بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے جتنے کام کیے ہیں پیسے کے لالچ میں کیے ہیں۔ کبھی دوسروں کو معاوضہ ادا کر کے کرائے ہیں تو کبھی اپنی جان بچانے کے لیے دوسروں کو بلیک میل بھی کیا ہے۔"

"میرا آخری سوال۔ میرے والد کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کرنے والا کون تھا؟" میں نے کہا۔ "اور ان کی کون سی مجبوری سے فائدہ اٹھا کے انہیں لوٹا جا رہا تھا؟"

"میر شرافت علی۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "اس کے اسباب کا علم صرف ایک شخص کو تھا جو میر شرافت علی کا ملازم تھا اور منشی کہلاتا تھا۔ مذاق میں لوگ اسے فوما بچو کہتے تھے۔ دنیا میں اس کا

وارث کوئی نہیں ہے۔"

میں نے محسن کو ٹیپ ریکارڈر آف کرنے کا ا…

تیس منٹ کی ایک سائڈ تقریباً ختم ہونے والی تھی… بجنے میں بیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے ٹرانسمیٹر کو جی… ہم دونوں چیزیں اٹھا کے باہر آ گئے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی سلوا مجرم ہے…" کہا۔ "لیکن اس کا جرم یہی ہے کہ وہ لالچی ہے… باعث اس نے غلط کام کیے اور بلیک میل ہو کے… دشمنوں کا آلۂ کار بنا لیکن براہِ راست اس کو ہم سے کو… نہیں تھی۔"

"اور جو کچھ اس نے بتایا ہے اس سے ہمیں کوئی… ملتی۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "ہاں یہ ریکارڈنگ اس… آئندہ کے لیے کوئی انتظام کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ… خود کچھ نہ کہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات معلوم ہو… پہلے سے بتا دے۔ ہم یہ ٹیپ بطورِ ضمانت اپنے پاس رکھیں…"

جب گاڑی اس گھر کے پاس رکی جس کے ایک… ڈی سلوا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا انتظار… کہ ہمارا فیصلہ کیا ہو گا تو لوٹنے آٹھ بجے تھے۔ جتنی دیر… ڈی سلوا کو اندر سے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا اتنی دیر… کو میں نے اندر پہنچا دیا۔ پھر پہلے کی طرح محسن نے میرے… پر چڑھ کے اندھیرے میں ہی روشن دان میں رکھی… کو بڑی احتیاط سے اٹھایا اور الارم کی چابی پر بندھی… الگ کر دی جب وہ نیچے اترا تو میں نے اطمینان کا سا… کیونکہ آٹھ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے… پرانی گھڑی سے پابندیٔ وقت کے اعلیٰ ترین معیار کی… رکھنا غلط تھا۔ الارم پانچ منٹ پہلے ہی بج سکتا… ہو سکتا تھا کہ اندھیرے میں گھڑی محسن کے ہاتھ سے… اور ایک جھٹکے سے نیچے آتی یا کسی بھی وجہ سے میرا اور محسن… بگڑ جاتا۔ ٹرانسمیٹر کے اندر چھپا ہوا بم بالکل چھت کے… ہوا تھا اور یہ یقینی بات تھی کہ بم پھٹتا تو چھت نیچے… آ گرتی اور ہم وہیں زندہ دفن ہو جاتے۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی آدھے ایک گھنٹے تک یہ… جاری رکھ سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گھر کی… سے گریز کیا اور میرے لائٹر کی روشنی میں محسن نے الارم… ساڑھے آٹھ اور پھر نو کر دیا۔

"فلموں کے شوز ساڑھے آٹھ کے بعد ہی ختم ہو…" میں نے کہا۔ "تم سوا نو بجے تک بھی گھر پہنچ جاؤ… کو شک نہیں ہو گا۔ یہاں سے ہمیں ساڑھے آٹھ بجے…

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی رسّی اور ایریل بھی روشن دان میں سے کھینچ لیے تھے اور اب اگلا مرحلہ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو پھر نیچے اتارنے کا تھا جس کے لیے مجھے چوتھی مرتبہ محسن کو جوتوں سمیت کندھوں پہ اٹھانا پڑا۔ ریڈیو ٹرانسمیٹر کو زمین پر رکھنے کے بعد میں نے دوسرے کمروں کو دیکھا ایک کمرے کے ساتھ باتھ روم تھا جس میں ابھی دروازہ نہیں لگا تھا۔ دلاور ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا تماشا کرنا چاہتے ہیں۔ میں اسے دوسرے کمرے میں پہنچا کے میں نے ریڈیو ٹرانسمیٹر کو باتھ روم میں لگا اور اس کے رسّی جیسے ایریل کو روشن دان سے باہر لٹکا دیا۔ دلاور کے ہاتھ پیر اسی طرح رسّی سے بندھے ہوئے تھے جب میں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے اتنی دیر سے مجھے جکڑ رکھا ہے میرے ہاتھ پاؤں ہمیشہ کے لیے مفلوج بھی ہو سکتے ہیں۔" وہ التجا کرتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہوا۔ کیا تم نے دنیا میں مفلوج انسانوں کو زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھا؟" میں نے بے رخی سے کہا۔

"سڑکوں اور فٹ پاتھ پر ہر جگہ مفلوج اور اپاہج پڑے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"لیکن میں اس زندگی پہ موت کو ترجیح دوں گا۔" دلاور نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ ہر لحاظ سے ڈی سلوا کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔

"آل رائٹ تمہاری یہ مرضی ہے تو یہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں قتل نہیں کر سکتے — ڈی سلوا تمہارا ماتحت ہے اور تمہارا حکم بھی مانتا ہے۔ ہم اسے بھیج دیتے ہیں کہ تمہاری آخری خواہش پوری کر دے۔"

کمرے میں صرف میرے سگریٹ لائٹر کا برائے نام اجالا تھا اور اس کی روشنی بھی بے رنگ و روغن سیمنٹ کی سلیٹی رنگ کی دیواریں جذب کر رہی تھیں۔ ہم دونوں کے سائے پیچھے کی پوری دیوار پر پھیلے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بیٹھا ہوا دلاور خود بھی سایہ ہی لگتا تھا جب ہم دروازہ بند کر کے رخصت ہونے والے تھے تو اس نے ہمیں فحش ترین گالیاں دیں، دھمکی دی کہ وہ ہم سے ایسا بدلہ لے گا کہ ہم کیا ہماری آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس وقت تک دلاور کو معلوم نہیں تھا کہ اس سے چند منٹ کے فاصلے پر ہم نے باتھ روم میں جو ریڈیو رکھا ہے وہ اصل ٹائم بم ہے۔ باہر آ کے ہم نے گاڑی میں سے اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ دور جانے کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم نے کوٹھی کے احاطے میں بیٹھ کر پھر

اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا اور محسن نے کیسٹ کو پلٹ کر لگا دیا۔

"چوہدری دلاور! میں نے ٹرانسمیٹر کا بٹن دبا کے کہا۔ "تم چاہتے تھے نا؟ تمہاری یہ زندگی ویسے بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس پہ فخر کر سکو۔ تمہارے نامۂ اعمال میں اب مزید گناہوں کی گنجائش نہیں رہی اور تمہارے جرائم کی فہرست کو دیکھتے ہوئے تمہیں سزائے موت دی جائے تو کچھ نہیں۔ تمہیں ڈرامے کرنے کا شوق تھا تو ایک بار تم نے مجھ سے اور رابعہ سے ایک تہہ خانے میں اسی طرح گفتگو کی تھی۔ دوسری مرتبہ بھی تم نے یہی طریقہ زیادہ مہلک انداز میں اپنایا تھا چنانچہ آج جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں نے تم سے ہی سیکھا ہے۔ اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کا فیوز ایک الارم کلاک سے ملا ہوا ہے جو ٹھیک نو بجے تمہاری موت کا اعلان کرے گا۔ الارم کی آواز سننے کے بعد تمہیں صرف اتنی مہلت ملے گی کہ کلمہ پڑھ سکو۔ لیکن نو بجنے میں ابھی چالیس منٹ باقی ہیں۔ اگر تم میرے چند سوالات کا صحیح جواب دے دو تو ہو سکتا ہے کہ میں ٹائم بم کو فیوز سے الگ کر دوں۔ آگے تمہاری قسمت کہ کوئی تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کوئی تمہاری پکار پہ متوجہ ہو جائے۔"

"اگر میں سوالوں کا جواب دے سکا تو دیکھوں گا کہ تم اپنے وعدے پہ قائم رہتے ہو یا نہیں۔" وہ بولا۔

"سیٹھ دلاور!" میں نے کہا اور محسن نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ بات بہت پرانی ہے۔ لاہور کے ایک بینک پر کچھ ڈاکوؤں نے حملہ کیا لیکن ایک فرض شناس گارڈ نے اپنی جان دے کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور فرار ہونے والے ڈاکو بدحواسی میں مالِ غنیمت سڑک پر پھینک گئے۔ ایک شخص نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور افراتفری میں نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا کے ایک گھر میں گھس گیا جہاں اتفاق سے کوئی بھی نہیں تھا سوائے ایک لڑکی کے جو اب لندن میں ہے۔ اسے خوف زدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ شخص جو ایک معمولی اور گمنام آدمی تھا جلد ہی دلاور دین کے میرو زیرا اینڈ کمپنی میں تیسرا پارٹنر ہو گیا اور جرائم پیشہ افراد کی انڈر گراؤنڈ دنیا میں سیٹھ دلاور کے نام سے مشہور ہوا۔"

"اس بے سروپا کہانی پر کوئی یقین نہیں کر سکتا۔" دلاور بولا۔

"اور نہ آج یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ میں ہی وہ شخص تھا۔"

"تم نے پہلے سوال کا جواب تلخ دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جانتے بوجھتے حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔"

"میں نے انکار نہیں کیا ہے۔" دلاور زچ ہو کے بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت یا شہادت نہیں۔"

جانتے بوجھتے میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہی لڑکی ڈی سلوا کی سیکرٹری رہ چکی تھی اور اگر اس نے غور سے دیکھا ہوتا تو

معلوم ہے کہ میر شرافت علی نے وزیر خان کو بلیک میں کیا میر شرافت کو تم نے استاد پیڈرو سے مروا دیا اور فومانچو کہلانے والے ایک غریب منشی کی جان لی تھی۔ مجھے نواب خسرو جمشید کے بیٹے خسرو پرویز کی سازش کا علم بھی ہو چکا ہے جو لندن میں رہتا ہے اور ہمارے ساتھ ایک ایمان دار کسٹم آفیسر نعیم بھی ہے جسے بلیک میں کر کے نوکری سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کس نمک حرام نے بتائی ہیں؟" دلاور نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ معلوم کر کے کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھو کہ کتنے کم وقت میں گردشِ حالات تمہیں کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ تمہارا کوئی راز، راز نہیں رہا ہے اور اب مقابلہ برابر کا ہے۔ اس وقت کا تصور کرو جب تم جیسے تنکاری مجھے گھیر کے پاکستان لے آئے تھے تاکہ مجھے چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے کی طرح مار سکیں۔ تم نے مجھے خریدنا بھی چاہا۔ تاکہ میں کچھ جانے بغیر تم سے ڈر کر میدان چھوڑ جاؤں۔ آج تم چوہے کی طرح پکڑے گئے ہو۔ تمہارے بعد دوسروں کو بھی بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ میں بھی ان سے کم تنکاری نہیں ہوں۔"

"ہم اس مسئلے پہ نئے سرے سے برابری کی بنیاد پہ بات کر سکتے ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"میں اور تم کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے قاتل اور مقتول برابر نہیں ہو سکتے۔ قانون کی نظر میں نہ دنیا کی نظر میں۔ ویسے بھی بات کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جو کچھ تمہیں کرنا تھا تم کر چکے ہو۔ اب فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے اگر تم میرے سوالات کا جواب دے دیتے تو شاید میں آج تمہاری جان بخشی کر دیتا۔ لیکن اب میں جا رہا ہوں۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ اس مہلت کا استعمال تم جیسے چاہو کرو۔ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آخری وقت میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو تو اچھا ہے۔" میں نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ کیسٹ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے بڑی عجلت میں اپنا سامان اٹھایا اور باہر نکل آئے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے ڈی سلوا کو کار کی ڈکی سے نکالا اور محسن نے جلدی جلدی ایک کپڑے سے ڈی سلوا کی گاڑی کے ان تمام حصوں کو صاف کر دیا جہاں ہماری انگلیوں کے نشانات ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ پھر محسن نے اپنا سامان بغل میں دبایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے بے ہوش ڈی سلوا کو ڈکی میں سے نکال کر کندھے پر ڈالا اور محسن کے پیچھے چل پڑا۔ اس علاقے میں ٹیکسی ملنا دشوار تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے پیچھے سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس دیکھیں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور سڑک کے درمیان میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹرک تھا۔

"کیا بات ہے؟" ٹرک ڈرائیور نے مجبوراً رک کے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"یہ ہمارا پڑوسی ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر ہمیں آبادی تک لے چلو، جہاں ٹیکسی مل جائے۔"

ڈرائیور کی صورت کا تاثر فوراً بدل گیا اور اس نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اور محسن نے ڈی سلوا کو ٹرک میں ڈالا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ٹرک اتنا پرانا تھا کہ اس کا پورا ڈھانچہ چلتے ہوئے فریاد کرتا تھا اور انجن جھٹکے لیتا تھا مگر اس وقت ٹرک کا پرانا ہونا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا — ڈی سلوا کو اچانک ہوش آگیا تھا۔ میں نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا تھا۔ وہ ایک بار کراہا اور دوسری بار چلایا لیکن اس کی آواز ٹرک ڈرائیور نے نہیں سنی۔ میں نے فوراً اس کی کنپٹی پہ کان کے نیچے ہلکا سا ہاتھ مارا اور اس کی آواز بند ہوگئی۔ ٹرک ضلع کچہری کے پاس رک گیا جہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم نے ٹرک ڈرائیور کا شکریہ ادا کرکے ڈی سلوا کو اتار لیا۔ ٹیکسی والا پہلے تو گلوب سینما جانے تک تیار ہی نہ تھا مگر ہم نے کہا "بھائی خدا کا خوف کرو، ایک بیمار کو گھر پہنچانا ہے۔ تم زیادہ پیسے لے لو" تو ٹیکسی والا شرمندہ ہوگیا۔ اس وقت نو بج کر دس منٹ ہوچکے تھے۔ سڑک خالی ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بیس منٹ بعد ہمیں گلوب سینما کے پاس ڈی سلوا کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور اصل کرایہ سے دس روپے زیادہ لے کر رخصت ہوگیا۔ ٹیکسی کے جاتے ہی ہم نے ڈی سلوا کو گیٹ کے اندر رکھا، دوبارہ گیٹ بند کیا اور شریر بچوں کی طرح کال بیل کا بٹن دبا کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اب نوکر اپنے آقا کو گیٹ سے اٹھا کے بیڈروم میں لے جائیں گے۔ گلوب سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم ان لوگوں میں شامل ہوگئے جو فلم کا آخری شو دیکھ کر نکلے تھے۔ ایک شخص نے دو ٹکٹوں کے آدھے آدھے حصے پھینکے جو میں نے فوراً اٹھا لیے۔ گھر پہنچنے کے بعد بہت ہوشیاری سے میں نے فلم کا ذکر کیا اور دونوں کو بے نیازی سے نیچے پھینک دیے۔ آج کی رات ہمیں اپنے گھر میں گزارنی تھی چنانچہ میں اور محسن اپنا سامان اٹھانے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں پہنچے وہاں ایک شخص ہمارے انتظار میں تھا۔

"تمہاری صورت مجھے کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" میں نے اس اجنبی کو غور سے دیکھ کر کہا۔

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خوف، گھبراہٹ اور پریشانی کا شکار ہے اور اسے بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا اس میں اتنی ہمت نہیں کہ صاف بات کرسکے۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا صحت مند آدمی تھا۔ اپنے حلیے سے غریب نظر آتا تھا۔ اس مختصر سے وقفے میں اپنی یادداشت کی مدد سے میں اس کی صورت سے آشنائی کے اسباب تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ محسن بھی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ایک بار آپ سے پہلے بھی ملاقات ہوچکی ہے۔ آپ نے مجھے مارا تھا۔"

"ضرور مارا ہوگا۔" مجھے تعارف کے اس انداز پر بے اختیار ہنسی آئی۔ "اب یہ بھی بتادو کہ ہم نے تمہیں کیوں مارا تھا اور کہاں مارا تھا اور کب مارا تھا؟"

"دراصل ہم اتنے لوگوں کی پٹائی کرچکے ہیں،" محسن نے ہنستے ہنستے کہا۔ "اور اتنی بار پیٹ چکے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ۔"

اس مظلوم صورت شخص کی پریشانی اور بدحواسی میں اضافہ ہوگیا۔ "نام... نام تو جناب عبداللہ تھا لیکن سب عبدل کہتے ہیں۔" اس نے خفت زدہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "آپ نے مجھے میر شرافت علی کے گھر میں مارا تھا کیونکہ میں نے اس کی جان بچانے کے لیے کوشش کی تھی۔ میں اس کا شوفر تھا۔"

میری ساری خوش مزاجی کافور ہوگئی اور میں پلک جھپکائے بغیر اس شخص کو دیکھتا رہا جس نے شرافت علی کے دوسرے ملازم شیدے کے ساتھ مل کر میرے خلاف گواہی دی تھی اور پولیس کے سامنے مجھے قاتل کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ اس کی گواہی پر پولیس نے مجھے عین اس وقت گرفتار کرلیا تھا جب میں لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کار میں بیٹھ چکا تھا اور ریل کار روانہ ہونے ہی والی تھی۔

"اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے سنجیدہ ہوکر سخت لہجے میں کہا۔ "اُس روز تم شوفر کی وردی میں تھے اس لیے آج میں تمہیں فوراً نہ پہچان سکا۔ کیا کوئی کسر باقی رہ گئی تھی جو...؟"

"مجھ پر خفا نہ ہوں جناب!" وہ خوف زدہ ہوکے بولا۔ "میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔"

"اس سے زیادہ دشمنی تم کیا کرسکتے تھے؟" میں نے

برافروختہ ہوکے کہا۔ "تم نے مجھ پر قتل کا جھوٹا الزام عائد کردیا۔"

"نہیں جناب! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ قتل آپ نے کیا ہے۔ آپ میرا بیان دیکھ کر تصدیق کرسکتے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہا تھا، وہی تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ میں نے آپ کو شرافت علی کے ڈرائنگ روم کا سامان تباہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ آپ شرافت علی کو مار رہے ہیں اور میں شور سن کر وہاں پہنچا تھا تو آپ نے مجھے بھی لمبا لٹا دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کہا تھا اور یہ سب سچ تھا۔ میں شرافت علی کا ملازم تھا۔ اس کا نمک کھاتا تھا پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں اس کی مدد نہ کرتا یا جانتے بوجھتے سچ نہ بولتا۔ قسم ہے پاک پروردگار کی، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ نے قتل بھی کیا ہے یا میں نے آپ کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ بات شیدے نے ضرور کہی تھی لیکن میں نے نہیں۔ میرے بیان کا ایک ایک لفظ پولیس کے ریکارڈ پر ہے اور آپ چاہیں تو تصدیق بھی کرسکتے ہیں۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میں اور محسن بھی خاموش بیٹھے اس شخص کی صورت دیکھتے رہے۔ وہ صورت سے اتنا مسکین اور لہجے سے اتنا شرمندہ نظر آتا تھا کہ اس پر غصہ اتارنا بے سود تھا۔ اس کی بات کو غلط یا جھوٹ قرار دینا بھی مشکل نظر آتا تھا لیکن سوچے سمجھے بغیر اس پر اعتبار کرلینا بھی مشکل تھا۔ اس کا آنا دشمن کی نئی چال بھی ہوسکتی تھی۔ ہمیں طائرِ بے بال و پر سمجھنے والے شکاری جان چکے تھے کہ ان کی طاقت ہمیں تسخیر نہیں کرسکتی۔ ان کی دولت ہمیں خرید نہیں سکتی اور موت کا خوف ہمارے جارحانہ عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا۔ وہ تمام اخلاقی اور غیر اخلاقی، جائز اور ناجائز حربے آزما چکے تھے لیکن اب تک انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور ہمارے بارے میں ان کے ابتدائی اندازے بالکل غلط ہوچکے تھے۔ اب یہ جنگ پورے عروج پر تھی۔ نقصان ہمارا ہوا تھا تو دشمن کا اس سے زیادہ ہوا تھا۔ مشکلات اگر ہمارے لیے پیدا ہوئی تھیں تو ہماری پیدا کردہ مشکلات نے دشمنوں کو بھی پریشان کردیا تھا اور ہمیں آسان شکار سمجھنے والے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ ہم بھی ان کی ٹکر کے شکاری ہیں بلکہ ان سے بہتر شکاری ہیں۔ ہمارے وسائل بہت محدود تھے اور ان کے پاس سب کچھ تھا چنانچہ ہمارے ذہن میں شکوک کا جنم لینا ایک قدرتی بات تھی۔ کیا دشمن اب صلح کے بہانے یا اپنی کمزوری کا اعتراف کرکے عیاری اور مکاری سے ہماری پیٹھ میں خنجر بھونکنا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔

"میاں عبدل!" بالآخر میں نے اس سکوت کو ختم کیا۔ "اگر میں تمہاری بات مان لوں تب بھی میرے سوال کا جواب باقی رہتا ہے کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"وہ... بات یہ ہے جی...!" عبدل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنا شروع کیا۔ "کہ میری ماں نے آپ کو بلایا ہے۔"

میں نے اور محسن نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن کے چونکنے سے مجھے یقین آیا کہ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا۔

"تمہاری ماں نے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمہاری ماں کا مجھ سے کیا تعلق؟ وہ مجھے جانتی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب!" عبدل نے کہا۔ "وہ مجھے کچھ نہیں بتاتی۔"

"کیا تم نے اسے کچھ بتایا تھا؟" میں نے کہا۔ "میرے بارے میں یا میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں؟ کیا وہ اس کیس میں تمہارے اور میرے کردار کے بارے میں کچھ جانتی ہے؟"

"میں بڑی مشکل میں ہوں جناب!" عبدل بولا۔ "ادھر آپ میری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اُدھر میری ماں مجھے کچھ بتانے کو تیار نہیں۔ اُس کی حالت ایسی ہے کہ میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔"

"حالت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے نرمی سے کہا کیونکہ وہ اب رو پڑنے کے قریب تھا۔

"وہ بہت بوڑھی ہے جناب!" عبدل نے کہا۔ "اتنی بوڑھی کہ اسے اپنی عمر بھی یاد نہیں لیکن اسے اور بہت کچھ یاد ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی باتیں بھی وہ بھولی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ ستر اسی برس کی تو ضرور ہوگی۔ یوں سمجھ لیں کہ اس نے میر شرافت علی کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اسے دکھائی نہیں دیتا۔ وہ بہت اونچا سنتی ہے اور سہارے کے بغیر بستر سے اٹھ کے ایک قدم نہیں چل سکتی — میں نے اس کو میر شرافت علی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اس نے شیدے سے پوچھا کہ شرافت کیوں نہیں آتا تو شیدے نے بتا دیا۔ جب تک میر شرافت علی زندہ تھا وہ دن میں ایک بار اس کے کمرے میں خیریت معلوم کرنے ضرور جاتا تھا۔ تین دن بعد اس نے شیدے سے پوچھا کہ شرافت کہاں ہے۔ کہیں دورے پر ولایت چلا گیا ہے کیا؟ اور شیدے بے وقوف نے کہہ دیا کہ ماں جی وہ تو ایسے لمبے دورے پر گیا ہے کہ اب واپس نہیں آئے گا۔ بس اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ شیدے نے قتل کی بات نہیں کی اور کہہ دیا کہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ بیمار ہوا تھا، اسپتال جاکے مر گیا۔ میری ماں بہت روتی پیٹی اور بعد میں مجھ پر بھی بہت خفا ہوئی کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا۔ ایک روز اچانک اس نے کہا کہ عبدل! تجھے وزیر خان کا پتہ معلوم ہے؟ میں تو اچھل پڑا۔ میں نے کہا، کون وزیر خان؟ اس نے کہا کہ وہی جو شرافت کا دوست تھا دونوں مل کر کاروبار کرتے تھے نا۔ اس وقت اگر میں اپنی ماں سے کہتا کہ وزیر خان بھی مر چکا ہے یا اسے دوسری باتیں بتا دیتا تو معلوم نہیں کیا ہوتا۔ شاید وہ اسی وقت مر جاتی۔ چنانچہ میں نے بات ٹال دی کہ مجھے نہیں معلوم لیکن وہ اس بات کو بھولی نہیں۔ جب بھی اسے یاد آتا تھا تو وہ پوچھتی تھی کہ وزیر خان کا پتہ معلوم کیا تو نے؟ اس کا ایک لڑکا بھی ہے کبیر خان جو ولایت میں پڑھتا ہے۔ اس کا اصرار بڑھتا گیا۔ اب کچھ روز سے وہ بیمار ہے۔ کھانا پینا بالکل چھٹ گیا ہے۔ وہ خود بھی کہتی ہے اور مجھے بھی ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں کل اس نے کہا کہ عبدل! تو مجھے... اندھی بوڑھی اور معذور عورت کو... اپنی ماں کو دھوکا دے رہا ہے؟ وزیر خان ایسا آدمی تو نہیں جس کا پتہ نہ ملے۔ میں تجھے مرتے وقت دودھ معاف نہیں کروں گی عبدل! مجھ پر وزیر خان کا ایک قرض ہے۔ تو چاہتا ہے وہ قرض میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں اور قیامت کے بعد وزیر خان کو منہ نہ دکھا سکوں؟ اس کے بعد میں کیا کرتا اگر میں آپ کے پاس نہ آتا تو پاگل ہو جاتا۔ آپ میرے ساتھ چلیں اور جیسے چاہیں اسے سمجھا دیں اور اس کی سن لیں۔"

میں اور محسن ہکا بکا بیٹھے تھے۔ شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت جس کے پاس زندگی کی آخری چند سانسوں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جو وزیر خان کو جانتی تھی، یہ بھی جانتی تھی کہ سکندر بخت کا اصل نام کبیر خان تھا، وہ مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنا چاہتی تھی؟ میرے والد نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے تو مجھے بہت سی باتوں سے بے خبر رکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر مجھے انگلی پکڑ کے چلایا۔ میرے راستے کی سمت کا تعین کیا اور میری نظر صرف منزل پر رہی میرے گرد و پیش کے حالات میری نگاہ سے اوجھل رہے۔ میں اس مسافر کی طرح چلتا گیا جو رات کے گھپ اندھیرے سے ... نہ صرف ستارے کی تلاش میں سرگرداں ہو مگر ... ستارہ طلوع ہونے سے پہلے ہی غروب ہو گیا تھا اور اب میرے ہر طرف ایک بھیانک اندھیرا تھا جس میں مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ ہر قدم پہ کوئی خوفناک حقیقت اندھے غار کی طرح منہ پھاڑے میری منتظر تھی۔ منشی مرحوم کی طرح یہ عورت بھی وہ چراغ ثابت ہو سکتی تھی جو مجھے بے رحم حقائق کے اس تاریک جنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا سکے۔ اس سے پہلے کہ یہ چراغ بھی بجھ جائے یا بجھا دیا جائے مجھے اس بوڑھی عورت سے مل لینا چاہیے۔ منشی سے ملنے میں دیر کرنے کا انجام میرے ذہن میں تھا۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اس میں دھوکا ہوا تو نقصان میں تم رہو گے۔"

"تیرے ساتھ میں بھی چلوں گا۔" محسن بولا۔ "لیکن میں باہر رک کر تیرا انتظار کروں گا اور مجھے خطرے کا احساس ہوا تو میں انکل رضوی کو فون پہ بتا دوں گا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے والا کون تھا اور کہاں لے گیا تھا۔"

"ہم انکل رضوی کو جانے سے پہلے بھی تو بتا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج کل ان کو ہماری نقل و حرکت کے بارے میں تشویش لاحق رہتی ہے۔ بتا کر جانے سے ان کو بھی تسلی ہو جائے گی اور وہ ہماری حفاظت کے خیال سے بھی غافل نہیں رہیں گے۔"

ہم عبدل کو رضوی صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے پوری بات غور سے سنی اور عبدل سے خالص پولیس افسر کے لہجے میں بہت سے سوالات بھی کیے۔ عبدل ان کے سامنے بھی بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ میں پولیس اسٹیشن فون کر دیتا ہوں۔ تمہارے پہنچنے تک میر شرافت علی کی کوٹھی کے آس پاس سادہ کپڑوں والے پولیس مین پہنچ چکے ہوں گے۔"

عبدل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے رضوی صاحب کے سوالات کا جواب کسی گھبراہٹ کے بغیر دیا تھا اور وہ حفاظتی اقدامات سے بھی پریشان نہیں تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔ ہمارا ارادہ ٹیکسی میں جانے کا تھا لیکن رابعہ نے اصرار کیا کہ ہم اس کی فوکس ویگن لے جائیں۔ "ہر جگہ ٹیکسی کا ملنا یقینی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔

"تمہاری اس گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زندگی پر یقین آدھا رہ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسافر منزل پہ پہنچے گا یا آخری منزل پر۔"

"یاد کرو اس گاڑی نے کہاں کہاں اور کیسے آڑے وقت میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔" رابعہ برا مان کے بولی۔ "مگر تم مرد، فطرت کے اعتبار سے سب ایک جیسے ہوتے ہو۔ صورت پر جاتے ہو، وفاداری اور خدمت گزاری کی قدر نہیں کرتے۔ خواہ وہ بیوی ہو یا گاڑی۔" محسن نے خواہ مخواہ رابعہ کی تائید کی۔ "حالانکہ ظاہری حسن کو دوام نہیں اور گاڑی ہو یا بیوی دونوں کا چہرہ وقت کے ہاتھوں یا حادثات کے باعث بگڑ سکتا ہے۔"

"اب دیکھو نا محسن بھائی۔" رابعہ شکایت کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا حلیہ بگاڑنے والے یہ خود ہیں۔ چلنے میں یہ گاڑی کسی سے کم نہیں ہے تھوڑا سا ڈینٹ پینٹ ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تھوڑا سا بی بی! اس پہ گاڑی کی قیمت سے زیادہ رقم کا خرچ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بس اب اسے ریٹائر کرو۔ بہت خدمت کر چکی تمہاری اور دوسری نئی گاڑی لے لو کوئی نئی اور خوبصورت سی۔"

"سنا تم نے؟" محسن شرارت سے بولا۔ "کل کو ایسی ہی بات یہ اپنی بیوی کے بارے میں بھی کہے گا۔ ابھی وقت ہے سوچنے کا۔"

رابعہ سمجھ گئی کہ محسن بالکل سنجیدہ نہیں ہے اور اس کی تائید کا مقصد شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ سخت برا مان کے اندر چلی گئی تو ہم گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔

"یار محسن!" میں نے فدا ایتونگ کرتے ہوئے کہا۔ "نیا نو دن تو پرانا سو دن۔ یہ گاڑی واقعی خوب ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے۔" محسن نے اسی غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ ہر چیز کی ایک جذباتی قیمت ہوتی ہے جس کا مارکیٹ ویلیو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر سگ لیلیٰ کو ہی لیجیے اگر مجنوں اس فضول سے کتے کو بیچنے جاتا تو کوئی کوڑیوں کے مول بھی نہ لیتا مگر مجنوں کے لیے اس کی جذباتی قیمت کیا تھی۔" وہ زور سے ہنسا۔ "رابعہ نے سخت مائنڈ کیا ہو گا۔"

"میں بھی بہت سخت مائنڈ کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ ٹھیک کہتی ہے۔ ہم اس کو نہیں چھوڑ سکتے اگر اس کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور ہمیں اس پہ نئی مرسڈیز کی قیمت سے زیادہ مرمت کے اخراجات برداشت کرنے پڑیں، تب بھی بری نہیں۔"

عبدل کے لیے ہماری گفتگو بالکل بے معنی تھی اور وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ گاڑی جانے پہچانے راستوں سے گزرتی ہوئی ایبٹ روڈ پہنچی اور میر شرافت علی کی کوٹھی "رین بسیرا" کے سامنے ٹھہر گئی۔ پوری عمارت پر اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ گیٹ بند تھا اور اس کے اوپر لگی ہوئی لائٹس بھی بجھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا ذہن گزرے ہوئے وقت کی یادوں میں کھو گیا۔ یہیں سے میرے تمام مصائب کا آغاز ہوا تھا اگر میں نے اس روز محسن کی بات مان لی ہوتی تو شاید میں میر شرافت علی کو قتل کرنے کے جھوٹے الزام میں ملوث نہ ہوتا۔ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر میں نے احتیاط کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیا تھا ورنہ میں عقل سے کام لیتا تو میر شرافت علی کو کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن اپنے خلاف کسی کو چشم دید گواہ نہ بناتا۔ میں اور محسن اسے اٹھا کر لے جا سکتے تھے اور اس سے وہ بات بھی معلوم کر سکتے تھے جو میر شرافت علی نے آخری وقت تک نہیں بتائی تھی۔ شاید اس طرح ہم اسے قتل ہونے سے بھی بچا لیتے مگر اب اس پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے اس جگہ کو بھی دیکھا جہاں سے میں ٹیلی فون کے تار کاٹ کر اندر کودا تھا اور اس جگہ کو بھی جہاں پیڈرو خراب نظر آنے والی ٹیکسی میں سر ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے میرے نکلتے ہی حالات سے فائدہ اٹھا کر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا مگر واقعاتی شہادت نے مجھے ملزم بنا دیا تھا۔

"اس کوٹھی کے دوسرے ملازم کہاں گئے؟" میں نے عبدل سے پوچھا۔ "رشیدے کے علاوہ ایک چوکیدار بھی تھا۔"

"چوکیدار تو دوسری جگہ چلا گیا ہے۔" عبدل بولا۔

"رشیدے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سرونٹ کوارٹر ش... سے ہمارے پاس تھا اس لیے ہم ابھی تک یہیں ...

اس نے بڑے گیٹ کے بیچ میں سے دوسرا چھوٹا ... کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر جانے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر مجھے پولیس جیسا کوئی شخص نظر نہ آیا۔ شاید رضوی صاحب نے بھی عبدل کو ڈرانے کے لیے صرف دھمکی دی تھی۔ میری طرح ان کو ... بات پہ یقین آ گیا تھا۔ محسن گاڑی میں ہی بیٹھا ... اور میں عبدل کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے میں ... دوسری بار آ کے میں نے گزرے ہوئے وقت کے ہر لمحے کو چشم تصور سے پھر زندہ دیکھا اور اس کی اذیت کو محسوس کیا۔ ویران اور تاریک کوٹھی کے اندر میر شرافت علی کا بیڈ روم تھا جہاں میں اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ وہ منظر میرے ذہن میں نقش تھا جب میر شرافت علی نے حیرانی اور پریشانی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سے مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ میرے ذہن میں ایک اور تصویر اُس ڈرائنگ رُوم کی تھی جس میں لاکھوں کی مالیت کے نوادرات تھے۔ میں نے ان سب کو تباہ کر دیا تھا اور۔۔۔۔ میر شرافت علی ملبے کے ڈھیر میں میرے سامنے زار و قطار رو رہا تھا اور مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ تمام تفصیلات میری نظر کے سامنے تھیں اور عبدل کے پیچھے چلتے ہوئے میں وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سرونٹ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کی ظاہری حالت اور ساز و سامان کی کیفیت ویسی ہی تھی جیسی کسی معمولی نوکر کے گھر کی ہونی چاہیے۔ ایک کمرہ تقریباً خالی تھا جبکہ دوسرے میں صرف ایک بستر بچھا ہوا تھا اور چالیس واٹ کا بلب روشن تھا۔ دوسرے کمرے میں اندھیرا تھا مگر عبدل نے لائٹ جلائی تو میلی دیواروں پر پھیل جانے والی زرد بیمار روشنی میں مجھے ایک چارپائی پر عبدل کی ماں نظر آئی۔ اس نے ماں کی حالت بیان کرتے ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ پلنگ پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جس پر خشک جھریوں بھری سیاہ کھال رہ گئی تھی۔ کمرے میں ٹین کے بنے ہوئے دو پرانے ٹرنک بھی اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔ لکڑی کے ایک پرانے بے ڈھنگے اسٹول پر زیر استعمال دوائیں جمع تھیں۔ لائٹ جلتے ہی ہڈیوں کے ڈھانچے میں حرکت ہوئی۔

"عبدل!" بوڑھی عورت نے آہستہ سے کہا۔ "کہاں گیا تھا تو؟ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"ماں!" عبدل اس پر جھک کر بولا۔ "میں وزیر خان کے لڑکے سکندر کو لایا ہوں۔"

بڑھیا نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ "کون سکندر؟ وزیر خان کے بیٹے کا نام تو کبیر خان تھا، میں نے تجھے بتایا تھا۔"

میں نے عبدل کو اشارہ کیا کہ وہ ہٹ جائے اور پھر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ "ماں جی!" میں نے کہا۔ "کبیر خان میرا ہی نام تھا۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے نام بدل لیا تھا۔"

"کیوں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔ "نام بھی کوئی پاؤں کی جوتی ہے کہ جب کوئی چاہے بدل لے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو ایک زمانے میں کبیر داس بھی رہا ہوں جب میرے گھر کے سب افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور میں ہندوستان میں اکیلا رہ گیا تھا۔"

میری بات نے اسے کچھ قائل کیا۔ "تیرا باپ وزیر خان کہاں ہے؟ وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"ابا جی بیمار تھے۔" میں نے پورے اعتماد سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "ان کو میں نے علاج کے لیے ولایت بھیج دیا ہے۔"

"کبیر خان!" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو نے اچھا کیا بیٹا، اگر تو بھی نہ آتا تو میرے لیے مرنا مشکل ہو جاتا۔ خدا اُسے معاف کرے، عبدل کے باپ نے یہ فرض داری میرے سپرد کی۔ یہ کام تو اس کا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ عبدل کی ماں! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں اس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ کیا یہ بات میں نہیں جانتی تھی؟ معلوم ہے وہ کتنا عرصہ میرے ساتھ رہا؟ ایک بار اس نے حساب لگا کے مجھے بتایا تھا، اس لیے مجھے یاد ہے۔ خیر چھوڑ اس بات کو۔ ہمارے دو بیٹے اور بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے۔ اب ان کے بچوں کے بھی بچے ہیں۔ یہ عبدل سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے باپ نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی لیکن اتنے عرصے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! ایک بات ایسی بھی ہے جو میں نے تجھے نہیں بتائی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اعتبار نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ میں اس راز کو راز رکھنے کا پابند تھا۔ ہر شخص قیامت کے دن اپنی نیکی بدی کا حساب خود دے گا۔ خدا دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور اس سے کچھ چھپانا ناممکن ہے مگر جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے نا وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ بات اب تجھے بتانے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو یہ بات وزیر خان کو یا اس کے بیٹے کو بتا دینا۔" وہ بولتے بولتے تھک کر ہانپنے لگی تھی۔ عبدل نے اسے پانی میں گلوکوز ملا کر دیا اور کوئی گولی کھانے کو دی۔ "اس نے کہا کہ اب میری زندگی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں کہ میں کسی سے ڈروں۔" وہ پانچ منٹ بعد پھر بولنے لگی۔ "اب تک میں ڈرتا تھا لیکن اب اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ وہ مجھے مارنا چاہیں تو مار دیں۔ میں نے کہا کہ وہ کون؟ وہ بولا کہ تو نہیں جانتی انہیں۔ بس تو دھیان سے میری بات سن لے تاکہ میرے بعد بھی وزیر خان یا اس کے بیٹے کو حقیقت معلوم ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک میں خود ان سے یہ بات نہیں کہہ سکا۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا اور جب موقع ملا تو کسی نے میری بات نہیں سنی یا مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وزیر خان کہیں چلا گیا ہے اور اس کا بیٹا ولایت میں ہے۔ میں نے دو مرتبہ ولایت میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"عبدل کے باپ نے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے مجھ سے دو بار بات کی تھی؟ ولایت میں۔۔۔؟"

"ہاں۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔" بڑھیا بولی۔ "جب وہ ولایت سے واپس آیا تو بہت مایوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ عبدل کی ماں! کیسا زمانہ آگیا ہے کوئی کسی پر اعتبار ہی نہیں کرتا۔ میں نے کبیر خان سے دو مرتبہ ٹیلی فون پر بات کی اور ایک بار اسے ملاقات کے لیے بلایا تاکہ اسے ساری بات بتا دوں۔۔۔ مگر وہ نہیں پہنچا۔ وزیر خان نے اسے ولایت بھیج کے بڑی غلطی کی ہے۔ معلوم نہیں وہ کن چکروں میں پڑا ہوا ہے کہ باپ کی خبر ہی نہیں لیتا۔ اللہ ایسی اولاد نہ دے تو اچھا ہے۔ وزیر خان کا بھرا گھر اجڑ گیا۔ یہ ایک لڑکا بچا تھا۔۔۔"

بڑھیا بولتی جا رہی تھی۔ میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے اور ہر لفظ میرے سامنے واقعات کی ایک تصویر پیش کر رہا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کی ہر بار ایک تصویر بن کے ابھرتی تھی اور مٹ جاتی تھی۔ پرانی آوازیں صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتی تھیں اور ختم ہو جاتی تھیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ فوما پخو نے کہا اور اس کی آواز میرے کانوں نے اسی طرح سنی جیسے لندن میں ٹیلی فون پر سنی تھی۔ ہاں، میں نے اس سے کہا تھا کہ سوری۔۔۔ مجھے اس وقت بہت بڑا معرکہ درپیش ہے اور اس نے کہا تھا، بیوقوف مت بنو، میں تمہیں بہت سے خطرات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور تدبیر کے زور سے نوشتۂ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ میں اس بڑھیا کو کیا بتاتا کہ ملنا تو میں بھی چاہتا تھا مگر کمرے کا نمبر غلط ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔

"معلوم نہیں وہ کیا لکھتا رہتا تھا۔" بڑھیا اب بھی بول رہی تھی۔ "ایک دن میں نے پوچھا تو اس نے کہا عبدل کی ماں! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو گئی ہیں جو معلوم نہ ہوتیں تو اچھا تھا اور انہیں بھی شک ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ کس کی بات کر رہے ہو؟ تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا کہ چھوڑو۔۔۔ تمہارا کچھ نہ جاننا ہی اچھا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں وزیر خان کے لیے کچھ نہ کر سکا کیونکہ میں بزدل تھا اور مرنے سے ڈرتا تھا۔ اب میں نے وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو مجھے معلوم تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح وزیر خان یا اس کے بیٹے سے بات کروں۔ وزیر خان سے بات کرنے کا مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ کبیر خان کو سب معلوم ہونا چاہیے۔ اور وہ کاربن رکھ کے نہ جانے کیا کچھ لکھتا رہا۔ میرا خیال ہے وہ ہی باتیں ہوں گی جو اس نے مجھے بتائی تھیں۔ کئی دن تک وہ پریشان پھرتا رہا۔ وہ بہت خوف زدہ تھا اور مجھے بھی کچھ نہ بتاتا تھا۔ پھر ایک روز وہ ایسا گیا کہ لوٹ کر نہیں آیا۔"

"منشی مرحوم آپ کے شوہر تھے؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"مرحوم؟" وہ چونکی۔ "وہ مر چکا ہے نا، مجھے معلوم تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی جاتا تھا تو مجھے بتا کے جاتا تھا اور اگر بتانے کا موقع نہیں ملتا تھا تو کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا دیتا تھا لیکن اس مرتبہ۔۔۔" وہ تھک گئی تھی۔ میری بات نے اس سے امید کی آخری کرن بھی چھین لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تمام عمر اس کا ساتھ نبھانے والا اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر خود فریبی کا یہ طلسم اسے عزیز تھا جو آج ٹوٹ گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے ہم سب جھوٹے سہاروں کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ صرف سچ کے زہر پر کون جی سکتا ہے۔ اب اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رو رہی ہے اور بے نور آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو چہرے کی جھریوں میں یوں بہے جا رہے تھے جیسے بارش کا پانی خشک ندی نالوں سے بہتا ہے۔

"جب ایک صدی کا آدھا حصہ ایک دوسرے کے ساتھ بیت جاتا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تو میاں بیوی ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کو الفاظ کی مدد کے بغیر بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن ایک ہو جاتا ہے اور وہ خیالات کی زبان میں بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ جب عبدل کے باپ نے کہا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں تو میں نے مان لیا تھا کہ وہ سچ کہتا ہے۔ اس کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اور نہ جانے کیوں میرے اپنے دل میں بھی ہول اٹھ رہے تھے۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور عبدل کا باپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور وہ چوٹی بادلوں میں سے یوں ابھری ہوئی ہے جیسے سمندر میں چٹانیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ زمین بہت نیچے بادلوں میں چھپی ہوئی تھی اور وہ جگہ جہاں ہم کھڑے تھے مشکل سے چھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی۔ بالکل کسی قبر کی طرح۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور اچانک عبدل کے باپ نے کہا کہ اب تم واپس جاؤ کیونکہ مجھے آگے جانا ہے اور میرا ہاتھ چھوڑ کے اس نے ایک قدم بڑھایا۔ میں حیرانی سے اس کو خلا میں اترتا ہوا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ بادلوں میں گم ہو گیا۔ میں نے عبدل کے باپ سے اپنے خواب کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور کسی خواب کی تعبیر بتلانے والے کے پاس بھی نہیں گئی تھی لیکن خواب کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ چند دن بعد وہ چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا لیکن ایک رات میں نے اسے پھر خواب میں دیکھا۔ وہ کوئی عجیب سی جگہ تھی۔ صرف ایک کمرہ تھا جس کی چھت گنبد جیسی تھی اس کی خستہ حال دیواروں میں دروازے بھی نہیں تھے۔ میں نے وہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں وہاں کیسے پہنچی۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا کہ وہ چراغ جلائے ایک کونے میں لیٹا ہوا ہے اور کچھ پڑھ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کتنی دیر سے میں تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ عبدل کی ماں! تجھ سے یہاں آنے کو کس نے کہا تھا؟ پھر اس نے وہ کاغذات دیئے کی لو پر رکھے اور ان کو جل کے راکھ ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بولا کہ گھر جاؤ اور مجھے سونے دو کیونکہ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اس نے چادر لی اور لمبی تان کر سو گیا۔ میں چلنے لگی تو اس نے چادر سے منہ نکال کر کہا کہ عبدل کی ماں! تمہارے پاس میری ایک امانت ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور جس کا حق ہے اسے پہنچا دینا۔ پھر وہ منہ ڈھانپ کے سو گیا اور میں ایک ویران جنگل کی رات میں بھٹکتی پھری لیکن اسی دن مجھے یقین آ گیا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

ٹیلی پیتھی — روح کا وجود اور ایسی ہی مافوق الفطرت باتوں کو عقل سلیم تسلیم کرے یا نہ کرے، میں نے اپنے کانوں سے جو کچھ سنا تھا ناقابلِ یقین بھی تھا اور ناقابلِ تردید بھی۔ جب وہ خواب میں اپنے شوہر سے آخری ملاقات کا ذکر کر رہی تھی تو میری نظروں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔ میں نے منشی مرحوم عرف فوما پنجو کو عین اسی جگہ دیکھا تھا جہاں اس کی بیوی نے دیکھا تھا۔ باغبان پورے کی طرف جانے والی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر بائیں طرف وہ مقبرہ اب بھی موجود تھا جس کی شکستہ حالی درسِ عبرت تھی جس کے اوپر گنبد جیسی چھت تھی مگر اس کی چاروں دیواریں بے در تھیں اور اسی گمنام اور ویران مقبرے میں میری آنکھوں نے منشی کی لاش پڑی دیکھی تھی۔ اس ویرانے میں ایک دیا بھی روشن تھا لیکن وہ خط مجھے نہیں ملا تھا جس کو میرے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش میں منشی کی جان چلی گئی تھی جو کچھ میں نے کھلی آنکھوں سے جاگتے ہوئے جائے واردات پر پہنچنے کے بعد دیکھا، وہ منشی کی بیوی نے خواب میں دیکھ لیا تھا۔ اس کے خواب اور حقیقت میں سرِ مو فرق نہیں تھا اور میں اس کی توضیح کرنے سے قاصر تھا۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی جب آدمی ذرے کا دل چیر کر دیکھنے میں کامیاب ہے اور خلا کی تسخیر پر مائل ہے ان گنت باتیں ایسی ہیں جن کا احاطہ عقل نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین آ چکا تھا کہ عبدل کی ماں نے اپنے شوہر کو اسی رات خواب میں دیکھا ہو گا جس رات وہ ہلاک ہوا۔

"آپ نے کچھ ایسی باتوں کا ذکر کیا تھا جو منشی مرحوم نے پہلے مجھے بتانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں آپ کو بتا دی تھیں۔" میں نے جانتے بوجھتے موضوع بدل دیا۔ "شاید یہی باتیں انہوں نے خط میں تحریر کی تھیں لیکن وہ خط مجھے نہیں مل سکا تھا۔ اس کی کوئی نقل آپ کے پاس بھی ہے؟ آپ نے ابھی گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ منشی مرحوم کاربن پیپر رکھ کے لکھتے تھے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کیا ہے۔" وہ بولی۔ "عبدل کہاں ہے؟"

"عبدل؟" میں نے اس غیر متوقع سوال پر حیران ہو کے کہا۔ "عبدل یہاں ہی موجود ہے۔"

"عبدل تو باہر چلا جا۔" بڑھیا نے بیٹے کو حکم دیا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو اماں؟" عبدل نے برہمی سے کہا۔ "کیا تمہیں اپنے بیٹے پر بھی اعتبار نہیں؟"

"اعتبار کی بات نہیں ہے بیٹا!" وہ عبدل کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ "تیرے باپ نے یہی کہا تھا۔ میں اس کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ اس نے کہا تھا کہ کبیر خان کو یہ امانت کسی کے سامنے نہیں لوٹانی ہے۔"

میں نے عبدل کی طرف دیکھا تو احساسِ ذلت سے یا غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور وہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس کی ماں کے عدم اعتماد والے تذلیل آمیز رویئے کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی کہ وہ عقل سے کام لے کر صورتِ حال کو سمجھے اور تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے چلا جائے۔ سخت اشتعال کے عالم میں اس نے دروازے کا رخ کیا تو مجھے افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے رضوی صاحب کے گھر میں وہ عاجزی و انکساری اور مظلومیت کا پیکر بنا ہوا تھا لیکن اب وہ مجسم نفرت و حقارت کا دھواں دیتا آتش فشاں تھا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنا بڑا انقلاب اس کی شخصیت میں رونما ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے نکل گیا تو اس کی ماں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر میں نے اسے ایک منٹ خاموش رہنے کے لیے کہا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک میں دروازے سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا اور عبدل میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑ کے اٹھا لیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے عبدل!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنی ماں کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم صاف انکار کر دیتے۔"

"اس نے مجھے کمرے سے باہر جانے کا حکم دیا تھا۔" عبدل خود کو چھڑا کے بولا۔ "میں کمرے سے باہر کھڑا ہوں۔"

"ایسی باتوں سے تم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہو، مجھے نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس دروازے سے اتنی دور چلے جاؤ کہ تمہارے کان کچھ نہ سن سکیں اگر تم نے چالاک بننے کی کوشش کی تو میں خود تم کو دور ڈال آؤں گا۔ پھر تم ایک گھنٹے تک ادھر کا رخ نہیں کر سکو گے، یہ دروازہ کھلا رہے گا... جاؤ۔"

عبدل نے خون آشام نظروں سے مجھے گھورا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔

"کبیر خان!... عبدل!" بڑھیا چلا رہی تھی۔ "کیا بات ہے تم دونوں چلے گئے ہو کیا؟" وہ اونچا سنتی تھی اس لیے میری اور عبدل کی گفتگو اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی اگر عبدل دروازے کے باہر کھڑا رہتا تو یقیناً ہماری سب باتیں سن لیتا کیونکہ مجھے ہر بات بڑھیا کے کان میں بلند آواز سے کہنی پڑتی تھی۔

"میں ذرا دروازے تک گیا تھا ماں جی!" میں نے کہا۔ "اب جو کہنا ہے کہہ دیجیے سننے والا کوئی نہیں ہے۔"

عبدل کی ماں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو گردن سے جدا کیا۔ زنجیر کے درمیان ایک لاکٹ تھا جو دیکھنے میں تعویز نظر آتا تھا۔ اس نے تقریباً سوا انچ لمبی اور ایک انچ سے کم چوڑی ڈبیہ کو انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر کھولا اور میرے سامنے کر دیا۔ ڈبیہ کے ایک حصے میں منشی مرحوم کی جوانی کی تصویر تھی اور دوسرے حصے میں کوئی نقش تھا۔

"یہ تصویر پہچانی تو نے کبیر خان؟" وہ بولی۔ "میری تو آنکھیں بھی نہیں ہیں مگر میں اسے دیکھ سکتی ہوں اور یہ نقش میرے بزرگوں کی نشانی ہے۔ دیکھ اس پر کیا لکھا ہے اور اس کے نیچے کیا ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہو گا...؟" میں نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کاغذ کا وہ پرانا میلا سا ٹکڑا اٹھا لیا جس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی چابی تھی۔ میں نے وہ چابی بھی اٹھا لی اور چار مرتبہ تہہ کیے ہوئے کاغذ کو احتیاط سے کھولا۔ کاغذ اتنا پرانا تھا کہ مجھے ہر تہہ پر سے اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ کاغذ پر صرف سات سو چھیاسی کے اعداد لکھے ہوئے تھے۔

"اس پر تو صرف بسم اللہ کے اعداد لکھے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ چھوٹی سی چابی ہے؟"

"ہاں۔" بڑھیا نے کہا۔ "ان مبارک اعداد سے سارے بند دروازے کھل جاتے ہیں اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" اس نے مجھے ایک اور چابی تھمائی جو عام قسم کے قفل کی چابی تھی اور اس نے تکیے کے نیچے سے برآمد کی تھی۔ "اس کمرے میں دو ٹرنک رکھے ہیں۔ یہ نیچے والے ٹرنک کی چابی ہے۔ اس میں میری شادی کے تمام زیور اور بھاری جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کئی سال سے اس کو کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن جانے سے پہلے عبدل کے باپ نے کپڑوں کے نیچے ایک چھوٹا سا بکس رکھوایا تھا اور مجھے بتا دیا تھا۔ اس بکس میں دو تالے ہیں۔ ایک چابی سے کھلے گا اور دوسرا نمبروں کو گھمانے سے۔ تجھے سات سو چھیاسی کے عدد ملانے ہوں گے۔ صندوق میں سے بکس نکال کر دیکھ لے، تیری امانت محفوظ ہے یا نہیں؟"

اوپر کا صندوق کافی بڑا اور بھاری تھا اسے ہٹانے کے لیے مجھے خاصی قوت صرف کرنی پڑی۔ پھر میں نے نیچے والے ٹرنک کا تالا کھولا اور کچھ دیر ڈھکنا تھامے بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی صندوق ہے جسے میرا باپ پاکستان آتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا اور جس میں وہ اپنی زندگی کی سب خوبصورت یادیں سمیٹ کر رکھتا تھا۔ ایسے ہی گہنے اور کپڑے میری ماں کے بھی تھے جو سلامت شاہ کے کوارٹر سے غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ٹرنک میں سلامت شاہ کی لاش کے ٹکڑے بھر دیئے گئے تھے۔ بڑھیا کی آواز سن کر میں چونکا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ مجھے بکس ملا ہے کہ نہیں۔ میں نے جلدی جلدی کافور سے مہکتے ہوئے پرانے ریشمی کپڑوں کے نیچے ہاتھ مارا۔ بکس درحقیقت ایک بریف کیس تھا جو بالکل نیا تھا اور

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

شاید منشی اپنے غیر ملکی دوروں سے واپسی پر لایا تھا۔

بریف کیس میں ایک لفافے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور یہ بالکل ویسا ہی لفافہ تھا جیسا ایک بار پہلے بھی میرے ہاتھ آچکا تھا لیکن اس لفافے کے حصول کی خاطر ہم نے ناقابلِ بیان سختیاں جھیلی تھیں اور بہت نقصان اٹھایا تھا۔ یہاں تک کہ منشی کو اس کی قیمت، جان دے کر ادا کرنا پڑی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میری نگاہ کھلے دروازے کی طرف گئی۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا جھلک دکھا کے اوجھل ہوگیا۔ میں نے لفافے کو بریف کیس میں سے نکال کر ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھا اور بریف کیس مقفل کر کے ایک ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ٹرنک کو میں نے مقفل نہیں کیا تھا لیکن ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ٹرنک غیر مقفل ہے۔ بریف کیس کی چابی جیب میں ڈال کر میں عبدل کی ماں کے پاس گیا اور ٹرنک کے تالے کی چابی اسے واپس کر دی۔

"اپنی امانت وصول کرلی؟" وہ بولی۔ "اب مجھ پر کوئی قرض تو نہیں رہا؟"

"نہیں ماں جی!" میں نے کہا۔ "میری چیز مجھے مل گئی ہے، میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ بولی۔ "یہ میرے لیے مجازی خدا کا حکم تھا اگر اس نے کہا ہوتا کہ وزیر خان کے بیٹے کو زہر دے دینا تو مرنے سے پہلے میں تجھے زہر ضرور دیتی۔"

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک سوال کروں؟" میں نے کہا۔ "منشی مرحوم خود کو فومانچو کیوں کہتے تھے؟"

"یہ بڑی پرانی بات ہے کبیر خان!" وہ اداس ہو کے بولی۔ "اسے ڈاکٹر فومانچو کے ناول بہت پسند تھے۔ ایک زمانے میں ان کے ترجمے شائع ہوئے تھے تو ہر جگہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر فومانچو۔ فومانچو کی واپسی... اور پتہ نہیں کیا کیا نام ہوتے تھے۔ عبدل کا باپ ان کے پیچھے ایسا دیوانہ تھا کہ یار دوست اس کو فومانچو کہنے لگے تھے مگر اس نے کبھی کسی کی بات کا بُرا نہیں مانا۔"

اس کی بات سننے کے بعد منشی کا پُراسرار رویہ میری سمجھ میں آگیا۔ اس نے خط لکھنے کے اور پہنچانے کے جتنے طریقے اختیار کیے تھے انہی ناولوں سے متاثر ہو کے کیے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ڈاکٹر فومانچو کا کردار تخلیق کرنے والے انگریز مصنف کو بہت بڑا خراجِ عقیدت تھا۔ عبدل کی ماں سے اجازت لے کر میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور کوٹھی سے باہر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ میں پوری طرح محتاط تھا مگر مجھے اپنے آس پاس کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پھر ایک کھڑکی کے چھجے پر سے عبدل نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور ہم دونوں ایک ساتھ نیچے گرے۔ بریف کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ میرے اٹھنے سے پہلے عبدل اس کی طرف لپکا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک ٹانگ بڑھائی اور عبدل پھر منہ کے بل گرا مگر اس نے بریف کیس نہیں چھوڑا۔ اگر میں چاہتا تو ایک پل میں اسے مقابلے کا مزہ چکھا دیتا لیکن میں نے جانتے بوجھتے کچھ سستی اور اناڑی پن کا مظاہرہ کیا اور اسے اتنی مہلت دی کہ وہ اٹھ کر فرار ہو جائے لیکن وہ فرار نہیں ہوا۔ اس نے اچانک ریوالور نکال لیا اور گولی داغ دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اتنی جلدی بحال نہیں ہوسکتی تھی۔ جنگ ابھی جاری تھی اور اسے دشمن پر غلبہ پانے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ اس موقع کو کیسے ضائع کرسکتا تھا اگر میں مقابلہ جاری رکھتا تو دوسری گولی یقیناً میرا کام تمام کر دیتی۔ پہلی گولی کا نشانہ تو اس لیے خطا ہوگیا تھا کہ عبدل نے بڑی عجلت میں فائر کیا تھا اور میں بھی متحرک تھا اگر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا تو وہ اطمینان سے نشانہ لے کر گولی چلاتا چنانچہ میں نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیا اور چیخ مار کر نیچے گر گیا۔ اندھیرے میں عبدل کو خون تو نظر نہیں آیا لیکن مجھے تڑپتا ہوا دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ گولی اپنا کام کر گئی ہے۔ میرے لیے خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ دوسری گولی چلا کے میری موت کو یقینی بنانے کی کوشش نہ کرے لیکن وہ بریف کیس مل جانے کے بعد ایک سیکنڈ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر سب سے پہلے محسن آجائے گا جو صرف میری حفاظت کے لیے دروازے پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ پلٹ کر بے تحاشا بھاگا۔ میں نے فرش پر لوٹتے ہوئے دیکھا کہ اس نے بریف کیس کو ہاتھ گھما کے چھت پر پھینک دیا ہے۔ میں اس شخص کی طرح دردناک آوازیں نکالتا رہا جو نزع کے کرب میں مبتلا ہو اور عبدل کو بندر کی طرح کھڑکی کے چھجے پر اور وہاں سے چھت پر چڑھتے دیکھتا رہا۔ دوسری طرف سے میں نے محسن کو دوڑ کر آتے ہوئے دیکھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے سکندر؟" محسن نے چلا کر کہا۔ "فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"وہ تو بھاگ گیا۔" میں نے کہا اور ویران چھت کی طرف دیکھا۔ عبدل کا تعاقب کرنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ وہ

خالی بریف کیس کے سوا کچھ بھی نہیں لے گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس صورتِ حال پر قہقہہ مار کے ہنسوں مگر میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ خطرہ اب بھی باقی ہے۔ عبدل اپنا روپ بدل کے مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ بدستور میرا دشمن تھا یا دشمن کا آلۂ کار تھا اور اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ رشیدا ابھی اس کے ساتھ ہی گھر میں یا گھر کے آس پاس کہیں موجود ہو۔ عبدل ماں کی ضد سے مجبور ہوگیا تھا۔ اور اس کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے مجھے بلا لایا تھا۔ اس نے یقیناً ماں سے معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ وہ مجھ سے یا وزیر خان سے کیوں ملنا چاہتی ہے اور مرنے سے پہلے کون سا قرض اتارنے کے لیے اتنی فکرمند ہے مگر بڑھیا جسمانی طور پر مفلوج ہونے کے باوجود پوری طرح ہوش و حواس میں تھی اور شوہر کے حکم کو خدا کا حکم سمجھتے ہوئے آخری وقت تک راز کو راز رکھنے کے ارادے پر قائم تھی۔ اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ اس نے کچھ دیر پہلے بیٹے کو کمرے سے نکال کر کیا تھا۔ ماں کی بات نے عبدل کے تجسس کو پریشانی میں بدل دیا ہوگا اور اس نے یہ بات رشیدے کو یا ان لوگوں کو بتائی ہوگی جو میرے نقطۂ نظر سے وزیر خان اور پھر میر شرافت علی کے قتل کے ذمہ دار تھے اور جنہوں نے مجھے قاتل بنانے کے بعد میرے قتل کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے ہی عبدل کو یہ اسکیم سمجھائی ہوگی کہ وہ شرافت کا لبادہ اوڑھ کے مجھے گھیر لائے اور پھر دیکھے کہ منشی کی بیوہ کیا چکر چلانا چاہتی ہے۔ منشی میرے دشمنوں کے نزدیک نمک حرام اور غدار تھا۔ چنانچہ شوہر کو مجازی خدا سمجھنے والی بیوی بھی ان کے لیے خطرہ پیدا کرسکتی تھی اور ان کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کیا جانتی ہے۔ اگر وہ اتنی ضعیف اور قریب المرگ نہ ہوتی تو شاید وہ تشدد کے مخصوص طریقے آزما کے اس سے ہر بات پوچھ لیتے مگر وہ جانتے تھے کہ بڑھیا کی صرف سانس اٹکی ہوئی ہے اور جسم و جاں کا رشتہ سُوت کے کچے دھاگے کی طرح ہے جو ایک معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جائے گا۔ وہ مرگئی تو انہیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ کون سا راز اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔ عبدل نے یقیناً چھپ کر ساری باتیں سن لی تھیں اور وہ مجھ سے لفافہ چھین لینے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن یہ اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ بہت جلد عبدل کو اپنے بے وقوف بنائے جانے کا پتہ چل جائے گا۔ رشیدے کے سامنے یا اپنے کسی آقا کے حضور اس نے بڑے فخر سے بریف کیس پیش کیا ہوگا تو اس میں سے کچھ بھی نہیں نکلا ہوگا اگر وہ کہیں قریب ہوئے تو فوراً واپس آئیں گے۔

"جب وہ بھاگ گیا ہے تو یہاں کھڑے رہ کر چھت کو گھورنے کا کیا مقصد؟" محسن نے میرا بازو ہلا کے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ واپس نہ آجائیں۔ ہمیں نکل جانا چاہیے یا انتظار کرنا چاہیے؟" پھر میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے بتایا کہ جس لفافے کے لیے فومانچو کی جان گئی تھی اور جو ہمارے ہاتھ میں آنے کے بعد بھی ضائع ہوگیا تھا، اس کی ایک نقل عبدل کی ماں کے پاس بھی موجود ہے اور اس کے پرانے کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی ہے لیکن عبدل خوش فہمی میں خالی بریف کیس لے کر فرار ہوگیا ہے۔

"ایسی صورت میں جلد بازی سے نقصان ہوسکتا ہے۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ عبدل کے علاوہ اس سازش میں کون کون شامل ہے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ہم دونوں شرافت علی کی کوٹھی سے باہر آئے تو ہماری صورت سے، چال سے اور انداز سے مایوسی اور شکست عیاں تھی۔ ہم گاڑی میں واپس ہوگئے۔ میں نے بیک ویو مرر میں اور محسن نے سر گھما کے کئی بار دیکھا لیکن ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہم الٹے سیدھے راستوں سے گزر کے لاہور ہوٹل کی طرف سے پھر میکلوڈ روڈ پر پہنچے اور گاڑی کو چوک میں "کنگ سرکل" ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا کر دیا۔ شرافت علی کی کوٹھی تک باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ شرافت علی کی کوٹھی اسی طرح ویران اور تاریک پڑی تھی۔ اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے اور محسن نے دو مختلف مقامات سے دیوار کو عبور کیا۔ کوٹھی کے دونوں طرف پتلی سی گلی تھی جو ساتھ والی کوٹھیوں کی دیواریں کھڑی ہونے سے خود بخود بن گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی گلی سیدھی سرونٹ کوارٹر تک پہنچ کے ختم ہوتی تھی۔ دائیں جانب کی گلی کے آخری حصے میں گیراج تھا جس میں اب شرافت علی کی گاڑی مقفل دروازوں کے پیچھے کھڑی رہ گئی تھی۔ میں نے بائیں طرف چلنا شروع کیا اور محسن نے دائیں جانب سے گھوم کر آنے والا راستہ اختیار کیا۔ یہ حفاظتی پیش بندی تھی۔ خدانخواستہ ہم میں سے ایک دشمن کے نرغے میں آجاتا تو دوسرا اس کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرسکتا۔ رضوی صاحب نے یقیناً پولیس نہیں بھیجی تھی ورنہ وہ فائرنگ کی آواز سن کر ضرور پہنچ جاتے۔ انہوں نے صرف عبدل کو ڈرایا تھا اور ہمیں اب اپنی حفاظت خود کرنی تھی۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مجھے گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا۔ عبدل کی ماں کے کمرے میں روشنی تھی اور سرونٹ کوارٹر میں سے دو مردوں کے اونچی آواز میں بات کرنے سے پتہ چلتا تھا کہ دشمنوں کے بارے میں ہماری توقعات غلط نہیں تھیں۔ میں نے محسن کے آنے کا انتظار کیا ایک منٹ بعد وہ گیراج کی طرف سے نمودار ہوا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بے آواز قدموں سے اندھیرے کی پناہ میں چلتے ہوئے دروازے تک جا پہنچے اور باہر رک کے دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

"اماں! دیکھ، اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر۔" عبدل کی آواز آئی۔ "تو نے سکندر بخت کو کیا دیا تھا؟"

"بدبخت، نامراد..." بڑھیا چلائی۔ "تجھے بتا دیا ہے کہ ایک بار تیرا باپ ایک امانت چھوڑ گیا تھا، وہ میں نے اس کے حوالے کر دی۔"

"یہ بکواس کرتی ہے عبدل!" دوسرے مرد کی آواز نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس نے سیدھی طرح نہ بتایا تو..."

"نہیں شیدے!" عبدل منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اماں کو سمجھا لوں گا۔ دیکھو اماں! وہ یہاں سے ایک بکس لے گیا تھا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اس کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اس میں کچھ بھی نہیں نکلا۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ اس بکس میں کیا تھا۔" بڑھیا بدستور اپنی بات پر اڑی رہی۔ "تجھے کیا بتاؤں۔"

"اچھا تیرے پاس وہ بکس کہاں سے آیا؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو نے تو ابھی دنیا میں بہت کچھ نہیں دیکھا بیٹا! جو یہ اندھی آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔" بڑھیا بولی۔

"تو ہٹ جا عبدل!" شیدے نے چیخ کر کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں سب معلوم کر لوں گا... اس کی زبان نہ کھلی تو..."

"تو کیا ہو گا؟" عبدل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو ملے گا اسے؟ اس بڑھیا کو جو بستر سے اٹھ نہیں سکتی؟ کیا ملے گا تجھے اس کو مار کے شیدے! تیرے نامۂ اعمال میں ایک اور قتل شامل ہو جائے گا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" شیدے نے غرا کے کہا۔ "یہ ویسے بھی مرنے والی ہے۔ میں اسے اجازت نہیں دے سکتا کہ مرتے مرتے ہم سب کو مروا دے۔"

"میں بھی تجھے اجازت نہیں دے سکتا شیدے! کہ میرے سامنے تو میری ماں پر ہاتھ اٹھائے۔" عبدل نے بے خوفی سے کہا۔

"میں تجھے صرف پانچ منٹ دوں گا۔" شیدے نے خطرناک لہجہ بنا کے کہا۔ "اتنی دیر میں اس سے پوچھ لے کہ اس نے سکندر کو کیا بتایا ہے۔ اس کے بعد تو نے میرا راستہ روکا تو میرا ہاتھ تجھ پر اٹھے گا۔ مجھے شک ہے کہ تو نے بھی غفلت برتی اور سکندر پر نگاہ نہیں رکھی، ورنہ وہ بریف کیس خالی نہ ہوتا۔"

"قسم خدا کی شیدے! میرے سامنے اس نے بریف کیس میں سے کوئی چیز نکال کر کہیں نہیں چھپائی تھی۔" عبدل بولا۔ "وہ نکلا ہی تھا کہ میں نے اس سے بریف کیس چھین لیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بریف کیس میں تھا، سکندر اسی کمرے میں چھپا گیا ہو گا۔" شیدے نے کہا۔ "خیر وہ ہم بعد میں تلاش کریں گے۔ اپنی ماں سے پوچھ کہ اس نے اپنے..."

"شیدے!" عبدل چیخا۔ "میرے سامنے میری ماں کو گالی مت دے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

"شیدے نے قہقہہ مارا۔ "خون پی جائے گا!" اس نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "خالی ہاتھوں سے؟ چمگادڑ کی اولاد!"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ عبدل نے اس پر حملہ کیا۔ ہم یہ جھانک کر دیکھ چکے تھے کہ شیدا صرف ریوالور کی وجہ سے ہی نہیں، جسمانی اعتبار سے بھی عبدل پر بھاری پڑتا تھا۔ اس نے گولی چلانے کے بجائے گھٹنا اٹھا کے عبدل کے پیٹ میں مارا اور اپنے ہی زور میں آنے والا عبدل ضرب کی شدت برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پیچھے گرا تو پلنگ سے ٹکرا کر ماں کے اوپر جا پڑا۔

"عبدل!" بڑھیا نے چیخ کر کہا اور اپنے دونوں ہاتھ اس اندھیرے میں پھیلائے جو دن اور رات کے فرق کے بغیر اس کی دنیا میں چھایا رہتا تھا۔ "کیا ہوا ہے تجھے، بول؟"

میں اور محسن دروازے کی دہلیز سے سر نکالے اندر کا پورا منظر دیکھ رہے تھے اور مداخلت کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ شیدا اچانک آگے بڑھا۔ اسی وقت عبدل کی نظر نے ہمیں دیکھا اور ہم جو اس کے دشمن تھے، یک لخت اس کی نظر میں مدد کے لیے پہنچنے والے فرشتۂ غیب بن گئے۔ وہ ہماری جان کا دشمن اور ہمارے خون کا پیاسا تھا مگر اس وقت وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا تھی کہ مجھے اور میری ماں کو بچا لو۔ میں بہت کمینہ ہوں مگر مجھے معاف کر دو۔ مگر تاسف اور پشیمانی کے اظہار کا وقت گزر چکا تھا اور

مکافاتِ عمل کی گھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لب کھولتا یا ہم اسے بچانے کی کوشش کرتے، شیدا اس کے سر پر ریوالور کی بھرپور ضرب لگا چکا تھا۔ یہ ضرب ماں کے بوڑھے ہاتھوں پر بھی آئی تھی۔ عبدل کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ ماں کے پھیلے ہوتے ہاتھوں میں گر گیا۔ اس سے زیادہ دل گداز چیخ عبدل کی ماں نے ماری۔

"مار ڈالا؟ میرے عبدل کو مار ڈالا؟" وہ دیوانہ وار عبدل کا سر ٹٹولتے ہوتے بولی اور اس کے بوڑھے ہاتھ خون میں بھر گئے۔

"ابھی تو نہیں مارا ہے لیکن مار ڈالوں گا۔" شیدا چیخ کر بولا اور اس نے ایک ہاتھ سے عبدل کو کھینچ کر ماں سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن دو سوکھے ہاتھ عبدل سے یوں چمٹ گئے تھے کہ عبدل اس کے وجود کا ہی ایک حصہ بن گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ جنم لینے سے پہلے تھا۔ اس ایک لمحے میں شیدے کی پشت ہماری طرف ہوئی اور میں نے اس پر چیتے کی طرح جست لگائی جو لہو کی پیاس دبائے شکار کے زد پر آجانے کا منتظر بیٹھا ہو۔ اس غیر متوقع حملے نے شیدے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اگر میں چاہتا تو ایک ہاتھ مار کے اس کی گردن توڑ دیتا یا اسے بے ہوش کر کے لٹا دیتا لیکن مجھ پر دحشت سوار تھی۔ میں اسے مارتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرے مکے اس کے سر، پیٹ اور منہ پر اتنی قوت سے پڑے کہ وہ کئی بار گرا۔ جب وہ گرتا تھا تو میرے پاؤں خود بخود اس کو ٹھوکریں مارتے تھے۔ اس میں مدافعت کی قوت ہی نہ رہی تھی کہ وہ تندرست و توانا تھا مگر میرے غیظ و غضب کی طوفانی آندھی میں اس کا وجود حقیر تنکا بن گیا۔ میں نے آخری بار اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اتنی طاقت سے دیوار پر دے مارا کہ اس سرونٹ کوارٹر کی پرانی دیواریں بھی ہل گئی ہوں گی۔

جب مجھے ہوش آیا تو منظر بالکل بدل چکا تھا۔ چارپائی پر عبدل کی ماں بانہیں پھیلائے پڑی تھی اور اس کی کھلی آنکھیں چھت پر مرتکز ہو گئی تھیں۔ روح نے بالآخر خاک ہو جانے والے جسم سے رہائی پالی تھی۔ بڑھیا کے لبوں پر مجھے ایک پُراطمینان کیفیت کا احساس ہوا۔ اس کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی جو ان سب کا تمسخر اڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جنہوں نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی کہ پھونک سے اڑ جانے والی یہ بڑھیا اپنے خداوندِ مجازی کے حکم کی تعمیل نہ کرے مگر انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ وہ جو اپنی

دولت، اپنے اثر و رسوخ اور اپنی بدمعاشی کے غرور میں تھے اور خود کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور ناقابلِ تسخیر سمجھتے تھے، اس معذور اور بے بس عورت کے عزم کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ عبدل خون میں نہایا ہوا شیدے کا ریوالور اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے محسن کو دروازے کے قریب روک رکھا تھا اور میرا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا چنانچہ اس کے چہرے پر سے بہتا ہوا خون اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا، اس کے ہاتھ پر بہہ رہا تھا اور فرش پر ٹپک رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا خون اسی طرح ضائع ہوتا رہا تو وہ زیادہ دیر نہیں جیے گا۔

"سکندر صاحب..." عبدل نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے شیدے کو دیکھا۔ جو بڑی مشکل سے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا تھا۔ "عبدل! ہم تمہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

عبدل نے انکار میں سر ہلایا اور ایک ہاتھ سے دیوار تھام لی۔ دیوار پر ایک خونی پنجے کا نقش بن گیا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارے خلاف جھوٹی گواہی دی تھی..."

"کس کے کہنے پر؟" میں نے کہا۔ "شرافت علی کا قاتل کون تھا؟"

"ان سب باتوں کا وقت نہیں ہے..." اس نے آستین سے بھنوؤں تک آجانے والا خون صاف کیا۔ "میری ماں تو مر ہی چکی ہے۔ میرے باپ نے بھی تمہارے لیے جان دی تھی۔ اب میرا وقت ہے... میں بہت ناخلف اولاد تھا لیکن میدانِ حشر میں سرخ رو ہونے کا وقت ابھی ہے۔ تم جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ پھر میں کوٹھی میں سے ٹیلیفون کر کے پولیس کو بلاؤں گا اور ان کے سامنے اعترافِ جرم کروں گا۔ مرتے ہوئے شخص کے اعتراف کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے نا... میں کہہ دوں گا کہ شرافت علی کو میں نے ہی مارا ہے اور شیدے کو بھی..."

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن شیدا تو ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

جواب دینے کی بجائے عبدل نے ریوالور سے شیدے کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ "شیدا زندہ تھا مگر اب نہیں ہے۔ اس بدمعاش نے میری ماں کو مارا۔ وہ مجھے بھی مارتا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

چاہتا تھا۔۔۔ اور اس لڑائی میں ہم دونوں مارے گئے۔۔۔ پولیس کے سامنے میرا بیان یہی ہوگا۔۔" اس نے قہقہہ مارا اور گرتے گرتے بچا۔ وہ پاگل ہو چکا تھا اور اس کی طاقت جواب دینے لگی تھی۔ "تم دونوں جاؤ" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ شیدا اب بالکل ساکت و صامت پڑا تھا۔

"اچھا عبدل ہم جاتے ہیں" میں نے کہا "لیکن وہ چیز جو تمہاری ماں نے مجھے دی تھی، میں یہیں چھوڑ گیا تھا۔" میں نے لوہے کے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا "بریف کیس میں ایک لفافہ تھا۔ تمہاری ماں کی امانت۔۔"

عبدل نے سر ہلایا "لے جاؤ۔ وہ ضرور لے جاؤ، ورنہ میرے باپ کی۔۔۔ میری ماں کی۔۔۔ اور میری قربانی رائیگاں جائے گی۔۔۔ تمہاری امانت کی حفاظت کے لیے ہم سب نے جان دی۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

میں نے بے یقینی کے ساتھ اوپر والا ٹرنک ہٹایا اور نیچے والے ٹرنک کے تالے کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔ لفافہ ہاتھ میں آنے تک مجھے یقین نہیں تھا کہ عبدل جو کچھ کہہ رہا ہے، بقائمی ہوش و حواس کہہ رہا ہے اور وہ مجھ پر گولی نہیں چلائے گا۔ لفافہ نکال کے میں نے پھر اس کی طرف دیکھا اور اس نے ریوالور سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جو کچھ میری اور محسن کی نظروں نے دیکھا تھا، کسی بھیانک خواب کا حصہ لگتا تھا۔ ہم دونوں بوجھل قدموں سے چلنے لگے۔ سرونٹ کوارٹر سے باہر آنے کے بعد ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ جسم کی رہی سہی قوت سے کام لے کر عبدل دیوار کا سہارا لیتا کوٹھی کی طرف آ رہا تھا۔

"ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے" میں نے محسن کی طرف دیکھے بغیر کہا "دعائے مغفرت بھی نہیں۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام گناہوں کا کفارہ خود ہی ادا کر دیا ہے۔"

مجھ پر مسلسل یہ خوف غالب تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی نادیدہ دشمن ہم پر حملہ نہ کر دے۔ معلوم نہیں منشی مرحوم نے کاغذ کے چند صفحات میں کیا لکھ دیا تھا کہ اس تحریر کو میری دسترس سے دور رکھنے کے لیے دشمن سب کچھ کر چکے تھے اور ان کی آخری ناکام کوشش کا نتیجہ تین افراد کی موت کی صورت میں نکلا تھا لیکن ہم بھی اس وقت تک اپنی کامیابی کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جب تک خط کا مضمون ہمارے ذہن میں منتقل نہ ہو جائے۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے میں بہت محتاط تھا اور میری نظریں ہر اجنبی پر تھیں کہ کہیں وہ ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ میں اس لفافے کو کھول کر دیکھوں جسے میں نے قمیص کے اندر چھپا لیا تھا مگر میں سڑک پر اس کو نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ میں اور محسن دونوں اعصابی کشیدگی پر قابو پا کے نارمل نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ جیب میں تھے۔ میں نے محسن کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ جیسے ہی وہ کوئی خطرہ محسوس کرے ریوالور نکال لے۔ ہمارے لیے تقدیر کے فراہم کردہ اس موقع کو ضائع کرنا انتہائی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ چنانچہ ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ساتھ پھر دھوکا نہ ہوا ہو اور لفافے میں سادہ یا بے معنی کاغذات کے سوا کچھ نہ نکلے۔

"محسن!" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دینی چاہیے۔"

"ہمارے پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟" محسن بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے چاروں طرف نگاہ رکھی تھی" میں نے کہا "لیکن میں سو فیصد یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا اور اس وقت تک کے ایک فیصد امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے دشمنوں نے بھی عبدل اور شیدے کی ناکامی کے امکانات کو نظر انداز نہ کیا ہو اور وہ ہماری گاڑی کے آس پاس موجود ہوں کہ ہم بخیر و عافیت یہ خطہ لے کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ پھر ہمارا راستہ روک سکیں۔"

"تیری بات دل کو لگتی ہے" محسن نے کہا "ایک تو رالو کی اس گاڑی کا رنگ ایسا ہے کہ ہر جگہ پہچانی جاتی ہے۔ رنگ سے زیادہ اس کا حلیہ متوجہ کرتا ہے۔ ہم کوئی ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔"

میکلوڈ روڈ پر پہنچ کر ہم نے مخالف سمت میں جی پی او کی طرف چلنا شروع کیا۔ ٹیکسی والے سینما کے آخری شو کی سواریوں کو لوٹنے کے لیے بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی کرشن نگر کی آخری حدود کے ویران علاقے تک جانے کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ دلیل ان کی وہی تھی کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی اور اس دلیل کی تجویز کا جواب پچاس کا نوٹ تھا جس کی ایک جھلک دکھا کے ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ محسن نے ٹیکسی والے سے صرف اتنا ہی کہا کہ بھائی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ واپسی میں خالی آنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر تمہیں ٹیکسی چلانے میں کوئی فائدہ نہیں نظر آ رہا ہے تو دوسرے دھندے بہت ہیں۔ یہ کوئی برا ماننے والی بات نہیں تھی مگر ٹیکسی ڈرائیور ضرورت سے زیادہ بدتمیز تھا۔

ٹیکسی روک دی۔ "... پچاس روپے کا نوٹ دے کر سمجھتے ہو کہ مجھے خرید لیا ہے" ... کے بولا۔ "گھنٹہ بھر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔ چلو ..."

... نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "چلو غلطی ہو گئی" میں نے محسن کا پیر دبا کے مسکینی سے کہا "غصہ ... ٹیکسی چلاؤ۔"

... ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ باتیں اور کہیں کہ وہ کسی کے باپ کا ... اور بڑے بڑے پھنے خاں اس کے سامنے کچھ نہیں ... اس کے بعد ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے قمیص کے ... لفافہ نکالا۔ لفافہ کھول کر کاغذات برآمد کیے اور ... لفافے کو پھر بند کر کے چھپا لیا۔ کاغذات میں نے محسن ... دیے اور اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنی ... کے اندر پتلون کی بیلٹ کے نیچے دبا کر رکھ لیے۔

"میں تجھے راستے میں کسی جگہ اتار دوں گا" میں نے ... میں کہا "ہم دونوں کا ایک ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ... انکل جنوی کو ٹیلی فون کر دینا کہ وہ ہماری طرف سے پریشان ... ہوں۔ ہم صبح کو حاضر ہوں گے۔ اس کے بعد تو کوئی اور ... لے کر آ جانا۔ میں شہلا کے گھر میں تیرا انتظار کروں گا۔"

"اس طرح الگ الگ جانے کا فائدہ؟" محسن نے کہا۔

"فائدہ ہو یا نہ ہو، احتیاط ضروری ہے" میں نے کہا۔ اسی احتیاط کی وجہ سے عبدل کو خالی بریف کیس ملا تھا۔ خدانخواستہ کوئی میرے پیچھے ہوا تو اسے پھر ناکامی ہوگی اور خالی ... ملے گا۔" انگریزی بولتے بولتے میں نے فرانسیسی میں ... "میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی بدتمیزی کی تھوڑی سی سزا بھی دوں گا۔"

ڈرائیور نے سر گھما کے پیچھے دیکھا "انگریزی تو میں نے ... دسویں تک پڑھی ہے مگر یہ کون سی زبان تھی؟"

"یہ فادری زبان تھی" میں نے سنجیدگی سے کہا "جیسے ... کی زبان ہوتی ہے نا۔۔"

"ویسے دیکھنے میں ہم پاکستانی لگتے ہیں" محسن نے کہا۔ "لیکن ہماری ماں انگریز تھی اور باپ فرانسیسی تھا اور وہ ... ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالک تھے۔ بڑا اچھا بزنس تھا، ... سب ڈوب گیا۔"

"... ہم اب یہاں خوار پھر رہے ہیں شتر بے مہار کی ..." میں نے کہا "بس گاڑی ایک منٹ کے لیے موڑ پہ ... آدھی سواریوں کو اترنا ہے" ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے گھور کر ہمیں دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ محسن کے اترتے ہی میں نے اسے آگے چلنے کے لیے کہا۔ گھر ابھی ایک فرلانگ دور تھا کہ میں نے ٹیکسی رکوائی اور نیچے اتر آیا "بھائی صاحب!" میں نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔ "ذرا باہر تشریف لائیے۔ آپ سے کچھ گفت و شنید کرنی ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے" وہ بولا "کرایہ نکالو۔"

میں اطمینان سے ہاتھ باندھے کھڑا رہا "بات یہ ہے حضورِ والا کہ یہ بندہ حقیر فقیر پُر تقصیر کرایہ ادا کرنے کا اس وقت تک کوئی ارادہ نہیں رکھتا جب تک آپ اپنے گستاخانہ رویے پر اظہارِ ندامت نہ فرمائیں۔ اردو سمجھ میں آ رہی ہے نا، ماشاءاللہ میٹرک تو پڑھی ہوگی۔"

"اسے کی بکواس اے" ڈرائیور مشتعل ہو کے باہر نکلا۔

"کی ٹر ٹر لائی ہوئی اے؟"

"یہ خاکسار واضح کرنا چاہتا تھا کہ آغاز میں ہم مجبور تھے، انجام آپ کی مجبوری ہے" میں نے شستہ اردو میں کہا۔

"مجبوری دے پتر" ڈرائیور نے ہاتھ گھمایا اور میں نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ دوسرے لمحے میں وہ سڑک پر لیٹا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ پھر اٹھا اور ڈب سے خنجر نکال کے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں چند قدم کے فاصلے پر اسی طرح

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہاتھ بلند کیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ کی ضرب سے اس کا خنجر اڑتا ہوا دور چلا گیا۔ دوسرے ہاتھ نے اس کو پھر پہلے والے پوز میں سڑک پر لٹا دیا۔

"اب فرمائیے کہ آپ اس ناچیز کی درخواست پر غور کریں گے؟" میں پھر ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ سڑک دور دور تک خالی تھی اور دو منٹ کے ایکشن کا یہ ڈراما کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ "بہتر ہے کہ اب معافی مانگ لیجیے کیونکہ ابھی تک تو میں نے صرف ایک ہاتھ کی صفائی دکھائی ہے۔" میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ "ابھی تم نے میرا نشانہ نہیں دیکھا۔"

ڈرائیور بڑی مشکل سے کھڑا ہوا تھا۔ ریوالور دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "اچھا میرے باپ!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔ خدا کے لیے میری جان بخش دے۔ میں نے غلطی کی تھی۔"

میں نے بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ سر ہلایا۔ ریوالور جیب میں رکھا اور پچاس کا نوٹ اس کو پکڑا دیا۔ "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ آئندہ کبھی ملاقات کا شوق ہو تو ایس پی ضامن رضوی کے گھر تشریف لے آئیے گا۔ میں وہیں ملوں گا۔ نام یاد رہے گا نا؟ ضامن رضوی۔"

جس بدحواسی کے عالم میں وہ ٹیکسی لے کر فرار ہوا اس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ٹیکسی کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی میں گلی میں غائب ہو گیا۔ اندازے سے کئی گلیوں میں مڑتا ہوا میں شہلا کے گھر کی سمت چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک گلی کا اختتام کھیتوں پر ہوا۔ پھر میں کھیت کی منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور مکانوں کو غور سے دیکھتا گیا۔ سو قدم چلنے کے بعد میری نظروں نے مکان کو شناخت کر لیا۔ کئی بار دستک دینے پر اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی صحن تک پہنچی۔ دروازے کے قریب آ کے شہلا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں شہلا!" میں نے نرمی سے کہا۔ "تمہارا بھائی سکندر۔"

دروازہ کھل گیا اور میرے سامنے شہلا کا حیرت زدہ چہرہ آ گیا۔ نیند کا خمار ابھی اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔ "آپ؟ اس وقت کیسے؟" وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"پریشان کیوں ہوتی ہے پگلی!" میں نے ہنس کے کہا۔ "سب خیریت ہے اور وقت کی کیا بات ہے۔ بھئی ہمارا گھر ہے۔ ہم بھری دوپہر میں آئیں یا آدھی رات..."

ظاہر تھا کہ میری بات یا میرے لہجے نے اسے مطمئن ... ہے۔ اندر جانے کے بعد جب وہ میری فرمائش پر ... لگی تو میں نے لفافہ نکال کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ ہے وہ خونی لفافہ جس میں ایک خوفناک ... بند ہے۔" میں نے کہا۔ "بالکل اسی طرح جیسے ... ہوتا ہے۔"

"لیکن اس میں تو نہ حقیقت ہے نہ جن" ... لفافے میں جھانک کر کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں محسن حسن خاں شیروانی نمودار ہونے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی جن ہیں اور حقیقت ... پاس ہے۔" پھر میں نے اسے سنجیدگی سے عبدل کے ... لے کر مارے جانے تک کے واقعات سنا دیے۔ ... دہشت زدہ ہوئی کہ مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی ... نے اسے پانی پلایا اور ایک اسٹول پر بٹھا دیا۔ اتنی دیر میں پانی اس نے چائے بنانے کے لیے ابلنے کے لیے رکھا تھا آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس میں اور پانی ڈالا۔

"سکندر بھائی!" شہلا نے کانپتی ہوئی آواز میں ... "آپ کو عبدل کو ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے شہلا کہ ہم مجبور تھے۔" میں نے ... کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم ... ہسپتال لے جاتے مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ پاگل ... تھا اور اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی ... اس کے ہاتھ میں تھا اگر ہم اس کی بات نہ مانتے تو معلوم ... وہ کیا کر گزرتا۔ شاید وہ سر میں گولی مار کے مر جاتا۔ اس کے ... ہمیں بھی نظر آ رہا تھا کہ اسے ہسپتال لے جانے سے کوئی ... نہیں ہو گا۔ الٹا ہم مزید مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی کوشش ہم نے ضرور کی تھی ... خود بھی پولیس کو طلب کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے خیال میں پولیس کے آنے تک وہ زندہ رہے گا؟" شہلا نے کہا۔

"اسے زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "خدا کرے وہ زندہ رہے۔ یہ ہے تو انتہائی خود غرضی اور کمینگی کی ... لیکن حقیقت یہی ہے شہلا کہ اس کا بیان ہمیں سارے ... سے بچا سکتا ہے اور مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کے الزام کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ اگر اسے یہ موقع نہ ملا تو ہم ... زیادہ مشکلات کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ عبدل ...

... استغاثہ کے سب سے بڑے اور چشم دید گواہ تھے۔ ان ... قتل کا الزام میرے سوا کسی پر نہیں آ سکتا۔ میرے لیے انکار ... بھی ناممکن ہو گا کیونکہ میں تو خود انکل رضوی کو بتا کے آیا ... میں کہاں جا رہا ہوں۔ قدرتی طور پر وہ یہی نتیجہ اخذ ... گے کہ میری عبدل اور رشید سے لڑائی ہوئی جس کے ... میں وہ دونوں مارے گئے اور عبدل کی ماں اس صدمے کی تاب ... کے مر گئی۔ مجھ پر ایک کی جگہ تین افراد کے قتل کا الزام آ ... گا اور میری ضمانت تو فوراً ہی منسوخ ہو جائے گی۔ اس ... یہ بہت ضروری ہے کہ عبدل پولیس کے سامنے اپنا پورا ... دیے بغیر نہ مرے۔"

محسن نے اس وقت دستک دی جب میں چائے تیار کر ... تھا۔ وہ اندر آیا تو اس کی صورت دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا ... بہت پریشان نظر آ رہا ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال ... "کہیں وہ پھر... ؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور باورچی خانہ کے فرش پر بیٹھ کر اپنے سامنے خلا میں گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ حزن و ملال ... ناامیدی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ بالآخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ یعنی ہر حفاظتی تدبیر کے باوجود ہماری عقل دشمنوں کے حصار کو توڑنے میں ناکام رہی تھی اور ہم پھر ہار گئے تھے۔ شاید یہ آخری موقع تھا۔ میں نے افسوس اور بے بسی کے ساتھ سوچا اور اب کبھی ہمیں معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ داستان ... کیا تھی جس کا ہر لفظ خون سے لکھا گیا تھا مگر یہ خون رائیگاں گیا۔ جب تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہو گا؟ زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کو کچھ نہیں ہوا تھا اور افسوس کے ساتھ مجھے اگر خوشی تھی تو صرف اسی بات کی۔

"چل چھوڑ محسن! جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب اس پر رنجیدہ ہونے سے کیا حاصل؟" میں نے بہت دیر بعد حوصلہ افزا لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس سے ہمارے عزم و استقلال میں فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ بشرط زندگی ہم اس راز کی حقیقت بھی پا لیں گے کیونکہ زندگی کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ کچھ لوگ روتے ہیں کہ پیمانۂ حیات کتنا خالی ہے، ہم خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ پیمانہ سلامت ہے۔"

محسن نے یک لخت قہقہہ مارا۔ "فلسفی کی اولاد۔" اس نے ہنستے ہنستے بے حال ہو کے کہا۔ "بند کر اپنی بکواس۔ میرے لیے اس سے زیادہ برداشت کرنا مشکل تھا۔"

"تو... مذاق کر رہا تھا؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح ششدر ہو کر کہا۔ "یہ سب اداکاری تھی؟"

محسن کے ساتھ اب شہلا بھی ہنسنے لگی تھی۔ "تم تو کمال کے اداکار ہو۔ فلموں میں جاتے تو ٹاپ کے ہیرو ہوتے۔" شہلا نے اسے چائے کی پیالی تھما دی۔

"کیا عرض کروں مس شہلا!" محسن نے انکساری سے کہا۔ "بس اپنے مقابلے کی کوئی ہیروئن نظر نہیں آتی تھی۔ اگر آپ ہوتیں تو ضرور کوشش کرتا۔"

"یہ سالا تو پیدائشی ایکٹر ہے۔" میں نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے نوٹ کیا کہ شہلا کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ "بلکہ اس کی زندگی مسلسل اداکاری ہے۔ ہیرو یہ تو کیا اس کا باپ بھی نہیں بن سکتا تھا۔ کالج کے زمانے میں اور لندن میں یہ جب بھی اسٹیج پر آتا تھا اس کو مضحکہ خیز کردار ملتے تھے۔"

شہلا کے لیے یہ انکشاف تھا۔ "تم د... قی اسٹیج پر ایکٹنگ کرتے تھے؟"

"ایسی ویسی۔" محسن نے فخر سے کہا۔ "تہلکہ مچا رکھا تھا میں نے۔ قیامت برپا کر رکھی تھی۔"

"یہ بھی بتا دوں کہ تمہیں رول کیا ملتے تھے؟" میں نے جل کر کہا۔ "ایک سے ایک بیہودہ اور مضحکہ خیز۔ ایک مرتبہ یہ ہیروئن کی ماں بنا تھا، ایک مرتبہ اس نے بوڑھے گنجے یہودی کا

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر جی ایم ناز کی شہرہ آفاق تصنیف

قیمت ۴۰ روپے

ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ازدواجی نفسیات

یہ کتاب ڈاکٹر ناز نے دس سال کی محنت سے ان تمام خطوط کی روشنی میں لکھی ہے جو کہ ہزاروں عورتوں نے اپنے مسائل پر مشوروں کے لیے ان کو لکھے تھے۔
اس کتاب میں خواتین کے ان تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے جو ان کی ازدواجی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

کتاب کے چند عنوانات

○ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل ○ تصوراتی محبوب کی تلاش ○ لڑکیوں کا تصوراتی محبوب ○ منگنی اور آئیڈیل ○ بچپن کی منگنی کے نقصانات ○ لڑکے کی طرف سے منگنی توڑنے کے اسباب ○ ازدواجی ہم آہنگی ○ بے حس لوگ ○ رومان پسند جوڑے ○ ازدواجی ہم آہنگی کے چند حقائق ○ اختلافات ترقی کا اخلاقی پہلو ○ لڑکیوں کی باپ سے وابستگی یا نفرت ○ دوہری حیثیت ○ انتہا پسندی ○ مذہبی احساس اور ناپاکی کا تصور ○ تیشہ پرستی کے الزام کا خوف ○ پہلی لڑکیاں بچا کی شا...

مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۳۳ کراچی

پارٹ کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار یہ زنخا بنا تھا اور اسٹیج پر مٹک مٹک کرنا چتا رہا تھا۔ اس کو ویسے بھی بھیس بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہمیں دقت پر پیسے نہیں پہنچے تھے اور کرسمس کا موقع تھا تو یہ لمبی سی سفید داڑھی اور میک اپ سے سانتا کلاز بن کے ہوسٹل کے رہنے والے ہر انگریز طالب علم کے دروازے پر جا پہنچا تھا اور اس نے نہایت جذباتی انداز میں آواز بنا کے کہا تھا کہ غریب سانتا کلاز غریب بچوں کو تحفہ دینے کی خاطر آپ سے تھوڑی سی قربانی چاہتا ہے اور انگریز قوم اس معاملے میں خاصی جذباتی ہے۔ لڑکوں کو والدین نے کرسمس کے لیے زیادہ جیب خرچ بھیجا تھا اور چھٹیاں بھی ہونے ہی والی تھیں۔ یہ ان سے تین سو پونڈ ٹھگ لایا اور انہیں کبھی شک نہیں ہوا۔"

ہنستے ہنستے شہلا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جھینپنے کے باوجود خود محسن بھی ہنس رہا تھا۔ "تین سو پونڈ سے کتنا عیش کیا تھا ہم نے اور گوروں کو لوٹ کر خوشی کتنی ہوئی تھی ہمیں۔" محسن نے قمیص میں ہاتھ ڈال کے کاغذات نکالتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے اب ہمیں سنجیدہ ہو جانا چاہیے مسٹر سکندر ریجنٹ! کیوں نہ خواتین کو باورچی خانے سے نکال دیا جائے۔ یہ رازداری کا معاملہ ہے۔"

"خواتین کو باورچی خانے سے نہیں نکالا جا سکتا۔" شہلا نے اعلان کیا۔ "اعتبار نہیں ہے تو حضرات باتھ روم استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"بات یہ ہے نیک بی بی کہ اس خط کا مواد سنسر سے پاس شدہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس میں کہیں پشتو فلموں کی سچویشن یا پنجابی فلموں کے ڈائلاگ آ گئے تو بڑی غلط بات ہو گی مگر خیر... محسن خیال رکھے گا کہ ایسے حصوں کو حذف کر دے اور آپ کو سنانے کے بجائے مجھے پڑھوا دے۔"

محسن نے پڑھنا شروع کیا۔

"عزیزم کبیر خان!

بعد دعائے خیریت اور درازیٔ عمر کے واضح ہو کہ مجھے اب تک تم سے ملاقات نہ ہونے کا بہت رنج ہے۔ مجھے قوی امید تھی کہ لندن میں تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے کیونکہ اس سے پہلے میں ٹیلی فون پر تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتا چکا تھا جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تمہارا تشویش میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا لیکن تم نہیں پہنچے اور میں بہت مایوس اور رنجیدہ واپس پاکستان لوٹا۔ مایوس اس لیے کہ میں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر تم سے رابطہ قائم کیا تو اس لیے کہ وزیر خان کے بیٹے کی حیثیت سے جو توقعات وابستہ کر لی تھیں تم ان پر پورے مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے نہ آنے کا سبب کیا تھا۔ مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھا تھا یا جو کچھ وہ تمہارے نقطۂ نظر سے اتنا اہم نہیں تھا کہ تمہارے تشویش ہوتا یا تمہاری راہ میں کوئی مجبوری حائل نے تمہارا راستہ روک لیا تھا یا مجھ سے بدظن کر دیا۔

وجہ خواہ کچھ بھی ہو میں تمہیں حقائق سے کی اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ حالات کو دیکھتے یہ کوشش بھی خودکشی کے مترادف لگتی ہے لیکن پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور میں خود کو بھی صف شامل سمجھنے لگا ہوں اگر کوئی تمہاری نظروں نکال کے کسی کے پیٹ میں گھونپ دینے کے لیے جا رہا ہو تو کیا تم اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہو؟ اور خاموش رہ سکتے ہو کہ زید نے بکر کو مار دیا تو مجھے کیا، تو دونوں سے تعلق نہیں اور میرے لیے صرف اپنی ہے؟ میں کسی تیسرے شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا نامہ بر بنا کے نہیں بھیج سکتا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ کچھ لوگوں کو میری ذات پر شک ہو گیا ہے اور وہ میری حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ غالباً کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے تم سے رابطہ قائم کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو پوری گفتگو کی رپورٹ مل چکی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ تمہارے ہوٹل نہ آنے خدا کو کوئی بہتری منظور تھی۔

اب جو کچھ میں جانتا ہوں اسے تحریری میں تمہارے ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا خط کے تم تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو جانے امکانات کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ ایک زمانے میں جاسوسی ناول پڑھنے کا جنون تھا اور میں نے انگریزی کے وہ سب ترجمے جمع کر رکھے تھے جو تیر تھ رام اور اس دور کے دوسرے لوگوں نے کیے تھے ان میں "سکیس روہمر" کے ناول بہت پسند تھے جن کا مرکزی کردار ڈاکٹر فومانچو کا تھا۔ فومانچو کے مطابق پندرہ سولہ ناول تھے اور میں فومانچو سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا تھا کہ جینئس ہے لیکن اس کی منفی ذہانت بھی حیرت بہت میں استعمال ہوتی تو وہ شرلاک ہومز ہوتا۔ میں نے بہت کچھ سیکھا مگر خدا کا شکر ہے استعمال نہیں کیا۔ اب میں ایک چھوٹا کی کوشش کروں گا۔ میں نے نظر نہ آنے والی سے طریقے نوٹ کر رکھے ہیں۔ ان میں میں تمہارے نام ایک خط ارسال صفحات پر مشتمل ہو گا اگر کسی کو شک ہوا تو خط کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور شاید ایک علیحدہ خط کے ذریعے میں تمہیں بتا سادہ صفحات وصول ہونے کے بعد پریشان ہونے نہیں اور اگر خط کو پڑھنا مقصود ہو تو اس خاص طریقہ ہے جس سے تحریر نمایاں ہو جائے گی ہے کہ خط کے مضمون میں سچ صرف ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اس خط کو غلط سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس میں ایک حقیقت بھی شامل کر دی ہے تاکہ وہ محض جھوٹ نہ اگر یہ خط دشمنوں کے ہاتھ پڑ گیا تو تمہیں نقصان نہیں ہو گا مگر تمہارے دشمن دھوکا کھا جائیں ایک چوتھائی واقعات کا سچ غیر ارادی طور پر انہیں واقعات کی سچائی کا قائل کر لے گا اور وہ اس کو ضائع کر کے مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میرا اپنا انجام مجھے اس کی فکر تو ہے لیکن میں اس سے خوف زدہ ہوں۔

میں تمہیں دوسرا خط بھی لکھوں گا جس میں تمام واقعات سو فیصد درست ہوں گے اور یہ خط میں ایک بینک کے لاکر رکھوا دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ لاکر بھی ان کی دسترس ہے کیونکہ وہ بہت طاقتور لوگ ہیں اور ان کے اثر و رسوخ بہت وسیع ہے چنانچہ دوسری نقل میں اپنی بیوی کے گھر میں رکھوا دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو مجھ حماقت کی توقع نہیں ہو سکتی اس لیے یہ نقل محفوظ امکانات زیادہ روشن ہیں اور میں اپنی بیوی سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ مرتے دم تک اس امانت کی حفاظت کر سکے گی جو میں تمہارے لیے چھوڑ جاؤں گا۔

برخوردار کبیر خان! تمہارے والد اور میرے درمیان تعلق تو نصف صدی پرانا کہا جا سکتا ہے ہم نے کم و بیش ایک ہی مکتب سے حصول علم کا آغاز کیا تھا امتحان تک ہم دن رات کے رفیق تھے۔ بعد میں غمِ روزگار نے ہمیں کئی بار جدا کیا اور تقدیر نے کتنی بار ملایا۔ دور رہ کر بھی ہمارا تعلق کسی نہ کسی صورت برقرار رہا اور ہم ایک دوسرے کے مونس و ہمدم، ہم مشرب و ہم راز رہے۔ وزیر خان مرحوم کی سب سے بڑی خوبی اس کی وضع داری تھی۔ اس کے اور میرے درمیان معاشی حالات کا فرق پڑ گیا تھا، لیکن وہ کہتا تھا کہ فومانچو! مایا تو آتی جاتی چھاؤں ہے۔ کاغذوں کے نوٹ پرانے ہوتے ہیں تو پھٹ جاتے ہیں۔ دوستی پرانی ہو کے پائیدار ہو جاتی ہے کیونکہ آدمی کاغذ کا نوٹ نہیں ہے... ہم اونچ نیچ کا خیال کیے بغیر ملتے تھے تو پرانے وقتوں کی باتیں بھی کرتے تھے اور آنے والے وقت کی بھی۔ وہ فیکٹری کا مالک تھا اور میں ایک معمولی منشی مگر وہ کہتا تھا کہ دنیا میں میرے لیے دو ہی رشتے تو رہ گئے ہیں۔ ایک خون کا رشتہ جو سکندر سے ہے اور دوسرا دوستی کا رشتہ جو تم سے ہے۔

لیکن کچھ عرصہ ہوا ہماری ملاقاتیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں کسی کام سے پندرہ دن کے لیے ملک سے باہر رہا اور واپس آنے کے بعد بھی ایک ہفتے تک وزیر خان سے ملنے نہ جا سکا۔ تین ہفتے بعد میں شام کے وقت میں اس کی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچا اور عادت کے مطابق سیدھا اندر چلا گیا۔ سب سے پہلے میری نگاہ ایک خادمہ پر گئی جو چائے کی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے چلا کے کہا۔ "ارے میاں وزیر باتدبیر! کیا ٹھاٹ ہیں۔ یہ غلام اور کنیزانِ خوبرو..." مگر میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی خادمہ نے چیخ مار کر ٹرے گرا دی۔ ہنگامے پر میم صاحب ٹائپ دوسری عورت نے ایک دروازہ کھول کے جھانکا اور فوراً بند کر دیا۔ پھر ایک ہٹا کٹا صاحب بہادر باہر آیا اور اس نے غنڈوں کی طرح غرا کے میری گردن پکڑ لی۔ میں نے بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرائی اور اسے یہ سمجھایا کہ میں کوٹھی کے مالک کا لنگوٹیا یار ہوں اور وزیر خان کے مہمانوں کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ زیب نہیں دیتا۔

"مہمان؟ کون مہمان؟" وہ دھاڑ کر بولا۔ "وزیر خان جب اس گھر کا مالک تھا تب تھا۔ اب مالک میں ہوں اور تم میرے لنگوٹیے یار نہیں ہو۔ اس لیے اپنی لنگوٹی سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"آپ کا مطلب ہے... یعنی کوٹھی آپ نے وزیر خان سے خرید لی ہے؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"خریدی نہیں تو کیا اس نے مجھے تحفے میں دی ہے؟"

"اچھا آپ ناراض نہ ہوں۔" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے صرف یہ بتا دیں کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"وہ گیا ہے جہنّم میں" وہ شخص چیخ کر بولا۔ "اب تم جاتے ہو یا تمہیں بھی جہنّم رسید کروں؟"

ایسے بدتمیز آدمی سے بات کرنا فضول تھا۔ میں نے اندازہ یہ کیا تھا کہ وزیر خان نے گلبرگ کینٹ اور ڈیفنس ایسے علاقے میں کوٹھی خرید لی ہوگی تو یہ بات کل معلوم ہو جائے گی لیکن میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے روز میر شرافت علی نے بھی ان تمام معاملات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

"کمال ہے میر صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے پارٹنر ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے اتنا بڑا سودا کر لیا ہے۔"

"بھئی منشی جی!" میر شرافت علی نے کہا۔ "یہ سب اس کے ذاتی معاملات ہیں جن سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی کوٹھی یا کار یا گھر کی کوئی بھی چیز خریدتا ہے یا بدلتا ہے تو مجھ سے مشورہ نہیں کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اس سے نہیں پوچھتا۔"

"مگر میر صاحب! اُن کا پتہ تو آپ کے پاس ہونا چاہیے نا۔"

"ہونا تو چاہیے۔" میر شرافت علی نے اتفاق کیا۔ "لیکن اس نے بتانا مناسب نہیں سمجھا تو میں کیا کروں۔"

"اگر آپ کو ان سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو؟"

"بھئی منشی یہ تو اس کو بھی سوچنا چاہیے۔" میر شرافت علی نے بے زاری سے کہا۔ "پھر یہ کہ اس کا فون ابھی کچھ دیر پہلے بھی آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے میر شرافت علی کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن یہ ضرور کہا کہ اب وزیر خان کا فون آئے تو آپ مجھے بلا لیں یا اس کا پتہ لے لیں۔ دفتر میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کو بھی میری زبانی ہی پتہ چلا کہ وزیر خان نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔ ان میں سے کچھ پرانے کارکن بھی تھے جن کو وزیر خان نے ہمیشہ قابلِ اعتماد دوست سمجھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے لیے بھی حیرانی کا سبب بنی۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں مسلسل میر شرافت علی سے اور دوسرے لوگوں سے دریافت کرتا رہا لیکن وزیر خان نے ٹیلی فون پر بھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک ہفتے بعد شرافت علی نے کہا کہ فون آیا تھا مگر میں تم کو بلانا بھول گیا۔ آٹھ دس دن اور گزرے تو شرافت علی نے کہا کہ وہ کچھ نہیں پوچھ سکا کیونکہ لائن اچانک کٹ گئی تھی۔ میری تشویش میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ میر شرافت علی کو میری تشویش

سے خوشی نہیں ہوتی، پریشانی ہوتی ہے۔ یہ بھی ... ایک بزنس پارٹنر کو دوسرے بزنس پارٹنر سے بے تعلق ہو کے بھی نہیں رہنا چاہیے۔ کچھ ... کے بعد تو انسان کو اپنے گھر کی دیواروں سے ... میں نے ولایت میں ایک کتے کی گمشدگی پر ... سوگوار اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تھا جیسے ... ایک فرد تھا۔ اتنے لمبے تعلق کے بعد میر شرافت ... جذباتی کاروباری رویّہ میری عقل اور سمجھ بوجھ سے ...

پھر اچانک ایک دن وزیر خان آفس آ گیا ... کا وقت تھا چنانچہ اس کو صرف چوکیدار، چپراسی اور ... سیکرٹری نے آتے اور جاتے دیکھا۔ ان میں سے کسی ... خال سے اس کا نیا پتہ دریافت نہیں کیا۔ ڈی سلوا ... پوچھنے پر بڑی حیرانی ظاہر کی کہ مسٹر وزیر خان کا ... گیا ہے۔ وزیر خان بہت سے اہم کاغذات پر دستخط ... چلا گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کہاں تلاش کروں۔ اگر وہ سرے سے غائب ہو جاتا تو ... جا کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا سکتا تھا لیکن میر شرافت علی سے اس کی ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی ... کے علاوہ آفس کے تین افراد اسے زندہ سلامت دیکھ ... چکے تھے۔ اگلے دو ماہ میں میر شرافت علی کے کہنے کے ... اس نے کئی بار ٹیلی فون پر گفتگو کی اور ڈی سلوا کے بیان ... مطابق وہ لنچ کے وقفے میں دو بار آیا اور پہلے کی طرح ... کاغذات پر دستخط کر کے چلا گیا۔ میں ان کو جھوٹا نہیں ... تھا اور ان کو مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ وزیر خان کو ... یا اس سے کسی اور وقت آنے کی اور مجھ سے ملنے کی درخواست ... کریں۔ ایک مہینے تک میں نے لنچ کے وقفے میں نکلنا ... دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بعد میں وزیر خان ... شام کو ایسے وقت میں آیا جب میں نہیں تھا تو کبھی ... کھلتے ہی آ پہنچا۔ مجھے معلوم ہوتا رہا کہ وہ زیادہ دیر ... اور ضروری کاغذات پر دستخط کر کے چلا جاتا ہے لیکن ... بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں قیام پذیر ہے۔ اسے ... رہائش بدلنے کی کیا ضرورت تھی اور یکلخت اس نے ... ترکِ تعلق کر کے گوشۂ گمنامی میں روپوش ہو جانا کیوں ... کیا ہے؟

وزیر خان کا رویّہ میرے لیے پُراسرار ہی نہیں ... بھی تھا۔ وہ کوئی خلوت پسند یا آدم بیزار شخص ... تعلقات کو زندگی کے سہارے سمجھتا تھا۔ اس نے ...

آخر کیوں؟ میں نے دفتر میں کچھ لوگوں سے کہا کہ وہ ہوشیار رہیں اور اگلی مرتبہ وزیر خان آئے تو اس سے پتہ پوچھنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ انکار کرے تو چپکے سے اس کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ چند افراد میرے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے تیار تھے لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب وزیر ... تو انہیں معلوم ہی نہ ہوا اور جب معلوم ہوا تو انہیں ... میں جانے کی اجازت ہی نہیں ملی۔ چپراسی نے کہا کہ اندر میٹنگ ہو رہی ہے اور حکم ہے کہ کسی کو مداخلت نہ کرنے دی جائے۔ میٹنگ کے ختم ہونے کا بھی کسی کو پتہ نہ چلا اور ... نہ جانے کس وقت چلا گیا۔ میرے دل میں ہزار قسم کے ... اٹھاتے تھے جن کو میں بے بنیاد قرار دے کر ذہن سے ... کر دیتا تھا کیونکہ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہ آتی تھی جسے ... پولیس کی بنیاد بنا کے میں کوئی قانونی کارروائی کر سکتا۔ وزیر خان ... کسی کی قید میں نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اس کے ... تحفظ کوئی اور نہیں کرتا تھا یا اس سے جبراً نہیں کرائے جاتے تھے۔ اگر مالک اپنے کاروباری معاملات اپنے پارٹنر کے سپرد ... کر دیتا ہے اور آفس نہیں آتا یا آتا ہے تو کسی سے نہیں ملتا ... اور کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا تو اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں ... اگر وہ ایک کے بعد ایک کوٹھی یا گاڑی بدلتا ہے تو اس ... اور دوستی کے پرانے رشتے توڑ دیتا ہے تو یہ اس کا ... ذاتی فعل ہے لیکن اس کے باوجود میری چھٹی حس خبردار کرتی ... تھی کہ وزیر خان کی فطرت نہیں بدلی۔ اس کے حالات میں کوئی ... ناخوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے جس نے اسے ساری دنیا ... سے الگ کر دیا ہے اور اس کو کوئی ایسی مجبوری لاحق ہے جو وہ ... بیان نہیں کر سکتا ہے لیکن بہت سوچنے کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وزیر خان کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر ایک ... اتفاق ایسا آیا کہ میں نے اسے میر شرافت علی کے ساتھ آفس سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا اور جذبات سے بے قابو ہو کر چلاتا ہوا اس کی طرف بھاگا مگر مجھے میر شرافت علی نے روک کر سخت ... لہجے میں کہا۔ "منشی! معلوم ہوتا ہے تم سٹھیا گئے ہو اور اب ... ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ آخر ڈسپلن بھی کوئی چیز ہے۔ ... اسی طرح چپراسی بھی نام لے کر چیختا چلاتا مالکوں کے پیچھے دوڑے گا اور ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کرے گا تو کام کیسے چلے گا۔ یہ مت بھولو کہ تم ایک معمولی منشی ہو۔" ان الفاظ نے مجھے ... پانی پانی کر دیا تھا اور میرے قدم روک لیے تھے۔ اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ وزیر خان مجھ سے بات

کرے گا لیکن اس نے بے رُخی سے میری طرف دیکھے بغیر کہا کہ میر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ آفس میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ پھر وہ آگے بڑھ گیا اور شرافت علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اپنے ساتھیوں سے زیادہ میں اپنی نظر میں رسوا ہو گیا اور اس وقت تو غصّے کی حالت میں میرا فیصلہ یہی تھا کہ وزیر خان کی ایسی تیسی۔ اس نے دوست سمجھنا چھوڑ دیا ہے تو مجھے اس کے لیے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن بعد میں غصہ اُتر گیا تو صرف دکھ کا احساس باقی رہ گیا اور میں نے سوچا کہ وزیر خان کا رویّہ ایسا کیوں تھا؟ وہ ایسا آدمی تو نہیں تھا۔ اس عمر میں انسانی فطرت کہاں بدلتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کہ وزیر خان مجھ سے بدظن ہو گیا ہو۔ اسے کوئی بات بُری لگتی تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتا اور مجھے صفائی کا موقع دیے بغیر اتنے پرانے تعلقات کو یکلخت ختم نہ کرتا۔ وہ یقیناً مجبور ہے لیکن میری عقل اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھی کہ یہ مجبوری کیا ہو سکتی تھی؟

اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ سنا کہ وہ آفس آیا اور چلا گیا۔ اس نے ضروری کاغذات پر دستخط بھی کیے مگر بات کسی سے نہیں کی۔ میر شرافت علی اور ڈی سلوا مجھے بری طرح جھاڑ چکے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھو ورنہ چھٹی کرو۔ وزیر خان ہمیں یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اب وہ کہاں رہتا ہے اور ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ تم چاہو تو تھانے جا کے رپورٹ لکھوا دو کہ میرا دوست وزیر خان مجھے اپنے گھر نہیں بلاتا اور مجھ سے ملنے بھی نہیں آتا۔ دیکھو پھر وہ تمہیں پاگل قرار دے کر بند کرتے ہیں یا وزیر خان کو بلاتے ہیں۔ انہوں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ آئندہ کبھی میں ان سے یا دفتر کے کسی فرد سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کروں ورنہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی وزیر خان کو سب سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقیناً وزیر خان کا پتہ معلوم ہے کیونکہ بارہا وہ اس کو اپنی گاڑی میں ساتھ لیجا چکے تھے مگر وہ اس کا پتہ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ آخر وہ کیوں نہیں چاہتے کہ وزیر خان کسی سے ملے؟ میں نے سوچا اُس میں ان کے لیے خطرے کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ وزیر خان کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں؟ اور آزاد نظر آنے کے باوجود وزیر خان عملاً ان کی قید میں ہے؟ لیکن وزیر خان کو کیا ہوا ہے؟ وہ ان کے ہاتھوں کھلونا بننے پر کیوں مجبور ہے؟ وہ انکار کیوں نہیں کر سکتا؟ احتجاج کیوں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نہیں کرتا، مدد کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں جاتا اور لوگوں کو کوئی بات کیوں نہیں بتاتا؟ ان تمام سوالوں کا جواب تھا کہ وزیر خان مجبور تھا۔ میرا ذہن ایک دائرے میں گھوم کر پھر وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں وزیر خان کی مجبوری۔ کوئی ناقابلِ فہم، ناقابلِ بیان اور ناقابلِ یقین مجبوری اپنے وجود کو تسلیم کرنے پر مصر تھی مگر اس کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں راتوں کو جاگ کر سوچتا رہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہی کیفیت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا لیکن اسی زمانے میں دو اہم واقعات پیش آئے۔ پہلے تو میر وزیر اینڈ کمپنی کی شاہدرہ کے صنعتی علاقے میں منتقلی تھی جہاں اس کا نام بدل کر ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی کمپلیکس کر دیا گیا (یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ اس کا سبب کاروبار میں تیسرے پارٹنر دلاور کی شمولیت تھی اور یہ میر وزیر دلاور کے ناموں کا مخفف تھا۔) ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے میں نے مالکوں کے معاملے میں غیر ضروری تشویش کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی نظر میں میرا وجود بھی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا اور اگر میں اپنا رویّہ نہ بدلتا تو وہ مجھے کب کا نکال باہر کر چکے ہوتے۔ صرف وزیر خان کے متعلق حقیقت جاننے کے لیے میں نے دل پر جبر کر کے خوشامد اور چاپلوسی سے بھی کام لیا ورنہ میں نکال دیا جاتا تو وزیر خان کے بارے میں کوئی بات کیسے معلوم کرتا؟ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وزیر خان کے دستخط اہم کاغذات پر باقاعدگی سے ثبت ہو رہے ہیں لیکن مدت سے اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بیمار رہنے لگا ہے اور مسلسل تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد وہ نظر آیا تو دیکھنے والوں کو یقین کرنا پڑا کہ وہ بیمار ہے مگر اس سے میرے یہ اندیشے مٹ گئے کہ وہ مر چکا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ تقریباً ایک ماہ بعد پیش آیا جب میں نے وزیر خان کو راہ چلتے دیکھ لیا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ وہ وزیر خان نہیں، اس کا کوئی ہم صورت ہے مگر قریب پہنچ کے میں سناٹے میں آ گیا۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ میں تو اس کی چال کو بھی دور سے پہچان سکتا تھا۔ پھر اس کے ماتھے پر دائیں جانب مندمل ہو جانے والے زخم کا نشان تھا جو ۱۹۴۷ء کی یادگار تھا۔ اس کی آنکھوں اور بالوں کا رنگ، یہاں تک کہ اس کے کپڑے بھی وہی تھے جو میرے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن یہ کپڑے انتہائی بوسیدہ تھے اور کثرتِ استعمال سے پھٹنے والے تھے۔ وہ انتہائی کمزور اور لاغر ہو چکا تھا اور ایک لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا پھر شک میں مبتلا ہو گیا۔ وزیر خان ایک فیکٹری تھا اور شاندار گاڑی میں گھومتا تھا۔ وہ ایسے حال میں کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسی تذبذب میں پیچھے چلتا گیا۔ میرا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہ ہے۔ ایک بار اس کا ٹھکانہ معلوم ہو جانے کے تفصیلی بات کی جا سکتی تھی اور پوچھا جا سکتا سب چکر کیا ہے۔ اچانک وہ ریلوے اسپتال میں گیا۔ میں نے اسے پرچی لے کر مریضوں کی قطار میں ہوتے دیکھا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد جب وہ لیے ایک کھڑکی کے سامنے لگی ہوئی قطار میں شا میں بھی قطار میں شامل ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر میں نے اس کی پرچی دیکھ لی۔ اس پر وزیر خان جاتا تھا۔ پھر دوا دینے والے نے شیشی اور پرچی منٹ بعد کہا۔ "وزیر خان... یہ تین گولیاں دن میں اور مکسچر صبح و شام۔ دو دن کی دوا ہے۔" اس نے ساتھ رنگین پانی جیسے مکسچر کی شیشی وزیر خان کو گولیاں وزیر خان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیں قطار سے الگ ہو کر کوشش کر رہا تھا کہ اس منظر کروں جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور ان الفاظ کروں جو میرے کانوں نے سنے۔ میرا دل خون کے رہا تھا اور مچل مچل کے فریاد کر رہا تھا کہ یہ سب ہے مگر عقل بضد تھی کہ سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔

جب وزیر خان اسی طرح لاٹھی ٹیکتا ہوا دم لیتا اور کچھوے کی طرح رینگتا ہوا واپس روانہ ہو اس کے پیچھے تھا۔ مناسب فاصلے سے میں نے کا تعاقب جاری رکھا۔ آدھے میل سے بھی کم فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے کیا کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے باہر کی بجائے "سی سی ڈین" کی تختی لگی ہوئی تھی صدمہ میرے لیے پہلے سے بھی زیادہ تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سی سی ڈین بن جانے اصلیت کیا ہے۔ نمک حرام اور بے ضمیر چراغ دین وزیر خان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کے کمپنی کے حسا غبن کیا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر عدالت نے کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کمینہ اپنے آقا کی سے دولت مند بنا اور یہ بات بہت سے پرانے لوگوں

وزیر خان کا اُسی مارِ آستیں کے گھر میں جانا میری سمجھ میں (نہ آیا) اور میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے چلا کر "وزیر خان!" اور اسے چونک کر پلٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی حالت مجھے دیکھ کر غیر ہو گئی۔ اس نے خود پر قابو پا لیا اور اچانک اس کی آنکھیں میرے لیے اجنبی ہو گئیں۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی ہو گئی، وہ خود اجنبی ہو گیا۔

"کس سے ملنا ہے بھائی؟" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم سے وزیر خان... تم سے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"لیکن میں تو وزیر خان نہیں ہوں۔" وہ اسی کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"تم وزیر خان نہیں ہو؟" میں نے اسی طرح چلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم وزیر خان نہیں ہو تو میری آواز پر چونکے کیوں اور اس پرچی پر تمہارا نام وزیر خان کیوں لکھا ہوا ہے جو تم ابھی ریلوے کے اسپتال سے دوا لے کر آ رہے ہو؟ شرم آنی چاہیے وزیر خان کہ تم مجھے جھٹلا رہے ہو۔ اندھا کہہ رہے ہو اور بے وقوف بنانا چاہتے ہو جو پچھلے چالیس سال سے تمہیں اور تمہاری اگلی پچھلی نسلوں کو جانتا ہے۔ آخر یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟ چھ مہینے سے تمہارے بارے میں سوچ سوچ کے، اور لوگوں سے پوچھ پوچھ کے میں نے اپنا جینا اجیرن کر رکھا ہے اور اب تم ملے ہو تو کہتے ہو کہ وزیر خان نہیں ہوں۔ قسم خدا کی وزیر خان! میں تمہارے ہر جاننے والے کو یہاں کھینچ لاؤں گا۔ میر شرافت علی کو، ڈی سلوا کو، تمہارے دفتر کے پرانے لوگوں کو۔ میں اسلام آباد سے برلانی صاحب کو اور ولایت سے کبیر خان کو...!"

خوف سے اس کا زرد رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور اس کی ویران آنکھوں میں خوف کے گہرے سائے اتر آئے۔

"اچھا اچھا... میں مانتا ہوں کہ میں وزیر خان ہوں۔" وہ ادھر ادھر دیکھ کے بولا۔ یوں جیسے اس کو ڈر ہو کہ کوئی یہ باتیں سن لے گا۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں لے گیا۔

"تم یہاں رہتے ہو وزیر خان؟" میں نے کمرے کی بے سامانی اور مفلسی کی منہ بولتی تصویر دیکھ کر کہا۔ "اس سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں؟ اور اس شخص کی کوٹھی میں جو کبھی تمہارا ملازم تھا؟ وہ نمک حرام جس نے تمہارے اعتماد کا یہ صلہ دیا تھا کہ تمہارے ہی مال پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کیا تھا؟ تم نے اپنی وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی، وہ گاڑی اور تمام ساز و سامان بیچ دیا۔ آخر کیوں؟ اور اس کے باوجود آج تمہارے پاس رہنے کو جگہ نہیں۔ تمہاری حالت سے ظاہر ہے کہ تمہارے پاس اچھا کھانے پہننے کو نہیں اور تم بیمار ہونے کے باوجود سرکاری اسپتال سے یہ بے کار دوائیں لا کے استعمال کرنے پر مجبور ہو۔ کیا تم میر وزیر اینڈ کمپنی کے مالک نہیں رہے...؟" مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر تک بولتا رہا۔ اگر میں نہ بولتا تو رنج و غم اور صدمے کا آتش فشاں اندر ہی اندر میرے وجود کو تہس نہس کر دیتا مگر یہ لاوا صبر و ضبط کے سارے بند توڑ کر بہہ نکلا۔ وزیر خان سب کچھ ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے سنتا رہا۔ بالآخر میں خاموش ہو گیا۔

"منشی!" وزیر خان نے بہت دیر بعد پُرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تیری ہر شکایت بجا ہے۔ ہر الزام درست ہے اور ہر سوال جائز ہے لیکن میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہنا تو چاہتا ہوں مگر نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اپنی مجبوری کا عذر ہی پیش کر سکتا ہوں اور یہ عذر مجھے قبول کرنا ہے کیونکہ یہ بے بنیاد نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، انتہائی مجبوری کے تحت کیا۔ میں پاگل نہیں ہوا تھا اور آج بھی خدا کے فضل سے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پہلے سے کم نہیں۔ میری قوتِ ارادی میں فرق نہیں آیا اور میری قوتِ فیصلہ برقرار ہے لیکن میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔"

میں پھر پھٹ پڑا۔ "تو بکواس کرتا ہے وزیر خان...! جھوٹ بولتا ہے۔ مجبوری کی رٹ لگا کے تو مجھے ٹالنا چاہتا ہے کیونکہ تیرے پاس مجھے مطمئن کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ مجبوری ہوتی ہے غریب آدمی کی، مجبوری ہوتی ہے لاوارث اور بے بس آدمی کی۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جس کے کندھوں پر کسی خاندان کی ذمے داریوں کا بوجھ ہو اور یہ بوجھ اٹھانے والا اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ مجبوری ہوتی ہے اس کی جو اپنا دکھ کسی کو نہ بانٹ سکے اور دکھ کا مداوا کوئی نہ ہو۔ تجھے کس بات کی مجبوری ہے؟ تیری مجبوری کا رونا سن کے کوئی ناواقف متاثر ہو جائے تو ہو جائے، لیکن میرے سامنے مجبوری کی بات مت کر۔"

وزیر خان نے ایک سرد آہ بھر کے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تو بھی ٹھیک کہتا ہے منشی! کیونکہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

چالیس سال میں تو نے کبھی مجھے مجبور نہیں دیکھا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ وزیر خان کو جتنے قریب سے تو نے دیکھا ہے کسی نے نہیں دیکھا اور تو مجھے جھوٹا بھی کہہ سکتا ہے۔ میں تجھے جھوٹا نہیں کہوں گا کیونکہ میں تیری نیت کے خلوص پر شک کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تیرا دل چاہتا ہے تو میری بات مان، ورنہ جو تیرا جی چاہے کر لے۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا منشی! کہ میری مجبوریوں نے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا لیکن میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں وزیر خان! کیوں؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کے کہا۔ "ایسی کون سی مجبوری ہے جس کا ذکر تو میرے سامنے بھی نہیں کر سکتا؟ کیا چالیس سال کی دوستی کے بعد بھی تیرے لیے میری ذات قابلِ اعتماد نہیں؟"

"کیسی باتیں کرتا ہے تو منشی!" وزیر خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے بتا کہ کبھی میں نے تجھ سے کوئی بات چھپائی ہے؟ وہ سب باتیں جو تجھے معلوم ہیں جو میں نے اپنی بیوی کو نہیں بتائیں، سکندر کو معلوم نہیں اور دنیا میں تیرے سوا ان کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا۔"

"پھر اب کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا میں بدل گیا ہوں؟ میرے بارے میں تیرے خیالات بدل گئے ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں منشی!" وزیر خان نے ایک انگلی سے آنکھوں میں آ جانے والے قطرۂ اشک کو جھٹک دیا۔ "میں اپنی مجبوری کا راز افشا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی میں کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اس زندگی کے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، مگر مجھے سکندر کی فکر ہے منشی! اس کی تو ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ خدا اسے اپنی امان میں رکھے۔ اپنا پورا گھر اس وطن کے لیے قربان کر دینے کے باوجود میں پاگل نہیں ہوا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کی رضا کے سامنے سرِ خم کر کے صبر اختیار کیا تھا تاکہ میں سکندر کی پرورش کر سکوں۔ میرے خاندان کے گلشن میں طوفان کی تباہ کاری سے بچ جانے والا ایک ہی نخلِ آرزو تھا جس سے میں نے مستقبل کی سب توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ اللہ کا بڑا احسان ہے جس نے مجھے اس کے لیے ہمت، استطاعت اور زندگی کی فرصت دی۔ آج سکندر میری امیدوں کا جیتا جاگتا نقش ہے اور میرے خوابوں کی مجسم تعبیر ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو جی کر بھی کیا کرتا۔ بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے لیکن میرا مقصد سکندر تھا۔ اب وہی میری مجبوری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں کامیابی کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد سکندر کے مستقبل کی خوشی، کامیابی اور خوشحالی کا دشمن ہو جاؤں... زندگی کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے... کر رہا ہوں منشی! جسے میں اپنی مجبوری کہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا وزیر خان!" میں... تو نے جو کچھ کیا سکندر کے لیے کیا، لیکن اس سے... فائدہ ہوگا؟ تو نے تو اس سے سب کچھ چھین لیا... کا حق تھا۔ یہ کیسی مجبوری ہے کہ تو نے اپنا سب... اور یہاں اس حال میں پڑا ہوا ہے۔ کیا سکندر کو... معلوم ہے؟"

وزیر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے معلوم ہوتا... منٹ بھی ولایت میں ٹھہرتا؟ وہ اپنے کیریر کو لات مار... مگر یہاں آ کے بھی وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا... خطرات میں گھر جاتا۔ میں تو اس حال میں بھی ڈرتا رہتا ہوں... کہیں اس پر ولایت میں کوئی مصیبت نازل نہ ہو... دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں منشی!"

"کون دشمن؟ کیسے خطرات؟ یہ کس کی بات... تو؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ "تو نے کسی کا کیا بگاڑا... جو کوئی تجھ سے دشمنی کرے گا یا سکندر کو نقصان پہنچا... گا؟ خدا کے لیے صاف بات کر کہ تیری اس حالت کا... کون ہے؟ میں اپنی دوستی کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ... دشمن کوئی بھی ہو، کتنا ہی طاقتور ہو اور اس کے ہاتھ... ہی لمبے کیوں نہ ہوں، میں اس کو نیست و نابود کرنے کے... اپنی جان قربان کر دوں گا تو یہ تجھ پر کوئی احسان نہیں..."

"تو سمجھتا نہیں منشی!" وزیر خان نے کہا۔ "یہ... بھی کر سکتا تھا، لیکن دشمن کوئی ایک نہیں ہے۔ وہ... اور ہر طرف شکاری کی طرح گھات میں ہیں۔ میں ان... سے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس سے... کے لیے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ کوئی باپ اپنے بیٹے... زندگی سنوارنے کے بعد اس کی راہ میں انگارے نہیں... سکتا۔ تو آج کی ملاقات کو بھول جا۔ یہ سمجھ لے کہ وزیر... چالیس سال تک تیرا دوست رہا تھا، مر چکا ہے اور... تو نے جسے دیکھا تھا وہ اس کا کوئی ہم شکل تھا۔ اگر... سے اس بات کا تذکرہ کیا تو یہ دوستی نہیں دشمنی ہوگی... ساتھ بھی، سکندر سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ یہاں... چلا جا اور دوبارہ کبھی مجھ سے ملنے مت آنا۔ نہ دن... آجالے میں اور نہ رات کے اندھیرے میں۔"

"نہیں وزیر خان! انجام کچھ بھی ہو لیکن...

...میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا البتہ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔ پینے والا میری یا بیوی بچوں کی جان تو لے سکتا ہے مگر یہ ناممکن ہے... میری زبان سے کچھ اگلوا سکے۔" میں نے کہا۔

وزیر خان مجبور ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میر وزیر اینڈ... اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ بے شک کا غذات... اس کا نام اب بھی مالکوں میں ہی شامل ہے مگر کاروبار... نقصان، انتظامی امور اور عملی طور پر تمام معاملات... اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ سارے فیصلے پہلے میر شرافت علی... تھا، اب ایک نیا پارٹنر چوہدری دلاور بھی پیدا ہو گیا ہے... ہے کہ وہ شخص جسے میں نے اپنے دستخط سے بطورِ مینجر... رکھا تھا یعنی ڈی سلوا بھی مالک بن بیٹھا ہے۔ وہ جہاں کہتے... دستخط کر دیتا ہوں۔ اس سال تمام اخراجات وضع کرنے... بعد میرے حصے کا منافع ساڑھے تین لاکھ بنتا تھا۔ انہوں... نے دستخط کروا کر منافع وصول پایا، اور میں نے دستخط... لیکن مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔

میں ہونقوں کی طرح... "اور یہ ساڑھے تین لاکھ کہاں گئے؟... نے وصول کیے؟"

"اسی شخص نے جو میری موجودہ حالت کا ذمے دار ہے۔" وزیر خان نے کہا۔ "اس نے یقیناً دوسروں کو بھی حصہ دیا ہوگا لیکن ان کی ذات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ میری تباہی کا ذمے دار وہی شخص ہے جسے میں نے سب سے پہلے اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ جب وہ شخص پاکستان آیا تھا اور مجھ سے ملا تھا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ میں اس شخص کی فطرت سے واقف ہوں لیکن سمجھتا تھا کہ میں اسے ہندوستان میں چھوڑ آیا ہوں اور یہاں اس کے شر سے بالکل محفوظ ہوں لیکن بہت جلد میری غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اس شخص نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ میرا بنا بنایا گھر، جما جمایا کاروبار، عزت اور آبرو۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیتا لیکن وہ دنیا کی نظر میں مجرم نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے زندہ رکھا لیکن کیا یہ زندگی ہے؟" وزیر خان اب زار و قطار رو رہا تھا۔ "میرے آفس کے لوگ، میرے پرانے دوست اور خیر خواہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں بدل گیا ہوں، مغرور ہو گیا ہوں یا خبطی ہو گیا ہوں۔ میں نے ماڈل ٹاؤن چھوڑ کے گلبرگ میں کوٹھی بنا لی ہے لیکن کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا کیونکہ میں اپنے برابر کے لوگوں کے علاوہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ مجھے آتا جاتا دیکھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ اب میں ان سے بات تک کرنے کا روادار نہیں ہوں۔ معلوم نہیں پیٹھ پیچھے لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہوں گے، لیکن میری کیسی بے بسی ہے کہ میں کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ اپنی صفائی تک پیش نہیں کر سکتا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ "وزیر خان! کیا تجھ میں شرافت علی کو قتل کر دینے کی ہمت نہیں تھی؟" میں نے برافروختہ ہو کے کہا۔ "اور اگر نہیں تھی تو تو نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ کیا ملا تجھے اپنا سب کچھ گنوا کے؟ سکندر کا سب کچھ محفوظ ہو گیا؟ تیرے مصائب کا خاتمہ ہو گیا؟ یہ سلسلہ تو جاری رہے گا۔ وہ اسی طرح تیرا خون چوستا رہے گا اور تو یہاں بیٹھ کر رونے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔ دنیا میں ایسا کون سا مسئلہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا؟ تیرا جوان بیٹا ہے۔ اس کے بازوؤں میں دم ہے اور اس کو تیری قربانیوں کا بھی احساس ہے جو تو نے اس کے بہترین مستقبل کے لیے دیں۔ وہ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ سکندر تو ولایت میں بیٹھا ہے مگر یہاں میں ہوں..."

"تو کچھ نہیں کرے گا منشی!" وزیر خان نے میری بات کاٹ دی۔ "تو وعدہ کر چکا ہے کہ اس گفتگو کا کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے اسی لیے تجھے یہ بات بتا دی ہے۔ اگر تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اس کی سزا صرف مجھے ملتی تو کوئی بات نہیں مگر سزا تجھ کو بھی ملے گی اور سب سے زیادہ نقصان سکندر کو ہوگا۔ میری تمام عمر کی محنت اور قربانی رائیگاں جائے گی۔ شرافت علی کو قتل کرنے سے خطرات کم نہیں ہوں گے بڑھ جائیں گے۔"

"اُف!" میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان! میں پاگل ہو جاؤں گا اور پاگل پن میں کچھ بھی کر گزروں، مجھے الزام مت دینا۔ خدا کے لیے مجھے یہ سمجھا دے کہ خطرہ کیا ہے اور کہاں ہے؟ تجھے میر شرافت علی نے پیسے پیسے کا محتاج کر دیا ہے۔ تیرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب اس سے کیا ڈرنا؟ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ ذرا اپنی ذلت کو دیکھ۔ تو اپنے معمولی نوکر کا نوکر ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں تو گلبرگ کی کسی عالی شان کوٹھی میں رہتا ہے اور تو اس سرونٹ کوارٹر میں مر رہا ہے۔ تو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور تیرا بیٹا ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اسے بالکل معلوم نہیں ہے کہ میر شرافت علی نے تجھ پر کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ کیوں ڈرتا ہے تو میر شرافت علی سے؟ تو اس کے خلاف کسی سے مدد کیوں نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مانگ سکتا۔ احتجاج اور فریاد کیوں نہیں کر سکتا؟ تو نے اپنا سب کچھ اسے دیا تو کیوں؟ تیری کس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اس نے؟" میں غم و غصہ میں کانپ رہا تھا۔ چلّا رہا تھا اور خستہ حال میز پر مُکّے مار رہا تھا۔ "ٹھیک ہے میں نے وعدہ کیا تھا اور میں وعدے پر قائم بھی رہوں گا، لیکن خدا کے لیے مجھے بتا تو سہی کہ میر شرافت علی کس طرح تجھے بلیک میل کر رہا ہے؟ اسے ایسی کون سی بات معلوم ہے تیرے بارے میں؟"

جو کچھ اس کے بعد وزیر خان نے بتایا وہ بہت پرانی باتیں ہیں لیکن مجھے معلوم تھیں، چنانچہ مجھے افسوس ہوا کہ میں یہ بات کیوں بھولا رہا۔ اگر مجھے تقسیمِ ہند سے پہلے کا یہ واقعہ یاد آجاتا تو شاید اس کلید سے میرے ذہن کے بند دروازے کھل جاتے اور جو واقعات میرے فہم و قیاس میں نہ آتے تھے، آپس کی کڑیاں مل جانے کے بعد خود بخود سمجھ میں آجاتے۔ میں یہ سرگزشت وزیر خاں کے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں۔

وزیر خان نے کہا۔ "تجھے یاد ہوگا منشی! کہ تقسیم سے پندرہ سولہ سال پہلے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک عروج پر تھی اور یہ آگ پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ ہر انگریزی چیز کو چھوڑ رہے تھے۔ خطابات واپس کر رہے تھے اور انگریزی لباس کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ نفرت کی یہ لہر کبھی کبھی پُرتشدد بھی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مشتعل ہجوم میں گھر جانے والے یا جوشیلے یا سر پھرے نوجوانوں کے ہتھے چڑھ جانے والے انگریز اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ ردِ عمل کے طور پر حاکموں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو بے گناہ اور گنہگار سب پکڑے جاتے تھے۔ جیل خانے بھر گئے تھے اور کالے پانی جانے والوں کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کیا جاتا تھا۔ میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھا لیکن عوامی جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے استعفےٰ دے دیا۔ میں مسلم لیگ کا بڑا جوشیلا اور سرگرم کارکن تھا۔ شاید تجھے یاد ہو میرے گھر پر بم اسی لیے پھینکا گیا تھا کہ میں نے مسلم لیگ کا سبز پرچم اتارنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ مخلص ساتھیوں نے بھی مجھے مصلحت کے تقاضے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور بعد میں بلوائیوں نے میرے بھرے گھر کے ایک ایک فرد سے یوں انتقام لیا تھا کہ میں اور سکندر اتفاق سے بچ گئے تھے۔ خیر اب اس بات کا کیا ذکر کرنا کہ یہ میری عاقبت نااندیشی تھی یا وہ میرا عزم تھا جس کی خاطر میں نے ہر قربانی دی۔ لیکن مسلم لیگ سے میری وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ میں جلسوں کے انتظام میں پیش پیش رہتا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی میں اور انتظام کرنے والوں میں آگے آگے رہتا تھا۔ جو کچھ پس انداز کرتا تھا وہ مسلم لیگ کو چندے میں پہلے اپنے حلقے کا سیکرٹری تھا۔ پھر صدر منتخب صوبائی مجلسِ عاملہ میں آگیا۔ میری سیاسی سرگرمیوں کی بھی نظر تھی۔ سول نافرمانی کے دور میں اگر میں ان رپورٹوں کی بنیاد پر برطرف کر دیا جاتا جو میرے خلاف بالا کو ارسال کی گئی تھیں۔ یہی شہرت میرے کام آئی اور ریاست سلطان آباد کے ولی عہد کا سیکرٹری رکھ لیا میری تنخواہ چار گنا تھی۔ مجھے شاہانہ مراعات حاصل تھیں ریاست کا تحفظ حاصل تھا۔ بہت سے والیانِ ریاست کے سرپرست تھے اور نواب اسد جنگ بھی ان میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں میرا جوش و خروش خیالات سے متاثر ہو کے انھوں نے مجھے شاباش اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو میں بلا تکلف ان کی میں حاضر ہو جاؤں۔ مستعفی ہونے کے بعد فکرِ معاش ہوا تو میں نواب صاحب کے پاس پہنچا اور انھوں نے مجھے لیا۔ نواب صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ میں صرف جذباتی اور جوشیلا آدمی ہی نہیں ہوں، ذہانت بھی رکھتا ہوں ورنہ برطانوی حکومت مجھے اچھا عہدہ نہ دیتی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے انگریز حریت پسند مسلمانوں کو ہمیشہ سر پر لٹکنے والی خطرے کی اور ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی وفاداری ہمیشہ مشکوک گئی۔ میرا استعفےٰ دینا جدوجہدِ آزادی کی خاطر بہت بڑی قربانی گیا اور نواب صاحب نے میری قدر کرتے ہوئے مجھے شہزادہ خورشید عالم کا سیکرٹری اور اتالیق مقرر فرمایا۔

نواب صاحب اور ان کے فرزند پرنس خورشید اور فطرت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ صاحب شفیق اور بردبار، فراخدل اور شریف النفس مضبوط کردار کے آدمی تھے۔ ان کی خط و کتابت رہنماؤں سے تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان کا سیکرٹری ہندو تھا جس پر وہ بے حد اعتماد کرتے تھے۔ نجانے کیوں شخص شروع سے اچھا نہیں لگا۔ اس کا نام گیان چند نے محسوس کیا کہ میرا سلطان آباد آنا بھی اس کو ناگوار گزرا میری ذات پر نواب صاحب کی عنایات نے بھی ناخوش کیا تھا۔ میں نے اس کو ایک پیشہ ور اور حاسد اور نظر انداز کر دیا تھا۔ ہماری ذمے داریاں الگ کی نوعیت میں فرق تھا اور ایک طرح سے ہمارے الگ ہی تھے۔ چنانچہ ہمارے راستوں کا ایک

مشکل تھا اور ہمارے درمیان براہِ راست تعلق نہ ہونے کسی مسئلے پر اختلافِ رائے کا بھی سوال نہ تھا مگر اس وجود میرے اور گیان چند کے درمیان پہلے ہی دن سے خاموش اور سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ اسے جنگ کہنا مشکل ہے یوں سمجھ لو کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں تھے تو دوست بھی نہیں تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرتے تھے۔ اس کشیدگی کو کسی نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کی بنیاد مذہبی عقائد کے اختلاف پر بھی نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ کسی ہندو کا مسلم لیگ کے منشور اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنا مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں کیونکہ بہت سے مسلمان بھی کٹر کانگریسی تھے۔

نواب صاحب کے برعکس شہزادہ خورشید عالم کی شخصیت بالکل مختلف تھی۔ حلقۂ احباب میں وہ پرنس خرم کہلاتا تھا اور اس حلقہ میں ایسے حضرات و خواتین کی اکثریت تھی جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے مگر میرے نقطۂ نظر سے ان کی معاشرت کے طور طریقے معیوب اور غیر شریفانہ تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت عیش و عشرت کی ہنگامہ آرائی میں صرف ہوتا تھا۔ اس کی ایک وجہ مصروفیت کا نہ ہونا بھی تھا۔ نوابوں، راجوں اور جاگیرداروں کی اولاد فکرِ معاش سے اور ہر قسم کی ذمے داریوں سے آزاد تھی۔ ان کے پاس خرچ کرنے کو بے حساب پیسہ تھا اور بہت فرصت تھی چنانچہ وہ ایک دوسرے کو پارٹیاں دیتے تھے کبھی سالگرہ کے بہانے کبھی تہوار کی خوشی میں۔ سالِ نو کے آغاز پر یہاں تک کہ کرسمس پر جس میں انگریز صاحب بھی بلائے جاتے تھے اور یہ صاحب لوگ موقع ریذیڈنٹ بہادر کے دوست اور حاشیہ بردار ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی سے ہر ریاست میں اپنا ایک مشیر مقرر کر رکھا تھا جو ریذیڈنٹ کہلاتا تھا۔ والیانِ ریاست اس کے مشورے اور اس کی تائید کے بغیر کوئی اہم فیصلہ کرنے کے مجاز نہ تھے اور وہ ایک طرح سے ریاست کے حاکموں کا حاکم ہوتا تھا۔ یہ صورتِ حال کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ جہاں حاکم یا ریذیڈنٹ میں سے کوئی ایک یہ سمجھتا تھا کہ ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں وہاں سارے کام رک جاتے تھے۔ والیِ ریاست اور ریذیڈنٹ کا جھگڑا وائسرائے کی کونسل میں پہنچتا تھا۔ حکومت ریذیڈنٹ کو اختیارات ضرور دیتی تھی لیکن مصالحت کی کوئی صورت نہیں رہتی تو ریذیڈنٹ ہی بدلا جاتا تھا۔ ہمارے ریذیڈنٹ جانتے تھے کہ والیانِ ریاست کی پوزیشن اب بھی مستحکم ہے اور حکومت انہیں سرکاری ملازم کی طرح نہ تبدیل کر سکتی ہے اور نہ برطرف کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ 'جیو اور جینے دو' کی پالیسی اپنا لیتے تھے۔ اختیارات کو سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے کہ خرابی پیدا نہ ہو اور عموماً والیانِ ریاست کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے دوست بنے رہتے تھے۔

سلطان آباد میں میرے وارد ہونے سے پہلے ایک معقولیت پسند انگریز بارہ سال تک ریذیڈنٹ رہا اور نواب صاحب اس کے اخلاق و کردار کی اکثر تعریف کرتے تھے۔ وہ ریٹائر ہو کے انگلستان چلا گیا تو حکومت نے ایک سرپھرے متعصب اور تنگ نظر نوجوان کو ریذیڈنٹ بنا دیا جو نواب صاحب کے مقابلے میں واقعی لونڈا تھا مگر حاکمیت کے نشے میں چُور تھا کیونکہ اس کی شاہی خاندان سے بہت دور کی قرابت داری تھی۔ وہ عام ہندوستانی کو ڈیم فول کالا آدمی سمجھتا تھا اور کہتا تھا۔ نواب صاحب نے اپنی فطری بُردباری اور عالی ظرفی کے باعث بہت عرصہ برداشت کیا اور بالآخر مجبور ہو کے وائسرائے سے کہا کہ یا تو اس ریذیڈنٹ کو والیانِ ریاست کے ساتھ رہنے کے آداب سکھا دیے جائیں ورنہ ہم اسے چماروں سے جوتے لگوا کر ریاست کی حدود سے باہر پھنکوا دیں گے۔ وائسرائے کے لیے یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سابقہ ریذیڈنٹ نے بارہ سال تک اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے تھے اور اگر وہ ریٹائر نہ ہوتا تو سلطان آباد میں اختلاف کی نوبت ہی نہ آتی۔ وائسرائے نے اوپر ہی اوپر ریذیڈنٹ کو سمجھا دیا کہ شاہی خاندان سے تعلق کو بھول جاؤ کیونکہ جن سے تمہارا تعلق ہے ان کا شجرۂ نسب بھی شاہوں کے خاندان سے ملتا ہے۔ ریذیڈنٹ وقتی طور پر خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا مگر اس نے ذلت کا انتقام لینے کے لیے سیاسی چال چلی۔ 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' انگریز کی ہندوستان میں کامیابی کا فارمولا تھا۔ ریذیڈنٹ نے ولی عہد سے دوستی گانٹھی۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دعوتوں کے ذریعے میل ملاقات بڑھی۔ دونوں سیر و تفریح اور شکار کے لیے ایک ساتھ جانے لگے اور عیش و نشاط کی ایسی محفلیں سجانے لگے جہاں رازداری کا خصوصی انتظام ہوتا تھا اور کسی غیر کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ریذیڈنٹ کے بنگلے پر لکھنؤ اور بمبئی سے ناچنے گانے والیاں بلائی جاتی تھیں۔ رقص و سرود کی محفلوں میں شراب و شباب ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ریذیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ کو ریذیڈنسی کہا جاتا تھا۔ یہ طوائفیں خاموشی سے وہیں بلوائی جاتی تھیں اور وہاں سے رخصت ہو جاتی تھیں۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میری جان بڑے عذاب میں پھنس گئی تھی۔ کہنے کو میں پرنس کا اتالیق بھی تھا مگر اصل صورتِ حال یہ تھی کہ اُلٹا پرنس مجھے زندہ رہنے کے طور طریقے سکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا نظریۂ حیات صرف یہ تھا کہ 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'۔ وہ کہتا تھا کہ "میاں وزیر خان! یہ جوانی میں تم نے کیا روگ پال رکھے ہیں۔ یہ آزادی اور مسلم لیگ، سیاسی نظریات۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آزادی نہیں ملنی چاہیے یا مسلم لیگ کا کوئی مقصد نہیں۔ آزادی بالکل ملنی چاہیے اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے مگر تمہاری کوئی سیاست کی عمر ہے۔ ارے بھائی چالیس سال کے ہو جاؤ تو یہ دھندے بھی کر لینا۔ جوانی کے دھندے کچھ اور ہوتے ہیں..." ظاہر ہے میں اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ صرف ایک بار میں نے کہا تھا کہ "شہزادہ صاحب! آپ کو امورِ سلطنت اور سیاست سے اتنا بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ نواب صاحب قبلہ کے بعد ان کی ذمہ داری آپ کو سنبھالنی ہے۔" تو وہ ہنستے ہنستے بولا تھا کہ "یار! تم تو بس نام کے وزیر ہو، عقل کے پیدل ہو۔ ذرا سوچو تم کب کی بات کر رہے ہو۔ نواب صاحب ماشاءاللہ جوانوں سے زیادہ صحت مند اور آبا و اجداد کی طرح لمبی عمر پائیں گے تو ابھی اتنا ہی اور جئیں گے۔ معلوم نہیں اس وقت تک ریاست رہتی ہے یا نہیں اور ہم خود رہتے ہیں یا نہیں۔ ہمیں حکومت کرنے کا بالکل شوق نہیں ورنہ باپ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ جانا تو روایت رہی ہے۔ خدا والدِ ماجد کا سایہ تا ابد سلامت رکھے تاکہ اپنی زندگی بھی اسی بے فکری سے عیش کرتے گزر جائے۔"

پرنس کی عیاشی اور عیش پرستی کی رپورٹ نواب صاحب کو دینا مجھے بے مقصد لگتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ باپ کو اکلوتے بیٹے کے بارے میں یقیناً پہلے سے سب کچھ معلوم ہوگا اگر وہ چشم پوشی کرتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ دونوں طرف سے بدگمانی مول لوں۔ نواب صاحب تو شاید ناگواری سے سب کچھ سُن کے بھی خاموش رہیں مگر پرنس فوراً مجھے برخاست کر دے گا۔ نواب صاحب مجھے اس پر زبردستی مسلط نہیں رکھیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ پرنس اسے انا کا مسئلہ بنا لے تو مجھے اصطبل میں گھوڑے مالش کرنے پر لگا دیا جائے یا ریاست سے نکال باہر کیا جائے ـــ انگریزی نوکری میں چھوڑ چکا تھا اور اب ایک طرح سے حکومت کے مخالفین میں شامل تھا۔ ریاست میں رہ کر مجھے تحفظ بھی حاصل تھا اور ہر آسائش بھی میسر تھی لیکن اس سے زیادہ اہم بات میرے لیے نواب صاحب کی مسلم لیگ کی حمایت تھی۔ یہاں میں دل کھول کر اور بے خوف و خطر مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا تھا چنانچہ میں نے پرنس کے ذاتی معاملات سے خود کو الگ رکھا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ پرنس نے مجھے دوست و ہمراز بنا لیا۔ اس کی رہائش محل کے آخری حصے میں تھی، اسی حصے میں میرا قیام بھی تھا۔ محل کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ یہ حصہ باقی محل سے تقریباً الگ تھا۔ آدھی رات کو عقبی دروازے سے چادروں میں لپٹی عورتیں اندر آتی تھیں اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے انعام و اکرام لے کر رخصت ہو جاتی تھیں۔ ان میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں تھی۔ بس وہ دولت کے بدلے آبرو کا سودا کرنے والی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ یہ بے راہ روی دیکھنے والا تماشائی میں ہی نہیں تھا، محل کے اسی حصے میں پرنس کی بیوی بھی تھی۔ اللہ میاں کی گائے جسے ایک رسم پوری کر کے محل میں لا کر کھونٹے سے باندھ دیا گیا تھا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس کے دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ میں کر سکتا تھا لیکن میری طرح وہ بھی مجبور تھی۔ اسے نواب زادوں کی جوانی کے بارے میں پہلے ہی سمجھا دیا گیا تھا جو کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ پرنس کو دیکھ کر میں نے دبے دبے لہجے میں کہا تھا کہ بیوی کے ہوتے ہوئے یہ سب کس حد تک جائز ہے تو پرنس نے ہنس کر کہا تھا "اے وزیرِ باتدبیر! کیا تو نے عقل مندوں کا قول نہیں سنا: گھر کی مرغی دال برابر۔"

اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہفتہ دس دن میں پرنس اپنی جگہ چھوڑ کے نکل گیا اور رات بھر ریذیڈنسی میں گزار کر صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے لوٹ آیا۔ جہاں بقول اس کے "ایک سے ایک ولایتی مال ملتا تھا۔" میں بڑی کوشش کرتا تھا کہ یہ خطرناک ذمہ داری قبول نہ کروں لیکن پرنس کی ضد کے سامنے میری ایک نہ چلتی تھی۔ ایک طرف مجھے اس کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اچانک کسی رات نواب صاحب ادھر نہ آ نکلیں یا پرنس کو طلب نہ کر لیں تو دوسری طرف یہ پریشانی لاحق رہتی تھی کہ پرنس کی بیوی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ میرے خلاف طوفان کھڑا کر دے گی اور شاید مجھے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گی کیونکہ وہ خود بھی ایک رئیس کی بیٹی تھی اور اس کے بھائی بڑے طرم خان تھے۔ میاں بیوی کے تعلقات 'روایت' کے مطابق کشیدگی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے جہاں ازدواجی رشتے کی حقیقت بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ صرف خاندانی وقار، معاشرتی مجبوری اور مذہب یا قانون کے تقاضے علیحدگی کی راہ میں حائل تھے۔ ان کے بیڈروم الگ اور اتنے فاصلے پر تھے کہ ایک کمرے کی آواز بھی دوسرے کمرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے باوجود بیوی کو شوہر کے کمرے میں آنے سے کون روک سکتا تھا اگر کسی رات وہ دیکھ لیتی کہ میں اس کے شوہر کی جگہ سو رہا ہوں اور شوہر غائب ہے تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مشتعل ہو کے وہ مجھے قتل کر دے یا کرا دے۔ اس محل کی چار دیواری کے اندر اس پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا لیکن مجھ پہ الزام آتا تھا کہ اتالیق ہونے کے باوجود میں نے پرنس کو رنگ رلیاں منانے کی اجازت دی۔ اس کے اخلاق و کردار کو سنوارنے کے بجائے بُرائی کے راستوں پر چلنے میں اس کی مدد کی۔ اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی مجروح کیا۔

میرا ضمیر بھی مجھے پریشان کرتا تھا اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ اس سے پہلے سلطان آباد سے نکل جاؤں۔ مجھے اس عیش و آسائش کی زندگی سے دست بردار ہونا پڑے گا اور کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرنی پڑے گی۔ جھوٹ بول کر نواب صاحب کو مطمئن کرنا ہوگا کہ میں ان کی عنایات کو ٹھکرانے پر کیوں مجبور ہوں اور مسلم لیگ سے جذباتی وابستگی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا مگر میں اس ذہنی عذاب سے تو بچ جاؤں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا میں اس دلدل میں اور گہرا اتر گیا۔ ایک روز وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

میرے احتجاج کے باوجود پرنس ریذیڈنسی جا چکا تھا کیونکہ وہاں ایک آفتِ جاں، غارت گرِ ہوش، کافر ادا، نوخیز دلربا حسینۂ افرنگ تازہ تازہ ولایت سے وارد ہوئی تھی اور اس نوخیز بتِ طناز کے عشقِ خانہ خراب نے قیامت سے پہلے قیامت ڈھا دی ہے۔ پرنس نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ بلبلِ نوبہار کسی اور کے باغ کی زینت ہے لیکن دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ میں نے پرنس کو ایک شادی شدہ عورت سے تعلقات سے آگاہ کر دیا تھا کیونکہ وہ رعایا میں سے کسی کی بیوی نہیں تھی حاکموں کے طبقے میں شامل تھی۔ عشق میں احتیاط بے سود ہے کیونکہ اس کی خوشبو تو مشک کی طرح پھیلتی ہے اور اپنے وجود کی خود خبر دیتی ہے۔ اس پر پرنس نے ایک سرد آہ بھر کے سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور نوٹنکی کے مکالموں کی طرح کہا تھا "حضرتِ ناصح! یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے۔ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

میں سر پکڑے بستر پر بیٹھا اس نئی اُفتاد کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ابھی روشنی گل بھی نہ کی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر آ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کون ہو سکتی ہے۔ وہ نوجوان اور صحت مند عورت تھی جس کے حسن و شباب کی دلکشی اور رعنائی کا ذکر کرنے لگوں تو الفاظ کم پڑ جائیں گے۔ اس کے انداز و اطوار میں ایسی شاہانہ تمکنت تھی کہ میں دم بخود اور سحر زدہ بیٹھا رہ گیا۔ محل میں محرم اور نامحرم سے پردے کا اہتمام بہت سخت تھا چنانچہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ پرنس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔

"بندی تسلیم بجا لاتی ہے وزیر صاحب!" اس نے طنز کا نشتر چلاتے ہوئے کہا اور معنی خیز طریقہ پر ہنسی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ بہت صدمہ ہوا ہے مجھے یہاں دیکھ کر؟"

"بیگم صاحبہ... !" میں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ اس وقت یہاں؟ آپ کو تو اپنی خواب گاہ میں ہونا چاہیے تھا۔"

"بجا ارشاد!" وہ اسی طنزیہ لہجے میں بولی۔ "میں اپنی خواب گاہ ہی میں ہوں۔ آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ شوہر کی خواب گاہ میں صرف شوہر کو یا اس کی بیوی کو ہونا چاہیے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں آپ کیا کر رہے ہیں اور شہزادہ صاحب کہاں ہیں؟"

میں سخت نروس ہو رہا تھا۔ شرمندگی سے میرا سارا وجود پانی بن گیا تھا۔ پرنس کی بیوی کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کی کاٹ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز تھی۔ میں بیک وقت اس کے حُسن و شباب کی کشش سے مغلوب اور مسحور کھڑا تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔

"تشریف رکھیے وزیر صاحب! پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے۔" وہ بڑی نخوت کے ساتھ مسہری کے ایک کنارے پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ "میں آپ کو شرمندہ کرنے نہیں آئی ہوں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ ایک اتالیق کا منصب نہیں تھا۔ مجھے اپنے شوہر کی ہر رات کا افسانۂ رنگیں معلوم ہے کہ یہاں کون آتا ہے یا وہ خود کہاں جاتا ہے۔ وہ بیوی ہی کیا جسے شوہر کے پل پل کی خبر نہ ہو خواہ شوہر پل بھر کے لیے بھی اس کی خبر لینے نہ آتا ہو اور جو اس کی رگ رگ سے واقف نہ ہو۔ جو کہنے کو رگِ جاں سے بھی قریب تر ہو مگر اتنی دور ہو جتنا آکاش سے پاتال... لیکن میری بدقسمتی کو میری خوش قسمتی مان لیا گیا ہے۔ ایک مزدور کی بیوی اپنے شوہر کا گریبان پکڑ کے پوچھ سکتی ہے کہ بول اتنی دیر سے گھر کیوں آیا لیکن ایک نواب کی بہو اور علی عہد بہادر کی منکوحہ جو محل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں رہتی ہے، خادموں اور کنیزوں پر حکم چلاتی ہے، دنیاوی مال ومتاع کے خزانوں کی چابیاں رکھتی ہے اور بہت اونچی ناک رکھنے والے خاندان کی عزت کہلاتی ہے' وہ اپنے شوہر سے کوئی سوال نہیں کرسکتی کہ میرے سرتاج! عروسی کے پہلے چند ماہ کے بعد مجھے میرا حق کیوں نہیں ملا ؟"

اب میں اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا لیکن میرے لب بند تھے اور میری عقل دنگ تھی۔ مجھے پرنس کی بدنصیبی کا خیال نہیں تھا جو گھر کے کوہ نور کو ٹھکرا کے کوچہ و بازار میں ٹھیکریاں چنتا پھر رہا تھا۔ میں دستِ قدرت کے تراشے ہوئے حسنِ بے مثال کے اس پیکر کو دیکھ رہا تھا جس کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ ٹکسال میں ڈھل کر نکلنے والے چمکتے دمکتے سکے کی طرح تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو، لہجے کی دلآویزی اور آواز کی نغمگی مجھ پر جادو کر رہی تھی۔ مجھے دیوانہ کر رہی تھی۔

"... میں تو آپ سے ایک صاف سیدھی بات کا جواب مانگنے آئی ہوں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "میں آپ کو منصف بناتی ہوں کہ مذہب اور قانون کی رو سے کسی کو اس کے جرم کی سزا دینا جائز ہے یا نہیں ؟ کیا خون کا بدلہ خون نہیں ہونا چاہیے ؟"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "یہ تو دنیا میں ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔"

"بجا ارشاد۔" وہ مسکرائی۔ "آپ نے انصاف کیا اور اسی فیصلے کی روشنی میں فریادی کے دوسرے سوال کا جواب بھی دیا جائے کہ کیا بے وفائی کے بدلے بے وفائی غلط ہوگی ؟ بولیے، جواب دیجیے۔"

"دیکھیے! میں کوئی مفتی، قاضی یا جج تو نہیں ہوں۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں۔ لیکن آپ نے ایک عام آدمی کی طرح اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کر دیا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔ "میں کب کہتی ہوں کہ یہ عدالتی فیصلہ ہے یا کوئی فتویٰ ہے۔ اب تم اس فیصلے سے انحراف ہی نہیں کرسکتے۔ تم اس پوزیشن میں ہی نہیں ہو کہ انحراف کرسکو۔" وہ آپ سے اچانک تم پر آگئی تھی اور اس کے لہجے میں بے تکلف شوخی کا انداز نمایاں ہونے لگا تھا۔ "تم اپنے ہونہار شاگرد کو بے وفائی کرنے سے نہیں روک سکے تو کیا مجھے روک سکتے ہو ؟ ہمت ہے تو انکار کرکے دیکھو۔ میری آواز کے بلند ہوتے ہی کتنے جانثار دوڑے چلے آئیں گے اور اسی دیر میں نواب صاحب کو بھی خبر ہو جائے گی۔"

اس نے مجھے بلیک میل کیا کیونکہ وہ بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں خود بھی بلیک میل ہونا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے اس کو امرت کا پیالہ سمجھ کے اٹھا لیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آگ ہے مگر میں نے انگاروں سے دامن بھر لیا۔ پرنس کو پھر کبھی نہیں ٹوکا اور اس کا رازدار بنا رہا۔ وہ جس عشق میں مبتلا تھا' وہ دن بدن شدت اختیار کر رہا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا لیکن میں نے اس کی عدم موجودگی کے ہر لمحے کو غنیمت شمار کیا اور وصل نایاب کی خوشی سمیٹ لی۔ اس کے جاتے ہی پرنس کی اس کی خواب گاہ میں خوشبو، رنگ اور لطافت بن کے اتر آتی تھی اور صبح سے پہلے میں اٹھ کے اس کے لیے دروازے کھول دیتا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ سب خیریت ہے نا میاں وزیر باتدبیر ؟ اور میں دل ہی دل میں مسکرا کے کہتا تھا کہ شہزادہ عالی جاہ آپ کو تو تقدیر یاد رہے۔ پرنس کے معاملات آگے بڑھے تو وہ کبھی محل میں آنے لگی۔ اس کا شوہر کبھی کبھی دو چار دن کے لیے دلی چلا جاتا تھا اور وہ ہر رات نوکروں کے سو جانے کے بعد پرنس کی خوابگاہ تک ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کرلیتی تھی۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی بدنامی ہے اور کتنے خطرات ہیں اور کسی نے اس کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ پرنس اس کو چشم براہ ملتا تھا اور صبح سے پہلے پھر خواب گاہ کے دروازے کھلتے تھے تو حویلی کے راز کسی پر افشا نہیں کرتے تھے۔ پرنس کو مجھ پر پورا اعتماد تھا اور اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ جو اپنا رازداں تھا وہ اپنا رقیب بن گیا ہے۔ جب وہ فرنگن پرنس کی خواب گاہ میں رہتی تو میرے لیے یہ فراغت بڑھ جاتی تھی۔ مجھے پرنس کے اچانک لوٹ آنے کا خوف نہیں رہتا تھا اور میں زیادہ سکون کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں رہتا تھا اور میرے لیے خواب گاہ کے دروازے بھی کھل جاتے تھے جس کی دہلیز کو پرنس کے قدموں نے کئی ماہ سے عبور نہیں کیا تھا۔

یہ انکشاف مجھ پر بہت بعد میں ہوا کہ پرنس جس شادی شدہ فرنگن کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے وہ ریذیڈنٹ کی بیوی ہے۔ یہ بات معلوم ہوئی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ ریذیڈنٹ کتنا کینہ پرور شخص ہے۔ ایک بار پہلے اس کی انا کو ٹھیس لگی

تھی تو اس نے انتقام لینے کے لیے بیٹے کے ہاتھوں باپ کو قتل کرانے کی سازش کی تھی۔ اس نے پرنس سے راہ و رسم اسی لیے بڑھائی تھی کہ اسے نواب صاحب کے خلاف اکسائے، جھوٹی اور بے بنیاد باتیں سنا کے بدظن کرنے کی کوشش کرے۔ اپنے بے ضمیر حاشیہ برداروں کی مدد سے افواہوں کا زہر پھیلائے اور پرنس کو حاکم بننے کے جنون میں مبتلا کر دے لیکن اس کی سازش ناکام رہی۔ اپنے والد کے بارے میں پرنس کے خیالات کو بدلنا ناممکن تھا۔ ریذیڈنٹ اسے الٹی پٹی پڑھاتا تھا اور وہ ہنس کے مجھے بتاتا تھا کہ سالا لحمِ خنزیر کھانے والا سمجھتا ہے کہ میں کاٹھ کا الو ہوں۔ ہمیں ہمارے والد سے بھڑانے کی باتیں کرتا ہے۔ ان انگریزوں نے ایسی ہی شیطانی سازشوں سے پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ سلطان آباد میں یہ چکر نہیں چلے گا۔ ہم تخت و تاج کو لات مار سکتے ہیں تو دوسری لات برطانیہ کے شاہی خاندان سے رشتہ ملانے والے کو بھی مار سکتے ہیں... اور یوں آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ریذیڈنٹ نے پرنس کو چکر میں ڈالنا چاہا اور خود چکر میں پڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسا شوہر ہے جس کو ابھی تک بیوی کے رویّے کی تبدیلی سے صورتِ حالات کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ آزادانہ میل جول ان کی سوسائٹی میں برا نہیں سمجھا جاتا لیکن پرنس جیسے شخص کا اپنی بیوی سے یہ میل جول اسے حد سے زیادہ نہیں لگتا ؟ کیا وہ اتنا بے وقوف ہے کہ جائز اور ناجائز تعلق کے فرق کو محسوس نہیں کرسکتا ؟ ریذیڈنسی کے نمک خوار کچھ نہیں دیکھتے اور اسے کچھ نہیں بتاتے ؟ اس کے حلقہ احباب میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ پرنس کے اور اس کی بیوی کے بڑھتے ہوئے تعلق کی طرف نہیں دلائی ؟ کیا اس نے کبھی آئینے میں خود کو دیکھ کر موازنہ نہیں کیا کہ پرنس اس کے مقابلے میں کتنا وجیہ و شکیل اور پرکشش مرد ہے ؟ اور اس کو بیوی کے رویّے کا فرق بھی محسوس نہیں ہوتا ؟

میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نامعلوم خطرے کا سایہ افق کے آخری کنارے سے اٹھنے والے ساون کے بادل کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ خطرہ ہر طرف تھا اور ہر لحظہ قریب آرہا تھا اور اس کا حصار تنگ سے تنگ تر ہونے لگا تھا۔ کئی بار میں نے اس کو اپنے مجرم ذہن کا احساس سمجھ کے جھٹک دینے کی کوشش کی مگر کوئی غیبی قوت یا میری چھٹی حس مجھے مسلسل خبردار کرتی رہی۔ اچانک ایک دن مجھے نواب صاحب نے تخلیے میں طلب فرمایا۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "میاں وزیر خان! ہمیں تمہاری ذہانت اور صلاحیت پر، تمہارے خلوص اور تمہاری وفاداری پر بہت اعتماد ہے۔"

"حضور کی ذرّہ نوازی ہے۔" میں نے اندر ہی اندر شرم سے پانی پانی ہو کے کہا۔

"تمہارے خیالات اور نظریات بھی ہمیں پسند ہیں۔" انہوں نے ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "ہم بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ ایک خاص کام تمہارے سپرد کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس معاملے میں تم رازداری کو شرطِ اوّل تصور کرو گے کیونکہ یہ ہماری عزت کا بھی سوال ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے کرلو گے۔ اگر تم چاہو تو گیان چند بھی تمہاری مدد کرسکتا ہے کیونکہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔"

"آپ حکم کیجیے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"معاملہ ہے ریذیڈنٹ کا۔" نواب صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم نے گیان چند سے بھی ذکر کیا تھا۔ لیکن دوبارہ غور کرنے پر تم ہمیں اس کام کے لیے زیادہ موزوں شخص نظر آئے۔ آج رات..."

نواب صاحب کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ گیان چند اندر آگیا اور اس نے اطلاع دی کہ ریذیڈنٹ صاحب بغرضِ ملاقات تشریف لائے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ پھر بات کریں گے اور خود مہمان کی پذیرائی کے لیے باہر چلے گئے۔ میں تمام دن سوچتا رہا کہ نواب صاحب کے کام کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے اور وہ کون سا معاملہ ہوسکتا ہے جس کا تعلق ریذیڈنٹ سے ہو۔ نواب صاحب کا مزاج برہم ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ بالآخر ان کے کانوں تک بات پہنچ چکی ہے۔ لیکن وہ بالکل پُرسکون تھے۔ میں اس روز اپنے کمرے سے بھی نہیں نکلا کہ کہیں نواب صاحب دوبارہ بات کرنے کے لیے طلب نہ فرمائیں۔ رات کے کھانے کے بعد میں پرنس سے یہی بات کر رہا تھا کہ گیان چند آیا اور اس نے کہا کہ ریذیڈنٹ صاحب نے گاڑی بھیجی ہے اور تمہیں بلایا ہے۔

"تمہیں بلایا ہے یا وزیر خان کو ؟" پرنس نے حیرانی سے کہا۔ "کون لینے آیا ہے ؟"

"میر شرافت علی۔ اُن کا شوفر۔" گیان چند نے کہا۔

"مگر ریذیڈنٹ صاحب کو وزیر خان سے کیا کام ہوسکتا ہے ؟" پرنس نے کچھ پریشان ہو کے کہا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا حضور، لیکن نواب صاحب کا کوئی کام ہوسکتا ہے۔" گیان چند نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیوں وزیرخان؟" اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اچھا اچھا۔ ہم ابھی یہی بات کر رہے تھے۔" پرنس نے مسکرا کے کہا۔ "ٹھیک ہے وزیرخان! نہ آپا حضور کا کام ٹالا جا سکتا ہے اور نہ ریذیڈنٹ بہادر کا حکم۔ تم جاؤ مگر واپسی میں مجھے ضرور بتانا کہ کیا گپ شپ رہی۔"

میں باہر آیا تو ریذیڈنسی کی سیاہ گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور میر شرافت علی ڈرائیور کی جگہ بیٹھا تھا۔ گیان چند نے پیچھے کا دروازہ کھولا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس وقت تک میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ گاڑی کی ڈکی میں ہمارے ساتھ ایک لاش بھی سفر کر رہی ہے!

جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے گیان چند سے پوچھا کہ ریذیڈنٹ صاحب کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ میں پرنس کا سیکرٹری ہوں اور میرا ریاست کے انتظامی معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یوں باہر دیکھتا رہا، جیسے میری بات اس نے سنی بھی نہیں ہے۔ دوسری بار میں نے شانہ ہلا کے اسے متوجہ کیا اور اپنا سوال دہرایا تو اس نے بڑی رکھائی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ کشیدگی کے اسباب ہمارے درمیان پہلے سے موجود تھے چنانچہ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میر شرافت علی کو مخاطب کیا۔ "شرافت علی! کیا تمہیں بھی کچھ معلوم نہیں؟"

"بھائی وزیرخان!" شرافت علی نے نگاہ سامنے رکھی۔ "ایک شوفر کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔"

"شوفر کو راستے تو معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "اور جس راستے پر تم جا رہے ہو وہ ریذیڈنسی کا راستہ نہیں ہے۔ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"گھبراتے کیوں ہو؟" گیان چند طنز سے بولا۔ "ہم تمہیں قتل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کیا مجھ سے جھوٹ بولا گیا تھا کہ مجھے ریذیڈنٹ نے طلب کیا ہے؟"

اس وقت تک گاڑی کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا اور ہم آبادی کی حدود سے نکل چکے تھے۔ آگے گھنا جنگل تھا اور پھر ایک برساتی ندی تھی جس پر دو پُل تھے۔ ایک لکڑی کا پرانا پل جسے صرف پیدل چلنے والے استعمال کرتے تھے اور دوسرا نیا بنا ہوا سیمنٹ کا پل جو گاڑیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ دو کے پار پھر جنگل شروع ہو جاتا تھا اور پانچ چھ میل تک سڑک اسی جنگل میں سے سیدھی گزرتی تھی۔ مگر دائیں بائیں درخت اور جھاڑیاں صاف کر کے ایسے کچے راستے بنا دیے گئے تھے جن پر سے جیپ گزر سکتی تھی اور یہ پُرپیچ راستے جنگل کے ہر گوشے تک پھیلے ہوئے تھے۔ جنگل دراصل ریاست کی شکارگاہ تھا اور یہ راستے شکاری رئیسوں اور صاحب بہادروں کے لیے بطور خاص بنوائے گئے تھے۔ عام آدمی کا ان خطرناک راستوں پر گزر نہیں ہوتا تھا۔

گاڑی جب پُل کو عبور کر گئی تو میں نے چلا کر کہا۔ "کیا ریذیڈنٹ صاحب اس جنگل میں ملیں گے؟ میں تو کوئی شکاری نہیں ہوں۔ ان کے ہم مرتبہ شکاری تو پرنس خورشید ہو سکتے ہیں، میں ان کا سیکرٹری نہیں ہو سکتا۔ اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے مجھ کو اپنے ساتھ لائے ہو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہر بات پرنس کے سامنے ہوئی تھی اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کون لوگ لے گئے ہیں۔"

"اگر ریذیڈنٹ صاحب نے اپنی زبان سے کہہ دیا کہ گاڑی میں تم کو صرف ریذیڈنسی لے جایا گیا تھا؟" گیان چند نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی کہ وہ تمہارے ساتھ شطرنج کھیلتے رہے تھے تو تم کیا کرو گے؟ کوئی مانے گا تمہاری بات کہ ہم تمہیں جنگل میں لے گئے تھے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری طرح ریذیڈنٹ بھی عیار آدمی ہے۔" میں نے حقارت سے کہا۔ "لیکن مجھ میں اس کو منہ پر جھوٹا کہنے کی ہمت ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ کیا مجھے توپ دم کر دے گا؟ پرنس کو معلوم ہے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ اعتبار وہ مجھ پر ہی کریں گے۔"

گاڑی اچانک سیدھے ہاتھ کے ایک کچے راستے پر اتر گئی۔ رات کے اندھیرے میں دونوں طرف کے گھنے درخت اور جھاڑیاں ایک سیاہ دیوار کی طرح نظر آتے تھے لیکن درمیان کا راستہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے منور تھا۔ میں نے چیخ کر شرافت علی کو گاڑی روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے رفتار میں اضافہ کر دیا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں جو راستے پر آگے تک نکل آئی تھیں، گاڑی کی بیرونی سطح سے رگڑ کھا رہی تھیں کیونکہ یہ گاڑی جیپ کے مقابلے میں زیادہ چوڑی تھی۔ میں نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے باہر کودنے کا فیصلہ کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وقتی ضرورت کی خاطر اندر سے دروازہ کھولنے والا ہینڈل نکال لیا گیا ہے۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ ایک گالی دے کر میں نے پیچھے سے شرافت

علی کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور شرافت علی کے بریک لگانے کے باوجود ایک جھاڑی میں گھس کے رک گئی۔

"یہ کیا دیوانگی ہے بھائی وزیرخان؟" شرافت علی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"دیوانگی کے بچے! میں تجھے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تو مجھے یہاں لانے کا مقصد نہیں بتائے گا۔" میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ "میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ آخر تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟"

"میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔" گیان چند نے کہا۔ "شرافت علی کو چھوڑ دو اور باہر آ جاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ وہ ریوالور لیے باہر کھڑا تھا اور اس نے باہر سے میری طرف والا دروازہ بھی کھول دیا تھا چنانچہ اب میں براہِ راست اس کے ریوالور کی زد میں تھا۔ میں نے شرافت علی کو چھوڑ دیا اور نیچے اتر آیا۔ گیان چند اس خیال سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں میں اس پر جست نہ لگا دوں۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لائے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے گیان چند کہ میرا وجود تمہاری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کم ظرف اور کمینے دشمن ہو۔"

"تم اب بھی غلط سمجھ رہے ہو۔" گیان چند بولا۔ "میں بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہیں قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں۔ ہم یہاں ایک مشن پر آئے ہیں۔ میں اکیلا شرافت علی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے تمہیں بھی ساتھ لے لیا۔ میرے اور شرافت علی کے مقابلے میں تم زیادہ صحت مند ہو اور یہ کام جسمانی مشقت کا ہے۔ ہمیں یہاں ایک لاش کو دفن کرنا ہے۔"

میں ہکا بکا کھڑا ہوا ان دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ "لاش کو؟ کس کی لاش کو؟"

"لاش تو لاش ہی ہوتی ہے۔ اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کی لاش ہے۔" شرافت علی نے کہا۔ "ہمارا کام تو اس کو دفن کرنا ہے۔"

"فرق کیسے نہیں پڑتا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "لاش میرے باپ کی ہو۔ میرے بھائی، دوست یا نواب صاحب کی ہو تو میں تم کو زندہ دفن کر دوں گا۔ اور میری جگہ تم ہوتے شرافت علی تو تم بھی یہی کہتے اور یہی کرتے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں میاں وزیرخان!" شرافت علی نے ہنس کر کہا۔ "تم بلاوجہ اتنے سیریس ہو رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ اپنے ریذیڈنٹ صاحب سے کچھ نشے میں ایک قتل ہو گیا ہے، ہم میں سے کسی کا بھی مقتول کے ساتھ دور کا بھی رشتہ نہیں۔ چنانچہ ہمیں تو صرف ان کی عزت بچانے کی فکر کرنی چاہیے جن کا ہم نمک کھاتے ہیں۔ اس معاملے میں ہر شخص پر تو اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ریذیڈنٹ صاحب نے یہ کام میرے سپرد کر دیا اور میرے لیے گیان چند کے بعد تم ہی بھروسے کے آدمی ہو کیونکہ تم پرنس کے سیکرٹری ہو اور جانتے ہو کہ ریذیڈنٹ صاحب سے ان کی کتنی پکی دوستی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا کام ہے۔ ہم تینوں مل کر ایک قبر کھودیں گے جس کے لیے ہم سامان اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ یہ سب کام ایک آدمی رات بھر میں نہیں کر سکتا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی پیشہ ور گورکن نہیں ہے۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

مجھے اس ماحول میں یہ ہنسی بڑی بھیانک اور دہشت زدہ کرنے والی محسوس ہوئی۔ لیکن شرافت علی پر کوئی اثر نہ تھا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ لاش کس کی ہے؟" میں نے بہت دیر بعد کہا۔ "عورت کی ہے یا مرد کی؟ غصہ اور نشہ کرنا تو تمہارے صاحب کی فطرت میں شامل ہے۔ اس بدبخت کا نام کیا تھا؟"

"یہ سب باتیں جان کے کیا کرو گے بھائی وزیرخان؟" شرافت علی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"یہ جانے بغیر میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔" میں نے اپنی ضد پر اڑتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے۔" شرافت علی نے کچھ سوچ کے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہر روز ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہمارے صاحب بہادر کچھ شوقین مزاج واقع ہوئے ہیں۔ شوقینی ایسے ہی صاحبوں اور رئیسوں کی شان ہے۔ میرے جیسے دال کھانے والے شوقین بننے کی کوشش کریں تو رسوا ہوتے ہیں۔ ایک بدبخت عورت نے صاحب کی مہربانیوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور بعد میں ان کی عزت سے کھیلنا چاہا۔ صاحب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ حاکم لوگ ہیں جن کی عزت رعایا کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ انہوں نے اس داغِ رسوائی کو پھیلنے سے پہلے ہی مٹا دیا اور باقی کام ہم جیسے قابلِ اعتماد نمک خواروں کے سپرد کر دیا۔"

ریذیڈنٹ نے کسی عورت کو قتل کر دیا تھا۔ قانون کی نظر میں یہ جرم تھا اور قانونی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ معاملاتِ انصاف میں حاکم و محکوم اور گورے یا کالے کے درمیان کوئی تفریق نہیں مگر یہ کتابی باتیں عملی زندگی کا حصہ نہیں تھیں، خصوصاً اس ریاست کی حدود میں جہاں حاکم اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محکوم کے درمیان زمین اور آسمان کی دوری تھی۔ حاکموں کا فرمایا ہوا مستند تھا اور قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ محکوم کے لیے کوئی قانون نہیں تھا اور اس کی کوئی آواز نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ رنگینیٔ طبع اور کاروبارِ شوق میں پرنس اور ریذیڈنٹ ایک دوسرے کے رفیق و راز داں ہیں۔ چنانچہ میرے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ پرنس کو یہ بات یقیناً ناگوار گزرے گی کہ میں نے اس کے ہم مشرب و ہم پیالہ ریذیڈنٹ کی خواہش کا احترام کیوں نہیں کیا۔ اور جس عورت نے ریذیڈنٹ کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی، اس کے قتل پر خاموشی سے پردہ ڈالنے والوں کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کیا۔ اس راز سے آشنائی کے بعد خود میری ذات کا تحفظ بھی اخفائے راز سے وابستہ تھا۔ بصورتِ دیگر افشائے راز کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے میرا خاتمہ ناگزیر ہو جاتا۔

ہم تینوں نے اپنے کپڑے اتارے اور صرف انڈر ویئر پہنے قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ رات اندھیری تھی اور آسمان پر گہرے سیاہ بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ شرافت علی نے کام کا آغاز کیا لیکن دس منٹ بعد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کا بدن پسینے میں تر ہو گیا اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے الگ ہوتے ہی گیان چند نے بیلچہ سنبھالا اور پندرہ منٹ کام کر کے الگ ہو گیا۔ قبر ابھی آدھا فٹ گہری بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سر جھکا کے زمین کھودنی شروع ہی کی تھی کہ ایک کوندا سا لپکا اور میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو شرافت علی اور گیان چند ساتھ ساتھ بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ شرافت علی نے کہا کہ بجلی چمک رہی ہے جلدی کرو۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ اس کے بعد گرج کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ میں پھر اپنے کام میں لگ گیا اور آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر دیکھے بغیر مٹی کھودتا رہا۔ اس دوران میں بجلی دو مرتبہ چمکی اور ہر بار مجھے پہلے کی طرح یوں لگا جیسے خیرہ کن روشنی آسمان سے نہیں اتری ہے لیکن کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے بجلی نے بادلوں میں رونمائی شروع کی اور گرج کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچی تو میرے ابتدائی شکوک خود بخود مٹ گئے۔ دو گھنٹے کی مسلسل اور مشترکہ کوشش کے بعد ہم چھ فٹ لمبی اور تین فٹ گہری قبر کھود کے فارغ ہوئے تو شرافت علی نے ڈکی کھولی اور مجھ سے لاش اٹھانے کو کہا۔ گیان چند ابھی ابھی کھدائی سے فارغ ہو کے بیٹھا تھا اور آرام کر رہا تھا۔ شرافت علی دبلا پتلا کمزور آدمی تھا چنانچہ میں نے عورت کی لاش کو ڈکی میں سے کھینچ کر نکالا۔

اور دونوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھا لیا کہ میرا ایک ہاتھ عورت کی کمر پر شانوں سے ذرا نیچے رہا تو دوسرا گھٹنوں کے خم کے نیچے۔ عورت کی ڈھلکی ہوئی گردن پیچھے جھولتی رہی اور اس کے بال تیز ہوا میں اڑتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے مُردہ جسم سے اٹھنے والی خوشبو جانی پہچانی لگی۔ میں اس بدبخت اور بدکردار عورت کا چہرہ دیکھنے سے عمداً گریز کر رہا تھا کہ پھر اس کی صورت کا تصور مجھے بعد میں پریشان نہ کرے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ویسے بھی چہرے کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں لاش کو قبر میں سیدھا لٹا رہا تھا کہ بجلی بالکل میرے سر پر چمکی۔ میں فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا اور میں نے قبر کے باہر مٹی کے ڈھیر پر شرافت علی کو بیٹھے دیکھا۔ اسی وقت فلیش کی خیرہ کن روشنی میرے منہ پر پڑی اور میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے شکوک بے بنیاد نہیں تھے۔ پہلے بھی تین بار کیمرے کی فلیش لائٹ ہی تھی جس کی چکاچوند کو شرافت علی نے آسمانی بجلی کی چمک قرار دیا تھا حالانکہ بادلوں میں چمک اور گرج کا سلسلہ بہت دیر بعد شروع ہوا تھا۔

میں نے شرافت علی کو ایک غلیظ گالی دی اور قبر سے باہر نکلنا چاہا۔ میں اتنا مشتعل تھا کہ شرافت علی میرے ہاتھ آ جاتا تو میں اس کو بھی کیمرے سمیت وہیں گاڑ دیتا۔ شرافت علی نے پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک اور تصویر اتار لی اور میں ابھی باہر آیا بھی نہ تھا کہ گیان چند نے میرے سر پر ربر کی بنی ہوئی سخت گیند جیسی کوئی چیز گھما کے ماری۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرا بھیجا تک ہل گیا اور میں ایک سیکنڈ میں بے ہوش ہو کر واپس قبر کے اندر لاش کے اوپر جا پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اس جنگل کے بجائے ریذیڈنسی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں صاف ستھرے بستر پر اپنے صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں، پیروں پر یا منہ پر یا سر میں مٹی کا ایک ذرہ تک نہ تھا۔ یہاں تک کہ میرے جوتے بھی پالش سے چمک رہے تھے۔ میرے سر پر چوٹ کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن سر کے اندر درد کا ایک سمندر موجزن تھا۔ مجھ پر نقاہت طاری تھی اور آنکھیں کھول کر دیکھنے سے مجھے اپنے اطراف کمرے کی دیواریں گردش کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھ لیا کہ شرافت علی میرے قریب گرم دودھ کا گلاس لیے کھڑا ہے اور گیان چند بند دروازے کے قریب ریوالور لیے بیٹھا ہے۔ تھوڑا سا دودھ حلق سے اتارنے کے بعد مجھے اپنی حالت میں افاقہ محسوس ہوا۔ ہوش و حواس کے ساتھ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور میں اس قابل ہو

گیا کہ بیٹھ کر بات کر سکوں۔ "شرافت علی!" میں نے اپنا سر تھام کے کہا۔ "تم نے مجھے کیوں دھوکا دیا تھا؟"

"اس کے بغیر تم وہ سب کچھ کرنے پر تیار نہ ہوتے۔" شرافت علی نے خباثت سے ہنس کر کہا۔ وہ اب مجھ سے کچھ فاصلے پر کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ "اور ہمیں یہ کام تم سے ہی لینا تھا۔"

"آخر وہ عورت کون تھی جس کو دفن کرنے کے لیے صرف میری خدمات حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہی کام سو پچاس روپے میں کوئی مزدور بھی کر سکتا تھا۔"

"اس کی وجہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گی وزیر خان!" گیان چند نے دور سے کہا۔

"وہ تصویریں تم نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے اتاری ہیں؟" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں پرنس کا سیکرٹری یا اتالیق ہی نہیں، قابلِ اعتماد دوست بھی ہوں۔ تم میرے خلاف جو ثبوت چاہو لے آؤ۔ پرنس صرف میری بات پر اعتبار کرے گا۔"

"قبل از وقت دعویٰ کرنا بے وقوفی کی دلیل ہے وزیر خان!" شرافت علی نے کہا۔ "تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ابھی کسی کے سامنے کوئی بات نہ کرو۔ تم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

"مجھے کسی ثبوت یا گواہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میرا گواہ پرنس ہے۔"

"پرنس؟" شرافت علی نے قہقہہ مارا۔ "پرنس اور ریذیڈنٹ تو آج ہی صبح اکٹھے آگرے گئے ہیں اور شاید دو دن بعد واپس آئیں گے۔ بے شک پرنس کو معلوم ہے کہ تم کو ریذیڈنٹ نے بلوایا تھا اور شرافت علی کو گاڑی دے کر بھیجا تھا۔ یہ بات تو ریذیڈنٹ صاحب نے بھی اب تک پرنس کے سامنے تسلیم کر لی ہو گی کہ تم گزشتہ شب دس منٹ کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہو گا کہ تمہیں ایک خط ذاتی طور پر پرنس کو پہنچانے کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر بعد میں ریذیڈنٹ صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اس کے بعد خود پرنس سے بات کر لی۔ ان دونوں کا آگرہ میں کوئی خاص پروگرام تھا۔ تم جانتے ہو کہ ان دونوں کے خاص پروگرام کیا ہوتے ہیں۔" شرافت علی مجھے آنکھ مار کے بے شرمی سے ہنسا۔ "نواب صاحب کو تو بیٹے کی مصروفیات کی کوئی خبر نہیں اور انہیں بے خبر رکھنے کے ذمے دار تم بھی ہو۔ اس لیے نواب صاحب کے سامنے تم لب نہیں کھول سکتے۔ گزشتہ رات کے واقعات کا ذکر کرو گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔ سوائے شرمندگی کے حاصل کچھ نہ ہو گا۔ گیان چند صبح ہونے سے پہلے ہی واپس پہنچ گیا تھا۔ نواب صاحب نے اس کو معمول کے مطابق محل میں موجود پایا تھا لیکن تم غائب تھے۔ عین ممکن ہے پرنس کو واپس آنے کے بعد یہ بات یاد آ جائے اور وہ تم سے پوچھے کہ رات بھر بارش میں تم کہاں رہے تھے؟ ریذیڈنٹ صاحب نے تو دس منٹ بعد ہی تمہیں واپس بھجوا دیا تھا اور میں بتاؤں گا کہ تمہیں محل کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا تو تمہارے لیے اپنی صفائی میں کچھ کہنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"تم بکواس کرتے ہو... بھونکتے ہو کتے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "میں تمہاری اس ناپاک سازش کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ پرنس کی واپسی سے پہلے ہی میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سارے واقعات من و عن بیان کر دوں گا اور ان کو سیدھا اس مقام تک لے جاؤں گا جہاں وہ قبر ہے۔ قتل کیا ہے تو ریذیڈنٹ نے یا پرنس نے، میں نے نہیں اور نواب صاحب اس لونڈے سے پہلے بھی نمٹ چکے ہیں اور اب بھی اس کی ایسی تیسی کر سکتے ہیں۔"

وہ دونوں ایک ساتھ ہنسے جیسے یہ سب مجذوب کی بڑ ہے اور ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں۔

"وزیر خان صاحب! آپ پر کوئی پابندی نہیں..." گیان چند نے طنز سے کہا۔ "اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہیں۔ نواب صاحب قیلولہ فرما رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کے کچھ عرض کرنے سے پہلے وہ جگہ دیکھ آؤ جہاں بقول تمہارے گزشتہ روز ایک عورت کو دفن کیا گیا تھا۔ اول تو تم شکارگاہ کے بھول بھلیوں جیسے کچے راستوں پر گھنٹوں بھٹکتے پھرو گے اور بالفرضِ محال اس راستے پر جا نکلے تب بھی اس جگہ کی نشاندہی کرنی ناممکن ہو گی۔ آدھی رات کے بعد سے صبح تک ہونے والی موسلادھار بارش نے سارے نشانات مٹا دیے ہیں اور زمین برابر کر دی ہے جیسے میلوں تک پھیلی ہوئی زمین۔ تمہیں نواب صاحب کو اپنے ہمراہ لے جا کر بڑی خفت کا سامنا ہو گا۔ ہم خود بھی نہا دھو کر کپڑے بدل چکے ہیں۔ گاڑی ریذیڈنٹ صاحب لے گئے ہیں اور انہیں گاڑی بالکل دھلی دھلائی اور صاف ملی تھی۔ اتنا تو پرنس کو بھی یاد رہے گا کہ صبح گاڑی کے پہیوں پر کیچڑ کا داغ تک نہ تھا اگر غلاظت اور گھاس پھونس ہوتی تو وہ فوراً نوٹ کر لیتے اور ریذیڈنٹ صاحب بھی شرافت علی پر ناراض ضرور ہوتے۔ یہاں ریذیڈنسی میں ایسا کوئی نہیں جو کہہ سکے کہ گاڑی رات بھر باہر رہی ہے۔ اب تم اپنی حالت پر غور کرو۔ تمہیں کہیں مٹی نظر آتی ہے؟ تمہارے ناخن تک صاف ہیں اور جوتوں کی پالش تک خراب نہیں ہوئی۔ تین فٹ گہری قبر کھودنے والے کی حالت ایسی ہوتی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے ؟ نواب صاحب تم پر کیسے یقین کر لیں گے وزیر خان کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو؟"

میں بیٹے ہوئے مہرے کی طرح بیٹھا ہوا تھا میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی تھی کہ شرافت علی اور گیان چند نے اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ اُس نا معلوم عورت کے اصل قاتل وہی دونوں ہیں۔ ریذیڈنٹ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور تصویریں اتارنے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ملزم مجھے بنا دیا جائے۔ شرافت علی کبھی میرا دوست نہ تھا اور گیان چند سے میری پرانی دشمنی تھی۔ اب اس نے مجھے بلیک میل کرنے کا ایک وسیلہ پیدا کر لیا تھا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اپنے کون سے شیطانی عزائم کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس کا مقصد مجھے ریاست سے فرار ہونے پر مجبور کرنا تھا۔

"اب میں تو چلتا ہوں۔" گیان چند نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "نواب صاحب جاگنے والے ہوں گے۔" اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ جسمانی طور پر وہ دونوں مجھ سے کمزور تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد میں مشتعل ہو کے ان پر حملہ نہ کر دوں لیکن اب میری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ خوف باقی نہیں رہا تھا۔ میں اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکوں۔ کمرے کے ایک گوشے میں تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا بہت موٹے ربر کا ہوز پائپ پڑا تھا جس کے ایک کنارے میں لکڑی کا گول سلنڈر جیسا ٹکڑا فٹ کر دیا گیا تھا۔ لکڑی کے ٹکڑے اور ہوز پائپ کا قطر برابر تھا لیکن ربر میں تھوڑی سی لچک کے باعث پھیلنے کی گنجائش تھی اور لکڑی کا وہ ٹکڑا ربر کے پائپ میں زبردستی ٹھونسا گیا تھا چنانچہ اس کا کنارہ تقریباً تین انچ تک باقی پائپ کے مقابلے میں پھولا ہوا نظر آتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جسے میں نے ربر کی سخت گیند سمجھا تھا وہ اسی پائپ کا پھولا ہوا حصہ تھا اور پائپ گھما کر میرے سر میں مارنے سے بیرونی چوٹ نہیں آئی تھی مگر اندر سے میرے دماغ کی مشینری کا ہر پرزہ ہل گیا تھا۔

گیان چند کے جانے کے بعد شرافت علی نے اپنی حفاظت کے لیے ہوز پائپ اٹھا لیا اور ایک دو بار ہوا میں گھما کر مجھ پر واضح کیا کہ وقت ضرورت یہ ہتھیار دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"شرافت علی!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گیان چند سے میں نے کبھی بھلائی کی توقع نہیں رکھی۔ وہ ہندو ہے اور میں مسلمان ہوں لیکن ہمارے درمیان اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتہائی چالاک کمینہ اور سازشی ذہن کا مالک ہے جو کسی طرح نواب صاحب کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ نواب صاحب خود شریف، اصول پرست اور فراخدل ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر میں گیان چند کے ظاہر و باطن کا فرق دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے ڈرتا ہے اور میرا پتّا کاٹ دینا چاہتا ہے لیکن تم سے میرا کوئی اختلاف نہیں اور اس رات سے پہلے ہمارا تعلق برائے نام تھا۔ آخر تم نے گیان چند کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کیوں کی؟"

شرافت علی کچھ دیر ہوز پائپ لیے مجھ سے دور دور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "نوکری کیسی بھی ہو مجبوری ہوتی ہے وزیر خان! اور یہاں تو غلامی ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ایک مسلمان ہونے کے باوجود میں نے ہندو کا ساتھ دیا اور تم سے دشمنی کی حالانکہ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن میں کیا کروں! میں ریذیڈنٹ صاحب کا حکم کیسے ٹالتا۔ ریاست میں دو ہی افراد کا حکم چلتا ہے۔ ایک نواب صاحب کا اور دوسرا ریذیڈنٹ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ گیان چند خود میرے پاس نواب صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس عورت کو نواب صاحب کی خواہش اور ان کے حکم کے مطابق قتل کیا گیا تھا۔"

"اس کا... اس کا مطلب یہ ہے..." میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کہ وہ کہانی جھوٹی تھی جو تم نے مجھے سنائی تھی؟"

"ہاں۔ گیان چند کے سامنے میں سچ نہیں بول سکتا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "ویسے تو خود ریذیڈنٹ صاحب بھی اس عورت کی وجہ سے پریشان تھے لیکن وہ اسے قتل شاید نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "نواب صاحب کا اس عورت سے کیا تعلق ہے ؟ اور اگر وہ ریذیڈنٹ کے لیے مسئلہ بنی ہوئی تھی تو نواب صاحب نے اس کو کیوں قتل کرایا؟"

"میرا خیال تھا وزیر خان کہ تم سمجھ جاؤ گے کیونکہ تم ذہین آدمی ہو۔" شرافت علی نے مایوسی اور افسردگی سے سر ہلایا۔ "تم خود بھی بالواسطہ طور پر ملوث تھے۔"

"میں ؟" میں نے بے اختیار چلا کے کہا۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہے۔ اب تم مجھے بھی اس معاملے میں گھسیٹ رہے ہو جس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو وزیر خان!" شرافت علی نے بھی اونچی آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ نواب صاحب کے

لڑکے شہزادہ خورشید عالم کے اور ریذیڈنٹ کی بیوی کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں ؟ کیا تم اس راز سے واقف نہیں تھے کہ پرنس رات کو محل سے غائب ہو کے کہاں جاتا ہے ؟ تمہیں تو یہ بھی علم ہوگا کہ ریذیڈنٹ کی بیوی نے کتنی راتیں پرنس کی خواب گاہ میں گزاری ہیں۔ جب ریذیڈنٹ سرکاری کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ تم پرنس کے اتالیق تھے۔ اس کے اخلاق و کردار کے ذمہ دار تھے۔ پھر تم نے یہ بات کیوں چھپائی۔ نواب صاحب کو کیوں نہیں بتایا کہ ان کا فرزند آگ سے کھیل رہا ہے ؟ عشق تو آدمی کو اندھا کر ہی دیتا ہے۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں اور انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن تمہاری عقل پر کیسا پردہ پڑ گیا تھا لالچ کا کیونکہ پرنس تمہیں انعام و کرام سے نوازتا تھا ؟"

خوف اور حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی اور میں بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا تھا چنانچہ میں تردید بھی نہ کر سکا کہ پرنس نے مجھے رازداری کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہو رہا ہے اور ایک نہ ایک دن اس عشق کے چرچے نواب صاحب کے کانوں تک پہنچیں گے تو مجرم میں بھی گردانا جاؤں گا۔ زبانِ خلق پر آ جانے والی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے اور عشق کی آگ بھڑکتی ہے تو جلنے والوں کے سوا دھواں سب کو نظر آتا ہے۔ میں شرافت علی کو کیسے سمجھاتا کہ پہلی غلطی مجھ سے مجبوری میں سرزد ہوئی تھی اور مجھے اندازہ نہ تھا کہ آگے مجبوریوں کی ایک دلدل ہے جس سے نکلنا میرے اختیار کی بات نہ رہے گی۔ میں نجات پانے کی جتنی کوشش کروں گا اتنا ہی اس میں اترتا چلا جاؤں گا۔

"شرافت علی! کیا یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہے... کہ میں بھی..." میں نے بے ربط الفاظ میں اپنے دل کی بات زبان سے کہنے کی کوشش کی۔

"پرنس کے بارے میں نواب صاحب کو یقیناً بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "لیکن وہ ریذیڈنٹ سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کسی اور کی بہو بیٹی ہوتی تو نواب صاحب اس کے وارثوں کو اٹھوا لیتے اور خاموشی سے سمجھا دیتے کہ میاں! اپنے گھر کی عزت سنبھالو اور اپنی اوقات مت بھولو۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھنے کی گستاخی کر رہی ہے۔ پھر کبھی ہم نے کچھ سنا تو زندہ دفن کرا دیں گے۔ لیکن اس لہجے میں برابر کے حاکم سے بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ خود نواب صاحب کو لاکھ منہ نہ لگائیں، اس کی بیوی کے متعلق کچھ کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ریذیڈنٹ اسے الزام اور اپنی عزت پر حملہ سمجھے گا تو نواب صاحب کو بھی بے عزت کر دے گا۔ وہ سمجھدار ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ منع کرنے سے یا سمجھانے سے پرنس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر وہ عقل سے کام لے سکتا تو یہ حماقت ہی کیوں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ان کو یہ خبر دینے والا گیان چند ہی ہوگا۔ اسے تم سے پرخاش تھی چنانچہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ظاہر ہے نواب صاحب اتنی آسانی سے گیان چند کی بات پر اعتبار نہ کرتے۔ گیان چند نے ناقابلِ تردید ثبوت اور شہادت مل جانے کے بعد ہی نواب صاحب کو بتایا ہوگا کہ پرنس کیسے خطرناک کھیل میں مصروف ہے اور جسے آپ نے اتالیق مقرر کیا تھا وہ پرنس کا معاون و مددگار بن گیا ہے۔ ریذیڈنٹ کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا لیکن نواب صاحب کو خیال ضرور آیا ہوگا کہ ریذیڈنٹ جیسا کینہ پرور آدمی رقابت کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے اکلوتے بیٹے کو مروا دے گا۔ عین ممکن ہے گیان چند نے نواب صاحب کو اپنی آنکھوں سے سب کچھ دکھا دیا ہو جس کے بعد شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی ہو۔ نواب صاحب کے لیے یہ بھی ناممکن تھا کہ پرنس کو قید کر دیں اور اس عورت سے نہ ملنے دیں اور یہ بھی ناممکن تھا کہ ریذیڈنٹ کو

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے
طالوت
۳ حصوں میں (مکمل)
قیمت فی حصہ../۴۰ روپے | ڈاک خرچ فی حصہ../۱۷ روپے
□ پُراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے
□ طنز و مزاح پسند کرنے والوں کے لیے
□ جاسوسی کہانیوں کے پرستاروں کے لیے
ایک دلچسپ داستان جو آج تک آپ نے نہ پڑھی ہوگی!
کتابی شکل میں تیار ہے
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے منگوائیں
تینوں حصے ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف
کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اپنی بیوی سمیت ریاست سے نکلوا دیں۔ چنانچہ انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو سب سے کم خطرناک تھا۔"

شرافت علی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے کانوں نے سزائے موت کے فیصلے کی طرح سنا جس کے خلاف اپیل کی گنجائش نہ ہو۔ گیان چند محل کے اندر ہی رہتا تھا اس نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہوگا یا کسی سے کچھ سنا ہوگا تو اس نے خود جاسوسی کی ہوگی تاکہ میرے خلاف ہر الزام کو ثابت بھی کر سکے۔ ایک بار شک ہو جانے کے بعد اس کے لیے چوری چھپے میری اور پرنس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنا مشکل نہ تھا۔ ہم مطمئن تھے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں لیکن گیان چند کسی تاریک گوشے، کسی بند دریچے یا کسی جھاڑی کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چشم دید گواہ بھی پیدا کر لیے ہوں گے یا خود نواب صاحب کو دکھا دیا ہوگا کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ نواب صاحب نے مجھے طلب فرما کے پرسش کیوں نہیں کی۔ اگر ان کو تمام حالات کا علم ہو چکا تھا تو انہوں نے مجھے قصوروار کیوں نہیں سمجھا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ولی عہد بہادر کی رنگین مزاجی کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ کون باپ ہے جو بیٹے کی فطرت سے ناآشنا ہے۔ پرنس کے سابقہ کارنامے بھی ان سے پوشیدہ نہ رہے ہوں گے مگر وہ چشم پوشی پر مجبور تھے۔ ایک اس لیے کہ پرنس ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ شہزادہ تھا۔ مجھے بھی انہوں نے مجبور سمجھ کر معاف کر دیا ہوگا۔ کہنے کو میں سیکرٹری بھی تھا اور اتالیق بھی لیکن در حقیقت میں پرنس کا ملازم تھا اور اس کے حکم یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ مجھ سے پہلے کسی نے پرنس کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہوگی تو براہِ راست پرنس نے اسے برطرف کر دیا ہوگا چنانچہ نواب صاحب نے مجھے موردِ الزام اور شریکِ جرم ہونے کی سزا نہیں دی اور خود ہی معاملات کو درست کر دیا۔

"شرافت علی! تم نے بتایا نہیں کہ نواب صاحب کا اختیار کردہ سب سے کم خطرناک طریقہ کیا تھا؟" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔

"یار وزیر خان! کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟" شرافت علی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں اس کی نگاہ میں دنیا کا سب سے بڑا احمق ہوں۔ "بھئی انہوں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ انہوں نے گیان چند سے کہا کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ جیسے بھی ہو اس معاملے کو ختم کر دو اور گیان چند نے معاملہ ختم کر دیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

"کیا بک رہے ہو؟" میں نے دہشت زدہ ہو کے کہا۔ "کیا گیان چند نے ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہ عورت کون تھی جسے ہم نے گزشتہ رات دفن کیا تھا؟" شرافت علی نے ہنس کر کہا اور اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کے میری طرف پھینکا۔ "یہ تصویریں ابھی دو گھنٹے پہلے دُھل کر تیار ہوئی ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

کانپتے ہاتھوں سے میں نے تصویریں نکالیں۔ پہلی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں ریذیڈنٹ کی بیوی کی لاش اٹھائے کھڑا تھا، اور پس منظر میں وہ قبر تھی جو ایک ویران جنگل کے کسی گمنام مقام پر کھودی گئی تھی۔ پھر دوسری تصویر میرے سامنے آگئی۔ میں تین فٹ گہری قبر میں لاش کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ایک اور بم کا دھماکا ہوا جس کے بعد میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ تصویریں میرے ہاتھ سے گر گئیں اور میں نے عالمِ دیوانگی میں شرافت علی پر جست لگائی لیکن وہ تیار تھا اور اسی وقت کے انتظار میں ہونز پاتپ لیے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ہاتھ گھمایا اور مجھے یوں لگا جیسے من بھر کا پتھر شہابِ ثاقب کی طرح میرے سینے پر آ گرا ہو۔ پل بھر کے لیے میں بے دم ہو گیا مگر جنون کی کیفیت میری طاقت بن گئی اور میں پھر شرافت علی کی طرف لپکا جو اتنی دیر میں چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا اور بڑی خباثت سے ہنس رہا تھا۔ دوسری مرتبہ وہ ہونز پاتپ میری دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا اوپر لگا۔ میری دائیں ٹانگ بیکار ہو گئی اور میں نیچے گر رہا تھا کہ شرافت علی نے میری دوسری ٹانگ پر وار کیا۔ وہ مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا ورنہ میرے سر کا نشانہ لیتا یا میری گردن توڑ دیتا لیکن اس نے مجھے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جب میں گر گیا تو اس نے میرے شانوں پر ضرب لگائی اور میرے ہاتھ بھی ناکارہ ہو گئے۔

"سنو وزیر خان! ریذیڈنٹ کی بیوی کو تم نے قتل کیا ہے صرف تم نے۔" وہ میرے مفلوج جسم پر جھک کے بولا۔ "بےشک نواب صاحب نے یہ کام گیان چند کے سپرد کیا تھا مگر قاتل تم ہو اور اس کا ثبوت یہ تصویریں ہیں۔ اس میں نہ گیان چند ہے اور نہ میں ہوں۔ گیان چند نے نواب صاحب کو جو رپورٹ دی ہے اس میں بھی تمہاری فرض شناسی اور جاں نثاری کو سراہا گیا ہے کہ گیان چند نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے تم سے مشورہ کیا اور تم نے اکیلے ہی سب کچھ کر لیا کیونکہ اتالیق کی حیثیت سے تم پرنس کی بہتری چاہتے تھے لیکن کچھ کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ نواب صاحب کا اشارہ پاکے تمہارا خوف دور ہو گیا اور اب نواب صاحب کو تم سے کوئی گلا نہیں۔ وہ خوش ہیں کہ تم نے اتنا بڑا مسئلہ ختم کر دیا... مگر وزیر خان! یہ سوچو کہ پرنس نے یہ تصویریں دیکھ لیں تو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی سمجھ لو کہ ریذیڈنٹ کی نگاہ میں ابھی تک اس کی بیوی نے جرمِ بے وفائی نہیں کیا تھا۔ وہ بے وقوف اور عقل کا اندھا اپنی بیوی کو روزِ اوّل کی طرح وفادار سمجھتا تھا۔ یہی تصویریں اس نے دیکھ لیں تو کیا وہ اپنی باوفا اور شوہر سے محبت کرنے والی بیوی کے قاتل کو معاف کر دے گا؟ تم بیک وقت پرنس اور ریذیڈنٹ کے قہر و غضب کا نشانہ بنو گے تو تمہیں کون پناہ دے گا؟ نواب صاحب؟ شاید وہ اس حد تک تمہاری مدد کر دیں کہ تمہیں بہ حفاظت ریاست کی حدود سے باہر پہنچا دیں کیونکہ یہاں وہ چوبیس گھنٹے تمہارے باڈی گارڈ کے فرائض انجام نہیں دے سکتے لیکن ایک بات اور بھی ہے جس کا علم ابھی تک صرف گیان چند کو ہے یا مجھے ہے اور وہ ہے تمہارے اور پرنس کی بیوی کے مراسم کی بات... تم نے نواب صاحب کے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اگر یہ بات نواب صاحب کے علم میں لائی گئی تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا وزیر خان؟"

میری نظروں کے سامنے بار بار اندھیرا پھیل جاتا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا وجود اس تاریکی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ قصوروار میں نہیں تھا، پرنس تھا جس نے مشرقی ماحول کی پروردہ، عالی نسب اور حسن و جمال میں بے مثال بیوی کو چھوڑ کے ایک فرنگن کے عشق کا طوق گلے میں ڈالا حالانکہ وہ فرنگن اپنی دلکشی اور معیارِ حسن کے اعتبار سے پرنس کی بیوی کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ دیارِ غیر سے آنے والی یہ عورت اس کی کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ اپنے شوہر کی نہ ہوئی۔ اور یہ نہیں سوچا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور جس دن بیوی کی بے وفائی اور دوستی کا دم بھرنے والے پرنس کی دغا بازی کا علم ریذیڈنٹ کو ہوگا، اس دن عزتوں کے کتنے جنازے اٹھیں گے کیونکہ ریذیڈنٹ بہرحال ایک مرد تھا جو کتنا ہی بے غیرت کیوں نہ ہو، بیوی کے معاملے میں مکمل حاکمیت اور احساسِ ملکیت اس کی فطرت کا جزو ہیں اور اس میں رخنہ اندازی سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچے تو جوشِ انتقام میں مہذب ترین معاشرے کا فرد بھی حیوان بن جاتا ہے... اور اس نے یہ نہیں سوچا کہ وہ بیوی بھی عورت ہوتی ہے جسے شرافت اور نجابت اور ظاہری حسن کے معیار سے پرکھنے کے بعد سنگین دیواروں کے حصار میں قید کر دیا جائے جہاں اس کے جذبات اور امنگوں کی فریاد سننے والا کوئی نہ ہو اور اس سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنی خواہشات کو ان دیواروں کی آبرو پر قربان کر دے گی۔ قصوروار اس عورت کی انا تھی جسے ایک کمتر عورت نے شکست دی تھی اور اس سے وہ مرد چھین لیا تھا جس کو اس نے سب کے سامنے اپنے سر کا تاج، اپنا سہاگ اور اپنا مجازی خدا تسلیم کیا تھا۔ اس کا انتقامی ردِ عمل فطری تھا۔ اس کے شوہر نے دوسری عورت کی خاطر اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دوسرے مرد کی خاطر شوہر کو چھوڑ دیا۔ اگر وہ بزدل اور کم ہمت عورت ہوتی تو شاہی محل کی خواب گاہ کی تنہائی میں دیواروں سے سر پھوڑ کے مر جاتی... لیکن اس بے وفائی کا بدلہ بے وفائی سے لیا، اور انجام کی پروا نہیں کی۔ اپنی خواب گاہ کی قیدِ تنہائی سے فرار ہوتے ہوئے اس کو خیال تو آیا ہوگا کہ پکڑے جانے کی صورت میں خاندان کے ناموس کو خاک میں ملانے کی سزا بھی موت ہوگی مگر وہ پہلے ہی زندہ درگور تھی۔ خودکشی کر کے یا گھٹ گھٹ کر جان دینے سے اس نے یہ بہتر سمجھا ہوگا کہ اس خاندان سے وہ سب خوشیاں چھین لے جو اس کا حق ہونے کے باوجود اسے نہیں ملی تھیں اور مرنے سے پہلے اونچی حویلیوں میں رہنے والے کھوکھلی عزت کے پاسبانوں کے منہ پر وہ سیاہی مل جائے جسے وہ دنیا سے چھپا لیں تب بھی آئینے میں ان کو اپنا چہرہ سیاہ دکھائی دے۔ قصوروار وہ ریذیڈنٹ بھی تھا جس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں یا جو اتنا بے غیرت تھا کہ اپنی بیوی کو بھی طوائف سمجھتا تھا جسے حصولِ مقصد کی خاطر استعمال کیا جا سکے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قصوروار صرف دوسرے تھے۔ قصوروار میں بھی تھا۔ مجھے روزِ اوّل ہی سے نواب صاحب کو بتا دینا چاہیے تھا کہ میں شہزادے کا اتالیق تو کیا سیکرٹری بھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں بن سکتا لیکن مجھے اچھی تنخواہ اور پُرآسائش زندگی کی ہوس نے روک لیا۔ میں نتائج کی پروا کیے بغیر نواب صاحب کو بتا سکتا تھا کہ پرنس کی مصروفیات کیا رنگ لاسکتی ہیں مگر خوف نے میری زبان پکڑ لی۔ میں موقع ملتے ہی باعزت طور پر ریاست سے جا سکتا تھا مگر مجھے پرنس کی بیوی نے اسیر کرلیا اور اب عملی صورتِ حال یہ تھی کہ ہر قصور کی سزا صرف میرا مقدر ہوچکی تھی۔ سوائے میرے کوئی بھی قصوروار نہ رہا تھا اور میں ہر طرف سے محصور ہوگیا تھا۔ واپس آنے کے بعد ریذیڈنٹ اپنی بیوی کی "پُراسرار گمشدگی" پر ہنگامہ برپا کرے گا تو رپورٹ وائسرائے تک جائے گی۔ ایسی صورت میں صرف ایک تصویر مجھے تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگی۔ بشرطیکہ اس مقدمۂ قتل کی سماعت مکمل ہونے تک پرنس نے بھی مجھے زندہ چھوڑا۔ شدتِ جذبات میں اپنی محبوبۂ دلنواز کے قاتل کو معاف کرنا اس کے بس میں نہ ہوگا۔ نواب صاحب بھی مجھے بچانا ضروری نہیں سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ وزیر خان! تم نے ہمیں شروع میں ہی خبردار کردیا ہوتا تو ہم اس فتنے کا سدِباب کرلیتے اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

مجھے معلوم نہیں کہ شرافت علی کب گیا۔ کتنی دیر تک بولتا رہا اور میں کب سے زمین پر پڑا ہوں۔ جب مجھے ہوش آیا اور میں اس قابل ہوا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کے چل سکوں تو میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا جسے شرافت علی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ درمیان میں پہنچ کر میرے قدم رک گئے۔ فرش پر وہ چاروں تصویریں بکھری پڑی تھیں جو میرے جرم کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر میری ذہنی کیفیت میں ایک غیرمتوقع تبدیلی آئی۔ یکلخت اپنی مجبوری اور بےبسی کا احساس انتقام کی آرزو میں ڈھلنے لگا۔ گیان چند اور شرافت علی نے مل کر میرے خلاف ایک ایسی سازش کی تھی جو مجھے قتل کرا دینے کی کوشش کے مترادف تھی لیکن میں ان کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے شکار نہیں کرسکیں گے۔ اگر وہ مجھے بلیک میل کرنے کی سوچ رہے ہیں تو میں ان کے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے بجائے ان کو مار کے مرجانے کو ترجیح دوں گا۔ اس سے پہلے کہ مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ملے میں ان دونوں کو اپنا جرم میرے سر تھوپنے کی سزا ضرور دوں گا۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو۔ ان کے پاس نیگیٹو ہے اور وہ جتنے پرنٹ چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ بعد میں کوئی کاپی پرنس یا ریذیڈنٹ کو ملتی ہے تو مل جاتے۔ تختۂ دار پر مجھے یہ اطمینان تو حاصل ہوگا کہ مجھ سے پہلے میرے قاتل مارے گئے۔ میں نے تصویروں کو جیب میں ڈالا اور باہر نکل کے دیکھا تو خود کو عقبی حصے میں پایا۔ ایک صحیح فیصلے پر پہنچ جانے کے بعد میں کچھ پُرسکون ہوگیا تھا۔ میں نے ریذیڈنسی کے دوسرے ملازموں سے پوچھا کہ شرافت علی کہاں ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ دہلی چلا گیا ہے اور وہاں سے آگرہ جائے گا تاکہ واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرکے لاسکے۔ ریذیڈنٹ صاحب یہی حکم دے گئے تھے۔ دوسرے ملازم مجھے پہچانتے تھے چنانچہ میری خواہش پر انہوں نے مجھے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیں۔ آدھے گھنٹے تک میں ریذیڈنسی کے لان پر اکیلا بیٹھا رہا۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا اور بہت سے فیصلے کرنا چاہتا تھا لیکن میرا ذہن اس طوفانی سمندر کی طرح تھا جس میں جگہ جگہ گرداب ہوں، پتھر کی چٹانیں ہوں اور مخالف ہوا ہو جن سے لہروں کا زور ٹوٹ جاتے۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میری حالت بہتر تھی۔ گزشتہ شب سے اب تک کے واقعات کسی دہشت زدہ کر دینے والے خواب کی طرح لگتے تھے مگر وہ چار تصویریں جو میری جیب میں تھیں، مجھے مسلسل یقین دلا رہی تھیں کہ حقیقت سے کہیں مفر نہیں۔ محل میں پہنچنے کے بعد دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ گیان چند بھی نواب صاحب سے تین دن کی چھٹی لے کر چلا گیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ دونوں خوفزدہ ہو کے فرار ہوگئے ہیں۔ ان کو یقین ہوگا کہ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد میرا پہلا ردِعمل انتقامی ہوگا۔ خیر، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" میرا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے۔ اتفاق سے میرا سامنا نواب صاحب سے بھی ہوگیا اور انہوں نے اخلاقاً پوچھا کہ خیریت تو ہے۔ کئی دن سے نظر نہیں آئے اور کچھ بیمار بیمار سے لگتے ہو؟ میں نے طبیعت کی معمولی سی خرابی کا بہانہ کیا اور کہا کہ میں تو اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ پرنس کے ساتھ آگرہ ہو آتے تو طبیعت بہل جاتی اور میں شکریہ ادا کرکے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میرا جسم رات بھر جاگنے، محنت مشقت کرنے اور اس کے بعد شرافت علی کے تشدد کا نشانہ بننے سے پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا اور مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی لیکن اس ذہنی کیفیت میں نیند کا آنا محال بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ چنانچہ موقع پاکے میں پرنس کی بیوی کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ تھوڑا سا تلاش کرنے پر مجھے ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز میں سے سکون بخش گولیاں مل گئیں۔ خوراک کی مقدار کا اندازہ کیے بغیر میں نے آدھی شیشی ہتھیلی پر انڈیلی

اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پانی کے ساتھ نگل گیا۔ عین وقت پر مجھے ان تصویروں کا خیال آیا جو میری جیب میں تھیں اور میں نے انہیں تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ بیس منٹ تک میں بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ سفید بےداغ چھت سینما کا اسکرین بن گئی اور اس پر گزشتہ شب کے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ پھر دوا کا اثر شروع ہوا اور میرا تصور بھٹکنے لگا۔ باری باری میں نے وہ سب مناظر دیکھے جو خوف بن کر لاشعور کی گہرائی میں نقش ہوگئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر دستِ جلاد کی ایک جنبش کا منتظر دیکھا جس کے بعد میرے جسم کو موت کے اندھے کنویں میں غائب ہوجانا تھا۔ پھر میں نے پرنس کو دیکھا جس کی آنکھوں سے مجنوں کی طرح وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ چلّا رہا تھا۔ "مارِ آستین! تو نے میری محبت کو ڈس لیا۔" اور اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جو وہ میری لاش پر برسا رہا تھا۔ میں نے ریذیڈنٹ کو دیکھا جو ریوالور سے میرے سر کا نشانہ لیے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یو ڈرٹی بلیک مین! وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھا جس کو تم مرڈر کیا۔ وہ ہمارا وائف تھا اور ہم رائل فیملی کا ممبر ہے۔" آخری منظر میں جو بہت دھندلا پڑگیا تھا، میں نے نواب صاحب کو ہاتھ باندھے اداس اور متفکر مگر پورے جاہ و جلال اور وقار کے ساتھ دو لاشوں کے پاس ٹہلتے دیکھا۔ ان میں سے ایک لاش میری تھی اور دوسری پرنس کی بیوی اور نواب صاحب کی بہو کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "افسوس کہ ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اب ان دو سیاہ بختوں کی لاش کے ٹکڑے شکارگاہ میں بکھیر دو تاکہ کل تک ہماری خاندانی عزت سے کھیلنے والوں کی ناپاک ہڈیاں بھی کتے اور بھیڑیے کھا جائیں۔" جیسے جیسے سکون بخش گولیوں کا اثر بڑھتا گیا، تصورات کی پرچھائیاں زیادہ بےربط ہونے لگیں اور نیند غالب آنے لگی جو درحقیقت ہوش سے بیگانگی تھی۔ تاہم ذہنی انتشار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ سکون دینے والی دواؤں کا اثر بھی عارضی ثابت ہوا اور رات کے کسی پہر میں بھیانک خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ اتنی زیادہ مقدار کے باوجود لاشعور پر دواؤں کی گرفت کمزور پڑگئی تھی۔ پھر نیم بیداری کے عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پرنس کی بیوی مجھے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ میرے گالوں پر طمانچے مارے۔ یہاں تک کہ میں آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوگیا اور اس کا دھندلایا ہوا چہرہ مجھے صاف نظر آنے لگا۔

"وزیر خان! دیکھو میری طرف۔" اس نے مجھے پانی کے چھینٹے مارنے شروع کیے۔ "دیکھو میں کون ہوں۔ پہچانتے ہو نا مجھے؟"

میں نے سر کو آہستہ سے اقرار میں ہلایا۔ "تم... پرنس اینہ ہو۔" میں نے آنکھیں بند کرکے بڑبڑانا شروع کیا۔ "اور میں وزیر خان... مجھے سب یاد ہے... ہم اس دنیا میں ملے تھے جہاں تمہارا عیاش اور بےوفا شوہر تھا... اور وہ بدمعاش... گیان چند تھا... اور اس کا ساتھی شرافت علی تھا... ان دونوں نے... ہم دونوں کی جان لی تھی۔ وہ قاتل ہیں... مگر وہ زندہ ہیں اور ہم مرچکے ہیں..."

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو وزیر خان!" وہ میرے شانے کو ہلا کے بولی۔ "دیکھو، یہ وہی دنیا ہے اور ہم دونوں زندہ ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اسے غور سے دیکھا۔ "ہم دونوں زندہ ہیں؟ کیوں زندہ ہیں؟"

"اچھا دیکھو اب سونا نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے گرم چائے لاتی ہوں۔" وہ بولی۔ "میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ اٹھ کر بیٹھو، شاباش۔"

اس نے تھرماس میں سے بغیر دودھ اور چینی کی چائے کے دو مگ زبردستی میرے حلق سے اتار دیے تو میں پوری طرح ہوش میں آگیا۔

"یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ مجھے تکیوں کے سہارے بٹھا کے بولی۔ "اگر وہ گولیاں زیادہ طاقت کی ہوتیں؟"

"تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے تمہاری گولیاں کھالی ہیں؟" میں نے کہا۔ میرا سر اب بھی بھاری تھا لیکن تلخ چائے نے تریاق کا کام کیا تھا۔

"تم جلدی میں دراز کھلا چھوڑ آئے تھے۔" وہ بولی۔ "اور شیشی بھی اوپر رکھی تھی چنانچہ میں نے فوراً دیکھ لی ورنہ مجھے رات کے وقت معلوم ہوتا۔"

"اور اس وقت تک میں واقعی عالمِ ارواح میں ہوتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔

"اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "تم پوری شیشی کھا لیتے تو زیادہ سے زیادہ بےہوش ہوجاتے لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کل رات تم کہاں تھے اور واپس آکے خودکشی کی یہ کوشش کرنے کا مقصد کیا تھا؟" اب تک اس کا رویہ ہمدردانہ اور حوصلہ افزا تھا مگر یکلخت وہ برہم ہوگئی۔

میں بہت دیر تک شش و پنج میں رہا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ تمام واقعات بتا دینے سے مصلحت کے تقاضے تو نظرانداز نہیں ہوں گے۔ بیشک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ابھی تک اس نے بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا اور اکیلے ہی میری حالت سنبھالنے میں کامیاب رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ حقائق سے آگاہی کے بعد اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

"کیا بات ہے وزیرخان؟" وہ مجروح لہجے میں بولی۔ "کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟ کسی کا ڈر ہے تمہیں؟ یا مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں؟ تمہاری صورت سے لگتا ہے کہ تم برسوں کے بیمار ہو۔ تمہاری آنکھوں میں دہشت زدہ کر دینے والی ویرانی نظر آتی ہے تو تمہارے ماتھے پہ احساسِ جرم و ندامت کی تحریر۔ ایسا کیوں ہے وزیرخان؟ کیا یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟ بولو۔ کچھ تو کہو۔" وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "کیا دنیا میں کوئی میرا نہیں ہوگا۔ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے میں نے تمہیں اپنایا تھا اور تم بھی مجھے اس بےدرد دنیا کے حوالے کرکے جانا چاہتے ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے بعد خود اپنی نظریں گر کے جینا میرے لیے ناممکن ہوگا۔"

میں اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ ہر قطرۂ اشک تیزاب کی طرح تھا جو میرے سینے پر فکر و غم کی بھاری چٹان کو کاٹ رہا تھا اور میرا بوجھ کم کر رہا تھا۔ ایک شاہی خاندان کی پروردہ، ایک والیِ ریاست کے اکلوتے بیٹے کی بیوی۔ دولت اور اختیارات کی مالک پرنس امینہ صرف ایک عورت رہ گئی تھی۔ ایک ایسی عورت جس کا دامن خوشیوں سے خالی تھا اور وہ جھولی پھیلائے مجھ سے پیار مانگ رہی تھی۔ اعتماد کی بھیک چاہتی تھی اور تحفظ کی طلب گار تھی۔ اس کے بدلے وہ مجھے بھی پیار، اعتماد اور تحفظ دے سکتی تھی چنانچہ میں نے اس کو سب کچھ بتلا دیا۔ پرنس کی عیاشی کی روداد سے لے کر اپنی ذات پر آنے والے ہر الزام تک اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں نے اعتراف کیا کہ میں نے اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے پرنس کی زندگی سنوارنے کی بجائے اور بگاڑ دی اور اس طرح نواب صاحب کے اعتماد کو بھی دھوکا دیا اور پھر پرنس کے اعتماد کو بھی... اور انجامِ کار نوبت یہاں تک آ گئی کہ اب مجھے جینے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ گیان چند اور شرافت علی جیسے شیطان مجھے ہر طرح سے بلیک میل کر سکتے ہیں اور ان کی بات نہ ماننے سے میری ہی نہیں امینہ کی عزت اور زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اُس نے میری بات بڑی توجہ سے سنی لیکن پریشان بالکل نہیں ہوئی۔ "جہاں تک میرے سرتاج ولی عہد بہادر کا تعلق ہے۔" اس نے میری بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ "اُن کے اخلاق و کردار کو تم نے نہیں بگاڑا۔ تم سے پہلے بھی کئی اتالیق اس جرم میں بڑی ذلت کے ساتھ رخصت کیے جا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے سچ مچ اتالیق بن کے شہزادے کی اصلاح کو اپنا فرض سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ یہاں شرافت کے معیار مختلف ہیں۔ جسے تم عیش پرستی کہتے ہو وہ نوابی شان ہے۔ جو کچھ کل رات ہوا اس میں تمہاری نیت کو یا ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اب رہا سوال اس اونچے خاندان کی جھوٹی آبرو کے بھرم کا تو تم سے پہلے میں نے اس کو خاک میں ملایا تھا۔ پہل تم نے نہیں کی تھی۔ اپنی زندگی کو خود میں نے داؤ پر لگایا تھا۔ تم نے میرے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کیا۔ میں تو تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں مرنے سے نہیں ڈرتی لیکن جینا ضرور چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے بھی کم حوصلہ ہو؟ کیا تم شرافت علی اور گیان چند جیسے لوگوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

میں حیرانی سے اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے وزیرخان!" وہ تذبذب اور فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ "کہ ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"ہمیں؟ کہاں؟ میرا مطلب ہے کیا تم بھی؟"

"ہاں۔" وہ میری بے ربط بات کے جواب میں سکون سے بولی۔ "مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی جانا ہوگا کیونکہ تم میرے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ اگر تم مجھے اکیلا چھوڑ کے جاؤ گے تو خود ہی واپس آنے پر مجبور ہو جاؤ گے مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی اور تمہیں مجھ سے ملنے کے لیے میری قبر پر آنا پڑے گا۔ میری مرگِ ناگہاں کی کہانی سب کی زبان پر ایک ہی ہوگی کہ کس طرح ایک رات اچانک میں علیل ہوئی اور اس سے پہلے کہ طبیب یا ڈاکٹر پہنچتے میں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ کسی زبان سے تم رسوائی کی کوئی بات نہ سنو گے۔"

"لیکن... امینہ... اس طرح بھاگ کے ہم کہاں جا سکتے ہیں؟" میں نے فکرمند ہو کے پوچھا۔ امینہ کی بات نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس تشویش میں ایک سنسنی خیز مسرت کا احساس بھی شامل تھا۔ امینہ نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جو میں نے تصور میں بھی نہ سوچی تھی مگر اب مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ میرے دل کی آواز تھی اور چاہتا میں بھی یہی تھا مگر اس کا اعتراف یا اظہار کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔

"کیا اتنی بڑی دنیا میں ہم کہیں نہیں جا سکتے؟" وہ بولی۔ "اور عشق کیا ہے تو انجام کی فکر کیسی؟ یہاں سے نہ جا کے ہم دشمنوں کو موقع فراہم کریں گے کہ وہ جس طرح چاہیں ہمیں ذلیل و خوار کریں اور سر پر لٹکتی ہوئی خوف کی تلوار کے سائے میں مر مر کے جئیں۔ ہم نکل گئے تو اپنی بے بسی پر ماتم کے سوا وہ کیا کریں گے؟ شکست انہیں ہوگی، ہمیں نہیں۔ اور اس کے بعد اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے وہ ہماری تلاش میں خوار ہوں گے مگر سوچو وزیرخان کہ وہ ہمیں ڈھونڈنے نکلیں گے بھی تو کدھر جائیں گے؟ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔ شمال میں یا جنوب میں۔ بالفرض محال وہ ہمیں پکڑ کر لانے میں کامیاب ہو گئے تب بھی کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہمیں قتل کرا دیں گے نا۔ یہ اطمینان پھر بھی ہمارا ہوگا کہ ہم نے جرمِ الفت کی سزا قبول کی مگر بلیک میل ہونا منظور نہیں کیا۔"

شہزادہ خورشید عالم کی بیوی پرنسس امینہ مجبور اور مظلوم ضرور تھی لیکن وہ انتہائی ذہین اور باہمت عورت بھی تھی۔ اس کی باتوں نے مجھے قائل بھی کیا اور شرمندہ بھی۔ اور اسی شرمندگی نے میرے اندر سوئے ہوئے مرد کو جگا دیا۔ اسی روز میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا۔ امینہ نے صرف وہ زیورات لیے جو اس کو باپ کے گھر سے جہیز میں ملے تھے اور ہم اسی رات وہی کپڑے پہن کر محل سے نکل کھڑے ہوئے جو ہمارے تن پر تھے۔ یہ کپڑے بھی معمولی اور میلے تھے اور ہمارا سرمایہ ایک پوٹلی میں بندھا ہوا تھا۔ اس پوٹلی کو میں نے کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی سے باندھ کر لٹکا لیا تھا اگر کوئی ہمیں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ہم دیہاتی یا معمولی حیثیت کے غریب لوگ ہیں اور اس پوٹلی میں بھی مکئی کی روٹی اور ساگ کے سوا کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہم نے چھپ کے سفر کیا اور سلطان آباد کی شاہراہ سے خاصے فاصلے پر گھنے جنگل میں چلتے رہے۔ رات بھر کا یہ سفر انتہائی مشکل، خطرناک اور ہمارے حوصلے کی آزمائش تھا۔ ہم راستے سے بھٹک جاتے تھے۔ ہمارا دامن کانٹوں میں الجھ جاتا تھا جس سے ہمارے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں پڑ جاتی تھیں۔ ناہموار اور پرُخار اندھیرے راستوں پر ہم نے کئی بار ٹھوکر کھائی مگر ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کیا اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ سلطان آباد کا یہ گھنا جنگل ایک شکارگاہ ہے جس میں تیتر، بٹیر یا خرگوش، ہرن جیسے بےضرر جانوروں کے علاوہ بھوکے بھیڑیے بھی گھومتے ہیں۔ بھوک میں تو گیدڑ بھی بھیڑیے کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اس جنگل میں سانپوں کی بہتات ہے مگر اس وقت ہمیں کسی کا خوف نہیں تھا اور ہم منزل کی لگن میں بڑھتے جا رہے تھے۔ ظلم و ستم، جبر و استیصال، عیش پرستی اور بے راہ روی اور مکر و فریب کی سازش کے جال سے نکل کر دنیا کے کسی گمنام گوشے میں ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے چلتے جا رہے تھے اور ایک بھیانک ماضی کی یادوں سے نجات کی خاطر خوبصورت مستقبل کے خوابوں کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس رات ہم نے کتنی مسافت طے کی مگر صبح کا اجالا افق پر نمودار ہوا تو ہم اس جہنم سے فرار کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ سورج نکلنے کے بعد میں نے دیکھا تو مجھے امینہ کے نازک ہاتھوں اور اس کے چہرے کی مخمل جیسی جلد پر اَن گنت سرخ لکیریں نظر آئیں جو کانٹوں کی زبان میں لکھی ہوئی اقرارِ محبت کی انمول تحریر تھی۔ اس نے بڑی استقامت کے ساتھ یہ سفر طے کیا تھا اور اتنی بڑی سختی صرف اس لیے جھیلی تھی کہ وہ خوشی مل جائے جو اسے محل میں رہ کر نہیں ملی تھی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا کہ میں اسے ہر خوشی دے سکتا ہوں جو خریدی نہیں جا سکتی اور اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔

سلطان آباد کی آخری حدود کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ تھا مگر اس سے پہلے ایک ندی تھی جس کو صرف پُل پر سے عبور کیا جا سکتا تھا اور یہ بہت خطرناک کام تھا۔ اگر نواب صاحب کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں ان کی خاندانی عزت کا جنازہ نکال کے محل سے نکل گیا ہوں تو ان کے کارندے ہر طرف دوڑ پڑے ہوں گے اور ریاست سے باہر جانے والے تمام راستے بند کر دیے جائیں گے۔ شرافت علی اور گیان چند کو معلوم ہوگا کہ میں نے ان کے شیطانی عزائم کو خاک میں ملا دیا ہے تو وہ انتقامی کارروائی کرتے ہوئے نواب صاحب کو جھوٹ سچ سب بتا دیں گے۔ اس کے بعد اگر فوری طور پر نواب صاحب نے خودکشی نہ کی تو گیان چند معاملہ فہم ہونے کا ثبوت دے گا اور نواب صاحب کو سمجھا دے گا کہ وہ فکر نہ کریں۔ محل کی بات محل کی دیواروں سے باہر نہیں جائے گی۔ ان کی بہو پر کوئی حرف نہیں آئے گا اور اصل ملزم کو یعنی مجھے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ نواب صاحب کی بہو کے بارے میں کون جان سکتا ہے کہ وہ محل میں موجود نہیں۔ پردہ دار عورت کا پردہ سلامت رہے گا۔ میرے بارے میں مشہور کر دیا جائے گا کہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں بہت سا مال و زر سمیٹ کر فرار ہو گیا ہوں اور میرے جیسے نمک حرام، احسان فراموش اور بے ضمیر آدمی کو قتل کر دینا کوئی جرم نہیں چنانچہ مجھے زندہ یا مردہ حالت میں نواب صاحب کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ رہا ہو بیگم کا مسئلہ تو مہینے بھر بعد ان کی علالت کا اور اچانک موت کا ڈرامہ بھی کیا جا سکتا ہے اور باعزت طور پر سب کے سامنے ایک لاش دفن بھی کی جا سکتی ہے لیکن حکم نواب صاحب کا یہی ہوگا کہ وہ دونوں جہاں بھی نظر آئیں ان کو وہیں مار کے گاڑ دیا جائے۔ نواب صاحب کو پہلے ہی گیان چند پر بہت اعتماد ہے اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو اس کی قدر و منزلت پہلے سے بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اگر ابھی کچھ نہ ہوا تو پرنس اور ریذیڈنٹ کی واپسی پر ضرور ہوگا۔

میں نے امینہ کے ساتھ دریا کو کس طرح تیر کر پار کیا یہ ایسی کہانی ہے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ آج مجھے یہ کارنامہ ناممکن نظر آتا ہے مگر اس وقت جذبۂ عشق نے مجھے ناممکن کو ممکن بنا دینے کا حوصلہ عطا کر دیا تھا۔ رات بھر کے سفر کی تھکن سے چور اور خستہ جان ہونے کے باوجود میں نے امینہ کے ساتھ دریا پار کر لیا اور ہم ایک چھوٹے سے پہاڑی غار میں پناہ گزیں ہو گئے جہاں سے پل کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ امینہ عورت تھی اور شہزادی تھی جس نے قالین اور سرسبز گھاس کے سوا کبھی سخت زمین پر پیدل سفر نہیں کیا تھا چنانچہ اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اسے آرام سے لٹا کر اور تسلی دے کر میں نے پہاڑ کی سرحد کو عبور کیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں اور ایک ایسا شخص بھی مل گیا جس نے پچاس روپے لے کر مجھے اپنا ایک پرانا جوڑا بخش دیا اور امینہ کے لیے چوری چھپے بیوی کے کپڑوں میں سے بھی ایک جوڑا نکال لایا۔ ان کپڑوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ بھنگی نظر آنے والا دیہاتی اور اس کی بیوی خود بھی یہ کپڑے استعمال نہیں کرتے ہوں گے مگر اس نے میری مدد کر کے ثواب بھی کما لیا اور پیسہ بھی۔ میں یہ چیزیں لے کر واپس غار میں پہنچا تو امینہ بے ہوش پڑی تھی۔ اِدھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں جمع کر کے میں نے آگ جلائی اور دودھ گرم کیا۔ امینہ کے زخم صاف کیے اور مجبوراً خود ہی اس کے کپڑے بھی بدلے۔ پھر میں نے گرم دودھ بھی پیا اور زبردستی اس کے حلق سے بھی اتارا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ہوش میں آئی، اُس وقت تک میں بھی لباس تبدیل کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے جو کچھ کھایا جا سکا کھایا اور بے سدھ ہو کے پڑ گئے۔ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ شام ہو چکی ہے۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ تھکن اور کمزوری کے اثرات زائل ہو چکے تھے اور میں اس قابل تھا کہ رات کو پھر سفر جاری رکھ سکوں۔ امینہ بدستور فرشِ خاک پر گہری نیند میں تھی۔ اس کے اور اپنے کپڑوں کو اور فقیرانہ حلیے کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پھر ایک دکھ کا احساس غالب آ گیا۔ یہ محلوں کی رہنے والی عورت تھی جو سرسراتے ریشم کے گل رنگ ملبوس پہنتی تھی۔ خوشبو اور لطافت کا پیکر تھی۔ شاہانہ خواب گاہ میں بالوں سے زیادہ ملائم گدوں کی آغوش میں سوتی تھی مگر وہ اس وقت اتنے سکون سے کھردری ناہموار اور پتھریلی زمین پر سو رہی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ یہ بالکل الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح لگتا تھا کہ گڈریا بادشاہ کی بیٹی پر فریفتہ ہو گیا اور شہزادی کو ایک جن کی قید سے نکال لایا اور پھر شہزادی نے گڈریے سے شادی کر لی۔ ایسی محبت میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اس محبت پر غرور کی خوشی کے سوا میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ نہ خوف کا، نہ پشیمانی کا، نہ بارِ گناہ کا۔ میں غار کے دہانے پر آ کھڑا ہوا اور دریا کے پار سلطان آباد کی طرف دیکھنے لگا۔ سورج میرے پیچھے پہاڑ کی بلندی میں غروب ہو چکا تھا لیکن سامنے اب بھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے سڑک پر ریاستی نشان والی گاڑی دیکھی۔ گاڑی پل پر پہنچ کے رک گئی اور اس میں سے چار آدمی اترے۔ ان میں سے دو مسلح محافظ تھے جن کی رائفلیں کندھے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ شرافت علی اور گیان چند تھے جن کو میں نے صاف شناخت کر لیا۔ انہوں نے پُل کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے محافظوں سے بات کی جن کو ابھی تک میں نہ دیکھ سکا تھا۔ شرافت علی نے پُل کے دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا اور شاید یہ پوچھا کہ کسی نے دریا کو پار تو نہیں کیا کیونکہ جواب میں سنتری نے گردن ہلا کر کسی بات کی تردید کی تھی۔ شرافت علی اس کے باوجود بہتے دریا کے پانی اور دریا کے پاٹ کو دیکھتا رہا۔ ایک بار اس کی نگاہ پہاڑی سلسلے پر بھی گئی اور ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ بے شک میں گہرے سائے میں اور چٹان کے پیچھے تھا مگر اسی وقت امینہ اٹھ کے باہر آ جاتی یا شرافت علی دوسرے کنارے سے غار تک پہنچنے کا فیصلہ کر لیتا تو ہم پکڑے جاتے۔ میرا خیال ہے کہ دریا کی تیز رفتاری اور چوڑائی کو دیکھنے کے بعد وہ خود بھی قائل ہو گیا کہ ہم پل پر سے نہیں گزرے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ اس مقام سے دریا کو عبور کر گئے ہوں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم ابھی تک جنگل میں ہی بھٹک رہے ہیں اور اگر ہم نے تیر کر دریا کو پار کیا ہوگا تو پل کے اتنے قریب سے نہیں کیا ہوگا۔ چنانچہ وہ جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی چلا گیا۔ میں نے دریا پار کرنے کی جس دیوانہ وار ہمت کا

مظاہرہ کیا تھا اسی نے ہمیں بچایا اور مجھے محبت کی اس طاقت پر اعتبار آیا جس کی مدد سے فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر قصرِ شیریں تک دودھ کی نہر نکال دی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب رات نے اپنا دامن پھیلایا تو میں نے اور امینہ نے "ڈنر" کیا۔ جو کھانے پینے کی بچی ہوئی چیزوں پر مشتمل تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت ہنسے۔ ہمیں شرافت علی اور گیان چند کے ناکام لوٹ جانے کی بات پر بھی ہنسی آئی۔ اصل بات یہ تھی کہ ہم بہت خوش تھے اور اس وقت کوئی ہمیں گرفتار کرنے بھی آ جاتا یا ہمارے سامنے شیر آ کھڑا ہوتا تب بھی ہم اسی طرح ہنستے رہتے اور ہنستے ہنستے ہی مر بھی جاتے۔ اس رات ہمارا سفر زیادہ دشوار نہیں رہا۔ ہم اس بستی سے نہیں گزرے جہاں سے میں نے کھانے پینے کی چیزیں لی تھیں اور کپڑے خریدے تھے۔ کپڑے دینے والا ایسا لالچی آدمی تھا کہ مزید پچاس روپے ملتے تو وہ میرا مکمل حلیہ بیان کر دیتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ میں پہاڑوں کی طرف چلا گیا ہوں۔ آدھی رات کے بعد ہم دوسری بستی میں پہنچے اور ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ ہم میاں بیوی اپنی بیل گاڑی میں آ رہے تھے کہ راستے میں بدمعاشوں نے ہماری بیل گاڑی چھین کر ہمیں پیدل کر دیا۔ جس دروازے پر ہم نے دستک دی تھی وہ ایک مسلمان جولاہے کا گھر تھا۔ اس نے ہمیں اپنے چھوٹے سے گھر میں پناہ دی اور سونے کی جگہ فراہم کی۔ اگلے روز ہم اس گاؤں سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک سلطان آباد کے بارے میں بہت سی سنسنی خیز خبریں اور افواہیں پھیل چکی تھیں۔ کچھ لوگ بتاتے تھے کہ نواب صاحب نے خودکشی کر لی، کچھ کہتے تھے کہ نواب صاحب نے انگریز حاکم کی بیوی کو اغوا کر لیا تھا اور انگریز نے دونوں کو گولی مار دی۔ مشہور یہ بھی تھا کہ بیٹے نے ریاست پر حکومت کی خاطر باپ کو قتل کر دیا اور موت کو خودکشی قرار دے دیا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ حقیقت بہرحال یہ تھی کہ نواب صاحب اپنی آن پر قربان ہو گئے تھے۔ یا انہوں نے بدبخت بیٹے کے گناہوں کا کفارہ اپنی جان دے کر ادا کر دیا تھا۔ بعد میں پرنس اور ریذیڈنٹ کے درمیان ایک زبردست جنگ چھڑ گئی، جس کی بنیاد ذاتی رقابت اور دشمنی کے جذبات پر مبنی تھی، جس کے نتیجہ میں ریذیڈنٹ کو تبدیل کر دیا گیا تھا۔ چونکہ وہ حاکموں کے طبقے کا آدمی تھا اور واقعی اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ اس لیے وہ مسلسل ترقی کرتا رہا اور کسی صوبہ کا لیفٹیننٹ گورنر بھی بن گیا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔ اس جھگڑے میں شرافت علی اور گیان چند کو بھی جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔ شرافت علی میرٹھ پہنچا اور گیان چند لاہور۔ میں امینہ کے ساتھ دس سال تک مختلف مقامات پر پھرتا رہا۔ تین سال ہم نے جنوبی ہندوستان میں گزارے اور مدراس کے قریب رہے۔ وہاں سے آسام گئے اور دو سال بعد پنجاب کے شہر امرتسر آ گئے۔ میرا اپنا گھر میرٹھ میں ہی تھا جہاں میرے والدین میری طرف سے سخت پریشان تھے کہ آخر میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ چھپ چھپا کر بھی میرٹھ نہیں پہنچ سکتا لیکن جب تک شرافت علی میرٹھ میں تھا، میرے وہاں جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو نہ کبھی اپنا پتہ دیا تھا اور نہ امینہ کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ ڈرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خط غلط ہاتھوں میں پڑ جاتا تو میرے خلاف میرے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی اعترافِ جرم کی تحریر بن جاتا یا خود میرے گھر والوں کی زبان سے نادانستگی میں کوئی بات نکل جاتی تو میرا راز افشا ہو جاتا لیکن خوف کی دوسری وجہ زیادہ اہم ہے۔ دس سال میں ہمارے پانچ بچے ہو چکے تھے لیکن ہمارا نکاح نہیں ہوا تھا۔ مذہب اور قانون کی رو سے امینہ ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا شوہر نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک ہم مجرم تھے اور گنہگار تھے لیکن ہم مجبور تھے اور دنیا کے بعد آخرت میں اپنے لیے ہر سزا قبول کر چکے تھے۔ میرے ساتھ محل کی زندگی کو لات مار کے خانہ بدوشی اختیار کرتے وقت امینہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ بچہ میرا نہیں، شہزادہ خورشید عالم کا تھا جو ایک ریاست کا حاکم تھا اور بہت طاقت ور شخص تھا۔ اس بچے کا نام میں نے کبیر خان اور اس کی ماں نے سکندر بخت رکھا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر امینہ نے اپنا نام بدل کر سلطانہ رکھ لیا تھا اور میں نے سلطان۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خدانخواستہ کبھی پرنس سے نواب خورشید عالم بن جانے والے امینہ کے شوہر کو ہماری خبر مل جائے تو وہ حقوقِ زوجیت یا کبیر پر حقوقِ ولدیت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ تقسیم کے بعد ریاستیں ختم ہو گئیں اور سابق حکمرانوں کا گزارا سرکاری وظائف پہ ہوتا تھا لیکن اس سے پہلے بھی برطانوی حکومت کا قانون غالب تھا اور ریاست کی حدود سے باہر نواب خورشید عالم ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہم ڈرتے رہے اور کہیں بھی جم کر نہیں رہ سکے۔ ہر جگہ ہمیں یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ نواب کے کسی حواری نے یا ریاست کے کسی باشندے نے ہمیں دیکھ لیا تو خبر آگے پہنچ جائے گی چنانچہ ہم اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے اور حسبِ ضرورت نام بھی۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں ثواب و عذاب کے فلسفے کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کہتا کہ ہم گنہگار نہ تھے اور یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارا جرم قابلِ معافی ہے لیکن میں نے سزا و جزا کا فیصلہ داورِ محشر پر چھوڑ دیا تھا جو نیتوں کا حال جانتا ہے اور ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا۔ عفو و درگذر ... ہے اور بہت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے ہمیشہ بڑے عجز کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکایا اور اپنی غلطی پر صدقِ دل سے معافی مانگی۔ دنیا میں انسانوں پر بہت کچھ حرام کیا گیا ہے لیکن مخصوص حالات میں جہاں زندگی اور موت کا سوال ہو اور جان بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، وہاں حرام کو بھی حلال کر دیا گیا ہے چنانچہ دنیا جو چاہے کہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بچائی تھی اور ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی گزاری تھی۔ آخرت میں ہمارے لیے کوئی سزا تھی تو ہم اس کے لیے راضی برضا تھے... اُس مجرم کی طرح جس نے ایک جائز مقصد کی خاطر ہنسی خوشی سزائے دار و رسن قبول کی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ سلطانہ کی اور ہمارے تمام بچوں کی موت ہمارے گناہوں کی سزا تھی اور سکندر اس لیے بچ گیا کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد تھا۔ منطقی اعتبار سے لوگوں کی بات غلط نہیں معلوم ہوتی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا۔ قدرت کے نظامِ انصاف کو سمجھنے کا دعویٰ فانی انسان کیسے کر سکتا ہے۔ اس دورِ جنوں خیز میں تو لاکھوں مارے گئے تھے۔ ان میں معصوم شیرخوار بچے بھی تھے جو گناہ کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے اور جن کی پاک دامنی کی قسم فرشتے بھی کھا سکتے تھے۔

قصہ مختصر... کئی سال تک در بدر پھرنے کے بعد ایک وقت ایسا آیا جب ہم نے محسوس کیا کہ وہ پُرخطر اور پُرآشوب زمانہ ختم ہو چکا ہے جو ہم نے جلا وطنی میں گزار دیا۔ شاید نواب خورشید عالم کو یاد بھی نہ ہوگا کہ پرنسس امینہ کو باعزت طور پر "دفن" کرتے وقت انھوں نے اپنے حلقۂ احباب اور اپنی رعایا کو اس کی المناک موت کی کیا کہانی سنائی ہوگی اور ان کا حرم حسبِ سابق اسی طرح آباد رہا ہوگا اور انتقام کے جذبات شراب و شباب کی مستی میں دم توڑ چکے ہوں گے۔ انگریز ریذیڈنٹ شاید وطن واپس لوٹ گیا ہوگا یا ہندوستان میں ہوا تو نہ جانے کہاں اور کس عہدے پر ہوگا۔ یہ ناممکن ہے کہ ابھی تک وہ اپنی بیوی کے مبینہ قاتل کی تلاش میں روزِ اوّل کی طرح سرگرداں ہو۔ وقت بہت بڑا چارہ گر ہے اور گہرے سے گہرے زخم کو اپنی مسیحائی سے مندمل کر دیتا ہے۔ جذبات کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑا سانحہ ایک بھولی بسری یاد بن کے ماضی کے صحرا کی گرد میں دفن ہو جاتا ہے۔

گیان چند کا تو مجھے علم ہی نہ تھا لیکن شرافت علی کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرٹھ میں ہے اور وہاں کوئی بزنس کر رہا ہے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ شرافت علی بھی پرانی باتیں بھلا چکا ہوگا۔ شاید وہ اپنے کیے پر شرمسار بھی ہو اور اب مجھے کوئی بھی نقصان پہنچانا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ آخری وقت تک وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مجھے یاد کرتے رہے اور ایک ایک سے التجا کرتے رہے کہ کسی طرح میرے وزیر خان کو بلا لاؤ۔ اس سے کہو کہ آخری بار مجھے اپنی صورت تو دکھا جائے لیکن کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے قانون کی گرفت میں آنے کا ڈر نہیں تھا۔ بھیس بدل کے یا رات کے اندھیرے میں چوری چھپے میرٹھ ہو آنا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر میں اپنے گھر والوں کو اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ میں ایک غیر مرد کی شادی شدہ بیوی کو اس کے گھر سے نکال لایا ہوں اور میں نے اس سے نکاح بھی نہیں کیا ہے لیکن میں پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ میں اپنے باپ کو اور اس کی فطرت کو سمجھتا تھا اور اپنی ماں کو بھی جانتا تھا۔ وہ حالات کا عذر کبھی قبول نہ کرتے اور مجھے کبھی معاف نہ کرتے۔ میری وجہ سے وہ خود اپنی نظر میں گر جاتے اور یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ میں اپنے بہنوں اور بھائیوں کو کیسے منہ دکھاتا؟ اور خدانخواستہ شرافت علی پرانی تصویریں لے کر پرانے واقعات سنانے آ جاتا تو میرے گھر کی عزت خاک میں مل جاتی۔

والد کے انتقال نے مجھے اپنا بن باس ختم کر کے گھر لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ مرنے سے پہلے وہ میری سب بہنوں کی رخصتی کر چکے تھے اور میرا واحد بھائی جو فوج میں تھا، برما کے محاذ سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ گھر میں صرف میری ماں رہ گئی تھی۔ اگرچہ میرے تمام خطوط یکطرفہ ہوتے تھے لیکن سال چھ مہینے میں مجھ کو کسی نہ کسی ذریعے سے گھر کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو میری ماں روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے بہت مارا اور بہت کوسا کہ نامراد، بےغیرت... اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی اور کچھ دن کے بعد میری قبر پر آ جاتا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے اور رو دھو کے اپنی مجبوریوں کی ایک جھوٹی کہانی سنائی۔ وہ ماں تھی، مجھے معاف کر کے گلے سے کیوں نہ لگاتی جبکہ قدرت نے اچانک اسے ایک جوان بیٹا لوٹا دیا تھا۔ اس

... سلیقہ مند اور خدمت گزار ہو اور اس کے بچوں کے وجود ... مالا مال کر دیا تھا۔ وہ اکیلی نہیں رہی تھی۔ بہت جلد وہ ... کچھ بھول گئی۔ سلطانہ نے یعنی امینہ نے گھر کو سنبھال لیا ... میں نے باپ کے کاروبار کو۔ سلطانہ کے بارے میں اپنی ... میں نے کوئی بات سچ نہیں بتائی اور صرف یہ کہا کہ اپنی ... کے پٹھانوں کی لڑکی ہے اور ماں باپ بہت عزت دار ... تھے لیکن ان کا انتقال ہو جانے کے بعد اب دنیا میں ... کا کوئی نہیں ہے۔ ایسی باتوں کا مقصد ایک طرف تو ... ماں کو مطمئن کرنا تھا اور دوسری طرف بہو کی حیثیت سے ... میں سلطانہ کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا تھا۔ میری ... بہن انڈین آرمی کے کسی میجر سے بیاہی گئی تھی جو آخری ... اطلاعات کے مطابق ڈیرہ دون کی ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر ... دوسری بہن شادی کر کے سنگاپور چلی گئی تھی۔ ایسے میں سلطانہ کا اور میرا گھر پہنچنا بہت مبارک ثابت ہوا اور اس ویران گھر کی رونق اور خوشی لوٹ آئی۔ لیکن یہ خوشی بہت ... ثابت ہوئی۔ دو مہینے بعد جب میں کاروبار بھی سنبھال چکا تھا، میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے آنے ... میں میر شرافت علی بھی تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی ... کا اظہار نہیں کیا۔ یوں جیسے وہ پہلے سے میری موجودگی ... باخبر تھا۔ اس نے بڑی شرافت سے بات کی اور دوسرے ... کی طرح دم دلاسہ دینے کا اخلاقی فرض پورا کر کے چلا ... میں نے اس کو سوئم اور چہلم پر بھی دیکھا۔ بعد میں اس ... جانتے بوجھتے میل ملاقات بڑھائی اور ایک پرانے تعلق ... دوستی کی بنیاد بنا لیا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ شرافت علی ... ذہن میں سلطان آباد میں پیش آنے والے واقعات ... اہمیت نہیں رہی تو خود میں نے ایک دن اس ... پوچھا کہ میرے اور پرنس امینہ کے فرار ہو جانے کے بعد ... لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

"سب سے زیادہ صدمہ نواب صاحب کو ہوا تھا۔ ... انہیں تم سے یا اپنی عالی نسب بہو سے یہ امید نہ ... تم ہی ان کے ناموس کا خون کرو گے۔ ان میں دنیا کے ... رسوا ہونے کی ہمت نہ تھی چنانچہ انھوں نے خودکشی ... تھی۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "پرنس کا ... کیا تھا؟"

"وہی جو کسی بھی غیرت مند شوہر کا ہونا چاہیے تھا۔" ... "اس نے قسم کھائی تھی کہ تم جہاں بھی ملو گے اور جب بھی ملو گے، وہ تمہیں زیادہ بے آبرو کر کے اور زیادہ عذاب دے کر قتل کر دے گا۔"

"تمہارے خیال میں وہ ابھی تک اپنے اس عہد پر قائم ہوگا؟" میں نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" شرافت علی بولا۔ "پرنس عیاش اور شوقین مزاج آدمی تھا۔ اس نے بعد میں کوئی شادی نہیں کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی راتیں بدستور آباد رہیں۔ در اصل پرنس میں بہت سی خوبیاں باپ کی طرح تھیں مثلاً یہ کہ وہ ذہین تھا۔ ریاست کے معاملات کو سابقہ روایت کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ مزاج کا ضدی اور اپنی انا کے معاملے میں انتہائی خود پرست تھا۔"

"کیا دوسری شادی نہ کرنا بھی اس کی قسم میں شامل تھا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہی سنا ہے۔" شرافت علی بولا۔ "کہ جب تک پرنس اپنی قسم پوری نہیں کرے گا، شادی بھی نہیں کرے گا۔ اب وہ ذمے دار اور سنجیدہ مزاج آدمی ہے۔ کوئی بے فکرا نوجوان نہیں ہے۔ نواب کا حرم کتنا ہی آباد کیوں نہ ہو، اس میں بیوی کی جگہ تو خالی رہتی ہے اور اس کا احساس بھی برقرار رہتا ہے۔"

"اپنی بیوی کی بے وفائی کے داغ کو اس نے دنیا سے کس طرح چھپایا تھا؟ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ وہ اس خبر کو محل کی دیواروں سے باہر نہیں نکلنے دے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ نواب صاحب کی خودکشی کو ایک حادثہ قرار دیا گیا تھا۔" شرافت علی نے کہا۔ "اور کہا یہ گیا کہ وہ اپنی شکاری بندوق کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میگزین خالی ہے لیکن اس میں ایک گولی تھی ـــ جو ٹریگر دباتے ہی چل گئی۔ اس کے گواہ محل کے ہی دو خادم بنے۔ ان میں سے ایک گیان چند تھا۔ جب پہلے گواہ کی لاش ایک رات تالاب میں تیرتی ہوئی پائی گئی تو گیان چند کو اپنی فکر لاحق ہوئی اور وہ صبح ہونے سے پہلے ہی فرار ہو گیا۔ پھر وہ ملازم پُراسرار طور پر غائب ہو گئے جو امینہ کی خدمت پر مامور تھے اور جن سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ بے شک وہ پرانے خدمت گار تھے اور محلوں کے راز کو راز رکھنا جانتے تھے مگر پرنس نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ غلطی سے بھی کہہ دیتے کہ بیگم صاحبہ تو خواب گاہ یا محل میں موجود ہی نہیں ہیں تو ڈرامہ آگے کیسے چلتا؟ بعد میں دوسرے ملازموں کو سختی سے تاکید کر دی گئی کہ وہ اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حصے میں قدم بھی نہ رکھیں جہاں پرنسس امینہ اور شہزادہ خورشید عالم کا قیام تھا کیونکہ نواب بیگم کی علالت کے باعث ڈاکٹروں نے سب ملنے جلنے والوں پر پابندی عائد کر دی ہے یہاں تک کہ خود نواب خورشید عالم بھی ان کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔ محل میں بہت سے اجنبی چہرے نظر آتے جن کے بارے میں کہا گیا کہ دہلی اور کلکتہ سے آئے ہوئے بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ تاہم صرف ایک ہفتہ بعد نواب بیگم کا انتقال ہو گیا اور ان کو خاموشی سے محل کے احاطے ہی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔"

"اور وہ لاش کس کی تھی جو دفنائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"صورت تو کسی نے بھی نہیں دیکھی ہو گی۔" شرافت علی بولا۔ "وہ پردہ دار بیوی تھی۔ مرنے کے بعد بھی شوہر کے سوا کوئی نامحرم اس کا چہرہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ کفن میں کسی عورت کی لاش تھی یا مرد کی۔ وہ لاش کہاں سے حاصل کی گئی تھی؟ یہ سب باتیں غیر اہم تھیں۔"

"کیوں؟ امینہ کے والدین اور اس کے بھائی بھی تو تھے۔" میں نے کہا۔

شرافت علی ہنسا۔ "ان کی مرضی شامل نہ ہوتی تو یہ ممکن ہو سکتا تھا؟ وہ بھی نواب کے خاندان کی طرح اونچی ناک والے تھے۔ انہوں نے نواب سے کہا ہو گا کہ ہمارے گھر سے جانے کے بعد وہ تمہارے گھر کی عزت تھی۔ باپ کے گھر سے بیٹی کی ڈولی اٹھتی ہے اور شوہر کے گھر سے صرف جنازہ اٹھتا ہے۔ اب تم جیسے چاہو اپنی عزت کا جنازہ اٹھاؤ، ہم دخل نہیں دیں گے۔ ان کی بیٹی کے فرار ہونے کی بات لوگوں کی زبان پر آ جاتی تو وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ چنانچہ انہوں نے داماد کا ساتھ دیا۔"

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ یہی بات مجھ سے امینہ نے بھی کہی تھی کہ تم واپس آ گئے بھی تو تمہیں صرف میری قبر ملے گی۔ قبر اب بھی موجود تھی مگر چند لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس میں پرنسس امینہ کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ امینہ اب سلطانہ تھی اور میرے ساتھ تھی اور میں خود بھی زندہ تھا۔ اگر اس رات میں اور امینہ محل سے نہ نکلتے تو آج میرا بے نشان مدفن بھی امینہ کے مزار سے بہت دور ہوتا۔

"اور وہ جو ریذیڈنٹ تھا۔۔۔ جان سائمن؟" میں نے کہا۔ "کیا گیان چند نے اور تم نے اسے بتا دیا تھا۔۔۔ تمہارے پاس تو ناقابلِ تردید ثبوت تھے۔"

"سچی بات تو یہ ہے بھائی وزیر خان!" شرافت علی مجھ سے نظر ملائے بغیر بولا۔ "کہ یہ ساری اسکیم گیان چند نے بنائی تھی۔ تم مانو یا نہ مانو اور میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تمہارے چلے جانے کا گیان چند کو بہت سخت ملال تھا لیکن بعد میں اس کو بھی جان کے لالے پڑ گئے تو وہ [illegible] سے اور بڑی عجلت میں جان بچا کر بھاگا تھا لیکن جانے سے پہلے اس نے وہ تصویریں جان سائمن کو ارسال کر دیں۔ دن کی بجائے ہفتے بھر بعد سائمن جب پرنس کے ہمراہ آگرہ سے لوٹا تو اس نے اپنی ڈاک دیکھی۔ ڈاک میں وہ تصویریں بھی شامل تھیں۔ غصّہ میں پاگل ہو کے وہ رائفل سمیت پرنس کے پاس پہنچا مگر محل میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ نواب صاحب نے واپس آتے ہی بیٹے کو بتا دیا تھا کہ وہ جس بہو کی عزت کا رکھوالا تھا وہ اس پر تھوک کے ایک ادنیٰ ملازم کے ساتھ جا چکی ہے۔ وہ دوسروں کی عزت سے کھیلنے میں مصروف تھا اور مکافاتِ عمل سے غافل ہو گیا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی عزت بھی تماشا بن سکتی ہے لیکن وہ خود تماشا بنیں گے اور نہ تماشائی۔ اس کے بعد انہوں نے بیٹے کو تاکید کی وصیت کی ہو گی اور سمجھایا ہو گا کہ اس مسئلے کو باعزت طور پر کیسے حل کرنا ہے چنانچہ ریذیڈنٹ پہنچا تو اسے معلوم ہوا "اتفاقیہ" گولی چل جانے سے نواب صاحب کی وفات ہو گئی ہے۔ سائمن غصّہ میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پرنس کو کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس وقت تک گیان چند بھی وہیں موجود تھا اور یہ باتیں مجھے اسی سے معلوم ہوئی ہیں۔ پرنس نے تصویروں کو بڑے سکون سے دیکھا اور کہا سوری ریذیڈنٹ صاحب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شخص وزیر خان جو آپ کی بیوی کا قاتل ہے محل سے فرار ہو گیا ہے اور وہ نمک حرام جاتے وقت کئی لاکھ کے ہیرے جواہرات اور میری بیوی کے زیورات بھی لے گیا ہے۔ ریذیڈنٹ نے کہا کہ تم جھوٹ بکتے ہو کیونکہ تم اس کو بچانا چاہتے ہو۔ وہ تمہارا خاص آدمی تھا تم اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اسے انتہائی ایماندار کہتے تھے۔ پرنس نے کہا کہ میرے اندازے غلط تھے اور مجھ سے آدمی کی پہچان میں دھوکا ہوا۔ وزیر خان بہت بدمعاش اور مجرمانہ ذہن کا مالک تھا۔ کہتے ہیں کہ عالمِ دیوانگی میں ریذیڈنٹ نے پرنس کی بات نہیں مانی اور اس پر رائفل تان لی کہ بتاؤ وزیر خان کہاں ہے؟ پرنس نے آسانی سے اس کو قابو کر لیا اور اسی کی رائفل سے نشانہ لے کر کہا کہ مسٹر سائمن، اگر میں چاہوں تو تم کو اسی وقت گولی مار کے تمہاری لاش برطانوی حکومت کو ارسال کر سکتا ہوں کہ تمہارا یہ ریذیڈنٹ مجھے قتل کرنے کی نیت سے محل میں داخل ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہاں اسلحہ لے کر کوئی نہیں آ سکتا۔ محل کے بہت سے ملازموں نے تمہیں رائفل سمیت اندر آتے دیکھا ہے اگر نہ دیکھا ہوتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔۔۔ کیونکہ وہ میرے ملازم ہیں اور میرے خلاف گواہی دینے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ ان کی زبان وہی کہے گی جو میں کہوں گا۔ اس سے بھی زیادہ آسان کام میرے لیے تم کو نواب صاحب کا قاتل ثابت کر دینا ہو گا۔ تم عین اسی وقت یہاں پہنچے ہو جب نواب صاحب اتفاقیہ گولی چل جانے سے وفات پا چکے ہیں۔ میں پولیس کے آنے تک تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر تمہیں قید رکھ سکتا ہوں۔ پولیس کے سامنے میں بیان دوں گا کہ نواب صاحب کو تم نے ہلاک کیا ہے اور یہاں محل کے سارے ملازم یک زبان ہو کر کہیں گے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں نواب صاحب پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارے اور نواب صاحب کے اختلافات پرانے ہیں جن کا علم وائسرائے کو بھی ہے واقعاتی شہادت اور چشم دید گواہوں کی موجودگی میں تمہارا قانون، تمہارا عہدہ اور شاہی خاندان سے تمہارا تعلق سب مل کر بھی تم کو بچا نہیں سکیں گے لیکن میں تم کو بخش رہا ہوں۔ اس لیے کہ تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم وزیر خان کے خلاف الگ رپورٹ درج کراؤ گے کہ اس نے تمہاری بیوی کو قتل کر دیا ہے اور تمہاری حکومت ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لانے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری رپورٹ میں لکھواؤں گا کہ میرا سیکرٹری وزیر خان دس لاکھ کی مالیت کے ہیرے جواہرات چوری کر کے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی گرفتاری کے لیے میں اپنے طور پر ایک لاکھ روپے کا انعام رکھوں گا، جو پولیس دے گی۔"

"اور کیا انہوں نے واقعی ایسا کیا تھا؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" شرافت علی نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "یہ خبر تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی تمہاری تصویر کے ساتھ۔ بعد میں پولیس کی جانب سے پبلک کے لیے ایک اشتہار بھی دیا گیا تھا کہ تمہیں گرفتار کر کے پیش کرنے والے کو یا تمہارا سراغ دینے والے کو ایک لاکھ روپے کا انعام ملے گا۔ اس اشتہار میں بھی تمہاری تصویر تھی۔ تمام صوبوں کی پولیس کو بھی اس تصویر کی نقل فراہم کی گئی تھی۔ کمال کی بات ہے کہ تم نے نہیں دیکھی۔"

"یہ کمال کی نہیں تقدیر کے یاور ہونے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ایسے گمنام مقامات پر رہا جہاں عام طور پر اخبارات ہی نہیں پہنچتے تھے۔ خواص کا ایک طبقہ اخبارات پڑھتا تھا مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ان کا مجھ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔"

"پھر بھی پولیس تو تمہیں شناخت کر سکتی تھی؟"

"پولیس کی مت پوچھو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تھانے میں ایسے کیس روز آتے ہیں اور مفرور مجرموں کی تصویریں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ سیکڑوں تصویریں پرانے ریکارڈ میں پڑی ہوں گی۔ ان سب کی صورت اور ان کے حلیے کسی کو کیا یاد رہ سکتے ہیں؟"

"تم ایک بہت اہم بات کو نظر انداز کر رہے ہو وزیر خان!" وہ بولا۔ "تم ایک لاکھ کی رقم کو نظر انداز کر رہے ہو۔ عام طور پر انعام کی رقم پانچ سو یا ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کسی حوالدار یا سپاہی کی نظر سے دیکھو۔ اپنے پورے ملازمت کے دور میں وہ جتنی تنخواہ یا رشوت لے سکتا ہے، یہ رقم اس سے کہیں زیادہ تھی اور یک مشت مل رہی تھی اور جائز طور پر۔ تھوڑا تھوڑا بچا کے تو کوئی تھانیدار بھی ایک لاکھ جمع نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے انعام کی امید میں نیچے سے اوپر تک سب اتنے مستعد ہو گئے ہوں گے کہ انہیں ہر شخص وزیر خان ہی نظر آتا ہو گا اور یہ بھی کیا معلوم کتنے محض تمہاری صورت سے مشابہت رکھنے کے جرم میں خواہ مخواہ پکڑ لیے گئے ہوں گے۔"

"ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سارے ہندوستان میں گھومتا پھرا اور نام بدلنے کے سوا کوئی احتیاط بھی نہیں کی۔ علم ہوتا تو میں چہرہ بھی بدل لیتا مگر میں سمجھ رہا تھا کہ معاملات دب گئے۔"

"معاملات کیسے دب سکتے ہیں وزیر خان!" شرافت علی نے کہا۔ "وہ دونوں مقدمات درج کرانے والے میرے تمہارے جیسے معمولی لوگ تو نہیں تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پولیس نے مایوس ہو کے تلاش ترک کر دی ہو گی۔ ان کے پاس نئے کیس آ گئے ہوں گے اور پرانے خود بخود سرد خانے میں چلے گئے ہوں گے لیکن تم جانتے ہو کہ قتل کا کیس کبھی ختم نہیں ہوتا اور چور جب بھی پکڑا جائے چور ہی کہلاتا ہے۔ پہلے تم پر ایک ریذیڈنٹ کی بیوی کے قتل کا الزام تھا مگر جان سائمن اب ایک صوبے

کا لیفٹیننٹ گورنر ہے اور نواب خورشید عالم کیسے بھول سکتے ہیں کہ تم نے ان کے خاندان کی عزت لوٹی اور ان کے والد کی موت کا سبب بنے۔ اگر آج بھی کوئی تمہارے بارے میں پولیس کو مخبری کر دے.....“

”کیا تم مجھے پھر دھمکی دے رہے ہو شرافت علی؟“ میں نے کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو وزیر خان!“ شرافت علی بولا۔ ”اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو میں اب تک انتظار کیوں کرتا۔ مجھے تو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ تم میرٹھ میں ہو لیکن دوسروں سے محتاط رہو۔ تمہارے رشتہ دار، محلے دار اور جان پہچان والوں کو کئی برس پرانی بات یاد ہوگی۔ ان میں سے بیشتر تمہارے خیرخواہ ہیں اس لیے تم ابھی تک محفوظ ہو مگر ایسا کوئی نہیں ہوتا جس کا دشمن کوئی نہ ہو۔“

شرافت علی کے انکشافات نے میرا خون خشک کر دیا تھا اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ ہر طرف سے رات کے اندھیرے کی طرح میری طرف بڑھ رہا ہے اور اس اندھیرے کی آڑ میں قانون کے ہاتھ چپکے چپکے مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے آ رہے ہیں۔ فضا میں انگشت نمائی کرنے والے بدخواہوں کی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر کھنکتی تھی اور تقدیر کی بے رحم ہنسی گونجتی تھی۔ اس رات میں نے آمنہ کو بتایا کہ شرافت علی سے مجھے کیا معلوم ہوا ہے تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ہندوستان کی زمین پر اب ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی ہے۔ بعد کے واقعات تم جانتے ہو منشی! میں بیوی بچوں کے ساتھ میرٹھ سے نکل گیا تھا کیونکہ میرٹھ میں میرے جاننے والے بہت تھے اور دہلی چلا گیا تھا جہاں مجھے کسی شناسا کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے منشی کہ میرا پورا خاندان فسادات کی نذر ہو گیا تھا۔“

میں وزیر خان کے بچپن کا دوست تھا اور ان واقعات کے سوا جن کا تعلق ریاست سلطان آباد سے تھا اور جو مجھے وزیر خان کی زبانی پہلی بار معلوم ہوئے تھے میں اس کی زندگی کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ جس زمانے میں وزیر خان سلطان آباد سے نکل کر ہندوستان کے طول و عرض میں چھپتا پھر رہا تھا میں میرٹھ سے ساٹھ میل دور ایک گاؤں کے چھوٹے سے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا اور انتہائی سکون اور قناعت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو بھی عام نہ تھے اور اس گاؤں تک اخبارات تو کیا تار بھی مشکل سے پہنچتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وزیر خان کے بارے میں شائع ہونے والی خبریں نہیں پڑھیں اشتہارات نہیں دیکھے اور تصویر نہیں دیکھی ورنہ میں اسے میرٹھ پہنچتے ہی خبردار کر دیتا اور اسے فوراً نکل جانے کا مشورہ دیتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وزیر خان کے والدین بھی ان حقائق سے بے خبر رہے میرا خیال ہے کہ ان کو عمداً بے خبر رکھا گیا۔ ورنہ بڑھاپے میں یہ صدمہ ان کی جان لے لیتا۔ وہ خود اخبار نہیں پڑھتے تھے اور جنہوں نے اخبار میں کچھ دیکھا تھا وہ نیک دل لوگ تھے۔ انہوں نے جانتے بوجھتے ان کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وزیر خان کا ایک بہنوئی انڈین آرمی میں میجر تھا اور اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ فرض شناسی کے چکر میں بیوی کے جذبات کی پروا نہ کرے اور اس کے بھائی کو پکڑوا دے۔ شاید بہت سے لوگوں کو اس خیال نے بھی کچھ نہ کرنے دیا کہ ادائے فرض سے زیادہ ان کی حرکت کو ایک لاکھ کے لالچ سے تعبیر کیا جائے گا۔ جو لوگ انگریز کے دشمن تھے انہوں نے سمجھا ہوگا کہ وزیر خان نے ایک انگریز کی بیوی کو قتل کیا تو کوئی جرم نہیں کیا بلکہ نیک کام کیا اور یہ قتل بھی اس نے بے سبب تو نہیں کیا ہوگا ممکن ہے اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا ہو۔ جو لوگ وزیر خان کے کردار سے واقف تھے وہ سمجھتے ہوں گے کہ چوری کا الزام کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ وزیر خان ایسا آدمی نہیں کہ جس تھالی میں کھائے اسی میں چھید کرے پھر یہ سب واقعات ایک ہی ریاست میں پیش آتے تھے اور وزیر خان پر الزامات عائد کرنے والے دونوں حاکم تھے۔ وزیر خان ایک معمولی ملازم تھا جسے حاکم لوگ کسی بھی ذاتی رنجش کے باعث اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ غرض یہ سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے وزیر خان میرٹھ میں بھی محفوظ رہا اور کسی نے اس کی موجودگی کا راز افشا نہیں کیا۔

لیکن یہ سب تقسیم سے پہلے کی باتیں تھیں جسے اٹھارہ سال ہو چکے تھے۔ وقت بدل گیا تھا، جغرافیائی سرحدیں بدل گئی تھیں۔ ہندوستان میں سلطان آباد کی ریاست اور دوسری ریاستیں بھارت میں ضم ہو گئی تھیں۔ انگریز اپنا بوریا بستر گول کر کے واپس چلے گئے تھے۔ وزیر خان نے دوسرے ملک میں ایک نئی زندگی کا آغاز اپنے حوصلے کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس نے کاروبار شروع کیا تھا تو اس کا سرمایہ فقط اس کا عزم تھا اور اس کی مستقل مزاجی تھی۔ نیک نیتی تھی اور ایمانداری بھی چنانچہ خدا نے کاروبار کو برکت دی۔

۱۹۵۶ء میں شرافت علی کاروبار میں پارٹنر بنا تو میں بہت پہلے سے وزیر خان کے ساتھ تھا اور وزیر خان مجھ پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ چنانچہ میرا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آج شرافت

کس طرح وزیر خان کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف لگائے گئے الزامات کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ شخص جس نے اپنی بیوی کا مقدمہ کیا تھا برطانیہ میں تھا اور بظاہر اس کو بھول چکا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ تم بھی اسے جانتے ہو کبیر خان! کیونکہ تم اس کی لڑکی مارگریٹ کے دوست تھے اور یہ لڑکی اس کی دوسری بیوی کے بطن سے ہے۔ وہ بڈھا اب سرجان سامن کہلاتا ہے مگر اسے یہ علم نہیں ہے کہ تم کس وزیر خان کے بیٹے ہو... تم کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ میں یہ سب کچھ کیسے جانتا ہوں، برخوردار! میری عمر جاسوسی ناول پڑھتے گزری ہے۔ اسی شوق کے باعث لوگ مجھے منشی کی بجائے فوما بچو کہنے لگے تھے۔ میں کام کے سلسلے میں لندن آتا جاتا رہتا تھا اور تمہارے والد کی خواہش کے مطابق جاسوسی کر کے معلوم کرتا تھا کہ تم لندن میں کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔ واپسی پر میں وزیر خان کو مکمل رپورٹ دیتا تھا کہ سب خیریت ہے۔ صرف ایک بات میں نے اسے نہیں بتائی تھی کہ تم جان سامن کے ساتھ گھومتے پھرتے ہو ورنہ وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔

وزیر خان کی ساری روداد سن کے میں نے کہا۔ ”وزیر خان! لیکن میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں ملا ہے۔ شرافت علی تمہیں کیسے بلیک میل کر رہا ہے؟ شرافت علی کو تم سے دشمنی ہوتی تو وہ تقسیم سے پہلے ہی اس زمانے میں تم کو پکڑوا دیتا جب تم میرٹھ میں تھے اور ایک لاکھ کا انعام حاصل کر لیتا۔“

”اس میں ہمت نہیں تھی منشی!“ وزیر خان نے کہا۔ ”میں مسلم لیگ کا بڑا پرانا کارکن ہوں اور میرے دوست بھی بہت تھے جو مجھ پر جان نثار کر سکتے تھے۔ وہ شرافت علی کو زندہ نہ چھوڑتے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تمہارے باقی دشمن تو مر گئے یا ادھر ادھر ہو گئے۔ مثلاً وہ ریذیڈنٹ جان سامن۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ نواب خورشید عالم کی نوابی ختم ہوئی اور وہ بھی ہندوستان میں رہ گئے۔ اب زندہ ہوں گے تو وظیفہ خوار ہوں گے۔ رہ گیا گیان چند تو میرا خیال ہے فسادات میں مارا گیا ہوگا۔ اس کا گھر اور کاروبار عالمی گیٹ کے اندر تھا جہاں سب سے زیادہ سکھ اور ہندو مارے گئے تھے۔ اگر وہ جان بچا کے فرار ہوا ہوگا تو بھارت میں ہوگا۔ بھارت کی پولیس کے قوانین پاکستان میں نہیں چلتے اور ایک لاکھ کے انعام والا اشتہار یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر تمہیں کس کا ڈر ہے؟ کیوں بلیک میل ہونے پر مجبور ہے تو؟“

”دیکھو منشی! میں نے تمہیں ہر بات بتا دی ہے۔“ وزیر خان نے کہا۔ ”یہ بھی مان لیا ہے کہ شرافت علی مجھے بلیک میل کر رہا ہے، میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اسباب وہی پرانے ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔ اب میں اپنے انجام سے نہیں ڈرتا، میری زندگی کے تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں لیکن سکندر کی پوری زندگی باقی ہے۔ اسے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے سینے پر صبر کی سِل رکھ لی ہے، اس کو اپنی نگاہوں سے بھی دور رکھا۔ میں نے یہ قربانی اس کے مستقبل کے لیے دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آخری وقت میں یہ جنگ ہار جاؤں۔ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے بھوکے بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا ہے۔ سوائے اس چیز کے جس پر میرے بعد سکندر کا حق تھا۔ یہ کاروبار میرا ہے۔ میری زندگی میں کوئی مجھے اس کی ملکیت سے محروم نہیں کر سکتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں اس سے بھی دستبردار ہو جاؤں لیکن میں سکندر کو اس کے حق سے کیسے محروم کر دوں۔ وہ میری جان تو لے سکتے ہیں مگر حقِ ملکیت سے دستبرداری کے کاغذات پر دستخط نہیں لے سکتے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا وزیر خان کہ کسی وکیل کی معرفت تُو اپنا مقدمہ عدالت میں کیوں نہیں لے جا سکتا؟“ میں نے کہا۔ ”یا پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں کر سکتا؟“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں منشی! یہ سب بالکل بے کار ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”اور اگر بعد میں انہوں نے یہی کھیل سکندر کے ساتھ جاری رکھا؟“

”سکندر جوان آدمی ہے۔“ وزیر خان نے کہا۔ ”باہمت ہے اور ذہین ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ماضی کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے۔ کوئی اسے بلیک میل نہیں کر سکتا وہ اپنا دفاع خود کر لے گا۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہوگا۔“

تو برخوردار کبیر خان! اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ اس سے زیادہ مجھے وزیر خان نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ بات میرے لیے آج بھی معمہ ہے کہ ستائیس سال قبل سلطان آباد کی ریاست میں پیش آنے والے واقعات کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے جو وزیر خان کے ساتھ پیش آئے۔ کم سے کم میری عقل تو کوئی تعلق دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ میں رازداری کا پابند تھا چنانچہ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ میں دوبارہ وزیر خان سے ملنے بھی نہیں گیا۔ میری اور اس کی آخری ملاقات اس کے مرنے کے بعد ہوئی تھی جب وہ چراغ دین

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی کوٹھی کے برآمدے میں کفن پہنے ابدی نیند سو رہا تھا لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کوٹھی اسی کی ہے اور میں کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ تو اپنے نوکر کے نوکروں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر کے ایک کمرے میں رہتا تھا لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا اور جب میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کو لحد میں اتارا تو میں نے کہا کہ بھائی وزیر خان تم نے رفاقت کا عہد توڑ دیا۔ اب میں کسی عہد کا پابند نہیں رہا۔ جو کچھ تھا تمہارے دم کے ساتھ تھا۔ اب تم نہیں تو دوستی نہیں۔ اور جب دوستی نہیں تو کیسا وعدہ اور کہاں کے عہد و پیمان۔ میں نے اسی لمحے طے کر لیا تھا کہ جو بات میں تم کو خود نہ بتا سکا وہ تحریر کی صورت میں چھوڑ جاؤں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے آگے کے معاملات میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم کو معلوم کرنا ہوگا کہ میر شرافت علی نے تمہارے باپ کی کونسی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے مار ڈالا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وزیر خان کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے۔ اسے ختم کیا گیا تھا۔ اس احساس کو تم میری چھٹی حس کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہو اور میری چھٹی حس یہ بھی کہتی ہے کہ میرا انجام وزیر خان کے انجام سے مختلف نہ ہوگا۔ اس کے دشمن پوری کوشش کریں گے کہ تم کو میں کچھ نہ بتا سکوں لیکن میں بھی نوماپخو ہوں۔ میں ان کو ایسا چکر دوں گا کہ ایک نہ ایک دن یہ تحریر تمہارے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جب تم اسے پڑھو تو میرا وجود رزقِ خاک بن چکا ہو اگر ایسا ہو تو میری مغفرت کی دعا کرنا۔ میری روح کی نجات کے لیے اتنا بھی بہت ہوگا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ فقط:

تمہارا چچا۔ دعاگو اور خیرخواہ

نوماپخو

خط ختم ہو گیا۔ ماضی کی ایک داستان ختم ہو گئی۔ وہ رات پہلے ختم ہو گئی تھی جس نے قیدِ زمان و مکاں کو ختم کر دیا تھا۔ میں، شہلا اور محسن محض ایک وجود رہ گئے تھے صرف ایک احساس جو حال اور ماضی کے درمیان سرگرداں تھا۔ یہ کوئی سائنس فکشن نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی ٹائم مشین نہیں تھی۔ ان سب کے لیے اس حقیقت سے انکار ناممکن تھا کہ اس رات کے دوران میں ہم نے بہت پیچھے جا کر ستائیس برسوں کا سفر طے کیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ چار گھنٹوں کے مختصر وقفوں میں ستائیس سال کا وقت کیسے سمٹ گیا؟ مگر اس طویل سفر کے بعد میں جگ دنیا پر اترا وہ دنیا میری نہیں تھی۔ میں بھی وہ نہیں تھا جو ماضی کے سفر میں محسن کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اس خلا نورد کی طرح جو ایک سیارے سے پرواز کر کے دوسرے سیارے پر جا اترے ایک اجنبی دنیا میں اکیلا تھا۔ ایسا خواب میں بھی ہوتا ہے آنکھ کھل جاتی ہے مگر ذہن بدستور خواب کے آسیب میں رہتا ہے۔

"سکندر! میری طرف دیکھو، میں محسن ہوں!" محسن نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"گستاخ!" میں نے گرج کر کہا اور اپنا ہاتھ گھمایا۔ "تو ہوگا محسن لیکن ہم سکندر نہیں ہیں۔ ہم۔۔۔ ہم سکندر نہیں ہیں۔۔۔ ہم پرنس کبیر خان ہیں۔۔۔ ولی عہد ریاست سلطان پور ہیں۔ ہماری ماں پرنسس امینہ تھی اور ہمارے والد نواب خورشید عالم۔۔۔" میں نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"بھائی جان۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔ خدا کے لیے ہوش میں آئیے" شہلا نے روتے ہوئے کہا۔

"بدتمیز کنیز" میں نے اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ جانتی نہیں کہ ہم اکلوتے تھے، تو ہمیں بھائی کہتی ہے بدکنیز۔ ہم تیری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔۔۔ ہم اس ریاست کے مالک ہیں اور یہاں کوئی ہمارے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں کر سکتا صرف ہم عالی نسب خاندان کے فرزند ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ ہمیں ایک معمولی آدمی کی اولاد کہہ سکے۔ ہم نواب خورشید عالم کی جائز اولاد ہیں باقی سب۔۔۔ وہ سب جو وزیر خان کی اولاد تھے۔۔۔" میرا خیال ہے کہ میں چلا رہا تھا نشے میں بدمست شرابی کی طرح ہنکار رہا تھا۔ زور زور سے سینے پر ہاتھ مار رہا تھا۔ ہنس رہا تھا اور رو رہا تھا کہ اچانک مجھ پر آسمان آ گرا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوتے آفاق پر خورشید و قمر۔ دنیا پر اندھیرا طاری ہو گیا اور میرا وجود اس خلا میں گرتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ میرے ہاتھ پیر بالکل سُن ہو چکے تھے اور میں اپنی مرضی سے ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مجھے مانوس چہروں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے باری باری ہر چہرے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں سوال خود بخود میرے ذہن میں آیا۔

آخر یہ کون لوگ ہیں جو صورت سے مہربان اور ہمدرد نظر آتے ہیں۔ یہ عورت جو میرے سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑی آنسو بہا رہی ہے، کس کے لیے رو رہی ہے؟ میرے بائیں ہاتھ بھی تو ایک اور لڑکی کھڑی ہے۔ وہ کیوں رو رہی ہے؟ میں نے آنکھیں کھول کر پھر دوسری طرف دیکھا جہاں دو مرد کھڑے تھے۔ ایک عمر رسیدہ اور ایک میرا ہم عمر۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے گہری نیند آ رہی ہے لیکن میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا مگر میرے دماغ میں خلا تھا اور جسم کے ساتھ میرا ذہن بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں مگر یہ میرے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ایسے بہت سے وقفے آئے جب میں نیم بیداری اور نیم ہوش کے عالم میں بہت کچھ دیکھتا رہا۔ ان میں سے کچھ مناظر حقیقی تھے اور کچھ میرے تصور کی پیداوار تھے۔ میرے کانوں نے بہت سی آوازیں سنیں جو ایک گم گشتہ وقت کی صدائے بازگشت تھی۔ میں نے مارگریٹ کے باپ سر جان سائمن کو دیکھا جو حوالات میں میرے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا "میری بیوی ایک نیٹو پرنس کو چاہنے لگی تھی۔ میں نے اس کو باعزت طور پر دفن کرا دیا تھا۔۔" میں نے اپنے والد کو دیکھا۔ انہوں نے روتے روتے مجھ سے کہا "تم میرے بیٹے ہو سکندر کیونکہ تم کو جنم دینے والی عورت میری بیوی تھی اور تمہیں میں نے پالا تھا" پھر ایک اجنبی نمودار ہوا جو حلیہ میں خسرو جمشید کی طرح تھا اور اس نے تنفر اور حقارت سے کہا "یہ نمک حرام جھوٹ بکتا ہے۔ امینہ میری بیوی تھی اور تم میرے بیٹے ہو۔" پھر یکے بعد دیگرے گھپ اندھیرے سے نکل کر بہت سے چہرے روشنی میں آ گئے۔ ان کے بدن زخموں سے فگار تھے اور انہوں نے یک زبان ہو کے کہا "ہماری خون آلودہ لاشوں کو دیکھو۔ کیا تم ہمیں پہچانتے نہیں ہو؟ ہم تمہارے بھائی بہن ہیں۔" اندھیرے ہال میں سینما کے پردے پر نظر آنے والے سلائیڈز کی طرح بہت سے چہرے روشن ہوئے اور بجھ گئے۔ ان میں پنڈت دیا ناتھ کا متفکر چہرہ تھا۔ ان کے بیٹے موہن اور بیٹی موہنی کا چہرہ تھا۔ ایک عورت بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ اپنے محل کی خوابگاہ میں دکھائی دی۔ پھر میں نے اسی عورت کو ایک چھوٹے سے گھر میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے جھاڑو دیتے ہوئے دیکھا۔ "پرنسس امینہ" اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا "میں تو تمہاری ماں ہوں سکندر!" اس کے علاوہ بھی میں نے بہت کچھ دیکھا جو نمشی کے خط میں بیان کردہ واقعات کی تصویر تھا۔ بالآخر میرے ذہن سے ایک شدید جذباتی صدمے کے اثرات زائل ہونے لگے اور میں اپنے غم گسار کی متفقہ کوششوں اور ان کی دعاؤں کے اعجاز مسیحائی کے سبب دیوانگی سے فرزانگی کی طرف بڑھتا گیا۔ میں نے رابعہ اور شہلا کا چہرہ پہچان لیا۔ محسن کو اور انکل رضوی کو پہچان لیا اور ان کی باتیں سمجھنے لگا۔ میری جسمانی معذوری اور ذہنی تھکن کا سبب وہ سکون بخش اور خواب آور دوائیں تھیں جو مجھے وافر مقدار میں دی گئی تھیں۔ میں اسی کرشن نگر والے گھر میں تھا اور رفتہ رفتہ حقیقت کو خواب سے الگ کر کے دیکھنے لگا تھا۔

بالآخر ایک وقت ایسا آیا جب میں نے ہوش سے بیگانہ رکھنے والی دوائیں کھانے سے انکار کر دیا اور سیاہ کافی طلب کی۔ میں نے اپنی بات کا انتہائی مسرت خیز ردِعمل دیکھا۔ ان سب کے چہرے امید کی روشنی سے دمک اٹھے جو میری شفایابی کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشاں تھے۔ چند منٹ بعد رابعہ بغیر دودھ اور چینی کی گرم کافی کا بہت بڑا مگ بھر لائی۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور شہلا نے تھوڑی تھوڑی کر کے سب کافی میرے حلق میں اتار دی۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹنے لگی اور میرا ذہن صاف ہوتا گیا۔ میری جسمانی توانائی بحال ہونے لگی اور آدھے گھنٹے بعد میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ میں نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہو کے کہا "میں بہت شرمندہ ہوں آپ سب سے۔"

"ابھی اپنے ذہن پر بار مت ڈالو" انکل رضوی نے شفقت سے مسکرا کے میری پیٹھ تھپکی "شرمندہ ہونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں انکل رضوی!" میں نے کہا "ذہنی صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں برداشت نہ کر سکا۔"

"زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس صدمہ کے اثرات عارضی ثابت ہوئے۔" محسن نے میرا ہاتھ تھام کر کہا "اور تم بہت جلد سنبھل گیا۔"

"کیا اس بات کا امکان بھی تھا کہ میرا دماغی توازن ہمیشہ کے لیے بگڑ جاتا؟"

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں" محسن بولا "لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ اس میں کچھ زیادہ وقت لگ جاتا۔"

"میری نیند یا بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟" میں نے پوچھا "مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"آپ صرف چوبیس گھنٹے دراز رہے" محسن نے کہا "اس وقت صبح کے نو بجے ہیں اور۔۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں زیادہ بات نہیں کرنی چاہیے" رضوی صاحب نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "فکر کی تو کوئی بات نہیں رہی مگر سکندر کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ میں اب ڈیوٹی پر جا رہا ہوں، شام کو آؤں گا۔ اس وقت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تک تم لوگ سکندر کے آرام کا خیال رکھو گے اور اس کو سوپ اور گلوکوز دیتے رہو۔"

انکل رضوی کے جانے کے بعد رابعہ، محسن اور شہلا نے مل کر ان کی ہدایات پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی اور زبردستی مجھے کمرے میں اکیلا چھوڑنے اور میرے پیٹ کو حلق تک طاقت دینے والی چیزوں سے بھر دینے کی متفقہ جدوجہد کی مگر میں نے اپنے آگے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

"آخر یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے گرم دودھ کا پیالہ لے کر کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میرا پیٹ پھٹ جائے۔ میرا پیٹ ہے کہ ڈرم؟ صبح سے کوئی ایک گیلن جوس چڑھا جا تا ہے، کوئی ایک گیلن چائے اور گلوکوز اور اب آپ دوسری بار ایک گیلن دودھ انڈیلنے آ گئی ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خاک ٹھیک ہو۔" رابعہ نے جل بھن کر کہا۔ "یہ دماغ کی خرابی نہیں ہے تو کیا ہے کہ پیالہ باہر پھینک دیا۔"

"اب اگر کوئی کسی قسم کا مائع میرے حلق میں ڈالنے کے لیے لایا تو میں اس کو بھی باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسی وقت شہلا اور محسن کمرے میں داخل ہوئے۔ شہلا کے ہاتھ میں سوپ کا پیالہ تھا اور محسن کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں دو ابلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے سہم کر کہا۔ "کیا یہ بھی۔۔۔"

"جی ہاں، یہ بھی۔" محسن نے جارحانہ انداز میں آستین چڑھائی۔ "ہم سب مل کر زبردستی یہ تمہارے حلق سے اتاریں گے، اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ ہمیں باری باری اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"دیکھیے شیروانی صاحب!" میں نے لجاجت سے کہا۔ "شرفا کا یہ شیوہ نہیں۔ میں ایک شرط پر آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ بعد میں آپ یہاں بیٹھ کر مجھ سے بات کریں گے۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔" محسن بولا اور میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا پینا شروع کیا۔ رابعہ اور شہلا مسکراتی رہیں۔

"اس وقت تو آپ دونوں کی بتیسی باہر آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے کیوں آنسو بہائے جا رہے تھے؟"

"وہ خوشی کے آنسو تھے۔" رابعہ نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہوئے اعلان کیا۔

"اچھا یار محسن!" میں نے خالی گلاس شہلا کو واپس پکڑا کے کہا۔ "وہ خط کہاں ہے؟"

"خط انکل رضوی کے پاس ہے۔" محسن نے کہا۔ "ویسے بھی اس وقت خط کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

"دیکھ محسن! میرا ذہنی ردِ عمل غیر ارادی تھا۔" میں نے کہا۔ "ذرا سی دیر کے لیے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں نارمل ہوں اور وہی پہلے والا سکندر بخت ہوں۔ بے شک اس خط نے بہت سے تلخ حقائق کا انکشاف کیا ہے جن کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں لیکن ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی نواب خورشید عالم کو نہیں جانتا اور حقیقت کچھ بھی ہو، اپنے والدین کے لیے میرے خیالات اور جذبات وہی ہیں جو یہ خط ملنے سے پہلے تھے۔ میں وزیر خان کا بیٹا ہوں اور اپنے اس عہد پر قائم ہوں کہ مجھے اس کے قتل کا انتقام لینا ہے۔ اُن سب سے جو اُس کی موت کے ذمے دار تھے۔ میر شرافت علی تو مر چکا ہے لیکن آج میرے دشمنوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو گیا ہے یعنی گیان چند۔ شرافت علی اور گیان چند بھی بہت مکار اور عیار شکاری تھے جو میرے باپ کو گھیر کر شکار گاہ تک لے گئے اور وہ ان کی سازش کا شکار ہو گیا۔ اس کی عمر شکاری کتوں کے تعاقب سے بچنے کے لیے بھاگتے ہوئے گزری۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کے نقل وطن کر گیا مگر یہ شکاری کتے یہاں بھی آ پہنچے اور انہوں نے بالآخر اس کا شکار کر لیا۔ اب بازی پلٹ گئی ہے اور شکاری میں ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ پر شرافت علی کے قتل کا الزام آیا لیکن میں اسے قتل نہ کر سکا۔ ایک جذباتی کمزوری کے لمحے میں شرافت علی کو میرے ہاتھوں وہ سزا نہ ملی جس کا وہ مستحق تھا۔"

"اگر منشی یہ خط نہ لکھتا تو اچھا ہوتا۔" محسن باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا فائدہ ہوا ہمیں اس سے؟ یہ تو ہم اب بھی نہیں جانتے کہ مرحوم چچا وزیر خان کی مجبوریاں کیا تھیں؟ کیا وہ ڈرتے تھے کہ تجھے حالات کا علم ہو گیا تو تیری نظر میں جذباتی رشتوں کی اہمیت ختم ہو جائے گی؟ تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرا ان سے خون کا رشتہ نہیں ہے، تو وزیر خان کو چھوڑ کر نواب خورشید عالم کے پاس چلا جائے گا؟"

"میں اپنے والد کی فطرت کو سمجھتا تھا محسن!" میں نے کہا۔ "انہیں مجھ پر پورا اعتماد ہو گا کہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اصل رشتے جذبات کے ہوتے ہیں۔ خون کا رشتوں سے کیا تعلق؟ خون کے صرف گروپ ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنا ہے تو کسی بھی ہسپتال میں چلا جا۔ گورے کا خون کالے کو دیا جاتا ہے، ضرورت پڑتی ہے تو بلڈ بینک سے مل جاتا ہے یا فٹ پاتھ پر بیٹھے خون فروشوں سے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس کا خون کس کے جسم میں پہنچا۔ پھر یہ خون کا رشتہ کیا ہوا۔ جس شخص کی جان بچ جاتی ہے وہ تو اسے پہچانتا بھی نہیں جس نے اپنا خون اس کو دیا تھا۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ میری ماں پرنسس امینہ تھی یا سلطانہ نام کی ایک عام عورت تھی۔ ماں تو صرف ماں ہی ہوتی ہے۔ میرے وہ بہن بھائی جنہوں نے اس وطن کے لیے جان قربان کی، ایک ہی ماں سے پیدا ہوئے تھے اور ان کی یاد آج بھی میرے لیے ایک مقدس امانت ہے۔ یہ جذبات کے بندھن ہیں۔ حالات کی گردش انہیں توڑ نہیں سکتی۔"

"مجھے تجھ پر فخر ہے سکندر بخت!" محسن نے کہا۔ "اگر تیرے خیالات بدل جاتے تو مجھے دکھ ہوتا۔"

"اگر آج میرے ماضی کے کسی راز پر پڑا ہوا پردہ اٹھ جائے۔" میں نے کہا۔ "اور تم میرے لیے غیر ہو جاؤ۔ تم سب جن کو میں اپنا خاندان سمجھتا ہوں تو دکھ مجھے بھی ہو گا۔ اگر آج رابعہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تو میرا دوست ہے یا شہلا نے مجھے بھائی کہا ہے تو اس لیے کہ آج میں جیسا بھی ہوں اس رشتے سے تمہارا ہوں۔ جس کا میرے ماضی سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اگر میں نے کبھی کسی سازش کا شکار ہو کے نادانستگی میں کوئی قتل کیا ہوتا تو کیا تم مجھ سے رشتے توڑ لیتے؟"

"میرا خیال ہے سکندر، اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اپنی نگاہ مستقبل پر رکھ۔ پیچھے مڑ کے دیکھے گا تو تیرے لیے آگے قدم بڑھانا مشکل ہوتا جائے گا۔"

"مجھے اپنے ماضی پر نہ کوئی ندامت ہے اور نہ افسوس۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اور میں اپنے آپ سے نہیں ڈرتا۔ جب بھی مجھے موقع ملا، میں سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔ میں گیان چند کا سراغ بھی لگاؤں گا۔ بے شک وہ بہت بڑا ملک ہے اور پچاس ساٹھ کروڑ کی آبادی میں ایک آدمی کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے لیکن ہو سکتا ہے سلطان آباد سے گیان چند کا کوئی اتا پتا مل جائے۔ سرحد کے پار بھی اچھے لوگ بستے ہیں اور انہی میں سے ایک پنڈت دیانا تھ تھے جو شاید اب دنیا میں نہ ہوں۔ مگر ان کا ایک بیٹا تھا موہن اور اس کی بہن تھی موہنی۔ ان سے بھی میرا بہت گہرا جذباتی رشتہ ہے۔ وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے لیکن فی الحال مجھے یہاں کے مسائل سے نمٹنا ہے اور میں اتنا آزاد بھی نہیں ہوں کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہوں چلا جاؤں۔ یہ بتا کہ تو نے میرے سر پر کیا مارا تھا جس سے میں بے ہوش ہوا؟"

"ڈنڈا۔" محسن ہنسا۔ "اس کے سوا تجھے قابو کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ تو پاگل ہو رہا تھا۔"

اچانک مجھے کچھ اور یاد آیا اور میں اٹھ بیٹھا۔ "محسن! میں تو یہ بات بالکل ہی بھول گیا تھا۔ پرسوں ہم نے دلاور کے لیے جال پھیلایا تھا۔۔۔ اور ڈی سلوا۔۔۔"

"مانا کہ تو بہت بڑا شکاری ہے۔" محسن نے لیٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بہت لمبی بات ہے۔"

"اچھا صرف اتنا بتا دے کہ دلاور مارا گیا یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور ڈی سلوا پکڑا گیا یا نہیں؟"

"اس سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دینا مشکل ہے۔" محسن پھر بیٹھ گیا۔ "بہت سی باتیں ہیں جو اخبار والوں کو معلوم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً یہ کہ جب ہم ڈی سلوا کو اس کے گھر کے دروازے پر ڈال کر بھاگ آئے تھے تو بعد میں کیا ہوا تھا۔۔۔ کال بیل کی آواز پر ایک نوکر دروازے تک آیا تھا اور اپنے آقا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ ڈی سلوا بے ہوش تھا اور نوکر کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ صاحب کو کیا ہوا ہے۔ سابقہ تجربے کی بنا پر اتنا اندازہ تو اس کو ہو گیا تھا کہ صاحب نشے میں دھت نہیں ہے۔ گھبراہٹ میں اس نے ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا جس نے غور سے معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ڈی سلوا کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشانات بھی تھے اور رسی سے باندھے جانے کے بھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں یہ ممکن تھا کہ کسی نے اسے لوٹنے کے لیے یا کسی بری نیت سے اغوا کیا ہو۔ چنانچہ یہ پولیس کیس ہے اور اس کی رپورٹ فوراً کر دینی چاہیے۔ بات اگر گھر تک محدود رہتی تو ڈی سلوا کے ہوش میں آنے تک نوکر کچھ بھی نہ کرتا اور اس نے کچھ کیا بھی نہیں تھا لیکن اس ڈاکٹر نے پہنچتے ہی تھانے فون کر دیا۔۔۔

وہ کچھ اصول پرست اور قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا ڈاکٹر تھا۔ نتیجہ یہ کہ اُدھر ڈی سلوا ہوش میں آیا، اُدھر قانون کے رکھوالے آ گئے۔ اب ڈی سلوا ان کو بتاتا بھی تو کیسے بتاتا؟ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی گاڑی کہاں کھڑی ہے اور چوہدری دلاور کہاں ہے۔ ہم نے اپنا پورا پلان اس کو بتا دیا تھا کہ ہم اس کی گاڑی میں دلاور کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں لیکن ہماری پوزیشن محفوظ ہے چنانچہ دلاور کے قتل کا الزام اگر آیا بھی تو صرف اس کی ذات پر آئے گا۔ اب تک وہ ہمیں اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ اس نے یہ فرض نہیں کیا ہو گا کہ ہم محض بکواس فرما رہے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا ہو گا کہ ہمیشہ کی طرح ہم نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جرچکو کہاں پر عمل بھی کیا ہوگا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم نے دلاور کو کہاں لے جا کے مارا اور کیسے مارا، وہ دس فیصد امکانات کو مسترد بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم نے ڈرامہ کیا ہو اور ہمارا مقصد دلاور سے کچھ معلومات حاصل کرنا اور اسے دہشت زدہ کرنا ہی ہو۔ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے پولیس کو ٹال دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں جس کی رپورٹ درج کرائی جائے۔ میرا اپنا قیاس ہے کہ ڈی سلوا نے پولیس کو نامعلوم افراد سے لڑائی جھگڑے کی کہانی سنا دی ہوگی کہ وہ ڈی سلوا کو لوٹنا چاہتے تھے۔ قاضی کے گھر کے تو چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اس کے نوکروں نے ہی معاملہ سنبھال لیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا ہوگا کہ صاحب کبھی زیادہ پی لیتا ہے تو آؤٹ ہو جاتا ہے اور ایسی حالت میں کیا بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ رپورٹ ایک ڈاکٹر کی تھی اس لیے پولیس کو جانا پڑا لیکن جانا انہیں مہنگا نہیں پڑا۔ وہ معاملے کو بھول جانے کا نذرانہ لے کر واپس چلے گئے تھے۔ غریب آدمی ہوتا تو تھانے لے جاتے اور کچھ 'تفتیش' بھی کرتے۔"

"ڈی سلوا نے ہمارا نام نہیں لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "یہ نہیں کہا کہ ہم اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اپنی گاڑی کے چوری ہو جانے کی رپورٹ تک نہیں لکھوائی تھی؟"

"اس وقت تو نہیں لکھوائی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ایک تو اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سوچ سمجھ کے کوئی فیصلہ کر سکتا۔ اس کو سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ پھر یہ کہ وہ انتظار کرنا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے، اس کی گاڑی کہاں ملتی ہے، دلاور کی لاش ملتی ہے یا وہ بھی اسی کی طرح اپنے گھر پہنچتا ہے۔ ڈی سلوا نے دیکھ لیا تھا کہ قتل کی دھمکی دینے اور مار کے گاڑ دینے کا مصمم ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود ہم نے اس سے کچھ معلومات حاصل کیں، اسے دہشت زدہ کیا لیکن آخر میں اس کو قتل کرنے کے بجائے گھر چھوڑ گئے۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ شاید دلاور کے ساتھ بھی ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہ کیا ہو اور صبح ہونے تک دلاور سے رابطہ قائم ہو جائے تو آئندہ کی فکر کی جائے اور ہمارے خلاف کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ وہ ڈرتا بھی ہوگا کہ جو کچھ ہم اس سے پوچھ چکے ہیں وہ کسی بھی لمحے اس کی پوزیشن خراب کر سکتا ہے۔ اطمینان کا ایک پہلو صرف یہ تھا کہ ہم نے دلاور کو قتل نہیں کیا ہوگا تو اس سے بھی بہت کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کے اپنی اپنی دکھ بھری کہانی سنا سکتے تھے اور اعتراف کر سکتے تھے کہ ہمارے جبر و تشدد اور ہماری بدمعاشی سے مجبور ہو کے انہوں نے ہمارے سامنے کتنا سچ بولا اور کتنا جھوٹ۔ اور جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن اب سوچنا چاہیے کہ آئندہ کیا ہوگا اور ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔"

"اور اگر بعد کے نتائج ڈی سلوا کے اندازوں کی نفی کر دیں؟" میں نے کہا۔

"بعد میں یہی ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یعنی ڈی سلوا نے عقل مند بننے کی کوشش میں زبردست بیوقوفی کا ثبوت دیا۔ ہوا یہ کہ ٹھیک آٹھ بجے ریڈیو ٹرانسمیٹر میں رکھا ہوا بم پھٹ گیا اور اس زیر تعمیر عمارت کے باتھ روم کی چھت دھماکے سے گر گئی جس کے ساتھ والے کمرے میں دلاور قید تھا۔ کمرے کی ایک دیوار اور چھت کا تھوڑا سا حصہ بھی منہدم ہوئے لیکن دلاور ذرا دور تھا اس لیے معمولی زخمی ہوا۔ کمرے کی باقی دیواریں بھی تڑخ گئی تھیں۔ میں نے خود بعد میں وہاں جا کے دیکھا تھا۔ اس وقت آپ یہاں محو استراحت تھے اور کچھ دیوانگی سے شوق فرما رہے تھے۔ خیر حسب توقع دھماکا ہوتے ہی ادھر ادھر کے لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے دلاور کو آزاد کیا اور اتنی دیر میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ جائے واردات پر چشم دید گواہوں نے تو وہی بتایا جو دیکھا تھا لیکن دلاور نے تمہارے خلاف اغوا کا اور ہم دونوں کے خلاف قتل کی سازش کا الزام عائد کر دیا۔ اب کنفیوژن سے بڑی عجیب و غریب اور مزاحیہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دلاور کی بیوی نے کہیں اپنے شوہر کو فون کیا تھا تو اسے بتایا گیا تھا کہ دلاور صاحب کو ڈی سلوا صاحب اپنی گاڑی میں کہیں لے گئے ہیں۔ اسے حقیقت کا علم کہاں تھا۔ یہی بات اس نے پولیس کو بتا دی۔ پولیس نے ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے چوکیدار سے بیان لیا تو اس نے حلف اٹھا کے کہا کہ دلاور صاحب خود گاڑی چلا رہے تھے اور گاڑی ڈی سلوا صاحب کی تھی۔ گیٹ سے گزرتے ہوئے چوہدری صاحب نے اس کے سلام کا جواب بھی دیا تھا اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر ڈی سلوا صاحب موجود تھے۔ چوکیدار بے چارہ کیسے کہتا کہ اس نے ڈی سلوا صاحب کو دیکھے بغیر گاڑی کو اندر جانے دیا تھا اور واپسی میں چوہدری صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ دلاور کی بیوی اور چوکیدار کا بیان دلاور کے بیان کی صاف نفی کرتے تھے۔ کسی نے بھی کارخانے کے اندر آتے جاتے اور دلاور کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دلاور کا خود گاڑی

کر لے جانا اور بالکل نارمل طریقے پر چوکیدار کے سلام کا جواب دینا مزید ثبوت فراہم کرتا تھا کہ وہ جہاں بھی گیا تھا، اپنی مرضی سے گیا تھا۔ چوکیدار کیسے کہہ دیتا کہ دلاور کا نارمل نظر آنا اور ڈرائیونگ کرنا بھی ایک امر مجبوری تھا، چنانچہ اس نے تیرا نام ہی نہیں لیا اور وہ ابھی تک اپنے بیان پر قائم ہے۔ بے چارے دلاور کو خود اس کی بیوی اور اس کے ایک ملازم نے جھوٹا کر دیا۔ دوسری طرف ڈی سلوا پھنس گیا۔ سب سے پہلے تو وہ آفس نہ جانے کی وجہ نہیں بتا سکا۔ چونکہ پولیس نے الگ الگ بیانات لیے تھے اور ڈی سلوا نے نوکروں کو صحیح بریفنگ نہیں کی تھی اس لیے نوکروں نے اپنے بیان میں کہہ دیا کہ صاحب معمول کے مطابق دفتر گئے تھے۔ اب بے چارہ ڈی سلوا کیا بتائے کہ سارا دن اس نے کہاں گزارا اور کیسے گزارا۔ اور وہ رات کو ہی پولیس کے سامنے حقیقت بیان کر دیتا تو اس کی پوزیشن خراب نہ ہوتی مگر اس نے جلد بازی سے گریز کیا اور معاملے کو چوہدری دلاور سے ملاقات تک التوا میں رکھنے کی حماقت کی۔ اب وہ کیسے ثابت کرتا کہ سہلا اس سے ملی تھی اور پھر کوئی اسے گاڑی سمیت ہائی جیک کر کے لے گیا تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ گھر سے دفتر جاتے ہوئے اس کو ایک پرانا دوست مل گیا تھا یا اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی مگر گاڑی اس کے لیے مسئلہ بن گئی۔ وہ کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکا کہ اس کی گاڑی ایک غیر آباد علاقے میں کھڑی ہوئی کیوں پائی گئی؟ اور اس نامکمل کوٹھی کے سامنے والی سڑک پر کیسے پہنچی جس میں بم کا دھماکا ہوا تھا اور دلاور قید تھا۔ اگر کوئی اس کی گاڑی لے گیا تھا یا گاڑی چوری ہو گئی تھی تو ڈی سلوا نے رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کیس الگ الگ تھانوں کے ہیں بلکہ اس میں تو تین تھانے ملوث ہو گئے۔ چوہدری دلاور کے اغوا کا کیس شاہدرہ کے ایک تھانے میں ہے۔ جہاں دھماکا ہوا تھا وہ ماڈل ٹاؤن تھانے کا علاقہ ہے اور تیسرا تھانہ وہ ہے جس کی حدود میں ڈی سلوا کی گلوب سینما والی کوٹھی آتی ہے۔ پولیس والے رات کو ڈاکٹر کی رپورٹ پر گئے تھے تو بڑے خوش لوٹے تھے کہ نہ پرچی نہ پرچا۔ ہاتھ میں آنے جانے کا خرچا۔ لیکن اب انہوں نے بھی ڈی سلوا اور اس کے ایک نوکر کو غلط بیانی کا ملزم بنا دیا کیونکہ وہ ڈاکٹر اپنی بات پر اڑا ہوا ہے کہ میں نے تو رات ہی کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔ اب تھانے والوں نے کچھ نہیں کیا اور ڈی سلوا نے منہ بند کر کے انہیں واپس بھیج دیا تو یہ دونوں کی مجرمانہ غلطی ہے۔"

"آخر پولیس کسی نتیجے پر تو پہنچی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"پولیس خود تو کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتی تھی اور نہ پہنچنا چاہتی تھی۔" محسن نے کہا۔ "ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے معاملات ان کے ہاتھ میں رہے۔ مقدمہ درج کرنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملوث کر کے اپنی 'تفتیش' کے عمل کو جاری رکھ سکیں اور پھر فریقین سے معاملات کو دبانے کا جتنا معاوضہ وصول کر سکیں کریں۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ غلطی کس کی تھی۔ ظلم کس نے کیا تھا، کس پر کیا تھا اور قانون کے تقاضے کیا ہیں؟ تفتیش، سماعت اور سزا کے نام سے سب کو ہراساں رکھنے میں ہی ان کی خوشحالی کا راز مضمر ہے۔ اگر انکل رضوی نے مداخلت نہ کی ہوتی تو تیرے خلاف بھی بہت سی دفعات کے تحت تفتیش شروع ہو جاتی لیکن ان کو یقین تھا کہ دلاور بکواس کرتا ہے۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سارا دن ہم کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ خود بیگم رضوی کی گواہی ہمارے حق میں ہے اور ہمیں بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے شوہر کو بتا دیا تھا کہ ہم ناشتے کے بعد کوارٹر میں چلے گئے تھے اور دوپہر کے کھانے کے وقت بھی گھر میں موجود تھے۔ اصل میں وہ ہم دونوں سے بہت خوش ہیں بلکہ ہم تینوں سے۔"

"کیونکہ ہم اپنی باتوں سے ان کا دل بہلاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ان کو ہنساتے ہیں۔"

"بالفاظ دیگر ایک سیدھی سادی عورت کو بڑی نیک نیتی سے بے وقوف بناتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ معاف کرے، خیر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بیگم رضوی ہماری خاطر جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔ وہ رضوی صاحب کی طرح سخت اصول پرست اور محبت پر فرض کو مقدم رکھنے والی چیز نہیں ہیں۔ انکل رضوی کا تو اصول یہ ہے کہ ادائے فرض میں وہ تعلقات کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ میرے ڈیڈی ممی یا تیرے مرحوم والد نے بھی کبھی ان سے کوئی ناجائز کام کرنے کو نہیں کہا لیکن ہمارے کیس میں انہیں صاف گڑبڑ نظر آتی ہے۔ معاملات اگر لندن تک محدود رہتے تو وہ ہمارے سوا کسی کو قصوروار نہ سمجھتے مگر یہاں انہوں نے اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا ہے۔ چچا وزیر خان مرحوم کے حالات اور ان کی موت کے غیر معمولی اسباب، سلامت شاہ کا قتل، رابعہ کے گھر کی تباہی اور اب یہ خط جس کی خاطر منشی مرحوم کے پورے خاندان نے اپنی جان قربان کر دی۔ ان سب باتوں نے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ ڈی سلوا اور دلاور ہی ہمارے اصل دشمن ہیں جن کا ساتھ دینے والے استاد پیڈرو سے لے کر نواب خسرو جمشید تک بہت سے لوگ تھے۔ ان کی مجبوریاں دو ہیں۔ ایک تو میر شرافت علی کے قتل کا الزام جس میں حالات اور واقعات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی شہادت مجھے مجرم ثابت کرتی ہے۔ دوسری مجبوری ہماری فطرت ہے۔ انہیں ہم سے گلہ ہے کہ ہم اُن پر یا پولیس پر بھروسہ نہیں کرتے اور جائز و ناجائز طریقے پر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر مزید خرابی کے اسباب پیدا کرتے ہیں لیکن اس دن کے بارے میں ان کو پورا یقین ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اس سے پہلے کی رات کے واقعات کا ان کو کوئی علم نہیں۔ صبح انہوں نے ہمیں سو کر اٹھ کر ناشتے کے لیے آتے دیکھا تھا۔ جب وہ آفس گئے تھے تو ہم گھر پر تھے جب رابعہ کورٹ گئی تھی تب بھی ہم ناشتے کی میز پر ہی بیٹھے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک ہماری موجودگی کی گواہ بیگم رضوی ہو گئیں۔ شام کے وقت پھر انکل رضوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہم سو کر اٹھے ہیں اور کوارٹر سے برآمد ہوتے ہیں۔ چھ بجے تک ہم نے ان کے ساتھ چائے پی تھی اور گپ لگائی تھی اور پھر پیدل روانہ ہوتے تھے کہ فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم ٹھیک وقت پر واپس پہنچے تو ہمارے پاس دو ٹکٹوں کے پھاڑے ہوئے کوپن بھی تھے۔ رضوی صاحب بہت ذہین افسر ہیں صرف کوپن دیکھ کر وہ کبھی تسلیم نہ کرتے کہ ہم واقعی فلم دیکھ رہے تھے لیکن شام چھ بجے تک ہماری گھر میں موجودگی شبے سے بالاتر تھی۔ پھر وہ کیسے مان لیتے کہ چوہدری دلاور اور ڈی سلوا سچ بول رہے ہیں۔ پولیس والے جب ہمارا بیان لینے پہنچے تو صرف میں موجود تھا اور میں نے بڑی معصومیت سے بتا دیا تھا کہ ہم تو گھر سے نکلے ہی نہیں تھے۔ یہ ساری کہانی جھوٹی ہے جو ڈی سلوا اور چوہدری دلاور نے آپس میں سازش کر کے ہمارے خلاف گھڑی ہے۔ اپنے یقین کی بنیاد پر انکل رضوی نے میری تائید کی۔ تفتیش کے لیے آنے والا ایک انسپکٹر تھا وہ بے چارہ کسی ایس۔ ایس۔ پی کے سامنے کیا بولتا۔ ایس ایس پی بھی وہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ باپ کو نہ بخشے۔ رضوی صاحب نے چوہدری دلاور اور ڈی سلوا پر سخت ناراضگی ظاہر کی۔ انسپکٹر سے کہا کہ ان دونوں بدمعاشوں سے ذرا سختی کے ساتھ پوچھو کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے کے لیے انہوں نے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟ کیا وہ دونوں سب کو احمق اور گدھا سمجھتے ہیں؟"

..... محسن نے قہقہہ مارا۔" اور میری توقعات کے عین مطابق انکل رضوی نے انسپکٹر سے بڑا اچھا سوال کیا۔ انہوں نے کہا۔ ' انسپکٹر! ذرا عقل سے کام لو۔ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک شخص گاڑی چرائے' اپنے دو جانی دشمنوں کو اغوا کرے۔ مارے' پیٹے اور پھر ان میں سے ایک کو بہ حفاظت گھر پہنچا دے۔ دوسرے کو قتل کرنے کی ایسی احمقانہ کوشش کرے۔ بم باتھ روم میں تھا اور دلاور کمرے میں۔ کیا بم کو اور دلاور کو باتھ روم میں ایک ہی جگہ نہیں رکھا جا سکتا تھا، [illegible] پرخچے اڑ جاتے۔ اس کے ساتھ ڈی سلوا کو بھی بند کر نا کیا مشکل [illegible] دونوں کا قصہ ہی پاک ہو جاتا۔ بالفرض محال محسن اور سکندر نے یہ حرکت کی ہوتی تو کیا ان پر کوئی الزام آ سکتا تھا؟ میری اور بیگم [illegible] واقف کی اور مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی گواہی تو یہی ہو گی کہ یہ دونوں سارا دن گھر میں ہی رہے، جو ایک حقیقت ہے اور ایسے گواہوں کی گواہی کو کوئی عدالت مسترد نہیں کر سکتی۔ کم سے کم میرے بارے میں تو دنیا جانتی ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔'"

"حالانکہ وہ اس وقت بھی جھوٹ بول رہے تھے۔" [illegible] نے شرمندگی سے کہا۔

"ہاں۔ اور اس یقینِ کامل کے ساتھ کہ یہی سچ ہے۔" محسن نے اعتراف کیا۔" انہوں نے انسپکٹر کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ ڈی سلوا کو چوہدری دلاور نے گھر کے دروازے پر اس حالت میں چھوڑا کہ خود بخود شبہ پیدا ہو۔ پھر وہ ڈی سلوا کی گاڑی چلا کے اس ویران کوٹھی تک لے گیا جہاں اس نے پوری احتیاط سے بم کو باتھ روم میں رکھا اور خود دوسرے کمرے کے آخری گوشے میں کھڑا رہا۔ اسے معلوم ہو گا کہ بم کی طاقت کتنی ہے اور آر سی سی کی چھت کتنی مضبوط ہے۔ شاید اس کے کسی آدمی نے اسے باندھ بھی دیا ہو۔ دھماکے کی آواز پر لوگوں کا آ جانا یقینی تھا۔ انسپکٹر تو تیرا بیان لینے کی رسمی کارروائی بھی پورا کرنا چاہتا تھا لیکن انکل رضوی نے کہا کہ سکندر کو ملیریا ہے اور بہت تیز بخار ہے۔ جو پوچھنا ہے دو دن بعد پوچھ لینا۔ ظاہر ہے انسپکٹر اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔"

"انکل رضوی نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے [illegible] میں کہا۔

"یہ جھوٹ نہیں تھا۔" محسن نے بُرا مان کے کہا۔" وہ خط پڑھ چکے تھے اور تیری حالت بھی دیکھ چکے تھے۔"

تین افراد بیک وقت کمرے میں داخل ہوتے۔ سب سے آگے ڈاکٹر تھا جسے میں نے عالمِ ہوش میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا۔ ویسے بھی میڈیکل بیگ [illegible] دل کی دھڑکن شمار کرنے والا گلے کا ہار اس کے ڈاکٹر ہونے کا اشتہار تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ اور شہلا تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں نے زبردستی ڈاکٹر کو آگے دھکیلا ہے اور اب ریوالور لیے اس کے پیچھے چل رہی ہیں۔

"ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر صاحب!" رابعہ نے باقاعدہ شکایت کرتے ہوئے کہا۔" یہ ہے آپ کا دوسرا باغی تیمار دار۔ دونوں آپ کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے ہم دونوں کو ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور نہایت خطرناک عزائم کے ساتھ میرے قریب بیٹھ کر اپنا بیگ کھولنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کوئی انجکشن بھونک کر پھر اتنا غفیل کرنا چاہتا ہے۔

"قبلہ ڈاکٹر صاحب!" میں کہنا شروع کیا۔" آپ یقین کیجیے میں بالکل صحت مند ہوں اور مجھے علاج یا تیمارداری کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر یوں سلوموشن میں سرنج بھرتا رہا جیسے میں کسی اور سے مخاطب ہوں۔ اور شہلا مسکراتی رہی۔" البتہ یہ خواتین" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔" ان کو کچھ۔ ۔ ذہنی امراض لاحق ہیں۔ پاگل تو خیر نہیں ہیں مگر۔ ۔"

سلوموشن میں حرکت کرنے والے ڈاکٹر نے اچانک بجلی کی طرح لپک کر میرا بازو تھام کر انجکشن لگانے کی ناکام کوشش کی۔ بڑے وقت پر میں نے پلٹا کھایا اور بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گرا۔

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری۔ تکیے میں گھپ جانے والے انجکشن کی سوئی نکالی اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ جو ایک طرح سے مشن کی ناکامی کا اعلان تھا۔" میں کچھ نہیں کر سکتا رابعہ بی بی!"

"کیا آپ کے پاس وہ گن نہیں ہے؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔" جس سے بے ہوش کرنے والے فائر کیے جاتے ہیں۔ میں نے ایک فلم میں دیکھا تھا کہ افریقہ میں گینڈے کس طرح پکڑے جاتے ہیں۔"

"یہ تقریباً ویسی ہی کوشش تھی۔" میں نے اٹھ کر فاتحانہ مسرت سے کہا۔" لیکن جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔"

"اس کو میں بے ہوش کر سکتا ہوں۔" محسن نے دعویٰ کیا۔" لیکن میرا خیال ہے' اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

ڈاکٹر بہت کم گو تھا یا شاید اس معقولے پر عمل پیرا تھا کہ جوابِ جاہلاں باشد خاموشی۔ وہ روانہ ہونے ہی والا تھا کہ خواتین کو آدابِ میزبانی کا خیال آیا اور وہ چائے لانے کے لیے چلی گئیں۔ میں نے سنجیدگی سے معذرت کی اور ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ میں اب واقعی ٹھیک ہوں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جو بے ہوش پڑے رہنے سے زیادہ ضروری ہیں۔"

"کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں۔" ڈاکٹر نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔" اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔"

اسی وقت شہلا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی تو میں حیران ہوا۔ یقیناً چائے پہلے سے تیار تھی ورنہ ایک منٹ میں کیسے آ جاتی۔ ڈاکٹر ایسا مظلوم صورت تھا کہ بے اختیار اسے چھیڑنے کو دل چاہتا تھا۔ جب وہ چائے پی رہا تھا تو میں نے بڑے فخر سے اس کو بتایا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں جوڈو اور کراٹے میں بلیک بیلٹ لیتے لیتے رہ گیا چنانچہ پہلے حملے کی ناکامی کے بعد وہ دوسری کوشش کرتا تو میری جگہ خود لیٹا ہوتا۔ انجکشن لگنے سے پہلے ہی میں اسے ناک آؤٹ کر دیتا۔ ڈاکٹر خاموش رہا اور رابعہ مجھے بدتمیزی کے اس مظاہرے پر گھورتی رہی۔

"اچھا مسٹر بلیک بیلٹ!" ڈاکٹر نے چلتے چلتے کہا۔" وقت ملے تو میری بات پر بھی غور کرنا۔"

کمرے میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران اس نے دو ہی جملے بولے اور قابلِ اعتبار صرف دوسرا ہی جملہ تھا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد رابعہ نے اور شہلا نے ہنسنا شروع کیا اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا تو میں نے اور محسن نے بے وقوفوں کی طرح ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ کیا چکر ہے مسٹر شیروانی؟" میں نے بیڈ پر لیٹ کر کہا۔

"چکر تو ابھی آپ کو آئیں گے۔" شہلا نے کہا۔" یہ کمرہ آپ کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے گا اور دنیا اندھیر ہو جائے گی۔"

"دراصل مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا سکندرِ اعظم!" رابعہ بولی۔" کہ تم مزاحمت کرو گے حالانکہ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے باہر ہی ڈاکٹر سے بات کر لی تھی اور اس نے دوسرا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ چائے آپ کو کیسی لگی؟"

"یہ چائے تھی یا کافی؟" میں نے ڈاکٹر کی اور رابعہ کی بات پر ایک ساتھ غور کیا اور فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جو دوا مجھے انجکشن کے ذریعے نہیں دی جا سکی' وہ مجھے چائے میں دے دی گئی ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔

"فراڈ۔" میں نے چلا کے کہا۔" ایک مجبور اور لاچار جاں بلب مریض کے ساتھ فراڈ۔ پولیس۔ ۔ ۔"

خواب آور دوا کا اثر زائل ہوا تو میری آنکھ اس وقت کھلی جب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک لائٹ دیوار کی اور ایک ٹیبل لیمپ میرے سرہانے روشن تھی۔ کچھ دیر تو کمرے کی ہر چیز آؤٹ آف فوکس رہی لیکن دس منٹ بعد دھند چھٹ گئی اور میں نے ہر صورت کو اپنے مقابل صاف دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر یعنی دروازے کی طرف تین کرسیاں پڑی تھیں۔ دو پر محسن اور رابعہ آمنے سامنے چپ بیٹھے تھے۔ تیسری خالی کرسی رضوی صاحب کی تھی جو ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور خاصے متفکر نظر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آ تے تھے۔

"گڈ مارننگ انکل رضوی!" میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آج مجھ پر بہت ظلم ہوا۔ ۔ ۔"

"مجھے معلوم ہے۔" انہوں نے درشتگی سے میری بات کاٹ دی اور ایک ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں طرف بھی دو کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر جو پولیس انسپکٹر بیٹھا تھا اسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔

"ہیلو ایس آئی شیخ!" میں نے حیرت اور مسرت سے کہا اور مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟" اس وقت تک میرا خیال یہی تھا کہ چراغ دین جیسے منشیات کے اسمگلر کی گرفتاری میں مدد کرنے پر وہ میرا شکریہ ادا کرنے آیا ہوگا یا محض میری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔

"میرا ٹرانسفر کر دیا گیا ہے مسٹر سکندر!" ایس آئی سید اکرام شیخ نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ جو میرے لیے غیر متوقع بات نہیں تھی۔

"تم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو؟" رضوی صاحب نے حیرانی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ "خیر یہ بڑی اچھی بات ہے۔ سکندر!" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "سب انسپکٹر شیخ ایک بہت اصول پرست اور ایماندار انسپکٹر ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے انکل!" میں نے کہا۔ "اور اسی لیے اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے پر ان کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ تبدیلی ہو گئی۔"

"آپ نے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ ہم سازگار حالات میں ملے ہوتے تو اچھے دوست بن سکتے تھے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ ہماری دوسری ملاقات بھی ایسے ہی حالات میں ہو رہی ہے۔"

"دراصل مسٹر شیخ ایک کیس کے سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنے کے لیے آئے ہیں۔" رابعہ نے بروقت مداخلت کر کے مجھے خبردار کر دیا کہ میں سوچے سمجھے بغیر منہ سے کوئی بات نہ نکالوں۔

"ان کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

"انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "پولیس کے ریکارڈ پر تمہارا پتہ وہی ہے جو میرا ہے۔ میں ان کو یہاں لے آیا ہوں اور مجھے یہاں رابعہ لائی تھی۔"

"ویسے آپ کو اپنا پتہ بدلنے سے پہلے عدالت کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔

"جس روز میں گھر بدلوں گا یہی کروں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میری بہن کا گھر ہے۔"

"میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق آپ کی کوئی بہن نہیں ہے۔" انسپکٹر شیخ نے ایک خاصی ضخیم فائل دکھا کے کہا۔ "آپ وزیر خان مرحوم کے ایک ہی وارث ہیں۔"

بے اختیار میں نے رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا ایک ہی سوال کا جواب انکار بھی ہو سکتا ہے اور اقرار بھی؟ آخر میں کس کا وارث ہوں؟ ریاست سلطان آباد کے سابق حکمران نواب خورشید کا؟ یا اس وزیر خان کا جس نے پاکستان کی خاطر اپنے پورے خاندان کی زندگی کا نذرانہ دے کر صرف مجھے بچا لیا تھا؟ اور جو لکھ پتی ہونے کے باوجود بے بسی کی موت مرا؟ ایسے سوالات میرے ذہن میں پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ اور محسن کے علاوہ رضوی صاحب نے میرے خیالات کو میری صورت پر پڑھ لیا تھا اور مجھ سے نظر ملاتے ہوئے کترا رہے تھے۔

"مسٹر سکندر! میرا چراغ دین کے کیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کیس کی تفتیش اپنے جانشین کے سپرد کرنے سے پہلے مجھے آپ کے بارے میں اور آپ کے والد کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں مگر میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔ اب جو کیس مجھے دیا گیا ہے اس کا تعلق تین افراد سے ہے۔ دو کے بارے میں میڈیکل رپورٹ اور اتفاقی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا تھا۔ ایک کا نام عبدل تھا اور دوسرے کو شیدا کہا جاتا تھا اور یہ دونوں میر شرافت علی کے ملازم تھے۔ ۔ ۔"

"اور میر شرافت علی کا قاتل میں ہوں؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا۔ "رائٹ؟"

"یہ فیصلہ تو صرف عدالت ہی کر سکتی ہے۔" انسپکٹر شیخ نے کہا۔ "میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تم پر اس قتل کا الزام ہے۔" شہلا کے اندر آ جانے کے باعث وہ خاموش ہو گیا۔ شہلا نے مجھے دوا دی اور چائے کی ٹرے درمیان میں رکھ کے خاموشی سے باہر چلی گئی۔ "میں اس لڑکی کو بہن کہتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام شہلا ہے۔"

"وہیں ہلاک ہونے والی بوڑھی عورت عبدل کی ماں تھی۔" انسپکٹر شیخ نے میری بات کو اہمیت دیے بغیر نگاہ فائل پر رکھی۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب ہوئی تھی۔"

"پولیس کو اس واردات کی اطلاع کس نے دی تھی؟" میں نے رابعہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر آگے بڑھایا۔

"مجھے بتایا گیا تھا۔" شیخ نے چائے کا کپ لیتے ہوئے رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ "کہ آپ بیمار ہیں، کچھ ملیریا وغیرہ تھا۔ چنانچہ میں شام کو ایس پی صاحب کے گھر پہنچا۔ ایس پی صاحب کے پاس جانے کا ایک مقصد یہ تھا کہ آپ کی خیریت معلوم کروں اور دوسرا مقصد آپ سے ان دونوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یعنی عبدل اور رشید سے کے بارے میں کیونکہ وہ ۔ ۔ ۔ شرافت علی کے قتل کے چشم دید گواہ تھے اور استغاثہ کا سارا کیس ان کی گواہی پر منحصر تھا۔ ۔ ۔"

"کتنی عجیب بات ہے انسپکٹر شیخ!" میں نے کہا۔ "صفائی کا صرف ایک ہی گواہ تھا، سلامت شاہ۔"

"پلیز۔ آپ مجھے بات ختم کرنے دیں۔" انسپکٹر شیخ نے کپ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایس پی صاحب نے بتایا کہ آپ ... ہیں اور آپ کو ابھی تک دُہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اخبار آپ نے دیکھا نہیں اور باقی ... نے بیماری کی وجہ سے آپ کو یہ بات نہیں بتائی۔" وہ ذرا دیر کے لیے رُکا، سگریٹ جلا کے اس نے ایک کش لیا اور دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ دو دن پہلے کی بات ہے یعنی منگل کی رات کو تقریباً ایک بجے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ بدھ کی صبح ایک بجے کسی شخص نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ اتفاق سے رات کی ڈیوٹی پر میں تھا۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا تو فون کرنے والے نے کہا کہ وہ کسی ذمے دار افسر سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں سب انسپکٹر شیخ بول رہا ہوں اور تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ اس نے کہا۔ 'جناب انسپکٹر صاحب! سوالات بعد میں کیجیے گا، پہلے میرا بیان لکھ لیجیے یا ٹیپ کر لیجیے کیونکہ میں شدید زخمی ہوں اور مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی مر جاؤں اور میں بیان دیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔' یہ اتفاق ہے کہ اس وقت تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ چند روز قبل ایک چور پکڑا گیا تھا اور اس کے قبضے سے چوری کا مال برآمد ہوا تھا اس میں یہ ٹیپ ریکارڈر بھی شامل تھا جو بالکل نیا تھا۔ فون کرنے والے کی آواز بتاتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر پلگ کر کے آن کیا اور اسے ٹیلی فون سے منسلک کر دیا۔ وہ گرنیڈگ جرمنی کا خاصا مہنگا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ماڈل ٹی کے ۲۴۔ جو میرے گھر میں بھی ہے۔ اس میں ٹیلی فون کے پیغامات ریکارڈ کرنے کا خصوصی نظام ہے۔ آپ اسے ٹیلی فون سے منسلک کر دیں تو یہ آپ کی عدم موجودگی میں آنے والی ہر کال ریکارڈ کر سکتا ہے اور آپ جب بھی واپس آئیں ٹیپ کے ذریعے یہ پیغامات سن سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اس کے طریقہ استعمال سے واقف تھا اس لیے مجھے ٹیلی فون اور ٹیپ ریکارڈر کا کنکشن ملانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ عبدل کا وہ بیان جو اس نے مرنے سے پہلے دیا لفظ بہ لفظ اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہو گیا۔ جب میں پولیس پارٹی کے ساتھ عبدل کے پتے پر یعنی۔ ۔ ۔ میر شرافت علی کی پرانی کوٹھی 'رین بسیرا' پر پہنچا تو عبدل ایک بیڈ روم میں ٹیلی فون کے قریب مرا پڑا تھا۔ بعد میں ٹیپ کی مدد سے ہم نے اس بیان کو کاغذ پر اتار لیا۔ اگر تھوڑی سی مہلت ملتی تو میں تحریری بیان پر عبدل کے دستخط بھی حاصل کر لیتا۔"

"لیکن اب تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ٹیپ جو ہے اور جہاں تک میری قانونی معلومات کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ وہ بیان سچ سمجھا جاتا ہے جو کوئی شخص مرنے سے پہلے دیتا ہے۔"

میری بات کا انسپکٹر شیخ نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کے جوتے سے مسل دیا کیونکہ آس پاس کوئی ایش ٹرے نہیں تھا۔ "آپ کی بات غلط نہیں ہے۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ وہ ٹیپ غائب ہو گیا تھا۔"

"غائب ہو گیا تھا؟" میں نے اس بات کا مطلب ذہن نشین کرنے کے بعد کہا لیکن یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ "شیخ صاحب! ٹیپ چوری ہو سکتا ہے، تباہ ہو سکتا ہے یا گم ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریکارڈنگ کو عمداً صاف کر دیا جائے مگر ایک اچھوت پانی کے بلبلے کی طرح غائب نہیں ہو سکتا۔"

"آپ کا طنز کرنا بجا ہے۔" شیخ بولا۔ "مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ ٹیپ غائب کر دیا گیا ہے یا چوری کر لیا گیا ہے۔ ٹیلی فون پر عبدل کا بیان پورا ہوتے ہی میں نے محرر کو سمجھایا کہ ٹیپ کے الفاظ کو کاغذ پر کیسے اتارنا ہے اور خود دو سپاہیوں کے ساتھ جائے واردات پر پہنچ گیا۔ یہاں تھانوں میں آمد و رفت کی کوئی سہولت تو ہوتی نہیں چنانچہ مجھے سڑک تک آ کے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا اور جب ہم ٹیکسی میں میر شرافت علی کی کوٹھی پہنچے تو آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میں نے محرر کو ہدایت کی تھی کہ بیان کی نقل بن جائے تو فوراً کسی کے ہاتھ روانہ کر دے۔ مقصد یہی تھا کہ عبدل زندہ مل جائے تو بیان پر اس کے دستخط لے لوں یا اس کا انگوٹھا لگوا لوں لیکن عبدل تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ بیان کی نقل ایک گھنٹے بعد موصول ہوئی۔ اس کے بعد میں ضابطے کی کارروائی میں الجھ گیا۔ شیدے کی لاش مجھے کمرے میں سے ملی اور عبدل کی ماں کی لاش بھی۔ میں نے آلۂ قتل وغیرہ اپنے قبضے میں کیے، فنگر پرنٹ لیے، آس پاس رہنے والوں کو بلوایا اور بالآخر تقریباً صبح کے دس بجے لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

واپس پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اگر یہ وارث نہ ہوتی تو میری ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہوجاتی۔ میری عدم موجودگی میں ڈیوٹی پر حشمت خان آگیا تھا۔“

”حشمت خان؟“ میں نے چونک کر کہا۔ ”پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔“

”نہیں، ٹیپ حشمت خان نے غائب نہیں کیا۔“ شیخ نے کہا۔ ”اس کی قسموں پر تو میں نے بھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر کسی ٹیپ کی موجودگی سے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ وہ آٹھ کے بجائے ساڑھے نو بجے یعنی صرف آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا اور اس آدھے گھنٹے میں روزنامچہ دیکھنے یا چائے پینے کے سوا اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ وہ تو اپنی سیٹ پر سے اٹھا بھی نہیں۔ ٹیپ ریکارڈر وہیں موجود تھا جہاں میں نے اس کو بیگ میں لگایا تھا لیکن اس میں کوئی اسپول نہیں تھا۔ میرے ہنگامہ کرنے پر وہ محرر جاگ اٹھا جو رات کی ڈیوٹی پر تھا اور پیچھے والے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس نے بروقت مداخلت کی ورنہ میری حشمت خان سے بھی جنگ چھڑ جاتی اور میں رپورٹ حکام بالا تک ضرور پہنچاتا۔ محرر نے رازداری کے وعدے پر ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا کہ جب وہ ٹیپ کو کاپی کر رہا تھا تو ایس ایچ او صاحب نے راؤنڈ لگایا تھا اور پوچھا تھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔۔۔“

”ایس ایچ او کے فرائض اب بھی وہی انجام دے رہا ہے؟“ میر محمد؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس تھانے کے بارے میں تمہاری معلومات خاصی اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔“ انسپکٹر شیخ نے کہا۔ ”محرر نے بتایا کہ ٹیپ ایس ایچ او صاحب ہی نے نکال لیا تھا اور ظاہر ہے ایک محرر اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ میر محمد انتہائی کینہ اور کینہ پرور آدمی ہے اگر اسے معلوم ہوگیا کہ محرر نے ٹیپ کی چوری کا الزام اس پر عائد کر دیا ہے تو میرے ساتھ وہ محرر کی جان کا دشمن بھی ہو جائے گا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور وہ مطمئن رہے۔ ابھی مجھے اس تھانے میں پہنچے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص سے اختلاف اور تلخ کلامی کی نوبت آچکی تھی۔ جب میں ڈیوٹی پر ہوتا تھا تو سارے عملے کے لیے مسئلہ بن جاتا تھا خصوصاً نائٹ ڈیوٹی کے دوران۔ ایک تو انہیں ہر شخص کی رپورٹ لکھنی پڑتی تھی اور قطعی غیر جانبداری کے ساتھ۔ نذر نذرانے کی مد سے حقائق کو مسخ کرنے یا ظالم کو مظلوم بنا دینے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی۔ لوگ رات کے وقت اپنے عزیزوں کو گھر سے کھانا پہنچاتے اور تشدد سے بچانے کے لیے بھاری معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ میری موجودگی میں یہ سب کچھ

نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ پہلی بار میر محمد سے میری اسی بات ہوئی۔ اس نے مجھ سے بڑے غلط لہجے میں کہا کہ مسٹر شیخ ... ہے کہ تم نے رات کو تفتیش میں رکاوٹ ڈالی، تھانے کے ... معمول کے مطابق کام نہیں کرنے دیا اور لوگوں کو بھی پریشان ... میں نے کہا کہ مسٹر قائم مقام ایس ایچ او صاحب! ... آپ کو معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ یاد رکھیے گا کہ میرا نام ... اکرام شیخ ہے۔ باقی الزامات میرے لیے نئے نہیں ہیں۔ اگر ... کو مجھ سے شکایت ہے تو تحریری طور پر آپ کو دے سکتا ہے ... اوپر بھیج سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنی موجودگی میں ... کو بھی کوئی غلط کام نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے پولیس کی نوکری ... ایک مشن سمجھ کے کی ہے اور یہ مشن ہے قانون کی مدد سے معاشرے ... کی اصلاح کا۔ ورنہ میرا باپ بزنس مین ہے اور مجھے پیٹ ... پالنے کے لیے اس تنخواہ کی بھی ضرورت نہیں۔ میر محمد بہت ہنسا ... اور کہنے لگا کہ شہزادے! کبھی ایک چنا بھاڑ پھوڑنے میں کامیاب ... ہوا ہے؟ نوکری کی ضرورت نہیں ہے تو گھر جاؤ اور عیش کرو ... دوسرے بھی عیش کریں۔ میں نے کہا کہ نوکری تو حکومت کی ہے ... یا کسی اور کے کہنے سے میں گھر جا کے نہیں بیٹھ سکتا اور آئندہ ایسی ... بات مجھ سے کہنا بھی نہیں۔ خیر اس کے بعد میری اور میر محمد کی ... بات نہیں ہوئی۔ محرر سے حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد ... بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ یا تو خود محرر گواہی دیتا کہ اس نے میر محمد کو ... ٹیپ لے جاتے دیکھا ہے لیکن یہ ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ ... کوئی صورت نہیں تھی کہ میں میر محمد پر الزام عائد کر سکتا۔ میں نے ... کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک چال چلی۔ میں حشمت خان کو چارج ... دے کر نکلا اور پیچھے سے گھوم کر پھر اسی کمرے میں آگیا۔ میں نے ... محرر سے کہا کہ وہ باہر برآمدے میں جا کے سو جائے۔ میں خود اس کی ... جگہ لیٹا رہا کہ کوئی اندر آئے تو مجھے سوتا دیکھ کر لوٹ جائے۔ مجھے ... زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس منٹ بعد میر محمد آگیا۔ حشمت ... نے فوراً اسے مطلع کیا کہ میں ٹیپ کے نہ ملنے پر سخت برہم ... تھا۔ حسب توقع میر محمد نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی ... اس عزم کا اظہار کیا کہ اس نے میری ایسی تیسی کر کے مجھے پولیس سے ... نہ نکلوایا تو اپنا نام بدل دے گا اور مجھے افسوس ہوا کہ میرے ... ان کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور ... عقبی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ اگر میرے پاس کوئی چھوٹا ... ٹیپ ریکارڈر بھی ہوتا تو صورت حال مختلف ہو جاتی ... ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا احرام خود حشمت خان ... جانا۔ اس موضوع پر ان کی گفتگو ختم ہوئی تو میں ایک دم سامنے ... آگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذرا سی دیر کے لیے ان دونوں

کی حالت غیر ہو گئی تھی مگر وہ پرانے پاپی ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا اور میں نے کہا کہ میر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ سب میں نے سنا۔ جتنی گالیاں آپ نے مجھے دیں ان سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اور آپ دونوں مل کر میرا جو بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں مگر وہ ٹیپ مجھے اسی وقت مل جانا چاہیے۔ ان دونوں کی اداکاری واقعی کمال کی تھی۔ میر نے بڑی حیرانی سے حشمت خان کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ شیخ صاحب کیا فرما رہے ہیں؟ ہم نے انہیں گالیاں اور دھمکیاں دی ہیں؟ اور حشمت خان نے بھی اتنی ہی حیرانی سے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ ہم نے تو شیخ صاحب کی بات ہی نہیں کی۔ میں نے کہا کہ اچھا یہ سب چھوڑو اور وہ ٹیپ نکالو۔ میر نے قطعی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ٹیپ ریکارڈر میں کوئی ٹیپ تھا ہی نہیں۔ میری دھمکی پر اس نے وہ مشیر نامہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں برآمد ہونے والے تمام سامان کی تفصیل لکھی ہوئی تھی جس میں ٹیپ ریکارڈر اور اس کا ماڈل نمبر وغیرہ سب درج تھے لیکن یہ واقعی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر کے اندر کوئی اسپول بھی تھا۔ ظاہر ہے اس پر کسی نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ یا غور کیا تھا تو قابل ذکر نہیں سمجھا تھا۔ اب یہی نادانستگی میں ہونے والی غلطی یا فروگزاشت ایک انتہائی سنگین مسئلہ بن گئی تھی۔ جس کی عدم موجودگی میں محرر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان بے معنی تھا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ محرر کے ہاتھ کی تحریر میں وہ بیان میرے پاس پہنچ گیا۔ اگر خود میں نے اسے کاپی کیا ہوتا تو میرے پاس کوئی گواہ بھی نہ ہوتا۔ محرر کی پوزیشن بڑی خراب ہے۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے اور میر محمد سے ڈرتا ہے کہ دشمن ہوگیا تو کسی الزام میں پھنسا کے نوکری سے بھی نکلوا دے گا اور جیل بھی بھجوا دے گا کیونکہ حشمت خان اینڈ کمپنی بھی میر محمد کے ساتھ ہے۔ میں نے محرر سے بات کی تھی کہ دیکھو، یہ ایک شخص کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو سکا کہ عبدل اور رشید نے ایک دوسرے کو قتل کیا تھا تو الزام خود بخود اس شخص پر آجائے گا جو پہلے ہی ایک قتل کے مقدمے میں ملوث ہے لیکن ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ اس کی ضمانت فوراً منسوخ کر دی جائے گی کہ اس نے اپنی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں چشم دید گواہوں کو ٹھکانے لگا دیا اور اس کے بعد یہ تین افراد کے قتل عمد کا کیس بنے گا جس میں سزائے موت یقینی ہوگی۔ تحریر تمہارے ہاتھ کی ہے اس لیے مجھے صرف تمہاری گواہی چاہیے کہ عبدل نے مرنے سے پہلے فون کیا تھا اور تم نے وہی لکھا تھا جو اس نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ محرر نے پھر اپنے بیوی بچوں کی بات کی۔ میں نے کہا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ تمہیں اس پر اور

اپنے آپ پر بالکل اعتماد نہیں۔ نعوذ باللہ، میر محمد کاتب تقدیر تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن میرے دلائل سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ محرر نے صاف بتا دیا کہ وہ میرے حق میں گواہی نہیں دے گا۔ اسے عاقبت میں اپنی سزا قبول ہے لیکن وہ دنیا میں بیوی بچوں کو فاقہ کشی، مفلسی اور پریشانی کی سزا نہیں دے سکتا۔ وہ اکیلا ہوتا تو پھانسی بھی چڑھ جاتا مگر اس پر اپنے خاندان کے علاوہ بوڑھے اور بیمار والدین کی ذمہ داری بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا اور مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں نے عبدل کے اس بیان کا حوالہ دیا جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا تو وہ کہے گا کہ شیخ صاحب نے سر پر کھڑے ہو کے مجھ سے یہ تحریر لکھوائی تھی۔ وہ افسر ہیں اور میں انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ جو کچھ کہتے گئے، میں لکھتا گیا۔“

کمرے میں موجود ہر شخص خاموش تھا۔ رابعہ سر جھکائے اپنے دوپٹے کو ایک انگلی پر لپیٹ رہی تھی اور کھول رہی تھی۔ یہ اضطراری حرکت اس کے جذباتی خلفشار کی آئینہ دار تھی۔ محسن میری بجائے رابعہ کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا اور رضوی صاحب نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

”کیا تمہاری اپنی گواہی بالکل معتبر نہیں سمجھی جائے گی؟“ میں نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ اس آواز میں ویرانی کی آسیب زدہ بازگشت تھی چنانچہ مجھے خود بھی اپنی آواز سے خوف آیا۔

”سکندر! اس وقت میں پولیس افسر نہیں ہوں۔“ شیخ نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔ ”مجھے تم سے اور تمہارے حالات سے پوری ہمدردی ہے لیکن قانون کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ بے شک میں تفتیش کے لیے ایس پی صاحب کے گھر گیا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو تو میں بیان لینے کے لیے یہاں آگیا اور میں نے تم کو وہ ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں جو ابھی تک میرے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کی ایک وجہ ہے۔ میں ایس ایس پی صاحب کے عہدے سے مرعوب نہیں مگر ان کے کردار سے متاثر ہوں اور یہی بات میرے لیے قابل عزت ہے۔ یہاں آنے کے بعد مس رابعہ قاری نے بھی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ تمہاری وکالت کر رہی ہیں اور کمرے میں موجود رہیں گی۔ کوئی اور وکیل ہوتا تو شاید میں یہ درخواست مسترد کر دیتا۔ میں نے تو محسن کو بھی کمرے سے نہیں نکالا۔ بہت سی باتیں میں نے معلوم کر لی تھیں مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ سب لوگ خون کا رشتہ نہ ہونے کے باوجود ایک خاندان کی طرح ہیں جس کی بنیاد اپنائیت کے احساس، خلوص اور اعتماد پر ہے مثلاً وہ لڑکی جو ابھی چائے لے کر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آئی تھی، تم اسے بہن کہتے ہو اور سمجھتے ہو۔ میں جب کام سے کہیں جاتا ہوں تو جائے کا ایک کپ بھی نہیں پیتا لیکن یہاں میں نے انکار نہیں کیا۔ دراصل اس گھر کی فضا میں مجھے اعتماد نظر آتا ہے۔ اعتماد نہ ہوتا تو ایس پی صاحب مجھے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ میری اپنی زندگی کے تجربات بالکل مختلف ہیں اور خاصے ناخوشگوار۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں تم سے دوست بن کے بات کر رہا ہوں۔ بے شک میری گواہی تمہارے حق میں ہوگی اور سچ بات کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس سے کوئی فائدہ ہونے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ جس تھانے سے مجھے ٹرانسفر کیا گیا ہے وہاں بھی تمہارے نام کے ساتھ میرا نام لیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ میں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے تمہیں ملزم چراغ دین سے لاک اپ میں ملاقات کی اجازت دی تھی۔ میرے کارنامے کو تمہاری مخبری سے منسوب کیا گیا تھا۔ اب میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کے کہوں گا کہ عبدل اور رشیدے کو سکندر بخت نے قتل نہیں کیا تھا عبدل نے رشیدے کو اس لیے مار دیا تھا کہ اس نے سرونٹ کوارٹر میں ایک بوڑھی عورت کو اکیلا پا کے ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی اور اس کا زیور وغیرہ اتارنے کے لیے زبردستی کر رہا تھا کہ عبدل آ گیا۔ اس نے مشتعل ہو کے رشیدے پر گولی چلا دی اور رشیدے نے مرتے مرتے عبدل کو گولی مار دی۔ یہ سب ایک تحریری بیان کی صورت میں پہلے سے موجود ہے لیکن یہ ثابت کیسے ہوگا کہ یہی وہ بیان ہے جو عبدل نے ٹیلی فون پر دیا تھا اور میں نے ٹیپ کیا تھا۔ اس ٹیپ کا تو وجود ہی ثابت نہیں ہوتا۔ اگر عبدل نے کسی دوسرے گھر سے فون کیا ہوتا تو ممکن ہے کوئی گواہ مل جاتا جو اس بیان کی تائید کرتا۔ اب تو یہ فرض کر لیا جائے گا اور کہا بھی جائے گا کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ چکا رہا ہوں۔ تمہاری مخبری سے میں نے منشیات کے اسمگلروں کے ایک گروہ کی بیخ کنی کی تھی اور اب تمہارے لیے صفائی کا گواہ بن گیا ہوں۔ پھر میری پوزیشن پر غور کرو کہ میں ہی ڈیوٹی پر تھا، میں نے ہی جائے واردات پر پہنچ کے ابتدائی تفتیش کی۔ ثبوت، شہادت، گواہوں کے بیانات وغیرہ حاصل کیے۔ یہ کیس پہلے سے میرے پاس تھا۔ اب میں ہی صفائی کا گواہ بن کے پیش ہوا تو اس کے دو نتیجے نکالے جائیں گے۔ ایک یہ کہ مجھے بہت بھاری رشوت دی گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھ پر رضوی صاحب کا دباؤ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں سچ نہیں بولوں گا۔ ثبوت کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کسی کی زبان سے یا نوکری کے خیال سے نہیں ڈرتا کیونکہ میرا اپنا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔

کل وکیلِ سرکار کی طرف سے درخواست لگائی جائے گی کہ تمہاری ضمانت منسوخ کر دی جائے جو منظور ہو جائے گی اور کل ہی تمہارے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ میر محمد کہتا ہے کہ اس مرتبہ تمہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہیں بھیجا جائے گا بلکہ پولیس تمہارا جسمانی ریمانڈ حاصل کرے گی۔ تمہارے دونوں وکیل بہت بڑے وکیل ہیں اور تمہارے ساتھ بہت مخلص ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ ان کی قابلیت اور ان کا خلوص تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ ہو سکتا ہے کل مجھے ہی تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالنی پڑے اور اپنے ساتھ لے جانا پڑے۔ اس سے دل شکستہ مت ہونا۔ ان سب لوگوں کی طرح میں بھی تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ مجھے بھی تمہاری بے گناہی کا پورا یقین ہے۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ شیخ!" میں نے فرطِ جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہ شخص خود کو اکیلا اور بے سہارا کیسے سمجھ سکتا ہے جس کے ساتھ خدا کے علاوہ اتنے نیک دل اور مخلص دوست بھی ہوں۔"

قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے انسپکٹر شیخ نے میرا بیان لکھا۔ میں نے اپنے بیان میں وہی کہا جو مجھے کہنا چاہیے تھا یعنی یہ کہ جس رات رشیدے اور عبدل کا قتل ہوا، میں عبدل کے کہنے پر اس کے ساتھ ضرور گیا تھا۔ وہ خود مجھے بلانے کے لیے رضوی صاحب کے گھر آیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کی بوڑھی اور بیمار ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور جاتے وقت یہ بات میں نے رضوی صاحب کو بھی بتا دی تھی۔

"مسٹر سکندر! اپنے بیان کو آپ ان واقعات تک محدود رکھیں جو میر شرافت علی کی کوٹھی میں پیش آئے۔" انسپکٹر شیخ نے مداخلت کی۔

"دراصل یہ سب باتیں تو میں اپنے بیان میں بھی بتا چکا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"سب سے پہلے یہ بتائیے کہ عبدل نے آپ سے جھوٹ بولا تھا تو آپ نے اس پر یقین کیسے کر لیا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا دوست یا ہمدرد نہیں بلکہ دشمن ہے؟"

"اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" میں نے کہا۔ "عبدل کی ماں نے مجھے واقعی بلایا تھا۔"

"کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبدل کی ماں تمام حالات سے بے خبر تھی۔۔۔؟" شیخ بولا۔ "یعنی اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا تمہارے خلاف قتل کے کیس میں ایک چشم دید گواہ ہے؟"

"ایک ایسی عورت کو دنیا میں پیش آنے والے واقعات کی خبر کیسے ہو سکتی ہے انسپکٹر جس کو عمر نے اور بیماری نے بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ چھوڑا ہو اور جو کچھ دیکھ بھی نہ سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ "وہ اپنی تاریک دنیا میں بھی اتنی ہی اکیلی رہتی تھی جتنی اب قبر کے اندھیرے میں ہوگی۔ اس کی یادوں کے رشتے ماضی سے ملتے تھے اور صرف اس کے تصور میں استوار تھے۔ شاید اسے اتنا ہی معلوم تھا کہ پہلے وہ ہندوستان میں تھی اور اب پاکستان میں ہے لیکن اسے یہ کون بتاتا کہ زمین کے ساتھ ہی انسان بدل گئے ہیں۔ انسانوں کے چہرے ہی نہیں اُن کے دل بدل گئے ہیں اور محبتوں کے رشتے عداوتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے والد وزیر خان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ یہی سمجھتی تھی کہ میر شرافت علی اور وزیر خان کی دوستی آج بھی قائم ہے۔"

"پھر ایسی کیا بات تھی کہ اس نے اچانک تمہیں طلب کر لیا اور تم سوچے سمجھے بغیر چلے گئے؟"

"یہ غلط ہے کہ میں سوچے سمجھے بغیر چلا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے محسن کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا اور ہم دونوں نے سازش کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ محسن کا باہر رک کر حالات پر نظر رکھنا اور میری واپسی تک انتظار کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ رضوی صاحب نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ وہ ہمارے لیے مناسب حفاظتی انتظامات کر دیں گے۔"

"یہ دلیل بالکل بے وزن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ میں سے کسی نے بھی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمام واقعات کو دُہرانا نہیں چاہتا لیکن اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے معاملات سے خود نمٹنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اگر وہاں چار آدمی پہلے سے موجود ہوتے اور وہ آپ کے ٹکڑے کر دیتے تو باہر انتظار کرنے والا محسن ان کا کیا بگاڑ لیتا اور ایس پی صاحب نے کوٹھی کے باہر ٹینک بھی کھڑے کر دیے ہوتے تو کیا تمہاری جان بچ جاتی؟ حفاظتی انتظامات اور اپنی احتیاط پسندی کی بات مت کرو۔ بس یہ کہو کہ زندگی باقی تھی اور خدا نے تمہیں محفوظ رکھا۔ تمہاری جگہ وہ دونوں مارے گئے جو تمہاری جان کے دشمن تھے اور تم سلامتی کے ساتھ لوٹ آئے۔ فرض کرو تم جانے سے پہلے پولیس کو اطلاع کر دیتے اور مسلح پولیس کے ساتھ جاتے تو ظاہر ہے اس کے بعد وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ پولیس کی موجودگی میں عبدل اور رشیدا ایک دوسرے کو قتل نہ کرتے لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ خود پولیس تمہاری بے گناہی کی گواہ ہو جاتی۔"

ہم میں سے کوئی بھی شیخ کی دلیل کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود رضوی صاحب بھی خاموش تھے۔ "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت مجھے عبدل کی بات اور اس کے لہجے نے قائل کر لیا تھا کہ مجبور وہ خود ہے اور اگر اس کی ماں بضد نہ ہوتی تو وہ خود بھی میرے سامنے آنے کی ہمت نہ کرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی میں مشتعل ہو جاتا اور نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔"

"خیر، یہ بتاؤ کہ عبدل کی ماں کو تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کا بیٹا ہے اور اس کے والدین زندہ ہیں یا نہیں لیکن وہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس کا شوہر میرے والد کا پرانا دوست تھا چنانچہ اسے وہ باتیں بھی معلوم تھیں جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔"

"اور اس نے تمہیں یہی باتیں بتانے کے لیے بلایا تھا؟" شیخ نے کہا۔

میں نے باری باری رابعہ، محسن اور رضوی صاحب کی طرف دیکھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر شیخ کو اس خط کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہے یا نہیں جس کی وجہ سے تین افراد بھی جائے واردات پر مر گئے تھے اور اس سے پہلے بھی بہت سے افراد اپنی جان دے چکے تھے۔ محسن اور رابعہ بالکل سامنے تھے اور ان پر شیخ کی نظر بھی تھی چنانچہ وہ مجھے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن رضوی صاحب ٹہلتے ہوئے ایسی جگہ پہنچ گئے تھے کہ شیخ کی پیٹھ ان کی طرف تھی مگر وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنا سگار جلاتے ہوئے ایک انگلی سے مجھے واضح اشارہ کیا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ میں خط کی بات نہ کروں۔

"وہ مجھ سے میرے والد کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ بہت عرصے سے ان کی کوئی خیر خیریت نہیں ملی تھی اور اسے کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

"غلط بیانی سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی خط دیا تھا۔"

میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ غالباً شیخ مجھ سے پہلے دوسروں کے بیانات قلمبند کر چکا تھا۔

"انسپکٹر!" رضوی صاحب نے بروقت مداخلت کی۔ "میرا ایک بیان سب کے بیانات کو غلط کر دیتا۔" میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ بوگس اور جعلی خط تھا جس کی کوئی اہمیت نہیں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

یہ خط کسی نے وزیر خان کے نام سے بھیجا تھا اور اس میں نمشی مرحوم سے دو ہزار روپے بطور قرض مانگے گئے تھے حالانکہ اس خط کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے خط وزیر خان کی موت کے ایک مہینے بعد لکھا گیا تھا۔ میں وزیر خان کی تحریر بھی پہچانتا ہوں اور اُن کے دستخط بھی۔"

شیخ نے اس مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ یہ بات ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ رضوی صاحب نے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا اور بالواسطہ طور پر مجھے سمجھا دیا کہ خط کے متعلق شیخ کو کیا بتایا گیا ہے۔ اگر اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شیخ یقیناً اسے بے عزت کر دیتا کہ سوال اس سے نہیں کیا تھا تو جواب اس نے کیوں دیا۔ شاید وہ اس حقیقت کو بھی فرض کے تقاضوں پر قربان کر دیتا کہ وہ خود ایک معمولی اے ایس آئی ہے جس کے مقابل ایس ایس پی ہے مگر دو باتوں کا لحاظ کر کے خاموش ہو گیا۔ ایک رضوی صاحب کی عمر کا اور ان کی نیک نامی کا، دوسرا اس بات کا کہ وہ تھانے میں نہیں ہمارے گھر میں بیٹھا تھا اور ہم نے میزبانی کے آداب کا خیال رکھا تھا تو یہ خود بخود اس کا اخلاقی فرض ہو جاتا تھا کہ وہ مہمانی کے آداب فراموش نہ کرے۔

"میں نے تم سے کہا تھا محسن کہ وہ خط انہیں دکھا دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلکہ انہیں دے دو۔ یہ اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیں۔"

"جی۔۔۔" محسن نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "دراصل وہ خط میں کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔" پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکالا۔ میں نے جان بوجھ کے کسی طرف نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ جو خط شیخ کے حوالے کیا گیا ہے، وہ جعلسازی کا نمونہ ہے۔

"اس خط کے ساتھ کوئی لفافہ بھی ہوگا؟" شیخ نے خط کے مضمون پر نگاہ ڈالنے کے بعد زیرِ لب مسکرا کے کہا۔

"لوگ عموماً خط سنبھال کے رکھتے ہیں اور لفافے پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"محض اسی خط سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ خط لکھنے والا کون ہے اور اس نے یہ خط کہاں سے ڈالا ہے؟" شیخ بولا۔

"خط ایک لیٹر ہیڈ پر لکھا گیا ہے اور اس پر لندن کا پتہ چھپا ہوا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگرچہ اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خط واقعی کسی نے لندن سے لکھا تھا کیونکہ پیڈ تو یہاں بھی چھپ جاتے ہیں مگر تفتیش کرنا پولیس کا کام ہے۔ ہو سکتا ہے اس پتے سے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نے اور محسن نے خود کو برطانیہ میں کالوں کے حقوق کے تحفظ کا ٹھیکیدار بنا رکھا تھا۔ خصوصاً اپنے ہم وطن پاکستانی طلبہ کے حقوق کا۔ ہم نے تین چار کلب اور انجمن قسم کے ادارے بنا رکھے تھے جن کے نام بہت متاثر کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا وجود کہیں نہ تھا مگر جب بھی ہمارے نقطۂ نظر سے کسی پاکستانی کے ساتھ یا ہمارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی تھی تو ہم مختلف اخبارات کو مراسلے، اجتماعی قراردادیں اور پریس نوٹ وغیرہ بھیج دیتے تھے جو کسی نہ کسی اخبار یا ہفت روزے میں شائع ہو جاتے تھے کہ پاکستانی طلبہ کی فلاں انجمن کے ایک زبردست جلسے میں اس بات کی مذمت کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان ہی میں سے ایک لیٹر ہیڈ تھا۔ اگر پاکستان کی پولیس دریافت کرتی تو خود لندن کی پولیس اس پتے پر پہنچنے میں ناکام رہتی اور اس تگ و دو سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

"دراصل عبدل کی ماں کا خیال تھا کہ میرے والد باہر ہیں۔" میں نے کہا۔ "بیٹے نے اس کو یہی بتا رکھا تھا۔ وہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وزیر خان کو لندن میں دو ہزار روپے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے کیونکہ یہ بہت چھوٹی سی رقم تھی اور عبدل کی ماں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ باہر پیسے بھجوانے ہوں تو کیا کرنا چاہیے۔"

"میرے لیے اس بیان کی صداقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں۔" شیخ نے خط کو فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب ایک انتہائی اہم سوال یہ ہے کہ آپ لوگ وہاں کتنی دیر ٹھہرے تھے؟"

"مشکل سے بیس منٹ۔" محسن نے فوراً کہا۔ "یہ بات آپ کو شہلا بھی بتا چکی ہے کہ ہم ساڑھے دس بجے گھر آ گئے تھے۔"

شیخ نے ناگواری سے محسن کی طرف دیکھا۔ "مجھے مسٹر سکندر کا بیان آپ لوگوں کی موجودگی میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب تو آپ سب کا بیان ایک ہو گیا۔ سوال میں نے آپ سے تو نہیں کیا تھا مسٹر محسن!"

"آئی ایم سوری۔" محسن نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔ "آپ نے پوچھا تھا، آپ لوگ۔ میں سمجھا سوال ہم دونوں سے کیا گیا ہے۔"

"اس کے باوجود مجموعی صورتِ حال نہیں بدلتی۔" شیخ نے کہا۔ "آپ کے لیے ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ آپ واقعی ساڑھے دس بجے لوٹ آئے تھے۔ اس کے گواہ صرف گھر والے ہی ہیں۔ باہر کا کوئی آدمی ہے جو کہہ سکے کہ اس نے آپ کو واردات سے پہلے کہیں دیکھا تھا؟"

"میں اس سوال کو تفتیش کا ایک لازمی جزو سمجھتا تھا چنانچہ اس کے لیے تیار تھا۔" "یار محسن!" میں نے اچانک کہا۔ "تو نے استاد ٹیڈی کا ذکر نہیں کیا؟ وہ کس وقت ملا تھا؟"

"وہ؟ میرا خیال ہے کہ دس بجے کے بعد ہی ملا تھا ہمیں۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا ذکر کرنے ہی والا تھا۔ وہ یقیناً شیخ صاحب کو بتا سکتا ہے کہ ہم کس وقت ملے تھے۔"

"جب ہم واپس آ رہے تھے انسپکٹر صاحب!" میں نے کہا۔ "تو ہمیں استاد ٹیڈی مل گیا تھا۔ وہ اکیلا تانگے میں جا رہا تھا کہ اس کی نظر ہم پر پڑ گئی اور اس نے ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ہم نے اس کے ساتھ چائے بھی پی تھی۔"

شیخ حیرانی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا۔ "یہ استاد ٹیڈی کیا چیز ہے اور آپ جیسے شریفوں کا ایسے استادوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔۔۔ چہ معنی دارد۔ نام سے تو مجھے وہ کسی اسکول کا استاد نہیں لگتا۔"

"کیا کریں شیخ صاحب!" میں نے افسوس سے کہا۔ "اپنا بچپن کا دوست تھا۔ بس غلط راستے پر پڑ گیا۔ کوئی بدمعاش نہیں ہے لیکن ذرا ٹیپے باز ہے اور کبھی کبھی ہاتھ کی صفائی دکھا دیتا ہے چنانچہ لونڈے اسے استاد ٹیڈی کہنے لگے ہیں۔"

"اور تمہارا یہ استاد کہاں ملے گا؟" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اس کا بیان علیحدگی میں لوں کیونکہ اس کی گواہی بہت اہم ہے۔"

"آج تو اس کا ملنا مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ راولپنڈی گیا ہوا ہے۔ بری امام شاہ کے مزار پر منت ماننے کی بات کر رہا تھا۔ کل پرسوں تک آ جائے گا۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا۔"

"تم اس کا پتہ تو بتا سکتے ہو؟" شیخ بولا۔ "لاہور میں وہ کہاں رہتا ہے؟"

"یہ بھی ہمیں معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہم بھی بس رسم و راہ نبھاتے ہیں۔ ایسے ہی سرِ راہ ملاقات ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ اس کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوتا۔"

"ویری گڈ مسٹر سکندر!" شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اتفاق میں بڑی برکت ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے آج یہاں دیکھا۔ جھوٹ سچ کا پتہ چلانا عدالت کا کام ہے لیکن اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ بڑا اچھا ٹیم ورک تھا۔"

"اے ایس آئی شیخ!" رابعہ نے پہلی بار لب کھولے۔ "بیان کے دوران میں نے کہیں دخل نہیں دیا اور میرے مؤکل نے آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہیں کیا لیکن اب میں بولنے ہوں کیونکہ آپ بیان لینے کے بعد بیان پر تبصرہ بھی فرما رہے ہیں جو آپ کی ذمّے داری نہیں۔ اس کے علاوہ آپ نام لیے بغیر سب کی دیانت داری پر شبہے کا اظہار کر رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس سے آپ کی اپنی غیر جانب داری مشکوک ہو جاتی ہے۔ آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں میڈم!" شیخ نے فائل سنبھال کے طنز سے کہا۔ "اگر میرے الفاظ سے غلط مفہوم نکلتا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اپنے الفاظ واپس بھی لے سکتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سِٹ ڈاؤن۔" رضوی صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "فرض شناسی بڑی اچھی چیز ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہارے رویّے میں اعتماد کی لچک نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جس وقت تم میرے گھر آئے تھے اور تم نے مجھ سے سکندر کے بارے میں دریافت کیا تھا تو میں تم کو یہاں لے آیا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا اردلی تم کو باہر سے ہی رخصت کر دیتا؟ میں کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں اور بات کرنی ہے تو کل دفتر میں آ جانا۔۔۔"

شیخ پھر بیٹھ گیا۔ "میں آپ کے رویّے سے متاثر ہوا ہوں رضوی صاحب لیکن آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرض کے تقاضے بہرحال نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔"

"یہ غلطی تو تم سے پہلے ہی سرزد ہو چکی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "کیا فرض کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ تم عبدل کا فون ملنے کے بعد ٹیپ کی حفاظت کا معقول انتظام پہلے کرتے؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم ٹیپ کو مقفل کر جاتے یا اپنے ساتھ لے جاتے۔"

"لیکن سر! میں نے کوشش کی تھی کہ تحریری بیان پر دستخط بھی حاصل کر لوں۔"

"اور حاصل کیا ہوا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ اب نہ تمہارے پاس وہ ٹیپ ہے اور نہ کوئی دستخط شدہ بیان ورنہ تمہارے پاس کم سے کم ایک چیز تو ہوتی جسے عدالت میں پیش کیا جا سکتا۔ اس پر ایک شخص کی زندگی اور موت کا انحصار تھا اور اس کے نہ ہونے سے کیا نقصانات ہوں گے، یہ اندازہ تم خود بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن سر! میں نے وہ ٹیپ ایک ذمّے دار شخص کے سپرد کیا تھا۔" شیخ کی پوزیشن خراب ہونے لگی تھی۔

"اور اس ایڈیٹ ذمّے دار شخص نے کیا کیا؟" رضوی صاحب اب واقعی غصّے میں تھے۔ "تم نے کیا کیا؟ اس محرّر کی رپورٹ بھیجو میرے پاس اور اس سے کہو کہ اپنے آپ کو معطل سمجھے۔ اسے بتا دو کہ اب وہ ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہے۔ اگر وہ سچ بولے

www.pakistanipoint.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور جو کچھ ہوا ہے عدالت میں بیان کر دے۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔ میں دیکھوں گا کہ نوکری اس کی جاتی ہے یا میر محمد کی۔ لیکن اس نے جانتے بوجھتے حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا اور سکندر کی ضمانت منسوخ ہوئی تو اس کا حشر بہت برا ہوگا۔"

"یس سر!" شیخ نے کھڑے ہو کر سلوٹ کیا۔ "جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

رضوی صاحب کا غصہ اس کے چلے جانے کے بعد بھی کم نہیں ہوا۔ "بہت فرض شناسی کی بات کرتا ہے۔ بے وقوف یہ نہیں دیکھتا کہ کوتاہی کتنی بڑی ہوئی ہے۔ جب ایک شخص ٹیلیفون پر خود بتا رہا ہے کہ میں مرنے والا ہوں تو اس کا بیان ضرور لکھو، مگر یہ بھی تو سوچو کہ دوسرے نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ آدمی کو ہر طرف دیکھنا چاہیے اور تمام امکانات کو مدنظر رکھنا چاہیے مگر تم نوجوان لوگ عقل کی بجائے جوش و جذبات سے کام لیتے ہو۔" وہ اچانک میری طرف مڑے۔ "یہ میر محمد وہی ہے نا جس نے تم پر تشدد کیا تھا؟ اس نے ٹیپ غائب کیا ہوگا تو میں اس کو بخشوں گا نہیں۔"

"جی۔" میں نے کہا۔ "بہت کینہ پرور اور کمینہ آدمی ہے اور میرے معاملے میں اس پر کسی کا دباؤ بھی ہے۔ کوئی اے ایس پی ہے۔"

"میں سمجھ لوں گا اس سے۔" رضوی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اسے فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہے یا وہ ٹیپ واپس کرنا چاہتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس نے ٹیپ تباہ کر دیا ہو یا صاف کر دیا ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایسی صورت میں وہ انتخاب کے حق سے بھی محروم ہو جائے گا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اس کے خلاف شیخ بھی گواہی دے گا اور وہ محرر بھی۔ ان کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک کپ چائے پلاؤ، پھر میں چلتا ہوں۔"

رابعہ ان کے لیے چائے لینے چلی گئی تو میں نے کہا۔ "انکل رضوی! میں نے اس دور دراز علاقے میں یہ ایک گمنام سا مکان شہلا کی حفاظت کے لیے لیا تھا مگر اب یہ بھی محفوظ نہیں رہا۔ یہ پتہ پولیس کے ریکارڈ پر آ جائے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔"

"تم لوگوں نے بھی مجھے کم پریشان نہیں کیا ہے۔" رضوی صاحب نے خفگی سے کہا۔ "کچھ تو تقدیر نے تمہارے خلاف چکر چلا رکھے ہیں اور کچھ تمہارے دشمنوں نے۔ لیکن خود تم بھی اپنی عقل مندی سے اپنی مشکلات میں اضافہ کرتے ہو۔ آخر کیا

ضرورت تھی اس نقل مکانی کی۔ کیا میرے پاس جگہ کم تھی یا تمہیں یہ احساس تھا کہ تم مجھ پر بار ہو یا وہاں محفوظ نہیں ہو؟"

• "ایسی تو کوئی بات نہیں تھی انکل!" محسن نے وضاحت کی کوشش کی۔ "مگر..."

"اگر مگر کچھ نہیں۔" انہوں نے محسن کی بات کاٹ دی۔ "اپنا سامان آج ہی یہاں سے اٹھاؤ اور واپس چلو۔ وہ ہمارا سرونٹ کوارٹر شہلا اور اس کی ماں کے لیے کافی ہوگا۔ کانسٹیبل اپنا بندوبست کہیں اور کرے گا۔ رابعہ حسبِ سابق رہے گی اور تم دونوں کو ایک کمرہ مل جائے گا، جہاں تم میری نگرانی میں رہو گے۔ تم دونوں نے اپنے آپ کو بہت آزاد اور خود مختار سمجھ لیا ہے اس لیے کہ ایک کا باپ مر گیا ہے اور دوسرے کا بہت دور اسلام آباد میں بیٹھا ہے۔" ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ ایک طرف دوستی کے رشتے سے یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ جس حد تک بھی ہمارا خیال رکھ سکتے ہوں رکھیں۔ دوسری طرف قانون کے مقابلے میں وہ اپنی مجبوریاں بھی سمجھتے تھے اور اس خیال سے بہت پریشان تھے کہ خدانخواستہ مجھ پر استغاثہ کے دونوں گواہوں کے قتل کا الزام آ گیا تو کیا ہوگا۔

وہ چائے پی کر رخصت ہو گئے تو میں نے اور محسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی اور ویسے بھی یہ گھر اب محفوظ نہیں رہا تھا۔ رابعہ اور محسن نے بھی اتفاق کیا کہ ان حالات میں ہمارے لیے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے اور فی الحال ہمیں رضوی صاحب کی میزبانی کو مجبوری یا ضرورت سمجھتے ہوئے قبول کرنا پڑے گا۔ شہلا کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ مردہ بدستِ زندہ۔ اسے ہمارا ہر فیصلہ قبول تھا۔ اسی روز شام تک منتقلی کا سارا کام مکمل ہو گیا، جس میں عملی طور پر میں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ محسن، رابعہ اور شہلا نے وہ سامان پھر باندھا جو ابھی پوری طرح کھلا بھی نہ تھا۔ پھر محسن ایک ٹرک اور چند مزدور لے کر آیا جنہوں نے ذرا سی دیر میں سب سامان لاد دیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے رضوی صاحب کی کوٹھی میں اتار دیا۔ ہمارا ہمسایہ کانسٹیبل رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کے واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ عرب کے اونٹ کی طرح ہم نے اسے باہر نکال پھینکا ہے۔ اس نے تو ہمارے جوتے تک پالش کیے تھے کیونکہ ہم نے اسے تھانے دار بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ ہمارے عزائم غاصبانہ اور بدنیتی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ سب رضوی صاحب کے حکم سے ہوا ہے لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوا اور فریاد لے کر رضوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا مگر رضوی صاحب نے اسے کہا کہ پریشان ہونے

کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی رہائش کے لیے ساتھ والی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ایک کمرے کا انتظام ہو گیا ہے۔ مطمئن وہ پھر بھی نہیں ہوا مگر تعمیل کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر اور ہم سے سخت بدظن ہو کے رخصت ہوا۔ اس وقت تک شہلا نے اپنے نئے گھر میں سامان کو ٹھکانے سے رکھنے کا انتظام مکمل کر لیا تھا۔ جو کمرہ ہمیں دیا گیا تھا وہ گھر کے آخری حصے میں تھا اور بچوں کا بیڈ روم تھا۔ نتیجے میں بچوں کو اس کمرے میں منتقل کیا جو پہلے مہمانوں کا کمرہ کہلاتا تھا۔ محسن نے میری توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچوں کو ان کے کمرے میں رہنے دیا جاتا اور ہمیں مہمانوں والا کمرہ دے دیا جاتا۔ اب ہم شریفانہ راستہ اختیار کر کے باہر جاتے تو یہ ناممکن تھا کہ رضوی صاحب یا ان کی بیگم کو معلوم نہ ہو۔ دوسرا طریقہ کھڑکی کو دروازے کے طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ اس میں بھی یہ خطرہ بہرحال تھا کہ ہماری عدم موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو جائے۔ محسن نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ رضوی صاحب ظالم سماج بن کے مجھے اور رابعہ کو زیادہ سے زیادہ فاصلے پر رکھنا چاہتے ہیں اور میں نے اس کو زبردست فلمی جواب دیا۔

رات کے کھانے پر رضوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ہماری سعادت مندی کی تعریف کی۔ ان سے زیادہ خوشی بیگم رضوی کو تھی کہ وہ اکیلی نہیں رہیں اور رابعہ کے علاوہ اب شہلا بھی ان کی رفیق تنہائی ہو گئی ہے۔ شہلا خود خاموش تھی کیونکہ وہ اس ماحول میں اجنبی تھی۔ شاید اسے یہ احساس بھی تھا کہ جو اختیار اسے پہلے اپنی زندگی پر تھا وہ اب نہیں رہا۔ اپنے گلبرگ والے گھر سے نکلنا اسے راس نہیں آیا تھا اور اس کا کوئی ٹھکانہ مستقل نہ رہا تھا۔ شہلا کی ماں اس سے زیادہ پریشان تھی جس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے اکلوتے بیٹے عدنان کے جاتے ہی حالات میں یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے اور اسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ وہ شہلا کی حقیقی ماں بھی نہیں تھی کہ اس پر حکم چلا سکتی یا اس سے وضاحت طلب کر سکتی۔ اس کا مفلوج وجود عملی زندگی کی جدوجہد میں آگے بڑھنے والوں کے لیے ایسا بارِ گراں تھا جسے اتار کر پھینکا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنی مجبوریوں کو بھی سمجھتی تھی اور دوسروں کی مجبوری کو بھی چنانچہ چپ لیے بیٹھی تھی۔

رات کو فرصت ملتے ہی میں اور محسن اپنے کمرے میں سونے کے لیے پہنچے تو ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے چائے کی فرمائش کی اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سگریٹ کے دھوئیں کو چھت کی طرف اٹھ کر فضا میں تحلیل ہوتا دیکھتے رہے۔

"آج کتنے دن ہو گئے، میرا اپنے گھر سے کوئی رابطہ نہیں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "معلوم نہیں فوزیہ کیسی ہے۔ سب سے زیادہ وہی مجھے یاد کرتی ہوگی۔"

"دیکھ محسن! اب بھی وقت ہے۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو اپنے گھر لوٹ جا۔ والدین کے حقوق مجھ سے زیادہ ہیں۔"

"میں ان کے حقوق تسلیم کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "اور وقت آئے گا تو میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کروں گا لیکن اس وقت میں کسی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ نہ تجھے، نہ رابعہ کو اور نہ شہلا کو۔ ہم سب ایک دوسرے کے ذمے دار ہیں اور جب رابعہ یا شہلا عورت ہونے کے باوجود پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیسے بھاگ جاؤں؟"

"تیرے پاس وہ کیسٹ تو محفوظ ہے نا جس میں ہم نے ڈی سلوا اور چودھری دلاور کی گفتگو ریکارڈ کی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہی تو ہمارے پاس ایک موثر ہتھیار ہے۔" محسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کم سے کم ڈی سلوا کے خلاف۔"

"ابھی تک ان میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ ہم نے ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، لیکن وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" محسن نے اپنے بریف کیس میں سے کیسٹ نکالا۔ "انہوں نے اندازہ ضرور کر لیا ہوگا کہ جب ہم دو طرفہ مواصلاتی رابطہ قائم کر سکتے ہیں تو ان کی آواز بھی ریکارڈ کر سکتے ہیں کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چودھری دلاور نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جو بعد میں اس کے خلاف استعمال کی جا سکتی۔ لیکن ڈی سلوا نے پوری طرح اعترافِ جرم کر لیا تھا۔"

"اب یہ ضروری ہے کہ اسے اپنی ہی آواز سنوائی جائے اور پھر اس کا ردِعمل دیکھا جائے۔" محسن بولا۔

"ردِعمل کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "وہ بزدل آدمی ہے یا تو دلاور کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوگا... یا فرار پر۔"

"لیکن دلاور کا ساتھ چھوڑ کے وہ کہاں جائے گا؟" محسن بولا۔ "میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر ہمارے دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ اس کے لیے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ غائب ہو جائے۔ وہ دلاور سے دشمنی مول نہیں لے سکتا اور ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یہ کیسٹ سنوائیں اور دھمکی دیں کہ اس کی ایک نقل دلاور کو ارسال کر دی جائے گی۔ اس کے بعد وہ کیا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

کرے گا؟ میرا خیال ہے وہ دلاور کی خدمت میں حاضر ہوکر روتے پیٹے گا کہ کس طرح ہم نے جبر اور تشدد سے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔ "دلاور کبھی اسے مجبوری کے عذر سے معاف نہیں کرے گا۔ اس کا اعتراف جرمِ غداری کے مترادف سمجھا جائے گا جس کی سزا مجرموں کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق صرف موت ہے۔ یہ بات خود ڈی سلوا بھی اچھی طرح جانتا ہوگا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دلاور تھوڑی سی عقل مندی سے کام لے تو ڈی سلوا کا تیا پانچا صاف کر سکتا ہے۔ حالات اور واقعات کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈی سلوا ہی دلاور کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر دلاور بھی یہی کہہ دے تو ڈی سلوا کیسے بچے گا؟"

"تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" محسن نے پھر کہا۔ "دلاور جانتا ہے کہ وہ تجھے ملزم ثابت نہیں کر سکتا۔ اس سے کہیں زیادہ آسان یہ ہے کہ ملزم ڈی سلوا کو بنا دیا جائے مگر اس سے دلاور کو کیا فائدہ ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ ڈی سلوا کو دو چار سال قید کی سزا ہو جائے گی مگر اس سے یہ خطرہ نہیں ہے کہ ڈی سلوا دشمن ہو جائے تو ساری پول کھول دے اور دلاور کا بیڑا غرق بھی کر دے ۔۔۔ اسے اور بھی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہیں جو کسی کو بھی معلوم نہیں ہیں۔ وہ اب تک ہر کاروبار میں اور ہر جرم میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ ان دونوں کے لیے ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن بھی نہیں ہو سکتے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا یہ کیسٹ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں، کام کیوں نہیں آ سکتا؟" محسن نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ خود اسی کیسٹ کی وجہ سے مصالحت یا کوئی سودا کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ پہلے جیسی صورتِ حال نہیں ہے۔"

"وہ اپنی بدمعاشی کے بل پر ہم سے یہ کیسٹ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا ڈی سلوا ڈبل گیم کھیل سکتا ہے۔"

"ایک کیسٹ تو ایک نیگیٹو کی طرح ہوتا ہے۔" محسن نے کہا "اس سے کئی نقلیں بنائی جا سکتی ہیں اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کوشش بے سود ہے کیونکہ ہمارے پاس اس کی دس کاپیاں موجود ہیں جن سے ہم مزید ایک سو یا ایک ہزار کاپیاں بنا سکتے ہیں۔"

"اور بھی بنا لینی چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہمارے پاس صرف اصل ہے۔"

"اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمیں خارج کرنی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جن کا نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر ضروری ہے کہ اسے ہم ایک بار سن کر دیکھیں اسی وقت۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ ابھی رابعہ چائے لے کر آئے گی تو اس سے کہیں گے کہ ٹیپ ریکارڈر ڈھونڈ لائے۔" میں نے کہا۔ "خود ہم نے کوشش کی تو انکل رضوی فوراً شک میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہ کیسٹ ان کے ہاتھ لگ گیا تو بحقِ سرکار ضبط ہو جائے گا اس لیے بہتر ہے کہ تو اسے واپس رکھ دے۔"

اسی وقت رابعہ چائے لے کر اندر آئی۔ "تم نے تو مجھے بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔" وہ ٹرے میز پر رکھ کے بولی۔ "انکل پوچھ رہے تھے کہ اس وقت چائے پینے کی کیا تک ہے؟ تم لوگوں کو سو جانا چاہیے۔ میں نے سر درد کا بہانہ کیا۔"

"کس کے سر درد کا؟" محسن نے کہا۔ "اپنے یا سکندر بخت کے؟ اور سر درد کے اسباب کیا بتائے؟"

رابعہ نے آنکھیں نکال کے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے کیسٹ کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک محسن کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ؟ یہ ایک کیسٹ ہے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔ "اور اس پر لکھا ہے پیار بھرے دوگانے۔ اگر آپ دونوں سننا یا گانا چاہیں تو ٹیپ ریکارڈر لے آئیں۔ میں یہاں سے دفع ہو جاتا ہوں۔"

"آپ ادھر سرونٹ کوارٹر کی طرف تشریف لے جائیے۔" رابعہ نے جواب دیا۔ "وہاں ایک خاتون ہیں مس شہلا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر ہے۔ آپ دونوں شوق فرمائیے۔" وہ بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"آئیڈیا، مسٹر محسن شیروانی!" میں نے کہا۔ "یہ خیال تو ہمیں آیا ہی نہیں تھا کہ ٹیپ ریکارڈر شہلا کے پاس بھی ہے۔"

"غالباً وہ سو چکی ہے۔" محسن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ "تھک گئی ہوگی سارا دن کی مصروفیت میں۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہو جائے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ پہلے عدنان کی موت کا صدمہ تھا۔ پھر اسے یہ جھوٹ نبھانا پڑا کہ عدنان زندہ ہے۔ ڈی سلوا کی وجہ سے اس کے گھر میں کشت و خون ہوا اور اب وہ کسی مفرور مجرم کی طرح روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ جذباتی دباؤ کی ایک وجہ عدنان کی ماں ہے جو نہ زندوں میں ہے اور نہ مُردوں میں۔ مصروفیت میں اعصابی دباؤ کم ہو جاتا ہے لیکن وہ گھر میں قید رہتی ہے۔ تم اتنے بے حس ہو کر تمہیں اس کی پروا ہی نہیں۔" وہ محسن کو مخاطب ہو کے بولی۔ "ورنہ تم اس کا سہارا بن سکتے ہو۔"

"نہیں بی بی! میں سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن یہ ذمے داری قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ سکندر جانتا ہے۔ میں اپنے والدین کا بھی ایک ہی بیٹا ہوں۔ اگر میرا ایک بھائی اور ہوتا تو بڑا اچھا تھا۔ میں بیک وقت ماں، بہن اور باپ کی امیدوں کا مرکز نہ ہوتا اور وقتی طور پر ان کو ناراض کرنا بھی منظور کر لیتا۔ میرے والد بہت معقولیت پسند ہیں لیکن فوزیہ ایک بے وقوف، انتہائی کم ہمت اور کمزور لڑکی ہے۔ اس میں کسی جذباتی بحران کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی چنانچہ ایک مرتبہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی بزدلانہ کوشش کر چکی ہے۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں اب صرف تین مہینے کی مہمان ہے۔ تین ماہ قبل جب ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر ٹرمینل کینسر کی تشخیص کی تھی اور حتمی فیصلہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے زندہ رہیں گی تو ہم سب نے عہد کیا تھا کہ ان کی زندگی کے بقیہ ایام میں ان کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں گے مگر وہ اس عہد کو بھول گئی۔ وہ مر جاتی تو ممی کی زندگی اور مختصر ہو جاتی اور ڈیڈی اکیلے رہ جاتے۔ یہ بات شاید ممی کو بھی معلوم ہو گئی ہے کہ ڈیڈی بہت جلد اکیلے رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے، ہر مریض کو اس کی چھٹی حس سب کچھ بتا دیتی ہے۔ شاید تیمارداروں کے محتاط رویے میں یا ان کے ظاہری اطمینان میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے جو اُن کے جھوٹ کی پول کھول دیتی ہے یا نادانستگی میں سچ سامنے آ جاتا ہے۔ اب وہ کوشش کر رہی ہیں کہ ایک مہینے کے اندر اندر بہو لے آئیں۔ زندگی مہلت دیتی تو وہ اتنی جلدی نہ کرتیں مگر وہ چاہتی ہیں کہ بعد میں کوئی ڈیڈی کا خیال رکھنے والا ہونا چاہیے۔ فوزیہ کو بالآخر اپنے گھر جانا ہے اور مجھے اطلاع تو نہیں ملی مگر میرا اندازہ ہے کہ اب وہ پھر پروفیسر ایاز ہی کا سہارا لیں گی۔ معلوم نہیں یہ چراغ دین بیچ میں کیوں آ گیا تھا۔ اس نے ممی کو گمراہ کیا۔ اپنی طرف سے انہوں نے بیٹی کے لیے وہ سب خوشی خرید لی تھی جو چراغ دین کی دولت دے سکتی تھی۔ پروفیسر ایاز کی شرافت، علمیت یا محبت نہیں دے سکتی تھی۔ ان کا نقطۂ نظر غلط تھا مگر اچھا ہوا خود حالات نے یہ بات انہیں سمجھا دی۔ ایاز نے یقیناً بہت تذلیل محسوس کی ہوگی مگر وہ کم ظرف آدمی نہیں ہے۔ وہ انہیں زیر سے نہیں لے گا۔ وہ فوزیہ کو خوش رکھ سکے گا۔"

"اور تم ۔۔۔ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ اس پر یہ انکشاف پہلی بار ہوا تھا چنانچہ وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی تھی۔ "ممی نے تمہارے لیے کس کو شریکِ حیات منتخب کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" محسن نے کہا۔ "پہلے کسی ڈپٹی سیکرٹری کی لڑکی تھی۔ چراغ دین اسکینڈل میں وہ بات ختم ہو گئی۔ خود لڑکی والوں نے انکار کر دیا اور مجھ پر بڑا احسان کیا۔ ممی کو دوسرا سبق ملا ہوگا کہ بڑے گھر والوں کے اخلاقی معیار کتنے پست ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے اب وہ اپنی پسند کا معیار بدل دیں۔ کوئی سگھڑ، سلیقہ مند، خدمت گزار ٹائپ بہو لائیں۔"

"شہلا اس معیار پر پوری اترتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اسے کوئی ناپسند نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ مگر ممی فیملی بیک گراؤنڈ بھی دیکھیں گی۔ شہلا کے ماں باپ کون ہیں، یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے اور تمہارے نقطۂ نظر سے اس کا باپ بھنگی بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ زیادہ قابلِ احترام ہو جاتا ہے جس نے بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر تمہاری ممی کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے شجرۂ نسب میں نظریۂ ضرورت کے تحت ترمیم کی جا سکتی ہے مثلاً وہ میری سگی بہن ہو سکتی ہے۔ میں انکل رضوی سے نہ سہی، بیگم رضوی سے بات کر سکتی ہوں اور وہ انکل کو سمجھا سکتی ہیں۔ پھر انکل تمہارے ڈیڈی سے بات کر سکتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں اتنا لمبا چکر چلانے کی اتنی اشد ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے بی بی؟" محسن نے کہا۔

"اس لیے کہ میں کھلی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "حقیقی زندگی کا ڈراما۔"

"بالکل اسی طرح جیسے ہم نے فلم، میرا انجھا اور سستی پنوں دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "علاوہ ولایت کی بالغ کرنے والی فلموں کے۔"

"اور اب اپنے کانوں سے سب کچھ سن لینے کے بعد میں نہیں چاہتی کہ مزید خرابی کے اسباب پیدا ہوں۔" رابعہ نے مجھے گھور کر کہا۔ "ابھی وقت ہے اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"ایک شعر عرض کیا ہے ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو!
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔"

"تھینک یو۔ مجھے صرف آپ کے این اوسی کی ضرورت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھی۔“ رابعہ نے جلتے جلتے کہا۔

”یہ اِن اوسی یکطرفہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اب تک کوئی شادی ایسی نہیں دیکھی جس میں قاضی کے علاوہ صرف دُولہا ہو اور کسی کو ایک ہاتھ سے تالی بجاتے نہیں سنا۔“

”میں صرف دائیں ہاتھ سے آپ کے ایک جھانپڑ رسید کروں تو آواز بالکل تالی کی طرح آئے گی، شرطیہ۔“ محسن نے کہا۔ ”اگر مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ اجازت دیں۔“

”میری طرف سے اجازت ہے۔“ رابعہ نے باہر سے کہا اور غائب ہوگئی۔

”کس بات کی اجازت ہے؟“ محسن نے چلاّ کے کہا۔ ”میں تو پوچھ رہا تھا کہ اجازت ہو تو نکاح شروع کروں؟“

بات مذاق میں ختم ہوگئی تھی لیکن وہ خلش ٹوٹ کر رہ جانے والی نوکِ خار کی طرح اپنے وجود کا مسلسل احساس دلا رہی تھی جس سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ رابعہ جانتی تھی کہ فوزیہ کے جذباتی بحران کی ذمے دار وہ خود بھی ہے۔ یہی احساسِ جرم مجھے بھی تھا اور محسن بھی سمجھتا ہوگا کہ رابعہ کی یہ کوشش ماضی کے عطاکردہ زخموں پر مستقبل کی امیدوں کا پھاہا رکھنے کے مترادف ہے۔ سب سے بڑا دل محسن کا تھا جس نے ہمیں معاف کر دیا تھا اور دوستی کے رشتے کا آئینہ سلامت تھا۔ اس میں بال تک نہ آیا تھا۔ اس کے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا محسوس کرتا تھا اور یہ خیال بھی مجھے اکثر آتا تھا کہ محسن کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا؟ اس سوال کا جواب بھی اتنا ہی مشکل تھا۔ معلوم نہیں جو کچھ ہوا۔ ایسا تو کسی نے نہ سوچا تھا، نہ چاہا تھا۔

”محسن!“ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم سب لوگوں نے، میرا مطلب ہے رابعہ نے، انکل رضوی نے اور تم نے، وہ خط پڑھنے کے بعد کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ اسے مخفی رکھا جائے۔“

”ہاں۔“ محسن نے کہا۔ ”کسی کو اس کے بارے میں بتانے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ پیچیدگی ضرور پیدا ہو سکتی تھی کہ تو وزیر خان کا وارث نہیں ہے اور اس کا اثر تیرے وراثت کے سرٹیفکیٹ کے مقدمے پر بھی پڑتا۔ بے شک تو خود کو وزیر خان کا بیٹا ہی سمجھتا ہے مگر یہ تیرے جذبات کا مسئلہ ہے جو قانونی مسئلے سے بالکل الگ ہے۔“

”غور طلب بات یہ ہے محسن کہ میرے والد نے اپنے دوست کو ایسی بہت سی باتیں بتا دیں... جو... اگر وہ چاہتے تو نہ بتاتے۔ مثلاً وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے محل چھوڑنے کے بعد نکاح کر لیا تھا۔ اس بات کا گواہ کون تھا۔ اور شی کبھی ثبوت نہ مانگتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر خان کو اپنے دوست پر کتنا اعتماد تھا۔ اس نے اپنی کوتاہیاں اور خامیاں چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی مگر پھر بھی اس نے وہ بات نہیں بتائی جو سب سے اہم تھی یعنی شرافت علی نے ان کو اس حد تک کیسے بلیک میل کر لیا۔“ میں نے کہا۔

”اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”اور ہم نے سب پر بحث کی تھی۔ ایک وجہ وہ تصاویر ہو سکتی تھیں جن کے نیگیٹو گیان چند کے پاس تھے۔ ممکن ہے وہ جاتے جاتے یہ نیگیٹو اپنے دوسرے رفیقِ کار کو بخش گیا ہو یا بیچ گیا ہو مگر ان سے شرافت علی پاکستان میں کیا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟“

”بہت سے ممالک کے درمیان ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو مجرموں کے تبادلے کا سمجھوتا کہلاتا ہے کہ ایک ملک کا کوئی مجرم سرحد پار کر جائے تو دوسرے ملک کی پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے اپنا مجرم فرض کرے اور وہ پکڑا جائے تو متعلقہ ملک کو واپس کر دے۔ وزیر خان کے خلاف دو مقدمات قائم تھے۔ ایک قتل کا، ایک ڈکیتی کا۔“

”ہاں۔ اور میر شرافت علی اس کو گرفتار کرا دیتا تو اسے ایک لاکھ کا وہ انعام بھی مل جاتا جو سابق برطانوی حکومت کے دور میں اس کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”مگر اس نے ایک لاکھ سے زیادہ کا فائدہ اٹھایا۔ ساڑھے تین لاکھ تو وزیر خان سے اس نے سالِ رواں کا منافع لے لیا۔ اس کے علاوہ بھی کیا کچھ نہیں لیا۔ نہیں سکندر! یہ بات کچھ اور تھی۔ اس سے بھی زیادہ سنگین خطرہ تھا جسے وزیر خان چپ چاپ ٹالتے رہے۔ شرافت علی کو اپنا منہ بند رکھنے کی قیمت ادا کرتے رہے اور خاموش رہے۔“

”تیرا مطلب ہے، وہ میرے اور وزیر خان کے درمیان موجود رشتے کو توڑ دینے کی دھمکی دیتا ہوگا؟“ میں نے کہا۔ ”میرے والد سے کہتا ہوگا کہ میں سکندر کو بتا دوں گا کہ تم کون ہو اور جو شخص میری پیدائش کا ذمہ دار ہے وہ کون تھا؟“

”ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس دھمکی کا وزیر خان مرحوم پر بھی کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں وقتی طور پر صدمہ ضرور ہوا تھا مگر بہت جلد تم سنبھل گئے تھے۔ وزیر خان مرحوم کے لیے اب تمہارے جذبات کے آئینے میں بال تک نہیں۔ تمہاری فطرت کو میں سمجھتا ہوں تو کیا وہ شخص نہیں سمجھتا ہوگا جس نے تمہیں پیدائش کے وقت سے تمہیں پال پوس کے بڑا کیا۔ تمہارے لیے بیک وقت باپ اور ماں بن کے جیا اور تمہارے لیے مر گیا۔ اسے تم پر اعتماد ہوگا کہ کوئی لاکھ گمان کرے اور وزیر خان کے خلاف کچھ بھی کہے، تمہارے جذبات کا رُخ نہیں پلٹ سکتا۔ میر شرافت علی یا گیان چند کے لیے ان تصویروں کی مدد سے ان کو قاتل ثابت کرنا بہت آسان تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ تصدیق کرنا چاہو تو کر لو کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کو بھگا کر لایا تھا اور انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی والی بات کو ثابت کرنا آسان نہیں تھا۔ پرانے وقتوں میں نکاح تو دو گواہوں کی موجودگی میں ہو جاتے تھے۔ لکھت پڑھت ہوتی ہی نہیں تھی مگر وہ الزام بہرحال لگا سکتے تھے اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ سابق ہندوستان اور موجودہ بھارت کی پولیس سے پوچھ کر دیکھو۔ ان کے پاس دس لاکھ کے ہیرے جواہرات لے کر بھاگ جانے والے وزیر خان کے خلاف ایک ایف آئی آر بھی نکل آئے گی جو پرنس خورشید عالم عرف خرم نے لکھوائی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم کہہ دوگے کہ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میرے لیے وزیر خان ہی باپ ہے اور اس حیثیت میں اس کی عزت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انہوں نے یہ نہیں کیا۔ انہوں نے وزیر خان کو بھی دھمکی نہیں دی اور تم سے بھی رابطہ قائم نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ وزیر خان سے بات کر کے منہ کی کھا چکے ہوں۔ اس نے کہہ دیا ہو۔ جاؤ، تمہارا جو دل چاہے کرو، جیسے جو چاہو بتاؤ۔ سکندر میرا بیٹا ہے اور میرا بیٹا ہی رہے گا۔ اس کے بعد...“

”مجھے ایک بات بتا محسن!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تو جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ بات شرافت علی کی تھی مگر تو گیان چند کو بھی بیچ میں لا رہا ہے؟“

”گیان چند کے بارے میں آخری اطلاع یہی تھی کہ وہ جان بچا کے بھاگ گیا تھا۔“ محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”لیکن بھاگ کر وہ کہاں گیا تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ انکل رضوی کا خیال ہے کہ وہ پنجاب کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہو سکتا ہے تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے نہ گیا ہو۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اپنی جائداد کو اپنے مذہب سے زیادہ اہم سمجھا اور ملک بدلنے سے زیادہ آسان یہ سمجھا کہ وہ مذہب بدل لیں اور پھر وہیں رہیں جہاں رہتے تھے۔ ویسے بھی بہت سے ہندو پاکستان میں اسی طرح آباد ہیں جس طرح بھارت میں مسلمان۔ اور ان میں دولت مند بھی ہیں۔ مثلاً پنڈی میں ایک مشہور فوٹو گرافر ہندو ہے۔ ایک دندان ساز ہے جس کی دکان صدر میں ہے اور وہ کوئی معمولی ڈینٹسٹ نہیں۔ وہ عام شہریوں کی طرح معزز زندگی گزار رہے ہیں ... شہر میں بھی ان کی حیثیت کا معیار ان کی دولت ہے جنوں کا وہ دور گزر چکا ہے جب مذہب کے نام پر شیطانوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی اور اب اُس وقت کو یاد کر کے بھی انسانوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ اندرونِ سندھ بہت سے دولت مند ساہوکار اور زمیندار، ڈاکٹر، ایڈووکیٹ اور پروفیسر ہندو ہیں۔ کیا گیان چند اُن میں شامل نہیں ہو سکتا؟ انکل رضوی سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ شرافت علی، چوہدری دلاور، ڈی سلوا اور خسر جمشید کے علاوہ اسی گروہ میں گیان چند بھی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اب اس کا نام ہی بدل گیا ہو۔ چہرہ تو وقت کے ساتھ کچھ بدل ہی جاتا ہے...“

”اس خط میں لکھا تھا کہ گیان چند نے وہ تصاویر سر جان سائمن کو ارسال کر دی تھیں جن میں وزیر خان کو ریذیڈنٹ کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد دفن کرتے دکھایا گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”جان سائمن کے پاس وہ تصویریں تو اب بھی ہوں گی۔“

”ضرور ہوں گی اور لندن میں ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا سبب وہ تصاویر ہو سکتی ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”یعنی جب تک سر جان سائمن کو یہ علم نہ تھا کہ تم کس کے بیٹے ہو، اس نے مارگریٹ کی تم سے محبت کو طوعاً و کرہاً برداشت کیا۔ دیسی لوگوں سے اس کی حد درجہ نفرت کے اسباب بھی اس پس منظر میں صاف نظر آتے ہیں۔ فرض کرو کسی مرحلے پر تمہارے والد کے انکار کے بعد جان سائمن کو یہ بات بتا دی گئی کہ وزیر خان تمہارا باپ تھا۔ برطانیہ میں بیٹھ کے وہ وزیر خان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے تمہیں قتل کرانے کی کوشش کی۔ محض اس لیے کہ وزیر خان کو بڑھاپے میں اتنا ہی شدید جذباتی صدمہ پہنچے جتنا اسے جوانی میں اٹھانا پڑا تھا مگر یہ بھی مفروضہ ہے۔ وزیر خان مرحوم نے سب کچھ تو انہیں دے دیا تھا۔“

”لیکن وہ کاروبار سے دستبردار ہونے پر آخری وقت تک رضامند نہیں ہوئے تھے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ شاید اسی بات پر انہیں دھمکی دی گئی ہو کہ سکندر کے بارے میں سر جان سائمن کو بتا دیا جائے گا۔“ محسن نے کہا۔ ”اور انہوں نے کہہ دیا ہو کہ اب جو چاہو کرو۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اور کچھ نہیں لیکن خود شرافت علی اینڈ کمپنی کے لیے بھی اس میں سو فیصد تحفظ کی ضمانت نہیں تھی۔ بالفرضِ محال وزیر خان کو برسوں پرانے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا تو کیا شرافت علی محفوظ رہتا اور وہ گیان چند جو تھا، یا ہے... محفوظ رہتا؟ وزیر خان کے بیان کے بعد وہ بھی ملوث ہو جاتے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ ریاست سلطان آباد کہیں نہ کہیں ضرور ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی خود مختاری بھارت میں ضم ہو جانے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

سے ضرور ختم ہو گئی ہو گی مگر وہ جگہ، سلطان آباد، وہاں کے لوگ جو سابق حکمرانوں کے دور میں زندہ تھے جو نواب کو، ریذیڈنٹ کو، پرنس کو، ان سے منسوب داستانوں کو اور سلطان آباد کی تاریخ کو یقیناً جانتے ہوں گے۔ کسی کتاب میں اس تاریخ کا ذکر ملے نہ ملے، ایک کے بعد دوسری نسل کو منتقل ہونے والی روایات زندہ رہتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے کا تصور کر سکتا ہوں حالانکہ ۱۹۱۹ء میں میرا وجود تک نہ تھا اور میں کبھی جالندھر نہیں گیا مگر میں نے پڑھنے کے علاوہ بہت سے لوگوں سے بہت کچھ سنا ہے۔ سلطان آباد کی موجودہ نسل کو بھی پرانے واقعات کا ضرور علم ہو گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اصل حقائق میں بہت کچھ زیبِ داستان کے لیے بھی شامل ہو گیا ہو گا مگر حقائق کا حوالہ پھر بھی ملے گا۔“

”رابعہ کا خیال تھا کہ خسرو جمشید ہی دراصل پرنس خورشید عالم ہے، جو بعد نواب خورشید عالم ہو گیا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ انکل رضوی نے غیر سرکاری طور پر ٹیلی فون کے ذریعے ہندوستان کے سفارت خانے سے درخواست کی تھی کہ سلطان آباد کے آخری نواب خورشید عالم کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ ان کے کسی صحافی دوست نے یہ کام کیا تھا۔ جواب یہ ملا کہ نواب نے پانچ سال سرکاری وظیفہ لیا۔ پھر اپنی تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ کو فروخت کیا اور غالباً لندن چلا گیا۔ شادی تو اس نے نہیں کی تھی چنانچہ سلطان آباد میں حکمران خاندان کا کوئی فرد نہیں۔ خسرو جمشید بھی لندن ہی سے آیا تھا لیکن میں نے کہا کہ یہ اس کے باپ کا نام تھا، خسرو جمشید مر چکا ہے اور اس کی قبر یہیں موجود ہے۔ وہ خسرو پرویز تھا جو تمہیں ملا تھا اور جس کے ساتھ ایک ہمشکل شوفر رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ خسرو پرویز لندن میں مر گیا ہو اور سابق نواب خورشید عالم نے دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہونے کے لیے یہ نام اختیار کر لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لاہور آنے کے باوجود اپنی کوٹھی میں نہیں گیا۔ اس کا مالی زندہ ہے۔ وہ فوراً پہچان جاتا کہ خسرو پرویز کے بہروپ میں کوئی اور ہے۔ تجھے یاد ہے کہ وہ چوکیدار مالی قسم کا بوڑھا ہمارے منہ سے خسرو جمشید کا اور پھر خسرو پرویز کا ذکر سن کے کتنا حیران ہوا تھا۔“

”نواب خورشید عالم نے اپنا نام کیوں بدلا ہے اور بدلنا ہی تھا تو یہ نام کیوں اختیار کیا؟“ میں نے کہا۔

”جب تک خسرو پرویز سے دوبارہ ملاقات نہ ہو یہ عقدہ وا نہیں ہو سکتا۔“ محسن نے کہا۔

”اگر زندگی نے مہلت دی تو میں کبھی نہ کبھی سلطان آباد ضرور جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس سے پہلے یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے نمٹنا ہے۔“ یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ کھڑکی کے پاس سے ایک سایہ سا گزرا ہے۔

”یہ... یہ کون تھا؟“ محسن نے چونک کر کہا۔ ”کیا کوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا؟“

”دیکھا تو کچھ میں نے بھی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں سمجھا میری نظر کا دھوکا ہے۔“

محسن نے کھڑکی کھول کے باہر جھانکا۔ ”یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“ اس نے احتیاط سے دائیں بائیں نگاہ ڈال کے کہا اور پھر باہر اتر گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی رضوی صاحب کی کوٹھی میں گیٹ لائٹ یا ہمارے کمرے کی لائٹ کے سوا کہیں روشنی نہ تھی۔ ”ہوشیار...!“ باہر سے چوکیدار صدا لگاتا گزرا۔ میں نے اٹھ کر باہر دیکھا تو مجھے اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے محسن کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ کوٹھی کے گرد گھوم کر دوسری دیوار کے گوشے سے سرونٹ کوارٹر پر نگاہ ڈالنا چاہتا تھا جہاں اب شہلا مقیم تھی۔ میں چند قدم اس کے پیچھے گیا اور رک گیا۔ صرف اس خیال سے کہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں اور محسن بھی کوارٹر تک جا کے لوٹ آئے گا۔ میری نظروں کے سامنے اس نے سرونٹ کوارٹر کی بیرونی دیوار تک پہنچ کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہلا احتیاط پسند لڑکی تھی اور اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس میں احتیاط پسندی ایک ضرورت تھی۔ یہ بات مجھے قدرے غیر معمولی لگی کہ اس اجنبی گھر میں پہلی رات ہی اس نے سونے سے پہلے کھڑکیاں اور دروازے کھلے چھوڑ دیے۔ محسن کے اور میرے درمیان شاید پچاس گز کا فاصلہ بھی نہیں ہو گا۔ اگر اس نے دستک دی ہوتی تو اس خاموشی میں میرے کان ضرور سن لیتے۔ میں یہ بھی فرض نہیں کر سکتا تھا کہ محسن نے شہلا کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا اور وہ نصف شب کے بعد دروازہ کھولے چشم براہ تھی۔ ایسی بات ہوتی تو محسن مجھے ضرور بتا دیتا۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنا ہوتا تو اس کے لیے اتنی رازداری کے اہتمام کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ ان کی راہ میں حائل ہونے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر یہ ”شجرِ ممنوعہ“ قسم کی محبت اور چوری چھپے ملنا چہ معنی دارد؟

ابھی تک گھر میں مکمل اندھیرا تھا۔ اگر شہلا جاگ رہی ہوتی تو محسن کے آنے پر لائٹ ضرور جلا دیتی۔ میری نظریں اس منظر کا تصور کرنے سے قاصر تھیں، وہ دونوں اندھیرے کی پناہ میں سایوں کی طرح کھڑے فلمی محبت کے جذباتی مکالمے بول رہے

ہوں گے۔ آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا اور سرونٹ کوارٹر کے کھلے دروازے تک جا پہنچا۔ ”محسن!“ میں نے مکمل خاموشی میں چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ اونچی آواز میں پکارا کہ اگر وہ اندر کے کسی کمرے میں ہوتا تب بھی میری آواز سن لیتا۔ پھر میں نے شہلا کو آواز دی مگر سکوتِ شب میں کمی نہ آئی اور یہ احساس بوجھل ہونے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے نظر آ رہے تھے۔ اب شک کی گنجائش ختم ہونے لگی تھی۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ شہلا باہر والا دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو مگر کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر سونا شہلا کے لیے مشکل تھا۔ وہ حالات سے بے حد خوف زدہ تھی اور یہ نئی جگہ تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ باقی گھر سے الگ ہے اور اس کے ساتھ صرف ایک بوڑھی عورت ہے جو کچھ نہیں کر سکتی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر بے فکری سے سو جائے۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ میری نگاہ کمروں کے کھلے دروازوں سے گزر کر اندھیرے میں کسی غیر معمولی حرکت یا اجنبی اور نا آشنا سائے کی جستجو میں تھی لیکن اندھیرا دیوار سے زیادہ ٹھوس تھا اور جامد تھا۔ خطرے کی بُو دیتا ہوا۔ کسی نامعلوم خوف سے دبکا ہوا، سہما ہوا۔ میں نے اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ میں نے نیچے دیکھا اور لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ فرش پر محسن چت لیٹا تھا۔ ”محسن!“ میں نے چلا کر کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے کو ٹٹولا۔ یہ حرکت قطعی غیر ارادی تھی لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے سر کے کسی زخم سے لہو تو نہیں بہہ رہا ہے۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار مجھے نارمل لگی۔ ایک جست لگا کے میں نے باتھ روم کی لائٹ جلا دی جو قریب ترین تھی۔ دروازے سے روشنی کا ایک مستطیل ٹکڑا صحن میں پھیل گیا اور میں نے محسن کو کسی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا دیکھا۔ ایک مگ میں پانی لے کر آدھے منٹ بعد پھر محسن کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ وہ آہستہ سے کراہا اور میں نے پانی کا مگ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ میں سے آدھا حلق سے اترا۔ باقی ہونٹوں کے کناروں سے بہہ گیا لیکن میری کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ دو منٹ بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے سر دبا کے اندر دیکھا۔ ”شہلا... وہ... سکندر... کیا وہ لے گئے اسے؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”کون؟“ میں نے کہا۔ ”کون لے گیا شہلا کو؟“ میں نے کہا۔

”وہی... جنہوں نے میرے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔“ محسن نے کہا۔ ”جیسے ہی میں اندر داخل ہوا... میں نے اسے دیکھا نہیں...“

اب تک میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ میری ساری توجہ محسن پر رہی تھی۔ اس کی بات پر میں نے پلٹ کر دیکھا اور کمرے تک پہنچنے والے مدھم سے اجالے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں نے پوری طرح چوکس رہتے ہوئے آگے بڑھ کر کمرے کی بجلی جلائی۔ کمرے کا پورا منظر یکلخت میرے سامنے آ گیا اور میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہلا کرسی پر بندھی بیٹھی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ پیروں کو رسی کے اگلے دو پایوں سے باندھا گیا تھا اور ہاتھوں کو ساتھ ملا کر ایک ہی رسی نیچے سے اوپر کرسی کی پشت تک لپیٹ دی گئی تھی۔ اس طرح کہ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ حرکت نہ کر سکے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو ضبط کیا۔ یہ رضوی صاحب کے گھر میں ان کی پہلی رات تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ شور اور ہنگامے سے رضوی صاحب کی فیملی جاگ اٹھے تو انہیں احساس ہو کہ ہماری میزبانی قبول کر کے انہوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ جانتے بوجھتے ہمارے خطرات کو اپنا دردِ سر بنا لیا ہے اور اپنی پُر تحفظ زندگی کا سکون قربان کر دیا ہے۔

سب سے پہلے میں نے شہلا کی ظاہری حالت دیکھی وہ صرف بے ہوش تھی۔ اس کے جسم پر مزاحمت، مقابلے یا تشدد کے آثار ناپید تھے۔ جب میں نے اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھولنی شروع کی تو مجھے احساس ہوا کہ باندھنے والوں نے اسے باندھ کے محض مذاق کیا ہے۔ ان کا مقصد ہرگز یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ شہلا کو بے بس کر دیا جائے۔ رسیاں اتنی ڈھیلی تھیں کہ اگر شہلا ہوش میں آ جاتی تو معمولی سی جدوجہد کر کے خود کو آزاد کر سکتی تھی۔ پیروں کی گانٹھیں ایک اشارے میں کھل گئیں۔ شہلا کے ٹخنوں پر ہلکا سا نشان ضرور پڑ گیا تھا مگر خراش نہیں آئی تھی۔ اس رعایت اور رحمدلی کے مظاہرے کی غرض و غایت میری سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میں نے ایک اور بات پر غور کیا۔ اسے بے بس کرنے والوں نے یہ بندوبست بھی نہیں کیا تھا کہ شہلا ہوش میں آنے کے بعد چلانے نہ لگے۔ نہ اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونسا گیا تھا اور نہ ہونٹوں پر ٹیپ چپکایا گیا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تھا۔ باندھنے کا مقصد یہ لگتا تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں کرسی سے نہ گر پڑے اور جیسے ہی ہوش میں آتے مدد کے لیے پکارنے لگے۔

"یہ کیا چکر ہے محسن؟" میں نے محسن کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ "تو نے دیکھا تھا کسی کو؟"

"نہیں۔ میں تو دروازہ کھلا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اور وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا کہ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا اس نے کوئی سخت سی چیز میرے سر پر دے ماری۔"

میں نے شہلا کو کرسی سے اٹھا کے بستر پر لٹا دیا۔ "کوئی سلاخ یا ڈنڈا؟"

"نہیں۔ انہوں نے وہی ہتھیار استعمال کیا۔" محسن بولا۔ "ربر کے ہوز یا ٹیوب کے ایک سرے پر لکڑی کا کوئی ٹکڑا پھنسا دیا یا کرکٹ کی گیند فٹ کر دی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے سر میں توپ کا گولہ آ لگا ہے مگر چوٹ کی کوئی علامت نہیں۔ بیہوش ہونے سے پہلے مجھے آواز نکالنے کی کیا پورا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ میں فوراً آؤٹ ہو گیا تھا۔ شہلا کو کیا ہوا ہے؟"

"ممکن ہے شہلا پر بھی وہی ہتھیار آزمایا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہلا محض دہشت سے بیہوش ہو گئی ہو۔ کلوروفارم وغیرہ کی بُو تو ہے نہیں اور مجھے تشدد کے آثار بھی نہیں ملتے۔ وہ خود ہی ہوش میں آ کے کچھ بتا سکے گی۔"

"وہ سایہ سا جو ہماری کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انہی لوگوں میں سے ایک ہو گا جو یہاں آتے تھے اور انہی میں سے ایک کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔"

"ایک وجہ میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ وہ ہمیں متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے ہم اس سائے کو کھڑکی کے سامنے سے گزرتا نہ دیکھ پاتے تو کچھ دیر بعد شہلا کی چیخ و پکار ہمیں متوجہ کر لیتی، لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہمیں یوں متوجہ کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور وہ آخری آدمی جو تیرے آنے کے بعد گیا، پہلے کیوں نہیں چلا گیا تھا؟ اصل وجہ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ صرف مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کو یہ خیال بھی تھا کہ کہیں ان کی ساری پلاننگ فیل نہ ہو جائے۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرنے والے پر صرف تیری نظر پڑے تو میری بجائے صرف تو آئے اور صورتِ حال کو مخدوش پا کے مجھے روک دے۔ اتفاق سے یہاں پہلے تو آیا اور وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے نکل گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب کچھ دیر بعد میں بھی ضرور پہنچوں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟"

"شہلا ہوش میں آ جاتے تو شاید کچھ بتا سکے۔" محسن نے گھڑی دیکھی جس میں رات کا ایک بجا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "محسن! دوسرے کمرے میں... وہ شہلا کی ماں کا بیڈ تھا۔ تو یہاں ٹھہر، میں دیکھتا ہوں۔"

دوسرا کمرہ بالکل خالی تھا۔ دو دیواروں کے سنگم پر لگا ہوا صاف ستھرا بستر دیکھ کے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ بوڑھی مفلوج عورت اس پر موجود تھی جسے شہلا اپنی ماں سمجھتی تھی۔ اب اس کی جگہ شکن آلودہ سفید چادر پر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس لفافے کو یوں اٹھایا جیسے اس میں موت کی اطلاع کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے بتایا جائے گا کہ

مسٹر سکندر بخت! جنگ ابھی جاری ہے۔ اس سے پہلے ایک محاذ پر تم اپنی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے جیسے کوئی چالاک جنرل دشمن کی فوجوں کو آپس میں ہی لڑا دے۔ لیکن اب جنگ ایک نئے فیصلہ کُن موڑ پر آ گئی ہے۔ صبح تمہیں اس عورت کی لاش مل جائے گی جس سے تمہارا براہِ راست کوئی جذباتی تعلق نہیں۔ اب تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کتنے بڑے شکاری تھے۔ تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو تو اپنے مہرے شمار کر لو۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد شہلا کی باری آ جائے۔ پھر فوزیہ کی، رابعہ کی، محسن کی اور بالآخر سب کچھ کھو کر تمہیں حقِ وراثت مل جائے۔

میں نے لاحول پڑھ کے ذہن سے پریشان کرنے والے خیالات کو جھٹک دیا۔ کیا یہ میری ذہنی شکست خوردگی کے آثار ہیں۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔ اور اب تو اپنے خیالوں سے ڈرنے لگا ہوں۔ مجھے پہلے اس لفافے کو کھول کر تو دیکھنا چاہیے۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ میں نے اس کے اندر سے وہ کاغذ نکالا جو کسی کتاب یا رسالے میں سے پھاڑا گیا تھا بلکہ نوچ لیا گیا تھا۔ مطبوعہ عبارت کو کہیں کہیں سے انڈر لائن کر دیا گیا تھا۔ یہ جرم و سزا کی کوئی کہانی تھی اور خط کشیدہ جملوں کو ملا کر پڑھنے سے پیغام بالکل واضح ہو جاتا تھا۔

خط کشیدہ الفاظ اور جملوں سے یہ عبارت بنتی تھی۔

"ہم کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ تمہاری بیوی کو ہم ایک خاص مقصد کی خاطر لے جا رہے ہیں۔ اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے تو ہماری بات مان لو۔ پولیس کو اطلاع دی تو ہم تمہاری بیوی کی لاش پولیس ہیڈ کوارٹر کے دروازے پر ڈال جائیں گے۔ باہر نکل کے دائیں طرف چلنا شروع کر دو۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے

پر تمہیں سلیٹی رنگ کی ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔ کار میں کوئی بھی نہیں ہو گا۔ مزید ہدایات تمہیں کار کے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے لفافے میں ملیں گی۔ ہم ایک گھنٹے تک تمہارا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد تمہاری بیوی..."

آخری جملہ اس لیے نامکمل رہ گیا تھا کہ وہ اس صفحے کی عبارت کا آخری جملہ تھا۔ باقی جملہ اس سے اگلے صفحے پر مکمل ہوا ہو گا، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ مطلب بہرحال واضح ہو جاتا تھا۔ ایک بچہ بھی تھوڑی سی عقل سے کام لے کر 'خالی جگہ کو پُر کیجیے' کا یہ سوال حل کر سکتا تھا۔ "اس کے بعد تمہاری بیوی کو قتل کر دیا جائے گا۔" وہ میری بیوی کو اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے مگر "تمہاری بیوی" کی جگہ "شہلا کی ماں" کے الفاظ رکھنے سے عبارت بالکل حسبِ حال ہو جاتی تھی۔ یوں گویا کسی اغوا کنندہ نے پیغام اپنے ہاتھ سے لکھا ہو۔

"یہ کیا لیے کھڑا ہے تو؟" محسن نے میرے پیچھے آ کے کہا اور میں نے وہ صفحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی مطلب سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔

"یہ بہت چالاک لوگ ہیں۔" وہ صفحے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے اپنا ہینڈ رائٹنگ تو کیا ٹائپ کے حرف کا پیغام بھی نہیں چھوڑا۔"

"حالانکہ ہماری پولیس۔ چشمِ بددور۔ ٹائپ رائٹر کے الفاظ کی ساخت اور صورت سے تا قیامت معلوم نہیں کر سکتی کہ یہ کس ٹائپ رائٹر کی تحریر ہے۔"

"اسکاٹ لینڈ یارڈ والے تو نے بھی دیکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اس صفحے کو بھی رکھ لیتے۔ پھر معلوم کر لیتے۔ یا کم از کم معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرتے... کہ یہ کس کتاب یا رسالے کا صفحہ چھیانوے ستانوے ہے۔ اصل کتاب انہیں نہ ملتی تب بھی وہ دوسرے نسخے سے کہانی ضرور ڈھونڈ لیتے اور پھر پوری کہانی پڑھ کے اس کے پلاٹ پر بھی غور کرتے کہ کیا اس سے کوئی سراغ ملتا ہے۔ لیکن یہاں تو یہ منوانا بھی مشکل کام ہے کہ یہ صفحہ واقعی بڑی بی کو اغوا کرنے والوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے اور یہ لکیریں بے مقصد نہیں ہیں اور کسی بچے نے نہیں لگائی ہیں۔ حرام خور قسم کے لوگوں کے لیے یہی بہانہ بہت ہے کہ اس میں تو لکھا ہے، 'ہم تمہاری بیوی کو ایک خاص مقصد کے لیے لے جا رہے ہیں۔' آپ دونوں میں سے تو کوئی شادی شدہ ہی نہیں چنانچہ یہ سب بے معنی بکواس ہے۔ یہ سمجھانا مشکل بارت میں 'شہلا کی ماں' کے الفاظ وہ کہاں سے لاتے؟"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"کرنا وہی ہے جو ہمیں کہا گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔ شہلا کی ماں کو واپس تو لانا ہی ہے۔"

"ایسے ہی؟ خالی ہاتھ؟" محسن نے کہا۔ "تو خود کیسے واپس آئے گا؟"

"میں ابھی سے کیسے بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مسلح ہو کر جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں پستول لے کر جاؤں گا تو وہ توپ لیے منتظر ملیں گے اور ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے دو ضرور ہوں گے۔"

"ہمیں رضوی صاحب کو بتا دینا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "انسپکٹر شیخ کو بھی یہ شکایت تھی کہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر نقصان اٹھاتے ہیں۔"

"میں یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ یقیناً مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے اور یہ بات بھی نئی نہیں ہو گی۔ وہ پرانی بات منوانے کے لیے دباؤ بڑھانا چاہتے ہیں۔ مجھے مار دینے سے ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ ان کو پہلے بھی معلوم تھا اور ہم نے بھی اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ میری فکر مت کر۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے کیا دھمکی دیتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ بڑی بی کو ساتھ لے کر جلد از جلد لوٹ آؤں۔ اگر صرف میرے وعدے سے کام چل سکتا تو میں سمجھتا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے نکل آؤں گا لیکن معاملات اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کچھ اور سوچا ہو گا جس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا۔ یہ تو ان سے مل کر ہی معلوم ہو گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اگر مذاکرات کامیاب رہے تو میں صبح ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا لیکن میں نہ آؤں تو جیسا تو مناسب سمجھے کرنا۔ اگر شہلا خود رضوی صاحب کو بتا دے کہ رات کو کیا ہوا تھا تو یہ زیادہ اچھا ہو گا۔ پھر تو کہہ دینا کہ میں سو کر اٹھا تو مجھے سکندر کے پلنگ پر یہ صفحہ پڑا ہوا ملا اور کہہ دینا میرا خیال ہے وہ شہلا کی ماں کی جان بچانے کے لیے نکل گیا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ اس نے تمہیں بھی نہیں بتایا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"اس کا جواب آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "تو کہہ سکتا ہے کہ شاید سکندر نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ میں اسے اکیلا جانے نہیں دوں گا۔ بات یہ ہے محسن کہ اس معاملے میں میری چھٹی حس میری رہنمائی کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تاخیر ہوئی یا ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو اس بڑھیا کی جان ضرور جائے گی جس کا ہمارے مسائل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ ہم بھی اتنے ہی بے حس اور بے ضمیر ہوتے تو خود کو قائل کرنے کے لیے ہمارے پاس دلائل کی کمی نہیں۔ اس بڑھیا سے شہلا کا قریبی تعلق تو ہے لیکن کوئی گہرا جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ تجھے یاد ہو گا کہ عدنان کی موت کا اسے دکھ ضرور ہوا تھا مگر ایسا شدید صدمہ نہیں جیسا اسے سگے بھائی کی موت پر ہوتا۔ بڑھیا کی موت پر وہ پاگل نہیں ہو جائے گی۔ ہم اس دھمکی کو اس طرح بھی نظر انداز کر سکتے ہیں کہ وہ آدھی ادھوری بے مصرف اور بے سہارا زندگی نہ رہی تو اچھا ہی ہو گا جو دوسروں کے اعصاب پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے جس کے لیے اپنا وجود ایک مسلسل ذہنی و جسمانی اذیت کے سوا کچھ نہیں اور اس طرح مر جانے سے ماں پر جوان بیٹے کی موت کا راز افشا نہیں ہو گا اور ہم اس کی نظر میں ذلیل نہیں ہوں گے کہ ہم نے جھوٹ بول کر اسے دھوکے میں رکھا۔ اس کو لندن سے موصول ہونے والے بے وجود خطوط سناتے رہے جبکہ اس کے بیٹے کا وجود محض ہڈیوں نے ایک مدفون پنجر کے سوا کچھ نہ تھا اور کیا معلوم جس روز بھی حقیقت کا انکشاف ہوتا وہ اسی روز صدمے سے مر جاتی مگر یہ سب دلائل غیر انسانی ہیں۔ اگر وہ مفلوج ہونے کے علاوہ پاگل ہوتی یا اس کی زندگی کی چند سانسیں باقی ہوتیں تب بھی میں اس کی اور اپنی زندگی کو ایک ہی سطح پر اہمیت دیتا۔ تو شہلا کا خیال رکھنا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی زیادہ کارآمد بات بتا سکے اور اسے تسلی بھی دینا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر صبح تک معاملات طے ہو گئے تو رضوی صاحب کو کچھ معلوم ہی نہیں ہو گا۔"

محسن کو خاموش اور اپنے خیالات سے نبرد آزما چھوڑ کے میں باہر نکل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے دلائل نے اسے قائل تو کر لیا ہے لیکن جذبات کی دیوار کو عبور کرنا اس کے لیے مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ وہ مجھے ہنسی خوشی کیسے اجازت دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں جن لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں، وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔ ویسے بھی دنیا میں یہ کہاں ہوا ہے کہ جنگ اصولوں پر لڑی گئی ہو۔ وہ وقت اور اس وقت کا تصور بھی اب مضحکہ خیز لگتا تھا جب سورج غروب ہوتے ہی لشکر ہتھیار رکھ کے خیموں میں لوٹ آتے تھے اور اگلی صبح طبلِ جنگ بجنے تک لڑائی پھر شروع نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ لڑائیاں بھی کھلے میدانوں میں ہوتی تھیں مثلاً پانی پت کا میدان۔ جنگ نہ ہوئی کرکٹ ہو گئی کہ لارڈز یا ٹرینٹ برج کے گراؤنڈ میں ہو سکتی ہے جہاں مقابلہ دو ٹیموں میں نہیں دو ملکوں میں ہوتا ہے۔ اصول و قواعد اور ضوابط کے مطابق وکٹ گری ہوئی اور اپیل پر کھیل ختم۔ اب صبح لڑیں گے کشتوں کے پشتے لگا کر رکھ دیں گے۔ گویا چوکے چھکے مار مار کے چھکے چھڑا دیں گے۔ بغیر لڑے شکست گویا انگ کی فتح۔

اپنے خیالات کی رو میں بہتا میں ابھی گیٹ سے نکل کے پچاس قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا اور پھر سامنے دور تک سڑک کو روشن کر دینے والی ہیڈ لائٹس کے اجالے میں کسی سلیٹی رنگ کی کار کی جستجو کرنے لگا مگر سڑک کے آخری کنارے تک مجھے صرف ایک گاڑی دکھائی دی جس کا رنگ سفید تھا۔ ممکن ہے اس صفحے کی عبارت میں سفید کی جگہ سلیٹی ہی چھپا ہوا ہو۔ جیسے "شہلا کی ماں" کی جگہ تمہاری بیوی تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ ایک کار ملے گی اور کار تقریباً اسی جگہ موجود تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی کار اس طرح میرے پاس آ کے رکی کہ مجھے زبردست رگڑ لگی اور میں ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ میری کہنی بھی کار کے دروازے کے ہینڈل سے ٹکرائی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے دروازے کھلے اور ایک ساتھ دو افراد نے مجھے تقریباً اٹھا کے پیچھے والی سیٹ پر اچھال دیا جس پر پہلے سے ایک شخص ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ مجھے اچھالنے والے دونوں افراد میں سے ایک تو خود ڈرائیور تھا اور دوسرا عین اس کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا گوریلا جو میرے اندر گرتے ہی پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ایک منٹ سے کم وقت میں دروازے پھر بند ہوئے اور کار چل پڑی۔ میں اب پچھلی سیٹ پر دو گوریلوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا جو قد و قامت سے دیوزاد لگتے تھے تو صورت سے حبشی مگر میں نے دیکھ لیا کہ انہوں نے چہروں پر کالک یا سیاہی وغیرہ مل رکھی ہے۔ گردن کے نیچے اور کان کے پیچھے ان کا اصل گندمی رنگ زیادہ سفید نظر آتا تھا۔ آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے علاوہ بھی ایک شخص تھا جس نے پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا اور زبان سے ایک لفظ نہیں بولا۔ وہ کچھ پستہ قد تھا۔ بھاری بدن کا اور اطوار و انداز سے مغرور نظر آنے والا۔ اس نے مفصل ہدایات پہلے ہی دے دی تھیں چنانچہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی اور میں خاموشی سے برضا و رغبت اغوا ہو گیا تھا۔ گاڑی کے شیشوں پر اندر سیاہ پینٹ کر دیا گیا تھا۔

"اس گاڑی کا رنگ سلیٹی تو نہیں، نیلا ہے۔" میں نے یہ بھی کہا جب گاڑی دائیں طرف گھومی۔ "اور یہ ...ی گاڑی ہے۔ اوپل ریکارڈ، لیفٹ ہینڈ ڈرائیو، 76 کے ... ماڈل ہے۔ بہت اچھی گاڑی ہے۔"

... کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ڈرائیور کے ... وہ میرے دائیں بائیں کا مک مل کے بیٹھنے والے تینوں افراد ... ایک جیسے سیاہ لباس بھی پہن رکھے تھے اور وہ قد و قامت ... بھی ایک دوسرے سے کم نہ تھے لیکن ایک بات میں ... نوٹ کر لی۔ ڈرائیور کے کالے کانوں میں سنہری مندریاں ... رہی تھیں۔

"اس کے ونڈ اسکرین پر یہ لکیر سی کیسی ہے؟" میں نے کہا۔

... شیشے میں بال پڑ گیا ہے۔ مار دیا ہو گا کسی نے دو ڈالنس ... پتھر اور ڈیڑھ گئی دو ہزار کی۔ میرا خیال ہے، میں دوبارہ اس ... کو دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔"

"پھر کسی جنم میں، اس جگہ سے گزرو گے تو سب یہ کچھ ... یاں لو گے۔ بشرطیکہ دوسرا جنم ملا اور تم اس میں آدمی ہی ... کتے نہ ہوتے۔" ڈرائیور نے غرا کر کہا۔

میں ہنسا۔ "میرا اس زندگی پر اعتقاد ہے یا عاقبت کی ... زندگی پر۔ خدا کا شکر ہے اس نے مجھے انسان بنایا ہے ورنہ ... اس دنیا میں بھی کتے کی طرح رہے۔ آقا کے اشارے پر چلنے ... ایک ہڈی کے پیچھے لپکنے والے۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ ... جس کی دم کو کسی نے بارہ سال بعد نلکی سے نکال کے دیکھا ... ٹیڑھا ہی پایا۔ معلوم نہیں تیرہ سال بعد کیا ہوتا ویسے ... بھونکتے ہی ہو یا کاٹتے بھی ہو ... اور وہ کتے ہو جو کتے ... اری ہوتا ہے ..."

میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنی کہنی سے ... پسلی پر زبردست وار کیا۔ درد کی شدت سے میری ... آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میں نے نوٹ کر لیا کہ گاڑی جو ... کی رفتار سے جا رہی تھی آہستہ ہوئی اور بائیں جانب مڑ ... رفتار پھر زیادہ ہو گئی۔

"معاف کرنا ... تم نے میرے سچ کا برا مانا۔ سچ عموماً ... لگتا ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اپنی باتوں ... دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو میں ان کو بتانا ... چاہتا تھا کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ دوسرے میں ان ... مشتعل کرنا چاہتا تھا کہ وہ راستے میں کچھ نہ کرنے اور کچھ ... کی ہدایات کو بھول کر ذرا بھی غافل ہوں تو میں موقعے ... فائدہ اٹھاؤں۔ لیکن آگے بیٹھے ہوئے دوسرے شخص ... کہا جس کے بعد وہ سب پھر محتاط ہو گئے۔

"تم تینوں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے کیا؟" میں نے کہا۔ "رنگ روپ، ناک نقش سب ایک ہے۔ یا کسی تھیٹر میں جوکر کا رول کرتے ہو تینوں؟ اس وقت تو خیر مشکل ہے لیکن کبھی نہ کبھی میں تم تینوں کو ایک ساتھ دنگل لڑنے کی دعوت ضرور دوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اپنے اپنے اسٹریچر ساتھ لانا اور ماؤں سے دودھ بھی بخشوا لینا۔"

اس بار بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ مجھے صرف ذرا سی دیر کے لیے چکر آیا تھا مگر میں اپنے محسن کے کندھے پر سر رکھ کے انٹا غفیل ہو گیا۔ کار رک گئی کیونکہ میں نے ایک زبردست کراہ بھی بلند کی تھی۔

"الو کے پٹھے۔" آگے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ "میں نے کیا سمجھایا تھا تجھے؟"

"ارے استاد، سالا بولتا جا رہا تھا اور اپنی ماں کا نام کیسے لیا اس نے؟" مجھے ناک آؤٹ کرنے والے نے کہا۔ "میں کب تک یہ بک بک برداشت کرتا۔ ہم کو اس نے کتا کہا اور یہ سمجھا کہ ہم چپ رہے ہیں۔"

"اگر اسے راستے میں ہی ہوش نہ آیا تو منزل پر پہنچنے کے بعد تمہاری قوتِ برداشت کا امتحان میں خود لوں گا۔" وہ بولا۔

"ارے استاد، معاف کر دو، بے وقوف ہے۔" ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "پہلی بار ایسے مشن میں شامل ہوا ہے۔"

"تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سب پرانے آدمی ہیں اور قابلِ اعتماد ہیں۔"

"ویسے تو بڑے بڑے کام کر چکا ہے مگر اس کام کی نوعیت ذرا اور ہے نا۔" مندری والے نے کہا۔

"تم اس کو نہیں جانتے۔ یہ ہر ایک کی آواز پہچان لے گا۔" استاد کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "میں نے اسی لیے سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی بالکل نہ بولے۔ تمہارا کام صرف اس کو اٹھانا تھا مگر تم نے مجھے بھی بولنے پر مجبور کر دیا۔"

"ہم میں سے کوئی بھی اصل آواز میں بات نہیں کر رہا ہے استاد!" اس شخص نے کہا جو اب تک خاموش تھا اور جس نے میری پسلیوں میں خاموشی سے کہنی ماری تھی۔

"ہر شخص کو اپنی طرح عقل سے پیدل مت سمجھو۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "تاڑنے والے سات پردوں میں تاڑ لیتے ہیں اور یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ عقل کے اعتبار سے تم جیسے دس کو یہ کوڑیوں کے مول بیچ آتے۔ چلو اب گاڑی چلاؤ۔"

دشمن کے منہ سے اپنی تعریف سن کے مجھے تھوڑی سی خوشی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوئی مگر اس وقت احساسِ مسرت پر دوسرے خیالات غالب تھے۔ میں واقعی کوشش کر رہا تھا کہ اصل آواز کو پہچان سکوں۔ مندری والے کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ حیرت مجھے اس کی عقل پر تھی۔ میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا مگر مندریوں کے باعث اسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ آخر وہ ان مندریوں کو اتار کیوں نہیں دیتا جو ہر جگہ اس کے ٹریڈ مارک کی طرح نظر آجاتی ہیں۔ اس نے روپوش رہنا قبول کیا اور اتنے عرصے بعد سامنے آیا بھی تو اپنی ظاہری صورت کو بدل کے لیکن مندریاں اس نے پھر بھی نہیں اتاریں۔ اس حماقت کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ مندریاں اسے بہت عزیز تھیں اور کوئی جذباتی وجہ ایسی تھی کہ ان سے جدا ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ کان کاٹے بغیر مندریاں اتاری ہی نہیں جا سکتی تھیں مگر پہلی وجہ زیادہ قابلِ قبول تھی۔ شاید مندریاں اس کی ماں نے کوئی منت مان کے پہنائی ہوں اور مرتے وقت اسے بتا دیا ہو کہ انہیں کبھی نہ اتارے ورنہ فلاں درویش بابا کے علمِ غیب کے مطابق وہ کسی سخت مشکل میں گرفتار ہو جائے گا یا اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ استاد کی آواز پر مجھے دلاور کی آواز کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ بڑا اچھا اداکار اور صداکار تھا۔ اس نے اپنے کمالِ فن کے کئی نمونے پیش کیے تھے۔ مجھ سے پہلی ملاقات میں اس کا لب و لہجہ بالکل مختلف تھا یا یہ بن کر مجھ سے بات کرتے وقت اس کا اندازِ گفتگو کچھ اور تھا۔ ایک تہ خانے میں مائیکروفون کے ذریعے بات کرتے ہوئے اور ہسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے گورکن کی ہلاکت کے معاملے پر اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے۔ ہر جگہ وہ ایک مختلف آدمی تھا۔ بے شک اس کی اصل آواز بھی میں نے سنی تھی لیکن اس وقت میں سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دلاور ہی ہے۔ صرف اس کے قد و قامت سے یہ اندازہ ممکن تھا ورنہ ابھی تک اس نے مجھے اپنا چہرہ ہی نہیں دکھایا تھا۔ میں بےہوش بنا ایک آنکھ کی درز کو تھوڑا سا کھولے پڑا تھا اور اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھتا تو اندھیرے کے باوجود میں اسے پہچان لیتا مگر اس نے پیچھے والوں کو بھی پیچھے دیکھے بغیر جھاڑ پلائی تھی۔ ایک وجہ آگے کی دونوں سیٹوں پر لگے ہوئے ہیڈ ریسٹ تھے جن کی وجہ سے سیٹوں کی بیک دونوں آگے بیٹھنے والوں کے سر سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔

دوسرے موڑ کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ گاڑی اب برمال پر چھاؤنی کی طرف جا رہی ہے اور میرا خیال تھا کہ اس سمت میں ہماری منزل ڈی سلوا کا گھر ہی ہو گا لیکن گاڑی نے ایک موڑ اور کاٹا۔ اگرچہ میں باہر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں نے اندازے کو بنیاد بنا کے فرض کیا کہ اب ہم صدر بازار جانے والی سڑک پر سے گزر رہے ہیں۔ دس منٹ بعد کار بائیں جانب مڑنے لگی تو میں نے تصور میں وہ سڑک دیکھی جو دھرمپورہ کے سامنے سے گزر کے گڑھی شاہو کی طرف جاتی ہے یعنی علامہ اقبال روڈ جو پہلے میو روڈ کہلاتی تھی۔ کار کو مسلسل دو جھٹکے لگے تو مجھے اپنے اندازے کے درست ہونے کا یقین آیا۔ کار کے پہیوں نے صدر کی ریلوے کراسنگ پار کی تھی اور جھٹکے دونوں لائنوں پر گاڑی کے اچھلنے سے آئے تھے ریلوے لائن کے آس پاس کی ٹوٹی پھوٹی سڑک میں لائنوں کے ساتھ ساتھ نالیاں سی بنی ہوئی تھیں اور ریلوے لائن سڑک کی سطح کے برابر نہیں رہی تھی۔

ہم ایک بہت لمبا چکر کاٹ کے تقریباً اسی جگہ پہنچ رہے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مزید پانچ منٹ کے بعد میں نے نہر کے پل کے نیچے پانی کی روانی کا شور سنا تو مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ اگر وہ چاہتے تو روانہ ہوتے ہی دائیں طرف مڑنے کی بجائے بائیں طرف مڑ جاتے اور جہاں وہ آدھے گھنٹے میں پہنچے تھے وہاں تین منٹ میں پہنچ جاتے لیکن وہ ڈرتے تھے کہ اس طرح میں سمت اور فاصلے کا اندازہ کر لوں گا۔ اتنے لمبے راستے سے گھوم کر آنے اور اتنے موڑ کاٹنے کا مقصد مجھے کنفیوز کرنے کے سوا کچھ نہ تھا لیکن انہیں ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ نہر کا پل عبور کرتے ہی کار سیدھے ہاتھ پر گھوم گئی اور نہر کے ساتھ ساتھ خالی سڑک پر دوڑتی رہی۔ اب اگرچہ نہر کے پانی کے خاموشی سے بہنے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن میں نہر کے پانی کی، کنارے کی مٹی کی، سبزے کی اور نم آلودہ ہوا کی خوشبو سونگھ رہا تھا جو کار کے اگلے شیشوں کے کھل جانے سے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ مجھے بےہوش دیکھ کر انہوں نے آگے والی کھڑکیوں کے شیشے اتار دیے تھے تاکہ گھٹن کچھ کم ہو۔ ایک پل اور آیا اور اس کے بعد گاڑی نے دائیں طرف کا رخ کر لیا جو میرے خیال کے مطابق باغبانپورہ والی سڑک تھی اور ہم اب شالیمار باغ کی طرف جا رہے تھے۔

بالآخر کار رک گئی اور میرے دونوں جانب متعین محافظوں نے مجھے باہر نکال کے اندر پہنچانے کا کام شروع کیا۔ چونکہ ان کے یقین کے مطابق میں ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا، اس لیے میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارنے کی غلطی کرنے والا یقیناً متفکر ہو گا کہ نہ جانے اب اسے قوتِ برداشت کا کیا امتحان دینا پڑے گا۔ اگر شہلا کی ماں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس موقعے

پورا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مندری والے ڈرائیور نے اترتے ہی ریوالور نکال لیا تھا تاکہ میری منتقلی کے آپریشن میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا سب کا استاد اترتے ہی اندر چلا گیا تھا چنانچہ میں چاہتا تو اس شخص کا ٹینٹوا دبا دیتا جو مجھے لاش کی طرح اٹھا کے لے جا رہا تھا۔ دوسرے کے ایک لات رسید کرتا تو اس کی گردن ٹوٹ جاتی۔ وہ میری لات کی رسائی میں بھی تھا اور اس سے پہلے کہ مندری والا سنبھلتا، میں سواری کے لیے استعمال ہونے والے حیوانِ ناطق کو اس کے اوپر پھینک دیتا۔ گولی لگتی بھی تو اسی کے جسم پر میں سوار تھا۔ شاید ریوالور بھی میرے ہاتھ لگ جاتا مگر اس کے بعد کیا ہوتا۔ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اندر سے گولیوں کی آواز سن کے کتنے شکاری نکل آتے۔ کیسے شکار کرتے اور کیسے معاف کرتے اور شہلا کی ماں سمیت بھاگ جاتے یا اس کی لاش چھوڑ جاتے کہ مجھے بہادر بننے کی بے وقوفی کرنے پر عبرت آمیز سبق دیا جائے۔

عمارت کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو نواب نما کے ڈبل رول کرنے والے خسرو جمشید نے میری معرفت رابعہ کو فروخت کی تھی۔ مجبوراً... ورنہ اس کے نیچے گولہ بارود تو انہوں نے بطورِ خاص اسی لیے بچھایا تھا کہ مجھے اور لواحقین کو ایک ہی دفعہ میں ایک ساتھ راہیِ ملکِ عدم کر دیا جائے۔ اب وصیت ناموں کے ایک سلسلے نے میری وفات سے حاصل ہونے والے فوائد کو عملاً صفر کر دیا تھا چنانچہ وہ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے اور زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ مجھ پر دباؤ ڈال کے مجھے اپنے مطالبات کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور کریں۔ کسی محاذ پر جنگ طول پکڑ جائے اور طاقت سے فیصلہ نہ ہوتا ہو تو حکمتِ عملی بدل کے مختلف حربے آزمانے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ شہلا کی ماں کا اغوا اس جنگ میں ایک نئے موڑ کے مترادف تھا۔ مجھے دشمن کے کیمپ میں جا کر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے جنگ بندی قبول ہے یا نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کس قسم کے نتائج کی دھمکیاں دے سکتے ہیں لیکن میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔

مجھے ایک خالی کمرے کے فرش پر لٹا دیا گیا۔ فرش وہائٹ سیمنٹ میں سرخ و سیاہ پتھروں کے موزیک کا نمونہ تھا مگر اس پر اتنی گرد تھی کہ اصل ڈیزائن کے نقوش نظر ہی نہ آتے تھے۔ چاروں دیواروں پر ڈبل وال لائٹس جل رہی تھیں۔ مخصوص ڈیزائن کے سفید دودھیا بلب دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شمعدانوں میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن ہوں۔ اسی قسم کا ایک فانوس عین وسط میں روشن تھا جس میں ایسی ہی سولہ لائٹس تھیں چنانچہ کمرہ ہر طرف سے روشن تھا لیکن سایہ کہیں نہ تھا۔ لائٹس کے علاوہ کمرے میں کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی سپاٹ دیواروں میں سے دو کا رنگ نیلا تھا اور دو کا نارنجی مائل زرد۔ میں نے فرش پر استراحت فرمانے سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں میرا انٹرویو یا میری جان لینے والے کتنے افراد موجود ہیں۔ جو شخص کار میں استاد بنا ہوا تھا چوہدری دلاور ہی تھا۔ ڈی سلوا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر وہ ڈبل رول کرنے والے دونوں بدمعاش تھے یعنی نواب خسرو جمشید اور اس کا شوفر۔ اس وقت بھی وہ ایک جیسے لباس اور حلیے میں تھے چنانچہ میں پورے یقین کے ساتھ محمود و ایاز میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ پانچویں شخص کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا جوان آدمی تھا جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ وہ قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا اور صورت سے مہذب، تعلیم یافتہ اور معزز نظر آتا تھا۔ ان سب کے سامنے تین آدمی منہ پر سیاہی ملے بالکل بھوت نظر آتے تھے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" پانچویں شخص نے مجھ پر نگاہ ڈال کے کہا۔ ساتھ والے کمرے میں سے خراٹوں کی آواز آئی۔

"اس پاگل کے بچے نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ چوہا نہیں ہے۔" دلاور نے حقارت سے اس سورما پر نظر ڈالی جو اب دوسری جانب دو سیاہ افراد کی صف میں سرنگوں کھڑا تھا۔ "حالانکہ ایک بار نہیں، دس بار سمجھا دیا تھا اسے کہ ہوش میں رہنا ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی سراج صاحب!" پاگل کے بچے نے گھگھیا کر کہا۔ "اس بار معافی دے دیں۔"

"یہ بھی دیکھو کہ بےہوشی اصلی ہے یا نقلی؟" سراج نے معافی کے خواستگار کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ بظاہر اسے معاف کر دیا گیا تھا مگر اس کی بات نے یکلخت میرے ذہن میں ایک بند دریچے کو کھول دیا تھا، ایک معما حل کر دیا تھا اور ایک پرانی یاد سے وابستہ نام کو حقیقی وجود عطا کر دیا تھا۔ وہ پورا منظر میرے تصور میں زندہ ہو گیا جب رابعہ کی ماں کی تدفین کے بعد ہم واپس لوٹ کر آئے تھے تو ایک جنگی قیدی جسے ہم بڑی مشکل سے نکال کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے (اور اس کامیابی کی بہت بڑی قیمت ادا کی تھی) قریب المرگ تھا۔ ہم اسے ایک نہر کے کنارے مرتا دیکھتے رہے تھے اور جب میں ہاتھوں کے پیالے میں نہر کا پانی بھر کے لایا تو وہ مر چکا تھا لیکن مرنے سے پہلے اس نے تین بے ربط الفاظ کہے تھے۔ ایک لفظ کا مطلب راج محل ہو سکتا تھا۔ دوسرا لفظ کرامت تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس کے معنی ابھی تک واضح نہ تھے مگر تیسرا لفظ سراج تھا۔ اب شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ اس نے سراب بھی نہیں کہا تھا اور سرج بھی نہیں۔ اس نے ہمیں سراج نام کے اس شخص کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر فرشتۂ اجل نے اس کی روح پہلے قبض کر لی۔

میری ناک میں زبردست خارش ہوئی۔ یوں جیسے چیونٹیوں کی فوج میری ناک کو اپنا بل سمجھ کے اندر گھس آئی ہو۔ پھر مجھے ایک زبردست چھینک آئی اور مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔ سراج اپنی چالاکی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ میری بیہوشی محض اداکاری ہے۔ کسی نے میری ناک کو بطور ایش ٹرے استعمال کیا تھا اور جلتی سگریٹ سے گرم راکھ جھاڑ کے پھونک مار دی تھی۔

"اسلام علیکم حضرات!" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ سب کو ایک جگہ دیکھ کر... خوشی تو نہیں ہوئی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ اکیلا صرف میں ہوں۔ بے شک میرا خدا میرے ساتھ ہے مگر آپ لوگوں کے ساتھ ساری خدائی ہے۔"

"ونڈرفل!" سراج نام کا شخص بولا جو اب پیچھے ہاتھ باندھے اور پیروں کو تھوڑا سا پھیلائے کھڑا تھا۔ "میں نے سنا تھا کہ تم اور تمہارا وہ ساتھی، دونوں جوکر ہو۔ تمہیں معلوم ہے ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں۔ اور میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا لیکن تم لوگ بتائے بغیر جانے نہیں دو گے۔" میں نے کہا۔ "اسے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ٹیبل سرے سے نہیں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں، ایسے کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"تم اس بڑھیا کو زندہ واپس لے جانا چاہو گے یا اس کی لاش؟" سراج نے متانت سے کہا۔ اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کے سامنے دوسروں کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس شکاری ٹولے کی کمان وہی کرتا ہے۔ اب تک وہ پس منظر میں تھا مگر اب دوسروں کی مسلسل ناکامیوں کے بعد اس نے خود سامنے آ کر مجھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے سراج صاحب!" میں نے کہا۔ "چاہتا تو میں یہ ہوں کہ شہلا کی ماں کو زندہ لے جاؤں اور آپ سب کی لاشیں۔ مگر کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟"

ساتھ کے کمرے سے پھر کسی کے کراہنے جیسی آواز سنائی دی۔

"تمہاری حس مزاح بہت سخت جان ہے۔" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے پہلے تم کو سنجیدگی سے گفتگو کے لیے آمادہ کیا جائے۔ مذاق بہت ہو چکا اور مذاق مذاق میں بہت وقت بھی ضائع ہوا اور بہت سے آدمی بھی ضائع ہو گئے۔ کیا خیال ہے، تمہیں کچھ مہمانوں سے ملوایا جائے جو تم سے ملاقات کے لیے بڑی دور سے آئے ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں کالے بھوت مجھ سے چمٹ گئے جو کارنر میں مجھے دونوں طرف سے دبوچے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے شرارت سوجھی حالانکہ یہ مقابلے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور مقابلے کا فائدہ بھی کوئی نہیں تھا لیکن یہ احساس غالب تھا کہ وہ مجھے نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے بڑی پھرتی سے آرم لاک لگا کے ایک کو الٹ دیا اور ابھی وہ فرش پر گرا ہی تھا کہ میں نے دوسرے کو گردن میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کر آگے دے مارا۔ ایک ساتھ بہت سے ریوالور نکل آئے اور خسرو جمشید یا اس کے شوفر نے نشانہ لے کر گولی بھی چلائی جو میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر کے دیوار میں پیوست ہو گئی۔

میں نے دونوں ہاتھ پہلے ہی اوپر اٹھا دیے تھے۔ "سوری!" میں نے کہا۔ "میں تھوڑی سی پریکٹس کر رہا تھا اور کچھ ان دونوں کالے دیو کے بچوں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اتنی بڑی باڈی سے کچھ نہیں ہوتا۔ چلو بھئی، کدھر چلنا ہے؟" میں نے ان دونوں سے سرپرستانہ انداز میں کہا جو اب کمر سہلاتے اٹھ رہے تھے اور اتنے خفت زدہ اور مشتعل تھے کہ پابندیاں نہ ہوتیں تو وہ متحد ہو کے مجھ پر بھرپور حملہ کرتے۔ "خبردار اب ہاتھ مت لگانا!" میں نے ان کو وارننگ دی۔ "ورنہ ہاتھ پیر تڑوا بیٹھو گے۔"

وہ دونوں مجھے خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے میرے ساتھ ہو لیے اور دائیں بائیں چلنے لگے لیکن ان میں سے کسی نے مجھ سے چھ انچ کے فاصلے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔ چوہدری دلاور زیر لب مسکرا رہا تھا اور اپنی ایک مونچھ کو عادت کے مطابق مروڑنے میں مصروف تھا۔ ڈی سلوا مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا اور یوں کھڑا تھا جیسے اس تمام قضیے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ خسرو جمشید اور اس کے نقش ثانی کے چہرے بھی سپاٹ تھے۔ صرف سراج کے ماتھے پر نمودار ہونے والی ایک شکن یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس نے میرے ایک ایکٹ کے مزاحیہ ڈرامے کو پسند نہیں کیا لیکن مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہوئے مجھے شوٹ بھی نہیں کیا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جو بات کرتے کرتے ریوالور نکال کے کسی کو بھی گولی مار سکتا تھا اور پھر ریوالور رکھ کے اطمینان سے بات وہیں سے شروع کر سکتا تھا جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ یوں جیسے درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایسا

شخص انگریزی محاورے کے مطابق "انتہائی ٹھنڈے دل کا قاتل بیٹھا"، کہنا غلط نہ ہوتا۔ اس میں وہ سب صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جو اسے خونی شکاریوں کے اس غول میں دوسروں سے ممتاز کرتی تھیں اور سرغنہ کے منصب کا اہل ثابت کرتی تھیں۔

دوسرے کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چھت میرے سر پر آ گری ہے یا زمین میرے قدموں کے نیچے سے غائب ہو گئی ہے اور میں اندھے خلا میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے سامنے دو کرسیوں پر فوزیہ اور انکل شیروانی بندھے بیٹھے تھے۔ ان کی آواز کو خاموش رکھنے کے لیے لبوں پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ جو آوازیں مجھے کبوتر کی غٹرغوں سے مشابہ لگی تھیں وہ صرف ناک سے نکلنے والی آوازیں تھیں جن سے شیروانی صاحب مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت اچانک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے اور نتائج کی پروا کیے بغیر ان شیطانوں کی رزم گاہ میں کود پڑنے کی بجائے میں نے کیسے خود پر قابو پا لیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا۔ خود کو یاد دلایا کہ اب صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے جس میں میرا غیر سنجیدہ رویہ دوسروں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر میں نے باری باری ان دونوں کے منہ پر سے ٹیپ ہٹایا اور وہ رسیاں کھولیں جن سے وہ بندھے ہوئے تھے۔

"یہ شیطان آپ کو بھی اٹھا لائے انکل!" میں نے سخت اذیت اور شرمندگی کے ساتھ کہا۔

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمیں کوئی اٹھا کے نہیں لایا سکندر!" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"پھر... پھر آپ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے فوزیہ کے زرد رنگ کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی صورت پر احساسِ ذلت، نفرت، برہمی و شرمندگی اور اس کے ساتھ میرے لیے ملامت کے جذبات عیاں تھے۔

"شامتِ اعمال ہمیں یہاں لے آئی بیٹے!" شیروانی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "ہم اس چکر سے کب تک بچے رہ سکتے تھے۔ میں نے تمہارا ضامن بننے کی غلطی بھی کی تھی۔"

"میں... میں آپ سے کیا کہوں انکل!" میں نے بمشکل [illegible] کہا۔ "یہ کہوں کہ میں بے قصور ہوں؟ میرا یہی قصور کیا کم ہے کہ میں اس وزیر خان کا بیٹا ہوں جو آپ کا دوست تھا۔ سزا صرف انہی کو برداشت کرنی پڑ رہی ہے جو کسی بھی طرح مجھ سے کوئی جذباتی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ اب ہو رہا ہے اس کا علم اگر مجھے پہلے سے ہو جاتا تو میں ابا سے کہتا کہ [illegible] کو چھوڑ دیجیے، سارے رشتے توڑ دیجیے، مجھے عاق کر کے مجھ سے بھی بے تعلق ہو جائیے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" شیروانی صاحب نے ہاتھ اٹھا کے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں تمہاری طرف سے ایک تار ملا تھا کہ محسن سخت بیمار ہے اور یہ بات ایسی تھی کہ میں... ہم نے محسن کی ماں کو نہیں بتائی۔ میں تو اکیلا ہی آ رہا تھا۔ بھائی کی وجہ سے فوزیہ بھی ساتھ آ گئی۔"

فوزیہ کی صورت کا تاثر میری بات کے بعد کچھ مختلف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائیوں پر رسی سے پڑ جانے والے نشانات کو مٹانے میں مصروف تھی جو ایک اضطراری اور غیر ارادی حرکت تھی۔ تاہم وہ میری طرف دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"اسٹیشن پر ہمیں پولیس کی وردی میں ملبوس ایک شخص ملا۔" شیروانی صاحب نے قدرے توقف کر کے کہا۔ "اس نے کہا کہ رضوی صاحب نے ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی بھیجی ہے۔ ہمیں شک کیسے ہو سکتا تھا۔"

"اب آئندہ کے لیے میں کیا کہوں۔ یہ کہ آپ تصدیق کیے بغیر یوں نہ آیا کریں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے آپ خود محتاط رہیں گے۔ ابھی تو آپ کو یہ بتانا ہے کہ محسن بالکل خیریت سے رضوی صاحب کے گھر پر ہے اور اب ان لوگوں سے پوچھنا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں؟"

"دیکھو سکندر! میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "حالات کو ہم سب سمجھتے ہیں اور کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا مگر ہو سکے تو معاملات کو سمیٹنے کی کوشش کرو، ورنہ خدا پر ہمیں بھی بھروسہ ہے۔ جو ہمارا نوشتۂ تقدیر ہے سامنے آ جائے گا۔ اس سے مفر نہیں، نہ ہمیں نہ تمہیں اور نہ ان کو جو نمرود کی طرح خدا بنے قسمتوں کے فیصلے کرنے لگے ہیں۔" ان کو تسلی دے کر میں پلٹ کر اسی کمرے میں آیا جہاں وہ سب جمع تھے۔

"یس مسٹر سکندر! ملاقات ہوئی اپنے انکل سے جو تمہارے ضامن بھی تھے؟" خسرو جمشید نمبر ون نے کہا۔

"اور سسر بھی ہو سکتے تھے اللہ کی مہربانی سے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اگر تم ذرا وہ نہ ہوتے۔ کیا نام اپنے... کوتاہ اندیش۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور مجھے بتاؤ ان لوگوں کو یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے دھاڑ کر کہا اور اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں فوزیہ اور شیروانی صاحب بدستور کرسی پر بیٹھے تھے۔ "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"جو ہم چاہتے ہیں۔" سراج نام کے شخص نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ تم جانتے ہو۔"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ غیر متعلق لوگوں کو، مفلوج اور بیمار عورتوں کو، بوڑھوں کو اور کمزور لڑکیوں کو اس طرح اٹھا لانے میں کون سی بہادری ہے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "کیا تم میں مردانہ وار مقابلے کا حوصلہ نہیں رہا؟"

"ہم نے کب کہا تھا کہ تم مقابلہ کرو۔" سراج بولا۔ "تمہیں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے ایک مہینے کی مہلت بھی دی تھی۔ تم نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔"

"سراج!" میں نے کہا۔ "تم اس جنگ کو پھیلا رہے ہو۔"

"جنگ کو ختم کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ ہم نے ایک پیشکش کی تھی۔" سراج بولا۔ "تمہارے سامنے بہت سے راستے رکھے تھے مگر تم نے ان میں سے کسی کا انتخاب نہیں کیا۔"

"وقت اب بھی نہیں گزرا ہے لیے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "غور فرماؤ۔"

"ہاں برخوردار! تمہیں غور کرنے کے لیے مزید مہلت دی جا سکتی ہے۔" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔

"اور اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری پیشکش میں کوئی کمی تھی۔" سراج نے اپنے معاونین کی تائید میں سر ہلایا۔ "تو تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟ آدمی کے رویّے میں لچک ہونی چاہیے۔ ہم مل بیٹھ کر معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر سکتے ہیں۔"

"خوش اسلوبی سے؟ اب؟" میں نے نفرت کے سارے زہر کو اگل کے کہا۔ "جب تم میرے باپ کو بے کسی کی موت مار چکے، منشی کو اور سلامت شاہ کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا چکے؟ غلام علی کو قتل کر چکے اور لندن کی ایک طوائف سے لے کر یہاں کرائے پر ملنے والے کتنے ہی بدمعاشوں کا خون بہا چکے؟ آج تم رویّے میں لچک کی بات کرتے ہو؟ رابعہ کے گھر کو بم سے اڑا کے، شہلا کے گھر کو آگ لگا کے، نعیم اور گل رخ کی زندگی تباہ کر کے؟" میں نے آگے بڑھ کر سراج کے منہ پر تھوک دیا۔ "میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں، کتو...!"

سراج کا تھپڑ میرے منہ پر پوری قوت سے پڑا۔ "میں تمہاری بات سن رہا ہوں، یہی کافی ہے۔" اس نے اطمینان سے رومال نکال کے اپنا منہ صاف کیا۔ "ورنہ کیا یہاں صرف لاشیں چھوڑ کر جانا میرے لیے ناممکن ہے؟"

"پہلے بہت کچھ ممکن تھا سراج! تم نے شرافت علی کے قتل کا الزام میرے سر منڈھ دیا۔" میں نے تلخی سے مسکرا کے کہا۔ "اور جتنی آسانی سے تم نے وزیر خان کو شکار کیا تھا اتنی ہی آسانی سے مجھے شکار کرنا چاہا تھا لیکن وقت نے تمہیں اچھا سبق دیا ہے کہ شکاری تم ہی نہیں، وہ بھی ہیں جو تہی دست نظر آتے ہیں۔ تم اپنی ساری فرعونیت اور طاقت کے باوجود منشی کے مشن کو ناکام نہیں بنا سکے۔ جان لینا آسان ہے، دینا بہت مشکل ہے مگر اس بوڑھے اور کمزور شخص کو دیکھو جس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگایا پھر اپنی بیوی کو۔ سوچو ذرا سراج کہ وہ اندھی بوڑھی عورت تمہارے مقابلے میں کیا تھی مگر منشی نے اس کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا اور انہوں نے تمہیں شکست دی۔ موت تو ایک دن سب کو آنی ہے مگر یہ دیکھو کہ کیا تم اس پیغام کو میرے ہاتھوں تک پہنچنے سے روک سکے۔ تم نے سلامت شاہ کے ٹکڑے کر دیے مگر کیا اس سے حقائق پر کوئی پردہ پڑا؟ تم نے ایک گورکن کو زندہ در گور کر دیا لیکن کیا یہ بات ثابت نہیں ہو گئی کہ وزیر خان کی لاش غائب کر دی گئی ہے۔" میں نے ایک نظر ڈیسلوا کی طرف دیکھا جس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "اب سارا زمانہ جانتا ہے کہ وزیر خان کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اسے بے رحمی سے کیسے بلیک میل کیا گیا اور کیوں؟ آج میں اکیلا ہی نہیں جس کو تمہارے مذموم عزائم کا علم ہے۔ تم نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے؟"

"وہ اپنے سکندر صاحب! یہ لیکچر ویکچر چھوڑ دو۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "یہ کتابی باتیں کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو... خیر... بات مطلب کی کرو اب کہ معاملہ کیسے ختم ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو تمہیں طے کرنا ہے۔ میں نے تو تم سے اپنے حق کے سوا کچھ نہیں مانگا اور میرے حق میں انصاف کا حق بھی شامل ہے۔" میں نے کہا۔

"انصاف کا معیار، اس کے تقاضے، سب حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔" سراج نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے کہا۔

"ہاں۔ حالات کے پیش نظر میں یہ چاہتا ہوں کہ اس بلیک میلر کو قانون کے سپرد کروں جس نے میرے باپ کو کھرب پتی ہونے کے باوجود فقیروں کی طرح کر دیا۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے قاتل کو تختۂ دار پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بے شک وزیر خان کے معاملے میں کچھ زیادتی ہوئی۔ افسوسناک حد تک زیادتی ہوئی۔" سراج نے ایک ایک لفظ آہستہ آہستہ ادا کیا۔ بات کرتے وقت وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا اور اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی تھیں۔ "مگر اس کا ذمے دار میر شرافت علی تھا۔ اسے تم نے مار دیا۔ اگر مصالحت کی بات ہو تو یہ الزام بھی تم پر نہ رہے گا۔"

"مصالحت کا کوئی سوال نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہ میرا کوئی مطالبہ ہے اور نہ میں تمہاری کسی فراخدلانہ پیشکش پر غور کرنے کے لیے مہلت چاہتا ہوں۔ جو قانونی طور پر میرا ہے وہ مجھے ضرور ملے گا۔ انصاف ضرور ہوگا خواہ عدالت کے باہر ہو۔ ظلم کرنے والے کو سزا ضرور ملے گی خواہ قانون نہ دے سکے۔ میرا ایمان دو باتوں پر متزلزل نہیں ہو سکتا۔ ایک یہ کہ موت وقت سے پہلے نہیں آ سکتی اور نوشتۂ تقدیر کو آدمی نہیں بدل سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے اس ضد کا نقصان کسے ہوگا؟" سراج نے کہا۔

"ہاں۔ تم نے ایک بوڑھی عورت کو اٹھا کے ثابت کر دیا ہے کہ میری ضد پر کون کون قربان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم اسلام آباد سے بھی لوگوں کو اٹھوا سکتے ہو۔"

"اور اس کے باوجود تم سمجھوتے پر راضی نہیں۔" سراج نے کہا۔ "تمہیں یہ منظور ہے کہ شہلا جسے تم بہن سمجھتی ہے، اس کی مسخ شدہ لاش دیکھے؟ اتنا عزیز ہے یہ کاروبار تمہیں؟ اس کی خاطر تم دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا سکتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے فوزیہ کی ماں کی عمر تمام ہو رہی ہے۔ کیا تمہاری ضد کی وجہ سے اسے بیوگی بھی ملے گی؟"

"تم اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم فوزیہ کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو۔ اس کی آبرو سے کھیل سکتے ہو۔ اس کی ماں تو مرنے ہی والی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ باپ بھی صدمے سے مر جائے گا۔"

سراج نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم حد درجہ احمق اور خودسر ہو۔ ان سب لوگوں کی زندگی کی قیمت تمہارے نزدیک اس چھوٹے سے کارخانے سے زیادہ نہیں۔"

"بات کارخانے کی نہیں۔ اگر میرا باپ بیس فیکٹریاں بھی چھوڑ گیا ہوتا تو مجھے فرق نہ پڑتا۔" میں نے کہا۔ "آج بھی میں اس جائداد سے دستبرداری قبول کر سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجرم میرے حوالے کیا جائے جو عدالت کے روبرو اعتراف کرے کہ اس نے کس طرح میرے باپ کو لوٹا، قتل کیا اور اس کی لاش کو بے حرمت کیا جو اس کے بعد ہونے والے ہر قتل کا الزام قبول کرے اور سب قاتلوں کی نشاندہی کرے۔ تم نے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کی ملکیت یا اپنے باپ کے حصے کی دولت نہیں مانگتا، میں انصاف مانگتا ہوں۔ یہ انصاف میرا حق ہے۔ مجھے میرا حق مل جائے تو میں دنیا کی ساری دولت ٹھکرا ...تا ہوں لیکن اس حق سے دستبرداری کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔ یہ کاروبار نہیں، اصولوں کا معاملہ ہے جس پر سودا نہیں ہوتا۔ اصولوں کی خاطر مجھ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے سختیاں جھیلی ہیں اور قربانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ایسا نہ ہو تو یہ انسانی معاشرہ درندوں کا جنگل بن جائے۔"

"ویری گڈ۔ تم خاصے اچھے ڈائلاگ بول لیتے ہو مگر اس وقت تم اسٹیج پر نہیں ہو۔" سراج نے کہا۔ "میں جلدی میں کوئی کام نہیں کرتا۔ فوزیہ کو اور شیروانی صاحب کو صبح باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔ بخیر و عافیت اور زندہ سلامت پھر کبھی ضرورت محسوس ہوگی تو بلا لیں گے۔ ابھی تو صبح تمہارے ساتھ صرف شہلا کی ماں کی لاش واپس کی جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری قوتِ مزاحمت کا اندازہ کیا جائے گا۔ تم ڈھیٹ ہے تو ہم تمہیں کوئی چھوٹا سا تحفہ بھیجیں گے۔ مثلاً تمہاری منگیتر اور شریکِ حیات بننے والی فوزیہ کی ایک چھوٹی انگلی۔ اگر تم مان گئے تو زیادہ گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ نو انگلیوں کے ساتھ بھی فوزیہ جیسی بیوی بری نہیں۔ اس سے اگلے مرحلے میں تمہیں اس کا ایک ہاتھ ارسال کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہاتھ کے بغیر وہ زندہ تو رہ سکے گی اور تمہاری محبت میں بھی شاید فرق نہ پڑے لیکن دونوں ہاتھوں سے محرومی کے بعد...!"

"کتے۔" میں نے سراج پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں کالے بھوت مجھ سے چمٹ گئے۔ "اس کے بعد؟ پھر تو فوزیہ کے باقی ٹکڑے ارسال کرے گا مجھے؟ اور تیرا کیا خیال ہے میں صرف آنسو بہاتا رہوں گا۔ میں تم سب کو چن چن کے قتل کر دوں گا۔ چوہدری دلاور! بدمعاش! تیری بھی تو ایک فیملی ہے۔ تم سب کی بھی کوئی نہ کوئی فوزیہ ضرور ہوگی۔ تمہارے بھی رشتے ہوں گے۔ ماں کے اور بہن کے اور بیٹی کے، جن کی تقدیس میں انسانیت کی عظمت ہے لیکن تم نے مجھے انسان سے شیطان بنا دیا تو کیا میں ان رشتوں کا احترام کروں گا؟ ان سب کو معاف کر دوں گا؟ میں تمہارے بوڑھے اور بیمار والدین کو، تمہاری بہنوں کو اور ان کے بچوں کو، تمہارے بچوں کو، بھائیوں کو اور سب کو اسی طرح اٹھاؤں گا۔ تم کس کس کے ساتھ رہو گے اور کہاں کہاں ان کی حفاظت کرو گے؟ ان کا حشر بھی مختلف نہیں ہوگا۔ یا تو تم مجھے قتل کر دو ورنہ میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوگا اس سے بدتر تمہارے ساتھ ہوگا۔" چلاتے چلاتے میرا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح پرسکون اور بہرے بنے کھڑے رہے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔

"تم مجھے میر شرافت علی کا قاتل سمجھتے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ قاتل تم میں سے ایک ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب تم میرے والد کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمے دار بھی اسے قرار دیتے ہو۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارے الزام کی تردید کے لیے نہیں آسکتا۔ پھر مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہو کہ میں اس کو سچ تسلیم کرلوں۔ میرا خیال ہے شرافت علی کا جرم بھی وہی ہوگا جو میرے والد کا تھا۔ اس نے تمہارے مذموم کاروبار میں رخنہ اندازی کی ہوگی چنانچہ تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ تم نے اسے مروا دیا اور مجھے اس کا قاتل بنا دیا تاکہ تم مجھے انتخاب کا حق دے سکو۔ میں اپنی زندگی یا حقِ وراثت میں سے ایک چیز سے محرومی قبول کرلوں۔ تم نے صفائی کے واحد گواہ کو بھی زندہ نہیں رہنے دیا مگر تم نے بچانے والے ہاتھ کا کرشمہ دیکھا۔ تمہارے دونوں چشم دید گواہ بھی نہیں رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ختم کردیا۔"

"ان کے قتل کا الزام بھی تم پر ہی ہے مسٹر سکندر!" سراج نے کہا۔ "اور حالات و واقعات کی شہادت پھر تمہارے خلاف ہے۔ تمہیں پھانسی ہوجائے گی۔"

"ہونے دو۔ اس سے تمہیں وہ کاروبار نہیں ملے گا۔ تمہارے مقاصد پورے نہیں ہوں گے اور وہ سب جو صفِ مجرماں میں شامل ہیں، اپنی سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں عاقبت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ انہیں یہیں اسی دنیا کے نظامِ انصاف کے مطابق سزا ملے گی۔ ایک سزا تو وہ اس وقت بھی کاٹ رہے ہیں۔ وہ خود اپنی نظر میں مجرم ہیں اور اس احساس سے نجات ان کے اختیار میں نہیں۔ تم جو چاہو کرو۔"

"دیکھو سکندر!" سراج نے نسبتاً دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں بہادر اور ذہین دشمن کو بزدل اور بے وقوف دوست سے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں اصول پرستی وغیرہ کو غلط نہیں کہتا مگر یہ دنیا کتابی نظریات پر نہیں چل رہی ہے۔ سب ایمانداری سے رزقِ حلال نہیں کما رہے ہیں، سچ نہیں بول رہے ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مذہب، اخلاق یا قانون کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھو کہ اقدار کی وقعت زیادہ ہے یا دولت کے انبار کی؟ فائدے میں کون ہے اور نقصان میں کون؟ مثالی انسان صرف مثالی معاشرے میں اور مثالی دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے جس کا تصور کتابوں میں تو ہے مگر عملاً یہ دنیا اس سے بہت دور ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ وقت کا دھارا ہے۔ یہ مت سوچو کہ اسے کس سمت میں بہنا چاہیے۔ یہ دیکھو کہ کس سمت میں بہہ رہا ہے اور اس حقیقت کو قبول کرلو۔ اس کا رخ بدلنے کی کوشش دیوانگی کہلاتی ہے۔ تم پر واضح کردیا گیا تھا کہ 'میر ونیر اینڈ کمپنی' کی گڈ ول سے ہم دیگر فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں اور اسی لیے تمہارے سامنے دو متبادل راستے رکھے گئے تھے۔ یکمشت رقم یا مکمل علیحدگی یا ہم سب کے برابر کمیشن کی بنیاد پر لندن میں ہماری نمائندگی۔ مگر تم حقِ ملکیت پر مصر رہے۔ تمہارے کہنے سے ہم اپنا کاروبار ختم کرکے صرف 'ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس' کی مصنوعات فروخت کرنے پر قناعت نہیں کرسکتے۔" اس نے ایک نظر دوسروں کی طرف دیکھا جو اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ جنرل ہیں اور ان کا سپریم کمانڈر، دشمن فوج کے کمانڈر سے فیصلہ کن مذاکرات کر رہا ہے۔ "مزید نقصانات سے بچنے کے لیے،" سراج نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اور مفادِ باہمی کی خاطر... ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تمہاری بات مان لی جائے یعنی تمہیں ایک مالک تسلیم کرلیا جائے۔ اس کے علاوہ جو سالانہ منافع اب تک تمہارا حق بنتا ہے وہ بھی تمہیں ادا کردیا جائے۔ علاوہ دیگر چھوٹے موٹے نقصانات کے۔ مثلاً تمہارے والد مرحوم کی جائداد، کوٹھی کار وغیرہ، اس کے عوض بھی تلافی کے طور پر مناسب معاوضہ ادا کردیا جائے۔"

"تھینک یو ویری مچ۔ آپ لوگ واقعی بہت فراخدل ہیں۔" میں نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "لیکن میں یہ رشوت اور خیرات آپ کو بخشتا ہوں۔ آپ سب نے مل کر جتنا مالِ حرام کھایا، جتنی بے ایمانی کی، ناجائز ذرائع سے جتنی دولت کمائی، وہ سب جو میرے والد کو ملنا تھا اور نہیں ملا۔ وہ سب جو اُن کے پاس تھا اور نہیں رہا، میں یہ سب کچھ چھوڑتا ہوں۔ باقی رہے آپ لوگوں کے جرائم اور نامۂ اعمال کے گناہ، ان سب کا حساب میں یومِ حساب پر چھوڑتا ہوں۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ آدمی کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ میں اکیلا اس ساری دنیا کی خرابیوں کو ٹھیک نہیں کرسکتا اور محض میرے چاہنے سے دنیا ایک تصوراتی جنت نہیں بن سکتی۔ جرائم کا وجود ہر دور میں رہا ہے مگر یہ زمانہ تیز رفتاری کا ہے چنانچہ جرائم کی رفتار میں بھی اسی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں۔ مافیا جیسی اسمگلروں کی بین الاقوامی تنظیم امریکی صدر کو قتل کرا سکتی ہے تو میں کیا ہوں۔ میں تو اپنے پڑوسی کے اعمال کو کیا خود اپنے اعمال کو درست رکھنے پر قادر نہیں۔ چنانچہ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس اور اس کی آڑ میں ہونے والا ناجائز اور جائز ہر قسم کا کاروبار کلی طور پر تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

انہوں نے پُرامید نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا تھا۔

"لیکن...!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ لوگوں کی ہر بات مان لینے اور ہر مطالبہ منظور کرلینے کے بعد مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے حضرات کہ آپ لوگوں سے کچھ مانگ سکوں۔ آپ

سب بااختیار، بااثر اور بادشاہ لوگ ہیں۔" میں خاموش ہوگیا۔

"یس۔" سراج نے میری خاموشی سے اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہو کے کہا۔ "کیا مطالبات ہیں تمہارے؟"

"میرا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ فوزیہ اور شیروانی صاحب کو اسی وقت رضوی صاحب کے گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔

سراج نے ایک سیاہ فام کی طرف دیکھا اور اسے سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ایک کار ان دونوں کو لے کر روانہ ہوگئی۔

"میرے باقی مطالبات بہت سیدھے سادے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اب جمع کا صیغہ استعمال کرنا بھی غلط ہے میرا تو صرف ایک مطالبہ ہے۔ مجھے اپنا باپ وزیر خان چاہیے۔ زندہ، سلامت، صحت مند اور خوشحال۔ بالکل اسی حالت میں جیسے میں نے اس کو لندن جاتے وقت دیکھا تھا۔ دیٹس آل۔"

اس اینٹی کلائمکس سے ان سب کے چہرے اتر گئے۔ سراج نے آدھی سے زیادہ سگریٹ کو زمین پر ڈال کے جوتے کی ایڑی سے رگڑ دیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ "میرا خیال تھا تم کوئی معقولیت کی بات کرو گے۔۔"

"یہ اپنے سکندر صاحب بڑے مسخرے ہیں جی!" چوہدری دلاور نے تمسخر آمیز طنز سے کہا۔

"بلڈی ڈسٹی جوکر!" سراج نے دانت پیس کر کہا۔ "تم ایسے نہیں مانو گے۔"

"ہاں۔ جب تک میرا یہ ایک مطالبہ پورا نہیں ہوگا میں کسی کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے بتا دیا ہے کہ اب تم کیا کرو گے۔ میرا پروگرام بھی سن لو۔ ابھی تک میں اکیلا تھا۔ میرا ایک دوست ضرور تھا محسن مگر وہ اس جنگ میں ایک فریق نہیں تھا۔ تمہارے عزائم کی نوعیت واضح ہوجانے کے بعد میں نے بھی طے کرلیا ہے کہ اب ہم شریف آدمی نہیں رہیں گے۔ شرافت کی سند کو ہم پھاڑ کر نہیں پھینکیں گے۔ فی الحال طاقِ نسیاں پر رکھ دیں گے اور پھر تمہاری طرح بدمعاشی کے دعوے کے ساتھ ایک گروہ بنائیں گے۔ سب کھیل پیسے کا ہے یا ہمت کا ہے اور ہمارے پاس گزارے کے لیے دونوں چیزیں ہیں۔ ہم کرائے کے بدمعاش بھرتی کریں گے یا ان کی خدمات حاصل کریں گے۔ اب تک ہم نے تم سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے، وہ سب ہمارے کام آئے گا۔ پھر ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکیں گے۔ سارا مسئلہ تو ہماری شرافت بنی ہوئی تھی۔ ایک بار ہم نے اس کو طلاق دے دی تو ہمارے لیے کوئی کام مشکل نہیں رہے گا۔ ہم بھی جس کو اٹھانا چاہیں گے، اٹھوالیں گے۔ تم سب بھی تو بن ماں باپ کے پیدا نہیں ہوئے ہو۔ تمہارے بھی خاندان ہیں اور دوست احباب ہیں اور ان سب کے بیوی بچے ہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے؟ رابعہ کا کون ہے؟ محسن کی بھی ایک ہی بہن ہے۔ ماں کو شمار ہی مت کرو۔ باپ کی زندگی بھی اچھی گزر گئی اور اس نے بیٹی کو مار کے خودکشی کرلی تو محسن بھی اکیلا رہ جائے گا۔ اب تم بھی اپنے اردگرد نظر ڈال لو، نفع نقصان کا حساب لگالو۔ شرافت، مروت، انسانیت کو بالائے طاق رکھنے کے بعد ہمیں بے ضمیر شیطان بننے پر مجبور کیا گیا تو...."

وہ سب بڑے انہماک سے، چہروں پر تمسخر اڑانے والی مسکراہٹ سجائے، اپنی طاقت کے غرور میں بدمست، ایک بے حس اندازِ بے نیازی کے ساتھ میرے بلند بانگ دعوؤں کو سن رہے تھے جو اُن کے نزدیک فضول بکواس سے زیادہ نہ تھی۔ میری حکمتِ عملی حالات کے مطابق کارگر ہو رہی تھی۔ عین اس وقت جب وہ میرا ادھورا جملہ مکمل ہونے کے انتظار میں تھے، میں نے ایک جست لگائی اور سراج کو یوں دبوچ لیا کہ ان میں سے کوئی حرکت بھی نہ کرسکا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں سراج اس طرح میرے سامنے آگیا کہ میرے بائیں ہاتھ نے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ میرا ہاتھ سامنے سے گھوم کر سراج کے دائیں شانے کو گرفت میں لے چکا تھا اور اپنے سیدھے ہاتھ سے میں نے سراج کے سیدھے ہاتھ کو اس طرح موڑ لیا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتا یا خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتا تو اس کی گردن یا کلائی ضرور ٹوٹ جاتی۔ میں اب دیوار سے لگا ہوا تھا اور سراج میرے سامنے ڈھال بن گیا تھا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ سراج کا سانس رکنے لگا تھا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور اس کی کلائی کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ کمرے میں موجود دیگر افراد اپنے اپنے ریوالور ہاتھ میں لیے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ سراج بلبلایا۔

"تم میں سے جو سراج کو گولی مارنا چاہے، مار سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی کو انتقام لینے کا موقع آج تک نہیں ملا تھا تو فائدہ اٹھالے۔ ابھی سراج زندہ ہے، صرف ایک ہاتھ سے معذور ہوا ہے جس سے یہ گولی چلاتا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد میں کہنی کے پاس سے بھی ہاتھ توڑ دوں گا۔" پھر میں نے سراج کی ایک ٹانگ کو اپنی ایک ٹانگ میں پھنسالیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر سراج نے ایک پروگرام کا خاکہ پیش کیا تھا کہ وہ کس طرح فوزیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ارسال کرسکتے ہیں۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا۔" میں نے سراج کے بازو کو بل دیا۔ کہنی کے پاس سے اس کا جوڑ کھنچ گیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور اس نے ایک کراہ بلند کی۔

"یہ... اپنے سکندر صاحب! تم نے اسی وقت مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے شاید۔" چوہدری دلاور نے کہا۔

"مجھے کب مرنا ہے، اس کا فیصلہ تو وہ کر چکا ہے جس نے مجھے زندگی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ سراج کا آخری وقت آ گیا ہو۔ اور تقدیر کی ستم ظریفی دیکھو، اس کو مارنے والا ابھی تم میں سے کوئی ایک ہو گا جو اس کے اطاعت گزار، پارٹنر، ہمراز یا چمچے تھے۔ گولی اگر سراج کے جسم سے گزر کر میرا کام بھی تمام کر گئی تو مجھے افسوس نہیں ہو گا کیونکہ مجھے ملنے والے دشمن ہی ہوں گے۔ سراج نے کبھی سوچا تک نہ ہو گا کہ تم میں سے کوئی اس کا قاتل بنے گا ورنہ وہ بہت پہلے مقتول ہو جاتا۔"

"تمہیں معلوم ہے سراج صاحب کون ہیں؟" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔

"ہاں۔ اچھے بھلے صحیح سالم آدمی تھے ابھی چند منٹ پہلے اور خاصے اونچے اڑ رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک ہاتھ سے معذور اور زندگی سے مایوس، بے بس آدمی ہیں۔" میں نے سراج کا ٹوٹا ہوا بازو چھوڑ دیا اور اس کی پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ "میں چاہوں تو ان کے شیطانی دماغ کا سارا مواد ایک سوراخ سے خارج بھی کر سکتا ہوں مگر میں انہی کی زبان میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ ایک ہاتھ سے معذور ہو جانے کے باوجود ابھی نقصان زیادہ نہیں ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نو انگلیاں ہونے کے باوجود فوزیہ بری بیوی نہیں... تو سراج بھی ہاتھ ٹوٹنے کے باوجود برا سرغنہ نہیں۔ دو چار ماہ میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ سکتی ہیں۔ ہاتھ پھر ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں مزید دو منٹ دوں گا۔ اس کے بعد سراج کا دوسرا بازو بھی پہلے بازو کی طرح ہو جائے گا۔ یہ خالی ہاتھوں سے بہت کچھ کرنے کا فن ہے۔ میں نے کوئی بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں لی مگر کوشش کرتا تو لے سکتا تھا۔ چنانچہ میں نہایت فنکارانہ طریقے پر اس کی ٹانگ کو بل دوں گا۔ اس کے بعد یہ صرف ایک ٹانگ پر کھڑا رہ سکے گا۔ تاہم جیسا کہ سراج نے کہا تھا کہ ایک ہاتھ نہ ہونے سے بھی فوزیہ کے ساتھ میری زندگی گزر سکتی ہے۔ ایسے ہی میں کہتا ہوں کہ ٹوٹے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کی مرمت کے بعد سراج زندہ رہ سکتا ہے اور سال چھ ماہ میں ویسا ہی ہو سکتا ہے جیسا کچھ دیر پہلے تھا۔"

"سکندر اعظم کی اولاد!" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔ "سراج ایک اعلیٰ پولیس افسر ہے۔"

"اوہ۔" میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا پھر یکلخت میرے ذہن کے نہاں خانوں میں یاد کی ایک کرن روشن ہوئی۔ اپنی گرفتاری کی پہلی رات میر محمد نے کسی اے ایس پی کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے مندری والے کو تھانے میں آتے جاتے دیکھا تھا لیکن میر محمد نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا، "کیا تو ڈی ایس پی صاحب کو کہہ دے گا کہ یہ اصل قاتل ہے؟" مگر بعد میں اس نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ اے ایس پی کا کیا حکم ہے۔ ملزم جب تک قتل کا اعتراف نہ کرے اور تحریری بیان نہ دے، پوچھ گچھ جاری رکھی جائے۔ پہلی بار شاید اس نے روانی میں صحیح عہدہ بتا دیا تھا۔ بعد میں اس کو غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اے ایس پی کہا۔

"سراج صاحب ڈی ایس پی ہیں نا؟" میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"ان کو کچھ ہوا... تو پولیس کا سارا محکمہ حرکت میں آ جائے گا۔" خسرو جمشید نمبر دو نے کہا۔ "اور وہ سب ہو گا جو اب تک نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ مثلاً ایک جگہ خالی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور کسی تھانیدار کو سفارش کی بنیاد پر ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل جائے گی یا کوئی اے ایس پی سنیارٹی پر ڈی ایس پی ہو جائے گا۔"

مندری والے کے ساتھ اب ایک کالا بھوت کھڑا رہ گیا تھا۔ دوسرا جو فوزیہ اور شیروانی صاحب کو لے کر گیا تھا، ایک گھنٹے سے پہلے لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی طرف سے میں بہت مطمئن تھا۔ وہ سراج کی اجازت یا حکم پر بھیجے گئے تھے اور انہیں لے جانے والے کی مجال نہ تھی کہ اپنے طور پر کوئی شرارت کرے۔ میرا خیال تھا کہ ڈرائیور انہیں کوٹھی سے کچھ فاصلے پر اتار کے لوٹ آئے گا۔ کوٹھی میں پہنچتے ہی وہ دونوں رضوی صاحب اور محسن کو ساری بات بتا دیں گے سوائے ایک بات کے۔ وہ اس جگہ کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں گے جہاں دشمنوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ البتہ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ خالی گھر اور کرمل کے نقشے سے وہ صحیح نتیجہ اخذ کر لیں اور دس فیصد امکانات کی روشنی میں پولیس فورس لے کر یہاں آ جائیں مگر اس سب کارروائی میں دو گھنٹے صرف ہونے لازمی تھے۔ میں نے اچانک سراج کا دوسرا ہاتھ موڑا اور کہنی کے پاس سے توڑ دیا۔

سراج کے سرغنہ ہونے کے اسباب بھی واضح ہو چکے تھے۔ وہ پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور اپنے اختیارات اور وسائل سے سب کو بچاتا تھا اور ہر قسم کی مدد فراہم کرتا تھا۔ شاید اسی کی معرفت بدمعاشوں کی خدمات حاصل ہوتی تھیں۔ پولیس [کو] علاقے کے اور شہر کے سب بدمعاشوں کے پتے ٹھکانے [اور] کاروبار جانتی ہے اور اخبارات اور رائے عامہ کے مطابق [ان] کی سرپرستی کے فرائض بھی پورے کرتی ہے۔ اگر کوئی اور [ہوتا تو] دلاور یقیناً اسے اور مجھے گولی مار دیتا اور خود گروہ [کی کمان] سنبھال لیتا مگر ڈی ایس پی سراج کو قتل کرنا آسان [نہیں] تھا اور اس کا نعم البدل ملنا بھی مشکل تھا۔ سب ڈی ایس پی [بدمع]اشوں کے گروہوں کے سرغنہ نہیں ہوتے۔ بقول شاعر [بڑی] بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ چنانچہ وہ [س]ب بے بس اور متذبذب کھڑے تھے۔

"اب صرف ایک منٹ باقی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے [بع]د ڈی ایس پی صاحب کی ٹانگ بھی گئی۔ ہاتھ تو عموماً ٹھیک [ہو] جاتے ہیں لیکن ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں سوت بھر فرق بھی [رہ] جائے تو اچھا بھلا پولیس افسر لنگڑ بگڑ کی طرح چلتا ہے۔ تم [سب] لوگ اپنے اپنے ریوالور اس گوشے میں پھینک سکتے ہو، [ج]ہاں میں کھڑا ہوں۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر چوہدری دلاور نے "[س]کندر ان کمانڈ" کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینے کی رسمی کارروائی [کا آغ]از کیا۔ یکے بعد دیگرے چھ ریوالور چھپس کے فرش پر بڑی آواز [ک]ے ساتھ گرے اور پھسلتے ہوئے دیوار تک آ گئے۔ میں نے ایک [لمحے] کے لیے بھی اپنی نظر ان سب پر سے نہیں ہٹائی۔ وہ بہت [ع]یار لوگ تھے اور ان کے پاس دوسرے ریوالور کی موجودگی عین [ممک]ن تھی۔ اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں تلاشی کا فرض اسے [سونپ]تا اور خود سراج کو یرغمال بنائے ریوالور لیے کھڑا رہتا مگر [تنہا] میرے ذہن میں صرف ایک ہی ترکیب آئی تھی۔ اگر میں ان [سے ک]ہتا کہ دوسرے کمرے میں چلے جائیں اور پھر باہر سے کنڈی [لگا ک]ے فرار ہونے کی کوشش کرتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ دوسرے [کمر]ے کے دوسرے دروازے سے نکل آتے یا کھڑکی میں سے [مجھے] نشانہ بنا لیتے۔ باتھ روم محفوظ جگہ ہو سکتی تھی مگر مجھے معلوم [نہیں] تھا کہ اس نو تعمیر کوٹھی میں باتھ روم کہاں ہیں۔ ان کے [روشند]ان چھوٹے ہیں یا اتنے بڑے کہ آدمی گزر جائے۔ اور [دروا]زے باہر سے بند ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے پیچھے [پڑ]ے ہوئے سب ریوالور کونے میں ڈھیر کر لیے۔ اس وقت [ت]ک سراج کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ درد سے تڑپ رہا تھا [اور م]یرے بازو کے شکنجے میں کسا ہوا سانس لینے کی کوشش میں [بُری ط]رح ہانپ رہا تھا تاہم آدمی سخت جان تھا کہ ابھی تک [بے ہو]ش بھی نہیں ہوا تھا اور ہڈیاں ٹوٹ جانے کے باوجود [کراہ] بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے مجھ سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگی تھی۔ میری منت سماجت بھی نہیں کی تھی اور مشتعل ہو کے اپنے معاونوں کو گالیاں بھی نہیں دی تھیں کہ وہ بزدلوں کی طرح خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں اور کٹھ پتلیوں کی طرح میرے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنی اور ان کی مجبوریوں کو سمجھتا تھا۔

"اب کیا چاہتے ہو تم، اپنے سکندر صاحب!" چوہدری دلاور نے پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم باہر چلے جائیں، دفع ہو جائیں یہاں سے، تم ڈی ایس پی صاحب کی جان تو چھوڑ دو۔"

"دفع ہو جائیں اور ہر طرف سے عمارت کو گھیر لیں؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ "چوہدری! جب تک یہ شکار میرے قبضے میں ہے، تم مجھے شکار نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں تم بہت بڑے شکاری ہو لیکن یہی بات اب تک تم کو میرے متعلق معلوم ہو چکی ہو گی۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس اندر کی کسی جیب میں کوئی دوسرا ریوالور نہیں ہے؟"

"آخر یہ ضمانت کیسے فراہم کی جائے؟" خسرو جمشید نمبر ایک نے کہا۔

"ہم اپنی اپنی تلاشی دینے کے لیے تیار ہیں۔" اس کے ہمزاد نے کہا۔

"لیکن میں تو تلاشی لے نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

"تو ہم تمہارے سامنے ایک دوسرے کی تلاشی لیتے ہیں۔" خسرو جمشید نمبر دو نے تجویز پیش کی۔

"اس جامہ تلاشی پر اعتماد کر کے میں اپنے بے وقوف ہونے کا ثبوت دینا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے اب میں حکم دیتا ہوں کہ آپ لوگ اسلحے کی طرح اپنے اپنے کپڑے اتار کے ادھر ہی پھینک دیں۔ ذرا احتیاط سے۔"

"تمہارا... تمہارا مطلب ہے ہم سب کپڑے... اتار دیں؟" چوہدری دلاور نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔ یہاں ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ محاورہ اگر عملاً درست ہو جائے تو کیا حرج ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ... یہ ناممکن ہے... اپنے سکندر صاحب! تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" چوہدری دلاور کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

"کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں ہے، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا اپنے چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "میں دو منٹ کی مہلت دوں گا، اس کے بعد تمہارے ہیڈ کی ٹانگ گھٹنے کے پاس سے دو نیم ہو جائے گی۔"

یہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ پانسہ اتنی جلدی پلٹ جائے گا اور انکی اتنی بڑی فتح اتنی تذلیل آمیز شکست

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں تبدیل ہوجائے گی۔ بے عزتی، ندامت، اشتعال اور بے بسی کے ملے جلے جذبات نے ان سب کو ایک دوسرے کی نظر میں اور خود اپنی نظر میں رسوا کر دیا تھا۔ سوائے ڈی سلوا کے وہ سب ایک جیسے جذباتی ردِ عمل کا شکار تھے۔ صرف ڈی سلوا تھا جو خاموش رہا تھا اور جس نے خلافِ معمول اپنا جارحانہ انداز برقرار نہیں رکھا تھا۔ اس کی وجہ صرف میں جانتا تھا۔ وہ خود کو پٹے ہوئے مہرے کی طرح محسوس کر رہا تھا اور اگرچہ وہ صورت سے اس خوف کا اظہار نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ خوف زدہ نہ ہو۔ اس نے میرے سامنے بہت کچھ قبول دیا تھا۔ چنانچہ ہر لحظہ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں اس کے الفاظ دہرا کے اسے مروا نہ دوں۔ اگر اس کے ساتھیوں کو اس کی غداری کا علم ہوجاتا تو وہ اس کو یقیناً مار ڈالتے۔ ڈی سلوا نے پہلے میرے رویّے کا مشاہدہ کیا تھا اور پھر شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس کا راز ابھی افشا نہیں کروں گا بلکہ بعد میں اسے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔

ہتھیار ڈالنے میں چوہدری دلاور نے پہل کی تھی، کپڑے اتارنے میں ڈی سلوا نے۔

"ڈیم اٹ مین!" اس نے غصے میں پتلون کے اندر سے قمیص نکالی اور اتار کے گولہ سا بنا کر میری طرف پھینک دی۔ اس کے بعد دوسروں کے لیے بھی تقلید کے سوا چارہ نہ رہا۔ سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ دونوں نظر آ رہے تھے جنہوں نے اپنے چہروں پر سیاہی ملی تھی۔ ان کے جسم کا رنگ ہاتھوں سے بھی زیادہ صاف تھا، چنانچہ کالے سر اور منہ کے ساتھ جسم کا صاف رنگ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے سنگِ مرمر کے مجسمے کا سر کالی مٹی سے بنا دیا ہو۔ میرا شبہ غلط نہیں تھا۔ جب چوہدری دلاور اور خسرو جمشید مزدون نے اپنے کپڑے پھینکے تو فرش پر دھات کی کسی چیز کے ٹکرانے سے آواز پیدا ہوئی جو سگریٹ لائٹر جیسی چھوٹی چیز کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"کار کی چابیاں کس کے پاس ہیں؟" میں نے کہا۔

"باہر اب صرف ایک کار رہ گئی۔ اس میں چابیاں لگی ہوئی ہیں۔" چوہدری دلاور نے چلا کے کہا۔ "جاؤ، دفع ہو جاؤ کتے کے بچے۔۔۔" اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی سبکی کا بدلہ لینے کے لیے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے غصے کے آتش فشاں کو پھٹتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریوالور اب صرف میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے سراج کو ان کی طرف دھکیلنے سے پہلے اس کے کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کے پاس دوسرا ریوالور نہیں تھا۔

"اب تم لوگ اتنے بے بس ہو کہ میں تمہیں ریوڑ کی طرح ہانک کر پولیس اسٹیشن بھی لے جا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چاہوں تو پولیس کو بھی یہاں بلا سکتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں ڈی ایس پی صاحب کی موجودگی میں پولیس کیا کارروائی کرے گی اور کس کے خلاف کرے گی۔ یہ اتفاق نہیں کہ گھر کی مالک رابعہ ہے۔ تم لوگوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اگر کوئی بات غلط ہو جاتی اور کشت و خون ہوتا تو اس کی وضاحت رابعہ قاری ایڈوکیٹ کو کرنی پڑتی۔ مجھے اپنے خلاف ڈی ایس پی صاحب کی ہڈیاں توڑنے کا کیس بنوانے کا بھی کوئی شوق نہیں، اس لیے میں آپ سب کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ کر اکیلا ہی جاؤں گا۔ جانے سے پہلے ایک آخری بات۔ میں یہاں آپ لوگوں سے ملاقات کرنے یا آپ لوگوں کا یہ باڈی بلڈنگ شو منعقد کرانے کے شوق میں نہیں آیا تھا۔ بہت سی باتوں میں اصل بات تو رہ گئی۔ وہ بوڑھی اور مفلوج عورت کہاں ہے جسے اٹھا لانے کا مردانہ کارنامہ سرانجام دے کر آپ نے سمجھا تھا کہ بازی جیت لی۔ دل تو چاہتا ہے کہ کاش میرے پاس اس وقت ایک کیمرہ ہوتا اور میں یہ گروپ فوٹو اتار لیتا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آوے۔ میں لوگوں کو، بشمول آپ کے اہلِ خانہ کے، یہ تصویر دکھا کے کہہ سکتا کہ دیکھو، یہ ہیں وہ شنزدہ مرد۔۔۔ یا میرے پاس ایک آئینہ ہوتا جس میں تم سب اپنے آپ کو دیکھ سکتے۔" میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "بالکل کسی سرکس کا ٹروپ ہے۔ دو جوکر اور پانچ بازیگر مع ایک عدد شکستہ ٹرینر، لباسِ قدرت میں۔"

"اس بڑھیا کو بھی واپس کر دیا گیا ہے بدمعاش!" چوہدری دلاور نے کہا۔ "تمہاری اس ماں کے ساتھ۔"

میں نے ایک فائر کیا اور چوہدری دلاور یوں فرش پر گرا جیسے اسے سچ مچ گولی لگ گئی ہے۔ فوزیہ کے بارے میں اس کے الفاظ نے مجھے مشتعل تو کیا تھا مگر مجھ میں اتنی عقل سلامت تھی کہ اس کامیابی کو ایک قتل کر کے ناکامی میں نہ بدلوں۔

"اب زبان سنبھال کے بات کرنا۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

"زندگی تھی، اس لیے پہلی بار میرا نشانہ خطا ہو گیا۔"

"وہ اسی کار میں تھی جو رضوی صاحب کے گھر گئی ہے۔" ڈی سلوا نے کہا۔

"آل رائٹ۔ باقی سب لوگ چلیں دوسرے کمرے میں۔" میں نے کہا۔ "مسٹر ڈی سلوا! تم اپنے کپڑے پہن لو۔ گاڑی تم چلاؤ گے۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔ تمہیں رضوی صاحب کے گھر کا راستہ تو معلوم ہوگا۔ راستے میں کسی جگہ سے میں فون کروں گا۔ اگر تصدیق ہو گئی کہ شہلا کی ماں بخیر و عافیت واپس پہنچ گئی ہے تو تم بھی بخیر و عافیت گھر لوٹ جاؤ گے لیکن یہ جھوٹ ہوا تو تمہاری لاش بھی کسی کو نہ ملے گی۔ کم آن۔ سنا نہیں باقی لوگوں نے۔"

وہ سب نہایت مضحکہ خیز طریقے پر آگے پیچھے چلتے، ایک دوسرے سے نظر چراتے، شرم سے اور شرمندگی سے ادھ موئے سے بے حال مگر بے بس، اس کمرے میں جانے لگے جس میں کچھ دیر پہلے میں نے انکل شیروانی سے اور فوزیہ سے ملاقات کی تھی۔ ایک پاؤں کی ٹھوکر سے میں نے ڈی سلوا کے کپڑے اس کی طرف پھینکے اور اسے نظر میں رکھتے ہوئے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید دیوار کی طرف منہ کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ باقی لوگ سراج کو سنبھال رہے تھے۔ غالباً وہ دیکھ چکے تھے کہ کمرے کے دوسرے دو دروازوں میں سے ایک اٹیچ باتھ کا تھا اور دوسرا باہر سے بند تھا۔ میں نے وہ دروازہ بھی بند کر دیا جس سے وہ کمرے میں گئے تھے۔ میرے کنڈی لگاتے ہی اندر سے چوہدری دلاور نے مجھے ایک درجن سے زائد غلیظ گالیاں دیں۔

"مسٹر ڈی سلوا!" میں نے کہا۔ "جب تم کپڑے پہن چکو تو منہ دیوار کی طرف رکھتے ہوئے ایک قمیص میں یہ سب اسلحہ باندھ لینا کسی کے کام نہ آ سکا۔ شاید میرے کام آئے اور یاد رکھنا کہ تم نے گردن موڑ کر دیکھنے کی خفیف سی کوشش بھی کی تو میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

ڈی سلوا نے کوئی جواب نہیں دیا اور میرے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے آٹھ ریوالور ایک پوٹلی میں باندھ لیے۔

"اب چلو آگے۔ گاڑی اسٹارٹ کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ پوٹلی پیچھے والی سیٹ پر رکھ دینا اور خیال رکھنا کہ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ غلط فہمی بھی تمہاری جان لے سکتی ہے۔"

"میں تمہارے خلاف نہیں ہوں۔" ڈی سلوا نے باہر آ کے آہستہ سے فرینچ میں کہا۔

"تمہیں فرینچ آتی ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"میں گوا کا رہنے والا ہوں اور یورپ میں کئی سال گزار چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھی۔ وہ بڑھیا اس کار میں نہیں تھی جو تمہارے انکل کو لے گئی ہے۔"

"پھر؟" میں چلتے چلتے رک گیا۔ "کیا وہ یہیں ہے؟"

ڈی سلوا نے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں باقی شکاری بند تھے۔ وہ سب کھڑکی سے منہ لگاتے باہر جھانک رہے تھے۔ کوئی بات کیے بغیر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار اسٹارٹ کی۔ اسی وقت مجھے ایک خیال آیا۔ اگر وہ بڑھیا گھر میں ہوتی تو ڈی سلوا ضرور اشارہ کر دیتا۔ جواب میں ہاں یا نہ ہی کہہ دیتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کسی دوسری جگہ پر رکھا گیا ہے۔ مثلاً اس کار کی ڈکی میں جو اب مجھے لے کر روانہ ہونے والی تھی؟

"اچھا!" میں نے کہا۔ "اگر وہ یہاں نہیں ہے تو کہاں ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔۔۔" ڈی سلوا نے کہا۔ "لیکن پلیز مسٹر سکندر! اپنے رویّے سے دوستانہ طرزِ عمل کا اظہار مت کیجیے۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر میرا رویّہ بدلتے دیکھ کر نہ کہہ سکا۔

"آل رائٹ۔ یو سن آف اے ڈرٹی۔۔۔۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے چلا کر انگریزی میں کہا۔

ڈی سلوا نے کسی وجہ کے بغیر نفی میں سر ہلایا۔ "میں ابھی تم کو بتا دیتا ہوں کہ وہ کہاں ہے لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے کی بجائے تم میرے ایک مکا مارنا جس سے ظاہر ہو کہ میں بدستور عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور جو لوگ کھڑکی میں سے دیکھ رہے ہیں ان کو یہ شک نہ ہو کہ۔۔۔ کہ میں غدار ہوں۔۔۔"

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے چیخ کر کہا اور نہایت جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھا۔

"وہ ڈکی میں بند ہے۔" ڈی سلوا نے آہستہ سے کہا اور میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کے ایک مکا رسید کیا۔ اگر اس نے مجھے پہلے سے تیار نہ کیا ہوتا تو میں یقیناً ڈکی کھول کر دیکھتا اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہو جاتا کہ ڈی سلوا نے غداری کی ہے۔ ڈی سلوا لڑکھڑایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھل گیا۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسیرانِ قفس رہائی کے لیے کوشاں ہیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے کی بجائے دروازہ توڑنے کی فکر میں ہیں۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" میں نے ریوالور کا رُخ اس کی جانب کیا۔

"اسے قتل کرنا پروگرام میں شامل نہیں تھا۔" ڈی سلوا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "وہ خود ہی مر گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

اس کا خیال میرے لیے سخت باعثِ تشویش ہو گیا۔ شہلا کی ماں اتنی دیر تک ڈکی میں بند رہ کے مری نہیں ہو گی تو مرنے والی ہو گی۔ اس کی جانِ ناتواں کے لیے اس فولادی پنجرے میں محبوس اور بے دست و پا رہ کے سانس کی نازک ڈوری کو ٹوٹنے نہ دینا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا لیکن یہ دیکھنے کے لیے میرا اس گھر سے کچھ دور پہنچ جانا ضروری تھا، جہاں محاورے کی عملی صورت کے مطابق ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ دروازے کا ٹوٹ جانا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یقینی تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ رہائی پاتے ہی وہ خاموشی سے راہِ فرار اختیار کریں گے۔ میری طرح وہ بھی چاہیں گے کہ بعد میں یہاں ان کی موجودگی کا کوئی سراغ نہ ملے اور نہ میں ان کو یہ موقع فراہم کرنا چاہتا تھا اور نہ میرے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ جاتے جاتے میں ان سب کو شوٹ کر دوں یا پولیس کو طلب کروں لیکن دونوں صورتوں میں میرے لیے اور رابعہ کے لیے ایسی قانونی مشکلات پیدا ہو جاتیں کہ میرا یہ انتہائی قدم خودکشی کے مترادف ہوتا۔ مسئلہ اگر صرف ان کو قتل کرنے کا ہوتا تو میں بہت پہلے ان سب کو مار دیتا لیکن مجھے پہلے ان سے یہ پوچھنا تھا کہ انہوں نے میرے باپ کو کیوں مارا اور کیسے مارا ہ بالکل اسی طرح جیسے مجھے مار دینے سے ان کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوتی تھی، اسی طرح میں بھی ان کو زندہ چھوڑ دینے پر مجبور تھا۔ ہم وہ شکاری تھے جو ایک دوسرے کے لیے جال پھیلا رہے تھے مگر ہمارا مقصد ایک دوسرے کی جان لینا نہیں تھا۔

پھر چلتے چلتے مجھے شرارت سوجھی۔ ”مسٹر ڈی سلوا!“ میں نے کہا۔ ”اباؤٹ ٹرن۔ بالکل گھوم جاؤ۔“

”کیا تم مجھے بھی ان کے ساتھ بند کر دو گے؟“ اس نے پلٹ کر کہا۔

”نہیں، مجھے ایک ڈرائیور کی ضرورت تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں اپنی حفاظت کی خاطر ایک تماشا کرنا چاہتا ہوں۔ تم واپس اندر چلو اور ان سب شرفا کے کپڑے اٹھا لاؤ۔“

میری نگرانی میں ڈی سلوا نے کمرے میں رکھے ہوئے سب کپڑوں کی گٹھڑی سی بنا لی۔ دروازہ اب بری طرح ہل رہا تھا اور گرنے ہی والا تھا۔ کپڑوں کے بنڈل کو بھی میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور ڈی سلوا کو حکم دیا کہ وہ کار نکال لے چلے۔ ڈی سلوا نے تعمیل کی اسی وقت ایک دھماکے سے دروازہ ٹوٹ کر گرا اور میں نے پلٹ کر دیکھا، کسی نے ایک پتھر پھینکا جو کار کے پچھلے حصے پر آ کے لگا۔ ان کی بے لبسی کا تصور کر کے مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ تاریکیٔ شب کی پناہ میں ہونے کے باوجود اُن سب کے لیے ہمارے پیچھے دوڑنا یا لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا بعید از قیاس تھا۔ ان کے لیے تو صبح ہونے سے پہلے پہلے اس گھر سے نکل کر اپنے اپنے گھر پہنچنا بھی مسئلہ ہو گا۔ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھنے والے پریشان تھے اور برہم تھے کہ شکار تو ہاتھ سے گیا، جاتے جاتے ان کو ایک دوسرے کی نظر میں شرمندہ و رسوا بھی کر گیا۔ شکار کرنے کو آئے، شکار ہو کے چلے۔ اب وہ کیا کریں گے؟ شاید کسی رُوسیاہ غلام کو روانہ کریں گے کہ کسی بھی گھر میں جا کر کوئی چادر، کوئی تولیہ یا پردہ ہی مار لائے۔ اور پھر اس لباس فاخرہ کو زیبِ تن کر کے کہیں جائے اور کسی بہانے ان سب کے لیے ایسے کپڑے لے آئے جو فٹ آئیں یا نہ آئیں، اس قابل ضرور ہوں کہ دیکھنے والوں کو وہ کپڑے نظر آئیں ۔۔۔ بقول شاعر ؎ تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس مگر اس کا کیا علاج کہ دنیا کی نظر شاعرانہ نہیں۔ جب تک ان کی ستر پوشی کا سامان فراہم نہیں ہو جائے گا وہ اس گھر سے تو نکل جائیں گے مگر کسی گمنام گوشے کے اندھیرے میں چھپ کر انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ گاڑی اب اس گھر سے کافی دور آ چکی تھی اور نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر رواں تھی۔

”مسٹر ڈی سلوا!“ میں نے اچانک کہا۔ ”یہ گاڑی کس کی ہے؟“

”کسی کی بھی نہیں۔“ ڈی سلوا نے اطمینان سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے ان سب میں سے کسی کی نہیں۔“

”آل رائٹ۔ گاڑی کو یہیں روک دو۔“ میں نے کہا۔ ”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس بوڑھی عورت کا کیا حال ہے اور یہ خیال رکھنا کہ میرا اعتماد حاصل کر کے تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اگر تم نے مقابلے کی کوشش کی تو میں تمہیں کتے کی موت مار دوں گا اور کار لے کر بھاگ جاؤں گا۔ تمہارے ساتھی بھی یہ وضاحت کرنے سے گریز کریں گے کہ تمہاری لاش یہاں کیوں پڑی تھی اور...“

”یقین کرو مسٹر سکندر! میں ابھی مرنا بالکل نہیں چاہتا۔“ ڈی سلوا نے کہا۔

اس کی یقین دہانی کے باوجود میں نے ایک قمیص میں لپٹے ہوئے آٹھ ریوالورں کا بے ہنگم بنڈل اٹھا لیا۔ ”اگر تم نے گاڑی لے کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی مجھے اس کے دونوں ٹائر برسٹ کرنے کے لیے گولی چلانی پڑے گی۔“

”اور اگر تم محض دھمکیاں دینے میں وقت ضائع کرتے رہے تو وہ بڑھیا مر جائے گی۔“ ڈی سلوا نے کہا۔ ”میری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈکی کھولنے کے لیے تمہیں چابیوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر میں کار لے کر کیسے فرار ہو سکتا ہوں؟“ اس نے اگنیشن سوئچ آف کیا اور چابیاں میری طرف اُچھال دیں۔

میں نے چابیاں اٹھا کے اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی۔ ابھی میں اس پر جھکا ہی تھا کہ گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، گاڑی ایک زبردست جست لگا کے آگے بڑھی۔ ڈی سلوا نے کلچ ایک دم چھوڑ کے ایکسیلریٹر کو پورا دبا دیا تھا اور بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں جھٹکے سے گروں تو سڑک پر پڑا رہ جاؤں لیکن میں اندر لڑھکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈکی کا اوپر اٹھا ہوا ڈھکنا جھٹکے سے نیچے آیا۔ اگر میری ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی نہ ہوتیں تو ڈکی خود بخود بند اور مقفل ہو جاتی اور میرے لیے اندر سے اس کو کھولنا ناممکن ہوتا۔ مزید یہ کہ اسپیئر وھیل اور جیک وغیرہ کے ساتھ جس مختصر سی جگہ میں شہلا کی ماں قید تھی اسی میں خود میں بھی پیک ہو جاتا اور ڈی سلوا دونوں قیدیوں کے ساتھ جا...

غنیمت اچھے اور ان کے کپڑے پیش کر کے اپنے آقاؤں کے سامنے سُرخرو ہوتا۔ اپنی ذہانت، جرأت اور وفاشناسی کا لوہا منوا لیتا اور اس عظیم الشان فتح کا سہرا بلاشبہ اسی کے سر بندھتا۔ مگر تقدیر نے ٹانگ اڑا دی اور میری ٹانگیں درمیان آ گئیں۔ چنانچہ ڈکی کا ڈھکنا میرے پیروں پر گرا جس سے ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ بھی شک گزرا کہ شاید گھٹنوں سے نیچے میری ٹانگیں کٹ کر سڑک پر ہی گر چکی ہیں۔ پھر درد کی شدت نے مجھے تڑپا دیا اور میں سمجھا کہ پنڈلی سے اوپر میری ٹانگوں کی ہڈیاں ضرور ٹوٹ گئی ہیں لیکن چند منٹ بعد میں ٹانگیں ہلا کے ڈھکن کو اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بفضلِ خدا میں صحیح سالم ہوں اور منہ ڈکی میں دیے ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھائے نہایت مضحکہ خیز انداز میں سفر کر رہا ہوں۔ کار اس وقت تک واپس ہو کے نہر کے ساتھ والی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور شالیمار باغ کی طرف رواں تھی۔

گاڑی کی رفتار ستر اسّی میل سے کم نہیں تھی۔ غیرارادی طور پر میں نے چیخ کر ڈی سلوا کو ایک غلیظ گالی دی۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور پہنچ بھی جاتی تو وہ کب فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے گاڑی روک دیتا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے ریوالور نکال کر ڈی سلوا کو شوٹ کرنے کا بارے میں سوچا لیکن ڈکی میں سے گولی چلا کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کا نشانہ لینا عملاً ناممکن تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گولی سے پٹرول ٹینک میں سوراخ کر دوں لیکن اس طرح پٹرول کو آگ لگتی تو ٹینک دھماکے سے پھٹ جاتا اور ہم خود جو گویا ٹینک کے اوپر براجمان تھے، اس کے ساتھ ہی اڑ جاتے۔ میرے پاس آٹھ ریوالور تھے اور سب بھرے ہوئے تھے لیکن میں ڈکی سے سر نکال کے ایک ٹائر بھی برسٹ نہیں کر سکتا تھا۔ اس رفتار پر ٹائر برسٹ ہوتے ہی گاڑی الٹ جاتی۔ وقت بہت کم تھا اور فاصلہ ہر لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈی سلوا مجھے واپس وہیں لے جا رہا تھا جہاں میرے دشمن کسی زخم خوردہ درندے کی طرح میرے خون کے پیاسے اور میری بوٹیاں نوچ کھانے کے لیے تیار تھے۔

پوری کوشش سے میں نے خود کو اٹھایا اور پیچھے کھسک کر اپنے پیروں کو گاڑی کے پیچھے والے بمپر پر جما دیا۔ اب میں انگریزی حرف ایل کی شکل میں آدھا کار کے اندر تھا اور آدھا باہر۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے جسم کا بوجھ اندر کی طرف رہے تاکہ میں الٹ کر سڑک پر نہ جا گروں۔ اپنا ایک ہاتھ میں نے اٹھا رکھا تھا۔ ہر جھٹکے سے نیچے آنے والا ڈکی کا فولادی اور بھاری بھرکم ڈھکنا میرے ہاتھ سے ٹکراتا تھا اور رک جاتا تھا۔ ہاتھ کی یہ روک نہ ہوتی تو ڈھکنا عین میری کمر پر گرتا اور ریڑھ کی ہڈی کا ایک آدھ مہرہ ضرور توڑ دیتا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے ڈکی کو اندر سے تھام رکھا تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے دونوں پنجے بمپر اور کار کی باڈی کے درمیان پھنس گئے ہیں اور چند سیکنڈ کے لیے ہی سہی مگر میں ہاتھوں کی گرفت کے بغیر بھی اپنا توازن کسی سرکس کے بازیگر کی طرح قائم رکھ سکتا ہوں تو میں نے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کو تھوڑا سا نیچے کیا۔ ڈکی کا ڈھکنا نیچے آیا تو میں نے جھپٹ کر اپنی انگلیاں نمبر پلیٹ پر جما دیں۔ ٹین کی نمبر پلیٹ تھوڑی سی خم ہوئی اور میری انگلیاں اس کے پیچھے پھنس گئیں۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا جس سے میں نے ڈکی کے اندر کا کنارہ پکڑ رکھا تھا۔

ڈکی کا ڈھکنا ایک دھماکے سے بند ہوا اور میرا جسم رفتار کے سبب کچھ یوں پیچھے گیا کہ میرے بمپر میں پھنسے ہوئے پیروں اور نمبر پلیٹ کو تھامنے والے ہاتھوں کے درمیان میرا جسم سات کے عدد کی طرح ہو گیا۔ یہ اطمینان بہت حوصلہ افزا تھا کہ میں جھٹکے سے سڑک پر نہیں گرا ورنہ میری موت انتہائی پُرعذاب ہوتی۔ میرے پیر بمپر میں پھنسے رہتے اور میرا سر سڑک کی سنگین سطح پر ساٹھ ستر میل کی رفتار سے رگڑ کھاتے ہوئے چند سیکنڈ میں پاش پاش ہو جاتا اور میرا جسم ان غلاموں کے جسم کی طرح اُدھڑ جاتا جن کو معتوب ہونے پر رتھ کے پیچھے باندھ کر رتھ دوڑانے کا فرمان جاری ہوتا تھا۔

اس جان لیوا مرحلے سے گزر جانے کے بعد میں نے نمبر پلیٹ چھوڑ کر ہاتھ آگے پھیلائے اور ڈکی پر سر کے بل جا گرا۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے دونوں پیروں کو بمپر سے نکالا۔ ڈی سلوا نے پلٹ کر دیکھا اور صورتِ حال کا فوراً اندازہ کر لیا۔ مجھے ڈکی پر سے گرانے کے لیے اس نے کار کی رفتار بڑھا دی اور انتہائی خطرناک طریقے پر لہرا کے چلانے لگا۔ کار ایک سیکنڈ میں سڑک کے ایک کنارے پر ہوتی تھی اور دوسرے سیکنڈ میں دوسرے کنارے پر۔ ڈکی پر پینٹ کی ہوئی سطح اتنی چکنی تھی کہ میں وائپر کی طرح پھسلتا ہوا کبھی ایک کنارے پر جا پہنچتا تھا تو کبھی دوسرے کنارے پر اور مجھے خود کو نیچے گرنے سے بچانے کے لیے جسم کی تمام قوت کو مخالف سمت میں صرف کرنا پڑتا تھا لیکن اب میں ونڈ اسکرین کے پیچھے تھا اور مجھے صرف ایک سیکنڈ کی مہلت درکار تھی کہ میں ریوالور سے بٹ مار کر شیشے کو چور چور کر دوں۔ اس کے پاس ماسٹر کی تھی چنانچہ ڈی سلوا مجھے دھوکا دینے اور گاڑی لے کر فرار ہونے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں کامیاب تو ہوگیا تھا مگر اب اسے اپنی کامیابی خاک میں ملتی نظر آرہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ناکامی اسے کتنی مہنگی پڑے گی اور اسے اپنا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ شکست سے بچنے کے لیے دیوانہ وار کوشش کررہا تھا اور اسے اپنی جان کی پروا بھی نہ تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے دائیں ہاتھ سے ریوالور کا بھرپور وار کیا اور پیچھے والا شیشہ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ ڈی سلوا نے دہشت زدہ ہوکے پیچھے دیکھا۔ شاید اسے یقین آچکا تھا کہ اب کسی بھی لمحے ریوالور کی گولی اس کے سر کو پاش پاش کردے گی۔ اس ایک لمحے میں جب خوف نے اس کی عقل کو مفلوج کردیا تھا اور اسے موت کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا وہ بھول گیا کہ اس کے ہاتھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی کار کے اسٹیئرنگ وھیل کو سنبھالے ہوتے ہیں اور یہ خطرناک کام مکمل یکسوئی اور توجہ کا طالب ہے۔ وہ اسٹیئرنگ کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس کی نگاہ سامنے نہ رہی لیکن ہاتھ کسی ارادے کے بغیر حرکت میں رہے۔ کار پھر قوس کی شکل میں لہرائی لیکن سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے بعد مخالف سمت میں گھومنے کی گنجائش نہ رہی اور ڈی سلوا نے یہ سب کچھ اس وقت دیکھا جب کچھ کرنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے میں میری نگاہ نے بھی دیکھ لیا کہ ایک تناور درخت کار کی رفتار سے بے نیاز اپنی جڑوں سے زمین کو تھامے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ کھڑا ہے۔ اگر ڈی سلوا کی نظر سڑک پر ہوتی اور اس کی عقل نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ اپنی مہارت اور کوشش سے تصادم نہ ہونے دیتا۔ میری نظر نے بھی درخت کا صرف سایہ سا دیکھا پھر ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات الٹ گئی ہو۔ آوازوں کا ایک مکروہ شور اٹھا جس میں موت کی ہذیانی ہنسی کا وجود سب سے الگ تھا۔ پھر ایک دم سناٹا پھیل گیا۔ مہیب، پُرآسیب اور بیکراں۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے عالمِ بالا کا تصور کیا لیکن مجھے اپنے اردگرد ایک فولادی شکستہ پنجرہ سا دکھائی دیا۔ میں کار کی اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں سر اٹھا کے اپنے جسم کے دیگر اعضا کا جائزہ لینے کے قابل ہوگیا۔ مارنے والا ہاتھ ڈی سلوا کا تھا۔ بچانے والا ہاتھ ڈی سلوا کے خدا اور میرے خدا کا تھا۔ میں جھٹکے سے اندر گیا تو کار کی اگلی سیٹوں نے "شاک ابزاربر" کا کام کیا۔ آگے پیچھے ہوجانے والی سیٹوں کی پشت سے ٹکرا کے میں وہیں رک گیا اور پیچھے آیا تو ایک لمبی سیٹ پر گرا جس کے کشن بہت نرم تھے چنانچہ میں لڑھک کر درمیان میں رہ گیا۔ مجھے چوٹیں تو آئی تھیں لیکن میرے تمام اعضا سلامت تھے اور معمولی خراشوں کے سوا میرے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ دھماکے نے اِدھر اُدھر کے بہت سے بنگلے والوں کو اور گشت کرنے والے چوکیداروں کو ضرور متوجہ کیا ہوگا۔ ڈی سلوا مرچکا تھا، اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ کار کا اگلا حصہ چور چور ہوکے پچک گیا تھا اور ڈی سلوا کی خون آلود، مسخ شدہ اور بھیانک لاش نہایت مضحکہ خیز طریقے پر اس کے ڈھانچے میں پھنسی رہ گئی تھی۔ اسٹیئرنگ وھیل ٹیڑھا ہوکے چھتری کی طرح اس کے اوپر آیا ہوا تھا اور اس کا سر گردن کے ٹوٹ جانے سے دائیں طرف کی کھڑکی سے باہر لٹک گیا تھا تو ایک ٹانگ مخالف سمت کی کھڑکی سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا سر بھی کھڑکی سے ٹکرا کے ہی ٹوٹا ہوگا۔ اب اس کا وہ مغز جو ہر طرح کے شیطانی خیالات کی آماجگاہ رہا تھا، جس سے تمام مجرم منصوبے جنم لیتے تھے اور جس میں اس کے ننگِ انسانیت ماضی کا ہر نقش موجود تھا اس کے ناپاک خون کے ساتھ فرشِ خاک پر ٹپک رہا تھا۔ اس کی موت ایک درسِ عبرت تھی مگر ان کے لیے جو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہوں ورنہ یہ عبرت ناک تماشا تو ہر روز ہر جگہ ہوتا ہے اور مرنے والے اس سے بھی کہیں زیادہ عذاب کے ساتھ مرتے ہیں۔

میں نے خود کو گھسیٹ کر پیچھے کے شکستہ شیشے سے باہر نکالا۔ حادثے نے میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا اور بچ جانے کے باوجود میرا وجود دہشت سے سُن ہورہا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ڈی سلوا کی لاش پر دوسری نظر ڈال سکوں لیکن اس سے بھی زیادہ روح فرسا خیال شہلا کی ماں کا تھا۔ پہلی چابیاں نہ جانے کہاں گری تھیں مگر دوسری ہنوز اگنیشن سوئچ میں جھول رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے چابیاں نکالیں لیکن ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ ڈی سلوا کے خون سے مس ہوا اور مجھے گرم انسانی خون کی مہک محسوس ہوئی۔ جو میرے جسم کے خون سے مختلف نہ تھا فرق ہوتا ہے تو انسانوں میں، لہو تو کسی کا بھی گنہگار نہیں ہوتا۔ مجھے ایک چکر سا آیا اور میرا جی مالش کرنے لگا۔ وہیں سڑک پر گر کے میں نے قے کی اور الٹا پڑا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ ابھی تک اس ویرانے میں کوئی نہیں پہنچا تھا لیکن کوئی راہ گیر، گشتی پولیس یا پہرے داروں میں سے کسی کا آجانا عین ممکن تھا۔ متلی ہوجانے کے بعد میری طبیعت کچھ بحال ہوگئی تھی لیکن کمزوری باقی تھی۔ جسم کی تمام قوت کو مجتمع کرکے میں

سیدھا کھڑا ہوا اور ڈگمگاتے قدموں سے ڈکی کھولنے بڑھا۔ چابی لگانے سے پہلے میرا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ پھر کوشش کے باوجود میں چابی نہ گھما سکا۔ ایک نامعلوم طاقت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مت کھولو اس لاوارث عورت کے مدفن کو، مت دیکھو کہ اس کے مفلوج جسم کا اس زنداں میں کیا انجام ہوا۔ تم جانتے ہو کہ تصادم ہوتے ہی اس کا استخوانی ڈھانچہ فولادی دیواروں سے ٹکرا کے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوگا۔ جسم سے روح کا رشتہ تو پہلے ہی زندگی کے نام پر ایک تہمت تھا۔ اب دیکھنے کو کیا ہے۔ جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل۔ درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل۔ پھر مٹی سینچو اشکوں سے۔ پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو اور اگلی رت کی فکر کرو۔ جب پھر اک بار اُجڑنا ہے۔ جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے۔

میں نے چابیاں واپس اگنیشن سوئچ میں لگادیں اور پیچھے سے وہ پوٹلی اٹھالی جس میں اب بھی سات ریوالور بندھے ہوئے تھے۔ آٹھویں ریوالور کو بھی اسی میں ٹھونس کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھیرے میں کئی جگہ میں ٹھوکر کھاکے گرتے گرتے بچا۔ جسم میں طاقت نہیں تھی اور ضمیر میرے راستے میں کانٹے بچھا رہا تھا لیکن عقل مجھے گھسیٹ رہی تھی۔ خودغرضی اور کمینگی پر مبنی اپنی ذات کے تحفظ کی آرزو مجھے اس جگہ سے دور دھکیل رہی تھی جہاں ایک بوڑھی عورت کا ٹوٹا پھوٹا بے جان جسم بہت سے سوالوں کے جواب مانگتا تھا کہ میں نے ممتا کی دھرتی سے صرف اسی کو پروان نہیں چڑھایا تھا جس نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا، شہلا کو بھی وہ سب دیا تھا جو اس کی ماں دیتی۔ پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ عالمِ ارواح میں اس نے اپنے بیٹے سے کہا ہوگا۔ "عدنان! کیا یہ وہی ولایت ہے جہاں سے تو نے مجھے چٹھی لکھی تھی اور روپیے بھیجے تھے؟ لوگوں نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ اگر اس وقت جب تو ایک جواری کے ہاتھوں قتل ہوا تھا مجھے سچ بتادیا جاتا تو میں یقیناً مرجاتی مگر کیا وہ موت زیادہ باعزت اور قابلِ احترام نہ ہوتی۔ اس موت سے بہتر نہ ہوتی؟ پھر اب میرا جنازہ کون اٹھائے گا؟ مجھے مٹی کون دے گا؟ میری قبر پر پھول چڑھانے کون آئے گا؟"

میں اپنے خیالات کے پاگل کرنے والے ہجوم سے پناہ چاہتا تھا۔ بے شک میرا ایک قوی دشمن خود اپنی ہی وجہ سے مارا گیا تھا اور جسے وہ مارنا چاہتا تھا یعنی میں۔ وہ صرف اس لیے زندہ رہا تھا کہ ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے مگر صرف میری وجہ سے شہلا کی ماں بھی مرگئی تھی۔ میری خاطر جان دینے والوں میں ایک اور بے گناہ نام کا اضافہ ہوگیا تھا اور ان سب کی جان کا قرض بڑھتا جارہا تھا۔ اس قرض کو چکانے کے لیے مجھے نہ جانے کتنی فرصتِ زندگی درکار تھی۔

کسی آہوئے صیاد دیدہ کی طرح میں سایوں کی پناہ لیے بھاگتا رہا۔ میں جلد از جلد رضوی صاحب کی کوٹھی پہنچ کے دیکھنا چاہتا تھا کہ فوزیہ اور انکل شیروانی کو بحفاظت پہنچا دیا گیا ہے یا وہ بھی محض میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک دامِ فریب تھا۔ کہیں مجھے مطمئن کرنے کے لیے ان کو وہاں سے رخصت کردیا گیا ہو اور کسی دوسرے زنداں میں قید کردیا گیا ہو۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی اگر فوزیہ اپنے والد کے ہمراہ رضوی صاحب کے پاس پہنچی ہوگی تو اب تک ایس ایس پی رضوی اپنی عقل اور ذہانت سے کام لے کر بہت کچھ پوچھ چکے ہوں گے اور سمجھ چکے ہوں گے۔ اپنی آتشِ قہر و غضب کو انہوں نے بھڑکنے سے پہلے ہی فرو کردیا ہوگا اور اب وہ اپنے تمام قانونی اختیارات سے کام لے کر مجھے بچانے کے ساتھ ساتھ مجرموں کو گرفت میں لینے کی فکر بھی کررہے ہوں گے۔ اس طرح کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بے شک یہ انتہائی اشتعال انگیز کارروائی تھی مگر رضوی صاحب کا سب سے نمایاں وصف (جو شاید ان کی ہر کامیابی کا ضامن تھا) ہنگامی حالات میں عقل پر جذبات کو حاوی نہ ہونے دینے کی قابلِ رشک صلاحیت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے خود بھی گھر پہنچ جاؤں۔ کچھ باتیں محسن پہلے ہی بتا چکا ہوگا یا اس نے اپنے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سن کر بتادی ہوں گی چنانچہ رابعہ اور شہلا سے بھی کچھ پوشیدہ نہ رہا ہوگا۔ انکل شیروانی نے بھی ان واقعات کا تذکرہ کردیا ہوگا جو ان کے ساتھ پیش آئے۔ اب مجھے یہ بتانا تھا کہ بعد میں کیا ہوا۔ میں اس اُدھیڑبُن میں تھا کہ کتنے فیصد حقائق کو حذف کردوں۔ مثلاً میں رضوی صاحب کو اپنے ایڈونچر کے متعلق صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں لڑ بھڑ کے نکل آیا۔ یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے کس طرح ڈی سلوا کا مقابلہ کیا۔ ڈی سلوا کے حادثے میں مرنے اور شہلا کی ماں کے بارے میں کچھ بتانے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ میں ایک اور ضابطے کی کارروائی میں ملوث ہوجاتا۔ صورتِ حالات ایسی تھی کہ میرے لیے بہت سی الجھنوں کا اضافہ ہوجاتا۔ ابھی تازہ ترین الزام یہ تھا کہ میں نے چوہدری دلاور کو اغوا کیا اور ڈی سلوا کی کار چرائی۔ پھر ڈی سلوا کو لے گیا اور دلاور کو ختم کرکے الزام ڈی سلوا پر عائد کرنے کا پلان بنایا۔ اس کے فوراً بعد اگر میں یہ کہتا کہ میں نے تو صرف یہ کوشش کی تھی کہ ڈی سلوا مجھے اور شہلا کی ماں واپس نہ لے جاسکے۔ حادثہ خود ڈی سلوا کی بدحواسی کا شاخسانہ تھا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو یہ بات سخت مشکوک سمجھی جاتی۔ دوست اور دشمن، اپنے اور پرائے سب یہ سوچنے میں حق بجانب ہوتے کہ فوزیہ کے اغوا کی واردات نے مجھے پاگل کر دیا ہوگا۔ میں شہلا کی ماں کو بچانا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ مجرم اس لڑکی کو اٹھا لائے ہیں جس سے میری پرانی جذباتی وابستگی تھی اور اس کے باپ کو پکڑ لائے ہیں تو غصے میں اپنی جان پر کھیل کر میں وہاں سے نکل آیا اور ڈی سلوا کو قتل کر کے یا بیہوش کر کے اس کی گاڑی کو درخت سے ٹکرا دیا کہ یہ حادثہ نظر آئے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اور گیئر میں ڈال کے دروازے میں سے چھلانگ لگا دی جائے اور چھلانگ لگانے سے پہلے ایکسیلریٹر کو دبانے کے لیے پتھر بھی رکھ دیا جائے تو گاڑی کسی بے ہوش آدمی کو لے کر دوڑتی ہوئی تیز ہوتی جائے گی اور کہیں نہ کہیں کسی کھمبے، درخت یا دیوار سے ٹکرا جائے گی۔ بیہوش آدمی کی موت اس تصادم کے بھیانک نتیجہ ہی سمجھی جائے گی۔

میرے خاموش رہنے سے پولیس کے لیے بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ فرض کر لیتے کہ ڈی سلوا جب شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے جا رہا تھا تو بریک فیل ہو جانے کے باعث یا کسی اور وجہ سے کار بے قابو ہو گئی اور درخت سے ٹکرا گئی۔ ٹوٹی پھوٹی کار کے ڈھانچے کو دیکھ کر تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہرین بھی نہیں بتا سکتے کہ بریک لائن کہاں سے ٹوٹی تھی۔ چشم بددور، ہماری بے حد ذہین اور مستعد پولیس ایسے کیس فوراً فائل کر دیتی ہے جس میں "متوفی" کچھ نہ بتا سکے، چشم دید گواہ کوئی نہ ہو اور مشکوک ملزم بھی کوئی نہ ہو جس سے تفتیش کی جا سکے۔ چنانچہ جو حقائق انہوں نے رپورٹ میں لکھ دیئے وہی فائنل۔ کیس داخل دفتر۔ بصورت دیگر ان کو مجھ سے بہت کچھ پوچھنا پڑتا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو بھی بلانا پڑتا، بیانات لینے پڑتے۔ میرے بتائے ہوئے راستوں پر خوار ہونا پڑتا، چھاپے مشتہر کرنے پڑتے اور انکل شیرازی، فوزیہ اور رضوی صاحب کے علاوہ شہلا سے، محسن سے اور بجانے کتنے لوگوں سے معلوم کرنا پڑتا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ ضابطے کی کارروائی ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ پولیس والے پھنس جاتے۔ ایک طرف وہ بڑے بدمعاش تھے جو انہیں اسی بات کا وظیفہ دیتے ہیں کہ ان کے معاملات دبا دیے جائیں یا ان کے حریفوں کو دبایا جائے۔ دوسری طرف ایک ایس ایس پی اور ایک ڈپٹی سیکرٹری۔ گویا آگے کنواں، پیچھے خندق۔ میں جلد از جلد گھر پہنچ کے کسی چکر کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کرنے کا آرزومند تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گھر پہنچوں تو ایک اسلحہ خانہ میرے پاس ہو اور ان میں وہ ریوالور بھی ہوں جن کے نمبر سے لائسنس کا اور مالک کا نام و نشان معلوم کیا جا سکے۔ دوسری طرف میں اسلحہ ہنر میں بھی غرق کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ریوالور بہت بڑی طاقت بننے کا ذریعہ تھے۔ پاکستان میں ایک ریوالور حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اگر درے سے دیسی ساخت کا ریوالور اسمگل کر کے لایا جائے تو اس میں بھی پکڑے جانے یا نکل آنے کے امکانات ففٹی ففٹی رہتے ہیں۔ بلاشبہ وہ دیسی ریوالور نا سہرن فن کے تجربہ کا شاہکار ہوتے ہیں اور انگلش ریوالور سے کسی طرح کوالٹی میں کم نہیں ہوتے مگر انہیں لاہور تک پہنچانا بھی اتنا ہی دشوار اور پُرخطر ہوتا ہے جتنا تیرنا سیکھے بغیر دریا پار کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ اب وقت کے تقاضوں نے اس کاروبار میں بھی ایمانداری کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ جو لوگ درے کا ریوالور فراہم کرتے ہیں، وہی پولیس کو مخبری بھی کر دیتے ہیں۔ پھر دُہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ریوالور اسمگل کرنے کی کوشش کرنے والا پکڑا جاتا ہے تو حسب توفیق سو پیاز اور سو جوتے کھا کے یا سو سو کے نوٹ اور ریوالور دے کر جان چھڑاتا ہے۔ ریوالور واپس اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے جس نے فراہم کیا تھا اور پولیس آدھی قیمت مال پہنچانے کے بدلے وصول کرتی ہے۔ وہی ریوالور پھر فروخت ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے یہ ریوالور اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ کسی جگہ ضرورت پڑنے پر ہم اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو مار کے نکل آنے پر مجبور ہو جاتے تو آلۂ قتل وہیں چھوڑ آتے۔ تفتیش ہوتی تو پولیس اس کے مالک کا سراغ لگاتی، ہمارا نہیں۔ ہمارے حریف وہ بدنام مجرم تھے جو عیاری، مکاری، جھوٹ اور فریب۔ دغابازی اور بدمعاشی کے تمام حربے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اپنی طاقت میں خود کو فرعون کی طرح (نعوذباللہ) خدا سے کم نہیں جانتے تھے اور اپنی دولت کی بالادستی کے غرور میں ساری خدائی کو قابل خرید سمجھتے تھے۔ ہم اب تک ان پر اچھی طرح واضح کر چکے تھے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے اور اگر وہ سیر ہیں تو ہم بھی سوا سیر ہیں۔ اگر ہم نے ان کا غرور نہیں توڑا تھا تو اتنا ضرور کیا تھا کہ انہیں اپنے برابر کا شکاری ہونے کا یقین ضرور دلا دیا تھا۔ پہلے وہ خود کو ببر شیر سمجھتے تھے تو ہمیں چوہے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ ان پر نفسیاتی دباؤ برقرار رکھا جائے اور یہ احساس بھی ختم نہ ہو کہ ہم ان سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم ریوالور سے کسی کی جان لیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہمارے اپنے دفاع کا مؤثر ذریعہ تھے۔ پھر یہ کہ حالات سے

فائدہ اٹھانے میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ جیسے دشمن نے محض حالات کی شہادت سے مجھے قاتل بنا دیا تھا، ایسے ہی موقع ملنے پر میں بھی یہ کر سکتا تھا کہ دلاور یا ——— سراج کے اپنے ریوالور کو کسی جگہ بطور ثبوت چھوڑ دوں اور پھر ایسے حالات پیدا کر دوں کہ قانون صرف انہیں گرفت میں لے۔ سر دست مسئلہ یہ تھا کہ میں یہ اسلحے کا ذخیرہ کہاں چھپاؤں جہاں سے وقت ضرورت اس کا حصول بھی آسان ہو۔

رضوی صاحب کے گھر کے پاس پہنچ کے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے اس جگہ کا خیال آیا جہاں میں نے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر دفن کیا تھا۔ یہ جگہ اس کوارٹر کے عقب میں تھی جہاں پہلے ہمارے ساتھ کے دوسرے کمرے میں ایک کانسٹیبل مقیم تھا۔ ہم نے اسے تھانیدار بنوانے کے چکر میں ڈال کے اپنے جوتے تک صاف کرائے تھے اور بالآخر گھر سے بیدخل کرا دیا تھا۔ اس کی جگہ شہلا کی ماں نے لی تھی مگر اس کا قیام کتنا مختصر تھا۔ ایک بار پھر چشم تصور سے میں نے وہ کار کا ڈھانچہ دیکھا جس میں دو انسانی ڈھانچے، آخر شب اس انتظار میں تھے کہ صبح ہو تو اجالا دنیا کو ان کے انجام کی خبر دے۔ ابھی نہ سہی چند گھنٹوں میں شہلا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ جنم دینے والی ماں کے بعد ممتا دینے والی ماں سے بھی محروم ہو چکی ہے۔ عدنان، اوباش قسم کا آدمی تھا جس سے شہلا کی جذباتی وابستگی سطحی رہی مگر جس عورت نے اسے پرورش کیا تھا، اسے زندہ رکھنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی، عزم و حوصلہ دیا تھا اور زمانے کی کڑی دھوپ سے بچائے رکھنے کے لیے محبت اور شفقت کا ٹھنڈا سایہ دیا تھا، اس کی یہ المناک موت ایک ایسا جذباتی سانحہ ہوگی جس کی شدت اسے لہو رلائے گی اور جس کی کسک برسوں باقی رہے گی۔ بے شک، وقت ہی سب سے بڑا چارہ گر ہے جو درد کے ہر زخم کا درماں بن جاتا ہے مگر وقت تو گزرتے گزرتے ہی گزرتا ہے۔ یہ آدمی کے اختیار میں نہیں کہ وہ احساس کو وقت کی رفتار سے آگے لے جائے اور سالوں کے زخم لمحوں میں مندمل ہو جائیں۔

رضوی صاحب کے گھر کا ہر کمرہ روشن تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ درون خانہ ہنگامہ برپا ہے اور اس ناگہانی افتاد سے پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے عملی اقدامات زیر غور ہیں۔ اس ہنگامی اجلاس میں شہلا بھی یقیناً شریک ہوگی۔ میں نے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو کے سوچا اور سایہ دیوار میں چوروں کی طرح چلنے لگا۔ لیکن ہنوز لذت خواب سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی خوش بختی پر رشک آیا جن کے دن غم جہاں کے لیے اور کار و بار حیات کی جدوجہد کے لیے وقف تھے مگر راتیں صرف غم جاں کے لیے تھی۔ نیند اُن کی ہے، خواب ان کے ہیں، راتیں ان کی ہیں جن کے خیالات پر خوف کی یلغار نہیں جن کی ہر رات ایک فصیل ہے جو انہیں تفکرات سے تحفظ فراہم کرتی ہے، دن بھر کی تھکن کے بعد آسودگی کے لیے فرصت فراہم کرتی ہے کہ وہ صبح اٹھیں تو زندگی کے ایک نئے پُرامید اور پُرمسرت دن کے آغاز کے لیے ان کے پاس توانائی اور ذہنی یکسوئی کا نیا ذخیرہ ہو۔

دیوار کے آخری گوشے تک پہنچ کے میں رضوی صاحب کے گھر میں سرونٹ کوارٹر کے پیچھے کود گیا۔ کوارٹر کے پیچھے اندھیرا تھا مگر دو کمروں کی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر کی روشنی باہر بھی پہنچ رہی تھی۔ اس اُجالے میں میرے لیے وہ جگہ تلاش کرنا آسان ہو گیا جہاں میں ریوالور دفن کرنا چاہتا تھا۔ وہ زمین ابھی زیادہ سخت نہیں ہوئی تھی مگر صرف ہاتھوں کی مدد سے ایک فٹ گہرا گڑھا بنانا بہرحال آسان نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے کھڑکی کے ایک شیشے میں سے اندر جھانکا۔ میں براہ راست روشنی کی زد میں نہیں تھا چنانچہ میرا سایہ شیشے پر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ شہلا کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ اس کا پلنگ خالی تھا اور اوپر سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے دوسرے کمرے کے اندر بھی دیکھا۔ چند سیکنڈ تک میں اس پلنگ کو گھورتا رہا جو اب کسی خالی قبر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اوپر جلنے والا چالیس واٹ کا بلب اپنی زرد اداس روشنی سے کمرے کی ویرانی کے تاثر کو گہرا کر رہا تھا اور اس کے ماحول کو پُرآسیب بنا رہا تھا۔

میں گھوم کر سامنے والے حصے کی طرف گیا اور کھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی گھر تھا جہاں میں رہتا تھا مگر اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں قدم رکھ رہا ہوں یا اس کمرے میں تنہا کھڑا ہوں جہاں سے ابھی ابھی کوئی میت اٹھائی گئی ہے۔ اس گھر کی دیواریں تک میرے لیے اجنبی ہو گئی تھیں اور مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے زبان خاموشی سے پوچھ رہی ہوں کہ آ گئے سورما! بڑے دعوے اور طمطراق سے گئے تھے۔ پھر اب تمہارے ہاتھ خالی اور تمہارا چہرہ احساس شکست کی تصویر اور تمہارا دل ویران کیوں ہے؟

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر باورچی خانے میں سے ایک چھری لے کر نکل آیا۔ زمین کے سینے میں یہ خنجر پوری قوت سے اتار کے میں نے ایک بہت بڑا گھاؤ پیدا کر دیا لیکن یہ گھاؤ بھی مجھ پر خندہ زن رہا۔ یہ دشمن کا سینہ نہیں مٹی ہے جو زندگی کو نمو بھی دیتی ہے اور اپنے جیسا بھی کر دیتی ہے۔ وہ گڑھا اور اس کے قریب لگے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو دیکھ کر مجھے اپنے باپ کی خالی قبر یاد آئی۔ زمین بیک وقت کتنی مہربان اور کتنی بے رحم ہے۔ آدمی کو جینے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے لیے کیا کچھ نہیں دیتی ــــ روٹی بہتے دریاؤں اور گنگناتے چشموں کا ٹھنڈا میٹھا پانی، سونا چاندی، تیل جو مشینوں کو متحرک رکھتا ہے اور پھر سب کچھ لے لیتی ہے۔ آدمی کا گوشت پوست اور ہڈیاں سب نگل جاتی ہے۔ کتنے وزیر خان ہیں جن کے گلستان مدفنوں کی خبر نہیں دیتی اور ان کے بے گناہ لہو کا سراغ نہیں دیتی۔ زلزلوں سے اور سیلابوں سے بستیاں فنا کر دیتی ہے۔ تہذیبوں کو مٹا دیتی ہے۔ بیکراں سمندروں اور صحراؤں میں ایٹمی دھماکوں کے لیے گنجائش نکالتی ہے مگر روتے زمین پر پھولوں کے رنگ اور خوشبو کا جادو بھی جگاتی ہے۔

ریوالورس کو بحفاظت قابلِ استعمال رکھنے کے لیے مجھے پولی تھین یا سیلوفین جیسی چیز کی تلاش میں پھر اندر جانا پڑا۔ کوڑے کے ڈھیر میں سے جو شہلا نے جھاڑ دے کر ایک گوشے میں کر دیا تھا مجھے ڈبل روٹی کے خالی بیگ ملے۔ میں نے ان کو جھاڑا اور ایک ایک تھیلی میں دو دو ریوالور اچھی طرح لپیٹ کر گڑھے میں اوپر تلے رکھ دیے۔ زمین برابر کرنے میں مجھے پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ مٹی کو پیروں سے دبا کر میں نے اس کے اوپر خشک پتے اور گھاس پھونس بکھیرا اور اس جگہ کو بالکل ایسا ہی کر دیا جیسا آس پاس کا علاقہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ قانونی کارروائی ہونے تو رضوی صاحب سرونٹ کوارٹر کے پیچھے بھی تفتیش کے لیے ضرور آئیں گے۔ وہ میرے نقشِ قدم بھی دیکھیں گے اور وہ جگہ بھی جہاں سے میں کودا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ میں نے باٹا کے آٹھ نمبر لیدر سول جوتے پہن رکھے تھے جو نیچے سے بالکل چکنے تھے۔ اگر سول پر کوئی پرنٹ ہوتا تو میں پکڑا جاتا اور رضوی صاحب مجھ سے پوچھ گچھ ضرور کرتے لیکن اب جو نشانات بنے تھے ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شہر میں ہزاروں افراد اسی سائز کے ایسے ہی جوتے پہنے پھر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے انکل شیروانی اور فوزیہ کے بیانات کا تحفظ بھی حاصل تھا جس کے مطابق میں ہنوز دشمن کی قید میں تھا۔ رضوی صاحب کا ذہن میری طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے براہِ راست اندر جانے سے گریز کیا اور لوٹ کر اس راستے پر بھی نہیں گیا جس سے اندر آیا تھا۔ میں نے مخالف سمت کا رُخ کیا اور دوسری طرف والی کوٹھی کو جدا کرنے والی دیوار عبور کر گیا۔ اب اگر نقوشِ قدم دیکھے جاتے تب بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا کہ ملزم ایک طرف سے آئے اور دوسری طرف سے نکل گئے۔ دوسری طرف قد آدم گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی جو مین گیٹ تک چلی گئی تھی لیکن خشک ہو رہی تھی۔ اس میں سے گزرتے ہوئے میرے ہاتھوں پر اور چہرے پر خراشیں آئیں اور میرے کپڑے پھٹے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ یہ ظاہری حالت میرے بیان کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہو گی۔ وہ قمیص جس میں ریوالور بندھے ہوتے تھے اب بھی میرے پاس تھی۔ اسے میں نے سڑک پر آتے ہی پھینک دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر میں دن نکلنے سے پہلے ہی سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گی تو پہلا ضرورت مند اس بیش قیمت قمیص کو فوراً اٹھا لے گا اور سب کی نظریں بچا کر بغل میں دبا کے فوراً رفو چکر ہو جائے گا۔

میں نے بڑی ڈرامائی "انٹری" دی۔ میں آہستہ سے دروازہ دھکیل کر بھی اندر جا سکتا تھا مگر میں نے باہر ہی سے چلانا شروع کیا۔ "انکل شیروانی! انکل رضوی! محسن۔۔۔" اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سب باہر نکلتے، میں دھڑام سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میرا تصادم رابعہ سے ہوا جو شاید سب سے پہلے بھاگی تھی۔ وہ نیچے گری اور رضوی صاحب نے اسے سنبھال لیا۔ میں بہت زور زور سے سانس لے رہا تھا جیسے سارا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کیا ہو۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ اور فوزیہ۔۔۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور دیوار تھام لی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں سب لوگ موجود ہیں۔ رابعہ اور فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور ان کے چہرے غم و اندوہ اور خوف سے نڈھال ہیں۔ انکل شیروانی کی حالت بھی ایسی تھی جیسے ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ صرف محسن اور انکل رضوی پُرسکون تھے مگر تفکرات کے آثار ان کی صورت پر بھی عیاں تھے۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔" انکل شیروانی نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "ہمیں تو وہ بدمعاش خود ہی چھوڑ گئے تھے۔"

"تم ٹھیک تو ہو نا سکندر!" فوزیہ اور رابعہ نے ایک ساتھ کہا۔ دونوں کے الفاظ ایک تھے۔ الفاظ کے جذبے ایک سے تھے، لہجہ ایک تھا اور لہجے میں تشویش کے ساتھ اطمینان کا احساس ایک تھا۔ ان دونوں کو بیک وقت اپنے اپنے دل کی بے تابی کا اور اپنے جذبات پر اپنے اختیار کے نہ ہونے کا احساس ہوا مگر اس میں رقابت کی خلش نہیں صرف خلوص اور اپنائیت کا انداز تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ان دونوں کو خفت سے بچانے کے لیے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا اور کرسی پر گر گیا۔ "شہلا کہاں ہے؟"

"وہ دوسرے کمرے میں سو رہی ہے۔" انکل رضوی نے متانت سے کہا۔ "تمہاری آنٹی نے اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کو طلب کر لیا تھا اور اب وہ سو رہی ہے۔" انہوں نے رابعہ اور فوزیہ کو اشارہ کیا۔ "تم لوگ جاؤ۔ کچھ چائے وغیرہ بنا لاؤ۔"

"میری امی کا کیا بنا سکندر بھائی؟" شہلا نے اچانک دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "آپ ان کو لینے گئے تھے۔"

ایک لمحے کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ غالباً میری آواز نے شہلا کے لاشعور کو بھی جھنجھوڑ دیا تھا اور اسے کوئی خواب آور دوا دی گئی تھی تو اس کا اثر زائل ہو گیا تھا مگر وہ اب بھی دروازے میں یوں کھڑی تھی کہ لگتا تھا سو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اپنے سامنے دیوار پر مرتکز تھیں جہاں کھڑکی کے شیشوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "خدا کا شکر ہے میں وقت پر پہنچ گیا۔"

"آپ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟" شہلا نے پلک جھپکائے بغیر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں ان کو یہاں لاتا۔" میں نے اسی بے ساختگی سے کہا۔ "میں انہیں ہسپتال لے گیا تھا جہاں ڈاکٹروں نے انہیں داخل کر لیا ہے۔ ایک دو دن میں گھر لوٹ آئیں گی۔ شام کو۔۔۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں سکندر بھائی!" شہلا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"یہ شک تمہیں کیسے ہوا بے وقوف؟" میں نے اس کے وار سے سنبھل کے کہا۔

"اس لیے کہ آپ نے عدنان کے بارے میں اسی اعتماد کے ساتھ ان سے جھوٹ بولا تھا۔" شہلا نے کہا۔

"وہ۔۔۔ ان کی بات اور تھی۔" میں نے اس کی منطق سے بوکھلا کے کہا۔ "تم تو ماشاءاللہ سمجھدار ہو۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"رابعہ!" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ فضول بحث کا وقت نہیں ہے۔ اسے اندر لے جاؤ اور دوا دے دو۔"

"کون سی دوا؟" شہلا نے رابعہ سے بازو چھڑا لیا۔ "جھوٹ کو سچ بنانے کی دوا؟ حقائق سے بے خبر رکھنے کے لیے آنکھیں بند کر دینے والی گولی؟ نہیں انکل! میں بھی آپ سب میں شامل ہوں۔ مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ جو آپ سب جانتے ہیں وہ مجھے بھی معلوم ہو۔ مجھے سُلا سُلا کر آپ کب تک حقیقت کو چھپائیں گے؟"

"دیکھو شہلا! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" محسن اور رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ ان کے بیچ میں سے نکل کے وسط میں آگئی۔ "آپ سب لوگ خوفزدہ نہ ہوں، میں وعدہ کرتی ہوں کہ بری سے بری خبر سن کے بھی چیخ نہیں ماروں گی، بیہوش ہو کے نہیں گروں گی، پاگل ہو کے کپڑے نہیں پھاڑوں گی اور بری سے بری خبر کیا ہو سکتی ہے؟ یہی نا کہ جو انہیں اٹھا کے لے گئے تھے ان بے ضمیروں نے انہیں مار دیا۔ وہ پہلے بھی زندہ ہی کہاں تھیں کہ کوئی ان کو مار کے جری کہلائے۔ یا مجھے صدمہ ہو کہ وہ کیوں مر گئیں۔ انہیں تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا۔"

"آل رائٹ۔ آل رائٹ۔" انکل رضوی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے شفقت سے تھپکی دی۔ "بیٹھ جاؤ۔ ابھی خود ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں۔ سکندر نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔" انہوں نے شہلا کو ایک کرسی پر شیروانی صاحب کے ساتھ بٹھا دیا۔

"سکندر بھائی! کہہ دیجیے کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور وہ مر چکی ہیں۔" شہلا نے اسی سکون سے کہا۔

اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور پھر۔۔۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کمرے میں موجود تمام افراد صرف پتھر کے بت بنے رہ گئے جن کی ساکت نظریں مجھ پر مرتکز تھیں۔

"میں نے کہا تھا کہ چائے لاؤ۔" رضوی صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہلا کو اور سکندر کو بلیک کافی دو۔ اسٹرانگ۔ تم اندر جا کے ہاتھ منہ دھو لو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولے۔ "اور کپڑے بدل کے آؤ۔ پانچ دس منٹ کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ہم سب بات کرنے اور سمجھنے کے قابل ہوں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد میں بدلے ہوئے حلیے میں واپس پہنچا تو کمرے میں انکل شیروانی اور رضوی کے علاوہ شہلا بھی بالکل اپنی اپنی جگہ اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ شہلا کا چہرہ بدستور سپاٹ تھا۔ شیروانی صاحب اضطراب میں پہلو بدل رہے تھے اور صرف رضوی صاحب تھے جو پُرسکون نظر آتے تھے۔ وہ سگریٹ کے کش لے کر کچھ سوچنے میں محو تھے۔

"شیروانی صاحب سے مجھے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔" رضوی صاحب نے اچانک سگریٹ کو کھڑکی سے باہر اُچھال کے کہا۔ "انہوں نے کسی کی صورت نہیں دیکھی سوائے اس کے جو پولیس کی وردی میں میرا ڈرائیور بن کے پہنچا تھا۔"

"میں نے تو اس کی صورت پر بھی غور نہیں کیا۔" شیروانی صاحب نے خفت سے کہا۔ "وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ دبلا پتلا اور درمیانے قد کا آدمی تھا۔"

"آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "ملا ور۔۔۔ ڈی سلوا اور دوسرے لوگوں کو؟"

شیروانی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ۔۔۔ وہ خبیث

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ڈرائیور۔۔۔ وہ مجھے سیدھا اس کمرے میں لے گیا تھا۔ وہاں دو آدمی اور بھی تھے مگر انھوں نے منہ پر نقاب ڈال رکھے تھے۔ ڈرائیور نے ریوالور نکال لیا، ایک نے فوزیہ کو باندھ دیا، دوسرے نے مجھے۔"

"واپسی میں تو آپ نے غور کیا ہوگا۔۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے دیکھا نہیں تھا؟ انھوں نے ہماری آنکھوں پر ٹیپ چپکا دیے تھے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"اوہ۔ دراصل۔۔۔ آپ لوگ جب میرے سامنے سے گزرے تو۔۔۔ تو میں نے صرف پشت دیکھی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک نے کہا تھا کہ خاموشی سے نکل چلو۔ حلق سے آواز بھی نکالی تو۔۔۔ وہ مارا جائے گا۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "اس نے گالی دے کر تمہارا نام لیا تھا۔ دوسرے نے کہا خطرہ مول مت لو ان کو ٹھنڈا کر کے لے چلو۔ غالباً اس کی مراد بیہوش کرنے سے تھی لیکن میں نے کہا کہ میں وعدہ کرتا ہوں، خاموش رہوں گا اور فوزیہ بھی خاموش رہے گی لیکن تم بھی خدا کو حاضر ناظر جان کے وعدہ کرو کہ بعد میں سکندر کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "وہ آپ کی بات پر ضرور ہنسے ہوں گے۔"

"ہاں۔ خبیث ہنسنے لگے مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہمیں ایسے ہی نکال لائے، بغیر ناک آؤٹ کیے۔" شیروانی صاحب نے کہا۔

"آپ نے ان سے پوچھا نہیں کہ اب کہاں لے جا رہے ہو؟ اور یہ اچانک ارادہ کیسے بدل گیا؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا۔ ایک بدمعاش کہنے لگا، ٹرٹر مت کرو۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "ہم کو باس کا حکم ہے کہ تمہیں ایس ایس پی کے گھر چھوڑ آئیں۔ ہمارا ارادہ بدل گیا تو اوپر پہنچا دیں گے۔ اللہ میاں کے گھر۔"

"انکل۔ آپ تو پہلے بھی لاہور آ چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب ڈرائیور نے راستہ بدلا تو آپ نے نوٹ نہیں کیا؟"

"بھئی۔۔۔ پہلے تو وہ سیدھے راستے پر چلتا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے گڑھی شاہو کی طرف۔" شیروانی صاحب نے کہا۔ "پھر میں اور فوزیہ باتیں کرنے لگے۔ محسن کی طرف سے ہمیں تشویش تو تھی اور ہماری سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو۔ یہاں تمہارے حالات ہی ایسے ہیں۔ بس اسی میں چند منٹ گزر گئے۔ پھر جب میں نے دیکھا تو کار ایک خاصی ویران سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ شالیمار باغ والی سڑک تھی غالباً۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ یہ کدھر جا رہے ہو تو اس نے ریوالور نکال لیا اور بولا ٹرٹر مت کرو۔ گاڑی کے شیشے اندر سے نہیں کھولے جا سکتے تھے۔ یہ احساس ہمیں بہت بعد میں ہوا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی ہے اس لیے شیشے بند ہیں۔ ویسے بھی کار کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ ہم چھلانگ مارتے تو یہ خودکشی کے مترادف ہوتا۔"

"وہ۔ انکل اور فوزیہ کو اسی کوٹھی میں لے گئے تھے جو نواب خسرو جمشید نے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے رضوی صاحب کو مطلع کیا۔ "اور وہاں ان کی پوری کمپنی موجود تھی۔" رابعہ اور فوزیہ چائے لے کر اندر آئیں اور خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

"پوری کمپنی سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم سب کو پہچانتے ہو؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی۔ ایک تو وہی تھا ان کا سرغنہ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرغنہ وہ بھی نہیں اور اس کا انکشاف بھی آج ہی ہوا ہے۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ سارے گروہ کی کمان چوہدری فلاور کے ہاتھ میں ہے۔ پھر مُندری والا تھا جس نے میرے یقین کے مطابق میر شرافت علی کو قتل کیا تھا، وہ شخص تھا جو خود کو نواب خسرو جمشید کہتا ہے اور اس کا نقشِ ثانی شوفر۔ یہ پتا چلانا بہت مشکل ہے کہ ان میں فرق کہاں ہے ـــــ وہاں ڈی سلو تھا جو بالکل خاموش تھا۔ دو افراد اور بھی تھے جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا۔ مُندری والے اور ان دونوں افراد نے منہ پر سیاہی مل رکھی تھی اور ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میر شرافت علی کا قاتل تو مُندریوں کی وجہ سے پہچانا گیا۔ باقی دو میں سے ایک شاید وہ ڈرائیور ہوگا جو انکل شیروانی کو اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ ان تینوں کی حیثیت حکم کے غلام کی سی تھی۔"

"گویا سات آدمی تھے۔" رضوی صاحب نے غور کر کے کہا۔ "اور سرغنہ تمہارے خیال میں کون تھا؟"

"سرغنہ۔۔" میں نے قدرے تامل کے ساتھ کہا۔ "آپ کو سُن کر حیرانی بھی ہوگی اور افسوس بھی ہوگا۔ سرغنہ کوئی بدمعاش نہیں، ایک پولیس افسر ہے۔"

رابعہ نے سب کو چائے کی پیالی تھمائی۔

"ڈی ایس پی؟" رضوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا نام ہے اس کا اور تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ پولیس افسر ہے؟"

فوزیہ نے مجھے ایک تنگ میں بلیک کافی بنا کے دی اور دوسرا تنگ شہلا کو پلانے لگی۔

"اس کا نام سراج ہے۔" میں نے کہا۔ "سراج دین یا سراج الدّین یہ میں نہیں جانتا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے وہ اسے سراج ہی کہہ رہے تھے اور اس کے سامنے بہت باادب، باملاحظہ ہوشیار نظر آتے تھے۔ تمام باتیں خود سراج نے کی تھیں اور وہی سب کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے اطوار میں بھی ایک شاہانہ وقار و دبدبہ اور تمکنت کا انداز تھا، جو ممکن ہے اداکاری ہو مگر انہوں نے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ پولیس افسر ہے۔"

"سراج؟" رضوی صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ وردی میں تھا؟"

"نہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ سراج واقعی پولیس افسر ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات یاد ہے۔ جس رات مجھے چند گھنٹے حوالات میں گزارنے پڑے تھے تو مُندری والا وہاں آیا تھا اور ایس ایچ او میر محمد سے مل کر نکل گیا تھا لیکن میں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا کیونکہ لندن سے واپسی پر وہی مجھے ٹیکسی میں چراغ دین کی کوٹھی تک لایا تھا۔ وہی قتل کی شب میر شرافت علی کی کوٹھی کے باہر مجھے دوبارہ ملا تھا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ جب میں قتل کے الزام میں حوالات میں بند تھا تو مجھے اس کی ایک جھلک دکھائی دی تھی اور میں نے بہت چیخ و پکار مچائی تھی کہ اسے پکڑو لیکن میر محمد نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ اس سے کوئی مُندری والا مل کر گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا پیغام لایا تھا اور کیا دیکھنے آیا تھا۔ میرے اصرار پر میر محمد نے مجھ پر تشدد کیا اور صاف کہا کہ اعترافِ جرم تو مجھے کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ڈی ایس پی صاحب یہ چاہتے ہیں۔ پہلے اس نے اے ایس پی کہا تھا اور ہو سکتا ہے عمداً ڈی ایس پی کو اے ایس پی کہا ہو یا اس وقت سراج اے ایس پی ہی ہو۔ اس کی ترقی بعد میں ہوئی ہو۔"

"یہ میں معلوم کر لوں گا۔" رضوی صاحب نے سر ہلا کے کہا اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

"مقصد مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ اس معاملے میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کے احکامات کیا ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے لیے ترابی کی کوئی صورت نہیں۔ بعد میں ایک اور واقعہ پیش آیا تھا آپ کو یاد ہوگا کہ جس دن رابعہ کی والدہ کا انتقال ہوا تھا اس رات ہمارے قبضے میں دشمن کا ایک آدمی تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے یاد ہے، تم نے اور محسن نے جو کارنامہ انجام دیا تھا۔" رضوی صاحب نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "اسی حماقت کے باعث رابعہ کا گھر بھی تباہ ہوا تھا اور جنازے میں شریک ہونے والے چند افراد کی گاڑیاں بھی تباہ ہوئی تھیں۔ اخبارات نے ایک اسکینڈل کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا نام نہیں آیا ورنہ ملوث تو تم نے مجھے بھی کر لیا تھا، بلاوجہ۔ میں نے بڑی مشکل سے نوکری بچائی تھی اپنی۔ کیا ملا تھا تمہیں اس سے؟" وہ غصے میں آنے لگے تھے۔

"میں اپنی حماقت کا اعتراف کرتا ہوں انکل!" میں نے نظر جھکا کر کہا۔ "اور ان تمام نقصانات کی ذمے داری بھی قبول کرتا ہوں جو میرے اور محسن کے غلط اقدام کا نتیجہ تھے لیکن ہمیں اس شخص سے ایک کام کی بات معلوم ہو گئی تھی۔"

"وہ تو۔۔ شاید کچھ بتائے بغیر ہی مر گیا تھا۔"

"نہیں انکل! ہم نے کچھ غلط بیانی بھی کی تھی آپ سے۔" میں نے خفت سے کہا۔ "مرنے سے پہلے اس نے ایک نام لیا تھا، سراج۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ میری سمجھ میں یہی آیا تھا مگر مجھے شبہ تھا کہ اس نے راج کہا ہے یا سروج کہا ہے۔ سروج تو ہو نہیں سکتا تھا اور خراج بھی مشکل تھا۔ راج گڑھ یہاں کے ایک علاقے کا نام ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا تھا کہ اسے مارنے والا کون ہے؟"

"اس نے ایک لفظ اور بھی بولا تھا، کرامت۔" محسن نے مجھے یاد دلانے کے لیے لب کھولے۔

"ہاں۔ اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ راج گڑھ میں ایک کرامت اسٹریٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو مسلم پارک سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے دوسری گلی سیدھی چوبرجی پر جا نکلتی ہے۔"

"تو گویا تمہارے خیال میں یہ ڈی ایس پی سراج وہیں رہتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "راج گڑھ کی کرامت اسٹریٹ میں؟ اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے؟"

"جی۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مرنے والا کیا بتانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ ڈی ایس پی سراج وہاں رہتا ہے یا وہاں ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس گلی میں تو پچاس سے زائد مکان ہوں گے اور وہاں عام قسم کے شریف لوگ رہتے ہیں۔ پرانی آبادی ہے۔ بیشتر غریب اور نچلے طبقے پر مشتمل۔ ان جیسے بدمعاشوں کو جن کے پاس لاکھوں ہوں اور ناجائز ذرائع سے آمدنی کے دس ذرائع ہوں، وہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ماڈل ٹاؤن، گلبرگ اور سمن آباد میں ان کے ہیڈ کوارٹرز ہو سکتے ہیں۔"

رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ لوگ گمنام علاقوں کو بھی اس لیے منتخب کر لیتے ہیں کہ سیدھے سادے لوگ کچھ نہیں سمجھتے اور وہاں ان کی موجودگی کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا۔ خیر، یہ مسئلہ اتنا اہم نہیں۔ کرامت اسٹریٹ کے دونوں کناروں پر سادہ کپڑوں میں پولیس کو پوسٹ کیا جا سکتا ہے اور ـــــــ سراج کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اس کا اصل نام ہو۔ تم اس کو دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟"

"بالکل پہچان لوں گا۔" میں نے یقینِ کامل کے ساتھ کہا۔ "وہ تقریباً چھ فٹ قد کا آدمی ہے۔ وزن شاید ڈیڑھ سو پونڈ کے لگ بھگ ہوگا چنانچہ جسم متناسب اور مضبوط لگتا ہے۔ پیچھے کی طرف بال بناتا ہے۔ بالوں کا رنگ بالکل سیاہ نہیں ہے بلکہ شنی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں ہلکا سا بھورا رنگ جھلکتا ہے۔ آنکھیں بھی ہلکی سی سبز جھلک دیتی ہیں اور آپ اسے شاعری نہ سمجھیں تو کہوں کہ بالکل کسی گہری جھیل کی طرح ساکت نظر آتی ہیں۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ رک رک کر ایک ایک لفظ صاف ادا کرتا ہے۔ لہجہ مدھم رکھتا ہے اور عادتاً سر کے بالوں کو ہاتھ پھیر کر جمانے کی غیرارادی حرکت میں مصروف رہتا ہے۔ چہرہ کچھ لمبوترا اور ناک قدرے ستواں۔۔۔"

"اتنا کافی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بعد میں نوٹ کرا دینا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا؟"

"وہی جو اُن کے پیغام میں تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ انہوں نے کسی کہانی کا ایک صفحہ پیغام کا مفہوم واضح کرنے کے لیے کس طرح استعمال کیا تھا لیکن تین سو فیصد ان کے پلان کے مطابق نہیں تھا۔ مجھے باہر کوئی سلیٹی رنگ کی کار نہیں ملی۔ میں ابھی مشکل سے پچاس قدم گیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک سفید کار نے میرے قریب آکے بریک لگائے اور اس کی ٹکر سے میں گر گیا۔ وہ مجھے کار میں ڈال کے لے گئے اور راستے میں ریوالور کا بٹ مار کے بیہوش کر دیا۔ کار کے اندر شیشوں پر بھی سیاہ پینٹ تھا یا سیاہ کاغذ چپکا دیا گیا تھا مگر میں نے اس کوٹھی کو اندر سے دیکھا تو پہچان لیا۔"

"اور وہاں ان سے کیا بات ہوئی؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمہیں لے جانے کا مقصد کچھ تو ہوگا؟"

"انہوں نے پرانے مطالبے دُہرائے۔ یعنی میں کاروبار سے اور حقِ وراثت سے دستبردار ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اپنی سابقہ پیش کش کا اعادہ کیا لیکن تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ۔ اب وہ مجھے ایک مالک کی حیثیت دینے پر تیار ہیں۔ میرے نقصانات کی تلافی پر بھی آمادہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب اس شرط پر کہ میں صرف منافعے سے سروکار رکھوں۔ کاروبار کی نوعیت سے نہیں دخل در معقولات نہ کروں اور ایک طرح سے 'سلیپنگ پارٹنر' رہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ مجھے اپنا سب کچھ دینا منظور ہے۔ بدلے میں مجھے صرف میرا باپ دلا دیا جائے۔ اس کے بعد مذاکرات کی گنجائش ہی نہ رہی۔ میں خاموش ہو گیا۔"

"اور انہوں نے پہلے شیروانی صاحب اور فوزیہ کو چھوڑ دیا پھر تمہیں گھر لوٹ جانے کی اجازت دے دی؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"نہیں۔ ایسے تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں موقعے کی تاک میں تھا اور قدرت کو مجھے بچانا منظور تھا۔ اچانک سراج میرے قابو میں آ گیا۔ وہ گولی مارتے تو اس کو لگتی۔ اس کے باوجود وہ اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً مجھے ان پر انہی کے حربے آزمانے پڑے۔"

"کیا؟ تم نے سراج کو۔۔۔ مار دیا؟" شیروانی صاحب نے پریشان ہو کے کہا۔

"نہیں انکل! میں نے ان کو نوٹس دیا کہ آپ کو بخیر و عافیت گھر پہنچا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "سراج کی ایک کلائی پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی، مزاحمت کرتے ہوئے۔ میں نے ان کو تھوڑی سی مہلت دی اور وہ انکل کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، دوسری کلائی ٹوٹنے کے بعد۔ اس کے بعد خود میرے نکلنے کا مسئلہ تھا۔ میں نے سراج کو ڈھال بنائے رکھا۔ اس کے ہاتھ تو بیکار ہو ہی چکے تھے۔ میں اس کی آڑ میں دروازے کی طرف بڑھا تو ان کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے تھے مگر میں نے کہا کہ ہاتھوں کی ہڈیاں تو جُڑ جائیں گی لیکن کوئی آگے بڑھا تو سراج صاحب کی دونوں ٹانگیں اور ضروری ہوا تو گردن بھی توڑ دوں گا——

وہ بے بس ہو گئے اور میں سراج کو سامنے رکھ کے الٹا چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ پچاس قدم بعد میں نے اسے دھکا دیا اور بھاگ لیا۔"

"شہلا کی ماں کے بارے میں؟" رضوی صاحب نے کچھ دیر بعد کہا اور شہلا کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کی گفتگو سے۔" میں نے اپنے جھوٹ کو پوری طرح نبھاتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ محض تمہیں خوفزدہ کر رہے ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے، لیکن مجھے امید کم ہے۔" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے شہلا کی ماں کو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "دیکھا تو نہیں۔۔۔ میں دیکھ بھی کیسے سکتا تھا؟"

یہ بات سچ تھی مگر سچ کے دو مفہوم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو میرے ذہن میں تھا، دوسرا وہ جو دوسروں نے سمجھا۔ "پھر تو امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ ایک بوڑھی اور اپاہج عورت کو بخش دیں۔" رضوی صاحب نے جملے کے آخری الفاظ بدل دیے۔ "قتل نہ کریں" کی بجائے انہوں نے "بخش دیں" کہہ دیا۔

"نہیں انکل!" میں نے مناسب سمجھا کہ شہلا کو جھوٹی امید دلانے کے کرب میں نہ رکھوں۔ "وہ جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ابھی تمہیں براہِ راست نقصان نہیں ہوا ہے۔ ہمارا اس عورت سے کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا جسے ہم نے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ ہم اس کے بوجھ کو کہاں اٹھائے پھرتے لیکن آئندہ ہم اسے اٹھائیں گے جو تمہیں زیادہ عزیز ہوگا۔ پھر اس کو جو عزیز تر ہوگا اور اس کے بعد عزیز ترین کو۔ کس کی قیمت تمہارے نزدیک کتنی ہے یہ ہم جانتے ہیں اور تم بھی جانتے ہو۔ دیکھتے ہیں تم میں دوسروں کی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ کتنا ہے۔ نفع نقصان کا حساب تم خود لگا لینا۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا انکل کہ میری اپنی جان کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے مار کے بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا لیکن کسی اور کی جان کی قیمت تم کو بھی برابر ادا کرنی پڑے گی اگر میں اکیلا نہیں ہوں تو تم بھی اکیلے نہیں ہو اور رشتے اگر میرے لیے اہم ہیں تو تمہارے لیے بھی ہوں گے۔ تم ان کی تقدیس کو مجروح کرو گے تو یہ مت سمجھنا کہ میں بدلہ نہیں لوں گا اور معاملہ یومِ حساب کے آنے تک ٹل جائے گا۔ یہ حساب یہیں بے باق ہوگا، مساوی طور پر۔" میرا خیال ہے مشتعل ہونے کی وجہ سے میری آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔

"اچھا اچھا۔ اب یہ بات چھوڑو، میرا خیال ہے تمہیں آج آرام کی ضرورت ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"لیکن مجھے آج عدالت میں حاضر ہونا ہے۔" میں نے کہا۔ "شیدے اور عبدل کے قتل کے بعد وکیلِ سرکار میری ضمانت کی منسوخی کی درخواست کرے گا۔"

"آئی سی۔" رضوی صاحب نے متفکر ہو کے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کیا ضمانت منسوخ ہو جائے گی؟"

"مجھے امکانات تو نظر نہیں آتے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں نے منظر صاحب سے بھی بات کی تھی۔ سب انسپکٹر شیخ کا بیان اور محرّر کی تحریر میں اُس بیان کی نقل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر محرّر بھی انسپکٹر شیخ کے بیان کی تائید کر دے تو نہ صرف یہ کہ ضمانت کی منسوخی کا جواز نہیں رہتا بلکہ بعد میں استغاثہ کے گواہوں کی عدم موجودگی میں میر شرافت علی کے قتل کا کیس بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔"

"محرّر ضرور تائیدی بیان دے گا۔" رضوی صاحب نے بڑے یقین سے کہا۔ "اسے میر محمد کا ڈر ہے نا؟ میں اسے اپنے پاس بلوا لیتا ہوں۔ فی الحال عارضی طور پر۔ بعد میں اسے ہیڈ کوارٹر ہی میں رکھ لوں گا یا جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھے گا بھجوا دوں گا یا پھر میر محمد کو کسی دور افتادہ قصبے میں پوسٹ کرا دوں گا۔"

"لیکن انکل! خطرہ تو پھر بھی رہے گا۔" میں نے کہا۔ "میر محمد کی پشت پر وہ سراج ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کر سکتا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میر محمد کو اس کی پشت پناہی مہنگی پڑے گی۔ یہ میں میر محمد کو سمجھا دوں گا ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں، وہاں سے فون کر کے پوچھ لوں گا کہ عدالت میں پیشی کا وقت کیا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت وہاں میر بھی ہوگا اور وہ محرّر بھی۔ تم نگاہ رکھنا کہ کہیں آس پاس سادے کپڑوں میں دوسرے لوگ بھی ہیں یا نہیں اور اگر —— سراج نظر آ جائے تو مجھے اشارہ کر دینا۔ ایک ٹیم کو میں وہاں بھیج رہا ہوں جہاں گزشتہ شب تمہیں لے جایا گیا تھا ویسے تو وہ رابعہ کا اپنا مکان ہے مگر میں معاملے کو الجھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ رپورٹ دوں گا کہ کچھ دشمن مجرم میری ایک عزیز خاتون کو اغوا کر کے یہاں لائے تھے اور انہوں نے فون کر کے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ ایک لاکھ لے کر وہ اسے رہا کر دیں گے ورنہ اسے قتل کر دیں گے۔ میرے پاس ایک لاکھ نہیں تھے چنانچہ میں بات کرنے گیا تھا مگر مجھے وہاں کوئی بھی نہیں ملا۔ شیروانی صاحب کا اور فوزیہ کا نام اس کیس میں بالکل نہیں آنا چاہیے اور میرا خیال ہے آپ دونوں کچھ دیر بعد واپس پنڈی چلے جائیں۔ میرا ڈرائیور میری کار میں آپ کو لے جائے گا۔ آپ محسن کی والدہ کو تسلی دیجیے گا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ نہ ہو وہ بھی یہاں آ جائیں اور ہاں محسن! تم نے شیخ کے سامنے کسی استاد ٹیڈی کا ذکر کیا تھا؟"

"میں اسے لے کر عدالت پہنچ جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ صفائی کا سب سے اہم گواہ بنے گا۔ بس وہ مل جائے۔"

"یہ صورتِ حال اب میرے لیے بھی باعثِ تشویش ہو گئی ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور خطرناک بھی۔ مجرموں کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی تک میں نے پوری کوشش کی ہے کہ غیر جانبدار رہوں اور انصاف کے عمل میں دخل اندازی نہ کروں لیکن مجرم اسی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہر غیر قانونی کام کرنے کے باوجود قانون کی گرفت میں نہیں آتے اور ہر جگہ اپنی بے گناہی ثابت کر دیتے ہیں۔ میں اس لاقانونیت کو کب تک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا رہوں گا۔ اگر آج انہوں نے تمہیں اور فوزیہ کو اٹھوا لیا ہے —— تو کل کو وہ میرے گھر سے کسی کو بھی اٹھا کے لے جا سکتے ہیں۔ میرے بیوی بچوں کو۔ شہلا یا رابعہ کو۔ اور پھر گواہ لا سکتے ہیں کہ وہ تو سیکڑوں میل دور کراچی میں یا پشاور میں کسی کی شادی یا موت میں گئے ہوئے تھے۔ اس جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنا ناممکن ہوگا لیکن میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا۔ یہ لوگ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنے قانونی اختیارات سے تجاوز کر کے ان کے دماغ درست کرنے کا انتظام کروں۔ بس میری اصول پرست فطرت آڑے آتی ہے۔ خیر آئندہ کی فکر ابھی سے کیا کرنی۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے شیروانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ "گھبرانا نہیں۔" انہوں نے شیروانی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "خدا نے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن احتیاط لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو اپنی رہائش بدل دو۔ کچھ عرصے کے لیے چھٹی لے کر یہاں آ جاؤ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے سروس میں بہت کم چھٹی کی ہے۔ بہت چھٹی جمع ہو گی تمہارے حساب میں؟"

"چھٹی تو ہے۔" شیروانی صاحب نے کہا "لیکن رضوی! جو تم کہہ رہے ہو وہ ناقابلِ عمل ہے۔ گھر بدلنے سے حالات تو نہیں بدلیں گے۔ پتا چلانے والے ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ پھر چھٹی لے کر میں یہاں کیسے آ جاؤں؟ دو مہینے میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

رضوی صاحب کا ہاتھ ان کے کندھے پر ہی رک گیا۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے جہاں ایک نئے دن کی دھوپ پھیل چکی تھی۔ محسن کی ماں کو ڈاکٹروں نے جینے کی جتنی مہلت دی تھی اس میں ایک اور دن کم ہو گیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ اتنا بوجھل ہو گیا کہ میرا سانس رکنے لگا۔ میرے لیے فوزیہ سے نظریں ملانا ناممکن ہو گیا۔ قصوروار اگر میرے حالات تھے تو میں بھی تھا۔ وقت نے مجھے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں مجھے اپنی قوتِ فیصلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے رابعہ اور فوزیہ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ فوزیہ سے میری دلی وابستگی ماضی کے حالات کا تقاضا تھی جب تک میں رابعہ سے نہیں ملا تھا اس کے لیے میرے جذبات بھی وہی تھے جو فوزیہ کے دل میں میرے لیے تھے لیکن رابعہ بہت مظلوم تھی۔ تنہا تھی اور میرے لیے تباہ ہو گئی تھی پھر عقل کے تقاضے دلی جذبات پر غالب آ گئے تھے اور میں نے فوزیہ کے خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ یا کم از کم اس کی ناکام کوشش ضرور کی تھی۔ فوزیہ اب تک دل کے نہاں خانے میں ماضی کی ہر یاد کے ساتھ جلوہ فگن تھی مگر مستقبل کے خوابوں میں اس کی جگہ رابعہ نے لے لی تھی۔ اس مسئلے پر میں نے بہت سوچا تھا لیکن یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کبھی ختم نہیں ہو سکتے تھے اور یہ حقیقت اپنا وجود خود تسلیم کرا لیتی تھی کہ رابعہ کا پلہ بھاری ہے۔ اپنے تجزیے کے مطابق فوزیہ کی اور میری محبت خلوصِ نیت پر مبنی ہونے کے باوجود ماحول کی پروردہ تھی۔ ہم بچپن سے قریب تھے اور عام خیال یہی تھا کہ باقاعدہ منسوب نہ ہونے پر بھی ہم بالآخر ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ رابعہ کا عشق عملی اور عقلی بنیادوں پر استوار تھا۔ بے شک اس کی جذباتی جڑیں بھی بچپن کے وقت کی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔ جب ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن دوبارہ رابعہ سے ملاقات کے وقت اس دور کی کوئی یاد میرے دامن میں نہ تھی۔ پھر دیکھتے دیکھتے حالات نے میرے خیالات کو بدل دیا اور رابعہ میرے لیے ناگزیر ہوتی گئی۔ مجھ پر اس کا قرض بڑھتا گیا اور میں ہر طرف سے محصور ہو گیا۔ ایک خیال ہمدردی و غم گساری کا تھا کیونکہ رابعہ ایک بار شادی کے بعد رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی اور المیہ یہ تھا کہ اس کا نام نہاد شوہر بھی زندہ تھا پھر رابعہ نے میری بھرپور مدد کی اور میرے جذبات میں احسان مندی کا خیال بھی شامل ہو گیا۔ رابعہ کی ماں کی موت اور اس کے گھر کی تباہی کے بعد احساسِ جرم نے مجھے رابعہ کا سہارا بننے پر مجبور کر دیا اور جب میں نے دیکھا کہ میری وجہ سے ہونے والے نقصانات کے باوجود رابعہ کے جذبات، اس کے خلوص اور اس کے عزمِ رفاقت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو بلاشبہ میں اس کی محبت کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں فوزیہ ایک عام لڑکی رہ گئی۔ ظاہری حسن کی کشش میں رابعہ بھی کم نہ تھی مگر فوزیہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی جو رابعہ نے میرے لیے کیا۔ آہستہ آہستہ میرا یہ یقین پختہ اور ناقابلِ شکست ہو گیا کہ زندگی کے پُرخطر، حوصلہ آزما اور دشوار سفر میں صرف رابعہ ہی میرا ساتھ دینے کی اہل ہے۔ فوزیہ کو صدمہ یقیناً ہو گا اور اس نے جذباتی بحران کے ایک لمحے میں اپنی جان سے کھیلنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بحران گزر چکا تھا اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ فوزیہ کا ردِعمل منفی ہونے لگا ہے۔ وہ مجھے ایک کمینہ، خود غرض، مغرب کی تعلیم سے بگڑا ہوا، دولت کے حصول کی خاطر رابعہ سے رشتہ جوڑ لینے والا طوطا چشم قسم کا جھوٹا عاشق سمجھنے لگی تھی جو میرے لیے دکھ کی نہیں بڑے اطمینان کی بات تھی۔ اب وہ ماں کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے پروفیسر ایاز کو قبول کرے گی تو اسے مجھ سے بے وفائی کا خیال ضمیر کی خلش بن کے پریشان نہیں کرے گا اور وہ ایاز کے ساتھ خوش بھی رہ سکے گی جو بہرحال ایک شریف آدمی تھا۔

ٹیڑھا مسئلہ محسن کا تھا۔ اگر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دو ماہ کے عرصے میں ماں نے یہ چاہا کہ بیٹی کو رخصت کرنے سے پہلے بہو کو گھر میں لے آئے تو کیا محسن اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرا ساتھ چھوڑ کے چلا جائے گا؟ معلوم نہیں میں کب تک اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا مگر محسن نے شانہ پکڑ کے مجھے ہلایا۔ "سات بجے ہیں گیانی مہاراج!" وہ بولا۔ "نو بجے آپ کو عدالت پہنچنا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ "باقی لوگ کہاں گئے؟"

"انکل رضوی گئے اپنے آفس۔ شہلا کو فوزیہ اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔"

"کہاں؟ اسلام آباد؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ اور ڈیڈی نے کہا ہے کہ اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ فی الحال شہلا کو اس ماحول سے نکل جانا چاہیے۔ وہ اکیلی بھی نہیں رہ سکتی اور رضوی صاحب کے لیے ہم تین ہی بہت ہیں۔" محسن ہنسا۔ "وہ لوگ ناشتہ کر رہے ہیں۔"

"محسن! ابھی سب کے سامنے جو کچھ میں نے کہا، سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "تفصیل میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی یہ سن لے کہ ڈی سلوا مارا جا چکا ہے۔"

"کیسے؟" محسن نے کچھ دیر بعد کہا جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سیریس ہوں۔ "تو نے...؟"

"نہیں، کار کے حادثے میں۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھے لے کر واپس جا رہا تھا کہ میں نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی اور کار بے قابو ہو کے درخت سے ٹکرا گئی۔ رفتار بہت زیادہ تھی، وہ وہیں مر گیا۔ اسی کار کی ڈکی میں شہلا کی ماں تھی جب سے دشمن اس کو اغوا کر کے لے گئے تھے، وہ اسی میں بند تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اوّل تو وہ پہلے ہی مر چکی ہو گی اور اگر زندہ ہوئی تو حادثے کے بعد اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا تو نے ڈکی کھول کے نہیں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی... اور... مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تجھے معلوم کیسے ہوا کہ شہلا کی ماں ڈکی میں بند ہے؟" محسن بولا۔

"مجھے ڈی سلوا نے بتایا تھا لیکن اُس وقت موقع نہیں تھا۔ موقع ملنے سے پہلے ہی حادثہ پیش آ گیا۔" میں نے کہا۔

"اور یہ حادثہ کہاں ہوا؟" محسن نے کہا۔

"نہر والی سڑک پر۔ تقریباً موڑ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "اسی شکستہ مرقد کے سامنے جہاں سے نوما پخو کی لاش ملی تھی۔"

"یہ بات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "ابھی کچھ دیر بعد انکل رضوی کو بھی خبر مل ہی جائے گی۔ پولیس تو اب تک پہنچ چکی ہو گی۔ انکل رضوی رپورٹ کریں گے کہ ان کی ایک خاتون عزیز کو گزشتہ شب اغوا کر لیا گیا تھا تو نام حلیہ اور عمر وغیرہ بھی لکھوائیں گے اور معاملہ چونکہ ایس ایس پی کا ہے اس لیے اطلاع دی جائے گی کہ مطلوبہ حلیے کی خاتون فلاں جگہ کار کی ڈکی میں سے ملی ہیں۔ پھر ڈی سلوا کی شناخت بھی ہو ہی جائے گی۔"

"اس سے میرا بیان غلط نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ثابت ہو گا کہ اغوا کرنے والا ڈی سلوا تھا۔ حادثہ کیسے پیش آیا، پولیس اپنی تفتیش سے جو نتیجہ چاہے اخذ کرے۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں کس طرح نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس میں کوئی بات غلط نہیں لیکن اس کے باوجود میں نے ڈی سلوا کو گن پوائنٹ پر گاڑی لے کر چلنے کو کہا تھا۔ اس نے شہلا کی ماں کے بارے میں بتا کے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی چال میں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب ہم سے خوفزدہ ہے لیکن میں ڈکی کھولنے اترا تو اس نے گاڑی چلا دی اور واپس جانے لگا۔ میں بونٹ پر چڑھ گیا اور ونڈ اسکرین توڑ کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی میں حادثہ ہو گیا۔ میں خواہ مخواہ کے قانونی چکروں سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ اب ڈی سلوا کی موت کے کیس میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ شہلا کو میں نے اتنا تو بتا دیا ہے کہ اس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ اس خبر کے صدمے کو برداشت کر لینے کے بعد لاش دیکھ کر بھی پاگل نہیں ہو گی اور ظاہر ہے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش یہیں آئے گی۔"

"پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے کہ شہلا اسی وقت ڈیڈی اور فوزیہ کے ساتھ نکل جائے۔" محسن بولا۔ "ہم بعد میں اسے اطلاع دے دیں گے کہ لاش مل گئی تھی اور ہم نے تدفین کر دی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھے گی۔"

"محسن!" میں نے کہا۔ "فوزیہ کے بارے میں تیری ممی نے کیا طے کیا ہے؟"

"اس کی شادی آئندہ ماہ پروفیسر ایاز سے ہو رہی ہے۔" محسن نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اچھا آدمی ہے، فوزیہ خوش رہے گی۔"

"تجھے کوئی دکھ نہیں۔ کوئی گلہ نہیں مجھ سے... کہ میں نے...؟" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

"نہیں سکندر! یہ حالات کا قصور ہے تیرا نہیں۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "فرض کرو تمہاری زندگی بعد میں ویسی نہ گزرتی جیسی کہ تم نے سوچا تھا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے والی بات ہوتی تو کیا فائدہ ہوتا۔ کون جانے انجام کتنی تلخی پر ہوتا اور اس سے ہماری دوستی بھی متاثر ہوتی۔ اچھا ہوا ابھی بات صاف ہو گئی۔ خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ تیری جگہ چراغ دین لیتا تو بڑی خرابی ہوتی۔ مجھے اس ذلیل کو قتل کرنا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پڑتا اور فوزیہ کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی۔"

"انکل شیروانی نے ابھی دو ماہ کی بات کی تھی۔" میں نے بڑی مشکل سے الفاظ کو مربوط کیا۔" فرض کرو اسی عرصے میں تیری ممی نے تجھے بھی بلا لیا اور پہلے بہو لانے کا سوچا؟"

"تو میں مخالفت نہیں کروں گا۔" محسن نے کہا۔" رشتہ تو تقریباً طے ہی ہے۔ نکاح کی رسمی کارروائی باقی ہے۔ اس کے لیے میں نے ممی سے بات کر لی تھی کہ اچھا ہو یا بُرا، میں آپ کے انتخاب کو قبول کرتا ہوں لیکن نکاح بالکل سادگی سے ہوگا۔ رسمیں وغیرہ بالکل نہیں ہوں گی۔ دھوم دھام قطعی نہیں۔ میں صرف دو دن کے لیے جاؤں گا۔ ایک دن نکاح کا دوسرا ولیمے کا۔ تیسرے دن لوٹ آؤں گا۔"

"اور تیری ممی۔۔۔ وہ اجازت دیں گی کہ تو نئی نویلی دلھن کو چھوڑ کر بھاگ جائے؟"

"وہ چکر میں نے الگ چلا دیا ہے۔ ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بھی اس بات کو سمجھ لیں۔ میں دوست کا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتا اور اُس ماں کو بھی ناخوش نہیں کر سکتا جس کی زندگی چراغِ سحری ہے۔" محسن بولا۔" چنانچہ میں جھوٹ بولوں گا کہ میں نے لاہور میں کام شروع کیا ہے اور اس مرحلے پر دو دن بھی میرے مستقبل کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے کنسٹرکشن کا ایک کنٹریکٹ ملا ہے جسے فوراً سائن کرنا ضروری ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ساتھ ساتھ کسی مناسب جگہ پر مکان بھی تلاش کرتا رہوں اور بعد میں بیوی کو بلواؤں۔ اس عرصے میں بیوی جہاں چاہے رہے۔ اس کے دو گھر ہیں۔ اپنے ماں باپ کا اور میرے ماں باپ کا۔"

"فوزیہ کی رخصتی کے لیے تجھے پھر جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کے لیے ڈیڈی کچھ ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ ایک برات آئے ایک جائے۔" محسن بولا۔

"تیرے ڈیڈی ابھی تک مجھ سے بدظن نہیں ہوئے۔ میں نے پہلے تو فوزیہ کو قبول نہیں کیا۔۔۔۔"

"اگر تیرے انکار سے ممی ناخوش ہوتیں تو ڈیڈی بھی تجھے معاف نہ کرتے۔" وہ بولا۔" لیکن ممی اس شادی کے شروع سے خلاف تھیں۔ تیرے انکار کے بعد ڈیڈی کو موقع مل گیا کہ انہیں اپنی خوشی کرنے دیں۔"

"انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ سکندر کے ساتھ رہ کر مصیبت میں گرفتار ہونے اور زندگی کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں۔ یہ بات وہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔" محسن نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔" وہ خود بہت وضعدار اور اصول پرست آدمی ہیں۔ انہوں نے چچا نذیر خان مرحوم سے جس طرح دوستی نبھائی وہ اس کی مثال ہے۔ وہ مجھے دوستی نبھانے سے کیسے روک سکتے ہیں؟ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر ان حالات میں میں تیرا ساتھ نہ دیتا تو ان کو افسوس ہوتا۔ اب تو وہ مطمئن ہوں گے کہ بیٹا ان سے کم نہیں رہا۔"

"تم لوگ ناشتہ بھی کرو گے یا ایک دوسرے کا سر کھاتے رہو گے۔" رابعہ نے اندر آ کے ہمیں ڈانٹا۔

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم! آپ نے ٹوکا نہ ہوتا تو سر کیا، ہم ایک دوسرے کو سالم نگل جاتے۔" محسن نے کہا۔

"لیکن محسن خان شیروانی! ہم آدم خور تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔" حوا خور ہیں۔"

"قبلہ آپ لام کو حذف کر گئے۔ غالباً آپ حلوا خور کہنا چاہتے تھے۔ عزیزہ! کیا ناشتے میں حلوا پوری ملے گا؟" محسن نے مفروضہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

"میں تو جا رہی ہوں کورٹ۔" رابعہ نے زچ ہو کے کہا۔" میں گیارہ بجے کا ٹائم لگواؤں گی۔ نہیں پہنچو گے تو ڈنر جیل میں کرو گے۔"

"اور لنچ؟" میں نے پوچھا۔" حوالات میں آج کل مینو کیا ہوتا ہے، چائنیز یا انگلش؟" مگر میری بات پوری ہونے تک وہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ مارا اور حیران ہوئے کہ ان حالات میں بھی ہم ہنسنا نہیں بھولے۔ اور خطرات حادثات اور سختی حالات کے باوجود ہنس کے فکر و غم کی گرد کو جھاڑ سکتے ہیں۔

"اب برادر۔۔۔" میں نسبتی کہتے کہتے رک گیا۔" تو جا استاد ٹیڈی کو پکڑ۔"

"کہاں سے پکڑوں؟ وہ تو شیخ کو ٹالا تھا۔" محسن نے کہا۔" مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہوگا۔"

"اس کے ٹھکانے دیکھ اور اگر وہ مل جائے تو اس کو ساری صورتِ حال سمجھا کے لے آ۔" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ دے گا وہی بیان، جو میں نے اس سے منسوب کر دیا تھا؟" محسن نے مشتبہ لہجے میں سوال کیا۔

"ٹیڈی دل کا شیر ہے اور بہت اچھا قابلِ اعتماد اور مخلص دوست بن سکتا ہے۔" میں نے کہا۔" المیہ یہی ہے کہ زمانے نے اس سے دشمنی کی اور وہ راستے سے بھٹک گیا۔ وحشی جانور کو بھی پیار سے اپنی مرضی کا تابع بنایا جا سکتا ہے۔ ٹیڈی بھی پیار سے محرومی کا شکار ہے۔ اسے کسی نے اپنایا نہیں ہے۔ ہم نے اسے عزت دی اور اس کی نیکی کو پہچانا۔ وہ شہلا کو بہن سمجھتا ہے اور ہمیں دوست۔ حالانکہ ہمارے معاشرے کے معیار پر اس میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ کم ظرف لوگوں کے لیے وہ اچھوت رہا ہے۔ معزز، تعلیم یافتہ اور شریف لوگوں میں جگہ مل جائے تو وہ بھی سُدھر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں وہ ہمارا اتنا ہی اچھا مددگار ثابت ہو سکتا ہے جتنا فوما بخو تھا، یا رابعہ ہے۔"

ہم دوسرے کمرے میں ناشتے کے لیے گئے تو اسلام آباد جانے والے تیار تھے۔ فوزیہ نے شہلا کے چند جوڑے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیے تھے۔ ان دونوں کی جسمانی ساخت ایک جیسی تھی چنانچہ شہلا اسلام آباد میں فوزیہ کے جوتے، کپڑے بھی استعمال کر سکتی تھی۔ باقی تمام چیزوں کے لیے اس نے شہلا سے کہہ دیا تھا کہ گھر میں سب کچھ ہے اور نہیں ہوگا تو آ جائے گا۔ شہلا اس عمل انتقال سے زیادہ مطمئن نظر نہیں آتی تھی مگر دونوں بزرگوں یعنی رضوی اور شیروانی صاحبان کے سامنے وہ کچھ نہ بول سکی۔ پھر رابعہ نے اور بیگم رضوی نے بھی اسے سمجھا دیا کہ پنڈی میں محسن کا گھر بھی غیر کا گھر نہیں ہے۔ شاید وہ خود بھی وقتی طور پر اس ماحول سے چھٹکارا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا آئندہ چند دن میں کیا ہوگا۔ اس نے ایک ماہ کے لیے جانا قبول کیا تھا۔ فوزیہ نے تو اسے نہیں بتایا تھا لیکن رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر فوزیہ کی رخصتی ہے اور اس کی ماں بیمار ہے چنانچہ وہ شادی کے کام میں مدد کر سکتی ہے۔ بے چاری لڑکی کے ساتھ دُہرا المیہ تھا۔ ایک تو فوزیہ کی شادی کی بات ایسے وقت میں کی گئی جب خود اس کی اپنی ماں کی موت کو ایک دن بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ لاکھ حقیقی ماں نہ سہی شہلا کا غم تو کم نہ تھا۔ پھر اسے یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ فوزیہ کے ساتھ ہی محسن کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ وہ محسن کو چاہنے لگی تھی اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ کم سے کم میں اور رابعہ اس کے جذبات کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور میرا اندازہ یہ بھی تھا کہ محسن مجبور نہ ہوتا تو شادی کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔ ناشتے کے دوران میں نے اس تمام صورتِ حال پر غور کیا اور مجھے یہ بات مناسب لگی کہ ایک ماہ بعد وہ لوٹ آتے، اس وقت تک یہاں تجہیز و تکفین کے اور قانونی کارروائی کے سارے مرحلے پورے ہو چکے ہوں گے۔ پولیس خواہ مخواہ شہلا کا بیان نہیں لے گی اور ڈی سلوا سے اس کے تعلقات کو زیرِ بحث نہیں لائے گی۔ رضوی صاحب کہہ دیں گے کہ وہ تو پنڈی میں ہے شہلا نے بھی میرے بیان پر یقین کر لیا تھا کہ اس کی ماں کو مجرموں نے راوی میں پھینک دیا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے اب تجہیز و تکفین کے امکانات ہی نہ رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ پسند نہ کرتا کہ وہ ماں کی مسخ شدہ لاش دیکھے۔ شہلا بہت رونے دھونے کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔

لیکن اس کا ایک ماہ بعد لوٹ آنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا اس وقت یہاں سے چلے جانا۔ ایک ماہ بعد اگر پروگرام کے مطابق محسن کی شادی ہو گئی تو یہ شہلا کے لیے ایک اور جذباتی سانحہ ہوگا۔ پھر فوزیہ رخصت ہو چکی ہو گی چنانچہ اسے تسلی دینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ فوزیہ کی ماں کے لیے وہ زندگی کا آخری مہینہ ہوگا اور ان کی حالت اس وقت تک یقیناً خاصی خراب ہو جائے گی۔ محسن کی بیوی اگر تیسرے دن والدین کے گھر جا بھی تو تیمارداری کے لیے صرف شہلا رہ جائے گی۔ محسن نے تو مجھے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شادی کے لیے گیا بھی تو دو دن کے لیے جائے گا اور لوٹ آئے گا۔ پھر شہلا کے لیے وہاں بھی ایک المناک موت کا نظارہ کرنے اور اپنا دکھ دنیا سے چھپائے رکھنے کا دُہرا عذاب ہوگا چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس وقت سے پہلے ہی واپس آ جائے اور یہاں ہم سب مل کر اس کو پھر زندگی کی جدوجہد میں نئی ... کے ساتھ شریک ہونے پر مجبور کر دیں۔

عین اُس وقت جب باقی لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے، میں نے شہلا کو ایک منٹ کے لیے ایک طرف بلایا۔" تمہیں معلوم ہے شہلا کہ محسن کی ماں بیمار ہے؟" میں نے کہا۔

"جی بھائی جان! رابعہ باجی نے مجھے بتایا تھا کہ فوزیہ کی شادی بھی آئندہ ماہ تک متوقع ہے۔" وہ بولی۔

"اور یہ شادی ہنگامی حالات میں اسی لیے کی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔" کیونکہ مسز شیروانی کی زندگی غیر متوقع ہے۔"

وہ میری بات پر کچھ حیران ہوئی۔" کیا بیماری لاحق ہے انہیں سکندر بھائی؟"

"انہیں سرطان ہے۔" میں نے کہا۔" یہ بات ڈاکٹروں نے بہت پہلے بتا دی تھی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ جینا ہے۔ اب انکل شیروانی نے کہا ہے کہ ان کی زندگی کے دو ماہ بھی نہیں رہے، کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے۔"

"کیا یہ بات فوزیہ کو۔۔۔ اور محسن کو معلوم ہے؟" وہ سہم کر بولی۔

"ہاں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ سوائے خود محسن کی ماں کے۔" میں نے کہا۔" لیکن میرا خیال ہے انہیں بھی معلوم ہو چکا ہے۔ حقیقت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سب ایک دوسرے کے جھوٹ کا بھرم رکھ رہے ہیں اور یہ بھرم تم کو بھی رکھنا ہے۔" میں نے الفاظ کی تلاش کے لیے سخت جدوجہد کی لیکن اچانک میرے ذہن میں خلا رہ گیا۔

"چلو بھئی۔ یہ کیا کانفرنس شروع کر دی ہے۔" باہر سے شیروانی صاحب کی آواز آئی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ایک منٹ انکل!" میں نے چلا کر کہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وقت کم ہے، تلخ حقیقت کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ "بات یہ ہے شہلا کہ محسن فوزیہ اور ان کے والد مل کر کوشش کر رہے ہیں کہ۔۔ کہ ایک شخص زندگی کے آخری ایام میں جو مانگے اسے دے دیا جائے۔ اس کی خوشی کو مقدم رکھا جائے اور اسے دنیا سے یوں رخصت کیا جائے کہ اسے اپنوں سے کوئی گلہ نہ ہو۔ ان سب نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم کر رکھا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ محسن کی شادی بھی اپنی زندگی میں ہی کرنا چاہتی ہیں۔ اس میں محسن کی پسند کا کوئی سوال نہیں۔ وہ مجبور ہے۔"

اس انکشافِ حقیقت کے ایک لمحے میں شہلا کے جذبات کا جو عکس اس کی صورت پہ نمودار ہوا اُسے الفاظ میں بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ اس نے ایک بار نظر جھکائی اور پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو مجھے وہ بالکل اجنبی لگی۔

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا آپ کو شک ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری نہیں اتروں گی؟" وہ بولی۔

"نہیں،" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا تھا کہ۔۔۔ کہ جہاں تم جا رہی ہو۔ وہاں کے بارے میں حالات کا کوئی پہلو تم سے پوشیدہ نہ رہے۔ ویسے مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔"

"اس اعتماد کا بہت بہت شکریہ بھائی جان!" شہلا نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ "شاید میں اس کی مستحق نہیں تھی مگر پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ خداحافظ!"

اس کی بات کا ہر لفظ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ محسن پہلے ہی استاد ٹیڈی کا کھوج لگانے جا چکا تھا۔ میں وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا وہ اس وقت موجود ہوتا تو شہلا کو جانے دیتا؟ غالباً کسی نے اس سے پوچھا ہی نہیں تھا اور انکل رضوی اور انکل شیروانی نے یہ فیصلہ خود ہی کر لیا تھا۔ انھیں اندازہ کہاں تھا کہ شہلا اور محسن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جذبات کی نوعیت کیا ہے۔ رابعہ کو موقع نہیں ملا تھا اور شاید اس کا خیال یہ بھی ہو کہ جب باقی لوگ جانتے ہیں تو محسن بھی جانتا ہی ہو گا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے نادانستگی میں شہلا پر ایک اور ظلم کیا ہے۔ اگر وہ یہیں رہتی اور محسن کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جاتی تو محسن اپنے طور پر اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کر دیتا اور اس سے معافی مانگ لیتا لیکن محسن کو خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اب فوزیہ کو رخصت کرتے وقت ایک امتحان میرے لیے درپیش ہو گا۔ دوسرے امتحان سے شہلا اس وقت گزرے گی جب محسن کی بارات سجے گی۔ میں اس جذباتی بحران کا سامنا کر لوں گا کیونکہ فوزیہ اس وقت تک میرے خیال کو بھی دل سے نکال دے گی اور غیر شعوری طور پر مجھ سے نفرت کا شکار ہو گی لیکن محسن دیکھے گا کہ ماں کی خوشی کے لیے اس نے اپنے جذبات کے ساتھ شہلا کے ارمانوں کو بھی پامال کر دیا ہے اور شہلا اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود ہے جہاں اس کے لیے شبِ عروسی کی مسرت کا اہتمام ہو رہا ہے اور سینے پر صبر کی سِل رکھے انگاروں کے بستر پر تنہا لیٹی ہے۔

باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر یہ آواز دور ہونے لگی اور چند سیکنڈ میں فضا کے سکوت کا ایک حصہ بن کے کھو گئی۔ انکل شیروانی نے مجھے بدتمیز سمجھا ہو گا کہ خداحافظ کہنے کے لیے دروازے سے باہر بھی نہیں آیا۔ فوزیہ نے مجھے مجرم سمجھا ہو گا جس میں اتنی ہمّت ہی نہ تھی کہ اپنا چہرہ دکھا سکے۔ شہلا نے مجھے وہ بھائی سمجھا ہو گا جس نے سہارا دے کر اسے بے سہارا کر دیا۔ بیگم رضوی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔

"یہ کیا رونی شکل بنائے کھڑے ہو؟" انھوں نے کہا۔ "کوئی تم سے ملنے آیا بیٹھا ہے۔"

"مجھ سے! اس وقت کون ملنے آ گیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"وہ جسے تم ڈبل ایس آئی شیخ کہتے ہو۔" بیگم رضوی نے کہا۔ "ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وہ تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ خلافِ معمول شیخ کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

"ملزم حاضر ہے شیخ صاحب!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "جس طرح چاہیں۔۔۔"

"آئی ایم سوری سکندر!" اس نے مصافحہ کرنے کے بعد پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "غالباً آج سماعت نہ ہو سکے گی۔ شیدے اور عبدل کے کیس کا چالان ہی پولیس نے مکمل نہیں کیا ہے۔ پھر بھی حاضری تو ضروری ہے۔"

"اور جب تک چالان پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "میری ضمانت برقرار رہے گی یا منسوخ سمجھی جائے گی؟"

"بغیر سماعت کے ضمانت کیسے منسوخ کی جا سکتی ہے۔" وہ بولا۔ "پہلے چالان پیش ہو گا۔ اس میں کہا جائے گا کہ قتل کے سلسلے میں تم پر شک ہے چنانچہ تفتیش کے لیے تمھاری ضمانت پر رہائی کے احکامات واپس لیے جائیں اور تمھیں پولیس کے حوالے کیا جائے۔ شیدے اور عبدل کے قتل کا مقدمہ دوسری عدالت میں سماعت کے لیے جائے گا۔ تمھاری ضمانت منظور کرنے والی عدالت دوسری ہے وہاں چالان کی نقل ہی نہیں پہنچے گی تو سماعت کیسے ہو گی۔"

"پھر پریشانی کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا ملزم کو حاضر کرنے کے لیے ہتھکڑی لگانے کا مسئلہ ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تم ضمانت پر ہو تو حاضر ہونا تمھاری اپنی ذمّے داری ہے۔ میرا کام عدالت کے سمن تم تک پہنچانا تھا۔" اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا۔ "یہ اپنے پاس رکھ لو اور اس پر یہاں دستخط کر دو۔ تاریخ آج کی مت ڈالنا۔ اس دن کی ڈالنا جب میں تم سے ملنے کے لیے کرشن نگر آیا تھا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سمن مجھے اسی روز دینے تھے۔" شیخ نے مطمئن ہو کے فائل پر نگاہ ڈالی۔ "لیکن میں باتوں میں بھول گیا۔ خیر اب چلو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو اس وقت کوئی سواری نہیں۔" میں نے کہا۔ "کار ابھی پنڈی گئی ہے۔ سرکاری جیپ میں رضوی صاحب آفس گئے ہیں اور اپنی فاکس ویگن میں رابعہ کورٹ جا چکی ہے۔ سڑک پر جہاں تک ٹیکسی ملے، پیدل ہی جانا ہو گا۔"

نہر کی طرف آنے کے بجائے ہم دونوں مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اگلے چوک پر رکشا یا ٹیکسی عموماً مل جاتے تھے۔

"سکندر!" شیخ نے اچانک کہا۔ "فرض کی ادائیگی خود ایک امتحان ہوتی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اب تک میں نے جانتے بوجھتے کبھی کوتاہی نہیں کی لیکن فرض شناسی کا یہ امتحان اب ایک سزا بننے لگا ہے۔"

"جو کچھ کہنا ہے، صاف الفاظ میں کھل کر کہو۔ کسی نے دھمکی دی ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مختلف اوقات میں اور مختلف طریقوں سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" وہ بولا۔ "سب سے پہلے تو اسی دن جب میں کرشن نگر میں تمھاری بہن شہلا کے مکان سے نکلا تو کچھ لوگ میرے انتظار میں تھے۔ باہر نکلتے ہی مجھے ٹیکسی نظر آ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ بات کرتے، میں روانہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک جیپ میں تعاقب کیا لیکن میری خوش قسمتی یا ان کی بدقسمتی، ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ میرے پیچھے بھی کوئی ہے اگر یہ معمولی سا حادثہ نہ پیش آتا تو وہ لوگ وہیں معاملہ طے کر لیتے۔"

"کس بات کا معاملہ؟" میں نے کہا۔

"وہ ٹیپ تو میرے پاس نہیں ہے جس پر میں نے عبدل کے مرنے سے پہلے اس کا ٹیلی فون پر موصول ہونے والا پیغام ریکارڈ کیا تھا مگر محرّر نے اپنے ہاتھ سے جو نقل بنائی تھی، وہ میرے پاس تھی اگر وہ نقل بھی نہ ہو تو خود محرّر بھی صاف انکار کر سکتا ہے کہ کیسا ٹیپ اور کیسا تحریری بیان؟ میں نے تو اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ غالباً ان لوگوں نے میر محمد کی اطلاع پر محرّر سے رابطہ قائم کیا تھا۔ محرّر بے چارے نے کہا ہو گا کہ میں اب کیا کروں، تحریر میرے ہاتھ کی ہے لیکن دوسروں کے ہاتھ پڑ چکی ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ میں یہی کر سکتا ہوں کہ شیخ صاحب پر زبردستی وہ بیان لکھوانے کا غلط الزام عائد کر دوں مگر یہ بہت کمزور مؤقف ہو گا۔ سکندر کے وکیل بہت بڑے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ایس ایس پی بھی ہے جو میری ایسی تیسی کر سکتا ہے اگر وہ تحریر محرّر کے پاس ہوتی یا تھانے میں ہوتی تو مجرم یقیناً ہر قیمت پر اسے حاصل کر لیتے۔"

"کیا اب وہ منہ مانگی قیمت دینے کی پوزیشن میں نہیں رہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، وہ تحریر کسی کی دسترس میں نہیں رہی۔" شیخ مسکرایا۔ "پہلی ناکامی کے بعد کسی نے میرے گھر فون کیا تھا اور مجھ سے صاف بات کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں کوئی بیان ہی نہ دوں اور اگر دوں تو اس میں عبدل کے ٹیلی فون کا کوئی ذکر نہ کروں۔ میں نے پوچھا کہ جناب کون ہیں، یہ مطالبہ کیوں فرما رہے ہیں اور اس کیس میں اتنی دلچسپی لینے کی وجہ کیا ہے؟ مجھے جواب ملا کہ شیخ صاحب! آپ واقعی جولاہے ہیں۔ بھائی آدمی کو آم کھانے چاہئیں یا پیڑ شمار کرنے میں وقت ضائع کرنا چاہیے۔ عقل سے کام لو۔ ہماری بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ اٹھاؤ۔ ہم بھی کے ٹو سر کرنے کا مطالبہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ خاموش رہنا بھی کوئی مشکل کام ہے اور اگر محض خاموش رہنے کے ایک لاکھ مل جائیں تو کیا حرج جائز ہے؟ میں نے کہا۔ لاکھ کے بعد ہوتا ہے کروڑ۔ اس کے بعد ارب اور کھرب، مگر ان سے پہلے ہوتا ہے اصول۔ اس کے معنی جانتے ہو؟ میرا دستور ہے کہ میرے اصول قابلِ فروخت و خرید نہیں چنانچہ اعداد و شمار کے چکر میں مت پڑو۔ اپنی دولت بچاؤ اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا۔ مجھ جولاہے کی بات ماننے میں فائدہ ہے تو فائدہ ضرور اٹھاؤ۔ پھر میں نے فون بند کر دیا لیکن اس شخص نے پھر فون کیا اور رقم بڑھا کے پانچ لاکھ تک کر دی۔ اس وقت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ میں نے کہہ دیا کہ اب میں ٹیلی فون ایکس چینج سے شکایت کر رہا ہوں اور تم نے فون کیا تو مجھے معلوم ہوجائے گا کہ تم کہاں سے بات کر رہے ہو اور ہو سکتا ہے وہاں آبزرویشن پر سب ریکارڈ ہوجائے۔ تیسری بار کسی عورت نے میرے والد سے بات کی اور ان سے کہا کہ آپ کا عاقبت نا اندیش بیٹا پانچ لاکھ کی رقم کو نہیں، ہمیں لات مار رہا ہے اور اچھا نہیں کر رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی زندگی کی قیمت کیا ہوگی؟ میرے والد پریشان تو ہوئے مگر انھوں نے کہا۔ ''بی بی! یہ کیا معمّوں میں بات کر رہی ہو، میں کچھ نہیں سمجھا۔ کیا تمھارا کوئی بیٹا ہے؟ ہے تو مجھے بھی بتا دو کہ اس کی زندگی کی مالیت تم نے سکۂ رائج الوقت میں کتنی رکھی ہے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کا کوئی مول ہی نہیں اور یہ خدا کی امانت ہے۔'' اس عورت نے کہا کہ تفصیلات اپنے بیٹے سے معلوم کر لیجیے اور فون بند کر دیا۔ غالباً وہ خوفزدہ ہوگئی کہ کہیں سچ مچ میں نے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر نہ رکھوا دیا ہو۔ میرے والد نے مجھے بلایا اور ساری بات بتائی۔ میں نے کہا کہ آپ کا جواب بہت مناسب تھا۔ وہ مجھ سے میرے ایمان کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بتائیے کتنے میں بیچوں؟ میرے والد نے کہا کہ یہ بات ہے تو جان کی فکر مت کرو۔ اس کا لینے والا بھی اُس ... کے سوا کوئی نہیں جو زندگی دیتا ہے اور اسے وقتِ مقررہ ... تک اس کی حفاظت بھی خود ہی کرتا ہے۔ لیکن ...''

''لیکن ... شیخ تم نے تو واقعی ثابت کر دیا کہ تم پولیس انسپکٹر نہیں ... ہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اس دھمکی کے باوجود فائل کو یوں ... لیے پھر رہے ہو بقولِ چچا غالب ؎

کو... جو چھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے''

... ہنسا۔ ''میں اتنا احمق نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں ... پوچھے گا تو میں چھپاؤں گا کچھ نہیں۔ فائل ان کے حوالے کر دوں گا۔''

''یہ مزید عقلمندی کی دلیل ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے پانچ لاکھ چھوڑ دیے پھر فائل تحفے میں دے دی۔''

''یہ تحفہ پا کے وہ خوش نہیں ہوں گے۔'' شیخ نے ہنس کر کہا اور فائل کھول کر مجھے دکھائی۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ فائل میں وہ سمن ضرور موجود تھا جس پر میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دستخط کیے تھے لیکن باقی فائل کی ضخامت بے مصرف صفحات پر مبنی تھی۔ درمیان میں ردّی اخبار تہہ کر کے لگا دیے گئے تھے۔

''اصل فائل کہاں گئی؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔

''اب بتاؤ، جولاہے عقلمند ہوتے ہیں یا پٹھان؟'' شیخ نے ایک ٹیکسی کو روکتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ نقلی فائل لیے پھر رہے ہو۔ خطرہ تو پھر بھی ہے۔ جو اسی نقلی فائل کو اصلی سمجھ کے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے وہ تمھیں کوئی رعایت نہیں دیں گے اور جب انھیں اپنے بے وقوف بننے کا اور اپنی ناکامی کا احساس ہوگا تو وہ مزید مشتعل ہوں گے۔'' میں بھی ٹیکسی کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''رات کو میں نے اس صورتِ حال پر ہر پہلو سے غور کر لیا تھا۔'' شیخ نے کہا۔ ''مجھے تو رات کو بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اس فائل کے لیے صبح ہونے سے پہلے ہی خریدار نہ آجائیں چنانچہ پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ فائل اپنے ساتھ والے گھر میں رکھوا دی۔ ایک لفافے میں بند کر کے اور لفافے کو بریف کیس میں مقفل کر کے۔ پھر راتوں رات میں نے یہ فائل تیار کی۔ اس کے علاوہ میں نے تھانے سے دو مسلح سپاہی بلوائے جو آگے پیچھے پہرہ دیتے رہے۔ خود میں بھی چوکس رہا اور میرا ریوالور تکیے کے نیچے موجود رہا۔ ممکن ہے کہ کوئی آیا ہو اور یہ حفاظتی انتظامات دیکھ کر لوٹ گیا ہو۔''

''اگر تم سادہ کپڑوں میں لوگوں کو چھپا دیتے تو شاید کوئی تمھارے ہاتھ لگ جاتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔'' شیخ نے کہا۔ ''لیکن میں نے دوسرے امکانات پر غور کیا۔ مثلاً یہ کہ وہ بھی مسلح ہو کے آتے اور خود کو محصور دیکھتے تو ایک خونریز جنگ کے بعد یا تو مر جاتے یا کسی کو مار دیتے۔ میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی واضح کر دینا چاہتا تھا کہ ایک پولیس افسر اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ کھلی جنگ نہیں لڑ سکتے۔ صبح میں نے والد سے کہا کہ جب میں نکل جاؤں تو آدھے گھنٹے بعد آپ پڑوس کے گھر جائیں۔ وہاں سے بریف کیس لیں اور ان سے کہیں کہ اپنی گاڑی میں آپ کو کورٹ پہنچا دیں۔ ان سے ہمارے پرانے مراسم ہیں اور ایک زمانے میں یہ پڑوسی میرے والد کا شاگرد تھا۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ کورٹ جانے کے بعد وہ بریف کیس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے حوالے کر دیں اور لوٹ آئیں۔ بار روم سے مس رابعہ قاری کا پتا چل جائے گا۔ وہ نہ ملیں تو عبدالودود منظر نام کے ایڈووکیٹ سے مل لیں اور انھیں ساری بات بتا دیں۔ پھر میں پہنچ جاؤں گا اور اگر نہ بھی پہنچا تو فائل بہرحال عدالت کی تحویل میں پہنچ جائے گی۔ ایک مرتبہ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اس محرّر کے لکھے ہوئے بیان کو پڑھ لے اور میرا بیان سن لے۔ میں گزشتہ شب ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا ذکر بھی کر دوں گا اور میرے والد بھی بیان حلفی داخل کریں

...ئے۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔''

''لیکن شیخ ۔ وہ محرّر ...''

ابھی میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے سخت کوشش کر کے ٹیکسی کو بے قابو ہونے ... الٹنے سے بچا لیا مگر اسے ایک دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے نہیں بچا سکا۔ میں اور شیخ تصادم کے بعد ایک دوسرے پر ... ے مگر فوراً سنبھل گئے۔ میرے کانوں میں ہیڈ لائٹس اور ... سامنے کے ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر بکھرنے کی آواز آئی اور ... شیشے کے ذرّے اڑ کر اندر آئے۔ مجھے ذرا سی دیر کے لیے ٹیکسی ... ڈرائیور کا لہولہان چہرہ دکھائی دیا پھر میں نے وہ جیپ دیکھی ... جس نے سائڈ روڈ سے آ کے ٹیکسی کو ٹکر ماری تھی۔ یہ پرانی جیپ ... ایسی ہی کم مضبوط نہ تھی لیکن اس کے سامنے بمپر کے اوپر لوہے کی سلاخوں سے بنی ہوئی جالی لگا دی گئی تھی۔ بظاہر اس کا مقصد ... صرف ہیڈ لائٹس یا جیپ کے سامنے والے حصے کی حفاظت کے ... اضافی انتظام کے سوا کچھ نہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ لوہے کی سلاخیں سامنے کی طرف موڑ دی گئی ہیں اور ان کا اگلا حصّہ نوکیلا ... ہے۔ جیپ کی چوڑائی کے رخ پر ایک ایک فٹ لمبے بھالے سے ... لگے ہوئے تھے کہ جیپ دیوار سے ٹکراتی تو دیوار میں پیوست ... ہو جاتے۔ انھوں نے ڈرائیور کی سائڈ سے ٹکر ماری تھی — شاید اُن کا نشانہ پیچھے والا دروازہ ہوگا لیکن ذرا سے فرق ... کے باعث سلاخیں ڈرائیور کی سائڈ والے حصّے میں، انجن کے ... بونٹ میں اور ایک ٹائر میں گھس گئیں۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی ... ٹیکسی سامنے سے تھوڑا سا جھک گئی اور ڈرائیور کی سائڈ کا دروازہ ... اندر گھس گیا تھا۔ اس میں سلاخوں سے سوراخ بھی ہوتے تھے ... لیکن ڈرائیور بال بال بچ گیا تھا۔ خود میں نے جب اسی طرف سے ... دروازہ کھول کے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ پیچھے ... والا دروازہ بھی ایک سلاخ نے سیل کر دیا ہے۔ میں اور شیخ تقریباً ... ایک ساتھ دوسری طرف سے باہر نکلے۔ میرا خیال تھا کہ شیخ نے ... ریوالور ضرور نکال لیا ہوگا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جیپ میں ... سے اترنے والے دو افراد نے ہمارا راستہ اس طرح روک لیا کہ ہم ... خود بھی دیوار سے لگ گئے۔ وہ دونوں قد و قامت میں ہم سے ... زیادہ تھے مگر اصل خطرے کی بات یہ تھی کہ ایک چند قدم پیچھے ... تھا اور اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑ رکھا تھا جس کا رخ ... ہماری طرف تھا۔ دونوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔

''انسپکٹر صاحب! یہ فائل ...'' آگے رہنے والے نے ہاتھ ... بڑھایا مگر وہ اب بھی ہم سے کافی دُور تھا۔

''لیکن ... تم نے پانچ لاکھ ... کل میری بات ہوئی تھی۔'' شیخ نے ہکلا کر کہا۔

اس شخص نے قہقہہ مارا اور پھر شیخ کو ایک گالی دی۔

''وہ کل کی بات تھی۔ کل کے ساتھ گئی۔''

''یہ ... یہ تو بڑی زیادتی ہے۔'' شیخ نے مظلوم بن کے فریاد کی۔ یہ سب اداکاری تھی۔ ''چلو ایک لاکھ ہی دے دو۔''

''بکواس نہیں چاہیے۔ فائل پھینک ادھر۔'' اس نے مزید غلاظت کا اضافہ کیا۔

شیخ نے فائل اس کی طرف پھینک دی جسے اس نے بڑی پھرتی سے اٹھا لیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا۔ میں ذرا بھی مستعدی دکھاتا تو وہ یقیناً گولی چلا دیتا۔ اس کی نیّت کا اندازہ اس کی آنکھوں سے ہو رہا تھا۔ شاید اسے اچھی طرح بریف کر دیا گیا تھا کہ انسپکٹر کے پاس تو خیر ریوالور ہوگا ہی مگر اس کے ساتھ جو شخص خالی ہاتھ ہوگا، وہ زیادہ خطرناک ہے۔ اسے موقع دیا تو وہ پلک جھپکتے میں گردن توڑ دے گا۔ میں نے اور شیخ نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنے حریفوں کو کامیابی پر مسرور ہونے کا موقع دیا۔

اچانک ایک کار نمودار ہوئی۔ جہاں ہم مجبور بنے کھڑے تھے وہاں سے صبح صبح گزرنے والا کوئی نہ تھا۔ چنانچہ اس کار کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی مگر یہ خوشی پل بھر کی بھی نہ تھی۔ کار پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نمبر نوٹ کر کے ایک گواہ تو پیدا کر لوں گا جو بعد میں چشم دید واقعات بیان کر سکے گا۔ کار سیدھی ہمارے سامنے آ رکی۔ فائل والا ایک ایک قدم پیچھے ہٹا اور کار کے ڈرائیور نے اس کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہی ریوالور کھڑکی سے باہر نکالا اور اپنے دوسرے ساتھی کو واپسی کا حکم دیا۔ دوسرا شخص دوسری طرف سے کار میں جا بیٹھا۔ کار ایک جھٹکے سے روانہ ہوئی اور حیرت انگیز رفتار سے سیدھی اس سڑک پر دوڑنے لگی جس پر ہم پیدل چل کے آئے تھے۔ اس کے بعد شیخ نے بڑی تیزی سے ریوالور نکالا اور کار کے ٹائروں کا نشانہ لے کر فائر کیا مگر اِس کی گولی کے نکلنے سے چند سیکنڈ قبل فرار ہونے والے مجرموں نے کھڑکی میں سے کوئی چیز باہر پھینکی جو چوراہے پر گر کے دھماکے سے پھٹی اور دھوئیں کا ایک گہرا سیاہ بادل اٹھا جس نے کار کو ہماری نظروں سے چھپا لیا۔ اس کثیف دھوئیں کے پار دیکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی ایک فٹ موٹی دیوار کے پار دیکھنا۔ شیخ کا نشانہ خطا ہوگیا۔ وہ بے اختیار پیچھے دوڑا مگر میں نے اسے روک لیا۔

''پاگل ہوئے ہو۔ وہ بہت دور جا چکے ہیں۔'' میں نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا۔ ہم ان کا پیچھا نہیں کر سکتے جتنی دیر میں ہمیں کوئی سواری ملے گی۔ وہ میلوں دُور جا چکے ہوں گے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے نکل چلو۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں۔"

"مگر مجھے اس حملے کی رپورٹ دینی ہے۔" شیخ نے برامی سے کہا۔ "انھوں نے جان بوجھ کے ٹکر ماری تھی۔"

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن اس کا ثبوت؟" میں نے کہا۔ کیوں خود کو بلاوجہ اس حادثے میں ملوّث کرتے ہو۔ عقل سے کام لے کر جان تو بچالی تھی اور فائل بھی۔ اب مصیبت میں کیوں . . ."

"تمھارا مطلب ہے میں اس ٹیکسی ڈرائیور کو یہیں چھوڑ کے چلا جاؤں؟ اسی حالت میں؟"

"ڈرائیور کو صرف خراشیں آئی ہیں اور وہ بھی منہ پر شیشہ لگنے سے۔" میں نے کہا۔ "وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔"

"اور ہوش میں آتے ہی وہ بیان دے گا کہ مجھے ایک سب انسپکٹر نے روکا تھا۔" شیخ بولا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔

"کس سب انسپکٹر نے؟ وہ تمھارا نام تو نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہم اپنے اپنے گھروں سے بہت دور ہیں۔ وہ میرا حلیہ بھی لکھوائے گا۔ تو کیا پتا چلے گا؟" میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

"مگر اس کی ٹیکسی کا بہت نقصان ہوا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کا ذمّے دار میں ہوں۔"

"زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار میں ٹیکسی ڈینٹ پینٹ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ رقم ہم اسے بعد میں بھجوا دیں گے۔ جیپ جس نے ٹکر ماری تھی، یہیں پھنسی ہوئی ہے اور اس پر نمبر پلیٹ بھی ہے۔ اس علاقے کے تھانے کو تفتیش کرنے دو۔ یا تو وہ جیپ والے کا سراغ لگا لیں گے۔ ورنہ کیس فائل کر دیں گے۔ ہوسکتا ہے جیپ چوری کی ہو یا کسی کی بھی نہ ہو۔ فرضی نام پتے پر رجسٹرڈ ہو۔ ابھی یہاں کوئی چشم دید گواہ نہیں۔ لوگ چوک میں جمع ہو رہے ہیں مگر وہ اِدھر بھی آ جائیں گے پھر ہم پھنس جائیں گے اور وقت پر عدالت میں حاضر نہیں ہو سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری ضمانت خود بخود منسوخ ہو جائے گی۔ عدالت میں پہنچ کے تم اپنا مفصل بیان لکھوا سکتے ہو لیکن دیکھو، حادثے کا ذکر کر کے مشکل میں پڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اطمینان سے عدالت میں وہ فائل پیش کر دو اور یہ ظاہر کر دو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پھر دیکھنا اس ناکامی سے مجرم کتنا پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن پھر وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیر ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔"

شیخ آہستہ آہستہ میری باتوں سے قائل ہونے لگا تھا۔ ہم اب جائے حادثہ سے اگلا موڑ کاٹ کر مال پر آ گئے تھے۔ وہاں ہمیں ایک رکشا ملا اور ہم اس مار دھاڑ سے بھرپور وقفے کے بعد پھر ضلع کچہری کی جانب روانہ ہوئے۔

یہ عجیب ہنگامہ خیز دن تھا۔ ایک رات کے ختم ہونے سے پہلے دو افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان میں ایک بوڑھی اور مفلوج عورت تھی جو کسی جرم کے مفہوم سے بھی آشنا نہ تھی۔ شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ جھوٹ بولنا جرم ہے، امانت میں خیانت جرم ہے، کسی کا دل دُکھانا جرم ہے۔ یہ باتیں پرانے لوگ کہتے تھے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی تھیں اور آج بھی غلط نہ تھیں مگر منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ، بردہ فروشی اور بطور پیشہ قتل کرنے یا کرانے اور اس نوعیت کے سنگین جرائم کے مقابلے میں یہ باتیں کس قدر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ شہلا کی ماں کو سمجھایا جاتا تب بھی وہ نہ سمجھتی کہ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور کیا کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں اور اس نے مرنے سے پہلے بہت سوچا ہوگا کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اور یہ سزا دینے والے کون ہیں مگر کوئی جواب اس کی عقل میں آنے سے پہلے موت کا بلاوا آ گیا ہوگا۔ خود ڈی سلوا نے اس کے برعکس یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ اگلا لمحہ اس کے اختیار سے باہر موت کی سرحد کو عبور کرنے کے بعد آئے گا۔ وہ اپنی قوت اور ذہنی و جسمانی صلاحیت پر نازاں کاملِ اعتماد کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کی طرف ایک اور قدم اٹھا چکا تھا اور اب اس وقت جبکہ میں شیخ اور ہم جیسے دنیا کے تمام انسان بدستور کاروبارِ حیات میں معروف تھے (کیونکہ وہ زندہ تھے) اور یہ دنیا اسی طرح وقت کے پیمانے کے مطابق سورج کے گرد گھوم رہی تھی، ڈی سلوا کا بے حس وجود ڈی کمپوز ہونے لگا تھا۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا۔ معلوم نہیں کہاں لکھا تھا کہ آدمی کے جسم میں ننانوے فی صد پانی ہے جو بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ باقی جسم کے کیمیائی اجزا کیلشیم، فاسفورس، فولاد وغیرہ کی قیمت ساڑھے چھ ڈالر بنتی ہے تو ڈی سلوا بھی ساڑھے چھ ڈالر کے نوٹ کی طرح پھٹا پڑا ہوگا اور قانون کے نگہبان صرف یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ یہ نوٹ آخر پھٹا کیسے؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" شیخ نے میرا شانہ ہلا کے کہا: "میں نے کچھ پوچھا تھا۔"

میں بڑی طرح چونکا۔ "اوہ۔ معاف کرنا۔ میرا ذہن سمجھ میں نہ آنے والے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ گر اس وقت تمھارے پاس اصل فائل ہوتی تو تم کیا کرتے؟"

"ظاہر ہے، میں اس کی حفاظت کرتا۔ جب تک ممکن ہوتا۔" شیخ بولا۔

"یہ تمھاری دانشمندی یا دُور اندیشی کے علاوہ تائیدِ ایزدی بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ اسی وقت فائل کھول کے دیکھ لیتے تب بھی شاید صورتِ حال مختلف نہ ہوتی مگر اب تو معاملہ الٹا ہو گیا ہے۔ مارے وہی جائیں گے جو ہمیں مارنے آئے تھے، وہ بڑے فخر سے اپنے کامیاب مشن کی رپورٹ دیں گے اور سند کے طور پر فائل پیش کریں گے۔ اس کا جو انعام انھیں ملے گا، وہ ظاہر ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوبارہ کوشش کریں، عدالت پہنچ جائیں۔" شیخ نے کہا۔

"نہیں۔ وہاں وہ بے بسی سے تماشا دیکھ سکتے ہیں، کچھ کر نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ناممکن ہے کہ اس کاغذ کے پرزے کے لیے وہ تمھیں، خدانخواستہ تمھارے والد کو، رابعہ اور شکر میں سے کسی کو شوٹ کر دیں۔ البتہ مجھے اب اس محرّر کی طرف سے تشویش لاحق ہو گئی ہے۔"

"تشویش کیسی، عدالت میں اسے کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ جھوٹ یا سچ۔" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ وہ عدالت پہنچا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو رضوی صاحب نے بھی کہا تھا کہ محرّر بیان ضرور دے گا اور اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میر محمد اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یا اسے اپنے پاس بلوا لیں گے یا میر کا خانہ خراب کر دیں گے مگر یہ زبانی دعوے ہیں جو غلط بھی ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے محرّر غائب ہو جائے۔"

"غائب ہو کے وہ کہاں جائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "اور کتنے دن غائب رہے گا؟"

"یار شیخ پھر وہی کم عقلی کی باتیں۔" میں نے کہا۔ "ارے بھائی اس دنیا میں سب تو ایس آئی شیخ نہیں ہیں اور ان کے باپ بھی ایسے کہاں ہوتے ہیں جو زندگی کو انمول بھی بتائیں اور یہ بھی تسلیم کریں کہ ایمان کے لیے جان دینا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں۔ محرّر گھاٹے کا سودا کیوں کرے گا۔ اس سے یہ توقع کیوں بیٹھ ہے کہ وہ پانچ لاکھ ٹھکرا دے گا اور اپنی زبان بند رکھے گا۔ وہ پانچ لاکھ لے کر بیوی بچّوں سمیت پاکستان سے غائب ہو جائے گا اور اس کی مدد کرنے والے بھی بہت اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ سمجھانے والوں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہوگا کہ وہ مدد کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں اور پانچ لاکھ دے سکتے ہیں تو جان بھی لے سکتے ہیں، ملک سے باہر پہنچا سکتے ہیں جہاں کوئی اس سے سوال کرنے والا نہ ہو لیکن وہ نہ مانے تو اسے عدم آباد بھی پہنچانا مشکل نہیں۔ محرّر غریب اور کم ہمّت آدمی ہے، پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اسے میر محمد سے ڈر لگتا ہے۔ ڈی سلوا اور چوہدری دلاور جیسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کی وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اگر اس نے میرے بیان کی تائید نہ کی تو میری گواہی قابلِ اعتبار نہیں رہے گی۔" شیخ نے مایوسی سے کہا۔ "الزام مجھ پر ہی آئے گا کہ میں نے تمھاری ناجائز مدد کی اور ایک ماتحت سے زبردستی وہ تحریر لکھوائی مگر تم نے کسی اور کا ذکر بھی تو کیا تھا؟"

"استاد ٹیڈی کا۔" میں نے کہا۔ "محسن اسے تلاش کرنے نکلا ہے۔ مل گیا تو سیدھا عدالت میں حاضر کر دے گا۔"

"مجھے اب بھی یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کو اس حال میں چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ بولا۔

"خدا کا شکر ادا کرو شیخ کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور مالی نقصان بھی برائے نام ہوا۔" میں نے کہا۔ "تم قتل نہیں ہوئے اور ایک فائل کو بچانے کے لیے میرے یا تمھارے ہاتھوں کوئی مارا نہیں گیا۔ حملہ آوروں کو بھی صرف فائل کے حصول کا حکم تھا اور خونریزی سے اجتناب کی تاکید تھی۔ جہاں اس وقت وہ ٹیکسی کھڑی ہے وہاں لاشیں پڑی ہوتیں۔ تم مارنے والوں میں ہوتے تو تمھارا شمار قاتلوں میں ہوتا اور تم معطل ہو جاتے۔ جو تمھارے بدخواہوں کی خواہش کے عین مطابق ہوتا۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی کہ حادثے میں ہمیں گزند نہ پہنچے ورنہ لوہے کی وہ سلاخیں میرے، تمھارے یا اس ٹیکسی ڈرائیور کے جسم کے پار بھی ہو سکتی تھیں۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ صرف بے ہوش تھا؟ فرض کرو اس کے سر کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی؟"

"چوٹ اس کے سر میں نہیں آئی تھی اور نہ کوئی گہرا زخم آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ صدمے کے عارضی اثرات سے بے ہوش تھا اور اب تک یقیناً ہوش میں آ گیا ہوگا۔ لوگ جائے حادثہ پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اسے اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مجرموں نے فرار ہوتے وقت دستی بم نہیں پھینکا۔ صرف دھواں پھیلانے والا گولا چھوڑ دیا اور اس اسموک اسکرین کی پناہ میں فرار ہو گئے۔ اسی اسموک اسکرین یا دھوئیں کی دیوار نے ہمیں بھی نکل آنے کا موقع فراہم کیا اور کسی نے ہمیں دیکھا نہیں۔"

"لوگوں کی بے حسی پر مجھے حیرانی ہوتی ہے۔" شیخ بولا۔ "حادثے کے بعد اور اس وقت جب ملزم ہمیں ہینڈز اپ کرائے کھڑے تھے،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس جگہ سے تین افراد گزرے تھے۔ تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے دیکھا تھا۔ ایک موٹر سائیکل والا، ایک سائیکل سوار اور ایک پیدل۔ مگر وہ سب ایسے نظر چُرا کے بھاگے جیسے خود مجرم ہوں۔"

"ہر شریف آدمی گواہی کے چکّر میں پڑنے سے گریز کرتا ہے شیخ۔" میں نے کہا۔ "بھلا جو شخص گھر سے نوکری پر جانے یا دکان کھولنے یا محنت مزدوری کرنے نکلا ہو، وہ خواہ مخواہ اس قسم کے معاملات میں پڑ کے مشکل میں گرفتار کیوں ہو۔ بعد میں کیس تو نہ جانے کب تک چلے گا۔ اسے تفتیش میں خوار ہونے کے بعد ہر تاریخِ سماعت پر حاضری کے لیے دفتر سے چھٹی کرنی پڑے گی۔ دکان بند رکھنی ہوگی یا ایک دن کی روزی قربان کرنی پڑے گی۔ چشم دید گواہ تو مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔"

رکشا ضلع کچہری کے احاطے میں رکا تو میں نے کرایہ ادا کیا۔ رکشا والے نے خاصی حیرانی سے اور کچھ پریشانی کے بعد کرایہ قبول کیا۔ اس کے لیے بھی یہ ایک نیا تجربہ ہوگا کہ کوئی پولیس افسر وردی میں ہونے کے باوجود مفت میں رکشا کی سواری نہ کرے۔

"اب آخری بار سمجھ لو شیخ!" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ تمھاری صورت پر بارہ بج رہے ہیں۔ پولیس افسر بن جاؤ جو قتل کے ایک ملزم کو لے کر عدالت پہنچا ہے۔ ہمارے چلے سے کچھ پتا نہیں چلتا پھر ہمیں کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بھی نہیں کہ ہم گھر سے رکشا میں بیٹھے اور یہاں آگئے۔ کوئی بھلا ہم سے کیوں پوچھے گا کہ آپ لوگ کس طرح پہنچے؟"

"اتنا بڑا جھوٹ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں بولا تھا سکندر!" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"زندگی میں ابھی تم نے بہت کچھ نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میری طرح تجربات کی بھٹی سے نکلو گے تو زمانے کے گرم و سرد کو سمجھ لو گے اور تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ اور سچ محض حالات کے پیمانے ہیں اور یہ دوسروں کا نقطۂ نظر ہے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق پیدا کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم جانتے ہو کہ عبدل نے تمھیں فون کیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ سچ کیا ہے۔ مگر اتنا بڑا سچ دوسروں کے نقطۂ نظر سے جھوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ سچ یہ بھی ہے کہ میر شرافت علی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا مگر اسے جھوٹ ثابت کرنے والے زیادہ مستند ہیں۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ میرے باپ کو بلیک میل کرنے والوں نے غربت اور بے بسی کی بدترین موت عطا کی مگر سچ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے سالِ رواں میں ساڑھے تین لاکھ کا منافع وصول کیا تھا اور اپنے دستخطوں سے۔ مگر اب اس کی لاش بھی نہیں جو اس جھوٹ کی تردید کر سکے۔ ہم اس ٹیکسی والے کی مدد سامنے آئے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ سامنے آنے اور سچ بولنے سے اس کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا تمھارا انجام وہی ہوگا جو فرض شناسی اور ایمانداری کے چکر میں پہلے بھی اچھا نہیں ہوا۔"

شیخ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی حالت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے دلائل سے اس کے ضمیر میں چبھا ہوا کانٹا نہیں نکلا اور اس وقت تک وہ اندرونی خلش سے جرم و پشیمانی کے احساس میں مبتلا رہے گا جب تک اسے معلوم نہیں ہو جائے گا کہ ٹیکسی والا خیریت سے ہے۔ بار روم میں پہنچ کے ہم نے مس رابعہ قاری سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وکیلوں کو بلوانے کی خدمت پہ مامور آدم بیزار شخص نے انٹر کام قسم کے ایک آلے میں پکارا "مس رابعہ قاری۔۔۔ مس رابعہ قاری!" اور پھر ہم سے کہا کہ ہم انتظار کریں، وہ آرہی ہیں۔ بار روم میں عام آدمی کا داخلہ ممنوع تھا چنانچہ اس کے سامنے موکلوں کا اور ملاقاتیوں کا ایک اجتماع تھا۔ وہ ایک وکیل کو پکار کے فارغ ہوتا تھا تو دوسرے لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے کہ فلاں وکیل صاحب کے بارے میں معلوم کرو، عدالت میں ہیں یا بار روم میں بیٹھے ہیں۔ اس کی آدم بیزاری درست تھی۔ کم سے کم دس افراد اس کے سامنے کھڑے مختلف ناموں کی گردان کر رہے تھے۔

پانچ منٹ بعد رابعہ نمودار ہوئی۔ "بہت دیر کر دی آپ لوگوں نے آنے میں۔" وہ بولی۔ "عدالت میں بڑی مشکل سے گیارہ بجے کا وقت لگوایا ہے۔"

"مگر ابھی تو دس بھی نہیں بجے۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تمھیں یہاں نو بجے موجود ہونا چاہیے تھا۔" وہ برہمی سے بولی۔ "اگر دلاور اینڈ کمپنی کی کوشش سے پہلا نام تمھارا ہی پکارا جاتا اور کاز لسٹ میں سرِ فہرست ہوتا تو تم کیا کر لیتے۔ تمھاری ضمانت منسوخ ہو جاتی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمھیں کسی نے کوئی بریف کیس پہنچایا ہے۔"

"ہاں۔ ایک بزرگوار تشریف لائے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ یہاں ریسپشن میں بریف کیس رہے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ میرا بیٹا آکے لے لے گا۔ کیا ہے اس میں؟ اور وہ کون صاحب تھے؟"

"وہ انسپکٹر شیخ کے والد تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے بریف کیس کھول کے دیکھا ہوتا تو تمھیں معلوم ہو جاتا کہ اس میں کیس فائل ہے جس میں محرّر کے ہاتھ کا لکھا ہوا عبدل کا بیان بھی لگا ہوا ہے۔"

"میں کیوں کھول کر دیکھتی۔" رابعہ نے کہا۔ "جب کہ مجھے بھی بتا دیا گیا تھا کہ ۔۔۔ کر لینے کوئی اور آئے گا۔ آخر کیس فائل ہے کہ

[...] طرح پہنچانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"اگر شیخ صاحب نے عقلمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو وہ تحریر [...] وقت تک دشمنوں کے ہاتھ میں پہنچ چکی ہوتی۔" میں نے کہا۔ [...]ھوں نے اس کا سودا کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور انسپکٹر صاحب [...] خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"اچھا تم اسی عدالت میں پہنچو اور باہر ٹھہرو۔" رابعہ نے کہا۔ [...]نظر صاحب بھی وہیں ملیں گے، میں آتی ہوں۔ وہ بریف کیس [...]ار روم ہی میں پڑا ہے۔ میں دو بریف کیس تو اٹھا نہیں سکتی۔ [...]یں فائل کو اپنے بریف کیس میں رکھ لوں گی۔"

"رابعہ وہ فائل عدالت کی تحویل میں دینی ہے۔ پوری فائل [...]ہی وہ بیان جو محرّر نے لکھا تھا اس کی اصل عدالت کے ریکارڈ [...]ر رہے گی تو محفوظ ہوگی۔"

"وہ محرّر بھی آیا ہے کہ نہیں؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کی تائید [...]ے بغیر وہ تحریر۔۔۔ اتنی اہم نہیں رہتی۔"

"کیوں اہم نہیں رہتی؟" میں نے کہا۔ "اگر وہ آیا تو اس [...]اپ بھی تسلیم کرے گا کہ اس نے یہ بیان خود ٹیپ سے کاغذ پر [...]ارا تھا اور ٹیپ بعد میں غائب ہو گیا تھا۔ نہ آیا تو ہم اس کے [...]ھے ہاتھا نے سے اس کی تحریر کے نمونے حاصل کریں گے [...]س سے ثابت ہو جائے گا کہ لکھنے والا وہی تھا اور میرا خیال ہے، [...]ہیں یہ دوسرا طریقہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ محرّر کے آنے کا بظاہر [...]وئی امکان نظر نہیں آتا۔"

"اور تمھارا وہ استاد ٹیڈی۔ وہ تو آئے گا؟" رابعہ نے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "محسن اسے تلاش کرنے [...] سے پہلے نکل گیا تھا۔"

"مس رابعہ!" شیخ نے کہا۔ "آج محض پیشی ہے۔ ضمانت کی [...]نسوخی کی درخواست پر سماعت نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے ٹیڈی [...] نہ آیا تو اگلی پیشی پر آجائے گا۔ اس کے لیے کافی وقت ملے [...] دراصل شیدے اور عبدل کے قتل کا چالان ہی ابھی تک پیش [...]ہیں کیا گیا ہے۔"

جب وہ رابعہ سے بات کر رہا تھا تو میری نگاہیں چاروں [...]ف کسی آشنا چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے سرگرداں تھیں [...]گر اس ہجوم میں مجھے جانے پہچانے دشمنوں کی صورت کہیں دکھائی [...]دی۔ ہر طرف وہ لوگ تھے جو کسی عزیز کی تاریخِ سماعت پر [...] کے ساتھ آئے تھے۔ گواہ تھے، ملزم تھے۔ کچھ صرف ہتھکڑیاں [...]گے ہوئے، کچھ پاؤں میں بیڑیوں کے ساتھ۔ ان کو گھیرے رکھنے والے [...]لیس کے سپاہی تھے جو زنجیر کا دوسرا سرا اپنی وردی کی بیلٹ سے [...] اور ملزم کو چائے اور ناشتے یا سگرٹ وغیرہ پینے

کی رعایت دینے کا نذرانہ ان کے عزیزوں دوستوں سے وصول کر رہے تھے۔ وکیل اور ان کے منشی اور ایجنٹ تھے اور اس گہماگہمی کو دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ قاتلوں کے محافظ کتنی مستعدی سے انصاف فراہم کرنے کے عمل میں کوشاں ہیں جبکہ درحقیقت کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وکیلوں کی معرفت ریڈر لمبی پیشی دینے یا نہ دینے کا فیصلہ اس معاوضے کی بنیاد پر کر رہے تھے جو ان کو سب کی نظر بچا کے مگر سب کے سامنے دیا جا رہا تھا۔ گواہوں کو سبق پڑھایا جا رہا تھا کہ ان کو کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے یا اظہارِ حقائق سے باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ فیس کا آدھا حصہ پیشگی وصول کر لینے والے اپنے موکلوں کو یقین دلانے میں مصروف تھے کہ چٹکی بجانے میں فیصلہ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ دور دراز مقامات مضافات اور دیہات سے آئے ہوئے پورے پورے خاندان کسی ایک اسیر کی خاطر خوار و زبوں تھے، برآمدوں میں اور خشک بے وجود گھاس کے تختوں پر ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے اور ملزم سے زیادہ مظلوم لگتے تھے۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دار و گیر!

جس عدالت میں مجھے پیش ہونا تھا وہاں کا نقشہ بھی مختلف نہ تھا اور فلموں میں دکھائے جانے والے مناظر سے قطعی مختلف تھا۔ میلی بوسیدہ دیواروں اور اونچی چھتوں والے کمرے نیم تاریک تھے جن میں پرانی خستہ حال بنچوں اور کرسیوں پر لوگ زندگی سے بیزار بیٹھے تھے۔ انگریزوں کے وقت کا لٹکایا ہوا پنکھا جیسے تھک چکا تھا کہ اب بادلِ ناخواستہ گھومنے پر مجبور تھا۔ کمرے کی الماریاں اور اس میں ٹھونسی ہوئی فائلوں کو دیکھ کر کسی سرکاری دفتر کا گماں ہوتا تھا۔ ریڈر کے گرد موکلوں اور وکیلوں کا اژدہام تھا اور ایک سیدھی سادی میز جس پر لوہے کے اسٹینڈ والا چھوٹا سا جھنڈا موجود تھا تقریباً خالی پڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کرسی بھی خالی تھی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کرسی پر رونق افروز ہونے والا منصف ابھی اپنے چیمبر میں ہے۔ عدالت اور چیمبر کے درمیانی دروازے پر ایک اتنا ہی میلا اور پرانا کپڑا بطور پردے کے استعمال ہو رہا تھا جتنا میز پر پھیلا ہوا میز پوش۔

میرا خیال تھا کہ وہاں میر محمد پہلے سے موجود ہوگا مگر اس کی جگہ میری ملاقات حشمت خان اور حوالدار بجلی سے ہوئی۔ حوالدار کے اضطراب و اشتیاق سے ظاہر ہوتا تھا کہ بقولِ شاعر۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

اسے ایک اشارہ چاہیے پھر وہ مثلِ برقِ تپاں مجھ پر گرتا اور ملزم زیرِ دفعہ ضابطۂ فوجداری ۳۰۲ ہونے کے باوجود اکڑ فوں دکھانے کا مزہ چکھا دیتا۔ میں نہ صرف یہ کہ گستاخانہ طور پر مسکرا رہا تھا بلکہ میں نے اس کے اعلیٰ افسر کو نظر انداز

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر کے گزر جانے کی جسارت بھی کی تھی۔ حشمت خان نے خود مجھے روک لیا۔"آ گئے ہو شہزادے! وا بھئی وا! اپنے شیخ صاحب بھی ساتھ ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کیا مگر میں نے اطمینان کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکالی اور لائٹر سے جلائی۔ حشمت خان نے خفیف ہو کے ہاتھ کھینچ لیا اور حوالدار کی نظر میں قہر کی بجلی سی لہرائی۔ وہ اپنی خودی کو بلند رکھنے کی جدوجہد میں افسران بالا کو بھی نہیں بھولا تھا۔

"خیر سے اپنے سکندر صاب کچھ ناراض ملوم ہوتے ہیں۔" وہ حوالدار سے مخاطب ہو کے بولا۔

"ایک بار آجائیں ہماری مہمانی کے لیے۔ ہم ساری ناراضگی دور کر دیں گے انشااللہ۔" حوالدار نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ پھر دلی تسکین کے لیے اس نے غیر معمولی پھرتی سے ایک قیدی کے منہ پر جھانپڑ مارا۔"سگریٹ پیتا ہے عدالت میں' کھوتے دا۔۔" ملزم مذکور بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ اس نے یہ رعایت ایسے ہی حاصل نہیں کی تھی۔

"تم کہاں شترِ بے مہار کی طرح پھر رہے ہو؟" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا۔"تمہارا وہ ایس ایچ او میر محمد کیوں نہیں آیا؟ الّو کے پٹھے!" میں نے غور سے سگریٹ کو دیکھا۔

"کیا؟" حوالدار یوں اُچھلا جیسے اس کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔"گالی۔۔۔ گالی دیتا ہے! ملزم!"

"ہاں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔"میں سگریٹ بنانے والوں کو کہہ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے بھوسہ بھر دیا ہے۔"

"وہ جی۔۔۔" حشمت خان مجھے ٹکٹکی باندھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔"بڑے فسوس کی بات ہے۔۔" اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ بھوسہ اس لیے تو نہیں ہوتا کہ سگریٹ میں بھرا جائے' آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے سگریٹ میں اور پولیس والوں کی کھوپڑی میں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ شیخ بے نیازی سے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

حوالدار بجلی پھر تڑپا۔"پچھلی بار تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس بار بتائیں گے کہ بھوسہ کیسے بھرا جاتا ہے کھال میں۔"

"ابھی ایس ایس پی صاحب آنے والے ہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔"انھیں بھی سمجھا دینا۔"

حوالدار بجلی کے غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔ حشمت خان نے اسے ملامت اور غصے سے دیکھا۔"اوئے کھوتے! ایویں اپنی ٹانگ مت اڑایا کر بیچ میں۔" حشمت خان نے حوالدار بجلی کی خودی کو انتہائی بلندی سے انتہائی پستی میں پہنچا کے کہا۔"میں بات کر رہا تھا میر کی۔ بات یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ آنا تو میر محمد ہی کو تھا۔ پر نا ایس ایچ او تو خیر ابھی وہ نہیں بنا۔ بس اس وقت کام کر رہا ہے مگر مجھے اس کا پیغام ملا۔ ایک سگریٹ تو نکالیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔"اپنے پیسے سے کھانا پینا سیکھو حشمت خان! سگریٹ خرید کر پیو۔ تم میرے دوست تو نہیں ہو۔"

حشمت خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے جیب سے ایک اٹھنی نکالی اور حوالدار بجلی کو دی۔"جا اوئے! کیفسٹن کا ایک سگریٹ پکڑ لا۔" حوالدار بجلی نے افسوس ناک نظروں سے اٹھنی کو دیکھا جو اس کے نقطۂ نظر سے بزدلی کا پیڈل تھی۔

"کیا پیغام ملا تھا میر محمد کا؟" میرے بجائے شیخ نے سوال کیا۔

انسپکٹر حشمت خان نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔"اس نے تو اچھا تھا رخصت کی درخواست بھیج دیتا لیکن اس میں لکھا ہے کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم صبح شرافت علی کے قتل کے کیس سے نمٹ لینا۔"

"حشمت خان!" انسپکٹر شیخ نے کاغذ کے اس پرزے پر غور کر کے کہا جو کسی کاپی سے پھاڑا گیا تھا۔"یہ میر محمد کا ہینڈ رائٹنگ تو نہیں ہے۔ وہ خاصا بدخط ہے۔ مجھے یہ دستخط بھی اس کے نہیں لگتے۔"

"او جی یہ تو ہم نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ آپ ہمیں کیا بتا رہے ہو؟" حشمت خان نے ناگواری سے کہا۔

"پھر۔۔۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد تم نے کچھ کیا؟" شیخ نے پوچھا۔

"آپ تو ہم سے ایسے پوچھ رہے ہو جی۔۔۔ جیسے کہ آپ ہی ہمارے افسر ہو۔ او جی ہم نے کیا کوئی توپ چلانی تھی؟" وہ خفگی سے بولا۔"میں نے اس کا انتظار کیا۔ پھر اس کے گھر جا کے دیکھا۔ وہیں تو رہتا ہے وہ۔ تھانے کے پیچھے لیکن اس کی گھر والی نے کہا۔ خیر اب عورت ذات کو کیا کہیں۔ اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ میر محمد اس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ گھر میں نہیں بیٹھا رہتا۔ مغز ماری کے لیے وقت نہیں تھا بعد میں دیکھیں گے کیا چکر ہے اگر سرکاری کام ہوتا تو وہ ہمیں بتا کے جاتا۔ پرائیویٹ کام ہوتا تو گھر والی کو معلوم ہوتا۔"

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

"ارے بھائی سکندرِ اعظم۔ واہ واہ۔ کمال کر دیا۔"

"منظر!" میں نے پلٹ کر اس سے مصافحہ کیا۔"کیا حال ہے میاں! کچھ اور پھول گیا ہے تو۔ کیا کھاتا ہے؟"

"کھاتے ہیں اپنا اور دوسروں کا سر۔ بس غم نہیں کھاتے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔"تو بھی بڑا آدم خور شیر دا پتر ہے۔ دو بندے اور کھا گیا؟ کھا جا سب سالوں کو۔ نہ رہے گا بانس اور نہ یہ تیرے پیچھے لے کر پھریں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ الٹے بانس بریلی کو۔۔" اس نے کہا اور پھر زور سے ہنسا۔

"ہاتھ آنے میں "کیفسٹن" کے بیس سگرٹوں کا پیکٹ لے آیا تھا خود کو بلحاظ ضخامت بہت کمتر محسوس کیا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے اسے اور شیخ کو پیش کی۔ حشمت خان نے مناسب یہی سمجھا کہ مزید توہین برداشت کرنے کے بجائے وہ کھسک لے۔

"یار۔ وہ تیرا جو کیس تھا حق وراثت والا۔" منظر نے سگریٹ جلا کے کہا۔"وہ ذرا وقت لے گا۔ کورٹ خالی ہے اور جب تک کسی کی پوسٹنگ نہیں ہوتی۔۔۔"

"اس کیس کی بات چھوڑ۔ تجھے رابعہ نے کچھ بتایا ہے اس کیس کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" منظر نے کہا۔"رابعہ خود ہی ٹھیک کر لے گی۔ ضمانت منسوخ نہیں ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ تو تیرے لیے بھی رابعہ سے بہتر وکیل کون ہو سکتا ہے۔" وہ معنی خیز طریقے پر مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔"ویسے میں عدالت میں موجود رہوں گا۔"

"منظر! اگر وہ محرر حاضر نہ ہوا جس کی امید بہت کم ہے۔"

"ارے بھائی گولی مار محرر کو بھی۔" وہ ہنسا۔"جب کہہ دیا کہ اب ٹھیک ہو جائے گا تو رونا کیسا۔ ہم پر اعتماد نہیں ہے کیا؟ لوگے تو تیری جگہ پھانسی چڑھ جائیں۔ سولی پر تو چڑھے ہوتے ہی ہیں جب سے شادی کی ہے۔ اور غضب خدا کا۔ وہ بھی فضور وار کہتی ہے مجھے۔ اچھا یار! میری پیشی ہے ایک کیس میں۔ ابھی آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔"

"خوب آدمی ہے تمہارا یہ وکیل بھی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا۔

"وکیل تو بعد میں بنا ہے' پہلے تو اپنا یار تھا۔ بچپن میں رابعہ اور ہم اس کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔" میں نے کہا۔"ساڑھے دس بج گئے ہیں شیخ!" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔"وہ محرر نہیں پہنچا نا۔"

"غنیمت ہے کہ آج سماعت کا امکان نہیں۔ بعد میں اسے تلاش کریں گے۔" شیخ نے کہا۔"میں نے تم سے کہا تھا کہ اِدھر اُدھر نگاہ رکھنا۔"

"میں ہر طرف دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔"ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا ہے۔ وہ لوگ دور دور سے دیکھ رہے ہوں تو الگ بات ہے۔ قریب آتے ہوئے ڈرتے ہوں۔"

"تمہارا دوست محسن بھی نہیں آیا۔" شیخ نے کہا۔"معلوم ہوتا ہے تمہارا استاد ٹیڈی۔۔۔"

"استاد ٹیڈی حاضر ہے جنابِ عالی!" ٹیڈی نے اچانک ہجوم میں سے نمودار ہو کے کہا۔"قسم مولا علی کی۔ یاروں کو ٹیڈی کی ضرورت پڑے اور ٹیڈی نہ آئے' یہ کبھی ہو سکتا ہے۔"

"تو تم استاد ٹیڈی ہو۔" انسپکٹر شیخ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔"استاد کس نے بنا دیا ہے تمھیں۔ کیا کہیں پڑھاتے ہو؟ کسی اسکول وغیرہ میں؟" اس نے جانتے بوجھتے انجان بن کے سوال کیا۔

"استاد زمانے نے بنا دیا ہے تھانیدار صاحب!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔"دنیا جسے چاہے کچھ بھی بنا دے۔ جسے چاہے بادشاہ کر دے اور جسے چاہے فقیر۔ قسم مولا علی کی۔ خود پڑھے ہوتے تو یہی پڑھانے کا کام کرتے۔ استاد کا درجہ تو باپ کے برابر ہوتا ہے۔ ہم تو اس نام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔"

"محسن کہاں ہے ٹیڈی؟" میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے کہا

"وہ رک گیا تھا ٹیکسی کے پیسے دینے کے لیے۔ آتا ہوگا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں سکندر صاحب!" اس نے مضبوط پُراعتماد لہجے میں کہا اور شیخ کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری۔"ہم وہی کہیں گے جو سچ ہے۔ بھلے کوئی ہماری گردن اتار دے۔"

"اور سچ کیا ہے؟ کیا اس رات سکندر صاحب اور محسن صاحب تمہارے ساتھ تھے جس رات شیدے اور عبدل کے قتل کی دُہری واردات ہوئی؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں جی' اس میں کوئی شک ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے یہ بات تو۔" وہ بولا۔"ہم ادھر رتن سنیما کے پاس تیل مالش کرا رہے تھے کہ پہلوان تانگے والا آگیا۔ بولا گھر چس رہے ہو۔ میں

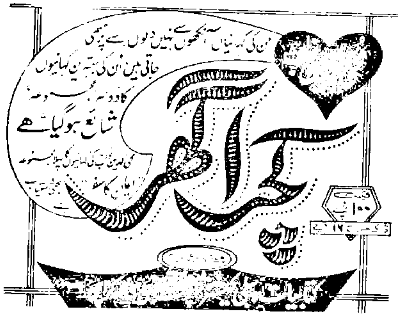

مطالعہ کرنے امتحان دینے اور یادداشت بڑھانے کیلئے ایک بے حد کارآمد نفسیاتی کتاب
قیمت ۲۵ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے
مکتبہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۹۲۲ کراچی نمبرا

گھوڑی کھول رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ آج ابھی سے ہ سواری نہیں مل رہی ہے کیا؟ یہ اپنا یار پہلوان بھی الّو ہے۔ رات کو جاگتا ہے' اسٹیشن سے سواریاں اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد صبح ہونے سے پہلے اکھاڑے پہنچ جاتا ہے۔ دن میں سوتا ہے اور شام کو پھر اکھاڑے میں۔ ایسے پٹھے ہیں اس کے۔ قسم مولا علی کی۔ ایک سے ایک بانکا گبرو جوان ہے۔ پر پہلوان تانگے والا سب کا باپ ہے...''

''تم پٹری سے اتر رہے ہو'' شیخ نے اسے ٹوکا ''یہ بتاؤ کہ سکندر صاحب کس وقت ملے تھے تمہیں؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں تھانیدار صاحب!'' ٹیڈی نے عاجزی سے کہا۔ ''پہلوان کہنے لگا کہ یار ماں بیمار ہے، جلدی گھر پہنچنا ہے' اس کو دوائی دینی ہے۔ ورنہ سواریاں تو رب کی مہربانی سے اتنی کہ رات مُک جاتی ہے ڈھوتے ڈھوتے۔ خیر جی ہم نے کہا۔ چلو چلتے ہیں۔ اس وقت بجے ہوں گے یہی کوئی دس۔ اتفاق سے میں نے سکندر صاحب کو اور محسن صاحب کو دیکھ لیا اور ان کو بھی اُدھر ہی جانا تھا۔ ہم پہلے تو سب بیٹھ گئے تانگے میں۔ پھر راستے میں ہم نے کہا سکندر صاحب! آؤ آپ کو چائے پلائیں۔ بڑے دن بعد ملے ہو ——— اپنے اڈے پر ایسی ملائی والی چائے ملتی ہے تھانیدار صاحب کہ آپ کو کہیں پورے لاہور میں نہیں ملے گی۔ ہم وہاں بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ اس ہوٹل کا مالک ہے شیرو۔ اس نے بھی دیکھا تھا اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ سب آسکتے ہیں گواہی دینے۔''

میں سمجھ گیا کہ محسن نے اسے تمام صورتِ حال سمجھا دی ہے اور باقی سب کچھ استاد ٹیڈی کے حسنِ انتظام کی دلیل ہے اگر اس نے کسی پہلوان تانگے والے اور کسی ہوٹل کے مالک شیرو کا حوالہ دیا ہے تو اسے یقین ہوگا کہ ضرورت پڑنے پر یہ دونوں گواہ اس کے بیان کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ضرور آجائیں گے۔ بے شک یہ گواہی جھوٹی ہوگی مگر جس نظام ——— کی بنیاد ہی شہادت پر ہو اور جس میں سچ کو جھوٹ ثابت کرنے والے پیشہ ور گواہ عدالتوں کے احاطوں کا طواف کرتے ہوں، پیشہ ور ضامن بے وجود یا جعلی کاغذات سے صاحبِ جائداد بن کے حاضر ہوتے ہوں، دنیا و عقبیٰ کے خوف کا خیال دل میں لائے بغیر حلف اٹھاتے ہوں۔ وہاں اور کیا ہو سکتا ہے۔ غلط کام میں بھی کر رہا تھا اور دل کو یہ تسلی بھی دے سکتا تھا کہ میں تو صرف ایک سچ کو سچ ثابت کرنے کے لیے جھوٹے گواہ لانے پر مجبور ہوں مگر یہ جواز صرف بقا کی جدوجہد کے معیار پر درست تسلیم کیا جا سکتا تھا جس کا اخلاق کے معیار سے رشتہ نہ ہو۔ ورنہ کسی معاشرے، مذہب یا قانون کا کوئی اصول میرے فعل کو قبولیت کی سند نہیں دے سکتا تھا۔ یہی میرا اور میرے دور کا المیہ تھا کہ اصولی اور عملی زندگی کے راستے جدا اور متضاد سمتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور سقراط کی طرح زہر کا پیالہ اٹھانے والا عقل و ہوش سے بیگانہ قرار دیا جاتا تھا۔ پھر میں یہ پیالہ کیسے اٹھاتا جو اس وقت کا تقاضا تھا۔

رابعہ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ پر نمودار ہوئی۔ ٹھیک گیارہ بجے میرا نام پکارا گیا اور اندر جاتے ہوئے میں نے رضوی صاحب کو گاڑی سے اترتے اور منظر کو ہانپتے ہوئے، ہجوم میں سے راستہ بناتے دیکھا۔ عدالتی کارروائی میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ وکیلِ استغاثہ کی طرف سے میری ضمانت منسوخ کرنے کی رسمی سی استدعا کی گئی۔ پبلک پراسیکیوٹر نوجوان لڑکا سا تھا جو بار بار رابعہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ رابعہ یقیناً پہلے ہی اس سے بات کر چکی ہے پھر سب انسپکٹر شیخ نے اپنا بیان قلم بند کرایا۔ اس نے بہت اختصار سے کام لیا اور اپنے بیان کو بنیادی حقائق تک محدود رکھا جس میں عبدل کے ٹیلی فون، محرّر کے لکھے ہوئے بیان، ٹیپ کے غائب ہونے اور ٹیلی فون پر ملنے والی دھمکی سب کا ذکر آگیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ حقائق عدالت کے ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہے اور اس کیس سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رابعہ نے استدعا کی کہ محرّر کے لکھے ہوئے عبدل کے اس بیان کو بھی عدالت اپنے ریکارڈ پر رکھے جو اس نے مرتے وقت دیا تھا کیونکہ نامعلوم افراد کی طرف سے دھمکیاں موصول ہونے کے بعد یہ اندیشہ ہے کہ ٹیپ کی طرح یہ تحریر بھی غائب ہو جائے گی پھر اس نے وکیلِ استغاثہ کی درخواست مسترد کرنے کے لیے اپنے دلائل پیش کیے اور صفائی کے ایک گواہ استاد ٹیڈی کا بیان ہوا۔ حسبِ توقع فیصلہ یہی ہوا کہ موجودہ حالات میں ضمانت کی منسوخی کا کوئی جواز نہیں۔ عبدل اور شیدے کے قتل کی تفتیش ہنوز نامکمل ہے اور ظاہری شہادت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ واردات سے سکندر بخت کا کوئی تعلق ہے۔ عدالت نے صفائی کے دوسرے گواہ یعنی محرّر کی غیر حاضری کو نوٹ کیا اور میر محمد کے خلاف تفتیش کے لیے بھی احکامات جاری کیے جو سب انسپکٹر شیخ کے بیان کے مطابق ٹیپ غائب کرنے کا ذمے دار تھا اور یہ بھی حکم دیا کہ اگلی پیشی پر وہ خود حاضر ہو کے ان الزامات کا جواب دے۔ تاہم کیس کی تفتیش سے سب انسپکٹر شیخ کی دستبرداری کے عذر کو عدالت نے ناکافی وجوہات کی بنا پر قبول نہیں کیا اور اسے پولیس کے اعلیٰ حکام کا مسئلہ قرار دیا۔ سب انسپکٹر شیخ چاہے تو اپنی درخواست افسرانِ بالا کو بھیج سکتا ہے۔ محرّر کے لکھے ہوئے بیان کو عدالت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی ایک مصدقہ نقل پولیس کو فراہم کرنے کی تاکید کی۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں اپنے آگے پیچھے دیکھتا رہا۔ منظر میرے سامنے پہلی قطار میں موجود تھا اور رابعہ نے کئی بار اس سے مشورہ بھی کیا۔ پیچھے کی بنچوں پر غیر متعلقہ افراد بھی موجود تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ محسن دوسری قطار میں استاد ٹیڈی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بعد میں سب انسپکٹر شیخ بھی ان کے ساتھ جا بیٹھا اور میں نے محسن کو اس سے ہاتھ ملاتے دیکھا جو ایک طرح سے اس کی حق گوئی و بے باکی اور آئینِ جواں مردی کو خراجِ تحسین تھا۔ رضوی صاحب کی عدم موجودگی کو میں نے خصوصاً نوٹ کیا۔ شاید وہ عمداً باہر رہے تھے۔ ایس ایس پی کی حیثیت سے وہ غیر معروف شخصیت نہیں تھے چنانچہ ان کا سماعت کے دوران حاضر رہنا سب کی نظر میں آتا۔ آئندہ تاریخِ سماعت ایک ماہ بعد مقرر ہوئی اور ہم باہر نکلے تو ایک بج رہا تھا۔ عدالت کی کارروائی میں بھی وقفہ آگیا تھا۔ سب سے پہلے جج کے اٹھتے ہی منظر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''بس، جا اور قتلِ کر۔ قتلِ عام کر سالے۔ بس فکر مت کر'' وہ ہنسا ''ابے جب رابعہ جیسی وکیل ہوگی تو کوئی تیرا کیا بگاڑے گا۔ تو خود ہی بگڑ جائے تو اور بات ہے۔'' وہ بے حد باتونی شخص تھا۔ مجھ سے بات کرتے کرتے وہ شیخ کی طرف متوجہ ہو گیا ''بھئی کیا نام ہے تمہارا۔ سب انسپکٹر شیخ۔ تم نے تو ثابت کر دیا کہ آج کل بھی سچ بولنا ممکن ہے۔ بہت ہمت کی بات ہے بھائی۔''

''میرا خیال ہے ضمانت منسوخ نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب شیخ کا بیان ہے'' میں نے کہا ''یہ میری خوش قسمتی ہے یا تائیدِ ایزدی کہ کیس شیخ کے پاس تھا۔ ورنہ ان کی خاموشی تو مجھے مزید دو افراد کے قتل کے الزام میں ملوث کر سکتی تھی۔ ان کی جراٴت اظہار، اصول پرستی اور ایمان داری نے مجھے تختۂ دار تک پہنچنے سے بچا لیا ہے۔ میری زندگی ان کا قرض ہو گئی ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ لوگ'' سب انسپکٹر شیخ نے کہا ''میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔''

''یہی تو کمال ہے آپ کا۔ ورنہ فرض کا احساس کہاں رہ گیا ہے؟'' رابعہ نے کہا ''آپ پہلے ہی فرض شناسی کا نقصان اٹھا چکے ہیں اور مجھے تو ڈر ہے، آج آپ نے اپنی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ اپنی نوکری ہی نہیں، زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے اور جب یہ بات مدِنظر رکھی جائے کہ آپ نے ایسے تو واقعی یقین نہیں آتا۔''

''مس رابعہ! اصول پرستی میں کبھی کسی نے دنیا میں مادّی فوائد حاصل نہیں کیے۔ اگر میں پانچ لاکھ لے کر خاموش ہو جاتا یا دھمکی سے ڈر جاتا تو اپنا ایمان ہی نہیں، ایک بے گناہ شخص کی زندگی بھی بیچتا۔ جو میرے نقطۂ نظر سے قتل ہوتا۔ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ آپ سب بھی جانتے بوجھتے کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔''

''قسم مولا علی کی تھانیدار بادشاہ!'' استاد ٹیڈی نے آگے بڑھ کر شیخ کے ہاتھ تھام لیے ''تم جناب نہ مانو، ہم تو سمجھتے ہیں کہ جو تم نے کیا، وہ کسی ہم جیسے گناہگار انسان کے لیے ناممکن تھا۔ تم واقعی فرشتہ ہو۔ کبھی ضرورت پڑے تو کہنا کہ جان چاہیے۔ قسم مولا علی کی ٹیڈی سر کے بل آئے گا۔''

''اچھا اچھا۔ اب چلیں آپ سب لوگ۔ بہت ہو چکی قصیدہ خوانی'' شیخ نے کہا ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ کیس کسی اور کے سپرد کر دوں۔''

''عجلت میں یہ فیصلہ مت کرو شیخ!'' میں نے کہا ''یہ نہ ہو کہ کیس تمہارے ہاتھ سے نکلے تو حشمت خان جیسے شخص کے سپرد ہو جائے اور تم آخر ڈرتے کیوں ہو۔ سچ بولنے والے تو رشتوں کے ٹوٹ جانے کی پروا نہیں کرتے اور تم جیسا شخص تو دوست رہ کے بھی جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اگر حقائق مجھے مجرم ثابت کریں گے تو تم کسی کا لحاظ نہیں کرو گے مگر اس میں میرے لیے یہ اطمینان تو ہوگا کہ میرے ساتھ انصاف ہوا۔ میر محمد اور حشمت خان تو ایسے لوگ ہیں کہ جس کی گردن میں فٹ آجائے اسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے پھرتے ہیں۔ مجھے ان کے حوالے کیوں کرتے ہو؟'' مجھے قطعی احساس نہیں تھا کہ حشمت خان اور حوالدار بجلی کان لگائے ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے ہیں۔ ان کی حیثیت پٹے ہوئے مہرے سے بدتر تھی۔ خصوصاً حوالدار بجلی کا تو سارا کرنٹ ختم ہو گیا تھا۔

رضوی صاحب عدالت کے باہر مجھے اس وقت ملے جب شیخ، استاد ٹیڈی اور دوسرے سب لوگ جا چکے تھے۔ میرے ساتھ صرف رابعہ اور محسن رہ گئے تھے۔

''تم لوگ میرے ساتھ چلو'' انھوں نے کہا اور میں نے اندازہ کیا کہ ان کا موڈ کچھ آف ہے۔

''لیکن انکل۔ میری گاڑی ...''

''وہ میرا شوفر لے آئے گا'' انھوں نے کہا ''... بیٹھو ... تم بھی محسن۔ مجھے کچھ کہنا ہے تم سب سے۔''

ان کی جیپ ڈسٹرکٹ کورٹ کے احاطے سے نکلی اور مال روڈ پر دوڑنے لگی۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے تھے'' رابعہ نے ہمت کر کے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہاں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ مجھے بے وقوف کیوں بناتے ہو؟ کیا تمھیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟" وہ یکلخت پھٹ پڑے "کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟"

محسن اور میں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے آپ سے بہت جھوٹ بولے ہیں، لیکن یہ غلط ہے کہ ہمیں آپ پر اعتماد نہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ تم کو معلوم تھا کہ شہلا کی ماں مر چکی ہے۔ تم جانتے تھے کہ ڈی سلوا مر چکا ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم تھی؟" میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ "اگر محسن یا رابعہ کو یہ بات معلوم تھی تو انھوں نے مجھے نہیں بتائی۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔" محسن نے احتجاج کیا۔ "میں صبح سے ٹیڈی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

"پھر تو میں ہی رہ گئی۔ میں نے ہی کسی عدالت میں یا بار روم میں سنی ہو گی یہ بات۔" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

"دیکھو۔ یہ سب کچھ تم لوگوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق کیا ہے؟" رضوی صاحب نے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں نے جانتے بوجھتے شہلا کو اسلام آباد بھجوا دیا۔ تاکہ وہ اپنی ماں کی مسخ شدہ لاش نہ دیکھے اور ہر قسم کی تحقیق و تفتیش سے بچ جائے۔"

"شہلا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ چلی گئی ہے؟" محسن نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اسے انکل شیروانی نے اور فوزیہ نے مجبور کیا تھا، میں نے نہیں۔ یقین نہیں تو گھر جا کے فون پر ان سے بات کر لینا۔ وہ بھی اب گھر پہنچنے ہی والے ہوں گے لیکن پہلے مجھے یہ بتائیے انکل کہ آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ ہمیں وہ سب کچھ معلوم تھا جو آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔"

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں مگر میں جانتا ہوں، کل رات تم نے مجھے اپنے فرار کی جو کہانی سنائی تھی، وہ سو فی صد سچ نہیں تھی۔"

"تو آپ بتا دیجیے کہ پورا سچ کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اور میرے سچ میں جھوٹ کی آمیزش کا تناسب آپ نے کیا نکالا ہے اور کیسے نکالا ہے؟"

"دیکھو برخوردار! تمھارے معاملے میں میرے دو کردار ہیں، میری شخصیت کے دو حصّے ہو گئے ہیں اور ان کو مربوط رکھنا میرے لیے دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔" رضوی صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک طرف میں ایس ایس پی ہوں۔ دوسری طرف تم مجھے انکل کہتے ہو۔ میں نے کبھی اپنے فرائض سے پہلوتہی نہیں کی مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ظلم تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ تاہم میں تمھاری طرح یہ نہیں کر سکتا کہ ظلم کرنے والوں سے خود نمٹنے لگوں۔ نظامِ انصاف میں لاکھ خرابیاں سہی پھر بھی اس سے بہتر نظام اور کیا ہو گا؟ عملی صورت کو مت دیکھو جسے ہم نے مسخ کر رکھا ہے۔ اصولی طور پر یہ ایک صدی سے زیادہ کے عرصے میں مکمل ہوا ہے اور تکمیل کا یہ عمل ابھی جاری ہے مگر اس نظام نے زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ہم اس کو بہتر بنانے کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی میں خود اس کو عملی طور پر قبول کریں اور اس کے پابند ہوں۔ اس وقت بھی جب ہمیں کوئی پولیس مین نہ دیکھ رہا ہو۔ اگر اس میں خرابیاں پیدا کرنے والے ہم خود ہیں تو اس نظام کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں اور پھر من مانی نہ کریں۔ اگر ہر شخص قانون کو بے بس اور بے اثر سمجھ کے خود اپنا نظامِ انصاف وضع کرنے لگے، خود مدّعی ہو اور خود ہی منصف بھی تو یہ قانون جنگل کا قانون ہو گا۔ معاشرے میں، کسی بھی دنیا کے مہذب معاشرے میں اجتماعی قدروں کو فروغ ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

"ہمارے ارد گرد یہی ہو رہا ہے انکل۔ اور اس کے ذمّے دار ہم نہیں آپ ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ جو ہمارے پیشرو تھے۔ جنھوں نے ہمارے لیے یہ ماحول پیدا کیا جس میں ہم نے پرورش پائی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے تو ابھی عملی زندگی میں قدم بھی نہیں رکھا۔ ان سب خرابیوں کے ذمّے دار ہم کیسے ہو گئے؟ ہر دور میں نئی نسل کو موردِ الزام قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی قدروں کو پامال کر رہی ہے۔ معاشرتی خرابیوں کا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا جاتا ہے جو نوجوان کہلاتے ہیں۔ کیا وہ لوگ بالکل بے قصور ہوتے ہیں جو ان نوجوانوں کی پرورش کرتے ہیں؟ ان کے اخلاق و کردار کے نگراں کہلاتے ہیں اور جن کے نقشِ قدم پر نوجوان چلتے ہیں؟ نہ جانے کب سے لوگ کہتے آ رہے ہیں کہ جی کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ویسا نہیں ہوتا تھا اور ہم تو گویا فرشتے تھے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں کس دور میں نظر نہیں آئیں۔ ان کو جو بزرگ ہو چلے تھے۔ کوئی ان سے سوال نہیں کرتا کہ جناب کیا ان نوجوانوں کے سن بلوغت کو پہنچتے ہی راتوں رات دنیا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئی۔ پہلے ہر شخص نیک تھا۔ پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ مہذب، باحیا اور قانون کا احترام کرنے والا تھا۔ پھر اس کا ...

... جیسی کیوں نہ بنی؟ مثلاً میں اور محسن تو پہلے اسکول ... میں ... پھر لندن چلے گئے۔ یہاں جو کچھ ہوا، اس میں نوجوان نسل کا ... کتنا تھا؟ میر شرافت علی، چوہدری دلاور، چراغ دین، پیڈرو ... سب آپ کے اور انکل شیروانی کے دور کے لوگ ہیں۔ یہاں ... کی باگ دوڑ انھی کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں تو واپسی پر ... دنیا ویسی ہی ملی جیسی نظر آتی ہے۔ وہ نہیں جو ہونی چاہیے تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں مگر تمھارا کام بھی یہ تو نہیں کہ ان خرابیوں میں اضافہ کرو۔ ظلم ہوتا دیکھو تو ظالم بن جاؤ۔ ... کو چوری کرتے، ڈاکا ڈالتے دیکھو تو ڈاکو بن جاؤ۔" رضوی صاحب ... نرم پڑتے ہوئے کہا۔ رابعہ نے بے حد عجیب نظروں سے ... دیکھا۔ ان نظروں میں فخر و مسرت کے جذبات بھی تھے ... ستائش کے بھی۔ "تم کو ان خرابیوں کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ نہ کہ ان خرابیوں کا شکار ہو جانا چاہیے۔ آخر یہ کام کون ... کرے گا؟ خیر۔ میں جانتا ہوں یہ فلسفیانہ بحث کبھی ختم ہونے ... والی نہیں ہے۔ یہ بتاؤ، کیا تمھیں واقعی ڈی سلوا کی موت کا علم ... نہیں تھا؟"

ذرا سی دیر کے لیے میں مخمصے میں پڑ گیا لیکن میری قوتِ ... نے بروقت مجھے خبردار کر دیا۔ اب سچ بولنے سے کچھ حاصل ... نہ ہو گا سوائے خرابی کے۔ اور جھوٹ جس سے کسی کو نقصان نہ ... ہو، جو مجبوری میں بولا جائے اور سچ کے مقابلے میں کم ... رساں ہو۔ بہرحال بہتر ہے۔

"مجھے اب تک یقین نہیں کہ میرا ایک اتنا بڑا دشمن نہیں ..." میں نے کہا۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

"میں نے ایک رپورٹ درج کرائی تھی۔ جیسا کہ میں نے ... بتایا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "دس بجے کے قریب مجھے ... موصول ہوا کہ حادثے میں تباہ ہو جانے والی ایک گاڑی ... میں سے ایک بوڑھی عورت کی لاش ملی ہے۔ مجھے شناخت ... کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں جائے واردات پر پہنچا یعنی باغبانپورے ... والی سڑک کے آخری موڑ پر۔ وہ سڑک جو نہر کے ساتھ ... ساتھ ... کی طرف سے جاتی ہے اور وہاں پہنچ کے میں ... شہلا کی ماں کو تو پہچان ہی لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی ... ڈی سلوا بھی ہلاک ہو گیا ہے۔"

"گویا ڈی سلوا ہی شہلا کی ماں کو اغوا کر کے لے گیا تھا ... حادثے کا شکار ہو گیا۔"

"نہیں۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" رضوی صاحب ... "ایک تو حادثے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈی سلوا شراب کے ... نشے میں نہیں تھا اور گاڑی درخت سے ٹکرائی ہے، کسی گاڑی سے نہیں۔ پھر گاڑی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حادثے کے وقت اس کی رفتار کم سے کم پچاس میل فی گھنٹہ ضرور تھی۔"

"ہو سکتا ہے اس نے سامنے سے آنے والی کسی گاڑی سے تصادم کو بچانے کی کوشش کی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور گاڑی بے قابو ہو گئی ہو۔"

"یہ۔ صرف فرض کیا جا سکتا ہے۔" رضوی صاحب نے عدم اتفاق کی کوئی صورت نہ پا کے کہا۔ "یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بریک فیل ہو گئے تھے مگر حقائق کچھ اور ہیں۔ تم نے اسے کس وقت دیکھا تھا؟"

"تقریباً رات کے ایک بجے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے ڈیڑھ کا وقت ہو۔"

"تم صبح کے ساڑھے پانچ بجے واپس پہنچے تھے اور بظاہر تم نے یہ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا۔ تمھاری حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ یہ فاصلہ تم نے کتنی دیر میں طے کیا تھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایک گھنٹہ تو لگا ہو گا مجھے۔" میں نے کہا۔ محسن نے میرا ہاتھ دبا کے مجھے محتاط ہونے کی تاکید کی۔

"شیروانی صاحب اور ان کی بیٹی تین بجے صبح پہنچے تھے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور وہ گاڑی میں لائے گئے تھے جس نے انھیں عین میری کوٹھی کے دروازے پر اتارا تھا۔ گاڑی پر کوئی نمبر پلیٹ تھی تو وہ دیکھ نہیں سکے۔ لائٹ آف تھی اور وہ گھبرائے ہوئے بھی تھے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے سے کم میں۔ تقریباً بیس منٹ میں پہنچے ہوں گے۔ گویا پونے تین بجے کے قریب وہاں سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس حساب میں کوئی غلطی ہے تو بتاؤ کہ جو فاصلہ ایک شخص پیدل چل کے ایک گھنٹے میں طے کرے۔ وہ کار میں زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی وقت میں طے ہو جائے گا۔ تم نے کسی سے لفٹ نہیں لی تھی۔ کوئی رکشا یا ٹیکسی تمھیں نہیں ملی تھی اور ظاہر ہے اتنی رات گئے تم نے پانچ میل کی دوڑ نہیں لگائی تھی۔ اتنے طویل راستے پر گشتی پولیس یا چوکیدار تمھیں بھاگتا دیکھتے تو ضرور تمھارے پیچھے لگ جاتے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمھیں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا ہو گا۔ اوسطاً آدمی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔ تیز چلے تب بھی چار میل سے زیادہ کی رفتار نہیں ہو سکتی اور یہ رفتار بھی ایک دو میل تک برقرار رہ سکتی ہے۔ بعد میں گھٹ جاتی ہے۔ خیر یہ بتاؤ کہ جب تم نے سراج کو قتل کر کے فوزیہ اور شیروانی کو بھیجا تو کیا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈی سلوا وہاں موجود تھا؟"

"جی۔ اس وقت وہ وہیں تھا۔" میں نے غور کر کے کہا۔

"اور تمھارے پہنچنے کے کتنی دیر بعد ان کو رہائی ملی تھی؟"

"ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد۔" میں نے کہا۔ "آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں اس سے؟"

"اور تم ان کے روانہ ہونے کے بعد کتنی دیر وہاں رہے تھے؟" رضوی صاحب نے میرے سوال کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔

"میں... میں تقریباً ان کے ساتھ ہی۔ چند منٹ کے فرق سے۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "جب تم نے ایک بار سراج کو قابو کر لیا تھا۔ تو ظاہر ہے اسے ایک گھنٹے تک پکڑے نہیں کھڑے رہے ہو گے۔ تم نے پہلے شیردانی اور فوزیہ کو چھڑایا اور اس کے بعد ڈی ایس پی سراج کو ڈھال بنائے باہر آ گئے۔ رائٹ۔ فرض کرو دس منٹ بعد۔ گویا تم تین بجے وہاں سے روانہ ہوئے اور تمھارے کہنے کے مطابق ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گئے لیکن اس طرح تمھیں چار بجے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا تم کہاں رہے؟"

رضوی صاحب نے مجھے ٹریپ کر لیا تھا۔ "وقت کے الٹ پھیر میں ڈیڑھ گھنٹے کا فرق نکل آیا تھا۔" میں نے اندازوں کی بنیاد پر بات کی ہے۔ آپ صحیح وقت کو مدِ نظر رکھ کے حساب لگا رہے ہیں۔" میں نے کہا مگر صاف ظاہر تھا کہ میرا لہجہ اعتماد سے خالی ہے۔

"اچھا یہ بھی مانا۔ یہ بتاؤ جب تم روانہ ہوئے تب بھی ڈی سلوا وہیں موجود تھا؟ ظاہر ہے، ہو گا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صبح کے تقریباً پانچ چھ بجے، وہ شہلا کی ماں کو ادھر سے لے کر مخالف سمت میں کہاں جا رہا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"کیا موت کے وقت کا تعین ہو گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابتدائی اندازے کے مطابق اسے مرے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "صبح چھ بجے ایک شخص نے کہیں سے فون کر کے حادثے کی اطلاع دی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ پولیس ساڑھے چھ بجے پہنچی اور ایک انسپکٹر نے مجھے بتایا ہے کہ خون کا رنگ اور مہک باقی تھے۔ خون کچھ جم گیا تھا لیکن کچھ اس وقت بھی رِس رہا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حادثے کے کچھ دیر بعد ہی کسی نے گاڑی دیکھ لی۔ سڑک کے دوسری طرف بنگلے ہیں۔ وہیں سے کسی نے فون کر دیا۔ گویا وقت وہی پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے حتمی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے گی مگر جو بات میں نہیں سمجھ سکا، وہ کچھ اور ہے۔ میرے ایما پر ایک پولیس پارٹی وہاں گئی تھی جہاں تمھیں لے جایا گیا تھا۔ انھوں نے بڑا تفصیلی معائنہ کیا لیکن کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ انھیں غیر آباد کمروں میں اور آس پاس کوئی سراغ نہیں ملا جس سے ثابت ہوتا کہ رات کو وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ بیروں کے نشانات کیا، گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات تک نہیں تھے۔ کھڑکیاں، دروازے سب بند تھے۔ سوائے ایک کھڑکی کے۔"

"ظاہر ہے، وہ اسی میں سے نکل گئے اور جاتے جاتے اپنی موجودگی کی تمام علامات مٹا گئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن ڈی سلوا کی گاڑی کو یہ حادثہ وہاں سے آتے ہوئے پیش نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں جا رہا تھا۔ وہ گلوب سنیما کے پاس رہتا ہے۔ اگر اسے یہ خیال تھا کہ شہلا کی ماں کو اپنے گھر لے جائے تب بھی یہ سمت بالکل الٹی ہے۔ کار کا رخ دوسری جانب ہونا چاہیے تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اگر اسے شہلا کی ماں کو کہیں اور لے جانا تھا تب بھی یہ غلط ہے۔ ایسی صورت میں حادثہ داروغہ والا کی جانب کہیں ہوتا یا مخالف سمت میں باغبانپورے کی طرف۔"

"اب آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ بھی صاف بتا دیجیے۔ منطقی اعتبار سے آپ نے مجھے قائل کر لیا۔"

"میرا خیال یہ ہے میاں سکندرِ اعظم کہ تم نے ڈی سلوا کو مجبور کیا کہ وہ تمھیں ڈراپ کرے۔" رضوی صاحب نے ایک بار پلٹ کے مجھے دیکھا اور پھر گاڑی موڑ لی۔ "اس وقت تمھارے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا کہ پانچ میل کی دوڑ لگائی جائے۔ جب باہر ایک گاڑی موجود ہو تو کوئی یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ تم گاڑی کے ٹائر فلیٹ کر دو۔ مگر اس کے لیے تمھیں گولی چلانی پڑتی۔ دوسری بہتر صورت یہ تھی کہ تم اسی گاڑی کو استعمال کرو۔ اتنی رات گئے تم رکشا یا ٹیکسی ملنے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ گھر سے پانچ میل دور تھے اور تمھیں جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ سراج جو تمھارے خیال کے مطابق گروہ کا سرغنہ ہے، تمھاری گرفت میں تھا۔ تم اس کے دونوں ہاتھ توڑ چکے تھے۔ کیا اس کے بعد تم نے سراج کا ریوالور نہیں نکال لیا ہو گا؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب میں فرض کر لوں کہ سراج غیر مسلح تھا مگر کسی خطرناک گروہ کا سرغنہ اپنے پاس ریوالور نہ رکھے، ورنہ وہ بھی ایک پولیس افسر جسے سرکاری طور پر ریوالور ملتا ہے اور ناجائز اسلحہ برآمد کرنے کے مواقع ملتے ہیں تو اس میں سے خورد برد کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ تم نے ریوالور کی مدد سے ڈی سلوا کو گاڑی چلانے پر مجبور کیا اور وہ تمھیں چھوڑ کے واپس جا رہا تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ تمھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈکی میں شہلا کی ماں ہے۔ جیسے ہی وہ تمھیں نہر کے پل کے آس پاس کہیں چھوڑ کے واپس ہوا، تم گاڑی سے چمٹ گئے۔ تمھارے پاس سراج کا ریوالور تھا۔ اس سے تم نے پیچھے کا ونڈ اسکرین توڑا۔ میرا خیال ہے جب ڈی سلوا نے گاڑی کو بیک کیا ہو گا تو اچانک چھلانگ مار کے تم بونٹ پر چڑھ گئے ہو گے۔ پہلے تم نے کوشش کی ہو گی کہ وہ ریوالور سے ڈر کے رک جائے مگر وہ بدحواس اور خوفزدہ ہو کے بھاگا اور اس کوشش میں گاڑی بے قابو ہو گئی۔ یہ فاصلہ چند منٹ کا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈی سلوا مخالف سمت میں کیوں جا رہا تھا۔ شہلا کی ماں کیسے ماری گئی اور تم کو گھر پہنچتے پہنچتے ساڑھے پانچ کیسے بج گئے۔ اب یہ بتاؤ کہ سراج کا ریوالور کہاں ہے؟"

"وہ... وہ میں نے نہر میں پھینک دیا تھا۔" میں نے اس وقت کہا جب گاڑی گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ رضوی صاحب نے اپنی ذہانت سے تقریباً صحیح صورتحال کا اندازہ کر لیا تھا اور میرے لیے اعترافِ جرم کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ محسن اور رابعہ بھی شرمسار بیٹھے تھے۔ رابعہ کچھ خفا تھی کیونکہ ابھی تک ہم نے اسے بھی شریکِ راز نہیں کیا تھا۔

"دیکھو پھر جھوٹ مت بولنا۔" رضوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس ریوالور کی مدد سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے، ممکن ہے۔ وہ سرکاری ریوالور ہو۔ اس کے سیریل نمبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس کو دیا گیا تھا۔"

"کیا اس کا نام سراج نہیں ہے؟" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہاں سراج نام کا کوئی اے ایس پی، ڈی ایس پی یا ایس پی نہیں ہے۔ کسی تھانے کا ایس ایچ او تک سراج نہیں ہے۔ پرسنل برانچ نے مجھے بتایا ہے کہ ایک سب انسپکٹر مزنگ تھانے میں ہے اور دوسرا مصری شاہ کے علاقے میں، جن کے نام میں سراج آتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ہمراہ لائلپور گیا ہوا ہے اور دوسرا ریٹائر ہونے والا ہے۔ یعنی بڑی عمر کا آدمی ہے۔ اس جگہ کی نشاندہی کر سکتے ہو جہاں تم نے ریوالور پھینکا تھا؟"

میں نے فقط اقرار میں سر ہلایا۔ پھر بیگم رضوی نمودار ہوئیں اور ہم خاموشی سے اندر چلے گئے۔

"کیا بات ہے۔ صورتیں کیوں اتری ہوئی ہیں؟" انھوں نے کہا۔ "ضمانت منسوخ ہو گئی کیا؟"

"ضمانت منسوخ ہو جاتی تو یہ حضرت یہاں نظر آتے۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ محسن بہت حد تک حقائق سے باخبر تھا مگر مجھے موقع ہی نہیں ملا تھا کہ رابعہ کو کچھ بتا سکوں۔ موقع اس وقت بھی نہیں تھا۔ کھانا تقریباً تیار تھا۔ ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ میو اسپتال سے ٹیلی فون موصول ہوا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد شہلا کی ماں کی لاش لے کر ایک ایمبولینس روانہ ہو چکی تھی۔

شام تک اس غریب لاوارث عورت کی تدفین بڑی سادگی اور خاموشی سے ہو گئی۔ جنازے میں مشکل سے بیس افراد شریک ہوئے جو میانی صاحب کے قبرستان سے ایک گھنٹے میں لوٹ آئے۔ میں نے اور محسن نے لوٹتے ہوئے رابعہ کی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پہلے رابعہ کی ماں، پھر شہلا کی ماں اور اب ہو گی محسن کی ماں کی باری۔ فرشتۂ اجل نے صرف میرے باپ کا انتخاب کیا تھا۔ باقی سب کی ماؤں کا۔ یہ فضول و بے سروپا خیال میرے ذہنی انتشار کا آئینہ دار تھا۔ شام کا اندھیرا ایک سوگوار رات کے اندھیرے میں ڈھل گیا۔ پورے گھر پر ایک ماتمی سکوت کا غلبہ تھا۔ کسی نے رات کے کھانے پر ہمیں نہیں بلایا۔ شاید کسی نے کھانا کھایا ہی نہیں۔ رضوی صاحب اپنے کمرے سے نہیں نکلے اور رابعہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ میں اور محسن سگریٹیں پھونکتے رہے اور دبے دبے لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ گزشتہ شب میری اپنے دشمنوں سے کیا باتیں ہوئی تھیں اور ڈی سلوا کی موت تک پیش آنے والے تمام واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ استاد ٹیڈی کو تلاش کرنے اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کر کے بیان کے لیے تیار کرنے میں کتنی محنت ہوئی۔ "لیکن یہ محنت اکارت نہیں گئی۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو کمال کر دیا۔"

"شیدے اور عبدل کے قتل کا الزام تو اب ہم پر آتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "شکاری کوئی اور چال سوچیں۔"

"میرا خیال ہے سرِدست تو ان کی پیش کش قبول کر لے۔" محسن نے اچانک کہا۔

"کیا؟ یعنی ان کے ناجائز کاروبار میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"نہیں۔ سیاست سے کام لے سکندر! وہ تجھے پارٹنر کی حیثیت دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ پہلے اپنی پوزیشن کو مستحکم کر لے۔ اس کے بعد دیکھ وہ کیا کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"انھوں نے میرے سامنے کچھ شرائط رکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو میں قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً ان کا مدعا ہے، وزیر خان

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

والے معاملے کو دبانا۔ وہ میرے نقصانات کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں اس کی موت کو بھول جاؤں۔ یہ بات بھول جاؤں کہ انھیں کس طرح محصور کر کے بے بس کر کے اور مفلس کر کے مارا گیا۔ میں سلامت شاہ، فوما نچو، غلام علی اور دیگر سب بے گناہوں کے خون کی قیمت وصول کرلوں اور خاموش ہو جاؤں۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ تُو ان کی شرائط پر صلح کرلے۔" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تیرے حقِ وراثت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ ایک محاذ پر تیری فتح ہے۔ جنگی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ پہلے مورچے کو مضبوط کر لیا جائے اور پھر پیش قدمی کی جائے۔ تو یہ طے ہے کہ سودا کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ آج اگر وہ سب کچھ تیرے حوالے کر دیں، تب بھی نہیں۔ کوئی مجرم کسی عدالت میں ایک معمولی سے جرم کی قیمت ادا کر کے نہیں بچ سکتا۔ ان کے جرائم تو بہت سنگین ہیں۔ ان کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ فوزیہ کو اٹھا لائے، میرے باپ کو اٹھا لائے۔ انھوں نے شہلا کی ماں کو مار دیا۔ جنگ کا دائرہ تو اب بہت پھیل گیا ہے۔"

"بالکل یہی میں نے ان سے کہا تھا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر یار سکندر! یہ تو نے شہلا کو وہاں جانے سے روکا کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تیرے کہنے سے رک جاتی۔"

"میں کیسے روکتا۔ سب لوگ ایک طرف تھے۔ بیگم رضوی، انکل، رابعہ اور فوزیہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن... میں نے اسے وہ سب بتا دیا تھا جو اسے نہیں معلوم تھا۔"

"ممی کی بیماری کے متعلق؟" وہ بولا۔ "یا فوزیہ کی شادی کے بارے میں؟"

"یہ تو اسے بتا دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مگر... یہ نہیں کہ فوزیہ کے علاوہ تیری بھی شادی ہو سکتی ہے۔ میرا ابھی خیال یہی ہے کہ اسے وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے۔ تیری شادی کے موقعے پر اور اس کے بعد۔ لیکن اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ پہلے فوزیہ کی شادی ہو۔ اس کے بعد شہلا لوٹ آئے اور..."

محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر ہم اپنے اپنے خیالات میں محو خاموش لیٹے چھت کو گھورتے رہے پھر باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے غور سے سنا۔ آہٹ باہر کی طرف ہوئی تھی۔ "محسن!" میں نے سرگوشی میں کہا مگر وہ سو چکا تھا۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ کمرے کی کھڑکی میں ایک سایہ سا نمودار ہوا۔

میں نے کھڑکی کھول کے جھانکا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ گیٹ پر صرف ایک مسلح سپاہی بے حد مستعد کھڑا تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں پولیس کی روایتی گوروں کے عہدِ رفتہ کی نشانی، دھائیں سے ایک فائر کرنے والی تھری ناٹ تھری کی وہ رائفل نہیں تھی جس سے دوسری گولی چلانی مقصود ہو تو اس کے میگزین سے برآمد کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے ایک لیور کو خاصی زور آزمائی سے آگے پیچھے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس رائفل کے بغیر میرے ذہن میں مسلح پولیس کی تصویر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سہرے کے بغیر دولہا کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

بلکہ یہ سپاہی جدید طرز کی چھوٹی سی آٹومیٹک مشین گن لیے کھڑا تھا جو اسٹین گن سے مشابہ تھی اور ممکن ہے اسٹین گن ہی ہو۔ میں نے جدید آلاتِ حرب کو مار دھاڑ سے بھرپور انگریزی فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا یا سنا تھا کہ وطنِ عزیز میں بھی ڈکیتی کی وارداتوں کے لیے ان کا استعمال کامیابی سے ہونے لگا ہے مگر ذاتی طور پر ان کی اقسام کے فرق کو اتنی دور سے محسوس کرنا میرے لیے مشکل تھا۔

گیٹ کے اوپر مجھے دو سرچ لائٹس بھی نظر آئیں۔ دونوں کا رُخ مخالف سمت میں تھا اور ایک سے بیرونی دیوار کا وہ حصہ روشن تھا جو سڑک کے ساتھ ساتھ تھا تو دوسری سے دائیں طرف سرونٹ کوارٹر تک کوٹھی کا تمام علاقہ روشن تھا۔ سرونٹ کوارٹر مقفل اور تاریک تھا مگر اس کے باہر سایہ بھی حرکت کرتا تو مستعد محافظ کی نظر اسے دیکھ لیتی۔ اسی طرح سڑک کی طرف سے کوئی احاطے کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ یہ تازہ ترین حفاظتی انتظامات جو رضوی صاحب نے صرف ہماری وجہ سے کیے تھے ان کی دوراندیشی، فہم و فراست اور حسنِ تدبیر کا عملی ثبوت تھے۔

میں نے اپنے آپ کو خاصا محفوظ محسوس کیا۔ دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ڈی سلوا کی موت کے بعد وہ راست اقدام کا منصوبہ بناتے تو مجھے، محسن یا رابعہ کو اغوا کر لے جاتے یا اس گھر کا بھی وہی حشر کرتے جو رابعہ کے گھر کا ہوا تھا۔ بے شک دن میں ہم ہر جگہ ان کے انتقام کا نشانہ بن سکتے تھے مگر اب ہم نے بھی غیر مسلح پھرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے قتل سے ان کو کوئی فائدہ ہوتا تو وہ بہت پہلے ہمیں ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ کسی نامعلوم سمت سے آ کے دل کے صحیح نشانے پر لگنے والی گولی ان کے مسائل کا حل ہوتی تو وہ خود سارا جھگڑا ختم کر دیتے یا کسی پیشہ ور قاتل کی خدمات حاصل کر لیتے۔

لیکن ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے ہم نے جارحیت کا جواب جارحیت سے دیا تھا اور اپنے دفاع کو بھی اتنا مضبوط بنا لیا تھا کہ وہ آسانی سے کامیاب ہونے کے جتنے خواب دیکھ رہے تھے ان کی تعبیر الٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ہم سے اپنی تمام شرائط منوانے کی صرف ایک مؤثر صورت یہ تھی کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو یرغمالی بنا لیں اور اس کی جان کے بدلے ہم سے سودا کریں۔ ہمارے دفاعی حصار میں صرف ایک کمزور پہلو تھا۔ ہماری ایک دوسرے سے جذباتی وابستگی۔

وہ جانتے تھے کہ مجھے شہلا، رابعہ یا محسن کو ایک دوسرے سے کتنی محبت ہے۔ انکل رضوی اور ان کی فیملی کے ہر ممبر یا شیروانی صاحب کے خاندان سے بھی ہمارے رشتوں کی بنیادیں کتنی مستحکم ہیں۔ بے غرضی اور خلوص پر مبنی ان رشتوں کو صرف اسی طرح شکست ہو سکتی ہے کہ ہمارے سامنے ہم میں سے کسی کے لیے بھی آزمائش کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔ وہ اگر رضوی صاحب کے گھر کے ایک بچّے کو بھی اٹھا لے جاتے تو میں بخوشی اپنی ہار قبول کر لیتا اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیتا، جو بات وہ نہیں جانتے تھے یہ تھی کہ ایسا وقت آیا تو اعترافِ شکست میرے لیے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ رضوی صاحب جیسے کٹّر اصول پرست شخص کے لیے یہ صرف ایک بچّے کے اغوا کا کیس تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ بچّہ ان کا ہے یا کسی اور کا۔ وہ مجھے کبھی اجازت نہ دیں گے کہ میں مجرموں کے ایسے مطالبے کے سامنے سر جھکا دوں خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ انھیں اپنے لختِ جگر کی لاش ملے نہ ملے، وہ کامل یکسوئی کے ساتھ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی قانونی کارروائی کو جاری رکھیں گے۔ یہی صورتِ حال دوسروں کے ساتھ ہوگی۔ رابعہ، محسن اور شہلا میں سے ہر ایک مجھے اپنی محبت یا اپنی جان کی قسم دے کر منع کر دے گا کہ دشمنوں کی بات نہ مانوں ورنہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔

دن دہاڑے ہم میں سے کوئی بھی آسانی سے اغوا نہ ہو سکتا تھا۔ نہ میں اور محسن، نہ رابعہ یا رضوی صاحب۔ ہم برابر کا مقابلہ کرتے اور مرتے یا مار دیتے۔ میری موت انھیں منظور نہ تھی، ایک افسر کو قتل کرنے کی ان میں ہمت

کا سارا محکمہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ

ان کی بیخ کنی پر تل جاتا اور یہ دشمنی انہیں بہت مہنگی پڑتی۔ یہی صورت رابعہ کی تھی۔ اس کے اغوا یا قتل ہوتے ہی ساری وکیل برادری اٹھ کھڑی ہوتی اور ڈسٹرکٹ سے لے کر ہائی کورٹ تک ہر بار ایسوسی ایشن اور سب قومی اخبارات پولیس کے پیچھے پڑ جاتے تو مجرموں کے لیے جائے پناہ نہ رہتی۔ پولیس کی نظر کس مجرم پر نہیں ہوتی۔ ولی را ولی می شناسد۔ وہ جانتے ہیں کہ علاقے میں کتنے گرہ کٹ اور جیب تراش ہیں، کتنے چور اور کتنے ڈاکو ہیں، سٹّے کے اڈے کہاں ہیں اور منشیات کے کہاں۔ لیکن وہ کچھ دو اور کچھ لو۔ جیو اور جینے دو کے فلسفے پر عمل پیرا رہتے ہوئے "عفو و درگزر" سے کام لیتے ہیں۔ جب یہ نوبت آ جائے کہ انھیں اپنی جان کے یا نوکری کے لالے پڑ جائیں تو وہ جائز طریقے اختیار کریں یا ناجائز مگر مجرم تک رسائی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کامیابی میں عموماً سب سے بڑا ہاتھ ان مخبروں کا ہوتا ہے جو بظاہر مجرموں کے آلۂ کار ہوتے ہیں اور خود بھی شریفانہ طریقے سے روزی نہیں کماتے۔ سابقہ سزا یافتہ مجرم، بھتّہ وصول کر کے آگے پہنچانے والے، ہتھارے وارا اور بعض اوقات بالکل بے ضرر کاروبار میں مصروف عام آدمی۔ ان سب کا جال شہر کے گلی کوچوں میں پھیلا رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت خفیہ طور پر معلومات کی فراہمی کا سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

صرف محسن ایسا شخص تھا جسے دشمن اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ناکامی کی صورت میں قتل بھی کر دیتے اور یہ ایک عام آدمی کا قتل کہلاتا جو زیادہ اہم نہیں سمجھا جاتا اور زیادہ مسائل پیدا نہ کرتا۔ مگر اس سے زیادہ آسان شہلا یا فوزیہ کو اٹھانا تھا اور فوزیہ کے ساتھ شیروانی صاحب کو اسلام آباد سے لاہور پہنچا کے انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں کھلی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پیتا رہا اور ایک غیر یقینی مستقبل کے خدشات، امکانات اور تصوّرات میں گم رہا۔ شیروانی صاحب، پرانی وضع کے شریف اور عمر رسیدہ افسر۔ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو کسی اور کو کیسے بچائیں گے۔ پہلے ایک فوزیہ ہی تھی، اب شہلا بھی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ ان بے ضمیر انسانوں نے انتقام کی آرزو میں اندھا ہو کے اور ذلّت کی انتہائی پستی میں گرتے ہوئے اس عورت کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنا لیا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس کی زندگی چراغِ سحری ہے تو کیا ہوگا؟ بہت جلد محسن کی ماں کو دنیا سے رختِ سفر باندھنا تھا اور اس کے پاس فرصتِ عمر بہت کم تھی۔ شاید وہ خود بھی جانتی تھی کہ زندگی کے باقی ماندہ گنے چنے دنوں میں اس کو کیا کچھ کرنا ہے ۔ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ کرنا تو بہت کچھ تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں۔ ان گنت خواہشوں اور بے حساب تمناؤں کے لیے کوئی گنجائش نہیں، اس نے تھوڑی سی خوشیوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ جیسے پیاسے نے سمندر سے شبنم کے چند قطرے مانگ لیے ہوں اور ہم سب نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان خوشیوں کی تکمیل کا سامان ضرور کریں گے۔ اسے دنیا سے بے مراد، دل شکستہ اور اس احساس کے ساتھ رخصت نہیں کریں گے کہ اس نے جن پودوں کو جنم دیا اور اپنے لہو سے پروان چڑھایا، ان کا ثمر نا امیدی ہے، احساسِ محرومی ہے اور تنہائی ہے۔ اَزلی و اَبدی۔ ان میں پھول نہیں کھلے، کانٹے نکلے اور ملکِ عدم میں اس کے ساتھ کسی کا پیار تک نہیں۔

اور ہمیں مجبوریوں کے جال میں پھنسا لینے والے فنکاری سوال کریں گے کہ میاں سکندرِ اعظم! کیا اب بھی تم کو اپنی فتوحات عزیز تر ہیں؟ فوزیہ اور اس کے باپ کی ملتجی سوالیہ نگاہیں مجھ سے ان خوشیوں کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوں گی جو وہ اپنی ماں اور اپنی شریکِ زندگی کے دامن میں ڈالنے کا عہد کر چکے تھے اور اس عہد کو ایک مقدس فرض کی طرح پورا کرنا چاہتے تھے مگر سب سے کڑی آزمائش محسن کے لیے ہوگی۔ وہ میرا ساتھ دے گا تو اس جنت سے محروم رہ جائے گا جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے پھر اس کے لیے یہ زندگی جہنم کے عذاب سے کم نہ ہوگی جس میں ہر سانس، ضمیر پر ایک تازیانہ ہوگی کہ بدبخت تو نے اپنی ہی ماں کی آخری چند سانسوں کو سکھ اور طمانیت کی جگہ دکھ اور آزار دیے اور اس سے چند دن اور جینے کا حق بھی چھین لیا۔ اگر اس نے ماں کی خاطر میری رفاقت کو قربان کیا، تب بھی یہ زندگی اس کے لیے ایک مستقل سزا ہوگی اور صرف وزیر خان ہی نہیں سلامت شاہ، فوما نجو اور نہ جانے کتنے بے گناہوں کے لہو کا خیال اُسے ستاتا رہے گا جو یومِ حشر اس سے انصاف کا طلبگار ہوگا۔ یہ احساس ہی اسے پاگل کر دے گا کہ اس نے اپنے مظلوم دوست کو آزمائش کی گھڑی میں تنہا چھوڑ دیا اور وہ منزلِ دار و رسن تک گیا تو ایک صدمہ اسے جرمِ بے گناہی کی سزا پانے کا تھا تو دوسرا دوستی کے نام کو رسوا کرنے والے محسن کی بے وفائی کا۔

خود میں اس پوزیشن میں ہوتا تو کیا کرتا؟ اس ماں کا ساتھ دیتا جسے بہرحال مرجانا ہے اور خواہ دنیا کی ساری خوشیاں بھی اس کے سامنے ڈھیر کر دی جائیں، اس کی زندگی کا طلبگار لمحہ جان کا نذرانہ لیے بغیر ٹلنے والا نہیں ہے۔ سب سے بڑا دکھ تو یہی ہے کہ آدمی خود کو اس لمحے کے مقابل بے بس پا کر زندہ انسانوں کی خوبصورت دنیا سے تہی دست جانے پر مجبور ہو اور پھر یہ بھی جانتا ہو کہ اپنے پرائے، جان سے پیارے اور جان کے دشمن، سب بہت جلد اسے بھول کر کاروبارِ حیات کی مصروفیت میں کھو جائیں گے۔ سوئم، چہلم، ایک آدھ برسی۔ پھر یاد کا کوئی بے کسک لمحہ۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ اطمینان کی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ جسم کے ساتھ ہی احساس بھی مر جاتا ہے اور جسم بھی مٹی ہو جاتا ہے ورنہ قبر میں لیٹے ہوئے آدمی کو یہ دکھ کتنا تڑپائے کہ اسے اتنی جلد فراموش کر دینے والی یہ کمینی دنیا، زندگی کے حسن سے بدستور آراستہ ہے اور خوشی کے خزانے سے اپنا حصہ وصول کرنے کی خود غرضانہ جدوجہد جاری ہے۔

کیا یہ سوال حساب کے قاعدے سے حل کیا جا سکتا ہے؟ ایک عورت (فرض کرو ماں) جس کو صرف چند دن جینا ہو، بیٹے کی طرف سے مایوسی کا دکھ اٹھا کے مر جائے تو بہتر ہے؟ یا ایک دوست جس کو ابھی نہیں مرنا ہے اسی عورت کی وقتی خوشی کی خاطر جینے کے حق سے محروم ہو جائے؟ کس کو دکھ دینا چاہیے؟ فائدہ کس کے دکھ میں ہے اور نقصان کس کے دکھ کا زیادہ ہے؟ نہیں۔ یہ نفع نقصان کا سوال ہی نہیں۔

معلوم نہیں میں کب تک چوکھٹ میں پیر سمیٹ کر توازن برقرار رکھے بیٹھا رہتا اور ایسے ہی خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا لیکن میری نظر نے سایۂ دیوار سے ایک اور سایہ جدا ہوتے دیکھا۔ یہ رابعہ تھی جو نجانے کب سے رات کے اس خاموش پہر میں دیوار سے ٹیک لگائے تنہا کھڑی تھی۔ میری طرف اس کی پشت نہ ہوتی تو وہ ضرور دیکھ لیتی کہ میں بھی اس کی طرح خیالات کے گرداب میں اکیلا ڈوب رہا ہوں، ڈوب کر ابھرنے کی کوشش میں امید کے ایک تنکے کا سہارا چاہتا ہوں اور روشنی کی ایک کرن کا متلاشی ہوں۔

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ مجھے اس پر رشک آیا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی کشمکش نہیں، کوئی خلفشار نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس فیصلے سے پوری طرح مطمئن بھی ہے۔

رابعہ اب دائیں جانب کے مختصر سے باغیچے میں لان پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ نیم شب کی چاندنی میں وہ بالکل کسی مرمریں مجسمے کی طرح نظر آتی تھی جس کے پیکر کے خدوخال کو اس مہارت سے تراشنے میں فنکار کے ہاتھوں کو خود قدرت نے اپنے کمالِ حسن آفرینی کا ذریعہ بنایا ہو۔ میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچا اور حلق سے مینڈک کی طرح آواز نکالی۔

وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔ میں جھک کر تسلیم بجا لایا اور پھر وہی آواز نکالی۔

”آدھی رات کو مینڈک کی طرح ٹرانے سے کیا ہوتا ہے؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”مینڈک ہو تو گلا صاف ہو جاتا ہے۔“ میں نے کھنکار کر کہا۔ ”اگر مینڈکی ہو تو زکام ہو جاتا ہے۔“

اسی وقت رابعہ کو چھینک آئی۔ دروازے پر مستعد کھڑے ہوئے سنتری نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ اس نے یقیناً یہ سمجھا ہوگا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے بھی رات کو شراب پی کر آؤٹ ہو جاتے ہیں اور کوٹھی والوں کے متعلق اس کے عقائد کو تقویت حاصل ہوئی ہوگی کہ سب بلا تخصیص اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوتے ہیں۔ ہم دونوں بے ساختہ ہنسے۔

”میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ایک گھنٹہ چوالیس منٹ بیالیس سیکنڈ تک سائے کو دیکھتی رہیں۔ پانچ منٹ چھ سیکنڈ تک چاندنی پر غور فرماتی رہیں۔ اور اب تین منٹ چار سیکنڈ سے میرے فرمودات عالیہ سے مستفید ہو رہی ہو۔ آخر کیوں؟ میرا مطلب ہے، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ مجھے اور تمھیں۔“ میں نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ ”کیا یہ الزام غلط ہے؟“

”نہیں۔“ رابعہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”مگر تم مدعی ہو یا مدعا علیہ؟ جواب تو تمھیں بھی دینا ہے۔“

”کرۂ ارض پر رات بھر جاگتے والوں کی تین اقسام مشہور ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اخبار چھاپنے والے، عاشقان مہجور اور اُلو۔“

رابعہ پھر ہنسی۔ ”تم نے جس زبان میں فریاد کی تھی، وہ کچھ اور تھی۔“

”اس کے بارے میں ایک شعر عرض کرتا ہوں ؎

جب مینڈک ٹراتے ہیں اُلو جاگتا رہتا ہے
کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلہ بھاگتا رہتا ہے“

”قافلہ چلتا رہتا ہے؟ کم سے کم محاورے کو تو بخش دو۔“ رابعہ نے کہا۔

”نہیں۔ جب کتے بھونکیں گے تو قافلے والے خود سرپٹ دوڑیں گے۔ محاورہ درست کر لیں۔ یہ ذاتی تجربے کی بات ہے۔“

رابعہ کو پھر ہنسی آئی اور مجھے بہت اچھا لگا۔ خدشات اور تفکرات کے بیاباں سے نکل کر میں یکلخت اپنے خوابوں کے دل نشیں جزیرے میں جا اُترا تھا جہاں رنگ اور خوشبو کی فراوانی تھی! حسن و رعنائی کے آبشار تھے اور گنگناتے چشموں کے گیت تھے۔

”اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے سکتہ کیوں طاری ہو گیا؟“ رابعہ نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کے کہا۔

میں چونکا۔ ”باتیں! ہاں، میں باتیں ہی تو کرنا چاہتا تھا کیوں کہ میں سوچتے سوچتے تھک گیا تھا۔“

”صرف سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا سکندر!“ وہ بولی۔

”صرف سوچتے رہنے سے آدمی پاگل تو ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور شاید تم نظر نہ آتیں تو میں بھی ہو جاتا۔ تم نے دیکھا کہ آثار پیدا ہو چلے تھے۔ میں نے جو بے سروپا باتیں کی ہیں، وہ اور کیا تھا؟ میرے دماغ کے بوائلر میں اندیشوں کی اسٹیم کا پریشر بڑھ گیا تھا۔ پریشر والو کھلنے سے کیسا شور پیدا ہوتا ہے مگر اس سے بوائلر نہیں پھٹتا۔ کچھ دیر پہلے میں بالکل اکیلا تھا اور بہت ڈرا ہوا تھا۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ اب مجھ سے باتیں کرو۔ وہ باتیں جن کا تعلق سکندر بخت کے مقدمات سے، اس کے مسائل اور اس کی مشکلات سے نہ ہو۔ تھانے، کچہری اور قانون کی دفعات سے نہ ہو۔ لاقانونیت سے نہ ہو۔ مستقبل کے کسی خوف، کسی تاریک پہلو اور کسی پریشانی سے نہ ہو۔ اپنی بات کرو۔ میری بات کرو۔ ان خوابوں کی بات کرو جو میرے بھی ہیں اور تمھارے بھی۔ اس محبت کی بات کرو جس نے مجھے تسخیر کر لیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے رات کے اندھیرے کو صبح کا اجالا تسخیر کرتا ہے۔ ہر صبح پہلے کاذب لگتی ہے۔ دھوکا۔ فریبِ نگاہ۔ مگر وہی صبحِ صادق کا اجالا بن جاتی ہے تو سحر کے یقین کو کون جھٹلا سکتا ہے۔“ بولتے بولتے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ وہ بُت بنی بیٹھی تھی اور چاندنی کے مدھم اجالے میں بھی اس کے عارض پر رنگ گلاب کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ سکون اور طمانیت کا ایک اجنبی اور مسرت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بخش احساس میرے وجود میں نشہ بن کے اترنے لگا۔ میں نے آرزو کی کہ کاش وقت کی گردش یہیں رک جائے۔ اس رات کا کا دوسرا کنارہ نہ ہو۔

"سکندر!" رابعہ کی آواز بیکراں وقت کے کسی ساحل سے آئی "میں تمھارے اس سوال کا جواب دوں گی جو تم نے سب سے پہلے کیا تھا۔ کہ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟ تم نے تو وجہ بتادی۔ وجہ میرے لیے بھی وہی تھی۔ میں بھی مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھی۔ تنہا تھی اور ڈری ہوئی تھی لیکن میں عورت بھی ہوں، صرف وکیل ہی نہیں۔ میں بھی سوچ رہی تھی اور تم نہ آتے تو شاید سوچتے سوچتے میں بھی پاگل ہو جاتی مگر میں صرف اپنے اور تمھارے بارے میں سوچ رہی تھی، کسی مقدمے اور کسی قانونی حوالے کے بارے میں نہیں۔ وہ دن کی دنیا ہے جس میں ہم سب ایک ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ تم اور میں۔ محسن اور شہلا۔ انکل رضوی اور شیرانی اور فوزیہ اور اس کی ماں۔ ہم سب ایک ساتھ پار اُتر جائیں گے۔ سلامتی کے کسی ساحل پر۔ یا اس منجدھار میں ڈوب جائیں گے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی۔ مجھے جینے کے لیے صرف ایک زندگی ملی ہے۔ اگر میں صرف اپنے لیے جینا چاہوں تو کیا یہ جرم ہے؟ خودغرضی ہے؟ اور خودغرضی ہے تو کیا بقا کی جدوجہد میں اپنے سوا سب کو نظرانداز کر دینا عین قانونِ فطرت ہے؟ ایک حیوانی جبلّت ہے؟ میں اپنی ایک زندگی کو ایک دنیا کی بقا کے مسائل پر قربان کیوں کروں؟ کیا دیا ہے آخر اب تک اس دنیا نے مجھے کہ میں اس کی خاطر کچھ کروں اور آئندہ کیا دے گی؟ دُکھ، بدنامی اور مصائب کے سوا۔ میں اپنی دنیا کو لے کر الگ کیوں نہ ہو جاؤں؟ خوشی پر میرا حق بھی تو ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے آنکھیں کھول کر اور سیدھا بیٹھ کے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ بولی "کیونکہ وہی تم بھی چاہتے ہو۔ اپنے آپ سے تو جھوٹ مت بولو سکندر!"

"حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے رابعہ!" میں نے کہا "صرف آرزو کرنے سے ہی بات نہیں بنتی۔"

"ہونہہ!" وہ سر جھٹک کر بولی۔ اس کے بال چہرے پر آئے۔ اس نے نزاکت سے انھیں پھر شانوں پر پھیلا دیا "آرزو کیا ہے؟ فقط اپنے ارادوں کی کمزوری۔ ورنہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔"

"راہ تو ہے لیکن منزل کہاں ہے؟ ابھی تو نشانِ منزل کا بھی پتا نہیں ہے؟"

"مجھے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ میری اور تمھاری منزل ایک ہے تو ڈر کیسا؟" وہ بولی "میرا ہاتھ تھام لو۔ میں تمھیں سیدھا راستہ دکھاتی ہوں۔ ورنہ جن راستوں سے ہم منزل تک پہنچنے کو سرگرداں ہیں، وہ اتنے پُرپیچ ہیں کہ ہم تمام عمر بھٹکتے رہیں گے اور منزل ہمیشہ سراب کی طرح دور ہوتی جائے گی۔ ان سب جھگڑوں، بکھیڑوں کو یہیں چھوڑ دو۔ سارے رشتوں کو اور سب بندھنوں کو توڑ دو۔ چلو اپنی دنیا میں چلیں۔"

"تم زنانہ ناولوں کے ڈائیلاگ بول رہی ہو؟ اس دنیا سے الگ کون سی دنیا ہے؟ سوائے عالمِ ارواح کے؟"

"نہیں۔ میرے سامنے ایک عملی صورت ہے۔" وہ بُرا مانے بغیر بولی "ذرا تصور کرو، دنیا کا دوسرا کنارہ کہاں ہے۔ دنیا کی تین ارب آبادی کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے۔ قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی تک۔ ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک۔ پانچ برِاعظم ہیں۔ سوا سو ملک ہیں۔ سیکڑوں شہر، لاکھوں قصبے۔ اتنی وسیع زمین پر انسانوں کے اس سمندر میں ایک مرد اور ایک عورت کے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے؟ کسی دور افتادہ، خیال اور امکان کی دسترس سے دور ایک چھوٹا سا گھر بھی نہیں جو کسی گمنام اور نادیدہ و ناشنیدہ گاؤں میں ہو؟"

میں بھونچکا رہ گیا "تم کہہ رہی ہو کہ ہم دونوں بھاگ جائیں!؟"

"بے شک اخباروں اور کتابوں کی دنیا میں اور ہمارے گھروں میں یہ لفظ مختلف معانی رکھتے ہیں۔ لیکن کیا اس کے باوجود لوگ پناہ کے لیے بھاگتے نہیں رہتے۔ ہمّت ہوتی ہے تو کبھی بچّے، کبھی ماں اور کبھی باپ اس گھر سے بھاگ جاتے ہیں جہاں خوشی نہ ہو۔ بزدل ہوں تو ذمّے داریوں سے بچ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہم سب دن سے بھاگ کر رات کی آغوش میں اور حقائق سے بھاگ کر خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ سب جو مار دھاڑ، عشق و محبت اور ہنسی و مذاق سے بھرپور فلمیں دیکھتے ہیں وہ بھی تو تین گھنٹے کے لیے عملی زندگی سے بھاگ جاتے ہیں اور اسکرین کی دنیا میں انھیں خوشی مل جاتی ہے۔ جنھیں کہیں خوشی نہ ملے، وہ نشہ یا خودکشی نہ کر سکیں تو عقل و ہوش کی دنیا سے بھاگ جاتے ہیں۔ پاگل خانے کی دنیا میں بھی انہیں خوشی مل جاتی ہے۔"

"تمھارا... مطلب ہے میں اور تم اس ملک سے نکل جائیں؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"ہاں۔ ذرا سوچو کتنے مجرم ہیں جو اس طرح اپنے اپنے ملک سے نکل گئے اور انھوں نے اپنے وسائل سے دوسرے ملکوں کی شہریت حاصل کر لی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو رابعہ!" میں نے کہا "تم قانون کو سمجھتی ہو۔ اتنا تجربہ مجھے بھی ہے کہ غلط نام سے پاسپورٹ کیسے اور کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بھیس بدل کے یا فرضی نام اختیار کر کے مشرق مغرب یا شمال جنوب کی طرف نکل جانے کے کتنے راستے ہیں۔ خشکی کے راستے۔ سمندری راستے اور ہوائی سفر کے راستے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنا پیسہ اب تمھارے پاس ہے اسے زرِمبادلہ کی صورت میں باہر منتقل کرنا ہو تو کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ رقم یقیناً اتنی ہے کہ اس سے ہم۔ بقول تمھارے ہانگ کانگ سے لاس اینجلز تک، کہیں بھی سکونت اختیار کر سکتے ہیں اور خود کفالت کے لیے آمدنی کے مزید ذرائع بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ارادوں میں کھوٹ نہیں۔ ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے اور جان بچانا کوئی جرم نہیں۔ ہم باقاعدہ شادی کر کے عام لوگوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ خواہ ہمارے نام کچھ بھی ہوں۔ جیسے فلمی دنیا میں ممتاز بیگم کی جگہ مدھوبالا اور یوسف خان کی جگہ دلیپ کمار نے لی۔ ویسے ہی ہم مسٹر اینڈ مسز ایکس وائی زیڈ ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہم جانتے ہیں ہم کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ... قانون کی دسترس سے دور ہو جانے کے بعد ہم سب آفات، تمام مصائب اور سارے مسائل و تفکّرات سے محفوظ ہو جائیں گے اور میرے مقدمات کی فائلیں بالآخر داخلِ دفتر ہو جائیں گی۔ ان کو دیمک چاٹ جائے گی خواہ ریکارڈ پر مفرور مجرم کا لیبل لگا رہے۔"

دم لینے کے لیے اور اینٹی کلائمکس کی تیاری کے لیے میں نے وقفہ دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ رابعہ جانتی تھی کہ میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اور اس میں فیصلہ کن موڑ باقی ہے۔

"ان تمام حقائق کو سمجھتے ہوئے بھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا "میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے نہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ نہیں۔ بقول فلمی شاعر۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ میں ہیرو بننے کے خبط میں بھی مبتلا نہیں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ فکر مت کرو۔ میں ایک ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا اور دشمنوں کی ایسی تیسی۔ ہم یہیں رہ کے شادی کریں گے اور جیسا کہ عموماً فلموں میں ہوتا ہے۔ ولن کا خانہ خراب ہو گا اور آخری منظر میں ہیرو۔ ہیروئن کی خانہ آبادی ہو گی۔ اصل بات یہ ہے رابعہ کہ مجھ پر اپنی جان کا نہیں دوسروں کی جان کا قرض ہے۔ سب سے پہلے وزیر خان کا دردناک انجام مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں اس کی روح کے لیے سکون کا سامان فراہم کروں۔ جذباتی رشتے رابابا تھا۔ اس نے جس نیک نیّتی اور فراخدلی سے میری پرورش پر اپنی زندگی قربان کی اس کا صلہ میں اس طرح نہیں دے سکتا کہ صرف اپنی خوشی کو مقدّم سمجھتے ہوئے بھاگ جاؤں۔ ہم کسی دور افتادہ اور گمنام قصبے کے چھوٹے سے گھر میں ـــــ قانون اور اپنے دشمنوں کے عتاب سے تو محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن خوش نہیں رہ سکتے رابعہ! ضمیر کی ایک خلش ہم دونوں کے لیے ساری عمر کا آزار بن جائے گی کہ ہم نے ان سب کے لیے کچھ نہیں کیا جنھوں نے ہماری خاطر جان تک دے دی۔ مظلوم تم بھی ہو شہلا بھی ہے۔ یاسمین نام کی ایک لڑکی بھی ہے۔ بھر گل رُخ ہے اور ایک ایماندار کسٹم آفیسر نعیم ہے جو روپوش رہنے پر مجبور ہے۔ میں بزدلی اور کم ہمتی کا طعنہ برداشت کر لوں گا۔ اپنی خودغرضی کو جواز فراہم کر دوں گا۔ لیکن کیا میں اس بات پر خود کو معاف کر سکوں گا کہ میرے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے سے جیت ان کی ہوئی جو ظالم تھے۔ اپنی طاقت کے زعم میں۔ نعوذ باللہ۔ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ہر سکندر بخت اگر مفرور مجرم ہو جائے تو دنیا میں صرف وہی پیشہ ور بے ضمیر مجرم رہ جائیں گے جو گڑی سلوا ہوں گے اور چوہدری دلاور ہوں گے۔ وزیر خان اور سلامت شاہ اور فوما نچو اسی طرح بے بسی کی موت مرتے رہیں گے۔ نہیں رابعہ! اس احساس کے ساتھ زندہ رہنے میں میرے لیے خوشی کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ دور کہیں سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ کوئی حاکم نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ ہر ڑی سلوا، ہر چوہدری دلاور، ہر خسرو جمشید، ہر ظالم اور فرعون۔ ہر شیطان اور ہر شکاری سے بہت بڑا ہے، بہت زیادہ طاقتور ہے۔ وہ بچانے والا ہے اور اس کا ہاتھ مارنے والے کے ہاتھ سے زبردست ہے۔ اس کی عدالت کا قانون اندھا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دنیا نیکی کے مفہوم اور سچ کے وجود کو کہاں سمجھتی اور خود آدمی نے اپنی ہی دنیا کو کب کا تباہ کر دیا ہوتا۔

مجھے رابعہ کے اٹھ کر جانے کا علم نہیں ہوا۔ چشمِ تصوّر میں وہ پیکرِ حسن و خوبی میرے مقابل تھا اور میں آنکھیں بند کیے اس چھوٹے سے گھر میں گھوم رہا تھا جو سیکڑوں سے ہزاروں میل دور دامنِ کوہ کے ایک چھوٹے سے پُرفضا قصبے کے آخری کنارے پر تھا۔ سُرخ اینٹوں کے اس مکان کی کھڑکیاں اور دروازے سفید تھے اور اس کی مخروطی چھت پر ایک چمنی کے ساتھ ٹی وی کا انٹینا لگا ہوا تھا۔ اندر آتشدان میں شعلے بھڑک رہے تھے جن کا عکس فائر اسکرین کو روشن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر رہا تھا۔ بند کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے برفباری کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ چھت پر ڈھیر ہو جانے والی برف پھسل پھسل کر نیچے گرنے لگی تھی۔ ٹی وی پر کوئی تصویر بھی نظر آ رہی تھی لیکن ہم خود تصویر بنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنی محبت کے عکس کو روشن دیکھ کر خوش تھے۔ میں اُس سے نظر نہ ملا سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ اس کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ خود شاید اندر اپنے کمرے میں بستر پر پڑی اپنے خوابِ آرزو کی شکست پر آنسو بہا رہی تھی۔ آخر کیا ہو جاتا ہے اچھی بھلی بالغ اور سمجھدار عورتوں کو۔ محبت کرتی ہیں تو سب ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ وہی رومان پرور خیالات کی غیر عملی دنیا میں رہنے والی نادان لڑکی جو صرف جذبات کی زبان سمجھتی ہے اور عقل سے سب رشتے توڑ دیتی ہے۔ میرا گھر میری جنت۔ شوہر میرے سر کا تاج اور میرے بچے، میرے گلشن کے پھول۔ کیا گاؤں کی اُلھڑ دوشیزہ۔ کیا اسکول گرل اور کیا وکیل۔ ان سب کی تمنائیں خوشیاں اور خواب اتنے عام اور مشترک کیوں ہوتے ہیں۔ فلم میں ہیروئن بھی مطالبہ کرتی ہے کہ چل چلیے دنیا دے اس نکڑے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ اور رابعہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ہم رہیں ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ بات تو ایک ہی ہے۔ کوئی سمجھائے کہ بابا۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تو ٹپ ٹپ آنسو، شکوے۔ ہسٹریا۔

میں اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ رابعہ کی بات نے میرے خیالات کے دھارے کا رخ بدل دیا تھا۔ میں اب اپنی زندگی کو لاحق خطرات اور اپنے مقدمات کے بارے میں نہیں، رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کیسے تفکرات کا بارِ گراں غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ صرف ایک خیال رہ گیا تھا۔ وہ مجھے اتنا چاہتی ہے؟ دیوانگی کی حد تک ہے۔ میری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہے؟ اپنا نام۔ اپنا معزز پیشہ۔ اپنا گھر اور وطن۔ اتنا بھروسہ ہے اسے مجھ پر؟ اور اس خیال میں میرے لیے وہ سکون بخش راحت اور مسرت تھی کہ جب میں کھڑکی کے راستے پھر کمرے میں وارد ہوا تو مسکرا رہا تھا۔

محسن آلتی پالتی مارے مہاتما بدھ کی طرح بستر پہ بیٹھا تھا اور اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"السلام علیکم!" میں نے خفت کو چھپانے کے لیے خوشدلی سے کہا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"

"یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر روبوٹ کی طرح کہا۔ "مگر ایش ٹرے میں ایک ٹوٹا تک نہ چھوڑنا بڑی کمینگی ہے۔ ایک سگریٹ ملے تو مزید گستاخی کروں آپ کی شان میں۔"

"ضرور، ضرور۔" میں نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی گود میں ڈال کے کہا۔

اس نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیا اور ڈانٹ کر بولا۔ "یہ کیا ہو رہا تھا؟ باغ میں۔"

"باغ میں؟ کون سے باغ میں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔ "کیا ہو رہا تھا؟ کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ کسی بھی باغ میں۔"

"میری پرنانی ایسے ہی بال بکھرائے راتوں کو باغ میں گھومتی تھیں۔" محسن نے کہا۔ "ان پر ایک جن فریفتہ ہو گیا تھا۔ خاصا وی آئی پی قسم کا۔"

"یہ تمھاری پرنانی نہیں تھیں۔" میں نے کہا۔ "رابعہ تھی۔"

"کہہ رہی ہو گی میرے ساتھ نکل چلو۔" محسن بولا۔

میں اچھل پڑا۔ "تو... تو سن رہا تھا!"

"نہیں۔" محسن ہنستے ہنستے دُہرا ہو گیا۔ "مگر یہ مخلوق ایک ہی زبان بولتی ہے۔ ہم نے یہ بال ایسے ہی راتیں کالی کر کے سیاہ کیے ہیں نورِ چشم۔ دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اس لیے سب جانتے ہیں۔"

محسن نے مذاق کیا تھا اور اندھیرے میں تیر چلایا تھا مگر غلط نہیں کہا تھا۔ "کمال ہے یار!" میں نے کہا۔ "رابعہ اتنی عقل و ذہانت، اعلیٰ تعلیم اور تجربے کے باوجود بہت کمزور عورت ہے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ رابعہ کیا چاہتی تھی۔

"یار تم دونوں ہنولولو چلے جاؤ۔ وہاں میری ایک پین فرینڈ ہے۔" محسن نے کہا۔ میں رابعہ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"پہلے تو شملا کے ساتھ ٹمبکٹو چلا جا۔ وہاں میری ایک پین فرینڈ رہتی ہے۔" میں نے جل بھن کر کہا۔

"خیال تو اچھا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بس ایسا کرتے ہیں کہ ان دونوں کو یہیں ڈراپ کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ فالتو پرسنل بیگیج پر خرچ کریں۔ تو خالی ہاتھ ٹمبکٹو چلا جا۔ میں جاتا ہوں ہنولولو۔ اپنی اپنی پین فرینڈز سے...."

"پین فرینڈ؟ ۔ ؟" رضوی صاحب نے اچانک اندر آ کے کہا۔ "ارے بھئی ابھی تک یہ بچوں والی بابی...!" وہ حسبِ عادت صبحدم لان پر ٹہلنے کے لیے نکلے تھے مگر ہمارے کمرے میں روشنی دیکھ کر ادھر آ گئے۔ محسن نے بڑی عجلت میں پیکٹ چھپایا اور جلتی ہوئی سگریٹ کو پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اسے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا سکتا۔

"السلام علیکم انکل!" ہم دونوں نے ایک ساتھ اٹھتے ہوئے بوکھلا کے کہا۔

رضوی صاحب مسکرائے۔ "یہ آج تم دونوں کی سحر خیزی۔ خدا خیر کرے۔ کوئی نیا گل کھلانے کا خیال ہے؟"

"نہیں انکل!" میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "یہ تو ایک اچھی عادت ہے۔ انگریز کہتے ہیں نا۔ ..."

"بالکل بالکل۔" رضوی صاحب نے بیڈ کے نیچے سے دھوئیں کی بل کھاتی لکیر کو دیکھ کر کہا۔ "مگر یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے۔ انگریز یہ بھی کہتے ہیں نا کہ جہاں دھواں ہو گا وہاں آگ ضرور ہو گی۔" انھوں نے نیچے جھک کر سگریٹ اٹھائی اور محسن کو پیش کی۔ "شوق فرمائیے۔"

محسن نے جھینپ کر سگریٹ لی اور ایش ٹرے میں بجھا دی۔

"وہ... میں... میرا خیال ہے۔ میں غسل کر لوں۔" وہ جلدی سے اٹھا۔ باتھ روم تک پہنچتے پہنچتے ایک اسٹول سے ٹھوکر کھا کے منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ پھر دروازہ کھولے بغیر باتھ روم میں داخل ہونے کی کوشش میں دروازے سے ٹکرایا اور سر سہلاتا، دانت نکالتا روپوش ہو گیا۔

"گدھا۔" رضوی صاحب نے شفقت سے مسکرا کے کہا اور نائٹ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے خالی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئے۔

"جی۔" میں نے کہا۔ سوائے اس کے میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

"جی کیا؟ تم خود کیا ہو؟" انھوں نے فرمایا۔ "الّو۔ آخر تم لوگوں کو نیند کیوں نہیں آتی۔ ارے بھئی جوانی میں تو آدمی گھوڑے گدھے سب بیچ کر سوتا ہے۔ ہم بھی سوتے تھے۔ کیا باتیں کرنے کے لیے دن کم ہے کہ رات کو بھی قربان کیا جائے۔ وکیل اور موکل کس مسئلے پر قانونی موشگافی میں مصروف تھے؟"

اب میرے بوکھلانے کی باری تھی۔ "وہ... بس یہی..... دراصل مسائل اتنے ہیں۔ پریشانیوں کے باعث۔"

"خدا نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ پریشان ہونے کے لیے نہیں اور کیا محض پریشان ہونے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔" انھوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ "خرابی یہی ہے۔ آرام نہ کرنے سے جسم پر، اعصاب پر اور ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ رات کو سکون سے سونے کے بعد جو شخص تازہ دم ہو کے اٹھتا ہے وہ اپنے مسائل کو بہتر طور پر حل کرنے کی [صلاحیت] رکھتا ہے۔ خیر، میں کوئی لیکچر دینے نہیں آیا تھا۔ تم عاقل و بالغ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مختار ہو۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں انکل!" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"ہاں۔ مگر کسی توقع پر نہیں۔" انھوں نے کہا۔ "اچھا ہوا تمھارا مشیرِ اعلیٰ چلا گیا۔ ورنہ مجھے تم کو خاص طور پر اپنے ساتھ لے جانا پڑتا۔ مجھے تم سے ہی بات کرنی تھی۔ اٹھو چلو میرے ساتھ۔"

میں نے بلا چون و چرا تعمیل کی اور ان کے ساتھ لان پر آ گیا۔

"رات کو شیروانی کا فون آیا تھا۔" انھوں نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔

"خیریت تو ہے نا وہاں انکل؟" میں نے ان کے لہجے کی تشویش کو محسوس کر لیا۔

"نہیں۔ بظاہر خیریت نہیں ہے۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "شیروانی نے تو مجھے تسلی دینے کے لیے الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ پریشان تھا۔ مسز شیروانی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ وہ سی ایم ایچ میں داخل ہیں۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ یہ کولیپس۔ اردو میں اس کا متبادل کیا ہے؟ خیر۔ تو یہ نتیجہ ہے غیر معمولی اعصابی کشیدگی اور ذہنی دباؤ کا۔ اور پریشانیوں کا۔ جبکہ انھیں تاکید تھی کہ وہ خوش رہیں۔ یہ ڈاکٹر لوگ آخر دنیا کو اپنی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ جسے روٹی میسر نہیں اسے کہتے ہیں کچھ نہیں۔ انیمیا ہے۔ خوب پھل انڈے، گوشت کھاؤ۔ وہی کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ اور وہ جو پانچ سو کمانے کے لیے صبح سے شام تک لوہا پتھر کوٹتا ہے اور ٹی بی میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے کہتے ہیں آرام کرو اور تفکرات سے دور رہو۔ وہ غریب آرام کرے گا تو کنبہ فاقے کرے گا۔ اس کو تو مرنا ہی ہے۔ یہ راج روگ ہیں۔ گنگو تیلی کیا کرے۔" وہ خفگی میں اصل بات تو بھول گئے تھے لیکن میں نے ان کو ٹوکا نہیں۔ انھوں نے ایک گہری سانس لی۔ "میرا خیال ہے کہ میرا بلڈ پریشر کچھ ہائی ہونے لگا ہے۔ اس عمر میں چیک کراتے رہنا چاہیے۔ میں بات کر رہا تھا مسز شیروانی کی۔"

"کیا خدانخواستہ.. معاملہ سیریس ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"نہیں۔ اب تو ہوش میں ہیں۔ مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انھوں نے۔ انھوں نے کیا۔ یہ تو قدرت کا بہت پہلے سے تحریر کردہ فیصلہ ہے جسے ڈاکٹر صحیح نہ پڑھ سکے۔ بہرحال، جتنی مہلت ان کے اندازے کے مطابق باقی تھی۔ وہ اب آدھی بھی نہیں رہی اور کوشش تو سب نے کی تھی لیکن یہ بات مسز شیروانی سے چھپی نہیں رہ سکی۔ ہوتی ہے کوئی غیبی قوت۔ یا چھٹی حس۔ جو پُرخطر حالات میں قبل از وقت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

خبردار کر دیتی ہے۔ انھوں نے سب کو بتا دیا ہے کہ ان کا آخری وقت آ گیا ہے اور ڈاکٹروں کی رائے یا دوسروں کے دلائل سے سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے کل دوائیں وغیرہ سب پھینک دیں اور واپس گھر جانے پر اصرار کیا۔ اس سے مزید تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ علاج جاری رہتا تو کچھ وقت اور گزر جاتا۔ مگر دوا نہ کھانے سے...'' انھوں نے مایوسی سے سر ہلایا ''آج شیروانی اسے گھر لے جائے گا۔ میں نے بھی کہا۔ اب کیا فائدہ زبردستی کرنے کا۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر ہم مختصر سے لان پر ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں جانتا تھا وہ کچھ اور کہنے کی سوچ رہے ہیں اور شاید مناسب الفاظ کی جستجو میں ہیں۔ تذبذب ان کی صورت سے عیاں تھا۔

''پھر تو محسن کو فوراً گھر چلا جانا چاہیے۔'' میں نے اس خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

''ہاں، اسے تو جانا ہی ہے۔'' وہ بے خیالی میں سر ہلا کے بولے ''بس وہ ابھی ناشتا وغیرہ کر لے اور روانہ ہو جائے۔ ڈر مجھے یہ ہے کہ وہ انکار نہ کر دے۔''

''وہ اتنا بے حس اور سنگدل یا نافرمان تو نہیں ہے انکل!'' میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے وہ اپنی ماں کے لیے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر قربانی دے سکتا ہے۔''

''ہاں۔ سوائے شاید ایک تمھاری دوستی کے۔'' انھوں نے اتفاق کیا۔ ''لیکن یہ قربانی کسی نے بھی نہیں مانگی ہے۔ ہوتا یہ ہے سکندر! کہ بعض اوقات آزمائش کے مرحلے توقعات سے زیادہ سخت ثابت ہوتے ہیں۔ وہ شخص جس کا دل موم کا بنا ہوا ہو، کسی کو مرتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے والی اگر اپنی ماں ہو اور اس کی موت دوسروں کے لیے بھی اتنی پُر عذاب ہو، تو وہ ڈر جاتا ہے۔ نزع کے قرب سے تدفین تک کے مراحل۔ سب انتہائی صبر آزما ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یادوں کو ذہن سے خارج کر دینا آسان نہیں ہوتا۔ زیادہ آسان یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سطر کا ٹیلی گرام پڑھ لے کہ ماں مر گئی یا ٹیلیفون پر اطلاع ملنے کے بعد بھی اس وقت پہنچے جب دیکھنے یا کرنے کو کچھ نہ رہے۔ وہ باپ کو تسلی دے۔ ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھے اور لوٹ آئے۔''

''محسن ایسا کبھی نہیں کرے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی ایک بہن بھی ہے۔ جو اس سے چھوٹی ہے۔''

''اسی کا تو مسئلہ ہے۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''دو دن کے اندر اندر وہ اس کا نکاح اور رخصتی سب کر دینا چاہتی ہیں۔ آج یا کل میں... کوئی پروفیسر ہے...''

''ایاز۔'' میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو پہلے سے طے تھی۔''

''تم... تمھیں کوئی صدمہ نہیں ہوا؟'' انھوں نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں؟''

''ایاز بہت اچھا آدمی ہے۔'' میں نے نظر چرا کے کہا۔ ''فوزیہ اس کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن رہے گی۔''

''اور تم.... میرا خیال تھا کہ تم بھی اسے چاہتے تھے۔ اس سے منسوب تھے۔ باقاعدہ نہ سہی۔''

''وقت کے ساتھ آدمی کے خیالات۔ اس کی پسند ناپسند بہت کچھ بدل جاتا ہے انکل! ہم سب ایک مسلسل تغیر کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ بقولِ شاعر۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔'' میں نے کسی یقین کے بغیر اپنا دفاع کیا۔

''جذبات کی اس تبدیلی کا ذمے دار کون ہے؟ تم یا فوزیہ؟''

''میں انکل!'' میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ ''خود میں نے اسے ٹرن ڈاؤن کیا۔ کسی مجبوری کے بغیر۔ ولایت میں رہ کے میرے جذبات وہ نہیں رہے تھے۔ یہ بات میں نے محسن سے بھی کہہ دی تھی اور فوزیہ سے بھی۔ میں جھوٹ کیسے بولتا ان سے۔''

رضوی صاحب نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ''سنا تو میں نے بھی تھا۔ اچھا کیا جو تم نے تصدیق کر دی۔ میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا۔'' انھوں نے گھڑی دیکھی۔ ''ناشتا کرنا چاہیے۔''

''ایک بات اور بتا دوں انکل!'' میں نے کہا۔ ''محسن کی ماں نے اس کی نسبت بھی کسی جمیل صاحب کی لڑکی سے طے کر دی تھی جسے محسن نے دیکھا تک نہیں۔ اس کا نام تک نہیں جانتا وہ۔ مگر وہ ماں کی خوشی کے لیے اس رشتے کو قبول کر چکا تھا حالانکہ وہ شہلا کو پسند کرتا ہے اور محسن ایسا آدمی ہے کہ جبر کے تحت ہونے والی شادی پر بھی تمام عمر خوش رہنے کی اداکاری کر لیتا مگر کسی پر اپنا دکھ ظاہر نہ ہونے دیتا۔''

''خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔'' انھوں نے میرے ساتھ اندر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت غلط لوگ ثابت ہوئے، بات کر کے مکر گئے۔ کسی لڑکے کا پیغام آیا تھا جو امریکہ میں ہے، انھوں نے راتوں رات نکاح پڑھوا کے لڑکی کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''اس کا علم آپ کو کیسے ہوا.... میرا مطلب ہے محسن...؟''

''مجھے شیروانی نے رات کو بتایا۔ لیکن اس نے یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائی ہے۔ اس سے کہا ہے کہ لڑکی یرقان میں مبتلا ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ ورنہ وہ تو مصر تھی کہ دونوں کام ایک ساتھ ہو جائیں۔ اسے حقیقت معلوم ہو جاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب لڑکی کو ایک ہفتہ تک اسپتال میں رکھا جا سکتا ہے۔'' رضوی صاحب نے کہا۔

''ایک ہفتہ؟ کیا اس کا مطلب ہے کہ محسن کی ماں... اس سے زیادہ...''

''ہاں برخوردار! اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''جاؤ ذرا اطمینان سے محسن کو سب سمجھا دو اور پھر جلدی سے ناشتے کے لیے آ جاؤ۔ غسل تو تم بھی کر دگے۔''

محسن اور بیگم رضوی صوفے پر بیٹھے بڑی متانت سے گفتگو میں مصروف تھے جو بہت غیر معمولی بات تھی۔ بیگم رضوی کے سامنے ہم دونوں سنجیدگی سے بات کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کو میری، محسن یا رابعہ کی باتوں پر یا لڑائیوں پر ہنسی آتی تھی تو ہمیں بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی اس بے تکلفی کا مظاہرہ رضوی صاحب کی موجودگی میں ناممکن تھا۔ جن کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا مگر ان کا رعب اور دبدبہ پورے گھر پر قائم تھا۔ رابعہ ان کے سامنے اتنی ہی متانت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے مجھ سے نگاہیں نہیں ملائیں مگر مجھے اس کے دھلے دھلائے شگفتہ چہرے پر برگشتگی یا شرمندگی کے آثار بالکل محسوس نہیں ہوئے۔

''محسن!'' میں نے موقع پا کے کہا۔ ''وہ ذرا ایک منٹ۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' محسن نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''آنٹی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

بے اختیار میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ یوں جیسے میرے سر پر رکھا ہوا پہاڑ کے برابر بوجھ بخارات بن کے فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ ''تھینک یو آنٹی! آپ نے میری مدد کر کے میری مشکل آسان کر دی۔'' میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟''

''محسن ابھی پنڈی جا رہا ہے۔'' بیگم رضوی نے مجھے مطلع کیا۔ ''ریل کار تو نکل گئی ہے۔ ویگن ہر وقت مل سکتی ہے۔''

نہانے کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماحول مجموعی طور پر سوگوار تھا جو ایک قدرتی بات تھی۔ ''آپ محسن کے ساتھ چلی جائیں۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''اور گاڑی لے جائیں۔''

''بچوں کا کیا ہو گا؟'' بیگم رضوی نے بالکل گھریلو بیویوں کی طرح کہا۔ ''انھیں بھی لے جانا ہے؟''

نہیں۔ میرے خیال میں ان کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ میں کچھ کر لوں گا۔ ساتھ والوں کے گھر میں انھیں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''ہم لوگ شام یا رات تک آ جائیں گے۔''

آخر آپ سب لوگ ہمارے ساتھ کیوں نہیں جا سکتے؟'' بیگم رضوی نے کہا۔

''میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''فون کر سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ دو چار دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ سب جانتے ہیں میں بلاوجہ چھٹی نہیں کرتا۔ کوئی مجھ سے سبب بھی نہیں پوچھے گا۔''

''میرے کیس میں میرے ساتھی پیش ہو سکتے ہیں یا تاریخ لے سکتے ہیں۔'' رابعہ نے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا

''مشکل ہے سکندر کے لیے۔'' رضوی صاحب نے کہا۔ ''یہ عدالت کی اجازت کے بغیر شہر سے نہیں جا سکتا۔ تمھاری اگلی پیشی کب ہے؟'' انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

''ابھی کافی دن ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اجازت ملنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے؟''

''اجازت عدالت کی صوابدید پر ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''آج ہی مل سکتی ہے۔ انکار بھی ہو سکتا ہے اور اس کے امکانات زیادہ ہیں۔''

''کیوں؟ جب میرے ضامن موجود ہیں...'' میں نے کہا۔

''عدالت کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے خلاف اپیل کی جا سکتی ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''وہ جج اس معاملے میں بہت سخت ہے جس کے پاس تمھارا کیس ہے۔ وہ تم سے دس سوالات کرے گا اور فیصلہ یہ دے گا کہ اجازت دینے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ملزم کا اس خاندان سے براہِ راست کوئی رشتہ نہیں۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن ہوں تو انکار کا جواز نہیں رہتا۔ دراصل زیرِ ضمانت ملزم جو اس نوعیت کے مقدمات میں ماخوذ ہوں، گھومنے پھرنے کے لیے ایسے ہی بہانے کرتے ہیں۔ فلاں دوست یا کسی کزن کی فیملی میں کچھ ہو رہا ہے۔ جھوٹ سچ کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے۔''

''تم چھوڑو اس سارے چکر کو۔'' بیگم رضوی نے کہا۔ ''ابھی نہ پیشی ہے نہ کوئی سمن آنے کو ہے۔''

''یہ... خلافِ قانون ہے بیگم؟'' رضوی صاحب نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں۔ ہے۔ مگر تم سڑک پر سے گزرتے ہو تو کتنی جگہ تمھاری نظر خلافِ قانون کام ہوتا دیکھتی ہے مگر تم نظر انداز کر کے گزر جاتے ہو۔ گاڑیاں غلط جگہ کھڑی ہوتی ہیں۔ خود

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تمھیں لوگ غلط سائڈ سے اوورٹیک کر جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر حجام سے لے کر فال نکالنے والے طوطے تک سب بزنس کرتے ہیں۔ پابندی کے باوجود لوگ کارپوریشن کے نلکوں پر نہاتے ہیں۔ نہر کے پل پر بچے تک سڑک سے کودتے ہیں اور اس ریلوے پھاٹک کو بند ہونے کے باوجود سائیکل اٹھا کے کراس کرتے ہیں۔ اور شب برات پر کیا تمھارے بچے آتش بازی نہیں کرتے ؟ پھر اس بات کو کیوں نظر انداز نہیں کرسکتے تم، جو بالکل جائز ہے۔" بیگم رضوی کو میں نے کبھی اتنی دیر تک مسلسل بولتے نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح رضوی صاحب کے سامنے اختلافِ رائے کرتے سنا تھا۔

"دیکھا بی بی رابعہ؟" خلاف توقع رضوی صاحب نے مسکرا کے کہا "تم ہی وکیل نہیں ہو اس گھر میں۔"

"ویسے کسی کو معلوم تو نہیں ہوسکتا انکل!" رابعہ نے کہا "لوگ تو تین تین مہینے تک سمن وصول نہیں کرتے۔ گھر میں موجود ہونے کے باوجود۔ ایسا کوئی انتظام کرلیں کہ کوئی آئے تو کہہ دیا جائے محسن صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ صرف ایک ہفتے کی بات ہی تو ہے۔" یکلخت اسے احساس ہوا کہ یہ آخری جملہ جو غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا تھا کتنا غلط تھا۔

"اگر یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس وقت ہم سب وہاں موجود ہوں۔" بیگم رضوی نے فوراً خلا کو پُر کر دیا۔ "تمام عمر پچھتانے سے بھی بعد میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس بچی کی رخصتی میں ہم شریک نہ ہوئے تو کون ہوگا۔"

محسن اچانک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کی حالت کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ برداشت کر رہا تھا مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ پھر میں نے رابعہ کو اپنے پیچھے آتے دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" رضوی صاحب نے بھی ناشتا ادھورا چھوڑ کے کہا۔ "ہم سب جائیں گے۔ ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر۔"

محسن اپنے کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پلٹا اور مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ یہ زندگی میں دوسرا موقع تھا جب میں نے اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر خود کو بے بس محسوس کیا۔ محسن باہمت اور اپنے دُکھ کو ہنس کر جھیلنے والا آدمی تھا جس کی نگاہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر رہتی تھی۔ پہلا جذباتی صدمہ مریم کی موت تھی۔ اس حادثے کے بعد وہ سارا دن روتا رہا تھا اور پھر مہینے رہا تھا۔ کھویا کھویا سا اور گرد و پیش سے بے خبر۔ اس کی نظریں اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں اور وہ یکلخت ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتا تھا۔ کبھی بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا تھا۔ محفلِ یاراں میں تنہا رہ جاتا تھا۔ فلم یا تھیٹر کے دوران میں احساس ہوتا تھا کہ اس کی توجہ سامنے کے منظر سے ہٹ گئی ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ میں نے جب بھی اسے ٹوکا اس نے اعتراف کیا کہ یار نہ جانے کیا بات ہے۔ باجی کی موت کو میں حقیقت سمجھ کے تسلیم کر چکا ہوں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو مجھے بہت عزیز تھی۔ میں سوچتا ہوں وہ کیا چیز تھی؟ جیب ٹٹولتا ہوں، کیا کوئی نوٹ گم ہوگیا ہے؟ پرس گر گیا ہے؟ سڑک پر چلتے چلتے خیال آتا ہے کہ کچھ تھا جو اب نہیں ہے۔ کیا تھا؟ درخت، کھمبے، عمارات، دکانیں، کوئی سائن بورڈ۔ ہزار بار کے دیکھے بھالے منظر میں سے کیا غائب ہوگیا ہے؟ میں غور کرتا ہوں اور سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ تیرے ساتھ یا دوستوں سے باتیں کرتے کرتے یکلخت اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آجاتی ہے مثلاً یہ کہ بعض اوقات کسی قصور کے بغیر پٹائی ہو جاتی تھی تو وہی مجھے تسلی دیتی تھی اور پیار کرتی تھی کہ بھئی نو مرتبہ تو قصور ہوتا ہے نا تمھارا؟ دسویں بار بے قصور پٹ گئے تو کیا ہوا۔ دس فیصد ظلم تو کچھ نہیں۔ جب تم دنیا میں قدم رکھو گے تو دیکھو گے کہ دنیا میں کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ بے گناہ مارے جا رہے ہیں۔ تمھیں پچاس فیصد انصاف بھی مل جائے گا تو سمجھنا بہت خوش قسمت ہو۔ دس فیصد مقدمات میں تو ہر جگہ غلط فیصلہ ہوسکتا ہے۔ یا بلاوجہ خیال آجاتا ہے کہ وہ بیسن کا حلوا کتنا اچھا بناتی تھی۔" یہ محسن کے لاشعور کا تصور تھا جو پرانی یادوں کے البم سے بھولی بسری تصویریں نکال کے موقع بے موقع اس کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ میں نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ وہ بالکل اس بچے کی طرح ہوگیا تھا جس کے ہاتھ میں گیس کے غبارے کی ڈور رہ گئی ہو۔ رنگین اڑتا ہوا غبارہ دھماکا ہوتے ہی غائب ہو چکا ہو۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
شکاری

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد دیہہ روڈ محلہ عید گاہ روڈ ٹوبہ

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی روداد جو گوشت پوست کے انسان کی
انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی
کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزرے

اب وہ پھر میرے کندھے پر سر رکھ کے رو رہا تھا مگر اس صدمے کی کیفیت مختلف تھی۔ یہ احساس زیادہ باعثِ آزار تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ دوا اور دعا سب بے کار ہیں۔ میں نے اسے رونے دیا۔ تاکہ اس کے دل کا غبار نکل جائے اور وہ گھر پہنچے تو سب کے سامنے نہ روئے۔ وہاں اس کی ذمے داریاں سب سے زیادہ تھیں۔ ایک جوان بیٹے کو اور بہن کے بڑے بھائی کو دوسروں کے آنسو پونچھنے تھے اور انھیں حوصلہ دینا تھا کہ وہ خاندان کی عمارت کے اس ستون کو گرنے سے تو نہیں بچا سکتے مگر تین ستونوں پر اس کو قائم رکھنے کی جدّوجہد انھیں ضرور کرنی چاہیے۔

رابعہ میرے پیچھے کھڑی تھی اور بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی "محسن بھائی! ہمت سے کام لیجیے۔ ایسے رونے سے تو کچھ نہیں ہوگا" اور خود بھی روتی جا رہی تھی لیکن اسے احساس نہ تھا۔ کچھ دیر بعد محسن پُرسکون ہو گیا تو میرے کہنے پر وہ سامان پیک کرنے چلی گئی۔

"محسن!" میں نے کہا "اب اس کے واپس آنے تک تجھے رونا نہیں ہے"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا "یار یہ سب۔ مجھے معلوم تھا یہ تو ہونا ہی ہے۔ مگر اس کے باوجود۔ تو جانتا ہے نا، جسے سزائے موت ہو جائے وہ آخری اپیل کے مسترد ہونے تک پُرامید رہتا ہے۔ اس وقت تک کسی معجزے کا انتظار کرتا ہے جب تک اسے تختۂ دار پر لے جانے والے نہ آ جائیں"

"تجھے اچھی طرح معلوم ہے وہاں کیا ہوگا۔ کوئی بات غیر متوقع نہیں ہے" میں نے کہا "لیکن تیرے مقابلے میں فوزیہ بہت کمزور ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور شیروانی صاحب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں رفیقِ سفر کے بغیر سفر ہی بے مقصد لگتا ہے اور پھر سب کے ساتھ تجھے وہ صدمہ بھی اٹھانا ہے جس میں تیری مدد کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔ میں بھی صرف الفاظ کا سہارا دے سکتا ہوں۔ اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمدردی کے رسمی الفاظ کی کمی کسی کے پاس نہیں ہوگی مگر اس درد کا درماں صرف وقت کے پاس ہے اور یہ سفاک مسیحا میرے قبضے میں نہیں"

"ہاں۔ ہم سب زندہ رہیں گے" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ایک بات اور ہے محسن!" میں نے کچھ دیر بعد کہا "وقت بہت کم ہے اس لیے میں صرف تجھے سمجھا سکتا ہوں۔ میں تم سب کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں آ جاؤں گا۔ تین چار دن بعد"

"فوزیہ کی رخصتی کے بعد؟" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"فوزیہ سے ڈرتا ہے تو؟"

"ہاں" میں نے بمشکل تمام کہا "صاف بات یہ ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کرسکوں اور وہ بھی ایسے وقت میں۔ یہاں سب مصر ہوں گے کہ ساتھ چلو۔"

"تو کیا بہانہ کرے گا؟" محسن نے کہا "رضوی صاحب اور رابعہ نہیں مانیں گے۔"

"بہانہ پہلے سے موجود ہے۔ میں اجازت لے کر آؤں گا" میں نے کہا "اجازت مجھے منظر صاحب بھی دلوا سکتے ہیں۔"

"جیسی تیری مرضی" محسن نے کہا "مگر تو یہاں اکیلا ہوگا..."

"میری فکر نہ کر۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا" میں نے کہا۔

دوسروں پر اپنے ارادے کا اعلان میں نے اس وقت کیا جب ساری تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ سامان گاڑی میں رکھا جاچکا تھا اور خواتین گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ ان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر محسن تھا۔ رضوی صاحب میری بات پر حیران ہوئے۔

"لو بیگم! اس کو کہتے ہیں مدعی چست، گواہ سست" انھوں نے کہا "صاحبزادے فرما رہے ہیں بعد میں آؤں گا۔ تمھاری وکالت نے مجھے تو مجبور کردیا تھا۔"

"یہ تمھیں اچانک کیا ہوگیا ہے سکندر!" بیگم رضوی نے برہمی سے کہا "کیا ارادہ ہے تمھارا؟"

"میرا کوئی غلط ارادہ نہیں ہے" میں نے کہا "دراصل میں نہیں چاہتا کہ خلافِ قانون کام کردوں اور کل کو خدانخواستہ میری وجہ سے رضوی صاحب پر حرف آئے۔ انھوں نے برامرِ مجبوری آپ کی بات مان لی تھی۔ میں کل پرسوں تک اجازت لے کر پہنچ جاؤں گا۔"

"مگر رابعہ تو ہمارے ساتھ جارہی ہے۔"

"میرے دو وکیل ہیں اور دوسرا بچپن کا دوست ہے۔ عبدالودود منظر۔ یہ کام وہ کرے گا" میں نے کہا۔

رابعہ میری صورت سے میرے دلی جذبات کا اندازہ کرنے کی بے سود کوشش کررہی تھی اور کچھ متفکر تھی۔ محسن کی طرح اسے بھی میرے اکیلے رہ جانے کا خیال آیا ہوگا اور شاید یہ بھی کہ شترِ بے مہار نہ ہوجاؤں۔ اکیلا ہی تیسری جنگِ عظیم نہ چھیڑ دوں یا دشمنوں کے نرغے میں نہ آجاؤں جو ڈی سلوا کی موت کے بعد بہت زیادہ مشتعل ہوں گے۔ ایسے ہی جیسے بہت بڑے اور بہت طاقتور غنیم کی فوج کا کوئی جنرل کمزور نہتے اور محصور حریف کے ہاتھوں ہلاک ہوجائے۔ مجھے آسان شکار سمجھنے والا ایک زورآور، عیار اور سفاک شکاری خود اپنی موت مارا گیا تھا۔ اپنی موت کا ذمے دار وہ خود تھا۔ اگر وہ مجھے شرافت سے گھر چھوڑ دیتا تو میں بھی اسے لوٹ جانے دیتا۔ دغا دینے کی کوشش خود اس نے کی تھی اور میں نے صرف اپنے دفاع کی جنگ لڑی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں نہیں گاڑی کے بے قابو ہوکر حادثے کا شکار ہوجانے کے باعث ہلاک ہوا تھا مگر شکار گاہ کے دوسرے شکاری یہ بات نہیں جانتے تھے۔ انھیں یقین ہوگا کہ یہ حادثہ نہیں، قتل تھا جو میں نے کیا۔

"ہمارے جانے کے بعد اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہوجانا" رابعہ نے کہا۔ بالکل میکے جانے والی بیویوں کی طرح۔

"بالفاظ دیگر۔ وہ دن شرافت سے رہنا" رضوی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "رستم خانی کے زعم میں ہر جگہ للکارتے مت پھرنا کہ آ بیل مجھے مار۔"

جب گاڑی چلی گئی تو مجھے ایک ایسے سناٹے کا احساس ہوا جو میرے چار سو، زمین سے آسمان تک محیط تھا۔ شہر جیسے شہرِ خموشاں بن گیا تھا جس میں خود اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ گھر کے دیوار و در خاموش تھے، اداس تھے اور میری طرح تنہائی کے احساس کا شکار تھے۔ میں خالی گھر کے خالی کمروں میں پھرتا رہا۔ ابھی صبح ہوئی تھی۔ دوپہر بہت دور تھی۔ اس کے بعد شام کی منزل تھی اور رات نہ جانے کتنی صدیوں کی مسافت پر تھی۔ صبح کرنا شام کا الگ مرحلہ ہوگا۔ میں کچھ دیر اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہا مگر چھت پر یادوں کی پرچھائیوں کی فلم چل رہی تھی اور سکوت میں آوازوں کی بازگشت تھی۔ رابعہ کی صورت کا خیال تھا اور اس کی باتیں تھیں — شبِ گزشتہ کا ہر نقش ہنوز تازہ تھا۔ چاندنی میں وہ کیسے وینس کا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ بے داغ سفید لباس میں اس کے ملکوتی حسن پر چاندنی کے کھلنے کا منظر کتنا سحر آفریں تھا۔ اس کی زلفِ مشکبار کے ہالے میں اس کا چہرہ کتنا روشن تھا۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کے جہاں کوئی نہ ہو۔ کاش! کاش خواہشوں کے مقابل آدمی اتنا بے اختیار نہ ہوتا۔ اس کا نقش مٹتا تھا تو فوزیہ اپنی تمام حشر سامانی کے ساتھ آجاتی تھی۔ وقت کے پرانے پیوند لے کر۔ کیا یہ تم نے نہیں کہا تھا؟ یہ وعدہ تم نے نہیں کیا تھا؟ میری آنکھوں کو یہ خواب تم نے نہیں دیا تھا؟ کیا ملا تمھیں آخر فریبِ آرزو کا درد دے کر؟ اب تم شکستہ شیشۂ دل کی صدا بھی نہیں سنتے۔ پھر وہ عام لڑکیوں کی طرح رونا شروع کردیتی تھی۔ قصور میرا تھا کہ میں نے تمھیں غلط نہیں سمجھا۔ تم وہ نہ تھے جو نظر آتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ولایت جاکے میرے سکندر نہ رہو گے۔ میری محبت کتنی بے ثبات تھی۔ کتنی آسانی سے دوسری عورت نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اگر تم ولایت سے کوئی میم لے آتے تو میں صبر کرلیتی کہ تمھارے قدم بھی آزادی ملتے ہی بہک گئے۔ یہ ڈر تو مجھے تھا۔ مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم واپس آکے...

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ ابھی تک نو ہی بجے ہیں۔ آخر میں کہاں جاؤں؟ دیواروں سے باتیں کروں یا اپنے آپ سے۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور ان کو واپس آنے کے بعد بھی ساتھ والے گھر جانا تھا جہاں ان سب کا سامان پہنچا دیا گیا تھا۔ وہاں ان کے ہم عمر دوست اور کلاس فیلو بھی تھے چنانچہ وہ بہت خوش تھے کہ ایک ہفتے تک دن رات ان کا ساتھ رہے گا۔ دروازے پر ڈیوٹی بدل جانے کے بعد دوسرا اسنتری آگیا تھا۔

سینما ابھی بند تھے اور اس وقت سونا بھی بہت مشکل تھا۔ وقت سے نمٹنے کا ایک طریقہ یہی تھا کہ میں باہر نکل جاؤں۔ سڑکوں اور بازاروں میں بے مقصد پھروں۔ جہاں کسی دشمن سے مڈبھیڑ کا امکان نہ ہو۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے تک شالیمار چلا جاؤں۔ باغِ جناح میں جا بیٹھوں۔ میوزیم۔ انارکلی۔ جہانگیر کا مقبرہ۔ مگر اکیلا آدمی ایسی جگہ کتنا بھٹکا ہوا لگتا ہے۔ اس بچے کی طرح جو گھر سے تو اسکول گیا ہو مگر اسکول سے بھاگ آیا ہو۔ دنیا کی رونق کسی ساتھی کے بغیر کچھ نہیں۔

میں لباس بدل کے موزے چڑھانے کے بعد جوتوں کے بند باندھ رہا تھا کہ اندر رضوی صاحب کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں ایک جوتا پہنے ایک ہاتھ میں اٹھائے لنگڑاتا ہوا گیا اور ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدلنے کے لیے ماؤتھ پیس پر رومال ڈال لیا "ایس ایس پی رضوی صاحب کی ریذیڈنس۔"

"رضوی صاحب کو بلاؤ" کسی نے بھاری آواز میں مجھے حکم دیا۔

"وہ تو نہیں ہیں" میں نے کہا "عموماً اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔ آپ کو آفس فون کرنا چاہیے تھا۔"

"بدتمیز! تم کون ہو مجھے سمجھانے والے۔ کیا وہ چلے گئے ہیں؟" بات کرنے والا گرم ہوکے انگریزی میں بولا۔

"ہاں۔ مگر تم مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا "نہ اس گھر میں بدتمیز لوگ رہتے ہیں اور نہ کسی بدتمیز سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں فون کرنے والے تم پہلے بدتمیز آدمی ہو۔ افسوس یہ ہے کہ میں تمھیں فون پر تمیز نہیں سکھا سکتا تھا۔"

مگر اس نے ریسور رکھ دیا۔ آخر یہ کون الو کا پٹھا تھا۔ اپنے تحکمانہ لہجے سے تو وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بہ لحاظ عہدہ وہ رضوی صاحب سے برتر ہے یا ان کے برابر ضرور ہے مگر ان کے عہدے کے لوگ اس طرح بات نہیں کرتے۔ ہیڈکوارٹر کے علاوہ کوئی ان سے سینئر کہاں ہوسکتا ہے اور ہیڈکوارٹر میں افسران کو معلوم ہوگا کہ ضامن رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور چند دن نہیں آئیں گے۔ مزید یہ کہ دس بجے گھر پر رضوی صاحب کو وہی فون کرسکتا ہے جسے معلوم ہو کہ وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ اس کا یہ پوچھنا کہ کیا وہ چلے گئے ہیں؟ کیا وہ جانتا تھا کہ انھیں جانا تھا۔ شاید رضوی صاحب نے بتادیا ہوگا کہ ان کے آفس نہ آنے کی وجہ کیا ہے لیکن بات تو انھوں نے اپنے کسی افسرِ اعلیٰ سے ہی کی ہوگی۔ جو انھیں چھٹی دینے کا مجاز ہوگا۔ رضوی صاحب جیسے شریف آدمی کے گھر فون کرنے والا اگر خود وہی افسرِ اعلیٰ ہوتا تو ایسے لہجے میں بات نہ کرتا۔ ماتحت ہوتا تو اس کا لہجہ زیادہ مؤدبانہ ہوتا مگر اتنی جلدی ہر ماتحت کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں اور انھیں اسلام آباد جانا تھا۔ وہ کیوں پوچھے گا کہ رضوی صاحب چلے گئے ہیں یا نہیں۔ خیر۔ وہ جو بھی تھا بھاڑ میں جائے۔

میں اسی طرح ایک جوتے کو انگلی کے ہک پر لٹکائے کھڑا تھا اور واپس ہونے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں کچھ دیر متذبذب کھڑا رہا۔ پھر یہ سوچ کر ریسیور اٹھا لیا کہ فون مسز رضوی کا یا ان کے کسی جاننے والے کا بھی تو

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

گمراہ

آٹھ حصے (مکمل) قیمت فی حصہ ۲۵ روپے

ایک ایسے نوجوان کی داستان جو حالات کے بھنور میں پھنس کر جرائم کی دنیا میں گرفتار ہوگیا

جبار توقیر کا منفرد اندازِ بیان

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہو سکتا ہے۔

"ہیلو۔" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے آواز سے بھی شناخت کرے۔

"ارے بھئی کون بول رہا ہے؟" کسی نے بڑے شائستہ شگفتہ لہجے میں کہا۔ آواز پھر مردانہ تھی اور نہ جانے کیا بات تھی کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پیغام میرے ذہن کی... لیبارٹری میں پہنچ چکا تھا جہاں آواز کا تجزیہ ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ میں رپورٹ موصول ہو گئی۔ آواز وہی ہے۔ لہجہ بدلا ہوا ہے۔

"میں... میں جی حکم کا غلام۔ میرا مطلب ہے حکم دین۔" میں نے جاہلوں کی طرح کہا۔

"اچھا بھئی حکم دین! ایس پی صاحب ایک سیف کی چابیاں دے کر نہیں گئے۔ اس میں بہت اہم کاغذات ہیں جن کی ضرورت پڑ سکتی ہے بعد میں۔" فون کرنے والے نے کہا "ان سے کہو رؤف بول رہا ہے۔ میں ان کا پی اے ہوں۔"

میں چکر میں پڑ گیا۔ کیا میرے دماغ کے کمپیوٹر کی رپورٹ غلط تھی۔

"وہ... وہ تو چلے گئے جی۔ پنڈی۔" میں نے کہا۔

"اکیلے؟" وہ بولا۔

میرا ماتھا پھر ٹھنکا۔ "اکیلے کیوں جی! سب گئے ہیں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ رضوی صاحب کے پی اے کو یہ تجسس کیوں کہ وہ اکیلے گئے ہیں یا سب کے ساتھ۔ اور کیا رضوی صاحب اتنے غیر ذمے دار ہیں کہ ایک ایسے سیف کی چابیاں ساتھ لے گئے جس میں اہم دستاویزات تھیں۔

جوتے کو نیچے رکھ کر میں نے ڈائریکٹری اٹھائی اور ہیڈ کوارٹر کے نمبر دیکھنے لگا۔ رضوی صاحب کا نمبر اسی لائن میں ذرا نیچے تھا۔ گھر کے فون نمبر کے علاوہ اس میں آفس کے دو نمبر دیے ہوئے تھے۔ ایک ڈائریکٹ لائن تھی۔ دوسری ایکسچینج کی ایکس ٹینشن۔ میں نے ڈائریکٹ نمبر ملایا۔

"رؤف!" کسی نے تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا کے کہا۔ گو نام درست تھا مگر میں فوراً سمجھ گیا کہ پہلا رؤف نقلی تھا۔

"رؤف صاحب!" میں نے کہا "میں رضوی صاحب کے گھر سے سکندر بول رہا تھا۔ کیا آپ نے ابھی فون کیا تھا؟"

"میں نے!" وہ حیران ہو کے بولا "میں فون کیوں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ چھٹی لے کر اسلام آباد گئے ہیں۔"

"ابھی کسی نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ رضوی صاحب دفتر کی چابیاں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" میں نے اسے گواہ بنانے کی خاطر یہ اطلاع دینا مناسب سمجھا "کسی الماری کی چابیاں۔"

"چابیاں سب میرے پاس رہتی ہیں۔" رؤف نے کہا "کسی نے شرارت کی ہو گی۔"

"ہاں۔ مگر رؤف صاحب! یہ شرارت بھی وہی کر سکتا تھا جسے علم ہو کہ رضوی صاحب رخصت پر ہیں۔" میں نے کہا "پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو میں صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو..."

"ایسی ویسی کیا بات ہو سکتی ہے سکندر صاحب؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"کچھ نہیں۔ بس سمجھ لیجیے احتیاطاً آپ کے نوٹس میں یہ بات ہونی چاہیے۔ کوئی گواہ تو ہو گا۔"

"میں سمجھا نہیں سکندر صاحب!" وہ بولا "گواہی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کہاں دینی ہو گی مجھے گواہی اور کیوں؟ دیکھیے تا میں تو آپ کو نہیں جانتا۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ واقعی رضوی صاحب کے گھر سے بول رہے ہیں یا کسی پبلک کال آفس سے..."

"میں ریسیور رکھ دیتا ہوں۔ آپ ان کے گھر کا نمبر ملا کے دیکھ لیں۔"

"چلیے میں مانتا ہوں۔ مگر دیکھیے نا۔ فون میری موجودگی میں تو نہیں آیا۔ آپ کہہ رہے ہیں وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ سکندر نام کے کسی شخص نے... دس بج کے چالیس منٹ پر مجھے فون کر کے کیا بتایا تھا۔"

وہ سخت جھکی اور قانونی آدمی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ رضوی صاحب جیسے افسر کا پی اے تھا۔

"رؤف صاحب! میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جوتا ہے؟" وہ چراغ پا ہو کے بولا "کیا مطلب ہے اس واہیات بات کا؟"

"میں نے صرف یہ کہا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک جوتا ہے۔" میں نے کہا "دوسرا میرے پیر میں ہے۔ جو میں نے ساڑھے دس بجے پہنا تھا۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے میں دوسرا جوتا بھی پہن لوں گا۔ آپ کو اس لیے اطلاع..."

اس نے فون بند کر دیا تو میں ہنسا اور جوتے کو پھر انگلی پر اٹھا لیا۔ اس وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ پالش تو میں نے دونوں جوتوں پر کر لی تھی لیکن برش اور کپڑا صرف ایک ہی پر مارا تھا اور اسے پہن لیا تھا۔ دوسرے کی باری

آنے سے قبل ہی فون آ گیا تھا۔ میں اسے شکار کی ہوئی مچھلی کی طرح لٹکائے اسی طرح لنگڑاتا ہوا اپنے بیڈ روم کی طرف واپس ہوا۔

جوتے کو کچھ دیر رگڑنے کے بعد میں نے اسے مقابل رکھ کے یہ دیکھنے کی عبث کوشش کی کہ اس میں آئینے جیسی چمک پیدا ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر وہ بدبخت جوتا جسے محض چمکایا جائے اور مہینوں پالش نصیب نہ ہو میری توقعات پر کیسے پورا اتر سکتا تھا۔ اس کا روکھا پھیکا بے رونق چہرہ کسی بیوہ کے چہرے کی طرح تھا جس پر میک اپ بھی ضائع ہو جائے۔

ابھی جوتا میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ مجھے باہر ایک آہٹ سی سنائی دی۔ میں جوتا ہاتھ میں لیے باہر نکلا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا لیکن میرا شک برقرار تھا۔ میں نے قدموں کی واضح آہٹ سنی تھی۔

میں ایک پاؤں میں جوتا پہنے دوسرے کمرے میں گیا۔ میری ایک ٹانگ تقریباً دو انچ لمبی ہو گئی تھی چنانچہ میری چال مضحکہ خیز ہو گئی تھی لیکن میری حالت پر ہنسنے یا رونے والا کون تھا۔ یکے بعد دیگرے میں نے سب کمرے دیکھے۔ کہیں کوئی بات بھی خلاف معمول نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک نہیں کم سے کم دو افراد کے قدموں کی دبی دبی چاپ سنی تھی۔ دو کمروں کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھے۔ میں نے ان میں بھی جھانکا۔ پھر اسٹور اور کچن کو ملاحظہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تنہائی میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی ہے اور یہ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے جس کی وجہ سے ابھی تو میرے کان بجنے لگے ہیں پھر میری آنکھیں بھی بے وجود چیزوں کو دیکھنے لگیں گی۔ کسی بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے اعصاب لوہے کے بنے ہوئے نہیں ہوتے اور دماغ بھی بالآخر قوت برداشت کی مسلسل آزمائش سے تھک جاتا ہے۔

اسی وقت میری نگاہ باہر گئی۔ سنتری جسے بہت سخت احکامات تھے کہ دروازے سے نہ ہلے اور کوئی زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے یا دروازے کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے اندر آنا چاہے تو بلا تامل گولی مار دے، غائب تھا۔

"سنتری!" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے آواز دی "گارڈ!"

اگر وہ دروازے کے آس پاس ہوتا تو جواب ضرور دیتا یا فوراً سامنے آ جاتا۔ میرے شکوک میں اضافہ ہو گیا۔ گارڈ کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ رضوی صاحب کے جاتے ہی خود بھی چھٹی کر لے۔ سگریٹ پینے نکل جائے یا لمبی تان کے سو جائے۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے اس کو لیکچر دیا تھا اور ایک معمولی کانسٹیبل کی کیا مجال کہ فرائض میں کوتاہی کا مرتکب ہو۔ رضوی صاحب کی سخت گیری مشہور تھی۔

میں پلٹا ہی تھا کہ ایک شخص اندر آ گیا۔ کوئی سوال کیے بغیر میں نے وہ جوتا ہاتھ گھما کر اس کی طرف پھینکا جو میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ راکٹ کی طرح گیا اور اس کی ناک پر لگا۔ وہ اتنے فوری ردِ عمل اور اس نوعیت کے ہتھیار کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ بری طرح بلبلایا اور میں نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ اُبلتے دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے ایک طرف ہوا ہی تھا کہ اس کے پیچھے آنے والے تین افراد نے کمان سنبھال لی۔ اعلان جنگ سے پہلے ہی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ بظاہر وہ بھی میری طرح خالی ہاتھ تھے لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ مسلح ہو کے نہ آئے ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان چاروں نے بالکل ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور کسی میک اپ آرٹسٹ نے ان کی صورتوں کو بھی مشابہ کر دیا تھا۔ سب نے گول قراقلی ٹوپیاں، گھیردار ملیشیا کی شلواریں اور قمیص پہننے کے علاوہ ایک ہی رنگ، سائز اور تراش کی داڑھی مونچھیں بھی لگا لی تھیں۔ فرق صرف قد و قامت میں رہ گیا تھا۔ دو تو ہم وزن تھے اور قد میں بھی برابر تھے۔ تیسرا نسبتاً دبلا اور چھوٹا تھا۔ چوتھا جسے جوتا لگا تھا سب سے دراز قد تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان کے ارادے نیک نہیں مگر مجھے پُرسکون رہنا تھا تاکہ میں اپنی عقل اور اپنے ہاتھوں سے زیادہ کام لے سکوں۔ "بس چار ہی ہو؟ خیر۔" میں نے ان کے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "کیوں پٹنے آئے ہو؟ اور باری باری پٹو گے یا ایک ساتھ؟"

"ہم ایک ٹیپ لینے آئے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا "شرافت سے لا دو گے تو ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔"

"واپس کیسے چلے جاؤ گے؟" میں نے کہا "خاطر تواضع کے بغیر۔"

جس شخص کی ناک جوتے کی راہ میں حائل ہو گئی تھی وہ غسل خانے سے برآمد ہوا "دیکھتے کیا ہو" وہ عجیب مضحکہ خیز آواز میں فریاد کرتے ہوئے چلایا "ہڈیاں توڑ دو اس کی۔ دو دانت توڑ دیے ہیں اس نے میرے۔" اس نے ہاتھ ہٹا کے اپنی صداقت کا ثبوت پیش کیا۔ اوپر کے لب کے نیچے دانتوں کی قطار میں واقعی خلا پیدا ہو گیا تھا۔

"باس نے کیا کہا تھا۔ مار پیٹ نہیں کرنی ہے۔" چھوٹے نے کہا "یہ تمہارے باپ کا نہیں ایک پولیس افسر کا گھر ہے۔"

"باس گیا تیل لینے۔" وہ بولا "میں اپنی منگیتر کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"یہ تمہاری بتیسی نہیں منگنی ٹوٹی ہے۔ ریچھ کے بچے!" اس نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"فضول بکواس مت کرو۔ وہ ٹیپ کہاں ہے؟" دراز قد نے کہا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا جو اس نے اندر آتے ہی نیچے رکھ دیا تھا۔

"ٹیپ؟" میں نے سر کھجا کے سوچتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے الماری میں ہوگا" کمرے میں ایک ہی الماری تھی۔

"چھوٹے! الماری دیکھ" دراز قد نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"الماری میں تالا ہے" چھوٹے نے اسٹیل کی الماری کا ہینڈل گھمانے کی ناکام جدوجہد کی۔

"چابیاں منگوا لیتے ہیں رضوی صاحب کو فون کر کے" میں نے کہا "مگر اس کی لائن تو کاٹ دی ہوگی تم نے"

"چھوٹے! عقل نہیں مگر ریوالور تو ہے تیرے پاس" دراز قد نے کہا۔

"ریوالور تو ہے" چھوٹے نے اڑتیس بور کا ریوالور نکال کے کہا "مگر اس سے تالا کیسے کھلے گا" وہ واقعی احمق تھا۔

"تالا اُڑا دے گولی مار کے ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا" دراز قد کا حوصلہ جواب دے گیا۔

ایک دھماکا ہوا۔ گولی نے فولادی دروازے کے پرخچے اڑا دیے اور شاید اس میں سے صاف گزر کر دیوار سے ٹکرائی کیونکہ بند الماری میں بھی گونج پیدا ہوئی تھی۔ چھوٹے نے الماری میں سے ہر چیز نکال کے باہر پھینکنا شروع کی۔ الماری خالی ہوگئی تو اس نے خفیہ دراز کو کھینچا۔ سارے کاغذات فرش پر بکھر گئے۔

"اس میں کوئی ٹیپ نہیں ہے" چھوٹے نے اعلان کیا اور بیگ میں سے کوئی چیز نکالی۔

"تم سب اندھے ہو کیا؟" میں نے کہا "یہ سامنے کیا پڑا ہے؟ اپنا اپنا قد دیکھ لو" میں نے اپنی ٹیپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ تم جوکر ہو" دراز قد نے دانت پیس کر کہا "یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ یہ بات سمجھ لو کہ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔ ایک ہفتے تک تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آسکتا"

"غلط فہمی خود تم نے پیدا کی" میں نے کہا "پہلے ہی بتا دیتے کہ اسکاچ ٹیپ چاہیے"

"اسکاچ ٹیپ کی اولاد" دراز قد نے چیخ کر کہا "ہمیں وہ ٹیپ چاہیے..."

"میں سمجھ گیا" میں نے سر ہلا کے کہا "تمہیں پلاسٹک ٹیپ چاہیے۔ انسولیشن کے لیے۔ الیکٹریشن ہو تم لوگ؟"

دراز قد نے جست لگائی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی قوتِ برداشت جواب دے جائے اور وہ اتنا مشتعل ہو جائے کہ حملہ کر دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس کی صلاحیت کو کم سمجھا تھا۔ وہ اناڑی نہیں تھا۔ اس نے مجھے دونوں پیر اٹھا کے فلائنگ کک مارنی چاہی تھی۔ اگر یہ پیر میرے سینے پر لگتے تو میں الٹ کر گرتا لیکن جوڈو کی مشق میرے کام آئی۔ میری تربیت بلیک بیلٹ کی حد تک تقریباً مکمل ہو چکی تھی جب میں کوئی سند لیے بغیر برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا۔ نہ انجینئرنگ کی سند نہ جوڈو کی۔ مگر اس کاغذی سند کے بغیر بھی میرا علم اور تجربہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے فوراً بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو بڑی پھرتی سے اوپر اٹھایا اور حملہ آور کو اپنی ہی قوت میں سر کے اوپر سے گزار دیا۔ وہ تیرتا ہوا گیا اور کھڑکی کے شیشے توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ میری توجہ باقی دو کی طرف ہوگئی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ بروقت میں نے دیکھ لیا کہ ایک جوتا مار کے میں نے جس شخص کا ازدواجی مستقبل تباہ کر دیا تھا وہ فائر کرنے کے لیے ریوالور اٹھا رہا تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور گولی اس شخص کے سر پر لگی جو باہر گرنے کے بعد پھر اٹھ کے اندر آنے کی کوشش میں کھڑکی کو عبور کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ ٹوٹے ہوئے شیشے لگنے سے پہلے ہی لہولہان ہو رہا تھا۔ گولی لگتے ہی اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور کھڑکی سے اندر لڑھک گیا۔ اس کا خون ایک دھارے کی شکل میں دیوار پر پڑا۔ اگر میں خود کو نہ بچاتا تو خون کے چھینٹے مجھ پر بھی گرتے۔ میں ابھی اٹھا بھی نہ تھا کہ چھوٹے نے بڑی مہارت سے کوئی چیز میری طرف پھینکی۔ یہ نائلون کا جال تھا۔ جو پیرا شوٹ کی طرح کھل کے میرے اوپر گرا۔ میں نے اس سے بچنے کی بے سود کوشش کی۔ جال میرے گرد لپٹتا گیا۔ چھوٹے نے ایک ڈوری کھینچی اور مجھے بے بس کر دیا۔

شکاری مجھے اس جال میں اسیر کر کے بے خوف ہوگئے تھے۔ میرے لیے اس جال کو توڑنا ناممکن تھا۔ اس کی ہر ڈوری پتلی ہونے کے باوجود اتنی مضبوط تھی کہ میں آزاد ہوتا تب بھی اپنے زورِ بازو سے اس کے دو ٹکڑے نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو یہ پوزیشن تھی کہ میں ہاتھ سے زور لگاتا تھا تو جال کھنچ جاتا تھا لیکن میری کمر دُہری ہونے لگتی تھی۔ پیروں سے زور لگاتا تھا تب بھی یہی ہوتا تھا۔ جال ہر سمت میں گنجائش کے مطابق پھیل جاتا تھا لیکن دوسری طرف سے میرے جسم میں گڑنے لگتا تھا۔ یہ اینٹ پتھر کی دیواروں سے زیادہ مضبوط حصار تھا جسے سر ٹکرا کے بھی نہیں توڑا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ میں اس محدود سے رقبے میں پابندِ سلاسل نہ ہونے کے باوجود حرکت تو کر سکتا تھا مگر نہ بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میرا چیخنا چلّانا یا کسی کو مدد کے لیے پکارنا سب بے کار تھا۔ میری آواز دوسری کسی کوٹھی کے اندر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس وقت کوٹھیوں میں

بچے تک نہ تھے۔ نوکر یا گھر میں رہ جانے والی خواتین باورچی خانے یا گھر کے کسی کمرے میں امورِ خانہ داری کو نمٹانے میں مصروف ہوں گے وہ کسی آواز پر متوجہ بھی ہوتے تو کام چھوڑ کر نہ آتے۔ سڑک پر سے بہت کم لوگ پیدل گزرتے تھے۔ زیادہ تعداد ان گاڑیوں کی ہوتی تھی جو گڑھی شاہو اور اسٹیشن کا لمبا راستہ چھوڑ کے اور رش سے بچنے کے لیے اس طرف سے مال روڈ تک پہنچنا پسند کرتے تھے یا ادھر سے واپس آتے تھے۔ ان میں رکشا اور ٹیکسی بھی شامل تھے۔ ایسے گزرنے والے اِدھر اُدھر کی آواز پر غور ہی نہیں کرتے تھے۔

میں یہ بات بھی سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے سے پہلے انھوں نے سنتری کو بھی قابو کر لیا ہوگا اور اگر قتل کر کے نہیں ڈالا ہوگا تو اُسے بھی میری طرح گٹھری بنا کے کسی جگہ رکھ دیا ہوگا۔ یہ کام مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔ سڑک پر کھڑا ہوا مسلح سنتری بہت خطرناک تھا۔ ایک تو یہ کہ ذرا سا شبہ ہوتے ہی وہ ایک راؤنڈ میں ان سب کو لٹا دیتا۔ مزید یہ کہ وہ آنے جانے والوں کی نظر میں تھا اور اسے لڑ بھڑ کے بے بس کرنے میں یہ اندیشہ یقینی تھا کہ کوئی دیکھ لے گا تو رک جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ساری کارروائی مناسب وقفے میں بڑی پھرتی سے کی ہوگی۔ سنتری کے سر پر ڈنڈا مار کے اسے لٹا دیا ہوگا یا اچانک پیچھے سے دبوچ کر اس کی ناک پر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا ہوگا اور پھر اسے فوراً دروازے سے ہٹا کے اندر لے آئے ہوں گے۔

"چھوٹے!" دراز قد نے کہا "یہ سب چیزیں جو تو نے الماری میں سے ایسے نکال پھینکی ہیں، واپس اسی طرح رکھ۔ جو چیز جہاں تھی وہیں۔ اور رومال سے فنگر پرنٹ وغیرہ مٹا"

چھوٹے نے پریشانی سے فرش پر بکھرے ہوئے متفرق نوعیت کے سامان کو دیکھا "مجھے تو یاد نہیں کون سی چیز کہاں تھی"

"تو پھر ایسے پھینکی کیوں تھیں؟" دراز قد غرّایا "کیا کہا تھا باس نے۔ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔ بالکل پتا نہ چلے کہ گھر میں داخل ہو کے کسی نے خانہ تلاشی لی ہے" اس نے دوسرے کی طرف دیکھا "تو الماری کے تالے کی طرف دیکھ لے اور بازار جا کے بالکل ایسا ہی تالا لے آ۔ بلکہ اسے کھول کے لے جا اپنے ساتھ"

جسے مخاطب کیا گیا تھا وہ بیگ اٹھا کے الماری کی طرف بڑھا۔ وہ بڑے منظم طریقے پر تمام سامانِ ضرورت سے لیس ہو کر آئے تھے۔ ان کو مفصّل ہدایات دے دی گئی تھیں کہ انھیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے چنانچہ مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ تالے کھولنے کے لیے چابیاں اور کسی ماہرِ فن کو نہیں لائے جو گولی سے اڑائے بغیر تالے کھول دیتا۔ شاید یہ انتظام عجلت میں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ رضوی صاحب نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ بھی گزشتہ شب کی ٹیلی فون کال موصول ہونے کے بعد کیا تھا۔ سب کے جانے کی بات تو ابھی چند گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔

اور یہ سب ہمارے دشمنوں کو فوراً معلوم ہو گیا تھا۔ اس انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی ہم ٹیلی فون سے منسلک ٹرانسمیٹر دریافت کر چکے تھے۔ مگر اس کے بعد دشمنوں نے موقع ملتے ہی متبادل بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گھر کے اندر کسی جگہ کوئی مائیکروفون نصب کر دیا تھا۔ چھت اور دیواروں کے سیکڑوں گوشے تھے اور سامان سے بھری ہوئی کوٹھی میں ایک ننھے سے مائیکروفون کو چھپانا کوئی مشکل کام نہ تھا مگر اس کو تلاش کرنا یقیناً بہت مشکل کام تھا۔ امریکہ اور یورپ میں یہ ننھے منّے خفیہ مائیکروفون "بگ" کہلاتے ہیں اور وہاں اتنا بڑا ٹرانسمیٹر حکومت کی اجازت سے کوئی بھی لگا سکتا ہے جس کی نشریات عام سنی جا سکیں مگر جاسوسی اور سراغرسانی کرنے والے اداروں یا پولیس کے سوا خفیہ مائیکروفون رکھنا وہاں بھی جرم ہے۔ تاہم یہ ممنوعہ چیز بھی وہاں اتنی ہی آسانی سے مل جاتی ہے جتنی آسانی سے ممنوعہ ادویات یا منشیات۔ شوکیس میں رکھ کے اسے نہیں بیچا جا سکتا مگر دنیا کے ہر ملک میں انڈر گراؤنڈ مارکیٹ ہوتی ہے جہاں سب کچھ دستیاب ہوتا ہے۔ لانے والے وہاں سے یہ چیزیں... پاکستان بھی لے آتے ہیں جو عموماً جرائم پیشہ افراد ہی کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ لوگوں کی پرائیویٹ زندگی کے یا کاروباری معاملات کے راز جاننے کا سب سے مؤثر ذریعہ "بگ" ہے۔

رضوی صاحب کے گھر میں ایک یا ایک سے زیادہ "بگ" موجود تھے۔ جو اس گھر کی چار دیواری میں ہونے والی سب گفتگو دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔ بگ ویسے تو کھٹمل کو کہتے ہیں مگر یہ نظر نہ آنے والے کھٹمل سے بہت زیادہ خطرناک تھے۔ ان کے ذریعے باہر پہنچنے والی ہر بات ایک محدود دائرے میں سنی جا سکتی تھی یا اور آگے نشر کی جا سکتی تھی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ آس پاس ہی کہیں دشمنوں نے اپنا ریسیونگ اسٹیشن بھی قائم کر رکھا تھا۔ سو دو سو گز کے اندر اندر وہ کسی کوٹھی میں مقیم ہیں جو انھوں نے خریدی ہے یا کرائے پر حاصل کی ہے۔ اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی ہمسائے سے مل گئے ہوں۔ اسے نقد رقم کا لالچ دیا ہو یا اس سے جھوٹ بولا ہو کہ وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں اور ایک دشمن ملک کے جاسوسوں نے قریب ہی اپنا خفیہ ٹھکانا بنا رکھا ہے چنانچہ ان کی نقل و حرکت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی نگرانی اور ان کے ارسال کردہ پیغامات کی "آبزرویشن" کے لیے جگہ مطلوب ہے۔ محبِ وطن شہری ویسے ہی تعاون کرتے ہوئے ایک کمرہ دینے میں عار نہیں محسوس کرے گا۔ اگر کوئی نہ مانے تو اسے دھمکی دی جا سکتی ہے کہ حکومت قانونی طور پر زبردستی بھی یہ گھر لے سکتی ہے۔ جو غلط نہیں۔ اور اسے افشائے راز یا اس مسئلے پر اظہارِ رائے کے سنگین نتائج اور سخت سزا سے خوفزدہ کر کے خاموش رہنے پر مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس ٹیم میں چوہدری دلاور جیسے ایکٹر ڈائریکٹر ہوں وہ ہر ڈراما کر سکتی ہے۔ رضوی صاحب کے سرونٹ کوارٹر کی طرح انھیں کوئی سے غیر آباد سرونٹ کوارٹر یا گیراج بھی مل سکتا ہے جہاں وہ خاموشی سے کسی نمک حرام لالچی نوکر کی مدد سے ڈیرہ جمائے بیٹھے ہوں اور صاحبِ خانہ کو علم ہی نہ ہو۔

یہ صورتِ حال بالکل نئی تھی اور بہت خطرناک۔ میرے لیے پہلا مسئلہ رہائی پانے کا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کا پروگرام مجھے قتل یا اغوا کرنے کا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں انھیں واضح ہدایات تھیں۔ وہ ایک پولیس افسر کے گھر میں واردات کرنے کے نتائج کی سنگینی سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اپنی تشریف آوری کا کوئی ثبوت تک چھوڑ کے جانا نہیں چاہتے تھے۔

ان میں سے ایک اسٹیل کی الماری کے نقصان رسیدہ تالے کو کھول کے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ باقی سب بڑے اطمینان سے تلاشی لینے میں مصروف تھے اور بہت احتیاط کے ساتھ۔ انھیں جلدی نہیں تھی اور کسی کا ڈر نہیں تھا۔ چھوٹا بھی کسی نہ کسی طرح تمام سامان واپس الماری میں اس طرح رکھ چکا تھا کہ بے ترتیب نظر نہ آئے۔ جوتے کا نشانہ بننے والا بار بار غسل خانے میں جاتا تھا اور کلیاں کر کے لوٹتا تھا اور ہر بار مجھے نئی گالیاں دیتا تھا۔

"تمھاری بتیسی اب تیسی رہ گئی ہے۔" میں نے فرش پر پڑے پڑے کہا۔ "اگر تم منہ بند رکھو تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس لیے اب تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ جتنی گالیاں دینی ہیں دل ہی دل میں دو۔"

"کتے! " وہ میرا جوتا اٹھا کے میری طرف لپکا۔ "تیرا منہ بھی اسی طرح بند کرتا ہوں میں۔"

میں نے اپنا سر گھما کے منہ فرش کی طرف نہ کر لیا ہوتا تو وہ اپنے عزائم میں یقیناً کامیاب ہو جاتا۔ اب ایک دلچسپ کھیل شروع ہوا۔ وہ جوتا لے کر دائیں طرف آتا تھا تو میں اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ وہ دوسری طرف آتا تھا تو میں منہ پھیر لیتا تھا۔ اس نے میرا سر تھام کے اور گردن گھما کے منہ کو اوپر لانے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ مجھے اس پر حملہ کرنے کے دو مواقع ملے۔ ایک بار میں نے جال کے اندر سے ہی ہاتھ لمبا کر کے اس کے سر پر مکا مارا مگر چوٹ سخت نہیں پڑی۔ دوسری بار میں نے اپنا سر اس کی پسلیوں میں مارا اور وہ نیچے لڑھک گیا۔ تیسری بار وہ لڑکھڑا کے پیچھے گرا تو میں اس کے اوپر آ گیا۔ جال میں پھنسا ہوا ہونے کے باوجود اب میں اپنے ہاتھوں سے یا جسم کے زور سے اس کی گردن بھی توڑ سکتا تھا لیکن گردن میری دسترس سے دور تھی۔ میں اس کے پیٹ پر تھا چنانچہ میں نے ہاتھوں کو پسلیوں پر رکھ کے دبایا تو وہ تڑپا، اس کی دو پسلیوں کی ہڈی بڑی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ اس نے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح آواز نکالی۔

اس کے ساتھی پہلے اس پر ہنس رہے تھے۔ بعد میں دراز قد نے اسے گالی دے کر کہا تھا کہ چھوڑ اسے اور اپنا کام کر۔ اب وہ کام چھوڑ کر لپکے۔

"تو بھی کیا یاد کرے گا۔" میں نے اسے گالی دے کر کہا۔ "اچھا بھلا ثابت اور مکمل آیا تھا۔ دو دانت، منگنی اور دو پسلیاں...." میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میرے سر پر کوئی چیز پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میری آنکھوں نے دن میں تارے دیکھ لیے۔ پھر تارے غائب ہو گئے اور دن کی جگہ رات رہ گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکے تھے۔ مجھے دست و پابستہ چھوڑ کے۔ چھوٹا کسی مچھیرے کی اولاد لگتا تھا۔ جس نے اتنی مہارت سے جال پھینکا تھا کہ مجھے بچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی اور ڈوری کھینچتے ہی جال میرے گرد یوں لپٹ گیا تھا کہ میں کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں کچھ نہ کروں۔ نہ گولی چلانی پڑے اور نہ خنجر۔ مجھے خراش تک نہ آئے اور میں ان کے کام میں مداخلت نہ کر سکوں۔ یہ کام آسانی سے ہونے والا نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں مزاحمت کروں گا اور اگرچہ وہ چار ہیں مگر پھر بھی نقصانات کا تناسب برابر رہے گا۔ وہ ایک کو پکڑیں گے تو دو کے جزوی یا کلی نقصان کے بعد۔ اور وہ اپنے ساتھ اسٹریچر ایمبولینس وغیرہ نہیں لائے تھے۔ اس کے باوجود میں نے ایک کا حلیہ اور مستقبل خراب کر ہی دیا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر لے گئے ہوں گے اور اب یہ اوپر والوں کی اور اوپر والے کی مرضی کہ اس بدبخت کا شکستہ اعضا کی مرمت کے بعد زندگی سے اور منگیتر سے پرانا رشتہ استوار رہے یا اس کی دنیا میں ضرورت اور قدر و قیمت ختم ہو گئی ہو تو اسے دریا برد کر دیا جائے۔ کرائے پر ایسی مہمات سر کرنے والوں کو زندگی اور موت کا جوا تو کھیلنا ہی پڑتا ہے اور جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ "قابلِ خرچ"

ہوتے ہیں۔ یعنی اٹھ گئے تو اٹھ گئے۔ ہزاروں اٹھ جاتے ہیں۔ کاغذ کے روپے بھی ایسے روپے سے ملنے والے بھی۔ ان کی جگہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ اتنا تردد کون کرتا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ جانے والوں کے علاج معالجے پر مزید خرچ کرے۔ گاڑی ہو تو ڈینٹنگ پینٹنگ پر اخراجات سے فائدہ بھی ہے۔ ناکارہ انسان کو صفر کر دینا چاہیے۔ ان کا معاوضہ بچتا ہے۔ دوا دارو کا خرچ بچتا ہے اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ وہ کچھ بک نہ دیں۔

مجھ سمیت کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ دنگل ہوتا تو یہ کمرہ پانی پت کے میدان کا نقشہ پیش کرتا لیکن اب تو صرف یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے برضا و رغبت خود کو اس جال میں داخل فرمایا اور شوقیہ ڈوری کھینچ کر استراحت کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھیں گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں تقریباً سوا گھنٹے بیہوش رہا تھا۔ کیا اس وقفے میں ان کی کوشش بار آور ہوئی تھی؟

ٹیپ سے ان کی مراد یقیناً وہ کیسٹ تھا جو ہم نے خاصی زبردستی کے بعد ریکارڈ کیا تھا اور جس میں ڈی سلوا آنجہانی کا اعترافِ جرم بھی تھا۔ اور چوہدری دلاور کی آواز بھی تھی۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد اس کیسٹ سے خطرہ صرف دلاور کے لیے باقی رہ گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا ہوگا کہ آخر اس میں کتنا مواد ہے جسے قانونی طور پر ہم اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ایک کیسٹ سے ہم جیسے چالاک لوگ کئی کاپیاں بنوا سکتے ہیں اس کے لیے ایک نقل حاصل کرنا ضروری تھا تاکہ وہ بچاؤ کی فکر کر سکے اور جوابی اقدامات سوچ سکے۔

کیسٹ محسن کے بریف کیس میں تھا جو وہ کمرے میں ہی چھوڑ گیا تھا چنانچہ شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کا مشن کامیاب رہا۔ الٹا انھیں افسوس ہوا ہوگا کہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے وہ اپنی کارروائی کا آغاز جال پھینکنے سے ہی کرتے تو اپنی ہڈیاں اور دانت تڑوائے بغیر کامراں لوٹ جاتے۔ کیسٹ تو سامنے ہی رکھا تھا۔

اب جھوٹی دھمکی تو دلاور کو بعد میں دی جائے گی کہ کیسٹ کی اور بھی نقول ہیں۔ اس سے پہلے تو اس جال کے جنجال سے رہائی کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ آخر میں کب تک یوں مالِ غنیمت کی طرح گٹھری بنا پڑا رہوں گا۔ سر کا درد سب سے زیادہ شدید تھا مگر جسم کے دیگر اعضا بھی ایک ہی پوز میں پڑے رہنے سے اکڑ گئے تھے۔ میں نے متعدد امکانات پر غور کیا۔ ان واقعات کو یاد کیا جہاں لوگ اس سے زیادہ مشکل حالات میں قید سے نکل گئے۔ میں نے دانتوں سے جال کاٹنے کا سوچا اور کچھ دیر ایک حلقۂ دام پر دانت بھی رگڑے لیکن کچھ دیر بعد میرے دانت درد کرنے لگے۔ رسی پر اثر کیا ہوتا غالباً دانت ہی کچھ گھس گئے۔ پھر میں نے جال کو کسی نوکیلی چیز پر رگڑ کے کاٹنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ترین دروازے یا کھڑکی کا کنارہ بھی میری پہنچ سے باہر تھا۔ میز اور بیڈ بھی دور تھے۔ قریب صرف ایک کرسی تھی اور اس کے پائے لکڑی کے تھے۔ مگر دھار خاصی امید افزا نظر آتی تھی۔ میں نے جال کو اس پر رگڑنا شروع کیا۔ کرسی الٹ گئی اور مجھ سے دور ہو گئی۔

مسلسل ناکامیوں کے بعد مجھے دوسری نوعیت کے واقعات کا خیال آنے لگا۔ ان کا جو کسی غیر آباد مکان میں ایسے ہی قید پڑے رہے تھے۔ اس امید میں کہ کوئی تو ادھر ضرور آئے گا۔ مگر ان کی نجات کے لیے صرف فرشتۂ اجل آیا تھا۔ اس وقت جب بھوک پیاس سے پہلے ہی وہ ہوش کھو چکے تھے۔ کیا میں ایک ہفتے تک کچھ کھائے پیے بغیر اسی طرح لیٹا رہ سکتا ہوں؟ ہر آدمی کی قوتِ برداشت جدا ہوتی ہے لیکن عموماً میرے جیسا صحت مند آدمی کتنے دن بھوکا رہ سکتا ہے۔ اور مرتا ہے تو بھوک سے یا پیاس سے؟ مجھے تو دو دن بھی بھوکے پیاسے رہنے کا تجربہ نہ تھا۔ آدمی کو یہ مشق بھی ہونی چاہیے۔ اسلام آباد میں میرے نہ پہنچنے سے کیا ہوگا؟ تین چار دن بعد ہی تشویش کا آغاز ہوگا۔ شاید رضوی صاحب یا رابعہ میں سے کوئی فون کرے۔ فون کی گھنٹی بجتی رہے گی۔ نہیں نہ۔ مجھے اچانک خیال آیا۔ اگر انھوں نے اندر آنے سے پہلے فون کے تار کاٹ دیے ہوں گے تو گھنٹی بھی کہاں بجے گی۔ پھر رضوی صاحب کیا کریں گے؟ ایکسچینج سے معلوم کریں گے کہ لائن ڈیڈ کیوں ہے؟ شاید ٹیلی فون والے ایک پولیس افسر کے فون کی خرابی کو اہمیت دیتے ہوئے فوراً دوڑیں۔ مگر وہ باہر سے ہی لائن جوڑ کے چلے جائیں گے۔ شاید وہ اپنے آفس میں پی اے کو فون کریں۔ یا کسی پولیس اسٹیشن کو۔ کہ جا کر دیکھو معاملہ کیا ہے۔ ممکن ہے رابعہ اپنے آفس کے ساتھیوں سے کہے کہ میری خیریت دریافت کریں۔ بے شک میں بچہ نہیں ہوں مگر میری خیریت کو ہمیشہ سخت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پانچویں دن کسی کے آنے یا نہ آنے کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔ پانچ دن کیا کم ہوتے ہیں۔ ابھی تو پانچ گھنٹے بھی نہیں گزرے اور جی چلاؤ لگتا ہے۔

نہ جانے کیا چیز تھی جو مسلسل میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ میں نے پہلو بدل کے اس کو ہٹانے کی کوشش کی اور میرے ہاتھ میں لائٹر آ گیا۔ صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ وہ لائٹر ایک میڈل تھا کہ کرۂ ارض پر میرا شمار ان میں کیا جا سکتا ہے جو احمق درجہ اوّل ہوں۔ عقل ہونے کے باوجود بر وقت اس کا استعمال نہ کر سکتے ہوں اور خود کو عاقل خان سمجھتے ہوں۔ لائٹر شاید اس دنگل کے دوران میں جیب سے باہر گر گیا تھا جس میں میرے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

حریف کی دو لبلیاں ٹوٹی تھیں۔

میں نے لائٹر کو روشن کیا اور چند سیکنڈ اس کے ننھے سے شعلے کو گھورنے میں ضائع کیے۔ پھر میں نے شعلے کو جال کے پھندے سے چھوا۔ نائلون پگھل کے جل گیا۔ ایک حلقہ پھیل کر دو حلقوں کے برابر ہو گیا۔ پھر دو کی وسعت چار کے برابر ہوئی۔ چند منٹ بعد جال فرش پر پڑا تھا اور میں کبڑا ہوا کھڑا تھا۔

آہستہ آہستہ میری کمر سیدھی ہونے لگی۔ میں نے کرسی کو سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب میرے ہاتھوں پیروں میں دورانِ خون بحال ہو گیا اور میری جسمانی صلاحیت کا گراف کچھ اوپر اٹھا تو میں ہمت کر کے کرسی پر سے اٹھا اور شرابی کی طرح ڈولتا کچن کی طرف گیا۔ وہاں میں نے چائے اور کافی میں سے کافی کا انتخاب کیا۔ کافی کے لیے مجھے صرف الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگا کے پانی ابالنا پڑا۔ اس میں کریم کے ساتھ میں نے چینی کے بجائے گلوکوز استعمال کیا اور وہیں دیوار کے سہارے بیٹھ کر پورا مگ ختم کیا۔ تھوڑی سی ورزش کے بعد میں بالکل ویسا ہی ہو گیا جیسا جال میں پھنسنے سے قبل تھا۔

اندر جا کے میں نے سب سے پہلے تو محسن کا بریف کیس دیکھا۔ حسبِ توقع کیسٹ اس میں نہیں تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس سے ہم دلاور کو سر کے بل آ کے اعترافِ شکست پر مجبور کر سکتے مگر کیسٹ ایک ٹرمپ کارڈ تھا جس سے ہم دلاور کو خوف میں ضرور مبتلا رکھ سکتے تھے۔ اب تک وہ کیسٹ سن چکا ہوگا اور شاید اس پر طبلہ خان ہارمونیم والے اور سارنگی خاں تانپورے والے قوال اور ہمنوا کی آوازیں کوئی قوالی بھی ریکارڈ کر چکا ہوگا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں رضوی صاحب کے مطالعے کے کمرے میں گیا اور سب سے نیچے والی دراز کھینچ کر دیکھی۔ اس میں سے وہ فائل بھی غائب تھی جو ہمیں مرحوم غلام علی نے لا کر دی تھی۔ اس نے یہ ہرگز نہیں سمجھا تھا کہ وہ اپنے محسن اور مربی وزیر خان کے احسانات کا بدلہ چکا رہا ہے اور یہ فائل ان احسانات کی قیمت ہے۔ مگر اس فائل کے ساتھ ہی اسے جان بھی دینی پڑی تھی۔ چنانچہ وہ قرض تو ادا ہو گیا تھا جو وزیر خان پر واجب الادا تھا اور اب الٹا میں اس کا مقروض تھا۔

اس فائل کے جانے کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے غلام علی کی قربانی رائگاں گئی۔ اس نے جس نیک مقصد کی خاطر جان تک قربان کر دی تھی وہ خاک میں مل گیا۔ صرف اس لیے کہ ہم نے اصل کی ایک ہی فوٹو اسٹیٹ کاپی بنوائی تھی جو میں نے ایک ڈرامائی تاثر کی خاطر ڈی سلوا کو ارسال کر دی تھی۔ ایک بار اس سے چھین لی تھی اور پھر اس کی سیکرٹری کے سامنے پھینک دی تھی کہ یہ اپنے باس کو دے دو۔ ہم اصل کے دس سو یا ہزار جتنی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں چاہیں بنوا سکتے ہیں۔ اس وقت ڈی سلوا کی سیکرٹری شہلا تھی۔ ہم نے اصل کو محفوظ سمجھتے ہوئے اس کی مزید کاپیاں بنوانے کی ضرورت کو اہم نہیں سمجھا تھا اور اس تساہل کا نتیجہ یہ تھا کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا تھا لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا تھا کہ سابقہ واقعات کے بارے میں ہماری معلومات کس حد تک اَپ ٹو ڈیٹ ہیں۔

فوری طور پر اس سے یاسمین کو اور اس کی ازدواجی زندگی کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ مگر کیا دلاور کو معلوم ہوگا کہ وہ لڑکی اب کہاں ہے جس نے اسے ایک ناکام بنک ڈکیتی کا مالِ غنیمت سمیٹ کر فرار ہوتے دیکھا تھا اور جو اسے اب بھی شناخت کر سکتی ہے کیونکہ وہ اسی کے گھر میں چھپا رہا تھا، خطرہ ٹلنے تک۔ اب وہ پھر خود کو خطرے میں محسوس کرے گا۔ اگر اسے علم ہوا کہ وہ لڑکی نسبت روڈ پر رہتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس خطرے کو ختم کر دے گا جو یاسمین کے وجود سے وابستہ ہے مگر یہ کام تو وہ پہلے بھی کر سکتا تھا اور یقیناً کر چکا ہوتا۔ نہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ یاسمین کہاں ہے تاہم میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں یاسمین کو خبردار کر دوں۔

لیکن اس سے بھی پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں غیر قانونی طور پر رضوی صاحب کے گھر میں داخل ہونے، خانہ تلاشی لینے والے اور مار پیٹ کرنے والے مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کروں اور یہ معلوم کروں کہ دروازے پر پہرہ دینے والے گارڈ کا کیا حشر ہوا؟ اس کی ایک سیدھی صورت یہ تھی کہ میں رابعہ کی گاڑی لے کر جاؤں اور پولیس اسٹیشن پر واردات کی رپورٹ لکھوا دوں۔ ان کے رپورٹ لکھنے میں لیت و لعل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ خبر فوراً حکام بالا تک پہنچ جائے گی۔ قواعد کے تحت رخصت پر جانے سے پہلے وہ پتا ضرور چھوڑ کر گئے ہوں گے۔ جہاں ان سے ہنگامی ضرورت میں رابطہ قائم کیا جا سکے۔ ان کے کسی ساتھی یا پی اے سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ریسیور اٹھائے اور شیروانی صاحب کے گھر کا نمبر گھما کے ساری کہانی سنا دے۔ خصوصاً وہ پی اے جسے میں نے کچھ ہی دیر قبل فون کیا تھا۔ وہ تو یہ بھی بتا دے گا کہ آپ کے گھر سے یا کہیں سے سکندر نام کے کسی شخص نے فون پر ایسی باتیں کی تھیں جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ رضوی صاحب کے لیے نئی پریشانی پیدا ہو جائے گی کہ منع کرنے کے باوجود میں نے کوئی نیا گل کھلایا ہے۔

وہ جس مقصد کی خاطر سارے کام چھوڑ کر گئے ہیں وہ فوت نہیں ہوگا تب بھی اس خبر سے ان کا پروگرام ضرور متاثر ہوگا۔ وہ یہاں آ کے صورتِ حال کا جائزہ لینے پر اور "سب ٹھیک ہے" کی اطلاع پا کے فوراً واپس جائیں گے تو ان کو سخت کوفت ہوگی اور ان کی برہمی کا نشانہ صرف میری ذات ہوگی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری قوتِ فیصلہ میرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ میں عبدالودود منظر سے مشورہ کر لیتا مگر وہ نہ جانے کس کورٹ میں تھا چنانچہ اس سے رابطہ محال تھا۔ پھر مجھے اکرام شیخ کا خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے بلا لوں اور اسے تمام واقعات بتا دوں۔ پھر جیسا مشورہ وہ دے، وہی کروں۔

ایک مرتبہ پھر میں نے ڈائریکٹری دیکھی اور تھانوں کی طویل فہرست میں سے اس کا نمبر تلاش کیا۔ ڈائریکٹری میں ابھی تک سابق ایس ایچ او کا نام درج تھا۔ جس کے بارے میں حشمت خان نے ارشاد کیا تھا کہ اسے ایک "معمولی" سی بات پر لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ معمولی بات یہ تھی کہ اس نے تفتیش کے دوران میں ایک آدمی پر اتنا تشدد کیا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ مگر پولیس کے نقطۂ نظر سے یہ واقعی معمولی بات تھی اور اس کی یہ سزا بہت بڑی تھی کہ اسے لائن حاضر کر دیا گیا۔ اور بس۔ تشدد سے موت واقع ہونے کے واقعات تو عام تھے لیکن ملک کی تاریخ میں ایسا واقعہ ایک بھی نہیں تھا جب کسی تھانیدار پر قتلِ عمد کا کیس بھی بنا ہو۔

ریسیور حشمت خان نے اٹھایا۔ "اوئے لگا اس... کے چھتر" اس نے درمیان میں ایک گالی دے کر کہا مگر یہ بات اس نے مجھ سے نہیں، حاضرین د ناظرین سے کہی تھی اور ان کے بارے میں کہی تھی جو زیرِ تفتیش تھے۔ "ہاں جی" اس نے یوں کہا جیسے میں نے دخل در معقولات کر کے اس کھیل کا مزہ کرکرا کر دیا ہے جس میں وہ پوری دلچسپی کے ساتھ مصروف تھا۔

"مجھے سید اکرام شیخ صاحب سے بات کرنی تھی" میں نے اپنا نام بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

"تو کر لینا شام کو۔ جب وہ ڈیوٹی پر آئیں۔ اوئے تیرا تے پیو وی منے گا" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ یہ آخری جملہ پھر میرے لیے نہیں تھا بلکہ کسی ایسے شخص کے لیے تھا جو اعترافِ جرم پر آمادہ نہ تھا۔

میں نے پھر نمبر ملایا۔ "حشمت خان!" میں نے آواز بدل کے سخت اور افسرانہ لہجے میں کہا۔ پس منظر میں مجھے "چھتر بازی" اور فریاد و فغاں کا ملا جلا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

"یس... یس سر!" حشمت خان نے محتاط ہو کے کہا اور شاید اشارہ کیا کہ "انٹرول" شور یکلخت تھم گیا۔

"بھئی میں رؤف ہوں۔ ہیڈ کوارٹر سے" میں نے حتی الامکان اس کی نقل اتاری۔ "ایس ایس پی کا پی اے۔ کون کون حاضر ہے؟"

"سب ہیں جناب! حکم فرمائیں میرے لیے۔ ہم بھی خادم ہیں"

"میر محمد کو بلاؤ" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ اکثر موجود نہیں ہوتا۔ "اور وہ نہیں تو اس کے لڑکے شیخ کو"

"میر صاحب تو... جائے واردات پر گئے ہیں۔ نقصِ امن کی رپورٹ ملی تھی۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ کوئی ضروری بات ہے تو اس کے گھر فون کر لیں" حشمت خان نے شرافت سے کہا۔

"اس کے گھر میں فون ہے؟" میں نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔ "اے ایس آئی کے گھر میں ہے؟"

"اجی رؤف صاحب! سب پیسے کے کھیل ہیں" حشمت خان نے گول مول بات کی اور یہ نہیں کہا کہ وہ کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے۔ "جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے نوکری کو۔ آپ نمبر لکھ لیں"

"بھئی حشمت خان!" میں نے نمبر نوٹ کر کے کہا۔ "تمہارے خلاف بڑی لمبی رپورٹ آئی ہے۔ اوپر والے بہت خفا تھے کہ یہ کیا چکر ہے۔ پہلے والی رپوٹیں کہاں ہیں؟"

"پہلے والی؟" حشمت خان کی مری مری آواز آئی۔ "کس... نے کی تھی" وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ تو اب تفتیش ہوگی تو معلوم ہوگا۔ تم ذرا محتاط رہو۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ اتنی بات حشمت خان کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ تفتیش وغیرہ چھوڑ کے اپنے خلاف ہونے والی تفتیش کے چکر میں پڑ جائے گا۔ اگر اس نے رؤف سے پھر بات کی تو رؤف اس سے زیادہ پریشان ہوگا کہ یہ آج کون میرے نام کے اور میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس کنفیوژن کا تصور کر کے میں بے اختیار ہنسا جو بعد میں پیدا ہوگا۔ حشمت خان پر حقیقت واضح ہوگی تو وہ پٹاخے کی طرح اچھلے گا۔

میں نے اکرام شیخ کے گھر فون کیا جو کسی خاتون نے اٹھایا۔ دو منٹ بعد اکرام شیخ کی آواز سنائی دی۔

"یار شیخ!" میں نے کہا۔ "میں بدبخت سکندر بول رہا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں؟ دوپہر کے کھانے کا انتظار۔" وہ بولا۔ "خیریت؟"

"خیریت! میں تو اس لفظ کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہوتا جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ایسا کرو۔ یہاں آجاؤ۔ غلام رضوی صاحب کے گھر۔ مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ کھانا ہم دونوں باہر کھائیں گے۔"

"کیوں، گھر میں دال پکی ہے کیا؟" وہ بولا۔

"گھر میں میرے سوا کوئی نہیں۔ سب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں آجاتا لیکن مسئلہ دہی ہے یعنی یہاں عجیب اور ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ تم سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔"

"اچھا۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ زندہ تو ملو گے نا؟"

"آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔" میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔" اور فون رکھ دیا۔

اس میں بیس منٹ تک میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور ہر ایک منٹ لاکر دی تھی اڑے کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر سنتری کہاں گیا؟ یہ سوال اور سرتی وزہ گیٹ دیکھ کر میرے ذہن میں آیا۔ گزشتہ شب کی بات فائل ان اے میں نے اسے بے حد مستعد کھڑا دیکھا تھا اور صبح اسے جان لمحہ بھر کے لیے گیٹ میں رکی تھی تو اس نے رضوی صاحب وزبردست سلیوٹ جھاڑا تھا۔ دوسرا سگریٹ ختم ہونے والا تھا کہ اکرام شیخ اسکوٹر پر اندر داخل ہوا۔

میں باہر نکلا تو وہ اسکوٹر بند کر کے اسٹینڈ پر کھڑا کر رہا تھا۔

"کدھر ہے ہنگامی صورت حال؟" اس نے کہا۔

"ہر طرف۔ اندر۔ باہر۔" میں نے کہا۔ "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ پیدائش پر ہنگامہ۔ موت پر ہنگامہ۔"

اندر لے جا کر میں نے اسے ساری بات تفصیل سے سنائی لیکن کیسٹ کا ذکر عمداً نہیں کیا۔ ورنہ مجھے یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں نے ڈی سلوا اور دلاور کی گفتگو کس طرح ریکارڈ کی تھی۔ میں نے صرف اس فائل کا ذکر کیا جو غلام علی نے فراہم کی تھی اور اس جرم کی پاداش میں مارا گیا تھا۔

"فائل تو بعد میں مل جائے گی۔ پہلا مسئلہ گارڈ کا ہے۔" وہ متفکر ہو کے بولا۔ "وہ کہاں گیا؟"

"مجھے تو شک ہے کہ وہ مارا گیا۔ ان لوگوں نے پہلے بھی پہرے داروں کو ٹھکانے لگایا ہے۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ پولیس کا آدمی تھا۔ انتہائی تجربہ کار اور اس کے پاس مشین گن تھی۔"

ہم دونوں نے گیٹ کا معائنہ کیا۔ وہاں جدوجہد، مزاحمت یا کشمکش کے آثار مفقود تھے۔ پھر میرے ساتھ شیخ نے ایک ایک کمرے میں، باتھ روم میں یہاں تک کہ ہر بیڈ کے نیچے اور پردوں، الماریوں کے پیچھے دیکھا۔ میں نے اسے وہ میز دکھائی جس کے نیچے والی دراز میں سے فائل چوری ہوئی تھی۔ باقی کاغذات کو چھیڑا تک نہیں گیا تھا۔ گھر کے اندر دیکھ لینے کے بعد ہم نے عقبی حصے کا رخ کیا۔ باغ اور گیراج دیکھے۔ آخری حصہ وہ کوارٹر تھا جس میں پہلے صرف ایک کانسٹیبل رہتا تھا۔ پھر ہم رہے تھے اور آخر میں شہلا نے اپنی ماں کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے۔ اب یہ کوارٹر ویران پڑا تھا۔ میں نے اس کے دروازے کو دھکیلا اور ہم تقریباً ایک ساتھ اندر داخل ہو کے ایک ساتھ رک گئے۔ صحن کی دیوار کے ساتھ کوئی شخص بندھا پڑا تھا۔ اسے بڑی مضبوطی سے باندھ کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ بظاہر وہ شخص مردہ نظر آتا تھا لیکن وہ صرف بے ہوش تھا۔

چہرہ دیکھتے ہی میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ وہی پولیس گارڈ تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے غور سے دیکھا۔ "شیخ! یہ تو پولیس گارڈ ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا اور ابھی صبح تک ڈیوٹی پر تھا۔"

شیخ بھی گھٹنوں کے بل میرے قریب ٹک گیا۔ اس نے گارڈ کا ہاتھ تھام کے اس کی نبض دیکھی۔ "غنیمت ہے کہ اسے قتل نہیں کیا گیا۔ نبض کچھ سست ہے۔" شیخ نے کہا اور گارڈ کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"جسم بھی کچھ ٹھنڈا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نہ جانے کب سے اسی طرح کھلے آسمان کے نیچے زمین پر پڑا ہے۔ یہ خود ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "پہلے تو اسے اٹھا کے اندر لے چلتے ہیں۔"

"پہلے اس کی یہ رسیاں کاٹ دیں۔" میں نے باورچی خانے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ جہاں میرے خیال کے مطابق ایک چھری ہونی چاہیے تھی۔ چھری مجھے تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گئی۔ ایک منٹ بعد میں وہ رسیاں کاٹ چکا تھا جو گارڈ کے جسم پر اتنی سختی سے باندھی گئی تھیں کہ گوشت میں گڑ گئیں تھیں اور سیاہی مائل نیلی لکیریں گارڈ کے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان لکیروں کے علاوہ اس کے جسم پر تشدد کے نشان نہیں تھے۔

میں اور شیخ اسے اٹھا کے سرونٹ کوارٹرز سے بیڈ روم تک لائے اور ایک بستر پر لٹا دیا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" میں نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

جتنی دیر میں شیخ نے اس کے جسم پر کمبل ڈالا میں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میں رضوی صاحب کے گھر سے بول رہا ہوں اور وہ فوراً پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر ان کی فیملی کے ہر فرد کو جانتا تھا چنانچہ اس نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ کون بیمار ہے اور بیماری کیا ہے۔ مجبوراً مجھے ٹیلی فون پر ہی بتانا پڑا کہ بات کیا ہے۔

"تم نے پولیس کو رپورٹ کی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"میرا ایک دوست ہے۔ پولیس انسپکٹر۔" میں نے کہا۔ "وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔"

"تمھیں اس گارڈ کو اسپتال لے جانا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پولیس سرجن سے بات کرو اور ایمبولینس منگوالو۔"

"اس کی کنڈیشن سیریس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی اور کا گھر ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو آپ سمجھا رہے ہیں اور رضوی صاحب ہوتے تو معاملات کو خود سنبھال لیتے۔ جیسا مناسب سمجھتے کرتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی تشہیر پسند نہ کرتے۔ تفتیش تو ہوگی ہی بعد میں۔ پہلے تو آپ اتنا دیکھ لیں کہ اسپتال لے جائے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں۔"

"اچھا۔" ڈاکٹر نے بادل ناخواستہ مجھ سے اتفاق کیا۔ "میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

اس کے آنے تک مجھے اور شیخ کو کچھ نہیں کرنا تھا۔ میں نے اسے چائے کی پیش کش کی۔

"چائے۔" وہ سر پہ ہاتھ مار کے بولا۔ "لنچ کے وقت چائے۔ گھر میں مچھلی تلی جا رہی تھی۔ تم نے کہا لنچ باہر کریں گے اور اب چائے۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔"

"لنچ بھی ہوگا۔ ذرا دیر ہوگی۔ ایسا اندھیر نہیں ہوگا کہ تمھیں محض ایک پیالی چائے پر ٹرخا دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"لاؤ لاؤ۔ کچھ بھی لاؤ۔" شیخ نے کہا۔ "بھوک کو قتل تو کرنا ہی ہے۔"

"شاید سنتری صاحب کو بھی چائے دینے سے ہوش آجائے۔" میں نے مزید دلائل دیے۔ "ڈاکٹر صاحب کی خاطر بھی ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر کے پہنچنے سے قبل ہی میں نے اور شیخ نے خاصی کوشش سے ایک ایک چمچہ کر کے آدھا کپ گرم چائے گارڈ کے حلق سے اتار دی اور اس کے مفید نتائج بھی برآمد ہوئے۔ وہ پوری طرح ہوش میں تو نہیں آیا مگر اس کے جسم کا درجۂ حرارت نارمل ہو گیا اور نبض کی رفتار بھی بہتر ہو گئی۔ وہ ایک بار آہستہ سے کراہا بھی جو ہوش آجانے کی پہلی امید افزا علامت تھی۔ ہم نے چائے کے ساتھ صبح کی بچی ہوئی ڈبل روٹی کا ایک ایک سلائس کھایا جو بھوکے اور خالی پیٹ کے لیے عبوری امداد کے مترادف تھا۔

"میں نے اپنا استعفیٰ اوپر ارسال کر دیا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"معاف کیجیے گا شیخ صاحب! یہ کوئی عقلمندی نہیں کی آپ نے۔" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔"

"سکندرِ اعظم! مانا کہ تم بڑے مردِ میداں ہو۔" وہ بولا۔ "مگر کیا ملا تمھیں مقابلہ کر کے؟ اس کے علاوہ تم میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ تمھارا جتنا نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تم انتقام کے جذبات سے مغلوب تھے اور تنہا تھے۔ میرے ساتھ جوان بہن ہے۔ ماں ہے۔ سوتیلی ہے تو کیا۔ اور میرا باپ ہے۔ میں ان سب کو اپنی جرأتِ مردانہ کی اَنا پر قربان نہیں کر سکتا۔ کیا قصور ہے آخر ان کا۔ انھوں نے مجھے پڑھا لکھا کے جوان کیا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ مجھے محبت دی اور... میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے بڑی نیک نیتی سے ایک غلطی بھی کی۔ یعنی مجھے اجازت دی کہ میں پولیس کی نوکری کر لوں وہ چاہتے تو مجھ سے کہتے کہ قانون پڑھو اور اپنی پریکٹس جماؤ۔ جیسا کہ میرے خاندان میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ مالی طور پر پریکٹس چلنے تک وہ میری کفالت بھی کر سکتے تھے اور مدد بھی۔ لیکن میں نے کہا کہ میں ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ طنز سے ہنسا۔ "بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر کہتے ہیں — لوگ بہت مظلوم ہیں کیونکہ انھیں انصاف نہیں ملتا اور انھیں پولیس سے بہت شکایات ہیں کہ وہ ظالم کے طرف دار ہیں اور خود بھی ظالم ہیں۔ میں اس تاثر کو ختم کروں گا۔ بے شک اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا مگر کسی نہ کسی کو صحیح سمت میں قدم اٹھانا ہی ہوگا۔ یہ نظام ان خرابیوں کے ساتھ ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ میں تمام نقصانات اور خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی تیار تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کیوں کہ دریا میں رہ کے مگرمچھوں سے بیر رکھنے کے نتائج کبھی خوشگوار نہیں ہوتے۔ اور تم اسے فلمی ڈائیلاگ نہ سمجھو تو کہوں کہ میں فرض کی ادائیگی کے لیے جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ جب فرض ہی چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلے کا ہو تو جان کی سلامتی کا یقین کیسے ہوتا ہے۔ یہ 'وائٹ کالر جاب' نہیں ہے۔ میز پر بیٹھ کے کلرکی کرنے یا افسر بن کے کمرے میں بیٹھنے والے کو بھلا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پولیس والے اگر رشوت لیتے ہیں، بھتے وصول کرتے ہیں یا جرائم کی سرپرستی کرتے ہیں تو مارے بھی جاتے ہیں۔ کبھی اسمگلروں کے ہاتھوں۔ کبھی قانون شکن عناصر کی فائرنگ سے اور کبھی مشتعل ہجوم کے حملے سے لیکن ملازمت کے اس مختصر سے دور نے میری خوش فہمی دور کر دی ہے۔ میری جنگ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نہیں ہوئی۔ میں ایک بدعنوان سازشی نظام کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا جنھوں نے مجھے صرف اس لیے مجرم قرار دیا کہ میں کتابی اور اصولی باتیں کرتا تھا اور ان پر عمل بھی کرنا چاہتا تھا۔ جب معاشرہ ہی 'کرپٹ' ہو تو وہ افراد جو اسی معاشرے کا حصہ ہوں، کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ انھیں آپ کہیں بھی بٹھا دیں۔ لہریں گننے والی بات سنی ہے نا تم نے؟ کسی بادشاہ نے ایک راشی اور بدعنوان شخص کو شکایات موصول ہونے کے بعد کبھی ایک محکمے میں کبھی دوسرے میں لگایا مگر وہ ہر جگہ لوگوں کو پریشان کر کے ناجائز آمدنی کے ذرائع پیدا کر لیتا تھا۔ تنگ آ کے بادشاہِ وقت نے اس کو دریا کے کنارے بٹھا دیا کہ یہاں بیٹھو اور لہریں گنو۔ صبح سے شام تک اور کوئی کام نہیں اور تمھیں بس اسی کام کی تنخواہ ملے گی۔ چند دن میں اس نے وہاں بھی آمدنی کی ایک صورت نکال لی۔ اس نے ماہی گیروں کو اور دریا سے کشتی پر سامان لے جانے والوں کو روک دیا اور کہا کہ تم سرکاری کام میں مداخلت کرتے ہو؟ مجھے یہاں لہریں گننے پر لگایا گیا ہے۔ تمھاری کشتیوں کے آنے جانے سے لہروں کا سارا حساب غلط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اجازت لیے بغیر کوئی نہیں گزر سکتا تھا اور اجازت بلا معاوضہ نہیں ملتی تھی۔"

میں اس کی سنجیدہ گفتگو کے باوجود ہنسنے لگا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں نیک نام صرف وہی ہیں جن کو موقع نہیں ملتا، ورنہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس حمام میں ننگا وہ ہے جس نے کپڑے پہن رکھے ہوں۔ جو مچھلی گندی نہیں ہے وہ جل میں رہنے کے قابل نہیں۔"

"اور الزام کوئی کسے دے؟" شیخ نے کہا۔ "آپ ایک ادارے کی بدعنوانی کی روک تھام کے لیے اس کے اوپر دوسرا ادارہ بنا دیں۔ وہ بھی ہوں گے تو ہم میں سے ہی نا۔ خیر یہ سب مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ مجھے کیا مشکلات درپیش ہوں گی۔ مگر میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میری اصول پرستی اور فرض شناسی کی سزا میرے علاوہ میرے گھر والوں کو بھی مل سکتی ہے۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور انھیں بھی خطرناک نتائج کی دھمکی دی جا سکتی ہے۔ تمھارے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہو جانے کے بعد مجھے انجام صاف نظر آنے لگا۔ میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میرے جرائم کی سزا سے دوسرے بھی نہیں بچ سکیں گے۔ میرا خیال ہے وہ مجرم بہتر ہیں جو کسی پولیس افسر کو گولی مار دیتے ہیں لیکن اس کے بعد کچھ نہیں کرتے۔ اس کی فیملی کو ختم نہیں کرتے۔ بیوی، بچوں۔ ماں باپ یا بھائی بہن پر ظلم نہیں کرتے۔ جن مجرموں سے میرا واسطہ پڑ رہا ہے وہ اتنے بے ضمیر ہیں کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے دوسروں کی زندگی سے دشمنی کرنے کی۔ کل کو خدانخواستہ میری بہن غائب ہو جائے۔ وہ ہر روز پیدل کالج جاتی ہے۔ میرے باپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے جس سے میری سوتیلی ماں بیوہ ہو جائے۔ وہ میری ماں کی سب سے چھوٹی بہن بھی ہے اور اس رشتے سے میری خالہ ہے۔ وہ روایتی قسم کی سوتیلی ماں نہیں ہے۔ میں اور میری بہن اس پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنا سب کچھ سمجھتی ہے۔ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ اپنی ضد پہ پورے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دوں۔ اپنی وجہ سے نہیں، میں ان سب کی وجہ سے شکست تسلیم کر لینا بہتر سمجھتا ہوں جن سے میرا خونی اور جذباتی رشتہ ہے۔ فکرِ معاش مجھے کبھی نہیں ہوئی۔ میں بزنس بھی کر سکتا ہوں۔"

"اور اس نظام کا کیا ہو گا جس کی اصلاح کا عزم لے کر تم پولیس میں بھرتی ہوئے تھے۔"

"اس کو خدا ہی ٹھیک کرے تو کرے۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں بھائی۔" شیخ نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"گویا یہاں کوئی بھی پہل نہیں کرے گا۔ کوئی سقراط نہیں آئے گا جو زہر کا یہ پیالہ اٹھائے؟" میں نے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ آخر رضوی صاحب نے اسی دلدل میں رہ کے خود کو کیسے غلاظت سے پاک رکھا۔ ان کے دامن پر داغ بھی نہیں آیا اور انھوں نے ترقی بھی کی۔ عزت بھی پائی اور نیک نامی بھی کمائی۔ آج بھی میری وجہ سے انھوں نے اپنی فیملی کے تحفظ کو غیر یقینی بنا رکھا ہے۔ وہ مجھے، محسن اور رابعہ کو گھر میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رابعہ کا گھر کس طرح تباہ ہوا تھا اور میرا ساتھ دینے والوں کا کیا حشر ہوا۔ تم اگر پولیس میں رہتے تو ہمارا اتفقہ کالم بن سکتے تھے۔"

"مجھے معلوم نہیں رضوی صاحب نے ناممکن کو کیسے ممکن کر دکھایا۔ شاید وہ اس دور میں بھرتی ہوئے تھے جب آزمائش اتنی سخت نہیں ہوتی تھی۔ اصول پرستی اور فرض شناسی سے کم لوگ خوش ہوتے ہوں گے مگر اوپر کچھ لوگ ضرور ہوں گے جو ان کی حفاظت کرتے رہے۔ اوپر والا مضبوط کردار کا مالک ہو اور غلطی پر سختی سے بازپرس کر سکتا ہو اور سخت سزا دے سکتا ہو تو نیچے والوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ کوئی غلط کام کریں۔ وہ اب اس پوزیشن میں ہیں کہ کوئی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے وہ نقصان میں ہیں۔" وہ اسی شہر کے کسی علاقے کے ایس پی ہوتے تو کتنے تھانوں کے مالک ہوتے؟ ایک معمولی تھانے کا چارج لینے والے کتنی سخت کوشش کرتے ہیں۔ سفارش لاتے ہیں اور بعض جگہ تو اس کی قیمت مقرر ہے۔ فلاں تھانے میں پوسٹنگ۔ اتنا معاوضہ۔ رضوی صاحب کسی قصبے کے ایس پی ہوتے تو اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ ہوتے اور اپنی رعایا سے جو خراج وصول کرنا چاہتے، کر لیتے اور ہیڈ کوارٹر میں پوسٹنگ تو گویا سزا ہوتی ہے ان کے نزدیک۔ رضوی صاحب تمھارے بارے میں سب جانتے ہیں اور ان کی رائے بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں بھی اپنے سایۂ عاطفت میں، یعنی ہیڈ کوارٹر میں بلانے کی سوچ رہے ہیں۔ لعنت بھیجو تھانے پر۔ تم حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے جو کتے کی دُم ہیں۔ بلکہ کاٹنے والے کتے ہیں۔ رضوی صاحب کے ساتھ رہو۔"

شیخ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ بظاہر وہ مجھ سے متفق نظر آتا تھا۔

"لیکن اب تو میں استعفیٰ بھیج چکا۔" اس نے کہا۔

"استعفیٰ واپس بھی لیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور نامنظور بھی کیا جا سکتا ہے۔"

اسی وقت کوئی گاڑی باہر آ کے رکی اور ڈاکٹر نے ہارن بجا کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں اسے لینے باہر گیا تو وہ کار سے اتر رہا تھا۔ اس نے اپنا بیگ مجھے یوں تھمایا جیسے گھر کے کسی خادم کو تھماتا۔

"تم ہو سکندرِ اعظم؟" اس نے کہا۔ "کیا لگتے ہو رضوی صاحب کے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "سکندرِ اعظم بھی ان کا کچھ نہیں لگتا تھا جو تئیس سو سال پہلے فوت ہوا تھا۔ میں سکندر بخت ہوں۔"

ڈاکٹر نے میرے مذاق پر برا سا منہ بنایا اور سیدھا چلتا گیا۔ میں دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو وہ خاصا

سب رنگ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونے والا سلسلہ

اقابلا

مکمل دو حصوں میں

تاریک برِاعظم کے پُراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور سفلی کے مقابلے برملا ہوتے تھے — وحشی قبائل اور اُن کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابلِ یقین سرگزشت — ان تاریک اور گمنام جزیروں کی کہانی — جہاں تہذیب کا کوئی دخل نہیں تھا — شگون کی خاطر معصوم اور شیرخوار بچوں کو نیزوں پر اُچھالا جاتا تھا عجیب الخلقت اور خوفناک دیوتاؤں کے مجسموں کو تازہ خون سے غسل دیا جاتا تھا — نوخیز حسیناؤں کی بھینٹ پیش کی جاتی تھی

اقابلا

وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حسینہ جس کا حُسن لازوال تھا جس کے حصول کے لیے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا — خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اُٹھا کر اقابلا کے دیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا —

کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہے

قیمت فی حصہ ۲۰/- روپے، علاوہ محصول ڈاک

پتہ ذیل پر رجوع کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ○ کراچی ۱

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آ گئے نکل چکا تھا اور میرے آواز دینے پر واپس آیا تو مزید جز بز ہوا۔ اس نے گارڈ کا معائنہ یوں کیا جیسے پوسٹ مارٹم شروع کرنے والا ہو۔

"کچھ نہیں" اس نے چند منٹ میں فیصلہ کر دیا۔ "شاک اور سر کی چوٹ۔ میں انجکشن دیتا ہوں۔ اگر ہوش نہ آئے ایک گھنٹے کے اندر اندر۔ یا ہوش آنے کے بعد متلی اور ستے وغیرہ ہو تو میو اسپتال لے جانا۔ ورنہ علاج کی ضرورت نہیں۔ آرام اور خوراک۔" اس نے ایک انجکشن بھرا اور گارڈ کی کلائی سے ذرا اوپر ابھری ہوئی رگ میں لگا دیا۔

"مسٹر پولیس انسپکٹر!" اس نے روانگی سے قبل کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ اس کیس میں کہیں میرا نام آئے۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" شیخ نے کہا۔

"تھینک یو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مریض خود ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ اور خدانخواستہ کنڈیشن سیریس ہو جائے۔ جس کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا تو آپ یہ نہیں کہیں گے کہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ دیا تھا۔"

"آئی ایم سوری۔ اس صورت میں جھوٹ بولنا مشکل ہو گا میرے لیے۔" شیخ نے کہا۔

ڈاکٹر نے نظر جما کے شیخ کو دیکھا۔ "میرے لیے مشکل نہیں ہو گا انسپکٹر! میں صاف انکار کر دوں گا۔ اور ثابت بھی کر دوں گا کہ میں سچا ہوں۔" وہ بیگ اٹھا کے احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گیا۔

"اس شخص کی رضوی صاحب سے کیسے نبھ رہی ہے؟" شیخ نے حیرانی سے کہا۔

"شاید اس لیے کہ ڈاکٹر اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد سنتری کو ہوش آ گیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا اور احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گیٹ پر ڈیوٹی دیتے دیتے وہ بیڈ روم میں کیسے آ لیٹا۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور زبردستی لٹا دیا۔ "وہ... جناب... بات تو سن لیں۔" اس نے حیرانی سے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔

"تمھاری بات بھی سنیں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "جب تمھاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"قسم خدا کی جناب! میرا کوئی... قصور نہیں۔" سنتری نے اس کے باوجود اپنا دفاع جاری رکھا۔

"ہاں ہاں۔ ہم جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم آرام کرو۔ یہ انسپکٹر صاحب اسی لیے آئے ہیں کہ تمھارا بیان لیں۔"

ہم نے اسے ایک گلاس گرم دودھ کا گلوکوز ملا کے دیا اور پھر طے کیا کہ ہم ایک گھنٹے کے لیے اسے چھوڑ کے لنچ کے لیے جا سکتے ہیں۔ یہ بات ہم نے اسے نہیں بتائی ورنہ وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ شاید اٹھ کے بھاگ جاتا۔ ہم نے کہا کہ دو گھنٹے بعد ہم پھر آئیں گے۔ ہم دوسرے کمرے میں آرام کرتے ہیں۔ ممکن ہو تو وہ بھی سو جائے۔

شیخ نے باہر آ کے اسکوٹر اسٹارٹ نہیں کیا۔ وہ سڑک تک اسکوٹر کو ایسے ہی چلا کے لایا اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر روک کے اسٹارٹنگ کک لگائی۔ اس وقت تین بجنے والے تھے اور جتنی دیر میں ہم بیڈن روڈ سے کھانا کھا کے لوٹے شام ہونے لگی تھی۔

"کیس کی رپورٹ تو لکھوانی پڑے گی۔" شیخ نے کہا۔

"پہلے ذرا اس کی سن لیں۔ رضوی صاحب کو اطلاع دینی چاہیے یا نہیں۔ یہ فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

سنتری پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا اور آنکھیں کھولے ہکا بکا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "آپ تو خیر سکندر صاحب ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ انسپکٹر صاحب کون ہیں۔ کس نے بلایا ہے انھیں؟"

"میں نے بلایا ہے۔" میں اس کے لہجے پر حیران ہو کے بولا۔ "یہ سب انسپکٹر اکرام شیخ ہیں۔"

"سوالات مجھے کرنے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟"

"دین محمد۔ مگر میں کانسٹیبل نہیں ہوں۔" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہو؟ نائک؟" شیخ نے فل اسکیپ کاغذ پر قلم سے کچھ لکھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی سب انسپکٹر ہوں۔" وہ بولا۔ "میں اپنی اسناد کا اور میڈلوں کا کیا ذکر کروں۔ یوں سمجھ لیں کہ دہشت گردی کا کیس ہو تو عموماً مجھے خصوصی تفتیش کی ٹیم میں ضرور شامل کیا جاتا ہے۔"

انسپکٹر شیخ نے اور میں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "گویا تمھیں خاص طور پر رضوی صاحب کے گھر کی حفاظت کے لیے منتخب کیا گیا تھا؟" شیخ نے کاغذ پر اس کا نام اور عہدہ لکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ناکام رہا۔ ایس پی صاحب کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟" وہ خفت سے بولا۔

"ہاں۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاتے وقت انھوں نے تم سے بات بھی کی تھی۔"

"مجھ سے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "میں نے تو انھیں جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ کب گئے تھے وہ؟"

"آج صبح ساڑھے نو بجے۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ خود گاڑی چلا رہے تھے اور اس وقت تم اپنی مشین گن لیے گیٹ پر کھڑے تھے۔ میرے سامنے انھوں نے گیٹ پر کار روکی تھی۔"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کوئی اور ہو گا سکندر صاحب!"

"کل۔ یعنی گزشتہ رات تقریباً ایک بجے سے ساڑھے چار بجے تک بھی میں نے تم کو ہی گیٹ پر اٹین شن دیکھا تھا۔" میں نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا۔ "اسی لیے میں نے تمھیں شناخت کر لیا۔ میرے علاوہ رابعہ بی بی نے دیکھا تھا تمھیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا ہمیں۔ ہم باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ چاندنی کا اجالا بہت کافی تھا۔ اور تم تو گیٹ لائٹ..."

"آپ اپنی کہتے جا رہے ہیں۔" دین محمد نے ناگواری سے کہا۔ "میری بھی تو سن لیں۔ گزشتہ رات بھی میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ آپ نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ اتنی دور سے وردی میں سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میرے ہی قد و قامت کا کوئی آدمی ہو۔ یا اس کی صورت مجھ سے ملتی ہو۔ صورت تو میک اپ سے بنائی بھی جا سکتی ہے۔ میں تو پرسوں شام کو اندھیرا ہونے کے بعد ڈیوٹی پر پہنچا تھا۔ دن میں دوسرا شخص آ گیا۔ رات کو دس بجے پھر میں نے چارج لیا تھا۔ اس وقت تک صاحب بھی گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس گیٹ پوسٹ کے پیچھے یا ساتھ والی کوٹھی کی دیوار کے ادھر کوئی چھپا کھڑا تھا جس نے اچانک مجھے قابو کر لیا۔ میری نظر سڑک پر بھی تھی اور... ہر طرف تھی۔ لیکن پڑوسیوں کی طرف سے میں مطمئن تھا۔ مجھے معلوم ہے وہاں کون رہتا ہے۔ وہ بہت چالاک لوگ تھے۔ واقعی پیشہ ور لوگ۔ انھوں نے مجھے پیچھے سے دبوچا اور میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ کلوروفارم میں بھیگا ہوا۔ وہ دو تھے اور جس نے مجھے قابو کیا وہ خاصا طاقتور تھا۔ اس نے رومال رکھتے ہی مجھے پیچھے جھاڑیوں میں گھسیٹ لیا تھا۔ پھر دوسرے نے میرے سر پر کوئی چیز دے ماری تھی۔ کوئی خاصی سخت چیز۔ میرا خیال ہے رومال یا کسی کپڑے سے ہاکی یا کرکٹ کی گیند لپیٹ کر وار کیا گیا تھا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ کلوروفارم سے نہیں۔ اس ضرب سے۔ میں نے سانس روک لیا تھا اور تین منٹ تک روک سکتا تھا۔ مجھے اگر مہلت ملتی تو میں ان دونوں سے نمٹ لیتا۔ شاید انھوں نے اندازہ کر لیا تھا۔ اور اسی لیے انھوں نے سر پر وار کیا۔ میں نے ان کی صورتیں تو نہیں دیکھیں مگر آوازیں سنی تھیں۔ ایک نے دوسرے سے چلا کے کہا تھا۔ "دیکھتا کیا ہے۔ مار۔" اس کے بعد کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے انہی میں سے کسی نے میری وردی پہن لی ہو گی اور پہرے دار بن کے کھڑا ہو گیا ہو گا۔ آپ نے بھی اسے ہی دیکھا اور ایس پی صاحب نے بھی۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی نظر تو دھوکا کھا سکتی ہے۔ ایس پی صاحب کو دھوکا کیسے ہو گیا!"

"میرا خیال ہے انھوں نے اس شخص کو نہیں دیکھا ہو گا جو دن کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ اگر انھیں تمھاری جگہ کوئی اور نظر آیا ہو گا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ دن میں یہی شخص ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "وہ کس وقت آتا ہے؟"

"دس بجے" دین محمد نے کہا۔ "بارہ بارہ گھنٹے سے ڈیوٹی بدلتی ہے۔"

"پھر سوال یہ ہے دین محمد کہ آج صبح دس بجے وہ کیوں نہیں آیا؟" شیخ نے کہا۔ "رضوی صاحب آدھے گھنٹے پہلے چلے گئے تھے اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے نقلی محافظ کو اصلی سمجھا۔ گزشتہ روز بھی وہ دس بجے آیا ہو گا۔ اور دس بجے رضوی صاحب آفس میں ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی باہر ہی باہر بدل جاتی تھی۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے بھی نہیں دیکھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"خواجہ اکبر۔ وہ بھی سب انسپکٹر ہے سی آئی اے کا۔" دین محمد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کل رات دس بجے سے تم وہاں بیہوش اور بندھے پڑے تھے۔"

"کہاں بندھا پڑا تھا۔ نشانات تو مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔ اپنے جسم پر۔" وہ بولا۔

"پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر ہے۔ اس کے صحن میں۔" میں نے کہا۔ "آج دو بجے تک سولہ گھنٹے ہو گئے۔ اور کلوروفارم سے کوئی بھی سولہ گھنٹے بیہوش نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے تمھیں خواب آور دوا بھی دی ہو گی۔"

"اس کا اثر بھی آٹھ گھنٹے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن تمھاری بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں پڑے ہو۔" شیخ نے میری بات پر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک نہیں۔ چنانچہ یا تو ہم فرض کر سکتے ہیں کہ سولہ گھنٹے کی بیہوشی سر کی چوٹ کا نتیجہ تھی۔ جو بہت طویل وقفہ ہے اور چوٹ اتنی سیریس ہوتی تو ڈاکٹر کو اندازہ ہو جاتا۔ اس کا کوئی نشان نہ ہوتا تب بھی ڈاکٹر اسے معمولی قرار نہ دیتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنا کام ختم ہونے تک تمھیں ہوش میں نہیں آنے دیا گیا۔ وقفے وقفے سے تمھیں انجکشن وغیرہ دیے گئے۔"

دین محمد نے ڈھیلے ڈھالے نائٹ سوٹ کی آستین کو شانے تک اٹھا کے دیکھا۔ شانے سے ذرا نیچے تین ننھے ننھے نشان نظر آ رہے تھے۔ اس نے بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھوڑا سا دبا کے اقرار میں سر ہلایا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"ممکن ہے اسی شخص نے یہ کام بھی کیا ہو جو بیداری کے بہانے گھر کی نگرانی پر مامور تھا۔ مارفیا۔ پیتھاڈین یا ڈائنزی پام کا ہیوی ڈوز دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ چیزیں عام دستیاب ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمھارا قابلِ فخر ریکارڈ خراب ہو گیا دین محمد! تم پہ چارج تو بنے گا۔ ایک غفلت برتنے کا۔ دوسرا وہ اسلحہ گم کرنے کا جو تمھیں خصوصی اجازت کے تحت دیا گیا ہوگا۔ تم معطل بھی ہو جاؤ گے لیکن میرا خیال ہے بحال بھی ہو جاؤ گے۔"

"کیسی عجیب اور خطرناک بات ہے شیخ کہ رضوی صاحب تک مطمئن تھے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بدمعاش پاسبان نہیں، دشمنِ جان تھا۔ آج مجھے خیال آیا تھا کہ سنتری اس طرح ڈیوٹی چھوڑ کے جانے کی حماقت اور جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ گھر کی بات دشمنوں تک اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ کل رات ہی محسن کے والد کا فون آیا تھا اور انھوں نے صبح ہم سے بات کی۔ اس سے پہلے اسلام آباد جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اور اس پروگرام کی فوراً دشمنوں کو خبر مل گئی۔ میں سوچ رہا تھا کیسے؟ کیا انھوں نے گھر کے اندر کوئی خفیہ مائیکروفون چھپا رکھا ہے اور کہیں آس پاس ہی بیٹھے سب گفتگو سن رہے ہیں۔ اب بات سمجھ میں آتی ہے۔ یا تو وہ بدمعاش جو گیٹ پر محافظ بنا کھڑا تھا کسی کھڑکی دروازے سے کان لگائے ساری باتیں سن سکتا تھا مگر اس میں پکڑے جانے کا بہت خطرہ تھا۔ رضوی صاحب یا گھر کا کوئی فرد اچانک باہر آ جاتا تو اسے دیکھ لیتا۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ کوئی چھوٹا سا ٹرانسمیٹر مائیکروفون گھر کے اندر تھا اور ریسیور اس کی جیب میں۔ ظاہر ہے اس کی رینج بہت کم ہوتی ہے۔ انھیں آس پاس کوئی جگہ نہ ملی...۔"

"نہیں سکندر! بات جگہ کی نہیں۔" شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ کچھ اور بتانا چاہتے تھے۔ یہ کہ تم لاکھ ایس پی کی کوٹھی میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ جاؤ اور دروازوں پر محافظ بٹھا دو۔ ہماری پہنچ سے باہر نہیں۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ غور کرو کہ ان کے ہاتھ میں مشین گن تھی۔ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ گھر کو اڑا دیتے یا سب کو لے جاتے۔ مگر وہ صرف ایک فائل لے گئے اور کچھ کہے بغیر بہت کچھ کہہ گئے۔ کہ ہم بلاوجہ کشت و خون نہیں کرتے اور تمھیں ایک موقع فراہم کرتے ہیں کہ ہماری طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے مقابلے کا خیال چھوڑ دو۔"

شیخ کے مشورے پر میں نے رضوی صاحب کو اطلاع دیے بغیر رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی ڈیوٹی شروع ہونے والی تھی۔ وہ رخصت ہو گیا تو میں نے طے کیا کہ رپورٹ بھی آٹھ بجے کے بعد لکھواؤں جب حشمت خان کی جگہ خود اکرام شیخ آ جائے۔ اس کے جانے کے بعد میں دین محمد سے باتیں کرتا رہا۔ وہ پرانا سپاہی تھا۔ وہ مجھے اپنی بہادری کے پرانے کارنامے سناتا رہا جن پر اسے تعریفی اسناد ملی تھیں اور میڈل ملے تھے۔

ساری بات یہ ہے کہ موت نہ وقتِ مقررہ سے پہلے آتی ہے نہ اس کے بعد۔ جب یہ وقت آتا ہے تو وہ عورت جو مفلوج ہو اور گھر کے اندر بستر پر لیٹی ہو اور بالکل نہ جانتی ہو کہ دنیا میں کوئی اس کا دشمن بھی ہے جو تصور بھی نہ کر سکتی ہو کہ اس کی موت طبعی نہیں ہوگی اور قتل کو ایسا فعل سمجھتی ہو جو انسان نہیں کر سکتے۔ خود قتل ہو جاتی ہے۔ ورنہ دین محمد جیسے لوگ خطرناک ترین مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں۔ آتشیں اسلحے کی جنگ میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ میڈل اور اسناد پانے کے لیے زندہ رہتے ہیں اور انھیں خراش تک نہیں آتی۔

رات کو میں اسے رابعہ کی گاڑی میں بٹھا کے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گیا۔ حشمت خان چارج دے چکا تھا اور محض اپنا فلسفۂ حیات اور ملازمت کے زریں اصول سمجھا کے شیخ کا وقت ضائع کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ چونکنے کا اصل سبب میرے ساتھ دین محمد کا آنا تھا۔ دین محمد پولیس سے سی آئی اے میں گیا تھا اور پرانا افسر تھا چنانچہ حشمت خان بھی اس کو پہچانتا تھا۔ پہلا نظریہ اس نے یہی قائم کیا ہوگا کہ میرے جیسے خطرناک مجرم کا کیس اب سی آئی اے نے لے لیا ہے مگر رپورٹ کی بات سن کے اسے مایوسی ہوئی۔ دین محمد اب میری قمیص اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

"آپ میری مانیں تو گھوڑے شاہ کے مزار پر کوئی منت مانیں۔" اس نے درمیان میں موقع پا کے کہا۔ "آپ کے سارے گھر پر کسی کا منحوس سایہ ہے۔" اس نے بڑے معنی خیز طریقے سے میری طرف دیکھا۔

"سارے گھر کا کیا مطلب ہے؟" دین محمد نے ناگواری سے کہا۔ "میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔"

"وہ تو ہے جی۔ مگر ذرا غور کریں نا۔ ایک ہی وقت میں آپ اور آپ کے بھائی دونوں...۔" اس نے عمداً جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"پوری بات کیوں نہیں کرتے؟" دین محمد نے کہا۔ "کیا ہوا ہے میر محمد کو؟"

چونکنے کی باری اب میری تھی۔ "میر محمد بھائی ہے تمھارا؟ سگا؟"

"اور کیا سوتیلا۔ آپ بھی کمال بات کرتے ہیں سکندر صاحب! اب دیکھیں نا۔ کل سے اس کا بھی پتا نہیں۔" حشمت خان بولا۔

"کیا پتا نہیں ہے؟" دین محمد نے برہمی سے کہا۔ "اس کا گھر تو یہیں ہے۔"

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" حشمت خان نے کہا۔ ان کو کل ... کہ

ساتھ عدالت جانا تھا لیکن ان کا ایک پیغام ملا مجھے کہ وہ نہیں جا سکتے اور یہ کام میں کروں۔ کورٹ تو میں چلا گیا۔ لیکن میں نے اپنے شک کا بہرحال اظہار کر دیا تھا کیونکہ تحریر میر محمد کی نہیں تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت پریشان ہے۔ ایسے بتائے بغیر وہ پہلے کبھی کہیں نہیں گیا۔"

دین محمد اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بھابی سے پوچھتا ہوں۔"

میں اور شیخ اس کے پیچھے گئے لیکن حشمت خان وہیں بیٹھا رہا۔ میر محمد کا گھر تھانے سے ملحق احاطے میں تھا جہاں عملے کی رہائش کے لیے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ دو بلاک ماتحت عملے کے لیے تھے اور یہ چھوٹے کوارٹر تھے۔ میر محمد تین کمروں والے فلیٹ میں تھا اور کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ دین محمد نے دستک دی اور دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ پھر ہم نے اس کے چلّانے کی آواز سنی اور اجازت لیے بغیر اندر گھس گئے۔

اندر دین محمد دیوانہ وار ایک سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ دونوں کمروں کی حالت ناقابلِ بیان حد تک ابتر تھی۔ گھر کا سارا سامان کباڑی کی دوکان کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ سارے صندوقوں کو الٹ کر خالی کر دیا گیا تھا۔ اب خالی صندوق الگ پڑے تھے اور ان کا سامان فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ یہی کیفیت الماریوں کی تھی۔ ان میں سے ہر چیز نکال کے باہر ڈال دی گئی تھی۔ تلاشی لینے والوں کے لیے ممکن ہوتا تو وہ دیواروں کو بھی ادھیڑ دیتے کیونکہ انھوں نے کوئی چیز سلامت نہیں چھوڑی تھی۔ انھوں نے تکیے، لحاف بستر سب پھاڑ دیے تھے۔ ایک صوفہ سیٹ کا کور خنجر جیسی کسی چیز سے یوں پھاڑا گیا تھا کہ صرف اندر کے اسپرنگ رہ گئے تھے انھوں نے درمیان میں بھری ہوئی جوٹ تک نکال پھینکی تھی۔

"میر محمد کی بیوی کہاں ہے؟" شیخ نے ہر طرف جھانک کر تباہی و بربادی کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔ میں ابھی تمھارے سامنے ہی تو آیا ہوں۔" دین محمد نے کہا۔ "دیکھا نہیں تھا کیا؟"

"تمھاری دستک پر دروازہ کس نے کھولا تھا؟" شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کسی نے بھی نہیں۔ جب میں نے دستک دی تھی تو دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہو گیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔ "دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔"

"شاید سامنے کے فلیٹ والے پڑوسی کو کچھ معلوم ہو۔" شیخ نے کہا۔ باہر جھانکنے پر مجھے سامنے کا دروازہ مقفل نظر آیا۔ نیچے رہنے والوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر منزل پر دو فلیٹ تھے جن کے دروازے زینے میں آمنے سامنے کھلتے تھے چنانچہ میر محمد کی بیوی کا میل ملاپ زیادہ تر تیسری منزل کے دوسرے مکینوں کے ساتھ تھا مگر اس میں رہنے والا اے ایس آئی تبدیل ہو کے ملتان چلا گیا تھا اور تب سے وہ فلیٹ خالی پڑا تھا۔ تیسری منزل پر میر محمد اکیلا تھا۔ دین محمد اور اکرام شیخ نے مجھے فلیٹ ہی میں چھوڑا اور اوپر چلے گئے۔ اوپر کسی دوسرے تھانے کے دو انسپکٹر رہتے تھے۔ وہ اپنے اپنے گھر میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ان کے کانوں نے بھی کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنی تھی۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میر محمد غائب ہے۔

دس منٹ بعد وہ دونوں لوٹ آئے۔ "ابھی کل میری اس سے بات ہوئی تھی۔" دین محمد نے کہا۔

"کل بات ہوئی تھی تمھاری؟" شیخ نے چونک کر کہا۔ "کس وقت؟"

"صبح دس سوا دس بجے۔ صحیح وقت تو میں نے نوٹ نہیں کیا تھا۔ میں ڈیوٹی کے بعد تھانے گیا تھا۔" دین محمد بولا۔

"اور تمھارا بھائی وہاں موجود تھا؟" شیخ نے کہا۔ "کیا بات ہوئی تھی اس سے؟"

"اس نے فون کیا تھا۔" دین محمد نے کہا۔

"کہاں سے؟ اس کے گھر میں تو فون ہے نہیں اور تھانے میں وہ آیا نہیں تھا۔" شیخ نے کہا۔

"یہ میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تھانے سے ہی بات کر رہا ہوگا۔" دین محمد بولا۔

"اور تم نے اپنے تھانے پہنچ کر فون ریسیو کیا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے ڈیوٹی کے بعد گھر جانے سے پہلے ایس پی صاحب کو رپورٹ دینی پڑتی ہے۔ ابھی میں نے رپورٹ نہیں دی تھی۔ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ اتنی دیر میں ایک انسپکٹر نے آواز دے کر مجھے بلایا اور کہا میر محمد کا فون ہے۔"

"گویا میر محمد کو معلوم تھا کہ تم اس وقت ڈیوٹی ختم کر کے تھانے پہنچ گئے ہو گے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ نتیجہ آپ نکال رہے ہیں۔" دین محمد نے کہا۔ "میر محمد کو میں نے اپنی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہمیں جب بھی بات کرنی ہوتی تھی، اپنے اپنے تھانے سے فون کر لیتے تھے۔ اس میں کوئی غیر معمولی یا نئی بات نہیں تھی۔"

"اچھا کل کوئی خاص بات کہی تھی اس نے؟" شیخ نے کہا۔

"دیکھیں جی۔ ویسے تو وہ بھائی تھا میرا۔ مجھ سے چھوٹا تھا۔" دین محمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "لیکن اس کی اور میری طبیعت میں بہت فرق تھا۔ اسے پیسے کی ہوس تھی۔ پیسے کی خاطر وہ بہت سے غلط کام بھی کرتا تھا۔ غلط کام تو سب ہی کرتے ہیں مگر اپنا دامن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بچا کے۔ زمانہ بڑا خراب آگیا ہے۔ ایک سبزی فروش کے وارث بھی ہائی کورٹ جا پہنچتے ہیں، وکیل کر لیتے ہیں اور پولیس کو عدالت میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ پیسہ آگیا ہے سب کے ہاتھ میں اور وکیل صاحب کو صرف پیسہ چاہیے۔ ایک بار اس نے کسی ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ مار دیا تھا۔ جی ٹی روڈ پر ساری ٹریفک رک گئی۔ ٹرک والوں کے ساتھ بس والے شامل ہو گئے اور انھوں نے سڑک بند کر دی۔ ایس ڈی ایم اور کمشنر صاحب کو معاملہ رفع دفع کرانا پڑا۔ میں اس کو بہت سمجھاتا رہا کہ دیکھ حد سے نہ بڑھ۔ تیرا ریکارڈ اچھا نہیں ہے۔ آئے دن شکایات موصول ہوتی ہیں۔ مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا تھا کہ وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ بیوی کے نام سے گلبرگ کی ایک دو منزلہ کوٹھی دو سال پہلے خریدی تھی۔ ایک کینال کی کوٹھی ہے۔ اس کے دونوں حصّے کرائے پر اٹھا رکھے تھے۔ دوسری ابھی بیٹے کے نام سے لی تھی۔ خاصی زرعی زمین بھی تھی۔ ساہیوال کی طرف۔ کِنوّں، مالٹے کے ایک باغ سے ہی پچاس ہزار سالانہ ملتے تھے۔ لیکن اس میں قناعت نہیں تھی۔ بیوی بھی روتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی بھائیا جی! آپ ہی سمجھائیں انھیں۔ میری تو ایک نہیں سنتے۔ اتنا لالچ ٹھیک نہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو نوکری بھی جائے گی اور عزت بھی۔ کیا فائدہ ان کوٹھیوں کا اور اس پیسے کا جن کا مالک جیل میں پڑا ہو۔ ہمیں اتنا بہت ہے۔ وہ الٹا بیوی پر گرم ہوتا تھا کہ کیسی عورت ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں اس کے بھلے کے لیے، بچوں کے بھلے کے لیے کرتا ہوں۔ جس روز ایسی ویسی بات کا خطرہ ہو گا میں استعفیٰ منہ پر مار دوں گا۔ کیا میں اس معمولی سی پینشن کی رقم کے لیے نوکری کر رہا ہوں جس سے میرا مہینے کا سگریٹ خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں جب چاہوں اپنا بزنس شروع کر سکتا ہوں اور جتنی تنخواہ اب سرکار کے خزانے سے لے رہا ہوں اس سے زیادہ تنخواہ پر سیلزمین ملازم رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ تو میں سمجھ گیا۔" شیخ نے بڑی احتیاط سے اس کو ٹوکا۔ "کل کیا بات ہوئی تھی؟"

"کل..." دین محمد نے کہا۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ "ایک بات ایسی تھی۔ قابلِ ذکر... اس نے کہا تھا، بھائیا جی! بس اب نوکری سے چھٹی اپنی، میں نے کہا۔ کیا مطلب؟ استعفیٰ دے دیا ہے کیا؟ اس نے کہا، بس دے دوں گا آج کل میں۔ بہت کر لی سب کی غلامی، میں پہلے تو یہی سمجھا کہ جس بات سے میں ڈرتا تھا وہی نہ ہوئی ہو۔ میں نے کہا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ وہ ہنسنے لگا۔ بولا، بھائیا جی! آپ تو ہمیشہ ڈرتے ہی رہے۔ بات کیا ہونی ہے۔ بس جی بھر گیا ہے اپنا، میں نے کہا۔ پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہو گی کہ آج تم نے اچانک فیصلہ کر لیا۔ وہ بولا، ہاں۔ ایک بڑا سودا کیا ہے۔ لاکھوں کا۔ بڑی پارٹی ہے۔ پانچ لاکھ دیتے تھے، میں نے دس پر مجبور کر دیا، میرے بہت پوچھنے پر بھی اس نے سودے کی نوعیت نہیں بتائی اور پارٹی کا نام نہیں لیا۔ ایک بات میں اس سے کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکا کہ دس لاکھ دینے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔ وہ نو لاکھ بچانے کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں۔ ایک لاکھ دے کر کسی کو تمھارا پتہ صاف کرنے کے لیے بھیج سکتے ہیں۔ اس شہر میں ایسے بہت ہیں جو ایک لاکھ کی خاطر اپنے بھائی کے قتل سے گریز نہ کریں۔" وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے اندیشے غلط نہیں تھے۔"

"یہ معاملہ تفتیش طلب ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ معلوم کرو اس کے بیوی بچے کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہیں وہ تمھارے گھر تو نہیں گئے ہوئے ہیں۔"

دین محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی بیوی کی میری بیوی سے کبھی نہیں بنی۔ حالانکہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔"

"اس اختلاف کی وجہ؟" شیخ نے کہا۔

"عورت ذات کی فطرت۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "سگی بہنیں دو گھروں میں جا کے ایک دوسرے کی بھاوج بن جاتی ہیں تو بہن کے رشتے کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یہ دیکھنے لگتی ہیں کہ دوسری بہن کے گھر میں کیا ہے اور میرے گھر میں کیا نہیں ہے۔ حسد کی کوئی انتہا نہیں۔ سارا قصور میری بیوی کا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی تھی کہ اپنے بھائی کے گھر کو دیکھو اور اپنے گھر کو دیکھو۔ میری تو قسمت پھوٹ گئی آپ سے شادی کر کے۔ وہ چھوٹی بہن ہے اور اس کے گھر میں ہر چیز ہے۔ بھلا دھول اڑ رہی ہے۔ وہ عیش کر رہی ہے اور میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں، حالانکہ میر محمد کی بیوی اپنے شوہر کی کمائی سے خوش نہیں تھی۔ وہ میرے سامنے روتی تھی کہ مجھے یہ منحوس کمائی اور ایسی بھلائی نہیں چاہیے۔ معاملہ بالکل الٹا تھا۔ جسے سب میسّر تھا وہ کہتی تھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ معلوم نہیں وہ میری بیوی ہوتی تو کیا کہتی۔ شاید وہی جواب میری بیوی کہتی ہے۔ عورت کو نہ غربت راس آتی ہے نہ دولت۔ بس اسی بات پر ان کی ایسی اَن بن تھی کہ ایک دوسرے سے بات تک کرنے کی روادار نہ تھیں۔"

"ممکن ہے وہ میکے گئی ہو۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "دونوں کا میکہ ایک تھا۔ اب نہیں ہے۔ ماں باپ مر گئے۔ بھائیوں نے مکان بیچ کر پیسہ بانٹ لیا۔ ایک دوبئی چلا گیا۔ دوسرا کراچی گیا تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہے۔"

"تمھیں ان کے ملنے جلنے والوں کے متعلق کچھ معلوم ہے؟" شیخ نے کہا۔

"شیخ صاحب! اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔" دین محمد نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا لیکن اُسے بیہوش کرنے والے اُس کی گھڑی بھی اتار کر لے گئے تھے۔ "جس عورت کا شوہر دو دن سے غائب ہو، وہ کہاں جائے گی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ۔"

"شاید وہ یہی معلوم کرنے نکلی ہو۔ اسے معلوم ہو گا کہ میر محمد کہاں جاتا ہے۔ کس کس سے ملتا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یہ معلوم کرنے کے لیے اسے خود دھکے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تھانے میں کہلوا سکتی تھی کہ فلاں فلاں جگہ پر جا کے دیکھو۔" دین محمد نے کہا۔ "وہ خود گھر پر انتظار کرتی۔"

"اگر وہ کچھ دیر میں آجاتی ہے تو ٹھیک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "ورنہ... ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ میر محمد کی بیوی بھی غائب ہے اور وہ خیریت سے نہیں ہے۔ نو لاکھ بچانے والوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا ہے۔ شاید انتخاب انھوں نے میر محمد پر چھوڑ دیا ہو گا کہ بیوی بچوں کی زندگی اور دس لاکھ میں سے جو قبول ہے رکھ لو۔"

دین محمد نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا مگر مجھ میں ہمت نہیں تھی یہ بات کہنے کی۔"

"حقائق کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے دین محمد!" شیخ نے کہا۔ "خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ تمھیں بالکل اندازہ نہیں کہ یہ سب کسی نے کیوں کیا ہو گا؟ کس چیز کی تلاش تھی انھیں؟"

میں بہت دیر سے خاموش تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ میر محمد کس پارٹی کو پانچ لاکھ کے بجائے دس لاکھ دینے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ وہ کیا چیز تھی جس کے بدلے کوئی اتنی بڑی رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ میری سمجھ میں ایک ہی جواب آتا تھا۔ میر محمد نے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے ٹیپ ریکارڈر کے ایک اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہو گی جو اس نے ٹیپ ریکارڈر میں سے نکال لیا تھا اور غائب کر دیا تھا۔ اس پر عبدل کا وہ اعترافِ جرم اس کی اپنی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا جو اس نے مرنے سے قبل کیا تھا۔ شیخ نے فون کو ٹیپ ریکارڈر سے جوڑ کر عبدل کی آواز کو محفوظ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جب عبدل کا فون آیا تھا تو تھانے میں ایک ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ گرانڈگ کا ماڈل TK-47 جو ٹیلی فون کے پیغامات خود بخود ریکارڈ کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ عبدل کے قتل کی ابتدائی تفتیش کر کے لوٹا تھا تو یہ ٹیپ موجود نہیں تھا جس کے پیغام کو ایک محرّر نے کاغذ پر نقل کیا تھا۔ اب وہ محرّر بھی نہیں تھا۔ لیکن محرّر نے بتایا تھا کہ ٹیپ کو میر محمد نے حشمت خان کی موجودگی میں نکالا تھا۔ محرّر اور ٹیپ کی عدم موجودگی میں عبدل اور رشید سے کے قتل کا الزام مجھ پر آتا تھا۔ میر محمد پہلے سے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے گرفتار کرنے کے بعد کہا تھا کہ صاحب چاہتے ہیں تم میر شرافت علی کے قتل کا اعتراف کر لو۔ میں نے اصل قاتل یعنی مندری والے استاد پیڈرو کو تھانے میں اس کے پاس آتے دیکھا تھا مگر وہ صاف مکر گیا تھا۔ اب تو یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ جعلی اے ایس پی سراج تھا جو کوئی جعل ساز تھا۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں تصور کر سکتا تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ اسپول کا سودا کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ اس نے چوہدری دلاور یا ان کے کسی ساتھی سے کہا ہو گا کہ میرے پاس وہ چیز ہے جو تمھارے دشمن کو سیدھا تختۂ دار تک پہنچا سکتی ہے اور تمھارے سارے مسائل حل کر سکتی ہے۔ بولو کتنے میں سودا کرتے ہو۔ اور جب انھوں نے پانچ لاکھ سے زیادہ دینے سے انکار کیا ہو گا تو میر نے کہا ہو گا کہ اچھا میں یہ ٹیپ شیخ کے حوالے کر دیتا ہوں یا سکندر کو دے دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ دس لاکھ دینے پر بھی رضامند ہو گئے ہوں گے۔

اور اس کے بعد وہی ہوا ہو گا جو دلاور جیسے لوگ یہ تمام آئے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے طے کر لیا ہو گا سب حفاظتی وہ اسپول ٹیپ ان کے حوالے کرے گا اُدھر دوسری طرف، ہو گا کہ میں بیوی بچوں کو اٹھوا لیا جائے گا اور میر محمد کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دی جائیں گی کہ یہ رہے دس لاکھ نقد اور یہ ہے تمھاری فیملی۔ ایک چیز لے جاؤ۔ دس لاکھ کی رقم کم تو نہیں ہوتی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ سودا اگر طے ہو گیا تھا تو خانہ تلاشی کی نوبت کیوں آئی۔

اس سوال کے کئی جواب ممکن تھے۔ مثلاً میر محمد نے وعدہ کیا کہ وہ اسپول ٹیپ لے کر وقتِ مقررہ پر فلاں جگہ پہنچ جائے گا۔ میر محمد بھی کم ہوشیار نہیں تھا۔ اس نے احتیاط کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی ویران جگہ پر ٹیپ اس کے حوالے نہیں کیا ہو گا۔ شاید اس نے کسی ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا ہو گا اور وہ مسلح ہو کے بھی گیا ہو گا۔ اس نے قبل از وقت پہنچ کے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اس کو رقم دینے اور ٹیپ لینے کون آتا ہے۔ وہ پولیس کی وردی میں گیا ہو گا اور اس نے ٹیپ کہیں رکھوا دیا ہو گا۔ مثلاً ریسٹورنٹ کے منیجر کے پاس یا اپنے کسی آدمی کے پاس جو قریب ہی مسلح بیٹھا ہو گا کہ سودا کرنے والوں کی نیت میں فتور کا احساس ہو یا وہ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے کے موڈ میں آئیں تو وہ بات کیے بغیر نکل جائے یا وہ لوگ ٹیپ چھین کر رقم ادا کیے بغیر جانا چاہیں تو نہ جا سکیں۔ میر محمد کا ساتھی ان کا راستہ روک لے۔ پھر وردی میں ملبوس ایک پولیس انسپکٹر ان سب کو ہینڈز اَپ کرا کے لے آئے اور تھانے میں بند کر دے۔ شاید ایسی ہی کوئی وجہ تھی جس کے باعث سودا نہ ہو سکا مگر وہ لوگ میر محمد کو ٹیپ سمیت لے جانے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اُن کامیاب ہو گئے، میر محمد کی احتیاطی پیش بندی ناکام رہی، ایسی صورت میں میر محمد کے بجائے اس کی لاش ملنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سودا کرنے والوں نے رقم ادا کر دی ہو مگر میر محمد کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہو اور اس نے جو ٹیپ دس لاکھ کے لیے کر دیا ہو، وہ اصل نہ ہو یا اس نے آدھی رقم پیشگی مانگی ہو اور اسے باقی آدھی نہ ملی ہو تو اس نے ٹیپ دینے سے انکار کر دیا ہو۔ تلاشی لینے پر اس کے پاس سے کچھ برآمد نہ ہوا ہو تو پانچ لاکھ ادا کر دینے والوں نے اسے اپنے پاس رکھا ہو اور اپنے آدمی اس کے گھر سے اسپول ٹیپ لانے کے لیے بھیجے ہوں۔ ٹیپ تو انھیں نہیں ملا مگر وہ جاتے جاتے اس کے بیوی بچوں کو لے گئے تاکہ ان کو تشدد کا نشانہ بنا کے میر سے ٹیپ حاصل کر سکیں۔

یا پھر سودا تو اسی طرح ہوا ہو جیسے ہونا چاہیے تھا مگر اس لاکھ ادا کرنے والوں نے اس بات کی ضمانت طلب سے دوسرا ٹیپ نہیں ریکارڈ کیا گیا ہے۔ میر محمد جیسے نقد رقم لینے سے گریز کیا ہوگا۔ اس نے محفوظ راستہ اختیار کیا ہوگا۔ مثلاً اس نے مختلف ناموں سے بیئرر چیک لیے ہوں گے۔ بیوی کے نام سے پے آرڈر۔ یا اس نے کہا ہوگا کہ فلاں کوٹھی خرید کے کاغذات میری بیوی کے نام کرا دو۔ خود براہ راست کچھ نہ لینے کے بہت سے طریقے ہیں۔ دس لاکھ دینے والوں کے لیے یہ رقم واپس لینا آسان نہیں تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ میر محمد کو قتل کر سکتے تھے اور اس کا خیال ہوگا کہ ٹیپ حاصل کر لینے کے بعد وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ شاید اس نے دھمکی دے دی کہ مجھے یا میری فیملی کو نقصان پہنچانے کا خیال دل میں مت لانا۔ میرے پاس اس کی ایک نقل محفوظ ہے جو میری سب سے بڑی ضمانت ہے۔

چنانچہ دلاور اینڈ کمپنی نے میر محمد کو روک لیا کہ تمھاری ضمانت کی ایسی تیسی۔ ہم دیکھتے ہیں وہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے۔ گھر ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں وہ اصل ٹیپ کی نقل تلاش کر سکتے تھے اور میرے ارد گرد پھیلی ہوئی تباہی اس کا ثبوت تھی کہ وہ کسی اور مقصد سے نہیں آئے تھے۔ جواب طلب سوال صرف یہ تھا کہ کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور انھوں نے ٹیپ حاصل کر کے میر محمد کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا؟ اگر وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے تو یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ میر محمد سے پوچھ رہے ہوں گے کہ دوسرا ٹیپ کہاں ہے؟ اور اس سے صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے اس کے بیوی بچوں پر تشدد کا مؤثر حربہ استعمال کر رہے ہوں گے یا کر چکے ہوں گے۔

دس لاکھ اتنی آسانی سے بہرحال حاصل نہیں ہوتے اور اس دھندے میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی کو داؤ پر لگا کے جوا کھیلنا ہی پڑتا ہے۔ جوئے میں جیت کا تناسب زیادہ رہتا ہے یا ہار کا۔ یہی آدمی کی بدبختی یا خوش قسمتی کہلاتی ہے۔ بقول دین محمد کے۔ نو لاکھ بچانے کے لیے ایک لاکھ میں کرائے کے قاتل حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

اب اس سوال کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے کہ میر محمد کا اور اس کے بیوی بچوں کا انجام کیا ہوا؟ چاہ کن را چاہ درپیش۔ میر محمد نے میرے لیے گڑھا کھودا تھا۔ کیا اس گڑھے میں وہ خود دفن ہوگا؟ اپنے بیوی، بچوں اور اپنے اس مستقبل سمیت جسے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کے غرور میں اپنی قوتِ خرید میں سمجھتا تھا۔ اس کی گلبرگ کی دو منزلہ کوٹھی۔ وہ کوٹھی جو اس نے حال ہی میں خریدی تھی۔ اس کی زرعی زمین۔ لاکھوں کا بنک بیلنس۔ کسی بھی وقت استعفیٰ دے کر بزنس کرنے کا پروگرام۔ ان سب کا کیا ہوگا۔ (سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔) میر محمد کے گناہوں کی سزا اس کے خاندان کو بھی ملے گی؟ اس کے بنک بیلنس میں دس لاکھ کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ بخیر و عافیت لوٹ آئے گا یا۔۔۔؟"

ایک کانسٹیبل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "آپ کا فون ہے صاحب!" اس نے اکرام شیخ کو مخاطب کر کے کہا۔ "کوئی صرف آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے یہ انتہائی اہم خبر ہے۔ کسی اخبار کا نمائندہ ہے۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ میں اس وقت کسی اخباری نمائندے کے ساتھ سر نہیں کھپا سکتا۔" شیخ نے خفگی سے کہا۔ "خیر۔ دیکھو اس فلیٹ کو تالا لگاؤ۔ کسی چیز کو چھونا نہیں ہے اور یہاں سے ہلنا بھی نہیں ہے۔"

"یس سر!" کانسٹیبل نے مردہ آواز میں کہا۔ وہ پیغام دینے آیا تھا اور بیگار میں پکڑا گیا تھا۔

"میر صاحب کی فیملی کے علاوہ کوئی اندر نہیں جائے گا۔" شیخ نے کہا۔ "اور اگر وہ آ جائیں تو ان سے بھی کہنا ہے کہ پہلے مجھ سے ملیں۔ کوئی اور آئے تو روک لو اور مجھے اطلاع کرو۔ زبردستی کرے تو گولی مار دو۔"

"گولی؟" کانسٹیبل نے بمشکل تمام کہا۔ "خالی ہاتھ سے۔۔۔"

شیخ نے اپنا خالی ریوالور اسے دے دیا۔ "یہ لو۔ مگر اس کا استعمال صرف ایک صورت میں کرنا ہے۔ جب کوئی تم پر حملہ کرے اور تم مقابلہ نہ کر سکو۔"

پریشان حال کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ کے ہم واپس تھانے کی عمارت میں پہنچے۔ حشمت خان کی کرسی خالی دیکھ کر ایک خیال بجلی کی

طرح میرے ذہن میں آیا۔ حشمت خان بھی تو جانتا ہے کہ میر نے اسپول نکالا تھا۔ شیخ نے چھپ کر ان کی باتیں سنی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ میر محمد کے ساتھ برابر کا شریکِ جرم ہے اور اس کا دستِ راست ہے۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ میر محمد کس سے سودا کر رہا ہے۔ اس سودے میں حشمت خان کا حصّہ بھی تو ہوگا لیکن وہ جا چکا تھا۔

اخباری نمائندہ بہت مستقل مزاج تھا کہ دس منٹ تک دوسری طرف ہولڈ کیے کھڑا رہا۔

"ہیلو! میں شیخ اکرام بول رہا ہوں۔ ایس آئی اکرام شیخ۔" شیخ نے ریسیور اٹھاتے ہی کہا۔ "ہاں ہاں بھائی میں ہی ڈیوٹی پر ہوں۔ ٹھیک ہے آپ کسی ذمے دار افسر سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کہو کیا کہنا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھائی ایس ایچ او کوئی نہیں ہے یہاں۔ اس وقت سب کچھ میں ہی ہوں یہاں۔ مست قلندر؟ اچھا آپ کالم لکھتے ہیں اس نام سے؟ کون سے اخبار میں؟ جی نہیں۔ بدقسمتی ہے میری کہ اب تک آپ کا یہ کالم تو کیا اخبار تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ فرمائیے کیسے یاد کیا اس وقت۔ اطلاع دینی تھی تو دیجیے۔" شیخ کچھ دیر سنتا رہا اور دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کا تاثر بدل گیا۔ اس کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی اور تشویش کے آثار زیادہ نمایاں ہو گئے۔

"جی ہاں بہت غور سے سن رہا ہوں۔ آپ بولتے جائیے۔" اس نے درمیان میں صرف ایک بار کہا۔ مست قلندر صاحب، بہت مفصل گفتگو کے عادی معلوم ہوتے تھے اور کئی سہ کالمی خبروں کا پورا متن سنانے پر آمادہ تھے۔ شیخ نے صبر و تحمل کے ساتھ غیر ضروری بکواس بھی سنی اور پھر کہا۔ "قلندر صاحب! معاف کیجیے گا مست قلندر صاحب! آپ وہیں موجود رہیے۔ میں خود حاضر ہوتا ہوں۔ جی یہی دس پندرہ منٹ میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

"دین محمد!" شیخ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک واردات ہو گئی ہے۔ تم یہاں اپنی رپورٹ لکھواؤ۔ وہ سب کچھ جو تمھارے ساتھ ہوا۔ جو تم نے دیکھا۔ یا ایسا کرو۔ دونوں کیس الگ کر لو۔ پہلے صاحب کے گھر کی رپورٹ دو۔ پھر دوسری رپورٹ بھائی کی حیثیت سے لکھواؤ۔ میر محمد اور اس کی فیملی اور گھر کے متعلق۔ محرر کہاں ہے؟"

"محرر تو آج بھی نہیں آیا سر!" ایک نائک نے کہا۔

"کیا مصیبت ہے۔ تھانہ ہے کہ چنڈو خانہ۔ ایس ایچ او غائب۔ محرر غائب۔ آج سارا دن رپورٹیں کس نے لکھیں؟"

"کسی نے بھی نہیں سر!" نائک نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "حشمت خان صاحب نے کہا جو رپورٹ لکھوانے آئے اسے بھگا دو۔ دو افراد چوری کی رپورٹ درج کرانے آئے تھے۔ ان میں سے ایک ضدی تھا۔ حشمت خان نے کہا محرر ہے نہیں تو رپورٹ تمھارا باپ درج کرے گا۔ کل آنا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی اخبار کے رپورٹر کا بھائی تھا۔ جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ کل کا اخبار دیکھ لینا۔"

"اچھا بابا۔ وہ حشمت خان کا دردِ سر ہے۔ تم بیٹھ جاؤ محرر کی جگہ۔" شیخ نے کہا۔ "اور دیکھو۔ میر محمد کے گھر کے دروازے پر ایک کانسٹیبل کھڑا ہے۔ اسے کوئی رائفل پہنچا دو اور اس سے میرا ریوالور لے آؤ۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سکندر صاحب! بہتر ہوگا آج کی رات آپ کسی ہوٹل میں گزار لیں۔ فوری طور پر میں وہاں کسی گارڈ کو پوسٹ کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ کل صبح معلوم کروں گا اس دوسرے گارڈ خواجہ اکبر کا کیا ہوا۔ وہ ڈیوٹی پر کیوں نہیں پہنچا۔"

باہر آ کے میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شیخ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے یا گھر ہی میں رہنا چاہیے۔ گھر کے اندر بھی مناسب حفاظتی انتظامات کے ساتھ ایک رات تو گزار ہی سکتا ہوں۔ فائدہ یہ ہوگا کہ میں اسلام آباد فون کر کے سب کی خیریت دریافت کر سکوں گا۔

"یار سکندر!" شیخ نے اچانک میرے پاس آ کے کہا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ "میرا اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے پلگ بھی صاف کر کے دیکھ لیا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ تم کو کوئی ضروری کام نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔" میں نے کہا۔ "بیٹھو۔" میں نے گاڑی کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔

"اسے چلتا دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوتی ہے۔" اس نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "اور اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ راستے میں ہی اس کی باڈی تو الگ ہو کے بکھر جائے گی، تم اسٹیئرنگ تھامے اور میں اس سیٹ پر چار پہیوں کے دوڑتے ہوئے چیسس پر دھرے رہ جائیں گے۔"

"اس شاندار گاڑی کی اس حالت کا ذمّے دار میں ہوں۔" میں نے اسے بڑے فخر سے مطلع کیا۔

"دیکھنے میں یہ اب بھی فاکس ویگن کی طرح لگتی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "بس معلوم ہوتا ہے بحرِ ظلمات میں دوڑتی رہی ہے۔"

"یہ اب بھی فاکس ویگن کی طرح دوڑتی ہے اور بحرِ ظلمات کیا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ یا بحرالکاہل دونوں پر سے گزر سکتی ہے۔" جب گاڑی نے زبردست گرج کے ساتھ دوڑنا شروع کیا تو شیخ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ گاڑی کی دل آزاری کے خیال سے۔

"فون کس مست قلندر کا تھا؟" میں نے کہا۔ "واردات

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کیا ہوئی ہے؟“

”میں دین محمد کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ شیخ نے کہا۔ ”وہ کسی روزنامہ میں کالم لکھتا ہے۔ کالم کا عنوان ہے ’دمادم‘ چنانچہ اُسے مست قلندر بہت موزوں ہے۔ آج شام ایک بچہ وہاں پہنچا۔ تقریباً سات سال کا۔ اس کے ساتھ دوسرا بچہ تھا جو دو سال چھوٹا تھا۔ انھوں نے اندر آکے ایڈیٹر کو پوچھا۔ دونوں بہت ڈرے ہوئے تھے اس وقت تک اخبار کا عملہ نہیں آیا تھا۔ مست قلندر صاحب اپنا کالم لکھتے لکھتے پان لینے باہر نکلے تھے کہ وہ بچے مل گئے۔ انھیں بچوں کا آنا کچھ عجیب سا لگا۔ پہلا خیال انھیں یہ آیا کہ بچے گھر سے بھاگے ہیں یا اغوا کرنے والے لوگوں سے بچ کے۔ انھیں تخریب کاروں کا خیال بھی آیا لیکن بچوں کی ظاہری حالت ویسی نہیں تھی جیسی تخریب کار کیمپ سے بھاگنے والوں کی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ کیا بات ہے بیٹا! میں ایڈیٹر ہوں۔ بڑے بچے نے کہا۔ ہمیں امی نے کہا تھا کہ سیدھے اخبار کے دفتر جانا اور ایڈیٹر کے سوا کسی سے بات نہ کرنا۔ قلندر صاحب مزید حیران ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھاری امی کون ہیں اور انھوں نے کیوں بھیجا ہے تمھیں یہاں۔ وہ بچوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور انھیں خاصی تسلی دی کہ ڈرنے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ تم پوری بات بتاؤ۔ اس پر بڑے بچے نے کہا کہ ان کے والد پولیس میں ہیں اور ان کا نام میر محمد ہے۔“

میں ایسے چونکا کہ گاڑی دائیں سے بائیں لہرائی۔ ”میر محمد کے بچے؟ اخبار کے دفتر میں؟“

”ہاں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے والد کا کل سے کوئی پتا نہیں۔“ شیخ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہماری امی بہت پریشان تھیں۔ آج شام کو کسی نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ ہماری امی نے دروازہ کھولا تو انھیں دو اجنبی نظر آئے۔ انھوں نے اندر آتے ہی ہماری امی کو دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر انھوں نے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالی اور ہماری امی کو مارا۔ وہ بیہوش ہو کے گر گئیں اور وہ اپنا کام کرتے رہے لیکن درمیان میں امی کو ہوش آگیا۔ انھوں نے بڑے لڑکے کو اشارے سے بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ نیچے چلے جاؤ۔ سب سے نیچے والے فلیٹ میں۔ ان سے کہنا کہ ابا جان نے جو چیز دکھولائی تھی وہ دے دیں۔ وہ موقع ملنے کے انتظار میں رہے۔ ماں نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ چیز لے کر اوپر نہ آئیں۔ سیدھے اخبار کے دفتر جائیں۔ گھر کی تلاشی لینے والے یہ سمجھتے رہے کہ عورت بیہوش پڑی ہے اور دونوں بچے اس سے لگے سہمے بیٹھے ہیں۔ پانچ اور سات سال کے بچوں کو انھوں نے قطعی بے ضرر سمجھتے ہوئے اہمیت نہیں دی۔ جب وہ اندر کے تیسرے کمرے کی خانہ تلاشی لے رہے تھے تو ماں نے ہمت کرکے اٹھی۔ خاموشی سے دبے پاؤں دروازے تک گئی اور اس نے دونوں بچوں کو باہر نکال دیا۔ پھر وہ واپس آکے اپنی جگہ لیٹ گئی۔ یہاں سے دائیں طرف...“

”اور وہ بچے، وہ چیز لے کر مست قلندر کے پاس پہنچ گئے؟“ میں نے کہا اور گاڑی موڑ دی۔

”ہاں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ دفتر کہاں... اور کتنی دور ہے۔“ شیخ نے کہا۔ ”تھانے سے کچھ دور آکے انھوں نے ایک شخص سے پوچھا۔ وہ شخص گاڑی سے اتر کے سگریٹ لینے کے بعد پھر گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا۔ بچوں نے اس سے پوچھا کہ اخبار ’ہم نوا‘ کا دفتر کہاں ہے؟ وہ شخص بھی حیران ہوا اور اس نے بھی پوچھا کہ تمھیں وہاں کیا کام ہے؟ بڑے بچے نے صاف کہہ دیا کہ ہماری امی نے کہا ہے کہ ایڈیٹر کے پاس چلے جاؤ۔ غالباً بچوں نے اسے بھی ساری بات بتا دی۔ وہ بچوں کو دفتر کے دروازے پر چھوڑ کے نکل گیا۔ وہ کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا... بائیں طرف؟“

”اور وہ چیز کیا تھی جو بچے لے کر گئے تھے؟“ میں نے کہا۔

”وہ ایک پیکٹ تھا۔ مست قلندر صاحب نے اس کو کھولا تو اس میں سے ایک اسپول ٹائپ ٹیپ نکلا۔“ شیخ نے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”وہ اسپول! وہ میر محمد نے...!“

”ہاں۔ اس نے بیوی کو دیا تھا اور شاید یہی ہدایات بھی دی تھیں جو اس نے بچوں کو دیں۔ بچوں نے کمال ہمت کا ثبوت دیا۔ مست قلندر صاحب نے ٹیپ کو سننے کے لیے کہیں سے ٹیپ ریکارڈر منگوایا۔“ شیخ نے کہا۔ ”اس وقت تک اخبار کا عملہ بھی آچکا تھا مگر مست قلندر صاحب نے ایڈیٹر کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ انھوں نے ٹیپ سنا۔ وہ پوری بات تو نہیں سمجھے لیکن ایڈیٹر نے مختلف تھانوں میں فون کیا۔ یہاں... بس یہاں روک لو۔“

میں نے کار روکی اور شیخ کے ساتھ اتر گیا۔ ”جگہ تو یہی بتائی تھی۔“ وہ زیرِ لب بولا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ میں اس کے ساتھ رہا۔ اچانک شیخ کی ٹارچ کی روشنی ایک گڑھے میں گئی۔

گڑھا

زمین کھودنے سے بنا تھا اور زمین کی مٹی کسی نے اپنے گھر کی بنیادیں اونچی رکھنے میں استعمال کرلی تھی۔ گڑھا بالکل گول نہیں تھا۔ بیضوی تھا لیکن کنارے گولائی میں تھے اور اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی چھ سات فٹ اور لمبائی دس بارہ فٹ کے درمیان تھی۔ کناروں کے مقابلے میں درمیان کا حصہ زیادہ گہرا تھا لیکن یہ گہرائی کہیں بھی یکساں نہیں تھی۔ اردگرد جھاڑیاں تھیں جو بے مصرف زمین پر کسی کی محنت کے بغیر محض سورج سے روشنی، ابرِ باراں سے نمی اور مٹی سے نمو پا کے اُگ آئی تھیں۔ بالکل ان بچوں کی طرح جن کو کسی عورت کی ممتا اور کسی مرد سے باپ کی شفقت، کسی کی محبت اور توجہ نہیں ملتی لیکن ان کا وجود گلیوں کی خاک چھان کے اور روٹی کے ٹکڑے چن کر، غربت اور محرومی کے سائے میں کسی مقصدِ حیات کے بغیر پلتا اور بڑھتا ہے۔ حالانکہ دنیا کو ان کی اور انھیں دنیا کی پروا نہیں ہوتی۔

”یہاں کیا ہے؟“ میں نے شیخ کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی کے دائرے کو اس گڑھے میں ہر طرف لے جاکر دیکھ چکا تھا اور بظاہر اس کی تلاش لاحاصل رہی تھی۔

”جگہ تو یہی ہے یار!“ اس نے میرے سوال کا جواب یوں دیا جیسے وہ مجھ سے زیادہ خود سے مخاطب ہے۔

”کیا تھا یہاں؟“ میں نے کہا۔

”پام کا ایک درخت۔“ وہ بولا۔ ”وہ درخت بھی ہے اور قریب میں اور کوئی ایسی گہری جگہ بھی نہیں ہے۔“ اس نے ٹارچ کی روشنی سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ”یہ مذاق بھی نہیں ہوسکتا۔ اطلاع دینے والا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔“

”تم اپنے آپ سے ہمکلام ہو اور ناچیز کی عقل دنگ ہے۔“ میں نے کہا۔

”عقل تو میری بھی دنگ ہے۔“ شیخ نے کہا۔ ”تمھارے آنے سے پہلے کسی نے فون کیا تھا۔ اس نے اپنا نام پتا کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ وہ موٹر سائیکل پر اس راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک گاڑی مخالف سمت سے آکے یہاں رکی۔ اس میں سے دو آدمی ایک بوری اٹھائے اترے اور بوری کو گھسیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گئے۔ موٹر سائیکل والے نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں یہ منظر صاف دیکھا تھا لیکن روشنی سڑک پر تھی اس لیے وہ ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ وہ عین اسی جگہ تو نہیں رکا مگر گزرتے گزرتے اس نے دیکھ لیا کہ کار سے اترنے والوں نے بوری کو گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ موٹر سائیکل والا تقریباً پچاس گز دور جاکے کھڑا ہوگیا۔ انجن بند کرکے اور لائٹس آف کرکے اس نے اپنی موٹر سائیکل کا اسپارک پلگ کو نکالا اور اسے صاف کرنے کے بہانے پیچھے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں جو بوری پھینکنے گئے تھے، کار کے پچھلے دروازے کو کھول کر بیٹھ گئے جس سے اس نے اندازہ کیا کہ کم سے کم ایک شخص آگے ڈرائیور کی سیٹ پر اسٹیئرنگ سنبھالے بھی بیٹھا تھا۔“

”یہ بات اس نے کار کے قریب سے گزرتے وقت نوٹ نہیں کی تھی؟“ میں نے کہا۔

”میں نے اس سے بالکل یہی سوال کیا تھا۔“ شیخ نے کہا۔ ”اور اس نے بہت معقول جواب دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بائیں جانب متوجہ تھا۔ کار دائیں جانب تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار قابلِ غور نہیں ہوتی۔ مگر رات کے اندھیرے میں دو افراد بوری میں کچھ بھر کے پھینکنے جا رہے ہوں تو یہ غیر معمولی بات لگتی ہے۔ بوری کا وزن کافی تھا کیونکہ اسے گھسیٹنے میں انھیں خاصا زور صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں کوئی کیا پھینکنے آئے گا۔ اسی خیال نے موٹر سائیکل والے کو شبہے میں مبتلا کردیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ بہت زیادہ جاسوسی ناول پڑھنے اور جرائم پر مبنی فلمیں دیکھنے کی وجہ سے اس کا ذہن فوراً اس امکان کی طرف گیا تھا کہ بوری میں لاش ہوسکتی ہے جسے قاتل جائے واردات سے بہت دور پھینکنے لائے ہوں گے۔ وہ خود بھی اس جگہ سے بہت دور رہتے ہوں گے اور ان کا بزنس یا ان کا ہیڈ کوارٹر بھی اتنی دور ہوگا کہ اس لاش کو دریافت کے بعد بھی کوئی ان سے منسوب نہ کرسکے۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کی لائٹس آف تھیں مگر انجن آن تھا۔ تاہم پچاس گز کے فاصلے سے وہ کار کا رنگ نہیں دیکھ سکا جو سیاہ، گہرا نیلا یا گہرا سرخ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ نمبر نوٹ کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لائٹ آن ہوتی تب بھی پچاس گز کے فاصلے سے نہ وہ حروف پڑھ سکتا تھا اور نہ اعداد۔ وہ کاروں کی ظاہری صورت سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کوئی جاپانی گاڑی ٹویوٹا، مزدا یا ڈاٹسن تھی یا فورڈ یا اوپل چنانچہ یہ کیسے بتائے کہ ماڈل کس سال کا تھا۔ جب گاڑی چلی گئی تو وہ موٹر سائیکل وہیں چھوڑ کے پیدل واپس گیا تاکہ وہ گاڑی آگے جاکے لوٹ آئے تو وہ فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے چھپ سکے۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ گڑھے کے قریب جاکے اس نے اپنا سگریٹ لائٹر جلایا اور اس کی برائے نام روشنی میں بوری کو دیکھ لیا۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ بتایا کہ بوری پر خون کے داغ تھے۔ اوپر سے یہ داغ صاف نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ اِدھر اُدھر دیکھ کے اور ’جل تو جلال تو‘ کا ورد کرتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔ بوری کو چھو کر دیکھنے سے ہی وہ سمجھ گیا کہ اس کے شکوک غلط نہیں تھے۔ اس میں واقعی کوئی آدمی تھا۔ زندہ یا مردہ۔ اس نے پہلے بھاگنے کی سوچی پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ شخص زندہ ہی نہ ہو جو بوری میں بند ہے۔ خوف پر انسانی ہمدردی کا جذبہ غالب آگیا اور اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر بوری کا منہ کھولا اور خاصی محنت سے اس شخص کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ شناخت کرنا تو اس کے لیے ناممکن تھا مگر اس نے کھلی آنکھیں اور مسخ شدہ صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ بے تحاشا بھاگا اور اپنی موٹر سائیکل لے کر ہوا ہوگیا۔ فون اس نے جی پی او سے کیا تھا۔“

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

"جی پی او سے تمھیں کیوں؟" میں نے کہا "کیا وہ تمھیں جانتا تھا؟"

"کمال ہے۔ تم تو مجھ سے وہی سوالات کر رہے ہو جو میں نے اس سے کیے تھے۔" شیخ نے کہا۔ "اس نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم، اس علاقے کا تھانہ کون سا ہے جہاں وہ لاش پڑی ہے۔ تھانے والوں کی حدود عجیب ہوتی ہیں اور اس علاقے میں رہنے والوں کو کیا بعض اوقات خود تھانے والے نہیں جانتے کہ ان کی تھانیداری کی سرحد کہاں سے کہاں تک ہے۔ اس نے تو ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھی۔ ایک نمبر ملایا۔ وہ ملا نہیں دوسرا ملایا تو کسی نے ریسیور ہی نہیں اٹھایا۔ تیسری جگہ میں نے اٹھا لیا۔ وہ خود تھانے میں قدم رکھنے سے بہتر سمجھتا تھا کہ آدم خور شیر کے پنجرے میں داخل ہو جائے جہاں موت سے فوراً اور باعزت طور پر تشدد کا عذاب جھیلے بغیر ملاقات ہو سکتی ہے۔ کیسا افسوسناک تاثر قائم ہو گیا ہے پبلک کے ذہن میں اور کسی کو پروا بھی نہیں۔ خیر، اتفاق یہ کہ وہ جگہ ہمارے تھانے کی حدود میں تھی۔ میں نے حشمت خان سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل پر گزرتے گزرتے دیکھ لے اور یہ کسی کی شرارت نہ ہو تو اپنے گھر جا کے فون کر دے مگر اسے کیا کہا جائے؟ بے حسی یا حرام خوری؟ اس نے کہا کہ شیخ صاحب! اتنی تنخواہ میں تو بس اتنی ہی نوکری ہو سکتی ہے۔ اپنی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔"

"حرام خور،" میں نے کہا۔ "تنخواہ اور ڈیوٹی کے ٹائم کی بات کرتا ہے، اس آمدنی کی بات نہیں کرتا جو اسی ڈیوٹی کے ٹائم میں رشوت سے ہوتی ہے۔ کچھ ملنے کی امید ہوتی نا تو سر کے بل جاتا۔ خواہ مخواہ بیٹھا رہا تھانے میں۔"

"یہ تو آف دی ریکارڈ بیچ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے انکار کے بعد میں کیا کرتا۔ ادھر میر محمد نہیں ہے۔ سابق ایس ایچ او صاحب معطل بیٹھے ہیں۔ افسر دو ہی رہ گئے ہیں۔ میں اور حشمت خان۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ خود جاؤں یا کسی کانسٹیبل کو بھیجوں، تھانے میں ایک ڈیوٹی آفیسر بھی تو ہونا چاہیے۔ اتنے میں تم آ گئے پھر وہ میر محمد کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تم تو گواہ ہو۔ ابھی اس سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ مست قلندر صاحب کا فون آ گیا۔ اب یہاں دیکھ لو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اخبار کے آفس جاتے ہوئے ایک نظر ڈال لوں۔"

"چلو اب یہاں کچھ نہیں تو وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔" میں نے کہا۔

"نہیں سکندر! میرے دل یا میری چھٹی حس کا تقاضا ہے کہ میں نیچے اتر کے دیکھوں۔ اس آدمی کا لہجہ اس کے سچ کا گواہ تھا۔ جو شرارت میں فون کرتے ہیں، اتنی سنجیدگی سے بات نہیں کرتے، اتنی تفصیلات نہیں بتاتے اور اتنا منطقی تجزیہ نہیں کرتے۔"

"چلو تو نیچے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "سچ کے آثار ہوں گے تو نظر بھی آ جائیں گے۔"

میں اور اکرام شیخ ایک ہی ٹارچ کی محدود روشنی کے دائرے میں ساتھ ساتھ اس بیضوی گڑھے کے کنارے سے اترنے لگے۔ نشیب کی جانب ناہموار زمین کی مٹی میں کنکر بھی تھے۔ چنانچہ ایک بار میں پھسلتے پھسلتے بچا۔ پانچ منٹ میں ہم سات آٹھ فٹ نیچے پہنچ گئے۔ اب ہمیں سڑک پر سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں زمین کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم نے گہرائی کے محیط میں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔

پھر شیخ اور میں ایک ساتھ رک گئے۔ مٹی کے خاکی رنگ میں سُرخی کا ایک دھبہ الگ نظر آ رہا تھا۔ اس دھبے سے اوپر کی طرف دیکھنے پر ہمیں وہ نشانات بھی نظر آئے جو کسی بوری کو گھسیٹنے سے ہی بن سکتے تھے۔

"رپورٹ بالکل درست تھی۔" شیخ نے کہا۔ "مگر وہ بوری اور لاش کہاں گئی؟"

"کہیں وہ لوگ بعد میں اسے اٹھا کے تو نہیں لے گئے۔" میں نے کہا۔ "انھیں خیال آیا ہو کہ... کہ وہ لاش کو دفنا دیتے تو بہتر تھا۔ کہیں کسی کو سراغ ہی نہ ملے تو اچھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو رک کر جائزہ لیتے دیکھ لیا ہو جس کا موٹر سائیکل والے کو اندازہ نہ ہو سکا ہو۔" شیخ نے کہا۔ "وہ اسے دیکھتے رہے اور جب وہ چلا گیا۔ تو وہ لوٹ کر آئے اور لاش لے گئے۔" میں نے شیخ سے اتفاق کیا۔ اس ناکامی پر وہ خاصا مایوس نظر آتا تھا۔ ہم دونوں نے اس لکیر کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنا شروع کیا جو بوری کے گھسیٹے جانے کا ثبوت فراہم کرتی تھی۔

شیخ اپنی ٹارچ سے اردگرد کی بنجر زمین اور خود رو نباتات پر بھی روشنی ڈالتا جا رہا تھا۔ پام کا واحد درخت اب ہمارے دائیں ہاتھ پر رہ گیا تھا۔ اچانک شیخ رک گیا۔

"یہ کیا ہے سکندر؟" اس نے روشنی کو ایک جگہ مرتکز کر دیا تھا۔ دس قدم دور سے بھی وہ جگہ تازہ کھدی ہوئی نظر آتی تھی جواب دینے کے بجائے میں شیخ کے ساتھ ہو لیا۔

"غالباً تمھارا خیال درست تھا۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے موٹر سائیکل والے کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی تھی۔ وہ لوٹ کر آئے ہوں گے مگر موٹر سائیکل والا انھیں نہیں دیکھ سکا۔ گڑھے کے اندر اتر جانے کے بعد سڑک تو نظر نہیں آتی۔ وہ ہیڈ لائٹس بجھا کے آئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موٹر سائیکل والے کو اس وقت دیکھا ہو جب وہ گڑھے سے نکل کر بھاگا تھا۔ اب یا تو وہ موٹر سائیکل کا پیچھا کرتے جو ذرا مشکل کام ہے۔ موٹر سائیکل گلی کوچوں میں بھی غائب ہو جاتی ہے پھر یہ کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا ہو تو انگلیاں ٹیڑھی کیوں کی جائیں۔ ایک اور قتل کرنے سے زیادہ آسان یہ تھا کہ لاش کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں زمین کھود کے برابر کی گئی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب میرے لیے خالی ہاتھوں زمین کھودنا تو ممکن نہیں۔ ویسے بھی عجلت غیر ضروری ہے۔ اس جگہ کا علم کسے ہے؟ میں بعد میں دوسرے لوگوں کو بھیج سکتا ہوں کہ لاش ہے تو نکال لیں۔ ہم مست قلندر صاحب کی طرف چلتے ہیں۔"

مست قلندر صاحب دیکھنے کی چیز تھے۔ اتنا مزہ شاید ان کے کالم میں نہیں نظر آتا ہو گا جتنا ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے سائز سے بہت بڑی شیروانی اور سائز سے بہت چھوٹی شلوار پہن رکھی تھی جسے شرعی کہا جا سکتا تھا۔ شلوار کا رنگ نیلا تھا اور شیروانی کبھی کریم کلر کی ہو گی۔ مسلسل استعمال اور سالانہ ڈرائی کلیننگ کے باعث اس کا رنگ کچھ سرمئی سا ہو گیا تھا۔ یہ طے کرنا مشکل تھا کہ شیروانی کے نیچے قمیص ہے یا نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سر پر پیالے کی طرح رکھی ہوئی ٹوپی کے نیچے بالوں کی موجودگی کا پتا چلانا مشکل تھا۔ حالانکہ کپڑے کی ٹوپی اس ہیئر ٹانک میں تر تھی جو انھوں نے وافر مقدار میں چپڑا تھا۔ ان کی منحنی آواز ان کی جانِ ناتواں سے بہت میچ کرتی تھی۔

"ارے میاں انعام شیخ صاحب! کمال کر دیا یعنی کہ..." انھوں نے کسی تعارف کے بغیر ہمیں پہچان لیا۔

"اکرام شیخ۔" شیخ نے ریکارڈ کی درستی کے لیے کہا۔

"اماں کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ چھوڑو انعام و اکرام بس شیخ۔" انھوں نے ایک چُرمُر میلے رومال میں اپنی ناک کی برآمدات کو بڑی پھرتی سے منتقل کیا۔ "ہم تو بس سوکھ گئے انتظار میں۔ طولِ شب فراق کیا چیز ہے۔ اب تو کالم چلا گیا۔ مگر کل... کل کا موضوع ہے پولیس کی تاخیر پسندی اور... خیر شیخ جی! بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔" میں نے عرض کی۔

"واہ سبحان اللہ۔ گویا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا۔ کون تھا وہ؟" انھوں نے پھڑک کر کہا۔ "یا تھی؟"

"وہ میں بعد میں عرض کروں گا۔ پہلے عرض مدعا۔ وہ بچے اور ٹیپ کہاں ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"ٹیپ کے بچے... میرا مطلب ہے ٹیپ اور بچے دونوں بلکہ تینوں خیر سے ہیں۔ الحمد للہ۔" مست قلندر صاحب نے فرمایا۔ "مگر میاں شیخ جی! یہ اسٹوری کیا ہے؟" انھوں نے رازدارانہ طور پر آگے جھک کر سرگوشی میں کہا۔

"اسٹوری آپ کی۔" شیخ نے مسکرا کے کہا۔ "پہلے یہ بتائیے ٹیپ اور بچے کہاں محفوظ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے آپ کے نقطۂ نظر سے وہ محفوظ ہوں لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔"

"شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی، شکر ہے زندگی تباہ نہ کی۔" انھوں نے کہا۔ "ورنہ میاں ہم بھی ہو جاتے گاؤدی۔ گویا افلاطون ایک آپ ہی ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یعنی کہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارا کالم۔ اور کالم آپ نے کبھی پڑھا نہیں ہمارا۔ حضرتِ شیخ! بچے ہیں اس عاجز کے یتیم خانے میں۔" وہ ہنسے۔ "کیا سمجھے؟ میاں ہم یتیم تو ہمارا گھر بھلا کیا ہوا۔ اور وہاں تو ایک اژدھام ہے۔ چند انچ سے چھ فٹ تک کے بچے حاضر اسٹاک سے دستیاب ہیں۔ وہ بھی انھی میں گھل مل گئے ہوں گے۔ کوئی کیسے ڈھونڈے گا انھیں؟ چراغِ رخِ زیبا لے کر؟ اب رہا ٹیپ۔ تو وہ یہاں ہے۔" انھوں نے عقیدت سے سر جھکا کے ٹوپی اتاری اور اس کی تیل سے چمکتی سطح کے بے بال و پر ہونے کا راز افشا کر دیا۔ "مگر یہی نہیں حضرت! اصل ٹیپ تو گیا لائبریری میں۔ گویا پرانی خبروں کی قبروں میں۔ نقل حاضر ہے۔" انھوں نے کھٹ سے الماری کھولی اور ٹیپ ہمارے سامنے رکھ دیا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا!" شیخ نے کچھ دیر بعد تعریفی لہجے میں کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں اعتماد نہ کرنے پر۔ یہ نقل میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ باقی معاملات کو جوں کا توں رکھیے فی الحال۔ ابھی یہ عقدہ پوری طرح وا نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں اسٹوری آپ کو اس وقت د[illegible] جب واقعات کی سب کڑیاں آپس میں مل جائیں گی۔ اجازت ہو تو چند سوالات کر لوں؟"

"اجازت؟ میاں تھانیدار بادشاہ! کیوں شرمندہ کرتے ہو اپنے نام کو۔ تم اور اجازت؟ انکار کر کے ہمیں تھانے نہیں جانا ہے۔" مست قلندر صاحب نے ٹوپی کو پھر سر پر چپکا کے کہا۔

"آپ نے ان بچوں سے پوچھا کہ انھیں ماں نے خاص طور سے آپ کے اخبار کے دفتر کے لیے ہی تاکید کیوں کی تھی؟" شیخ نے ان کے طنز کو پی کر کہا۔ "کون تھا جس پر ان کی ماں کو اتنا اعتماد تھا۔ میرا مطلب ہے مقصد صرف کسی اخبار کے دفتر بھیجنا ہوتا تو..."

"ہاں ہاں، کہیے کہیے کہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔" قلندر صاحب نے چہک کر کہا۔ "کون پوچھتا ہے اس اخبار کو جو صدائے وقت ہے۔ امروز ہے اور مشرق ہے اور بڑے بڑے کثیر الاشاعت متعدد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اخبارات میں۔ تو قصور اس کی بھی وجہ تھی۔ اس رسالے کے مدیر اس وقت بھی مجنوں تھے جبکہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر۔ دونوں کا المیہ ایک ہی ہے۔ خیالِ فرقتِ لیلیٰ نے ایک کو صحرا میں پہنچا دیا، دوسرے کو صدائے وقت میں جسے کوئی نہیں سنتا۔ دروغ بر گردنِ راوی۔ بچوں کی ماں سے وہی منسوب تھے۔ عقد ہو گیا تھانیدار سے۔ اب یہ تو ظالم سماج کی وہ خباثت ہے جس پر اتنے ناول لکھے گئے اور اتنی فلمیں بنیں مگر کتے کی دُم کبھی سیدھی ہوئی ہے۔ ہمارے مدیر صاحب تب سے بیٹھے ہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ حالانکہ یہ قصہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا۔ تھانیدار کی رقابت مہنگی پڑی۔ ہر روز ایک نئی دفعہ ضابطۂ فوجداری کی نکال لیتا تھا اور ان کو بند کر دیتا تھا۔ آخری بار جب نکلے تو لیلیٰ تھانیدارنی ہو چکی تھی، خیر سے۔"

"میں سمجھ گیا۔" شیخ میری طرف دیکھ کے بے ساختہ ہنسا۔ "پھر بچوں کو وہ کیوں نہیں لے گئے؟"

"ارے میاں! جس نے شادی ہی نہیں کی، بچے کیسے پالتا۔" مست قلندر صاحب نے کہا۔ "اور لیلیٰ کے بچے پالتا تو لیلیٰ کو کیسے تلاش کرتا۔ وہ بھی تو کرنا ہے۔ ہم نے کہا میاں جہاں سیر وہاں سوا سیر۔ یہ بارِ امانت بھی اٹھا لیتے ہیں۔ اپنے ریوڑ میں شامل کرا لیا۔ گویا سمندر میں لوٹا بھر پانی۔"

ٹیپ لے کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ہنستے ہوئے رخصت ہوئے۔

"آدمی ہے کہ اچھا خاصا فکاہیہ کالم۔" میں نے کہا۔

"لگتا بھی کارٹون ہے لیکن عقل سے پیدل نہیں ہے۔ بہت سے تھانیداروں سے زیادہ معاملہ فہم اور دُور اندیش ہے۔ تم بُرا مت ماننا، میں حشمت خان جیسے سیانوں سے موازنہ کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے واقعی بہت تسلی بخش انتظام کیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر۔ حالانکہ پوری بات اسے معلوم نہیں تھی۔"

"میرے سر سے تو ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔" میں نے کہا۔

"یوں لگتا ہے کہ قدرت نے بازی میرے حق میں پلٹ دی ہے۔ ایک طرف شیدے اور عبدل کے قتل کا الزام نہیں رہا۔ دوسری طرف استغاثہ کے دونوں چشم دید گواہ نہیں رہے۔"

"اس وقت میرے سامنے زیادہ اہم اور فوری توجہ طلب سوال دو ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ کہ میر محمد کہاں گیا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ گھر میں گھس کر تلاشی لینے اور مار پیٹ کرنے والے اسی ٹیپ کی جستجو میں تھے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میر محمد کی بیوی کہاں گئی۔ عورت ذات اس حد تک ناقص العقل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ یوں کرو کہ میر کی بیوی نے بچوں کو باہر نکال دیا۔ اسے بھی دروازہ کھولا تھا تو خود بھی نکل جاتی اور دروازے کو باہر سے بند کر دیتی۔ واپس جا کے وہیں لیٹنے کی کیا تک تھی؟"

"میری سمجھ میں ایک وجہ آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ بچوں کو فرار ہونے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ فلیٹ کا دوسرا دروازہ بھی تھا لیکن اس کی باہر والی کنڈی غائب تھی۔ حملہ آوروں نے پانچ اور سات سال کے دونوں بچوں سے تعرض نہیں کیا تھا اور ایک طرح سے ان کی موجودگی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ انھیں غیر موجود پا کے بھی وہ پریشان نہیں ہوئے ہوں گے لیکن وہ خود نکل جاتی اور ایک منٹ بعد انھیں معلوم ہو جاتا تو وہ نیچے دوڑتے اور شاید وہ اس قابل نہیں تھی کہ ایک منٹ میں دوڑ کر ان کی دسترس سے دور ہو جائے۔ اس نے خود کو ڈھال بنا کے بچوں کو پناہ فراہم کی۔ ممکن ہے بعد میں انھوں نے پوچھا بھی ہو کہ بچے کہاں گئے اور اس نے کوئی بہانہ کر کے انھیں چند منٹ تک روکے رکھا ہو۔ مثلاً یہ کہہ دیا ہو کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ ادھر بچوں کی مدد تقدیر نے کی۔ وہ ٹیپ لے کر نکلے تو ایک کار والے نے انھیں بٹھا لیا اور اخبار کے دفتر تک چھوڑ گیا۔"

"آدمی میر محمد بھی چالاک تھا لیکن اس کی بیوی بھی بہت سمجھدار ثابت ہوئی۔ شاید اسی لیے میر نے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بتا دیا ہوگا کہ نیچے والوں کے پاس ٹیپ کی ایک نقل موجود ہے جب تک کوئی تم سے زبردستی کر کے نہ پوچھے اس کے بارے میں کسی سے بات تک نہ کرنا۔ وہ میری زندگی کی ضمانت ہے۔ اس کی بیوی نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ٹیپ کی تلاش میں آنے والے جب اپنے مقصد میں ناکام ہوں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تشدد پر اُتر آئیں گے اور ہو سکتا ہے وہ ان کے ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے سچ بولنے پر مجبور ہو جائے۔ میر محمد جیسے پولیس افسر کی بیوی جانتی ہو گی کہ تشدد کے حربے کیا ہوتے ہیں اور کتنے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بتا دیتی کہ ٹیپ نیچے والوں کے پاس ہے تو امانت رکھنے والوں کی شامت آ جاتی اور وہ ٹیپ ہاتھ سے [illegible] اس کے شوہر کی زندگی کی ضمانت تھا۔ بعد میں اس نے خود بتا دیا کہ ٹیپ تو بچے لے گئے پولیس اسٹیشن۔ یا محض یہ کہہ دیا کہ ٹیپ نیچے والوں کے پاس ہے اگر وہ نیچے والوں کے پاس گئے ہوں گے تو انھیں معلوم ہوا ہوگا کہ پانچ سات سال کے دو بچے جن کو وہ بے ضرر سمجھے تھے، ٹیپ لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑے ہوں گے کہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ دور نہیں جا سکتے لیکن بچے کار میں نکل گئے تھے۔ اب یا تو میر کی بیوی بھی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل گئی مگر وہ نکلتی تو اس کے لیے پناہ کی قریب ترین اور سب سے محفوظ جگہ پولیس اسٹیشن تھا۔ وہ وہاں نہیں پہنچی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنی ناکامی اور ایک عورت کی چالاکی پر سخت مشتعل ہوتے

اور شدتِ اشتعال میں یا تو انھوں نے میر کی بیوی کو وہیں مار دیا اور لاش لے گئے یا اسے اپنے باس کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ ہے ہمارے خالی ہاتھ لوٹنے کی اصل وجہ۔ چنانچہ لاش کو دریا بُرد یا کہیں دفن نہیں کیا گیا تو اس وقت وہ میر محمد کے سامنے جسمانی تشدد کے وہ سب انسانیت سوز مظالم جھیل رہی ہو گی جو میر محمد کے معمولات میں شامل تھے۔ اس معاملے میں یعنی ایذا رسانی کے طریقے ایجاد کرنے میں وہ شیطانی جینئس تھا لیکن اپنا کیا اپنے ہی سامنے آتا ہے تم خود تصور کر سکتے ہو کہ میر محمد کی بے بسی کا عذاب کتنا شدید ہو گا۔"

"کیا یہ امکان نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے اظہار پر مجبور ہو جائے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن جس بد معاشی کا مظاہرہ انھوں نے ایک گھر میں کیا، وہ کسی اخبار کے دفتر میں یا پولیس اسٹیشن پر ناممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔ "نقار خانے میں طوطی کی آواز چاہے کوئی نہ سنے، مست قلندر کے اخبار کی بہر حال سنی جاتی ہے اور اس عورت سے تو مجھے امید ہے کہ اس نے کسی بڑے اخبار کا نام ہی لیا ہو گا۔ اب وہ ایڈیٹر کو فون کر کے دھمکی دینا تو در کنار اس سے ٹیپ کے متعلق پوچھ بھی نہیں سکتے۔ تم نے ایک کالم لکھنے والے کی عقلمندی دیکھی ہے تو ایڈیٹر کے متعلق خود ہی سوچ لو۔ کسی نے اس سے پوچھنے کی حماقت کی ہو گی نا تو اس نے وہ چکر چلایا ہو گا کہ بد معاشوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے۔ مثلاً اس نے کہا ہو گا کہ بچوں کی فکر چھوڑو اپنی فکر کرو۔ ٹیپ کی نقل تو گئی اوپر ڈی آئی جی تک۔ تمہارا نام نہیں تو کیا، حلیہ وغیرہ سب آ رہا ہے صبح کے اخبار میں۔ اب خیریت مطلوب ہے تو میر محمد اور اس کی بیوی کو اخبار کی آخری کاپی پریس جانے سے پہلے چھوڑ دو۔ ورنہ وہ چشم دید گواہ بہت کچھ کر سکتے ہیں جتنی تصویریں پولیس کے ریکارڈ پر ہیں وہ ان کو دکھائی جائیں گی اور مجرم پہچان لیے جائیں گے۔"

میں نے اس کے باوجود مایوسی کا اظہار کیا۔ "میر محمد یا اس کی بیوی کا زندہ ملنا مجھے محال نظر آتا ہے اگر اغوا کرنے والوں کو امید ہوتی کہ ان کی فراہم کردہ معلومات کے بغیر ٹیپ حاصل کرنا ناممکن ہے تو وہ ان کو زندہ رکھتے لیکن جھنجلاہٹ اور بے بسی میں وہ یہی کر سکتے ہیں کہ بچوں کو یتیم کر دیں۔ ان کے ماں باپ دونوں کو مار ڈالیں۔ وہ کسی ایڈیٹر کی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ پکڑے جانے کا خوف کچھ نہیں۔ سب سے زیادہ ملال انھیں ٹیپ کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہو گا۔"

"مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ حشمت خان اس ٹیپ کو غائب کرنے کی سازش میں شریک تھا۔" میں نے کہا۔ "یا اس جرم کا گواہ ضرور تھا۔ کیا اس نے میر محمد سے کوئی قیمت وصول نہیں کی ہو گی؟"

"ممکن ہے کی ہو اور میر محمد نے کہا ہو کہ ذرا صبر کرو، میں بہت بڑا سودا کر رہا ہوں۔ اس میں سے تمھیں حصہ ضرور ملے گا مگر مجھ سے کچھ توقع مت رکھنا جیسے تم نے انکار کیا تھا ویسے ہی میں بھی انکار کر سکتا ہوں۔"

"کیا حشمت خان نے نہیں پوچھا ہو گا کہ سودا کس سے ہو رہا ہے اور کتنی رقم کا؟"

"پوچھا ہو گا تو وہ ہمیں کیوں بتائے گا۔ اسے تو اب اپنی فکر پڑ جائے گی اور اس کے لیے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے سابقہ مؤقف پر ڈٹا رہے۔" شیخ نے کہا۔

"تم نے اس محرر کے نہ آنے کو اہمیت نہیں دی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہ نہیں ہو سکتا جو میر محمد کے ساتھ ہوا۔ اسے اپنے ہاتھ کی تحریر شناخت کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ دشمن جانتے ہیں کہ رضوی صاحب ہمارے حامی ہیں۔ وہ محرر سے ڈرا دھمکا کے یہ بیان بھی دلوا سکتے تھے کہ بیان اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا اور ٹیپ میر محمد نے نکال لیا تھا۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔ میں صبح اس کے بارے میں بھی معلوم کروں گا۔ میری تگ و دو اسی کیس تک محدود رہے گی جس کا تعلق تم سے بھی اتنا ہی ہے جتنا میر محمد سے۔ لیکن میر محمد کا کیس میں نہیں لوں گا۔ اس کا بھائی جو چاہے کرے۔ کیس حشمت خان کو دے یا سی آئی اے کو ٹرانسفر کرا لے۔" شیخ نے کہا۔ "یا خصوصی ٹیم بنا دی جائے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ایک پوسٹ پہلے سے خالی تھی۔ دوسری ایس ایچ او کی معطلی سے خالی ہوئی۔ تیسری میر محمد کی گمشدگی سے اور توقع ہے کہ چوتھی میرے استعفے سے ہو گی۔ اس طرح تھانہ نہیں چل سکتا۔"

گاڑی پھر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ "استعفےٰ ان حالات میں ویسے بھی منظور نہیں ہو گا اور رضوی صاحب سے کہوں گا کہ منظور نہ ہونے پائے۔ بعد میں چاہو تو ہیڈ کوارٹر چلے جانا۔"

تھانے میں دین محمد بے چینی سے ہماری واپسی کے انتظار میں تھا۔ اکرام شیخ نے اسے مختصراً بتایا کہ اس کے بھائی اور بیوی کے ساتھ کیا ہوا یا ہو سکتا ہے۔

"یہ ٹیپ ساری خرابی کی وجہ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "میر محمد نے اس کو غائب نہ کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ یا وہ اتنا بڑا سودا کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔ بے شک وہ بہت ہوشیار تھا اور کبھی پکڑا نہیں گیا تھا لیکن اونٹ کبھی تو پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہی ہے۔ تب ہی اسے معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ مجھے معلوم ہے جو ہونا تھا ہو چکا لیکن اب تم کیا کر رہے ہو؟" دین محمد نے برہمی سے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں ہی، میں تفتیش کر رہا ہوں۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے مجھے۔"

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" دین محمد نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"میں اب بھی تمھیں کچھ بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" شیخ نے اسی لہجے میں کہا۔ "نہ میں تمھارا ماتحت ہوں۔"

"لیکن تم میر محمد کے ماتحت ہو۔" دین محمد چیخ کے بولا۔

"آہستہ بات کرو۔" شیخ نے میز پر ہاتھ مارا۔ "اگر میں اس کا ماتحت ہوں تو مجھ سے صرف وہ پرسش کا اختیار رکھتا ہے، تم نہیں۔ دوسری زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس لہجے میں تمھارا بھائی بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتا۔ میں اپنا استعفیٰ اوپر بھیج چکا ہوں۔ میں تفتیش سے انکار بھی کر دوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آئی جی بھی نہیں۔"

دین محمد کا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"مجھے ایک ہی کام نہیں ہے دین محمد! مجھے تمھارے بھائی اور بھاوج کے علاوہ اپنے محرّر اور تمھارے دوسرے ساتھی خواجہ اکبر کی گمشدگی کا بھی پتا چلانا ہے۔" شیخ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے اور اسی لیے میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ صبح ایس پی صاحب سے ملو۔ ان سے کہو میر محمد کا کیس سی آئی اے کو دے دیا جائے۔ یا اس کی تفتیش کے لیے خصوصی ٹیم تشکیل دی جائے کیونکہ معاملہ بہرحال ایک ایس ایچ او کی گمشدگی یا اغوا کا ہے۔ شاید میں اکیلا زیادہ دوڑ دھوپ نہ کر سکوں۔ حشمت خان پر بھروسہ ہے تو الگ بات ہے۔ ورنہ میرا مشورہ مانو۔ تم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر سکتے ہو۔ سی آئی اے میں تمھارے ہی ساتھی ہوں گے اور ہمدردی تو سب کو ہی ہوگی۔ ابھی تو بجے ہیں رات کے گیارہ، مجھے ایک اور کیس کے لیے جانا ہے اور ابھی تک میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ تم صبح ہونے تک صبر کرو۔"

"اس کے بچے تو میرے پاس ہونے چاہئیں۔" دین محمد بولا۔

"میری مانو تو انھیں وہیں رہنے دو۔ وہاں وہ زیادہ محفوظ ہیں اور اپنی حفاظت کی سوچو کیونکہ تم میر محمد کے بھائی ہو۔" شیخ نے کہا۔ "مجرموں کا اگلا نشانہ تمھارا گھر بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھا۔ "تو پھر میں چلتا ہوں۔"

"تم نے اس حملے کی رپورٹ لکھوادی ہے جو تم پر ہوا تھا؟" اکرام شیخ نے کہا۔

دین محمد نے اقرار میں سر ہلایا۔ نائک نے تصدیق کی کہ دونوں کیس الگ الگ درج کر لیے گئے ہیں۔

"دیکھو دین محمد! ان حالات میں تم کو گھر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں تمھیں گرفتار کرنے پر مجبور ہوں۔ تم نے وہ مشین گن کھو دی ہے جو تمھیں حکومت کی طرف سے ڈیوٹی کے لیے دی گئی تھی۔"

دین محمد رک گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ "مگر کیا وہ میرا قصور تھا؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تمھارا بیان ہے اور میں فیصلے کا مجاز نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "صبح تمھیں متعلقہ حکام کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ تمھیں معطل رکھیں یا تمھارے بیان سُن کر تمھیں بحال کر دیں۔ یہ ان کا کام ہے۔"

"خبیث! تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" دین محمد برافروختہ ہو کے بولا۔

"جو کچھ میں نے یا سکندر صاحب نے دیکھا تھا، وہ ہم بتا دیں گے۔" شیخ نے کہا۔ "تم ہمارا نام بطور گواہ کے دے سکتے ہو۔ ہم نے تم کو سرونٹ کوارٹر میں بیہوش اور بندھا ہوا پایا تھا لیکن اس سے قبل کیا ہوا تھا۔ یہ صرف تم جانتے ہو۔ ہم اس کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ گالی دینے پر میں تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ "دین محمد صاحب کو لاک اپ میں لے جاؤ۔ لاٹ صاحب کا فون آئے تب بھی میری اجازت کے بغیر ان کو چھوڑنا نہیں ہے۔"

"میں تم سے سمجھ لوں گا شیخ!" دین محمد نے سخت احساسِ تذلیل کے ساتھ زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں اس دھمکی کو بھی نظر انداز کرتا ہوں کیونکہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ لیکن میں کسی طرح بھی قانون کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔" شیخ نے کہا۔

دین محمد آہستہ آہستہ لاک اپ کی طرف بڑھا اور اس کے کھلے دروازے سے زیرِ تفتیش مجرموں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس جرأت و ہمت اور فرض شناسی کے مظاہرے پر ملنے والی اسنادِ تحسین اور میڈل تھے۔ اس کا شمار اچھے پولیس افسروں میں ہوتا تھا اور اپنے فرض میں کوتاہی کا مرتکب وہ اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت وہ عام مجرموں کے ساتھ ایک تھانے کے لاک اپ میں بند تھا۔

"کانسٹیبل!" شیخ نے کہا۔ "لاک اپ کی چابی مجھے دے دو اور تم دو سپاہیوں کے ساتھ چلو۔ اپنے ساتھ زمین کھودنے کا سامان بھی لے لو۔ ہمیں ایک لاش برآمد کرنی ہے۔"

کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔ "اس وقت... میرا مطلب ہے سر کہ سواری کا کیا ہوگا؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ سکندر صاحب ہماری مدد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس گاڑی ہے۔" شیخ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

تین افراد کو ہم نے وہاں پہنچایا۔ جہاں زمین تازہ کھدی ہوئی لگتی تھی۔ میری حالت بھوک سے غیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ راہ میں کسی سینما کے آخری شو سے لوٹنے والی ریڑھی کو دیکھ کر میں نے گاڑی روکی اور اس سے بند کباب کا تمام بچا ہوا اسٹاک خرید لیا۔ اس کے پاس دس بند اور بیس کباب باقی رہ گئے تھے جو شاید وہ اگلے دن کے مال میں شامل کرتا۔ پورے پیسے ملنے پر اس کا چہرہ دمک اٹھا ورنہ وہ سمجھ رہا تھا کہ بچا ہوا مال حرام ہی گیا۔ گاڑی میں میرے سوا چاروں افراد پولیس کی وردی میں تھے اور ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ بادل ناخواستہ ہمارے ساتھ بیگار پر جانے والے تینوں کانسٹبل یقیناً ڈنر تناول فرما چکے تھے مگر انھوں نے ہماری دعوت کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ روکھی سوکھی حلق سے اتارنے کے بعد ہم نے کولڈ ڈرنک پیے اور تھانے سے روانہ ہونے کے نصف گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہمارے اندازے کے مطابق ایک لاش دفن تھی۔

ایک کانسٹبل نے جو زیادہ بے باک تھا۔ یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی کارروائی صبح ہونے کے بعد کی جاتی تو کیا تھا اور اس بات پر شیخ سے جھاڑ کھائی۔ ہم انھیں کھدائی میں مصروف چھوڑ کے چند قدم دور جا کھڑے ہوئے اور سگریٹ پینے لگے۔ ہم سڑک سے تقریباً پچاس گز دور نشیبی علاقے میں تھے۔ اب چاند بھی نکل آیا تھا لیکن گورکنی پر مامور کانسٹبل ایک پیٹرومیکس لیمپ بھی لائے تھے اور اسے روشن کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ آدھے گھنٹے میں سڑک پر سے دو گاڑیاں گزریں اور دو موٹر سائیکلیں۔ ان سب نے رک کر اندھیرے اور ویرانی میں ہونے والی کارروائی کو بغور دیکھا اور اس امر کا یقین کرنے کے بعد کہ یہ جن بھوت نہیں، پولیس والے ہیں، رفو چکر ہو گئے۔ ان کے لیے دونوں برابر تھے کہ چمٹ جائیں تو جان نہ چھوڑیں۔ خدا دونوں سے امان میں رکھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک آپس میں باتیں کرنے یا ہمیں گالیاں دینے کے بعد بالآخر ایک کانسٹبل نے چلا کر ہمیں پکارا اور ہم بڑی توقعات کے ساتھ لپکے۔ وہ تین فٹ قطر کے محدود علاقے میں دو فٹ کی گہرائی تک کھدائی کر چکے تھے اور ایک بوری کی دریافت پر مطمئن تھے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔

بوری کا منہ اوپر کی طرف نہیں تھا لیکن بوری خالی بھی نہیں تھی۔ اردگرد کی ساری جگہ کھودے بغیر یہ بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ نیچے سے بوری کا منہ بند ہو گیا یا نہیں۔ ٹیلی فون کرنے والے نے تو واضح اعتراف کیا تھا کہ اس نے بوری کو کھول کر دیکھا تھا اور پھر خوف زدہ ہو کے بھاگ لیا تھا۔ ایسی صورت میں بوری کو اوپر کے دونوں کناروں سے کوئی تھام کر کھینچا جاتا تو انجام یہی ہوتا کہ لاش گڑھے میں رہ جاتی اور خالی بوری کھینچنے والے پیچھے جا گرتے۔

اکرام نے ٹارچ کی لائٹ ڈال کے دیکھا۔ بوری کے اوپر مٹی میں خون کا رنگ شامل تھا۔ قانون کے رکھوالے عام طور پر اس قسم کی محنت کے عادی نہ تھے جس سے جیب میں کچھ نہ جائے اور تھکن کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ معاشیات کی اصطلاح میں یہ غیر بارآور محنت کہلاتی ہے۔ وہ بوری کے اردگرد تین فٹ تک زمین سے مٹی نکالنے پر آمادہ نہ لگتے تھے۔ شیخ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو انھوں نے متبادل تجویز پیش کی۔ وہ بوری کے کناروں کو اس طرح کھینچ کر نکالیں گے کہ اندر سے لاش کے جسم کا کوئی حصہ بھی گرفت میں آجائے۔ شیخ نے بادل ناخواستہ ان سے اتفاق کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زبردستی اب نہیں چلے گی۔ تینوں ماتحت لمبے لیٹ جائیں گے ایک کہے گا میری کمر میں جھٹکا آگیا ہے۔ دوسرا چکر آنے کے بعد بیہوش بھی ہو سکتا تھا۔ تیسرا صاف کہتا کہ اب میں اکیلا کیا کروں سر!

ان تینوں نے مل کر زور لگایا اور معلوم نہیں کس نے لاش کی ٹانگ کھینچی اور کس نے ہاتھ پکڑ کے گھسیٹا لیکن بالآخر وہ مٹی میں دبی ہوئی بوری کو نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بوری کا منہ دوسری طرف سے پھر باندھ دیا گیا تھا جس سے یہ نظریہ درست ثابت ہوتا تھا کہ اصل قاتل کسی خوف یا مصلحت کی بنا پر دوبارہ آئے تھے۔

"کھولو اسے۔" شیخ نے کچھ دیر ٹارچ لائٹ کو بوری پر جمانے کے بعد کہا۔ یہ اندازہ تو بوری کی بے ڈھب حالت سے بھی ہو جاتا تھا کہ اس میں لاش ہی ہے، ریت یا بھوسہ نہیں بھرا ہوا ہے۔

اس پر لپٹی ہوئی رسی کسی دشواری کے بغیر کھل گئی لیکن جو چیز اس میں سے برآمد ہوئی اس نے ہمیں بھی دہشت زدہ کر دیا۔ دو کانسٹبل اللہ توبہ کرتے بھاگے اور چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔ بوری کا کفن اتارنے والا بھی خود بخود پیچھے ہٹ کر ہمارے قریب آگیا۔

اب ہمارے درمیان ایک بے گور و کفن ہی نہیں، بے لباس لاش پڑی تھی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی اور محاورے کے مطابق منہ کے بل لیکن عملی طور پر منہ کے بغیر۔ گردن سے اوپر لاش کا سر غائب تھا۔ سر کو تن سے جدا کرنے کا کام کسی نے بڑی مہارت اور صفائی کے ساتھ کیا تھا۔ ... قصابوں کا بڑا چھرا استعمال کیا ہو گا یا 'ٹوکا'۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے خاموشی کے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی مایوسی ہوئی ہے۔" میں ... "تمھیں امید تھی کہ اس میں سے میر محمد یا اس کی بیوی کی لاش نکلے گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن میں قبل از وقت یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "قتل تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور کبھی کبھار پرانی مدفون لاشیں بھی نکل آتی ہیں لیکن جس طرح مجھے اطلاع دی گئی تھی پھر جیسے میر محمد کے گھر کی تباہی دیکھی اور اس کے فوراً بعد مست قلندر صاحب نے میر محمد کے بچوں کی بات کی۔ اس سے میرے ذہن نے واقعات کو منسلک کر لیا اور میرا یہ شک بھی یقین میں بدلنے لگا کہ ایسے پھینکی جانے والی لاش دونوں بدقسمت میاں بیوی میں سے کسی ایک کی ہو گی۔ یہ نہ ہوتا تو میں اتنی رات تک اپنے ساتھ دوسروں کو بھی خوار نہ کرتا۔ لاش صبح نکال لی جاتی اور اسپتال بھیج دی جاتی۔"

"سچ پوچھو تو میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اس لیے خاموش رہا کہ جو ہو گا سامنے آجائے گا۔ تم بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے۔"

"اب یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ لاش میر محمد کی بھی ہو سکتی ہے مگر تصدیق صرف فنگر پرنٹ سے ہی ممکن ہے۔" شیخ نے کہا۔

"فنگر پرنٹ کہاں سے ملیں گے سر!" ایک کانسٹبل نے اطلاعاً کہا۔ "جب فنگرز ہی نہیں ہوں گی۔"

"کیا مطلب ہے؟" اکرام شیخ نے چونک کر کانسٹبل کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ لاش کے سر کی طرح اس کے ہاتھ بھی غائب ہیں کلائی کے پاس سے۔" کانسٹبل نے کہا۔

"یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ سر بریدہ لاش تو بعض اوقات مل جاتی ہے لیکن وہ کسی عام آدمی کی لاش ہوتی ہے جس کی فنگر پرنٹس کا ریکارڈ کہیں بھی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "بس کوئی قاتل جنونی کیفیت میں یہ حرکت کر بیٹھتا ہے یا پھر وہ اتنا سیانا ہوتا ہے کہ شناخت کو دشوار بنا دیتا ہے۔ لیکن ہاتھ کاٹنے کا تو اور کوئی سبب ہی نہیں۔ قاتل یہ جانتے ہوں گے کہ مقتول کی شناخت فنگر پرنٹ سے بھی ہو جائے گی۔ فنگر پرنٹ یا تو ہسٹری شیٹر مجرموں کے مل جاتے ہیں یا پھر ملازمت پیشہ افراد کے۔ ان کی سروس بک کے آغاز میں۔ اب میں پھر شک میں پڑ گیا ہوں۔"

"یعنی یہ کہ لاش میر محمد کی ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن فوری طور پر میں کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔ عملی زندگی میں شناخت کی دوسری علامات وہ نشان ہوتے ہیں جو کسی زخم، حادثے کے باعث یا چوٹ لگنے سے پڑ جاتے ہیں۔ عموماً یہ نشانات بھی جسم کے کھلے حصوں پر ملتے ہیں۔ منہ پر یا ہاتھوں پر۔ اور نمایاں شناختی علامات کبھی صورت دیکھ کر لکھ دی جاتی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "جسم کے باقی حصوں پر کوئی تل، برتھ مارک یا جلد کا داغ ہو تو... تو اس کی ماں کے بعد صرف اس کی بیوی بتا سکتی ہے۔ فی الحال وہ دونوں بھی موجود نہیں۔ ایک مر چکی ہے، ایک غائب ہے۔ اس لیے ہم چلتے ہیں، ایمبولینس بھیج دیتے ہیں جو لاش کو اسپتال لے جائے گی۔"

میں اور اکرام شیخ تھکے ہارے سڑک کی طرف روانہ ہوئے مجھے بھی اپنی توقعات کے غلط ثابت ہو جانے کا ملال تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس شخص کو مردہ دیکھنا چاہتا تھا جو شکاریوں کا آلۂ کار تھا اور جس نے قتل جیسے سنگین ترین جرم کا اعتراف کرانے کے لیے ایک رات مجھ پر تشدد کے وہ حیاسوز اور ننگِ انسانیت حربے آزمائے تھے جن کے تصور سے آج بھی مجھے جھرجھری آجاتی تھی۔ میں صرف ایک بے نام تجسس کا شکار تھا اور میرے خیال کے راستے بھی ایک ہی سمت میں اشارہ کرتے تھے اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری سوچ کی سمت غلط ہے یا نہیں۔ اس شخص نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے تھے۔ اس نے ٹیپ غائب کر کے مجھے تختۂ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی اپنے کارنامے پر منہ مانگا انعام حاصل کرنا چاہا تھا مگر تیرِ قضا نے اسے پہلے شکار کر لیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ ٹیپ پھر شیخ کی تحویل میں تھا اور میر محمد لالچ میں ایک بہت بڑا سودا کرتے کرتے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔

اگر وہ مجھے دوبارہ زندہ مل جائے تو میں اس سے ضرور پوچھوں کہ کیا قدرت کے فیصلوں کو بدلنا اس کے اختیار میں تھا؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ظلم کی کھیتی کبھی پھلتی نہیں ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو؟" شیخ نے کہا "واپس نہیں چلنا کیا؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور شیخ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے تھانے میں ڈراپ کر دو۔ اس کے بعد تم جاؤ۔ رات کے دو بجنے والے ہیں اور میری ڈیوٹی تو صبح تک ہے۔" شیخ نے کہا۔ "تم جا کے آرام کرو۔"

"مجھے بھی اسلام آباد فون کرنا ہے۔ اس وقت لائن فوراً مل جائے گی۔" میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"فون تو مجھے بھی کرنا ہے۔" شیخ بولا۔ "وہ حضرت بھی فارغ ہونے ہی والے ہوں گے۔ مجنوں پر..."

مجھے جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "گاڑی یہاں سے سیدھی لے چلو۔" تھپکی دینے والے نے بھاری بھرکم لہجے میں مجھے حکم دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک لمحے کے لیے میں اور اکرام شیخ اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ہم دونوں کے ذہن نے فوراً اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ حکم دینے والا حکم پر عمل کرانے کی پوزیشن میں بھی ہے اور کسی فوری ردِعمل کے تحت ہم نے جرأت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو یقیناً نقصان میں رہتے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں نے سر کو تھوڑا سا پیچھے گھمایا اور بیک وقت اس ریوالور کو دیکھا جس کی زد میں ہم دونوں تھے۔ اسے گولی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سر کے پچھلے حصے پر بٹ مار کے بھی ہمیں ناک آؤٹ کر سکتا تھا۔ اس کا پہلا نشانہ شیخ ہی ہوتا کیونکہ میرے ہاتھ میں اسٹیئرنگ تھا۔

میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑتے وقت لاک کر دیا تھا مگر کاروں کے ڈور لاک کسی بھی ملتی جلتی چابی سے کھل جاتے ہیں۔ وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیچھے آ بیٹھا تھا اور ہم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ ہم اپنے اپنے خیالات میں محو تھے اور آگے کی سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو شاید میں اس کی پرچھائیں بیک ویو مرر میں دیکھ لیتا مگر وہ لیٹا ہوا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ سیاہ رنگ و بن کی سیٹوں پر کیمو فلاج کرنے کے لیے اس نے کالے کپڑے بھی پہن لیے ہوں یا اوپر کالی چادر اوڑھ رکھی ہو۔

"کیا چاہیے تمھیں؟" شیخ نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم جو بھی ہو مسٹر ایکس وائی زیڈ۔"

"مجھے وہ چیز چاہیے جو میر محمد ہمیں نہ دے سکا۔" وہ بولا۔ میں نے اس کی آواز پر غور کیا جو سنی ہوئی لگتی تھی۔

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ وہ چیز تم کو ہم سے مل سکتی ہے؟" شیخ نے کہا۔

"میر محمد نے بتا دیا تھا کہ وہ چیز تمھارے پاس ہے۔" وہ بولا۔ "اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔"

"تم اس کے لیے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو۔ کیا تم اسے مار چکے ہو مسٹر ایکس؟"

"مجبوری تھی۔ وہ لالچ میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ آدمی جس شاخ پر بیٹھا ہو اسے ہی کاٹے گا تو کیا ہوگا؟"

"تم نے اس کی بات پر یقین کر کے عقلمند ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔" شیخ نے کہا۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ وہ ٹیپ جو تم مانگ رہے ہو میر محمد لے گیا تھا۔ اس کا گواہ حشمت خان بھی ہے اور اسی بات پر میر کے اور میرے درمیان شدید اختلافات تھے۔ میں نے عدالت کے رُو برو اپنے بیان میں بھی یہی کہا تھا۔"

"اس وقت تک یہ بات سچ تھی۔" وہ پیچھے سے بولا۔ "گویا بعد میں اس کے ضمیر نے ملامت کی تو اس نے ٹیپ مجھے دے دیا؟" شیخ نے طنز سے کہا۔ "یا وہ تم سے منہ مانگا معاوضہ وصول کرنے میں ناکام رہا تو دشمنی پر اتر آیا؟"

"اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہم سے دشمنی کر سکتا اور ہم اسے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ بھی کر چکے تھے۔۔۔"

"صرف وعدہ؟ یا تم نے اسے کچھ دیا بھی تھا؟" شیخ نے کہا۔

"اس نے دس لاکھ مانگے تھے اور پانچ لاکھ اسے دے دیے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن کل تم دونوں سکندر اور محسن آدھی رات کے وقت اس کے گھر میں جا گھسے۔ تم نے اس کے بچوں کو ریوالور کی زد پر رکھ کے اس سے ٹیپ طلب کیا اور دھمکی دی کہ ٹیپ نہ دیا گیا تو تم اس کے دونوں بچوں کو لے جاؤ گے۔ کوئی بھی تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا کیونکہ ایک بڑا پولیس افسر اور ایڈووکیٹ رابعہ جیسے لوگ گواہی دیں گے کہ اغوا کی واردات کے وقت تم ان کے سامنے گھر میں بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے۔"

"مسٹر ایکس۔۔۔! یہ سب کچھ تم سے میر محمد نے کہا تھا؟" شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ وہ خود کبھی تمھاری دھمکی میں نہ آتا۔ اس نے اپنی بے وقوف اور بزدل بیوی کو سمجھایا بھی کہ نہ ہم گولی چلا سکتے ہیں، اس کی آواز پر اوپر نیچے رہنے والے آ جائیں گے اور شاید تھانے والے بھی اور نہ یہ ممکن ہے کہ ہم دو بچوں کو اٹھا کے نیچے تک جائیں اور پھر بھاگ کر تھانے کی حدود سے بھی نکل جائیں لیکن وہ عورت تھی، اپنے بچوں کو دہشت زدہ نہ دیکھ سکی اور خود ان سے زیادہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس نے میر محمد کے منع کرنے کے باوجود ٹیپ تمھیں لا دیا۔ میر محمد نے صرف ایک بے وقوفی کی تھی۔ اس نے ٹیپ کو گھر میں رکھا تھا اور وہ بھی اپنے بیڈ کے نیچے اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ منہ مانگا انعام وصول کیے بغیر ٹیپ ہمارے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ وہ ٹیپ کو اگلے ہی دن پہنچا دیتا۔"

"ویری گڈ۔ کہانی اچھی سنائی تھی میر محمد نے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔ "کیا ہم نے اسے چھوڑ دیا اور اطمینان سے نیچے اتر گئے۔ یا جاتے جاتے ہم میاں بیوی کو ناک آؤٹ کر گئے کہ وہ شور نہ مچا سکیں اور کھڑکی سے کسی کو آواز نہ دے سکیں؟"

"نہیں، تم ایک بچے کو بطورِ ضمانت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "کہ اسے تھانے کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا جائے گا۔ بچہ دس منٹ بعد واپس آیا اور اس نے دونوں دروازوں کی کُنڈی باہر سے کھولی۔"

میں اور شیخ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔ "کیا بچے نے یہ بھی کہا تھا کہ گاڑی لال رنگ کی تھی یا وہ فاکس ویگن کو

پہچانتا ہے۔ ایک ہوشیار پولیس افسر کا بیٹا ہے نا۔ اس نے تو نمبر بھی نوٹ کر لیا ہوگا۔"

"گاڑی یہاں روک دو۔" وہ بولا۔ میں نے تعمیل کی اور گاڑی کو اس ویران سڑک پر کھڑا کر دیا جہاں سے اس وقت کسی کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ "ہمیں یہیں انتظار کرنا ہے کچھ دیر۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے کہا۔

"بچے نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میر محمد تمھیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمھاری گاڑی تھانے کے گیٹ سے نکل رہی ہے۔ وہ گاڑی کو بھی پہچان گیا۔" اجنبی نے کہا۔

"مسٹر ایکس! پھر تم یہ ٹیپ لینے کے لیے میرے گھر کیوں نہیں آئے۔ حالانکہ میں اکیلا تھا اور تمھارا ہی ایک آدمی رضوی صاحب کی کوٹھی کے گیٹ پر سنتری بنا کھڑا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو سکندر! کہ ہم نے ایک نہیں، چار آدمی بھیجے تھے اور انھیں اچھی طرح سمجھا بھی دیا تھا کہ انھیں ایک ٹیپ لانا ہے۔ ہم انھیں یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ٹیپ کیسا ہے یا اس میں کون سی خطرناک بات ہے۔ اتنا ان کو یقیناً معلوم تھا کہ وہ ٹیپ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کا حاصل کرنا ہمارے لیے بے حد ضروری ہے۔ ان کو دس دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اپنا کام اطمینان سے کریں وہاں کوئی نہیں آئے گا لیکن تم سے ہوشیار رہیں۔ لیکن وہ ناتجربہ کار لوگ تھے اور اس بات سے بہت زیادہ پریشان تھے کہ انھیں ایک بہت بڑے پولیس افسر کے گھر میں گھس کر سارا کام کرنا ہے جس نے سخت حفاظتی انتظامات بھی کر رکھے ہیں۔ سنتری کو ہم نے خود ہی ہٹا دیا تھا مگر اندر کی ہمیں بھی خبر نہ تھی کہ وہاں کوئی خفیہ الارم نہ ہو یا کوئی کیمرہ وغیرہ پوشیدہ نہ ہو۔ یہ بات ہم نے ان پر بھی واضح کر دی تھی کہ چند روپوں کے ایک کیسٹ کو لانے کے لیے ہم چار افراد کو دس دس ہزار بے وجہ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ کام آسان بہرحال نہیں ہے۔ انھیں گھر کی تلاشی لینی ہوگی اور پوری احتیاط کے ساتھ۔ وہ کیسٹ کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ کیسٹ ہمارے ہی کمرے میں ہوگا۔ ورنہ رابعہ کے کمرے میں۔ رضوی صاحب کا کمرہ اور گھر کے دوسرے حصے بعد میں دیکھے جائیں لیکن خانہ تلاشی کا ثبوت کہیں نہ چھوڑا جائے۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ مار پیٹ اور توڑ پھوڑ سے گریز کریں اور ریوالور دکھا کے تمھیں بے بس کر دیں۔ مگر وہ جو بڑا بدمعاش بنتا تھا اور ان کا سرغنہ بن کے گیا تھا انھیں کنٹرول نہ کر سکا۔ ایک تو تمھاری اشتعال انگیزی کے باعث بے قابو ہو گیا اور دوسرے نے تمھیں ڈنڈا مار کے بے ہوش کر دیا۔"

"اگر میں نے وہ دوسرا جوتا بھی پہن لیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اگر کا لفظ تاریخ میں بھی بڑی گڑبڑ کا باعث رہا ہے اگر نورجہاں نے وہ دوسرا کبوتر بھی نہ چھوڑا ہوتا جو جہانگیر نے اسے تھمایا تھا۔ اگر ایک سقّے نے اپنی مشک سے شہنشاہِ ہند کی جان نہ بچائی ہوتی۔ وہ جوتا بھی میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں اس کو فوراً نہ کھینچ مارتا اس کے سامنے کے دو دانت نہ ٹوٹتے۔ وہ مذاق نہ بنتا۔ اسے رشتہ ٹوٹنے کا غم نہ ہوتا اور وہ مشتعل ہو کے حملہ کرنے کی حماقت نہ کرتا تو اس کی پسلیاں ٹوٹنے کی نوبت نہ آتی۔ غالباً اس کے بعد وہ بدحواس ہو گئے۔"

"ہاں۔ مجھے اتو فوراً دوڑ کر باہر آ گیا کہ میرا کام ختم ہو گیا۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے بڑی عجلت میں تلاشی لی۔ ان میں سے ایک احمق نے اپنے باس کے حکم پر الماری کے تالے کو فائر کر کے کھول لیا تھا۔ جو انھیں بعد میں بازار سے لا کے لگانا پڑا تھا۔"

"مسٹر ایکس! کیا اس ٹیم میں شامل کرنے کے لیے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا تھا جو تالے کھولنے کا ماہر ہوتا؟" میں نے کہا۔

"وہ پانچواں آدمی پہنچا ہی نہیں جس کا وہ بیگ تھا۔ اسے پولیس بہت سے لوگوں کے ساتھ چوری کے ایک کیس میں تفتیش کے لیے اٹھا کر لے گئی تھی۔" وہ بولا۔ "باقی لوگوں نے واپس آ کے ناکامی کی رپورٹ دینا کسرِ شان سمجھا۔ انھیں یہ ڈر بھی تھا کہ ان کے دس دس ہزار مارے جائیں گے۔ وہ ایک کے بعد دوسری غلطی کرتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک بریف کیس میں سے ایک ٹیپ بھی نکال لیا۔ وہ اسے ہی اصل سمجھے۔"

"کیوں؟ کیا انھوں نے اسے سُن کر دیکھا تھا مسٹر ایکس؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ انھوں نے گھر کے ہی ایک کیسٹ پلیئر پر اسے سنا تھا۔" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ آوازیں پہچان گئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو پہلے سے جانتے تھے جن کی آوازیں اس ٹیپ میں تھیں۔ وہ ناتجربہ کار تو تھے مگر نئے لوگ نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ چوہدری دلاور کی اور ڈی سلوا کی باتیں سن کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہی وہ خطرناک ٹیپ ہے۔ پھر یہ کہ وہ ایک فائل بھی لے گئے۔"

"فائل؟ کون سی فائل۔ وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں گئے تھے۔" وہ بولا۔ اس کے لیقین نے مجھے چکرا دیا۔ "وہ فائل پھر کہاں گئی؟"

"تم انھیں بتا دیتے کہ ٹیپ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "ایک یہ نئے کیسٹ ٹائپ اور دوسرے پرانے اسپول۔"

"یہ غلط فہمی تو اس اُلّو کے پٹھے میر محمد نے پیدا کی تھی جو آخر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تک صرف ٹیپ ٹیپ کہتا رہا۔"

"اسے اب گالی کیوں دیتے ہو جو مر چکا۔ اس نے تو تمھیں نجانے کتنی غلط باتوں سے بے وقوف بنایا۔" میں نے کہا۔ "تم کو ٹیپ چاہیے تو یہ لو۔" میں نے گاڑی کا خانہ کھولا اور اسپول کو گتے کے ڈبے سمیت پیچھے بڑھا دیا۔ "لیکن کچھ باتیں میری بھی سن لو۔ معلوم نہیں ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں اور کیوں۔ اور یہ انتظار کب تک جاری رہے گا۔ میری باتیں تمھاری سمجھ میں آجائیں تو انھیں بھی سمجھا دینا جو سمجھتے ہیں کہ میری جان اس ٹیپ میں ہے۔ یہ پرانے الف لیلوی قصوں جیسی بات ہے کہ سمندر بیچ ایک جزیرہ ہے، جزیرے میں سات کوس پر ایک باغ ہے۔ باغ میں سونے کا ایک پنجرہ ہے اور اس پنجرے میں جو طوطا ہے اس میں کالے دیو کی جان ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہیں لیکن اس ٹیپ کو حاصل کرنے کی جدوجہد بھی فضول تھی۔ ایک جھوٹ تو میر محمد نے تم سے یہ بولا کہ ٹیپ ہم لے گئے تھے۔ ثبوت اگر دیکھنا ہو تو میر محمد کا فلیٹ جا کے دیکھنا۔ اس کے دو دروازے زینے میں کھلتے ہیں مگر دونوں باہر سے بند نہیں ہو سکتے۔ ایک کی کنڈی ہی نہیں ہے باہر۔ اگر میر محمد کو ناک آؤٹ کیے بغیر فرار ہوتے تو صرف ایک دروازہ بند کر سکتے تھے۔ وہ دوسرے دروازے سے ہمارے پیچھے دوڑ کر آسکتا تھا۔"

وہ خاموش رہا اور میں نے اندازہ لگایا کہ میری بات کا تھوڑا بہت اثر ضرور ہوا ہے۔

"دوسری بات زیادہ اہم ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے یہ ٹیپ اپنے خلاف ہونے والی محکمہ جاتی کارروائی سے بچنے کے لیے خود اکرام شیخ کو دیا تھا۔ اس بیان کے بعد جو اکرام شیخ نے عدالت میں دیا تھا۔ اس کے خلاف تفتیش ناگزیر تھی۔ خاص طور پر محرّر کے اس بیان کی وجہ سے جو اس نے ٹیپ سے نقل کیا تھا۔ بے شک اب وہ محرّر بھی غائب ہے اور بیان پر عبدل کے دستخط بھی نہیں ہیں، لیکن اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ وہ تحریر محرّر کی ہی ہے۔ اس کی تحریر کا نمونہ تو تھانے کے روزنامچے میں بھی ہے۔ یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ عدالت قدرتی طور پر یہ سوال کرے گی کہ محرّر کو بلاوجہ کسی مقتول سے ایک اعترافِ جرم منسوب کر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ شیخ کو بلاوجہ میر محمد پر ٹیپ کی چوری کا الزام عائد کرنے میں کیا فائدہ تھا؟"

"تم غلط کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "میر محمد کو ٹیپ کے پانچ لاکھ مل چکے تھے۔ پانچ لاکھ اور ملنے تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ بدعہدی اور غداری کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"خمیازہ!" میں نے طنز سے ہنس کر کہا۔ "وہ بہت چالاک تھا مسٹر ایکس! اس نے اکرام شیخ سے کہا تھا کہ وہ نادم ہے اور اس سے ایک درخواست کی تھی۔ شیخ کہہ دے کہ کوئی شخص یہ ٹیپ تھانے میں چھوڑ گیا تھا۔ اگلی پیشی پر شیخ یہ بتا دے کہ گمشدہ ٹیپ مل گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ اصل ٹیپ تمھارے حوالے کر کے تم سے باقی پانچ لاکھ وصول کر لیتا اور بعد میں معصوم بن جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شیخ پہلے ہی ایک نقل بنا چکا ہے۔ اس کے گھر میں بھی ویسا ہی ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یقین نہیں تو اس کے گھر جا کے دیکھ لو۔ ویسے بھی وہ نوکری پر لات مار کے ملک سے فرار ہونے کی سوچ رہا تھا۔"

"بکواس بند کرو۔ اب تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ ٹیپ دو ہیں؟"

"افسوس کہ تم نے میر محمد کو مارنے میں بہت جلدی کی۔" میں نے کہا۔ "وہ زندہ ہوتا تو تم اس سے پوچھ سکتے تھے کہ اصل ٹیپ کس کمپنی کا بنایا ہوا تھا اور وہ تمھیں بتاتا کہ جو ٹیپ اس نے نکالا تھا 'بی اے ایس ایف' کا تھا۔ وہ ٹیپ ریکارڈر بھی جرمنی کا بنا ہوا تھا۔ اسپول ٹیپ بھی جرمن تھا۔ اب اس ٹیپ پر غور کرو مسٹر ایکس! یہ جاپانی ہے۔ اکائی آف جاپان۔ فرق صاف ظاہر ہے لیکن تمھارے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"اور وہ اصل۔ کیا نام لیا تھا تم نے۔ ایم بی بی ایس..."

میری بات نے اسے چکرا دیا تھا۔

"بی اے ایس ایف۔" میں نے اس کی جہالت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میر کی بیوی کے پاس لے جاؤ گے۔ تو وہ دونوں کے ڈبے دیکھ کر فرق بتا دے گی۔"

"اس کو تو ہم نے میر محمد کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ساری خرابی کی ذمے دار وہ تھی۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اور میر محمد، وہ کچھ نہیں بولا تھا" اس ظلم کے باوجود؟"

"ہم نے اسے ایک ہی دفعہ میں نہیں مار دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کیا تھا۔ میر محمد کے سامنے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا کہ میر پاگل ہو گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بیوی کو گالیاں دیتا رہا اور اسے کہتا رہا کہ ٹیپ کے متعلق بتا دے مگر اس نے شوہر کی بھی نہیں مانی اور بڑے عذاب کے ساتھ مرنا منظور کر لیا۔ کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ ایک عورت ایسی قوت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔"

عورت؟ میں نے سوچا۔ وہ عورت نہیں ماں تھی۔ اس کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنی جان بچا لیتی اور اپنی ممتا کا خون کر دیتی۔ اپنے بچوں کو ان خونی درندوں کے حوالے کر دیتی۔ ممتا کے مقدس رشتے کی آبرو گنوا دیتی۔

"جلد بازی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"اب تمھیں کون بتائے گا کہ اصل ٹیپ کہاں ہے؟ تم تو میر محمد کو بھی قتل کر چکے ہو مسٹر ایکس!"

"اس نے دیوانگی میں ہم پر حملہ کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اور تم میں سے کسی نے اسے گولی مار دی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہم نے اسے ذبح کر دیا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"گویا وہ لاش میر محمد کی ہے جس کا نہ سر ہے، نہ ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو ابھی قبر سے نکلی ہے۔"

"وہ قبر نہیں تھی، چوہے دان تھا جس میں تم دونوں پھنس گئے ہو۔" وہ بولا۔

"مجھے فون کرنے والے تم ہی تھے نا؟" شیخ نے اچانک کہا۔ "آواز بدلی ہوئی تھی لیکن تمھارا لہجہ وہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "کیسی تھی وہ کہانی جو میں نے سنائی تھی۔ جب میں اور میرے ساتھی بوری پھینکنے گئے تھے تو وہاں سے کوئی اُلّو کا پٹھا موٹر سائیکل والا نہیں گزرا تھا۔ ہمیں معلوم تھا تم تجسّس اور فرض شناسی کے چکر میں وہاں ضرور آؤ گے۔"

"تم اس ڈرامے کے ہدایتکار نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "ایک معمولی اداکار ہو۔ خود کو یہ کریڈٹ مت دو کہ..."

"یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میں نہ آتا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک حماقت تم نے بھی کی تھی یعنی پہلے لاش کو گڑھے میں پھینک دیا تھا اور پھر اس کو کچھ دور لے جا کر دفن کیا تھا۔"

"یہ صرف اس لیے تھا کہ تم نہ آؤ تو کم سے کم میر محمد کی گمشدگی کا راز فاش نہ ہو۔" وہ بولا۔ "بعد میں کسی نے کہا تھا کہ ایک پولیس افسر کی لاش سے بہت ہلچل پیدا ہو گی۔ اسے ناقابل شناخت بنا دو۔ تم نہ آئے تو کوئی بات نہیں اور آ گئے تو کھود کر کیا نکالو گے۔ محض ایک جسم۔ نامکمل اور بے جان، جو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔ تمھاری ذہانت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ تم نشانات سے اصل مدفن تک پہنچ جاؤ گے۔"

"ہم یہاں کب تک مذاکرات کرتے رہیں گے؟" میں نے کہا۔ "جبکہ مشترکہ اعلامیہ جاری ہونے کے امکانات بھی ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم سب کا انجام کیا ہو گا۔"

"تمھیں میرے انجام کی فکر کیوں ہے؟" وہ چڑ کر بولا۔

"اس لیے کہ تم بھی محض ایک مُہرے ہو، پیدل، گھوڑے یا فیل بھی نہیں۔ تمھارا پٹنا بھی یقینی ہے۔"

"تم بولے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ بولا۔ "یا تم مجھے بھی مشتعل کرنے کا حربہ آزما کے شکار کرنا چاہتے ہو؟"

"میر، ایک سگریٹ تو پی سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "تمھاری اجازت ہے؟"

"اس بہانے اپنی پھرتی اور چالاکی مت دکھانا۔ مجھے حکم ہے کہ تم سے کوئی سروکار نہ رکھوں بلکہ پوری کوشش کروں کہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔" وہ بولا۔ "وہ لوگ صرف شیخ صاحب کو لینے آئیں گے۔"

"بیٹھے بیٹھے تو میرا سارا جسم اکڑ گیا ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے انگڑائی لی اور ہاتھ نیچے لاتے ہوئے تھوڑا سا بیک ویو مرر کو چھو دیا۔ بیک ویو مرر گھوم کر پیچھے والی سیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔ پھر میں نے سگریٹ جلائی۔

میرا دل اُچھل کر میرے سینے سے ٹکرایا اور میرا سانس رک گیا۔ پیچھے کی سیٹ پر سے میر محمد مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ لائٹر کی مدّھم روشنی میں بھی اس کی صورت کے نقوش بالکل واضح تھے۔ اس صورت کو شناخت کرنے میں میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یہ وہی میر محمد تھا جس نے بہت کوشش کی تھی کہ پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ ہو جائے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ میری نظر کے سامنے صرف میر محمد کا چہرہ تھا۔ باقی دھڑ نہیں تھا۔ باقی دھڑ بہت پیچھے اس وقت بھی فرشِ خاک پر داستانِ عبرت بنا پڑا تھا۔ یہ صرف سر تھا۔ گردن سے اوپر کا وہ حصہ جو لاش کے تن سے جدا کر دیا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے اپنے رُکے ہوئے سانس کو خارج کیا اور پھونک مار کے لائٹر کو آف کر دیا حالانکہ میرا اس پر سے انگوٹھا ہٹا لینا ہی اس کے شعلے کو دبا دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور دھواں خارج کرتے ہوئے ایک بار پھر بیک ویو مرر میں دیکھا۔

شیخ نے یقیناً میری حالت میں رُونما ہونے والے تغیر کو نوٹ کر لیا تھا۔

"تم نے مجھے سگریٹ نہیں دی۔" وہ بولا۔ "سگریٹ پینے کے ادب آداب سب بھول گئے؟"

قیمت فی کتاب ۔/۱۰ روپے

فالیوط سیریز نمبر ۸
مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور
مسٹر چکرم

فالیوط سیریز نمبر ۹
قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول
تیسرا روپ

کتابیات پبلی کیشنز ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ۔ کراچی

"سوری" میں نے چونک کر کہا "پہلے ان سے تو اجازت لے لو۔ ہمارے جیلر صاحب سے"

"مسٹر ایکس! کیا میں بھی سکندر سے ایک سگریٹ لے سکتا ہوں" شیخ نے کہا۔

"لے لو۔ اور ہو سکے تو ایک مجھے بھی دے دو" اس نے بڑی شانِ استغنا سے کہا۔

میں نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کے شیخ کی طرف بڑھائی اور اپنے لائٹر سے جلائی۔ امید کی ایک کرن پل بھر کے لیے روشن ہوئی۔ میں نے سگریٹ اور لائٹر دونوں ۔۔۔ مڑ کر دیکھے بغیر پیچھے بڑھائے۔

حسبِ توقع اس نے ایک ہاتھ سے ریوالور تھامے رکھا اور سگریٹ کا پیکٹ لینے کے لیے دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا "معلوم نہیں یار شیخ! اسلام آباد کی صورتِ حال کیا ہے" میں نے ایک بے مقصد بات کی اور بظاہر غیر ارادی طور پر میرا وہ ہاتھ پیچھے ہو گیا جو سگریٹ اور لائٹر اپنے شانے کے پیچھے پکڑانے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یہ ایک بے ضرر سی بات تھی جس کا ہماری موجودہ صورتِ حال سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا۔ مسٹر ایکس نے ہاتھ اور آگے بڑھا کے دونوں چیزیں لے لیں۔

مشکل یہ تھی کہ وہ عین اکرام شیخ کے پیچھے تھا چنانچہ مجھے بیک ویو مرر میں نظر نہیں آتا تھا۔ بالکل دوسرے کنارے پر یعنی میرے پیچھے میر محمد کا سر سیٹ پر یوں رکھا ہوا تھا کہ میں نگاہ اٹھا کے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں مجھے گھورنے لگتی تھی۔ بیک ویو مرر کا زاویہ جس میں پہلے پیچھے کی سڑک اور ٹریفک نظر آتی تھی میرا ہاتھ لگنے سے ایسے زاویے پر آ گیا تھا جسے درست کرنا اب مشکل تھا۔ چاہتا میں یہی تھا کہ اس آئینے میں اپنے دشمن کا چہرہ دیکھوں مگر میرا ہاتھ ایسے لگا کہ آئینہ دوسری سمت میں گھوم گیا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں ریوالور پر گرفت مضبوط رکھی۔ پیکٹ کو گود میں رکھ کے اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے ایک سگریٹ نکال کے لبوں میں دبائی اور پھر بائیں ہاتھ سے ہی لائٹر کو دبا کے روشن کیا۔

"یہ لوگ تمھیں کہاں لے جائیں گے شیخ؟" میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "ٹیپ تو مل گیا ہے ان کو" بظاہر میں پیچھے کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا لیکن درحقیقت میری تمام توجہ پیچھے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر مجھے واپس دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا چکا ہے۔ میں نے بات شیخ سے جاری رکھی اور ہاتھ کو تھوڑا سا پیچھے کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اور آگے بڑھایا تاکہ دونوں چیزیں میرے ہاتھ تک پہنچ جائیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ تقریباً میرے کندھے کے پاس ہے۔

وہ لمحہ بہت مختصر تھا جب میں ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکے میں اسے آگے لا سکتا تھا اور اسی وقت ہاتھوں کی قوت سے خود کو اٹھا کر پیروں کو سمیٹتے ہوئے اس خالی جگہ سے گزر سکتا تھا جو سیٹ اور فاکس ویگن کی چھت کے درمیان تھی۔ وہ جھٹکے سے آگے آتا اور اس کا منہ اپنے مقابل سیٹ کی پشت سے ٹکراتا اور وہ اتنا جھک جاتا کہ میں اس کے اوپر جا گرتا۔

لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس کے ریوالور سے ایک گولی ضرور نکلے گی۔ جب اس کا توازن بگڑے گا تو ریوالور کا رخ بھی بدلے گا مگر کس حد تک؟ حملہ ہوتے ہی اس کا ذہنی ردِعمل کسی خودکار مشین کی طرح ہو گا۔ اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کی گرفت میں محسوس کرتے ہی وہ فائر کرے گا اور اس لمحے کے ایک مختصر ترین حصے میں جب میں اچانک اس پر حملہ کروں گا، وہ آگے آ رہا ہو گا اور میں اس کو زیر کرنے کے لیے پیچھے کی طرف چھلانگ لگا دوں گا مگر ابھی اتنا ہی وقت گزرا ہو گا کہ میں اوپر اٹھ جاؤں۔ وہ فائر کر چکا ہو گا۔ اس وقت ریوالور سے نکلنے والی گولی کہاں جائے گی؟

میرا اندازہ یہ تھا کہ ریوالور کا رُخ اس وقت اکرام شیخ کے سر کی طرف ہے۔ دشمن کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں کہ میں جو بڑے پُرسکون طریقے پر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے تسلیم کر چکا ہوں کہ دشمن زبردست ہے اور مقابلہ بے سود ہے، یکلخت اپنی بے ضرر گفتگو کو منقطع کر کے اور جملہ ادھورا چھوڑ کے اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب فائر ہو گا تو ریوالور کا رُخ اوپر کے بجائے کچھ نیچے ہو جائے گا لیکن ریوالور اکرام شیخ کے بالکل پیچھے، بہت قریب تھا۔ تھوڑا نیچا ہونے کے باوجود ریوالور کی گولی اس کو کہیں بھی لگ سکتی تھی۔ گردن میں، اس سے نیچے ریڑھ کی ہڈی میں، شانے سے کچھ نیچے بائیں طرف سے دل میں۔ ہر صورت میں یہ گولی مہلک ثابت ہوتی۔ میری بہادری کا انعام یہ احساس ہو کہ میں نے اکرام شیخ کو مروا دیا۔ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر میں اس کے قتل کا ذمّے دار ہوا۔

ہاں اگر ریوالور اتنا جھک جائے کہ گولی سیٹ کے نیچے فرش پر لگے یا دس فیصد امکانات کی صورت میں ہاتھ کے اوپر اٹھنے سے چھت پھاڑ کے نکل جائے تو میں اس دشمن کو مغلوب کر سکتا ہوں جسے اپنی طاقت پر نہیں، اس چھوٹے سے آتشیں اور ہلاکت خیز کھلونے پر بھروسہ تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے خالی ہاتھوں کی قوت پر ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ اس لیے کہ خطرہ میری جان کو نہیں، میرے دوست اکرام شیخ کی زندگی کو تھا۔

چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وقت کم ہے اور مجھے کوئی

موقع نہیں ملے گا، میں نے اس فیصلہ کن لمحے کو مایوس لوٹا دیا اور سگریٹ لائٹر لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں نے بزدلی اور کم ہمتی کے احساس سے مفاہمت کر لی لیکن ایک اچھے دوست اور اچھے آدمی کے بے گناہ خون کے چھینٹوں سے اپنا دامن بچا لیا۔

"تم ٹاپ مین تو نہیں ہو" میں نے کہا "لیکن استاد پیڈرو کی طرح اوپر والوں کے معتمدِ خاص ضرور ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے چھوڑنے اور شیخ کو ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"میں جواب دینے کا پابند تو نہیں" مجھ سے معتمدِ خاص کا خطاب پا کے اس کی خودی کچھ بلند ہو گئی تھی "لیکن بتا دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب انسپکٹر شیخ کو ہم بطورِ ضمانت لے جائیں گے۔ صرف تصدیق کے لیے کہ تم نے ہمیں خالی ٹیپ تو نہیں تھما دیا ہے۔ یہاں تو کوئی صورت نہیں اس کو سننے کی۔ اس کے لیے وہ بھاری بھرکم ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔ اگر ٹیپ ٹھیک ہوا تو شیخ صاحب کو چھوڑ دیا جائے گا لیکن یہ پہلے کی بات تھی جب ہمارا خیال تھا کہ ٹیپ ایک ہی ہے۔ تم نے دوسرے ٹیپ کی موجودگی کا ذکر کر کے حالات کو غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اب مسٹر شیخ کو اس وقت تک رکھا جائے جب تک دوسرا ٹیپ بھی نہ مل جائے جو اصل ہے"

"مگر وہ دوسرا ٹیپ ہمارے پاس تو نہیں ہے جو اصل ہے" میں نے کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیا یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا؟" وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے" میں نے اعتراف کیا "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل ٹیپ سے صرف ایک ہی کاپی نہ بنائی گئی ہو۔ دو یا دس کاپیاں بنا لی گئی ہوں۔ اب تک ایک کاپی ہمارے پاس تھی۔ تمھیں کیا معلوم ہم نے اس کاپی سے کتنی کاپیاں اور بنا لی ہیں۔ جس ثبوت کو تم مٹانا چاہتے تھے۔ وہ صرف ایک کاپی لے جانے سے تو ختم نہیں ہو گا"

"اب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے" وہ لاجواب ہو کے بولا۔ "اس کا فیصلہ وہی کریں گے جو ٹاپ مین ہیں"

پھر ایک ایسی بات ہوئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

فاکس ویگن دو دروازوں والی کار ہے اور یہ دونوں دروازے آگے ہوتے ہیں۔ ان کو کھولنے والے ہینڈل بھی آگے ہی ہوتے ہیں مگر اکرام شیخ اگر نکلنا چاہتا تو اسے بائیں ہاتھ سے لیور ٹائپ ہینڈل کو اوپر کرنا پڑتا اور پھر اس کے دروازے کو شانے سے یا ہاتھ سے دھکا دینا پڑتا۔ اس کے بعد بھی باہر نکلنا اقدامِ خودکشی کے مترادف ہوتا۔ وہ سیٹ پر سے لڑھک جاتا تب بھی کھلے دروازے کے فٹ بورڈ کے قریب زمین پر گرتا اور اتنی دیر میں دشمن اس کو یقیناً شوٹ کر دیتا۔

یہ گولی اکرام شیخ کے کہیں بھی لگ سکتی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے یا زمین پر گرنے کے بعد۔ دشمن جو پوری طرح تیار بیٹھا تھا اطمینان سے اس کا نشانہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ اکرام شیخ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا مگر جس طرح میرا ذہن مسلسل مصروفِ عمل تھا، شیخ بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے میری صورت کے تاثرات سے، میرے لہجے کی مایوسی سے یا اپنی چھٹی حس سے، جس کو ہم ٹیلی پیتھی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہم ایک جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے اور ہمارے ذہن اس لیے ہم آہنگ تھے کہ ہم ایک ہی مسئلے پر ساری توانائی صرف کر رہے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا کہ میں نے کچھ سوچا تھا اور ناقابلِ عمل سمجھ کے اس پر عمل نہیں کیا۔

پھر اس نے طے کیا کہ اب میری باری ہے "سکندر کم ہمت نہیں ہے اور اس نے خطرہ مول نہیں لیا۔ تو شاید میری وجہ سے کیونکہ ریوالور کی زد پر میں ہوں" اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد شیخ نے عملی قدم اٹھایا۔

میں نے تو صرف ہلکا سا کھٹکا سنا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں یا اس سے بھی کم حصّے میں مَیں نے سمجھ لیا کہ شیخ اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور دروازہ کھول کے باہر گرنے والا ہے۔ یہ کھٹکا اس سوئچ کے کھٹکے کی طرح تھا جس سے کوئی برقی میکانکی نظام فعال ہو جائے۔ کوئی مشینی کارخانہ چل پڑے یا دو تاروں کے ملنے سے ڈائنامائٹ کا دھماکا ہو جائے۔ بیک وقت میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر پیچھے چھلانگ لگائی۔ شیخ کو باہر گرتے دیکھا اور فائر کی آواز سنی۔

ریوالور کا رخ باہر کی طرف تھا اور دشمن کی تمام توجہ اس شخص کی طرف تھی جسے وہ گرفتار کر کے ساتھ لے جانے پر مامور تھا۔ چنانچہ میرے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرے لمحے مَیں اس کے اوپر تھا اور وہ میرے نیچے۔

میں نے اس کا سر ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ آگے اور پیچھے والی سیٹ کے درمیان گھسیٹر دیا۔ وہ دُہرا ہو گیا۔ کیونکہ اس کے پیر پہلے ہی فرش پر تھے۔ میں مشتعل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ اور متوازن قوت کے ساتھ اس کے کان کے پیچھے وار کیا۔ اس کا تمام شور و غوغا تھم گیا اور وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اسے کھینچ کر سیٹ پر ڈال دیا پھر میں نے اگلی سیٹ کو دھکیلا اور جگہ پیدا ہوتے ہی باہر نکل گیا۔

"شیخ!" میں نے زور سے پکارا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

وہ گاڑی کے پیچھے سے نکلا۔ اسے زندہ سلامت پا کے مجھے خوشی ہوئی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم نے بڑی حماقت کی تھی۔ مرجاتے تو یہ بہادری نہیں، خودکشی کہلاتی۔" میں نے کہا۔

"ارے یار! مرنا تو ایک ہی بار ہے نا۔" وہ بولا۔

"اور ٹیپو سلطان کا قول ہے کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر شیخ جی! وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ اس کی لڑائی بدمعاشوں سے نہیں تھی اور وہ میسور کا حکمراں تھا۔ پولیس کا سب انسپکٹر نہیں تھا۔ یہ بتا کہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

"چوٹ تو نہیں آئی۔" وہ بولا۔ "ایک زخم آیا ہے گولی سے۔"

پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا تو میں نے اسے لنگڑاتے دیکھا۔ گولی اس کی بائیں ٹانگ میں لگی تھی۔

"کہاں لگی ہے گولی؟" میں نے اسے سہارا دے کر کہا۔ "تو چل سکتا ہے نا یا میں اٹھالوں۔"

"میں چل سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "گولی پنڈلی میں لگی ہے، بس ہڈی نہیں ٹوٹی۔"

"اس کار کو یہیں چھوڑ کے ذرا دور سے دیکھتے ہیں کہ ادھر کون آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک منٹ ٹھہر جا۔ پہلے میں ذرا اپنی حفاظت کا انتظام بھی کرلوں۔ تیرے پاس تو ایک ریوالور ہے نا؟ اس سے مجھے کور کر۔"

میں اسے چھوڑ کے واپس فاکس ویگن میں گھسا اور اس شخص کو دیکھا جو پچھلی سیٹ پر ترچھا پڑا تھا۔ اس طرح کہ اس کے اور میر محمد کے سر کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب سی تھی جو اتار کر دیکھنے پر عام کپڑے کا سیاہ تھیلا ثابت ہوا۔ اس میں سامنے سے دیکھنے کے لیے دو سوراخ بنا دیے گئے تھے۔

میں نے اگلی سیٹ پر دیکھا مگر شیخ کی ٹارچ سیٹ پر نہیں تھی۔ فاکس ویگن کے ڈیش بورڈ پر کچھ رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ ٹارچ اس نے اپنی گود میں ہی رکھی ہوگی اور جب اس نے باہر چھلانگ لگائی تھی تو شاید نیچے جاگری ہوگی۔ میں نے آگے آکے دیکھا۔ ٹارچ دونوں اگلی سیٹوں کے درمیان پڑی تھی۔

ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ سیدھا کرکے دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ پیڈرو تھا۔ اس کے کانوں میں مندریاں بدستور موجود تھیں اور ویسے بھی اس سے میرا اتنا سابقہ پڑ چکا تھا کہ اب اسے میں دور سے بھی شناخت کرسکتا تھا۔

اس نے کالے رنگ کی ٹائٹ فٹ پینٹ اور اوپر اسی رنگ کی جسم سے چپکی ہوئی جرسی پہن رکھی تھی۔ چنانچہ وہ غور سے دیکھے بغیر اندھیرے میں کیسے نظر آتا۔ حیرت کا ایک لمحہ گزر گیا تو اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔

"بلّے بلّے شیخ!" میں نے بے اختیار ایک نعرہ بلند کیا۔ "اوئے دیکھ، ہم نے تو ایک شکاری کو گرفتار کرلیا ہے۔"

"کون شکاری؟" شیخ نے قریب آکے کہا۔

"واہ بیٹا!" میں نے شیخ کی بات کا جواب دینے کے بجائے بیہوش استاد پیڈرو کو مخاطب کیا۔ "کہاں جا کے قابو آیا ہے۔ اب تو تیرا باپ بھی بتائے گا کہ شرافت علی کو میں نے قتل کیا تھا یا تو نے؟"

شیخ نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ "پاگل ہوگیا ہے کیا؟" اس کی آواز میں وحشت تھی اور اس وحشت کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ اس نے میر محمد کا کٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا۔ "کس سے باتیں کر رہا ہے؟"

"سوری یار!" میں نے کہا۔ "یہ استاد پیڈرو ہے جو میرے بہت سے مصائب کے علاوہ میر شرافت علی کا اصل قاتل ہے۔ میر محمد کا سر میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔ لیکن میں خاموش رہا۔"

"اس سر کو یہاں رکھنے کا مقصد؟" شیخ نے سوچ کر کہا۔

"غالباً دشمن یہ چاہتے تھے کہ وہ تجھے ٹیپ سمیت لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے جانے دیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں پیچھے نہ دیکھتا اور تیرے اغوا کی رپورٹ لے کر سیدھا تھانے جاتا تو یہ سر میرے ساتھ تھانے پہنچتا۔ میری اور اس کی دشمنی پہلے سے چل رہی ہے اور میں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ تھانے میں پہنچنے کے بعد یہ دریافت ہوتا کہ میں ایس ایچ او صاحب کا سر پُرغرور بھی اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ لیے پھر رہا ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ سکندرِ اعظم! باقی ایس ایچ او صاحب کہاں ہیں اور میں انھیں سچ بولتے ہوئے بتا دیتا کہ اس سر کا حصہ فلاں جگہ برآمد ہونے والے جسم سے جوڑ کر دیکھو تو وہ کہتے کہ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو۔ وہ بے سر کی لاش تو مسٹر ایکس یا ایرا خان ولد غیرا خان کی ہے۔ میر محمد کی لاش کہاں ہے؟"

"ایسے مفروضات نہیں چلتے۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہو جاتا کہ سر اسی لاش کا ہے۔" شیخ نے کہا۔

"یار تم غیر عملی باتیں کرتے ہو۔" میں نے جھلّا کر کہا۔ "جب قبر سے لاش غائب ہوسکتی ہے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں، پولیس اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں ایک زندہ درگور کیے جانے والے گورکن کو زہر دیا جاسکتا ہے تو کیا اسپتال میں پڑی ہوئی درجنوں لاشوں میں سے ایک غائب نہیں کی جاسکتی یا اس کی جگہ دوسری لاش نہیں رکھی جاسکتی۔ تم نے مردہ خانے تو دیکھے ہوں گے اور وہاں کی حالت زار اور بد انتظامی بھی دیکھی ہوگی۔ جمعدار ٹائپ اشخص "....

کے اس ٹرانزٹ کیمپ کا سب کچھ ہوتا ہے۔ آل اِن آل۔ دھن اور دھونس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہ دھاندلی اس کے لیے ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ دھن کا راج ہے۔ دھن مہاراج ہے اور مُردہ تو مُردہ ہے۔ اِدھر سے اُدھر رکھنے یا اس کا "ٹیب" بدلنے سے جیب میں سو سو کے دس بیس نوٹ آجائیں تو کسی کا نقصان نہیں۔ الف کے وارثوں نے جیم کے مردے کو دفنا دیا اور جیم کے وارثوں نے الف کے مردے کو تو کون سا غضب ہوگیا۔ دفن تو دونوں ہوگئے اور قیامت آئے گی تو اٹھیں گے بھی ساتھ ساتھ۔ تم غور کرو تو اس سر اور اس جسم کے اسپتال پہنچنے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے تک ہزار مرحلے ہیں اور گھپلا کہیں بھی کیا جاسکتا ہے جس سے حسبِ منشا رپورٹ حاصل ہو جائے۔ میں کیا بتاتا کہ سر سے نیچے کا میر محمد کیا ہوا؟ پھر ایک اور بھی غور طلب بات ہے۔ لاش کے بارے میں ابتدائی رپورٹ غلط تھی۔ جھوٹ بول کر ہمیں ایک جگہ بلایا گیا تھا اور شک ہونے کے باوجود ہم نے قبل از وقت کسی سے بات نہیں کی تھی۔ ایک دوسرے سے بھی نہیں لیکن پتا چلانے ہم دونوں ہی آئے تھے۔ کیا یہ نہ کہا جاتا کہ ہم دونوں پہلے میر محمد کو گاڑ گئے پھر لاش برآمد کرنے کے لیے پولیس کی نفری کے ساتھ پہنچے، بالکل انجان بن کے۔ میں یہ کیسے ثابت کرتا کہ اکرام شیخ کو واقعی گن پوائنٹ پر اغوا کیا گیا ہے۔ جب تو رہا ہو کے واپس پہنچتا تو یہی ثابت ہوتا کہ اغوا بھی ڈراما تھا۔ اکرام شیخ اپنی مرضی سے غائب ہوا اور پھر مناسب وقت پر لوٹ آیا۔ یعنی اس وقت جب میں رپورٹ لکھوا چکا تھا۔ میر محمد کے سر کو ہم نے کہیں اور پھینکنے یا گاڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بدحواسی یا شامتِ اعمال کے باعث بھول گئے۔"

"یہ تو بڑی خطرناک سازش تھی جس سے ہم بال بال بچ گئے۔" شیخ نے قائل ہو کے کہا۔

"بس تیری ٹانگ میں گولی کا ایک زخم آیا۔ مجھ پر ایک اور قتل کا الزام نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "اور ہمارے ہاتھ وہ شخص لگ گیا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "میری ٹانگ میں تکلیف ہو رہی ہے۔ رومال تو باندھ لیا تھا میں نے پیچھے جا کر۔"

"یہاں سے کچھ دور مورچہ قائم کرتے ہیں۔" میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھتے ہیں کون آتا ہے۔"

میں اسے کچھ دور لے گیا اور ہم ایک جھاڑی کے پیچھے اس طرح لیٹ گئے کہ ہماری گاڑی صاف نظر آتی رہے۔ ایک دروازہ مقفل تھا اور اگر ہوش میں آنے کے بعد جس کا کوئی امکان نہ تھا، پیڈرو دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو اسی کے ریوالور کی ایک گولی اس کا راستہ روکنے کے لیے کافی ہوتی۔

"ہمیں یہاں ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "آخر وہ لوگ آئے کیوں نہیں؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بے شک ہماری واپسی کا کوئی وقت متعین نہیں تھا لیکن پیڈرو کے ساتھی کچھ دور رہ کر انتظار کرسکتے تھے۔ مثلاً اسی جگہ اور اگر ان کا خیال واقعی عین اس وقت پہنچنے کا تھا جب پیڈرو ہمیں لے کر یہاں پہنچ جائے تب بھی ایک گھنٹے کا فرق، چہ معنی دارد کیا وہ پانچ دس منٹ پہلے یا پانچ دس منٹ بعد نہیں آسکتے تھے؟"

"ورنہ اس ایک گھنٹے میں چکر لگا کے تو دیکھ سکتے تھے کہ پیڈرو اپنے اسیروں کو لے آیا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا معلوم وہ کس قسم کی گاڑی میں آئیں گے۔ وہ احتیاط کی خاطر یہ کرسکتے تھے کہ ایک مرتبہ سیدھے گزر جاتے اور مطمئن ہو جانے کے بعد لوٹ آتے۔" شیخ نے کہا۔

"ادھر تو کوئی گاڑی ہی نہیں آئی۔"

"کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں۔"

"کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آگیا ہو۔" شیخ بولا۔ "یا ان کی گاڑی خراب ہوگئی ہو؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اب کچھ اور سوچ رہا ہوں شیخ!"
میں نے کہا۔ "جب کوئی چوکی محصور ہو جائے اور اس کے دفاع کی کوئی صورت نہ رہے تو اسے دشمنوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ گھوڑا بیمار یا لنگڑا ہو جائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں اور جس گھر کی مخدوش حالت سے دوسروں کو خطرہ لاحق ہو، اسے گرا دیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" اکرام شیخ نے کراہ کے کہا۔ "آپ سیدھی صاف بات کریں تو میری ناقص عقل میں آئے۔"

"شیخ جی!" میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "شروع سے اب تک استاد پیڈرو نمایاں رہا ہے۔ ہر جگہ اس کا نام آیا ہے اور وہ کئی بار نظر آ چکا ہے۔ میرے اور محسن کے علاوہ بھی اسے بہت سے لوگ پہچانتے ہیں۔ اس کی پوزیشن ایک ایسی قابلِ اعتماد لانچ کی سی ہے جو کارکردگی کے اعتبار سے بہترین ہو، سیکڑوں بار سمندر میں سفر کر چکی ہو اور مالکوں کو لاکھوں کروڑوں کا فائدہ پہنچا چکی ہو، ابھی مزید کئی سال چل سکتی ہو اور مالکوں کو اتنا ہی فائدہ اور پہنچا سکتی ہو مگر پولیس کی نظر میں آ گئی ہو۔ کیا یہ لانچ اپنی جان کے صدقے میں پولیس کے سپرد کر دینا عقلمندی نہیں کہ اسے آخری سفر پر یوں روانہ کیا جائے کہ معلوم ہو، یہ بھی ایک کاروباری پھیرا ہے اور پولیس کو موقع دیا جائے کہ وہ تعاقب کر کے اسے پکڑ لے۔"

"تمھارا مطلب ہے اب وہ خود پیڈرو کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں؟" شیخ نے کہا۔

"غالباً۔ لیکن بیچارے استاد پیڈرو کو یہ بات نہیں معلوم۔ وہ اسی یقین کے ساتھ آیا تھا کہ یہ بھی حسبِ سابق ایک ایسی اہم خدمت تھی جس کے لائق کوئی اور نہ تھا۔ ذرا سوچو کہ دن کا اجالا پھیل جانے کے بعد وہ ہمیں کیسے قابو میں رکھتا۔ اسے حکم تھا کہ مجھے گزند نہ پہنچے۔ تمھیں بحفاظت لایا جائے اور وہ بھی بطورِ ضمانت صرف تصدیق کے لیے۔ دن چڑھنے سے پہلے وہ کیسے بھاگتا۔ کیا ہم اسے بھاگنے دیتے؟ ایک صورت یہی رہ جاتی تھی کہ وہ ہم دونوں کو مار کے نکل جائے۔ ورنہ روشنی ہوتے ہی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ سامنے والی کوٹھیوں میں سے کوئی پوچھنے آ جاتا کہ میاں یہاں کیوں گاڑی روکے بیٹھے ہو یا کوئی راہ گیر ایس ایچ او کا سر دیکھ لیتا تو اس کا سر نہ پھر جاتا۔ ابھی تک پیڈرو کو شک نہیں ہوا تھا کہ اسے پھنسا دیا گیا ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھیوں کے نہ آنے سے پریشان تھا تو اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اگر اسی طرح بیٹھے بیٹھے آدھا گھنٹہ بھی اور گزر جاتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔"

"پھر یہاں انتظار کرنے سے کیا حاصل؟" شیخ نے کہا۔ "تھانے چلتے ہیں؟"

"کیا تیری ٹانگ میں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟"
میں نے کہا۔

"نہیں۔ گولی سے تو صرف خراش آئی ہے۔ کچھ گہری ہے مگر اب تو خون بھی رِسنا بند ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کچھ دیر انتظار کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید تیری ہی بات ٹھیک ہو۔ کسی حادثے یا گاڑی میں خرابی کے باعث وہ ابھی تک نہ پہنچ سکے ہوں۔"

"تیری بات میں بہت سے نکات کی وضاحت نہیں ہوتی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا ان کے پاس پیڈرو سے نجات پانے کے اور طریقے نہیں تھے؟ وہ چاہتے تو کسی دشواری کے بغیر قتل کرا دیتے۔"

"یعنی سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتے؟" میں نے کہا۔ "یا کسی کو اس کے قتل پر مامور کر دیتے۔ بے شک یہ ہو سکتا تھا لیکن اس طرح ان کے دیگر ساتھی احساسِ عدم تحفظ میں مبتلا ہو جاتے۔ ان کے پاس دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کی خدمات کسی وقتی ضرورت کے لیے اور معاوضے پر حاصل کر لی جاتی ہیں۔ عموماً پیڈرو جیسے لوگ ہی مطلب کے آدمی ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ کام ہو جائے تو انھیں معاوضہ دے دیا جاتا ہے اور تعلق ختم۔ کام کے دوران میں وہ مارے جائیں تو ان کا مقدر۔ پکڑے جائیں تو خطرے کی بات نہیں۔ وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ ان کو اتنے معاوضے پر یہ کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کس نے کہا تھا؟ ایک آدمی تھا اس حلیے کا۔ حلیہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ چنانچہ خود ان کے سوا کوئی سزا نہیں پاتا۔ دوسری قسم پیڈرو جیسے لوگوں کی ہے۔ لیڈرانِ درجہ دوم۔ خصوصی معتمد۔ یہ مستقل ساتھی ہوتے ہیں جو طویل رفاقت اور آزمائش کے بعد اس مرتبے تک پہنچتے ہیں اور اگر تقدیر یاوری کرے۔ یعنی جرائم کی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت نہ رہیں۔ حادثے میں جہنم رسید ہو جائیں یا شامتِ اعمال کے باعث پولیس سے مقابلے میں کام آ جائیں تو قیادت انھی کے پاس آ جاتی ہے لیکن ایسے وفاداروں کو قتل کیا جائے اور یہ خبر پھیل جائے تو دوسرے سمجھتے ہیں کہ کسی دن انھیں بھی وفاداری اور جانثاری کا صلہ یہی ملے گا۔ ان میں خوف اور بددلی پھیل جاتی ہے تو گروہ میں ڈسپلن نہیں رہتا۔ بغاوت کا اندیشہ رہتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خصوصی معتمد کسی حریف گروہ میں شامل ہو جائیں تو ان کے اپنے گروہ کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ یہ طریقہ باعزت اور بے ضرر ہے۔ پیڈرو کو سب کے سامنے ایک مشن پر روانہ کیا گیا تھا۔ افسوس کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی کچھ لوگ مخالف سمت میں یا یہاں سے بہت دور کسی سڑک پر منتظر ہوں کہ استاد پیڈرو فتح کے جھنڈے لہراتا سرخ فاکس ویگن میں دو قیدیوں کے ساتھ نمودار ہو گا۔ یہ جگہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گی۔ وہ کب تک انتظار کریں گے؟ شاید اب تک وہ واپس جا کے پیڈرو کے نہ آنے کی رپورٹ بھی دے چکے ہوں گے۔"

شیخ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تمھاری باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چار سال تک تم انگلستان میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے نہیں گئے تھے، اسکاٹ لینڈ یارڈ میں زیرِ تربیت تھے۔ کتنا اچھا ہو اگر تم جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔"

میں بے اختیار ہنسا۔ "تیری یہ خواہش ایسی ہی ہے جیسے کوئی چاہے کہ سورج رات کو نکلا کرے اور چاند دن میں۔ فرق تو کوئی نہیں پڑے گا۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ تو شیخ صاحب! پولیس کے بجائے میں صفِ مجرماں میں شامل ہوں۔ اور ہوتے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ یہ ہو سکتا ہے لیکن ہو گا نہیں کہ میرے جیسے لوگ پولیس میں ہوں۔ جہاں سے تم جیسے بھی خارج کیے جا رہے ہیں۔"

"کیا پیڈرو کو خودکشی کے اس مشن پر ارسال کرنے والوں کو یہ اندیشہ نہیں کہ پیڈرو سب کچھ جانتا ہے اور پولیس اقبالِ جرم کرانا جانتی ہے۔ ان کے سارے راز افشا ہو جائیں گے۔"

"نہیں۔ جب یہ لوگ پولیس کے ہاتھ لگتے ہیں تو یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اعترافِ جرم کیا تو قانون سزائے موت دے گا اور اگر کوئی انکشاف کیا تو سزائے موت دوسری طرف سے ملے گی لیکن وہ پامردی سے ڈٹے رہے اور کسی کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو انھیں قانونی و غیر قانونی طور پر تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ وکیل اور مقدمے کے اخراجات زرِ ضمانت سب کا بندوبست ہو جائے گا اور خدانخواستہ سزا ہو گئی تب بھی جیل کے اندر انھیں ہر سہولت حاصل رہے گی۔ وہ رہائی پا کے نکلیں گے تو اپنی جانثاری کے باعث پہلے سے زیادہ اہم ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" شیخ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب کوئی نہیں آئے گا۔ تیرا خیال درست ثابت ہو رہا ہے۔"

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے میں صبح کے آثار نمودار ہونے لگیں گے۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں تیرے ساتھ تھانے تک نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تیرا بیان یہی ہو گا کہ میں تجھے جائے واردات تک پہنچانے کے بعد گھر چلا گیا تھا۔ تیرا اور میرا ایک ساتھ تھانے پہنچنا شکوک پیدا کرے گا۔ میں تجھے اور تیرے قیدی کو کسی ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں سے تجھے ٹیکسی مل جائے۔ ٹیپ بھی میں لے جاؤں گا۔"

"اور اس کا کیا ہو گا؟" اکرام شیخ نے ہاتھ سے میر محمد کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی میں ہی لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم اس کو جائے واردات کے آس پاس ہی ڈال سکتے لیکن ابھی وہاں تیری فوج کھڑی ہے اور شاید آج کا سارا دن کوئی وہاں رہے۔"

"میں ان کو ہٹا لوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "لاش کے اسپتال پہنچنے کے بعد۔"

"پھر بھی دن میں ایسی کوئی کارروائی خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے کہا۔ "رات تک میں کچھ کر لوں گا۔ تجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک تو میر محمد کی بے سر لاش کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات۔ کہ غائب یا تبدیل نہ ہونے پائے۔ اس سے زیادہ خطرناک کام استاد پیڈرو کو بچانا ہے۔ اگر یہ ہوش میں ہوا تو اس کو حوالات میں بھی قتل کرا دیا جائے گا خواہ اس کے لیے قاتلوں کو دستی بم ہی کیوں نہ پھینکنا پڑے۔ یہ ہوش میں نہ آیا تو اسے پولیس کی تحویل میں اسپتال لے جانا پڑے گا اور اسپتال میں قاتلوں کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ اچھا اب تو آگے پیچھے نظر رکھ۔ میں میر محمد کے سر کو سیٹ پر سے اٹھا کے آگے ڈِکّی میں رکھتا ہوں۔"

"ایسے ہی۔۔۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "تیری سیٹ پر تو خون کے داغ ہوں گے ہی۔ آگے بھی پڑ جائیں گے۔"

"میرے پاس ایک پرانا تولیہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے میں گاڑی یا ونڈ اسکرین پر سے گرد جھاڑنے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے سر کو اسی میں لپیٹ لوں۔"

تولیہ سیٹ کے نیچے تھا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر پھیلایا اور میر محمد کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ ذرا سی دیر کے لیے میرا ہاتھ کانپا۔ پھر میں نے سر کو تولیے پر رکھ دیا اور تولیے کے چاروں کونے الٹ کر اس کی گٹھری سی بنا لی۔ اکرام شیخ نے اندر سے تار کھینچا اور میں نے ڈکی کو اٹھا کے سر کو اسپیئر وھیل کے بیچ کی خالی جگہ میں رکھ دیا۔ اسپیئر وھیل کو بالکل سامنے کے کھانچے میں کھڑا ہونا چاہیے تھا لیکن جب سے ایکسیڈنٹ میں اگلا حصّہ پچکا تھا، ٹائر اس جگہ میں فٹ نہیں ہوتا تھا اور فٹ ہوتا تھا تو بونٹ بند نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اسے ڈکی میں جیک وغیرہ کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا تھا۔ درمیان میں سر کے لڑھکتے پھرنے کا امکان نہیں تھا۔

بونٹ بند کر کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اکرام شیخ نے دروازہ بند کیا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ایک کام یہ کیا کہ جو کالا نقاب پیڈرو کے منہ پر تھا، وہ پیچھے کی نمبر پلیٹ پر چڑھا دیا۔ احتیاط بہرحال ضروری تھی۔

"کیا تو نے کوئی بہت زوردار ہاتھ مار دیا تھا؟" شیخ نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا "یہ ہوش میں کیوں نہیں آرہا ہے؟"

"ہاتھ تو میں نے بہت ناپ تول کے مارا تھا" میں نے کہا "اب ہر شخص کی قوتِ برداشت الگ ہوتی ہے۔ ویسے تشویش کی بات نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے اسے یقیناً ہوش آجائے گا۔ اسے باندھ کے رکھنا اور ہو سکے تو چھپا کے بھی۔"

"وہ میں کرلوں گا" شیخ نے کہا "اس سے اگلے چوک پر ٹھہر جانا۔ وہاں سے اسٹیشن جانے والے رکشا اور ٹیکسی گزرتے رہتے ہیں۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔"

"ٹیکسی والے کو شک نہیں ہوگا؟" میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔ اسی وقت ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ شیخ فوراً اتر کے اس کے سامنے آگیا۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صبح دم بیگار میں پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ جاتا۔

"دیکھو بھائی!" شیخ نے شرافت سے کہا "ذرا تھانے تک چلنا ہے۔ ایک آدمی سڑک پر بیہوش پڑا تھا۔ یہ کار والے شریف آدمی تھے۔ یہاں تک تو لے آئے ہیں مگر یہ خود جلدی میں ہیں، ان کو مخالف سمت میں جانا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ایک بار رکنے کے بعد انکار کی پوزیشن میں کہاں تھا مگر اکرام شیخ کے شریفانہ اور قطعی "غیر تھانیدارانہ" لہجے نے اسے شک میں ڈال دیا کہ کہیں پولیس کی وردی میں ڈاکو نہ ہوں۔ وہ تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح منہ کیا دیکھ رہے ہو" اکرام شیخ نے ایک دم لہجہ بدل لیا "کوئی فارسی تو نہیں بول رہا ہوں میں" اس نے گرج کر کہا "نیچے اترو اور اس آدمی کو اٹھاؤ۔"

"جی... جی صاحب..." ٹیکسی والے کے سارے شکوک دور ہوگئے۔ اس نے پیڈرو کو ٹیکسی کے اندر لٹانے میں میری مدد کی اور کچھ حیران بھی ہوا۔ ایک شخص پولیس کی وردی میں، دوسرا شریفانہ لباس میں، تیسرا چوروں جیسے کالے کپڑے پہنے۔ لیکن وہ بولا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانے جاکے جب شیخ اسے کرایہ ادا کرے گا تو وہ مزید حیران ہوگا کہ جسے وہ بُرا شگون سمجھا تھا، وہ مبارک ترین فال ثابت ہوا۔ ایک "اصلی تے وڈا" تھانیدار اسے پکڑ کر تھانے لے گیا اور "بوہنی" ایسی ہوئی جو اس کی توقعات کے عین برعکس تھی۔ اس تھانیدار نے غلط میٹر کے مطابق پیسے دیے۔ ایسا پہلے کبھی ہوا ہے؟

ٹیکسی کے نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے بیک کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے کراؤن سینما سے آگے "گڑھی شاہو" کا موڑ کاٹ کے دائیں طرف ایک فرلانگ کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ انجن نے پہلا جھٹکا لیا۔ چند قدم بعد دوسرا اور آخری ہچکی لے کر بند ہوگیا۔

میں نے فیول میٹر کی طرف نگاہ ڈالی۔ اس کی سُوئی نہ جانے کب سے بتا رہی تھی کہ ٹینک خالی ہو چکا ہے مگر میں ذہنی طور پر دوسرے مسائل میں ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ میں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ پیٹرول پمپ مجھے سامنے مشکل سے سو گز کے فاصلے پر نظر آرہا تھا لیکن میرے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں تھا اور ہوتا بھی تو پیٹرول پمپ سے ڈبے میں پیٹرول نہ ملتا۔ اس قانون کی مضحکہ خیزی نے مجھے ہمیشہ حیران کیا تھا۔ ویسے ایک بُوند پیٹرول نہیں ملے گا۔ آپ خود چاہیں تو ٹینک فُل کرائیں۔ پھر ربر کے پائپ سے سب نکال کے ڈبے بھر لیں اور اگلے پیٹرول پمپ سے پھر ٹینک بھروالیں۔ جب تک خود آپ کا دل نہ بھرے آپ ہر پیٹرول پمپ پر جا کے اپنا یہ شغل جاری رکھیں۔ قانون اپنی جگہ ہے چنانچہ پمپ والے پیٹرول دیں تو ان کی سزا یہ کہ لائسنس منسوخ۔ قید یا جرمانہ یا دونوں۔ اور جو اس طرح پٹرول لینے آتا ہے وہ فیملی کے ساتھ ہو یا خود کو ہر حوالے سے شریف آدمی ثابت کرے تب بھی مجرم ہے جو آتش زنی کی واردات پر کمر بستہ ہے۔

سڑک خالی پڑی تھی۔ فاکس ویگن کو اکیلے دھکا لگا کے لے جانا بہت مشکل کام تھا۔ دس گز بعد میرا سانس پھول گیا۔ دو ریڑھے والے مدد کرنے کے بجائے آپس میں ریس لگاتے گزر گئے ایک "جوگنگ" کرنے والے نوجوان نے اس خستہ حال فاکس ویگن کو دھکا لگانے کو کسرِ شان سمجھا۔ دھکا لگانا ہو تو آدمی کم سے کم مرسیڈیز کو تو دھکا لگائے۔

پھر ایک فقیر گلے میں کشکول ڈالے نمودار ہوا۔ وہ بھی روز کی طرح فکرِ معاش میں نکلا تھا اور ڈیوٹی پر جارہا تھا "دھکا دینے کو کہتا ہے بچّہ!" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "تم جیسوں نے ہمیں دھکّے دیے ہیں ہمیشہ"

"وہ وقت اور مقدّر کی بات ہے بابا! جس کے مقدّر میں دھکّے کھانا لکھا ہے وہ دھکّے ہی کھائے گا" میں نے اس کے فلسفیانہ نکتے کا جواب فلسفے سے دیا "میں ایک روپیہ دوں گا"

"ایک روپیہ!" وہ کھی کھی کرکے ہنسا "ایک روپے میں تو فقیر صرف دعا دیتا ہے، دھکّا نہیں دیتا۔ پانچ دے گا؟"

مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ وہ موقعے سے فائدہ ضرور اٹھائے گا۔ اگر وہ ایک روپے میں مان جاتا تو میں حیران ہوتا اور پیٹرول پمپ پہنچنے کے بعد اسے پانچ ہی دیتا۔ گاڑی نے آگے کھسکنا شروع کیا۔ "یا علی مدد" فقیر نے نعرہ لگایا۔ میں یہ سوچ رہا کہ پیٹرول پمپ پر بہت روشنی ہوگی۔ پیٹرول ڈلوانے کے لیے مجھے آگے سے ڈکّی کھولنی پڑے گی جس میں پیٹرول ٹینک کا منہ ہے اگر تولیے میں لپٹا ہوا سر کوئی کونہ ہٹ جانے سے نمایاں ہوگیا۔ یا کہیں خون کا داغ نظر آگیا تو کیا ہوگا؟ پٹرول بھرنے والا تو فوراً تولیہ اٹھا کے دیکھ لے گا، چیخ مارے گا اور بیہوش ہو جائے گا۔ ورنہ پولیس پولیس چلانے لگے گا۔ اس کے لیے مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ میں نے طے کیا۔ ڈکّی کا ڈھکن اٹھتے ہی میں باہر جا کے کھڑا ہو جاؤں گا اور خود پیٹرول ٹینک کی کیپ کھولوں گا۔ پائپ سے پیٹرول ڈالنے والے کو پیسے دینے والے کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا اور تولیے کو ہرگز ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔

فقیر اور میں فاکس ویگن کو دھکا دیتے پیٹرول پمپ پہنچے تو اس منظر سے وہاں موجود عملہ محظوظ ہوا۔ فقیر نے پانچ کا نوٹ کھیسے میں ڈالا اور کوئی دعا نہیں دی۔ پانچ روپے اس نے محنت سے کمائے تھے، خیرات نہیں لیے تھے اور شاید وہ پشیمان بھی تھا کہ خواہ مخواہ زورِ بازو سے کمائی کے چکر میں انرجی ضائع کی۔ اسے محنت کی عادت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا سانس مجھ سے بھی زیادہ پھولا ہوا تھا۔ خود اندر سے تار کھینچ کر ڈکّی کھولنے کے بجائے میں نے اس لڑکے سے جو پمپ کی نال کو مشین گن کی طرح تھامے کھڑا تھا، یہ کہا کہ وہ تار کھینچے اور اس کے لیے ایک فضول سا بہانہ کیا۔

"معاف کرنا یار! مجھ میں مزید زور لگانے کا دم نہیں ہے" میں نے ضرورت سے زیادہ ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اس بات پر حیران تو ہوا مگر اس نے ہوز پائپ کو واپس لٹکایا اور میری مدد کی۔ میں نے ڈکّی کو اٹھایا اور بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ سر کے اوپر سے تولیے کے چاروں کونے پھسل چکے تھے اور اب ٹائر کے بیچ میں وہ سر ایک بچھے ہوئے تولیے پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے نمائش کے لیے رکھا گیا ہو۔

میں نے خدا کا ہزار شکر ادا کیا کہ دوسرا شخص یعنی کیشیئر جس نے گلے میں چمڑے کا تھیلا لٹکا رکھا تھا، ابھی دور تھا۔ پیٹرول بھرنے والے لڑکے نے بھی سامنے سے ہو کر جانے کے بجائے پیچھے کی طرف سے پمپ تک کا فاصلہ طے کیا اور مجھے اتنا وقت مل گیا کہ میں تولیے کو پھر اس کھوپڑی پر ڈھک سکوں۔ چار گیلن پورے ہوتے ہی میں نے خود پیٹرول ٹینک کی کیپ بند کی اور لڑکے نے ربر پائپ کو واپس پمپ کی سائڈ میں لٹکا دیا۔

اور اس وقت اپنی طرف سے ہر احتیاط برتنے کے باوجود مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ نوٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میری توجہ کیشیئر کی طرف نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں ڈکّی بند کرتا، وہ میرے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا "ٹائر کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے صاحب!" اس نے میرے منع کرنے سے پہلے ٹائر اٹھانے کے لیے کھینچا۔

"کیا کر رہے ہو تم؟" میں چلّایا "رہنے دو اسے یہیں"

"اس کے نیچے تار ہوتے ہیں صاحب! شارٹ ہو سکتے..."

جملہ نامکمل رہ گیا کیونکہ ٹائر کے کھینچنے سے درمیان میں رکھے ہوئے سر کے اوپر پڑا ہوا تولیہ ہٹ گیا اور میر محمد کا کٹا ہوا سر کیشیئر کو گھورنے لگا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے دہشت سے منجمد ہوگیا۔ پہلے اس نے یقیناً سمجھا ہوگا کہ یہ فریبِ نظر ہے یا میرا دماغ چل گیا ہے۔ کسی شریف آدمی کی ڈکّی میں لاش کا سر کسی کے قیاس میں آنے والی بات بھی نہیں۔

یکلخت مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے نوٹ اس کی طرف پھینکا مگر اس وقت تک وہ ایک فلک شگاف چیخ مار چکا تھا "خون... قاتل... اوئے پکڑو..." اس نے پوری قوت سے چلّانا شروع کیا۔ میں نے ایک کمرے کے شیشے والے آفس میں سے دو افراد کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ کیشیئر کے جنون کی حالت دیکھ کر وہ سمجھے ہوں گے کہ میں کوئی ڈاکو ہوں جو گن پوائنٹ پر اس کے کیش کا تھیلا چھین کر بھاگنا چاہتا ہوں۔

میں نے کیشیئر کے ایک مکّا رسید کیا کیونکہ وہ مجھے پکڑ چکا تھا اور مجھے کار میں نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ وہ پیچھے گرا تو وہ نوعمر لڑکا سامنے آگیا جس نے پیٹرول ڈالا تھا۔ میں نے ایک لات اس کے رسید کی اور وہ بلبلا کے بیٹھ گیا۔ کیشیئر کو پکّے فرش پر گرنے سے چکّر آگئے تھے۔ چنانچہ وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا تھا مگر پھر مقابلے کے لیے کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چلّا رہا تھا "قاتل، خون۔ اوئے میری توبہ مولا۔ ڈکی میں سر بندے کا..." میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ آفس میں سے نمودار ہونے والے آپہنچے۔

صورتِ حال یکلخت سنگین ہوگئی تھی۔ کوئی گاڑی کسی بھی وقت پیٹرول لینے آجاتی تو میرے لیے فرار بھی مشکل ہو جاتا۔ اندر سے آنے والے ہٹے کٹے نوجوان تھے اور غالباً گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان دونوں سے مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ میں نے فوراً پوزیشن لے لی۔ اب میرے لیے جوڈو میں اپنی مہارت کا استعمال کیے بغیر نکلنا مشکل تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے اور میں نے غوطہ مار کے دونوں کو بازوؤں پر لے لیا۔ پھر میں نے بیک سمر سالٹ یعنی الٹی قلابازی کھائی اور وہ میرے ساتھ ہی فرش پر یوں گرے۔ جیسے کوئی دھوبی پٹخا مارنے سے کمر کے بل گرتا ہے۔ وہ ایسی پیشہ ورانہ مہارت کے مظاہرے کے لیے بالکل تیار نہ تھے، وہ چت ہی پڑے تھے کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کروٹ لے کر اٹھنے لگے تو میں نے بُوٹ سے ان کی ٹھوڑی کے نیچے کِک رسید کی۔ وہ دونوں اُلٹ کر گرے اور میں کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

گاڑی کا انجن بند تھا اور اگلے حصّے کے ٹینک سے پیچھے انجن کے کاربوریٹر تک پیٹرول اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک میں ایکسلریٹر کو خوب پمپ نہ کروں۔ اس کے بعد بھی اگر انجن اسٹارٹ نہ ہوتا تو کوئی عجیب بات نہ ہوتی۔ بعض اوقات خشک کاربوریٹر میں تھوڑا سا پیٹرول انجن کا بونٹ اٹھا کے اور ایئر کلینر ہٹا کے بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ اس میں بھی مقدار کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پیٹرول کم ہو تو آخری قطرہ تک استعمال کر لینے والے انجن کا بھلا نہیں ہوتا اور زیادہ ہو کے کاربوریٹر میں جمع ہو جائے تو گاڑی "اوور" ہو جاتی ہے پھر اسے دھکا دے کر ہی اسٹارٹ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ سیلف مارنے سے کاربوریٹر میں کچھ اور پیٹرول آجاتا ہے اور بار بار سیلف مارنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیٹری بیٹھ جاتی ہے اور گاڑی کھڑی رہتی ہے۔

اندر بیٹھتے ہی میں نے زور زور سے ایکسلریٹر پر پیر مارے اور کھڑکی سے باہر دیکھا تو ناک آؤٹ ہونے والے کھڑے ہو چکے تھے۔ کیشیئر ان پر واضح کر چکا تھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ عام حالات میں شاید وہ کیشیئر کی بات پر یقین نہ کرتے اور اسے نظر یا دماغ کا فتور قرار دیتے لیکن اس معرکہ آرائی کے بعد یقین نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ اب چلّا چلّا کے رائے عامّہ کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر رائے عامّہ ابھی سوئی پڑی تھی۔ ایک شخص نے دوسری منزل کے مکان کی کھڑکی سے سر نکال کے کہا "اوئے! کی رولا اے بھئی؟"

میں نے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ انجن غرّایا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے پھر پمپنگ کی۔ اسی وقت ایک رکشا اندر کی طرف مڑا۔ پیٹرول پمپ والے اس کی طرف دوڑے۔ میں نے دوبارہ چابی گھمائی اور انجن یکلخت اسٹارٹ ہو گیا۔ اس مختصر مدت میں رکشا والے کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا خلاصہ چار افراد نے بیک وقت اپنی بے ربط گفتگو میں سنا دیا تھا "آدمی کا سر!" رکشا والا چلّایا۔

میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کے دو ہوائی فائر کیے اور کار لے کر بھاگا۔ فاکس ویگن کی رفتار کا مقابلہ رکشا کیا کرتا۔ میرا مقصد تو اسے خوفزدہ کر کے تعاقب سے روکنا تھا۔ اندھیرا اب بھی تھا مگر میں نے نہ ہیڈ لائٹس جلائیں نہ عقبی لائٹس جلائیں۔ اس وقت مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میری ایک چھوٹی سی احتیاط نے مجھے بڑی مشکل میں پڑنے سے بچا لیا ہے۔ اگر پیچھے والی نمبر پلیٹ پر کالا کپڑا نہ چڑھا ہوتا تو پیٹرول پمپ کی مرکزی لائٹ میں وہ کار کا نمبر صاف نوٹ کر لیتے۔

لائٹس میں نے ایک فرلانگ دور آنے کے بعد جلائیں جب مجھے یقین آگیا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔

صحیح سمت سے گریز کی خاطر میں نے گاڑی کو دائیں ہاتھ موڑنے کے بجائے بائیں طرف موڑ لیا۔ پھر مجھے پولیس کی نفری کا خیال آیا جو شاید ابھی تک ایمبولینس کے انتظار میں اپنے افسرِ اعلیٰ کی بے سر لاش پر پہرہ دے رہی ہو۔ وہ گاڑی کو پہچان جاتے گے۔ عام فاکس ویگن کا رنگ سرخ ہوتا تو وہ سمجھتے کہ یہ دلیسی ہی دوسری گاڑی ہے لیکن سامنے سے میں نے اس کا حلیہ یوں بگاڑا تھا کہ اب اسے ایک بار دیکھنے والا دوبارہ دیکھتے ہی شناخت کر سکتا تھا۔ پھر یہ کیا عجیب صورتِ حال ہوتی کہ ایس ایچ او کا دھڑ تو اسی جگہ پڑا نظر آیا اور سر کو میں اتنے قریب سے لے کر گزر جاتا۔ اگر ایمانداری بقول شاعر ؎ حق گوئی و بیباکی آئینِ جواں مرداں۔ سے کام لیتے ہوئے رک کر یہ سر پیش کرتا کہ ایس ایچ او صاحب کو مکمل کر لیا جائے تو کوئی جرم نہ کرنے کے باوجود مجرم بن جاتا اور یہ راست گوئی خود اپنے لیے رسن و دار کا سامان فراہم کرنے کے مترادف ہوتی۔

میں نے کار کو بیک کیا اور پُل پر سے سیدھا گزر گیا۔ صبح کے آثار اب آسمان کی سیاہی میں ہلکی سی سفیدی بن کے جھلکنے لگے تھے۔ اخبار فروش اور دودھ والے سائیکلوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" پھر انھیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دو۔ کارپوریشن کا پانی اور بھینس کا دودھ ایک ہی قیمت میں ایک ساتھ۔ اور انھیں اخبار دو کہ انھیں جرائم کی تازہ ترین صورتِ حال سے لے کر آٹے دال کا بھاؤ سب معلوم ہو جائے اور رات خوابوں کی دنیا میں بسر کرنے والے عملی زندگی کے تلخ اور سنگین حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کار کی طرح میرے خیالات کی سمت بھی کوئی نہ تھی۔ کار کو میں نے غیر ارادی طور پر دائیں طرف موڑ لیا اور انفنٹری روڈ سے گزرا۔ میاں میر صاحب کا قبرستان سیدھے ہاتھ پر رہ گیا اور ایک ورکشاپ کی چار دیواری شروع ہو گئی پھر فورٹریس اسٹیڈیم آگیا جہاں ہر سال میلۂ اَسپاں و مویشیاں کا ہنگامہ بپا ہوتا تھا۔ اس وقت وہاں حدِ نظر تک ویرانی تھی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے بھی سڑک دور دور تک خالی نظر آئی۔ آگے مال روڈ تھا اور نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا کے وہاں سے گزرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ مال پر ٹریفک ہو گا اور پیچھے سے آنے والی کوئی بھی گاڑی پولیس یا ملٹری کی ہوگی تو فوراً روک لے گی۔

میں نے گاڑی کو ایک طرف روکا اور اتر کے پیچھے گیا۔ پیڈرو کا سیاہ نقاب میں نے زبردستی نمبر پلیٹ کے اوپر نیچے دبا دیا تھا کیونکہ کنارے نٹ بولٹ سے کسے ہوئے تھے۔ تاہم اس سے تین چوتھائی نمبر چھپ گیا تھا۔ ایک طرف صرف ایل پڑھا جاتا تھا تو دوسرے کنارے پر نمبر صرف چھ کا ہندسہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے اتارا اور وہیں پھینک دیا۔

مال روڈ پر پہنچ کے میں نے اطمینان سے گاڑی چلاتے ہوئے اپنے خطرات اور خدشات کا جائزہ لیا۔ بے شک ہوائی فائرنگ سے خوفزدہ ہو جانے والوں نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کسی کو بھی ایک نئے دن کا آغاز اپنی وفات سے کرنا منظور نہ تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا انھوں نے بعد میں اس ناقابلِ حد تک خوفناک، دہشتناک، افسوسناک اور سنسنی خیز واقعے کی رپورٹ پولیس کو دی ہوگی۔ نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رپورٹ میں وہ کیا لکھوائیں گے؟ سب سے ضروری کام تو یہ تھا کہ وہ کار کا نمبر نوٹ کرتے۔ ٹالنے کی ماہر پولیس انھیں اس نااہلی پر دھر لے گی اور حسبِ نذرانہ لے کر چھوڑے گی کہ خبردار! آئندہ بلاوجہ پولیس کو تنگ کرنے مت آنا۔ نہ یہ معلوم کہ نمبر کیا تھا، ملزم کا نام کیا تھا۔ ولدیت پتا کچھ معلوم نہیں۔ چلے آئے رپورٹ لکھوانے۔ لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ آدمی تھا تقریباً چھ فٹ کا، رنگ سانولا، بال کالے، سفید قمیص، سیاہی مائل پتلون۔ ایسے تو سب ہی ہوتے ہیں اور لال رنگ کی کیا ایک ہی گاڑی ہے شہر میں؟

لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ سب بھی عام لوگ تھے۔ عام آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تھانے کچہری کے چکر میں نہیں پڑتا۔ قانون کی مدد کرنا اپنا فرض نہیں سمجھتا یہ سمجھتا ہے کہ قانون اس کے گلے پڑ جائے گا۔ اس کا وقت، ذہنی سکون، پیسہ، کاروبار، سب متاثر ہوں گے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تفتیش کتنے مہینے یا کتنے سال چلے گی۔ پھر مقدمے کے سلسلے میں کتنے مہینے یا کتنے سال وہ بطورِ گواہ حاضر ہوتے رہیں گے اور انجام کی کسے خبر۔ جس کی گردن میں پھندا فٹ ہو وہی لٹک جائے چنانچہ پیٹرول پمپ پر رہ جانے والوں نے بعد میں، پہلے تو اپنے اپنے نقصانات کا جائزہ لیا ہوگا۔ سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں، سب کی ہڈّی، پسلی، بتّیسی سلامت تھی۔ پیسے میں زیادہ ہی دے آیا تھا۔ یعنی پچاس کا پورا نوٹ پھینک دیا تھا۔ اتفاقِ رائے سے انھوں نے طے کیا ہوگا کہ اس معاملے میں لب کشائی کی ضرورت نہیں۔ انھیں جان کا صدقہ دینا چاہیے کہ ایک خطرناک قاتل کی کوئی گولی ان میں سے کسی کے نہیں لگی۔ اس لاقانونیّت کا تدارک کون کر سکتا ہے۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کس دیدہ دلیری کے ساتھ قاتل اپنے مقتول کے سر کولیوں لیے پھرتے ہیں جیسے بھُس بھروا کے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ ہے۔ اسی طرح جیسے شکاری ہرن، بارہ سنگھے یا شیر کے سر کو شیلڈ بنا کے لگاتے ہیں۔

جب میں گھر پہنچا تو سورج نکل آیا تھا۔ دروازے کے باہر ایک شخص ملٹری ماڈل کی پرانی موٹر سائیکل پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اسے ہارن دیا۔ "گاڑی کے بریک ٹھیک نہیں ہیں۔" میں نے نیچے اتر کے گیٹ کھولتے ہوئے کہا "غنیمت ہے کہ تمھارے اَسپِ تازی پر سے نہیں گزری۔"

"کس پر سے؟" وہ موٹر سائیکل کو ہٹا کے کھڑا کرنے کے بعد بولا "کیا کہا ہے تم نے مجھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا اور گاڑی کو اندر لے گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ اس کی بغل میں ایک فائل تھی۔

"تم۔۔۔ تم اندر بھی آگئے؟" میں نے کہا "بلا اجازت؟"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ ضامن رضوی صاحب کی کوٹھی ہے؟" اس نے کچھ مؤدب ہو کے کہا۔

"تمھیں کیا نظر آتی ہے، کوٹھی یا جھگّی؟ اور اس سوال کا مقصد؟" میں نے کہا۔

"میں تفتیش کے لیے آیا ہوں۔" وہ فائل نکالتے ہوئے بولا۔ "بیان لینا ہے۔"

"معاف کرو بابا! میں اس وقت کچھ نہیں دے سکتا۔ پھر کبھی آنا۔" میں نے یوں کہا جیسے وہ فقیر ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔

"میں بیان لیے بغیر نہیں جا سکتا۔" اس نے اپنی خودی کو سہارا دے کر بلند کیا "میں سی آئی اے میں ہوں۔"

"پی آئی اے میں ہو تو جاؤ جہاز اڑاؤ۔" میں نے کہا۔ "ہوا بازی کی جگہ بیان بازی کا اختیار کس نے دیا ہے تمھیں؟"

اس نے جُز بُز ہو کے اپنا کارڈ نکالا۔ "میں نے سی آئی اے کہا تھا۔ ہمارے دو انسپکٹر یہاں ڈیوٹی پر مامور تھے۔ دین محمد اور خواجہ اکبر۔"

"ان میں سے پچاس فیصد کو میں دریافت کر چکا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔" میں نے کہا "تم کو دین محمد سے ملنا ہو تو تھانے چلے جاؤ۔ وہ حوالات میں بند ہے۔"

"آپ سیریس ہو کے بات نہیں کر سکتے؟" اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا "میں سیریس نہیں ہوں، مذاق کر رہا ہوں؟ جوکر ہوں؟ اچھا اندر آؤ۔"

وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ "یہ فون رکھا ہے، نمبر ملانا آتا ہے نا؟ تو یہ نمبر ملاؤ۔ ایک انسپکٹر اکرام شیخ جواب دے گا۔ اس سے کہنا دین محمد سے بات کرا دے۔ میں اتنی دیر میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نہا کے آتا ہوں ۔"

جب میں نہا کے آیا تو تفتیش کے لیے آنے والا یوں بیٹھا تھا جیسے زیرِ تفتیش ہو۔

"بات یہ ہے سکندر صاحب!" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا "یہ خواجہ اکبر پہلے ہی مل چکا تھا۔ دین محمد کا پتا نہیں چل رہا تھا۔"

"خواجہ اکبر کی سرگزشت سناؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں تھا اور کیوں تھا؟"

"اس کے ساتھ بڑی عجیب بات ہوئی۔" وہ بولا۔ "وہ صبح گھر سے نکلا تھا ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے۔ وہ بس سے آ رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک مسافر نے سگریٹ پیش کی۔"

"سگریٹ؟" میں نے کہا۔ "بس میں تو سگریٹ پینا جرم ہے مگر تم لوگوں کو مفت ملے تو زہر بھی پی لو۔ خیر۔"

"اس نے سگریٹ ختم کی تو اسے چکر سے آنے لگے۔ ذرا سی دیر میں وہ بے ہوش ہوگیا۔" وہ میری مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "لوگوں نے اسے سگریٹ پیش کرنے والے سے باتیں کرتے دیکھا تھا چنانچہ وہ انھیں ساتھی سمجھے اور سگریٹ پلانے والے نے کہا کہ اس کا دوست دل کا مریض ہے۔ بس فوراً روک دی گئی اور وہ خواجہ اکبر کو لے کر اُتر گیا اور ٹیکسی میں ڈال کے لے گیا۔" وہ خاموش ہوگیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟ کوئی دردناک واقعہ پیش آیا یا شرمناک؟" میں نے اس کے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

"میں وہی بتا دیتا ہوں جو خواجہ اکبر نے کہا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ کسی کوٹھی میں لیٹا تھا۔ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ خواجہ اکبر بیڈ روم میں تھا اور جس بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ وہ بھی بہت بیش قیمت تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ آہستہ آہستہ اسے گزرے ہوئے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ ساری خرابی اس سگریٹ کی تھی جو اسے ایک اجنبی نے پیش کی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ شریف آدمی نظر آتا تھا اور کچھ شریف آدمی بااخلاق بھی ہوتے ہیں جو کسی ہمسفر کو ایک سگریٹ پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ خواجہ اکبر کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور وہ لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں سمجھا۔ ممکن ہے اس کی طبیعت بگڑ گئی ہو۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہے۔ اس نے سوچا کہ کہیں مجھے دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا اور یہ اسی شریف آدمی کا گھر تو نہیں ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سگریٹ پلا کے بیہوش کرنے والا اسے ایک سجی سجائی کوٹھی میں اتنے آرام سے لا کر لٹا دے۔ ایک اجنبی دوسرے بیہوش اجنبی کو اٹھا کے تیسرے اجنبی کی خوابگاہ میں کیسے پہنچا سکتا ہے۔ وہ سوچ رہا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے علاوہ اٹھنے کی اور کسی کو پکارنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک عورت اندر آگئی۔ خواجہ اکبر کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور چِت سے گر کر بے ہوش ہوگئی۔ خواجہ اکبر کو وضاحت کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ بھونچکا بیٹھا تھا کہ دو ہٹے کٹے نوکر اور دو مسٹنڈے نوجوان اندر آ گئے جو اس عورت کے بیٹے تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کو پکڑ لیا۔ نوکروں نے صرف خواجہ اکبر کو پکڑے رکھا۔ نوجوانوں نے . . ."

"نوجوانوں نے 'تفتیش' شروع کی۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "تمھارے اپنے طریقوں کے مطابق۔"

"وہ دونوں کالج کے باکسر تھے۔ انھوں نے خواجہ اکبر کی ایک نہیں مانی اور یہی پوچھتے رہے کہ وہ اندر کیسے آیا اور اس نے ان کی ممی کو کیوں مارا؟" وہ بولا۔ "خواجہ اکبر کی جیب میں کچھ نہیں تھا نہ پرس، نہ شناختی کارڈ۔ انھوں نے اسے اپنے باتھ روم میں بند کر دیا اور تھانے میں رپورٹ لکھوا دی کہ کوئی بدمعاش چوری کی نیّت سے ان کے گھر میں آ گھسا تھا۔ خواجہ اکبر پرانا آدمی ہے مگر جو اے ایس آئی آیا، وہ نیا تھا۔ اس نے دفعہ چار سو اکیاون ضابطۂ فوجداری کے تحت ایف آئی آر کاٹ دی۔ یعنی مجرمانہ عزائم لے کر ناجائز طور پر کسی کے گھر میں داخل ہونا۔ جو ناقابلِ ضمانت جرم ہو جاتا ہے۔ ضمانت صرف عدالت منظور کر سکتی ہے۔ اصل بات تو اس کے حوالات میں بند ہو جانے کے بعد معلوم ہوئی۔ مگر ایف آئی آر تو کٹ چکی تھی۔ اب وہ معطل ہے اور حوالات میں بیٹھا ہے۔ باعزت طور پر بَری ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

میری ہنسی اس کو مشتعل بھی کر رہی تھی اور شرمندہ بھی لیکن وہ ضبط پر مجبور تھا کیونکہ یہ کسی غریب لاوارث کا نہیں، ایک پولیس افسر کا گھر تھا۔ دشمنوں کی پلاننگ بہت اچھی تھی۔ انھیں وقتی طور پر دونوں محافظوں کو ہٹانا مقصود تھا۔ ایک پر انھیں تھوڑی سی زبردستی کرنی پڑی۔ دوسرے کو انھوں نے بڑی آسانی سے روک لیا۔ دونوں کی فرض شناسی نے انھیں حوالات پہنچا دیا۔ زمانہ بڑا قدر ناشناس ہے۔

"واہ بھئی واہ۔" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ "ساتھ ہو تو ایسا۔ پہلے دونوں سی آئی اے میں تھے۔ اب دونوں حوالات میں ہیں۔"

اچانک باہر سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ میں نے دو منٹ تک برداشت سے کام لیا۔ اس امید میں کہ شاید وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن دو منٹ بعد وہ ایک سے دو ہو گئے۔

"کیا رضوی صاحب نے کتے بھی پال رکھے ہیں؟"

"کتے؟" میں نے کچھ سوچ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "ہاں۔ بہت۔" لیکن وہ کچھ نہیں سمجھا اور میں اس کے ساتھ باہر آیا۔ میری ساری شوخی یکلخت کافور ہوگئی۔ دونوں کتے کار کی ڈِکّی پہ حملہ کرنے کے موڈ میں تھے اور اس کی طرف تھوتھنی اٹھا کے مسلسل بھونک رہے تھے۔ انھیں ڈِکّی میں سے خارج ہونے والے خون اور گوشت کی اس بُو نے متوجہ کر لیا تھا جو انسانی ناک محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہے اس کار میں؟" تفتیش کے لیے آنے والے نے کہا۔

"بہت کچھ ہے۔" میں نے بدستور غیر سنجیدہ رہنے کی کوشش کی۔ "انجن ہے، باڈی ہے، چار پہیے ہیں۔"

"ڈِکّی میں کیا ہے؟" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔

"پیٹرول ٹینک، اسپیئر وھیل، جیک۔" میں نے کہا۔ "بجلی کے تار اور بہت کچھ۔"

"کتے ایسی چیزوں پر نہیں بھونکتے۔"

"ان کتوں کو کسی چیز سے الرجی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً پیٹرول کی بُو سے۔ یا سرخ رنگ سے۔" میں نے کہا۔ "اور ان کا ایک علاج تو یہ ہے کہ انھیں نفسیاتی کلینک بھیج دیا جائے لیکن دوسرا علاج فوری، سہل اور مؤثر ہے۔" میں نے ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر ایک کتے کے رسید کیا۔ مجھے اس وقت تک علم نہ تھا کہ میرا نشانہ کتنا صحیح ہے۔ پتھر ایک کتے کے سر پر لگا۔ وہ چِلّاتا ہوا بھاگا۔ اس کے پارٹنر نے دوسرے پتھر کا انتظار نہیں کیا اور وہ دونوں بیک وقت فرار ہو گئے۔ "کتے کہیں کے۔" میں نے ہاتھ جھاڑے اور اس اجنبی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آؤ اب چائے پی کر جانا۔"

اس نے برا سا منہ بنایا کیونکہ جملے کا ابتدائی آدھا حصّہ اس سے نہیں کہا گیا تھا مگر اس پر بھی منطبق ہوتا تھا۔ وہ میرے اس رویّے کے بعد میری مہمان نوازی کو قبول کرنے کے موڈ میں نہ تھا لیکن میں نے اسے بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔ میں نے اس کے سامنے اخبار رکھا اور ناشتا بنانے چلا گیا۔ ناشتا بناتے بناتے مجھے ایک اور خیال آیا۔

واپسی پر میں چائے کے علاوہ ٹرے میں اتنا سامان بھر لایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک کھانے میں مصروف رہے۔ فریج میں سالم ڈبل روٹی تھی۔ میں نے چار انڈے اُبال لیے تھے، چار کا آملیٹ بنا لیا تھا۔ مکھن اور جام اس کے علاوہ تھے اور غالباً وہ ناشتا کر کے نہیں آیا تھا۔ وہ سب ذلت بھول کے پورے انہماک کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ دو منٹ بعد میں نے کہا۔ "معاف کرنا یار! میں آتا ہوں باتھ روم ہو کے۔ تم جاری رکھو۔ تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ اور اس نے فقط سر ہلایا۔

باہر آ کے میں نے ڈِکّی کو کسی آواز کے بغیر کھولا اور میر محمد کے سر کو تولیے سمیت اٹھا لیا۔ وہ ہیبت ناک موٹر سائیکل گیٹ کے اندر کھڑی تھی۔ اس کے کیریر سے دونوں طرف موٹے اور میلے کینوس کے بیگ لٹک رہے تھے اور انھیں بیلٹ جیسے تسموں کو بکل سے گزار کے بند کیا گیا تھا۔ ایک میں کچھ کاغذات تھے۔ دوسرے میں سے مختلف اشیا برآمد ہوئیں۔ بسکٹ کا ایک ڈبا۔ بچّوں کے مِلک پاؤڈر کا ایک ڈبا۔ ڈرائی فروٹ کے دو لفافے۔ ایک میں آدھا سیر کے قریب کاٹھے بادام تھے۔ دوسرے میں اخروٹ کی گری۔ یہ سب مالِ غنیمت تھا۔ وہ نذرانہ جو صاحبِ اختیار لوگ راہ چلتے بھی وصول کر لیتے ہیں۔ سوائے شاید بے بی مِلک پاؤڈر کے جو میں نے واپس رکھ دیا۔ باقی اسباب کی جگہ میں نے میر محمد سابق سب انسپکٹر اینڈ آنریری ایس ایچ او کے سر کو منتقل کیا۔ اس طرح کہ میں نے اپنے ہاتھ سے سر کو چھوا تک نہیں۔ تولیے کا ایک کونا پکڑ کے کھینچ لیا۔ دوبارہ بکل سے بیگ کو بند کرنے اور سامان کو اندر لے جانے میں میرے دو منٹ بھی صرف نہیں ہوئے۔ پانچ منٹ بعد میں پھر ناشتے کی میز پر تھا۔ جہاں اب میرے کھانے کے لیے بہت کم بچا تھا مگر میں نے اسی

بچوں کے مشہور ادیب شکیل انجم کی مقبول ترین کتابیں

آئندہ ماہ کے ناول

کرنل پرویز سیریز نمبر ۱
بین الاقوامی سازش پر مبنی سنسنی خیز ناول
پکارتی لاشیں
کیا لاشیں پکار سکتی ہیں۔ جی ہاں! لاشیں پکار رہی تھیں۔ اس عمارت میں زبردست دھماکہ ہوا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ سندھ بھائی کو ایک شخص نے گہرے سمندر میں پھینک دیا ایک خوبصورت لڑکی جو زہریلی ناگن تھی!!!

کرنل پرویز سیریز نمبر ۲
خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہولناک ناول
جہنم کی بلائیں
فیصل، ندیم اور سندھ بھائی جہنم کی بلاؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس دوران حویلی کا ایک بہت تباہ کن آدمی اور سندھ بھائی کو اپنی جگہ ... سندھ بھائی کا کیا حشر ہوا یہ تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

قیمت فی کتاب ۱۰ روپے

قابوط سیریز نمبر ۱
مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور
مسٹر چکرم
وہ عجیب شخص تھا جو سر کے بل کھڑا ہو کر کتے کی طرح بھونکتا تھا۔ قابوط بھی اس بھونک میں شریک ہو گیا۔ پھر محمود، فرحانہ اور پلو سب ہی بھونکنے لگے۔ قہقہوں کا طوفان آ جائے گا۔ بیٹ میں بھی بل ڈال دیگا اور ہو سکتا ہے آپ بھی...

قابوط سیریز نمبر ۲
قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول
تیسرا روپ
اس کے تین روپ تھے اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف اور سنسنی خیز۔ انسپکٹر خورشید بھی اس ہولناک مجرم کی تلاش میں۔ سنجیدہ اغوا ہو گئی، اسے اغوا کرنے والے کون لوگ تھے۔ محمود، فرحانہ اور ڈیوڈ پر قیامت ٹوٹ پڑی!!!

[illegible]

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر اکتفا کی جو میرے مقدّر میں تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے سگریٹ پیش کی اور اس سے معذرت کی کہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں اور بعض اوقات مذاق میں حد سے بڑھ جاتا ہوں۔ میرا مقصد اس کی بے عزتی ہرگز نہیں تھا۔

جب وہ رخصت ہوا تو بہت خوش تھا اور اس نے رازدارانہ طور پر مجھے یہ بھی بتایا کہ خواجہ اکبر کو زیرِ دفعہ چار سو اکیاون ضابطۂ فوجداری سزا ہو جائے تو اس کی ترقی یقینی ہے اور سزا اس لیے یقینی ہے کہ مدّعی بہت اونچے لوگ ہیں۔ کیا رضوی صاحب بھی سزا دلوانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں کر سکتے؟ میں نے اسے یقین دلایا۔ میں بات کروں گا انکل سے اور انکل بات کریں گے مجسٹریٹ سے اور سمجھ لو کہ خواجہ اکبر گیا اندر۔ خوشی میں اس نے موٹر سائیکل سے متعلق کسی بیگ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دو تار آپس میں ملائے اور کِک مارنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔ اس کا سانس اکھڑنے ہی والا تھا جب موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ہانپتے ہوئے اس نے آخری بار مجھ سے مصافحہ کیا اور دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اکرام شیخ سے بات کی اور اسے پیٹرول پمپ کی پہلی جنگ کے اسباب، واقعات اور نتائج سے مطلع کیا۔ ”ذرا معلوم کرنا اپنے طور پر کہ متعلقہ تھانے میں کسی نے رپورٹ لکھوانے کی حماقت تو نہیں کی ہے؟“ میں نے کہا۔

” وہ تو میں کر لوں گا۔“ شیخ نے کہا۔ ”تم خدا کے لیے اس کار کو لے کر مت نکلنا۔“

”اسے میں ابھی ڈینٹ پینٹ کے لیے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”نیا رنگ ہونے کے بعد نئی لگے گی۔“

” اس پر... میرا مطلب ہے سیٹ پر۔ ویسے تو تم عقل مند ہو۔“

” درست چہ شک۔ وہ میں دھو دُھلا کے صاف کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ پھر لائن کٹ گئی۔ شاید کوئی آ گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسلام آباد سے ضامن رضوی صاحب بات کر رہے تھے۔

”گڈ مارننگ انکل!“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”خیریت تو ہے وہاں؟“

”ابھی تک تو خیریت ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔ ”تم رات کو کہاں تھے۔ دو مرتبہ فون کیا تھا میں نے؟“

”اچھا؟“ میں نے بے حد حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں تو کہیں گیا ہی نہیں۔ ذرا جلدی سو گیا تھا؟“

”جھوٹ مت بولو۔ میں نے ایک آدمی کو بھیجا تھا چیک کرنے کے لیے۔ نو بجے کے قریب۔“

” وہ... اس وقت تو میں کھانے کے لیے نکلا تھا۔ دس بجے تک لوٹ آیا تھا۔“ میں نے سنبھل کر کہا۔

” اچھا اچھا۔ وہ تم نے اجازت کے لیے درخواست دی، کب آ رہے ہو یہاں؟“ انھوں نے مطمئن ہو کے کہا۔

” بس انشاءاللہ آج نہیں تو کل۔“ میں نے کہا۔ ”مسز شیرازی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ان کی حالت اچانک سنبھل گئی ہے لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ حالت اسی طرح اچانک بگڑ بھی سکتی ہے۔ دوا یا علاج نہیں، یہ ان کی اپنی قوتِ ارادی ہے جو انھیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ قدرت کا مقرر کیا ہوا وقت ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو وہ پوری طرح ہوش میں ہیں اور لیٹے لیٹے سب انتظامات اپنی نگرانی میں کرا رہی ہیں۔“ انھوں نے کہا۔

”کیسے انتظامات؟“ میں نے بے خیالی میں کہا۔

” فوزیہ کی رخصتی کے۔ آج سہ پہر کے بعد نکاح ہے۔“ رضوی صاحب نے کہا۔

اچانک میرے اردگرد ایک مہیب سناٹا مسلط ہو گیا۔ پھر جیسے شہرِ خموشاں کی زمین شق ہو گئی اور گزرے ہوئے وقت کی یادوں کے قبرستان سے ان گنت ڈھانچے نکل آئے۔ وہ اپنے استخوانی ہاتھ اٹھا اٹھا کے میری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ بنا تم نے۔ فوزیہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ دُلھن بن کے رخصت ہو رہی ہے۔ تمھاری محبت کو تمھارے وعدوں کو اور تمھارے خوابوں کو اس نے نفرت کا زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔ پیار کا امرت دینے کے بعد یہ زہر بھی تم نے ہی فوزیہ کو دیا تھا۔ تم ان سب امیدوں کے قاتل ہو جو آسیب بن کے مرتے دم تک اس کا پیچھا کریں گی۔ کوئی اپنے ماضی سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ یادوں کے گلاب اگر خاردار کیکٹس بن جائیں تو اس آزار سے نجات کوئی مستقبل نہیں دے سکتا۔ خواہ اس میں ہر خوشی ہو، ہر آسائش ہو اور ہر آرزو کی تکمیل کا سامان ہو۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ رضوی صاحب نے کب بات ختم کی اور کیا کہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور بالکل اکیلا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ آخری بار فوزیہ سے معافی مانگ سکتا۔

باہر آ کے میں نے کار کی پچھلی سیٹ نکالی اور اسے اٹھا کے دھونے کے لیے اندر لے گیا۔ صابن سے اچھی طرح رگڑ کر دھونے اور خشک کرنے کے بعد میں نے اسے پھر فٹ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ لہو کے داغ دھونے سے کبھی نہیں جاتے اور اگر سائنٹیفک ٹیسٹ لیے جائیں تو ہزار بار دھونے کے بعد بھی ان کا سراغ ملتا ہے مگر مجھے ایسے کسی ٹیسٹ کا اندیشہ نہ تھا۔ ڈِکّی میں ایسا کوئی داغ نہ تھا کیونکہ کٹے ہوئے سر سے رِسنے والا خون جم کر بالکل خشک ہو چکا تھا اور میں نے اسے ڈِکّی میں رکھا تھا تو تولیے میں لپیٹ کر۔ اس کے باوجود مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ کہیں وہ موٹر سائیکل والا پھر نہ آ دھمکے۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ سارا دن مصروف رہے اور شام کو گھر پہنچنے سے پہلے بیگ نہ کھولے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے ابھی معلوم ہو جائے۔ وہ کہیں موٹر سائیکل کھڑی کرے تو کوئی کتا اس کے بیگ کو دیکھ کر بھونکنے لگے۔ یہاں تو میں نے اسے ٹال دیا تھا لیکن اپنی موٹر سائیکل کی تلاشی وہ فوراً لے گا۔ اس کا ذہن فاکس ویگن کی طرف بھی جا سکتا ہے اور اگر اس نے میر محمد کا سر برآمد کر لیا تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ کتے بلاوجہ نہیں بھونک رہے تھے۔ اس میں شبہے کی بات ہی نہ ہو گی کہ وہ سر میں نے اس کے تھیلے میں ڈالا لیکن اس کے پاس ثبوت کوئی نہ ہو گا۔

اگر یہ ایک بڑے پولیس افسر کا گھر نہ ہوتا اور یہ گاڑی رابعہ قاری ایڈووکیٹ کی نہ ہوتی تو وہ مجھے سی آئی اے کے تھانے میں اُلٹا لٹکا کے ثبوت بھی حاصل کر لیتا اور مجھ سے اعترافِ جرم بھی کرا لیتا۔ مگر وہ میرا رویّہ دیکھ چکا تھا۔ میں اس کے قابو میں آنے والا شخص نہیں تھا۔ میں نے اپنی بَلا اُس کے سر منڈھ دی تھی۔ وہ عقلمندی سے کام لے گا تو ہنگامہ کیے بغیر اس سر کو کسی اور کے حوالے کر دے گا یا کہیں پھینک دے گا۔ دوسرے کاغذات کے علاوہ میں ٹیپ کو بھی گھر میں رکھ چکا تھا۔ تاہم میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں فوراً گھر سے نکل جاؤں۔ اگر وہ لوٹ کر آئے بھی تو میرا اس سے سامنا نہ ہو۔ حفظِ ماتقدّم کے طور پر یہ بندوبست بھی ضروری تھا کہ وہ مجھے پھنسانا چاہے تو میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں۔ یہ ثابت کر دوں کہ میں گھر سے باہر تھا۔ چنانچہ اس سے ملاقات کا کیا سوال۔ اس کام میں دو افراد میری مدد کر سکتے تھے۔ ایک اُستاد ٹیڈی، دوسرا عبدالودود منظر۔ استاد ٹیڈی کا پتا ٹھکانا مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے منظر سے مل کر اپنے دفاعی انتظامات مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ناشتے کے آثار مٹائے، سارے دروازے مقفّل کیے پھر میں فاکس ویگن لے کر نکلا۔ کونے والے گھر کے سامنے ایک اور فاکس ویگن کھڑی تھی جسے میں عموماً وہاں کھڑا دیکھتا تھا۔ اس کے چلنے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ اس پر گرد، خشک پتّے اور پرندوں کی غلاظت دو دو ہفتے تک کوئی صاف نہیں کرتا تھا۔ آج بھی اس کی حالت مالکوں کی عدم توجہی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ شاید اسے چلانے والا یہاں تھا ہی نہیں یا گھر والوں کے پاس کوئی دوسری بڑی گاڑی آ گئی تھی۔ چنانچہ پرانی گاڑی کسمپرسی کا شکار تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کو اس کے پاس لے جا کر روکا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر دیکھا پھر میں نے اپنی چابی سے دوسری فاکس ویگن کا دروازہ کھولا۔ اس کی گرد آلودہ سیٹ کو اٹھا کر اپنی گاڑی تک لا کے میں نے اپنی گاڑی کی سیٹ ہٹائی، اس کی جگہ دوسری سیٹ فٹ کی اور اپنی سیٹ دوسری فاکس ویگن میں لگا کے دروازہ پھر مقفّل کر دیا۔ چند گزرنے والوں نے مجھے ایک نظر دیکھا اور کسی قسم کا شک کیے بغیر گزر گئے۔ دونوں گاڑیوں کی سیٹ اوریجنل تھی یعنی کالے رنگ کی دانے دار ریگزین سے بنی ہوئی۔ دوسری فاکس ویگن کے مالک کو تبدیلی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ حیران ہو گا کہ پیچھے والی سیٹ اتنی صاف کیسے ہو گئی۔ اسی حیرت کا اظہار اس ڈینٹر پینٹر نے بھی کیا جسے میں نے فاکس ویگن سفید رنگ کرنے کے لیے دی۔ پچھلی سیٹ کی گرد دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میں نے کافی دن بعد گاڑی کو چلایا ہے۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ”ایسی بگڑی ہوئی شکل والی فاکس ویگن کو لے کر شہر میں پھرنا کوئی آسان کام ہے۔ لوگ کم اور دوست زیادہ ہنستے ہیں۔“ میں نے کہا۔

” اب آپ فکر نہ کریں۔ ایک دم لشکارا مارتی ہوئی نکلے گی۔ نئی بھی کیا مقابلہ کرے گی اس کا۔“ وہ بولا۔

” اور یہ کام کتنے دن میں مکمل ہو جائے گا؟“ میں نے کہا۔

” دس دن تو لگیں گے صاحب!“ وہ بولا۔ ”یہ رنگ اسکریپ کرنا پڑے گا۔ پھر نیا استر۔ اس سے پہلے چار پانچ دن ڈینٹر لے گا۔ ڈیکو پینٹ ہو گا، اصلی جناب، بہت رب کرنا پڑتا ہے اسے۔“

” ٹھیک ہے۔ مگر گاڑی لینے میں نہیں آؤں گا۔ وہ بیگم صاحبہ آئیں گی جن کی گاڑی ہے۔ بہت بڑی وکیل ہیں مس رابعہ قاری۔“ میں نے اسے بتایا۔ تاکہ پولیس تفتیش کرتی ہوئی آئے اور لال گاڑی دیکھ کر سوال کرے تو وہ کہہ دے۔ کہ گاڑی ایک خاتون وکیل کی ہے۔ میں نے اسے پانچ سو روپے بطور ایڈوانس دیے اور پیدل روانہ ہو گیا۔

شہر اُجڑا اُجڑا سا تھا۔ فضا بے رنگ تھی اور ہوا خاموش، اوپر آسمان کی ویرانی میں بہت بلندی پر اُڑنے والے پرندے ایک میکانکی انداز میں محوِ پرواز تھے۔ نیچے زمین پر جنت سے نکالے ہوئے انسان زندگی کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ بقا کی جدوجہد میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر ایک دوسرے کا گلا تک کاٹنے کے لیے تیار تھے۔ حصولِ دولت کی اس سعیٔ رائیگاں کو ہی کامیابی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سمجھ رہے تھے جس کی ابتدا عدم وجود پر تھی اور انتہا بھی عدم وجود پر۔ ایک صفر کے اضافے سے ایک کا ہندسہ کیا بنتا ہے۔ دس، سو، ہزار، لاکھ، کروڑ، پہلے صفر سے آخری صفر تک کے سفر میں آدمی کو کیا ملتا ہے۔ ثواب و عذاب، نیکی بدی، دُکھ سُکھ، ان سب کی قیمت کیا ہوتی ہے؟

میں بے حد قنوطی ہو رہا تھا اور اس کے اسباب واضح تھے۔ میرے پاس کوئی بھی نہیں تھا جس کے کندھے پر سر رکھ کے میں رو سکتا۔ نہ محسن، نہ رابعہ اور نہ شہلا۔ خون کے سب رشتے سرحد کے اِدھر یا اُدھر انسانوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے نئے رشتے استوار کرلیے تھے اور انھی کو بیساکھی بنا کے زندگی کا سفر طے کر رہا تھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ کِدھر جاؤں؟

پونے دو سو میل دور اسلام آباد میں فوزیہ دُلھن بن رہی تھی۔ کیا بیٹیاں ایسے رخصت ہوتی ہیں ماں باپ کے گھر سے۔ نہ جشنِ طرب، نہ ہنگامہ مسرت، نہ ڈھولک کی تھاپ اور چوڑیوں کی جھنکار پر گائے جانے والے وداعی کے گیت، نہ سکھیوں سہیلیوں کی شوخی سے کھنکتے قہقہے۔ فرشتۂ اجل دروازے پر دستک دیے جا رہا ہے۔ جلدی کرو جلدی۔ کیونکہ وقت کم ہے۔ دیر کیسی ہے مولانا صاحب! بسم اللہ کیجیے، مسٹر شیروانی دِس اِز نو ٹائم۔ ہاں مگر میں کیا کروں۔ مسماۃ فوزیہ ناہید بنت احمد رضا خاں شیروانی۔ تم کو مسمی ایاز احمد ولد غیاث احمد سے اپنا عقد بعوض حقِ مہر شرعی قبول ہے۔ ویری سوری شیروانی صاحب! ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ خاتمہ اچانک ہوسکتا ہے۔ جاؤ بی بی! اپنے گھر سدھارو۔ سدا سُکھی رہو۔ دُودھوں نہاؤ، پُوتوں پھلو۔ سب کے چہرے سوگوار ہیں۔ بجھے بجھے ہیں۔ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں۔ سب آنسوؤں کو پی رہے ہیں۔ زبردستی مسکرا رہے ہیں۔ وہ خوشی کہاں ہے جو رخصتی کے وقت اشکوں سے بھی یوں چھلکتی ہے جیسے دامنِ سحاب سے شفق کی سرخی۔ شبِ تار میں ستاروں کی ضیا۔ آمدِ فصلِ گل کی نامہ بر ہوا سے خوشبو۔

سکندر بخت، بدبخت، تیرے مقدر کی خوشی کیا ہوئی۔ کاتبِ تقدیر تجھ پر اتنا نامہرباں کیوں ہوا کہ مسرتوں کے لازوال، لامحدود خزانے تیرے اپنے نہ رہے۔ تو صحرا کے اس پیاسے مسافر کی طرح حیران و سرگرداں ہے جس کی چھاگل کا آخری قطرۂ آب بھی ریت نے پی لیا ہو۔ یہاں جو کچھ ہے اپنے اپنے وقت کا پیمانہ ہے۔ ہاتف نے صدا دی۔ آدمی خود اپنے گرد زنداں کی دیواریں اٹھاتا ہے، اپنے جہنم کی آگ خود روشن کرتا ہے۔ اپنی جنت کی خود تعمیر کرتا ہے۔ اپنی خوشیوں کو خود قتل کرتا ہے اور اپنے دُکھوں کو خود سینچتا ہے۔ وقت گزر جائے گا تو احساس مر جائے گا، سو جائے گا۔ فوزیہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان ہنستے ہنستے ایک پل کے لیے خاموش ہو جائے گی اور دوسرے پل میں تمھاری یاد کو بھی اس طرح دھکّے مار کے دل سے نکال دے گی جیسے کوئی گھر میں گھس آنے والے فقیر کو نکالتا ہے اور خود تم۔ تم کیا کرو گے؟ رسن و دار کی منزل سے گزر کے کوئے یار تک پہنچے تو وقت کے ہر زخم کا نشاں بھی کھرچ دو گے۔ محبّت! مائی فٹ۔ آئی واز این ایڈیٹ اینڈ سو واز شی۔ معلوم ہے جس روز اس کی شادی ہوئی میں کیا محسوس کر رہا تھا۔ آئی واز میڈ۔ ہا ہا... جوانی میں تو ایک عشق اِزاے مسٹ۔ مزے قہقہے۔ شادی کی ساتویں یا سترھویں سالگرہ میں شریک ہونے والے معزز مہمان بھنے ہوئے مرغ، لیمب روسٹ، فروٹ کسٹرڈ کھا رہے ہیں۔ یہ سب فوزیہ، رابعہ ہوتی ہیں۔ صرف بیویاں۔

ایک ہاتھ میری کمر پر پڑا "یُو بلڈی مَرڈرر" پھر بڑی گھن گرج کے ساتھ ایک قہقہہ۔

میں نے بیدالودود منظر کی طرف دیکھا جو بار رُوم کے باہر کھڑا تھا۔ میں بار رُوم کیسے پہنچا آخر؟ پیدل۔

"ابے ایسے کیا اُلوؤں کی طرح دیدے گھما رہا ہے۔" اس نے میرے شانے کو ہلایا۔

"میں... میں تجھے ہی دیکھ رہا تھا۔" میں نے خود کو سنبھال کے بمشکل تمام کہا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ بالکل غیر شعوری طور پر میں پیدل چلتا ہوا ڈسٹرکٹ کورٹ تک آپہنچا ہوں۔

"تو بھائی کب تک دیکھے گا؟ نظر نہیں آ رہا ہوں میں کیا؟" وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "کوئی خوردبین سے دیکھنے کی چیز ہوں میں؟ ابے گدھے ایک جھانپڑ اور دوں گا۔ یہ کیا رونی شکل بنا رکھی ہے پھر کسی کو قتل کر آیا ہے تو بتا۔ ابے ہم ہیں تو پھانسی کا کیا ڈر۔ خود پہنچائیں گے تجھے۔"

"یار وہ... فوزیہ کی ماں ڈیتھ بیڈ پر ہے۔" میں نے کہا۔ "سب چلے گئے ہیں۔ میں اس لیے نہیں جا سکا کہ اجازت کی فوراً تھی۔" عمداً میں نے یہ نہیں کہا کہ آج فوزیہ کی شادی بھی ہے۔

"تجھے جانا ہے؟" وہ بولا۔ "تو جا۔ یہاں کیوں آگیا۔ بلا دی بلاغ کا اڈا ہے یہ؟"

"یار! بات کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔ "اکیلے میں کرنی ہے۔ پانچ منٹ میری بات سن لے۔"

اس نے سر ہلایا اور مجھے کنٹین میں لے گیا۔ میں نے میر محمد کی لاش ملنے سے لے کر اس کے سر کی بلا کو ٹلانے تک کی رُوداد اِلف من وعن سنا دی۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔

"اب تو میری طرف سے اجازت کی درخواست لگا۔" میں نے کہا۔ "خدانخواستہ کوئی چکر چلے تو میں یہ کہہ سکوں کہ میں منظر کے ساتھ تھا۔ رضوی صاحب کا فون آیا تھا ساڑھے آٹھ بجے۔ پونے نو بجے میں نے تجھے فون کیا اور تو مجھے تو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔"

"ابے تیرے چکر مجھے لگوا دیں گے پھانسی۔" وہ سر پر ہاتھ مار کے بولا۔ "جان ویسے ہی سولی پر اٹکی ہوئی ہے۔ گھر پہ جورو نے دسواں سپوت تحفتہً دیا ہے۔ خیر یہ بتا وہ تفتیش کرنے والا کس وقت آیا تھا؟"

"وہ تو سات بجے ہی وہاں موجود تھا۔" میں نے کہا۔

"تو پونے نو بجے سے پہلے کا کیا بنے گا؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "کیسے ثابت ہوگا کہ تو سو رہا تھا اور تجھ سے ملنے کوئی آیا ہی نہیں تھا؟"

"میرا خیال ہے استاد ٹیڈی گواہ بن جائے گا۔ میں کہوں گا کہ میں اکیلا تھا، اسے بلا لیا۔"

"ابے چھوڑ۔ میں کہہ دوں گا۔ تو نے جھوٹ بولا تھا۔ تو رات کو میرے گھر میں سویا تھا۔ ڈر کے مارے ہمت نہیں پڑ رہی تھی گھر جانے کی۔" منظر نے کہا۔ "بس اسی وقت گیا تھا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب ناشتا کر کے۔ میرے گھر سے وہاں تک آدھا گھنٹا تو لگتا ہی ہے اور رضوی صاحب میری مانیں گے، تیری نہیں۔ کیا سمجھا؟" اس نے پھر میرے شانے پر ہاتھ مارا اور زور سے ہنسا۔

"تھینک یو منظر!" میں نے کہا۔ "میں بہت پریشان تھا۔ تجھے بھی جھوٹ بولنا پڑ رہا ہے میری وجہ سے۔"

"جھوٹ!" وہ پھر ہنسا۔ "یار! جھوٹ تو ہم یہاں اتنا بولتے ہیں کہ کبھی سچ منہ سے نکل جائے تو حیرانی ہوتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ جھوٹ بولا ہے اور جب پیسے کی خاطر بولتے ہیں تو کیا یار کی خاطر نہیں بول سکتے؟"

"پھر تو بیوی سے بھی جھوٹ ہی بولتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

وہ یوں ہنسا کہ کنٹین میں بہت سے لوگ متوجہ ہوئے۔ "ابے شادی کرے گا تو معلوم ہوگا کہ جھوٹ بولے بنا زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ کیا کہتے ہیں وہ۔ کہ میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ تو بھیّا جھوٹ اس کی گریس ہے۔ گریس نہ ہو تو فرکشن پیدا ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کا بوجھ ڈھونا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہیے چُوں چُوں کرنے لگتے ہیں۔ دیکھ لے بیوی مجھ سے کتنی خوش ہے۔ سچ بولتا تو کب کی میکے جا بیٹھی ہوتی۔ طلاق لے چکی ہوتی۔ کامیاب شوہر وہ ہے جو کامیابی سے جھوٹ بول سکے۔ آیا کچھ عقل میں؟ چل اٹھ۔"

میں نے بڑی صفائی سے کندھے کو ایک اور وار سے بچایا اور ہم دونوں کنٹین سے نکل آئے۔ میں اس سے رخصت ہوا تو دوپہر ہونے والی تھی۔ میرے سر سے ایک پریشانی کا بوجھ اتر گیا تھا۔ رضوی صاحب نے جاتے جاتے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں خرافات سے رہوں اور کوئی نیا گل نہ کھلاؤں۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میں نے تو اکرام شیخ کی مدد کی تھی۔ یہ شرافت اور اخلاق، دوستی یا قانون سب کا تقاضا تھا۔ اگر اس کا اسکوٹر خراب نہ ہوتا تو مجھے اس کے ساتھ نہ جانا پڑتا اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔

لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ میر محمد کی لاش کا سر میری گاڑی میں صرف اس لیے رکھا گیا تھا کہ میں لاش برآمد کرانے کے لیے اکرام شیخ کو اپنی گاڑی میں لے گیا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ وہ ٹیکسی میں چلا جاتا۔ پھر کیا دشمن اس سر کو ٹیکسی میں رکھتے؟ نہیں۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ میر محمد کا سر میری گاڑی میں رکھا جائے گا۔ اگر میں اکرام شیخ کے ساتھ نہ جاتا اور گھر آکے سو جاتا تو صبح یہ سر مجھے اسی طرح فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر موجود ملتا۔ شاید میں پیچھے نگاہ ڈالے بغیر گاڑی لے کر روانہ ہو جاتا اور دن کے اجالے میں کہیں گاڑی پارک کر کے جاتا تو واپسی پر گاڑی کے گرد مجمع ہوتا یا پھر میرے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی پولیس آدھمکتی اور مجھے آنکھیں کھلنے سے پہلے گرفتار کر کے لے جاتی۔

یس۔ پولیس تو واقعی صبح ہی آپہنچی تھی۔ سات بجے سے پہلے کسی کا تفتیش کے لیے آنا۔ چہ معنی دارد۔ یہ انتظام تو پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ جب اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی سر نظر نہ آیا تو اسے مایوسی ہوئی اور اس نے خواجہ اکبر کی بازیابی اور دین محمد کی گمشدگی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اپنے آنے کی کوئی وجہ تو بتانی ہی تھی۔ لاش کا سر مل جاتا تو وہ کہتا کہ ہمیں مخبروں کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی۔ اور اطلاع غلط بھی نہیں تھی اسے پہلے سے معلوم ہوگا کہ خواجہ اکبر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب میں اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر غسل کرنے گیا تھا تو اس نے کہیں فون نہیں کیا ہوگا اور دین محمد کے بارے میں اکرام شیخ سے بات نہیں کی ہوگی۔ اس نے باہر آکے فاکس ویگن میں جھانکا ہوگا لیکن گاڑی کے دونوں دروازے مقفل تھے اور شیشوں سے ناک لگا کر اندر دیکھنے سے اس کو خالی سیٹ تو نظر آگئی ہوگی مگر سیاہ سیٹ پر خون کے معمولی سے سرخ داغ دکھائی نہیں دیے ہوں گے۔ وہ سمجھا ہوگا کہ کسی وجہ سے وہ لوگ اپنی اسکیم پر عمل درآمد میں کامیاب نہیں ہوئے جنھوں نے اسے نہار منہ رضوی صاحب کے گھر پہنچنے کی تاکید کی تھی اور اس بات کا معاوضہ ادا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں غسل کے بعد لوٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر آیا تھا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ بظاہر میں نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے اور اپنے گلے پڑنے والی بلا سے نجات حاصل کر لی ہے مگر خطرہ اب بھی باقی ہے۔ وہ شخص اپنی ناکامی کی رپورٹ دے گا اور بتائے گا کہ سکندر بخت نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ معلوم نہیں کیسے اور کب اس نے میر محمد کا سر میری موٹر سائیکل کے بیگ میں ٹھونس دیا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے کہیں گے ”پاگل کے بچے! سر تو ہم نے رات کو ہی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ اس گاڑی کو فوراً قبضے میں لے لو۔ اس کی پچھلی سیٹ پر خون کے داغ ضرور ہوں گے۔

اور اس وقت پریشانی کے باوجود مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی کہ میں نے سیٹ بدل کے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنا دیا ہے۔ اب شوق سے لے جائیں گاڑی کو اپنی لیبارٹری میں اور ہر طرح سے ٹیسٹ کریں۔ اکرام شیخ کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے گھر پر فون کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ متعلقہ تھانے میں کسی پیٹرول پمپ پر کام کرنے والوں نے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں لیکن میں نے کہا کہ میں ذرا مصروف ہوں اور بے کار بھی ہوں۔

”یہ تو بڑی خراب بات ہے“ وہ بولا ”انگریزی میں کہتے ہیں ناکہ بیکار آدمی کا ذہن شیطان کی ورکشاپ ہوتا ہے۔ مجھے بھی معلوم تو ہو آپ کی مصروفیات کیا ہیں آخر؟ آپ کا مصروف رہنا ہی آپ کے حق اچھا ہے۔“

میں ہنسا ”نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ مصروفیت سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔“

”یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے سکندر اعظم!“ وہ بولا۔

”اچھا بھائی میں گھر جاتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔ خواب تک نہیں دیکھوں گا۔“ میں نے کہا۔

”یہاں آنے میں کیا اعتراض ہے تمہیں؟ کھانا کہیں تو کھاؤ گے یا بھوکے ہی سو جاؤ گے۔“ شیخ نے کہا ”چلو اس بہانے میرے گھر والوں سے مل لو اور میرا گھر بھی دیکھ لو۔“

میں مجبور ہو گیا۔ رکشا لے کر میں آدھے گھنٹے بعد گلبرگ پہنچا۔ گھر کا نمبر مجھے معلوم تھا لیکن گھر تلاش کرنے میں میرا مزید آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا۔ میں نے ان لوگوں کو کوسا جو شہر بساتے ہیں تو اپنی اپنی عقل کے مطابق گھروں پر نمبر لگانے کا طریقہ خود وضع کرتے ہیں۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ جو آیا اس نے سابقہ سسٹم کو خوبیاں خامیاں دیکھے بغیر آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر متروک کر دیا اور اپنی افلاطونیت کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر علاقے میں نمبروں کا نظام ایک معمّا بن گیا۔ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ میں نے پہلے سنا تھا اور پھر دیکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں کسی ایک علاقے کا سسٹم جدا نہیں ہے۔ پورے شہر کی نمبرنگ کا ایک سائنٹیفک فارمولا ہے جو اتنا آسان ہے کہ آپ ٹیکسی والے کو نمبر بتا دیں اور وہ آپ کو گھر کے دروازے پر اتار دے گا۔

جب بالآخر ایک گھنٹے بعد میں نے کال بیل بجائی تو شیخ نے دروازہ کھولا ”خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیر و عافیت پہنچے۔ میں تو متفکر ہو چلا تھا۔“

”فکر کی کون سی بات تھی۔“ میں نے کہا ”ذرا گھر تلاش کرنے میں دیر لگی۔“

”ارے بھائی! آپ کے لیے ہی تو کہا تھا کسی نے کہ یہ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔“ وہ بولا ”خیر۔ اب اندر آؤ۔“

اکرام شیخ کے والد ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے مگر صحت مند آدمی تھے۔ شیخ نے میرا تعارف کرایا تو وہ ہاتھ ملانے کے بعد بہت دیر تک میرا ہاتھ بڑی شفقت اور محبت سے تھامے کھڑے رہے۔ ”تو تم ہو سکندر بخت؟“ انھوں نے کہا ”مجھے اکرام نے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم بہت باہمت اور باکردار آدمی ہو۔ خدا نے چاہا تو کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ آزمائش کا وقت تو سب پر آتا ہے۔ حوصلہ مت ہارنا۔“

”میں آپ کی حوصلہ افزائی اور آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر وہ ظہر کی نماز کے لیے مسجد چلے گئے اور شیخ مجھے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک لڑکی صوفے پر بیٹھی کتاب پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ کتاب نیچے گر گئی تھی لیکن اسے خبر نہ تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی ایسی لڑکی تھی جس کا حسن نقش چغتائی تھا اور ایک نظر میں دیکھنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں پلکوں کی چلمن کے سائے میں بھی غیر معمولی طور پر لمبی لگتی تھیں اور اس کے گول چہرے پر بہت بڑی نظر آتی تھیں۔ اس کے بھورے سیاہ بالوں پر روشنی پڑنے سے چہرے کے گرد ایک سنہرا اجالا سا دکھائی دیتا تھا اور وہ سچ مچ کسی مصوّر کے تصوّر کی خیالی صورت کا حسین ترین مگر جیتا جاگتا عکس تھی۔ اپنی معصومیت کے تاثر سے یہ حسن ملکوتی لگتا تھا۔

شیخ نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور صوفے کے پیچھے جا کے قالین کے دھاگے سے بتی سی بنائی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کے یہ بتی اس کی ناک میں گھمائی اور صوفے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

وہ ہڑبڑا کے اور ایک چھینک مار کے اٹھی۔ اپنے مقابل مجھے پا کے اس نے فوراً دوپٹہ سنبھالا اور کچھ حیران ہوئی ”آپ کون ہیں جی؟“ وہ بگڑ کے بولی ”اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟“

”آپ کی کتاب!“ میں نے نیچے سے کتاب اٹھا کے گرد جھاڑی اور اسے پیش کی ”میں سکندر اعظم ہوں۔“

”کیا؟“ وہ کتاب چھین کر بولی ”میں بتاتی ہوں تمہیں۔“ اس نے کتاب پھینک کر آستین چڑھائی اور جوڈو کی بالکل صحیح پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ یقیناً اس فن کی تربیت حاصل کر رہی تھی اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی قدرتی صلاحیت اور تربیت کا معیار کیا ہے لیکن شیخ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ قہقہہ مار کے صوفے کے پیچھے سے برآمد ہوا۔

”دیکھا تم نے؟ کیسے کیسے نمونے ہیں یہاں! یہ میری چھوٹی بہن ہے نازلی جسے ہم نازو کہتے ہیں، سوائے میرے میں اسے نازی کہتا ہوں۔ کیونکہ یہ ہٹلر سے کم خطرناک نہیں۔“ شیخ نے ہنستے ہوئے کہا۔

نازلی کا رنگ خفت سے لال ہو گیا ”تو یہ تمہاری حرکت تھی شیخ آف چلی۔“ وہ چلّائی۔ اس نے صوفے کا کشن اٹھا کے شیخ کی طرف پھینکا۔ شیخ نے غوطہ مارا اور صاف بچ گیا۔

”ارے ارے۔“ وہ بولا ”مہمانوں کے سامنے بھی خانہ جنگی۔ کیا کہیں گے میرے دوست کہ گھر ہے یا پانی پت کا میدان۔“

”اور ابھی میں مار دیتی ان کے ایک ہاتھ۔ پھر...؟“ وہ میری طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔

”تو تم پر چودہ طبق روشن ہو جاتے نادان لڑکی! یہ جوڈو میں بلیک بیلٹ ہیں۔“ شیخ نے کہا ”میرے دوست سکندر بخت۔“

نازلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں اس کے حسنِ فتنۂ محشر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ”آپ واقعی بلیک بیلٹ ہیں۔ مجھ سے اکرام نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ جوڈو کہاں سے سیکھا ہے آپ نے؟“

”اکرام ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔“ میں نے مسکرا کے کہا ”مجھے جوڈو وغیرہ نہیں آتا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ بلیک بیلٹ تو اس وقت بھی باندھ رکھی ہے اس نے نازی!“ اکرام شیخ نے کہا ”تو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ ایک ہاتھ مار دیا نا تیرے۔ تو یہاں سے ڈولی میں نہیں اسٹریچر پر جائے گی۔ سسرال نہیں اسپتال۔“

”بھیّا میں مار دوں گی۔“ نازلی چلّائی اور میں بہن بھائی کی اس دلچسپ لڑائی میں اپنے سارے فکر و غم بھول گیا۔

تیس بتیس سال کی ایک عورت اندر آئی ”کیا شور ہے یہ۔ پھر لڑ رہے ہو بچّوں کی طرح؟“ اس نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔

”یہ میرے دوست ہیں سکندر بخت عرف سکندر اعظم ثانی۔“ اکرام شیخ نے میرا تعارف کرایا ”ان کی فتوحات اور معرکہ آرائی کا ذکر تو آپ سنتی ہی رہتی ہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ شیخ نے تعارف کو ادھورا کیوں چھوڑ دیا۔ وہ اس کے باپ کی دوسری بیوی تھی جسے وہ ماں نہیں کہتا تھا۔ یہ بات وہ پہلے میرے سامنے تسلیم کر چکا تھا لیکن اس وقت وہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی سوتیلی ماں کو اپنی ماں بھی نہیں کہنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ”یہ ہیں میری آنٹی۔“

”آپ نے بہت دیر کی سکندر صاحب! ہم سب نے آپ کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا!“ وہ بے حد اخلاق اور شائستگی سے بولی ”اب آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ نماز پڑھ کے آ جائیں۔ آپ بیٹھیں، میں کھانا لگاتی ہوں۔“ وہ لوٹ گئی اور میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ کہیں جوڈو سیکھ رہی ہیں؟“ میں نے نازلی سے مخاطب ہو کے کہا۔

”جی۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں۔“ نازلی نے بڑے فخر سے کہا۔

”یہ بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا ”ہمارے ملک کی لڑکیوں نے خود کو چھوئی موئی بنا رکھا تھا۔ حالانکہ زمانہ ایسا ہے کہ سب کو اپنا دفاع اور اپنی حفاظت کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ افراد کی طاقت ہی قوم کی طاقت ہے۔“

نازلی نے بھائی کی طرف دیکھا ”یہ ہمارے بھیّا کبھی آپ سے اتفاق نہیں کریں گے۔ یہ تو کہتے ہیں بس ایک ریوالور کافی ہوتا ہے۔ ہاتھ پیر چلانے کا فن سیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

”یہ تو ہے۔“ اکرام شیخ نے کہا ”ہاتھ میں ریوالور ہو تو بلیک بیلٹ کا باپ قریب نہیں پھٹک سکتا۔“

”ہر شخص ہر وقت اور ہر جگہ تو ریوالور لے کر نہیں پھر سکتا۔“ میں نے کہا ”خصوصاً لڑکیاں۔“

”یہی میں کہتی ہوں ان سے۔“ نازلی کا چہرہ مسرّت سے دمکنے لگا ”سچ بتائیں آپ بلیک بیلٹ ہیں؟“

اس نے اتنی معصومیت سے سوال کیا تھا کہ میں جھوٹ نہ بول سکا ”بھئی بیلٹ وغیرہ تو لی نہیں۔ مگر لندن میں ایک اسکول تھا، جوڈو اور کراٹے کا۔ وہاں میں نے مسلسل تربیت حاصل کی تھی اور تربیت دینے والے جاپان کے سند یافتہ بلیک بیلٹ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ مجھ میں ایک خداداد صلاحیت ہے اور بلیک بیلٹ مل جاتی مجھے، اگر لندن سے کِک آؤٹ نہ کیا جاتا۔“

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نازلی نے حیرت اور مسرت سے ایک "ہائے اللہ" قسم کی خالص زنانہ آواز نکالی: "پھر تو آپ مجھے بھی کوچ کر سکتے ہیں۔"

"سوری۔" میں نے کہا: "ان۔نوں مجھے ایک۔ بلکہ کئی اہم آپریشن درپیش ہیں۔" شیخ نے سر ہلا کے میری تائید کی۔

"آپریشن؟" وہ ہکا بکا رہ گئی: "تو آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔ سرجن۔"

وہ آپریشن کا مطلب سرجیکل آپریشن سمجھی تھی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ عام گفتگو میں یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا کہ اکرام شیخ نے اسے میرے مقدمات اور قانونی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

"سرجن ۔" میں نے کہا: "بس یہی سمجھ لو۔ کچھ لوگ ہیں جن کے دماغ درست کرنے ہیں۔ کام بہت مشکل ہے۔"

"دماغ کا آپریشن بہت خطرناک ہوتا ہے۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ وہ مجھ سے سخت متاثر اور مرعوب ہو چکی تھی۔

"تم بھی بیک وقت جوڈو اور شاعری سے شوق کرتی ہو؟" میں نے اس کی پھینکی ہوئی کتاب اٹھالی۔

"بھی کا مطلب یہ کہ سکندرِ اعظم بھی گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"کون سے اسکول میں پڑھتی ہو تم؟" میں نے کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔

"اسکول میں؟" اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا: "کیا میں آپ کو ننھی سی بچی نظر آتی ہوں۔ بس تھرڈ ایئر میں ہوں جناب!"

اکرام شیخ کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا: "بات تھرڈ ایئر کی نہیں۔ عقل کے اعتبار سے تم اسکول کی بچی کے برابر بھی نہیں ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اٹھارہ سال کی بالغ لڑکی ہو۔ مگر بالغ اور عاقل میں بڑا فرق ہے۔"

وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ دوبارہ اس سے کھانے کی میز پر ملاقات ہوئی لیکن اس کا منہ پھولا رہا اور شیخ کی چھیڑ چھاڑ کے باوجود وہ خاموش رہی۔ مجھے وہ گھر اور وہ سب لوگ بہت اچھے لگے جہاں رہنے والے تمام تفکرات سے آزاد تھے اور اعتماد کے باہمی رشتے میں اس طرح منسلک تھے کہ سب مل کر اس گھر کی تکمیل کرتے تھے۔ جیسے الگ الگ کڑیوں کے ملنے سے ایک زنجیر بنتی ہے۔

کھانے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو شیخ نے کہا کہ وہ مجھے اپنے اسکوٹر پہ چھوڑ دے گا جس کا اصل مقصد باہم تبادلۂ خیالات کرنا تھا۔ ہم نسبت روڈ تک باتیں کرتے گئے۔ وہاں پہنچ کے مجھے معلوم ہوا کہ یاسمین اس مکان کو چھوڑ کے جا چکی ہے۔ اس کے بزرگ مالک مکان نے اتنا تو بتا دیا کہ وہ ملک سے باہر ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کس ملک میں ہے۔ میرے اطمینان کے لیے یہی بات کافی تھی کہ فی الحال وہ کسی کی دسترس میں نہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ چوہدری دلاور نے وہ کیسٹ سن لیا ہوگا۔ تب بھی وہ یاسمین کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

شام ہونے والی تھی جب اکرام شیخ نے مجھے رضوی صاحب کے گھر کے اندر اتارا۔ میں کھلا گیٹ دیکھ کر سوچ ہی رہا تھا کہ یہ بے احتیاطی میں نے جاتے وقت کی تھی یا بعد میں کوئی آیا تھا کہ مجھے حشمت خان نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی اور بھی تھے۔ وہ مجھے میر محمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے تھے۔

شیخ کو میرے ساتھ دیکھ کے حشمت خان کو کچھ مایوسی ہوئی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں ماتحت بڑے اطمینان سے لان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور وہ خود بحیثیت افسر کے ایک کرسی پر متمکن تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا: "کس کی اجازت سے اندر آئے ہو؟"

"پولیس کو تفتیش کے لیے بھی کسی سے اجازت لینی پڑتی ہے اپنے سکندر صاحب؟" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"میں نے تفتیش کے بارے میں نہیں، تمہارے بلا اجازت اندر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔" میں نے اسی لہجے میں کہا: "تفتیش اپنے تھانے میں جیسے چاہے کرو۔ یہ ایک بڑے پولیس آفیسر کا گھر ہے۔"

"تو ہم کون سے گھر کے اندر گھس گئے ہیں جو آپ گرمی دکھا رہے ہو۔" حشمت خان نے ماتحتوں کی موجودگی میں اپنی سبکی محسوس کی۔ خود یا تحت اس کی عزتِ نفس کا دفاع کرنے سے قاصر تھے۔

"تمہیں باہر انتظار کرنا چاہیے تھا حشمت خان!" ایس آئی شیخ نے متانت سے کہا: "تمہیں معلوم ہے گھر پر کوئی نہیں؟"

"لیکن گیٹ کھلا پڑا تھا۔" حشمت خان نے احتجاج کیا۔ "ہم نے یہاں سے کیا اٹھا لیا ہے؟"

"اگر اندر والے دروازے کھلے پڑے ہوتے تو تم کیا کرتے؟" میں نے برہمی سے کہا: "رضوی صاحب کے بیڈ روم میں استراحت فرماتے؟ مجھے اجازت دو گے تم کہ تمہارے گھر کا دروازہ کھلا دیکھوں تو اندر جا بیٹھوں؟ تم صریحاً مداخلتِ بیجا کے مرتکب ہوئے ہو حشمت خان! اور رضوی صاحب موجود ہوتے تو اس وضاحت کے باوجود تم معطل کر دیے جاتے۔ یہ کرسی تمہارے تھانے کی نہیں، رضوی صاحب کی ذاتی ملکیت ہے اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔" میں نے اسے نہایت تحقیر آمیز انداز میں ایک انگلی سے اشارہ کیا۔ مہمان کی تو بات

ہی الگ ہے اگر اس کی جگہ کوئی اجنبی یا شریف آدمی ہوتا تو میں اتنی معمولی سی بات پر یہ مسئلہ کھڑا نہ کرتا مگر حشمت خان جیسے لوگ میرے نقطۂ نظر سے ہر تذلیل کے مستحق تھے جو کسی شریف آدمی کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے ہی لوگ پولیس کے ماتھے پر بدنما داغ ہیں۔ اگر ایس آئی شیخ جیسا۔ کوئی ایماندار و ذمے دار افسر ہوتا تو میں اسے معاف کر دیتا اور میرا رویہ اس کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔

"تم کو معلوم ہے۔" احساسِ ذلت سے حشمت خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا: "میرے آنے کا مقصد...."

"تمہارے آنے کا مقصد اگر مجھے یہیں پھانسی دینا بھی ہے تو میں بعد میں معلوم کر لوں گا۔" میں نے چٹکی بجا کر اس کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے کہا: "گیٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔ دروازے سے باہر جاؤ۔ کال بیل بجاؤ اور میرے آنے کا انتظار کرو۔ اگر دو منٹ میں تم باہر نظر نہ آئے تو میں تمہارے خلاف مجرمانہ مداخلت کا کیس درج کرانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ سب انسپکٹر شیخ تمہارے جرم کے گواہ ہیں۔"

حشمت خان آہستہ آہستہ اٹھا اور اس نے گھٹنے پر رکھی ہوئی ٹوپی سر پر جمائی۔ "باہر نکلو۔" اس نے ایک خوفناک گالی دی اور غرا کے دونوں ماتحت سپاہیوں کو مخاطب کیا۔ "اتنا سن کے بھی بیٹھے ہوئے ہو بے غیرتو!"

دونوں سپاہی بڑی پھرتی سے اٹھے اور پلٹ کر دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گئے۔ پھر حشمت خان نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے ایک قدم بڑھایا۔ میں نے زیرِ لب مسکرا کے شیخ کی طرف دیکھا اور اسے آہستہ سے آنکھ ماری۔ وہ تمام معاملے سے قطعی لاتعلق اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر!" حشمت خان رک کر بولا۔ "تم پچھتاؤ گے۔"

"آؤٹ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے آج تک کچھ بھی اچھا نہیں کیا لیکن پچھتانا مجھے نہیں آتا۔ اچھا تم نے بھی میرے ساتھ نہیں کیا مگر وہ سب جو تم نے اب تک اپنے حق میں کیا، زیادہ برا تھا۔ اس کا اندازہ تمہیں میر محمد کے انجام سے ہو جانا چاہیے۔"

حشمت خان تڑپ کے پلٹا اور شاید جواب میں گالی دینے کی خواہش پر قابو پا کے باہر نکل گیا۔ میں نے گیٹ بند کر دیا۔

"یہ کس چکر میں آیا ہے؟" شیخ نے موقع پاتے ہی کہا: "تم کیا چاہتے ہو؟ میں ٹھہروں کہ جاؤں؟"

"میرا خیال ہے تم کچھ دیر رک جاؤ۔" میں نے کہا: "پہلے میں اس کی بات سن لوں۔ تمہاری موجودگی میں وہ ذرا محتاط رہے گا۔"

حشمت خان نے باہر سے کال بیل بجائی، اس کی آواز گھر کے اندر سے آئی۔ میں نے شیخ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں مقفل دروازے کو کھول کر اندر چلے گئے۔ دوبارہ گھنٹی بجی تو میں شیخ کے ساتھ باہر آیا۔ میرے ہاتھ میں ایک قفل تھا جو میں نے گیٹ کو بند کرنے کے بعد اندر کی طرف لگا دیا۔ "ہاں بھئی حشمت خان! اب بولو کیا بات ہے؟" میں نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔

"دراصل رضوی صاحب کہہ گئے تھے کہ میری عدم موجودگی میں گھر کا پوری طرح خیال رکھنا۔"

"میں انسپکٹر میر محمد کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"گویا مشتبہ افراد میں میرا نام شامل کر لیا ہے تم نے؟" میں نے کہا: "تم جیسے فرض شناس افسروں نے محکمے کا نام واقعی بہت روشن کیا ہے۔ میر شرافت علی کے قتل سے لے کر اب تک کتنے افراد کے قتل میں ملوث کر چکے ہو تم مجھے؟ ناکامی کی پروا مت کرو اور آئندہ بھی کوشش جاری رکھو۔ لاہور میں کیا، سندھ و آسام میں بھی کوئی واردات ہو جائے تو میرا نام لکھوا دو۔"

"بات کو خواہ مخواہ مت بڑھاؤ اپنے سکندر صاحب!" حشمت خان بولا: "ہمیں باقاعدہ رپورٹ ملی ہے اور میں صرف پوچھ گچھ کے لیے آیا ہوں۔ تم سے زبانی باتیں کر دوں گا اور چلا جاؤں گا۔ میں نے تمہارا نام ایف۔ آئی۔ آر میں نہیں لکھا ہے لیکن تم نے یہی رویہ رکھا تو میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ بھی لے آؤں گا۔"

مجھے اس کیس میں ملوث کرنے کے بعد میرے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن میری پریشانیوں میں تھوڑا سا اضافہ ضرور ہو جاتا۔ میر محمد کا تعلق براہِ راست ان سب مقدمات سے تھا جو میرے خلاف زیرِ سماعت تھے۔ میری طرف سے اس پر متعدد ایسے الزامات بھی عائد کیے جا چکے تھے جن سے میری اور اس کی عداوت کے اسباب عدالت کے ریکارڈ پر آ گئے تھے مثلاً میں نے پہلی رات تھانے میں تشدد کی کارروائی کا ذمے دار اسے ٹھہرایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے وہ ٹیپ غائب کر دیا جسے سن کر محرر نے عبدل کا آخری بیان تحریر کیا تھا۔ ٹیپ کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ میر شرافت علی کے قتل کے کیس کے دونوں چشم دید گواہ یعنی عبدل اور شیدے کو قتل کرنے والا میں نہیں تھا۔ اب اگر میر محمد کے کیس میں بھی میرا نام آ جاتا تو مجھے ایک اور ضمانت حاصل کرنا پڑتی۔ قتل کی کسی ایف آئی آر میں نام آ جائے تو مقدمے کا فیصلہ ہونے تک خارج ہونا مشکل ہی نہیں عملاً ناممکن

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

ہوتا ہے۔

"آل رائٹ۔" میں نے کہا۔ "تم چلو، میں شیخ کے ساتھ پولیس اسٹیشن آتا ہوں جو پوچھنا ہے، وہیں پوچھ لینا۔ میں اپنے وکلاء کو بھی مطلع کر دوں اور ان سے مشورہ بھی لے لوں۔"

"صرف پوچھنے کی بات ہوتی تو ہم اتنی نفری لے کر آپ کے درِ دولت پر کیوں حاضر ہوتے۔" وہ طنزیہ اور تمسخر آمیز لہجے میں بولا۔ "ہمیں اندر کچھ دیکھنا ہے۔ میں وارنٹ لے کر تو نہیں آیا مگر۔۔۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرا گھر ہوتا تو میں ضرور اجازت دیتا مگر صاحبِ خانہ کی عدم موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔"

"اور یہ جو تمہارا یار شیخ اندر بیٹھا ہے۔ وہ بھی تو تھانیدار ہے سکندر صاحب!" حشمت خان نے احساسِ ذلت کے ساتھ کہا۔

"وہ کسی قسم کی تفتیش کے سلسلے میں نہیں آیا ہے حشمت خان!" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ شیخ آدمی ہے تھانیدار نہیں جب رضوی صاحب آجائیں تو خانہ تلاشی کے وارنٹ سمیت حاضر ہو جانا۔ ابھی تو وہ اسلام آباد میں ہیں۔"

"میں نے خانہ تلاشی کی تو بات نہیں کی۔" حشمت خان بولا۔ "مجھے صرف وہ گاڑی دیکھنا تھی جو تمہاری۔۔۔۔ وکیل مس رابعہ قاری کی ہے۔"

"وہ گاڑی دیکھ کے کیا کرو گے؟" میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "کئی بار تو دیکھ چکے ہو۔ اس کے علاوہ، دیکھنے کا ہی شوق ہے تو اس جیسی کوئی بھی فاکس ویگن دیکھ لو۔ لاہور میں سیکڑوں پھر رہی ہیں۔ خریدنے کا خیال ہے کیا؟ تمہارا یہ دھواں دھار چھکڑا۔۔۔" میں نے اس کی موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا۔

"سکندر صاحب! بہت ہو چکی۔" حشمت خان کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آج صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے تم وہ گاڑی لے کر پھر رہے تھے اور اس گاڑی میں کوئی قتل ہوا تھا۔ تم نے ایک پیٹرول پمپ پر مارپیٹ کی تھی اور فرار ہو گئے تھے کیونکہ پیٹرول پمپ کے ملازم نے گاڑی میں لاش کا سر دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے نمبر بھی نوٹ کر لیا تھا اور یہ نمبر مس رابعہ کی گاڑی کا ہے۔"

پیٹرول پمپ کے واقعات غلط نہیں تھے مگر نمبر دیکھنے والی بات جھوٹ تھی۔ جب میں فرار ہوا تھا تو پیچھے والی نمبر پلیٹ پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ یہ نمبر پولیس والے پہلے سے جانتے تھے۔ اگر پیٹرول پمپ والوں نے کسی لمبے چکر سے بچنے کے لیے پولیس اسٹیشن فون کیا ہوگا کہ اس حلیے اور رنگ کی ایک گاڑی جسے اس قسم کا ایک جوان چلا رہا تھا، پیٹرول لینے رکی تھی اور اس میں کسی لاش کا سر

رکھا تھا تو میر محمد کے سر کو ایک خاص مقصد کے تحت اس گا
کی پچھلی سیٹ پر رکھنے والوں نے فوراً پیٹرول پمپ والوں
سمجھا دیا ہوگا کہ انہیں کیا بیان دینا ہے۔ گاڑی کا نمبر بتا
کے علاوہ ان کو یہ بھی کہنا ہوگا کہ سر پچھلی سیٹ پر رکھا تھا
اور گاڑی کو شناخت کرنے والے یہ گواہ ایسے تھے کہ انکی جانب
کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بیان میں اگر حقیقت
عنصر پچھتر فیصد ہوتا تو باقی پچیس فیصد پولیس کے دباؤ سے
شامل ہو جاتا کہ مجموعی طور پر اس سچ پر جھوٹ کا شائبہ تک

"اگر میں قفل نہ کھولوں حشمت خان!" میں نے سوچ
کہا۔ "تو تم زبردستی اندر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ رضوی صا
کی واپسی تک تمہیں یہاں گارڈ بٹھانی پڑے گی کہ کہیں ملزم
فرار نہ ہو جائے۔ چونکہ مجھے فرار ہونا ہے، اس کے لیے مجھے عدا
سے اجازت مل چکی ہے اس لیے میں تم کو برضا و رغبت اند
تشریف لانے کی دعوت دیتا ہوں۔" میں نے قفل کھولتے ہو
کہا۔ "تم اگر چاہو تو میرے ساتھ گھر کے ہر کمرے میں، ہر میز کی دراز
کھول کے بھی دیکھ سکتے ہو کہ گاڑی کہیں بھی چھپائی نہیں گئی
حشمت خان نے باضابطہ طور پر اندر قدم رنجہ فرمایا۔ "یہا
نہیں ہے تو وہ گاڑی کہاں ہے سکندر صاحب؟"

"یہاں سے کوئی پونے دو سو میل دور۔" میں نے دانت
نکال کے کہا۔ "اب تم پوچھو گے کیوں؟ تو تھانیدار صاحب ملک
کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو مالک کو اپنی گاڑی لے کر پاکستان
کی جغرافیائی حدود میں کسی بھی سمت میں جانے سے روک سکے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر صاحب!" حشمت خان
نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن اس طرح تم بچ نہیں سکتے۔"

"یہ دعویٰ اب تک اتنے لوگ کر چکے ہیں کہ اب مجھے ہنسی
تک نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ "میں قانون سے تعاون کو فرض
سمجھنے والا شہری ہوں اور اگرچہ تم میری نظر میں لاقانونیت کے
علمبردار ہو مگر میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اپنا اطمینان کر لو۔"

شیخ ڈرائنگ روم میں صوفے پر نیم دراز تھا اور تازہ اخبار
ملاحظہ کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ سیدھا بیٹھ گیا۔

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے شیخ صاحب!" حشمت خان
نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی موجودگی میں ہماری
اتنی بے عزتی خراب ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی پولیس افسر ہیں۔ پھر
آپ ایک ملزم کے ساتھ پھرتے ہیں۔"

"میں استعفیٰ دے چکا ہوں حشمت خان۔" شیخ نے بے نیازی
سے کہا۔ "تمہیں میرے ذاتی قول و فعل کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہی تو بڑی مشکل ہے۔" حشمت خان نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ملزموں کو پولیس افسروں کی پشت پناہی مل جاتی ہے۔ ہم کیا کریں؟"

"تم اپنا کام کرو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تمہارے سامنے ٹیلی فون رکھا ہے۔ میں تم کو اسلام آباد میں ایک ڈپٹی سیکرٹری کی کوٹھی کا نمبر دیتا ہوں۔ خود بات کر لو جس سے چاہو۔ رضوی صاحب بھی وہیں ہیں۔ رابعہ بھی اور دونوں گھروں کے افراد بھی۔ سب لوگ اپنی اپنی گاڑی میں ایک ساتھ ہی گئے تھے۔"

حشمت خان کا ہاتھ بڑھا اور رک گیا۔ میرے اعتماد نے اس کے ارادے کو متزلزل کر دیا تھا، ویسے بھی کسی ڈپٹی سیکرٹری، کسی بیرسٹر خاتون یا ایک ایس ایس پی سے بات کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

"تمہارا۔۔۔ مطلب ہے۔۔۔۔ وہ سب جھوٹ ہے۔ پیٹرول پمپ کے وہ معمولی ملازم دشمن تو نہیں ہیں تمہارے۔"

"تم جسے چاہو میرے خلاف صفِ دشمناں میں کھڑا کر دو حشمت خان!" میں نے تلخی سے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ تم جھوٹ بھی وہ بولتے ہو جس کے پیر نہیں ہوتے۔ جھوٹ بولنے کے لیے بھی تمہارے پاس عقل کہاں۔"

"سکندر صاحب!" حشمت خان نے کہا۔ "ہم ان پڑھ لوگ ضرور ہیں۔ تم جیسے سیانے لوگ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف علم سے تجربے کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ آج ہی صبح ایک انسپکٹر تفتیش کے لیے آیا تھا تو اس نے وہی گاڑی یہاں دیکھی تھی۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم اسی وقت کہیں سے آئے تھے اور تمہاری گاڑی کو دیکھ کر کتے بھونکنے لگے تھے۔ کتے بلا وجہ ہر گاڑی پر تو نہیں بھونکتے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "مثلاً تمہاری اس موٹر سائیکل جیسی چیز پر ضرور بھونکتے ہوں گے مگر جہاں تک کسی انسپکٹر صاحب بہادر کا سوال ہے تو عرض یہ ہے کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں مجھے صرف دو انسپکٹر ملے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ انسپکٹر کا بیان غلط نہیں تھا۔" حشمت خان بولا۔

"کس کا بیان؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ایک انسپکٹر تو شیخ ہے، دوسرے تم ہو۔ تم دونوں نے کوئی بیان دیا ہے؟"

"میں اس کی بات کر رہا ہوں جو آج صبح تم سے ملا تھا۔" حشمت خان کا موڈ خراب ہو گیا۔

"آج صبح کوئی الو کا پٹھا مجھ سے ملنے یہاں نہیں آیا۔" میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔ "اور آیا ہوگا تو جھک مار کے لوٹ گیا ہوگا۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گزشتہ رات بھی میں ایک دوست کے گھر تھا۔ وہ میرا دوست بھی ہے اور میرا وکیل بھی۔ تم چاہو تو تصدیق کر سکتے ہو کہ میں رات کو عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے گھر سویا تھا یا نہیں۔ وہ خود تو اس وقت ہوگا نہیں لیکن یہ بات تو اس کی بیوی بھی بتا دے گی کہ صبح میں کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اس کے بعد میں شیخ کے گھر چلا گیا تھا۔ شیخ تمہارے سامنے بیٹھا ہے لیکن تم اس کے گھر فون کر لو۔ وہاں اس کے والد اور گھر کے دیگر افراد ہیں۔ وہ تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کل شام سے اب تک میں کہاں تھا۔ یہ بھی پوچھ لینا کہ میں گاڑی لے کر گیا تھا یا پیدل۔ اس کے بعد پیٹرول پمپ والوں کو تھانے بلا کے سچ پوچھنا۔ شاید اس وقت وہ نشے میں نہ ہوں۔"

حشمت خان کی مایوسی اور بے بسی قابلِ دید تھی۔ میرے اعتماد کے علاوہ میرے حوالوں نے اس کی تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ سارا منصوبہ جو مجھے میر محمد کے سرِ بریدہ کے ساتھ گرفتار کرنے کا تھا، فلاپ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں اس جال سے صاف بچ گیا تھا اور اس نے اپنے سازشی منصوبے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی تھی تو میں نے زیادہ بڑے جھوٹ سے اس کو ناکام بنا دیا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میرے گواہ زیادہ معتبر اور ناقابلِ تردید تھے۔ ان کی گواہی کو مسترد کرنا ناممکن تھا۔ حشمت خان دوسروں کا مہرہ تھا۔ وہ بہت بڑے شاطر تھے لیکن حشمت خان بہت چھوٹا پولیس افسر تھا۔ اگر اس میں ہمت ہوتی تو وہ اسلام آباد فون ضرور کر لیتا اور پھر میرے جھوٹ کا پردہ چاک ہو جاتا لیکن میرا اعتماد میرے کام آیا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ جھوٹ ہونے کے باوجود سچ وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں اور وہ گاڑی واقعی رابعہ اپنے ساتھ اسلام آباد لے جا چکی ہے۔ اسے یقین [illegible] ہوگا کہ رابعہ صبح انسپکٹر سے میری ملاقات کے بعد گاڑی لے کر [illegible] گی تو چار پانچ گھنٹے میں اسلام آباد جا پہنچی ہوگی لیکن اس سے پوچھا گیا تو وہ بھی یہی کہے گی کہ وہ اپنی گاڑی میں گزشتہ روز اسلام آباد پہنچی تھی۔ اسی طرح شیخ یا عبدالودود منظر کے گھر فون کرنا اسے بے سود نظر آتا تھا۔ وہاں کون تھا جس سے حشمت خان کو مختلف بیان کی توقع ہوتی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم سب نے مل کے طے کر لیا ہے کہ ہمیں کیا کہنا ہے چنانچہ ہمارے بیانات میں سرِ مو فرق نہ ہوگا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن حشمت خان کے مایوس ذہن کا ردِ عمل حالات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی حوصلہ شکن تصویر پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے کہیں بھی فون نہیں کیا۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ وہ لاہور میں ہی رابعہ کی گاڑی کو تلاش کرتا ہوا اس گیراج تک جا پہنچے گا جہاں میں نے گاڑی کو ڈینٹ پینٹ ہونے کے لیے دیا تھا۔ بے شک میں اس کی سیٹ بدل چکا تھا لیکن آگے ڈکّی میں خون کے ذرّات کی موجودگی بہت کچھ ثابت کر سکتی تھی۔ ہفتہ بھر کے بعد تو نئی چمکتی دمکتی گاڑی کو میں خود بھی اسی پیٹرول پمپ پر لے جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ نئے رنگ و روغن کے بعد کسی لہو کا سراغ ملنا بھی ناممکن تھا۔

"میر محمد کے کیس کی کیا پوزیشن ہے حشمت خان؟" شیخ نے اخبار رکھ کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"لاش تو جناب کو مل ہی گئی تھی۔" وہ طنز آمیز تعظیم سے بولا۔ "سر کوئی تھانے میں ڈال گیا۔"

"کوئی کا کیا مطلب؟" شیخ نے کہا۔ "اور کہاں ڈال گیا؟ ایس۔ ایچ۔ او صاحب کے کمرے میں؟"

"ملندر صاحب کی صحبت میں آپ بھی مسخرے ہوتے جا رہے ہیں۔" حشمت خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "ہم نے دیکھا ہی ہوتا کسی کو تو اسے جانے دیتے؟ سر عمارت کے پچھلے حصے میں پڑا ہوا ملا تھا، کھلے گٹر میں۔"

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس انسپکٹر کے لیے اپنی جان چھڑانے کا اور کوئی آسان طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی اس پر انکشاف ہوا ہو گا کہ اپنے بیگ میں مالِ غنیمت کے ساتھ وہ ایک پولیس والے کی سری بھی لیے پھر رہا ہے، وہ ساری بات سمجھ گیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ لوٹ کر بھی آیا ہو مگر اس وقت تک میں گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ کسی جھمیلے میں پڑنے کے بجائے اس نے سوچ سمجھ کر سر کو سپردِ گٹر کیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ اپنا مسئلہ حل کیا بلکہ پولیس کی مشکل بھی آسان کر دی۔ اب ان کے پاس سالم میر محمد جملہ اعضا کے ساتھ موجود تھا۔ جسے مقتول ثابت کیا جا سکتا تھا اور اسے نہ میرا نام لینے کی ضرورت تھی نہ کسی اور کی۔ شیخ مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

"میرا مشورہ تو ان حالات میں یہ ہے حشمت خان! کہ ہم لوگ سب کچھ بھول جائیں۔" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ پیٹرول پمپ والے بھول جائیں کہ نشے کی کیفیت میں انہوں نے کیا دیکھا تھا۔ تم ان کی رپورٹ کو بھول جاؤ۔ میں بھول جاتا ہوں کہ تم یہاں آئے تھے اور تمہارے اور ہمارے درمیان غلط فہمی کی بنیاد پر کوئی بات ہوئی تھی۔ پُرسکون زندگی گزارنے کا ایک نسخہ یہ بھی ہے کہ آدمی بے بنیاد خیالات کے انتشار سے بچے اور جو بات ثابت نہ ہوتی ہو، وہ بے بنیاد خیال سے زیادہ فضول ہوتی ہے۔ تم جو قانون کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ اسی سچائی کو تسلیم کرتا ہے جو ثابت بھی کی جا سکے۔"

معلوم نہیں حشمت خان کس موڈ میں تھا کہ جواب دینے کے بجائے وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اپنی کون سی خاندانی دشمنی چل رہی ہے سکندر صاحب! ہم تو گیہوں کے ساتھ پس جانے والے گھن ہیں۔"

"اور تم محض لالچ کے باعث چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آ گئے ہو۔" میں نے کہا۔ "چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے۔ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے۔ ذرا احساب کرو کہ اس چلتی ہوئی چکی میں کتنے پس گئے۔ کیا میر محمد کے سر کو گٹر میں سے نکالتے وقت تمہیں بالکل خیال نہیں آیا تھا حشمت خان کہ یہ سر تمہارا بھی ہو سکتا ہے؟"

"میں..... میں..... میں ایسا کیوں سوچوں؟" حشمت خان کا رنگ اڑ گیا۔ "ویسے تو اس نوکری میں بدنامی اور خطرات کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ سر کو ہتھیلی پر رکھ کے پھرنا ہی پڑتا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم تفتیش کر چکے۔ اب تم میرے مہمان ہو۔ ہماری گفتگو آف دی ریکارڈ ہو گی۔ تم نے تسلیم کیا ہے کہ ذاتی طور پر تمہیں مجھ سے کوئی عداوت نہیں تھی۔ پھر یہ کیا تھا حشمت خان! جس نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم نے ایک ٹیپ کو غائب کرنے میں میر محمد کا ساتھ دیا۔ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ میری بے گناہی کا وہی ایک ثبوت ہے اور اگر وہ ثبوت نہ رہا تو شاید استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کا الزام براہِ راست مجھ پر آ جائے گا۔ کرنے والے تو بہت دنوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے دھکیل کر تختۂ دار تک لے جائیں۔ اس کوشش میں ان کا اپنا کیا انجام ہوا، یہ تم اب بھی نہیں سمجھے؟ تم ہتھیلی پر سر رکھ کے نہیں، ہتھیلی پھیلائے پھر رہے ہو اور تمہاری ہتھیلی میں سوراخ ہے۔ اس کو شاید دولت نہیں بھر سکتی۔ ایک دن قبر کی مٹی ضرور بھر دے گی۔"

"ایسی آف دی ریکارڈ باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ نروس ہو کے بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب تمہارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا کہ ڈی سلوا نہیں رہا۔ اسے کتنا غرور تھا اپنی طاقت کا اور میر محمد نہیں رہا۔ اس نے بھی ساری خدائی کو اپنی قوّتِ تسخیر میں سمجھا تھا۔ ان سے پہلے بہت سے نمرود اور فرعون گزرے جو اتنی سی بات نہ سمجھ پائے کہ ملنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ تم نے میری زندگی کی قیمت کیا وصول کی تھی؟ بلکہ اس سوال کو یوں سمجھو کہ لگانے والوں نے میری زندگی کی جتنی قیمت لگائی تھی، اس میں سے تمہارا حصہ کیا تھا؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" حشمت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا تھا۔

"میں تم پر ایک الزام لگا رہا ہوں اور اس کے باوجود مجھے تمہاری برہمی کا یہ انداز بھی کھوکھلا لگتا ہے۔ تم خوفزدہ ہو حشمت خان!" میں نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟ مجھے کچھ معلوم نہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے صحیح رقم کا اندازہ نہیں مگر میں جانتا ہوں کہ میر محمد نے وہ ٹیپ میری جان کے دشمنوں کو فروخت کرنا چاہا تھا۔ اور وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا تھا کہ اسے خاصی رقم پیشگی مل گئی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ اکیلا ساری رقم ہضم کر جاتا۔ اس کے شریکِ راز اور برابر کے شریکِ جرم تم بھی تھے۔ اس نے تمہارا حصہ ضرور ادا کیا ہو گا۔ خود تم حصہ لیے بغیر ٹلنے والے کہاں تھے مگر انعام کے بعد انجام کے لیے بھی تیار رہو۔ اپنی بیوی کو بھی وہ سب تفصیل سے بتا دینا جو میر محمد کی بیوی کے ساتھ ہوا۔ وہ بھی ذہنی طور پر تیار رہے اور اتنی ہی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرے جتنا میر محمد کی بیوی نے مرتے دم تک کیا۔"

"تمہارا..... تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟" حشمت خان ہکلایا۔

"بہت سی باتیں تمہیں آج معلوم نہیں لیکن کیا تمہاری لاعلمی سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "جو ہونا ہے وہ ضرور ہو گا۔ میں تو اچھا کر رہا ہوں کہ تم کو قبل از وقت خبردار کر رہا ہوں۔ میر محمد کی بیوی بہت سمجھدار تھی، اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے بچوں کی جان تو بچا لی۔ اگر تمہاری بیوی کچھ نہیں کر سکتی تو تم کوئی انتظام کر لو۔"

حشمت خان نے ٹوپی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

"اور کل صبح کے اخبارات ضرور دیکھ لینا!" میں نے چلا کر کہا۔ "کسی میں تم کو میر محمد کے دونوں بچوں کی تصویروں کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ خبریں ملیں گی۔" میں نے ایک قہقہہ مارا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر تک آیا۔ حشمت خان کے دونوں ماتحت پہلے ہی جا چکے تھے۔ اب وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔

"اب تو بہت پیسہ ہو گا تمہارے پاس۔ نئی کار نہ سہی موٹر سائیکل تو لے لو حشمت خان!" میں نے گیٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "دینے والے تو اتنے سود خور ہیں کہ ایک ہاتھ سے پیسہ دیتے ہیں تو دوسرے سے جان لے لیتے ہیں۔ میر محمد کا مزار تک نہیں بنائیں گے اس پیسے سے جو بیچارے نے جان کی بازی لگا کر کمایا تھا۔"

حشمت خان نے اِدھر اُدھر دیکھ کے مجھے ایک فحش گالی دی اور ہانپتے ہوئے کِک مارتا رہا۔

میں ہنسا۔ "تم جتنی گالیاں چاہے دو، میں مشتعل ہو کے ایک باوردی پولیس افسر پر حملہ نہیں کر دوں گا۔ افسوس حشمت خان! کہ دنیا میں تمہارا کوئی دوست نہیں ہے جو دوستی میں تمہاری خاطر جان دے سکے۔ پیسہ جسے تُو نے دوست رکھا، ہمیشہ جان لیتا ہے اور کسی سے وفا نہیں کرتا۔" اسی وقت موٹر سائیکل ایک پٹاخہ چھوٹنے کے بعد اسٹارٹ ہو گئی۔ "اچھا بھئی! خدا کرے صبح تک تمہارے بیوی بچے، بیوہ اور یتیم نہ ہوں۔ میری فکر نہ کرنا۔ میں رضوی صاحب سے کچھ نہیں کہوں گا۔" حشمت خان کا حوصلہ اتنا پست ہو گیا تھا کہ وہ بڑی عجلت میں فرار ہو گیا۔ خطرے کا احساس اسے یقیناً ہو گیا تھا۔ جو اسکیم میر محمد کے قتل میں مجھے ملوّث کرنے کے لیے اسے سمجھائی گئی تھی، وہ ناکام ہو گئی تھی اور اسے ڈر تھا کہ موردِ الزام اس کی ذات ٹھہرے گی۔ میر محمد کے انجام کے بعد میری باتوں نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ تاہم ڈی سلوا کے مارے جانے کے بعد میری اپنی ذات کے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔ ڈی سلوا اس گروہ کا ایک شکاری تھا جو وزیر خان کے بعد

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مجھے شکار کرنے کے لیے متحد ہوئے تھے۔ استاد پیڈرو اور میر محمد جیسے لوگ تو ان کا آلۂ کار تھے۔ جو کار آمد رہیں تو قیمت رکھتے ہیں اور بے مصرف ہو جائیں تو ختم کر دیے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔ دنیا کے ہر بازار میں قاتل بھی مل جاتے ہیں جو صرف معاوضے کی بات کرتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھتے کہ کس کی جان لینی ہے اور کیوں لینی ہے اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ بازی جان کی بازی ہے اور بازی میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہو سکتی ہے۔ ڈی سلوا کی موت پر ایک فوری انتقامی ردِعمل یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکاری مزید صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں۔ اب تک وہ مجھے زندہ گرفتار کرنے کے لیے حصار کو تنگ کرتے جا رہے تھے اور انہیں امید تھی کہ بالآخر وہ مجھے زیرِ دام لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے لیے وہ بہت بڑی قیمت ادا کر چکے تھے لیکن کامیابی کی منزل ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ تازہ ترین شکست استاد پیڈرو کی گرفتاری تھی جسے وہ ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اسے بچا کے ہم نے ان کے لیے بہت سے تشویش کے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ استاد پیڈرو بہت کچھ جانتا تھا اور اب دشمن نے ہمیں کمزور سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں ڈر ہو گا کہ ہم اپنے مخصوص طریقے آزما کے استاد پیڈرو کی قوتِ مزاحمت کو شکست دے سکتے ہیں اور اسے بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ بات تقریباً یقینی لگتی تھی کہ افشائے راز سے قبل ہی وہ استاد پیڈرو کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا انتظام کر دیں گے۔ خواہ اس کے لیے پیڈرو کو حوالات میں ہی قتل کرانا پڑے یا اسے بزورِ بازو نکال کے لے جانا پڑے۔ مجھے شیخ پر اعتماد تھا کہ وہ پیڈرو کی حفاظت کے انتظامات میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو سکتا چنانچہ میں نے بعد میں اس سے پوچھا ہی نہ تھا کہ قیدی کس حال میں ہے۔ رضوی صاحب نے اپنے گھر میں میری حفاظت کے لیے جو انتظامات کیے تھے وہ درہم برہم ہو گئے تھے اور اب ان کی واپسی تک یہاں میرا صرف اللہ نگہبان تھا تاہم احتیاط کرنا مجھ پر لازم تھا اور مجھے آج کی رات اکیلے سونے میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ میں سارا دن گھر سے غیر حاضر رہا تھا اور اس وقفے میں کسی کا اندر چھپ کے بیٹھ جانا مشکل نہ تھا۔ جو رات کو اندر سے دروازہ کھول دے تو مجھے سوتے میں اٹھا لیا جائے۔ استاد پیڈرو کے حصول کا ایک آسان طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میری رہائی کو اس کی رہائی سے مشروط کر دیا جائے۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ تم پیڈرو کو چھوڑ دو، ہم سکندر کو واپس کر دیتے ہیں۔ چوہدری دلاور ایسے سودے کرنے میں کسی سے کم نہ تھا۔

نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں راسخ ہوتا گیا کہ آج رات ایسا ہی ہو گا اور مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔ پہلے میں نے بھرا ہوا ساتھ رکھ کے گھر کا ہر کمرہ اور ہر کمرے کا ہر گوشہ دیکھا۔ اندر کوئی نہیں تھا لیکن میری تسلی نہ ہوئی۔ اس قسم کی خانہ تلاشی بے سود تھی کسی بھی شخص کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ میں ایک کمرے میں جاؤں تو وہ دوسرے میں کھسک جائے اور میں دوسرے میں پہنچوں تو وہ پھر پہلے میں آ جائے۔ میں نے عقل کے دلائل سے خود کو قائل کرنا چاہا کہ یہ خیال میرے لاشعور میں پنہاں خوف کی پیداوار جو اس لیے غالب آ رہا ہے کہ اچانک مجھے اپنے اکیلے رہ جانے کا ہو گیا ہے۔ محسن، رابعہ، شہلا اور انکل رضوی سمیت اس گھر کے مکین میرے لیے ایک نفسیاتی سہارا تھے جن کی موجودگی میں تنہا کے خوف سے کبھی واسطہ نہ پڑتا تھا۔

میں نے سب کھڑکیاں اندر سے بند کر کے دروازے مقفل کیے اور گھر سے باہر آ گیا۔ رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی اور اس سے ویرانئ شہرِ نگاراں کا تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر لا میں کھڑا رہا۔ اس جگہ جہاں ایک رات میں اور رابعہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ یہ قربتیں اور فاصلے، سب احساس کے کرشمے تھے۔ اس رات وہ میرے کتنی قریب تھی، ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کو کیسے نظر آتا۔ اب وہ مجھ سے دور تھ تو اس کا تصور ایک حقیقت بن کے رگِ جاں سے قریب تر آ گیا اور میں اسے بالکل ویسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اسلام آباد میں محسن اسے دیکھ رہا تھا یا شہلا اور دوسرے لوگ دیکھ رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے سب کے چہرے دکھائی دیے۔ افسر اور ملول۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ میں شریک تھے۔ ان کو ملا ایک دوسرے کے غم میں رفاقت کا جذبہ تو تھا۔ وہ ایک ساتھ رو سکتے تھے اور ایک دوسرے کے آنسو پونچھ سکتے تھے۔ صرف میں اکیلا تھا۔ شام کے ساتھ ہی قنوطیت اسی طرح میرے رگ و پے میں اترنے لگتی تھی جب بھی میں اکیلا رہ جاتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں نے فوزیہ کو یاد کیا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے بہت دور ہے۔ جہاں میرے خیال کی رسائی بھی نہیں۔ وہ میرے خیالات کی دنیا سے بھی اتنی دور چلی گئی ہے کہ اس کا تصور تک دھندلا گیا ہے۔ اس خواب کے نقش کی طرح جسے رواں دواں زندگی کے ہنگا میں یاد رکھنا بھی محال ہو۔

شاید جینے والوں کو ایسے ہی سہاروں کی ضرورت پڑتی وہ مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے۔ راستوں پر ساتھ چھوڑ جا والوں کی جگہ نئے ہمسفر بنا لیتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ خود غرضی؟ دنیا کی چارہ گری یا حقیقت پسندی کی انتہا؟ وہ انتہا جہاں جذبات کی وابستگی بھی عقل کے پیمانے پر حماقت نظر آتی ہے۔ وقت گزرتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بے وجود ہوا، وقت جو آنے والا ہے، وجود کا محتاج ہے۔ جو کچھ ہے، یہی اک پل ہے، لمحہ گزراں۔ آج رابعہ کے بغیر میں ادھورا ہوں جیسے دن کے ساتھ رات کے بغیر وقت کا کوئی تصور نہیں۔ کل اگر رابعہ کا ساتھ بھی نہ رہا تو کیا سفر ایسے ہی جاری رہے گا؟ میری ذات کی تکمیل کوئی اور کر دے گا؟ "نہیں"۔ میں نے گھبرا کے سوچا۔ رابعہ کہاں جا سکتی ہے جو اس کے بغیر میں کہاں رہ سکتا ہوں جو اس نے اپنا سب کچھ دے دیا ہے اور مجھ سے سب کچھ لے لیا ہے اور پھر زندگی کو اس سانچے میں ڈھال دیا ہے جو اس کے لیے اور میرے لیے ایک ہی ہے۔ فوزیہ ایک خواب تھی۔ رابعہ وہ حقیقت جس سے مفر نہیں۔

میں نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور سوچا کہ اگر میں اسی وقت روانہ ہو جاؤں تو رات کو کسی وقت پنڈی پہنچ سکتا ہوں۔ یہاں تو میں نے بلاوجہ وقت ضائع کیا۔ مجھے عدالت سے اجازت ملتے ہی روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ رات بھی کسی دوست کے گھر میں یا ہوٹل میں گزارنے سے کیا حاصل؟ فوزیہ کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا ایک جذباتی عذر بھی تھا اور ایک قانونی عذر بھی لیکن محسن کی ماں کی زندگی کے آخری لمحات میں سب کے ساتھ مجھے بھی موجود ہونا چاہیے۔ بے شک محسن کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مگر خدانخواستہ میں نے اجازت ہونے کے باوجود مسز شیروانی کی آخری رسوم میں شرکت نہ کی تو یہ بہت معیوب بات ہوگی۔

آدھی رات کے بعد اسلام آباد پہنچنے میں میرے لیے بھی پریشانی تھی اور میزبانوں کے لیے بھی۔ صبح پہنچنا بہتر تھا یا صبح روانہ ہونا؟ میں نے اندر جا کے اپنا بریف کیس خالی کیا اور اس میں کپڑوں کے دو جوڑے ڈال لیے۔ میری جیب میں دو ڈھائی سو روپے تھے جو عام حالات میں میری ضرورت کے لیے کم نہ تھے لیکن اسلام آباد میں جہاں میرا کوئی بنک اکاؤنٹ نہیں تھا اور میرے قیام کی مدت غیر یقینی تھی، مجھے پیسے کی ضرورت پڑ جاتی تو رابعہ یا محسن سے مانگنے پڑتے۔ بے شک وہ بھی اپنا ہی گھر تھا اور انکل رضوی یا انکل شیروانی میری ہر ضرورت پوری کر سکتے تھے مگر میں نے بہتر یہ سمجھا کہ خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ اس وقت بنک بند تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ میں کسی کو ایک ہزار کا چیک دے دوں جو وہ صبح کیش کرا لے اور مجھے اس وقت اپنے پاس سے ایک ہزار دے دے۔ شاید شیخ اس کا انتظام کر دے۔ اس کے سوا لاہور میں اپنا کوئی جاننے والا تھا تو استاد ٹیڈی مگر اس کا سراغ لگانا آسان کام نہ تھا۔ شیخ دن بھر میرے ساتھ رہا تھا چنانچہ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر ہوگا اور کچھ دیر قبل آنے والا حشمت خان اسے چارج دے کر جا چکا ہوگا۔

میرا اندازہ درست تھا جب میں پولیس اسٹیشن پہنچا شیخ کو ڈیوٹی پر آئے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔

"یہ کوئی پرابلم نہیں" اس نے مجھ سے چیک لے کر کہا۔ "جیب میں تو تھوڑی سی رقم ہے مگر میں گھر سے منگوا لیتا ہوں۔" اس نے اپنے گھر فون کیا۔ "نازو بی بی!" کچھ دیر بعد "ہاں، ہم تو بالکل خیریت سے ہیں لیکن تمہارے یہ گرو مہاراج مکرم، سکندرِ اعظم بلیک بیلٹ مصیبت زدہ بیٹھے ہیں۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بڑی دکھ بھری کہانی ہے ان کی، مختصراً یہ کہ ہزار کا چیک لیے پھر رہے ہیں اور نقد مانگتے ہیں۔ دیکھو بی بی! ہم پولیس والے کسی پر اعتبار نہیں کرتے، یہ چیک ضرور بوگس ہوگا... تمہاری مرضی... تم کر لو بات۔" اس نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"یہ کیا مصیبت ہے یار؟" میں نے با دلِ ناخواستہ ریسیور ... حوالات کی طرف سے کسی کا نعرہ سنائی دیا۔ "حق اللہ!"

"استاد جی!" نازلی کی شوخ آواز آئی۔ "ہزار روپے ... سکتے ہیں اسی وقت لیکن چند شرائط ہیں۔"

"وہ بھی فرما دیجیے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ذرا آہستہ بات ... یا پھر ٹیلی فون رکھ کے بات کیجیے۔ آواز آ جائے گی۔"

وہ ہنسی۔ "ایک شرط تو یہ ہے کہ معاملہ ادھار کا ہے۔ رات بھر کا سود لگے گا۔ دوسری یہ کہ آپ نے مجھے اسکول کی بچی سمجھا اس کا جرمانہ دینا پڑے گا اور جرمانہ یہ ہے کہ آپ کو مجھے شاگردی میں قبول کرنا ہوگا۔"

"پہلی شرط منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی نامنظور ... تو سود بھی حرام ہے لیکن گناہ تمہارے سر۔"

"چلیے سود اور جرمانہ ایک کر لیتے ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ آئیے اور... چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ باقی رہا شاگردی میں ... کرنے کا معاملہ تو جناب میرا بھیا تھانیدار ہے۔ اسے سب ... کرانا آتا ہے۔" اس نے ہنس کے ریسیور رکھ دیا۔

"یہ تیری بہن بھی کیا چیز ہے یار!" میں نے کان میں ... گھما کے کہا۔ "کان کھا گئی میرے۔ ذرا مجھے اسکوٹر کی چابی دینا۔"

"کیوں؟" شیخ نے مسکرا کے چابی میری طرف کھسکا دی۔ دیا کوئی جرمانہ تم پر بھی۔ بس ایسے ہی مجھ سے بھی جرمانے وصول ... رہتی ہے اور رقم اینٹھتی رہتی ہے۔ اس کے پاس ہمیشہ نقد ... موجود رہتی ہے۔ ادھار دیتی ہے تو اس کی شرحِ سود فی گھنٹہ ... ہے۔ دس فیصد گھنٹہ تک۔ ایک بار رات کو سو روپے لیے ... صبح دو سو دینے پڑے۔"

"مجھے حکم ہے کہ آ کے لے جائیے۔" میں نے کہا۔ "میں ... آتا ہوں۔"

"جانا تو ویسے بھی پڑتا تمہیں۔" شیخ نے کہا۔ "گھر پر کوئی نوکر تو ہے نہیں اور یہاں سے میرا جانا مشکل تھا۔"

✽

نازلی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ آج ہی دن میں اسے دیکھ کر میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ اسکول کی بچی ہے تو کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم اور صورت سے بہت زیادہ معصوم لگتی تھی لیکن اس وقت وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے اہتمام سے ساری باندھی تھی جس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ بال شانوں پر پریشان تھے اور اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔

"تم جا رہی ہو کہیں؟" میں نے اس کے حیا آلودہ رخساروں پر شبنمی مسکراہٹ کا اجالا دیکھ کر کہا۔

"میں..... جی نہیں..... میرا مطلب ہے جی ہاں۔" اس نے کچھ سوچ کے اپنے جواب کو بدل دیا۔ "یہ لیجیے۔" اس نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔ گلابی ہاتھ پر سو سو کے دس نوٹوں کا رول سا بنا ہوا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کی نمی سے بھیگا بھیگا لگتا تھا۔ میں نے نوٹ جیب میں رکھے اور چیک آگے بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے چیک کو غور سے پڑھا اور پھر اطمینان سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے کہا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے کلی محسوس ہونے لگی تھی۔

"کچھ نہیں۔ ہمیں اعتبار ہے آپ پر۔ واپس آ کے لوٹا دیجیے گا۔" وہ اٹھلا کے بولی۔ "میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"چائے؟" میں نے کہا۔ "میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے اس وقت چائے پینے کا۔ بس میں چلتا ہوں اب۔"

"میں کہوں ابو سے؟" وہ مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولی۔ "وہ تھانیدار کے باپ ہیں۔ کھانے پر روک لیں گے۔"

میں مجبور ہو کے بیٹھ گیا۔ کسی کمرے سے ٹی۔ وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید بڑے شیخ صاحب خبریں سن رہے تھے۔

نازلی کا رویہ اچانک میرے لیے پُراسرار اور کسی حد تک پریشان کن ہو گیا تھا۔ وہ نابالغ بچی واقعی نہیں تھی چنانچہ اس کی ہر بات کا اور اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ وہ نادان لڑکی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی جو ہر طرح سے بہت خطرناک بات تھی۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کی دلچسپی کا جواب دلچسپی سے دوں۔ اس کی دل شکنی بھی بہت مشکل اور صبر آزما کام تھا اور انکار یا اقرار، نتائج بہرصورت میری اور شیخ کی بے غرض دوستی پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ میں نے تہیہ کیا کہ آئندہ کبھی ادھر نہیں آؤں گا اور آیا بھی تو رابعہ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ ذرا بھی عقل ہوگی تو نازلی خود سمجھ لے گی کہ میرے اور رابعہ کے درمیان جذبات کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ میں خود کسی نہ کسی طرح یہ بات نازلی کے کان میں ڈال دوں گا کہ میرا اور رابعہ کا ارادہ تمام عمر کی رفاقت کا ہے اور حالات کے سازگار ہوتے ہی ہم ایک ہو جائیں گے۔ میں نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ تو ایسے بھاگ رہے ہیں۔" نازلی نے اپنا کپ رکھ کے کہا۔ "جیسے گاڑی نکلی جا رہی ہو!"

"بجا ارشاد۔ گاڑی واقعی نکل جائے گی۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "مجھے اسی وقت پنڈی جانا ہے۔"

"سکندر جی! اس وقت کوئی ٹرین پنڈی نہیں جاتی۔" اس نے گھڑی دیکھ کے اعلان کیا۔ "اب آپ پہلے مجھے راستے میں میری ایک سہیلی کے گھر ڈراپ کریں گے۔ پلیز! ذرا آپ کو زحمت ہوگی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اگر میں نہیں آتا تو تم کیسے جاتیں؟" میں نے بھنا کے کہا۔ میں اسے دوسرا مصرعہ پڑھنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ شاید وہ پڑھتی بھی نہیں مگر کسی طرح مفہوم کا اظہار کر دیتی۔ میں نے خود کو احمق اور ناسمجھ ظاہر کرنا بہتر جانا جو اشارہ پا کے بھی بات نہ سمجھے۔

"پھر میں ٹیکسی پر چلی جاتی۔ اب پیسے کیوں نہ بچاؤں۔" وہ بولی۔ "اور آپ کیوں اکڑ رہے ہیں جناب! میرے بھیا کا اسکوٹر ہے۔ تھوڑی سی ڈرائیونگ ہی کرنا پڑے گی نا۔ ہم اس کا معاوضہ ادا کر دیں گے۔" وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی اور میرے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے یہ تمام تیاری میرے استقبال کے لیے کی تھی مگر میرے پوچھنے پر فوراً ایک جواز تلاش کر لیا اور میرے ساتھ جانے کا ایک بہانہ بھی۔ وہ کسی بھی سہیلی کے گھر کوئی پروگرام بنائے بغیر صرف ملاقات کے لیے جا سکتی تھی۔ اگرچہ میں اسکوٹر چلاتے وقت بہت محتاط تھا اور سڑک بھی ہموار تھی، پھر بھی میں سخت مشکل میں تھا۔

بالآخر اس نے ایک کوٹھی کے گیٹ پر مجھ سے رکنے کو کہا۔ "اب آپ مانگیں گے اجرت؟"

"جی نہیں۔" میں نے جل کر کہا۔ "صرف اجازت مانگوں گا۔ یہ نہ ہو واپس لے جانے کی بیگار میں پکڑا جاؤں۔" میں نے اس کے اترتے ہی اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنسی اور ہاتھ لہرا کے اندر غائب ہو گئی۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ خیریت رہی اور کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہونے کی نوبت نہیں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آئی، نہ میرے لیے اور نہ نازلی کے لیے۔ بیس منٹ بعد میں نے اسکوٹر کو پھر تھانے میں روکا تو رات کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ تھانے میں ایک وکیل نہ بیٹھا ہوتا تو شاید شیخ مجھ سے پوچھتا کہ اتنی دیر کیوں لگی مگر وہ دونوں بحث میں مصروف تھے۔ میں نے خاموشی سے چابی شیخ کی طرف کھسکائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں وکیل نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

"میں نے کہا نا وکیل صاحب کہ ملزم خیریت سے ہے۔" شیخ نے چابی جیب میں ڈال کے کہا۔

"ملزم! پھر وہی ملزم۔" وکیل نے کہا۔ "میں یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس پر الزام کیا ہے؟"

"حقیقت تو یہ ہے وکیل صاحب کہ وہ ایک بہت پرانے مقدمۂ قتل کے سلسلے میں مطلوب تھا۔" شیخ نے کہا۔

"کیا اس کا نام ایف۔ آئی۔ آر میں ہے؟" وکیل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں۔ مگر اس کو مشتبہ افراد میں سرِفہرست سمجھا جا سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اب یہ نہ پوچھیے گا کہ کیوں؟ یہ شبے کی بات ہے اور ہم تفتیش کے نتائج سے مطمئن ہیں۔ کسی کو قبل از وقت کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ بے قصور ہوگا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

"کب؟ اور کس حالت میں؟" وکیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ساری رات اس پر تشدد کر کے؟ جب وہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکے گا اور مرنے کے قریب ہو جائے گا تو تم اسے سڑک پر ڈال دو گے۔"

"تم کسی ثبوت کے بغیر مجھ پر ایک سنگین الزام عائد کر رہے ہو۔" شیخ نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔

"تو کر دو مجھے بھی بند۔ تم بادشاہ ہو تھانیدار صاحب!" وکیل نے تڑخ کے کہا۔ "میری زندگی اسی پیشے میں گزری ہے مجھے مت بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرتے ہو اور کیا نہیں کرتے۔"

"میں نے زندگی میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا وکیل صاحب!"

"مجھے ابھی تک کوئی تھانیدار ایسا نہیں ملا جو یہ دعویٰ نہ کرتا ہو۔" وکیل نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "جو ثابت نہ کرتا ہو کہ وہ صرف اپنی تنخواہ میں گزارا کرتا ہے اور رشوت لیتے ہیں تو دوسرے، وہ خود تو فرشتہ ہے۔"

"میں تم پر کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" شیخ نے برہمی سے کہا۔ "نہ میرا کوئی دعویٰ ہے۔"

"دعویٰ تم کس منہ سے کرو گے۔" وکیل نے میز پر مکا مارا۔ "کسی قانونی اختیار کے بغیر تم ایک شریف آدمی کے گھر میں گھس گئے۔ دن دھاڑے اسے گھر کے اندر سے اٹھا لائے۔ اس کے گھر کا سامان توڑ پھوڑ دیا۔ کیا ہے تمہارے نزدیک قانونی تحفظ کا؟ تمہارے سورماؤں نے ایک عورت کو مارا، بچوں کو نہیں بخشا۔"

"کون الو کا پٹھا کہتا ہے یہ؟" شیخ نے چیخ کر زیادہ زور سے میز پر مکا مارا۔ "نام بتاؤ مجھے اس کا؟"

"تم مجھ سے اس کا نام پوچھتے ہو؟" وکیل نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "گالی تم نے اپنے آپ کو دی ہے تھانیدار!"

"میں...... میں نے یہ سب کچھ کیا تھا؟" شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور کس نے کیا تھا! کیسے گرفتار کیا تھا تم نے اسے؟ کہاں سے پکڑا تھا؟" وکیل نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"ایک منٹ!" میں نے مداخلت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کوئی غلط فہمی......"

"شٹ اپ، غلط فہمی کے معنی معلوم ہیں تمہیں؟" وہ چراغ پا ہو کے بولا۔ "کون ہو تم؟ مخبر؟ پولیس کے چمچے؟"

پلک جھپکتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ شیخ اپنی برہمی کو بھول کر ہمارے بیچ میں حائل ہو گیا۔ اس نے فوراً اندازہ کر لیا تھا کہ اشتعال انگیزی کی فضا کس حد تک خطرناک ہو گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ شیخ نہ روکتا تو میں اس تذلیل کے بعد وکیل کو کرسی سمیت تھانے سے باہر پھینک دیتا اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔

"وکیل صاحب! یہ میرے دوست ہیں۔ انگلینڈ سے ... کی اعلیٰ تعلیم لے کر لوٹے ہیں اور خود بھی ایک صنعتکار ہیں۔" شیخ نے تھوڑے سے مبالغے کو ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔ "ان کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ بھی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تھانے کو میدانِ جنگ مت بنائیے۔ اطمینان سے بیٹھ کے بات کیجیے۔ یہ بتائیے کہ میرے متعلق جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"خود اس شخص کی بیوی نے، اس کے بچوں نے، محلے والوں نے۔" وکیل نے کہا۔

"یقین کیجیے یہ سب جھوٹ ہے۔" شیخ نے کہا۔ "میری تفتیش تو ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔"

"لیکن اسے آپ نے کل رات گھر سے اٹھایا تھا۔" وکیل نے ...

"اور جن لوگوں نے مجھے دیکھا تھا، وہ مجھے پہچان لیں گے؟" شیخ نے کہا۔ "غالباً پہچان لیں گے۔ انہیں میری تصویر دکھا دی گئی ہوگی۔ استعفیٰ تو میں دے چکا ہوں۔ یہ مجھے معطل یا برخاست کرانے کی کوشش ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" وکیل نے کہا۔ "جھوٹ ہے یا سچ، فیصلہ عدالت کرے گی۔ اس شخص کے دوستوں نے اور لواحقین نے مجھے وکیل کیا ہے اور میں ان کے بیانات کی ... ہوں۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن وہ شخص کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔" شیخ نے کہا۔ "آج دن میں بھی کچھ ملاقاتی آئے تھے...."

"اور انہیں بھی لوٹا دیا گیا تھا۔" وکیل نے کہا۔ "لیکن میں غیر نہیں، اس کا وکیل ہوں۔ مجھے وکالت نامے پر اس کے دستخط لینے ہیں۔"

"لیکن اس نے آپ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا۔" شیخ نے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وکیل نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں کہ تم اسے میرے سامنے لا سکو۔ تمہارے تشدد کے باعث اس کی حالت غیر ہے یا وہ مر رہا ہے۔"

"یہ اقدام ہم نے اس کی حفاظت کے پیشِ نظر بھی کیا تھا کہ کسی کو اس سے نہ ملنے دیں۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن اب تمہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے مجھے اس کو زبردستی بلوانا پڑے گا۔" اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

ایک سنتری نے کمرے میں آ کے سیلوٹ جھاڑا اور اٹین شن کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ایک حوالاتی ہے، آخری کمرے میں۔" ایس۔ آئی شیخ نے کہا۔ "اس کو یہاں بلا لاؤ۔ کہنا میں بلا رہا ہوں۔"

آخری کمرے کے نام پر مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ یہ وہ کمرۂ تفتیش تھا جہاں پہلی رات میں نے بھی تفتیش کے نام پر پولیس کی جانب سے ہونے والے انسانیت سوز ظلم کی اذیت برداشت کی تھی۔ چند لمحے مکمل خاموشی میں گزر گئے۔ وکیل کے جارحانہ رویّے کے باعث کشیدگی کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی تھی جس میں کسی کے لیے کسی سے نظر ملانا دشوار تھا۔ وکیل اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ شیخ نے میز کی نیچے والی دراز میں کچھ تلاش کیا اور میں نے جیب سے سگریٹ لائٹر نکالا۔ اخلاقاً مجھے دوسروں کو بھی سگریٹ پیش کرنے کی عادت تھی مگر شیخ سگریٹ نوشی ترک کر چکا تھا اور بڑی سختی سے اپنے عہد پر قائم تھا۔ وکیل کے ساتھ اس کی بدتمیزی کے بعد بااخلاق برتنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک سگریٹ نکالی اور پیکٹ کو خالی پا کے میز کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈال دیا۔ جب میں نے سر اٹھایا تو ایک کانسٹبل استاد پیڈرو کو اپنے ساتھ لے کر اندر آ چکا تھا۔ پیڈرو کی نظر مجھ سے ملی تو وہ چونکا مگر پھر انجان بن کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کی مسکین صورت اور اس کے رویّے کی انکساری پر حیرت ہوئی کہ وہ بدمعاش جو استادی کے مرتبے پر فائز ہو جائیں، تھانوں میں ایسی سعادت مندی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کی اکڑفوں میں کمی نہیں آتی۔ لیکن اس کے انداز و اطوار میں بدمعاشی کی جھلک تک نہ تھی۔ کسی حوالاتی نے نعرہ لگایا۔ "حق اللہ"۔

"بیٹھ جاؤ بھئی۔" شیخ نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"زرداد جناب!" اس نے سوچے بغیر کہا۔ "ہمارا قصور تو بتا دیں تھانیدار صاحب! کل سے بند کر رکھا ہے ہمیں۔"

"تم استاد پیڈرو کے نام سے زیادہ مشہور ہو؟" شیخ نے کہا۔ "کرتے کیا ہو؟"

"ریڑھی لگاتا ہوں ریجنٹ سینما پر جناب! سردی میں مونگ پھلی، گرمی میں قلفی۔ استاد پیڈرو تو مجھے کوئی نہیں کہتا۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ مجھے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا گیا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا اور ہتھکڑی کھنکی۔ میں نے اس سے کچھ کہنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

کچھ دیر میں اور شیخ اسے گھورتے رہے۔ وہ بُری اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ "تم میر شرافت علی کے نام سے واقف ہو؟"

"جی ہاں۔ میرا ماموں بھی ہے اور سسر بھی۔" وہ بولا۔ "میرے ساتھ مل کر ریڑھی لگاتا ہے۔"

"اب ان کو یہ بھی بتا دو زرداد کہ تمہیں کیسے گرفتار کیا گیا تھا اور کہاں سے۔" وکیل نے کہا۔

استاد پیڈرو کی باتوں نے مجھے اور شیخ کو چکرا دیا تھا۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس میں ہمارے لیے شک کی ایک فیصد گنجائش بھی نہ تھی مگر اس وقت وہ ایک مظلوم اور غریب آدمی بنا ہوا تھا جو محنت مزدوری کر کے اپنے اور بیوی بچّوں کے لیے حلال کی روزی کمانے کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ استاد پیڈرو دُہری زندگی بسر کرتا ہو۔ اپنے محلّے میں وہ واقعی زرداد ہو اور اس بات کے گواہ بھی ہوں کہ وہ شرافت کی زندگی گزارتا ہے مگر باہر اُس دنیا میں جہاں چوہدری دلاور اور ڈی سلوا جیسے لوگ اس کے باس تھے، وہ استاد پیڈرو ہو۔ بہت سے بدمعاش اپنے بیوی بچّوں کی نگاہ میں ویسے ہی شوہر اور باپ رہنا پسند کرتے ہیں جیسے عام لوگ۔ اپنی مجرمانہ زندگی کا سایہ تک اپنے گھر پر نہیں پڑنے دیتے۔ وہ اس دنیا کے نشیب و فراز دیکھ لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر نے انہیں جس غلط راہ پر ڈال دیا تھا اس پر ان کی اولاد کبھی دولت کو نصب العین بنا کے نہ چلے۔ وہ شریف کہلائیں اور ان کی زندگی دنیا میں قانون کی سزا کے خوف سے بھی آزاد ہو اور عاقبت کی سزا کے ڈر سے بھی۔ شاید پیڈرو بھی ایسا ہی آدمی تھا۔ اس نے بچّوں کو ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کا سُکھ آرام اور زندگی کے تمام لوازمات ضرور فراہم کیے ہوں گے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی نظر میں اپنی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

عزت اور وقار بحال رکھنے کے لیے جھوٹ کا سہارا بھی لیا ہوگا اور انہیں یقین ہوگا کہ ان کے باپ کا کوئی کاروبار ہے۔ اتنا ہی جائزہ جتنے سب کے ہوتے ہیں۔

وکیل کے سوال پر اس نے اجازت طلب نظروں سے شیخ کی طرف دیکھا۔ ڈرتے ڈرتے۔

"ان کی فکر مت کرو۔" وکیل نے کہا۔ "میری موجودگی میں یہ تم کو سچ بولنے سے نہیں روک سکتے۔ میں تمہارا وکیل ہوں۔ تمہاری بیوی نے مجھے بھیجا ہے۔ میری فیس بھی ادا کر دی ہے اس نے۔ کیا تم نے ملاقات سے انکار کر دیا تھا؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" استاد پیڈرو کے رویّے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کا خوف دور ہوگیا۔ اس نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح آدھی رات کے بعد پولیس والے دیوار پھاند کے اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس کی بیوی نے شور مچایا تو ایک سپاہی نے اسے مارا اور باورچی خانے میں بند کر دیا۔ اس شور سے بچّے جاگ اٹھے تھے اور سہم کر چلّانے لگے تھے۔ ایک اور پولیس مین نے ان کو بھی گھسیٹ کر ماں کے ساتھ بند کر دیا۔ وہ لوگ سارے گھر میں کچھ تلاش کرتے پھرے اور پھر اسے مارتے دھکیلتے باہر لے آئے اور ایک جیپ میں ڈال کے تھانے پہنچا دیا۔

شیخ کے لیے اور میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہم اپنے ملزم کی گرفتاری کے اصل واقعات اور اسباب بیان نہیں کر سکتے تھے۔ جن حالات میں وہ ہمارے ہاتھ آیا تھا ان پر ہم نے مختلف انداز میں سوچا تھا۔ میر محمد اپنی ہوس کا شکار ہوا۔ اس نے تمام عمر ناجائز ذرائع سے پیسہ کمایا تھا اور اپنی تھانیداری کے بل پر اس کا شکار وہ ہوئے جو کمزور تھے۔ اپنی شہ زوری کے اسی زعم میں اس نے بڑی اسامی دیکھ کر بڑا ہاتھ مارنا چاہا لیکن جن پر اس نے ہاتھ ڈالا تھا وہ بہت بڑے شکاری تھے۔ شاید وہ میر محمد کو منہ مانگا انعام بھی دے دیتے لیکن میر محمد نے ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کی اور وہ ٹیپ گنوا دیا جس کا ضائع ہونا مجھے دُہرے قتل کے الزام میں ملوّث رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اس کی وجہ سے چوہدری دلاور کی وہ کوشش ناکامی کے انجام سے دوچار ہوئی جو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کی گئی تھی۔ اگر میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں ناکام رہتا تو استغاثہ کے لیے مجھے میر شرافت علی کا قاتل ثابت کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میر شرافت علی کے گھر میں گھس کے مجھے مارپیٹ اور توڑ پھوڑ میں مصروف دیکھنے والے بھی دو افراد تھے جو اس وقت میر شرافت علی کے گھر میں موجود تھے اور جنہوں نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے مجھے شناخت بھی کر لیا تھا۔ ان کے سفاکانہ قتل کا ذمّے دار میرے سوا کون ٹھہرتا۔

عبدل اور رشید معمولی گھریلو ملازم تھے اور ان کی کسی سے دشمنی نہ تھی سوائے میرے۔ میں ان کے خلاف انتقامی ردِعمل کا قائل اور جانتا تھا کہ جب عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگا تو یہی دو گواہ منزلِ دار و رسن تک پہنچائیں گے چنانچہ میں نے اس وقت آنے سے پہلے ہی ان کا پتہ بھی صاف کر دیا۔ جس طرح حالات گواہی نے مجھے میر شرافت علی کا قاتل بنا دیا تھا اسی طرح کی گواہی سے یہ الزام بھی مجھ پر آجاتا کہ پہلے قتل کی سزا سے بچنے کے لیے میں نے دو قتل اور کر دیے۔ جب سوال اپنی زندگی کا ہو تو کسی اور کی زندگی کی پروا کون کرتا ہے اور پھانسی تو ایک ہی ہوتی ہے خواہ ایک قتل کا جرم ثابت ہو، خواہ تین کے قتل کا۔ ایک بات یقینی تھی۔ اگر میر شرافت علی کے کیس میں میرے موت سے بچنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے اور عمر قید ہو جانے کے فائدے میں بَری ہو جانے کے امکانات بھی ففٹی ففٹی تھے، استغاثہ کے سب سے اہم گواہوں کو قتل کرنے کے بعد میرا سزائے موت سے بچنا ناممکن تھا۔ پہلے قتل کو حادثے کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا تھا۔ رالعہ اور عبدالودود منظر کی کوشش سے یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں نے عمداً اسے قتل نہیں کیا تھا بلکہ اپنا دفاع کیا تھا مگر عبدل اور رشیدے کا معاملہ قطعی مختلف ہوتا۔ عدالت یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی کہ میں نے ان کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک خاص مقصد کی خاطر قتل کیا۔ موت حادثاتی، اشتعال انگیزی کا نتیجہ ہو یا اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے واقع ہو جائے قانون کی نظر میں اتنا سنگین جرم نہیں رہتا جتنا قتلِ عمد۔ بلکہ بعض اوقات یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ انسان بے بس ہے اور جذبات اس کی عقل پر حاوی آجائیں تو وہ وحشت و دیوانگی میں جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے مگر دیوانے کو اس کے قول و فعل کا ذمّے دار ٹھہرا کر سزا کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا تھا کہ دنیا بھر کے قابل ترین وکیل بل کے، مجھے میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے تو بَری کرا سکتے تھے مگر عبدل اور رشیدے کے قتل سے بچانے میں ناکام رہتے۔ میرا دشمن، میرا ماضی تھا۔ لندن میں قیام کے دوران میں مجھ پر ایک طوائف کے قتل کا الزام آیا تھا جو ثابت نہیں ہوا تھا۔ انگریز دشمنی کے باعث مجھ پر ہوسٹل میں بم رکھنے اور دو افراد کی موت کا سبب بننے کا الزام آیا تھا مگر میں بچ گیا تھا لیکن بالآخر انہی مشکوک حالات کے باعث میرا نام پہلے کالج اور پھر برطانیہ سے اخراج عمل میں آیا تھا۔ جن دنوں میں میرے والد وزیر خان کا انتقال ہوا تھا وہ خود دلیل دیا کرتے تھے کہ میں نے بلیک میلنگ اور قتل ... کہتے؟

میر شرافت علی کا خون کیا یا اسے اتنا مارا کہ وہ مرگیا (استغاثہ کا کیس مختلف تھا کہ میں نے اسے خنجر کے وار سے ہلاک کیا) لیکن عبدل اور رشیدے کے کیس میں میرا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ارتکاب جرم ثابت ہوتا تھا مگر عبدل نے مرتے مرتے اپنے بارِ گناہ کو یوں اتارا کہ مجھے بے گناہ قرار دے گیا اور قانون کی نظر میں وہ بیان اس لیے سچ تھا کہ ایک شخص نے اس وقت دیا جب اسے اپنی زندگی کے ختم ہونے کا اعتبار بقائمی ہوش و حواس آگیا تھا۔ میر محمد کے لالچ سے زیادہ اس کی غیر دانشمندانہ دانشمندی کے باعث عبدل کا وہ آخری بیان ریکارڈ پر آگیا جس کے بارے میں شکاری مطمئن تھے کہ اب اس کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس بیان کو ایک محرر نے لکھا تھا مگر اس پر عبدل کے دستخط نہیں تھے بصرف تحریر محرر کے ہاتھ کی تھی جسے عدالت کے ریکارڈ پر رکھنے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا تھا کیونکہ میر محمد کے دباؤ میں یا چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی طرف سے دھمکی یا فراخدلانہ پیش کش کے بعد وہ کہہ سکتا تھا کہ ٹیپ کا کوئی وجود نہیں اور اس نے اپنے ہاتھ سے وہی لکھ دیا تھا جو ایس۔ آئی شیخ صاحب نے لکھوایا تھا مگر اب ٹیپ نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہمارے دشمنوں کے پاس بلکہ ایک طرح سے پبلک پراپرٹی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرنے سے پہلے میر محمد کی بیوی نے تشدّد کرنے والوں کو دھمکی ضرور دی ہوگی کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور وہ ٹیپ اخبار والوں تک پہنچ چکا ہے۔ شاید اس باہمت اور چالاک عورت نے یہ بھی کہا ہو کہ اب بیان ہی اخبار میں نہیں آئے گا، بچّوں کی تصویر اور ان کا بیان کردہ مجرموں کا حلیہ بھی شائع ہو جائیں گے اور کچھ بعید نہیں کہ اس نے جان بچانے کی خاطر ہر قابلِ یقین اور ناقابلِ یقین جھوٹ کا سہارا لیا ہو۔ یہ بھی کہہ دیا ہو کہ بچے مجرموں کی تصویر بھی لے کر گئے تھے۔ ایک رشوت خور پولیس والے کے بچّوں کے پاس عام قسم کا پاکٹ سائز یا بے بی کیمرہ ہونا بعید از قیاس بات نہیں لیکن اس کے بیان نے شکاریوں کو احساس دلا دیا کہ وہ جال کاٹ دیا گیا ہے جو انہوں نے مجھے شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا اور اسے کاٹنے میں میر محمد کا ہاتھ بھی ہے اور اس کی بیوی کا بھی۔ میر محمد نے ان کو بلیک میل کرنے کا جرم کیا تھا جو اُن کے نقطۂ نظر سے اتنا سنگین جرم نہیں تھا۔ پیسہ ان کے لیے غیر اہم تھا۔ زیادہ سنگین جرم یہ تھا کہ میر محمد نے اس ٹیپ کی نقل بنا کے کہیں اور رکھوائی اور اس کی بیوی نے ناکامی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے وہ ٹیپ اخبار والوں کو پہنچا دیا۔ ان دونوں کے لیے کم از کم سزا موت کی ہی ہوسکتی تھی جو انہیں بڑے عذاب کے ساتھ دی گئی اور دوسروں کے

خوف!
ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے
خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔
خوف سے آدمی پاگل ہوجاتا ہے۔
خوف سے زندگی ناکام ہوجاتی ہے۔
خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔
خوف سے آدمی خودکشی کرلیتا ہے۔
خوف دیمک کی طرح زندگی کو چاٹتا رہتا ہے۔
شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور اتنا ہی خطرناک
اُردو کے جانے پہچانے منفرد نفسیاتی ادیب اسلام حسین کے قلم سے

خوف و شرم
اور اس کا سدِباب
کا مطالعہ کیجیے
اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کرکے
کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزاریے
قیمت: ۲۰ روپے
مکتبۂ نفسیات، پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی ۱

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

لیے درسِ عبرت بنا کے دی گئی مگر اس کے باوجود تلافی نہ ہوئی تو انہوں نے نئی چال چلی اور میر محمد کی لاش سے وہ کام لیا جو میر محمد سے نہ لے سکے تھے۔ عبدل اور شیدے کے قتل کا الزام نہ سہی، میر محمد کے قتل کا سہی۔ اسباب تو دونوں کے ایک ہی بنتے تھے اور سزا بھی ایک تھی لیکن اس چال کی ناکامی غیر متوقع تھی۔ نہ صرف یہ کہ میں اپنی چالاکی اور تقدیر کی یاوری کے باعث صاف بچ گیا تھا بلکہ اُلٹا ہم ایک شکاری کو شکار کر لائے تھے۔

میں اور شیخ دونوں ہی قانونی معاملات کی اُلجھن کو جانتے تھے چنانچہ شیخ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے قانونی کارروائی نہیں کی تھی اور اگر کی تھی تو صرف اس حد تک کہ اس شکاری کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے ذہن میں وہ سب غیر قانونی حربے تھے جو دشمن ہمارے خلاف استعمال کر رہا تھا یا کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ایک قانون شکن دشمن کو ذہن میں رکھا اور یہ سوچا کہ اب وہ اپنے ساتھی کی رہائی کے لیے یا اس کی زبان کھلنے سے پہلے ہمیشہ کے لیے بند کرنے کی خاطر کیا قدم اٹھائیں گے۔ ہم نے تمام امکانات پر غور کر لیا تھا۔ سوائے قانونی امکانات کے۔ یہ خیال مجھے بھی نہیں آیا تھا کہ استاد پیڈرو کی رہائی کے لیے ایک وکیل آ دھمکے گا جو قانون کے حوالے سے الزامات کی نوعیت اور شیخ کے اختیارات کو چیلنج کر دے گا۔ ابھی تو شیخ نے تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا اور پیڈرو سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

اب اچانک صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو گئی تھی۔ جسے ہم بہت بڑے مجرموں کا سب سے اہم آدمی سمجھ کے اٹھا لائے تھے وہ خود کو ایک غریب مونگ پھلی بیچنے والا ثابت کر رہا تھا اور اُلٹا الزام عائد کر رہا تھا کہ اسے کسی جرم کے بغیر گھر کے اندر گھس کر اٹھایا گیا ہے۔

"آپ کی زبان کو تالا کیوں لگ گیا تھانیدار صاحب؟" وکیل نے طنز سے کہا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟"

"میں یہ سوچ رہا تھا وکیل صاحب کہ سچ صرف ایک ہو سکتا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے کہ جھوٹ بیک وقت جھوٹ بھی ہو اور سچ بھی۔ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں میری بات سے؟"

"یہ ایک منطقی اور فلسفیانہ نکتہ ہے جس سے ہر معقول آدمی اتفاق کرے گا۔"

"پھر آپ مجھے بتائیے کہ یہ شخص اتنے بڑے جھوٹ کو سچ کیسے ثابت کرے گا؟" شیخ نے کہا۔

"یہ کام میرا ہے۔ ثبوت میں عدالت کے سامنے پیش کر دوں گا۔" وکیل نے کہا۔ "اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ معاملے کو ختم کریں گے ابھی اور اسی وقت....."

"ختم کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" شیخ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس شخص پر کوئی الزام نہیں۔ آپ اسے میرے ساتھ... پولیس زیادتی بھی کرتی ہے، خصوصاً ایسے غریبوں کے ساتھ مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر مقدمے بازی میں وقت ضائع ہوتا ہے..." نے مصالحت کے موڈ میں کہا۔

"یہ غریب شخص کہاں رہتا ہے؟" شیخ نے کہا۔ "بقول آپ جہاں سے میں نے اس کو بزورِ بازو اٹھایا؟"

"مزنگ میں، جہاں مچھلی بیچنے والوں کی دکانیں ہیں، ان کے پیچھے ایک گلی میں۔" وکیل نے کہا۔

"اور آپ کو یقین ہے کہ وہاں چشم دید گواہ موجود ہیں جو... بھی پہچان لیں گے؟ اس کے بیوی، بچے، محلے دار۔"

"یس۔ اور ان سب کی گواہی سے آپ خود مجرم بن... گے۔" وکیل نے کہا۔

"آل رائٹ وکیل صاحب!" شیخ نے فیصلہ کن لہجے میں... "مقابلہ اگر جھوٹے گواہوں کو عدالت میں پیش کرنے کا ہے تو... یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ آپ کے علم میں یقیناً ہوگا کہ پولیس... وسائل اور اختیارات کا ناجائز استعمال مشکل نہیں۔ گو میں... کبھی نہیں کیا مگر آپ نہیں مانیں گے اس لیے یہ دعویٰ کر... بجائے میں وہی کروں گا جو آپ چاہتے ہیں یعنی انگریزی کا... کے مطابق میں آپ کے سکّوں سے آپ کو ادائیگی کروں گا۔ اب... وقت بہت قیمتی ہے لیکن آپ کچھ دیر یہیں انتظار فرمائیے۔" وہ... ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

وکیل کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے اعتماد... رخصت ہو گیا۔ "میں سمجھا نہیں یہ بات؟"

"آپ ابھی سمجھ جائیں گے۔ صرف دس منٹ میں۔" ... دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں اسی اندازِ بے نیازی... ساتھ بیٹھا رہا۔ استاد پیڈرو کے لبوں پر ایک تحقیر آمیز مسکر... تھی۔ وکیل بظاہر بے تعلق بیٹھا تھا مگر ایک بار مجھے بے... کے خاموش کر دینے کے بعد وہ بھی خود کو فاتح تصور کرنے لگا... تاہم اس کی صورت پر اب الجھن کے آثار پیدا ہو گئے تھے... اسے یقین تھا کہ وہ شیخ کو دبانے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن... رویّے کی تبدیلی اور اس کی آخری بات کے واضح نہ ہونے... کا یقین برقرار نہ رہا تھا۔ خود میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ... کرنا چاہتا ہے۔ دس منٹ کے بجائے پندرہ منٹ گزر گئے... شیخ لوٹ کر نہ آیا۔ اس دوران میں وکیل نے کم از کم پندرہ...

گھڑی دیکھی اور اپنی متانت قائم رکھتے ہوئے غریب مونگ پھلی والے کو تسلی بھی دی کہ وہ فکر نہ کرے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی گفتگو کے انداز میں اجنبیت بھی تھی جیسے کہ وہ پہلی بار اپنے مؤکل سے ملا ہو اور اپنائیت بھی تھی کیونکہ اب بہرحال ان کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ نوعیت کے اعتبار سے کاروباری تھا۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ ہم سب جانتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میری نظر اور عقل نے دھوکا نہیں کھایا۔ استاد پیڈرو جانتا تھا کہ وکیل کو بھیجنے والے کون ہیں، وکیل جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کامیابی کی صورت میں اس کا معاوضہ کتنا ہوگا۔ وہ یقیناً مجھے بھی جانتا ہوگا۔ استاد پیڈرو جیسے خطرناک مجرم کو سب کی آنکھوں میں دُھول جھونک کے غریب مونگ پھلی والا ثابت کرنے کے انتظامات کر لیے گئے تھے اور بڑی ٹھوس بنیادوں پر۔ کون کہتا ہے، اس بیسویں صدی میں کہ جھوٹ کی کھیتی سدا پھلتی نہیں۔ اور ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں ـــ یہ بھی کاغذی کی ناؤ تھی جسے ایسے ہی وکیل اور ایسے ہی مجرموں کے مفاد و اشتراکِ باہمی کی قوت چلا رہی تھی اور وہ انصاف جس کا بول بالا ہوتا ہے اس ناؤ کے سامنے ڈوب رہا تھا۔

"سوری وکیل صاحب!" شیخ نے اچانک اندر آ کے کہا۔ "آپ کو کچھ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" وہ اپنے ساتھ روزنامچہ لے کر آیا تھا۔ اسی وقت ایک سپاہی چائے لے کر اندر آیا۔ "آپ کو کم از کم یہ شکایت تو نہ ہو کہ تھانے میں کوئی اخلاق سے بات نہیں کرتا اور حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتا۔"

وکیل نے بادلِ ناخواستہ چائے کا کپ لے لیا۔ "آپ تشریف کہاں لے گئے تھے؟"

"میں دراصل روزنامچہ لینے گیا تھا۔" شیخ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "محرر غائب ہے چنانچہ آجکل سب کام ایسے ہی چل رہا ہے۔ بعض اوقات تو رپورٹ بھی خود لکھنی پڑتی ہے، اپنے ہاتھ سے۔" اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف دیکھا۔ چائے کا ایک کپ میرے سامنے بھی رکھ دیا گیا تھا۔ صرف استاد پیڈرو کو نظرانداز کیا گیا تھا۔

"چائے نہیں تو ایک سگریٹ ہی مل جائے تھانیدار صاحب۔" استاد پیڈرو نے مسکینی سے کہا۔

"اچھا۔" شیخ نے کہا اور ایک سپاہی کو طلب کیا کہ ملزم کی ہتھکڑی کو ایک ہاتھ تک محدود کر دیا جائے۔

استاد پیڈرو نے میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وکیل زیادہ مستعد ثابت ہوا۔ اس نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ آگے بڑھائی اور میز پر سے ماچس اٹھا کے سلگانے میں اپنے مؤکل کی مدد کی جس کے لیے یہ سب کام ایک ہاتھ سے ممکن تو تھے لیکن آسان نہ تھے۔

"وکیل صاحب!" ایس۔ آئی شیخ نے روزنامچے پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ریکارڈ میں ملزم کا نام استاد پیڈرو ہے۔ کوئی زردادغلطی سے پکڑا گیا ہوگا تو چھوڑ بھی دیا گیا ہوگا۔ روزنامچے کے اندراجات کے مطابق تو ملزم کو آج سہ پہر گرفتار کیا گیا....."

"یہ جھوٹ ہے۔" وکیل یکلخت پھٹ پڑا۔ "کون اُلّو کا پٹھا کہتا ہے۔"

"پلیز، شٹ اپ۔" شیخ نے میز پر دھڑ سے ہاتھ مارا۔ "اگر آپ نے مجھے پھر گالی دی تو نتائج کے خود ذمّے دار ہوں گے۔ آپ وکیل ہیں، اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تھانے میں کیا، سڑک پر بھی آپ کسی کو گالی دے کر اشتعال انگیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں آپ کو وہ بتا رہا ہوں جو روزنامچے میں لکھا ہوا ہے۔ اپنے دلائل عدالت میں دیجیے گا۔ کل صبح ہم ملزم کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے۔ اور چودہ دن کے لیے اس کا جسمانی ریمانڈ حاصل کر لیں گے۔ جب تک تفتیش مکمل نہ ہو، چالان پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" اس نے پھر روزنامچے کو دیکھا۔ "اس میں لکھا ہے کہ ملزم مشتبہ حالت میں تھانے کے قریب گھومتا ہوا پایا گیا۔ ایک سنتری کے روکنے پر اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پکڑ لیا گیا۔ اس کے قبضے سے چرس بھرے سگریٹوں کا ایک پیکٹ اور ایک بغیر لائسنس کا ریوالور دستیاب ہوا۔"

"یہ اندراج تم نے ابھی اندر جا کے کیا ہے۔" وکیل مشتعل ہو کے بولا۔ "چرس بھرے سگریٹ اور ایسے ریوالور تو تم لوگ اپنے پاس رکھتے ہو کہ....."

"میں نے کہا ہے کہ اسے عدالت مت سمجھیے۔" شیخ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ اور آپ کا مؤکل دونوں پرلے درجے کے جھوٹے آدمی ہیں اور اس کا ثبوت یہ اندراج ہے جو چھ گھنٹے پہلے کا ہے۔ اس پر چار بج کر دس منٹ کا وقت لکھا ہوا ہے۔ میری ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت حشمت خان ڈیوٹی پر تھا مگر اندراج اس کے ہاتھ کا نہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں، یہ میرے ہاتھ کی تحریر بھی نہیں، اس لیے یہ مت کہیے کہ میں ابھی اندر اسی کام سے گیا تھا۔"

وکیل نے روزنامچہ لے لیا۔ "میں جانتا ہوں تھانیدار صاحب تم نے ابھی ابھی اپنے کسی ماتحت سے یہ سب کچھ لکھوایا ہے۔ اس سے پہلے چوری کی رپورٹ چار بجے لکھی گئی تھی۔ تم نے اگلا اندراج دس منٹ کا وقفہ دے کر دکھا دیا ہے۔"

"اب تم اپنے وہ سب گواہ عدالت میں لے کر آنا جنھوں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نے دیکھا تھا کہ میں نے پولیس کی نفری کے ساتھ اس غریب مونگ پھلی بیچنے والے کو اس کے گھر میں گھس کے گرفتار کیا' اس کے بیوی بچوں کو مارا اور توڑ پھوڑ کی۔ میں تو خیر استعفا دے ہی چکا ہوں۔ تم حشمت خان کو طلب کر کے جرح کرنا کیونکہ یہ اندراج اس کی ڈیوٹی کے ٹائم میں ہوا ہے۔ اس کی جواب دہی میرا کام نہیں۔ ہاں' تمہارے الزام کے جواب میں اپنا دفاع میں خود کروں گا یا میرا کوئی وکیل ہوگا۔" اس نے روزنامچہ بند کر کے گھنٹی بجائی۔" ملزم کو ہتھکڑی لگاؤ اور لے جاؤ۔" اس نے ایک سپاہی کے اندر آتے ہی کہا۔

وکیل کے ماتھے پر ہر شکن گہری ہو گئی۔" اس کا مطلب ہے... خیر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کے استاد پیڈرو کو دوسری سگریٹ دی۔" میں سمجھ لوں گا تم سے شیخ جی!" وہ پیڈرو کی سگریٹ جلانے کے بعد پیکٹ اور ماچس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

" شٹ اپ! اینڈ گیٹ آؤٹ۔" شیخ نے کہا۔" اس سے پہلے کہ میری قوتِ برداشت جواب دے جائے۔"

وکیل نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔ سپاہی نے استاد پیڈرو کے دونوں ہاتھوں کو پھر ہتھکڑی میں جکڑ دیا اور اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ دست بستہ ہونے کے باوجود پیڈرو نے سگریٹ تو نہیں چھوڑی۔ اس کے لبوں پر وہی زیرِ لب فاتحانہ مسکراہٹ رہی جو صاف ہمارا مذاق اڑاتی محسوس ہوتی تھی مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

" لاحول ولاقوۃ۔" شیخ نے وکیل کے جاتے ہی گہری سانس لے کر کہا۔" یہ تو میرے گلے پڑ گیا تھا۔"

" مگر تم نے اچھا سلوک کیا اس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

" یار اب کیا کریں' مجبور ہو جاتے ہیں پولیس کے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر۔ شرافت اور اصول پرستی سے کام لیتا تو جاتے جاتے بھی یہ الزام سر آ جاتا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔" اور میاں سکندرِ اعظم! مجھے قطعی شبہ نہ تھا کہ مجرم نکل جاتا' مجھے مجرم بنا کے۔"

" اندراج کس نے کیا؟" میں نے کہا۔" حشمت خان اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔"

" اسی سپاہی نے جو پیڈرو کو لے گیا ہے۔" شیخ نے کہا۔" اس کی اور حشمت خان کی پرانی دشمنی چل رہی ہے' پہلے سے لگتی ہے۔ شاید کسی بے ایمانی کے سودے میں بے ایمانی پر۔"

" یہ چکر تمہاری سمجھ میں آیا؟" میں نے کہا۔" استاد پیڈرو کا ڈبل رول۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ پیڈرو سے ملتی جلتی شکل کا کوئی آدمی ہو؟ فلمی فارمولے کے مطابق جڑواں بھائی ہو۔ یا میک اپ سے..."

اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوتی' حوالات کی طرف سے ہنگامے کی آواز آئی۔ بیک وقت تین چار افراد ایک دوسرے سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا۔" اوئے کھوتے! بلا انچارج صاحب کو..."

" او پانی پلا اس کو کھوتے دے پُتّر! انچارج صاب! انچارج صاب!" دوسرے نے پکارنا شروع کیا اور بیک وقت میں اور شیخ اندر کی طرف لپکے۔ استاد پیڈرو حوالات کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور ایک سپاہی زبردستی اس کے حلق سے پانی اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ حوالات کے دوسرے مکین ذرا فاصلے سے بیک وقت خوف' نفرت اور دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

" کیا ہوا ہے اسے؟" شیخ نے پیڈرو کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نبض پر انگلی رکھ دی۔

" پتا نہیں سر! ابھی سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر کھانسنے لگا۔ جیسے دمے کا دورہ پڑتا ہے۔ پھر لیٹ گیا۔" پانی پلانے والے سپاہی نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی کیونکہ پیڈرو مر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئی تھیں۔

" فون کرو۔ ڈاکٹر کو بلاؤ فوراً۔" شیخ نے چلا کر کہا۔" ایمبولینس منگواؤ۔ غالباً دل کا دورہ ہے۔"

" اس کا اب کوئی فائدہ نہیں شیخ!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔" مُردے زندہ نہیں ہو سکتے۔"

شیخ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں سپاہیوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے اس نے کہا۔" تم بتاؤ! تم اس کو لے کر آئے تھے۔ کسی نے کچھ دیا تھا اسے؟" اس نے حوالات میں بند دوسرے لوگوں کے حوالے سے کہا۔

" نہیں سر!" سپاہی نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔" ابھی تو میں اس کو چھوڑ کر حوالات سے نکلا بھی نہیں تھا۔ بس اُدھر لے جا کے بٹھایا تھا۔ کھانا اس نے کیا تھا؟ ان میں سے تو کوئی قریب نہیں آیا ملزم کے سر..." اس نے حوالات کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔" بس وہی سگریٹ کے سوٹے لگا رہا تھا..."

" سگریٹ؟ کہاں ہے وہ سگریٹ؟" شیخ نے چلا کر اس کی بات کاٹ دی۔" یہاں لاؤ تلاش کر کے۔"

پانچ منٹ کے اندر اندر وہ سگریٹ کا نصف سے زیادہ بھیگا ہوا ٹکڑا شیخ کے سامنے رکھ دیا گیا۔

" اس ٹکڑے کو کسی کاغذ پر اٹھا لو۔" اس

" سکندر! تم نے دیکھا تھا نا؟ اس وکیل نے یہ سگریٹ دی تھی اسے؟"

" ہاں' لیکن میری گواہی سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے تردد سے کہا۔" اس کے علاوہ کیا وکیل نے اپنا نام بتایا تھا؟"

" ہاں۔ اس نے کہا تھا' میں خادم حسین آفندی بار ایٹ لاء ہوں۔" شیخ نے مایوسی سے کہا۔" اگر یہ اس کا نام نہ ہوا تو؟"

" مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" ممکن ہے سگریٹ میں کچھ نہ ہو۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہو۔"

شیخ نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔" وہ جعل ساز ہاتھ دکھا گیا سکندر! مجھے اس کو یہ رعایت نہیں دینا چاہیے تھی کہ حوالاتی کو سگریٹ پیش کرے۔ وہ پیکٹ بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جاؤ لاش کو حوالات سے ہٹا دو۔" اس نے دونوں سپاہیوں سے کہا۔

" میں اور تم جو سگریٹ پیتے ہیں..." میں نے کہا۔" وہ کیپسٹن ہیں۔ مگر وکیل نے اسے" کے ٹو" دی تھی۔"

" یہ بھی کیپسٹن ہے سکندر بخت!" شیخ نے کہا۔" جو کے ٹو کی ڈبیا میں اسی لیے رکھا گیا تھا۔ اس وقت کے لیے جب ملزم کو چھڑا کے ساتھ لے جانے کی کوئی صورت نہ رہے۔ آؤ ذرا لاش کو دیکھیں۔"

لاش اب ایک کمرے میں چارپائی پر رکھ دی گئی تھی۔

" جب اس نے سگریٹ ماچس جیب میں رکھے تھے تو میں حیران ہوا تھا۔ تم جانتے ہو کہ عموماً وکیل اتنے کم قیمت سگریٹ نہیں پیتے اور خود اس نے تو سگریٹ پی ہی نہیں۔" میں نے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

" وہ ڈبیا اس نے میز پر کب رکھی تھی؟" شیخ نے چارپائی پر پڑے ہوئے پیڈرو کو دیکھا۔

" میں نے اسے کچھ رکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈبیا... پہلے سے میز پر رکھی تھی۔ میں سمجھا ہو گی کسی کی۔" میں نے کہا۔" کسی سپاہی کی۔"

" اب کچھ نہیں ہو سکتا دوست! مرنے والا مر گیا بلکہ مار دیا گیا۔" شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔" اب تو صرف پوسٹ مارٹم ہوگا۔ اس کی رپورٹ میں کچھ بھی لکھا جائے' یہ کہ سگریٹ میں سائنائڈ تھا یا ملزم کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ کل کے اخبارات کی سرخی یہی ہوگی کہ زیرِ تفتیش ملزم کی حوالات میں پُراسرار ہلاکت۔"

" شیخ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اس کی توجہ مرنے والے کے چہرے کی طرف مبذول کرائی۔

جب پیڈرو بیہوش ہوا تھا تو اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والوں نے اس کے منہ پر پانی ڈالا تھا۔ جو پانی اسے پلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ بھی منہ پر بہہ گیا تھا اور جہاں پر پانی جذب ہوا تھا وہاں سے اس کی کھال اترنے لگی تھی۔ لیکن کھال تو اتنی جلدی تیزاب سے بھی نہیں اترتی۔ شیخ نے اسے انگلی سے چھو کر دیکھا۔

" یہ... یہ تو کچھ پلستر جیسی چیز ہے۔" اس نے فوراً انگلی ہٹا لی۔ میں نے نیچے بیٹھ کر غور سے دیکھا تو مجھے بالوں کے بھی مصنوعی ہونے کا شبہ ہوا۔" یہ کوئی اور ہے سکندر!" شیخ دروازہ بند کر کے بولا۔

" مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن تم کچھ مت کرو۔ ایمبولینس کو آنے دو۔" میں نے کہا اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ شیخ نے دو سپاہیوں کو لاش کے پاس کھڑا کر دیا تھا۔ ایک درویش صفت قیدی نے نعرہ لگایا۔" حق اللہ۔"

" یہ تو بہت برا ہوا سکندر!" شیخ نے اپنے آفس میں پہنچ کے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔" مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ نوکری مجھے لے بیٹھے گی۔ اسی لیے میں اپنی جان چھڑا رہا تھا مگر اب تو جو مقدر میں لکھا ہے' ضرور ہوگا۔"

" گھبرانے کی کیا بات ہے یار!" میں نے کہا۔" یہ سب

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

قیمت = ۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ = ۱۰ روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مر گیا تھا لیکن اس کی لاش مندر کے تہہ خانے میں اصلی حالت میں موجود تھی۔
- سوناگھاٹ کے علاقے پر اس مُردہ پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ ہر جگہ زندہ نظر آتا تھا۔
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آکر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کرلیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟
ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی ہم سے مل سکتے ہیں۔

انکا مکمل، دو حصے	اقابلا مکمل، دو حصے	غلام روحیں مکمل
قیمت فی حصہ ۲۰/-	قیمت فی حصہ ۲۵/-	قیمت ۱۵/-

کتابیات پبلی کیشنز

میری وجہ سے ہوا ہے مگر رابعہ کو دیکھ اور شہلا کو دیکھ۔ انھوں نے میرا ساتھ دینے کی کتنی سخت سزا پائی ہے۔ تُو نے خود تو اسے قتل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ تجھ پر الزام آئے گا فرائض کی بجا آوری میں غفلت برتنے کا۔ تُو نے ملزم کو وکیل سے ملوایا اور اسے سگریٹ پلانے کی اجازت دی اور... ظاہر ہے وہ جعلی وکیل تھا۔ تُو نے تصدیق نہیں کی۔ مگر اس جرم کی سزا زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہی معطلی یا لائن حاضری۔ انکل رضوی اور کچھ نہیں ہونے دیں گے۔"

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہوگی سکندر!" شیخ نے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ پیڈرو نہیں تھا تو پھر یہ زر داد ہی ہوگا۔ جو گرمی میں قلفی اور سردی میں مونگ پھلی بیچتا تھا۔ اس کی خدمات مستعار لی گئی ہوں گی۔ بھاری معاوضہ ادا کر کے اور تحفظ کی پوری یقین دہانی کے ساتھ۔ غریب اور سادہ لوح آدمی تھا۔ لالچ میں مارا گیا۔ اب میں فرض کر سکتا ہوں کہ یہ ڈرلما کیا تھا۔ اس مونگ پھلی والے سے بات کرنے اور اسے نقد معاوضہ ادا کرنے کے بعد رات کو کچھ لوگ پولیس کی وردی میں اس کے گھر پہنچے۔ انھوں نے وہی کیا جو زر داد نے بتایا تھا اور ظاہر ہے کہ سب نے دیکھا تھا۔ ان میں کوئی تھانیدار بھی ہوگا۔ میرے جیسے قد و قامت کا اور میری عمر کا۔ وردی پہن کے یوں بھی سب ایک جیسے لگتے ہیں۔ رات کے وقت دیکھی ہوئی صورت کس کے ذہن میں رہے گی۔ لیکن دیکھنے والوں کے سامنے میرا نام لیا گیا ہوگا۔ اس جعلی سب انسپکٹر کو اکرام شیخ کہہ کے بلایا گیا ہوگا۔ یا شاید اس کے بیوی بچوں کو پہلے سے کوئی جھوٹی کہانی سنا دی گئی ہوگی کہ اکرام شیخ نام کا ایک سب انسپکٹر اس کے غریب شوہر کا دشمن ہو رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بھتہ زیادہ مانگتا تھا ریڑھی لگانے کا۔ اور ڈر ہے کہ وہ دشمنی میں زر داد کو بند کر دے گا، کوئی بھی جھوٹا الزام لگا کے۔ مرنے والا تو بتا نہیں سکتا کہ اس نے میک اپ کیوں کیا تھا۔ اس کے بیوی بچے کیا بتائیں گے۔ شاید یہی کہ مجھ سے بچنے کے لیے اس نے یہ سوانگ بھرا ہوگا مگر وہ مجھے یقیناً پہچان لیں گے اور میرا نام بھی بتا دیں گے۔ میں نے جھوٹا الزام اس پر واقعی عائد کر دیا ہے۔ کون مانے گا کہ وہ غریب آدمی چرس کے سگریٹ اور بغیر لائسنس کا ریوالور لے کر مشتبہ حالت میں تھانے کے پاس گھوم رہا تھا۔"

"میرا موجود ہونا بھی اچھا ہی رہا۔ کم سے کم ایک گواہ تو تھا جس نے سب کچھ دیکھا۔" میں نے کہا۔ "مثلاً اس وکیل کو۔"

"مجھے خوش فہمی میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔" شیخ نے روزنامچے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "بہرحال۔ تم اپنا بیان لکھ کے دے دو۔ وجہ کیا بتاؤ گے کہ یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں حشمت خان سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو علم نہیں تھا کہ ڈیوٹی پر کون ملے گا اور مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا واقعی انسپکٹر میر محمد کے قتل کے سلسلے میں کسی قسم کی رپورٹ میں میرا نام بھی آیا ہے۔ آیا ہے تو کیوں اور کس نے لیا ہے، آخر حشمت خان تفتیش کے لیے میرے پاس کیسے پہنچا؟ اتنا جواز کافی ہے۔"

"عملے کی کمی بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اگر میر محمد ہوتا تو اس وقت میں یہاں موجود نہ ہوتا۔" شیخ بولا۔ "اب ایک تو ایس ایچ او کوئی نہیں، دوسرے محرّر غائب۔ کسی کو لاش کے ساتھ بھی اسپتال بھیجنا ہے۔ یہاں حشمت خان کو شوق ہے دن بھر میں زیادہ سے زیادہ بندے ڈک دینے کا۔ لڑائی جھگڑا ہو تو دونوں پارٹیاں اندر۔ چوری ڈکیتی کا کیس ہو تو جسے چاہو مشتبہ قرار دے کر بلوالو، آوارہ گردی میں دھر لو۔ رپورٹ کسی کی نہیں لکھتا۔ بس سودا کھرا کیا اور مال جیب میں تو ملزم باہر۔ ورنہ حوالات میں۔ اب یہ دیکھو! اس وقت بھی دس آدمی بند ہیں۔ ان میں سے صرف دو کے خلاف پرچہ کاٹا گیا ہے۔ باقی آٹھ سے کچھ نہیں ملا تو میرے لیے چھوڑ گیا۔ روز رات کو آ کے ایک ایک سے سر کھپاتا ہوں اور جو واقعی بلاوجہ بند ہوتے ہیں، انھیں چھوڑتا ہوں۔ آج تو ان بے چاروں کی بھی نہیں سنی۔"

باہر سے ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا تو شیخ باہر نکلا۔ اس نے لاش اٹھوا کے میو اسپتال ارسال کی۔ ایک کانسٹیبل کو ہدایات دے کے ساتھ کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد لوٹا تو میں اپنا تفصیلی بیان لکھ چکا تھا جو میں نے دستخط کرنے سے پہلے اسے پڑھ کے سنایا اور پھر دستخط کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ چوری کی ایک رپورٹ روزنامچے میں لکھ کے فارغ ہوا تو وہ سپاہی اندر آ گیا جو پیڈرو یعنی زر داد کی لاش کے ساتھ گیا تھا۔

"ہمارا کیا بنے گا سر؟" اس نے فریاد کے انداز میں کہا۔ "حشمت خان کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"جو مقدر میں ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا جوان!" شیخ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "خود مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بے چارہ ایک سازش کا شکار ہوا ہے۔ جہاں تک حشمت خان کا سوال ہے تو اس سے ڈرنے کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ وہ سارا دن بوگس کارروائی کے سوا کرتا کیا ہے۔ تم اگر اَڑ جاؤ کہ تم نے اسی کے کہنے پر اندراج کیا تھا تو وہ مصالحت ہی بہتر سمجھے گا کہ اس کیس میں وہ بالکل ملوّث نہ ہو چنانچہ وہ ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ تم اس کے خلاف کوئی بیان دو۔ وہ تمھاری تائید کرے گا تو تمھارا یا اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ جہاں تک محکمے کی کارروائی کا تعلق ہے تم دونوں محفوظ ہو۔ خود کو بچانے کے لیے حشمت خان چرس اور ریوالور وغیرہ کا انتظام بھی کر ہی لے گا۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ نہ ہو تو وہ حاصل کر لیتا ہے۔ سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ اس لیے حشمت خان اپنی پوزیشن محفوظ رکھے گا اور تمھیں خود بخود تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ اس نے ایک مشتبہ شخص کو پکڑا تھا اور بس۔ جو کچھ برآمد ہوا وہ محفوظ ہے۔ قیدی مر گیا تو اس کا کیا تعلق حشمت خان سے۔ وہ ڈیوٹی پر تھا ہی نہیں۔ وہ میرا بھی دشمن ہے اور تمھارا بھی لیکن اس وقت صورتِ حالات ایسی ہو گئی ہے کہ وہ ایک دشمن کا ساتھ دے کر دوسرے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ تم مطمئن رہو، وہ تمھارا ساتھ دے گا۔ جھوٹ یا سچ سے مرنے والے کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان ہو سکتا ہے۔ اس کی قضا آئی تھی کہ وہ یہاں پہنچا۔ قضا خود آدمی کو اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں فرشتۂ اجل اس کا منتظر ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کے خلاف بلاوجہ ایک اندراج کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اسے چھوڑ دیتا تو وہ بچ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کی جان بچانے کی خاطر ہی اسے حوالات میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس دھوکے باز وکیل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کوئی جواز پیدا کروں۔ وہ وکیل تھا ہی نہیں، قاتل تھا۔"

"جی؟" سپاہی کی صورت پر بارہ بج گئے۔ اپنے افسر کی بات اس کی ناقص عقل میں نہیں آئی تھی۔

"تم کو یہ سب سمجھنے کی ضرورت نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ لمبا چکر ہے، بس اتنا سمجھ لو کہ وہ شخص حوالات میں نہ مرتا تو باہر لے جا کر مار دیا جاتا۔ جب اس کی صورت نہ رہی تو اسے یہیں ختم کر دیا گیا۔ حوالات میں کتنے لوگ بلاوجہ بند ہیں۔ روزنامچہ دیکھو اور جن کے خلاف کوئی الزام نہیں انھیں یہاں لے آؤ۔"

دس منٹ بعد آٹھ افراد دست بستہ قائم مقام ایس۔ ایچ۔ او صاحب کے کمرے میں حاضر کیے گئے اور سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سب کو غور سے دیکھا۔ ان میں ایک تو حلیے سے ہی فقیر لگتا تھا۔ داڑھی اور سر کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں اور سرخ انگارہ آنکھوں سے، تار تار لباس سے اور گلے میں پڑی ہوئی منکوں کی مالا سے۔ چھ اوباش اور لوفر قسم کے نوجوان تھے۔ لنڈے کی رنگین شرٹیں پہن کے اور لمبے بال رکھ کے ہپی بن جانے والے، جو پڑھتے تھے نہ کوئی کام کرتے تھے مگر جوانی کے زعم میں اینڈتے پھرتے تھے کہ ہم چو من دیگرے نیست۔ ان کی صورتوں پر مفلسی کی تحریر بتاتی تھی کہ وہ احساسِ محرومی کا شکار ہونے اور غریب گھر میں پیدا ہونے کو اپنا جرم سمجھنے لگے۔ وہ چاہتے تو محنت کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے تھے مگر انھوں نے منفی اور انتقامی ردِعمل اختیار کیا۔ اور غلط راہ پر چل پڑے۔ بد اچھا، بدنام بُرا اور لاوارث اس سے بھی بُرا۔ اب کہیں کچھ ہو، انھیں پکڑ کر جوتا کاری کے لیے بلا لیا جاتا تھا۔ آٹھواں نسبتاً عمر رسیدہ تھا اور اپنی صورت سے شریف اور مظلوم آدمی لگتا تھا۔ غالباً ان سب کو یہ سمجھا کر لایا گیا تھا کہ ایس ایچ او صاحب بہادر کے سامنے ان کو شور و غل نہیں کرنا ہے، رونا دھونا نہیں ہے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بک بک نہیں کرنی ہے چنانچہ وہ سب حکمِ حاکم کے انتظار میں تھے۔

درویش نے نعرہ مارا "حق اللہ" اور شیخ کے اشارے پر اسے سوال و جواب کیے بغیر سب سے پہلے رہائی مل گئی۔

"تم کیا کرتے ہو میاں؟" شیخ نے پولیس والوں کے لہجے میں عمر رسیدہ شخص سے پوچھا۔

"بروکر ہوں مائی باپ!" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "لوگوں کے مکان کرائے پر اٹھواتا ہوں۔ کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ اپنی محنت کا معاوضہ، کمیشن لیتا ہوں۔ تھانیدار حشمت خان کو ایک کرائے دار لا کر دیا تھا۔ حشمت خان نے اپنی تھانیداری سے اس کا جینا عذاب کر دیا۔ ورنہ وہ شریف آدمی تھا۔ تنگ آ گیا تو اس نے اپنے سالے سے کہا۔ وہ سی آئی اے کا کوئی ڈی ایس پی ہے۔ اس نے حشمت خان کو اُدھر جانے سے بھی روک دیا۔ حشمت خان سال میں دو بار کرایہ بڑھوا چکا تھا۔ پھر اس نے مکان خالی کرانے کا نوٹس دے دیا۔ کرائے دار نے عدالت میں کیس کر دیا اور حشمت خان نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھ سے کہتا ہے اسے نکالو، نہیں تو دو سو روپے ماہانہ دو۔ کرایہ بڑھ گیا ہے اور تمھارا آدمی پرانا کرایہ دیتا ہے۔ مائی باپ! معاملہ عدالت کا ہے۔ ہم کیا کریں اور کرائے دار کو میں نے زبردستی تو نہیں رکھوایا تھا۔ بعد میں میری کیا ذمّے داری۔"

"اچھا اچھا۔" شیخ نے کہا۔ "تم جاؤ۔ آئندہ کسی تھانیدار کو کرائے دار مت لا کر دینا۔"

"یہ بھی مشکل ہے مائی باپ! جب دھندا یہی ہے تو تھانیدار کو کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ آپ کی مہربانی۔" وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ پھر شیخ نے نوجوانوں کی طرف دیکھا۔

"ان دو کو تو میں پہچانتا ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "مہینے میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ایک بار ہمارے مہمان ضرور ہوتے ہیں۔" اس نے قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دو جوانوں سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے پھر کیا کرتے ہیں۔ تم سب بھی انھی کے چیلے ہو؟"

سب سر جھکائے کھڑے رہے اور شیخ کا لیکچر سنتے رہے۔
"تم لوگ لاتوں کے بھوت ہوگئے ہو۔" شیخ نے کہا۔ "باتیں بیکار ہیں۔ اس لیے میں پھر تم کو چھوڑ رہا ہوں مگر یہ آخری موقع ہے ہو سکتا ہے میرے بعد آنے والا تھانیدار تمھارا دماغ درست کر دے۔"

چونکہ ان کی صحبت خراب تھی اور وہ چوروں، بدمعاشوں، جیب کتروں اور دس نمبریوں کے مرید تھے۔ اس لیے بعض اوقات جوتا کاری کے مفید نتائج نکلتے تھے اور ان کے ذریعے کسی نہ کسی واردات کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔ ورنہ وہ رات حوالات میں گزارتے تھے اور صبح کوئی غریب باپ یا بھائی کہیں سے سو پچاس کا بندوبست کر لاتا تھا اور انھیں جوتے مارتا ہوا لے جاتا تھا۔ مگر وہ جس راستے پر گامزن تھے اس کی منزل حوالات کے بعد جیل یا تختۂ دار بھی ہو سکتی تھی۔ واپسی نصیب کی نہیں، ان کے اپنے اختیار کی بات تھی۔ کسی سزا کے خوف سے یا کسی کی نصیحت سے وہ راہِ راست پر نہیں آسکتے تھے۔ یہ صرف قوتِ ارادی کو بروئے کار لانے کا مسئلہ تھا۔ لیکن غلط ماحول میں وہ دن بدن خراب ہو رہے تھے۔ بیشتر صورتوں میں وہ چھوٹے موٹے گروہ بنا لیتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف پولیس کے مخبر بن کے بھی کام کرتے تھے۔ کچھ ان سے بڑے بدمعاش اور کچھ پولیس والے دونوں مل کے انھیں صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہے تھے۔ کیونکہ دونوں کے مفادات انھی سے وابستہ تھے اور یہ کم عمر نوجوان نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ یہ شاید قومی ہی نہیں بین الاقوامی مسئلہ تھا۔ سنِ بلوغت تک پہنچنے والوں کو منشیات کا عادی بنانا، جرائم کی ترغیب دینا، دولت کی خاطر قانون اور معاشرے کے خلاف بغاوت پر اکسانا اور بدمعاشی کا مطلب بہادری سمجھانا آسان ہے کیونکہ بالغ اور بالغ نظر ہونے کی عمر میں بڑا فرق ہے۔ جو نوجوان بالغ ہوتے ہی اعلانِ خود مختاری کر دیتے ہیں۔ انھیں زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پتا چلتا ہے کہ قصوروار کون تھا۔ ان کا مقدر؟ زمانہ یا وہ خود؟

"ابھی جو کچھ ہوا، تم سب نے دیکھا تھا؟" شیخ نے کہا اور میں چونکا۔ ان سب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ کیا اس میں میرا قصور تھا؟" شیخ نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کیا میں نے اس پر تشدد کیا تھا؟ تم میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی کی ہے میں نے؟ کبھی کسی بے قصور کو پکڑا ہے؟"

"نہیں جنابِ عالی! آپ ہی تو ایک ہمیں بچا لیتے تھے" ان میں سے ایک نے کہا۔ "رات کو کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی تو ہماری شامت آجاتی تھی۔ اپنے پیروں پر چل کے گھر جانا مشکل ہوتا تھا۔"

"آئندہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔" شیخ نے کہا۔ "ایک بات تو یہ کہ میں نے استعفا دے دیا ہے لیکن استعفا قبول ہونے سے پہلے ہی میں معطل ہو جاؤں گا اور ممکن ہے مجھ پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش بھی کی جائے کہ میں نے مرنے والے پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا۔ تھانوں میں یہ ہوتا رہتا ہے اور سنسنی خیز خبریں چھاپنے والے اخبارات اس کی پبلسٹی کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میری طرف سے صفائی کے گواہ کے طور پر پیش ہو سکو گے؟ کبھی مجھے بچانے کے لیے عدالت میں آکے سچ بول سکو گے؟ وہی بتا سکو گے جو تم نے دیکھا تھا؟"

قطار کے اوّل و آخر میں کھڑے ہوئے دونوں تجربہ کار نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر دوسروں کو متذبذب دیکھ کر وہ آگے بڑھے۔
"ہم آئیں گے جنابِ عالی!" ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "کوئی مائی کا لال ہمیں سچ بولنے سے نہیں روک سکتا۔" باقی چار نے بھی ان کی دیکھا دیکھی کہا کہ وہ گواہی دینے حاضر ہو جائیں گے لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ مجبوراً اور صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔
"سالے سقراط کی اولاد۔" شیخ نے ان سب کے رخصت ہوتے ہی کہا۔ "تم دیکھنا یہی دونوں صاف مکر جائیں گے اور ضرورت پڑنے پر ان کا پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہیں کہاں۔ باقی چار میں سے دو شاید آجائیں۔"

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ میں نے شیخ سے اجازت لی۔ "مجھے اسلام آباد جانا ہے۔"
"واپسی کب ہوگی؟" شیخ نے پوچھا۔ "ممکن ہے یہاں مجھے تمھاری ضرورت پڑ جائے۔"
"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مسز شیروانی کی کنڈیشن بہت سیریس تھی اور ڈاکٹر ناامید ہو چکے تھے۔ خدا کرے ان کی حالت سنبھل جائے اور میں دو تین دن میں ہی واپس آجاؤں۔ بصورتِ دیگر شاید ٹھہرنا پڑ جائے۔"
"میں بھی اسپتال چلتا ہوں۔ دیکھوں گا کہ میک اَپ کے بغیر وہ کیا تھا۔" شیخ نے کہا۔ "پھر موقع ملا تو اس کے گھر جاؤں گا، صرف تصدیق کے لیے کہ وہ وہیں رہتا تھا اور گھر سے اٹھایا گیا تھا۔"

"اور اگر یہ سچ ہوا۔" میں نے کہا۔ "تو یہ خبر بھی تم ہی سناؤ گے کہ زرداد کی گھر والی بیوہ ہوگئی ہے اور اس کے بچے یتیم ہوگئے ہیں۔ اتنی ہمت ہے تم میں؟"
"بے شک یہ کام بہت مشکل ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ میں اپنی بے گناہی کسی عدالت میں ثابت کرنے سے پہلے اس عورت اور اس کے بچوں کے سامنے ثابت کر دوں۔ انھیں یہ بتا دوں کہ وہ کس چکر میں مارا گیا اور اس کے قاتل کیا چاہتے تھے؟ یہ وضاحت کر دوں کہ خود میں بھی سازش کا شکار ہوا ہوں اور قصوروار نہ ہونے کے باوجود مجھے مجرم بنا دیا گیا ہے۔ مجھے محکمہ جاتی کارروائی اور قانونی مسائل کی فکر نہیں۔ اگر وہ عورت میری بات سمجھ لے، مجھے معاف کر دے اور میری بے گناہی تسلیم کر لے تو میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ بہت اطمینان کی بات ہوگی میرے لیے۔"
"اچھا۔" میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "پھر میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔ صبح چلا جاؤں گا اسلام آباد۔ میرا خیال ہے کہ اس تمام معاملے کو میں بہتر طور پر سمجھا سکتا ہوں۔ مگر میں تھانے سے باہر ملوں گا۔"

ماتحت عملے کا انچارج ایک تانگ کو مقرر کر کے اور دیگر لوگوں کو ضروری ہدایات دے کر وہ گشت پر روانہ ہوگیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا، تھانے سے کچھ فاصلے پر اپنا بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ چنانچہ اس نے تھانے سے نکلتے ہی مجھے دیکھ لیا اور اسکوٹر میرے قریب لا کر روکا۔ سینما کے آخری شو ختم ہوئے تھے۔ چنانچہ ایبٹ روڈ سے آگے سڑکیں کچھ دیر کے لیے آباد ہوگئی تھیں۔ نسبت روڈ پر بھی ایک دو حلوائی دکانیں کھولے بیٹھے تھے۔ دکانوں کے سامنے لکڑی کی بینچوں پر لوگ بڑے بڑے پیالوں میں گرما گرم ملائی والا دودھ پی رہے تھے یا پیڑے والی گاڑھی اور ٹھنڈی لسی۔ اس کے آگے میو اسپتال کے دروازے پر پھر رونق تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب رابعہ کی ماں نے ایمرجنسی وارڈ میں زندگی کی آخری چند سانسوں کے ختم ہونے سے پہلے بیٹی کو دیکھنا چاہا تھا اور میں نے ایک اجنبی لڑکی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کر کے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس گناہِ بے لذت کی کسک پھر تازہ ہوگئی۔ نہ جانے اب وہ لڑکی کہاں ہوگی جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں۔ اسے بھی تمام عمر ملال رہے گا کہ اس نے ایک مرتی ہوئی عورت کو دھوکا دینا کیوں منظور کر لیا تھا جس کے حواس ہنک جواب دے چکے تھے جو نہ دیکھ سکتی تھی، نہ سن سکتی تھی اور نہ محسوس کر سکتی تھی۔

شیخ نے اسکوٹر مُردہ خانے کے قریب روکا تو میں چونکا۔
"کون سی دنیا میں تھے جناب!" شیخ نے کہا۔ "پریشان میں بھی ہوں لیکن تم سے کم۔"
"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے خفت سے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔
"ہونا کیا تھا، اکیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا آیا ہوں — تم نے کچھ سنا؟" شیخ نے اسکوٹر کو لاک کیا۔
"سچ تو یہ ہے کہ میں نے نہیں سنا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن اس کی وجہ پریشانی نہیں، میں اپنے خیالات میں گم تھا۔"
"کس کے خیالات میں؟" شیخ نے صرف میرا مورال اَپ رکھنے کے لیے مذاق کیا۔ "نام لوں اس کا؟"
"کمال ہے کہ تم نے صحیح اندازہ کیا۔" میں نے کہا۔ "نسبت اسی کے نام سے ہے۔ میں رابعہ کی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

لاش کو مُردہ خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کوئی ایمرجنسی نہیں ہوتی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ تو صبح ہی طے ہوگا کہ پوسٹ مارٹم کس وقت کیا جائے گا اور کون ڈاکٹر کرے گا۔ چونکہ شیخ اپنی وردی میں تھا، اس لیے مردہ خانے کے قائم مقام نگراں نے (جو بلحاظ عہدہ بھنگی تھا) ہمیں اندر جانے سے نہیں روکا مگر وہ ہمارے ساتھ رہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے بڑے دوستانہ لہجے میں اس سے نام پوچھا، یہ پوچھا کہ اسے کتنی تنخواہ ملتی ہے اور کیا اس مشکل کام کا کوئی خصوصی معاوضہ ملتا ہے؟ ظاہر ہے خصوصی معاوضہ کچھ نہ تھا۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ بچے کتنے ہیں؟ چار بچے، ایک بیوی، ماں باپ، ایک بہن۔ نو افراد کا اس آمدنی میں کیسے گزارا ہوتا ہے؟ میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے اسے دیا۔ بظاہر یہ ہمدردی کا انداز صرف مدد کرنے کے لیے تھا مگر وہ جانتا تھا کہ دولت مند بھی بلاوجہ ضرورت مندوں میں سو سو کے نوٹ نہیں بانٹتے پھرتے۔ اس تمام عرصے میں شیخ لاش کا بغور معائنہ کرتا رہا تھا۔
"تمھیں یقین ہے کہ یہی وہ لاش ہے جو تھانے سے لائی گئی تھی؟" میں نے کہا۔
جمعدار نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آپ کے کوئی عزیز یا جاننے والے تھے کیا؟" سو کا نوٹ جیب میں رکھ لینے کے بعد وہ میری جوابی مدد کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ وہاں آنے والے اس کو خصوصی خدمات کا خصوصی نذرانہ دیتے تھے اور وہ سب کے نذرانے ان کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے قبول کرتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ ایک بہروپیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بے چارہ ضرورت سے مجبور ہو کے چوری کر بیٹھا۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بات کچھ پلّے نہیں پڑی جی۔ پولیس ایک چور کی مدد کیوں کرنا چاہتی ہے؟" وہ بے رُخی سے بولا۔ شیخ اب معائنے سے فارغ ہو چکا تھا اور ہماری گفتگو سے اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میرے ذہن میں کیا ہے؟

"بات بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بے چارہ بھیس بدل کے ایک جگہ چوری کرنے پہنچا اور پکڑا گیا۔ گھر والے جاگ اٹھے تھے۔ یہ بھاگا اور کوئی راستہ نہ پا کے چھت پر سے گلی میں کود گیا۔ گھر والوں کی چیخ پکار پر گشتی پولیس آگئی اور گلی میں بھی لوگ نکل آئے مگر یہ غریب بھاگنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ کسی اندرونی چوٹ سے جہاں گرا تھا، وہیں بیہوش پڑا ہوا تھا۔ پولیس اس کو تھانے لائی تو یہ مر چکا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس نے فاقوں سے مجبور ہو کے پہلی بار یہ حرکت کی تھی۔ سرکس میں سوانگ بھرنے والوں کی اب آمدنی کہاں رہی ہے۔ لوگ فلم دیکھتے ہیں یا ٹی وی۔ اکیلا آدمی تو فاقے بھی برداشت کر لیتا ہے لیکن جس کے بیوی بچّے ہوں؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "انھی کی خاطر تو آدمی سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"یہ تو ہے جی۔" جمعدار مذکور نے اتفاق میں سر ہلایا۔

"جن لوگوں نے اسے گرفتار کیا تھا، وہ اس کو پہچانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن گرفتاری کے وقت یہ میک اَپ میں تھا۔ اب یہ بے چارہ خود تو مر گیا، تفتیش سے کیا فائدہ۔ اس کے گھر والے ہی پریشان ہوں گے نا۔ لیکن اس کا میک اَپ اتار دیا جائے تو اس کو وہ لوگ بھی نہیں پہچان سکیں گے جنھوں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ میرا مطلب ہے اس گھر کے لوگ جہاں یہ چوری کرنے گیا تھا اور گشتی پولیس۔ پھر اس لاش کو گھر والے لے جائیں گے اور یہ کسی چور کی لاش نہیں، اس غریب آدمی کی لاش ہو گی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوا تھا۔"

"لیکن جو لوگ لاش لائے تھے...؟" وہ متفکر ہو کے بولا۔

"وہ اسے تلاش کریں گے۔"

"انھیں یہ لاش چاہیے۔ جیسی یہ اب ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر میک اَپ اتار دیا جائے تو وہ اس کو کیسے شناخت کر سکتے ہیں۔ صبح سے پہلے کوئی کارروائی نہیں ہو گی اور تمھاری ڈیوٹی صبح ختم ہو جائے گی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے، یہ تمھاری ذمّے داری نہیں۔"

"صرف... سو روپے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ...؟" اس نے متذبذب لہجے میں کہا اور لاش کو غور سے دیکھنے لگا۔

میں نے شیخ کو آنکھ ماری اور جیب سے مزید چار نوٹ نکالے۔ "لو بھئی اب تو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔ پولیس نے ابھی تک کوئی رپورٹ درج نہیں کی ہے۔"

جمعدار نے پانچ سو کی رقم پر غور کیا، مردہ خانے کے نظام اور طریقِ کار پر غور کیا۔ ان خطرات پر غور کیا جو اس کی ذات کو لاحق ہو سکتے تھے۔ ان امکانات پر غور کیا جو تحفّظ کی ضمانت فراہم کرتے تھے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی کو آدمی کی مدد کرنا چاہیے۔ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ دس منٹ میں اس نے میک اَپ دھو ڈالا اور وِگ اتار کے ہمیں تھما دی۔ میں اور شیخ دم بخود دیکھتے رہے۔ ذرا سی دیر میں جہاں استاد پیڈرو کی لاش پڑی تھی، وہاں اسی قد و قامت کے دوسرے آدمی کی لاش رہ گئی جس کی شکل ذرا بھی پیڈرو سے نہیں ملتی تھی۔ اس کا رنگ پیڈرو کے مقابلے میں بہت صاف تھا۔ مونچھیں ہٹ جانے کے بعد اس کے کلّوں کی ہڈیاں اور نمایاں ہو گئیں۔ پیڈرو کے جیسے بالوں کی جگہ استرے سے گُھٹا ہوا صاف سر رہ گیا۔ معلوم نہیں صرف وِگ لگانے کے لیے اس نے سر صاف کرا لیا تھا یا وہ اسی ہیڈ اسٹائل کو پسند کرتا تھا۔ لباس کا مسئلہ اب بھی باقی تھا۔ دو نوٹوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ جمعدار نے زرداد کے کپڑے اتارے اور اس کی لاش کو اسپتال کی ہی ایک چادر میں لپیٹ دیا۔ وہ مردہ خانے میں کام کرتے کرتے اتنا نڈر اور بے حس ہو چکا تھا کہ نہ اسے مُردوں سے خوف محسوس ہوتا تھا اور نہ ان کے ساتھ کسی زیادتی پر افسوس۔ میں نے سنا تھا کہ مردہ خانوں میں لائی جانے والی لاشوں کے ہاتھوں سے گھڑیاں اور انگوٹھیاں تک اتار لی جاتی ہیں۔

"بس جی ہمارا خیال رکھنا۔" وہ شیخ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "ہم غریب آدمی ہیں تھانیدار صاحب!"

"فکر مت کرو۔" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں کو پریشانی سے بچایا ہے۔"

"... مثلاً ہم کو۔" شیخ نے باہر آ کے کہا۔ "تمھاری اسکیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔"

"شیخ صاحب!" میں نے کہا۔ "میں جو اَب تک بچا ہوا ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے دنیا کے نظامِ قانون کا تحفّظ ملتا رہا۔ قانون کی نظر میں تو میں مجرم ہوں لیکن بہت سے جرائم مجھ پر اس لیے ثابت نہیں ہوئے کہ میں نے بے بنیاد ثبوت مٹا دیے اور اپنے خلاف جھوٹ کی شہادت کو ختم کرا دیا۔ تم کہہ سکتے ہو، مجھے تائیدِ ایزدی اس لیے حاصل ہے کہ میں خو...

پر ہوں یا سمجھ لو کہ میں نے ذہانت سے کام لیا۔ جو کچھ میں نے اپنے دفاع کے لیے کیا، اسے جرم نہیں سمجھا سکتا۔ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور جنھوں نے میرے لیے گڑھا کھودا، میں نے ان کو گڑھے میں پہلے دھکیل دیا۔ فنا اور بقا کی جنگ میں یہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دنیا اسی پر عمل پیرا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور ہم بہرحال اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اب تم بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ حوالات میں کوئی زرداد وغیرہ نہیں تھا۔ کسی روزنامچے میں اس کا ذکر نہیں۔ تم سے ملنے کے لیے کوئی خادم حسین آفندی بارایٹ لا نہیں آیا تھا، نہ استاد پیڈرو اس کے سامنے لایا گیا تھا۔ نہ تم نے اس کو سگریٹ پیش کرنے کی اجازت دی تھی۔ چونکہ اس نام کا کوئی وکیل ہے ہی نہیں۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟" شیخ نے کہا۔

"میری چھٹی حس کبھی غلط نہیں کہتی۔" میں نے کہا۔ "چاہو تو صبح بار کونسل سے تصدیق کر لینا۔ بیشتر قیدی رہا ہو کے گئے اور جو دور رہ گئے ہیں انھیں وہی معلوم ہے جو ان کے سامنے ہوا۔ یعنی استاد پیڈرو حوالات میں بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ کسی نے اس پر تشدد نہیں کیا اور کوئی زہر آلود چیز نہیں دی۔ غالباً اس کا ہارٹ فیل ہوا۔ یہی سب نے سنا بھی تھا۔ پھر تم نے لاش اسپتال بھیج دی ایک کانسٹیبل کے ہمراہ۔ تمھاری ذمّے داری ختم۔ اس وکیل میں ہمّت ہے تو دوبارہ آ کے دکھائے۔"

"نہ جانے کیوں میں احساسِ جرم کا شکار ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا فیئر پلے نہیں تھا۔"

"یار شیخ! جذبات سے نہیں، عقل سے سوچو۔ کہاں کا فیئر پلے، کیسا فیئر پلے؟" میں نے کہا۔ "فیئر پلے کے چکر میں تم نے اپنی نوکری کو اپنے لیے سزا بنا لیا اور کیا ملا اس سے؟ کیا حشمت خان اور میر محمد جیسے لوگوں نے تمھاری تقلید شروع کر دی؟ یا تمھیں جھک مار کے اس دلدل سے نکلنا پڑا۔ احساسِ جرم پھر کیسا؟ کیا اس شخص نے جو کچھ کیا تھا، وہ جائز تھا؟ جن لوگوں کے لیے وہ ایک غلط کام کرنے پر تیار ہوا، وہ اچھے لوگ تھے؟ تمھیں یا مجھے تو وہ جانتا تک نہ تھا مگر پیسہ لے کر اس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی اور تمھیں باعزّت طور پر مستعفی ہونے سے قبل ہی بدنام کر کے معطّل کرانے کی سازش میں آلۂ کار بنا۔ پھر یہ بتاؤ کہ کیا اسے تم نے مارا؟ اس کا قاتل تو وہ دھوکے باز بدمعاش تھا جو وکیل بن کے پہنچا تھا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ابھی تک تم نے اس واردات کے متعلق روزنامچے میں کوئی اندراج نہیں کیا ہے۔ ورنہ تم کیا کرتے جب معلوم ہوتا کہ خادم حسین آفندی بارایٹ لا کا وجود ہی نہیں؟ قاتل کو کیسے گرفتار کرتے؟ جو آیا تو صرف ایک کام سے تھا کہ کچھ لے دے کر معاملہ ختم کرا دے اور زرداد مطمئن تھا کہ حسبِ وعدہ اسے بحفاظت نکال کر لے جانے والے الفائے عہد کرنے آ گئے ہیں۔ اگر زرداد اس کے ساتھ چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید لواحقین کو اس کی لاش بھی نہ ملتی۔ مگر تم نے دشمنوں کے عزائم کو ناکام بنانا چاہا تو وہ جاتے جاتے ایک تیر سے دو شکار کر گیا۔ اس نے زرداد کو بھی ٹھکانے لگایا اور تمھیں بھی سزا دلوانے کا انتظام کر دیا۔ اس کے باوجود تم بات کرتے ہو فیئر پلے کی؟ زندگی کے بارے میں میرا ایک نظریہ ہے جو نہ اخلاقیات کے خلاف ہے نہ ہمارے مذہبی عقائد کے۔ جان لینے کی کوشش کرنے والے کے ساتھ رعایت کیسی؟ ہمارا مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ کوئی تمھارے گال پر ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال آگے کر دو۔ نہیں۔ ہم آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کے مجاز ہیں۔ فرق صرف طریقۂ کار کا ہے۔ تو یہ طریقۂ کار بھی انگریز کے بنائے ہوئے قانون کی وجہ سے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ یہ پورا معاشرہ جھوٹ کے پاؤں پر چل رہا ہے۔ تم سچ کا سہارا لے کر دو قدم نہیں چل سکتے۔"

"پھر بھی مجھے خیال آتا ہے کہ مجھے سب سچ لکھ دینا چاہیے تھا اور پھر نتائج کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔"

"خدا نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ جب ضرورت پڑے تو کچھ مت سوچو۔ عقل کو بالائے طاق رکھ دو اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔" میں نے جھنّا کے کہا۔ "کہ جو خدا کو منظور ہو گا، وہی ہو گا۔ حالات تمھارے سامنے ہیں اور تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ خود تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا، کسی کے خلاف زیادتی نہیں کی، قانون کا احترام کرتے رہے اور فرض کو مقدّم جانا۔ کبھی رشوت نہیں لی اور اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کیا۔ آج جو کچھ ہوا، وہ میرے اور تمھارے خلاف ایک مذموم سازش تھی۔ ہم نے عقل سے کام لیا اور بچ گئے۔ خدا جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک بوجھ تمھارے ضمیر پر یہ ہے کہ مرنے والے کی بیوی کی نظر میں اس کے شوہر کو لے جانے والا ایس آئی اکرام شیخ تھا اور جب اسے علم ہو گا کہ وہ مر گیا ہے تو شاید وہ اکرام شیخ کو ہی قاتل سمجھتی رہے گی۔ اس کے لیے تم اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم اچھا کر رہے ہو اور اسی لیے میں تمھارا ساتھ دے رہا ہوں۔"

"اچھا یار!" شیخ نے ایک گہری سانس لی۔ "تم کہتے ہو تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ٹھیک ہے۔" اس نے کِک مار کے اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا۔ "لیکن اب یہ نوکری اپنے بس کی نہیں۔ میں نے اس پر لعنت بھیج دی ہے اور بس اب خیریت کے ساتھ استعفا منظور ہو جائے۔"

"پھر وہی حماقت کی بات۔" میں نے پیچھے بیٹھ کے کہا۔ "تم استعفا واپس لو گے اور نہیں لو گے تو شرط لگا لو کہ منظور نہیں ہو گا۔ تھانہ اگر گندی جگہ ہے تو اسے چھوڑ دو۔ ہیڈ کوارٹر میں رہو۔ وہاں صاف ستھرا کام ہے۔"

"بس، میں یہ نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا۔" شیخ نے بگڑ کے کہا۔ "میں محتاج نہیں ہوں، میرے پاس سب کچھ ہے۔"

"یہ سب کچھ تو اس وقت بھی تھا جب تم نے پولیس کا محکمہ جوائن کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ جذبہ اتنا کمزور تھا، قانون کے ذریعے خدمتِ خلق کرنے کا؟ وہ محض جذباتی فیصلہ تھا جس نے تمھیں بزنس کرنے، مقابلے کا امتحان دینے یا گھر بیٹھ کر کھانے کے بجائے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں نے یہاں آ کے دیکھ لیا، کسی کو میرے جذبے کی ضرورت نہیں۔"

"غلط۔ بے شک تمھیں ماحول غلط ملا مگر یہ مت کہو کہ تمھارے جذبے کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو میں ہوں اور میں اکیلا ہی نہیں، وہ سب ہیں جو میرے ساتھ ہیں اور تمھیں جانتے ہیں۔ تمھارے گھر والے بھی ان میں شامل ہیں۔ انکل رضوی جیسے بھی پولیس میں ہیں۔ ان کی جگہ کون لے گا اگر تم جیسے ہمت ہار کے نکل جائیں گے؟ تمھارا تجربہ ابھی بہت کم ہے۔ آہستہ آہستہ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے مشن میں تم اکیلے نہیں، تمھارے محکمے میں بھی تمھارے ساتھ بہت ہیں۔ کیا کہا ہے وہ شاعر نے کہ تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ تو مسٹر عقاب! ایک دن تمھیں آئی جی وغیرہ بننا ہے اور اس پورے محکمے سے ہر حشمت خان کو خارج کرنا ہے۔ خود خارج ہو گئے تو یہاں راج کریں گے حشمت خان۔ نقصان ہو گا ملک و قوم کا اور پبلک کا کہ گل گئے، گلشن گئے، کدّو کریلے رہ گئے۔"

شیخ ہنس پڑا۔ "کہاں انجینئرنگ کے پیشے میں گھس گیا تو۔ وکیل ہوتا تو سب کا باجا بجا دیتا۔ تیری دلیل کے آگے کسی کی منطق نہ چلتی۔"

"اور سزا، نہ مدعی کو ملتی، نہ ملزم کو ملتی۔ وکیل صاحب دونوں طرف سے پٹتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مزنگ جا کے کسی کا دروازہ بجانا اور اس آدمی، زرداد کا گھر تلاش کرنا بہت غلط بات ہو گی۔ کسی کو سوتے سے اٹھا کے بُری خبر سنائی جائے تو شاک بہت زیادہ ہوتا ہے۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہاں صبح ہونے سے پہلے نہیں جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ تُو جا اپنے تھانے۔ گشت کے لیے نکلا تھا نا، اس لیے رات بھر غائب رہنا اچھا نہیں۔ وہاں تو معمول کے مطابق ڈیوٹی پوری کر۔ کسی قسم کی پریشانی کے بغیر۔ حوالات میں ایک قیدی مر گیا تھا۔ لاش تُو نے اسپتال کی ایمبولینس میں بھیج دی جو روزنامچے کے اندراجات کے مطابق استاد پیڈرو کی لاش تھی اور اسے شناخت کرنے والے بہت ہیں۔ بظاہر اسے دل کا دورہ پڑا تھا لیکن پوسٹ مارٹم ہو گا تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔ اب استاد پیڈرو کی لاش ہی نہ ملی تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کیسی؟ اور لاش کہاں گئی؟ یہ تیری ذمّے داری نہیں۔ اس سپاہی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جو ایمبولینس میں لاش کے ساتھ گیا تھا۔ وہ حلفیہ بیان دے گا کہ لاش اس نے اسپتال والوں کے حوالے کی تھی اور اس کا جو حلیہ بیان کرے گا، وہ بھی اس کے یقین کے مطابق غلط نہیں ہو گا۔ میں جاتا ہوں اپنے گھر۔ صبح جب تو ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچے گا تو میں بھی آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، ناشتا ہمارے ساتھ کرنا۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے بعد ہم زرداد کے گھر چلیں گے۔"

"میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے اسلام آباد چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "دو ڈھائی سو روپے کم نہیں تھے مگر میں ایک ہزار احتیاطاً ساتھ لے جانے کے چکّر میں پڑ گیا اور اب مجھے کل دوپہر سے پہلے روانگی مشکل نظر آتی ہے۔ میں تیرے پاس نہ آتا تو اس وقت پنڈی میں ہوتا۔ اچھی سزا ملی ہے احتیاط پسندی کی۔"

"قدرت کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔" شیخ نے کہا۔ "یہ احتیاط پسندی میرے تو کام آئی۔ میں اکیلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ تو نے میرا اعتماد بحال رکھا۔" اسکوٹر کا رُخ اب میرے گھر کی طرف تھا۔

"محسن کے ساتھ میری ذہنی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ اور مجھے تو لگتا ہے کہ اب ہم ایک سو گیارہ ہو گئے ہیں۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے کہ جتنے دشمنوں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے عزائم پہلے سے زیادہ خطرناک ہونے لگے ہیں، اتنے ہی میرے دوست اور مددگار بڑھتے جا رہے ہیں۔ جب میں لندن سے تھا تو میرے ساتھ صرف محسن تھا۔ یہاں پہنچا تو بالکل اکیلا تھا۔ ایک

باپ تھا، وہ بھی نہیں ملا۔ مگر اس دن کے بعد سے آج تک کیا ہوا؟ شکاری جالی پر جال پھیلاتے گئے اور میں بچ کر نکلتا گیا۔ یہاں تک کہ مجھ میں اتنا حوصلہ اور اعتماد آ گیا کہ میں خود شکاری بن گیا اور میں گزرے ہوئے وقت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی کامیابیوں پر فخر کیا مغرور محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میں غرور سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ سب تائیدِ ایزدی ہے کہ آج دشمن بھی مجھ سے اتنے ہی خوفزدہ ہیں جتنا کل میں ان سے تھا۔ آج میرے ساتھ صرف محسن ہی نہیں، رابعہ ہے اور شہلا ہے اور منظر ہے۔ تُو ہے اور تیرے گھر والے ہیں۔ استاد ٹیڈی ہے۔ یہ سب لوگ اجنبی تھے۔ جب میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو ان میں سے کسی کو نہ جانتا تھا۔ رابعہ اور منظر بچپن کے ساتھی ضرور ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں یہ بھی علم نہ تھا کہ کون زندہ ہے اور کون مر گیا ہے۔ میں انکل رضوی اور شیروانی صاحب سے ضرور واقف تھا مگر اس کے بعد مجھے کتنے سہارے ملے؟ کتنے قابلِ اعتماد اور کتنے حوصلہ دینے والے اور بے غرض، کتنے مخلص دوست ملے؟ کتنے سچ بولنے والے ملے اور کتنے بدخواہ کیفرِ کردار کو پہنچے؟ کتنے دشمن کم ہوئے؟ کم سے کم تین افراد کا نام میں پورے وثوق کے ساتھ لے سکتا ہوں کہ میرا وجود ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور وہ اس کانٹے کو نکال پھینکنا چاہتے تھے مگر کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو سب کے دشمن مر گئے ہوتے اور دنیا روزِ اوّل کی طرح غیر آباد ہوتی۔ یا اس میں صرف جانور ہوتے کیونکہ آدمی کا دشمن تو صرف آدمی ہی رہا ہے۔ چراغ دین۔ ڈی سلوا اور میر محمد نے کیا چاہا تھا اور خود ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

اسکوٹر نہر کے پُل سے مُڑا تو میں نے موقع پاتے ہی زرداد کے کپڑے اور اس کی وِگ کا بنڈل پانی میں پھینک دیا۔ پھر رات کے تین بجنے کی اطلاع کسی گھر کے وال کلاک نے بہت دور سے دی۔ اور شیخ نے اسکوٹر روک کر مجھے گھر کے دروازے پر اُتارا۔ میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ اس کی سرخ ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ پھر میں نے گیٹ کو اندر ہاتھ ڈال کے کھولنا چاہا مگر اس کے پٹ خود بخود پیچھے ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں گیٹ کو اندر سے مقفل کر کے اوپر سے باہر کود گیا تھا لیکن اب وہ تالا ہی غائب تھا۔ بے اختیار میں پیچھے ہٹا اور دیوار کے سائے میں چلتا ہوا گیٹ سے دور ہوتا گیا۔ میں نے احتیاطاً وہ بھرا ہوا ریوالور بھی نکال لیا تھا جو میں نے جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

آخری کونے پر جہاں ساتھ والی کوٹھی کا گیٹ تھا، میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ بظاہر اندر کسی قسم کی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ سب کھڑکیاں اور دروازے بند تھے اور کمروں میں مکمل اندھیرا غالب تھا۔

"سکندر صاب!" کسی نے دبی دبی سرگوشی میں مجھے پکارا اور میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ درختوں کے پیچھے سے نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی سرسبز باڑھ کے پیچھے رہ کر سرکتا ہوا آگے بڑھا۔ دیوار اور باڑھ کے درمیان جگہ نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ اس کی پشت یقیناً دیوار سے چھل گئی ہو گی اور سامنے سے کٹی ہوئی شاخوں کے نوکیلے کناروں سے اس کے جسم پر خراشیں آئی ہوں گی۔ اس کی حرکت سے خاصی سرسراہٹ بھی پیدا ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بہت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں دیوار پر سے اندر اتر گیا کیونکہ میں نے استاد ٹیڈی کو پہچان لیا تھا۔ میں دو دیواروں کے سنگم پر کونے میں دبکا کھڑا رہا اور استاد ٹیڈی کے پُراسرار رویّے کے اسباب پر غور کرتا رہا۔ اس نے ضرور کوئی ایسی بات نوٹ کی تھی کہ وہ چھپا کھڑا تھا اور نگرانی کے علاوہ اس کا مقصد مجھے کسی خطرے سے بروقت خبردار کرنا تھا۔

"کیا بات ہے استاد؟" میں نے ٹیڈی کے قریب آتے ہی آہستہ سے پوچھا۔

"آپ نے اچھا کیا، سیدھے اندر نہیں گئے۔" وہ منہ پر انگلی رکھ کے بولا۔ "میں نے اسی لیے تالا کھول لیا تھا۔"

"تالا تم نے کھولا تھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیسے؟"

"قسم مولا کی سکندر صاب! ایسے ہی تو ہم استاد نہیں ہو گئے۔" وہ بولا۔ "بس آپ کی دعا سے جب تک ضرورت نہ پڑے ہاتھ کی صفائی نہیں دکھاتے۔ یہ تو سیدھا سادا تالا تھا علی گڑھ والا۔ کبھی کوئی تجوری کھولنی ہو تو بتانا۔"

"تم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا اس وقت۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی تالے کو غائب پا کے کھٹک گیا تھا۔"

"میں دروازے کے پاس انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے صاف دیکھ لیتے۔" ٹیڈی نے کہا۔ اس کی نظر بے اختیار گھر کی طرف گئی۔

"وہ کون؟" میں نے کہا۔ "اندر کوئی ہے کیا؟"

ٹیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کم سے کم تین آدمی ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "ایک ایک کر کے آئے تھے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ پیچھے ایک کھڑکی کا شیشہ غائب ہے۔ اندھیرے میں پتا نہیں چلتا۔ اندر سے پردے بھی برابر ہیں لیکن وہی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ تینوں اسی راستے سے اندر گئے ہوں گے۔"

"تم نے کسی کو پہچانا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، وہ بہت دور تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس اندھیرے میں تو آپ نے آواز سن کے ہی مجھے پہچانا ہوگا۔"

"مجھے ڈر تھا اسی بات کا۔" میں نے کہا۔ "اور میں گھر سے تو نکل گیا تھا کہ آج رات یہاں نہیں رہوں گا، اسلام آباد چلا جاؤں گا لیکن واپس آنا پڑ گیا۔ اب کیا ہم صبح تک اسی جگہ چھپے کھڑے رہیں گے؟"

"اگر کچھ کرنا ہے اپنے سکندر صاب! تو بس یہی وقت ہے۔" ٹیڈی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "اندھیرے میں ہم بھی اندر جا سکتے ہیں اور ان کو دبوچ سکتے ہیں۔ ورنہ ان کا کیا ہے، وہ صبح ہونے کے بعد بھی اندر بیٹھے رہیں۔"

"ہاں۔ اندر ان کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ سوائے میرے فی الحال کسی کے گھر آنے کا کوئی امکان نہیں اور میں کب تک نہیں آؤں گا؟ وہ انتظار کر سکتے ہیں۔ اندر ان کی ضرورت کا ہر سامان ہے۔ کھانے پینے کا اور آرام کرنے کا۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ہم تو صبح کی روشنی پھیلتے ہی صاف نظر آجائیں گے۔" ٹیڈی نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "کیوں آئے ہیں یہ لوگ جی؟"

"استاد بھولے!" میں نے کہا۔ "چور ہوتے تو مایوس ہو کر لوٹ چکے ہوتے۔ اب تک جو بیٹھے ہیں، صرف سکندر بخت کے منتظر ہیں۔"

"پھر بتائیں آپ! اندر جا کے بھرتہ بنا دوں ان کا؟ قسم مولا کی... گاجر مولی ہیں سسرے۔" اس نے ڈب سے خنجر نکال لیا۔

"بس بس، اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ چالاک دشمن کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری صحبت میں رہ کے ابھی تک تم نے اتنا بھی نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "یہ خنجر رکھ لو۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ تمھیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے استاد!"

"آپ بولیں جی، کرنا کیا ہے؟" ٹیڈی کے جذبۂ شجاعت میں خنجر رکھ لینے کے باوجود کمی نہیں آئی تھی۔

"تم یہ کرو کہ اطمینان سے ہوشیار! خبردار! کی صدا لگاتے اندر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یوں جیسے تم اس علاقے کے چوکیدار ہو۔ اندر وہ یقیناً پریشان اور حیران ہوں گے کہ چوکیدار اندر کیوں آیا۔ لیکن سمجھیں گے یہی کہ ایس پی کا گھر ہے، وہ جاتے وقت چوکیدار کو بطورِ خاص گھر کا خیال رکھنے کا کہہ گئے ہوں گے۔ چوکیدار اب دوسرے گھروں کا خیال رکھے نہ رکھے، اس گھر کی طرف سے غافل نہیں ہوگا۔ تم سامنے سے شروع کرو۔ ہر دروازے کو ٹھوک بجا کے اور ہلا جلا کے دیکھو۔ جیسے جیسے تم اس کھڑکی کی طرف بڑھو گے ان کی تشویش میں اضافہ ہوگا۔ وہ اندر سے کنڈی لگائیں گے اور انتظار کریں گے کہ تم چیکنگ سے مطمئن ہو کے دفع ہو جاؤ اور تم بالکل یہی کرنا یعنی اگلی کھڑکی یا دروازہ دیکھ کے اسی طرح صدا دیتے نکل جانا۔ اس وقت تک میں کھڑکی کے عین نیچے پہنچ جاؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ تمھارے جاتے ہی کوئی کھڑکی پھر کھولے گا اور اپنے اطمینان کے لیے سر نکال کر دیکھے گا۔ اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔"

"میں بھی چکر لگا کے پھر پیچھے پہنچ جاؤں گا۔" ٹیڈی نے میری اسکیم سے اتفاق کیا۔ "قسم مولا کی دونوں مل کر ان کا بھرتہ بنا دیں گے۔ ان کی تو..." اس نے کہا اور دیوار پھر سے باہر کود گیا۔

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود مجھے ہنسی آئی۔ استاد ٹیڈی کے لیے شاید یہ عملی آزمائش کا پہلا موقع ہوگا۔ اب تک تو اس نے مولا کی قسمیں کھانے اور ساری دنیا کا بھرتہ بنا دینے کے زبانی عزائم کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے استاد ٹیڈی کی دبنگ آواز سنی جو اونچا بولنے کی وجہ سے پتلی اور کسی حد تک مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ وہ بڑے سُر میں صدا لگا رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ 'جاگتے رہو، ہوشیار رہو اور خبردار رہو' کے بول گا رہا ہے۔ اصل چوکیدار کی آواز میں جو کرختگی اور کرارا پن ہوتا ہے اور جو ہر رات صدا لگانے کی مشق سے آتا ہے، وہ ٹیڈی کی آواز میں مفقود تھا لیکن اس فرق کو صرف میں ہی محسوس کر رہا تھا۔ دوبارہ وہ اپنی سُریلی آواز میں چلّا کے کھنکارا اور کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ اس نے پورے اطمینان کے ساتھ سامنے کے دروازے ہلا کے بلکہ جھنجوڑ کر دیکھے۔ جب وہ پیچھے کی طرف بڑھا تو میں جھاڑیوں سے تیر کی طرح نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ اب جو لوگ اندر ہوں گے، غیر شعوری طور پر اسی کھڑکی کی طرف لپکے ہوں گے جس میں سے وہ اندر گئے تھے چنانچہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ ٹیڈی دائیں طرف سے گھوم کر گیا تھا، میں بائیں طرف سے گیا۔ موڑ کاٹتے ہی میں اتنا نیچے جُھک گیا کہ مجھے چاروں ہاتھوں پیروں پر آہٹ کیے بغیر کسی جانور کی طرح دوڑنا پڑا۔ میں نے ٹیڈی کو سامنے سے آتے دیکھا اور اس سے چند سیکنڈ قبل ٹوٹے ہوئے شیشے والی کھڑکی کے نیچے پہنچ گیا۔ میرے کانوں نے واضح طور پر اندر سے چٹخنی

کے چڑھائے جانے کی ہلکی سی آواز سنی۔ میں دیوار سے چپکا ہوا، سانس روکے، چوکھٹ کے عین نیچے اس چیتے کی طرح بیٹھا رہا جو شکار پر جست لگانے کے لیے تیار ہو۔ ٹیڈی نے اس کھڑکی کو بھی تھوڑا سا ہلایا اور اگلی کھڑکی پر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دروازہ تھا۔ پھر آخری کھڑکی اور تقریباً موڑ کے پاس اسٹور کا دروازہ۔ ٹیڈی نے صدا لگائی اور گھوم گیا۔ اب میں بالکل تیار تھا کیونکہ ٹیڈی دوسری طرف کے کھڑکی دروازے چیک کر رہا تھا، جدھر سے میں آیا تھا اور اب کسی بھی لمحے کوئی کھڑکی کھول کے جھانک سکتا تھا۔

اچانک میرے کانوں نے چٹخنی کھولے جانے کی ہلکی سی آواز سُنی۔ میں چوکنا ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کے دیکھنے پر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا جو کھڑکی کے چوکھٹے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ "چلا گیا۔" کسی نے سرگوشی میں کہا۔

میں بجلی کی طرح اٹھا اور میرے ہاتھوں نے حلقہ بنا کے باہر جھانکنے والے کی گردن کو شکنجے کی طرح کس لیا۔ پھر میں نے آگے کی طرف جھٹکا دیا اور وہ کھڑکی سے سیدھا باہر آیا۔ یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکا۔ اس کے حلق سے 'اوق' کی آواز نکلی۔ میں نے دھوبی پٹخے کے انداز میں اس کو کندھے پر سے گزار کے زمین پر دے مارا لیکن وہ بلا کا پُھرتیلا آدمی تھا کہ گرتے ہی اس نے قلا بازی کھائی اور پلک جھپکتے میں اٹھ کر میرے مقابل آ گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس نے چوکیدار کے چلے جانے کے بعد کسی سے بات کی تھی اور خود ٹیڈی کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اندر دو یا تین آدمی موجود ہیں۔ چنانچہ میں دوسروں کی طرف سے بھی غافل نہ تھا۔ میں نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اپنے حریف کو سامنے آنے کی دعوت دی۔ میرا مقصد تو کھڑکی سے دور ہونا تھا تاکہ پیچھے سے کوئی مجھے دبوچ نہ لے۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم وجود پر انحصار کرتے ہوئے خود کو مجھ پر پھینک دیا اور سخت اناڑی پن کا ثبوت دیا۔ میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل گرا۔ اگر وہ مجھ سے ٹکرا جاتا تو یقیناً دیوار سے تصادم میں میرا جسم پتّے کی طرح چپٹا ہو جاتا۔ خود اسے امید ہوگی کہ میں جوابی حملے کے لیے تیار نہ ملوں گا۔ کیونکہ وہ کسی دبا کے چھوڑ دیے جانے والے اسپرنگ کی طرح میری طرف آیا تھا۔ دوسری بار منہ کے بل گرنے سے اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جانا چاہیے تھی مگر وہ اتنی ہی مستعدی سے پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے اٹھتے اس نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے گھٹنے کے اوپر کی گول اور نرم ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔ درد کی لہر سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں جگنو سے جھلملانے لگے اور میرے وجود کی عمارت کو سہارا دینے والا ایک ستون ہلنے لگا۔ میں نے دوسری لات گھما کے اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ ضرب کی شدّت سے بے اختیار دُہرا ہوا اور میں نے اسی پیر کو اٹھا کے گھٹنا مارا جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ وہ پیچھے الٹ گیا۔ اسی وقت میں نے ٹیڈی کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ وہ یوں چُھرا لہراتا ہوا آ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام ہے اور وہ کسی لشکر کی کمان کر رہا ہے جو غنیم کو تہِ تیغ کرنے کے لیے جوش سے نعرے لگاتا گھوڑے دوڑاتا میدانِ کارزار کی جانب بڑھ رہا ہو۔

"قسم مولا کی۔ آج کوئی سالا بچ کر نہیں جا سکتا۔" اس نے قریب آ کے بیانگِ دُہل کہا لیکن دشمن کے اس مورچے یا کمیں گاہ کو بھول گیا جس کے سامنے ابھی تک میری صرف ایک حریف سے دست بدست جنگ چل رہی تھی۔ کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کے کسی نے اس کے سر پر ٹن سے کوئی چیز ماری۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پیتل کی ایک منقش تھالی تھی جو دیوار پر ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور تھالی کی میوزیکل گونج کے ساتھ ہی وہ بھد سے نیچے گرا اور بالکل ساکت ہو گیا۔ مجھے بے ساختہ میاں خوجی اور ان کی وہ شہرہ آفاق قرولی یاد آئی جو وقتِ ضرورت اسی طرح ان کے بلند بانگ دعوؤں کو باطل کر دیتی تھی۔ استاد ٹیڈی کا خنجر بھی کام نہ آیا تھا اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا پڑا تھا۔ میں فوراً اس کی طرف جھپٹا۔

اسی وقت کھڑکی سے آنے والی سرچ لائٹ جیسی تیز اندھا کر دینے والی روشنی میرے منہ پر پڑی۔

"بس۔" کسی نے بھاری بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔ بالکل سیدھے۔"

میں نے تعمیل کی اور خنجر کا خیال چھوڑ کے اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ وہ شخص جو میرے مقابلے پر اترا تھا۔ بلکہ جسے خود میں نے مقابلے پر گھسیٹ لیا تھا۔ اب احمقوں کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اپنا سر سہلا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا اور کسی سانڈ کی طرح مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنے مقابلے کے بعد چت ہو جاتا لیکن وہ سخت جان بھی تھا اور کچھ لڑنے بھڑنے کا ماہر بھی۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کھڑکی میں سے دوسرا شخص آہستہ آہستہ باہر آیا۔ اس نے ٹارچ ایک ہاتھ کی گرفت میں رکھی اور ریوالور کو دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایک ٹانگ نیچے لٹکائی۔ "کون ہو تم ٹارزن کی اولاد؟" وہ بولا۔

پھر ایک غیر متوقع اور کسی حد تک مضحکہ خیز بات ہوئی۔ استاد ٹیڈی تڑپ کر اٹھا اور اس نے اندر سے اترنے والے کو ٹانگ پکڑ کے پوری قوت سے گھسیٹ لیا۔ وہ بڑے عجیب طریقے سے باہر گرا۔ خود بخود اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی اور چند فٹ دور جا گری۔ اس کی روشنی دیوار پر ایک دائرے کی شکل میں پڑنے لگی۔

"قسم مولا کی... میں نے کہا تھا نا کہ کوئی..." استاد ٹیڈی کی آواز آئی۔

ابھی مجھے استاد ٹیڈی کی حاضر دماغی، پھرتی اور اداکاری پر حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ حریفِ اوّل نے ایک دم پیچھے سے آ کے اس کے سر پر وہی ٹارچ دے ماری جو اس کے قریب گری تھی۔ استاد ٹیڈی نے جملہ نامکمل چھوڑ کے حلق سے پھر وہی "اوق" کی آواز نکالی اور اس بار بیچ میں اٹا غفیل ہو گیا۔ حریفِ ثانی جس کو اس نے کھڑکی سے برآمد کیا تھا، مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنا چاہا تو میں نے اس کے ہاتھ کو کلائی پر جھٹکا دیا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر اس نے بڑی پھرتی سے میرے کان کے قریب بائیں ہتھیلی سے وار کیا۔ جس طرح اسے امید نہ تھی کہ میں جوڈو کراٹے کے فن سے واقف ہوں، اسی طرح میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ لڑائی مار کٹائی کے مروجہ دیسی طریقوں سے کام لے گا لیکن وہ بھی اس معاملے میں مجھ سے کم نہ تھا۔ اچانک وہ پورا منظر میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا، دھندلا ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔ میرا خیال ہے نیچے گرنے سے پہلے ہی میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

ہوش آنے کے بعد میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو ماحول کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ دھند چھٹنے لگی اور میں نے انکل رضوی کے بیڈ روم کو پہچان لیا۔ میں اپنے ہی گھر میں رضوی صاحب کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ گردن گھما کے دیکھنے پر مجھے اپنے ساتھ ہی استاد ٹیڈی لیٹا ہوا نظر آیا۔ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ یہ جان کے مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ پھر میں نے ان دونوں کو دیکھا جو ہاتھ میں ریوالور لیے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

"تم... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"یہی سوال ہمیں تم سے کرنا ہے۔" حریفِ اوّل نے کسی قسم کی پریشانی کے بغیر کہا۔ "اور جواب تم پہلے دو گے۔"

"میں سکندر بخت ہوں!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اسی گھر میں رہتا ہوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں؟"

"نہیں، ہمیں معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "اور یہ کارٹون؟"

اس نے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرا دوست ہے۔ مجھ سے ملنے آیا تھا۔" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"تو یہ چوکیدار بننے کی ایکٹنگ کیوں کر رہا تھا؟" وہ بولا۔ "کیا تمھارے دوست اسی طرح آتے ہیں ملاقات کرنے اور ایسے ہی جوکر ہیں سب؟" اس کے انداز میں بڑا اہانت آمیز تمسخر تھا۔

"یہ سب پوچھنے والے تم کون ہوتے ہو؟" میں نے متانت سے کہا۔ "اور تم یہاں کیا کر رہے تھے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے؟" ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے اور ریوالور جیب میں رکھ لیے۔

"ہاں، اور ہمیں بھی انھوں نے ہی بھیجا تھا۔" دوسرے نے پہلی بار لب کھولے۔ "ضامن رضوی صاحب نے۔"

میں نے احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھا۔ "رضوی صاحب نے؟ وہ کیوں؟"

اس نے جیب سے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور میری طرف پھینک دیا۔ میں نے تصویر کو اس کی صورت سے ملایا اور کارڈ پر غور کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ خفیہ پولیس کا ایک انسپکٹر ہے۔

"اگر میں مان لوں کہ شناختی کارڈ جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انکل رضوی نے تم کو یہاں چوروں کی طرح چھپ کر بیٹھنے کے لیے کیوں بھیجا تھا اور کیا انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر بخت کی مرمت کرنی ہے؟"

"وہ آپ نے خود ہمیں دعوت دی تھی۔" وہ بولا۔ "اور ہم آپ کو پہچانتے نہیں تھے۔ رضوی صاحب آج دن بھر آپ کو فون کرتے رہے مگر آپ نہیں ملے۔ رات گیارہ بجے انھوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا۔ وہ آپ کی طرف سے متفکر تھے۔ انھوں نے کہا کہ خاموشی سے جاؤ اور دیکھو، سکندر بخت گھر میں ہے یا نہیں۔ یہاں آنے کے بعد ہم نے آپ کو سارے گھر میں تلاش کر کے دیکھ لیا اور رضوی صاحب کو فون پر بتا دیا کہ گھر پر تو سب خیریت ہے۔ دراصل انھوں نے کہا تھا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو تو..."

"ان کا مطلب ہو گا کہ میری لاش پڑی ملے یا توڑ پھوڑ، مار پیٹ یا خون خرابے کے آثار ملیں۔" میں نے کہا۔

"جی۔ ان کا مطلب ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم جانے ہی والے تھے کہ ہمیں ایک شخص باہر بڑے مشکوک انداز میں داخل ہو کے چھپتا نظر آیا۔ پھر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے اس کے دوسرے ساتھی بھی آئیں۔ اس کی نقل و حرکت پر تو ہمیں نگاہ رکھنی ہی تھی۔ ہم اندر کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھے تھے اور شیشے میں سے جھانک رہے تھے۔ باہر نسبتاً زیادہ روشنی تھی۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے چھپا رہا۔ پھر اس کا ایک ساتھی دروازے تک آ کے لوٹ گیا۔ دوبارہ ہم نے اسے دیوار کے کونے سے اندر کودتے دیکھا۔ وہ شخص جھاڑیوں کے پیچھے سرکتا ہوا اس کے پاس گیا اور کچھ دیر وہ دونوں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔"

"وہ شخص" میں نے اسی متانت سے استاد ٹیڈی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ ہے۔ اور دیوار پر سے کودنے والا میں خود تھا۔"

استاد ٹیڈی کی مونچھیں تھرتھرانے لگی تھیں اور حلق سے کچھ کراہنے کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔

"یہ سب غلط فہمی کے باعث ہوا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ ہم باہر چھپ کر انتظار کرتے رہے۔ پھر میں نے ہی استاد ٹیڈی... میرا مطلب ہے اپنے اس دوست کو چوکیدار بنا کے بھیجا تھا۔"

"رضوی صاحب نے کہا تھا کہ آپ ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ "مگر یہ تو کوئی ڈراما نہیں تھا کہ آپ نے اٹھا کے مجھے باہر پھینک دیا۔ خواہ مخواہ، میں یا آپ لنگڑے لولے ہو جاتے پھر؟ یا ایس آئی صاحب گولی مار دیتے۔"

ایس آئی نے اپنے ماتحت کو گھورا۔ "میرا خیال تھا کہ تم مقابلہ کر سکتے تھے۔ اتنی جان صرف حرام کھانے کے لیے بنائی ہے؟"

"اچھا اب آپ لوگ بیٹھیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "خوشی کی بات یہ ہے کہ کسی کا نقصان نہیں ہوا۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔ میرا یار ہوش میں آنے لگا ہے۔ اسے بھی سمجھا دینا کہ سب خیریت ہے۔" لیکن وہ دونوں میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ چائے پئیں، ہم چلتے ہیں۔" پہلے نے جماہی لے کر کہا۔ "خواہ مخواہ رات بھر کی بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ اب گھر چل کے سوتے ہیں۔ آپ رضوی صاحب سے بات کر لیں۔"

"لیکن... یہ سب نہ کہیں... تو بڑی مہربانی۔" حوالدار نے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "جو بھی ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا۔"

میں ہنسا۔ "فکر مت کرو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے تو ہم بڑی بڑی باتیں نہیں کہتے۔"

جب میں چائے بنا کے لوٹا تو استاد ٹیڈی کے ہوش و حواس میں سے ہوش بحال ہو چکے تھے۔ میں نے اسے چائے پلانے کے بعد ساری رام کہانی سنائی تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ خصوصاً اس منظر کا ذکر کرتے وقت جب ٹیڈی سر پر تھال بجتے ہی بیک گراؤنڈ میوزک کے ساتھ لیٹ گیا تھا۔ "اداکاری خوب کی تھی تم نے استاد!" میں نے کہا۔

"ایسا نخرہ دیا تھا گدھوں کو۔" وہ خفت سے بولا۔ "اچھا ہوا دشمن نہیں تھے ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔"

میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں چاہتا تھا لیکن چائے پیتے پیتے مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ خنجر کو تیغِ آبدار کی طرح لہراتا آ رہا تھا۔ تو مجھے پھر ہنسی آئی۔ "غلط فہمی نے بھی کیا تماشا دکھا دیا۔" میں نے اسے مزید خفت سے بچانے کے لیے کہا۔ میں نے اسے اس رات کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور ابھی تک اسی تذبذب کا شکار تھا کہ جو بات ابھی تک میرے اور شیخ کے سوا کسی کو معلوم نہیں، کیا وہ ٹیڈی کو بتانے سے مجھے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مجھے اسلام آباد جا کے یہ سب کچھ رابعہ کو اور محسن کو تو بتانا ہی تھا۔ استاد ٹیڈی کام کا آدمی تھا۔ اس نے ایک ہنگامی صورتِ حال میں میری مدد کی تھی اور ایسے گواہ فراہم کر دیے تھے جو ثابت کر سکتے تھے کہ عبدل اور شیرے کے قتل کی واردات کے وقت میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ ضرورت مجھے پھر پیش آ سکتی تھی۔ گزشتہ رات کا بندوبست تو عبدالودود منظر نے کر دیا تھا۔ اس کا یہی احسان بہت تھا۔ آج کی رات میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا؟ اس کے گواہ بھی ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے سچ بولنے کی گنجائش نہ میرے لیے رہی تھی، نہ شیخ کے لیے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ کون جانے کل میرے لیے یہ ثبوت فراہم کرنا مسئلہ بن جائے کہ میں رات بھر کہاں تھا اور کس وقت کیا کر رہا تھا۔ خود انکل رضوی مجھ سے پوچھ سکتے تھے کہ برخوردار! گھر سے کہاں غائب تھے؟

"کیا سوچ رہے ہو استاد سکندرِ اعظم؟" ٹیڈی نے کہا۔

"میں؟... ہاں... میں سوچ رہا تھا کہ انکل نے بار بار مجھے فون کیوں کیا تھا۔" میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسلام آباد فون کر کے معلوم کر لینا چاہیے۔ خدا کرے، وہاں خیریت ہو۔"

"میرا بھی سلام دینا شہلا باجی کو۔" وہ بولا۔ "اور محسن بھائی کو۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

میں ٹیلی فون کرنے کی غرض سے ہی دوسرے کمرے میں گیا تھا لیکن ریسیور اٹھانے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لائن تو ڈیڈ ہے۔ میں نے پورے محکمے پر لعنت بھیجی اور ٹیلی فون کے پروگرام کو صبح پر ملتوی کر کے لوٹ آیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس وقت جب میٹھی نیند سونے والے کسی خواب کے کلائمکس کا فلمی انجام دیکھ رہے ہوں گے۔ میں انھیں جگا کے کہوں کہ جناب مجھے ٹیلی فون کی خرابی کی شکایت درج کرانے کے لیے آپ کے گھر سے فون کرنا ہے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہتے لیکن دل ہی دل میں گالیاں دیتے کہ میاں پانچ دس منٹ بعد آجاتے تو کیا تھا۔

میں منہ لٹکائے واپس آیا تو ٹیڈی نے پوچھا "خیریت تو ہے اپنے سکندر صاب ؟"

"ہاں۔ بس فون مرا پڑا ہے" میں نے کہا "اب صبح ہونے والی ہے، بلکہ ہو گئی ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ جو کچھ ابھی ہوا، اس کی تو کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے پہلے بہت کچھ ہو چکا تھا، بڑی گڑبڑ والی بات ہے "

"پھر... کوئی... کسی قاتل کو مقتول بنا دیا ہے کیا؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا "یار! تم نے بھی خواہ مخواہ اپنی جان کو روگ لگا رکھے ہیں۔ میری مانو تو اپنی اس وکیل صاحبہ کو لو اور لوٹ جاؤ ولایت "

" یہ آرزو ہی بڑی چیز ہے مگر ہمدم " میں نے آہ بھر کے کسی فلسفی کی طرح کہا "خواہشات کوئی تانگوں میں جتے ہوئے گھوڑے نہیں کہ لگام ہاتھ میں ہو تو اپنی مرضی سے جس تعبیر کی راہ پر چاہو موڑ لو اور ہم کو ولایت یہیں مل جائے تو اچھا ہے۔ وہاں سے تو ہم آئے نہیں، لائے گئے تھے۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اسے دھیان سے سنو! ہو سکتا ہے مجھے پھر تمھاری مدد کی ضرورت پڑ جائے "

جتنی دیر تک میں نے اسے تھانے میں پیش آنے والے واقعات کے انجام سے آگاہ کیا، وہ یوں ہکا بکا بیٹھا رہا جیسے کسی زمانے میں داستانِ امیر حمزہ یا طلسم ہوشربا جیسی کہانیاں قسط وار سننے والے عمرو عیار کے کارناموں پر دم بخود بیٹھے رہتے ہوں گے۔ حقیقت سے ٹیڈی کو روشناس کرا دینے کا فیصلہ کر لینے کے بعد میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔

"قسم مولا کی " وہ میری بات ختم ہونے کے بعد بولا "ایسے خوفناک سنسنی خیز واقعات تو اپن نے کسی انگریزی فلم میں بھی نہیں دیکھے۔ کون تھا وہ جو پیڈرو کے میک اپ میں تھا!"

" جیسا کہ اس نے خود بتایا، زرداد " میں نے کہا "لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا نام کیا تھا اور وہ کیا کرتا تھا۔ مونگ پھلی بیچتا تھا یا قلفی۔ وہ تو اب ایک لاوارث لاش ہے جس پر صرف ایک حوالہ نمبر پڑا ہوا ہے۔ تم اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو۔ بلکہ دو کام کرو "

"آپ دس کام کہیں اپنے سکندر صاب! قسم مولا کی، آپ نے ٹیڈی کو یار کہہ دیا تو اب ہم یاری کا حق ادا کر کے نہ دکھائیں تو لعنت ہم پر " وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"پہلا کام تو یہ ہے کہ تم استاد پیڈرو کا پتا لگاؤ۔ وہ کہاں ملتا ہے اور واردات کی شب کہاں تھا؟ یقینی بات یہ ہے کہ جب کسی اور کو پیڈرو بنا کے بھیجا گیا تھا تو یہ انتظام بھی کیا ہو گا کہ اصل پیڈرو رات بھر کسی اور جگہ موجود رہے جہاں درجن بھر افراد اس کی ہمہ وقت موجودگی کے گواہ ہوں۔ دوسرا کام تم پہلے بھی کر چکے ہو۔ دو چار ایسے قابلِ اعتماد گواہ پیدا کر لو جو کہہ سکیں کہ رات بھر میں ان کے ساتھ تھا "

" لو جی۔ کیا موقعے کی بات کی ہے آپ نے " وہ ہاتھ ملا کے بولا "آج اپنے یار رحیمو پہلوان تانگے والے کے گھر میں کچھ رونق میلہ تھا، اس کی بیٹی کی شادی ہے کل۔ اس نے کچھ فنکشن وغیرہ کا انتظام کیا تھا اور سب یار دوستوں کو بلایا تھا بس تم بھی وہیں تھے۔ رات بھر کا پروگرام تھا۔ صبح تک تم شریک رہے۔ خود رحیمو بتا دے گا "

" واہ استاد! تم واقعی یاروں کے یار ہو اور استادوں کے استاد " میں نے کہا۔

ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا سا بدمعاش تھا لیکن اس کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ ہر وقت ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا اور ہر کسی کے دکھ میں شریک ہو جانا اس کا شعار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا حلقۂ احباب وسیع تھا اور وہ سب جن کے لیے اس نے کبھی کچھ کیا تھا، ضرورت پڑنے پر ٹیڈی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس کو احساس تھا تو یہ کہ معاشرے میں اس کی عزت نہیں اور شرفا اس سے یوں پرہیز کرتے ہیں جیسے کسی کوڑھی سے لیکن ہم نے اسے وہ مقام دیا جس کا وہ آرزومند تھا۔ اب وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، دولت مند اور معزز افراد کا دوست ہی نہیں، جذبات کے رشتوں سے ہمارے مختصر سے خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ سکندر بخت کا دوست ہے جو ایک فیکٹری کا مالک ہے اور چار سال ولایت میں رہ چکا ہے اور محسن کا دوست ہے جو اسلام آباد کے ایک ڈپٹی سیکرٹری کا لڑکا ہے۔ رابعہ قاضی جیسی ایڈووکیٹ کے گھر میں اس کا آنا جانا اسی طرح ہے جیسے بہنوں کے گھروں میں اور وہ ضامن رضوی صاحب جیسے بھائیوں کا بھی جاتا رہتا ہے۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں کہ ٹیڈی کے حلقۂ احباب میں بیشتر لوگ اسے زبردست گپ قرار دیتے ہوں گے تو یقین کرنے پر سخت مرعوب ہوتے ہوں گے۔ کیونکہ خود ان کے خاندان اور حلقۂ شناسائی میں بھی انھی کے ہم رتبہ لوگ تھے۔ وہ سب پستی کے مکین کہلاتے تھے اور جن کا ذکر ٹیڈی کرتا ہو گا، وہ اونچے لوگ تھے جن کا دماغ بہرحال عرشِ معلّے پر رہتا ہے۔ اعلیٰ سوسائٹی کا کمپلیکس ٹیڈی کے مستقبل کی راہیں بدل سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی موجودہ صحبت سے دور ہوتا جائے اور جتنا ہم سے قریب ہو، اس کی زندگی کے نظریات میں رونما ہونے والے انقلاب کی بنیادیں استوار ہوتی جائیں ؎ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ یہ بات اگر پہلے درست تھی تو اب یہ ہو سکتا تھا کہ ؎ جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد، والی بات صحیح ہو جائے۔

میں نے سات بجے کے قریب غسل کیا اور جب ٹیڈی ایک کوٹھی کے خوبصورت باتھ روم میں نہانے کا لطف اٹھاتے ہوئے زور زور سے گا رہا تھا "میں تو چھوٹی موٹی ہے " تو میں ناشتا بنا رہا تھا اور استاد ٹیڈی کی شجاعت کے کارنامے یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب میں نے دروازوں کو مقفّل کیا اور ہم دونوں ایک ساتھ نکل کے مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے گزشتہ دن ہی عہد کیا تھا کہ پھر کبھی آیا تو رابعہ کے ساتھ آؤں گا لیکن ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں پھر شیخ کے گھر میں تھا۔ مجھے امید تھی کہ شیخ آچکا ہو گا لیکن اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ میرا استقبال اسی آفت کی پرکالہ نازلی نے کیا۔

" ارے آپ ؟" وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی "آپ تو اسلام آباد گئے تھے ؟ پھر یہ کیا ؟ آپ کی تصویر مجھے ٹی وی پر نظر آ رہی ہے یا تصور میں۔ یا آپ کی روح کو میری آنکھیں مجسم دیکھ رہی ہیں سکندر جی !"

" ارے بابا! نہ سلام نہ دعا " میں نے زچ ہو کے کہا۔ "اب آپ مجھے اندر جانے دیں "

" اوہ۔ سوری۔ السلام علیکم !" وہ پیچھے ہٹ کے بولی۔ "صبح صبح کوا بول رہا تھا منڈیر پر۔ میں نے بہت غور کیا کہ کون آنے والا ہے ؟ ہے نا کمال کہ آپ آ گئے۔ ویسے آپ کو ہزار روپے کی ضرورت تھی تو اتنا لمبا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی ؟ جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اب مجھے ہی لیجیے، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی "

" مگر بولتی بہت ہو۔ محاورے کے مطابق آپ کو کوّے نوش فرمانے سے تو رغبت نہیں ہے ؟" میں نے کہا "اور آج ناشتے میں آپ نے اس بدبخت کوّے کو تو نہیں کھا لیا جس نے آپ کے گھر کی منڈیر پر آ کے بولنے کی حماقت کی تھی ؟"

وہ ہنسی "وہ دراصل کوا نہیں تھا، اُلو تھا۔ آ گیا صبح صبح۔ اب آنے والے کو کوئی کیسے روکے ؟"

" خدا کے واسطے اندر جا کے شیخ سے کہو کہ شامت کا مارا سکندر آیا ہے " میں نے کہا۔

" شیخ صاحب کے تشریف لاتے ہی یہ بات میں ان سے کہہ دوں گی " وہ بولی " فی الحال آپ تشریف رکھیں "

" اچھا اپنے ڈیڈی سے یا امی سے کہہ دو " میں نے کہا۔

" ان سے تو ابھی ملاقات ہو جائے گی سکندر جی !" وہ چٹکی بجا کے بولی "میں ناشتا لگانے ہی والی تھی میز پر "

" میں ناشتا کر کے آیا ہوں " میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میرا پیٹ بھرا ہوا ہے "

" معاف کرنا کیسا جی۔ میں جا کے بتا دیتی ہوں امی کو کہ سکندر صاحب آئے ہیں، بغیر ناشتا کیے " وہ ہنسی "صبح صبح کوئی بھوکا آ جائے دروازے پر تو اسے پیٹ بھر کھلانے کا بڑا ثواب ہے۔ ظاہر ہے، تم اتنے بدخواہ بھی نہیں ہو ہمارے کہ ہمیں ثواب سے محروم رکھو اور اتنے بد اخلاق بھی نہیں کہ امی ڈیڈی کے ڈانٹنے پر بھی کچھ نہ کھاؤ۔ زیادہ سے زیادہ بدہضمی ہی ہو گی نا۔ باہر جا کے چورن کھا لینا " وہ باہر جاتے جاتے پھر ہنسی۔ یا میرے خدا! اس کی شادی کسی بہرے سے ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جائے گا۔

ناشتے کی میز پر اس کا جبر جاری رہا۔ اس نے دو بار بے خبری میں حملہ کیا اور میری پلیٹ کو ایک بار دلیے سے اور دوسری بار حلوے سے بھر دیا۔ پھر اس نے یہی زبردستی چائے کے معاملے میں کی۔ چنانچہ میں ناشتے کے بعد اٹھا تو میرے لیے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے بدہضمی کیا، ہیضہ ہو جانے کا یقین آنے لگا تھا۔ نازلی کے والدین کو پتا نہیں تھا کہ صرف آدھے گھنٹے کے وقفے سے میں نے یہ دوسرا اور ڈبل ناشتا کیا تھا۔ وہ بڑے شفقت آمیز اصرار کے ساتھ مجھے اور کھانے پر مجبور کرتے رہے اور نازلی کی شرارت کو آدابِ میزبانی سمجھ کے نظر انداز کرتے رہے۔ صرف نازلی تھی جو مجھ پر یہ ظلم کر کے بہت خوش تھی۔

شیخ ساڑھے آٹھ بجے آیا اور اس نے اخلاقاً معذرت کی۔ "ہم پولیس والوں کی تو نوکری ہی ایسی ہے یار! نہ آنے کا وقت نہ جانے کا "

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کوئی بات نہیں بھائی جان! انھوں نے ناشتا کر لیا ہے۔ گھر سے ایسے ہی آ گئے تھے۔" نازلی نے کہا۔

"گڈ۔" شیخ نے چٹکی بجا کے کہا۔ "بس اب مجھے آدھا گھنٹا اور دے دو۔ میں آیا نہا کے اور ناشتا کر کے۔"

نازلی کی ماں اندر جا چکی تھی اور اس کے ابا اخبار لے کر باہر جا بیٹھے تھے چنانچہ آدھے گھنٹے کے لیے میں پھر نازلی کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ "مس نازلی!" میں نے متانت سے کہا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بھی تشریف لے جائیں اور اندر جا کے کوئی نیک کام کریں۔ مثلاً کتابوں میں دل لگائیں۔"

"استاد جی!" وہ آہ سرد بھر کے بولی۔ "اس وقت میرا پڑھنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میرا ٹیسٹ لے لیں۔"

"ٹیسٹ لے لوں؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "کس چیز کا؟"

"یہی کہ مجھے جوڈو اور کراٹے کتنا آتا ہے۔ آجائیے سامنے۔" وہ اٹھی اور دوپٹے کو سر پر سے آتار کے کمر کے گرد لپیٹ لیا اور آستین کو اوپر چڑھا کے اس نے مجھے چیلنج کیا لیکن میں چیلنج قبول کرنے کے بجائے یہ سوچ رہا تھا کہ بے تکلفی اور معصومیت کے اس مظاہرے کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والا کیا صرف نوجوانی کا الّڑھ پن سمجھے گا؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو آزمانے کے بہانے ایسا سبق دوں کہ وہ ساری شوخی بھول جائے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایک کم عمر اور کم عقل لڑکی ہی تو ہے، میرا اس کا کیا مقابلہ؟ چنانچہ میں اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ تیار ہونے کے بجائے میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"تم واقعی اسکول کی بچی ہو۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ "غلطی سے کالج میں پہنچ گئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کے بولی۔ "عقل نہیں ہے مجھ میں یا... چھوٹی ہوں میں؟"

"ماشا اللہ، بہت جلد سمجھ لیا بات کو۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی سچ ہے کہ تمھارا عقل نام کی کسی چیز سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹا بڑا ہوتا ہے آدمی ذہنی طور پر۔ اب تم دیکھنے میں تو واقعی بڑی لگتی ہو۔ مگر ہو نہیں۔"

میرا حربہ کارگر رہا۔ نازلی کا موڈ آف ہو گیا اور منہ سُوج گیا۔ اس نے دوپٹے کو کمر سے کھول کر شانے پر ڈالا اور آستین نیچی کر کے سخت برہمی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھی۔ عین دروازے میں اس کا تصادم شیخ سے ہوا۔

"الٰہی خیر! یہ لومڑی دُم دبا کے کہاں فرار ہو رہی ہے؟" شیخ نے کہا اور پھر غور سے اس کی روتی صورت کو دیکھا۔ "... ہے تجھے؟ بھڑنے کاٹا ہے کیا؟ منہ کیوں کُپّا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں یار!" میں نے کہا۔ "مجھ سے فرما رہی تھیں جوڈو کراٹے سکھا دیں۔" میں نے کہا۔ "عقل کے ناخن لو بی بی۔ شریف لڑکیاں ہانڈی چولھا کرتی ہیں، جھاڑو برتن کرتی ہیں، مار دھاڑ نہیں کرتی پھرتیں اور ابھی تو گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے تمھاری۔ بس اسی کا غصہ ہے کہ میں نے سچ کیوں بولا۔"

نازلی میری بات سُن کے ذرا سی دیر کے لیے رکی تھی مگر بات سننے کے بعد اس کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ پیر پٹختی ہوئی نکل گئی۔

شیخ نے ایک زبردست قہقہہ مارا اور میں نے عمداً اس کا ساتھ دیا۔ تاکہ آواز نازلی تک پہنچ جائے اور وہ سمجھ لے ہم اس پر ہنس رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ جذباتی لڑکی اپنے کمرے میں بیڈ پر گر کے اب رو رہی تھی — میں نے سوچا۔ اس جذباتی حماقت کی انتہا کا شکار ہونے والی لڑکی تو خودکشی تک کر سکتی ہے۔ اگر اس نے بھی اسی قسم کا کوئی قدم اٹھا لیا تو اس جرم کا داغ میرے ضمیر پر رہ جائے گا۔ میں کسی کو بتا بھی نہ سکوں گا کہ ایسا کیوں ہوا؟

"بیٹھے ہیں پھر تصوّرِ جاناں کیے ہوئے۔" شیخ نے اندر آ کر کہا۔ "مگر جناب ابھی فرصت کے وہ رات دن کہاں؟ اپنے کہ اب وہ لذّتِ خواب سحر گئی۔"

میں چونک کر ہنسا۔ "پولیس اور غالب۔ کیا ستم ہے! کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

باہر نکل کے میں نے اسے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات سنائے جو کسی لطیفے سے کم نہ تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ ایک اسکوٹر کی آواز پھر ٹریفک کا شور۔ مجھے اس کے کان میں چلّا کے بات کرنا پڑ رہی تھی لیکن میری نظر اِدھر اُدھر بھی تھی کہ خدانخواستہ کوئی ہمارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔

"یہ خوب ہوا۔" شیخ نے کہا۔ "مارا بھی اور مار بھی کھائی، وجہ کوئی نہیں۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا دو روپے۔"

"اب یہ تو مشکل تھا کہ ہم آمنے سامنے ہو کے تعظیم بجا لاتے اور اپنا اپنا تعارف کراتے کہ فدوی کو سکندر بخت کہتے ہیں اور وہ کورنش بجا لاتے کہ ناچیز کارکنانِ خفیہ پولیس ہیں۔ آداب اور شب بخیر! مقصود صرف حضور کی خیریت دریافت کرنا تھا۔"

"لیکن یار! رضوی صاحب نے بار بار فون کیا تھا تو ان سے بھی پوچھ لینا تھا کہ بات کیا ہے۔ خدانخواستہ..."

"میں نے پہلا کام یہی کیا تھا مگر اپنے گھر کا ٹیلی فون فوت ہو چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ذرا اپنے کام سے فارغ ہو لیں تو کسی جگہ سے بات کریں گے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی یار! آخر رابعہ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ ایک بار تو کرتی۔"

"حالانکہ جناب نے اس کی یاد میں ہجر و فراق کے یہ دن تڑپ کر گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔" شیخ ہنسا۔ "صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا۔ رات اختر شماری کرتے گزرتی تھی اور دن اسے ٹیلی فون کرتے۔"

"میں اسے کس طرح فون کر سکتا تھا یار! وہاں اتنے لوگ ہیں اور پھر وہاں کے حالات۔" میں نے خفت سے کہا۔

"تو اس کے لیے یہ پرابلم نہیں تھی کیا؟" شیخ نے کہا۔ "سب کچھ نظر انداز کر کے تمھیں حالِ دلِ زار بتاتی رہتی۔"

"اسے تو معلوم تھا نا یار کہ یہاں میں اکیلا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو وہاں انکل رضوی یا شیروانی صاحب میں سے کوئی ریسیور اٹھا لیتا تو میں بیمار پرسی کے بجائے کہتا کہ ذرا میری منسوبہ کو بلائیے۔"

"یار! وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی ہے۔" شیخ نے کہا۔ "اس کے علاوہ وہ سمجھ رہی ہوگی کہ تم پہنچنے والے ہو۔ آج نہ سہی کل عدالتی اجازت ملتے ہی آجاؤ گے۔ عدالت کی اجازت ملے چوبیس گھنٹے ہونے کو ہیں اور جناب کہاں جا رہے ہیں، مزنگ۔"

"میں تو مارا گیا شیخ صاحب! دونوں طرف سے۔" میں نے کہا۔ "اُدھر محسن کو گلہ ہوگا تو دوسری طرف رابعہ کو بھی کہ میں اپنے ایڈونچرز سے باز نہیں آیا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں چلنے کی نیت کر کے ہی تیرے پاس آیا تھا اور نازلی سے ایک ہزار نقد بھی اسی مقصد کے لیے مانگے تھے۔ مگر آگے جو کچھ ہوا اس میں میرا کیا قصور۔" مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر وہ لڑکی مجھے زبردستی چائے پینے اور پھر خواہ مخواہ ایک سہیلی کے گھر چھوڑ کر آنے پر مجبور نہ کرتی تو میں بہت پہلے تھانے پہنچ جاتا۔ اس وکیل کے آنے سے پہلے میں بادامی باغ کے اڈے پہنچ جاتا اور اس سارے جھمیلے سے بچ جاتا۔ لیکن بات وہی ہے کہ نصیب کا لکھا آگے آتا ہے اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ میری موجودگی کے باعث ہی شیخ بچ گیا تھا۔

"تو نے اس کانسٹیبل کو بریف کر دیا ہے نا کہ اسے حشمت خان سے کیا کہنا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ بہت نروس تھا لیکن میں نے کہا کہ جوان جب اوکھلی میں دیا سر، تو موصل کا کیا ڈر۔" شیخ نے کہا۔ "اب ڈٹے رہو اپنے بیان پر۔ حشمت خان کو شاید یاد ہی نہ آئے کہ اس نے کب کس کو ڈک دینے کے احکامات صادر فرمائے تھے اور اس کا کیا جرم تھا۔ ہر روز..."

"یہ ذرا مختلف بات ہے شیخ!" میں نے کہا۔ "اگر وہ کانسٹیبل کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کا نام لیتا تو حشمت خان شاید مخمصے میں پڑ جاتا لیکن استاد پیڈرو کا نام ایسا نہیں کہ وہ اچھل نہ پڑے۔ وہ استاد پیڈرو کی صورت ہی نہیں پہچانتا، اس کے معاونین میں سے ایک ہے۔ دوسرا امیر محمد تھا جو اب نہیں ہے۔ تیسرا کوئی نقلی ڈی ایس پی سراج ہے۔"

"خیر اب وہ کانسٹیبل تو اپنے بیان سے ایک انچ نہیں ہٹے گا۔ ویسے بھی وہ گل محمد ہے۔ زمیں جنبد، نہ جنبد گل محمد۔" شیخ نے کہا۔ "اسے اپنی جان بھی تو بچانی ہے۔ وہ اڑ جائے گا کہ اس نے حشمت خان کے کہنے پر روزنامچے میں اندراج کیا تھا۔ بعد میں وہ کیسے مرا؟ اس کے گواہ بہت ہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ لاش کو اس نے خود اسپتال پہنچایا تھا اور اس کے گواہ ہوں گے ایمبولینس لے کر آنے والے۔ بعد میں لاش کہاں گئی؟ اس کی فکر حشمت خان کو بھی نہیں ہوگی۔ وہ سمجھے گا کہ لاش کو وہی لوگ لے گئے جو کبھی سامنے آ کے کام نہیں کرتے اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا سراغ نہیں چھوڑتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے شیخ جی کہ حشمت خان کو اصلیت کا علم ہو۔ وہ جانتا ہو کہ پکڑا جانے والا استاد پیڈرو کے روپ میں کوئی اور ہے۔ اگر یہ بات ہوگی تو وہ سمجھے گا کہ بلا ٹلی اور تمھارے گلے پڑ گئی۔ اب تم وضاحت کرتے پھرو کہ زرداد کون تھا؟ کیسے پکڑا گیا تھا اور کیسے مر گیا؟ وہ تو خوش ہوگا کہ کرنے والوں نے خود ایسا انتظام کر دیا کہ ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔ زرداد کو تو مرنا ہی تھا، اس نے ایس آئی شیخ کو بھی مروا دیا۔ میرا ساتھ دینے کی وجہ سے تم بھی اس کے دشمنوں میں شامل ہو گئے ہو۔"

"ارے یار! کرے کوئی ہم سے دشمنی۔ ایک جان ہی تو ہے جس کے جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اس کے بعد کیا لے گا؟ یہ زندگی اور موت کا معاملہ خدا نے دنیا بناتے وقت کسی حشمت خان کے اختیار میں نہیں رکھا تھا۔" شیخ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "یار شیخ! تو نے اخبار دیکھا؟"

"اخبار تو دیکھا مگر وہ نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "وہ تو اس اخبار کی ایسی خبر ہوگی جو دھماکا کرے گی اور سب کو ہلا دے گی۔ ایکس کلیوسو اسٹوری۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے اسکوٹر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو ایک بکسٹال کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے روکا اور میں نے بطورِ خاص 'صدائے وقت' طلب کیا اور اخبار فروش نے حسبِ توقع 'نوائے وقت' نکالا۔ میں نے دوبارہ زیادہ واضح الفاظ میں 'صدائے وقت' کہا۔ تو وہ خاصا حیران ہوا۔

"بابو جی! ایک بات پوچھوں؟ آج صبح سے آپ تیسرے آدمی ہیں جس نے یہ اخبار مانگا ہے۔" وہ بولا "بکتا نہیں اس لیے ہم تو رکھتے نہیں۔ مگر آگے آپ کو مل جائے گا۔ مزنگ چوک پر۔"

ہم آگے روانہ ہو گئے۔ مزنگ چوک کی ایک دکان سے بالآخر "صدائے وقت" دستیاب ہوا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پہلا صفحہ کھولا۔ اس پر ملکی و غیر ملکی اور اندرونِ اضلاع کی سب اہم خبریں تھیں مگر وہ خبر نہیں تھی جس کی ہمیں تلاش تھی۔ میں نے وہ صفحہ دیکھا جس پر شہر کی خبریں تھیں۔ ہر اخبار کا ایک صفحہ مقامی نوعیت کی خبروں اور اعلانات وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، اس پر بھی ایسی کوئی سنسنی خیز ہیڈ لائن نہیں تھی۔ جس میں کسی ایس۔ ایچ۔ او میر محمد کے گھر میں ہونے والی واردات کا ذکر ملتا۔ بقول شیخ کے اس میں کوئی "ایکس کلیوسو" اسٹوری نہیں تھی جس کے ساتھ ان بچوں کی تصویر بھی ہوتی جنھوں نے اخبار کو یہ خبر فراہم کی۔

"یہ کیا چکر ہے شیخ؟" میں نے اخبار الٹ پلٹ کر اس کے حوالے کیا۔

"میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ خبر تو تہلکہ مچا دیتی۔ پولیس کی ایسی تیسی ہو جاتی۔"

"اس کی وجہ صرف ایک ہو سکتی ہے دوست۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "کہیں سے فون کریں گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

"فون کسے کرو گے؟ مست قلندر صاحب کو؟" شیخ نے کہا۔ "یا مدیر مجنوں کو؟ اس وقت دونوں نہیں ملیں گے۔"

"یار اخبار کا مدیر تھا۔ اس کے گھر پر فون ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کس اخبار کا؟ جسے کوئی پڑھتا ہی نہ تھا؟" شیخ نے تلخی سے کہا۔ "خیر کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

ایک جنرل اسٹور والا پہلے تو سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن اس کے کوئی بہانہ کرنے سے قبل ہی شیخ نے اپنا کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "ایک سرکاری کام سے اخبار کے دفتر فون کرنا ہے۔" شیخ نے کہا۔ "لیکن ہم مفت نہیں کریں گے۔ کال کے چارجز دیں گے۔"

"کیسی بات کرتے ہیں آپ سر! قانون کی مدد ... مہذب شہری کا فرض ہے۔" اس نے رٹا رٹایا جملہ ... نے ڈائریکٹری دیکھی اور "صدائے وقت" کا نمبر تلاش کیا۔ خوش قسمتی کہ وہاں آپریٹر تو نہیں تھا لیکن ایک چوکیدار نے اٹھا لیا اور یہ حوصلہ شکن اطلاع دی کہ مست قلندر صاحب ... میں تو فون ہے ہی نہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے گھر میں ... اسے نمبر یاد نہیں۔ آپریٹر بتائے گا اور وہ دس گیارہ بجے ... گا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ... عقل پر افسوس ہوا۔ اخبار کے آخری صفحے پر سب سے ... پرنٹ لائن میں ایڈیٹر کا اصل نام موجود تھا۔ ذرا سی دیر ... یہ نام ڈائریکٹری میں مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ... نوٹ کر لیا۔ دس منٹ تک ہم مسلسل وہ نمبر ملاتے رہے ... بجتی رہی لیکن ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

"یہ رات کو جاگنے والی مخلوق ہے شیخ جی۔" میں ... سوچتے ہوئے کہا۔ "گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو رہے ہوں ..."

"کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو۔" شیخ نے سوچتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ مجنوں صاحب کے ساتھ ... کچھ ہو سکتا تھا کیونکہ بچے انھی کے پاس تھے اور وہ ٹیپ ... اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میر محمد کی بیوی تشدد ... تاب نہ لا کے سچ بولنے پر مجبور ہو گئی ہو۔ مست قلندر صاحب ... تو بچوں کو ایسے ہی مل گئے تھے لیکن انھوں نے بڑی عقلمندی کا ... ثبوت دیا تھا کہ بچوں کو ٹیپ سمیت آگے ارسال کرنے سے ... ٹیپ کی ایک نقل بنوا کے اپنے ریکارڈ روم میں رکھوا دی۔ ... اینڈ کمپنی کو بھی معلوم ہوا ہو گا تو صرف یہی کہ بچے ٹیپ لے ... ایڈیٹر صاحب "صدائے وقت" کے پاس جا پہنچے۔ وہ دوڑے ہوں ... گے کہ راز کے طشت از بام ہونے سے قبل ہی کوئی بندوبست ... لیں۔ خبر کی اشاعت کے بعد انھیں نہ مجنوں صاحب کو مار ... کوئی فائدہ ہوتا، نہ ان کی لیلیٰ کی نشانیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ ... کے۔ جو خبر چھپ جاتی وہ زمانے کو معلوم ہو جاتی۔ اخبار معمولی ... ہو تو کیا، ایڈیٹر تو ایڈیٹر ہی ہوتا ہے۔ ایک معمولی رپورٹر کے ساتھ ... کوئی زیادتی ہو تو سارا قومی پریس آسمان پر اٹھا لیتا ہے۔ ... ناممکن تھا کہ وہ اخبار کے دفتر پر حملہ کریں اور ایڈیٹر کو اٹھا ... اتنا تو وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ اخبار کا ایڈیٹر احمق نہیں ہو ... اس نے سب سے پہلے اپنی اور بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی ... بندوبست کیا ہو گا اور اس ٹیپ کی نہ جانے کتنی نقلیں بنوا کے ... تقسیم کر دی ہوں گی۔ میں اور شیخ یہ بات جانتے تھے کہ میر محمد

کی بیوی مست قلندر صاحب کا نام نہیں جانتی تھی اور نہ اسے علم تھا کہ بچے اس کے پاس جا پہنچے ہوں گے۔ وہ کسی کو ایک ایسی بات کیسے بتا سکتی ہے جس سے وہ خود بے خبر ہے۔ چنانچہ مست قلندر صاحب کی ذات محفوظ تھی اور اس طرح وہ ٹیپ بھی محفوظ تھا جو انھوں نے پرانے ریکارڈ میں دفن کر دیا تھا۔ لیکن ایڈیٹر کی ذات اپنے گھر میں بہرحال محفوظ نہ تھی۔ مست قلندر صاحب نے بتا دیا تھا کہ میاں مجنوں ابھی تک لنڈورے ہیں۔ ان کو بچوں اور ٹیپ سمیت اغوا کیا جا سکتا ہے۔

"یار شیخ!" میں نے کہا۔ "مجھے مجنوں صاحب کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی ہے۔ پہلے ان کو نہ دیکھ لیں۔"

"رہتے تو وہ بھی ادھر ہی ہیں۔" شیخ نے پھر اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ "دیر تو ہو ہی گئی ہے۔"

"ابھی دیر نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "اسپتال میں نئی لاشوں کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی معمول کے مطابق ہو گی۔ کتنی لاشیں ہیں اور کتنے ڈاکٹر فارغ ہیں۔ پھر یہ کہ کون سا کیس فوری توجہ کا طالب ہے اور کس لاش کے پوسٹ مارٹم کو آخر تک التوا میں رکھا جا سکتا ہے۔ جلدی یا تو پولیس کرتی ہے یا لواحقین کرتے ہیں۔ زرداد کے لیے کون دباؤ ڈال رہا ہے۔"

شیخ نے تائید میں سر ہلایا اور ہم ایڈیٹر صدائے وقت کی اقامت گاہ تلاش کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

پتا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ایڈیٹر کوئی ایسی شخصیت نہیں ہوتا جو ہر روز چمکتی دمکتی مرسیڈیز میں گزرتا ہو تو زمانہ دیکھتا اور سلام کرتا ہو۔ وہ دانشور قسم کا، اپنے خیالوں میں اور اپنے حال میں مست رہنے والا، اپنے حلیے کی پروا نہ کرنے والا اور غریب نظر آنے والا شخص ایسا نہ تھا کہ اسے سب پہچانتے چنانچہ ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے جہاں ہم دس منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔

دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ہمیں بند دروازے کے سامنے احمقوں کی طرح کھڑا دیکھ کر ایک پڑوسی نے اوپر والی منزل کی کھڑکی سے سر نکالا۔ "کس سے ملنا ہے جی؟ ایڈیٹر صاحب سے؟" وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "صدائے وقت کے مدیرِ اعلیٰ سے جناب!"

"او بس جی۔ زبان کو اتنی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ وہ چلے گئے۔" اس نے دھوتی کو بڑی مہارت سے کھول کر باندھا۔

"کہاں چلے گئے؟" میں نے اور شیخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"من موجی آدمی تھے۔ دنیا کا موج میلہ دیکھنے نکل گئے۔"

وہ مسکرایا۔ "اور دنیا بہت بڑی ہے۔ میرے کرائے دار تھے۔"

"تمھیں تو کچھ ضرور بتا کے جانا چاہیے تھا۔ بعد میں کوئی ملاقاتی آئے یا ڈاک آئے تو ..."

"او جی یہ سب ہم نے بھی کہا تھا۔" وہ آگے لٹک کر بولا۔ "مگر وہ تو بس ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ آدھا سامان بھی چھوڑ گئے۔ نوٹس نہیں دیا تھا، اس لیے کرایہ دے گئے اور چلے گئے۔ کہنے لگے کہ جو بھی پوچھنے آئے اسے بتا دینا کہ گئے اور کچھ نہیں بتا کے گئے۔ ملکِ عدم گئے کہ جہنم میں گئے۔ یہ انھی کے الفاظ ہیں۔"

"ان کے ساتھ دو بچے بھی تھے؟" میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "ہاں ... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "وہ بھلے مانس تھے اس لیے میں نے رکھا ہوا تھا۔ ورنہ چھڑے چھانٹ کو کون رکھتا ہے۔ کل نہ جانے کہاں سے دو بچے آ گئے تھے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے انسان کے بچے ہیں اور کس کے بچے ہیں۔ موڈی بندہ تھا جی، ایک دم موڈی۔ آپ دفتر سے معلوم کریں۔"

دفتر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ مجنوں صاحب نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہی کیا فیصلہ کیا ہو گا۔ ایک طرف ملازمت تھی اور ان کا کیریئر تھا تو دوسری طرف وہ امانت تھی جس کی حفاظت ان کو جان دے کر بھی کرنی تھی کیونکہ یہ امانت اس عورت نے ان کے سپرد کی تھی جس کی محبت ان کی زندگی کا سب سے عزیز سرمایہ تھی۔ برسوں حفاظت کرنے کے بعد وہ اس سرمائے کو ضائع کیسے کر دیتے۔

انھوں نے اخبار کے دفتر اپنا استعفیٰ ارسال کیا ہو گا اور خود اپنا بارِ امانت اٹھا کے نکل گئے ہوں گے۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست۔ اور وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ تو غلط نہیں کہا۔

مزنگ کی گلیوں میں زرداد کا گھر تلاش کرنا کہیں زیادہ مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ ہم نے مختلف دکانداروں سے پوچھا۔ ریڑھی والوں سے پوچھا۔ بالآخر ایک پان والے نے کاغذ پر نقشہ بنا کے ہمیں منزلِ مراد کا پتا سمجھایا۔ دس منٹ بعد ہم نے ٹاٹ کے پردے والے ایک دروازے پر دستک دی۔ تقریباً تیس سال کی ایک عورت نے دروازے کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک صاف دیکھ لی تھی۔ وہ اگر غریب اور پھٹے حال میں نہ ہوتی تو یقیناً قبول صورت کہلاتی مگر زندگی کے دکھوں نے اس کو قبل از وقت ضعیفی کی سند عطا کر دی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

چند لمحے اس کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر اور شیخ پر مرتکز رہیں، وہ یادداشت کے دریچوں سے ہماری اجنبی صورتوں میں شناسائی کے آثار تلاش کر رہی تھی اور میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ اس نے شیخ کو دیکھتے ہی ہنگامہ برپا نہیں کیا۔ اگر شیخ نے واقعی اس کے شوہر کو گھر سے اٹھایا ہوتا تو اب تک وہ شیخ کا گریبان تھام چکی ہوتی چلا چلا کے اس سے سوال کرتی کہ میرا شوہر زرداد کہاں ہے اور تم دوبارہ اس گھر کے دروازے تک آ پہنچے ہو تو اب کیا لے جاؤ گے؟ مجھے یا اس آبرو کو جو ہر شریف عورت کے لیے متاعِ عاقبت ہوتی ہے اور بدکار کے لیے متاعِ حیات۔ لیکن اس کی آنکھوں سے حیرت ایک سوال بن کے جھانکنے لگی تھی۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو بھائی صاحب؟" اس نے بیک وقت ہم دونوں کو مخاطب کیا۔

"یہاں زرداد نام کا ایک شخص رہتا ہے؟" میں نے کہنا شروع کیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہوں!

"کیا کام ہے تمہیں اس سے؟" عورت کی صورت اور لہجہ دونوں بدل گئے۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"ہم اس کے دوست ہیں بہن!" شیخ نے کہا۔ "ہمیں اس کے بارے میں ایک تشویش ناک اطلاع ملی تھی کہ اُسے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے، کسی قصور کے بغیر۔"

"اور بہن ہم آپ کی مدد کے خیال سے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ ہم پر اعتماد کرتے ہوئے اجازت دیں گی کہ ہم اندر بیٹھ کے چند باتیں کر لیں، یا اس دروازے سے اندر آ کے؟ گلی میں کھڑے رہ کر کچھ معیوب لگتا ہے۔"

وہ کچھ متذبذب کھڑی ہماری شریفانہ صورتوں پر اور ہمارے شائستہ لہجے پر غور کرتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم دھوکے باز ہوئے تب بھی بہن کہنے کے بعد اس کی عزت پر تو ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔ باقی اس گھر میں کیا ہے جس کے لٹ جانے کا ڈر ہو۔ یا پھر اسے واقعی ہم پر اعتبار آ گیا کہ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازہ کھلا چھوڑ کے پیچھے ہٹ گئی۔ تین چار مرلے پر بنے ہوئے اس گھر میں دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ پھیلا ہوا تھا۔ پھر وہ صحن تھا جس میں ہم دونوں کھڑے تھے۔ دائیں ہاتھ پر غسلخانہ اور بائیں جانب زینہ تھا جو اوپر کھلی چھت کی طرف جا رہا تھا۔ چھت پر بیت الخلاء کے علاوہ اسٹور یا دو چھتی قسم کی کوئی چیز بھی بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں صحن میں ہی ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"پولیس نے آپ کے شوہر کو کس جرم میں گرفتار کیا تھا بہن؟" شیخ نے کہا۔

"وہ کسی کو بتاتے کب ہیں؟" وہ تلخی سے بولی۔ "اور گرفتاری اس کے لیے کون سی انوکھی بات تھی۔ دو چار دن رہے گا حوالات میں، جوتے کھائے گا اور پھر آ جائے گا بے غیرتوں کی طرح دانت نکالتا ہوا۔"

"وہ اکثر گرفتار ہوتا رہتا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "پہلے تو ایسا نہیں تھا وہ؟"

"پہلے کب؟ جب اس نے مجھے اس گھر میں زندہ درگور کیا تھا؟" وہ دیوار کا سہارا لے کر خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "میں کیا جانتی کہ اس وقت وہ کیا تھا۔ اب تو وہ غلطی سے بھی کوئی نیک کام نہیں..."

"مگر میں نے سُنا تھا کہ وہ سردیوں میں مونگ پھلی اور گرمیوں میں... بیچتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔"

"خود اس نے کہی ہوں گی یہ سب باتیں آپ سے؟" وہ بولی۔ "... تو میرا باپ لگاتا ہے۔ اُس نے بہت چاہا کہ وہیں کسی دوسرے ... زرداد کو بھی جگہ مل جائے مگر محنت کر کے کمانا بہت سخت کام ہے۔ ... بجے سے رات کے ساڑھے گیارہ بارہ بجے تک ایک ہی جگہ پر کھڑے رہنا جیسے نکھٹو کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب میرا باپ ہے، آدھی رات کو گھر لوٹتا ہے تو روٹی کھاتا ہے۔ صبح سو کے اٹھتا ہے تو پھر دوپہر تک تیار کرتا ہے۔ وہ تو اُلٹا اپنے مفت خورے یاروں کے ساتھ جا پہنچتا تھا اور وہ مزے سے قلفی کھاتے تھے یا مونگ پھلیاں جیب میں بھر کے ... پڑتے تھے۔"

"اور تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا تھا اُسے؟" میں نے کہا۔ "گھر کا خرچ آخر کیسے چلتا تھا؟"

"پیٹ تو کتا بھی بھر ہی لیتا ہے۔" وہ بولی۔ "اُس نے تو کبھی ... نہیں کیا کہ میری ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں۔ بازار سے ایک گز کپڑا نہیں خریدا تو میرے تن پر کپڑے کہاں سے آ گئے؟ اُسے معلوم ہے کہ باپ مجبور ہے، کما کے کہاں لے جائے گا۔ ایک میں ہی تو رہ گئی ہوں اس کی ... مجھے بھوکا ننگا تو دیکھ نہیں سکتا۔ شادی کے بعد رخصت ہو کے میں اس کے گھر نہیں گئی تھی، وہ اس گھر میں رہنے لگا تھا۔ اس نے تو مجھے بہت سبز باغ دکھائے کہ گھر بیچ کر پیسہ اسے دے دو تو وہ دن رات ایک کر کے لاکھ کے دس لاکھ بنا لے گا۔ دکان سے فیکٹری کھڑی کرے گا اور گلبرگ میں کوٹھی خریدے گا لیکن یہی تو میرے پاس سر چھپانے کا آسرا ہے۔ میں مر جاؤں گی لیکن اسے فروخت نہیں ہونے دوں گی۔"

"زرداد کچھ تو کرتا ہی ہوگا۔ میرا مطلب ہے آخر پولیس اُسے ... آئے دن کیوں پکڑ لیتی ہے؟" شیخ نے کچھ دیر بعد کہا۔

"پہلے سنیما ٹکٹوں کی بلیک کرتا تھا۔ دو چار مرتبہ پکڑا گیا مگر میرا باپ چھڑا لایا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "پھر فلمی تصویریں بھی بیچنے لگا۔ فلموں کے ٹوٹے جو دکھائے نہیں جاتے تھے۔ کسی فوٹوگرافر سے یارانہ تھا۔ اُس کے ساتھ مل کر یہ تصویروں کا دھندا کرتا تھا۔" اُس کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے سُرخ ہو گیا۔ "جوئے اور سٹے کا دھندا کرنے لگا تو پولیس والوں سے معاملہ ہو گیا۔ علاقے میں کوئی بھی ایسی واردات ہو جائے جس میں تفتیش کیے بنا چارہ نہ ہو تو وہ سب نامی گرامی لوگوں کو بلا کے تھانے میں رونق میلہ لگائے تھے۔ کسی

کو قبول دیا تو ٹھیک ہے ورنہ سب کی گرد جھاڑ کے واپس کر دیتے تھے۔ آج کل پولیس کے لیے بھتہ وصول کر رہا تھا اور مخبری بھی کرتا تھا۔"

میرے دل پر سے احساسِ ملامت کا بار اُتر گیا۔ شاید شیخ نے بھی میری طرح خود کو بری الذمہ محسوس کیا ہوگا کہ اس کی کوتاہی سے کوئی شریف محنت کر کے روزی کمانے والا غریب آدمی نہیں مارا گیا جس راہ پہ زرداد چل رہا تھا اس کی منزل یہی ذلت کی موت ہو سکتی تھی۔ اس خود ساختہ وکیل نے زرداد کو قتل کرنے سے پہلے جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔

"آپ اُن پولیس والوں کو پہچانتی ہیں بہن؟" شیخ نے کہا۔ "اور آپ کب تک کھڑی رہیں گی۔ بیٹھ جائیں۔" وہ اندر سے ایک پیڑھی اُٹھا کے لائی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ دونوں زرداد کے دوست ہیں۔ آپ لوگ تو شریف آدمی ہیں۔"

"ہم جب بہت چھوٹے تھے تو دوست تھے۔" میں نے کہا۔ "اب کبھی برسوں ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ ملتا تھا تو اپنے متعلق کچھ بھی نہیں بتاتا تھا بس یہی کہتا تھا کہ محنت مزدوری سے گزارا ہو رہا ہے۔ عزت سے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔"

"عزت سے!" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ زرداد غریب اور لاوارث ہے تو کیا، بس عزت سے محنت مزدوری کر کے روکھی سوکھی کھلائے گا تو میں خدا کا شکر ادا کروں گی۔ سونے چاندی اور محلوں کے خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔"

"میں نے یہ پوچھا تھا بہن کہ اسے لے جانے والے کون تھے؟" شیخ نے نرمی سے اپنا سوال دُہرایا۔

"وہی جو آتے رہتے تھے۔ کبھی بھتے کی رقم وصول کرنے تو کبھی ساتھ لے جانے کے لیے۔" وہ بولی۔

"آپ پہچانتی ہیں اُن سب کو؟" شیخ نے کہا۔ "اگر وہ سادہ کپڑوں میں ہوں تو انھیں عدالت میں شناخت کر سکتی ہیں؟ میری مراد اُن سے ہے جو اَب زرداد کو لے گئے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی! کس عدالت میں لے جانا ہے مجھے؟" وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

"بات یہ ہے بہن!" شیخ نے ایک طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ "میں خود بھی ایک پولیس افسر ہوں۔ آپ میرا شناختی کارڈ دیکھ کر اطمینان کر لیں۔" اس نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر آگے بڑھایا۔ معلوم نہیں وہ عورت کچھ پڑھ سکتی تھی یا نہیں مگر اُس نے کارڈ پر لگی ہوئی تصویر ضرور دیکھی اور مطمئن ہو کے کارڈ واپس کر دیا۔

"میرا آج تک زرداد سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میرا نام سید اکرام شیخ ہے۔ میں نے کسی مجبوری یا لالچ کی وجہ سے یہ نوکری نہیں کی تھی۔ خدا کے فضل سے ہمارے گھر میں سب کچھ تھا۔ میں خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور میرے والد نے شروع سے مجھے جو تربیت دی تھی وہ پولیس کی نوکری کے لیے نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اصول پرست، ایماندار اور فرض شناس بنا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے بعد میں ہوا کہ یہ خوبیاں نہیں، میری خامیاں ہیں۔ شاید میں کسی بھی محکمے کی ملازمت کرتا تو دوسروں کے لیے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کرتا۔ پولیس میں بھی دوست میں نے ایک بنایا تو دشمن دس پیدا کر لیے۔ ان دشمنوں نے میرے خلاف ہر سازش کی اور مجھے بدنام کر کے نکلوانے کی خاطر مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کیے۔ اب تو خیر میں استعفیٰ دے چکا ہوں لیکن میرے دشمنوں نے آخری کوشش یہ کی تھی کہ مجھ پر زرداد کو گھر کے اندر گھس کر گرفتار کرنے کا الزام لگا دیا تھا۔ زرداد اُن کا آلۂ کار بنا اور جیسا بیان پولیس نے دلوانا چاہا اُس نے وہی دے دیا۔ بیان میں یہ بھی ہے کہ میں نے کسی قانونی اختیار کے بغیر گھر میں داخل ہو کے زرداد کو پکڑنے کے علاوہ خدانخواستہ تمہیں بھی مارا اور تمہارے بچوں کو بھی۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ سکتا ہوں بہن کہ میں نے تو تھانے میں کسی مجرم تک پر ہاتھ نہیں اُٹھایا، میں تم جیسی مظلوم اور بے گناہ عورت پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ میری نظر میں یہ ناقابلِ معافی گناہ ہے اور جرم ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو خود اپنی نظر میں گر جاؤں گا۔ میرے والد کو شدید ذہنی صدمہ ہوگا اور میری بہن جو کالج میں پڑھتی ہے اور مجھے فرشتہ سیرت سمجھتی ہے اُسے بہت دُکھ ہوگا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نگاہیں چُراتے رہے۔

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو بھائی۔۔؟" زرداد کی بیوی نے بالآخر سر اُٹھا کے کہا۔

"کچھ نہیں۔ صرف اتنا کہ کبھی ضرورت پڑے تو کہہ دینا کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے، غلط ہے۔" شیخ نے کہا۔ "باتی ہو کہ میں زرداد کو لے گیا تھا، نہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی۔ میں نے تو آج پہلی بار اس گھر میں قدم رکھا ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔" زرداد کی بیوی نے کہا۔ "اور سچ بولنے میں کیا ہے۔"

"بعض اوقات حالات آدمی کو اتنا بے بس کر دیتے ہیں بہن کہ وہ سچ نہیں بول سکتا۔" شیخ نے کہا۔ "فرض کرو زرداد ہی کا معاملہ ہو۔ پولیس تمہیں مجبور کرے کہ اپنے شوہر کے بیان کی تائید کرو۔ ورنہ....."

"ورنہ کیا؟ وہ اُس پر تشدد کریں گے؟ تشدد جھیلنے کا تو زرداد عادی ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اسے جھوٹے کیس میں پھنسا کے جیل بھجوا دیں گے؟ جیل تو اسے کئی بار ہو جاتی مگر نہیں ہوئی۔ اس نے ہر جرم کیا اور پولیس کی پشت پناہی کے باعث بچ گیا۔ میں سمجھ لوں گی کہ اُسے پرانے گناہوں پر اب سزا ملی ہے۔"

اس عورت کی ثابت قدمی نے اور مظلومیت نے مجھے حیران کر دیا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کا ذہن نفرت کے ردِعمل کا شکار تو نہیں ہے، وہ شعوری طور پر اپنے شوہر سے اس کے مظالم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتی؟

"آزمائش کا وقت آتا ہے تو زبانی دعوے ریت کی دیوار ثابت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوتے ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے بہن کہ خود تمہاری ذات براہِ راست کسی وحشیانہ بربریت کا نشانہ بن جائے۔ تم عورت ہو اس لیے میں تم سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم ہر ظلم برداشت کر لو گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدانخواستہ اب کوئی غیر قانونی طور پر اس گھر میں قدم رکھے تو مجھے بتانا۔ میں تم کو اپنے گھر اور آفس کا پتا دے کر جاؤں گا۔ فون میرے گھر پر بھی ہے اور دفتر میں بھی۔ تم کسی طرح مجھے اطلاع کرا دینا اور ان کو بتا دینا کہ سید اکرام شیخ میرا بھائی ہے۔ پھر میں سب سے نمٹ لوں گا۔"

"میرے چچا ایس، ایس، پی ہیں۔" میں نے کہا۔ "پولیس کے بہت بڑے افسر۔ وہ سب کو تمہارے سامنے کھڑا کر دیں گے۔ تم بتانا کہ وہ کون تھے جو اکثر زرداد کے پاس آتے تھے اور جو اسے لے گئے تھے۔ اس کے بعد تم بالکل محفوظ رہو گی۔"

"مجھے اپنی فکر نہیں بھائی!" وہ سر جھکا کے بولی۔ "بس زرداد کی جان ان لوگوں سے چھوٹ جائے جنہوں نے اسے اپنے شیطانی جال میں پھنسا رکھا ہے اور وہ راہِ راست پر آ جائے۔"

میں نے اور شیخ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ راہِ راست پر کیا آئے گا جو کبھی لوٹ کر نہ آنے والے راستوں پر جا چکا ہو۔ زرداد کی بیوی سے یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ اس خود ساختہ وکیل نے اپنے جھوٹ سے ہمیں خوفزدہ کر کے یہ چاہا تھا کہ کسی طرح ہم مصالحت پر مجبور ہو جائیں اور ان کے لیے استاد پیڈرو کا رول کرنے والے کو چھوڑ دیں۔ زرداد، پولیس کا خاص آدمی تھا چنانچہ حشمت خان یا میر محمد کے قاتلوں نے اس کو معقول معاوضے کے وعدے پر ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر وہ جعلی وکیل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو زرداد کا کچھ نہ بگڑتا۔ اسے معاوضہ ادا کر دیا جاتا اور وہ حسبِ سابق پولیس کے لیے کام کرتا رہتا مگر اس وکیل کا واسطہ شیخ جیسے خر دماغ افسر سے پڑ گیا۔ مجبوراً اسے زرداد کا قصہ ہی پاک کرنا پڑا۔ زرداد جیسے پولیس کو ہر وقت دستیاب رہتے ہیں اور کہیں کام بگڑ آ جائیں تو خس کم جہاں پاک والی بات ہوتی ہے۔ بظاہر زرداد کی بیوی بھی اس کے ساتھ انتہائی مجبوری میں زندگی گزار رہی تھی اور اس نے خود کو "زندہ درگور" بھی کہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ وہ زرداد سے چھٹکارا چاہتی تھی اور اس کی موت کو بھی ذریعۂ نجات سمجھ کے قبول کر سکتی تھی۔ اس کے لیے وہ جیسا بھی تھا شوہر تھا۔ سرتاج، مجازی خدا، سہاگ کا سیندور اور مانگ کی افشاں۔ اس مرد کے رشتے کے اَن گنت نام تھے۔ اس کے بغیر وہ بیوی نہیں، بیوہ ہو جاتی تھی اور سوگ کا تمغہ کوئی سہاگن نہیں مانگتی۔ خواہ وہ کسی چور، ڈاکو، شرابی، جواری یا قاتل کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک وہ بات کہنے کی جرأت ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کی تھی جو سب سے اہم اٹل اور بے رحم حقیقت تھی۔

"اگر تم اس کے ساتھ نباہ کرنا اتنا ہی مشکل سمجھتی ہو تو اس سے علیحدگی اختیار کر لو۔" شیخ نے کہا۔

اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اگر یہ میرے اختیار میں ہوتا، تو میں ضرور کر لیتی۔" اُس نے رُک رُک کے کہا۔ "لیکن میرا باپ کہتا ہے میں عورت کی ڈولی جائے وہاں سے اس کا جنازہ ہی نکلنا چاہیے ... نہیں آتا کہ میں تو اب بھی چلتی پھرتی لاش ہی ہوں۔ اسے زندگی ... کوئی؟ میرا جنازہ تو کب کا اٹھ چکا۔ میرے ارمانوں کا، میری ... امیدوں کا۔ اس محبت کا جو میں اپنے شوہر کو دے سکتی تھی اور ... طلب کر سکتی تھی۔ سب کا جنازہ اٹھ چکا۔ وہ خود زرداد جیسا نہیں ... اپنی زندگی تو گزار لی۔ اس کی بیوی نے یعنی میری ماں نے کبھی نہیں ... مر جائے یا اس کو مارنے والا مر جائے۔"

"اور تم چاہتی ہو، تمہیں آتا ہے یہ خیال کہ وہ مر جائے؟" ... کو نارمل رکھنے کی سخت جدوجہد کی۔

"جب زندگی کا عذاب اتنا سخت ہو گا تو آدمی کیا چاہے گا؟" ... لہجے میں بولی۔ "طلاق تو وہ مجھے دیتا نہیں۔ کہتا ہے ٹکڑے کر کے گاڑ ... لیکن یہ طعنہ برداشت نہیں کروں گا کہ جورو نے چھوڑ دیا۔ موت کے سوا کیا ... کوئی راستہ ہے؟"

"اچھا بہن!" شیخ نے ہمت کر کے کہا۔ "شاید خدا کو یہی ... کہ تمہیں نجات بھی ملے تو دکھ اٹھا کے۔"

"ہم یہاں آئے تھے۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "تو ہمارے ... ایک مقصد اور بھی تھا۔ وہ جیسا بھی تھا، تمہارا شوہر تھا اور تمہارے ... باپ تھا...."

"اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ یقیناً بہت بُرا ہوا...." ... بات آگے بڑھائی۔ "انھیں اس کی سزا ضرور ملے گی.... میرا مطلب ... اس ظلم کے ذمہ دار ثابت ہوں گے.... قانون سب کے لیے ایک ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ چلائی۔ "جو کچھ کہنا ہے صاف ... کیا وہ مر گیا ہے؟"

"ہاں بہن! ہم تمہیں یہ بُری خبر سناتے ہوئے ڈرتے تھے۔" میں ... کہا۔ "اب تم حوصلے سے اور صبر سے کام لو....."

"اور ہمیں بتاؤ کہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے والے کون تھے؟" ... نے کہا۔

زرداد کی بیوی نے سینے پر ایک دو ہتڑ مارا۔ "مار دیا اُسے؟ ما... میرے زرداد کو۔" اُس نے چیخ کر کہا۔ "بے رحمو.... قتل کر دیا تم ... مجھے بھی مار دو اب کتو!" اُس نے چلا چلا کر بین کرنا شروع کر دیا ... عورت تھی جو ابھی ایک لمحہ پہلے طلاق یا موت، ہر صورت میں زرداد سے ... قبول کرنے پر آمادہ تھی۔

"..... ارے لوگو! ... ارے خدا غارت کرے انھیں.... ... نے مجھے بیوہ کر دیا ..... خدا ان سب کے گھر برباد کر دے جنہوں نے ... بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھینا۔" وہ سر پر ہاتھ مار مار کے چیخنے ... ذرا سی دیر میں اِرد گرد کے بہت سے گھروں کی عورتیں اندر آ گئیں۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دروازے پر اکٹھا ہونے لگے۔ میں اور شیخ اس صورتِ حال کے لیے قطعی تیار نہ تھے مگر اب شیخ کو سامنے آنا پڑا۔ میرے ساتھ باہر آ کے اس نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔

"میں سب انسپکٹر شیخ ہوں۔" اُس نے اپنا کارڈ دکھا کے کہا۔ "میں زرداد کے فوت ہونے کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ میرا تعلق اس علاقے کے تھانے سے نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اسے پولیس والے لے گئے تھے۔ آپ میں سے کوئی عینی گواہ ہے؟"

شیخ کی بات کا جواب وہ خاموشی تھی جو دیکھنے اور سُننے والوں کے دلی جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی تھی۔ شیخ بھی پولیس مین تھا اور وہ بھی پولیس والے تھے جو زرداد کو قتل کرنے کے لیے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے چنانچہ شیخ کے اعتراف کا ردِعمل غیر متوقع نہیں تھا۔ ہر جگہ لوگ اسی طرح پولیس کو عوام دشمن، بے رحم، بے ضمیر اور بدعنوان و بدکردار افراد کا ایسا ٹولہ سمجھتے ہیں جو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے کی ذمے داری پوری نہیں کرتا۔ قانون کی آڑ میں من مانی کارروائی کرتا ہے اور ان کے ظلم کا نشانہ وہی بنتے ہیں جن کا خدا کے سوا کوئی نہ ہو۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ سب کی زبانوں کو تالے کیوں لگ گئے؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس واقعے کے چشم دید گواہ محلے والے ہیں۔ کسی نے تو دیکھا ہوگا کہ زرداد کو لے جانے والے کون تھے؟"

"ایسے بھولے مت بنو تھانیدار بادشاہ!" ایک پہلوان قسم کے شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ سب جانتے ہوئے بھی ہم سے ہی پوچھ رہے ہو۔"

"تاکہ ہم میں سے جو بولے اسے گواہی میں پکڑ کے لے جاؤ۔" لمبے لمبے بالوں والے ایک نوجوان نے چلّا کر کہا۔ "اور تھانے لے جا کر اس کا بھی وہی حشر کرو جو زرداد کا کیا۔ تاکہ تمہاری مرضی کے مطابق بیان دے۔"

"یا سادہ کاغذ پر دستخط کر دے۔" ایک مولوی ٹائپ شخص نے غصے سے کہا۔ "جس پر تم جو چاہو لکھ لو۔"

"اے یہ سب ایک جیسے ہی ہیں۔ جرم خود کیا ہے، پھنسانا ہمیں چاہتے ہیں۔" کسی نے پیچھے سے چیخ کر کہا۔ مجمع اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا اور ایک بات سے اُن کی زبانیں کھل گئی تھیں۔ اپنی افرادی طاقت کا احساس ان کے مشتعل جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔

"آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔" شیخ نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "زرداد تو مر گیا۔ اب اس کیس میں ان لوگوں کی گرفتاری ضروری ہے جو زرداد کو کسی جرم اور کسی وارنٹ کے بغیر لے گئے تھے۔ آخر اُن کی شناخت کیسے ہوگی؟"

"اے تھانیدار بادشاہ! زیادہ اُلّو مت بناؤ ہمیں۔" پہلوان نے ایک قدم آگے بڑھ کے کہا۔ "تم کو سب معلوم ہوگا کہ کس نے زرداد کے ساتھ کیا ظلم کیا اور اس کے قاتل کون ہیں۔ ہم بڑے خراب آدمی ہیں۔ غصہ آ جائے تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہمارا باپ کون تھا؟"

"مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیسے آدمی ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔ "اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے نہ کہا کہ اس نے مجرموں کو دیکھا تھا تو مجھے مجبوراً زرداد کی بیوہ کو لے جانا پڑے گا۔ وہ پہچانتی ہے سب کو۔"

"تم اس کی بیوہ کو تھانے لے جاؤ گے؟" نوجوان نے چیخ کر پوچھا۔ "عورت کو؟"

"اور عورت بھی وہ جو عدت کا زمانہ پورا کیے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی۔" مولوی نے کہا اور گویا اجتماعی فیصلہ سُنا دیا۔

"اے قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی تھانیدار بادشاہ!" پہلوان نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "ہمارے ہوتے ہوئے تم نے عورت ذات کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا تو ہم اپنی اور تمہاری جان ایک کر دیں گے۔"

"تم لے جا کر تو دیکھو اس بیوہ عورت کو ....." پیچھے سے کسی نے بات مکمل کرنے کے بعد ایک زبردست گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی دیگر افراد نے پولیس کی ہجو شروع کر دی۔ "ہوگا سالا تھانیدار کی اولاد۔ ہم پر رعب جماتا ہے۔ اکڑ دکھاتا ہے ..... ہم سے سالا۔" پہلوان سب سے آگے تھا۔ "پکڑو۔ مارو سالوں کو۔ یہیں گاڑ دو۔" لوگ چلّانے لگے۔ شیخ کی اور میری آواز ان کے شور میں دب گئی۔ پھر پہلوان نے شیخ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ شیخ نے اس کا ہاتھ جھٹک کے اسے پیچھے دھکیل دیا مگر اتنی دیر میں لوگ آگے بڑھ آئے تھے۔ فرداً فرداً وہ سب کمزور حریف تھے مگر ایک مشتعل ہجوم بڑی تباہ کن قوت بن جاتا ہے۔ کئی ہاتھ اوپر اٹھے۔ میں اور شیخ دروازے سے پیچھے ہٹ گئے۔ پیچھے صحن کا کھلا میدان تھا۔ آٹھ دس افراد بیک وقت ہم پر حملہ آور ہوئے۔ اس سے پہلے کہ شیخ اپنا ریوالور نکالتا، میں نے بچاؤ کے لیے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میری لات مگدر کی طرح پہلوان کے پیٹ پر لگی اور وہ بلبلا کے لیٹ گیا اور ہائے ہائے کرنے لگا لیکن اس سے ہجوم کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے دوسرے شخص کو دائیں ہاتھ کے وار سے چت کیا۔ تیسرے کو ہاتھ تھام کے جھٹکا دیا اور اپنے پیچھے اچھال دیا۔ میرا گھٹنا ایک اور شخص کی ٹانگوں میں لگا۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے لیکن میں مشتعل نہیں تھا اور مجھے ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ کسی کو کاری ضرب نہ آئے۔ ایک منٹ میں وہ سب ڈھیر ہو گئے جو سامنے آئے تھے۔ آخری آدمی کو میں نے درمیان سے پکڑ کے اٹھا لیا، گھمایا اور باقی مجمع کی طرف اچھال دیا۔ بدحواس ہو جانے والے اور رہ کر بہادری کا مظاہرہ کرنے والے پلٹ کر بھاگے۔ اسی وقت شیخ نے ریوالور نکال لیا۔ "ٹھہر جاؤ۔" اس نے گرج کر کہا۔ "ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" اس نے ایک ہوائی فائر کیا۔

فرار ہونے والے اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ میں نے ایک جست لگائی اور ان کے درمیان سے گزر کے گلی میں آ گیا۔

"سب اندر۔" میں نے انہیں ریوڑ کی طرح ہانکتے ہوئے کہا۔ صرف لمبے بالوں والے نوجوان نے مجھے غچہ دے کر نکلنے کی کوشش کی مگر میں نے ٹانگ آگے بڑھائی اور وہ گلی میں منہ کے بل گرا۔ میں نے اُسے گردن سے پکڑ کے اٹھایا اور اندر کی جانب دھکیل دیا۔ سب لوگوں کے صحن میں جمع ہوتے ہی میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ وہ سب ایک گوشے میں منہ کے شکست خوردہ اور اسیر ہو جانے والے دستے کی طرح کھڑے تھے۔ سب کو ندامت تھی۔ ان میں سے چند ایک کی صورت دیکھ کر واقعی ہنسی آتی تھی۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ اب ہم انہیں دیوار سے لگا کے شوٹ کر دیں گے، مرغا بنا دیں گے ورنہ تھانے تو لے ہی جائیں گے۔ میرے اور شیخ کے کپڑے بھی اس ہاتھا پائی میں پھٹ گئے تھے اور ہم غالب حریف ہونے کے باوجود قابلِ رحم لگتے تھے۔

"تم سب کا جرم بہت سنگین ہے۔" شیخ نے ریوالور کا رخ ان سب کی طرف کر کے کہا۔ "تم نے ان پولیس افسروں پر ہاتھ اٹھایا جو ڈیوٹی پر تھے اور فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ گواہی دینے سے انکار کیا اور حقائق کو جانتے بوجھتے چھپانا چاہا۔ ان سب جرائم پر متعدد قانونی دفعات لاگو ہوتی ہیں اور تم سب کی سزا تین سال سے سات سال تک کی قیدِ بامشقت ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنی بات کا تاثر دیکھنے کے لیے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔

یکلخت کسی نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔ "آپ کو اللہ رسول کا واسطہ تھانیدار صاحب! غلطی ہو گئی مجھ سے۔"

دو چار افراد میں اب بھی جرأتِ رندانہ باقی تھی اور ان کی آنکھیں چیلنج دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں کہ ہمت ہے تو اپنی تھانیداری اور اپنا ریوالور چھوڑ کے سامنے آؤ لیکن بیشتر افراد کی حالت غیر تھی۔ انہیں اپنے جذبات کی رو میں بہہ جانے کا افسوس تھا۔ یہ زندگی کا ایک اور عملی سبق تھا کہ پرائے پھڈے میں پڑ کے آدمی کس طرح خوار ہوتا ہے۔

"لیکن۔" شیخ نے ریوالور جیب میں رکھ کر خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرنے میں پہل کی۔ "میں آپ سب کو کچھ نہیں کہوں گا۔ معاف کرنے کا لفظ مجھے زیب نہیں دیتا۔ آپ سب میری ہی طرح جذبات سے مغلوب ہو جانے والے انسان ہیں۔ آپ لوگوں کو پولیس کے مظالم کی شکایت ہے اور اپنے ایک محلے دار کی موت کا افسوس ہے جو شریف آدمی تو نہیں تھا لیکن ایسی موت کا مستحق بہرحال نہ تھا۔ میں کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا لیکن آپ سب کو سچ بولنا ہوگا۔ اپنا نام پتا بتاتے جائیں تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ پاس پڑوس میں کون رہتا ہے یا پھر جنہوں نے سب کچھ دیکھا تھا، وہ رضاکارانہ طور پر آگے آ جائیں اور میرے ساتھ اس علاقے کے پولیس اسٹیشن تک چلیں۔ آپ لوگ نہیں چاہتے تو میں بھی زرداد کی بیوی کو تھانے جا کر گناہگار ہونا نہیں چاہتا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ لوگوں پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بس اُن لوگوں کی نشاندہی کر دیں جو تھانے سے آنے جاتے رہتے تھے اور زرداد کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ میرا مقصد بھی صرف یہی ہے کہ مجرموں کو سزا ملے۔ یہ کوئی نیکی یا بہادری نہیں ہے جس کا مظاہرہ ابھی ہوا تھا۔ کرنا ہے تو عملی طور پر کچھ کیجیے۔ گواہی دیجیے بےخوف ہو کے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ لوگوں کی صورتوں کے تاثرات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ شیخ کی بات کا ردِعمل انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ انھوں نے کسی تھانیدار کے لبوں سے اس لہجے میں ایسی باتیں کبھی نہیں سُنی تھیں چنانچہ وہ حیران تھے، پشیمان تھے اور نفرت کی جگہ ان کی صورتوں پر دوستانہ جذبات کا عکس یوں پھیلنے لگا تھا جیسے تاریکی کے بعد صبحِ صادق کی روشنی پھیلتی ہے۔

مولوی ٹائپ شخص نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ وہ زرداد کا ایک ہمسایہ تھا۔ پھر پہلوان نے سر ہلایا جو اب تک کمر پر ہاتھ رکھے مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ کل کے لونڈے نے جو اس سے عمر، وزن اور جسامت میں نصف بھی نہیں تھا اس کی برسوں میں قائم ہونے والی ..... ساکھ پل بھر میں خاک میں ملا دی تھی۔ وہ زرداد کا دوسرا ہمسایہ تھا۔

"دو گواہ کافی ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "باقی لوگ جا سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ کچھ لوگ اسپتال جا کے زرداد کی میت لائیں اور تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں۔"

اسی وقت مجھے پہلی بار زرداد کی بیوی کا خیال آیا۔ فساد کے اندیشے کے علاوہ فائر کی آواز سے دہشت زدہ ہو کے وہ کمرے میں گھس گئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

"آپ ہمت سے کام لیں بہن!" میں نے کہا۔ "محلے والے آپ کے ساتھ ہیں اور ہم تھانے جا رہے ہیں تاکہ وہ مجرموں کی نشاندہی کر سکیں۔ آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

"دونوں بچے نانا اور نانی کے ساتھ رہتے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں خود تو بھوک بھی برداشت کر لیتی تھی، محلے والے دے جاتے تھے تو صبر شکر کے ساتھ یہ خیرات بھی قبول کر لیتی تھی اور وہ نشے میں مجھے گالیاں بھی بکتا تھا، میری ہڈیاں توڑتا تھا تو یہ ظلم بھی سہتی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ بچوں کی نظر میں یہ گھر یتیم خانہ ہو۔ جہاں اُن کو خیرات سے پیٹ بھرنا پڑتا ہو۔ مجھے ان کے سامنے ذلیل ہونا قبول نہیں تھا۔ وہاں وہ سکھ سے رہتے ہیں۔ وہ گھر ایسا تو ہے کہ انھیں محبت اور شفقت بھی مل رہی ہے اور ان کی پرورش بھی عزت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہاں رہتے تو وہ گھر سے متنفر ہو جاتے۔ ماں باپ سے نفرت کرتے اور گھر کی قید سے نکل جاتے تو غلط صحبت میں پڑ کے وہی بنتے جو اُن کا باپ تھا۔"

"ہاں۔" میں نے سوچا۔ "ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ ہم جو بچوں کی فلاح و بہبود کے شاندار منصوبے بناتے ہیں، کام کے لیے رفاہی ادارے قائم کرتے ہیں، سیمینار منعقد کراتے ہیں جن میں پُرمغز مقالے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پڑھے جاتے ہیں۔ بچّوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو آج کے بچّوں کو آنے والے کل کا معمار کہتا ہے، یونیسیف اور بچّوں کی نفسیات کے ماہرین، ہم سب مل کے بھی کچھ نہیں کرسکتے۔"

پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں اور شیخ اسکوٹر پر تھے چنانچہ دونوں چشم دید گواہوں کو رکشا لینا پڑا جب تو تھانے پولیس اسٹیشن میں خاصا دلچسپ تماشا ہوا۔ پہلی نظر میں تھانے کے عملے نے ہمیں مجرم اور رکشا سے اُترکے آنے والوں کو مدعی سمجھا۔ پھر انہیں یہ نقصِ امن کا کیس لگا جس میں فریقین الگ الگ آئے تھے اور ظاہری حالت سے ایک جیسے معزز و مظلوم لگتے تھے۔ شیخ کے اعلان نے اُن کو دم بخود کردیا۔ انہوں نے پہلے کبھی وردی میں چٹ کر آنے والے کسی پولیس افسر کو اتنے سکون سے ایسے شریفانہ لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایس ایچ او صاحب بہادر "گوشت" پر تشریف لے گئے تھے لیکن ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے شیخ کو اور مجھے بڑی عزت سے کمرے میں بٹھایا اور بادلِ نخواستہ محترم گواہوں کے لیے بھی کرسیاں طلب کیں۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔

"میری ڈیوٹی کے دوران میں تو یہ واردات ہوئی نہیں شیخ صاحب!" وہ تمسخر آمیز لہجے میں زیرِلب مسکرایا۔ "آپ کہتے ہیں تو روزنامچہ دیکھ لیتے ہیں۔"

"روزنامچے میں اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہوگا۔" شیخ نے کہا۔ "اس لیے خواہ مخواہ تکلیف مت کرو۔"

"اچھا جی پھر آپ ہی فرمادیں کہ میں کیا کروں؟" انسپکٹر نے کہا۔ "تھانے میں تو ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ میں ساری نفری کو اس وقت شناختی پریڈ کے لیے لائن حاضر نہیں کرسکتا۔"

"مجھ سے ایسے بات مت کرو جیسے میں نے کبھی تھانہ نہیں دیکھا۔" شیخ نے تند لہجے میں کہا۔ "تمھاری طرح میں بھی ایک پولیس اسٹیشن میں ہوں اور جب ڈیوٹی ہوتی ہے تو وہی کرتا ہوں جو تم کررہے ہو۔ اس وقت جو لوگ حاضر ہیں انھیں بلاؤ۔"

"تم مجھے ایسے حکم دے رہے ہو جیسے تم ہی میرے افسرِ اعلیٰ ہو۔ یا ایس۔ ایس۔ پی ہو۔" انسپکٹر بولا۔ "اگر میں انکار کردوں تو تم کیا کروگے شیخ صاحب!"

"اس کے بعد کچھ مجھے بھی کرنا پڑے گا۔" میں نے شیخ کے جواب دینے سے پہلے کہا۔ "ایس۔ ایس۔ پی ضامن رضوی صاحب ہی یہاں آئیں گے اور یہ شناختی پریڈ اُن کی موجودگی ہی میں ہوگی جس میں تھانے کی ساری نفری اٹینشن کھڑی ہوگی۔ جو ڈیوٹی پر ہوں گے وہ بھی اور جو نہیں ہوں گے وہ بھی حاضر ہوں گے۔ میں انہی کے گھر میں رہتا ہوں اور اُن کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تم ابھی تو ہمیں ٹال سکتے ہو کیونکہ رضوی صاحب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں لیکن دو چار دن میں حقائق بدل لیں گے اور نہ گواہ۔ گواہوں کو بدلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ تم جانتے ہی ہوگے کہ رضوی صاحب کس قسم کے افسر ہیں۔"

انسپکٹر کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "لاؤ یہ فون مجھے دو۔ مجھے ویسے بھی ان سے بات کرنی تھی۔ یہیں سے کرلیتا ہوں اور یہ بھی بتادیتا ہوں کہ مسئلہ کیا ہے۔ وہ ان سے بات کریں گے۔ فون تو میں باہر سے بھی کرسکتا ہوں یا شیخ کے ساتھ چلا جاؤں لیکن اس کے بعد تمھاری پوزیشن زیادہ خراب ہوجائے گی انسپکٹر! جب رضوی صاحب براہِ راست تمھیں فون کریں گے یا ایس ایچ او سے وضاحت طلب کریں گے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم اس کیس میں اصل مجرموں کی معطلی یا گرفتاری تک کوئی رعایت نہیں کریں گے۔"

انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے اپنے علاقے کے دو افراد کے سامنے اس کی خاصی سبکی ہوئی تھی لیکن ہمارے جارحانہ تیور بتاتے تھے کہ ہم ٹلنے والے نہیں ہیں اور عدم تعاون کا نتیجہ مزید خرابی کا باعث ہوگا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی زنگ خوردہ گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا جس سے محض ایک بار ٹن کی آواز پیدا ہوئی اور ایک کانسٹیبل نے چق سے جھانکا۔

"تھانے کے اندر کون کون ہے اس وقت؟" انسپکٹر نے کہا۔ "لکھوا تو سب کو بلاؤ۔"

شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں بہت وقت لگے گا۔ تم وہ رجسٹر منگواؤ جس میں سب کی تصویریں اور نام پتے ہوں گے۔"

لوہے کو لوہا کاٹ رہا تھا۔ ایک انسپکٹر تھا تو دوسرا بھی سب انسپکٹر۔

خواب سب دیکھتے ہیں۔
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟
سچے خواب کیا ہوتے ہیں؟ خوابوں کی تشریحات کیسے کی جا سکتی ہیں؟ ان کی تعبیریں کیا ہیں؟ خواب آدمی کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی راہنمائی سے مستقبل کی تعبیریں کیا بدلی جاسکتی ہے؟ کیا وہ ہماری الجھنوں کے عکاس ہوتے ہیں؟ یا وہ ہماری الجھنوں کا حل بھی پیش کرتے ہیں؟
خوابوں کے بارے میں ماہرین کی کیا رائے ہے؟
خوابوں کے بارے میں مذاہبِ عالم کیا کہتے ہیں؟ یہ اور ایسے لاتعداد سوالوں کے مکمل جواب کے لئے ——— پڑھئے!
قیمت ۱۵ روپے
خوابوں کے اسرار
ڈاک خرچ ۱۰ روپے
اے۔ ایس صدیقی کے قلم سے
اردو میں پہلی بار ——— ایک بھرپور اور منفرد کتاب
مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس ۱۴۴ کراچی

...زیادہ تھا تو دوسرا عقل و ذہانت میں اس سے ایک بیٹے کندھے پر ایک چول زیادہ تھا۔ لیکن اس وقت ہمیں سخت مایوسی ہوئی جب گواہوں نے کسی کو شناخت نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس کے دو اسباب ہوسکتے تھے۔ ایک یہ کہ وہاں گواہ جانتے بوجھتے انجان بن رہے تھے۔ انھیں بعد میں بھی اسی علاقے میں رہنا تھا۔ زرداد کے انجام کے بعد دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر نہ رکھنے کے فلسفے کی افادیت ان پر عیاں ہوچکی تھی۔ دوسری یہ کہ فی الحقیقت اغوا کنندگان کا تعلق اس تھانے سے تھا ہی نہیں۔ دوسری وجہ مجھے زیادہ قرینِ قیاس لگی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ پاچنت خان یا اندھی کمپنی نے بقلم خود مارا ہو یا پولیس کی وردی میں پولیس والے نہ ہوں۔ گواہوں کو ضرورت کے وقت حاضر ہونے کی ہدایت دے کر رخصت کرنے کے بعد ہم نے رسماً یا اخلاقاً انسپکٹر سے معذرت کی اور انسپکٹر مذکور نے ہمیں بڑی فراخدلی سے معاف بھی کردیا۔

"یہ تو بڑا عجیب معاملہ ہوگیا۔" میں نے تھانے سے نکل کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہم نے جھک ماری۔ زرداد کے اغوا کا ڈراما کرنے والے ہاتھ آئے نہیں۔"

"پھر بھی ایک بوجھ تو سر سے اُترا۔" شیخ نے اسکوٹر چلاتے ہوئے کہا۔ "کہ مجھ پر الزام نہیں۔ اب رہ گیا زرداد کی پُراسرار موت کا معاملہ۔ تو ہمارا اس سے کیا تعلق۔ وہاں استاد پیڈرو نام کا ایک شخص بند تھا جس کی لاش ہم نے موت کے بعد انسپکٹر مذکور نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادی تھی۔ اس لاش کا کیا ہوا؟ یہ اسپتال والے ہی بتاسکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ جب اس کے متعلق کوئی پوچھے گا نہیں تو انھیں وضاحت کی نوبت بھی پیش نہیں آئے گی۔ زرداد کا معاملہ دوسرے تھانے کا ہے جہاں سے ہم آئے ہیں۔ وہ لکھیں رپورٹ کہ اسے کس طرح گھر سے اٹھایا گیا تھا۔ اٹھانے والے کون تھے اور اس کی لاش اسپتال کیسے پہنچی۔ اس کی تفتیش بھی انہی کا کام ہے لیکن وہ اتنے بھی خود ہی لمبے چکر میں نہیں پڑیں گے چنانچہ زرداد کی تدفین اس طرح ہوجائے گی جیسے وہ اپنے گھر میں طبعی موت مرا۔ نہ اسپتال والوں کے لیے پریشانی۔ نہ پولیس کے لیے۔ زرداد جیسے لوگوں کی موت بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی ان کی زندگی۔"

"یہ بھی غنیمت ہے کہ زرداد کی بیوی کے پاس اپنا مکان ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اور ابھی باپ بھی ہے جس کی آمدنی سے گھر کا خرچ چل جاتا ہے۔ خدا کرے جب تک اس کے اپنے بچّے کمانے کے قابل نہ ہوجائیں یہ سہارا باقی رہے۔"

"میں تو عورت کی فطرت پر انگشت بدنداں ہوں جناب!" شیخ نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ذرا دیر پہلے وہی عورت کہہ رہی تھی کہ خدا اُسے موت دے دے یا مجھے۔ اور موت کی خبر ملی تو سب بھول گئی۔"

"آدمی زبان سے جو کچھ کہتا ہے یا کسی مخصوص ذہنی کیفیت میں کہہ جاتا ہے اس کا دلی جذبات سے لازمی تعلق نہیں ہوتا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "اب یہ سب کہنے ماضی کی تلخ یادوں کے باعث وہ مرنے والے کو جلد بھول جائے گی۔ میں اسلام آباد ہو آؤں پھر استاد پیڈرو کی مدد سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ زرداد کو گرفتاری کا ڈراما رچانے والے کون تھے۔"

"چھوڑو اس چکر کو میاں!" شیخ نے کہا۔ "معلوم کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اپنے وقت اور اپنی توانائی کو اپنے مسائل کے لیے بچا کے رکھو۔ دکھ مجھے بھی ہے اور میرا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ خبیث میرے ہاتھ لگ جائیں تو ان کی کھال میں بھُس بھر دوں مگر اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ یہ ظلم اور ناانصافی ہر طرف ہے اور ہر جگہ ہے۔ زرداد کے انصاف کو خدا پر چھوڑ۔ ایسے زرداد تو لاتعداد ہیں جن کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ بتا تجھے کہاں چھوڑ دوں؟"

"مجھے میرے گھر کے دروازے پر گرادے، میرا مطلب ہے ڈراپ کردے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار پھر لباسِ فاخرہ زیبِ تن فرماکر قصدِ اسلام آباد کا کرتا ہوں۔"

"اس سے زیادہ کٹھن مرحلہ مجھے درپیش ہے۔" شیخ نے کہا۔ "مجھے نادرہ اس لباسِ فاخرہ میں دیکھ کے بہت محظوظ ہوگی تو آپا میاں سخت پریشان ہوں گے اور انھیں مطمئن کرنے کے لیے مجھے کوئی کہانی گھڑنی پڑے گی۔ پھر ڈیوٹی پر پہنچنا ہے حشمت خان کو چارج دینے کے لیے۔"

جب وہ رخصت ہوا تو شیخ نے نیک نیتی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "انشاء اللہ بہت جلد پھر ملاقات ہوگی۔"

"خدا کرے اسلام آباد میں سب خیریت ہو اور میں جلد لوٹ آؤں۔" میں نے کہا اور گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ غسل سے فارغ ہوکے میں نے لباس بدلا تو دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے اسلام آباد فون کرلوں اور پھر روانہ ہوجاؤں۔ کھانا باہر کہیں بھی کھاکے میں دو بجے والی بس یا ویگن پکڑ سکتا تھا جو مجھے سات بجے پنڈی پہنچادے۔ میں نے خیرو لالی صاحب کے گھر کا نمبر ملایا۔ خلافِ توقع لائن دس منٹ میں مل گئی۔ ریسیور شہلا نے اٹھایا۔ "ہیلو!" اس نے کہا۔

"ہیلو کیا جی۔" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ یہ بتائیں آپ کون ہیں؟ ہم اسی حساب سے بات کریں۔"

"سکندر بھائی! میں شہلا ہوں۔" شہلا ہنسی۔ "آپ کی آواز تو پہچان لی میں نے۔ خیریت سے ہیں نا آپ؟"

"آداب بجا لاتا ہوں آپا!" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہارا اور دیگر اہلِ خانہ کا کیا حال ہے۔ چچی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"چچی کی طبیعت بہتر ہے۔" وہ بولی۔ "فوزیہ کی رخصتی ہوچکی۔ آپ اس کے بعد بھی نہیں آئے۔ دونوں انکل بہت خفا ہیں۔"

"بس آج میں آرہا ہوں شام تک۔" میں نے کہا۔ "قصد کر کے کئی بار گھر سے نکلا۔ ہر بار کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا۔ یا کوئی ایسی ہی بات ہوگئی کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ تم ذرا پولیس والے انکل کو بلاؤ۔ پہلے انھیں گولی دے دوں۔"

"بلاتی ہوں۔ آپ ہولڈ کریں۔" وہ بولی۔ "یہ بھی کہہ دوں گی کہ سکندر بھائی آپ کو گولی دینا چاہتے ہیں۔"

تقریباً ایک منٹ بعد رضوی صاحب کی آواز آئی۔ "سکندر! فرصت مل گئی تمھیں؟"

"مجھے معلوم ہے انکل کہ آپ بہت خفا ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن یقین کیجیے......"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

"کس بات پر یقین کروں؟" رضوی صاحب نے برہمی سے کہا۔ "شہلا نے بتا دیا ہے کہ تم گولی دینا چاہتے ہو۔"

اُف، میں نے سر پکڑ لیا۔ سچ سچ بتا دیا جائے۔ الّو کی پٹھی۔ واپسی پر سمجھوں گا تجھ سے بھی۔

"قسم خدا کی انکل! حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ شہلا نے شرارت کی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نہ آتا اور وہ بھی ایسے موقع پر۔"

"آنے کی بات چھوڑو۔ تم تھے کہاں؟" انکل نے کہا۔ "ہم نے دن میں دو بار فون کیا۔ رات میں تین بار۔"

"اکیلے گھر میں وحشت ہوتی تھی انکل!" میں نے کہا۔ "عبدالودود منظر کے گھر چلا گیا تھا۔ عدالت میں درخواست دی تھی سپرات کو اس نے روک لیا۔ اجازت اگلے دن ملی۔ میں نے سوچا تھا کہ رات کو روانہ ہو کے صبح اسلام آباد پہنچ جاؤں گا لیکن گھر گیا تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔"

"تمہارے ساتھ گڑبڑ کے سوا ہوتا کیا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"یقین کیجیے انکل! کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں۔" میں نے مسکینی سے کہا۔

"یہ بھی آپ نے سچ فرمایا قصوروار ہمیشہ دوسرے ہوتے ہیں۔"

"دیکھیے انکل! گھر میں چور گھس گئے تھے۔ میں کیا کرتا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اتفاق ہے کہ میں نے عین وقت پر انھیں اندر جاتا دیکھ لیا، اور وہ کچھ لے جا نہیں سکے۔ بس جان سلامت لے گئے، یہی غنیمت ہے۔ انشاء اللہ جب تک زندہ رہیں گے، یاد رکھیں گے۔"

"تم نے مارپیٹ کی اُن سے؟" رضوی صاحب نے سخت تشویش میں مبتلا ہو کے کہا۔

"اور کیا میں مار کھاتا اُن چوروں سے انکل؟" میں نے معصومیت سے کہا۔ "چار سال جوڈو کراٹے سیکھا کس لیے تھا آخر۔ بہت عرصے بعد صحیح موقع ملا تھا۔ ایک کی تو آدھی پسلیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ دوسرے کی آدھی بتیسی خلاص ہو گئی۔ ایک شاید تمام عمر ایسے چلے گا جیسے ایک پاؤں فٹ پاتھ پر ہو تو دوسرا سڑک پر۔ دوسرا دنیا کو ہمیشہ ایک آنکھ سے دیکھے گا۔ خاصی ڈینٹنگ کرانی پڑے گی دونوں کو پھر بھی اوریجنل شیپ میں آنا مشکل ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ اسے بھی اُن دونوں کو میں نے بھیجا تھا تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"اوہ..... آئی ایم سوری انکل... !دیکھیے نا.... آپ نے بھی تو نہیں بتایا اور وہ بھی بس پٹتے رہے اور پھر بھاگ گئے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ واپس آئیں گے تو میں اُن سے معذرت کر لوں گا اسپتال جا کے۔ میں رات تک پہنچ رہا ہوں۔"

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ "خیر اب بھی آ جاؤ گے تو مسز شیروانی کی عیادت کا اخلاقی فرض تو پورا کر لو گے ورنہ بڑی معیوب بات ہوتی۔ محسن سے یہ دوستی اور اس پہ بے تعلقی کا یہ انداز۔"

"محسن میری مجبوریوں کو سمجھتا ہے انکل! اور مجھے بھی سمجھتا ہے" میں نے کہا۔ "ذرا اسے بلا دیں آپ۔"

محسن سے میری گفتگو سرسری اور مختصر ہوئی۔ اصل مقصد رابعہ کو بلوانے کا تھا۔ دو تین منٹ میں رابعہ آ گئی۔ "جی؟" وہ بولی۔ "کہاں ہیں جناب آج کل؟"

"عرض کیا ہے۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔" میں نے بزبانِ غالب ارشاد کیا۔

"دن رات غائب رہتے ہو۔" وہ بولی۔ "میں نے دن میں رات کو کیا جناب کا پتا نہیں۔ کیا کر رہے تھے؟"

"دن میں مثنوی زہرِ عشق پڑھتا رہا۔" میں نے کہا۔ "رات کو چلا گیا۔ شرفاء کا قاعدہ پہلے یہی تھا۔"

"میں شرفاء کی نہیں تمہاری بات کر رہی تھی۔" وہ بولی۔ "اندازہ تھا مجھے کہ تمہاری مصروفیات میں قرار کو دخل نہیں۔ مجھے حشمت خان کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ آپ اسلام آباد کیسے گئی ہیں؟ میں نے کہا گاڑی سے۔ بولا کون سی گاڑی سے؟ میں نے کہا۔ ان فضول سوالات کا مطلب؟ صرف اتنا بتا دیجیے کہ اپنی گاڑی میں گئی ہیں یا ریلوے کی گاڑی میں۔ غلط کیا اُس نے ورنہ تمہارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ اگر اسے معلوم کرنا ہوتا کس وقت لاہور سے روانہ ہوئی تھی تو وہ وقت پوچھتا یا ٹرین کا نام یہ معلوم کرتا کہ میں ریل کار سے گئی ہوں یا "فلائنگ ہارس" والوں کی ویگن۔ اسے یہ تو علم تھا کہ رضوی صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ عقل میں تو یہی بات میں ان کے ساتھ انہی کی گاڑی میں گئی ہوں گی۔ اس کے باوجود اپنی گاڑی کر کے اس نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کہا تمہارا کیا خیال ہے میں اپنی گاڑی میں گئی ہوں تو کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے؟ کہنے لگا کہ ایسی جرح سے کیا فائدہ۔ اگر واقعی آپ اپنی فوکس ویگن میں تشریف لے گئی ہیں دیجیے۔ آپ کا احسان ہو گا۔ واقعی کا لفظ استعمال کر کے اس نے مجھے ہوشیار ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے اسلام آباد فون کرنا ضروری ہوتا۔ وہ انکل دیکھ سکتا تھا یا تم سے پوچھ سکتا تھا کہ گاڑی ہے یا نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ ہی گیا ہو گا اور گاڑی کے متعلق تم نے ہی کہا ہو گا کہ رابعہ لے گئی ہے کر دیا تھا کیا؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ سکندر صاحب کا بیان بالکل ٹھیک ہے۔ اپنی گاڑی ساتھ لائی ہوں۔" وہ بولی۔

میں نے قہقہہ مارا۔ "بھلا میرے حوالے سے اقرار کرنے کا تھا؟ اُسے سخت صدمہ ہوا ہو گا۔"

"ہاں۔ کہنے لگا ٹھیک ہے وکیل صاحبہ! آپ بھی سچی اور سکندر بھی سچے۔ ہم ہی بن جاتے ہیں جھوٹے۔" رابعہ ہنسی۔

"گاڑی کی کہانی طویل ہے۔ بقلم خود حاضر ہو کے سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اب اجازت ہو تو کچھ فلمی قسم کے رومانٹک ڈائیلاگ بول لوں۔ میں نے ایک فلم میں ٹیلی فون پر باقاعدہ دوگانا سنا ہے۔ بتانا صرف یہ تھا کہ کل رات کی اختر شماری میں میں نے کتنی سرد آہیں بھری ہیں اور رات کا کم سے کم درجۂ حرارت کاؤنٹ کیا ہے۔ کتنے لیٹر خونِ جگر جلا کے میں نے آنکھوں سے کتنے آنسو بہائے ہیں۔"

"جب انکل کے ٹیلی فون کا بل آئے گا تو سب معلوم ہو جائے گا۔" وہ ہنسی۔ "کہ یہ ٹرنک کال انھیں کتنی مہنگی پڑی۔ تم کو جو کچھ کہنا ہے فون بند کر کے کہہ دینا میں سن لوں گی۔ اب ایک خوشخبری جسے میں شام کو تمہارے آنے تک ملتوی نہیں کر سکتی۔ محسن کی امی نے شہلا کو پسند کر لیا ہے۔ بات پکی سمجھو۔"

"ہمیں کیا جی دوسروں کی کچی پکی سے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اپنی دال تو گلتی نظر نہیں آتی۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" وہ ہنسی اور فون بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے چشمِ تصور سے وہ سب کچھ دیکھا جو بارہا خوابوں میں بھی دیکھ چکا تھا۔

رات کے بجائے میں ساڑھے سات بجے راولپنڈی پہنچا۔ اسلام آباد پہنچتے پہنچتے مجھے نو بج گئے۔ سب سے پہلے مسز شیروانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی حالت دیکھ کر مجھے ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا۔ وہ بستر پہ لیٹی ہوئی بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتی تھیں حالانکہ جب میں نے ان کو گزشتہ بار دیکھا تھا تو بیماری کے باوجود وہ جسمانی طور پر تو کچھ صحت مند نظر آتی تھیں۔ ان کا رنگ روپ میں نے جوانی میں بھی دیکھا تھا۔ اب فوزیہ ان کا نقشِ ثانی بن گئی تھی اور ماں جو نقشِ اول تھی یوں مٹ رہی تھی جیسے مغلوں کے عہد کی حسین و پرشکوہ عمارات کے وہ کھنڈر جن کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے بھی فراموش کر دیا ہو۔ میں نے اُن کا ہاتھ جو ہڈیوں پر منڈھی ہوئی کھال اور رگوں کے ابھرے ہوئے جال کے سوا کچھ نہ تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"میں تو سمجھی تھی، تم خفا ہو مجھ سے۔" انہوں نے اُداسی سے مسکرا کے کہا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مجھے مزید شرمندہ کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "کیا مجھ میں اور محسن میں کوئی فرق ہے۔ میں نے تو آپ کو ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھا ہے۔ دکھ تو مجھے ہے کہ میں، ... میں نے آپ کو بہت دکھ پہنچائے اور آپ کی کوئی بھی خدمت نہ کر سکا۔ معافی مجھے مانگنی ہے آپ سے۔"

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں بیٹا۔" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خدا تمہیں اور رابعہ کو خوش رکھے۔"

"مجھے آپ کی دعاؤں کی ہمیشہ ضرورت رہے گی چچی!" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے پہلے تم نہا دھو کے کھانا کھا لو۔" شیروانی صاحب نے صورتحال کو سنبھالنے کے لیے کہا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ گفتگو میں یہی جذباتی عنصر غالب رہا تو سب رونے لگیں گے۔ رابعہ تو خاموشی سے سسک رہی تھی لیکن شہلا سب سے پیچھے افسردہ کھڑی تھی اور اسے بالکل احساس نہ تھا کہ اس کا ایک ہاتھ محسن کے کندھے پہ ہے۔ خود محسن سخت ملول اور دل گرفتہ تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا تھا۔ انکل رضوی اور انکل شیروانی ان کے سامنے تھے چنانچہ ان دونوں کا یہ پوز نہیں دیکھ رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے شہلا نے ایک ہی ہاتھ سے محسن کا سہارا بھی لیا ہے اور اسے سہارا فراہم بھی کر دیا ہے۔ بالکل غیر شعوری طور پر بغیر الفاظ کی زبان میں کچھ کہے بغیر اس نے محسن سے رفاقت کا دائمی عہد کر لیا ہے اور یہ عہد نامہ دنیا داری کی ظاہری رسموں سے کہیں زیادہ پُرتقدس ہے اور صرف ان جذبوں کا امین ہے جو انتہائی معصوم سچے اور پاکیزہ ہوتے ہیں چنانچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نسبت طے ہو جانے کے بعد انھیں ایک دوسرے کے سامنے نہیں آنا چاہیے اور شہلا کو اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنے منگیتر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بے شرمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ منظر اتنا دلکش اور نظر نواز تھا کہ میں کوئی عظیم مصور ہوتا تو اس خوب صورت لمحے کے طلسم کو رنگوں میں اتار لیتا اور حسن و عشق کی یہ تصویر بھی مونا لیزا کی مسکراہٹ کی طرح لافانی ہو جاتی۔ دیکھنے والے اس کے سامنے مسحور کھڑے رہتے اور ان کے دل محبت کے جذبات کی عظمت، پاکیزگی اور ہمہ گیری کے احساس سے معمور ہو جاتے۔ جب میں اٹھا تو منظر بدل گیا، لیکن اس تصویر کا نقش میرے تصور میں باقی رہا اور لازوال ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے رضوی صاحب کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے جو واقعات اُن کو سنائے تھے ان میں زیبِ داستان کے لیے کچھ بڑھا بھی دیا تھا۔ غلط فہمی کے باعث معمولی سی ہاتھا پائی ضرور ہوئی تھی لیکن ٹوٹ پھوٹ بالکل نہیں ہوئی اور ان کے آدمی بفضلِ خدا اتنے ہی صحیح سلامت ہیں جتنا میں۔

جب انکل حضرات ہم لوگوں کی نامعقولیت پر تبصرے کے بعد تشریف لے گئے تو میں نے محسن اور رابعہ کو ان کی عدم موجودگی میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنائے۔ شہلا جانتے بوجھتے محفل سے غیر حاضر رہی۔ اس کا خیال ہو گا کہ اکٹھے ہو جانے کے بعد ہم سب اس کو چھیڑیں گے۔ محسن ڈھیٹ آدمی، اس پر کیا اثر ہو گا۔ اگر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو کے شہلا کو پریشان کرنے پر اُتر آئے تو اس سے بعید نہیں۔ شہلا سیدھی سادی لڑکی تھی۔ نہ بہت زیادہ ذہین اور حاضر جواب اور نہ اتنی تیز طرار کہ اپنی زبان سے برابر کا مقابلہ کر سکے۔ محسن نے بالآخر اعتراف کیا کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے تو نہیں ہوا لیکن اس کی خواہشات کے عین مطابق ہوا۔

"شہلا نے اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی اور شرافت سے پاپا اور امی کے دل جیت لیے ہیں۔" اس نے خاصے جذباتی لہجے میں کہا۔ "فوزیہ نے تو بہت پہلے ہی شہلا کو پسند کر لیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے ماں سے بات کر لی تھی کہ امی! اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے گھر بیٹھے وہ بہو بھیج دی ہے آپ کے لیے کہ اس جیسی دوسری چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

"رات کو ٹارچ لے کر ڈھونڈنے سے۔" میں نے کہا۔ "دن میں عینک لگا کے تلاش کرنے سے تیسری نہیں ملے گی۔"

رابعہ نے اس بے محل دخل اندازی پر مجھے گھور کے دیکھا۔ "محاورے میں یہ غیر ضروری ترمیم خلافِ ضابطہ قرار دی جاتی ہے۔"

"لیکن دوسری تو خود شہلا تھی۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "جو ہم نے اسی طرح دریافت کی تھی۔ کیوں محسن؟"

رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں نے پہلے نمبر پہ اسے رکھا ہے کیونکہ وہ مجھے پہلے ملی تھی۔

"یہ تو ہے۔" محسن مسکرایا۔ "خیر۔ فوزیہ کی بات خود امی کے دل کی بات تھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیکن انھوں نے کہا کہ وہ شہلا کی مرضی جاننا چاہتی ہیں۔ اگر اس کے والدین ہوتے تو ان کی مرضی معلوم کی جاتی اور وہ زبردستی بھی کرتے تو یہ ان کا حق تھا لیکن وہ بن ماں باپ کی بچی یہاں ایک طرح سے ہماری پناہ میں ہے۔ فوزیہ نے اپنی طرف سے تو واضح کر دیا تھا کہ شہلا انکار نہیں کرے گی مگر بعد میں امی نے شہلا سے خود بات کی۔ شہلا نے سر جھکا کے کہہ دیا کہ امی، میرا اپنا تو اس دنیا میں کوئی رہا نہیں جو کچھ بھی ہیں آپ ہیں، انکل رضوی ہیں، رابعہ باجی ہیں اور سکندر بھائی ہیں۔ یہی میرا خاندان ہے اور میرے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے تو یہی لوگ کریں گے! امی نے پاپا سے کہا اور بزرگوں کا ایک خصوصی اجلاس طلب کیا گیا۔ گویا شادی کمیشن کا اجلاس۔"

"جس کی رکنیت کا اعزاز مجھے بھی بخشا گیا۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ تو طے ہے میاں محسن خان شیروانی بہ حیثیت سرپرست کے اگر میں رشتہ قبول نہ کرتی تو انجام آپ کا وہی ہوتا جو قیس و فرہاد کا ہوا۔ لیکن میں نے کہا کہ لڑکا ہے تو کچھ سر پھرا مگر آ جائے گا راہِ راست پر، چنانچہ بات پکی ہو گئی۔ اب وہاں ایک بڑا لطیفہ پیش آیا۔ انکل شیروانی نے اخلاقاً کچھ دبے دبے لہجے میں کہا کہ بھئی سکندر آ جاتا تو اچھا تھا اس کی رائے بھی معلوم کر لیتے۔ انکل رضوی نے مجھے ڈانٹا کہ اس نامعقول کی کیا مجال کہ جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے لیکن محسن سے بہرحال پوچھ لینا چاہیے۔ اس پر انکل شیروانی نے بھی مجھے ڈانٹ کر کہا اس نامعقول کی کیا مجال جو ہمارے فیصلے سے اختلاف کرے۔ نزلہ برعضوِ ضعیف۔ میں ہی سب سے جونیئر رکن تھی، جسے بلاوجہ ڈانٹا جا سکتا تھا۔" وہ ہم سب کے ساتھ ہنسی۔ "اصل بات معلوم ہے کیا تھی؟" اس نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "دونوں انکل اچھی طرح جانتے تھے کہ محسن اور شہلا کیا چاہتے ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"اور اب ایک اور اجلاس ہوگا شادی کمیشن کا۔" محسن نے کہا۔ "جس میں دوسرا ایسا ہی کیس پیش ہوگا لیکن اس کا سب سے جونیئر رکن ہوگا یہ خاکسار...."

"فی الحال کوئی اجلاس وغیرہ نہیں ہو رہا ہے مسٹر خاکسار! بلکہ یہ اجلاس بھی برخواست۔" رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

"عقلمندوں نے کہا ہے کہ عورت کی نا کو اس کی ہاں سمجھنا چاہیے۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا ہے عقلمندوں نے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"لیکن افسوس کہ شہلا نے ہاں کہہ دیا۔ مجبور تھی بے چاری۔"

"جب تیرا وقت آئے گا کبیر داس...." محسن نے تکیے سے مجھ پر حملہ کیا۔ "تو دیکھیں گے کہ دلھن ہاں کہتی ہے یا نا۔"

"خان صاحب!" میں نے اپنے تکیے سے جوابی کارروائی کی۔ "اس نے انکار کیا تو میں دلھن کو قاضی سمیت یوں اٹھا کے لے جاؤں گا جیسے پرتھوی راج نے سوئمبر سے سنجوگتا کو اٹھا لیا تھا۔"

⊛

شہلا کو وہیں چھوڑ کے ہم سب اگلے دن ناشتے کے بعد واپس ہوئے۔ مسز شیروانی کی طبیعت کچھ افسردہ ضرور تھی لیکن یہ وقتی کیفیت تھی۔ یہ خیال اُن کے ذہن میں کبھی آیا ہوگا کہ شاید ان سب لوگوں سے دوبارہ ملاقات ... بالکل فطری تھا۔ اس خیال کا اظہار ہم میں سے کبھی کسی نے نہیں کیا ... طور پر ہم بھی اسی خوف کا شکار تھے کہ یہ مسز شیروانی کو زندہ دیکھنے کا ... ثابت نہ ہو۔ ڈاکٹر ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے جس کا واضح ... نکالا جا سکتا تھا کہ ان کی زندگی کے گنے چنے دن باقی رہ گئے ہیں مگر ... تھے۔ رضوی صاحب ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے اور رابعہ ... مقدمات کی پیروی، غیر معینہ مدت کے لیے ماتحتوں پر نہیں چھوڑ سکتی ... زیرِ ضمانت تھا اور مجھے عدالت سے صرف تین دن کے لیے لاہور جانے کی اجازت ملی تھی۔ محسن کے نہ رکنے کے متعدد اسباب تھے۔ پہلی وجہ اس کی بہا... نے کہا تھا۔ "یار میں اپنی ماں کو لمحہ لمحہ اپنے سامنے مرتا دیکھنے کا عذاب نہیں کر سکتا۔ ایک بار خبر سن کے صبر کر لوں گا کیونکہ یہ خبر غیر متوقع نہیں ... سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ دوسری وجہ شہلا تھی جس کی موجودگی میں ... گھر میں رہنا اخلاقی، جذباتی اور معاشرتی مسائل پیدا کر دیتا اور تیسری ... جسے ان حالات میں وہ اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میر محمد کے قتل اور اس الزام میں مجھے ملوث کرنے کی سازش ... نے محسن کے علاوہ رابعہ کو بھی متفکر اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ اُن کی پریشانی ... تھی لیکن خوف کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ زرداد والا معاملہ ... اور افسوسناک تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جسے ہم نے اتنی جدوجہد کے بعد ... تھی کہ گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا اور افسوسناک اس کی موت تھی شیخ کی ... تائید سے ہماری قوت میں اضافہ ہوا تھا اور سب کی متفقہ رائے یہی تھی ... کو اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ شیخ کا استعفیٰ ... دیں اور اسے تھانے سے ہٹا کے اپنے ساتھ ہیڈ آفس میں رکھیں۔ رابعہ ... وضاحت کے باوجود مطمئن نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے زرداد کی موت کے کیس ... اپنی جان چھڑائی وہی اخلاقی اور قانونی طور پر جائز اور دانشمندانہ طرزِ عمل ... کا خیال تھا کہ شیخ کو تمام واقعات کی من و عن رپورٹ لکھنی چاہیے تھی۔

"اگر وہ رپورٹ میں ایک جعلساز کے وکیل بن کر آنے کا اور زہریلی ... ایک زیرِ تفتیش ملزم کو قتل کر جانے کا ذکر کر دیتا تو شیخ پر کیا الزام آتا؟ ... زیادہ محتاط نہ رہنے کا۔" اس نے کہا۔ "مگر اس انکشاف کے بعد ... والا استاد پیڈرو نہیں، زرداد تھا جس نے میک اَپ سے اس کا حلیہ ... تھا شیخ کی پوزیشن اور صاف ہو جاتی۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ... وقت بھی یہ بات واضح کر سکتا تھا۔"

"تم ایک بات بھول رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اس وقت ... خیال تھا کہ مقتول زرداد کو غیر قانونی طور پر گھر سے اٹھانے کا، اس ... بچوں کو مار نے پیٹنے کا اور تھانے میں بند کرنے کا الزام بھی شیخ پر ہی ... یہ سفید جھوٹ تھا جو اس خود ساختہ وکیل نے زرداد کو نکال کر لے جانے ... بولا تھا۔ شیخ پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ جھوٹ ہے ... ہوتا تو وہ کتنے سنگین الزامات میں ملوث ہو جاتا۔ ہم کہا تھا اس وقت ...

زرداد کی لاش سے اپنی لاتعلقی کا بندوبست کر چکے تھے اور ظاہر ہے اس کے بعد سچ بولنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔" میری بات نے رابعہ کو خاموش کر دیا تھا لیکن قائل نہیں کیا تھا۔

معاملات پیچیدہ صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور اس کا خیال تھا کہ اس قسم کے غلط چکر جتنے زیادہ ہوں گے اتنے ہی خطرات زیادہ ہوں گے، اور یہ امکانات بڑھتے جائیں گے کہ نادانستگی میں ہم سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے۔ جنگ میں خود کو دشمن سے زیادہ چالاک اور طاقتور سمجھنے والا مارا بھی جاتا ہے، خواہ یہ خوش فہمی حقیقت پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا کہ اب شرافت علی کے قتل کے مقدمے کی سماعت فوراً شروع ہو جانی چاہیے۔ اصل قاتل کا سراغ ملے نہ ملے، استغاثہ کے دونوں بنیادی گواہ شیدا اور عبدل مارے جا چکے تھے اور ان میں سے ایک یعنی عبدل نے مرتے وقت جو بیان دیا تھا، اس میں مجھے قتل کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا گیا تھا۔ اس بیان کا ایک ٹیپ مست قلندر صاحب نے روزنامہ 'صدائے وقت' کے ریکارڈ میں رکھوا دیا تھا تو دوسرا اخبار کے مدیرِ اعلیٰ اپنے ساتھ لے کر غائب ہو گئے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑنے پر فاضل مدیر باتدبیر کسی جن کی طرح اچانک نمودار ہو جائے گا اور عدالت کے سامنے اصل ٹیپ پیش کر کے سب کو حیران کر دے گا۔ عدالت کی فائل میں محرر کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان موجود ہے۔ جب ٹیپ ہوگا اور اکرم شیخ کی گواہی ہوگی تو کیس میں میرے خلاف کیا ہوگا؟

سفر کے آغاز میں موسم بہت خوشگوار تھا لیکن ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ باہر اونچے نیچے پہاڑی سلسلے تھے اور زرد مٹی کے ٹیلے تھے جن پر کیکر اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ زمین کا کٹاؤ کہیں کہیں گہری کھائی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ سطحِ مرتفع پوٹھوہار کا یہ نسبتاً بنجر علاقہ گوجر خان سے آگے جہلم تک پھیلا ہوا تھا۔ دو جگہ کار پہاڑی سرنگوں کے اوپر سے گزری اور ہم نے سیکڑوں فٹ نیچے ٹرین کو سرنگ میں سے نکل کے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا۔ پھر کسی موڑ پر سڑک کا راستہ جدا ہو گیا اور کار پہاڑی راستوں پر چکر کاٹتی، برساتی نالوں کے پل عبور کرتی دوبارہ ٹرین سے آگے نکل گئی۔ جہلم کے بعد میدانی علاقے کی ہریالی، گھنے سرسبز درختوں کی شادابی اور لہلہاتے کھیتوں کی مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ تقریباً نصف راستہ طے کرنے کے بعد رضوی صاحب نے گاڑی روکی اور ہم نے ایک روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ میں چائے پی۔ لاہور اب اسی میل دور تھا۔

دوبارہ سفر شروع ہوا تو رضوی صاحب پیچھے چلے گئے اور ڈرائیونگ میرے سپرد کر دی۔ تقریباً دس منٹ تک وہ پائپ کے کش لیتے رہے اور باہر دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے اچانک کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ میر محمد کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش کا نصف حصہ یعنی دھڑ اکرام شیخ نے دریافت کیا تھا۔ سر کوئی تھانے میں پھینک گیا تھا۔ تم کو شیخ نے کچھ بتایا تو ہوگا کہ قتل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟"

"اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے عبدل کے بیان کا ٹیپ غائب کیا تھا۔ بعد میں اس نے ٹیپ کے بدلے بہت بڑی رقم مانگی۔ اور اس نے بڑی غلطی یہ کی کہ ٹیپ کی نقل بنا لی۔" میں نے اُن کو مختصراً وہ تمام واقعات سنا دیے جو ان کی غیر حاضری میں پیش آئے تھے یعنی کس طرح میں نے دین محمد کے ساتھ جا کے اس کے بھائی کے گھر کا نقشہ دیکھا تھا اور پھر کیسے مجھے مست قلندر صاحب کی زبانی دیگر تفصیلات کا علم ہوا تھا۔ "لیکن اب میر محمد کے بچے، اصل ٹیپ اور روزنامہ 'صدائے وقت' کے مدیر کہاں ہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔" وہ بڑے دھیان سے سنتے رہے اور پائپ کے کش لیتے رہے۔

"گویا اس قتل کا براہِ راست تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے کوئی تعلق ضرور ہے؟" انھوں نے کہا۔ "کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ جن پر قتل کا شبہہ کیا جا سکتا ہے؟"

"آپ اُن لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ لوگ مجھے میر شرافت کا قاتل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ میر محمد کی بے وقوفی نے ان کے عزائم کو ناکامی کے اندیشے میں بدل دیا۔"

"اور ان لوگوں نے صرف میر محمد اور اس کی بیوی کے قتل کو کافی سمجھا؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "تمہیں اس الزام میں ملوث کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہ بہت چالاک قسم کے لوگ ہیں۔ اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ میر محمد کو مار کے اس کی لاش تمہارے کمرے میں یعنی میرے گھر میں ڈال جاتے یا تمہاری کچھ چیزیں وہاں ڈال دیتے جہاں لاش ملی تھی۔"

رضوی صاحب کا ذہن ایک تجربہ کار پولیس افسر کی طرح صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا، لیکن میں اُن سے کیا کہتا کہ دشمنوں نے تو بڑی زبردست چال چلی تھی میرے ساتھ اور مجھے میر محمد کے کٹے ہوئے سر سمیت گرفتار کرانے کا پورا بندوبست بھی کر لیا تھا، مگر خدا کو بچانا منظور تھا اُن کی چال ناکام ہو گئی۔

"دیکھو نا! میر محمد تمہارا دشمن تھا۔" انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔ "یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر بھی ہے۔ اگرچہ دشمنی کے اسباب معلوم نہیں لیکن تم نے اور شیخ نے اُس پر ٹیپ غائب کرنے کا الزام لگایا تھا۔ اُس نے تم پر تشدد بھی کیا تھا اور تم سے اعترافِ جرم بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ تم کو اس جرم میں ملوث کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔"

"انھوں نے کوشش تو کی تھی انکل!" میں نے کہا۔ "حشمت خان ایک دن صبح صبح آ پہنچا تھا، یہ پوچھنے کہ گزشتہ شب میں کہاں تھا۔"

"اور یہ اتفاق ہے کہ اس رات تم عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے گھر سوئے تھے۔" رضوی صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایڈووکیٹ صاحب اس بات کے گواہ ہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ اُن کا بیان نہ ہوتا تو پولیس تمہیں یقیناً گرفتار کر کے لے جاتی اور قتل کی ایف آئی آر میں تمہارا نام ضرور آتا۔"

"کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے میر محمد کو قتل کیا، لیکن عبدالودود منظر نے جھوٹا بیان دے کر مجھے بچا لیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" انھوں نے کچھ سوچ کے کہا۔ "قتل تو تم نہیں کر سکتے لیکن

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تمہارے دوست بھی تم سے کم نہیں۔ تمہیں ہر الزام سے بچا لیتے ہیں۔"
" اگر مجھے جھوٹے الزام سے بچانے کی خاطر وہ جھوٹ بولتے بھی ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جس دنیا میں آپ رہتے ہیں انکل! اس میں کتنے ہیں جو سچ بول کے جی رہے ہیں۔ آپ کا تجربہ میری عمر سے زیادہ ہے۔"

" میں ساری دنیا کی بات نہیں کر رہا تھا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ " تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ یا تمہیں اندیشہ ہے کہ میں جھوٹ اور سچ کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں اور حقائق کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ سوچے سمجھے بغیر میں تم کو اُن لوگوں کے حوالے کر دوں گا جو تمہاری جان کے دشمن ہیں اور ہر قیمت پر تمہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل ہو سکے۔"

" میں سمجھتا ہوں، اب تک مجھے سب سے زیادہ تحفظ خدا کے بعد آپ نے ہی فراہم کیا ہے۔ صرف مجھے ہی نہیں، رابعہ کو بھی اور شہلا کو بھی آپ نے صرف میری وجہ سے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اپنے خاندان کا ایک فرد بنا کے رکھا۔" میں نے کہا۔

" اور اس کے باوجود تم مجھے ہی وہ بات نہیں بتاتے ہو جو شاید رابعہ کو اور محسن کو بتا چکے ہو؟"

میں مجبور ہو گیا۔ میں نے اُن کو میر محمد کی لاش کے ملنے سے اُس کا کام ملنے تک کی تمام روداد سنا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں نے کس طرح اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ سر تفتیش کے لیے آنے والے انسپکٹر کے بیگ میں ڈال دیا تھا اور اس نے سر کو گٹر میں ڈال کے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا۔ گاڑی کو میں نے ڈینٹ پینٹ کے لیے دے دیا تھا چنانچہ حشمت خان کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے بیان میں سے استاد پیڈرو کی گرفتاری کا اور اس کے زردار ثابت ہونے کا ذکر میں نے پھر بھی گول کر دیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میر محمد کا سر میں نے گھر پہنچنے کے بعد پچھلی سیٹ پر پڑا دیکھا تھا اور فوراً سمجھ گیا تھا کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے وہی کیا جو میری عقل میں آیا۔

رضوی صاحب نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اُن کا موڈ بتاتا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اُن کی زندگی میں آزمائش کا ایسا دور کبھی نہیں آیا تھا۔ اگر وہ فرض کو مقدم رکھتے تو اسی وقت مجھے پولیس کے حوالے کر دیتے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ مجھ پر دہرا ظلم ہوگا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہر طرح سے مجھے اپنی سازش کے جال میں گرفتار کرنے پر تُلے بیٹھے تھے اور اپنی طاقت اور اپنی دولت سے جھوٹی گواہیاں خرید رہے تھے، جھوٹے حالات پیدا کر رہے تھے اور جھوٹی شہادتیں جمع کر رہے تھے تاکہ مجھے تختۂ دار تک پہنچا سکیں۔ یہی نہیں، وہ براہِ راست بھی میری زندگی پر قاتلانہ داؤ آزما چکے تھے۔ اگر رضوی صاحب یہ سب کچھ جاننے کے باوجود صرف قانون کو دیکھتے تو انہی کی مدد کرتے جو صفِ دشمناں میں شامل تھے اور خود کو اتنا بڑا شکاری سمجھتے تھے کہ نظامِ انصاف تک کو شکار کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے بچپن سے مجھے دیکھا تھا، وہ میری فطرت کو اچھی طرح سمجھتے تھے

اور اب میرے باپ کی جگہ تھے۔ انہیں وزیر خان کے حالات کا بھی علم تھا جو بظاہر یہ ناممکن تھا کہ اب وہ مجھے بھی ان سفاک درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جو وزیر خان کے قاتل تھے۔ اگر میں اُن کی نظر میں مجرم ہوتا تو شاید وہ کسی جذباتی رشتے کا لحاظ نہ کرتے لیکن ان کو یقین تھا کہ غلط طریقے سے ہی سہی میں جو کچھ کر رہا ہوں اپنے دفاع میں کر رہا ہوں۔

رضوی صاحب کی بیگم اگر ایک پولیس افسر کی رفاقت کی عادی نہ ہوتیں تو ہماری باتوں سے یقیناً دہشت زدہ ہو جاتیں لیکن ان کے تو بچے بھی ایسی گفتگو کے عادی تھے۔ رابعہ کچھ پریشان سی تھی کہ کہیں میرے منہ سے روانی میں کوئی غلط بات نہ نکل جائے اور میں اس ذہنی انتشار سے دوچار تھا کہ کہیں میری مسلسل غیر ذمے دارانہ حرکتوں کے باعث رضوی صاحب کی عقل کا فیصلہ میری توقعات کے برعکس نہ ہو جائے کیونکہ حقیقت کو ان کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو جو کچھ میں اور محسن کرتے تھے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف تھا۔ ہم گجرانوالہ کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور وہ سنگِ میل ابھی ابھی گزرا تھا جس پر لکھا ہوا تھا لاہور پینتیس میل دور رہ گئے۔ میں نے ایک ٹرک کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی جو تقریباً سڑک کے وسط میں تھا اور اس پر عمارتی سریا لدا ہوا تھا۔ ہارن دے کر میں نے رفتار بڑھائی اور سیدھے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت سامنے سے دوسرا ٹرک نمودار ہوا جو انتہائی تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ حالانکہ اوور ٹیک کرنے سے پہلے میں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ سڑک خالی ہے اور اتنی گنجائش ضرور ہے کہ میں آگے نکل کر اپنی سائڈ پر ہو جاؤں۔ اس غیر متوقع صورتحال نے بھی مجھے نروس نہیں کیا کیونکہ سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے ذہن کو ہر انہونی بات کے لیے تیار رکھنا پڑتا ہے۔ پریشانی میں اس وقت ہوا جب میں نے بریک لگانے کی کوشش کی اور بریک نہیں لگے۔ بریک پیڈل گاڑی کے فرش سے جا لگا لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بریک فیل نہ ہوتے تو میں بڑی آسانی سے رفتار کو کنٹرول کر کے پھر سریے سے لدے ہوئے ٹرک کے پیچھے ہو جاتا لیکن اب اس کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

اس خطرناک صورتِ حال میں بھی میرے اوسان خطا نہیں ہوئے۔ میں نے چلا کر کہا۔ " انکل! بریک فیل ہو گئے ہیں۔" اور اس وارننگ کے ساتھ ہی میں نے انجن کو ٹاپ گیئر میں سے دوسرے گیئر میں ڈالا۔ گاڑی نے ایک زبردست جھٹکا لیا اور اس کا انجن احتجاج کرتے ہوئے گرجا۔ رفتار میں فوراً کمی آئی اور سریے والا ٹرک تھوڑا سا آگے ہو گیا اس کے باوجود میرے لیے ٹرک کی لائن میں آنا مشکل تھا۔ لمبے لمبے سریے انتہائی خطرناک طریقے پر ٹرک کی باڈی سے بہت پیچھے تک جھول رہے تھے اور میں گاڑی کو بائیں طرف تھوڑا سا بھی موڑتا تو یہ سریے ونڈ اسکرین کو توڑتے، گاڑی کی باڈی میں سوراخ کرتے اور گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی زخمی کر دیتے۔ دوسری طرف سامنے سے آنے والا ٹرک بہت نزدیک آ گیا تھا لیکن ابھی تک اس کا ڈرائیور یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ہماری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں۔ اس نے تو مجھے کوئی سرپھرا اور جوشیلا نوجوان سمجھا ہوگا جو اسی طرح

کی جان کی پروا کیے بغیر یوں گاڑی چلاتے ہیں جیسے وہ زمین پر نہیں ہوا میں اڑ رہے ہیں یا اس نے مجھے نشے میں دُھت تصور کیا ہوگا ورنہ کالے کر ٹرک کے سامنے آنا خودکشی کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے ہارن دیا اور کھڑکی سے سر نکال کے کلینر نے بھی چلا کے مجھے راستہ دینے کو کہا۔ بالکل آخری وقت میں مَیں نے اسٹیرنگ کو پورا دائیں جانب کاٹ دیا اور گاڑی تقریباً نوّے درجے کے زاویے پر گھوم گئی۔ کچی سڑک پر اور پھر نیچے نشیبی علاقے میں اُتر گئی۔ میری ساری توجہ اور جدوجہد گاڑی کا توازن برقرار رکھنے پر صرف ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ایک ہلکی سی رگڑ کی آواز سُنی جو گاڑی کے پچھلے حصے سے آئی تھی۔ بعد میں نیچے اتر کے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ موت ہمارے کتنے قریب سے گاڑی کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ گاڑی کا پیچھے والا بمپر اور مڈگارڈ کا کونا تیز رفتار ٹرک سے مس ہو کر پچک گئے تھے۔ فوری طور پر میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور بالکل آخری لمحے میں گاڑی کو ایک گڑھے میں گر کر اُلٹنے سے بچانے کی دیوانہ وار کوشش میں پھر دائیں طرف اسٹیرنگ کو پورا گھما دیا۔ گاڑی کے پہیے کھڈ کے کناروں کو چھوتے ہوئے گزر گئے لیکن گاڑی ٹیلی فون کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ اس وقت تک گاڑی کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ تصادم کی قوت نے صرف گاڑی کے سامنے والے حصے کو تباہ کیا۔ بمپر اور بونٹ بالکل درمیان میں سے اندر گھس گئے لیکن ونڈ اسکرین اور ہیڈ لائٹس کو

کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے لوگوں کو خبردار کرنے کے بعد جو وقت میں نے اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بچانے میں صرف کیا تھا وہ مشکل سے آدھا منٹ ہوگا۔ اس آدھے منٹ میں کس نے مجھ سے کیا کہا اور میں نے کیا جواب دیا، کس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور کون کس پر گرا، یہ سب نہ میں نے دیکھا نہ سُنا۔ آدھے منٹ کی اس جدوجہد کی کامیابی کے بعد گاڑی آخری جھٹکا لے کر رکی اور اس کا انجن بند ہو گیا تو میں نے نڈھال ہو کے اپنا سر اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ ذہنی اور جسمانی طور میں اتنا تھک گیا تھا جیسے میں نے مسلسل چوبیس گھنٹے گاڑی چلائی ہو۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے انکل رضوی کی آواز سُنی۔ وہ میرے شانے پر تھپکی دے رہے تھے۔ " بیٹے سکندر! ہوش میں آؤ۔ شاباش! تم نے ہم سب کو بچا لیا ہے سکندر! تم نے تو کمال کر دیا ہے بیٹے"!

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے بہت سے چہرے دکھائی دیے جن میں رابعہ کا چہرہ تھا جو خوف سے سفید پڑ گیا تھا لیکن وہ مسکرا رہی تھی میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اُسے مجھ پر کتنا فخر ہے۔ میں نے محسن کو دیکھا جس کی مسکراہٹ میں اعتماد کا غرور تھا۔ بچوں کو خطرے کی سنگینی کا کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا اور وہ صرف جھٹکے لگنے سے خوف زدہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ خوف زدہ بیگم رضوی تھیں جو اب اپنے بچوں کو دونوں

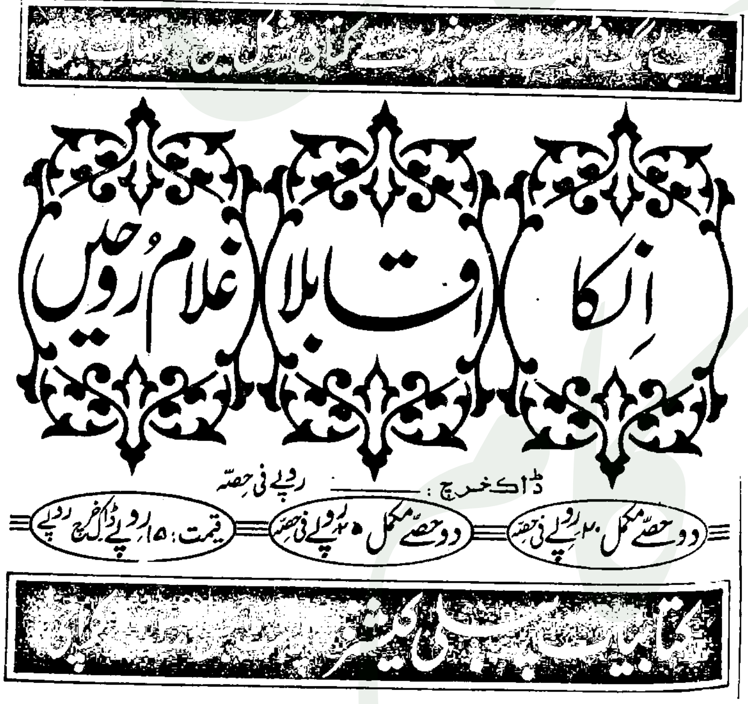

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ہاتھوں سے اپنے قریب کیے کھڑی تھیں۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں رُک گئی تھیں اور بہت سے لوگ مدد کے لیے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ ٹرک جس نے کار کے پچھلے حصے کو چھوا تھا بلغیر رُکے سیدھا نکل گیا تھا۔

"کسی کے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے محسن سے کہا اور دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

"خدا کا شکر ہے کہ سب خیریت سے ہیں۔" محسن [illegible] اور یہ صرف تیرا کمال ہے سکندر! ورنہ مجھے تو تصادم سے بچنے [illegible] صورت نظر نہیں آتی تھی۔" بعد میں سب نے فرداً فرداً میری حاضر [illegible] قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا اعتراف کیا اور خود میں نے گاڑی [illegible] حصے کو دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ مجھ سے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے [illegible] بھی دیر ہو جاتی تو ٹرک اپنی پوری قوت کے ساتھ گاڑی کے دونوں [illegible] سے ٹکراتا اور اسے یوں گھسیٹتا ہوا لے جاتا جیسے کوئی خون آشام [illegible] پر جست لگا کر اسے اپنے خونی پنجوں میں دبوچ کر لے جاتا ہے۔ [illegible] تصادم کے بعد ہم میں سے کسی کا زندہ بچ جانا معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اگر گاڑی الٹ جاتی یا کھڈ میں گر جاتی تب بھی ہمارے شدید زخمی ہو[illegible] کے امکانات تھے لیکن کھمبے سے ٹکرا کے صرف یہ نقصان ہوا تھا کہ [illegible] جالی ٹوٹ گئی تھی۔ انجن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اب [illegible] ڈھلوان سے سڑک تک لانا بھی ناممکن تھا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے انجن گرم [illegible] بند ہو جاتا۔

مدد کے لیے آنے والوں نے یہ کیا کہ گاڑی میں سے سارا سامان نکالا اور ایک شخص میرے اور محسن کے سوا سب لوگوں کو اپنی گاڑی میں لاہور لے جانے پر تیار ہو گیا۔ جاتے جاتے بھی رضوی صاحب نے مجھے شاباش دی اور کہا کہ میں نقصان کی بالکل فکر نہ کروں۔ خدا کو سب کی زندگی منظور تھی ورنہ وہ خود گاڑی چلا رہے ہوتے تو اس حادثے سے نہیں بچ سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے دو ہزار روپے بھی دیے کہ میں اور محسن کسی طرح بھی گاڑی کو واپس گوجرانوالہ لے جائیں یا لاہور لے آئیں۔ ہم نے انھیں تسلی دے کر رخصت کیا اور کہا کہ وہ ہماری طرف سے مطمئن رہیں۔ جیسے بھی ہوگا، ہم شام سے پہلے گاڑی سمیت گھر پہنچ جائیں گے۔

گاڑی کو نشیب سے سڑک تک پہنچانا بہت کٹھن مرحلہ تھا لیکن مدد کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ پندرہ بیس افراد نے جن میں زیادہ تر ڈرائیور اور کلینر قسم کے لوگ تھے ایک ساتھ مل کر زور لگایا اور گاڑی کا رُخ پلٹ کے سڑک تک لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ فاصلہ شاید سو گز بھی نہیں ہوگا لیکن سڑک تک آتے آتے ہر شخص بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ سب کے کپڑے پسینے میں تر تھے اور ہاتھ پیر گندے ہو گئے تھے۔ میں نے اور محسن نے مدد کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب ہم باقی کام خود کر لیں گے۔ جو لوگ گاڑیاں روک کر آئے تھے وہ رخصت ہو گئے۔ صرف ایک پولیس کی گاڑی رہ گئی جسے کوئی کانسٹیبل چلا رہا تھا۔ ہمارے اشارے پر تو شاید نہ رُکتا مگر وہ اپنے تجسس کی وجہ سے رُکا تھا کہ رضوی صاحب نے اُسے پکڑ لیا اور حکم دیا کہ وہ ہماری مدد کیے بغیر نہ جائے۔ کانسٹیبل میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ کسی اعلیٰ افسر کے حکم سے سرتابی کرتا۔ اس نے کسی ٹرک کو روک کے ایک بہت مضبوط رسّی حاصل کی اور پھر خود ہی ہماری گاڑی کو اپنی گاڑی کے پیچھے باندھا۔ محسن نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو کانسٹیبل نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی گاڑی کا اسٹارٹ کی۔ ہماری گاڑی جھٹکا لے کر آگے بڑھی اور دونوں گاڑیاں تقریباً چھ سات گز آگے پیچھے کچھوے کی طرح رینگنے لگیں۔ صرف ایک بار کانسٹیبل نے رفتار میں تھوڑا سا اضافہ کیا تھا تو میں نے ہارن دے کر اسے خبردار کیا کہ رفتار کم رکھے ورنہ اس نے بریک لگائی تو ہم اس کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے کہ پیچھے سے اس کی گاڑی کو ٹکر مار دیں۔

میرے اعصاب پر ابھی تک حادثے کے اثرات باقی تھے اور اس منظر کا تصور بھی روح فرسا ثابت ہو رہا تھا جب زندگی اور موت کے درمیان وقت کے ایک بے وجود لمحے کی ناپائیدار دیوار حائل رہ گئی تھی۔ موت کو میں نے اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا اور محسن کی طرح اب مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ صرف میری کوشش سے ایک نہیں کئی خاندان تباہ ہونے سے بچ گئے تھے۔ ایک خاندان تو رضوی صاحب کا تھا۔ دوسرا محسن کا خاندان تھا۔ اُس کی بہن کی رخصتی ہو چکی تھی اور ماں بہت جلد ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہونے والی تھی۔ محسن نہ رہتا تو بوڑھے والد بھی اس صدمے سے مر جاتے۔ پھر اسی خاندان کے بطن سے جنم لینے والا دوسرا خاندان وہ تھا جس کی بنیاد شہلا اور محسن تھے۔ یہ خاندان وجود میں آنے سے قبل ہی مٹ جاتا۔ چوتھا خاندان وہ تھا جو میرا اور رابعہ کا خاندان کہلاتا۔ ابھی تو ہم نے صرف خیالوں میں اس کا نقش مکمل کیا تھا۔ صرف اپنے تصور میں اس کا خاکہ بنایا تھا اور صرف خوابوں میں اس کو آباد کیا تھا۔ کتنا بے حس اور سفاک ہوتا ہے وہ لمحہ جو برسوں روشن رہنے والے امیدوں کے چراغ ایک پل میں بجھا دیتا ہے۔ ایک پل میں اُس نخلِ آرزو کو ویران کر دیتا ہے جس کی آبیاری خونِ جگر سے کرتے عمر بیت جاتی ہے اور ایک پل میں محبت کے ہر تاج محل کو سنسان کھنڈر کر کے گزر جاتا ہے۔

محسن نے میری طرف سگریٹ بڑھائی تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" محسن نے کہا۔ "بس اتنا ہی حوصلہ تھا سکندرِ اعظم!" میں نے پیکٹ لے کر دو سگریٹیں جلائیں اور ایک محسن کو دے دی۔

"بات حوصلے کی نہیں ہے محسن!" میں نے کہا۔ "نتائج کا تصور لرزہ خیز ہے۔ کیا ہوتا اگر گاڑی ٹکرا جاتی۔ ہم نے اپنی جدوجہد کا آغاز کب کیا تھا اور کہاں سے کیا تھا پھر کتنے مصائب برداشت کیے۔ کیسی کیسی آزمائش سے گزرے اور کتنے بڑے دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اُن کی ہر چال کو ناکام بنایا اور کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ کہاں جاتا کامیابی کا سارا غرور اور اپنے اعتماد سے بالآخر دشمن کو شکست دینے کا عزم۔ تقدیر کی ایک غلط چال سے دشمن جیت جاتے اور ہم نے جتنی جدوجہد کی تھی رائیگاں جاتی۔"

"یہ جدوجہد بہت عظیم تھی جو تو نے ابھی سات افراد کی زندگی بچانے کے لیے کی۔" محسن نے کہا۔ "اور میں سمجھتا ہوں تائیدِ ایزدی حاصل نہ ہوتی تو ہمیں بہت پہلے ہی شکست ہو جاتی۔ خدا نے تجھے حوصلہ عطا کیا، راستہ [illegible] دی اور تیری مدد کی تو آج بھی تیری کوشش نے موت کو شکست دے دی۔"

"میری کوشش سے کیا ہو سکتا تھا محسن! اگر نوشتۂ تقدیر کے مطابق فرشتۂ اجل اسی جگہ اسی وقت ہم سب کی روح قبض کرنے کا انتظار ہی ہوتا۔" میں نے کہا۔ "امی کب سے موت کے خلاف نبرد آزما ہیں اور ڈاکٹر جتنی کوشش کر سکتے تھے کر چکے۔ ان کے پاس جتنا علم تھا، تجربہ تھا اور صلاحیت تھی اور میڈیکل سائنس کی جتنی ریسرچ کا سرمایہ تھا، سب تمام ہوا اور انہوں نے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیا کہ وہ اس ناگزیر لمحے کو نہیں ٹال سکتے۔"

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔" محسن بولا۔ "ڈاکٹروں نے پہلے ان کی زندگی کی میعاد چھ ماہ رکھی تھی پھر اسے چار مہینے کر دیا اور اب انھیں اسپتال سے لائے تھے تو ڈاکٹروں نے صاف بتا دیا تھا کہ شاید یہ آخری مہینہ بھی پورا نہیں گزرے گا لیکن تین ہفتے گزر چکے ہیں۔ مایوسی میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔ مشورے دینے والے سب ہی ہمدرد لوگ تھے۔ کسی نے کہا فلاں درگاہ کی مٹی میں شفا ہے، ڈیڈی نے وہ بھی پانی میں گھول کر پلا دی۔ کسی نے اپنے پیر صاحب سے تعویذ لا کے دیا۔ ڈیڈی نے اسے بھی عین ہدایات کے مطابق عمل کر کے سرہانے رکھ دیا۔ ایک نفسیاتی سہارے کی ضرورت ڈیڈی کو بھی تھی اور یہی سہارا دے کر وہ امی کی قوتِ ارادی کو بحال رکھنا چاہتے تھے ورنہ میرا خیال ہے کہ زندگی میں خدا کے سوا انہوں نے کسی سے مدد نہیں مانگی اور کوشش کو صرف ایک وسیلہ ضرور سمجھا ہوگا مگر کامیابی کو رضائے الٰہی سے منسوب کیا۔ ہر شخص کی زندگی کے تجربات الگ ہوتے ہیں اور انہی کے نتائج پر وہ اپنے یقین کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ معمولات متعین کرتا ہے اور جینے کا ایک ڈھنگ اپناتا ہے۔ ڈیڈی پر کبھی سخت وقت آیا تو وہ رات بھر سربسجود رہے اور خدا کے حضور دستِ بدعا رہے مگر میں نے نہیں کبھی پیروں فقیروں کے آستانوں پر حاضری دیتے نہیں دیکھا۔ بیماری میں انہوں نے ہمیشہ سرکاری ڈاکٹروں سے رجوع کیا یا اسپتال گئے۔ دنیا میں ایک سے ایک بڑا حکیم موجود ہے جن کے ہاتھ میں خدا نے شفا دی ہے اور بڑے ماہر ہومیوپیتھ بیٹھے ہیں جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور علم سے صحیح تشخیص کی اور ان کے علاج سے وہ مریض صحت یاب ہوئے جن کو ایلوپیتھک ڈاکٹر ناقابلِ علاج قرار دے چکے تھے۔ امی کے کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ ڈیڈی کے کسی دوست نے گوالمنڈی کے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کا ذکر کیا اور ان کے اعجازِ مسیحائی کے بہت سے واقعات سنا کے ڈیڈی کو قائل کر لیا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ عام ڈاکٹر تو جواب دے چکے ہیں۔ وہ خود ڈاکٹر کو گھر پر لائے اور انہوں نے تو بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ مایوسی کفر ہے کیونکہ شفا خدا دیتا ہے اور انسان کی عقل سے یا دوا کی تاثیر سے اس وقت تک کچھ نہیں ہوتا جب تک اس کا حکم نہ ہو۔ عجیب درویش صفت اور بے غرض آدمی تھا۔ اس نے نہ جانے کیا دوا دی، میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آگے کیا ہوگا۔ اس ہومیوپیتھ نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا ہے مگر امی کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ ان کی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے اور بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ بے شک یہ معجزوں کا زمانہ نہیں ہے لیکن کیا ہر جگہ، ہر دور میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے جن کو صرف معجزہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، وید اور ہومیوپیتھ۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے سنیاسی اور صرف دعا دینے والے درویش، ان سب سے ایسے واقعات منسوب ہیں جب مریض کی زندگی کی امید کسی کو نہیں تھی لیکن وہ کسی کے دستِ شفا کے باعث موت کی سرحد تک جا کے لوٹ آئے اور پھر طبعی عمر کو پہنچ کے مرے۔"

"یہ بات صرف ہمارے ہندوستان پاکستان کی حد تک ہی درست نہیں۔" میں نے کہا۔ "جب ہم برطانیہ میں تھے تو کیسے عجیب و غریب کیس اخبارات میں نظر آتے تھے۔ فلاں ماہرِ روحانیات، ہپناٹزم سے علاج کرنے والے۔ پُراسرار علوم کے ذریعے ہر جسمانی عذاب سے نجات دلانے والے، اُن کے معتقد بھی ہوتے تھے اور ایسے لوگ خود پبلک کے سامنے آتے تھے جو انہی لوگوں کے ہاتھوں کسی علتِ ناقابلِ علاج مرض سے شفایاب ہوئے۔ خود میڈیکل ایکسپرٹ یہ وضاحت کرنے سے قاصر رہتے تھے کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"پھر پچھلے دنوں ایک بڑی عجیب بات اور بھی ہوئی۔" محسن بولا۔ "امی نے خواب میں ایک آواز سنی۔ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھیں۔ یہ خواب انہوں نے مجھ سے بھی بیان کیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے آواز آ رہی تھی جس کی بازگشت ہر سمت سے آ رہی تھی۔ جا تجھے نئی بیٹی کے لیے زندگی دی بیٹی

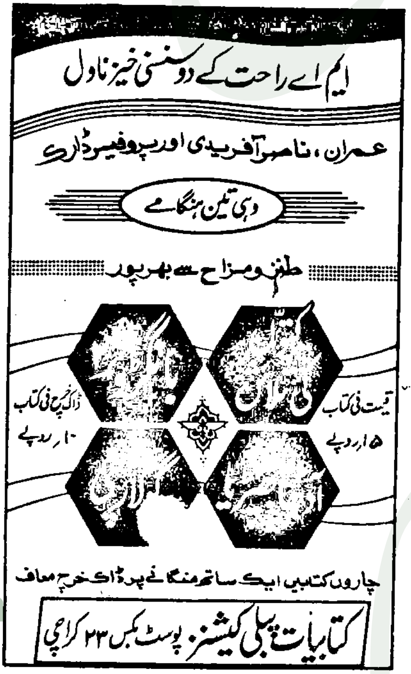

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دی اور اس کی زندگی بھی دی۔ الفاظ بالکل یہی تھے۔ کیا مطلب ہے ان کا؟"

"ہمارے کسی خواب کی تعبیر بتانے والے سے پوچھو گے تو وہ تمہاری توقعات کے عین مطابق یہ بتائے گا کہ یہ نئی زندگی کی بشارت ہے۔" میں نے کہا۔ "یا اسی قسم کی امید افزا باتیں کرے گا۔ نفسیات تو کہتی ہے خواب انسان کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا سامان فراہم کرتے ہیں اور انہی کا عکس ہوتے ہیں۔ چنانچہ تمہاری امی کے لاشعور میں زندہ رہنے کی جو خواہش موجود ہے، وہی خواب بن گئی۔ اب کون سچ کہتا ہے اور کون غلط، اس کا فیصلہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔"

"فیصلہ میں بھی نہیں کر سکتا کہ خواب جھوٹے سچے ہوتے ہیں یا نہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن امی پر اس خواب کا بڑا خوشگوار نفسیاتی اثر پڑا ہے۔ پہلے وہ خاصی ناامیدی کی باتیں کرتی تھیں۔ اب کہتی ہیں میں زندہ رہوں گی۔ خدا نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے۔ تم سب دیکھ لوگے، میری بیٹی نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔"

"یعنی مریم باجی نے؟" میں نے کہا۔ "خواب میں انہوں نے خود کو پہاڑ پر دیکھا تھا اور مریم باجی کا انتقال جس حادثے میں ہوا تھا وہ مری میں پیش آیا تھا۔ یہ سانحہ بھی ان کے لاشعور میں......"

"نہیں۔ ان کی مراد شہلا سے ہے۔" محسن بولا۔ "پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن انہوں نے میری توجہ الفاظ کی طرف دلائی۔ نئی بیٹی کے لیے زندگی دی۔ بیٹی بھی دی اور زندگی بھی دی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔ شہلا نے اس حد تک متاثر کر لیا ہے انہیں۔ ان حالات میں اگر شہلا ہی وہ نفسیاتی قوت بن جائے جو انہیں موت کے منہ سے کھینچ لائے تو کچھ عجب نہیں۔"

"معلوم نہیں کیا بات ہے سکندر! میں ان کی حالت میں موجودہ افاقے کو کسی طریقہ علاج کی کامیابی سے منسوب نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔ "یہ ممکن ہے کہ ہومیوپیتھی کا علاج انہیں موافق آ گیا ہو۔ مگر تیری طرح میں بھی اسے اعتقاد کا کرشمہ سمجھنے پر مجبور ہوں میرے اور ڈیڈی کے لیے ان کے یقین سے روگردانی ناممکن تھی۔ ہم نے ان کے یقین کو تقویت پہنچانے کی پوری کوشش کی یقین کی قوت سے ہی معجزے ظہور میں آتے ہیں اور اسی لیے میں تیرے ساتھ چلا آیا میں نے کہا امی! اب تو آپ ٹھیک ہو رہی ہیں میں یہاں رہ کے کیا کروں گا۔ آپ کی خدمت کے لیے خدا نے آپ کو نئی بیٹی بھی دے دی ہے۔ وہاں سکندر کے ساتھ کوئی نہیں یہ دراصل ان کے اعتقاد پر اپنے اعتماد کا اظہار تھا جو اس مرحلے پر بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر یہ سب میری خواہشات کا فریب ہوا اور ڈاکٹروں کا فیصلہ ہی صحیح ثابت ہوا تو میری بدنصیبی۔ میں ان کے پاس رہ کے بھی کیا کر لیتا۔ جب ضرورت پڑے گی پھر چلا جاؤں گا اور ان کی آخری رسوم میں شرکت کر کے لوٹ آؤں گا۔ ورنہ میری بات کا ردعمل بہت مثبت ہوگا اور اثر تو اسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے کہا تھا تو جا میں اب ٹھیک ہوں۔ میری فکر مت کر۔ سکندر کا خیال رکھ۔"

جی ٹی روڈ پر ٹریفک بہت زیادہ تھی چنانچہ ہم بالکل بائیں کنارے پر رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پیچھے سے آنے والے تو قریب آ کے ہماری سست رفتاری کا سبب جان لیتے تھے اور اوورٹیک کرنے سے پہلے احتیاط سے کام لیتے تھے لاہور کی طرف سے آنے والی بسوں اور ویگنوں سے تھا جو اس سیدھی سڑک پر ایک دوسرے کے ساتھ ریس لگاتے تھے اور بعض اوقات آگے نکلنے کی کوشش میں سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچ جاتے تھے تو سامنے سے آنے والوں کے لیے نہیں رہتا تھا چنانچہ حادثات بھی ہو جاتے تھے۔

کالا شاہ کاکو سے آگے یہ خطرہ اور بڑھ گیا تو میں نے اور محسن نے فیصلہ کیا کہ شاہدرہ پہنچتے ہی گاڑی کو سب سے پہلے نظر آنے والے گیراج پر کھڑا کر دینا۔ پانچ میل کے بعد میں نے سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ سائلنسر لٹکے ہوئے دیکھے وہیں درخت کے نیچے ایک شخص ریڈی ایٹر کی جالی میں ٹانکے لگا رہا تھا اور بقلم خود لکھے ہوئے "داتا نگری موٹر ورکشاپ" کے سامنے بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں دو ٹرک، ایک بس اور ایک ویگن کے علاوہ دو کاریں بھی زیر علاج تھیں۔

میں نے ہارن دے کر کانسٹیبل کو متوجہ کیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے کا مطلب سمجھ کے اپنی گاڑی آہستہ آہستہ روک لی۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کر کے رخصت کیا اور گیراج کے مالک کو تلاش کیا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ استاد کہاں ہیں۔

پروپرائٹر گیراج ہذا درخت کے نیچے چارپائی پر نیم دراز تھے اور نذرانہ پیش کرنے والے شاگردوں کو ان کی عمر اور سینیارٹی کے مطابق پرشفقت گالیوں سے نواز رہے تھے۔

"بیٹھو باؤ جی!" انہوں نے ہمیں کسی بس سے نکلی ہوئی سیٹ کی طرف متوجہ کیا جو صوفے کا کام دیتی تھی۔ پھر انہوں نے دہاڑ کر کہا۔ "اوئے کبوترا! دیکھ باؤ جی دی گڈی لے کر آ فٹافٹ۔ تو بھی جا ساتھ اس کے پہلوان۔"

جسے کبوتر قرار دیا گیا تھا وہ چودہ پندرہ برس کا شوقین مزاج لڑکا تھا جس نے لمبے لمبے بال رکھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں جیسے کے حساب سے سرمہ ڈالا تھا۔ شاید یہ لقب اسے کبوتر بازی کے شوق کے طفیل ملا ہوگا۔ پہلوان کا معاملہ برعکس نہند نام زنگی کافور والا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا بانس کی طرح سوکھا اور لمبا نوجوان تھا جس کی ساری پسلیاں بنیان کے سوراخوں سے گنی جا سکتی تھیں۔

"کیا ہوا ہے گڈی کو جناب عالی!" پروپرائٹر نے حقے کا کش لے کر سوال کیا۔ ہم نے اپنی دکھ بھری کہانی رقت انگیز پیرائے میں اور رحم سے کم الفاظ میں بیان کی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حادثے کے متاثرین کو ترجیح دے اور فوری امداد فراہم کرے۔

"چلو جی رب دا شکر کریں۔ سب آنا دا فضل ہے۔ گڈی ابھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔" اس نے متاثر ہو کے کہا۔ "لیکن فیر دی تین چار گھنٹے لگ جائیں گے آپ کے۔ جالی کھول کے دیکھنی پڑے گی کہ نئی ڈالنی ہے یا مرمت سے کام چل جائے گا۔ ماشر سلنڈر کی واشریں اور ساری بریک لائن چیک کرنے کے بعد بریک سیٹ کرنے پڑیں گے چاروں وہیلوں کے۔ ایک ڈبہ بریک آئل چاہیے۔"

"آپ یہ بتا دیں کہ کل خرچ کتنا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو کتنے پیسے دے جائیں اور کس وقت آئیں؟"

"دیکھو جی! اگر تو جالی نئی پڑی تو خرچہ ہوگا زیادہ۔ ورنہ آپ سو دے جائیں۔" استاد نے کہا۔ "آپ ریڈی ایٹر نیا ڈال دیں۔ مجھے امید نہیں کہ مرمت کے بعد وہ ٹھیک ہو سکے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گرم ہونے لگی تو مصیبت بنی رہے گی۔"

"چنگا جی جیسے آپ کی مرضی۔" استاد نے کہا۔ "پھر آپ پانچ سو دے جائیں اور ابھی کیا ٹائم ہوا ہے..... تین۔ آپ آ جائیں مغرب کے وقت۔ یہ ڈینٹ شینٹ کا کیا ہوگا؟" اس نے گاڑی پر نگاہ ڈال کے افسوس سے سر ہلایا۔

"وہ ہم بعد میں کرائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پہلے گاڑی چلنے کے قابل تو ہو جائے۔" اور سو سو کے پانچ نوٹ استاد جی کی نذر کیے۔ استاد جی نے دیکھا کہ جتنے نوٹ ان کی جیب میں گئے ہیں ان سے کہیں زیادہ تو میری جیب میں موجود ہیں۔ ایک بار پھر انہوں نے ڈینٹنگ کا سارا کام بھی ختم کرا لینے کے فوائد پر روشنی ڈالنی چاہی اور یہ بھی کہا کہ ہمیں خصوصی رعایت دی جائے گی لیکن ہم چاہتے تھے کہ رنگ و روغن خود رضوی صاحب اپنی پسند سے کرائیں، جب چاہیں کرائیں اور جس سے چاہیں کرائیں۔ یہ دو چار گھنٹے کا نہیں، ہفتے دس دن کا کام تھا۔

تین بجے ہم نے شاہدرہ کے "ہائی کلاس ہوٹل" میں لنچ تناول فرمایا۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ تنور کی روٹیاں ٹھنڈی تھیں اور انہیں دانتوں سے پیس کر حلق میں اتارنا خاصا مشقت طلب کام تھا۔ بچا کھچا "قورمہ" چند ہڈیوں پر مشتمل تھا جن پر گوشت کے ذرات محسن نے دریافت کیے۔ دیگر اجزا میں سب سے اہم عنصر سرخ مرچوں کا تھا جو وافر مقدار میں ڈالی گئی تھیں اتنی کہ پہلا لقمہ کھانے کے بعد اشک آنکھوں سے بہنے لگے اور دھواں سے کانوں سے خارج ہونے لگا پھر میں اتنا محتاط ہو گیا کہ روٹی کو سالن سے رسماً چھوتا رہا اور اوپر سے پانی ڈالتا رہا۔

"شاید اسی کا نام قورمہ ہے بھائی محسن!" میں نے گلوگیر لہجے میں آنکھیں پونچھ کر کہا۔ "اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔"

"یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے۔" محسن نے ارشاد کیا اور باقی جگ خالی کر دیا۔ "اب اگر مجھے اجازت ہو تو میں جاؤں۔ کئی دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔ پہلے رخصتی کا ہنگامہ تھا اور کام کرنے والا میں اکیلا۔ پھر تیمارداری اور دونوں کا جذباتی دباؤ۔"

"مجھے افسوس ہے یار کہ میں پہلے نہیں آ سکا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب تو لے آنا گاڑی۔ تین گھنٹے گزارنے کے لیے جہانگیر کے مقبرے چلا جا یا وہ جو سامنے دوسرا مقبرہ سا نظر آ رہا ہے نا..... وہ ہے تھیٹر۔ اس میں فلم "تیکے والی" دیکھ اور عش عش کر۔ کیا غضب ڈھایا ہے مسرت نذیر نے بھی تانگہ چلا کے۔ گھوڑے کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے" اور ان مفید مشوروں کے بعد وہ ایک رکشا روک کے روانہ ہو گیا۔

میرا ارادہ فلم تیکے والی دیکھ کے مسرت نذیر پر فریفتہ ہونے کا ہرگز نہیں تھا چنانچہ میں نے بڑی نیک نیتی سے مقبرہ جہانگیر کا رخ کیا تھا۔ اور کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ بقول شاعر ــ جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے سامنے سے گزرا تو میری نیت بدل گئی اور میں نے سوچا کہ اتنے عرصے بعد چوہدری دلاور سے ملاقات کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ مقصد تو صرف وقت گزارنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ مجھے دیکھ کر دلاور کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں اطمینان سے اس کیبن تک گیا جو "ریسپشن" سے زیادہ چیک پوسٹ تھا۔ حسب توقع اندر وہی نوجوان شاید اسی مصنف کے تازہ ترین جاسوسی ناول میں غرق تھا۔ اگر وہ غور کرتا تو مجھے پہچان جاتا لیکن اس کے تصور میں منظر وہی رہا جہاں میں نے دخل اندازی کی تھی۔

"کیا کام ہے؟" اس نے کتاب رکھ کے کہا۔ "نام بتاؤ اپنا؟"

"نام ہے سائیں علی مراد بھائی۔ دروازے والا۔" میں نے کہا۔ "وڈے چوہدری صاحب نے بلایا تھا۔"

اس نے ایک پرچی پر "علی مراد" اور وقت ملاقات کے بعد چوہدری دلاور لکھا اور مجھے پکڑا دی۔ "واپسی میں دستخط کرا کے لانا۔" اس نے دوبارہ ناول اٹھا کے اسی صفحے سے مطالعہ شروع کیا۔ میں نے پرچی گیٹ پر موجود چوکیدار کو دکھائی۔ وہ میری صورت سے آشنائی اور نام سے ناآشنائی کے باعث تھوڑے سے تذبذب کا شکار ہوا۔ پھر اس نے طے کیا کہ پرچی ہو تو اسے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی۔ اسی نے مجھے اندر کر دیا۔ گیٹ پھر بند ہو گیا۔

میں نے پرچی کو گولی بنا کے اچھال دیا اور چوہدری دلاور کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی ایک مرحلہ اور بھی تھا۔ پہلے دروازے سے کمرے میں قدم رکھتے ہی دلاور کے پی اے سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی — میرا آنا مصیبت کے آنے سے کم نہیں تھا اور شاید دلاور نے اسے اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ میں کتنی خطرناک چیز ہوں اور کتنی گڑبڑ پھیلانے کا سبب بن چکا ہوں۔ چنانچہ وہ میری طرف لپکا۔ "سکندر صاحب! کیا بات ہے؟"

"کہاں کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر کوئی بات ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ تمہیں بتائی جائے۔"

"چوہدری صاحب کا حکم ہے..... میرا مطلب ہے وہ خفا ہوں گے مجھ پر۔" وہ نروس ہو گیا۔ "میری نوکری کا تو خیال کیجیے۔"

"تمہاری نوکری برقرار رہے گی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ ہم ترقی بھی دیں گے لیکن تم راہ میں حائل ہوئے تو ہم ایک جھانپڑ دیں گے اور تمہیں مالکوں سے یوں بات کرنے کا مزہ اس وقت آئے گا جب تم نقلی بتیسی لگا کے سوپ تناول فرماؤ گے۔"

مجھے اس کی مجبوری اور بے بسی پر ترس آیا۔ وہ ہاتھیوں کی جنگ میں پس جانے والے حشرات الارض سے زیادہ مظلوم تھا اور کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، سوائے اپنے۔ وہ مجھے نہ روکتا تو اچھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نوکری سے ہاتھ دھوتا اور روکتا تو اپنے دانتوں سے۔ میں اسے ہکا بکا اور پریشان حال چھوڑ کے دلاور کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ چوہدری دلاور گھومنے والی کرسی کی پشت کا سہارا لیے پیر اپنی میز پہ پھیلائے فارغ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکا اور اسی پوز میں بالکل بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا میں پہلے سے معترف تھا لیکن یہ اداکاری کا کمال نہیں تھا۔ اس نے یقیناً میری آواز سن لی تھی اور یہ طے کرچکا تھا کہ میری آمد پر حیرت، خوف یا پریشانی کا اظہار اس کو زیب نہیں دیتا۔

"کون ہے اپنے سکندر صاحب" میرے "السلام علیکم" کے جواب میں اس نے بڑے سکون کے ساتھ مسکرا کے کہا اور پاؤں میز پر سے ہٹا کے آہستہ آہستہ اٹھا "لو بھئی کمال ہوگیا۔ بڑی عمر ہے آپ کی۔ ابھی آپ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا میں" مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا۔

"انگریز کہتے ہیں کہ ادھر شیطان کو یاد کرو، ادھر وہ حاضر" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"یہی تو فرق ہے جی ان میں اور ہم میں" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیں۔ ہم سادہ دل لوگوں کے دل میں کبھی برائی کا خیال نہیں آتا۔ ہم کہتے ہیں عمر لمبی ہو۔ وہ کہتے ہیں شیطان آگیا۔ اسی سادگی سے فائدہ اٹھا کے تو وہ ہم پہ اتنا عرصہ حکومت کر گئے۔ آپ نے تو بہت کچھ سیکھا ہوگا ان سے"

"انسان نے تو شیطان سے بھی سبق سیکھا تھا" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "اور انگریز تو دفع ہوئے مگر حکومت اب آپ جیسے سادہ دل لوگوں کی ہے۔ ہمیں بھی جو کچھ سیکھنا ہے آپ ہی سے سیکھنا ہے۔ اور کچھ سکھانا ہے تو وہ بھی آپ ہی کو"

چوہدری دلاور کا چہرہ میری ذومعنی بات کے باوجود سپاٹ رہا "بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی آپ سے" وہ بولا۔

"آپ تو جانتے ہیں میں کتنا مصروف تھا اپنے چوہدری صاحب!" میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی "تعزیت تک کے لیے حاضر نہ ہوسکا" میں نے لائٹر کو جیب میں رکھنے سے پہلے پھونک مار کے اس کے شعلے کو بجھایا۔

"کیسی تعزیت؟" دلاور نے کہا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کی صورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے۔ میرا آخری جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اپنے فطری ردِ عمل کو نہ چھپا سکا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ میں کس کا حوالہ دے رہا ہوں "اچھا..... وہ....."

"جی۔ میں نے سنا تھا آپ کے گھر کی کسی خاتون کا انتقال ہو گیا تھا" میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہلا کی والدہ سے آپ کی قرابت داری تھی۔ وہ لڑکی تھی نا شہلا۔ اپنے ڈی سلوا صاحب کی سیکرٹری"

"مجھے معلوم ہوا ہے" دلاور نے مکھی مارنے والی جالی کو ... سے میز پہ مارا اور مقتول مکھی کی لاش نیچے پھینک دی۔

"پھر بڑا افسوس ہوا ڈی سلوا صاحب کا" میں نے ... جاری رکھی "سنا ہے بڑا خوفناک۔ بلکہ عبرتناک حادثہ تھا ... بھی سنا ہے کہ....."

"جو بھی آپ نے سنا ہے ٹھیک ہی سنا ہوگا۔ اپنے سکندر ..." وہ میری بات کاٹ کے بولا "اور ابھی بہت کچھ سنیں گے ہم ... آپ بھی۔ یہ بتائیں کیا پئیں گے؟ دیسی کہ ولائتی؟ میرا مطلب ہے ... کہ ٹھنڈا"

"چائے" میں نے کہا "اس میں زہر ہوتا ہے تھوڑا ... کیفین۔ وہی دے دیں اپنے ہاتھ سے"

دلاور ہنسا "آپ مذاق خوب کرتے ہیں جی" وہ بولا "بھلا ... پر زہر کیا اثر کرے گا؟ اور ہم کوئی دشمن ہیں آپ کے جو خدانخواستہ زہر دیں گے آپ کو اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے" اس نے ... کا بٹن دبا کے پی اے سے چائے کے لیے کہا۔

"ڈی سلوا کی جگہ کسی نئے مینجر کا تقرر کیا ہے آپ نے؟" ... نے کہا "یا ایسے ہی کام چل رہا ہے؟"

"کام ایسے ہی کیسے چل سکتا ہے۔ نیا بندہ رکھا ہے میں نے ایک" وہ بولا "لیکن ابھی عارضی ہے۔ اب یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اپنے سکندر صاحب کہ میں ہی فیصلے کرتا رہوں، آپ سے مشورہ کیے بغیر۔ مالک تو آپ بھی ہیں برابر کے۔ قانون یہ بات کل تسلیم کرے ... ہم آج کرتے ہیں"

دلاور کا رویہ اور خیالات کی یہ تبدیلی کسی نئی حکمتِ عملی ... تپا دیتی تھی۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ دلاور جیسے شخص کے ... کی سوچ کا یہ مثبت پہلو اس کی شخصیت میں رونما ہونے والے ... کا نتیجہ ہے۔ وہ مصالحت پہ آمادہ ہے یا اس نے حقیقت کو تسلیم ... ہے۔ شکاری نئی چال چل رہے تھے یا نیا جال بچھا رہے تھے ... عقل تقاضہ کرتی تھی کہ میں محتاط ہو جاؤں۔ پی اے نے ڈرتے ڈرتے ... چائے لاکر رکھی اور دلاور سے نظر ملائے بغیر لوٹ گیا۔

"کیا پرانے لوگوں میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اسے ... بنایا جائے۔ ان کو کام کا تجربہ تھا" میں نے کہا۔

"ایک ہی آدمی تھا کام کا جناب!" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا "مارا گیا بے چارا حادثے میں۔ کیا نام تھا اس کا..... ہاں غلام ... اکاؤنٹنٹ تھا اور آپ کے والد مرحوم کا خاص آدمی تھا"

"اور یہ نیا مینجر؟ یہ کس کے والد کا خاص آدمی ہے؟" ... نے کہا "تجربہ اور تعلیم کیا ہے اس کی؟"

دلاور کی قابلِ رشک خوبی یہ تھی کہ اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ وہ گالی کھا کے بھی مسکرا سکتا تھا اور مسکراتے ہوئے گالی دے سکتا تھا۔ اس کے دلی جذبات کا عکس اس کی صورت پر حسبِ منشا نمودار ہوتا تھا۔ اور اندر ہی اندر آتشِ غضب سے کھولنے کے باوجود وہ اظہارِ مسرت پر قادر تھا اور نفرت کے زہر کو دبا کے محبت کرنا جانتا تھا۔

"ڈی سلوا قابل آدمی تھا" اس نے اعتراف کیا "احمد نواز گردیزی..... میری مراد اس نئے مینجر سے ہے اس کے برابر تو نہیں ہے لیکن ہو جائے گا" اس نے ایک کپ چائے بنا کر میرے سامنے رکھی۔

"آپ کے زیرِ سایہ تربیت پا کے تو وہ ڈی سلوا ہی بنے گا" میں نے کہا "لیکن سوال یہ ہے چوہدری صاحب! کہ آپ کی جوہر شناس نظروں نے اس ہیرے کو کہاں سے اٹھا لیا۔ راہ چلتے کسی آدمی کا تقرر تو نہیں کیا ہوگا آپ نے؟ احمد نواز..... اور کیا؟..... گردیزی۔ تو یہ گردیزی صاحب کون ہیں، پہلے کیا کرتے تھے اور کہاں تھے؟"

"میں اتنے بہت سارے سوالات کا جواب کیا دوں سکندر صاحب!" دلاور نے کہا اور انٹرکام کا بٹن دبایا "ذرا احمد نواز سے کہو کہ سب کام چھوڑ کے آجائے اور یہ لڑکا جو ریسپشن پر بیٹھا ہے اسے کہو کہ اپنا رجسٹر لے کر آئے"

"یس سر!" پی اے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی حاضر ہو جاتا ہے گردیزی" دلاور نے کہا "آپ چائے پئیں۔ جو پوچھنا ہے اس سے آپ خود ہی دریافت فرمالیں"

"گویا آپ کو کچھ معلوم نہیں؟" میں نے کہا "یا آپ کا خیال ہے کہ میں یقین نہیں کروں گا؟ خیر۔ آنے دیں اسے"

"بات دراصل یہ ہے جنابِ عالی!" دلاور نے کسی طنز کے بغیر کہا "کہ یہ جو میرا پی اے ہے نا، اسی نے کوئی فون وغیرہ کیا تھا دفتر روزگار والوں کو اور ان کو سمجھا دیا تھا کہ ہمیں کیسا بندہ چاہیے۔ پہلے ہمارے پاس کون تھا اور ہم کرتے کیا ہیں۔ انہوں نے غلط آدمی تو نہیں بھیجا ہوگا۔ ایک سے ایک قابل بندہ ڈگریاں لے کر جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ اس منڈی میں دیسی ولایتی سب مال مل جاتا ہے"

ریسپشن کے ڈبے میں بیٹھ کے جاسوسی ناولوں کا کورس کرنے والا نوجوان رجسٹر لے کر نمودار ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر ناگواری اور حیرت کے آثار شکن بن کے نمودار ہوئے۔ دوسرے لمحے مجھے پہچانتے ہی اس پر چودہ طبق روشن ہوگئے اور اس پر یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ عملی زندگی میں اس کی جاسوسی دھری رہ گئی اور اتنا پڑھ کے بھی اس نے جھک ماری کہ غلط آدمی کو شناخت نہ کیا۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے رجسٹر دلاور کے سامنے رکھ دیا۔

دلاور نے دور ہی سے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی "یہ سائیں علی مراد کون آیا ہے مجھ سے ملنے۔ بلاؤ اسے"

"وہ..... یہ..... انہوں نے یہی کہا تھا" نوجوان نے میری طرف اشارہ کیا۔ اسے شاید میرا نام یاد نہیں آیا۔

دلاور نے اسے غور سے دیکھا "او میاں! یہ بتا کہ نشہ کون سا کرتا ہے تو؟ مالکوں کو نہیں پہچانتا ہے آج، کل باپ کو بھی نہیں پہچانے گا۔ کوئی اور ہوگا وہ۔ جا اسے دیکھ اور لے کر آ میرے پاس۔ کوئی ملنگ فقیر اندر فیکٹری میں گھس گیا اور تو کیا کرتا رہا؟ جاسوسی ناول پڑھتا رہ گیا؟" اس نے رجسٹر بند کرکے واپس کھسکایا۔ "اس چوکیدار کے ساتھ مل کے سائیں علی مراد کو لے آ فٹافٹ ورنہ پتر تم دونوں کی خیر نہیں۔ دیکھیں نا اپنے سکندر صاحب! نہ جانے کون (.....) سائیں بن کے اندر آگیا اور یہ (.....) دیکھتے رہے۔ وہ پاگل کا بچہ نقصان پہنچا دے مشینری کو؟ آگ لگا دے فیکٹری میں" اس نے تینوں افراد کے لیے ایک ہی اسمِ صفت استعمال کیا اور اسے بڑی مہارت سے جملے کے درمیان یوں فٹ کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اتنی بڑی گالی اس نوجوان مرد نے محض اس لیے چپ چاپ کھالی کہ اسے اور اس کی آمدنی پر انحصار کرنے والوں کو روٹی بھی کھانی تھی، تن بھی ڈھانپنا تھا اور زندہ رہنے کے اس سہارے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو قائم رکھنا تھا۔ اس نے بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں فریاد بھی تھی، احتجاج بھی تھا، ملامت بھی تھی اور اپنی بے بسی کا اقرار بھی تھا کہ ملاحظہ فرمائیے سکندر صاحب! کسی کی جان گئی اور آپ کی ہنسی ٹھہری۔ ہم غریبوں سے آپ کا یہ کیسا جان لیوا مذاق تھا کہ ہم بے آبرو بھی ہوئے اور بے روزگار بھی اور آپ اب بھی اقرار نہیں کر رہے ہیں کہ سائیں علی مراد بن کے آپ ہی آئے تھے۔

" چوہدری صاحب! قسم خدا کی، میں نے کوئی غلطی کی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔" وہ اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔" یہ سکندر صاحب ہیں نا یہ۔ اب مجھے ان کا نام یاد آ گیا ہے۔ انہوں نے اپنا نام سائیں علی مراد بھاٹی گیٹ والا ہی بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے بلایا ہے۔ میں ان کو پہچان نہیں سکا تھا۔ میری ماں کی آنکھوں کا آپریشن ہونا ہے۔ اس کے لیے میں تین ہزار روپے جمع کر رہا ہوں۔ آپ نوکری سے نکال دیں گے تو......"

" تو کیا ہو گا ؟" میں نے گرج کر کہا۔" اور جتنے لوگ دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں سب یہیں پر ملازم ہیں ؟ جسے یہاں سے نکال دیا گیا، کیا وہ فاقے کرتا سڑک پر ایڑیاں رگڑتا مر گیا ؟ شرم آنی چاہیے تمہیں جوان آدمی ہو۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ مسلمان ہو۔ اس کے باوجود اپنے رزق کو اپنے ہی جیسے انسان کے ہاتھ میں سمجھتے ہو ؟ یہاں سے نکال دیے گئے تو اور کچھ نہیں کر سکو گے ؟ ماں کی آنکھوں کی روشنی عزیز ہے تو اس کے لیے ریڑھی نہیں لگا سکتے ؟ گنڈیریاں نہیں بیچ سکتے ؟ ہاکر، پیشہ ور قلی نہیں بن سکتے ؟ محنت کرنی پڑتی ہے نا اور جاسوسی ناول پڑھنے کے لیے فراغت نہیں ملتی اس لیے تن آسانی کے عادی ہو گئے ہو۔ ہاتھ پیر چلائے بغیر ملتی ہے اس لیے گالیاں بھی قبول ہیں...."

نوجوان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا اور رونا بھول گیا۔

" جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا۔" آج معاف کیا تم کو بھی اور چوکیدار کو بھی لیکن یہ چوہدری صاحب کی مہربانی سمجھو کیونکہ برابر کے مالک کی حیثیت سے انہوں نے مجھے بھی فیصلے کرنے کا اختیار دیا ہے۔ میں دوبارہ بھی تمہارا تقرر کر سکتا ہوں مگر ابھی تو کسی نے برطرف بھی نہیں کیا ہے تم کو۔ ذاتی طور پر میں اتنے کم ہمت اور بے غیرت لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے دلاور کو دیکھا۔ وہ یقیناً اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہو گا مگر ظاہری طور پر بالکل پرسکون بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

" بس ایسے ہی دل لگی کی سوجھ گئی مجھے اپنے چوہدری صاحب!" میں نے بھی اس کی طرف مسکرا کے دیکھا۔" میں نے کہا ذرا آپ کو حیران کر دیں۔ بے چارے خواہ مخواہ پریشان ہوئے میرے مذاق سے۔ آپ کو اطلاع ملتی تو آپ بھی حیران ہوتے کہ یہ کون سائیں آ گیا۔"

" کمال کرتے ہیں جی آپ۔" وہ بولا۔" آپ جس نام سے چاہیں آئیں اور کسی بھی حلیے میں آئیں کیا ہم آپ کو نہیں پہچانیں گے ؟ کیا آپ نے وضاحت بھی کر دی۔ آئندہ مالکوں میں اور مالکوں کے لیے آنے والوں میں فرق کا خیال تو رکھیں گے۔ آنکھیں تو کھلی چاہییں نا جی۔ یہی بات بری لگی تھی مجھے کہ شاید یہ سوتے رہے، نہ جانے کون اندر گھس گیا۔ سو دوست ہوتے ہیں بند سے کے تو ..... اسی لیے ان کو کھڑا کیا ہے وہاں۔ اب آپ نے معاف کر دیا ہے تو ہم کیا کہیں۔ ویسے بھی میں ذرا دم خم دیکھ رہا تھا۔ سمجھ تو گیا تھا کہ سائیں جی آپ ہی ہیں۔"

" مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے چوہدری صاحب کہ آپ ..... آدمی کو پہچان جاتی ہے۔" میں نے کہا۔" اور حالات کو بہت جلد ..... ہے۔ کاروبار میں آپ جیسے پارٹنر کا ہونا میری خوش قسمتی ہے ..... ذرا ٹیڑھا آدمی تھا۔ خواہ مخواہ قانونی الجھنوں میں پڑتا تھا اور ..... کام کرتا تھا۔ اب یہ کتنی معقول بات ہے جو آپ نے ابھی کی تھی ..... تو مجھے کل مالک تسلیم کرے گا، آپ آج کر رہے ہیں۔ بے شک ہم ..... کے مالک ہیں لیکن تجربہ آپ کا زیادہ ہے۔ جو کام آپ نے کیے ہیں ..... کر سکتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتا۔ اس لیے آئندہ بھی آپ کی حیثیت ..... بڑے بھائی جیسی ہو گی۔ آپ کی رہنمائی کے بغیر شاید میں اس کاروبار ..... کو چلا ہی نہیں سکتا تھا جو آپ چلا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ..... کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں۔"

چوہدری دلاور نے محسوس کر لیا ہو گا کہ میری ہر بات کا دو ..... مطلب ہے چنانچہ جس کاروبار کا میں حوالہ دے رہا ہوں وہ عالم ..... انجینئرنگ کمپلیکس کی آڑ میں چلنے والا کاروبار ہے۔ وہ کاروبار بھی ..... کی بنیاد وزیر خان مرحوم نے رکھی تھی۔ دلاور نے میری مالکانہ حیثیت ..... تسلیم کر کے کوئی چال چلی تھی۔ تو اس کو بڑے بھائی کی جگہ قرار دے کر ..... میں نے بھی ظاہر کر دیا تھا کہ میٹھی چھری سے حلال کرنا مجھے بھی ..... ہے اور حقیقت اب بھی وہی ہے کہ ہم پارٹنر نہیں ایک دوسرے کے ..... حریف ہیں۔ دشمن ہیں یا وہ ہی شکاری ہیں جو اس زندگی کی بازی میں ..... اپنی چال سے ایک دوسرے کی شکست کے سوا کچھ نہیں چاہتے ..... اس کاروبار میں مجھے برابر کا شریک کر رہا ہے تو صرف زبان سے یا ..... کی کسی مجبوری کے باعث اور میں اسے قابل اعتماد سمجھ رہا ہوں تو صرف ..... اس لیے کہ مجھے سچائی کا پتا چلانا ہے۔ اس ایک سچائی کے پردے ..... بہت سے پیچ ہیں۔

" غلط فہمی سے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔" دلاور نے ..... ایک ایک لفظ کو سوچ کر ادا کیا۔" لیکن ہر غلط فہمی کبھی نہ کبھی دور ہو جاتی ہے اپنے سکندر صاحب! ساری بات وقت کی ہے۔ شاید وہ کچھ اور .....

کہتا لیکن اسی وقت پھر اس کے پی اے نے مداخلت کی اور یہ اطلاع دی کہ گردیزی صاحب آ گئے ہیں۔ دلاور نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔" کیا خیال ہے ؟ بلا لیں اس کو بھی ؟"

" اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے ؟" میں نے کہا۔" آپ نے اسے بیڈن روڈ سے یہاں تک دوڑایا ہے تو کیا صرف باہر بٹھانے کے لیے ؟"

ایک منٹ بعد احمد نواز گردیزی نے اندر قدم رکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری دلاور کا یہ ڈراما بھی کتنا کامیاب رہا ہے۔ اس سے قبل کئی بار صورت حال کو انتہائی پراسرار اور ڈرامائی انداز میں پیش کر کے وہ اپنی صلاحیت تسلیم کرا چکا تھا اور اس فن میں طاق تھا۔ وہ ذہن کو شاک دینے کے لیے ایسے ہی تیار کرتا تھا جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے بکرے کو چھری نہیں دکھاتا بلکہ پانی پلا کے تازہ دم کرتا ہے۔ احمد نواز گردیزی پر نگاہ پڑتے ہی میں حیرت اور صدمے سے مفلوج ہو گیا اور اس طرح بیٹھا رہا جس طرح میرے آنے پر دلاور بیٹھا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے اداکاری کی تھی اور میرا ردعمل بالکل فطری تھا۔ کیونکہ نئے مینجر گردیزی کے روپ میں میرے سامنے استاد پیڈرو مسکرا رہا تھا۔ بے شک اس کا ظاہری حلیہ بدلا ہوا تھا۔ وہ بہترین سوٹ میں تھا اور اس کے ہاتھ میں خاصا قیمتی بریف کیس تھا۔ اس کے گھنگھریالے بالوں جیسے بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور کانوں میں پیتل کی وہ مندریاں بھی نہیں تھیں جو ہر جگہ اس کی شناخت کی سب سے بڑی اور نمایاں نشانی بن جاتی تھیں لیکن دونوں کانوں میں وہ سوراخ صاف نظر آ رہے تھے جو برسوں مندریاں پہننے سے ہو گئے تھے۔ اس کا باقی ناک نقشہ اور رنگ روپ وہی تھا۔ اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ اپنا چہرہ بھی بدلے۔ چنانچہ میری نظریں استاد پیڈرو کا روپ دیکھ رہی تھیں۔ سب سے پہلے وہ مجھے ایک ٹیکسی ڈرائیور بن کے ملا تھا۔ اور برطانیہ سے پاکستان پہنچنے کے بعد ایک ہی دن میں اس سے میری دوبارہ ملاقات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ دوسری بار وہ تعاقب کرتا ہوا میرے ساتھ ساتھ میر شرافت علی کی کوٹھی تک گیا تھا اور اسے قتل کر کے الزام میرے سر تھوپنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملا استاد پیڈرو بن کے ہی ملا لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا عارضی بہروپ میں نے زرداد کے روپ میں دیکھا تھا۔ جو اب منوں مٹی تلے دنیا کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ احمد نواز گردیزی اس کا تیسرا روپ تھا۔ شاید دلاور نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ استاد پیڈرو کا اصل روپ اب خطرناک ہو گیا ہے اور اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔ پیڈرو نے حق نمک ادا کر دیا تھا اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا تھا چنانچہ وہ اس انعام کا مستحق تھا کہ اس کا درجہ بڑھا دیا جائے۔ ڈی سلوا کے خلا کو اس سے بہتر طور پر کون پُر کر سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی صلاحیت یہی تھی کہ وہ جاں نثار تھا، رازدار تھا اور وفادار تھا اور دلاور کے لیے ڈی سلوا کے بعد دست راست بننے کا اہل تھا۔

" خیریت تو ہے اپنے سکندر صاحب ؟" چوہدری دلاور نے خوشدلی سے کہا۔" آپ کی طبیعت کچھ خراب لگتی ہے مجھے۔"

" نہیں ۔۔۔ وہ دراصل میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔" میں نے چونک کر کہا اور مسکرایا۔

" آپ تو بالکل ہی جام ہو گئے تھے۔" چوہدری دلاور نے کہا۔" بھئی یہ ہمارے نئے جنرل مینجر ہیں جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

احمد نواز گردیزی نے شاید پہلے بھی مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ وہ اب دوسری کرسی پر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ بیٹھا تھا۔ دلاور نے میرا نام بتانے کے بعد یہ بھی کہا کہ گردیزی صاحب! میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ اس کاروبار کے دوسرے مالک سکندر بخت صاحب بھی ہیں اور آج یہ اتفاق سے آ گئے تو مناسب سمجھا کہ آپ کا تعارف کرا دوں۔"

گردیزی نے ایک بار پھر رسمی آداب و اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور اپنا ہاتھ تھوڑا سا آگے بڑھایا لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے لائٹر کو بڑی صفائی سے چھوڑ دیا اور پھر اسے اٹھانے کے لیے جھکا۔ گردیزی کو دوبارہ شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ میں نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔

" گردیزی صاحب!" میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔" آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی لگتی ہے۔ کیا ہماری ملاقات پہلے کبھی ہوئی ہے ؟"

" مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" گردیزی نے کہا اور میں نے اس کی آواز بھی پہچان لی۔

" لیکن مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لیے تھوڑا سا وقفہ دیا۔ گردیزی بن جانے کے باوجود پیڈرو وہی شخص تھا جو ایک معمولی بدمعاش تھا اور جرائم کی دنیا میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد استاد کے منصب پر فائز ہو گیا تھا لیکن وہ دلاور کی طرح منجھا ہوا اداکار نہیں تھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور اس نے دلاور کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا۔ میری نظر دونوں پر تھی، اس لیے میں نے دلاور کی وہ نگاہ بھی دیکھ لی جس میں پیڈرو کے لیے واضح پیغام تھا کہ ہمت سے کام لو ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جنرل مینجر کے عہدے سے ہٹا کر پھر استاد پیڈرو بنا دیا جائے۔

" آپ کو یاد ہے تو بتا دیجیے کہ ہم کب اور کہاں ملے تھے ؟" گردیزی نے خود کو سنبھال کے کہا۔

" میں نے یہ نہیں کہا مسٹر گردیزی!" میں نے معنی خیز مسکراہٹ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے ساتھ جواب دیا۔" مجھے کچھ یاد آ رہا تھا، دراصل اس شہر میں بالکل آپ جیسی شکل وصورت کا ایک بدمعاش تھا۔"

"بعض اوقات شریفوں کی اور بدمعاشوں کی صورتوں کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

"یہی میں بھی عرض کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ پہلے تو ایسے ہی غنڈہ گردی کرتا تھا اور صرف پیڈرو تھا۔ بعد میں اپنا گروہ بنا کے استاد ہو گیا پھر کسی اسمگلر کا ساتھی رہا اور بالآخر پولیس سے مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کافی پرانی بات ہے جو آج مسٹر گردیزی کو دیکھ کر یاد آ گئی۔ میرا مطلب ہے ان کی صورت دیکھ کر۔" براہِ راست کوئی الزام لگائے بغیر میں نے واضح کر دیا تھا کہ میں گردیزی کی اصلیت کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں جتنی اچھی طرح پیڈرو کی اصلیت کو جانتا تھا اور میری معلومات کس حد تک درست ہیں۔

دلاور مطمئن بیٹھا رہا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ یہ تماشا پہلی بار خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے بعد اگلا قدم اٹھائے۔ اگر میں اچانک میروزیر اینڈ کمپنی کے آفس جا پہنچتا اور وڈی سلوا کی جگہ پیڈرو کو دیکھتا تو دلاور کو ہم دونوں کے ردِ عمل کا پتا نہ چلتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں وہاں سے گردیزی کو جوتے مار کے نکال دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پیڈرو کو گردیزی کا کردار نبھانے میں ناکامی ہوتی تو وہ مشتعل ہو کے اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق مجھ پر خنجر یا ریوالور نکال لیتا۔ یہاں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دونوں کردار اس کے سامنے تھے اور اس کے کنٹرول میں تھے۔ میری پوزیشن کو اس نے پیڈرو سے بہتر رکھا تھا کیونکہ اسے مجھ پر زیادہ اعتماد تھا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو کے کوئی ہنگامہ کرنے سے گریز کروں۔ بالفرضِ محال میں یہ حماقت کرتا تو وہ گردیزی کو رخصت کر دیتا اور کسی دشواری کے بغیر میرے جذبات کو اپنی باتوں سے ٹھنڈا کر دیتا۔ غلطی اگر پیڈرو کرتا تو دلاور اسے کوئی رعایت نہ دیتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ سکندر صاحب اگر یہ شخص آپ کے خیال میں جنرل منیجر بننے کے قابل نہیں تو اس کی چھٹی کر دیتے ہیں اور بعد میں پیڈرو پر واضح کر دیتا کہ وہ خود کو جنرل منیجر احمد نواز گردیزی کی اہلیت کے معیار کا مستحق ثابت نہیں کر سکا چنانچہ اسے اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس لوٹ کے استاد پیڈرو ہی رہنا ہوگا۔ میرے اچانک آ جانے سے اس کو موقع مل گیا کہ وہ پیڈرو کو آزما سکے اور یہ دیکھ سکے کہ وہ گردیزی کے کردار میں کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔ یہ بات تو یقیناً پیڈرو بھی سمجھتا ہوگا کہ ایک نہ ایک دن اس کا اور میرا سامنا ہوگا لیکن وہ اس غیر متوقع آزمائش کے لیے تیار نہ تھا۔

"مجھے چوہدری صاحب نے بتایا ہے کہ جو کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے اس میں تو آپ کو خاصا تجربہ ہے اور آپ اس کام کی نوعیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں جو چوہدری صاحب کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا کہ آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے۔ آپ پہلے کہاں تھے اور اس فیلڈ میں آپ کے تجربے کی مدت کیا ہوگا؟ ظاہر ہے چوہدری صاحب نے آپ کا تقرر کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔"

"تو بھئی بلایئے گردیزی صاحب!" دلاور نے مسکرا کے کہا۔ "سکندر صاحب نے آپ کی نوکری پکّی کر دی۔"

"اگر میں ان کو مطمئن کر سکا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" گردیزی نے اچانک انگریزی میں کہا۔ اس کے لہجے کی روانی نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ یقیناً تعلیم یافتہ تھا اور یہ میرے لیے بہت افسوسناک انکشاف تھا۔ نہیں وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے باوجود ایک شخص کو غلط راستوں پر ڈال دیا جہاں اس نے اپنی ہمت اور ذہانت کا استعمال کیا۔ دنیا ایسے افراد سے بھری پڑی ہے جو حالات کو اپنی منفی سوچ کے انداز کا جواز فراہم کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا سے اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہے ہیں یا نفرت کے اس جذبے کا شکار ہیں جو انہیں ساری دنیا نے دی۔ سب کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ مجرم بنانے والی یہ دنیا ہے ورنہ ماں کے پیٹ سے تو کوئی بھی مجرم پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سارا قصور انسان کی فطرت کا ہے۔ اس کی سرشت میں شامل بدی کے عنصر کا ہے۔ برائی بہت جلد اور آسانی سے مغلوب کر لیتی ہے تو یہ انسان کے اپنے کردار میں خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کے فقدان کے سبب ہوتا ہے۔ پیڈرو کے پاس بھی کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی جو اب نئی نہیں رہی۔

"مسٹر گردیزی! آفس کا کام تو آپ نے یقیناً اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا؟" میں نے کہا اور بات انگریزی میں کی۔

"میرے تقرر کو ابھی صرف تین دن ہوئے ہیں مسٹر سکندر۔" گردیزی نے اسی روانی سے انگریزی کا جواب انگریزی میں دیا۔ "پھر بھی میں نے دفتر کے نظام کو کافی حد تک سمجھ لیا ہے۔ لوگوں سے مل چکا ہوں اور کمپنی کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے حالات کیا تھے اور اب کیا ہیں؟"

"گویا آپ ابھی فائلوں کی کاغذی دنیا میں گھوم رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "فیکٹری دیکھی آپ نے؟ یہاں کیا بنتا ہے، کیسے بنتا ہے، کتنا بنتا ہے اور کیسا جاتا ہے؟ پروڈکشن کی سائیڈ کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔"

"یس سر!" گردیزی نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "یہ میں دیکھ چکا ہوں۔"

اسی غلط جواب نے صورتحال کو یک لخت بدل دیا۔ میں کھڑا ہوا۔ "ویری گڈ مسٹر گردیزی!" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل برطانیہ سے آنے کے بعد میں بہت سے مسائل میں الجھ گیا تھا۔ ممکن ہے چوہدری صاحب نے ان کا ذکر کیا ہو۔ نہیں کیا تو تفصیل سے بعد میں سمجھا دوں گا۔ لیکن ان ہی مسائل کی وجہ سے مجھے فیکٹری کو دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت آپ بھی موجود ہیں تو چلیے میرے ساتھ۔"

"لیکن اب تو کوئی وقت نہیں رہا اپنے سکندر صاحب!" دلاور نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا اور اپنے ظاہری اطمینان میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

"چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔" گردیزی نے اس کی تائید کی۔ "اس معاملے کو کل پر اٹھا رکھیے سر!"

"آج کا کام کبھی کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے متانت سے کہا۔ "کل کا کوئی اعتبار نہیں اور ویسے بھی کاروباری دنیا میں یہی اصول کامیابی کی ضمانت ہے ورنہ دوسرے آگے نکل جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ تو نہیں لگے گا؟ ابھی پانچ بجے میں بلکہ پانچ منٹ باقی ہیں پانچ بجنے میں، آپ مزدوروں کو جانے دیں۔ ہر سیکشن کے فورمین کو ایک گھنٹے کے لیے روک لیں اور انہیں کل ایک دن کے اوور ٹائم کی ادائیگی کر دیں۔ کل کتنے سیکشن ہیں جن کا تعلق ہماری پروڈکشن لائن سے ہے؟"

"سیکشن تو سات ہیں۔" دلاور نے بے خیالی میں کہا۔ وہ گردیزی کو غلط جواب دینے کی پریشانی سے بچا رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ میری بات نے اس کے لیے کوئی الجھن کھڑی کر دی تھی۔ پریشانی کے آثار گردیزی کے چہرے سے بھی عیاں تھے اور وہ دلاور کی طرف سوالیہ مگر پُرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سوچنے کی اور دیر کرنے کی کیا ضرورت ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ نے میرے احکامات نہیں سنے؟ دو منٹ میں چھٹی ہو جائے گی تو سب لوگ نکل جائیں گے۔ جائیے اور چوکیدار کو بتا دیجیے۔"

میرے سخت لہجے نے گردیزی کو کمرے سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ دلاور ابھی تک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بظاہر اس مشکل سے نکلنے کی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"آپ ساتھ چلیں گے چوہدری صاحب؟" میں نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یا گھر جائیں گے؟"

"میرا خیال ہے میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔" دلاور نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی بخیریت واپسی تک آفس میں انتظار کروں گا اپنے سکندر صاحب!" وہ یقیناً کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا اور اب میں اس کے لہجے میں محسوس ہونے والی دھمکی کو اپنا وہم سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کے وجود سے خبردار کرنے لگی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ میں آپ کی واپسی تک انتظار کروں گا تو بخیریت واپسی کا حوالہ بہت سوچ سمجھ کے اور مجھے یہ سمجھانے کے لیے دیا تھا کہ ہو سکتا ہے میری واپسی نہ ہو یا ہو تو خیریت کے ساتھ نہ ہو لیکن اب قدم آگے بڑھانے کے بعد پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ یہ بات تو میرے ذہن میں بہت پہلے سے تھی کہ ایک نہ ایک دن مجھے فیکٹری کو اندر سے دیکھنا ہے کیونکہ گھپلا اگر کہیں ہو سکتا تھا تو صرف فیکٹری میں۔ آفس میں اس کی گنجائش نہیں تھی لیکن میرا اس وقت کا فیصلہ فوری تھا اور میں نے بہت عجلت سے کام لیتے ہوئے کر لیا تھا۔ اس فیصلے کی محرک یہ خواہش بھی تھی کہ میں احمد نواز گردیزی کی شخصیت میں چھپے ہوئے پیڈرو کو بے نقاب کر دوں۔ اس کی دیدہ دلیری میرے لیے ایک کھلا چیلنج بن گئی تھی اور دلاور نے مجھے یہ چیلنج دینے کے بعد مجھ پر خندہ زن تھا کہ سکندر اعظم! تم بھی تو بہت بڑا شکاری ہونے کا دعویٰ رکھتے ہو اور تمہیں اپنی عقل و ذہانت پر بھی بہت ناز ہے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس فراڈ کو فراڈ ثابت کرنے کے لیے تم کیا کرتے ہو۔ میں نے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا دیا ہے۔ تم میں ہمت ہے تو اسے پھر استاد پیڈرو بنا کے دکھاؤ اور میں نے غیر شعوری طور پر اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا کہ یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ جب پیڈرو نے گردیزی بن کے مجھ سے انگریزی میں بات کی تھی تو ذہنی طور پر مجھے تسلیم کرنا پڑا تھا کہ یہ ایک کامیاب چال تھی اور ایک طرح سے انہیں مجھ پر نفسیاتی برتری حاصل ہو گئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بدمعاش کہلانے والا پیڈرو میری ہی فیکٹری میں جنرل منیجر بن کے بیٹھ جائے گا اور اپنی تعلیم، انتظامی صلاحیت اور تجربے کی بنا پر وہ خود کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس بات نے مجھے مشتعل کر دیا تھا کیونکہ یہ کھلی دھاندلی تھی۔

سوا پانچ بجے تک فیکٹری کے کارکن اور مزدور گیٹ سے جا چکے تھے۔ چوکیدار نے بڑے گیٹ میں فٹ ہونے والا چھوٹا دروازہ کھولا تھا جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ دروازے کے باہر چوکیدار ان کے کپڑوں کو ٹٹول کر جامہ تلاشی کی رسمی کارروائی پوری کرتا تھا۔ ان کے بیگ اور ٹفن کیریئر کھول کے دیکھتا تھا۔ وہ سب اسی طریقۂ کار کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ جو سلوک میرے نقطۂ نظر سے ذلت آمیز تھا وہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ ہر فیکٹری یا کارخانے میں چوری سے ہونے والے نقصانات کو روکنے کا یہی دستور تھا ورنہ نیچے سے اوپر تک جس کو موقع ملتا تھا وہ کوئی نہ کوئی چیز چھپا کے نکالنے کی کوشش کرتا تھا خواہ وہ ایک پنسل ہو، کسی مشین کا کوئی پرزہ، کوئی اوزار یا مشین پر بنی ہوئی کوئی ایسی چیز جسے بازار میں فروخت کرنے سے چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں۔ مزدوروں کی قطار میری اور گردیزی کی موجودگی کے خیال سے محتاط تھی یا مرعوب تھی چنانچہ وہ ہر روز کی طرح چھٹی کی خوشی میں ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے ہوئے نہیں جا رہے تھے بلکہ کچھ سہمے سہمے دکھائی دیتے تھے۔ ایسا ہے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے جانتے تھے یا نہیں لیکن گردیزی کا نام عہدہ اور چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا کیونکہ بیشتر لوگ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مینیجر صاحب کہہ کے سلام کرتے تھے۔ کیا ان لوگوں نے پیڈرو کو کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے سوچا پھر یہ لوگ اس کی ظاہری حالت کے انقلاب پر حیران کیوں نہیں ہیں۔ کیا انہوں نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ جو شخص پہلے چوہدری صاحب کا خاص آدمی تھا اس نے اب ڈی سلوا صاحب کی جگہ لے لی ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔

گیٹ بند ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اندر میرے اور گردیزی کے علاوہ صرف چھ آدمی رہ گئے ہیں۔ یہ چھ آدمی ایک جیسے دراز قد اور صحت مند تھے۔ مجھے وہ حلیے سے ذرا بھی فورمین قسم کے لوگ نہیں لگے۔ نہ ان کے ہاتھ مشینوں پر کام کرنے سے گندے ہوئے تھے اور نہ ان کے لباس پر داغ آیا تھا۔ ان میں سے چار نے ڈینم کی پرانی پتلونیں اور چُست قسم کے آدھے بازوؤں والی جرسیاں پہن رکھی تھیں تاکہ وہ اپنے بازوؤں کی قوت کی پوری نمائش کر سکیں۔ باقی دو کا لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جو چیز مشترک تھی وہ ان کے جارحانہ تیور اور خطرناک انداز تھے۔ وہ سب کسی رجمنٹ کی طرح ایک قطار میں ہاتھ سینوں پر باندھے پیر پھیلائے کھڑے تھے اور مجھے گھور رہے تھے۔ یہ خود کو بدمعاش ظاہر کرنے کا گھٹیا فلمی انداز تھا۔ اگر وہ فورمین ہوتے تو صرف ایک گھنٹہ رُکے جانے پر مالکوں کی موجودگی میں یہ اشتعال انگیز رویّہ اختیار نہ کرتے اور اس بات پر تو یقیناً شکر گزار ہوتے کہ انہیں مفت کی بے گار میں نہیں پکڑا گیا بلکہ ایک گھنٹے کا اور شاید ایک پورے دن کے معاوضے کے برابر دیا جا رہا ہے لیکن وہ پیڈرو جیسے لوگ تھے۔ پیڈرو اگر جنرل مینیجر کا عہدہ سنبھال سکتا تھا تو وہ بھی ایک سیکشن کو یقیناً کنٹرول کر سکتے تھے۔ وہ مشینوں پر محنت کر کے صلاحیت کی بنا پر فورمین نہیں بنے تھے بلکہ مزدوروں پر مسلط کر دیے گئے تھے۔ ان کے انتخاب میں بھی اس بات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہوگا کہ مشینوں سے زیادہ وہ گڑبڑ کرنے والوں کو کنٹرول کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ یہی کام میں اس طرح بھی کر سکتا تھا کہ میرے لیے اپنی حفاظت کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ میں محسن کے ساتھ کسی بھی دن ایسے وقت میں آ سکتا تھا جب کام جاری ہو یا رضوی صاحب کی مدد سے باڈی گارڈ ساتھ لے کر آ سکتا تھا لیکن اس وقت میں اکیلا تھا خالی ہاتھ تھا اور محصور تھا۔

باہر ابھی شام کے سائے پھیلنے شروع ہوئے تھے مگر اندر اندھیرا دن کے اجالے پر غالب آنے لگا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک اتنی دور تھی اور سڑک پر ٹریفک کا شور اتنا زیادہ تھا کہ یہاں کوئی مجھ پر گولی بھی چلاتا تو فائر کی آواز پر کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ سب لوگ جو میری مدد کر سکتے تھے اس بات سے بے خبر تھے کہ کارِ خیر کراتے کراتے شامتِ اعمال کے باعث میں کہاں آ کے مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ محسن نے تو مجھے سیدھا سا بے ضرر نسخہ یہ بتایا تھا کہ وقت گزارنے کے لیے میں فلم دیکھوں یا جہانگیر کے مقبرے پر چلا جاؤں۔ اگر اسے شک بھی ہو جاتا کہ میں اس کے جاتے ہی چوہدری دلاور کے ہاں پہنچ جاؤں گا تو شاید وہ مجھے چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔ اب میں واپس نہ پہنچا تو وہ لوگ موٹر ورکشاپ جائیں گے۔ میں وہاں نہیں ملوں گا تو انتظار کریں گے اور اگر تلاش بھی کریں گے تو ان مقامات پر جہاں میری موجودگی کا کوئی سراغ مل سکے۔ فیکٹری کی طرف کوئی نہیں آئے گا جس کے گیٹ بند ہوں گے اور بام و در تاریک۔ چوکیدار کے سوا انہیں کون ملے گا اور چوکیدار کیا بتائے گا کہ اندر کیا ہوا۔ شاید وہ کچھ بتائے گا ہی نہیں۔

لیکن اب اپنے خوف کو ظاہر کرنا دشمن کا حوصلہ بڑھانے کے مترادف تھا چنانچہ میں نے اپنے انداز کے اعتماد میں کمی نہیں آنے دی۔ "مسٹر گردیزی! میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ سیکشن سات ہیں اور یہ بات مسٹر دلاور نے آپ کی موجودگی میں کہی تھی۔ پھر یہاں چھ شکلیں کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟"

"ساتواں آدمی اگر نہیں رُکا تو میں کیا کر سکتا ہوں؟" گردیزی نے کہا۔

"اس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا کنٹرول مؤثر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لوگ تمہارے حکم کی پروا نہیں کرتے اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ مسٹر گردیزی! تم پوری فیکٹری کو اور آفس کو کیسے کنٹرول کرو گے۔ اس ساتویں آدمی کو ڈسمس کرو اور کل ٹھیک بارہ بجے اسے اپنے آفس بلا کے اس کا حساب کر دو۔ اگر اسے کچھ کہنا ہوگا تو مجھ سے کہہ دے گا۔" پھر میں نے اپنا بریف کیس اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ چوکیدار کے پاس رکھوا دو بلکہ اسے یہاں بلا لو۔ میں خود بات کروں گا۔"

گردیزی نے بُرا سا منہ بنایا لیکن چوکیدار کو بلانے چلا گیا۔ چوکیدار کو شاید معلوم ہو چکا تھا کہ آج میں نہ بچا تو وہ نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس نے اندر آ کے مجھے سلام کیا اور با ادب کھڑا ہو گیا۔ "کیا حکم ہے صاحب؟"

"دیکھو چوکیدار!" میں نے کہا۔ "ابھی میرے ایک دوست آنے والے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بند دیکھ کر وہ لوٹ جائیں۔۔۔ یہ بریف کیس ان کو دینا ہے اور یاد رکھنا کہ ان کا نام محسن ہوگا۔" میں نے بریف کیس اسے تھما دیا۔

"میں یاد رکھوں گا جناب!" چوکیدار نے مجھ سے بریف کیس لے لیا اور چلا گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں انہیں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر محسن کو بھی ہے اور وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں اب خالی ہاتھ بھی تھا اور پوری طرح تیار بھی تھا کہ ضرورت پڑی تو خالی ہاتھ لڑنے کی جتنی تربیت میں نے حاصل کی تھی وہ اپنی جان بچانے کے لیے صرف کر دوں گا۔ عملی زندگی میں اس کے بھرپور مظاہرے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی لیکن آج صورت حال مختلف تھی کیونکہ میرے مقابل سات آدمی تھے جو کسی طرح بھی مجھ سے کم نہ تھے۔ کم سے کم ان کی ظاہری صحت مجھ سے بہتر تھی۔ اندیشے کی بات تھی تو صرف یہ کہ وہ مسلح نہ ہوں ورنہ جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو وہی غالب رہتا ہے اور اس کے سامنے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ لینے والے چھ حریف ہوں تب بھی اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

"مسٹر گردیزی! میں کسی جلوس کی قیادت نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "پہلے صرف ایک سیکشن کا فورمین آئے گا جب وہ فارغ ہوگا تو دوسرے کو بھیج دے گا۔ کیا تم نے ان سب کو بتا دیا ہے کہ میں کون ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کو پہلے سے جانتے ہیں۔" گردیزی نے کہا۔ "ورنہ اب جان لیں گے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے تمہارا خیال نہیں پوچھا تھا۔" میں نے غرا کے کہا۔ "ایک سوال پوچھا تھا جس کا جواب ہاں یا نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ باہر تم مجھ سے برابر کے دوستوں کی طرح مل سکتے ہو لیکن یہاں میں باس ہوں اس لیے بات کرتے وقت یا جواب دیتے ہوئے سر کہنا مت بھولو۔ یہ بات تم سب لوگ بھی نوٹ کر لو۔" میں نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کے کہا جو میری اکڑفوں سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے کے علاوہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ میرے اشارے پر پہلا آدمی آگے آیا۔ اس کے چیونگ گم چبانے کا انداز خالص ویسٹرن ولن کا تھا۔

"تمہارا کون سا سیکشن ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس سیکشن میں کب سے ہو اور نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا نام غفور ہے۔۔۔۔۔ سر!" اس نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا اور آخری لفظ یوں ادا کیا جیسے وہ مجھے باس سمجھ کے میری عزت کرنے کے بجائے میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ "میں فونڈری میں ہوں۔ چھ مہینے سے۔"

"اور چھ مہینے پہلے کہاں تھے؟" میں نے کہا۔ "کسی اور سیکشن میں؟"

"یہ آپ چوہدری صاحب سے پوچھ سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ بتائیں گے آپ کو۔"

"شٹ اپ۔ جو بات تم سے پوچھی گئی ہے اس کا جواب تم دو گے۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کوئی چوہدری نہیں دے گا۔ سمجھے!"

"دیکھو سکندر صاحب! ہم سے چوہدری صاحب نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "اور ہم بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ اپن سے سیدھا بولو۔ ہاں۔"

"چوہدری صاحب اگر تمہاری بدتمیزی برداشت کرتے رہے ہیں یا انہوں نے تم کو ڈھیل دے رکھی تھی تو سمجھ لو کہ میں بالکل مختلف قسم کا آدمی ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "برطرف تو میں بعد میں کروں گا لیکن کسی نے گستاخانہ لہجے میں بات کی تو اس بدتمیزی کی سزا پہلے خود دوں گا۔ بڑے بدمعاش کارخانوں میں فورمین نہیں ہوتے لیکن کسی کو خوش فہمی ہو تو میں دور کر سکتا ہوں۔ اب بتاؤ کہ چھ مہینے پہلے تم کیا کرتے تھے؟ یہ جنگلی مت کرو میرے سامنے۔"

"چھ مہینے پہلے میں روڈ انسپکٹر تھا۔ گھاس کھودتا تھا۔" اس نے زمین پر تھوک کر کہا اور اس کے ساتھی بہت محظوظ ہوئے۔ ان میں سے دو نے ہنسنے کی کوشش بھی کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیکھ سکتے میں نے بڑی پھرتی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا تو میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ میں نے ایک ہتھیلی سے اس کے بازو پر ضرب لگائی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز اس کی چیخ سے پہلے آئی۔ دوسرا ہاتھ اتنی دیر میں کان کے قریب پڑ چکا تھا۔ مشکل سے پانچ سیکنڈ میں وہ زمین پر گر کے بے حس و حرکت ہو گیا۔ گردیزی سمیت باقی چھ افراد اس غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ذرا سی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا اور سب کی نظریں زمین پر پڑے ہوئے شخص پر مرتکز ہو گئیں لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوئے۔ ان کا غصّہ بھڑک اٹھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" گردیزی برہم ہو کے بولا۔ "یہ تو پولیس کیس بنے گا تم پر۔"

میں نے گردیزی کے کوٹ کا کالر تھام لیا۔ "یہ آخری موقع ہے مسٹر گردیزی! دوبارہ اس لہجے میں بات کی تو اس کے ساتھ تمہیں بھی پارسل کرنا پڑے گا۔ زبان اور دماغ کو قابو میں رکھو۔ تم کی جگہ آپ

ایک تجسس پرست نوجوان کی داستانِ حیات جسے کیمیاگری کا جنون تھا اور اس راہ میں اسے قدم قدم پر ایک سنسنی خیز دنیا نظر آئی۔ اس کا جنونِ کیمیاگری کبھی اسے نیپال کی بھول بھلیوں میں لے گیا تو کبھی ہمالیہ کی وادیوں میں۔ اس سنسنی خیز مسافرت میں ایک روز پارس پتھر اس کے ہاتھ لگ گیا تو ایک دنیا اس کے پیچھے پڑ گئی۔ موت کے فرشتے لمحہ بہ لمحہ اس کے تعاقب میں رہتے۔ کبھی وہ ہندوستان میں چھپتا رہا اور کبھی سرزمینِ عرب پر پناہ تلاش کرتا رہا۔ بالآخر اسرائیل میں جا پھنسا۔ اسرائیل نے اسے اپنا ایجنٹ بنانا چاہا کیونکہ وہ ان کا آلۂ کار بن گیا ہے اسے صرف طاقت کے معرکے ہی درپیش نہیں تھے، قدم قدم پر اس کی ذہانت و فطانت کو بھی ایک آزمائش درپیش تھی۔ ہر موڑ پر اَن دیکھے پیغامِ اجل کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔
اس طویل داستان کی ہر سطر ایک واقعہ ہے۔ ایکشن، تجسس، تصادم اور حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ لازوال کہانی کئی برس سلسلہ وار، جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہی اور اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

مفرور

(پانچ حصّوں میں مکمل) ——— قیمت فی حصہ ۔/25 روپے ——— ڈاک خرچ فی حصہ ۔/10 روپے
پوری قیمت پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہو اور سر ضرور کہو۔ پولیس نے آج تک کسی صنعتکار کو اس جرم میں گرفتار نہیں کیا کہ اس نے ایک خطرناک ارادہ رکھنے والے مزدور کو سزا دی۔ پولیس میری مٹھی میں ہے۔ سمجھے؟" میں نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم کو معلوم نہیں تو جاکے اپنے چوہدری سے پوچھو کہ میری کیا حیثیت ہے اور کتنی پہنچ ہے۔"

پیڈرو کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ پڑ گیا۔ "کیا یہ یہیں پڑا رہے گا... سر؟" وہ بولا۔

"تم ایک آدمی کو ساتھ لو۔ دوسرے سیکشن کے فورمین کو۔" میں نے کہا۔ "باقی چار میں سے ایک چوہدری صاحب کے پاس جائے اور فون کرکے ایمبولینس منگوا لے۔ ویسے آدھے گھنٹے بعد یہ ہوش میں آجائے گا... تو خود بھی اپنے پیروں سے چل کے جاسکے گا۔ ہڈی صرف ایک بازو کی ٹوٹی ہے۔ دوسرا میں نے رحم کھا کے چھوڑ دیا۔"

دوسرا فورمین زیادہ محتاط انداز میں آگے آیا۔ "چلو سرجی! ہمارا پیکنگ کا کام ہے۔"

گردیزی میرے دائیں ہاتھ پر رہا اور فورمین تھوڑے سے فاصلے سے بائیں جانب لیکن میں نے عمداً ان کو ایک قدم آگے رکھا تاکہ وہ میری نظر میں رہیں اور مجھ پہ بے خبری میں حملہ نہ کرسکیں۔ جس بیرک نما ہال میں ہم داخل ہوئے وہ سب سے پہلا تھا اور اس لحاظ سے ٹھیک تھا کہ یہاں فیکٹری کا مال آخری مرحلے میں مکمل ہونے کے بعد پہنچتا تھا تو پیک ہونے کے بعد سیدھا گیٹ سے نکل جاتا تھا۔ میں نے فورمین کو موقع دیا کہ وہ ساری لائٹس جلائے کیونکہ اندر اندھیرا تھا۔ بیرک کے سب سے اوپر والے حصے میں روشندانوں کی قطار تھی جو اس وقت روشنی کی مدھم سی جھلک دے رہی تھی۔ اندر مجھے مختلف سائز کے کریٹ نظر آئے۔ کچھ اتنے چھوٹے جتنے پھلوں کے کریٹ ہوتے ہیں تو کچھ اتنے بڑے کہ معلوم ہوتا تھا ان میں ٹریکٹر کا ٹائر ہو گا۔ ہم ٹائر نہیں بناتے تھے چنانچہ میں نے فورمین سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے اور اس نے خاصے مؤدب لہجے میں بتایا کہ اس میں فصل کاٹنے والے آلات ہیں جو ٹریکٹر کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ حالات اب بہت حد تک قابو میں آگئے تھے اور میں نے اپنے مالک ہونے کے علاوہ اپنے "طاقتور بدمعاش" ہونے کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ بیرک سے گزرتے ہوئے ہم نے لکڑی کے تختوں کے ڈھیر دیکھے جن سے کریٹ بنائے جارہے تھے۔ کچھ لمبوترے، کچھ چوڑے، کچھ اونچائی کے رخ چپٹے اور کچھ ہر طرف سے برابر نظر آنے والے کریٹ مکمل پڑے تھے۔ دوسری طرف وہ سامان رکھا تھا جو شاید اگلے دن پیک ہونا تھا۔ یہ سب زرعی آلات تھے۔ ویٹ تھریشر، چاول چھڑنے، فصل کاٹنے اور بونے والے آلات کے پرزے یا مکمل آلات ان سب پر "ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی" کی مہر تھی۔

میرا دورہ کامیاب رہا تھا اور فورمین نے تمام سوالات کے جواب شرافت سے دیے تھے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کارروائی کو ختم کردوں۔ اتنی تفصیل سے پوری فیکٹری کو دیکھنے کے لیے کم از کم آدھے دن کی مہلت درکار تھی۔ پون گھنٹے میں صرف ایک سیکشن ختم ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو انہیں روک کے رکھتا اور رات تک معائنہ جاری رکھتا لیکن یہ خطرہ مول لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ رات زیادہ ہوجاتی تو میرا نکلنا دشوار ہوجاتا۔ مجھے مغرب کے وقت گاڑی بھی لینی تھی اور مستری نے کام کے لیے جو تین گھنٹے کی مہلت مانگی تھی وہ ختم ہورہی تھی۔

"ٹھیک ہے مسٹر گردیزی!" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "باقی میں پھر کبھی دیکھوں گا۔ میں نے ان لوگوں کو ایک گھنٹے کے لیے روکا تھا۔ انہیں اب جانے دو۔" لیکن اسی وقت میں نے نوٹ کیا کہ فورمین جو مجھ سے آگے آگے اپنے سیکشن کے کام کی وضاحت کرتا چل رہا تھا دروازے میں رک گیا ہے۔ اس نے دونوں پیر پورے پھیلا لیے تھے کہ عین وسط میں کھڑا رہ کے وہ راستے کو بلاک کر رہا تھا۔ دروازہ اس سے زیادہ چوڑا تھا لیکن وہ دونوں طرف ہاتھ پھیلا کے اور دائیں بائیں جھک کے کسی کو بھی پکڑ سکتا تھا۔ پھر میں نے گردیزی کو دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس نے ٹائی کے ساتھ اپنا کوٹ بھی اتار کے نیچے پھینک دیا تھا۔

"تو یہ بات ہے؟" میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے کہا۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں اب نکل نہیں سکتا؟"

"ضرور نکلے گا تم سکندر صاحب!" فورمین بولا۔ "لیکن ایسے نہیں۔ تمہارا جنازہ نکلے گا۔"

گردیزی یعنی پیڈرو نے مجھے آگے دھکا دیا۔ میں سیدھا ہو گیا۔ یوں جیسے دھکے سے میرے پیر اکھڑ گئے ہیں لیکن رکنے کے بجائے میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے فورمین سے ٹکرا کے باہر نکلنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ فورمین میری نیت کو بھانپ گیا اور اس نے بڑی پھرتی سے لات گھمائی جو میرے منہ پر پڑتی تو میرے جبڑے ٹوٹ جاتے یا میری گردن ٹیڑھی ہوجاتی مگر میں نے جھپٹ کے اسی ٹانگ کو پکڑ لیا اور ایک جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ فورمین ایک ٹانگ پر آگے آیا اور اس کے ہاتھوں نے دروازے کو گرفت میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی اور وہ تھوڑا سا گھسٹنے کے بعد کمر کے بل گرا۔ پیچھے سے گردیزی مجھ پر حملہ آور ہوچکا تھا۔ میں نے فورمین کو اس کی ٹانگ سے پکڑ کے زمین سے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور خود گھوم گیا۔ فورمین بھی یوں گھوم گیا جیسے مرکز کے ساتھ گھڑی کی سوئی گھومتی ہے یا بیچ کا حصہ گھومتا ہے تو پنکھے کے ونگ گھومتے ہیں۔ اس کا سر گردیزی کی ٹانگ سے ٹکرایا۔ گردیزی لڑکھڑا کے گرا اور

میں نے فورمین کو چھوڑ دیا۔ وہ گرتے ہوئے گردیزی کے ساتھ متصادم ہوا اور اسے بھی کچھ پیچھے لے گیا۔ ان کو اٹھنے کا موقع دیے بغیر میں نے آگے بڑھ کے گردیزی کے بوٹ کو ٹھوکر ماری اور وہ الٹ کر دیوار سے جا لگا۔ فورمین رکوع کی حالت میں تھا کہ میں نے اس کو کمر سے پکڑ کے اٹھایا اور سر سے اوپر لے جاکر یوں پھینکا کہ وہ ایک کریٹ سے ٹکرایا۔ کریٹ خالی تھا اور چوڑائی کی نسبت اس کی بلندی دگنی تھی۔ کریٹ پیچھے گرا اور گردیزی کے سر پر لگا۔ اس نے کراہ کر سر پر ہاتھ رکھا اور عالمِ دیوانگی میں کریٹ اٹھا کے میری طرف پھینکا۔ میں نے غوطہ مار کے خود کو بچایا لیکن اس کا ایک کونا میرے شانے سے چھوتا ہوا گزرا تو میری قمیص پھٹ گئی۔ کریٹ فرش پر بڑی آواز کے ساتھ گرا۔ اسی کے ساتھ دونوں طرف کے دروازوں سے دو دو افراد اندر داخل ہوئے۔ میں نے انہیں تختوں کے ڈھیر سے لکڑی کے چوڑے اور لمبے تختے اٹھاتے دیکھا۔ اپنے قریب ہی مجھے ٹوٹنے والے کریٹ کے تختے نظر آئے۔ میں نے ایک تختہ اٹھایا جس کی چوڑائی چار انچ کے قریب تھی اور جیسے ہی گردیزی میری طرف آیا میں نے تختہ گھما کے اس کے سر پر مارا لیکن وہ بچ گیا اور چوٹ اس کے شانے پر آئی۔ اس کی اور فورمین کی حالت کسی حد تک غیر تھی مگر چار تازہ دم افراد کی کمک نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ میں ہر سمت سے محصور ہونے لگا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کسی کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا لیکن ان سب نے اپنی اپنی پسند کے مطابق لمبے لمبے تختے اٹھا لیے جو میرے ہاتھ کے تختے کی لمبائی سے دگنے لمبے تھے۔ اب وہ آہستہ آہستہ حلقہ بنائے میری طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ گالیاں بکتے، زمین پر سانڈ کی طرح پیر مارتے، پھنکارتے، نفرت اور حقارت سے تھوکتے۔ میرے مالک ہونے کے غرور کو خاک میں ملانے کی دھمکیاں دیتے۔

میں نے اب دفاعی انداز اختیار کرلیا تھا اور اپنی نشست دیوار سے لگالی تھی تاکہ وہ سب میرے سامنے رہیں۔ بالکل سامنے آکے ان میں سے ایک اچھلا اور جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے تختہ اٹھا کے میرے سر پر مارنا چاہا۔ میں نے سر کو بچانے یا جوابی وار کرنے کے بجائے اس تختے کا وار ہتھیلی پر روکا اور گرفت مضبوط کرکے جھٹکا دیا تو وہ اپنے ہی زور میں آگے جھکا اور میں نے دوسرے ہاتھ سے تختہ اس کے سر پر مارا۔ وہ چلایا اور وہیں گر گیا مگر اس کے بعد وہ سب ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دو کے وار کو میں نے تختے پر روکا اور ایک کو لات مار کے دور پھینکا مگر ایک کا وار میرے شانے پر لگا۔ مجھے یہ مقابلہ بے سود نظر آرہا تھا کیونکہ اپنی دو آنکھوں سے میں ان سب پر نظر رکھ سکتا تھا اور بیک وقت چھ افراد کے وار سے نہیں بچ سکتا تھا پھر بھی یہ ناممکن تھا کہ میں مقابلہ کیے بغیر شکست قبول کرلوں۔ خود گرنے سے پہلے میں دو حملہ آوروں کو لٹا چکا تھا۔ یہ دیوانہ وار جدوجہد بالآخر ختم ہوگئی۔ مجھے لٹانے والا وار ٹھیک میرے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ یکلخت ساری روشنیاں بجھ گئیں اور مجھے اندھیرے میں جگنو سے اڑتے دکھائی دیے۔ آخری احساس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے گالی دے کر میرے کِک رسید کی ہے۔ آخری آواز دلاور کی تھی لیکن الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے پہلے میرے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میری ناک میں لکڑی کے رندہ کیے ہوئے تختوں کی مخصوص بو آئی۔ یہ بو بہت واضح تھی۔ پھر مجھے حرکت کا احساس ہوا۔ زمین میرے نیچے مسلسل اوپر نیچے ہورہی تھی اور رگڑ کا شور اس حرکت کے ساتھ تھا۔ میرے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور دونوں پیر ایک ساتھ باندھنے کے لیے بھی وہی رسی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے باوجود میں کھڑا نہیں ہوسکتا تھا اور کچھ دیر تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر میرا سر نیچے کیوں ہے اور پیر اوپر کیوں اٹھے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے جیسے ہوش و حواس بحال ہوتے گئے میں اس صورتِ حال کا بہتر طور پر جائزہ لینے کے قابل ہوگیا۔ میں لکڑی کے کسی کریٹ میں تھا اور کریٹ کو ایک طرف سے اوپر اٹھا کے زمین پر گھسیٹا جارہا تھا۔ اگر باہر اجالا ہوتا تو مجھے تختوں کی جھری سے ضرور دکھائی دیتا لیکن اندر اور باہر ایک جیسی سیاہی ظاہر کرتی تھی کہ وقت رات کا ہے۔ میں اس تابوت نما بکس میں ادھر سے ادھر ہورہا تھا اور میرا سر بار بار نیچے کے حصے پر لگ رہا تھا۔ کریٹ میرے سائز کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا بلکہ ان ہی میں سے منتخب کیا گیا تھا جو میں نے ورکشاپ میں تیار دیکھے تھے۔ اس کی لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں اتنی گنجائش تھی کہ میں ہر طرف ایک منٹ تک حرکت کرسکتا تھا۔ چونکہ کریٹ مشینری کے لیے بنائے گئے تھے اس لیے تختے موٹے استعمال ہوئے تھے مگر ان کے درمیان کہیں سوت آدھے سوت کی جھری رہ گئی تھی تو اسے نظرانداز کردیا گیا تھا۔ کوئی چیز اس میں سے پگھل کے یا بہہ کے باہر آنے والی ہوتی تو شاید اسے ایئرٹائٹ بھی کیا جاتا مگر اس میں سے تو ایک نٹ بولٹ بھی گرنے کا امکان نہیں تھا۔ تاہم یہی جھریاں میری زندگی کی ضامن تھیں کیونکہ ان میں سے تازہ ہوا کی فراہمی جاری تھی۔

"کریٹ کے اوپر کچھ نہیں لکھا' پاگل کے بچو!" میں نے دلاور کی آواز سنی۔ "راستے میں تمہارا کوئی باپ مل گیا تو کیا بتاؤ گے کہ کس کا مال ہے اور کہاں جارہا ہے۔"

"کمپنی کا ٹرک ہے چوہدری صاحب!" پیڈرو یعنی گردیزی کی آواز آئی۔

"تو مجھ سے زیادہ عقلمند ہے؟" چوہدری دلاور نے برہمی سے کہا۔ "خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر پشاور کے کسی دیہات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یا قصبے کا نام لکھ دو۔ کسی زمیں دار کے نام سے مشینری کے کاغذات بنا کے ساتھ رکھو۔"

کریٹ اب ساکت تھا چنانچہ میں سیدھا لیٹا ہوا خود کو خاصا پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ زمین سے رگڑ کھانے کا شور میری کھوپڑی میں بادلوں کی گرج بن کے گونجتا تھا اور میرا مغز الٹ پلٹ ہونے لگتا تھا۔ میرے منہ پر انہوں نے ٹیپ لگا دیا تھا چنانچہ میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار سکتا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو میرے حلق سے کبوتر کی طرح غٹرغوں کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ میں کریٹ کی سائڈ پر لاتیں مار سکتا تھا اور ہاتھوں سے بھی پیچھے کی طرف زور لگا سکتا تھا لیکن ابھی اس کارروائی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے لیے مناسب ترین موقع کا انتظار کرنا بہتر تھا۔ حالانکہ یہ امید بھی خود فریبی کے سوا کچھ نہ تھی کہ میں ٹانگوں کا زور لگا کے آدھا انچ سے زائد موٹے تختوں کو توڑ دوں گا یا ان کی کیلیں نکال دوں گا۔ دیواروں پر دھم دھم لاتیں مار کے کسی کو متوجہ کر سکوں گا یا ایس او ایس کا سگنل دے سکوں گا۔

ان ہی بدمعاشوں میں سے کسی نے کریٹ پر کالے رنگ اور برش سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ ایک جھری میں سے بلب کی روشنی سنہرے تار کی طرح جھلملانے لگی لیکن میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ابھی ان کو یہی تاثر دینا بہتر تھا کہ مجھے ہوش ہی نہیں۔ شاید اسی طرح میں ان کی گفتگو کا کوئی لفظ سن کے اندازہ کر سکوں کہ وہ مجھے پیک کر کے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ مقصد اگر مجھے مارنے کا ہوتا تو اس کے لیے یہ تکلف غیر ضروری تھا اور تدفین کی خاطر تابوت بھی غیر ضروری تھا۔ صاف ظاہر یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لیے بغیر مجھے کہیں شفٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ہاتھ پیر باندھ کے گٹھڑی کی طرح ٹرک میں لے جانا مشکل کام نہیں تھا لیکن وہ محتاط تھے اور مجھے کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے کہ میں رسیاں کھول کے چلتے ٹرک سے کود جاؤں یا ہوش میں آ کے بندھا ہوا بھی پَر کٹے کبوتر کی طرح قلابازیاں کھانے لگوں۔ کریٹ کے اندر رہ کے میں نہ کسی کو نظر آ سکتا تھا اور نہ آزاد ہو جانے کی صورت میں (جس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا) کوئی خطرناک کارروائی کر سکتا تھا۔

"گاڑی میں دوسرا مال بھی جائے گا؟" گردیزی نے سوال کیا۔ معلوم نہیں دوسرے مال سے اس کی مراد کیا تھی؟

"نہیں۔ فی الحال اسی کو ٹھکانے پہنچا دو۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اور دیکھو! راستے میں کوئی روکے تو اسے دور لے جا کر سودا کر لینا۔ قریب کوئی آنے ہی نہ پائے۔ کوئی پیچھے لگ جائے تو بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ٹرک لے کر کھلی سڑک پر کوئی نہیں بھاگ سکتا اور تیز رفتاری میں حادثہ ہو جاتا ہے۔ میں ہر غلطی معاف کر دوں گا لیکن حادثے میں کوئی نقصان ہوا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" اس کی آواز اور اس کا لہجہ دونوں بدلے ہوئے تھے۔

"چوہدری صاحب! دونوں پرانے ڈرائیور ہیں اند... اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔" گردیزی بولا۔

"صبح تک سب کو واپس آنا ہے۔ سب ڈیوٹی پر ہوں... کے مطابق۔" دلاور نے کہا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتائج اخذ کیے کہ ٹھکانے کا مطلب ٹھکانے لگانا نہیں تھا۔ مجھے وہ کسی محفوظ مقام... رہے تھے جو ان کا اڈہ تھا یا کوئی ایسی جگہ تھی جہاں کسی کو... مزید یہ کہ وہ جگہ سو سوا سو میل کے اندر تھی۔ ایک ٹرک دا... ہی دور جا کے واپس آ سکتا تھا۔ صبح تک انہیں دس گھنٹے... پانچ گھنٹے کا یک طرفہ سفر زیادہ سے زیادہ دو سو میل ہو سکتا... ٹرک کی اوسط رفتار چالیس میل فی گھنٹہ سے کم نہ ہو۔ ہائی وے... رفتار رات کے وقت کافی ہے۔ پھر یہ کہ شہروں سے گزرتے... رفتار کو پندرہ بیس میل رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ پانچ گھنٹے... تیس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں طے کیے جا سکتے۔ راہ میں گو... وزیر آباد، گجرات اور لالہ موسیٰ کے شہر تو یقیناً تھے لیکن... پھر جہلم کا شہر بھی آ سکتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو میل کے... تھا۔ ایک سو ساٹھ میل۔ اور میرے حساب کے مطابق وہ... آگے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ شاید جہلم اور راولپنڈی... ہی پہاڑوں اور کھائیوں میں کہیں وہ جگہ تھی جہاں مجھے قید رکھا... تھا۔ قید میں رکھنے کا مقصد کیا ہوگا یہ میں نے ابھی نہیں سوچا تھا... دشمنوں کو صرف مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے قید نہیں رکھا... سے کچھ اعتراف کرانے، کچھ پوچھنے یا کسی نام پر مجبور کرنے کا... ہے اور دیگر علوم و فنون کی طرح ایذا رسانی اور تشدد کے طریقے... نبیادوں پر اتنے موثر ہو گئے ہیں کہ ان کا تصور کرنے سے بھی رز... ہوتی ہے۔

دس منٹ بعد جو دس گھنٹوں کے برابر طویل تھے، میں نے... ٹرک کی آواز سنی۔ میرے کان سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے رہنے... کی گاڑی کی آواز سے آشنا تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں... لوگ اس فرق کو محسوس کر سکتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق... کا چھوٹا ٹرک تھا۔ آوازیں جو کچھ دیر کے لیے معدوم ہو گئی... وہ لوگ راستے میں دکھانے کے لیے کاغذات بنانے آفس... گئے تھے) دوبارہ سنائی دیں اور چار ہاتھوں نے مجھے آگے پیچھے... اٹھا کے ٹرک پر رکھا اور دھکا لگا کے آگے کر دیا۔ ٹرک کا پچھلا... دروازہ بند ہوا جو دراصل دو فٹ اونچی روک تھا اور ٹرک کے... کی تین دیواروں کے برابر تھا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ دلاور نے سب... بھاگ غائب ہو جانے کا حکم دیا۔ "وہ تو سچ مچ آ گیا ہے۔" اس نے جملے کے آخر میں ایک گالی کا اضافہ کیا۔ "سب اندر جاؤ اور اتنی ہی لائٹس جلنے دو جتنی روز ہوتی ہے۔"

"کیا یہ خطرہ ہے چوہدری صاحب کہ وہ اندر آ جائے گا؟" گردیزی نے گھبرا کے کہا۔

"اندر کیوں آئے گا؟ اس کے باپ کا گھر ہے یا بیوی کا میکہ ہے؟" دلاور نے کہا۔ "بریف کیس لے گا اور چلا جائے گا۔"

"اس نے چوکیدار سے کچھ پوچھا تو....." گردیزی نے کہا۔ "وہ کچھ بک دے۔" لیکن اس کی بات سننے سے پہلے ہی میرا دل میرے سینے میں اتنی ہی زور سے دھڑکا تھا جتنی قوت سے میں لکڑی کے اس تابوت میں تڑپا تھا۔ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا تھا۔ محسن سچ مچ آ پہنچا تھا جس کی مجھے کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے ان کو بلف کیا تھا اور مقصد صرف ان کو یہ احساس دلانا تھا کہ میرے یہاں آنے کی خبر دوسروں کو بھی ہے۔

"یہ منحوس لاتیں مار کے ڈھول بجا رہا ہے۔" گردیزی نے کہا۔ "ہوش میں آ گیا ہے....."

"اس کا ڈھول بعد میں بجائیں گے۔" دلاور نے کہا۔ "جا کے سنو وہ اس کا یار کیا جھک جھک کر رہا ہے۔"

"آپ نے تو کہہ ہی دیا تھا چوکیدار کو۔ وہ کہہ دے گا کہ سکندر صاحب آئے تھے اور یہ دے کر چلے گئے۔"

"وہی تو غلطی ہو گئی ہے ہم سے۔" دلاور نے کہا۔ "اب اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا نا کہ وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا باپ ایس ایس پی ہے وہ آ جائے گا جرح کرنے کہ سکندر دروازے تک ہی آیا تھا یا اندر بھی گیا تھا۔"

میرا دل چاہا کہ میں قہقہہ مار کے ہنسوں۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ محسن، رابعہ اور رضوی صاحب کی ساری تفتیش کا مرکز چوکیدار ہوگا۔ یہ سوال قدرتی طور پر ان کے ذہن میں پیدا ہوگا کہ سکندر کو یہاں بریف کیس رکھوانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اسے گاڑی لے کر گھر پہنچنا تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن محسن کا آنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ مغرب کے بعد بھی دو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے رات ہونے تک میرا انتظار کیا ہوگا اور پھر محسن نے طے کیا ہوگا کہ وہ خود جا کے معلوم کرے۔ مجھے صرف تین گھنٹے ہی تو گزارنے تھے۔ پانچ گھنٹے بعد بھی میرے نہ پہنچنے سے تشویش پیدا ہونا یقینی تھا۔ چھ گھنٹے بعد بھی اگر محسن عوامی ٹانگری موٹر ورکشاپ پہنچا ہوگا تو پورے پراسٹر استاد نے بتایا ہوگا کہ "جناب عالی! گاڑی تو ایم ٹی تیار کھڑی ہے پردہ صاحب لینے ہی نہیں آئے۔" اور اس کے بعد محسن گاڑی لے کر چلا ہوگا تو اس کے ذہن میں دو ہی مقامات ہوں گے۔ مقبرہ جہانگیر اور فلم دیکھنے والی... لیکن رات کو مقبرہ بند رہتا ہے اور فلم کا آخری شو جاری ہوگا یا شروع ہونے والا ہوگا چنانچہ دونوں جگہ میری موجودگی خارج از امکان تھی۔ پھر وہی ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہوا یعنی اس کی نظر نے "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کا بورڈ دیکھ لیا ہوگا۔ وہ میری فطرت سے بخوبی واقف تھا اور خود اس کی سوچ کا انداز طویل رفاقت کے بعد میرے ذہن سے ہم آہنگ ہو چکا تھا اور ہمارے خیالات کی یہ مطابقت بعض اوقات ٹیلی پیتھی کی طرح ہو جاتی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اگر سکندر اعظم کی جولانیٔ طبع اور مہم جو فطرت نے مجبور کیا ہوگا تو کچھ بعید نہیں کہ وہ مسٹر نذیر کو یکہ چلاتا دیکھنے کے بجائے چوہدری دلاور سے "آ بیل مجھے مار" کہنے چل پڑے ہوں گے اور اب وہ دروازے تک آ پہنچا تھا۔ میری ایک فضول سی حرکت بہت بامعنی ہو گئی تھی اور دشمنوں کی ذرا سی غلطی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ اگر وہ بریف کیس غائب کر دیتے اور چوکیدار کو سمجھا دیتے کہ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تو کچھ نہ ہوتا لیکن خود ان کو ایک فیصد شبہ نہ تھا کہ محسن واقعی آ جائے گا۔ انہیں یہ سب میری اداکاری کا جزو محسوس ہوا ہوگا۔

"تم گدھے ہو بہت گھٹیا قسم کے۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے اسی وقت مجھے بتا دیا ہوتا تو میں بریف کیس منگوا لیتا لیکن تم نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائے۔"

"میری جگہ آپ ہوتے چوہدری صاحب! تو اس مکار کی باتیں سن کے یہی سمجھتے کہ سب بکواس ہے۔" گردیزی بولا۔

"اچھا اب تم لوگ جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "چوکیدار سے میں نمٹ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ صبح پھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے رات کو ہی آ جائیں۔ اس سے پہلے مجھے چوکیدار بدلنا ہے۔ چوکیدار کو بھی ڈال دو گاڑی میں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ لوگ اب چوکیدار کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔ جب وہ چوکیدار ہی نہیں ہوگا تو کوئی اس کی زبان سے کیا اگلوائے گا اور نیا آدمی ہوگا تو لاکھ پوچھنے پر بھی وہ بات کیسے بتائے گا جس کا علم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں۔ رضوی صاحب کی ساری فورس اندر آ کے کونا کونا چھان مارے۔ نہ انہیں سکندر ملے گا نہ وہ چوکیدار۔ چوہدری دلاور یا گردیزی بن جانے والے پیڈرو کی پوزیشن بالکل محفوظ ہوگی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ سکندر بخت کو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ وہ معمول کے مطابق چھٹی کر کے گھر چلے گئے تھے۔ ان کے وہ پیچے فورمین بھی یہی بیان دیں گے تو ثابت کیا ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے خوشی تھی کہ کچھ تو ہوا۔ میرا سراغ اس فیکٹری کے گیٹ تک تو ملا۔ آگے رضوی صاحب کی ذہانت، ان کے وسائل اور ان کی خصوصی ٹیم مل کے کیا کرتے ہیں، یہ میرا مقدر۔

"چوہدری صاحب! میری غلطی جناب!" چوکیدار کے چلانے کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آواز آئی۔ پھر کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری کہ اس نے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے جیسی آواز نکالی اور خاموش ہوگیا۔ میرے قریب ہی دھاکا ہوا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ چوکیدار کو باندھ کے اوپر سے اچھال دیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ راستے میں اسے ہوش آجائے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک تختے کی دیوار ہے۔ وہ میری بات سن سکے گا لیکن یہ آواز آگے بیٹھ کے ٹرک چلانے والوں تک نہیں پہنچے گی۔ میری پہلی کوشش کی ناکامی نے مجھے تھوڑا سا دل شکستہ کر دیا تھا لیکن مایوس نہیں کیا تھا۔ محسن گیٹ سے باہر تھا چنانچہ وہ آواز اس کے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی تھی جو میری لاتوں کے کریٹ پر لگنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر یہ دھم دھم وہ سن بھی لیتا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کرتا کہ یہ شہزادہ سکندر بخت کا ایس او ایس ہے جو اس وقت لکڑی کے ایک ڈبے میں پیک کیے جا چکے ہیں اور اندر ہی اندر مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں لیکن اندر رہ کے بھی میں باہر پڑے ہوئے چوکیدار سے مشورہ کر سکتا تھا اور حالات کے مطابق اس کو مشورہ دے سکتا تھا یا اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں یہ اشتراکِ باہمی کارآمد ثابت ہوگا یا نہیں، یہ کہنا قبل از وقت تھا۔

آگے کا دروازہ بند ہوا اور ٹرک جھٹکا لے کر آگے بڑھا۔ فیکٹری کے گیٹ سے سڑک تک آنے میں دو منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے۔ اس وقت میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں نے اس تمام ٹریفک کا تصور کیا جو ہمارے آگے پیچھے رواں تھی۔ بسیں اور ٹرک، ویگن اور کاریں۔ ان کا شور مجھ تک پہنچ رہا تھا لیکن مجھے ذرا بھی امید نہیں تھی کہ میں نے کریٹ کے اندر لاتیں مار کے ڈھول بجایا تو یہ آواز کسی کے کانوں تک پہنچے گی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر ٹرک کا کسی سے ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ وجہ کچھ بھی ہو مثلاً اس کے بھی بریک فیل ہو جائیں۔ یا سامنے سے کوئی غلط اوورٹیک کرتے ہوئے اس سے ٹکرا جائے تو اس بات کا خاصا امکان ہے کہ جھٹکے سے کریٹ نیچے جا گرے یا ٹوٹ جائے۔ لیکن ایسی صورت میں ففٹی ففٹی چانس میری گردن ٹوٹنے کے یا میرا سر پھٹنے کے بھی تھے۔ معمولی زخمی ہونا تو یقینی تھا۔ یہ کس قدر ناقابلِ یقین بات ہوگی۔ میں نے سوچا۔ اگر دیکھنے والوں کو بتایا جائے کہ یہ جو ٹرک ابھی ابھی "ایم۔ ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" سے نکلا ہے اور جس پر صرف ایک کریٹ رکھا ہے اس میں خود فیکٹری کے مالک تشریف فرما ہیں۔ بے شک عام حالات میں فیکٹریوں کے مالک اس طرح سفر نہیں کرتے مگر یہ مخصوص حالات ہیں جن کا تعلق شامتِ اعمال سے ہے۔

سڑک پر پہنچنے کے بعد ٹرک کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر فٹ کرنے والوں کی طرح میں نے صندوق کو اندر سے "ہیلو ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ" کے انداز میں بجایا۔ مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ صدا کس... ہے۔ اس مشینی سفینے کے قاتل ناخداؤں تک یا میرے... دھڑے بحرِ مصائب میں غرق ہونے والے پاسباں تک... کے شور کے سوا کچھ نہ آیا جواب کچھ گم ہوگیا تھا۔

ہم شاہدرے سے دور آ چکے تھے میں نے ... لیٹے سوچنا شروع کیا کہ چار پانچ گھنٹے میں کیا کچھ کیا جا... سے کچھ حاصل ہوا یا نہ ہو۔ سب سے اچھا تو یہ ہوتا کہ کوئی... میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیتا۔ پھر میں لاؤڈ اسپیکر کی... نہ کسی کو ضرور متوجہ کر لیتا مگر دستِ غیب کے کریٹ میں... الف لیلوی تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسے کسی پری یا جن... کا خیال جو ہاتھ کی ایک جنبش سے کریٹ کی دیواریں غائب کر...

میری ناک میں عجیب سی ناگوار بدبو پہنچی تو میں نے... ہم کالا شاہ کاکو سے گزر رہے ہیں جہاں کیڑے مکوڑے... بنانے والا بہت بڑا کارخانہ ہے اور اس کا کیمیائی دھواں... کو معطر رکھتا ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں... آیا" اس وقت جب موت یقینی نظر آتی تھی خدا نے مجھے... تھی کہ میں نے گاڑی کو ایک خوفناک تصادم سے بال بال... اس کے بعد جب وفات پانے کے امکانات تقریباً معدوم... مجھے بھٹکا کے کہاں لے گیا۔ اب میں اسی راستے پر وا... میری منزل سلامتی کی منزل نہ تھی۔ اگلے اور پچھلے حصے... تھا چنانچہ ڈرائیورانِ گرامی یہ تو دیکھ سکتے تھے کہ اسیران... جگہ موجود ہیں لیکن کسی قسم کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ اگر... ہوتا تو یقیناً بے ہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو پکارتا اور کس... والے کی طرح اس وقت تک یہ عمل جاری رکھتا جب تک... اس کے کانوں کے راستے اس کے لاشعور میں نہ اتر جاتی اور... کو بیدار نہ کر دیتی لیکن میں قوتِ گویائی سے ہی محروم تھا۔

میں اپنے بے سروپا خیالات میں غرق تھا کہ میں نے... کراہنے کی آواز سنی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اگر چوکیدار... آجائے تو یقیناً چیخ و پکار مچا سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ ... سے گزرتے ہوئے۔ اسی وقت میں نے ایک بھاری بھرکم... آواز سنی۔ پھر موٹر سائیکل نے ٹرک کو اوورٹیک کیا... خالص پولیس والے دبنگ لہجے میں کہا" گاڑی روک ادھر... حکم عدولی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ٹرک کی رفتار کم ہو... ایک سائڈ پر رک گیا۔

"کیا لے جا رہے ہو؟" ٹرک کو روکنے والے نے کہا۔ ... آواز بہت قریب محسوس ہوئی۔

موہوم سی امید میں میرا دل زور سے دھڑکا۔ ایک بار میں نے دونوں لاتوں کو سمیٹ کر پھیلایا اور جسم کی ساری توانائی صرف کر کے اس صندوق کی دیوار پہ مارا جو میرا تابوت بنا ہوا تھا۔ اندر ایک گونج سی پیدا ہوئی اور یہ آواز یقیناً اس کو بھی متوجہ کر لیتی جس نے ٹرک روکا تھا مگر میری بدقسمتی کہ عین اسی وقت کوئی ٹرک کا دروازہ زور سے بند کر کے نیچے اترا۔

"حکم کریں عالی جاہ!" میں نے ایک آواز سنی۔ یہ انہی میں سے ایک تھا جو میر وزیر اینڈ کمپنی میں فورمین کہلاتے تھے۔

"کیا لے جا رہے ہو ٹرک میں؟" عالی جاہ نے خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر غرا کے کہا۔

"وہی جو روز لے جاتے ہیں سرکار! کمپنی کا مال ہے تھانیدار جی۔"

"کون سی کمپنی کا؟ کیا مال ہے، اس صندوق میں۔؟" تھانیدار بولا۔

"کمپنی کا نام تو ٹرک پر لکھا ہوا ہے سرکار! اپنے چوہدری دلاور صاحب کی فیکٹری ہے۔"

میں نے پھر صندوق کی دیوار پر لات ماری۔ "یہ کیسی آواز ہے؟" تھانیدار نے کہا۔

"وہ پیچھے والا پٹ ذرا ڈھیلا ہے عالی جاہ! آپ ذرا ادھر آئیں۔ ٹرک سے ہٹ کر بات کریں۔"

"اوئے.... ہاتھ چھوڑ۔ بات کر اسی جگہ۔" تھانیدار گرم ہوگیا۔ "بکس میں کیا ہے؟"

"بکس میں پرزے ہیں جی! ٹریکٹر کے ساتھ جوڑنے والے۔"

آواز اب قدرے دور سے آئی مگر میں نے باکس کے اندر لاتیں مارنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ "اپنے چوہدری صاحب کی فیکٹری میں یہی بنتے ہیں۔"

باہر سے ٹرک اور بسیں گزرتے جا رہے تھے چنانچہ جتنی آواز میرے کان اس ڈبے میں سن رہے تھے اتنی باہر تھانیدار تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کے باوجود تھانیدار کے ذہن میں پیدا ہونے والا شک برقرار رہا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مجھے اغوا کرنے والے کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا اور شاید وہ گھبرا گیا تھا کہ خوف اس کی آواز سے جھلکتا تھا۔

"اُلّو بناتا ہے مجھے۔" تھانیدار نے اسے ایک اور گالی دے کر کہا۔ "تھانے لے کر چل ٹرک کو۔"

"تھانے کی بات کیوں کرتے ہیں جنابِ عالی"، ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "بات تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔"

"تو بات کر انسانوں کی طرح۔ یہ کیا ڈھک ڈھک ہو رہی ہے بکس میں؟" تھانیدار نے کہا اور اپنی کوشش کی کامیابی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ میں نے صندوق کے اندر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنا شروع کیا اور میری لاتیں لکڑی کی بنی ہوئی تین دیواروں پر پڑتی رہیں۔

"ٹریکٹر کے پرزے اندر ہی اندر چلنے لگے ہیں؟ تیرے چوہدری صاحب کی..." تھانیدار نے برہمی سے دلاور کو بھی گالی سے نوازا۔ "میں کھال کھینچ کے سڑک پر ڈال دوں گا۔"

"عالی جاہ! اس بار معاف کر دیں۔" ڈرائیور بولا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا۔ بکس میں ہرن ہے۔ چوہدری صاحب نے چھانگا مانگا سے پکڑا تھا۔ بڑا سخت جرم ہے جی! لیکن ہم تو بے قصور ہیں۔ بڑے آدمیوں کے شوق ہیں۔ ہمیں حکم ملا تھا کہ اسے ایک دوست کے گھر پہنچانا ہے۔ وہ صوبہ سرحد کے بہت بڑے زمیندار ہیں سرکار۔ کھلا نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے ایک بکس میں ڈال کے لے جا رہے ہیں۔" اس کی آواز رفتہ رفتہ قریب آ رہی تھی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھانیدار ایک ایک قدم پیچھے کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔

ڈرائیور نے بڑی چالاکی سے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ لیکن ایک امید ابھی زندہ تھی۔ اگر پولیس والے نے پیچھے آ کے جھانکا تو اسے بیہوش پڑا ہوا چوکیدار ضرور نظر آجائے گا۔ اس کے بعد وہ ڈرائیور کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

"وہ دیکھیں عالی جاہ... چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو اسے یہی بتایا جائے۔ اور یہ نذرانہ ہے چوہدری صاحب کی طرف سے۔" ڈرائیور نے تھانیدار کو رد کرنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ "پورے دو ہزار ہیں۔ آپ فرما دیں، کم ہے تو..."

"یہ ہرن کا بچہ اچھل کود رہا ہے؟" تھانیدار کی آواز بہت قریب سے آئی۔ "چلا کیوں نہیں رہا ہے؟"

"چلائے گا کیسے سرکار! منہ باندھ دیا ہے اس کا۔" ڈرائیور بولا۔ "اب جانے دیں اس معاملے کو۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔ آپ اسے ضبط کر لیں گے۔ پھر مجھے پکڑ کے ڈک لیں گے مگر چوہدری صاحب بڑے رسوخ والے آدمی ہیں۔ ان کو جیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جرمانہ ہی ہوگا عدالت سے۔ جرمانہ آپ لے لیں۔ اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہیں عالی جاہ! میری بھی ضمانت ہو جائے گی۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ ہمارا کوئی جرم نہیں۔ چلیں آپ دو کے چار کر لیں۔ ویسے اپنے چوہدری صاحب نے مجھے پانچ تک اختیار دیا ہے لیکن ہرن تو ضرور جائے گا جی۔ ہو سکتا ہے چوہدری صاحب ایسے ہی آ کر لے جائیں۔ پھر آپ کو افسوس ہوگا اپنے نقصان کا۔ ایسے ہی ضد میں پانچ ہزار بھی جائیں گے، ہرن کا کیا ہے۔"

"اوئے ہرن کے بچے!" تھانیدار نے یکلخت مشتعل ہو کے کہا۔ پھر پٹاخے کی طرح آواز آئی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ تھپڑ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

خاصا بھرپور تھا اور ڈرائیور کے منہ پر پڑا تھا۔ "یہ ہرن ہے کہ بندہ؟ بول تیری ایسی تیسی۔"

"بتاتا ہوں، بتاتا ہوں عالی جاہ!" ڈرائیور کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ یوں لگتا تھا کہ تھانیدار نے گالی دیتے ہی اس کی گردن بھی دبوچ لی ہے۔ خدا نے میری سن لی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے بیہوش پڑے ہوئے چوکیدار کو دیکھ لیا تھا۔ ہرن والا جھوٹ شاید پانچ ہزار میں چل جاتا۔ لیکن اب معاملہ لمبا ہو گیا تھا۔ ڈرائیور بولنے کی کوشش میں حلق سے خرخر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ "میرا گلا تو چھوڑیں۔" وہ ہانپتے ہوئے کھانسنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گالیاں دینے والے تھانیدار کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ آخری آواز جو میرے کانوں نے سنی کراہنے کی تھی۔ شاید اس سے پہلے کوئی چیز گری تھی یا ٹکرائی تھی۔

"بازای نیکس سی آوندا شودا پُتّر۔" ایک اور کرخت، بیٹھی ہوئی آواز آئی۔ "ہُن لے پنج ہزار۔"

"بڑے وقت پر کام کر دیا تو نے۔" پہلا شخص بولا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا۔"

"چل اب نکل۔ گڈی سٹارٹ کر۔" دوسرے نے کہا۔ "ٹریفک بہت ہے۔"

"اور اس کا کیا بنے گا۔ یہیں سڑک پر ہی پڑا رہے گا۔"

"یار تو جلدی کر۔ میں اس کو ڈالتا ہوں کنارے پر۔" دوسرا ہنستا ہوا بولا۔ "اوئے ٹھیر ذرا۔ اِدھر بیٹھ جا۔ بیٹھ میرے ساتھ۔ کوئی گڈی ہے پیچھے۔ لائٹ اس پر نہ آئے ورنہ پھنس جائیں گے۔ اس کو بالکل کور کر لے۔ بس نیچے دیکھ۔ معلوم ہو کہ ہم ٹرک میں کوئی خرابی دیکھ رہے ہیں۔ ایسے گھبرا مت جایا کر۔۔۔۔"

"اس کی موٹر سائیکل بھی تو کھڑی ہے۔"

"وہ آگے ہے اور بالکل ٹرک کی سائڈ میں ہے۔ پیچھے سے نظر نہیں آتی۔" دوسرا بولا۔

"مگر یار! اس نے نمبر تو نوٹ کر ہی لیا ہو گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"اوئے دماغ کو ٹھکانے رکھ۔ نمبر کون سا اصلی ہے۔" دوسرے نے جھلا کر کہا۔ "چل اب اٹھ۔ فٹافٹ نکل جاتے ہیں۔"

ٹرک ایک بار پھر روانہ ہو گیا اور اس اندھیرے میں جو رات کا ایک حصہ تھا اور میرے ساتھ لکڑی کے اس باکس میں محصور تھا مایوسی کا گہرا اندھیرا بھی شامل ہو گیا۔ اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ ٹرک میں آگے کم سے کم دو افراد ہوں گے۔ اب میں تصور کر سکتا تھا کہ شامتِ اعمال کے باعث راستہ روکنے والے انسپکٹر کے ساتھ کیا ہوا۔ جب وہ ایک سے بات کر رہا تھا تو دوسرا ٹرک میں بیٹھا رہا اور موقع ملتے ہی دوسری جانب اتر گیا جہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انسپکٹر یا تو بہت ایماندار اور فرض شناس تھا یا بہت لالچی کہ پانچ ہزار کی رقم بھی دگنی کرنے کی فکر میں تھا۔ ڈرائیور کا دوسرا ساتھی ٹرک کی اوٹ میں چھپا کھڑا رہا۔ انسپکٹر پانچ ہزار لے کر چلا جاتا تو وہ بھی خاموشی سے لوٹ کر اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ مگر اس نے معاملات کو قابو سے باہر دیکھا تو بے خبری میں اچانک پیچھے سے آ کے انسپکٹر کے سر پر یا سریے سے وار کیا اور بات ختم کر دی۔ اب معلوم نہیں وہ زندہ تھا یا صرف بیہوش لیکن اس کا جسم سڑک سے ہٹ کر نشیب یا کسی جھاڑی کے پیچھے پڑا تھا جہاں اسے سڑک پر سے گزرنے والی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی موٹر سائیکل کو یقیناً ہر گاڑی کے ڈرائیور نے دیکھا ہو گا اور پہچان لیا ہو گا مگر جانتے بوجھتے اس جگہ پڑتا ہے کہ پولیس کی خیریت معلوم کرنے رُکے اور اپنی خیریت سب یہی فرض کرتے رہیں گے کہ سارجنٹ آگے پیچھے کہیں مصروف ہو گا۔ صبح کی روشنی پھیلنے تک اس کو کوئی اٹھانے والا نہ ہو گا خدا کرے۔ اگر وہ خود بھی ہوش میں آ کے اٹھ کھڑا ہوا تب بھی چوہدری صاحب کا کیا بگاڑ لے گا۔ وہ رپورٹ کرے گا کہ "میر ... کے فلاں ٹرک نے جس کا نمبر یہ تھا اور جسے اس حلیے کا ڈرائیور چلا رہا تھا اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اور چوہدری دلاور کہے گا "کیسی باتیں کرتے ہیں اپنے تھانیدار صاحب! اِنہ اس نمبر کا ٹرک ہماری فیکٹری میں ہے اور نہ اس حلیے کا کوئی ڈرائیور۔ ہیں جی! یہ جو بندہ ہے جسے آپ نے شناخت کیا ہے تو یہ ڈرائیور نہیں، فورمین ہے جناب عالی! اور ہرن کیسا؟ آپ مذاق کر رہے ہیں ہم سے اپنے تھانیدار صاحب! چھانگا مانگا میں ہرن کہاں۔ اور ہوں بھی تو ہم کو مرنے جینے کی فرصت نہیں ہم کیا پکڑیں گے ہرن۔ کیا ہمیں معلوم نہیں کہ یہ جرم ہے۔ صوبہ سرحد ... دوست؟ واہ جی واہ! ہم نے تو ابھی تک پنجاب سے آگے کچھ ... ہی نہیں۔ یہ صوبہ سرحد ہے کدھر جناب انسپکٹر صاحب بہادر ... بیچارا انسپکٹر یہی بہتر سمجھے گا کہ چوہدری صاحب ازراہِ عنایت خیر ... جو کچھ بھی دیں، وہی لے کر شکریہ ادا کرے اور رخصت ہو جائے ... لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔

وقت کے ساتھ فاصلے کا احساس بھی باقی نہ رہا۔ رفتہ رفتہ مسلسل جھٹکوں سے میری اپنی حالت غیر ہونے لگی۔ اگر مجھے کنکریٹ مکسر میں ڈال کے گھمایا جاتا تب بھی میری حالت یہی ہوتی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا اور اسی طرح درد کر رہا تھا جیسے دلہن ... میں پہلی رات سرکار کی میزبانی کے بعد درد میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس قید سے نجات کی بظاہر کوئی صورت نظر آتی تھی اور منزل تک پہنچنے سے پہلے اغواکنندگان کے عزائم کا اندازہ بھی محال تھا۔ تاہم وقتی مایوسی اور ناامیدی کا وقفہ گزر گیا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب تائیدِ غیبی کی کیا صورت ہو سکتی ہے — سوائے سوچنے کے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک امید کی کرن ...

چوکیدار کا وجود تھا۔ خدا کرے اسے ہوش آ جائے اور وہ اس قابل ہو جائے کہ رائے عامہ کو متوجہ کر سکے یعنی کسی شہر یا قصبے سے گزرتے ہوئے چیخ و پکار مچا سکے۔ ہاتھوں اور پیروں کے کھل جانے کی امید رکھنا ایسا ہی تھا جیسے میرے گرد مضبوطی سے جمے ہوئے تختوں کی دیوار کے شق ہونے کی توقع رکھنا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ کسی طرح وہ ٹیپ ڈھیلا ہو جائے جس نے میری قوتِ گویائی سلب کر رکھی تھی۔ میں نے ہونٹوں کو جبڑوں کو اور دانتوں کو حرکت دے کر اس ٹیپ سے نجات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی جس کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ٹیپ تو میرے لبوں کے گرد گوشت کے ہر ریشے سے لیول چپکا ہوا تھا کہ اس قسم کی سعی لاحاصل اپنی ہی نظر میں حماقت لگتی تھی۔

پیچھے سے کسی گاڑی نے میوزیکل ہارن دینا شروع کیا۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ یہ غالباً لاہور سے راولپنڈی جانے والی کوئی ویگن تھی جو ذرا سی دیر میں آگے نکل گئی۔ ڈرائیور محض تفریحِ طبع اور اپنی انفرادیت کے مظاہرے کی خاطر ہارن بجا رہا تھا ورنہ اس وقت سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ شہر کے رش میں راستہ مانگنے کے لیے یہ سرگم شاید کسی کے کانوں پر جوں کی طرح رینگتی مگر باہر صرف وہی گاڑیاں تھیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر آ جا رہی تھیں۔ ہارن کی سریلی آواز دور ہوتی گئی پھر دوسرے ٹریفک کے شور میں گم ہو گئی۔ میں اس ہارن کے سُر بھول چکا تھا کہ اچانک میرے کانوں نے وہی آواز پھر سنی۔ ٹرک کی رفتار میں اضافہ نہیں ہوا تھا چنانچہ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ ویگن رُک گئی تھی یا اس کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ ٹرک نے پھر اسے جا لیا۔ دوسری صورت قدرے غیر عملی لگتی تھی کیونکہ ویگن والے تیز رفتاری کے باعث خاصے نیک نام ہیں چنانچہ یہ بات زیادہ قرینِ قیاس لگتی تھی کہ ویگن رکی ہے۔ پیں پاں پیں پیں پاں۔ میوزیکل ہارن کی آواز پھر سنائی دی اور اسی وقت ہم نے انسے کراس کیا۔ ذرا سی دیر کے لیے ویگن کے کنڈیکٹر کی صدا آئی۔ "بھائی چکوال موڑ۔" ہارن پھر بولا۔ سوہاوہ کے قریب بائیں جانب ایک سڑک چکوال جاتی ہے اور ایک سنگِ میل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام آباد کتنی دور ہے۔ مخالف سمت میں لاہور کتنی دور اور بائیں ہاتھ پر چکوال کا فاصلہ کتنا ہے۔ ایسا ہی دوسرا موڑ بہت آگے راولپنڈی کے قریب آتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق ابھی ہم نے اتنا فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔

ٹرک بائیں طرف گھوم گیا۔ ویگن کا میوزیکل ہارن دور سے سنائی دیا۔ پھر قریب آنے لگا۔ اب شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ٹرک چکوال والی سڑک پر جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ویگن پھر آگے نکل گئی۔ ٹرک نے ایک اور موڑ کاٹا اور راستہ مزید ناہموار ہو گیا۔ یہ جہلم کے گرد و نواح کا وہی ناہموار، ٹیلوں اور کھائیوں والا علاقہ تھا جہاں سے میں صبح کار میں گزرا تھا۔ کار تو اب محسن لے جا چکا ہو گا اور میرے غائب ہو جانے سے سب تشویش اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہو گی کہ میرا بریف کیس "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے چوکیدار کے پاس کیسے پہنچا اور میں فیکٹری میں نہیں گیا — تو کہاں گیا۔ رضوی صاحب سخت برہم ہوں گے۔ "یہ سکندر باز نہیں آتا کوئی نیا گل کھلانے سے۔ اسے تو ہر وقت نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ بس غلطی ہو گئی کہ گاڑی کو مرمت کرا کے لانے کی ذمہ داری سونپ دی۔" اور رابعہ سخت فکرمند ہو گی۔ عین ممکن ہے کسی کمرے میں بیٹھی رو رہی ہو۔ میں نے چشمِ تصور سے رابعہ کو اپنے لیے روتے دیکھا اور اس منظر نے مجھے خاصا سامانِ تسکینِ قلب فراہم کیا۔ محسن کیا کرے گا۔ اب تو رضوی صاحب ہی ہیں کہ اپنی پولیس فورس کے ساتھ فیکٹری پر چڑھائی کر دیں اور چوکیدار سے چوہدری دلاور تک سب کو چھان پھٹک کے میرا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ نئے چوکیدار کو کچھ معلوم نہیں ہو گا تو بتائے گا کیا خاک۔ چوہدری دلاور کچھ بتانے والا آدمی ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایسا ایکٹر ہے کہ ایف بی آئی اور اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کے سامنے قتل کر دے اور پھر انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلا دے۔

ٹرک ایک ہچکولے کے بعد رک گیا۔ آگے والے دونوں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں منتظر رہا کہ سفر ختم ہونے کے بعد آزمائش کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید اب وہ میرا قصہ پاک کر کے مجھے اس مقام پر دفن کر جائیں گے جہاں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہو گی ا[illegible] نے یہ بھی سوچا کہ میرے قتل سے دشمنوں کو کچھ حاصل ہوتا تو وہ [illegible] آج سے بہت پہلے ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا نہیں۔ ایس ایس پی ضامن رضوی۔ رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ محسن۔ اے ایس آئی شیخ اور استاد ٹیڈی کے علاوہ میرے اتنے مخلص دوست اور طرفدار ہیں کہ انہیں ہر قطرۂ خون کا حساب دینا پڑے گا اور یہ سب لوگ مل کر انہیں تختۂ دار تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیں گے جن کے دامن پر میرے لہو کا ایک بھی داغ نظر آیا۔ مجھے اتنی دور لانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا جو مجھ پر واضح نہیں تھا۔ تشدد کے ذریعے کوئی تحریر حاصل کرنے یا کسی بات کا اعتراف کرنے کا مسئلہ ہوتا تو لاہور میں بھی حل ہو جاتا۔

لیکن ان کے رکنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تھک گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو رفعِ حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور دوسرا سر درد کی شکایت کر رہا تھا۔ اب وہ دونوں تھرماس میں سے چائے پی رہے تھے، کچھ کھا رہے تھے اور نہ جانے کیوں خاموش تھے۔ پھر وہ ٹرک کے عقبی حصے کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قریب بیٹھ کے سگریٹیں پینے لگے۔ اسی وقت چوکیدار بڑبڑایا۔

"چوہدری... چوہد... ری... صاحب..... ماف... ماف کر دیں مجھے.... آپ کو.... پاک پنج تن کا... واسطہ... مجھے.... مت ماریں.... میرے.... بیوی بچے...."

وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔ شعور اور لاشعور کے درمیان اس کا احساس جاگ رہا تھا اور اسے یاد دلا رہا تھا کہ چوہدری صاحب اس کے قتل کا حکم صادر فرما چکے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شخص جو اپنا گھر بنا لیتا ہے، کسی بھی عورت سے وابستہ ہو جاتا ہے اور باپ بن جاتا ہے اسے اپنی ذات کے مفادات کا تحفظ عزیز نہیں رہتا۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی سے محبت کو بھول جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ، محبت و شفقت، جذبات اور خیالات کی دنیا وہی گھر بن جاتا ہے۔ وہ خود کو اور اپنی زندگی کو اسی گھر میں بانٹ دیتا ہے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں رکھتا، کچھ بھی نہیں مانگتا۔ مرنے سے نہیں ڈرتا لیکن اس خیال سے ڈرتا ہے کہ وہ مر گیا تو اس کے گھر کا کیا بنے گا اور اس کے بیوی بچوں کو وہ سب کون دے گا جو اس کے دم سے انہیں میسر تھا اور اس میں بھی حسرت کا پہلو یہ تھا کہ کبھی کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ انہیں روٹی کپڑا کون فراہم کرے گا اور ان کے مادی وسائل کیا اسباب کیا ہوں گے۔ خدا کے رازق ہونے پر سب کا اعتقاد کامل رہتا تھا اور سب یہ سمجھتے تھے کہ پلنے کو دنیا میں کتے کے بچے بھی پل جاتے ہیں جن کا کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ جذباتی رشتے نہیں ہوتے اور والدین جیسا پرورش کرنے والا نہیں ہوتا۔ اصل کمی محبت کی رہ جاتی ہے اور تربیت کی رہ جاتی ہے اور یہ کمی صرف باپ پوری کر سکتا ہے۔

میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ بیوی اور بچے نہیں تھے لیکن میں نے دنیا میں ہر جگہ خاندان اور گھر سے آدمی کے تعلق کو اسی انداز میں دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا۔

"گامے! ہمیں کام ختم کر کے واپس بھی جانا ہے۔" میں نے ڈرائیور کی آواز کو بہت قریب سے سُنا۔

"دیکھ طافے! اس چوکیدار کو چھوڑ دے۔" دوسرے شخص نے متذبذب لہجے میں کہا جسے گامے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"کیا؟ دماغ چل گیا ہے تیرا۔" طافے نے کہا۔ "اس وقت سڑک پر کوئی نہیں۔ اسے یہیں ڈال کے گاڑی اوپر سے گزار دیتے ہیں۔ اسے لمبائی کے رخ لٹا دے۔ پیچھے والے ڈبل پہیے اوپر سے ایک بار گزر گئے تو قیمہ ہو جائے گا۔ صورت پھر کون پہچانے گا؟"

"طافے! میری بات مان لے۔ یہ بہت غریب اور.... بے قصور آدمی ہے۔ بیوی بچے ہیں اس کے۔"

"طافے نے اسے گالی دی۔ "وہ تو تیرے بھی ہیں۔ چوہدری صاحب تجھے زندہ چھوڑیں گے؟"

"انہیں معلوم ہی نہیں ہوگا۔ میں اس کو سمجھا دوں گا کہ یہ..." گامے نے لجاجت سے کہا۔

"تو سفارش کیوں کر رہا ہے اس کی؟" طافے نے بگڑ کر... "تیرا ماما لگتا ہے یہ؟"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے طافے! یہ میرا ماما ہے۔" گامے... "سگا تو نہیں لیکن اس نے میری ماں کو ہمیشہ بہن کہا تھا اور میں... اسے گاؤں سے بُلا کے نوکری دلائی تھی۔"

"نہیں گامے!" طافے نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں یہ خطرہ نہیں لے سکتا۔ مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں وہی کروں گا جو مجھے چوہدری صاحب نے کہا تھا۔"

"طافے! کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری صاحب... کا انعام تجھے الٹا دیں۔" گامے نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ چوہدری... کے کتنے تابعدار اسی لیے مارے گئے کہ انہوں نے حکم کی تعمیل... وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتا اور اپنے کسی رازدار کو زندہ ہی نہیں رہنے... بعد میں اس کے لیے خطرہ بنے۔"

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔" طافے نے کہا لیکن اب اس... لہجے میں خوف شامل ہو گیا تھا اور اس کا اعتماد کھوکھلا لگتا تھا۔ "اس... علاوہ جھوٹ تو ہمیں ہی بولنا پڑے گا واپس جا کے۔ یہ اعتراف... پڑے گا کہ ہم نے اسے مار دیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔ پھر یہ... جرم کرنے کا فائدہ؟ ہو سکتا ہے چوہدری کو ان پر بھروسہ نہ ہو جو... بات تو کرتا ہے۔ ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کبھی یہ راز... ہو گیا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا اور چوکیدار کو زندہ چھوڑ دیا تھا تو... معاف نہیں کرے گا۔"

"اسے نہیں معلوم ہوگا طافے!" گامے نے کہا۔ "یہ تلہ گنگ... آگے ایک گمنام سے گاؤں میں رہتا ہے۔ ضلع کیمبل پور میں۔ ا... چوہدری کا یا اس کے کارندے کا گزر ہونے کا کوئی سوال نہیں... میں اسے سب بتا دوں گا... کہ روپوش ہو جائے۔"

"بے وقوفی کی بات نہ کر۔" طافے نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کل... تو پرسوں چوہدری ہر اخبار دیکھے گا اور اس کو کسی بھی اخبار میں یہ... ملے گی کہ چکوال جانے والی سڑک پر کوئی نامعلوم شخص کسی بس یا ٹرک... نیچے کچلا گیا تو کیا وہ ہم سے نہیں پوچھے گا؟ کیا جواب دے گا تو...

"ہم..... ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ سڑک پر خطرہ تھا۔ گاڑیاں... آ جا رہی تھیں۔" گامے نے کہا۔ "چنانچہ ہم نے اسے ایک غیر آباد..."

"کیسے گاڑ دیا۔ خالی ہاتھوں سے قبر کھود کے؟" طافے نے... سے کہا۔ "اتنا بے وقوف سمجھتا ہے تو دلاور کو؟ وہ مجھے گردن... کے لے آئے گا کہ بتا اپنے ماما کو کہاں گاڑا تھا۔ پھر وہ تیری قبر بنا دے..."

"کچھ بھی ہو طافے!" گامے نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے...

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

ہوتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ قتل نہیں ہونے دوں گا۔"

"تیرے فیصلے کی ایسی تیسی۔ میں خود کر لوں گا سب کچھ اور دیکھتا ہوں تو مجھے کیسے روک سکتا ہے؟" طافے نے کہا۔ میں دم بخود لیٹا یہ سب سن رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ ان کا اختلافِ رائے تصادم کا باعث بن جائے۔ ان میں سے ایک مارا جائے گا مگر دوسرا بھی شدید زخمی ہو سکتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ ٹرک چلانے کے قابل نہ رہے اور اب جھگڑا واقعی بڑھ گیا تھا۔ غالباً طافے نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور گامے نے اس کا راستہ روکا۔ میں گھپ اندھیرے میں آوازیں سُن کے صرف تصور سے کام لے سکتا تھا۔

طافے نے چلا کے ایک گالی بکی "چھوڑ دے مجھے۔"

"میرا خیال تھا تو ایسے ہی سمجھ جائے گا۔" گامے نے ہانپتے ہوئے کہا "جا کے اپنے ماما کو قتل کر۔" اُس نے گالی دے کر کہا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" طافے نے بھی ہانپتے ہوئے دوسری گالی دی۔ "تو ہے کیا۔" آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گتھم گتھا ہو رہے ہیں پھر ان میں سے کوئی سڑک کی دیوار سے ٹکرا کے کراہا۔ یہ آواز گامے کی تھی۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید گامے کی قوتِ مزاحمت وقتی طور پہ جواب دے گئی تھی۔

"اوئے گامیا! طافے اچانک چلایا۔ وہ تو ہے ہی نہیں۔ بھاگ گیا وہ تیری ماں کا خصم۔"

"بھاگ گیا۔" گامے نے کمزور آواز میں کہا "اب کیا کرے گا تیرا چوہدری۔"

"ابھی تو یہاں تھا وہ۔" طافے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی کہاں جا سکتا ہے وہ۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔ اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ دور گیا ہو۔" پھر ایک جسم کے زمین پہ گرنے کی آواز آئی "چھوڑ میری ٹانگ کتے۔" طافے نے چیخ کر کہا جو شاید گامے کی وجہ سے منہ کے بل گرا تھا۔ گامے نے اس کے بھاگنے سے پہلے ہی اپنی ٹانگ اڑا دی تھی یا پھر ہاتھ بڑھا کے اس طرح طافے کی ٹانگ پکڑ لی تھی کہ وہ چت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک میں صرف گالیوں دھمکیوں اور خالی ہاتھ مار پیٹ کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر ان آوازوں میں تھکن کے اور شکست کے آثار نمودار ہونے لگے۔ غالباً دونوں حریف ہم پلہ تھے اور کسی کو موقع نہیں ملا تھا کہ خنجر پستول استعمال کر سکے چنانچہ دونوں ادھ موئے ہو رہے تھے۔ یہ صورتِ حالات میرے حق میں خوش آئند تھی اور قدرتی طور پر میری جذباتی ہمدردی گامے کے ساتھ تھی۔ وقت کا احساس بے معنی ہو چکا تھا۔ اب صرف انجام کا انتظار تھا لیکن آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں یا مدھم پڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں اس طرح کراہ رہے تھے جیسے نزع کے کرب میں مبتلا ہوں۔

میری اُمیدیں نئے سرے سے بیدار ہو گئی تھیں۔ میں یہ فرض کرنے میں حق بجانب تھا کہ بچ جانے والا بھی اس ٹرک کو اتنی رفتار کے ساتھ، ایسے اندھیرے میں اور ایسے راستوں پر نہیں چلا سکے گا۔ کوشش کی تب بھی ٹرک الٹ جائے گا۔ کسی کھڈ میں گر جائے گا یا کسی چیز سے ٹکرا جائے گا۔ ایسی صورت میں باکس کے گر کر کھل جانے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہ اٹھ سکے اور چند گھنٹے بعد دن کا اجالا نمودار ہوتے ہی اس سڑک پر ٹریفک بحال ہو تو گزرنے والے مدد کے لیے آ جائیں یا پولیس کو بلا لیں۔ یا اس سے پہلے ہی گامے کا ماما کسی کو بُلا لائے۔ مجھے رہائی یقینی نظر آنے لگی تھی لیکن نجات کے بعد بہت سے مسائل کا سامنا بھی یقینی تھا۔ مجھے اس دڑبے سے نکالنے والے پہلا سوال یہی کریں گے کہ میں کون ہوں؟ طافے نے تو مجھے ہرن قرار دیا تھا اور ہرن میں انسان ہونے کے باوجود آ ہوئے صیاد دیدہ تھا لیکن میرا اس ٹرک میں منتقلی اور قریب ہی دو افراد کے مردہ یا نیم مردہ پائے جانے کے اسباب خاصے وضاحت طلب ہوں گے۔ خیر... میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ صفائی کے کٹھن مرحلے مس رابعہ شمس اور مس شہلا پر مشتمل ٹریبونل کے سامنے درپیش ہوں گے جس کے چیئرمین ہوں گے انکل ایس ایس پی۔

اچانک میں نے صندوق کی ایک دیوار پر ٹھک ٹھک سنی۔ خاموشی اتنی گہری تھی اور میں اپنے خیالات میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ اس پر بھی میں اچھل پڑا۔ میرے چونکنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس دستک کا انداز مختلف تھا۔ اس میں سوال تھا کہ بتاؤ کیا تم خیریت سے ہو؟ تم جو بھی ہو میری مدد کے مستحق ہو۔ نہ تم محمود ہو نہ میں ایاز ہوں جسے ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ اگر تم اسی فیکٹری کے مالک ہو جس کا ادنیٰ سا ملازم ہوں تو کیا۔ اس مقام پر اور اس لمحے ہم ایک ہی کشتی کے سوار ایک ہی جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ خود بھی زندہ رہیں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیں۔ میں نے جواب میں اندر سے لاتیں چلائیں۔

"دیکھ میاں! گھبرانا نہیں۔ رب نے چاہا تو سب خیر ٹھیک ہو جائے گا۔" چوکیدار کی نحیف سی آواز آئی۔ اگر میں جواب دے سکتا تو ضرور کہتا کہ یہ فیصلہ تو میرے تمہارے رب نے پہلے ہی کر لیا تھا کہ ابھی ہمیں جینا ہے۔

"جواب دے میاں! کچھ منہ سے بول۔" چوکیدار نے تختے سے منہ لگا کر سرگوشی کی۔ صحرا میں گم گشتہ مسافر کو تلاش کرنے والا ہیلی کاپٹر مسلسل پیغام نشر کر رہا تھا۔ "ہیلو! ہیلو! ہم تمہیں دیکھ نہیں سکتے۔ ہماری آواز سُن رہے ہو تو جواب دو۔" مگر نیم جاں مسافر کے ساتھ ہی اس کا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی بے کار پڑا تھا۔

سمندر کی بیکراں وسعت میں ایک تنکے کا سہارا لے کر جینے کی امید رکھنے والے کو جان بچانے والی کشتی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ کاش اس کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ چلا کے انہیں متوجہ کر سکے جو اتنے قریب آ گئے تھے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے۔

"او بھائی! کوئی اندر ہے؟ کوئی بندہ ہے۔ جیوندا ہے؟" چوکیدار بولا۔ میں نے سر کو دیوارِ زنداں سے ٹکرا کے اثبات میں جواب دیا۔ ہاں میں اندر ہوں۔ میں انسان ہوں اور ابھی زندہ ہوں۔

"اچھا اچھا۔ فکر نہ کر۔" چوکیدار نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اب اپنے وجود کی خبر دے رہا تھا۔ چوکیدار اب ٹرک سے اترا ہے۔ اب اس نے آگے والا دروازہ کھولا ہے۔ اب شاید وہ اندر لگی ہوئی چابیاں نکال لایا ہے۔ اب اس کے ہاتھ ٹول بکس میں صحیح چابی لگا رہے ہیں۔ ٹول بکس کھل گیا ہے۔ اس میں جیک ہو گا ہینڈل ہو گا۔ دھیل اسپینر اور اسکرو ڈرائیور بھی ہوں گے۔ چوکیدار کے ہاتھ اوزاروں کو ٹٹول رہے تھے۔ اوزاروں کی آواز کتنی خوشگوار ہے۔ بالکل رابعہ کی ہنسی۔ رومت رابعہ! تیرے میرے بیچ صرف یہی رات حائل ہے۔ رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سورج تو صرف زمین کے گرد گھومتا ہے۔ چوکیدار نے کوئی بڑا اسکرو ڈرائیور کونے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا اور درز پھیلی تو لوہے کی ہر کیل ہلی جس نے تختوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر رکھا تھا۔ چوکیدار نے اسکرو ڈرائیور کو نیچے لا کے پھر زور لگایا اور ایک تختہ بڑی آواز کے ساتھ ٹرک میں گرا۔ چوکیدار اب ہانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں نے چھ انچ چوڑے شگاف میں سے مجھے دست و پابستہ دیکھ لیا تھا۔ کونے کا تختہ ہی زیادہ کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔ باقی تختوں میں صرف اوپر نیچے کیلیں ٹھونکی گئی تھیں۔ اس نے اوپر سے دوسرے تختے کو الگ کیا اور پھر ہاتھوں سے کھینچ کر نچلے حصے سے جدا کر دیا۔ خلا اب ایک فٹ کا ہو گیا تھا۔ لیکن خستہ جان چوکیدار کی جسمانی قوت اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ میں کینچوے کی طرح نیچے کھسکا۔ جسم کو سمیٹ کر فرش کے ساتھ پوری قوت سے پھیلایا اور میرے پاؤں ایک فٹ کے شگاف سے باہر نکل گئے۔

چوکیدار کے ہاتھ میرے پاؤں سے مس ہوئے۔ اس نے رسی کی مضبوطی اور ہر گرہ کی سختی کا اندازہ کیا اور نہ جانے کیا سوچ کے نیچے اتر گیا۔ ناطاقتی کے سبب وہ ٹرک سے اترنے کے بجائے گرا تھا اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک فٹ کے اس روشندان میں سے اس کا تاریک سایہ دیکھا جس کے پس منظر میں تاروں بھرا آسمان تھا اور پھر کچھ نیچے سرکا۔ چند منٹ بعد چوکیدار پھر نمودار ہوا۔ سخت کوشش سے اس نے اپنے بوجھ کو اوپر گھسیٹا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے تیلی جلائی تو مجھے تھکن کی جگہ اس کے چہرے پہ نور دکھائی دیا۔ جیسے وہ انسان نہیں فرشتہ ہے جو خدا کے حکم سے صرف میری زندگی بچانے کے لیے اترا ہو۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کی پناہ میں دیا سلائی کے ننھے سے شعلے کو روشن رکھا اور آہستہ آہستہ رسی کے نیچے لے آیا۔ ایک تیلی بجھ گئی تو اس نے دوسری جلائی اور رسی کا ایک بل ایک ہی جگہ سے جلنے لگا۔ میں نے پیروں کو پھیلا کے زور لگایا اور ایک بند ٹوٹ گیا۔ باقی بل ڈھیلے پڑ گئے۔ چوکیدار نے ان کو میری پنڈلیوں سے جدا کیا۔ مُردہ ہو جانے والی رگوں میں خون پھیلا تو درد کی ٹیس اٹھی۔ چوکیدار اس تمام کارروائی کے دوران مجھے مسلسل تسلی دیتا رہا تھا اور میرا حوصلہ بڑھاتا رہا تھا۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور دیہاتی لہجے میں۔ لیکن میں الفاظ کے مفہوم پر غور ہی کہاں کر رہا تھا۔ میں تو دل ہی دل میں اس ہستیٔ مطلق کے انتظام اور اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے آدمی کی بےبسی پر غور کر رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ "کُن" کہا اور وہ ہو گیا۔ فتح مندی کا غرور رکھنے والے مٹ گئے اور شکست خوردہ فاتح کہلائے جو خاک نشیں تھے مسند نشین ہوئے۔ جو تاجدار تھے فقیر ہوئے۔ ایک بےبس و فادار، بیہوش و ناتواں چوکیدار کو قتل کرنے والے اس انجام سے دوچار ہوئے جو ان کے تصور میں بھی نہ تھا۔

میں نے جسم کی توانائی کو مجتمع کر کے خود کو کچھ اور نیچے کھینچا یہاں تک کہ میرا دھڑ اس ایک فٹ چوڑے شگاف تک پہنچ گیا۔ اگر میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو میں پہلو کے بل سمٹ کے نکلنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن ہاتھ کمر کی طرف تھے۔ چوکیدار نے تیلی جلا کے دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرے رُک جانے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے وہی اسکرو ڈرائیور اٹھایا اور اوپر سے تیسرے تختے کی درز میں پھنسا کے زور لگایا۔ ہر کیل کسی چٹان میں پیوست پودے کی جڑ کی طرح نکل آئی اور تختہ نیچے کی طرف جھکا تو چوکیدار نے اسے کھینچ لیا۔ نیچے کی کیلیں تختے کے وزن ہی سے مڑ کے الگ ہو گئیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور کھڑے ہونے کی کوشش میں دھڑام سے گرا۔ میرے پیر ابھی جسم کا وزن اٹھا کے توازن برقرار رکھنے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ چوکیدار نے میرے منہ پر سے ٹیپ اتار دیا۔

"نا۔ نا۔ ہولے ہولے پُتر۔" چوکیدار نے مجھے سہارا دیا اور مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ مجھ سے زیادہ تو خود چوکیدار کو سہارے کی ضرورت تھی۔ جسمانی طور پر وہ مجھ سے کم اور عمر میں بہت زیادہ تھا۔ میرے تو صرف ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے لیکن وہ سر کی چوٹ کے اثر سے گھنٹوں بیہوش پڑا رہا تھا اور پھر بھی یہ اسی کی ہمت تھی کہ اپنے ساتھ اس نے مجھے بھی بچا لیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اتر کے بھاگ جاتا۔ اب اس نے آہستہ آہستہ میرے ہاتھ سے لپٹی ہوئی رسی کھولی جو ہتھکڑی سے زیادہ مضبوط تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو سیدھا کیا تو میرے شانوں کا ہر جوڑ اور بازوؤں کا ہر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پٹھا درد بن گیا۔ مجسم درد جو کلائیوں سے آگے انگلیوں میں اور انگلیوں کی پوروں تک پھیلتا چلا گیا۔ میں لکڑی کے اسی صندوق کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میری جسمانی توانائی بڑی سرعت سے بحال ہونے لگی تھی۔ دورانِ خون کے معمول پر آجانے کے بعد ہاتھوں اور پیروں کا درد ناقابلِ برداشت نہیں رہا تھا۔ چوکیدار میرے سامنے بیٹھا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان پڑھ۔ کم حیثیت اور کمزور شخص نے ابھی تک مجھے پہچانا نہیں تھا۔

"بابا!" میں نے کچھ دیر بعد کہا "آج تم نے میری زندگی بچالی۔"

"نا پُتر! ایہہ کفر دا کلمہ ہے۔" وہ انگلی اوپر اٹھا کے بولا۔ "اس دا حکم نہ ہووے تو بندہ کیا کرسکتا ہے۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ اس حالت میں بھی تم نے حوصلہ نہیں ہارا اور میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔" میں نے ہاتھوں پیروں کو متحرک رکھتے ہوئے کہا "تمہارا یہ احسان بھی مجھ پر ایک قرض رہے گا۔ جب چاہو وصول کرلینا۔ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

کی جاناں میں کون بُلیا۔ میں کون ہوں اے ہم نفسو۔ اگر میری اصل دیکھی جائے تو میں ایک پرنس ہوں۔ میری رگوں میں ایک نواب خاندان کا خون دوڑ رہا ہے اور میں ایک شہزادہ ہوں کیونکہ پدرم سلطان بود۔ باپ بن کے پرورش کرنے والا شخص وزیر خان تھا۔ بے شک زندگی خدا کی دی ہوئی تھی مگر اس کی حفاظت دوسروں نے کی۔ اور وہ سب بھی اپنا اپنا قرض مجھ پر چھوڑ گئے۔ یوم حشر میں کس کس کا قرض چکاؤں گا۔ سلامت شاہ کا؟ اس نابینا بوڑھی عورت کا جس نے میری امانت میرے حوالے کرنے سے پہلے فرشتۂ اجل کا مقابلہ کیا؟ فقیرانہ بھیس بنا کے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے والے فو مانچو کا؟ اس بوڑھے گورکن کا جو زندہ درگور ہوا؟ بار بڑھتا جا رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے مقروض ہونے کی ایک اور دستاویز اس چوکیدار کے حوالے کردی ہے۔ رابعہ اور اس کی ماں۔ محسن اور اس کی ماں۔ یہ سب مجھ پر احسانات کرتے جا رہے ہیں یا کر کے گزرتے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی اتنی توفیق دے خداوندا کہ میں سر اٹھا کے چل سکوں۔

"دیکھو بابا!" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ سگریٹ لائٹر اور پیکٹ میری جیب میں موجود تھے۔ "میں بھی اس فیکٹری کا ایک مالک ہوں جس میں تم چوکیدار ہو۔ چوہدری دلاور کی طرح۔ میں وزیر خان کا بیٹا ہوں۔"

"آپ... آپ وزیر خان مرحوم کے..." شدتِ جذبات سے اس کی آواز بند ہوگئی۔

"ہاں۔ میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے سگریٹ جلا کے ایک طویل کش لیا۔ "چوہدری دلاور مجھے اپنے راستے سے ہٹا فیکٹری کا مالک بننا چاہتا ہے۔ آج اس نے مجھے دھوکے تھا اور شاید یہ لوگ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے لے جا رہے تھے نے تفصیلات اور الجھنوں کا حوالہ دیے بغیر اسے سیدھے ساد یں وہ بات بتائی جو اس کا ذہن آسانی سے قبول کرلے۔ "میر وہ تمہیں بھی قتل کر دیتے کیونکہ تم نے مجھے فیکٹری میں آتے دیکھ مگر ابھی تم کہاں غائب ہوگئے تھے اچانک؟"

"وہ... میں... معلوم نہیں جی کیسے میں نیچے اترا اور ٹرک نیچے گھس گیا۔ انہوں نے مجھے کیوں مارا تھا جی؟"

"چوہدری دلاور اور اس کے چمچوں کو ڈر تھا کہ تم پولیس کو دو گے۔" میں نے کہا "جب میں غائب ہوجاؤں گا تو پولیس تفتیش لیے فیکٹری بھی جائے گی۔ میں نے ایک بریف کیس تمہارے حوال تھا۔ کچھ یاد ہے؟"

"ہاں۔" اس نے سر پہ ہاتھ رکھ کے ذہن پر زور دیا۔ "اور اسے کوئی لینے آیا تھا۔ کیا نام تھا اس کا... احسان؟"

"نہیں۔ وہ محسن خان تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہی تمہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ لیکن چوہدری دلاور ڈرتا تھا کہ تم یہ سب کچھ پو کو بتا دو گے۔ اس نے مجھے صندوق میں ڈالا اور تمہیں مار کے ٹر میں ڈال دیا۔ طافے اور گامے نام کے دو شخص ہمیں یہاں تک تھے۔ یہ چکوال جانے والی سڑک ہے۔ جہلم سے آگے سوہاوہ موڑ

"گاما کون جناب؟" چوکیدار نے مضطرب ہو کے میری کاٹ دی۔ "غلام محمد؟"

"ہاں۔ وہ جو تمہاری منہ بولی بہن کا لڑکا تھا۔" میں نے کہا۔ چوکیدار اب حفظِ مراتب کے خیال سے محتاط اور مؤدب ہوگیا تھا۔

"وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ گاما مجھے قتل نہیں کرسکتا جناب" وہ بڑے دکھ اور یقین کے ساتھ بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا "اسی نے طافے سے کہا کہ تمہیں چھوڑ دے۔ اس بات پر ان میں جھگڑا ہوا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا جناب! آپ تو کچھ نہیں دیکھ سکتے" اس کا لہجہ بے یقینی کا آئینہ دار تھا۔

"ہاں۔ لیکن میں سب سن رہا تھا۔ اور اندازہ کر رہا تھا۔" نے کہا۔ "انہوں نے ایک دوسرے کو بہت مارا۔ اور میرا خیال وہ کہیں قریب ہی بے ہوش پڑے ہوں گے۔ ہم ابھی دیکھ لیتے اب میں بھی چل پھر سکتا ہوں۔"

وہ مجھ سے پہلے نیچے اتر گیا۔ "گامے!" اس نے ایک منہ پر رکھ کے آواز دی اور پھر دوسری طرف منہ کر کے پکار "پُتر غلام محمد!" لیکن ان دونوں کو پہلے

پر لہولہان اور بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ اب یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہوں۔ میں نے لائٹر کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں ان کی کھلی آنکھوں کو دیکھا اور ان کے زخموں کا معائنہ کیا۔ بظاہر ان کی موت زیادہ خون بہہ جانے سے واقع ہوئی تھی لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پہلے ایک نے دوسرے کو مار دیا ہو اور پھر کسی اندرونی چوٹ کے باعث خود بھی مر گیا ہو۔ لائٹر کی روشنی دیکھ کے چوکیدار میری طرف آیا۔

"گامیا...!" نصف شب کے سکوت میں اس کی چیخ نے جنگل کی ویران فضا کو جھنجوڑ دیا۔ "او دے ظالما۔ مینوں مار دیناسی۔ اوئے اپنے مامے نوں قتل کر دیناسی۔ تیری ماں نوں کی دساں گا میں کہ تیرا پُتر میرے لئی مر گیا۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا اور اس بھانجے کے لیے بین کر رہا تھا جس کو ایک نہ ایک دن اسی انجام سے دوچار ہونا تھا۔ عیدل کی طرح اس نے بھی انسانیت کے رشتوں کا تقدس تمام عمر پامال کیا تھا مگر مرتے مرتے ایک لمحے کی جذباتی طاقت نے اسے جان دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جس کے خون کا اس کے خون سے براہِ راست کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں نے چوکیدار کو ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔

"گامے کے لیے اب تم کچھ نہیں کرسکتے۔" میں نے کہا "سوائے مغفرت کی دعا کے۔ مگر جو کچھ وہ تمہارے لیے کرنا چاہتا تھا وہ مت بھولو۔ وہ تمہیں بچانا چاہتا تھا۔ مرتے دم تک اس نے یہی خواہش کی تھی۔"

میں اسے کھینچ کر ٹرک تک لے آیا۔ آگے ڈیش بورڈ کے نیچے پینے کے پانی سے بھرا ہوا پلاسٹک کا جیری کین رکھا ہوا تھا۔ میں نے چند گھونٹ اس کو پلائے اور پھر بوتل اپنے منہ سے لگالی۔ آدھی کے قریب بوتل خالی کر کے مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا پیاسا تھا لیکن ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو کے چھوٹی چھوٹی مشکلات کی طرف کس کا دھیان جاتا ہے۔

"اس ٹرک کو ایک خاص وقت پر کسی جگہ پہنچنا تھا۔" میں نے کہا "اور صبح ہوتے ہی لاہور لوٹ جانا تھا۔ جب دیر ہوگی تو یقیناً شکاری اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے۔ میرا مطلب ہے چوہدری دلاور کے آدمی۔ اور ہم یہیں بیٹھے ملے تو وہ اپنا کام کر جائیں گے۔ گامے کی یہ آرزو مر کے بھی پوری نہیں ہوگی کہ تم زندہ رہو۔ اس لیے اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم میرے ساتھ بیٹھو۔ ٹرک میں چلاؤں گا۔ چلو۔" میں نے اس کا بازو تھام کے کہا۔

"لیکن گاما؟ کیا وہ یہیں پڑا رہے گا؟" اس نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ "وہ میری خاطر مر گیا اور..."

"گامے کو پولیس پہنچا دے گی۔" میں نے کہا۔ "کل پرسوں تک اس کی لاش گاؤں پہنچ جائے گی۔ ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ راستے میں کسی نے دیکھ لیا تو بہت سی قانونی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔"

"میں اسے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا مالک!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "آپ جائیں۔"

مجبوراً میں نے گامے کی لاش کو اٹھا کے ٹرک کے پچھلے حصے میں اسی صندوق کے اندر رکھا جس میں کچھ دیر پہلے میں قید تھا۔ لاش کو چھپانے کے لیے مجھے باکس کا رخ بدلنا پڑا تاکہ کھلا حصہ دوسری طرف ہو جائے۔ خطرہ اس کے باوجود تھا کہ راہ میں کوئی چیک نہ کرلے لیکن فوری طور پر اس سے زیادہ پریشان کن مسائل دو تھے۔ ایک یہ کہ کہیں واپسی کے سفر میں خالی سڑک پہ شکاری نہ مل جائیں۔ وہ ٹرک کو فوراً شناخت کرلیں گے اور ان کا مقابلہ آسان نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ مسلح ہوں گے۔ دوسرا مسئلہ چوکیدار اور گامے کا تھا۔ چوکیدار کو میں بآسانی بس یا ویگن میں بٹھا کے روانہ کرسکتا تھا اور سمجھا سکتا تھا کہ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے وہ روپوش رہے لیکن لاش کو تلہ گنگ کے پہاڑی علاقے میں کسی دور افتادہ گاؤں تک پہنچانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ گاما طبعی موت مرا ہوتا تو میں اس کے تابوت کو پورے ٹرک کا کرایہ ادا کر کے بھیج سکتا تھا۔ وہ رقم بھی میری جیب میں محفوظ تھی جو رضوی صاحب نے گاڑی کی مرمت کے اخراجات کے لیے دی تھی لیکن گاما ایک خون آلود لاش تھا جسے کسی ایمبولینس یا ٹرک کے ذریعے اس وقت تک ارسال نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مرحلے طے نہ ہو جائیں اور پوسٹ مارٹم نہ ہو جائے۔ اس چکر میں چوکیدار کے لیے بہت خواری تھی اور روپوشی ناممکن تھی چنانچہ دوسری صورت یہی رہ جاتی تھی کہ میں خود لاش کو اس کے گاؤں تک پہنچاؤں اور کسی قسم کی قانونی کارروائی کے بغیر تدفین کرا دوں۔ چوہدری دلاور کو معلوم ہی نہ ہوگا کہ طافے کیسے مارا گیا اور گاما کدھر گیا۔ لیکن یہ بڑا لمبا اور خطرناک کام تھا۔ ٹرک پر "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹرک جہاں سے بھی گزرتا پہچانا جاتا۔ خصوصاً چھوٹے قصبوں اور دیہات میں۔ اور اگر ایک طرف کا سفر چھ سات گھنٹے کا ہو تب بھی تدفین کے بعد لاہور پہنچنے کے لیے مجھے دو دن درکار تھے۔ ایک عام ڈرائیور کے مقابلے میں میری پوزیشن قدرے بہتر تھی۔ میں کسی بھی پولیس افسر سے زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرسکتا تھا۔ ان میں اتنا دم خم نہیں ہوتا کہ کسی فیکٹری کے مالک سے اکڑ فوں کرسکیں جو فر فر انگریزی بولتا ہو۔ میرا دوسرا سہارا ساڑھے تین ہزار کی وہ رقم تھی جو میری جیب میں محفوظ رہ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میرے دشمنوں کو میرے پیسے کی ضرورت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہی نہیں تھی۔

میں نے لاش کے بارے میں ساری صورتِ حال چوکیدار کو سمجھا دی۔ "اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں خود تمہیں گاؤں چھوڑ آؤں۔ گاؤں میں کوئی تھانیدار ہے؟"

"نہیں سرکار! تھانہ تلہ گنگ کا ہی لگتا ہے۔" وہ بولا۔ "وہ گشت پر آتے رہتے ہیں۔"

"حرام کھانے اور ہراساں کرنے کے لیے؟" میں نے کہا۔ "خیر۔ تم کو بیان دینا ہے کہ گاما کوٹھے سے گر گیا تھا۔ مار پیٹ، چوہدری دلاور یا طافے کا ذکر نہیں کرنا ہے۔ سمجھے؟ ورنہ پھنس جاؤ گے لمبے چکر میں۔ گامے کی ماں کو سمجھانا تمہارا کام ہے۔ گاؤں والوں کو صرف یہ معلوم ہوگا کہ گاما رات کو چھٹی لے کر گھر آیا تھا اور ذرا سی دیر بعد یہ حادثہ پیش آگیا۔ پھر فوراً تدفین کرا دینا۔ لاش کو صاف ستھرا کر کے۔"

"جو آپ کا حکم سرکار!" اور میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا۔ اپنے اندازے پر بھروسہ کرتے ہوئے میں بہت جلد اس سڑک پر آگیا جو سوہاوہ کے قریب جی ٹی روڈ سے جا ملتی تھی۔

"مقصد صرف یہ ہے کہ بات جتنی جلدی ختم ہو جائے، اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ چوہدری دلاور تک پہنچ جائے گی۔" وہ سادہ لوح اور سیدھا سادا آدمی تھا جس کا ذہن شکوک، وسوسوں اور اندیشوں کے جنگل سے دور رہتا تھا۔ ورنہ وہ پوچھ سکتا تھا کہ آخر چوہدری دلاور سے یہ بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔ کیا گاؤں کے لوگ اس ٹرک کو اور اس ڈرائیور کو نہیں پہچان لیں گے جو خود کو فیکٹری کا مالک کہتا تھا۔ کیا فیکٹریوں کے مالک خود اپنے ملازموں کی میت ان کے آبائی گھروں تک پہنچاتے ہیں۔ میں خود نہیں چاہتا تھا کہ اس ٹرک میں میں خود اپنا اشتہار دیتا ہوا اتنی دور تک جاؤں لیکن اس مسئلے کو کسی اور طریقے سے حل کرنے کی ابھی تک میرے ذہن میں کوئی صورت نہیں آئی تھی۔ چنانچہ میں نے اس پر سوچ بچار ملتوی کر دی۔

"تم وزیر خان کو جانتے تھے چوکیدار؟" میں نے اچانک کہا۔

"آتے جاتے دیکھا تھا جناب!" چوکیدار بولا۔ "سلام کا جواب بڑی خوش اخلاقی سے دیتے تھے۔ گھر بار کا حال بھی پوچھ لیتے تھے۔"

"وہ باقاعدگی سے فیکٹری میں آتے تھے؟ ہر روز؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو ہر روز ہی آتے تھے۔ پھر کبھی کبھار آنے لگے۔ میں نے سنا تھا وہ بیمار ہیں۔ آخری بار آئے تھے تو وہ بہت کمزور تھے۔" وہ بولا۔ "میر صاحب کے ساتھ آتے تھے۔"

"اور میر صاحب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ غالباً اسے علم نہیں تھا کہ مجھ پر میر صاحب کے قتل کا الزام ہے۔

"وہ بھی اچھے آدمی تھے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔" چوکیدار بولا۔ "مجھے انہوں نے ہی ملازم رکھا تھا۔"

"کب؟" میں نے کہا۔ "تم سے پہلے تو صرف گاما یہاں کام کرتا تھا۔"

"ہاں جی۔ اسی نے مجھے چھٹی ڈالی تھی۔" وہ بولا۔ "پہلے میں میر صاحب کا چپراسی تھا۔ پھر یہاں چوکیدار مر گیا۔ میرا مطلب ہے فیکٹری میں۔ کسی نے اسے رات کے وقت مار دیا۔"

"مار دیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کیسے؟ اور کتنی پرانی بات ہے یہ؟"

"سال ہو گیا جناب! یا ہونے والا ہے جناب!" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "اس کی لاش فیکٹری گیٹ سے سو گز دور جی ٹی روڈ پر ملی تھی۔ کوئی اسے کچل کے فرار ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ روڈ پر کیا لینے گیا تھا۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ روڈ تک وہ خود نہیں گیا تھا، لے جایا گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج وہ خود چکوال روڈ تک لایا گیا تھا۔ صبح اس کی بھی کچلی ہوئی مسخ شدہ لاش ملتی اگر گاما دخل در معقولات نہ کرتا۔ ایک حادثہ جی ٹی روڈ پر پیش آچکا تھا چنانچہ انہی حالات میں ویسا ہی دوسرا حادثہ شکوک کو جنم دیتا۔ یہ اہتمام اسی لیے تھا کہ اس بار کوئی چوکیدار کی لاش کو شناخت تک نہ کر سکے اور یہ ذکر تک نہ ہو کہ "ایم ڈبلیو ڈی بلڈنگ کمپلیکس" کا دوسرا چوکیدار بالکل اسی طرح مارا گیا جیسے پہلا مارا گیا تھا۔ آنے کو تو تیسرا بھی آجاتا جو دونوں اموات کو اتفاق پر معمول کرتا تا وقتیکہ تیسرا خود شکار نہ ہوتا لیکن پولیس اتفاقات کو اتنی آسانی سے تسلیم نہیں کرتی۔ ہر چوکیدار محرمِ رازِ درونِ میخانہ ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کون آرہا ہے اور کیا جارہا ہے اور تجسس کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن وہ فرض شناسی کو ضروری سمجھتے ہوئے روک ٹوک کرنے لگے یا سچ مچ کا چوکیدار بن کے کوئی ناجائز چیز ناجائز طریقے پر نہ نکلنے دے تو حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور شکاری ہمیشہ وہی رہتے ہیں جو کبھی سامنے نہیں آتے۔

"چوکیدار!" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ سوہاوہ موڑ اب زیادہ دور نہیں رہا تھا۔ مجھے جی ٹی روڈ پر ٹریفک لائٹس نظر آنے لگی تھیں۔ "تم کو سال بھر میں معلوم تو ہو گیا ہوگا کہ فیکٹری میں زرعی مشینری اور آلات بنتے ہیں۔ کیا اس عرصے میں تم نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی؟ مثلاً یہ کہ اندر کوئی غلط کام ہو رہا ہے۔ یا فیکٹری میں غلط قسم کے لوگ آنے لگے ہیں؟"

"نہیں مالک! ہمارا کام دروازے کے باہر تھا۔ اندر کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔" وہ بولا۔ "بابو جیسے چٹ بنا دیتا تھا اسے اندر جانے کی اجازت تھی۔ اندر سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو پاس کے بغیر [illegible] نہیں جاتی تھی اور پاس پر خود چوہدری صاحب دستخط کرتے تھے۔"

"جس بابو کا تم ذکر کر رہے ہو" میں نے کہا۔ "وہ جو باہر کیبن میں بیٹھا ہر وقت جاسوسی ناول پڑھتا رہتا ہے، اسے ملازم ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟" میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ کلرک اس چوکیدار کے مقابلے میں زیادہ معلومات رکھتا ہو۔

"وہ بھی نیا آدمی ہے جناب!" چوکیدار بولا۔ "پہلے میں آیا تھا، دو چار دن بعد وہ آگیا۔"

"اور اس سے پہلے وہاں کون تھا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ "کیا وہ بھی حادثے میں مر گیا تھا۔ یا قتل ہو گیا تھا؟"

چوکیدار نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں جی! یہ کام پہلے طافے کرتا تھا جو اب الطاف فورمین کہلاتا ہے۔"

جی ٹی روڈ سے فرلانگ بھر پہلے میں نے ٹرک کو روک لیا۔ باہر نکل کے میں نے ٹرک پر لکھی ہوئی عبارت پر غور کیا۔ ٹرک کا رنگ دونوں طرف سے نیلا تھا اور اس پر فیکٹری کا نام سفید رنگ سے بعد میں لکھا گیا تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر یا ہاتھ پھیرنے سے سفید حروف ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے سب سے بڑا پیچ کس اٹھایا اور بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے لفظ کو کھرچنے لگا۔ پرانے سفید رنگ کی پپڑیاں سی اکھڑتی گئیں اور ٹرک پر "وزیر اینڈ کمپنی" باقی رہ گیا۔ لیکن یہ نام بھی "میر وزیر اینڈ کمپنی" سے خاصا مشابہ تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس میں مزید کیا رد و بدل کر دوں۔ پھر مجھے ایک طریقہ سوجھ گیا۔ میں نے وزیر کے انگریزی میں لکھے ہوئے لفظ کا پہلا حرف W جزوی طور پر یوں مٹا دیا کہ بائیں طرف سے W کی صرف ایک لکیر نہ رہی۔ ڈبلیو اپنی شکل بدل کے این ہو گیا اور جو پہلے وزیر اینڈ کمپنی تھا وہ نذیر اینڈ کمپنی ہو گیا۔ سفید حروف کے نیچے سے ٹرک کا اصل نیلا رنگ نکل آیا تھا چنانچہ ایک نظر میں دیکھنے والے کو یہ تبدیلی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔

دوسرا مسئلہ نمبر کا تھا اور فوری طور پر حل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمبر سیاہ پلیٹ پر سفید رنگ سے لکھے ہوئے تھے۔ اس کو میں نے سر دست التوا میں رکھنا بہتر سمجھا۔ آگے گوجر خان سے بھی مجھے کالا یا سفید رنگ ملنے کی امید تھی۔ لیکن میں نمبروں کو پینٹ سے بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے عام کالی روشنائی ہی کافی تھی اور تھوڑا سا سفید کاغذ اور گوند۔ ایک کے ہندسے پر سفید کاغذ کی پٹی چپکا کے میں اسے سات بنا سکتا تھا اس طرح کہ جب تک کوئی قریب آ کے نہ دیکھے سفید پینٹ اور سفید کاغذ میں فرق محسوس نہ کر سکے۔ کالی روشنائی میں سفید پینٹ پر پھیر دیتا تو ایل کا ایک بازو انگریزی حرف آئی رہ جاتا۔ آٹھ کے اوپر والے حصے میں دائیں جانب تھوڑی سی سیاہی ملنے سے چھ کا ہندسہ بن سکتا تھا اور اس کے بعد نمبر پلیٹ بالکل مختلف ہو جاتی۔ واپس آتے ہوئے نمبر پلیٹ کو دھو دینا کافی تھا۔ کاغذ اور روشنائی بہہ کر صاف ہو جاتے اور اصل نمبر پھر نمودار ہو جاتے۔

ابھی صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ باکس اور اس میں رکھی ہوئی لاش کا مسئلہ میں نے یوں حل کیا کہ لاش کو باہر رکھ کر چوکیدار کی مدد سے خالی بکس اور اکھڑے ہوئے تختے سب نیچے لڑھکا دیے۔ پتھریلی زمین کے نشیب و فراز میں لڑھکنے والا صندوق سو فٹ کی گہری کھائی تک پہنچتے پہنچتے پاش پاش ہو چکا تھا۔ لاش اب کھلے ٹرک میں رکھی تھی۔ ٹرک کی تینوں دیواریں تقریباً دو دو فٹ بلند تھیں۔ چنانچہ بالکل آخری حصے میں رکھی ہوئی لاش کو کوئی اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ قریب آ کے اندر نہ جھانکے۔ یہ صورتِ حال اطمینان بخش تو نہیں تھی لیکن میں نے اس کا بھی کوئی بہتر طریقہ اختیار کرنے کا۔۔۔۔۔۔۔ مسئلہ حالات پر چھوڑ دیا اور ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ سوہاوہ کے قصبے کا بازار صبح کے دھندلکے میں ویران پڑا تھا۔ آبادی سے نکلتے ہی کھیت آگئے۔ پھر ایک جگہ میں نے سڑک کے بہت قریب ایک کچا گھر دیکھا۔ باہر کھلی ہوا میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ دونوں پر بستر بھی تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی کوئی اٹھ کے کسی کنوئیں یا نہر پہ نہانے گیا ہوگا یا کسی مسجد میں نماز پڑھنے۔ میں نے ٹرک روکا اور بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بستر سمیٹ کر بغل میں دبایا اور دوسرے میں بان کی چارپائی اٹھا کے دوڑا۔ جب میں چارپائی کو ٹرک میں ڈال چکا تھا تو اندر سے نکلنے والے ایک بچے نے چلانا شروع کیا۔ میں نے بستر بھی ٹرک میں پھینکا اور ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کر ٹرک اسٹارٹ کر دیا۔

ایک میل آگے جا کے میں نے چوکیدار کو مدد کے لیے طلب کیا۔ ہم نے چارپائی پر بستر بچھا کے لاش کو اس کے اوپر لٹا دیا اور چادر اس طرح پھیلا دی کہ صرف چہرہ نظر آئے۔

"اب راستے میں اگر کوئی پوچھے تو کہنا میرا لڑکا ہے۔ علاج کے لیے پنڈی لے جا رہا ہوں۔" میں نے چوکیدار کو سمجھایا۔

"لیکن جناب! زندہ مردہ کا فرق تو نظر آجاتا ہے۔" چوکیدار نے کہا جو میری اس کارروائی سے پریشان بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔

"فرق تمہیں نظر آرہا ہے کیونکہ تم حقیقت جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ بیہوش یا بے جان آدمی ایک جیسے لگتے ہیں، جب تک کوئی نظر جما کے نہ دیکھے کہ سانس بھی چل رہی ہے یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ کسی نے پوچھا تو تمہارے جواب سے یقیناً مطمئن ہو جائے گا۔ شک کی بات ہی نہیں ہوگی تو کوئی اتنے غور سے نہیں دیکھے گا۔"

مردہ بدست زندہ۔ خود چوکیدار بھی میرے رحم و کرم پر تھا اور مطمئن اس لیے تھا کہ میں یہ سب کچھ اس کی بھلائی کے لیے کر رہا تھا۔

"اب تک تو میں تمہیں چوکیدار کہتا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"فلک شیر جناب"۔ وہ بولا "ویسے سب لوگ شیرو کہتے تھے"۔

"اچھا تو فلک شیر!" میں نے کہا "کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہیں ابھی سے سمجھ لینی چاہئیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چوہدری دلاور نے تمہیں قتل کرا کے دفن کرانے کا پورا بندوبست کر لیا تھا اور۔ شاید میرا بھی۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ تم بچ کر نکل گئے ہو یا انہیں شبہ ہوگا کہ خانے کی موت اس مشن سے پہلے واقع ہوگئی تھی تو وہ پریشان بھی ہوں گے اور برہم بھی۔ وہ کوشش کریں گے کہ تمہارا اور گامے کا پتا چلائیں اور پھر تم کو قتل کرا دیں۔ یہ بتاؤ تم لاہور میں کہاں رہتے تھے؟"

"میں گامے کے ساتھ تھا جناب"۔ چوکیدار بولا "محلہ بی بی پاکدامن میں ایک کمرہ تھا"۔

"آفس میں تمہارا یا گامے کا پتا لکھا ہوا تھا؟ گاؤں یا گھر کا؟" میں نے کہا۔

"ہوگا جی"۔ چوکیدار نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں"۔

"گاؤں سے تمہارے خطوط تو آتے ہوں گے؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"گامے کی ماں منشی سے چٹھیاں لکھواتی رہتی تھی۔ میری بیوی خود لکھتی تھی۔ وہ چار جماعت پڑھی ہوئی ہے"۔

"اور یہ سب خط تم پھاڑ دیتے تھے یا محفوظ رکھتے تھے؟" میں نے کہا۔

"کاکے کی ماں کے سارے خط میں نے بکسے میں ڈال چھوڑے تھے جناب! گاما بھی ماں کے خطوں کو سنبھال کے رکھتا تھا"۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا "پھر تو وہ بہت جلد تمہارے گاؤں پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ تم گاؤں چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ گامے کی ماں کو رہنے دو۔ اسے وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی ہے؟"

"گامے کے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ دونوں کی عمریں کم ہیں، دونوں ابھی بچے ہیں۔ سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں"۔ وہ بولا۔

"بس تو تم اپنی فیملی کو لے کر نکل جاؤ۔ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کچھ عرصہ چھپ کے رہ سکو اور کسی کو معلوم نہ ہو"۔ میں نے کہا۔

"کراچی میں بھائی ہے میرا"۔ وہ بولا "کسی افسر کے پاس ڈرائیور ہے"۔

"بس اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ کے مجھے ایک خط ڈال دینا"۔ میں نے کہا۔

"لیکن۔۔۔ جناب! کراچی پہنچنے کے لیے گاڑی کا کرایہ۔ اور وہاں پہنچ کے بھائی پر بوجھ بننا"۔

"تم اس کی بالکل بھی فکر مت کرو"۔ میں نے ٹرک چلاتے چلاتے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سارے نوٹ لے اسے تھما دیے۔

"یہ ساڑھے تین ہزار کے قریب ہیں۔ دو ہزار تم رکھ لو۔ کراچی پہنچنے کے لیے کافی ہوں گے۔ باقی مجھے دے دو۔ مجھے بھی واپس پہنچنا ہے۔ چلو ڈھائی ہزار رکھ لو۔ ہزار مجھے بہت ہوں گے۔ جب تک تم کراچی میں رہو گے تمہیں ہر ماہ ایک ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ وہاں روزگار بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ تمہارا بھائی مدد کرے گا تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور تم اس پر بوجھ نہیں بنو گے۔ جیسے ہی حالات میرے قابو میں آئے میں تم کو بلا لوں گا۔ اس وقت تو میں کوئی انعام دینے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتا لیکن جب میں اس قابل ہو جاؤں گا تو تمہیں انعام ضرور ملے گا"۔

"کس بات کا انعام سرکار؟" چوکیدار ہکا بکا بیٹھا تھا۔

"تم نے آج میری زندگی بچا کے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں چکا نہیں سکتا"۔ میں نے کہا "تمہاری ہمت اور محنت کا انعام ضرور دوں گا لیکن اس دن جب حالات سازگار ہوں گے تمہاری توقعات سے بڑھ کر"۔

"آپ۔۔۔ آپ کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہے سرکار!" فلک شیر نے کہا "آپ کہاں جائیں گے؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا"۔ میں نے کہا "تمہارے بدنصیب بھانجے کی آخری رسوم میں شرکت کے بعد واپس لاہور جاؤں گا۔ لیکن پھر بھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ تم گاؤں میں میرا نام نذیر صاحب بتاؤ گے کیونکہ ٹرک پر "نذیر اینڈ کمپنی" رہ گیا ہے۔ تاکہ جب کوئی ہیرو وزیر اینڈ کمپنی یا سکندر بخت کو تلاش کرتا ہوا پہنچے تو کسی سے کچھ نہ معلوم ہو کہ میں اسی ٹرک میں تمہارے ساتھ گاؤں گیا تھا۔ تم کو گاؤں میں دو چار دن سے زیادہ نہیں رہنا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم گامے کا سوئم ہوتے ہی روپوش ہو جاؤ۔ اپنی بیوی کو بھی یہ بتانا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور اب وہیں رہیں گے جہاں میں کام کرتا ہوں مگر اسے تاکید کر دینا کہ کسی سے کچھ نہ کہے۔ عورتیں بات کو چھپا نہیں سکتیں۔ اگر وہ کسی کو بتانے کی غلطی کرے گی تو بھی لاہور ہی بتائے گی۔ پھر تم کراچی کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جب کراچی پہنچ جاؤ تو اپنے بھائی سے کسی بات کا ذکر مت کرنا۔ بس یہی کہہ دینا کہ تلاشِ روزگار میں آیا ہوں"۔

"اور اگر اس نے پوچھا کہ ہزار روپیہ مہینہ کون بھیج رہا ہے پھر؟"

"اسے بتا دینا کہ ایک دوست ہے۔ ملازمت اور الگ گھر ملنے تک مدد کرے گا۔ جب تم الگ رہنے لگو گے تو بھائی کو کیا معلوم ہوگا"۔ میں نے کہا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے۔ اسے بہت سے جھوٹ بولنے کے لیے اور نقلِ مکانی یا جلاوطنی قبول کرنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا۔ وہ گاؤں کا باسی تھا جس کے رشتے زمین سے اتنے ہی گہرے

ہوتے ہیں جتنے پرانے ہوں۔ برگد کے درخت کی طرح۔ سنگ و خشت کی دیواروں کی طرح نہیں جن کی بنیادیں ایک دو فٹ مٹی کے بعد نہ ملیں چنانچہ شہروں میں رہنے والے گھروں سے ناتے نہیں جوڑتے خواہ ان کا اپنا ہو یا پرایا اور خوب سے خوب تر کی جانب لپکتے رہتے ہیں اور بھٹکتے رہتے ہیں مگر گاؤں میں جس زمین پر دادا پردادا ہل چلاتے آئے اسی پر تیسری چوتھی نسل نے بالکل اسی طرح ہل چلایا۔ وہی کچے گھروندے، وہی خاندانی محبتوں اور عداوتوں کے سلسلے۔ نہ جانے لاہور وہ کیسے آگیا تھا۔ پھر لاہور میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد ایک اور زیادہ بڑے، زیادہ مشینی اور زیادہ بے حس شہر جا کے کیا ہوگا جہاں انسانوں کا جنگل آباد ہو اور آدمی بھی درخت ہوں جو پھلتے پھولتے ہیں مگر دوسروں سے اپنا فاصلہ برقرار رکھتے ہیں اور جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خطرے کی وجہ سے تو خود خدا کے پیارے نبی ؐ نے ہجرت کی تھی اور جب سوال اپنوں کی زندگی کا ہو تو تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ بعد میں کفِ افسوس ملنے سے کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ چوہدری دلاور بہت خطرناک آدمی ہے اور اس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ بہت جلد پھر اس کی گردن تک پہنچ جائیں گے اور عین ممکن ہے اس مرتبہ وہ اکیلا نہ مارا جائے۔ انتقام کے عتاب کی زد میں اس کا پورا خاندان آ جائے۔ بالآخر وہ قائل ہوگیا۔

جب ہم گوجر خان سے گزرے تو صبح کے سات بجے تھے۔ بچے اور بچیاں بستے لیے اسکول جا رہے تھے اور بازار آباد ہونے لگے تھے۔ کالی روشنائی اور گوند آسانی سے ہر جگہ مل جانے والی چیزیں تھیں اور مجھے صرف ایک روپے میں پہلی ہی دکان سے مل گئیں۔ اتفاق سے میری نظر برتنوں کی دکان میں رکھے ہوئے تھرماس پر پڑ گئی۔ میں نے وہ بھی خرید لیا اور ایک دکان نما ریسٹورنٹ سے کھولتی ہوئی چائے بھروالی۔ بسکٹوں کا ایک پیکٹ اور اسپرین لے کر میں واپس آیا تو چوکیدار جی بنا ایک اے ایس آئی کے سامنے کھڑا تھا۔ "سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟" اے ایس آئی نے کہا۔

"ہیلو!" میں نے سامان آگے رکھ کے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا اور انگریزی پر آ گیا "جھوٹ سچ مجھ سے پوچھو۔ میرے ملازم کو بلاوجہ ہراساں مت کرو"۔ مجھ سے ذرا سی چوک یہ ہو گئی تھی کہ میں نے ٹرک کو سڑک کے کنارے واقع تھانے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

اے ایس آئی نے مجھے گھور کر دیکھا "تم کون ہو مالک صاحب؟"

"میرا نام مالک نہیں نذیر بیگ ہے۔ میں اس فیکٹری کا مالک ہوں جس کا نام ٹرک پر لکھا ہوا ہے"۔ میں نے کہا "اب بولو؟"

"یہ بڈھا پہلے تو کہہ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کو علاج کے لیے پنڈی لے جا رہا ہے"۔ اے ایس آئی بولا "پھر میں نے پوچھا کہ بیماری کیا ہے تو کہنے لگا کوٹھے سے گر گیا ہے"۔ اور مجھے بسکٹ کا پیکٹ کھولتے دیکھتا رہا۔

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟" میں نے کہا "اس کے سر میں کوئی اندرونی چوٹ معلوم ہوتی ہے"۔

"اس کے چہرے پر خون نظر آ رہا ہے"۔ اے ایس آئی نے کہا۔

"تم کوٹھے سے گر کے دیکھو، خون نکلتا ہے یا صرف ہڈیاں ٹوٹتی ہیں"۔ میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا۔

"مجھے شک ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے"۔ وہ گرم ہو کے بولا "یہ دیکھنا پڑے گا کہ زخمی اس کا بیٹا ہے یا نہیں۔ اس نے خودکشی کی کوشش تو نہیں کی تھی اور یہ مار پیٹ میں تو زخمی نہیں ہوا"۔ وہ زبردستی کیس بنانے پر آمادہ تھا اور میں اس کا مطلب بھی سمجھتا تھا۔ "یہ ٹرک تمہارے تھانے کے علاقے میں کھڑا ہے اس لیے؟" میں نے کہا۔ "ہم تو چکوال کی طرف سے آ رہے ہیں"۔ میں نے تھرماس میں سے چائے کا ایک مگ بھرا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا"۔ وہ بولا "تفتیش ہوگی تو سب معلوم ہو جائے گا"۔ ٹھیٹھ پولیس کا لہجہ اور زبان۔

"اور تفتیش ہی تفتیش میں یہ مر گیا تو ذمے دار کون ہوگا؟" میں نے ہاتھ سے گامے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"تم نے حادثے کی رپورٹ درج نہیں کرائی ہے"۔ وہ بولا "اور میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد تم کو قانونی کارروائی کے بغیر کیسے جانے دوں"۔

میں نے چائے کا ایک مگ چوکیدار کو دیا "تم اندر جا کے بیٹھو"۔ میں نے کہا "یہ بسکٹ بھی لیتے جاؤ"۔ پھر میں نے دوسرا مگ اپنے لیے بھرا اور ایک بسکٹ کھانے لگا "پھر ایسا کرتے ہیں۔۔۔!" میں نے کھاتے کھاتے بدتمیزی سے کہا۔ میرے اندازِ بے نیازی کے بعد وہ اس بداخلاقی پر مزید برہم تھا کہ ہم نے اسے چائے کے لیے پوچھا تک نہیں "ایسا کرتے ہیں کہ اندر چلتے ہیں"۔ میں نے تھانے کی طرف اشارہ کیا اور تیسرا بسکٹ نگلا "معاف کرنا ناشتے کا وقت تھا۔ تم تو ڈٹ کے آئے ہو گے۔ ہم ذرا تازہ دم ہو لیں۔ پھر لاہور فون کر لیتے ہیں۔ فون تو ہوگا نا تھانے میں؟"

"فون کسے کرنا ہے؟" اے ایس آئی مزید گرم ہوا "مجھ سے سیدھی طرح بات کرو"۔

"میں نے چائے کا خالی مگ تھرماس پر رکھا۔ رومال سے منہ صاف کیا اور جیب سے سگریٹ نکال کے لائٹر سے جلائی "لاہور فون کر لو"۔ میں نے ایک طویل کش لے کر بے نیازی سے کہا اور اسے ضامن رضوی صاحب کے گھر کا نمبر بتایا "یہ نمبر ہے لاہور کے ایس ایس پی کی کوٹھی کا۔ ابھی وہ آفس نہیں گئے ہوں گے"۔ میں نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گھڑی پر نظر ڈالی۔ "غالباً ناشتا کر رہے ہوں گے۔ فون ان کے گھر میں سے کوئی اٹھائے گا۔ محسن یا رابعہ قاری ایڈووکیٹ۔ یا خود ان کی بیگم۔ ان سے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کون ایس ایس پی؟" اے ایس آئی نے کہا۔ "ضامن رضوی صاحب؟"

"ویری گڈ۔ تم تو جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لاہور میں رہے ہو کیا؟"

"تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟" وہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"وہ انکل ہیں میرے۔" میں نے کہا۔ "انہی کے گھر میں رہتا ہوں۔ چلو۔" میں نے تھانے کی طرف قدم بڑھائے۔

"آپ پہلے ہی بتا دیتے نا جی۔" اے ایس آئی نے ناگواری سے کہا۔ "جائیں آپ۔"

"بھئی مجھے بات کرنی ہے اپنے گھر۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "انہیں اطلاع دینی ہے کہ ابھی تک سب خیریت ہے۔ اور آگے تو شاید پنڈی ہی میں کوئی موقع ملے۔ لیکن اس وقت تک وہ ڈیوٹی پر جا چکے ہوں گے۔ دفتر کا نمبر ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ یا تم سمجھتے ہو کہ تھانے کا فون ایک ایس ایس پی سے گفتگو کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا؟"

"میں نے کب کہا ہے جی! آپ تو ایسے ہی بات بڑھا رہے ہیں۔ دس بار فون کریں۔" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی تھی۔ اس کی صبح کا آغاز بہت غلط طریقے پر ہوا تھا۔ قانونی تفتیش اور کارروائی کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا تھا۔ الٹی اسے یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ میں اس کی شکایت نہ کر دوں۔ ایک تو میں دولت مند اور فیکٹری کا مالک۔ پھر ایس ایس پی کا بھانجا۔ لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دینی چاہیے۔ میں تار بھی دے سکتا تھا مگر فون پر براہِ راست بات ہو سکتی تھی اور اس کے لیے تھانے کا فون سب سے بہتر ذریعہ تھا۔ بڑا اچھا ہو اگر فون محسن یا رابعہ میں سے کوئی اٹھا لے، میں نے سوچا۔

اندر وہی نحوست زدہ۔ پُر آسیب اور نیم روشن سہمی سہمی فضا تھی جو ہر تھانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کے فون کو اپنی طرف گھسیٹا اور سگریٹ لبوں میں دبا کے نمبر ملانے لگا۔ میں اوور ایکٹنگ کر رہا تھا چنانچہ غریب اے ایس آئی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ایسے ہی مواقع پر اس کی بادشاہت کا غرور خاک میں مل جاتا تھا۔ گھنٹی تین بار بجی۔ پھر محسن نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو!"

"ارے بھائی شیروانی صاحب! آداب عرض ہے قبلہ۔" میں نے اپنی قدرتی آواز میں کہا۔

"سکندر! اُلو کے پٹھے۔ خبیث۔" محسن نے میری آواز پہچانتے ہی بے اختیار دل کا غبار نکالنا شروع کیا۔ "کہاں ... کہاں ہے اب؟ مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟"

"یار میں یہاں گوجر خان کے تھانے سے بول رہا ہو... نے مسکرا کے کہا۔

"پہنچ گیا پھر تھانے۔ قسم خدا کی جو اب ہم میں سے کوئی ... آیا۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "حد ہوتی ہے کسی بات کی۔"

"میں بالکل خیریت سے ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "اور ... کو یہی اطلاع دینی تھی۔ مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا کیا حال ہے"

"انتقال ہو گیا ان کا۔" محسن نے جھنا کے کہا۔ "آپ کے ... رو رو کے جان دے دی۔"

"اور انکل رضوی؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی ... نہیں گئے ہوں گے۔ ناشتا کر رہے ہوں گے۔"

"وہ بندوق لے کر آ رہے ہیں، ابھی فون پر گولی مار د... محسن بہت ناراض تھا۔

"آپ بات کرنا چاہیں ایس ایس پی صاحب سے ... میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے نزدیک ہی موجود اے ایس آئی ... کہا۔ "ناشتے کی میز پر ہیں۔ اخبار بھی اسی وقت پڑھتے ہیں اس ... کوئی ڈسٹرب کرے تو ....؟"

"نہیں ... اس کی ... ان کو تکلیف مت دیں۔ سلام دیں ... اس نے سینے پر انگلی سے اپنے نام کے بیج کی طرف اشارہ کیا ...

"اچھا بھائی محسن! میں کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں ... پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "انکل کو بتا دینا۔ ابھی تو میں جا رہا ... بس دو چار منٹ میں۔"

"کہاں؟" محسن چلّایا۔ "اب کدھر کا ارادہ ہے؟ بھائی خدا ... واسطے گھر آ جا۔ لے بات کر انکل اور رابعہ سے۔"

"اچھا خان صاحب! خدا حافظ۔" میں نے فوراً ریسیو... دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے ... کو بتا دیا تھا کہ میں تھانہ گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ رضوی ... ابھی ذرا سی دیر میں اس کا نمبر معلوم کر لیں گے اور پھر ... کہہ دیں گے کہ اس شخص کو بند کر دو حوالات میں۔ اور جب ... خود لینے نہ آ جاؤں اسے مت چھوڑ و۔ یا حکم صادر کر دیں گے ... اسے پولیس کے پہرے اور نگرانی میں لاہور روانہ کر دو۔ ... منٹ میں میرا فرار ہو جانا ضروری تھا۔ اے ایس آئی با دلِ ... مجھے رخصت کرنے تھانے کے گیٹ تک آیا۔

"دیکھیں۔ وہ جو کچھ بات ہوئی۔ غلط فہمی کے باعث ... نے بمشکل تمام کہا۔

"اوہ نو۔ فارگیٹ اِٹ۔" میں نے کہا۔ "میں پولیس وا...

... کے بزنس کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس لیے مائنڈ ... نہیں کرتا۔ یُوسی۔ جب آپ جانتے ہوں کہ بچھو ڈنک مارتا ہے ... اس کی فطرت کو بدلنے کی کوشش کرنا یا اس کے کاٹنے پر بچھو کو ... برا بھلا کہنا، دونوں ایک جیسی فضول باتیں ہیں۔ او کے۔ خدا حافظ۔" ... میں نے اس کے منہ پر جوتا رسید کر کے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا ... اور ٹرک کی جانب چل پڑا۔ اے ایس آئی کی دلی کیفیت کا مجھے بخوبی ... اندازہ تھا۔ اس ذلت کا بدلہ آج وہ ان سے لے گا جو شامتِ اعمال کے باعث کوتوالی لائے جائیں گے۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ وہ زندہ اور مُردہ میں فرق نوٹ نہیں کر سکا اور شاید ٹرک کا نمبر بھی۔

فلک شیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ میں نے شاپنگ، بریک فاسٹ اور ٹرنک کال میں تقریباً ایک گھنٹہ گزار دیا تھا۔ دھوپ بڑھ گئی تھی چنانچہ وہ لاش کی طرف سے متفکر تھا جو کھلی جگہ پر رکھی تھی۔ ابھی ٹرک سائے میں تھا لیکن آگے کا سفر کم سے کم چھ گھنٹے کا تھا اور دوپہر کے دو بجے تک دھوپ میں رہنا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ راولپنڈی سے ہم کوئی ترپال وغیرہ لے کر اوپر پھیلا دیں گے اور لاش خراب نہیں ہو گی۔ گاؤں پہنچنے کے بعد بھی تدفین کے لیے دو چار گھنٹے مل جائیں گے۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا کہ بارہ گھنٹے میں خرابی کے آثار پیدا ہو جائیں۔

راولپنڈی کا فاصلہ میں نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور راستے میں صرف ایک جگہ پٹرول ٹینک فل کرانے کے لیے رُکا۔ اگر میں سواں ندی اور ٹوپی پارک کی طرف سے پنڈی میں داخل ہو کے مال روڈ پر ہو جاتا تو شہر کی ٹریفک سے بچ کے بالکل سیدھا گزر جاتا اور کوہِ نور ٹیکسٹائل مل کے بعد صرف ترنول چیک پوسٹ ہی تھی جہاں کوئی ٹرک میں جھانک کر دیکھتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ زخمی مریض کو لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل پشاور لے جا رہے ہیں کیونکہ وہاں اس کا چچا نیورو سرجن ہے۔ عام حالات میں پنڈی کے ہولی فیملی یا سی ایم ایچ جیسے اسپتالوں کو چھوڑ کے پشاور جانے کی بات کوئی نہیں کرتا لیکن کسی کا قریبی عزیز مثلاً خود ڈاکٹر ہو تو یہ بات فطری نظر آتی ہے۔ غیروں کے بجائے اپنے زیادہ توجہ دے سکتے ہیں اور نہ دیں تب بھی ان پر اعتماد تو زیادہ ہی رہتا ہے۔

ترپال خریدنے کے لیے مجھے ہاتھی چوک ضرور جانا پڑتا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ ٹرک میں لگے ہوئے بستر پر ایک مجروح شخص کو لیٹا دیکھ کر تجسس کے مارے لوگ جمع ہو جائیں اور کسی کی نظر قیامت کی ہو تو وہ تاڑ جائے۔ احتیاطاً میں نے کینٹ ہاسپٹل کی طرف سے گزرنے والی سڑک پکڑی جب پر ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ترپال کیلے سے پہلے مجھے رنگوں والی ایک دکان نظر آ گئی اور میں نے وہیں سے ٹرک کو موڑ لیا۔ فرش پر بچھانے والے پلاسٹک کی شیٹ کے رنگ برنگے تھان کپڑوں کی طرح لپٹے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے سادہ سے براؤن رنگ کی شیٹ خریدی اور ٹرک کی تینوں دیواروں پر پھیلا کے لاش پر ایک عارضی سائبان قائم کر دیا۔ شیٹ کے کناروں کو میں نے ٹرک کی سائڈ میں بنے ہوئے لوہے کی ہر ہُک میں پرو دیا تاکہ ٹرک چلنے سے شیٹ کو ہوا نہ اڑائے۔ اس کے باوجود جب میں پھر فیروز سنز کی طرف سے مال روڈ پر پہنچا اور دائیں طرف گھوم کے پشاور جانے والی سڑک پر ٹرک نے اسپیڈ پکڑی تو پلاسٹک شیٹ ہوا بھرنے سے پیراشوٹ کی طرح پھول گئی اور بالآخر پھٹ گئی۔ اس کا ایک کونا پھڑپھڑانے لگا۔ پھر دوسری ہُک کا سوراخ ایک چاک بن گیا اور ابھی ہم ریڈیو پاکستان کے سامنے سے گزرے ہی تھے کہ شیٹ اُڑ گئی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے فلک شیر سے کہا۔ "ٹرک پر چھت تو نہیں ہے لیکن دھوپ کا اثر ہوا سے زائل ہوتا رہے گا۔"

فلک شیر کچھ نہیں بولا مگر اس کی صورت بتاتی تھی کہ اس صورتِ حال پر وہ آزردہ ہے۔

"اب چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہو تو میں لاش کو پلنگ کے نیچے رکھ دوں۔ یہی ایک صورت ہو سکتی ہے اسے سائے میں رکھنے کی۔"

فلک شیر نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے ٹرک کو ایک طرف کھڑا کیا۔ نیچے اترا اور پیچھے جا کے اکیلے ہی لاش کو چارپائی سے اتار کے ٹرک کے فرش پر رکھا اور چادر اس پر ڈال دی۔ لیکن بستر چارپائی پر ہی رہنے دیا۔ اب مردہ گامے کو بیہوش قرار دینے اور علاج کی غرض سے پشاور لے جانے والی کہانی نہیں چل سکتی تھی۔ بیمار اور مجروح شخص کو آرام سے بستر پر لٹا کے لے جایا جاتا ہے نہ کہ سخت فرش پر جہاں جھٹکے لگنے سے صحت مند آدمی کی حالت بھی خراب ہو جائے۔ میں نے فلک شیر کو سمجھایا کہ اب ہم سے راہ میں کوئی سوال کرے گا تو ہمارا جواب مختلف ہو گا۔ ہم بتائیں گے کہ مریض کو علاج کے لیے پنڈی لے گئے تھے اور اس کا آپریشن ہونا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ چنانچہ اب تجہیز و تکفین کے لیے واپس لے جا رہے ہیں اور اسے چارپائی کے نیچے رکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دھوپ سے محفوظ رکھا جائے۔ گامے کے سر اور چہرے کے زخموں سے رِسنے والا لہو جم کے سیاہ اور سخت ہو چکا تھا چنانچہ اس چادر پر کوئی داغ نمودار نہیں ہوا تھا جو میں نے لاش پر ڈالی تھی اور میرا خیال تھا کہ ہم نے اعتماد سے بات کی تو کوئی شک نہیں کرے گا۔

لیکن ترنول چیک پوسٹ پر تین افراد اچانک ٹرک کے سامنے آ گئے اور سڑک روکنے والے لمبے بانس سے ڈنڈے کے پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ عموماً وہ ہر گاڑی پر سرسری نگاہ ڈال کے چنگی محصول لیتے تھے اور گاڑی کو گزر جانے دیتے تھے مگر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ ہر گاڑی کی تلاشی تفصیل سے لیتے تو دونوں جانب گاڑیوں کی
قطاریں لگ جاتیں اور ٹریفک جام ہو جاتا۔ اس وقت وہ مکمل ناکہ بندی
کی پوزیشن میں تھے اور یہ ناممکن تھا کہ میں بیریئر کو توڑتا ہوا فرار ہو جاؤں۔
صاف ظاہر تھا کہ رضوی صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ گوجر خان
کے تھانے میں ایس ایچ او نے انہیں ٹرک کا نمبر اور میرا حلیہ سب
بتا دیا ہو گا۔ اگلا بندوبست انہوں نے یہی کیا ہو گا کہ مجھے راولپنڈی
میں داخل ہوتے وقت یا شہر سے نکلتے وقت روکنے کی ہدایات
جاری کر دی ہوں گی۔ انہیں راولپنڈی کے ایس ایس پی یا اسی عہدے
کے کسی افسر کا تعاون حاصل ہو گا یا انہوں نے شیروانی صاحب کو بتا
دیا ہو گا جو خود بھی اسلام آباد میں خاصے با اثر افسر تھے۔ جیسے ہی میں نے
ٹرک کو روکا ایک انسپکٹر قسم کا شخص میری طرف آیا۔ باقی دو پچھلے حصّے کی
طرف بڑھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے اطمینان سے
کہا لیکن فلک شیر کا چہرہ فق ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ آپ نیچے تشریف لے آئیں۔" انسپکٹر نے طنز آمیز
شائستگی سے کہا۔ "آپ کا نام سکندر بخت ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن اس طرح میرا راستہ روکنے کا مقصد؟" میں نے
چیں بجبیں ہو کے کہا۔ "مجھے پشاور جانا ہے۔"

"ہم صرف احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "کہ آپ
کو یہیں روک لیا جائے۔"

"کس لیے۔ اور کس نے دیا ہے یہ حکم؟" میں نے بحث کر کے
اسے قائل کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"ہمارے اعلیٰ افسران کا۔ اگر ہم نے کوتاہی کی تو معطل ہو جائیں
گے۔ اس لیے آپ ضد نہ کریں۔" وہ بولا۔

"پیچھے منجی کے نیچے لاش ہے سر جی!" ایک ماتحت نے سامنے
آ کے رپورٹ پیش کی اور اس سنسنی خیز دریافت پر اپنے افسر کی طرف
داد طلب نظروں سے دیکھا۔ افسر نے چونک کر مجھے غور سے دیکھا۔
اب تک وہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں کوئی خطرناک قسم کا پُراسرار مجرم ہوں مثلاً
غیر ملکی جاسوس۔ چنانچہ افسرانِ بالا نے صرف مجھے روکنے کا حکم دیا
ہے۔ گرفتار کرنے کا نہیں اور شاید وہ خود آ کے مجھے تفتیش کے لیے
اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہوں گے مگر اب اچانک میری حیثیت
ایک عام مجرم کی سی ہو گئی جو قتل کر کے لاش سمیت فرار ہو رہا تھا۔
میں نے نیچے اُتر کے دروازے کو دھڑ سے مارا۔ فلک شیر پہلے ہی
اتر گیا تھا۔ ایک شخص فوراً میری جگہ چڑھ گیا اور اس نے ٹرک کو بیچ
میں سے ہٹا کے سڑک سے دور ایک کنارے پر کھڑا کر دیا۔ وقتی طور پہ
رُک جانے والی ٹریفک پھر چل پڑی۔ انسپکٹر مجھے ایک مختصر سے کمرے
میں لے گیا جہاں صرف ایک میز تھی اور ایک کرسی۔ میں فوراً اس

کرسی پر بیٹھ گیا۔ عام حالات میں یہ بڑی گستاخی ہوتی مگر اس
انسپکٹر خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے
سے دوسری کرسی منگوائی لیکن فلک شیر کو کھڑا رکھا۔

"یہ لاش میری فیکٹری کے ایک فورمین غلام محمد کی ہے۔"
اطمینان سے کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی۔ "میں
ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا مالک ہوں۔ ہم اسے تدفین کے
لے جا رہے ہیں۔"

"اچھا جی!" انسپکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پھر میں کیا کروں
اس نے ٹرک پر نگاہ ڈالی جس پر نذیر اینڈ کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔
لہجہ اور سوال دونوں مشتعل کرنے والے تھے لیکن میں نے ضبط
کام لیا۔ "تم یہ کرو کہ اس افسر سے میری بات کراؤ جس کے حکم پر
یہاں روکا گیا ہے۔ اور ہاں۔ یہاں چائے تو ملتی ہے۔ ہمارے
چائے کا انتظام کرو۔ پیسے میں دوں گا۔" میں نے جیب سے
نوٹ نکال کر میز پر رکھے ہوئے فون کے قریب ڈال دیا۔
مجبوراً اُٹھا۔ میرے تحکمانہ انداز نے اسے قائل کر لیا تھا کہ "معاملہ
ہے" اور میں معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے فلک
کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انسپکٹر نے غصّے سے پلٹ کر دیکھا
پھر کسی سے کہا کہ ہاف سیٹ چائے اور ایک کرسی لائے۔
ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کے ضامن رضوی صاحب کے آفس کا
ملانا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے لائن کاٹ دی۔

"میں ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب کو فون کر رہا تھا۔"
میں نے ناگواری سے کہا۔

"یہاں کوئی ضامن رضوی نہیں ہے۔" انسپکٹر یوں مسکرایا
جیسے اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔

"میں لاہور کا نمبر ملا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہاں ضامن رضوی
ہی ایس ایس پی ہیں۔ جن کے حکم پر مجھے روکا گیا ہے۔"

"ہم کسی ضامن رضوی کو نہیں جانتے۔" وہ بولا۔ "یہ اسلام آباد
کے ایک ایس پی کا حکم تھا۔ وہ آنے ہی والے ہیں۔"

کرسی پہلے آئی چائے اس کے بعد۔ دودھ پتی اور چینی
اس مکسچر کو اجزائے ترکیبی کی بنا پر چائے ہی کہا جا سکتا تھا ورنہ
اس میں چائے والی کوئی بات نہ تھی۔ سوائے درجۂ حرارت کے جو
بہت زیادہ تھا۔ تھکن دور کرنے میں یہ گرم مشروب بے حد مفید
ثابت ہوا۔ "شرع کے مطابق میّت کو دفن کرنے میں عجلت پسندیدہ
فعل ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر میری دینی معلومات پر تبصرہ کرتا ایک
جیپ باہر آ کر رُکی اور اس میں سے انکل شیروانی ایک ڈی ایس پی
کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انسپکٹر اُچھل کے کھڑا

ایڑیاں کھٹ سے بجا کے سیلوٹ جھاڑا۔ انکل شیروانی نے پہلے مجھے
گلے لگایا اور پھر جھاڑ پلانی شروع کی۔ "یعنی حد ہوتی ہے نامعقولیت
کی۔ کسی کا خیال نہیں کہ سب کتنے پریشان ہیں۔ جب جی چاہا ایسے غائب
ہو گئے جیسے..... جیسے.....!"

"جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔
"میں واقعی گدھا ہوں لیکن آپ میری بات تو سُن لیں۔"

"خاک سُن لوں تمہاری بات۔" انکل شیروانی نے کہا۔ "وہاں
سب کا جینا حرام کر رکھا ہے تم نے۔ رضوی کے فون پر فون آ رہے
ہیں کہ اسے کوئی سوال کیے بغیر ہتھکڑی لگا کے واپس بھیج دو۔ رابعہ
اور محسن الگ پریشان ہیں۔ یہاں میری اور شہلا کی نیند حرام۔ آخر
تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے دیکھا کہ ڈی ایس پی زیرِ لب مسکرا رہا ہے۔ میں انکل
شیروانی کو ایک طرف لے گیا۔

"مسئلہ کوئی ایسا سنگین نہیں انکل!" میں نے کہا۔ "یہ فورمین میری
جان بچاتے ہوئے مارا گیا۔ مجھے اتنا تو کرنا چاہیے کہ اس کی آخری رسوم
میں شریک ہوں۔" میری آواز اتنی کم تھی کہ دوسرے لوگ صاف
نہیں سُن سکتے تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" انکل شیروانی بولے۔ "لیکن یہ نوبت آئی
کیسے؟ یعنی تم اچھے بھلے سمجھدار آدمی، اپنی عقل اور حاضر دماغی سے
تم نے سب کی جان بچائی اور پھر سب کی جان کے دشمن ہو گئے۔
کس حکیم نے لکھا تھا نسخے میں کہ اکیلے وہاں جاؤ۔ بلا وجہ۔"

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت
میری پوزیشن کا خیال کیجیے۔ فورمین کی لاش کے ساتھ اس کا ماما ہے
جو فیکٹری کا چوکیدار تھا اس کی جان بھی خدا نے بچا لی۔ ورنہ یہ بھی
میرے ساتھ ہی مارا جاتا۔ بس میں انہیں گاؤں تک چھوڑ آؤں۔
میرا وعدہ کہ کل دوپہر تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ ذرا انکل
رضوی کو سمجھا دیں۔ وہ آپ کی بات مان لیں گے۔"

"اچھا بھئی۔ لیکن دیکھو۔ میں کوئی انتظام کر دیتا ہوں کہ تمہارے
ساتھ کچھ لوگ چلے جائیں۔" انکل شیروانی نے مجبور ہو کے کہا۔ "صرف تمہاری
حفاظت کے لیے۔ تمہارے لیے کار آ جائے گی۔"

میں یقیناً انکار کر دیتا لیکن اسی وقت پل بھر کے لیے میری نگاہ
باہر گئی اور میں نے ایک نیلے رنگ کی کار کو گزرتے دیکھا۔ پھر شعوری
طور پر مجھے ڈی سلوا یاد آیا جس کے پاس ایسی ہی ٹویوٹا کراؤن تھی۔ پھر
میں نے ونڈ اسکرین کے پیچھے سابق استاد پیڈرو اور موجودہ احمد نواز
گردیزی کو دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے واپس جا رہا تھا اور اس کی
نظر سڑک کے کنارے سے دور کھڑے ہوئے ٹرک پر گئی ہی نہیں
ورنہ وہ "نذیر اینڈ کمپنی" لکھا ہوا دیکھنے کے باوجود اپنی فیکٹری کے

ٹرک کو پہچان جاتا۔ یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ ہم کمرے کے اندر تھے ورنہ
سخت گڑبڑ ہو جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں سے واپس آیا ہے۔ مجھے
اور چوکیدار کو لے جانے والا ٹرک مقررہ وقت پر ان کے ٹھکانے
پر نہیں پہنچا ہو گا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے اور تلاش
کرنے پر انہیں طافے کی لاش کے علاوہ لکڑی کا وہ شکستہ تابوت
بھی نظر آ گیا ہو گا جس میں مجھے پیک کیا گیا تھا۔ شاید انہیں پہلے سے
معلوم ہو گا کہ فیکٹری کا چوکیدار گامے کا رشتہ دار ہے اور وہ اسی
نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ چوکیدار نے "غداری" کی یعنی مجھ سے وفاداری
اور اپنے بھانجے سمیت فرار ہو گیا۔ گردیزی کے پاس خاصی طاقتور
کار تھی اور اسے پہلے سے معلوم ہو گا کہ گامے کا اور چوکیدار کا تعلق
کس گاؤں سے ہے۔ وہ بلا تاخیر روانہ ہو گیا۔ غالباً اس وقت جب
ہم گوجر خان تھانے میں رُکے ہوئے تھے وہ ہمیں کراس کر گیا۔ گامے
اور چوکیدار کے گھر پہنچا اور یہ معلوم کر کے فوراً واپس آ گیا کہ وہ دونوں
گاؤں نہیں پہنچے۔ اب وہ چوہدری دلاور کو رپورٹ دے گا کہ دونوں
نمک حرام موت کی وجہ سے گھر کی طرف نہیں گئے اور روپوش ہیں۔ دلاور
احمق نہیں ہے۔ وہ پیڈرو سے کہے گا۔ "گردیزی! تم گدھے کی اولاد
ہو اور گدھے ہی رہو گے۔ تمہارے پاس کار تھی۔ تم گولی کی طرح گئے اور
تصدیق کر کے لوٹ آئے۔ ان کے پاس کیا ہوائی جہاز تھا کہ تم سے پہلے
پہنچ جاتے۔ وہ چھپتے چھپاتے بس میں سفر کر کے جائیں گے تو کل پرسوں
تک پہنچیں گے۔" اور اس کے بعد پیڈرو کو اسی مشن پر واپس بھیج دیا
جائے گا۔ اور دوسرے پھیرے میں پیڈرو کو چوکیدار مل جائے گا
تو اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی اٹھا لیے جائیں گے اور انجام پہلے سے
بھی بُرا ہو گا۔

"ٹھیک ہے انکل!" میں نے کہا۔ "مگر آپ کے آدمی سادہ
کپڑوں میں ہوں تو اچھا ہے۔ دیہاتی بن کے پیچھے میّت کے ساتھ بیٹھ
جائیں۔ تدفین میں شریک رہیں اور ہمارے ساتھ ہی واپس آ جائیں لیکن
میں اسی ٹرک کو لے جاؤں گا، کار رہنے دیں۔"

باوردی حضرات کو بے وردی کرنے اور حفاظتی انتظامات
کی نوعیت سمجھانے میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن ہم دوبارہ روانہ ہوئے
تو حالات بہت بہتر تھے۔ پیچھے میّت کو دوبارہ چارپائی پر رکھ دیا گیا
تھا اور پولیس نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے برف کی دو
سلوں کا بھی انتظام کر لیا تھا جو چارپائی کے نیچے رکھ دی گئی تھیں۔ ٹرک
دیکھنے میں پرانا لگتا تھا کیونکہ لوڈنگ میں استعمال ہوتا تھا لیکن اس
کا انجن جاندار تھا۔ میں نے کیمبل پور تک اسے ساٹھ میل کی رفتار سے
دوڑایا۔ پھر میں نے فلک شیر کی ہدایات پر عمل کیا کیونکہ آگے کا راستہ
مجھے معلوم نہیں تھا۔ کیمبل پور سے گزرتے ہوئے ہرو ندی کا تنگ سا
پُل آ گیا۔ ندی خود کسی برساتی نالے کی طرح تھی اور اس کے پانی کی گہرائی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

برائے نام تھی۔ پانی کے شفاف دھارے کئی حصوں میں بٹ گئے تھے اور خشک جزیرے جیسے کئی ٹکڑے الگ الگ نظر آتے تھے۔ ندی کی پوری تہ پر گول چکنے پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر جو پُل قائم تھا وہ خاصا بلند تھا۔ شاید باڑھ کے موسم میں ندی کی سطح اتنی ہی بلند ہو جاتی ہو گی اور اس کا پاٹ بھی پُل کی لمبائی کے برابر ہو جاتا ہو گا۔ ابھی تو مجھے خاصے نشیب میں فٹ پاتھ یا کسی چھوٹی سی سڑک کے برابر ہموار سطح نظر آ رہی تھی جس پر دونوں جانب کوئی حفاظتی جنگلا نہیں تھا اور اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں ٹرک کے چاروں پہیوں کو سیدھا اور پُل کے کناروں پر رکھنے میں کامیاب ہو گیا تب بھی اس کی باڈی پُل کے دونوں طرف نکلی رہے گی۔ تلہ گنگ جانے والی بس کے مسافروں کا اس پُل پر سے گزرتے ہوئے کیا حال ہوتا ہو گا جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ بس پُل صراط پر سے گزر رہی ہے اور پہیے تو شاید پُل پر ہی ہیں مگر وہ خود ندی کے اوپر معلق ہیں۔ نشیب کے فوراً بعد فراز تھا اور سڑک تیس درجے کے زاویے پر ایک دم اٹھتی تھی۔ کہیں کہیں یہ زاویہ پینتالیس درجے تک ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پُل کراس کرتے ہی مجھے ٹرک کو سیکنڈ گیئر میں رکھنا پڑا اور اس کا انجن زور لگاتا شور مچاتا اوپر چڑھنے لگا۔ چڑھائی کے علاوہ پہاڑی موڑ تھے جو اتنے خطرناک تھے کہ دوسری طرف سے آنے والی ٹریفک بالکل نظر نہیں آتی تھی چنانچہ ایک بس جو کیمبلپور جا رہی تھی، اترائی کی وجہ سے لڑھکتی ہوئی زن سے گزر گئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ دونوں گاڑیوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیوں نہیں کیا۔ لیکن بس ڈرائیور تجربہ کار اور ان راستوں پر غیر متوقع ملاقاتوں کا عادی تھا کہ ایک ملی میٹر کے فاصلے سے گاڑی نکال لے گیا۔ آگے کا راستہ اور بھی خطرناک ثابت ہوا اور مسافت کم ہونے کے باوجود مجھے بے حد محتاط رہنا پڑا اور رفتار کو قابو میں رکھنا پڑا۔

دو بجے بالآخر ہم اپنی منزل پر پہنچے۔ اس کے بعد ایک ماتمی کہرام تھا جس کی ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے میں گاؤں کے بازار چلا گیا جہاں گنتی کی چند دکانوں میں سے ایک چائے خانہ بھی تھا اور پروپرائٹر چائے خانہ ہذا نے میرے جیسے وی آئی پی کے قدم رنجہ فرمانے پر خصوصی چائے کا انتظام کیا اور گلاس بھر کے اوپر چھٹانک بھر ملائی کی تہ کے ساتھ چائے پیش کی۔ اس کی عقل سمجھنے سے قاصر تھی کہ میں آخر ہوں کیا ——— کیونکہ تین بے وردی ملازم سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ مسلح بھی نظر آتے تھے اور مجھ سے آپ جناب کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔ ان تینوں کو بھی تقریباً ویسی ہی اسپیشل چائے پیش کی گئی لیکن وہ عموماً مجھ سے دور بیٹھے۔ میں بسکٹوں کے باقی ماندہ حصے کو بطور لنچ چرتا رہا۔ دریں حالات یہ شہری نعمت بھی بہت غنیمت ثابت ہوئی۔

شام کو قبرستان سے لوٹنے کے بعد میں نے فلک شیر سے کہا۔ "اگر تمہیں جانا پڑے تو تیاری کے لیے اور سامان وغیرہ باندھنے کے لیے کتنا وقت درکار ہو گا؟"

"تیاری کیسی مالک؟" وہ بولا۔ "اور غریب کا سامان ہی کتنا، بوریا بستر، چند کپڑے اور برتن۔"

"اس کا مطلب ہے تم اگر چاہو تو آج میرے ساتھ واپس جا سکتے ہو، بیوی بچوں سمیت۔" میں نے کہا۔

"آج؟" وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ "سوئم سے بھی پہلے؟"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور میری کوئی ذاتی غرض وابستہ نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ یہاں تک آتا ہی نہیں۔ تم کو وہیں ترنول چوکی سے پولیس کی ایمبولینس میں یا اسی ٹرک میں بھجوا دیتا اور خود واپس چلا جاتا۔ لیکن میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد ہے تمہیں اور تمہارے بیوی بچوں کو دلاور کے ظلم و ستم سے بچانا۔ تمہیں معلوم ہے اس کا ایک آدمی گامے کو پوچھتا ہوا گاؤں آ کے جا چکا ہے۔"

"آپ نے بھی سُن لی ہے یہ بات جناب؟" وہ پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

"ہاں۔ آج یہاں اسے کوئی نہیں ملا۔ لیکن وہ معاف کرنے والا اور بھول جانے والا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ تمہارا وجود اس کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ وہ پھر کسی کو بھیجے گا۔ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں۔ گامے نے تمہیں بچایا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تمہیں اس سے کتنی محبت تھی۔ کوئی ان کی خاطر تو جان نہیں دیتا جن سے نفرت کرتا ہو۔ لیکن کیا اپنے بیوی بچوں سے تمہیں محبت نہیں ہے۔ تم یہ منظور کر سکتے ہو کہ تمہارے حصے کی سزا انہیں بھی ملے اور دلاور کے آدمی انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹ کے ڈال دیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنی بساط کے مطابق تمہیں اس ظلم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کروں۔ تاکہ تم زندہ رہو اور مجھے موقع ملے کہ میں تمہارے احسان کے بدلے تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔"

"پھر بھی، آج اچانک چلا جاؤں۔" وہ بڑبڑایا۔ "گامے کی ماں سے کیا کہوں؟"

"کچھ نہیں۔ کسی سے کچھ نہیں کہنا۔" میں نے کہا۔ "رات کو سامان سمیٹو اور میرے ساتھ ٹرک میں نکل چلو۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے غائب ہو جاؤ۔ میں پنڈی سے تم کو کراچی کی ٹرین میں بٹھا دوں گا۔"

گاؤں میں رات مغرب کے فوراً بعد آ گئی۔ تعزیت کے لیے آنے والے عشا کی نماز سے پہلے ہی اٹھ گئے۔ عشاء کے بعد چوپال میں کوئی بھی نہ رہا۔ کچے گھروں میں جلنے والے تیل کے چراغ بجھ گئے اور ابھی نو ہی بجے تھے کہ چوکیدار نے "ہوشیار خبردار" کی صدا لگا

پوری کی۔ پھر ہر سمت خاموشی پھیل گئی۔ اتنی گہری اور بوجھل کہ میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ آوارہ کتے تک سو گئے تھے کہ کسی کے بھونکنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جنگلوں اور کھیتوں میں گیدڑ تک نہیں چلا رہے تھے۔ میں نے فلک شیر سے کہا کہ یہی مناسب وقت ہے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ فلک شیر کی بیوی اتنی کم مہلت میں اور "آدھی رات" کو چوروں کی طرح ہزار کوس کے سفر پر نکلنے کے لیے آمادہ نہ ہو گی۔ مرد حقائق کو نسبتاً کم وقت میں قبول کر لیتے ہیں۔ اور حالات کو سمجھتے ہوئے مفاہمت کا راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ عورت کی ذات جذبات کا پیکر۔ جہاں رہے جس کے ساتھ رہے، وفا کے رشتوں کو اتنا استوار کر لیتی ہے کہ آسانی سے توڑ بھی نہیں سکتی۔ لیکن فلک شیر کی بیوی مختلف عورت ثابت ہوئی۔ فلک شیر کے کہنے پر میں نے خود اس سے بات کی تو اس نے میری بات بڑے سکون سے سُنی اور فلک شیر کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں فلک شیر نے اس سے نگاہ نہیں ملائی۔

"میں ضرور جاؤں گی ویر۔" اس نے بالآخر کہا۔ "اگر میں یہاں رہوں گی تو وہ ڈائن ہم سب کو کھا جائے گی۔"

"خواہ مخواہ بات کو مت بڑھا نیک بخت۔" فلک شیر نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

"میں نے اپنی زندگی جل جل کے گزار دی۔ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے۔ مگر مجھے خوشی کبھی نہیں ملی۔ اس نے مجھے خوش رہنے ہی نہیں دیا۔" وہ نفرت کے زہر سے بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اتنی دور چلی جاتی کہ اس کا منحوس خیال تک میرا سُکھ نہ چھینے۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو بہن؟" میں نے نرمی سے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اسی شہدے گامے کی ماں کو رو رہی ہوں ویر۔" وہ بولی۔ "جو میری بچپن کی منگنی توڑ کے اس سے بیاہ رچانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہے اس نے مولوی سے کتنے تعویذ لیے میرے خلاف، کتنے عمل کرائے۔"

"ایسی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا بہن! ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔" میں نے محبت کی کہانی کے اس پرانے المیے کو سمجھتے ہوئے کہا جو ہر آدمی کا المیہ ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے اسے کوئی اور چاہنے لگتا ہے۔ محبت کرنے والے دو۔ حاصلِ محبت ایک، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور انجام یہی خانہ خرابی۔ خوشی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے معلوم ہوتا ہے کہ خوشی تو ایک سراب تھی۔

"اپنا کیا اپنے آگے آتا ہے ویر جی۔" وہ بولی۔ "گھر والا چھوڑ گیا۔ کب تک لوگوں کی سُنتا اور بے غیرت بن کے جیتا۔ حیا ان دونوں کو کبھی نہ آئی۔"

"لیکن گامے کے دو بھائی ہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "فلک شیر نے بتایا ہے مجھے۔"

"ہاں۔ اس نے دوسرا خصم جو کر لیا تھا۔" وہ بولی۔ "دونوں اسی کی اولاد ہیں۔ ایک دس سال کا، دوسرا بارہ سال کا۔"

"اور یہ گاما۔ غلام محمد۔ یہ پہلے شوہر سے تھا؟" میں نے زنانہ تجسس کا مظاہرہ کیا۔

وہ ہنسی۔ طنز آمیز۔ تلخ۔ تمسخر اُڑانے والی بے بس ہنسی جو اپنی مجبوری کا نوحہ تھی۔ "ہاں، کہا تو یہی جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم بلاوجہ حسد اور شک میں مبتلا ہو بہن۔" میں نے بے یقینی کے باوجود کہا۔ "وہ فلک شیر کی منہ بولی بہن ہے۔"

"پہلے سب یہی سمجھتے تھے۔ اب سب سمجھتے ہیں۔ اور پھر شوہر کو بیوی سے زیادہ کون جانتا ہے۔" وہ بولی۔

"چلو پھر تو تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" میں نے بات کو مختصر کیا۔ "فرض کرو فلک شیر جھوٹ بولتا تھا تم سے۔ کراچی میں تو کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم تیار ہو نا؟"

"میرا یہاں کون ہے۔ ہوتا تو میں اتنے دکھ سہتی۔" وہ بولی۔ "ان بچوں کو کسی کے سپرد کرتی اور نیلا تھوتھا کھا لیتی۔ میرا فلک شیر مجھے مل جائے تو میں کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

رات کے گیارہ بجے اس خاندان کا مختصر سا سامان پیک ہو چکا تھا۔ فلک شیر کے دونوں بچے حیران تھے کہ اتنی رات کو تمام سامان لے کر جانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ فلک شیر چپ تھا اور اس چپ کے ہزار مفہوم تھے۔ یا نکالے جا سکتے تھے۔ یہ اس گھر سے یا اس زمین سے رشتہ ٹوٹنے کا دکھ بھی ہو سکتا تھا جس کے ہر ذرے سے اس کی عمرِ رفتہ کا دامن بندھا ہوا تھا۔ اگر فلک شیر کی بیوی نے غلط نہیں کہا تھا تو یہ ایک نقشِ ماضی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا افسوس بھی ہو سکتا تھا۔ خواب تھا جو ہم نے دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ یہ گامے کی موت کا غم بھی ہو سکتا تھا جسے اس نے اپنا بھانجا کہا تھا مگر جو اس کی بیوی کے خیال میں فلک شیر کا بیٹا تھا۔ اپنے عقیدے کے مطابق وہ اس کی مغفرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ زندگی کی کہانیاں کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں اور ہر داستانِ حیات کا عنوان جدا ہے۔ اسی نفرت اور محبت اور رقابت کی بنیاد پر کھڑی ہوئی مثلث کے لاتعداد زاویے تھے۔

رات ایک بجے میں نے انہیں پنڈی کے اسٹیشن پر اتارا اور ان کے لیے بڑے جتن کر کے پشاور سے آنے والی خیبر میل میں جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ رات ڈھائی بجے خیبر میل کے روانہ ہو جانے کے بعد میں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سر پر تفکرات اور اندیشوں کا ایک کوہِ گراں تھا جو اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد باقی نہ رہا۔

میری حفاظت پر مامور تینوں افراد کی حالت غیر تھی۔ مجھے ردک کردہ بیگار میں پکڑے گئے تھے۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ انہیں کچھ بھی نہیں کرنا تھا اور یہی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی۔ یہ بھی کوئی "ڈیوٹی" ہوئی کہ بس ایک آدمی کے ساتھ رہو۔ وہ جہنم میں بھی جائے تو ساتھ جاؤ۔ سڑک پر کھڑے رہنا بھی ان کے نقطۂ نظر سے لاکھ درجہ بہتر تھا کہ وہ خود بھی مصروف رہتے اور دوسروں کو بھی مصروف رکھتے۔ آدمی بھی انہیں میرے جیسا ملا تھا جس سے تعلقات کی ابتداہی کشیدگی لیے ہوئی تھی اور جو پوزیشن رکھتا تھا جیسے ڈی آئی جی ہو چنانچہ وہ آپس میں بھی بے تکلف ہو کے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ مجھ سے بے تکلف ہونے کا کیا سوال۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ ان کو دخل در معقولات سے باز رکھنے کے لیے یہ رویّہ ضروری ہے۔ اب مجھے ان پر ترس آیا۔ میں نے اخلاقاً ان سے کھانے پینے تک کو نہیں پوچھا تھا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا "میری وجہ سے آپ سب کو بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ اب آپ لوگ جائیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے اور ان سب کو سو سو کے نوٹ پکڑا دیے۔ "افسوس یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس یہی ہیں ورنہ میں آپ لوگوں کو اس مستعدی اور فرض شناسی کا زیادہ انعام دیتا۔"

انہوں نے رسماً انکار کیا اور پھر مجھ سے مصافحہ کر کے رفوچکر ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے مجھے بہت گالیاں دی ہوں گی کہ سالا فیکٹری کا مالک۔ سو روپے دے کر اسے انعام کہتا ہے۔ دس گھنٹے کی بیگار اور سو روپے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ایک بندے کو دھر لو آوارہ گردی میں تو اس کی جیب سے نکل آتے ہیں۔ چار بندے ڈک دو تو والی وارث ہزار روپے نذرانہ دے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے انکار نہیں کیا تھا۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

صبح دم ساڑھے تین بجے جب مرغوں کے الارم کلاک بجنے لگے تھے میں نے ٹرک سمیت انکل شیروانی کی کوٹھی میں داخل ہو کے مسلسل ہارن بجانا شروع کیا اور انجن کو ریس دیتا رہا۔ پھر خود باہر نکلا اور چلانے لگا "ارے بھئی کوئی ہے ہم ڈاکو ہیں۔ لوٹنے آئے ہیں۔ کسی کو کچھ خوف ہونا چاہیے۔"

انکل شیروانی سخت بدحواسی میں نائٹ گاؤن پہنتے اور پاجامے کے ازاربند کا ایک کنارا ٹخنوں تک لہراتے نکلے "یعنی کہ یہ کیا ہنگامۂ محشر ہے۔ میاں تم آئے ہو کہ قیامت آئی ہے؟" انہوں نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا۔ "چلو اندر چلو۔"

پھر شہلا نکلی اور گلے لگ کے رونے لگی۔ میں نے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ "ڈاکوؤں کے نام سے ڈر گئی سب؟" میں نے دانت نکال کے خفت سے کہا اور پھر شہلا کو تسلی دینے لگا۔ "ارے بھئی ہم مذاق کر رہے تھے۔ ہم شریف آدمی ہیں اور پھر یہ کوئی کسٹم آفیسر یا پولیس آفیسر کا گھر تو ہے نہیں جسے کوئی لوٹنے آئے۔" میں شیروانی صاحب کے پیچھے چلنے لگے۔

"یہ آپ کیا کرتے ہیں بھائی جان!" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ "سب کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہاں تو آپ کی خیریت کی اطلاع ملنے سے پہلے سب کا سکھ چین حرام ہو گیا تھا۔"

"وہاں کہاں؟ آپ کے سسرال میں۔ نہیں میکے میں۔" میں نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ سب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ جو میکہ تھا اصولاً وہ سسرال ہو گیا ہے اور سسرال کو بنا دیا ہے تم نے میکہ۔ رخصتی کس کی ہوئی، کدھر کدھر سے ہوگی؟"

حسبِ توقع شہلا بھاگ گئی۔ میں چچی کے کمرے میں داخل ہوا۔ کورنش بجا لایا۔ انہوں نے بہت حیرت کا اظہار کیا "ارے لڑکے کل ہی تو گیا تھا۔ آج اتنے سویرے واپس! بات کیا ہے؟" انہیں غالباً میری پُراسرار گمشدگی اور بازیابی کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

"وہ چچی۔ میں ذرا نکلا تھا کھانے کے بعد چہل قدمی کے لیے۔" میں نے کہا۔ "سوچا آپ کی خیریت بھی پوچھ لوں۔"

"سن رہی ہو باتیں۔ لاہور سے اسلام آباد آ گئے چہل قدمی کرتے ہوئے۔" شیروانی صاحب مسکرائے "چلو تم نہا دھو کے انسان بنو۔ میں شہلا سے کہتا ہوں کچھ چائے کافی وغیرہ کا انتظام کرے یا ناشتا ہوگا؟ میں تو دفتر جانے سے پہلے سات بجے کرتا ہوں۔"

"ابھی تو کافی ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔ "ناشتا کریں گے ذرا اطمینان سے۔ آپ کے ساتھ ہی۔"

کافی میں نے شہلا کے کمرے میں پی۔ "تم نے اپنے میاں کے بارے میں نہیں پوچھا۔ افسوس!"

"دیکھیں بھائی جان! ایسی باتیں مت کریں۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔" شہلا نے منہ پھلا کے کہا۔

"ایکٹنگ کا یہ انداز اب مقبول نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ارے بھئی ڈر کیسا، صاف پوچھو محسن کا کیا حال ہے۔ دل کی بات لبوں تک نہ آنے دینا کون سی عقلمندی ہے اور خیریت معلوم کرنے میں اخلاقاً یا شرعاً کون سی معیوب بات ہے؟"

"آپ اپنی بات کریں۔" وہ بولی "اس بار کہاں کہاں تیر مار آئے کیا معرکہ سر کیا ہے؟ دنیا میں ایسی کھلبلی مچی ہوئی تھی جیسے سکندرِ اعظم نے ڈھائی ہزار سال بعد پھر حملہ کر دیا ہے۔ سکندر بخت کے نام سے" میرے ساتھ وہ بھی ہنسی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ شیر کی کچھار میں

داخل ہونے کی حماقت فرما کے مجھ پر کیا بیتی تھی اور اس حرکت کے فوائد و نقصانات پر روشنی ڈالی۔ پند و نصائح کا انبار لے کر میں شیروانی صاحب کے ساتھ ہی نکلا اور انہیں خدا حافظ کہہ کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوپہر ایک بجے میں شاہدرہ پہنچا۔ پروگرام کے مطابق میں نے ٹرک کو "ایم ڈبلیو ڈی" انجینئرنگ کمپلیکس کی طرف موڑا اور راستے کے بیچ عین دروازے کے سامنے روک دیا۔ یہ دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا چنانچہ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان غیر حاضر تھا، نئے چوکیدار نے ہلڑ مچا دیا "او خانہ خراب ... یہ کیا ہے۔ کدھر کھڑا کیا ہے اس کو۔ ہٹاؤ اسے اور سائڈ میں کھڑا کرو۔"

"محترم خانِ اعظم!" میں نے چابیاں بڑھا کے کہا "اندر اولادِ سگ، برادرِ خر چوہدری دلاور صاحب اپنے مرقد میں تشریف فرما ہوں گے۔ یہ چابیاں ان کی خدمت میں پیش کر دو۔ انہیں بتا دینا کہ عالمِ ارواح سے فوزین غلام محمد اور الطاف نے ارسال کی ہیں۔"

میری فارسی کو چوکیدار کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا لیکن میں چابیاں دیتے ہی واپس چل پڑا تھا اس لیے وہ حیرت سے سر ہلاتا اندر چلا گیا۔ اس کے چوہدری دلاور کے ہمراہ واپس آنے تک میں دوڑ کر سڑک تک جا پہنچا تھا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا تھا۔ "الٹے بانس بریلی کو" میں نے رکشا والے سے کہا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "معاف کرنا۔ بانسوں والی سڑک۔" میں نے کہا اور رکشا چل پڑا۔ "اصل معرکہ تو اب درپیش ہوگا، جنابِ شہزادہ سکندر بخت صاحب" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "جب محسن زبان درازی کے ساتھ دست درازی پر اتر آئے گا اور مس رابعہ قاری روٹھنے کا زنانہ طریقِ جنگ اختیار کریں گی۔ آخر میں رضوی صاحب کا آتش فشاں لیکچر۔ خیر۔ جب اوکھلی میں دیا سر تو موصلی کا کیا ڈر۔ بس ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے اڑا دو۔ رہ گئی روٹھی ہوئی محبوبہ تو اس کو منانے کے ایک ہزار ایک کارگر نسخے تمہیں آتے ہیں۔ ایڈووکیٹ ہے تو کیا۔ ہر عورت جو محبت کرتی ہے مجبور ہوتی ہے اور اسی مجبوری کو سرمایۂ افتخار سمجھتی ہے۔ صرف رو سکتی ہے رُلا نہیں سکتی اور یہ روٹھنا منانا تو پیار کا وہ سیمنٹ ہے جس سے عشق کی بنیادیں استوار ہوتی جاتی ہیں۔"

محسن خان نے سب سے پہلے میرا دیدار کیا اور استقبال کے لیے آگے بڑھے "آئیے آئیے مہاراج۔ پدھاریے۔" اس نے سلیپر اتارتے ہوئے کہا۔ میں اندر کی طرف دوڑا لیکن دروازے پر پکڑا گیا۔ محسن آگ بگولا ہو رہا تھا۔ جو گالیاں وہ ٹیلی فون پر نہیں دے سکا تھا، وہ اس نے اب دیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نصیبِ دشمناں، یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو شیروانی صاحب!" میں نے کہا۔ "اجی ابھلا چھوڑ کے گیا تھا آپ کو میں! کب سے ہے یہ جنونی کیفیت؟ اور یہ کفش برداری آپ جیسے شرفا کو زیب نہیں دیتی۔"

بیگم رضوی ہنگامہ سن کے باہر آئیں اور انہوں نے ہم دونوں کو ڈانٹا۔ "کیا بیہودگی ہے یہ۔ اندر تو چلو۔"

"نہیں آنٹی! یہ جائے کسی اور سفر پہ۔ سند باد جہازی کا بچہ۔" محسن نے کہا لیکن بیگم رضوی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ فوری طور پہ میں نے باتھ روم کا رخ کیا اور نہانے دھونے کے بعد کپڑے بدل کے نکلا تو میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔

"واضح ہو کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں باقاعدہ طعام قسم کی کوئی چیز مجھے نصیب نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔

"افسوس یہ ہے کہ راہِ حق میں آپ کو شہادت نصیب نہیں ہوئی۔" محسن نے میز پر طبلہ بجاتے ہوئے کہا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا "مثلاً ایس ایس پی صاحب اور خاتون ایڈووکیٹ۔"

"اوّل الذکر آپ کی خبر لینے دفتر سے روانہ ہو چکے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "بار روم میں بھوک ہڑتال ہے۔"

"اچھا!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں بار روم تک ہو کے آتا ہوں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا کارِ ثواب ہے۔" اور محسن کے ہنستے اور بیگم رضوی صاحب کے مسکرانے کی پروا کیے بغیر میں باہر نکل گیا۔ رابعہ کا کمرہ بند تھا۔ میں نے ایک بار دستک دی اور کوئی جواب نہ پا کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ بیڈ پر پیر لٹکائے سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے بتا دیتے تھے کہ وہ سوئی نہیں اور روتی رہی ہے۔

"آہم۔" میں نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ "بقولِ شاعر ؎ بھوئیں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔"

وہ اٹھ کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ "بہت ناراض ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "اور تم کون ہوتے ہو یہ سوال پوچھنے والے؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ایسی ہی صورتِ حال میں کسی نے فرمایا تھا کہ ؎ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔"

"یہ تھرڈ کلاس شعر اور آؤٹ آف ڈیٹ طریقے ہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔ "زندگی فلم لیلیٰ مجنوں نہیں ہے۔"

"اچھا تو سیدھی طرح بتاؤ کہ منہ کیوں سُوجا ہوا ہے اور کھانے کی میز پر موجود نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟" میں نے کہا "جو کچھ میں نے کیا اس کی وضاحت تو ہوتی رہے گی۔ جواب کے لیے میں پانچ سیکنڈ دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ کسی کی پروا کیے بغیر اور کرسی پر لے جا کر رکھ دوں گا۔ ہو گئے پانچ سیکنڈ۔" میں ایک دم اس کی طرف بڑھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خاموش ہوا۔

"میں نے اسی وقت چوہدری دلاور کے گھر فون کیا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "لیکن حسبِ توقع اس نے یہی کہا کہ سکندر صاحب سے ملے تو زمانہ ہوگیا۔ میں نے کہا پھر تمہارے چوکیدار کے پاس سکندر کا بریف کیس کیسے پہنچا؟ کہنے لگا جنابِ عالی یہ آپ اسی سے جا کے پوچھیں۔ میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگا اپنے ایس پی صاحب! ہم قصوروار ہوں تو بے شک پھانسی لگوا دیجیے۔ آپ حاکم ہیں۔ مگر ایسے تو نہ کریں۔ سکندر کہیں چلا گیا ہے تو کیا شہر میں کسی کو بھی پکڑ کے اس سے زبردستی اعترافِ جرم کرا لیں گے کہ وہی سکندر کا قاتل ہے۔ پھر میں کیا کہتا اس سے۔ میں اور محسن فیکٹری پہنچے لیکن وہاں وہ چوکیدار ہی نہیں تھا جس نے محسن کو تمہارا بریف کیس دیا تھا۔ اسے میں نے شاہدرہ پولیس اسٹیشن بھجوا دیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو ابھی ابھی ڈیوٹی پر آیا ہے۔ اس سے پہلے چوکیدار کون تھا یہ اسے بالکل معلوم نہیں۔ صبح میں نے سرچ وارنٹ حاصل کیے اور فیکٹری کے اندر کونا کونا چھان مارا لیکن تم وہاں ہوتے تو ملتے۔"

"تلاشی کے دوران میں آپ کو وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کا تعلق کاروبار سے نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "کوئی غلط قسم کی یا مشتبہ بات نوٹ نہیں کی آپ نے؟"

رضوی صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں وہی ہو رہا تھا جو ہونا چاہیے۔"

"دلاور دور اندیش آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے یقین ہوگا کہ صبح چھاپا ضرور پڑے گا۔ اس نے راتوں رات سب صاف کر دیا۔"

"کیا صاف کر دیا؟" انکل رضوی نے بے خیالی میں کہا۔

"دیکھیے نا انکل! وہاں کوئی نہ کوئی غیر قانونی کاروبار ضرور ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ مجھے کاروبار سے الگ رکھنے کے لیے اتنے جتن نہ کرتے۔ اگر میں پارٹنر بن جاتا تو وہ فقیر نہیں ہو جاتے۔ دلاور کا منافع آدھا رہ جاتا نا، یہ آدھا بھی کم تو نہیں ہوتا۔ پھر یہ سب کچھ کیوں کیا اس نے؟ لندن میں نمائندہ بن کے لاکھوں روپے کمانے کی پیشکش، یکمشت رقم کی ادائیگی کی پیشکش تاکہ میں اس کاروبار سے دستبردار ہو جاؤں اور مجھے کسی نہ کسی طرح تختۂ دار تک پہنچانے کی سازش۔ وہ تو ہم نے انتظام ایسا کر لیا ہے کہ میرے قتل سے بھی ان کو فائدہ نہیں ہوتا۔ ایک کے بعد دوسرا وارث آ جائے گا۔ دلاور بزنس سے زیادہ منافع دینے کو تیار ہے، سلیپنگ پارٹنر بنانے کو تیار ہے مگر عملی طور پر کاروبار میں دخل اندازی کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتا ہے میں کاروبار سے دور رہوں۔ آخر کیوں؟ ظاہر ہے اس کو خطرہ ہے کہ قریب رہ کر میں اصل کاروبار کی نوعیت جان لوں گا۔ اور وہ میرے سامنے اعتراف بھی کر چکا ہے کہ یہ جائز کاروبار دوسرے ناجائز کاروبار کا پردہ ہے۔ یہ دوسرا کاروبار کیا ہے؟"

"مجھے اس سلسلے میں کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دینی پڑے گی۔" ضامن رضوی صاحب نے کہا۔ "اُن کی سرگرمیاں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے قانون کوئی چیز ہی نہیں۔ جسے چاہا اٹھا لیا، جسے چاہا مروا دیا اور اُن کا حوصلہ اس لیے بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ ابھی تک گرفت میں نہیں آئے مگر اُن کے ننانوے دن پورے ہو چکے ہیں۔ ایک دن اور سہی۔ اس سے اگلا دن تو زوال کا ہوگا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رضوی صاحب مستقل مزاج اور دُھن کے پکے تو مشہور ہی تھے۔ اس وقت وہ برہم بھی تھے اور یہ برہمی اپنی بے بسی پر تھی۔ "آپ کی یہ خصوصی ٹیم کیا کرے گی انکل؟" میں نے ایک فضول سا سوال کیا۔

"ابھی سے کیا بتا دوں تمھیں کہ کیا کرے گی؟" انکل رضوی نے چڑ کے کہا۔ "ہر ٹیم اپنے طریقۂ تفتیش کو حالات کے مطابق طے کرتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عام کارکن کی حیثیت سے فیکٹری میں بھرتی ہو جائیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہر سیکشن کے فورمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ دلاور کے اپنے آدمی ہیں۔ ڈی سلوا کی جگہ وہ بیٹر ڈکو احمد نواز گردیزی بنا کے لے آیا ہے۔ کچھ تجربہ اسے ہے۔ باقی راہنمائی دلاور کرے گا اور اسے چلائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ فورمین اپنے اپنے سیکشن کے آدمی خود رکھتے ہوں گے۔ اگر والد مرحوم زندہ ہوتے یا میر شرافت علی ہی ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ پرانے وفادار کارکن کتنے ہیں اور نئے آدمی کتنے۔ میں تو کسی کو بھی نہیں پہچانتا، نہ وہ مجھے جانتے ہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی نے ایک ایک کر کے سب پرانے آدمی نکال باہر کیے ہوں گے اور جیسے جیسے بھروسے کے آدمی ملتے گئے ہوں گے، انھیں رکھتے گئے ہوں گے۔ بے شک ہر راہ چلتے کو ایک مخصوص مہارت کا مشینی کام نہیں سونپا جا سکتا لیکن ان مشینوں کو چلانے کے لیے کوئی ڈگری یا کورس نہیں کرنا پڑتا۔ جسے بھی خراد کا کام آتا ہو وہ ان مشینوں پر کام کر سکتا ہے اور خراد کی مشین کا استعمال تین مہینے میں آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ افراد بھی لالچ میں ضمیر فروش بن سکتے ہیں۔"

"ابھی تو میرا خیال ہے کہ تمھارے ساتھ ایک بار دلاور سے ملاقات کروں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"دوسرا کام آپ یہ کریں کہ سوہاوہ سے آگے جی ٹی روڈ پر بائیں جانب کے علاقے پر نظر رکھیں۔ اُدھر کوئی ایسی جگہ ضرور ہے، جہاں ان لوگوں کے ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"

"وہ سارا علاقہ سیکڑوں مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔"

"ارے رے.... کیا کرتے ہو۔" اس کی پریشانی قابلِ دید تھی۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔ میں چلتی ہوں۔ چلتی ہوں بابا۔"

چند منٹ بعد میں رابعہ کے ساتھ مسکراتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچا لیکن انکل رضوی پر نگاہ پڑتے ہی میری مسکراہٹ منجمد ہو گئی اور میں ساری شوخی بھول گیا۔ "دیکھیے انکل! مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت خفا ہیں۔ لیکن پہلے آپ مجھے کھانا کھانے دیں۔ پھر اپنے کمرے میں لے جا کر میری گوشمالی کریں یا بے عزتی خراب فرمائیں۔ مجھے منظور ہے۔ لیکن میں بھوک سے ویسے ہی فوت ہونے والا ہوں۔ اس پر آپ نے مجمعِ عام میں پاپوشِ مبارک سے سرفراز فرمایا تو...."

انکل رضوی مسکرائے۔ "بہت ڈھیٹ اور نامعقول ہو۔ چلو بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" میرا خیال ہے میرے آنے سے پہلے ہی بیگم رضوی نے انہیں کسی شفیق ماں کی طرح سمجھا دیا تھا کہ خیر سے گھر لوٹ کے آنے والے بدھو پر ایک دم جوتا لے کر مت پل پڑنا۔ پہلے اس کی سُن لینا۔ ورنہ میرے مسخرے پن پر وہ اور بھڑک اٹھتے۔

"کچھ نہیں انکل۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "یہی وقت تھا اس کا دماغ درست کرنے کا۔ آپ کو پولیس کے بجائے محکمۂ انسدادِ بے رحمی حیوانات میں ہونا چاہیے تھا۔"

کھانے کے بعد بند کمرے میں ایک اجلاس ہوا۔ انکل رضوی، رابعہ اور محسن کی طرف سے مجھ پر ایک ہی الزام تھا کہ سیدھی طرح گاڑی لے کر گھر آنے کے بجائے مجھے خالی ہاتھ ممنوعہ علاقے میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کی اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات بلا کم و کاست سنا دیے۔ میرا بیان کوئی ایک گھنٹہ جاری رہا۔ محسن صوفے پر نیم دراز رہا اور انکل رضوی ہاتھ پیچھے باندھے کمرے میں ٹہلتے رہے۔

"میں تو گھر آتے ہی سو گیا تھا اور شام کو اٹھا۔" محسن نے کہا۔ "جب رات ہوئی تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ مکینک نے کام وقت پر پورا نہیں کیا ہوگا لیکن دیر کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں رکشا لے کر گیراج گیا تو گاڑی تیار تھی۔ مالک نے کہا کہ کام تو مغرب کے وقت ہی ختم ہو گیا تھا لیکن کوئی لینے ہی نہیں آیا۔ میری جیب میں اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ مرمت کے اخراجات ادا کر کے گاڑی لے آتا۔ میں نے کہا اچھا، میں دیکھ کے آتا ہوں۔ مقبرۂ جہانگیر جانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ میں نے سینما کا رُخ کیا جہاں مسرت نذیر کی تہلکہ خیز فلم 'یکے والی' چل رہی ہے۔ آپ نے دیکھی ہے انکل؟"

"کیا؟" رضوی صاحب نے چونک کر کہا۔ "لاحول ولا قوۃ...."

میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

"خیر۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ راہ میں میری نظر "ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس" کے بورڈ پر چلی گئی۔ اسے آپ چھٹی حس کہیں یا ٹیلی پیتھی یا کچھ اور۔ مگر میں رک گیا اور مجھے خیال آیا کہ کیا میں یہاں سے گزرتا اور سکندر ریجنٹ ہوتا تو میرے قدم آگے بڑھتے؟ جواب نفی میں آیا کیونکہ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں نے سوچا پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ جب چوکیدار نے مجھے صرف بریف کیس دیا تو میں چکرا گیا۔ صرف بریف کیس؟ وہ آدمی کہاں ہے جس کا بریف کیس تھا؟ چوکیدار نے جانتے بوجھتے یا بے خبری کے باعث کہا کہ اندر کوئی نہیں۔ فیکٹری بند ہو چکی ہے۔ اس نے کہا کہ اندر جانے کا کوئی سوال نہیں۔ میری تمام جرح بے کار گئی۔ اس کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ وہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں بریف کیس لے کر مین روڈ پر آ گیا اور ایک گھنٹے تک کھڑا رہا۔ ٹرک میرے سامنے نکلا تو میں نے فوراً رکشا ٹیکسی تلاش کیے۔ اگر اس وقت میری جیب میں اتنی رقم ہوتی کہ میں کار چھڑا سکتا تو تعاقب کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ رکشا مجھے ملا وہ دس منٹ بعد ملا اور جب چلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی رفتار سائیکل کے برابر بھی نہیں۔ پانچ چھ میل کے بعد اس کے پلگ میں کچرا آ گیا اور اس نے سیٹ اٹھا کے پلگ نکالا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور دوسرے رکشے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر پنڈی جانے والی ایک ویگن آ گئی اور میں اسی میں بیٹھ گیا۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ میں نے ٹرک کا نمبر نہیں دیکھا۔ ایک تو موڑ پر اندھیرا تھا، نمبر پلیٹ کو روشن رکھنے والی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ راستے میں کہیں نہ کہیں میں ٹرک کو دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔ ویگن کی رفتار ٹرک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن پہلے تو ویگن ایک جگہ ڈیزل بھروانے کے لیے رک گئی۔ قسمت کی خرابی دیکھو کہ ویگن کے پیٹرول پمپ پر پہنچنے تک بجلی جا چکی تھی۔ اِدھر ویگن کی باری آئی اُدھر بجلی غائب۔ خیر انہوں نے ہاتھ سے ہینڈل گھما کے ڈیزل بھر دیا۔ ایک ایک منٹ کا انتظار میرے لیے دوبھر تھا اور میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ ٹرک اتنی دیر میں کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ خدا خدا کر کے ویگن پھر چلی اور ابھی بچیس میل دور ہی گئی ہوگی کہ اس کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ اس وقت گوجرانوالہ شہر کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ عام حالات میں پہیہ بدلنا دس پندرہ منٹ کا کام ہوتا ہے لیکن ان کے پاس جیک نہیں تھا۔ میں ذرا گرم ہوا کہ گاڑی ایسے ہی لیے پھرتے ہو تو کہنے لگے کہ جیک چوری ہو گیا تھا، ابھی کسی سے لے لیتے ہیں۔ پھر وہ سڑک پر کھڑے ہو کر آنے والی ویگن کو ہاتھ دیتے رہے۔ آدھے گھنٹے بعد ایک ویگن کے ڈرائیور نے اس کی مدد کی لیکن اس وقت تک میں بالکل مایوس ہو چکا تھا اور مجھے یہ خیال بھی تھا کہ سکندر تو گیا ہی تھا، میں بھی واپس نہ پہنچا تو انکل رضوی کہیں گے کہ لو۔ یک نہ شد دو شد۔ میں وہیں سے لوٹ آیا اور میں نے انکل کو ساری بات بتا دی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رضوی صاحب نے کہا "اس میں نہ جانے کتنے گاؤں ہوں گے۔ پہاڑیوں اور کھائیوں کا کوئی شمار نہیں۔"

"میں دائرہ کار کو کسی حد تک کم کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا "یہ تو ظاہر ہے کہ طافے اور گامے کو ابھی کچھ اور آگے جانا تھا۔ جہاں وہ رُکے تھے وہاں تک میں پہنچ جاؤں گا۔ تلاش کا سلسلہ اس سے آگے شروع کیا جائے۔ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ اُن کی منزل زیادہ دُور نہیں رہی تھی جی ٹی روڈ پر اُن کو موقع نہیں ملا کہ گامے کو کچل سکیں۔ اسے زندہ سلامت منزل تک پہنچانا احکامات کی خلاف ورزی کے مترادف ہوتا۔ شاید ان سے پہلے دلاور خود پہنچ چکا ہوتا یا اس کے معاونین منتظر ہوتے۔ مثلاً وہ نقلی ڈی۔ ایس پی سراج۔ وہ نقلی نواب خسرو جمشید۔ یا پیڈرو۔ اس مقام سے آگے جہاں طافے اور گامے نے ایک دوسرے کو مار ڈالا او چکوال سے پہلے ہی کہیں کوئی خفیہ جگہ ہو گی۔"

"ایسے لوگ خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹھکانہ بدل لیتے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا "وہیں فتح جنگ کے پاس انتہائی خطرناک قسم کا دشوار گزار جنگل بھی ہے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ناشتا کر کے تم میرے ساتھ چلو۔ تم دونو!"

نو بجنے میں پندرہ منٹ پر ہم رضوی صاب کی جیپ میں "ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس" پہنچے۔ وہ ایس ایس پی کی وردی میں تھے۔ چنانچہ دربان کی جرأت نہ ہوئی کہ اُن کا راستہ روک کے تشریف لانے کا مقصد پوچھے۔ جاسوسی ناول پڑھنے والا نوجوان کھڑا ہوا اور دم بخود کھڑا رہا۔ جیپ اندر داخل ہوئی اور بائیں طرف گھوم کے دلاور کے آفس کے سامنے رک گئی۔ دلاور کے پی اے نے بڑی پھرتی دکھائی اور فوراً انٹر کام اٹھا کے دلاور سے کچھ کہا۔ اس نے یقیناً ایس ایس پی کے دوبارہ اور میرے ہمراہ آنے کی اطلاع دے دی تھی لیکن دلاور نے حسب سابق بڑے سکون اور اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ جب ہم نے دروازہ کھولا تو وہ غور سے کسی فائل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور مسکرا کر آہستہ آہستہ اٹھا۔

"واہ بھئی واہ! صبح صبح بڑی بڑی ہستیاں آ رہی ہیں آج تو۔ بڑا مبارک دن ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اس کا رویہ اور لہجہ دونوں ایسے تھے کہ نہ اُن سے کسی قسم کی مسرت کا احساس ہوتا تھا نہ حیرت کا۔ وہ ہمیں دیکھ کے نہ پریشان ہوا تھا نہ برہم۔ یہی ایس ایس پی ایک دن پہلے سرچ وارنٹس کے ساتھ اپنی پولیس فورس لے کر اس کی فیکٹری پر چڑھائی کر چکا تھا۔ گزشتہ رات اس کا ایک مشن ناکامی کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے دو کارندے اس ناکامی کی نذر ہو گئے تھے مگر اس کی صورت سے نہ تو افسوس کا اظہار ہوتا تھا نہ پشیمانی کا، نہ جھنجلاہٹ کا اور انتقامی جذبات کا۔ میں اور وہ تو ایک دوسرے کے باقاعدہ شناسا تھے۔ محسن میرا دستِ راست تھا اور ضامن رضوی صاحب اس کے خلاف ہی تھے۔ اس کے باوجود وہ اتنے تپاک سے ملا جیسے ہم روز کے آنے والے ہیں اور آج بھی ہمارا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ رضوی صاحب کی وجہ سے ہم نے بھی اپنی متانت برقرار رکھی اور خاموشی سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔

"کیا حکم ہے غلام واسطے؟" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انکسار کے ساتھ کہا "لیکن پہلے بتائیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم" اور جواب کا انتظار کیے بغیر انٹر کام اٹھا لیا۔

"کچھ نہیں۔" رضوی صاحب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی ناشتا کر کے گھر سے نکلے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا جی۔ وہ تو بڑی دیر ہو گئی۔" وہ مسکرایا "ایک پیالی چائے کی جگہ تو ہر وقت رہتی ہے۔"

"مسٹر دلاور! یہ بات کل بھی ہوئی تھی کہ ڈیوٹی پر میں خاطر تواضع قبول نہیں کرتا۔" رضوی صاحب کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

"اچھا جناب عالی!" وہ ہتھیار ڈالنے کے انداز میں بولا۔ "سکندر صاحب تو ڈیوٹی پر نہیں ہیں اور ان کے یہ دوست تو کئی بار آئے ہیں۔"

"دوسری بار۔" محسن نے یاد دلایا "میں کل شام بھی تشریف لایا تھا لیکن باہر سے ہی لوٹ گیا تھا۔"

"باہر سے کیوں جی؟" دلاور نے افسوس اور حیرت کا اظہار کیا۔ "اندر آنے میں کیا تھا! کوئی ناراضگی تھی ہم سے؟"

"مجھے اندر آنے ہی نہیں دیا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "چوکیدار نے مجھے ایک بریف کیس تھما کے واپس کر دیا تھا۔"

"کون سا بریف کیس؟ اور کون بدتمیز چوکیدار تھا وہ؟" وہ بولا "میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

"تمھیں سب معلوم ہے۔" رضوی صاحب نے میز پر ہاتھ مارا "لیکن تم اداکاری اچھی کر لیتے ہو۔ کل رات تمھاری فیکٹری میں سکندر کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ وہ چھ فورمین کہاں ہیں جنھوں نے اسے بے ہوش کیا اور ایک صندوق میں بند کر دیا تھا۔"

دلاور تصویرِ حیرت بن گیا۔ "رات کو کس وقت اپنے صاحب! فیکٹری تو پانچ بجے بند ہو گئی تھی۔"

"بکواس مت کرو۔" رضوی صاحب نے گرج کر کہا "اُن سب کو حاضر کرو۔ سب کو شناخت کے لیے لاؤ۔ کرو۔"

"جو حکم عالی جاہ! لیکن بات آہستہ ... اس نے مرعوب ہوئے بغیر پھر انٹر کام اٹھا لیا۔ "او میاں! یہ جتنے بھی فورمین ہیں نا، سب کو میرے پاس بھیج دے۔ فوراً۔"

"تمھارا ایک فورمین غلام محمد بھی ہے۔" میں نے کہا "گامے کے نام سے مشہور ہے۔"

"ہو گا۔ دراصل مجھے فیکٹری کے سب ورکرز کے نام ایسے یاد نہیں رہتے۔ صورت سے سب کو پہچانتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا تو الطاف عرف طافے نام کے ایک شخص کو بھی بلوا لو۔" میں نے کہا۔

"ابھی لو جی۔ او دیکھ میاں! کوئی الطاف ہے یہاں، طافا۔ ہاں اسے بھی حاضر کر۔" وہ انٹر کام میں بولا۔

چند منٹ بعد پہلا شخص اندر آیا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی۔ اس کے بعد پانچ افراد اور آ گئے اور ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ان سب کی صورتوں پر ایک جیسا سوالیہ نشان تھا اور ایس ایس پی کو دیکھ کر وہ مزید نروس ہو گئے تھے۔

"کل مجھے بتایا گیا تھا کہ فورمین سات ہیں۔" میں نے کہا۔

"ساتواں آدمی حکم عدولی کرتے ہوئے چلا گیا تھا۔"

"بولو بھئی! کل اپنے سکندر صاحب سے کیا بات ہوئی تھی؟" دلاور نے ان چھ افراد سے مخاطب ہو کر کہا جن میں ایک کی صورت بھی میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ مجھے ٹھوک پیٹ کے پیک کرنے کے لیے جو چھ افراد لائے گئے تھے وہ اور تھے۔ میں خود کسی کو کہاں پہچانتا تھا کہ اعتراض کرتا چنانچہ چھ آدمی فورمین بنا کے میرے سامنے پیش کر دیے گئے تھے۔ ایک بات غور طلب تھی۔ وہ سب کام کی نوعیت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات ضرور رکھتے تھے اور اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مختلف ورکشاپس کے ملازم تھے یا انہیں باہر سے لایا گیا تھا۔ تب بھی وہ تربیت یافتہ فورس تھی جس کا اصل کام فیکٹری سے باہر تھا مگر وہ اندر کے معاملات میں بھی کورے نہیں تھے۔

"یہ سب لوگ مختلف ہیں۔" میں نے کہا "اگر یہ فورمین ہیں تو وہ کون تھے جن کو فورمین بنا کے لائن اپ کیا گیا تھا۔ ساتواں آدمی کہاں ہے؟"

دلاور نے سر کھجایا۔ "آپ کی بات کچھ اپنے پلے نہیں پڑ رہی ہے۔ فورمین تو یہی ہیں اپنے سکندر صاحب! کُل چھ۔"

"ان میں غلام محمد عرف گاما بھی ہے؟" میں نے کہا۔

"ضرور ہو گا جی۔"

ایک لاغر اور بائنس جیسا شخص آگے بڑھا۔ "غلام محمد میرا نام ہے۔" اس نے کہا۔ جسم کے مقابلے میں اس کی آواز حیرت انگیز طور پر بھاری تھی۔

رضوی صاحب بڑے غور سے اُنہیں دیکھ رہے تھے اور اُن کے ماتھے کی ہر شکن ظاہر کرتی تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے ہر فورمین نے اپنا تعارف کرایا یا شناختی کارڈ دکھایا۔ یہ بتایا کہ وہ کب سے ملازم ہے اور کیا کرتا ہے۔ وہ سب سچ بول رہے تھے۔ چنانچہ شبہے کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ گزشتہ شام چھ افراد کی خصوصی ٹیم برآمد کی گئی تھی اور وہ سب دلاور اینڈ کمپنی کے غیر قانونی کاروبار کو چلانے والے لوگ تھے جن کا فیکٹری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چوکیدار پرانا آدمی تھا لیکن وہ باہر کھڑا تھا۔ اگر میں اس سے پوچھتا تو وہ یقیناً بتا دیتا کہ ان میں سے فورمین کوئی نہیں لیکن مجھے شک ہی نہیں ہوا تھا کہ دلاور اتنے کم وقت میں بھی اتنی کامیابی سے اس قسم کا چکر چلا سکتا ہے۔ شاید چوکیدار کا قصہ پاک کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ بوقت ضرورت وہ گواہ نہ ہو سکے۔ انکل رضوی کے سوالات کے جواب میں ان لوگوں نے بتایا کہ وہ پندرہ سے بیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں اور انھیں خود مرحوم وزیر خان نے ملازم رکھا تھا۔ وزیر خان کے متعلق اُن کی معلومات وہی تھیں جو عام طور سے مشہور تھیں کہ وہ بیمار رہنے لگے تھے اور بہت کم آتے تھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے عملاً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور سارے معاملات میر شرافت علی پر چھوڑ دیے تھے۔ چودھری دلاور صاحب میر صاحب کے ساتھ مل کر کاروبار کو چلاتے رہے۔ وزیر خان کے انتقال تک۔

میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ "طافے یعنی الطاف کو نہیں بلوایا گیا۔"

"ابھی بلا لیتے ہیں جی کسی کام میں لگا ہوا ہو گا۔" دلاور نے انٹر کام اٹھایا۔ "او یار اس طافے کے بچے کو گردن سے پکڑ لا۔"

طافے کی صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ الیکٹریشن ہے اور فیکٹری میں بجلی کی ہر خرابی دور کرنا اسی کا کام ہے۔ مجھے ذہن پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص سے پہلے کب اور کہاں ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن اس نے اپنے الیکٹریشن ہونے کا ذکر کیا تو یکلخت وہ پورا منظر میری نظروں میں گھوم گیا۔ جب مجھے کسی فلم میکر کی خالی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا جہاں میرے سامنے خیرہ کُن سرچ لائٹس لگا دی گئی تھیں تاکہ میں عملاً اندھا ہو جاؤں۔ پھر دلاور نے ایک روشن پردے کے پیچھے سے سایہ بن کر گفتگو کی تھی۔ وہاں سرچ لائٹس لانے والا۔ صحیح نا دیے پر نصب کرنے والا اور جلانے، بجھانے والا یہی شخص تھا۔ مجھے اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کا شبہ بھی ہوا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"میں داد دیتا ہوں تمھاری چالاکی اور عیاری کی۔" میں نے سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد کہا۔ "تم نے بڑی صفائی سے میری آنکھوں میں دھول جھونکی۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں اپنے سکندر صاحب!" وہ بُرا مانے بغیر بولا۔ "ہم اور آپ ہی تو پارٹنر ہیں بزنس میں۔"

"چھوڑو یہ باتیں۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "وہ چوکیدار کہاں ہے جس نے محسن کو بریف کیس دیا تھا۔"

"چوکیدار تین ہیں اپنے ایس پی صاحب۔" دلاور نے کرسی کی پُشت کا سہارا لے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "اور اُن کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ اَب دیکھیں نا، کوئی بھی رات بارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ہر روز ڈیوٹی دینا نہیں چاہتا۔ رات بھر گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے نا جی۔ اس لیے ہم نے ایک انتظام کر رکھا ہے۔ باری باری شفٹ بدلتی رہتی ہے۔"

"کل پانچ بجے کون ڈیوٹی پر تھا؟" میرے ضبط کا پیمانہ چھلکنے والا تھا اور اگر انکل رضوی نہ ہوتے تو شاید میں دلاور کی گردن پر نوکِ خنجر رکھ کر سچ اُگلوا لیتا۔ دلاور حیرت انگیز طور پر سرد مزاج تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اسی طرح وہ اپنے حریف کو اعصابی شکست دے سکتا ہے۔ نہ وہ خود مشتعل ہوتا تھا اور نہ ایسا موقع آنے دیتا تھا کہ کوئی اور مشتعل ہو۔

"یہ ڈیوٹی کا چارٹ دیکھنا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "ایک تو گیا ہوگا چار بجے چھٹی کر کے۔ جو کل چار بجے سے بارہ بجے رات تک ڈیوٹی پہ تھا۔ وہ آج رات بارہ بجے سے کل صبح کے آٹھ بجے تک ملے گا۔"

"تمھارے پاس اسٹاف کے پتے تو ہوں گے۔ جہاں ہنگامی ضرورت میں تم ان سے رابطہ قائم کر سکو۔"

"ہاں۔ ایک رجسٹر تو ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "لیکن ہوتا یہ ہے اپنے سکندر صاحب کہ جب کوئی گھر بدلتا ہے تو اطلاع نہیں بتاتا۔ حالانکہ اس کا فرض ہے کہ نئے پتے سے مطلع کرے۔ بہت کم لوگوں کے پتے اَپ ٹو ڈیٹ ہوں گے۔ پھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اس نے پھر اپنے پی اے سے بات کی اور اُسے مطلوبہ رجسٹر لانے کے لیے کہا۔ اس میں چوکیدار فلک شیر کا وہی پتا درج تھا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ محلہ بی بی پاک دامن میں ایک کمرے کا مکان۔ اچانک مجھے ایک اور بات یاد آئی فلک شیر نے کہا تھا کہ وہ اپنے بھانجے غلام محمد کے ساتھ رہتا ہے جو فیکٹری میں فورمین ہے۔ لیکن فورمین غلام محمد بالکل مختلف آدمی تھا۔ چوکیدار مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ نیت اور اعمال کی خبر صرف خدا کو ہے۔ اس نے گلے کو اپنی منہ بولی بہن کا بیٹا کہا تھا، جب کہ اس کی بیوی کے بیان کے مطابق وہ فلک شیر کا بیٹا تھا۔ اس جھوٹ یا ...

ثواب سے قطع نظر چوکیدار کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ فیکٹری میں فورمین ہے۔ شاید وہ گاما اکثر فیکٹری میں آتا جاتا ... وہ چوہدری دلاور کا کارندہ تھا اور اس نے خود ہی فلک شیر ... جھوٹ بولا تھا کہ وہ فورمین ہے۔ اب وہ مر چکا تھا اور فلک ... بیوی بچوں کے ساتھ خیبر میل میں کراچی کی جانب رواں تھا ... محلہ بی بی پاکدامن جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہاں مکان ... اور ہمارے کسی سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ رات ... بجے آ کے ہم مزید بے وقوف بنتے۔

خود رضوی صاحب کنفیوژن میں مبتلا تھے۔ گزشتہ روز ... اور آج کی جرح رائیگاں گئی تھی۔ "اچھا مسٹر دلاور!" انھوں نے ... بعد کہا۔ "تمہارے ریکارڈ پر ہر قسم کی گاڑیوں کی فہرست تو ہو ..."

"بالکل ہے جناب عالی! اس میں سب کچھ ہے۔ کون ... کب خریدی گئی تھی۔ کتنے میل چل چکی ہے۔ کتنی بار سروس ہو چکی ..." وہ بولا۔ "ہر گاڑی کی لاگ بک الگ ہے۔ اس میں تو یہ بھی ... جاتا ہے کہ گاڑی کہاں گئی تھی۔ کتنے میل چلی۔ اس سے پیٹرول ... کے خرچ کا صحیح اندازہ رہتا ہے ورنہ یہ ڈرائیور تو لوٹ کر کھا ... کوئی سوال کیے بغیر کہ یہ تفتیش کس سلسلے میں کی جا رہی ہے اس ... کہ ہر گاڑی کی لاگ بک لائی جاتے۔

ٹرک کا نمبر مجھے یاد تھا چنانچہ ایک لاگ بک میں نے ...

"یہ گاڑی کل کہاں تھی؟"

"آپ بھی خوب مذاق کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب!" ...

"دراصل سارا قصور عمر کا ہے۔" وہ رضوی صاحب سے مخاطب ... بولا۔ "طبیعت میں تھوڑی سی شوخی ہے۔ اس گاڑی کو خود سکندر ... کل کہیں لے گئے تھے۔ اب ہم سے پوچھ رہے ہیں اور ا... صاحب! ہم خود تو کبھی آپ سے شکایت نہ کرتے۔ لیکن بتا... پڑے گا۔ مجھے تو چوکیدار سے معلوم ہوا۔ یہ آج صبح گاڑی کو ... کے سامنے چھوڑ گئے اور چابیاں بھجوا کے چلے گئے۔ میں نے ... جا کے دیکھا تو بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ انھوں نے "میر وزیر اینڈ ... کو "نذیر اینڈ کمپنی" بنا دیا تھا۔ پینٹ کھرچ کے۔ تھوڑی سی کاری... انھوں نے نمبر پلیٹ میں بھی دکھائی تھی۔ معلوم نہیں نمبر بدلنے کا ... کیا تھا۔ اب الٹا مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو آپ بتائیں اپ... صاحب کہ گاڑی کو آپ کل کہاں لے گئے تھے؟

"کیا میرے پاس گاڑی کی چابیاں تھیں۔ اصل چابیاں ... نے برہمی سے کہا۔

"اصل نقل کا تو ہمیں پتا نہیں جی۔ لیکن آپ تو جا... بھی گاڑی کو اسٹارٹ کرنا ناممکن نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک ...

... چاہیے۔ جب چوکیدار نے مجھے وہ چابیاں لا کے دیں اور حلیہ بتلایا ... سمجھ گیا کہ اپنے سکندر صاحب ہی ہوں گے۔"

میں نے غصے کو ضبط کیا۔ مجرم دلاور تھا یا طافے اور گامے کی ... تھی لیکن کتنی آسانی سے الزام میری ذات پر آ رہا تھا۔ صرف اس ... بے وجہ جذباتی ہو کے میں نے ایک غلطی کی تھی اور نئے چوکیدار کو ... اپنے خلاف ایک گواہ بنا لیا تھا۔

"میرے آنے کا مقصد بھی یہی تھا چوہدری صاحب!" رضوی صاحب نے لہجہ بدل کے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ ذرا غیر ذمے دار قسم کے لڑکے ہیں۔ شرارتیں کرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ ... کچھ باتیں وضاحت طلب رہ گئی تھیں جن کی آج وضاحت ہو گئی۔"

"آپ ہزار بار تشریف لائیں جی۔" دلاور نے مصافحہ کرنے کے بعد اٹھ کے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ "ہم کوئی بُرا تھوڑی ملتے ہیں۔ وہ فارسی میں کچھ کہتے ہیں کہ جس کا حساب ٹھیک ہو وہ محاسبے سے نہیں ڈرتا۔ کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی۔ خدمت کا موقع تو دیا ہی نہیں آپ نے۔" وہ دروازے تک ہمارے ساتھ آیا۔ "بے شک آپ رشوت نہیں لیتے۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔ مگر چائے کی ایک پیالی تو رشوت میں شمار نہیں ہوتی۔ مہمان کے لیے اتنا تو سب ہی کرتے ہیں۔ خیر آپ کی مرضی۔"

اس نے محض اپنے اعتماد اور پُرسکون لہجے سے بات بگڑنے نہیں دی تھی اور یہ ایسی صلاحیت تھی جس کا اعتراف مجھے بھی کرنا پڑا۔ اتنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ میرے لیے ناممکن تھا۔ دلاور کی جگہ میں ہوتا تو کسی ایس پی کو کمرے میں قدم نہ رکھنے دیتا۔

واپسی پر ضامن رضوی صاحب ذہنی طور پر غیر حاضر تھے اور میرا خیال ہے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ میری ذہنی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ دلاور کے پاس آ کے میں نے خود کو صرف بے وقوف ثابت کیا ہے۔ اور دلاور نے ایک بار پھر واضح کر دیا ہے کہ اس کا حصار کتنا مضبوط ہے۔

"میں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ تم جذباتی ہو کے جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہو۔" رضوی صاحب نے اچانک کہا۔ "تمہارے مقابلے میں دلاور دفاعی کھیل کھیلتا ہے۔ پہلی غلطی تم نے یہ کی تھی کہ خالی ہاتھ اور اکیلے فیکٹری میں جا گھسے تھے۔ اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اندر پہنچ کر تم نے اپنے مالکانہ اختیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ اختیارات قانونی طور پر تمہیں حاصل نہیں ہوتے اور اس کے لیے بہت غلط وقت کا انتخاب کیا۔ تم کسی وقت جاتے تو کچھ نہ ہوتا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انکل۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کے کہا۔

وقت کوئی غلط کام ہو رہا تھا۔ ثبوت تو کوئی نہیں

لیکن فرض کر لو کہ منشیات کی ایک کھیپ برآمد کے لیے تیار تھی ایسے وقت میں تمہیں اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ تم چھاننے کے بہانے تلاشی لو۔ اور حقیقت جان جاؤ چنانچہ تمہیں وہ ٹیم ملی جو دوہرا دھندا کرتی تھی۔ انھوں نے تمہیں راستے سے ہٹا دیا اور اپنا کام کر لیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ خانہ تلاشی میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ چھاپے بہت سوچ سمجھ کے مارے جاتے ہیں۔ طویل عرصے تک نگرانی کے بعد۔ مخبروں سے تمام معلومات حاصل کر لینے کے بعد اور فرار کے تمام راستے بند کر دینے کے بعد۔ تمہارا اچانک جانا چھاپے سے کم نہیں تھا۔ اگر تم آج جاتے تو دلاور خود تمہیں ہر ورکشاپ میں لے جاتا اور تمہیں اجازت دیتا کہ جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر لو۔ جو چاہو دیکھ لو۔ وہ ایک چال آگے کی سوچتا ہے۔ اس کو معلوم تھا کہ تمہاری تلاش کا آغاز یہیں سے ہوگا۔ وہ اگر چاہتا تو نہ ... بریف کیس چوکیدار کو ملتا اور نہ تمہارا پیغام۔ لیکن اس نے ہمارے لیے جال پھیلایا تھا۔ ہم آئے اور جھک مار کے چلے گئے۔ دلاور کا کیا نقصان ہوا؟ اس کی پوزیشن تو اور کلیئر ہو گئی کہ ایس پی صاحب نے دشمنوں کی رپورٹ پر چھاپا مارا لیکن ملا کچھ نہیں۔ آئندہ چھاپا مارنے کی اجازت لینا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری حماقت تم نے آج صبح کی۔ اگر تم اس ٹرک کو سڑک کے کنارے کسی جگہ بھی چھوڑ دیتے تو کیا حرج تھا۔ ٹرک بالآخر فیکٹری پہنچ جاتا۔ لیکن تم نے دلاور پر یہ جتلانے کی کوشش کی کہ تم کتنے بہادر اور عقلمند ہو۔ عقلمندی کے اس زعم میں تم بھول گئے کہ یہ نیا چوکیدار تمہارے خلاف ایک چشم دید گواہ ہو گیا ہے۔ دلاور جیسے دشمن کا مقابلہ ٹھنڈے دماغ سے اور عقل سے نہیں کرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ مجھے تو اب کوئی امید نظر نہیں آتی کہ ہمیں کسی خفیہ ٹھکانے کا سراغ تک ملے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خصوصی ٹیم تشکیل دینے کا پروگرام ختم کر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب مجھے سوچنا پڑے گا۔" انکل نے کہا۔ "دلاور سے میں پہلی بار ملا ہوں اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ تم دونوں کے مقابلے میں بہت بھاری پڑتا ہے۔ تم اس کے سامنے طفلِ مکتب ہو۔"

"کیا آپ کے خیال میں یہ لوگ منشیات اسمگل کر رہے ہیں؟" محسن خفت سے بولا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو ایسی کوئی شہادت نہیں ملی۔" انکل رضوی نے کہا۔ "یہ کوئی اور چکر ہے۔ اچھا اب تم لوگوں کا پروگرام کیا ہے؟ مجھے تو پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے۔"

"آپ ہمیں کہیں بھی اتار دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم گھر چلے جائیں گے۔ مجھے تو سونا ہے۔"

انکل رضوی نے جیپ روک لی۔ "میرا مشورہ مانو تو سوچ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سمجھے بغیر کوئی قدم مت اٹھاؤ۔ موقع ملے تو مشورہ کرلو۔ مجھ سے یا رابعہ سے۔ ورنہ کسی دن ایسے پھنسو گے کہ ہم بھی تمہارے لیے کچھ نہ کرسکیں گے۔" صاف ظاہر تھا کہ ان کا موڈ آف تھا۔

"آیا کچھ عقل شریف میں؟" محسن نے جیپ کے جاتے ہی طنز سے کہا۔

"ہر کام عقل پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔" میں نے کہا۔ "کچھ جذباتی فیصلے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ جب عقل ساتھ نہیں دیتی یا اتنی مہلت ہی نہیں ملتی کہ مشورے سے لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ مثلاً اب میں سوچ رہا ہوں کہ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے آفس کا ایک چکر لگا کے سابق استاد پیڈرو کو بحیثیت احمد نواز گردیزی جنرل منیجر کام کرتے دیکھوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اگر آپ نے آج اسے نہ دیکھا تو کیا آپ کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا؟" محسن نے بھنا کر کہا۔ "گھر چل سیدھی طرح۔"

"شیروانی۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے تیری ہمت شکستہ کرکے بزدل بنا دیا ہے۔ اس وقت چوہدری دلاور بہت خوش ہو گا کہ اس نے ایس ایس پی صاحب کو دوسری شکستِ فاش دی۔ حالانکہ میرا خیال ہے اب اس کی خیر نہیں۔ رضوی صاحب نے اس کو مع ثبوت گھیرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔"

"گویا رضوی صاحب بھی شکاری ہو گئے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ہماری طرح۔"

"یہی سمجھ لے۔ دلاور نے فون پر پیڈرو یعنی احمد نواز گردیزی کو ہنس ہنس کے ہمارے آنے اور جانے کا احوال سنایا ہوگا اور گردیزی کو اس وقت بالکل توقع نہیں ہو گی کہ ہم اہلِ ایمان ہیں۔ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔ وہ احمق ہے۔ نروس ہو جائے گا۔ اسی آفس میں ڈی سلوا کی اور میری چپقلش بلکہ جنگ ہو چکی ہے۔ ڈی سلوا دباؤ میں آگیا تھا۔ اپنے استاد پیڈرو کی شان دیکھتے ہیں۔ کوا ہنس کی چال کیسے چل رہا ہے۔"

"ایڈونچر کوئی نہیں ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "میں بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔" ہم ایک رکشا میں بیٹھ کر گئے۔

"جہاں تک موڈ کا تعلق ہے خان صاحب!" میں نے کہا۔ "تو دل اس وقت میرا بھی چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے؟ یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ مگر رابعہ کورٹ میں ہو گی اور ضابطہ فوجداری و دیوانی کے چکر میں سب بھول گئی ہو گی۔ ضابطہ عشق کی دفعہ ایک سو نو۔"

"ایک سو نو آوارہ گردی ہوتی ہے۔" محسن نے مجھے مطلع کیا۔

"یہ ظالم سماج عشق کو آج بھی آوارہ گردی ہی سمجھتا ہے حالانکہ آوارہ گردی عشق کے نصاب میں شامل ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً خانۂ مجنوں صحرا گردِ بے دروازہ تھا۔ وہ جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ چنانچہ میرے تصور میں اور کچھ زنانہ رومانی ناولوں کا سا منظر ہے کہ چودھویں کی رات۔ لبِ جوئبار اور دامنِ کوہسار۔ سرو سمن اور مرغزار۔ وہ جانِ بہار۔ لیکن حاضر اسٹاک میں کیا دستیاب ہے؟ دوپہر کا تارکول کی پکی سڑک۔ جوتیاں چٹخاتا میر وزیر ضمانت زیرِ دفعہ ——— اور ہیروئن ندارد۔ چنانچہ اب تصور سے ہی گزارا کیا ہے جیسے اسلام آباد میں آپ کی ممکنہ زوجہ کر رہی ہیں۔"

"یار تو نے کچھ پوچھا تھا اس سے؟" محسن نے نہایت سے دانت نکال کے پوچھا۔ "یاد کر رہی تھی مجھے؟"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میں اس دلشکن، دل آزار اور موضوع سے گریز چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس بدبخت کے ساتھ کچھ بزرگوں نے کیا یعنی زبردستی سے کام لے کر اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ بس کچھ وہ مجبور تھی اس لیے استحصال کا شکار رہی۔ مگر اب ایک انتقامی ردِعمل کا شکار ہے اور دروغ بر گردنِ راوی۔ سنوا ہر جوانِ رعنا و خورد کے ساتھ فرار پر کمر بستہ ہے۔ میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے اس کے کمرے میں وحید مراد اور ندیم کی دیکھی ہیں۔ علاوہ انکل رضوی اینڈ شیروانی کی تصاویر کے۔

"اگر تو نے کچھ اس بند نہ کی تو میں رکشا سے کود جاؤں گا یا تجھے پھینک دوں گا۔" محسن نے جھلا کے کہا۔

"رکشا ڈرائیور کو پھینک دینے میں زیادہ فائدہ ہے۔" نے کہا لیکن اسی وقت رکشا رُک گیا۔

میں اور محسن سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے۔ خلافِ توقع کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا۔ چوکیدار اوپر کھڑا تھا جہاں بائیں کا دروازہ اسٹاف روم میں کھلتا تھا اور بائیں طرف جنرل منیجر کا کمرا

"کس سے ملنا ہے آپ کو صاحب؟" نئے چوکیدار نے وہ پرانے چوکیدار سے زیادہ مہذب تھا۔

"ملنا تو سب سے ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم اجازت دو گے۔ حاکم ہو۔"

"ہماری کیا مجال صاحب!" وہ سمجھا ہم اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ "میرا مطلب ہے آپ کو جس سے کام ہے تو ادھر جائیں۔"

"ہمیں ڈی سلوا صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"وہ... وہ تو... ان کا انتقال ہو چکا ہے صاحب!" ہماری کم علمی پر کہا۔

"اچھا!" میں نے کہا۔ "ہم استاد پیڈرو سے ملیں گے۔"

"کون استاد پیڈرو جناب؟" اس نے حیران ہو کے کہا۔

ہم اس کو جواب دیے بغیر جنرل منیجر کے کمرے میں داخل ہو نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ پہلے وہی مختصر کمرہ آیا جس میں شہلا یہ جگہ نہ جانے کیوں ابھی تک خالی تھی۔ میں کو دھکیلا اور اندر داخل ہوا۔ میرے قدم!

جو شخص

جو شخص جنرل منیجر کی جگہ بیٹھا تھا وہ استاد پیڈرو نہیں تھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا اسمارٹ سا آدمی تھا۔ کھلتے ہوئے رنگ اور اکہرے جسم والا جس کے صاف شیو کیے ہوئے چہرے پر ہلکی ہلکی اور نفاست سے تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ اس کے گھنے سیاہ بال درمیان سے دو حصے کرکے بنائے گئے تھے اور اس نے آنکھوں پر قیمتی سنہرے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ سوٹ میں آفس آیا تھا لیکن کوٹ اس نے ہینگر سے لٹکا دیا تھا اور اب بے داغ سفید قمیص، سلیٹی رنگ کی پتلون اور آڑی سیاہ و سفید پٹیوں والی ٹائی میں ملبوس تھا۔ چہرے کے نقوش کی ملائمت سے وہ تعلیم یافتہ اور مہذب لگتا تھا۔

"یس پلیز؟" وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھا۔ "تشریف لائیے۔" اس نے مجھے اور محسن کو مقابل کی نشست پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"وہ... دراصل ہمیں مسٹر احمد نواز گردیزی سے ملنا تھا۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور گفتگو انگریزی میں کی۔

"احمد نواز گردیزی میں ہوں۔" اس نے بڑی شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔ "فرمائیے؟"

اگر وہ کہتا کہ میں الٰہ دین کے چراغ کا جن ہوں تب بھی میں اور محسن اتنا نہ چونکتے۔ ہم نے پہلے ایک دوسرے کی طرف اور پھر غور سے اس دوسرے احمد نواز گردیزی کی طرف دیکھا جسے ہمارے رویے نے تھوڑا سا حیران کر دیا تھا۔

"آپ کو یقین ہے... کہ آپ ہی احمد نواز گردیزی ہیں؟" محسن نے نہایت احمقانہ سوال کیا۔ "نئے جنرل منیجر؟"

وہ مسکرایا۔ "مجھے تو یقین ہے لیکن آپ لوگوں کو یقین نہیں آیا ہے، کیوں؟"

"کیونکہ ایک احمد نواز گردیزی سے ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" محسن نے کہا اور خود کو مزید خفت سے بچایا۔

"اسی جگہ؟ میرا مطلب ہے کسی نے عمداً آپ کو دھوکا دیا تھا؟" وہ بولا۔

"جی۔ لیکن اسے ہم سے یہاں نہیں ملوایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہماری ملاقات باہر ہوئی تھی اور اس کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ سابق جنرل منیجر مسٹر ڈی سلوا کی جگہ آیا ہے۔"

وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ "ملوانے والا کون تھا؟ اور کیا مقصد تھا اس کا؟"

"ایک تو یہ بات بہت لمبی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کے علاوہ... میں یہ سمجھتا ہوں یہ ہمارے باہمی مفاد میں بھی نہیں کہ ملوانے والے کا نام اور مقصد ظاہر کیا جائے۔ ایک نہ ایک دن آپ کو معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"آل رائٹ۔" وہ کسی تردد کے بغیر بولا۔ "یہ تو بتائیں گے آپ کہ وہ شخص خود کون تھا؟"

"استاد پیڈرو نام کے کسی شخص کو جانتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"استاد پیڈرو؟" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ "یہ بڑا عجیب سا نام ہے۔ میں نے پہلے کبھی نہیں سُنا۔"

"یہ شیخ مختار اور بیگم پارہ کی ایک فلم تھی۔" محسن نے کہا۔ "اس کا یہی نام تھا۔ پاکستان میں بھی ریلیز ہوئی تھی۔ نام ضرور سُنا ہو گا آپ نے۔"

"آپ لوگ خود کون ہیں؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔ "ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا ہے اور اپنے آنے کا کوئی مقصد بھی بیان نہیں کیا ہے۔"

"میرا نام سکندر ہے۔ سکندرِ اعظم نہیں، سکندر بخت۔" میں نے کہا۔ "ان دنوں بخت خراب ہیں لیکن سکندر ابھی تک ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ میرا دوست ہے مسٹر شیروانی عرف محسن حسن خان۔ ہمارے آنے کا مقصد صرف آپ سے ملاقات کرنا تھا۔"

"لیکن! میں تو آپ حضرات کو جانتا تک نہیں۔" حیرت زدہ گردیزی نے کہا۔ "ویسے فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"آپ ہمارے لیے چائے یا کافی منگوا سکتے ہیں۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکالی اور ایک اسے پیش کی۔ "جو بھی مل جائے۔"

"تھینکس۔" اس نے سگریٹ کی پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے رکھائی سے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ ریسٹورنٹ نیچے ہے۔ یہ آفس ہے میر وزیر اینڈ کمپنی کا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اطمینان سے سگریٹ جلا کے لائٹر اور پیکٹ محسن کو پکڑا دیے۔ "اس کے بانی اور ایک سابق مالک وزیر خان میرے والد تھے۔ ان کی وفات کے وقت میں انگلینڈ میں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ اب میں ان کا واحد وارث ہوں۔ میں نے حقِ وراثت کے لیے کیس فائل کر رکھا ہے چنانچہ آپ مجھے نصف فرم کا مالک سمجھ سکتے ہیں۔ میر شرافت علی کے بعد میں اور دلاور ہی رہ گئے ہیں۔"

اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ "آئی سی!" اس نے ابتدائی صدمے سے سنبھلنے کے بعد خوشگوار لہجے میں کہا اور دوبارہ مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "آپ نے بہت دیر میں بتایا۔ بہرحال۔ آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔"

"میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو مسٹر محسن کے والد وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس نے فوراً محسن سے بھی مصافحہ کیا اور تقریباً وہی الفاظ کہے جو مجھ سے کہے تھے۔ پھر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"مسٹر ڈی سلوا کے پاس ایک سکریٹری تھی" میں نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک کسی کا تقرر نہیں کیا؟"

"پرابلم یہ ہے مسٹر سکندر" وہ سوچتے ہوئے بولا" کہ تقرر کریں گے مسٹر چوہدری۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام آپ خود بھی کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔ "اور بہتر ہوگا کہ آپ کرلیں۔ میں دلاور سے بات کرلوں گا۔"

"تھینک یو مسٹر سکندر!" وہ شکر گزار لہجے میں بولا۔ "میں یہی چاہتا تھا۔ یو سی۔ کام میرا ہے۔ مجھے کیسے کرنا ہے اور کیسے لینا ہے۔ یہ میری پرابلم ہے۔ اب مسٹر چوہدری مالک ہیں اور مجھے اس میں بھی شبہ نہیں کہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ میری اور ان کی پسند ناپسند میں مطابقت ہو۔ جسے وہ سکریٹری منتخب کرکے بھیجتے، اگر وہ میرے مزاج اور طریقہ کار کو نہ سمجھ پاتی تو اس سے کارکردگی یقیناً متاثر ہوتی۔"

"اس لیے میں نے آپ کو اختیار دیا ہے کہ اپنی سیکرٹری کا انتخاب خود کریں" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے دیں جو انٹرویو کے لیے آئیں ان میں سے دیکھ لیں۔ اور تنخواہ بھی خود ہی صلاحیت اور تجربے کی بنا پر طے کرلیں۔"

گردیزی کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ ایک چپراسی کافی کی ٹرے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ ہمارے لیے کافی بنانے لگا۔ مجھے یہ شخص پسند آیا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کے بارے میں مفصل معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن مجھے کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ جنرل منیجر کے عہدے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ ڈراما میرے ساتھ چوہدری دلاور نے کیا تھا۔ اس نے چھ عدد بدمعاش جو اس کے ناجائز کاروبار کو چلاتے تھے "میرذ زیراینڈ کمپنی" کا فورمین بنا کے پیش کردیے تھے اور پھر مجھے ان کے حوالے کردیا تھا کہ مجھے صراطِ مستقیم دکھائیں۔ صبح مجھے رضوی صاحب کی موجودگی میں سخت خفت اٹھانی پڑی تھی جب اصل فورمین شناخت کے لیے صف بستہ کیے گئے تھے۔ دوسرا چکر دلاور نے مجھے جنرل منیجر کے لیے دیا تھا۔ اس نے اصل کاروبار کے لیے صحیح آدمی کا تقرر کیا تھا مگر میرے سامنے استاد پیڈرو کو احمد نواز گردیزی بنا کے کھڑا کردیا تھا۔ صرف میرا ردِعمل دیکھنے کے لیے اور لطف لینے کے لیے۔ مجھ پر واضح کرنے کے لیے کہ وہ مجھے احمق سمجھتا ہے اور بے وقوف بنا سکتا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر یں ہنگامہ برپا کرتا کہ یہ فراڈ ہے اور ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے تو وہ بڑے اطمینان سے اصل احمد نواز گردیزی کو سامنے لے آتا اور کہتا "آپ بھی کمال کی باتیں کرتے ہیں اپنے سکندر صاحب! مذاق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پوچھ لیں ان سے۔ یہ نئے جنرل منیجر ہیں۔ کیا ان کا نام کبھی استاد پیڈرو تھا یا ہے؟"

اور میں مزید بے وقوف بنتا۔

"آپ نے اپنے متعلق نہیں بتایا؟" میں نے کافی لے کر کہا۔ "پہلے آپ کہاں تھے؟"

"میں بٹالہ انجینئرنگ میں تھا۔" گردیزی نے کہا۔ "میں نے لائلپور کی زرعی یونیورسٹی سے گریجویشن کی تھی۔ بیکو میں سیل مانیٹر تھا۔ مسٹر چوہدری نے بہت اچھی آفر دی تو میں ادھر آگیا۔"

"آپ کو یقیناً کام سمجھنے اور چلانے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی" میں نے کہا۔ "لیکن کچھ مسائل ایسے ہوں گے جن سے خود کو الگ تھلگ رکھ کے آپ کامیاب رہیں گے۔"

"مثلاً؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "وہ کیا مسائل ہوں گے مسٹر سکندر؟"

"میں آپ کو تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ "میرے اور دلاور کے درمیان کچھ ذاتی اختلافات ہیں۔ قانونی طور پر ہم دونوں برابر کے مالک ضرور ہیں۔ بظاہر تپاک سے ملتے ہیں اور کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جو سب جانتے ہیں اور آپ کو بھی معلوم ہونی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مجھ پر میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے۔ الزام بے بنیاد ہے اور اس کا مقصد مجھے کاروبار سے الگ کرنا ہے۔ میری بے گناہی یا سزا کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ دلاور پورے کاروبار کا مالک بننا چاہتا تھا مگر ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ تفصیلات میں جائے بغیر میں کہوں کہ وہ میرا دشمن ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔"

احمد نواز گردیزی کے لیے یہ انکشافات ناقابلِ یقین تھے چنانچہ وہ بھونچکا بیٹھا تھا۔ "شاید اسی لیے آپ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں سیکرٹری کا تقرر خود کرلوں۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔ "مسٹر چوہدری ان احکامات کو منسوخ کردیں گے۔"

"اوہ نو۔" میں نے کہا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا۔ "میں نے بتایا ناکہ ہمارے ظاہری تعلقات اچھے ہیں۔" میں نے چوہدری دلاور کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ "اس فون کی ایکسٹینشن سیکرٹری کے کمرے میں ہے۔ آپ ہماری گفتگو سن لیں۔"

گردیزی اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔ "چوہدری صاحب!" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔ سکندر بول رہا ہوں۔"

"وعلیکم السلام اپنے سکندر صاحب۔" چوہدری نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "خیر ہے ناجی؟"

"ہاں۔ میں یہاں آفس میں گردیزی صاحب کے پاس بیٹھا تھا" میں نے کہا۔ "ان کے پاس کوئی سیکرٹری نہیں ابھی تک۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اخبار میں اشتہار دے کر رکھ لیں اور تنخواہ بھی خود طے کرلیں۔ جو بھی مناسب ہو۔"

"یہ اچھا کیا جی آپ نے" چوہدری دلاور نے بالکل نارمل رہتے ہوئے کہا۔ "میرا دردِ سر نہیں رہا۔ ویسے ہی وقت نہیں ملتا۔ کچھ یاد بھی نہیں رہتا۔"

"بس یہی بتانا تھا آپ کو۔ خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بتانا تو مجھے یہ تھا کہ میں اصل گردیزی سے مل چکا ہوں اور کسی بات پر بالکل حیران نہیں ہوں۔ گردیزی جب واپس آیا تو زیادہ مطمئن تھا۔

"یہ میں بھی نہیں چاہوں گا" گردیزی اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اور آپ کی بھی بڑی عنایت ہوگی کہ اپنے ذاتی اور قانونی مسائل سے مجھے بالکل الگ رکھیں۔ میں آپ دونوں کو ایک جیسا مالک تسلیم کرتا ہوں۔ کسی نے مجھے پارٹی بنایا تو میرے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ڈراما پڑھا ہے آپ نے 'اے سرونٹ آف ٹو ماسٹرز'۔ کمال احمد رضوی نے یہاں آرٹس کونسل میں 'صاحب، بی بی اور غلام' کے نام سے اسٹیج کیا تھا۔ تو وہ پوزیشن نہ ہو میری۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "آپ تو ماسٹر آف ٹو سرونٹس ہوں گے۔"

"آف دی ریکارڈ مسٹر۔" وہ بولا۔ "آپ مجھے قاتل ٹائپ نہیں لگتے۔ ذرا اپنا ہاتھ دکھائیے۔"

"آپ پامسٹری کے حساب سے فیصلہ کریں گے؟" میں نے کہا۔ "عدالتی نظام میں اس کی اہمیت نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ لیکن میرا اپنے علم پر سے یقین ختم نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی پروفیشنل نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ میرا شوق ہے۔ میں نے بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو ان خود ساختہ اور اشتہار وں سے بڑے بن جانے والے پامسٹوں نے دیکھی تک نہیں ہوں گی۔ دوسری زبانوں میں ایسی کتب کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔" اس نے میرے ہاتھ کو دیکھنا جاری رکھا۔ "میرا ایک دوست روسی نژاد تھا۔ اس کا باپ انقلابِ روس کے بعد ملک سے فرار ہوا تھا اور افغانستان کے راستے ہندوستان آگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ زارِ روس کا شاہی منجم تھا۔ بہت ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور اس کے گھر کے برتن بھی سونے چاندی کے تھے لیکن اس کو بھاگنا پڑا تو نقد و زر اور ہیرے جواہرات چھوڑ کے اس نے اپنے ساتھ وہی نایاب اور نادر کتابیں رکھیں جن کو وہ اپنی متاعِ حیات سمجھتا تھا۔ مرتے وقت وہ اپنا علم اور کتب خانہ بیٹے کو دے گیا۔ ظاہر ہے اب دنیا میں نہ زار ہیں، نہ شہنشاہ۔ پامسٹ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہیں۔ میرے اس دوست کی پرورش پاکستان میں ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ اس نے بیشتر کتابوں کا مجھ سے انگلش ترجمہ کرایا تھا کیونکہ یہ خبط مجھے بھی تھا۔ ان کتابوں کے ٹائپ کیے ہوئے مسودے میرے پاس پڑے ہیں۔ کوئی ناشر انہیں چھاپنے کے لیے تیار نہیں۔ خدا نے جب بھی توفیق دی میں انہیں اپنے خرچ پر چھپواؤں گا۔"

"تم اکیلے؟" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست اس منصوبے کے اخراجات میں حصہ نہیں دے گا؟ نام تو اسی کا ہوگا۔"

"نام۔" وہ تلخی سے مسکرایا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "وہ کئی سال پہلے ایک حادثے میں مرچکا ہے۔ مجھے معلوم ہونے تک اس کی تدفین ایک لاوارث کی حیثیت سے ہوچکی تھی۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے اخلاقاً کہا۔ "کس نتیجے پر پہنچے آپ؟ اعتقاد نہیں ہے میرا۔ لیکن تجسس سمجھ لیں اسے۔"

"میرا پختہ یقین ہے کہ آپ پر قتل کا الزام بے بنیاد ہے۔" وہ بولا۔ "آپ قتل کرہی نہیں سکتے۔"

"غیر ارادی یا اپنے دفاع میں بھی نہیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "فرض کیجیے کوئی میری جان لینے کی کوشش میں مارا جاتا ہے۔"

"وہ قتل نہیں ہے مسٹر سکندر بخت جو کسی ارادے یا نیت کے بغیر سرزد ہو جائے۔" گردیزی نے کہا۔ "میں قانون کی بات نہیں کرتا۔ ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ اگر روزے کی نیت کے بعد آپ بھول چوک میں کچھ کھالیں تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ بات ارادۂ قتل کی ہے جس میں فطری رجحانات کو دخل ہوتا ہے۔ گویا قتل عمد وہ آپ نہیں کرسکتے۔"

"ابھی میں اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "حالات خود اس کی گواہی دیں گے۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں آپ کو معلوم ہو جائیں گی۔ کچھ جھوٹ اور کچھ سچ۔ آپ اپنی عقل کے مطابق تجزیہ ضرور کریں۔ لیکن میں ایک بات کی قدر کروں گا۔ اگر آپ خود کو تمام معاملات سے الگ رکھیں اور صرف اس کام سے کام رکھیں جس کے لیے آپ کی خدمات مستعار لی گئی ہیں، تو بالآخر اس غیر جانبداری سے آپ کو فائدہ ہوگا۔ ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کوئی وعدہ کرسکوں لیکن آپ کی اس غیر جانبدارانہ فرض شناسی کی کوشش میں مشکلات کا سامنا ہوا تو میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہوگی۔ صرف جذباتی نہیں، عملی۔ اب میں چلتا ہوں۔ کوئی پرابلم ہو تو مجھے ایس ایس پی رضوی صاحب کے گھر فون کرلیجیے۔ میں نہ ملوں تو مسٹر محسن یا رابعہ قاری ایڈووکیٹ کو پیغام دے دیجیے۔"

وہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے اٹھا تھا اور اس کی صورت پر بڑی دوستانہ، شائستہ اور زندہ مسکراہٹ تھی اور اس کا ہاتھ الوداعی مصافحے کے لیے آگے بڑھا ہوا تھا۔ یکلخت وہ مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس چراغ کی طرح جس نے محفل کو روشن رکھا ہو۔ مرگئی، اس نوزائیدہ بچے کی طرح جس نے ابھی مسکرانا سیکھا ہو۔ اس کی نظر میں ایک ویرانی اتر گئی۔ اداس اور تنہا لمحوں کی طرح نوحہ خواں۔ اس کا وجود سیل وقت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اس پتھر کی طرح پڑا رہ گیا جسے دریا نے رُخ بدل کے پیاسا چھوڑ دیا ہو اور اس کا ذہن حال کی فصیل عبور کر کے ماضی کے ویرانوں میں بھٹکنے لگا جہاں ہر یاد کے مدفن پر ایک کتبہ تھا لیکن اس کی تحریر مٹ گئی تھی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ بے جان ہو کے گر گیا اور وہ لڑکھڑا کے بیٹھ گیا۔ اس کی حالت میں یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ میں نے تشویش سے محسن کی طرف دیکھا۔ وہ خود اس انقلاب پر حیران تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر گردیزی؟" میں نے کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔ "وہ بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔" میں نے پھر بیٹھ کے کہا اور کہنیاں میز پر ٹکا کے آگے جھکا۔ "کیا آپ رابعہ کو جانتے ہیں؟" میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ یہ تبدیلی جس نے اس دلکش شخصیت کا سارا طلسم باطل کر دیا تھا کس کے نام پر آئی تھی۔

"میں؟" وہ زبردستی مسکرایا۔ "کیوں۔ جانتا تو آدمی بہت سے لوگوں کو ہے۔ اب وہ اتنی مشہور وکیل ہیں۔"

بات کچھ اور تھی جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ ولادر کی طرح اچھا اداکار ہوتا تو اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنی صورت سے نہ ہونے دیتا اور مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا لیکن اس کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ تھا جس میں ہر جذبے کا عکس اپنے اصل روپ میں اتر آتا تھا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور بہت کچھ بتا دیا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مجھے نہ معلوم ہو تو اچھا ہے۔ محسن نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔

"اس گردیزی کو کیا ہو گیا تھا رابعہ کا نام سن کے؟" میں نے سڑک پر آتے ہی کہا۔

"اسے تو ہو گیا تھا مالیخولیا۔" محسن نے کہا۔ "تجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"رابعہ نے تو مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ یہ خیال آنا لازمی تھا کہ گردیزی کا رابعہ سے کیا تعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کی نوعیت جذباتی تھی۔"

"کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ یہ سب جان کے کیا کرے گا تو؟" محسن نے کہا۔ "اپنے مستقبل کی بنیاد اس حسد پر رکھے گا جس کا اب کوئی جواز نہیں۔ فرض کر رابعہ کبھی اس کو چاہتی تھی۔ یہی پھانس چبھ گئی ہے نا تیرے دل میں؟ اب تُو اس پھانس کو وہم کی طرح پالے گا۔ اس کی خلش سے آزار میں مبتلا رہے گا۔ تیرا دماغ خراب ہے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مار۔ آج وہ تجھے چاہتی ہے۔ صرف تیرے لیے زندہ ہے۔ کیا اس میں کوئی شبہ ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ میں کیا کروں۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا۔ "آدمی جسے چاہتا ہے دل سے نہیں، دماغ سے چاہتا ہے۔ اسے سمجھتا ہے۔ پرکھتا ہے اپنی خواہشات کے پیمانے سے۔ زندگی کے تقاضوں کے حوالے سے۔ مستقبل کی توقعات کے ترازو میں تول کر۔ اور رابعہ کو تو اسی طرح دیکھ کر طے کیا ہے کہ زندگی کے سفر میں اس سے بہتر تُو شاید پھر نہ ملے۔ یہ عقل کا فیصلہ تھا اس لیے میں نے بھی قبول کیا۔"

میں مجرم بنا خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا اب وہ کیا کہے گا۔

"فوزیہ میری بہن تھی ____________ مگر وہ جذباتی عمر تھی۔" محسن نے بات جاری رکھی۔ "میں حقیقت پسند نہ ہوتا تو تجھے قتل کر دیتا کہ تو نے اس کی زندگی میں کانٹے بوئے۔ ورنہ تیرا ساتھ تو چھوڑ ہی دیتا اور کوئی برا نہ کہتا۔ سب میرے ہمنوا ہوتے کہ تو نے دوست بن کے دغا کی اور رشتوں کی آبرو گنوا دی۔ لیکن میں جانتا ہوں، فوزیہ کی وابستگی بھی بس ایسی ہی تھی جیسی کہ اس عمر میں ہو جاتی ہے لیکن اب وہ تجھے بھول چکی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اپنے گھر میں وہ بہت خوش رہے گی۔ تجھے یاد بھی کرے گی تو زندگی کے ایک تلخ تجربے کی طرح جسے فراموش کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ رابعہ کی بات مختلف ہے۔ تم دونوں اب سنجیدہ مزاج اور پریکٹیکل ہو۔ تم دونوں اب ایک دوسرے پر شک کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس حسد وغیرہ کی اب تمہاری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر زندگی کے کسی دور میں رابعہ نے گردیزی کو پسند بھی کیا ہو گا تو اسے بالکل ایسے ہی بھول بھی جائے گی جیسے فوزیہ تجھے بھول جائے گی۔ اس کے علاوہ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ گردیزی کے جذبات یکطرفہ ہوں۔ صرف وہ رابعہ کو چاہتا ہو۔ رابعہ کو علم ہی نہ ہو یا پروا ہی نہ ہو۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"اور برادر۔ رابعہ کی فراخدلی بھی تو دیکھ۔" محسن نے کہا۔ "وہ تیرے اور فوزیہ کے جذباتی تعلقات کے بارے میں جانتی ہے مگر اس کے باوجود کیا وہ رشک یا حسد میں مبتلا ہوئی؟ اپنے رویے یا اشارے کنائے سے اس نے کبھی حوالہ دیا کہ اسے تیری ذات پر اعتماد نہیں۔ شاید اس نے کبھی سوچا تک نہیں کہ جیسے تو فوزیہ کے لیے بدل گیا، ایسے ہی پھر کسی کے لیے بدل جائے گا۔ اس کا یقین کامل ہے۔ اتنا کہ مجھے تعجب بھی ہوتا ہے اور تجھ پر رشک بھی آتا ہے۔"

"یقین تو میرا بھی کامل ہے۔" میں نے خفت سے کہا۔ "بس یہ ہی سوچ رہا تھا کہ یہ بات کیا ہوئی۔ تو نے اچھا کیا کہ میرے دماغ کو بھٹکنے سے پہلے ہی پھر راہِ راست پر ڈال دیا۔"

"اس کے باوجود تو رابعہ سے پوچھے گا کہ احمد نواز گردیزی کون ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اس طرح نہیں جیسے پہلے پوچھا۔ ممکن ہے وہ خود ہی بتا دے۔"

"وہ بتا دے گی۔" محسن نے کہا۔ "وہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی کہ تجھ سے کچھ چھپائے۔"

"مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ احمد نواز گردیزی وہی نہ ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہی کون؟" محسن نے چلتے چلتے حیرانی سے کہا۔ ہم دونوں پیدل ہی گھر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"اس کا پہلا شوہر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ معلوم نہیں رابعہ نے بتایا تھا یا نہیں۔"

"رابعہ کی شادی پہلے بھی ہو چکی ہے؟" محسن نے دم بخود ہو کے کہا۔

"ہاں۔ صرف شادی۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ شادی قانونی طور پر کافی عرصہ برقرار رہی۔ لیکن رخصتی کی نوبت نہیں آئی۔"

"کیوں؟" محسن نے کہا۔ "کسی کے ساتھ زبردستی ہوئی تھی؟"

"کسی کے ساتھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اپنی اپنی جگہ دونوں اچھے تھے۔ خراب کسی کو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ رشتہ سے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر بدنامی خود رابعہ کے حصے میں آئی۔ دنیا نے تو ظاہر کو ہی دیکھا کہ پہلے اس کی رخصتی التوا میں پڑی رہی۔ بظاہر کسی وجہ کے بغیر۔ پھر طلاق ہو گئی۔ کوئی خرابی تو ہو گی نا کہ بیاہنے والے بیاہ کر پچھتائے اور لے کر نہیں گئے اور شریف لوگ تھے اس لیے خاموش رہے۔ خرابی کی تشہیر نہیں کی اور طلاق دے کر الگ ہو گئے۔ شاید میں نے تجھے بھی بتایا تھا یہ سب کچھ۔ جس دن مجھے رابعہ سے معلوم ہوا تھا۔"

"ممکن ہے بتایا ہو۔" محسن نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ میں ذہنی طور پر غیر حاضر تھا اور کچھ سوچ رہا تھا ورنہ ایسی بات تو نہیں کہ میں سنتا اور بھول جاتا۔ بڑی مظلوم لڑکی ہے رابعہ بھی۔ اگر بات یہی ہے تو میں اس کی وسعتِ قلب اور نیک نیتی کا پہلے سے زیادہ معترف ہو گیا ہوں۔"

"اس نے زندگی سے بہت سمجھوتے کیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ حسرتوں، محرومیوں اور ناکامیوں کے سوا زندگی نے اسے کیا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہی بہت بڑا کمال ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کے حصار میں دراڑ تک نہیں پڑنے دی اور کسی منفی ردِ عمل کا شکار نہیں ہوئی۔"

"اگر احمد نواز گردیزی وہی شخص ہوا تو کیا ہو گا؟" محسن نے کہا۔

"کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہیں ہو گا۔ وہ رابعہ کا احسان مند تھا اور اس نے بعد میں بھی اپنا رویّہ دوستانہ رکھا۔ ایک بار میرے لیے رابعہ کو اس کے پاس جانا پڑا تھا تو اس نے رابعہ کی مدد کی تھی۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی ناکامی کے باوجود بعد میں تجھ سے وہ ذہنی رقابت محسوس کرنے لگا ہو۔" محسن بولا۔ "رابعہ نے تو خود کو بچا لیا مگر ممکن ہے اس کی اپنی شخصیت منفی ردِ عمل سے مسخ ہو گئی ہو۔"

"میری رقابت سے اسے کیا فائدہ اور مجھے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ جذبات کا مسئلہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک معصوم بچہ بھی معذوری کے باعث کسی کھلونے سے نہ کھیل سکتا ہو تو اسے توڑ دیتا ہے اور اس طرح دوسروں کو بھی اس مسرت سے محروم کر دیتا ہے جس سے وہ خود محروم ہے۔"

"نہ جانے کیوں میرا ذہن اس دلیل کو قبول نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "اس نے رابعہ کو نقصان نہیں پہنچایا تو میرے خلاف کیا

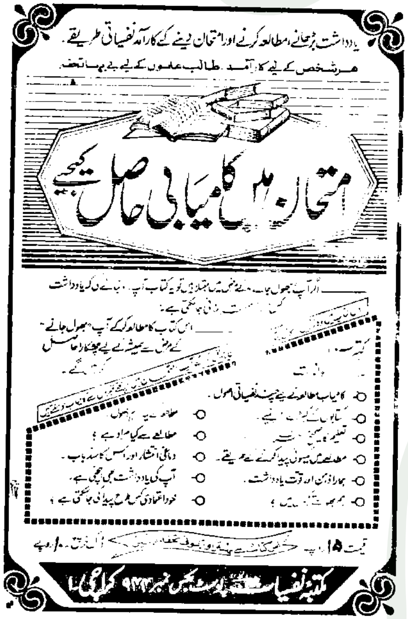

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کرے گا؟ اور کیوں کرے گا؟ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی، وہ کچھ اور ہے۔ رابعہ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سی ایس پی افسر ہو گیا تھا اور خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ احمد نواز گردیزی کہتا ہے کہ وہ بیکو میں تھا۔"

"فرض کرو یہ بات غلط ثابت ہوتی؟" محسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے میری وہ بات زیادہ قابلِ غور ہو جائے گی کہ محض رابعہ کی وجہ سے وہ تیرے خلاف حسد میں مبتلا ہو جائے۔ رابعہ ایسی لڑکی ہے کہ جو اسے قریب سے دیکھتا ہے، اس کے ظاہر اور باطن کے حسن کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شادی چل سکتی تو گردیزی خود کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب کیا وہ اس شخص کے لیے مخالفانہ جذبات کا شکار نہیں ہو گا جو اتنا خوش قسمت ہے کہ رابعہ اسے مل گئی ہے۔ حالات نے جو انعام اسے دیا تھا وہ تقدیر نے کسی اور کو بخش دیا ہے۔"

"نظریاتی طور پر میں تیری بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ عملی صورتِ حال کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے احمد نواز گردیزی نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی ہو۔ اسے ٹیالہ انجینئرنگ میں بہتر مواقع ملے ہوں۔ سرکاری نوکری ذہنی و جسمانی طور پر انسان کی طاقتِ پرواز کو محدود کر دیتی ہے اور اس کی صلاحیت کے لیے کوئی چیلنج نہیں بنتی۔ سال کے سال ایک انکریمنٹ ملتی ہے اور ترقی بھی قواعد و ضوابط کے مطابق ہو تو اس وقت تک نہیں ملتی جب تک کہ افسرانِ بالا کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل نہ رہے۔ گردیزی جیسے مرد زندگی کے ایک محاذ پر شکست کی تلافی یوں کرتے ہیں کہ باقی زندگی میں ہر جگہ فتح حاصل کرتے رہیں۔ ان کے نامۂ اعمال میں ناکامی کا لفظ صرف ایک بار آئے تو کامیابی کے ذکر سے ان کی داستانِ حیات دوسروں کے لیے قابلِ رشک بن جائے۔ یوں سمجھ لے کہ جسمانی توانائی کی سمت بدل جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گردیزی کو یہاں لایا گیا ہے۔"

میں چونکا۔ محسن کا سارا فلسفہ اچانک میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "تیرا مطلب ہے وہ بھی شکاری ہے؟"

"ہے نہیں تو ہو جائے گا۔ اس میں صلاحیت ہے اور وہ تمام صفات ہیں جن سے دوسرے شکاری فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اسے تھوڑی سی تربیت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کی سوچ کا انداز پہلے سے تیرے خلاف ہے۔ اب تک اس میں تخریبی عنصر شامل نہیں تھا لیکن ایک چیز کی کمی دوسری چیز سے پوری کی جا سکتی ہے۔ دولت کی طاقت سے اس کے جذبات کا رُخ اسی طرح موڑا جا سکتا ہے جیسے دریا پر بند باندھ کے اس کا رخ موڑ دیا جاتا ہے اور اس کے پانی سے ... جاتی ہے۔ تو خود سوچ کہ جہاں ڈی سلوا جیسا شخص ... چل سکتا ہے؟ اگر چلے گا تو صرف دو ہی صورتوں میں۔ ... کاروبار بدل جائے اور دلاور سابقہ دھندے چھوڑ کر ... جائز کام کرنے لگے۔ وہی پرانا کام جس کی بنیاد وزیر ... نے رکھی تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ دوسری صورت پھر یہی رہ ... ہے کہ گردیزی دوسرا ڈی سلوا بن جائے یا بنا دیا جائے۔ ... بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔"

"یار محسن حسن خاں شیروانی۔" میں نے کہا۔ "معاف کیجیے ... میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں کہ آپ دنیا کے سب ... احمق آدمی نہیں ہیں۔ جیسا کہ میرا عقیدہ تھا۔ یہ بات میری ... میں نہیں آ سکتی تھی۔"

"عقل ہوتی آپ کے سرِ عزیز میں تو رونا کس بات ... عزیزم۔" محسن نے شفقت سے فرمایا۔ "یقیناً آپ نے ... کو پسند کیا ہو گا۔ کوئی بھی شخص جو اس کے پس منظر سے آگاہ نہ ہو ... راست اس کا حریف نہ بنے یقیناً اس سے متاثر ہو گا۔ مگر تو ... وہی مورچہ فتح کیا ہے جس پر اسے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ ... سینے پر سجا ہوا رابعہ کی محبت کا میڈل اس کے منہ پر طمانچہ ... دلاور اینڈ کمپنی نے یہ مہرہ بہت سوچ سمجھ کے انتخاب کیا ... انہیں اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہو گی لیکن ... ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"اگر تصدیق کرنے پر معلوم ہو گیا کہ احمد نواز گردیزی ... انجینئرنگ میں نہیں تھا تو واقعی شبہے کی گنجائش نہیں رہے ... گردیزی نو آموز شکاری ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن بعد میں ... سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گا کیونکہ اس کا بہت بڑا اثاثہ ... اور صلاحیت ہے، علاوہ اس کی فطرت کے۔" میں نے سوچا ... کسی رکاوٹ کے بغیر بہتا ہے تو اس کے کنارے آباد ... ان سے کھیتوں کی زرخیزی قائم رہتی ہے اور زمین کی ... بڑھتی ہے لیکن گردیزی وہ دریا ہے جس کی راہ میں ایک ... نے رکاوٹ ڈالی ہے بے شک ایٹم سے حاصل ہونے والی ... قوت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس ... روشن ہوتے ہیں۔ مشینوں کے پرزے متحرک ہو جاتے ہیں جو ... کے لیے تن ڈھانپنے کو کپڑا بنتی ہیں اور زندگی کو پُر آسائش بنانے ... ہزار اسباب فراہم کرتی ہیں مگر یہی توانائی غلط مقاصد رکھنے ... اسیر ہو جائے تو ہیروشیما اور ناگاساکی کھنڈر بن جاتے ہیں ... کو پُرامن جنت بنانے والوں کے عزائم جوہری اسلحہ خانوں ... سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔

گھر میں ہم ٹھیک کھانے کے وقت پہنچے۔ بیگم رضوی، اُن کے دونوں بچے اور رابعہ سب میز پر جمع تھے۔

"انکل سکندر۔" رضوی صاحب کے چھوٹے بچے نے کہا۔ "انٹی نے کہا تھا اب آپ کی خیر نہیں۔"

"کیونکہ ڈیڈی مولا بخش کو لینے گئے ہیں۔" دوسرے نے شرارت سے کہا۔ ان کی ماں نے گھور کر انہیں دیکھا۔

"انکل! یہ مولا بخش کون ہے؟" چھوٹے نے ماں کی تنبیہہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"مولا بخش؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا ایک بچپن کا دوست ہے۔ ہماری طرح سیدھا سادہ۔"

"سیدھے تو خیر ہم اب بھی ہیں۔ بالکل جلیبی کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "بس کبھی کبھی مولا بخش کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"کل آنٹی رابعہ بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ کو بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کا شوق ہے۔" پہلے نے مجھے مطلع کیا۔ "یہ آپ کی ہابی ہے انکل؟" وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ میں بہت دلیر آدمی ہوں۔

"شہد تو بازار میں بھی مل جاتا ہے۔"

"بھابی؟" محسن نے دخل در معقولات کیا۔ "ہماری بھابی؟ آپ جانتے ہیں ہماری بھابی کے متعلق۔ شہد کیا چیز ہے...؟"

"ارے بھئی کھانا کھاؤ۔" بیگم رضوی نے ہمیں ٹوکا۔ "یہ کیا بچوں کے سامنے ہابی اور بھابی کو ملا رہے ہو۔"

"وہ دراصل آنٹی! بچوں کی تعلیم و تربیت بھی تو ضروری ہے۔" محسن بولا۔ "لغویات کے جدید نظریات کے مطابق پہلے ہوتی ہے صرف ہابی۔ وہی آگے چل کر بھابی بن جاتی ہے.... اور جب بھابی وجود میں آتی ہے تو بن جاتی ہے ایک لابی۔ حزبِ اقتدار کی۔ جو پیدا کرتی ہے خرابی...." اس سے پہلے کہ محسن اسی قافیے میں اپنی آزاد نظم کو آگے بڑھاتا، رضوی صاحب نازل ہوئے۔

"آپ کچھ فرما رہے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "اپنے خیالات سے انکل کو بھی مستفیض فرمائیے۔"

"میں؟" محسن نے بے حد حیرانی سے کہا۔ "میں تو ایک لفظ نہیں بولا۔ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ آپ کے کان بجنے لگے ہیں خاتون۔" بیگم رضوی کی ہنسی نے یہ راز افشا کر دیا کہ ہم کچھ ہانک رہے تھے لیکن انہیں دیکھ کر خاموش ہو گئے ہیں۔

"آج اس لڑکے اکرام شیخ کو بلوایا تھا میں نے۔" انکل نے ہمارے پہلے کھانے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ان کے پاس ہنڈ کے لیے بہت کم وقت ہوتا تھا۔ وہ مشکل سے آدھا گھنٹہ گھر رُکتے۔ اس کا انحصار بھی فرصت ملنے پر تھا۔

"آپ اس کے استعفے کو نامنظور کر دیں انکل۔" میں نے کہا۔ "اور اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں۔ میرا مطلب ہے پولیس ہیڈ آفس میں ہی بلا لیں۔"

"ارے بھئی اس میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی کیسے کر سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اب وہ نوکری نہیں کرنا چاہتا تو میں کیا کروں۔ میں نے اسے انٹرویو کے لیے وقت دیا اور پوچھا کہ بات کیا ہے۔ خیر بات تو مجھے معلوم تھی۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔ یہی کہتا رہا کہ سر میرے نجی حالات کا یہی تقاضا ہے۔ فی الحال میں نے فیصلہ ملتوی کر دیا ہے کہ اسٹاف کی پوزیشن بہتر ہونے پر غور کیا جائے گا۔ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ برہم ہے۔ کہنے لگا آپ کی مرضی سر۔ میں تو نوکری چھوڑ چکا اور کمرے سے واک آؤٹ کر گیا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو ان ڈسپلن سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوانی کی شوریدہ سری ہے۔ تم سمجھاؤ اسے۔"

"اب میں سمجھا لوں گا اسے انکل۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔ "اس کا تو باپ بھی نوکری کرے گا۔"

"وہ تو نوکری کر کے ریٹائر ہو چکا۔ دوبارہ نہیں کر سکتا۔" انکل رضوی نے ہنس کے کہا۔

"ڈیڈی! وہ مولا بخش کہاں ہے؟" ان کے چھوٹے بچے نے موقع پاتے ہی کہا۔

"ارے بیٹا۔ جانے دے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے ہی مارے ہوئے ہیں زمانے کے، شامتِ اعمال کے، تقدیر کے اور نہ جانے کس کس کی نظر کے۔" میں نے نظر بچا کے رابعہ کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔

"کل فون آیا تھا اس کی بہن کا۔" بیگم رضوی نے اچانک کہا۔ "کیا نام ہے اس کا۔ تازو۔ کہہ رہی تھی تم کو اس کا کوئی ادھار چکانا تھا۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیا ادھار ہے لیکن وہ ہنسنے لگی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو لاپتا ہے تو پریشان ہو گئی۔ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔ کہنے لگی داتا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کے منت مانگوں گی۔ عجیب باؤلی لڑکی ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ جو پھانس میرے دل میں احمد نواز گردیزی کے رویّے سے بلاوجہ چُبھ گئی تھی وہی اب رابعہ کے دل میں خلش بن گئی ہے۔

"میں نے پنڈی جانے سے پہلے شیخ کو ایک ہزار روپے کا چیک لے کر کیش دینے کے لیے کہا تھا۔" میں نے سب کے سامنے وضاحت کرنا بہتر سمجھا۔ "اس کے پاس نقد نہیں تھے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے اس کے گھر جانا پڑا ۔ نازو اس کی چھوٹی بہن ہے ۔ بالکل یہودی ۔ اپنے بھائی کو بھی ایک دن کے لیے سو روپے دیتی ہے تو دوسرے دن ایک سو دس روپے وصول کرتی ہے ۔ سو روپے روزانہ کے حساب سے تیرہ سو روپے دینے پڑیں گے اسے ۔ بچپن بہت ہے اس کی عادت میں ۔"

"کیا کرنا تھا تمہیں ایک ہزار کا ؟" رابعہ کے دل کی بات بیگم رضوی نے کہی ۔"تم پنڈی جا رہے تھے کہ حج کرنے ؟"

"بس ایسے ہی ۔۔۔ میں نے احتیاطاً یہ مناسب سمجھا ۔۔۔ کہ کچھ پیسے جیب میں ہوں ۔" میں نے محسوس کیا کہ اس وضاحت نے کسی کو بھی مطمئن نہیں کیا ہے ۔" اچانک کوئی ضرورت پڑ جائے تو ۔"

" اچانک کوئی اشد ضرورت پڑ جاتی تو ہم سب تھے وہاں ۔" رضوی صاحب نے اٹھتے ہوئے نیپکن سے ہاتھ صاف کیا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گئے ۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ان کی جیپ کے باہر نکلنے کی آواز آئی ۔ چند منٹ بعد محسن اندر آیا تو میں بستر پر نیم دراز سگریٹ کا دھواں پھیلا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا رابعہ جیسی عورت بھی بے بنیاد شک اور حسد میں مبتلا ہو سکتی ہے ۔ یہی سوال میں نے محسن سے کیا ۔

"عورت تو عورت ہی ہوتی ہے ۔" محسن نے فلسفیانہ انداز میں انکشاف کیا ۔" اور ہمارے سابق حکماء فرماتے تھے کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو ۔ تو یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے ؟"

"آگ تو ہے مگر دونوں طرف برابر نہیں لگی ہوئی ہے اور میں نے لگائی بھی نہیں ہے ۔" میں نے کہا اور اسے نازو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو اب تک محسن کو معلوم نہیں تھا ۔" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کروں کیا ۔"

"نکاح ۔" مسٹر محسن نے آنکھیں بند کر کے غور فرمانے کے بعد کہا ۔" ویسے تو آپ چار کر سکتے ہیں مگر میں صرف رابعہ کی بات کر رہا ہوں ۔ میں نے اس کی بدگمانی یا غلط فہمی وغیرہ نوٹ کی تھی ۔ اب تک اگر وہ دل شکستہ ہو کے خودکشی کر چکی ہو تو کچھ عجب نہیں ۔"

"تو ۔۔۔ نے دیکھا ہو گا فلموں میں کیا ہوتا ہے ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا ۔" جہاں اس قسم کی سچویشن آتی ہے ہیرو کھٹ سے آ ٹپکتا ہے ۔ اور پھر جناب یا تو ہاتھ مار کے زہر کی شیشی گرا دیتا ہے یا چٹان سے دریا میں کودنے والی ہیروئن کو ہوا میں اُچک لیتا ہے ۔ چنانچہ میں جاتا ہوں عین وقت پر نمودار ہونے کے لیے ۔" میں پھرتی سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر کود گیا ۔

رابعہ اپنے کمرے میں سیدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی ۔

نوحہ تھا ۔

"یہ کیا حرکت ہے ؟" وہ مجھے کھڑکی کے راستے قدم رنجہ ... دیکھ کر اٹھ بیٹھی ۔" دروازہ بھی تو کھلا تھا ۔"

"کودا تیری محفل میں کوئی دھم سے نہ ہو گا ۔" میں نے ... میں جا کے شعر پڑھا ۔" وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہو گا ۔"

"چشم بد دور ۔ ذوق اچھا ہے آپ کا ۔" وہ بولی ... آپ کی پسند کے معیار بدلتے رہتے ہیں ۔"

" ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا ۔" میں سمجھ رہا ہوں بی بی کہ تم کس حوالے سے بات کر رہی ... لیکن میں تم سے نکاح کرنے آیا ہوں ۔ محسن کے حکم پر ۔"

" تمہارے دماغ پر اثر ہے ۔ کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی تھی کیا ؟" رابعہ مسکرائی ۔

" چوٹ لگی ہے دل پر ۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھا ۔" یہ ... ہے ڈائیلاگ ؟ جہاں تک نکاح والی بات ہے تو میں بے حد سیریس ہوں ۔ اس کے دو اسباب ہیں ۔ بلکہ تین ۔ ایک تو ... میں محسن کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا ۔ دوسرے یہ کہ نکاح ... ہے اور تیسرا یہ کہ تم کو بطورِ منکوحہ اپنے ساتھ لے جا کر اس لڑکی ... نازو پر واضح کر سکتا ہوں کہ میں شادی شدہ آدمی ہوں چنانچہ مجھ پر ... ڈورے نہ ڈالے اور ڈالنے ہی ہیں تو پہلے تم سے ڈوئیل لڑ ...

" وہ تو میں ہار جاؤں گی ۔" رابعہ ہنسی ۔" میں نے سنا ہے ... جوڈو جانتی ہے اور تمہاری شاگردی پر مُصر ہے ۔"

" اچھا ۔ اور اس کے باوجود تم روٹھی ہوئی تک نہیں ہو ... سے ؟ بڑے افسوس کی بات ہے ۔" میں نے کہا ۔" میں تو تمہیں منانے آیا تھا لیکن محسن حسن خاں شیروانی پہلے ہی فرما چکے تھے کہ تمہیں مجھ پر کامل یقین ہے ۔"

" کامل یقین کیا ہوتا ہے ۔" وہ بولی ۔" اور کوئی کسی کے بارے میں یہ بات یقینِ کامل کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے ؟"

" یہ تو ہے ۔" میں نے سر کھجا کے کہا ۔" اچھا یہ بتاؤ کہ جب ... تمہارے بھیڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کے ، گرفتارِ بلا ہو چکا تھا ... تمہارے دل کی کیا حالت تھی ؟ میرا مطلب ہے خدانخواستہ ... واپس نہ آتا ؟"

" تم مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو کہ تم مر جاتے تو میں بھی ... لیتی ؟" وہ چڑ کے بولی ۔" یہ خیال مجھے آیا ہی نہیں تھا ۔"

" تو بس یہی ہے وہ ۔ کامل یقین ۔" میں نے کہا ۔" اور مثال ... دوں ؟ جب میں اپنے تابوت شریف میں دست و پا بستہ اور ... بے زبان محوِ استراحت تھا ۔۔۔ تو مجھے خیال آیا تھا ۔ اس وقت ... بالکل خوفزدہ نہیں تھا ۔ اور جب تمہارا تصور کیا تو تم کو بالکل ایسے ... دیکھا جیسے اب دیکھ رہا ہوں ۔ اور کیا محسوس کیا ۔ میں اسے بیان ...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر سکتا۔ تمہارے وجود سے ایک ذہنی کیفیت وابستہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر میگنٹ کا ایک حلقۂ اثر ہوتا ہے۔ برقی مقناطیسی میدان کہتے ہیں اسے۔ تو بس اسی طرح میں نے تم کو محسوس کیا تھا۔"

"اب تمہیں سچ بتاؤں میں؟" رابعہ یکلخت بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ "اس رات میری آنکھ کھلی تو میں رو رہی تھی۔ حالانکہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا۔ سوتے وقت میرے ذہن میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا۔ تمہارا ٹیلی فون تو بہت بعد میں آیا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے تم نے کچھ کہا۔ اور میں اندھیرے میں بیٹھی غور کرتی رہی۔ تمہارے الفاظ مجھے یاد تھے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور تم لوگوں کو بس یہی اطلاع دینا مقصود تھی۔ اور تم نے میری خیریت پوچھی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ تم نے کہا تھا کہ میں گوجر خان سے بول رہا ہوں۔ سوچو ذرا مجھے گوجر خان کا خیال کیسے آ گیا؟ ان گنت شہر قصبے ہیں جن کے نام میرے ذہن میں موجود ہیں۔ پھر یہی نام کہاں سے سن لیا تھا میں نے۔ میں نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی ورنہ سب میرا مذاق اڑاتے۔ مجھ پر ہنستے کہ تم دلی ہو گئی ہو بی بی۔ اور محسن۔ وہ تو نہ جانے کیا کچھ کہتا۔ مگر اس نے مجھے تمہارے فون کے متعلق بتایا تو میں۔۔۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ "ایسا مت کیا کرو سکندر!"

"اب نہیں کروں گا۔" میں نے بے خیالی میں کہا جب رابعہ بات کر رہی تھی تو میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جب مجھے رابعہ کے خیال نے سامانِ تسکینِ قلب فراہم کیا تھا کیونکہ چشمِ تصور سے میں نے اسے اپنے لیے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ٹرک کہاں تھا؟ سوہاوہ سے چکوال کی طرف مڑ چکا تھا۔ گویا رات کے بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔

"جب رات کو تمہاری آنکھ کھلی تھی تو تم نے وقت دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بارہ بج کے چالیس منٹ ہوتے تھے۔" وہ بولی۔ "میں بارہ بجے کے قریب سو گئی تھی۔ کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ایسی ہی بات ہے کہ کوئی سنے گا تو ہنسے گا، مثلاً محسن۔ ٹھیک اسی وقت میں نے تم کو دیکھا تھا روتے ہوئے۔ حالانکہ میں تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔"

رابعہ کے عارض پر محبت کے گلاب کھلے اور اس کی آنکھوں سے اترنے والے شبنم کے دو موتی وہیں رک کر جھلملانے لگے۔ پھر وہ ہنس پڑی۔ پھر میں ہنس پڑا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہیں ہم لوگ۔" رابعہ نے کہا۔

"سچی باتیں۔" میں نے کہا۔ اسی وقت آدم و حوا کی جنت میں شیطان بن کے محسن خان وارد ہوئے۔

"اس سے زیادہ رومانس میں برداشت نہیں کر سکتا۔ کٹ۔" اس نے فلم ڈائریکٹر کی طرح کہا۔ "آپ لوگ دوگانا گانے کرنے والے تھے۔ میں کوئی ریکارڈ لگا دیتا ہوں۔ آپ لپ سنک پر۔ بس لیے کونسا گانا چلے گا۔ میں ترا چاند تو مری چاندنی۔ ہکلا کر "ہم شہزادہ سکندر بخت۔ اگر اپنی ریاست میں ہوتے تو ہم نے خالی ہوا میں مکا گھمایا۔ "تو تخلیے میں اس مداخلت پر آپ کی کھال میں بھس بھروا دیتے جو آپ کے سرِ عزیز میں بھرا ہوا ہے۔ چھپ چھپ کے باتیں سنتا ہے ولد شیروانی عرف اچکن۔"

محسن نے غوطہ مار کے خود کو بچایا۔ "دیکھیے دیکھیے خان صاحب میں تو ٹیلی پیتھی پر اپنی ریسرچ مکمل کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ آپ بلا وجہ ناراض ہو رہے ہیں۔ آپ دونوں کی گفتگو سے میرا تھیسس پورا ہو۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔ "پھر کوئی بات نہیں۔ تشریف رکھیے اور بذریعہ ٹیلی پیتھی شہلا سے کہیے۔۔۔ کہیے کہ۔۔۔ پہلو حور میں لنگور خدا کی قدرت۔ اور دیکھیے جواب کیا آتا ہے۔"

"گویا جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ بیان کر دوں؟" محسن بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کہنے میں یہ آیا تھا کہ انکل جاتے جاتے کچھ فرما گئے ہیں۔ پولیس چالان پیش کر چکی ہے اور کل سماعت باقاعدہ شروع ہو گی۔ اس لیے آج باہر جانا بند۔"

"رابعہ نے مجھے بتا دیا تھا۔" میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ پھر بات سنجیدگی سے ہونے لگی۔ اور رابعہ نے بتایا کہ عدالتی طریقِ کار کے مطابق کل کوئی خاص بات نہیں ہو گی۔ بس چالان کی ایک نقل فراہم کر دی جائے گی اور ایف آئی آر پیش ہو گی۔

"حقِ وراثت والے کیس میں کہاں تک پیش رفت ہوئی ہے؟" میں نے کہا۔

"منظر صاحب ملے تھے۔ ایسے ہی بار روم میں سامنا ہو گیا تھا۔" وہ بولی۔ "کہہ رہے تھے کسی نے اعتراض داخل کیا ہے۔ وہ خود ہی جواب دیں گے آئندہ تاریخِ سماعت پر۔"

"تم نے پوچھا نہیں، کسے اعتراض ہے اور کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ جلدی میں تھے۔" رابعہ بولی۔ "ظاہر ہے اعتراض کرنے والے وہی تمہارے مہربان ہوں گے یا محض ٹانگ اڑانے فیصلے میں تاخیر کرانے والے ہوتے ہیں۔ حسد کے مارے ہوئے لوگ۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں انہیں اور اعتراض بھی بے بنیاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہوتا بھی کچھ نہیں۔ حق تو حقدار کو مل ہی جاتا ہے۔ دو چار مہینے کی دیر معمولی بات ہے۔ یہ بتاؤ تم نے گاڑی تو دے دی گی رنگ روغن کے لیے۔ واپس کب ملے گی؟ اور رنگ کا کیا کہا تھا؟"

"میں نے سفید رنگ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "محبوب سے عام رنگ ہے۔ گاڑی تو ملے گی ہفتہ بھر بعد۔"

"مجھے اس کا سرخ رنگ ہی اچھا لگتا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"سب لڑکیوں کو سرخ رنگ اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ رنگ حنا اور سہاگ کے جوڑے کا رنگ ہی نہیں لہو کا رنگ بھی ہے۔ خون کسی کا نہیں ہونا چاہیے۔ نہ دل کا نہ ارمانوں کا اور نہ اپنا۔ اس لیے سفید رنگ جو امن کی علامت ہے۔۔۔"

"تم پھر نان سیریس ہو گئے ہو۔" وہ اٹھ کے باہر نکل گئی۔ "اب جو کچھ کہنا ہے ایک دوسرے سے کہو۔"

صبح میں اور محسن بھی رابعہ کے ساتھ ہی کورٹ گئے اور رضوی صاحب کی گاڑی میں ٹھیک نو بجے کورٹ پہنچے تو ہجوم میں نظر آنے والا سب سے پہلا چہرہ حشمت خان اور حوالدار بجلی کا تھا۔ حشمت خان کے تیور پہلے جتنے جارحانہ نہیں رہے تھے اور وہ کچھ ناامید سا نظر آتا تھا لیکن حوالدار بجلی کا کرنٹ کم نہیں ہوا تھا۔

"سکندر بخت ولد وزیر خان۔ زیرِ ضمانت۔ ملزم زیرِ دفعہ تین صفر دو ض۔ ف حاضر ہے جنابِ عالی۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے افسرِ اعلیٰ کو رپورٹ دی۔ اور مجھے یوں دیکھا جیسے جلاد تختۂ دار پر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔

"اوئے دیکھ لیا ہے میں نے تجھ سے پہلے۔" افسرِ اعلیٰ نے اس فرض شناسی کے مظاہرے کا جواب نہایت حوصلہ شکن لہجے میں دیا۔

"کوئی رسّی وسّی لے آئے ہو نا حوالدار صاحب جی۔" محسن نے کہا۔ "پھانسی تو ہونی ہی ہونی ہے۔" اس نے بے تکلفی سے حوالدار بجلی کے کندھے پر ہاتھ مارا جو صرف وردی ہی وردی تھا۔ حوالدار نے محسن کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"یار تم کو بیوی ایسے ہی ٹانگ دیتی ہو گی ہینگر میں؟" محسن اسے چھیڑنے پر مصر تھا۔ "وردی سمیت۔ اگلے دن اتارا اور روانہ کر دیا۔ کچھ جان شان بناؤ اپنے حشمت خان کی طرح۔ کیا عالی شان توند ہے۔ کوئی دیکھے تو سمجھے تربوز چھپا کے جا رہا ہے۔"

"آپ جی۔۔۔ بس آپ خیال کریں۔ اپنا اور ہمارا بھی۔۔۔ منہ مت کھلوائیں۔" غصے سے حوالدار بجلی کا برا حال ہو گیا۔

پھر استاد ڈیڈی نمودار ہوا۔ "قسم مولا کی۔۔۔" اس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "یہ حوالدار کسی دن اندر ہی اندر غائب ہو جائے گا۔ وردی جھاڑیں گے تو خالی۔" یہ جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔ حوالدار فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کمینوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔ روزِ اوّل کی طرح اس نے تڑپ کر محسن کے ہاتھ نہیں مارا۔ اتنے عرصے میں جو کچھ وہ ہمارے متعلق سنتا رہا تھا اس سے حوالدار کو اتنا اندازہ تو بخوبی ہو گیا تھا کہ ہم سے عام مجرموں کی طرح پیش آنا اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں اختیارات سے تجاوز کرنا خود اس کی ذات کے مفاد میں نہیں۔

سماعت کا آغاز معمول کے مطابق ویسے ہی ماحول میں ہوا جو میں نے اپنے ملک کی عدالتوں میں بارہا دیکھا تھا۔ یہ ماحول برطانوی عدالتوں اور پاکستانی فلموں میں پیش کیے جانے والے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ اس بار نہ میں گواہ تھا نہ تماشائی۔ بلکہ ملزموں کے کٹہرے میں تھا۔ جہاں سے میں پوری عدالت کے منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ وکیلِ استغاثہ اور پبلک پراسیکیوٹر کے ساتھ ہی دو میزیں اور کرسیاں رابعہ قاری اور عبدالودود منظر کے لیے تھیں جہاں سے منظر دوبارہ یہ بتانے آ چکا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور جہاں میں ہوں وہاں کوئی مجرم ہو تو شرم کی بات ہے ورنہ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔ مجھ سے پہلے بھی کئی بے گناہ محض جرمِ بے گناہی میں اسی منزلِ دار و رسن سے سرفراز گزر چکے ہیں اور بعد میں بھی گزرتے رہیں گے۔ کیونکہ حق و باطل کی یہ جنگ ازلی و ابدی ہے۔ سماعت کی کارروائی دیکھنے کے لیے آنے والوں میں بہت سے چہرے اجنبی بھی تھے۔ اس کیس نے اخبارات میں بڑی شہرت پائی تھی۔ کیونکہ اس میں نچلے طبقے کے یا پیشہ ور فلم کے کردار نہیں تھے۔ یہ ایک صنعت کار کے بیٹے کے ہاتھوں اپنے بزنس پارٹنر کے

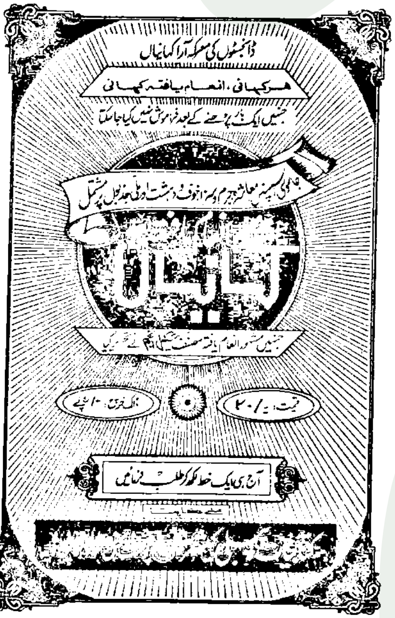

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

قتل کا کیس تھا۔ مبینہ قاتل برطانیہ سے آیا تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ مقامی ایس ایس پی کا عزیز مشہور تھا۔ رضوی صاحب اسی لیے عدالت سے غیر حاضر تھے۔ اب تک زبانِ خلق پر میرا اور رابعہ کا نام بھی آ گیا تھا اور ان ناموں سے وابستہ افسانے بھی مخصوص حلقوں میں گردش کر رہے تھے۔ پبلک کے لیے دلچسپی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ میں صرف بے گناہ ہونے کا دعوےٰ نہیں رکھتا تھا، یہ الزام بھی عائد کر چکا تھا کہ خود مقتول شرافت علی نے میرے والد کو بلیک میل کیا تھا اور بالواسطہ طور پر ان کے قتل کا ذمّہ دار تھا۔ بعد کے واقعات بھی وقتاً فوقتاً اخبارات کی زینت بنتے تھے چنانچہ میں نے اندازہ کیا کہ حاضرین میں مقامی اخباروں کے سب ہی نمائندے ہوں گے جنہوں نے اوّل سے آخر تک تمام واقعات کو اور خبروں کو منسلک کر لیا تھا چنانچہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ انتہائی سنسنی خیز مقدمہ تھا۔

حاضرین کی پہلی صف میں کچھ دوست بھی تھے۔ محسن کے ساتھ استاد ڈیڈی بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ بالکل آخری وقت میں مسز رضوی اندر آئیں اور ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ رضوی صاحب کی پبلک لائف سے دور رہتی تھیں چنانچہ کسی نے ان کو ایس ایس پی کی بیگم کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا۔ میں نے احمد نواز گردیزی کو بھی دیکھا جس نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کے مجھے دیکھا اور دو انگلیوں سے "وی فار وکٹری" کا مشہور نشان بنایا۔ میری نگاہیں دوستوں اور ناآشنا چہروں کے درمیان شکاری تلاش کر رہی تھیں جن کے پھیلائے ہوئے دام نے مجھے بڑی کامیابی سے اسیر کر لیا تھا۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے کے برعکس اُترنے نہ پائے تھے زمیں پہ کہ گرفتار ہم ہوئے۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے۔ لیکن مجھے کوئی شکاری صورت نظر نہ آئی۔ اگر ان کا کوئی "رپورٹر" سب کے درمیان سب سے الگ تھا تو میری نگاہ اسے شناخت نہ کر پائی۔ مختصر سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اچانک دوسری صف میں سے ایک شخص اٹھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا دبلا پتلا اور اوسط قد و قامت کا آدمی تھا جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصّہ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ بے ترتیب اور اس کے شانوں سے ذرا اوپر تک آنے والے سیاہ بالوں میں سفیدی کا عنصر قبل از وقت غالب محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصی بے توجہی کا شکار تھا۔ جو کرتا پاجامہ وہ پہن کے سویا تھا، اسی میں عدالت آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی محوِ خواب لگتی تھیں۔

"جناب والا!" اس نے پلاسٹک کے سیاہ فریم اور موٹے شیشوں والی عینک کو ناک کے بانسے پہ جما کے کہا۔ "میں معذرت پر معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کچھ عرض کرنا تھا۔"

جج نے چشمہ ہٹا کے اسے غور سے دیکھا۔ "آپ کا اس کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"جی۔ بہت اہم تعلق ہے۔" وہ بولا۔ "میں صفائی کا گواہ ہوں۔"

"تو آپ انتظار کیجیے۔ جب گواہی کا مرحلہ آئے گا آپ کو طلب کر لیا جائے گا۔" جج نے کہا۔

"میرا نام صفائی کے گواہوں میں نہیں ہے جناب والا۔" وہ بولا۔

"تو شامل کر لیا جائے گا۔" جج نے پھر چشمہ لگا لیا۔ "بیٹھ جائیں آپ۔"

"میں اس عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ میرا بیان پہلے ہو جانا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"سماعت ایک طریقۂ کار کے مطابق ہوتی ہے مسٹر!" جج نے سختی سے کہا۔

"مجھے اس کا علم ہے یور آنر۔ لیکن مخصوص حالات کے پیشِ نظر میں گزارش کروں گا کہ اس طریقۂ کار سے تھوڑا سا انحراف کرتے ہوئے میرا بیان ریکارڈ کر لیا جائے۔" اس شخص نے گھورنے والی نظروں کی پروا کیے بغیر کہا۔ اس کا لہجہ پُرسکون، پُراعتماد اور پُریقین تھا۔ میں اور محسن، رابعہ اور منظر سب کی نگاہیں اس پہ مرتکز ہو گئی تھیں جو ہمارا نامعلوم طرفدار تھا۔

"کیوں؟" جج نے پھر چشمہ اتار کے رکھ دیا۔ "کیا ہیں وہ مخصوص حالات؟ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ صرف تمہارے بیان کے لیے عدالتی طریقۂ کار بدل دیا جائے۔"

"یور آنر۔ میں روزنامہ صدائے وقت کا مدیرِ اعلیٰ ہوں میرا نام احمد شہریار۔" اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "جو بیان میں دینا چاہتا ہوں وہ میرے نقطۂ نظر سے اس پورے مقدمے کا سب سے اہم بیان ہوگا اور میں عرض کروں کہ اس کا تعلق زندگی اور موت سے ہے تو اس میں قطعی مبالغہ نہیں۔ مزید یہ کہ میرے بیان اور میری پیش کردہ دستاویزی شہادت سے میر شرافت علی قتل کے مقدمے کا رُخ ہی نہیں بدلے گا اس سے قتل کے دوسرے کیس کے حالات بھی منظرِ عام پر آئیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" جج نے جھنجلا کے کہا۔ "سوال صرف یہ ہے کہ تم اسی وقت مداخلت پہ کیوں مصر ہو؟"

"یہ مداخلت نہیں ہے جناب والا! ضرورت ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔ "اس لیے کہ مجھے اپنی زندگی کے آنے والے لمحے کا بھی یقین نہیں۔ یہ بات میں عام عقیدے یا محاورے کے مطابق نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ معزز عدالت مجھے ضمانت فراہم کر سکے کہ اس کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے قتل کر کے میری آواز ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں کر دی جائے گی اور مجھے یقین دلا دیا جائے کہ مناسب وقت آنے پر جب میری گواہی مطلوب ہوگی تو یہ عدالت مجھے زندہ سلامت پیش کر سکے گی تو میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

جب تک عدالت میں اس کی آواز آتی رہی مکمل سکوت رہا جس میں قدیم چھت کے پنکھے کی سرسراہٹ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی آوازوں کا بھنور سا اٹھا۔ جج نے روایت کے مطابق لکڑی کا ہتھوڑا میز پہ مار کے 'آرڈر۔ آرڈر' کہا۔ "مسٹر جمیل احمد! آپ کو کیوں یقین ہے کہ بیان دینے سے پہلے ہی آپ کو قتل کر دیا جائے گا؟" جج نے سوال کیا۔

"اس لیے یور آنر کہ مجھے اس انجام سے خبردار کر دیا گیا ہے۔" جمیل احمد نے کہا۔ "اور میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ صرف دھمکی نہیں دیتے اس پر عمل کر کے بھی دکھاتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" جج نے کہا جو اب اخبار کے اس ایڈیٹر کی بات سننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ "آپ نے پولیس کو رپورٹ کی تھی؟"

"میں ان کو نام سے نہیں جانتا جناب والا۔ کسی کو صورت سے بھی نہیں پہچانتا۔" جمیل نے کہا۔ "وہ میرے ذاتی دشمن بھی نہیں ہیں لیکن وہ یہ نہیں چاہتے کہ میں اپنی شہادت اس عدالت کے روبرو پیش کروں۔ ان کے خلاف میں رپورٹ کیسے لکھوا سکتا ہوں جناب والا جن کے متعلق میری معلومات صفر ہیں۔ مجھے ان کا نام پتا صورت کچھ معلوم نہیں۔ کیا پولیس رپورٹ درج کر لیتی؟ اور بالفرضِ محال مجھے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے رپورٹ لکھوانے میں کامیابی ہو جاتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ میں اس وقت حاضر ہو سکتا؟ محض ایک رپورٹ نے کبھی کسی کی جان بچائی ہے جناب والا؟"

"آل رائٹ۔" جج نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے وہ لوگ آپ کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آپ کے پاس کوئی ایسی شہادت ہے جس سے۔ بقول آپ کے۔ مقدمے کا رُخ پلٹ جائے گا۔ تو انہوں نے اب تک آپ کو مہلت کیوں دی؟"

"اس لیے جناب والا کہ میں روپوش تھا۔" جمیل احمد نے کہا۔ "میں نے ان کے عزائم کا اندازہ حالات سے کر لیا تھا اس لیے میں غائب ہو گیا۔ انہیں میرا پتا معلوم ہو جاتا تو وہ مجھے اس عدالت تک ہرگز نہ پہنچنے دیتے۔ میں جانتا تھا کہ میرے لیے اس ملک سے بھاگ جانا آسان ہے اور جس دن میں اپنی گواہی کے لیے عدالت جاؤں گا تو شاید زندہ لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ مگر اس میں میرے لیے اطمینان کا ایک پہلو تھا۔ فرار ہو جانے کی صورت میں یہ بوجھ تمام عمر میرے ضمیر پہ رہتا کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے حقائق سے پہلو تہی کی اور وہ بنیادی شہادت فراہم نہیں کی جس سے ایک شخص کی زندگی بچ سکتی تھی۔ میری مراد مبیّنہ ملزم سکندر بخت سے ہے جسے میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ میرے یقین کے مطابق قتل ہوتا۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ بے شک کسی کے چاہنے سے کوئی نہ مر سکتا ہے نہ جی سکتا ہے لیکن ضمیر پر کوئی بوجھ لے کر جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ میرے بیان کے بعد اگر وہ لوگ مجھے قتل بھی کر دیں گے تو مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"مسٹر جمیل، مختصر بات کیجیے۔" جج نے کہا۔ "کیونکہ عدالت کا وقت قیمتی ہے۔"

"وقت کبھی انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا جنابِ والا۔" وہ بولا۔ "کیا یہ عدالت وقت کو انصاف کے تقاضوں سے زیادہ اہمیت دے گی؟ طریقِ کار کو ملحوظ رکھنے کے لیے ایک بے گناہ کو سزائے موت دینا پسند کرے گی؟ ہرگز نہیں۔"

"سوال صرف یہ ہے کہ آپ کو گواہی سے روکنے والے کون ہیں۔ نہ آپ انہیں جانتے ہیں نہ وہ آپ کے بارے میں جانتے تھے کہ آپ کہاں روپوش ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے آپ کو قتل کی دھمکی دی تو کیسے؟" جج نے کہا۔ "انہیں کیسے علم ہوا کہ آپ کے پاس کوئی بے حد اہم دستاویزی شہادت ہے۔ اور اگر مقدمے کا رُخ پلٹ جاتا تو ان کا کیا نقصان تھا؟"

"میں معذرت خواہ ہوں یور آنر کہ تمام سوالات کے جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے جیب میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا جسے اس نے تہ کر کے چھپا رکھا تھا۔ "باقی تمام سوالات کا جواب شاید آپ کو سماعت کے دوران میں مل جائے گا۔ میں صرف ایک سوال کا جواب پیش کرتا ہوں تاکہ عدالت کو قائل کر سکوں۔ یہ ایک اشتہار ہے جو ہر سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔ کسی نے اس کی عبارت یا مفہوم پہ غور نہیں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے تازہ ترین اشتہار۔ بنام جمیل احمد صدیقی ولد کفیل احمد صدیقی۔ المعروف بہ پیارے میاں۔ ہمارے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ تم اہم دستاویزات لے کر روپوش ہو گئے ہو جن میں ایک ٹیپ بھی شامل ہے۔ تمہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ کوئی غلط قدم اٹھانے کے نتائج انتہائی سنگین ہوں گے جس کے ذمّے دار تم خود ہو گے۔"

کچھ دیر عدالت میں مچھلی بازار کا سماں رہا۔ کسی نے جج کے ہتھوڑے اور 'آرڈر۔ آرڈر' پکارنے کی پروا نہیں کی۔ اخبار کا وہ صفحہ رابعہ سے عبدالودود منتظر کے ہاتھوں میں اور پھر جج تک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پہنچا۔ جمیل احمد اب بیٹھ گیا تھا اور اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس مجمع عام میں جو اس کے چاروں طرف موجود ہے کوئی بھی شخص اسے اس وقت بھی قتل کر سکتا تھا مگر عدالت کے کمرے میں قتل کے امکانات عملاً معدوم ہوتے ہیں اور اس چار دیواری میں تحفظ کا احساس غالب رہتا ہے۔ مجھے اس شخص کی جرأت و ہمت نے، بے باکی اور بے خوفی نے اور ضمیر کی آواز سنوانے کے اٹل فیصلے پر قائم رہنے کی مستقل مزاجی نے حیران کر دیا تھا۔ یہ تو وہ خود ہی بتا چکا تھا کہ اپنے مرنے جینے کی فکر اسے اپنے فرض سے سبکدوشی سے قبل تک تھی، اس کے بعد نہیں ہوگی اور جس طرح اس نے عدالتی کارروائی روک کر اپنے بیان اور دلائل دیے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنی کہنے آیا ہے تو اپنی کہہ کر ہی جائے گا۔ عدالت کے لیے وہ صفائی کا ایک اہم گواہ تھا لیکن میرے لیے وہ فرشتۂ غیب جس کی آمد کا مجھے انتظار تھا اور میرا نادیدہ محسن تھا جس نے میری زندگی بچانے کو اپنا مشن بنا لیا تھا اور یہ مشن طلبگارِ جاں تھا تو اسے پروا نہ تھی۔ جس درجے سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔

عدالت کا اجلاس آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔

جج نے رابعہ اور منظر کے ساتھ ہی استغاثہ کے دکیلوں کو بھی چیمبر میں مشورے کے لیے طلب کیا تھا اور محسن نے جمیل صدیقی کو آ گھیرے، اپنے اور استاد ڈیڈی کے درمیان بُلا لیا تھا۔ محسن کے ساتھ مجھے اکرام شیخ نظر آیا جو شاید جمیل صدیقی کی بحث کے دوران میں پہنچا تھا پھر میں نے نازلی کو دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے دکھ ہوا کہ یہ نادان لڑکی گرد و پیش سے بے نیاز آنکھیں بند کیے جذباتی وابستگی کے اس راستے پر آگے بڑھتی جا رہی ہے جس پر میں اس کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ اس فریبِ آرزو کا انجام دل شکستگی تھا۔ خواہشوں کے سراب کی جستجو میں سرگرداں اس لڑکی کے لیے منزل فقط بے مراد واپسی کا تنہا اور پُرآزار سفر تھی لیکن یہ بات وہ نہیں سمجھتی تھی اور سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ میں اس کو یہیں روک کر کہہ سکتا کہ لوٹ جائے۔ مگر کیا میرے کہنے سے وہ اپنی امیدوں کی شکست قبول کر لیتی اور تہی دامن و تہی دست لوٹ جاتی؟ اپنے خوابوں سے دستبردار ہو جاتی اور اپنے ارمانوں کو اس نوزائیدہ بچے کی طرح دفن کر دیتی جس کا وجود سندِ رسوائی ہو۔ دل کو بہلا کے تھپک کے سلا دیتی کہ نہیں کوئی نہیں۔ راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔

میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ یہ احساس مجھے جج کے دوبارہ آنے پر ہوا لیکن نازو میری نظر کے اشارے کا غلط مطلب نکال چکی تھی۔ اب میں اسے کیا بتاتا اور کیسے بتاتا کہ میں تو اسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا اور تصور صرف آنکھوں کا سہارا ہے جو اس کی جانب دیکھتی رہیں جب کہ میرے خیالات متضاد سمت محوِ پرواز تھے۔ رابعہ نے مجھے دیکھ کے سر ہلایا اور منظر نے مسکرا کے باقاعدہ آنکھ ماری۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے کہا اور صدیقی صاحب کھڑے ہو گئے۔ "اگرچہ آپ شواہد و دلائل سے عدالت کے سامنے مخصوص حالات کا جواز پیش کرنے میں ناکام رہے اور یہ ثابت نہیں کر سکے کہ محض اپنے بیان کی پاداش میں آپ کو نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ ہے لیکن وکیلانِ صفائی نے نسبتاً تفصیل سے وضاحت کی چنانچہ یہ عدالت آپ کو اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی خصوصی اجازت دیتی ہے۔"

"جنابِ والا!" وکیلِ استغاثہ نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اگر عدالتی طریقہ کار سے انحراف کا کوئی جواز نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ تو اس مرحلے پر یہ شہادت انصاف کے تقاضوں کے خلاف اور ملزم کو خصوصی رعایت دینے کے مترادف ہے۔"

"گواہ ایک معتبر اور معزز شخص ہے۔" جج نے کہا۔ "اس نے یہ درخواست بقائمی ہوش و حواس کی ہے۔ چنانچہ عدالت یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں۔ اگر مناسب تحفظ فراہم نہ ہونے کے باعث ایک ایسی شہادت پیش ہونے سے رہ گئی جس پر ایک انسان کی زندگی یا موت کے فیصلے کا انحصار ہے تو یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوگا۔ صدیقی صاحب! آپ گواہوں کے کٹہرے میں آ سکتے ہیں۔"

جمیل احمد صدیقی نے مروجہ حلف اٹھایا اور بیان شروع کیا۔ "حضورِ والا! جو کچھ میں عرض کروں گا اس کا پہلے ہی کچھ حصہ تحریری صورت میں اس عدالت کے ریکارڈ پر ہے۔ میری مراد اے ایس آئی اکرام شیخ کے ایک بیان سے ہے جس کے ساتھ متعلقہ تھانے کے محرر کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک اقبالی اعترافِ جرم شامل ہے۔ یہ استغاثہ کے ایک چشم دید گواہ عبدل کا وہ بیان ہے جو اس نے مرنے سے پہلے ٹیلی فون کر کے لکھوایا تھا کیونکہ مرحوم عبدل کے پاس خود تھانے حاضر ہو کے بیان دینے کے لیے وقت نہیں تھا اور اس کی جسمانی قوت جواب دے رہی تھی۔ وہ شیدے نام کے ایک شخص کو قتل کر چکا تھا جو استغاثہ کا دوسرا عینی گواہ تھا لیکن اس جھگڑے میں وہ خود بھی مہلک طور پر شدید زخمی ہوا تھا۔"

"مجھے اس پر اعتراض ہے جنابِ والا!" وکیلِ استغاثہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ "معزز گواہ کو ان واقعات کا علم کیسے ہوا؟"

جمیل صدیقی مسکرایا۔ "اوّل تو یہ سماعت پہلے بھی کھلی عدالت میں ہوئی ہے چنانچہ کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک اخبار کا مدیر ہوں جس کو گرد و پیش کے واقعات کی خبر عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ اے ایس آئی اکرام شیخ خود عدالت میں موجود ہیں۔ اگر میں غلط بیانی کروں تو انہیں تصدیق کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔"

"میں آپ کا اعتراض مسترد کرنے پر مجبور ہوں۔" جج نے کہا۔ "بیان جاری رکھیے صدیقی صاحب!"

"شکریہ جنابِ والا!" جمیل نے کہا۔ "اے ایس آئی... اکرام شیخ نے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر موصول ہونے والے عبدل کے بیان کو صرف محرر نے ہی نہیں لکھا تھا خود انہوں نے تھانے میں موجود ایک ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کر لیا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر مالِ مسروقہ تھا۔ بعد میں ٹیپ ریکارڈر میں لگا ہوا اسپول پُراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ اور ایک مقتول انسپکٹر میر محمد نے مشیر نامے کی رُو سے ثابت کیا کہ اس ٹیپ ریکارڈر میں کوئی اسپول نہیں تھا۔ شاید عدالت کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد وہ محرر بھی کہیں چلا گیا جس نے اپنے ہاتھ سے عبدل کا بیان ٹیپ سے کاغذ پہ اُتارا تھا۔ محرر کی گمشدگی کے متعلق پندرہ دن بعد تھانے میں ایک رپورٹ لکھوائی گئی جو محرر کی بیوی نے درج کرائی تھی۔ اس خبر کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے جنابِ والا کہ متعلقہ تھانے والوں نے محرر کی بیوی کی رپورٹ درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیا کریں۔ اس عورت نے میرے اخبار کے ایک رپورٹر کی مدد سے ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دی اور انہی کے حکم پر رپورٹ لکھی گئی مگر محرر کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ ان حالات میں، میں یہ فرض کر سکتا ہوں کہ اس کی تحریر کی صداقت کو چیلنج کیا جائے گا۔ نہ وہ خود موجود ہے کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے بیان کی تائید کر سکے اور مقتول ایس ایچ او ٹیپ کی عدم موجودگی کا دستاویزی ثبوت پہلے ہی پیش کر چکا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ موجود تھا لیکن مشیر نامہ تیار کرتے وقت صرف اہم تفصیلات کو مدِنظر رکھا گیا۔ مثلاً مالِ مسروقہ کے کوائف میں صرف ٹیپ ریکارڈر لکھا گیا اور میکر یعنی بنانے والی کمپنی کا نام۔ میرے خیال میں 'گرنڈگ' کے اس ٹیپ ریکارڈر کا ماڈل نمبر بھی لکھا جانا چاہیے تھا ورنہ گرنڈگ کمپنی کے بہت سے نئے پرانے ماڈل مستعمل ہیں۔ البتہ TK - 47 ایسا ماڈل ہے جو ٹیلی فون سے منسلک ہو جائے تو موصول ہونے والے پیغامات ریکارڈ کر سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک ضروری تفصیل یہ تھی کہ ٹیپ ریکارڈر میں لگے ہوئے اسپول کا ذکر کیا جاتا۔ بلکہ اس کا سائز بھی درج کیا جاتا۔ یہ عمداً کیا گیا یا محض بے پروائی کے باعث۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن مقتول ایس ایچ او نے عدالت کے روبرو جانتے بوجھتے جھوٹ بولا۔ حقائق کو چھپایا اور بنیادی شہادت کو ختم کرنے کی کوشش کے جرم کا ارتکاب کیا۔"

"اعتراض یور آنر!" وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ "ایک مقتول ایس ایچ او پر اس نوعیت کے سنگین الزامات عائد کرنا اخلاقاً اور قانوناً غلط ہے کیونکہ وہ ان کی تردید کے لیے پیش نہیں ہو سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں یور آنر!" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ پھر اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کے گتے کا ایک ڈبا برآمد کیا جو سات آٹھ انچ مربع اور موٹائی میں نصف انچ کے قریب تھا۔ "یہ بی اے ایس ایف کا وہ اسپول ہے جنابِ والا جو ٹیپ ریکارڈر میں فٹ تھا۔ یہ چھ انچ سائز کا اسپول ہے۔ گتے کا ڈبا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ میں نے ٹیپ کی حفاظت کی خاطر خود فراہم کیا تھا۔ اس پر عبدل کا پورا بیان اس کی اپنی آواز میں موجود ہے جو اس نے مرنے سے پہلے دیا تھا چنانچہ قانوناً اس کی صداقت مسلّم ہے۔"

عدالت میں پھر ایک شور بپا ہوا۔ جج کے ریڈر نے ڈبا لے کر بڑی احتیاط سے جج کے سامنے رکھ دیا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا اور میرا سر اس شخص کے لیے تعظیم سے جھک گیا جس نے عملاً ثابت کر دیا تھا کہ حق گوئی و بے باکی آئینِ جواں مرداں۔ جس نے بتا دیا تھا کہ دنیا اب بھی ان لوگوں سے خالی نہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں اور دوسروں کے لیے مر بھی جاتے ہیں۔ جج نے کئی بار میز پہ ہتھوڑا بجایا۔ اس سنسنی خیز اور ڈرامائی انکشاف نے عدالت میں دھماکا کر دیا تھا اور واقعی مقدمے کا رُخ بدل دیا تھا۔

"مسٹر جمیل احمد صدیقی!" جج نے خاموشی ہو جانے کے بعد کہا۔ "قانون کی مدد کے لیے آپ نے جس مستقل مزاجی اور دُور اندیشی کا ثبوت دیا، عدالت اس کی قدر کرتی ہے۔"

"ابھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے جنابِ عالی کہ یہی وہ ٹیپ ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے احتجاج کیا۔

"مجھے اس اعتراض کے اٹھائے جانے کی توقع تھی یور آنر۔" جمیل احمد صدیقی نے کہا۔ "چنانچہ میں نے اپنے فراہم کردہ ثبوت کو حتمی اور ناقابلِ تردید بنانے کا بھی پورا بندوبست کر لیا تھا۔ اے ایس آئی اکرام شیخ میری اور اس معزز عدالت کی مدد کے لیے ویسا ہی ایک ٹیپ ریکارڈر لے کر آئے ہیں۔ میں استدعا کروں گا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

کہ مقتول عبدل کا یہ آخری بیان مدعی اور مدعا علیہان کے سامنے سنوا دیا جائے۔ اور اسپول کو عدالت کی تحویل میں اور اس کے ریکارڈ پر لے لیا جائے۔"

"مجھے یہ ٹیپ ریکارڈر پیش کرنے کی اجازت ہے یور آنر؟" اے ایس آئی اکرام شیخ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"بیان زیادہ طویل نہیں ہے۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور اس کی اہمیت واضح ہو جانے کے بعد یہ عدالت پندرہ بیس منٹ کے وقفے کو وقت کا زیاں قرار نہیں دے گی۔"

جتنی دیر میں اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر کو جج کے سامنے میز پر رکھا اور اس کا پلگ لگایا عدالت میں ایک ہلچل مچی رہی۔ ہر شخص آگے آ کے ٹیپ کا ہر لفظ سننے کے لیے بے تاب تھا خصوصاً اخباری نمائندے۔ وہ اب پینسل اور پیڈ لیے اس بیان کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پلگ میز کے قریب نہیں تھا مگر یہ بات یقیناً اکرام شیخ کے ذہن میں تھی چنانچہ وہ خاصی لمبی لیڈ لے کر آیا تھا جس سے ٹیپ ریکارڈر کو تقریباً چھ گز دور پلگ میں لگا دیا گیا۔ جج نے اس دوران میں کئی بار میز کو ہتھوڑے سے بجایا اور آرڈر آرڈر پکارا لیکن خاموشی اسی وقت ہوئی جب اکرام شیخ نے ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ فٹ کیا اور ٹیپ ریکارڈ کی ایک سرخ آنکھ جیسی روشنی "ہوشیار خبردار" پکارنے لگی۔ میں نے اشارے سے رابعہ کو اپنی طرف بلایا۔

"محسن سے کہو ذرا انکل رضوی کو فون کرے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "ٹیپ ہم سن رہے ہیں۔ وہ انکل کو بتا دے کہ یہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔ وہ جمیل احمد صدیقی کو بحفاظت عدالت سے باہر لے جانے اور گھر تک پہنچانے کا ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ پندرہ بیس منٹ ٹیپ چلے گا ممکن ہے جمیل احمد صدیقی کا بیان بعد میں بھی چلے۔"

"یور آنر!" اکرام شیخ نے ٹیپ کو ایک جگہ روک کر جج کو مخاطب کیا۔ "عبدل کا ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد میں ابتدائی گفتگو کا کچھ حصہ ریکارڈ نہیں کر سکا تھا کیونکہ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہونے کے بعد میں نے فوراً اس ٹیپ ریکارڈر سے فائدہ اٹھایا جو برآمد شدہ... مالِ مسروقہ میں شامل تھا اور عبدل سے درخواست کی کہ وہ ساری بات پھر کہے چنانچہ اس نے دوبارہ بات شروع کی۔"

میں نے رابعہ کو محسن کے پاس جا کے آہستہ سے کچھ کہتے اور محسن کو دبے پاؤں باہر جاتے دیکھا۔ اسی وقت ٹیپ ریکارڈر سے ایک آواز ابھری جو بے وجود ہو چکی تھی مگر برقی مقناطیسی ارتعاشات کی صورت میں زندہ تھی۔

"جناب تھانیدار صاحب! میں عبدل ہوں۔ پورا نام عبداللہ۔ باپ کا نام منشی بندے علی... شرافت علی مرحوم کا پرانا ملازم ہوں.. مجھ سے پہلے میرا باپ منشی اسی خاندان کا نمک خوار تھا.. اور دوست احباب کے حلقے میں نومانجومی کہلاتا تھا شرافت علی کو قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا الزام وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت پر ہے۔ اس کے خلاف میں نے بھی گواہی دی تھی اور شیدے نے بھی۔ شیدا دراصل.. رشید ہے۔ اسے ملازم ہوتے دو سال بھی نہیں ہوتے تھے اور وہ شرافت علی کا ڈرائیور تھا۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ... سکندر بخت نے میرے سامنے شرافت علی کو مارا... اور اس کے کمرے میں سامان توڑ پھوڑ کر تباہ کیا کیونکہ... وہ بہت غصے میں تھا اور شرافت علی پر چلا رہا تھا کہ اسی نے وزیر خان کو... بلیک میل کیا... اور قتل کرا دیا.... میں نے شرافت علی کو سکندر کے سامنے.... گھٹنوں کے بل بیٹھ کے رحم کی بھیک مانگتے بھی دیکھا تھا.. لیکن خدا گواہ ہے.... میں نے سکندر کو قتل کرتے نہیں دیکھا تھا... یہ بات صرف شیدے نے اپنے بیان میں کہی تھی.. آج ہی اپنی ماں کے مجبور کرنے پر میں سکندر بخت کو بلانے گیا تھا.. معلوم نہیں کیوں میری ماں اس سے ملنا چاہتی تھی... میں یہ جانتا ہوں کہ وزیر خان کی اور میرے باپ منشی کی دوستی تھی... پاکستان بننے سے پہلے سے... سکندر میرے ساتھ اکیلا نہیں آیا... اس نے اپنے دوست کو بھی ساتھ لیا... اور آنے سے پہلے ایس پی رضوی صاحب کو بھی بتا دیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے کچھ سوالات کیے تھے... اور سکندر سے یہ بھی کہا تھا کہ جاؤ... تمہاری حفاظت کا انتظام میں کر دوں گا۔ میری ماں نے سکندر کے آنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں باہر چلا جاؤں... وہ سکندر سے کوئی راز کی بات کہنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے چپکے سے سکندر کو کچھ دے دیا۔ کیونکہ سکندر جب آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا۔ لیکن وہ جانے لگا تو اس کے پاس ایک بریف کیس تھا.. یہ بات میں نے شیدے کو بتائی... ہم... نے ہم دونوں نے مل کر سکندر کو روکنے کی اور اس سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کی... مگر وہ نکل گیا... کیونکہ اس کا دوسرا ساتھی فائر کی آواز پہ آ گیا تھا... شیدا مجھے گالیاں دینے لگا... کہ تیری بے وقوفی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ تجھے کیا ضرورت تھی وہاں سے نکلنے کی.... اور نکلا ہی تھا تو چھپ کر دیکھتا.. اس نے میری ایک نہیں سنی... کہ میں نے پوری کوشش کی تھی.. پھر وہ میری ماں سے پوچھنے گیا... کہ اس نے سکندر بخت کو کیا دیا ہے... میری ماں اندھی تھی۔ تھانیدار صاحب۔ اور بہت بوڑھی تھی.. مگر اس نے شیدے کو کچھ بتانے سے انکار کر دیا... شیدا گرم ہو گیا اور اس نے میری ماں کو گالی دی.. میں نے اسے منع کیا تو وہ اور بڑھ گیا۔ وہ میری ماں کو میرے سامنے مارنا چاہتا تھا... اور زبردستی اس سے.. معلوم کرنا چاہتا تھا کہ... سکندر کیا... کیا لے گیا ہے.... یہ میں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ میں بہت برا ہوں... بڑا گنہگار ہوں... میری ساری عمر برے کاموں میں گزری ہے... لیکن اچھا ہو یا برا... ماں تو ہر بیٹے کے لیے ایک ہی جیسی ہوتی ہے نا تھانیدار صاحب... میں نے شیدے کا مقابلہ کیا.. لیکن اس سے پہلے وہ مجھے گولی مار چکا تھا... مجھے معلوم ہے اب میں بھی مر جاؤں گا.... میری ماں اس لڑائی سے پہلے ہی مر گئی تھی.. اور میرا باپ بہت پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔ اب میں اپنے ماں باپ کو اور شرمندہ نہیں کروں گا... میں بہت ناخلف تھا.. ان کو بہت دکھ دیے میں نے... لیکن مرنے سے پہلے وہی کروں گا.. جو وہ کرنا چاہتے تھے... میں سکندر پر کسی اور قتل کا الزام نہیں آنے دوں گا... اتنی رات گئے مجھے کوئی سواری نہیں ملے گی... ملی تو وہ مجھے لہولہان دیکھ کر بھاگ جائے گا.. میں تھانے نہیں آ سکتا۔ میر شرافت علی کی کوٹھی کے اندر فون سے...."

ٹیپ یکلخت خاموش ہو گیا۔ مکمل سکوت میں صرف اس کے اسپیکر کی ہلکی سی سرسراہٹ باقی رہ گئی تھی۔ عبدل کے ساتھ ہی عبدل کا بیان ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ایک سچائی ناقابلِ شکست بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ اکرام شیخ نے ہاتھ بڑھا کے ٹیپ کو آف کر دیا۔ ری وائنڈ کیا اور نکال کے جج کے سامنے رکھ دیا۔ مہر بلب اور ساکت و صامت بیٹھے لوگوں کی صورت قابلِ دید تھی۔ وہ خوف، حیرت، تجسس و تحیر اور واقعات کے اس نئے موڑ کی سنسنی خیزی سے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ٹیپ ختم ہوا تو آہستہ آہستہ انہیں کمرۂ عدالت میں اپنی موجودگی کا احساس ہوا۔ سرگوشی میں کی جانے والی باتوں کا شور رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا۔ رابعہ اور عبدالودود منظر نے مسرت سے میری طرف دیکھا اور منظر نے عادتاً مجھے آنکھ ماری۔ اکرام شیخ اب تار نکال کے لپیٹ رہا تھا۔ اس کی بہن کا چہرہ یوں کھل اٹھا تھا جیسے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی ہے اور عدالت نے مجھے باعزت طور پر بری کر دیا ہے۔

"مسٹر صدیقی! آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟" جج نے ایک بار پھر شور ہنگامے پر قابو پا کے کہا۔

"یس سر!" جمیل احمد نے کرسی سے اٹھ کے کہا جو اسے وہیں فراہم کر دی گئی تھی۔ "ابھی تو میں نے ان معاملات سے متعلق کچھ کہا ہی نہیں جن کا تعلق مجھ سے ہے۔ میں سکندر بخت کو نہیں جانتا۔ کسی عبدل سے واقف نہیں اور میں نے نہ میر شرافت علی کا نام سنا تھا اور نہ اسے دیکھا تھا۔ قتل ہر روز ہوتے ہیں اور ان کے اسباب زر، زمین اور زن سے بڑھ کر کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ میں ان کی خبریں چھاپتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ اس کیس میں بھی میری کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی اور سکندر بخت قاتل ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے مجرم کسی نہ کسی طرح قانون کی گرفت میں آنے سے رہ جاتے ہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سزا سے نہیں بچتے۔ اس دنیا کی ہر عدالتِ عظمیٰ سے بڑی عدالت اوپر ہے جس کے سامنے 'حقائق' واقعات اور شہادت' کسی کو مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو اس دنیا کی عدالت سے سزا نہ پا کے سمجھتے ہیں کہ وہ بچ گئے وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس عدالت کی دی ہوئی سزا کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے اور اس کے خلاف اپیل کوئی نہیں۔" اس نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود آج میں اس کیس میں بطور گواہ پیش ہونے پر مجبور ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا یہ فعل خود میری زندگی کے لیے پُرخطر ہے۔ یہ ٹیپ میرے پاس دو بچے لے کر آئے تھے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ دونوں بچے مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے اخبار کے دفتر پہنچے تھے۔ میں آفس میں موجود نہیں تھا چنانچہ ان کی ملاقات ایک مزاحیہ کالم نگار سے ہوئی جس کا نام مست قلندر تو نہیں تھا مگر وہ اسی قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھتا تھا۔ آپ نے پرسوں کے اخبارات میں ملاحظہ کیا ہو گا کہ کس طرح دن دہاڑے کچھ لوگوں نے 'صدائے وقت' کے دفتر پہ حملہ کیا۔ بظاہر وہ طلبہ کا ایک گروہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تھے جو کسی خبر کے خلاف احتجاج کرنے آئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے جنابِ والا کہ انہوں نے مست قلندر سے یہی ٹیپ مانگا تھا۔ وہ دُبلا پتلا کمزور سا آدمی جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا تھا تو ایوانِ اقتدار میں بیٹھنے والوں کے قول و فعل کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ مارتا تھا اور اس کے قلم کی کاٹ سے افسر شاہی کے بڑے بڑے مُہرے پٹ جاتے تھے لیکن ان غنڈوں پر ہاتھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی جو لاقانونیت کو اپنا قانون سمجھتے تھے۔ انہوں نے مست قلندر سے پوچھا کہ ٹیپ کہاں ہے اور وہ دونوں بچے کہاں ہیں لیکن اس نے جبر کی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: تم مجھے صرف قتل کر سکتے ہو۔ قتل تو لوگ ہر روز ہوتے ہیں۔ یہی اس نے بھی کہا تھا جنابِ والا۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب لوگ ایک ہی طرح نہیں مرتے۔ کوئی بھی نہیں جان سکتا کہ وہ کب، کہاں اور کس طرح دنیا سے جائے گا۔ اب اگر نوشتۂ تقدیر یہی ہے تو اس سے لڑنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ ہاں، مجھے اپنے قول و فعل پر پورا اختیار ہے اور اس کا حق تم مجھ سے اس وقت تک نہیں چھین سکتے جب تک اجل کا نامہ بر آ کے نہ کہے کہ مست قلندر تیری زندگی کا یہ فکاہیہ کالم پورا ہوا۔ میں تم کو نہیں بتاؤں گا کہ اس ٹیپ کی اصل کہاں ہے اور نقل کہاں ہے۔ مرتے دم تک وہ اپنی بات پر قائم رہا اور وہ لوگ بہت مایوس ہوئے جو قتل کو دھمکی سمجھتے تھے۔ اس نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تم لوگ مجھے قتل کر سکتے ہو۔ خبر آپ نے پڑھ ہی لی ہو گی۔ آپ تعزیتی بیانات۔ احتجاجی بیانات۔ مذمت کی قرار دادیں۔ مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے کے مطالبے سب پڑھ چکے ہوں گے۔ یہ رسمِ دنیا ہے جسے نبھانے والوں نے پسِ مرگ خوب نبھایا۔ عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن۔ یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ جذباتی ہو کے عدالتی بیان میں شاعری کو لے آیا۔ کہنا مجھے یہ تھا جنابِ والا کہ جو خبر کہیں شائع نہیں ہوئی اور کسی نے نہیں پڑھی، وہ کچھ اور تھی۔ مست قلندر مر گیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اسے مارنے والے ٹیپ کی نقل تلاش کر کے لے جانے میں بھی کامیاب ہو گئے مگر وہ اصل کو اس عدالت تک پہنچانے کے مشن کو ناکام بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مست قلندر کو امید نہیں تھی کہ اس بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں بھی قانون کو اتنا بے بس سمجھنے والے ہیں جو ایک ٹیپ کی خاطر ایک زندگی لے سکتے ہیں ورنہ وہ دو نقلیں بنوا لیتا اور دونوں ان کے حوالے کر دیتا۔ ممکن ہے وہ لوگ اسے بخش جاتے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اسے ایسے ہی مرنا تھا سو وہ مر گیا۔ اسے مارنے والوں کو پھر بھی شکست ہوئی اور میں نے وہ ٹیپ عدالت کے سپرد کر دیا ہے لیکن ان حالات میں کیا میرے خدشات کو بے سبب اور بے بنیاد کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس صورت میں سچ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے بعد میں نے خود اپنے لیے سزائے موت قبول نہیں کر لی ہے۔ میں اس نبی کی خاکِ پا بھی نہیں جس نے راہِ حق میں ہر صعوبت کو سجدۂ شکر کے ساتھ قبول کیا۔ میں تو سقراط ہونے کا دعویٰ بھی کر دوں تو خدا مجھے اس غرور پر رسوا کرے۔ یہ سچ میرے پاس ایک امانت تھا اور کیوں تھا، اس کہانی کا زیرِ سماعت مقدمے سے کوئی تعلق نہیں چنانچہ میں اس کو حذف کرتا ہوں۔ میں سرخ رُو ہوں کہ اس بارِ امانت سے سبکدوش ہوا۔"

"مسٹر صدیقی!" جج نے نرمی سے کہا۔ "یہ ٹیپ آپ کے پاس کیسے پہنچا اور وہ بچے کون تھے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے؟"

"جنابِ والا! مست قلندر مرحوم نے بڑی عجلت میں ٹیپ کی ایک نقل بنا کے اولڈ ریکارڈ میں رکھوا دی تھی۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور ان بچوں کو اصل سمیت میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بچے مقتول ایس ایچ او میر محمد کے تھے۔ آپ کے علم میں یقیناً ہو گا کہ اسے قتل کرنے والے ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے ہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ میر محمد کی بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"سوال یہ ہے صدیقی صاحب کہ وہ بچے آپ کے پاس ہی کیوں پہنچے؟" جج نے کہا۔ "وہ پولیس اسٹیشن کی حدود میں رہتے تھے اور ان کے لیے وہیں پناہ لینا زیادہ آسان تھا۔"

"یہ ان کی ماں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ تھانے نہ جائیں۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "شاید اس لیے کہ تھانے کو وہ ان کی دسترس سے دور نہیں سمجھتی تھی جو اس کے گھر میں داخل ہو کے مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ وہ بچے بہت چھوٹے ہیں جنابِ والا، چنانچہ ان باتوں کو نہیں سمجھتے کہ لوگ قتل کیوں کرتے ہیں اور جب باپ گھر میں نہ ہو تو ماں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے مست قلندر مرحوم کو بھی بتایا تھا اور مجھے بھی کہ ان کے ابو کہیں گئے ہوئے تھے اور گھر میں صرف ان کی ماں تھی۔ ایک دُبلی پتلی کمزور عورت۔"

"کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟" جج نے کہا۔ "آپ کی کوئی عزیزہ تھی وہ؟"

"عزیزہ؟" جمیل صدیقی نے یہ لفظ یوں دُہرایا جیسے اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "جی ہاں۔ وہ عزیزہ تھی... بے حد

عزیزہ تھی مجھے اور میں نے اسے دیکھا تھا۔ یہ قصہ ہے جب کا آتش جواں تھا۔ آئی ایم سوری۔ مجھے بات مختصر کرنی چاہیے اور ٹو دی پوائنٹ۔ ان بچوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسکول سے واپس آ کے کھانا کھا رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی اور ان کی امی یہ سمجھی کہ شاید میر محمد لوٹ آیا ہے۔ میں میر محمد کے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس کے فرائض کی نوعیت البتہ ایسی تھی کہ وہ بعض اوقات دن رات گھر سے باہر رہتا تھا۔ اگر مسلسل غیر حاضر رہتا ہو تو یہ بھی ممکن ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دو افراد اندر آ گئے جن کے متعلق بچوں نے بتایا کہ وہ بہت طاقتور تھے اور ان کی ماں کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ بچوں کے اپنے الفاظ میں 'وہ پہلوانوں جیسے تھے اور امی ان کے سامنے بہت چھوٹی لگتی تھیں'۔ اسی لیے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی دُبلی پتلی اور نازک اندام تھی۔ بڑا بچہ نسبتاً سمجھدار ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اندر آتے ہی ان لوگوں نے بڑے بڑے چاقو نکال لیے تھے اور کہا تھا کہ چیخنے چلانے یا حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو سب کو ذبح کر دیا جائے گا۔ بچے ڈر گئے کیونکہ ان کی ماں بھی ڈر گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے بچوں کی ماں سے ٹیپ کے متعلق پوچھا۔ اور اس کے بعد اس پر تشدد کے وہ سب انسانیت سوز حربے آزمائے جن کا ذکر بھی میرے لیے باعثِ آزار ہے۔ یہ عدالت خود اندازہ کر سکتی ہے کہ کسی گھر میں ایک تنہا عورت کے ساتھ دو وحشی اور درندہ صفت افراد کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ تاہم بچے اسی دھمکی سے خوفزدہ تھے جو آنے والوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی دی تھی۔ انہوں نے اس ڈر سے کوئی آواز نہیں نکالی کہ وہ لوگ انہیں اور ان کی ماں کو ذبح کر دیں گے اور کونے میں دبکے پڑے رہے۔ آپ ان بچوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے حضورِ والا۔ ان کے معصوم ذہن کو خوف نے کس حد تک مسخ کر دیا ہے۔ وہ رات کو روتے ہیں، نیند میں چلنے لگتے ہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جو اُن کی عمر کے دوسرے بچے نہیں کرتے۔ وقت بڑا مسیحا ہے۔ میں انہیں جھوٹ کی گولیاں دے دے کر وقت گزار رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہ نارمل رہیں لیکن اس کے باوجود وہ بڑے ہو کر انسان نہ رہیں، آدمیت کا احترام نہ کریں اور عورت کے مرتبے اور مقام کی عزت نہ کریں تو یہ ان کا قصور نہیں ہو گا۔ بقول شاعر۔ دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ ہم سب یہی کرتے ہیں۔ پیار پاتے ہیں تو پیار لٹاتے ہیں۔ نفرت پاتے ہیں تو نفرت لوٹاتے ہیں۔"

"آپ بیان کو واقعات تک محدود رکھنے کی کوشش کیجیے صدیقی صاحب کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔" جج نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"وقت واقعی کم رہ گیا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی بات کر رہا ہو۔ "بچوں نے بتایا کہ انہوں نے ماں کو بہت مارا لیکن ماں نے ٹیپ کا پتا نہیں بتایا۔ ٹیپ سب سے نیچے فلیٹ میں رہنے والوں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ یہ بچوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کیوں؟ مگر جب ان کی ماں نے موقع پاتے ہی انہیں گھر سے نکال دیا اور کہا کہ وہ نیچے والے گھر سے ٹیپ لے کر بھاگ جائیں تو وہ ٹیپ لے آئے۔ ماں نے ان سے کہا تھا کہ خبردار! تھانے مت جانا۔ ایک نام یاد رکھنا۔ صدائے وقت۔ یہ اخبار ہے۔ اس کے دفتر پہنچ جانا۔ کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کے۔ وہاں جمیل صاحب ہوں گے جو اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ انہیں سب بتا دینا۔ ٹیپ ان کے حوالے کر دینا اور پھر جیسا وہ کہیں، کرنا۔ وہ بھول گئی تھی کہ میں دن میں گھر پر ہوتا ہوں۔ اخبار رات کو چھپتا ہے چنانچہ میں شام کے بعد آفس پہنچتا ہوں۔ بڑا بچہ میرا نام بھول گیا لیکن اسے ایڈیٹر کا لفظ یاد رہا۔ تقدیر ان کی یاور تھی کہ رکشا ٹیکسی تلاش کرنے سے پہلے ان کو ایک پرائیویٹ کار کا ڈرائیور مل گیا جس نے انہیں 'صدائے وقت' کے آفس پہنچا دیا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ جانتے ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ان بچوں کو کسی مرحلے پر عدالت میں پیش کر سکیں؟"

"میں قانون کا پابند اور عدالت کا احترام کرنے والا آدمی ہوں جنابِ والا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں استدعا کروں گا کہ ان بچوں کی زندگی کی خاطر مجھے اس حکم کی تعمیل کا پابند نہ کیا جائے۔ بچے بالکل محفوظ ہیں اور میں ان کو محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے عدالت کے احکامات کی تعمیل نہ کرنے کے جرم کی سزا قبول ہو گی...."

"یہ کوئی حکم نہیں ہے صدیقی صاحب!" جج نے کہا۔ "کیا آپ یہ بتائیں گے کہ اس ٹیپ کو اتنی تاخیر سے عدالت تک پہنچانے کے اسباب کیا تھے؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ آپ ٹیپ کسی قابلِ اعتماد شخص کے ہاتھوں بھجوا دیتے اور خود سامنے آنے کا خطرہ مول نہ لیتے۔ ٹیپ کو آپ ڈاک سے بھی بھیج سکتے تھے۔ میرے گھر بھی پہنچا سکتے تھے۔ پتا معلوم کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کے وسائل کم نہیں۔"

"بجا ارشاد یور آنر۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن ٹیپ ملنے کے بعد میں نے بہت سے کام کیے۔ میں نے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کیا۔ ٹیپ کی مزید دو نقول بنوائیں۔ اس

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے ساتھ ہی میں میر محمد کی بیوی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور اب میں بھی ان سب کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں جو سمجھتے ہیں کہ میر محمد کے ساتھ ہی اس کی بیوی کو بھی اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا ہوگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر محمد کی لاش کے ٹکڑے مل گئے ہیں۔ ان بچوں کی ماں کو کسی مدفنِ بے نشاں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں نے ٹیپ سننے کے بعد گزشتہ اخبارات میں شائع ہونے والی میر شرافت علی کے قتل کی سب خبروں کو یکجا کیا۔ پھر سکندر رجنت یعنی مبینہ قاتل کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کیں۔ اس کے لیے مجھے برطانیہ میں اپنے چند ہم پیشہ افراد سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا۔ انہوں نے مجھے وہاں کے اخبارات کے تراشے ارسال کیے۔ میں نے واقعات کی کڑیوں کو جوڑا تو مجھے اور بھی بہت سی خبریں ملیں جن کا تعلق اسی ایک کیس سے تھا۔ یہ سب خبریں مختلف اوقات میں الگ الگ شائع ہوئی تھیں۔ اور ان سب پر غور کرنے کے بعد میں نے متعدد نتائج اخذ کیے۔ چونکہ مقدمۂ زیرِ سماعت پر اپنی رائے دینا قانوناً جرم ہے اور یہ عدالت، سماعت کے دوران میں واقعات، حالات اور شہادتوں سے از خود نتائج اخذ کرنے کی اہل ہے اس لیے میں یہ فائل عدالت کو پیش کر سکتا ہوں۔ صرف عدالت کی مدد کے لیے۔" اس نے پیچھے کی طرف دیکھا اور لوگوں میں سے ایک شخص اچانک اٹھا جیسے وہ اسی وقت اور اشارے کا منتظر تھا۔ وہ صفوں کے بیچ سے گزر کے آیا اور اس نے ایک پتلی سی فائل جج کی میز پر رکھ دی۔ اسی وقت میں نے دائیں اور بائیں دروازوں سے سادہ کپڑے والوں کو اندر آتے دیکھا۔ محسن ان کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ دروازوں کے قریب ہی دیوار سے یوں ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے جیسے بیٹھنے کی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً کھڑے ہیں لیکن میں نے ان کو صورت شکل سے ہی نہیں، طور طریقے سے، مستعدی کے انداز سے اور تیوروں سے پہچان لیا۔ ضامن رضوی صاحب نے محسن کے ایس۔ او۔ ایس پر فوری کارروائی کی تھی۔ جمیل صدیقی کو بحفاظت اپنے نرغے میں لے کر نکال لے جانے والے آ پہنچے تھے اور اب جمیل صدیقی سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں۔

"مجھے اور کچھ نہیں عرض کرنا ہے جنابِ والا۔" صدیقی نے کہا۔

"مسٹر صدیقی!" جج نے کہا۔ "آج کی کارروائی کا تمام وقت آپ کے بیان میں صرف ہوا اور عدالت نے آپ کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر مروجہ طریقۂ کار سے انحراف کی رعایت بھی دی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مقدمے میں قانون کے تقاضے نظرانداز نہیں کیے جا سکتے۔ اس بیان کے بعد استغاثہ کو جرح کا حق ملنا چاہیے۔ آپ کا بیان فی الحال ریکارڈ پر رہنا چاہیے لیکن گواہوں پر جرح کا مرحلہ آئے گا تو آپ کے نام سمن جاری کر دیے جائیں گے۔ معرفت روزنامہ صدائے وقت۔"

"بشرطِ زندگی میں عدالت کے احکامات کی ضرور تعمیل کروں گا جنابِ والا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "اور حاضر ہو جاؤں گا۔"

"آپ اب بھی محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے تو عدالت آپ کو پولیس کی معیت میں بھیج سکتی ہے لیکن آپ کو تحفظ کے لیے خود پولیس سے رجوع کرنا ہوگا۔" جج نے کہا۔ "وہ بھی آپ سے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو کس سے خطرہ لاحق ہے۔"

"میں عدالت کا شکر گزار ہوں۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں ان انتظامات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر ایک مسلح پہریدار سائے کی طرح ہمرکاب رہے تب بھی اس گولی کو نہیں روکا جا سکتا جو کسی بھی نامعلوم سمت سے آ کے سارے انتظامات کو غیر موثر کر سکتی ہے۔ اگر ایک پوری رجمنٹ بھی میری حفاظت پر مامور ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی رجمنٹ کا ایک سپاہی دشمنوں کے عزائم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی قیمت وصول کر لے۔" اس نے تعظیم کے لیے سر جھکایا اور باہر نکل آیا۔

بڑی تیزی سے میں نے نصف درجن کے قریب افراد کو جمیل صدیقی کے گرد حصار سا قائم کرتے دیکھا۔ جج اپنے چیمبر میں جا چکا تھا اور باقی لوگ بھی منتشر ہو رہے تھے۔ بظاہر کوئی بھی صورت سے قاتل نہیں لگتا تھا۔ لیکن جمیل احمد صدیقی کسی فوبیا کا شکار نہیں تھا۔ اس کا خوف بے سبب نہیں تھا۔ مست قلندر پر قاتلانہ حملے کی اطلاع نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ رابعہ اور محسن بھی اس خبر پر چونکے تھے۔ ظاہر ہے یہ افسوسناک واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ہم نے لاہور کے اخبار نہیں دیکھے تھے۔ مقامی اخبارات میں یہ خبر ہو گی تو اندر کے کسی صفحے پر اور اتنی غیر نمایاں کہ ہم میں سے کسی نے نوٹ نہیں کی۔ محسن اور رابعہ کو ان دنوں میں یوں بھی تفصیل سے اخبار دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اور میں اپنے چکروں میں تھا۔ اس کے علاوہ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ خبر میں مست قلندر کا نام نمایاں نہیں ہوگا۔ جمیل صدیقی کے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو ہیڈ لائن بنتی تھی وہ یہی ہو سکتی تھی کہ اخبار کے دفتر پر مشتعل طلبا کا حملہ۔ ایک کارکن زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق۔ اس سے ہمارے ذہن میں مست قلندر کا خیال کیسے آ سکتا تھا۔

یہ اس مست قلندر کی مرگِ ناگہاں کے بعد جمیل صدیقی کی زندگی واقعی خطرے میں نظر آتی تھی۔

"بھئی یہ کیا ہے! کون ہیں آپ لوگ؟" جمیل صدیقی نے یکلخت اپنے گرد کچھ اجنبی چہرے دیکھ کر کہا۔

"فکر کی بات نہیں جمیل صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ سب دوست ہیں۔ دشمن نہیں۔"

"اچھے دوست ہیں! میں تو کسی کو پہچانتا تک نہیں سکندر صاحب!" وہ بولا۔

"یہ آپ کے محافظ ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔ "مجھے امید ہے یہ کسی کو آپ کے قریب نہیں آنے دیں گے۔"

"میں نے کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کی درخواست کسی سے نہیں کی تھی۔" وہ ناگواری سے بولا۔

"یہ جرأت میں نے کی صدیقی صاحب کہ آپ کی اجازت کے بغیر خاموشی سے یہ بندوبست کر لیا۔" میں نے کہا۔ "جیسے میری طرف سے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہونے کا خطرہ آپ نے اپنی مرضی سے مول لیا تھا۔ آگے بڑھتے رہیے۔"

"لیکن یہ لوگ مجھے کہاں لے جائیں گے؟" جمیل صدیقی نے بے بسی سے کہا۔

"جہاں آپ کہیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ لوگ اپنے کام کے ماہر ہیں۔ ان کے درمیان چلتے جائیے۔ باہر ایک بلٹ پروف کار کھڑی ہے۔ اگر کوئی اس کار کا پیچھا کرے گا تو پکڑا جائے گا۔ کیونکہ اس کے پیچھے بھی ایک کار ہو گی۔ اس کار کا تعاقب بہت مشکل ہے۔ یہ چکمہ دے کر آپ کو صاف نکال لے جائیں گے اور جب ان کو یقین ہو گا کہ اب آپ کے پیچھے کوئی نہیں تو یہ آپ کو گھر پہنچا دیں گے۔ اور کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ وہ گھر کہاں ہے۔ آپ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ تاوقتیکہ آپ پر کوئی دستی بم نہ پھینکے۔ یہ آپ پر ہونے والے فائر کو بھی آپ کے جسم تک نہیں پہنچنے دیں گے۔"

"میں یقیناً بہت متاثر ہوا ہوں سکندر صاحب!" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کیوں کیا؟"

"یہ تو ایسا سوال ہے کہ مجھے جواب دیتے ہوئے بھی ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سب کچھ آپ نے کیا۔ اس ٹیپ کو عدالت میں سنوانے تک اتنے مرحلے تھے اور میرا تو آپ سے کوئی رشتہ تک نہ تھا۔ سوائے انسانیت کے رشتے کے۔ جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا اس کے مقابلے میں یہ فضول سی کوشش کیا ہے۔ مجھے اتنا حق تو دیجیے کہ آپ نے میری زندگی بچانے کے مقصد کو جہاد سمجھا تو میں بھی آپ کی زندگی کی قدر کر سکوں۔"

"جو کچھ میں نے کیا وہ میرا فرض تھا۔ اور فرض سے میں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔" وہ بولا۔

"بات تو احساس کی ہے صدیقی صاحب کہ آپ نفسا نفسی کی اس دنیا میں فرض کسے سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف اپنے لیے جینے اور مرنے کو؟ اپنے مفادات کے تحفظ کو اور اپنے مسائل کو؟ اپنے رشتوں کو اور اپنی محدود دنیا میں اپنی خوشی کی خاطر جدوجہد کرنے کو؟"

"اپنے مفادات کو دیکھتا اور صرف اپنے لیے جیتا برخوردار تو میں اس غیر معروف، ہمیشہ زیرِ عتاب رہنے والے اور مالی مشکلات کے شکار 'صدائے وقت' کا مدیر نہ ہوتا۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "میں بڑے اور نامور، زیادہ فروخت ہونے والے اور سرکاری اشتہارات کے بل پر چلنے والے اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کو جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی صلاحیت کیا ہے۔ وہ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ خوشامد کر لیتے ہیں۔ ناجائز کو جائز اور دن کو رات کہہ سکتے ہیں اور اصول یا سچائی ان کے نزدیک محض تجارتی پیمانے ہیں چنانچہ وہ خوش حال ہیں۔ مست قلندر میرا دستِ راست تھا اور میرے لیے حوصلہ افزا بات یہی تھی کہ دنیا میں میرے جیسے سرپھرے اور بھی ہیں۔ میری پوری ٹیم میری جانشین ہو سکتی ہے۔"

"آپ جیسے لوگ روشنی کا مینار ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب کوئی ان سے رہنمائی حاصل کرے یا نہ کرے۔ آپ نے ان دونوں بچوں کی ذمہ داری قبول کی جن سے آپ کا ایک جذباتی تعلق تھا، بہت پرانا۔"

"یہ بات تم کیسے جانتے ہو؟" وہ چونکا اور چلتے چلتے رک گیا۔

"جیسے آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کسی غرض کے بغیر میرے کیس میں دلچسپی لی۔ خبریں جمع کیں۔ ٹیپ کی حفاظت کی اور اسے عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر چلے آئے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ ان دونوں بچوں کے ساتھ روپوش ہو جاتے۔ اس کی پروا کیے بغیر کہ سکندر کے ساتھ کیا ہوا اور کیوں ہوا۔ اور بعد میں کیا ہو گا۔ آپ پر کوئی اخلاقی ذمے داری تک عائد نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں آپ مجبور ہو گئے تھے کسی منطقی استدلال کے بعد آپ قائل ہو گئے تھے کہ آپ نے میری مدد نہ کی تو تمام عمر اپنے آپ سے شرمندہ رہیں گے۔"

یہ مختصر سا جلوس سیاہ رنگ کی بلٹ پروف کار تک پہنچ گیا تھا۔ معلوم نہیں رضوی صاحب نے اتنے کم وقت میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اتنا قابلِ اعتماد انتظام کیسے کر دیا تھا۔ سکیورٹی کے پانچ افراد ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بظاہر ہم سے لاتعلق چل رہے تھے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی نگاہ ہر طرف ہے اور سب پہ ہے۔ اگر وہ کسی کو ذرا بھی مشتبہ حرکت کرتے دیکھتے تو فوراً وہ ریوالور نکال لیتے جو اُن کی قمیص کے نیچے شلوار کے گھیر میں نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اس قسم کے لوگوں کی پھرتی کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف میں جنون کی حد تک پہنچ جانے والے ایک شخص نے میرے سامنے ایک غیر ملکی مہمان کو گولی کا نشانہ بنانے کے لیے ریوالور نکالا ہی تھا کہ سیکیورٹی والوں نے مہمان کو گرا دیا اور خود اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں لیٹ گئے۔ اس حالت میں مشین گن یا دستی بم سے بھی نقصان پہنچتا تو صرف انہی کی ذات کو۔ پھر پلک جھپکنے میں انہوں نے نوجوان کو نشانہ بنا لیا تھا لیکن اسے مارا نہیں تھا۔ اس کا نشانہ خطا کر دیا تھا اور اسے زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تاکہ اس سے مزید پوچھ گچھ کی جا سکے اور یہ پتا چلایا جائے کہ جو کچھ اس نے کیا، وہ اس کا ذاتی فعل تھا یا کسی منظم سازش کا نتیجہ۔ کیا ہمارے یہ محافظ بھی ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے؟ میں نے سوچا۔ جمیل صدیقی کے دائیں ہاتھ پر میں تھا۔ بائیں ہاتھ پہ محسن اور پیچھے استاد ٹیڈی۔

"صدیقی صاحب!" میں نے کہا۔ "ان حالات میں آپ کا رُوپوش اور گمنام رہنا ہی بہتر ہے۔ اور آپ کو یقیناً ہم سب کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی وقت میں آپ سے مل سکوں۔ آپ مجھے ایس پی ضامن رضوی کے گھر فون کر سکتے ہیں اور یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ میں کہاں اور کس وقت حاضر ہو جاؤں؟"

ایک محافظ نے دروازہ کھولا۔ جمیل صدیقی کو شاید زندگی میں پہلی بار یہ "دی آئی پی ٹریٹ منٹ" ملا تھا ورنہ وہ مردِ آزاد و بے باک تو نہ جینے سے ڈرتا تھا نہ مرنے سے چنانچہ اپنی ذات اور خدا پر اعتماد کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ وہی کرتا تھا جس پر اس کو ضمیر سے تائید ملے اور وہی لکھتا تھا جو اس کے نقطۂ نظر سے سچ ہو اور یہی وجوہات تھیں کہ "صدائے وقت" ایک غیر معروف، گمنام اخبار رہا اور تجارتی کامیابی کی اس منزل تک نہ پہنچ سکا جہاں دولت، عزت اور شہرت ملتی نہیں، عطا کر دی جاتی ہے۔ خلعتِ فاخرہ کی طرح۔

"میں بتا دوں گا۔" جمیل صدیقی نے کہا۔ "لیکن اس کی وجہ؟"

"میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ مجھے موضوع بنا کے آپ نے جو ریسرچ کی تھی اس کے نتائج کس حد تک درست ہیں۔ میری حقیقت کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جس رائے کے اظہار سے آپ نے عدالت میں اجتناب کیا وہ صائب ہو گی اور جو نتائج آپ نے اخذ کیے وہ میرے یقین کے مطابق ہوں گے؟"

جمیل صدیقی مسکرایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جو شخص دروازہ تھامے کھڑا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر ڈرائیور کی جگہ جا بیٹھا۔ باقی تین افراد پہلے ہی پچھلی نشست پر پوزیشن سنبھال کے دروازے بند کر چکے تھے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہم وہیں کھڑے رہے۔ ہمیں بالکل احساس نہیں تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ تماشائی ہیں۔ ان کے اخباری نمائندے بھی تو تھے جنہوں نے جمیل صدیقی کی متعدد تصاویر اتاری تھیں۔ ہماری ساری توجہ دوسری طرف تھی لیکن فوری طور پر کوئی گاڑی تعاقب میں روانہ نہیں ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"قسم مولا کی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ ہوئی نا بہادری۔ آج سمجھ میں آئی بات۔"

"آج تک تم کیا سمجھتے تھے؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ خنجر، پستول سے کسی نہتے شخص کو دہشت زدہ کر دینا یا اسٹین گن سے کسی بنک کے لاکھوں لوٹ کر فرار ہو جانا ہی بہادری ہے۔"

"اب چلو۔ بیگم رضوی گاڑی میں ہماری منتظر ہیں۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے رابعہ بھی پہنچ گئی ہو گی۔"

"پھر مجھے اجازت دیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "شہلا باجی کو میرا سلام دیں۔ آج کی بات سن کے وہ بھی خوش ہوں گی۔"

"ہاں۔ شہلا کو ہم فون پہ اطلاع دیں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن استاد! تم کو ایک کام کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت کی کوئی میعاد نہیں۔ ذرا یہ معلوم کرو کہ استاد پیڈرو کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ خصوصاً گزشتہ ایک ہفتے میں وہ کیا کر رہا تھا۔ معلوم کر سکتے ہو؟"

"کوشش ضرور کروں گا جی۔ معلوم کیسے نہیں ہو گا۔" وہ جاتے جاتے بولا۔ میں اور محسن پلٹ کر مخالف سمت میں چلنے لگے۔ اچانک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ایک شخص بے تحاشا بھاگا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اسی شخص نے عدالت میں اخباروں کے تراشوں پر مشتمل فائل پیش کی تھی۔ اس کے کپڑے کچھ پھٹے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑے مقابلے کے بعد دشمنوں کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔ دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میں نے بیک وقت دو افراد کو اس کے پیچھے لپکتے دیکھا۔

"پکڑو۔ پکڑو" وہ دونوں چلا رہے تھے۔ "جیب کاٹ کے بھاگا ہے۔"

یہ سب جھوٹ تھا اور اس شخص کو پکڑنے کا بہانہ تھا یہ بات سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ خود محسن اندازہ کر چکا تھا کہ بات کیا ہے۔ میں نے سامنے سے ایک کا راستہ یوں روکا کہ تصادم اتفاقیہ نظر آئے۔ دوسرے کی ٹکر محسن سے ہوئی۔ دو دوسرے لمحے ہم چاروں بعد سے منہ کے بل گرے۔ معذرت کرنے کی بجائے میں نے اٹھ کے اس شخص کی گردن دبوچ لی جو مجھ سے ٹکرایا تھا۔

"اندھا ہے کیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "سانڈ کی طرح لوگوں کے ٹکر مارتا پھرتا ہے؟"

"ارے... رے بھائی! میں تو اس کے پیچھے تھا۔" اس نے بمشکل تمام کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کی بدقسمتی کہ اشارے کا رخ ایک لڑکی کی طرف ہوا جو اس ہنگامے پہ رُک گئی اور کچھ سہمی ہوئی لگتی تھی۔

"اچھا۔ چوری اور سینہ زوری۔" میں نے اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ "شہدے! لفنگے! لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہے۔"

"اجی وہ میرا بٹوا نکال کر لے گیا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "میں ایک جیب کترے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔"

"جیب کترا؟" میں نے حیرانی اور خفت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "پہلے بکنا تھا نا۔ ہم خود اسے پکڑ لیتے۔"

محسن حسن خاں نے بھی کچھ ایسا ہی ڈراما کیا تھا اور ان سے بھی فریقِ ثانی کے مذاکرات خاصے غیر دوستانہ فضا میں ہو رہے تھے۔ لیکن ان میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔

"تم نے جانتے بوجھتے میرے ٹکر ماری ہے۔" محسن کہہ رہا تھا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ وہ شخص میری جیب کاٹ کر بھاگا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔" دوسرا چیخ کر بولا۔

"ایک آدمی بیک وقت دو کی جیب کاٹ کر کیسے بھاگ گیا؟" میں نے چلا کے کہا۔ ہمارا ایک مقصد ان دونوں کی پیش قدمی روکنا تھا۔ اس ہنگامے پہ ہمارے گرد مجمع لگ گیا تھا اور وہ شخص صاف بچ کے نکل گیا تھا جو حقائق پر مبنی فائل پیش کرنے کا مجرم تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے جمیل صدیقی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن صدیقی صاحب جاتے وقت اسے غیر محفوظ چھوڑ گئے تھے۔ شاید ان کو یاد نہیں رہا تھا ورنہ وہ کسی مددگار و معاون کو بھولنے والے آدمی نہیں تھے۔ عدالت کے احاطے میں پولیس کی کمی نہیں ہوتی۔ مجمع دیکھتے ہی حوالدار سے کمتر عہدے کے چند افراد نمودار ہوئے۔ پھر حوالدار بجلی نمودار ہوا اور جھگڑے میں ملوث ہمیں دیکھ کر اس کے لبوں پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی جو زبانِ حال سے اعلان کر رہی تھی کہ ہم جیسے "شرپسندوں" سے نمٹنے کے لیے اس کے قانونی اختیارات کافی ہیں اور وہ اس سنہرے موقعے سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ ابھی اس نے امن و امان کی صورتِ حال سنبھالنے کے لیے ابتدائی تفتیش کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ نمودار ہو گیا۔ حوالدار بجلی کی امیدوں کے غنچے بن کھلے مرجھا گئے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" شیخ نے قطعی انجان بن کے کہا۔ "یہ کوئی مجمع لگانے کی جگہ ہے؟"

"اس نے مجھ پر جیب کترا ہونے کا الزام لگایا ہے۔" محسن نے اپنے فریق کے خلاف اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا۔

"جھوٹ۔ جیب کترا وہ تھا جو بھاگ گیا۔" دوسرا فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "تم نے مجھے اس کے پیچھے جانے سے روکا۔"

"گویا میں بھی اس کا ساتھی اور شریکِ کار تھا۔" محسن نے اس بار اپنے حریف کا گریبان تھام لیا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو۔ میں تم دونوں کو بند کر دوں گا۔" شیخ نے گرج کر کہا کیونکہ اس نے مجھے آنکھ مارتے دیکھ لیا تھا۔

"اس نے جانتے بوجھتے مجھے ٹکر ماری۔" میں نے اپنا کیس پیش کیا۔ "اس کا ساتھی میرا پرس لے کر بھاگ گیا۔"

"یہاں سے کوئی نہیں بھاگا۔" محسن نے چلا کر کہا۔ "کس نے دیکھا ہے کسی کو فرار ہوتے؟"

یہ سوال بڑا برمحل تھا۔ جنہوں نے ایک شخص کو بھاگتے دیکھا تھا وہ یا تو جا چکے تھے یا اب بھی موجود تھے تو انہوں نے لب کشائی سے گریز کیا۔ بلاوجہ کے جھگڑے میں کون اپنا کام چھوڑ کے تھانے جائے۔ باقی جمع ہونے والے بعد میں پہنچے تھے اور انہوں نے واقعی کسی کو بھی جائے واردات سے فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ خاصے محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ یہ طے کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ جیب کس کی کٹی، کس نے کاٹی؟ کون فرار ہوا اور کس نے کس کا راستہ روکا؟

"حوالدار!" شیخ نے حوالدار بجلی کو مخاطب کیا۔ "ان سب کو تھانے لے چلو۔ دیکھو کوئی ٹیکسی ہے۔"

"لیکن سر۔ آپ مجھ سے تو پوچھیں۔ میں جائے واردات پر موجود تھا۔ یہ دونوں..." اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"یہاں کچہری مت لگاؤ۔" شیخ نے پھر گرج کر کہا۔ "جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ جاؤ۔"

"یہ حوالدار بجتا ہے سرجی۔" کسی نے پیچھے سے کہا۔ "یہ تو آپ کے بھی بعد میں آیا تھا۔" میں نے استاد ٹیڈی کی آواز پہچان لی اور اس کی حمایت پر بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی لیکن حوالدار بجلی اچھلا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ٹیڈی بھی شاید مجمع دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔
"کون ... کون کمینہ کہتا ہے —" اس نے چیخ کر کہا۔ "سامنے آئے میرے۔"
"حوالدار"۔ شیخ نے غرا کے کہا "تم ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ میرے حکم کو نظر انداز کر رہے ہو۔"
حوالدار بجلی کو خون کے گھونٹ پی کے رہ جانا پڑا۔ میں نے موقع پا کے استاد ٹیڈی سے کہا "رابعہ اور بیگم رضوی کو جانے کے لیے کہہ دو۔ ہم ذرا دیر سے گھر آئیں گے۔ شیخ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ مت کہنا۔"
ٹیڈی جو سرکتا ہوا آگے آگیا تھا میری بات سنتے ہی سر ہلا کے غائب ہو گیا۔ غیظ و غضب سے کھولتے ہوئے حوالدار بجلی نے ٹیکسی پکڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ بیگار میں ہاتھ آنے والی ٹیکسی کا ڈرائیور انکار کرتا تو یقیناً اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ شیخ نے یہی مناسب سمجھا کہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جائے ورنہ یہاں اس سے بڑے افسر کا یا کسی مجسٹریٹ وغیرہ کا نمودار ہو جانا بھی عین ممکن تھا۔ متحارب گروپ کے ارکان چار تھے لیکن شیخ پانچویں سواری بن کے فٹ ہو گیا۔ ڈرائیور کیسے کہتا کہ یہ خلاف قانون ہے۔ تھانیدار کی وردی میں شیخ آگے براجمان تھا۔ پیچھے ہم چار افراد تھے لیکن ہم نے بھی بڑی چالاکی سے یہ کیا تھا کہ ایک پچھلے دروازے سے محسن پہلے اندر گھس کے بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف سے میں نے ان دونوں کو پہلے بیٹھنے پر مجبور کیا تاکہ خود دوسرے دروازے کی طرف پہریداری کے فرائض انجام دے سکوں۔ نشست کے اس انتظام پر بھی ایک مختصر سا تلخ و ترش اختلافی مکالمہ ہوا لیکن وہ محض چھیڑ خانی تھا۔ شیخ نے ان کو ایک ڈانٹ لگائی تو وہ مجبور ہو گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے وہ خاصے بے ضرر اور مظلوم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن گرفتاری کے غیر متوقع انجام نے انہیں متفکر کر دیا تھا اور ان کے چہروں پر وہ خباثت لوٹ آئی تھی جو اُن کی اصل فطرت کی عکاس تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مسلح ہوں گے لیکن ضلع کچہری میں اسلحے کی نمائش مشکل تھی۔ اس کے بعد ہماری مداخلت نے انہیں بے بس کر دیا۔ خصوصاً میں بہت محتاط رہا کہ کسی کا ہاتھ جیب یا نیفے کی طرف بڑھے تو اسے روک دوں خواہ اس کے لیے مجھے ہاتھ کو وار کر کے سُن کرنا پڑے یا کلائی توڑنی پڑے۔ آخری خرابی حوالدار بجلی اور انسپکٹر شیخ کا نمودار ہونا تھا اور یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ عدالت میں یقیناً وہ بھی ہوں گے جنہوں نے طے کیا ہو گا کہ کسی نے ٹیپ کی کاپی پیش کی تو اسے باہر نکلتے ہی ٹھکانے لگا دیں گے لیکن ان

کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنے دو چھو... کو حکم دیا کہ سکندر کے دوسرے حمایتی کو پکڑ لاؤ مگر اسے لیا اور ... کہ خاک شدہ۔ وہ خود پکڑے گئے۔ حوالدار بجلی کو ذلت کا آخری صدمہ یہ اٹھانا پڑا کہ شیخ نے اسے زبردستی ٹیکسی میں ... ہونے سے روک دیا اور بس میں آنے کو کہا۔
"پانچ تو پہلے ہی پھنس گئے ہیں۔ پھر تم کو بیچ میں آ کے چوڑا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" شیخ نے کہا۔
"ویسے تو سر جی پانچ بھی نہیں بیٹھ سکتے ٹیکسی میں۔" حوالدار نے جل بھُن کے مگر آہستہ سے کہا۔
"یہ تو ہے۔" شیخ نے یوں کہا جیسے ابھی تک اسے احساس نہیں تھا کہ پانچویں سواری قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔
"اچھا تم ان میں سے ایک کے ساتھ رکشا میں آ جاؤ۔" وہ بولا اور اس نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ شیخ نے ریوالور نکال لیا "اگر راستے میں کسی نے دروازے کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا تو میں گولی مار دوں گا۔" اور بیک دیو... کو اس دروازے پر ایڈجسٹ کر لیا جس سے میں اترا تھا۔ "تم ذرا پیچھے دیکھ کے گاڑی چلاؤ۔ اور پیچھے اپنی آنکھوں سے دیکھو۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔
حوالدار بجلی اور میں ان مسافروں کی طرح کھڑے رہ گئے جن کو ایک دوسرے کی شکایت پر بے ٹکٹ ہونے کے جرم میں کسی ویران پلیٹ فارم پر اتار دیا گیا ہو اور ٹرین جا چکی ہو۔
"حوالدار صاب!" میں نے کہا "رکشا روکو۔ ایس پی صاحب حکم دے گئے ہیں۔"
"وہ اے ایس آئی تھا۔" حوالدار نے میری جہالت پر ملامت آمیز لہجے میں کہا "رکشا کا کرایہ اس کا باپ دے گا۔ حکم دے گئے ہیں!"
"میرا خیال ہے تم سوال کر دگے تو بڑے شیخ صاحب انکار نہیں کریں گے؟" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی "ان کا اصول ہے کہ کسی فقیر کو خالی ہاتھ مت لوٹاؤ۔ بڑے سخی اور نیک دل آدمی ہیں۔"
"تمہاری جیب میں بھی تو پیسے ہوں گے۔" حوالدار نے اس بے عزتی کو بھی دل پر جبر کر کے برداشت کیا "ایک سگریٹ تو دے دو۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ رشوت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ میرا اصول یہ ہے کہ نہ کسی سے مانگ کے پیتا ہوں نہ پلاتا ہوں۔"
"رکشا کا کرایہ تو دے سکتے ہو۔ تم خود بیٹھو گے اس میں۔"

حوالدار بجلی نے خونخوار لہجے میں کہا۔
"دے تو سکتا ہوں۔ مگر دوں گا نہیں۔" میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر کہا "اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ سوال میری عزت کا ہے۔ تم ساتھ بیٹھو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا ارادہ پیدل جانے کا ہے۔ پیدل چلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے اور مجھے تمہاری صحت تو ویسے ہی قابلِ افسوس لگتی ہے۔ موسم بھی کیا سہانا ہے۔ پیدل چلو گے تو بھوک کھُل جائے گی۔"
سہ پہر کا سورج اپنی تمازت برسا رہا تھا جس سے سڑک کا تارکول تک پگھلنے لگا تھا اور خود میرا بھوک سے حال پتلا تھا لیکن میں نے پیدل چلنا شروع کیا۔ سخت طیش کے عالم میں حوالدار بجلی نے ایک رکشا والے کو روکا اور تھانے چلنے کو کہا۔ رکشا والے نے میٹر پہ بندھے ہوئے کپڑے کی طرف اشارہ کیا "میری شفٹ ختم ہو رہی ہے حوالدار صاحب!"
حوالدار بجلی نے اپنی مخصوص مہارت کا استعمال کیا اور بجلی کی طرح رکشا والے کی گُدّی پر ایک ہاتھ رسید کیا "شفٹ کی اولاد۔ سرکاری ڈیوٹی سے انکار کرتا ہے۔"
رکشا والا ضرب کی شدت سے زیادہ اس قدر منحنی قسم کے حوالدار کی پھرتی پر بھونچکا رہ گیا۔ انکار وہ کیا کرتا۔
"تمہارا میٹر ٹھیک ہے نا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "حوالدار صاحب کرایہ ہمیشہ پورا دیتے ہیں۔"
"کرایہ کیا سرکار۔ دوسری شفٹ والے کو رکشا وقت پر نہ ملا تو کل مالک مجھے رکشا دے گا ہی نہیں۔" رکشا والے نے فریاد کی۔
میں نے حوالدار بجلی کو بے تکلفی سے ہاتھ تھام کے گھسیٹ لیا "اچھا تو پھر تم جاؤ۔ ہم دوسرا رکشا لے کر چلے جاتے ہیں۔"
"آپ جیسے لوگ..." حوالدار بجلی نے بمشکل تمام خود کو غلط جملہ بولنے سے روکا "ہماری بھی بے عزتی خراب کراتے ہیں۔"
رکشا کا ڈرائیور رفوچکر ہو گیا تھا اور میں دوسرے رکشا کے لیے پھر حوالدار پر تکیہ کیے کھڑا تھا۔
"بے عزتی خراب اسی وقت ہوتی ہے۔" میں نے سگریٹ کا کش لے کر اطمینان سے کہا "جب آدمی کی عزت ہو۔ اچھا ہوا تم نے زبردستی نہیں کی ورنہ دنیا و آخرت میں رسوا ہوتے۔ ایک بے گناہ کو مارنے کا جرم تو کر ہی چکے تھے۔ وہ تھانے جا کے بول پڑتا تو تمہیں بھی سچ بتانا پڑتا۔ خواہ مخواہ کیس بن جاتا تم پر مار پیٹ کا۔ اور کل اسے رکشا نہ ملتا تو گناہ بھی تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا کہ تم نے اسے رزق سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔ خدانخواستہ اس کے گھر میں فاقہ ہوتا۔"
"بہت پڑھنے سے بندے کا دماغ چل جاتا ہے۔ تمہاری طرح۔" اس نے دوسرا رکشا روکتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

*

شیخ نے دونوں ملزموں کو حوالات میں "ڈک" دیا تھا۔ ان کے قبضے سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سب معاملہ غتر بود ہو گیا تھا جو ہمارے ٹانگ اڑانے کا نتیجہ تھا۔ اور ان کی ایک نہیں سنی گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو فون کیا اور بتایا کہ ہم ساتھ کیوں نہیں آ سکے "ذرا ان دونوں کی سُن لیں پھر آتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"تمہاری نازو کا فون آ چکا ہے دو بار۔" رابعہ نے شوخی اور شرارت سے کہا لیکن مجھے یہ بات بُری لگی۔
"تم کبھی کبھی بالکل عام اور جاہل عورتوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہو۔ یہ تمہاری کہنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے بھنا کے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے اور شیخ نے بڑی دلچسپی سے میری صورت دیکھی۔
"کیا بات ہے؟" شیخ نے کہا "دونوں طرف ہے بھوک برابر لگی ہوئی؟"
"ہاں۔ ہاں یار۔ حکم تھا کہ کھانا گھر آ کے کھاؤ۔" میں نے بات بنائی "یہاں کہیں سے کچھ منگوا لے یار۔ حوالدار کو پیسے دیدے۔"
حوالدار نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ شیخ نے اسے پچاس کا نوٹ دیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک پیسہ خرچ کیے بغیر چاروں افراد کے لیے طعام کا مناسب بندوبست کرے گا۔
"منگل ہے سر جی۔ صرف چکن ملے گا۔ یا چکن بریانی۔"
"چکن ملے یا کچن۔" شیخ نے کہا "واپس آ کے مجھے بتانا کہاں سے لائے ہو۔ کھانا خراب ہو تو میں اسے بھی ڈک دوں۔"
حوالدار کا چہرہ اتر گیا۔ یہ پیسے دے کر کھانا منگوانے والا صاحب کسی کو نہیں ڈک سکتا تھا۔ اس کی بات کا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ خبردار مالِ مفت مت لانا ورنہ میں معلوم کر لوں گا۔ وہ سخت دل شکستہ روانہ ہوا۔ شیخ نے ہم دونوں کو اشارہ کیا اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ نئے مہمانوں کو خاطر تواضع کے لیے لایا جائے۔ شیخ کے ہمراہ میں نے پھر اس کمرے میں قدم رکھا جہاں ایک رات نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دیسی اور ولایتی تفتیش کے طریقوں میں کیا فرق ہے اور میں نے اتنی زیادہ رسوائی، تشدد کی سختی اور ناقابلِ بیان مظالم کی ذلت جھیلی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی اس رات کا تصور میرے لیے حقیقی عذاب بن گیا۔ اس اذیت خانے میں ہر چیز ویسی ہی تھی۔ اس کی پُر آسیب، دہشت زدہ کر دینے والی فضا۔ وہی دیواریں جن کے ہر داغ پر کسی کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لہو کا گمان ہوتا تھا۔ وہی غلیظ بدبودار فرش اور وہی سامانِ عقوبت۔ مجھے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔

میری حالت کے تغیر کو محسن نے محسوس کیا اور سمجھ لیا۔ "یار شیخ کسی دوسرے کمرے میں بات نہیں ہوسکتی؟" میں نے کہا۔

"ہوسکتی ہے۔ لیکن میں اس جگہ کے نفسیاتی دباؤ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا "میں خود مختار ہوتا تو اس کمرے کو مسمار کرا دیتا لیکن یہاں جو کچھ ہے اور جیسا ہے 'وہی رہے گا۔ ایک رات کے تجربے کو اپنا کمپلکس مت بننے دے۔ زندگی میں اس سے زیادہ کٹھن مرحلے آتے ہیں۔ حادثے کا شکار ہونے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور خون آلودہ، مردہ اور نیم جاں جسم اور بکھر جانے والے انسانی اعضا سمیٹتے ہیں اور بعض اوقات خود تمام عمر معذوری کی زندگی گزارتے ہیں لیکن کیا اس بھیانک تجربے کے بعد وہ بسوں اور ٹرینوں سے ڈرنے لگتے ہیں، ان میں سفر کرنا چھوڑ دیتے ہیں؟ یہاں ایسے بھی ہیں جو روز یہی دیکھتے ہیں۔"

میں شرمندہ ہو کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی ان دونوں کو دھکے دیتا ہوا اندر لایا۔

"ہاں بھئی۔" شیخ نے ٹھیٹھ تھانیداروں والے لہجے میں کہا۔ "کیا ارادے ہیں پھر اب؟ کچھ خاطر مدارت کریں تمہاری؟"

"ان میں سے ایک نے واویلا شروع کیا۔" لیکن ہمارا جرم تھانیدار جی! یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"اوئے انصاف دے پُتّر۔" شیخ نے اس کے ایک جانپڑ رسید کیا۔ "ناجائز اسلحہ لے کر پھرتا ہے ڈبے میں۔ یہ شریف آدمی مداخلت نہ کرتے تو تم نے اس بندے کو وہیں کاٹ دینا تھا۔ اب جرم پوچھتا ہے؟"

ناجائز اسلحے کی تفصیل اب مجھ پر اور محسن پر واضح ہوئی۔ ان کے پاس سے صرف خنجر برآمد ہوئے تھے۔ میں نے خنجر دیکھے نہیں تھے لیکن یہ جانتا تھا کہ پولیس معمولی چاقو کو بھی اسلحہ ایکٹ کے تحت خنجر قرار دینے کے اختیارات رکھتی تھی جو ہر گھر کے باورچی خانے سے برآمد ہوسکتا ہے اور سڑک پر تلاشی لی جائے تو شرفا کی جیب میں مل سکتا ہے۔

"تو بتا لاتوں کے بھوت؟" شیخ نے دوسرے کے لات رسید کی۔ "کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ بول نہیں تو تیری چمڑی اتارتا ہوں۔"

دوسرا ڈیل ڈول میں بڑا ہونے کے باوجود بہت کم ہمت تھا۔ وہ سجدے میں گرا اور بھوں بھوں کرکے رونے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" وہ بولا۔ "ہم جیب کترے ضرور ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔

"جیب کترے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔ اپنی اپنی جیب دیکھی۔ ہم دونوں کے پرس غائب تھے، بلکہ وقت ان دونوں نے اپنی جیب سے پرس نکالے اور سامنے رکھ دیے۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ جیب کترے پیچھے دوڑنے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں جیب تراش قرار دیا تھا اور تھے خود اس فن کے پرستار مگر حال کی سنگینی کے پیشِ نظر ہم نے سنجیدگی سے اپنے پرس اٹھا لیے۔

"دیکھ لیجیے جناب۔ ایک پیسہ کم ہو تو ہم کو سو جوتے لگا سو پیاز منظور۔" پہلا بولا۔

"تم نے میرا سوال سُنا نہیں تھا شاید۔" شیخ نے کہا "کان خراب معلوم ہوتے ہیں تمہارے۔ ابھی گرم تیل ڈالتے ہیں، صاف سننے لگو گے۔ اوئے حوالدار! ذرا لانا گرم مسالہ۔"

ان دونوں کی حالت غیر ہوگئی۔ انہوں نے اس پیشے میں دوسروں کی زبانی اس تشدد کا آنکھوں دیکھا حال ضرور سنا ہوگا، کبھی پکڑے جانے کی صورت میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا ہوگا کہ تھانے میں گرم مسالہ کس طرح لگایا جاتا ہے۔ انہوں نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ پھر موٹے نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں سرکار۔ اللہ آپ تھانہ مزنگ کے ملک صاحب سے ہمارے بارے میں پوچھ لیں۔ ہم صرف جیب کاٹتے ہیں۔ ضلع کچہری میں رش ہوتا ہے اور پیسہ دونوں کی جیب میں ملتا ہے۔"

"دونوں کون؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ بات میری ناقص عقل میں بھی نہیں آئی تھی۔

"وہی جی۔ رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے۔" موٹے نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور ہم نے یوں سر ہلایا جیسے یہ بات تو ہمیں پہلے سے معلوم تھی۔ "اپنا علاقہ اب ملک صاحب کی سفارش سے یہی ہوگیا ہے۔ پہلے انارکلی میں، نیلے گنبد سے ریگل چوک تک تھا۔ ہماری جگہ دو بھائی تھے۔"

"انہیں کیوں تبدیل کردیا گیا اس علاقے سے؟" شیخ نے کہا۔ "ڈنڈی مارتے تھے۔"

"ہاں سرکار۔ نیت بے ایمان ہوگئی تھی ان کی۔ حصہ پورا نہیں پہنچاتے تھے۔" چھوٹے نے اعتراف کیا۔ میں اور محسن دم بخود بیٹھے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک علاقے کے تھانے سے دوسرے علاقے کے تھانے میں پوسٹنگ کی بات ہو رہی ہے لیکن شیخ نے ہمیں بعد میں سمجھایا کہ تھانوں کی طرح جیب تراشوں کے دائرۂ اختیار کی بھی حدود متعین ہیں۔ ایک علاقے کا جیب تراش دوسرے علاقے میں واردات نہیں کرسکتا۔ یہ ان کے اپنے ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی سمجھی جاتی ہے جس پر علاقے میں ان کے علاقے کا گروہ کا سردار دوسرے علاقے کے سرغنہ سے شکایت کرتا ہے اور عموماً معاملہ افہام و تفہیم سے طے پا جاتا ہے یعنی وہ مال متعلقہ علاقے والوں کے حوالے کردیا جاتا ہے جو "علاقہ غیر" سے لایا گیا ہو۔

"ملک صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔" موٹے نے کہا اور شیخ نے سر ہلایا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اسے خاک علم نہیں ہوگا۔ "اب سرکار مندی کا زمانہ ہو یا دھندے کا زور ہو، ان کا حصہ ان تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ وہ بھی خوش، ہم بھی خوش۔ آج بھی ہم روز کی طرح شکار کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ وہاں روز نئے چہرے ہوتے ہیں ناجی! اس لیے کوئی کسی کو پہچانتا نہیں اور رش بھی اتنا ہوتا ہے کہ بندے کو بندے کی خبر نہیں ہوتی۔ دھکم پیل بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ بولائے ہوئے پھرتے ہیں۔ گواچی گاں کی طرح۔ کوئی وکیل کو ڈھونڈ رہا ہے تو کوئی پیش کار کو۔ سب کے اپنے اپنے کیس اڑے ہوئے ہوتے ہیں اور سب اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ دس بندے بھی ٹکرا جائیں تو وہ پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ بس اسی لیے وہاں دھندا خوب چلتا ہے۔" اس کی باتیں اتنی عجیب تھیں کہ میں نے اور محسن نے ان کا باقاعدہ انٹرویو شروع کیا۔

"پھر بھی جیب کی طرف سے تو سب ہوشیار رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تھانہ کچہری ہو یا بازار۔"

"اوجی بھولے بادشاہو۔ آپ نہیں سمجھتے ان باتوں کو۔" چھوٹے نے کہا۔ "کیسے پاکٹ سے تو لوگ بسوں میں بھی ہوشیار رہتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنا کام دکھا جاتے ہیں۔ دراصل ہماری کامیابی کا ایک راز ہے۔ جیب پہ ہاتھ مارنے سے پہلے بندے کو 'پُٹ' دو۔ پُٹ دو سمجھتے ہیں آپ؟ اس کے قدم اکھاڑ دو۔ جو لوگ گھر سے مال لے کر چلتے ہیں ناجی، وہ تو خود اس کی خبر دیتے ہیں۔ ان کا ہاتھ خود اسی جیب کی طرف جاتا ہے جس میں مال ہو۔ ہم یہی تاڑتے رہتے ہیں پھر جیسے ہی موقع ملتا ہے، مال غائب۔ اب موقع کبھی تو خود مل جاتا ہے۔ بس کو اچانک جھٹکا لگا یا ڈرائیور نے ماردی بریک تو جتنے کھڑے ہوتے ہیں سب خود کو گرنے سے بچاتے ہیں۔ گریں نہ تب بھی آپس میں ٹکرا لیتے ہیں یا کسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ بیٹھے ہوئے بھی اچھلتے تو ہیں۔ بس یہی ہوتا ہے موقع۔ اس وقت ایک سیکنڈ کے لیے آدمی کی توجہ مال سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ خود کو سنبھالتا ہے یا معذرت کرتا ہے۔ ورنہ ڈرائیور کو اور پرائیویٹ کو گالی دیتا ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں ہم ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں تو اسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کچہری میں موقع خود پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے چاہو اوپر نیچے آتے جاتے ٹکرا جاؤ۔ کوئی بُرا نہیں مانتا اور اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کب لٹ گیا۔ کس نے ٹکر ماری تھی جیب صاف کرنے کی نیت سے۔ ٹکر تو بھیڑ بھاڑ میں ہوتی رہتی ہے۔ کئی جگہ خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ کبھی گرنے سے کبھی کسی اور سے ٹکرانے سے۔ سب سوری کہہ کے گزر جاتے ہیں۔"

'پُٹ' دینے یا کسی کے قدم اکھاڑ کے لوٹ لینے کے اس بے حد باریک نفسیاتی مسئلے کی افادیت نے مجھے حیران کر دیا۔ کسی جیب کترے کی زبانی اس کے فن سے اسرار و رموز سے آشنائی کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تو تم وہاں شکار کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟" شیخ نے متانت سے کہا۔

"لنچ تناول فرمالیجیے سر جی!" حوالدار بجلی نے کمرے میں قدم رنجہ فرما کے اعلان کیا۔ "صرف چکن بریانی ہے۔۔۔"

"اچھا تم تناول فرماؤ۔" شیخ نے کہا۔ "ہم آتے ہیں۔ ہاں بھئی؟" وہ پھر ملزمانِ زیرِ تفتیش سے مخاطب ہوگیا۔

"ہمیں ایک آدمی نے بلایا اور کہا کہ ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دونوں کو ہزار ہزار دوں گا۔" موٹے نے کہا۔ "اسی نے ہمیں طریقہ بھی سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس اس آدمی

کو پکڑ کے لے آؤ۔ میں اپنی گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ تھانے لے جانے کے لیے اس کو اندر ڈال دو اور خود بھی بیٹھ جاؤ۔ جہاں کہو گے اتار دوں گا۔ باقی کام میرا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ دو ہزار کم نہیں تھے اور کام زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا تھا۔ ہم نے کہا رقم ایڈوانس دے دیں۔ انہوں نے دیدی۔"

"بے وقوف۔ اگر بعد میں وہ اس شخص کو قتل کر کے سڑک پر پھینک دیتے تو تم کیا کرتے؟" شیخ نے کہا۔ "کتنے لوگ گواہی دیتے کہ انہیں پکڑ کر لانے والے تم تھے۔ وہ سارے اسٹامپ وینڈر اور منشی اور ٹائپ کرنے والے۔ کیا بتاتے تم ان کے بارے میں؟ قتل کا کیس ایسا تو نہیں ہوتا کہ تمہارے ملک صاحب کی 'سفارش' سے ختم ہو جاتا۔"

ان دونوں کا رنگ اُڑ گیا۔ دو ہزار پیشگی مل جانے کے بعد وہ نتائج کی سنگینی کے بارے میں سوچنا تک بھول گئے تھے۔ اسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محض جیب کترے ہیں۔ کوئی خطرناک مجرم نہیں۔

"اس شخص کی گاڑی دیکھی تھی تم نے؟" شیخ نے کہا۔ "اس کا رنگ۔ ماڈل۔ نمبر؟"

ان دونوں نے سر جھکا کے اپنی کوتاہ اندیشی اور بیوقوفی کا اعتراف کیا۔

"اچھا پھر دیکھو گے اس شخص کو تو پہچان لو گے؟" شیخ نے کہا۔ "خدا کا شکر کرو کہ آج قتل کے الزام میں پکڑے جانے سے بچ گئے۔ اگر وہ شخص تمہارے ہاتھ آ جاتا تو اب تک اس کی لاش مردہ خانے پہنچ چکی ہوتی۔ صورت یاد ہے نا اس کی؟"

ان دونوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پھر دیکھیں گے تو ضرور پہچان لیں گے عالی جاہ! آپ چاہیں تو وہ دو ہزار بھی رکھ لیں۔"

"بکو مت!" شیخ نے گرج کے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ تم واردات کا ارتکاب کرتے پکڑے نہیں گئے۔ نام بتاؤ اپنے؟ اچھا رہنے دو۔ میں ملک صاحب سے پوچھ لوں گا سب کچھ۔ انہیں تو پتا بھی معلوم ہوگا۔"

"نام تو میرا بھولا ہے جی۔" چھوٹے نے کہا۔ "اور یہ چھوٹو ہے۔ ملک صاحب پتا نہیں بتائیں گے۔"

"اچھا۔" شیخ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر ابھی تم یہیں رہو۔ جب تک تمہارا صحیح ٹھکانہ معلوم نہ ہو جائے۔ حوالدار — لے جاؤ انہیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔ حوالدار کی جگہ وہی کانسٹیبل پھر نمودار ہوا اور انہیں ہنکا کے لے گیا۔

حوالدار آفس میں ماحضر تناول فرمانے کی کارروائی میں بڑے انہماک سے مصروف تھا۔ ہمیں دیکھ کے اس نے ایک زوردار ڈکار لی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ ہم سب نے بچے ہوئے "چکن بریانی" سے لنچ شروع کیا۔

"کیا انکشافات ہوتے ہیں اس ناچیز پہ کہ عقل دنگ رہ ..." میں نے کہا۔ "یعنی دھندا جیب کاٹنے کا اور ذکر بدنیتی کے انجام کا اور ایمانداری پر قائم رہنے کا۔"

"میرے علم میں تو اتنا اضافہ ہوا ہے کہ سوچتا ہوں یہی پیشہ اختیار کر لوں۔" محسن نے کہا۔ "بندوں کو ٹُبٹ دینے کا۔"

"اس پیشے کے اور دلچسپ اور مضحکہ خیز پہلو ہیں۔" شیخ نے کہا۔ "مثلاً یہی علاقوں کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس میں بعض اوقات ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک جیب کترے نے کسی موٹی اسامی کو تاڑا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ اب فرض کرو اسے بدقسمتی سے موقع ہی نہیں ملا اور علاقہ دوسرا شروع ہو گیا کسی دوسرے جیب تراش کا۔ تو وہ آگے نہیں جائے گا۔ اسامی کا سودا کرے گا۔ اپنے کسی ہم پیشہ کو بتا دے گا کہ اسامی موٹی ہے۔ اتنا مال ملنے کی امید ہے۔ اتنے میں سودا منظور ہے تو مال نکال میں بتا دیتا ہوں۔ اب بالکل یہ لاٹری والا کھیل ہے۔ معمولی سے معاوضے پر موٹی مرغی دوسرے کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ بقول شاعر۔ سپردم بہ تو مایۂ خویش را۔ کہ مال تو میرا تھا مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اب آگے دوسرا اپنی قسمت آزماتا ہے۔ خدانخواستہ وہ بھی ناکام رہے اور تیسرے علاقے کی حدود میں داخل ہو جائے تو وہ رقم اسے واپس مل جاتی ہے جو اس نے داؤ پہ لگائی تھی۔ بعض اوقات ایک ہی اسامی چار چار پانچ پانچ ہاتھوں میں جاتی ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی کہ کرنے والے کس مزے سے اس کی خرید و فروخت کر رہے ہیں۔"

مجھے اور محسن کو بے اختیار ہنسی آئی۔ "یار شیخ! تو کسی جیب کتروں کے گروہ میں تو نہیں رہا؟" میں نے کہا۔

"گروہ میں تو نہیں رہا لیکن اتفاق ہے کہ میں نے ان کا تماشا بہت قریب سے کیا ہے۔" شیخ ہنسا۔ "ایک زمانہ تھا کہ ہم ... میں رہتے تھے۔ وہیں ایک جیب کتروں کا اڈا تھا جہاں ان کا سرغنہ رہتا تھا۔ محلے میں اس کی بڑی عزت تھی اور وہ شاہ صاحب کہلاتا تھا لیکن عموماً لوگ یہ بات جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ بس کچھ محلے داری کی وجہ سے۔ کچھ دشمنی کے ڈر سے۔ ... شہادت نہ ہونے کے باعث اور پولیس کے چکر سے دور رہنے کے لیے کوئی اس کی رپورٹ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار ... گلبرگ سے چار نمبر بس میں بیٹھا اور اسٹیشن پہنچا۔ کوئی ڈیڑھ ... میں۔ تمہیں معلوم ہے وہ بس آدھا لاہور گھوم

ہے۔ اسٹیشن تک پرس میرے پاس تھا کیونکہ میں نے اترنے کے بعد آلو بخارے خریدے تھے۔ جیب میں دوبارہ رام گلی کی بس میں چڑھا اور کنڈکٹر نے ٹکٹ کے پیسے مانگے تو پرس غائب۔ میں سخت پریشان اور شرمندہ ہوا۔ کچھ لوگ ٹکٹ نہ لینے کے لیے جیب کٹ جانے کا بہانہ استعمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے کنڈکٹر کو ایک سیر آلو بخارے پیش کیے کہ قبول فرمائیے اور رام گلی کا ایک ٹکٹ عنایت کر دیجیے۔ معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ کنڈکٹر نے دانت نکالتے ہوئے لفافہ لے لیا اور یہ ظاہر کیا جیسے میرا جاننے والا ہے۔ 'اس تکلف کی کیا ضرورت ہے جناب!' وہ بولا اور ٹکٹ دیے بغیر آگے نکل گیا۔"

ہنستے ہنستے میرا اور محسن کا بُرا حال ہو گیا۔ "فائدے میں رہا تُو۔ ورنہ وہ اتار دیتا بے عزت کر کے تو مارچ کرنا پڑتا۔"

"ابھی اور سنو۔" وہ بولا۔ "شام کو میں شاہ جی کے ڈیرے پہنچا۔ میں نے کہا شاہ صاحب بڑے افسوس کی بات ہے اب محلے داری کا اتنا بھی لحاظ نہیں رہا۔ آپ ہی کے علاقے میں کسی نے ہم پر ہاتھ صاف کر دیا؟ شاہ جی نے مجھے تسلی دی اور تفصیلات پوچھیں۔ مثلاً یہ کہ کیا آپ کو یقین ہے جیب اسٹیشن آنے سے پہلے نہیں کاٹی گئی۔ میں نے آلو بخارے والا واقعہ عرض کیا جو اس بات کا ٹھوس ثبوت تھا کہ پرس اس وقت نہیں نکلا تھا۔ وہ قائل ہو گئے۔ 'اسٹیشن سے پرے ہمارا علاقہ نہیں ہے ناجی۔' انہوں نے کہا۔ 'لیکن اب آپ فکر نہ کریں۔ رات کو عشاء کے بعد آ جائیں۔ پرس مل جائے گا۔' مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا مگر رات کو پھر میں گیا تو انہوں نے درجن بھر پرس میرے سامنے رکھے اور کہا کہ اپنی چیز اٹھا لیں اور رقم گن کے تسلی کر لیں۔ میں نے بندے کو سمجھا دیا ہے۔ دیکھیں ناجی کسی کے ماتھے پہ تو نہیں لکھا ہوتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ پرس میں ایک روپیہ تک کم نہیں تھا۔"

کھانے کے بعد شیخ نے مزنگ تھانے کا نمبر ملایا۔ "ہیلو بھئی میں ... آئی ایم شیخ بول رہا ہوں۔ ہاں۔ وہ اپنے ملک صاحب ڈیوٹی پر ہیں؟ اچھا اچھا۔ ملک صاحب ہی بول رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ ہاں خیریت ہی تھی۔ وہ آج ضلع کچہری کے احاطے سے دو بندے پکڑے گئے تھے۔ ایک خود کو بھولا بھالا۔ معاف کیجیے گا بھولا کہتا ہے۔ دوسرا چھوٹو۔ کہتے ہیں ملک صاحب مزنگ تھانے والے جانتے ہیں ہمیں۔ میں نے کہا اچھا انہی سے معلوم کر لوں گا۔ کیا پتا ہے ان کا؟ پھر بھی کوئی ٹھکانہ ہوگا ان کا جہاں سے ضرورت پڑنے پر انہیں بلایا جا سکے۔ نہیں ابھی تو میں ان کو چھوڑ رہا ہوں اپنی ذمہ داری پہ۔ لیکن بعد میں ان کو بلانا پڑا تو... جی۔ آپ سے کہہ دوں۔ بہت بہتر۔ السلام علیکم۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "دونوں ملک صاحب کے آدمی ہیں۔ جیب تراشی کے علاوہ مخبری بھی کرتے ہیں۔ ان کو روکے رکھنے سے کیا حاصل۔ وہ تو نکل گئے جنہوں نے دو ہزار میں انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ جیسے چاہیں اپنے دو ہزار واپس وصول کریں۔ نقد یا ناکامی کی سزا دے کر۔ حوالدار!"

حوالدار بجلی زیادہ کھا لینے کے بعد کسی کمرے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ وہ جماہیاں لیتا افیم کھانے والوں کی طرح سلوموشن میں چلتا ہوا نمودار ہوا۔ "حکم عالی جاہ!"

"ان دونوں کی چھٹی کر دو۔" اے ایس آئی شیخ نے کہا۔ "اور تم کو بھی سونا ہی ہے تو گھر جاؤ۔ چار بجنے والے ہیں حشمت خان کو چارج دے کر میں بھی چلا جاؤں گا۔" حوالدار نے سر کھجایا اور ملزمان کو تفتیش یا جرمانے کے بغیر رہا کر دینے کی مصلحت پر غور کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ کام کی کوئی بات ہمیں بھی معلوم نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہم نے اجازت چاہی۔ چلتے چلتے مجھے نازلی کا قرض یاد آیا۔

"یار شیخ! وہ ہزار جو میں نے نازو سے لیے تھے ابھی تک ادا نہیں ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

شیخ ہنسا۔ "کوئی بات نہیں۔ سو روپیہ روز کے حساب سے سود ادا کر دینا۔ اس کا تو یہی حساب ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "آج رات ہم آئیں گے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے۔" شیخ نے مصیبت سود کے بارِ گراں کو ہی سمجھا ہو گا لیکن میرے نقطۂ نظر سے خود نازو ایک مصیبت بننے لگی تھی۔

"دنیا کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔" محسن نے باہر آ کے کہا۔ "مثلاً یہ بھولا اور چھوٹو۔ اوسان کے برعکس مست قلندر مرحوم اور جمیل صدیقی۔ جو آج تو مرحوم نہیں ہو سکے مگر۔"

"مگر دگر کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنا کام کر کے نکل گیا۔ اب وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ گواہی دے گیا لیکن جرح کے لیے حاضر نہیں ہوگا۔ زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے اس کیس میں اب جان نہیں رہی۔" محسن نے کہا۔ "یہ دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے۔ باقی رہ جاتا ہے مارپیٹ اور توڑ پھوڑ کا مقدمہ تو وہ کوئی سنگین معاملہ نہیں۔ اس کے ذمے دار کسی حد تک ہمارے اشتعال انگیز حالات تھے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"بظاہر تو مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن عقلمندوں نے کہا ہے کہ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ دشمن اگر دلاور جیسے ہوں تو خود کو کسی خطرے سے محفوظ سمجھنا بے وقوفی ہے۔ انہوں نے میر شرافت علی کے قتل کا الزام مجھ پر عائد کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے تو کیا، اس سے پہلے ہی وہ مجھے میر محمد کے قتل میں ملوث کرنے کا انتظام کر چکے تھے۔ مجھ پر عبدل اور رشیدے کے قتل کا الزام تو یقیناً آجاتا لیکن مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ عبدل نے مرتے مرتے مجھے بچا لیا۔ میری کوشش کا کیا دخل تھا اس میں کہ وہ ٹیپ آج بحفاظت عدالت تک پہنچ گیا۔ کرنے والوں نے تو اس شہادت کو ضائع کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا۔ اس کی خاطر میر محمد، اس کی بیوی اور مست قلندر تین افراد تو اپنی جان سے گئے۔ زیادہ سے زیادہ میں میر محمد کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس انجام کا مستحق تھا لیکن اس کی بیوی اور اس کے بچے، مست قلندر کا خاندان؟ انہیں کس بات کی سزا ملی؟"

"اس عشق کی حقیقت کو بھی کسی نے نہ سمجھا۔" محسن بولا۔ "مضحکہ خیز نظر آنے کے باوجود جمیل صدیقی کتنا عظیم ہے۔ کوئی تصوّر کر سکتا ہے اس کے عشق کا۔ یہ کیا تھا؟ صرف ایک عورت کے حصول کی خواہش اور اس میں ناکامی کا ردِّعمل۔ وہ جذبہ تو اسی شدّت کے ساتھ زندہ رہا۔ وہ عورت کسی اور کی ہو گئی اور شاید بھول بھی گئی کہ جمیل نام کے کسی شخص نے اسے چاہا تھا لیکن کمال دیکھ کہ جب وقت آیا تو اسے ساری دنیا میں جمیل سے زیادہ اعتماد کے قابل کوئی نظر نہ آیا اور اس نے کتنی عقیدت سے یہ بارِ امانت اٹھا لیا۔ کوئی رقابت نہیں، کوئی حسد نہیں، کوئی شکایت نہیں۔ یہ خیال نہیں کہ بچے کس کے ہیں۔ تمام عمر ایک نام سے نسبت رہی دل کو۔"

"کتنی حسرت سے کہا تھا اس نے کہ ہاں وہ عزیز تھی مجھے۔ بے حد عزیز تھی۔" میں نے کہا۔ "سب نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے اور اس عورت کے رشتے کو تسلیم کر رہا ہے۔ وہ رشتہ کیا تھا؟ یہ صرف ہم جانتے ہیں۔ جب اس نے آتش کے جواں ہونے کا ذکر کیا تھا تو کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن بھٹک گیا تھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے فرض کر لیا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس عورت کو قتل کر کے کہیں گاڑ دیا لیکن یہ بات اس نے کتنے غیر جذباتی انداز میں کی۔ وجہ وہی کہ اس عورت سے وقتی رشتہ نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے۔ وہ اس کے خیال سے اور اس کے تصور سے پرستش کے جذبات وابستہ کیے زندہ ہے

چنانچہ اس کے ذہن میں وہی پرانی دُبلی پتلی نازک اندام لڑکی ہے۔ تلخی اس کے لہجے میں اس وقت آئی تھی جب وہ ایک عورت پر ہونے والے مظالم اور بچوں کے ذہن پر ان کے اثرات کا ذکر کر رہا تھا مگر یہ تلخی بھی غیر ذاتی تھی۔ میرا مطلب ہے اگر وہ کسی اجنبی عورت اور اس کے بچوں کا ذکر کرتا تب بھی اس کا لہجہ ایسا ہی تلخ ہو جاتا۔ ایک طرف یہ دیوانگی۔ دوسری طرف زندگی کا یہ شعور کہ اس نے ٹیپ سُن کر تمام معلومات حاصل کیں اور انہیں عدالت تک پہنچا دیا۔ کیا آدمی تھا۔"

ہمارے گھر پہنچنے تک شام ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب لان پر بیٹھے تھے لیکن اکیلے نہیں تھے۔ وہ دین محمد سے کسی بات پر بحث کر رہے تھے جو میر محمد کا بھائی تھا۔ ہم قریب جا کے بیٹھے تو ہم نے دیکھا کہ رضوی صاحب کا موڈ خراب تھا۔

"مجھے افسوس ہے سر۔ تھانے والوں نے میر محمد کے قتل اور اس کی بیوی کے اغوا کے کیس میں دلچسپی نہیں لی۔ ابھی تک کسی کو اس شک میں تفتیش کے لیے گرفتار تک نہیں کیا گیا۔" وہ بولا۔

"تمہیں اگر کسی پر شک ہے تو بتاؤ۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "اور تم کیا چاہتے ہو؟ کیس سی آئی اے یا کرائمز برانچ والوں کے سُپرد کر دیا جائے؟ اس کے لیے تمہیں ڈی آئی جی کرائمز کے پاس جانا چاہیے۔"

"وہ کہتے ہیں پولیس خود ہمیں کوئی کیس ٹرانسفر کر سکتی ہے۔" دین محمد نے تلخی سے کہا۔ "حالانکہ کچھ واقعات بالکل واضح ہیں اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مثلاً آپ کے اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے بیہوش کر کے اور باندھ کے پیچھے آپ کے سرونٹ کوارٹر میں ڈال دیا گیا۔ اُدھر میرا بھائی غائب ہو گیا اور تھانے کی حدود میں سے اس کی بیوی کو اٹھا لیا گیا۔"

"تمہارے پاس اگر کوئی ثبوت ہے کہ تمہیں ناک آؤٹ کرنے والے اور تمہارے بھائی کے گھر میں واردات کرنے والے وہی لوگ تھے تو بتاتے کیوں نہیں؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی کو تمہارے خاندان سے دشمنی تھی۔"

"بس اسی خاندانی تنازعہ اور انتقام کی لائن پر تفتیش جاری ہے جو سراسر غلط ہے۔ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ ہمارا کوئی خاندانی تنازعہ نہیں تھا۔ نہ زمین جائداد کا۔ نہ رشتے ناتے کا۔" دین محمد نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے سر کہ دونوں جگہ وارداتوں کے پس منظر میں اتفاق کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے یہاں کس کے لیے حفاظت پر مامور کیا گیا تھا؟ اور میر محمد کس کے خلاف قتل کے الزام کی تفتیش کر رہا تھا؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ وہ نام لیے بغیر میرا حوالہ دے رہا تھا۔ لیکن میں عمداً خاموش رہا۔

"تم سکندر بخت کو تفتیش میں شامل کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "البتہ یہ بات منطقی طور پر عجیب سی لگے گی کہ میں سکندر بخت کی زندگی کو محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی وجوہات تھیں۔ پہلے کے واقعات۔ اور وہ یہاں اکیلا رہ گیا تھا اس لیے میں نے عارضی طور پر تمہیں تعینات کر دیا۔ اب تم کہو گے کہ اسی نے تمہیں مار باندھ کے ڈال دیا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر وہ تمہیں نجات نہ دلاتا تو ہماری واپسی تک تم وہیں پڑے رہتے اور خدا معلوم اس وقت تک کیا ہو جاتا۔ تم کسی کو مدد کے لیے بھی متوجہ نہ کر سکتے۔ پھر مجھے اس کا سبب بتاؤ۔ یعنی فرض کر و سکندر نے ایسا کیا تو کیوں کیا؟"

"یہ تو تفتیش کرنے والے معلوم کر سکتے ہیں سر۔" دین محمد بولا۔ "لیکن آپ مزید اتفاقات پر غور کریں۔ میر محمد کے گھر میں پیش آنے والے واقعات اور اس کے بیوی بچوں کے اغوا کا پتا کس نے چلایا؟ اے ایس آئی شیخ نے۔"

"یہ غلط ہے۔" رضوی صاحب کے نفی میں سر ہلانے سے قبل ہی میں نے کہا۔ "پہلے تم گئے تھے۔ تم نے دروازہ کھلا پایا تھا اور سب سے پہلے تم نے خود ہی اندر کی تباہی کا نظارہ دیکھا تھا۔ میں اور شیخ بعد میں پہنچے۔"

"لیکن اس وقت میں ساتھ نہیں تھا جب تم نے اور شیخ نے میر محمد کی آدھی لاش دریافت کی تھی۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" رضوی صاحب نے کہا۔ "جو کہنا ہے صاف کہو۔"

"صاف کیا کہوں سر! سب کچھ تو آپ کے سامنے ہے۔" وہ بولا۔ "اسی شخص کی وجہ سے سب کچھ ہوا۔ اسی کی حفاظت کرتے ہوئے مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اسی کے کیس کی تفتیش کرتے ہوئے میرا بھائی مارا گیا۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب میر محمد کے گھر تباہی کا پتا چلا اور اس وقت بھی جب اس کی ادھوری لاش نکالی گئی۔ یہ اور اس کا دوست اے ایس آئی شیخ۔ پھر اس کے سر کے بارے میں بھی رپورٹ ملی کہ ایک گاڑی میں تھا۔ وہ گاڑی یہی چلا رہا تھا۔ پٹرول پمپ والوں نے اس کا نمبر تک دیکھ لیا تھا لیکن وہ گاڑی مس رابعہ قاری کی ثابت ہوئی جو اسی کی وکیل ہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ وہ گاڑی میں اسلام آباد گئی ہیں۔ اس سے کسی نے سوال تک نہیں کیا؟"

"دیکھو دین محمد! یہ سب کچھ لکھ کے تم ڈی آئی جی صاحب کو درخواست دے دو۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے ذہن میں شبہات کی نوعیت کیا ہے۔ تمہارے خیال میں سکندر بخت نے پہلے تمہیں ناک آؤٹ کیا۔ پھر دین محمد کو قتل کر کے کہیں گاڑا لیکن اس کا سر اپنے ساتھ لے آیا۔ پھر سکندر بخت نے دین محمد کی بیوی اور بچوں کو اغوا کیا اور مار ا پیٹا۔ اور رابعہ نے اس کی مدد کی۔ اے ایس آئی شیخ نے اس کی مدد کی۔ پولیس اس لیے تفتیش سے گریز کر رہی ہے کہ سکندر سے میرا کوئی تعلق ہے۔" وہ اب غصّے میں تھے۔ "تم کو جذبات نے پاگل کر دیا ہے دین محمد! اس لیے میں تم کو قصوروار نہیں سمجھتا۔ تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ تم آزاد ہو۔ ایک ایک درخواست سب کے خلاف دے دو اور دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ تمہیں دماغ کے معائنے کے لیے بھیج دیا جائے گا۔"

"آپ چاہیں گے تو ایسا ہی ہوگا سر۔" دین محمد اٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے نوکری کی پروا نہیں۔"

"شٹ اَپ۔ بیٹھو ادھر اور میری پوری بات سنو۔" رضوی صاحب نے گرج کے کہا۔ "یہ دنیا جانتی ہے کہ میر محمد کس قماش کا آدمی تھا اور اے ایس آئی شیخ کیسا آدمی ہے۔ اس میں میری گواہی شامل نہیں ہو گی۔ مجھ سے سُنو کہ میر محمد کیوں مارا گیا۔ اگر تم آج عدالت میں ہوتے تو ایک ایسے شخص کی زبان سے ساری کہانی سن لیتے جس کا نام بھی شاید تم نے نہیں سُنا ہوگا۔ میر محمد نے اپنی تباہی کا سامان خود کیا تھا۔ اس نے ایک ٹیپ غائب کر دیا تھا تاکہ دو افراد کے قتل کا جرم ثابت ہو جائے۔ لیکن خود اس کی بیوی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ میر محمد کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہے۔ اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔ اور کیا تھا تو ٹیپ اپنے پاس کیوں رکھا۔ یہی وہ جرم تھا جس کی وجہ سے وہ مارا گیا۔ اس کی بیوی کو شوہر کے جرم کی سزا ملی۔ انجام ایک ہوا لیکن اسباب مختلف تھے۔ میر محمد اپنے لالچ کے باعث قتل ہوا۔ اور اس کی بیوی نے جو کچھ کیا وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی بن کے لکھا گیا۔ ان دونوں کے بچے محفوظ ہیں۔ کل کا اخبار پڑھ کے دیکھنا۔"

دین محمد کا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا سر!"

"مجھے مطلب مت سمجھاؤ۔ میں نے تم سے زیادہ نوکری کی ہے اور اس سے زیادہ پیچیدہ نوعیت کے مقدمات دیکھے ہیں۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "تم کو شکایت ہے کہ رابعہ قاری ایڈووکیٹ نے جھوٹ بولا۔ تمہارے لیے سب دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تھانے جاؤ۔ براہ راست ایس ڈی ایم کو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

شکایت لکھوا دو یا ڈی آئی جی کو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اے ایس آئی اکرام شیخ نے تو استعفیٰ دے دیا ہے مگر ابھی تک منظور نہیں ہوا ہے۔ اس کے خلاف دوسری درخواست لگا دو کہ جب تم نے اپنے بھائی کے گھر کی حالت دیکھی تو وہ کیوں موجود تھا؟ ایک گمنام اطلاع پر اس نے نصف شب کو کارروائی کیوں کی اور تمہارے بھائی کی لاش برآمد کیوں کی۔ گمنام شکایات پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ اچھا تھا اگر وہ لات پر لات رکھے تھانے میں بیٹھا رہتا۔ اب رہ گیا سکندر۔ اس کے خلاف الگ تحقیقات شروع کراؤ کہ اس نے تمہیں کیوں آزاد کیا۔ یہ ثابت کرنا چاہو تو کر دینا کہ اسی نے تمہیں باندھا تھا۔ یہ نکتہ بھی اٹھانا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ کے ساتھ یہ کیوں موجود تھا؟ یہ سب اپنی اپنی جوابدہی کر لیں گے۔ میرے خلاف بھی ایک درخواست دے دو کہ میں مجرموں کی پشت پناہی کر رہا ہوں، مجھے پروا نہ ہوگی۔ میرا ماضی بے داغ ہے اور ضمیر مطمئن ہے۔ اگر الزام تمہارے بیٹے پر ہوتا تو کیا تم اسے نکال سکتے تھے گھر سے؟ پھر یہ توقع مجھ سے کیوں رکھتے ہو کہ میں سکندر کو اس گھر میں رہنے بھی نہ دوں حالانکہ وہ میرے بچپن کے دوست کا بیٹا ہے اور اس کی حیثیت پہلے بھی اس گھر میں ایک فرد کی تھی جب اس پر قتل کا کوئی الزام نہیں تھا۔ اور دین محمد! اسے جب پھانسی ہو گئی نا تو اس کی لاش لینے والا وارث میرے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے۔"

دین محمد کا چہرہ فق ہو گیا۔ رضوی صاحب خوش گفتار اور... خوش اخلاق آدمی تھے اور اپنے کسی ماتحت پر یوں برہم نہیں ہوتے تھے۔ شاید اسی رویے نے دین محمد کو اس جسارت پر اکسایا تھا کہ ان کے سامنے آ کے اول فول بکنا شروع کر دے۔ اب رضوی صاحب نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا تھا۔ جو بات اس کی ناقص عقل میں اس لیے نہیں آ رہی تھی کہ اس کی راہ میں جذبات حائل تھے، وہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اس پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

خادم جو چائے اندر سے لا کے درمیان میں رکھ گیا تھا وہ پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ انکل رضوی نے محسن سے کہا کہ وہ دوسری چائے منگوائے۔ محسن کے اندر جاتے ہی دین محمد نے اجازت چاہی۔

"بیٹھو ابھی، چائے پی کر جانا۔" رضوی صاحب نے حکم دیا۔ وہ اب سگار کا کونا کاٹ رہے تھے اور نسبتاً پُرسکون تھے۔ "تم پولیس میں ہو دین محمد؟" انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا اس شہر میں ہونے والے اغوا، قتل اور دیگر تمام جرائم کا سراغ لگانے کا فرض دار میں ہوں؟ ابھی تم سے پہلے اس محرر کی بیوی آئی تھی۔ اس نے رو رو کے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی جیسے میرے سوا اس کے گمشدہ شوہر کو کوئی نہیں لا سکتا۔ ڈی آئی جی کو وہ پہلے ہی درخواست دے چکی ہے اور اس پر احکامات بھی صادر ہو چکے ہیں۔ میرے پاس کیا الٰہ دین کے چراغ کا جن ہے جسے میں حکم دوں اور وہ پلک جھپکنے میں مسئلہ حل کر دے۔ یہ سب تھانے۔ سی آئی اے۔ ایف آئی اے۔ ایس پی، ڈی ایس پی اور صوبوں کے ڈی آئی جی اور آئی جی آخر کس لیے بیٹھے ہیں۔ کیا تم اسی طرح ڈی آئی جی کے گھر جا سکتے تھے اور ان سے اتنی ہی دیر تک اس لہجے میں بات کر سکتے تھے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں، تم ہمدردی کے مستحق ہو۔ سکندر بخت کا سارا کیس معلوم ہے تم کو؟ تمہیں معلوم ہے رالو کے ساتھ کیا کچھ ہوا؟ کیا ان کے لیے میں نے کوئی خصوصی کوشش کی؟ پولیس کے سارے محکمے کو لائن اَپ کر دیا؟ کوئی خصوصی ٹیم تشکیل دی ان کے معاملات کی تفتیش کے لیے؟ کیا تم سے پہلے ان کا حق نہیں تھا۔ مجھے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنا ہوتا اور اپنی افسری سے ناجائز مدد کرنی ہوتی تو ان کی نہ کرتا۔ جا کے ریکارڈ چیک کر لینا۔ مجھے اس نظام انصاف پر اعتماد ہے۔ ایک عدالت کے اوپر دوسری ہے، پھر ہائی کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ ہے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے ہیں اپنی عقل ذہانت اور تجربے سے اس مقام تک پہنچے ہیں اور خدا نے انہیں جھوٹ سچ میں تمیز کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی سے غلط فیصلہ ہوتا ہے تو اس لیے کہ اس کے سامنے حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ گواہ جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی مرحلے پر اس کی تلافی ہو جاتی ہے اور فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ میں ایک انتظامی افسر ہوں۔ آئندہ میرے پاس آنے کے بجائے انصاف کرنے والوں سے رجوع کرنا۔ شکایت کسی کے خلاف بھی ہو، میرے پاس مت آنا۔"

چائے پیتے ہوئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم نے میر محمد کے بارے میں انکل کو پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا ورنہ اس انکشاف کے بعد کہ اس کا سراغ کس وگین سے دستیاب ہوا تھا، وہ ہمیں کبھی نہ بخشتے۔ میں اور محسن نہایت سعادت مندی سے خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارا کیس رضوی صاحب خود لڑ رہے تھے چنانچہ ہمارا دین محمد سے لڑنا حالات کو ہمارے خلاف کر دیتا۔ تھوڑی بہت جھاڑ پڑنے کی امید اب بھی تھی کیونکہ ان کا موڈ بے حد خراب تھا۔ دین محمد سے انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ مدلل اور ناقابلِ تردید تھا چنانچہ وہ اپنا سا منہ لے کر چلا گیا تو ہماری شامت آئی۔

"دیکھا تم دونوں نے۔ زندگی میں کبھی کسی ماتحت کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میرے سامنے تو کیا، میرے گھر آ کے اس قسم کی باتیں کر سکے۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔ "اور تم لوگ ہو کہ 'ہم چو من دیگرے نیست'۔ ابھی تک نہیں سمجھے ہو کہ دنیا کس ڈھب پہ جا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں مل کے اس پورے نظام کی اصلاح کیے بغیر دم نہیں لو گے۔" وہ اور جانے کیا کچھ بولتے لیکن اندر سے رابعہ نے نمودار ہو کے انہیں طلب کیا۔

"آنٹی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ دیکھ لیں ڈاکٹر کو بلانا ہے کہ اسپتال لے جائیں۔" رابعہ نے کہا۔

رضوی صاحب سب کچھ بھول گئے۔ اپنا غصہ، چائے کی آدھی پیالی اور بجھا ہوا سگار چھوڑ کے وہ اندر لپکے۔

"کیا ہوا ہے بیگم رضوی کو؟" میں نے حیران اور پریشان ہو کے کہا۔

"تمہارا سر۔" رابعہ نے برتن اٹھاتے اٹھاتے کہا۔ "وہ سب سن رہی تھیں۔ پھر یہ اچکن خاں آ گئے چائے کے بہانے اور ہاتھ پیر جوڑنے لگے کہ آنٹی ہم تو مارے گئے۔ بس کسی طرح انکل کو اندر بلا لیں۔"

"بڑے شرم کی بات ہے خاں صاحب۔" میں نے شرمندہ ہو کے محسن کو ڈانٹا۔ "کیا تھا اگر ہم جھاڑ کی ایک ڈوز پی جاتے۔"

"ان کی طبیعت واقعی خراب تھی۔" محسن ڈھٹائی سے بولا۔ "میں نے کہا آپ لیٹ جائیں اور انکل کو بلا لیں ہماری جاں بخشی بھی ہو جائے گی۔ رحمدل خاتون نے اس گناہگار کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔"

"لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہاں بے فکر بیٹھے دانت نکالتے رہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اٹھو۔ اندر جا کے دیکھو۔"

میں اور محسن فوراً اٹھے اور اندر دوڑے۔ ضرورت سے زیادہ فرمانبرداری اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر کو بلانے پر اصرار کیا لیکن بیگم رضوی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بات ٹال دی۔ "رابعہ نے ایسے ہی پریشان کیا سب کو۔ بس ذرا سر میں درد تھا اس لیے اسپرین کھا کے لیٹ گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے۔"

رضوی صاحب وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سگار سلگانے لگے۔ "اچھا ہو گیا آج۔" انہوں نے عدالتی کارروائی کا حوالہ دیا۔

"آپ نے کمال کر دیا انکل۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ جمیل صدیقی زندہ سلامت واپس جا سکے۔"

"جمیل صدیقی؟ وہ کون ہے؟" انہوں نے بے خیالی میں کہا۔ "اچھا وہی۔ مدیرِ صدائے وقت۔ وہ بس اتنی جلدی میں کرنا پڑا سب انتظام کہ میں خود مطمئن نہیں تھا۔ بات سمجھنے میں بھی ذرا دیر لگی۔ مگر خیر۔ تم لوگ جاؤ۔ نہانا دھونا ہوگا۔"

میں نے اور محسن نے اتنی آسانی سے گلو خلاصی پر خدا کا شکر ادا کیا اور باہر آ گئے۔ محسن کو واقعی غسل کرنا تھا اور پھر اس کا ارادہ اسلام آباد ٹیلی فون کرنے کا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے رابعہ کے کمرے کا رُخ کیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ "کون ہے؟" اس نے میری مخصوص دستک پہچان لینے کے باوجود کہا۔

"شرفا۔" میں نے کہا۔ "سوری۔ یہ تو جمع کا صیغہ ہے۔ واحد متکلم حقیر فقیر پُرتقصیر۔ طالبِ خیراتِ حُسن۔"

"معاف کرو فقیر صاحب۔" اس نے دروازہ کھول کے جھانکا۔ "ہٹے کٹے ہو۔ بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔"

میں زبردستی اندر داخل ہو گیا۔ "پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" میں نے کہا۔ وہ آئینے کے سامنے بال سنوار رہی تھی۔ اس کے گہرے سیاہ بالوں کو یوں کھلا ہوا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نظارۂ حسن نے مجھے پل بھر کے لیے مبہوت کر دیا۔

رابعہ نے آئینے میں مجھے دیکھا اور اس کا رنگ گلابی ہو گیا لیکن اس نے پلٹے بغیر کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

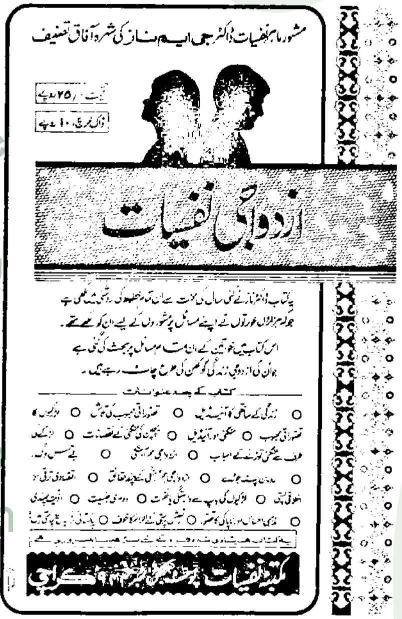

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"جو کچھ سوچ رہا تھا وہ تو نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہو؟"

" مجھے کہاں جانا ہے؟ وہ بولی۔"

"جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ۔ اور میں تم کو لے کر ہی جاؤں گا۔"

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ "نصیب دشمناں دماغ پر کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔" وہ بولی اور مسکرائی۔

"مسئلہ بہت سنگین ہے رابعہ۔" میں نے گھٹنے سمیٹ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ادر نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔ لیکن یہ مسئلہ فی الحال قانونی نہیں ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی ہے۔ اس کو حل کرنے میں تمہاری مدد، بلکہ رضا درکار ہے۔"

"میں نے تمہارے سارے مسائل حل کرنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ جب دیکھو مسئلہ۔ کبھی کوئی اور بات بھی کر لیا کرو۔"

"قسم خدا کی اگر میں نے وہ باتیں شروع کر دیں نا تو تم ایک منٹ نہیں ٹھہرو گی یہاں۔" میں نے جھنا کر کہا۔ "دیواروں سے سر پھوڑتا رہ جاؤں گا میں۔ تم کو واقعی میرے ساتھ چلنا ہے۔ مجھے، تم کو اور محسن کو۔"

"لیکن کہاں؟" وہ مجھے سنجیدہ دیکھ کے بولی۔ "انکل ناراض ہوں گے۔ گاڑی بھی نہیں ہے۔"

"انکل بالکل ناراض نہیں ہوں گے اور ہم انہیں کی گاڑی میں جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ کے گھر۔"

"اس کے گھر میں کوئی تقریب ہے؟" وہ بولی۔ "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔"

"نہیں۔ اس نے مدعو کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "خود میں نے کہا تھا کہ ہم آئیں گے۔ مقصد صرف ملاقات نہیں ہے۔ میں تم کو نازلی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ شیخ کی بہن سے۔"

رابعہ ہنسی۔ "ملنا ہے تو تم جا کے ملو اس سے۔ مجھے ساتھ کیوں گھسیٹتے ہو۔ کباب میں ہڈی۔"

"میں ابھی یہ سارا میک اپ خراب کر دوں گا۔ منہ پر یہ بھبھوت مل دوں گا۔" میں نے ایش ٹرے کو الٹ کر ہتھیلی پر خالی کی۔ "اور بال بنا دوں گا بیا کا گھونسلا۔" میں جارحانہ طریقے پر آگے بڑھا۔ "بات سنو گی سنجیدگی سے یا نہیں؟"

"ارے رے ــــــ پاگل ہوئے ہو۔" وہ گھوم کر بیڈ کے کنارے پر جا کھڑی ہوئی۔ "اچھا کہو کیا بات ہے۔"

میں پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ "شیخ کی یہ بہن نازلی عرف نازو میرے لیے وبال جان بن رہی ہے۔ بہت کم سن ہے، ناداں ہے اور ...ادر اسے کچھ بھی معلوم نہیں میرے بارے میں؟"

"کیا معلوم نہیں؟ تمہارا کچا چٹھا تو اخباروں میں آ رہا ہے۔ اور وہ ہے اے ایس آئی شیخ کی بہن۔"

"پھر وہی۔" میں نے اسے دھمکی کے انداز میں کہا۔ "... نہیں معلوم کہ میں اب محبت نہیں کر سکتا۔ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"آئی سی۔" رابعہ سنجیدہ ہو کے بولی۔ "اور وہ تمہیں مجبور کر رہی ہے کسی سے محبت کرنے پر؟ کون ہے وہ؟"

"وہ مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئی ہے، تمہاری ..." میں نے چلا کے کہا۔ "اسے نہیں معلوم کہ میں تم پر مرتا ہوں۔"

رابعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ "خدا کے لیے آہستہ بولو۔ یہ کیا بچپن ہے۔"

"کسے نہیں معلوم کہ کون کس پر مرتا ہے۔" محسن خان نے بلا اجازت اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔

"یار محسن! وہ جو شیخ ہے نا۔ اس کی بہن نازو نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی مجھے اس کا قرض چکانے جانا ہے۔ میں نے شیخ سے کہہ دیا تھا کہ ہم سب آئیں گے۔ اب وہاں ایک ڈراما کرنا ہے۔ تو کسی طرح نازو کے سامنے انکشاف کرے گا کہ ... کہ رابعہ میری منگیتر ہے ... اور کہ بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔ کوئی نہ کوئی ... تجھے ایسا مل جائے گا جب نازو ہو گی یا اس کے والدین ہوں گے۔ شیخ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔"

رابعہ کا چہرہ حیا سے گلنار ہو گیا۔ "سکندر! ایسا مت ... انکل کو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہو جانے دو۔ وہ بعد کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ میرے لیے اس لڑکی سے جان چھڑانے کی اور کوئی صورت نہیں رہی۔ اسے ایک ہی مرتبہ یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کر دیا جائے۔ امید ہے اس کو بھی شفا ہو گی۔ بات کو بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دینا بہتر ہے۔ ورنہ یہ دیکھو، شیخ اپنا دوست ہے۔ اس لڑکی نے یہ جذباتی پیش قدمی جاری رکھی تو اسے ضرور معلوم ہو جائے گا اور اس کے ... ٹھیس پہنچے گی۔"

"ٹھیس تو اس کے دل کو بھی پہنچے گی۔" محسن نے خود ... کہا۔ "اور میں نے سنا ہے ٹھکرائی ہوئی عورت زخم خوردہ ناگن سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

"آپ نے اب تک جو کچھ سنا ہے وہ مجھے مت سنائیے۔" میں نے کہا۔ "رابعہ! ذرا تم جا کے انکل سے گاڑی کی بات کر لو۔"

*

نو بجے کے قریب ہم شیخ کے گھر پہنچے تو دعوت کے اہتمام کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میں نے تو سرسری طور پہ کہا تھا کہ ہم آئیں گے لیکن وہاں سب یوں چشم براہ تھے جیسے ہمیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ رابعہ نے دلچسپی سے نازلی کو دیکھا جو سادگی کے باوجود بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ رابعہ کی صورت پر مجھے کسی جذباتی تاثر کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن نازو کا شگفتہ، مسکراتا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے بجھ گیا۔ "آپ سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"یہ رابعہ قاری ہیں۔ مشہور ایڈووکیٹ۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

"ہمارے ساتھ کا کیا مطلب؟" نازو مسکرائی۔ "آپ کے ساتھ۔ یا آپ کے ساتھ؟" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

محسن نے مسکرا کے کہا۔ "جیسے میرے ساتھ رہتا ہے وہ تو اسلام آباد میں بیٹھی ہے۔" اس نے بڑی خوبی سے اور بڑے واضح الفاظ میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اکرام شیخ کے والدین معذرت کر کے جا چکے تھے کہ آپ لوگ گپ شپ کریں۔ نوجوانوں کی محفل میں ہم بوڑھوں کا کیا کام۔ اور شیخ کسی کو فون کر رہا تھا چنانچہ محسن نے موقعے سے فائدہ اٹھا لیا۔

کھانے کے دوران میں اور واپسی تک نازلی بجھی بجھی سی رہی۔ اس کی ساری شگفتگی اور شوخی کافور ہو چکی تھی۔ شیخ نے اسے محسوس کیا اور نازو کو چھیڑا مگر اس کے منہ کو چپ لگ گئی۔ انکل رضوی کا بہانہ کر کے ہم جلد ہی لوٹ آئے۔ روانہ ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور کار بھی ہمارے تعاقب میں روانہ ہوئی ہے۔ تصدیق کے لیے میں نے اپنی گاڑی کو غلط سمتوں میں، ویران سڑکوں پر موڑا اور رفتار کم زیادہ کر کے دوڑایا لیکن وہ دوسری گاڑی بدستور پیچھے رہی۔

شک محسن کو بھی ہو گیا تھا اور اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کئی بار پلٹ کے دیکھا مگر رابعہ کے خیال سے خاموش رہا جو نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔ شاید اسے نازلی کے دل پر بیتنے والے صدمے کا خیال تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ خود نازلی کی جگہ ہوتی تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی۔ مجھ پر اس کا اعتماد برقرار تھا مگر ایک ناداں لڑکی کو شکست دے کر اس جیت کی متاع غرور پر فخر کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ اتنی کم ظرف نہیں تھی ــــــ تعاقب کرنے والی گاڑی سو گز کا فاصلہ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شبہے کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی اور میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایکسلریٹر دبا کے شہر کی خالی سڑکوں پر ریس کا فلمی سین پیش کروں اور اسے جل دے کر نکل جاؤں۔ اس میں کامیابی، ناکامی یا کسی حادثے کے امکانات مساوی تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں رک کر پیچھے آنے والوں کو سامنے آنے کا موقع دوں اور اگر ان کے عزائم غلط ہوں تو محسن کے ساتھ ان سے دو دو ہاتھ کر لوں۔ لیکن اس میں بھی خطرہ یہ تھا کہ ہمارے مقابل چار چار ہاتھ ہوتے یا آٹھ آٹھ تو مقابلہ برابر کا نہیں رہے گا اور پھر رابعہ کا کیا ہو گا؟

"سکندر!" میرے خیالات کا تسلسل محسن نے توڑ دیا۔ "یہ کون ہیں جو ہمیں گھر تک چھوڑنے پر کمربستہ ہیں۔ رضوی صاحب کے بندے یا ہمارے پرانے دوستوں کے نامہ بر؟"

رابعہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اسی وقت پیچھے والی کار ایک دم آگے آئی اور میں نے اندازہ کیا کہ اس طاقتور مرسیڈیز کو تیز رفتاری میں شکست دینا عملاً محال ہے۔ "یہ تو اب ان سے پوچھنا ہی پڑے گا۔" میں نے ہیڈ لائٹس آف کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ! کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تم مت رکنا۔" میں نے چلا کر کہا اور رفتار کم کر کے اچانک بریک لگائے۔ "گاڑی لے کر نکل جانا۔" میری آواز تصادم کے ہلکے سے دھماکے میں دب گئی۔ مرسیڈیز نے جان بوجھ کے پیچھے سے ٹکر ماری تھی اور مقصد صرف یہی ہو سکتا تھا کہ اب ہم دونوں نیچے اتر کے اپنی اپنی گاڑی کو دیکھیں۔ نقصان

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کا جائزہ لیں اور ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دیں۔ سڑک پر یہ تماشا ہوتا ہی رہتا ہے اور غلطی کسی کی ہو دونوں ٹک ٹک جھک جھک کرکے اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ قانون کی مدد سے تلافی کی کوئی نہیں سوچتا لیکن یہاں ٹکر مارنے والے کچھ اور چاہتے تھے۔ اگر مقصد ہمیں ہلاک کرنا ہوتا تو وہ پیچھے سے فائرنگ کرتے یا دستی بم پھینک کر فرار ہو جاتے لیکن شکاری اب دفاعی کھیل پر اُتر آئے تھے کیونکہ وہ یقین کرچکے تھے کہ ہم میں سے کسی کی موت سے ان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ورنہ یہ کام تو بہت آسان تھا اور بہت پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔ ان کے عزائم کی تکمیل ہمارے زندہ گرفتار ہونے سے ممکن تھی۔

ٹکر کے وقت گاڑی سڑک کے انتہائی بائیں جانب تھی۔ چنانچہ میرا دائیں طرف سڑک پر اترنا ہی ممکن تھا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا اور وہ بھی اُدھر کا دروازہ کھول کر ہی نکلا جدھر سے میں نکلا تھا۔ اگر وہ دوسری طرف اترتا تو زیادہ محفوظ رہتا اور چھُپ کے زیادہ مؤثر کارروائی کرسکتا تھا۔ میں نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ اترتے اترتے میں نے رابعہ کو سیٹ پر گھسیٹ لیا اور چلا کر اپنی بات دُہرائی۔

"جاؤ۔ نکل جاؤ!" ہمارے پیچھے آنے والی مرسیڈیز کے ڈرائیور نے بھی انجن بند نہیں کیا تھا۔ تصادم سے ہماری گاڑی کچھ آگے ہو گئی تھی۔ مرسیڈیز غرا کے پیچھے ہوئی۔ ابھی ہمارے قدم زمین پر پڑے ہی تھے کہ وہ راستہ کاٹ کے اس طرح آگے آئی جیسے ڈرائیور کا ارادہ ہمیں کچل دینے کا ہو۔ میں نے اور محسن نے ایک ساتھ جست لگائی لیکن مرسیڈیز کا اگلا دروازہ ہماری گاڑی کے کھلے دروازوں سے ٹکرایا۔ دونوں دروازے ٹوٹ کے سڑک پر گرے اور ایک خوفناک آواز کے ساتھ سڑک کی سخت کھردری سطح پر دور تک گھسٹتے ہوئے گئے۔ میں اور محسن اپنی اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے تھے لیکن رابعہ کی خوفزدہ نظروں نے اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے فرض کرلیا کہ ہم بھی گاڑی کے نیچے کچلے گئے "سکندر!" اس نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری۔

"رابعہ! گاڑی نکال کے لے جاؤ۔" میں نے اسے چلا کے زندہ سلامت ہونے کا ثبوت فراہم کیا ورنہ شاید وہ نتائج کی پروا کیے بغیر سڑک پر آجاتی۔ میرے اندیشے یہ تھے کہ حملہ آور کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتے "مجھ پر دباؤ ڈال کے اپنے مطالبات کے سامنے سر جھکانے کے لیے مجبور کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ اب یہی رہ گیا تھا کہ وہ کسی اور کی جان یا آبرو کے بدلے میں مجھ سے سب کچھ لے لیں۔ وہ جانتے تھے کہ رابعہ اور محسن کے لیے میں سب کچھ دے سکتا ہوں۔ دنیاوی مال و متاع بھی اور اپنی جان بھی۔ لیکن انہیں تو صرف ایک تحریر مطلوب تھی کہ میں سکندر بخت ولد وزیر خان برضا و رغبت "میر وزیر اینڈ کمپنی" کی ملکیت کے دعوے سے دستبرداری قبول کرتا ہوں۔ اعتراف شکست کی اس دستاویز پر دستخط کے بعد مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ یہ کرنے کو کچھ باقی بھی نہیں رہتا لیکن میرے لیے مرنے والوں کا لہو رائیگاں جاتا تھا۔ ابھی تک میں نے کئی بار سوچا تھا مگر کبھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وقت آیا اور مجھے ایک طرف رابعہ اور محسن یا ان کی طرح کسی اور کی زندگی اور مقابل میں سب بے گناہ مرنے والوں کی آرزوئے انتقام میں سے کسی کا انتخاب کرنا پڑا تو میں کسے چھوڑوں گا۔ اس وقت میرے ساتھ رابعہ بھی تھی اور محسن بھی تھا لیکن شکاری بھی انتخاب کرتے تو رابعہ کو ہی لے جاتے۔ وہ قانون کی عدالت میں ہمارا دفاع کرتی تھی لیکن لاقانونیت کی قوت کے مقابل وہ ہمارے دفاعی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھی۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ کمزور۔ لیکن میری ساری طاقت تھی۔

گاڑی جو سائڈ سے آگے نکل گئی تھی تھوڑا سا گھوم کر ہماری کار کے سامنے رُک گئی تھی۔ یوں کہ اس کی طوالت نے سڑک کی چوڑائی میں گزرنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ میرے اندیشے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ وہ رابعہ کو لے جانے آئے تھے اور اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کار میں سے کوئی اترتا اور رابعہ کو گھسیٹ کر لے جاتا میں نے ایک جست لگائی اور دروازے پر جا پڑا۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے ایک پاؤں زمین پر رکھا ہی تھا کہ میں نے دروازہ اپنے جسم کی قوت سے بند کر دیا۔ وہ بیچ میں دب کے کراہا۔

"محسن!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ گاڑی جانے نہ پائے۔" محسن میرے ساتھ ہی آگے آیا تھا اور اس نے بھی حملہ آوروں کے دوسرے ساتھی کو دوسری طرف سے اترتے دیکھ لیا تھا مگر وہ دونوں گاڑیوں اور سڑک کے ساتھ بنی ہوئی دیوار کے درمیان تین طرف سے محصور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی ڈگی پر چڑھ کے مجھ پر کودنے کی کوشش کی لیکن محسن نے اسے دھکا دیا تو پلٹ کر گرا اور دیوار سے ٹکرایا۔

"رابعہ! گاڑی پیچھے کرو اور ریورس میں لے جاؤ۔" میں نے محسن کی آواز سُنی۔ میری ساری قوت اس شخص کو اندر رکھنے میں صرف ہو رہی تھی جو آدھے کھلے دروازے سے باہر آنے کی بھرپور جدوجہد کر رہا تھا۔ ہماری گاڑی ایک دم پیچھے ہوئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ رابعہ ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب وہ ہمارے لیے امداد بھی حاصل کرسکتی تھی اور رضوی صاحب کو

بھی بتا سکتی تھی کہ ہم کہاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کوٹھی میں گھس جائے گی اور وہاں کے رہنے والوں کو بلائے گی اور وہیں سے انکل رضوی کو بھی فون کر دے گی۔ لیکن گاڑی کو ریورس میں دُور تک لے جانے کے بجائے وہ صرف دس گز پیچھے لے گئی اور پھر آگے لے کر آئی۔ اس وقت تک دوسرا شخص اُٹھ کھڑا ہوا تھا، جسے محسن نے پیچھے گرا دیا تھا۔ وہ حملے کی نیت سے آگے بڑھا ہی تھا کہ اس نے کار کو تیزی سے آتے دیکھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے پھر پیچھے جست لگائی اور سیدھا دیوار پر لگا۔ رابعہ نے خاصی رفتار سے گاڑی آگے لا کے ٹکر ماری۔ غالباً اس نے وہ بات سُن لی تھی جو میں نے محسن سے کہی تھی۔ ایک اور دھماکا ہوا اور میں جھٹکے سے دور جا گرا۔ مجھے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ پھر شیشے کے کنکر جیسے ٹکڑے اوپر گرے۔ ہیڈ لائٹس کا اجالا غائب ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ ٹکر سے ہماری گاڑی کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کی ہیڈ لائٹس کا ہی نہیں، ونڈ اسکرین کا بھی چورا ہو گیا ہو تو عجب نہیں، لیکن مرسیڈیز کا بھی تھوڑا بہت نقصان ضرور ہوا ہو گا۔ جب میں اٹھا تو میں نے دیکھا کہ دھکا لگنے سے مرسیڈیز آگے بڑھ کر دیوار میں گھس گئی تھی۔ دیوار منہدم ہونے سے مرسیڈیز کے شیشے بھی چکنا چور ہو گئے تھے اور ملبہ اس کے اوپر گرا تھا۔ بونٹ پر اور ونڈ اسکرین کے کھلے شگاف سے سیٹوں پر اور اگلے پہیوں کے آس پاس۔ چنانچہ گاڑی اب پھنس گئی تھی اور اس کے نکل جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ جو کام محسن نہیں کرسکتا تھا وہ رابعہ نے ہمت اور حاضر دماغی سے کر دیا تھا۔

میں نے دوسرے حملہ آور کو رابعہ کی طرف لپکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے دونوں دروازے کسمپرسی کے عالم میں ٹوٹے پھوٹے سڑک پر پڑے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے گاڑی میں داخل ہونا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ شاید وہ رابعہ سمیت ہماری گاڑی لے جانا چاہتا تھا۔ رابعہ نے اسے روکنے کے لیے لات ماری جو اس کے پیٹ پر لگی پھر محسن نے اس کو پیچھے سے کھینچ لیا۔ "رابعہ!" محسن چلایا۔ "بے وقوفی مت کر۔ گاڑی لے کر بھاگ جاؤ۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکا۔ میرے جسم کا دایاں حصہ سُن ہو کے ناکارہ ہو چکا تھا۔ جب رابعہ نے ٹکر ماری تھی تو میں مرسیڈیز کے دروازے پر جسم کا سارا بوجھ ڈالے جھکا کھڑا تھا۔ ٹکر سے دروازہ کھُلا اور [illegible] زبردست قوت نے مجھے کسی جناتی ہاتھ کی طرح دور پھینک دیا تو سڑک پر گرنے اور پتھروں پر رگڑنے سے مجھے کہنی کے پاس اور گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ انتہائی بے بسی سے میں نے محسن کو اپنے حریف کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوتے دیکھا۔ وہ سڑک پر گر کے پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑیوں کے ٹکرانے کی اور ٹوٹنے کی، شیشہ بکھرنے کی اور دیوار کے منہدم ہونے کی آوازوں کے شور نے رات کے سکوت کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس گھر کے مکین جاگ اُٹھے تھے جس کی دیوار جنگ میں کام آئی تھی۔ گیٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور اندر سے کچھ لوگ چلاتے، دوڑتے آرہے تھے۔ پھر مجھے اور بھی لوگ نظر آئے جو چوکیدار تھے یا آس پاس کے رہنے والے۔ ان سب کا خیال یہی ہو گا کہ دونوں گاڑیوں کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ خالی سڑک پر دو گاڑیوں کے یوں ٹکرانے کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ اوورٹیک کرتے ہوئے کسی وجہ سے ایک گاڑی بے قابو ہو گئی۔ وجہ اگلے وھیل کا نکل جانا یا ٹائر برسٹ ہو جانا بھی ہو سکتی تھی۔ اور ڈرائیور کی مدہوشی بھی۔ لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ہم پر غالب آجانے والے حملہ آوروں کی گرفتاری یقینی تھی۔

پھر اس شخص کو اچانک میں نے اپنے سر پر دیکھا جو مرسیڈیز کا ڈرائیور تھا۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ "خبردار!" وہ چلایا۔ "کوئی آگے نہ آئے۔" اس نے قریب آنے والوں کی طرف دو ہوائی فائر کیے۔ چار پانچ جیالے ایک دم رُک گئے اور پلٹ کر بھاگے۔ جیسے وہ حادثہ سمجھ کے مدد کے لیے آئے تھے وہ حادثہ نہیں تھا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک خوف اور گھبراہٹ میں منہ کے بل گرا اور ساکت ہو گیا۔ اسے گولی ہرگز نہیں لگی تھی۔ وہ کمزور دل تھا یا دل کا مریض تھا۔ دوسرے لمحے ہوائی فائر کرنے والے نے ریوالور کا بٹ میرے سر پر دے مارا۔ سارا منظر ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سیکنڈ کے ایک حصے کے لیے مجھے پھر ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں محسن کو گھسیٹ رہے تھے اور رابعہ اپنی بے مصرف زنانہ قوت کے ساتھ محسن سے لپٹی ہوئی تھی اور مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ اس کے بعد آخری آواز فائر کی تھی یا گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی۔ گھُپ اندھیرے میں بصارت کے ساتھ میری سماعت بھی ختم ہو گئی اور میرا وجود بے حسی کے اندھے کنوئیں میں ڈوب گیا۔

مجھے ہوش آیا تو حالات بدلے ہوئے تھے۔ قدرتی طور پر سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ پھر منظر جو میرے پیشِ نگاہ تھا لیکن فوکس آؤٹ تھا، واضح ہونے لگا۔ میں ایک عام سے کمرے میں تھا اور انہی کپڑوں میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا جو گزشتہ شب زور آزمائی کے وقت میرے جسم پر تھے۔ رات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بیت چکی تھی کیونکہ دو جانب وسیع و عریض کھڑکیاں تھیں جن پر سے پردے ہٹا دیے گئے تھے اور باہر کے روز روشن کا اجالا اندر بھی پھیل رہا تھا۔ کمرہ خاصے تکلف سے آراستہ تھا۔ چاروں دیواروں پر ایک آبنوسی ہاتھ نے دودھیا شیشے والی لائٹ تھام رکھی تھی۔ چھت کا پنکھا خاموشی سے گھوم رہا تھا اور بالکل وسط میں تھا۔ نیچے منقش قالین پر ایک صوفہ سیٹ اور درمیان میں سینٹر ٹیبل سیٹ رکھا تھا۔ گلاس ٹاپ اور سنہری المونیم کی پٹی کے حاشیے والا۔ ایک کونے میں پیڈسٹل لیمپ استادہ تھا اور دیوار پر لینڈ اسکیپ کا ایک منظر تھا جس میں سورج کو طلوع یا غروب ہوتے دکھایا گیا تھا۔ سینری کوئی چار فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی تھی لیکن فریم سے کم قیمت تھی۔

سب سے آخر میں سر گھما کے میں نے استاد پیڈرو کو دیکھا۔ وہ بیڈ کی دوسری جانب کرسی پر اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا اور مجھے گرد و پیش کا جائزہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی کو میں نے فوراً نوٹ کر لیا۔ اس کے دونوں کانوں سے سونے کی مندریاں غائب ہو گئی تھیں جو اب تک اس کی شناخت بن چکی تھیں۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدل لیا تھا۔ بھورے گھنگھریالے اور سخت بالوں کی جگہ اس کے سر پر سیدھے سیاہ اور چمکیلے بال تھے جن کو اس نے درمیان سے دو حصے کر کے سنوار رکھا تھا۔ ایک جیسی شلوار قمیص کے بجائے وہ باریک سرخ دھاریوں والی سفید قمیص اور براؤن پتلون میں ملبوس تھا۔ لیکن اس ظاہری انقلاب سے اس کی صورت کی خباثت میں کمی نہیں آئی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھانکنے والی درندوں جیسی سفاکی و بے رحمی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"ایسے کیا دیکھتے ہو سکندرِ اعظم؟" وہ بولا "کیا پہچانا نہیں؟"

"میں ولی ہونے کا دعوٰی تو نہیں رکھتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی شیطان کو ہر روپ میں پہچان سکتا ہوں!"

"اس نئی شخصیت کے لیے مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" وہ مسکرایا۔ "تمہاری کوشش سے استاد پیڈرو کی لاش میو ہسپتال کے مردہ خانے پہنچی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ تمہارا دوست ایس آئی شیخ اور تھانے کا عملہ گواہ ہے کہ اس کی موت حوالات میں واقع ہوئی تھی اور ضابطے کی کارروائی کے مطابق اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی تھی۔ اب تو حشمت خان بھی یہی کہتا ہے اور وہ کانسٹیبل بھی جو لاش کے ساتھ گیا تھا۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ استاد پیڈرو مر گیا۔ وہ اتنا بدنام ہو گیا تھا اور اتنے لوگوں کی نظر میں آ گیا تھا کہ اس کا مر جانا ضروری تھا۔" پھر اسے کچھ اور یاد آیا۔ "اب کیا خیال ہے تمہارا؟ میں کون ہوں؟ احمد نواز گردیزی!" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ اب تم دنیا کے لیے کیا ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے محسن اور رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ کیا وہ بھی میرے ساتھ ہی پکڑے گئے تھے؟"

"محسن تو نہیں پکڑا گیا۔" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔ "بڑی مزاحمت کی اس نے حالانکہ وہ بھی ہمارے ساتھ آ جاتا تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ دیکھو لو تم کتنے آرام سے ہو؟"

"وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے چیخ کر کہا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن خود ہی بستر پر گر گیا۔ ایک پٹی میری کہنی کے گرد لپٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اپنا بازو سیدھا رکھنے پر مجبور تھا۔ دوسری پٹی گھٹنے کے اوپر سے نیچے تک پلستر کی شکل میں موجود تھی چنانچہ میں دائیں ٹانگ ہلانے سے قاصر تھا۔

"تمہیں شاید علم نہیں۔" استاد پیڈرو نے جیب سے سگریٹ نکال کے اطمینان سے جلائی۔ "تمہارے گھٹنے سے ذرا نیچے ٹانگ کی ہڈی میں بال آ گیا ہے۔ اگر تم نے مزید ہنگامہ آرائی کی تو یہ بال بڑھ کے وبال بن جائے گا۔ ابھی تو ڈاکٹر کا خیال ہے کہ پندرہ بیس دن میں تم لنگڑا کے چل سکو گے اور مہینے دو مہینے میں بالکل سیدھے۔ لیکن ہڈی ٹوٹ گئی تو...؟"

"مجھے اپنی میڈیکل رپورٹ نہیں چاہیے۔" میں نے چیخ پکار کو بے سود سمجھتے ہوئے کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو؟"

"محسن کے بارے میں مجھے افسوس ہے۔" وہ کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اسے قتل کیا۔ اسے مار پیٹ میں سر کی چوٹ آئی تھی۔ وہ تین دن اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔"

"جھوٹ... بکواس کرتے ہو تم!" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ "محسن نہیں مر سکتا...!"

"ہم سب مر سکتے ہیں سکندرِ اعظم۔" وہ تلخی سے بولا۔ "وہ سکندرِ اعظم بھی مر گیا جس نے دنیا کو فتح کرنا چاہا تھا۔ ایک مچھر کے ڈنک نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیا اور لوگوں کو مرتے نہیں دیکھا تم نے؟ پھر محسن کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مر نہیں سکتا بڑی عجیب سی بات ہے۔"

"تم مجھے دہشت زدہ کرنا چاہتے ہو۔ غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔" میں نے یقین کی گرتی ہوئی دیوار کو استوار رکھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ "ایسی ہی بات تم رابعہ کے بارے میں کہو گے۔"

"نہیں۔" پیڈرو نے نفی میں سر ہلایا۔ "رابعہ کے بارے میں کوئی بیان نہیں دوں گا میں۔ اس لیے کہ مجھے خود بھی پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے کسی اور کو معلوم ہو۔"

"کیا وہ رضوی صاحب کے گھر میں نہیں ہے؟" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

"نہیں۔ وہاں تو یقیناً نہیں ہے۔" پیڈرو بولا۔ "اس لیے کہ میں نے اخبارات میں خود مشہور خاتون ایڈووکیٹ اور ان کے دوست کی پُراسرار گمشدگی کی چٹپٹی خبر پڑھی تھی۔ اخبار والے ایسی خبروں سے بہت فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک اخبار نے تو پورے کیس پر پھیر دے دیا تھا کہ یہ ایڈووکیٹ اور سکندر بخت پیار نے دوست ہیں لیکن سکندر بخت پر قتل کا الزام ہے چنانچہ ان کی ہیروئی خاتون ایڈووکیٹ کر رہی تھیں۔ دونوں ایس پی ضامن رضوی کے گھر میں مقیم تھے چنانچہ گمشدگی کو فرار بھی سمجھا جا سکتا ہے۔"

میں اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ لیکن میں بے بس تھا۔ نہ میں اس کا گلا گھونٹ کے اس کی زبان بند کر سکتا تھا اور نہ میرے قریب کوئی ایسی چیز تھی جو میں اس پر کھینچ مارتا۔ میں نے اس پر تکیہ پھینکا اور اسے ایک سے ایک گالی دی ـــــ تکیہ دور جا گرا اور پیڈرو اسی اطمینان کے ساتھ بیٹھا مسکراتا رہا۔ بالآخر میں بے دم ہو گیا۔

"افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ تمہارے اور رابعہ کے اسکینڈل میں ضامن رضوی صاحب جیسے بااصول اور ایماندار افسر کو بھی استعفٰی دینا پڑا۔" پیڈرو نے کچھ دیر بعد کہا۔ "وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ آدمی عزت دار اور باغیرت تھے ورنہ دنیا کو بھونکنے دیتے۔ ان پر ایک مجرم کی اعانت اور سرپرستی کا الزام آ گیا تو کیا۔ یہ الزام تو پولیس پر بہت پرانا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ایک اور اخبار والا تو بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ خاتون ایڈووکیٹ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی جو سراسر غلط ہے۔ ان کی پہلی شادی ایک سی ایس پی افسر سے ہوئی تھی جس نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کو رخصتی سے قبل طلاق دے دی۔ بنز ملزم میں خاتون ایڈووکیٹ کی دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سابق صنعت کار کا ولایت پلٹ بیٹا ہے جس کے حقِ وراثت کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے اور فیصلہ ملزم کے حق میں ہو جانے کی صورت میں ایڈووکیٹ کو اس سے بہتر دوسرا رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو اپنی آزاد خیالی کے باعث خاصی مشہور ہیں۔ رقابت اور دشمنی میں خاتون ایڈووکیٹ کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ اب ملزم سکندر بخت کی وجہ سے ان کی پریکٹس بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔"

"میں ان سب کی ایسی تیسی کر دوں گا۔" میں نے عالمِ اشتعال میں دانت پیس کر اور بند مٹھی بیڈ سائڈ پر مار کے کہا۔ "سب پر ہتکِ عزت کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ ان سب کو بہت مہنگا پڑے گا...!"

"کیا؟" پیڈرو ہنسا۔ "سچ بولنا مہنگا پڑے گا؟ اس میں کوئی بات غلط ثابت کر سکو گے تم؟ بشرطِ زندگی۔ ابھی تو تم اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔"

یکلخت مجھے مایوسی کی ایک قیامت خیز لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پیڈرو کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس داستان کا ہر لفظ گزرے ہوئے وقت کی تفسیر تھا۔ رابعہ کے اور میرے بارے میں ہر بات سچ تھی۔ فرق صرف سچ کے مفہوم کا تھا۔ سنسنی خیز صحافت کی زبان میں یہ "مشتبہ مراسم" تھے اور "پُراسرار گمشدگی" تھی یا فرار تھا جبکہ میرے نزدیک یہ محبت تھی۔ وہ محبت جس کا تعلق صرف خوبصورت جذبوں سے تھا اور خوبصورت مستقبل کے خوابوں سے تھا اور یہ جذبے اور یہ خواب ہر آلودگی سے پاک تھے۔ ان میں صرف وفا کے سدا بہار پھولوں کی مہک تھی اور زندگی کی آبرومند روایات کو تابندہ رکھنے کے لیے سارے رنگ تھے۔ ان کی محبت اتنی معصوم تھی جتنا برگِ گل پر اترنے والے قطرۂ شبنم کی مسکان۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب رابعہ نے کہا تھا کہ چلو سکندر ہم ان سارے جھمیلوں کی دنیا سے نکل جاتے ہیں لیکن میں نے کہا تھا کہ رابعہ! ہم کو اپنا گھر اس دنیا میں آباد کرنا ہے۔ اس طرح کہ وہ گھر ایک ایسی جنتِ ارضی ہو جسے دیکھ کر محبت کرنے والے رشک کریں اور دنیا والے عقیدت سے سر جھکا دیں۔ پُراسرار گمشدگی اور فرار کا کیا سوال۔ یہ کیچڑ تو ہمارے منہ پر صرف اس لیے ملا گیا تھا کہ ہماری محبت کو ہوس کا شیطانی جذبہ بنا دیا جائے اور بدنامی کی یہ داستان پھیلا کر ہمیں مستقبل پر اعتماد کے رشتوں سے محروم کر دیا جائے۔ نیا جال لائے پرانے شکاری۔ انہوں نے مجھے کہیں اور پہنچا دیا۔ رابعہ کو کہیں اور.... ہماری نجی زندگی کے معاملات کو اسکینڈل بنا کے پیش کر دیا کیونکہ اس کے منفی اثرات بہت دور رس تھے! اس کی لپیٹ میں ضامن رضوی صاحب کی نوکری آ گئی جو نوکری سے زیادہ ان کے لیے آبرو کا سودا تھی۔ یہ خبر شہلا تک پہنچے گی۔ بالآخر وہ بھی یقین کرنے پر مجبور ہو گی کہ زبانِ خلق غلط نہیں کہہ سکتی۔ پھر نوزیہ تک پہنچے گی جس کی نظر میں میرا جرمِ بے وفائی پہلے ہی ناقابلِ معافی تھا۔ وہ بھی یقین کر لے گی کہ سکندر محض ہوس پرست تھا۔ اس کی ہوس نے انگلستان میں گل کھلائے۔ یہاں آ کے دولت کی ہوس نے اسے قاتل بنا دیا۔ انکل شیر دانی کیا سمجھیں گے۔ اور اگر رابعہ کو بھی معلوم ہوا تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ پھر مجھے وہ متعدد مواقع یاد آئے جب زندگی کی آزمائش کے لمحات بہت سخت تھے اور رابعہ نے کہا تھا ہمت نہ ہارنا سکندر۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں۔ محسن مر گیا۔ پھر کیا ہوا؟ کیا آدمی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کے بغیر زندہ نہیں رہتے؟ انکل زخمی ایس ایس پی نہیں رہے تو کیا ہوا؟ خدا کے اس سہارے پر تمہارا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اعتماد کیوں متزلزل ہو رہا ہے جس نے تمہیں اب تک حوصلہ دیا۔ سہارا دیا اور قوت دی کیونکہ تم حق پر تھے۔ آہستہ آہستہ میرے خیالات کی بازگشت رابعہ کی آواز بن گئی۔ بازی ابھی تمام نہیں ہوئی سکندر۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ تمہارا حوصلہ ختم کرنا، تم سے امید کا سہارا چھین لینا اور تمہیں اعتماد سے محروم کر دینا بھی دشمن شکاری کی ایک چال ہو۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر پیڈررو کو دیکھا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بات کا؟" میں نے کہا۔ "کہ محسن مرگیا۔ رابعہ لاپتا ہوگئی اور رضوی صاحب مستعفی ہوگئے ہیں؟ تم مجھے وہ اخبارات لاکے دکھا سکتے ہو جن میں یہ سب بکواس شائع ہوئی ہے؟"

"کیوں نہیں؟" پیڈررو بولا۔ "اخبارات گزشتہ ہفتے کے ہیں، گزشتہ صدی کے تو نہیں۔ فوراً تو پیش نہیں کر سکتا لیکن لادوں گا۔ کہیں نہ کہیں سے مل جائیں گے۔"

"یہ.... یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "ایک ہفتہ بے ہوش رہا میں؟"

"مجبوراً رکھا ہم نے۔" وہ بولا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نظر نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی وقت کے ساتھ ہی تاریخ بتا رہی تھی۔ جو واقعات مجھے یاد تھے ایک ہفتہ پرانے ہو چلے تھے۔

"کیا مجبوری لاحق تھی تمہیں؟" میں نے طنز آمیز تلخ لہجے میں کہا۔

"ایک مجبوری تو تم خود تھے۔ درد کی شدت سے چلاتے تھے تو ہمارا سونا بھی حرام کرتے تھے۔" وہ بولا۔ "پھر حکم یہی تھا کہ جب تک معاملات درست نہ ہو جائیں تمہیں اتنا غنیل رکھا جائے۔ اب یہ مت پوچھنا مجھ سے کہ کون سے معاملات؟"

میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ کیا معاملات درست ہونے کا مطلب یہ تھا کہ رابعہ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ سب کی دسترس سے اور میرے وہم و گمان کی رسائی سے بھی دور ہو۔ اور اس کے بعد مجھ سے میرا حال پوچھا جائے کہ سکندر اعظم صاحب! کیسے سودا کرتے ہیں؟ ہماری ایک مٹھی میں رابعہ کی جان واپس دبی ہے، دوسری مٹھی میں ہمارا کاروبار۔ تمہیں کیا چاہیے۔ ہماری شرائط پر رابعہ کی واپسی یا وہ سب جو ابھی تک نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے۔ اس وقت پیڈررو نے تمہیں صرف ٹریلر دکھایا ہے۔ اصل فلم اس سے کہیں زیادہ صبر آزما، لرزہ خیز اور عذاب ناک ہے۔ اور اگر وہ سب کچھ ہو چکا تھا جو پیڈررو نے مجھے بتایا تھا تو اور کیا ہوگا۔ انہی رشتوں کی تقدیس تو میرے پاؤں کی زنجیر تھی۔ اکیلے آدمی کا جینا کیا اور مرنا کیا۔ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ تو موت سے کون کافر ڈرتا ہے جو ایک ہی بار آنی ہے۔ آدمی دوسروں کے لیے جینا چاہتا ہے۔ کبھی اپنے بیوی بچوں کے لیے۔ کبھی والدین کی زندگی کے لیے۔ ان کے لیے جو اس کی ذات کو پیار دیتے ہیں اور پھر اس کے پیار سے سہارا پاتے ہیں۔ دوستوں کے لیے اور محبت سے اپنا سمجھنے والوں کے لیے۔ دشمنوں کے لیے کون جیتا ہے۔ وہ مارتا ہے یا مر جاتا ہے اور کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کی زندگی میں خلا نہیں آتا اور کوئی آنکھ نم نہیں ہوتی۔

میں قنوطی ہو رہا تھا اور میرے خیالات بھٹکنے لگے تھے۔ میرا ذہن اس حقیقت سے گریزاں تھا کہ میں جینے کے سارے سہاروں سے محروم ہو چکا ہوں۔ ماں کی ممتا اور بہن بھائیوں سے خون کا رشتہ ہوش سنبھالنے سے قبل ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن وقت اپنی یاد کا ناسور چھوڑ گیا تھا۔ وزیر خان کی موت کا زخم ہنوز تازہ تھا۔ اور اس کی پُرالم زندگی کا انجام مجھے خون رُلاتا تھا۔ میں ایک مشن لے کر آگے بڑھ رہا تھا اور یہ مشن تھا انہیں سزا دینے کا اور دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کا جو وزیر خان کے ہی نہیں اور بھی بہت سے بے گناہوں کے قاتل تھے۔ ان میں سلامت شاہ تھا۔ منشی بندہ علی عرف فومانچو تھا۔ اس کی نابینا اور لبِ گور بیوی تھی۔ رابعہ کی ماں تھی اور ایک بوڑھا گورکن تھا جسے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ مرنے والوں میں شملا کی ماں تھی۔ غلام علی اکاؤنٹنٹ تھا جس نے تمام عمر ایماندار رہنے کے جرم کی سزا پائی تھی اور نیکی کا ایک قرض اتارتے ہوئے مارا گیا تھا۔ مرنے والے ڈی سلوا سے لے کر زرداد جیسے غریب آدمی تک ان گنت لوگ تھے جن کی حقیقت بساطِ حیات پر پیادے، فیل یا وزیر کی تھی۔ ان کی جگہ نئے مُہرے آگئے تھے۔ اور بازی تمام ہونے تک نہ جانے کتنے ہوں گے جو میر محمد اور اس کی بیوی کی طرح مٹ جائیں گے۔ کبھی اِدھر سے مارے جائیں گے تو کبھی اُدھر سے کیونکہ دونوں طرف کے شکاری اپنی اپنی کامیابی کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔

لیکن اب محسن بھی مر چکا تھا اور رابعہ میرے کیے کی سزا پا رہی تھی۔ جو اس نے پہلے کئی بار پائی تھی لیکن میری خاطر اس نے ہر ظلم جھیلا تھا اور ہر انسانیت سوز ظلم برداشت کیا تھا۔ اب انکل رضوی کی ساری زندگی کی اصول پرستی، فرض شناسی اور ایمانداری میری وجہ سے خاک میں مل گئی تھی۔ یہی ان کی متاعِ عزیز تھی جو مجھ سے تعلق رکھنے کی پاداش میں بدنامی کی سند بن گئی۔ ہے کہاں روزِ مکافات، اے خدائے داردگیر۔ یہی سب تو میرا سہارا تھے۔ اگر میں اکیلا رہ گیا ہوں تو جیت کے میں کیا کروں گا۔ میری جیت پر خوش ہونے والا کون ہوگا؟ کامیابی مجھے کیا دے گی اور ناکامی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

میرا کیا لے گی۔ بہتر ہے میں اس کھیل کو ختم کر دوں، اپنی شکست مان لوں۔ سارے معاملات یومِ حشر پر اٹھا رکھوں جب انصاف بہر حال ہو گا۔ وہاں میزانِ عدل کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہو گی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری آنکھیں اشک فشاں ہیں۔ لاشعور کا خوف اب شعور پر غالب آ رہا تھا اور میری آنکھیں محسن کو دیکھ رہی تھیں۔ یادوں کا سلسلہ بڑا دراز تھا لیکن اب عمرِ گزشتہ انہی یادوں کا ایک قبرستان تھی جس میں ہر تاریخ ایک کتبہ بن گئی تھی۔ گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں۔ محسن اور میں کہاں کہاں یہ نقش چھوڑ آتے ہیں۔ اس راستے پر جو گھر سے اسکول تک پھیلا ہوا تھا اور جس پر ہم بستے گلوں میں لٹکائے برسوں آتے جاتے رہے۔ اس وقت کی راہ گزر پر جو سات سمندر پار ولایت کے عہدِ طالبعلمی تک پھیلی ہوئی ہے۔ شب و روز کے واقعات۔ ہر وارداتِ قلب و نظر۔ زندگی کی فتوحات کے کامراں لمحے۔ ناکامیوں کی دل شکستگی کے صدمے۔ وہ سب کچھ رزقِ خاک ہوا؟ محسن بھی مٹی کا ایک ڈھیر رہ گیا ہے جس پر پھول خشک ہو چکے ہیں اور اس کا جیتا جاگتا، ہنگامہ خیز، ناقابلِ شکست نظر آنے والا وجود ڈھانچہ بن رہا ہے؟ مٹی میں مل رہا ہے اور حشرات الارض کا رزق ہو گیا ہے۔ صرف میں زندہ ہوں۔ اپنی آرزوئے انتقام پر سب کو قربان کر دینے والا خود غرض انسان۔

"تم رو رہے ہو؟" پیڈرو کی ہنسی نے مجھے پھر متوجہ کیا۔ اس کے انداز میں تمسخر کے ساتھ حقارت تھی۔

"تم مجھ پر ہنس سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن انگریز ایک بات کہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخری بار کون کس پر ہنستا ہے اور کون کس کو روتا ہے۔ یہ دوسری بات میری ہے۔ میں تم سے کسی قسم کی رعایت کا طلب گار نہیں۔"

"تم کو اس سے زیادہ رعایت دی بھی نہیں جا سکتی تھی۔" پیڈرو بولا۔

"تم مجھے اتنا تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی زمین پر ہو۔ انسانوں کی دنیا میں۔" وہ بولا۔ "کیا اتنا کافی نہیں ہے کہ تم عالمِ ارواح تک نہیں پہنچے۔ یہ اچھا خاصا آرام دہ مکان ہے۔ تمہاری ضرورت کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر تمہیں صبح شام دیکھنے آتا ہے۔ سگریٹ، چائے یا کافی کی خواہش ہے تو بتا دو۔ میں منگوا دیتا ہوں۔"

"یہ مکان کس کا ہے اور مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا انحصار حالات پر ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "ابھی تو تم خود بھی اس قابل نہیں ہو کہ کہیں جا سکو چنانچہ صرف میں تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔ یہ جان کے کیا کرو گے کہ مکان لاہور میں ہے یا شیخوپورے میں۔ اور کس گلی محلے میں ہے یا کس کی ملکیت ہے۔ فرض کر لو یہ مکان میرے باپ کا ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں تمہارے کسی حمایتی کے پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ زیادہ یہ ہے کہ یہاں تم بالکل بے بس ہو۔ کھلی کھڑکی سے بھی تمہارے چلانے کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ خواہ تم سارا دن گلا پھاڑتے رہو۔ میرے علاوہ یہاں ایک ملازم ہے جو گونگا ہے۔ پیدائشی طور پر نہیں۔ پہلے وہ ٹھیک تھا مگر اس سے ایک غلطی ہوئی۔ اس نے ایک راز کی بات سن لی اور غلط موقع پر زبان سے بک دی۔ آدمی وفادار تھا چنانچہ باس نے نرمی سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ بس وہ چیز نہیں چھوڑی جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا۔ بچہ بھی چاقو اٹھا لے تو اسی لیے چھین لیتے ہیں کہ وہ اس کا استعمال نہیں جانتا۔ اور اس کے غلط استعمال سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جو ڈاکٹر تمہارا علاج کر رہا ہے ہمارا اپنا آدمی ہے۔ پچاس ہزار روپے ماہانہ کا ملازم ہے اور احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ جو دوا یا انجکشن دینا ہو دے دیتا ہے جس سے منع کیا جائے وہ نہیں دیتا۔ فائدے یا نقصان کی فکر نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر اسی وقت کمرے میں داخل ہوا۔ نہ جانے اس نے اپنی گاڑی کہاں کھڑی کی تھی؟ باہر مکمل سکوت تھا۔ وہ گاڑی لاتا تو میں آواز صاف سنتا۔ ایسے ڈاکٹر جو صرف ایک مجرموں کے گروہ سے ہر ماہ پچاس ہزار روپے وصول کر لیتے ہوں، دیگر ناجائز ذرائع اختیار کر کے بھی پچاس ہزار تو یقیناً کما لیتے ہیں۔ ماہ ایک لاکھ ماہانہ کی آمدنی والا ڈاکٹر جوتیاں نہیں چٹخاتا پھرتا۔ اس کے پاس ایک، دو یا تین شاندار گاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ غالباً وہ گاڑی کو دور چھوڑ کے آیا تھا تاکہ کوئی اسے یہاں آتا نہ دیکھے۔ اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی تھی کہ سڑک اس کمرے سے بہت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چالیس سال سے زائد عمر کا منحنی آدمی تھا جس کی صورت کو اس کے اعمال نے مسخ کر دیا تھا۔ پیسے کی خاطر نہ جانے اس نے کتنے انسانوں کے جسم میں زہر اتارا تھا اور کتنے جسموں سے روح کھینچ لی تھی۔ وہ اس مقدس پیشے کے نام پر کلنک کا بدنما ٹیکا تھا۔ اگر اس کے مذموم کاروبار کی خبر پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کو ہو جاتی تو اس کا پریکٹس لائسنس منسوخ ہو جاتا اور شاید اس کی ڈگری بھی۔ اسے عام مجرموں کی طرح عدالت میں پیش کیا جاتا اور عام قاتلوں کی طرح پھانسی پر لٹکایا جاتا۔

"کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا میں؟" میں نے اس کے معائنے کے بعد کہا۔

"جب ہم چاہیں گے۔" وہ بولا۔ "ابھی تو دائیں ٹانگ ٹھیک نہیں۔ اس کے بعد بائیں ٹانگ خراب ہو سکتی ہے۔"

"بائیں ٹانگ کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے! اس کی بات کیوں کرتے ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"کچھ ہوا تو نہیں مگر ہو سکتا ہے۔ ایک تم نے خود توڑی تھی۔ کیا دوسری ہم نہیں توڑ سکتے؟ ایسے۔" اس نے اپنا ہاتھ میری بائیں ٹانگ پر ہتھوڑے کے انداز میں مارا۔

"تم واقعی ڈاکٹر نہیں جلاد ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے میری ٹانگ توڑی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"اچھا؟" وہ میرے مذاق سے محظوظ ہو کے ہنسا۔ "تم سے پہلے میرا واسطہ بڑے بڑے ٹارزن اور رستم قسم کے بدمعاشوں سے پڑ چکا ہے جو تم سے زیادہ ہٹے کٹے تھے اور میرا سر مسکر سکتے تھے۔ لیکن صرف ایک گولی کھا کے مر گئے، ایک چھوٹے سے انجکشن نے ان کو چت کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔"

"اور ایسے کتنے ٹارزن اور رستم چت کر چکے ہو تم پہلوان؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اس کا حساب نہیں رکھا میں نے۔" وہ جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ورنہ ضرور بتاتا۔"

ذرا سی دیر کے لیے اس کا شیطانی سر میرے بہت قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ میں چاہتا تو اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اور اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ ابھی ابھی اس نے میرے روبرو اعتراف کیا تھا کہ وہ بے حساب قتل کر چکا ہے اور یہ اعتراف اس نے بالکل بے خوفی سے اور کسی دباؤ کے بغیر کیا تھا کیونکہ وہ کسی عدالت میں نہیں تھا۔ کسی ایسے شخص کے سامنے بیان نہیں دے رہا تھا جو بعد میں اس کے خلاف گواہی دے سکے اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ لیکن وہ قاتل تھا اور اتنے قتل کرنے کے بعد اسے سزائے موت سے کم کوئی سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ چشم زدن میں میرا ہاتھ گھوما اور اس کی گردن پر پڑا۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر اپنے بے جان ہو کے زمین پر گر گیا۔

چند سیکنڈ تک پیڈرو بے یقینی کے عالم میں منجمد بیٹھا رہا۔ خوف اور حیرت نے اسے مفلوج کر دیا تھا اور اس کی آنکھیں بے حس و حرکت جسم پر ٹھہر گئی تھیں۔ پھر وہ ایسے اچھلا جیسے کرسی میں گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ آ گیا ہو۔

"خبیث!" وہ چیخ کر بولا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا.....؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" میں نے سکون سے کہا۔ "میں نے ایک قاتل کو سزائے موت دے کر انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ یہ سزا تو اسے بہت پہلے ہو جانی چاہیے تھی!"

پیڈرو نے زمین پر پڑے ہوئے ڈاکٹر کی لاش کو بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی کھوپڑی گردن سے معلق ہو کے جھولنے لگی۔ جب پیڈرو نے اسے صوفے پر ڈالا تب بھی اس کا سر مضحکہ خیز طور پر جھول رہا تھا۔

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ انصاف تمہیں کتنا مہنگا پڑا ہے۔" پیڈرو ہانپتے ہوئے غرایا۔ اس کا چہرا غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں انگارے بن گئیں تھیں۔ اگر اسے واضح احکامات نہ ہوتے کہ مجھے گزند نہ پہنچے تو وہ یقیناً مجھے قتل کر دیتا۔

"میرا ضمیر مطمئن ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو ڈاکٹر کہلانے والے اس پیشہ ور قاتل کو دنیا کی کسی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنا ناممکن تھا۔ عدالت ثبوت اور شہادت مانگتی ہے۔"

"اور تم نے کسی ثبوت اور شہادت کے بغیر اسے قتل کر دیا۔ منصف کی اولاد۔" پیڈرو چلایا۔

"مجھے ثبوت و شہادت کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے متعلق پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے۔ خود اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ جتنے قتل وہ کر چکا ہے اس کا حساب بھی یاد نہیں۔"

"ایسے تو کوئی جج اپنے باپ کے قاتل کو بھی نہیں مار سکتا۔ خواہ اس نے قتل ہوتے دیکھا ہو۔"

"جج اپنے عہدے اور حفظِ مراتب، شرائطِ ملازمت اور قانونی پابندیوں کے باعث مجبور ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں مجبور نہیں تھا۔ اگر میں اس شخص کو زندہ چھوڑ دیتا تو یہ جرم ہوتا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کی جان لیتا۔"

پیڈرو نے مجھے ایک گندی گالی دی۔ ڈاکٹر کی موت نے اسے مشتعل ضرور کیا تھا لیکن اتنا پاگل نہیں کیا تھا کہ اب وہ میرے قریب آنے کا خطرہ مول لیتا۔ اس نے کرسی اٹھا کے میری ٹانگ پر ماری۔ میں اچھلا اور درد کی ٹیسوں سے تڑپ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹانگ کی وہ ہڈی جس میں بال تھا، ٹوٹ کے الگ ہو گئی ہے لیکن کرسی کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر لگی تھی۔ "اب کرو انصاف۔" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مجھے پھر گالی دی اور کرسی کو سر سے اوپر اٹھا کے پھر وہیں مارا۔ ضبط کرنے کے باوجود میری چیخ نکل گئی اور میری آنکھوں میں درد کی شدت سے آنسو آ گئے۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ "میرے ساتھ انصاف کرو!" پیڈرو چیخا اور اس نے تیسری بار کرسی اٹھائی۔ اگر اس کی وحشت بڑھ جاتی تو وہ براہِ راست میری ٹانگ کے مضروب حصے پر وار کر دیتا یا شاید کرسی میرے سر پہ دے مارتا۔ نیم بیہوشی کی کیفیت میں بھی میرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ذہن نے سوچنا بند نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کو جو بھی بار کرسی اٹھاتے دیکھا اور اس وقت اچانک مجھ میں اتنی طاقت آ گئی کہ میں اُلٹے ہاتھ کے بل پر اوپر اٹھا اور میں نے کرسی کو بائیں ٹانگ ماری یہ ضرب کی شدت تھی یا تصادم کی قوت کہ کرسی ٹوٹ گئی اور پیڈرو جو اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہ تھا جھٹکے سے پیچھے جا گرا۔

وہ کچھ دیر اسی جگہ پڑا ہانپتا رہا جہاں پہلے ڈاکٹر پڑا تھا۔ اس کی دیوانگی کا دورہ ختم ہو گیا تھا "تم سے میں بعد میں سمجھوں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور ایک دروازے سے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ میں اسے کسی سے باتیں کرتے سنتا رہا۔ وہ اس حادثے کی رپورٹ اپنے الفاظ میں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا تو مجھے ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کی آواز سنائی نہیں دی اور تب مجھے خیال آیا کہ میں نے نمبر ڈائل کرنے کی آواز بھی کہاں سنی تھی۔ وہ یقیناً ریڈیو ٹرانسمیٹر پر بات کر رہا تھا۔ کس سے اور کہاں؟ اس کا اندازہ مجھے نہ ہو سکا۔

وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو بظاہر انسان ہی تھا کیونکہ اس کے دو ہاتھ پیر تھے۔ ناک کان اور آنکھیں بالکل انسانی تھیں۔ لیکن دیگر بہت سی صفات میں وہ آدمی نہیں تھا۔ مثلاً قد و قامت، جسامت اور وزن میں وہ گوریلا تھا۔ آدمی اگر حیوانِ ناطق ہے تو وہ صرف حیوان تھا۔ کیونکہ پیڈرو کے بیان کے مطابق وہ زبان جس کا اس نے غلط استعمال کیا تھا، کاٹ دی گئی تھی۔ اب وہ بولنے کی کوشش میں حلق سے بے معنی اور عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ اور اپنا مفہوم اشاروں کی مدد سے واضح کرتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے کانوں میں کیا سرجری کی گئی ہو گی کہ وہ سماعت سے بھی محروم ہو گیا۔ ان جیسے سفاک لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ وہ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ قد کا آدمی تھا اور اس کی گردن کسی سانڈ سے زیادہ مضبوط تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گولائی شانوں سے نیچے اتنی زیادہ تھی کہ ان کا موازنہ میں اپنی ٹانگوں سے کر سکتا تھا لیکن وہ صرف گوشت کا انبار نہیں تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اور جسم کے پٹھے چڑھے ہوتے تھے۔ اور اس کے ورزشی بدن کی غیر معمولی قوت کے مظہر تھے۔ مجھے اسے دیکھ کر الف لیلوی کہانیوں کے جن اور دیو یاد آئے اور وہ فلمیں یاد آئیں جن میں ہرکولیس، ٹارزن اور سیمسن کے کردار تھے۔ جب پیڈرو نے اسے مخاطب کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام سیمسن ہی ہے۔ پیڈرو نے اسے اشاروں کی زبان میں سمجھایا کہ میں نے کیسے ہاتھ مار کے ڈاکٹر کی گردن توڑ دی ہے اور وہ میری طرف بڑھا۔ میری روح فنا ہونے لگی۔ وہ دیوزاد مجھے کسی کھلونے کی طرح اٹھا کے اُچھال سکتا تھا اور دیوار پر مار مار کے میرے جسم کے چیتھڑے بکھیر سکتا تھا۔ دفاع کی واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ معذوری کے باوجود میں جوڈو کراٹے کے فن کی ساری مہارت کو بروئے کار لاؤں اور جیسے بھی ہو اس گوریلے کے بازو توڑ دوں یا اس گونگے بہرے جانور کو اندھا بھی کر دوں۔ پیڈرو چند سیکنڈ میرے ردِ عمل سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر اس نے اپنے حکم کے غلام کو روک دیا۔ "سیمسن!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈاکٹر کی لاش کامل بے حسی کے ساتھ پڑی تھی۔ "وہ بعد میں۔ پہلے یہ۔" اس نے ہاتھوں کی مدد سے واضح کیا کہ اس دیوزاد کو کیا کرنا ہے۔ اس نے سیمسن کو سمجھا دیا تھا کہ ڈاکٹر کو باہر لے جا کر گاڑ دے۔

"اچھا کیا جو تم نے اس گوریلے کو روک دیا۔" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔ "ورنہ خود تمہیں ایک کے بجائے دو لاشیں دفن کرنا پڑتیں۔ ڈاکٹر کو تو اٹھایا جا سکتا تھا۔ اس حیوان کو کیسے لے جاتے تم؟ کرین کی مدد سے؟ اس کی قبر کے لیے گڑھا بھی موت کے کنوئیں جتنا چاہیے۔"

سیمسن اپنے آقا کا اشارہ پا کے لوٹ گیا تھا لیکن میری بات سے پیڈرو کو پھر طیش آ گیا۔

"سیمسن!" اس نے چیخ کر کہا حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سیمسن اس کی آواز کے بجائے کندھے کی تھپکی محسوس کر کے پلٹا اور پیڈرو کو دیکھنے لگا۔ نہ جانے پیڈرو نے اسے کیا اشارہ کیا کہ وہ حیوانی آوازیں نکالتا اپنے بازو پھیلا کے میری طرف لپکا۔ مجھے سنبھلنے کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میں نے صحیح "کراتیکا" کی طرح اپنے حواس کو قابو میں رکھا۔ محض ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت میرے لیے کچھ نہیں تھی۔ میری کمزوری صرف یہ تھی کہ میں ایک ہاتھ اور ایک پیر کی مدد سے محروم تھا اور میری حرکت پذیری کی صلاحیت مایوس کن تھی۔ اگر میں صحیح پوزیشن لے سکتا اور آزادانہ نقل و حرکت کر سکتا تو مجھے اس پہاڑ کو زمین بوس کرنے میں سات سیکنڈ سے زیادہ نہ لگتے اور وہ ایک بار میرے سر پر سے گزر کر فرش پر کمر کے بل گرتا تو پھر نہ اٹھتا۔ اس کی کمر اور فرش دونوں ٹوٹ جاتے۔ لیکن اب بھی تقدیر یاور رہی اور سیمسن نے سوچے سمجھے بغیر اپنے پورے وجود سمیت مجھ پر گرنے کی حماقت کی۔ میں نے اسے بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر لیا اور یوں گزر جانے دیا کہ وہ مقابل کی دیوار تک اپنے ہی زور میں گیا اور اس سے یوں ٹکرایا کہ مجھے دیوار کے گرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ میرا بایاں ہاتھ زیادہ کام آیا تھا لیکن زور دائیں ہاتھ پر بھی پڑا تھا اور جھٹکا میرے دائیں پیر پر بھی آیا تھا۔ اگر وہ پھر حملہ کرتا تو شاید میں نہ روک پاتا لیکن پیڈرو نے اسے گِر کر اٹھتے ہی رُک جانے کا اشارہ کیا۔ شاید پیڈرو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس جنگ میں یہ ٹیک بھی کام آ گیا تو وہ خسارہ جاتے گا۔ سیمسن رُک گیا۔

"بس؟" میں نے تمسخر آمیز انداز میں چیلنج کیا لیکن میں جانتا تھا کہ اب پیڈرو مشتعل نہیں ہو گا۔ "ختم ہو گیا اس گینڈے کی طاقت آزمائی کا غرور؟ اس حال میں بھی میرے لیے تمہارا سیمسن حقیر چوہے سے زیادہ نہیں۔"

پیڈرو نے اس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کر دیا اور سیمسن کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ جسم کی مناسبت سے سیمسن کا سر بہت چھوٹا تھا۔ بالکل شاہ دولہ کے چوہوں کی طرح۔

سیمسن بالکل شاہ دولہ کا چوہا تھا۔ اس کا ذہن عام آدمی جیسا ہوتا تو آج اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ نہ جانے وہ کب سے ان مجرموں کے ساتھ تھا۔ نادانستگی میں سرزد ہو جانے والی ایک غلطی پر اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور کان بہرے کر دیے گئے تھے اور یہ ایسی سزا تھی جس کا بیسویں صدی کے مہذب معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سیمسن اس کے باوجود وہیں تھا، فرار نہیں ہوا تھا۔ اور ذہنی طور پر بدستور ان کا غلام تھا۔ ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ کیونکہ اس کا اپنا کوئی ارادہ، کوئی مرضی، کوئی رائے نہیں تھی۔ قوتِ فیصلہ نہیں تھی اور اچھے بُرے میں تفریق کا شعور نہیں تھا۔ وہ آدمی سے زیادہ روبوٹ تھا۔ مشینی آدمی۔ ایک اشارہ اسے متحرک و فعال کر دیتا تھا، دوسرا اشارہ اسے سوئچ کی طرح آف کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے ذاتی جذبات بالکل نہیں تھے کہ وہ حیران ہوتا، خوش ہوتا، مشتعل ہوتا۔ سوال کرتا کہ اسے یہ کام کرنے کے لیے کیوں کہا جا رہا ہے اور وہ کام کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ اس کا کام عمل کرنا تھا، سوچنا نہیں۔ وہ سوچ سکتا تو ضرور سوچتا کہ اس میں اور پیڈرو میں کیا فرق ہے؟ نہ وہ ڈاکٹر کی لاش دیکھ کے خوفزدہ ہوا تھا اور نہ میرے ہاتھوں پہلے حملے کی ناکامی سے مشتعل۔ اس نے پہلے بھی پیڈرو کا حکم بلا چون و چرا مانا تھا اور بعد میں بھی۔

جتنی دیر میں پیڈرو نے ڈاکٹر کی جیب سے ہر کاغذ کا پرزہ نکالا، اس کی گھڑی اور ہیرے ۔۔۔۔۔۔ والی سونے کی انگوٹھی اتاری اتنی دیر میں سیمسن کئی بار اندر گیا اور باہر آیا۔ پیڈرو جو کچھ کر رہا تھا، شناخت کی ہر علامت مٹانے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے پیڈرو کے گروہ کے لیے اتنا کارآمد تھا کہ وہ اسے پچاس ہزار روپے ہر ماہ ادا کرنا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں سمجھتے تھے، یکلخت بے مصرف ہو گیا تھا۔ صرف ایک لاش رہ گیا تھا جس سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ فوری مسئلہ میرا نہیں، اس لاش کو تمام احتیاطی تدابیر کے ساتھ ٹھکانے لگانے کا تھا اور اس کے انتظامات مرحلہ وار ہو رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے سیمسن پلاسٹک کی ایک تھیلی لایا اور پیڈرو نے سر ہلا کے اطمینان سے سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے جسم پر سے اب کپڑے تک اتار لیے گئے تھے۔ پیڈرو نے جیب سے ایک تیز دھار خنجر نکالا۔ بٹن دباتے ہی اس کا پھل باہر آ گیا۔ "اس سے میں تمہاری کھال اتار دوں گا۔" وہ خنجر کو میری طرف لہرا کے بولا۔ لیکن یہ محض ایک جملۂ معترضہ تھا۔ خنجر سے اس نے ڈاکٹر کے دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں کو اس طرح کچو کے لگا کے زخمی کیا جیسے قصائی گوشت کا قیمہ کرتے ہیں۔ یہ فنگر پرنٹ مٹانے کا آپریشن تھا۔

پھر پیڈرو نے خنجر کو واپس جیب میں رکھا اور سیمسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سیمسن نے ڈاکٹر کو ٹوٹی ہوئی گردن سے چوہے کی طرح پکڑ کے اٹھایا اور پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر کو مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس کی لاش اکڑی نہیں تھی۔ وہ تھیلی میں یوں سما گیا کہ انگریزی حرف یُو بن گیا۔ اس کی ٹانگیں سر کی طرف تھیں اور سر دونوں پیروں میں پھنس گیا تھا۔ پلاسٹک کی موٹی تھیلی چھ فٹ لمبی تھی چنانچہ آدھی تھیلی میں ڈاکٹر کا جسم دو بار لپیٹ دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اس قسم کی تھیلی عام استعمال میں تو آتی نہیں ۔۔۔ حاضر اسٹاک میں سے کیسے لے آیا پھر جواب میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ پلاسٹک کے کفن غالباً لاشوں کے لیے ہی تھے۔ ان میں بند کر کے لاش کو دفن کرنے اور غرق کرنے کے بعد یہ خطرہ بالکل نہیں رہتا تھا کہ تعفن کسی کو متوجہ کر سکتا ہے۔ لیکن میری آنکھوں نے ابھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔

پیڈرو کے حکم پر سیمسن نے ڈاکٹر کی پلاسٹک کے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کو ایک بوری میں ڈال دیا اور بوری کا منہ اس جگہ سے باندھ دیا جہاں تک اس کا وجود سمایا۔ اوپر کا خالی حصہ سیمسن کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ اچانک اس نے بوری کو اُٹھا کے گھمایا اور یوں زمین پر دے مارا جیسے دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ پیڈرو نے پھر اشارہ کیا اور سیمسن نے وہی عمل دُہرایا۔ بے رحمی کا یہ مظاہرہ دیکھنا میری برداشت سے باہر ہو گیا۔

"پیڈرو۔۔۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو!" میں چلایا "وہ مر گیا۔ اب اسے کیوں مارتے ہو؟"

"مجھے خدا ترسی کا سبق دے رہے ہو؟" پیڈرو نے طنز سے کہا "اسے مارنے والے خود تم ہو۔"

"میں نے اسے صرف وہ سزا دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ جو اسے دنیا کا ہر نظامِ انصاف دیتا مگر سزائے موت دینے والے بھی کم سے کم عذاب دے کر مارتے ہیں۔ پھانسی کی جگہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

الیکٹرک چیئر اور گیس چیمبر...."

" بند کر دا پنا یہ فضول لیکچر۔" پیڈرو بیزار ہو کے بولا۔ اس کے اشارے پر سیمسن نے بوری کو گھما گھما کے پٹخنا شروع کیا۔ میں نے اس اذیت ناک منظر سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر کے منہ پھیر لیا مگر دھم دھم کی صدا میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑتی رہی۔ سیمسن کے طاقتور بازو مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ ڈاکٹر کی ہڈیاں تو پہلی دفعہ ہی ٹوٹ گئی ہوں گی۔ اب اس کی لاش کا چُورا ہو رہا تھا اور سالم آدمی کو قیمے جیسے گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اس ظالمانہ کارروائی کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ خوشی جو ڈاکٹر کے شیطانی وجود سے دنیا کو پاک کر کے ملی تھی ایک پُرعذاب احساسِ ندامت میں ڈھل گئی تھی۔ ڈاکٹر کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ میں نے اس پر پہلا ہاتھ اٹھایا تھا اور اب مجھے اس کی سزا مل رہی تھی جسے میں نے انصاف کا تقاضا سمجھا تھا۔ جو حشر مرنے کے بعد ڈاکٹر کا ہوا تھا دنیا میں کسی کا نہیں ہوا ہوگا۔ پرانے وقتوں میں مطلق العنان حکمران باغیوں کو باندھ کر ہاتھی کے پیروں میں ڈلوانے کی سزا دیتے تھے۔ انسان اب بھی ٹرینوں سے کٹ جاتے تھے۔ دیوہیکل بسوں کے نیچے پس جاتے تھے اور بڑی بڑی مشینوں کی لپیٹ میں آ کے ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ حادثات کہلاتے تھے۔ ایسے متعدد افسوسناک واقعات میں نے سُنے تھے یا پڑھے تھے۔ لیکن سُننے اور دیکھنے ہوئے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اب میری طبیعت متلی ہو رہی تھی۔ میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا اور میرا دل قے کرنے کو چاہتا تھا۔ لیکن مجھے مسلسل ابکائیاں آ رہی تھیں۔ مجھے یہ احساس بالکل نہ تھا کہ میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔

باہر ایک گاڑی آ کے رُکی۔ میں نے دو افراد کے باتیں کرنے کی آواز سُنی۔ پھر کار کے چاروں دروازے بند ہوئے اور میں سوچتا رہا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ حالانکہ میرا سابقہ اس آواز سے اتنی بار پڑ چکا تھا کہ اب مجھے ایک جملہ سُن کے اسے شناخت کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن میرا ذہن اس وقت بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔

" اچھا! تو اپنے سکندر صاحب یہاں بھی ہاتھ کی صفائی دکھا گئے۔" اسی آواز نے کہا۔ اور میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے اپنے قریب چوہدری دلاور نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور وہ ٹانگوں کو تھوڑا سا پھیلا کے متانت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ میں نواب خسرو جمشید تھا۔

" کیا بتاؤں چوہدری صاحب!" پیڈرو نے سہمے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کتے نے ایک دم ہاتھ ملا دیا۔ ڈاکٹر کی اتنی جان کہاں تھی۔"

" جان تو ہمارے سکندر صاحب کی ہے۔ بڑے سخت جان ہیں یہ۔" دلاور نے تلخی سے کہا۔ "لیکن ان کی حالت کیوں غیر ہو رہی ہے! ٹوٹی تو ٹانگ ہے، ہوائیاں چہرے پر اڑ رہی ہیں!"

" بالکل عالمِ نزع کی سی کیفیت ہے۔" خسرو جمشید نے کہا جو مجھے بہت عرصے بعد پھر نظر آیا تھا۔

" او ہو ہو.... ان کے تو پسینے چھوٹ گئے ہیں۔" دلاور نے ہمیشہ کی طرح اپنی اداکاری جاری رکھی۔ " ارے بھئی جوان آدمی ہو بہادر رہو، تمہیں تو ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی سے ہمت ہار گئے؟"

میں اسے کیا جواب دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے قریب ہوتا تو میں اس کے منہ پر ضرور تھوک دیتا۔

" ڈاکٹر اچھا آدمی تھا۔" خسرو جمشید نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وفادار تھا۔"

" ہاں۔ لالچی تو تھا مگر وفادار تھا۔ اب کسی اور کی وفاداری خریدنی ہوگی۔" دلاور نے کہا۔ "ہے کوئی بندہ ایسا نظر میں جو اعتبار کے قابل ہو؟ مگر خیر، یہ سب بعد میں ہوگا۔ پہلے ہم ڈاکٹر کی آخری رسوم تو ادا کر لیں۔ پیڈرو! پیکنگ بہت اچھی ہونی چاہیے۔ تحفۂ خاص ہے۔"

پیڈرو نے ٹین کا وہ خاص ڈبا بجایا جو گھروں میں ایک من آٹا رکھنے کے کام آتا ہے۔ " یہ کیسا رہے گا؟"

" چلے گا۔" چوہدری دلاور نے کچھ دیر بعد سر ہلایا۔ میں نے ہمت کر کے سر گھمایا۔ ڈاکٹر کی لاش ایک گٹھڑی کی شکل میں فرش پر رکھی تھی۔ بوری اسی طرح بند تھی لیکن اس میں سے خون کا ایک قطرہ تک باہر نہیں ٹپکا تھا۔ ٹاٹ کی موٹی بوری کے اندر پلاسٹک کی ڈبل تہ لگانے کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے تھے۔ پیڈرو نے بوری کو اٹھایا اور ڈبے میں ڈال دیا۔ مرحوم کے پاس بہت کچھ تھا۔ کوٹھیاں اور کاریں۔ سامانِ عیش و عشرت، دولت کی قوت کا غرور، چوہدری دلاور جیسے مجرموں کی پشت پناہی کا اعتماد۔ اس انجام کو پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے کتنے اعتماد سے دھمکی دی تھی کہ وہ ایک ننھی سی گولی یا انجکشن سے مجھے چت کر سکتا ہے کیونکہ دلاور پہلے مجھ سے زیادہ طاقتور اور ٹارزن ٹائپ لوگوں کو مار چکا ہے جو اس کی ہڈیوں کا سُرمہ بنا سکتے تھے۔ تقدیر کا یہ بھی عجب مذاق تھی جو ڈاکٹر نے کہا تھا وہ چند منٹ بعد ہو گیا۔

" اس کو کیسے بھیجنا ہے چوہدری صاحب؟" پیڈرو نے ڈبے کے کنستر کو بند کرتے ہوئے کہا۔ " دستی یا...؟"

" دستی کا کیا سوال؟" چوہدری دلاور نے یوں کہا جیسے پیڈرو اس کی غلطی پر تنبیہہ کر رہا ہو۔ "لاہور تک ٹرین میں بُک کر لو، آگے انتظام ہو جائے گا۔"

پیڈرو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا تھا کہ غلطی سے وہ سچ بول گیا تھا۔ جہاں یہ خونی پارسل رکھا تھا وہ جگہ لاہور سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شاید لاہور ہی میں تھی اور یہ ممکن تھا کہ ڈبا کوئی خود پہنچا دے۔ چوہدری دلاور نے ٹرین سے بکنگ کا ذکر کر کے معاملے کو سنبھالنا چاہا تھا لیکن میں سمجھ گیا۔

" اور دیکھو، وہ سامان کہاں ہے جو گفٹ کے ساتھ جائے گا؟" دلاور بولا۔

پیڈرو دوسرے کمرے میں گیا اور دونوں ہاتھوں میں کچھ چیزیں لیے لوٹا۔ ان میں میری کلائی گھڑی تھی۔ میرا پرس تھا، اور قلم تھا۔ پرس میں نقد رقم بھی تھی جسے دلاور نے سرسری انداز میں دیکھا اور واپس رکھ دیا۔ پھر اس نے انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس نکالا جو میں نے لندن سے حاصل کیا تھا۔ اسے کھول کر میری تصویر دیکھنے کے بعد دلاور مسکرایا۔

" تصویر زیادہ پرانی تو نہیں لگتی اپنے سکندر صاحب۔ وارث پہچان لیں گے آپ کو۔"

" کون وارث؟" میں نے کسی انجانے خوف سے لرز کے کہا۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

دلاور اور خسرو جمشید اس صوفے پر بیٹھ گئے جس پر کچھ دیر پہلے ڈاکٹر کی لاش پڑی تھی۔ " آدمی تو تم ضرورت سے زیادہ سیانے ہو۔ وارث کا مطلب نہیں سمجھے؟" دلاور نے اطمینان سے پیر پھیلا کے کہا اور میری ذاتی اشیاء پیڈرو کو تھما دیں۔ " وارث صرف ماں باپ یا بھائی بہن ہی تو نہیں ہوتے۔ یار بیلی ہیں، چاچے مامے ہیں، چاہنے والے ہیں، مثلاً وہ وکیل صاحب ہیں۔ نہیں نہیں، فکر مت کرو۔ ان کو نہیں ملے گا یہ تحفہ۔ محسن زندہ ہوتا تو...."

" محسن زندہ ہے۔" میں دیوانہ وار چلّایا۔ "تم سب بکتے ہو، جھوٹ بکتے ہو۔"

" اچھا بھئی سب زندہ ہیں۔" دلاور معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "بات زندے مُردے شمار کرنے کی نہیں ہو رہی تھی، مسئلہ یہ ہے کہ کس کو یہ تحفہ بھیجنا ہے۔" اس نے آٹے کے بند ٹین کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے ایس پی صاحب تو اب رہے نہیں ورنہ وہ فٹا فٹ تحقیقات شروع کر دیتے۔ پھر انہیں تکلیف دینے کا کیا فائدہ؟ تمہارا ذاتی سامان بھی تحفے کے ساتھ ہی جائے گا۔ بس اتنا بتا دو کہ کس کو بھیجا جائے؟ ایک وہ تمہاری بہن ہے شہلا۔ دوسری وہ جسے تم نے چھوڑ دیا۔ فوزیہ! تیسرا محسن کا باپ ہے.... کون زیادہ خوش ہوگا یہ تحفہ وصول کر کے؟"

" خدا کے لیے دلاور۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ " اپنے اور میرے معاملات میں ان لوگوں کو مت لاؤ۔ پہلے ہی کیا کم سزا مل چکی ہے انہیں۔ قصوروار اگر ہوں تو میں۔ مجھے جو سزا چاہو دو۔"

دلاور ہنسا۔ " اپنے اور میرے معاملات کے بیچ خدا کو مت لاؤ۔ خدا نے یہ دنیا بنانے کے بعد آدمی کو عقل و شعور اسی لیے دیا تھا کہ وہ اس کے انتظامی مسائل خود سنبھالے۔ قصوروار تو ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ وہ کسی خاندان کا سربراہ ہو۔ ادارے کا یا ملک کا۔ اگر وہ غلط فیصلہ کرتا ہے تو نقصان سب کو ہوتا ہے۔ بیوی بچوں کو۔ اس ادارے سے وابستہ افراد کو یا اس ملک میں رہنے والوں کو۔ جواری، شرابی اور بدکردار افراد کے گھر میں کیا ہوتا ہے؟ کیا ان کے بیٹے وطن کا نام روشن کرتے ہیں؟ بیٹیوں کو عزت دار رشتے مل جاتے ہیں؟"

" پیڈرو کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن تمہارا تو گھر بھی ہے اور بیوی بچے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

" میں عزت دار آدمی ہوں اپنے سکندر صاحب!" دلاور طنز سے مسکرایا۔ "ایک تمہارے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات کسی طرح بھی تمہارے انکل ایس ایس پی صاحب سے کم نہیں۔ میرے مقابلے میں تم کیا ہو؟ اپنی نظر میں بڑے ہیرو۔ اصولوں کی جنگ میں جان کی بازی لگا دینے والے۔ حق پرست اور باضمیر۔ لیکن دنیا تم کو پھر بھی فرشتہ نہیں مانتی! قاتل سمجھتی ہے۔ تمہارے خلاف دستاویزات پر مشتمل ایک پوری فائل انگلستان میں محفوظ ہے۔ یہاں تمہارا نام اتنی بار اخبارات کی زینت بن چکا ہے، اتنے تھانوں میں اور مقدمات میں درج ہے کہ سب کو اکٹھا کیا جائے تو یہاں بھی دوسری فائل بن سکتی ہے۔ زیادہ بڑی، مار پیٹ، توڑ پھوڑ، آتش زنی، اغوا، قتل، کیا کچھ منسوب نہیں ہے تم سے۔ تم لاکھ کہو کہ یہ سب غلط ہے، تمہاری مانے گا کون؟ اس کے برعکس میرے خلاف کیا ہے؟ وہ ایک بار تم نے مجھے ملوث کرنے کے لیے میرا نام لیا مگر اس سے کیا فرق پڑا؟ میرا نام آیا کہیں؟ میری عزت کم ہوئی یا کسی نے انگشت نمائی بھی کی مجھ پر؟"

" دلاور!" میں نے کہا۔ "چور کے اسی طرح سو دن ہوتے ہیں اور کوتوال کا ایک دن۔"

" سب پرانے محاورے، پرانی باتیں ہیں۔ اب کوتوال بھی تو چوروں کا ہے۔" دلاور بولا۔ " اور سو دن تو بہت ہیں۔ ابھی تم کو ہماری دنیا میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ غلطی ہم سے ہوئی کہ تمہاری جوانی پر ترس کھایا اور تمہیں زندہ سلامت آنے دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم جس کاروباری ماحول اور مادہ پرست معاشرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں برسوں رہ کے لوٹے ہو اس کے بعد تم اپنے دماغ سے سوچتے ہوگے، دل سے نہیں۔ تم دو اور دو پانچ بھی مان لوگے۔ ہم نے تو دد جمع دو، دس تک کیے تھے اور ہماری آفر انتہائی فراخدلانہ تھی۔ تم عیش سے عمر بسر کر سکتے تھے اور اس سارے عذاب سے بچ سکتے تھے جس میں تم خود بھی مبتلا ہوئے اور ہمیں بھی مبتلا کیا۔ تمہارا باپ اتنا ضدی نہیں تھا۔ اس نے ہماری ہر بات خوشی سے مان لی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ تم بھی اسی کی طرح ہوگے۔ ورنہ کیا ضرورت تھی ہمیں تم کو رعایت دینے کی۔ تمہاری ضد سے ہمارا کتنا نقصان ہوا، مالی بھی اور جانی بھی۔ دو چار مرتبہ تم حسنِ اتفاق یا تقدیر کی یاوری سے بچ گئے تو تمہارا حوصلہ بڑھ گیا؟" وہ اپنے لب و لہجے اور اندازِ گفتگو سے قطعی بدلا ہوا دلاور تھا۔

اتنی سنجیدگی کے ساتھ اور ایسے رواں لہجے میں اس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کا میں شروع سے معترف تھا۔ یہ انکشاف بھی میرے لیے باعثِ حیرت ثابت ہوا کہ اس کا ہر جملے میں "اپنے سکندر صاحب" کہنا۔ ادھورے جملے بولنا۔ اردو میں پنجابی کے الفاظ شامل کرنا اور ان پڑھوں کی طرح گفتگو کرنا بھی اداکاری تھی۔ اصل چوہدری دلاور کی زبان بالکل مختلف تھی۔ وہ انتہائی عیار اور معاملہ فہم، متین اور سرد مزاج، جہاندیدہ اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ دوٹوک اور ٹو دی پوائنٹ بات کہنے والا۔ پُراعتماد اور اپنی حاکمیت میں خود مختار۔

"اس وقت تم سب کچھ کہہ سکتے ہو دلاور۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے لیے قابلِ قبول ہو۔ اور آج اگر سچ ہے تو کل بھی سچ ہوگا" میں نے کہا "میں نے صرف اپنا حق مانگا تھا اور انصاف مانگا تھا"

دلاور ہنسا "پہلے تم غلط وقت پر پیدا ہوگئے۔ پھر غلط جگہ آ گئے۔ اپنی کتابوں کی دنیا میں ہی رہتے تو اچھا تھا۔ پڑھ لکھ کے کیا فائدہ ہوا تمہیں؟ آنکھیں تو تمہاری بند ہی رہیں ورنہ تم دنیا کو دیکھتے، اپنی آنکھ سے بھی اور دوسروں کی آنکھ سے بھی۔ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس پورے کرۂ ارض پر حق و انصاف کے الفاظ صرف تقریروں میں استعمال ہوتے ہیں جن کے مسودے بڑی محنت سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں میں نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی فلموں یا قصے کہانیوں میں بھی جو دل بہلانے کے ذریعے ہیں۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ ان الفاظ کو اب دنیا کی ہر زبان کی ڈکشنری سے بھی خارج کر دینا چاہیے۔ حق کسے مل رہا ہے اور انصاف کہاں ہو رہا ہے؟ اسرائیل سے کشمیر تک؟ گوروں اور کالوں کی معاشی جنگ میں؟ پسماندہ کہلانے والے اور ترقی یافتہ ممالک میں؟ امیر اور غریب میں؟ اپنی معاشرتی قدروں کو دیکھو جن کے دُہرے معیار ہیں۔ اخلاقی حالت پسِ نظر ڈالو؟"

"یہ فلسفہ مت پڑھاؤ مجھے دلاور! کیونکہ میرا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ جو فرق میری فطرت میں ہے، وہ رہے گا۔ ازل سے آج تک انسان کی سرشت میں نیکی یا بدی کا عنصر اسی لیے غالب رہا کہ سب انسان ایک جیسے نہیں تھے۔ کچھ زہر کا پیالہ دیتے تھے تو کچھ اسے بخوشی لبوں سے لگا لیتے تھے۔ شیطان آدمی کا ازلی دشمن ہے مگر پھر بھی پہچانا جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی بہروپ میں آئے۔ دلاور بن کر یا میر محمد بن کر۔ اور انکل رضوی صاحب یا انسپکٹر شیخ، رابعہ جیسی عورت اور مجھ جیسے کم عقل اور کوتاہ بیں اسے دیکھ لیتے ہیں۔"

"یہ بکواس بند کرو اور بتاؤ کہ ہم یہ باکس کس کے نام ارسال کریں؟" دلاور نے برہمی سے کہا۔

"میرا خیال ہے اسے تم خود اپنے بیوی بچوں کے لیے لے جاؤ۔ بیوی تمہاری شرافت کی اور بچے تمہاری نرم دلی کے قائل ہو جائیں گے دلاور" میں نے کہا "تمہاری عزت پہلے سے زیادہ کرنے لگیں گے۔ پوری داستانِ شجاعت سنا دینا انہیں۔"

"تم مجھے مشتعل کرنا چاہتے ہونا؟" چوہدری دلاور مسکرایا "تاکہ میں تمہارے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کی غلطی کر دوں اور تم کو دوسرا وار میری گردن پر کرنے کا موقع مل جائے۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے نہیں سمجھا حالانکہ تم ذہین بھی ہو۔ حماقت کی حد تک جرأت مند ہونے کے علاوہ۔ اپنا کام کرو پیڈرو! تم کیوں رک گئے تھے؟"

پیڈرو نے خفیف ہو کے سر ہلایا اور ٹین کے اس ڈبے کو بند کر کے چاروں طرف سے گوند سے موٹا سفید کاغذ چپکانے لگا۔ مقفل کرنے سے پہلے اس نے باکس کو کھولا اور بوری میں میرے ذاتی استعمال کی وہ سب چیزیں ڈال دیں جو میری شناخت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ یہ دلاور کے شیطان کے زیادہ قریبی ذہن کا کمال تھا کہ اس نے مجھے نفسیاتی طور پر دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ڈاکٹر تو مر ہی چکا تھا اور دلاور کے لیے اس میں ذاتی صدمے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب ناجائز مقاصد کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے کسی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تو ایک غیر تحریری معاہدے کے تحت یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ اتنا زیادہ معاوضہ درحقیقت اُن خطرات کا ہے جو ہمرکاب ہوں گے۔ بدنامی تو کچھ نہیں۔ زندگی اور موت کے مابین پُل صراط کا سفر طے کرنا ہوگا اور ہر گام پر ایک مرحلہ طلبگارِ جاں درپیش ہوگا۔ یہ کتنا عرصہ وہ اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز پچاس ہزار ماہانہ وصول کرتا رہا۔ اب موت اچانک آگئی تو اصل مع سود برابر ہوگیا۔ یہی کام اتنے ہی معاوضے پر کوئی اور کرے گا اور پھر کوئی اور۔ اس معاملے میں سب سے اہم کاروبار ہے۔ افراد یا پیسہ نہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر جو برضا و رغبت پچاس ہزار روپے سکۂ رائج الوقت پر جلاد مقرر ہوا تھا، اپنی غلطی سے مرا یا کسی اور کی غلطی سے۔ دلاور اینڈ کمپنی کی بیلنس شیٹ میں گھٹ گیا۔ اس کی آخری رسوم مذہبی عقائد کے مطابق ہونے سے اور اس کی مغفرت کے لیے دُعا مانگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس کے نامۂ اعمال پر جہنمی ہونے کی مُہر بہت پہلے لگ چکی تھی۔ بے جان جسم سے دلاور نے تھوڑا سا فائدہ اور اٹھا لیا۔ لاش کو اُس نے گاڑنے اور جلانے یا دبانے کے بجائے میرے لیے سامانِ عقوبت بنا دیا۔ اب یہ لاش جسے بھی ملے گی، انکل رضوی اور شیروانی۔ فوزیہ اور شہلا، انسپکٹر شیخ یا استاد ٹیڈی۔ سب جان لیں گے کہ یہ تحفہ کس نے بھیجا ہے اور نشانیاں دیکھ کر مان لیں گے کہ گوشت پوست کا یہ ڈھیر کس کا ہے۔ نہیں مانیں گے، تب بھی یہ اُن کا دردِ سر ہوگا کہ لاش کو دفن کریں یا پوسٹ مارٹم کے لیے رکھوا دیں۔ شناخت تو ناممکن ہوگی کہ مرنے والا کون تھا۔ میری روح اس منظر کے تصور سے کانپتی تھی جب پلاسٹک کے کفن میں سے نکلنے والے متعفن گوشت اور ہڈیوں کے چورے کو بوری سے برآمد ہونے والی اشیاء کی مدد سے سکندر بخت سمجھا جائے گا۔ ابھی تو سب ہی میری گمشدگی سے پریشان تھے۔ ایسے میں میرے پرس قلم اور گھڑی کے ساتھ موصول ہونے والے باکس کو کھولنے والے کے لیے ذہنی صدمہ کتنا شدید ہوگا۔ شیخ اور انکل رضوی تو پولیس کی نوکری کے باعث ایسے نظارے کے بعد بھی اعصاب پر قابو رکھ سکتے ہیں اور عقل سے کام لے کر طے کر سکتے ہیں کہ یہ اسباب تو سکندر بخت کا ہے لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ پُرزہ پُرزہ جسم بھی سکندر کا ہے؟ انکل شیروانی سول سرونٹ۔ شریکِ حیات کے جُدا ہونے کا منظر دیکھنے والے۔ یہ منظر دیکھ سکیں گے؟ ان کو ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے اور اُن کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ فوزیہ پر ہسٹریا کا دورہ پڑ سکتا ہے اور اس کا ذہن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ شہلا کا کچھ پتا نہیں۔ اس نے اتنے غم جھیلے ہیں اور اتنے دُکھ اٹھائے ہیں کہ شاید اس کی تاب ہی نہ لا سکے۔ پاگل ہو جائے یا خودکشی کر لے۔ صرف رابعہ کے بارے میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کو بھی دامِ فریب سمجھے۔ اس کا دل نہ مانے کہ یہ سکندر ہے اور دماغ تسلیم نہ کرے کہ سکندر کا یہ انجام ہو سکتا ہے۔ مگر ہے تو وہ بھی عورت۔ باشعور اور پیشے کے اعتبار سے وکیل مگر ہر طرح سے صرف محبت کرنے والی عورت۔ باہر سے منطق، دلائل اور عقل۔ اندر سے صرف جذبات کا زمی، عشق کی حلاوت، خوابوں کی آسودگی۔

"دلاور!" میں نے کہا "تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔ مجھے اتنا تو بتا دو کہ رابعہ کہاں ہے؟"

"رابعہ کہاں ہے؟" چوہدری دلاور نے زیرِ لب دُہرایا جیسے یہ سیدھی سادی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آئی "یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ آدمی کے لیے یہ دنیا ہے یا وہ دنیا۔ کہیں نہ کہیں وہ بھی ہوگی۔"

پیڈرو اتنی دیر میں فارغ ہو گیا تھا اور اب کہیں سے لال رنگ کا موٹا مارکر لا کے باکس پر کچھ لکھ رہا تھا لیکن جس سائڈ پر وہ لکھ رہا تھا وہ میرے سامنے نہیں تھی۔

"اب اسے بھجوا دو وہیں جہاں میں نے کہا تھا" دلاور نے کہا۔ اسی وقت سیمسن سے ایک غلطی ہوگئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے ہاتھ کو ہتھوڑا سا ہلایا۔ زمین کھودنے کے انداز میں۔ کیونکہ پیڈرو اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ اس باکس کو دفن کرنا ہے۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ناقابلِ بیان اطمینان کی لذت سے سرشار ہو گیا تھا۔ دلاور نے نہیں دیکھا تھا کہ ایک گینڈے جتنا جسم اور چیونٹی جتنی عقل رکھنے والے غلام نے اس کے سارے ڈرامے کا پلاٹ کلائمکس سے پہلے ہی مجھے بتا دیا ہے۔ اس کی یہ حرکت ایسی ہی تھی جیسے مداری کی ڈگڈگی سے زیادہ اس کے الفاظ پر بندر خود بخود کھڑا ہو جائے۔ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے یا قلابازی کھا کے کوئی کرتب دکھا دے۔ سیمسن بھی ایک بہت بڑا بندر تھا جس کی ڈگڈگی دلاور کے ہاتھ میں تھی۔ محض عقلِ سلیم سے محرومی کے باعث وہ قدرت کی عطا کردہ سماعت اور نطق کی انسانی صفات سے محروم ہوا تھا۔ شاید اس نے کوئی ایسی بات بلاارادہ سُن لی تھی اور انجام کا تصور کیے بغیر کہہ دی تھی جس سے دلاور اینڈ کمپنی کو نقصان ہوا۔ معمولی نقصان ہوتا تو اسے جسمانی مار کی سزا دی جاتی۔ کوڑے مار مار کے اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی یا اس کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا مگر نقصان زیادہ ہوا تھا چنانچہ سزا بھی اسی مناسبت سے ملی تھی۔ اس وقت سیمسن سے پھر بیوقوفی سرزد ہوگئی تھی مگر اس کا ذمے دار پیڈرو بھی تھا جس نے میرے سامنے سیمسن کو اشاروں میں سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر کا کیا کرنا ہے۔ اس کے ہاتھ ہلتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ خونیں تحفہ کسی کو بھی نہیں جائے گا۔ اگر اس وقت میں اپنی خوشی کا اظہار کر دیتا یا بتا دیتا کہ پیڈرو اور سیمسن کی مشترکہ حماقت کے باعث حقیقت مجھ پر عیاں ہوگئی ہے تو ان دونوں کو ہی سزا نہ ملتی، سزا مجھے بھی ملتی ــــ دلاور کو اس خیال سے تسکین تھی کہ وہ مجھے دہشت زدہ کرنے میں کامیاب رہا اور اب یہ احساس میرے لیے سوہانِ روح رہے گا کہ میرے یوں مرنے کی خبر پاکر لواحقین پر کیا بیتے گی۔

"ٹھہرو!" سیمسن نے وہ ڈبا اٹھایا تو میں چلایا "دلاور!

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رحم کرو مجھ پر۔ یہ تو بتا دو کہ میری لاش کسے بھیج رہے ہو؟"

"میں نے تو تم کو انتخاب کا حق دیا تھا۔" دلاور نے ہاتھ اٹھا کے سیمن کو روکا۔" جلو اب بتاؤ۔"

"معلوم نہیں تم کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اگر فوزیہ مر گئی یا شہلا پاگل ہو گئی تو تمہیں کیا ملے گا؟ کوئی عورت یہ بھیانک منظر کیسے دیکھ سکتی ہے؟" میں نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔

"تم پھر فضول باتوں میں اُلجھ گئے۔" دلاور بولا۔" جلدی سے نام بتا دو۔ ورنہ ...."

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔" فوزیہ، رابعہ اور شہلا کو چھوڑ دو۔ وہ کمزور، جذباتی عورتیں ہیں۔ فوزیہ کی شادی ہو چکی ہے اور وہ مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتی لیکن اس کی ازدواجی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی ہے۔ مظلوم رابعہ بھی ہے مگر شہلا سب سے بزدل ہے اور سب سے زیادہ دُکھ اٹھا چکی ہے۔ وہ پاگل ہو کے اپنی جان دے دے گی۔ تم اسے بخش دو۔ انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ ...."

"بس بس۔ وقت نہیں ہے میرے پاس اتنا۔" دلاور بولا۔ "پیڈرو۔ یہ تحفہ شہلا کو پہنچا دو۔"

سیمن اور پیڈرو کے ساتھ جمشید بھی نکل گیا۔ مجھے امید تھی کہ دلاور کا مقصد مجھے زیادہ سے زیادہ اذیت دینا ہے چنانچہ وہ میری بات کیوں ماننے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ بالفرضِ محال یہ تحفہ بھیجنا ہی ہوتا تو اس سے کس کو زیادہ سے زیادہ صدمہ ہوتا۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ شہلا سب سے زیادہ اثر لے گی۔ اس نے حسب توقع شہلا ہی کو باکس بھجوانے کی ہدایت کر دی اور یہ اس کی ایذا پسند فطرت کے عین مطابق تھا۔ وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا اور میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں بیوقوف بن گیا۔ میں نے اس پر اعتبار کر لیا اور اب شدید اندرونی کرب میں مبتلا ہوں جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں جانتا تھا کہ رات کو کسی ویرانے میں ڈاکٹر کی لاش گاڑ دی جائے گی۔ دلاور کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتا تھا۔ میری لاش میرے وارثوں کو بھجوانے سے اسے کیا فائدہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ میری موت کا یقین کر لیتے۔ اس کے لیے وہ سب ضروری تو نہیں تھا جو میرے سامنے ہوا۔ وہ تو صرف مجھے سزا دے رہا تھا ورنہ میرے مرنے کا یقین دلانے کے اور بھی آسان طریقے تھے۔

"دلاور۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔" اس درندگی کے مظاہرے سے تم کو حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ میرے سارے وارث تو نہیں مر جائیں گے۔ تم نے مجھے اور رابعہ کو قتل کر دیا اور شہلا نے خودکشی کر لی تب بھی تین آدمی اور بچیں گے کیونکہ محسن کو تم پہلے ہی مار چکے ہو۔ وہ تین ہماری جگہ مزید چار افراد کو نامزد کر دیں گے اور کاروبار اس زندگی میں کبھی صرف تمہاری ملکیت نہیں بنے گا۔ وارثوں کی اس قطار میں انکل رضوی اور انسپکٹر شیخ بھی ہیں۔ جس دن وہ تمہارے پارٹنر ہو گئے ...."

"اپنے سکندر صاحب، آپ بولتے بہت ہو۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔" کس نے کہا ہے آپ سے کہ ہم رابعہ یا خدانخواستہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ محسن تو اپنی بہادری کی وجہ سے مارا گیا ہے۔"

"تو پھر کیا مقصد ہے مجھے یوں اغوا کرلانے کا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس دل چاہتا تھا کہ آپ کچھ دن ہمارے مہمان رہیں۔ رابعہ بی بی تو اپنے گھر میں ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟" میں نے دھڑکتے دل پر قابو پا کے کہا۔

"ثبوت تو میں ابھی فراہم کر دیتا۔ ٹیلی فون پر بات کروا دیتا تمہاری۔" وہ بولا۔" لیکن اس میں تھوڑا سا خطرہ ہے۔ تمہارے انکل کی لائن پر یقیناً آبزرویشن ہو گی۔ تمہاری گفتگو ٹیپ ہونے میں تو ہمارا کچھ نہیں جاتا لیکن یہ نمبر معلوم ہو جائے گا جہاں سے کال کی گئی۔ تم کوئی اور نمبر بتا دو۔"

"نمبر تو رابعہ کے آفس کا بھی ہے۔" میں نے کہا۔" شیخ کے گھر کا ہے۔"

"ہوں۔" وہ سوچ کے بولا۔" اچھا میں بندوبست کرتا ہوں کہ تم بات کر لو۔ پہلے میں تصدیق کر لوں کہ جو نمبر تم دو گے وہ بھی آبزرویشن پر تو نہیں ہیں۔ اگر نہ ہوئے تو میں رابعہ کے لیے پیغام دے دوں گا کہ کل کسی وقت وہاں آ جائے اور تم سے بات کر لے۔ شرط یہی ہے کہ لائن آبزرویشن پہ نہ ہو۔ اگر کل تک یہ انتظام کر لیا گیا تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر بات نہیں ہو سکے گی۔ نمبر بتاؤ۔"

میں نے اسے نمبر دیے اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ پہلے کی طرح پھر نمبر ڈائل کرنے کی آواز نہیں آئی۔" ہیلو۔ دیکھو پتا کرو کہ ضامن رضوی سابق ایس ایس پی کی لائن ٹیپ ہو رہی ہے یا نہیں۔ یہی بات دو اور نمبروں کے لیے معلوم کرنی ہے۔ نمبر لکھو۔ ہاں .... اور دیکھو مجھے ابھی بتاؤ آدھے گھنٹے میں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف دلاور ایک نامعلوم لاش بھجوا کے میری موت کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فون پر براہ راست رابعہ سے بات کرا کے مجھے زندہ

ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ پہلی بات تو ڈراما تھی جس کا دلاور ماہر تھا مگر یہ دوسری بات، یہ بھی ڈراما ہو گی؟

"مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟ ٹانگ ٹھیک ہونے تک؟" میں نے واپسی پر اس سے پوچھا۔

"اب اتنی بھی کیا جلدی ہے اپنے سکندر صاحب۔ آپ اپنے گھر میں آرام سے رہو۔ کھانے کی کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ۔ ڈاکٹر کل دوسرا آ جائے گا۔ چاہو تو اسے بھی مار دینا۔ وہ تحفہ فوزیہ کو پہنچ جائے گا۔ زمانہ بڑا عجیب ہے۔ عجیب کیا ہے، پیسے کا ہے۔ تم جتنے چاہو بندے مارو۔ بازار میں جو چیز آج کل بہت لوگ بیچ رہے ہیں وہ ضمیر ہی ہے۔ اس کے پیسے اچھے مل جاتے ہیں نا۔ وطن دشمن اور غدار۔ پیشہ ور مجرم۔ ہر غیر قانونی اور ناجائز کام کرنے والے کم نہیں۔ علاج تمہیں کرانا ہے، مجھے نہیں۔ ایسے بندے مارتے جاؤ گے تو اپنا ہی دُہرا نقصان کرو گے۔ ہم لاش آگے بھیجتے رہیں گے اور تم یہاں پڑے رہو گے اسی طرح۔"

"پھر بھی مجھے کب تک قید رکھو گے؟" میں نے کہا۔

"یہی کوئی سات سال تک۔" دلاور بے نیازی سے بولا۔ "زیادہ دن لگے تو آٹھ نو سال۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔" آٹھ نو سال۔ تمام عمر کیوں نہیں اور اس سے کیا حاصل؟" میں نے کہا۔" تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے۔ سات آٹھ یا نو سال تک تم مجھے کیوں زندہ رکھو گے؟"

"ہر بات میں کوئی مصلحت ہوتی ہے اپنے سکندر صاحب۔" وہ بولا۔" اب فرض کرو ہم تمہیں مار دیں تو ہمیں کیا فائدہ ہو گا؟ تم نے تو پکا بندوبست کر رکھا ہے۔ لائن لگا رکھی ہے کہ الف مر جائے تو ب اور ب مر جائے تو جیم تمہاری جگہ وارث ہو گا اور میر وزیر اینڈ کمپنی کا وارث بن جائے گا۔ خود وہ لوگ ایسے ہیں کہ پکا کام کرتے ہیں۔ تم سے کم نہیں۔ ظاہر ہے ان سب کو نہیں مارا جا سکتا۔ تم پہلے ہو، دوسرا محسن تھا۔ اُوپر بھی اندھے نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ پوچھیں گے ضرور کہ چوہدری صاحب یہ قصہ کیا ہے۔ جو بھی میر وزیر اینڈ کمپنی میں آپ کا پارٹنر بنتا ہے، قتل ہو جاتا ہے! اب آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ حقِ وراثت کا سرٹیفکیٹ آپ کے نام سے جاری ہو گیا ہے۔ عدالت نے احکامات تو صادر کر دیے ہیں لیکن آپ خود کیسے جاؤ گے عدالت میں یہ سرٹیفکیٹ لینے کے لیے۔ عدالت انتظار کرے گی۔ دوسری عدالت جس میں قتل کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے، انتظار نہیں کرے گی اور آپ کی غیر حاضری پر ضمانت منسوخ کر دے گی۔ آپ کے وارث کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی انتظار کریں گے۔ تلاش کریں گے۔ ساری دنیا کی خاک چھان ماریں گے۔ اگر لاش مل جائے اور شناخت ہو جائے تو قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ حقِ وراثت دوسرے شخص کو منتقل ہو جاتا ہے لیکن پہلا آدمی ملے ہی نہیں تو اسے کیسے مردہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اس کے لیے سات سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی عدالت کو درخواست دی جا سکتی ہے کہ اب فلاں گم شدہ شخص کی بازیابی کا کوئی امکان نہیں چنانچہ اسے مُردہ قرار دے دیا جائے اور فلاں کو اس کا وارث تسلیم کر لیا جائے۔ جس بیوی کا شوہر گم ہو جائے وہ سات سال تک دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ جنگ کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سپاہی لاپتا ہو جاتے ہیں اور کسی ذریعے سے ان کی موت کی تصدیق نہیں ہوتی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ دشمن کے قیدی بن گئے۔ قید میں مر گئے یا قید سے فرار ہو گئے۔ چنانچہ ان کی بیویوں کو سات سال تک شوہر کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری واپسی کا انتظار بھی سات سال تو ہو گا اور اس عرصے میں چار چھ ماہ تک میں بھی سخت تشویش میں مبتلا رہوں گا کہ میرا اتنا لائق فائق قانونی پارٹنر کدھر گیا۔ پھر کوئی اور تمہاری جگہ لینے آئے گا اور عدالتی کارروائی ہو گی۔ اسی لیے میں نے کہا کہ کم سے کم سات سال۔ آٹھ یا نو اس لیے کہے کہ عدالت کو سال دو سال لگ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں رابعہ اتنا عرصہ تمہارا انتظار کرے گی یا نہیں۔ مگر ہمارے لیے آٹھ نو سال کی مہلت بہت ہے۔ ظاہر ہے عملی طور پر میں ہی سارے کاروبار کو چلاؤں گا۔ کاروبار میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی۔ آگے کچھ یوں ہو گا کہ کاروبار سال بھر بعد گھاٹے میں جانے لگے گا۔ کبھی آگ لگ جائے گی، کبھی ہڑتالی توڑ پھوڑ کر دیں گے۔ ڈاکا پڑ جائے گا۔ کوئی عمارت بیٹھ جائے گی۔ ان آفات کا انجام یہ ہو گا کہ کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔ چار پانچ سال میں اس کا ملبہ اور جگہ رہ جائیں گے۔ وقت آنے پر اس کا قبضہ تمہارے وارثوں کو دے دیا جائے گا۔ شاید میں اس وقت نہ ملوں۔ پہلے ہی کاروبار سے دستبرداری کا اعلان کر کے نکل جاؤں گا۔ میرے ساتھیوں میں سے کوئی بھی نہیں ملے گا کیونکہ ہم کاروبار کو منتقل کر چکے ہوں گے۔ کسی اور شہر یا کسی اور ملک میں۔ ہاں، پولیس تمہیں منتظر ملے گی، میر شرافت علی کے قتل کے کیس میں گرفتار کرنے کے لیے۔"

میں خاموش لیٹا سنتا رہا۔ چوہدری دلاور کا یہ منصوبہ بھی بہت مکمل تھا۔

"اور تمہیں یقین ہے کہ تم آٹھ نو سال تک خود بھی زندہ رہو گے؟" میں نے کہا۔" میں بھی زندہ رہوں گا اور اسی طرح تمہاری قید میں جیسے اس وقت ہوں۔"

"معاف کرنا، میں بشرطِ زندگی کہنا بھول گیا تھا۔" دلاور نے طنز سے کہا۔" کل کیا ہو گا اس کا دعویٰ سو فیصد یقین کے ساتھ کس نے کیا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں۔ سامان سو برس کا پل کی خبر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نہیں۔ تو یہ بھی میرا ارادہ ہے یا منصوبہ ہے اور منصوبے تو حکومت بھی بناتی ہے۔ ایک پنج سالہ منصوبہ، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے اور ہر سال بجٹ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ آئندہ ایک سال میں کیا ہوگا۔ آدمی گھر بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کے لیے دن رات محنت کرتا ہے اور پس انداز کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موت پر ہر لحظہ یقین رکھنے کے باوجود اور ہر سانس کو آخری سانس شمار کرنے کے باوجود ہر شخص زندگی کے کاروبار میں مگن ہے اور اس کی نظر آنے والے وقت پر ہے۔"

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور بے مقصد نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کیا ہے۔ ایک طرف تم میری لاش ارسال کر رہے ہو کہ لواحقین کو میری موت کا یقین آجائے۔ دوسری طرف رابعہ سے بات کرا رہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا جواب دیتا، دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دلاور اٹھ کے دوسرے کمرے میں گیا۔ "ہاں۔" میں نے اس کی آواز سنی۔ "تم نے اچھی طرح معلوم کرلیا ہے نا؟ کیسے؟ کون ہے ڈیوٹی پر ٹیلیفون ایکسچینج میں؟ اچھا.... اچھا ٹھیک ہے۔" بات ختم ہوگئی اور وہ ٹیلی فون اٹھائے نمودار ہوا۔ یہ عام ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس میں چوڑائی کے رُخ ایک حصے میں صفر سے نو تک ہندسوں والے نمبر تھے جن کو ڈائل گھمانے کے بجائے صرف انگلیوں سے دبانا کافی تھا مگر چند بٹن اس کے علاوہ تھے۔ دوسرے حصے میں لکیریں سی یہ ظاہر کرتی تھیں کہ پیچھے اسپیکر ہوگا۔ ٹیلی فون کے ساتھ ساتھ یہ تین لائنوں کا انٹرکام بھی تھا جسے ایک گھر یا آفس میں تین ٹیلی فون لگا کے آپس میں گفتگو کے لیے یا کال کو ایک فون سے دوسرے فون پر منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی ایجاد نہیں تھی۔ بازار میں اس قسم کے سیٹ عام ملتے تھے۔

"لو بھئی۔ سابق ایس ایس پی صاحب نے اپنے گھر اور رابعہ کے آفس کی لائن پر تو آبزرویشن لگا رکھی ہے۔ تمہارے شیخ صاحب کا فون البتہ محفوظ ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اب میں نمبر ملاتا ہوں۔ تمام گفتگو میں یہیں بیٹھ کے سنوں گا۔ تم کسے پیغام دو گے؟"

"اگر شیخ ڈیوٹی پر ہوا تو اس کے والد ہوں گے یا نازو ہوگی، اس کی بہن۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پیغام میں تم صرف اتنا کہو گے کہ رابعہ کو فون کر کے بلا لیا جائے۔ اسے بتا دیا جائے کہ سکندر بات کرے گا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں اور یہ بات بھی صرف رابعہ کو بتائی جائے گی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر آئے گی۔ اگر کسی اور کو معلوم ہوا تو بات نہیں ہو سکے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "تم نمبر ملاؤ اور پیغام بھی خود ہی دے دو۔"

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہو سکتا ہے ایک اجنبی کی آواز پر اعتبار کوئی نہ کرے۔" وہ نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ لیکن فون کو اس نے اس انداز سے گود میں رکھا کہ میں نمبروں پر اس کی ایک انگلی کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکوں۔ ڈائل ہوتا تو اس کے گھومنے کی آواز سے مجھے ایک بات ضرور معلوم ہو جاتی کہ نمبر لوکل ہے یا اس نے ٹرنک نمبر ڈائل کیا ہے۔ پانچ بار نمبر ملانے کا مطلب ہوتا کہ بات لاہور ہی میں ہو رہی ہے۔ سات بار ڈائل گھومتا تو اس بات کا ثبوت ہوتا کہ ڈائریکٹ ڈائلنگ سے لاہور یا کراچی ملایا گیا ہے اور میں پنڈی میں ہوں۔ یا پھر کراچی میں۔

"ہیلو! کون بول رہا ہے؟" دلاور نے کہا اور میرا دل بے اختیار دھڑکا۔ اس خیال سے کہ میں دشمن کی قید سے اپنے گھر اپنی خیریت کی اطلاع دوں گا۔ جنگی اسیر اپنے زنداں سے ریڈیو کے ذریعے اپنے گھر والوں کو پیغام ارسال کرتے تھے اور وہ سب جن کے باپ بیٹے یا بھائی محاذ سے لوٹ کر نہیں آئے تھے اور لاپتا ہو گئے تھے دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ریڈیو کے گرد جمگھٹا لگائے، سانس روکے گوش بر آواز رہتے تھے۔ ان کے چہروں کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا: جو بیک وقت امید اور ناامیدی، خوف اور غم و اندوہ میں مبتلا، اپنی دعاؤں کی قبولیت پر اعتماد کے باوجود عدم اعتماد کا شکار، آس کا دامن تھامے بیٹھے رہتے تھے اور جب اچانک، بالکل لاٹری میں نکل آنے والے انعام کی طرح کوئی نام آجاتا تھا۔ "میں سپاہی فلاں ولد فلاں۔ فلاں علاقے کا رہنے والا اپنے گھر والوں کو سلام کہتا ہوں۔ میں دشمن کی قید میں ہوں۔ بالکل فکر نہ کریں۔" اور اس وقت اچانک کوئی فرطِ مسرت سے چلانے لگتا تھا۔ رونے لگتا تھا، بلکنے لگتا تھا اور ہنسنے لگتا تھا۔ سُنا کا کے دی ماں! وہ زندہ ہے۔ تیرا شکر ہے مولا۔ اور دوسرے جن کے حصے میں ابھی خوشی کا نامہ بر یہ لمحہ نہیں آیا تھا، بڑے رشک سے، اپنے دُکھ کے باوجود انہیں مبارکباد دیتے تھے۔ زندہ ہے تو کسی دن لوٹ بھی آئے گا۔ دشمن کی قید میں ہے تو کیا۔ کسی نامعلوم محاذ پر بے گور و کفن تو نہیں پڑا ہے۔ اس پر سے کوئی ٹینک تو نہیں گزرا۔ اور جب وہ اتنے مرحلوں سے گزر گیا تو قیدِ زنداں کی مشکلات سے بھی گزر جائے گا۔ یہ تصویر کا بہت پرانا نقش تھا جو ہنوز میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ ان جذبات کی تمام شدت کے ساتھ جو میں نے انتظار کرنے والوں کی صورت پر دیکھے تھے۔ پل بھر میں وہی تصویر بدلے ہوئے وقت اور کردار کے ساتھ زندہ ہوگئی۔

"ہیلو۔ کون ہیں جی آپ؟ کس سے کام ہے آپ کو؟" چھوٹے اسپیکر سے نازو کی آواز آئی۔

"نازو بی بی! سکندر صاحب بات کریں گے آپ سے۔" دلاور نے سکون سے کہا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

"نازو!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"

"سکندر!" نازو کی ہسٹریائی چیخ سنائی دی۔ "کہاں ہو تم۔ اللہ۔ کتنے پریشان ہیں سب۔"

"سنو نازو! چیخ پکار مت مچاؤ۔" میں نے کہا۔

"شور کیسے نہ مچاؤں۔ یہاں سب کی حالت خراب ہے۔" نازو اب رونے لگی تھی۔ "یہ کیا کرتے ہو تم؟"

"نازو! میری بات سن لو پہلے۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ رابعہ سے بات کر لوں لیکن رابعہ کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کرنا مشکل تھا۔" میں نے کہا۔ "انکل نے لائن پر آبزرویشن رکھوا دی ہے۔ اس لیے تم کو.... تمہارے گھر فون کرنا پڑا۔ اب تم ایسا کرو کہ اسی وقت رابعہ کے پاس جاؤ۔ رکشا ٹیکسی کر کے یا کسی بھی طرح اور یہ رونا دھونا بھی بند کرو۔"

"میں بھائی جان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔" وہ بدستور سسکیاں لیتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ فون مت کرنا اُسے۔ سُنا تم نے۔ اور شیخ سے...."

"میں بُلا لیتی ہوں اُن کو بھی...."

"نہیں نہیں... ایسا غضب مت کرنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ صرف رابعہ سے کہنی ہے یہ بات کہ میں بات کرنا چاہتا ہوں، تمہارے گھر میں۔ اسے ساتھ لے آنا لیکن نہ شیخ کو معلوم ہو کہ تم نے رابعہ سے کیا کہا ہے اور نہ کسی اور کو۔ رابعہ سے کہنا چُپ چاپ تمہارے ساتھ آجائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر ورنہ میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی...."

"کیوں؟ تم کسی کی قید میں ہو کیا؟" نازو نے روتے ہوئے کہا۔

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ اگر تمہارے بھیا یا انکل کو معلوم ہوا تو وہ پولیس والوں کی طرح اس نمبر سے بھی کال ٹریس کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے اور یہ لوگ... جنہوں نے مجھے بات کرنے کی اجازت دی ہے... ان کے تعلقات اور وسائل بہت وسیع ہیں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا۔ اس لیے یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہیے۔ میری قسم کھا کے کہو کہ ایسا ہی ہوگا۔"

"اپنی قسم دیتے ہو مجھے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "کیوں؟ بولو سکندر؟"

"بس نازو... میں پھر فون کروں گا... ایک گھنٹے بعد۔" میں نے کہا۔

"سکندر!" وہ چلائی۔ "ابھی بند مت کرنا۔ خدا کے لیے.... ایک بات مجھے بھی کہنے دو... جو میں ابھی تک نہیں کہہ سکی تھی.... ایسا نہ ہو.. خدا نہ کرے... کہ میں... پھر کوئی اجازت نہ دے... یا مہلت نہ ملے۔ مجھے یا تمہیں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہے گی لیکن میں مجبور تھا اور کوشش کے باوجود ریسیور نہ رکھ سکا۔ "جلدی بولو نازو۔"

"بات... بات بہت چھوٹی سی ہے... اور بہت بڑی ہے... میں تم سے محبت کرتی ہوں سکندر... اس کے باوجود کہ تم رابعہ کو چاہتے ہو اور کبھی میرے نہیں ہو سکتے... یہ میرے اختیار کی بات نہیں رہی کہ تمہیں نہ چاہوں.."

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن نازو میرے تصور میں اسی طرح ریسیور تھامے کھڑی رہی۔ اس کی آواز اب بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی: سکندر... سکندر۔ تم سُن رہے ہونا... ہیلو... ہیلو...!

"زندگی میں اتنے چاہنے والے مجھے نہیں ملے۔" دلاور مسکرایا۔ "میں کیا کہوں تمہیں، خوش نصیب یا بدنصیب؟"

"خود تم نے کسے چاہا دلاور؟" میں نے کہا۔ "کس کی آرزو کی؟ صرف مال و زر کی۔ تمہارے دل میں چاہت کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ تمہارا دل تو سونے کا ایک ڈلا تھا۔ صرف دماغ تھا تمہارے پاس۔ اس سے تم نے جو چاہا پالیا۔ اب شکوہ کیسا۔ کچھ لوگوں کے نقطۂ نظر سے تم انتہائی خوش نصیب ہو۔"

"تم پر اس لیے افسوس ہوتا ہے کہ اپنی خوش نصیبی کو تم نے اپنی اَنا پر قربان کر دیا۔" وہ بولا۔ "یہ اَنا کا مسئلہ آخر کیا تھا۔ احمقانہ جذباتیت۔ جوانی کی شوریدہ سری۔ عاقبت نااندیشی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تم دس بیس لاکھ روپے لے کر واپس چلے جاتے۔ فوزیہ، رابعہ اور نازو جیسی لڑکیاں ہی کیا ساری دنیا کی رنگینی ہی اس عمر میں تمہارے لیے تھی۔ عقل کی آنکھ سے دیکھتے تو دنیا تمہیں بیس لاکھ کی روشنی میں بڑی خوبصورت نظر آتی۔ لیکن تم الٹے چکر میں پڑ گئے۔ گڑے مُردے اکھاڑنے کے، انتقام کے اور محاورے کے مطابق، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے چکر میں۔ اب تک کیا ملا ہے تمہیں اور میرا کیا گیا ہے۔ کبھی نفع نقصان کی بیلنس شیٹ دیکھو۔ گھاٹے میں کون جا رہا ہے؟ تکلیف کون اُٹھا رہا ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ تم آج کی بات کر رہے ہو اور میں کل کو دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کون سے کل کو؟ وہ جو گزر گیا، یا وہ جو آئے گا ہی نہیں؟" دلاور نے پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

"دونوں کو۔ جو کل ہوا اُسے بھلانا میرے بس کی بات نہیں اور آنے والے دن پر میرا اعتقاد کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا خواہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حالات اس سے بھی زیادہ سخت ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔" دلاور نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ٹیلی فون آنے سے پہلے۔ کہ تمہاری وفات کا ثبوت فراہم کرنے کے بعد تمہاری گفتگو کرانے میں کون سی عقلمندی ہے؟ تو اپنے سکندر صاحب۔ وہ تحفہ پہنچے گا دو چار دن بعد۔ بات کرو گے تم ابھی۔ نکالنے والے تو یہی نتیجہ نکالیں گے تاکہ تم بعد میں مارے گئے کسی غلطی کے باعث۔ بعض اوقات بہادری بھی تو غلطی بن جاتی ہے اور اس میں کسی کو شک نہیں کہ تمہیں بہادر بننے کا بہت شوق ہے۔ پھر کچھ دن یہی سسپنس چلے گا کہ تم زندہ ہو یا نہیں اور ہو تو کہاں ہو؟ اخبارات سے ہمیں معلوم ہوتا رہے گا کہ تمہارے انکل کیا توپ چلا رہے ہیں اور تمہارے چاہنے والے کہاں کہاں کی خاک چھان رہے ہیں؟"

"گویا تمہیں یقین نہیں کہ اس لاش کا تحفہ وصول کرنے کے باوجود بھی ان کو میری موت کا اعتبار آئے گا؟"

دلاور ہنسا۔ "ارے وہ ایس ایس پی بہت ہوشیار ہے اور اس کے ساتھ ہے ایک تو تمہاری سب کچھ۔ وکیل، محبوبہ، منگیتر۔ وہ بھی کم چالاک نہیں۔ تیسرے شیخ جی ہیں۔ وہ چھان بین کر کے پتا چلا لیں گے کہ لاش کسی اور کی ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد ہم پھر کہیں سے تمہاری آواز سنوا دیں گے انہیں۔"

"کتنے عرصے بعد؟" میں نے محسوس کیا کہ میرے لہجے میں مایوسی کا عنصر غالب آنے لگا ہے۔

"بھئی ابھی تو بات کی ہے تم نے۔" دلاور بولا۔ "اب چار چھ مہینے کی مکمل خاموشی ضروری ہے۔ جب دیکھیں گے کہ وہ کچھ مایوس ہونے لگے ہیں تو انہیں اُمید کا دوسرا انجکشن دے دیں گے۔"

"لیکن تم نے تو ابھی طلب کیا ہے رابعہ کو۔ ایک گھنٹے میں۔"

دلاور قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بھولے بادشاہو۔ رابعہ آتی ہے تو آنے دو۔ وہ بیٹھی رہے گی۔ انتظار کرتی رہے گی، شام تک یا رات تک۔ اصل مقصد تو حاصل ہو گیا۔ نازو نے تمہاری آواز پہچان لی۔ تم سے بات کر لی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ تم قیدی ہو اور مجبور ہو۔ اتنا کافی ہے۔ اب وہ رو رو کے اور قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو یقین دلاتی رہے گی کہ غلط فہمی کا کوئی سوال نہیں۔ آواز سکندر کی تھی لیکن اور کسی سوال کا جواب نہ دے سکے گی۔ کرنے والے تو اس سے ہزاروں سوال کریں گے۔ تحریری بیان لیں گے۔ ایک ایک لفظ جو تم نے کہا یا اس نے کہا لکھ کر دینے کو کہیں گے۔ سوائے اس آخری بات کے وہ سب لکھ دے گی اور بتا دے گی مگر اس کے بعد فل اسٹاپ۔

اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

صرف ٹیلی فون تھا جو میں اس پر پھینک کر مار سکتا تھا۔ وہ اُٹھ کر دو ہی قدم گیا تھا کہ میں نے گالیاں دیتے ہوئے ٹیلیفون اس کے سر کا نشانہ لے کر پھینکا۔ مگر ٹیلی فون کے ساتھ تار تھا، چنانچہ دلاور بال بال بچ گیا۔ ٹیلی فون اس کے جسم سے چند انچ دور رہ گیا اور تار کی لمبائی ختم ہو جانے کے بعد جھٹکے سے نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔

"ویسے کوئی نہ کوئی تمہاری خبر گیری کے لیے یہاں ہر وقت موجود رہے گا۔" دلاور نے ٹیلی فون کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اور تمہاری ہر ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ پھر بھی کسی چیز کی کمی ہو یا مجھ سے کوئی بات کرنی ہو تو بتا دینا۔ جیسے ہی مجھے فرصت ملی، میں آ جاؤں گا۔" اس نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

کمرے کے اندر اپنی اسیری اور تنہائی کا احساس پوری شدت کے ساتھ مجھ پر مسلط ہونے لگا۔ میرے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں تھی اور میرے ہاتھ بھی آزاد تھے لیکن میں اٹھ کر کھڑکی تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جسمانی طور پر نقل و حرکت کے قابل ہونے تک اس قید سے نجات کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ زنداں کی دیواروں سے نکلنے اور فرار ہونے کے لیے جسمانی قوت بغیر صحت کے نہیں حاصل ہو سکتی تھی چنانچہ ابھی تو میرے لیے سوائے لیٹے رہنے کے کوئی کام نہ تھا۔ کسی سے بات کیے بغیر اور بالکل بے کار لیٹ کر چوبیس گھنٹے کا پورا دن کیسے کٹے گا۔ صبح کرنا شام کا اور پھر شام کرنا صبح کا دونوں ہی جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہوں گے۔ اس پر وہ ذہنی عذاب جو تصور دے گا جو ہر تصویر پیش کرے گا۔ ان سب کی صورت پر رنج و الم کی ہر کیفیت کا عکس دکھائے گا جو دن رات کے ہر لمحے میں پریشان ہوں گے۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق رہیں گے اور ایک موہوم اُمید پر جئیں گے۔ اچھا ہوتا اگر ایک ہی بار وہ مان لیتے کہ سکندر دنیا سے خالی ہاتھ گیا لیکن وہ میری آواز سن چکے ہیں۔ انہیں میری زندگی کا یقین آ چکا ہوگا۔ رابعہ نے پہلے ہی بتا دیا ہوگا کہ مجھے کن حالات میں اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ اب نازو بتا دے گی کہ میں نے اسے کیوں فون کیا تھا؟ مجھے اکیلا پا کے بھیانک خیالوں کے عفریت ہر سمت سے نمودار ہونے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں نوکیلے خنجر اور بھالے تھے جن سے وہ دل کو چھیدتے تھے۔ ان کی زبان خاردار تھی جو روح کو زخم دیتی تھی اور ان کی آنکھیں زہر کے پیالے جو نزع کے کرب میں مبتلا تھے۔ کیا محسن سچ مچ مر گیا؟ بالآخر؟ کب سے وہ اس جنگ میں میرے ساتھ تھا۔ ہر فتح اور ہر شکست میں شریک تھا۔ میرے لیے اتنا ہی ناگزیر ہو چکا تھا جتنا روح کے لیے ایک جسم کا وجود۔ اب یہ ذہن

کرنا کہ اس کو کفن میں لپیٹ کر کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور قبر میں رکھ کے اس پر مٹی ڈھیر کر دی گئی۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ہاہاہا۔ دلاور کی ہنسی ایک بازگشت بن کے گونجی۔ ہم سب مر سکتے ہیں سکندر اعظم۔ کیا اور لوگوں کو مرتے نہیں دیکھا تم نے؟ محسن کیا لافانی تھا؟ تھا تو انسان ہی نا۔ انسان فانی ہے۔

یہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ چوہدری دلاور بہت بڑا ڈرامے باز تھا۔ ایکٹر، ڈائریکٹر اور سنسنی خیز پلاٹ بنانے والا۔ ابھی ابھی دو بار اس نے اپنے جھوٹ کے سچ ہونے کا یقین دلا دیا تھا۔ اس نے مجھے واقعی دہشت زدہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹر کی لاش کو میری لاش بنا کے شہلا کے نام ارسال کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ ایک انتہائی اذیت دہ اور ہولناک تجربہ تھا۔ پھر اس نے شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ کچھ دیر میں میری بات رابعہ سے ہو گی اور پھر چٹکی بجا کے خواب آرزو کو ختم کر دیا۔ عین اس وقت جب تصور رابعہ کو روبرو دیکھ رہا تھا اور اس سے ہمکلام تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا لیکن اس کی باتوں میں آ کے میں نے ایک موقع گنوا دیا تھا۔ میں نے نازو سے وہ سب نہیں کہا تھا جو میں رابعہ سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میں اس سے کیا کہوں گا اور کیا کہہ سکوں گا لیکن میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ واضح الفاظ میں نہ سہی اشاروں میں کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ نازو کی نسبت رابعہ زیادہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ وہ سمجھ لیتی لیکن اب وہ شیخ کے گھر میں ٹیلی فون کے پاس گم صم بیٹھی ہو گی۔ ایک ایک لمحے کا انتظار ایک صدی کا انتظار ہو گا۔ لیکن ٹیلی فون چپ رہے گا۔ اس کی گھنٹی اگر بجے گی تو محض دھوکا دینے کے لیے۔ جھوٹی اُمیدوں کا مذاق اُڑانے کے لیے۔

یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکتے رہنا جانکنی کی تکلیف سے کم نہ تھا۔ کاش کوئی مجھے صرف اتنا بتا سکتا کہ محسن زندہ ہے اور رضوی صاحب کو میری وجہ سے مستعفی نہیں ہونا پڑا۔ دلاور کے جھوٹ کا پردہ محسن کی ایک غیر شعوری حرکت نے چاک کر دیا تھا۔ پیڈرو کے ایک جھوٹ کو دلاور نبھانے میں ناکام رہا تھا۔ پیڈرو نے مجھ سے رابعہ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ رضوی صاحب کے گھر میں تو یقیناً نہیں ہے مگر دلاور نے کسی تذبذب کے بغیر بتا دیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سب جھوٹ ہو جو میرے سامنے سچ بنا کے پیش کیا گیا تھا۔ وہ صرف مجھے اغوا کرانے ہوں۔ اغوا کی اس واردات کے محرکات کیا تھے، یہ دلاور مجھے اچھی طرح سمجھا گیا تھا۔ کسی اور سے ان کو غرض نہ تھی چنانچہ ان کو گزند پہنچانا غیر ضروری تھا۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اس رات حملے کے بعد وہ مجھے بیہوشی کے عالم میں اٹھا لائے۔ محسن اور رابعہ کسی وجہ سے ان کا تعاقب نہیں کر سکے۔ حملہ آوروں کی گاڑی تو پھنس گئی تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے اسی گاڑی میں ڈال کے فرار ہوئے ہوں جس میں رابعہ تھی۔ میری نگاہ پھر دیوار پر گئی۔ وقت اور تاریخ نظر کا دھوکا نہیں تھے لیکن یہ عقل کو فریب دینے کا ایک طریقہ ہو سکتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کو اگر گھما کر چوبیس گھنٹے آگے کر دیا جائے تو تاریخ خود بخود ایک دن آگے بڑھ جاتی ہے۔ ایسے سات دن آگے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے باور کرانے کے لیے کہ گزشتہ شب کا واقعہ درحقیقت ایک ہفتہ پہلے پیش آیا تھا۔

پیڈرو نے یہ بھی کہا تھا کہ تمام واقعات اخباروں میں آ چکے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ تھا تو انتہائی احمقانہ جھوٹ تھا جو پیڈرو تو بول سکتا تھا لیکن دلاور کبھی نہ بولتا۔ میں ثبوت کے لیے اخبار مانگ سکتا تھا۔ ایک بار تو اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے ٹال دیا تھا لیکن ایسے وہ کب تک ٹالے گا؟ اور ٹالے گا تو اس کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔ پھر میں نے اس امکان پر غور کیا کہ کیا وہ تاریخ بدل کے یا مٹا کے مجھے کوئی اخبار دکھا سکتا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اخبار کے ہر صفحے پر ہی نہیں، ہر خبر کے ساتھ تاریخ ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ دو دن پہلے کی ہو سکتی ہے۔ وہ خبر کون چھاپتا ہے جو تین دن پرانی ہو۔ بیشتر خبروں پر گزشتہ دن کی تاریخ ہو گی۔ چوہدری دلاور کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ وہ ایک اخبار چھاپ کے مجھے پیش کر سکتا تھا جس میں مجھے ہر خبر مل جائے اور تاریخ بھی لیکن یہ کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرنے کے مقابلے میں انتہائی دشوار کام تھا۔ اخبار کا ایک صفحہ ترتیب دینا بھی عقل اور ذہانت کا، تجربے اور مہارت کا اور خالص تکنیکی نوعیت کا کام ہے۔ اہمیت کے اعتبار سے ہر صفحے پر خبر کا انتخاب۔ سرخی کی تشکیل۔ متن کا مضمون۔ کتابت اور طباعت، سب زرعی آلات بنانے سے مختلف کام تھے۔ ہر اخبار میں سیکڑوں خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے صفحے پر بین الاقوامی۔ اندر ایک صفحہ شہر کی مقامی خبروں کا۔ پھر ڈسٹرکٹ کی خبریں جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے نمائندے ایک سے ایک غیر معروف مقام سے ارسال کرتے ہیں۔ پریس ریلیز اور بیانات۔ فیچر اور تصاویر۔ نہیں یہ کام چوہدری دلاور اپنا تمام پیسہ اور اثر و رسوخ استعمال کر کے بھی نہیں کر سکتا۔

سیدھا طریقہ یہ تھا کہ میں پیڈرو سے گزشتہ ایک ہفتے کے اخبارات طلب کروں اور اس مطالبے کو اس کی جان کے لیے عذاب بنا دوں یہاں تک کہ وہ ٹالتے ٹالتے تنگ آ جائے اور صاف انکار کر دے۔ اس کا انکار دراصل اقرار ہو گا کہ اس نے صرف جھوٹ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بولا تھا لیکن پیڈرو ہے کہاں؟ میں نے کان لگا کے آواز سننے کی کوشش کی مگر اس گھر میں تو جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ ہر سمت ایک گہرا سکوت تھا۔ بوجھل اور بے کراں۔ باہر سے بھی کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ نہ کسی گاڑی کے گزرنے کی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی۔ میں گوش بر آواز رہا تھا۔ کہیں کوئی بچّہ رونے، کوئی قہقہہ مار کے ہنسے، کسی کے ہاتھ سے کوئی برتن گرے، کوئی دروازہ کھلے یا بند ہو۔ زندگی اپنے وجود کا کوئی تو ثبوت دے لیکن آس پاس صرف سنّاٹا تھا جس میں کسی پرندے کی صدا تک نہ تھی۔ یہ کیسا ویرانہ ہے۔ میں نے سوچا۔ ورنہ چڑیاں کہاں نہیں بولتیں۔ کوّے کہاں نہیں ہوتے۔ آبادیوں کے باہر تو طوطے اور مینا۔ کوئل اور شیاما کی آواز بھی سُنائی دے جاتی ہے۔

میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ پیڈرو نے میری مجروح ٹانگ کو کرسی مار مار کے بالکل ناکارہ بنا دیا تھا اور اب یہ ٹانگ بُری طرح درد کر رہی تھی۔ تکلیف دائیں ہاتھ میں بھی تھی چنانچہ عملاً میرے جسم کا دایاں نصف حصّہ کارآمد نہیں رہا تھا لیکن اس وقت میں ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کو کام میں لا سکتا تھا۔ میری نگاہ فرش پر گئی۔ ڈاکٹر کا بیگ وہیں دھرا ہوا تھا جہاں سے اس کو اٹھاتے اٹھاتے وہ خود جہاں سے اٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر کو اس مرگِ ناگہاں پر حیران ہونے کا وقت تک نہ ملا۔ جب وہ پچاس ہزار روپے ماہانہ کا حقِ نمک ادا کرنے یہاں آیا تھا تو اس نے اپنی شاندار گاڑی کسی پوشیدہ مقام پر روکی ہو گی اور تھوڑا سا فاصلہ پیدل طے کرتے وقت بھی اس کے ذہن میں جلد از جلد واپسی کا خیال ہو گا۔ آج شام سے رات تک کی مصروفیات کا خیال ہو گا لیکن یہ خیال ہرگز نہیں ہو گا کہ اگلے آدھے گھنٹے میں اس کی لاش کا چُورا کر کے اسے ڈبّے میں پیک کر دیا جائے گا اور وہ لوحِ جہاں سے حرفِ مکرّر کی طرح مٹ جائے گا، غائب ہو جائے گا۔ کیا کوئی اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرے گا؟ میں نے سوچا اور جب وہ لوٹ کر نہیں جائے گا تو کوئی پریشان نہیں ہو گا؟ کوئی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائے گا؟ امید کی ایک کرن روشن ہوئی اور بُجھ گئی۔ رپورٹ لکھوانے سے کیا ہو گا؟ کسے معلوم ہو گا کہ کلینک سے وہ کہاں گیا؟ اس نے کسی کو نہیں بتایا ہو گا کہ وہ مجرموں کے ایک گروہ میں شامل ہے اور مسیحا ان کے قاتل ہو گیا ہے۔ نشترِ جرّاحی چھوڑ کے اس نے تیشۂ جلاّد اٹھا لیا ہے۔ اس نے اپنے مذموم کاروبار کا سراغ کہیں نہیں چھوڑا ہو گا۔ پھر کوئی اس کا سراغ یہاں تک کیسے لگائے گا؟

میں نے بائیں جانب جُھک کر جسم کو تھوڑا سا گھسیٹا اور آگے جُھکا۔ بیگ میری دسترس میں تھا۔ میں نے اُسے جُھکا کے اندر جھانکا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو ایک عام ڈاکٹر کے میڈیکل بیگ میں ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ کوئی جانی پہچانا زہر۔ سفوف، گولی یا انجکشن کی صورت میں۔ چند مہلک زہر میں نے بھی دیکھے تھے۔ مثلاً سنکھیا اور نیلا تھوتھا۔ کچھ کا میں نے ذکر سنا تھا یا پڑھا تھا لیکن میں ان کو شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض مخصوص حالات میں جو دوا کسی کو شفا دیتی ہے وہی ایک صحت مند آدمی کو دی جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ کچھ دواؤں کی مقررہ مقدار فائدہ مند ہوتی ہے، زیادہ مقدار ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے لیکن میں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ مجھے یہ سب معلوم ہوتا۔ اس کے علاوہ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ میں بیگ سے ہر شیشی، ہر پیکٹ اور انجکشن کو نکال کے اس کا معائنہ کرتا۔ پیڈرو کسی وقت بھی آسکتا تھا۔ پورے بیگ کو چُھپانا عملاً ناممکن تھا لیکن اس کا سامان نکالا جا سکتا تھا۔ سب سامان نکال لینا شکوک پیدا کرتا۔ میں نے جلدی جلدی بیگ میں ہاتھ مارا۔ ایک پیکٹ میں پانچ سی سی کا انجکشن بھرا ہوا تھا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر صرف ضرورت کے وقت سرنج بھرتے ہیں اور وہ بھی ٹیسٹ ڈوز کرنے کے بعد۔ میں نے اس پیکٹ کو فوراً تکیے کے نیچے چُھپا دیا۔

ایک نظر دروازے پر اور کان آہٹ پر رکھتے ہوئے میں نے بڑی عجلت میں شیشیوں کو دیکھا۔ بیشتر پر کمپنی کا لیبل تھا اور دوا کا نام صاف لکھا ہوا تھا۔ صرف تین شیشیاں ایسی تھیں جن پر سے لیبل اتار دیا گیا تھا۔ شیشیوں کا رنگ گہرا ہرا تھا۔ ایک میں گولیاں تھیں اور دو میں پاؤڈر تھا لیکن کسی کے رنگ کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے یہی تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے رکھیں اور بیگ کو واپس وہیں رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔ اپنی بے بسی کا احساس کچھ کم ہوا۔ خنجر، پستول نہ سہی میرے پاس کچھ تو آیا جس کو میں اپنا اسلحہ سمجھوں۔ شاید تقدیر ساتھ دے تو میں اسی سے شکاری کو شکار کر سکوں۔

پھر میری نظر نے ٹوٹی ہوئی کرسی کو دیکھا جو خاصے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا منصوبہ ایک دم میرے ذہن میں آگیا۔ بات صرف جسمانی ہمّت کی تھی۔ اگر میں کسی طرح اُٹھ کے دروازے تک جا سکوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار سے لگ کے کھڑا ہو جاؤں اور اس مضبوط ڈنڈے کو ہاتھ میں تھامے تیار کھڑا رہوں۔ دروازہ کھلتے ہی جو بھی اندر آئے اس کے سر پر پوری قوت سے وار کر دوں اور اسے ناک آؤٹ کر دوں لیکن اندر تین آدمی آسکتے تھے جو شاید اس وقت ڈاکٹر کی تدفین میں شریک تھے۔ پیڈرو، نواب خسرو جمشید کہلانے والا بہروپیہ اور سیمسن۔ آگے یقیناً پیڈرو ہو گا یا خسرو جمشید۔ ایک ناک آؤٹ ہو جائے گا لیکن دوسرا مجھے ناک آؤٹ کر دے گا۔ بالفرضِ محال میں نے اسے بھی کھینچ لیا تو سیمسن رہ جائے گا۔ اُس نے مجھے پکڑ لیا تو میری ہڈیاں چُرمُر کر دے گا لیکن اس کے ڈیل ڈول سے نمٹا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُسے قریب آنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔

ابھی میں نے سخت جدوجہد کے بعد نیچے قدم رکھا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں ایک گھنٹی بجنے لگی لیکن کال بیل نہیں تھی۔ میں نے ایک پیر پر توازن قائم رکھتے ہوئے بیڈ کے کنارے کو تھاما اور جُھک کر آگے بڑھا۔ اُسی وقت دروازہ کُھلا اور سفید وردی میں ایک نرس اندر آگئی۔

”یس سر؟“ اُس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”تم کہاں سے آگئیں؟“ میں نے خفّت سے سر کھُجایا۔ ”کیا میں نے تمہیں طلب کیا تھا؟“

”اس گھنٹی کا مطلب ہے کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ اتنے ہی جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

نرس اٹھائیس برس کی ہو سکتی تھی اور اڑتیس کی بھی۔ عورت کی عمر میں لباس کی تبدیلی سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ تھا کہ اچھی خاصی جوان لڑکیاں اسکول یونیفارم میں بچّی نظر آتی ہیں۔ انہی کو اسکول کے فنکشن میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے جب وہ اپنے بہترین لباس میں سج دھج کے آتی ہیں۔ ساری میں عمر زیادہ لگتی ہے تو شلوار قمیص میں کم ہو جاتی ہے اور پیشہ ورانہ قسم کے یونیفارم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

”جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے۔“ میں نے کوئی جواب نہ پا کے کہا۔ ”میں نے کوئی گھنٹی نہیں بجائی۔“

اُس نے کوئی ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ گھنٹی ابھی تک بند نہیں ہوئی تھی۔

”آل رائٹ۔“ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے باتھ روم جانا ہے۔“ گھنٹی اچانک بند ہو گئی۔

”آپ بیساکھی لے کر جا سکتے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”عجیب بات ہے! ابھی تم نے کہا تھا مدد کرنے آئی ہو۔ اب مشورہ دے رہی ہو کہ بیساکھی لے کر چلے جاؤ۔ میں اپنی مدد آپ کروں؟ دیکھنے کی مجھ میں کون سی بات ہے؟“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ گھنٹی پھر بجنے لگی اور اچانک یہ انتظام میری سمجھ میں آگیا۔ ”ویری گُڈ۔ سارا آٹومیٹک نظام ہے۔“ میں پھر بیٹھا، اٹھا اور گھنٹی بند ہو کے دوبارہ بجنے لگی۔ اس کا سلسلہ میرے بیڈ سے ملا ہوا تھا۔ بیڈ پر میرا دباؤ رہتا تھا تو کسی تار سے منسلک کوئی سوئچ بھی آف رہتا تھا ۔۔۔ دباؤ کم ہوتے ہی سوئچ آن ہو جاتا تھا۔ بالفاظِ دیگر گھنٹی ایک الارم تھی کہ قیدی نے بستر سے نیچے قدم رکھا ہے۔ نرس خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔

”اگر بیساکھی لے کر میں باتھ روم کی طرف نہ جاؤں، بلکہ دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کروں تو کیا تم میرا راستہ روک سکو گی؟“ میں نے کہا۔

”یس سر۔ میرے پاس دو قسم کے پستول ہیں۔“ وہ بولی۔ ”ایک سے میں آپ کی ٹانگ پر گولی مار دوں گی۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ دوسری قسم کا پستول کیا ہے؟ پستول تو صرف گولی چلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ بے شک بچّے پچکاری والے پستول بھی استعمال کرتے ہیں لیکن تم بچّی تو نہیں ہو۔“

”ضرورت کے وقت آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرا پستول کس کام آتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اب آپ باتھ روم ہو آئیں۔ آپ کے ڈنر کا اور دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کو انجکشن بھی دینا ہے۔“

”اب کس کی ہمّت ہے کہ میرے قریب آ کے مجھے انجکشن لگا سکے۔“ میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے یہ غلطی کی تھی اور اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔“

نرس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور باہر نکل گئی۔ جب وہ دوبارہ کھانے کی ٹرے لیے نمودار ہوئی تو میں سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور اس حوصلہ شکن صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔

”لے جاؤ یہ کھانا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔ نرس نے ٹرے کو دروازے کے قریب رکھ دیا۔

”پھر آپ کو سو جانا چاہیے سر، آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ نرس نے مخصوص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔

”میں سونا بھی نہیں چاہتا ابھی۔“ میں نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ ”جب نیند آئے گی سو جاؤں گا۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے فرض کیا کہ اب وہ کھانے کی ٹرے اٹھائے گی اور چلی جائے گی۔ میں نے اس سے کوئی بھی غلط بات نہیں کہی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ اس ذہنی پریشان حالی میں میری نیند، بھوک کا کوئی سوال نہ تھا۔ اچانک میری پُشت پر شانے کے قریب ٹیس اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی نوکدار شے میرے جسم میں پیوست ہو گئی ہے۔ میرا خیال غلط نہیں تھا۔ میں نے کراہ کے ہاتھ سے دیکھا تو شانے میں تقریباً چھ انچ لمبا ایک ننھا سا تیر گڑا ہوا تھا اور وہ نرس ہاتھ میں پستول جیسی کوئی چیز لیے کھڑی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس پستول کی نالی زیادہ لمبی تھی۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میں نے مشتعل لہجے میں کہا اور تیر کو کھینچ کر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نکلا جو ربر کا بنا ہوا تھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں سر۔" وہ پستول کو اپنی یونیفارم میں ڈال کے جھکی۔ "آپ کو انجکشن لگا دیا گیا ہے۔ چند منٹ بعد آپ سکون سے سو جائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں اس خبیث نرس سے کچھ کہتا وہ ٹرے اُٹھا کے اور دروازہ بند کر کے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دوسری قسم کا ریوالور کیا ہے اور اب اس کا استعمال خود پر میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے افریقی جنگلوں میں بنائی جانے والی فلموں میں شکاریوں کو ایسے کارتوس استعمال کرتے دیکھا تھا۔ جو وحشی درندوں کو بیہوش کر کے زندہ پکڑنے کے کام آتے تھے۔ شکاری چھُپ کر نشانہ لیتے تھے اور ببر شیر، چیتے یہاں تک کہ وہ پیکر ہاتھی بھی کارتوس کے جسم میں پیوست ہوتے ہی تھوڑی دُور بھاگتے تھے اور چت ہو جاتے تھے۔

میرے شکاری بھی جانتے تھے کہ میرے قریب جا کے مجھے انجکشن لگانا آسان نہیں۔ ڈاکٹر کی موت کے بعد وہ اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان کے لیے میں بھی کسی وحشی درندے سے کم خطرناک نہیں تھا جسے وہ زیرِ دام لانے میں تو کامیاب ہو گئے تھے مگر اب اسے اسیر رکھنا بھی ایک چیلنج تھا۔ یا تو وہ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھتے۔ اپنی موجودہ حالت میں انہوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا تھا مگر تقریباً بے دست و پا ہونے کے باوجود میں نے ان کا ایک آدمی مار ڈالا تھا اور ان کے سیمسن کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اب کوئی میرے قریب آنے کا رسک کیسے لیتا۔ اگر وہ میری گرفت میں آ جاتا تو بچ کے نہ نکلتا۔ چنانچہ انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ٹھیک تھا۔

مجھے معلوم تھا اب اس "پستولی" انجکشن کے زیرِ اثر میں بہت جلد ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں گا۔ شاید پھر ہوش آنے پر یہی ہو گا کہ میں خود کو دست و پا بستہ پاؤں گا۔ آہستہ آہستہ کمرہ میری نظر کے سامنے ہلنے لگا۔ پھر گھومنے لگا اور دھندلا پڑ گیا۔ نرس نے جاتے جاتے بلب جلا دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ جل بجھ رہا ہے۔ پھر سب کچھ غائب ہو گیا۔

▲

جب پھر میری آنکھ کھلی تو کمرے میں سورج کی روشنی تھی۔ میری نگاہ بے اختیار اس دیوار پر گئی جہاں گھڑی تھی لیکن گھڑی ہٹا لی گئی تھی۔ اب میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ بیہوشی کی اس نیند کا وقفہ کتنا طویل تھا اور میں اگلی صبح جاگا ہوں یا پھر مجھے کئی دن عالمِ ہوش سے بیگانہ رکھا گیا ہے۔ دیو زاد سیمسن میرے سامنے دوسری طرف زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کیمیائی اسلحے کی جستجو میں تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

اس حیوان نما انسان کی جگہ پیڈرو ہوتا تو میری حرکت پر فوراً شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا اور خود یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ میں تکیے کے نیچے سے کیا نکال رہا ہوں لیکن سیمسن کا آئی کیو یا ذہانت کا معیار بہت پست تھا۔ وہ جگالی کے انداز میں جبڑوں کو ہلانے میں مصروف رہا اور نہ جانے کیا چباتا رہا۔ میرا کیمیائی اسلحے کا ذخیرہ ابھی موجود تھا۔ ابھی تک میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ دشمنوں کے خلاف یہ اسلحہ موثر طور پر کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب موقع کب ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میری چوری پکڑی جائے اور میں خوش فہمی کے اس سہارے سے بھی محروم ہو جاؤں کہ اس زہر سے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر میں فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے علاوہ ابھی میں یقینِ کامل کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو گولیاں اور سفوف میرے قبضے میں ہیں یا جو دوا انجکشن کی سرنج میں بھری ہوئی ہے وہ زہرِ قاتل ہی ہیں۔ گولیاں اور پاؤڈر کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ بے ضرر قسم کی اسپرین یا کوئی اینٹی بائیوٹک۔ صرف انجکشن کے بارے میں میں زیادہ پُر امید تھا۔ عام طور پر ڈاکٹر دوا کو وقتِ ضرورت سے پہلے سرنج میں نہیں بھرتے کیونکہ وہ خود نہیں جانتے کہ اگلا مریض کس قسم کا ہو گا اور اسے کون سا انجکشن دینا ہو گا لیکن یہ سرنج پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق تیار تھی کہ ضرورت پڑنے پر فوراً استعمال کی جا سکے۔ جب حالات ہنگامی ہوں اور اتنا وقت بھی نہ ہو کہ وائل کو ننھی سی آری سے کاٹا جائے اور شیشے کو توڑ کر دوائی سوئی کے ذریعے سرنج میں بھری جائے۔

دشمن چالاک تھے۔ جسمانی طور پر مجھ سے قوی اور صحت مند تھے چنانچہ انہیں زہر دینا ہرگز آسان نہ تھا۔ نہ وہ میرے ہاتھ سے لے کر جائے پیتے تھے نہ پانی۔ بلکہ میں وہی کھاتا پیتا تھا جو وہ لا کر دیتے تھے اور وہ میرے قریب تک نہیں آتے تھے۔ پھر بھی ناامیدی کے صحرا میں خیال کا یہ سراب غنیمت تھا کہ شاید کوئی فلمی اتفاق ایسا ہو کہ میں زہر چائے کی پیالی میں ڈال سکوں اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیالیاں بدل سکوں۔ عقل کہتی تھی کہ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

بیڈ کے پاس رکھا ہوا ڈاکٹر کا بیگ ہٹا لیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو بیگ میں سے کسی چیز کے نکالے جانے کی خبر نہیں ہوئی۔

کام آئے یا نہ آئے لیکن مجھے اپنے کیمیائی اسلحہ خانے کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا تھا۔ تکیے کے نیچے اس کی موجودگی کا راز کسی بھی وقت افشا ہو سکتا تھا۔ مثلاً بیڈ شیٹ بدلتے وقت سیمسن کی طرف کروٹ بدل کے میں نے بڑی احتیاط سے انجکشن والے پیکٹ کو قمیص اور پتلون کے نیچے اپنے پیٹ سے لگا کے دبا لیا۔ تین شیشیوں کو چھپانا البتہ مسئلہ تھا۔ کمبل کے نیچے ہی میں نے انہیں اپنی پتلون کی دو جیبوں میں منتقل کرنا چاہا لیکن ٹائٹ پتلون کی جیب میں اتنی گنجائش نہ تھی۔ میرے اٹھتے ہی جیب میں شیشی کی موجودگی خود اپنا راز فاش کر دیتی۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ تینوں شیشیاں تکیے کے نیچے چھوڑ دوں اور اس طرح دشمن کو موقع دوں کہ وہ میرے پوشیدہ وسائل کا سراغ لگا کے مطمئن ہو جائے۔ یہ سمجھے کہ اس نے اپنی ہوشیاری سے میری چالاکی کا پتہ کاٹ دیا ہے اور اس کامیابی کے بعد مزید جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے۔ گولیاں زیادہ بڑی نہیں تھیں اور شیشی تقریباً بھری ہوئی تھی۔ اس میں سے چھ گولیاں نکالی جا سکتی تھیں اور جیب میں بھی چھپائی جا سکتی تھیں۔

ابھی میں اُٹھ کے بیٹھا ہی تھا کہ سیمسن کھڑا ہو گیا۔ اس کے تیور یکلخت جارحانہ اور خطرناک ہو گئے۔ وہ مجھے اس خون آشام درندے کی طرح نظر آیا جو اپنے شکار پر جست لگانے ہی والا ہو۔ اس کی آنکھوں کی حیوانی چمک میں وہی سفاکی تھی جس میں لہو کی پیاس جھلکتی تھی۔ میں دوستانہ انداز میں اس کو دیکھ کے مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ مجھے صرف باتھ روم تک جانا ہے۔

میری ٹانگ میں درد بہت کم تھا اور دائیں ہاتھ کی تکلیف میں بھی افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ بے حس کرنے والی دواؤں کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا۔ تاہم مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں افاقے کا پتا نہ چلنے دوں۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے میں نے بستر سے نیچے قدم رکھا اور بیساکھی اٹھائی۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ نرس اندر آ گئی جس کے بارے میں اب مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ بلا تذبذب میری دوسری ٹانگ پر گولی چلا سکتی تھی اور سرِدست مجھے مکمل معذوری قبول نہ تھی۔

"یس سر؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا اور ریوالور نکال لیا۔ یہ اصلی ریوالور تھا۔ ۳۸۔ کا تقریباً نیا کولٹ آٹومیٹک۔ اس کی نیلگوں چمک والی نال کا رُخ میری طرف تھا اور نشانہ میری ٹانگ تھی

"کچھ نہیں۔" میں نے بے ضرر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ذرا باتھ روم تک جانا تھا مجھے۔" اور بیساکھی کا سہارا لے کر آگے بڑھا۔ میری صورت سے سخت تکلیف کے آثار عیاں تھے۔ جبکہ تکلیف معمولی تھی۔

نرس نے سر ہلا کے مجھے اجازت دی۔ "میں اتنی دیر میں آپ کا بیڈ ٹھیک کر دیتی ہوں۔" جس اطمینان کے ساتھ اس نے میری بات مانی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا باتھ روم جانا خطرے کی کوئی بات نہیں اور اس کا اطمینان غلط نہیں تھا۔ باتھ روم سے فرار کے راستے معدوم تھے۔ اس میں صرف ایک واش بیسن اور ایک

بدنام ترین مُجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی مکمّل تفصیل

قیمت ۲۰ روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت

میں ملاحظہ فرمائیں

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈبلیو سی تھا۔ باقی دیواریں بالکل سپاٹ اور بے رنگ و روغن تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کے ساتھ باتھ روم کا اضافہ حال ہی میں کیا گیا ہے۔ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر دو طرف روشندان تھے لیکن میں واش بیسن پر چڑھ کے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ واش بیسن تیسری طرف تھا۔ بالفرضِ محال میں روشندان تک رسائی حاصل کر لیتا تب بھی مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس میں لوہے کی مضبوط گرل نصب تھی جسے ویلڈنگ ٹارچ سے ہی کاٹا جا سکتا تھا۔

میں بائیں ہاتھ سے منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر سے پیڈرو کے اونچا بولنے اور جواب میں نرس کے کچھ کہنے کا شور سنائی دیا۔ میں نے ڈور لاک کے سوراخ سے آنکھ لگائی تو مجھے پیڈرو کی پشت نظر آئی۔ نرس اس کے سامنے تھی چنانچہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”کہاں سے آئیں یہ سب چیزیں اس کے پاس؟“ پیڈرو ہاتھ بڑھا کے بولا ”کیا ہے یہ سب؟“

”مجھے... مجھے نہیں معلوم۔“ نرس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

پیڈرو کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کے بائیں رخسار پر آواز کے ساتھ پڑا۔ ”تجھے نہیں معلوم اور کسے معلوم ہوگا؟ دروازے پر تو بیٹھی تھی۔ سو گئی تھی کیا؟“

”قسم خدا کی سر۔ وہ جب بھی بستر سے اترا میں نے اندر آنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کی۔“

”پھر یقیناً کوئی اندر آ کے اُسے یہ دے گیا ہوگا۔“ پیڈرو نے غرّا کے ہاتھ سامنے کیا جس پر یہ تینوں شیشیاں رکھی تھیں۔

”دروازہ میں باہر سے مقفل رکھتی تھی سر۔“ نرس نے کہا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔

”پھر تو یہی راستہ رہ جاتا ہے۔“ پیڈرو نے سر اٹھا کے کھڑکی کو دیکھا۔ نرس کے آنسوؤں نے یا لہجے نے پیڈرو کو اس کی سچائی کا قائل کر دیا تھا۔ اس کے اپنے لہجے کی درشتی ختم ہو گئی تھی اور اس نے سوال نہیں کیا تھا۔ ایک خیال ظاہر کیا تھا۔

”سیمسن!“ اس نے کچھ دیر بعد کہا اور آگے بڑھ کے اشاروں کی زبان میں اس پر واضح کیا کہ ان تینوں شیشیوں میں کیا ہے جو میرے تکیے کے نیچے سے ملی تھیں۔ ”یہ زہر ہے، بہت خطرناک قسم کا۔“ پیڈرو نے زبان سے بھی بات کرنا جاری رکھا کیونکہ وہ خود گونگا نہیں تھا۔ بیشتر لوگ گونگے بہروں سے اشاروں میں بات کرتے ہوئے بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ پیڈرو میری نظروں کے سامنے نہیں تھا چنانچہ میں اس کا ردِعمل نہ دیکھ سکا۔

”کہاں سے آیا یہ زہر! اُلو کے پٹھے؟“ پیڈرو نے چلا کر کہا۔ ”بات سمجھتا ہی نہیں۔“

”اس کھڑکی کے راستے سے آیا تھا کوئی؟“ پیڈرو نے مشتعل ہو کے ہاتھ چلائے۔ یوں جیسے کوئی رسّی کو تھام کے اوپر چڑھتا ہے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ غالباً سیمسن نے یقینِ محکم کے ساتھ نفی میں سر ہلایا یا اس امکان کو مسترد کر دیا ہوگا۔

”جھوٹ۔“ پیڈرو نے دہاڑ کر کہا ”تم دونوں میں سے ایک جھوٹ بک رہا ہے۔ کسی نہ کسی نے غفلت برتی ہے۔ میں کہتا ہوں غلطی کی ہے تو مان لو ورنہ میں منوا لوں گا۔ ہزار طریقے ہیں میرے پاس سچ اگلوانے کے۔“

”سر۔ یہ ضروری تو نہیں کہ اس میں زہر ہی ہو۔“ نرس نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

”اور کیا فرض کر لوں میں؟“ پیڈرو نے چیخ کر کہا ”دوا تو خود دیتی ہے۔ یہ کون سی دوا ہے؟“

دریں حالات میرے لیے انجکشن کو اپنے پاس رکھنا خطرناک تھا۔ میں نے باتھ روم میں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے روشندان کے سوا کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں اس پیکٹ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ روشندان تک میرا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ پیکٹ کو آہستہ سے اوپر اچھال دوں اور پیکٹ اس چھ انچ چوڑی جگہ میں لینڈ کر جائے جو دیوار کی موٹائی کے برابر تھی اور جسے روشندان کی گہرائی بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ تاہم یہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ اگر پیڈرو باتھ روم کی تلاشی لیتا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے روشندان کے طاق پہ ہاتھ ڈالتا۔ وقت کم تھا۔ میں نے باتھ روم میں دس منٹ گزار لیے تھے۔ پانچ منٹ بعد کسی کو بھی غیر ضروری تاخیر کا احساس ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی تالے کے سوراخ سے دیکھنے لگتا تو میرے لیے اپنی کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ عین وقت پہ مجھے جُرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پکڑ لیتے۔

روشندان کے علاوہ مجھے ایک ہی جگہ نسبتاً محفوظ نظر آئی۔ ڈبلیو سی کے اوپر لگا ہوا فلش ٹینک۔ میں نے اس ٹونٹی کو بند کیا جس سے ٹینک میں پانی جاتا تھا اور فلش چلا دیا۔ ٹینک خالی ہو گیا لیکن دوبارہ نہیں بھرا۔ پھر میں نے پیکٹ کو بڑی احتیاط سے نکالا اور فلش ٹینک کا ڈھکنا ہٹا کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ ٹینک کی سطح نم تھی مگر اس نمی سے گتّے کی ڈبیا کے گل جانے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے ڈھکنا واپس فٹ کیا اور اگرچہ مجھے سو فیصد اطمینان حاصل نہ تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا لیکن نصف اطمینان کا یہ احساس بھی بہت غنیمت تھا۔ ابھی میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دھڑ سے دروازے پر لات ماری۔

”کیا ہو رہا ہے اندر؟“ پیڈرو نے مجھے گالی دے کر کہا۔ ”یہ باتھ روم ہے یا آرام کرنے کی جگہ؟“

قدرتی طور پہ اس خیال نے مجھے مایوس کر دیا کہ شاید میرا مشن ناکام ہو گیا ہے۔ لات مارنے سے پہلے پیڈرو نے جھانکا ہوگا تو سب دیکھ لیا ہوگا۔ میں نے کُنڈی کھولی اور باہر آ گیا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے قمیص کے دامن سے منہ صاف کر کے کہا۔ ”اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ تمہیں فکر تھی کہ میں لات مار کے دیوار سے راستہ نہ بنا لوں۔ میری لات تو ویسے ہی ٹوٹی ہوئی ہے اور میں سیمسن بھی نہیں ہوں۔“

”تمہیں فضول بھونکنے کی بہت عادت ہے۔“ پیڈرو نے کہا جو میری بیساکھی اور میرے ہاتھ کی پہنچ سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ؟“ میں نے اس کی ہتھیلی کو غور سے دیکھا۔ ”مجھے تو تین شیشیاں نظر آ رہی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ان میں زہر ہے۔ تمہارے پاس کیسے آئیں یہ شیشیاں؟“ پیڈرو بولا۔

”میرے پاس!“ میں نے حیرانی سے کہا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔ ”شیشیاں تمہارے پاس ہیں پیڈرو۔“

”لیکن مجھے تمہارے تکیے کے نیچے سے ملی ہیں۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”میں نے کبھی تکیے کے نیچے جھانک کر نہیں دیکھا۔“ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ اب تک یہ زہر تم سب کو دے چکا ہوتا۔ اب تم خود کھا لو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ کون سا زہر ہے؟“

مجھے جواب دینے کے بجائے پیڈرو غصّے میں پھنکارتا ہوا پلٹا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر سے دروازے کے قفل میں چابی گھمانے کی آواز سُنی۔ ”اب ہم تینوں قید میں ہیں۔ ایک ہی کشتی کے ڈوبنے والے مسافر۔“ میں نے نرس اور سیمسن کی طرف دیکھ کے کہا۔ سیمسن نے بات سُنی نہ سمجھی چنانچہ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

”تم خود تو مرو گے ہی۔ ہم سب کو بھی ساتھ مرواؤ گے۔“ نرس نے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورا۔

”سب مرنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے۔“ میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ ”کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔“

”اور اس سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں تو؟“ نرس کو میرے الفاظ نے مزید مشتعل کیا۔

”تم کیا چیز ہو؟ مجھے پیڈرو تک گولی نہیں مار سکتا۔“ میں نے جلتی پر کچھ اور تیل چھڑکا۔ ”کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! ہاتھ میں ریوالور آ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے چلانے کا اختیار بھی رکھتی ہو۔ تم نے صرف نرس کا یہ لباس پہن لیا ہے، ورنہ تم پیسے کے عوض بک جانے والی ایک بدکردار اور بے ضمیر عورت ہو۔ تم بے گناہوں کے خون پر پلنے والی جونک ہو۔“

”بکواس مت کرو۔“ نرس نے چیخ کر کہا اور پلک جھپکنے میں ریوالور نکال لیا۔ اس کا اشتعال قوتِ برداشت سے بڑھ گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اُس کے ہسٹریائی لہجے سے ہوا اور ایک فطری ردِعمل کے طور پر میں پلٹ کر بیڈ کے دوسرے کنارے سے نیچے گر گیا۔ گولی جو میرے سینے یا پیٹ اور کمر میں کسی جگہ پیوست ہو سکتی تھی، خالی بستر پر لگی اور سفید چادر پہ ایک سوراخ چھوڑ کے فرش سے ٹکرائی۔ سوراخ کے جلے ہوئے کنارے سے دھواں اُٹھا اور کمرے میں بارود کی بو پھیل گئی۔ کمرہ بند ہونے کے باوجود دھماکا پیڈرو نے بھی سنا جو شاید واپس آ رہا تھا۔ اس نے باہر سے قفل کھولا اور بگولے کی طرح اندر آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ وہ نرس کی طرف دیکھ کر چلایا جو اب مجرم بنی کھڑی تھی۔ مغلوب کر کے عقل و ہوش سے بیگانہ کر دینے والا قاتل لمحہ گزر گیا تھا۔ اس کے بعد ندامت اور خوف کا لمحہ تھا جو پوچھتا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور کیا تم کو عقل نہیں تھی کہ ہر ضابطے، حکم یا قانون کو توڑنے کی سزا ہے۔ شاید ہر قتل کے بعد یہ لمحہ ضرور آتا ہے۔ عمل کے بعد ردِعمل اور مکافاتِ عمل۔

”کہاں ہے وہ؟“ پیڈرو نے میرے نام کی جگہ ایک غلیظ گالی استعمال کی۔ ”سیمسن!“

صورتِ حالات کو محفوظ پا کے میں فرش سے اٹھا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک اسی قیدِ حیات میں اور تمہاری جیل میں ہوں ورنہ اس عورت نے تو مجھے دونوں سے آزاد کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ حکم عدولی کی سزا کیا ہے تمہارے ضابطۂ فوجداری میں؟“ میں نے چادر کے زخم کو ہاتھ سے جھاڑا۔ ”یہ نقصان الگ ہوا۔“

”گولی کیوں چلائی تھی؟“ پیڈرو نے پھر نرس پر گرجنا شروع کیا۔ ”دماغ چل گیا تھا...؟“

”اس نے... اس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔“ نرس نے اس انتہائی اقدام کا ایک فضول سا جواز پیش کیا۔ خوف اور ہسٹریا کی کیفیت میں اس کا ذہن کوئی بہتر وجہ سوچنے سے قاصر تھا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔

پیڈرو نے اسے نصف درجن ایسی گالیاں دیں کہ مجھے شرم آ گئی۔ ”اور جواب میں گالیاں دینے کے بجائے تو نے گولی چلا دی؟ اس لیے کہ تو بہت عزت دار اور غیرت مند ہے؟“ اس نے مزید مغلّظات اگلنے کے بعد اچانک اپنا ہاتھ سامنے کیا۔ تب پہلی بار میں نے اس

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بات پر غور کیا کہ اب تک وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے، دونوں پاؤں کچھ پھیلا کے مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے اور بالکل ویلن کا پوز بنائے کیوں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ہنٹر تھا جس کا ایک سرا نسبتاً موٹا اور خنجر کے دستے کی طرح تھا۔ سانپ کی طرح لہرانے والا چابک جیسا حصہ چمڑے کی پتلی پتلی لیکن مضبوط ڈوریوں سے ایسے بنایا گیا تھا جیسے عورتیں چوٹی گوندھتی ہیں۔ اس نے جبر و استبداد، حاکمیت اور قوت کے پیکر کا روپ دھار کے ہنٹر کو ایک بار ہوا میں شائیں سے لہرایا اور اس ڈرامائی تاثر سے خوف کی فضا کو گمبھیر کر دیا۔ نرس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا اور وہ کانپنے لگی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ میں ایک بار پھر پیڈرو کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس سے ادائے فرض میں کوتاہی بالکل نہیں ہوئی۔ وہ کرسچن تھی چنانچہ اس نے انگلی کے اشارے سے سینے پر صلیب بنانے کی غیر ارادی حرکت کی اور حضرت یسوع مسیح کی قسم کھا کے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھے گی اور گولی چلانے سے گریز کرے گی مگر ہونٹوں پہ ایک انتقامی اور شیطانی قسم کی سفاک مسکراہٹ سجائے پیڈرو قدم قدم اس کی طرف بڑھتا گیا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی اور میں سانس روکے دیکھتا رہا کہ کیا واقعی اس جرم کی پاداش میں جوانمرد پیڈرو ایک عورت کی کھال اُدھیڑ دے گا۔

نرس دیوار سے جا لگی۔ دیوار نہ ہوتی تب بھی اس کے لیے فرار ناممکن تھا۔ اچانک پیڈرو نے سیمن کو اشارہ کیا جو نرس کے بہت قریب تھا اور اس نے نرس کو یوں پکڑ لیا جیسے شکاری باز اپنے پنجوں میں چڑیا کو جکڑ لے۔ پیڈرو کا ہاتھ گھوما اور نرس نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ ضرب کی اذیت میں نے محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے چمڑے کے ہنٹر کی آتشیں زبان میرے جسم پر سلگتی ہوئی لکیر بن کے دہکنے لگی ہے۔

"ٹھہر و سورما!" میں نے پیڈرو کو مخاطب کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔ "اس عورت کا کوئی قصور نہیں۔"

"تم کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" پیڈرو سر گھما کے بولا لیکن اس کا ہاتھ رُک گیا تھا۔

"وہ زہر میں نے ڈاکٹر کے بیگ سے چوری کیا تھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اپنی غلطی کی سزا اس عورت کو کیوں دیتے ہو۔ کیا تمہیں خوش فہمی ہے کہ تم سزا سے بالاتر ہو۔ سزا تو ایک دن تمہارے آقا اور اَن داتا چوہدری دلاور کو بھی ملے گی مگر وہ دن ابھی نہیں آیا۔ دلاور شاید آج آئے۔ اگر وہ آیا تو میں اس کو بتا دوں گا کہ تم اس اعتماد کے مستحق نہیں ہو جو تمہیں حاصل ہے کیونکہ تم احمق ہو۔ احمق وہ ڈاکٹر بھی تھا جس نے میرے قریب آنے کی غلطی کی تھی مگر کیا یہ تمہارا کام نہیں تھا کہ ڈاکٹر کی حفاظت کرتے۔ تم جانتے تھے کہ ڈاکٹر اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور تمہاری کوتاہی کا انجام یہ ہوا کہ ڈاکٹر اپنی جان سے گیا۔ دلاور نے ابھی تک یہ نہیں سوچا ہے کہ تمہارا سیکورٹی کا انتظام ناقص تھا۔ تم ریوالور اٹھائے کھڑے رہتے تو میں ڈاکٹر پر ہاتھ کیسے اٹھاتا۔ دوسری غلطی تم نے بعد میں کی جب تم ڈاکٹر کی لاش کو کتے کی لاش سے زیادہ بے حرمت کرانے میں مصروف تھے اور اپنے نامۂ اعمال میں وہ گناہ بھی لکھوا رہے تھے جو شاید ابلیس کے لیے بھی باعثِ شرم ہوتا۔ تو ڈاکٹر کا بیگ میری دسترس میں تھا۔ تم کو معلوم تھا کہ اس میں نسخۂ شفا ہے تو زہرِ ہلاہل بھی ہے۔ میرے قریب پڑا ہوا بیگ کیا کسی آتشیں اسلحے سے کم خطرناک تھا؟ اس کی جگہ ریوالور ہوتا تو تم فوراً ہٹا لیتے۔ یہ کس کی غلطی تھی؟" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے سب گولیاں نکال لیں۔ "یہ دیکھو!"

پیڈرو کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے متغیر ہوا۔ "تم بکتے ہو۔"

"اچھا اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ ٹافیاں ہیں تو کھا لو۔" میں نے ہتھیلی پھیلا کے کہا۔ لیکن پیڈرو نے آگے بڑھ کر مجھ سے وہ گولیاں چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سیمن کو اشارہ کیا۔

"اس کی تلاشی لینی ہے سیمن۔" وہ ریوالور نکال کے بولا اور اسے سمجھایا کہ وہ مجھے قابو میں رکھے۔ سیمن نے میرے پیچھے آ کے اپنے دونوں ہاتھ میری بغل میں دیے اور گردن کو آگے جھکا کے انگلیاں یوں کس لیں کہ میں بے بس ہو گیا۔ میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی ورنہ میں ایک جھٹکے سے سیمن کے شانوں کو بے کار کر دیتا۔ کلائی کے جوڑ الگ کر دیتا یا قریب آنے سے پہلے اس کو یوں ڈھال بنا لیتا کہ پیڈرو کے لیے گولی چلانا ناممکن ہو جاتا مگر میں اپنے سچ کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ وہ عورت میرے نقطۂ نظر سے مجرم تھی اور اگر ممکن ہوتا تو میں خود اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ سخت ترین سزا کے لیے۔ اگر یہی لوگ اسے مار دیتے جن کے ہاتھوں میں وہ کٹھ پتلی تھی تو مجھے اس کی موت کا قطعی افسوس نہ ہوتا لیکن میرے سامنے اس پر جو ننگِ انسانیت ظلم ہو رہا تھا وہ ایک ناکردہ گناہ کا خمیازہ تھا۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ انصاف کے تقاضوں کے برعکس ہے۔ ہر مجرم کو انہی جرائم کی سزا ملتی ہے جو اس پر ثابت ہوں۔

نرس ڈرتے ڈرتے میرے ہاتھ پر سے گولیاں اٹھانے بڑھی۔ اس کے لیے آگے کنواں پیچھے خندق والا مسئلہ تھا۔ ایک طرف پیڈرو ریوالور اور ہنٹر لیے کھڑا تھا تو دوسری طرف میں تھا جس کے متعلق وہ جانتی تھی کہ خالی ہاتھ اور بے بس نظر آنے کے باوجود خطرناک ہوں۔ ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ میرا ہاتھ اس کی نازک سی گردن کو بھی شاخِ گل کی طرح نہ توڑ دے تو دوسری جانب یہ ڈر کہ اس کشمکش میں چلنے والی گولی اسی کو نشانہ نہ بنا لے مگر وہ مجبور تھی۔

"ڈرو نہیں۔" میں نے سرنگوں ہونے کے باوجود مسکرا کے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" نرس نے گولیاں چن لیں اور پیڈرو کی طرف پلٹی لیکن اس نے مکمل تلاشی کا حکم دیا۔ نرس نے ہر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میری یقین دہانی کے بعد اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہو گئی تھی۔ جامہ تلاشی کے بعد میرے بیڈ کو اچھی طرح جھاڑ کر یہاں تک کہ تکیے کے اندر سے بھی پوشیدہ زہر برآمد کرنے کی کوشش کی گئی اور میں نے دشمنوں کے اطمینان کی خاطر اس کارروائی کی تکمیل میں عدم تعاون کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ میرا یہ اعترافِ شکست اپنی اس کامیابی کو کیموفلاج کرنے کے مترادف تھا جو میں نے ایک آلۂ قتل کو فلش ٹینک میں چھپا کے حاصل کی تھی اور یہ آلۂ قتل ایک چھوٹی سی سرنج تھا جس کے متعلق میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کون سا ہلاکت خیز محلول ہے۔ جب سیمن نے مجھے رہا کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مگر خلافِ توقع پیڈرو نے نرس کو میرا خیال رکھنے کا حکم دیا اور خود باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میری کامیابی پھر مشکوک ہو گئی۔ میری نگاہ کھلے دروازے پہ اور کان ہر آواز پر تھے جو باتھ روم سے سُنائی دے رہی تھی۔ اگر پیڈرو فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھاتا تو مجھے فوراً معلوم ہو جاتا مگر اس کا دھیان اُدھر گیا ہی نہیں۔ فلش ٹونٹی کو ہاتھ سے گھما کر دیکھے بغیر اسے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے یا بند ہے۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ ٹونٹی کھلی ہوئی ہے چنانچہ فلش ٹینک پانی سے بھرا ہوا ہے اور اس میں کوئی چیز نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس نے روشندانوں کے اوپر ضرور دیکھا ہو گا کیونکہ پانچ منٹ بعد وہ ہاتھ سے گرد جھاڑتا نمودار ہوا۔ اس نے نرس کے ہاتھ سے گولیاں لے کر انہیں غور سے دیکھا۔ محتاط انداز میں سونگھا اور جیب میں ڈال لیا۔

"تمہیں معلوم ہے یہ کیا تھا؟" میں نے سخت کرب اور تکلیف کے احساس کو ظاہر کرنے کے لیے کراہ کر کہا۔ "نام تو اس کا بہت مشکل ہے۔ ٹرائی نائٹرو ڈائی آرسینک کلورائڈ پوٹاشیم سائنائڈ۔" میں نے سائنس اور کیمیائی مرکبات کے ناموں کو یوں جوڑا کہ پیڈرو کو صرف دو الفاظ سمجھ میں آ سکے۔ آرسینک یعنی سنکھیا اور سائنائڈ۔ اور اگر قائل ہو جائے تو اسے اندازہ ہو کہ دو قاتل زہر مل کے کس حد تک جان لیوا ہو سکتے ہیں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" وہ کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد بولا۔

"شیشی پر ایک لیبل تھا جو میں نے پھاڑ کے ہٹا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں اس زہر کے خواص کا علم ہے۔ سائنائڈ تو اتنا ہی مہلک ہے نا کہ آدمی نے چکھا اور ختم ہوا۔ یہ سائنائڈ کا باپ ہے۔ چھونے سے جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اب ہم تینوں نے بارہ گولیوں کو کم سے کم بارہ سیکنڈ تک تو ہتھیلی پہ رکھا ہے۔ اس کی خاصی مقدار ہمارے خون میں شامل ہو چکی ہے۔ اس کی علامات آہستہ آہستہ ظاہر ہوں گی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہمارا نروس سسٹم متاثر ہو گا۔ سارا جسم کانپنے لگے گا۔ رعشے کے مریض کی طرح۔ اور اس کے بعد کسی چیز پہ ہمارا اختیار نہیں رہے گا۔ نہ ہم اپنی مرضی سے ہاتھ ہلا سکیں گے نہ پیر۔ نظامِ اخراج اور اعصابی نظام پر ہمارا کنٹرول نہیں رہے گا۔ تم نے گردن توڑ بخار کے مریض کو مرتے دیکھا ہے کبھی؟"

"بکواس مت کرو۔ تم کہاں کے ڈاکٹر ہو؟ یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پیڈرو نے اپنا اعتماد بحال رکھتے ہوئے کہا مگر نرس نے بلاارادہ ہتھیلی کو دیکھا اور اپنی یونیفارم سے رگڑ کے صاف کیا۔

"میں نے جرائم پر مبنی کئی ناولوں میں پڑھا تھا۔" میں نے کہا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کا پتا نہیں چلتا۔"

"نہیں۔" نرس نے ایک چیخ ماری اور باتھ روم کی طرف دوڑی۔ "میں... میں مرنا نہیں چاہتی۔" اس کے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے تھے۔ یہ دہشت زدہ کرنے والا جھوٹ اس کو بڑا بھیانک سچ نظر آیا۔ اس نے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ "میں ابھی نہیں مروں گی۔ ہولی فادر، مجھے موت سے بچا۔ میں بہت گنہگار ہوں۔ مجھے شیطان سے بچا۔" واش بیسن میں بہنے والے پانی کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زہر آلودہ ہاتھ کو رگڑ رگڑ کے دھو رہی ہے۔

"بے کار ہے۔" میں نے باتھ روم کی طرف دیکھ کر ہمدردی سے کہا۔ "جو نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوائے بہادری سے موت کا انتظار کرنے کے اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"جھوٹ بولتے ہو تم؟" پیڈرو چلایا۔ نرس کے نروس بریک ڈاؤن نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

"ایک نرس تم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ ڈاکٹروں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسپتالوں میں ہر قسم کے کیس آتے ہیں اور یہ بات مجھے معلوم ہے تو اس کو کیسے معلوم نہ ہو گی۔" نرس اب بھی پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔

"میری ماں مر جائے گی۔ پھر پیٹر تم سب کو مار ڈالے گا۔ ڈرٹی ڈاگ! اس نے مجھ کو پرپوز کیا تھا۔" وہ باہر آ کے پیڈرو پر حملہ آور ہوئی۔ پیڈرو نے اسے ایک ہاتھ پر روکا اور پوری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قوت سے اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ کسی لاش کی طرح ٹکرائی اور فرش پر گر کے بے حس و حرکت ہو گئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پیڈرو کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ نرس کا ہاتھ تھام کے اس نے نبض دیکھی اور اطمینان کا سانس لے کر سیمسن کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے سیمسن کو میری طرف سے غافل نہ ہونے کی ہدایت دی اور یہ سمجھایا کہ نرس زندہ ہے۔ "ڈاکٹر کو بلاتا ہوں میں۔" اس نے مجھے سنانے کے لیے کہا اور جھک کر نرس کو اٹھا لیا۔ اسے کندھے پر ڈال کے پیڈرو نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر باہر سے مقفل کیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک بات جو میں نے قطعی غیر سنجیدگی سے کوئی مقصد سامنے رکھے بغیر کہی تھی اس کے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہو رہے تھے۔ میں اس مختصر وقفے سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا جس میں میرا محافظ و نگراں صرف ایک گوریلا رہ گیا تھا۔ جو عقل و فہم میں کسی بچے سے بھی کم تھا حالانکہ اس کا وجود مجھ پر بھاری پڑتا تھا۔ اس کے خلاف صرف عقل استعمال کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے مالکوں کے اشارے پر چلتا تھا مگر حیوان کا کیا ہے۔ اسے پیڈرو اپنے قابو میں کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ وہ صرف عمل کرتا ہے۔ نتائج اور انجام کے بارے میں سوچنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

"سیمسن" میں نے ہاتھ اٹھا کے چٹکی بجائی۔ وہ حرکت پر میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے دیکھا" میں نے ہاتھ کے اشارے سے ہنٹر گھمایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے ابھی نرس کو مارا ہے۔ وہ مر گئی ہے"۔ مرے ہوئے آدمی کی اداکاری میں نے یوں کی کہ آنکھیں ساکت کر کے، گردن ڈھلکا کے اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کے اپنا سانس روک لیا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے سیمسن کی آنکھوں میں خوف و ہراس نظر آیا۔

"ابھی وہ واپس آئے گا" میں نے دروازے کے دوبارہ کھلنے اور پیڈرو کے اندر آنے کا تاثر دیا۔ "اس کے ہاتھ میں وہی ہوگا"۔ میں نے ہوا میں ہاتھ لہرا کے ہنٹر کا مفہوم واضح کیا۔ "اور اب تمہاری باری ہے" میں نے انگلی سے اس کے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ تم کو اتنا مارے گا۔ اتنا مارے گا"

سیمسن میری بات سمجھ رہا تھا اور بڑے انہماک کے ساتھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ میں اگلے منظر کا بیان کروں جو اس کی آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ نرس تو ہلکی پھلکی عورت تھی جس کی لاش کو پیڈرو اٹھا کر لے گیا۔ خود اس کی لاش کو پیڈرو کیسے لے جائے گا۔ وہ کچھ کنفیوز بھی ہو رہا تھا۔ اشاروں کی زبان میں پیڈرو نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ نرس زندہ ہے۔ میں نے اس کے برعکس بات کہی تھی اور وہ پریشان تھا کہ کس پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ اس نے دیکھا تھا کہ پیڈرو نے نرس کے ایک ہنٹر رسید کیا تھا پھر وہ پاگلوں کی طرح غسل خانے میں گئی تھی اور نکلی تھی تو پیڈرو پر لپکی تھی۔ اس کے بعد سیمسن نے سنا کچھ نہیں تھا۔ واقعات کی ایک خاموش فلم دیکھی تھی۔ اس کا انجام کیا تھا؟ وہی جو ڈاکٹر کا ہوا تھا؟ اور اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگوں کا ہو چکا تھا سیمسن نے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح مارے گئے تھے۔ اسے اپنی سزا ابھی یاد تھی۔ کیا اب اس کا بھی وہی حشر ہوگا۔ مالک اس پر سخت ناراض تھا۔ اس کی ناراضگی بُری چیز ہے۔

میں نے اسے ساکت و صامت کھڑا دیکھ کر ایک جست لگائی۔ میرا بایاں پیر پہلے زمین پر پڑا۔ دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے ہی درد کی ٹیس اٹھی۔ میں لڑکھڑایا مگر جسم کے بوجھ کو پنجوں پر سنبھال کے میں نے ایک اور چھلانگ لگائی۔ مجروح پیر پر میرا وزن چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں رہا اور میں نے کمرے کا آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ صرف ایک بار سر گھما کے میں نے تیسری کوشش کی۔ سیمسن کو ہوش آگیا تھا اور وہ میرے تعاقب میں آ رہا تھا لیکن وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں گر رہا ہوں۔ میں نے جسم کی باقی ماندہ قوت کو مجتمع کیا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے بازی لگائی ہے تو ہارنی نہیں ہے۔ میں نے خود کو یاد دلایا۔ ورنہ یہ درندہ مجھے دبوچ لے گا اور میری ہڈیاں سلامت نہیں چھوڑے گا۔ باتھ روم کا کھلا دروازہ میرے سامنے آگیا تھا۔ صرف ایک اور کوشش۔ ایک اور ایسی ہی بھرپور جدوجہد۔ میں نے ہانپتے ہانپتے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر دائیں پیر کا سہارا لے کر آخری چھلانگ لگائی۔ میں دروازے سے اندر جا کر گرا۔ سیمسن مجھے چند قدم دور نظر آیا۔ ایک بپھرا ہوا حیوان۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا اور بائیں گھٹنے پر اٹھ کے اندر سے لاک کر دیا۔ سیمسن کسی بیل کی طرح دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔

مہلت بہت کم تھی۔ میں نے اس حیوان کو اسی طرح مشتعل کر دیا تھا جس طرح ایک بُل فائٹر کپڑا لہرا کے خونخوار سانڈ کو مقابلے کے لیے اُکساتا ہے لیکن بُل فائٹر اپنی پھرتی اور ذہانت سے کام لیتا ہے اور بالآخر سانڈ کی گردن توڑ دیتا ہے۔ وقت ضائع کیے بغیر میں اٹھا اور پھسل کے گرا۔ سیمسن نے دروازے پر زیادہ قوت سے ٹکر ماری اور دھماکا مختصر سے کمرے میں گونجا۔ مجھے یوں لگا جیسے دروازے کے ساتھ باتھ روم کی دیواریں تک ہل گئی ہیں۔ دو تین ٹکروں میں دروازے کے قبضے نکل جائیں گے یا پٹ ٹوٹ کے گر جائے گا۔ کسی جانور کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر خود کو گھسیٹتا، میں اس فلش ٹینک تک پہنچا جس میں میرا پوشیدہ ہتھیار موجود تھا۔

سیمسن نے تیسری بار ٹکر ماری اور دروازہ لڑکھڑایا۔ اگر پیڈرو یہ دھماکے سُن کے آ پہنچا تو میرا مشن ناکامی کے عبرتناک انجام میں بدل جائے گا۔ وہ سیمسن کو روک لے گا اور ریوالور سے فائر کر کے ڈور لاک کو اُڑا دے گا۔ میں نے فلش کا ڈھکنا اٹھا کے نیچے پھینکا۔ چینی کا ڈھکنا ایک آواز کے ساتھ سیمنٹ کے فرش پر گرا اور بکھر گیا۔ میرے ہاتھوں نے پلک جھپکنے میں اندر سے ڈبیا نکال لی۔ سرنج کو اپنے ہاتھ میں تھام کے میں نے تیزی سے پلٹا۔ اس کی قاتل سوئی کا رُخ مخالف سمت میں تھا۔ آخری مرحلہ اسے انتہائی احتیاط کے ساتھ، صحیح وقت پر اور موثر طور پر استعمال کرنے کا تھا۔ سیکنڈ کے ایک حصے کے فرق سے دروازے کا پٹ اندر کی جانب گرا اور سیمسن اپنی ہی جسامت کے باعث اپنے ہی زور میں اندر آیا۔ میری بائیں ٹانگ آگے بڑھی اور سیمسن منہ کے بل گرا۔ اس کے حلق سے "ہاہ" جیسی آواز نکلی اور اس کے دونوں ریچھ جیسے بازو اوپر اٹھ گئے۔ پھر وہ دروازے کے پٹ پر گرا۔ میں گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کی طرح لپکا اور اگلے لمحے انجکشن کی سوئی پُشت کی جانب سیمسن کی کمر سے ذرا نیچے گوشت میں اُتر گئی۔ وہ چبھن کو اس لیے محسوس نہ کر سکا کہ گرنے سے اس کے سر پر چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے چکرا دیا تھا۔

سرنج کی دوا اس انسان نما حیوان کے جسم میں اُتر گئی جس کی زندگی خود اس کے لیے بے مصرف تھی۔ اس کا مصرف دوسروں کے لیے یہی تھا کہ ایک حیوانی قوت سے کمزور انسانوں کو زیر کیا جائے اور ضرورت محسوس ہو تو انہیں ڈاکٹر کی طرح توڑ پھوڑ کے ختم کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس کا مرنا جینا اپنی مرضی پر منحصر نہیں تھا اور جو لوگ اس کی زندگی پر اختیار رکھتے تھے اسے ایک ہلاکت خیز قوت کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہ انسان نہیں، انسانوں کی زندگی ختم کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ پستول اور بندوق، ٹینک اور بم کی طرح جو خود خطرناک نہیں ہوتے۔ ان کو استعمال کرنے والے اور استعمال کرنے والوں کے عزائم خطرناک ہوتے ہیں۔ سیمسن اگر زندہ رہتا تو نہ جانے کتنے خون اور کرتا۔ اس خونی درندے کو ختم کر دینا کسی آدم خور شیر کو مار دینے کے مترادف تھا۔

میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر انجکشن میں زہر نہ ہوا، صرف بی کمپلیکس ہوا؟ لیکن بی کمپلیکس کی مخصوص بُو ہوتی ہے۔ میں نے انجکشن کی سرنج کو سونگھا اور فلش میں پھینک دیا۔ اس کا شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فلش کے پانی میں گر گیا۔ دیو پیکر سیمسن نے اٹھنا چاہا تھا لیکن ناکام رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آوازیں بھیانک خرخراہٹ میں بدل گئیں۔ اسی وقت پیڈرو اندر آیا۔ میں نے دروازے کا قفل کھلنے کی آواز سُنی ہی نہیں تھی لیکن اس نے باتھ روم کے اندر کا منظر فوراً دیکھ لیا تھا۔

"سیمسن" وہ چلایا اور ریوالور نکال کے دوڑا۔ "کیا ہوا ہے سیمسن کو؟" وہ جانتا تھا کہ سیمسن کے کان نہیں ہیں چنانچہ اسے پکارنے کے باوجود سوال پیڈرو نے مجھ سے ہی کیا تھا۔ سیمسن کا جسم بڑے عجیب اور بھیانک کرب میں مبتلا تھا۔ وہ پلٹ رہا تھا اور اینٹھ رہا تھا۔ پیڈرو اس کے پاس پہنچ کے جھکا۔ اسی وقت سیمسن کے جسم نے آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں باتھ روم کی چھت پر مرتکز ہو گئیں۔ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں ایک لمحے کی اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا جب حیرت، خوف اور غصے نے پیڈرو کو مفلوج کر دیا تھا لیکن میرے پاس صرف فلش ٹینک کے ڈھکنے کے ٹکڑے تھے۔ بے اختیار میں نے ایک بڑا ٹکڑا اٹھایا اور پیڈرو پر جا پڑا جس نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارنے کے لیے جست لگائی تھی۔ موٹے پورسلین کے ٹکڑے نے تیشے کا کام کیا۔ ہم بیک وقت ٹکرائے۔ خطرہ محسوس کرتے ہی پیڈرو نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ دھماکا دو بار ہوا مگر گولی نہ جانے کدھر گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے۔ پھر میرے ہاتھ نے تکون نما وہ ٹکڑا پیڈرو کے ! ! اجس کے کنارے آری کی طرح تیز تھے۔ اس نے سر جھٹکا اور سنبھلنا چاہا مگر میں نے بڑی پھرتی سے دوسرا وار کیا۔ پیڈرو ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے تیسری مرتبہ اپنا ہتھیار استعمال کرنا چاہا لیکن اس کی بیرونی سطح بہت چکنی تھی۔ چینی کی سطح میری انگلیوں میں سے پھسل گئی کیونکہ میرے ہاتھوں میں پسینے کی نمی بھی آگئی تھی اور میری ہمت بھی جواب دے چکی تھی۔ میں کسی بدمست شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ ایک دھندلے سائے کی طرح میں نے پیڈرو کو سلو موشن میں اٹھتے اور ہاتھ اٹھاتے دیکھا۔ پھر ضرب میرے سر پر لگی اور میں اندھیرے کنوئیں میں گر گیا۔ بالکل پُرسکون ہو گیا۔

زندہ رہنے کی تمنا لاشعور میں موجود تھی اور اسی نے بیہوشی کے وقفے میں احساس کو بیدار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ یہ تمنا ایک آواز بن کے مجھے جگاتی رہی کہ اتنی جدوجہد کے بعد ہمت نہ ہارو، اٹھو، وقت سے فائدہ اٹھا لو اور نکل جاؤ۔ آزادی کی منزل کے راستے تک پہنچ جانے کے بعد واپسی کا کوئی سوال نہیں۔ پَل بھر کے لیے گھُپ اندھیرے میں رابعہ ایک پیکرِ نور بن کے ابھری اور اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے "اٹھو سکندر! اب نہ اُٹھے تو پھر کبھی یہ موقع نہ ملے گا۔ یہ لوگ تمہیں ایک ضرورت کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تحت زندہ رکھے ہوئے ہیں مگر یہ ضرورت کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہ تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں مگر تم کو زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے، میرے لیے۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ باتھ روم کے فرش پر تین افراد پڑے ہوئے تھے۔ ایک سیمسن تھا جسے صورِ اسرافیل پھونکے جانے سے قبل نہیں اٹھنا تھا۔ دوسرا پیڈرو تھا جس کے سر پر میرے ہاتھ کی کوئی ضرب کاری ثابت ہوئی تھی اور مجھے لٹانے کے بعد وہ خود بھی لیٹ گیا تھا۔ تیسرا میں تھا جو سیمسن کی لاش کے اوپر گرا تھا۔ میرا سر اس کے سینے پر تھا چنانچہ آنکھیں کھولتے ہی میری نظریں اس کی بے نور نظروں سے ملیں اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ اور ٹانگ کے مقابلے میں سر کی چوٹ زیادہ درد کر رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری گردن پر میرا سر نہیں کوئی چٹان ہے جس کا بوجھ اٹھانا میرے بس کی بات نہیں۔

دیوار کو ہاتھ سے تھام کر میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ واش بیسن کے پاس رُک کر میں نے ایک ہاتھ سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو میری حالت کچھ سنبھلی۔ میں نے دروازے کے خلا کا رُخ کیا۔ پھر مجھے پیڈرو کے ریوالور کا خیال آیا اور میں واپس ہوا۔ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتا تھا اور میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ میں نے سیمسن کو مار دیا تھا اور دشمن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ ایک کی جگہ دوسرا ضمیر فروش ڈاکٹر تو لا سکتے تھے مگر دنیا کے بازار میں سیمسن اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ میں نے پیڈرو پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میری نگرانی میں اس سے کیا کوتاہی سرزد ہوئی اور اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ میں دلاور کو اس کی حماقت سے آگاہ کروں گا۔ پھر میں نے اس کو دھوکا دے کر ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اب ہوش میں آتے ہی وہ انتقام لینے کے لیے، سزا دینے کے لیے یا اپنی ذات کے تحفظ کی خاطر مجھے کوئی سوال کیے بغیر گولی مار دے تو عجب نہیں۔ دلاور کے سامنے وہ اس اقدام کو ناگزیر قرار دینے کے لیے دس جواز پیش کر سکتا ہے اور اسے مطمئن کر سکتا ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کرتا تو سیمسن کے بعد خود مارا جاتا اور پھر نرس ماری جاتی۔ ان کے زنداں کا راز فاش ہو جاتا اور دلاور آتا تو سیدھا پولیس کے جال میں گرفتار ہو جاتا۔ مجھے قتل نہ کرنے کے احکامات بہت واضح تھے لیکن اس کا مطلب یہ بہرحال نہیں تھا کہ مجھے سب کو قتل کرنے کا لائسنس مل گیا ہے۔ اپنے دفاع کے لیے قتل کرنے کا حق تو قانون بھی دیتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ دو گولیاں تو پیڈرو نے بھی چلائی تھیں۔ میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے دیکھا لیکن مجھے صرف ایک چابی ملی جو ڈور لاک سے زیادہ کسی ہتھکڑی کی لگتی تھی۔ میں نے اسے جیب میں ڈال لیا۔

پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر ریوالور نہ جانے کہاں تھا۔ اگر پیڈرو کے ہاتھ سے گرتا تو اسی باتھ روم کے فرش پر کہیں ہوتا۔ اگر گرتے گرتے بھی اس نے ریوالور کو نہیں چھوڑا تھا تو اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو کھینچا جو اس کے اوندھے پڑے ہوئے جسم کے نیچے آ گیا تھا۔ پیڈرو کراہا اور میں نے اسے پلٹ دیا۔ ریوالور نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اُٹھایا ہی تھا کہ پیڈرو نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"خبردار،" میں نے اس سے دُور ہو کے کہا۔ "میں گولی مار دوں گا۔" لیکن ہوش میں آتے ہی پیڈرو نے صورتِ حال کا اندازہ کر لیا۔ میری دھمکی کی پروا کیے بغیر اس نے پلٹ کر ایک ہاتھ بڑھایا اور میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں نے پیر کو جھٹکا لیکن یہ میرا صحت مند پیر نہیں تھا۔ پیڈرو نے اپنی گرفت اور سخت کر دی۔ ناقابلِ بیان درد نے مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا اور مجھے گرنے سے سنبھلنے کے لیے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ اتنی اذیت برداشت کرنے اور فنا و بقا کی اس جنگ کے آخری مرحلے میں جان کی بازی لگا دینے کے بعد ناکامی کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ اب میں شکست کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔

"پیڈرو، چھوڑ دے مجھے کتے!" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باوجود اپنا پیر چھڑا کے دروازے کی طرف بڑھنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ کمزوری مجھ پر پھر غالب آنے لگی لیکن دوبارہ بیہوشی کا مطلب تھا موت۔ میں نے ریوالور سے نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ریوالور میں گولی ہوتی تو پیڈرو کی کلائی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی مگر میگزین خالی ہو چکا تھا۔ ریوالور میں سے "کلک" کی آواز آئی۔ میں نے پھر کوشش کی اور آخری وقت میں جھک کر ریوالور کا دستہ پیڈرو کے ہاتھ پر مارا۔ پیڈرو کراہا اور میری ٹانگ آزاد ہو گئی۔ میں باہر بھاگا اور گرا۔ میری ٹانگ نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ پیڈرو اُٹھ کے کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور دوسری نظر سے اس بیساکھی کو جو میرے بیڈ کے ساتھ کھڑی تھی اور مجھ سے دور نہیں تھی۔ بیساکھی ہاتھ میں آتے ہی میں ایک ٹانگ پر اٹھا اور تیزی سے گھوما۔ پیڈرو کسی زخم خوردہ درندے کی طرح مجھے دبوچنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیساکھی گھمائی اور اس کے نچلے حصے کو پیڈرو کے سر پہ لگتے دیکھا۔ نچلا حصہ ڈنڈے کی طرح گول تھا اور اس پر لوہے کا خول تھا۔ پیڈرو نے اپنا سر پیچھے ہٹا کے بچنا چاہا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ بیساکھی اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اگر وہ پوری طرح ہوش میں ہوتا تو اس معمولی ضرب کو جھیل جاتا۔ بیساکھی لگتے ہی وہ نیچے گرا۔ وہ بیہوش نہیں ہوا تھا لیکن چکرا گیا تھا۔

میں دروازے کی طرف لپکا جو پیڈرو نے اندر آتے وقت کھلا چھوڑ دیا تھا۔ چابی باہر ہی لگی رہ گئی تھی۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر چابی گھما دی اور نکال کے جیب میں ڈالی۔ پھر میں نے اپنے زنداں کو باہر سے دیکھا۔ میں ایک زینے کے مقابل کھڑا تھا۔ دائیں بائیں کچھ بھی نہیں تھا جس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کمرہ جہاں میں قید تھا اور جہاں اب سیمسن کی لاش کے علاوہ پیڈرو پڑا رہ گیا تھا کسی مکان میں سب سے اوپر والی منزل پر بنا ہوا واحد کمرہ تھا۔ کھڑکی سے نظر آنے والے درختوں کی بلندی سے اور پرندوں کو محوِ پرواز دیکھ کر میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں سطحِ زمین سے خاصا اوپر ہوں۔ تیسری یا چوتھی منزل پر۔ اب میں نے زینے کو دیکھا تو مجھے ایک اور طلبگارِ جاں مرحلے سے گزرنا مشکل دکھائی دیا۔ یہ زینہ صرف ایک ڈھانچہ تھا جس میں بغیر پلاستر کی سیڑھیاں تھیں اور کوئی ریلنگ نہیں تھی۔ دونوں طرف آڑے ترچھے زنگ خوردہ سریے نکلے ہوئے تھے۔ اگر دیوار اٹھائی جاتی تو یہ سریے اندر آ جاتے لیکن نہ جانے کیوں باتھ روم کی طرح زینہ بھی تکمیل کے آخری مراحل میں رُک گیا تھا۔ ایک طرف گھر کی نچلی منزل کا پورا نقشہ تھا لیکن دوسری طرف صرف خلا تھا۔ خالی میدان جس میں اینٹ پتھر کے ڈھیر تھے اور خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک ببول اُگا ہوا تھا۔ قریب ترین مکان بھی پچاس گز دُور تھا اور بیشتر مکان ایک دوسرے سے الگ، زیرِ تکمیل یا نئے بنے ہوئے تھے۔

میرا اندازہ درست تھا۔ میں دو منزلہ مکان کی چھت پر بنے ہوئے کمرے میں بند تھا گویا تیسری منزل پر تھا۔ سب سے اوپر کا یہ کمرہ فاضل تھا جسے مکین پورا نہ کر سکے تھے تاہم یہ رہائش کے قابل تھا اور اس میں مہمان ٹھہر سکتے تھے یا نوکر رہ سکتے تھے۔ غور سے دیکھنے کے باوجود میں گرد و نواح سے اندازہ نہ کر سکا کہ میں کہاں ہوں۔

بیساکھی بغل میں دبا کے میں نے پوری احتیاط کے ساتھ پہلے زینے سے دوسرے زینے پر قدم رکھا۔ اپنا توازن برقرار رکھنا انتہائی ضروری تھا ورنہ میں دائیں جانب بیس فٹ نیچے پتھروں پر گرتا یا بائیں جانب اس سے نصف فاصلہ طے کر کے صحن میں سیمنٹ کے پکے فرش پر۔ دو زینے اُتر کے مجھے احساس ہوا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ پہلے میں جسم کا سارا بوجھ ایک ٹانگ پر ڈالتا تھا جو ٹھیک تھی۔ پھر کسی چیز کا سہارا لیے بغیر بیساکھی اگلے زینے پر رکھتا تھا اور اس مصنوعی ٹانگ کے سہارے آگے جھک کر نیچے آتا تھا۔ دونوں زینوں پر میرے جسم کی ساری قوت صرف ہوتی تھی۔ آسان تو ایک ٹانگ پر اچھلنا بھی نہ تھا مگر بیساکھی کے نچلے گول حصے پر توازن رکھنے کی مجھے مشق ہی نہ تھی۔ تیسرا زینہ اُترنے سے پہلے مجھے چکر سا آیا اور زینہ میری نظروں کے سامنے ہلنے لگا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔

بیٹھ کے اُترنا نسبتاً آسان تھا اور اس میں گرنے کے امکانات معدوم تھے۔ نیچے پہنچنے سے پہلے مجھے کئی بار پیڈرو کا خیال آیا۔ وہ کھلی کھڑکی کے راستے نیچے اُتر سکتا تھا مگر آسانی سے نہیں۔ جسمانی طور پر وہ پوری طرح چاق و چوبند ہوتا تو روایتی انداز میں چادر پھاڑ کے پٹیاں بناتا اور پٹیوں کو گرہ دے کر رسّی۔ پھر وہ اسی رسّی کے سہارے ہر گانٹھ کو انگلی اور پیر کے انگوٹھے میں پھنساتا نیچے اُتر جاتا لیکن ابھی تو اس کا ذہن بھی اس حد تک معاون نہیں ہوگا اور بالفرض محال اُس نے رسّی بنا بھی لی تو اس کی جسمانی صلاحیت آڑے آئے گی۔ اسے سوچنا پڑے گا کہ اس کوشش میں وہ اپنا وزن نہ سنبھال سکا تو نیچے گر کر کیسے اُٹھے گا۔ بہرصورت وہ دس پندرہ منٹ سے پہلے کمرے سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔

نیچے والی منزل کا ہر کمرہ بند اور مقفل تھا۔ گرد و غبار کی تہ بتاتی تھی کہ مدت سے یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ دلاور اینڈ کمپنی ہمیشہ ایسے ہی گھروں کا انتخاب کرتی تھی جن سے اس کا دُور کا بھی تعلق ثابت نہ ہو۔ ہر آبادی میں ایسے گھر مل ہی جاتے ہیں جن کے مالک دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں ہوں، مر چکے ہوں اور گھر لاوارث رہ گئے ہوں یا آسیب زدہ مشہور ہو گئے ہوں اور کوئی ان میں رہنے کے لیے نہ آتا ہو۔ دلاور اور اس کے حواری تو ایسے گھر تلاش کر کے نظروں میں رکھتے ہوں گے جو ان کے کام آئیں لیکن ان کا سراغ نہ دیں۔ ماضی میں ایسا کئی بار ہو چکا تھا۔

سب سے نیچے والی منزل تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہ بنا کیونکہ زینے کے ایک طرف دیوار تھی تو دوسری جانب لکڑی کی ریلنگ۔ لیکن ابھی میں نے آخری زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چھپنے کے لیے نہ جگہ تھی اور نہ وقت تھا۔ چند سیکنڈ بعد نرس نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بُری طرح چونکی اور اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکالنے کے لیے بڑھا مگر میں خالی ریوالور کا رُخ پہلے ہی اس کی طرف کر چکا تھا۔

"بالکل سیدھی کھڑی رہو،" میں نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔ "ورنہ جس طرح میں دو گولیوں سے سیمسن اور پیڈرو کو ٹھنڈا کر آیا ہوں اسی طرح تیسری گولی سے ..." میں نے نشانہ لینے کے انداز میں ریوالور اُوپر اٹھایا۔

"پلیز ... پلیز مجھے مت مارو ..." وہ کانپنے لگی۔ "تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گی ...!"

"اچھا تو پہلے اپنے دونوں ریوالور نکالو۔ احتیاط سے آہستہ آہستہ اور نیچے میرے پیروں کی طرف پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "یہ مت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھولنا کہ مجھے صرف ٹریگر دبانا ہے۔ ذرا سی غلط حرکت کا شبہ بھی ہوا مجھے تو میں سوچوں گا نہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف سرکا دیا۔ میں نے جھک کر اُسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ "اب دوسرا۔ جس سے تم نے مجھے گینڈا سمجھ کر بے ہوشی کا انجکشن دیا تھا۔" میں نے کہا اور اس وقت مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے اپنا خالی ریوالور رکھ کے جیب سے نرس کا دیا ہوا ریوالور نکال لیا۔ اس کا ردِعمل انتہائی غیر متوقع تھا۔ نرس نے بڑی پھرتی سے دوسرا ریوالور نکالا اور پیچھے ہٹ کر میرا نشانہ لیتے ہی فائر کر دیا۔ میں اُسے گولی مار سکتا تھا لیکن میری خواہش یہ تھی کہ اس پیشہ ور قاتلہ کو زندہ گرفتار کروں اور اس سے وہ سب پوچھ لوں جو مجھے معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے کے بجائے میں نے نیچے گر کے خود کو اس زہریلے تیر نما کارتوس سے بچا لیا جو میرے جسم میں کہیں بھی پیوست ہو جاتا تو تین منٹ کے اندر اندر مجھے لٹا دیتا۔

میں نے نرس کو ایک گالی دی جو بلا ارادہ میری زبان پر آ گئی تھی اور محض اُسے خوف زدہ کرنے کے لیے ریوالور اٹھا کے ٹریگر دبا دیا۔ میں مطمئن تھا کہ گولی اُسے چھوئے بغیر اس کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی لیکن ایک بار پھر ٹریگر دبنے کی آواز نہ آئی۔

نرس قہقہہ مار کے ہنسی۔ "اب تم جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ نہ جانے کیوں ہنسی کی طرح مجھے یہ حکم بھی ایک کھوکھلی دھمکی لگا۔ مجھے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا غالباً پیڈرو نے اس کے ریوالور کی گولیاں نکال لی تھیں اور نرس یہ بات جانتی تھی۔ اس سے پیڈرو کا خالی ریوالور بہرحال بہتر تھا جس نے نرس کو دہشت زدہ کر کے میرا حکم ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ وہ پھر مجھے نشانہ بنائے کھڑی تھی۔ ایک سیکنڈ منجمد ہو کے انتظار کا کرب بن گیا۔

"انتظار کس کا ہے؟" میں نے اس سیکنڈ کے بوجھ تلے دب کر کہا لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ پھر حقیقت کو میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا۔ نشانہ خطا ہو جانے کے بعد وہ بھی خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ یہ ریوالور بے مصرف ہو گیا تھا۔ شاید دوسری بار چلانے کے لیے اُسے پھر لوڈ کرنا پڑتا تھا۔ نرس کی ہنسی ایک بے جان مسکراہٹ میں ڈھل کے غائب ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ اٹھا اور بیساکھی لے کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں بے مصرف کھلونے ہیں۔" میں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "عملاً ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ میری ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پوری طرح کار آمد نہیں لیکن میرے پاس یہ اضافی ہتھیار ہے۔" میں نے بیساکھی اٹھا کے کہا۔ "اس کے علاوہ۔ جیسے مرا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ایسے ہی آدھا مرد پوری عورت کے مقابلے میں بھاری پڑتا ہے تم آزمانا چاہو گی؟"

"اگر تم نے... میری طرف قدم بڑھایا۔" وہ چلائی اور اس نے خالی ریوالور مجھ پر کھینچ مارا۔ ریوالور ایک فٹ دور سے گزرا اور زینے کی دیوار پر لگا۔ "میں شور مچا دوں گی۔" وہ نروس ہو کے بولی۔

"چو مچائے شور۔" میں نے کہا۔ "اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو فائدہ ہو گا یا نہیں۔ یہ تم کو یقیناً معلوم ہو گا۔ شور مچانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو میں تمھارے مقابلے میں لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلّا سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس سے صرف میری آواز خراب ہو جائے گی۔ سُنے گا کون میری۔ تمھاری آواز بھی کہاں تک جائے گی۔ سُننے والے تو مر گئے۔" موت کی خبر نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"پھر... مجھ سے کیا... کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ ایک قدم پیچھے ہو کے بولی۔ "میرا کوئی قصور نہیں... میں مجبور تھی۔"

"ہم سب کے پاس مجبوری ایک ڈھال کا نام ہے۔" میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ "اس کی آڑ میں ہم اپنی ہر غلطی کو چھپا کے دنیا سے لڑتے ہیں۔ چور کہتا ہے میں مجبور تھا۔ طوائف خود کو مجبور کہتی ہے اسمگلر تک مجبور ہے یہاں آخر کون سی مجبوری ہوتی ہے یہ... پیٹ کی؟ پیٹ بھر روٹی تو شرافت اور عزت سے بھی مل جاتی ہے۔ مجبوری ہوتی ہے ہوسِ زر کی۔ اس دولت کی جس سے تن آسانی اور عیاشی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔" جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا وہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ وہ ایک دیوار سے جا لگی اور اس کے لیے مزید مراجعت ممکن نہ رہی۔ میرے اور اس کے درمیان تین فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

"میرے پاس وقت کم ہے اس لیے میں تمھاری مجبوری کی کہانی سُننے نہیں بیٹھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسلحہ چاہیے۔ ریوالور کی دونوں قسم کی گولیاں جو تم استعمال کرتی رہی ہو۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے اب۔" وہ بولی۔ "تمھاری وجہ سے اُنھوں نے سب کچھ چھین لیا۔"

"میری وجہ سے۔ خوب۔ گویا وہ میری غلطی تھی جس کی وجہ سے تم نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"تم کو یقین نہیں تو میری تلاشی لے کر دیکھ لو۔" وہ بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس نے ریوالور سے گولیاں نکالی ہوں گی بے ہوش کرنے والی گولی میرے پاس ایک ہی رہتی تھی۔"

"افسوس یہ ہے کہ میں تم جیسی عورت پر یقین نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں علم تھا کہ ریوالور خالی ہے؟"

"ہاں... ابھی ہوش میں آنے کے بعد میں نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس نے مجھے قابو کر کے ریوالور چھین لیا اور گولیاں باہر پھینک دیں۔"

"پھینک کیوں دیں؟" میں نے کہا۔ "جیب میں کیوں نہیں ڈالیں؟ وہ خود اُنھیں استعمال کر سکتا تھا۔"

نرس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا ریوالور دوسری ساخت کا تھا۔ گولیاں باہر پڑی ہوں گی۔ تم ڈھونڈ سکتے ہو۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ یہ طے کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے یا مجھے اُلّو بنا رہی ہے۔ اس کا چہرہ اور آواز دونوں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھے۔ "تم نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی اور اس نے صرف ریوالور خالی کرنا مناسب سمجھا؟" میں نے کہا۔ "تمھیں کچھ نہیں کہا؟"

"اس نے... مارا تھا مجھے...۔" اس نے اپنا رخسار سامنے کیا جس پر چار انگلیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ "میں گر گئی۔ وہ سمجھا میں پھر بے ہوش ہو گئی ہوں۔ اُسی وقت اُوپر سے ایک دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا... وہ مجھے چھوڑ کے اوپر بھاگا۔ اُسے دوسرا ریوالور لینے کا خیال نہیں آیا جلدی میں۔"

"اس دوسرے بے ہوش کرنے والے ریوالور کی گولی وہ کہاں سے لاتا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو وہ اپنی جیب سے نکال کے دیتا تھا۔" وہ بولی۔ "اور میرا خیال ہے اس کے پاس ایک ہی ہوتی تھی۔"

میں نے غور کیا تو مجھے سب سے نچلی منزل کے سارے کمرے بھی بند نظر آئے۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور شاید پانچ مرلے پر بنا ہوا تھا۔ ہر منزل کا نقشہ ایک ہی تھا۔ دائیں طرف ایک کمرہ سامنے دو کمرے۔ دونوں کمروں کے سامنے برآمدہ اور بائیں جانب ایک قطار میں تینوں خانے یعنی باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ برآمدے میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ غالباً اس پر نرس سوتی ہو گی۔ سیمسن کے لیے فرشِ خاک اور بسترِ ریشم و کمخواب برابر تھے۔ وہ دونوں باری باری سوتے جاگتے ہوں گے اور میری نگرانی کرتے ہوں گے۔ کھلا باورچی خانہ اس بات کا ثبوت تھا کہ نرس کے لیے وہاں کھانے پکانے کی سہولت فراہم کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ باورچن بھی تھی۔ اپنے علاوہ سیمسن کو بھی پکا کے کھلاتی تھی اور مجھے بھی۔ پیڈرو یا دلاور جیسے معزز مہمانوں کے لیے چائے کافی بھی وہی بناتی ہو گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلحہ دشمن کچن کے کسی خانے میں پوشیدہ ہو؟ میں نے سوچا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" نرس نے کہا۔ "باورچی خانے میں تمھارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"تم تو خیالات تک پڑھ لیتی ہو۔" میں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسے اعتبار نہیں کر سکتا میں تم پر۔ اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو۔ میں تلاشی لوں گا۔ حرکت بالکل نہ کرنا بلکہ سانس بھی احتیاط سے لینا تم نے میرے خالی ہاتھوں کا کمال دیکھا ہے۔"

"تم وقت ضائع کر کے خطرہ مول لے رہے ہو۔" وہ پلٹ کر بولی۔ "یہ نہ ہو کوئی آ جائے۔"

اس کا احساس مجھے بھی تھا لیکن فرار ہونے سے پہلے میں اس امر کو یقینی بنا لینا چاہتا تھا کہ یہ شکاری عورت زیرِ دام آ جانے والے شکار کو حلقۂ دام توڑ کے فرار ہوتا دیکھے گی تو گولی نہیں چلائے گی۔ پیڈرو کا کسی بھی وقت ہوش میں آ جانا ممکن تھا اور اس کے لیے بند کمرے سے نکل آنا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔

"کیا سچ مچ تم نے پیڈرو کو مار دیا ہے؟" وہ میری صورت پر تذبذب کے آثار دیکھ کر بولی۔

"ہاں۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لاشیں دیکھنا چاہتی ہو تو چلو۔ تمھیں بہت صدمہ ہے؟"

"نہیں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میرا کون سا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ میں بھی تو وہی کرنے والی تھی جو تم نے کر دیا ہے۔ دلاور کی بات کر رہی تھی۔ یہ اس کے آنے کا وقت ہے۔ وہ آ گیا تو ہمارا نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ہمارا؟" میں نے جمع کے صیغے پر حیران ہو کے کہا۔ "اگر تم بھی میرے ساتھ ہی نکلنے کا سوچ رہی ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ میں تم کو یہیں باتھ روم میں بند کر جاؤں گا۔"

"پلیز۔ دلاور مجھے مار ڈالے گا... مجھے یہاں مت چھوڑو۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "میں تمھاری مدد کروں گی۔"

"کیسے اور کیوں؟" میں نے کہا۔ "مجھ سے کیا ہمدردی ہو گئی ہے اچانک تم کو؟" میں نے کہا۔

"اس جرح سے کیا فائدہ۔" وہ بولی۔ "نکلنا مجھے بھی ہے یہاں سے اور تم کو بھی۔ ساتھ لے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے تو جاؤ مگر مجھے بند کر کے مت جاؤ۔ مجھے بھی زندہ رہنے دو۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرو گی؟" میں نے کہا۔ "یہ کوئی نئی چال تو نہیں ہے؟"

"تم کو اعتبار تو ہے نہیں مجھ پر۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ پھر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ضمانت میں کیسے دوں ؟" وہ بولی ۔" جو پوچھنا ہے یہاں سے نکل کر پوچھ لینا۔ یقین کرنا چاہو تو کرنا ورنہ مجھے جہاں چاہو چھوڑ دینا۔ میرے تمہارے راستے الگ ہو جائیں گے ۔"

"اچھا ۔" میں نے کہا ۔"تم آگے چلو ۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں ۔ یہ کون سی جگہ ہے اور کون سا شہر ہے ۔" اس کے ساتھ ہی میں اُسے راستہ دینے کے لیے پیچھے ہو گیا ۔

"تمہیں نہیں معلوم کہ تم راولپنڈی میں ہو ؟" وہ حیرانی سے بولی ۔" یہ ٹینچ بھاٹہ کا علاقہ ہے ۔ ذرا آگے دھمیال ہے ۔ جہاں پہلے ایک چھوٹا سا ایئر فیلڈ تھا ۔ سڑک ایک میل دور ہو گی ۔ ہم کھیتوں سے گزر کے ایک کستی عبور کریں گے ۔"

"کستی کیا ؟" میں نے کہا ۔

"ایک نالہ ہے ۔" وہ بولی ۔" سارا سال تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے ۔ تم چل سکو گے نا ؟"

"ہاں ۔ چلنا ہی پڑے گا ۔" میں نے کہا ۔

"اسی طرح ؟ ننگے پاؤں ۔" وہ بولی ۔" میں اوپر سے جوتے لے آتی ہوں تمہارے ۔ ۔ ۔"

"نہیں ۔" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔" اس رعایت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی مت سوچو ۔ میری فکر مت کرو اور باہر چلو ۔" میں نے اُسے مخالف سمت میں دھکیل دیا ۔ اگر پیڈرو واقعی مر گیا ہوتا تو شاید میں اُسے اوپر جانے دیتا لیکن اب میں افشائے راز سے ڈرتا تھا ۔ نرس کی صورت پر دکھ کا ایک سایہ آ کے گزر گیا ۔

باہر کھلا آسمان تھا اور اس کی نیلگوں وسعت میں پرندے آزادی سے پرواز کر رہے تھے ۔ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی جیسی منڈیر پر چلتے ہوئے میں نے بھی انہی پرندوں کی طرح محسوس کیا جو پنجرہ کھلا پا کے اڑ جاتے ہیں ۔ گندم کی فصل پک چکی تھی اور فضا میں خوشۂ گندم کی دلنواز مہک تھی ۔ ہوا گرد و غبار اور دھوئیں سے پاک تھی اور اس میں سانس لینا ایک انتہائی فرحت بخش تجربہ تھا ۔ پرندوں کی چہکار کے علاوہ کبھی کبھی فصل اُگانے والے محنت کشوں کی صدا بھی سنائی دے جاتی تھی ۔" ہا آ ۔ ۔ ۔ ہو و ۔" اور اس کے ساتھ ہی خوشہ چینی کرنے والی چڑیوں کا ایک غول پھر سے اُڑ جاتا تھا ۔ اپنی محنت کے ثمر کو بچانے کے لیے کاشت کاروں نے ڈنڈے جوڑ کر عجیب و غریب نمونے کھڑے کر دیے تھے ۔ پھٹے پرانے کوٹ ، پتلون پہنے اور ٹوپی یا ہیٹ لگائے یہ ڈراؤنے ڈھانچے دُور سے آدمی کی طرح نظر آتے تھے چنانچہ کم عقل پرندے اُسے محافظ سمجھتے ہوئے قرب و جوار میں دانہ چگنے کی ہمت نہیں کرتے تھے ۔ قریب سے دیکھنے پر پیکارڈ جدید مجسمہ سازی میں کسی تجریدی تجربے کا شہکار لگتے تھے ۔ احتیاطاً میں نے منڈیر چھوڑ کے کھیتوں کے کنارے پر چلنا شروع کیا ۔ زمین نرم تھی اور اس میں کنکر نہیں تھے ۔ زیادہ حصے پر دوب یا چھوٹی مگر گھنی گھاس تھی ۔ چنانچہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تھی ۔"تم ان راستوں سے واقف ہو ۔ یہیں رہتی ہو کیا ؟" میں نے پیچھے سے کہا ۔

"نہیں ۔ لیکن میں آتی جاتی رہی ہوں ۔" وہ آگے چلتے چلتے بولی ۔

"آج دن کون سا ہے ۔ اور تاریخ کیا ہے ؟" میں نے اچانک پوچھا ۔

"دن ہے جمعرات اور تاریخ ہے ستائیس ۔" وہ بولی ۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا ۔ میرے حساب سے وقت تقریباً ایک ہفتہ پیچھے ہو گیا تھا ۔ مجھے شک تو شروع سے تھا کہ میری بے ہوشی میں وقت کا حساب گڑبڑ کر دیا گیا ہے اور گھڑی ، کیلنڈر یا اخبار کی عدم موجودگی میں صرف اندھیرے اُجالے سے وقت کی رفتار کا اندازہ کرنا محال تھا ۔ دلاور اور پیڈرو نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ میرے اغوا کی واردات کو دو ہفتے بیت چکے ہیں ۔ محسن کو مرے ہوئے چودہ دن ہو گئے ہیں ۔ میرے دل میں ایک ٹھیس سی اٹھی ۔ ایک ہفتہ ۔

اب تک تو جیتے جاگتے محسن کا جسم فقط ہڈیوں کا پنجر رہ گیا ہو گا ۔ ایک ہفتہ کم ہو گیا تو کیا ہوا ۔ رابعہ کا کیا حال ہو گا ؟ میرے تصور نے ایک تصویر پیش کی ۔ وہ بالکل گم صم اور تنہا بیٹھی تھی ۔ اس کے کپڑے میلے اور شکن آلود تھے ۔ بال پریشان تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے ۔ کیوں کہ اس نے کھانا پینا سونا سب چھوڑ رکھا تھا ۔ ایک ہفتے بعد وہ ایک سال کی بیمار لگتی تھی ۔ پھر میں نے فوزیہ کو دیکھا جس نے آخری بار میری آواز سُنی تھی ۔ وہ رو رہی تھی اور شیخ اسے تسلی دے رہا تھا کہ رونے کی کیا بات ہے ، سکندر زندہ ہے تو لوٹ کر ضرور آئے گا ۔ (کیا شیخ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ نازو کے آنسو کیا کہانی سنا رہے ہیں ؟) ۔ تیسری تصویر شہلا کی تھی جو میرے تصور کی گرفت میں ہی نہ آئی ۔ وہ سب سے کمزور ، مظلوم اور بے سہارا لڑکی تھی ۔ اس نے اپنے وجود کی بنجر ہو جانے والی زمین میں سخت جدوجہد کے بعد محبت کے پھول کھلائے تھے ۔ محسن کی محبت ، میرے جیسے بھائی کی محبت ۔ ان رشتوں کی محبت جو اجنبی ہو کے بھی اپنے ہو گئے تھے ۔ موت کی آندھی نے وہ گلشن اُجاڑ دیا ۔ ایک زندگی میں دوسری بار مرنے کے بعد اُس نے جینا قبول کیا ہو گا ؟ جواب حوصلہ شکن تھا ۔ وہ کم ہمت لڑکی مر گئی ہو گی ۔

لیکن ابھی ابھی وقت ایک ہفتہ پیچھے لوٹ گیا تھا ۔ ایک حقیقت جسے میرے ذہن نے قبول کر لیا تھا فریبِ خیال بن گئی ۔ وہ بات ، جو پہلے پیش کی گئی تھی ، دھوکا ثابت ہوئی ۔ اُمید کا ایک ستارہ مایوسی کے تاریک اُفق پر یوں روشن ہوا کہ اس کی تابندگی نے میری عقل کو خیرہ کر دیا ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سب جھوٹ ہو ۔ اوّل تا آخر ۔ اغوا صرف مجھے کیا گیا ہو اور باقی خبریں محض میرے ذہن کو مایوسی ، شکست خوردگی اور بے بسی کے احساس سے دوچار کرنے کا ذریعہ ہوں ؟ مقصد میرا حوصلہ پست کرنا ہو تا کہ میں احساسِ جرم و ندامت میں مبتلا ہو کے جینے کی جدوجہد ہی چھوڑ دوں ۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ بالآخر میں اپنے عزیز ترین دوست محسن کی موت کا سبب بنا ۔ اپنے محسن انکل رضوی کے کیریئر کی تباہی کا سبب بنا اور رابعہ کے مستقبل کی بربادی کا سبب بنا ۔

میں اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا ۔ اچانک میرے کانوں نے کچھ آوازیں سنیں ۔ یہ ان آوازوں سے بالکل الگ تھیں جو کسان پرندوں کو اڑانے کے لیے نکال رہے تھے ۔ کچھ لوگ تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے یا ایک دوسرے پر چلا رہے تھے اور یہ آوازیں قریب آ رہی تھیں ۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں تعاقب کرنے والوں کا خیال آیا ۔ میں نے نرس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا چلنے کے بجائے کھیتوں کے اندر گھستا چلا گیا ۔ وہ ایک جھٹکے سے میرے ساتھ آئی اور اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ۔ ابھی اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بیساکھی چھوڑ کے اس کا منہ دبا لیا اور کھڑی فصلوں کے درمیان گر گیا ۔

"خبردار جو آواز نکالی ۔" میں نے سرگوشی میں کہا ۔" گلا گھونٹ دوں گا ۔"

نرس نے وحشت زدہ سہمی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مزاحمت بالکل نہیں کی ۔ میں سانس روکے پڑا رہا اور ہلکی سی نم آلود مٹی کی سبز پتوں کی اور گھاس کی خوشبو سونگھتا رہا ۔ میرا صرف ایک ہاتھ پوری طرح کارآمد تھا اور اس سے میں نے نرس کو قابو کر رکھا تھا ۔ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرتی تو میں ایک ٹانگ سے بھی کام لے سکتا تھا ۔ آوازیں اب واضح ہونے لگی تھیں ۔

"وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتے ۔" یہ آواز پیڈرو کی تھی ۔" میں نے بیساکھی کے نشان زمین پر دیکھے تھے ۔"

"تم اس سے بہت آگے نکل آئے ہو ۔" دلاور نے کہا اور خوشبو کے نازک تنوں کی چلمن سے میں نے ان دونوں کو منڈیر پر کھڑا دیکھا ۔" وہ نشان اب کیوں نظر نہیں آ رہے ہیں ؟"

"عورت ذات میں وفا نہیں ۔" پیڈرو نے دانت پیس کر کہا ۔" وہ میرے ہاتھ آ جائے تو اس کے ٹکڑے کر کے یہیں ڈال دوں ۔ کتے اور گدھ کھا جائیں ۔ کیا نہیں دیا میں نے اُسے ۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا ۔

"اگر وہ نہ ملے تو یہی سلوک میں تمہارے ساتھ کروں گا ۔" دلاور نے سکون سے کہا ۔" تمہیں بھی سب کچھ دیا ہے میں نے ۔ تمہاری اوقات سے زیادہ ۔" ایک بِل میں سے نکلنے والے چیونٹوں نے میری ٹانگ پر چلنا شروع کیا ، میں نے پیر کو جھٹکا ۔

"چوہدری صاحب ۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس ۔ ۔ ۔ کے ساتھ مل گئی ہو گی ۔" پیڈرو نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی ۔

"کیوں ؟ کیا وہ پہلے بڑی شوہر پرست اور باوفا تھی ؟" دلاور نے طنز سے کہا ۔" سکندر بھی کم پُرکشش مرد نہیں ہے پیڈرو ۔"

"جہاں آ کے بیساکھی کے نشانات ختم ہوئے تھے ، وہاں سے دائیں اور بائیں جانب کھیتوں میں تلاش جاری ہے ۔" پیڈرو نے دبے دبے لہجے میں کہا ۔" وہ بچ کے کیسے نکل سکتے ہیں ۔ شکاری کتے ان کے پیچھے ہیں ۔"

"سڑک زیادہ دور نہیں ہے پیڈرو ۔" دلاور نے کہا ۔" اور ہوا کا رُخ مخالف ہے ۔ کتے ان کی بُو نہیں پا سکتے ۔"

یہ بڑا لرزہ خیز انکشاف تھا کہ وہ تربیت یافتہ شکاری کتے لے کر ہمارے تعاقب میں نکلے تھے ۔ ہوا کی موافقت ایک تائیدِ ایزدی تھی ورنہ اب تک آدم بُو کو راڈار کی طرح محسوس کر لینے والے خون آشام کتے ہمارے دامن کی دھجیاں بکھیر چکے ہوتے اور اپنے دانتوں سے ہمارا گوشت اُدھیڑتے ہوئے ہمیں پھر اُنہی کے پاس پہنچا دیتے جو انسان کے بھیس میں زیادہ بے رحم درندے تھے ۔

وہ دونوں کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے ۔" ایک کسان نے انھیں اسی طرف سے گزرتے دیکھا تھا ابھی کچھ دیر پہلے ۔" پیڈرو نے کہا ۔" اس نے جو حلیہ بتایا تھا وہی تھا ۔" چیونٹے میری ٹانگ پر کاٹنے لگے تھے مگر میں ضبط کر رہا تھا ۔

"اگر تم سڑک پر پہنچ کے پوچھو گے تو بہت سے لوگ بتا دیں گے کہ انھوں نے بھی ایک نرس اور ایک بیساکھی کے سہارے چلنے والے لنگڑے آدمی کو دیکھا تھا ۔" دلاور تلخ لہجے میں بولا ۔" تلاش کرو گے تو کوئی ٹیکسی والا بھی بتا دے گا کہ وہ کہاں سے بیٹھے تھے اور کہاں گئے تھے ۔ ان کی جوڑی بہت نمایاں تھی ۔ نرس کی سفید یونیفارم اور اس کے ساتھ ایک جوان اور ہینڈسم آدمی جو معذور تھا ۔ مگر یہ معلومات ان کا بدل نہیں ہیں پیڈرو ! مجھے ان کا سراغ نہیں ، وہ دونوں چاہئیں ۔"

"وہ ان ہی کھیتوں میں چھپے ہوئے ہوں گے چوہدری صاحب ۔" پیڈرو نے لاجواب ہو کے کہا ۔" مل جائیں گے ۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اچھا تو دیکھو۔ دو میل اِدھر اور دو میل اُدھر۔" ولاور نے زن سے اس کے منہ پہ ایک تھپڑ رسید کیا۔ بالکل نارمل لہجے میں بات کرتے کرتے چوہدری نے اتنی پھرتی سے ہاتھ چلایا تھا کہ پیڈرو دم بخود رہ گیا۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر گال تک گیا۔ طمانچے کی آواز بتاتی تھی۔ ضرب کتنی شدید ہو گی۔ چیونٹے اب میری پنڈلی پر رینگتے ہوئے بہت اُوپر تک چلے گئے تھے۔ ایک چیونٹے نے نرس کو کاٹا۔ وہ تڑپی لیکن چلّا نہ سکی۔ اُسی وقت دلاور پلٹا اور واپس چلنے لگا۔ پیڈرو کی بہت ذلت ہوئی تھی مگر وہ پٹے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے پیچھے چلنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ تذلیل کا یہ تماشا سرِعام نہیں ہوا اور کسی نے اُس کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کو نہیں دیکھا۔

پتلون کے دو پائنچوں کی سُرنگ میں داخل ہو جانے والے چیونٹے میرا گوشت نوچ رہے تھے اور یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ نرس کا حال بھی کم خراب نہ تھا۔ چیونٹے اسے بھی کاٹ رہے تھے۔ وہ بار بار ٹانگیں چلاتی تھی اور میں مجبور تھا کہ اُسے حرکت بھی نہ کرنے دوں۔ ورنہ پودوں کے درمیان یہ ہلچل اور سرسراہٹ دشمنوں کو متوجہ کر لیتی جو ہم سے بمشکل تمام دس گز کے فاصلے پر موجود تھے۔

ان کے جاتے ہی میں نے نرس کو چھوڑ دیا اور اُٹھ کر زمین پر زور زور سے پیر مارے۔ پتلون کو اوپر سے جھاڑا اور بالآخر چیونٹوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نرس نے بھی "ہائے اوئی" کرتے ہوئے ایک ایک چیونٹے کو نامراد، کم بخت اور بدذات قسم کے نام دے کر ختم کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں کھیتوں سے نکل آئے۔

"تم نے مجھ سے پیڈرو کے متعلق جھوٹ کیوں بولا تھا؟" وہ کپڑے جھاڑ کے بولی۔

"کیا اُسے زندہ پا کے تمہیں افسوس ہوا ہے؟" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اگر تمہیں موقع ملا تھا تو تم نے اُسے قتل کیوں نہیں کر دیا؟" وہ بولی۔ "سیمسن کا ڈر تھا تمہیں؟"

"سیمسن؟ اس گوریلے کو میں پہلے ہی مار چکا تھا۔" میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ "مگر خود میری حالت ابتر تھی۔ پیڈرو کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا ریوالور بھی خالی ملا تھا۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ اب میں آزاد ہوں۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری راہ میں کوئی مجبوری حائل نہیں۔"

"مجبوری کا حوالہ تم نے پہلے بھی دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیا تھی وہ مجبوری؟"

"مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا شوہر ہے۔" وہ چلائی۔ "لیکن مجھے اس سے نفرت ہے۔ تم میں اگر ہمت نہیں تھی تو مجھے بتاتے۔ میں خود اُسے قتل کراتی۔"

اس انکشاف نے مجھے ایک لمحے کے لیے سُن کر دیا۔ "تم ... تم بیوی ہو اس کی۔ پھر یہ پیٹر کون ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تمہاری ماں مر جائے گی۔ پھر پیٹر تم کو مار ڈالے گا۔"

"پیٹر ... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے مجھے۔ میری خاطر اُس نے اپنی زندگی برباد کر لی۔" وہ کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئی اور منہ چھپا کے رونے لگی۔ "پندرہ سال پہلے اس نے مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی جو اب تک اس کے پاس ہے۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کی تم دونوں نے؟" میں نے اس کے پاس بیٹھ کے نرمی سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمارا خاندان مقروض تھا۔ میرے شرابی باپ نے سب کچھ بیچ دیا تھا یا جُوئے میں ہار دیا تھا۔ پہلے بیوی کا زیور پھر وہ گھر جس میں ہم رہتے تھے۔ وہ گھر میری ماں کا تھا اور میری ماں نرس تھی۔ ایسی نرس نہیں جیسی میں ہوں۔ خداوند یسوع مسیح کی قسم وہ ایسی نہیں تھی۔" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"پھر پیڈرو نے کہا کہ وہ تمہارے سارے قرض ادا کرے گا اور تمہارا گھر بھی تمہیں واپس مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ تم اس سے شادی کر لو۔"

اس نے روتے ہوئے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "کیا یہ سب کچھ پیڈرو نے بتایا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا ہے۔ گو پیڈرو بھی محبت کرتا ہو گا تم سے۔"

"محبت۔" اس نے آنسو پونچھ کے نفرت سے کہا۔ "اس لفظ کا مطلب تک نہیں جانتا وہ۔ اس کے خون میں صرف نفرت ہے اور اس کا خون زہریلا ہے۔ اس نے پہلے میری ماں کو بلیک میل کیا پھر مجھے۔"

"تمہاری ماں کا قصور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کوئی قصور نہیں تھا اس کا۔ تمام زندگی جہنم کا عذاب سہنے کے بعد اس نے ایک شیطان سے نجات حاصل کر لی تو کیا یہ اس کا قصور ہوا؟" وہ بولی۔ "کب تک سہتی وہ ہر ظلم۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"اور اس حد سے گزر کے تمہاری ماں نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

"ہاں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ شراب نے اس کا جگر چھلنی کر دیا تھا۔ میری ماں نے تو اس کے ساتھ نیکی کی اور اُسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنے سے بچا لیا۔ صرف ایک انجکشن سے اس کے اور اپنے تمام دکھوں کا خاتمہ کر دیا۔" وہ بولی۔

"تمھاری ماں اُس کا علاج بھی تو کرا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کس لیے؟ تاکہ وہ پھر اسی راستے پر چلنے لگے۔ جس پر وہ کئی مرتبہ موت کی دہلیز تک گیا لیکن میری ماں نے اُسے اسپتال لے جا کر رکھا جہاں ڈاکٹر اُس کے ہمدرد تھے۔ اس کی مشکلات کو سمجھتے تھے اس کا اچھے سے اچھا علاج ہوا اُسے بہترین دوائیں ملیں اور وہ ہمیشہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو کے لوٹا میری ماں کے ٹکڑوں پر پلنے، اس کی ہڈیاں توڑنے اور پُرانے دوستوں کے ساتھ پُرانی عادتیں اختیار کرنے کے لیے۔ ذلت و رسوائی کی اس زندگی میں کوئی سیدھا موڑ نہیں تھا جس پر وہ اُمید کا سہارا لے کر چل سکتی۔ نجات اسی میں تھی کہ وہ اپنا خاتمہ کر لے یا اُسے مار دے جو اُس کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والی سزا بن گیا تھا۔ اگر میں نہ ہوتی تو وہ خود مر جاتی لیکن مجھے ایک ایسے باپ کے سُپرد کر کے وہ کیسے قبر میں جا لیٹتی جو اتنا بے غیرت تھا کہ شراب کی ایک بوتل کے لیے مجھے بھی بیچ ڈالتا۔"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جو نرس نے باندھ رکھی تھی اور طے کیا کہ مجھے کم سے کم ایک گھنٹہ یہیں گزارنا چاہیے تاکہ سڑک تک پہنچ کے تلاش کرنے والے مایوس ہو کر لوٹ جائیں۔ یہ وقت نرس سے مفید معلومات حاصل کر کے گزارا جا سکتا تھا۔

"یہ بات پیڈرو کو کیسے معلوم ہو گئی؟" میں نے واقعات سے نتائج اخذ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی اسپتال کی ایک اور نرس سے۔" وہ بولی۔ "اس کا پیڈرو سے ملنا جُلنا تھا۔ وہ میری ماں کی نجی زندگی کے مسائل سے بھی واقف تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ سسٹر شیبا کتنی مظلوم ہے لیکن پولیس کو میرے باپ کی اچانک موت نے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے رپورٹ دے دی کہ موت کا سبب کثرتِ شراب نوشی ہے۔ پولیس کچھ نہ کر سکی۔ پیڈرو کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے میری ماں کی مدد کی ہے اور عمداً غلط رپورٹ دی ہے تو اُسے موقع مل گیا۔ حالاں کہ جس نرس نے اُسے یہ واقعہ سنایا تھا وہ میری ماں کی بدخواہ ہرگز نہیں تھی۔ بس وہ پیڈرو کی اصل فطرت سے ناواقف تھی۔ تین دن بعد وہ ایک حادثے میں مر گئی۔"

"اچھا! کیا حادثہ پیش آ گیا اُسے؟" میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ رات کی ڈیوٹی ختم کر کے جا رہی تھی کہ ویران سڑک پر کوئی گاڑی اُسے کچلتی ہوئی نکل گئی۔" وہ بولی۔ "ایک ہفتے بعد پیڈرو نے میری ماں سے بات کی۔ میں ساتھ والے کمرے میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ ہم اسپتال کے اندر ہی دو کمروں کے چھوٹے سے کوارٹر میں رہنے لگے تھے۔ چنانچہ میں نے ہر بات صاف سُنی۔ پیڈرو نے میری ماں کو بتایا کہ سنکھیا کے اثرات کا پانچ سال بعد بھی لاش کے ناخن اور بال دیکھ کے پتا چلایا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے کی لاش دوبارہ نکال کے پھر پوسٹ مارٹم کرانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میری ماں کی منت سماجت، رونا دھونا سب رائیگاں گیا۔ اس نے پیڈرو کو یہ بھی بتایا کہ روبی کی منگنی ہو چکی ہے لیکن اس نے کہا منگنی کوئی شادی تو نہیں۔ توڑی بھی جا سکتی ہے۔ نہ اس میں کوئی گناہ کی بات ہے نہ یہ جرم ہے۔ بڑی مشکل سے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ جب تک میں میٹرک نہ کرلوں، وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس عرصے میں پیٹر کو بھی مناسب الفاظ میں سمجھا دیا جائے گا کہ یہ شادی اب نہیں ہو سکتی۔ وہ چلا گیا تو میں نے بڑا کہرام مچایا۔ جان دینے کی دھمکی دی۔ ماں نے کہا تُو کیوں مرتی ہے جوانی میں۔ زہر میں کھا لیتی ہوں۔ پیٹر نے ہم دونوں کو سمجھایا۔ ہماری عزت پر اس نے اپنی محبت کو قربان کرنا منظور کر لیا اور منگنی کی انگوٹھی واپس لے گیا۔ میں نے میٹرک کر لیا اور ماں نے مجھے بھی نرسنگ اسکول بھیج دیا۔ پیٹر ایک مشن اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس نے اپنا اسکول چھوڑ دیا اور سیالکوٹ چلا گیا۔ جہاں اس کا باپ پادری تھا۔ پیڈرو نے مطمئن ہو کے مجھے مزید مہلت دے دی کہ میں نرس بن جاؤں۔"

"روبی۔ یہ تمھارا نام ہے اور تمھاری ماں کا نام شیبا تھا۔ پیٹر بھی عیسائی ہو گا۔ پیڈرو کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے باپ دادا مسلمان تھے۔ دادا سیالکوٹ کے قریب ڈسکہ میں تھا جہاں مشنریوں نے تبلیغ سے اور مالی امداد سے مفلوک الحال افراد کو عیسائی بنانے میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔" وہ بولی۔ "اس کا باپ سیالکوٹ میں خاکروب تھا اور ماں بھی خاکروب ہی تھی۔ اس کا باپ مجرموں کو جلاد کی حیثیت سے جیل میں پھانسی دیا کرتا تھا۔ پیڈرو کا اصل نام عنایت مسیح تھا۔"

"پیڈرو میں ماں باپ کی مشترکہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم میں اور تمھاری ماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خود زہر کھانے کا سوچنے کے بجائے پیڈرو کو وہی زہر دے کر مار ڈالتیں؟"

"وہ پیڈرو نہیں، عنایت مسیح تھا جس نے مجھ سے شادی کی تھی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اور شادی سے پہلے وہ بالکل مختلف انسان تھا۔ یہی شرافت کا لبادہ اوڑھ کے تو اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس نے اپنے سب وعدے پورے کیے۔ ہمارا قرض بے باق ہو گیا۔ ہم پھر اُسی مکان میں چلے گئے جو میری ماں کا تھا۔ پیڈرو نے اُسے دُگنی قیمت ادا کر کے واپس لے لیا پھر میری ماں کے نام کر دیا۔ اس گھر میں لوٹنے کے بعد ہماری زندگی کا بالکل نیا دور شروع ہوا۔ پیڈرو نے اس میں آرام و آسائش کے تمام اسباب فراہم کیے۔ پیٹر یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ میری زندگی بہت تنگ دستی میں گزرتی۔ میری ماں خوش تھی کہ جو ہوا اچھا ہوا... خود میں نادان اور کم عقل... پیڈرو کو چاہنے لگی اور پیٹر کو بھول گئی۔ لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ عیش و آرام کسے اچھا نہیں لگتا اور مجھے وہ زندگی مل گئی تھی جس کے میں خواب تو دیکھتی تھی لیکن اُن کی تعبیر پہ یقین نہیں رکھتی تھی۔ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ مگر میرے خواب سچ ہو گئے تھے۔ پیڈرو میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس نے مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کیا تھا اور اُسے خاکروب کا بیٹا ہونے کے باوجود بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کرسچن مشنری اس کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ اس کی فیس معاف تھی۔ کتابیں مفت مل جاتی تھیں۔ اس کو ہوسٹل میں رہنے کا خرچ نہیں دینا پڑتا تھا اور ماہانہ خرچ کے لیے وظیفہ الگ ملتا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ وہ کبھی ہفتہ بھر، کبھی پندرہ دن اور بعض اوقات ایک ایک مہینے کے لیے باہر چلا جاتا تھا اور لوٹ کر آتا تھا تو ہمارے لیے اتنے تحائف لاتا تھا اور میری ماں کو اتنا پیسہ دیتا تھا کہ اس نے زندگی بھر کی ملازمت میں نہ دیکھا تھا۔ شادی کے بعد میں ملازمت چھوڑ دینا چاہتی تھی لیکن اُس نے مجھے منع کر دیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اکثر شوہر تو یہی چاہتے ہیں کہ بیوی صرف گھر کی ہو کر رہے اور ملازمت کو معیوب سمجھتے ہیں۔ یہاں اُلٹا معاملہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ صرف گھر بار سنبھالوں کیوں کہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہی نہیں۔ شوہر کی آمدنی اتنی تھی کہ میں خود ملازم رکھ سکتی تھی مگر پیڈرو نے کہا، وقت گزارنے کے لیے مشغلہ اچھا ہے۔ وہ اکثر باہر رہتا ہے۔ میں گھر کے اندر بند ہو کے کیا کروں گی۔ میں کیسے کہتی کہ جب بچے ہوں گے تو میں اکیلی کہاں رہوں گی اور مجھے فرصت کب ملے گی۔ سال بھر بعد میں اُمید سے ہوئی مگر میری گود نہ بھری۔ وہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ میں بہت روئی دھوئی لیکن اُسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ دوسری اور تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے اس ڈاکٹر سے بات کی جو مجھے دیکھنے گھر آتی تھی اور اس نے رازداری کا وعدہ لے کر مجھے بتا دیا کہ میرے شوہر کو میرا ماں بننا منظور نہیں تھا۔ کیوں کہ بچوں کو وہ مصیبت سمجھتا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی، بچہ خدا کی رحمت ہوتا ہے انسان کے روپ میں فرشتہ ہوتا ہے۔ وہ پُل ہوتا ہے جو ازدواجی زندگی کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ دو کناروں کو، دو رشتوں کو ملاتا ہے۔ غم و غصے نے مجھے پاگل کر دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر تھی ہی نہیں۔ کوئی تجربہ کار مڈوائف تھی۔ میں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کا منہ نوچ لیا۔ اُسے گالیاں دیں۔ چڑیل، ڈائن اور قاتل کہا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ وہ ایسی بھاگی کہ پھر نظر نہ آئی۔ میری ماں تو اس کے گھر بھی گئی تھی لیکن اس کا کوئی پتا نہ چلا۔"

"زمین کے اوپر پتا چل بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"پیڈرو نے مجھے بہت مارا اور پھر دھمکی دی کہ میں نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو نتیجہ میری ماں کے حق میں بُرا ہو گا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کیونکہ میرے باپ کو مرے ہوئے ابھی پانچ سال نہیں ہوئے۔ ان حادثات کے بعد میں عورت نہیں بنجر زمین رہ گئی تھی۔ اس روگ نے میری ماں کو پلنگ سے لگا دیا اور علاج کے باوجود اس کی حالت بگڑتی گئی۔ میں نے کئی ڈاکٹر بدلے اور انھوں نے کئی نسخے بدلے لیکن ہر دوا بے اثر ہو گئی تھی۔ ایک رات میں نے پیڈرو کو اصل دواؤں کی جگہ دوسری دوائیں رکھتے دیکھا۔ میں نے دیکھا تو شیشیاں بھی وہی تھیں اور اُن کے لیبل بھی وہی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ردّ و بدل کا مقصد دوا کی جگہ زہر دینے کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے ہنگامہ کیا تو پیڈرو نے مجھے ہنٹر سے مارا اور کہا کہ مجرم میں ہوں۔ وہ تو باہر رہتا ہے۔ ماں کے لیے ڈاکٹر لانا اور دوا دینا سب میں خود کرتی ہوں۔ مجھ سے پہلے وہ اپنے شک کا اظہار ڈاکٹروں سے کر چکا تھا۔ یہ سوال تو بعد میں پیدا ہوتا کہ کیا بیٹی بلاوجہ ماں کو زہر دے سکتی ہے۔ پہلے تو پولیس مجھے گرفتار کر لیتی اور ڈاکٹر بھی شوہر کے ساتھ میرے خلاف گواہی دیتے۔ شوہر نے تو پہلے ہی بیوی پر شبہ ظاہر کر دیا تھا۔ میں کیا کرتی؟ ماں کو صدمے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ اس کے بعد میں نے دوائیں مقفل رکھنا اور خود ہر بار بازار سے دوا لانا شروع کیا مگر اس وقت تک زہر نے ماں کو موت کے کنارے تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے جسم میں اتنا زہر جمع ہو گیا تھا کہ دوائیں کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہی دنوں میں اچانک پیٹر مجھے مل گیا۔ وہ خود خاصا بدل گیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ میں نے اُسے ساری بات بتا دی اور اس سے مدد مانگی۔ اس نے خاموشی سے پیڈرو کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور دو ہفتے بعد مجھے بتا دیا کہ جسے میں گھر کے اندر عنایت مسیح سمجھتی ہوں، وہ باہر کی دنیا میں استاد پیڈرو ہے اور اس کا بزنس کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میرا شوہر جرائم پیشہ افراد کے گروہ میں شامل ہے اور اس کی تمام آمدنی غیر قانونی ہے۔ ہر بیوی کی نظر میں شوہر فرشتہ ہوتا ہے لیکن میرا شوہر شیطان تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں اس کے ساتھ کب تک نباہ کرتی۔ میں نے اُسے بتادیا کہ اب وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا کیوں کہ حقیقت مجھے معلوم ہوگئی ہے۔

"حقیقت۔" وہ زہر خند کے ساتھ بولا۔ "حقیقت کیا ہوتی ہے؟ اور اگر تمھیں معلوم ہوگئی ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم میری بیوی ہو۔"

"نہیں ہوں میں تمھاری بیوی۔" میں نے چلاّ کے کہا۔ "میں عنایت مسیح کی بیوی تھی کسی استاد پیڈرو کی نہیں۔"

وہ چونکا۔ "کس نے بھرا ہے تمھارے دماغ میں یہ زہر؟ کس نے بتایا ہے یہ نام تمھیں؟"

"پیٹر نے۔ اور اس نے مجھے یہ بھی بتادیا ہے کہ تم کوئی شریف آدمی نہیں ہو۔" میں اسی طرح چلاتی رہی۔ "تمھارے بزنس کا بھی پتا چلالیا ہے اس نے۔ تم مجرموں کے ساتھی ہو۔ سٹے باز اور جواری ہو۔ تم غنڈہ ٹیکس وصول کرتے ہو۔ شراب اور چرس اور مارفیا کے انجکشن بیچتے ہو۔ اب میں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے طلاق چاہیے۔"

اُس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ "اپنے اس عاشق سے کہنا کہ میرے جیتے جی وہ تمھیں نہیں لے جاسکتا اور میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکتا۔"

"تم مجھے قتل کرسکتے ہو لیکن اپنی بیوی بناکے نہیں رکھ سکتے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ "میں تم سے عدالت کے ذریعے علیٰحدگی حاصل کرلوں گی۔"

"عدالت میں جانے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ابھی تمھارے باپ کو مرے ہوئے پانچ سال نہیں ہوئے۔" وہ بولا۔ "یہ پولیس کیس تھا جسے تمھاری ماں کے جاننے والے ڈاکٹروں نے مل کر دبا دیا۔ لیکن پولیس کے پاس تفتیش کا ریکارڈ موجود ہے۔ دوسری پوسٹ مارٹم رپورٹ سارا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ کیوں اپنے باپ کی ہڈیوں کو خراب کرتی ہو اور اپنی ماں کو جیل بھیجنے کے کام کرتی ہو۔ اُسے سزائے موت نہ ہوئی تب بھی عمر قید ضرور ہوگی۔ اس کو اپنے گھر میں ہی مرنے دو۔"

"میں اب اس دھمکی میں نہیں آؤں گی۔" میں نے عزم مصمم کے ساتھ کہا۔ "میری ماں یوں بھی مرنے والی ہے۔ رسوائی سے پہلے وہ خود کشی کرلے گی۔ لیکن تم کیسے بچو گے؟ میں بیان دوں گی عدالت میں کہ تم نے اپنے تین بچوں کو قتل کیا، میری ماں کو زہر دیتے رہے۔ تم عنایت مسیح نہیں، استاد پیڈرو ہو۔ میں نے پیٹر سے کہہ دیا ہے کہ وکیل سے بات کرے۔"

اس نے مجھے ایک کمرے میں باندھ کے ڈال دیا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور دروازہ باہر سے مقفل کرکے چلا گیا۔

تین دن تک میں اسی کمرے میں بھوکی پیاسی پڑی رہی لیکن بدنصیب تھی کہ مری نہیں۔ چوتھے دن میرا شوہر پھر آیا۔ اس نے مجھے آزاد کیا، کھانے پینے کو دیا اور بولا۔ "اب کیا خیال ہے دماغ درست ہوا کچھ یا نہیں؟"

"میں یہیں مرجاؤں گی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "لیکن تمھارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ پیٹر تمھیں چھوڑے گا نہیں۔ اب تک وہ وکیل سے بات کرچکا ہوگا اور میرا سراغ نہ ملا تو وہ پولیس کے ساتھ آجائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے پہلے اس کتے کا بندوبست کرنا چاہیے۔" وہ بولا اور مجھے پھر بے بس چھوڑ کے چلا گیا۔ وہ ہمارے گھر کا ہی ایک اسٹور روم تھا جسے صاف کرنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا تھا۔ تقریباً آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور صرف چھ فٹ اونچا یہ کمرہ کچن کے نیچے تھا۔ اُسے گھر کا ٹوٹا پھوٹا اور غیر ضروری سامان پھینکنے کے لیے ہی کھولا جاتا تھا چنانچہ اس میں دن کے وقت بھی اندھیرا رہتا تھا اور چوہے اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہتے تھے۔ وہ اوپر کچن سے کھانے کی چیزیں لاتے تھے اور غلاظت پھیلاتے تھے۔ یہ سب چوہے بہت بڑے تھے۔ بلّی کے بچے سے بھی بڑے۔ وہ بہت بھیانک آوازیں نکالتے تھے اور میرے قریب آکے بڑے خطرناک طریقے سے مجھے گھورتے رہتے تھے۔ میں دہشت سے کانپنے لگتی تھی اور میرا جسم ٹھنڈا پڑجاتا تھا۔ اس خیال سے کہ میں مرگئی تو یہ آدم خور میرا گوشت نوچ کر کھا جائیں گے اور دو دن میں صرف ہڈیوں کا پنجر چھوڑ دیں گے۔ کئی بار میں تھکن اور اذیت کے باوجود سوگئی یا بے ہوش ہوگئی تو یہ چوہے میرے اوپر چڑھ آئے۔ ایک بار میں نے سوتے ہوئے درد کی شدید ٹیس سے تڑپ کر آنکھ کھولی تو میرے پاؤں کے ایک انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا اور کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا چوہا ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔ اُس نے میرے انگوٹھے پر سے نوچا ہوا گوشت نگل لیا تھا اور اب تازہ گوشت کا دوسرا ٹکڑا اتارنے کی فکر میں تھا۔ میں نے اُسے ٹانگیں ہلا کے بھگایا تو وہ دوسری طرف آگیا۔ میرے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر۔ میں خوف سے چیخ بھی نہیں سکتی تھی اور چوہا شاید اندازہ کرچکا تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ دوسرے چوہوں سے زیادہ سیانا اور جرأت مند تھا اور اس کی مکروہ شکل کو اتنا قریب پاکے مجھے یوں لگا جیسے اب وہ میری آنکھیں نکال لے گا۔ اس کے بعد میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکوں گی اور وہ اپنے قبیلے کے دوسرے چوہوں کو بلاکے کہے گا کہ بے خوف ہوکر دعوت اڑاؤ۔ اب تک آدمی ہمیں چوہے دان میں پھنسا کر مارتا رہا

ہے۔ آج آدمی ہمارے درمیان پھنس گیا ہے اور اُتنا ہی بے بس ہے۔ اس وقت مجھ میں غیر معمولی طاقت آگئی اور میں نے فرش پر گھوم کے لاتیں چلائیں تو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی چوہے پر گر پڑی اور وہ بھاگ گیا۔ میرے ہاتھ پیر ایک ہی ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا ایک بہت بڑی کیل کے ساتھ دیوار میں ٹھوک دیا گیا تھا چنانچہ میں بیٹھ تو سکتی تھی لیکن کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ دیوار سے پیٹھ لگا کر کبھی میں کتنی دیر بیٹھی رہتی۔ میری کمر اور شانے جب درد کرنے لگتے تھے اور جسمانی ہمت جواب دے جاتی تھی تو میں خود ہی فرش پر گر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا یہ عذاب کب تک چلے گا۔ لیکن میں تہیہ کرچکی تھی کہ ان حالات میں پیڈرو کے ساتھ زندگی گزارنے کے بجائے مرجانا بہتر ہے۔ اگلے تین دنوں میں میری حالت اور بگڑ گئی۔ مجھے خیالی شکلیں ڈرانے لگیں۔ خیالات کا انتشار آسیب بن کر سامنے آنے لگا اور میرا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ مجھے وہ نظر آتا تھا جو نہیں تھا اور جو سامنے تھا وہ دکھائی نہ دیتا تھا مثلاً وہ چوہے۔ اب وہ بے باکی سے میرے اردگرد اور میرے اوپر دندناتے پھرتے تھے اور جس چوہے نے مجھے کاٹا تھا اسے انسانی گوشت کے مزے نے آدم خور بنادیا تھا۔ وہ کئی جگہ سے میرا گوشت نوچ کرلے جاچکا تھا اور میرے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے جن سے رسنے والا خون جم گیا تھا۔ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میں مرجاؤں۔ جلد از جلد۔ پھر جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ لیکن پیڈرو پھر آگیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ میری ماں کو بھی لے آیا تھا۔ اس نے کھانے پینے کا اور مرہم پٹی کا سامان، دوائیں، پانی کی ایک بالٹی اور صاف کپڑے لاکر دیے اور مجھے آزاد کردیا۔ میری ماں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی لیکن مجھے دیکھ کر وہ پاگل ہوگئی۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا اور گلے لگاکر زار و قطار رونے لگی۔ میں رو بھی نہ سکی۔

"دیکھ بڑھیا۔" پیڈرو کچھ دیر بے حسی اور بے رحمی سے تماشا دیکھنے کے بعد بولا۔ "اپنی بیٹی کو سمجھالے۔ یہ عورت ذات ہے اور میری بیوی بھی ہے۔ چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ بڑے بڑے کانپتے ہیں میرے نام سے۔ یہ کیا مقابلہ کرے گی۔"

"میں سمجھالوں گی بیٹا۔" میری ماں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہوگا۔"

"میں کل آؤں گا۔" وہ بولا۔ "آخری بار۔ اس کا دماغ درست ہوگیا تو ٹھیک ورنہ مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو ماں نے میرے غلیظ جسم کو کپڑا بھگو کے صاف کیا۔ میرا لباس بدلا اور مجھے کھلانے کو دیا۔ بھوک کی مار بڑی سفاک ہوتی ہے۔ تم نے سنا ہوگا کہ بنگال میں قحط پڑا تھا تو عورتوں نے مٹھی بھر چاول کے لیے اولاد تک کو بیچ دیا تھا ——— مجھے کھاتا دیکھ کر میری ماں پھر دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ میں بالکل کسی جانور کی طرح کھانا نگل رہی تھی اور میری دماغی حالت کسی ذہنی مریض سے کم خراب نہ تھی۔ کھانے کے بعد مجھے ماں نے دوا دی اور جب میں سوگئی تو میرے زخموں کو آنسوؤں سے دھودھو کر ان پر مرہم لگاتی رہی۔ میں بارہ گھنٹے بعد سوکر اٹھی تو صرف جسمانی کمزوری رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر میری حالت میں حیرت انگیز افاقہ ہوا تھا اور میں صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہوگئی تھی۔ میں نے ماں کو وہ سب کچھ بتادیا جو مجھے پیٹر سے معلوم ہوا تھا اور وہ بھی جو مجھے پہلے سے معلوم ہوچکا تھا۔ میں نے ماں کو اس فیصلے سے بھی مطلع کردیا کہ اب کچھ بھی ہوجائے، میں پیڈرو کے ساتھ نہیں رہوں گی اور ماں نے بڑی مستقل مزاجی، صبر اور حوصلے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کی۔

اگلے دن پیڈرو آیا تو ہم نے اُسے بتادیا کہ نہ ہمیں ذلت و رسوائی کا خوف ہے اور نہ موت کا۔

"تم دونوں کی عقل خراب ہوگئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں نے تمھیں بہت کچھ دیا ہے اور آئندہ بھی دیتا رہوں گا۔ بدلے میں تمھیں خاموش رہنے کے سوا کیا کرنا ہے۔ عیش سے جیو۔"

"میری ممتا کا خون کرکے اور میرے اندر کی عورت کو مار کے کہتا ہے عیش سے جیو۔" میں نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ "اپنی اولاد کو قتل کیا ہے تو نے۔ غنڈے ——— بدمعاش ——— بلیک میلر۔"

"میری بیٹی سے پہلے مجھے مار دے۔" میری ماں نے کہا۔ "زہر دے دے یا خود پھانسی پر لٹکا دے۔ میں کسی پولیس کی دھمکی سے نہیں ڈرتی اب۔ جا کر دے رپورٹ تھانے میں۔ میں لکھ کر دیتی ہوں کہ میں نے اپنے شرابی اور بدکردار شوہر کو زہر دے کر مارا تھا۔"

پیڈرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے میری ماں کو ہتھکڑی لگاکے بٹھادیا اور مجھے چمڑے کے ہنٹر سے اتنا مارا کہ کپڑے ہی نہیں میری کھال تک پھٹ گئی۔ چیخ چیخ کر میری ماں پاگل ہوگئی اور دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ مجھے ہوش آیا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میں اپنے بیڈروم میں صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹی تھی اور پیڈرو کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

"میری ماں کہاں ہے؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماں تمھیں؟" پیڈرو مسکرایا۔ "بوڑھی اور بیمار تھی نا۔ وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وقت میں ہی مرجائے گی۔ تم نے تو دیکھے ہیں وہ چوہے جو اس کا گوشت کھائیں گے۔ میں نے ان کو بڑی محنت سے پالا ہے۔ وہ عام چوہے نہیں ہیں۔ آدمی کا گوشت انھیں بہت مرغوب ہے۔"

میں چیختی چلاتی باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ پیڈرو نے میرا راستہ روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ لیکن کچن سے نیچے جانے والے زینے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے سُنا۔ چوہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور آواز بھی تھی جیسے کوئی نزع کے کرب میں کراہ رہا ہو۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں نے دروازے کو ٹھوکریں ماریں اور ماں کو آوازیں دیں۔ میری آنکھیں ایک بھیانک منظر دیکھ رہی تھیں۔ کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی ہے اور چوہے اس کے جسم پر چڑھے ہوئے اپنے نوکیلے دانتوں سے ہڈیوں پر منڈھی ہوئی کھال اتارتے جا رہے ہیں۔ میں نے دروازہ توڑنے کے لیے اس پر ہر چیز ماری جو میرے ہاتھ میں آئی مگر وہ اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا دروازہ نہیں تھا۔

میں چیختی چلاتی باہر جانے کے لیے کچن کی کھڑکی سے کود گئی۔ پیڈرو کے مکان کے چاروں طرف کھلی جگہ ہے پیچھے ایک سرونٹ کوارٹر ہے۔ گیراج ہے اور ٹیوب ویل ہے۔ دائیں اور بائیں طرف درخت ہیں اور پھولوں کے پودے ہیں اور سامنے لان ہے۔ بدقسمتی سے اس کوٹھی کے ساتھ والا پلاٹ خالی پڑا ہے اور بائیں طرف ایک انجینئر رہتا ہے جس کی بیوی مرچکی ہے اور ماں بہری ہے۔ اس کے باوجود مجھے اُمید تھی کہ میں کسی نہ کسی کو مدد کے لیے بلا لاؤں گی لیکن میرے باہر آتے ہی ایک سیٹی سی سنائی دی اور تین طرف سے خوں خوار شکل والے کتے بھونکتے ہوئے لپکے۔ میں دوڑ کر واپس کھڑکی کے راستے کچن میں پہنچ گئی۔ پیڈرو قہقہہ مار کے ہنسا تو میں سمجھ گئی کہ سیٹی اسی نے بجائی تھی۔ میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں زار و قطار روتی ہوئی اس کے قدموں میں گر گئی "اسے چھوڑ دو مجھے بند کر دو اس کی جگہ۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "تمھاری اگر یہی مرضی ہے تو مجھے کیا۔" اس نے جیب سے چابی نکال کے دروازہ کھولا اور میں دیوانہ وار نیچے بھاگی۔ میری ماں ہوش میں تھی لیکن چوہے اس کے آس پاس مُردار خور گدھ کی طرح آس لگائے بیٹھے تھے۔

"اس کی کوئی بات مت ماننا روبی۔" میری ماں نے کہا۔ "مجھے یہ سزا منظور ہے۔" اس نے ہاتھ سے سینے پر صلیب بنائی۔

"نہیں ماں۔" میں نے روتے روتے کہا۔ "میں تمھیں اس طرح نہیں مرنے دوں گی۔" پیڈرو نے چابی میری طرف بڑھائی اور خباثت سے مسکرایا۔ میں نے ماں کی ہتھکڑی کھول دی اور خود اس کی جگہ بیٹھ گئی۔

"اب تم مجھے یہاں چھوڑ کے جاسکتے ہو۔ دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ میری ماں بہت چیخی چلائی اس نے پیڈرو کے علاوہ مجھے بھی گالیاں دیں کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی لیکن پیڈرو اُسے کھینچ کر لے گیا۔

"ماں بیٹی دونوں کو شوق ہے مرنے کا۔" وہ بولا۔ "میرا کیا ہے تو باری باری مرو۔ ایک دوسرے کی موت کا نظارہ کرکے مرو۔" پھر دروازہ بند ہو گیا۔ میری ماں کی چیخیں بہت دیر تک سُنائی دیتی رہیں میں نے دل پر پتھر رکھ لیا کہ مقدر میں یہی تھا۔ میرے بعد صدمے اور بیماری سے ماں بھی مر جائے گی لیکن اس کی موت میری طرح پُرعذاب تو نہیں ہوگی۔ پیڈرو اُسے گھر سے باہر نہیں جانے دے گا لیکن گھر کے اندر رہ کر بھی وہ زیادہ آسانی سے، جلد اور کسی تکلیف کے بغیر مرنے کی کوئی صورت نکال لے گی۔ جرم میرا تھا کہ میں نے پیڈرو سے شادی کی۔ مجھے اُسی وقت پیٹر کے ساتھ نکل جانا چاہیے تھا۔ جب وہ میری ماں کو بلیک میل کر رہا تھا لیکن میں نے غریب پیٹر کی محبت کو چھوڑ کر دولت کو قبول کر لیا۔ میں اپنے ساتھ ماں کو بھی لے جاسکتی تھی اور ہم کہیں بھی گمنامی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اس نے ہماری کمزوری سے دُہرا فائدہ اٹھایا۔ باپ نے ہمیں بے گھر کر دیا تھا اور ہم سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ پیڈرو نے ہمیں پھر اسی گھر میں آباد کیا اور وہ سُکھ دیا جو کبھی میری ماں کا خواب ہوگا۔ پھر میری حسرت بن گیا تھا۔ اس کا رویّہ شریفانہ تھا اور میری رضامندی کے بعد اس نے کوئی بھی ناجائز مطالبہ نہیں کیا تھا۔ میں یہی سمجھی کہ پیڈرو بھی مجھ سے محبت کرتا تھا اور صرف مجھ سے شادی کرنے کے لیے اس نے بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا کیوں کہ وہ کسی قیمت پر مجھے کھونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑا کٹھن مرحلہ بن جاتا ہے کہ وہ ماں کی عزت آبرو اور اپنی خوشی میں سے کس کا انتخاب کرے۔ مجبوری میں یہ سودا بہر حال بُرا نہ تھا۔ پیٹر سے مجھے صرف محبت ملتی۔ پیڈرو سے محبت کے ساتھ دولت بھی مل گئی۔ خود میری ماں کے لیے اپنے باپ کے گھر میں واپس جانا ایک ایسی تمنا تھی جس کے پورا ہونے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی کیوں کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ پیڈرو نے مکان دُگنی قیمت پر خرید کے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے میری ماں سے اس کی دُوہری قیمت کیسے وصول کی۔ میری ماں چپکے چپکے اسپتال سے خطرناک قسم کی دوائیں لاکر دیتی رہی۔ اسٹور سے چوری کر کے۔ پیڈرو نے اُسے کبھی نہیں بتایا کہ وہ ان کا استعمال کہاں کرتا ہے۔

بدقسمتی سے پیٹر اسی دن ایک وکیل کے ساتھ آ پہنچا۔ پیڈرو نے اُسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وکیل اڑ گیا کہ میں اپنی مؤکلہ سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے وکالت نامے پاس کے دستخط لینے ہیں کیوں کہ وہ طلاق چاہتی ہے اور اگر وہ نہ ملی تو مجھے پولیس کے پاس جانا پڑے گا کہ تم نے اُسے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے یا قتل کر دیا ہے اور پولیس خود اُسے برآمد نہ کر سکی تو عدالت تمھیں اس کا پابند کرے گی کہ اپنی بیوی کو حاضر کرو یا اس کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔ پیڈرو مجبور ہو گیا اور انھیں اندر لے آیا میری ماں نے وکیل کو سب کچھ بتا دیا اور پیڈرو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے بھی وکیل کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے میری بھی سُنی اور میں نے اوّل تا آخر اُسے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی پوری روداد سنا دی۔ جب تک میں بولتی رہی وہ بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وکیل سخت چراغ پا تھا کہ یہ انتہائی انسانیت سوز اور سنگین جرائم ہیں جن پر اُسے عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو بولا۔ "میں ہر غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔ تم مجھے جیل بھجوا سکتے ہو لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پریشانی روبی اور اس کی ماں کے لیے بھی پیدا ہوگی۔ تھانے کچہری تک بات جائے گی تو اخبارات میں بھی آئے گی۔ کیوں نہ گھر کا معاملہ گھر ہی میں طے کر لیا جائے۔ ابھی آپ کی موجودگی میں۔ ہم طلاق کا مسئلہ حل کیے لیتے ہیں۔"

"اور جو ذہنی اور جسمانی اذیت آپ نے روبی کو اور اس کی ماں کو دی۔" وکیل بولا۔ "اس کی تلافی کیسے ہوگی؟"

"ویسے تو میں پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن اب بھی میں جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جتنی رقم چاہیے بتادیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم اپنا دیا بھی واپس لے سکتے ہو۔" میں نے روتے روتے کہا۔ "بس مجھے اور میری ماں کو جانے دو۔"

"یہ جذباتی ہو رہی ہے وکیل صاحب۔" پیڈرو نے کہا۔ "آپ ذرا میرے ساتھ آئیے باہر۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہوگا۔"

یہ اس کی چال تھی۔ وہ وکیل کو باہر لے گیا اور نہ جانے اس سے کیا بات کی اور اُسے کتنی بڑی رشوت دی کہ اس نے اپنا منہ بند رکھنا منظور کر لیا۔ واپس آکے اس نے کہا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں اور آئندہ تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری سابقہ تکالیف کا ازالہ ہو جائے گا اور پیڈرو سے قانونی طور پر میرا پیچھا بھی چھوٹ جائے گا۔ جب وہ رخصت ہو گیا تو پیٹر نے کہا۔ "میں روبی کو اور اس کی ماں کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں انھیں محفوظ نہیں سمجھتا۔"

پیڈرو ہنسا۔ "خود جاؤ گے تو انھیں لے جاؤ گے ہیرو۔"

"کیا مطلب؟" پیٹر نے کھڑے ہو کر کہا۔ جسمانی قد و قامت میں وہ پیڈرو سے کم نہیں تھا۔

"مطلب یہ کہ آنا ہمیشہ اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔" پیڈرو نے کہا۔ "جانا دوسرے کی مرضی سے۔ یہ تمھیں اس گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا۔" خطرے کی بُو میں نے اس کے لہجے سے سونگھ لی تھی لیکن میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" پیٹر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تم میرا راستہ روک سکتے ہو؟"

"ہاں۔ میں بھی روک سکتا ہوں۔" پیڈرو نے اس کو نظروں سے ناپ کر کہا۔ "لیکن جو کام ملازم کر سکتے ہوں وہ میں خود نہیں کرتا۔"

"میرا وکیل جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔" پیٹر نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن وہ عقل مند آدمی تھا۔ سودا کر کے فائدے میں رہا اور خاموشی سے چلا گیا۔" پیڈرو بولا۔ "اب تم اس سے بات کر کے دیکھو، وہ تمھیں پہچانے گا بھی نہیں۔ یہ ماننا تو دور کی بات ہے کہ وہ تمھارے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

"اگر اس ضمیر فروش کو تم نے اپنی حرام کی کمائی سے خرید لیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پیٹر نے برہمی سے کہا۔ "میں دوسرا وکیل تلاش کر لوں گا۔ ہر وکیل ایسا نہیں ہوتا۔ تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پیڈرو اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر اس نے کھڑکی سے منہ نکال کے سیٹی بجائی۔ باہر سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دو منٹ بعد پیٹر دروازے سے ٹکرایا اور اندر آگرا۔ دو جرمن نسل کے شیپرڈ کتے اس کے اوپر حملہ آور ہوئے۔ اس نے اپنا بریف کیس گھمایا اور ایک کتے کو لات ماری لیکن وہ بہت طاقت ور اور انتہائی خوں آشام کتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پیٹر کے جسم کو چیر پھاڑ کے کھا جائیں گے۔ میری ماں خوف سے بے ہوش ہو گئی اور میں نے ایک چیخ ماری۔ پیٹر بڑی بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ ایک شریف آدمی دو وحشی کتّوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

"عنایت۔ خدا کے لیے اسے بچالو۔" میں نے دوڑ کے پیڈرو کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں، پھر کبھی تم سے طلاق کی بات نہیں کروں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔"

"اچھا۔" پیڈرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ بات بعد میں بھول مت جانا۔" اس نے دوبارہ سیٹی بجائی اور دونوں کتے ایک دم خاموش ہو کے پیچھے ہٹ گئے اور اس کے پاس آکے دُم ہلانے لگے۔ "شاباش۔" اس نے دونوں کے سر پر تھپکی دی۔ "اب جاؤ۔" کتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چھلانگیں مارتے دروازے سے نکل گئے۔ پیٹر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے چہرے اور بازوؤں پر گہری خراشیں آئی تھیں جن سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک کتے نے اس کی ٹانگ کو دانتوں میں دبا لیا تھا اور ٹخنے کے اوپر جہاں اس نے دانت گاڑے تھے زخم کے نشانات زیادہ گہرے تھے۔ میں دوڑ کر اندر گئی اور اس کے لیے ایک گلاس پانی لے کر آئی۔ پانی پی کر اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے۔

"میرے وکیل کیسے ہیں ہیرو!" پیڈرو بولا۔ "تمھارے وکیل سے تو زیادہ ہی وفادار ثابت ہوئے۔"

"تم... تم بچ نہیں سکتے۔ شیطان کی اولاد!" پیٹر نے غصے میں کانپتے ہوئے کہا۔ "ایک نہ ایک دن تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تمھارے یہ بھائی بند تمھارے کام نہیں آئیں گے۔" اس کا اشارہ کتوں کی طرف تھا۔

پیڈرو نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ کھڑے کھڑے اس نے اتنی تیزی سے لات گھمائی کہ پیٹر خود کو بچانے کے لیے حرکت بھی نہ کرسکا۔ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے اُڑ کر دور گیا اور وہ خود بلبلا کے فرش پر گر گیا۔ پیڈرو نے پے در پے اس کو ٹھوکریں ماریں۔ اس کی پسلیوں میں، سر پر اور کمر پر۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی تو اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دھکا دیا اور میں دیوار سے اس طرح ٹکرائی کہ مجھے چکر آگئے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ پیڈرو بڑی بے رحمی کے ساتھ پیٹر کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ وہ ضربات کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گرنے کے بعد میں اس کے پیچھے بھاگی۔ اس وقت تک پیڈرو کچن سے گزر کے پیٹر کو تہ خانے میں لے جا چکا تھا۔ زینے کے قریب مجھے پھر چکر آیا اور سنبھلنے کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی۔ میں اوپر سے نیچے تک لڑھکتی ہوئی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے پیٹر کو اسی آہنی زنجیر سے بندھا ہوا دیکھا جس سے مجھے اور میری ماں کو اسیر رکھا گیا تھا۔ وہ زمین پر بے سُدھ پڑا تھا اور وہی آدم خور چوہے اس کے اوپر کود رہے تھے۔ میں ایک چیخ مار کے اٹھی اور پیٹر کو پکارتی ہوئی بھاگی۔ خود میرے جسم پر گرنے سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ لیکن مجھے اس وقت اپنی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے وہ لمبے لمبے اُبھرے ہوئے نیل دکھائی دیے جو پیٹر کے سارے جسم پر پھیلے ہوئے تھے۔ پیڈرو نے اسے چمڑے کے ہنٹر سے اتنا مارا تھا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ سوائے رونے کے میں اس کے لیے کیا کرسکتی تھی۔ ایک گھنٹے بعد پیڈرو پھر نمودار ہوا۔ ہنٹر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں چیختی چلاتی اس کے ہنٹر کی ضرب سے بچنے کے لیے اِدھر سے اُدھر بھاگتی رہی مگر اس مختصر سے کمرے میں بھاگنے کی جگہ ہی کہاں تھی۔ ہنٹر مجھ پر مسلسل برستے رہے۔ ہر بار مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے انگارے سے میرے جسم پر ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ بالآخر میں بے ہوش ہو کے گر پڑی۔

دوسری بار ہوش آنے پر میں نے خود کو اپنے بیڈ روم میں پایا، اسی بیڈ پر میری ماں سکون سے سوئی پڑی تھی۔ میرا سارا جسم زخموں سے چُور تھا اور میں ہاتھ لگا کے ہر اُبھرے ہوئے نیل کو بھی محسوس کرسکتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ درد کا احساس سرے سے مفقود تھا۔ پیڈرو نے یقیناً مجھے کوئی انتہائی مؤثر اور درد کے احساس کو ختم کر دینے والی دوا دی تھی۔ میرے کپڑے بدلے ہوئے تھے اور پیڈرو ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور آنسو خود بخود میری زبان بن گئے۔

"اس سے پہلے کہ تم پیٹر کے متعلق سوال کرو۔" وہ بولا۔ "میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔"

اس نے عمداً بات ادھوری چھوڑ دی اور میں نے وحشت سے چیخ کر کہا۔ "مار دیا اُسے تو نے... کتے... بے رحم خونی بھیڑیے... میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" میں نے دیوانگی کی کیفیت میں اس پر حملہ کیا۔ اس نے سگریٹ پھینک کر میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کو کلائی پر سے پکڑ لیا اور بازو گھما کے میری کمر سے لگا دیا۔ میں بے بس ہو گئی۔ اگر ذرا بھی زور لگاتی تو بازو ٹوٹ جاتا۔

"وہ زندہ ہے۔" پیڈرو میرے کان میں بولا۔ "اور زندہ رہے گا لیکن اس کا انحصار تمھارے رویے پر ہے۔" اس نے مجھے آگے دھکیلا اور تہ خانے میں لے گیا۔ وہاں پیٹر صاف ستھرے کپڑے پہنے فرش کے بجائے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ ہتھکڑی اس کے ایک ہاتھ میں تھی۔ اس کے قریب ہی کھانے کے برتن اور پانی کا گلاس موجود تھے لیکن اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ لکڑی کی ایک ڈنڈی اس کے پاس رکھی تھی۔ جسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر وہ قریب آنے والے چوہوں کو بھگا سکتا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آتا تھا۔ اس کا گندمی رنگ زرد ہو رہا تھا اور بڑھی ہوئی شیو کے باعث وہ قطعی بدلا ہوا نظر آتا تھا لیکن سب سے حیرت انگیز تبدیلی اس کے بالوں میں ہوئی تھی جو پہلے گھنے سیاہ تھے مگر اب بالکل سفید ہو چکے تھے ایسا لگتا تھا جیسے میں... پیٹر کو تیس چالیس سال کی نیند سے جاگنے کے بعد دیکھ رہی ہوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مارفیا کے زیر اثر میں دو دن تک سوتی رہی اور اب درد کے احساس کا نہ ہونا بھی اسی کا نتیجہ تھا۔ صدمے نے دو دن میں پیٹر کے بال سفید کر دیے تھے۔

"پیٹر۔" میں چلائی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔" اور اس کی طرف لپکی۔ مگر پیڈرو نے بال پکڑ کے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"یہ مت بھولو کہ تم میری بیوی ہو۔" پیڈرو بولا۔ "اور کوئی شوہر اتنا بے غیرت نہیں ہوتا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے بیوی کو کسی غیر کے لیے مضطرب دیکھے۔"

"میری فکر مت کرو روبی۔" پیٹر نے کہا۔ "اپنی جان بچاؤ۔ میں تو مر چکا ہوں۔"

"میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تمھارے بغیر۔" میں نے خون کے آنسو روتے ہوئے کہا۔ میں نرس تھی اور اسپتال میں ڈاکٹروں سے میں نے کئی بار سُنا تھا کہ ذہنی صدمہ انتہائی شدید ہو تو بال راتوں رات سفید ہو جاتے ہیں اور ایسے کیس میڈیکل ہسٹری میں عام ہیں۔

"ہیرو اور ہیروئن کے ڈائیلاگ مجھے یعنی وِلن کو پسند آئے۔" پیڈرو ہنسا۔ "لیکن ایسی باتیں فلموں کی حد تک تو اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں جھوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ زندگی سے سب کو پیار ہوتا ہے۔ چار دن کھانے کو نہ ملے تو عشق محبت سب ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسٹر پیٹر کتوں سے مقابلہ ہی نہ کرتے، خود کو ان کے آگے ڈال دیتے اور تم میرے پاؤں پکڑ کر وعدہ نہ کرتیں کہ جیسا میں چاہوں گا ویسا ہی کرو گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر؟" میں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"اوپر چلو۔ میں یہاں اس لیے لایا تھا تمھیں کہ تم پیٹر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" پیڈرو نے کہا۔ "قیدِ تنہائی کے سوا اس کو کوئی تکلیف نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے کھانے کو مل جاتا ہے اور ڈاکٹر ہر روز دیکھنے آتا ہے۔ اگر تمھارا رویّہ درست رہا تو پیٹر کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ورنہ یہ اسی تہ خانے میں سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر بھوکا پیاسا مر جائے گا اور اس کی لاش کا گوشت میرے چوہے کھا جائیں گے تو ہڈیاں میرے کتے۔ اس کے وجود کا سراغ تک نہیں ملے گا۔ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ پولیس سے یا کسی اور سے مدد حاصل کرنا بے سود ہوگا۔ سرچ وارنٹ کے بغیر پولیس یہاں قدم نہیں رکھ سکتی اور سرچ وارنٹ جاری ہونے سے بہت پہلے مجھے خود پولیس کے ذریعے اس کی اطلاع مل جائے گی۔ میں پیٹر کو ایسی جگہ شفٹ کر دوں گا جہاں تمھارے تصور کی رسائی بھی نہ ہوگی۔" اس نے مجھے واپس سیڑھیوں کی جانب دھکیلا۔ "اپنا اور پیٹر کا مستقبل تمھارے ہاتھ میں ہے روبی۔ اسی دنیا میں تم دونوں مل بھی سکتے ہو۔"

"میری خاطر اس کمینے سے کوئی سودا مت کرنا روبی۔" پیٹر چلّایا۔ "کم تمھارے ضمیر کے خلاف ہو۔"

پیڈرو نے رک کر سگریٹ اور ماچس اس کی طرف اچھال دی۔ "روبی بے وقوف نہیں ہیرو۔"

"کھانا پینا مت چھوڑنا پیٹر۔ تمھیں میری قسم۔" میں نے جاتے جاتے کہا۔ "میں سب ٹھیک کرلوں گی۔"

"یہ تم نے کیا کیا۔" پیٹر نے کہا۔ "اپنی قسم کیوں دی مجھے۔ یہ ظلم کیوں کیا مجھ پر۔"

اوپر آنے کے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ یہ مکان واپس دلانے سے پہلے اس نے ایک سودا میری ماں سے بھی کیا تھا اور اپنے مکان کے معاملے میں وہ اتنی جذباتی ہو گئی تھی کہ اُس نے پیڈرو کی بات مان لی۔ وہ اسپتال کے اسٹور سے اور وارڈوں سے ہر قسم کے خطرناک انجکشن اور زہریلی دوائیں پیڈرو کو فراہم کرتی رہی۔ شرط کے مطابق اس نے کبھی پیڈرو سے سوال نہیں کیا کہ وہ ان کا کیا کرتا ہے۔ پیڈرو نے بتایا تھا کہ اس کا ایک سائنس داں دوست ہے جسے اپنی تحقیقات اور ریسرچ کے لیے ان دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے مگر یہ دوائیں بازار میں دستیاب نہیں۔ اب میری ماں نے نوکری چھوڑ دی تھی [illegible] تھا کہ یہی کام میں کروں۔ اسی لیے پیڈرو نے مجھ سے شادی کی تھی۔ مجھے نرس بننے کا موقع فراہم کیا تھا اور شادی کے بعد نوکری جاری رکھنے پر مجبور کیا تھا میری ماں سکون کی نیند میں تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ جذباتی تعلق انسان کو کتنا مجبور اور بے بس کر دیتا ہے۔ اینٹ پتھر کے اس مکان کے لیے جو اس کے باپ کی نشانی تھا، میری ماں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا۔ ایک انتقامی خواہش سے مغلوب ہو کے اس نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ یہ دوسری انتقامی کارروائی ایک لاشعوری خواہش کا نتیجہ تھی۔ وہ مرنے والے کی روح کو بھی عذاب دینا چاہتی تھی کہ جس گھر کو اس نے شراب اور جوئے کی نذر کر دیا تھا وہ اسے واپس مل گیا ہے۔ اس کے لیے میری ماں نے بہت بھاری قیمت ادا کی۔ اس نے بہت بڑے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے بھی چھپائی لیکن اس کے اپنے ضمیر کی خلش اس کا آزار بن گئی۔ ایک مکان کے بدلے اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اپنی عزتِ نفس۔ اپنی عاقبت۔ اپنی بیٹی کی خوشی اور اس کا مستقبل۔ ورنہ رہنے والے کیا فٹ پاتھ پر نہیں رہتے۔ عورتیں کیا جھگی میں خوش نہیں رہتیں اور کیا وہ محل کے بدلے اپنی عاقبت و آزادی کا سودا کرتی ہیں؟

اس جال میں اب میں گرفتار تھی اور ہر طرف سے زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایک زنجیر میری اپنی زندگی تھی۔ دوسری ماں کا بڑھاپا اور بیماری۔ اور تیسری پیٹر کی محبت۔ میں اپنی ماں سے زیادہ مجبور تھی۔

"اگر تم نے ایک سال تک میرا حکم مانا اور کوئی غلط حرکت نہ کی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں طلاق دے دوں گا اور پیٹر کو آزاد کر دوں گا۔" پیڈرو نے کہا۔ "اس عرصے میں تمھیں پیٹر سے ملنے کی آزادی ہوگی۔ تم اس کے آرام کا اور اس کی صحت کا خود خیال

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

سکنا چاہو تب بھی مجھے اعتراض نہیں۔ اس کو کھانا اور دوا کھلانا اور اُسے ہر آسائش فراہم کرنا تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تو تم سب کچھ کر سکو گی۔ سوائے اس زنجیر کے جو پیٹر کے ہاتھ میں پڑی رہے گی۔ وہ کسی طرح بھی قید کی تکلیف نہیں اٹھائے گا۔ تم اُسے جو چاہو گی فراہم کر سکو گی۔ مثلاً اخبار، رسالے، ریڈیو۔ لیکن یہ سب میری منظوری سے ہوگا۔ جب میں دیکھوں گا کہ تم اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہو تو میں رعایت دیتا جاؤں گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمھیں اخلاقی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت ہوگی۔ نہیں۔ اس کی دیکھ بھال اور خاطر مدارت کا کام تم میری موجودگی میں کرو گی۔ بات صرف ایک سال کی ہے۔ باقی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق حاصل کرنا ہے تو یہ سودا کر لو۔"

سودا کرنا میرے اختیار کی بات ہی کہاں تھی۔ وہ سال بھر بعد بھی مُکر جاتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ وعدے کا پاس تو وہ کرتے ہیں جن کا کوئی ایمان ہو۔ اصول ہو یا ضمیر ہو۔ پھر بھی ایک اُمیدِ موہوم پر میں نے پیڈرو سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کی مدد کروں گی۔ ایک مہینے تک اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اور میں پیٹر سے مل کے اسے تسلی دیتی رہی کہ وہ حوصلہ نہ ہارے۔ سال ختم ہوتے ہی ہم نکل جائیں گے۔ اپنا نام، شہر، مذہب سب بدل لیں گے تاکہ پھر کبھی یہ سفاک مجرم ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ پیڈرو کی بات پر اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچھو سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ اور حالات سال بھر بعد بھی یہی ہوں گے بلکہ بدتر۔ مگر میں نے پیٹر کو سمجھانا بجھانا جاری رکھا۔ ایک مہینے میں اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی۔ ہتھکڑی کی زنجیر تین فٹ سے زیادہ لمبی تھی چنانچہ وہ بیٹھ سکتا تھا۔ کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے ہاتھ پیر چلا کے ورزش کر سکتا تھا تاکہ جسم کے رگ پٹھے ناکارہ نہ ہو جائیں۔ پیڈرو نے اتنی رعایت اور دی تھی کہ ہر تیسرے دن ہتھکڑی کو دوسرے ہاتھ میں ڈال دیتا تھا۔ ایک مہینے بعد پیڈرو نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا اور کیا نہیں کرنا ہوگا۔ دو دن تک وہ مجھے تفصیلات بتاتا رہا اور تیار رہنے کے لیے کہتا رہا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں پیٹر کا ویسے ہی خیال رکھا جائے گا جیسے میں رکھتی ہوں۔ تیسرے دن وہ مجھے یہاں لے آیا۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ باقی تم جانتے ہو؟"

میں بہت دیر تک کچی گندم خوشوں سے نکال کے چباتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا خیال ہے کہ اب سڑک تک جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں وہ لوگ مایوس ہو کے واپس جا چکے ہوں گے۔ تمھیں اس شہر کے ماحول کا علم ہے؟"

"پیدائش سے اب تک میں نے دوسرا شہر نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔

"کیا... کیا اس کا مطلب ہے کہ پیٹر بھی یہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ گھر کہاں ہے؟"

"چوک بتی مائی ویرو سے آگے جو سڑک مسلم ہائی اسکول اور ہولی فیملی اسپتال کی طرف جاتی ہے۔" وہ بولی۔ [illegible] کے قریب میری ماں کا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں پیٹر قید ہے سیٹلائٹ ٹاؤن میں ہے۔ مری روڈ اور سید پوری روڈ کے درمیان۔ تم اکیلے وہاں کیسے جاؤ گے؟ پیڈرو اور دلاور وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ پولیس کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

میں کہتے کہتے رک گیا کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہوا تو پولیس بھی وہاں جا کے کیا کرے گی۔ کون ملے گا وہاں۔

"لاحول ولا قوۃ!" میں نے کہا۔ "یہ تم کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ ہم نے دو گھنٹے ضائع کر دیے ہیں۔ یوں چھپے رہنے کے بجائے ہم سیدھے وہاں جاتے اور پہلے پیٹر کو نکالتے۔" میں نے اپنی جیب سے وہ چابی نکالی جو مجھے پیڈرو کی جامہ تلاشی کے دوران میں ملی تھی اور بلاشبہ اسی ہتھکڑی کی چابی تھی جس نے پیٹر کو اسیر کر رکھا تھا۔

"یہ... یہ کہاں سے ملی تمھیں؟" روبی نے چابی میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ "یہی تو ہے وہ چابی... چلو اب دیر مت کرو۔" وہ میرا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ مجھے بیساکھی بغل میں دبا کے چلنے کی عادت کہاں تھی۔ میری دائیں بغل اس مشقت سے درد کرنے لگی تھی اور شانے کے ساتھ سینے کے پٹھے بھی اکڑ رہے تھے۔ ننگے پاؤں چلنے سے میرے پیر زخمی ہو رہے تھے۔ کنکروں کی رگڑ سے تلوے چھل رہے تھے تو کئی جگہ کانٹوں کے پیوست ہو جانے سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ صرف میری قوتِ ارادی تھی اور زندگی کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم تھا جس نے مجھے سڑک پر پہنچنے میں مدد دی۔ اب میں نئے مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ پَر لگا کے اُڑ جاؤں اور انکل شیروانی کے آنگن میں شہلا کے سامنے جا اتروں۔ پھر ٹیلی فون کر کے رابعہ سے بات کروں اور محسن کے بارے میں پوچھوں مگر اس عورت کو بھی بے آسرا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا، جو حد درجہ مظلوم تھی۔

یہ سوال اپنی جگہ جواب طلب تھا کہ دوبارہ گرفتار ہوئے بغیر میں روبی کی کیسے مدد کر سکتا ہوں۔ اگر میں اس کے ساتھ جاتا تو اتنی ہی آسانی اور بے بسی کے ساتھ پھر پیڈرو اور دلاور کے جال میں پھنس جاتا جتنی آسانی سے چوہا چوہے دان میں پھنستا ہے۔ اپنے آدھے ادھورے جسم کے ساتھ اور کسی ہتھیار کی عدم موجودگی میں ان کا اور میرا کیا مقابلہ۔ قدرت نے مجھے ایک موقع فراہم کیا تھا، اسے گنوانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اگر میں روبی کے ساتھ پولیس اسٹیشن جاتا تب بھی گرفتار ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک مجھے مفرور مجرم قرار دیا جا چکا ہوگا اور میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہوگی جیسے ہی میں نے بتایا کہ میں کون ہوں وہ مجھے حوالات میں بند کر دیں گے اور اس کے بعد روبی ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔ حالات آدمی کو خودغرض بھی بنا دیتے ہیں۔ یہ قطعی ناممکن تھا کہ میں روبی کو اس کے محبوب پیٹر سے ملوانے کے لیے اُن سب سے جدا ہو جاؤں جن کو اب میں اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس زنداں سے دوسری بار رہائی نصیب ہی نہ ہو۔ ہم اب سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

"دیکھو روبی!" میں نے کہا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ میں اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم پھر پکڑے جائیں گے۔ بعض وجوہات کی بنا پر میں تمھارے ساتھ پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتا۔ مجھے گرفتاری کا ڈر ہے۔ اس لیے تم ہی ہمت کرو اور پولیس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"وہ اتنی آسانی سے تو میرے ساتھ نہیں چلے چلیں گے۔" روبی نے مایوسی سے کہا۔

"وہ ضرور جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم تھانے جاؤ۔ آدھے پون گھنٹے میں اُن کو کسی اعلیٰ پولیس افسر کا فون موصول ہوگا۔"

"تم جانتے ہو کسی اعلیٰ پولیس افسر کو؟" وہ بولی۔ اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی۔

"ہاں۔ براہِ راست تو نہیں لیکن میں فون کرا دوں گا۔" میں نے کہا اور ٹیکسی کو روک لیا لیکن وہ متذبذب کھڑی رہی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور مجھے اسلام آباد پہنچنے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ بہرحال ادا کرنا ہے۔

"روبی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اگر تمھارے پاس سو روپے ہوں تو مجھے اُدھار دے دو۔ شام کو اسی پولیس اسٹیشن پر جا کے لے لینا یا اپنا پتا چھوڑ دینا، میں خود پہنچا دوں گا۔"

"تمھیں جانا کہاں ہے؟" روبی نے اپنی جیب سے ایک رومال برآمد کیا جس میں نوٹ لپٹے ہوئے تھے۔ سو کا ایک بوسیدہ نوٹ اس نے میرے حوالے کیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے قدرے خفت کے ساتھ نوٹ لے لیا۔

"مجھے پہلے تو اسلام آباد جانا ہے، پھر لاہور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمھاری مدد کے لیے ایس۔ پی۔ سی کو فون کرا کے جاؤں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور ایس پی کے حوالے پر باادب باملاحظہ ہوشیار ہو گیا، ورنہ اب تک وہ مجھے، میری بیساکھی کو اور میرے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے زخمی پیروں کو انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر تم کو دوسری ٹیکسی لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے راستے میں پولیس اسٹیشن کے سامنے اتار دینا۔"

"اچھا۔" میں نے اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت آزاد ہونے کے باوجود میری حیثیت ایک مفرور مجرم سے زیادہ نہیں جس پر ایک نہیں، تین افراد کے قتل کا الزام ہو۔ کیا ایسی صورت میں انکل شیروانی کے گھر جانا مناسب ہوگا؟ ممکن ہے پولیس وہاں پہلے سے موجود ہو۔ انکل رضوی جیسے فرض شناس افسر سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے میرے سارے ٹھکانے بتا دیے ہوں۔ کیوں نہ میں پہلے رابعہ کو فون کر لوں؟

"روبی۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے میں فون کر سکوں۔ تم تو یہاں کی رہنے والی ہو۔ بہت سے لوگ جانتے ہوں گے تمھیں!"

"ٹیلی فون آفس سے کیوں نہیں کر لیتے۔ راستے میں آئے گا۔" وہ بولی۔

"وہ... دراصل... وہاں اور بھی لوگ ہوں گے...." میں نے کہا۔ "اور مجھے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔"

"اچھا تو یہاں توپ خانہ بازار میں ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ڈیوٹی پر ہوں گے۔" وہ بولی۔ "لیکن ان کی ماں مجھے جانتی ہے۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بائیں طرف ایک پتلی سی سڑک پر مڑنے کا اشارہ کیا۔

پانچ منٹ بعد میں اس نامعلوم ڈاکٹر کے ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا رابعہ کا ٹیلی فون نمبر ملا رہا تھا۔ روبی اندر ڈاکٹر کی ماں سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ گھنٹی بج رہی تھی اور میرے دل کی دھڑکن میرے قابو سے باہر ہونے لگی تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ کی گرفت میں کانپ رہا تھا۔ بالآخر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میں نے رابعہ کی آواز سنی۔ "ہیلو۔"

میرے دل نے سینے کے اندر قلابازی کھائی اور الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔ کچھ دیر میں بول ہی نہ سکا۔

"ہیلو۔ کون ہے؟" رابعہ کی آواز پھر آئی۔ "کس سے بات کرنی ہے؟"

"رابعہ۔" میرے حلق سے بڑی عجیب و غریب آواز نکلی جو بالکل اجنبی لگتی تھی۔ خود میرے کانوں کو بھی۔

"کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟" رابعہ نے کہا اور میں نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش کو محسوس کیا۔

"میں سکندر ہوں رالعہ۔" میں نے بالآخر اپنی آواز پر قابو پالیا۔ "تمھارا سکندر — ہیلو — رالعہ — میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"جھوٹ۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ ہسٹریائی لہجے میں کانپتے ہوئے بولی۔ "تم کوئی اور ہو۔ ابھی جب میں یقین کرلوں گی تو تم غائب ہوجاؤ گے۔ دھوکے باز۔ تم نے میری آنکھوں کو۔ میرے کانوں کو — مجھے کئی بار ایسے دھوکے دیے ہیں۔"

"مگر یہ دھوکا نہیں ہے جانم۔" میں نے کہا۔ "میں ایک ڈاکٹر کے گھر سے بول رہا ہوں۔ یہاں راولپنڈی سے۔ تم تصدیق کرسکتی ہو۔ میں فون بند کردیتا ہوں تم یہ نمبر ملالو۔" میں نے اُسے فون پر لکھا ہوا نمبر بتایا۔

"کیا کروں گی تصدیق کر کے؟" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ "تم اتنی دور ہو۔"

"میں شام تک پہنچ جاؤں گا۔ سُنا تم نے۔" میں نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش میں اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم پھر کوئی معرکہ سر کرنے نکل جاؤ گے۔ پھر چھوڑ جاؤ گے مجھے اپنی تنہائی کے جہنّم میں۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔ "میں پاگل ہوں کہ تم سے گِلہ کررہی ہوں۔ سارا قصور تو میرے نصیب کا ہے۔"

"رالعہ۔" میں نے کہا۔ "حوصلے سے کام لو۔ میں تو سمجھتا تھا تم بہت بہادر ہو۔ اتنی بڑی وکیل..."

"نہیں ہوں میں وکیل۔" وہ چلّائی۔ "میں صرف رالعہ ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بننا بھی نہیں چاہتی۔ مت دو مجھے بہادر ہونے کا الزام۔ میں انتہائی کمزور اور بزدل عورت ہوں۔ بالکل حوصلہ نہیں ہے مجھ میں دُکھ اٹھانے کا۔"

"اچھا دیکھو۔ میں جانتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "انکل رضوی کو معلوم ہوا تو وہ مجھے فوراً گرفتار کرلیں گے۔ میں صرف تم سے ملنے آؤں گا۔ دس بجے کے بعد کھڑکی کھلی رکھنا۔ سُن رہی ہونا۔ محسن کے سوا یہ بات کسی کو مت بتانا۔ ہیلو۔ ہیلو رالعہ۔ محسن کے بارے میں یہ بات غلط ہے نا کہ وہ مرگیا..."

لیکن لائن کٹ گئی تھی۔ نہ جانے کب۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ رالعہ نے میری کتنی بات سنی اور کتنی نہیں سنی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ ٹیلی فون اچانک ڈیڈ ہوگیا ہے۔ اب میں انکل شیردانی کے گھر بھی فون نہیں کرسکتا تھا۔

بوجھل دل کے ساتھ بادلِ ناخواستہ میں روبی کے ساتھ باہر آیا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ مصروف پُرہجوم بازاروں سے نکلنے کے بعد قدرے غیر آباد علاقہ آگیا۔ پھر سٹلائٹ ٹاؤن کا وہ علاقہ شروع ہوا جو پوری طرح آباد تھا۔ روبی کی ہدایات کے مطابق ٹیکسی مختلف موڑ کاٹتی ہوئی بالآخر ایک کنال پر بنی ہوئی کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ اس علاقے میں خالی پلاٹ کافی تھے۔

"جاؤ۔" میں نے روبی کی طرف دیکھ کر حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "گڈ لک، پانچ دس منٹ تک یہیں ہوں میں۔ جاؤ۔"

"صاب جی۔ ہم اتنا انتظار نہیں کرسکتے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔ "دھندے کا ٹیم ہے۔"

میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ سب کافی ہے تمھارے قیمتی وقت کے لیے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے نوٹ لے لیا اور انجن بند کرکے بیٹھ گیا۔ روبی نیچے اتری اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر گئی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے آخری بار پلٹ کے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں نے ہاتھ ہلا کے جواب دیا اور ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔

"ہوسکتا ہے ہمیں ایک دم روانہ ہونا پڑے۔" میں نے کہا۔ "انجن اسٹارٹ رکھو۔ جیسے ہی میں اشارہ کروں گولی کی طرح نکل جاؤ سیدھے اسلام آباد کی طرف۔"

"یہ کیا چکر ہے سر؟" وہ انجن اسٹارٹ کیے بغیر بولا۔ "کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟ انجن اسٹارٹ ہوجائے گا۔"

"نہیں۔ تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا اور گھڑی کو دیکھا۔ دو منٹ ہوچکے تھے۔ میری نگاہ اندر ہی کہ پیڈرو یا دلاور میں سے کسی کی جھلک بھی دکھائی دے تو ڈرائیور کو سگنل دے دوں۔ ڈائل پر لگی ہوئی گھڑی کی سوئی نے ایک اور چکر پورا کرلیا۔ تین منٹ۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اچانک اندر سے ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی۔ پھر دروازہ جس سے روبی اندر گئی تھی پورا کھل گیا اور چیختی ہوئی روبی نمودار ہوئی۔

"چلو۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "جلدی کرو۔" مجھے یقین تھا کہ روبی کے تعاقب میں یقیناً شکاری ہوں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے عجلت میں چابی گھمائی۔ انجن ایک بار غرّایا اور رک گیا۔ اس نے دوسری کوشش کی۔

"الو کے پٹھے۔ اسی لیے کہا تھا میں نے تم سے کہ انجن بند مت کرو" میں نے چیخ کر کہا۔ روبی پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بھاگتی چلی آرہی تھی۔ دہشت زدہ اور سراسیمہ۔ کسی آہوئے صیاد دیدہ کی طرح۔

"پتا نہیں کیا ہوگیا ہے سر۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔ "انجن تو ٹھیک اسٹارٹ ہے۔ پٹرول نہیں ہے شاید۔" اس کا خیال صحیح لگتا تھا۔ فیول میٹر کی سوئی "ای" کے نشان سے بھی نیچے چلی گئی تھی۔ میں نے اس وقت کو کوسا، جب میں نے ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہوکے روبی کے ساتھ آنا منظور کرلیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک آ گئی ہے لیکن ابھی تک کوئی شکاری کتا اس کمزور ہرنی کو دبوچنے کے لیے نہیں نکلا ہے۔ اسی وقت ٹیکسی کے انجن میں جان پڑ گئی۔

"اب کہاں سے آگیا پٹرول؟" میں نے کہا۔ "تم نے تو مجھے مروا دیا تھا۔" فیول میٹر کی سوئی بدستور وہیں تھی۔

"اس کا میٹر ٹھیک نہیں ہے صاب۔" وہ بولا۔ "دھوکا ہوجاتا ہے کبھی کبھی۔" ٹیکسی نے حرکت کی۔

"ٹھہرو۔" روبی ہاتھ ہلا کے چلّائی، ٹھوکر کھا کے گری اور پھر اٹھ کے دوڑنے لگی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے شانے پر تھپکی دی اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اب جو ہو سو ہو۔ میں ایک عورت کو مصیبت میں مدد کے لیے پکارتا چھوڑ کے بزدلوں کی طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں نیچے اترا ہی تھا کہ روبی نے میرا بازو اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اس کے ہاتھ کنکروں کی رگڑ سے چھِل گئے تھے اور رِسنے والا خون میری آستین کو داغدار کر رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے کھینچنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدّتِ جذبات نے اس کو قوتِ گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ وہ مسلسل ہچکیاں لے رہی تھی۔

"کیا بات ہے روبی؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

"وہ... انھوں نے مار دیا اسے۔" اس نے چیخ ماری۔ "مار دیا اسے۔" وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"اچھا اچھا۔ میں دیکھتا ہوں۔ تم حوصلہ رکھو۔" میں نے کہا۔ ٹیکسی کا دروازہ بند ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ موقع پاتے ہی بدحواس ڈرائیور نے ٹیکسی سمیت فرار ہوجانا بہتر سمجھا تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور روبی کے ساتھ اندر گیا۔ مجھے امید یہی تھی کہ اندر کوئی نہ ہوگا۔ ہوتا تو روبی باہر نہ آسکتی۔

کمروں کے درمیان راہداری جیسا تنگ سا راستہ تھا دونوں طرف کے سب دروازے بند تھے۔ چنانچہ دن میں بھی وہاں اندھیرے اجالے کی ملی جُلی کیفیت تھی اور باہر اُجلی دھوپ سے یکلخت اندر آنے پر تاریکی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ آخری دروازہ کھلا پڑا تھا۔ بین کرتی روبی کے ساتھ میں ویران کچن سے گزرا اور آخری گوشے کے دروازے سے نیچے اتر گیا۔ تہ خانہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ اس کی چھت وہی تھی جو گھر کا فرش تھا۔ تہ خانے کے فرش سے اس کی [illegible] بھی نہ تھی...... دس فٹ کا [illegible] کمرہ کا اسٹور تھا جسے پہلے عقوبت خانہ بنایا گیا اور پھر قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

ایک دیوار کے قریب پیڈرو مرا پڑا تھا۔ میں نے کبھی پیڈرو کو دیکھا نہیں تھا لیکن وہ لاش کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی جو ارد گرد پھیلے ہوئے خون میں اور فرش کی گرد میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔ امید اور انتظار کے آخری لمحات کا عکس ان آنکھوں میں منجمد ہوگیا تھا۔ ایک خنجر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست تھا مگر لہو دوسرے زخموں سے بہا تھا جو اس کے لاغر جسم پر جا بجا نظر آرہے تھے۔ روح کو جسم کی قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن جسم ابھی تک اسیر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اور زنجیر کا دوسرا سرا دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اسی طرح پیر ایک ہی رسّی سے باندھ کر رسّی کو ایک حلقۂ زنجیر کے ساتھ گرہ دے دی گئی تھی۔ روبی مسلسل رو رہی تھی لیکن میں اس شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنے خون سے محبت کے لازوال جذبوں کی ایک اور کہانی لکھ گیا۔ اس محبّت کی جو کسی سے کچھ نہیں مانگتی اور سب کچھ محبوب کے قدموں میں ڈال دیتی ہے۔ اپنے سارے سُکھ سب خوشیاں، جان و دل۔

میں نے جھک کر اس کے جسم کو ہاتھ لگایا۔ جسم ابھی بالکل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں زخم سے ابھی خون رِس کر نیچے بہہ رہا تھا۔ ہر سمت سے بند تہ خانے میں گرم لہو کی بُو بسی ہوئی تھی۔ مجھے اُبکائی سی آنے لگی۔ آدمی کا خون براہِ راست اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک ہاتھ نے مجھے پیچھے سے دھکیل دیا۔ میں لاش کے اوپر گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے روبی کی چیخ سُنی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھے دھکیل کر وہ دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے برہمی سے کہا۔ میرے سب کپڑے خون میں بھر گئے تھے اور جب میں اٹھا تھا تو دونوں ہاتھوں کی سب انگلیاں بھی پیڈرو کے خون میں تر ہوچکی تھیں۔ روبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اٹھنے کے بعد میں نے ان سب کو دیکھا جو خاموشی سے اندر آگئے تھے۔ پیڈرو سمیت وہ چار تھے۔ پیڈرو زینے کے اوپر دروازے کے فریم میں کھڑا تھا۔ باقی تین جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مجھے تین طرف سے محصور کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے روبی کو دیکھا۔ وہ کمر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی۔

"تم نے ایک اور قتل کر دیا ہے ہیرو" پیڈرو نے ایک خندۂ تحقیر کے ساتھ کہا۔

"ذلیل عورت" میں نے دانت پیس کے کہا "تو یہ سب فریب تھا، تیرا رونا دھونا، تیری کہانی"

وہ ہنسی "کہانی تو ایک رسالے میں پڑھی تھی میں نے، اداکاری میری اپنی تھی۔ اس کے بغیر میں تم سے خود کو کیسے بچاتی اور یہاں تک کیسے لے کر آتی۔ میں اسکول کے زمانے میں بھی ڈرامے کرتی تھی اور کچھ عرصہ ایکسٹرا بھی رہی تھی۔"

"ایکسٹرا تو اب بھی ہے۔ ایک فاضل پُرزہ" پیڈرو نے اوپر سے کہا "جس کی اب کسی کو ضرورت نہیں"

"ایسا مت کہو" روبی سہم کے بولی "تمھارے لیے میں نے سب کچھ کیا۔ جو تم نے کہا"

"نہیں۔ تو نے جو کچھ کیا تھا، پیسے کے لیے کیا تھا" پیڈرو نے ایک ایک سیڑھی اترتے ہوئے کہا "کیا میں نے کہا تھا کہ عقل سے کام نہ لینا؟ وہ کوئی ایسا زہر نہیں تھا جو ہاتھ پر رکھنے سے جسم میں سرایت کر جائے۔ اگر تو اس وقت ہسٹریا میں مبتلا نہ ہوتی تو اسے سیمسن کی جان لینے کا موقع نہ ملتا۔ مجھے معلوم ہے تو اس کو یہاں کیوں لائی تھی۔ تو اس کو نکال کر لے جانا چاہتی تھی۔ اب مجھے بے وقوف بنا کے جان بچانا چاہتی ہے؟"

مجھے گھیرے میں لینے والے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا اور ان کے ہاتھوں میں لمبے پھل والے خنجر تھے۔ مجھے نفسیاتی طور پر خوفزدہ کرنے کے لیے انھوں نے ایک ساتھ بٹن دبائے تھے اور دستے میں چھپے ہوئے پھل کھٹ سے نکل آئے تھے۔ میں پوری طرح مستعد دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا تاکہ تینوں دشمن میرے پیچھے آ کے وار نہ کر سکیں۔ ریوالور صرف پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ روبی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اداکاری اس کے کام نہیں آئی تھی۔

"یہ تمھارا شوہر عنایت مسیح کیسی باتیں کر رہا ہے روبی؟" میں نے کہا۔

"میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا" روبی چلائی۔ "میں بے بس تھی۔ اس کو روکے رکھنے کے سوا میں کیا کر سکتی تھی"

"اور جب تو کچھ نہ کر سکی تو اس کی مدد سے تو نے پیٹر کو آزاد کرانا چاہا؟"

"کیا مجھے اس کا بھی حق نہیں تھا؟" روبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "اسی لیے تو تم نے پیٹر کو یرغمال بنایا تھا کہ جب مطلب نکل جائے تو اسے مار دو؟ میں نے انکار تو نہیں کیا تھا کسی کام سے۔ پھر تم نے اس کی جان کیوں لی؟"

"سیمسن کی زندگی بہت قیمتی تھی۔ دس پیٹر مر جائیں تب بھی اس کا خون بہا ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ تیری بے وقوفی کی سزا ہے" پیڈرو بولا "صرف آدھی سزا۔ باقی سزا تو خود بھگتے گی" اس نے اچانک ریوالور اٹھایا اور گولی چلا دی۔ روبی کے سر سے خون کی دھار نکلی اور وہ نیچے گر گئی۔ یہ سب میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ساکت و صامت کھڑا روبی کو دم توڑتے دیکھتا رہا۔ تہ خانے میں سائلنسر والے پستول کی آواز دب گئی تھی اور روبی کو چیخ مارنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اپنا آخری جملہ مکمل ہونے سے پہلے پیڈرو فائر کر چکا تھا۔ اب وہ نزع کے کرب میں تڑپتی ہوئی پیٹر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے پیٹر کو چھوا اور آخری جھٹکا لے کر ساکت ہو گئی۔

"اگر تم سب یہ خنجر ریوالور لے کر نہ آتے تو میں تم کو بہادری کا سبق سکھاتا" میں نے کہا "لیکن تم صرف کمزوروں کو زنجیر سے باندھ کے مار سکتے ہو۔ نہتی عورتوں کو قتل کر سکتے ہو عنایت مسیح"

"یہ نام تمھیں کس نے بتایا؟ اس عورت نے؟" پیڈرو مسکرایا "اور تم نے یقین کر لیا؟"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں اس نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا سچ تھا۔ وہ کسی رسالے میں پڑھی ہوئی کہانی نہیں تھی" میں نے کہا "اسے تم پر اعتبار نہیں تھا۔ اس نے تمھارے ایک دشمن کو قابلِ اعتماد سمجھا اور اسے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تاکہ کوئی تو ہو جو تمھارے جرم کا گواہ بنے۔ اسے اندیشہ تھا کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو"

"اس نے اعتراف کیا تھا تمھارے سامنے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی" پیڈرو بولا۔

"یہ بات اس نے تم کو اچانک روبرو پا کے کہی تھی" میں نے کہا "خوف نے اسے سچ سے انکار پر مجبور کر دیا تھا"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے" پیڈرو نے بے نیازی سے کہا۔

"فرق اس عورت کو ضرور پڑے گا جو روبی کی ماں تھی" میں نے کہا "جسے تم بلیک میل کرتے رہے"

پیڈرو ہنسا "اس کے لیے بھی دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تین دن ہوئے، وہ بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئی"

"اس بوڑھی اور بیمار عورت کے لیے بھی تم نے انھی قاتلوں کی فوج بھیجی تھی؟" میں نے افسوس سے روبی کی طرف دیکھا جس نے محبت کی پناہ میں ایک ایسے مستقبل کے خواب دیکھے تھے جو اس کے لیے اور اس کی ماں کے لیے عمرِ رفتہ کی ہر تلخ یاد سے نجات کا ضامن ہو، مگر وقت ایک بے رحم جلاد تھا جو معاف کرنا نہ جانتا تھا۔ روبی کی ماں اپنی سزا کاٹتے ہوئے مر گئی اور بیٹی کو اس کی صورت بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، پیٹر کے ساتھ روبی بھی مر گئی۔ ان کا یہ جنم تو امیدوں کا سراب تھا مگر وہ آبلہ پا چلتے رہے۔ اس منزل تک جہاں خون خون میں شامل ہو گیا تھا اور اس لکیر پر سفر تمام ہوا جہاں روبی کے بہتے ہوئے لہو کی لکیر نے پیٹر کے خون سے رشتہ استوار کر لیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں پولیس کو بلانے کے لیے" پیڈرو نے زینے کا رخ کیا "تم تیار رہنا اور اس کی طرف سے غافل مت ہونا۔ میرا اشارہ ملتے ہی تم کو یہاں سے نکلنا ہے"

بظاہر ان کا پلان یہی تھا کہ مجھے پیٹر کا قاتل بنا دیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ مجھے ناک آؤٹ کر کے نکل جاتے تو ہوش آنے پر میں خود کو حوالات میں بند پاتا۔ شاید پیڈرو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوانا چاہتا تھا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے ہاتھ واقعی پیٹر کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی تہ خانے میں ایک عورت کی لاش پڑی تھی جس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کا نام روبی ہے لیکن اس کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

"یہ ریوالور اپنے پاس رکھو" پیڈرو نے زینے کے وسط میں پہنچ کے محسوس کیا کہ وہ خود تو محفوظ رہے گا مگر ان تین افراد کی سلامتی سو فیصد یقینی نہیں جن کے ہاتھوں میں صرف خنجر ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ خالی ہاتھوں سے بھی میں کیا کر سکتا ہوں اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ باری باری ان سے نمٹ لوں گا اور یہ خنجر ان کو نہ بچا سکیں گے۔ وار کرنے کے لیے ان کو قریب آنا پڑے گا۔ پہل چونکہ میری طرف سے ہوتی اس لیے پہلا شکار تو حرکت بھی نہ کر پاتا۔ باقی دو بیک وقت جھپٹتے لیکن اس وقت تک میں ایک خنجر حاصل کر چکا ہوتا اور ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیتا۔ یا اسے ڈھال بنا لیتا اور پھر باقی دو سے مقابلہ کرتا۔ اس سے میرے زخمی ہونے کے امکانات بھی تھے کیونکہ میں بالکل فٹ نہیں تھا اور چاروں ہاتھ پیر اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہیں کر سکتا تھا لیکن بڑے خطرے سے بچنے کے لیے چھوٹا خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ ریوالور کی گولی سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو ابھی تک پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔

لیکن ریوالور اپنے ساتھیوں کو دینا اس کی غلطی بن گیا۔ اس نے زینے پر سے ریوالور اس کی طرف اچھالا جو عین میرے مقابل تھا۔ اس نے ریوالور کو کیچ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک جست لگا کے اس کو جسم کی ٹکر ماری۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ خنجر کو اس نے دانتوں میں دبا لیا تھا۔ اس کے گرتے گرتے خنجر بھی فرش پر گر کے اچھلا۔ میں نے ریوالور پر قبضہ کرنے کے لیے غوطہ مارا تھا اور سیدھا اس کے اوپر جا پڑا تھا لیکن مجھے اٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ باقی دو اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دوسرے نے مجھے فرش پر ہی دبانا چاہا لیکن میں کروٹ لے کر پلٹ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا تھا مگر تیسرے نے میرے کِک ماری جو میری کہنی پر لگی اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھُٹ گیا۔ اسی وقت پہلا شخص چلایا۔ وہ خنجر جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تھا، اچھلنے کے بعد اس کے اپنے پیٹ میں گھس گیا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے زینے کی طرف بھاگ رہا تھا اور اس کا اپنا خون دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سے بہتا اس کے کپڑوں کو سرخ کر رہا تھا۔ وہ نہایت بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔

تیسرے نے مجھے ایک اور کِک مارنے کی کوشش کی لیکن اس بار میں نے اس کا پنجہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے اسے ایک ٹانگ پر گھما کر دیوار سے ٹکرانا چاہا مگر اس کا جوتا میرے ہاتھ میں آ گیا اور وہ دیوار پر لگنے کے بجائے منہ کے بل فرش پر گرا۔ صورتِ حال کو بدلتا دیکھ کے پیڈرو بھی زینے سے لوٹ آیا تھا۔ اس نے زیادہ حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور پلک جھپکتے میں وہ ریوالور دوبارہ اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ تہ خانہ تاریک ہو گیا اور میں دو لاشوں کے درمیان لیٹ گیا۔

آنکھ کھولنے پر مجھے اپنے اردگرد بڑی چہل پہل نظر آئی۔ پولیس والے دُہرے قتل کی اس واردات میں بڑی مستعدی دکھا رہے تھے جس میں سب کچھ تفتیش کی پریشانی کے بغیر مل گیا تھا یعنی قاتل بھی، مقتول بھی اور آلۂ قتل بھی۔ دو پھول والا ایک سب انسپکٹر مقتل کا نقشہ بنوانے میں مصروف تھا اور ایف آئی آر کی زبان میں جائے واردات کا منظر تمام تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر رہا تھا۔ اس کی ماتحت ٹیم ایک نائک اور دو کانسٹبلوں پر مشتمل تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک کانسٹبل میرے قریب کھڑا بے زاری سے تمام کارروائی کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اس تہ خانے میں لاشوں یا دیواروں کے سوا دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ ان کا افسرِ اعلیٰ تین پھولوں والا انسپکٹر، سو فیصد تھانیدار تھا۔ بھاری بھرکم، بے رحم اور کرخت چہرے والا، بڑی بڑی مونچھوں والا اور سب سے بڑی توند والا۔ اس کے لیے کہیں سے ایک کرسی برآمد کی گئی تھی۔ جب وہ حرکت کرتا تھا تو کرسی کراہنے لگتی تھی۔

صورت حال اچانک انتہائی سنگین ہوگئی تھی۔ پیڈرو کے ساتھی بھاگ گئے تھے اور جاتے جاتے مجھے موردِ الزام بنانے کا پورا اہتمام کر گئے تھے۔ پولیس ان کے طلب کرنے پر ہی پہنچی ہوگی اور ریوالور پر سے اپنے انگلیوں کے نشانات مٹا دیے ہوں گے۔ اگر بے ہوشی میں میرے ہاتھ سے میرے فنگر پرنٹ بنا گئے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔ یہ تو بہت بعد میں ثابت ہوگا کہ میں کسی مقتول کے نام سے بھی واقف نہیں۔ پہلے مجھے بتانا پڑے گا کہ میں کون ہوں۔ یہاں کیسے پہنچا اور کس طرح قتل کی اس واردات میں ملوث کیا گیا۔ اس سے پہلے ایف آئی آر میں ہر ثبوت میرے خلاف درج ہو جائے گا اور تفتیش ہوگی۔ تفتیش کیسے ہوتی ہے؟ اس کا مجھے عملی تجربہ تھا۔ پولیس مجھ سے ہر قیمت پر اعترافِ جرم حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گی اور میرے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے تشدد کے سارے حربے آزمائے گی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں یا ناکام۔ یہاں میرے خلاف دُہرے قتل کا دوسرا مقدمہ درج ہو جائے گا اور اس کے بعد وہی ہوگا۔ وکیل اور ضمانت حاصل کرنے کی کوشش، سماعت کے مرحلے، فیصلہ ہونے تک انتظارِ مسلسل کا عذاب۔

تقدیر نے مجھے ایک زنداں سے رہا کیا تھا تو دوسرے زنداں میں اسیر کر دیا تھا۔ بے وقوفی میری تھی کہ ایک بار آزاد ہونے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لاہور کا رخ نہیں کیا۔ میں اس نرس سے کہہ سکتا تھا کہ بی بی تم بہت مظلوم ہو لیکن میں بھی گرفتارِ بلا ہوں۔ سب کے پاس اپنے اپنے غم کا اور دکھوں کا بار ہے جو اسے خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ ہم دونوں کا مددگار ہو۔ اب مجھے سب کو مطلع کرنا پڑے گا۔ رالعہ اور شہلا کو، عبدالودود منظر کو اور دونوں انکلوں کو۔ رالعہ کہے گی کہ تم نے تو فون کر کے مجھ سے کچھ اور کہا تھا۔ تم نے کسی نرس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر تم اس کے ساتھ کہاں جا پھنسے اور ودود منظر پریشان ہونے کے باوجود قہقہہ مار کے کہے گا۔ جا بھوتنی کے، ہر شہر میں قتلِ عام کر رہے ہم ہیں تو غم کیسا۔ انکل رضوی اور شیروانی بہت زیادہ خفا ہوں گے اور ان سب لوگوں کی پریشانی یا خفگی برحق ہوگی۔

اس بار شاید ضمانت پر بھی رہائی نہ ہو۔ جیسے ہی یہ بات معلوم ہوگی کہ مبینہ مجرم سکندر بخت پر لاہور میں تین افراد کے قتل کا الزام ہے جس میں ایک دُہرا قتل بھی شامل ہے، عدالت مجبور ہو جائے گی کہ ضمانت کی درخواست مسترد کر دے ایسے مجرم کو چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ کیا پتا وہ پشاور یا کراچی جا کے کسی اور کا خون کر دے اور یہ بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ قتل کے دو مقدمات لاہور میں تو ایک پنڈی میں۔ رالعہ اور منظر کہاں کہاں سماعت کی تاریخ پر حاضر ہوں گے۔ بے شک اصل مسئلہ تو مجھے میر شرافت علی کے قتل کے الزام سے بری کرانے کا ہے۔ لاہور میں عبدل اور رشیدے کا قتل اور پنڈی میں روبی اور پیٹر کا قتل مجھ پر ثابت نہیں ہوگا کیونکہ حالات اور واقعات کی شہادت سو فیصد میرے حق میں ہوگی لیکن طریقۂ کار کے مطابق سماعت تو ہوگی۔ دلائل دیے جائیں گے، گواہ پیش ہوں گے اور باعزت بری کیے جانے تک کیا ہوگا، یہ سب میں جانتا ہوں۔

اس مصیبت سے بچنے کی ایک صورت یہ تھی کہ میں سکندر بخت نہ رہوں۔ اپنا نام پتا غلط بتاؤں اور خود کو لاوارث ظاہر کروں۔ یا سمین کی طرح گونگا بہرا بن جاؤں۔ اُدھر رالعہ انتظار کرتی رہے، اِدھر میں انتظار کروں کہ تقدیر کوئی صورت پیدا کر دے کہ میں خود کو بے گناہ ثابت کر سکوں۔ کوئی وکیل ترس کھا کے میری پیروی پر آمادہ ہو جائے اور کوئی اللہ کا نیک بندہ میرا ضامن بن جائے۔ یا مجھے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ گو اس کے امکانات بہت کم تھے لیکن مجھے رالعہ کو اور اپنے دوستوں ہمدردوں کو یہ ایس او ایس دیتے ہوئے شرم آتی تھی کہ آؤ مجھے بچاؤ۔ کیونکہ میں نے یہاں بھی دُہرے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا ہے، خواہ مخواہ مصیبت کو گلے لگا لیا ہے اور کوٹھے یار سے سوئے دار پہنچ گیا ہوں۔ صرف میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان ہیں۔ ان کے لیے مزید پریشانیوں کا سامان کرنا غلطی نہیں تھی، گناہ تھا۔ یہ ان کے پُرخلوص جذبات کا استحصال تھا لیکن کیا میں ان سب کی مدد کے بغیر اس عذاب سے چھٹکارا پا سکوں گا؟

ابھی میرا ذہن اس الجھن کا کوئی حل تلاش نہیں کر پایا تھا کہ کسی نے میرے ایک لات رسید کی۔ "اٹھ اوئے...." کسی نے پوٹھوہاری لہجے میں ایک مقبولِ عام گالی دے کر کہا۔ "مکر نہ کر۔"

"چھترلا ایس... کی۔" تھانیدار نے میرے نام کی جگہ گالی استعمال کی۔ "پتا لگ ویسی۔" مگر لات مارنے والے نے اس مشورے سے قبل ہی جلتی ہوئی سگریٹ میری گردن پر لگا دی تھی۔ مجھے اٹھ کر بیٹھنا پڑا۔ جو سپاہی اب تک بیزار کھڑا تھا، مجھ پر پل پڑا۔ میرے بال پکڑ کے اس نے مکّے اور لاتیں مارتے ہوئے مجھے اپنے افسرِ اعلیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا۔

نصف درجن کے قریب گالیاں دینے کے بعد تھانیدار نے پہلا سوال کیا۔ "ناں دس اپنا؟"

"جی... اس بندۂ حقیر و پُرتقصیر کو... اے اے اے اے الٰہ بادی..." میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے نستعلیق لہجے میں کہا۔

"اے اے اے..." تھانیدار نے میرے پیٹ پر چھڑی ماری۔ "نام پوچھا ہے میں نے..."

"وہی عرض کر رہا تھا حضور والا!" میں نے بلبلا کے کہا۔ "آغا احمد علی عرش الٰہ بادی۔ یہی نام ہے احقر کا۔"

"عرش الٰہ بادی؟ گویا شاعر ہیں آغا صاحب۔" تھانیدار نے میرا سر جھکا کے دو زنّاٹے دار تھپڑ رسید کیے اور میری کمر پر مکّے مارے۔ میں نیچے گر پڑا۔ میں نے شدید تکلیف کا اظہار شور مچا کے کیا۔

"قتل تو نے کیے ہیں؟" تھانیدار نے کہا۔ "بھونک مت کتے کی طرح۔ سیدھی طرح جواب دے۔"

"جی... جی ہاں، میں نے کیے ہیں۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔ "اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا ڈی ایس پی صاحب۔"

تھانیدار کو عزت افزائی پسند آئی۔ اسے یہ بھی یقین آیا کہ یہ شخص جو پھٹے کپڑوں میں بال بکھرائے، ننگے پاؤں اور شکستہ حال کھڑا ہے، شاعر ہی نہیں، جاہل بھی ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ہی بات تھی۔ "یہ عورت کون تھی تمھاری؟" وہ بولا۔

"منکوحہ تھی اس خاکسار کی بندہ پرور۔" میں نے کہا۔ "بے وفائی پر آمادہ تھی۔"

تھانیدار نے یوں سر ہلایا جیسے اس کا قائم کردہ مفروضہ درست ثابت ہوا ہے۔ "اور یہ اس کا آشنا تھا؟" وہ پیٹر کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اسے بھی تم نے قتل کیا ہے؟"

"جی حضور۔ اسی نابکار کے طفیل مجھ بدبخت کی ازدواجی زندگی کا یہ انجام ہوا۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

تھانیدار کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔ اس نے لاشوں کو مردہ خانے پہنچانے کے احکامات صادر کیے اور اپنی باقی سپاہ کو حکم دیا کہ مجھے تھانے لے چلیں۔ "ہتھکڑی ڈال دو اس کے۔" تھانیدار بولا۔

"اجی حضور ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے فریاد کی۔ "خادم کے تو دست و بازو شکستہ ہیں۔ بغیر بیساکھی کے چل نہیں سکتا۔ میں تو خود تھانے حاضر ہونے والا تھا۔ میں بھلا فرار ہو سکتا ہوں؟ آپ سب کے ہوتے ہوئے؟"

میری بات سے وہ قائل ہونے والا نہیں تھا لیکن قتل کی اطلاع پا کے آنے والے اپنے ساتھ ہتھکڑی نہیں لائے تھے، ان کو معلوم نہیں تھا کہ جائے واردات پر قاتل بھی دستیاب ہوگا۔ ایک کانسٹبل نے لات مار کے مجھے چلنے کا حکم دیا لیکن میں اسی طرح پڑا رہا۔

"میں تو سہارے کے بغیر اٹھ بھی نہیں سکتا جناب ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے مظلوم بن کے کہا۔

بادلِ ناخواستہ دو افراد نے مجھے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ میرے جس ہاتھ اور پیر پر پٹیاں تھیں ان میں درد تو تھا لیکن ناقابلِ برداشت نہیں۔ بیساکھی وہ ٹیکسی والا لے گیا تھا جس میں روبی مجھے اپنے ساتھ لائی تھی اور اس کے ساتھ تہ خانے تک میں کسی سہارے کے بغیر آیا تھا۔ غالباً بستر پر پڑے رہنے سے اور پٹیوں میں بندھے رہنے سے میرے ہاتھ پیر سُن ہو گئے تھے اور دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث تکلیف زیادہ تھی جو تھوڑا سا چلنے سے کم ہو گئی تھی۔ اب پٹیاں کچھ اور ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ چنانچہ میں مزید افاقہ محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے ظاہر یہی کیا کہ جہاں پٹیاں ہیں وہاں میری ہڈیاں چورا ہو چکی ہیں اور عملاً میں مفلوج ہوں۔

قتل کی سنسنی خیز خبر نے گرد و نواح سے پندرہ بیس تماشائیوں کو کھینچ لیا تھا۔ ان میں سے بیشتر ملازم یا راہ گیر تھے۔ یہ بے کار لوگوں کا علاقہ نہیں تھا۔ چنانچہ بچّے اسکول جا چکے تھے اور مرد اپنے اپنے کام سے۔ خواتین دور اپنے اپنے دروازوں کے سامنے خوف زدہ اور سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خبر محدود رہی اور کسی اخباری نمائندے تک نہیں پہنچی۔ کچھ لوگوں نے پولیس کے حکّامِ زیریں سے قتل کے پسِ پردہ اسباب و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی واجبی سی کوشش کی مگر انھیں مایوسی ہوئی۔ پولیس نے مجھے اٹھا کے ایک جیپ میں پھینکا۔ میرے ساتھ دو ماتحت اور دو افسر بیٹھ گئے۔ ایک اور دو پھول والے افسر۔ ان کے پاس ریوالور تھے اور انھوں نے مجھے دونوں سیٹوں کے درمیان اپنے قدموں میں گاڑی کے فرش پر ڈال کے پیروں سے دبا رکھا تھا۔ تین پھول والا پکّا تھانیدار آگے فٹ ہوا اور جیپ روانہ ہوگئی۔ میں مسلسل کراہتا گیا۔

تھانے کی عمارت نئی تھی لیکن اس کے در و دیوار پر پھیلی ہوئی آسیب زدہ نحوست کی فضا پرانی تھی۔ میرے لیے اس کے ماحول میں بھی کوئی چیز اجنبی نہیں تھی۔ نہ پولیس کا رویّہ، نہ پکڑے جانے والوں کی مظلوم بے بسی۔ نہ حوالات میں بند افراد

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کی حالتِ زار۔ ناانصافی اور لاقانونیت کی فریاد لے کر آنے والوں کی کس مپرسی۔ مرغا بنے ہوئے مشتبہ افراد کی قطار اور دیواروں پر تھانے کی حدود میں ہونے والے جرائم کے بے بنیاد اور خود ساختہ اعداد و شمار کے چارٹ۔ ایس ایچ او کا کمرہ اور کمرۂ تفتیش جہاں مجھے لے جایا گیا۔

رات نو بجے ایک اے ایس آئی نے باضابطہ طور پر میرا بیان لینا شروع کیا۔ جماہیاں لیتے ہوئے ایک نیم خوابیدہ اور عمر رسیدہ حوالدار نے اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے کرسی اور میز پر پوزیشن سنبھالی۔ میں یوں فرش پر پڑا رہا جیسے صرف ہاتھ پیر کی نہیں بلکہ میرے جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ سب کچھ میں ایک موہوم سی امید پر کر رہا تھا اور اس میں ابھی تک مجھے صرف اتنی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالی گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر میرا نام پوچھا گیا اور میں نے "فاثیوا" کی گردان شروع کی۔ ہائے اور آہ کے ساتھ۔

"بس بس۔" اے ایس آئی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھے لات ماری۔ "عرش کی اولاد، فرش میں گاڑ دوں گا۔ لکھ بھئی احمد علی۔" اس نے نائک کو مخاطب کر کے کہا۔ "باپ تھا؟ نام بتا اس کا؟" میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپا۔

"ہائے مر گیا۔ اس میں ایک اے کم تھا جی۔" میں نے کہا۔ "آپ ارشد علی لکھ لیں۔ ورنہ وہ بھی آغا اور الٰہ آبادی تھا۔"

"سکنہ؟" اے ایس آئی کے بجائے حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "قوم اور ذات؟"

"کیا جی؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ "ہائے... اُف..." میں نے اپنا واویلا جاری رکھا۔

"اوئے رہتا کہاں ہے؟" اے ایس آئی نے پھر مجھے لات ماری۔ میں نے چیخ مار کے مزید شور مچایا۔

"کہیں نہیں جناب۔ اف۔ میں مر گیا تھانیدار صاحب۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے اسپتال بھجوا دیں۔"

"اسپتال؟" تھانیدار نے اٹھ کر مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کیں۔ "تجھے ہم قبرستان پہنچائیں گے پھانسی کے بعد۔" بہت سی گالیوں کے بعد اس نے مجھ سے باقی سوالات کیے۔ مجھے حالات امید افزا نظر آنے لگے تھے۔ وہ میری بات مان رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میرا اعترافِ جرم جلد سے جلد مکمل ہو جائے تو وہ میرے دستخط لیں اور دُہرے قتل کی اس واردات کے مجرم کو گرفتار کر لینے کے بعد عدالت میں پیش کر دیں۔ اس میں انھیں کوئی اُلجھن یا پیچیدگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا تھا۔ گاؤں میں بھی اور شہروں میں بھی کہ غیرت مند شوہر بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر کے تھانے میں حاضر ہو جاتے تھے لیکن اس کارنامے کا سہرا تھانے کا عملہ اپنے سر باندھنا چاہتا تھا کہ اتنے کم وقت میں چالان مکمل کر لیا۔ ورنہ بیشتر صورتوں میں وہ کامیاب ہوتے تھے تو مخبروں کی مدد سے یا مشتبہ افراد پر تیرہ نمبر جوتے کی مشق سے۔ سراغ رسانی یہاں صرف قصے کہانیوں تک محدود تھی۔ خود پولیس کو اعتراف تھا کہ چوری، ڈکیتی اور قتل جیسی واردات کر کے ہاتھ نہ آنے والے مجرموں کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے اور برسوں پرانے مقدمات کی فائلیں سرد خانے میں ڈھیر ہو رہی ہیں۔

میں نے بے ربط الفاظ میں جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں اپنی بیوی اللہ رکھی کے ساتھ ناجائز طور پر ہندوستان سے پاکستان پہنچا تھا۔ سرحد پر گرفتاری کے بعد ہم اپنا سب کچھ دے کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ لاہور پہنچے تو جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا اور رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دن میں چھوٹا موٹا کام تلاش کرتے۔ کوٹھیوں میں ملازمت مل سکتی تھی بشرطیکہ ہم کوئی حوالہ پیش کر سکتے یا ضامن فراہم کر سکتے لیکن ہمیں تو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ کئی جگہ صاحب لوگوں کو ایسی عورت کی ضرورت بھی تھی جو کچن کا سارا کام سنبھال سکے اور مالی یا ڈرائیور کی جگہ بھی خالی تھی لیکن وہ سب پیسے والے لوگ تھے جن کو ہر اجنبی چور نظر آتا تھا۔ یوں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں سے پیٹ بھر کھانا بہرحال مل جاتا تھا۔ بیگمات ہم پر ترس کھا کے مدد بھی کر دیتی تھیں لیکن صاحب کی اجازت کے بغیر گھر میں جگہ دینے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ سب صاحب ضرورت سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوتے تھے۔ اسی چکر میں لاہور کا ایک بدمعاش ہمارے پیچھے لگ گیا۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہم ناجائز طور پر پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ کوئی دلّال یا بردہ فروش تھا جو اللہ رکھی کو ہتھیانا چاہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر راولپنڈی والی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن بدمعاش بھی ہمارے ساتھ سائے کی طرح رہا۔ ٹرین میں اس نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ رات کا وقت تھا لیکن اللہ رکھی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے زنجیر کھینچی تو وہ بھاگ گیا۔ میں دو ہفتے اسپتال میں رہا۔ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال میں۔ پھر پنڈی آ گیا۔ یہاں بھی لاہور والا مسئلہ تھا یعنی نوکری کا اور سر چھپانے کی جگہ کا۔ ایک دن اس بدمعاش نے ہمیں دیکھ لیا اور ہمیں باتوں میں لگا کے ایک گھر میں لے گیا۔ اس نے کہا تھا کہ نوکری بھی ملے گی اور رہنے کی جگہ بھی۔

"اور تم بے وقوف۔ تم نے اسی پر اعتبار کر لیا جس نے تمھیں دھکا دیا تھا چلتی گاڑی سے؟" انسپکٹر نے افسوس سے مجھے دیکھا۔ "اور جو تمھاری بیوی کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔"

"اس نے قسم کھائی تھی حضور۔" میں نے کہا۔ "کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور مجھے غلط فہمی ہوئی ہے اور وہ ایک شریف آدمی ہے۔ صرف ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ جو قسم پر بھی اعتبار نہ کرے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ میں اور اللہ رکھی اس کے ساتھ آ گئے۔"

"کافر ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر نے طنز سے کہا۔ "کیسے کیسے نمونے پڑے ہیں دنیا میں۔ عقل سے پیدل۔ اوئے کھوتے۔ تو نے اس اُلو کے پٹھے سے یہ نہیں پوچھا کہ آخر وہ کیوں مدد کرنا چاہتا ہے؟" اسے اب مجھ سے تھوڑی سی ہمدردی بھی ہونے لگی تھی کیونکہ اس کے خیال میں مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں تھا۔

"یہاں آتے ہی اس نے ریوالور نکال لیا حضور۔ اور ہمیں تہ خانے میں لے گیا۔" میں نے کہا۔ "میں نے قتل کر دیا۔"

"کیسے قتل کر دیا؟" انسپکٹر بولا۔ "کیا ہوا تھا تہ خانے میں؟ پوری بات بتاؤ۔"

"بس جناب اس نے اللہ رکھی پر دست درازی کی۔ میں ہندوستان سے ایک خنجر لایا تھا۔" میں نے کہا۔ "جو میری ڈب میں تھا۔ میں نے اسی سے مار ڈالا اس بدمعاش کو۔"

"لیکن پھر اس عورت اللہ رکھی کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" انسپکٹر نے مشکوک لہجے میں کہا۔ "اس نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ تم اسے لے کر فرار کیوں نہیں ہوئے؟"

"آپ کو کیا معلوم جنابِ عالی۔" میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ تو پہلے سے بھاگنے کو تیار بیٹھی تھی۔ میرے ساتھ دھکے کھاتے کھاتے تنگ آ گئی تھی۔ کہتی تھی کب تک ایسے بھیک کے ٹکڑوں پر گزارا ہو گا۔ رہنے کو جھونپڑا تک نصیب نہیں۔ مجھے نکھٹو اور بے غیرت کہتی تھی۔ کہتی تھی، مزدوری کرو۔ ریلوے اسٹیشن پر جا کے قلی ہو جاؤ۔ میں نے کوشش کی تھی حضور مگر وہاں ٹھیکیدار نے مجھے بھگا دیا۔ اس تہ خانے میں اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ میں اس کا گھر والا ہوں۔ اس کے ساتھ میرا نکاح ہوا ہے اور اس کو دکھ میں بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میرے ساتھ مرنا پڑے تو مر جانا چاہیے۔ وہ تو فوراً اس کی طرف ہو گئی۔ اس سے کہنے لگی کہ گولی مارو اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اس کے ساتھ تو میں فاقے کرتی مر جاؤں گی۔ وہ خبیث کہنے لگا کہ میں تجھے رانی بنا کے رکھوں گا۔ عیش کراؤں گا۔ بس اسی وقت مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کو مارنے کے بعد اسی کے ریوالور سے گولی چلائی اور اس بے وفا عورت کو بھی مار دیا۔ وہ میرا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ تو کر ہی چکی تھی۔ وہ قتل کی چشم دید گواہ بن جاتی اور جب مجھے پھانسی ہو جاتی تو اسے آزادی مل جاتی، موج کرنے کے لیے۔"

"کیا تمھاری بیوی نرس تھی؟" سب انسپکٹر نے کہا۔ "اس نے وردی پہن رکھی تھی۔"

"وہ چوری کی تھی جناب۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "اس کے تن پر کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا۔ وہ کب تک ساتھ دیتا۔ ایک رات ہم نے اسپتال سے چوری کیا تھا۔ وزیر آباد میں۔"

بیان اس کی مرضی کے مطابق تھا اور بظاہر اس میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن یہ پہلا بیان تھا۔ اس میں بہت سی باتیں تصدیق طلب تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال سے ہمارے متعلق ضرور معلوم کریں گے۔ ممکن ہے ریلوے والوں سے بھی پوچھیں اور مقتول کے متعلق لاہور کی پولیس سے دریافت کریں۔ اس بات کا اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ وہ لاہور یا پنڈی میں ہمارے کسی آشنا کو تلاش کریں۔ میری کہانی کے مطابق تو پاکستان میں ہمارا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ ہمارا وکیل کون ہو گا اور ضامن کون؟ یہ بعد کی بات تھی۔

"اس بیان پر دستخط کرو گے یا انگوٹھا لگاؤ گے؟" انسپکٹر نے کہا۔ "بیان عدالت میں بھی یہی دینا چاہیے ورنہ یاد رکھنا کال میں بھس بھروا کے واپس ہندوستان بھیج دوں گا۔ کس شہر سے آئے تھے تم دونوں؟"

دو گھنٹے سے میرا بیان لیا جا رہا تھا اور اس عرصے میں صرف ایک بار چائے والا اندر آیا تھا۔ چنانچہ حالات خاصے سازگار تھے۔

"بریلی سے حضور۔" میں نے کہا۔ "دستخط کہاں کروں؟" میں نے محسوس کیا کہ وقت آ گیا ہے اور اگر میں نے اس وقت کچھ نہ کیا تو پھر کبھی مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ حوالدار پہلے ہی میز کے نیچے ٹانگیں پھیلائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے تھوڑا سا جھک کر مجھے بتانا چاہا کہ بیان کے نیچے مجھے کس جگہ اپنے دستخط کرنے ہیں۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ میں کچھ خالی جگہ چھوڑ کے دستخط کروں تاکہ بعد میں وہ بیان کو بڑھانا چاہیں تو اس کے لیے گنجائش ہو۔ اسے یہ اندیشہ ہو گا کہ کہیں میں آخری سطر کو دستخط سے نہ ملا دوں چنانچہ اس نے کاغذ پر ایک جگہ انگلی رکھ دی۔ میرا دل آخری بار اس خیال سے دھڑکا کہ عین وقت پر یا میرے پروگرام پر عمل درآمد سے قبل کوئی آ گیا تو میرا حشر کیا ہو گا لیکن یہ خطرہ ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس جُوئے میں ہار جیت کے امکانات برابر تھے۔ جیت کا مطلب تھا، اس دُہرے قتل کے جھوٹے الزام سے چھٹکارا۔ ایک بار یہاں سے نکل جانے کے بعد میں محفوظ تھا۔ اسلام آباد اور لاہور میں میری بے گناہی کے گواہ بہت تھے۔ خدانخواستہ پولیس مجھے پھر پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی تو انھیں سخت خفت اٹھا کے لوٹنا پڑتا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس جُوئے میں بازی ہارنے کا مطلب صرف سزائے موت تھا۔

پلک جھپکتے میں میرا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار انسپکٹر کی گردن سے ذرا نیچے شانے پر پڑا۔ وہی ہاتھ سیدھا آگے گیا اور حوالدار اونگھتے خاں کے نرخرے پر لگا۔ حوالدار کا تو سانس ذرا سی دیر کے لیے رک گیا۔ اس نے بے اختیار منہ کھولا لیکن چلّانے کے لیے نہیں، ہوا کے لیے۔ لیکن ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ دوسرا سانس نہ لے سکا اور وہیں کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ انسپکٹر لڑکھڑا کے آگے جھکا اور اس کا سر میز پر لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ وہ کراہتے ہوئے کسی کو پکارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا سر میز کے کونے پر اس طرح مارا کہ چوٹ کنپٹی پر آئی۔ وہ بے سدھ ہوکے کرسی سے گرا تو کرسی کے گرنے سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز کسی کو بھی متوجہ کرسکتی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سب انسپکٹر کا ریوالور قبضے میں کیا اور دروازے کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اگر کوئی شامت کا مارا اندر آجاتا تو مجموعی صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ریوالور کا بٹ اس کے سر پر پڑ جاتا اور وہ خود بھی لمبا لیٹ جاتا۔

ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا بیت الخلا قسم کا باتھ روم تھا جس میں صرف دو بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کو قیدی اور زیرِ تفتیش مجرم نظامِ اخراج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کرسکتے تھے اور کرتے رہے تھے۔ چنانچہ اس کی بدبو سے وہ کمرہ متعفن ہو رہا تھا۔ ایک رات میں بھی تھانے میں تفتیش کے پُرتشدد اور انسانیت سوز طریقوں کا شکار ہوا تھا۔ وہاں بھی ایسی ہی بالٹیاں تھیں۔ گندی بالٹی میں ان کی غلاظت بھی سمیٹی جاتی تھی جو وحشیانہ جسمانی اذیت کی تاب نہ لاتے ہوئے گندگی اور آلائش پھیلاتے تھے۔ الٹیاں کرتے تھے یا خون اگلنے لگتے تھے۔ دوسری بالٹی میں پانی تھا۔ پینے کے لیے، غلاظت صاف کرنے کے لیے، بے ہوش ہوجانے والوں کو ہوش میں لانے کے لیے یا کسی ضدی مجرم کا سر ڈبو کے اس کی زبان کھلوانے کے لیے۔ تھانے میں گزری ہوئی اُس بھیانک رات کی یاد سے مجھے جھرجھری آگئی۔

میں نے جلدی جلدی بالٹی کے پانی سے ہاتھ صاف کیے اپنے کپڑے اتار کے چہرے اور جسم پر گیلا کپڑا پھیرا اور خون کے داغ رگڑے۔ پھر میں دروازہ بند کرکے بڑے کمرے میں آیا۔ سب انسپکٹر تقریباً میرے سائز کا تھا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی اتار کے میں نے اپنے جسم پر چڑھالی۔ اس وقت مجھے اپنے ایک ہاتھ اور پاؤں میں کسی قسم کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میرا ذہن سر پر منڈلانے والے خطرے سے نبرد آزما تھا۔ سب انسپکٹر کے جوتے پہننے میں بھی مجھے پانچ منٹ ہی لگے۔ اس کی ٹوپی سر پر لگا کے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ خود کو آئینے میں دیکھوں کہ میں اپنا بھیس بدلنے میں کس حد تک کامیاب رہا۔ میرے چہرے پر کوئی لہو کا داغ تو نہیں ہے جو نمایاں ہوکے پکارنے لگے کہ دوڑو، پکڑو، مجرم فرار ہو رہا ہے۔ وردی مجھے چھوٹی بڑی تو نہیں ہے اور فرق اتنا واضح تو نہیں ہے کہ جو دیکھے وہ ایک نظر میں پہچان لے۔ لیکن وہاں آئینہ کہاں تھا۔ ہر طرف نصف شب کا ہولناک سناٹا تھا۔

میرے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی تو پتلون کے نیچے آگئی تھی لیکن دائیں ہاتھ کی پٹی وردی کی آدھی آستین سے باہر تھی اور یہ انتہائی نمایاں خطرہ تھا۔ کوئی بھی پولیس مین یا افسر مجھے دیکھتے ہی شک میں مبتلا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ان میں سے کسی کا ہاتھ زخمی نہیں تھا۔ سب انسپکٹر کی جیب سے چابیوں کے ساتھ چھوٹا سا ناخن تراش اور اسی کے برابر جیبی چاقو بھی نکلا تھا۔ میں نے ڈیڑھ انچ کے بلیڈ جیسی دھار والے چاقو سے پٹی کو ایک جگہ سے کاٹا اور کھولنے لگا۔ پوری پٹی ہٹانے کے بعد مجھے اپنا سوجا ہوا بازو دکھائی دیا۔ یہ صرف ہڈی پر ضرب کا اثر تھا۔ ہڈی میں فریکچر نہیں تھا۔ چلتے چلتے میں نے سب انسپکٹر کی گھڑی اتار کے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہنی۔ پھر حوالدار کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس میں سے سات سو بیس روپے نکلے۔ میں نے یہ بھی اپنی جیب میں منتقل کیے۔ ابھی میں نے سب انسپکٹر کی کوئی جیب ٹٹول کر نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ حوالدار اونگھتے خاں جیب میں اپنی ماہانہ آمدنی سے دُگنی رقم لیے پھر رہے تھے تو انسپکٹر کے پاس بھی ہزاروں ضرور ہوں گے۔ وہ بہرحال افسر تھا۔ انسپکٹر کے رومال سے میں نے ہر اس جگہ کو صاف کردیا۔ جہاں مجھے اپنے فنگر پرنٹ کا شبہ ہوا پھر ریوالور ہاتھ میں لے کر میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا لیکن دوسری طرف سے ان آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا جو تھانے کی پہچان ہوتی ہیں۔ تھانہ ہی کیا ہر مقام آوازوں کی وجہ سے پہچان رکھتا ہے۔ ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کی آوازوں سے گونجتا جنگل۔ ہر طرح کی ٹریفک کے شور سے معمور شہر۔ ہر قسم کی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے بھرپور کارخانہ۔ طیاروں کی گھن گرج اور بم کے دھماکوں سے لرزتا محاذِ جنگ۔ سناٹے کی بازگشت کو دُہراتے برف پوش کوہسار۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے وہ بیان سمیٹ کر جیب میں رکھ لیا جس پر مجھے

دستخط کرنے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ تھانے کی عمارت میں کسی عقبی دروازے کا ملنا یقینی تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اتنی بڑی عمارت میں آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہو۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کمرے کا کھلا دروازہ نظر آیا۔ یہ کمرہ نہیں، خاصا بڑا ہال تھا جس میں دونوں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ چارپائیوں کی قطار تھی۔ ہر قطار میں تین چارپائیاں تھیں۔ ہر چارپائی کے بعد لکڑی یا ٹین کا ایک باکس رکھا تھا۔ یا میز تھی جس پر تیل، کنگھے اور ٹوتھ پیسٹ قسم کی اشیا رکھی تھیں۔ جہاں میز نہیں تھی وہاں سرہانے کی جانب دیوار پر شیلف سا بنا لیا گیا تھا۔ تین چارپائیاں بالکل خالی تھیں۔ دو پر وہ لمبی تان کے سو رہے تھے جو ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ سر تک چادر لپیٹے، بالکل سیدھے لیٹے وہ لاش نظر آتے تھے۔ صرف ایک شخص بنیان، دھوتی باندھے سیدھا بیٹھا نسوار کی ڈبیا کے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنی مونچھیں کتر رہا تھا۔ اگر وہ اس کام میں منہمک نہ ہوتا تو کسی افسر کو جوانوں کی رہائشی بیرک سے گزرتا دیکھ کے ضرور چونکتا لیکن اس نے مجھے ذرا دیر سے دیکھا۔ ہڑبڑا کے کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا کیونکہ سلیوٹ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ چالیس واٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں وہ میرا چہرہ صاف طور پر دیکھ ہی نہ سکا۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور سیدھا بیرک کے دوسرے دروازے سے باہر آگیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک قطار میں چار غسلخانے بنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بائیں جانب ایک اور دو کمروں والے چھوٹے چھوٹے رہائشی فلیٹوں کی سہ منزلہ عمارات کے تین بلاک تھے جن میں پولیس کے لوگ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دائیں طرف احاطے کی دیوار تھی۔ اس میں دروازہ کوئی نہیں تھا لیکن فلیٹ میں رہنے والوں نے اپنی سہولت کے لیے دیوار کے ایک حصے میں شگاف ڈال دیا تھا جو اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس میں سے سر جھکا کر گزرا جاسکتا تھا اور تھانے کا چکر لگا کے نہیں جانا پڑتا تھا۔ میں بھی کسی دشواری کے بغیر اسی سے گزرا۔ میرے ساتھ ہی ایک نوجوان لڑکے نے اندر آنے کی کوشش کی۔ تصادم میں اس کے ہاتھ سے کتابیں گر گئیں اور میرے سر سے ٹوپی۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے "معاف کرنا بھائی" نکل گیا جو بڑی غلط بات تھی۔ کوئی پولیس کا تھانیدار ایسے شائستہ اور نرم لہجے میں ایک نوجوان سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ اگر اس کے بجائے میں گالی دے کر کہتا کہ "اندھا ہے الّو کے پٹھے" تو لڑکا بالکل برا نہ مانتا اور حیران بھی نہ ہوتا۔ جب میں نے ٹوپی سر پر رکھی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتابیں سمیٹنے کے بجائے غور سے میری صورت کو تک رہا ہے پھر اس کی نگاہ میری وردی کی جیب پر گئی جس پر نیلے پلاسٹک کی پٹی لگی ہوئی تھی اور پٹی پر اس افسر کا نام سفید حروف میں لکھا ہوا تھا جس کی یہ وردی تھی۔

"کون ہو تم؟" لڑکا ایک دم کھڑا ہوگیا۔ وہ یقیناً وہیں رہتا تھا۔ چنانچہ تھانے کے افسروں کو پہچانتا تھا۔

"تمھیں کیا نظر آتا ہوں میں؟" میں نے لہجہ بدل کے سخت الفاظ میں کہا۔ "شیشم کا درخت؟" لیکن میرے جواب اور لہجے نے نوجوان کو مطمئن نہیں کیا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا تھا کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں جو کہیں سے پڑھ کے لوٹ رہا تھا۔

"یہ وردی تمھاری نہیں ہے؟" وہ کتابیں چھوڑ کے چلاتا ہوا بھاگا۔ اگر میں اس کے پیچھے دوڑتا تو اسے پچاس گز طے کرنے کے بعد پکڑ سکتا تھا اور خاموش بھی کرسکتا تھا لیکن پچاس گز دشمن کی سرحد کے اندر ہوتے۔ نوجوان کی چیخ پکار پر تھانے والوں کا متوجہ ہونا لازمی تھا۔ اس کے بعد میرا واپس پچاس گز دوڑ کر آنا اور فرار ہونا بہت مشکل ہوجاتا۔ میں نے غوطہ مار کے باہر نکل جانا بہتر سمجھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ باہر نکلنے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے فوراً کوئی سواری ملے گی یا نہیں۔ گلی ہوگی تو سڑک کس سمت ہوگی اور سڑک ہوئی تو مجھے کہاں لے جائے گی۔ تھانیدار کی وردی پہن کے بازار میں دوڑ لگانا تھانیدار کی شان نہیں۔ یہ منظر پبلک نے کبھی نہیں دیکھا۔ خواہ مجرم فرار ہو رہا ہو۔ اکثر تھانیدار بارِ شکم کے باعث اس قابل نہیں ہوتے کہ ایک فرلانگ بھی بھاگ سکیں۔ نوجوان اور پُھرتیلے مجرم فرار ہوجاتے ہیں اور تھانیدار ایک آدھ ہوائی فائر کرکے ماتحت کی نااہلی پر گرجتے برستے لوٹ آتے ہیں۔ میں تو اپنی ایک ٹانگ کے جزوی طور پر ناکارہ ہونے کے سبب سیدھا بھی بڑی مشکل سے چل رہا تھا اور اب مجھے سخت پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ دور کہیں سے کسی کلاک نے ایک گھنٹا بجایا۔

میرے اور تعاقب میں روانہ ہونے والوں کے درمیان تقریباً دو سو گز حائل تھے۔ جو دس منٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ دُبلے پتلے سپاہی شکاری کتوں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے تو بس چند قدم بھی نہ چل پاتا کہ پکڑ لیا جاتا۔ مجھ پر تشدد تو ہوا تھا لیکن بہت کم۔ صرف اس لیے کہ میں پولیس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا اور ان کے لیے کیس میں کسی قسم کی الجھن پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن فرار کی کوشش تو ان سب کا خانہ خراب کرنے کے مترادف تھی۔ وہ نااہل قرار پاتے، لائن حاضر کیے جاتے یا معطل ہوجاتے۔ چنانچہ میں دوسری بار گرفتار ہوتا تو ان سب کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

انتقامی کارروائی کا نشانہ بنتا اور وہ میرے جسم پر تشدد کے وہ سب طریقے آزماتے جو برسوں کے تجربے کا حاصل ہوتے اور جن کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بڑے بڑے سورما ان اذیت گاہوں میں محض شک کی بنیاد پر لائے گئے اور عبرتناک موت سے دوچار ہوئے، ان کی لاشیں سڑکوں پر ڈال دی گئیں اور جب ان پر سے گاڑیاں گزر گئیں تو یہ حادثاتی موت کہلائی۔ تشدد سے ہلاک ہونے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ انھوں نے خودکشی کرلی۔ اخبارات نے یا لواحقین نے واویلا کیا تو تحقیقات کی رسمی کارروائی بھی ہوئی لیکن اس کے بعد کچھ نہ ہوا۔

میں گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری ساری جدوجہد ایک غیر متوقع اور معمولی سے واقعے کے باعث ناکامی بن رہی تھی۔ اسی کو کہتے ہیں "تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ"۔ قسمت نے ساتھ دیا ہوتا تو وہ ریوالور واپس پیڈرو کے ہاتھ میں کیوں پہنچتا جو میں نے ہر طرف سے محصور ہونے کے باوجود دشمنوں سے چھین لیا تھا۔ اس وقت بھی میرے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا لیکن میں بازار سے فائرنگ کرتا ہوا فرار نہیں ہوسکتا تھا اور پیچھے آنے والوں کو بے دریغ گولی نہیں مار سکتا تھا۔ البتہ وہ مجھے دور سے ہی نشانہ بنا سکتے تھے اور کتے کی موت مار کے سرخرو ہوسکتے تھے کہ انھوں نے ایک قاتل کے فرار کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ ابھی تک دیوار کے شگاف سے کوئی نہیں نکلا تھا لیکن مجھے کوئی رکشا یا ٹیکسی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا جہاں گنتی کی چند دکانیں تھیں۔ پیچھے سے ایک پرائیویٹ کار آئی مگر اس میں کسی کی پوری فیملی بھری ہوئی تھی۔ میں چلتا گیا اور پلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا۔ ایک اسکوٹر والا میرے اشارے کی پروا کیے بغیر گزر گیا پھر دوسری کار ایک کوٹھی میں سے نکلی۔ میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔

"میں صدر تک جارہا ہوں۔" کار کے ادھیڑ عمر مالک نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

"مجھے بھی صدر ہی جانا تھا۔" میں نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی پتلون کا پائنچہ اٹھا کے اسے پٹیاں دکھائیں۔ "میں کافی دیر سے پیدل چل رہا تھا۔ کوئی رکشا ٹیکسی نہیں ملی۔ پیر میں بہت تکلیف ہے۔"

کار کے مالک نے سر ہلا کے افسوس کا اظہار کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ "کیا ہوا تھا؟" وہ بولا۔

لیکن میں سامنے ذرا اوپر لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ تھانے کی دیوار کے شگاف سے بہت سے وردی والے نکل آئے تھے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے جھانکا۔ وہ سب بے بسی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کے چلا رہے تھے اور مجرم کی کار کو اپنی دسترس سے دور جاتا دیکھ رہے تھے۔ شاید اس وقت تھانے میں کسی کی موٹر سائیکل یا پکڑی ہوئی گاڑی تک نہ تھی۔ ورنہ وہ پیچھا ضرور کرتے۔ اب میری طرح ان کو بھی کسی سواری کا انتظار تھا جو فوری طور پر دستیاب نہیں تھی۔ یہ چند منٹ کی مہلت مجھے غالباً اس لیے مل گئی تھی کہ وہ پہلے اس سب انسپکٹر کی خیریت معلوم کرنے لپکے ہوں گے جو میلا پیان لے رہا تھا تاکہ نوجوان کے شکوک کی تصدیق ہوجائے پھر انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بے وردی سب انسپکٹر بے جان تو نہیں ہے اور حوالدار اونگھتے خاں کو ہمیشہ کی نیند تو نہیں سلادیا گیا ہے۔

اپنی کامیابی نے مجھے بے پناہ مسرت عطا کی اور میرا حوصلہ ہمالیہ پہاڑ سے بھی بلند تر ہوگیا۔ یہ میری بہت بڑی فتح تھی۔ دشمنوں نے مجھے دُہرے قتل کے جھوٹے الزام میں ملوث کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور وہ ابھی تک مطمئن ہوں گے کہ اس کوشش میں کامیاب رہے۔ ایک شکاری دوسرے شکاری کو مبارک باد دے رہا ہوگا کہ اس بار سکندر بخت ایسا پھنسا ہے کہ نہ اسے چالاکی بچاسکے گی، نہ وکیلوں کی مدد۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سازش ناکام رہی۔ کسی کو میری گرفتاری کی خبر تک نہ ہوئی اور میں جھوٹ، مکروفریب اور شیطانی حربوں کے جال سے صاف بچ کر نکل آیا۔ قانون مجھے بے گناہ تسلیم کرکے باعزت طور پر رہا کرتا تو برسوں بعد۔ بہت اذیت برداشت کرنے اور بہت خوار ہونے کے بعد۔

"میں نے پوچھا تھا کہ اس ٹانگ کو کیا ہوا ہے؟" کار کے مالک نے کہا۔ "تم پیچھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی نظر ہمیشہ آگے رکھتا ہوں لیکن بقولِ شاعر، کبھی گزری ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔"

گاڑی اب ایک کم آباد سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ "آپ نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

"نام نہ تم نے پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا۔" وہ ناگواری سے بولا۔ "ویسے مجھے غلام کہتے ہیں۔"

"صرف غلام؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اسی لیے آپ ہر ایک کی مان لیتے ہیں۔ مثلاً میرے لیے گاڑی روک لی تھی آپ نے اور ابھی میں آپ سے کہوں گا کہ گاڑی روک کے چابیاں میرے حوالے کردیں تو یہ بات بھی مان لیں گے آپ۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ میں ایسی فضول بات کیوں مانوں گا۔" وہ برا مان کے بولا۔

"اس لیے کہ ہم دونوں کا بھلا اسی میں ہے۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "گاڑی روک لیجیے غلام صاحب۔"

اس کا رنگ ریوالور دیکھ کے فق ہوگیا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی۔ "یہ... یہ صلہ ہے شرافت کا؟ اگر کوئی قانون پسند شہری پولیس کی مدد کرتا ہے تو... تو پولیس یہ کرتی ہے اس کے ساتھ؟" وہ بولا۔

"پولیس جو کچھ کرتی ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب آپ یہاں اتر جائیں اور سیدھے چلنے لگیں۔ پولیس کو رپورٹ کرنے کے چکر میں مت پڑیں۔ آپ کو کار واپس لینی مشکل ہوجائے گی اور بہت الٹے چکر میں پھنس جائیں گے آپ۔ میں اپنے محسن کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کی گاڑی اسی سڑک پر ایک میل آگے کھڑی ہوگی۔"

"مجھے شک ہے کہ تم پولیس کے بھیس میں چور ڈاکو ہو۔" اس نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"چور ڈاکو نہیں جناب۔ مفرور چور ڈاکو۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ شور ہنگامہ نہ کریں اور پولیس میں رپورٹ کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ عین ممکن ہے وہ آپ کو بھی دھرلیں کہ آپ نے ایک مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی اور آپ اس کے ساتھی ہیں۔ آپ گاڑی لیے تھانے کے باہر موجود تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ میں چور ڈاکو ہوں، نہ آپ میرے ساتھی ہیں لیکن پولیس کی سمجھ کا کیا علاج۔ ایک میل زیادہ نہیں ہوتا۔ آپ اطمینان سے چلتے ہوئے بھی بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد مجھ سے ملاقات کو بھول جائیے۔ ایسا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ آپ بیس منٹ دیر سے پہنچنے کی کوئی بھی معقول وجہ پیش کرسکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کا ٹائر فلیٹ ہوگیا تھا۔ چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوگی۔" گاڑی کی گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا نیچے اترا۔ "خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ جب میں نے دیکھا تو وہ اطمینان سے مارچ کرتا ہوا روانہ ہوچکا تھا۔ ایک میل سے کچھ آگے جاکے میں نے کار کو سڑک کے کنارے صحیح جگہ پارک کیا۔ انجن بند کرکے چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈالی اور دروازہ بند کرکے نیچے اتر آیا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں نے ایک سائڈ اسٹریٹ میں چلنا شروع کیا۔ میری کامیابی پر اب مُہرِ تصدیق لگ گئی تھی۔ اس عقیدے پر میرا اعتقاد اور راسخ ہوگیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے اور رہے گا اور اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ بالآخر میں پھر آزاد ہوگیا تھا اور وہ شکاری جنھوں نے مجھے زیرِ دام لانے کے لیے بہت مضبوط جال پھیلایا تھا پھر اپنی ناکامی پر نوحہ خواں تھے۔ کتنے اعتماد کے ساتھ دلاور نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم تمھیں سات سال تک اسیر رکھیں گے۔ وقتاً فوقتاً تمھاری زندگی کا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے لیکن تمھیں لاپتا رکھیں گے تاکہ تمھیں قانوناً مردہ بھی قرار نہ دیا جاسکے اور وراثت کا سرٹیفکیٹ کسی کو جاری نہ ہوسکے۔ یہ منصوبہ بہت مکمل تھا لیکن اس پر عمل درآمد کتنا مشکل ہوگا، اس کا وہ پوری طرح اندازہ نہیں کرسکے۔ میرے جیسے کسی بھی شخص کو سات سال تک ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنا اور دن رات میری پہرے داری کرنا بہت دشوار کام تھا۔ سات برسوں کے ڈھائی ہزار سے زیادہ دنوں میں تقدیر مجھے ایک بھی موقع فراہم کردیتی تو ان کی محنت اکارت جاتی مگر وہ ضدی اور کینہ پرور لوگ تھے، ان کو کم ہمت نہیں کہا جاسکتا اور غیر مستقل مزاج نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان کا سرغنہ چوہدری دلاور انتہائی ذہین اور ٹھنڈے دل و دماغ والا آدمی تھا۔ اس نے منصوبے کی جزئیات اور تفصیلات پر اچھی طرح غور کرلیا ہوگا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا کہ سات سال تک وہ مجھے کہاں کہاں رکھتے اور کیسے رکھتے۔ میرا قید خانہ کتنے دور افتادہ اور اجنبی مقامات پر کتنی بار بدلتے۔ مجھے کب تک بے ہوش اور پابہ زنجیر رکھتے۔ ابھی تو سات دن ہی گزرے تھے کہ میں قید سے نکل بھاگا اور آزادی کی اس جنگ میں داروغۂ زنداں کے علاوہ بھی تین افراد مارے گئے۔ روبی، پیٹر اور روبی کی ماں۔ میں ان کو مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن قدرت پہلے ہی ان کو سزا دینے کا فیصلہ صادر کرچکی تھی۔ شاید یہ سزا انھی کے اعمال کا شاخسانہ تھی۔

میں جانتا تھا کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کو اس ناکامی پر کتنا صدمہ ہوگا۔ سیمسن تو صرف ایک وحشی قوت تھا۔ اس کا جسم انسانی تھا لیکن عقل و فہم میں وہ لاکھوں کروڑوں سال پہلے کا انسان تھا جس کو سائنسداں بندر کے قبیلے کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ اسے قصوروار نہیں سمجھا جاسکتا۔ دلاور کا سارا عتاب پیڈرو پر نازل ہوگا۔ اس نے اپنی بے وفا بیوی پر بھروسہ کیا۔ اس کے آشنا کو یرغمال بنا کے قید میں رکھا اور اس خدمت کے انعام میں لیلٰے کو مجنوں کے وصل سے شادکامی کا یقین دلایا۔ وہ روبی سے بہرصورت نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ پھر پیٹر کو وہ کیسے زندہ چھوڑتا لیکن اب اس پر الزام آئے گا کہ اس نے جو انتظامات کیے تھے، ناقص تھے اور اسی کی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سات سالہ منصوبہ سات دن میں چوپٹ ہوگیا۔ اب وہ یہی کرسکتے ہیں کہ پولیس کو میرے ٹھکانے کی اطلاع دے دیں لیکن ان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رالجہ اور منظر، پولیس کے پیچھے پڑجائیں گے۔ کون آغا علی احمد عرش الٰہ آبادی؟ گھاس کھا گئے ہیں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آپ لوگ ، پھر ایس آئی اکرام شیخ ہوگا اور ایس پی ضامن رضوی۔ وہ چکرا جائیں گے کہ بظاہر ملزم وہی ہے۔ شکل صورت میں بھی صرف اتنا ہی فرق پڑا ہے کہ بڑھی ہوئی شیو، بکھرے بالوں اور غلیظ کپڑوں کی جگہ اب وہی شخص کلین شیو، صاف ستھرے اور بہترین سوٹ میں ہے مگر اس کے علاوہ بھی یہ سکندر بخت ہے ایک فیکٹری کا مالک، ولایت پلٹ انجینئر اور پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے گھر میں مقیم۔ وہ ہزیمت اٹھا کے لوٹیں گے تو اپنی کوتاہی پر ایک دوسرے کو الزام دیں گے اور مفرور مجرم کو گالیاں دیں گے جو اُن کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں بے وقوف بنا کے "ڈز" دے گیا۔ نہ ان کو یہ معلوم ہوگا کہ سیمسن کون تھا اور جس کے گھر میں قتل ہوا وہ کون ہے، ان کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ پوسٹ مارٹم رپورٹ مزید الجھن پیدا کرے گی کہ اسے زہر دے کر کس نے مارا۔ روبی اور پیٹر کے قتل کو وہ سیمسن کے قتل سے منسوب کر ہی نہیں سکیں گے۔ روبی کی ماں زندہ ہوتی تو شاید کچھ بتا دیتی۔ اب تو ان دونوں کو بھی لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا اور ان کی فائلیں بھی سیکڑوں ہزاروں فائلوں کی طرح کلوز ہو جائیں گی جن میں قتل کی واردات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس مصیبت سے نجات پاتے ہی مجھے محسن یاد آیا اور میں تڑپ اٹھا۔ اپنی اور اس کی دوستی اور رفاقت کے تیس برسوں کو یاد کرتا میں چلتا گیا۔ سڑک آگے جا کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور وہاں مجھے ایک ٹیکسی بھی نظر آگئی جس نے سواریاں اتاری ہی تھیں۔ بالکل تھانیدارانہ شان کے ساتھ میں نے دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے جو ابھی سواریوں سے کرائے کے مسئلے پر مذاکرات میں مصروف تھا، بلا اجازت بیٹھنے والے کو سخت غصے میں پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کی آواز بند ہوگئی۔ "اسلام آباد چلو۔" میں نے اسے حکم دیا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر چل پڑا۔ اسے دُہرا نقصان ہوا تھا۔ ایک تو وہ میٹر سے زائد پیسے وصول نہیں کر سکا تھا اور اتنی دیر میں خالی ٹیکسی پر ایک مفت خورا تھانیدار قابض ہو گیا تھا جس سے کرایہ ملنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ پھر رات کے تین بجے خالی واپس آنا بھی نقصان ہی تھا۔

میرے دل پر اب محسن کی موت کا صدمہ ایک بارِ گراں بن گیا تھا۔ عدم تحفظ کے احساس سے نجات پاتے ہی اس کا غم جاگ اٹھا تھا اور جیسے جیسے میں اسلام آباد کی طرف بڑھ رہا تھا، میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس گھر میں اب کون ہوگا جہاں محسن ہی نہیں۔ اس کی ماں بھی جوان بیٹے سے جدائی کے بعد کہاں زندہ رہی ہوگی۔ صرف شہلا ہوگی جس کی محبت کا چمن ـــــ فصلِ گُل کی خبر سے پہلے ہی خزاں نے اجاڑ دیا۔ نخلِ محبت جو حالات کی سخت زمین سے پھوٹا تھا جل گیا اور خواب ابھی پورے بھی نہ ہوا تھا کہ ٹوٹ گیا۔ اپنی اس بہن کو میں کیسے تسلی دوں گا جو اپنا گھر بسنے سے پہلے ہی بیوہ ہوگئی۔ کیسے صبر کی تلقین کروں گا اسے جب خود مجھے صبر کا حوصلہ نہیں۔

"اسلام آباد میں کدھر جانا ہے سر جی؟" ٹیکسی ڈرائیور نے مؤدب ہو کے پوچھا۔ میں نے چونک کر اسے ہدایات دیں۔ پندرہ منٹ بعد ٹیکسی انکل شیردانی کے گھر کے سامنے جا رکی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کے نوٹوں کی ایک گڈی میرے ہاتھ میں آگئی جس میں کم سے کم بیس نوٹ تھے۔ دوسری جیب سے پچاس کا ایک اور دس دس کے دو نوٹ نکلے۔ میں نے اسے پچاس روپے دیے اور کہا "جاؤ۔" وہ پچاس کا نوٹ پکڑے ہکا بکا مجھے دیکھتا رہا اور پھر "سلام سر جی۔ بڑی مہربانی" کہہ کے بھاگ لیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین ہو چکے تھے۔

میں دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ میرے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے ـــــ دل چاہتا تھا کہ یہیں سے لوٹ جاؤں لیکن یہاں سے بھاگ کر لاہور کے سوا میں کہاں جا سکتا تھا۔ محسن وہاں بھی نہیں ہوگا۔ صرف رالبعہ ہوگی جو اَب بھی کھڑکی کھولے بیٹھی ہوگی اور ویران آنکھوں سے خلا میں دیکھ رہی ہوگی۔ ہوائے راہ گزر سے سوال کرنے والی آنکھیں انتظار کے بعد مایوس ہوگئی ہوں گی کہ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا مگر وہ بار بار دل کو سمجھاتی ہوگی کہ میرے وقت پر نہ پہنچنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ دیر بھی تو ہو سکتی ہے۔ سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔ ہو سکتا ہے وہ آج رات نہ آئے کل آئے۔

میں گیٹ سے اندر داخل ہوا اور لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظر میں رالبعہ کا چہرہ گھوم گیا۔ اداس، پژمردہ، بیمار، ان سب دکھوں کی تصویر جو دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں دیے۔ بے آسرا اور تنہا اس مسافر کی طرح جو منزل پر پہنچ کے لُٹ جائے۔ ان خوابوں کے سوا اس کے پاس کیا رہا تھا جو اس نے اب میرے حوالے سے دیکھنے شروع کیے تھے۔ اپنے خوابوں کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ اس کا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ پریکٹس ختم ہوگئی تھی اور اس نے نیک نامی کی جگہ بدنامی کمائی تھی۔ خود اس نے عورت ہو کے بھی شدید مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھوں ذلت برداشت کی تھی اور وہ اذیت اٹھائی تھی جو کسی عام عورت کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لیے ماضی فقط ایک پُرعذاب سفر تھا لیکن اس نے مستقبل کو مجھ سمیت اپنا لیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ سکندر میری طرح تم بھی سب کچھ قربان

کر دو اور چلو ہم اپنی دنیا کہیں اور بسا لیتے ہیں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ کیوں انکار کیا تھا میں نے؟ کیا میں بزدل تھا؟ مجھے اپنی آرزوئے انتقام اس کی محبت سے زیادہ عزیز تھی؟ یا میری محبت میں اتنی وسعت نہیں تھی کہ سارے جہاں کو چھوڑ کے رالبعہ کے خواب سمیٹ کر مطمئن ہو جائے؟ آخر کیا پایا میں نے اس زندگی سے؟ اپنے باپ کے علاوہ میں نے کتنے دوست گنوا دیے۔ منشی فوما نچو اور سلامت شاہ کو، رالبعہ اور شہلا کی ماں کو۔ ان کے علاوہ ان گنت لوگوں کو اور بالآخر محسن کو۔ میرے گرد شکاریوں کا حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ خطرات بڑھ رہے تھے اور میری مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک نہ کسی کو فتح ہوئی تھی نہ شکست لیکن نقصان دونوں طرف برابر ہو رہا تھا۔ پھر ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اصولوں پر مفاہمت کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں رالبعہ کی مان لوں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نکل جاؤں۔ مجھ میں صلاحیت ہے، عزم اور حوصلہ ہے۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم۔

میں اپنے خیالات میں محو تھا اور وردی کی جیب سے ملنے والی سگریٹ کو لائٹر سے سلگائے بیٹھا تھا کہ مجھے پودوں کے درمیان حرکت کا احساس ہوا۔ آخر شب کی مدھم چاندنی میں کوئی سایہ تھا جو شجر سے جدا ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا اور شہلا کو پہچان لیا۔ وہ کسی بُت کی طرح کھڑی خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ کو نیچے ڈال کے بجھایا اور دھڑکتے دل کو سنبھال کے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہوا اور میں اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے سسکی لی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ میرے دل میں یہ سسکی خنجر کی نوک بن کے اتر گئی۔

"شہلا!" میں نے آواز کی رقّت پر قابو پا کے آہستہ سے کہا۔ "کیا رونے سے جانے والے لوٹ آئیں گے پگلی؟" وہ بری طرح چونک کے پلٹی۔ چند لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بے یقینی کی کیفیت میں میرے چہرے پر منجمد ہوگئیں۔ پولیس کی وردی میں وہ اچانک مجھے اپنے مقابل دیکھتی تو بے اختیار چیخ مارتی لیکن اس نے میری آواز کو شناخت کر لیا تھا اور پھر اس اجنبی حلیے کے باوجود میری صورت بھی پہچان گئی تھی۔

"سکندر بھائی۔" اس نے بمشکل تمام کہا اور یوں لڑکھڑائی جیسے اس کے قدموں میں زمین متحرک ہوگئی ہے۔

"ہاں ہاں۔" میں نے اسے سنبھال لیا۔ "شہلا میں سکندر ہی ہوں۔ میں دشمنوں کی قید میں تھا لیکن اب نکل آیا۔"

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ "آپ . . . آپ نے تو رالبعہ باجی سے کہا تھا . . ."

"ہاں۔ میں نے اس سے آج رات پہنچنے کا کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔" شہلا نے کہا۔ "گیارہ بجے، پھر بارہ بجے۔ 'میں اب بھی کھڑکی کھولے ویران راہ گزر کو تک رہی ہوں۔ تم آؤ گے، ضرور آؤ گے۔' رالبعہ کی آواز آئی۔"

"مجھے دیر ہوگئی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "لیکن اب میں لاہور ہی جاؤں گا۔ میں آخری بار تم سے ملنے آیا تھا۔"

"آخری بار۔" وہ رونا بھول گئی۔ "آخری بار کیوں سکندر بھائی؟"

"بس شہلا۔ اب مجھے ہار جیت کی پروا نہیں رہی۔" میں نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں اکیلا نہیں لڑ سکتا۔ اکیلے آدمی کی جیت بھی ہار سے زیادہ عذاب ناک ہوتی ہے۔ محسن میرے ساتھ تھا تو میں خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد . . ."

شہلا نے تڑپ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا نہ کرے انھیں کچھ ہو۔ آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکالتے ہیں سکندر بھائی! اپنی بہن کی خوشی تو بہت عزیز تھی آپ کو؟"

میں نے اس کی کلائی تھام کے ہاتھ ہٹایا اور اسے نظر جما کے دیکھا۔

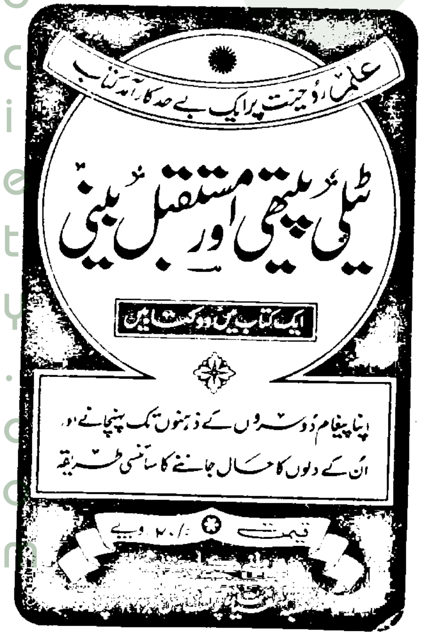

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"تمہارا مطلب ہے، محسن زندہ ہے!"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ مجھے خوف آتا ہے۔" شہلا چلائی۔

"ابھی تو بات کی تھی انہوں نے انکل سے۔"

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے رکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور یہ محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ شہلا کی کیفیت بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی، وہ کانپ رہی تھی۔ "میں... دراصل مجھے غلط بتایا گیا تھا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے شہلا!" پھر فرطِ جذبات سے میرے آنسو بہ نکلے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ احسان مندی کے جذبات تھے جو اشکوں میں ڈھل گئے تھے۔ میرے جسم کا رواں رواں ایک نئی مسرت سے سرشار ہو کے اس خدا کی حمد و ثنا کر رہا تھا جس نے مجھے جینے کے سہاروں سے محروم نہیں کیا۔ ان کو زندہ رکھا جن کے لیے میں زندہ تھا۔ دور کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ خدا بہت بڑا ہے۔ خدا بہت بڑا ہے۔ یہ آواز اسلام آباد کے کوہساروں میں بازگشت بن کے پھیل گئی اور آسمانوں تک کُل کائنات پر محیط ہو گئی۔ میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ یہ اپنے عجز و انکسار، اپنی بندگی اور اس کی بے پناہ قدرتِ کاملہ پر یقین کا سجدہ تھا۔

"سکندر بھائی!" شہلا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"شہلا!" میں نے سر اٹھا کے کہا۔ "سچ بتاؤ محسن خیریت سے ہے؟ انکل رضوی کو معطل اور برطرف نہیں کیا گیا...؟"

"یہاں کسی کو کچھ نہیں ہوا سکندر بھائی۔" وہ بولی۔ "لیکن آپ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ آپ کی ضمانت منسوخ ہو چکی ہے کیونکہ آپ پولیس کی نظر میں مفرور قاتل ہیں۔"

"مجھے دشمن اغوا کر کے لے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "میں راولپنڈی کے ایک گھر میں قید تھا لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تو بہت سخت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" شہلا نے کہا۔ "میں کچھ نہیں سمجھی۔ یہ وردی کس کی پہن رکھی ہے آپ نے؟"

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر کبھی سناؤں گا۔ میں سیدھا لاہور چلا جاتا مگر میں نے پہلے یہاں آنا بہتر سمجھا۔"

"اچھا ہوا کہ آپ دن میں نہیں آئے۔" وہ بولی۔ "اور مجھے یہیں مل گئے۔ انکل شیروانی سے ملاقات ہو جاتی تو وہ فوراً پولیس کو بلا لیتے۔ انکل رضوی نے انہیں بہت سختی سے تاکید کی تھی۔ صاف کہا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ رعایت یا نرمی برتی تو ہمارے ذاتی تعلقات پر برا اثر پڑے گا۔"

"انکل رضوی ایسے ہی آدمی ہیں۔" میں نے فخر سے کہا۔ "ذاتی رشتے ان کو فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ نکل جائیں۔" وہ بولی۔ "صبح ہونے والی ہے اور انکل شیروانی اٹھنے والے ہی ہوں گے۔ لاہور جائیں تو پہلے رابعہ باجی سے مل لیں۔ انہوں نے فون پر کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟" میں نے ہنس کے کہا۔ "اور کیوں کہا تھا؟"

"کیوں کا جواب میں کیا دوں؟" وہ مسکرائی۔ "آپ انہی سے پوچھ لیجیے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ سکندر آئے تو اسے بتا دینا کہ سیدھا گھر نہ آئے۔ انکل رضوی اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے اور ایک بات نہیں سنیں گے۔"

"تو یہ رابعہ بی بی کیا کریں گی آخر؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور میں ان سے ملوں گا کیسے؟"

"پہلے کہیں سے ان کو فون کر لیں۔" شہلا نے کہا۔ "پھر جیسا وہ کہیں، ویسا کریں۔ وہ اتنی بڑی وکیل ہیں۔"

"خاک وکیل ہیں۔ وہ تم سے زیادہ احمق اور جذباتی خاتون ہیں۔" میں نے کہا۔ ذرا سی دیر میں میری کایا پلٹ گئی تھی۔ اس رنج و غم کا کہیں نشان تک نہ تھا جس کا بار میں اپنی روح پہ لے کر آیا تھا۔ محسن کی زندگی نے مجھے پھر پرانا سکندر بخت بنا دیا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں نازو کے گھر فون کر کے اسے بلا لوں گا لیکن ایک مصیبت نازو کا بھائی بھی تھا جو فرض شناسی میں عین انکل رضوی کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔

"اچھا میری بہن!" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ انکل شیروانی مجھے دیکھیں میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے لیکن میں اس فینسی ڈریس میں نہیں پھر سکتا۔ مجھے شریفانہ کپڑوں کا جوڑا چاہیے۔"

"آپ ایسا کریں کہ...." وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "میرے کمرے میں جا کے سو جائیں۔ آپ کی حالت سے ظاہر ہے کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ لباس ہی نہیں آپ کو اپنا حلیہ بھی ٹھیک کرنا ہے۔ میں اب جا کے ناشتے کا بندوبست کر دوں گی۔"

"بہت بہتر۔ پھر تم میرا اور انکل کا ناشتا ایک ساتھ بھیج دینا۔" میں نے کہا۔ "ناشتے کے بعد وہ دفتر چلے جائیں گے اور میں حوالات چلا جاؤں گا۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔ حلیہ وہ خود ٹھیک کر دیں گے۔"

شہلا مسکرائی۔ "آپ گھبرائیں نہیں۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں امی کو چائے دوں گی۔ پھر انکل کے لیے ناشتا بنا کے لگا دوں گی۔ ان کے جانے کے بعد امی کو ناشتا دوں گی۔ نو بجے تک آپ سوتے رہیں گے۔ میں خود آپ کو جگا دوں گی۔ نہا دھو کے اور شیو کر کے حلیہ بدل لیجیے گا۔ ویسے بہت جلدی ہے جانے کی تو جائیں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"معوذیہ کے جانے کے بعد تم نے اس گھر کو سنبھال لیا ہے شہلا!"

میں نے کہا۔ "بہت خوش قسمت ہیں انکل کہ بیٹی سے اچھی بہو ملی۔ ورنہ وہ دونوں کیا کرتے؟"

حسبِ توقع وہ بھاگ گئی اور میں چوری چھپے پیچھے سے گھر میں داخل ہوا اور اس کے کمرے میں گھس کر سو گیا لیکن نیند آنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ محسن جو میرے لیے مر گیا تھا ایک معجزے سے پھر زندہ ہو گیا تھا۔ اس کی جتنی خوشی مجھے ہو سکتی تھی وہی نیند اڑانے کے لیے کافی تھی۔ پھر میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں اس گھر میں تھا جسے ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہمیشہ میں نے اپنا ہی گھر سمجھا تھا لیکن آج میں یہاں مجرموں کی طرح چھپا ہوا تھا۔ میرے کان مختلف آوازوں کو سن رہے تھے۔ انکل شیروانی کے غسل کرنے کی، بار بار شہلا کو پکارنے کی۔ "ارے بھئی شہلا۔ وہ رومال نہیں مل رہا۔ شہلا بیٹی وہ چشمہ ابھی تھا ہاتھ میں۔ کدھر رکھ دیا۔" ان کی خفت سے ہنسنے کی آواز۔ "اب ایک چشمہ دوسرا چشمہ ڈھونڈنے کے لیے بنوانا پڑے گا۔ اچھا بھئی ہم جا رہے ہیں۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ انکل!"

گاڑی کا دروازہ بند ہونے اور اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ کچن سے برتنوں کے کھنکنے کی صدا۔ وقفے وقفے سے بیگم شیروانی کے کچھ کہنے کی آواز جو صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ بولتی تھیں اور اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اب پیر پر سے بھی پٹی اتار دی تھی جو ڈھیلی ہونے کے علاوہ بے مصرف ہو گئی تھی۔ نو بجے سے پہلے ہی شہلا نے آہستہ سے دروازہ کھول کے جھانکا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ قریب آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سکندر بھائی!" پھر میرا شانہ پکڑ کے ہلایا۔ میں بے سُدھ پڑا رہا اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"السلام علیکم بھابی صاحبہ! صبح بخیر!" میں نے آلتی پالتی مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔ پھر میں نے اس کا رنگ لال ہوتے دیکھا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "میں بتا دوں گا محسن کو کہ میں ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن تم نے میرا منہ بند کر دیا تھا۔ اصل الفاظ دہرا دوں گا۔"

اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔ "سکندر بھائی تنگ مت کریں مجھے۔ اندر امی کے کانوں تک باتوں کی آواز پہنچ گئی تو میں کیا بتاؤں گی۔ چلیں انسپکٹر صاحب اٹھیں۔ نہائیں اور آدمی بن جائیں۔" اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور باتھ روم میں دھکیل دیا۔ غسل کے بعد میں نے محسن کا ایک سوٹ پہنا جو ڈرائی کلینر کی دکان سے جیسا آیا تھا ویسا ہی لٹکا ہوا رکھا تھا۔ انسپکٹر کی وردی میں سے ستائیس سو بیس روپے برآمد ہوئے۔ میرا کُل سرمایہ چونتیس سو ہو گیا۔ وردی کی جیب میں سے ایک نوٹ بک اور ایک شناختی کارڈ کے علاوہ دو چار صفحے کا بیان بھی نکلا تھا جو حوالدار اورنگزیب خان نے تحریر کیا تھا۔ میں نے اسے بھی جیب میں منتقل کیا اور شناختی کارڈ کی تصویر کو غور سے دیکھا۔ کوئی ماہرِ فن اس کی جگہ میری تصویر لگا دے تو یہ وردی اور یہ شناختی کارڈ میرے کام بھی آ سکتے ہیں، میں نے سوچا۔ جوتے ٹھیک تھے۔ میں نے کپڑوں کو بڑے سلیقے سے ایک بریف کیس میں پیک کیا۔ یہ بریف کیس بھی محسن کا تھا۔ اس کے استعمال کا بیشتر سامان اس کے گھر میں ہی تھا۔ ناشتے کے بعد میں چلنے کے لیے تیار ہوا تو گیارہ بجے تھے۔

اچانک شہلا نے ایک انتہائی جذباتی حرکت کی۔ اس نے کپڑے کی ایک پٹی نکالی اور میرے بازو پر باندھ دی۔ "یہ امام ضامن ہے۔" وہ بولی۔ "خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔" اس کی آنکھوں سے قطرۂ اشک کے موتی ڈھلک آئے۔ پھر اس نے مٹھی کھولی اور میرے سامنے پھیلا دی۔ "یہ آپ رکھ لیں۔ ڈیڑھ سو روپے ہیں۔ آپ کے لاہور پہنچنے تک کام آ جائیں گے۔ مجھے امی نے دیے تھے کپڑے بنانے کے لیے۔ میرے پاس ابھی بہت کپڑے ہیں۔"

"مجھے شرمندہ کرتی ہے؟" میں نے اس کی مٹھی بند کر دی۔ "بیوقوف۔ بھائی جب بہن کے گھر آتے ہیں تو کچھ لے کر نہیں جاتے، دے کر جاتے ہیں۔" میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "سب سے زیادہ ضرورت مجھے دعاؤں کی ہے اور ایک ماں یا بہن سے زیادہ کس کی دعا قبول ہو سکتی ہے۔ اس امام ضامن کے ساتھ جو دعا تو نے دل سے دی ہے وہ میری سب سے بڑی محافظ ہو گی پاگل۔ ابھی میں مجبور ہوں کہ تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا لیکن زندہ رہا تو...."

ایک بار پھر اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا حافظ۔ جاؤ بھیا، خدا کرے میری زندگی بھی تمہیں لگ جائے۔"

میں بریف کیس اٹھائے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ شہلا پہلے برآمدے سے اور پھر چھت پر چڑھ کے دیکھتی رہی۔ یہ سب لڑکیاں جب محبت کرتی ہیں تو اپنی ذات کو فراموش کیوں کر دیتی ہیں اور جسے چاہتی ہیں اسے ایک ہی دل سے اتنا پیار کیسے بانٹ دیتی ہیں؟ بہن ہوں تو بھائی کے لیے اور بیوی ہوں تو شوہر کے لیے اور ماں ہوں تو بیٹے کے لیے۔ سب کو مالا مال کر دیتی ہیں اور ان کے پیار کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ شہلا کی سابقہ اور موجودہ زندگی میرے سامنے تھی۔ ذہنی طور پر اس نے ایک رشتہ محسن سے استوار کر لیا تھا تو اس کے گھر سے بھی جذباتی طور پر پوری شدت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ سارے رشتے اس کے اپنے رشتے ہو گئے تھے اور اس گھر میں وہ ایسے تھی جیسے ہمیشہ سے یہیں تھی اور اسے اب ہمیشہ رہنا بھی یہیں ہے۔ اسے وہ سب مل گیا ہے جس کی تمنا تھی۔ اب صرف سکون ہے، قناعت اور مسرت ہے اور ٹھہراؤ ہے۔

اسلام آباد کی سنسان سڑک پر بہت سی ٹیکسیاں خالی لوٹ رہی تھیں جو افسروں کو اور دفتروں کے بابوؤں کو پنڈی سے ہر روز آفس ٹائم پہ لاتی اور لے جاتی تھیں۔ ایک ٹیکسی نے مجھے کمپنی باغ کے اڈے پہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پہنچا دیا جہاں سے لاہور اور پشاور کی ویگن سروس ملتی تھی۔ سولہ سال بعد بھی اس شہر کے رہنے والوں نے کمپنی باغ کو لیاقت باغ کہنے کی عادت اختیار نہیں کی تھی۔ میں نے اپنا بریف کیس اگلی سیٹ پر رکھا اور نیچے اُتر آیا کیونکہ ابھی مسافر پورے نہیں ہوئے تھے۔ میری عاجزانہ درخواست اور کال کی قیمت ادا کرنے کے وعدے نے ٹکٹ جاری کرنے والے کو متاثر کیا اور اس نے مجھے ایک لوکل کال کی اجازت عنایت کی۔ یہ واضح کرنے کے بعد کہ "یہ پبلک فون نہیں ہے۔"

میں نے انکل شیروانی کے گھر کا نمبر ملایا۔ دو منٹ بعد شہلا نے ہی ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔" وہ بولی۔

"شہلا۔" میں نے کہا۔ "دیکھو میں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ تم ذرا لاہور فون کر دو۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو آپ خود جا کے نہیں کہہ سکتے؟" وہ بولی۔

"بہتر ہوگا کہ تم رابعہ کو میرے پہنچنے کی خبر دے دو۔" میں نے کہا۔ "بس یہ بتا دینا کہ آج کسی وقت میں اس سے رابطہ قائم کر لوں گا۔ میرے اچانک پہنچنے کا شاک نہ ہو اُسے۔"

"شاک تو اسے نہ پہنچنے کا تھا۔" وہ بولی۔ "آپ کے جاتے ہی فون آیا تھا۔ میں نے خوشخبری دے دی ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔ "یہی کہ میں کیسے آیا تھا؟"

"فکر مت کریں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے آپ کی پوزیشن خراب ہو۔" وہ بولی۔ "بس اتنا ہی کہا کہ وہ چند منٹ کے لیے آئے تھے اور خیریت معلوم کر کے لاہور چلے گئے۔ ہاں اس کے بعد پولیس کی ایک جیپ آئی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ "کیا پوچھ رہے تھے؟"

"بڑا عجیب سا نام تھا۔" وہ بولی۔ "آغا علی احمد عرش الٰہ آبادی۔" وہ ہنسی۔ "میں تو سمجھ گئی تھی لیکن میں نے ان کو بہت ڈانٹا کہ منہ اٹھائے ہر جگہ گھسے چلے آتے ہو۔ یہ وزارت خارجہ کے ایک ڈپٹی سیکریٹری مسٹر شیروانی کی کوٹھی ہے اور یہاں کوئی مرد نہیں رہتا۔ ان سے بات کرنی ہے تو آفس جا کے کر لو۔ فون نمبر بھی دے دیا تھا ان کا۔ وہ سخت پریشان واپس ہوئے، معافی مانگ کر۔"

"چلیں جناب چلیں۔" کنڈیکٹر نے ہانک لگائی۔ "گڈی فل ہو گئی ہے۔"

"اچھا شہلا، تھینک یو اور خدا حافظ۔" میں نے ریسیور رکھ کے بکنگ کلرک کا شکریہ ادا کیا اور اسے پانچ روپے نذر کر کے ویگن میں آبیٹھا۔ میں بال بال بچ گیا تھا۔ پولیس مجھے کوٹھی سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی اور ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے بھی۔ اس پتے کی نشاندہی کرنے والے وہی ہو سکتے تھے جو شکاری بن کے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ شہلا کی احتیاط پسندی کے باعث وہاں میری موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اگر بعد میں انہوں نے شیروانی صاحب سے آفس میں رابطہ قائم کر کے آغا علی احمد عرش الٰہ آبادی کے متعلق پوچھا تو اور بُری ہو گی۔ انکل شیروانی بہت ڈانٹ پلائیں گے۔ "کون نامعقول ہو تم؟ نشے میں ہو؟ معلوم ہے کس سے بات کر رہے ہو؟ ابھی بات کرتا ہوں میں ڈی آئی جی سے۔ کیسے گدھے بھرتی کر لیے ہیں۔"

لیکن میری تلاش میں آنے والے گدھے نہیں تھے۔ اس مہم پر وہی بھیجے گئے ہوں گے جو مجھے دیکھ چکے تھے اور لباس بدلنے کے باوجود شناخت کر چکے تھے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب تک میرا حلیہ مشتہر کر دیا گیا ہوگا۔ پولیس کو انکل شیروانی کے گھر کا پتا بتانے والے اگر چوہدری دلاور کے گرگے تھے تو یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ انہوں نے میرے لاہور کے ٹھکانے کی نشاندہی بھی کر دی ہوگی اور اگر شہلا جیسی لڑکی نے سمجھ لیا تھا کہ یہ عجیب و غریب نام میرے ذہن کی اختراع تھی تو رابعہ بھی سمجھ جائے گی۔ محسن اور انکل رضوی بھی سمجھ جائیں گے۔ اور یہ بہت پُرتشویش بات تھی۔ اب تک میرا ایک گھر تھا جہاں میں خود کو محفوظ اور مددگاروں کے درمیان محسوس کرتا تھا۔ اب اگر مجھے وہاں بھی پناہ نہ ملی تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ شکاری پہلے دلاور کے ساتھی تھے۔ اب پولیس بھی میرے تعاقب میں تھی اور وہ خود بھی مجھے پولیس کے حوالے کر دینے پر کمربستہ تھے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ سوائے رابعہ یا محسن کے میں کسی سے یہ اُمید نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر مجھے قانون کے خلاف تحفظ فراہم کریں گے۔

اگر میں خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو ہر مقدمے کا تصفیہ ہونے تک میرا جیل سے باہر آنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے راستے کا پتھر خود بخود ہٹ جاتا۔ وہ یکے بعد دیگرے مجھے جیل کے اندر ہی نئے مقدمات میں اُلجھاتے رہتے۔ مار پیٹ، فرار کی کوشش، کسی سے سازباز کا الزام، اشتعال انگیزی۔ جیل کے اندر تو مجرم صرف مجرم ہوتا ہے اور اسے اندر ہی رکھنا مقصود ہو تو اس کے لیے جیل کے عملے کے پاس بہت سے اختیارات ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی مدعی ہوتے ہیں اور خود ہی منصف۔ انہیں گواہ بھی مل جاتے ہیں جو ہر الزام ثابت کر دیتے ہیں۔ جھوٹے گواہوں کو نرم رویے کی یا سزا میں تھوڑی سی تخفیف مل جاتی ہے۔ معمولی سے جرم میں جیل جانے والے کی سزا کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے بے رحمی سے مارنے والے الزام عائد کر دیتے ہیں کہ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی سے روکنے پر ملزم نے حملہ کیا۔ کہیں بھی قیدیوں میں جھگڑا ہو اسے دھر لیا جاتا ہے۔ عینی شاہد مل جاتے ہیں کہ جھگڑے پر اکسانے والا وہی تھا۔ اگر کوئی بہت شوریدہ سر ہو اور برسوں بعد بھی حق و انصاف کی بات کرتا رہے تو اسے پاگل خانے ارسال کر دیا جاتا ہے اور کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا۔

میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہی ہوگا۔ شکاری مجھے اسیر کر کے آرام سے نہیں بیٹھ جائیں گے۔ ان

کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور ان کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ وہ میرے لیے انصاف کے سارے در بند کر دیں گے۔ میں ریمانڈ پر بھی جیل گیا تو دوبارہ باہر کی دنیا نہ دیکھوں گا۔ میری سزا میرے ہر نئے جرم کے ساتھ طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی۔ محسن اور رابعہ جیسے دوست اور میری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ مجھے پاگل قرار دے دیا جائے گا یا سچ مچ پاگل کر دیا جائے گا۔ دوائیں اور انجکشن، نشہ اور ادویات، اندر کیا نہیں پہنچتا اور کس کام نہیں آتا لیکن مجھے باہر رہنا تھا تاکہ میں ایک ایک شکاری کو زیر دام لا سکوں اور اس سے پوچھ سکوں کہ بتاؤ میرے باپ کا جرم کیا تھا۔ اسے کس نے بلیک میل کیا اور کیوں وہ لکھ پتی فیکٹری اونر ہونے کے باوجود غربت و افلاس میں ایسی بے کسی کی موت کیوں مرا؟ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اور میرا ساتھ دینے والوں کے ساتھ ہوا کیوں ہوا اور اس کے بعد مجھے ایک ایک کو سزا دینی تھی۔ وہ سزا جس سے وہ اس لیے بچے رہے کہ وہ کسی عدالتِ انصاف میں پیش نہیں ہوئے۔ انہوں نے ثبوت، شہادت اور گواہ سب خرید لیے یا ختم کر دیے۔ اب میں کسی عدالت سے انصاف نہیں مانگ سکتا تھا۔ میری فریاد سننے سے پہلے قانون کے محافظ مجھے گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زنداں پہنچا دیتے چنانچہ اب انصاف بھی خود مجھے ہی کرنا تھا۔ ثبوت بھی مجھے ہی فراہم کرنے تھے۔ شہادت بھی مجھے ہی حاصل کرنی تھی اور گواہ بھی مجھے ہی تلاش کرنے تھے لیکن یہ سب کچھ مجھے چھُپ کر کرنا تھا۔ پولیس کی نظر سے چھُپ کر۔ دشمنوں کی نظر سے چھُپ کر اور اپنوں کی نظر سے چھُپ کر۔ کوئی بھی مجھے پکڑوا سکتا تھا اور میرے مشن کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اس مشن کو جس کے لیے بہت سے بے گناہوں نے بھی اپنی زندگی گنوا دی اور اپنی جان کا قرض مجھ پر چھوڑ گئے۔

ویگن نے مجھے ریلوے اسٹیشن سے کچھ دُور اتارا۔ اپنے ہی شہر میں پہلی بار مجھے سوچنا پڑا کہ کدھر جاؤں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا زندگی کی ہر نعمت اور آسائش مجھے میسر تھی۔ دولت مند باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اعلیٰ ترین اسکولوں میں پڑھتا رہا۔ کوٹھی سے باہر نکلا تو ہمیشہ کار میں۔ چار سال ولایت میں اعلیٰ تعلیم کے بہانے عیش کرتا رہا اور واپس آیا تب بھی ایک ایس ایس پی کی پناہ میں اس کے گھر میں خاندان کے ایک فرد کی طرح رہا۔ رابعہ اور محسن اب بھی وہیں تھے لیکن میں اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سارا شہر اجنبی ہو گیا تھا اور ہر نظر نامہرباں لگتی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں کسی ہوٹل میں کمرہ لے لوں اور وہیں سے فون کر کے رابعہ کو بلوا لوں۔ پھر میں طے نہ کر سکا کہ مجھے کس ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ ہوٹل غیر محفوظ بھی تھے۔ اگر پولیس بہت زیادہ مستعد ہو گی تو سب سے پہلے ہوٹلوں کو چیک کرے گی۔ ایس ایس پی صاحب کو یہ تو معلوم نہیں کہ مجھے کس طرح اغوا کیا گیا اور کہاں قید رکھا گیا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ قتل کے دو مقدمات میں مطلوب زیرِ ضمانت ملزم کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے تھے چنانچہ وہ جہاں نظر آئے اُسے گرفتار کر لینا ضروری ہے۔ وہ عدالت میں اپنی غیر حاضری کا سبب بیان کر سکتا ہے اور عدالت مطمئن ہو گی تو پھر اسے ضمانت پر چھوڑ دے گی لیکن میں جانتا تھا کہ میں عدالت کو قائل نہیں کر سکتا کہ مجھے اغوا کر کے محبوس رکھا گیا تھا۔ نہ اغوا کا الزام دلاور اینڈ کمپنی پر عائد ہوتا تھا۔ نہ میں بتا سکتا تھا کہ اغوا کرنے والے کون تھے۔ خود میں پولیس کو وہ جگہ تک نہیں دکھا سکتا تھا جہاں مجھے ایک ہفتے تک مقید رکھا گیا تھا۔ اوّل تو میں اس مکان تک ہی نہ پہنچ پاتا اور اگر پہنچ جاتا تو نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ وہاں سیمین کی لاش اب تک پڑی ہو گی یا کسی نے دیکھ لی ہو گی تو تفتیش جاری ہو گی۔ روبی اگر زندہ ہوتی تو شاید میری گواہ بن جاتی مگر وہ پیٹر کے ساتھ ماری گئی تھی اور دُہرے قتل کی اس واردات میں مجرم یعنی میں پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا۔ وہاں میرے خلاف متعدد مقدمات درج ہوں گے۔ تفتیش کرنے والے پولیس کے افسروں پر قاتلانہ حملہ، پولیس افسر کی وردی اور آتشیں اسلحے کی چوری، غلط بیانی۔ ممکن ہے اس شخص نے بھی کار چھینے جانے کی رپورٹ کر دی ہو جو پولیس اسٹیشن کے قریب ہی رہتا ہے اور جس کے سامنے میں نے مفرور مجرم ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ انکل شیروانی کے گھر سے تو پولیس ناکام لوٹ چکی تھی لیکن یہاں کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ ایک بار وہ ہر جگہ سے ناکام ہو کے لوٹ گئے کہ یہاں اس نام اور حلیے کا کوئی شخص نہیں رہتا تو شاید صبر کر کے بیٹھ جائیں مگر ان کو شبہ بھی ہو گیا تو مجھے پہچاننے والے بہت ہوں گے۔

مناسب یہی تھا کہ میں پہلے رابعہ یا محسن سے رابطہ قائم کر لوں۔ ایک جگہ "پبلک ٹیلی فون" کا بورڈ دیکھ کر میں نے اکرام شیخ کے گھر کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد ناز کی آواز آئی۔ "جی؟"

"ایس پی اکرام شیخ صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "تھانے فون کر لیں آپ۔"

"وہ کب تک لوٹیں گے؟" میں نے کہا۔

"رات آٹھ بجے کے بعد۔" وہ بولی۔ "کون صاحب بول رہے ہیں آپ؟"

[illegible] دینے کے بجائے ریسیور رکھ دیا۔ ابھی شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ایک رکشہ [illegible] مجھے بیس منٹ میں اکرام شیخ کے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن گیٹ لائٹس ابھی آف تھیں۔ روشنی برآمدے میں تھی اور اندر کے کمروں میں نظر آ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میرے قدم بے اختیار رُک گئے۔ پورچ میں رابعہ کی بالکل نئی ڈینٹ پینٹ کی ہوئی فاکس ویگن کھڑی تھی۔ اس کی چمک دمک دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے اس کا پرانا حلیہ یاد آگیا کہ میں نے اس کی صورت کس طرح بگاڑ دی تھی۔ وہ شخص یقیناً ماہرِ فن تھا کہ اس نے ایک ڈھانچہ نظر آنے والی کار کو ایسا بنا دیا جیسے وہ ابھی شوروم سے نکلی ہو۔

اب مسئلہ اندر اپنی تشریف آوری کی اطلاع دینے کا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ رابعہ جو وکیل ہے میرے بجائے قانون کا ساتھ تو نہیں دے گی۔ پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ میرے لیے رابعہ صرف وہ عورت تھی جو محبت کرنا جانتی تھی اور اس محبت میں میرے لیے آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا سکتی تھی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ آگے دائیں طرف کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ بڑے شیخ صاحب اور ان کی بیگم اسی کمرے میں ہیں۔ بائیں طرف نازو کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کان لگا کر سننے پر مجھے اندر سے ان دونوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"شہلا نے فون کیا تھا مجھے۔" رابعہ نے کہا۔ "کہ سکندر لاہور کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔"

"فون تو سکندر نے مجھے بھی کیا تھا۔" نازو نے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب دُکھ بھری حسرت تھی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"مگر آج تو وہ شہلا سے ملا تھا۔ اس کی خیریت پوچھنے گیا تھا اور بالکل خیریت سے تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"پھر بھی اس کا یہاں آنا مشکل ہے۔" نازو بولی۔ "وہ آپ سے ملنے جائے گا یا محسن سے؟"

"میرا خیال ہے وہ گھر نہیں جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"تو کہیں سے آپ کو فون کرے گا۔ محسن سے بات کرے گا۔" نازو نے کہا۔ "یہاں اس کا انتظار بے سود ہے۔"

"معلوم نہیں کیوں.... آج صبح منہ دھوتے وقت مجھے یہ خیال آیا۔" رابعہ نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "اس وقت تو مجھے شہلا کا فون بھی نہیں ملا تھا۔ توہمات پر یقین کرنا کتنا عجیب لگتا ہے مگر کبھی کبھی تنکے کا سہارا بھی ضرورت بن جاتا ہے اور اتفاقات ایسے ہو جاتے ہیں۔ منڈیر پہ کوا بول رہا تھا۔ اسی وقت بیگم رضوی نے کہا کہ آج کوئی آنے گا اور میں حیران رہ گئی کیونکہ اس وقت میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ دن بھر عجیب سی کیفیت رہی۔ کھانا کھا کے سوئی تو بڑا اوٹ پٹانگ خواب دیکھا کہ سکندر میری گاڑی میں بیٹھا ہے لیکن گاڑی تمہارے گھر میں کھڑی ہے۔ اُٹھنے کے بعد کسی کام میں جی نہ لگا۔ میں یہاں آگئی۔ بس ایسے ہی۔" اس کے لیے وضاحت مشکل ہو رہی تھی۔

"آپ بھی یقین رکھتی ہیں ایسی باتوں پر۔" نازو نے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ بے وقوف میں ہی ہوں... میں جمعرات کو داتا صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوئی تھی۔ اسی رات سکندر نے فون کیا۔ صبح ایک فقیر آیا میں نے اسے اکرام بھائی کا ایک جوڑا دیا۔ پرانی شلوار قمیص۔ اُس نے دعا دی کہ اللہ تیرا دُکھ دور کرے اور بچھڑے ہوؤں کو ملائے۔ ہے نا بڑی عجیب بات۔ معلوم نہیں اس نے صورت دیکھ کر کہی تھی یا بس ایسے ہی۔" نازو جانتی تھی کہ میں رابعہ کے علاوہ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود وہ مجھے چاہتی تھی اور بڑی نیک نیتی سے اس کا اعتراف کر رہی تھی۔ رابعہ سے حسد کیے بغیر۔ اور رابعہ اس سے حالِ دل کہہ رہی تھی۔ رقابت کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر۔ "ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے۔ جز تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں" میرے شعران کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اسے بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ فریبِ آرزو۔ سوچ کا نفسیاتی ردِ عمل۔ ٹیلی پیتھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ باہر رابعہ کی گاڑی میں جا بیٹھوں اور اس کا خواب سچ کر دوں لیکن رابعہ کا پتا نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر نازو سے گفتگو کرتی رہے اور یہ وقت ضائع جائے۔ میں تو اس نیت سے یہاں آیا تھا کہ رابعہ کو فون کر کے بُلوا لوں گا مگر وہ پہلے سے موجود تھی تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھانا حالات کا تقاضا تھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کسی آواز کے بغیر تھوڑا سا پیچھے ہو گیا۔ میں نے ایک انگلی خاموش رہنے کی تاکید کے طور پر ہونٹوں پر رکھی اور اندر داخل ہو گیا۔ نازو کی پُشت میری طرف تھی۔ اس کے سامنے رابعہ بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ چنانچہ مجھے رابعہ نے پہلے دیکھا۔ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ پلک جھپکانا تک بھول گئی۔ اس کی حالت کا یہ تغیر اتنا نمایاں تھا کہ نازو نے پلٹ کر دیکھا۔ رابعہ آہستہ آہستہ اٹھی مگر نازو نے ایک چیخ ماری۔ "سکندر!" وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ دونوں کے رویے کا فرق وہی تھا جو اُن کی شخصیت میں تھا۔ رابعہ کی حیرت اور خوشی میں متانت تھی، وقار تھا، ایک پُرسکون ٹھہراؤ تھا جو جذبات کی گہرائی کا پتا دیتا تھا۔ نازو کے انداز میں برساتی ندی کی تیزی تھی اور جنوں خیزی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔

"خدا کے لیے عقل سے کام لو۔" میں نے خود کو نازو کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کی کیونکہ رابعہ بُت بنی کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"ہم سے کہتے ہو عقل سے کام لو، خود کیا کرتے رہے؟" نازو نے روتے روتے کہا۔

"آہستہ بولو۔" میں نے اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے یہاں دیکھے۔" پھر میں رابعہ کی طرف پلٹا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے" میں نے اس کے قریب پہنچ کر نرمی سے کہا۔ "اگر میں آ سکتا تو کل رات ضرور آتا۔"

رابعہ نے ایک گہری سانس لی اور پھر بیڈ پر گر گئی۔ "کاش تم نے انتظار کرنا بھی سیکھا ہوتا سکندر!" وہ بولی۔ "تم کو بھی اندازہ ہوتا کہ اس میں کتنی اذیت جھیلنی پڑتی ہے۔" اُس نے آنکھوں میں اُتر آنے والی نمی کو ایک انگلی سے جھٹک دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ سب کی زبان بن گیا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں شیخ اندر موجود نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "میں اسے فرض اور دوستی کی آزمائش میں مبتلا کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ اس کے لیے فرض مقدم ہے۔ میں نے سوچا خاموشی سے تمہاری گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔"

حسبِ توقع نازو نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ روشن ہو گیا۔ سو فیصد جانبداری سے کام لیتے ہوئے میں نے اس کی محبت کو فاتح قرار دے دیا تھا۔ رابعہ کا جذبۂ عشق صادق ہو گیا تھا۔

"پھر یہ سوچ کر میں اندر آ گیا کہ نہ جانے تم کتنی دیر گپ لگاتی رہو۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے شہلا نے بتا دیا تھا کہ میری گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انکل رضوی کے ڈر سے میں گھر نہیں گیا۔ میں تم کو یہیں بلانا چاہتا تھا۔ میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا لیکن یہ بات میں چائے پینے کے بعد سناؤں گا۔ صبح شہلا... اس سے ملنے کے بعد میں نے بازار میں ناشتا کیا تھا اور بس میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا۔ چل نازو کی بچی۔ اُٹھ میرے لیے کچھ کھانے کو لا لیکن کسی کو یہاں میری موجودگی کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تجھے میری قسم!"

نازو یوں اُٹھی کہ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ اپنے ہسٹریا پر قابو پانے کی سخت جدوجہد کر رہی تھی۔ میرے رویے نے اس کا دل توڑ دیا تھا اور وہ صرف ایک ایسی عورت رہ گئی تھی جس کو دوسری عورت کی موجودگی میں ٹھکرا دیا گیا ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ رابعہ کو اس ایک لمحے میں قتل کر دیتی جب میں نے اس سے پہلی بات کی تھی اور اس نے فراق کی ساری کیفیت اپنے مختصر سے جواب میں کسی گلے شکوے کے بغیر بیان کر دی تھی۔ میں چند لمحوں میں رونما ہو جانے والے اس انقلاب پر دنگ تھا۔ کتنی اپنائیت کے ساتھ وہ رابعہ سے میری ہی باتیں کر رہی تھی اور اب میں سامنے تھا تو شکست کے احساس نے اسے رابعہ سے کتنا دُور کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ چائے کے بہلاوے میں اُسے رخصت کرنا چاہتا ہوں تاکہ رابعہ سے وہ سب کچھ کہہ سکوں جو میں اس کے سامنے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے اُسے یوں نکال پھینکا تھا جیسے وہ کباب میں ہڈی ہے۔ اسے حسبِ سابق یوں مخاطب کیا تھا جیسے وہ میرے سامنے ایک بچی ہے۔ چنانچہ وہ جلنے لگی تھی اور یہ میری لگائی ہوئی آگ تھی۔ اس کی یاسیت کا ردِعمل تذلیل کے احساس میں ڈھل گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی رابعہ کے سامنے اپنے رویے سے نازو پہ واضح کر چکا تھا کہ میں مجبور ہوں۔ صرف رابعہ سے محبت کر سکتا ہوں اور اس کی چاہت کا جادو مجھ پر چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی ابھی میں نے اس کی انا کو نئی ٹھوکر ماری تھی۔ اس لیے کہ یہ حقیقت پھر اس پر عیاں ہو جائے۔ مجھ پر رابعہ کا اعتماد کم نہ ہو اور میں ان خطرات سے محفوظ رہوں جو دو کشتیوں میں قدم رکھ کے سفر کرنے والے کو لاحق ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح میں نے نازو کے اندر کی عورت کو مشتعل کر دیا تھا۔ اشتعال میں آ کر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اپنے بھائی کو بُلا کے مجھے گرفتار کروا سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ نہیں تو رابعہ کے ساتھ بھی کیوں رہوں۔ کسی غلط اقدام سے باز رکھنے کے لیے ہی میں نے اسے اپنی قسم دی تھی۔

چند منٹ بعد نازو واپس آئی تو میں کرسی پر بیٹھا تھا اور رابعہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں برس کے کھُل جانے والے بادل کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔ نکھری نکھری اور نمی سے بوجھل۔

"ہو گئے سب گلے شکوے دُور؟" نازو نے مسکراتے ہوئے طنز کا تیر چلایا۔ رابعہ نے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں۔" میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔ "اب تم اپنی کہو گی یا میری سُنو گی؟"

"مجھے کیا کہنا ہے۔" وہ پھیکی ہنسی ہنس کے چائے بنانے لگی۔ "آپ دونوں کہیں۔"

"ہم نے تمہارے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔" رابعہ نے کشیدگی ختم کرنے کے لیے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ "لیکن ہم نے دیکھا کسی کو نہیں تھا، چنانچہ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج کی گئی۔ وہ کار جس نے ہمارا راستہ روکا تھا ڈی سلوا کے نام پر رجسٹرڈ تھی۔ پولیس کیا کرتی؟ ڈی سلوا زندہ ہوتا تو شاید اس سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ چوہدری دلاور حسبِ توقع معصوم بن گیا اور اس نے بے حد افسوس اور حیرانی کا اظہار کیا، بتایا کچھ نہیں۔ میں نے تو کوشش کی تھی کہ کم سے کم ایک کو تو لپیٹ میں لے لوں لیکن وہ بچ گئے۔ ان کی گاڑی بھی تباہ ہوئی۔"

"اور انکل کی گاڑی؟" میں نے کہا۔ "اس وقت تم نے عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ ایک بار تم کو موقع ملا تھا ریورس میں جانے کا تو پھر آگے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ نکل جاؤ۔"

"میں نے سُنا نہیں تھا اور سُن لیتی تب بھی تمہیں اور محسن کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر میں کہاں جاتی؟" وہ بولی۔ "بس مجھے اس کے سوا کچھ نہ سُوجھا کہ اسی گاڑی سے ان سب کو کچل دوں۔ زخمی کر دوں یا مار ڈالوں۔ ان کے لیے فرار کے راستے بند کر دوں۔"

"تم خود بھی ٹکر سے زخمی ہو سکتی تھیں۔" میں نے کہا۔ "فائدہ کیا ہوا؟"

"نفع نقصان کا خیال مجھے آیا ہی نہیں۔ عقل ایسے وقت میں کہاں ساتھ دیتی ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "تصادم کے بعد میرا سر اسٹیئرنگ وہیل پر بڑے زور سے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر سے اور بھی لوگ آ گئے تھے چنانچہ وہ تو بھاگ گئے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"باقی دو مجھے اٹھا کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے تو کندھے پر ڈال کے بھاگے ہوں گے۔ آگے ٹیکسی کھڑی ہوگی یا کوئی دوسری گاڑی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں جھاڑیوں میں جا گرا تھا اور بیہوش ہو گیا تھا۔"

"انہوں نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا۔" رابعہ بولی۔ "بعد میں سب نے اِدھر اُدھر دیکھ لیا تھا لیکن تم نہیں ملے تھے۔ انکل رضوی وہیں آ گئے تھے۔ محسن نے کسی کو نمبر دے دیا تھا کہ فون کر دے۔ ان کی گاڑی ابھی تک گیراج میں ہے اور مہینہ بھر رہے گی۔ گیارہ ہزار کے قریب خرچ آئے گا اسے اصل حالت پر لانے کے لیے۔ میں نے ایک بار انکل سے کہا تھا کہ غلطی میری تھی تو وہ برہم ہو گئے کہ غلطی کسی کی نہیں تھی۔ ایک رستم خاں ہے تو دوسرا طرم خاں ہے۔ اور تم خاک وکیل ہو۔ عقل نام کو نہیں۔ میں گیارہ ہزار کا نقصان برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ حماقت برداشت نہیں کر سکتا جس میں تم مبتلا ہو۔ وہ خاصے پریشان رہے۔ ایک طرف تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ دوسری طرف تمہاری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی۔ کہہ رہے تھے استعفیٰ دے دوں گا یا تبادلہ کرا لوں گا ورنہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"بچارے انکل رضوی۔ نہ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں نہ اداۓ فرض سے کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے اغوا، حبس بیجا اور قید سے فرار کی کہانی یوں سنائی کہ اس میں سیمسن، روبی یا پیٹر کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ میں یہ باتیں رابعہ کو بتا سکتا تھا لیکن نازو کے سامنے نہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس تھا کہ اسی جذباتی کیفیت میں وہ کسی دن کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گی جس سے رابعہ کو یا مجھے نقصان ہوگا۔ وہ کم عمری کے باعث ناپختہ شعور کی مالک تھی اور انتہا پسندی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ جتنی دیوانگی سے محبت کرنے کی اہل تھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفرت کر سکتی تھی۔ اس کا وجود ایک لمحے کے لیے گلیشیر تھا تو دوسرے لمحے آتش فشاں۔ کسی بھی کمزور لمحے کی یلغار سے مغلوب ہو کر وہ جان دے بھی سکتی تھی اور لے بھی سکتی تھی۔ خواہ اس سے اگلے لمحے کا حاصل صرف پچھتاوا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اچانک کچھ خاموش اور نروس ہو گئی ہے اور منفعل نظر آنے لگی ہے۔ اس بچے کی طرح جو ایک غلطی کر چکا ہو اور اُسے چھپانے کی فکر میں ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس غلطی کے نتائج سامنے آئیں گے تو اس کے لیے کوئی جواز پیش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ابھی میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اکرام شیخ نمودار ہوا۔ اگر وہ دوست بن کے آتا تو میں اور وہ بڑے جوش و خروش سے گلے ملتے لیکن وہ پولیس افسر بن کے آیا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے رک گیا۔ پھر میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں ابھی ساڑھے سات ہی بجے تھے اور نازو نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ آٹھ بجنے سے پہلے اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ میری نظر نازو کی طرف گئی۔ اس کا چہرہ خفت سے زرد ہو گیا تھا اور اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ کسی سے نظر ملا سکے۔ اپنے بھائی سے بھی نہیں جسے اس نے فرض شناسی کے ایک مظاہرے کا موقع فراہم کیا تھا اور خود اپنے قانون پسند ہونے کا ثبوت دے کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کس بھائی کی بہن ہے۔

"آؤ شیخ جی!" میں نے ہاتھ اٹھا کے بے تکلفی سے کہا جس میں طنز آمیز تلخی نمایاں تھی۔ "بڑے وقت پہ پہنچے۔ ایک سا مفرور قاتل اور مجرم دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہارے ہی گھر میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔"

"تم میرے مہمان ہو، پرانے دوست ہو۔" شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا۔ "میں تمہاری عزت کرتا ہوں سکندر اور تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری کئی بار مدد کی۔ لیکن...."

"اپنی صفائی پیش مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جانتا ہوں تم اور انکل رضوی ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ قانون کے معاملے میں تم کسی کو رعایت دے ہی نہیں سکتے۔ میری جگہ تمہارا سگا بھائی ہوتا تب بھی تم اپنا فرض ادا کرتے۔ افسوس مجھے نازو پر ہے۔ کاش وہ بھی تم جیسی ہی ہوتی۔" میں نے نازو کی طرف دیکھا جس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"اسی نے مجھے مطلع کیا تھا کہ تم یہاں موجود ہو۔" شیخ نے متانت سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن فرق اس جذبے کا ہے جس کے تحت تم ایک مجرم کو گرفتار کرتے ہو۔ تمہیں کوئی ندامت تو نہیں ہوتی ناخواہ اسے تم اپنے گھر سے گرفتار کرو اور وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔ "نازو کی صورت دیکھو۔ اس کو شرمندگی کیوں ہے؟ اس نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ پھر یہ پشیمانی کیوں ہے اسے؟ جیسے مجرم یہ خود ہو!"

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لے جایا گیا تھا۔" شیخ نے ریوالور کا رُخ میری طرف رکھتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ "لیکن مجھے عدالت سے تمہاری ضمانت کی منسوخی کے احکامات موصول ہو چکے ہیں۔ تمہارے اغوا کی رپورٹ بھی تو میں نے ہی لکھی تھی۔ اب اگر میں عدالتی حکم کی تعمیل کروں تو یہ میری مجبوری ہے اور تمہیں میری مجبوری کو سمجھنا چاہیے۔"

"میں صرف اپنی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ یہ خود غرضی نہیں، میرے حالات کا تقاضا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں کسی قیمت پر گرفتار ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں، بعد میں تمہارا قانون میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ تم اس مشینری کے بہت چھوٹے سے پُرزے ہو جسے میرے دشمنوں کے بہت طاقت ور ہاتھ چلا رہے ہیں۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

کیا تم ضمانت دے سکتے ہو کہ میرے ساتھ انصاف ہوگا؟ اور ایک بار جیل جانے کے بعد میں زندہ سلامت اور باعزت طور پر باہر بھی آ سکوں گا؟ تم کیا کر سکو گے میرے لیے؟

"میں جانتا ہوں یا نہیں جانتا۔" شیخ نے آہستہ سے کہا۔ "کہ کل کیا ہوگا۔ مجھے تو اس وقت تم کو ہر حال میں گرفتار کرنا ہے۔"

"زندہ یا مردہ۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بے نا یہی بات؟ فرض اور دوستی کا کیا زبردست فلمی مرحلہ ہے۔ لیکن میں تم کو کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے بارہا جان کی بازی لگا کے دشمنوں کی قید سے رہائی حاصل کی ہے۔ اس وقت بھی میں ہفتہ بھر ایک ایسے قید خانے میں رہ کے آیا ہوں جہاں سے رہائی کی بظاہر کوئی امید نہیں تھی لیکن میں نے ہمت کبھی نہیں ہاری اور امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں آخری سانس تک جدوجہد کیے بغیر شکست قبول نہیں کر سکتا اور اس وقت بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔ اس وقت تک جب تک میرا کام ختم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں خود کو تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"لیکن میں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔ مجھے جو بھی کرنا ہے وہ ابھی کرنا ہے۔" شیخ نے ریوالور اٹھا کے کہا۔

"بھیا!" نازو نے ایک ہسٹریائی چیخ ماری اور اچانک میرے سامنے آگئی۔ "تم گولی چلاؤ گے سکندر پر؟"

میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ بیڈ پر جا گری۔ "میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور اپنی مرضی سے ہی جاؤں گا۔ تم وہی کر رہے ہو جو تمہیں کرنا چاہیے تو میں بھی وہی کروں گا جو مجھے کرنا چاہیے۔"

"تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"تم جانتے ہو شیخ کہ نہ میں قاتل ہوں، نہ مفرور۔" میں نے کہا۔ "میں وہ نہیں ہوں جو مجھے بنا دیا گیا ہے۔"

"میرے قائل ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا سکندر۔" شیخ نے بے بسی سے کہا۔ "تمہیں عدالت کو قائل کرنا ہے۔ میں تو استعفیٰ دے چکا تھا اسی لیے۔ تم نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں آزمائش سے نہ گھبراؤں۔ اب تم ہی میری راہ میں حائل ہو رہے ہو۔ جب تک یہ وردی میرے جسم پر ہے میں تمہاری بے گناہی کی دلیل کو عدالتی احکامات سے برتر نہیں سمجھ سکتا۔"

"رابعہ!" میں نے کہا۔ "یہ بریف کیس لو اور چلو۔ اٹھاؤ اسے!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔

رابعہ نے بریف کیس اٹھا لیا۔ "یہ کیا ہونے والا ہے یہاں؟" وہ چلائی۔ "نازو۔ یہ کیا ظلم کیا تو نے؟"

"تم جاؤ باہر۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں آ جاؤں گا دیکھنا ہے نہ وہ کتنا باز و نے قاتل میں ہے؟"

نازو دروازے کی طرف بھاگی۔ "امی، ابو!" اس نے دیوانہ وار چیخنا شروع کیا۔ میں نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ رابعہ وہیں بُت بنی کھڑی رہی۔ پھر شیخ کے والد اور اس کی ماں بدحواسی میں ہانپتے کانپتے اندر آئے اور اس منظر کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئے جو اُن کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔

"بھیا کو سمجھائیں ابو۔" نازو نے دہاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "یہ سکندر کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ سکندر جانا چاہتا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

"یہ ٹیلی فون کر کے مجھے بلانے سے پہلے سوچنا تھا۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور مجھے ایک مفرور مجرم کو گرفتار کرنا ہے جس کے لیے وارنٹ میری جیب میں ہے۔ آپ لوگ جائیں۔"

"آپ لوگ جائیں پلیز۔" میں نے کہا۔ "بات صرف میرے اور شیخ کے درمیان ہے۔ اسے مزید مشکل میں نہ ڈالیں۔" میں نے رابعہ کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "چلو رابعہ۔"

"میں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں سکندر، میں گولی مار دوں گا۔" شیخ نے چلا کر کہا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" شیخ کی ماں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "خون کرے گا دوست کا؟ اپنے ہی گھر میں؟"

"نہیں امی، غلطی میری تھی تو سزا بھی میں ہی بھگتوں گی۔" نازو نے پھر درمیان میں آ کر کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں قدم آگے بڑھاتا یا نازو کو اپنے راستے سے ہٹاتا، وہ تیزی سے ایک پنجے پر گھومی۔ اس کی دوسری ٹانگ سیدھی اوپر اٹھی اور شیخ کے ہاتھ پر لگی۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ جوڈو جاننے والی وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ اسکول گرل، طفلِ مکتب اور مبتدی سمجھا تھا، بجلی کی طرح لہرائی اور میری حفاظت پر کمربستہ ہو گئی۔ شیخ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس نے غوطہ مارا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے بھائی کو اٹھا کے دُور پھینک دیا۔ "جاؤ!" وہ چیخ کر بولی۔ "بھاگ جاؤ۔"

میں رابعہ کا ہاتھ تھام کے بھاگا۔ مجھے یقین تھا کہ شیخ مجھ پر گولی نہیں چلا سکے گا لیکن میرا یقین غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ چند منٹ میں راہداری عبور کر کے ہم کار میں بیٹھ چکے تھے۔ رابعہ بہت زیادہ نروس تھی چنانچہ اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا۔ چابی لگاتے ہی انجن گرجا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھی۔ شاید اتنی دیر میں اندر شیخ نے ادائے فرض سے روکنے والی بہن کو قابو کر لیا تھا۔ فائر کی آواز اس وقت آئی جب گاڑی گیٹ سے نکل چکی تھی۔ شیخ نے ایمان اور پھر حاصل کر لیا تھا لیکن وہ وقت گزر چکا تھا جب دوست کے ہاتھوں دوست کا خون ہو جاتا۔ اب مجرم نازو ہو گئی تھی جس نے ایک پولیس افسر پر حملہ

کیا تھا۔ رابعہ ہو گئی تھی جو ایک مجرم کو بھگا کر لے گئی۔

"وہ ہمارے پیچھے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنا اسکوٹر لے کر۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گے سکندر؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن حالات پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں اور سارے سہاروں سے محروم ہو گیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

"ایسا مت کہو سکندر۔ مجھے تو اپنے ساتھ رکھو۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "یہ سوچو کہ میں کہاں جاؤں گی۔"

"تم ابھی تو گھر جاؤ۔" میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ "تم تو ہر وقت، ہر جگہ میرے ساتھ ہو۔ دل و جاں سے بھی قریب تر۔ تمہارا تصور اس وقت بھی میرا سب سے بڑا سہارا تھا جب خدا کے سوا کسی کی مدد میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ آج اگر مجھے اعتماد ہے تو صرف تم پر اور محسن پر۔ انکل رضوی، شیخ یا انکل شیروانی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اُن کے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

"پھر اس وقت تم کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔ "کسی ہوٹل میں؟"

"ہوٹل میں؟ نہیں۔ کم سے کم ابھی دو چار دن نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ دونوں فرض شناس پولیس مین بہت ذہین بھی ہیں۔ شیخ اور انکل رضوی۔ یہ سب سے پہلے ہوٹل ہی دیکھیں گے۔ میرا خیال ہے اب تک اکرام شیخ نے فون کر کے ایس ایس پی صاحب کو سب بتا دیا ہوگا۔ اس نے تو اگر نازو کو بھی گرفتار کر لیا ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ اس نے مجرم کو فرار ہونے میں مدد دی۔"

"اس کے والدین بھی تو ہیں۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" رابعہ نے کہا۔

"تم بڑے شیخ صاحب کو نہیں جانتیں۔" میں نے کہا۔ "میں ان سے مل چکا ہوں۔ یہ انہی کی تربیت تھی جس نے اکرام شیخ کو اتنا کڑا اصول پرست بنا دیا۔ انہوں نے ہی شیخ کو سکھایا ہے کہ فرض کی ادائیگی اور راہِ حق میں جان چلی جائے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔"

گیٹ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی کو اچانک روک لیا اور نیچے اُتر گیا۔ ہم اس وقت تک تقریباً سات میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جانتے بوجھتے میں نے گاڑی کا رُخ رضوی صاحب کے گھر کی طرف رکھا تھا کیونکہ اُدھر اکرام شیخ کے آنے کا امکان کم تھا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں اب گھر کیسے جا سکتا ہوں۔ اگر وہ تعاقب میں روانہ ہوا ہوگا تو مخالف سمت میں۔ اس کا اسکوٹر کسی طرح بھی فاکس ویگن سے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے تعاقب کیا ہی نہ ہو۔

"تم اب جاؤ۔ میں تم سے صبح رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سات بجے۔ شب بخیر۔" اور اسے جواب کا موقع دیے بغیر چل پڑا۔ ایک منٹ بعد رابعہ گاڑی لے کر آگے بڑھ گئی۔ میں رُک گیا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک اس کی ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔ یہ تقریباً وہی جگہ تھی جہاں سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ دیوار اب بھی ٹوٹی پڑی تھی جس سے ہمارا راستہ روکنے والی کار ٹکرائی تھی۔ میں نے اس شگاف سے تاریکی دیکھی اور آگے جا کے اندر جھانکا۔ اندر کسی کوٹھی کا باغ تھا۔ اور تقریباً سو گز دُور کوٹھی کی بند کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس گھر میں رہنے والوں کو یقیناً اس رات کا حادثہ یاد ہوگا۔ شاید انہوں نے رابعہ، محسن اور انکل رضوی کے ساتھ مجھے تلاش بھی کیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کے سوچا۔ اسی وقت اکرام شیخ اپنے اسکوٹر پر میرے سامنے سے گزر گیا۔ ایک بے مقصد حرکت کے باعث میں اس کے سامنے آنے سے بچ گیا تھا۔ فون کرنے کے بجائے وہ خود رضوی صاحب کو بتانے جا رہا تھا کہ ملزم سکندر بخت کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ رابعہ کو بھی موردِ الزام ٹھہرائے گا کہ وکیل صاحبہ! آپ کو تو قانون کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ وہ کیا کہے گی؟ یہ کہ میں بے بس تھی۔ سکندر زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یا صاف مُکر جائے گی کہ میں نے تو سکندر کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو اسی کے کیس میں عبدالودود منظر سے بات کرنے گئی تھی۔ یقین نہیں تو فون کر کے پوچھ لو۔ منظر یاروں کا یار۔ بے فکرا اور بے جھجک جھوٹ بولنے والا۔ بالکل وہی کہے گا جو رابعہ چاہے گی۔ بیچارہ اکرام شیخ کس مشکل میں پڑ گیا۔

ابھی رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے پوری رات پڑی تھی۔ پہلا مسئلہ پیٹ کی آگ بجھانے کا تھا۔ اچانک مجھے بریف کیس کا خیال آیا جو رابعہ کی گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ اس میں پولیس انسپکٹر کی وردی تھی۔ اس کا ریوالور تھا اور پورے تین ہزار روپے تھے۔ اپنی جیب میں میں نے صرف چار سو چالیس روپے رکھے تھے اور اس میں سے بھی سو کم ہو چکے تھے لیکن باقی رقم ایک رات گزارنے کے لیے کافی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پولیس ایک رات میں سارے ہوٹل چیک کر لے؟ میں نے سوچا۔ جواب نفی میں آیا۔ شہر میں سیکڑوں ہوٹل تھے، فلیٹیز سے لے کر غریب نواز سرائے تک۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسٹیشن سے میکلوڈ روڈ تک پھیلے ہوئے ہوٹلوں کے رجسٹر دیکھ لیں مگر ہوٹل تو اور بھی ہیں۔ انارکلی میں اور شاہ عالمی میں۔ اور رجسٹر دیکھنے سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ میں اپنا نام کچھ بھی لکھوا سکتا ہوں۔ مسئلہ میرے خالی ہاتھ پہنچنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسباب ساتھ ہو تو کسی کو قیام کے لیے آنے والے پر شک نہیں ہوتا کہ وہ مسافر نہیں ہے لیکن جس کے ہاتھ میں بریف کیس تک نہ ہو، اس سے شناخت کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ثبوت مانگا جاسکتا ہے۔ بے شک میں نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں صورت سے شریف آدمی لگتا تھا اور گفتگو سے بھی اور اسباب نہ ہونے کی معقول وجہ بھی بتا سکتا تھا۔ ہوٹل والے آدمی کو صورت سے پہچان لیتے ہیں اور انہیں ایڈوانس مل جائے تو ان کے لیے عدم اطمینان کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ رہنے کو منظر کا گھر بھی تھا مگر میں نئے سرے سے اس کو ساری آپ بیتی سنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ استاد ٹیڈی کا پتا اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں بلا تکلف اور بے خوف و خطر اس کے گھر جا کے سو جاتا۔

میں نے شب بسری کے مسئلے کو التوا میں رکھا اور کھانے کے لیے بیڈن روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ رش کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم لوگ میزوں پر موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں رابعہ نے وہ بریف کیس کھول کے دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھے گی؟ یہ کہ میں نے کسی سب انسپکٹر کو قتل کر کے اس کی وردی اور ریوالور حاصل کر لیے ہیں۔ اسے تو میں صبح ساری کہانی سُنا کے مطمئن کر لوں گا لیکن خدانخواستہ انکل رضوی نے پوچھ لیا کہ یہ بریف کیس کس کا ہے؟ یا محسن نے اپنے بریف کیس کو ان کے سامنے شناخت کر لیا تو رابعہ کے لیے ان کو اپنے جواب سے مطمئن کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور رضوی صاحب نے شک رفع کرنے کے لیے حکم دیا کہ میرے سامنے بریف کیس کھولو تو رابعہ مجبور ہو جائے گی۔ خود اسے بھی معلوم نہیں کہ بریف کیس میں کیا ہے۔ جب اندر سے ایک سب انسپکٹر کی وردی نکلے گی تو صورتِ حالات بہت سنگین ہو جائے گی۔ وردی کے ساتھ انسپکٹر کا ریوالور ہی نہیں شناختی کارڈ بھی ہے۔ اس کی ایک جیب میں میرا وہ بیان بھی ہے جو حوالدار اد نگیتے خان نے تحریر کیا تھا۔ کل تک راولپنڈی سے پولیس آجائے گی اور رضوی صاحب میری کوئی تصویر دکھا کے تصدیق کر دیں گے کہ دُہرے قتل کی واردات کر کے پولیس کی تحویل سے فرار ہونے والا آغا علی احمد عرش اللہ آبادی میرے سوا کوئی نہیں۔

یہ خیال اتنا پریشان کُن تھا کہ میری بھوک اُڑ گئی۔ میں نے فوراً رابعہ کو فون کر کے اسے بریف کیس کی حفاظت کرنے کی تاکید کرنے کا فیصلہ کیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کے میں نے ایک لوکل کال کی اجازت طلب کی۔ منیجر نے بڑی خوش اخلاقی سے ٹیلی فون میری طرف کھسکا دیا۔ نمبر ڈائل کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ کہیں رضوی صاحب کی لائن پہ آبزرویشن نہ ہو۔ میرے اغوا کے بعد انہوں نے ٹیلی فون والوں سے ہر کال ریکارڈ کرنے کا کہا ہو۔ لیکن اغوا کی بات پرانی ہو چکی تھی اور ٹیلی فون والے یہ سمجھتے ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تو تین دن بعد آبزرویشن ہٹا دیتے ہیں۔ ہمت کر کے میں نے نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی دو بار بجی۔ پھر رضوی صاحب کی آواز آئی: "رضوی اسپیکنگ۔"

"ایس پی صاحب۔" میں نے حواس بحال رکھے اور آواز کو تھوڑا سا بدل کے کہا۔ "مجھے مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ سے بات کرنی ہے۔"

"کون صاحب ہیں آپ؟ نام بتائیے اپنا۔" انکل رضوی نے کہا۔ وہ آواز کے فرق کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

"غلام ربانی ایڈووکیٹ۔" میں نے کہا۔ غلام ربانی پہلے رابعہ کا معتمدِ خاص اور ماتحت وکیل تھا۔

"ہولڈ پلیز۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "میں بلواتا ہوں۔" اور میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا کیونکہ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے آواز بدل کے بات کرنے پر مجھے چونک کر دیکھا تھا لیکن خاموش رہنا بہتر سمجھا تھا۔ یہ نمبر کسی ایس پی کا تھا۔ میں ایک ایڈووکیٹ تھا اور دوسرے ایڈووکیٹ سے بات کرنا چاہتا تھا چنانچہ آواز کی تبدیلی کو گلے کی عارضی خرابی ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ "غلام ربانی؟" رابعہ کی حیرت زدہ آواز آئی: "خیریت تو ہے۔ تم اس وقت...؟"

"مس رابعہ ایڈووکیٹ؟" میں نے پھر اصل آواز میں کہا۔ "میری ابھی ایس پی صاحب سے بات ہوئی تھی۔"

"سکندر؟" وہ سرگوشی میں بولی۔ "یہ تم نے کیا غلطی کی۔ اپنا بریف کیس چھوڑ گئے؟"

"ہاں۔ میرا بریف کیس تمہاری گاڑی میں رہ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کہاں ہے؟"

"انکل رضوی کے پاس۔" رابعہ نے کہا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ آس پاس موجود ہوتے تو رابعہ ان کا نام نہ لیتی۔ "کھول کے دیکھا ہے انہوں نے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کوشش کی تھی لیکن اس کا قفل نمبروں والا ہے۔" رابعہ بولی۔ "انہوں نے مجھ سے لے کر اپنے کمرے میں رکھ لیا ہے۔ صبح پولیس کی تحویل میں دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا شک ہو گیا ہے انہیں؟"

"پہلے تو شک ہی تھا۔" وہ بولی۔ "انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ٹال دیا تھا۔ پھر محسن آگیا اور سوچے سمجھے بغیر بول پڑا۔ اس نے ایک مونوگرام بنوا رکھا ہے نا۔ وہ پہچان گیا۔ میرے اشارے پر وہ چُپ ہوا مگر رضوی صاحب...."

"انہوں نے تاڑ لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس بات کا ڈر تھا۔ تم نے اسے گاڑی میں کیوں نہیں رہنے دیا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سے بھی کوئی خرابی پیدا ہوگی۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا ہے اس میں؟"

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ پنڈورا کا صندوق ہے۔ اس کے کھلتے ہی ساری آفات نازل ہو جائیں گی۔"

"تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔" وہ دُکھ اور خفگی سے بولی۔ "اب کیا ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ ہی اکرام شیخ پہنچ گیا تھا۔ تم بال بال بچ گئے۔"

"میں نے اُسے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کس لیے آیا تھا وہ؟" میں نے کہا۔

"اپنا استعفا دینے۔" رابعہ نے کہا۔ "میرا خیال تھا وہ سخت مشتعل ہوگا اور مجھے دیکھتے ہی جھپٹ پڑے گا۔ رضوی صاحب کو ایک ایک بات بتا دے گا لیکن وہ بہت دل گرفتہ اور خاموش تھا۔ اس نے استعفا ہی نہیں، اپنی وردی، شناختی کارڈ، ریوالور سب انکل رضوی کے سامنے رکھے اور کہا کہ میں ابھی اسی وقت پولیس کی ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔ استعفا منظور ہو یا نا منظور۔ مجھے پروا نہیں۔ یہ ڈسپلن کے خلاف ہے تو آپ جو کارروائی کرنا چاہیں کر لیں۔ رضوی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جذباتی ہو رہا ہے اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم فیصلہ کر ہی چکے ہو تو میں زبردستی نہیں کر سکتا لیکن اس فوری فیصلے کا سبب تو بتا دو۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہا۔ مجھے سکندر بخت کو گرفتار کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میں اسے گرفتار نہیں کر سکا پھر وہ واپس چلا گیا کوئی تفصیل بتائے بغیر۔ لیکن اس کے بعد انکل رضوی نے مجھے طلب کر لیا اور جرح شروع کر دی۔ ابھی کہاں سے آئی ہو؟ محسن کا بریف کیس تمہیں کس نے دیا؟ تم تو خالی ہاتھ گئی تھیں۔ میں نے کہا کہ بریف کیس پہلے سے گاڑی میں موجود تھا اور محسن کا نہیں ہے۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ذرا محسن کی طلبی ہوئی۔ اسے کیا معلوم کہ میں نے ابھی ابھی کیا بیان دیا ہے لیکن اس نے میری صورت پہ ہوائیاں اُڑتے دیکھیں تو تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور جب بریف کیس دکھا کر اس سے پوچھا گیا کہ کیا یہ تمہارا ہے تو اس نے بڑے غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر انکار کر دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ رضوی صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ بہت بگڑے کہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رابعہ نے تمہیں اشارہ کیا تھا لیکن سچ تمہاری زبان سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ اب اپنے ہی سچ کو جھوٹ ثابت کر کے میری آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہو۔ تم دونوں کو معلوم ہے سکندر کہاں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بریف کیس اپنے کمرے میں رکھوا دیا کہ صبح تفتیش ہو گی، جس کا بریف کیس ہوگا اسے مل جائے گا۔"

"رابعہ صبح ہونے سے پہلے وہ بریف کیس وہاں سے غائب کر دو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "شک کی زد میں براہِ راست میں اور محسن آ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی خواب گاہ میں جانا اور بریف کیس چُرانا ناممکن ہے۔"

"تم محسن سے کہو۔" میں نے کہا۔ "انکل صبح جلدی اٹھتے ہیں اور گھاس پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ تک۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہوتا۔"

"میں پھر کہتی ہوں سکندر کہ یہ بہت خطرناک کام ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے رابعہ کہ اس بریف کیس کی وجہ سے میں کتنی مشکل میں پڑ سکتا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے۔ اور جو میں کرنا چاہتا ہوں سب خاک میں مل جائے گا۔ تمام عمر پچھتاؤ گی تم کہ ایک چھوٹا سا کام نہیں کیا تھا۔"

"اچھا۔ میں اسے غائب کر دوں گی۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھ میں اب اور چھپانے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

"آئی ایم سوری رابعہ۔ میں تم کو دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ بلیک میل نہیں کر رہا تھا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "میں خود آتا ہوں۔ تمہیں اور محسن کو سب بتا دیتا ہوں۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ بل کے علاوہ میں نے کال کے پانچ روپے ادا کیے لیکن اس سے منیجر کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس نے گفتگو کا ایک ایک لفظ سُنا تھا اور جو کچھ سنا تھا وہ انتہائی سنسنی خیز، پُراسرار اور پریشان کُن تھا۔

"یہ کیا سلسلہ ہے مسٹر؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "آپ نے ایس پی کے گھر فون کیا تھا۔ نمبر بتائیں۔"

"ایس پی آغا احمد علی عرش اللہ آبادی کے گھر۔" میں نے متانت سے کہا اور اسے ایک نمبر بتا دیا جو کسی زمانے میں چراغ دین کے گھر کا نمبر تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر سر ہلایا اور نمبر لکھ لیا اور مجھ سے کہا کہ ریکارڈ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ میرا نام وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ میں کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر اطمینان سے چلتا ہوا باہر آگیا۔ مال روڈ کی اِکا دُکا دکانیں اب بھی کُھلی ہوئی تھیں۔ میں نے رابعہ سے کہہ تو دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں لیکن یہ نہیں بتا سکا تھا کہ میں کس وقت اور کس طرف سے آؤں گا۔ اتنا تو وہ خود بھی سمجھ سکتی ہے کہ میں اس طرح اندر نہیں جاسکتا جیسے پہلے جاتا تھا۔ میں چُھپ کر جاؤں گا تو اسی کھڑکی کے راستے اندر پہنچوں گا جو رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی تھی اور احاطے کے اندر بائیں جانب کُھلتی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایسا انتشار تھا کہ میں یکسوئی کے ساتھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں تھوڑی دُور ہی پیدل گیا تھا کہ مجھے سوٹ کیس اور چمڑے کے سامان کی ایک دکان میں روشنی نظر آئی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے تھوڑے سے کُھلے ہوئے شٹر سے جھانک کر دیکھا۔ اندر پروپرائیٹر ایک میز پر بیٹھا دن بھر کی فروخت کا حساب کر رہا تھا۔ شٹر بجا کے میں نے اسے متوجہ کیا۔ "دکان بند ہو گئی ہے۔" اُس نے وہیں سے جواب دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"مجھے معلوم ہے۔ آپ ذرا ایک منٹ کے لیے قریب آ کے میری بات سُن لیں" میں نے انتہائی عاجزی سے کہا۔

اُس نے میری صورت، حُلیے اور لہجے سب پر غور کیا اور پھر کیش کو مقفل کر کے آگے آیا۔ "فرمایئے!"

"بات یہ ہے جناب کہ ابھی ایک ریسٹورنٹ سے کوئی میرا بریف کیس لے بھاگا" میں نے کہا "میں کھانا کھا رہا تھا۔ اب مجھے رات کی فلائٹ سے کراچی جانا ہے۔ مجھے ایک بریف کیس کی اشد ضرورت ہے۔ پیسہ تو گیا سو گیا۔ اس کے ساتھ کاغذات بھی گئے۔ غنیمت ہے ٹکٹ گھر پر تھا۔۔!"

اس نے شٹر اوپر اٹھا دیا "دیکھ لیجیے آپ کو کون سا پسند ہے؟ لیکن ذرا جلدی" اس نے ایک شیلف میں لگے ہوئے بریف کیسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلایا اور سب پر نظر ڈالتا گیا۔ نمبر لاک والے بریف کیس بہت تھے مگر کسی کا سائز مختلف تھا۔ کوئی زیادہ موٹا تھا یا بہت پتلا۔ پھر مجھے ایک بریف کیس ویسا ہی نظر آ گیا۔ اس پر مصنوعی مگر مچھ کی کھال جیسا کور تھا۔ فرق رنگ کا تھا۔ محسن کا بریف کیس سیاہی مائل براؤن تھا، یہ ڈارک براؤن۔ لیکن اتنا فرق چل سکتا تھا۔ دکاندار نے اس کی قیمت تین سو بتائی اور ڈھائی سو قبول کر لی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ محسن اور رابعہ کا کام اب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ چرانے کے بجائے اب بریف کیس بدلا جا سکتا تھا۔ صبح اگر رضوی صاحب کو رنگ کے فرق کا احساس بھی ہوا تو وہ سمجھیں گے کہ رات کو بلب کی روشنی میں اور صبح سورج کی روشنی میں دیکھنے سے ان کو رنگ کچھ ہلکا لگ رہا ہے۔ مونوگرام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اسٹکر تھا اور محسن اسے کسی دشواری کے بغیر اکھاڑ کے نئے بریف کیس پر لگا سکتا تھا۔ سب سے نمایاں پُرانے اور نئے کا فرق تھا۔ محسن کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ بدلنے سے پہلے وہ نئے کو پُرانا بنا دے۔ مٹی دھول میں رگڑ کے اور کور کو میلا کر کے۔

اب میں جلد از جلد انکل رضوی کے گھر پہنچنا چاہتا تھا لیکن گھڑی میں دس بجے تھے۔ رضوی صاحب کا گیارہ بارہ بجے تک جاگتے رہنا بھی ممکن تھا۔ وہ پہلے بھی مصروف تھے اور اب مجھے خود رابعہ نے بتا دیا تھا کہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے اور آج کے واقعات کا ان کے ذہن پر اثر ہونا لازمی ہے۔ سوچنا مجھے یہ بھی تھا کہ اس بریف کیس میں کیا بھروں۔ پھر میں نے اس مسئلے کو محسن اور رابعہ پر چھوڑ دیا۔ وہ خود باہمی مشورے سے سب ٹھیک کر لیں گے۔ انکل رضوی کے ذہن سے شک کو مٹانا تو اُن کے لیے ممکن نہ ہو گا لیکن وقتی طور پر رابعہ کی پوزیشن محفوظ ہو جائے گی۔

مجھے افسوس تھا کہ میری وجہ سے شیخ کو مستعفی ہونا پڑا اور پولیس، مستقبل کے ایک دیانت دار فرض کو جان کا قرض سمجھنے والے ذہین پولیس افسر سے محروم ہو گئی۔ اس کے اپنے گھر کی فضا مکدر ہوئی۔ نہ جانے اس کے بعد کیا ہو گا۔ نازو چھوٹی بہن تھی۔ بڑا بھائی پولیس افسر تھا جو اس سے شکست کھا گیا تھا۔ شیخ دل میں مَیل رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ مگر نازو کی اس حرکت کا وہ کیا مطلب نکالے گا؟ خود نازو کے والدین کی نظر میں میری پوزیشن گر گئی تھی۔ اور اب میرے لیے اس گھر میں قدم رکھنا بھی محال تھا حالانکہ اب شیخ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ رہی تھی۔ وہ پولیس کی فرائض داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد صرف دوستی نبھا سکتا تھا لیکن مسئلہ اس سے کہیں زیادہ اُلجھا ہوا تھا۔ میں رابعہ کی خاطر دنیا کو چھوڑ سکتا تھا اور نازو اتنی ضدی لڑکی تھی کہ مجھے اس سے خوف آتا تھا کیونکہ میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔

میں اطمینان سے پیدل چلتا جا رہا تھا۔ ایک موڑ پر پلٹ کر دیکھنے سے مجھے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے دو افراد نظر آئے۔ اگر وہ تیزی سے اندھیرے کی پناہ نہ لیتے تو مجھے کوئی شک نہ ہوتا لیکن ان کی اس حرکت نے مجھے چوکنا کر دیا۔ میں موڑ کاٹ کے ایک جگہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے لیٹر بکس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں میرے سامنے سے گزرے۔

"کہاں گیا وہ؟" ان میں سے ایک نے تشویش سے کہا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔

"جائے گا کہاں" دوسرا بولا "ابھی دیکھ لیتے ہیں" پھر اس نے ایک رکشا کو روک لیا۔ رکشا کچھ دُور جا کے رُکا چنانچہ میں ان کی بات نہ سُن سکا لیکن روشنی پڑتے ہی میں نے ان کی صورت کو پہچان لیا۔ ایک بار دلاور نے میرے سامنے چھ جعلی فورمین پیش کیے تھے۔ یہ انہی میں سے دو تھے۔ رکشا روانہ ہو گیا تو میں لیٹر باکس کے پیچھے سے نکلا اور سوچنے لگا کہ یہ فرشتے کب اور کہاں سے میرے تعاقب میں تھے اور کہاں گئے ہیں؟ "ابھی دیکھ لیتے ہیں" کا کیا مطلب ہے؟ کیا انھوں نے ریسٹورنٹ میں ٹیلی فون پر میری اور رابعہ کی گفتگو سُنی تھی اور وہیں سے میرے پیچھے لگ گئے تھے؟ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ رکشا میں وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے جہاں اُن کو میرے پہنچنے کا یقین ہے۔ اگر بریف کیس بدلنے کا مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو میں اپنا پروگرام یقیناً ملتوی کر دیتا۔

گیارہ بجے کے بعد میں نے رکشا کو دھرمپورہ نہر کے پل سے سیدھے ہاتھ مڑتے ہی روک لیا۔ حالات بدل گئے تھے۔ اب میں دندناتا ہوا سردار تو کی کوئے جاناں تک بھی نہیں جا سکتا تھا۔ نصف فرلانگ کا فاصلہ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ کسی درخت یا دیوار کے سائے میں ٹھہر ٹھہر کے طے کیا۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا لیکن کسی کسی کھمبے پر روشن بلب کا اجالا سایوں کو تاریکی سے اس حد تک جُدا کرنے میں کامیاب تھا کہ کہیں حرکت ہوتی تو منتظر نگاہیں ضرور دیکھ سکتی تھیں۔ چشم براہ تو رابعہ کی آنکھیں بھی ہوں گی لیکن اس کے علاوہ شکاری آنکھیں بھی تاک میں ہو سکتی تھیں۔ احتیاط کے خیال سے میں نے بڑے دروازے سے داخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔

فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اور موسم سرما کی آمد کا پتا شہر کے کوچہ و بازار سے بھی چلتا تھا جہاں وہ رونق نظر نہ آتی تھی جو گرمیوں میں شام سے نصف شب کے بعد تک لوگوں کو گھر سے باہر رکھتی تھی۔ اب تو دس بجے ہی آدھی رات کا گمان ہوتا تھا اور ٹی وی پروگرام ختم ہونے کے بعد بہت کم لوگ جاگتے تھے۔ رضوی صاحب کے ساتھ والے گھر میں بھی اندھیرا تھا۔ میں خالی بریف کے ساتھ اطمینان سے اندر داخل ہوا اور اس دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جو رضوی صاحب کی کوٹھی کو اس کوٹھی سے جُدا کرتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر مجھ سے پہلے ہی آ کے گھات میں بیٹھ جانے والے دیوار کی دوسری جانب ہوں گے تو اس سکوت میں میری آواز پا بھی سن لیں گے چنانچہ میں محتاط تھا۔ تعجب تو مجھے اس بات پر بھی تھا کہ دو شکاری کب اور کیسے میرے پیچھے لگ گئے تھے لیکن اس سے زیادہ حیرت مجھے ان کے اعتماد پر تھی۔ رکشا میں بیٹھتے وقت انہیں یقین تھا کہ میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اور وہ اس یقین کے ساتھ روانہ ہوئے تھے جیسے میری منزل کا پتا وہ پہلے سے جانتے تھے۔

ہاتھوں کے بل پر خود کو تھوڑا سا بلند کر کے میں نے دیوار پر سے دوسری جانب جھانکا۔ اس گوشۂ چمن کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس۔ خوابیدہ درخت، سب میرے دیرینہ ہمدم و ہمراز تھے لیکن اس وقت وہ بھی اجنبی ہو گئے تھے۔ میں نے نظر جما کے دیکھا اور تاریکی میں ایک جگنو سا فروزاں دیکھ لیا۔ اگر میں سامنے والے دروازے سے اندر آتا تو جھاڑی کے پیچھے دبکے ہوئے اس شخص کو ہرگز نہ دیکھ پاتا جو وہاں اطمینان سے چھپ کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ پتوں کی گھنی دیوار کے پیچھے یہ چنگاری کسی کو نظر نہیں آ سکتی۔

میں نے اس کے دوسرے ساتھی کو تلاش کیا اور ناکام رہا۔ اگر وہ بھی اندر تھا تو کسی ایسے مقام پر مورچہ بند بیٹھا تھا جہاں میری نظر کی رسائی نہ تھی۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں دیوار پر چڑھ کے دوسری جانب اتروں اور بے خبری میں اس کو دبوچ لوں۔ فاصلہ بہت کم تھا اور خاموشی اتنی گہری تھی کہ میرے دیوار پر چڑھنے کی سرسراہٹ بھی اسے متوجہ کر سکتی تھی۔ پھر دوسری طرف جا کے مجھے چند قدم چلنا تھا اور خواہ میں کتنی ہی احتیاط سے قدم کیوں نہ رکھتا، خشک گھاس اور سُوکھے پتوں کی پُکار اسے چوکنا کر دیتی۔ کچھ بائیں طرف مجھے رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کھلی نظر آ رہی تھی۔ اندر زیرو واٹ کے بلب کا برائے نام اُجالا یہی فریب دیتا تھا کہ اندر جو بھی ہے محوِ خواب ہے مگر میں جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہو گی۔ ایک میرے انتظار کی خلش تھی، میری ذات سے وابستہ اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور فکرِ سود و زیاں تھی۔ اس کی آنکھوں کے لیے نیند کہاں۔ اندر اپنی خواب گاہ میں محسن بھی جاگ رہا تھا۔ رفاقتوں کے یہ سلسلے نہ ہوتے تو وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں ساری دنیا کی طرح چین سے سوتے لیکن محسن میرے ماضی کا امین تھا تو رابعہ میرے مستقبل کی مالک تھی۔

گھات میں بیٹھے ہوئے شکاری کو فریب کے جال میں اُلجھا کے باہر بُلانا بہت مشکل تھا۔ اور اندر محاذِ جنگ کھولنا خود اپنے منصوبے کی ناکامی کا سامان کرنے کے مترادف تھا۔ شور و غل پر رضوی صاحب تیسرے فریق بن کے آ جائیں گے اور دونوں کو پکڑ لیں گے۔ وہ پکڑا جاتا تو میری بلا سے لیکن اس مرحلے پر میں اپنی آزادی کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ صبر کے ساتھ انتظار کے علاوہ میں کیا کر سکتا تھا۔ ایک اُمید یہ تھی کہ شاید وہ مایوس ہو جائیں۔ آخر کب تک وہ انتظار کریں گے؟ بالآخر انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے اندازے میں غلطی ہوئی اور اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ رضوی صاحب کے ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے خاندانی کلاک نے بارہ گھنٹے بجا کے نئے دن کے آغاز کا اعلان کیا۔ میں مسلسل دیوار پہ لٹکا نہیں رہ سکتا تھا، چنانچہ وقفے وقفے سے میں تانک جھانک میں مصروف رہا لیکن وہ خبیث انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ وہیں براجمان نظر آیا۔ میرے ذہن میں اس کو اٹھانے اور وہاں سے کھسکانے کی کوئی تدبیر نہ آئی۔ یہ ڈرا لگ رہا کہ جس کوٹھی کی سرحد میں میں نے خود آبزرویشن قائم کر رکھی تھی اس کا کوئی مکین مجھے چور نہ سمجھ لے لیکن تاریخ بدلتے ہی حالات بدل گئے۔ اچانک اندر سے رضوی صاحب برآمد ہوئے۔ انھوں نے نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ذہنی بے سکونی کے باعث وہ نیند سے محروم ہیں۔ انھوں نے لان پر ٹہلنا شروع کیا۔ وہ لان کے دوسرے کنارے سے عین اس جھاڑی تک آتے تھے جس کے پیچھے غنیم کے لشکر کا تنہا سپاہی چھپا بیٹھا تھا۔ کئی بار مجھے یوں لگا کہ وہ جھاڑی سے کترا کے آگے نکل آئیں گے لیکن وہ میکانکی انداز میں پلٹ گئے۔ اگر وہ چند قدم آگے آ جاتے تو وہ شخص چھُپا نہ رہ سکتا اور پھر یا تو وہ حملے میں پہل کرتا اور رضوی صاحب کو خاموش کر دیتا یا جوتیاں بغل میں دبا کے بھاگ جاتا۔ اگر وہ حملہ کرتا تو مجھے ان کو بچانے کی خاطر بے خطر آتش نمرود میں کودنا پڑتا اور اس احسان کا بدلہ انکل رضوی یوں چکاتے کہ مجھے فوراً گرفتار کر لیتے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس میں تو شبے کی بات ہی نہیں تھی کہ خود وہ شخص بھی خوف اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہوگا اور اس کے اعصاب کے تار اس حد تک کشیدہ ہوں گے کہ خفیف سا صدمہ بھی برداشت نہ کرسکیں گے۔ جیسے جیسے رضوی صاحب کے قدم اس کی طرف بڑھتے ہوں گے اپنی موجودگی کا راز افشا ہونے کا خوف بڑھتا جاتا ہوگا اور وہ پلٹتے ہوں گے تو اطمینان کے ایک لمحے میں وہ دعا کرتا ہوگا کہ اس چکر کے بعد وہ اندر چلے جائیں۔ میں نے نیچے سے تقریباً ایک پاؤ کا پتھر اٹھایا۔ بریف کیس کو دیوار سے لگا کے کھڑا کیا اور خود اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اب میرا سر دیوار سے چند انچ اوپر تھا۔ اندیشہ بس یہ تھا کہ کہیں بریف کیس میرے وزن سے ٹوٹ نہ جائے یا دیوار سے رگڑ کھا کے پھسل نہ جائے لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رضوی صاحب جیسے ہی جھاڑی تک پہنچ کے واپس ہوئے میں نے اطمینان سے نشانہ لیا اور پوری قوت کے ساتھ وہ پتھر اس کی کمر پہ دے مارا۔

اسے چوٹ یقیناً آئی ہوگی لیکن وار اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ چلا پڑا۔ رضوی صاحب ایک دم پلٹے اور اس سے پہلے کہ وہ شخص سنبھلتا، رضوی صاحب نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ حشمت خان ٹائپ تندوری پیٹ والے تھانیدار نہیں تھے، اعلیٰ پولیس افسر تھے اور انہوں نے خود کو جسمانی طور پہ ہمیشہ فٹ رکھا تھا۔ میرا شکاری خود شکار ہو گیا۔

"کون ہو تم؟" رضوی صاحب نے گرج کر کہا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیوں چھپے بیٹھے تھے؟" اب ان کی ساری توجہ زیرِ حراست ملزم کی طرف تھی چنانچہ میں اطمینان سے سارا تماشا دیکھ سکتا تھا۔ اس شخص کے پاس جواب تھا ہی نہیں۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی اور خود کو چھڑا کے بھاگنا چاہا لیکن حیرت انگیز طور پر رضوی صاحب نے کسی پیشہ ور باکسر کی طرح وار کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ ہنگامے نے اندر ان کی بیگم کو متوجہ کر لیا تھا۔ انہوں نے باہر کی لائٹ جلائی۔ دو منٹ بعد وہ خود نکلیں۔ پھر ان کا نوکر اور آخر میں محسن۔

"اسے لے جاؤ اندر۔" رضوی صاحب نے حکم دیا۔ "اور باندھ کے ڈال دو۔"

محسن اور رضوی صاحب کا ملازم نیم بے ہوش شخص کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

"کون تھا یہ؟" بیگم رضوی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کچھ ہوا تو نہیں آپ کو؟"

"نہیں۔" رضوی صاحب نے سکون سے کہا۔ "کوئی چور معلوم ہوتا ہے۔ یہاں چھپا ہوا تھا جھاڑی کے پیچھے۔"

"آپ نے کیسے دیکھ لیا؟" بیگم رضوی نے حسن تجسس کے باعث بیویوں کی طرح بے موقع جرح کی۔

"ارے بھئی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" رضوی صاحب نے چڑ کر کہا۔ "ٹہل رہا تھا باہر۔ اسے شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹ لیا۔"

میرے لیے یہ مناسب ترین موقع تھا جب کوئی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ میں نے بریف کیس کو دیوار پہ رکھا، خود کو بلند کیا اور دوسری طرف اتر گیا۔ بریف کیس اٹھا کے میں دبے پاؤں اس گلی میں غائب ہو گیا جس میں کھلنے والی رابعہ کے بیڈ روم کی کھڑکی مجھے پناہ دینے کے لیے بلا رہی تھی۔ میں کھڑکی کے راستے کمرے میں وارد ہوا تو رابعہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"یہ باہر کیا ہو رہا تھا؟" رابعہ نے جس لہجے میں کہا اس سے اس کے دلی اضطراب کی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"انکل رضوی نے ایک چور کو گرفتار کیا ہے۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ "کیا دیدہ دلیری ہے۔"

"میں تو ڈر گئی تھی کہ تم پکڑے گئے۔" رابعہ نے سرگوشی کی۔

"بات یہ ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "کہ آیا تو وہ بدبخت مجھے پکڑنے تھا لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

"تم جانتے ہو اسے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو شاید یاد ہو کہ ایک دن میری اپنی فیکٹری میں مجھے زرعی آلات کی جگہ کریٹ میں بند کر دیا گیا تھا اور یہ کارنامہ چھ افراد نے انجام دیا تھا جن کو میرے سامنے فورمین بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اسے میرے حوالے کر دیا جائے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "انکل اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔ وہ مسلح بھی تھا؟"

"یقیناً ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم ذرا اندر جا کے انکل کی خیریت معلوم کرو۔ ویسے وہ بالکل خیریت سے ہیں اور محسن کے ساتھ مل کے ایک بیان دے دو کہ یہ مجھے اغوا کر کے لے جانے والوں میں سے ایک ہے۔ تم دونوں کی شناخت سے تفتیش کی لائن بدل جائے گی اور اسے اچھی طرح ٹھوک بجا کے پوچھا گیا تو ممکن ہے وہ بہت سے انکشافات کرے۔ ورنہ تو وہ اتنا کہہ کے بچ جائے گا کہ چوری کی نیت سے آیا تھا۔ اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ باقی پانچ فورمین کون تھے؟"

فوری طور پر کسی کے ادھر آنے کا امکان نہیں تھا اس لیے

رابعہ کی واپسی تک میں اطمینان سے لیٹا رہا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد آئی۔ رضوی صاحب کا فون خراب نہ ہوتا تو پولیس فوراً آ جاتی۔ فی الحال ملزم کو باندھ کر باتھ روم میں ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ اور محسن کے بیان پر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب نے اس پہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اغوا کرنے والے باقی افراد کے نام بتا دے۔ یہ بتا دے کہ اسے کس نے اغوا پہ مامور کیا تھا اور وہ سکندر کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے گئے تھے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ورنہ اس کی کھال کے جوتے بنوا کے ہر تھانے میں تفتیش کے لیے رکھوا دیے جائیں گے۔ معلوم کرنے والے سب معلوم کر ہی لیں گے۔"

"اس وقت گھر میں خاصی ہلچل ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی کون سوئے گا۔ کسی کو بھی نیند نہیں آئے گی۔ تم انکل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں رہو۔ مجھے یہ بتا دو کہ وہ بریف کیس کہاں ہے؟ میں یہ بریف کیس لایا ہوں۔"

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اب کیا فائدہ؟" وہ بولی۔ "انکل نے اسے کھول کر دیکھ لیا تھا قفل توڑ کے۔ اور بریف کیس اب ان کی الماری میں مقفل ہے۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے سر پکڑ کے کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا لیکن رابعہ مجھے بہرحال وہ بریف کیس حاصل کرنا ہوگا اس سے پہلے کہ میرے خلاف یہ شہادت ریکارڈ پہ آئے۔ مجھے معلوم ہے الماری کی چابیاں ان کے تکیے کے نیچے ہوں گی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو سکندر!" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔ "صبح انکل کو خالی بریف کیس ملے گا تو الزام کس پہ آئے گا؟ سب سے پہلے مجھ پر اس کے بعد محسن پہ۔" اسی وقت محسن اندر آیا۔ اس نے رابعہ کی پوری بات سن لی تھی اور سب سمجھ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ انکل کے ساتھ موجود رہو، تم دونوں۔" میں نے کہا۔

"مگر اس سے کیا فرق پڑے گا۔ کیا تم انکل کو جھوٹا بناؤ گے؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔ "وہ ہم دونوں سے ذکر کر چکے ہیں۔"

"صرف ذکر کیا تھا یا تمہیں... خود تم نے دیکھا تھا کہ اس میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے ہم بھی ان کے بیان کی تائید نہ کریں؟" رابعہ نے کہا۔ "یہ کہیں کہ ایس پی صاحب! ہم نے تو آپ کے لبوں سے ایک بات سنی تھی، دیکھا کچھ نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم کہ آپ جھوٹ بول رہے تھے یا سچ۔ سوچو ذرا اس کے بعد ان کی نظر میں ہماری کیا عزت رہے گی؟ اس شخص کو زمانہ دیانتدار تسلیم کرتا ہے اور جس کے ہم پر اتنے احسانات ہیں اور جس کے لیے ہم اپنے ہی بچوں کی طرح ہیں، ہم اس کو منہ پر جھوٹا کہہ دیں؟"

"اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں دہرے قتل کے ایک اور جھوٹے الزام میں پھنس جاؤں گا۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "جو راولپنڈی میں درج ہے۔ وہاں میں نے اپنا جھوٹا نام لکھوا دیا تھا اور یہ تائید ایزدی تھی کہ میں اغوا کرنے والوں کی قید سے ہی نہیں، پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد حوالات سے فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ جب تک یہ ثبوت نہ ملے کوئی مجھے وہی مفرور مجرم قرار نہیں دے سکتا، محض صورت کی مشابہت پہ نہیں پکڑ سکتا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں لاہور میں تھا۔"

"بات ثابت کرنے کی نہیں..." محسن نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں کیسے انکار کر سکتے ہیں؟"

"تم تو وکیل ہو رابعہ، مجھے بتاؤ کہ میرے خلاف دہرے قتل سمیت کچھ اور مقدمات راولپنڈی میں درج ہو گئے تو کیا ہوگا؟ تم کہاں کہاں پیروی کرو گی؟ اور کیا اس کے بعد میرے ضمانت پہ رہا ہونے کی کوئی صورت رہے گی؟" میں نے کہا۔

"ضمانت تو ویسے بھی منسوخ ہو چکی ہے تمہاری۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ لیکن انہی مقدمات میں جو یہاں درج ہیں۔" میں نے کہا۔ "شیدے اور عبدل کا کیس تو تقریباً ختم ہو چکا۔ صرف میر شرافت علی کے قتل کا الزام ہے جو اتنا ہی بے بنیاد ہے جتنا یہ راولپنڈی والا الزام۔ مقصد مجھے جیل پہنچانا ہے۔ تم جیل کے اندر کے حالات جانتی ہو۔ میں ایک بار بند ہو گیا تو اس زندگی میں باہر نہیں آ سکوں گا۔ دشمنوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے خلاف اندر ہی اندر مقدمات کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ مجرم اندر پاگل بھی ہو جاتے ہیں، مر بھی جاتے ہیں۔"

"بس بس... اور کچھ مت کہو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کے رونے لگی۔ "لیکن میں یہ جھوٹ کیسے بولوں؟ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی گھر میں رہوں؟" محسن نے اس کے شانے پہ تھپکی دی اور تائید میں سر ہلایا۔

"یہ انتخاب تو تم کو کرنا پڑے گا، اسی وقت۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ انکل رضوی تم دونوں سے وقتی طور پہ بدظن ہو جائیں گے۔ وہ دوبارہ تمہاری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کریں گے اور ان کو بہت صدمہ ہوگا۔ لیکن دوسری طرف تمہارے سچ کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں، راولپنڈی میں دہرے قتل کی واردات میں نے نہیں کی لیکن وہاں کے حالات اور واقعات کی ساری گواہی میرے خلاف ہے۔ سو فیصد۔ مجھ پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا، پولیس افسر پہ تفتیش کے دوران

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حملہ کرنے کا اور تھانے سے فرار ہونے کے الزامات الگ ہیں۔ تم کیا، پاکستان کے بڑے بڑے وکیلوں کا پینل بھی مجھے سزا سے نہیں بچا سکتا۔ ایسے سچ کا کیا فائدہ رابعہ جو کسی بے گناہ کو تختۂ دار تک پہنچا دے۔"

"لیکن یہ جھوٹ بہت مشکل ہے، بہت مشکل۔" وہ روتے روتے بولی۔ "میں خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گی کہ میں نے کیسے جھوٹا کہا۔ تم خود بھی یہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"میرے لیے تمہارا یہ جھوٹ اشد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ میں سچ کو ثابت کرنے کے لیے آزاد رہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے رابعہ تو ان کی گردن تک کیسے پہنچیں گے جو اصل مجرم ہیں جو سب کچھ جانتے ہیں لیکن اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے مجرم بنانے پر کمر بستہ ہیں۔ مجھے قربانی کا بکرا بنانے والے وہی ہیں جو میرے باپ کے قاتل ہیں۔ شہلا کی ماں کے قاتل ہیں۔ نہیں تباہ کر چکے ہیں۔ ان کے دامن پر کتنے بے گناہوں کے لہو کا داغ ہے۔ وہ کس کس کو برباد کر چکے ہیں۔ یہ تم سے بہتر کون جانتا ہے۔ ان کی طاقت کا غرور آخر کون توڑے گا۔ وہ تو اپنے پیسے اور اپنی بدمعاشی کے بل پر سب کچھ کر رہے ہیں اور پھر بھی عزت دار ہیں کیونکہ قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں اس بے بسی کے ساتھ پھانسی نہیں چڑھوں گا رابعہ۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک کو چن چن کے مارے بغیر نہ مروں۔ تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو میں کیا کروں گا؟"

"میں تمہارے ساتھ تختۂ دار تک جا سکتی ہوں، مر سکتی ہوں لیکن یہ نہیں کر سکتی۔" رابعہ روتی رہی۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، تمہارے منہ سے بے وفائی کا طعنہ نہیں سن سکتی۔ تم جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اسی وقت تمہارے ساتھ نکل جاؤں گی اور تم کو کیا ضرورت ہے، میں خود وہ بریف کیس اٹھا لاتی ہوں۔ یہ الزام مجھے قبول ہے کہ رابعہ بھاگ گئی اور سکندر کی خاطر اس نے چوری ہی نہیں کی، اپنی زندگی بھی تباہ کر لی لیکن میں انکل کو اُن کے منہ پر جھوٹا نہیں کہہ سکتی۔"

"نہیں رابعہ نہیں۔ میں جھوٹے الزامات کی یہ گٹھڑی تمہارے سر پر نہیں رکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تمہیں اس لیے مجرم نہیں بنا سکتا کہ تم نے مجھ سے محبت کی تھی۔ میری مدد کی تھی۔ ایسے وقت میں جب خدا کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ اس محبت کی تمہیں پہلے ہی بہت سزا مل چکی ہے۔ باقی سزا مجھے اکیلے بھگتنے دو۔ تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی۔ میرا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔"

"نہ ہو۔ مگر میرا ٹھکانہ وہیں ہوگا جہاں تم ہو گے۔" وہ عزم مصمم کے ساتھ بولی۔ "میں نے تو تم سے پہلے بھی کہا تھا سکندر کہ ہم کہاں تک دشمنوں سے لڑیں گے۔ زندگی تو بہت مختصر ہے اور خوشیوں کی عمر اس سے بھی کم۔"

"میرا جواب اب بھی وہی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بدنامی اور رسوائی کی سند کے ساتھ تمہیں نہیں اپنا سکتا۔ تمام زندگی تمہارے ساتھ گزارنی ہے۔ فرار ہونے کے بعد پکڑے نہ گئے تب بھی خود اپنی نظروں میں تو مجرم رہیں گی اور جو مجرم ہیں وہ فتح کا ڈنکا بجاتے پھریں گے کہ ہے کوئی ہمارے مقابل آنے والا۔ ہم سے کچھ پوچھنے والا۔ وہ چور ہو کے بھی سر اٹھا کے چلیں گے اور ہم بے گناہ ہو کے بھی چوروں کی طرح چھپ کر کسی گمنام گوشۂ زمین میں جئیں گے تو یہ خاک جینا ہوگا! میرے والد کی رُوح کتنی پشیمان ہوگی اور کتنے بے گناہوں کا لہو ہمیں الزام دے گا کہ اتنے بزدل تھے تو مقابلے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈی سلوا اور دلاور نے اچھی منافع بخش پیشکش کی تھی، قبول کر لیتے۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں۔" محسن نے جھنجلا کے کہا۔ "جب تک انکل نے اسے کھولا نہیں تھا بات اور تھی، میں اسے غائب کر سکتا تھا۔ یہ دوسرا بریف کیس بالکل ویسا ہی ہے۔ انکل کو فرق کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن صبح وہ خالی بریف کیس دیکھیں گے تو فرق بھی محسوس کر لیں گے۔"

"اس سے تو بہتر یہ ہے کہ اصل بریف کیس کو خالی کر دیا جائے۔ اس کا تالا تو ٹوٹا ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"الماری کا تالا تو کھولنا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔ "چوری کا الزام تو بہر صورت آئے گا۔"

"لیکن اس بریف کیس پر میری زندگی اور موت کا انحصار ہے محسن!" میں نے کہا۔ "تم چوری کا الزام قبول کر لو یا مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا دو۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔ رابعہ کے لیے بھی یہ الزام قبول کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا تیرے لیے مگر رابعہ عورت ہے۔ اس گھر کے علاوہ رابعہ کا ٹھکانہ بھی کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ رابعہ کا یہاں موجود رہنا ضروری ہے، تاکہ مجھے تازہ ترین صورتِ حالات کا علم ہوتا رہے اور قانونی طور پر رابعہ جس حد تک میری مدد کر سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہ بریف کیس غائب کر دوں گا اور خود بھی غائب ہو جاؤں گا۔" محسن نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ انکل رضوی کیا کریں گے؟ میرے ڈیڈی سے شکایت کریں گے نا، کہ محسن نے سکندر کی مدد کی جو قانون کی نظر میں ایک مجرم ہے۔ میں اعتراف کر لوں گا کہ میں نے ایسا کیا۔ میرے لیے دوستی کا رشتہ زیادہ اہم تھا۔ ہر شخص ایس پی ضامن رضوی جیسا نہیں ہو سکتا۔ رضوی انکل مجھے گرفتار بھی نہیں کروا سکتے۔ ایک تو ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں رہے گا، اس کے علاوہ میرے ڈیڈی ہیں۔ وہ ان کو یہ قدم نہیں اٹھانے دیں گے۔ خودمی کی حالت کے پیشِ نظر انکل رضوی مجبور ہو جائیں گے۔ پھر اگر وہ امانت مجرمانہ کی فردِ جرم عائد کرتے ہیں تو کر دیں۔ مجھے پروا نہیں۔"

"میں اب دربدر ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف شکاری

میرے لیے نئے جال بچھا رہے ہیں، دوسری طرف پولیس کو میری جستجو ہے۔ میرا کام بہت کٹھن ہو گیا ہے لیکن ناممکن اب بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنا کام چھپ کر کرنا ہے۔ تم کو نہ جانے کہاں کہاں میری مدد کرنی پڑے۔ مدد تو تم نے ہمیشہ کی ہے مگر اب تم ایک مجرم کی مدد کرو گے، چوری چھپے۔"

"میں جانتا ہوں، مگر میری نظر میں تو آج بھی وہی ہے جو آج سے سال بھر پہلے یا دس سال پہلے تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تو مجرم نہیں ہے۔ تو واقعی مجرم ہوتا تو شاید میں تیرا ساتھ نہ دیتا لیکن مجھے حقیقت کا علم ہے، تیرے خلاف کتنے مقدمات درج ہیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہیں تو سب جھوٹے مقدمات۔" محسن نے کہا۔ "کیا یہ بات ہمیں معلوم نہیں؟"

"مجھے اپنی تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں۔" میں نے اطمینان اور فخر سے محسن کو دیکھا۔ "خدا کا یہ احسان کیا کم ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور اس نے مجھے اتنے قابلِ اعتماد سہارے فراہم کیے ہیں تو مجھے ناکامی کا ڈر کیوں ہو؟"

"میں بریف کیس لے کر آتا ہوں۔" محسن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تیرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔" اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور غائب ہو گیا۔

"تم اب کہاں جاؤ گے؟" رابعہ نے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں، مگر میں... میں تم سے ملتا رہوں گا۔" میں نے خاموشی کے ایک بوجھل وقفے کے بعد کہا۔ "جب بھی موقع ملا۔"

"اور یہاں میں کیا کروں گی؟" رابعہ نے خلا کو گھورتے ہوئے کہا۔ "محض انتظار کسی امید کے بغیر؟"

"کیا میں کسی امید کے بغیر یہ سب کچھ کر رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"میں تمہاری حوصلہ شکنی کرنا نہیں چاہتی لیکن حقیقت سے نظر نہیں چرائی جا سکتی۔" وہ بولی۔ "پہلے تم سخت حالات اور مشکلات کے جنگل میں تھے۔ اس سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے کرتے تم دلدل میں پھنس گئے ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اپنے حالات کی خرابی کا خود ذمہ دار ہوں؟" میں نے کہا۔ "میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے؟"

"کوئی تمہاری مدد کرنا بھی چاہے گا تو کیسے کرے گا؟" وہ بولی۔ "جب تک تم روپوش رہو گے، عدالتی معاملات میں پیش رفت نہیں ہوگی، میں اور منتظر بے بس ہوں گے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ کہاں ہو اور کس حال میں ہو، یہ کم عذاب ہوگا ہم سب کے لیے۔"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تم سے اور محسن سے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا..."

محسن کے اندر آنے سے میری بات ادھوری رہ گئی۔ "انکل نے غلط کہا تھا۔ وہ بریف کیس لے آیا تھا۔" انہوں نے بریف کیس کھول کے نہیں دیکھا۔ اس کا تالا سلامت ہے۔" اس نے مسرت سے اعلان کیا۔

"پھر کیا مقصد تھا ان کی غلط بیانی کا؟" رابعہ نے سر اٹھا کے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ تم سے اعتراف کروانا چاہتے تھے کہ بریف کیس سکندر کا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ان کا خیال ہوگا کہ اس طرح کچھ اور باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ مثلاً یہ کہ سکندر کہاں ملا تھا اور اب کہاں ہے؟ اس نے بریف کیس کیوں دیا تھا۔ یہ ٹرک تھی اُن کی۔"

رابعہ کا مایوس چہرہ امید کی روشنی سے دمکنے لگا۔ "اچھا ہوا جو میں اپنی بات پر قائم رہی کہ بریف کیس میرا ہے۔"

محسن نے بریف کیس کو بیڈ پر رکھا اور اس کے نمبر ملانے لگا۔ بریف کیس اسی کا تھا چنانچہ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے کھلتے ہی وہ چونکا۔ "سکندر! یہ کیا ہے؟" اس نے سب انسپکٹر کی وردی نکال کے کہا۔ پھر وردی میں سے پولیس کا سروس ریوالور نیچے گرا۔

"اس میں تین ہزار روپے بھی ہوں گے۔" میں نے اطمینان سے کہا اور سامان نئے بریف کیس میں منتقل کرنے لگا۔

"لیکن یہ سب تیرے پاس کیسے آیا؟" محسن نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی۔

"تو سمجھ رہا ہے کہ میں نے اس سب انسپکٹر کو قتل کر دیا ہوگا!" میں نے کہا "اور اس سے سب کچھ چھینا ہوگا۔ یہ وردی، ریوالور اور رقم!" میں نے کن انکھیوں سے رابعہ کو دیکھا۔ رابعہ کا چہرہ پھر بجھ گیا تھا۔

"نہیں... یہ تو نہیں، لیکن اصل بات کیا ہے؟" محسن نے تذبذب کے ساتھ کہا۔

میں نے کم سے کم الفاظ میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اغوا ہونے کے بعد میرے ساتھ ہوا تھا۔ ایک ویران اور غیر آباد گھر میں اپنی اسیری۔ دلاور سے میری ملاقات اور اس کے منصوبے کی تفصیل۔ سیمیں کی موت اور رہائی کے بعد روبی اور پیٹر کے قتل میں ملوث ہونے سے گرفتاری کے بعد تھانے سے فرار ہونے کے واقعات تک۔ یہ باتیں میں نے شہلا کو نہیں بتائی تھیں لیکن رابعہ میری وکیل بھی تھی۔ اسے حقائق کا علم ہونا ضروری تھا۔ محسن ایسا دوست تھا کہ میرے اعتماد کو دھوکا دینے کے بجائے میری جگہ ہنسی خوشی سزائے موت بھی قبول کر سکتا تھا۔ اتنا ہی اعتماد انہیں مجھ پر تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ میری کوئی بات ان کے لیے قابلِ اعتبار نہیں ہو گی۔

"اسلام آباد میں تیری زوجہ نے کمال کیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے میری تلاش میں آنے والوں کو بُری طرح جھاڑا۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ کام تو تیری زوجہ بھی کرلے گی یہاں" محسن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رابعہ کا رنگ لال پڑ گیا۔

میری بات ختم ہونے تک محسن نے اپنے بریف کیس کا مونوگرام نئے بریف کیس پر چپکا دیا تھا۔ نیا بریف کیس بھی اب بالکل نیا نہیں رہا تھا کیونکہ میں اسے زمین پر رکھ کے جوتوں سمیت اس پر چڑھ چکا تھا۔ میری موجودگی میں ہی رابعہ نے اس میں اپنی کچھ فائلیں رکھیں۔ اپنا ایک رومال ڈالا اور محسن نے اس کو کھولنے کا نمبر پوچھا جو ہم دونوں ایک ہی رکھتے تھے۔ سات سو چھیاسی۔ پھر محسن بریف کیس کو رکھنے گیا۔ رابعہ نے اٹھ کر اپنی الماری کھولی اور اس کے سیف میں سے نقد رقم نکالی۔

"یہ پانچ ہزار روپے ہیں۔" اس نے رقم میرے سامنے رکھ کے کہا۔

"ابھی مجھے یہ تین ہزار کافی ہیں۔" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "ضرورت پڑے گی تو لے لوں گا۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ ضرورت کہاں پڑے گی اور اس وقت تم کسی سے مانگ سکو گے یا نہیں۔" وہ ایک چیک لکھتے ہوئے بولی۔ "یہ چیک بھی رکھ لو۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں صرف دس روپے چھوڑے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "تم خود کیا کرو گی؟ اور میں کیا کروں گا اتنا پیسہ رکھ کر۔"

"اس سے اپنا خفیہ اکاؤنٹ کھول لینا۔" وہ بولی۔ "جہاں سے تم ضرورت پڑنے پر آسانی سے رقم نکلوا سکو۔ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں پڑی رہے یا تمہارے اکاؤنٹ میں، بات تو ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔ میری آمدنی بھی ہے اور انکل رضوی کے علاوہ محسن میری ضرورت پوری کرنے کے لیے موجود ہے۔ تم اکیلے ہو، اس لیے تمہارے ساتھ پیسہ ہونا چاہیے۔ پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔ بگڑے کام بنا سکتا ہے اور مشکل میں کام آسکتا ہے۔"

اس کی دلیل میں بہت وزن تھا مگر اس سے زیادہ قیمت اس کے خلوص کی تھی۔ چیک تو کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ اس پہ لکھے ہوئے اعداد و شمار بھی محبت کی اس مہر کے بغیر بے وقعت تھے جو رابعہ نے اپنے دستخط کی صورت میں چیک پر ثبت کر دی تھی۔ "بات تو ایک ہی ہے۔" اس نے اتنی اپنائیت اور یقین کے ساتھ کہا تھا کہ میں چیک لینے پر مجبور ہو گیا لیکن میں رابعہ کی محبت کا جواب اپنی محبت کے والہانہ جذبات سے نہ دے سکا۔ اس سے پہلے ہی محسن لوٹ آیا۔

"اب تو جا۔" اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "اس وقت بال بال بچا ہوں میں۔ چابیاں تکیے کے نیچے رکھ کر نکل رہا تھا کہ انکل آگئے۔ دروازے میں ٹکر ہوئی۔ کہنے لگے کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ذرا اس بدمعاش سے پوچھو اس کے ہمدرد بن کر۔ پولیس کو شاید وہ کچھ نہ بتائے۔ میں نے فوراً کہا کہ یہی اجازت تو میں آپ سے لینے آیا تھا۔"

"دیکھو محسن۔" میں نے بریف کیس اٹھا کے نظروں ہی نظروں میں رابعہ کو الوداع کہا۔ "کیا تو اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو رضوی صاحب نے فراہم کر دیا ہے؟ تھوڑا سا ڈراما کرنا پڑے گا۔"

"کیسا ڈراما؟" محسن نے کہا۔ "پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں ہے، صاف بات کرو۔"

"تو اسے موقع دے کہ وہ تجھے ناک آؤٹ کر کے فرار ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "اس سے وعدہ کرنا کہ وہ باقی پانچ کے نام پتے بتا دے تو اس کی رہائی ہو سکتی ہے۔ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے اس کے ہاتھ پیر کھول دینا۔ باقی کام وہ خود کرلے گا۔ اس سے اسلحہ تو لے لیا ہو گا۔ وہ ایک ہاتھ مارے گا تو فوراً لیٹ جانا۔ آدھے پونے گھنٹے میں رضوی انکل کو خود معلوم ہو جائے گا کہ جسے انہوں نے افسر تفتیش مقرر کیا تھا وہ اس کام کے لیے کتنا موزوں تھا۔"

رابعہ اور محسن نے پہلے ایک دوسرے کو اور پھر مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ "مطلب یہ کہ مار کھاؤں۔ مجرم کو فرار ہونے دوں اور اس کے بعد انکل کو جواب دہی کروں؟" محسن بولا۔

"جواب دہی کیسی؟ خود انہوں نے ہمدرد بننے کے لیے کہا تھا۔ تو نے ہمدردی میں اس کے ہاتھ کھول دیے تھے اور اسے سگریٹ پیش کی تھی۔ اس نے ناجائز فائدہ اٹھا لیا۔" میں نے کہا۔ "ظاہر یہی کرنا جیسے تیرا سر اس بدمعاش کی ضرب سے خاصا مجروح ہوا ہے، اندرونی طور پر۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کی فکر میں پڑ جائیں گے۔"

"اور اس مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر کے تجھے کیا ملے گا؟" محسن نے کہا۔

"جب وہ فرار ہو گا تو سامنے والے حصے کا رخ نہیں کرے گا جدھر مین گیٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ساتھ والی دیوار پھاندے گا۔ ادھر میں اس کو کیچ کر لوں گا اور پھر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر پولیس اسے لے گئی نا تو چھڑانے والے اسے ضمانت پر چھڑا کے لے جائیں گے۔ اس نے چوری کی ناکام کوشش کی ہے، چوری نہیں کی۔ تیرے اور رابعہ کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہو گا کہ وہ مجھے اغوا کرنے والے گروہ کا رکن ہے۔ لا اور اینڈ کمپنی کی طرف سے پیش ہونے والا کوئی بہت بڑا وکیل اس الزام کو بے بنیاد ثابت کر دے گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیشہ کی طرح اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلنے سے پہلے ہی وہ اسے خاموش کر دیں۔"

"اور تو اس کا کیا کرے گا؟" محسن نے کہا۔ "کہاں لے جائے گا اسے؟"

"تفتیش کے لیے۔" میں نے کہا۔ "طریقہ میرا اپنا ہو گا جو میں نے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔"

محسن کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کا ذہن تمام مثبت اور منفی پہلوؤں

کا جائزہ لے رہا تھا۔ کامیابی اور ناکامی کے امکانات پر غور کر رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اتنا بڑا خطرہ مول لینا عقلمندی ہے یا بیوقوفی۔ پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ رابعہ مجھے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک میں دیوار پر سے دوسری جانب نہیں اتر گیا۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ میں نے بریف کیس کو پھر پہلے والی پوزیشن میں دیوار سے لگایا اور اس کے اوپر چڑھ گیا۔ رابعہ اب بھی نیم روشن دریچے میں تصویر بنی کھڑی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق محسن کو میرے پلان پر عمل درآمد میں دس پندرہ منٹ بہرحال درکار تھے۔ تشویش مجھے تھی تو صرف محسن کی طرف سے۔ محسن اسے آزاد کرتے وقت محتاط تو رہے گا لیکن اس کے باوجود رہائی پانے کے بعد اس بدمعاش نے بے رحمی کا مظاہرہ کیا اور بے ہوش کرنے کے بجائے محسن کو ختم کرنا چاہا؟ نہیں۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ محسن اتنی آسانی سے نہیں مارا جائے گا۔ وہ مفرور ہونے والے کی نیت بدلتے دیکھے گا تو اپنا دفاع کرے گا۔ اسے پھر پکڑوا دے گا۔ محسن کی مدد کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتا۔ اسے شک تو ہو گا کہ دشمن اچانک مہربان کیسے ہو گیا۔ ممکن ہے وہ پانچ غلط نام اور پتے بتا دے اور محسن کو اس کی خواہش کے مطابق "ناک آؤٹ" کر کے نکل آئے۔

میری پریشانی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت میں اپنے قیدی کو کہاں لے کر جاؤں گا اور کیسے لے کر جاؤں گا۔ اتنی رات گئے کسی سواری کا ملنا محال تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مجھے رات کے پہریدار دیکھ لیں اور شک میں پڑ جائیں کیونکہ مجھے اس کو کندھے پر ڈال کے ہی لے جانا تھا۔ میں صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا مجرم کے فرار کا راز افشا ہونے سے پہلے کرنا تھا۔ ممکن ہے پندرہ بیس منٹ بعد ہی رضوی صاحب تفتیش کے نتائج معلوم کرنا چاہیں اور محسن کو "بے ہوش" پڑا دیکھ لیں۔ اس کے بعد جو افراتفری پھیلے گی اس میں مفرور ملزم کی تلاش بھی ہو گی۔ اسے گھر کے اندر باہر، باغ میں اور آس پاس کے گھروں میں دیکھا جائے۔ میرے لیے ضروری ہو گا کہ اس سے قبل ہی نکل جاؤں۔

مجھ پر انتظار کا ایک ایک لمحہ اس وقت بھاری محسوس ہونے لگا تھا کہ عقبی حصے کی جانب میں نے ایک سایہ سا متحرک دیکھا۔ وہ دبے پاؤں تیز تیز قدم اٹھاتا دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے کیچ کرنے کے لیے مجھے فوراً اپنی پوزیشن تبدیل کرنی پڑی۔ جب وہ دیوار پر چڑھا تو میں نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے چھلانگ نہیں ماری بلکہ الٹا ہو کے ہاتھوں کے سہارے نیچے لٹکا۔ اسی وقت میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ اسے حیران ہونے اور یہ سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا کہ اس کی رہائی درحقیقت دوسری قید تھی۔ میں نے اس کے نرخرے پر وار کیا اور وہ ڈھیلا پڑ کے مجھ پر جھول گیا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا۔ اسے کندھے پر یوں ڈالا کہ اس کی دونوں ٹانگیں میری پشت کی جانب لٹکتی رہیں۔ باقی دھڑ اور دونوں ہاتھ آگے رہے۔ کسی توقف کے بغیر میں کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اس شخص کا وزن کافی تھا لیکن اسے خود اٹھا کے لے جانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔

محسن کس حد تک کامیاب رہا تھا، اس کا فیصلہ قیاس کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تو میرا جلد از جلد اس بنگلے سے دور چلے جانا ضروری تھا۔ سڑک بالکل اندھیری تھی۔ آخری دنوں کا چاند بھی غائب ہو چکا تھا۔ سو قدم کا فاصلہ طے کرتے کرتے میرا سانس پھول گیا۔ پھر دائیں جانب دیوار کا وہی شگاف آ گیا جو میرے اغوا کرنے والوں نے کار ٹکرا کے بنایا تھا۔ میں نے بے ہوش کو اس دیوار کے پیچھے ڈال دیا۔ اس کے لیے مجھے سنبھل سنبھل کر ملبے کے ڈھیر کو عبور کرنا پڑا۔ میرا پیر ذرا بھی لڑکھڑا جاتا تو پاؤں میں موچ آ جاتی۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اس قیدی کو کس محفوظ مقام پر منتقل کروں اور اسے کیسے لے جاؤں۔ صبح کا اجالا پھیلنے تک میں اسی جگہ انتظار کرتا تو خود بھی پکڑا جاتا۔ ایک ڈر یہ بھی تھا کہ میں کہیں سے ٹیکسی پکڑ لایا تو ٹیکسی والا اس بے ہوش سواری کو دیکھ کر پریشان ہو گا یا شکوک میں مبتلا ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ انکار کر دے اور میں زبردستی کروں تو ہنگامہ کرے۔

رات کا باقی حصہ منظر کے گھر گزارا جا سکتا تھا۔ وہ صبح ہونے سے دو گھنٹے قبل اٹھے گا تو حسبِ عادت شور مچائے گا کہ خود تو شترِ بے مہار کی طرح لاوارث پھر رہا ہے، شادی شدہ لوگوں کی ازدواجی زندگی کیوں خراب کرتا ہے لیکن اسے تمام حالات بتانے ضروری تھے۔ صبح اس کے کورٹ جانے تک کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں نہا دھو کے ناشتا بھی کر سکوں گا اور اس کے بعد دیکھی جائے گی کہ اپنا ہیڈ کوارٹر عارضی طور پر کہاں قائم کیا جائے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام پہلے کرنا تھا چنانچہ میں نے بریف کیس میں سے ریوالور نکالا اور پتلون کی جیب میں رکھ کے بے سدھ پڑے ہوئے شخص کا معائنہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی اس کا آدھے گھنٹے تک ہوش میں آنا مشکل تھا لیکن میں نے احتیاط بہتر سمجھی۔ اس کی قمیص پھاڑ کے میں نے ایک حصے کو دونوں پیر باندھنے کے لیے استعمال کیا اور دوسرے کو ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنے کے لیے۔ بنیان اس کے منہ میں ٹھونسنے کے کام آیا۔

قیدی کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے نہر کی سمت چلنا شروع کیا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ چلنے والی سڑک بالکل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سنسان تھی اور گدلا پانی بالکل خاموشی سے نہر میں بہتا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے آمدِ صبح کا اعلان کرنے والے مرغ بھی ابھی خاموش تھے، سائیکلوں اور ریڑھیوں پر دودھ لانے والے اور اخبار لے جانے والے بھی نمودار نہیں ہوئے تھے تو اس سڑک پر ٹیکسی کہاں سے آتی۔ میں دھر مپورے کے پُل کی جانب چلتا گیا۔ ابھی میں پُل تک پہنچا نہیں تھا کہ مجھے پیچھے سے پڑنے والی ہیڈ لائٹس نے کسی گاڑی کی آمد کی اطلاع دی۔ میں رُک گیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس کی خیرہ کن روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے بڑی بے قراری سے ہاتھ ہلا کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹیکسی نہیں تھی۔ کوئی پرائیویٹ کار تھی۔ میرے شریفانہ حلیے نے یا میری اضطرابی کیفیت نے ڈرائیور کو بریک لگانے پر مجبور کر دیا اور کار مجھ سے بیس گز آگے جا رکی۔ میں دوڑ کر ڈرائیور کے پاس پہنچا۔ وہ تقریباً تیس سال کا خاصا صحت مند جوان تھا۔ اسے خود پر اعتماد نہ ہوتا تو اس سنسان سڑک پر کسی اجنبی کے لیے کبھی نہ رُکتا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے رعونت آمیز سخت لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیے پلیز۔ میری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "اور بدقسمتی سے میری گاڑی کا بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ دوسری سواری کوئی نہیں مل رہی ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن میری ماں کو فوراً ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ مر جائے گی۔"

بریک ڈاؤن کسی بھی کار کا ہو سکتا ہے۔ یہ بات سب کار والے جانتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ان پر بھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب ان کو مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ خواہ مدد صرف اتنی ہو کہ گاڑی کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کر دیا جائے چنانچہ کار والوں کے درمیان اشتراکِ باہمی کے جذبات بہ بدل یا بسوں میں سفر کرنے والے "بے کار" لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ملتے ہیں۔ ایک ذہنی، معاشی اور معاشرتی فرق کے باعث کار والے اور "بے کار" صرف اپنے جیسوں کی مدد کرتے ہیں۔

"آل رائٹ۔" وہ بولا۔ "میں ڈیوٹی سے آ رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں لیکن میں تمہاری مدد کر دوں گا۔" اس نے دروازہ کھول کے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا کہ ٹائر فٹ پاتھ کے کنارے سے دور ہیں اور پیچھے کوئی پتھر یا کھمبا نہیں ہے۔ جب اس نے دوبارہ میری طرف رُخ کیا تو ریوالور کا رُخ اپنی طرف دیکھ کے ہونق سا رہ گیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ ریوالور ہے۔" میں نے اُسے انگریزی میں سمجھایا۔ "اس میں چھ گولیاں ہوتی ہیں۔ آدمی عموماً ایک ہی سے مر جاتا ہے اور اتنے کم فاصلے سے تو نشانہ خطا ہونے کا چانس ہی نہیں۔ مجھے یہ کار چاہیے۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا ڈاکو ایسے سوٹ پہن کر گھومنے لگے ہیں اور اتنے شریفانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ بہت اچھے ایکٹر ہو تم۔"

"تھینک یو۔ جس دن اس پیشے سے آمدنی نہ رہی، میں کسی فلمساز سے بات کر دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس وقت بھی فلم انڈسٹری میں میرے جیسے ہی ہیں۔ اب آپ خود اُترنا پسند کریں گے یا میں آپ کو باہر پھینک دوں۔ میرے پاس وقت کم ہے۔"

"ہاں۔" نیچے اُتر کے اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ "تمہاری ماں مرنے والی ہوگی نا۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"وہ اس وقت مر گئی تھی جب میں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔" میں نے اس کی جگہ کھسکتے ہوئے کہا۔ "اب میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں، بالکل مفت۔ گاڑی آپ کو شام چھ بجے میاں میر صاحب کے قبرستان کے دروازے پر کھڑی ہوئی مل جائے گی۔ چابیاں گلوز کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔ اس میں سے ایک چیز بھی غائب نہیں ہوگی۔ اس لیے آپ شام تک گزارا کر لیں اور پولیس کے پاس رپورٹ لکھوانے نہ جائیں۔ بہت وقت ضائع کریں گے وہ آپ کا۔ گاڑی مل جائے گی تب بھی اے سی ایم سے ریلیز آرڈر لیے بغیر آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔ دوڑ دھوپ اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر آپ نے کنجوسی سے کام لیا تو ممکن ہے وہ ٹائر بدل دیں۔ ٹیپ نکال لیں یا کاغذات غائب کر دیں۔ جذبات سے نہیں، عقل سے کام لیں۔ آپ تو مجھے شریف آدمی تسلیم نہیں کریں گے لیکن میری طرف سے یہ شریفانہ وعدہ ہے۔ ورڈ آف آنر۔ تھینک یو سر اور خدا حافظ۔ اور ہاں۔ کار کسی واردات میں بھی استعمال نہیں ہوگی۔ ڈرنے کی بات نہیں۔" وہ دم بخود کھڑا اُلوؤں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا۔ اس نے کاریں چھینے جانے کی خبریں تو بہت سُنی اور پڑھی ہوں گی لیکن اس قسم کی گفتگو کبھی نہیں سُنی ہوگی۔ "کوئی فون نمبر ہے آپ کا تو بتا دیں۔ ممکن ہے میں خطرہ محسوس کروں تو کار کو کسی اور جگہ چھوڑ دوں اور آپ کو اطلاع دے دوں۔"

اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ "معلوم نہیں، تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ مگر یہ لو۔" اس کے پُرسکون لہجے نے مجھے مطمئن کر دیا کہ ذہنی طور پر وہ میرا مشورہ قبول کر چکا ہے۔

میں نے یوٹرن میں گاڑی کو موڑا اور اسپیڈ ایک دم بڑھا دی۔ پھر بانسوں والی سڑک پر مُڑ گیا۔ وہ ٹیل لائٹ دیکھتا رہتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی جہاں میرا قیدی پڑا تھا اور کار کا مالک ایتھلیٹ ہوتا تو دوڑ لگا کے چند

منٹ میں میری روانگی سے قبل ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ کار روکنے کے بعد بھی میں نے اس امکان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا اور گاڑی سے اُتر کے دو منٹ میں قیدی کو اٹھا لیا۔ اسے پیچھے والی نشست کے بجائے میں نے ڈکی میں بند کیا اور گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ وہ نئی ٹویوٹا کرونا تھی۔ اسی سال کا ماڈل۔ مضبوط اور طاقتور انجن والی لیکن بالکل خاموش۔

منظر کے گھر پہنچتے پہنچتے مجھے ساڑھے چار ہو گئے تھے۔ میں نے گاڑی کو پچاس قدم دُور پلاٹ کے وسط میں کھڑا کیا جس کے تین طرف دوسرے گھروں کی دیوار نے احاطہ کر رکھا تھا۔ ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے تقریباً دس گز لمبی رسی نظر آئی۔ محتاط لوگ ایسی کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں جس سے بریک ڈاؤن کی صورت میں گاڑی کو دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر گیراج تک لے جایا جا سکے۔ اس وقت یہ رسی مختلف کام کے لیے استعمال ہوئی۔ میں نے اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ کسی وقت ہوش میں آ جائے تب بھی لاتیں چلا کے یا ہاتھ مار کے کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔ ڈکی لاک کر کے میں نے بریف کیس میں سے پولیس کی وردی نکالی اور گاڑی میں ڈال دی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ خالی بریف کیس رکھنے کا بھی کیا فائدہ۔ میں نے اُسے بھی گاڑی میں چھوڑا اور گاڑی کو مقفل کر دیا۔

ابھی میں پلٹا ہی تھا کہ فاکس ویگن کی مخصوص آواز کے ساتھ ہی چمکتے ہوئے لال رنگ والی گاڑی زدم سے گزر گئی۔ فرق چند ثانیوں کا تھا۔ اگر میں کچھ آگے ہوتا تو انکل رضوی کی نظر مجھ پر ضرور پڑ جاتی لیکن وہ سامنے دیکھ رہے تھے۔ غالباً منظر کے گھر کو۔ گاڑی رابعہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ ان کی صرف ایک جھلک دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دونوں اعصابی کشیدگی کا شکار ہوں۔ رات کے اندھیرے میں ابھی صبحِ کاذب کا اجالا بھی شامل نہیں ہوا تھا اور یہ بھی میرے نظر نہ آنے کی ایک وجہ تھی۔ میں نے ان کو اس وقت دیکھا جب گاڑی ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے سے گزر رہی تھی۔

بے اختیار میرے قدم زمین میں گڑ گئے۔ میں نے پلٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور واپس ہوا۔ کسی انجانے خوف کے باعث مجھے خیریت اسی میں نظر آئی کہ اس جگہ سے فوراً نکل جاؤں۔ اس وقت انکل رضوی کا رابعہ کے ساتھ منظر کے گھر آنا بڑی تشویشناک بات تھی۔ کیا انہیں شک ہو گیا تھا کہ بریف کیس بدل دیا گیا ہے؟ محسن اور رابعہ نے حقائق کو چھپاتے ہوئے میری مدد کی ہے؟ لیکن یہ خیال میرے مجرم ذہن کی پیداوار تھا۔ رضوی صاحب یہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ پھر ان کا رابعہ کو یہاں لے کر آنا چہ معنی دارد؟ سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے میرے خیالات کے گھوڑے ہر سمت میں دوڑتے رہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہیں براہِ راست مجھ پر شک ہو کہ میں مجرم کو نکال کر لے گیا۔ محسن نے مجھے صرف شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ظاہر کیا کہ خود مجرم اسے ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا۔ محسن کی اداکاری انہیں قائل نہ کر سکی ہو یا انہوں نے دیکھ لیا ہو کہ محسن کے سر پر کسی چوٹ کا نشان تک نہیں ہے۔ پرانے تجربہ کار اور ذہین پولیس افسر ہیں۔ ان کی نظر دھوکا نہیں کھا سکتی اور پولیس تو ہر قسم کے مفروضات قائم کر لیتی ہے اور سب کو قابلِ قبول سمجھتی ہے۔ رضوی صاحب نے سوچا ہوگا کہ میرے ٹھکانوں میں سرِ فہرست منظر کا گھر ہے۔ وہ میرا دوست بھی ہے، وکیل بھی اور کوئی ایس ایس پی کیا آئی جی بھی سرچ وارنٹ لیے بغیر اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے غور کیا تو گاڑی ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔ صبح کا دھندلکا افق کو روشن کر رہا تھا۔ سڑکوں پر اب بھی ویرانی کا بسیرا تھا اور گھنے درختوں میں چھپی ہوئی کوٹھیاں بے صدا تھیں۔ اذانِ فجر کی آواز کہیں بہت دُور سے آئی۔ پھر پیڑوں کی شاخوں میں ہر آشیاں سے پرندوں کی چہکار کا ملا جلا شور پھیلنے لگا۔ میں نے بریک لگا کے گاڑی روکی۔ وہ گھر جو کبھی میرا تھا آج بھی وہی تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے اندر کی ہر خواب گاہ کا، ڈرائنگ روم کا، ان کو ملانے والے راستوں کا، ان کی کھڑکیوں اور دروازوں کا تصور کیا۔ سقف و بام سے دیوار و در تک سب کچھ وہی تھا۔ لیکن اس میں رہنے والے وہ نہیں تھے۔ وہ مجھے کیا، میرے نام کو بھی نہ جانتے ہوں گے۔ ایک بار پھر مجھے وزیر خان کا خیال آیا۔ جب اس نے بحالتِ مجبوری اس برسوں میں شب و روز کی محنت سے تعمیر ہونے والے گھر کی ملکیت سے محرومی قبول کی ہوگی تو اس کے دلی جذبات کی نوعیت کیا ہوگی۔

نہ جانے میں ادھر کیوں آ گیا تھا؟ راستے تو بہت تھے۔ سارے شہر میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لاشعور تھا جس نے شعور کو الجھنوں میں گرفتار دیکھا تو مجھے اس سمت لے آیا۔ ایک نہ ایک دن مجھے یہ گھر پھر آباد کرنا ہے خواہ اس کے لیے مجھے موجودہ مالکوں کو دس گنا قیمت دینی پڑے۔ میں نے گاڑی کو پھر اسٹارٹ کرتے ہوئے عزمِ نو کے ساتھ فیصلہ کیا۔ مجھے اپنا حق حاصل کرنا ہے۔ انصاف کا حق۔ انتقام کا حق۔ وراثت کا حق۔ وزیر خان کے خوابوں کو تعبیر دینے کا حق۔ رابعہ سے وابستہ مستقبل کو حقیقت میں ڈھالنے کا حق۔ وقت کے تجربات نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ حق مانگنے سے نہیں ملے گا۔ مانگنے سے تو کوئی مجھے خیرات بھی نہیں دے گا۔ مجھے اپنا حق چھیننا پڑے گا۔ ان سے جو غاصب ہیں۔ آدمی اب حیوان کی سطح پر آ گیا ہے کہ جینے کا حق بھی لے حاصل ہے جو طاقتور ہے اور یہ فنا و بقا کی جنگ رہ گئی ہے جس میں کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ جو اصولوں اور قانون کا تحفظ مانگے، اسے خود اپنی حفاظت کے لیے نااہل سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر یوں ہے تو یونہی سہی۔ میں بتا دوں گا کہ مجھے ایسے بھی زندہ رہنا آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس کس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے وزیر خان اور مجھ سے وہ سب کچھ چھینا جو اُن کا نہیں تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک ایک سے سب واپس لینا ہے۔ جب غاصب کوئی نہیں رہے گا تو حق خود بخود حقدار کو پہنچ جائے گا۔

اگلا موڑ کاٹنے سے پہلے میری نظر ایک اور جانی پہچانی مگر آسیب زدہ نظر آنے والی اور وسیع و عریض کوٹھی پر گئی۔ یہ نواب خسرو جمشید کا مسکن بھی رہی تھی اور اب اس کے ایک گوشے میں ان کا مدفن بھی تھا۔ ان کی قبر لوہے کی گرل والی چار دیواری کے آخری موڑ پر تھی۔ سنگِ مرمر کے چار ستونوں والی چھت کے نیچے۔ اس کی خانہ ویرانی کا تاثر پہلے کے مقابلے میں زیادہ عبرت آموز ہو گیا تھا۔ گھاس کچھ اور بڑھ گئی تھی اور سائنڈ بند کھڑکیوں اور دروازوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی جن سے کمروں کی تاریکی باہر جھانکتی تھی۔ گیٹ پوسٹ پر لگی ہوئی "قصرِ جمشید" کی پیتل کی تختی اپنی آب و تاب کھو چکی تھی۔ گزشتہ مرتبہ میں محسن کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میری ملاقات ایک ضعیف العمر مالی سے ہوئی تھی لیکن اس وقت میری نگاہ نے ایک تبدیلی کو نوٹ کیا۔ لوہے کا بھاری بھرکم گیٹ جس کے دونوں پٹ زنجیروں سے مقفّل تھے اور برسوں بند رہنے کے باعث جام ہو گئے تھے اس وقت آدھا کھلا ہوا تھا۔ اس کو سنبھالنے والا ایک ستون گر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک پٹ بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔ زنگ خوردہ زنجیر یا قفل کے ٹوٹنے سے دوسرا پٹ نہیں گرا تھا۔ نیچے گرنے والے فرش کی گرل میں مٹی بھر گئی تھی اور اس میں بھی گھاس اُگ آئی تھی۔ ٹوٹنے والے ستون کا ملبہ دوسری طرف پڑا تھا۔ تھوڑی سی احتیاط کے ساتھ میں نصف کھلے گیٹ سے گاڑی گزار کے اندر لے جا سکتا تھا۔ مجھے یہ جگہ اپنی ضرورت کے عین مطابق نظر آئی۔ اس کی وسعت اور ویرانی میں میرا وجود ساری دُنیا سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔

میں نے کار کو بیک کیا اور موڑ کر دونوں طرف سے بچاتے ہوئے اندر لے گیا۔ ایک طرف لوہے کا گیٹ تھا تو دوسری طرف گیٹ پوسٹ کے ملبے پر پڑا ہوا ستون کا نصف حصہ۔ اگر کسی طرف سے گاڑی ذرا بھی لگ جاتی تو اس کی ہموار چمکیلی سطح پر ڈینٹ پڑ جاتا یا پینٹ اُکھڑ جاتا۔ میں نے دیکھا تو دونوں طرف مشکل سے ایک ایک انچ جگہ تھی۔ اگر آگے وہ لوہے کا گیٹ نہیں پڑا ہوتا تو میں سیدھا گزر ہی جاتا لیکن گیٹ کے چوکور سریے ایک ایک انچ موٹے تھے اور ان پر سے گاڑی کے اگلے پہیے گزرے تو مجھے یوں لگا جیسے میں ریلوے لائن کے درمیان سلیپروں پر ڈرائیو کر رہا ہوں۔ گاڑی نے جھٹکے لیے اور اسٹیرنگ وھیل اِدھر سے اُدھر ہوا تو پچھلا حصہ لوہے کے گیٹ سے چھو گیا۔ میں نے آگے جا کے گاڑی روکی اور نیچے اُتر کے دیکھا تو ٹیل لائٹ کے ساتھ والا حصہ پچک گیا تھا اور ٹیل لائٹ کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ غریب مالک کے لیے پانچ سو روپے چھوڑ دوں گا تاکہ جو کوفت اور پریشانی اسے ایک دن کار کے بغیر گزارنے سے ہوئی اس کا بھی ازالہ ہو جائے اور وہ اپنی نئی نویلی دُلھن جیسی کار کو پھر پہلے جیسا بنوا لے۔

گزشتہ بار مالی ہماری باتوں کی آواز پر یوں آ گیا تھا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گاڑی کی آواز پر بھی نمودار نہ ہوا۔ میں نے ہارن دیا اور انتظار کیا۔ پھر گاڑی کو قصرِ جمشید کے عقبی حصے میں لے گیا۔ ہر روش اور راستے پر گھاس اور خودرو پودے قابض تھے۔ مگر وہ اینٹوں سے بنی حاشیے جیسی چھ انچ اونچی لکیر اب بھی راستوں کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں گھوم کر پیچھے پہنچا تو مجھے قدرے غریبانہ اور مختصر عمارت کا ملبہ نظر آیا۔ اس کے دو ہی کمرے سلامت کھڑے تھے۔ یہ دونوں گیراج تھے۔ ایک میں اُنیس سو چالیس کے ماڈل کی کار کا زنگ خوردہ، مٹی سے اَٹا ہوا ڈھانچہ کھڑا تھا جس کے ٹائر فلیٹ تھے لیکن شیشے بند تھے اور دروازے مقفل تھے۔ شاید بیس پچیس سال سے یہ کار اسی حالت میں اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ باقی عمارت سرونٹ کوارٹر معلوم ہوتی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان اینٹوں کا ملبہ اور آدھی ادھوری بے چھت کی دیواریں۔ منہدم ہو جانے والی دیواروں سے لوگ کھڑکیاں اور دروازے نکال کر لے گئے تھے۔ بظاہر اب "قصرِ جمشید" روحوں کا مسکن رہ گیا تھا۔ ماضی کا ایک لاوارث مزار۔ میں نے ایک بار پھر ہارن دیا کہ مالی اگر ایک کنال پر پھیلی ہوئی عمارت کے کسی ایک کمرے میں مقیم ہو تو باہر آ جائے مگر اندر سے کوئی نہیں نکلا تو میں نیچے اُترا۔ آخر وہ مالی کہاں گیا جس نے مجھے اور محسن کو بتایا تھا کہ اصل نواب خسرو جمشید کو انتقال کیے زمانہ ہوا اور ان کے وارث جو صرف نام کے وارث تھے دس سال قبل انگلستان ہجرت کر گئے تھے تو وہیں کے ہو رہے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے خسرو پرویز نے وہیں شادی بھی کر لی تھی اور آٹھ سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔

کار ایسی جگہ کھڑی تھی کہ سڑک پر سے کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کار کی ڈکی کھولی اور اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا مگر تین گھنٹے تک دست و پابستہ ڈکی میں پڑے رہنے سے نیم جاں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھولے تو وہ مجھے خوف کے باوجود ایسی خونی نظروں سے گھورتا رہا کہ دلی جذبات اس کی صورت پر تحریر بن گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی اسے اُٹھنے میں کچھ دیر لگی۔ دورانِ خون میں رکاوٹ کے باعث اس کے ہاتھوں اور پیروں میں دَم نہ رہا تھا۔

"آپ خود تشریف لائیں گے یا میں آپ کو گھسیٹ کر نکالوں؟" میں نے طنز آمیز پُرتمسخر لہجے میں کہا۔

رومال منہ سے نکال کر آہستہ آہستہ وہ دونوں ہتھیلیاں فرش پہ ٹکا کے اُٹھا۔ ٹانگوں کو دو تین مرتبہ حرکت دی اور ڈکی سے اُتر آیا۔ ایک بار لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں سکندر بابو" اس نے لمبے لمبے سانس لے کر کہا۔

"وہ تمہارا ساتھی تو بہت بے وفا نکلا" میں نے کہا۔ "تمہارے گرفتار ہوتے ہی بھاگ گیا۔"

"آئے گا، وہ بھی آئے گا اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمہاری خبر لینے۔" وہ بولا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم پہلے سے یہاں موجود ہوں گے سب کا استقبال کرنے کے لیے۔ اتنی بڑی حویلی ہے۔ سب کو الگ الگ کمروں میں دفن کرنا پڑا تب بھی جگہ کم نہیں ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی پھرتی سے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ ڈکی سے ٹکرا کے اُچھلا اور نیچے گر گیا۔ میں نے نیچے جھک کر اُس کو بالوں سے اٹھایا اور پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "اندر چلو۔ پہلے تمہارا کریا کرم ہو جائے۔" میں نے اُسے آگے دھکیلا۔ میں نے ایک دروازے کے ٹوٹے شیشے میں ہاتھ ڈالا اور جام ہو جانے والی کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی لیکن زنگ نے چٹخنی کو تقریباً ویلڈ کر دیا تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑا تھا مگر مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ میری کِک نے اس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس میں اتنی جسمانی قوت ہی نہ تھی کہ مجھ پر حملہ کر سکے۔

دروازے کو کھولنے کی اب یہی ایک صورت تھی کہ میں دھکا مار کے گلے ہوئے قبضوں کو پٹ سے جُدا کر دوں یا چٹخنی نکال دوں۔ دروازہ اتنی مضبوط لکڑی کا اور اتنا بھاری تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کندھے سے ایک ٹکر ماری۔ دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوسری مرتبہ زیادہ قوت صرف کی اور دروازہ کچھ اندر کی طرف جُھکا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے مسلسل دائیں اور بائیں شانے کو باری باری استعمال کیا۔ دروازہ جھولنے لگا تھا اور شاید اگلی ٹکر سے نیچے جا پڑتا لیکن اسی وقت کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ ضرب نے مجھے چکرا دیا تھا۔ اس بدمعاش نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کے پتھر اٹھا لیا تھا اور مجھ پر کھینچ مارا تھا۔ پتھر خاصا بڑا تھا اور نشانے پر بھی لگا تھا مگر بہت کم قوت کے ساتھ پھینکا گیا تھا۔ اس کے جسم کی توانائی میرے برابر ہوتی تو اسی پتھر سے وہ میرا سر پاش پاش کر دیتا۔ میں نے دَم لینے کے لیے دروازے کا سہارا لیا اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے ہر چیز آؤٹ آف فوکس ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے دوسرے پتھر کے لیے رینگتے ہوئے اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اُٹھا تو میں نے اپنے سر کو جھٹکا، پتھر زَن سے گزرا اور میرے سر کو مس کرتا ہوا دروازے پر جا لگا۔ اس دوسرے پتھر کو پھینکنے میں اس نے اپنی تمام قوت صرف کر دی تھی۔ اگر نشانہ خطا نہ ہوتا تو مجھے اس کی طرف سے غافل رہنے کی بہت سخت سزا ملتی۔ دو منٹ میں میرے حواس بحال ہو گئے۔ میں اٹھ کے اس کی طرف بڑھا۔ میرے جارحانہ عزائم کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی بے رحمی سے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ زمین پر ہی لڑھک گیا۔ میں نے دوسری کِک اس کی پسلیوں میں ماری۔ وہ بلبلایا اور دُہرا ہو گیا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دروازے پر دے مارا۔ دروازہ بڑی آواز کے ساتھ اندر گرا۔ خالی کمرے میں اس کی گونج کے ساتھ ہی اس شخص کی آخری چیخ بلند ہوئی۔ میں نے اندر قدم رکھنے کے بعد نیچے بیٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا اور نبض کی رفتار کچھ کم ضرور تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بھاری بھرکم دروازہ اس کے اوپر نہیں گرا تھا ورنہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور شاید وہ مر جاتا۔

کمرے کے فرش پر گرد تھی۔ تنکے تھے اور اُن پرندوں کی بیٹ کے ڈھیر تھے جو اس وسیع و عریض کمرے کی بلند چھت میں آشیاں بندی کیے بیٹھے تھے۔ نہ جانے ان کی کتنی نسلیں اسی ویرانے میں پیدا ہو کے ختم ہو چکی تھیں یا کائنات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے پرواز کر گئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک فانوس کا آہنی ڈھانچہ لٹکا ہوا تھا جس میں نہ شیشہ تھا، نہ ہولڈر تھے اور نہ بلب۔ پنکھوں کی جگہ صرف ان کی لمبی لمبی ڈنڈیاں چھت سے آویزاں رہ گئی تھیں۔ نکالنے والے وہ سب کچھ نکال کر لے گئے جو نکالا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر سے سوئچ بورڈ اور بجلی کے تار تک اتار لیے گئے تھے۔ اگر خسرو پرویز نے ولایت جاتے وقت اس محل میں فرنیچر چھوڑا تھا تو اب اس کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے اندر کے کھلے دروازوں میں سے گزر کے دوسرے کمروں کو دیکھا۔ ان سب کی کہانی ایک ہی تھی۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

میں نے آدھے گھنٹے میں نیچے اوپر کے سب کمرے، باتھ روم، باورچی خانے دیکھ لیے۔ سب کمرے وسعت کے اعتبار سے ہال لگتے تھے۔ سب کی چھت کم سے کم سولہ فٹ بلند تھی۔ بجلی کا کنکشن بہت پہلے ہی کٹ چکا تھا۔ اب اندر پینے کے لیے پانی تک نہ تھا۔ کسی کمرے میں روشنی کا انتظام تک نہ تھا اور کوئی کمرہ اس قابل نہ تھا کہ رہائش کے لیے استعمال ہو سکے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ میں نے لق و دق محل کا نظارہ کر کے سوچا۔ کتنے شوق سے اور کتنے عزم سے نواب خسرو جمشید نے یہ قصر بنوایا اور سجایا ہوگا۔ بنانے والوں اور سجانے والوں نے اس کو نواب صاحب کے ذوق و شوق کے مطابق ڈھالنے میں کتنا وقت صرف کیا ہوگا اور کتنا پسینہ بہا کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کتنا پیسہ کمایا ہوگا؟ لوٹنے والوں نے اسے کیسا لوٹا کہ اندر کہیں کیل تک نہ چھوڑی۔ نہ جانے پیتل کی وہ تختی کوئی کیوں نہیں لے گیا جس پر "قصرِ جمشید" کے الفاظ کندہ تھے۔ اسے سنگِ لوحِ مزار کی طرح چھوڑ دیا۔

اپنے قیدی کو میں نے اُوپر کی منزل پر ایک درمیانی کمرے میں منتقل کیا۔ اگر وہ وہاں چلاتا تب بھی اس کی آواز ان دیواروں کے سوا کوئی نہ سُنتا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے اسے کار کی ڈکی سے رسّی لا کے پھر باندھ دیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نیچے اتر آیا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور بھوک سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے گزشتہ روز دوپہر کے وقت کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد مجھے چائے کی ایک پیالی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کار کو دوبارہ نکالنا ایک اور ڈرائیونگ ٹیسٹ ثابت ہوا لیکن اس مرتبہ میں نے کار پر خراش نہیں آنے دی۔ میری ظاہری حالت سوٹ پہننے کے باوجود ایسی ہو رہی تھی کہ میرا کار میں ہونا ضروری تھا۔ سڑک پر سے گزرنے والے مزدوروں نے اس حویلی سے نکلنے والی شاندار کار کو حیرت سے دیکھا۔ میں نے سمن آباد کے بازار کا رُخ کیا۔

ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتا کرنے کے بعد میں نے کچھ خریداری کی۔ ایک تھرماس میں چائے لے جانی تھی۔ بسکٹوں کے کچھ ڈبے، سگریٹ اور اسپرین لے کر میں نے واپسی اختیار کی۔ اگر مجھے اسی ویرانے میں رہائش اختیار کرنی پڑی تو مجھے اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ پہننے کے کپڑے، دو چار برتن۔ کم سے کم چائے کافی بنانے کا سامان۔ لالٹین اور مٹی کا تیل۔ فرش صاف کرنے کے لیے ایک جھاڑو۔ سونے کے لیے ایک دری اور ایک تکیہ۔ لیکن یہ شاپنگ بعد میں بھی کی جا سکتی تھی۔ پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اپنے قیدی کو زندہ رکھنے کا سامان فراہم کر دوں۔ وہ مر گیا تو میری تفتیش دھری رہ جائے گی۔ جلدی کسی بات کی نہیں تھی۔ میرے کام میں مداخلت کرنے...... والا کوئی نہیں تھا اور میں تہیہ کر چکا تھا کہ نہ اس شخص کو مرنے دوں گا اور نہ قتل ہونے دوں گا۔ میں اس کی زبان سے وہ سب کچھ سُنوں گا جو اسے معلوم ہے۔ اس بار میں نے گاڑی کو سڑک پر چھوڑا اور اندر پہنچا۔ وہ پھر ہوش میں تھا اور آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ اس کے بدن پر صرف بنیان رہ گئی تھی۔ چنانچہ رسّی کے ہر بَل کا نیل، چوٹ کا ہر زخم اور ہر خراش اس کے شانوں، کمر، پیٹ اور سینے پر نمایاں تھے۔ آدمی وہ یقیناً سخت جان تھا اور بزدل بھی نہیں تھا ورنہ میرے سامنے گڑگڑاتا اور مجھ سے رحم کی بھیک مانگتا کہ وہ میرا دشمن نہیں محض حکم کا غلام ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے شکست تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ میں نے اسے آزاد کیا اور کھانے پینے کی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

"اس تھرماس میں چائے ہے۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بسکٹ ہیں اور اسپرین ہے۔"

"تم مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے؟" وہ رُک رُک کر بولا۔ "مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے تم سے چند سوال کرنے ہیں۔" میں نے اپنے بیٹھنے کے لیے رومال بچھا کے کہا اور سگریٹ جلالی۔ "تم اگر مرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہاری موت آسان نہیں ہے۔ تمہیں قتل کرنا ہی ہوگا تو میں خود نہیں کروں گا۔ تمہیں تمہارے ساتھیوں کے حوالے کر دوں گا مگر یہ میری مرضی پر منحصر ہے۔ مجبوری میں بہت سے لوگوں کو میں نے خود ٹھکانے لگایا ہے۔"

اس نے بسکٹ چبانے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے پورا ڈبا صاف ہو گیا۔ وہ بھی میری طرح بھوکا تھا لیکن اس کی جسمانی توانائی مجھ سے زیادہ خرچ ہوئی تھی۔ گرم گرم چائے کے ساتھ اس نے اسپرین نگل لی اور بالکل تازہ دَم نظر آنے لگا۔ "تم سمجھتے ہو میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" وہ بولا۔ "میری زبان آج تک پولیس نہیں کھلوا سکی۔"

"ہماری پولیس واقعی بہت نااہل ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں کر سکتی لیکن میں سمجھتا ہی نہیں، جانتا بھی ہوں کہ تم میری ہر بات کا صحیح جواب دو گے۔ تم چوہدری دلاور کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"کون چوہدری دلاور؟" وہ بولا۔ "میں تو اپنا نام بھی نہیں جانتا۔"

"لیکن میرا نام جانتے ہو؟" میں نے طنز سے کہا۔ "ایس پی صاحب کے گھر میں کس سے ملاقات کرنے گئے تھے؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کے ہاتھ میں تھام لیا۔

"مسٹر نورمین!" میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے نام سے کوئی غرض نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نورمین بھی نہیں ہو لیکن ایک شام تم نے دیگر پانچ افراد کے ساتھ مل کر مجھے لکڑی کے ایک کریٹ میں پیک کیا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح نقلی نورمین تھے۔ ان میں سے دو مجھے ٹرک میں ڈال کے روانہ ہوئے تھے لیکن لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ باقی تین کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے سگریٹ کو فرش پر رگڑ کے بجھایا اور کھڑا ہو گیا۔ "ابھی وقت ہے، یاد کرو وہ لوگ کون تھے؟" میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ سیدھا بیٹھا اپنے سامنے والی دیوار کو دیکھتا رہا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس میں بھی ایک فانوس کا ڈھانچہ معلّق تھا۔ اس کے ہر سمت پھیلے ہوئے بازو یقیناً پیتل کے ہوں گے لیکن اب لوہے کے ہی نظر آتے تھے۔ میں نے رسّی کا

ایک سرا اوپر اُچھالا اور دوسری طرف سے کھینچ لیا۔ دوسرے سرے کا پھندا بنا کے میں نے رسّی کو کھینچا۔ آہستہ آہستہ گرہ اُوپر پہنچ گئی اور فانوس کو چھت سے معلّق رکھنے والے پائپ کے گرد جم کر سخت ہو گئی۔ وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ اچانک اس نے مجھ پر حملہ کیا لیکن اس بار میں غافل نہیں تھا۔ میں نے لات ماری جو اس کے سینے پر پوری قوّت سے پڑی۔ وہ کراہ کے اُلٹ گیا اور فرش پر جا پڑا۔

"اس رسّی سے میں ایک ایک کو پھانسی دوں گا۔" میں نے کہا اور اسے ٹانگ سے پکڑ کے گھسیٹ لایا۔ رسّی کے جھولنے والے سرے کو میں نے دوبارہ فانوس کے اوپر سے گزارا اور پھر دُہری ہو جانے والی رسّی سے لٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ جب میں نے پھندا بنایا تو اس کی صورت پر دہشت کے آثار پہلی مرتبہ نمودار ہوئے۔ "چلو اٹھو۔" میں نے کسی جلّاد کی طرح اس کے قریب جا کر کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ اُسے یقین آنے لگا تھا کہ میں اُسے پھانسی دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اچانک اس کے سر پر مُکّا مارا۔ وہ چکرا کے گرا تو میں نے اس کے دونوں پاؤں کے پنجے اٹھائے اور رسّی سے باندھ دیے۔ پھر میں نے دوسرے سرے کو کھینچنا شروع کیا۔ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ میں رسّی کھینچتا گیا یہاں تک کہ وہ زمین سے تین فٹ کی بلندی پر اُلٹا جھولنے لگا۔ باقی رسّی کو میں نے ایک دروازے کے ہینڈل سے باندھ دیا۔

"دلاور تم کو چھوڑے گا نہیں...." اُس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور ہاتھوں سے اُوپر اٹھ کے رسّی کو تھامنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ زمین تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور وہ محض جسم کی طاقت سے خود کو اُٹھا کے رسّی کا سہارا بھی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اُسے آہستہ سے دھکیلا اور وہ پنڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

"بہت جلد یاد آ گیا اپنے باپ کا نام۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ کون دلاور؟ اب میں جا رہا ہوں۔ تم اور باتیں بھی یاد کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح جسم کا خون سر کی طرف آ جاتا ہے اور سُنا ہے یہ آسن یادداشت کو بہتر بنا دیتا ہے۔ میں واپس آ کے پوچھوں گا کہ کتنا یاد آیا۔ تم چیخنا چلّانا چاہو تو اپنا شوق ضرور پورا کرو۔ تمہاری آواز بیٹھ جائے گی، کسی کے کان تک نہیں پہنچے گی۔"

میں دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ صبح کے آٹھ بجے تھے۔ کوٹھیوں میں رہنے والے سو کر اُٹھ چکے تھے لیکن باہر سے.... دیکھنے پر کہیں انسانی آبادی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ رہائشی علاقے سے گزرنے والی یہ مختصر اور تنگ سڑک عام آمد و رفت کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی اور بائی لین سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے اس ویران کوٹھی میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو سامنے والی کوٹھی سے ایک کار نکلی اور مخالف سمت میں چلی گئی جسے خود مالک چلا رہا تھا۔ وہ کام پر پہنچنے کی جلدی میں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھ پر نگاہ نہیں ڈالی۔ میں نے ایک شاپنگ لسٹ بنائی اور انارکلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جی پی او کے سامنے گاڑی روک کے میں نے پبلک ٹیلی فون سے رابعہ کو کال کی۔ ریسیور بیگم رضوی نے اٹھایا۔ ہیلو کے جواب میں میں نے کہا کہ رابعہ سے بات کرنی ہے۔

"کون؟ تم سکندر....؟" بیگم رضوی نے میری آواز فوراً پہچان لی۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"سوری آنٹی۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا فون آبزرویشن پر ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن سکندر۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں آپ کے اور انکل کے نقطۂ نظر سے غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے یہی ثابت کرنا تھا کہ اس کے سوا میں اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے آپ سب کی مدد پر بہت بھروسہ تھا لیکن زمانہ بہت خراب ہے آنٹی۔ سیدھی انگلیوں سے گھی پہلے نکلتا ہوگا، اب نہیں نکلتا۔ میری مشکلات میں اضافہ ہوا اور میں الجھتا چلا گیا۔ کیونکہ میرے دشمن غیر قانونی حربے استعمال کرتے تھے۔ اینٹ کا جواب تو پتھر سے ہی دیا جا سکتا ہے۔"

"پتھر تمہاری عقل پر پڑ گئے ہیں۔ تمہیں کسی کا خیال نہیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

"آپ لوگوں کے لیے میرا وجود پریشانیوں کا سبب تھا اور سب کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ کے گھر میں سکون برباد ہو رہا تھا۔ محض میری وجہ سے انکل کشیدگی میں مبتلا تھے اور خطرہ آپ سب کو لاحق تھا۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔ رابعہ کا خیال ہے تمہیں؟" بیگم رضوی نے کہا۔ "کبھی غور کیا اس کی حالت پر کہ وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے؟ آخر کتنی قربانی چاہتے ہو تم اس سے؟ اپنا سب کچھ تو گنوا چکی ہے وہ۔ سوچو ذرا وہ کتنی کامیاب وکیل تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنی مصروفیات تھیں۔ اب کیا ہے۔ نہ کہیں آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی ہے۔ کھو تو کھا لیتی ہے، نہ کھو تو اسے خیال ہی نہیں آتا۔ مجھ سے چھپاتی ہے لیکن کیا اس کی آنکھیں بتاتی نہیں کہ وہ روتی ہے۔ اس کی صحت کتنی گر گئی ہے۔"

"آپ رو رہی ہیں؟" میں نے دل میں اٹھنے والی ٹیس کو دبا کے کہا۔ "ایک ایس پی کی بیوی ہو کے ابھی سے ہمت ہار بیٹھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں؟ رابعہ تو آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں سمجھتا تھا آپ اس کو سنبھال کے رکھیں گی۔ اسے سمجھائیں گی کہ عقل سے کام لے۔ بھلا اس طرح مسائل حل ہوتے ہیں؟"

"میں کسی کو کیا سمجھاؤں۔" انہوں نے کہا۔ "عقل میں تم سب افلاطون ہو۔ کسی کی مانتے ہو؟ جو سمجھانا ہے، اسے خود ہی سمجھا دو۔ یہ امانت کا بار مجھ پر مت ڈالو۔ ایک پولیس افسر کی بیوی کسی مجرم کی امانت دار نہیں ہو سکتی۔"

انہوں نے رابعہ کو آواز دی اور ریسیور رکھ دیا۔ چند منٹ بعد رابعہ نے فون اٹھا لیا۔ "کیا بات ہے سکندر؟" وہ بولی۔

"بیگم رضوی تم سے بہت خفا ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے یا تم سے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم خود جانتی ہو۔" میں نے کہا۔ "آج رات میں تم سے ملنے آؤں گا تو بتاؤں گا۔"

"ایسی حماقت مت کرنا۔" وہ بولی۔ "یہاں پھر گارڈ پوسٹ کر دی گئی ہے اور غالباً سادے کپڑوں والے بھی ہیں جو باہر سے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے ہیں۔ میں خود آ جاؤں گی۔ کہاں ملوگے تم؟"

"شام چھ بجے میاں میر صاحب کے قبرستان آ جانا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی رکھنا۔ میں چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان کسی وقت بھی آ بیٹھوں گا۔ یہ بتاؤ تم آج صبح وم انکل کے ساتھ منظر کے گھر کیوں گئی تھیں؟"

"انکل کو شک تو ہے کہ ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "اور ہم نے ہی تم کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ اچانک ان کو منظر کے گھر چھاپا مارنے کا خیال آ گیا۔ تم کو کس نے بتایا؟"

"میں نے دیکھا تھا۔ اگر انکل صرف پانچ دس منٹ بعد آتے تو ان کا چھاپا کامیاب رہتا۔" میں نے کہا۔ "میرا ارادہ ان سے ملنے کا تھا۔ تمہاری گاڑی میرے قریب سے گزر گئی۔ میں منظر کے گھر سے پچاس قدم دُور تھا لیکن اندھیرے میں تھا۔ کیا بتایا منظر نے؟"

"وہ کیا بتاتا؟ حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔" رابعہ نے کہا۔ "کہنے لگا ایس پی صاحب بن کر آئے ہیں تو سرچ وارنٹ دکھائیے۔ ویسے آپ سکندر اور رابعہ کے انکل ہیں تو میرے بھی انکل ہی ہوئے۔ آپ کا گھر ہے شوق سے دیکھیے۔ میں ہر الماری اور صندوق بھی کھول کے دکھا سکتا ہوں۔"

"محسن کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔ "اس پر شک تو نہیں ہوا انکل کو؟"

"نہیں وہ ایکٹر اچھا ہے۔" رابعہ ہنسی۔ "اس نے ملزم کو آزاد کرنے کے بعد چیخ ماری تھی اور اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنے سر پر کپڑے دھونے کا ڈنڈا مار لیا تھا۔ خاصی قوت سے۔ سر میں گومڑ نکل آیا۔ ہم سب نیچے پہنچے تو وہ مکر کیے بے ہوش پڑا تھا۔ انکل پریشان بھی ہوئے اور پشیمان بھی کہ کس نالائق پر بھروسا کیا۔ تفتیش خاک بھی نہیں کی، ملزم کو موقع دے دیا کہ مار کے بھاگ جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے ٹھیک طرح سے باندھا ہی نہیں گیا تھا۔ محسن کے باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے حملہ کر دیا اور بھاگ گیا۔ محسن نے اتفاق کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ انکل نے کہا۔ خدا کا شکر ہے، چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ سر کی چوٹ خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ "مجھے بھی اس کی طرف سے فکر ہے۔ قیدی کو میں لے گیا تھا۔ مگر رابعہ، فون آبزرویشن پر تو نہیں ہے؟ ساری گفتگو ٹیپ ہو جائے گی۔"

"ابھی تک تو نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن نے معلوم کیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ تمہارا فون نہ آ جائے۔ یہ بتاؤ تم خود کہاں ہو اور اس قیدی کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

"شام کو چھ بجے۔" میں نے کہا۔ "محسن کو ساتھ لا سکو تو لے آنا۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

تمام اسبابِ ضرورت گاڑی میں بھر کے اور اپنا پنچ ساتھ لے کر میں واپس قصرِ جمشید پہنچا تو ساڑھے دس بجے تھے۔ اب مجھے شام پانچ بجے تک باہر نہیں جانا تھا۔ چنانچہ میں کار کو اندر لے گیا اور عقبی حصے میں کھڑا کر دیا۔ سوٹ کیس، تیل کا چولہا، برتن اور چائے بنانے کا سامان میں نے نیچے والے پہلے ہی کمرے میں ڈال دیا۔ اپنے ساتھ میں صرف ایک دری، تکیہ اور جھاڑو اوپر لے گیا۔ قیدی کی حالت ابتر تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔

میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ "اپنا نام یاد آیا؟" میں نے کہا۔ "دوستوں کے نام یاد آئے؟"

"میں... میں بتاتا ہوں۔" وہ چلّایا۔ "سب بتا دوں گا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سب پُرانے حربے ہیں۔ تم کو دم لینے کی مہلت چاہیے۔ میں نے تمہیں چھوڑ دیا تو سنبھلتے ہی تم اپنے الفاظ سے پھر جاؤ گے۔ تم بہادر آدمی ہو، آج تک پولیس تمہاری زبان نہیں کھلوا سکی۔" میں نے اس کا سر ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلّانے لگا اور مجھے گالیاں دینے لگا۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ مُردہ ہو کے لٹکنے لگا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور ایک کش لیا۔

"ہاں؟" میں نے جلتی ہوئی سگریٹ کو اس کی ناف پر رکھ دیا۔ "کون تھے باقی تین آدمی؟"

وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح بلبلایا۔ "بتاتا ہوں... بتاتا ہوں..." اس نے تڑپ کر اپنا پیٹ ملا جس پر زخم کا جلا ہوا سیاہ بدنما داغ نمایاں ہو گیا تھا۔ "ایک کو جانتا ہوں میں۔ وہ مجھے لے گیا تھا۔ رحمت کباڑی۔"

"تمہاری یادداشت بہتر ہونے لگی ہے۔" میں نے ایک اور سگریٹ سُلگا کے دوسرا کش لیا اور آگے بڑھایا۔

"نہیں... نہیں۔" وہ چلّایا لیکن سگریٹ کا روشن حصہ اس کے سینے پر دائیں طرف چپک گیا تھا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی ہلکی سی بُو پھیلی اور اس نے دلخراش چیخ ماری۔ میں نے تیل کا چولھا روشن کیا اور اس کے عین نیچے رکھ دیا۔

"کہاں رہتا ہے یہ رحمت کباڑی؟" میں نے اطمینان سے کہا اور تیسری سگریٹ جلائی اور اس کے ہاتھ باندھ دیے۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ چولھے کی اٹھتی ہوئی حرارت اس کے سر کو گرم کرنے لگی تھی۔

"معلوم ہو جائے گا۔" میں نے سگریٹ کو تیسری جگہ اس کے سینے پر بائیں طرف رکھ دیا۔ وہ اُچھلا اور دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کا جسم سخت اذیت میں بَل کھا رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور جُھول رہا تھا۔ اس میں اب اتنی بھی جسمانی ہمت نہ رہی تھی کہ سر اُٹھا کے ہاتھوں سے رسّی تھام سکے اور بندر کی طرح سیدھا اس سے چپکا رہے — وہ اونچا ہونے کے لیے ہاتھ اٹھاتا تھا اور سر اٹھانے کی بے سود کوشش کرتا تھا۔

"جب تک تم مجھے رحمت کباڑی کا پتا نہیں بتاؤ گے تمہاری گلو خلاصی نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ خود آیا تھا... میرے پاس۔ اڈّے پر۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ تپش اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

"کس کے اڈّے پر؟" میں نے کہا اور چولھے کی بتیاں کچھ اور اونچی کر دیں، شعلہ اور بلند ہو گیا۔

"گامے ماچھی کے اڈّے پر، سٹہ ہوتا تھا وہاں۔" الفاظ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"کیا کام تھا اُسے؟" میں نے کہا اور چوتھی سگریٹ کا کش لیا۔ "کہاں لے گیا تھا وہ تم کو؟"

"میں... میں نہیں بتا سکتا۔ رات کا وقت تھا۔" اس کے سر کے اندر اب بھیجا تک گرم ہونے لگا تھا۔

میں نے سگریٹ اس کے نرخرے پر لگا دی۔ "تم اسی شہر کے رہنے والے ہو، رات کو راستے نہیں پہچانتے؟"

وہ چیخ مار کے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے رسّی کی گرہ دروازے سے کھولی اور آہستہ آہستہ اسے نیچے اتار لیا۔ وہ فرش پر کسی بے جان لاش کی طرح پڑا رہا۔ میں نیچے اترا اور اپنا اسبابِ ضرورت اُوپر لے آیا۔ فرش کو جھاڑو سے صاف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے صرف ایک کونے کی صفائی پر قناعت کی اور وہاں دری بچھا دی۔ سوٹ کیس دری پر اور باقی سامان میں نے دری کے پاس ہی رکھ دیا۔ میرا سوٹ تو پہلے ہی غارت ہو چکا تھا۔ صبح سے میں نے منہ تک نہیں دھویا تھا۔ رہی سہی کسر اب پوری ہو گئی اور میں گرد و غبار سے بھوت بن گیا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے ضروری تھا کہ کہیں سے پانی کا بندوبست کیا جائے۔ اتنے بڑے "قصرِ جمشید" میں نہ جانے کتنے باتھ روم تھے مگر سب کے نلکے خشک پڑے تھے۔ مجھے اس مالی اور چوکیدار کا خیال آیا جو پہلے سے یہاں رہتا تھا۔ آخر وہ اپنی ضرورت کہاں سے پوری کرتا تھا۔ حویلی کے گرد پھیلے ہوئے کئی ایکڑ کے جنگل نما باغ میں کوئی ٹیوب ویل یا کنواں تو ہوگا۔

میری تلاش کامیاب رہی۔ سرونٹ کوارٹر کی منہدم شدہ عمارت کے ایک گوشے میں مجھے ہینڈ پمپ نظر آ گیا۔ میں نے اس کے ہینڈل پمپ کو اوپر نیچے کیا۔ کچھ دیر اس میں سے ہوا نکلتی رہی لیکن اُوپر چڑھنے والا پانی خود اپنی موجودگی کی خبر دے رہا تھا۔ مجھے ہینڈل پر پہلے سے زیادہ قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ بالآخر پانی ہینڈ پمپ میں بولا اور اس کا شفاف دھارا ابل کے باہر گرا — میں اس دریافت پر اتنا ہی خوش تھا جتنا امریکہ ملنے پر کولمبس خوش ہوا تھا۔ اُوپر آ کے میں نے اپنے قیدی کو دیکھا۔ وہ اسی طرح بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مکر تو نہیں کر رہا ہے، میں نے اس کے تلوے کو ایک تنکے سے سہلایا مگر اس نے جنبش نہ کی۔ ایک برتن اور تولیہ لے کر میں نیچے اتر گیا۔ ہینڈ پمپ دو نامکمل دیواروں کے گوشے میں نصب تھا۔ تیسری طرف ملبے کا ڈھیر تھا اور چوتھی سمت میں حویلی کی فصیل دُور ہونے کے باوجود پردہ فراہم کرتی تھی۔ میں نے اطمینان سے غسل کیا اور تولیہ لپیٹ کر اوپر پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں میلے کپڑوں کا بنڈل تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا برتن۔ سوٹ کیس میں سے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر پہننے کے بعد میں نے وقت دیکھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میرا قیدی کراہنے لگا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ ہوش میں آ رہا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "پانی... " وہ بولا۔

میں نے رسّی کو پھر کھینچا اور اُسے اُوپر اٹھا لیا۔ وہ زیادہ اونچی آواز میں کراہنے لگا۔ "پانی نظر آیا تمہیں؟" میں نے کہا۔ "نیچے دیکھو، اس پتیلی میں پانی ہے... ٹھنڈا اور میٹھا۔" میں رسّی کو زور لگا کے کھینچنے لگا۔ اس مرتبہ وہ فرش سے دس فٹ اوپر چلا گیا اور اس کے پاؤں فانوس کے ڈھانچے کو چھونے لگے۔ پھر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے رسّی کو ایک دم ڈھیل دی۔ وہ چار فٹ نیچے آیا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ اسے موت سامنے نظر آنے لگی ہوگی اور اس کا خیال یہی ہوگا کہ ایک لمحے بعد وہ دس فٹ کی بلندی سے سر کے بل فرش سے ٹکرائے گا لیکن میں نے رسّی کو پھر پکڑ لیا اور اسے چھ فٹ کی بلندی پر لٹکا دیا۔

"تمہارے بیوی بچّے یقیناً نہیں ہوں گے۔ ورنہ تم ان کے لیے زندہ ضرور رہتے۔" میں نے کہا۔

"خدا.... خدا کے لیے... رحم... رحم کرو۔ میری لڑکی.... اس کی شادی ہونے والی ہے۔" اس نے ہاتھ جوڑ کے میری منت سماجت شروع کی۔ "اگلے مہینے.... اس کی ماں نہیں ہے۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔" میں نے سر ہلایا۔ "اب رخصتی کون کرے گا؟ کہاں رہتے ہو تم؟"

"محلّہ بی بی پاکدامن میں۔" وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بولا۔

میں نے اسے نیچے اتار دیا۔ اسے پینے کے لیے پانی دیا اور دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

"تمہاری بیٹی کو رحمت کباڑی کا پتا معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں.... وہ کچھ نہیں جانتی۔" وہ چلّایا۔ "اسے تو میرے بارے میں بھی نہیں معلوم۔ کہ میں کیا کرتا ہوں؟ کتنا خراب آدمی ہوں۔ محلّے میں کوئی نہیں جانتا۔"

"بیٹی کو باپ کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیوں نہ اسے بھی بُلا لیں یہاں؟"

وہ دیوانہ وار مجھ پر لپکا۔ "تم اسے کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کے ایک مُکّا رسید کیا اور وہ وہیں جا گرا جہاں سے اُٹھا تھا۔ "لوگ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ گامے ماچھی کے اڈّے پر لوگ تمہیں جانتے ہوں گے۔"

"آج تک کسی کو میں نے گھر کا پتا نہیں بتایا۔" وہ سر اٹھا کے بولا۔ "تمہیں میرا نام بھی نہیں معلوم۔"

"تمہاری صورت تو بہت سے لوگ پہچانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "شام کو ایک فوٹوگرافر آئے گا۔ کل تک تمہاری تصویریں بن جائیں گی۔ محلّہ بی بی پاکدامن میں کتنی گلیاں ہیں؟ کتنی دکانیں ہیں۔ تمہاری تصویر دیکھ کے کوئی نہ کوئی پولیس کو تمہارے گھر ضرور لے جائے گا اور جب پولیس اسے گرفتار کرے گی مثلاً اس جرم میں کہ تم اس سے عصمت فروشی کراتے تھے.... تو یہ خبر...؟"

"نہیں!" وہ چلّایا۔ "اس نے کچھ نہیں کیا۔ میرے جرم کی سزا اسے مت دو۔"

"رحمت کباڑی کہاں ملے گا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"میں بتا دوں گا لیکن ایک شرط ہے..." وہ ہانپنے لگا۔ "اسے معلوم نہ ہو کہ میں نے غداری کی تھی.... پہلے مجھے چھوڑ دینا۔ بس میری بیٹی کی شادی ہو جائے۔ پھر وہ بے شک مجھے مار ڈالیں.... مجھے پروا نہیں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مت بھولنا کہ تم نے چالاک بن کے دھوکا دیا مجھے یا جھوٹ بولا تو اپنی بیٹی کے مستقبل کی تباہی کے ذمّہ دار تم خود ہو گے۔ میں پہلے تصدیق کروں گا کہ تم نے سچ بولا ہے یا نہیں۔ کوئی بات غلط ہوئی تو کل اسی جگہ تمہاری ملاقات بیٹی سے ہوگی جو تمہیں یاد رہے گی۔ تمہیں بھی اور تمہاری بیٹی کو بھی۔"

اس کی کمزور رگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے رحمت کباڑی کا پتا کیسے نہ بتاتا۔ اُس نے ڈینگ ماری تھی کہ پولیس اس کی زبان نہیں کھلوا سکی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ انسان کا جسم کتنا کمزور قلعہ ہے اور تشدّد کے ذہنی اور جسمانی طریقے شطرنج کی چالوں کی طرح ہیں۔ لاتعداد اور ایک سے ایک موثر، قوّتِ مدافعت کو مات دینے والا اور برداشت کی طاقت سے کہیں زیادہ۔ ترقّی یافتہ ممالک میں تو تشدّد ایک فن ہے اور سائنس ہے جس میں محض انسان کی بے رحم ذہانت ہی نہیں، ذہن کو تابع فرمان بنانے والی ادویات سے لے کر الیکٹرانک مشینوں تک سب کا استعمال ہوتا ہے۔ میں کوئی ماہرِ فن نہیں تھا مگر میرے مقابل ایک معمولی آدمی تھا۔ ایک ادنیٰ درجے کا مجرم جس کی قوّتِ ارادی بہت کم تھی اور جو مجبور بھی تھا۔

خلافِ توقع مجھے بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی تھی میں نے اسے کھانے کو دیا اور اس کے مانگنے پر سگریٹ بھی دی۔ کچھ دیر کے لیے میں نے اسے آزاد کر دیا اور ریوالور قریب رکھے دری پر نیم دراز رہا۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔

"تمہاری حیثیت وعدہ معاف گواہ کی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں تم سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کیا معلومات فراہم کی ہیں۔"

"ان کو معلوم ہو جائے گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "اب تک دلاور کو پوری رپورٹ مل چکی ہوگی کہ میں پکڑا گیا ہوں۔"

"لیکن دلاور نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ تم قید سے فرار ہو گئے ہو۔ ورنہ ایس پی صاحب اب تک تم کو پولیس کے حوالے کر چکے ہوتے۔ تمہارے خلاف رپورٹ ہو تی تھانے میں۔"

"لیکن میں کیا بتاؤں گا کہ فرار ہونے کے بعد میں کہاں تھا، واپس کیوں نہیں پہنچا؟" وہ بہت نروس اور پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس نے بیٹی کا نام کیوں لیا۔ اسی مجبوری کے باعث وہ اپنے ساتھیوں سے غداری کا مرتکب ہوا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ بیٹی سمیت اس شہر سے چلا جائے۔ اگلے مہینے اسے بیٹی کو رخصت کرنا تھا اور وہ خوفزدہ تھا کہ اسے اتنی مہلت بھی ملے گی یا نہیں؟

"تمہارے ساتھ ایک اور شخص تھا۔" میں نے کہا۔ "اسی نے واپس جا کے بتایا ہوگا تمہارے بارے میں؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ باہر موجود تھا۔ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔"

"پھر وہ کیا رپورٹ دے گا؟" میں نے کہا۔ "اسے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ تم پکڑے گئے۔ فرار کا اسے علم نہیں ہوگا۔ تم کل شام تک اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔ ممکن ہے دوپہر کو میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

"وہ پوچھیں گے اب تک کہاں تھا؟" وہ بولا۔ "وہ میرے زخم دیکھ لیں گے اور سب سمجھ جائیں گے کہ گرفتار کرنے والوں نے مجھ پر تشدّد کیا ہے۔ میری کون مانے گا کہ میں نے کچھ نہیں بتایا اور جب تم رحمت کباڑی کو پکڑو گے تو کیا وہ سمجھ نہیں جائیں گے کہ تم کو سب میں نے ہی بتایا ہوگا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ زار و قطار رونے لگا۔ یہ تمام عمر کے اعمال کا کفّارہ تھا جو اسے اب ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ قدرت کی وہ سزا تھی جس سے مفر نہ تھا۔ وہ سب بھی قصور وار کہاں تھے جو اب تک مارے جا چکے تھے مگر ان کی مجبوری کی نوعیت مختلف تھی۔ کچھ اپنی اصول پرستی کے باعث مجبور رہے، کچھ انسانیت کے رشتوں سے مجبور تھے۔ وزیر خان کو بھی کچھ مجبوری تھی کہ میرے سر پر سہرا نہ دیکھ سکا۔ شہلا کی رخصتی سے قبل اس کی ماں مر گئی۔ رابعہ بھی دلھن بنی مگر اس کی رخصتی نہ ہو سکی۔ سب کی مجبوریاں ان کی خواہشات کے سامنے دیوار بن گئیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا آیا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ تقدیر کے سوا آدمی کے ہر المیے کا الزام کسے دیا جا سکتا ہے۔ قصور وار میں نہیں تھا۔ میں تو یہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کی ڈولی اٹھنے سے پہلے باپ کا جنازہ اٹھ جائے۔ قصور وار وہ خود بھی نہیں تھا جسے معلوم نہ تھا کہ اس مشن میں ناکامی کا انجام یہ ہوگا۔ قصور وار اس کی بیٹی بھی نہ تھی۔

"ہو سکتا ہے دلاور تمہیں کچھ مہلت دے دے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "اور تم بیٹی کو رخصت کر سکو۔"

لیکن وہ ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس شخص کی طرح جسے سزائے موت دی جا چکی ہو اور جس کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو چکی ہو۔ اس کے دامن میں امید کی ایک بھی کرن نہیں تھی۔

میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں منتقل کیا اور اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر رسّی کا دوسرا کنارہ بیچ کے دروازے سے یوں گزارا کہ دونوں پٹ ایک بَل سے مل گئے۔ باقی رسّی میں نے ایک ٹخنے کے اوپر باندھ لی۔ پھندا بہت ڈھیلا تھا اور مجھے کوئی تکلیف نہیں دے رہا تھا مگر میرے پاؤں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر میرا قیدی زور لگاتا اور دروازہ کھینچ کر میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تو رسّی کا دباؤ پڑتا اور ٹانگ کھنچی جاتی تو میں فوراً اٹھ بیٹھتا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کرے اور اگر خود نہیں سو سکتا تو مجھے سونے دے۔

میں ٹھیک پانچ بجے اٹھا۔ کسی الارم کے بغیر وقت پر جاگنا میرے لیے کبھی مشکل نہ تھا۔ ہر شخص تھوڑی سی قوّتِ ارادی سے کام لے کر ذہن کو یہ تربیت دے سکتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے اٹھ جائے اور بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے اٹھنے کا وقت طے کر لیتے ہیں۔ ان کا لاشعور ٹھیک وقت پر شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ مجھے چھ بجے قبرستان میاں میر صاحب کے دروازے پر پہنچنا تھا اور وہاں تک کم سے کم آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ میں نے اپنا لباس بدل کے اے ایس آئی کی پوری وردی پہنی۔ اپنے قیدی کو اس طرح باندھا کہ وہ ہل بھی نہ سکے۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ رسّی کو فرش پر گھستا رہا ہے۔ اگر اسے زیادہ مہلت ملتی تو وہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے دور کے ایک گوشے میں لالٹین روشن کی اور اس سے کوئی بات کیے بغیر کار لے کر نکل آیا۔ کار کو میں نے قبرستان کے سامنے دھرم پورے کی ایک گلی میں روکا۔ رومال سے ہر وہ جگہ صاف کی جہاں مجھے اپنے فنگر پرنٹ کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ پھر میں نے کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک بال پوائنٹ قلم اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر لکھا

"محترم۔ بارہ گھنٹے تک اپنی کار استعمال کرنے کی اجازت دینے کا شکریہ۔ آپ کو ہمدردی کا یہ جذبہ بہت مہنگا پڑا۔ غالباً آئندہ آپ کسی مستحق کو بھی لفٹ نہیں دیں گے۔ آپ کی پریشانی اور زحمت کے لیے معذرت۔ افسوس یہ ہے کہ احتیاط کے باوجود کار کا پچھلا حصّہ معمولی سی رگڑ سے خراب ہو گیا۔ امید ہے پانچ سو روپے میں آپ اس کو بہترین ڈینٹ پینٹ کرا لیں گے اور یہ نقص نظر بھی نہ آئے گا۔"

اسی کاغذ میں سو سو کے پانچ نوٹ لپیٹ کر میں نے چابیاں بھی گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دیں اور کار سے اتر کے گلی سے سڑک پر آ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرے سمجھانے کے باوجود اس شخص نے پولیس کو رپورٹ نہ دے دی ہو اور اب پولیس سادہ کپڑوں میں میری منتظر ہو۔ عقلمند آدمی ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا لیکن اس نے میری بات کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ شاید اسے ڈر ہوگا کہ کار ڈکیتی یا اغوا کی واردات میں استعمال ہوئی اور اس نے رپورٹ بھی نہ لکھوائی تو وہ تفتیش کے لیے چکّر میں پھنس جائے گا۔ پولیس اسے مظلوم نہیں، مجرموں کا ساتھی فرض کرے گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ قبرستان

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے دروازے پر کھڑا بے چینی سے انفنٹری روڈ پر دونوں طرف دیکھ رہا تھا۔ فورٹریس اسٹیڈیم کی طرف سے آنے والی سڑک کو بھی اور دھرمپورے کے پل کی جانب بھی۔ بے حد عقلمند اور مستعد پولیس والے وردی سمیت اس کے آس پاس موجود تھے۔ ان کی کھوپڑی میں یہ آیا ہی نہیں تھا کہ میں تیسری سمت سے بھی آسکتا ہوں۔ یعنی سامنے کسی بھی گلی سے۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن بہت سی دوسری کاروں کے درمیان موجود تھی۔ دوسری کاروں والے فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے اور جمعرات ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد زیادہ تھی۔

میں اطمینان سے سڑک کے دوسرے کنارے پر چلتا رہا۔ پھر سڑک عبور کر گیا۔ پولیس کی نفری نے مجھے بالکل قابلِ توجہ نہیں سمجھا اور میں اچانک رابعہ اور محسن کے سامنے جا پہنچا۔ محسن خان آگے والی سیٹ خالی رکھنے کے لیے پیچھے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن میں ان کے اظہارِ حیرت سے پہلے دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ کیا جعلسازی ہے؟" محسن نے کہا۔ "تو آدمی ہے کہ تھانیدار؟"

"آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ اٹھانوے فیصد پانی کا اور پانی اس برتن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں رکھا جائے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا۔ "حالات کا یہی تقاضا تھا اور آئندہ بھی مجھے اپنا حلیہ اپنی ضرورت کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ میں سکندر بخت بن کے نہیں رہ سکتا چنانچہ عالم ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔"

"ایسے کتنی بار اپنا حلیہ بدلو گے؟" رابعہ نے کہا۔ "اور کب تک چھپ چھپ کے رہو گے؟"

"اس کا جواب وقت دے گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہاں سے نکلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

روانگی سے قبل میں نے رابعہ سے قلم لے کر ایک چٹ پر لکھا۔ "آپ کی کار سامنے گلی میں کھڑی ہے۔" اور قریب سے گزرنے والے ایک بچے کو بلایا۔ "یہ ان کو دے دو بیٹے۔" میں نے کہا۔ "وہ جو پولیس کے ساتھ کھڑے ہیں۔"

یہ بات محسن نے کہی ہوتی تو بچہ بھاگ جاتا لیکن وہ میری وردی دیکھ کر ڈر گیا۔ رابعہ نے گاڑی نکالی تو میں نے دیکھا کہ بچہ وہ چٹ کار کے مالک کو دے رہا ہے۔ فاکس ویگن ان کی بھاگ دوڑ سے قبل ہی اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کا نمبر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مالک سے زیادہ پولیس کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ وہ کون ذہین پولیس افسر تھا جو سامنے نہیں آیا اور کار کا سراغ لگا کے کامیابی کا اعزاز انہیں بخش گیا۔ رابعہ نے گاڑی کو گلبرگ کی طرف موڑ دیا۔

گلبرگ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے میں نے انہیں دن بھر کی روداد سنائی اور ان سے رضوی صاحب کے گھر میں پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ سنا۔ جانتے بوجھتے میں نے رابعہ کو صرف اتنا بتایا کہ آج کی رات میں اور محسن رحمت کباڑی کا پتا لگانے جائیں گے۔ اگر میں اس کو اپنے حقیقی عزائم سے آگاہ کر دیتا تو وہ مجھے کچھ بھی نہ کرنے دیتی۔ نہ ایک وکیل کی حیثیت سے نہ اس عورت کی حیثیت سے جسے محبت بزدل بنا دیتی ہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

"قصرِ جمشید کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک طرح سے دشمن کی سرزمین ہے۔"

"ہاں۔ لیکن دشمن وہاں سے کوچ کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور اس کے ایجنٹ ہیں تو انہیں یہ خیال کیسے آسکتا ہے کہ میں انہی کے علاقے میں خیمہ زن ہوں۔"

"اور تم ان بھوتوں، چمگادڑوں اور الوؤں کے ساتھ کب تک رہو گے؟ جہاں بجلی تک نہیں ہے۔" رابعہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ "خوف نہیں آئے گا تمہیں اتنے بڑے ویرانے کی تنہائی میں؟"

"نہیں۔ میرے ساتھ ایک تو یہ ہوگا۔" میں نے جیب کے اوپر نظر آنے والے ریوالور کو تھپک کر کہا ــــ "دوسرے تمہارا تصور ہوگا۔ خوف کی گنجائش پھر کہاں ہوگی۔" لیکن میرے اس مذاق پر بھی وہ مسکرائی تک نہیں۔ تصور میں وہ مجھے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تاریک کمرے میں ابابیلوں اور چمگادڑوں کے شور میں گھونسلوں سے گرنے والے تنکوں کی بارش میں اور غلاظت میں دری پر سوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ جو ایک مل اونر، چار سال برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے لوٹنے والا، ناز و نعم اور عیش و عشرت کی زندگی کا پروردہ تھا۔ زمین کی پستیوں پر آسمان نے ہم کو دے مارا۔ میں اب قاتل تھا اور مفرور مجرم تھا اور میری فردِ جرم طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھی ــــ میں زمانے کی نظر سے، پولیس کی نظر سے اور ہر سمت جال لے کر پھرنے والے شکاریوں سے چھپنے پر مجبور تھا اور وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

"کس فکر میں مبتلا ہو؟" میں نے کہا۔ "میرا ساتھ دینا مشکل نظر آرہا ہے؟"

"اب کیسی مشکل؟" وہ تلخی سے بولی۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ مجبور میں ہوں، تم نہیں ہو۔ تم جو چاہو اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں فکر کرنے کے سوا۔"

"دیکھو رابعہ۔ میری تو یہی زندگی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس میں خطرات بھی ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا لیکن میں اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتا۔ میں اپنے ارادے پہ قائم رہوں گا۔ تخت ہو یا تختہ۔ تم کسی امید پر انتظار کر سکتی ہو تو ضرور کرو۔ ورنہ مجھے میری تقدیر کے سپرد کر دو۔ میں واپس آیا تو صرف تمہارے لیے آؤں گا اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے۔ لیکن میں نہ آؤں تو ....؟"

"بس بس....؟" اس نے آنکھوں میں اتر آنے والے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہی ضروری باتیں کرنے کے لیے بلایا تھا تم نے مجھے؟"

میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے پھر بٹھا دیا۔ "آئی ایم سوری لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم حقیقت کو نظر انداز نہ کرو۔ ابھی تک میں آزاد ہوں تو تمہاری ہی مدد کے طفیل۔ تم نے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانیاں دیں لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ تمہاری مدد میرے کام نہیں آسکتی۔ میں نے ابھی تک اپنا دفاع کیا اور قانونی جنگ لڑتا رہا۔ اس سے مجھے کیا ملا؟ میں ہر طرف سے محصور ہو گیا ہوں۔ اب میں نے کھلی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ ساری عمر بھاگتے ہوئے کون گزار سکتا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے خود مجھے کرنا ہے خواہ وہ قانونی طریقے سے ہو یا غیر قانونی طریقے سے۔ میرا مقصد بہرحال غلط نہیں ہے۔ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جنگ میں صرف ایک فریق کی جیت ہوتی ہے۔ میرا حوصلہ تم ہو، میرا مقصد تم ہو۔ اگر تمہاری آنکھ میں آنسو ہوں گے تو.... تو میں مارا جاؤں گا.... میں مقابلہ کر ہی نہیں سکوں گا.... مجھے سہارا دو، پلیز۔ امید کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ...."

"خوشی مقدر میں ہو تو ملتی ہے سکندر۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ "کوشش تو سب ہی کرتے ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گی کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔"

"تم نے برا مانا میری بات کا؟" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں کیا کروں رابعہ کہ تم ہی میری طاقت ہو اور تم ہی میری سب سے بڑی کمزوری بن گئی ہو۔"

"اچھا ڈائلاگ ہے۔" محسن نے کیبن میں قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "میں نے نوٹ کر لیا ہے۔"

"ساڑھے سات بجے تم کو "قصرِ جمشید" پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

"وعدہ کرو کہ تم لوگ کوئی حماقت آمیز بہادری کا کارنامہ سرانجام نہیں دو گے۔" رابعہ نے کہا۔

"خطرے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہم دو چار گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔" میں نے محسن کو رابعہ کی نظر بچا کے آنکھ ماری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے رکشا یا ٹیکسی لے لوں گا۔"

اگر میں شریفانہ لباس میں ہوتا تو اس وقت کوئی مجھے ماڈل ٹاؤن نہ لے جاتا لیکن وردی والے تھانیدار کو رکشا والا کیسے انکار کر سکتا تھا۔ راستے میں دو جگہ رکشا روک کر میں نے کچھ اور چیزیں خریدیں۔ ایک بہت مضبوط زنجیر اور دو انتہائی مضبوط تالے۔ ایک فٹ لمبا اور آدھے انچ موٹا لوہے کا کھونٹا جس میں لوہے کا ایک کڑا تھا۔ ایسے کھونٹے گوالے اپنی گائے بھینسوں کو باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پھر ایک ہوٹل سے میں نے اپنے قیدی کے لیے روٹیاں اور کباب خریدے۔ ماڈل ٹاؤن پہنچ کر میں نے رکشا کو سامنے والی کوٹھی کے دروازے پر روکا اور اسے دس روپے دیے۔ اس نے سلام کیا اور بھاگ گیا۔ اندھیرے میں اوپر پہنچنے کے لیے مجھے لائٹر کی روشنی کا سہارا لینا پڑا۔ وہ اسی طرح بے بس بندھا ہوا پڑا تھا۔ کھانا قیدی کے سامنے رکھ کر میں نے کھونٹے کو ایک پتھر کی مدد سے دیوار میں ٹھونک دیا۔ پرانی ہونے کے باوجود دیواریں ٹھوس تھیں اور کھونٹے کو پورا گاڑنا آسان نہ تھا۔ میں پسینے پسینے ہو گیا لیکن پندرہ بیس منٹ کی محنت کے بعد صرف لوہے کا کڑا دیوار کے باہر لٹکتا رہ گیا۔ میں نے زنجیر کے ایک سرے پر دو حلقوں کو ملا کے ان میں کھٹکے سے بند ہونے والا ایک قفل لگا دیا۔ پھر میں نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ میری اس کارروائی کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ "کھانا کھا لو۔" میں نے کہا۔ "مجھے واپس جانا ہے۔"

جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو میں نے زنجیر کے دوسرے کنارے کے آخری حلقوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ یہ حلقہ اب اس کے ٹخنے سے ذرا اوپر دائیں ٹانگ پر پڑ گیا تھا۔ "جب تک میں نہ آؤں اس کو گھستے رہنا۔ بے کار رہنے سے کچھ کرنا اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ رسی نہیں کہ کٹ جائے۔" کمرے میں اب چمگادڑیں چکر لگا رہی تھیں اور ان کی بھیانک صدائے احتجاج سے پورا محل گونج رہا تھا۔ میں نے ایک چراغ روشن کر کے ان کی راتوں کے سکون اور ان کی خلوت میں رخنہ اندازی کی تھی۔ وہ ان آوازوں سے دہشت زدہ لگتا تھا۔

"اگر تم چاہو تو یہ لالٹین بجھا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اندھیرے میں بدروحیں چمٹ جائیں گی تم سے تو گلہ مت کرنا۔ میں نے سنا ہے یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ بے بسی، مایوسی خوف اور بے یقینی نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔

ساڑھے سات ہو گئے تھے۔ میں نیچے اتر آیا اور سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ محسن دس منٹ بعد رکشا میں پہنچا۔ کرائے کے مسئلے پر ان کی تکرار جاری تھی کہ میں نے مداخلت کی۔ رکشے والے کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے اچانک رکشے کو گیئر میں ڈالا اور کرایہ لیے بغیر فرار ہو گیا۔ کچھ دور جا کے اس کی رفتار کافی تیز ہو گئی تو اس نے سر گھما کے ہم دونوں کو ایک زبردست گالی دی اور رکشے کی رفتار بڑھا دی۔ میں اور محسن بے اختیار ہنسے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"چودہ روپے آٹھ آنے میں ایک گالی۔ سوا سات روپے فی کس۔" محسن نے کہا اور قصرِ جمشید کی تاریک عمارت کو دیکھنے لگا۔ "یہاں پہلے ایک مالی تھا۔"

"ہاں۔ یا تو وہ سب کچھ سمیٹ کر نکل گیا۔ کب تک انتظار کرتا۔" میں نے کہا۔ "یا مر گیا۔ سرونٹ کوارٹر کا ملبہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اوپر رکھا ہے۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز باہر نہیں آسکتی۔"

"ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔" "تو مستعد ہو کے آیا ہے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کام خطرناک ہے۔" کھانا ہم دونوں نے درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کھایا اور اسپیشل سروس کے باوجود پروپرائیٹر کے ساتھ وہی رویہ رکھا جو تھانیداری کی شان کے مطابق تھا۔ کھانے کے بعد بوتل اور سگریٹ منگوائی اور ڈکار لے کر باہر نکل گئے۔ پروپرائیٹر نے صرف سلام کیا۔ اگر ہم بل ادا کرنے پر اصرار کرتے تو وہ حیران ہوتا کہ یہ کیسا تھانیدار ہے! اور میں ہر طرح سے ایک عام تھانیدار نظر آنا چاہتا تھا۔

"ایک مثل ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔" میں نے باہر آکے کہا۔ "دوسری مثل یہ ہونی چاہیے کہ جیسا بھیس ویسا رویہ۔"

"ہم کوٹ لکھپت تک مارچ نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا "اور ہمیں ان سے پہلے وہاں موجود ہونا چاہیے۔"

"سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ میں نے محسن کو ایک درخت کے سائے میں تنے کے پیچھے چھپ جانے کے لیے کہا اور خود سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ پہلی ہیڈلائٹس کے نمودار ہوتے ہی میں نے وسط میں آکے اشارہ کیا لیکن وہ ٹیکسی تھی۔" ساڈا قصور مائی باپ؟" ڈرائیور ہاتھ باندھ کے باہر نکلا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کچھ نہیں، جاؤ۔ کوئی اور ٹیکسی دیکھی تھی تم نے ادھر آتے ہوئے؟"

"نہیں مائی باپ۔" ٹیکسی ڈرائیور نے اطمینان کا سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا اور بڑی گھبراہٹ میں روانہ ہو گیا۔ پھر جو کار آئی اس میں ایک فیملی تھی۔ میں نے اسے بھی روکا۔ رسماً چند ضروری سوالات کیے اور جانے کی اجازت دی۔ وہ میرے اخلاق سے متاثر ہوئے لیکن تیسرے کو قانون سے تعاون مہنگا پڑا۔ وہ اکیلا تھا۔ کانونٹ کے لہجے میں انگریزی بولنے والا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کا ٹینس کا ریکٹ پڑا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔"

"یس آفیسر؟" اس نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا اور میں نے کرخت اکھڑ لہجے میں اسے نیچے آنے کا حکم دیا۔ وہ سخت برا مان کے باہر نکلا ہی تھا کہ محسن نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا اور اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی محسن اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ ایک منٹ بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے کوٹ لکھپت کی طرف رواں تھے۔ یہ فورڈ کورٹینا تین سال پرانی تھی مگر نئی لگتی تھی۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟" محسن نے کہا۔ "میں نے سخت وار تو نہیں کیا تھا۔"

"میرا خیال ہے اسے چوٹ ہی نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "نازک مزاج تھا اس لیے بے ہوش ہو گیا۔ تھا کوئی رئیس زادہ۔"

ساڑھے نو بجے میں نے کار کو کچے راستے پر اتار دیا۔ غیر آباد علاقے میں مکان بہت دور بنے ہوئے تھے۔ میں نے نشانیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آخری موڑ کاٹا اور ہیڈلائٹس آف کر کے گاڑی کو ایک احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ باقی راستہ ہم نے پیدل طے کیا۔ چھوٹی سی مسجد کے مینار مجھے صاف نظر آرہے تھے۔

عشاء کی نماز قضا پڑھ کے نکلنے والے ایک شخص نے محسن کو غور سے دیکھا۔ "شاہ صاحب کا ڈیرا؟ کس سے ملنا ہے؟" میں ان سے ذرا فاصلے پر ان کی نظروں سے اوجھل سب کچھ سن رہا تھا۔

"شاہ صاحب سے؟" محسن نے کہا جو اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔

"بھولے بادشاہو۔" وہ شخص ہنس پڑا۔ "پھر چالیس سال پہلے آنا تھا۔ وہاں تو اب ڈیرا ہی ڈیرا ہے۔"

"کوئی تو ہوگا وہاں؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ مجاور ہیں۔" وہ بولا۔ "گدی نشین کو اس کے بھائی نے مار دیا تھا۔ پھر نذیر نے بکر کو مارا اور مجاور بن گیا۔ پتا نہیں گدی نشینی کی اس جنگ میں کتنے جان سے گئے۔ مرید بٹ گئے یا کٹ گئے۔"

"نذر نیاز سے بہت آمدنی ہوتی ہے کیا؟" محسن نے ایک اچھا سوال کیا۔

"تو اور کس لیے ہے یہ خون خرابہ بھولے بادشاہو؟" وہ شخص بولا۔ "لوگ ڈرتے ہیں ان سے۔ اور پولیس... خیر جی۔ آپ گامے شاہ سے مل لیں۔ پہلے وہ گاما ماچھی تھا۔ میں نے سنا ہے۔ آگے پکا احاطہ ہے اور گنبد ہے۔"

گامے ماچھی کے نام پر میں چونکا۔ وہ شخص جو میری قید میں تھا اس نے بتایا تھا کہ رحمت کباڑی اس کو لینے کے لیے گامے ماچھی کے اڈے پر آیا تھا اور وہاں سٹہ ہوتا تھا۔ گویا اب گاما ماچھی ڈبل رول کر رہا تھا۔ یہاں وہ گامے شاہ تھا۔ بدمعاشی کے سارے کاروبار پر سجادہ نشینی کا پردہ۔ پردہ تو عقیدت مندوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا جو حقیقت کو دیکھنے اور پرکھنے کے قابل نہ تھیں لیکن وہ باتونی شخص اندھا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اور کان سب کھلے ہوئے تھے اور وہ بھولا بادشاہ سب سمجھتا تھا۔ گنبد ایک مختصر سے حجرے پر تھا جس کا رنگ سبز تھا اور اس کے اوپر سبز رنگ کا پرچم بھی بیس فٹ کی ڈنڈی سے باندھ دیا گیا تھا۔ پرچم پرانے کپڑے کا تکونا ٹکڑا تھا جس کے کناروں پر گوٹا بھی کالا پڑ گیا تھا اور اوپر لگے ہوئے چھوٹے سے بلب کی مدھم روشنی میں ماحول زیادہ سوگوار اور پُراسرار لگتا تھا۔ مزار کے دروازے بند تھے۔ حجرے سے متصل دیوار دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً اتنی ہی اونچی تھی جتنی مزار کی دیواریں۔ میں نے اور محسن نے اس فصیل کو ہر طرف سے گھوم پھر کے دیکھا لیکن مجھے اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے چاروں کونوں پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کو دیکھ کر ہوئی جو گھومنے والی اور بہت بڑی تھیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی میں نے سینٹرل جیل کی بیرونی دیواروں پر نصب دیکھی تھیں۔

"سیکورٹی کا یہ اہتمام کس لیے؟" میں نے کہا۔ "یہ دس فٹ اونچی دیوار، سرچ لائٹس؟"

"ایسے انتظامات کی ضرورت وہی محسوس کرتا ہے جسے کوئی ڈر ہو۔" محسن نے کہا۔

"اندر جانے کے لیے وہی ایک دروازہ ہے، مزار والے حجرے کا۔" میں نے کہا۔

"دیوار کے اوپر بھی نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کے ٹکڑے چن دیے گئے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"بقولِ شاعر۔ پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر۔ لیکن کبوتر کو بامِ یار پر تو جانا ہے۔"

محسن نے میرے کندھے پر قدم جمائے اور اندر جھانکتے ہوئے رننگ کمنٹری شروع کی۔ "تیس درجہ دائیں جانب شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ کمرے ہیں۔ ایک دو... تین چار۔ ان کی چھت دیوار سے ایک فٹ نیچے ہے۔ اس لیے باہر سے کچھ نظر نہیں آتا۔ تیس درجہ بائیں طرف ایک ٹرک کھڑا ہے اور ایک ٹرک کا بچہ۔ سوری، ایک جیپ۔ ایک کمرے میں روشنی ہے۔ بندہ بشر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے اسے نیچے گرا دیا۔ "میں ٹرانسمیشن ٹاور نہیں ہوں کہ تیری نشریات چلتی رہیں گی۔ یہ بتا اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں تو ٹرک اور جیپ اندر کیسے پہنچے؟"

"یہ فقیر کا ڈیرا ہے نابکار، بس کا اڈا نہیں۔" محسن نے کپڑے جھاڑ کر کہا۔ "اور فقیروں کی کرامات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ سوئی کے ناکے سے اونٹ گزار سکتے ہیں تو دروازے کی جھری سے ٹرک کیوں نہیں نکال سکتے۔"

"اب تو واپس جا، گاڑی میں ربڑ کے فٹ میٹ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "چاروں نکال لا۔"

چار فٹ میٹ ایک کے اوپر ایک رکھنے کے بعد نوکیلے شیشوں پر قدم جمانا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ میں نے محسن کو اوپر اٹھایا اور وہ ربر پر کم سے کم دباؤ ڈالے بغیر دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے پاؤں میں لیدر سول کے جوتے بھی تھے۔ چنانچہ وہ ایک فٹ چوڑی فصیل پر کھڑا ہوا تو اس کے وزن سے کچھ شیشے ٹوٹے۔ پھر اس نے جھک کر میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اوپر کھینچ لیا۔ احاطے کی ہر دیوار تقریباً سو فٹ لمبی تھی۔ ہم ٹرک کے بالکل پیچھے کھڑے تھے اور وہ روشن حجرہ ہم سے سو فٹ دور تھا جس میں محسن نے روشنی دیکھی تھی۔ بالکل سامنے سے اور بلندی سے ہم روشنی میں کم سے کم تین سائے متحرک دیکھ سکتے تھے۔ "بسم اللہ کیجیے قبلہ۔" میں نے کہا۔ "گر جائیے۔"

"پہلے آپ بندہ نواز۔" محسن نے کورنش بجا لا کے کہا لیکن میں نے اسے آگے دھکیلا۔ وہ دھم سے کودا۔ پھر میں نے چھلانگ لگائی اور محسن کے قریب ہی لینڈ کر گیا۔ دونوں کے گٹے ٹخنے سلامت رہے اور ہم ٹرک کی اوٹ میں آگے بڑھے۔ ابھی تک کسی کو شاہ صاحب کے ڈیرے میں دو عقیدت مندوں کے تشریف لانے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

"ہے تو یہ ٹرک۔" میں نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "اور میں ایک سنسنی خیز انکشاف کرتا ہوں۔ یہ میسرز زیرا اینڈ کمپنی کا وہی ٹرک ہے جس میں اس کے مالک یعنی خاکسار کو پیک کر کے ارسال کیا گیا تھا۔ میں نے اس کے نام 'ایم ڈبلیو ڈی' کے حروف کھرچ کر کچھ ترمیم کی تھی۔ اس کے مٹے ہوئے حصوں پر نیا رنگ ہے حالانکہ اس کا نمبر اب وہ نہیں مگر ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" محسن خان نے ٹرک کے اندر جھانک کر کہا۔

میں نے ریڈی ایٹر کے پانی میں رومال بھگو کر نمبر پلیٹ پر رگڑا۔ رومال سیاہ ہو گیا اور کچی سیاہی اتری تو وہ سات نظر آنے لگا۔ کمرشل نمبر پلیٹ کا رنگ کالا تھا اور حروف سفید تھے چنانچہ میں نے بھی نمبر آسانی سے بدل لیے تھے اور میرے طریقۂ واردات کی نقل کے لیے عقل کسی کو استعمال نہیں کرنی پڑی تھی۔ تھوڑا سا اور رگڑنے پر جو حرف ایل نظر آتا تھا وہ "ای" بن گیا۔ محسن اسی عمل کے ذریعے جیپ کا نمبر دریافت کرنے میں مصروف تھا کہ پہلے کسی ٹرک کی ہلکی سی آواز اور پھر روشنی جھلملائی۔ میں نے اور محسن نے چونک کر دیکھا۔ زمین سے بلندی کی جانب دو عمودی روشن لکیریں تاریک آسمان میں صاف نظر آرہی تھیں اور یہ... روشنی زمین سے پھوٹ رہی تھی۔ پھر ہم سے پچاس گز دور بائیں جانب اور مزار کے بالکل سامنے کی دیوار کے قریب زمین کے نشیبی خلا سے ایک ٹرک طلوع ہوا اور ہماری طرف آیا۔ میں اور محسن ابھی تک ٹرک کے پیچھے تھے۔ اگر ہم وہیں کھڑے رہتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو یقیناً پکڑے جاتے۔

پناہ کی واحد جگہ ٹرک کے نیچے تھی۔ میں نے اور محسن نے غوطہ مارا اور ٹرک کے چاروں پہیوں کے نیچے سمٹ کر لیٹ گئے۔ دوسرا ٹرک سیدھا گزر گیا اور پھر ریورس میں واپس آیا۔ آہستہ آہستہ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ ٹرک میں سے ڈرائیور کا نائب اللہ مور نیچے اُتر آیا تھا۔ وہ ڈرائیور کو سگنل دیتا رہا۔ "آنے دو۔ آنے دو استاد۔ تھوڑا دائیں کو کاٹ کے... بس...!" اگر وہ کھڑے ہوئے ٹرک سے ٹکرا جاتا تو ہم دونوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ ہم پہیوں کے آگے بڑھنے سے کچلے جاتے یا ہاتھ پیر سے محروم ہو جاتے لیکن ڈرائیور ہوشیار اور بہت محتاط تھا۔ دونوں ٹرک چند انچ کے فاصلے سے یوں کھڑے ہو گئے کہ ایک کا منہ مشرق کی طرف تھا تو دوسرے کا مغرب کی طرف لیکن پشت کی جانب سے دونوں کے کھلے حصے تقریباً مل گئے تھے۔ زیرِ زمین اتنے بڑے راستے کی موجودگی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ نہ جانے یہ راستہ کتنی دُور تک نشیب میں جانے کے بعد بلندی کی طرف پھیلتا ہوگا اور کسی ایسے احاطے یا بیرک نما گیراج میں نکلتا ہوگا جس کا شاہ صاحب کے ڈیرے سے تعلق کسی کے وہم و گمان میں نہ آسکے۔ عقیدت مند تو مزار کے حجرے تک آ کے لوٹ جاتے ہوں گے۔ اندر کا حال انہیں کیا معلوم۔ ممکن ہے دن میں زیرِ زمین راستے کا شگاف بھی کسی ترپال یا تختے وغیرہ سے ڈھک کر بند کر دیا جاتا ہو۔

میں اور محسن دَم سادھے لیٹے رہے۔ ڈرائیور نے اپنے ماتحت کو حکم دیا کہ وہ سامان رکھے اور خود گامے شاہ کو سلام کرنے چلا گیا۔ ہم نے نیچے سے سر گھما کے دیکھا۔ جس کمرے میں روشنی تھی اس میں سے تین افراد باہر نکل آئے تھے اور ڈرائیور انہی سے ملنے جا رہا تھا۔ اوپر کی دھما دھم سے میں نے اندازہ کیا کہ ماتحت ٹرک کے سامان کو منتقل کر رہا ہے۔ میں نے باہر نکل کے ٹرک کی سائڈ سے سامان کی منتقلی کے کام کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ چاروں سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان کا رُخ اندر کی طرف اور نیچے تھا۔ پورا احاطہ اس چندھیا دینے والی روشنی میں یوں نظر آنے لگا کہ گھاس کا تنکا بھی حرکت کرتا تو پتا چل جاتا۔ ڈرائیور نے باری باری تینوں افراد سے ہاتھ ملایا۔ ان کی آواز تو ہم تک پہنچ رہی تھی لیکن بات کوئی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سب ہم سے چند قدم کے فاصلے پر آ کھڑے ہوئے۔

"رانجھے کا کوئی پتا نہیں شاہ صاحب۔" ڈرائیور نے کہا۔ "اس کی لڑکی کو بھی معلوم نہیں۔"

"اسے معلوم ہوگا۔" گامے ماچھی نے غرا کے کہا۔ "تم اسے یہاں لاتے۔ میں خود پوچھتا اس سے۔"

"وہ اکیلی تھی نا جی۔ ساتھ والوں کے گھر میں ہے۔ وہ کوئی لفنگی ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"خیر اس کا پتا تو چل جائے گا۔" گامے نے کہا۔ وہ بھاری بھرکم پہلوانوں جیسے جسم والا دراز قد آدمی تھا جس کی گھنی داڑھی تھی۔ لمبی لمبی زلفیں تھیں اور پاٹ دار آواز تھی۔ اس نے ریشمی سُرخ لاچے پر بوسکی کا کرتا پہن رکھا تھا اور کندھے پر چار خانے والا رومال ڈالا ہوا تھا۔

"مال اب رحمت لے جائے گا۔ رحمت اور تم۔"

"گامے شاہ جی۔" ڈرائیور بولا۔ "کراچی میں کریم بھائی گڑبڑ کر رہا ہے۔ اس کے شیر شاہ والے گودام پر کوئی چھاپا نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کے اپنے آدمی تھے۔ سارا ڈراما تھا۔ وہ مال ہضم کر گیا۔"

"مال تو میں اس کے حلق سے نکلوا لوں گا۔" گامے شاہ نے کہا۔

"لیکن تو کیسے جانتا ہے؟"

"ایکسائز والوں نے بتایا ہے جی۔ اپنا ہی آدمی ہے۔ اخبار کی خبر جھوٹی تھی۔" ڈرائیور بولا۔ "اور صرف ایک اخبار میں آئی تھی۔ اس نے کسی سے مل ملا کے چھپوائی تھی۔ رحمت کباڑی کو بھی معلوم ہے۔"

"ایکسائز میں میرا سالا انسپکٹر ہے جی۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"پیار علی۔ اس نے میری بیوی کو فون کیا تھا۔"

"اپنے اس پیار علی کو سمجھا دینا کہ ایسی باتیں عورتوں سے کرنے کی نہیں ہوتیں۔" گامے نے برہمی سے کہا۔

"میں نے اسے سمجھا دیا تھا جی۔ اور بیوی کو بھی کہ زبان سے ایک لفظ نکلا تو زندہ گاڑ دوں گا۔" ڈرائیور سہم کر بولا۔

"یاد ہے نا اس سے پہلے والے ایکسائز انسپکٹر کو اس کی غلطی کی کیا سزا دی تھی ہم نے؟" گامے نے کہا۔

"یاد ہے شاہ جی۔ یہ نیا ہے لیکن بے وقوف نہیں ہے۔" ڈرائیور اب پشیمان تھا کہ اس نے بیوی سے فون پر گفتگو کا حوالہ ہی کیوں دیا۔

"کام سمجھ لے گا تو سب سے زیادہ کام کا ثابت ہوگا۔"

"کام ٹھیک کرے گا تو خود بھی موج کرے گا۔ کریم بھائی سے میں بات کر لوں گا۔" گامے نے کہا اور واپس ہو گیا۔

"کتنا مال رہ گیا ہے چھوٹے؟" ڈرائیور نے چلا کر کہا۔ "جانا بھی ہے گھنٹے بھر میں۔"

"مُک گیا استاد جی۔ بس دو منٹ۔" چھوٹے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اور پھر "چھٹی لے کے آ جا بالما" گانے لگا۔ بہت لہک لہک کر۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ چھوٹے سمیت چار افراد اپنی آرام گاہ کی جانب جاتے ہوئے رُکے۔ انہوں نے احاطے کے وسط سے ایک تختے کو گھسیٹنا شروع کیا۔ تختے میں یقیناً ہک تھے یا زنجیر تھی جس سے وہ اسے کھینچ رہے تھے۔ اس تختے کو انہوں نے زیرِ زمین راستے کے سوراخ پر رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا تختہ کھینچتے

ہوئے لے گئے اور پہلے تختے کے برابر رکھ دیا۔ تختے یقیناً بہت بھاری تھے کیونکہ انہیں پوری طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک وہ چھ تختے لے گئے اور انہیں برابر جما دیا۔ سرچ لائٹس آف ہو گئیں تو میں اور محسن ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ پہلے ہم نے اس مال کا جائزہ لیا جو ایک ٹرک سے دوسرے ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ سب لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کریٹ تھے جن پر "میرو زریر اینڈ کمپنی" لکھا ہوا تھا۔ لائٹر جلا کے دیکھنے پر مجھے ہر کریٹ کے اوپر ایک چھپی ہوئی سلپ بھی چسپاں نظر آئی۔ ہر سلپ پہ مال کی کیفیت درج تھی۔ بظاہر ان میں نٹ بولٹ تھے اور مختلف سائز کے پیچ تھے اور سب پہ "زرعی آلات کے پرزے" لکھا ہوا تھا لیکن ایک ہی کریٹ کو اٹھا کر دیکھنے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مال کچھ اور ہے۔ اگر ان میں لوہے کے نٹ بولٹ ہوتے تو ان کا وزن چار گنا ہوتا لیکن اس وقت نہ کسی کریٹ کو کھول کر دیکھا جا سکتا تھا اور نہ اس احاطے کے باہر اسمگل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ یہ ایکسائز اور کسٹم والوں کی گرفت میں آنے والا مال ہے۔ "زرعی آلات کے پرزے" ہوتے تو اتنا لمبا چکر ہی کیوں ہوتا۔

"کیا خیال ہے اب؟" محسن نے کہا۔ "سب کو دھر لیں؟ تیری پولیس کی وردی کام آ سکتی ہے۔ ہم ایک ایک کو ہینڈز اَپ کرا سکتے ہیں، بلکہ گولی بھی مار سکتے ہیں۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انڈر گراؤنڈ راستہ کہاں جا کے نکلتا ہے۔ اس کے لیے تجھے مال کے پیچھے چھپ کر جانا ہوگا۔ میرا خیال ہے سرنگ زیادہ لمبی نہیں ہو سکتی۔ سو سوا سو گز کے اندر ہی دوسری جگہ ہوگی جہاں سے ٹرک باہر نکلے گا۔ پھر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مال کہاں جاتا ہے۔"

"مال کراچی جائے گا سیٹھ کریم بھائی کے پاس جس کا گودام شیر شاہ میں ہے۔" محسن بولا۔

"ہو سکتا ہے میں کراچی چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "مجھے دو نام معلوم ہوئے ہیں۔ کریم بھائی اور ایکسائز انسپکٹر پیار علی کا۔ یہ بہت بڑا لنک ہے۔ مجھے اس اخبار کے دفتر جانا پڑے گا جس میں چھاپے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی اخبار تھا۔ میں دیکھوں گا رپورٹر کون تھا۔ وہ کریم بھائی کے شیر شاہ والے گودام کا صحیح پتا بتا سکے گا۔ پیار علی کو تلاش کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیے۔"

آہستہ آہستہ ہم اس طرف چلنے لگے جہاں سے دوسرا ٹرک اندر آیا تھا۔ یہ انتہائی حیرت کی بات تھی کہ اس جگہ کا اب پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ دس فٹ چوڑے اور کم سے کم بیس فٹ لمبے سوئمنگ پول جیسے راستے پر تختے بڑی صفائی سے بچھائے گئے تھے۔ تختوں کے اوپر مٹی تھی اور مٹی میں برابر کٹی ہوئی گھنی گھاس تھی چنانچہ وہ جگہ باقی احاطے میں مل گئی تھی جس میں ایسی ہی گھاس تھی۔ فرق صرف اوپر چلنے سے محسوس ہوتا تھا۔ دیکھنے سے نہیں۔ ہر تختہ اسی لیے بھاری ہو گیا تھا کہ اس پر چار چھ انچ مٹی اور گھاس کا وزن تھا لیکن وہ اپنے خفیہ راستے کو کیموفلاج کرنے میں کامیاب تھے۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمارا آگے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اگر سرچ لائٹس اچانک روشن ہو گئیں یا وہ لوگ نکل آئے تو اس سپاٹ میدان میں ہم چھپے نہ رہ سکیں گے۔

"میرا خیال ہے کہ ٹرک لے کر دو ہی آدمی روانہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیپ ساتھ جائے۔ اگر جیپ پیچھے ہوئی تو میں کار سے کور کر آؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔ ضرورت پڑے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

"یس سر۔ اگر میں زندہ سلامت یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔" محسن نے ٹرک پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"پیچھے غالباً چھوٹو ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "جیسے ہی موقع ملے اسے ناک آؤٹ کر کے باہر پھینک دینا ورنہ اس نے تجھے دیکھ لیا تو یہی سلوک تیرے ساتھ ہوگا۔ میں سڑک پر گاڑی لیے کھڑا رہوں گا۔ یہ لوگ ایک گھنٹے میں روانہ ہوں گے۔"

میں نے چند کریٹ کھسکا کے محسن کے لیے جگہ بنائی۔ پھر اسے اپنے ساتھ لے کر واپس اسی جگہ پہنچا جہاں سے ہم اندر کُودے تھے۔ محسن نے مجھے اوپر اٹھایا اور میں ربر میٹ پر قدم جما کے باہر کُود گیا۔ کار تک پہنچنے میں میرے دس منٹ صرف ہوئے۔ یہ مشن جو رحمت کباڑی کی تلاش اور گرفتاری کے سوا کچھ نہ تھا اب غیر متوقع طور پہ لمبا ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی کون ہے اور گاما ماچھی کون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ جس شخص کو میں نے قید کر رکھا ہے وہ رانجھا ہے۔ اس کا اصل نام یہ نہیں ہوگا۔ یہ اس کی عرفیت تھی۔ وہی ایک آدمی ہماری تحویل میں ہے جس کے بارے میں گامے کو تشویش تھی اور اس نے رانجھے کی بیٹی کا حوالہ بھی دیا تھا۔ یہ میرے لیے اطمینان بخش بات تھی کہ پڑوس میں رہنے والا کوئی لیفٹیننٹ ہے جو اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔

لیکن کار سے جب میں سڑک پر پہنچا تو مجھے خیال آیا کہ اب رانجھے کا کیا ہوگا۔ وہ رات بھر بھوکا پیاسا اور بندھا ہوا پڑا رہے گا۔ کچھ کھائے پیے بغیر؟ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ رحمت کباڑی مل گیا تو اگلے دن دوپہر یا شام تک اسے رہائی مل جائے گی لیکن اب ہماری واپسی غیر یقینی ہو گئی تھی۔ محسن کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ روانہ ہوں گے تو بالکل مطمئن ہوں گے کہ ان کے سوا ٹرک میں کوئی نہیں اور لکڑی کے بکسوں کے درمیان چھپا ہوا محسن ان کو نظر ہی نہیں آئے گا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قسمت ہی ساتھ نہ دے تو اور بات ہے۔ ایک چھینک اس کی موجودگی کا راز افشا کر سکتی ہے لیکن وہ مسلح ہے اور کسی کے قابو میں نہیں آ سکتا۔ وہ ایک آدھ کو مار کے بھی نکل آئے گا۔

سڑک کے کنارے کار روک کے میں نے سگریٹ سلگائی اور آگے انجن کا بونٹ کھول دیا تا کہ معلوم یہ ہو کہ گاڑی گرم ہو گئی ہے یا کسی خرابی کے باعث میں وہاں رُکنے پر مجبور ہوں۔ پولیس کی وردی پہن کے میں نے بہت اچھا کیا تھا۔ اگر میں سادہ کپڑوں میں ہوتا تو مجھے ہر لحظہ پکڑے جانے کا خدشہ لاحق رہتا۔ وردی سے مجھے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ میں ہر تھانیدار کی طرح من مانی کر سکتا تھا۔ پیسے نہ ہونے کی صورت میں کسی سے بھی رشوت لے سکتا تھا۔ کسی بس یا ویگن والے سے جس نے زیادہ یا بغیر ٹکٹ سواریاں بٹھا رکھی ہوں، ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں سے، کسی بھی پھڈے میں ٹانگ اڑا کر۔ بل ادا کرنے کے لیے رقم نہ ہو تو کہیں بھی کھانا کھا کے ڈکار لیے بغیر روانہ ہو سکتا تھا۔ سواری کے لیے کسی بھی رکشا ٹیکسی کو پکڑ سکتا تھا۔ شریفانہ لباس میں آدمی کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ تھانیدار کی وردی میں کتنا خود مختار۔ میری جیب میں ابھی ڈھائی ہزار کی نقد رقم موجود تھی اور یہ بھی اسی تھانیدار کی کمائی تھی جس کی وردی میں نے زیب تن کر رکھی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ وردی اور یہ رقم کب تک میرا ساتھ دیں گے۔

ابھی کچھ واضح نہیں تھا کہ گامے شاہ کے آدمی ٹرک لے کر کہاں جائیں گے۔ اپنا مال کسی مال گاڑی میں بُک کرائیں گے یا سیدھا کراچی لے جائیں گے۔ میں نے محسن سے کراچی جانے کی بات تو کر دی تھی مگر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی مشکل تھا کہ میں کراچی نہ جاؤں۔ کریم بھائی اور ریاض علی سے مل کر بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میں محسن کو واپس بھیج دوں تو یہ بھی ضروری تھا کہ میں رحمت کباڑی کو کراچی پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کر لوں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ میں ٹرک کو راستے میں ہی غائب کر دوں۔ رحمت کباڑی، چھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو گرفتار کر لوں اور ٹرک کو ایسے تباہ کروں کہ اس کا سراغ نہ ملے۔ گرفتاری کے بعد چھوٹو اور ٹرک ڈرائیور کو رہا کر دیا جائے تا کہ وہ واپس جا کے گامے شاہ کو اس واردات کی خبر دے سکیں۔ الزام پھر کریم بھائی پر آئے گا۔ اس نے پہلے ڈراما کیا تھا کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور ایکسائز والے مال لے گئے مگر اس کا جھوٹ کھل گیا تھا۔ اب گامے شاہ کو شک ہو گا کہ ٹرک اس کے آدمی لے گئے۔ یہ رپورٹ بھی دلاور کو ہی کرنی پڑے گی کہ ٹرک میر وزیر اینڈ کمپنی کا تھا جس میں زرعی آلات کے پُرزے تھے۔ وہ مجھ پر شک کرے گا مگر گامے شاہ اسے بتا دے گا کہ کراچی میں کریم بھائی گڑبڑ کر رہا ہے اور یہ اس نے دوسرا ہاتھ مارا ہے۔

کچے راستے پر دُور سے ہیڈلائٹس نمودار ہوئیں تو میں نے بونٹ بند کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کار میں فیول میٹر کی سوئی آدھے سے زیادہ ٹینک فل بتا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میں سو میل تک ٹرک کا تعاقب کر سکتا ہوں۔ ٹرک کے پیچھے کوئی جیپ نہیں تھی جو مزید حوصلہ افزا بات تھی۔ قریب آنے پر میں نے ٹرک کو پہچان لیا۔ ٹرک نے کراچی جانے والی سڑک پر سفر شروع کیا تو میں سو گز کے فاصلے سے اس کے پیچھے رہا۔ ایک موڑ پر ٹرک کی رفتار کم ہوئی تو میں نے ٹرک میں سے کوئی چیز اُڑ کر جھاڑیوں میں گرتی دیکھی۔ محسن نے چھوٹو کو اس طرح اور ایسی جگہ پھینکا تھا کہ اسے کم سے کم چوٹ آئے۔ میں نے کار روک کے دیکھا، وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور بہت داویلا مچا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے کار روک کے پوچھا۔ "کیوں شور کر رہے ہو؟"

"اجی مر گیا میں تھانیدار صاحب۔ مجھے ٹرک میں سے پھینک دیا۔ وہ جا رہا ہے ٹرک؟" اُس نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"کس نے پھینک دیا؟" میں نے کہا۔ "اور وہ ٹرک کر کا تھا؟"

اس کے پاس دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا چنانچہ وہ چلّایا۔ "آپ پہلے اسے پکڑیں۔ وہ نکل جائے گا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے اس کی تسلّی کے لیے کہا۔ "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے نا۔ اسی جگہ کھڑے رہو۔ میں پکڑتا ہوں اسے۔" میں نے کار کی رفتار بڑھائی اور دس منٹ میں ٹرک کو جا لیا۔ محسن نے کریٹ کے پیچھے سے سر نکال کے ہاتھ ہلایا۔ میں نے جواب میں دو انگلیوں سے وی بنایا اور پھر مٹھی بند کر کے انگوٹھا دکھایا جس کا مطلب تھا کہ آل او کے۔ اب میں منتظر تھا کہ کہیں ٹریفک کم ہو تو ٹرک کو روکوں۔ اچانک ایک ریلوے کراسنگ آ گئی۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ اُتر آئے۔ وہ پلک جھپکتے میں سڑک پر کُود گیا اور کار میں آ بیٹھا۔ وہ اپنے کارنامے پر بہت خوش تھا۔

"بڑے موڈ میں کان پہ ہاتھ رکھے ہانک لگا رہا تھا۔ بہت لائٹ ویٹ تھا۔" محسن خان نے کہا۔ "ٹرک کا شور اتنا تھا کہ اسے میرے نکلنے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ چوٹ تو نہیں آئی اسے؟"

"نہیں۔ میں اُسے وہیں روک آیا ہوں۔ کسی اور سے اب کچھ نہیں کہے گا۔" میں نے کہا۔

تین میل بعد مجھے موقع ملا اور میں نے کار آگے نکالنے کا فیصلہ کیا اور رفتار بڑھائی۔

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو ایک بکس اٹھا کے کہیں سڑک کے کنارے رکھ دینا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے ڈرائیور اُترے گا اور مجھے الگ لے جا کر معاملہ طے کرے گا۔ اسے فوراً کار

میں ڈالنا ہے۔ میں دوسرے سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کار آگے نکال کے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کیا اور اس کا راستہ روکنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں بالکل ٹرک کے سامنے آ گیا اور ٹرک ڈرائیور رفتار کم کر کے رُکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اطمینان سے نیچے اُتر آیا۔

"کیا بات ہے تھانیدار صاحب؟" ڈرائیور نے سلام کر کے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "کوئی غلطی ہوئی ہم سے مائی باپ؟" وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ نیا انسپکٹر کہاں سے آیا۔ اس راستے پر وہ سب کو جانتے ہوں گے اور سب کو ان کا حصہ پہنچا دیتے ہوں گے چنانچہ ان کے لیے خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"نیچے اُتر گورنر کی اولاد۔" میں نے کہا۔ "کاغذات دکھا۔"

وہ کاغذات لے کر نیچے اُتر آیا۔ کاغذات بالکل ٹھیک تھے۔ "کیا لے جا رہے ہو؟" میں نے پیچھے نظر ڈال کے کہا۔

"وہی جو ہمیشہ لے جاتے ہیں مائی باپ۔" وہ گول مول الفاظ میں بولا۔

"کیا لے جاتے ہو ہمیشہ، اپنی ماں کا سر؟" میں نے گرج کے کہا۔ "یہ اسپیشل چیکنگ ہے۔ خود ایس پی صاحب نگرانی کر رہے ہیں۔ منشیات کا ایک ٹرک پشاور سے آ رہا ہے۔"

"توبہ توبہ۔" ڈرائیور نے دونوں کانوں کو چھو کر کہا۔ "اللہ معاف کرے ایسے دھندے سے۔ ہم تو جناب عالی پُرزے لے جاتے ہیں۔ ٹریکٹر کے، چاول اور کپاس چھڑنے کی مشینوں کے، کمپنی زرعی آلات بناتی ہے۔"

میں نے ریوالور نکال لیا۔ "زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ کریٹ کھولو۔"

اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "آپ مالک سے بات کر لیں جناب عالی۔ ہم تو نوکر ہیں۔"

وہ پلٹا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا۔ وہ تھوڑا سا تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے اُسے وہیں ڈال دیا اور پھر آگے گیا۔

"تم مالک ہو اس کے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تلاشی لینی ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے تم سے بات کروں۔" میں نے اسپیشل چیکنگ والی بات پھر دُہرائی۔ رحمت کباڑی چالیس سال کا ضرور ہو گا لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ اسی وقت میں نے محسن کو کار سے اُتر کے ٹرک کی دوسری سائڈ سے پیچھے جاتے دیکھا۔ "اس میں کیا ہے تلاشی کے لیے تھانیدار جی؟" رحمت نے مالکانہ رعونت سے کہا۔

"ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا لیکن ایس پی...."

"ایس پی کون ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔ "پراچہ صاحب؟"

"ایس پی اینٹی کرپشن اے آر مغل۔" میں نے کہا۔ "بہت سخت آدمی ہے۔"

"سخت تو سب ہی ہوتے ہیں بادشاہو۔ نرم کر لیں گے ہم۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"اپنے ہاتھ اُوپر رکھو۔" میں نے سخت لہجے میں حکم دیا لیکن وہ اتنی دیر میں ایک پیکٹ نکال چکا تھا۔

"اِدھر آ جائیں سر جی۔" وہ بولا۔ "سڑک پر کھڑے ہو کے کیا بات کرنی۔ آپس کا معاملہ ہے۔"

وہ مجھے سڑک سے ذرا دُور لے گیا جہاں دو درختوں کی اوٹ میں ہم کسی سڑک پہ سے گزرنے والی گاڑی کی روشنی میں نہیں آتے تھے۔ "سو میں رٹ پرمٹ مل جائے گا جناب؟" وہ معنی خیز انداز میں دانت نکال کے بولا۔ اس کی مراد سو سو کے سو نوٹوں سے تھی۔

"مال کیا ہے؟" میں نے دس ہزار کی گڈی پر نگاہ ڈالے بغیر کہا لیکن لہجہ بدل دیا۔

"مال نو چھڈو ویراں جی۔ گل مکاؤ۔" وہ بولا۔ "ابھی کوئی اور نہ آ جائے حصے دار۔ ہم تو دونوں کے بھلے کی بات کرتے ہیں۔"

"ایسے مشکل ہے، پشاور سے پورا ٹرک روانہ ہونے کی اطلاع ملی تھی اور مخبر نے خود ایس پی صاحب کو بتایا تھا کہ پھیرا کتنے کا ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اب دشمنوں کی طرح نہیں پارٹنرز کی طرح بات کر رہے تھے۔ راز داری کے ساتھ اور بے خوف و خطر۔

"چنگا جی۔ یہ لو اب مت بولنا۔" اس نے دوسری گڈی برآمد کی لیکن وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اگر میں اس کی طرف سے محتاط نہ ہوتا تو یقیناً مارا جاتا۔ میرے ریوالور جیب میں رکھنے کے بعد اس نے سمجھا تھا کہ اب فریقِ ثانی نہتا ہے اور اس کا کام آسانی سے تمام کیا جا سکتا ہے۔ نوٹوں کی دوسری گڈی کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کچھ غیر معمولی جلدی کی یا گھبراہٹ میں اس طرح دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالا کہ میں چوکنا ہو گیا ورنہ وہ مجھے گڈیاں تھمانے کے بعد بھی اطمینان سے ریوالور نکال سکتا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ دیر سے کام خراب نہ ہو جائے اور کوئی گاڑی نہ آ جائے۔ گاڑیاں تو مسلسل گزر رہی تھیں لیکن شک کسی کو نہیں ہوا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ایک کار اور ایک مال بردار ٹرک ساتھ ساتھ کھڑے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے ایک گاڑی خراب ہو اور دوسرا اس کی مدد کر رہا ہو یا دونوں آپس میں چھو گئے ہوں اور اب لڑ جھگڑ کے اپنے اپنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

نقصانات کی تلافی کر رہے ہوں۔ محسن اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

فائر اس نے بڑی عجلت میں کیا تھا لیکن میں اس سے قبل ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ عین اس وقت جب اس کی دوسری جیب سے ریوالور نکلا تھا، میں نے بڑی پھرتی سے گھٹنا اس کے ہاتھ پر مارا اور گولی آسمان کی طرف نکل گئی۔ ریوالور سائلنسر والا تھا چنانچہ اس کی آواز قریب سے گزرنے والی ایک بس میں کسی نے نہیں سُنی۔ اس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی اور میں نے اُسے لات مار کے اچھال دیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور پھر اٹھا لیکن میرے اگلے وار نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ بے سُدھ ہو کے گر گیا۔ میں نے ریوالور اور بیس ہزار روپے جیب میں ڈالے اور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"کریٹ ڈکی میں اور مہمان پیچھے۔" محسن نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کو کہاں رکھنا ہے؟"

"ابھی تو یہیں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ رحمت کباڑی کو اٹھا کے اندر پھینکا اور محسن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یہاں سے نکل لے۔ بہت سی گاڑیاں گزری ہیں۔ معلوم نہیں کس نے کیا دیکھا ہو اور آگے پولیس کو بتا دیا ہو۔"

محسن نے کار اسٹارٹ کر دی۔ تین میل آگے جانے کے بعد مجھے ایک کچا راستہ نظر آیا جو گھنے درختوں کے بیچ میں سے کسی قصبے یا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے محسن کو گاڑی موڑنے کو کہا۔ کچے راستے پر اُترتے وقت میں نے آگے پیچھے دیکھا۔ اس وقت دونوں طرف سڑک خالی پڑی تھی۔ محسن نے کار کو پھر موڑا اور درختوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے روک لیا۔

"ڈکی میں کوئی رسّی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کار میں تو نہیں تھی، ٹرک میں تھی۔" محسن نے کہا۔ "میں نے ضرورت کے خیال سے اُٹھا لی تھی۔"

"غلطی سے تو کبھی کبھی عقلمند ہونے کا ثبوت دے دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب پہلے تو ان دونوں کو باندھنا ہے اور ان کے منہ بند کرنے ہیں۔"

"رشوت کتنی ملی؟" محسن نے رسّی نکالتے ہوئے کہا۔

"بیس ہزار۔" میں نے جیب پر ہاتھ مار کے کہا۔ "اگر کچھ اور ملے تو رکھ لینا۔ سب مال اپنا ہے۔"

"ہاں کمائی تو میر وزیر اینڈ کمپنی کے نام پر ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔ ہم دونوں نے مل کر رحمت کباڑی اور چھوٹو کو ایک ساتھ ملا کے یوں باندھ دیا کہ وہ "تو من شدم من تو شدی" کی تفسیر بن گئے۔ ان کے منہ میں رومال ٹھونس کر میں نے ان پر وہ چادر ڈال دی جو ڈرائیور کے کندھے پر تھی۔

"اب تو واپس قصرِ جمشید جا۔" میں نے کہا۔ "مجھے راستے میں ٹرک کے قریب اتار دینا۔"

"تو ٹرک لے کر کہاں جائے گا؟" محسن بولا۔ "اسے رہنے دے وہیں۔"

"میں صبح تک واپس پہنچ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کا نام و نشان مٹا کر۔"

محسن نے گاڑی کو واپس سڑک پر لا کے لاہور جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ مجھے ٹرک کے پاس اُتار کے اور احتیاط کی تاکید کر کے وہ سیدھا نکل گیا۔ میں نے ٹرک ڈرائیور کی جگہ سنبھالی۔ چابیاں وہیں لٹکی ہوئی تھیں جہاں ڈرائیور نے انہیں چھوڑا تھا۔ میں ٹرک کو لے کر چلتا گیا۔ تقریباً پندرہ میل چلنے کے بعد مجھے ایک خشک برساتی نالہ نظر آیا۔ جس کا پُل بہت اونچا تھا۔ میں نے جگہ دیکھ کر ٹرک کو نیچے اتارا اور اونچے نیچے کچے راستوں پر احتیاط سے چلاتا ہوا پُل کے نیچے لے گیا۔ ٹرک کی سیٹ کے نیچے ایک ڈبا موبل آئل کا تھا۔ اُسے میں نے آگے ہی چھڑک دیا۔ پیچھے اسپیئر وہیل کے درمیان پانچ گیلن پٹرول کا جیری کین رکھا تھا جو میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ٹرک احاطے میں کھڑا تھا۔ گھاس پھونس جمع کرنے کے لیے مجھے کچھ دُور جانا پڑا لیکن بالآخر میں ہر ٹائر کے نیچے اور پٹرول ٹینک کے نیچے خاصی مقدار میں خشک گھاس اور ٹہنیاں جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات صرف آگ پکڑنے کی تھی۔ اس کے بعد ٹائر خود ہی جلنے لگتے۔ ٹرک کا ڈھانچہ لکڑی کا تھا، اندر لکڑی کے کریٹ تھے۔ آگے ریگزین کی سیٹوں پر موبل آئل پڑا ہوا تھا۔ اور پٹرول ٹینک خود ایک پٹرول بم تھا۔ میں نے پانچ گیلن پٹرول پانچوں جگہ مساوی مقدار میں چھڑکا۔ لائٹر سے چاروں ٹائروں کے نیچے آگ دکھائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ آگ ایک دم بھڑکی تھی اور میرے سڑک پر پہنچنے تک نیچے الاؤ روشن ہو گیا تھا۔ ایک مسافر بس سے چھپنے کے لیے میں ایک درخت کے تنے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مسافر بس جنگل میں منگل دیکھ کر رُک گئی تھی۔ پھر مخالف سمت سے آنے والی بس وہیں آ رکی۔ دیکھتے دیکھتے پُل پر کئی گاڑیاں ٹھہر گئیں۔ پھر میں اطمینان سے نکلا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات

چوتھے حصے میں

ملاحظہ فرمائیے جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شکاری
چوتھا حصہ

پسندیدہ ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
[illegible] روڈ محلہ عیدگاہ وزیرآباد

[illegible]

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس

"کیا تماشا ہو رہا ہے یہاں؟" میں نے گرج کے کہا۔ "ساری ٹریفک بلاک ہو گئی ہے۔"

"وہ دیکھیں جناب!" ایک شخص نے کہا۔ "نیچے کہیں آگ لگی ہے۔"

"تو تم یہاں کھڑے رہ کر اسے بجھا لو گے۔" میں نے اُس کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ "پھونک مار کے بجھاؤ گے۔ اوئے ہمت ہے تو نیچے جاؤ۔ جا کے فون کرو کوئی فائر بریگیڈ کو۔" باقی لوگ سہم گئے۔

"یہاں فون کدھر ہے؟ کسی پیڑ پر؟" ایک فیشن ایبل نوجوان نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

دونوں بس والوں نے مسافروں سے بیٹھنے کو کہا اور خیریت اسی میں سمجھی کر روانہ ہو جائیں۔

"اسمارٹ بوائے!" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ویری فنی۔ اگر فون یہاں نہیں ہے تو کیا آگے کسی پیٹرول پمپ یا کسی پولیس اسٹیشن پر بھی نہیں ہو گا؟"

اسمارٹ بوائے فوراً اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے روک لیا۔ "ایک منٹ۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ خود فون کر دوں گا۔"

"لیکن میرے ساتھ میری بیوی ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔

"شٹ اَپ۔ میں پیچھے بیٹھوں گا اور ٹک ٹک کرو گے تو دونوں کو مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

اسمارٹ بوائے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا۔ کوٹ لکھپت سے آگے میں نے ایک پیٹرول پمپ کے سامنے اسے رُکنے کے لیے کہا۔ "تھینک یو ویری مچ۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت ہوئی خاتون! اس کے لیے معذرت۔" اسمارٹ بوائے نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کی بیوی نے مسکرا کے کہا۔ "یو آر ویلکم۔"

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور رحمت کباڑی کو گرفتار کرنے کے علاوہ شکاریوں کے نئے ٹھکانے دیکھ آیا تھا۔ مجھے نئے شکاریوں کے نام معلوم ہو گئے تھے اور... ان کو لاکھوں کا نقصان پہنچانے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ میں کچھ دیر پیدل چلتا رہا تھا۔ پھر میں نے لاہور جانے والی ایک ویگن کو روکا۔

"کوئی سیٹ ہے بھئی لاہور تک۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جنابِ عالی۔" کنڈیکٹر نے کہا اور اگلی سیٹ کے مسافروں کو اٹھا دیا۔ "چلو بھئی زنانہ سیٹ خالی کرو۔"

"کدھر ہے زنانہ سواری؟" ایک شخص نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ میں بالکل بے نیازی سے کھڑا رہا۔

"میاں تم کو ہم نے چڑھتے وقت ہی بتا دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر یہ سیٹ خالی کرنی پڑے گی۔" ڈرائیور نے ناگواری سے کہا۔ "اب زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔" لوگ بڑبڑاتے ہوئے اُتر کے پیچھے چلے گئے اور میں پوری شانِ بےنیازانہ شان کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان ہو کے پبلک کی باتیں سنتا رہا جو وہ پولیس کے خلاف

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر رہے تھے۔ زنانہ سواری۔ پولیس، زنانہ سواری ہوتی ہے ؟ سب بدمعاشی ہے جی۔ خود پولیس یہ کرے گی تو کسی اور سے کیا گلہ۔ لاقانونیت ہے سب۔ یہ قوم صرف باتیں کر سکتی ہے۔ قانونی کارروائی کی ہمت نہیں رکھتی۔ لاہور آتے ہی میں ویگن سے اتر گیا۔ اس وقت کسی رکشا یا ٹیکسی کا ملنا مشکل تھا چنانچہ مجھے ریلوے اسٹیشن تک مارچ کرنا پڑا۔

ایک رکشا کو بیگار میں پکڑ کے سمن آباد پہنچا۔ رکشا کو میں نے قصرِ جمشید سے بہت پہلے روک لیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے پورا پچاس کا نوٹ بخش دیا۔ میرے پاس کھلے تھے ہی نہیں۔ رکشا والے نے سلام کر کے رکھ لیا۔ بعد میں اُس نے بھی گالی دی ہو گی مجھے کہ میرے پاس کون سا حلال کا مال تھا کہ مجھے دس کے پچاس دیتے ہوئے دُکھ ہوتا اور اپنی خوش قسمتی کا یہ واقعہ متعدد بار سنایا ہو گا۔

آخری موڑ کاٹتے ہوئے میرے قدم رُک گئے۔ قصرِ جمشید سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس کی پرانی لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔

سڑک پر خاصے لوگ جمع تھے اور دور ہونے کے باوجود وہ قصرِ جمشید کو ایک ملبے کا ڈھیر بنا دینے والی آگ کی حدّت کو محسوس کر رہے تھے۔ اندر صرف ایک فائر بریگیڈ تھا جس میں سے پرانی وردیوں والے فائر مین اتر کے پائپ ہاتھ میں پکڑے اِدھر سے اُدھر دوڑ کر اپنی مستعدی کا مظاہرہ کر رہے تھے کیونکہ پبلک کے سامنے ان کو کچھ نہ کچھ بہرحال کرنا تھا۔ عام طور پر کاہل اور بے کار بیٹھے رہنے والے فائر مین عملاً ایسی سنگین آتش زنی کی واردات سے بہت کم دوچار ہوتے تھے عموماً تو وہ کسی دکان کی یا گھر کی راکھ میں دبکنے والی چنگاریوں پر پانی چھڑک کر لوٹ آتے تھے یا کسی کی احمقانہ شرارت پر شرمندہ و مشتعل ہو کر جو انھیں بے وجہ دوڑاتا تھا۔ اس وقت ان کی پریشانی کا سبب پانی کی نایابی تھا۔ اتنے وسیع و عریض قصرِ جمشید کی آگ بجھانے کے لیے تفصیل درکار تھی ... [illegible] ایک ہینڈ پمپ کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور اس میں سے صرف گلاس بھر بھر کے پانی پھینکا جا سکتا تھا۔ ہوا میں ٹائر جلنے کی بُو تھی۔

میری نظر محسن کو تلاش نہ کر سکی لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی کورٹینا نہ جانے کہاں تھی۔

"سکندر!" اس نے مجھے دور سے آواز دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ایک درخت کی شاخوں پر زمین سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر براجمان تھا۔ "یہاں آجاؤ ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ یہاں سے سب صاف نظر آتا ہے۔"

درخت کا تنا اوپر دس فٹ تک سیدھا گیا تھا پھر ایک سے زیادہ شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا مگر سب سے بڑی شاخ کی موٹائی ایک فٹ کے قریب تھی اور وہ باقی درخت سے الگ ہو کے یوں اوپر جا رہی تھی جیسے مسلسل ترقی کو ظاہر کرنے والے گراف کی لکیر اوپر جاتی ہے۔ اس کے قریب ایک غلیل نما حصے میں تشریف رکھنے کے بعد میں نے محسن سے سگریٹ لی اور سامنے کا پورا منظر دیکھا۔ فائر بریگیڈ والوں کی ایک اور خستہ حال ٹیم گھنٹیاں بجاتی آ پہنچی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ گھر میں کیا تھا کہ تراغم اسے غارت کرتا؟

"محسن خان!" میں نے کہا۔ "اس کھنڈر میں آگ پکڑنے والی کون سی چیز تھی۔ کھڑکیاں دروازے تک تو لے جانے والے لے جا چکے تھے۔"

"ایک چیز تھی جو آپ چھوڑ گئے تھے۔" محسن خان نے کمالِ اطمینان سے فرمایا۔ "مسٹر رانجھا کو۔"

"ہاں۔ اب کون بتائے گا کہ کھنڈر میں آگ کس نے لگائی؟" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اور کون جل گیا۔ تو نے کسی کو آتے جاتے دیکھا؟ دلاور اینڈ کمپنی کے کسی بندے کو؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں پہنچا تو یہی افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ فائر بریگیڈ کو بھی شاید کسی نے پاس پڑوس سے فون کیا ہو گا۔"

"اس وقت جب رانجھا کو آگ لگانے والے اپنا کام کر کے نکل گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹرک کا کیا ہوا؟" محسن نے کہا۔ "آگ لگا دی تو نے اسے! یا کہیں غرق کر دیا ہے؟"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں۔ لیکن تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" وہ ہنسا۔ "چوہدری دلاور کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتا۔"

"اب ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یہ تماشا تو بے مقصد چل رہا ہے۔ نقصان کسی کا بھی نہیں ہوا سوائے رانجھا کے ... جان سے گیا اور اس کی بیٹی یتیم ہوئی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔

"صرف دعا کر سکتے ہیں کہ خدا رانجھا کے گناہوں کو معاف کرے۔" میں نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی سلامتی کے ساتھ رخصت ہو کے اپنے گھر چلی جائے۔ دنیا میں بہت لوگ ہیں محسن خان جن کے لیے ہم صرف دعا کر سکتے ہیں، دوا نہیں۔"

ہم دونوں ایک ساتھ نیچے اترے اور واپس چل پڑے۔ محسن نے کار کو سوگز پیچھے ایک احاطے کی دیوار سے لگا کے کھڑا کر دیا تھا۔ یوں کہ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ آیا ہو گا کسی کا مہمان۔ اس مختصر سے فاصلے کو طے کرتے ہوئے میں نے محسن کو بتا دیا کہ میں نے ٹرک کو کس طرح ٹھکانے لگایا تھا۔

"گویا چوہدری صاحب کو اب تک اطلاع مل چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "چھوٹو بچ گیا تھا۔"

"اس نے گامے شاہ یا گامے ماچھی کو بتایا ہو گا کہیں سے فون کر کے یا کسی طرح واپس پہنچ کے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی وہ راہ میں ہو۔ یا گاما ماچھی سوچ رہا ہو کہ دلاور کو اس نقصانِ عظیم کی اطلاع کیسے دے اور اپنے دو قابلِ اعتماد کارندوں کی گمشدگی کا الزام کس پر عائد کرے۔ کراچی کے سیٹھ کریم پر یا ہم پر۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کریٹ میں کیا ہے جو ہم نے ٹرک سے اتار لیا تھا۔" میں نے کہا۔

بند کریٹ ابھی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولنا آسان کام نہ تھا۔ چاروں طرف سے اس کے کناروں پر کیلیں ٹھوک دی گئی تھیں اور تختے آدھے انچ کے قریب موٹے تھے، ان پر دونوں طرف سے آدھی انچ چوڑی اور چمکیلی ٹین کی پتی مشین سے لپیٹ کر کس دی گئی تھی۔ اسے کاٹے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا اور ہمارے پاس اس کے لیے ضروری آلات نہیں تھے۔ کار کی ڈکی میں صرف بنیادی ضرورت کا سامان تھا۔ اسپیئر وہیل جیک اور وہیل اسپینر۔ اس میں اگر ایک معمولی سا پلائر بھی ہوتا تو ہمارا کام چل جاتا۔

"مجھے شک ہے،" میں نے کہا۔ "شک ہی نہیں یقین ہے کہ اس میں منشیات ہوں گی۔"

"اب کہیں سے اسے کھولنے کا سامان ملے تو پتا چلے کہ آپ کس حد تک درست فرماتے ہیں۔" محسن نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"رانجھا تو مر گیا لیکن مرنے سے پہلے بہت کچھ بتا گیا۔" میں نے کہا۔ "نہ بتاتا تب بھی کون سا زندہ رہتا۔ ہم اب تین نئے کرداروں سے متعارف ہو چکے ہیں۔ گاما ماچھی۔ کراچی کا سیٹھ کریم اور ایکسائز کا کوئی آدمی پیار علی۔"

"تو اُن دونوں کو کیوں بھول رہا ہے جو ہمارے ساتھ ہیں۔" محسن بولا۔ "ان کو اگر زیادہ دیر اسی طرح رکھا گیا تو وہ کچھ بتانے کے لیے زندہ ہی نہیں رہیں گے۔"

"اس وقت انھیں کہاں لے جائیں؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ قصرِ جمشید بہت محفوظ رہے گا۔ شکاری شک تک نہیں کریں گے کہ شکار انھی کے سایۂ عاطفت میں محفوظ بیٹھا ہے لیکن اب مجھے آنجہانی مسٹر رانجھا کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ آئیں گے تمھاری خبر لینے۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ یہ کھوکھلی دھمکی ہے لیکن آتش زنی کی اس واردات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ یہاں آتے رہتے ہیں۔ میرا تعاقب کسی نے نہیں کیا تھا کہ انھیں کچھ علوم ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو مجھے اتنی مہلت نہ ملتی اور وہ فوراً آ پہنچتے۔ میں نے اس مالی کو بھی یہاں نہیں دیکھا تھا اور نہ اس بات کے آثار ملے تھے کہ وہاں کوئی رہائش پذیر ہے لیکن اب مجھے یقین نہیں کہ میرے اندازے صحیح تھے۔ یا تو وہی مالی بعد میں آیا اور اندر ایک نامانوس گاڑی کو دیکھ کر کھٹک گیا۔ ممکن ہے، وہ دبے پاؤں اوپر بھی آیا ہو اور میری تفتیش دیکھ گیا ہو۔"

"تیرا مطلب ہے وہ مالی بھی انھی کا ایجنٹ ... یہ روسیلون ہو سکتا ہے؟" محسن نے کہا۔

"کوئی بات اب بعید از امکان نہیں رہی۔" ... نے کہا۔

"ان کے پاس ایک غریب آدمی کی وفاداریاں خرید... کا سب سے مؤثر ہتھیار پیسہ ہے۔ پیسہ آج کی دنیا میں کیا نہیں ... رہا ہے۔ دین ایمان، شرافت اور انسانیت، ضمیر، اصول اور ... دن اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کچھ خریدتے ہیں تو اس ... کے ساتھ خریدتے ہیں کہ انھوں نے پیسہ ضائع نہیں کیا۔ شاید وہ ... مالی مجھے دیکھ گیا اور اس نے سب کچھ سن کر دلاور کو مطلع کر دیا۔ میری قسمت کہ میں اس کی جوابی کارروائی میں جل کے راکھ نہیں ہو سکا۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی اس اجڑے دیار کو اپنے ناجائز کاروبار کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ایسی ہی غیر آباد جگہ ان کے کاروباری نقطۂ نظر سے انتہائی محفوظ ہو سکتی ہے جس پر کسی کی نگاہ تک نہ جائے اور جائے تو کسی کے دل میں یہ خیال ہی نہ آئے کہ اسی کھنڈر میں مٹی سے سونا بنایا جاتا ہے۔ وہ رات کی خاموشی اور ویرانی میں یہاں جمع ہو کے کچھ بھی کریں، مال کی تقسیم اور ترسیل کا انتظام، میٹنگ یا رقم کی وصولی۔"

"تاہم یہ جگہ ان کا گودام یا فیکٹری نہیں ہو سکتی۔" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں — ورنہ وہ اتنی جلدی اسے آگ نہ لگا پاتے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "انھیں مال یا مشینری کو شفٹ کرنے میں کچھ وقت لگتا۔"

"محسن!" میں نے ایک فوری خیال ... کہا۔ "کیا یہ آگ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ آگ بالکل حقیقی تھی۔" محسن بولا۔ "اس میں کوئی کیمرہ ٹرک نہیں تھی۔ اگر تو مرغی ہوتا تو میں تجھے روسٹ کر لیتا۔ میرا بھوک سے بُرا حال ہے۔"

"اسی لیے تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب کچھ اور تھا۔ فرض کر جیسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انھوں نے ایک کھنڈر میں اپنا ہیڈ آفس قائم کر رکھا تھا ایسے ہی راز افشا ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتے ہی انھوں نے دنیا کی آنکھوں میں ایک مٹھی دھول اور جھونک دی ہو۔ آگ لگا کے انھوں نے دشمنوں کے یعنی ہمارے وسوسے مٹا دیے۔ ہمارا مقابلہ کسی عام شکاری سے نہیں ہے۔ انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو رانجھا کو گرفتار ہونے کی سزا دی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ جان لیں کہ غلطی دانستہ ہو یا نادانستہ، بہر صورت اس کی سزا موت ہے۔ میرے یہاں آنے اور رانجھا سے تفتیش کے علاوہ اسی ویرانے میں قیام فرمانے کے ارادے نے انھیں شک میں ڈال دیا ہو گا۔ میں الّو تو نہیں ہوں کہ ویرانوں میں رہوں۔"

"بچشمِ بد دور، آپ تو جہاں بھی رہیں، الّو ہی رہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آپ ڈرائیونگ فرما رہے ہیں، اس لیے جھانپڑ اُدھار۔" میں نے کہا۔ "چور تو دل کے اندر ہوتا ہے محسن خان شیروانی اور آدمی ہاتھ پھیرتا ہے داڑھی پر کہ تنکا کہاں ہے۔ دلاور نے سوچا ہو گا کہ یہ سکندرِ اعظم نے کہاں ڈیرا ڈال دیا اور کیوں؟ کیا اس نے معلوم کر لیا ہے کہ یہ جگہ کس کام آتی ہے اور اب اپنا جال پھیلانا چاہتا ہے کہ جو آئے پکڑا جائے۔ وہ جانتا ہے کہ اکیلا تھوی سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں اور وہ کسی گروہ کے ہیڈ کوارٹر کو ختم کرنے کے لیے خود بھی کس حد تک میدانِ عمل میں کود سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے تیر سے دوسرا شکار انھوں نے ہمارے اندیشوں کو کیا۔ آگ لگا کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ یہ سنسان کھنڈر کسی غلط قسم کے کام کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ ہمارے ذہن میں صرف یہی خیال آئے کہ آگ لگانے کا مقصد رانجھے کو راکھ کرنا تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں اور بلاشبہ ہم یہی سمجھے تھے۔"

"کیا ہم غلط سمجھے تھے اے دور اندیش مردِ دانا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں عزیزم۔ غور فرما آتش زنی کے طریقے پر۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اوپر نیچے ہر کمرے میں آگ کیسے پھیلائی؟ دیواریں تو آگ پکڑ نہیں سکتی تھیں۔ اندر نہ فرنیچر تھا نہ پردے قالین اور نہ کھڑکی دروازے۔ پھر بھی دیکھنے سے تاثر یہی ملتا تھا کہ پورا قصرِ جمشید آگ کی لپیٹ میں ہے۔ میرا خیال ہے انھوں نے سب کمروں میں کھڑکیوں، دروازوں کے پاس گھاس پھونس اور لکڑیاں رکھیں۔ ان پر پٹرول یا مٹی کا تیل ڈالا اور گھوم پھر کر خود آگ لگائی۔ تو نے ٹائروں کے جلنے کی بو محسوس کی تھی۔ وہ بھی انھوں نے ہی رکھے ہوں گے پرانے ناکارہ ٹائر زیادہ دیر جلتے ہیں اور بہت دھواں دیتے ہیں۔"

"اور اس اہتمام کا مقصد ہمیں۔۔ میرا مطلب ہے تجھے الّو بنانا کیسے ہوا؟" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سلسلہ بدستور زیرِ زمین چلتا رہے گا۔" میں نے کہا۔ "انڈر گراؤنڈ بزنس ہے اور وہ عملی طور پر انڈر گراؤنڈ ہی کام کرتے ہوں گے۔ اوپر کا کھنڈر رہے یا نہ رہے۔ ان کا گودام، فیکٹری یا ہیڈ آفس محفوظ اور دنیا کی نظر سے اب بھی اوجھل ہے۔ پہلے کوئی اسے ویرانہ سمجھ کے قابلِ توجہ نہیں سمجھتا تھا۔ اب جلنے کے بعد اس کی ظاہری حالت پہلے سے زیادہ تباہ نظر آئے گی۔"

"تیری ناقص عقل میں یہ قابلِ رشک خیال کیسے آیا!" محسن نے کہا۔ "مجھے تو حسد ہو رہا ہے۔"

"واضح ہو کہ پہلے تہ خانے بنانے کا رواج عام تھا۔" میں نے کہا۔ "اور قصرِ جمشید کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ ہو تو عین ممکن ہے۔ اس کی وسعت بھی قصر کہلانے والی اس عمارت کے مطابق ہو گی۔ دلاور اینڈ کمپنی کے وسیع کاروبار کے لیے تو ایسی کوئی جگہ ضروریات کے عین مطابق ہے۔ شاید اس سے بہتر کوئی جگہ ہی نہ ہو۔"

"رائٹ۔" محسن نے بریک لگا کے کہا۔ "لیکن اس مرحلے پر میں تحریکِ التوا پیش کر کے منظور کرتا ہوں۔" اور گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روک لیا۔ جہاں سے آخری گاہک رخصت ہو چکا تھا۔ چنانچہ پروپرائٹر آمدنی کے علاوہ بہت سے مسائل پر غور فرما رہے تھے کہ کون سی چیز بچی اور کیوں بچی؟ زیادہ پکائی گئی تھی تو کیوں اور کم کھائی گئی تھی تو کیوں؟ اور ظاہر ہے کہ اب اس "پس خوردہ" کو اگلے دن معزز گاہکوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بچا کر رکھنے ہی والے تھے کہ ہم نے بچا کھچا مال خرید کے انھیں تفکرات سے نجات دلائی۔ دو میل دور جا کے میں نے اور محسن نے ڈنر تناول فرمایا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہم ملتان روڈ پر تھے اور آبادی تقریباً ختم ہو چکی تھی جس مکان کی اوٹ میں محسن نے گاڑی کو روکا تھا، وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور چھت پڑ جاتی تو مکمل ہی کہلاتا لیکن آثار یہ تھے کہ اسے نامکمل پڑے ہوئے زمانہ ہو گیا۔

میں پہلے گاڑی کی چھت پر اور اس کے بعد دیوار پر چڑھا۔ اندر خانہ ویرانی کا ڈیرا تھا اور بغیر پٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں کے خلا سے اندھیرا جھانک رہا تھا۔ میں آہستہ سے اندر لٹک گیا اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ پیروں کے زمین سے لگتے ہی میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ اچانک اندر سے ایک بھاری بیٹھی ہوئی اور بڑبڑاتی ہوئی آواز آئی۔

"لعنت چور، کہیں اور جا۔" میں اچھل پڑا اور بےساختہ اندر لپکا۔ اندھیرے میں مجھے فرش پر ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ میں نے لائٹر جلایا۔ فرش پر ایک مٹا کٹا فقیر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر پیوند لگی ہوئی لمبی سی ایک قبا تھی جسے چُغہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ میل اور گرد میں اس کے کپڑے کا رنگ خاکستری ہو رہا تھا۔ سر کے لمبے جٹا دھاری بال داڑھی میں الجھ گئے تھے اور اس جھاڑ جھنکاڑ چہرے میں اس کی صورت کے نقوش چھپ گئے تھے۔ سامنے سے صرف ناک، لب اور لال لال آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کشکول اور چمٹا سرہانے دھرا تھا۔

"ہم نے کہا ہے کہیں اور جا نامراد۔" وہ جلالی لہجے میں بولا۔ "فقیر کے آرام میں خلل ڈال کے کیا ملے گا تجھے؟"

مجھے تھوڑی سی دل لگی سوجھی۔ "مال تو آپ کے پاس بھی کم نہیں ہو گا سائیں جی۔ خیرات میں بڑی آمدنی ہے۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے رنگین منکے آپس میں ٹکرائے۔ اس نے فوراً چمٹا اٹھا لیا اور چوکنا ہو گیا۔ بےاختیار اس کے ایک ہاتھ نے میلے چغے کی خفیہ جیب کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے ریوالور نکال کر رخ فقیر کی جانب کر دیا۔ "ذرا کھیسا خالی کریں مگر پہلے یہ چمٹا ایک طرف رکھ دیں، پھر مال نکالیں۔"

فقیر کی حالت غیر ہو گئی۔ چمٹا رکھ کے اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور آہ و زاری پر اتر آیا۔ "قسم رب کی، سوکھی روٹی ہے جیب میں، مال کہاں سے آیا، یہ جان لینی ہے تو لے لے ظالم۔"

اسی وقت محسن اندر آیا۔ مجھے کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ دروازہ کھلنے کا زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ "یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "کون ہے یہ؟"

"بہت پیسے والے درویش ہیں۔" میں نے کہا۔ "کبھی انکم ٹیکس نہیں دیا۔ میں ذرا حساب مانگ رہا تھا۔"

فقیر نے پھر غلغلہ بلند کیا اور یقین دلانے لگا کہ یہ غلط ہے۔ "پیسہ اب کہاں بابا۔ دنیا بڑی کنجوس اور کمینی ہو گئی ہے۔ چمڑی اتار لیتی ہے اگر دمڑی مانگو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ کسی سیٹھ ساہوکار کو لوٹو۔"

میں نے محسن کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ "ذرا دیکھ، یہ اللہ لوک جھوٹ کہہ رہے ہیں یا سچ؟"

محسن نے اسے کھڑا کر دیا۔ "آواز بند۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا اور اس کے چغے پر ہاتھ مارا۔ فقیر کی گھگھی بندھ گئی۔ اندر ایک تھیلے جتنی جیب تھی۔ اس میں سے میلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے سو اور پچاس کے نوٹ برآمد ہوئے۔ فقیر محسن کے قدموں میں گر گیا اور بڑے مضحکہ خیز انداز میں رونے لگا۔

"یہ میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ پیسہ پیسہ جوڑا تھا میں نے بیس سال میں۔"

"کس لیے؟ اور کس کے لیے؟" میں نے کہا۔ "محل بنوانا تھا یا مزار شریف؟ یا دھی پتر بیاہنے تھے۔"

لیکن وہ کیا جواب دیتا۔ وہ ان دولت مند فقیروں میں سے تھا جو عادتاً مانگتے ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت نہیں اور دنیا سے پوشیدہ خزانہ ان کی متاعِ غرور ہوتا ہے۔ بیشتر دینے والے ان کے مقابلے میں فقیر اور زیادہ غریب ہوتے ہیں۔ اس خفیہ دولت کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہونا ہی ان کا نصیب ہوتا ہے جو نہ دنیا میں سکھ دیتی ہے اور نہ آخرت سنوارتی ہے۔ ایسے فقیروں کی نفسیات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"ستائیس ہزار دو سو بیس روپے۔" محسن بولا۔ "کتنا انکم ٹیکس بنا؟"

"چل بخش دے سائیں بادشاہ کو۔" میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ فقیر کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا خزانہ جھپٹ کر واپس اندر کی جیب میں چھپا لیا اور سہم کر کونے میں دبک گیا۔ اس کی خوف زدہ نظروں میں بے یقینی تھی اور ایک سوال تھا کہ

آنکھیں بڑی نعمت ہیں
* کیا آپ کی آنکھیں کمزور ہیں۔
* کیا آپ کی آنکھیں بھینگی ہیں۔
* کیا آپ چشمہ لگاتے ہیں۔
* یا آنکھوں کے کسی مرض کا شکار ہیں؟
تو کتاب
کم نظری اور اس کا سدِباب
قیمت ۱۵ روپے۔ ڈاک خرچ ۱۰ روپے
آپ کو بتائے گی کہ
عینک سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بغیر دواؤں کے اپنی آنکھیں کس طرح صحت مند بنائی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ کی آنکھیں صحت مند ہیں تو انہیں ہمیشہ کس طرح صحت مند رکھا جا سکتا ہے
ہر شخص کے لئے یکساں طور پر مفید کتاب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیا سچ مچ ہم لے سو ٹنے کا ارادہ ترک کر چکے ہیں؟ یہ مذاق ہے یا ہم پاگل تو نہیں ہیں؟" اب اسی جگہ ایسے ہی خاموش بیٹھے رہنا" میں نے کہا" ورنہ۔۔۔" میں نے پھر ریوالور نکال کے اسے دکھایا۔ اس نے زور زور سے اقرار میں سر ہلا کے وعدہ کیا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔

رحمت کباڑی اور ٹرک ڈرائیور ہوش میں آ چکے تھے لیکن ان کی حالت خراب تھی۔ محسن نے انھیں آزاد کیا اور میں ریوالور کا رخ ان کی طرف کیے کھڑا رہا۔ تلاشی لینے پر محسن کو رحمت کباڑی کی جیب سے ایک اور ریوالور ملا جو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر محسن فقیر کا کشکول لے کر گیا اور صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ سے پانی لے آیا۔ چند چھینٹے پڑتے ہی وہ ہوش میں آ گئے۔ کراہتے ہوئے انھوں نے کشکول سے منہ لگا کے تھوڑا سا پانی پیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ لالٹین کا شعلہ روشن رکھنے کے لیے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو دبائے رکھنا ضروری تھا۔ یہ انگوٹھا اب سُن ہونے لگا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے انگوٹھا ہٹایا تو دیے سے بھی کم روشنی دینے والا شعلہ بجھ گیا۔

رحمت کباڑی نے اتنی پھرتی سے مجھ پر جست لگائی کہ میں حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ جسمانی طور پر وہ اس قابل بھی نہیں ہوگا کہ اٹھ سکے۔ لالٹین میرے ہاتھ سے گر گیا مگر مجھے سنبھلنے میں دیر نہیں لگی۔ ایک میکانیکی ردِ عمل کے طور پر میں نے جوابی کِک ماری جو رحمت کباڑی کے سینے پر لگی اور وہ الٹ کر گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ محسن نے اتنی دیر میں لالٹین اٹھا لیا تھا۔

"کوئی ذرا بھی ہلا تو میں گولی مار دوں گا۔" اس نے لالٹین جلا کے ریوالور نکال لیا۔

فقیر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ پھر بھد سے فرش پر بیٹھ گیا۔" یا میرے مولا! آدھی رات کو یہ موت کے فرشتے کہاں سے بھیج دیے۔ چل تو جلال تو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ڈرائیور ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ میں نے جھک کر رحمت کباڑی کو ہلایا لیکن اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اگر وہ مجھے دھوکے میں رکھ کر پھر حملہ کرتا تو میں ریوالور کے بٹ سے اس کو یقیناً ناک آؤٹ کر دیتا لیکن وہ مکر نہیں کر رہا تھا۔ سچ مچ بے ہوش تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھ کے اسے سیدھا کیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے اس کی سانس نہیں چل رہی ہے۔ تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود میں محتاط رہا کہ سانس کو روک لینے کا مقصد بھی مجھے فریب دینا نہ ہو۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر نبض تلاش کی۔ نبض رکی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری تشویش میں خوف اور گھبراہٹ شامل ہو گئی۔ محسن نے اندازہ کر لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

"اسے دوسرے کمرے میں ڈال دے۔" محسن بولا۔" آ جائے گا تھوڑی دیر بعد ہوش میں۔"

میں نے سر ہلایا اور رحمت کباڑی کے دونوں ہاتھ تھام کر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ ڈرائیور اچانک ہنسا۔

"او ئے کیوں تکلیف دیتے ہو مردے کو۔" وہ بولا۔" پڑا رہنے دو یہیں۔"

میں نے رحمت کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ فقیر متوحش انداز میں چلایا۔" مر گیا؟ قتل کر دیا تم نے؟"

"میں نے کہا تھا آواز نہ نکلے۔" محسن نے دانت پیس کر کہا اور اس کے سر پر لات ماری۔

"غلطی اس کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔" اس نے خود مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔"

"مگر یہ مر گیا۔" ڈرائیور بولا۔ یوں جیسے یہ بات اس نے ہم سے نہیں، اپنے آپ سے کہی تھی۔ اس کی نظر رحمت کی لاش پر جمی ہوئی تھی جس کی کھلی آنکھیں آخرِ شب کے محوِ سفر ستاروں کو دیکھ رہی تھیں۔

"شاید چوٹ غلط جگہ پڑی۔" محسن بولا۔ لہجے سے وہ بھی متفکر نظر آتا تھا۔

ڈرائیور پھر ہنسا۔" موت بندے کو کھینچ لاتی ہے، وہیں پر جہاں اس کو مرنا ہو۔ اُس کنجر نے تو سمجھا تھا کہ رحمت کی موت کا فرمان جاری کر دیا۔ جیسے رحمت کی زندگی اس کے اختیار میں تھی، ایسے ہی موت بھی ہے۔" اس نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک کاغذ نکالا اور ہماری طرف پھینک دیا۔

میں نے جھک کر وہ پُرزہ اٹھایا اور رکھول کے لالٹین کی روشنی میں تحریر کو دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔" کریم سیٹھ۔ رحمت واپس نہ آئے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔"

"گویا گامے ماچھی کی طرف سے کریم سیٹھ کو پہلے ہی احکامات جاری ہو چکے تھے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔" کیوں؟" میں نے فقیر کو ایک سگریٹ میں کچھ بھر کے جلاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ڈرائیور اب یوں ہنس رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔" او نئیں میری بھولی سرکار۔ ایہہ اُچیاں گلاں نے۔ تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم تو دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے والے بچے ہو۔ ایہہ دوجی دنیا اے۔ یہاں کالے کا مطلب ہے سفید تو سفید کا مطلب کالا۔ موتیاں والیو۔" فقیر نے لمبے لمبے دو کش لگائے اور اس کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ پھر وہ زمین پر لیٹ گیا۔

"سیدھی طرح بات کرو۔" میں نے اس کی گردن پکڑ کے ...جھٹکے دیے۔" ہم اتنے بے خبر بھی نہیں ہیں۔"

"...گامے کا مال نہ کراچی میں پکڑا گیا تھا اور نہ چھاپے کی خبر ...سیٹھ کریم کا ہاتھ تھا۔" محسن نے کہا۔" رحمت کباڑی نے اس کی ...وئی شکایت کی تھی۔"

"درحقیقت خرد برد کرنے والا وہ خود تھا۔" میں نے کہا۔" اور یہ ...ت گامے کو معلوم تھی کہ سیٹھ کریم بے قصور ہے لیکن رحمت خود ...شک سے بچانے کے لیے اس کا نام لے رہا ہے۔ اگر گاما یقین ...لیتا تو کریم سیٹھ کا قصہ پاک کر دیتا جو رحمت کے جرم کا واحد ...اہ تھا لیکن گامے نے اپنے طور پر حقیقت جان لی تھی۔"

ڈرائیور ہنستے ہنستے رونے لگا۔" تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم اپنی ...کھوں سے دیکھ رہے ہو۔ جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ...مجھے نوٹ ہی نوٹ دکھائی دیے تھے۔ سبز ہی سبز نوٹ۔ سو سو ...ے ہزاروں نوٹ۔ کریم سیٹھ نے کہا تھا کہ تم گدھے ہو۔ بوجھ ڈھونے ...لے گدھے۔ تم ٹرک میں کیا لاتے ہو؟ کیا معاوضہ ملتا ہے تمھیں ...مہینے؟ اور میں نے بتا دیا کہ ہزار روپے مہینہ تنخواہ ہے جو کوئی ...ہیں دیتا۔ دوسرے اس کی آدھی تنخواہ بھی نہیں دیتے۔ کراچی کے ...پھیرے کے سو روپے الگ اور کھانا پینا مفت۔ اور کیا چاہیے ...ے؟ لیکن سیٹھ کریم نے کہا کہ تم واقعی گدھے ہو۔ تمھیں معلوم ہے ...مہینے تم کیا لاتے ہو؟ کتنے کا مال لاتے ہو؟ میں نے جواب دیا ...ٹرک میں جتنا مال آ جائے وہ سب لے آتا ہوں۔ یہ مرضی ہے ...لوں کی کہ آدھا ٹرک دے کر بھیج دیں۔ قیمت یا مالیت سے ...ے کیا لینا دینا۔ کریم سیٹھ نے پھر کہا کہ اسی لیے تو تم گدھے ہو۔ ...لاکھوں کا مال لاتے ہو اور اس میں لاکھوں کا منافع ہوتا ہے ...گامے ماچھی کو اور اس سے اوپر والوں کو ملتا ہے۔ اس کا ...واں حصہ مجھے بھی مل جاتا ہے مگر تم کو تو وہی ہزار روپے ماہوار ...تے ہیں اور لاکھوں کے پھیرے پر سو روپے۔ سو روپے کیا ہوتے ...ں؟ کیا تمھاری زندگی کی قیمت سو روپے ہے؟ تم کو معلوم ہے کہ ...ر کا نوٹ تھما کے وہ تمھیں موت کے سفر پر روانہ کر دیتے ہیں ...ر تم پھر بھی خوش ہو۔ کبھی پکڑے جاؤ گے تو وہ تم کو شناخت ...کرنے سے بھی انکار کر دیں گے یا تمھارے خلاف رپورٹ درج ...ہو جائے گی کہ تم ایک ٹرک سمیت فرار ہو گئے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ...ے کہ تم مارے جاؤ اور تمھارے بیوی بچوں کو ہزار روپے ماہانہ ...بھی بند ہو جائے۔ سو روپے کی خاطر تم ان کے لیے منافع اور اپنے ...ے سارے خطرات کا بوجھ ڈھو کر یہاں آتے ہو۔ اس لیے تم گدھے ...ہو۔ جب اس نے مجھے حقیقت بتائی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ ...لے میں نے اسی بدذات کو مارنے کی کوشش کی جو خود کو سیٹھ کریم

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لیے قیمت: ۶/- روپے
HOW TO WRITE AN ESSAY
مضمون نگاری کے لیے قیمت ۶/- روپے
HOW TO WRITE AN EXPLANATION
وضاحت و تشریح کے لیے قیمت: ۶/- روپے
HOW TO LEARN CORRECT SPELLING
صحیح ہجے لکھنے کے لیے قیمت: ۶/- روپے
HOW TO DO COMPREHENSION
ادراک و فہم کا اظہار کرنے کے لیے قیمت: ۶/- روپے
CORRECT POSITIONS OF PREPOSITIONS
پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لیے قیمت ۶/- روپے
HOW TO PUNCTUATE
رموز اوقاف جاننے کے لیے قیمت: ۶/- روپے
10 DAYS TO TRANSLATION
اُردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لیے قیمت: ۱۲/- روپے

○ اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا ایک سے زائد کتابوں کا ۱۰ روپے ہوگا۔ پورا سیٹ منگانے پر ڈاک خرچ معاف (صرف اندرون ملک کے لیے) ○ کتابوں کی قیمت اور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتا اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں ○ کسی قسم کی نقد رقم خط میں ڈال کر ہرگز نہ بھیجیں۔ منی آرڈر ارسال کرنے کا پتا: مکتبہ نفسیات، پوسٹ بکس ۹۴۴ سعید منشن بلیوریا اسٹریٹ کراچی ۱
○ بیرون ملک پورے سیٹ کی قیمتیں مع ڈاک خرچ: شرقِ وسطیٰ ۱۰۰/- پاکستانی روپے، یورپ اور مشرق بعید ۱۵۰/- پاکستانی روپے، آسٹریلیا، امریکا، افریقہ ۲۰۰/- پاکستانی روپے ○ بیرون ملک کتابیں منگانے کے لیے رقم بذریعہ ڈرافٹ روانہ کریں۔ ڈرافٹ پر نام اس طرح لکھوائیں۔
MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L
MANSFIELD STR. BR. KARACHI
Sales Office ذاتی طور پر حاصل کرنے کے لیے:
MAKTABA NAFSIAT 404 HUSSAIN
CENTRE, SHAHRAHE IRAQ SADDAR
KARACHI - PHONE: 526689

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہتا ہے۔ اس نے مجھے یہ بات اتنے عرصے بعد کیوں بتائی کہ میں گدھا ہوں۔ غصّے نے مجھے پاگل کر دیا تھا کہ سیٹھ کریم سب جانتا تھا تو اب تک خاموش کیوں رہا لیکن اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے گولی مار دی۔" ٹرک ڈرائیور نے بائیں ہاتھ کی آستین اوپر چڑھائی۔ کہنی سے ذرا اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اور محسن نے سفید پٹی پر نظر آنے والے ننھے سے خون کے داغ کو دیکھا۔ "اس وقت تو اللہ نے جان بچالی۔ گولی ہڈی میں بھی نہیں لگی۔ گوشت میں سے گزر گئی۔ زخم بھر گیا تھا۔ آپ کی مہربانی سے پھر کھل گیا۔"

"تم سیٹھ کریم کی بات کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم اس کی باتوں سے گمراہ ہو گئے۔"

"گمراہ؟" وہ ہنسا۔ "پتا نہیں جی گمراہ میں پہلے تھا یا بعد میں ہوا۔ اس نے کہا بے وقوف مت بنو۔ اگر میں چاہوں تو اسی وقت تم کو ٹھکانے لگا دوں اور کہہ دوں کہ تم ٹرک لے کر پہنچے ہی نہیں۔ لیکن گاما ماچھی گدھا نہیں ہے۔ وہ بہت سے ثبوت حاصل کر لے گا کہ لاہور سے کراچی تک ٹرک کس کس نے دیکھا ہے۔ اس کے اپنے کارندے ہیں، پولیس کے مخبر ہیں، ایکسائز والے ہیں۔ سب اس کا نمک کھاتے ہیں۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ بے ایمانی میں نے کی ہے لیکن تم میرا ساتھ دو تو دونوں کے حصّے میں پانچ پانچ لاکھ روپے آ سکتے ہیں۔ میں ڈر گیا تھا لیکن اس نے کہا کہ تم تو بالکل محفوظ ہو۔ میں ہمیشہ کی طرح ابھی فون کر کے گامے کو بتا دیتا ہوں کہ سب مال پہنچ گیا۔ پھر تم پانچ لاکھ لو اور جاؤ۔ یہاں کا بندوبست مجھ پر چھوڑ دو۔ آپ نے کبھی پانچ لاکھ دیکھے ہیں جی؟ نہیں دیکھے ہوں گے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ایک بار گامے ماچھی نے تھیلے میں ڈال کر رحمت کو دیے تھے اور میں رحمت کباڑی کو شاہ عالمی لے گیا تھا۔ وہ رقم اس نے وہاں جمع کرا دی تھی۔ پانچ لاکھ میں آدمی ساری دنیا کو خرید سکتا ہے۔ دنیا تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ شاید ایک لاکھ میں بھی خریدی جا سکتی ہے۔ پانچ لاکھ کی سُن کے میرا دماغ گھوم گیا۔ میں مجبور ہو گیا۔ صرف لالچ سے نہیں، خوف سے بھی کیونکہ سیٹھ کریم نے کہا تھا کہ یہ بات کرنے کے بعد وہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس دھندے میں ایمان داری کا یا ایمان کا کیا کام۔ تم نے جا کے گامے سے یہی بات کہہ دی تو وہ میرا دشمن ہو جائے گا۔ میرا دھندا ختم اور شاید میں بھی ختم۔ پھر کیوں نہ میں تم کو ختم کر کے گامے کا سارا مال پی جاؤں۔ خطرہ تو ہو گا میرے لیے لیکن میں کوئی نہ کوئی طریقہ سوچ لوں گا جس سے اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں۔ میں نے پانچ لاکھ لیے اور واپس آ گیا۔ شاید میری حالت دیکھ کر ہی گامے نے اندازہ کر لیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ خوف پانچ لاکھ کا بھی تھا اور گامے کا بھی۔ پانچ لاکھ ہوں آدمی کے پاس تو اسے بہت ڈر لگتا ہے جی۔ میری حالت اس شخص کی طرح ہو رہی تھی جس نے پانچ لاکھ میں اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہو۔ میں پچھتاتا تھا اور پھر ہوا میں اڑنے لگتا تھا۔ پانچ لاکھ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ اب بھی وقت ہے، گامے کو سب بتا دوں مگر دوسرے لمحے میرے سامنے کوئی خواب آ جاتا تھا۔ ہر آدمی کے پاس خوابوں کا عجائب گھر ہوتا ہے اور اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب خواب کہاں سے آئے۔ یہی سوچتے اور خوابوں کی تعبیر دیکھتے بہت وقت گزر گیا۔ سب سے بڑی غلطی میں نے وہی کی جو سب کرتے ہیں کہ یہ بات اپنی بیوی کو بتا دی۔ حوّا نے تو حضرت آدم کو بھی بہکا دیا تھا۔ میرے قدم تو پہلے ہی بہک چکے تھے۔ اس کی باتوں نے مجھے ہزار روپے ماہانہ کے بارے میں نہیں سوچنے دیا جس میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے خواب خریدنے شروع کر دیے۔ میں ان خوابوں میں پھنس گیا۔ پھر کراچی سے کریم سیٹھ نے اطلاع دی کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا اور اخبار میں خبر بھی لگوا دی۔ اس نے کہا کہ وہ خود بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہی اس کی غلطی تھی۔ گودام تو کرائے کے تھے اور کرایہ نامہ فرضی نام سے بنوایا گیا تھا۔ اگر چھاپا پڑتا تو کریم کیسے پکڑا جاتا۔ پکڑے جاتے کرائے دار اور وہ نہ ملتے تو گرفتار ہوتا گودام کا مالک۔ اس نے رحمت کباڑی کو بھیجا اور سب کچھ معلوم کر لیا۔"

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ "پھر اس نے رحمت ہی کو ختم کرنے کے بارے میں کیوں سوچا؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "یہی تو اصل چکر ہے۔ اگر رقعہ رحمت کباڑی کو دیا جاتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ ڈرائیور کو واپس نہ آنے دیا جائے تو رحمت مارا جاتا۔ پیغام کا مطلب ہمیشہ الٹا ہوتا تھا۔ سیدھا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حاملِ رقعہ ہٰذا کو ختم کر دیا جائے۔"

"کیا یہ بات رحمت کباڑی نہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔ "کہ تمہارے پاس ایک رقعہ ہے۔"

"نہیں۔" ڈرائیور بولا۔ "لیکن میں جانتا تھا۔ دو بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ ان دونوں نے میرے سامنے سیٹھ کریم کو رقعہ دیا تھا اور وہ دونوں لوٹ کر نہیں آئے۔ میں نے پھر کبھی ان کو نہیں دیکھا۔"

"اس کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ وہ مارے گئے؟" محسن بولا۔

"سیٹھ کریم نے اگلے پھیرے میں مجھے ان کی موت کی خبر دی۔" ڈرائیور بولا۔ "یہ بتایا کہ ان کی لاشیں سمندر میں مچھیروں

نے نکالی تھیں۔ ایسی ہر خبر پھیلائی جاتی تھی تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔"

"ذرا اس کا خیال رکھنا۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا اور رحمت کباڑی کی لاش کے پاس بیٹھ کے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اندر کی جیب میں نوٹوں اور ذاتی کاغذات کے درمیان نئے سفید کاغذ کا ایک پُرزہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "کریم سیٹھ۔ ڈرائیور واپس نہ آنے پائے۔ کراچی کا سمندر بہت بڑا ہے۔" میں بہت دیر تک اس تحریر کو دیکھتا رہا۔ اگر وہ سب سچ تھا جو ٹرک ڈرائیور نے بتایا تھا تو گامے کی طرف سے رحمت کی موت کا فرمان بھی جاری ہو چکا تھا۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا کہ وہ کب، کہاں اور کیسے مارا جائے۔ گامے ماچھی کا فرمان قدرت کا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا اور رحمت کباڑی کے پاس کراچی تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ تھی۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ مجھے پرانا گھسا پٹا شعر یاد آیا جو بہت حسبِ حال تھا۔ خود ٹرک ڈرائیور بھی جانتا تھا کہ وہ خود اپنی موت کا نامہ بر بن کے جا رہا ہے لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رقعہ اسے آخری وقت میں یا چلتے وقت دیا گیا ہو گا۔ وہ کیسے کہتا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں۔ کہتا تو اسی وقت مارا جاتا۔ اس نے خاموشی سے موت کا پروانہ جیب میں رکھ لیا۔ صرف اس خیال سے کہ اس طرح کچھ مہلت تو ملے گی۔ لاہور سے کراچی تک کے سفر میں شاید کہیں فرار کا راستہ ہو۔ جہاں وہ رحمت کباڑی کو دھوکا دے کر نکل جائے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ خود غیر مسلح تھا اور جانتا تھا کہ رحمت کے پاس ریوالور ہے۔ اگر اس نے بھاگنا چاہا تو رحمت اسے فوراً گولی مار دے گا۔

"یہ رقعہ دیکھو۔" میں نے کہا اور کاغذ ٹرک ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ تم دونوں کا آخری پھیرا تھا۔"

ٹرک ڈرائیور نے رقعہ پڑھ کے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی بہت عجیب تھی۔ جنون آمیز، خوف زدہ کرنے والی اور پُرآسیب۔ وہ مجھے پاگل نہیں لگتا تھا اور نشے میں بھی نہیں تھا لیکن اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ گردشِ حالات اسے خود بخود ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں وہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پہلے سیٹھ کریم کی نیت میں فتور آیا۔ اس نے پانچ لاکھ روپے زبردستی تھما دیے اور وہ مجبور آدمی اپنی ہی کمزوریوں کے جال میں پھنس گیا۔ وہ سیدھا سادہ ٹرک ڈرائیور تھا، شکاری نہیں تھا لیکن وہ شکاریوں میں گھر گیا تھا تو شکار کیسے نہ ہوتا۔ راہِ حیات کے آگے جان لیوا موڑ پر میں اپنا جال پھیلائے کھڑا تھا۔ ایک اور شکاری جو اسی کی طرح حالات کی سازش کا شکار ہو کے شکاری بنا تھا۔ وہ سرحدوں پر دشمن فوجوں کے درمیان کھڑا درخت تھا جو ایک دوسرے پر گولہ باری کر رہی تھیں اور جن کو صرف فتح و شکست سے سروکار تھا۔ اس اکیلے درخت کی یا اس کی شاخوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی سلامتی اتنی غیر اہم تھی کہ کوئی اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں۔ اس کے لیے دونوں طرف موت تھی اور موت تو موت ہی ہوتی ہے خواہ دشمنوں کے ہاتھوں آئے یا دوستی کا صلہ ہو۔

"جس بات کا تمھیں علم تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بات رحمت کباڑی کو کیوں معلوم نہیں تھی؟"

"کون سی بات؟" ڈرائیور نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ فقیر اب بھی انٹا غفیل پڑا تھا۔

"یہی کہ اپنی جیب میں وہ اپنی ہی سزائے موت کا حکم لے کر جا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"رحمت تو آج سال بھر کے بعد میرے ساتھ جا رہا تھا۔" وہ بولا۔ "میں نے سال میں بارہ پھیرے کیے اور بارہ آدمی میرے ساتھ گئے۔ ان میں سے اگر دس واپس آئے تو ان کے بارے میں رحمت کو کیسے علم ہو سکتا تھا۔ اسے تو یقین ہو گا کہ وہ پیغام میرے بارے میں ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو ..... جو تم نے سمجھا تھا۔ اصل مطلب سمجھتا تو جاتا میرے ساتھ؟"

"تم بھی تو سب جاننے کے باوجود جا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں مجبور تھا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "گھر سے چلتے وقت بیوی نے کہا تھا، آج مت جاؤ۔ رات میں نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا تھا کہ تمھارے ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے کہا نیک بخت، سب محبت کرنے والی بیویاں ایسے ہی خواب دیکھ دیکھ کر ڈرتی رہتی ہیں۔ وسوسے اور اندیشے ان کو سوتے میں بھی ڈراتے ہیں لیکن ٹرک تو ہر روز اتنے ہی چلتے ہیں، کسی ڈرائیور کی بیوی اچھا خواب دیکھے یا بُرا۔ موت کی طرح حادثے کا بھی وقت مقرر ہے۔ اس سے کون بچ سکتا ہے۔ وہ کہنے لگی، میں نے ایسا خواب تو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی پہلے بھی روکا ہے میں نے تم کو؟ مگر مجھے موت بلا رہی تھی۔ میں بیوی کے روکنے سے کیسے رک سکتا تھا۔ میں نہ جاتا تو کوئی قیامت نہیں آتی۔ ٹرک اگلے دن چلا جاتا یا میری جگہ دوسرا شخص ٹرک لے جاتا۔ پھر باہر آتے آتے میں دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرا۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"رونے سے کیا ہو گا؟" وہ بولا۔ "تقدیر کے اس مذاق پر آخری بار بھی نہ ہنسوں۔ خود اپنی موت پر کون روتا ہے؟"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"لیکن تم ابھی زندہ ہو اور میں نے طے نہیں کیا ہے کہ تم کو قتل کروں۔ رحمت تو اپنی بہادری میں مارا گیا۔ مجھے اپنا دفاع تو کرنا ہی تھا۔ اسے قتل نہیں کہا جا سکتا اور عمداً میں نے ابھی تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آئندہ کی بات نہیں کرتا۔"

"لیکن میں آئندہ کی بات کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم چاہے قتل نہ کرو، قتل تو میں ہو چکا۔ جب روانگی کے وقت گامے ماچھی نے مجھے وہ رقعہ دیا تھا، تب ہی میں نے یہ بات سمجھ لی تھی۔ تم راستہ نہ روکتے تب بھی میرا انجام مختلف نہ ہوتا۔ میں گامے ماچھی کو دھوکا دے کر یا اسے قتل کر کے بھاگ جاتا۔ ناکام رہتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔ اگر کراچی پہنچتا تو سیٹھ کریم بھی قتل کرتا۔ بچ جاتا تو کب تک بچتا۔ کبھی نہ کبھی تلاش کرنے والے مجھے تلاش کر لیتے اور مار دیتے۔ میں نہ ملتا تو میرے بیوی بچے انتقام کا نشانہ بنتے جو مجھے منظور نہیں تھا۔"

"تم انھیں کیسے بچا سکتے ہو؟" میں نے ان سب کو ذہن میں رکھ کے کہا جن کا نام بھی ڈرائیور نہیں جانتا تھا۔ اب تک وہ ایک معمولی ڈرائیور تھا۔ غیر معمولی وہ اس لیے ہو گیا تھا کہ اس نے غداری کی تھی، غبن کیا تھا اور مالکوں کو پانچ لاکھ کا نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ اس جرم کی سزا کسی نہ کسی کو بہر حال ملنی تھی۔ اسے نہ سہی، اس کے بیوی بچوں کو۔ یہی تو آدمی کے پاؤں کی وہ زنجیر ہوتی ہے جو اسے بے بسی کے ساتھ پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے کا ہار بنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوگا۔" ڈرائیور بولا۔ "پھر بھی میں نے کوشش ضرور کی تھی۔ میں نے راستے میں ٹرک روک کے فون کیا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک ڈاکٹر رہتا ہے۔ بہت شریف آدمی ہے۔ اسے ایک پیغام دے دیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے نام۔ کہ جتنی جلد ہو سکے اپنا سب نقد اور زیور لے کر فوراً چلی جائے۔ وہ خود جانتی ہے کہ پانچ لاکھ میں سے کتنے بچے ہیں جو صندوق میں رکھے ہیں اور اس کا زیور کتنا ہے اور یہ سب کہاں ہے، کیسے آیا ہے۔"

"تمھارے خیال میں وہ کہاں جائے گی؟" میں نے کہا۔

"اور کیا اب تک جا چکی ہوگی؟"

"وہ یقیناً اب تک جا چکی ہوگی۔" ڈرائیور بولا۔ "کہاں گئی ہوگی، یہ میں مر کے بھی نہیں بتاؤں گا، نہ تمھیں نہ انھیں۔"

"اور اگر تم کو آزاد کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "تو تم اس کے پاس پہنچ جاؤ گے؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔ وہاں کوئی اور نہیں پہنچ سکتا۔" وہ بولا۔ "لیکن وہاں پانچ لاکھ میرے کام نہیں آئیں گے۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں کوئی لکھ پتی نہیں، زمیندار بھی نہیں، نمبردار بھی نہیں۔ اگر میں نے اس دولت سے سارا گاؤں خرید لیا تو سب میرے دشمن ہو جائیں گے۔ میرے اور میری بیوی کے چاچے ماما سب حسد کرنے لگیں گے۔ وہ خود ہی تھانے میں اطلاع دے دیں گے کہ یہ معمولی سا ڈرائیور کہیں سے ڈاکا ڈال کے لاکھوں لے آیا ہے۔ وہاں تو میں اسی طرح زندہ رہ سکتا ہوں کہ تھوڑی سی زمین خرید لوں اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لوں اور اس سب دولت کو دفن کر دوں، کنویں میں ڈال دوں یا جلا کے راکھ کر دوں۔ ورنہ وہ آ جائیں گے اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، میرے بچوں کو بھی نہیں۔"

"تم فرار ہو کے کسی ویسے ہی دوسرے گاؤں میں نہیں جا سکتے؟" میں نے کہا۔ "پنجاب کے رہنے والے ہو تو بلوچستان یا سندھ کے کسی گاؤں میں؟ یا ملک سے باہر، میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں ایک شرط پر۔ تم مجھے کراچی کے سارے ٹھکانوں کے پتے بتا دو۔ یہ بتا دو کہ مال کیا لے جاتے تھے۔"

"یہ تو مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا، تمھیں کیسے بتاؤں۔" وہ بولا۔ اس کا لہجہ اب کچھ پُرامید محسوس ہوتا تھا۔ "لیکن.... کہیں اور جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ باہر کی پولیس بہت چالاک ہوتی ہے۔ پھر ملک سے باہر بھی ان کے آدمی ہیں۔ کسی چھوٹے سے گاؤں میں اچانک کوئی اجنبی پانچ لاکھ لے کر کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ کون قبول کرے گا اسے؟ اور یہ پٹواری، نمبردار اور تھانے دار۔ یہ کب برداشت کریں گے۔ نہیں جی، ہم سب اسی گاؤں میں رہ سکتے ہیں مگر اس دولت کے بغیر۔ اس دولت اور موت میں سے ہمیں ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہاں میں نے ایک لاکھ کا مکان خریدا تھا لاہور میں۔ پچاس ہزار کے قریب میری بیوی نے گھر کے سامان اور زیورات بنانے میں خرچ کیے تھے۔ ساڑھے تین لاکھ نقد ہوں گے۔ اس کے لیے میں اپنی، بیوی کی اور تین بچوں کی زندگی بیچ دوں۔"

"اچھا جو تمھارا دل چاہے کرنا۔" میں نے صبح کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر کہا۔ "یہاں سے رہائی کی شرط وہی ہے۔ مال ہم ابھی تم کو دکھا دیتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ کراچی چلو۔"

"میں تمھیں پتا بتا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "نام بتا سکتا ہوں۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ پتا غلط نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"خطرہ میرے لیے نہیں ہوگا تمھارے ساتھ جانے میں؟" وہ بولا۔

"تم دور سے بتاؤ گے۔ ہم میں سے ایک تصدیق کے لیے جائے گا۔ ایک تمھارے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی بات غلط نہیں ہوئی تو تم کو چھوڑ دیا جائے گا۔ آگے جو تمھارا نصیب۔"

میں ڈرائیور سے گفتگو میں اتنا مصروف تھا کہ محسن کی طرف متوجہ نہیں رہا تھا۔ وہ اطمینان سے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ فقیر گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا اور رحمت کباڑی کی لاش اکڑنے لگی تھی۔ مجھے فقیر پر رشک آیا جو ایک دم لگا کے بے غم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ذات کی حد تک ہم سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ ہم نے اس کا پیسہ گن کر اسے واپس کر دیا تھا اور ہم اس کے دشمن بھی نہیں تھے لیکن جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا، وہ اس کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ اس کا آسان علاج یہ تھا کہ آنکھیں اور کان سب بند کر لیے جائیں اور احساس کو ختم کر دیا جائے۔ پھر ہوش آنے پہ یا تو سب خیریت ہوگی یا ہوش آئے گا ہی نہیں۔ آنکھ کھلے گی تو معلوم ہوگا یوم حساب آ گیا۔

طویل جسمانی اذیت برداشت کرنے کے باوجود ڈرائیور بھوک پیاس، تھکن یا درد کے احساس سے بے نیاز تھا۔ زندگی کا یقین ختم ہو جانے کے بعد جسم کی مادی ضروریات بھی ختم ہو گئی تھیں اور ان حالات میں اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اسے زد میں رکھا اور محسن کے پاس بیٹھ کے اس سے مشورہ کیا۔ کچھ دیر بعد محسن باہر گیا اور گاڑی میں سے وہ کریٹ اٹھا لایا جو ہم نے ٹرک میں سے اتارا تھا۔ پھر وہ اسے کھولنے کے لیے کچھ تلاش کرنے نکلا۔

"تمھیں معلوم ہے ہم کون ہیں؟" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا جیسے اسے یہ بات معلوم ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ محسن ایک زنگ خوردہ سریے کا ٹکڑا لیے نمودار ہوا جو دو فٹ لمبا تھا۔

"ہم تمھارے نہیں، ان کے دشمن ہیں جن کی خاطر تم اب تک غلط کام کرتے رہے۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "مگر نہ ہم ایکسائز والے ہیں اور نہ پولیس والے۔" ڈرائیور نے ایک نظر میری پولیس انسپکٹر کی وردی پر ڈالی۔

"ہم نے وہ ٹرک تباہ کر دیا ہے جو تم اور رحمت کباڑی لے کر روانہ ہوئے تھے۔" محسن نے اسے مطلع کیا۔

"بس یہ نمونہ بچا ہے یہیں۔" میں نے اسے سریے کی مدد سے کریٹ پر زور آزمائی کرتے ہوئے دیکھا۔ "ہمارے آئندہ پروگرام میں ان سب کو تباہ کرنا شامل ہے جو رحمت اور گامے ماچھی کے ساتھی ہیں۔ اس سے اوپر بھی بہت سے لوگ ہیں لیکن تم بھی اس نمونے کی طرح بچ سکتے ہو کیونکہ تم محض آلۂ کار تھے اور تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو ان کے اصل دھندے کا علم نہیں تھا۔ ورنہ تم ان کا ساتھ نہ دیتے۔ کہیں اور ڈرائیور کی نوکری کر لیتے۔ پھر تم پھنس گئے اور تمھارا نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہ نا یہی بات؟"

ڈرائیور نے اقرار میں سر ہلایا۔ اسی وقت محسن نے کریٹ کے گرد لپٹی ہوئی پتی کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ اب اوپر کے تختے کھولنے کا مرحلہ درپیش تھا جو زیادہ مشکل تھا۔ ہمارے پاس کوئی تیز دھار والی یا نوکیلی چیز نہیں تھی جسے تختوں کی درز میں پھنسا کے زور لگانے سے تختہ اٹھ جاتا۔ یہ مسئلہ محسن خان نے اس طرح حل کیا کہ باہر سے ایک بھاری پتھر لا کے کریٹ کے کونے پر ضرب لگائی۔ تختے کا کونا ٹوٹ گیا اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی مثلث الگ ہو گئی۔ اس سے کریٹ میں اتنا بڑا سوراخ بن گیا کہ آدھا انچ موٹائی کا سریا اندر ڈالا جا سکے۔ محسن نے سریا داخل کر کے لیور بنا لیا اور نیچے زور لگا لیا۔ نیچے کے تختے میں پیوست کیلوں نے مزاحمت کی اور تختہ چرچرایا لیکن بالآخر اوپر اٹھ گیا۔ اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ محسن سریے کو آگے کھسکا کے زور لگاتا گیا اور اوپر نیچے کے تختوں میں جڑی ہوئی کیلیں نکلنے لگیں۔

اچانک میری دلچسپی بڑھ گئی۔ افشائے راز کا وقت آ گیا تھا۔ "میر وزیر اینڈ کمپنی" کے جائز کاروبار کی آڑ میں کون سا ناجائز کاروبار چل رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے میں نے کتنی ناکام اور پُراذیت جدوجہد کی تھی۔ میرا ساتھ دینے والوں نے کتنی سزا پائی تھی اور کتنی قربانی دی تھی۔ وزیر خان نے ایمانداری اور محنت کو اصول بنا کے "وزیر خان انجینئرنگ" کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر بے ایمان اور بے ضمیر لوگ اس کے ساتھی بن گئے جنھوں نے اسے ایم۔ ڈبلیو۔ ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں تبدیل کر دیا۔ اس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر قانونی کاروبار شروع کیا۔ لاکھوں کمائے مگر وزیر خان کو ایمانداری اور اصول پرستی پر قائم رہنے کے جرم میں کاروبار سے الگ کیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج کیا اور ختم کر دیا۔ اس راز پر برسوں پردہ پڑا رہا اور جب پردہ اٹھنے کا خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے مجھے خریدنا چاہا۔ دس لاکھ، بیس لاکھ، پچاس لاکھ میں مجھ سے صرف اتنا چاہا کہ میں خاموش رہوں اور جو ہوا اسے بھول جاؤں۔ اس کے بعد تباہی و بربادی، قتل و غارت گری اور خوں ریزی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب تک جاری تھا کیونکہ میں نے ان کی لگائی ہوئی بولی مسترد کر دی تھی جو سمجھتے تھے کہ دولت لے کر میں سب فراموش کر دوں گا۔ وزیر خان کو، اس سے اپنے رشتے کو، اس رشتے کی آبرو کو، وزیر خان

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کے بے گناہ خون کی پکار کو، مستقبل کی خوشی کے لیے ماضی کے غم بیچ دوں گا اور خوف زدہ ہو کے انتقام کے خیال سے تائب ہو جاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور افشائے راز کے خوف نے دوست بن کر وزیر خان سے دشمنی کرنے والوں کی نیند بھی حرام کر دی تھی۔ لندن سے آنے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور سنا تھا اس کے بعد میرے ذہن میں سب سے پہلے یہی سوال آیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ ایسا کس نے کیا؟ ابھی تک مجھے کسی سوال کا جواب نہیں ملا تھا لیکن اس باکس یا کریٹ کا کھلنا میرے پہلے سوال کے جواب کی بنیاد بن سکتا تھا۔ پردہ میری آنکھوں پر سے اٹھنے والا تھا کہ وہ "مال" کیا ہے جو ایسے پُراسرار اور پیچیدہ طریقے سے "میر وزیر اینڈ کمپنی" سے کراچی پہنچتا ہے اور لاکھوں کے منافع کا ضامن ہے۔ ٹرک ڈرائیور کے بیان کے مطابق ایک پھیرے میں دس لاکھ کا منافع تھا جو اس نے سیٹھ کریم کے ساتھ ففٹی ففٹی کر لیا تھا۔ زرعی آلات اور پُرزے سونے کے بنے ہوتے نہیں ہوتے کہ ایک ٹرک کا مال اتنا مہنگا فروخت ہو اور اتنا منافع دے۔

تختہ ہٹتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بالآخر مجھے معلوم ہونے والا تھا کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا اصل دھندا کیا تھا۔ ایک بار یہی معلوم کرنے کے لیے میں سر سے کفن باندھ کے فیکٹری میں جا گھسا تھا لیکن وہاں چھ بدمعاشوں نے فورمین بن کر مجھے لکڑی کے تابوت میں بند کر دیا تھا۔ ایک فورمین رانجھا تھا جو اس راز کی حفاظت میں نااہلی کا مظاہرہ کرنے پر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ دوسرا فورمین رحمت کباڑی تھا جس کی بے حس وحرکت لاش آدمی کی زندگی کے ہر یقین کا، ہر دعوے کا اور فتح کے ہر عزم کے لیے تصویرِ عبرت بنی ہوئی تھی۔ باقی چار کون تھے اور ان کے لیے کاتبِ تقدیر نے کیا لکھا تھا، یہ کوئی وقت سے پہلے کیسے جان سکتا تھا۔

محسن نے کریٹ کے اندر جمی ہوئی گھاس ہٹائی۔ اس کے نیچے ایک گتا تھا۔ آخری تہ سیلوفین شیٹ کی تھی جو درحقیقت سیلوفین کی ہر طرف سے بند تھیلی تھی۔ بارش کا پانی کریٹ کے اندر پہنچ سکتا تھا لیکن سیلوفین کی تھیلی میں بند مال کو خراب نہیں کر سکتا تھا۔ محسن نے سیلوفین کو دانتوں سے کاٹا اور اس کا ایک منہ کھولا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ ہم دونوں کی نظر "مال" پر جم گئی۔ ہم گردوپیش سے اتنے بے خبر تھے کہ اگر ڈرائیور چاہتا تو ہماری غفلت کے اس لمحے سے فائدہ اٹھا کے ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ وہی سریا ہمارے سر پر مار سکتا تھا جو محسن کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا یا میرے ہاتھ سے ریوالور چھین سکتا تھا لیکن ہم اس کے لیے زندگی کی نئی امید کے نامہ بر تھے۔ وہ حیرت سے ہماری صورتوں کو دیکھتا رہا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا محسن!" میں نے مایوسی کے اس حوصلہ شکن وقفے کو ختم کیا جس میں میری توقعات خاک میں مل گئی تھیں۔ کریٹ کے اندر مجھے نٹ بولٹ بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"صرف اس لیے کہ وقت کم تھا۔" محسن نے امید افزا لہجے میں کہا۔ "ہم نے سوچے سمجھے بغیر ایک کریٹ اٹھا لیا تھا۔ ہم کو دیکھنے میں سب ایک جیسے لگے تھے۔"

"لیکن ان سب میں نٹ بولٹ نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "شاید اوپر والے سب کریٹ ایسے تھے کہ ضرورت پڑنے پر کھول کے دکھائے جا سکتے تھے۔"

"ہاں، اصل مال نیچے تھا۔" محسن بولا۔ "یا مال کے چند ہی کریٹ تھے۔ ہم کھول کر کیسے دیکھتے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے محسن۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "کہ نٹ بولٹ اوپر ہی ہوں۔ نیچے ذرا دیکھ۔"

محسن نے تھیلی کو کھینچ کر باہر نکالنا چاہا لیکن پلاسٹک کی تھیلی وزن سے پھٹ گئی۔ محسن نے کریٹ الٹ دیا۔ ایک بار پھر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اس میں ایک ہی سائز کے نٹ بولٹ تھے۔

"شکر ہے تیرا میرے مولا!" فقیر نے صدا لگائی اور ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا تھا لیکن ہماری طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ اپنی مایوسی کی کیفیت میں محسن کو اور مجھے یہ بات یوں لگی جیسے وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

"کس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہو؟" محسن نے جھنجلا کے کہا۔

"بڑا کرم ہے میرے رب کا۔" وہ رحمت کباڑی کو دیکھ کے بولا۔ "سوئے تو دونوں ایک ساتھ تھے۔ اٹھنا صرف مجھے نصیب ہوا۔" اس نے چمٹا اور کشکول اٹھایا۔ "جان اور مال دونوں کو بچانے والا وہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن سواری کہاں چلی؟"

"سویرا ہو گیا بابا۔ پنچھی بھی دانہ دُنکا چگنے نکل گئے۔" وہ بولا۔ "فقیر کا بھی وقت ہو گیا۔"

"ابھی آپ تشریف رکھیں۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "ہم سے پہلے آپ نہیں جا سکتے۔"

"ارے بابا! پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔" فقیر فرش پر بیٹھ گیا۔ "آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"نکرمت کرو۔ ایک دن کے فاقے سے اِنّا لِلّٰہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئے گی۔" میں نے کہا۔ "ابھی یہیں منّ وسلویٰ اترے گا۔ صبر کا پھل۔۔۔"

"ارے بابا صبر کے پھل کا نہیں، روزی کا سوال ہے۔" وہ جھلا کے بولا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"یار محسن۔" میں نے کہا۔ "یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کا زرِ ضمانت ضبط کر لے۔ منہ ادھر کرو سائیں بادشاہ۔" اور کندھا پکڑ کے اسے گھما دیا۔ محسن نے اس کی مزاحمت کے باوجود جیب میں ہاتھ ڈال کے اس کا تمام سرمایہ نکال لیا پھر اسے دھکا دیا تو وہ کونے میں جا گرا۔ اس کا چمٹا اور کشکول اس سے پہلے ہی گر گئے۔

"ارے ظالمو، قاتلو، فقیر کی بددعا مت لو۔" وہ اپنی قبا سے ناک صاف کر کے پھُس پھُس رونے لگا۔ "میرا مال کھاؤ گے تو بری موت مرو گے۔ ہضم نہیں ہو گا تمھیں۔"

"آرام سے بیٹھے رہو گے تو مال واپس مل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ مال کیا، ہم تمھیں بھی کھا جائیں گے اور ہضم بھی کر لیں گے۔" پھر میں محسن سے مخاطب ہوا۔ "میں گاڑی لے کر جاتا ہوں اور ناشتے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔"

"اس گاڑی سے فوراً نجات حاصل کرنی ضروری ہے۔" محسن نے فرنچ میں فرمایا جو میں اور وہ گزارے کی حد تک جانتے تھے۔ "اس کے مالک نے پولیس میں رپورٹ ضرور لکھوائی ہو گی۔"

میں باہر نکلا تو سورج بھی نکل رہا تھا۔ میرے پاس تقریباً اٹھائیس ہزار روپے نقد تھے۔ بیس ہزار میں نے رشوت لی تھی۔ پانچ ہزار نقد رابعہ نے دیے تھے اور تین ہزار اس وردی کے ساتھ ہی آئے تھے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک چیک تھا۔ جس کے اعداد غیر اہم تھے۔ ان سے کہیں زیادہ بیش قیمت خلوص، محبت اور اعتماد کا وہ جذبہ تھا جو اس کاغذ کے پُرزے میں بھی خوشبو بن کے سما گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے تھرمس کی ضرورت کا احساس ہوا۔ میں نے ماڈل ٹاؤن کے بازار کا رخ کیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ اب مجھے پولیس کی وردی میں پھرنے اور کاریں چھیننے کی مزید واردات کرنے کی ضرورت نہیں۔ خطرات جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ نقد رقم اتنی تھی کہ ہم ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید سکتے تھے جو ہمیں کراچی پہنچا دے۔ رجسٹریشن تو اس کی پہلے سے ہو گی۔ ٹرانسفر کے لیے فرضی نام استعمال کرنے سے ہم محفوظ ہو جاتے تھے۔ بشرطیکہ ہم اسی نام سے ڈرائیونگ لائسنس بھی حاصل کر لیں۔

میں نے چار انڈوں کا آملیٹ بنوایا۔ ایک پوری ڈبل روٹی کے سلائس کٹوا کے مکھن لگوایا۔ تھرماس میں چائے بھروائی اور انتہائی مشتبہ نظروں سے دیکھنے والے منیجر کو گھورتا ہوا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی ریسٹورنٹ کا منیجر اتنا بہادر کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک باوردی پولیس انسپکٹر کو اشتعال دلائے اور وہ بھی کسی وجہ کے بغیر۔ میں نے تو بل بھی پورا ادا کیا تھا۔ جب میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا تو وہ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا چکا تھا اور گردن آگے بڑھا کے کار کا نمبر نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ والی بات تھی۔

واپسی کے بجائے میں نے کار کو سیدھا دوڑایا اور چند منٹ میں کئی موڑ کاٹنے کے بعد ریسٹورنٹ سے کئی میل دور لے گیا۔ ریسٹورنٹ منیجر کے رویّے نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مزنگ کی ایک سڑک پر میں نے کار کو روکا ہی تھا کہ ایک اخبار والا میرے سامنے آ گیا۔ "اخبار صاحب۔" اس نے کھڑکی کے قریب آ کے کہا۔ میں نے اسے ایک روپیہ دیا اور اخبار خرید لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ گاڑی کو یہیں چھوڑ دوں اور رکشا یا ٹیکسی لے کر واپس جاؤں۔ تھوڑا سا دم لینے کے لیے میں نے اخبار کھولا اور سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ لیکن صفحہ پلٹتے ہی میری نظروں کے سامنے برق سی کوندی اور پل بھر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مقامی

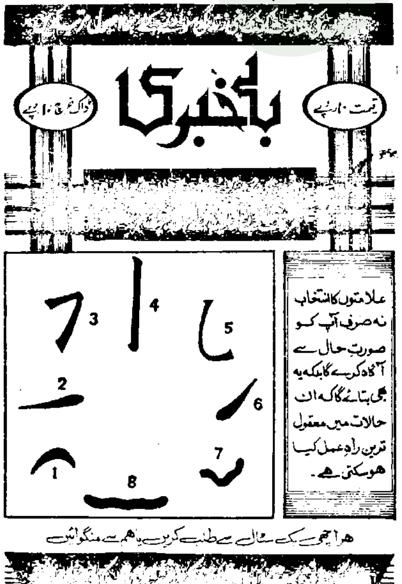

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

خبروں والے صفحے پر میری تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہی تصویر جو میرے پاسپورٹ پر بھی موجود تھی۔ تصویر کے اوپر لکھا تھا "مطلوب ہے" اور نیچے تفصیلات میں یہ تھا کہ یہ شخص جو سکندر بخت ولد وزیر خان ہے اور کبیر بھی کہلاتا ہے' پولیس کو قتل اور رہزنی کی متعدد وارداتوں میں مطلوب ہے۔ اس کے خلاف راولپنڈی اور لاہور میں دُہرے قتل کے مقدمات درج ہیں اور عدالت اسے مفرور قرار دے چکی ہے۔ اس نے پولیس انسپکٹر کی وردی اور ریوالور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہ چلتے لوگوں کو روک کر کم سے کم دو کاریں چھینی ہیں۔ اس کی گرفتاری یا نشاندہی کرنے والے کو دس ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

اشتہار پولیس کی طرف سے تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ اس میں اگر چودھری دلاور اینڈ کمپنی کا ہاتھ نہیں تو عین ممکن ہے یہ انکل رضوی کی کوشش کا نتیجہ ہو۔ فرض شناسی میں وہ پہلے سے بہت نیک نام تھے لیکن اب میں ان کی بدنامی کا باعث ہو رہا تھا۔ انکل رضوی اب صفِ دشمناں میں شامل ہو چکے تھے اور مجھ پر ان کی شفقت کا سایہ نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ تصویر کتنے اخباروں میں چھپی تھی اور اب تک کہاں کہاں پہنچ چکی تھی۔

صورتِ حال انتہائی سنگین ہو گئی تھی۔ ایک ریسٹورنٹ کے منیجر نے مجھے یقیناً شناخت کر لیا تھا۔ اب تک اس نے پولیس کو فون کر دیا ہو گا اور یہ بتا دیا ہو گا کہ ملزم ۱۹۶۵ء ماڈل کی سفید کورٹینا میں کہاں دیکھا گیا ہے اور کدھر گیا ہے۔ شاید اس نے کار کا نمبر بھی لکھوا دیا ہو گا۔

فوری طور پر مجھے بہت سے لوگوں کا خیال آیا۔ رابعہ کا اور شہلا کا۔ انکل شیردانی کا اور فوزیہ کا۔ استاد ٹیڈی کا اور میرے دوسرے وکیل عبدالودود منظر کا۔ وہ سب کیا سوچیں گے اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ اچانک وہ سب جو کل تک میری طرف تھے' چودھری دلاور اینڈ کمپنی میں شامل ہو گئے تھے اور پولیس ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ تین طاقتور دشمن ایک ہو گئے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ دو شکاری واقعی طاقتور تھے یعنی پولیس اور دلاور اینڈ کمپنی۔ تیسرا فریق اس لیے طاقتور تھا کہ ان کے مقابل میری جذباتی کمزوری تھی۔ وہ خود میری کمزوری تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ میں بے گناہ ہوں لیکن ان کا یقین کوئی قانونی دلیل نہیں تھا۔ یہ فیصلہ تو عدالت کو کرنا تھا اور وہ مجبور تھے کہ مجھے عدالت سے باعزت طور پر زندہ رہنے کا حق دلوائیں۔ دوسری طرف میری عملی دشواریاں جن کی وجہ سے میں انصاف حاصل کرنے کا مروجہ طریق کار اختیار نہیں کر سکتا تھا اور اب جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا میرے اور دنیا کے نقطۂ نظر کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انصاف حاصل کرنے کی جدوجہد میں میرے ساتھ ہونے والی ناانصافی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے بڑی عجلت سے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ پہلی ویران سڑک پر آتے ہی میں نے کار کو ایک دیوار کے ساتھ روکا اور رومال سے اندر باہر وہ جگہ صاف کر دی جہاں میرے فنگر پرنٹ ملنے کا امکان تھا۔ اب اپنی وردی سے نجات حاصل کرنا بھی اتنا ہی ضروری تھا لیکن میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے اور میں بازار جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ابھی میں کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ میں نے اپنے سامنے سے سائیکل پر ایک پوسٹ مین کو آتے دیکھا۔ اسے نو بجے ڈاک خانے ڈیوٹی پر پہنچنا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ اور اس غریب نے ابھی اخبار کہاں دیکھا ہو گا۔ اس ملک میں تو اخبار خرید کر پڑھنا بھی وہ عیاشی ہے جس کا شوق سب کو نہیں ہوتا خواہ ان کے پاس فرصت' تعلیم اور پیسہ سب کچھ ہو۔

میں اطمینان سے باہر نکلا اور پوسٹ مین کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ سراسیمہ نظر آنے لگا اور قریب آنے سے پہلے ہی سائیکل سے اُتر گیا۔ جب وہ سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑی کر رہا تھا تو میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی آواز تک نہ نکل سکی اور میں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ پانچ منٹ میں اس کی وردی میرے جسم پر تھی اور کھانے پینے کا سب سامان پولیس کی وردی سمیت ڈاک کے تھیلے میں سما گیا تھا۔ خاکی وردی خاصی بوسیدہ تھی چنانچہ جب میں کار کے دروازے بند کر کے اور چابی وہیں چھوڑ کے سائیکل پر پیڈل مارتا روانہ ہوا تو میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں نے شاید بچپن میں سائیکل چلائی تھی۔ اب اس پر سواری کرنا مجھے بہت مضحکہ خیز لگا۔ یہ خیال بھی بہت عجیب تھا کہ اس وقت مجھے دیکھنے والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں کون ہوں۔ انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم پا کے لوٹنے والا۔ ایک صنعتکار۔ ایک پرنس یا دنیا کے نقطۂ نظر سے جعلی پولیس انسپکٹر۔ دُہرے قتل کی.... وارداتوں میں مطلوب ایک مفرور اشتہاری مجرم۔ کوئی کیسے سوچ سکتا ہے کہ ڈاکیے کے اس فرسودہ بیگ میں انسپکٹر پولیس کی وردی ہی نہیں' ایک ریوالور بھی ہے اور اٹھائیس ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پوسٹ مین کی ڈاک اور نقد رقم میں نے اس کے پاس کار میں ہی رکھ دی تھی۔

ایک جگہ مجھے "پبلک ٹیلی فون" کا سائن بورڈ نظر آیا۔ دکان

ایک ہیٹ اینڈ ہارڈ ویئر اسٹور تھی لیکن اندر اسٹول پر ایک بچہ بیٹھا تھا۔ عقبی حصے میں ایک دروازہ تھا۔

"میں ابا کو اندر سے بلاتا ہوں" وہ مجھے گاہک سمجھ کے بولا "ناشتا کر رہے ہیں وہ"

"نہیں بیٹا۔ رہنے دو" میں نے کہا "مجھے صرف فون کرنا تھا"

"ایک روپیہ ہو گا" بچے نے بڑی متانت سے کہا اور روپیہ ایک صندوقچی میں ڈال دیا۔ اس شرح پر وہ بل ادا کر کے بھی کچھ نہ کچھ یقیناً بچا لیتے ہوں گے۔ میں نے دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔

"چودھری صاحب۔ السلام علیکم" میں نے کہا "میں رانجھا فورمین بول رہا ہوں جنابِ عالی"

"اچھا" دلاور نے خاصی دیر کے بعد کہا "کہاں سے؟"

"عالمِ ارواح سے جنابِ عالی" میں نے کہا "بچہ عالمِ ارواح کا مطلب بالکل نہیں سمجھا" کوئی پیغام ہے اپنے ڈھی سلوا صاحب کے لیے؟ میرے ساتھ ہی ہیں جہنم میں۔ آپ کب تشریف لا رہے ہیں؟"

"دیکھو سکندر" دلاور کی آواز آئی "ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ جتنا نقصان ہو چکا سو ہو چکا۔ لیکن آئندہ جو کچھ ہو گا اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ تم نے اخبار دیکھا ہے آج کا؟"

"دیکھا ہے" میں نے کہا "اور اس سے مجھے خاصی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ کل کیا ہو گا' یہ علمِ غیب کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا جو خدا نے نہ تمھیں دیا ہے اور نہ مجھے۔ اس لیے آج کی بات کرو۔ آج ایک چیز بھیج رہا ہوں میں تمھارے نام"

"کیا چیز ہے؟" دلاور نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"ایک خوش خبری ہے" میں نے کہا "اور ایک تحفہ ہے۔ ڈرو نہیں۔ کوئی ہلاکت خیز چیز نہیں ہے۔ فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تم کو جہنم رسید کرنے کا"

"تمھارا خیال ہو گا کہ وہ اشتہار میں نے لگوایا ہے؟" وہ بولا۔

"خیال تو آیا تھا مجھے لیکن خیال مجھے رضوی صاحب کا بھی آیا تھا" میں نے کہا۔

"راولپنڈی کی پولیس نے لاہور پولیس سے رابطہ قائم کیا تھا اور ان کے پاس تمھاری تصویر تھی"

"جو تم نے کسی طرح ان کو فراہم کر دی تھی" میں نے کہا "میرا مطلب ہے تمھارے کسی آدمی نے"

"اس کی ضرورت پیش نہیں" وہ بولا "ہم نے فون پر بتا دیا کہ مفرور ملزم کہاں مل سکتا ہے۔ تصویر تمھارے انکل نے دکھا دی اور سائنھوں نے شناخت کر لی"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ دلاور بات کو طول دینا چاہتا ہے اور اس کا مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے گھر میں دو فون تھے۔ اس نے بیوی سے کہہ دیا ہو گا کہ وہ دوسرے فون پر پولیس کو بتا دے کہ ملزم سکندر فون پر بات کر رہا ہے اور وہ آپریٹر سے معلوم کر لیں کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے۔ ایسی مستعدی کی توقع نہ مجھے اپنی پولیس سے تھی اور نہ اپنے ٹیلی فون کے محکمے والوں سے لیکن موجودہ حالات میں خطرے کے ایک فی صد امکانات سے بھی دور رہنا بہتر تھا۔

وہی فاصلہ جو میں نے کار میں آسانی سے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا' سائیکل پر ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ سائیکل کو میں نے اس گھر سے کافی دور چھوڑا اور ڈاکیوں کی طرح تھیلا لٹکائے پیدل گھر تک گیا۔ اس وقت نو بج چکے تھے اور دھوپ میں تمازت اتنی آ گئی تھی کہ میں پسینے میں شرابور تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد میں نے محسن کو چونک کر ریوالور اٹھاتے دیکھا "میاں خان صاحب!" میں نے فریاد کی "ذرا یہ مکھڑا تو دیکھ لو گولی مارنے سے پہلے۔ ہم سکندرِ اعظم ہیں"

"اچھا کیا پہلے بتا دیا۔ ورنہ ہم خان لوگ گولی پہلے مارتے ہیں' سوال بعد میں کرتے ہیں" محسن خان نے کہا۔

"یا میرے مولا" فقیر نے آواز لگائی "کس عذاب میں ڈال دیا فقیر کو۔ دھندا گیا' مال گیا۔ اب جان جائے گی۔ گولی سے نہ مارا ان ظالموں نے تو بھوک سے مار دیں گے"

میں نے کچھ کہے بغیر اخبار محسن کے حوالے کیا اور ناشتے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ ٹرک ڈرائیور کو اور دوسرا محسن کو دینے کے بعد میں نے باقی سلائس اور آملیٹ فقیر کے حوالے کیا تو اس کی شکل رونے والی ہو گئی "ارے ظالمو۔ اتنا انتظار کرانے کے بعد دو پراٹھے اور ایک پاؤ حلوہ بھی نہیں؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ....!"

"اونٹ کے بچے" میں نے اس کے ایک الٹا ہاتھ مارا "خدا کا شکر ادا نہیں کرتا کہ یہ بھی مل گیا" اس کی آواز بند ہو گئی۔ باقی ناشتا اس نے خاموشی سے ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کیا۔ چائے سب کو باری باری اسی مگ نما پیالے میں ملی جو تھرمس کور تھا۔

"یہ تو معاملہ بہت بگڑ گیا ہے" محسن نے اخبار رکھ کے کہا۔ اور آواز کم رکھی "اب کیا ہو گا؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب آگے میں اکیلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ تو واپس جائے گا۔"

"میں ان حالات میں تیرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔" محسن نے قطعی لہجے میں کہا۔ "گفتگو فرنچ میں فرمائیے۔"

"پہلے میری بات سن لے۔" میں نے کہا۔ "رالعبہ عورت ہے۔ وہ جب دل چاہے اکیلی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ تو میرے اور رالعبہ کے درمیان رابطے کا کام کر سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ میری وکیل ہے اور میں اس کا مؤکل ہوں۔ ہمیں باہمی صلاح مشورے کی ہمیشہ ضرورت پڑے گی۔ ہم ٹیلی فون پر بات نہیں کر سکتے اور میں نے کوئے یار کا رُخ بھی کیا تو شکاری مجھے سوئے دار لے جائیں گے۔ وقت اور مقام طے ہو جانے کے بعد بچھڑے ہوؤں کو ملانا تیری کوشش پر منحصر ہے۔ اس کا ثواب تجھے مفت میں ملے گا۔ میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ کراچی جاؤں اور کار میں جاؤں جسے یہ ڈرائیو کرے۔"

"کوئی اور گاڑی چھین لی ہے کیا؟" محسن نے کہا۔ "اخبار دیکھنے کے بعد؟"

"نہیں۔ اب تو شہر جا۔" میں نے کہا۔ "کوئی اچھی سی پرانی گاڑی خرید۔ بیس بائیس ہزار تک اچھی گاڑی مل جانی چاہیے۔ مجھے ایک سوٹ کیس چاہیے اور کچھ کپڑے۔"

"اس تصویر کی اشاعت کے بعد تو ہر لباس میں پہچانا جائے گا۔" محسن بولا۔

"باہر پھرنے کے لیے میرے پاس تین ڈریس ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک تھانیدار کا۔ ایک ڈاکیے کا اور ایک فقیر کا۔"

"اور ان تینوں میں سے کار کا مالک کون ہوگا؟" محسن نے کہا۔

"کار کسی فرضی نام سے آج ہی ٹرانسفر بھی کرانی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈرائیونگ لائسنس اس کے پاس ہوگا۔"

"تو اس ٹرک ڈرائیور پر بہت اعتماد کر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ کسی بھی وقت اس پوزیشن میں نہیں ہوگا کہ مجھے دھوکا دے سکے۔" میں نے کہا۔ "بیوی، بچوں والا آدمی ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مرنا پسند نہیں کرے گا۔ شوروم دس بجے کھل جاتے ہیں۔ سو پچاس روپے خرچ کر کے تو ایک گھنٹے میں ٹرانسفر وغیرہ کی کارروائی مکمل کر سکتا ہے۔ باقی شاپنگ مکمل کر کے بارہ بجے تک لوٹ آ۔ شام تک اور بھی بہت سے کام ہیں جس کے بعد مجھے کراچی جانا ہے اور تجھے رالعبہ کے پاس۔ وہ عورت پہلے ہے وکیل بعد میں۔ اسے کسی قسم کی جذباتی حماقت نہ کرنے دینا اور یقین دلانا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور بہت جلد واپس آجاؤں گا۔"

"وہ پوچھے گی نہیں کہ کل سے کہاں تھے؟" محسن نے کہا۔ "اور انکل کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"انکل سے کچھ بھی کہہ دینا۔ ناراض تو وہ بہرحال ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "رالعبہ سے کہنا کہ منظر سے مشورہ کرے اور میرے خلاف پنڈی والے مقدمات کی پیروی کرے۔ وہ خود یا پنڈی میں اس کا کوئی دوست۔ کہنا صرف یہ ہے کہ پولیس کی کہانی جھوٹی ہے سکندر بخت اغوا ہوا تھا اور اس کے بعد سے اب تک لاپتا ہے۔ اغوا کی رپورٹ لکھوا دی گئی تھی لیکن پولیس اسے برآمد نہیں کر سکی تو اس کے خلاف یہ جھوٹا چکر چلا دیا ہے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے۔"

"لیکن تیری عدم موجودگی میں مقدمہ خارج تو نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ حاضر تو مجھے ہونا ہی پڑے گا کبھی نہ کبھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس عرصے میں منظر کارروائی جاری رکھ سکتا ہے۔ گواہ وغیرہ پیش کر سکتا ہے کہ جس دن یہ واقعہ پیش آیا میں لاہور میں تھا۔ یا راولپنڈی میں تھا۔ اس بات کا پولیس کے پاس کیا ثبوت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اغوا کیا گیا تھا اور اس کے چشم دید گواہ نہیں۔ باقی وہ شخص خود بتا سکتا ہے کہ اغوا کرنے والے کون تھے اور اسے کہاں لے گئے تھے۔ اس عرصے میں کراچی سے میرا رجسٹرڈ لیٹر موصول ہوگا۔ انکل رضوی کے نام۔ اس پر مُہر اور تاریخ بہت واضح ہوگی۔ میں ایک دردناک کہانی بیان کر دوں گا کہ اغوا کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ کے مجھے نامعلوم مقامات پر رکھا گیا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر مختلف شہروں میں لے جایا گیا لیکن میں کسی شہر کا نام بتانے سے قاصر ہوں کیونکہ عموماً میرا قید خانہ مضافات میں ہوتا تھا اور میں کمرے سے نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے بہت اذیت دی گئی اور مجبور کیا گیا کہ میں اپنے وکیلوں کی معرفت حقِ وراثت سے دستبرداری قبول کر لوں تو انھیں بلایا جا سکتا ہے یا مجھے ان کے پاس لے جایا جا سکتا ہے ورنہ میں سات سال تک قید رہوں گا۔ سات سال بعد عدالت میں ایم ڈبلیو ڈی کا موجودہ مالک درخواست پیش کرے گا کہ میرے پارٹنر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے کیونکہ اس کی مسلسل عدم موجودگی سنگین قانونی مسائل پیدا کر رہی ہے۔ میں یہ بھی لکھوں گا کہ میں نے ظلم و جبر کے سامنے سر جھکانے کے بجائے جان دینے کا تہیہ کر رکھا ہے اس لیے میں اغوا کرنے والوں کی کوئی شرط تسلیم نہیں کروں گا۔ ممکن ہے سات

ان کی قید سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی موقع مل جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے یہ خط پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ میرا یہ دستخط شدہ بیان عدالت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور اخبارات کو بھی جاری کیا جا سکتا ہے۔ شامت پولیس کی آجائے گی اور کیس بہت کمزور پڑ جائے گا۔ ایک امیدوار بھی ہے۔ شاید میری تصویر اخبار میں دیکھ کر ایک عورت گواہی دینے عدالت پہنچ جائے۔ اس مقتول نرس روبی کی ماں۔ وہ پہلے ہی بیمار اور لبِ گور تھی۔ روبی کی موت کے بعد پولیس نے اس ے کوئی بیان نہیں لیا تھا۔ یہ میں نے اخبار میں دیکھ لیا تھا۔ روبی کی ماں کہیں اصغر مال روڈ کے قریب رہتی تھی اور اس کا نام ثیبا ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن وہ سب کچھ جانتی ہے کہ روبی کو قتل کرنے والا کون ہو سکتا ہے کیونکہ روبی کی لاش پیٹر کی لاش کے ساتھ ملی تھی۔ وہ دونوں محبت کرتے تھے اور روبی کی ماں کو اس کا علم تھا۔ وہ عدالت میں حاضر ہو کے بیان دے سکتی ہے کہ روبی اور پیٹر کا قاتل عنایت مسیح ہے اور یہ بھی بتا سکتی ہے کہ رقابت میں عنایت مسیح نے اسے کتنی اذیت دی۔ پیٹر مشن ہائی اسکول میں ٹیچر تھا اور اس کا باپ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں پادری ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جانتا ہو کہ پیٹر کس کے لیے مارا گیا اور اسے مارنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ایک نرس پادری کی گواہی بہت اہم ہوگی۔ روبی کی ماں کا پتا نہ ملے پنڈی کے آر اے بازار میں ایک ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرنا۔ اس اکٹر کا فون نمبر رالعبہ کے پاس ہے کیونکہ اس کے گھر سے میں نے بعہ کو فون کیا تھا اور رالعبہ سے کہا تھا کہ مجھے فون کر لے۔ اس اکٹر کی ماں روبی کی ماں کو جانتی ہے۔ شاید اسے بھی کچھ علم ہو۔ رے خیال میں اتنا کافی ہے۔"

محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نوٹ بک نکال کے اس نے کچھ باتیں نوٹ کر لی تھیں۔ "تو خط میں لکھے گا نہیں کہ اغوا نندہ کون ہیں؟ تو ان کو پہچانتا ہے یا نہیں؟"

"لکھنے کو میں دلاور کا نام بھی لکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یکن اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ وہ ثابت کر دے گا کہ یہ جھوٹ ہے۔ میں رحمت کباڑی کا نام لکھوں گا۔ باقی کے متعلق کہوں گا کہ ں نہیں جانتا۔ ابھی جب تو گاڑی خرید کر لوٹے گا ایک کیمرہ بھی تے آنا۔ میں رحمت کی آخری تصویر بھی اتار لوں گا۔ اس طرح کہ ف چہرہ آئے۔ یہ تصویر میں خط کے ساتھ ارسال کروں گا۔ لوم یہ ہوگا کہ پرانی تصویر ہے اور کہیں سے پھاڑی گئی ہے۔ ے عدالت میں پیش کر دینا اور کسی طرح اس لاش کی بازیابی کے س سے ملا دینا۔ لاش ملنے کا مقدمہ لاہور میں درج ہوگا کہیں نہ کہیں تو یہ سب رالعبہ کو بتائے گا اور منظر کو تو باقی کام وہ خود کر لیں گے۔ اب تو جا اور جتنی جلدی ہو سکے لوٹ آ۔"

محسن کے جانے کے بعد فقیر نے پھر واویلا کیا۔ "ارے ہم کو بھی جانے دے ظالم۔ کس جرم میں قید کر رکھا ہے یہاں؟ ہمارا دھندا غارت کر دیا۔ خدا تجھے غارت کرے۔ ہم درویش۔"

"الو کے پٹھے۔" میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "مفت خورے۔ ہٹا کٹا مشٹنڈا ہو کے بھیک مانگتا ہے۔ درویش کہتا ہے خود کو اور جیب میں ستائیس ہزار روپے لیے پھرتا ہے۔ بے وقوف بناتا پھرتا ہے کہ روٹی کھانے کو پیسہ نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں ورنہ تجھے خرکاروں کے ہاتھ بیچ دیتا اور وہ تجھے محنت کرنا سکھا دیتے لیکن اب تیری آواز نکلی تو یہ سب مالِ حرام ضبط کر لوں گا اور تیری ان نظروں کے سامنے جلا کے راکھ کر دوں گا۔ قتل کر کے لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" فقیر کی حالت ابتر ہو گئی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک لات مار کے میں رحمت جیسے شخص کو قتل کر چکا ہوں۔ میرے جیسے قاتل سے کیا بعید کہ دوسری لات مار کے اسے بھی فنا کر دوں۔ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ پھر میں نے ٹرک ڈرائیور سے بات کی اور اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اندازہ اسے بھی ہو گیا تھا کہ ہم گامے ماچھی اور رحمت کباڑی کے حریف ہیں تو کمزور کیسے ہو سکتے ہیں۔ میر کا مقابلہ سوا سیر ہی کر سکتا ہے۔ وہ مجھ سے اتفاق نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس کے دشمن بھی وہی تھے جو ہمارے دشمن تھے چنانچہ ہم متحد ہو سکتے تھے اور یہ اتحاد اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے سلامتی کی تھوڑی بہت ضمانت ضرور فراہم کرتا تھا۔

ایک بجے تک میں انتظار میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ بار بار اخبار دیکھتا رہا اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن رہا۔ مستقبل انتہائی غیر یقینی ہو گیا تھا۔ رالعبہ رگِ جاں سے بھی قریب تر تھی اور ہر لمحہ میرے تصور میں اس پہلے دن کی طرح زندہ تھی جب وہ جیل میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ نیلی ساری پر زرد پھول کھلائے۔ لیکن وہ گھر بے یقینی کی دھند میں کھو گیا تھا جہاں مجھے اور اس کو اپنی خوابوں کی دنیا بسانی تھی۔ محسن ٹھیک ایک بجے نمودار ہوا۔

"یہ لے گاڑی کی چابیاں۔" اس نے چابی میری طرف اچھالی۔ "کاغذات گلوز کمپارٹمنٹ میں ہیں۔ کپڑوں کا سوٹ کیس ڈکی میں۔ ایک ڈاکٹر کی اوپل ریکارڈ ہے۔ ریڈ کراس کا نشان تک بنا ہوا ہے ونڈ اسکرین پر۔ کراچی تک کسی قسم کی تکلیف نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دے گی لیکن ایک مسئلہ اور پیدا ہو گیا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تو کوئی انتخابی امیدوار ہے،' اس نے جیب سے ایک پوسٹر نکالا۔ یہ تقریباً سات انچ چوڑا اور دس انچ لمبا پوسٹر تھا۔ اس میں میری تصویر بہت نمایاں تھی۔ وہی سامنے کا پوز جو اخبار میں تھا۔ لیکن اس کے اوپر لکھا ہوا تھا "تلاش گمشدہ" اور نیچے انتہائی مضحکہ خیز عبارت تھی۔ اس میں لکھا تھا۔

"سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم تیرہ نومبر کی شب سے لاپتا ہے۔ اگر وہ خود پڑھے تو واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا اور اس کی ہر بات مان لی جائے گی۔ اس کی جدائی میں انکل رضوی اور اس کی بہن شہلا کی حالت خراب ہے اس کا نام پتا بتانے والے یا اسے لانے والے کو شکریے کے ساتھ دس ہزار روپے پیش کیے جائیں گے۔ قریبی پولیس اسٹیشن یا براہِ راست ضامن رضوی ایس ایس پی لاہور سے آفس یا گھر میں اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ سے فون پر رابطہ قائم کریں۔"

اس کے بعد ایک طرف انکل رضوی کے دونوں فون نمبر تھے اور دوسری جانب رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے نام کے نیچے اس کے آفس کا فون نمبر تھا۔ تاریخ وہی تھی جب میں اغوا کیا گیا تھا۔

"یہ دلاور اینڈ کمپنی کا کمینہ پن ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں انھوں نے۔ دس ہزار کے انعام کا اعلان کر کے پبلک کو تیرے پیچھے لگا دیا ہے۔ براہِ راست لاہور کے ایس پی اور ایک خاتون وکیل کا ایک اشتہاری مجرم سے تعلق ثابت کر کے ان کی پوزیشن خراب کر دی ہے اور تجھے اس حلیے میں اور اس شکل کے ساتھ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ اغوا کی رپورٹ تک جھوٹی سمجھی جائے گی اب۔"

"اور اب تک جن لوگوں نے اخبار میں میرا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا ہو گا وہ اشتہار میں دیوار پر ملاحظہ فرمائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور تھانے گئے تو دس ہزار ان کو ضرور ملیں گے۔ پولیس کہے گی کہ آپ نے مفرور مجرم پکڑ لیا۔ اس بہادری کے کارنامے پر انعام قبول فرمائیے۔"

"انکل رضوی اور رابعہ کیا کریں گے" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کس کس کے خلاف کارروائی کریں گے۔ کس کس کو بتائیں گے کہ یہ اشتہار انھوں نے نہیں لگوایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک پریس کانفرنس میں تردید کر سکتے ہیں مگر اس تردید کو کتنے لوگ دیکھیں گے۔"

"اور اشتہار سارے ملک کے اخباروں میں چھپا ہو گا تو یہ پوسٹر بھی ہر جگہ لگائے گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "بڑے بڑے شہروں میں، بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشن۔ ایئرپورٹ اور بازار۔ وہ ایک لاکھ کیا دس لاکھ پوسٹر چھپوا سکتے ہیں۔ شہر کیا، ہر قصبے اور گاؤں تک پھیلا سکتے ہیں یہاں تک کہ سارا ملک مجھے پہچاننے لگے۔"

"اس لیے اب تیرا اس چہرے کے ساتھ باہر نکلنا مزید دشوار ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دس ہزار کا چلتا پھرتا چیک ہے جسے سب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس والے بھی اور پبلک بھی۔"

"ابھی تو یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "میں نقلی داڑھی اور مونچھیں لگانے سے رہا۔"

"تو اپنا ہیئر اسٹائل بدل دے اور بالوں کا رنگ تبدیل کر لے۔" محسن نے کہا۔ "کراچی پہنچنے کے بعد شیو چھوڑ دینا۔ ایک مہینے میں داڑھی مونچھوں کی فصل خاصی بڑھ جائے گی اور تو خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے گا۔"

"اور اگر راستے میں پکڑا گیا تو کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پولیس نے ناکہ بندی کی ہو۔"

"اپنی ڈاکیے کی وردی پر سے ڈاک خانے والوں کا مونوگرام ہٹا دے۔ تیرے اور ٹرک ڈرائیور کے قد میں معمولی سا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن خاکی وردی میں وہ شوفر لگے گا۔ تو معزز آدمی کی طرح پیچھے بیٹھنا۔ پیچھے کے شیشے ڈارک ہیں، اس لیے جب تک کوئی اندر منہ نہ ڈالے یا تو منہ باہر نہ نکالے کسی کو کچھ نظر نہیں آسکتا۔ تو ایک ڈاکٹر کی کار میں سفر کر رہا ہے اور آگے ریڈ کراس کا نشان بھی چسپاں ہے اس لیے کوئی زیادہ تردد نہیں کرے گا اور تو محفوظ رہے گا۔ مشکل یہ ہے کہ تیرا ہم سفر بھی ڈاکٹر نہیں لگتا ورنہ تو زیادہ موزوں شوفر ہوتا۔"

محسن کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے قمیص اور پتلون پہننے کے بعد میں نے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اس کا حلیہ بدل کر سفر کرنا خود اس کے مفاد میں ہے۔ گامے ماچھی کا کوئی مخبر اسے تلاش نہیں کر سکے گا۔ ڈاکیے کے بیگ میں سے ریوالور نکال کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا تو محسن نے مجھے فریج میں مطلع کیا کہ اس نے اپنا ریوالور گاڑی کے گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات کے نیچے رکھ دیا ہے کہ خدانخواستہ ایک نہ رہے تو دوسرا کام آسکے۔ جب وہ ڈرائیور کو ہمراہ لے کر نکل گیا تو میں فقیر کی طرف متوجہ ہوا جو ہماری ساری کارروائی سے سخت حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ ہم نے نصف شب کو اس کی خلوت میں خلل ڈالا تھا اور اب تک ایک قتل کر چکے تھے۔ اس کا مال چھین کر واپس کر چکے تھے اور پھر چھین کر ضبط کر چکے تھے۔ اس کے دو جھانپڑ مار چکے تھے۔ اس کے پراٹھے حلوے کا ناشتا بند کر چکے تھے اور اس کو دھندے پر جانے سے روک چکے تھے۔ ہم نے اس کے سامنے حلیہ بدلا تھا۔ اردو پنجابی کے علاوہ انگریزی میں اور کبھی فرانسیسی میں گفتگو کرتے رہے تھے جو اس کی خاک سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب ہماری روانگی کا وقت آیا تھا تو اس کا یہ اندیشہ بڑھنے لگا تھا کہ ہم اس کے ستائیس ہزار روپے ہرگز واپس نہیں کریں گے بلکہ عین ممکن ہے جاتے جاتے اسے بھی رحمت کے ساتھ ہی لٹا جائیں تاکہ گواہ کوئی نہ ہو۔

"فقیر سائیں۔" میں نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ ہماری وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔"

"ارے تکلیف کو مارو گولی۔" وہ چلایا۔ "میرا پیسہ تو دے جاؤ ظالمو!"

"تکلیف کے بجائے ہم تمھیں گولی نہ مار دیں؟" میں نے کہا۔ "دونوں لاشیں پولیس اٹھائے گی۔"

یکلخت اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ ہمیں گالیاں دینے لگا۔ "تم خونی اور قاتل ہو، ڈاکو ہو۔" پھر اس نے اچانک میرے پاؤں پکڑ لیے "دیکھو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا ہے، مجھ پر رحم کرو خدا کے لیے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اپنے پیر چھڑا کے میں نے اس کی کپڑے میں لپیٹی ہوئی رقم نکالی۔ "یہ لو اپنا پیسہ۔" وہ چپ ہو کے ایک دم اٹھا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہو کے ہاتھ پشت کی جانب کر لیے۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔

"یہ سب رقم اگر میں نہ دینا چاہوں تو تم مجھ سے چھین نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں شریف آدمی نہ ہوتا تو تمھیں بھی گولی مار کے چل پڑتا لیکن میں تمھارے وعدے پر اعتبار کر رہا ہوں کہ تم کسی کے سامنے کچھ نہیں کہو گے۔"

"قسم خدا کی کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "کبھی نام تک نہیں لوں گا۔ اِدھر لوٹ کر بھی نہیں آؤں گا۔"

"ہاں۔ دوبارہ اِدھر مت آنا۔" میں نے رقم آگے بڑھائی لیکن جیسے ہی اس کا ہاتھ بڑھا پھر پیچھے کر لی۔ "ایک شرط اور ہے۔ میں تمھارا یہ شاہانہ لباس خریدنا چاہتا ہوں۔ ستائیس ہزار دو سو بیس روپے میں۔ بولو منظور ہے؟"

"کیا؟ یہ تمھیں دے دوں؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ محسن نے اندر آ کے قہقہہ مارا۔

"یہ چمٹا بھی اور کشکول بھی۔" میں نے کہا۔ "ستائیس ہزار دو سو بیس روپے میں اچھا سودا ہے۔"

"لیکن... میں خود... میں کیا پہنوں گا؟" وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ایسے ہی رہوں گا کیا؟"

"تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "منظور نہیں تو میں چلتا ہوں کسی دوسرے فقیر سے بات کرتا ہوں۔"

اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر وہاں سے کپڑے اچھال دیے جن میں منکوں کی مالا بھی شامل تھی۔ میں نے اس کے نوٹوں کی گڈی اس کی طرف اچھال دی۔ "اللہ کے نام پر ایک جوڑا نہ سہی ایک چادر، تولیہ کچھ تو دیتے جاؤ۔" وہ نوٹ سینے سے لگا کے بولا۔ "میں باہر کیسے جاؤں گا۔ اس لاش کے کپڑے ہی دے دو۔"

"نہیں۔ یہی تو ہم چاہتے ہیں کہ تم فی الحال باہر نہ نکلو۔" میں نے کہا۔ "شام تک تمھاری چیخ پکار پر متوجہ ہو کے کوئی ضرور آ جائے گا۔ اس سے مانگ لینا جو مانگنا ہو۔ ورنہ نکل جانا اسی قلندرانہ شان سے۔"

"نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔" محسن نے ارشاد کیا۔

اس نے اندازہ کر لیا کہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے۔ سینے پر صبر کی سِل رکھ کر وہ ایک کونے میں دبک گیا۔ میں نے اور محسن نے رحمت کباڑی کی لاش اٹھائی اور باہر لے جا کر گاڑی کی ڈکی میں بند کر دی۔ دس منٹ میں ہم اس جگہ سے تین میل دور جا چکے تھے۔ ہلکے نیلے رنگ کی ڈیلکس ماڈل اوپل کا انجن اٹھائیس سو سی سی کا تھا اور بے حد طاقتور اور خاموش تھا۔

"اب ایک آخری کام۔" میں نے محسن سے کہا جو میرے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا۔

"سب سے پہلا کام ہے یہ پاپی پیٹ بھرنا۔" محسن نے پیٹ کو ڈرم کی طرح بجایا۔ "دیکھ کیسی خالی برتن جیسی آواز آ رہی ہے۔"

"اچھا اُس کے بعد مجھے ولاور کو ایک گفٹ پارسل بھیجنا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار اس نے مجھے کریٹ میں پیک کر کے عدم آباد کی جانب روانہ کیا تھا لیکن میں لوٹ آیا تھا۔ یہ اسی کے جواب میں ہے۔ مجھے ایک تابوت چاہیے۔"

"تابوت کہیں ریڈی میڈ نہیں ملتے۔" محسن بولا۔ "اور اتنے کم وقت میں بنوائے بھی نہیں جا سکتے۔"

"لوہے کا صندوق بھی تابوت کا کام دے سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

کھانا ایک رسمی کارروائی تھا۔ محسن نے مال پر ایک ریسٹورنٹ سے نصف درجن لنچ باکس خریدے۔ ان میں سے تین ہم نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ختم کر دیے۔ باقی زادِ راہ کے طور پر محفوظ رکھے۔ پھر میں گاڑی لے کر دلاور کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور اس کے گیٹ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر رک کر انتظار کرنے لگا۔ ڈرائیور نچلی سطح کا آدمی تھا چنانچہ دلاور کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ اس نے ایک بار پوچھا کہ ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں اور میں نے جواب دیا کہ خاموشی سے سب دیکھو اور غیر ضروری سوال مت کرو۔ محسن پون گھنٹے بعد نمودار ہوا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر ریڑھا رکا کے اس نے موٹی چادر کا تقریباً پانچ فٹ لمبا اور اس سے نصف اونچائی کا اور چوڑائی کا صندوق اتارا۔ جب ریڑھی والا کرایہ لے کر چلا گیا تو محسن اور میں صندوق کو دونوں جانب کے کُنڈوں سے اٹھا کر گاڑی کے پیچھے لائے۔ مناسب موقع دیکھ کر میں نے ڈِکی کھولی اور محسن نے صندوق کا ڈھکنا اٹھایا۔ پلک جھپکتے میں رحمت کباڑی کی لاش صندوق میں جا گری۔ اسے ہم نے بڑی پھرتی سے اور خاصی بے دردی سے ....

صندوق کے اندر فٹ کر دیا۔ محسن نے اس کی دونوں کنڈلیوں کو دبا کے بند کیا اور دونوں میں تالے ڈال دیے۔ پھر اس نے جیب سے مارکر نکالا اور صندوق کی بے داغ چادر پر لکھا۔ ”را بنجھے کی طرف سے۔“ میں گاڑی لے کر واپس گیا۔ ایک فرلانگ کے بعد مجھے دوسرا ریڑھا ملا جسے میں نے پیچھے بھیج دیا۔ ”سڑک کے کنارے ایک صاحب صندوق لیے کھڑے ہیں۔“ میں نے یوں کہا جیسے میرا ان صاحب سے کوئی تعلق نہیں اور شاید انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ کوئی ریڑھا نظر آئے تو بھیج دوں۔ گھڑی دیکھ کر میں دس منٹ بعد پھر لوٹا اور محسن کو تیز تیز قدموں سے آتے دیکھا۔

”ویری گڈ۔ ریڑھے والا صندوق لے گیا۔“ محسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے پچّیس روپے دیے۔“

”شک تو نہیں ہوا تھا اسے؟“ میں نے کہا اور گاڑی واپس کی۔ ہم دلاور کے گھر سے دور ہونے لگے۔

”نہیں۔ خوش ہو گیا اتنا کرایہ ملنے پر۔ میں نے کہا، بیگم صاحب سے کہہ دینا کہ صاحب نے بھیجا ہے۔“ محسن بولا۔

پبلک ٹیلی فون کا پہلا سائن نظر آتے ہی میں نے گاڑی رکوائی اور محسن کو گاڑی میں چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا نمبر ملایا۔ حسبِ توقع ریسیور اس کے پی اے نے اٹھایا۔

”کون صاحب ہیں آپ؟“ وہ بولا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دکاندار میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔

”رحمت کباڑی۔“ میں نے کہا۔ خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر دلاور نے ہیلو کہا۔

”چودھری صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”تحفہ آپ کے گھر پہنچ گیا ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا نا۔“

”سکندر! بہت جلد تم یہ مذاق وغیرہ سب بھول جاؤ گے۔“ دلاور نے غرّا کے کہا۔

”مجھے ایک خوشخبری بھی سنانی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”جو ٹرک مال لے کر کراچی جا رہا تھا اسے فرشتے لے گئے۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ چوہدری دلاور کے لہجے میں پہلی بار مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

”حساب کچھ برابر ہو رہا ہے چوہدری صاحب۔“ میں نے کہا۔ ”اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔“ میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور پیسے دے کر دکان سے نکل آیا۔ دوسرا فون دس منٹ بعد دوسری جگہ سے محسن نے کیا اور بہت خوش لوٹا۔

”کوئی بہت فرض شناس۔ یا لالچی افسر بیٹھا تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”میں نے دلاور کا پتا بتایا اور کہا کہ وہاں قتل ہو گیا ہے اور لاش کو صندوق میں ڈال کے ٹھکانے لگانے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ میں ان کا پڑوسی ہوں لیکن اپنا نام نہیں بتا سکتا۔ اس نے کہا ہم دس منٹ میں پہنچتے ہیں۔ کمال میری اداکاری کا تھا جس نے اسے قائل کیا۔“

”میرا خیال ہے دلاور نے بھی گھر فون کیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اور اسے معلوم ہوا ہوگا کہ ریڑھے والا اس کا نام لے کر ایک صندوق چھوڑ گیا ہے جو مقفل ہے۔ تو وہ بھی گھر کی طرف دوڑے گا۔“

”اپنا ایک یار اخبار کے دفتر میں سب ایڈیٹر ہے۔ ابھی آیا ہی تھا۔ میں نے کہا کسی رپورٹر کو اس پتے پر بھیج دو۔ قتل کی بہت سنسنی خیز خبر ہے۔“ محسن بولا۔ ”خدا نے چاہا تو سب کا اجتماع ایک ساتھ ہوگا۔ دلاور پہلے پہنچا تو سب سے پہلے صندوق کو اندر چھپائے گا یا تالے توڑ کر دیکھے گا۔ پولیس پہلے پہنچی تو پھنس جائے گا اور صندوق کو کھولنے پر مجبور ہوگا لیکن وہ کائیاں آدمی ہے کوشش کرے گا کہ پولیس کو کچھ دے دلا کے رخصت کرے اور لاش ٹھکانے لگا دے لیکن پولیس کے ساتھ ہی اخبار والے پہنچ جائیں گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

”وہ رپورٹر کو بھی خرید لے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت پیسہ اہم نہیں رہے گا دلاور کے لیے۔“

”مشکل ہے۔ اخبار والوں کو خبر زیادہ عزیز ہوتی ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں گھپلا ہو جائے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ سے موت طبعی ثابت کر دی جائے مگر میرا وہ سب ایڈیٹر یار سب کا ملبہ کر دے گا۔“

”اپنے اخبار والے دوست سے کہنا دوسرے رپورٹروں کو بھی پیچھے لگا دے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر عموماً تو صحیح رپورٹ دیتے ہیں لیکن بدنامی کا ڈر بھی ہو تو غلط رپورٹ دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دوبارہ پوسٹ مارٹم کا چکر چل جاتا ہے اور میڈیکل بورڈ بن جاتا ہے۔ یہ قتل تو دلاور کے نام لکھا گیا سمجھو۔“

”یہ دلاور کون ہے جی؟“ ڈرائیور سے بالآخر ضبط نہ ہو سکا۔

”اس کے پہلے بہت سے نام تھے۔ ابلیس، شیطان وغیرہ۔“ میں نے کہا۔ ”اب نام بدل لیا ہے اس نے۔ کام وہی کرتا ہے۔ اس سے زیادہ جاننا تمھارے حق میں نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ایک جگہ میں نے کار رکوائی۔ ”اب جدائی کی گھڑی آئی ہے دوست۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں سے تو جا اپنے گھر۔ میں جاتا ہوں جدھر تقدیر لے جائے مگر فکر کی بات کوئی نہیں۔ ہر اتوار کی شام کو چھ بجے اور سات بجے کے درمیان عبدالودود منظر کے گھر موجود رہنا۔ میں ٹیلی فون پر بات کروں گا۔ آج رات ملتان میں گزرے گی۔ کل سکھر سے بھی فون کروں گا۔“

”اور یہاں سے مجھے بات کرنی ہو یا خط لکھنا ہو تو؟“ وہ بولا۔ ”کراچی کا پتا کیا ہوگا؟“

”ظاہر ہے اس وقت میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں جاتے ہی کوئی بندوبست کروں گا۔ اتوار کو بتا دوں گا۔“

”رابعہ سے مل کر نہیں جائے گا؟“ محسن نے افسردگی سے کہا۔

”دل تو چاہتا ہے یار۔“ میں نے دردِ دل کو دبا کے کہا۔ ”لیکن دل کی بات مانی تو دماغ کے ارادے کمزور پڑ جائیں۔ وہ میرے سامنے آئے گی تو میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ اس کی مان لوں گا۔ مجھے ایسے ہی جانے دے۔ خیال رکھنا اس کا...“

”تو بھی اپنا خیال رکھنا۔“ وہ اچانک اتنا جذباتی ہو گیا کہ مجھے مجبوراً ہنسنا پڑا۔

”ایسے وداع مت کر مجھے جیسے کوئی سہاگن اپنے اکلوتے شوہر کو لام پر بھیج رہی ہو۔“ میں نے اس کے ایک ہاتھ رسید کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے آنسو اس وقت نکلے جب بہت آگے جا کر میں نے پیچھے دیکھا اور محسن مجھے وہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے ایک ہاتھ ہلایا شاید رومال سے آنسو صاف کیے۔

حسبِ توقع پولیس نے لاہور سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکابندی کر رکھی تھی اور یہ رسمی کارروائی والی ناکابندی نہیں تھی۔ شاید ان پر ایک طرف سے ایس پی ضامن رضوی کا دباؤ تھا تو دوسری طرف دلاور نے اپنے شکاری کتوں کو چوکنا کر دیا تھا کہ شکار نکلنے نہ پائے۔ میں جانتا تھا کہ پہلی چیک پوسٹ چھنگی نا کے پر ہوگی۔ اگر میں وہاں سے نکل گیا تو آگے بہت شہر آئیں گے جو ایس پی ضامن رضوی اور چوہدری دلاور کے حلقۂ اثر سے دور ہوں گے۔ ان کی ساری کوشش یہی ہوگی کہ مجھے لاہور میں رکھا جائے جہاں ان کا زور چلتا تھا۔ اگر میں اس پہلی رکاوٹ کو عبور کر گیا تو کراچی تک پہنچتے پہنچتے رکاوٹوں کا وجود ختم ہو جائے گا۔

چھنگی نا کے تک پہنچنے سے پہلے میں نے ایک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

”تمھارا نام کیا ہے؟“ میں نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ ”نام بتانے میں تو کوئی خطرہ نہیں۔“

”آپ سے اب کیا خطرہ۔ میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ ہی کے سہارے پر زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں ورنہ کوئی صورت نہیں تھی میرے بچنے کی ــــ میرا نام الطاف ہے جی۔ طافو کہتے ہیں سب۔“

”بات یہ ہے طافو۔ کہ قسمت نے ہمیں ایک دوسرے کا ہم سفر بنا دیا ہے۔ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور اسی طرح پار اتر سکتے ہیں کہ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔ ہم دونوں کا دشمن ایک ہے اور بہت طاقتور ہے۔ اگر ہم نے مل کر اس کا مقابلہ نہ کیا تو وہ ہمارا بیڑہ غرق کر دے گا۔ تمھاری طرح مجھے بھی اپنی زندگی عزیز ہے اور ہم ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔ نہ تم اکیلے کچھ کر سکتے ہو اور نہ اکیلا میں۔ اب دیکھو یہاں سے چند میل کے فاصلے پر چھنگی ناکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں پولیس مجھے پہچان لے۔ میں مجرم تو نہیں ہوں مگر بنا دیا گیا ہوں۔ تم گاڑی کو کچھ دیر کے لیے یہاں روکو۔ یوں جیسے اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اور میرا انتظار کرو۔“

اس نے گاڑی روک لی۔ میں نے ڈِکی میں سے وہ بیگ نکالا جس میں ایک فقیر کی پوری کِٹ موجود تھی۔ قبا اور کشکول، منکے اور چمٹا۔ یہ سب کچھ لے کر میں کھیتوں میں گھس گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں واپس آیا تو میں نے طافو کو بونٹ اٹھائے اس میں سر ڈالے مصروف دیکھا۔ ”حق اللہ۔“ میں نے نعرہ لگایا اور اس نے سر نکال کے ایک بار مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے وہ لباسِ فاخرہ پہننے کے بعد منہ پر مٹی مل لی تھی اور بال بکھرا کے ان میں تنکے اور خس و خاشاک ڈال لیے تھے۔ شیو میں نے دو دن سے نہیں کی تھی چنانچہ گلے میں رنگین منکوں کی مالائیں ڈالے، کشکول اور چمٹا لیے اور ننگے پاؤں میں بالکل فقیر لگتا تھا۔ میں نے جوتے کپڑے گاڑی میں اُچھال دیے۔

”اب لائٹ جلائے بغیر چلو۔ تم تو اس راستے سے واقف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہو۔" میں نے پیچھے بیٹھ کر کہا۔ "چنگی ناکا جب ایک میل رہ جائے تو مجھے اتار دینا اور لائٹ جلا کے گزر جانا۔ وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ پوچھیں تو کہہ دینا کہ ڈاکٹر امجد صاحب کی فیملی کو لینے ملتان جا رہا ہوں۔ میں پیدل آؤں گا۔ چنگی ناکے سے ایک میل آگے میرا انتظار کرنا۔"

ڈرائیور نے سر ہلایا۔ "یہ وردی نہ ہوتی تو میرے لیے بھی خطرہ ہوتا مگر اب کون پہچانے گا مجھے۔"

وہ چلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے پھر روک لیا۔ "دیکھو، اوّل تو مجھے خطرے کی کوئی بات نظر نہیں آتی لیکن خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہو جائے مثلاً میں پکڑا جاؤں تو تم ایک گھنٹہ انتظار کرنا اور ملتان چلے جانا۔ صبح وہاں سے واپس لاہور جانا اور میرا نام لیے بغیر ایک وکیل سے ملنا۔ ان کا نام ہے منظر صاحب۔ یاد رہے گا نا یہ نام؟"

"یاد رہے گا جی۔ منظر صاحب۔" وہ بولا۔ "لیکن میں پکڑا گیا تو؟ آپ انھیں نہیں جانتے..."

"میں سب کو جانتا ہوں طافو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم کو کسی نے چنگی پر روکا تو میں چھڑا لوں گا۔ یہ میری ذمّے داری ہے۔"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ گلوز کمپارٹمنٹ میں ایک ریوالور بھی ہے لیکن ابھی اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ دانش مندی کے خلاف ہوتا۔ اسی لیے میں نے نقد رقم اور رابعہ کا دیا ہوا چیک اپنے پاس رکھا تھا۔

جب گاڑی میری نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آگے پیچھے دیکھا اور جھوم جھوم کر چمٹا بجاتے ہوئے گانے لگا۔ "رکھ مولا تے آس بندے۔" یہ ٹیپ کا بند تھا جسے میں بُلھے شاہ کی ایک کافی کے بیچ بار بار لے آتا تھا۔ اور پھر ایک نعرہ لگاتا تھا۔ "مولا ای مولا۔ باقی سب رولا ای رولا۔" میں سڑک کے وسط میں بھی نہیں تھا اور بالکل کنارے پر بھی نہیں تھا چنانچہ دونوں طرف کی ٹریفک سے محتاط تھا۔ آتی جاتی بسوں اور کاروں کے مسافر مجھ پر دلچسپی کی ایک نگاہ ڈالتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ کسی ملنگ کی ذات میں دلچسپی بڑھ جائے تو عقیدت کے جذبات میں ڈھل جاتی ہے لیکن حیرانی کسی کو نہیں ہوتی۔ ایک گزرتی ہوئی بس میں سے کسی نے ہاتھ نکال کے مٹھی بھر سکّے اچھال دیے۔ "سائیں بادشاہ! رب خیر کرے۔"

"مولا ای مولا۔ باقی سب رولا ای رولا۔" میں نے سڑک پر بکھر جانے والے سکّوں پر نگاہ ڈالے بغیر نعرۂ مستانہ لگایا اور سیدھا چلتا گیا۔ چنگی ناکا اب مجھے سامنے دکھائی دے رہا تھا اور وہاں مختلف کاریں بسیں رک کر گزر رہی جا رہی تھیں لیکن ان میں میری کار نہیں تھی۔ قریب پہنچ کے میں نے سڑک کے دونوں جانب دیکھا لیکن میری کار گزر گئی تھی۔ میں نے اب زیادہ لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ میری آواز اگر اچھی نہیں تھی تو اس قسم کے تماشے کے لیے بری بھی نہیں تھی۔ دو تین مرتبہ میں رقص کے انداز میں گھوما اور کسی حال مست ملنگ کی طرح گرد و پیش پر نگاہ ڈالے بغیر سیدھا اس راستے سے گزرنے لگا جو پیدل چلنے والوں کے لیے تھا۔ گاڑیوں کو چیک کرنے کے لیے درمیان میں لوہے کا بانس جیسا ڈنڈا تھا جس نے چوڑائی کے رُخ سڑک کو بند کر رکھا تھا۔ ڈنڈے کے ایک کنارے پر من بھر وزن کا سیمنٹ کا بلاک تھا اور دوسرا کنارا ایک ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ جب کسی گاڑی کو کلیئرنس مل جاتا تھا تو ایک شخص ڈوری کو چھوڑتا تھا اور بلاک کے وزن سے ڈنڈا خود بخود اوپر اٹھ جاتا تھا۔ گاڑی کے گزرتے ہی وہ شخص ڈوری کھینچتا تھا اور بیریئر اشارے پر نیچے آ جاتا تھا۔

پہلے مجھے چنگی پر کوئی بات خلافِ معمول نظر نہ آئی تھی۔ راستہ کھولنے اور بند کرنے والے کے علاوہ وہاں دو افراد تھے۔ ایک پرچی کاٹنے والا اور دوسرا یہ پرچی گزرتی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو تھمانے والا۔ پھر مجھے مختصر سے کیبن میں ایک سب انسپکٹر کے ساتھ دو پولیس مین نظر آئے۔ پولیس والوں کے پاس رائفلیں تھیں لیکن سب انسپکٹر کا ریوالور اس کی وردی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک مسلّح سنتری تو عموماً نظر آ جاتا ہے مگر چنگی ناکے پر پولیس کی اتنی نفری کا مطلب تھا ناکا بندی۔ اصولاً تو انھیں ہر گاڑی میں جھانک کر دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ میری تلاش میں آئے تھے یا کسی ڈاکو کو پکڑنے۔ ہر صورت میں انھیں باہر کھڑے رہ کر گزرنے والوں پر نظر رکھنی تھی لیکن وہ کیبن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا لیکن اچانک ایک اور شخص کیبن میں سے برآمد ہوا۔

"سائیں بادشاہ!" اس نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔ "اک پیالی چا دی ساڈے دی پی جاؤ۔"

چائے پینے کے لیے کیبن میں جانا شیر کی کچھار میں داخل ہونے کے مترادف تھا لیکن وہ عقیدت مند مگ ہاتھ میں اٹھائے کھڑا تھا۔ "فقیر کا راستہ مت روک۔ منزل بہت دور ہے۔ سفر بہت لمبا ہے۔" میں نے گرج کے کہا لیکن وہ متاثر نہیں ہوا۔ ایسے کمزور عقیدہ لوگوں کے لیے کسی صوفی درویش کی برہمی بھی شانِ قلندری کی ادا ہے اور انھیں رام کر لینے کا مطلب ہے تقدیر کو رام کر لینا۔ اس نے میرا راستہ روک لیا اور میرے پیر پکڑنے ہی والا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔

"چھ کُڑیاں نے ملنگ سائیں۔ ایس واری مُنڈا چائیدا اے۔" وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

وہ ان بے عقل اور بے نصیب لوگوں میں سے تھا جو آج بھی جہالت کے اسی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے چھ لڑکیوں کی پیدائش اس کے نزدیک ایک سانحہ تھی اور نحس تھی اور وہ مجھ سے ایک بیٹا مانگ رہا تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی بیوقوفی تھی۔ اُسے کون سمجھاتا کہ عورت تو تخلیق کا سرچشمہ ہے جس نے پیغمبر، سائنسدان اور فنکار پیدا کیے اور عورت تو اس کی ماں بھی تھی۔ ایک بیٹے کی آرزو میں وہ چھ بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ شاید بیوی کو احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا کہ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی ہے اور میرے جیسے فراڈ درویشوں سے توقع رکھنے لگا کہ ان کی دُعا سے اس بچّے کی جنس بدل سکتی ہے جو ابھی ماں کی کوکھ میں اپنے وجود کی تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

مجبوراً میں نے اس سے چائے کا مگ لے لیا جو اس نے کیبن کے اندر ہی سب کے لیے بنائی ہوگی اور اسے دعا دی کہ "اللہ سب ٹھیک کرے گا۔" جو در حقیقت کوئی دُعا نہیں تھی حقیقت کا اظہار تھا مگر چند منٹ کی یہ تاخیر ہی مجھے مہنگی پڑی۔ چنگی وصول کرنے والے کارندے کا کسی ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہوا۔ ٹرک ڈرائیور نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ منشی نے اس سے کھُلا دینے کو کہا اور بات بڑھ گئی۔ اے ایس آئی معاملے کو رفع اور ٹرک ڈرائیور کو دفع کرنے کے لیے نکلا اور مسئلہ یوں حل کیا کہ سو کا نوٹ جیب میں رکھا اور ٹرک ڈرائیور کو پرچی کے بغیر نکال دیا۔ انصاف کے تقاضوں کے مطابق بد زبان ڈرائیور کو اتنا جرمانہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

شامتِ اعمال کہ واپسی پر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ "کیا نام ہے تمھارا ملنگ سائیں ہے؟" وہ بولا۔ شک اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے نروس ہوئے بغیر پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "اسی داتا دی نگری دے فقیر۔"

"میں نے نام پوچھا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "وہ نام جو ماں باپ نے رکھا تھا۔"

"اوئے ساڈا کی ناں تھانیدارا۔ ناں سچّا اس رب دا۔" میں نے اوپر انگلی اٹھائی لیکن انسپکٹر کا شک ایسے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مجھے اندر لایا جائے۔ میں نے خود کو ہنگامی صورتِ حال کے لیے تیار کر لیا اور دونوں

خوف، تحیّر، اسرار اور ٹیلی پیتھی پر مبنی ایک دلچسپ سلسلہ

دیوانہ

◎ ایک ایسے عامل کی کہانی جس نے ماورائی علوم کی مدد سے قتل اور غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔
◎ ایک طاقتور دیوانہ جو قاتل ہونے کے باوجود انتہائی معصوم تھا۔
◎ ٹیلی پیتھی کی ماہر ایک خوبصورت عورت جو کوئی بھی قتل ہونے سے پہلے ہی اس واقعے کو دیکھ لیتی تھی۔ لیکن تمام جزئیات دیکھنے کے باوجود قاتل کا چہرہ دیکھنے سے معذور تھی۔

ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور دوسرے
ماورائی علوم پر مشتمل
ایک سنسنی خیز کہانی
ماہنامہ نفسیات کے ہر شمارے میں قسط وار پڑھیے۔

ماہنامہ نفسیات میں دلچسپ کہانیوں کے علاوہ زندگی بنانے، خوشیاں حاصل کرنے، کامیابیاں اپنانے اور دیگر اہم نفسیاتی موضوعات پر انتہائی علمی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

قیمت فی پرچا: ۱۲ روپے = رجسٹری فیس: ٦ روپے
زرِ سالانہ (بذریعہ رجسٹری) ۲۰۰ روپے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سپاہی مجھے اندر لے گئے۔ تھانیدار نے اخبار اٹھایا تو میں نے "اللہ ہو" کا نعرہ لگایا اور اس کے بہت قریب ہو گیا۔ وہ اب میری تصویر کو میری صورت کے خدوخال سے ملا رہا تھا۔ غلطی اس نے یہ کی کہ اپنے ایک ماتحت سے تصدیق چاہی۔ اگر وہ کسی تذبذب کے بغیر ریوالور نکال لیتا تو میرا کام بہت مشکل ہو جاتا۔

سپاہی نے اقرار میں سر ہلایا ہی تھا کہ میں نے سب انسپکٹر کے ٹخنوں پر لات ماری۔ وہ سامنے کھڑے ہوئے سپاہی سمیت منہ کے بل فرش پر گرا۔ دوسرے سپاہی نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور رائفل کا رُخ میری طرف کیا۔ میں نے رائفل کی نال تھام کے ایک جھٹکا دیا۔ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی اور جھٹکے سے وہ آگے آیا تو میں نے وہی رائفل پیچھے کی۔ رائفل کا چوڑا دستہ اس کے سینے پر لگا اور وہ ہاتھ اٹھا کے نیچے جھکا۔ میں نے اُلٹی پکڑی ہوئی رائفل کو گھما کے تھانیدار کے بازو پر مارا جو اٹھ کر ریوالور نکال چکا تھا۔ کہنی سے اوپر اس کے بازو کی ہڈی خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ وہ بلبلایا اور اس کا ریوالور گرفت سے نکل گیا۔ دوسرا سپاہی چلانے کے علاوہ کچھ فاصلے پر پوزیشن لے رہا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ اگر میں اپنی جگہ کھڑا رہتا تو اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ دھماکے سے میرے کان سُن ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی گولی نے تھانیدار کا کام تمام کر دیا۔ وہ ہمت والا آدمی تھا اور ایک ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود ریوالور اٹھا چکا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔ دوسرے سپاہی کو میں نے ریوالور سے سر ٹکرا کے ناک آؤٹ کر دیا تھا لیکن اتنی دیر میں پہلا سپاہی اور مجھ سے اولادِ نرینہ کی دعا کا طالب باہر نکل چکے تھے "قتل ہو گیا، خون ہو گیا تھانیدار کا۔" انھوں نے چنگی والوں کو پکارنا شروع کیا جو ایک بس کی پرچی بنا رہے تھے۔

بس والا اگر کسی برطانیہ جیسے قانون پرست معاشرے کا ذمہ دار شہری ہوتا تو بس روک دیتا۔ وہ بس نہ روکتا تو مسافروں میں سے کوئی اسے رکنے پر مجبور کر دیتا لیکن یہاں ہر شخص قانون کے چکر میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ کوئی کسی کے قتل کا چشم دید گواہ ہو تب بھی بھاگ جاتا ہے۔ عدالت میں سالہا سال حاضری دینے کے علاوہ اسے مقتول کے ورثا کی دھمکیوں اور پولیس کی دستی کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے جو اس کو اپنی تفتیش کے مطابق بیان دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بس ڈرائیور نے موقع پاتے ہی بس نکال لی اور پرچی لیے بغیر فرار ہو گیا۔ چنگی والوں نے افراتفری میں بس کا نمبر نوٹ ہی نہیں کیا ہو گا اور باقی معاملہ بس کے مسافروں نے سنبھال لیا ہو گا۔ خود مسافروں نے ڈرائیور کی تعریف کی ہو گی کہ وہ سب کو بچا لایا۔ پتا نہیں وہاں قتل کرنے والے کتنے ڈاکو تھے۔

میں نے تھانیدار کا ریوالور اٹھایا اور باہر نکل کے ایک ہوائی فائر کیا۔ سپاہی تو وہیں لیٹ گیا۔ میرا معتقد چند قدم دوڑ کے گرا۔ چنگی کا باقی عملہ مخالف سمت میں فرار ہوا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خود بھی نکل جاؤں۔ سڑک پر ٹریفک جاری تھی اور کسی بھی کار یا بس میں کوئی شخص مسلح ہوتا تو مجھے نشانہ بنا لیتا یا میرے تعاقب میں دوڑنے لگتا تو دوسرے لوگ بھی ہمت کر کے پیچھے آ جاتے۔ اس فقیرانہ قبا کے باعث میرے لیے تیز دوڑنا مشکل تھا۔ پھر بھی میں سو گز تک بھاگا۔ کیبن کے بالکل پیچھے کھیت تھے اور رات کے اندھیرے میں سیاہ قبا میرے لیے رکاوٹ بن رہی تھی تو مجھے بچا بھی رہی تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ تک کھیتوں میں دوڑنے کے بعد میں نے رُخ بدلا اور سڑک کے متوازی بھاگنے لگا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے اور کچے راستوں پر ننگے پاؤں دوڑنا بہت مشکل کام تھا لیکن مجھے سڑک پر کھڑی گاڑی تک پہنچنے کی فکر تھی۔ میں نے طافو کو ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ چلا جائے گا تو میرے لیے اس مصیبت سے نجات کے راستے بند ہو جائیں گے۔

مجھے وقت کا کوئی احساس نہ تھا اور میں اندازاً خطِ مستقیم میں دوڑ رہا تھا۔ ایک جگہ ذرا سی دیر کے لیے رک کر میں نے وہ قبا اتاری اور اس کی گٹھڑی سی بنا لی جس میں میرے اپنے ریوالور کے علاوہ سب انسپکٹر سے چھینا ہوا ریوالور بھی تھا اور میری ساری نقد رقم بھی تھی۔ صرف انڈر ویئر میں ریس لگانا زیادہ آسان ثابت ہوا۔ اس وقت خنکی تھی اور نم آلودہ کھیتوں کے درمیان خاصی سردی ہو گی لیکن دوڑنے سے میرے جسم پر پسینہ آ رہا تھا۔ اندازے کے مطابق فاصلہ طے کر کے میں پھر دائیں جانب مڑا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ کار کی پارکنگ لائٹ سب سے مجھے ایک فرلانگ دور نظر آئی۔ میں پھر بھاگا۔ سامنے سے اور پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹ مجھ پر کئی مرتبہ پڑی۔ ہر بار مجھے اس خوف سے جھرجھری آ گئی کہ اگر کوئی گاڑی آگے جا رکی اور اس میں سے پولیس یا چنگی کے عملے کا کوئی شخص اتر آیا تو میں کیا کروں گا۔ یا کوئی مجھے یوں ننگ دھڑنگ سڑک پر دوڑ لگاتے دیکھ کر شک میں مبتلا ہو گیا اور اس نے گاڑی روک کر مجھ سے سوال کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر اچانک کسی بس میں سوار ہو کے پہنچنے والے مجروح پولیس مین نے بس روک لی اور مسافروں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تو میں کہاں فرار ہو سکوں گا۔ ان سب سے مقابلہ ناممکن ہو گا۔

کے باوجود میں بھاگتا گیا۔ عین اس وقت جب کار مجھ سے سو گز کے فاصلے پر بھی نہیں رہی تھی، اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں، انجن غرایا اور کار روانہ ہو گئی۔ "طافو!" میں دیوانہ وار چلایا اور اس کے پیچھے زیادہ قوت کے ساتھ بھاگا لیکن میں اس کی تیز رفتاری کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ سردی کی وجہ سے ڈرائیور نے شیشے بھی بند کر رکھے ہوں گے چنانچہ میری آواز انجن کی آواز میں دب گئی ہو گی۔ کار چند منٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

چند سیکنڈ پریشان و سرگرداں رہنے کے بعد میں سڑک سے نیچے اتر گیا لیکن اس طرف نہیں جدھر سے میں آیا تھا۔ گاڑی تو محض میری بدقسمتی کے باعث عین اس وقت نکل گئی تھی جب میں اپنی کوشش کے کامیاب ہونے کا یقین کر چکا تھا۔ میرے سارے مسائل کا حل یہی تھا کہ میں کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں۔ میں اپنے کپڑے بدل سکتا تھا اور آج کی رات بحفاظت ملتان پہنچ کر کسی ہوٹل میں سکون سے سو سکتا تھا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ سکھر سے اسے فون کروں گا لیکن اب سارا پروگرام چوپٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ فوری مسئلہ اپنے تحفظ کا اور رات گزارنے کا تھا۔ سڑک پر سے اب گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن میں ان کی روشنی سے دور تھا۔ اب مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی اوٹ میں وہی فقیری لباس زیبِ تن کیا۔ گلے میں وہی منکوں کی مالائیں ڈالیں اور دوسرے ریوالور کو بھی اندر کی جیب میں چھپا لیا۔

اندر کی تھیلا نما جیب بہت بوجھل ہو گئی تھی کیونکہ اس میں دو ریوالوروں کے علاوہ تقریباً آٹھ ہزار روپے نقد بھی تھے۔ میرے پیر کنکروں اور کانٹوں سے زخمی تھے اور اب ٹھنڈی زمین بھی تلوے کاٹ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چنگی ناکے پر ہنگامہ آرائی کی خبر اوپر پہنچ چکی ہو گی اور اب تک مزید پولیس کی کمک نہیں پہنچی تھی تو بہت جلد پہنچنے والی ہو گی۔ وہ میرا تعاقب کریں گے اور تلاش کرنے والے اُدھر ہی جائیں گے جدھر میں بھاگا تھا۔ وہ ٹارچ لائٹس لے کر آئیں گے۔ عین ممکن ہے شکاری کتے بھی لے آئیں جو بو کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ معاملہ ایک اشتہاری مجرم کا تھا جس نے سنگین جرائم کی فہرست میں مزید وارداتوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ شاید وہاں موجود افراد طے کریں کہ سب انسپکٹر پر گولی چلانے کا الزام بھی مجھ سے ہی منسوب کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ سپاہی تو بچ جائے گا جس نے گولی مجھے مارنی چاہی تھی لیکن وہ نشانہ خطا ہونے سے اس کے افسر کو جا لگی۔ وہ مل کر بیان دے سکتے ہیں کہ مفرور مجرم نے سپاہی سے رائفل چھین کر گولی چلائی اور پھر تھانیدار صاحب کا ریوالور لے کر ہوائی فائر کرتا، دھمکیاں دیتا فرار ہو گیا۔ اس آخری بات کا گواہ تو چنگی کا عملہ بھی تھا۔ صبح کے بعد خبر آگے چھوٹے دیہات اور قصبوں تک پہنچ جائے گی اور اس طرف میری تلاش پورے زور شور سے جاری رہے گی۔

میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ میں راتوں رات ملتان جا پہنچوں اور اپنی کار کے ڈرائیور کو تلاش کر لوں۔ اگر وہ کسی ہوٹل میں قیام کرے گا تو اپنا نام ہرگز نہیں لکھوائے گا۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا نام ہی لکھوائے گا جو گاڑی کے کاغذات میں درج تھا لیکن اس کا کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ اسے یہ خوف بھی ہو گا کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے اور بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اُسے تجربہ بھی نہیں ہو گا۔ ملتان پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس معقول کپڑے ہوں اور اس ویرانے میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں سڑک پر پہنچ کر کسی موٹر سائیکل یا کار والے کا انتظار کروں جو مجھے لفٹ دینے پر راضی ہو جائے اور اس احسان کا بدلہ یوں چکاؤں کہ اس سے گاڑی بھی چھین لوں اور اس کے کپڑے بھی اتروا لوں۔ یہ کام ناممکن نہیں تھا لیکن اس واردات کی خبر عام ہونے کے بعد یہ ثابت ہو جاتا کہ مجرم میرے سوا کوئی نہیں اور یہ معلوم ہو جاتا کہ میرا رخ کس طرف ہے۔ اس کے علاوہ ملتان پہنچ کر ڈرائیور کو تلاش کرنا بھی مشکل کام تھا۔ میں اسے گنتی کے دو چار ہوٹلوں میں تو دیکھ سکتا تھا لیکن چھوٹے ہوٹلوں کا کوئی شمار نہ تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ہوٹل کا رخ ہی نہ کرے۔ اپنے کسی عزیز دوست کے پاس رک جائے یا کار ہی میں سو جائے۔ اسے صبح لاہور واپس آنا تھا۔

چنانچہ اس سے ملاقات کی دوسری صورت یہ تھی کہ میں صبح ہوتے ہی سڑک پر آ بیٹھوں اور اسے واپس لاہور جاتے ہوئے روک لوں۔ آج کی رات کہاں گزاری جائے؟ یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہتا تھا۔ اندھیرے میں فصلوں کے درمیان یا کھیتوں کی منڈیر پر چلنا تکلیف دہ ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی چنانچہ پیر کے نیچے کوئی کیڑا مکوڑا آ جاتا تھا تو میں اچھل پڑتا تھا اور پھر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ پاؤں کسی سانپ بچھو پر نہیں پڑا۔ میری ہمت جواب دینے لگی تھی کہ کھیت اچانک ختم ہو گئے اور میرے سامنے ایک چھوٹا سا نالہ آ گیا۔ اس کے پار تھوڑا سا بائیں جانب مدھم روشنیاں کسی گاؤں کی موجودگی کا پتا دیتی تھیں۔ میں نے دونوں ریوالور اور نقد رقم ہاتھ میں اوپر اٹھائے اور نالے میں اُتر گیا۔ برساتی نالے میں پانی بہت کم تھا لیکن اتنا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ٹھنڈا تھا جیسے پگھلی ہوئی برف۔ نالے کی تہہ میں گول کنکر بچھے ہوئے تھے۔ میں سنبھل سنبھل کے ایک ایک قدم اٹھاتا، اپنا توازن برقرار رکھتا آگے بڑھتا گیا۔ چکنی سطح والی کنکریاں بھی اب میرے پاؤں کے نیچے شیشے کی نوکیلی کرچیاں بن گئی تھیں اور میری جسمانی طاقت بھی جواب دینے لگی تھی۔ مجھے پانی کی گہرائی کا اندازہ اگلا قدم بڑھانے کے بعد ہوتا تھا جو ابھی تک زیادہ نہیں تھی اور پانی میرے گھٹنوں سے اوپر نہیں پہنچا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک گڑھا آگیا اور اندازہ غلط ہوجانے کے بعد میں سنبھل نہ سکا۔

گرتے گرتے بھی میں نے اپنا اسلحہ اور سرمایہ بچایا چنانچہ پانی میں غرق ہونے کے باوجود میرے دونوں ہاتھ پانی سے باہر رہے۔ جب میں پھر کھڑا ہوا تو وہ فقیرانہ قبا پانی میں تر تھی اور یخ بستہ پانی میرے جسم کو بھگو کر ہڈیوں میں پیوست ہورہا تھا۔ سردی سے میرا پورا وجود کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ میں نے رہی سہی جسمانی قوت کو مجتمع کیا اور نالے کو عبور کر گیا۔ گاؤں کا پہلا گھر ایک فرلانگ کے بعد آگیا۔ اب میرے لیے دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ میں پانی سے تر کپڑوں میں ریوالور اور نقد رقم نہیں رکھ سکتا تھا اور اگر رکھ لیتا تو کپڑے بدلتے وقت انھیں نکال نہیں سکتا تھا۔ پناہ دینے والے خشک کپڑے، کھانا اور رات بھر کے لیے سونے کی جگہ دے سکتے تھے کیونکہ وہ سیدھے سادے مہمان نواز دیہاتی تھے لیکن کسی ملنگ کے پاس آتشیں اسلحہ اور اتنی نقد رقم دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوجائیں گے اور یہی سمجھیں گے کہ ملنگ کے بھیس میں کوئی ڈاکو ان کے گھر میں گھس آیا ہے۔

میں نے ایک جگہ نرم زمین دیکھ کر چھوٹا سا گڑھا بنایا، اس میں ایک درخت کے پتے بچھائے اور سب چیزیں اوپر رکھ کے پتوں کی دوسری تہہ ڈال دی تاکہ مٹی کسی کو خراب نہ کرے۔ ایک احتیاط میں نے یہ بھی کی کہ دونوں ریوالور رکھنے سے پہلے اوپر نیچے خشک نوٹ بھی پھیلا دیے تاکہ ایک ذرّہ بھی ریوالوروں کی گراریوں کے نظام تک نہ پہنچے۔ مٹی برابر کرکے میں نے پیروں سے دبادی اور اس تازہ کھدی ہوئی زمین کو چھپانے کے لیے اس پر سوکھے پتے اور اردگرد کا کوڑا ڈھیر کر دیا۔ نشانی کے لیے میں نے اسی درخت کو ذہن میں رکھا جس کے پتے نوچے تھے۔ گڑھا اسی کے نیچے شمال کی جانب ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ پھر میں نے اس کچے گھر کے بند دروازے پر دستک دی جس کے مکین شاید سورج ڈھلتے ہی کھانا کھا کے سونے کے عادی تھے۔

بار بار دستک دینے پر کسی نے اندر سے کہا۔ ”کون اے بھئی۔ دم لے ذرا۔“ پھر کنڈی گری اور ساٹھ ستّر سال کا ایک بوڑھا دیہاتی لالٹین اٹھائے نمودار ہوا۔ لالٹین اٹھا کے اس نے میرا چہرہ غور سے دیکھا۔

”مسافر ہوں بابا۔“ میں نے قلندرانہ انداز میں کہا۔ ”ایک روٹی کا سوال ہے اور ایک رات کے لیے قبر جتنی جگہ سونے کے لیے چاہیے۔“

”ہمارے بھاگ پیر بادشاہ۔“ وہ فرطِ عقیدت سے سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا۔ ”کہ آپ ہمارے مہمان ہوئے۔ اری بختے! دیکھ تو کون آیا ہے۔ رحمت کے فرشتے آئے ہیں ہمارے دروازے پر۔“ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے مجھے اندر آنے کے لیے کہا اور شاید اپنی گھر والی کو پکارا۔ وہ کچا گھروندا صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ لالٹین کی روشنی میں مجھے ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس نے تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کی اور کھانسی۔

”رب مبارک کرے۔“ اس سادہ لوح عورت نے کہا۔ ”شکر ہے تیرا مالک کہ یہاں بھی کوئی آیا۔“

”آپ بیٹھیں پیر بادشاہ۔“ دیہاتی نے دوسری جھلنگا چارپائی پر میرے لیے جگہ بنائی۔ ”میں روٹی لاتا ہوں۔“

میں دل ہی دل میں اتنا شرمسار تھا کہ ممکن ہوتا تو اسی وقت بھاگ جاتا۔ اگر وہ مجھے دھتکار دیتے اور میری منت سماجت کے بعد کسی کونے میں ڈال کر ایک روٹی تھما دیتے تو میں خدا کا شکر بجالاتا اور شرمندہ تو نہ ہوتا۔ شہر میں رات کو کسی اجنبی کے لیے کون گھر کا دروازہ کھولتا ہے خواہ دو ہزار گز کی کوٹھی خالی پڑی ہو۔ سب چور اچکا سمجھ کے بھگا دیتے ہیں۔ کوئی شرافت سے کام لے تو کہہ دیتا ہے کہ معاف کرو بابا۔ لیکن یہاں میری ایسی پذیرائی ہورہی تھی جیسے میں کوئی انتہائی اہم اور قابلِ احترام مہمان ہوں۔ یہ خیال میرے ضمیر کی خلش بن گیا کہ اگر ان سادہ دل، پُرخلوص اور نیک طبع لوگوں کو میری حقیقت کا علم ہوجائے تو انھیں کتنا دکھ ہوگا۔ مشکل یہ تھی کہ میں انھیں اس عزت و تکریم سے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے پیر شاہ کہہ کر گالی نہ دیں۔ میں تو ایک مفرور اشتہاری ملزم ہوں۔

بوڑھا دوسرے کمرے میں کسی کو جگا رہا تھا۔ ”ارے اب اُٹھ جا گلابو۔ مہمان آئے ہیں ہمارے گھر۔ ان کے کھانے کے لیے لا۔“ لالٹین دونوں کمروں کے بیچ والے دروازے کی دہلیز میں ٹانگ دی گئی تھی چنانچہ اس کا اُجالا تقسیم ہوگیا تھا اور دونوں طرف پھیل گیا تھا۔ بڈھا پھر نمودار ہوا اور نیچے بیٹھ گیا۔

یہ کیا کرتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔“

”نہیں پیر بادشاہ۔ اس قابل نہیں ہوں میں گنہگار۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیں۔ کرمو خارش زدہ کتا ہے جسے گاؤں والے پتھر مار کے بھگا دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے سامنے کھڑا نہیں رہنے دیتے۔ آپ ساتھ بیٹھنے کی کہتے ہیں۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے ہمدردی، حیرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔ ”گاؤں والے ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں تمہارے ساتھ؟ کیا خطا ہوئی ہے تم سے؟“ عورت اچانک کھانسنے لگی۔ کھانستے کھانستے اس کا دم پھول گیا۔ اس نے بہت سا بلغم تھوکا اور کم روشنی کے باوجود مجھے اس میں خون نظر آیا۔

”ٹی بی ہے اسے تو۔“ میں نے کہا۔

”ہاں... ہاں جی۔ دُعا کریں اللہ مجھے موت دے دے۔“ عورت نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اب اور نہیں جیا جاتا۔“

”مایوسی کفر ہے ماسی۔ اللہ سے شفا کی دُعا مانگنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”کب سے ہے ٹی بی اسے؟“

”جب سے گلابو جوان ہوئی ہے پیر بادشاہ۔“ کرمو بولا۔ ”وہی روگ ہے اس کا۔“

”بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے بُرا کیوں کہتے ہو۔“

”جس کے نصیب بُرے ہوں اسے اور کیا کہوں جی۔“ کرمو بولا۔ ”خدا کو منظور نہ ہوتا تو اب تک ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوتی؟ اتنی ذلت کے باوجود ہم زندہ رہنے پر مجبور ہوتے۔“

”ہر کام کا ایک وقت ہے کرمو۔“ میں نے کہا۔ ”اور خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ رشتہ ضرور ملے گا اور ایسا ملے گا کہ...“

”رشتے تو بہت پیر بادشاہ۔ اس کی تو منگنی بھی ہوگئی تھی۔“ کرمو نے کہا۔ ”لیکن خدا غارت کرے اس کا جس نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ ہمارا سکھ۔ ہماری خوشی۔ ہماری عزت۔ کرمو کی ماں کو ٹی بی دے دی اور گلابو کی رخصتی نہ ہونے دی۔“

”کون ہے وہ کرمو؟“ میں نے کہا۔ اندر سے ایک لڑکی چنگیر اور ایک گلاس لیے اندر آئی۔ اگر اس کا نام گلابو تھا تو غلط نہیں تھا۔ غربت اور دیہاتی وضع کے کپڑوں میں بھی اس کا گلاب دمک رہا تھا۔ آنکھوں کے دیپ روشن تھے اور اس کے حسن کی آب و تاب پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ چہرے پر وہ معصومیت تھی کہ گنہگار نظر کو حجاب آتا تھا۔

”یہی ہے وہ بدبخت پیر بادشاہ۔“ میں نے کرمو کی دکھی آواز سنی۔

”کبھی کسی کو بدبخت مت کہو کرمو۔ تم کیا جانو کسی کے مقدر میں کیا ہے۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”یہ سچا رب جانتا ہے اور اسی کو معلوم ہے کہ زندگی میں دکھ کتنا ہے اور سکھ کتنا۔ تقدیر بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بس اسی کا حکم چاہیے۔“ میں نے انگلی اوپر اٹھا کے کہا۔ گلابو روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

”اگر اس کی منگنی بھی ہوچکی تھی تو شادی کیوں نہیں ہوئی؟“ میں نے چنگیر اپنی طرف کھسکا کے کہا۔ چنگیر میں مکئی کی گرم روٹی، مکھن کا پیالہ اور اچار تھا۔

”مر گیا جی وہ۔“ کرمو نے گھٹنوں پر سر رکھ کے کہا۔ ”میرے بھائی کا بیٹا تھا۔ ایسا گبرو جوان تھا۔ جل کے مر گیا، اپنے ہی گھر کی آگ میں۔ آگ لگانے والا اب بھی ہمیں معاف نہیں کرتا۔ نہ جانے کتنے دکھی لوگوں کی بد دُعائیں لے کر بھی سانڈ کی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے کہا۔ نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ ”کوئی بدمعاش ہے؟“

”نہیں پیر بادشاہ۔ وہ تو شریف زادہ ہے۔“ کرمو تلخی سے ہنسا۔ ”بدمعاش تو ہم ہیں، ہماری بیٹی ہے۔“

”رہنے دے کرمو۔“ عورت پھر کھانستے کھانستے چلائی۔ ”کس کس کے سامنے روئے گا اپنا دکھڑا اور کتنی بار سنائے گا۔ مجھے مت جلا اور۔ پیر بادشاہ ایک رات کے مہمان... مہمان ہیں۔“

”ہم اسے نیست و نابود کردیں گے۔“ میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ یہ ڈراما کیے بنا چارہ نہیں تھا۔

”جاگیردار کا بیٹا ہے، اکرم۔“ کرمو نے سر اٹھا کے کہا۔ ”اکرم بدمعاش کہتا ہے خود کو۔ باپ کی شہ ہے اور دولت کا گھمنڈ ہے۔ پولیس بھی اس کے ساتھ ہے۔ پہلے اپنے ملے کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ بچاری سال بھر بھی نہ گزار سکی اور گلے میں پھندا ڈال کے لٹک گئی۔ پورے دلوں سے تھی۔ جتنا ظلم

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس نے برداشت کیا تھا اس کے بعد وہ یہی سزا دے سکتی تھی، خود کو بھی اور جاگیردار کو بھی۔ اس نے اپنے ساتھ اکرم کے بیٹے اور جاگیردار کے پوتے کو بھی قتل کر دیا۔ تب سے اکرم بے مہار پھر رہا ہے۔ معلوم نہیں گاؤں میں کسی کی عزت اس کے ہاتھوں خراب ہونے سے بچی بھی ہے یا نہیں۔ وہ تو بے وقوف تھے جنھوں نے آبرو گنوا کے شور مچایا' فریاد کی اور جوتے کھائے۔ جاگیردار سے بھی اور تھانے میں بھی۔ ایک اس کا مضارع تھا جس نے بہن کو کاٹ کے گاڑ دیا اور کلہاڑی سمیت تھانے میں حاضر ہو گیا۔ پچھلے مہینے ہی پھانسی ہوئی ہے اسے۔ دوسری فتو چمار کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میری طرف بری نظر سے دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گی اور وہ سچ مچ ڈب میں خنجر لیے پھرتی تھی۔ اکرم نے اس کو کھیتوں میں اکیلا دیکھ لیا تھا۔ اس نے خنجر سے مقابلہ کیا مگر اکرم جیسے مشٹنڈے مرد کا مقابلہ کیا کرتی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع کر دی۔" وہ اچانک چپ ہو گیا۔

"اور... اس کا خود کیا بنا؟" میں نے سوال کا جواب معلوم ہونے کے باوجود پوچھا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا پیر بادشاہ۔" وہ بولا "کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔ گاؤں میں یا گاؤں سے باہر کسی ویران سی جگہ میں، پاگلوں کی سی دہشت ناک حالت میں دربدر اور آوارہ دو چار کتوں کو ساتھ لیے پھرتی ہے۔ انہی کے ساتھ رہتی ہے اور انہی کے ساتھ کھاتی ہے۔ جو بھی لوگ ڈال دیں۔ انہی کو اپنا خاندان کہتی ہے۔ اب تو بچے بھی پتھر نہیں مارتے۔ کوئی چڑیل بھی نہیں کہتا۔ صرف اکرم بدمعاش کہتا ہے کہ فتو چمار کی بیٹی کو دیکھا ہے نا؟ نہیں دیکھا تو اب دیکھ لو کہ اکرم سے دشمنی کرنے والے کا حشر کیا ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے اسے مار سکتا ہے لیکن وہ مر گئی تو اکرم کی شہ زوری کا چلتا پھرتا نمونہ کہاں رہے گا...!"

میں نے افسوس کیا کہ اپنی جان بچانے کے لیے میں بھاگ کر اس گاؤں میں آیا۔

"یہ قصور کس کا ہے کرمو؟" میں نے کہا "کیا گاؤں کے مردوں نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لی ہیں؟ یا وہ اتنے بے غیرت ہو گئے ہیں کہ پڑوسی کی بیٹی کو بے آبرو ہوتا دیکھتے ہیں تب بھی نظر چرا کے گزر جاتے ہیں؟"

"وہ سب کا اَن داتا ہے پیر بادشاہ۔"

"کفر کا کلمہ مت بک کرمو۔" میں نے گرج کر کہا "سب کا اَن داتا وہ نیلی چھتری والا ہے۔ اپنی کمزوری کو مان لے۔ تجھے بھی ایک روٹی' ایک بیٹی کی آبرو سے زیادہ عزیز ہے؟ اس نے تیرے بھائی کا گھر جلا کے راکھ کر دیا۔ تیری بیٹی کو سہاگن ہونے سے پہلے بیوہ کر دیا۔ تیری بیوی خون تھوک رہی ہے اور تو ڈرتا ہے۔ اب بھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ جا کے اسے مار کیوں نہیں دیتا اور پھانسی کیوں نہیں چڑھ جاتا؟"

"میرے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں رہا پیر بادشاہ کہ کلہاڑی بھی اٹھا سکوں۔" وہ رونے لگا "میرا جوان بیٹا ہوتا کوئی تو میں قربان کر دیتا۔ کسی اور کو کیا کہوں۔ لوگ تو اس سے اتنا ڈرتے ہیں کہ اس کے خوف کے باعث ہم سے بات نہیں کرتے۔ ہمیں بلاتے نہیں۔ ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم بستی میں رہ کے اکیلے ہو گئے ہیں، شودر ہو گئے ہیں۔"

"اب کیا چاہتا ہے وہ؟" میرا خون آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا تھا۔

"وہ گلابو کو مانگتا ہے۔" وہ بولا "گلابو ضدی لڑکی ہے۔ کہتی ہے نہ زہر کھا کے مروں گی نہ گلے میں پھندا ڈال کے۔ میں فتو چمار کی بیٹی بھی نہیں ہوں۔ وہ بیاہ کر کے دیکھے مجھ سے۔ اسی رات جنازہ نہ اٹھے اس کا تو کہنا۔ باؤلی لڑکی' بھلا شادی کے بعد عورت کچھ کر سکتی ہے۔"

"عورت ہر وقت سب کچھ کر سکتی ہے کرمو۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "آخری بار کب بات کی تھی اس لفنگے نے؟"

"بات تو وہ کرتا ہی رہتا ہے۔ راہ چلتے دست درازی پر بھی اتر آتا ہے لیکن اللہ نے اب تک عزت بچا رکھی ہے۔" وہ بولا "اس نے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے سیجھے کہ آخری بار سوچ لے۔ میں کیا سوچوں پیر بادشاہ! گلابو نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ کہتی ہے ہاں کر دو۔ مہلت تو پوری ہو چکی۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ تم ہاں کر دو کرمو۔" میں نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔

باہر سے کئی افراد کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"اب کون آ گیا! رب خیر کرے۔" کرمو اٹھا۔

"ایک منٹ کرمو۔" میں نے کہا "ذرا میں دیکھ لوں پہلے۔"

اور اسے حیران چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جھری سے جھانکنے پر مجھے چار آدمی نظر آئے۔ میں پلٹ کر بھاگا۔

"باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟" میں نے کہا۔ "دروازہ میرے جانے کے بعد کھولنا۔"

"اُدھر دوسرے کمرے میں ایک کھڑکی ہے۔" کرمو گھبرا کے بولا "پیچھے کی طرف کھلتی ہے۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف لپکا اور کھڑکی کھول کے باہر اُتر گیا۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور گلیوں میں بھونکنے والے آوارہ کتوں یا بہت دور چلاّنے والے گیدڑوں کی آوازوں کے سوا کہیں، کوئی صدا نہ تھی مگر یہ بھی اس بھیانک رات کے سکوت کا ایک حصہ لگتی تھیں۔ مجھے صرف اتنا اندازہ ہو سکا تھا کہ حملہ آور تعداد میں چار ہیں۔ انھوں نے شب رنگ کپڑے پہن کے اپنے چہرے بھی یوں چھپا لیے تھے کہ میں صرف تاریکی میں چار سائے دیکھ سکا تھا۔ زیادہ امکانات یہی تھے کہ وہ اس غریب گھر کی عزت کو تاخت و تاراج کرنے والے لیٹرے تھے جو اپنی طاقت کے زعم میں' جواں مردی کے غرور میں اور شہ زوری کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے یہ بھول گئے تھے کہ عاقبت کا سرمایہ اعمال کی نیکیاں ہیں۔ وہ فتوحات نہیں جو انھوں نے کسی مظلوم' بے بس اور کمزور حریف پر انسانیت سوز مظالم ڈھا کے حاصل کی تھیں کیونکہ انھیں قوتِ تسخیر کے اس مظاہرے کا معاوضہ مال و زر کی صورت میں ادا ہوا تھا۔ یہ حریص شیطان بھول گئے تھے کہ ان کے ہوس پرست' ظالم اور بے ضمیر آقا کے مقابلے میں ایک انصاف پرور اور محافظِ قدرت کا ہاتھ کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ شکاری کتے ہوں جو مسلسل میرے تعاقب میں تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا مشکل ضرور تھا' ناممکن نہیں تھا۔ باہر نکل آنے کے بعد میں نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہے تھے اور کچے گھر کی دیواریں اتنی مضبوط نہیں تھیں کہ دروازے کو ناقابلِ شکست سہارا فراہم کر سکیں۔ گھر کے اندر ایک بیمار عورت تھی جو زندگی اور موت کی بے رحم جنگ کا شکار تھی اور جس کا شمار نہ زندوں میں لیا جا سکتا تھا اور نہ مردوں میں۔ وہ مرنا چاہتی تھی مگر مر نہیں سکتی تھی اور زندہ رہنے میں اس کے لیے موت سے شدید تر عذاب کا سلسلہ تھا۔ دوسری وہ لڑکی تھی جس کی جوانی کا حسن اس کا دشمن ہو رہا تھا اور وہ اپنے وجود پر بھی شرمسار تھی کہ آج اس کی وجہ سے والدین کی رسوائی اور موت کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ وہ یقیناً سوچتی ہو گی کہ کاش وہ پیدا نہ ہوئی ہوتی یا خدا نے اسے بدصورت نہ سہی گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت نہ بنایا ہوتا۔ اس کا اکیلا بوڑھا اور کمزور باپ اپنی بیٹی کی آبرو کے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ جان کی بازی لگا دے اور یہ بھیڑیے اس کی لاش کو پامال کرتے ہوئے گھر کی عزت کا جنازہ نکال کر لے جائیں۔

بستی کے گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھے لیکن ابھی تک کوئی دروازہ نہیں کھلا تھا اور کسی نے آواز دے کر بھی نہیں پوچھا تھا کہ اتنی رات گئے یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے۔ گلابو کے باپ کی فریاد و فغاں تو گھر کی دیواروں میں محصور تھی لیکن ان کی آواز تو دور دور تک رات کی خاموشی کو مجروح کر رہی تھی جو للکار رہے تھے، جنکار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ دروازے پر لاتیں مار رہے تھے اور مکے برسا رہے تھے۔ ایک دیوار کی طوالت چند قدم تھی۔ میں پنجوں کے بل تیزی سے آگے بڑھا اور کونے سے سر نکال کے دیکھنے لگا۔ چار میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی جسے وہ کندھے پر بندوق کی طرح جمائے سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب کمزور دروازے کو توڑنے کے لیے دو افراد کی قوتِ بازو کافی تھی۔ دوسرا لاٹھی کو زمین پر ٹکائے' اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ باقی دو ہاتھ خالی تھے اور اب کندھوں سے دروازے کو ٹکریں مار رہے تھے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات بھی تھی اور افسوس کا مقام بھی تھا کہ ابھی تک حقوقِ ہمسائیگی' انسانیت کے رشتوں اور شرافت کے تقاضوں نے کسی کو بیدار نہیں کیا تھا۔ کیا گاؤں میں لوگ سُکھ چین کی اور بے فکری کی اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ کسی کا گھر لُٹے یا کسی کی آبرو، ان کے کان کسی کی مدد کی پکار تک نہیں سُنتے؟ نہیں۔ گلابو کے باپ نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ محکوم و مجبور و حقیر لوگ ڈرتے ہیں۔ خوفِ خدا سے زیادہ ان کو زمین پر نمرود کی طرح خدائی کرنے والے مالکوں کا ڈر تھا۔ شاید وہ جاگ رہے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے مگر انھوں نے اپنی مجبوریوں کی آڑ میں پناہ لے لی تھی۔ خود غرضی نے انھیں بزدل اور بے حس بنا دیا تھا۔ آخر ہمارے بھی تو بیوی بچے ہیں اور پھر ہم مقابلے کی طاقت کہاں رکھتے ہیں۔ کل یہی ہمارے ساتھ ہوا تو کوئی نکلے گا اپنے گھر سے؟ پھر ہم کیوں جائیں اور کیسے جائیں۔

میں کونے سے نکل کر اچانک ان کے سامنے آ گیا "کیسا ہے یہ شور و غل؟"

دروازہ گرانے کی کوشش کرنے والے رک گئے۔ ایک ساتھ ان سب نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ پھر کلہاڑی والا ایک قدم آگے آیا "اپنا کام کرو سائیں بابا۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔" لاٹھی والے نے کہا۔

"جاؤ سائیں۔"

"اوئے ملنگ ہے کوئی یار۔" دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف ایک شخص نے جھنجلا کے کہا۔

"حق اللہ۔" میں آہستہ آہستہ جھومتا ہوا آگے بڑھا "او بدبختو، کیوں اس گھر کو گراتے ہو۔ جس گھر میں بستے ہو اسی کی دیواریں ڈھاتے ہو۔" میری آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں نے چرس کا دم لگا رکھا ہے۔

"یہ ہمارا گھر نہیں ہے موتیاں والیو۔" لاٹھی والا میرے سامنے آ گیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سر تو بس گھر ہوتا ہے۔ اینٹ چھوٹے گارے کا۔" میں نے جلالی لہجے میں کہا۔ "کبھی تیرا، کبھی میرا۔ ایک جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے۔ بندہ وہیں پہنچتا ہے جہاں سب گئے تو بھی جائے گا۔"

"بس کر بابا، دفع ہو جا یہاں سے" کلہاڑی والے نے کہا۔

لاٹھی والے نے مجھے دونوں ہاتھوں میں لاٹھی تھام کے دھکیلا۔ میں اسی موقعے کا منتظر تھا۔ میں نے لاٹھی کو بیچ میں سے تھام کر جھٹکا دیا۔ لاٹھی پر اس کی گرفت بہت مضبوط نہ تھی اور اسے ایک چرس کے نشے میں دُھت فقیر سے ایسی پھرتی اور قوت آزمائی کی امید بھی نہ تھی۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں آ گئی اور وہ دو قلابازیاں کھا کے دور جا گرا۔ میں نے لاٹھی کو یوں گھمایا کہ اس کا ایک سرا کلہاڑی والے کی گردن پر پڑے مگر وہ کندھے پر رکھی ہوئی کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے مجھ پر وار کر چکا تھا۔ لاٹھی اس کی کلہاڑی کے دستے پر لگی۔ کلہاڑی کے دستے کی لکڑی لاٹھی کے مقابلے میں بہت کمزور اور پتلی تھی۔ لاٹھی اور کلہاڑی کا دستہ یوں ٹکرائے جیسے بیک وقت ایک دوسرے پر وار کرنے والوں کی تلوار ٹکراتی ہے۔ کلہاڑی کا دستہ درمیان سے ٹوٹ گیا اور میرے حریف کے ہاتھ میں مشکل سے دو فٹ لمبا ڈنڈا رہ گیا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر قدم جمانے کی کوشش کی۔ میں نے لاٹھی اس کے پاؤں میں اڑائی اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ لاٹھی کا اصل مالک کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کے پوری قوت سے میری طرف پھینکا۔ اندھیرے کے باوجود میں نے اسے جھکتے اور زمین پر سے کچھ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔ جب اس نے مجھے گالی دینے کے بعد ہاتھ گھمایا تو میں غوطہ مار گیا۔ پتھر زن سے میرے کان کے پاس سے گزرا۔ میرے پیچھے کلہاڑی والا سخت اشتعال کے عالم میں اٹھ کے مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ پتھر کتنا بڑا تھا، اس کا اندازہ تو مجھے نہیں ہو سکا لیکن اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ میرے قدموں کے پاس آ گرا تو میں سمجھ گیا کہ میرا ایک مدِمقابل کم ہو گیا ہے۔ اس کی منہ زور، بے مہار اور مغرور قوت ایک لمحے میں اس سنگِ راہ سے ٹکرا کے فنا ہو گئی جو فرشتۂ اجل نے اس کے اپنے ساتھی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اس رات اگر وہ ایک غریب اور مظلوم آدمی کا گھر اجاڑنے اور اس کی جوان بیٹی کو اٹھا لانے کے لیے اپنے گھر سے نہ نکلتا تو زندہ رہتا۔ خود اس نے اپنی جرأت اور جواں مردی ثابت کرنے اور اپنی خدمت گزاری کا انعام لیتے وقت یہ سوچا تک نہیں ہو گا کہ کتنے کم داموں پر اس نے اپنی زندگی کا سودا کر لیا ہے۔ اس نے موت کی ہنسی نہیں سُنی ہو گی جو طے شدہ وقت پر آدمی کو کسی نہ کسی بہانے وہیں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ آخری بار سانس لیتا ہے۔ اسے حیران ہونے کی مہلت بھی نہیں ملی کہ آج کے دن تک یکسانیت اور تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والا عمل یکلخت کیوں اور کیسے رک گیا۔ وہ عمل جس میں دل کا دھڑکنا، نبض کا گھڑی کی طرح چلتے رہنا، سانس کی آمد و رفت، حواسِ خمسہ کی صحت اور سلامتی اور جسم کے تمام اعضا کا اپنے اپنے افعال کی کارکردگی کو برقرار رکھنا شامل ہوتا ہے۔

صرف ایک لمحے کے لیے سکوت اور جمود اور بے یقینی کا وہ لمحہ آیا جس میں لاٹھی والے نے محسوس کیا کہ اس نے کلہاڑی والے کو قتل کر دیا ہے۔ پھر یہ لمحہ خوف اور پشیمانی اور قہر و غضب کے طوفان میں ڈھل گیا۔ اچانک ان سب کو احساس ہوا کہ مجھے ایک مخبوط الحواس، بے ضرر اور بے وجہ ٹپک پڑنے والا فقیر سمجھ کے انھوں نے کتنی مہلک غلطی کی تھی۔ میں نے لاٹھی کو گھٹنے پر رکھ کے دو ٹکڑے کر دیا اور دونوں ٹکڑے دور اچھال دیے۔ میں نفسیاتی طور پر ان کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔

ان سب نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ پہلا توپ کے گولے کی طرح میرے پیٹ میں لگا۔ میں نے اسے رکوع کی حالت میں دیکھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اس کو پیٹ کے نیچے سے پکڑ کے اٹھایا اور سر کے اوپر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں نے ایک پنجے پر گھوم کے لات چلائی جو دوسرے کے پیٹ پر بالکل صحیح جگہ لگی۔ وہ بلبلایا اور ضرب کی قوت سے تقریباً پانچ گز دور گرا۔ میرے پیچھے گرنے والا اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ میں چھلانگ لگا کے اس پر گرا۔ میرے مکّے اس کے منہ پر گرز کی طرح پڑے۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ وہ بہت سخت جان اور طاقت ور حریف تھا۔ ورنہ پہلی بار ہی گرنے کے بعد اٹھ نہ پاتا لیکن اس نے مقابلہ کیا اور مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ پھر اس کے دونوں بازو اپنا دفاع کرنے کے بجائے میری کمر کے گرد لپیٹ لیے۔ کیونکہ اس نے اپنے آخری ساتھی کو پیش قدمی کرتے دیکھ لیا تھا۔

خود کو چھڑانے کی خاطر مجھے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی اور اسے تقریباً ختم کرنا پڑا لیکن یہ تاخیر مجھے مہنگی پڑی۔ اس نے آخری حریف کو مہلت دے دی کہ وہ اطمینان سے مجھ پر حملہ کرے۔ میں نیچے پڑے ہوئے شخص کی گرفت میں آدھا منٹ بھی نہیں رہا تھا لیکن اس آدھے منٹ میں چوتھے آدمی نے لاٹھی کے نصف ٹکڑے سے میرے سر پر وار کیا۔ یہ ٹکڑا وہیں پڑا تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا جہاں وہ میری لات لگنے سے جا کر گرا تھا۔

ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اُٹھ بھی نہ سکا۔ میرے ہاتھ پاؤں بے دَم ہو گئے اور میں نے خود کو درخت سے کٹ کر گرنے والی شاخ کی طرح زمین پر گرتے محسوس کیا پھر احساس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اندھیری رات زیادہ سیاہ اور بے صدا ہو گئی۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر رہا۔ کوئی آواز میرے لاشعور کو جھنجوڑ رہی تھی۔ سکندر! اٹھو یہ دوسرے شکاری ہیں، وہ نہیں جو تمھیں زندہ اور گرفتار رکھنا چاہتے ہیں اپنی قید میں، جیل خانے یا پاگل خانے میں۔ یہ خونی اور قاتل انھیں ہیں جو تمھیں پہچانتے بھی نہیں مگر یہ تمھیں معاف نہیں کریں گے۔ اپنے ایک ساتھی کے خون کا بدلہ یہ تمھارے خون سے لیں گے کیونکہ قتل تم نے نہیں کیا لیکن قتل کا سبب تم ہی ہو۔ تم نے ان کی متحدہ قوت سے ٹکر لے کر ناقابلِ معافی گناہ کیا ہے۔ یہ تم کو اسی دشت کی تنہائی میں ایسی جگہ گاڑ دیں گے جہاں تمھارے کسی دوست اور ہمدرد کے خیال کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ سب تو یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ تم ایک کار میں کراچی کی جانب رواں ہو اور اس وقت ملتان کے کسی ہوٹل میں سو رہے ہو اور کل تم سکھر سے فون کرو گے۔

ہوش آنے کے بعد بھی میں نے اپنے ہی خیالات کی بازگشت سُنی۔ آواز میری تھی اور بازگشت رابعہ کی۔ خیال میرا تھا اور صدا اُس کی لیکن یہ احساس کا فریب تھا اور آرزو کا سراب تھا۔ وہ آواز رابعہ کی نہیں گلابو کی تھی۔ وہ میرے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی، مجھے جھنجوڑ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔

میرا سر میرے کندھوں پر رکھی ہوئی چٹان بن گیا تھا لیکن گلابو نے مجھے سہارا دیا تو میں اُٹھ کے بیٹھ گیا پھر میں نے دیکھا کہ گلابو رو رہی ہے۔ کچے گھر کی دہلیز کے اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔

"گلابو!" میں نے کہا۔ "رو رہی کیوں ہے؟ وہ... وہ کہاں ہیں؟"

اور سر کو گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے سوال کا جواب میرے سامنے آگیا۔ اِدھر اُدھر چار افراد پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو اس جنگ میں سب سے پہلے کام آیا تھا۔ دوسرے کو میں نے مار مار کے نیم جاں کر دیا تھا اور وہ بھی لاش کی طرح ہی پڑا تھا۔ دُور سے یہ اندازہ کرنا دُشوار تھا کہ وہ ابھی تک بے ہوش ہے یا مر چکا ہے۔ تیسرا جسم دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ اس کا دھڑ، گردن تک الگ پڑا تھا۔ سر لڑھک کر چند قدم دُور چلا گیا۔ دُور سے آنے والے لالٹین کے مدھم اجالے میں لہو کی سُرخی اور رات کی سیاہی نمایاں طور پر الگ نظر آتی تھی۔ یہ لہو گردن کی شہ رگوں سے بہہ کر زمین کو رنگین کر رہا تھا۔ آدھی گردن دھڑ کے ساتھ تھی اور آدھی سر کے ساتھ۔ دونوں حصّوں کو اتنی صفائی سے کاٹنے والا لٹو کا گلابو کے باپ نے تھام رکھا تھا حالانکہ وہ بھی مر چکا تھا۔ اس کی لاش کا سر تن سے جُدا تو نہیں ہوا تھا مگر دو ٹکڑے

ہو گیا تھا۔ اس دہشت ناک منظر نے مجھے وہ الیکٹرک شاک دیا جس سے میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"گلابو!" میں نے اُسے ہاتھ تھام کے اُٹھا لیا۔ "تیرے باپ نے تو کہا تھا کہ تو بہت بہادر لڑکی ہے، بہادر باپ کی بہادر بیٹی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ چلّائی۔ "میں منحوس ہوں، قاتل ہوں اپنے باپ کی، چڑیل اور ڈائن ہوں، سب کو کھا گئی میں۔" بالآخر اُس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور ہسٹریا کی دیوانگی نے اسے مغلوب کر لیا تو میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا اور اس کے رخساروں پر مسلسل تھپڑ لگائے۔ روتے روتے اُس کی آواز یکلخت بند ہو گئی۔ وہ گرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال لیا اور اُٹھا کے اندر لے گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میری نظر گلابو کی ماں پر گئی۔ وہ اسی طرح اپنے بسترِ مرگ پر دراز تھی اور سکون سے سو رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں اس کے سکون سے سونے کا تصور ہی محال ہے جب اُس کی اکلوتی جوان بیٹی کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والے دروازے کو توڑ رہے ہوں، گلابو کا ضعیف مگر غیرت مند باپ مدد کے لیے بہرے بن جانے والوں کو پکار رہا ہو اور مایوس ہو کے اپنی جان کی بازی لگانے نکل گیا ہو۔ باہر ایک عورت کی عزت کے دُشمنوں اور محافظوں میں خونریز جنگ جاری ہو تو وہ سکون سے کیسے سو سکتی ہے۔ اس کے نحیف و نزار جسم پر پڑا ہوا لحاف بے ترتیب تھا۔ اُس کا سر بھی تکیے پر نہیں تھا۔ شبہے کی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ موت کی نیند ہے جس نے اسے یہ سکون بخشا ہے اور اب وہ اس جنگ میں فتح و شکست کے غم سے بے نیاز ہے جو اس کے گھر کی آبرو کی سرحد پر جاری تھی۔

میں نے گلابو کو دوسرے کمرے میں لٹایا اور فوراً باہر نکل گیا۔ میرے قدم پہلے اس درخت کی سمت بڑھے جس کے نیچے میرا ریوالور اور میرا تمام سرمایا دفن تھا پھر پلٹ کر میں اس شخص کی طرف چلا گیا جو تین لاشوں کے درمیان بے ہوش پڑا تھا۔ اندھیری رات کے پردے میں اپنا لباس اُتارنے میں مجھے دو منٹ بھی نہیں لگے لیکن اس بے ہوش شخص کے کپڑے اُتارنے میں مجھے کچھ محنت کرنا پڑی۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور مجھے بار بار چکر سے آتے تھے۔ چار خانے کا ریشمی لاچا باندھ کے میں نے بوسکی کا کرتا پہنا جو مجھے کچھ تنگ رہا لیکن صرف شانوں اور بغلوں میں۔ تاریکی میں رنگ کی تمیز مشکل تھی۔ بوسکی کے کرتے کا رنگ گہرا تھا اور کالا، زرد یا سفید کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی پگڑی کھل گئی تھی۔ اسے میں نے ناڑی پن سے پر لپیٹا اور اپنا اسلحہ نکالنے لپکا۔ جگہ میرے ذہن میں تھی اور بہت واضح۔ تازہ کھدی ہوئی مٹی کو دوبارہ کھودنا کوئی مشکل کام ثابت نہ ہوا اور میں لوٹ کر آیا تو نقد رقم کرتے کی جیب میں تھی۔ اسی میں

...بدکا وہ تعویذ بھی تھا جس پر اس نے بڑے پیار سے دستخط کیے تھے۔ باقی بندے تھے۔ حساب کی غیر جذباتی زبان کے الفاظ۔ ریوالور کو میں نے پہلے ڈب میں اُڑسا تھا لیکن اس سے ...کھلنے لگا تو میں نے اسے ہاتھ میں رکھا اور لاچے کو یوں پیٹا کہ ...نوں کناروں کو ملا کر دوہری گرہ لگا دی۔ ملنگ کی مسودہ سیاہ قبا ...نے ریشمی لاچے والے پر ڈال دی تھی کہ ہوش میں آنا نصیب ہوا ...و وہی پہن لے گا۔ مقدر میں کفن ہوا تو ملے گا ورنہ ناکامی کی سزا ...نے والوں کے لیے آسانی ہو گی۔ وہ اسی قبا میں لپیٹ کر گاڑ دیں ...ے۔ ایک مالا کے منکے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ دو مالائیں اسے ...پر ہاتھ پیر باندھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوئی تھیں۔

گلابو اب کراہنے لگی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پھر ہوش کی ...نیا میں لوٹ رہی ہے۔ موت کے اس خونی ڈرامے کا ہر کردار اپنی ...انی خود لکھتا تھا لیکن گلابو کی تصدیق ضروری تھی۔ وہی بتا سکتی تھی ...حملہ آوروں کا چوتھا ساتھی کہاں گیا۔ اگر اس کی لاش بھی نظر آگئی ...اتی تو میں پریشان نہ ہوتا۔ اس کی عدم موجودگی سے مجھے یہ خدشہ ...ق تھا کہ وہ بچ کر نکل گیا ہو گا۔ اس صورت میں خطرہ زیادہ تھا کہ ...ن اپنی غیر متوقع شکست کا بدلہ لینے کے لیے لوٹ آئے گا اور ...سری بار فتح کو یقینی بنانے کے لیے بہت زیادہ قوت کے ساتھ ...ئے گا۔

"ہوش میں آؤ گلابو!" میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "میری ...ف دیکھو، میں کون ہوں؟ آنکھیں کھولو۔" اس نے آہستہ آہستہ ...ھیں کھولیں اور مجھے پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے مددگار و ...فظ ملنگ سائیں کی جگہ اس نے میرے حلیے میں ایک دُشمن کو دیکھا ...اس سے سب کچھ چھین چکا تھا۔ اس کے ماں باپ کو قتل کر چکا تھا ...ن اس درندے کی ہوس ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ گلابو کے گھر میں ...ل ہو چکا تھا اور گلابو پر جھکا ہوا تھا اس کے جسم کی بوٹیاں نوچنے ...لیے اور اس کے دامنِ عصمت کو تار تار کرنے کے لیے۔ گلابو کی ...نکھوں میں دیوانگی کی ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی اور اس نے ایک ...مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔

"کمینے، خونی کتے، میں خون پی جاؤں گی تیرا۔" ایک وحشیانہ ...ت کے ساتھ اس کے ہاتھوں نے میری گردن دبوچنے یا میرا چہرہ ...نے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے چت کر دیا اور اس کے ...وں ہاتھ پکڑ کے اسے دبا لیا۔

"دیکھو گلابو! میں وہی ملنگ سائیں ہوں۔" میں نے پھولی ...ی سانس کے ساتھ کہا۔ "تم میرے لیے کھانا لے کر آئی تھیں نا؟ ...ی صورت دیکھو۔ بس میں نے کپڑے بدل لیے ہیں، غور سے دیکھو۔" آہستہ آہستہ اس کی قوتِ مدافعت میں کمی آنے لگی۔ میں نے

اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور چارپائی پر بیٹھا رہا۔ گلابو خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ آنکھیں اب ویران تھیں، دُکھ کے احساس سے عاری۔ اپنی تباہی کے غم سے، دُکھ سے اور سارے اندیشوں سے بے نیاز۔ احساس سے یہی محرومی مستقل دیوانگی میں بھی ڈھل سکتی تھی۔ جب آدمی زندہ رہے لیکن احساس مر جائے تو اُسے علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ خود کیا کر رہا ہے اور دُنیا اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ جذبات ہی نہ ہوں تو عزت و غیرت اور شرم و حیا کا خیال کیا۔ جسم فرشِ خاک پر پڑا ہو تو کیا، بے بس ہو تب بھی کیا، اور بے آبرو ہو تب بھی کیا۔

"تمھیں معلوم ہے گلابو کہ تمھارے باپ کے آنے سے پہلے میں اکیلا ان غیرت فروشوں سے لڑ رہا تھا؟" میں نے کہا۔ گلابو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ نہ وہ یادداشت سے محروم ہوئی ہے اور نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور عقل و ہوش سے۔

"میں دیکھ رہی تھی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ایک دُشمن نے کوشش کی تھی کہ میرا سر پھاڑ دے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد تمھارا باپ ٹوکا لے کر آگیا تھا۔"

گلابو نے پھر آہستہ سے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اور اُس نے ایک کا سر تن سے جُدا کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

گلابو کچھ دیر سوچتی رہی۔ "مجھے معلوم نہیں۔" وہ بولی۔

"لیکن تم تو دیکھ رہی تھیں، تم نے ابھی مجھے بتایا ہے۔" میں نے کہا۔

"جب... جب اس نے ٹوکا اُٹھایا تو... تو میں چھپ گئی تھی۔" گلابو نے کہا اور آنسو پھر اُس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔ "ماں کے بعد وہ مجھے بھی مار دینا چاہتا تھا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے اُس نے تمھاری ماں کا گلا گھونٹ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میری ماں نے خود... خود کہا تھا... اسے مجبور کر دیا تھا۔" وہ بولی۔ "پھر وہ پاگل ہو گیا تھا۔ میں پیچھے سے باہر نکل گئی ورنہ وہ سب سے پہلے میرا خاتمہ کرتا۔ میں بے غیرت اور بزدل نہیں ہوں۔"

"پھر تم کو بھاگ کر جان بچانے کا خیال کیوں آیا؟" میں نے کہا۔

"میں اس طرح پہلے بھی مرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔" وہ بولی۔ "ورنہ میں زہر کھا لیتی، کنویں میں کود جاتی لیکن میں مروں گی تو اسے مار کے۔ مجھے مرنے سے پہلے ایک شیطان کو مارنا ہے تاکہ پھر کوئی گلابو پیدا ہو تو اس کی طرف بُری نظر سے دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور ہو تو وہ کسی گلابو میں بھی ہمت ہو کہ اسے کتے کی موت مار سکے۔"

"تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گی گلابو۔" میں نے کہا۔ "تم عورت ہو اور کمزور ہو۔ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں حفاظت کے ساتھ پہنچا دوں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گا، جہاں بھی تم جانا چاہو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ویر۔" وہ بولی۔ "اب تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے اور اسے مار کے بھی میں کسی جگہ زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ یہ خیال مجھے زندہ نہیں رہنے دے گا کہ میرے ماں باپ کو قتل کرنے والا اور گاؤں کی لڑکیوں کی عزت کا لٹیرا اسی طرح دندناتا پھر رہا ہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک کو اس کے ساتھیوں نے مار دیا تھا۔ ایک کو تمہارے باپ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسرے نے کلہاڑی سے تمہارے باپ کا سر پھاڑ دیا۔ تیسرا بے ہوش پڑا ہے لیکن چوتھے کا کوئی پتا نہیں۔ شاید وہی تمہارے باپ کا قاتل تھا، جو قتل کے بعد بھاگ گیا۔ اب تک وہ اپنے آقا کو ساری بات بتا چکا ہوگا اور وہ بدمعاش اکٹھے ہو کر ضرور آئیں گے۔"

"آنے دو ویر۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "تم ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارا احسان ہے کہ تم نے اس گھر کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی لیکن تمہارا اتنا ہی احسان کافی ہے۔ اب معاملہ میرے اور ان کے درمیان ہے۔ باہر میرے باپ کی اور اندر میری ملک کی لاش پڑی ہے۔"

"میں تم کو چھوڑ کے نہیں جا سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور دیوار کے ایک طاقچے کی طرف بڑھی۔ اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن اٹھایا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ میں اس کی حرکت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا تھا اور یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ "میں تمہیں مسلمان سمجھ کے اس قرآن کی قسم دیتی ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔ "مجھ سے پھر مت کہنا کہ نکل چلو۔ تمہارے اور میرے درمیان یہ مقدس کتاب ایک دیوار ہے۔ اس کے ادھر مت آنا۔ دروازہ تمہارے پیچھے ہے جس طرح آئے تھے اسی طرح لوٹ جاؤ۔"

میری زبان گنگ ہو گئی اور میں پتھر کے بت کی طرح منجمد کھڑا رہا۔

"تمہارے احسان کا قرض مجھ پر رہے گا، میرے ماں باپ پر رہے گا۔ تم رحمت کے فرشتے بن کر نازل ہوئے تھے۔ ہر مہمان خدا کی رحمت ہوتا ہے اور تم نے تو اپنا فرض ادا کر کے ہمیں قیامت کے دن تک اپنا مقروض کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ تم پر فرض ہے اور نہ مجھ میں قرض اٹھانے کا حوصلہ۔ جاؤ میرے ویر۔ تمہارا رب راکھا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ اس شیطان کو مارنے سے پہلے نہیں مروں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔ تم میری کامیابی کی اور مغفرت کی دعا کرنا۔"

خاموشی کا ایک بہت بوجھل اعصاب شکن...... اور عذاب جاں وقفہ آیا۔ اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ جیب سے ریوالور نکالا۔ "تم نے میرے پاؤں میں دہری زنجیر ڈال دی ہے۔ ایک اتنی بڑی قسم دے کر اور دوسری مجھے اپنا بھائی کہہ کر۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"بھائی تو بے غیرت بھی ہوتے ہیں۔" وہ ریوالور کو دیکھ کر خوفزدہ ہونے لگی۔

"نہیں، میں بے غیرت بھائی نہیں ہوں گلابو۔ میں خود تیرا انتقام لیتا لیکن میں ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ وقت کم ہے اور مجھے دوسرے کام کرنے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایسے ہی کچھ لوگ ہیں، جو میرے باپ کو قتل کر چکے ہیں اور اب میری جان لینے کے درپے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں زندہ رہوں گا تو ان کو دنیا میں کہیں امان نہ ملے گی۔ جیسے آج میرے لیے کہیں امان نہیں۔" حالات کی وضاحت کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"تم نے ملنگ سائیں کا بھیس بدل رکھا تھا۔" وہ بولی۔ "کون ہو تم؟"

"میں اس سوال کا کیا جواب دوں۔ سخت مشکل میں پھنس گیا ہوں بس اتنا سمجھ لو، گلابو کہ میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ ہم دونوں عزت سے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ہمارے دشمنوں نے یہ بھی منظور نہیں کیا کیونکہ وہ عزت کا مطلب ہی نہیں سمجھتے تھے۔ نہ اپنی عزت کا اور نہ دوسروں کی عزت کا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو تو پہلے میں اپنے دشمنوں سے نمٹ لوں کیونکہ وہ ہر جگہ، ہر وقت میرے تعاقب میں ہیں۔ وہ بھی بہت طاقت ور اور بے ضمیر ہیں۔ ان سے نمٹنے کے بعد میں تمہارے ساتھ آؤں گا۔"

"نہیں ویر، تم جاؤ۔" وہ بولی۔ "اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"تمہارے والدین کی لاشیں باہر پڑی ہیں گلابو۔ کیا وہ ایسے ہی پڑی رہیں گی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، گاؤں کے لوگ انہیں دفن کر دیں گے۔" وہ بولی۔ "دو قاتل اور دو مقتول ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ جائیں گے۔ ایک ہی قبرستان میں۔ مشہور ہو جائے گا کہ انہیں ڈاکو مار گئے۔ تفتیش یہاں کون کرتا ہے۔"

"تم مجھے پڑھی لکھی لگتی ہو، اپنی باتوں سے۔" میں نے کہا۔

"بدقسمتی ہے ویر کہ میں نے آٹھ جماعت تک یہاں کے اسکول میں پڑھا۔ دس جماعت پرائیویٹ۔" وہ بولی۔

میری قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی تھی۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا تھا کہ میں اس لڑکی کو حالات کے سپرد کر کے بھاگ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کتنی کمزور ہے

لیکن یہاں رک کر بھی میں اس کی مدد کرتا تو خود پھنس جاتا۔ یہ بھی مشکل نظر آتا تھا کہ میں اسے عقل سے کام لینے کو اور صبر کرنے کو کہوں۔ جو زندہ رہنا ہی نہ چاہتا ہو اور جس کے لیے زندگی کا مفہوم ہی کچھ نہ ہو اسے زندہ رہنے کی تلقین کرنا بے سود تھا۔ وہ طے کر چکی تھی کہ اپنا انتقام خود لے گی اور اسے احساس ہی نہ تھا کہ مارنے کے بعد مر جانا آسان نہ ہو تو وہ کیا کرے گی۔ اس کے لیے والدین کی بے گور و کفن لاشوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی محال تھا۔ میرے دماغ میں الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔

"یہ لو۔" میں نے ریوالور آگے بڑھا کے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کس کام آتا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں لے کر تولا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اسی کی ضرورت تھی مجھے۔"

"تمہیں چلانا آتا ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں مگر جانے سے پہلے یہ بتا دو کہ کوئی میرے قریب آئے تو میں کیا کروں؟" وہ بولی۔

"جب یہ تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو تمہارے قریب آنے کی جرأت کوئی نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اتنے کم وقت میں تمہارا نشانہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ تم یہ کر سکتی ہو کہ انہیں نزدیک آنے دو۔ اگر وہ بالکل تمہارے سامنے ہوں تو تم ایک گولی سے ایک جان لے سکتی ہو۔ اس میں چھ گولیاں ہیں۔ یوں پکڑو اسے...... ایسے۔"

"مجھے تو اپنا بدلہ صرف ایک آدمی سے لینا ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن جیسے میرے والدین صرف اس لیے مارے گئے کہ میں ان کی بیٹی تھی، ویسے ہی اس کے ماں باپ کو بھی مرنا ہوگا صرف اس لیے کہ وہ اس شیطان کو جنم دینے کے ذمے دار تھے۔" میں نے سیفٹی کیچ ہٹا کے گلابو کو سمجھایا کہ اب گولی چلانے کے لیے اس کا صرف ٹریگر دبانا ہوگا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مظلوم لڑکی کے لیے کیا کروں۔ اس کی مدد کرنا جائز ہوگا یا نہیں، قانونی ہوگا یا غیر قانونی، اس کی حوصلہ افزائی بہتر ہوگی یا حوصلہ شکنی۔ اگر اس نے تین قتل کیے تو کیا میں بھی جرم میں اعانت کا مرتکب ٹھہروں گا؟ کس کی نظر میں؟ قانون کی نظر میں یا خود اپنی نظر میں؟

اچانک میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ باہر سے مجھے دھیمے دھیمے بات کرنے والوں کی آواز سنائی دی تھی۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپ الگ تھی جو نزدیک ہو رہی تھی۔ غالباً شکست خوردہ سپاہ کی تذلیل کا انتقام لینے کے لیے دوسرا لشکر بھیجا گیا تھا جو بہت بڑا اور زیادہ اسلحے سے لیس تھا۔ میں نے گلابو کو اپنے ساتھ کھینچا اور باہر بھاگا۔ گلابو نے تھوڑا سا احتجاج کیا اور کچھ مزاحمت بھی کی لیکن خود کو بے بس پا کر ہتھیار ڈال دیے۔ میں اسے کندھے پر ڈال کے بھی دوڑ لگا سکتا تھا۔

باہر آتے ہی قریب آنے والوں کی آوازوں کا ملا جلا شور زیادہ واضح ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک درخت کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ "اوپر چڑھ سکتی ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ لوگ ادھر سے ہی گزریں گے۔ تم ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لو گی بس مجھے بتا دینا۔" درخت پر چڑھنے کی مجھے بھی زیادہ مشق نہ تھی۔ میں اسے اوپر کیسے لے جاتا۔ میری بات کا مطلب اس نے یہ لیا کہ شناخت اور نشاندہی کے بعد ہر مجرم کو میں خود شوٹ کر دوں گا۔ یہ چال مؤثر ثابت ہوئی ورنہ میرے لیے اس کا بوجھ اٹھا کے یہ کارنامہ سرانجام دینا ناممکن ہوتا۔ کسی جوان اور صحت مند، مچلتی اور مزاحمت کرتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹ کر بھاگا تو جا سکتا ہے۔ عموداً سفر نہیں کیا جا سکتا۔

وہ گاؤں کی آزاد فضاؤں کی پروردہ لڑکی تھی جس کا بچپن اسی طرح درختوں پر اترتے چڑھتے گزرا ہوگا۔ کبھی گھونسلوں میں جھانکنے کے لیے تو کبھی کچے آم توڑنے کے لیے۔ وہ بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گئی اور اس نے مجھے مشکل میں دیکھا تو اپنا ہاتھ نیچے بڑھا کے مجھے کھینچنے کے لیے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ زمین کی سطح سے دس گیارہ فٹ کی بلندی پر میں نے اس کے ساتھ ایک شاخ پر بسیرا کیا جو تنے کا ایک مضبوط بازو تھی۔ باقی دو بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پر وہ لوگ نمودار ہوئے۔ وہ سب ایک کے پیچھے ایک دوڑ رہے تھے اور ان سب کے کندھوں پر لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔

"اتنی جلدی وہ بھاگ کر نہیں جائے گا۔" کسی نے کہا۔ "تم چاروں طرف پھیل جاؤ۔"

"وہ گھر میں ہی ہوگا۔" کسی اور نے تائید کی۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رکے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔

"ہاں، گلابو بھی تو اکیلی ہی ہوگی، نا گھر میں۔" کسی کے غلیظ ذہن کی بات زبان پر آ گئی۔

میں اور گلابو دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہ کچا مکان مشکل سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا جس کے مکین زندگی کی آخری جنگ میں شکست کو اپنا مقدر سمجھ کے قبول کر چکے تھے اور مقابلے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ فاتحین نے مکان کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں دو عین درخت کے نیچے کھڑے محض ہدایات دے رہے تھے۔ اس طرح اس تمام فوج کی قیادت خود بخود اس شخص کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو گلابو کے باپ کو قتل کر کے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ گولی چلنے کی آواز آئی تو میں اچھل پڑا۔ گلابو نے ایک دشمن کا کام تمام کر دیا تھا لیکن مرنے والا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کے باپ کا قاتل نہیں تھا۔ اس کو دوسری گولی نے ختم کیا۔ دونوں گولیاں چند فٹ کی بلندی سے ان کے سروں میں پیوست ہو گئیں۔

کچھ پوچھنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے گلابو سمیت نیچے چھلانگ ماری۔ وہ میرے اوپر گری اور میرے اٹھنے سے پہلے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اپنے گھر سے دور بستی کی جانب دوڑ رہی تھی۔ وہ ان کچے راستوں کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے آشنا تھی اور کوئی نازک اندام شہری لڑکی نہیں تھی۔ عام حالات میں اس کو پکڑنا دشوار نہ ہوتا لیکن میرے لیے بہت سی مشکلات تھیں۔ رات کا اندھیرا، ناہموار راستے، کنکر، پتھر اور ریشمی لاچا، جو میں نے پہلے کبھی نہیں باندھا تھا۔ کم سے کم کسی دیہاتی لڑکی سے نصف شب کو کھلے کھیتوں کے درمیان ریس لگانے کے لیے ہرگز نہیں۔ وہ شلوار میں تھی اور زیادہ آسانی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی۔ میں بھی شلوار یا پتلون میں ہوتا تو ریس چند قدم کے بعد ختم ہو جاتی مگر ماڑی پن میں کس کر باندھے ہوئے لاچے نے مجھے لمبی چھلانگ لگانے سے روک دیا تھا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ دو گولیوں کی آواز نے سب حملہ آوروں کو متوجہ کر لیا ہو گا۔ ان پر پہلا انکشاف یہ ہوا ہو گا کہ وہ گھر اب قبرستان ہے جسے وہ تہس نہس کرنے کے لیے زیادہ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔

دوسرا انکشاف مایوس کن ہو گا کہ اصل دشمن تو بھاگ گیا، جس نے ان کی کامیابی کو ناقابل تصور ناکامی میں بدل دیا تھا اور وہ جاتے جاتے گلابو کو بھی نکال لے گیا لیکن گولیوں کی آواز سن کے وہ دوڑے ہوں گے تو تیسرا اور آخری لرزہ خیز انکشاف ان پر یہ ہوا ہو گا کہ جن کو وہ گھر کے اندر تلاش کر رہے تھے، وہ گھر کے باہر موجود تھے۔ وہ پہلے ہی طے کر چکے ہوں گے کہ میلے سے ملنگ نظر آنے والا کوئی خطرناک مجرم تھا۔ شاید کسی جیل سے بھاگنے والا۔ درخت کے نیچے خاک و خون میں غلطاں لاشوں کو دیکھ کر شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی ہو گی۔ گاؤں میں ریوالور تھانیدار، نمبردار یا زمیندار کے سوا کس کے پاس ہوتا ہے۔ گلابو کے لیے تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ دونوں قتل اس نے ریوالور سے دو گولیاں چلا کے کیے ہوں گے۔

اگر میں گلابو کو آواز دیتا تو وہ سن لیتے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کس طرف فرار ہوئے ہیں۔ گلابو اچانک رک گئی۔ اس کے اور میرے درمیان اس وقت مشکل سے دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

"آگے مت آنا ویرا!" اس نے دونوں ہاتھوں میں ریوالور مضبوطی سے پکڑ کے اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ "پہلے میں نے تم کو قرآن کا واسطہ دیا تھا، اب اس رشتے کا واسطہ دے رہی ہوں کہ لوٹ جاؤ۔ بہن کو مجبور نہ کرو کہ بھائی پر گولی چلائے۔"

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے تھے اور اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو گلابو؟" میں نے کہا۔ یہ سوال بھی غیر ارادی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔

"ہاں، تم چاہو تو مجھے پاگل سمجھ سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے میں کیا کر رہی ہوں۔"

"تم... تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اسی لیے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم نے بہت جلدی کی گلابو!" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہو رہا ہے کہ یہ قاتل کھلونا میں نے نادان ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم اپنی عزت کی حفاظت آخری وقت تک کر سکو اور جب دیکھو کہ اب آبرو پر جان قربان کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں رہی تو آخری گولی خود پر چلا کے انہیں آخری شکست دے دینا، جو اب تک فتح مندی کے غرور میں بدمست ہیں لیکن تم نے ایک گولی کا ناجائز استعمال کیا۔ ایک تو تمہارے باپ کا قاتل تھا لیکن دوسرا اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ وہ مجرم تھا اور دشمنوں کے ساتھ تھا لیکن سزائے موت...!"

"وہ بھی سانپ تھا۔ ایک بار مجھے ڈس چکا ہے۔" گلابو نے کہا۔ "وہ گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش کہلاتا تھا۔ وہ تین لڑکیوں کے خون کا ذمے دار تھا۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔ دوسری کا آج تک پتا نہیں چلا۔ انھوں نے تو یہی مشہور کیا تھا کہ وہ آوارہ تھی، گھر سے بھاگ گئی لیکن میری طرح اور بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ وہ اسی مٹی کے نیچے مٹی ہو چکی ہے۔" اس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں اور ویران جنگل کی طرف ہاتھ ہلا کے اشارہ کیا۔ میں موقعے کی تاک میں تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ بدلا ہی تھا کہ میں نے جست لگا کے اسے دبوچنا چاہا لیکن وہ بے حد ہوشیار، چالاک اور پھرتیلی ثابت ہوئی۔ اس نے مخالف سمت میں چھلانگ لگائی اور مجھے سخت گرفت اٹھانی پڑی۔ وہ پھر مجھ سے چند قدم دور اسی طرح ریوالور کے ٹرائیگر پہ انگلی رکھے موجود تھی۔ فرق صرف پوزیشن کا پڑا تھا۔ جہاں پہلے میں تھا وہاں گلابو تھی اور گلابو کی جگہ میں احمقوں کی طرح کھڑا تھا۔

"تیسری لڑکی سے تم مل سکتے ہو۔" وہ بولی۔ "وہ سب سے خوبصورت تھی۔" گلابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس گاؤں سے باہر ایک قبرستان ہے جو ندی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سفید جالی کے گنبد والا مزار پیر علمدار شاہ کا ہے، جو وہاں ایک چلہ کاٹنے اس کے من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ وہ دو سال سے وہیں ہے۔ تم اسے دیکھو گے تو پہچان لو گے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہتی ہے یا پڑی رہتی ہے اور اس کے جسم پر مٹی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے موسم میں بھی کسی نے اسے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔

اگر تم ترس کھا کے اس پر چادر یا کمبل ڈالنے کی کوشش کرو گے تو وہ چلانے لگے گی اور تم سے کہے گی کہ گھر لے جا یہ کفن۔ تیری ماں اور بہن کو بھی تو کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بہت لمبا چلہ ہو گیا ہے اس کا لیکن ابھی تک اس بے چاری کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں وہ کیا مانگنے گئی تھی اور بس اب بے بس زندہ ہے یا نہیں تو نہ شرم آتی ہے نہ موت، جو اس کی یہ حالت بنانے کے بھی سینہ تانے پھر رہے ہیں۔ اگر یہ کھلونا اس کے پاس ہوتا تو دو سال پہلے ہی وہ سارے عذاب سے چھٹکارا پا لیتی اور جو کام میں نے آج کیا وہ خود کر لیتی۔"

اپنی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے گلابو بھی دیوانگی کی سرحد پر کھڑی تھی۔ میں نے اسے ریوالور نہ دیا ہوتا تو شاید گاؤں والے دیکھتے کہ پیر علمدار شاہ کے مزار پر فریاد کرنے والے سائل دو ہو گئے ہیں۔ دونوں کا مسموم گزیدہ وجود ایک ہے۔ ان پر کھلے ہوئے زخموں کے پھول ایک ہیں۔ دونوں کا دکھ ایک ہے اور دیوانگی کا سبب ایک ہے اور یہ دونوں کا بے لباس وجود آدمیت کا وہ اشتہار ہے جسے پڑھ کے آدمی کو اپنے آدمی ہونے پر شرم آتی ہے لیکن ریوالور ہاتھ میں آ جانے سے اس کا ذہن بھٹکنے سے بچ گیا تھا اور وہ خود انسانیت کا تماشا بننے سے بچ گئی تھی لیکن اس کی سوچ کے کچھ دروازے بند ہو گئے تھے۔ اب اسے دکھ نہیں تھا کہ بیمار ماں کو اس کے باپ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اسے فکر نہیں تھی کہ اس کی ماں کا جنازہ کون اٹھائے گا۔ باپ کو لوگ کیا کہیں گے اور وہ مرنے کے بعد بھی رسوا ہوں گے یا نہیں۔ اسے اپنے انجام کی بھی پروا نہیں تھی۔ صرف ایک خیال نے ذہنی و جسمانی طور پر اسے مغلوب کر لیا تھا۔ اس حد تک کہ وہ دکھ کے احساس سے بھی نجات پا چکی تھی اور بالکل خوفزدہ نہ تھی۔ پہلے اس کی خواہش تھی لیکن اب اس کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا تو اسے پانچ گولیوں سے ان درندوں کا خاتمہ آسان نظر آنے لگا تھا جن کی سفاکی اور بربریت نے کئی گھر اجاڑے تھے، عصمتوں کے چراغ گل کیے تھے اور زندگیوں کے نذرانے لیے تھے۔ وہ سب کا خون بہا لے سکتی تھی اور کم سے کم پانچ مجرموں کے وجود کو ختم کر سکتی تھی۔ چھٹی گولی اس نے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد باعزت طور پر فتح مندی کے غرور کے ساتھ اور کامیابی کی سرخروئی کے ساتھ دنیا سے چلے جانے کے لیے رکھی تھی۔

دو مجرم اور گناہ گار اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ باقی تین کون تھے، یہ وہ خود بتا چکی تھی۔ ایک وہ سانپ تھا، جو گلابو کے والدین کو مار دینے کے بعد بھی اس کے سامنے پھن پھیلائے موجود تھا۔ دوسرے وہ مرد اور عورت تھے جنھوں نے اس سپولیے کو دودھ پلا کے بڑا کیا تھا۔ اپنی تربیت سے اس کی سرشت میں بدی شامل کی۔ اسے ڈسنا سکھایا اور اس کے خون میں زہر بھرا۔ عقل کہتی تھی کہ بیٹے کی بدی

معاشرتی جبر کے خلاف زاہدہ حنا کا قلم تیغ برہنہ بن جاتا ہے
اُن کی کتاب
قیدی سانس لیتا ہے
کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے
اُردو افسانے میں
زاہدہ حنا
کا نام اور کام
کسی تعارف کے
محتاج نہیں
سسکیاں
بھرتے ہوئے مظلوموں
کے لیے اُن کی تحریریں
مرہم کا درجہ
رکھتی ہیں
قیمت /۶۰ روپے ڈاک خرچ ۱۰ روپے
رقم پیشگی منی آرڈر
بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف
زاہدہ کے افسانوں کا یہ مجموعہ
مشاہیر ادب اور عوامی حلقوں سے
خراج تحسین حاصل کر چکا ہے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کی سزا والدین کو نہیں ملنی چاہیے لیکن یہ فیصلہ میری عقل کا تھا، گلابو کی عقل کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ اگر میری وجہ سے میرے والدین کو قتل کیا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے والدین کو قتل کرنا بھی بالکل جائز ہے، ضروری ہے اور منطقی ہے۔ میں اب پچھتا رہا تھا کہ میں نے جذباتی ہو کے اس کے ہاتھ میں ریوالور کیوں دیا۔ اب نہ میں اس کا فیصلہ بدل سکتا تھا اور نہ اس سے ریوالور چھین سکتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں نے کوشش کی تو وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔ سو وہ اپنے مقصد کی راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو بلاتذبذب مار ڈالے گی اور اسے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میں نے آخری بار اس لڑکی کو دیکھا جو بغاوت اور سرکشی، انتقام اور مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر اور صنفِ نازک کی قوتِ برداشت ختم ہو جانے کے بعد ایک تباہ کن قوت بن گئی تھی۔ اس ایٹم بم کی طرح جس میں فیوز لگا دیا گیا ہو اور جسے اب کوئی پھٹنے سے نہ روک سکتا ہو۔

"اچھا گلابو، میں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تمھیں میری مدد کی ضرورت نہیں رہی۔ میری دعا ہے کہ اچھا ہو یا برا لیکن وہی ہو جو تم چاہتی ہو۔" وہ سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور میں پلٹ گیا۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اندازے کے مطابق سڑک کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً بیس قدم جانے کے بعد میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ اسی پوزیشن میں ریوالور لیے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں اسے ڈاج کر جاؤں اور چکر کاٹ کے اسے پکڑنے کی کوشش کروں۔ اتنی دوری سے اس کا نشانہ خطا ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے لیکن پھر میں نے طے کیا کہ مجھے چلتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک گولی ضائع کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ وہ زندہ رہے گی تو روح اور جسم کی طویل اور ناقابلِ برداشت اذیت اٹھانے کے بعد پیر علمدار شاہ کے مزار پر اس حالت میں پہنچے گی جس حالت میں آج اس کی سہیلی ہے۔

میں نے پلٹ کر آخری بار اسے دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ خدا حافظ میری بہن، چند گھنٹوں کا یہ مقدس رشتہ ختم ہوا۔ اب ہم میدانِ حشر میں پھر ملیں گے۔ اس سے پہلے میں کبھی ادھر نہیں آؤں گا۔ نہ کبھی تیری بے نشاں قبر تلاش کرنے، نہ پیر علمدار شاہ کے مزار پر تیری ناکامی کی سزا کا تماشا دیکھنے۔ اوپر آسمان پر صبح کا ستارہ چمکنے لگا تھا لیکن آج اس کی چمک ماند تھی۔ اس کی ہر کرن اداس تھی۔ بہت دور رابعہ بھی جاگ رہی ہوگی اور شاید اس کی نظر میں بھی یہی ستارہ ہوگا۔ وہ امید کی کوئی کرن تلاش کر رہی ہوگی۔ میرے پیچھے چھ لاشیں پڑی تھیں۔ دو کی بے نور آنکھیں اس ستارے کی روشن کرن میں کھلی نظر آتی ہوں گی۔ تیسری لاش ایک عورت کی تھی۔ میرے آنے سے پہلے اسے یقین ہوگا کہ ابھی وہ کچھ دن اور جیے گی۔ ایک لاش کا سر تن سے جدا پڑا تھا۔ دوسری لاش کو کلہاڑی کی ایک ضرب نے دونیم کر دیا تھا۔ صبح ابھی بہت دور تھی۔ اس سے پہلے فرشتۂ اجل کو یکے بعد دیگرے چار افراد کی کتابِ زندگی کے آخری صفحے پر لکھنا ہے THE END۔ اس کو بالکل غرض نہیں کہ انجام اچھا تھا یا برا، فلم اچھی تھی یا بری۔ ختم ہوئی اور اب جس کا جو دل چاہے کہے۔

میں نے اچانک خود کو ایک شکستہ چار دیواری کے مقابل پایا۔ یہ شہرِ خموشاں کی فصیل تھی۔ تین ساڑھے تین فٹ اونچی پختہ اینٹوں اور گارے کی دیوار پرانی ہونے کی وجہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے تھے۔ میں نے دور تک پھیلی ہوئی قبروں پر نگاہ ڈالی۔ ان میں کچی اور پکی قبروں کے فرق کے علاوہ جو بات غیر معمولی لگی تھی وہ جگہ جگہ نظر آنے والے اونچے نیچے حجروں اور چار دیواری والے مکانوں کی موجودگی تھی۔ اس وقت میں دیکھ سکتا تھا کہ کئی جگہ گنبد بھی ہیں جن پر مختلف وضع اور سائز کے جھنڈے لگا دیے گئے ہیں۔ جھنڈے مجھے درختوں میں بھی نظر آ رہے تھے جو قبرستان میں بہت کم تھے۔ کچھ کو لوگوں نے پیر بنا دیا تھا، کچھ خود ساختہ پیر تھے۔ آدمی کی ضعیف الاعتقادی کے نشان۔ خدا کے علاوہ بھی کسی سے سہارا پانے کی آرزو کے مظہر اور کوشش کیے بنا محض منت مان کے خواہشات کی تکمیل چاہنے والوں کی بے چارگی کا ثبوت۔ اللہ نے تو کہا ہے کہ جس نے کوشش کی تو بلاشک اسے ملا۔

سفید جالی دار گنبد میرے ذہن میں تھا۔ میرے قدم مسمار یا ہموار ہو جانے والی قبروں کو بچاتے آگے بڑھنے لگے۔ گنبد بہت نمایاں تھا لیکن ایک درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے باعث میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ صبح کاذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں مزار کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایک موڑ کاٹتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا جس کی خاطر گلابو نے پہلی گولی چلائی تھی۔ انسانیت کا وہ نوحہ جو انسان کی دنیا سے الگ مردوں سے بدتر حالت میں فرشِ خاک پر پڑا تھا۔ میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا۔ شرم، کراہت اور نفرت کے جذبات نے مجھے منہ پھیر کر گزر جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پہلے کبھی اپنے انسان ہونے پر ندامت محسوس نہیں کی تھی لیکن اس وقت ایک لمحے کے لیے مجھے شرم آئی کہ اشرف المخلوقات کیا اسی عورت کا نام ہے جسے میں نے دیکھا تھا اور میرے جیسے انسانوں نے ننگِ انسانیت بنا دیا تھا۔

میں قبرستان کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ صبح ہونے میں ابھی دیر تھی اور میں بہت تھک گیا تھا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میرا سفر اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ختم ہوا تو یوں ہوگا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مجھے شناخت کر لے اور دھوکے سے پولیس کے حوالے کر دے یا خود پولیس مجھے گرفتار کر لے لیکن رات گزارنے کے لیے ایک در پر صدا دینا مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ منجانب اللہ تھا۔ میں نہ آتا تب بھی وہ ضرور ہوتا جو نوشتۂ تقدیر تھا۔ آج کی رات کا سورج طلوع ہونے سے پہلے گلابو کو، اس کے ماں باپ کو اور نہ جانے کس کس کو موت کی سرحد عبور کر جانے والے قافلے میں شامل ہونا تھا لیکن کتنا اچھا ہوتا اگر میں ادھر کا رخ نہ کرتا اور یہ سب نہ دیکھتا۔ خدا کی ہر سمت پھیلی ہوئی زمین پر ہر لمحہ ایسے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ جو آدمی کو درندہ بن کے انسانیت کی لاش نوچتے نہیں دیکھتے۔ اب آئندہ جب بھی میں ادھر سے گزروں گا تو مجھے اس شب کے واقعات کی یاد کا عذاب نئے سرے سے برداشت کرنا ہوگا اور ان مناظر کو فراموش کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا جو میرے تصور میں تصویر بن کے زندہ رہیں گے۔

گولی چلنے کی ایک آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری اور پھر تیسری آواز رات کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئی۔ میں سانس روک کے گوش بر آواز نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ افق پر صبح صادق کی روشنی پھوٹی۔ آسمان کا آخری کنارا دہکنے لگا اور سورج کا خونی گولہ طلوع ہوا۔ نادیدہ مناظر کا تصور کرنے کی ساری کوشش بے مصرف ثابت ہوئی۔ پہلی گولی کی صدا کا کوئی منظر سامنے نہ آیا کیسے اس لڑکی نے دشمن کے قلعے میں داخل ہو کے کہا ہوگا کہ سنو، میں یتیم اور لاوارث گلابو ہوں۔ میں اتنی خوبصورت تھی کہ تمھارے ہوس پرست بیٹے نے میرے جسم کی خاطر دو جسموں کی دیوار گرا دی۔ وہ دونوں جسم میرے والدین کے تھے جنھوں نے مجھے بڑے ارمانوں سے اور بڑی محبت سے پالا اور بڑا کیا تھا اس لیے نہیں کہ وہ تمھارے بیٹے کی ہوس پر قربان ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا گھر بسے اور میں اس گھر میں سکھی رہوں، آباد رہوں۔ ان کو نواسے اور نواسیاں دوں لیکن ان کے مقدر کی خوشی اور ان کے خواب تمھارے بیٹے نے قتل کر دیے۔ تم نے ایسے شیطان کو جنم دینے کا گناہ کیا تھا اس لیے میں تمھیں سزائے موت دیتی ہوں۔ کل دیکھنے والے دیکھیں گے کہ میرے والدین اور تمھارے فرعون صفت شیطان بیٹے کے ماں باپ ایک ہی زمین میں دفن ہوئے اور ان کے جنازے ایک ساتھ اٹھے اور وہ کتنے حیران ہوں گے کہ فرشتۂ اجل گلابو جیسی لڑکی بن کے بھی آتا ہے۔

پھر تیسری گولی تھی جو ایک تصویر پیش کرتی تھی تمام قاتلوں کا قاتل اپنی طاقت اور برتری کے غرور میں سرشار، خود کو سب کا ان داتا، سب کی جان و آبرو کا مالک اور ایک ناقابلِ تسخیر قوت سمجھنے والا ابھی اپنے لہو میں غرق، محض ایک بے جان لاشہ، ایک عام ڈی کمپوز ہو جانے والا جسم بنا پڑا تھا۔ اس کا نامۂ اعمال یومِ حشر تک کے لیے لپیٹ دیا گیا تھا کہ دنیاوی سزا ختم ہوئی لیکن آخرت کا عذاب باقی ہے۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے دو نمک خوار تو ایک جنگ کی دیوانگی کے سبب مارے گئے لیکن وہ عظیم سپاہ کہاں گئی جو پہلی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ارسال کی گئی تھی۔ خنجر، لوکا یا کلہاڑی کا تصور تو کیا جا سکتا تھا مگر گلابو کو یہ ریوالور کس نے تھما دیا، اسی فقیر نے؟ مگر فقیر بھی ریوالور تو نہیں لیے پھرتے، وہ ڈاکو ہوتے ہیں اور ڈاکو بھیس بدل کے کہیں پناہ لینے نہیں آتے اور کوئی ڈاکا ڈالے بغیر لوٹ کر نہیں جاتے۔ اپنا ریوالور کسی گلابو کے سپرد نہیں کرتے۔ شاید اس نے زندگی کی بھیک مانگی ہوگی، موت کو اپنے قریب دیکھ کر سارے گناہوں سے توبہ کی ہوگی۔ آئندہ کے لیے برائی سے تائب ہونے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اپنے ہاتھ جوڑے ہوں گے، خدا رسولؐ کا واسطہ دیا ہوگا اور جب گلابو کے ٹریگر دباتے ہی گولی اس کے دل میں اتر گئی ہوگی یا اس کے سر کو پاش پاش کر چکی ہوگی تب بھی اس کی حیرت کم نہیں ہوئی ہوگی۔ ریوالور دینے والے نے گلابو کو ریوالور چلانا بھی سکھا دیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھے گولی مار چکی ہے ممکن ہے اسے حیران یا پشیمان ہونے کی مہلت ہی نہ ملی ہو۔

لیکن ریوالور میں ابھی ایک گولی باقی تھی۔ وہ آخری گولی جو گلابو کی باعزت موت کی ضامن تھی، وہ ابھی تک ریوالور سے کیوں نہیں نکلی۔ گلابو بے غیرت نہیں تھی۔ بے غیرت ہوتی تو خود کو بیچ دیتی۔ وہ زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ گلابو بہت پہلے مر چکی تھی۔ وہ لڑکی جو ریوالور لے کر تین افراد کو قتل کرنے گئی تھی، گلابو کے پیکر میں موت تھی۔ وہ بزدل بھی نہیں تھی کہ آخری گولی خود پر چلاتے وقت اس کا حوصلہ جواب دے گیا ہو لیکن رات کا ماتمی سناٹا برقرار تھا اور چوتھی گولی کا منتظر تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت ٹھہر گیا ہے، سورج رک گیا ہے۔ آشیانوں سے صبح دم پرواز کر جانے والے پرند بھی آنکھیں کھولے اس صدا کے انتظار میں دبکے پڑے ہیں۔

پھر وہ چوتھی گولی چلنے کی آواز نسیمِ سحر کے ساتھ تیرتی ہوئی مسکراتی ہوئی آئی۔ "آ جاؤ، اب تم سب آ کے دیکھ لو کہ میں وہی گلابو ہوں۔ ابھی اتنی ہی خوبصورت اور دلکش جتنی زندگی میں تھی لیکن یاد رکھو تو صرف مجھے یاد رکھنا، جیسی میں تھی یا ہوں۔ اب سے چند دن یا چند ماہ یا چند سال بعد میرا وجود زمین کے نیچے پہچانا بھی نہ جائے گا۔ کون مانے گا کہ اس ہڈیوں کے پنجر کے لیے زمین پر کتنا خون بہا تھا۔" میں اچانک ہوش میں آ گیا۔ دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا کہ چلو میاں مسافر، ایک شب کا قیام تھا سو وہ شب بیت گئی۔ اب اپنی زندگی ہے اور اسی زندگی کے مرحلے ہیں۔ یہاں تو نہ اب کوئی ظالم ہے نہ مظلوم۔ نہ مدعی نہ مدعا علیہ،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کون کس کا قاتل ہے اور کس نے کس کو کیوں قتل کیا اس بحث میں پڑ کے کیا ملے گا۔ اس رات کو اپنی زندگی سے خارج کر دو۔

میں سڑک کی طرف روانہ ہوا تو میرے ذہن کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میں بیک وقت دکھ کے گھاؤ کی اذیت گلابو کی زندگی کے المیے اور آدمی کے آغاز و انجام کی جدوجہد کے لیے عبرت آموز انجام پر دل گرفتہ تھا اور بے حد قنوطی ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں پھر اپنے مسائل کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور تھا۔ میری اپنی زندگی خطرات کے جال میں الجھی ہوئی تھی لیکن میں گلابو نہیں تھا کہ اپنے سارے مسائل کو ایک گولی سے حل کرتا۔ مجھے دمِ آخر تک جدوجہد کو جاری رکھنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ اپنے لیے بھی اور رابعہ کے لیے بھی۔ مجھے سکون اور عقل سے کام لینا تھا اور خیالات کے انتشار سے بچنا تھا۔

میرے قدم ایک میکانکی انداز میں اٹھ رہے تھے اور میں کچے راستوں پر مڑتا، کھیتوں کی منڈیر پر توازن رکھتا، گڑھوں سے اور راہ کی رکاوٹوں سے بچتا سڑک کی جانب بڑھ رہا تھا جو تقریباً دو فرلانگ دور تھی مجھے دن کے اجالے میں ملتان اور لاہور کی ٹریفک نظر آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میری کار لے کر ملتان جانے والا ڈرائیور ملے گا بھی یا نہیں۔ وہ بہت پریشان ہوا تو صبح کا اجالا پھیلتے ہی چل پڑے گا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے وہ لاہور کی جانب چل چکا ہو۔ اگر وہ تھک کر دیر سے سویا تو دیر سے اٹھے گا اس صورت میں مجھے کافی دیر سڑک کے کنارے رک کر ہر آتی جاتی کار کو دیکھنا پڑے گا۔ اتنی دیر تک ایک مصروف شاہراہ پر آنے جانے والوں کی نظروں کے سامنے رہنا بھی پر خطر تھا۔ کوئی بھی شخص جس کی نظر تیز ہو مجھے بدلے ہوئے حلیے میں بھی پہچان لے گا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے اپنے چاروں طرف اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان کی دشمن آنکھیں بھڑکتی ہوئی تھیں۔ کم سے کم چار افراد دھوپ میں چمکتی دھار والی کلہاڑیاں لیے میرے چاروں طرف موجود تھے۔ درختوں کے پیچھے یا کھیتوں میں کتنے آدمی اور تھے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ عمداً صرف چار افراد سامنے آئے ہیں تاکہ میں ان سے نبرد آزما ہو جاؤں تو چھپے ہوئے مددگاروں میں سے کوئی مجھ پر پیچھے سے بے خبری میں حملہ کر دے۔

"کون ہے تو؟" ان میں سے ایک نے اجڈ اور درشت لہجے میں کہا۔

میں نے فوراً ایک درخت کے تنے سے پشت لگا لی "تم کو کیا میں آدمی نظر نہیں آتا؟" میں نے کہا۔

"لیکن تو اس گاؤں کا نہیں ہے۔" دوسرے نے غرّا کر کہا۔

"ہاں، میں اس گاؤں کا نہیں ہوں۔" میں نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "مسافر ہوں۔"

"مسافر اس راستے سے نہیں گزرتے۔" تیسرے نے کہا۔ "تو تین میل پیچھے ہے۔ تو کیا ندی سے گزر کے آیا ہے۔ تیرے تو پاؤں بھی خشک ہیں۔"

"اس سے پوچھو کس گاؤں سے تعلق ہے اس کا؟" چوتھے نے پہلے سے کہا۔ "اور اسے جانا کدھر ہے؟"

اگر یہ سوال کیا جاتا تو میں لاجواب ہو جاتا۔ مجھے تو صرف معلوم تھا کہ میں لاہور کے نواح سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے سوال کے جواب میں سوال کر کے جان بچائی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟" میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرا راستہ کیوں روکا ہے؟ کیا ادھر سے گزرنا منع ہے۔ کچھ چرا کے لے جا رہا ہوں میں؟"

"ہاں" پہلے نے بدمعاشوں جیسے خطرناک لہجے میں کہا۔ "یہ کپڑے کس کے ہیں؟"

"میرے تن پر تم میں سے کسی کے کپڑے نہیں ہیں" میں نے کہا "جیسے تم سب نے اپنے اپنے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"جھوٹ بکتا ہے تو، میرے بھائی کے کپڑے ہیں یہ" وہ دہاڑ کر بولا "یہ لاچا بھی، کرتا بھی اور تیری یہ پگڑی بھی۔ سب چیزیں میرے بھائی کی ہے۔"

صورتِ حال یکلخت خطرناک ہو گئی تھی "کیا ان پر تمہارے بھائی کا نام لکھا ہوا ہے؟" میں نے بھی سخت لہجہ اختیار کیا۔ "کیا اس نے یہ کپڑا پر بنوایا تھا؟ ایسا کپڑا بازار میں نہیں ملتا؟ کوئی نہیں خرید سکتا؟"

دوسرے نے ایک دم کلہاڑی اٹھالی "سیدھی طرح بتاؤ ورنہ۔۔۔!"

"ورنہ کیا، تم ان کپڑوں کی خاطر مجھے قتل کر دو گے؟" میں بے خوف رہنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں، میں قتل کر دوں گا تجھے" پہلا شخص چلایا "اس لیے کہ کسی نے ابھی کپڑوں کے لیے میرے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔"

اس اطلاع سے مجھے افسوس ہوا کہ جو شخص بے ہوش تھا وہ بھی مر چکا ہے میں نے زور سے اناللہ پڑھا۔

"ایسے دو کپڑوں کی خاطر؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "یہاں ایسا بھی ہوتا ہے؟ تم لوگ کر سکتے ہو ایسا؟"

"ہم نہیں کر سکتے مگر تو نے سوانگ بھرنے کے لیے کیا" وہ بولا "جب تو کل رات آیا تھا۔ تو ملنگ کے حلیے میں تھا۔ تیرے گلے میں موٹے رنگین منکوں کی مالا تھی اور تو نے کالا چولا پہن رکھا تھا۔ وہ تو نے لاش کے اوپر ڈال دیا۔" اس نے پھر کلہاڑی اٹھائی "ہم تجھے تلاش کر رہے تھے۔"

"ٹھہرو، پہلے میری بات سن لو" میں نے کہا "پھر تم چاہو تو مجھے مار دینا۔ تمہارے پاس کلہاڑیاں ہیں اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوں نہ آس پاس کے کسی گاؤں کا۔ میں لاہور میں رہتا ہوں اور پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ تم کس ملنگ کی بات کر رہے ہو۔ میری تو گاڑی خراب ہوئی تھی۔ گاڑی کا مطلب بیل گاڑی نہیں، کار ہے۔ میرا ڈرائیور کار کو مرمت کے لیے لے گیا ہے اور واپس آتا ہی ہو گا۔ تم میرے ساتھ سڑک تک چلو اور اس کی واپسی تک ٹھہرو تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ۔ صرف وقت گزارنے کے لیے ذرا کھیتوں میں سیر کرنے آ گیا تھا۔"

"پھر تو نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ تو مسافر ہے؟" چوتھا ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ میری بات نے انھیں نفسیاتی طور پر متاثر کیا تھا۔ ان کے خطرناک جارحانہ تیور تو بدل گئے تھے لیکن ابھی تک انھوں نے میری بات کا پوری طرح یقین نہیں کیا تھا۔ باقی تین بھی مجھے غور سے دیکھ کر طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا کاروں والے ایسے ہوتے ہیں؟

"جھوٹ کیا تھا اس میں؟" میں نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا۔ "میں لاہور سے ملتان جا رہا تھا۔ مسافر نہیں ہوں تو اور کیا ہوں۔ میں تو ثبوت بھی دے رہا ہوں۔"

"کتنا پڑھا ہوا ہے تو" دوسرے نے کچھ سوچ کے کہا "تیرا حلیہ تو پڑھے لکھے بابوؤں جیسا نہیں ہے۔"

"کیسی عجیب باتیں کر رہے ہو تم لوگ" میں نے برہمی سے کہا کیونکہ ان لوگوں کی قوتِ فیصلہ کو میرے اعتماد نے متزلزل کر دیا تھا "اگر تم لوگ شہری بابو کی طرح کوٹ پتلون پہن لو گے تو کیا پڑھ لکھ جاؤ گے۔ تم میں سے کون زیادہ پڑھا ہوا ہے جو مجھ سے انگریزی میں بات کر سکے؟"

جواب کے لیے انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مقتول کے بڑے بھائی نے کہا "ہم تو نہیں لیکن گاؤں میں پڑھے لکھے بہت ہیں۔ اسکول ماسٹر ہے۔ ڈاک بابو ہے۔"

"تو اگر لاہور جا رہا تھا تو کسی واقف کار کے پاس جا رہا ہو گا۔ وہ کون ہے؟" دوسرے نے کہا "ہم نے تو تیرا نام بھی نہیں پوچھا۔ تو ہمارے ساتھ چل۔ تھانے والے خود جھوٹ سچ کا پتا چلا لیں گے۔"

"تھانے؟" میں نے چونک کر کہا "کیا جرم کیا ہے میں نے کہ تم زبردستی مجھے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟ وہ جو میرا ڈرائیور ہے۔۔۔!"

"بھاڑ میں گیا تیرا ڈرائیور" تیسرا دہاڑ کر بولا "تیری کار کے رعب میں آ کے ہم تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ یہ قتل کا معاملہ ہے اور گاؤں میں رات کو کم سے کم نو قتل ہوئے ہیں۔"

"نو قتل؟" میں اچھل پڑا "تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک آدمی اتنے قتل کیسے کر سکتا ہے؟"

"یہ تو ہم نہیں جانتے کہ سب قتل ایک ہی آدمی نے کیے ہیں یا نہیں۔ لیکن تجھے تھانے چل کے سب معلوم ہو جائے گا۔"

"کیا تم اسی طرح ہر اجنبی کو پکڑ پکڑ کے تھانے لے جاتے رہو گے؟" میں نے احتجاج کیا۔

"ہر شخص نے میرے بھائی کے کپڑے نہیں پہن رکھے ہیں" پہلا ایک دم کلہاڑی اٹھا کے حملہ آور ہوا۔ میں فوراً درخت کے پیچھے ہو گیا۔ سیکنڈ کے سوویں حصے کے فرق سے کلہاڑی کا تیز پھل درخت کے تنے میں اتر گیا۔

"اچھا اچھا" میں نے کہا "تم لوگ کہتے ہو تو میں چلتا ہوں مگر تمہارا بھائی قتل ہو گیا ہے تو مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم کسی بھی بے گناہ کا خون کر دو۔" میرا مقصد انھیں فوری طور پر انتہائی اقدام سے باز رکھنا تھا۔ وہ چاروں بیک وقت حملہ کرتے تو کسی ایک کی کلہاڑی یقیناً میرے دو حصے کر دیتی۔ لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ تھانے جاتے ہوئے مجھے کوئی موقع مل جائے۔ وہ ذرا بھی غافل ہوں تو میں ان کو لمبا لٹ کے نکل جاؤں۔ میرے تھانے پہنچ کر لوٹنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا راستے میں ہی کرنا تھا۔ اپنے اطمینان سے میں ان کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں خوفزدہ بالکل نہیں ہوں اور مقابلہ کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

معلوم نہیں اس وقت کس نے کیا اشارہ کیا کہ چار آدمی میرے پیچھے سے نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی اور وہ سب صحت مند جوان آدمی تھے لیکن میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں ان کو الٹ دیتا۔ اصل خطرہ چار مسلح افراد سے تھا جو اپنی کلہاڑیاں لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ میرا چیخنا چلانا اور میری یقین دہانی سب رائیگاں گئی۔ وہ جلوس کی صورت میں مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ گرفتار کرنے والوں میں سے دو مقتول کے بھائی ہیں اور محافظوں میں ایک بھائی کے ساتھ باقی اس کے کزن ہیں۔ چاچے اور ماموں کے لڑکے۔ کلہاڑی والوں میں سے تین پیچھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہے اور ایک آگے چلتا رہا۔

اگر وہ مجھے گاؤں لے جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ مجھے گلابو کی لاش بھی دیکھنی پڑتی اور شاید ان کی لاشیں بھی جن کو گلابو نے میرے دیے ہوئے ریوالور سے قتل کر دیا تھا۔ یہ نظارہ میرے لیے انتہائی باعثِ اذیت ہوتا لیکن اس میں خطرے کی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ سب مر چکے تھے جنھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میرا چہرہ پہچاننے والا کوئی نہ ہوتا لیکن تھانے کی صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ اگر میرا حلیہ اور تصویر انھیں بھی ارسال کی گئی ہوگی تو وہ مجھے فوراً شناخت کر لیں گے۔ میرا یہ نیا حلیہ بھی مجھے بچا نہ سکے گا اور ان گاؤں کے تھانے والوں کا کیا بھروسہ۔ وہ مجھ پر لوکا دسہی دو چار کے قتل کا الزام تھوپ دیں اور تفتیش کا آغاز کر دیں۔

"میرے ساتھ یہ سلوک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں بھاگ تو نہیں رہا ہوں۔"

"ہم تجھے بھاگنے بھی نہ دیں گے۔" ایک بولا۔

"کوشش کی تو ٹکڑے کر کے اسی جگہ گاڑ جائیں گے۔" دوسرے نے کہا۔

پھر ایک فرلانگ تک ہم اسی طرح چلتے گئے۔ کسی نے کوئی بات نہیں کی لیکن مجھے خطرہ مول لیے بغیر رہائی پانے کی صورت نظر نہ آئی۔ مجھے گرفتار کر کے لے جانے والے پوری طرح مستعد رہے اور یوں آگے پیچھے ہوتے رہے کہ میں دو یا چار کو لٹا بھی دیتا تب بھی باقی چار ایک ساتھ مجھ کو دبوچ لیتے۔ لاچا پھر میری راہ کی سب سے بڑی دیوار بن گیا تھا۔ لاچے ان سب نے بھی باندھ رکھے تھے لیکن وہ اس لباس کے عادی تھے۔ میں نے پتلون پہن رکھی ہوتی تو خود کو چھڑانے کے بعد ایسی ریس لگاتا کہ وہ منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ان کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ ریوالور نہیں تھے جس کی گولی آدمی کو توقع سے پہلے آ لیتی ہے۔ لیکن لاچے کے ساتھ نہ میں زیادہ تیز بھاگ سکتا تھا اور نہ زیادہ دور جا سکتا تھا۔ "لاچا ریس" میں جیت ان کی ہوتی اور اس کا اختتام بہت دردناک ہوتا۔ چار کلہاڑیوں سے میرے آٹھ ٹکڑے تو ضرور کر دیے جاتے۔ چنانچہ میں چلتا رہا۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے مضبوطی سے بازوؤں کے شکنجے میں گرفتار رکھنے والے کچھ تھک سے گئے ہیں اور ان کی گرفت میں پہلے جیسی سختی نہیں رہی۔ یہ ایک امید افزا بات تھی لیکن میری سب امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب کسی خبیث محافظ نے تجویز پیش کی کہ اسے باندھ دیا جائے۔ تجویز کو اکثریت کی حمایت حاصل ہوئی اور کسی نے نہایت بدتمیزی سے ہاتھ مار کے میری پگڑی اتاری۔ میں نے بہت شور مچایا لیکن وہ مجھے کسی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہ تھے۔ وہ سب ایک مقتول کے بھائی اور کزن تھے۔ معاملہ گاؤں یا ذات برادری کا ہوتا تو انتقام کی جنگ چلتی رہتی اور دونوں طرف کے لوگ مرتے رہتے لیکن میں باہر کا آدمی تھا اور میرے بارے میں بھی ان کو شک تھا۔ یقین تھا۔ شک کا پلڑا ذرا بھاری تھا چنانچہ وہ قانونی کارروائی کر رہے تھے۔ ان کو اس قانونی کارروائی تک محدود رکھنے میں خوف کے عنصر کا دخل بھی تھا کہ ایک کار والے کو قتل کر کے وہ خود نہ پھنس جائیں۔

جب میرے ہاتھ پیچھے کر کے مضبوطی سے باندھ دیے گئے تو اپنے عبرتناک انجام کا نقشہ میری نظر میں پھر گیا۔ اب خدا کے سوا میری مدد کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ رابعہ کی محبت۔ نہ نرمی کا خلوص۔ نہ رضوی صاحب کا اثر و رسوخ اور نہ قانون۔ تھانے والے تو اپنے اس کارنامے پر پھولے نہیں سمائیں گے کہ انھوں نے ایک خطرناک مفرور اشتہاری مجرم کو پکڑ لیا۔ حالانکہ مجھے پکڑنے میں ان کی کوشش کو ذرا بھی دخل نہ تھا لیکن اس کا سارا کریڈٹ وہ خود لے لیں گے۔ مقتول کے ورثا کو مایوسی ہوگی کہ انھوں نے ایک قاتل کو پکڑا تھا لیکن وہ ان کے بھائی کا قاتل نہیں تھا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے گاؤں کی طرف نہیں لے جایا جا رہا ہے۔

"تھانہ کیا گاؤں میں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں اس گاؤں کا تھانہ چار میل اُدھر ہے۔" اس نے بادلِ ناخواستہ ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"یہ جگہ کون سی ہے؟" میں نے اس بستی کی طرف اشارہ کیا جہاں آج نوجوان اٹھے تھے۔

"قلعہ ستار شاہ۔" ان میں سے کسی نے کہا۔ "اتنا بھولا ہے۔"

"اور تھانہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ تھکن، بھوک اور ہاتھ بندھے رہنے سے میرا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہم تجھے 'جیجو کی ملیاں' کے تھانے لے جائیں گے۔" آگے چلنے والا پلٹ کر بولا۔ "اب بک بک نہ کر۔"

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ اور ہوئے بھی کہاں کس جرم کی پاداش میں۔ اپنی طرف سے میں نے ایک گھر کی عزت بچائی تھی۔ مارنے والے اور مرنے والے سب اجنبی تھے اور میں کسی کا دشمن نہیں تھا۔ میرے ہاتھوں اگر کوئی مارا گیا تھا تو وہ شخص جو پہلے بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن اس کو بھی قتل نہ کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنے دفاع کا حق استعمال کیا تھا اور خود کو بچایا تھا۔ اگر حملہ آور نہ مارا جاتا تو میں مارا جاتا۔ مجبوراً

طور پر صورتِ حال یہ تھی کہ ایک حملہ آور اپنے ہی ساتھی کے تیر کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا۔ قاتل اور مقتول اپنے اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک کو گلابو کے باپ نے لوٹے کے سے دو ٹکڑے کر دیا تھا اور خود دوسرے کے ہاتھوں کلہاڑی کے وار سے مارا گیا تھا۔ یہ مقدمہ بھی فیصل۔ باقی پانچ قتل گلابو نے کیے تھے اور پھر خودکشی کر لی تھی۔ اب کس کے خون کا دعویٰ کس پر رہا۔ نظامِ انصاف کے طویل مرحلوں اور پُر پیچ عمل سے گزرنے کے بجائے سب نے اپنا اپنا فیصلہ دمیں کر لیا تھا۔ پانچ قتل کرنے پر گلابو کو زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہوتی۔ یہ سزا خود کو دے کر اس نے پولیس کا کام بہت ہلکا کر دیا تھا۔

اگر یہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے تو ان کو یقیناً علم ہوگا کہ ایک رات میں یہ نو آدمی کس کے لیے اور کس کے اشارے پر اور کیوں مارے گئے۔ ایک مقتول کے چار بھائی اور چار کزن اتنا تو جانتے ہوں گے کہ ان کا مقتول بھائی کس قماش کا آدمی تھا اور کس کے اشاروں کا غلام تھا۔ گاؤں میں کون سی بات چھپی رہتی ہے۔ وہ یقیناً جانتے ہوں گے کہ گلابو کے گھر والوں پر یہ قیامت کیوں ٹوٹی۔ گلابو نے دوسرں کی اور اپنی جان لی تو کیوں لی۔ وہ پاگل تو نہیں تھی۔

"کیا سب مرنے والے تمھارے... عزیز اور دوست تھے...؟" میں نے کہا۔

"ہمارا تو ایک ہی بھائی تھا۔" کسی نے جواب دیا۔ "جس کے کپڑے تو نے چڑھا رکھے ہیں۔"

"جھوٹ سچ کا تو پتا چل ہی جائے گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن مجھے اتنا تو بتاؤ کہ باقی آٹھ مرنے والے کون تھے۔ ایک ہی گھر کے لوگ تھے یا الگ الگ۔"

"بتا دوں بھائیا جی؟" ان میں سب سے کم عمر نظر آنے والے نے کہا۔

آگے چلنے والے نے پلٹ کر مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا اور تند لہجے میں کہا۔ "بتا دے اگر تیرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔" باقی سب نے بھی اسے گھور کر دیکھا۔

"سارا فساد ایک لڑکی کا تھا۔" سب سے چھوٹے بھائی نے کہنا شروع کیا۔ "ایک بہت طاقتور اور بارسوخ آدمی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ پڑھ لکھ گئی تھی۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔"

"واقعی پڑھنے لکھنے سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ میری حالت اس کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیر۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا اس شخص نے لڑکی کے انکار سے مشتعل ہو کے اسے قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ الٹا یہ ہوا کہ لڑکی نے پہلے تو اس کے ماں باپ کو مارا۔" وہ بولا۔ "پھر وہ سامنے آ گیا تو اسے ڈھیر کر دیا۔ اور پھر خود کو گولی مار کے کنویں میں کود گئی۔"

چوتھی گولی چلنے کی آواز دیر میں کیوں آئی تھی۔ اس کا سبب معلوم ہو گیا۔

"بڑی خونخوار لڑکی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ گولی مارنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ گاؤں کیا شہر میں بھی ایک پستول حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر لڑکی ذات۔ اسے ریوالور چلانا کس نے سکھایا تھا۔ اس کا کوئی بھائی یا باپ فوج میں تھے؟"

"نہیں۔ یہی بات تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں ریوالور صرف نمبردار کے پاس ہے اور اس کا لائسنس ہے۔ اس نے پولیس کو دکھا دیا۔"

"پھر وہ لڑکی ریوالور کہاں سے لے آئی؟" میں نے سخت حیرانی کا اظہار کیا اور جواب میں اس نے مجھے مفروضے کی بنیاد پر ایک کہانی سنائی کہ غالباً وہ ملنگ نہیں تھا کوئی مفرور قیدی یا ڈاکو تھا جس نے دشمنی میں گلابو کی مدد کی۔ وہ خود قتل کرنے آیا تھا لیکن اسے موقع مل گیا کہ وہ گلابو کے ہاتھوں سب کو قتل کرا سکے۔ ویسے یہ بات ابھی پولیس والوں نے نہیں مانی۔ وہ گھر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

"یہ نہیں بکتا کمینے کہ تیرے اپنے بھائی کو بھی اسی گلابو نے مارا یا اس نے جو ملنگ کے حلیے میں تھا۔" بڑے بھائی نے برہمی سے کہا۔ "کون تھا اس کا دشمن۔ کسی کا کیا بگاڑا تھا اس نے؟" وہ اچانک رونے لگا۔

"اب کیوں روتے ہو بھائیا جی۔" چھوٹے نے ہمت کر کے کہا۔ "جب ابا کہتا تھا کہ بُرے کام کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور جن کو وہ دوست کہتا ہے وہی اس کے دشمن ہیں..."

بڑے بھائی نے اس کے ایک طمانچہ مارا۔ اس نے گال پر ہاتھ رکھا اور چپ ہو گیا۔

تھانے میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اپنی جدوجہد رائگاں جانے کا صدمہ بھی تھا اور گلابو کی موت کا بھی۔ صبح کا سورج بہت اوپر آ گیا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ شاید دس بجنے والے ہوں گے۔ تھانے میں صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور کچھ پوچھے بغیر میرے منہ پر تھپڑ اور سر پر مکے مارے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ مجھے کھول دیا جائے۔ مجھے لانے والوں نے بیک وقت بولنا شروع کیا تو اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے ایک کے سوا سب کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فرض کر لیا تھا کہ میں چور یا ڈاکو ہوں ورنہ مجھے اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ نہ لایا جاتا۔

”ہے تو اس علاقے میں نیا۔“ اس نے میرے ایک ملازم رسید کی ”یہ کہاں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟“

”ڈاکا ڈالنے نہیں آیا تھا جناب آلی۔“ سب سے بڑے نے کہا۔ ”اس نے ہمارے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ جو کپڑے اس نے پہن رکھے ہیں وہ میرے بھائی کے ہیں۔ ہم قلعہ ستار شاہ سے آئے ہیں۔“

ہیڈ کانسٹیبل کو سخت مایوسی ہوئی۔ ”تمہارا بھائی بھی انہی میں شامل تھا۔ وہ جو نوبندے مارے گئے ہیں؟“

”ہاں جناب۔“ وہ بولا۔ ”یہ کھیتوں میں سے بھاگ رہا تھا کہ ہم نے دیکھ لیا۔“

”او میاں دیکھ لیا تھا تو ادھر کیوں تکلیف کی؟“ ہیڈ کانسٹیبل نے درشت لہجے میں کہا۔ ”ادھر ہی لے جانا تھا نا۔ شیخوپورہ سے ڈی ایس پی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ یہاں سے تھانیدار صاحب بھی گئے ہیں۔ سب تفتیش تو وہاں ہو رہی ہے۔ وہ شام سے پہلے تو یہاں آئیں گے نہیں۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا... ہم تو رات سے اس ملنگ کو ڈھونڈ رہے تھے؟“ اس نے ایک بار پھر کسی ریوالور والے ملنگ کی کہانی کا خلاصہ پیش کیا اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ ملنگ میں ہی تھا۔ لیکن اس تمام عرصے میں جو بات میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا باعث بنی تھی، وہ کانسٹیبل کی بے خبری تھی۔ اس نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا۔ تاہم اس نے شکایت کنندہ کی بات سننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

”اچھا۔ اب تم لوگ جاؤ۔“ اس نے پوری بات سن کے کہا۔ ”شام کو پھر آ جانا۔ یا میں بتا دوں گا ڈی ایس پی صاحب کو۔ وہ ضروری سمجھیں گے تو تمہیں بیان دینے کے لیے بلوا لیں گے۔ میں ملزم کو حوالات میں بند کر دیتا ہوں۔ اب یہ کیس بہت اوپر چلا گیا ہے۔ میں تو تفتیش بھی نہیں کر سکتا۔“

مجھے گرفتار کر کے لانے والے بے نیل و مرام واپس ہوئے۔ شاید ان کو افسوس ہو گا کہ اتنی محنت کر کے مجھے یہاں لانے کے بجائے وہ کلہاڑیوں سے میرا قیمہ کر کے گاڑ دیتے تو ان کے دل کو کچھ اطمینان تو حاصل ہوتا۔ یہاں تو واحد حاضر افسرِ اعلیٰ نے مجھ سے میرا نام تک اور ولدیت کچھ نہیں پوچھا تھا انکار یا اقرار کرانے کے لیے کوئی سوال تک نہیں کیا تھا۔ وہ چار تھپڑ مار کے حوالات میں بند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کی تسلی تب ہوتی جب ہیڈ کانسٹیبل مجھے مرغا بنا کے سترہ نمبر کے جوتے سے تفتیش شروع کرتا اور مجھ سے قتل کے جرم کا اعتراف کرائے بنا زندہ نہ چھوڑتا۔ یہ سب تائید ایزدی تھی کہ میری جان بچ گئی۔

”ہیڈ کانسٹیبل!“ میں نے اس قاتل ہجوم کے جانے کے بعد سکون کا سانس لے کر اطمینان سے کہا۔ ”یہ تو بالکل جاہل لوگ ہیں۔ بلاوجہ مجھے قتل کرنے پر آمادہ تھے۔ آپ نے میری جان بچالی۔“

”آپ کی جان تو بچانی ہی تھی سکندر بخت صاحب۔“ وہ عیاری سے مسکرا کے بولا۔ ”میں تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اب آپ کو گرفتار کر کے پیش کرنے سے مجھے انعام تعریفی سند اور ترقی سب ملیں گے۔“

ہیڈ کانسٹیبل زبردست اداکار اور بہت چالاک آدمی تھا۔ اس معمولی سے تھانے میں اس جیسے جغد صورت شخص سے مجھے اتنی ہوشیاری کی توقع بالکل نہیں تھی۔ میرے اطمینان کا وہ غبارہ جو اب یقینِ کامل کے سہارے امید کے آسمان پر بہت اونچا اڑنے لگا تھا ایک دھماکے سے پھٹ گیا اور میں اوجِ افلاک سے زمین کی پستی پر آ گرا تاہم میں نے اس ذہنی صدمے کے اثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

”تم نے عقل مندی سے کام لیا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر کیا یہ انعام کافی ہے؟“

”اور کیا مل سکتا ہے مجھے؟“ وہ تلخی سے بولا۔ ”گاؤں کے تھانے میں رہ کے۔ یہاں کسی کو پکڑو تو نمبردار کی سفارش اور زمیندار کا زور چلتا ہے۔ کسی کے پاس نقد نہیں ہوتا۔ چار چھ مرغیاں معمولی کیس میں۔ بڑا مسئلہ ہو تو بھینس۔ ورنہ وہی فصل کی گندم۔ دودھ اور سبزی۔ زندگی میں عیش کے لیے کیش چلتا ہے۔“ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور کرسی گھسیٹ لی۔

”تم تو میری توقع سے بہت زیادہ سمجھدار ثابت ہوئے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے بڑی طاقت کیش کی ہے اور کیش تمہیں انعام میں ملا تو کتنا ملے گا۔ سو دو سو۔ حد سے حد پانچ سو۔ باقی یہ تعریفی سند یا وردی میں ایک پٹی کا اضافہ تمہیں کیا دے گا۔ تمہاری ماہانہ آمدنی میں پچاس روپے کا فرق بھی نہیں پڑے گا۔“

”چالیس روپے کا۔“ وہ بولا۔ ”لیکن اگلے مہینے میری بیوی کے بچہ بھی ہونے والا ہے۔“

”گویا آمدنی سے خرچ بڑھ جائے گا۔“ میں نے کہا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کی جسمانی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔

”کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہی ہے۔“ وہ بولا۔

”اور اگر میں نکل جاؤں تو تم کیا کرو گے؟“ میں نے کہا۔ مشکل یہ تھی کہ اب وہ عین دروازے میں بیٹھا ہوا تھا۔

”کیسے بھاگ جاؤ گے؟“ وہ بولا۔ ”دیوار میں سے؟ یا دھواں بن کے اڑ جاؤ گے؟“

”ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ مددگار نہ کوئی تمہارا ہے اور نہ میرا۔“ میں نے کہا۔ ”مقابلہ کرو گے یا سودا؟“

”مقابلہ۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس گاؤں میں ایک شخص خود کو پہلوان، بدمعاش اور بڑا زور آور سمجھتا تھا اور کبڈی کا چیمپئن تھا۔ پنجہ لڑانے میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں تھا۔“

”اور تم نے اس کو ہر مقابلے میں نیچا دکھایا؟“ میں نے حیرت سے منہ کھول کے احمقوں کی طرح کہا۔ ”مگر خیر۔ تم اپنا برا بھلا خود سمجھتے ہو۔ کہاں مقابلہ کرو گے؟“

”ادھر چلو۔“ اس نے عقبی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”پیچھے والا کمرہ خالی ہے۔ صرف تفتیش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی مجرم نہیں۔“

عقبی کمرے میں ایک نورا کشتی کا مقابلہ ہوا۔ کچھ دیر میں نے مار کھائی اور ہیڈ کانسٹیبل کے غرور کا بیرومیٹر اونچا ہونے لگا۔ پھر پلک جھپکتے میں نقشہ بدل گیا۔ میں نے اسے مسلسل سر کے اوپر تک اٹھا اٹھا کے نیچے پٹخا اور اٹھنے سے پہلے ہاتھوں پر گھمایا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑایا اور پلٹتے ہی الٹ دیا۔ دو منٹ بعد اس کی تمام چیمپئن شپ تمام ہو گئی۔

”اب بولو جوان۔“ میں نے کہا۔ ”میں کس راستے سے جاؤں؟ اور یہ تو نمونہ تھا۔ کہو تو دھواں بن کے دکھاؤں یا دیوار میں سے گزر کے۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تم سودا کر لیتے تو اچھا رہتا۔ خیر۔ خدا حافظ۔“ میں نے بیچ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ کراہتا اور گالیاں بکتا اٹھا مگر پھر گر گیا۔

”سودا اب بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے اچانک رک کر کہا۔ ”ہو تم بھی مرد اور مرد اپنی زبان سے سودا کرتے ہیں۔ تم زبان پر قائم رہنے کی بات کرو تو میں کچھ کروں؟“

”اب۔۔۔ اب کیا۔۔۔ چاہتے ہو تم؟“ وہ بالآخر اٹھنے میں کامیاب ہوا۔ ”دفع ہو جاؤ...“

”میں تمہیں اپنی زبان بند رکھنے کا معاوضہ دے سکتا ہوں۔“ میں نے جیب میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ گرفتار کرنے والوں نے مجھے بے قابو کرنے کے بعد جامہ تلاشی ضرور نہیں سمجھی تھی اور تھانے میں تفتیش کا آغاز ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی ورنہ میرا یہ خزانہ کسی رسید کے بغیر بحق سرکار ضبط ہو جاتا۔ وہ خاموش رہا۔

”اگر تم سب کچھ بھول جاؤ۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ کہ نہ کوئی مجھے یہاں لایا۔ نہ تم نے مجھے دیکھا۔ نہ پہچانا اور نہ میں ہنسا۔ نہ کوئی ہار جیت کا مقابلہ ہوا۔ تو اس کی اب بھی قیمت ہے۔ انکار کر کے اپنا اور نقصان کرو گے۔ گورنمنٹ کا انعام تو گیا۔ یہ ہزار رکھ لو۔“ میں نے دس نوٹ الگ کیے۔

”ہزار۔ ہزار تو کم ہے۔“ وہ بمشکل تمام بولا۔ ”اگر تم تین ہزار دے جاؤ تو تمہاری مہربانی۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”مہربانی؟ تم کو تو سودا کرنا بھی نہیں آتا۔ پانچ کیوں نہیں مانگے تم نے؟“

”شاید بے وقوف ہوں میں۔ ڈرتا ہوں۔ اور مجبور بھی ہوں۔ تم ہزار بھی نہ دو تو میں کیا کر لوں گا۔ مجھے یہ پہلا موقع ملا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسا موقع۔ ورنہ بڑا ہاتھ تو افسر مارتے ہیں۔ اپنا حصہ وہی رہتا ہے جو میں نے بتایا تھا۔ اس سے قرض ادا نہیں ہوتا۔ رہن رکھی ہوئی زمین نہیں چھڑائی جا سکتی۔ بیٹی سے رخصت نہیں ہوتی اور گھر نہیں بنتا۔“ وہ بولا۔ اس کے غرور کی جگہ اب شرمندگی مایوسی اور افسردگی نے لے لی تھی۔

”تم کو کیا کرنا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کون سی ضرورت پوری کرنی ہے؟“

”بیٹی کو... وہ دینا ہے جو میں اس تنخواہ میں... اور یہاں رہ کے نہیں دے سکتا۔“ وہ مجھ سے نظر ملائے بغیر بولا۔ ”یہ سال بھی گزر گیا تو وہ منگنی توڑ دیں گے۔ دس تولے سونا مانگتے ہیں وہ۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے تین ہزار الگ کیے اور زمین پر رکھ دیے۔ ”یہ ان کمینوں کے منہ پر مارنا جو سونے سے پرائی بیٹی کو تولتے ہیں۔ اور یہ ہزار میری طرف سے۔ اسے جو چاہو سمجھ لو۔ اپنی زبان کے مطابق معاوضہ۔ یا ایک احسان کی قیمت۔ یا اپنی بیٹی کے لیے میری طرف سے تحفہ۔“ میں نے کہا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ پورے یقین کے ساتھ کہ اب مجھے کسی ضمانت کی ضرورت نہیں۔ پیسہ دے کر نہیں شرافت سے بات کر کے میں نے اس کی زبان بند کر دی ہے۔

میں سڑک پر پہنچا تو دونوں طرف سے گاڑیوں کی آمدورفت پورے زور شور سے جاری تھی۔ بارہ بجنے والے تھے اور اب اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ میری ملاقات ملتان سے لوٹنے والے ڈرائیور سے ہو۔ فوری مسئلہ بھوک مٹانے کا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا اور دو بھٹی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مینوں کے گرد لکڑی کی چار بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت یہ کیفے سر راہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ پروپرائٹر کے علاوہ صرف ایک شخص تھا جو بنچ پر اکڑوں اور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ اچانک کوئی کار یا بس وہاں رک جائے چنانچہ میں نے اس چارپائی کا انتخاب کیا جو فاصلے پر ایک درخت کے نیچے پڑی تھی۔

"دو پیالی چائے لے آؤ اور کھانے کے لیے جتنا ہے وہ سب۔" میں نے کہا۔ بوڑھے نے ہونقوں کی طرح میری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی تو میں نے کہا "میرا مطلب ہے چار پیالی چائے ایک کیتلی میں۔ خوب اُبال کے۔ اور کل شام سے میں بھوکا ہوں۔ اس لیے پیٹ بھرنے کو جو ملے۔" پھر میں چارپائی پر لمبا لیٹ گیا اور گہرے نیلے آسمان کی گہرائی اور وسعت میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ قید سے نجات کے بعد میں بھی اتنا ہی آزاد تھا۔ اس احساس میں بڑی طمانیت تھی۔ اگر تھانے والے تفتیش کے لیے نہ گئے ہوئے ہوتے تو میرا اور اس ہیڈ کانسٹیبل کا نہ مقابلہ ہوتا نہ سودا۔ اس وقت میں زنجیروں میں جکڑا ہوا حوالات میں یا لاہور جانے والی کسی گاڑی میں پڑا ہوتا۔ اور میرا مستقبل وہی ہوتا۔ مسلسل قید۔ نت نئے مقدمات کے بہانے زندگی کی آخری سانس تک جیل میں رکھنے کا انتظام۔ یا پاگل خانے منتقلی۔ یہ آئندہ بھی ہو سکتا تھا کیونکہ میرے دشمن شکاری یہی جانتے تھے۔

چائے کے ساتھ خشک اسفنج ٹائپ کیک پیس کا مرتبان خالی کرنے کے بعد میرے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میری قنوطیت میں کمی آئی اور حوصلہ بڑھ گیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نے گزشتہ روز فرار ہوتے وقت قلعہ ستار شاہ کا رُخ نہ کیا ہوتا۔ میں دس ڈگری دائیں یا بائیں ہو جاتا تو کسی اور گاؤں پہنچتا اور مجھے علم ہی نہ ہوتا کہ آج گلابو نام کی ایک لڑکی کا جنازہ اٹھے گا تو ساتھ آٹھ جنازے اور بھی اٹھیں گے۔ بدبختی کے مقابلے میں بدصورتی یقیناً قابلِ ترجیح ہے لیکن انتخاب آدمی کے ہاتھ میں کہاں ہے۔ انتخاب کا حق ملتا تو گلابو اس خوبصورتی کو یقیناً ٹھکرا دیتی جس کے ساتھ نحوست کے ایسے بھیانک سائے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے وہیں مرنے کے بجائے کنویں میں ڈوب کر مرنا کیوں پسند کیا؟ موت کو یقینی بنانے کے لیے اس نے خود کو گولی پہلے ماری تھی لیکن گولی تو وہ جائے واردات پر چلاتی تب بھی اس کی جان لے لیتی۔ جواب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی لاش اس گھر سے اٹھائی جائے۔ وہاں مارا جانے والا اس کی عزت کا دشمن ہو رہا تھا اور یہ بات سب جانتے تھے۔ اب اس پر یہ الزام نہیں آتا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ بے آبرو ہو چکی تھی۔ پولیس کو ایک ریوالور بھی تو ملے گا۔ یہ تو پتا چل ہی جائے گا کہ اس کی چھ گولیوں سے کون کون مرا۔ لیکن کیا سیریل نمبر سے وہ معلوم نہیں کر لیں گے کہ ریوالور کس کا تھا۔ کیا انھیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ اس مفرور اشتہاری مجرم نے کدھر کا رُخ کیا تھا۔ وہ ریوالور گلابو کو کیسے ملا۔ یہ تفتیش غیر اہم ہو جائے گی۔ اصل کامیابی میری سمت کا تعین ہوگی۔

میں گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کہاں جانے والی ایک ویگن نے بریک کیا مگر چائے والا میری طرف لپکا۔ "پیسے تو دے میاں!" وہ بولا۔ غالباً وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں استطاعت سے زیادہ مال کھا کے بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ میں نے نوٹوں کی گڈی نکالی تو وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ میں نے ایک نوٹ اسے پکڑا دیا۔

"کھلا تو نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے نوٹ ہاتھ میں لے کر کہا۔ میں بے نیاز کھڑا رہا اور اس نے ویگن کی طرف رُخ کیا۔ "میں پوچھتا ہوں کسی سے۔" لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر منہ لٹکائے لوٹا۔ پہلے اسے ڈر تھا کہ میں کھا پی کر بھاگ گیا تو اس کے پیسے مارے جائیں گے۔ پیسے اب بھی مارے جا رہے تھے مگر قصوروار وہ خود ہو گیا تھا۔

"اچھا چاچا!" میں نے کچھ سوچ کے کہا "جتنے تمھارے پاس ہیں اتنے ہی دے دو۔"

"میں... میرے پاس تو بیس بائیس رپے ہوئے ہیں صبح سے۔"

وہ بولا "دس کا نوٹ نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "اچھا تم چائے کے پیسے کاٹ لو۔ جو ہے وہ دے دو۔ اور جتنی رقم بچے اس سے پھول خرید کر ایک قبر پر چڑھا دینا۔ ادھر قلعہ ستار شاہ میں آج ایک لڑکی قتل کر دی گئی ہے۔ گلابو نام تھا اس کا۔"

چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہ کہہ سکا "پھول.... پھول یہاں کون بیچتا ہے۔ ویسے ہی مل جاتے ہیں۔"

"اچھا تو اس کے نام پر خیرات کر دینا۔ کسی مستحق کو دے دینا اور اس کی بخشش کی دعا کرنا۔" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور واپس جانے لگا۔ اسے ویگن کے مسافروں کو بھی چائے دینی تھی۔

"کون تھی یہ لڑکی تمھاری؟" اس نے اچانک رک کر سوال کیا۔ اسے میرا رویہ بہت عجیب لگا تھا۔

"بہن سمجھ لو۔" میں نے کہا "بیٹی سمجھ لو۔ یا ماں سمجھ لو۔"

وہ مجھے بیس روپے پکڑا کے سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔

خطرناک تو میں نہیں تھا لیکن پاگل ضرور تھا۔ میری باتوں سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جب میں واپس لاہور جانے کے لیے ایک بس میں سوار ہوا تو ایک بجنے کو تھا۔ میرا حلیہ خاصا بدل گیا تھا۔ اب میں عام دیہاتی لباس میں تھا جو کسی کو تھانیدار کی وردی یا ملنگ کی قبا کی طرح متوجہ نہیں کرتا۔ میرے سر پر بھی پگڑی تھی اور دو دن میں شیو خاصی بڑھ چکی تھی۔ کنڈیکٹر سے لاہور کا ٹکٹ لے کر میں اس ڈرائیور کے متعلق سوچتا رہا۔ گزشتہ شب بھی میرے نہ پہنچنے سے وہ پریشان ہوا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک گیا اور کب واپس ہوا۔ کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ وہ کار چھوڑ کے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے بعد میں میرے کسی ٹھکانے کا پتا لگانے کے لیے کار کی تلاشی لی ہو۔ اسے ایک تھانیدار کی وردی اور ایک ریوالور ملا ہوگا۔ وہ یقیناً پریشان ہوا ہوگا۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ میں خفیہ پولیس کا آدمی تھا جس نے وردی اتار کے رکھ دی تھی اور جوگی فقیر کے کپڑوں میں اس کو بھی دھوکا دے رہا تھا اور گامے شاہ کے مجذوبوں کو بھی۔ جتنا میں نے غور کیا مجھے اس کے گاڑی چھوڑ کر بھاگنے کے امکانات زیادہ نظر آنے لگے۔

وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ وہ گامے ماچھی سے غداری کا مرتکب ہو چکا تھا اور خفیہ پولیس کے جال میں پھنس گیا تھا۔ ان حالات میں اسے میرا سراغ لگانے کے لیے تردد کی کیا ضرورت ہے۔ کہ وہ مجھے تلاش کرتا ہوا لاہور جائے اور پھر پکڑا جائے۔ وہ یقیناً کار چھوڑ کے بھاگ گیا ہوگا۔ شاید اس جگہ سے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد جہاں میں نے اس سے ملنے کو کہا تھا۔

اس خیال نے مجھے اتنا قائل کر لیا کہ میری نظریں بس کے باہر بھاگتے ہوئے مناظر سے الجھنے لگیں۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ مشرق سے آغاز سفر کرنے والا آفتاب مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔ کھانے اور سستانے کے بعد کسان پھر کھیتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں ندی نالوں میں کپڑے دھو رہی تھیں اور بچوں کو نہلا رہی تھیں۔ بچے مویشی چرا رہے تھے اور دونوں طرف سے مسافروں کی ریل پیل جاری تھی۔ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا چنانچہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک بستی میں آج کتنے جنازے اٹھے یا اٹھیں گے تو کیوں اٹھیں گے۔ پانچ افراد کی قاتل یا اکیلی رہ جانے والی مظلوم عورت۔ اس نے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

انصاف کیا یا خودکشی کر کے حرام موت مری۔

میرے خیالات کی ڈور ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ "گاڑی روکنا بھائی۔" میں چلایا۔

"کیوں؟ کیا ہو گیا؟" کنڈیکٹر نے کہا اور بہت سے لوگوں نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ ان میں ڈرائیور بھی شامل تھا۔

"وہ... میرا بٹوہ... گر گیا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے بس روک دی اور میں کود کر اتر گیا۔ بس روانہ ہو گئی۔ یہ سوال بعد میں ضرور کیا گیا ہو گا کہ جو شخص کھڑکی سے دور بیٹھا تھا اس کا بٹوہ باہر کیسے گرا۔ اس کے اور کھڑکی کے درمیان تو دو مسافر حائل تھے۔ انھوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا ہو گا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ خیر۔ اب ان کا جو دل چاہے سمجھیں۔ میں نے اپنی گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ ایک مفروضہ یکلخت ایک حقیقت بن گیا تھا چنانچہ وقتی طور پر میں سب کچھ بھول گیا تھا اور تیز تیز قدموں سے دو فرلانگ پیچھے رہ جانے والی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی کے سب دروازے مقفل تھے۔ سوائے ایک دروازے کے جدھر ڈرائیونگ سیٹ تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ چابیاں سوئچ میں موجود تھیں۔ زیادہ وقت گاڑی رات کے اندھیرے میں لاوارث کھڑی رہی تھی چنانچہ کسی نے دیکھا بھی تھا تو یہی سمجھا ہو گا کہ ڈرائیور کسی ضرورت کے تحت اترا ہے اور اس پاس ہی موجود ہو گا۔ صبح کے بعد سے اب تک چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اگر صبح سے پھر شام ہو جاتی یا گاڑی اگلے دن بھی نظر آتی تو اس کی پوزیشن یقیناً مشتبہ ہو جاتی اور کوئی نہ کوئی پولیس کو بھی مطلع کر دیتا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں ریوالور موجود تھا۔ پھر اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ اس میں کپڑوں کے ساتھ تھانیدار کی وردی بھی موجود تھی۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ کسی غیر متوقع مصیبت میں گرفتار ہونے کے خوف سے ڈرائیور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فرار ہو گیا تھا۔

اس گاڑی کا ملنا کسی گم شدہ خزانے کے ملنے سے کم نہیں تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کچھ سوچ کے واپس جانے کے بجائے آگے روانہ ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح پہلے میں چیک پوسٹ پر پکڑے جانے سے بال بال بچا تھا لیکن جان بچانے کی کوشش میں اس سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ پھر کھجور سے گرا تو کھڈ میں گیا۔ میرا تھانے جا کے نکل آنا تائیدِ ایزدی کے بغیر ناممکن تھا اور اب گاڑی کا مل جانا نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنے کا اشارہ تھا۔ میں نے سب کچھ گنوا کے صبح ہونے تک پھر سب کچھ پا لیا تھا اور اب دوبارہ ملتان کی جانب یوں رواں تھا جیسے درمیانی وقفے میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو کچھ ذہن میں تھا ایک خوابِ پریشاں کا نقش لگتا تھا۔

میرا حلیہ مضحکہ خیز ضرور تھا لیکن اطمینان بخش تھا۔ رابعہ، محسن یا شہلا مجھے اس بھیس میں دیکھ لیتے تو بہت ہنستے۔ مجھے ایک سے ایک نیا خطاب دیتے۔ اکرام شیخ، نازو، انکل رضوی کی فیملی اور استاد ڈیڈی اور منظر۔ یہ سب لوگ عام حالات میں میرے "فینسی ڈریس شو" سے بے حد محظوظ ہوتے لیکن اب نہ میں ان کے سامنے جا سکتا تھا اور نہ یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر پہلے کی طرح ہنس بول سکتے تھے۔ وقت نے اور حالات نے رشتوں میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور مجھے سب سے الگ کر دیا تھا تو باقی سب کو ایک دوسرے سے دور۔ خیر۔ خدا وہ وقت لائے کہ اعتماد، خلوص اور محبت کے پرانے رشتے بحال ہوں اور ہم پھر ایک ہو جائیں۔ آمین۔

میں نے دعا مانگی۔

ملتان پہنچنے سے پہلے میں نے اپنا کفن اُتارا۔ ایک مردہ شخص کے لباس کو کفن ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی جگہ شلوار قمیص پہن لی۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تھے کہ میں نے کار کو ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے مقابل روکا اور اندر چلا گیا۔ رجسٹر میں اپنے نام کا اندراج میں نے وہی کیا جو گاڑی کے کاغذات میں تھا۔ چابی منیجر کے حوالے کی کہ کسی کو بھیج کر اس کی سروس اور ٹیوننگ کرا دی جائے کیونکہ صبح مجھے کوئٹہ جانا ہے اور رقم پیشگی ادا کر دی۔ میرے انداز و اطوار میں متانت اتنی زیادہ تھی کہ حاکمانہ غرور لگتی تھی اور ظاہر یہ ہوتا تھا کہ میں کوئی بدتمیز، بدمزاج اور بدخو قسم کا پھنے خاں ہوں چنانچہ منیجر "یس سر۔ یس سر" کرتا رہا۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے غسل کیا۔ کافی اور سینڈوچ طلب کیے اور پھر پڑ کے سویا تو رات کے دس بجے اٹھا۔ میں پوری رات جاگتا رہا تھا اور پھر پورا دن سفر کرتا رہا تھا چنانچہ میں پوری رات سو کے گزار سکتا تھا لیکن میرے لاشعور میں ایک بات تھی جس نے ٹیبل کلاک کے الارم کی طرح مجھے وقت پر بیدار کر دیا۔ میں نے محسن سے وعدہ کیا تھا کہ پرسوں سکھر سے فون کروں گا۔ سکھر کے بجائے میں ابھی ملتان ہی پہنچا تھا لیکن اسی وقت منظر کے گھر میں محسن اور رابعہ میری کال کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن گن کر کاٹ رہے تھے۔ وقت تو گزر چکا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اتنی جلدی مایوس ہو کے لوٹنے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے ہزار اندیشہ ہائے دور و دراز کو مدِنظر رکھا ہو گا۔ اور کال میں تاخیر کے بہت سے اسباب تلاش کر لیے ہوں گے۔

میری ڈانٹ ڈپٹ کا اثر یہ ہوا کہ چند منٹ میں میرے کمرے کے فون کی لائن عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے فون سے ملا دی گئی۔ گھنٹی بجتے ہی وہ سب لپکے ہوں گے مگر لیڈیز فرسٹ کے اصول کی آڑ میں انھوں نے رابعہ کو ریسیور اٹھا کے پہلے بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل اس گاڑی کی طرح دوڑ رہا ہے جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں۔

"ہیلو۔" رابعہ نے کہا۔ اور مجھے اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔

"رابعہ!" میں نے بے حد جذباتی ہو کے کہا۔ "بولو بولو۔ کچھ تو اور کہو تصور میں تم میرے سامنے ہو اور کان تمھاری آواز سن رہے ہیں۔ تم اداس تو نہیں ہو نا؟"

"تم خیریت سے تو ہو نا سکندر۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ملتان کے ایک ہوٹل سے۔" میں نے کہا۔ "سویا ہوا تھا کہ تمھاری یاد نے گہری نیند سے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔"

"تم... تم کو... تم نے کہا تھا سکھر سے فون کرو گے۔" وہ بولی۔ پھر منظر کی آواز سنائی دی۔ "ارے بھائی کھڑی کھڑی کانپ رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ یہ کرسی اسی لیے رکھی ہوئی ہے" اور اس کا زبردست قہقہہ گونجا۔ میں نے تصور میں رابعہ کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔

"ہاں مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تشویش کی بات کوئی نہیں۔"

"یہ تو اچھا ہی ہوا۔" وہ بولی۔ "معلوم نہیں کیسے انکل رضوی کو اطلاع مل گئی تھی کہ تم حلیہ بدل کے گاڑی میں کراچی کی طرف جا رہے ہو۔ محسن کا خیال تھا کہ تم اب تک پکڑے جا چکے ہو گے۔"

"اور تمھارا خیال کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "فرض کرو ایسا ہی ہوتا۔"

وہ ہنسی۔ "بہت تنگ کرتے ہیں مجھے یہ دونوں۔ محسن اور منظر۔ ابھی کہہ کر گئے ہیں کہ ہم ذرا دو نفل شکرانے کے ادا کر آئیں۔ مجھے موقع دینا چاہتے تھے کہ تم سے اکیلے میں بات کر لوں۔ معلوم ہے کل رات کیا ہوا۔ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ تم اور محسن باتیں کر رہے تھے۔"

"وہ... ایک بہت پرانا شعر ہے... کہ کہتے ہیں جس کو عشق..."

"وہ تمھارے دماغ کا خلل ہے۔ سچ بتاؤ کیا تم کل رات آئے تھے؟"

"رابعہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آؤں اور تمھیں دیکھے بغیر لوٹ آؤں؟" میں نے کہا۔ "خود سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے۔"

"میں نے تو صاف سنا تھا۔ تم محسن سے کہہ رہے تھے۔" وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

"کیا کہہ رہا تھا۔ رک کیوں گئیں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ میں اکیلا کراچی نہیں جا سکتا... اور... اور بس..." وہ بولی۔ "رابعہ کو ساتھ جانا چاہیے۔"

"پھر محسن نے کیا کہا؟" میرا دل ایک اندرونی مسرت سے رقص کرنے لگا۔

"وہی جو تم نے ابھی کہا تھا۔" وہ بولی اور اس کا حیا سے گلنار چہرہ مجھے روبرو نظر آیا۔ اس نے کہا۔ "بی بی۔ سوتے وقت کم کھایا کرو۔ وظیفہ زیادہ۔ اور پھر بھی بُرے خواب آئیں تو مجھے بلا لیا کرو۔ میں سنسر کر دوں گا اور ان میں سے سکندر اعظم کو خارج کر دوں گا۔"

"وہ تمھارا خواب تھا۔ عشق کی چھٹی حس تھی یا ٹیلی پیتھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہو گا یہی۔ میں تو کل نہیں آیا تھا لیکن کل آ جاؤں گا۔ بات وہی ہے جو تم نے سنی تھی۔"

"اچھا لو محسن سے بات کرو۔" رابعہ نے کہا اور دوسرے لمحے مجھے محسن کی آواز سنائی دی۔

"جہاں تک میرا خیال ہے تو پیدل روانہ نہیں ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔ "کار تھی تیرے پاس۔"

"کار کبھی کبھی بے کار بھی ہو جاتی ہے۔ اب ذرا میری بات غور سے سن۔ اس کار کو میں کل صبح دس بجے کے قریب "ڈریم لینڈ" سینما کے سامنے چھوڑ کے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ میں لمبی بات نہیں کر سکتا اس لیے اتنی دیر میں ملتان پہنچنے اور کچھ کیے بغیر لوٹ آنے کے اسباب ملاقات میں بیان کر دوں گا۔ تو کل صبح لاہور سے نکل اور ملتان پہنچ۔ گاڑی کے اندر سیٹ کے نیچے چابیاں ہوں گی۔ ریوالور میں نکال لوں گا۔ تیرا کام کار کو واپس لانا ہے۔ میں بس سے سفر کروں گا۔"

"اس ڈھنگ کا یا تھانیدار کا حلیہ بنا کے مت نکلنا۔"

"نہیں۔ وہ سب معلوم ہے مجھے۔ میں احتیاط کروں گا۔" میں نے کہا۔ "رات آٹھ بجے منظر کے گھر آ جانا۔"

"تو نے سیٹھ دلاور کے بارے میں نہیں پوچھا۔" محسن بولا۔

"پوچھوں گا لیکن وہاں آ کے۔ کال لمبی ہو رہی ہے اور بل بڑھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ منظر سے رسماً اور اخلاقاً

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

غیر رسمی اور بداخلاق گفتگو ہوئی جس میں گفتگو کم اور بکواس زیادہ تھی۔ پھر میں ریسیور رکھ کے سو گیا۔ اس سے پہلے کی قاتل تاریک ساعات کتنی قیامت خیز، خون آشام اور پُرآشوب تھی۔ اس دوسری رات کے دامن میں سکون تھا، محبت کی دلنواز مہک تھی اور خوبصورت خوابوں کی ہفت رنگ کرنوں کا اجالا تھا۔ یہ رات گلابو کے لیے بھی پُرسکون ابدی نیند کا پیغام لے کر آئی تھی اور وہ اپنی عزت و عفت کے پورے غرور کے ساتھ۔ تمام فکروں سے بے نیاز اور سارے دکھوں سے آزاد شہرِ خموشاں کے ایک گوشے میں بڑی معصومیت سے محوِ خواب تھی۔ اس کے قاتل بھی اس زمین کے نیچے تھے لیکن وہ شرمسار تھے اور خوفزدہ تھے کیونکہ وہ جانتے تھے ان کے نامۂ اعمال میں کیا کچھ لکھا جا چکا ہے۔

صبح ناشتے کے بعد میں نے حساب بے باق کیا اور گاڑی کی چابی لے کر نکل آیا۔ سروس کے بعد اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اور چال بھی بدل گئی تھی۔ میں نے ڈریم لینڈ سینما کا صرف نام سنا تھا یا کسی اخبار کے اشتہار میں دیکھا تھا۔ ملتان کا شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ مختلف لوگوں سے راستہ پوچھتا میں ٹھیک دس بجے سینما کے سامنے پہنچا۔ ہر طرف سے جائزہ لینے کے بعد میں نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں ڈرائیونگ سیٹ کے بالکل ساتھ دیوار تھی۔ درمیانی فاصلہ میں نے اتنا کم رکھا تھا کہ دروازہ پورا نہیں کھلا اور مجھے خاصی کوشش کے بعد خود کو تنگ سی جگہ میں سے گزارنا پڑا۔ چابیاں اگنیشن سوئچ میں ٹنگی ہوئی صاف نظر آتی تھیں۔ میں نے اسٹیئرنگ پر ایک رومال ڈال دیا اور دوسرے دروازے سے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کر ریوالور نکالا۔ پھر شیشہ بند کیا اور ڈور ناب دبا کے دروازہ بند کیا تو خود بخود لاک ہو گیا۔

پھر مجھے سوٹ کیس کا خیال آیا۔ میں نے محسن سے کہا تھا کہ میں سوٹ کیس نکال لوں گا لیکن وہ ڈکی میں بند تھا۔ ڈکی کھولنے کے لیے میرا دیوار کے ساتھ ساتھ چل کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنا اور پھر چابیاں نکالنا ضروری تھا۔ اب تک میں نے ہر کام پوری احتیاط کے ساتھ سب کی نظر بچا کے کیا تھا مگر اب کار کے سامنے ایک ریڑھی والا آ کھڑا ہوا تھا اور اپنے ٹھکانے پر ایک کار کی موجودگی سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس نکالنے کا ارادہ ترک کیا اور ریڑھی والے کی طرف نظر ڈالے بغیر چل پڑا۔ اس کی موجودگی نے مجھے تھوڑا سا تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محسن کو گاڑی نہ نکالنے دے اور اڑ جائے کہ گاڑی کھڑی کر کے جانے والے صاحب تو دوسرے تھے۔ مگر یہ کوئی ایسی بڑی پرابلم نہیں تھی۔ محسن اس سے بخوبی نمٹنے کا اہل تھا۔ خود میرے حق میں خالی ہاتھ رہنا بہتر تھا کہ بھاگنے کا موقع آئے تو سوٹ کیس کا بوجھ ساتھ نہ گھسیٹنا پڑے۔ نقد رقم اور ریوالور کی طاقت اضافی تھی۔

بس کے بجائے میں نے ٹرین سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس ہر جگہ، ہر شہر کی آبادی کے درمیان سے گزرتی تھی اور اس میں بیشتر لوگ مقامی ہوتے تھے۔ کراچی سے آنے والی ٹرین یوں بھی کھچا کھچ بھری ہوتی تھی اور اس کے مسافروں کو طویل سفر درپیش ہوتا تھا۔ رش اور بدانتظامی کے باعث انھیں اپنا یا اہل و عیال کا ہوش نہیں ہوتا تھا اور اگر آدمی اس میں ایسی جگہ فٹ ہو جائے جہاں کوئی اسے نہ پہچانے تو پھر آخر تک وہی لوگ رہتے تھے اور ٹرین کے ہزاروں مسافروں میں پولیس کی نگاہ ایک چہرے کو نہ تلاش کر سکتی تھی۔ نہ انھوں نے کبھی اس کی کوشش کی تھی۔ عملاً یہ ناممکن تھا چنانچہ ناکابندی کی صف میں اسٹیشن صرف بیان کی حد تک آتے تھے۔

اس کے باوجود میں نے احتیاط سے کنارا نہیں کیا۔ ٹرین کے آنے تک میں بینچ پر بیٹھا اپنا چہرہ چھپائے اخبار پڑھتا رہا۔ اب نہ میں بابو تھا، نہ دیہاتی۔ نہ ملنگ اور نہ تھانیدار بلکہ ایک عام آدمی کے کپڑوں میں تھا۔ جو کسی کی توجہ کا باعث نہیں بنتے تھے۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی مہلت درکار تھی۔ اس عرصے میں جہاں شیو بڑھ جانے سے میری صورت میں داڑھی کا اضافہ ہو جاتا وہاں عام لوگوں کے ذہن سے بھی ہفتہ بھر پہلے اخبارات میں چھپنے والی تصویر کے خدوخال مدھم پڑ جانے کا امکان بہت واضح تھا۔ سب لوگ ایک ہی اخبار نہیں پڑھتے بلکہ پچانوے فیصد تو شاید اخبار ہاتھ لگا کر بھی نہیں پڑھتے۔ سنی سنائی سے حالاتِ حاضرہ کا اندازہ کرتے ہیں یا حالاتِ حاضرہ کو اتنا اہم ہی نہیں سمجھتے کہ ان پر دماغ سوزی کی جائے۔ باقی مختلف اخبارات دیکھتے ہیں اور ہر روز ہر اخبار میں اتنی تصویریں چھپتی ہیں کہ ذہن میں سب گڈمڈ ہو جاتا ہے کہ صورت تو دیکھی بھالی لگتی ہے مگر تصویر کسی مفرور مجرم کی تھی یا سیاسی لیڈر کی؟

ٹرین ایک گھنٹے سے زیادہ لیٹ تھی اور مشکل یہ تھی کہ ایک پسنجر ٹرین عرف مردار گاڑی اور ایک تیز رفتار ریل کار دونوں اس کے بعد ملتی تھیں۔ میں نے کچھ وقت ایک پرانے ریسٹورنٹ کے ویرانی اور گھٹن والے ماحول میں کھانا کھاتے گزارا اور وہاں سے اس وقت نکلا جب بیرا خود مجھے نکالنے

بر کربستہ نظر آتے تھے۔ میرے باہر آتے ہی ٹرین آ گئی اور میں کھڑکی کے راستے اس بوگی میں داخل ہو گیا جس میں مسافر یوں بھرے ہوئے تھے جیسے انار میں دانے لیکن ایک اور دانہ اندر گرتے ہی شور مچ گیا کیونکہ میں نے براہِ راست نیچے کی دو برقعوں پر قابض ایک فیملی کے درمیان لینڈ کیا تھا۔ بدقسمتی سے فرش پر مقیم حضرات میں منحنی جسم اور دیہاتی وضع کے ایک بزرگ بھی تھے جو کچھ مراقبے کی حالت میں سرنگوں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں ان پر گرا تو وہ بے سُری کال بیل کی طرح چلانے لگے: "ابے گنوار، اجڈ! یہ راستہ ہے شرفاء کے اندر آنے کا۔ دروازے کیا نمائش کے لیے ہیں۔ ہائیں!"

"معاف۔ معاف کیجیے گا۔" میں نے ان کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ دروازہ نہیں تھا؟ میری نظر کمزور ہے۔" ان کی فیملی کی ایک خاتون نے جو مزاج، صورت اور عمر کے اعتبار سے ان کی شریکِ حیات ہو سکتی تھیں میرے دوہتڑ مارا۔

"موئے مشٹنڈے۔ اتنا مجبور تو نہیں ہے تو۔ مجاک کرتا ہے سر پھیوں سے؟ نامراد۔ اللہ نہ کرے ان کو کچھ ہو جاتا تو بیوہ ہو جاتی میں۔ دس بچے یتیم ہو جاتے۔" وہ بانسری کی طرح بجنے لگی۔

"فکر مت کرو خالہ۔ یہ کہیں سے نہیں ٹوٹے۔" میں نے کہا۔ "ٹھوک بجا کے دیکھ لو۔" اور فوراً ان کے درمیان سے نکل کے کھڑے ہوئے مسافروں میں شامل ہو گیا جو اس ایک منٹ کی کامیڈی سے محظوظ ہوئے تھے۔

"ارے چھپا کی ماں!" ٹیم کے کپتان نے آہ و بکا جاری کی۔ "کم بخت ایک ٹن کا گینڈا تھا۔ چورا کر دیا خبیث نے۔ ساتویں آسمان سے مجھ پر ٹپک پڑا۔ آہ....!" وہ شخص حلیے سے بھی خوجی کا دوسرا ایڈیشن تھا۔

"آدمی کو ساتویں آسمان پر سے ہی زمین پر پھینکا گیا تھا نانا۔" میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"نانا؟" چورا ہونے کے باوجود وہ پٹاخے کی طرح پھٹے۔ "ابے اندھے۔ یہ بال دھوپ میں سفید ہو گئے ہیں۔ سمجھتا ہے بڈھے ہیں ہم۔ ابے آج بھی تیرے جیسے جوان بھاری ہیں۔ اٹھا کے پٹخ دیں تو پانی نہ مانگے۔"

"ایسا غضب مت کرنا دادا میاں۔" کسی نے لطف لینے کے لیے کہا۔ "یہ کوکا کولا مانگے گا۔ مہنگا پڑ جائے گا۔"

"ایسی جوانی ہے تو کر ڈالو ایک اور شادی۔" کسی نے مشورہ دیا۔ "گھر کی دو ٹیمیں ہو جائیں گی۔"

اب خوجی کی زوجہ کی باری تھی۔ اس نے عقدِ ثانی کی تحریک پیش کرنے والے کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ دلچسپ تماشا اس وقت تک جاری رہا جب تک چھیڑ چھاڑ کرنے والے خود ہی بور نہیں ہو گئے اور میاں خوجی کی فیملی نے محسوس نہیں کیا کہ عافیت خاموشی میں ہی ہے۔ بچے اس تماشے میں غیر جانبدار تماشائی تھے۔ کبھی اماں ابا کو دیکھتے تھے تو کبھی ٹھٹھے لگانے والوں کو جو سب بچے کچے جوان اور تعداد میں زیادہ تھے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میاں خوجی بار بار ناک پر سے پھسل آنے والا چشمہ اونچا کر کے مجھے فوکس کر رہے ہیں اور کچھ کنفیوژن کا شکار ہیں۔ چور میرے دل میں تھا چنانچہ میں نے اس ہجوم میں سے کھسک جانا بہتر سمجھا۔

میں نے خوجی کو لوگوں کے درمیان سے گزر کے باتھ روم کی جانب جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں تو خود بھی باتھ روم جانا چاہتا تھا چنانچہ میں آگے بڑھ کے باتھ روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا کہ جیسے ہی کوئی برآمد ہو میں اندر چلا جاؤں۔ دس منٹ بعد بالآخر وہ ہاتھ میں لوٹا پکڑے نمودار ہوئے۔ "پہچان لیا۔" وہ مجھے روبرو پاتے ہی چلائے۔ "بالکل پہچان لیا۔" اس سے زیادہ بولنے کی میں نے انھیں مہلت ہی نہیں دی۔ میں انھیں سمیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر کے لاک کر دیا۔ چار فٹ مربع جگہ میں دو افراد کا صرف کھڑا رہنا ممکن تھا۔ میں نے خوجی کو دیوار سے لگا کے گھٹنے سے دبا لیا۔ ایک ہاتھ سے ان کی نازک گردن دبوچی اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا۔

"یہ دیکھا ہے کبھی؟" میں نے لہجے کو انتہائی خونخوار بنا کے کہا اور ریوالور کی نال ان کی پیشانی پر رکھ دی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی ہیں۔ رنگ ان کا پہلے ہی لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا لیکن انھوں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا ہے مجھے۔" میں نے بدمعاشوں کی طرح غرا کے کہا۔ "چھ قتل کر چکا ہوں۔ چوری، ڈاکے، اغوا، سب کھیل ہیں میرے۔ جیل سے بھاگا ہوں اور ایک بار نہیں دس بار۔ آئندہ بھی بھاگ سکتا ہوں۔"

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو اس نے کانپتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ "خدا... خدا کے لیے... معاف...!"

"معاف کرنا نہیں جانتا میں۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اگر تمھاری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو ساری گولیاں مار دوں گا۔ اور چلتی ٹرین سے کود جاؤں گا۔ بہت مشق ہے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مجھے اس کی۔" اس کے ہاتھ سے لوٹا گر گیا۔

"قسم... قسم اللہ کی... میں... میں بولوں تو کافر۔" وہ تھر تھر کانپتا رہا۔

"اچھی طرح سمجھ لو۔ تم اور تمھاری بیوی۔ چار بچے۔ یہ سب تمھاری بے وقوفی سے مریں گے۔" میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ "ویسے میں تم کو اسی جگہ بھی مار سکتا ہوں۔ گاڑی کے شور میں آواز باہر نہیں جائے گی۔ تمھاری لاش کا پتا لگنے تک میں پچاس میل دور نکل جاؤں گا۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے منت سماجت اور رونا دھونا شروع کیا۔ قسمیں کھانے لگا۔ "میری توبہ میرے باپ کی توبہ۔ ڈاکو صاحب۔ مجھے بخش دو۔ میرے بیوی بچوں پر رحم کرو۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں ایک موقع دیتا ہوں۔ زبان بند رکھنا۔ یہ مت سمجھنا کہ تم لوگوں کی مدد سے مجھے پکڑ لو گے یا کنڈیکٹر گارڈ کو بتا دو گے۔ میں اگر جیل چلا گیا تا تب بھی میرے ساتھی باہر ہوں گے۔ تمھارے ایک ایک بچے کو تمھاری نظر کے سامنے ذبح کر دیں گے۔ یوں۔" میں نے قصابوں کی طرح چھری چلائی۔ میرا مقصد صرف اسے دہشت زدہ کرنا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ اس کی عقل جواب دے چکی تھی ورنہ وہ مجھ سے سوال ضرور کرتا کہ تمھارے ساتھی میرے گھر کا پتا کس سے معلوم کریں گے۔ جب میں نے اسے آزاد کیا تو اس نے جھک کر لوٹا اٹھایا اور گرتا پڑتا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے چلّانے کی آواز آئی تو میں دروازہ کھول کے بھاگا اور باہر نکل گیا۔ ایک فٹ بورڈ پر چلتا ہوا میں بوگی کے آخری کنارے تک پہنچا اور ہاتھ بڑھا کے دوسری بوگی کے دروازے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ مرنا چاہتا ہے کیا؟ خودکشی کرنی ہے؟ پاگل ہوا ہے؟ مگر میں نے سب کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے سوڈا واٹر بیچنے والوں کو اسی طرح ایک بوگی سے دوسری بوگی میں جاتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ تو بوتلوں کی بالٹی کا وزن بھی ہوتا تھا لیکن مجھے مشق نہیں تھی۔ گاڑی کم سے کم چالیس پچاس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اگر میرا اندازہ ذرا بھی غلط ہو جاتا یا توازن باقی نہ رہتا تو دوسرے لمحے میں پٹری پر گرتا۔ اسی گاڑی کے پہیوں کے نیچے آ کے کٹ جاتا یا پتھروں سے ٹکرا کے میرا سر پاش پاش ہو جاتا۔

بدقسمتی یا خوش قسمتی تھی کہ اگلی بوگی ڈائننگ کار تھی۔ وہاں ویٹر حضرات کا اجتماع تھا۔ انھوں نے چلّانا شروع کیا۔

"یہ مسافروں کے لیے نہیں ہے۔ نکل باہر۔"

"بلغیر ٹکٹ سفر کرنا چاہتا ہے۔" دوسرے نے کہا۔ کسی نے زنجیر کھینچنے کی دھمکی بھی دی۔

"ٹکٹ ہے میرے پاس بھائی۔" میں نے کہا جو غلطی ثابت ہوا۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میں بے ٹکٹ ہوں تو مجھ سے سو پچاس لے کر خاموش ہو جاتے اور مجھے اپنے بحفاظت لاہور لے جاتے۔ اب وہاں میری موجودگی کا جواز نہ رہا۔ انھوں نے مجھے دھکّے دے کر دوسری بوگی میں دیا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈائننگ کار تو دونوں طرف ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اگلی بوگی فرسٹ کلاس کی تھی جس میں برتھوں کے الگ الگ کیبن بنے ہوتے ہیں۔ یہ خیال آنے نے خطرے کو قریب تر محسوس کیا۔ اب اگر خوجی کی باتوں پر کرتے ہوئے زیادہ جوشیلے اور فرض شناس جوان آدمی پر پیچھے دوڑے تو وہ سیدھے آئیں گے۔ انھوں نے کھڑکی سے سر نکال کر مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا ہوگا اور یہی میرے ہونے کا ثبوت بن جائے گا۔ اگر میں مجرم نہ ہوتا تو اپنی جان پر کھیل کر کیوں بھاگتا۔ اگلی بوگی میں داخل ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے وہ راہداری دیکھی جس کے دونوں طرف ہوتے ہیں۔ اسی کے نصف حصّے میں دوسرا باتھ روم تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ مجھے دیکھتے یا میں انھیں دھکیلتا ہوا اور ان کے بیچ میں سے راستہ بناتا ہوا آگے جاتا، پیچھے والا دروازہ اور ایک ویٹر چائے کی ٹرے لیے ہوئے نمودار ہوا۔ ٹرے کو اس نے ہاتھ پر یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے ٹرے کھینچ لی۔ اس نے پلٹ کر احتجاج کے لیے منہ کھولا بھی نہ تھا کہ میں نے ہاتھ سے اس کو اپنی طرف کھینچا اور اس کی ٹرے نیچے رکھ دی۔ اس سے تھوڑی سی آواز پیدا ہوئی جو ٹرین کے شور میں دب گئی۔ ویٹر پہلے حیران ہوا تھا پھر اس نے اپنا توازن بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان کر شور مچانے والا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو دبوچ لیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا کر میں نے اسے باتھ روم میں گھسیٹ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ تندرست آدمی تھا۔ جدوجہد کرتے ہوئے اس نے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹا لیا۔ "یہ... یہ کیا بدمعاشی ہے؟" وہ چلّایا۔ لیکن میں نے ریوالور نکال لیا۔

"اپنی آواز بند رکھو۔" میں نے کہا۔ "میں تمھاری جان نہیں چاہتا۔"

"تو پھر کیا چاہتے ہو؟ مفت کی چائے پینی ہے؟ جیب میں ساٹھ ستر روپے ہیں۔ وہ بھی لے لو..."

"مجھے یہ وردی چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

کہا۔ "جلدی کرو۔" اور اس کے سر پر بڑی صفائی سے رکھی ہوئی کلاہ دار پگڑی اتار لی۔ نیچے اس کے سر کی سطح کی تمام فصل کسی حجام کے استرے نے بالکل صاف کر رکھی تھی۔ اور یہ واردات بالکل تازہ تھی۔ چنانچہ اس کے سر سے چھت کے بلب کی روشنی منعکس ہونے لگی۔

"اوئے۔" اس کا ہاتھ خود بخود سر کی طرف گیا اور اس نے مجھے ایک گالی دی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ریوالور چھینا چاہا اور مجھ سے بھڑ گیا۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو میرا ایک پیر اس گول سوراخ میں گیا جو دو قدمچوں کے درمیان بنا ہوا ہوتا ہے۔ گرتے گرتے میں نے اس کے سر کو دیوار سے دے مارا۔ اس سے خاصی آواز پیدا ہوئی۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پھر سنبھل کے کھڑا ہوا تو وہ میرے اوپر آیا۔ اس کے سر میں چوٹ ضرور آئی تھی لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میری وقتی پسپائی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا تھا اور اس نے مجھے دوسری زیادہ اشتعال انگیز گالی دی اور میرے سر پر مکا مارا۔ میں نے خود کو بچایا لیکن وہ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں گولی چلانے کی صرف دھمکی دے رہا ہوں۔ مجبوراً مجھے اس کے سر پر ریوالور مارنا پڑا۔ اس کی ساری گالی گلوچ اور مار پیٹ کی ہمت ختم ہو گئی۔ وہ آدمی یقیناً جی دار تھا کہ ریوالور دیکھ کر بھی ہراساں نہیں ہوا تھا۔ میں بھی خالی ہاتھ ہوتا تو مقابلہ سخت ہوتا اور مجھے کشتی یا باکسنگ کے بجائے جوڈو کا استعمال کرنا پڑتا۔

دروازے کو لاک کر کے میں نے ایک مرتبہ پھر کپڑے بدلنے کا عمل شروع کیا۔ اس کی بے داغ سفید وردی پہن کر میں نے پگڑی سر پر رکھی اور آئینے میں دیکھا۔ میرا یہ نیا روپ بہت بہتر تھا۔ اپنا سرمایہ اور ریوالور وردی کی جیب میں منتقل کرنے کے بعد میں نے اس بھاری بھرکم ویٹر کو شلوار قمیص پہنائی اور اس کی وردی سے نکلنے والی رقم اور دوسرے کاغذات بحفاظت قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ میں چاہتا تو اسے بے لباس چھوڑ کے بھی نکل جاتا لیکن یہ اس پر دہرا ظلم ہوتا۔ اس تمام کارروائی میں چھ سات منٹ لگ گئے تھے اور میرے کان باہر کی آوازیں سن رہے تھے۔ غالباً خوجی کی بات کو سچ مان کے کچھ لوگ ڈائننگ کار کے راستے میری تلاش میں آئے تھے۔ ویٹرز نے تصدیق کی ہوگی کہ اس حلیے اور لباس میں ایک شخص کو ادھر ارسال کیا گیا ہے۔

باہر نکلتے ہی میں نے ٹرے کو بالکل ویٹرز کے انداز میں ایک ہاتھ پر رکھا اور ہاتھ کو گھما کے شانے پر یوں رکھا کہ میرا چہرہ نمایاں نہیں رہا۔ تین افراد جو فرسٹ کلاس میں داخل ہو گئے تھے، ہر کیبن میں جھانکنے کے بعد ناکام واپس آ رہے تھے۔ "یار وہ بندہ آؤٹ ہے۔" ایک شخص نے کہا۔ اور انگلی کو کنپٹی پر گھمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ میاں خوجی کا دماغ خراب ہے۔ "ایسے ہی بولتا آ رہا ہے۔"

"وہ نہیں، افیم کی گولی بول رہی تھی۔" دوسرے نے کہا۔

"مگر بھائی وہ آدمی ایسے کیوں بھاگا؟" تیسرے نے کہا۔ "میں نے خود دیکھا تھا۔"

"دیکھا تو میں نے بھی تھا۔" پہلے نے سر کھجایا۔ "اور بیرا ملنے بھی بتایا تھا کہ وہ ادھر ہی سے آیا تھا۔ پھر گیا کہاں؟"

وہ ایک قطار میں چلتے پھر ڈائننگ کار سے گزرے۔ میں ان کے پیچھے رہا۔ سارے ویٹر اب چائے کی ٹرے رکھ کے جا چکے تھے یا خالی ٹرے رکھ کے نئی ٹرے اٹھا رہے تھے۔ کم سے کم وقت میں ان کو ٹرین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سب مسافروں کو چائے پہنچانی تھی چنانچہ کسی کو میری طرف غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کو نمبر سے یاد کرتے تھے جو ان کی سفید پگڑی پر سامنے لگا ہوا تھا۔ پیتل کا بنا ہوا بیج جس کے درمیان میں یہ نمبر بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ ان کے لیے میں صرف نمبر دو سو دس تھا۔ آنے جانے والے چلّا رہے تھے۔ "او یار یہ غلط ہے۔ دو سو چھتیس نے میرے تین آرڈر لے لیے۔" "دو سو ایک کا پھڈا ہو گیا کسی مسافر سے۔ اس نے ٹرے کے پورے پیسے لیے۔" میں سب کی سنتا سیدھا گزرا اور واپس پہلی بوگی میں آ گیا جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

میری تلاش میں جانے والے اور ناکام واپس آنے والے خفیف بھی تھے اور حیران بھی۔

"تم بھی کمال کرتے ہو چاچا۔ وہ آدمی نہیں تھا، جن تھا۔" کسی نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں کیا جن شرفاء کو باتھ روم میں تنگ کرتے ہیں؟ پستول تان لیتے ہیں ان پر؟" خوجی نے خفا ہو کے کہا۔ "سب نے دیکھا تھا اسے۔ کیا جنات نظر آتے ہیں؟"

"جنات ہر روپ میں نظر آ سکتے ہیں۔" کسی نے فیصلہ دیا۔

"میرے دادا نے خود...!"

"جنات وغیرہ سب فضول باتیں ہیں۔ آدمی کے ذہن کی پیداوار۔" کسی ملحد دانشور نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس سے پہلے کہ جنات کے وجود سے انکار کرنے والے اور دادا مذکور کے ذاتی تجربے کو فریبِ خیال قرار دینے کا مسئلہ نزاعی بنتا ٹرین کی رفتار سست پڑ گئی۔ لاہور آ گیا۔ لاہور آ گیا کا شور مچا اور سب نے اپنا سامان اور خاندان سنبھالنا شروع کیا۔ ٹرین تو کوٹ رادھاکشن کے بعد لاہور ہی رکی تھی۔ کینٹ سے پہلے گلبرگ اور نواحی بستی کے درمیان سے گزر رہی تھی اور نان اسٹاپ جا رہی تھی۔ دھرمپورہ کی نہر کا پل آیا تو میں نے سر جھکا کے کھڑکی سے جھانکا اور مجھے بانسوں والی سڑک کی ایک جھلک دکھائی دی۔ پھر وہ سڑک آ گئی جس کا پھاٹک بند تھا۔ ایک طرف گڑھی شاہو اور دوسری طرف صدر سے آنے والی ٹریفک رک گئی تھی۔ لوکو شیڈ میں سے نکلتے نکلتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ٹرین دندناتی ہوئی بلند و بالا چھتوں کے نیچے قلیوں اور لوگوں کے شور و غل سے گونجتے پلیٹ فارم پر جا رکی۔ میں نے چائے کی ٹرے ایک خالی ہونے والی سیٹ پر رکھی اور نیچے اتر گیا۔ یہ بھی ایک غلطی تھی۔ میں باہر جانے والے گیٹ کی سمت بڑھ رہا تھا کہ ایک ویٹر نے مجھے دیکھا۔ ”ارے دو سو دس! تو کہاں جا رہا ہے؟“ وہ چلّایا۔ ”جاتا تو مجھے تھا۔“

”تم بھی جاؤ۔“ میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”میں نے کیا راستہ روکا ہے تمھارا۔“

شک اسے میری آواز پر ہی ہو گیا تھا۔ ”لیکن تو نے میری جگہ پشاور تک جانے کا وعدہ کیا تھا۔“ پھر اس نے میرے قریب آ کے سر اٹھا کر دیکھا ”تو... تم دو سو دس نہیں ہو۔“

میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ پیچھے آنے والے بہت سے مسافروں کو گراتا ہوا گرا۔ کچھ مسافروں کے ہاتھ سے سامان چھوٹ گیا۔ ایک قلی توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سامان سمیت گرا تو دو خواتین نیچے دب گئیں۔ انھوں نے برقعوں کے اندر سے چیخنا شروع کیا۔ پلیٹ فارم پر بھگدڑ مچ گئی اور باہر جانے کا راستہ بند ہوتے ہی پلیٹ فارم پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوڑ لگائی اور اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے باہر ”ٹکٹ کلکٹرز آفس“ لکھا ہوا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں چار ٹکٹ کلکٹر لمبی سی میز کے آخری کنارے پر فارغ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

ایک نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا: ”کسے تلاش کر رہا ہے پہلوان؟“

”وہ... آپ کے ساتھ ہوتے ہیں نا ایک لمبے پتلے سے۔“ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”براچہ صاحب؟ کیا کام ہے ان سے؟“ اس نے ... چلتے ہوئے کہا: ”نکالو اپنا غلام۔“

میں نے سو کا ایک نوٹ نکالا: ”یہ دینا تھا ان کو۔ ادھار ... مَیں نے۔“ میں نے کہا اور ساتھ والے کمرے کی طرف چل ... میں منہمک ٹکٹ چیکر نے دیکھے بغیر سو کا نوٹ جیب میں رکھ ... تھا۔ نہ جانے براچہ کون تھا۔ شاید میں چوہدری کہتا تب بھی ... نہ کوئی نکل ہی آتا۔ کنفیوژن اس وقت پیدا ہوگا جب ... نامعلوم براچہ سو روپے کسی بھی ویٹر کو ادھار دینے کی بار ... نہیں مانے گا۔ اس وقت تو میں کسی چور دروازے سے بھا... چاہتا تھا۔ پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اسٹیشن ... ماسٹر کے کمرے میں موجود ہوں۔ اس نے عینک لگا کے ... گھورا ہی تھا کہ میں: ”معاف کرنا جناب۔“ کہہ کے پیچھے ... باہر نکل گیا۔

ریلوے اسٹیشن کے جنجال سے نکل کے میں نے ... کا سانس لیا کہ مصیبت ٹل گئی۔ میں نے عظیم الشان کلاک ... دیکھا۔ اس میں چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے ... منظر کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم میرے ایک گھنٹہ ... پہنچ جانے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ محسن ... صبح آٹھ بجے روانہ ہوا ہوگا تو تقریباً ایک بجے ملتان پہنچے ... سے رابعہ اسے اپنی کار میں لے گئی ہو۔ اگر دو بجے کے بعد ... الگ الگ کاروں میں واپس روانہ ہوئے تو سات بجے ... بعد ہی لاہور پہنچیں گے۔ مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ ... کی اس وردی کو اتار کے پھر سکندر بخت بن جاؤں اور وردی ... سنبھال کے رکھ لوں۔ تھانیدار اور ویٹر کی وردی حاضر اسٹاک ... میں دستیاب رہے گی تو وقتِ ضرورت کام آئے گی۔

میرا خیال تھا کہ رکشا لوں اور بازار سے گزرتے ہوئے ... اپنے سائز کا شلوار قمیص خرید لوں۔ لیکن میری مشکلات ... نہیں ہوئی تھیں۔ تانگا اسٹینڈ پر خوجی نے مجھے دیکھ لیا۔ ... اپنی ٹیم کو دو تانگوں میں فٹ کر چکے تھے اور خود پانچویں سوار ... طرح کھڑے رہ گئے تھے۔ جس کے لیے جگہ کہیں نہ تھی۔

”تانگے میں تو جگہ ہے نہیں پہلوان۔ گھوڑے پر بیٹھ ...“ کسی نے کہا اور میں ہنس پڑا۔ پلٹ کر دیکھتے ہی ہماری ... چار ہوئیں اور میں نے خود کو خوجی کی آتش فشاں نظروں ... دو فٹ کے فاصلے پر پایا۔ ان کے حلق سے ایک گھٹی ... چیخ نکلی: ”اے بدمعاش۔“ انھوں نے کہا جسے تانگے وا... نے اپنی بات کا ردِ عمل سمجھا۔

”... کسے کہا ہے بدمعاش پہلوان؟“ تانگے والا جا...

لے کر نیچے آیا۔ خوجی فیملی کی پروڈیوسر نے زنانہ گالیاں دینی شروع کر دی تھیں مگر میں وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ خوجی کو جارحیت پسند تانگے والے کی غلط فہمی دور کرنے اور اسے میرے بارے میں معلومات بہم پہنچانے میں جو چند منٹ لگے وہی میرے کام آئے۔ میں نے ایک موٹر سائیکل والے کو پان سگریٹ کی دکان کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کیا۔ انجن کو چلتا چھوڑ کے اترا اور جیب سے پرس نکال کے کچھ لینے کے لیے بڑھا۔ اس کے خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل اس کے بالکل پیچھے دو قدم دور کھڑی تھی اور اسے دو منٹ میں لوٹ آنا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور میدان صاف پا کے دوڑتے ہوئے موٹر سائیکل اٹھاتے ہی گیئر میں ڈال دی۔ نئی موٹر سائیکل کی پک اپ اچھی تھی مگر اس کے مالک کو فوراً علم ہو گیا تھا کہ موٹر سائیکل گئی۔ وہ میرے پیچھے بھاگا۔ موٹر سائیکل نے پورا ایکسیلریٹر دینے کے باوجود زیادہ اسپیڈ نہیں پکڑی تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ ایک بدحواس شخص سے ٹکرا گیا جو رکشا سے اترا تھا۔ شاید وہ لیٹ ہو گیا تھا اور اسے گاڑی نکل جانے کا ڈر تھا کہ اس نے بھی مخالف سمت میں دوڑ لگائی۔ ان کے باہمی تصادم نے مجھے اس آخری مشکل مرحلے سے کامیاب و کامران گزرنے کا موقع فراہم کیا۔

بہت سے لوگ ویٹر کی وردی میں ایک موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر خوش ہوئے اور یوں ہنسے جیسے سرکس میں لوگ جوکر کو موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے لگتے ہیں۔ موٹر سائیکل کو میں نے اطمینان سے ایک گلی میں چھوڑا اور وہاں سے تانگے میں بیٹھ گیا۔ کیا ایڈونچر تھا یہ مختصر سفر بھی۔ اپنی طرف سے میں نے بس کے سفر کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ٹرین کا انتخاب کیا تھا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب میاں خوجی کے علاوہ ان کے چند ہم سفر، باتھ روم سے دریافت ہونے والا بیہوش ویٹر اور وہ ویٹر جس نے پہچان لیا تھا کہ میں دو سو دس نمبر نہیں ہوں، ایک ٹکٹ کلکٹر، ایک تانگے والا اور ایک موٹر سائیکل والا میری جان کے دشمن تھے اور ان سب کی نظر میں میری حیثیت ایک مجرم کی تھی جسے وہ شناخت کر سکتے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ میں کسی بس میں بیٹھتا اور سیدھا لاہور آ کے اتر جاتا مگر جیسے گیدڑ کی شامت اسے شہر کی طرف لے جاتی ہے میری شامتِ اعمال مجھے ریلوے اسٹیشن لے گئی تھی۔ شلوار قمیص تو میں نے تانگہ ذرا سی دیر کے لیے رکوا کر خرید لیے مگر ان کو پہننے کی نہ جگہ تھی اور نہ فوری ضرورت۔

تانگے والے کو میں نے ”خوش“ کر کے ایک فرلانگ پہلے ہی رخصت کیا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے عبدالودود منظر کے گھر پہنچا۔ رابعہ کی گاڑی باہر موجود تھی۔ مجھے اس کے قبل از وقت پہنچ جانے سے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ اضطرابِ عشق نے اسے بہت پہلے کھینچ لیا تھا۔ محسن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا ورنہ دوسری کار بھی وہیں موجود ہوتی۔ گھنٹی کا بٹن دبانے کی کوشش میں مجھے کرنٹ لگا۔ میں نے زیرِ لب منظر کو گالی دے کر دروازہ بجایا۔

”کون ہے بے؟“ منظر نے ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کے کہا۔

”تمھارا باپ۔“ میں نے کہا۔ ”نمبر دو سو دس جسے دو سو بیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہے۔“

آواز پہچان کے منظر نے دروازہ کھولا اور گلا پھاڑ کے ہنسا: ”ابے بھوتنی کے۔ دو سو دس نمبر کی اولاد۔ آ گیا اپنی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اصل اوقات پر۔ چل اچھا ہوا کہیں نوکری سے تو لگا۔" اس نے میرے ایک دھپ مارا۔ میں نے اس کے دو ہاتھ مارے۔ "یہ خطے کی گھنٹی لگانے کا مقصد کیا ہے؟ اندر بھی" الیکٹرک چیئر رکھوا لے۔"

اسی وقت رابعہ نمودار ہوئی۔ حیران ہوئی۔ ہنسی اور شرمائی۔ میں نے پیشہ ور ویٹر کے انداز میں کہا۔ "آپ چائے پسند کریں گی میڈم یا کافی؟ اور اس کے ساتھ کیا کھائیں گی؟ بلا تکلف سے آپ کے اندر ستے ہے؟"

آدھے گھنٹے بعد جب میں نہا کے کپڑے بدل چکا تھا اور کافی کے ساتھ سینڈوچ کی پلیٹ صاف کر رہا تھا جو رابعہ نے بنائے تھے تو مجھے محسن کا خیال آیا۔ "معاف کیجیے گا بھوکے تو آپ لوگ بھی ہوں گے۔ مجھے خیال نہیں آیا پوچھنے کا۔ بڑی بداخلاقی کی بات ہے لیکن اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ شیروانی صاحب لیٹ کیوں ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ارے وہ سالا کون سا کم ہے۔" منظر نے کہا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔ بھاگ گیا وہ کار سمیت کسی کے ساتھ۔ ہمیں تو خیر کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا۔"

"یار منظر۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"شکاری کی اولاد۔ پولیس ریمانڈ پر ہیں آج کل۔" وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "سالے کی ضمانت بھی نہیں ہوئی۔"

"ضمانت کیوں۔ یار ایسے شریف آدمی نے کیا جرم کیا تھا؟" میں نے کہا۔

منظر نے پھر مجھے ایک دھپ رسید کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "اچھا پھنسایا ہے تم دونوں نے اسے۔ ادھر محسن نے وہ صندوق اندر اتروایا ادھر پولیس پہنچ گئی چوہدری صاحب کے گھر۔ بیگم صاحبہ نے بڑی خوشی سے صندوق رکھ لیا اور محسن تو خیر باہر سے ہی کھسک لیا تھا۔ وہ تانگے والا بھی چلا گیا تھا چوہدری صاحب پولیس کے ساتھ ساتھ ہی پہنچے۔ بس چند منٹ کا فرق تھا۔ اب وہاں بڑی گرما گرمی ہوئی۔ پولیس مصر تھی کہ اس میں لاش ہے۔ چوہدری دلاور بہت گرم ہوا کہ یہ کس الو کے پٹھے نے کہا ہے۔ وہ کوئی اکرام شیخ نائب انسپکٹر تھا۔ کہنے لگا کہ کسی پڑوسی نے سب کچھ دیکھ کر فون کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کی حالت غیر تھی کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی۔ میاں بیوی کا جھگڑا الگ شروع ہو گیا۔ چوہدری چلانے لگا کہ میرا نام لے کر کوئی ایٹم بم دے جائے تو لے لینا اور کر دینا تباہ اس گھر کو۔ پھر پولیس سے لڑنے لگا۔ اندر آئے کیسے؟ بے خانہ تلاشی کے وارنٹ ہیں؟ یہ گھر کا سامان ہے۔ اس نے کہا کہ یہ چھاپا مارا ہے ہم نے۔ وارنٹ بھی لے لیں گے لیکن اچھا ہے آپ صندوق کھول کر دکھا دیں۔ اس نے انکار کیا۔ شک تو تھا اسے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ انسپکٹر نے کہا پھر میں تمہیں اپنی ذمے داری پر گرفتار کر کے لے جاتا ہوں اور یہ صندوق بھی۔ اس کے ساتھ پولیس کی نفری تھی۔ دلاور کی پوزیشن بڑی خراب ہونے لگی۔ انسپکٹر اسے ہتھکڑی لگا کے لے جانے پر مصر تھا اور یہ بڑی بے عزتی کی بات تھی۔ صندوق میں کیا ہے یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو اندر لے جا کے بات کرنی چاہی۔ مقصد تھا کچھ دے دلا کے اسے رخصت کرے۔ اس نے دوسری فرد جرم عائد کرائی۔ چوہدری دلاور نے اس سے فون کرانے کی اور اس سے بات کرنے کی دھمکی دی مگر وہ انسپکٹر تو اینٹھ گیا کہ اب تو چاہے نوکری جائے یا پھانسی مجھے ہو جائے، میں یا تو صندوق کھول کے دیکھوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ چوہدری کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ صندوق کا تالا توڑے۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اندر سے کیا نکلے گا۔ نہ اسے یہ امید تھی کہ اکرام شیخ کے علاوہ بھی پولیس میں کتنی اکرام شیخ ہیں۔ تالا ٹوٹنے کے بعد اس پر ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش ہو گئی۔ دو تین ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے لاش قبضے میں لی اور دلاور کو اٹھا کر لے گئے۔ ہارٹ اٹیک کو انھوں نے صاف مکر قرار دیا۔ اتنے بڑے جھوٹ کے بعد وہ دلاور کی کوئی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ بچ گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو تھانے میں آ کر دیکھا تھا۔"

"اس نے اسپتال بھیجنے کی سفارش نہیں کی؟" میں نے کہا۔

"کی تھی لیکن وہ سرکاری ڈاکٹر نہیں تھا۔" منظر بولا۔ "دلاور کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ پھر دلاور ٹھیک ہو گیا اور اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو گئی۔ خاصے سنگین الزامات عائد ہو گئے اس پر۔ مزید یہ کہ اس کی شریک حیات کا نام چشم دید گواہوں میں آ گیا۔ اس کے اپنے ڈرائیور اور خانساماں کے ناموں کے علاوہ۔ اس نے نائب کے وکیل کیے ہیں۔ چودہ دن کا ریمانڈ ختم ہو گا تو ضمانت ہو گی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے جوش سے ہاتھ مل کے کہا۔ "پوائنٹس برابر ہوتے جا رہے ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ حسب عادت منظر نے پردہ ہٹا کے جھانکا اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں نے دیکھا تو دروازے پر محسن کھڑا تھا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔

اُس کے ساتھ ڈاکیے کی وردی میں شوفر کی خدمات بجا لانے والا وہ ٹرک ڈرائیور بھی تھا جو پہلے ہمارے نکتۂ نظر سے صفِ دشمناں میں شامل تھا اور اب ہم سے مل گیا تھا۔ وہ بھی اس کی مجبوری تھی اور یہ بھی مگر خود اپنی نظر میں وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا جو نہ گھر کا رہے نہ گھاٹ کا۔ تقدیر بھی آدمی کے ساتھ کیسے مذاق کرتی ہے۔ طافو صرف ایک ہزار روپے ماہانہ پر ٹرک چلا کے لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں ٹرک ڈرائیوروں کی طرح جو مال برداری کے سوا کچھ نہیں کرتے اور یہ مال کسی بھی اعتبار سے ناجائز نہیں ہوتا۔ وہ ایک بہت بڑے قانون شکن گروہ کا آلۂ کار تھا لیکن یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ پھر اچانک حرص و طمع سے گمراہ ہو جانے والے رحمت کباڑی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ مال حرام میں برابر کا شریک بن جائے۔ وہ انکار کرتا تب بھی مارا جاتا۔ شریک جرم ہو جانے کے بعد بھی اسے سزائے موت ہی ملی۔ اوپر والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحمت کباڑی نے اور اس ٹرک ڈرائیور نے مل کر دس لاکھ کے مال کو خورد برد کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے انھوں نے دونوں کے لیے موت کا فرمان جاری کر دیا تھا مگر قدرت کی طرف سے اپنے انجام کو وہ پہنچا جو اصل مجرم تھا اور اس سزا کا مستحق تھا۔ طافو کو پانچ لاکھ کے عوض اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی گروی رکھنا منظور نہ تھا اور وہ جینے کی آرزو میں ہمارا سہارا پا کے نئی امید کے ساتھ جدوجہد کر رہا تھا۔

طافو بہت تھکا ہوا اور پژمردہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور میں نے حیرت و مسرت کے ساتھ ہاتھ ملا کے اسے اندر کھینچ لیا۔ "میں تو سمجھا تھا تم کھو گئے۔" میں نے کہا۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"میں نے نہیں ناکے سے گزر کر آپ کا بہت دیر تک انتظار کیا۔" وہ بولا۔ "پھر میں نے فائرنگ کی آواز سنی اور بہتر یہی سمجھا کہ گاڑی لے کر نکل جاؤں۔ گاڑی میں نے سڑک کے کنارے محفوظ جگہ پر چھوڑ دی تھی اور ملتان چلا گیا تھا۔"

"تمھیں مجھ سے زیادہ گاڑی کی فکر تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ تو کبھی نہ کسی طرح ملتان پہنچ جائیں گے۔" وہ بولا۔ "گاڑی پکڑی جاتی تو میرے لیے بھی مشکل پیدا ہوتی اور آپ کے لیے بھی پریشانی میں اضافہ ہوتا۔ کیا میں نے غلط کیا جناب؟"

"نہیں۔ تم نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو اس وقت گاڑی کے ساتھ یہاں نہ پہنچ پاتے۔" میں نے کہا۔ "میں تو واقعی ملتان پہنچ گیا تھا۔ تم نے گاڑی کو پھر کیسے تلاش کر لیا؟"

"بس جی میرا خیال تھا کہ آپ اگر ملتان گئے تو اچھے ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے۔" وہ بولا۔ "میں نے ساری رات تمام فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں دیکھا مگر گاڑی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں مایوس ہو کے واپس لوٹ رہا تھا کہ گاڑی ایک سینما کے سامنے مل گئی۔ میں دور کھڑا دیکھتا رہا۔ تین گھنٹے بعد میں نے محسن صاحب کو دیکھا۔ یہ گاڑی لے جانے کے لیے آئے تھے میرے سامنے سے گزرے تو میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انھوں نے پہچان لیا۔"

"تم رات بھر مجھے تلاش کرتے رہے تو یقیناً سوئے نہیں ہو گے۔" میں نے کہا۔

"بس جی۔ فکر ہو تو نیند بھی کہاں آتی ہے۔" وہ بولا۔ "اپنا ڈر تھا۔ بیوی بچوں کا خیال تھا اور آپ کی طرف سے تشویش تھی۔ محسن صاحب نے بتایا کہ سب ٹھیک ہے تو تسلی ہوئی۔ راستے میں پلک جھپکی تھی کہ لاہور آ گیا۔"

"اچھا۔ اب تم نہا دھو کے کپڑے بدلو۔" میں نے کہا۔ "یہ ڈاکیے کی وردی اتار دو۔ کچھ کھا پی کے آرام کر لو۔ کل دیکھیں گے کہ تمہیں اور تمہارے خاندان کو بحفاظت کہاں منتقل کیا جائے اور کیسے؟"

منظر نے اور رابعہ نے یہ سب گفتگو خاموشی سے اور توجہ سے سنی تھی۔ محسن کو ڈرائیونگ نے تھکا دیا تھا اور وہ جوتوں سمیت صوفے پر دراز تھا لیکن سویا نہیں تھا محض آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ طافو کی نظر بار بار منظر اور رابعہ کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھتی تھی۔

"یہ اپنے دوست ہیں طافو۔" میں نے کہا۔ "بہت بڑے اور قابل وکیل ہیں۔ یہ منظر صاحب تو تم کو بھی نظر آ رہے ہوں گے کہ کتنے بڑے ہیں اور یہ قانونی۔۔۔۔"

"یہ بہت قابل وکیلن ہیں۔" محسن نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "مگر ان کی قابلیت کے اور ان کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے بڑی متانت سے بات کی تھی لیکن طافو کیا سمجھتا۔ رابعہ کا رنگ گلابی ہوا اور اُس نے گھور کر محسن کی طرف دیکھا لیکن وہ مزے سے لیٹا ٹانگ ہلاتا رہا۔ پھر منظر نے "ہوہو ہو" کرکے ہنسنا شروع کیا تو رابعہ مزید خفیف ہوئی لیکن محسن کی سنجیدگی میں فرق نہیں آیا۔

"یار منظر" میں نے کہا۔ "یہ اپنے ساتھی ہیں، ان کے نہانے دھونے کا اور قیام و طعام کا کچھ انتظام کر۔۔۔ اس پوسٹ مین کی وردی کی جگہ اگر شریفانہ کپڑے مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"شریفانہ کیا۔۔۔ اپنے کفن ہیں جو ہم تیری خاطر سر سے باندھے پھرتے ہیں ۔۔۔۔" منظر بولا۔ "اسی سے یہ بھی گزارا کر سکتے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔۔۔ آئیے جناب۔"

وہ طافو کو اندر لے گیا۔

میں نے جوتا اتارا۔ "نورِ چشمی! تمھاری زبان کے بریک فیل کیوں ہو جاتے ہیں بے موقع؟" اور جوتا کھینچ کر اس کی طرف پھینکا مگر وہ بڑی پھرتی سے اٹھ بیٹھا اور بچ گیا۔

"خاتون! دیکھ رہی ہیں یہ لاقانونیت؟" وہ چلّایا۔ "آپ کی نظروں کے سامنے ہو رہی ہے یہ دست درازی۔۔۔ میں اس قاتلانہ حملے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔" اُس نے جوتا اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر سے کسی کے ملکٹر مچانے کی آواز آئی۔ میں کھڑکی کی طرف دوڑا۔

"مار دیا جوتا اپنے ماموں کو؟" میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر کہا۔ "آ رہے ہیں وہ جوابی کارروائی کے لیے۔۔۔ جا اُن سے جوتا وصول کر۔"

"جس کا جوتا اسی کا سر۔" محسن نے کہا اور اپنے دونوں جوتے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ دروازہ کھولتے ہی میری نگاہ ایک پہلوان ٹائپ شخص پر پڑی جس کی شخصیت کا سب سے نمایاں حصّہ مونچھیں اور پیٹ تھا۔

"بھوے پہلوان کے سر پر جوتا رسید کرنے کی جرأت کس نے کی ہے؟" وہ جوتا اٹھا کے پھنکارنے لگا۔ اپنے جسم کے مقابلے میں پہلوان کی آواز مضحکہ خیز حد تک نسوانی تھی لیکن میں نے ہنسی کو ضبط کیا۔

"ایسی جرأت کون کرسکتا ہے پہلوان جی!" میں نے مسکینی سے کہا۔ "بچے نے غلطی سے باہر پھینک دیا۔"

"کس کا بچہ تھا اور جوتا کس کا تھا؟" پہلوان نے جوتا دیوار پر مار کر کہا۔ "تمھارا؟"

"توبہ توبہ۔۔۔ میں تو ابھی خود بچہ ہوں پہلوان جی! وہ بہنوئی ہے میرا۔" میں نے کہا۔ "تھانیدار ہے نا، اس لیے بچے کو عادت پڑ گئی ہے۔۔۔ شرفاء کو جوتے مارنے کی۔۔۔ جوتا بے شک میرا ہے۔"

پہلوان کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔

"بھانجے اور جوتے کو سنبھال کے رکھو۔" اُس نے جوتا مجھے تھما کر کہا۔ عین اس وقت جب پہلوان واپس جانے کے لیے مڑا اور میں نے دروازہ بند کیا، ایک جیپ دروازے کے سامنے آ رکی۔ درز میں سے مجھے انکل رضوی کا چہرہ نظر آیا جو پوری وردی میں تھے اور اپنے ساتھ پولیس کی نفری بھی لائے تھے۔ میں واپس بھاگا۔ اُن کے یوں آنے کا مقصد میری گرفتاری کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا لیکن میں حیران تھا کہ انھیں منظر کے گھر میں میری موجودگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟ یہ فرض کرنا محال تھا کہ گھر کے کسی فرد نے انھیں فون پر مطلع کردیا ہوگا۔ شاید مجھے کسی نے یہاں آتے ہوئے دیکھا اور پہچان کر پولیس کو خبر کر دی۔ اس وقت یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی، چند سیکنڈ میں میں اندر جا پہنچا۔

"محسن! انکل رضوی نے میری گرفتاری کے لیے چھاپا مارا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن ایک دم کھڑا ہو گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ بُت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

"وہ۔۔۔۔ وہ یہاں کیسے آ پہنچے؟" محسن نے کھڑکی بند کر دی۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔ لیکن میں اس وقت گرفتار ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے کہا۔ "باہر جو گاڑی کھڑی ہے وہ ڈاکٹر امجد کے نام پر رجسٹرڈ ہے، اسے میں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"لیکن۔۔۔ کہاں؟" رابعہ نے گھبرا کے کہا۔ اللہ کال بیل بجنے لگی۔

"میں۔۔۔ اب دروازے سے تو نکل نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ اسی وقت منظر نمودار ہوا۔

"منظر! باہر انکل رضوی اپنی پولیس فورس کے ساتھ کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے گرفتار کرنے کے لیے۔"

"پھر کیا ہوا؟" وہ بولا۔ "کھڑا رہنے دے۔۔۔ ایک وکیل کا گھر ہے۔ منڈا لاٹ بھی وارنٹ کے بغیر اندر نہیں آ سکتا۔"

"یار، انکل رضوی بے وقوف نہیں ہیں، وہ کھٹ سے وارنٹ نکال کے دکھا دیں گے۔" میں نے گھبرا کے کہا کیونکہ کال بیل اب مسلسل بج رہی تھی۔ "تو جا کے انھیں روک، میں اندر سے ہو کے چھت پر چلا جاتا ہوں۔۔۔ اور ساتھ والے گھر میں اُترنے کی کوشش کرتا ہوں، راستہ ہے نا؟"

"راستہ تو ہے۔" منظر بولا۔ "مگر بھوتنی کے یہ ایک اور مصیبت نہ بن جائے گی۔ وہ گلی کا محاصرہ کریں گے۔"

"تو جا دروازہ کھول۔" میں نے کہا۔ "اور محسن! طافو پر آنچ نہ آنے دینا۔ گھر کا نوکر ہے۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

میں نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا اور غائب ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا، منظر کی بیوی پردہ کرتی ہے اور میں نے کبھی منظر کے گھر کے اندر کا نقشہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک کمرے سے گزرتے ہی میری نظر نے منظر کی بیوی کو دیکھا جو ہاتھ میں لوٹا لیے کھڑی تھی۔ مجھے یوں شترِ بے مہار کی طرح اندر آتے دیکھ کر وہ اتنی حیران ہوئی کہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دوپٹے سے منہ چھپا کے اندر بھاگی۔ زینہ اچانک صحن کے دوسرے کنارے پر میرے سامنے آگیا۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ منظر کی اولاد کا ہجوم میری راہ میں حائل نہیں ہوا۔ ان کو خبر ہونے تک میں زینے کے راستے چھت پر پہنچ چکا تھا۔ چھت پر وہ سب رنگ برنگے زنانہ اور مردانہ کپڑے لہرا رہے تھے۔ جو منظر کی زوجہ نے دھو کر سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلائے تھے۔ میں ان کے نیچے سے گزرا اور چھت کی منڈیر تک پہنچا۔ ایک طرف تین منزلہ مکان کی سیدھی دیوار کھڑی تھی۔ پچھلے حصے میں دوسری قلعہ نما عمارت کھڑی تھی چنانچہ میرے لیے فرار کا راستہ صرف ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے چھ فٹ کی دیوار کو دونوں ہاتھوں کے بل پر عبور کیا اور دوسری طرف کی چھت پر گرا۔ منظر کے گھر کی چھت بارہ فٹ بلند تھی مگر ساتھ والے گھر کی اونچائی دس فٹ تھی چنانچہ میں آٹھ فٹ نیچے کودا تو دھماکے سے چھت میں گونج اور لرزش پیدا ہوئی۔ اپنی ناجائز تشریف آوری کا اعلان میں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ "ارے کون کم بخت ہے چھت پر؟" نیچے سے کسی عورت نے چلّا کر کہا۔ "اجی ذرا دیکھنا۔"

میں کھٹ کھٹ کرتا نیچے اُتر گیا جیسے میں نے کوئی غیر انسانی حرکت نہیں کی اور یہ کسی اجنبی کا نہیں میرے ماموں کا گھر ہے۔ خستہ زینے سے نیچے قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک مختصر سے صحن میں پایا۔ اتنی دیر میں اہلِ خانہ کے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ خلائی مخلوق کی اڑن طشتری چھت پر نہیں اُتری ہے تو کسی چور ڈاکو نے یقیناً دھاوا بولا ہے۔ خاتونِ خانہ اپنے خداوندِ مجازی کو پہلے ہی متوجہ کر چکی تھیں اور اب صحن میں میرے مقابل تین افراد تھے۔ ایک ساٹھ ستر سال کی بڑھیا جو خشک ہو کے چمڑا بن گئی تھی۔ ایک نسبتاً جوان اور فربہ بدن عورت جو بڑھیا کی بہو اور بیٹی ہو سکتی تھی اور ایک بانس کی طرح لمبا پتلا مرد جو مذکورہ بڑھیا کا بیٹا یا داماد تھا۔

"کو۔۔۔ کون ہے۔ بے تو؟" مرد نے کہا جسے زوجہ محترمہ نے کپڑے دھونے کا ڈنڈا پکڑا کے مسلح کر دیا تھا۔ بڑھیا نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ "خبردار۔ کسی کے حلق سے آواز نکلی تو حلق میں سوراخ کر دوں گا۔" میں نے پنجابی فلموں کے ولن کی طرح آواز کو خطرناک بنا کے کہا۔ بڑھیا کا منہ بند ہو گیا اور وہ پُشت سے نیچے گری مگر جوان عورت نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ بہو ہے۔

"اماں۔۔۔" مرد چلّایا، پھر اس نے گھور کر بیوی کو دیکھا۔ "ارے دیکھ اماں کو۔۔۔ مر تو نہیں گئیں۔"

"اونہہ۔۔۔ روز مرنے کی دھمکی دیتی ہیں۔۔۔ مرتی کہاں ہیں۔۔۔" عورت نے منہ بنا کر کہا اور بڑھیا کو اُٹھانے کے لیے بڑھی۔

"تم کیا چاہتے ہو ڈاکو صاحب!" مرد مجھ سے مخاطب ہوا۔ اُس نے ریوالور سے نظریں چراتے ہوئے اپنے جسم کی کپکپی اور آواز کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ "قسم اللہ کی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "شریف آدمی ہوں۔"

"اچھا!" مرد بھونچکا رہ گیا۔ "یہ بات اگر تم زبردستی منوانا چاہتے ہو تو الگ بات ہے۔۔۔۔"

"میں کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لیے پناہ چاہیے کیونکہ میرے پیچھے کچھ دشمن لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے جاتے ہی میں بھی چلا جاؤں گا۔"

"تم وکیل صاحب کے گھر سے اِدھر آئے ہو؟ ہائی جمپ لگا کے؟" وہ بولا۔

"میں۔۔۔ اُن کو نہیں جانتا۔ وہاں بھی ایسے ہی گھسا تھا۔" میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں منظر پر کوئی الزام آئے تو ہمسایہ اس کے خلاف ایک گواہ بن جائے۔

"پھر تو تم واقعی شریف آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "ابھی میں دروازے سے جھانک رہا تھا اور میں نے پولیس کو آتے دیکھا تھا۔ اگر وہی تمھارے دشمن ہیں تو تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، تمھاری شرافت ثابت ہے۔"

"اچھا میں بدمعاش ہوں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اب تمھاری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

خیریت اِسی میں ہے کہ جو میں کہوں وہی کرو۔ اپنی بیوی سے کہو کہ ساس کو اندر لے جائے اور اسے فی الحال بے ہوش رہنے دے ——— تم آگے چلو۔ مجھے بتاؤ کہ ضرورت پڑنے پر میں کس طرف سے باہر جاسکتا ہوں؟"

"باہر جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ گلی میں کھلتا ہے اور گلی میں پولیس کھڑی ہے۔"

"پھر میں پولیس کے واپس جانے کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"لیکن پولیس یہاں بھی آسکتی ہے۔ تمہارے ساتھ وہ مجھے بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔" اُس نے مُردہ آواز میں کہا۔

"نہیں۔ وہ تمہارے گھر کا محاصرہ کر سکتے ہیں، اندر نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا۔ "اُن کے پاس وارنٹ نہیں ہو گا۔"

"اجی کیا بات کرتے ہیں آپ۔ پولیس کہاں پروا کرتی ہے وارنٹ کی۔" وہ بولا۔

"مگر جو پولیس افسر چھاپا مارنے... میرا مطلب ہے، پولیس کی نفری کے ساتھ آیا ہے وہ بہت اصول پرست اور شریف آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ تنومند بہو اپنی ازلی دشمن ساس کو اُٹھا کے اندر لے گئی۔ زیرِ لب مجھے یا ساس کو کوستی ہوئی۔

"ہاں ہاں۔ ایک تم شریف آدمی ہو، ایک وہ شریف ہیں جیسی رُوح ویسے فرشتے۔" وہ بولا۔ "مارا جاؤں گا میں غریب آدمی ادھر سے تم گولی مارو گے اُدھر سے پولیس۔ آگے کنواں پیچھے خندق۔"

"اندر چلو۔" میں نے غرّا کر کہا اور ریوالور لہرایا۔ وہ خاموش ہو کے اندر چل پڑا۔

"بات سنو جی۔" دروازے کی اوٹ سے خاتونِ خانہ نے پکار کے کہا۔ میں اُن کے شوہر کے ساتھ اندر داخل ہوا اور خاتون نے مجھے گھُورا۔ "اجی ایک منٹ بات تو کرنے دیں۔ میاں بیوی کی بات ہے۔" اُس نے کوئی چیز پیچھے چھپائی۔

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "میں دُور کھڑا ہو جاتا ہوں۔ جو کہنا ہے آہستہ سے کان میں کہہ دو۔ ویسے میں بھی بہرا ہوں۔"

میں نے کمرے کے دُوسرے گوشے سے میاں بیوی کو زد میں رکھا اور بڑی بی کو دیکھا جو مسہری نما پلنگ پر سیدھی لیٹی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس ٹھیک چل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ بڑی بی مکر کر رہی ہیں اور بے ہوشی کو صرف تحفظ و سلامتی کی خاطر چھتری بنائے لیٹی ہیں۔

"کون سکندر بخت؟" صاحبِ خانہ نے اچانک بلند آواز میں کہا اور اپنے احمق ہونے کا ثبوت دیا۔ بیوی نے دیکھا کہ تیر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں اپنا نام سُن کر چونک پڑا تھا اور وہ دونوں مجرم بنے سہمے کھڑے تھے۔

"تو تمہیں پہچان لیا ہے تمہاری بیوی نے۔" میں نے ریوالور اٹھایا۔

"وہ... دیکھیں۔ یہ عورت فاترالعقل ہے۔" مرد چلّانے لگا۔ "بہت چالاک بنتی ہے۔ معاف کر دیں اس بے وقوف کو۔"

"بے وقوف تم ہو۔" میں نے آہستہ سے بات کی تھی۔ "کیا ضرورت تھی چلّانے کی۔" بیوی نے جھاڑ اس کے سر پر دے مارا۔

"اب تمہارے بچنے کی صُورت نہیں رہی۔" میں نے ریوالور کو ذرا سا اُچھال کے گھمایا اور بڑی مہارت کے ساتھ پھر سیدھا تھام لیا۔ "ویسٹرن فلموں کے کاؤبوائے کی طرح۔" "تم سب جانتے ہو۔ اخبار میں میری تصویر دیکھ چکے ہو۔ اچھا ہوا مجھے بروقت معلوم ہو گیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ تم میرے خلاف پولیس کو بیان دیتے۔"

"نہیں نہیں... قسم اللہ کی۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے کسی سے۔" عورت نے رونا شروع کر دیا۔ اسی وقت انکل رضوی نے میگا فون پر بولنا شروع کیا۔

"سکندر ——— میں تم کو دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔ تم فرار ہو کے کہیں نہیں جاسکتے۔ پولیس نے ہر طرف سے گلی بند کر دی ہے۔" انکل رضوی کی آواز میرے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی جیسے وہ یرغمالی میاں بیوی بھی سُن رہے تھے۔ میرا ذہن صورتِ حال کی اس ڈرامائی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے مصروف تھا۔ انکل رضوی کی وارننگ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ انہیں میری جائے پناہ کا علم ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے آئے ہوں اور منظر نے انہیں گھر میں داخل نہ ہونے دیا ہو۔ انہیں منظر کے گھر میں میری موجودگی کا یقین نہ ہوتا تو وہ اتنی تیاری کے ساتھ گرفتار کرنے نہ آتے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ منظر کے گھر میں تلاش کرنے کے بعد ناکام ہو کے اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ میں چھت سے ساتھ والے گھر میں اُتر گیا۔ میں کوئی جن بھوت نہیں تھا کہ غائب ہو جاؤں یا مکھی بن کے اُڑ جاؤں۔ وہ ذہین آدمی تھے اور مجھے گھر میں نہ پا کے انھوں نے فرار کے امکانات کا جائزہ لیا ہو گا۔ اسی نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ میں اور کہیں نہیں جاسکتا۔ اس گھر سے نکلنے کا راستہ صرف ایک تھا جو اُن کی نظر میں تھا اور وہ جانتے تھے کہ میں اس راستے سے باہر نہیں گیا۔ میں کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ مجھے منظر کے گھر سے باہر آنے کا حکم دے رہے تھے تو دُوسرے گھر سے نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وہ جانتے تھے کہ میں ساتھ والے گھر سے نکل آؤں تو مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ ہتھیار ڈالنے کا مطلب میرے لیے صرف شکست نہیں تھا، میری ساری جدوجہد کا خاتمہ تھا، میرے تمام مقاصد کی ناکامی تھا اور ان عزائم سے دستبرداری تھا جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز تھے۔

خود کو قانون کے حوالے کر دیتا تو فتح مند وہ شکاری کہلاتے جو مجھے شکار کرنے کے لیے گھیر کر ولایت سے پاکستان لے آئے تھے۔ میرے گرد سازشوں کے جال پھیلاتے رہے تھے لو، مجھے ہر طرف سے محصُور کرتے رہے تھے۔ ابھی تک مقابلہ برابر تھا۔ شکاری خود بھی شکار ہوئے تھے اور جانی و مالی اعتبار سے اُن کے نقصانات بھی کم نہ تھے ——— میں اپنی منحد قوت، اپنی اجتماعی طاقت اور اپنی دولت سے حاصل ہونے والی حمایت پر جتنا غرور پہلے تھا، اتنا اب نہیں رہا تھا۔ انھوں نے تو مجھے تنہا جانا تھا اور بہت کمزور حریف سمجھا تھا۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے نہ طاقت کے بل پر دبا سکیں گے اور نہ میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے شکار کر سکیں گے۔ جیسے وہ ایک ناتجربے کار، کھلنڈرا اور کم عمر لونڈا سمجھے تھے، وہ اُن کی ٹکر کا حریف بن گیا تھا جس کے ہاتھوں انھیں پے در پے ہزیمت کا سامنا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ سب میرے باپ کو بلیک میل کر کے قتل کرا چکے تھے، اس کے جائز کاروبار کی آڑ میں اپنا مذموم غیر قانونی کاروبار کر رہے تھے اور اپنے جرم پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اور افشائے راز سے بچنے کے لیے اَن گنت بے گناہوں کے خون سے اپنا دامن تر رکھتے تھے ——— دُنیا کی نظر میں معزز، معتبر اور بے گناہ تھے کیونکہ اس نظامِ انصاف کے لیے انھوں نے اپنے خلاف ہر ثبوت کو اور ہر شہادت کو باقی نہ رہنے دیا تھا اور میں جو مظلوم تھا، انصاف چاہتا تھا، اپنا حق مانگتا تھا آج اس مقام پر تھا جہاں انصاف کی نظر میں میری حیثیت ایک مفرور اور اشتہاری مجرم کی تھی جس کی فردِ جرم میں اتنے الزامات تھے کہ اگر میں اپنا معاملہ انصاف کے سپرد کرتا تو اپنے خلاف موجود شہادتوں اور گواہوں کے طفیل حق اور انصاف ملنے سے پہلے سزائے موت پاتا۔ حالات آج اس حد تک میرے خلاف ہو چکے تھے کہ اپنے بھی اپنے نہ رہے تھے، شکاری بن گئے تھے۔ شکاری اب چوہدری دلاور جیسے دشمن ہی نہیں تھے، پولیس بھی تھی۔ سرکاری وہ قانون بھی تھا جو آنکھ سے نظر آنے والے ثبوت اور شہادت و واقعات کی بنا پر مجھے مجرم گردانتا تھا۔ شکاری سارا معاشرہ تھا جن کی آنکھ نے میری صُورت کو دیوار پر چسپاں اشتہاروں میں دیکھا تھا اور اخبارات میں دیکھا تھا۔ شکاری وہ سب لوگ تھے جو قانون کے ساتھ تھے اور مجھے گرفتار کرا دینے پر مستعد تھے ——— بس جانتے تھے کہ حقیقت کیا ہے اور صرف سکندر بخت کا چہرہ پہچانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ پولیس کو قتل و خونریزی، ڈکیتی و اغوا، رہزنی اور دھوکا دہی کے متعدد مقدمات میں مطلوب ہے۔ لیکن اب وہ گنے چُنے افراد نہیں رہے تھے جنھوں نے وزیر خان کی کمپنی کو میرو ویرا اینڈ کمپنی بنایا اور پھر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کر دیا۔

یہ صرف نام کی تبدیلی نہیں تھی، اس تبدیلی نے حق دار سے حق چھین لیا تھا۔ مالک کو مجبور بنا دیا تھا اور جائز کو ناجائز کر دیا تھا ——— جو غاصب تھے وہ ظلم و استبداد سے سیاہ کو سفید ثابت کر چکے تھے۔ اب سیاہ و سفید کے مالک تھے اور حقداروں سے جینے کا حق تک چھین لینا چاہتے تھے۔

انکل رضوی نے نہیں، ایس ایس پی خان رضوی نے ایک مجرم کو دس منٹ کی مہلت دی تھی۔ یہ دس منٹ زندگی اور موت کی سرحدوں کے درمیان نو مین لینڈ کی طرح تھے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جہاں اندھا انصاف میزانِ عدل لیے تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ چاہو تو اس حد سے گزر جاؤ جس کے بعد کوئی نہیں۔ وقت کا ہر لمحہ صدا دینے لگا۔ "فیصلہ کرو سکندر! تم اس دنیا کے نظامِ انصاف کو قبول کرتے ہو؟ اس میں تمہیں مجرم پہلے بنایا جائے گا، طالبِ انصاف بعد میں۔ سزا پہلے ملے گی حق بعد میں ملے گا۔ بشرطیکہ تم کو فرصتِ زندگی ملی اور تم ثابت بھی کر سکے کہ تم حقدار تھے اور ناانصافی تمہارے ساتھ ہوئی تھی اور بشرطیکہ تم وزیر خاں، سلامت شاہ، فومانچو۔ اس کی مفلوج بیوی اور بیٹے، رابعہ کی ماں اور شہلا کی ماں اور اُن سب کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے پیش کر سکے جو سچ کو جانتے تھے۔ چنانچہ آج اپنی قبروں میں ڈھانچے سنبھالے منتظرِ یومِ مکافات ہیں۔ مگر ہے کہاں یومِ مکافات اے خدائے دادگیر! فیصلہ تو آج کرنا ہے۔ چنانچہ سکندر بخت! تم یہ بھی کر سکتے ہو کہ اس نظامِ انصاف کو مسترد کر دو۔ لو! اپنی آگہی، اپنے شعور اور اپنی سچائی کو بنیاد بنا کے خود اپنا انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنا نظامِ انصاف بنا لو۔ اپنے ضمیر کو اپنی عدالت جانو۔ اور اس عدالت میں اپنے ضمیر ہی کو منصف کرو۔ تم جانتے ہو مجرم کون ہیں اور ان کی فردِ جرم میں کیا کچھ ہے۔ کیا تم اُن کو جو سزا دو گے غلط ہو گی؟ وہ اس کے مستحق ہیں مگر وہ جھوٹ اور مکر و فریب اور بے ضمیری کے غیر انسانی اور شیطانی لبادے پہنے آج کے دن کی سزا سے محفوظ ہیں اور یومِ حساب کی سزا کے خوف سے بیگانہ ہیں۔ قصور انصاف کرنے والوں کا نہیں اور انصاف کا نہیں۔ اس پورے نظام کا ہے جس میں سارے فیصلے ظاہر کی آنکھ کرتی ہے۔

انکل رضوی قانون کی آواز بن گئے تھے اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ چیختا چلّاتا، فریاد کرتا، بے رحم سفاک اور خونی وقت، وہی وقت جو دستِ اجل کے نذرانے لے کر گزر گیا تھا۔ جو ستم کشوں کا وقت نہ تھا، بے دادگروں کا وقت تھا۔ اندھا وقت جس نے بے گناہوں کو نہ پہچانا۔ حق سے محروم ہو جانے والوں کا ساتھ نہ دیا۔ اب وہ دل سے انصاف کا اور انتقام کا طلب گار تھا تو عقل سے تقاضا کرتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا کہ میں دس منٹ کے چھ سو سیکنڈ لمبے پُل صراط پر گزرنے سے پہلے ہتھیار پھینک دوں اور کوئی حق رسی کا خوں بہا اور کوئی انصاف نہ مانگوں اور سزا و جزا کو اس کل پر اٹھا رکھوں جس کے بعد کوئی کل نہیں۔ یا میں بھی سارے اصُول، اخلاق کے معیار اور قانون کے تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کے وہی شکاری بن جاؤں، جو آج کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا نام چوہدری دلاور ہو یا سکندر بخت، فنا و بقا کی جنگ میں نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میدانِ جنگ میں اپنے مقابل آنے والے کا صرف ایک نام ہوتا ہے — دشمن — یہ کون پوچھتا ہے کہ تم کون ہو، کس کے بیٹے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ اس جنگ میں کیوں شریک ہو؟ میرے ہاتھوں کیوں مرنا چاہتے ہو؟ اور مجھے قتل کرنے آئے ہو تو کیوں؟ تمھارے اور میرے درمیان تو اختلاف نہ تھا اور نہ ہے مگر ان سب سوالات کا جواب مانگے بغیر پہلے گولی چلانے والا زندہ رہتا ہے۔ مانگنے والوں کو جینے کا حق کون دیتا ہے — یہ حق تو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ وہ جو شکار ہوئے، یہ بات سمجھتے تو اس بے کسی کے ساتھ نہ مرتے۔

"سکندر — دس منٹ پورے ہونے والے ہیں۔" ایس ایس پی ضامن رضوی کی آواز آئی۔ "تمھارے لیے ایک منٹ — صرف ایک منٹ اور ہے۔" ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سامنے وہ میاں بیوی بُت بنے کھڑے تھے۔ یہ بے یقینی ان کے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی کہ اس ڈرامے کا انجام کیا ہوگا۔ جس کی کاسٹ میں انھیں یوں زبردستی شامل ہونا پڑا تھا کہ وہ خود ہی تماشا تھے اور خود ہی تماشائی۔ بڑھیا ویسے ہی لیٹی تھی اور بہو مسلسل رو رہی تھی۔

"ارے بھائی! خدا کے واسطے کچھ تو جواب دو انھیں۔" مرد نے ہمت کر کے کہا۔ "یہ لوگ مہلت ختم ہونے کے بعد دھائیں سے اندر گولا پھینک دیتے ہیں۔ گولی مار دیتے ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "یہ بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ فرض کرو مجھے نکلنا ہو۔"

"ہم... ہم کیا کر سکتے ہیں۔ باہر وہ بندوق تانے کھڑے ہیں۔" مرد نے بیوی کی طرف دیکھا جو اب بے ہوش ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ "اندر تم نے ریوالور نکال رکھا ہے۔ میری ماں مر جائے گی، بچے اسکول سے آنے والے ہیں۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں خود کو آسانی سے پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ اس کشت و خون میں کچھ بھی ہو جائے میں ذمے دار نہیں — مجھے اپنی جان بچانی ہے۔"

"سنو جی! اسے اِدھر سے نکال دو۔" بیوی نے روتے روتے اچانک میاں کے کان میں کچھ کہا۔

میاں نے سر ہلایا۔ "ایک راستہ... اگر بنا سکتے ہو۔ ویسے گزرنا مشکل ہے تمھارا... پیچھے والا گھر اس کے بھائی کا ہے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جو پہلے کھلی رہتی تھی مگر میرے گھر کا مال اِدھر سے اُدھر اسمگل ہوتا رہتا تھا اس لیے میں نے بند کرا دی۔ کھڑکی کے تختے کیلوں سے ٹھوک دیے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ انکل رضوی نے حکم دیا کہ قانون کے نام پر دروازہ کھول دیا جائے۔ میں نے مرد کو بازو پکڑ کے گھسیٹا۔ "اتنی دیر میں عقل آ گئی تھیں۔ کدھر ہے وہ کھڑکی؟ تمھارا سالا شور ہنگامہ تو نہیں کرے گا؟" گھر کا دروازہ اب بج رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھاگا اور مجھے پچھلے حصے میں لے گیا۔

"اپنی بیوی سے کہو دروازے پر جا کے مہلت کرے۔" میں نے کہا۔ "انھیں کچھ دیر روکے..." عورت نے میری بات سمجھ لی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ کر دروازے کی طرف گئی۔

"میرا سالا اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔" مرد نے کہا۔ "اس کی بیوی بھی میکے میں ہے۔ گھر بند ہوگا۔"

"اُدھر باہر جانے کا راستہ ہوگا؟" میں نے کہا اور اس کھڑکی کو دیکھا جو مشکل سے ڈیڑھ فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی تھی۔ اس میں چوڑائی کے رُخ چار چار انچ چوڑی اور آدھا انچ موٹی لکڑی کے تختے جڑ دیے گئے تھے۔ دونوں جانب کی دہلیز میں لگی ہوئی کیلوں کو نکالنے کے لیے لوہے کی سلاخ درکار تھی۔ لیکن درمیان سے تختے توڑے جا سکتے تھے۔ جب میں جوڈو کی تربیت حاصل کر رہا تھا تو پہلے پہل دوسروں کے سامنے مہارت کا مظاہرہ یوں کرتا تھا کہ ہتھیلی کی ایک ضرب سے برف کی سِل کے دو ٹکڑے کر دیتا تھا۔ ایسے ہی تختوں کو اوپر تلے رکھ کے توڑتا تھا اور ان کی تعداد میں اضافہ کرتا جاتا تھا۔ ایک بار تو میں نے ہاتھ مار کے ہوسٹل میں ایک انگریز طالب علم کی میز توڑ ڈالی تھی اور اس کے شور مچانے پر واضح کیا تھا کہ یہ تو ریہرسل ہے۔ ایک دن میں حکمران قوم کی اکڑی ہوئی گردن اور ان کا غرور بھی توڑ دوں گا۔ وہ مذاق اور تماشے کی بات تھی مگر اس وقت وہی صلاحیت معاون ثابت ہوئی۔ میں نے وار کیا۔ کھٹا کھٹ سارے تختے ٹوٹ گئے۔ اور صاحب خانہ کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے نقطۂ نظر سے یہ تختے نہ توڑے جا سکتے نہ اکھاڑے جا سکتے تھے۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے لیے اس کی گردن یا گیارہ پسلیاں توڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لات مارتے ہی کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے اور میں نے نیم تاریک بند کمرے میں جھانکا۔

"میں جا رہا ہوں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔ "میں چھت پھاڑ کے پھر آ سکتا ہوں اور میرے نشانے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ تم کو بعد میں پولیس کے سامنے صرف یہ بیان دینا ہے کہ میں تمہاری عدم موجودگی میں اندر آیا تھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ میں کس طرف سے داخل ہوا تھا۔ باقی سب سچ بتا دینا۔“

”یعنی۔۔۔ یہ کہ وہ کہ تم نے ریوالور نکال کر ہمیں مجبور کیا۔۔۔ کہ ہم فرار میں مدد دیں؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ بالکل یہی کہنا ہے۔“ میں نے کھڑکی میں داخل ہو کے کہا ”یہ مت کہنا کہ میں اوپر چھت پر کودا تھا اور زینے کے راستے اترا تھا۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا چنانچہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ بیان ذرا بھی مختلف ہوا تو میں نمٹ لوں گا تم سے۔“

پولیس اس کے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی صدا سنی اور انکل رضوی کو چلاتے ہوئے سنا۔ میں نے لپک کر سامنے والا بند دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی بند کر دیا۔ دو کمروں سے گزر کر میں نے ہر دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی تاکہ میرے تعاقب میں آنے والوں کو کچھ وقت لگے اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے نکل جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ گھر خالی ملا ورنہ یہاں بھی مجھے زبردستی تعاون حاصل کرنا پڑتا۔ گھر کا صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے کھول کر میں نے گلی میں قدم رکھا۔ اسی وقت میرے قریب ایک موٹر سائیکل آ رکی ”اوئے کون ہے تو۔ اندر کیا کر رہا تھا؟“

موٹر سائیکل والے نے چلانا شروع کر دیا۔ ”چور ہے چور۔“ وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ چھ فٹ قد کا صحت مند جوان آدمی تھا۔ اور یقیناً وہی شخص تھا جس کے لیے ہمشیرہ محترمہ کی اسمگلنگ سے حاصل ہونے والے فوائد کا سرچشمہ یعنی درمیانی دیوار کی کھڑکی کو تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کم بخت کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے سوچا اور مجبوراً اس کو ایک دھوبی پٹخا دیا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں نے چابیاں چھین کر موٹر سائیکل میں لگا دیں۔ وہ اٹھ کر دوڑا مگر ایک لات کھا کر پھر لیٹ گیا۔ اس کے شور نے بہت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا مگر میری راہ میں حائل ہونے کی غلطی صرف ایک نے کی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو اس پر چڑھانے کی نیت سے دوڑایا۔ وہ چھلانگ لگا کے ایک طرف گرا اور میں نے اسکی گالی سنی۔ ابھی میں سو گز دور بھی نہیں گیا تھا کہ پہلا فائر ہوا اور گولی نہ جانے کدھر گئی۔ میرے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ نشانے پر نہیں لگی تھی۔ انکل رضوی نے گھر سے ساتھ والے گھر تک پہنچنے اور عقبی گلی تک آنے میں تین منٹ بھی نہیں لگائے تھے۔ اگر وہ موٹر سائیکل والا شامتِ اعمال کے باعث نمودار نہ ہوتا تو میرے لیے دوڑ لگا کے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ میں بھی زیادہ انحصار کسی ٹیکسی یا گاڑی میں نکلنے پر کر رہا تھا لیکن اس گلی میں کوئی سواری دستیاب نہ تھی۔ موٹر سائیکل نے میری جان بچالی۔

خطرے کی حدود سے نکل کے میں نے دو پہیوں والی اس سواری کو اطمینان سے چلاتے ہوئے اس نئی صورتِ حالات پر غور کیا۔ بالآخر گردشِ فلک نے یہ دن دکھایا تھا کہ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ آج انکل رضوی نے کسی تذبذب اور تامل کے بغیر مجھ پر گولی چلائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فائر کرتے ہوئے ان کا ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپا ہوگا۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا ہوگا کہ میں ان کے مرحوم دوست وزیر خان کا وہ بدنصیب بیٹا ہوں جس کے والدین اور بہن بھائی سب پہلے ہی قتل ہو چکے ہیں۔ ان کو قتل کرنے والے تو دشمن تھے مگر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرنے والوں میں آج ایک پولیس افسر بھی شامل ہو گیا تھا۔ جذباتی تعلق کو اور رشتوں کے لحاظ کو فراموش کر کے۔ کیونکہ اس کی نظر میں ایک مفرور اشتہاری مجرم کے سوا میری کوئی حیثیت اہم نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میرے دشمن کون ہیں۔ مجھے کیا نقصان پہنچا چکے ہیں اور مجھ سے کیا کچھ چھین چکے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ہر ناانصافی میرے ساتھ ہوئی ہے، ہر ظلم مجھ پر ہوا ہے اور ہر تیرِ ستم کا نشانہ میں رہا ہوں لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ میری مدد کر سکتا تھا بشرطیکہ میں عام لوگوں کی طرح اس کے پاس فریادی بن کے پہنچتا اور قانون کی مدد مانگتا۔ اس قانون کی جس کا وہ نمائندہ تھا لیکن خوب جانتا تھا کہ اس قانون نے وزیر خان کو تحفظ فراہم نہیں کیا تھا۔ اور اس کی پُرعذاب موت سے شروع ہونے والے خونی کھیل میں جتنے بے گناہ اپنی جان سے گئے تھے سب قانون پرست اور پُرامن شہری تھے لیکن قانون نے کس کے قاتل کا ہاتھ تھاما۔ کس خنجر کی زبان سے جواب مانگا کہ لہو کے چھینٹے تو کسی آستین پر نہیں، تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے۔ پھر وہ سب جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ان کا قصاص کس پر واجب ہے؟ ان کی جان کا خوں بہا کس سے لیا جائے۔ قانون کے ہاتھ تو بہت لمبے کہلاتے ہیں۔ کس قاتل کی گردن تک پہنچے یہ ہاتھ؟ ضامن رضوی ایس ایس پی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قاتل کون ہیں۔ اسے سب کے نام پتے اور چہرے معلوم تھے مگر وہ ضوابط کی زنجیر میں جکڑا ہوا، سرکاری قواعد کا پابند اور کتابوں میں لکھے ہوئے قانون کو واجب الاحترام سمجھنے والا پولیس افسر تھا جو ثبوت اور شہادت کے بغیر کسی کا دامن تھام نہیں سکتا تھا کہ اس کی آستین خون آلود ہے۔ اس نے پولیس افسر کی وردی پہن کے خود کو پابند کر لیا تھا کہ وہ دل کی نہیں عقل کی بات مانے گا اور اسی کو حقیقت تسلیم کرے گا جسے آنکھ دیکھے اور زمانہ تسلیم کرے۔

موٹر سائیکل کو فٹ پاتھ کے کنارے روک کر میں نے چابیاں اسی میں لگی رہنے دیں۔ پھر کچھ سوچ کے نکال لیں اور جیب میں ڈال کر ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ میری جیب میں صرف تین نوٹ تھے۔ ایک دس کا، ایک پانچ کا اور ایک روپے والا ایک۔ باقی رقم۔۔۔ میرے کپڑے اور رابعہ کا دیا ہوا جیک اور دوسرا ریوالور سب اس گاڑی میں تھے جو منظر کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ گلی میں اور گاڑیاں بھی تھیں چنانچہ یہ گاڑی بالکل محفوظ تھی۔ رضوی صاحب کو یہ شک کیسے ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر امجد بھی میں ہی ہوں۔ اس گاڑی پر تو ڈاکٹروں کا نشان ایک ریڈ کراس آگے اور پیچھے کے ونڈ اسکرین پر چسپاں تھا۔ مسئلہ صرف اسے واپس لانے کا تھا۔ میرے فرار کے بعد منظر کے گھر میں کیا ہوا، یہ سب منظر، رابعہ یا محسن سے ملے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا تھا اور فوری طور پر ان سے رابطہ قائم کرنا انہیں بھی مشکلات میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے غیر شعوری طور میں چوکس رہا اور چوری چوری یہ دیکھتا رہا کہ کہیں کوئی نظر میرے چہرے پر تو نہیں لیکن لوگ اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ دیواروں پر میری تصویر والے اشتہار ابھی تازہ تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ بہت جلد فلموں کے اور دواخانوں کے پوسٹر ان پر غالب آ جائیں گے اور لوگ جو کاروبارِ حیات میں صرف لمحۂ گزراں کو یاد رکھتے ہیں سکندر بخت کو بھول جائیں گے۔ اخبار کی تصویریں تو صرف چوبیس گھنٹے میں پرانی ہو کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں، نئے اخبار میں نئی صورتیں نظر آتی ہیں اور نئی خبروں میں کسی مفرور مجرم کی خبر بھی دب جاتی ہے۔ کوئی اپنے دماغ میں کمپیوٹر نہیں لیے پھرتا کہ مہینے بھر میں نظر آنے والی سیکڑوں تصویروں کو یاد رکھے کہ کون سی تصویر تلاشِ گمشدہ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ حادثات اور قتل کی وارداتوں کا شکار ہونے والوں، اہم شخصیات، کبھی امتحان میں اول آنے والوں سے لے کر وظیفے پر بیرونِ ملک جانے والوں، کھلاڑیوں سے لے کر نو اسیرانِ قیدِ شریعت، یعنی نئے میاں بیوی بننے والوں تک اور لاٹری یا ریفل میں انعام پانے والے خوش نصیبوں سے عاق ہونے والے بدنصیبوں تک سب کی تصویریں اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ بعد میں کوئی چہرہ مطبوعہ لگے تب بھی یہ کسے یاد آتا ہے کہ اس سے منسوب خبر کیا تھی لیکن ابھی بات پرانی نہیں ہوئی تھی چنانچہ مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ تازہ ترین واقعہ کچھ دیر پہلے کا تھا، جب ناقابلِ یقین طور پر ایک عورت نے اخبار کے حوالے سے مجھے شناخت کر لیا تھا۔ ورنہ عورتوں کا اخبار سے تعلق فلم اور فیشن کے صفحات تک محدود رہتا ہے۔ موٹر سائیکل کی چابیاں میں نے اسی لیے رکھ لی تھیں کہ پھر بھاگنا پڑے تو اپنی دو ٹانگوں کے بجائے دو پہیوں پر بھاگوں۔

فیصلہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر خود بخود ہو گیا تھا اور اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اگر میں شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے انکل رضوی کا حکم مان لیتا اور خود کو قانون کے حوالے کر دیتا، تو میرا انجام برا ہوتا۔ انکل رضوی مجھے اپنے گھر نہیں، تھانے لے جاتے اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ مجھ پر پہلا سنگین الزام تو۔۔۔ میر شرافت علی کے قتل کا تھا۔ تب سے اب تک مجھ پر دونوں چشم دید گواہوں کے قتل کا الزام عائد ہو چکا تھا اور اگرچہ اس مقدمے میں عبدل نے مرتے مرتے جو بیان دیا تھا اس سے میری بے گناہی ثابت ہو گئی تھی تاہم عدالت نے باقاعدہ سماعت کے بعد ابھی تک مجھے باعزت طور پر بری کرنے کا فیصلہ صادر نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد میں کسی پیشی پر حاضر نہیں ہوا تھا چنانچہ مقدمہ اصولی طور پر ہنوز زیرِ سماعت تھا اور مسلسل غیر حاضری کی بنا پر میری ضمانت منسوخ ہو چکی تھی۔ دوہرے قتل کا تیسرا مقدمہ مجھ پر راولپنڈی کی سیشن کورٹ میں چل رہا تھا اور وہاں سے بھی میرے ناقابلِ ضمانت وارنٹِ گرفتاری بہت پہلے جاری ہو چکے تھے۔ ان حالات میں اگر میں خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو مجھے خطرناک مجرم قرار دینے کے بعد ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کے رکھا جاتا اور ہر مقدمے کی سماعت پر پیش کرنے کے لیے زبردست گارڈ اور پہرے میں لایا جاتا۔ رابعہ اور منظر کی قانونی قابلیت زیادہ سے زیادہ مجھے سزائے موت سے بچا لیتی یا مجھے شک کا فائدہ مل جاتا۔ لیکن ایک مقدمہ بھی میرے خلاف جاتا تو مجھے عمر قید کی سزا بہر حال ہوتی۔ ہائی کورٹ میں اپیل اور پھر سپریم کورٹ کے فیصلے تک چھ سات سال لگ جاتے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور یہ تمام وقت میں دیوارِ زنداں کے پیچھے زنجیر و سلاسل کے ساتھ کاٹ دیتا۔ نہ جانے اس عرصے میں چوہدری دلاور کے پیسے کی طاقت اور اُن کا اثر و رسوخ کتنے مسائل پیدا کرتا اور وہ اپنے وسائل سے کیا انتظام کرتے کہ میں پھر ہوشمندوں کی دنیا میں آ کے اُن کے معاملات میں مخل نہ ہو سکوں۔ وہ مجھے پاگل خانے بھجوا سکتے تھے۔ فرار کی کوشش کا الزام لگوا کے مجھے اندر ہی گولی کا نشانہ بنوا سکتے تھے یا دنگے فساد، بغاوت اور شر پسندی کے الزامات کی فہرست کو طول دے کر میرے لیے زندگی کی آخری سانس بھی جیل خانے میں لینے کا انتظام کر سکتے تھے۔ میرے مددگار اور معاون تو سب باہر تھے اور اندر صرف جیل کے حکام کی چلتی تھی۔

قتل کے ان الزامات کے علاوہ بھی میرے خلاف بہت سی رپورٹیں درج تھیں۔ زبردستی لوگوں سے کاریں چھیننے کی۔ پولیس پر حملے اور اُن کے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی۔ اغوا اور حبسِ بے جا میں رکھنے کی۔ بھیس بدل کر دھوکا دینے کی اور مختلف مواقع پر مار پیٹ کی۔ اس کے علاوہ پولیس کے ریکارڈ پر ضابطہ فوجداری کی کتنی دفعات کے تحت مقدمات درج تھے، ان کی صحیح تعداد خود مجھے بھی معلوم نہیں تھی۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی کوششوں کے طفیل بالآخر میں قانون کے شکنجے میں اس طرح جکڑا جا چکا تھا کہ قانونی طور پر اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اگر میں قانون کے چکر میں پڑتا تو میرا انجام وہی ہوتا جو یہ شکاری چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں خاصے کامیاب رہے تھے کیونکہ ہر ننگِ انسانیت جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود بلیک میلنگ سے لے کر اسمگلنگ تک سارے ناجائز دھندے کرنے کے باوجود اور وزیر خاں کے علاوہ میر شرافت علی اور کم سے کم ایک درجن دوسرے بے گناہوں کے قاتل ہونے کے باوجود وہ قانونی طور پر بالکل محفوظ تھے۔ جس شخص سے اُن کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا وہ خود اپنے ہی جال میں گرفتار ہو چکا تھا اور روپوش رہنے پر مجبور تھا۔

ان حالات میں میرے لیے یہی ایک راستہ رہ جاتا تھا جو میں نے منتخب کیا۔ اگر قانون مجھے معاف نہیں کر سکتا تھا تو میں ان سب کو کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے تمام مصائب کے ذمے دار تھے۔ بہت پہلے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انہیں سزا ضرور ملے گی۔ اس شکار گاہ میں وہ اکیلے ہی شکاری نہیں اور میں وہ شکار نہیں جو خود نشانے پر آ بیٹھے۔ میں عملی طور پر ان کو سمجھا چکا تھا کہ شکاری میں بھی ہوں اور میرا شکار وہ سب ہیں جو وزیر خاں کو کاروبار سے بے دخل کر لینے کے بعد اسے غربت اور افلاس، ذلت و رسوائی اور بیماری و کس مپرسی کے عالم میں ہلاک کرنے کے بعد اب بے دھڑک کسی خطرناک اور ناجائز دھندے کو پھیلاتے جا رہے تھے۔ انھوں نے دباؤ کے ذریعے مجھے حقِ وراثت سے محروم کرنا چاہا تھا۔ مگر میری مزاحمت کی قوت بڑھتی گئی تھی اور اس جنگ میں دونوں طرف کے لوگ مارے گئے تھے۔ چوہدری دلاور کے ساتھی تو اس کے کارندے، جرائم پیشہ لوگ اور زر خرید افراد تھے مگر میرے لیے جان دینے والوں میں صرف وہ تھے جو حق کو تسلیم کرتے تھے، سچ بولنا جانتے تھے، خلوص کے جذبات رکھتے تھے اور وفاداری میں وضع داری کے قائل تھے۔ ان سب کا لہو مجھ پر قرض تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان سب کے قاتلوں کو بخش دیتا۔ انھوں نے قانون سے تحفظ حاصل کر لیا تھا مگر مجھے اُن کے تمام جرائم کا اتنا ہی یقین تھا جتنا اپنے وجود کا۔ اور یہ یقین میرے ایمان کی طرح راسخ تھا۔ اگر میں اُن کو چھوڑ دیتا تو صداقت سے روگردانی کرتا۔ اور ضمیر کی قید سے فرار ہو کے کہاں جاتا۔ اب یہ میرا فرض تھا کہ میں مجرموں کو وہ سزا دوں جس کے وہ مستحق ہیں۔ مذہب اگر آنکھ کے بدلے آنکھ اور جان کے بدلے جان لینے کی اجازت دیتا ہے تو مجھے دنیاوی قانون کی موشگافیوں سے کیا۔ اب تو میں خود ہی پولیس ہوں، خود ہی وکیلِ استغاثہ، خود ہی منصف، خود ہی جیلر۔ فردِ جرم عائد کرنے سے سزا پر عمل درآمد تک ہر مرحلہ مجھے اکیلے سر کرنا تھا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہلے کم از کم مجھے اتنی آزادی تو حاصل تھی کہ میں بے خوف و خطر جہاں چاہوں آ جا سکوں لیکن اب میرے لیے روپوش رہنا شرطِ اول تھا۔ اس کے بغیر میرا پہلا قدم ہی آخری قدم ہوتا۔ میرے روبرو پرانے دشمن تھے۔ دوسری طرف پولیس کو میری جستجو تھی تو تیسری طرف ضامن رضوی اور اکرام شیخ جیسے اصول پرست لوگ تھے جو تعلق پر فرض کو ترجیح دیتے تھے اور اُن کے ساتھ وہ سب تھے جو مجھے پہچانتے تھے۔ اور مجرم کو قانون کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ میرے تین طرف شکاری تھے اور میرے لیے پناہ صرف [illegible] میں تھی۔ جہاں محسن اور رابعہ جیسے سہارے تھے۔ شہلا تھی اور استاد ٹیڈی تھا۔ یہ سب ایسے لوگ تھے جو صرف میرے ساتھ تھے۔ انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ میں مجرم ہوں یا بے گناہ، اچھا ہوں یا برا اور جو کچھ کر رہا ہوں وہ غلط ہے یا صحیح۔

چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور یہ کوئی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ نہیں تھا جہاں کے مؤدب ویٹر کسی کی خلوت میں تا حکمِ ثانی حارج نہیں ہوتے اور کوئی دو گھنٹے چائے کی پیالی کو گھورتا رہے تو اسے دانشور سمجھ کر زیرِ لب مسکرانے کے سوا کچھ نہیں کہتے۔

"اور کچھ چاہیے صاحب؟" ایک ویٹر نے بہ آوازِ بلند برتن ٹرے میں پٹختے ہوئے سوال کیا۔

میں چونکا۔ "ہاں۔ میرا خیال ہے کھانا لے آؤ۔ کیا پکا ہے؟"

میں نے کہا اور ویٹر نے فرفر مینو سنانا شروع کیا۔ بمشکل تمام میں نے اس کی نان اسٹاپ گردان کو آلو قیمے پر روکا۔ کھانے کے دوران بھی میں یہ سوچتا رہا کہ اب رابعہ یا محسن سے کیسے رابطہ قائم ہو؟ رضوی صاحب نے یقیناً منظر کے ٹیلی فون کو آبزرویشن پر کرا دیا ہوگا۔ میری تمام گفتگو ٹیپ ہو جائے گی۔ رضوی صاحب کے گھر یا رابعہ کے آفس کی پوزیشن بھی ایسی ہی تھی کہ میں آواز بدل کے کسی پبلک آفس سے بھی کال کرتا تو میرا پیغام ریکارڈ ہو جاتا۔ اور ان دونوں سے ملنے ہر جائے ملاقات پر پولیس پہنچ جاتی۔ سادہ کپڑوں میں اور مسلح۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ رضوی صاحب اچانک منظر کے گھر چھاپا مارنے کیسے پہنچے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کر کے آئے تھے۔ انھیں کس نے اطلاع دی کہ میں منظر کے گھر میں موجود ہوں۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہی ہو سکتا تھا کہ رضوی صاحب کو مخبری کی گئی اور مخبر ان کے لیے اتنا مصدقہ تھا کہ انھوں نے پورے وثوق کے ساتھ کامیاب چھاپا مارا۔ لیکن اس مخبری کا ذمے دار کون تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ بات لگتی تھی کہ رضوی صاحب نے رابعہ اور محسن کے پیچھے اپنے آدمی لگا رکھے تھے جو ہر جگہ اور ہر وقت اُن کی نگرانی کرتے تھے۔ رضوی صاحب کو یہ یقین برحق تھا کہ کبھی نہ کبھی میں ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رابطہ ضرور قائم کروں گا۔ غالباً انھی سائے کی طرح تعاقب کرنے والے فرشتوں نے رضوی صاحب کو اطلاع فراہم کر دی کہ رابعہ اور محسن ایک ساتھ کہاں پہنچے ہیں۔ عین ممکن ہے انھوں نے میری موجودگی کی تصدیق بھی کر لی ہو۔ باہر رہتے ہوئے میری آواز سن لی ہو یا کہیں سے اندر جھانک کر بھی دیکھ لیا ہو۔

اس کا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ عملاً اب رابعہ اور محسن زیرِ حراست ہیں۔ اُن پر کسی مجرم کو چھپانے کا جرم تو ثابت نہیں ہوتا تھا مگر رضوی صاحب جانتے تھے کہ مبینہ مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت اور وزیر خاں کا انھی دو سے رابطہ قائم ہے لیکن وہ قانون سے عدم تعاون پر کمر بستہ ہیں۔ خود منظر بھی اسی چکر میں مشتبہ افراد میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ بڑا دبنگ وکیل تھا اور رضوی صاحب مجھے اس کے گھر میں موجود نہ پا کر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ رابعہ بھی آسانی سے دبنے والی نہیں تھی اور محسن کو دو دو کیسوں کے علاوہ اپنے والد کی پشت پناہی حاصل تھی ورنہ رضوی صاحب اسے پولیس کی تحویل میں دے دیتے کہ تھرڈ ڈگری کے مجرب نسخے آزما کے اُس سے مجرم سکندر بخت کا پتا ٹھکانا دریافت کیا جائے۔ ان حالات میں رابعہ اور محسن کا رضوی صاحب ہی کے گھر میں رہنا مشکل سے محال ہوتا رہا تھا اور وہ ایک ہی کام کر سکتے تھے۔ یا رضوی صاحب جیسے پولیس افسر کے گھر میں رہیں یا میرے جیسے مجرم سے دوستی اور محبت کا حق ادا کریں۔

بہت سوچنے کے بعد مجھے نازو کا خیال آیا۔ ایک دم میری مشکل آسان ہو گئی اور کھانا ادھورا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دس کا نوٹ کاؤنٹر پر چھوڑ کے میں باہر نکلا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ چوری کی یہ سواری کام تو آ رہی تھی مگر اس سے خطرہ زیادہ ہو جاتا تھا۔ کہ ایک تو میں خود مجرم اور پھر شہر میں دندناتا پھروں، چوری کی موٹر سائیکل پر۔ گویا کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔ ہزاروں افراد پر مشتمل پولیس اور خفیہ پولیس، سی آئی اے اور ایف آئی اے جیسے متعدد اداروں کی ساری نفری کے لیے ڈوب مرنے کا مقام۔ تاہم میں یہ جانتا تھا کہ چوری کی رپورٹ درج ہونے سے مشتہر ہونے تک سارا عمل کس رفتار سے ہوتا ہے۔ ابھی چند گھنٹے کوئی مجھے تو پکڑ سکتا تھا، موٹر سائیکل کو نہیں۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں سے ایک پیچ کس نکالا اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ اتار دی۔ رونی شکل بنا کے میں میکلوڈ روڈ پر نمبر پلیٹ بنانے والوں کے پاس گیا اور انھیں نمبر پلیٹوں کے چوری ہونے کی افسوس ناک کہانی سنائی۔ میری درخواست پر ایک عظیم پینٹر نے ٹین کی دو پلیٹوں پر سفید پینٹ سے فرضی نمبر لکھے اور مجھ سے وہی چھ روپے قبول کر لیے جو میری جیب میں تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے چالان سے بچا لیا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ میری نظر تین افراد پر گئی جو میرے بہت قریب فٹ پاتھ پر کھڑے بحث کر رہے تھے۔ وہ سب تالوں کی چابیاں بنانے والے اور نمبر پلیٹ لکھنے والے لوگ تھے۔

"اوئے یار او ہی اے۔" ایک نے کہا۔ "ایہہ ویکھ اخبار۔"

دوسرے نے مخالفت کی۔ "او ہی اے تے فیر یار سانوں کی؟"

تیسرے نے ہاتھ ہلا کے دوسرے کو ڈانٹا۔ "او پاغل دے پتر! وخت نہ نا پئے جائے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ اُن کے اتفاقِ رائے سے قبل مجھے نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے۔ ابھی تک تین میں سے صرف ایک ووٹ قانونی چارہ جوئی کے خلاف تھا مگر دو ہی مجھے پکڑنے کے لیے کافی تھے۔ بڑی پھرتی سے میں نے موٹر سائیکل کا رخ پلٹا اور گرتے گرتے بچا۔ معلوم نہیں کس نے چلا کر مجھے پکڑنے کے لیے کہا لیکن میں اتنی دیر میں ہوا ہو گیا تھا۔ وہاں موٹر سائیکلوں کی کمی نہیں تھی اور وہ سب جو لاک ٹھیک کرا رہے تھے تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے تو کئی شہسوار سڑکوں پر نکل آتے اور جو زیادہ جیالے ہوتے یا زیادہ طاقتور موٹر سائیکل کے مالک ہوتے وہ یقیناً ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد مجھے آ لیتے۔ پھر میں اس کے سوا کیا کرتا کہ ایک دو کو ناک آؤٹ کر دوں یا ہوا میں فائر کروں اور سب کی پیش قدمی روک کے نکل جاؤں۔ میں موٹر سائیکل چلانے کے معاملے میں مہارت کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے ایبٹ روڈ پر گھومتے ہی موٹر سائیکل کو ایک سینما کے کمپاؤنڈ میں درجنوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

موٹر سائیکلوں کی صف میں کھڑا کیا اور خود منیجر کے کمرے میں گھس گیا۔
"وہ ایسا ہے کہ مجھے ایک کال کرنی تھی۔" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
منیجر کا چہرہ بگڑ گیا۔ "یہ کوئی پبلک کال آفس نہیں ہے جناب۔" اس نے میری بے تکلفی کے جواب میں رکھائی سے کہا۔
"اچھا۔ لیکن وہ ایس آئی اکرام شیخ نے تو کہا تھا کہ یہاں سے فون کر لینا۔" میں نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے انھیں؟"
"کیا نمبر ہے؟" منیجر نے چند سیکنڈ مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔
میں نے اُسے نمبر بتا دیا جو اُس نے خود ڈائل کیا۔
"یہ ایس آئی اکرام شیخ صاحب کا گھر ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "اچھا۔ لیجیے... بات کریں۔" اس نے کچھ خفیف ہو کے ریسیور مجھے تھما دیا۔
"کوئی خاتون ہیں۔"
"ہیلو۔ کون؟... نازو۔" میں نے بشاشت سے کہا۔
"بھئی میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔"
حسبِ توقع ذہنی صدمے نے اسے کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ میں ریسیور سے کان لگائے مسکراتا رہا۔ "تم... تم واقعی... سکندر ہو؟ کہاں ہو اس وقت؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"کیا بتائیں جی! ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ تم تو جانتی ہی ہو۔ تمھارے بھیّا کہاں ہیں؟ ڈیوٹی پر ہیں یا گھر پر؟"
"خدا کا شکر ادا کرو کہ ریسیور انھوں نے نہیں اٹھایا۔" وہ بولی۔
"دوسرے کمرے میں ہیں۔ جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟"
"آج عجیب اتفاق ہوا۔" میں نے یوں کہا کہ منیجر کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ "میں اپنے دوست عبدالودود منظر کے گھر میں تھا۔ وہ ایڈووکیٹ ہیں نا۔ وہاں محسن بھی تھا۔ اچانک اپنے انکل ایس ایس پی صاحب آ گئے۔ ہاں انکل ضامن رضوی۔ ساتھ لے جانے پر مُصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ تم تو جانتی ہو وہ کیسے آدمی ہیں۔"
"میں سمجھ رہی ہوں۔" نازو بولی۔ "وہ تمھیں گرفتار کرنے پہنچے تھے اور تم پھر فرار ہو گئے۔"
"ہاں۔ اب ایسا ہے کہ فوری طور پر تو میں تمھارے گھر نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم آ سکتی ہو۔"
"کہاں؟ جلدی سے بتاؤ۔ بھائی جان آ رہے ہیں شاید۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔
"شالیمار باغ کے گیٹ پر۔" میں نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے کی آواز سنی۔ لائن کٹ گئی۔
منیجر اب مسکرا رہا تھا۔ اس نے نتیجہ یہ اخذ کیا تھا کہ معاملہ کچھ عاشقانہ ہے، جو کچھ غلط نہ تھا لیکن ایس ایس پی ضامن رضوی کو انکل کہنے والا اگر کسی ایس آئی کی بہن کو بغرضِ ملاقات شالیمار باغ بلائے تو اعتراض وہ کرے جسے تھانے جانا مقصود ہو۔ منیجر نے خوش دلی سے ہاتھ ملایا اور کچھ معذرت بھی کی۔ میں باہر نکلا تو ہر طرف امن تھا۔ اگر میرے تعاقب میں کوئی نکلا تھا تو بہت آگے نکل گیا یا شاید دُنیا کے گول ہونے کا ثبوت دینے کے لیے پھر وہیں گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل نکالی تو ٹوکن دینے والا لپکا۔
"واپس جا رہے ہیں باؤ جی! علم نہیں دیکھنی؟" اس نے ... لے کر کہا۔ "ایک روپیہ۔"
"وہ کس بات کا؟" میں نے کہا۔ "منیجر صاحب کے دوست ملنے آتے ہیں تو اُن سے ایک روپیہ لیتے ہو تم؟ جاؤ... جاکے اُن سے مانگ لو۔ کہنا وہ صاحب جو ابھی فون کر رہے تھے..." لڑکا مایوس ہو کے لَوٹ گیا تھا اور یہ راز افشا نہیں ہوا کہ میرے پاس ایک روپیہ ہوتا تو میں منیجر کے کمرے میں ... کیا خطرہ کیوں مول لیتا۔ کسی پبلک کال آفس سے بات نہ کر لیتا اور جیب نہ ہوتا تو نازو سے شالیمار باغ کے دروازے پر ملنے کی کیوں ... اسے کسی ریسٹورنٹ میں نہ بلاتا۔
بیس منٹ بعد میں نے شالیمار باغ کے مقابل ایک درخت کی اوٹ میں موٹر سائیکل کھڑی کی۔ مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی لیکن میری جیب میں ایک پیسہ تک نہ تھا۔ خیر نازو آئے گی، اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔ اصل مسئلہ تو محسن ... کے آتے ہی سے حل ہو گا اور نازو نامہ بری کے فرائض کے لیے موزوں ترین انتخاب ہے۔ اس پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ میری آلۂ کار بنی ہے۔ مجھے تھوڑی سی شرم بھی آئی کہ میں اپنے ... کے حصول کی خاطر اس نو عمر، عقل کی کچی اور جذبات کی اندھی لڑکی کو بے وقوف بنانا چاہتا ہوں جو یک طرفہ طور پر میرے عشق میں دیوانی ہے کہ میری خاطر آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں کود ... اب تک میں نے بڑے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کی حوصلہ شکنی ... تھی۔ مگر آج میں مجبور تھا اور میری مدد صرف وہی کر سکتی تھی۔ ... ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا اور شالیمار باغ کے دروازے پر بس ... سے اُترنے والے جنبی تھے۔ گھڑی کی سوئیاں ہمیشہ کی طرح ایک ... کا فاصلہ پانچ منٹ میں، پھر دس منٹ میں، پھر پندرہ منٹ ... طے کرنے لگیں۔ ٹیلی فون پر آخری بات کہنے سے اب تک ... ایک گھنٹہ کتنا لمبا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ پھر ایک ... اور میں نے دُور ہونے کے باوجود نازو کو پہچان لیا۔
وہ آٹو کے کرایہ ادا کر رہی تھی کہ میں نے موٹر سائیکل اس کے ... روکی۔ "بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ گولی مارو باقی ...
... دس کا نوٹ ہاتھ میں پکڑنے والے رکشا ڈرائیور نے مجھے بڑی مشتبہ نظروں سے دیکھا مگر یہ اغوا کا کیس نہیں تھا۔ لڑکی برضا و رغبت موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی تھی۔
"اُف۔ ایسی کیا افراتفری ہے۔" نازو نے سنبھلنے کے لیے میری کمر کو مضبوطی سے تھام لیا تھا کیونکہ میں نے موٹر سائیکل کو ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کیا تھا اور رفتار ایک دم بڑھا دی تھی۔
"تم ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ فرار ہو رہی ہو لڑکی!" میں نے کہا۔ "اور وہ بھی چوری کی موٹر سائیکل پر۔ ایک تھانیدار کی بہن ہو کے۔"
"یہ بہت غلط بات ہے۔ وہ تمھارے پیچھے تو نہیں لگے تھے نا؟"
"معلوم نہیں۔" نازو نے کہا۔ "جرح کر رہے تھے کہ کس کا فون تھا۔ رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے؟ اچھا ہوا امّی آ گئیں اور میں نے شکایت کر دی کہ تنگ کر رہے ہیں۔ میری سہیلی نے فون کیا تھا۔"
"اچھا سہیلی! ذرا جیب سے پانچ کا نوٹ تو نکالو۔ دل دلا دو... ارے بھئی اپنی جیب سے۔" میں نے کہا۔
میں موٹر سائیکل کو کچے راستے پر اتار چکا تھا اور اب اسی ویران قصبے میں تھا جس کے ایک مکان میں رابعہ اور میں قید رہ چکے تھے۔
نازو ہنسی اور اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ "پانچ کا نوٹ نکال کے کروں سہیلی؟" وہ بیگ کھول کر بولی۔
میں نے موٹر سائیکل روک دی۔ "سگریٹ پلاؤ اپنی سہیلی کو۔ سامنے سے جا کے ایک ڈبی کیپسٹن مع ماچس لا دو۔"
نازو نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے لڑکے سے سگریٹ ماچس لینے اُتری۔ ابھی اُس نے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا تھا کہ میری نظر نے پیچھے سے نمودار ہونے والے اسکوٹر کو دیکھ لیا جس پر اکرام شیخ سوار تھا۔ میں نے چلا کر نازو کو پھر بیٹھنے کو کہا اور ابھی وہ ٹھیک سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ موٹر سائیکل دوڑا دی۔ اکرام شیخ نے مجھے آواز دی اور رکنے کو کہا مگر میں پیچھے دیکھے بغیر چلتا رہا۔ میری رفتار ستر میل سے تجاوز کر گئی۔
"سکندر۔ تم بھاگ نہیں سکتے۔ رک جاؤ ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ اسکوٹر اتنی رفتار پر اس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا لیکن موٹر سائیکل کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اسکوٹر پیچھے ہو رہا تھا۔
"رکنا نہیں سکندر۔" نازو ہسٹریائی لہجے میں چلّائی۔ "وہ گولی نہیں چلا سکتے۔ پیچھے میں ہوں۔"
"مجھ سے بھی جھوٹ بول رہی ہو بے وقوف لڑکی!" میں نے رفتار کو یک دم بہت کم کر لیا۔ اسی وقت نازو نے چیخ ماری اور جھٹکے سے آگے آ گئی۔ "کیا میں تمھارے بھائی کو نہیں جانتا؟" میرا خیال تھا کہ نازو اچانک بریک لگانے سے مجھ پر گر رہی ہے لیکن اپنی بات ختم ہونے سے پہلے میں نے فائر کی آواز سنی۔ آواز کے مقابلے میں تیز تر سفر کرنے والی گولی اس سے پہلے ہی نازو کے وجود میں پیوست ہو چکی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ پھسل کر نیچے گری اور میں نے اس کی پشت پر زرد ریشمی قمیص کے چاک سے پھوٹنے والی لہو کی سرخی کو دیکھا جو تیزی سے پھیل رہی تھی۔ دوسرے لمحے اسکوٹر میرے سامنے آ رکا اور میں نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ چھلانگ لگائی۔ اکرام شیخ اس کے لیے تیار تھا چنانچہ اسکوٹر کے رکنے سے پہلے ہی وہ کود کر الگ ہو گیا تھا۔ اس کا اسکوٹر میری موٹر سائیکل کے پاس جا لیٹا تھا اور اس کا پچھلا پہیہ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اکرام شیخ نے جست لگا کے خود کو بچایا۔ پیچھے گرا اور اُلٹی قلابازی کھا کے بڑی پھرتی سے پھر کھڑا ہو گیا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ "رک جاؤ۔ وہیں ٹھہر جاؤ سکندر۔ میں اپنی بہن کو گولی مار سکتا ہوں تو تم کو بھی مار سکتا ہوں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ میں پاگل ہو رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔ اس کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے خوف آیا۔ وہ اکرام شیخ کا نہیں کسی جنونی کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے انگارے تھیں اور اس کی صورت پر وحشت عیاں تھی۔ زمین پر گر کے اُٹھنے سے اس کے بالوں میں خس و خاشاک بھر گئے تھے اور منہ پر گرد

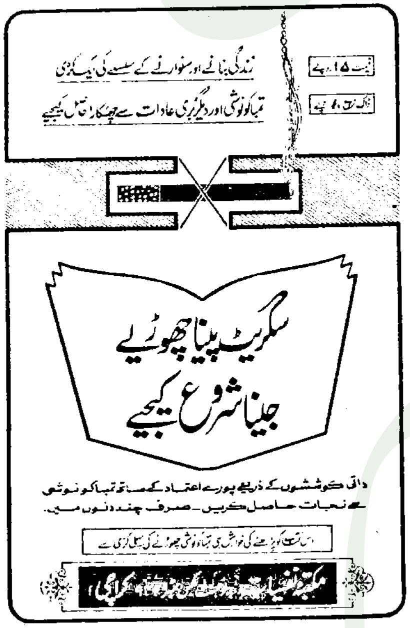

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جم گئی تھی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

"اس کی جان بھی لے لی تم نے!" وہ چلایا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آواز ہی نہیں۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔ "اور کتنی زندگیوں کا نذرانہ لو گے آخر؟ کس کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونکو گے؟ کوئی حد ہے تمھاری دیوانگی کی؟ تمھارا تو ایک باپ مرا تھا۔ اس کی خاطر تم نے کتنے گھر اجاڑ دیے ہیں اب تک؟ کیا سلامت شاہ۔ فوما نچو اور غلام علی، زرداد اور میر محمد باپ نہیں تھے۔ عبدل کی ماں، شہلا کی ماں اور رابعہ کی ماں کسی بھی ماں سے کم تھیں! آج تم نے بھائی کے ہاتھوں بہن کے خون کی لالی بھی دیکھ لی۔" میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے نازو کو سیدھا کیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سانس چل رہی تھی۔ گولی اس کے شانے پر ذرا نیچے لگی تھی۔

"اسے اسپتال لے چلو۔ نازو بچ جائے گی اکرام شیخ!" میں نے کہا۔ اکرام شیخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب یہ مر بھی گئی تو کیا، پہلے میں اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاؤں۔ تم فرار ہو گئے تو میں اس لڑکی کے ماں باپ کو کیا جواب دوں گا کہ اسے مار کے میں نے کیا پایا۔ اسے تو ایک دن گھر سے جانا ہی تھا۔ سسرال نہ گئی، قبرستان گئی۔ ماں باپ کو یہ اطمینان تو رہے گا کہ اس کی جان بلاوجہ نہیں لی تھی میں نے۔ تمھیں شرمندگی تو نہ ہو کہ۔۔۔۔" انتہائی ضبط اور حوصلے سے کام لینے کے باوجود اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں شیخ! کہ اسپتال پہنچنے کے بعد خود کو۔۔۔" میں نے کہا لیکن میرا جملہ نامکمل رہ گیا۔ میرے الفاظ پر اعتبار کرتے ہوئے شیخ نے ریوالور نیچے کر لیا تھا اور اس نے آہستہ سے اقرار میں سر بھی ہلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول کر جان بچانے والے بزدلوں میں سے نہیں ہوں اور اگر میں نے وعدہ کیا ہے تو اب جان دے کر بھی الفاظ کی حرمت کا پاس کروں گا مگر نازو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کے ہاتھ مارا اور اکرام شیخ کے ہاتھ سے ریوالور اڑ کر میرے قدموں میں آ گرا۔ دوسرے لمحے نازو نے بھائی کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا اور گھٹنا اوپر اٹھایا۔ اکرام شیخ تھوڑا سا اوپر اچھلا اور پانچ گز دور جا لیٹا۔ میں دم بخود کھڑا رہا۔

"ریوالور اٹھا لو سکندر اور جاؤ۔" نازو نے کراہ کے کہا اور پھر پیچھے گر گئی۔ میں ایک دم ہوش میں آ گیا۔ اور میں نے اکرام شیخ کا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ نازو نے جوڈو کی تھوڑی بہت مہارت کا استعمال بڑی کامیابی کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ اس نے حاضر دماغی اور قوت برداشت کا کیا تھا۔ اس نے ٹھیک وقت پر اندازہ کر لیا تھا کہ ادائے فرض کی راہ میں حائل ہونے والی اکلوتی بہن کا لحاظ نہ کرنے والا بھائی مجھے کوئی رعایت نہیں دے گا۔ وہ مجھے گرفتار نہ کر سکا تو گولی مار دے گا اور ذرا بھی پشیمان نہ ہو گا۔ جب میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہ جان بوجھ کے یوں سیٹ سے گری جیسے بے ہوش ہو۔ اسے یقین تھا کہ تقدیر اسے ایک موقع فراہم کرے گی جب اس کی مدد سے میں جان بچا کے نکل سکوں گا۔ اس کا خون بہتا رہا لیکن اس لمحے کے انتظار میں وہ ہوش و حواس بحال رکھنے کی جد و جہد کرتی رہی۔ نازو جیسی نازک اور دھان پان لڑکی کے لیے اتنا خون ضائع ہو جانے کے باوجود جسم کی طاقت کو ضائع نہ ہونے دینا فقط قوت ارادی کا کمال تھا۔ اور جیسے کوئی اس سے یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے سے چار گنا لمبے چوڑے اور طاقتور مردوں کو نازک نظر آنے والے ہاتھوں کے ایک کاری وار سے چت کر سکتی ہے۔ ایسے ہی اکرام شیخ اور میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس حالت میں وہ بجلی کی طرح لپک کے یوں پانسہ پلٹ سکتی ہے۔ اس نے اپنی جسمانی قوت کو امکان کی حد تک سنبھالے رکھا اور جب وہ لمحہ آیا جس کا اسے انتظار تھا تو وہ ساری توانائی مجتمع کر کے بے خطر آتش نمرود میں کود گئی۔ اکرام شیخ اپنے فرض کی خاطر جان دے بھی سکتا تھا اور نازو جیسی بہن کی جان لے بھی سکتا تھا تو نازو بھی اس سے کم نہ تھی۔ وہ اپنی محبت کی خاطر جان کی بازی لگا کے بھائی کا راستہ روک سکتی تھی اور نتائج کی پروا کیے بغیر مرنے سے نہیں ڈرتی تھی۔ جو گولی میرے جسم کا نشانہ لے کر چلی تھی اسے نازو نے ڈھال بن کے اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔ چھوڑ دو مجھے سکندر!" اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے کمزور ہاتھوں سے دھکیلا۔ "جاؤ تمھیں رابعہ کی قسم۔"

"میں اس حال میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا نازو!" میں نے کہا۔ اس کے الفاظ آگ کے تیر بن کے میرے دل میں اتر گئے تھے۔ اس وقت بھی جب اسے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی اس نے مجھے اپنی قسم نہیں دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنی محبت کی خاطر جانے پر مجبور کرنا چاہا تھا۔

"اکرام شیخ! دیکھو۔ نازو کا زخم گہرا ہے لیکن گولی شانے سے ذرا نیچے ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر دل تک نہیں پہنچی ہے تو شاید ڈاکٹر نازو کی جان بچا لیں۔ لیکن اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔" اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے آیا اور گھٹنوں کے بل نازو کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ تو نے کیا کیا پاگل! مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" اس نے نازو کا ہاتھ تھاما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"بھیا۔۔۔ رونا نہیں۔۔۔ تمھیں تو فخر ہونا چاہیے۔ آخر میں بہن کس کی ہوں۔" نازو زبردستی مسکرائی۔ پھر اکرام شیخ نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ "ٹھہرو بھیا صرف ایک منٹ کی مہلت۔۔۔ دے دو۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے کچھ کہنا ہے سکندر سے۔۔۔ تمھارے سامنے نہیں۔۔۔ اور دیکھو۔۔۔ وعدہ کرو اسے جانے دو گے۔۔۔ میری قسم تمھیں۔"

اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا اور اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ سلگتے دکھائی دیے جن میں کبھی میرے لیے خلوص اور یگانگت کے جذبات موجزن نظر آتے تھے۔ پھر اس نے آہستہ سے نازو کو زمین پر رکھ دیا۔ اپنے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور چند قدم دور جا کے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"وقت ضائع مت کرو نازو!" میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابھی تک تم نے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بات تو بتائی نہیں۔۔۔ جس کے لیے مجھے۔۔۔ بلایا تھا۔" وہ بمشکل تمام بولی۔

"مجھے تمھارے ذریعے محسن کو پیغام دینا تھا۔" میں نے کہا۔ "وعدہ کرو تم زندہ رہو گی۔۔۔ تم جیسی بہادر لڑکی مر نہیں سکتی۔ محسن آئے تو کہنا کل شام میں وہیں ملوں گا۔ جہاں تم سے ملا تھا۔"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اس کا ہاتھ گر گیا۔ "شیخ! یہ بے ہوش ہو گئی ہے، لے جاؤ اسے۔"

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ ذلیل آدمی!" وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ "یہ نہ ہو اس کے مرنے سے پہلے میں تجھے مار دوں اور اگر یہ مر گئی نا سکندر، تو خدا کی قسم میں تجھے تلاش کر کے کتے سے بدتر موت ماروں گا۔"

پھر اس نے نازو کو دوبارہ اٹھایا اور سڑک کی طرف چل دیا۔ بہت دور کسان کھیتوں سے لوٹ رہے تھے۔ شاید انھوں نے بھی دو مردوں کو ایک عورت کے ساتھ آتے دیکھا ہو گا۔ ایک موٹر سائیکل اور ایک اسکوٹر پر ایک ساتھ۔۔۔ اور یہی سمجھا ہو گا کہ وہ سب شہر کے اوباش لوگ ہیں جو اس ویرانے میں دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر مل رہے ہیں۔ کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان تین افراد کے درمیان محبت اور نفرت کے جذبات کی آگ کے شعلے کس طرح رشتوں کی آبرو کو خاک کر رہے ہیں۔ میں سڑک تک اکرام شیخ کے ساتھ گیا لیکن ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر میں نے ایک ٹیکسی کو روکا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک نظر ہم دونوں پر اور بے ہوش نازو پر ڈالی جس کے خون سے اکرام شیخ کے ہاتھ اور کپڑے تر تھے اور انکار میں سر ہلایا۔ وہ فرار ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "دیکھ رہے ہو کہ ایک زخمی عورت کو فوراً طبی امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔" میں نے کہا۔ "انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔"

"کوئی زبردستی ہے؟" وہ باہر نکل آیا۔ "میری ٹیکسی ہے میں نہیں جاتا۔ نہیں ہے مجھ میں انسانیت تم دوسری ٹیکسی لے لو۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ شیخ نے نازو کو سیٹ پر لٹایا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک بار گر کے پھر اٹھا اور گالیاں بکتا مجھ پر حملہ آور ہوا۔

"۔۔۔ ساری سیٹ گندی کر دی۔ بدمعاشی الگ کھلتے ہو۔ تمھیں معلوم ہے یہ ٹیکسی ڈی ایس پی صاحب کی ہے۔"

"ایسی کی تیسی تیرے ڈی ایس پی صاحب کی۔" میں نے اس کے سینے پر لات ماری اور وہ الٹے کر کے دور جا گرا۔

"یہ کارڈ رکھو اپنے پاس۔" اکرام شیخ نے جیب سے کارڈ نکال کے اس کی طرف پھینکا۔ "ٹیکسی لینے کے لیے ڈی ایس پی کو تھانے بھیج دینا۔ اور خود بھی حاضر ہو جانا۔ تم پر مسافروں کے ساتھ بدسلوکی اور سواریاں بٹھانے سے انکار کرنے کا الزام ہے لیکن میں اس وقت تم کو گرفتار نہیں کر سکتا۔"

جب میں نے ٹیکسی میں لگی ہوئی چابی گھمائی تو اکرام شیخ نے اسے کارڈ اٹھا کے دوڑتے دیکھا۔ "غلطی ہو گئی مائی باپ۔" وہ چلاتا ہوا ٹیکسی کے سامنے آ گیا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ "اس بار معاف کر دیں، ہزار بار میری توبہ۔"

میں نے اس کی سیٹ خالی کی اور ساتھ والی سیٹ پر سرک گیا۔ اس نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کر دی کیونکہ سڑک پر اس کی درگت بننے کا تماشا دیکھنے والے جو پہلے اس کے ہمدرد تھے اب اس پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ "بس او تے؟" "اوئے اینا ای زور سی ڈی ایس پی صاب وچ؟" "وڈا پھنّے خاں دا پتر۔" ان میں راہگیر بھی تھے اور کچھ اس کے ہم پیشہ بھی۔ چنانچہ اس نے کسی کو جواب دینے کے بجائے نکل جانا بہتر سمجھا۔ میں نے کچھ دور جا کے اکرام شیخ کا ریوالور اسے واپس دینے کے لیے نکالا مگر کچھ سوچ کے واپس رکھ لیا۔ ڈرائیور نے اس کا مطلب کچھ اور نکالا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

"باؤ جی!۔۔۔ تھانیدار صاحب۔ رب دا واسطہ۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں اکیلا سہارا ہوں ان سب کا۔" اس نے گڑگڑانا شروع کیا۔ "پولیس میری ٹیکسی بھی بند کر دے گی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور مجھے بھی ۔ میں کیا بتاؤں گا کہ گاڑی میں خون کس کا ہے اور کہاں سے آیا ۔ کون سُنے گا میری بات ۔ آپ تو بچ جائیں گے ۔"

وہ اپنے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ہم میں سے کسی نے اس لڑکی کو گولی ماری ہے اور جب ایک تھانیدار اور ایک بدمعاش کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو ویرانے میں لے جا کر گولی مار دیں تو معاملہ انتہائی سنگین ہوتا ہے۔

"دیکھو ۔۔۔ یہ میری سگی بہن ہے ۔" اکرام شیخ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا ۔" یہ ۔۔۔ اس کی اپنی بے وقوفی تھی ۔۔۔ کہ اسے گولی لگ گئی ۔۔۔" میں نے پلٹ کر دیکھا مگر اکرام شیخ نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔

"تمھارا نام کوئی نہیں لے گا ۔ تم ہمیں البرٹ وکٹر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ تک پہنچا دو ۔" اکرام شیخ نے کہا ۔" اور جاؤ ۔۔۔ اس معاملے میں کبھی پریشانی لاحق ہو تو فون کر لینا یا میرے پاس آجانا ۔"

"ٹیکسی اسی جگہ روک دو ۔" میں نے اچانک کہا ۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اکرام شیخ نے نازو کو کہاں لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈرائیور نے تعمیل کی ۔ میں نے نیچے اُتر کے شیخ کو اس کا ریوالور واپس کر دیا ۔ اب مجھے یہ خطرہ لاحق نہیں رہا تھا کہ وہ پیچھے سے ریوالور میری گدّی پر رکھ دے گا ۔ اس کے باوجود میں نے اپنا ریوالور نکال کے ہاتھ میں رکھا ۔ ڈرائیور نے آنکھیں پھاڑ کے ایک شخص کی جیب سے دو ریوالور برآمد ہوتے دیکھے۔

"جو کچھ ہوا ۔۔۔ اس کے لیے ۔۔۔ آئی ایم سوری ۔۔۔"

میں نے بے ربط الفاظ میں کہا ۔" خدا کرے نازلی ۔۔۔۔"

"اُلو کے پٹھے ! گاڑی چلاؤ ۔" اکرام شیخ نے میری بات کاٹ کے اور ڈرائیور سے گرج کر کہا ۔" میری بہن مرگئی تو میں تم کو بھی شوٹ کر دوں گا ۔"

ڈرائیور کے لیے یہ بہت منحوس دن تھا اور ہم سا بنکار اُسے بہت مہنگا پڑا تھا ۔ وہ ٹیکسی لے کر ہوا ہو گیا ۔

میں سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا رہ گیا ۔ میرے بائیں ہاتھ پر شالامار باغ کا دروازہ تھا جہاں صرف چالیس منٹ پہلے میں نے نازو کو رکشا سے اُترتے دیکھا تھا ۔ گلِ نوشگفتہ کی طرح اُس کے حسن کی ہر ادا ۔ ادائے حسن کی محجوبیت اور معصومیت میں نازآفرینی کا انداز اتنا دلنواز اور ساحرانہ تھا کہ میں نے بہت سی نظروں کو اس کے حسن کی تجلی سے خیرہ ہوتے دیکھا تھا ۔ دائیں جانب وہ فرشِ خس و خاشاک تھا جس پر اس کا لہو زمین پر ایک داغ کی صورت میں موجود تھا ۔ یہ داغ میرے دل پر نقش ہو گیا تھا اور اکرام شیخ کے ذہن پر آگیا تھا ۔ واپس جاتے ہوئے میرے کانوں میں اکرام شیخ کے الفاظ گونج رہے تھے ۔ "اور کتنی زندگیوں کا نذرانہ لو گے ؟ کس کس کو اپنے انتقام کی آگ میں جھونکو گے ؟"

اور میں ندامت و احساسِ جرم کے بارِ گراں کے نیچے دبنے لگا تھا ۔ میں نے تو نازو کو اپنی مدد کی خاطر بلایا تھا ۔ وہ میری مدد کر گئی اور مجھ پر قرض کا بوجھ چھوڑ گئی ۔ اسے کیا ضرورت تھی اس گولی کا راستہ روکنے کی جو میرا مقدر تھی ۔ اپنے خون سے اس نے میری آزادی کی قیمت ادا کی اور شاید پہلی بار اکرام شیخ ادائے فرض کی راہ میں شکست سے دوچار ہوا ۔ وہ فرض شناسی اور اصول پرستی میں کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو بہرحال ایک گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا جس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نہیں تھا ۔ مزاحمت اور قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ وہ شیشے کا آدمی تھا جیسا اندر سے تھا ویسا ہی باہر سے نظر آتا تھا مگر اس میں لچک نہ تھی ۔ دباؤ نے اُسے یکلخت توڑ دیا ۔ چُورا چُورا کر دیا ۔ اب وہ کیا کرے گا ؟ اپنے وجود کے ٹکڑے کیسے سمیٹے گا ؟ کیا ان سے وہ پُورا آدمی بن سکے گا ؟ ۔۔۔ سوالات کی یلغار میرے ذہن کو ماؤف کر رہی تھی ۔ کچے راستے پر اُترتے ہوئے میں نے نازو کے تصور کو ہمرکاب دیکھا ۔ وہ اسپتال کے بے داغ بستر پر لاش کی طرح پڑی تھی ۔ نرس اور ڈاکٹر تیزی سے آجا رہے تھے ۔ "کنڈیشن سیریس ہے مسٹر شیخ ! خون بہت ضائع ہوگیا ہے ۔ زخم تو اتنا خطرناک تھا لیکن آپ نے دیر کر دی ۔ ایمرجنسی آپریشن کر رہے ہیں ہم لیکن آپ خون کا بندوبست کریں ۔ کم سے کم چار بوتل ۔ بلڈ گروپ کیا ہے ؟"

اور اکرام شیخ اپنے گھر فون کر رہا ہے ۔" البرٹ وکٹر ہوسپٹل میں آجایئے ۔ نازو زخمی ہے ۔ نہیں ۔ کوئی خطرے کی بات نہیں !"

جھوٹ جھوٹ !! ۔۔۔ ایک جھوٹ تم نے ٹیکسی ڈرائیور سے بولا تھا ۔ کیا واقعی نازو اپنی غلطی سے زخمی ہوئی تھی ؟ غلطی اگر تھی تو میری جس نے اسے بُلایا تھا ۔ یا تمھاری جس نے اس کا نشانہ لیا ۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے تھے کہ پیچھے تو وہ ہے اور میں بالکل محفوظ ہوں ۔ مگر تم کہہ سکتے ہو کہ غلطی نازو کی تھی ۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی میرے جیسے مجرم سے ملنے کی ۔ یُوں خاندان کی عزت آبرو اور اخلاقی و معاشرتی قیود کا خیال کیے بغیر گھر سے نکلنے کی ؟ کیا مُنہ دکھائیں گے وہ ماں باپ کسی کو جن کی جوان بیٹی ایک مفرور اشتہاری مجرم سے چوری چھپے ملنے پہنچی ہو ؟ بہن پر گولی چلانے والا بھائی کیا کہے گا کہ اس کی چھوٹی اور اکلوتی بہن نے اس پر ہاتھ کیوں اٹھایا تھا ؟ اسی مجرم کی خاطر ؟ کیا وضاحت پیش کرے گا وہ تھانیدار جو ایک زخمی لڑکی سے مار کھا گیا اور مسلح ہونے کے باوجود ملزم کو گرفتار نہ کرسکا ؟

جواب وہی تھا جو اکرام شیخ نے ٹیکسی ڈرائیور کو دیا تھا ۔ اس جواب میں سکندر بخت کا نام کہیں نہیں آئے گا ۔ وہ اپنی بہن کی عزت اور خاندان کی آبرو بچانے کا ۔ کوئی سیدھی سی جھوٹی کہانی سب کو قائل کرے گی ۔ جس کے واقعات روزمرہ زندگی کے مطابق ہوں گے مثلاً یہ کہ نازلی کو کالج سے واپسی پر چند غنڈوں نے اغوا کرنے کی نیت سے ٹھس جیپ میں ڈال کے لے جانا چاہا تھا اور اکرام شیخ نے ان کا تعاقب کیا مگر گولی نازلی کی پشت سامنے ہونے کے باعث اسے لگ گئی ۔ غنڈے ان کا اسکوٹر چھین کر بھاگ گئے ۔ اسکوٹر بعد میں داروغہ والا پل کے قریب پڑا ہوا مل جائے گا ۔ وہ پولیس افسر ہے ' قانونی معاملات کی پیچیدگی کو سمجھتا ہے ۔ وہ خود ہی اس واردات کا ایسا تانا بانا بُن لے گا کہ سقم کوئی نہ رہے ۔ رپورٹ نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف درج ہو اور کیس داخلِ دفتر ہو جائے ۔ وہ اپنی ناکامی اور بہن کی بدنامی پر خاموشی سے پردہ ڈال دے گا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا اس کا میرے سوا کوئی عینی گواہ نہ تھا اور میرا اس کے کسی بھی بیان سے اختلاف کرنا بعید از قیاس تھا ۔

موٹر سائیکل اور اسکوٹر اب بھی ساتھ ساتھ پڑے تھے لیکن وہاں دس بارہ افراد جمع ہو گئے تھے ۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ خون کس کا پڑا ہے اور قاتل یا مقتول میں سے یہ کس کا سامان ہے ۔ وہ سب ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے اور مشورے کر رہے تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے ۔ لیکن سب اپنی اپنی بولی بول رہے تھے ۔ آدھے تو اس چکر میں پڑ کے مصیبت میں گرفتار ہونے کے لیے بالکل تیار نہ تھے ۔ باقی نصف پولیس کو رپورٹ کرنے کے حق میں تھے ۔ مگر اس بات پر اتفاق نہیں کر پا رہے تھے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کون جائے ۔ اسی وقت میں نے قدم رنجہ فرمایا اور تھانیدارانہ لب و لہجے میں صورتِ حال پر قابو پا لیا ۔

"سب تماشا دیکھنے جمع ہو ؟" میں نے ڈانٹ کر کہا ۔" نام بتلاؤ اپنا اپنا ۔ سب کے بیانات ہوں گے تھانے میں ۔" میں نے کہا ۔ آدھی پبلک فوراً چھٹ گئی ۔ باقی نے کہا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں تو بیان کیا دیں ۔ نازو کا پرس ایک ریشمی لاچے والا لیے کھڑا تھا اور مجھے خاصی مشکوک نظروں سے گھور رہا تھا ۔

"تم کون ہو جی ! کہاں کے تھانے دار ہو ؟" لاچے والے نے کہا ۔

میں نے اُسے ایک خوفناک گالی دے کر اُلٹے ہاتھ کا طمانچہ مارا جس سے اس کا رخسار لال پڑ گیا ۔" یہ پرس کیسے اٹھایا تم نے ؟ اس پر فنگر پرنٹ تھے ۔" میں نے گرج کر کہا ۔" یہ اسکوٹر سب انسپکٹر اکرام شیخ کا ہے ۔ اور میں تھانیدار ہوں یا نہیں ' اس کا پتا تمھیں تھانے جا کے چلے گا ۔ اُٹھاؤ یہ اسکوٹر ۔" میں نے اچانک ریوالور نکال لیا ۔

لاچے والے ہی کو نہیں جملہ حاضرین کو بھی میرے تھانیدار ہونے کا یقین ہو گیا ۔ اس نے نازو کا زنانہ ہینڈ بیگ مجھے پکڑا دیا ۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو مجھے نوٹ ہی نوٹ نظر آئے ۔ سو کے پچاس کے ۔۔۔ دس اور پانچ کے ۔

"کتنی رقم پار کی ہے اس میں سے ؟" میں نے لاچے والے کی گردن پکڑ لی جو اسکوٹر اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا ۔

"قسم مولا کی سرکارِ عالی ! حرام ہے جو کھول کے بھی دیکھا ہو ۔ پُوچھ لیں آپ ان سب سے ۔" وہ رونے کے قریب ہو گیا ۔

"اسکوٹر چلا سکتے ہو ؟" میں نے اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد قدرے نرم لہجے میں کہا ۔

لاچے والے نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔" کہاں لے جانا ہے سرکارِ عالی ؟"

میں نے اُسے تھانے کا پتا بتایا ۔" تم چلو میں پیچھے آرہا ہوں ۔ اِدھر اُدھر مت ہو جانا ورنہ قبر سے نکال لاؤں گا ۔ سارے گھر کو بند کر دوں گا ۔" میں نے فحش کلامی میں پولیس مین کا مثالی کردار پیش کیا اور کامیاب رہا ۔ لاچے والے کو کچھ لوگوں نے حوصلہ دیا کہ تھانیدار صاحب کچھ نہیں کہیں گے بس تم اسکوٹر تھانے پہنچا کے لوٹ آؤ گے ۔ دو ایک نے دست بستہ مجھ سے گزارش کی کہ میں ازراہِ بندہ پروری لاچے والے کو گھر واپس آنے دوں ۔ اور میں نے اکڑی ہوئی گردن پر سرِ پُرغرور کو جنبش دے کر صحیح تھانیدار کی طرح اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور کہا ' وہ اسکوٹر تھانے کے باہر کھڑا کر کے بھاگ آئے ۔ جب لاچے والا بڑے خشوع و خضوع سے اسکوٹر لے کر تھانے جا رہا تھا تو میں ایک پبلک کال آفس سے البرٹ وکٹر ہوسپٹل فون کر رہا تھا ۔۔۔ ایمرجنسی کے نمبر پر میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ۔

"میں ایس ایس پی ضامن رضوی بول رہا ہوں ۔" میں نے انگریزی میں کہا ۔" ابھی ابھی ایک کیس آیا ہے ۔ میرے ایک ماتحت سب انسپکٹر شیخ کی سسٹر ہے ۔ غالبًا وہ کسی حادثے میں گولی سے زخمی ہوئی تھی ۔۔۔ مس نازلی ۔"

"یس سر ۔۔۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے ۔" ڈاکٹر نے کہا ۔" بلٹ نے ہارٹ کو مس کر دیا ہے ۔ ویری لکی فار ہر ۔۔۔ شولڈر بلیڈ کے نیچے رہ گئی ۔ ہڈی پر معمولی سی خراش ہے ۔ ایکس رے بہت صاف ہے ۔"

"خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے نا ؟" میں نے کہا ۔" مجھے یقین ہے وہ ماہر ہاتھوں میں ہوگی ۔"

"آف کورس سر ۔۔۔ لیکن خون کافی بہہ گیا ہے ۔۔۔ ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے ۔" وہ بولا ۔" چوبیس گھنٹے بعد معلوم ہوگا ۔۔۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"حادثہ کیسے پیش آیا؟ شیخ نے کیا بتایا ہے؟" میں نے کہا۔

"تفصیلات تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "پولیس سرجن کی رپورٹ میں ہے کہ وہ اپنی سسٹر کے ساتھ جا رہے تھے کہ چند افراد نے اُن کا راستہ روکا اور انھیں لوٹنے کی کوشش کی۔ وہ اسکوٹر اور مس نازلی کا پرس چھین کر لے گئے جس میں کافی رقم تھی۔ مقابلے میں جو گولی انسپکٹر شیخ نے ایک ڈاکو پر چلائی تھی وہ اُن کی بہن کو لگ گئی جو خود بھی جوڈو وغیرہ جانتی ہے چنانچہ مقابلے میں شریک تھی اور اگر گولی نہ لگتی تو شاید وہ بدمعاش بھاگ نہ پاتے۔"

"اوہ یس۔ میں جانتا ہوں اُسے۔" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ "ویری بریو گرل۔ اچھا ڈاکٹر۔ ڈو می اے فیور۔ میری لائن کچھ خراب ہے۔ کسی سے کہو میرے گھر رنگ کر دے۔ میری وائف کو یا مس رابعہ کو۔ ورنہ وہاں محسن ہوگا، ان کو اس حادثے کی اطلاع دینی ہے۔ تھینک یو۔"

ایک ٹیلی فون سے کئی مسئلے حل ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اکرام شیخ نے میری توقعات کے مطابق سب کو مطمئن کرنے کے لیے اور سب کی پوزیشن محفوظ رکھنے کے لیے تقریباً ویسی ہی کہانی گھڑلی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔ کچھ دیر میں بیگم رضوی، رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں گی۔ انھیں تو البرٹ وکٹر اسپتال سے پیغام ملے گا۔ چنانچہ ان کے لیے شک کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اسپتال سے کسی نے ایس ایس پی کا حوالہ دیا تو تھوڑا سا کنفیوژن پیدا ہوگا مگر نقصان کوئی نہیں ہوگا۔ رضوی صاحب کا ذہن میرے سوا کسی کی طرف نہیں جائے گا کہ رابعہ اور محسن کو اسپتال بلوانے کے لیے میں نے ان کا نام استعمال کیا ہے۔ اکرام شیخ بھی یہ بات سمجھ جائے گا کہ اسکوٹر کو تھانے بھجوانے والا بھی میں ہی ہوں لیکن کہا یہ جائے گا کہ غالباً ڈاکو خود اسے وہاں پھینک گئے۔ حالات امید افزا تھے۔ اور اگرچہ ڈاکٹر نے واضح الفاظ میں امکانات کو ففٹی ففٹی قرار دیا تھا لیکن میرے دل کی آواز یہ کہتی تھی کہ وہ زندہ رہے گی۔ قدرت اتنی نامہرباں اور غیر منصف نہیں کہ ایک ناکردہ گناہ پر اس کو عمر کے دورِ بہار میں زندگی سے محرومی کی سزا دے۔ ویری لکی فار ہر، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دل محفوظ رہا۔ ساری خرابی اسی دل کی تھی جس کے ہاتھوں مجبور ہو کے وہ مجھ سے ملنے آ پہنچی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کبھی اس سے محبت نہیں کر سکتا، اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ کہ سکندر! یہ جان تو آنی جانی ہے۔ اس جاں کی تو کوئی بات نہیں۔ کیا یوں بھی کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے؟

ایک خوش آئند امکان یہ تھا کہ انکل رضوی کے تعینات کیے ہوئے فرشتے اس سانحے سے غمزدہ رابعہ اور محسن کے ساتھ اسپتال پہنچ جائیں مگر وارڈ سے دُور رہیں خصوصاً بیگم رضوی کے ساتھ ہونے کے باعث۔ نازو اگر ہوش میں ہوتی تو محسن کو میرا پیغام ضرور دیتی لیکن ابھی تو اس پر چوبیس گھنٹے بھاری ہیں اس کے بعد بھی وہ کب اس قابل ہوگی کہ کسی سے بات کر سکے۔ یہ بالکل غیر یقینی تھا۔ مگر میں خود اسپتال میں موجود رہ کے اس سے رابطے کی کوئی صورت یقیناً نکال سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں پہلے ہی اسپتال پہنچ کے کوئی بندوبست کر لوں۔ موٹر سائیکل اس بے سروسامانی میں میری بہت مدد کر رہی تھی۔ اس کا نمبر تو پہلے ہی بدل چکا تھا۔ اس کی ظاہری صورت کو بدلنے کے لیے میں نے ٹول بکس کے اوزاروں کی مدد سے اس کے دونوں بیک ویو مرر اتار دیے، کیریئر ہٹا دیا جو سیٹ کے پیچھے مڈ گارڈ کے اوپر لگا ہوا تھا۔ اور ایک جگہ رک کر سیاہ ریگزین کی سیٹ پر شالا مار کالا تھا کا نیلے رنگ کا کور چڑھا لیا۔ موٹر سائیکل کو اب اس کا حقیقی مالک بھی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

اسپتال میں داخل ہونے کے لیے میں نے عام راستے کے بجائے عقبی دروازے کو استعمال کیا جو ڈاکٹروں اور پیرا میڈیکل اسٹاف کے لیے مخصوص تھا۔ ادھر نرسیں اور ڈاکٹر ہی نہیں میڈیکل کے اسٹوڈنٹ اور اسپتال کے ملازم بھی پھر رہے تھے۔ کینٹین انہی کے دم سے آباد تھی۔ اب شام کے اندھیرے میں رات کی سیاہی کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا چنانچہ ہر جگہ مرکری لائٹس اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ اور سائے میں صورتوں کی شناخت بھی دشوار تھی۔ میں نے کینٹین کی ایک خالی میز پر بیٹھ کے نازو کے ہینڈ بیگ کی رقم شمار کی۔ مجموعی طور پر اس میں تین ہزار سات سو چھپن روپے تھے۔ مجھے ایک پرانی کہانی یاد آئی جب کسی نے نصف شب کو اپنے دوست کے دروازے پر دستک دی تھی تو دوست تین چیزیں ساتھ لے کر باہر آیا تھا۔ شمشیر برہنہ کہ دشمنوں کا خوف ہو تو مقابلے کے لیے جان حاضر ہے۔ اشرفیوں کا توڑا کہ دنیاوی ضرورت کے باعث تنگی ہے، مال حاضر ہے۔ اور ایک کنیز مہ لقا کہ شبِ تنہائی کا عذاب ہے تو چاندنی رات اب تیرے حوالے۔ نازو جانتی تھی کہ میں مصیبت میں ہوں۔ وہ خود تو مدد کے لیے سربکف پہنچی ہی تھی، اپنی تمام متاعِ نقد بھی ہمراہ لے آئی تھی کہ میرے کام آ سکے تو میں لے لوں۔ یہ وہ لڑکی تھی جو ایک دن کے لیے سو روپے ادھار دیتی تھی تو سوا یا ڈیڑھ سو واپس لیتی تھی اور زبردست سود خور شمار ہوتی تھی۔ سود ادا کرنے میں اس کے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا تھا اور ایک بار تو یہ سود مجھے بھی بہت مہنگا پڑا تھا۔ اب وہ اتنی بڑی رقم

جو اس نے عجیب خرچ سے پس انداز کی تھی اور سود سے کمائی تھی، اپنا خلوص اور اپنی محبت شامل کر کے میرے حوالے کر چکی تھی۔ میرا اسے بلانے کا اصل مقصد تو پیغام رسانی تھا مگر میں اس سے سوچا میں ادھار ضرور لیتا کیونکہ اس وقت میں بالکل قلاش تھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو۔۔۔" ایک نرس نے چائے کی پیالی اور دو مکھن لگے سلائس لے کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل جگہ کہیں نہیں ہے۔۔۔ اور مجھے جلدی ہے۔" اُس نے توس دانتوں سے کاٹ کے کھاتے کھاتے مجھے دیکھا۔ "باہر کے آدمی ہو، جانتے نہیں یہ کینٹین۔۔۔"

"جانتا ہوں۔ لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں ادھر نہیں جا سکتا۔" میں نے سخت مغموم صورت بنا کے رقت طاری کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں پولیس آئے گی اور مجھے پکڑ کے لے جائے گی۔۔۔ میں کیا کروں؟"

"کیا کہا؟ ارے بھئی بھاگ جاؤ۔" وہ گرم چائے کا گھونٹ لے کر بولی۔ "کیا۔۔۔ جرم۔۔۔ الزام ہے تم پر؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ سب سے بڑا الزام میری غربت ہے۔" میں نے سر تھام کے کہا۔ "میرا دشمن وہ شخص ہے جس نے میری بہن کو گولی ماری۔ اور الزام لگا دیا کہ اسے اپنے دفاع میں گولی چلانی پڑی تھی مجھ پر۔"

"تم پر؟" نرس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ "یا تمھاری بہن پر؟"

"بات سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "وہ سؤر کا بچہ دھوکے سے میری بہن کو ورغلا کے لے گیا تھا۔ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ وہ دست درازی پر آمادہ تھا کہ میں جا پہنچا۔ اس نے نشے میں مجھے شوٹ کرنا چاہا۔ بہن مجھے بچانے کے لیے سامنے آ گئی لیکن الزام مجھ پر آیا۔ اس کے نوکروں نے گواہی دے دی کہ فائر کرنے والا میں تھا۔ میں نے سیٹھ پر گولی چلائی تھی جو میری بہن کو لگی۔ میری بہن سیٹھ کے پاس ملازمت کی درخواست لے کر گئی تھی۔ میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہوا۔ لیکن میں جانتا ہوں رپورٹ میرے خلاف لکھی جا چکی ہے۔ اب وہ ایمرجنسی وارڈ میں ہے۔ معلوم نہیں زندہ ہے کہ مر گئی ہے۔ میرا ایک دوست دیکھنے گیا تھا مگر وہ بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ اب میرے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ بھی پکڑا نہ گیا ہو۔ تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟"

"میں؟ میری ڈیوٹی ایمرجنسی وارڈ میں نہیں ہے۔" وہ چونک کر بولی۔

"لیکن تم جا تو سکتی ہو وہاں۔ پلیز۔ دیکھو تم مجھے مجرم سمجھو یا بے گناہ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس مجھے اپنی بہن کی خبر لا دو۔ تم بھی تو کسی کی بہن ہو آخر۔ سوچو ذرا میری جگہ تمھارا بھائی ہوتا۔۔۔" میں نے فرفر بولنا جاری رکھا۔

"اچھا اچھا۔ نام بتاؤ۔" وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نازو۔۔۔ ہم نازو کہتے تھے۔ یہاں نازلی لکھوایا گیا ہوگا۔ پرائیویٹ وارڈ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ایک منٹ کے لیے یہ قلم دو۔"

"راوِ گاڈ۔ ارے بھئی وقت نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے اپنا نازک سا زنانہ قلم مجھے تھما دیا۔

میں نے زمین پر سے سگریٹ کا خالی پیکٹ اٹھایا اور درمیان میں سے پھاڑ کے لکھا۔ "نازلی کا کیا حال ہے؟" اور نرس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "وہاں محسن کو دیکھ لینا۔ میرے ہی قد کا جوان آدمی ہے۔ درمیان سے مانگ نکالتا ہے۔ براؤن بال ہیں نیچرل براؤن۔۔۔ یا ایک لڑکی ہوگی رابعہ، فلم اسٹار زیبا کی ہمشکل۔ نام نہ لینا نہ ان کے متعلق پوچھنا۔ بس وہ نظر آ جائیں تو یہ اُن کے ہاتھ میں دے دینا۔ ایسے کہ کوئی دوسرا نہ دیکھے۔ اور سسٹر۔" میں نے ہینڈ بیگ میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے۔ "فار یور ٹربل۔ اس احسان کا بدلہ پھر کبھی ادا کروں گا۔"

"واٹ؟ کیسا احسان؟ کیسی ٹربل؟ مجھے معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے۔" اس نے مختصر سے کارڈ کو پڑھ کر کہا۔ لیکن اس میں مشتبہ بات کوئی نہیں تھی۔ "تم رشوت دے رہے ہو مجھے؟"

"اوہ نو۔ کاش میں اس سے زیادہ کر سکتا۔ اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ معاملہ تو گڑبڑ ہے اور میں تم کو بتا بھی چکا ہوں۔ مجھے تم اعتماد کے قابل نظر آئی تھیں ورنہ میں یہ سب نہ بتاتا۔ مگر کیا میں نے غلطی کی ہے؟ کیا تم پولیس کو اطلاع دو گی؟ بولو۔۔۔ اگر تمھارا بھائی ہوتا۔" بھائی کا ذکر اس کی کمزوری معلوم ہوتا تھا۔

"اچھا اچھا۔ میں جاتی ہوں۔" اُس نے پانچ سو روپے رکھ لیے اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی باہر نکلا۔ اور کینٹین کے روشن دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ انتظار ایک بار پھر میرے اعصاب پر مسلط ہو گیا۔ ایک ہی دن میں دوسری بار میں سسپنس کا شکار ہوا۔ امید اور ناامیدی۔ خوف اور بے یقینی اور آرزو کا اضطراب جھیلتے اور ایک ایک منٹ بعد گھڑی دیکھتے بارہ منٹ گزر گئے۔ تیرھویں منٹ پر محسن نمودار ہوا۔ اس نے میری تحریر شناخت کر لی تھی اور ذاتی عقل سے کام لیتے ہوئے یہ بھی معلوم کر لیا تھا۔ کہ میں کہاں دستیاب ہوں۔ پانچ سو روپے ضائع نہیں ہوئے تھے۔ اس نرس نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ باقی محسن کی ذہانت تھی کہ وہ غائب ہو کے یہاں آ پہنچا۔ وہ سیدھا اندر جا کے اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے چند

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

منٹ میں یہ ہمت دیکھا کہ اگر کوئی محسن کے تعاقب میں ہو تو نظر آ جائے۔ پھر میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا کہ نازو کے گولی لگ گئی ہے؟" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ یوں جیسے ایک اجنبی دوسرے اجنبی سے کوئی فضول سا سوال کرے مثلاً وقت پوچھے۔ قطعی غیر جذباتی لہجے میں۔

"باہر میری موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ یہاں سے نکل اور موٹر سائیکل اسٹینڈ پر میرا انتظار کر۔" میں نے کہا۔ پھر محسن نے چائے ختم کی۔ میں نے اس کے اٹھنے کے بعد چائے منگوائی، خاموشی سے پی اور دس منٹ بعد روانہ ہوا۔ محسن گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ "یہ موٹر سائیکل چھینی ہے کسی سے؟" اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یا دی ہے؟"

"وہ نہیں ہے۔ جہیز میں ملی ہے سسرال سے۔" میں نے کہا۔

"مگر تجھے کیا موٹر سائیکل کے شجرۂ نسب سے۔ تو یہ بتا آج صبح انکل رضوی نے اچانک اتنا کامیاب چھاپا کیسے مارا؟ ان کو کس نے بتایا کہ میں وہاں موجود ہوں؟"

"مجھے طافو پر شک ہے۔" محسن نے کہا۔ "منظر نے تو یہی کہا تھا کہ وہ گھر کا ملازم ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی اور ایس ایس پی صاحب کی نظروں میں خفیہ پیغام رسانی ہو گئی تھی۔ کوئی بات تھی کہ طافو پولیس کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوا حالانکہ اس کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ وہ سیٹھ کریم سے پانچ لاکھ لے کر ایک ٹرک کا مال خورد برد کر چکا ہے۔ مجبوراً ہی سہی۔ اور اس بات کا علم ہو جانے کے بعد گلامے ماچھی نے ان دونوں کی موت کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ رحمت تو اتفاقیہ مارا گیا لیکن طافو بچ گیا تھا۔ ہمارے بہت بند جانے پر وہ تیار ہو گیا تھا کہ بیوی بچوں سمیت نکل جائے مگر تیرا ساتھ چھٹ جانے کے بعد اس کا حوصلہ پھر جواب دے گیا۔ وہ دھوبی کا کتا ہو گیا تھا۔ خوف اسے پہلے بھی تھا کہ وہ لوگ اسے چھوڑیں گے نہیں اور وہ جہاں بھی ہو گا بالآخر تلاش کرنے والے اس تک پہنچ جائیں گے۔ جب تیرا مقابلہ پولیس سے ہوا تو وہ سمجھا کہ تو پکڑا گیا اور وہ جان بچا کے بھاگا۔ اسے یقین تھا کہ اب پولیس بھی اسے گرفتار کر کے ہی دم لے گی اور اگر ایک بار پولیس کے ہاتھ پڑ گیا تو مارنے والے اسے بڑی آسانی سے مار جائیں گے۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے پرانے آقاؤں سے تعلق کو پھر استوار کرے جو ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ طافو فرار نہیں ہوا تھا، اغوا ہو گیا تھا اور اغوا کرنے والے ہم تھے جو اسے سب کچھ بتا چکے تھے کہ ہم کون ہیں۔ میں نے تجھے خبردار کیا تھا کہ تو اس ٹرک ڈرائیور پر بہت

زیادہ اعتبار کر رہا ہے۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور ملتان پہنچتے ہی فون پر گامے ماچھی کو بتا دیا کہ وہ کس وجہ سے کراچی نہیں پہنچ سکا۔ یہ اپنی وفاداری ثابت کر کے جان بچانے کی ایک کوشش تھی جسے جوا کہا جا سکتا ہے۔ اس نے گامے ماچھی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ جان کے خوف سے پانچ لاکھ لینے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ انکار کرتا تو رحمت کباڑی یا سیٹھ کریم اسے مار ڈالتے۔ لیکن اب تو کباڑی نہیں رہا تو وہ بتا رہا ہے کہ اس کا ارادہ کبھی غبن کا نہیں تھا اور اس کی نیت میں فتور نہیں آیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، خوف کے باعث کیا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اعتراف جرم بھی کر رہا ہے۔ سکندر اور محسن نام کے دو افراد کے متعلق مفید اور اہم معلومات بھی فراہم کر رہا ہے۔ اس کے بعد گامے ماچھی نے اسے حکم دیا کہ وہ ملتان کے ہوٹلوں پر نظر رکھے اور جیسے ہی سکندر بخت نظر آئے اسے فون کر دے۔ تیری خوش قسمتی تھی کہ اس رات تو ملتان نہیں پہنچا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ڈرائیور نے جو کچھ بتایا وہ گلامے ماچھی نے دلاور کو بتا دیا اور دلاور نے ہی طافو کے لیے یہ احکامات صادر کیے کہ وہ سکندر بخت کے ساتھ رہے اور اسے منظر صاحب کے گھر لے آئے۔ ڈبل ایجنٹ بن جائے۔"

"محسن خان! آپ مفروضات پر بات نہیں کر رہے ہیں!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "جب میں نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ دوبارہ ملاقات نہ ہو تو منظر نام کے وکیل صاحب کے گھر پہنچ جانا۔ اس وقت تو موجود نہیں تھا۔ کیا طافو نے تیرے سامنے اعتراف جرم کر لیا ہے؟"

"ہاں۔" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "اس کے رویے نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ شک مجھے انکل رضوی کے رویے سے ہوا۔ وہ طافو کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے حالانکہ وہ آسانی سے کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ انھوں نے طافو کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کم سے کم اس سے پوچھ سکتے تھے کہ تم نے اس نام اور حلیے کے آدمی کو گھر میں دیکھا ہے؟ یہ سوال انھوں نے مجھ سے کیا۔ منظر اور رابعہ سے پوچھا۔ منظر کی بیوی اور بچوں سے پوچھا کہ سکندر کہاں ہے اور ہم سب نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ اس کا یہاں کیا کام اور کون کہتا ہے کہ وہ یہاں آیا تھا۔ کمال تو منظر کی بیوی نے کیا کہ اتنے کم وقت میں خود بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئی اور اس نے بچوں کو بھی سمجھا دیا۔ منظر نے تو بہت ہنگامہ کیا لیکن وہ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے آئے تھے۔ رضوی صاحب نے کسی کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ انھوں نے منہ پر کہہ بھی دیا کہ ہم سب مجرم ہیں کیونکہ ہم سب

ایک مجرم کو چھپا رہے ہیں اور فرار میں مدد دے رہے ہیں۔ منظر نے بھی لحاظ نہیں کیا اور صاف کہا کہ یہ دھونس نہیں چلے گی۔ سکندر بخت کسی کی جیب میں نہیں ہے اور ہے تو جامہ تلاشی لے لو۔ اب گڑبڑ یہ تھی کہ تیرا سب سامان وہیں تھا لیکن انکل رضوی تیری تلاش میں نکل گئے اور کامیاب بھی ہو جاتے اگر تو موٹر سائیکل پر فرار نہ ہوتا۔ وہ تیرے پیچھے دوسرے اور پھر تیسرے گھر کے راستے باہر نکل گئے۔ اور منظر نے فوراً قانونی نکتہ پیدا کر لیا۔ غالباً رابعہ نے اس کے کان میں یہی بات کی تھی۔ اب دوبارہ ایس ایس پی صاحب تشریف لائے تو ان کا ارادہ تھا کہ تیرا سامان دیکھیں اور تیری موجودگی کے ثبوت حاصل کریں مگر منظر نے دروازے پر ہی روک لیا کہ ایک بار خانہ تلاشی کے وارنٹ تھے، وہ آپ لے چکے۔ دوسری بار گھر میں داخل ہونے کے لیے دوسرے وارنٹ لے کر آیئے۔ ناکامی نے رضوی صاحب کو ویسے ہی مشتعل کر رکھا تھا۔ وہ منظر پر برس پڑے اور بس اپنی افسری کی شان میں بلڈ پریشر کی وجہ سے زیادہ بول گئے۔ منظر نے کہا کہ ایک وکیل سے اس قسم کی زبان استعمال کرنے پر میں قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ یہ ہتک عزت کا کیس ہے۔ اور رضوی صاحب کو واپس لوٹنا پڑا۔ میں اور رابعہ اندر دبکے رہے۔ اس کے بعد میں نے طافو کو جکڑ دیا۔ میں حیران تھا کہ رضوی صاحب نے اس سے تیرے متعلق ایک سوال بھی نہیں کیا۔ ان کے رخصت ہوتے ہی میں نے طافو سے کہا کہ سکندر کا سامان گاڑی میں رکھو ہمیں ابھی جانا ہے۔ اسے مجھ پر اور میری نیت پر کوئی شبہ تھا ہی نہیں وہ بے خوف ہو کے دلاور اور گامے ماچھی کا ایجنٹ زیرو زیرو سیون بنا میرے ساتھ چل پڑا۔ میں اسے استاد ٹیڈی کے گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے تفتیش کی۔ اور تیرا خیال درست ہے۔ جو کچھ میں نے بتایا مفروضات پر مشتمل نہیں تھا۔ طافو کے اعتراف جرم پر مبنی تھا۔ ہم نے سب ریکارڈ کر لیا ہے۔"

"اور وہ خود اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی کی قید میں۔ اسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔" محسن نے کہا۔ "گاڑی کی نمبر پلیٹ میں نے بدل دی ہے اور گاڑی اس وقت ہوٹل فاران میں ہے۔ جہاں میں نے اپنے لیے اور رابعہ کے لیے کمرے بک کرائے ہیں۔"

"کیوں؟ انکل رضوی سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"یار! جب کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد اس بات کی ضرورت کہاں رہتی ہے۔ ہم اب وہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر ہم دونوں وہاں رہیں گے تو ہماری حیثیت وہاں نظر بندوں کی سی ہو گی اور ہم کسی طرح بھی تیرے کام نہیں آ سکیں گے۔ اب اگر وہ ایس

ایس پی بن کے ایک طرف ہیں تو پھر ہم دوسری طرف ہیں، جدھر تو ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ انکل رضوی ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔ رابعہ نے اپنا سامان پیک کر لیا ہے اور میرا بھی۔ بیگم رضوی بہت افسردہ ہیں مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ وہ دخل نہیں دے رہی ہیں۔"

"نہیں یقین ہے کہ تم لوگ اتنی آسانی سے باہر نکل آؤ گے؟ کوئی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔

"میں تو نکل آیا تھا۔" محسن بولا۔ "کیونکہ میں منظر کے گھر سے لوٹ کر گیا ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ایس پی صاحب کے حکم کے غلام رابعہ کے تعاقب میں آئیں۔ گزشتہ چند دن سے مجھے بھی شک ہے کہ جہاں میں جاتا ہوں، ایک چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور مڑی ہوئی ناک والا چیچک رو شخص میرے ساتھ جاتا ہے۔ کل تو میں نے مذاق میں اسے روک لیا تھا اور اس سے ہاتھ بھی ملایا تھا۔ میں نے کہا کہ واہ بھئی خوب ملے۔ کہاں ہو آج کل۔ سنا ہے شادی کر لی ہے دوسری۔ آپ کے اسٹاک میں کتنی بیویاں ہیں؟ وہ ایسا بوکھلایا کہ اوں آں کرتا رہ گیا۔ اور میں نے دھپ مار کے کہا کہ بھئی اس وقت تو جلدی میں ہوں۔ کل آ جاؤ چھمیا جان کے کوٹھے پر۔ اور چل پڑا۔ ہمارے ٹیلیفون بھی ٹیپ ہوتے ہیں اس لیے میں رابعہ کو ایک ترکیب سمجھا کے آیا ہوں۔ امید ہے وہ بخیر و عافیت منزل مراد تک پہنچے گی۔ اب باقی باتیں ملاقات پر یار۔ وہ بیگم رضوی تاڑ چکی ہوں گی کہ میں غائب ہوں اور ایس ایس پی صاحب پہنچ گئے ہوں گے تو مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر لوٹ کر آیا۔ "تو نے میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا تھا نا کہ تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"ہاں۔ اور ابھی اس سوال کا جواب دینا ضروری بھی نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تو جا۔"

میں موٹر سائیکل پر دندناتا ہوا ہوٹل فاران پہنچا۔ "محسن حسن خاں شیروانی کون سے کمرے میں مقیم ہیں؟" میں نے کاؤنٹر کلرک سے سوال کیا۔

"محسن خاں شیروانی؟" اس نے دہرایا اور ایک نظر اپنے رجسٹر پر ڈال کے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں تو اس نام سے کوئی بھی نہیں۔"

"اچھا۔ تو مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہوں گی؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

کلرک نے پھر وہی عمل دہرایا اور پھر انکار کیا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ محسن نے یقیناً فرضی ناموں سے بکنگ کرائی ہو گی۔ میں نے ان کے اصلی نام لے کر غلطی کی تھی۔ اب یہ عین ممکن تھا کہ کلرک کو دونوں نام یاد رہ جائیں اور خدانخواستہ کوئی ان کا سراغ لگاتا ہوا آئے تو کلرک بتا دے کہ پہلے بھی ایک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

شخص فلاں کمرے میں مقیم ایک خاتون اور فلاں صاحب کسے ہی نام لے رہا تھا۔ میں فوراً واپس ہُوا۔ اب میرا اس ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ یُوں بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہم سب ایک ہی جگہ نہ ہوں میرا اندازہ تھا کہ ابھی ایک گھنٹے سے پہلے وہ دونوں ہوٹل نہیں پہنچ سکتے اور اس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے اپنے قیام کا بندوبست کر لینا چاہیے۔ میں نے لاہور ہوٹل کا انتخاب کیا جو اپنی کئی منزلہ عمارت کی وسعت کے باعث اندر ایک پورا شہر ہے۔ اس کے چھوٹے سے چھوٹے کمرے سے لے کر بڑے سے بڑے کمرے تک مختلف شہروں سے آئے ہوئے ہر طرح کے لوگ بھرے رہتے ہیں۔ امیر سے فقیر بیگ تک اور نزاکت علی خاں سے شہ زور خاں تک۔ اس بھیڑ میں میرا گم رہنا زیادہ آسان تھا۔ ڈاکٹر امجد کے نام سے میں نے نسبتاً بہتر قسم کا اٹیچ باتھ اور ٹیلی فون والا کمرہ ساٹھ رُوپے یومیہ پر حاصل کیا۔ اور پانچ دن کی ادائیگی بھی ایڈوانس کر دی۔ کلرک کچھ مرعوب تھا اور حیران بھی کہ ڈاکٹر صاحب خالی ہاتھ آ گئے۔ پہننے کے کپڑوں کا سوٹ کیس تک نہیں ویسے تو ڈاکٹر کے گلے میں سٹیتھسکوپ بھی ضرور ہونا چاہیے۔

”گاڑی کی پارکنگ کے لیے کوئی انتظام ہے؟“ میں نے کہا۔

”ابھی کچھ دیر میں شوفر آئے گا۔ گاڑی کے علاوہ میرا سامان لے کر۔ وہ مجھے ڈراپ کر کے ایک کام سے گیا ہے۔“

”آپ بالکل مطمئن رہیں سر“ کلرک نے مطمئن ہو کے کہا۔ ”انشاءاللہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“ وہ مجھے چابی دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کہا کہ شوفر کو دیدیے اور خود ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ جہاں امرتسر دُوردرشن سے فلمی گانے سننے کے شائقین چائے پینے کے بہانے جمع تھے۔ ائیرکنڈیشنڈ ہال میں نمکین کی وی تھا اور چائے قدرے مہنگی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ ناظرین باہر کے عوام میں شامل تھے۔ اس طبقاتی فرق پر غور کیے بغیر میں نے ڈنر تناول فرمایا اور قیمت بل میں شامل کرانے کے بجائے نقد ادا کی پھر میں نے ایک شانِ بے نیازی سے گھڑی دیکھ کر شوفر پر خفگی کا اظہار کیا۔ کاؤنٹر کلرک کو تاکید کی کہ وہ آئے تو اسے چابیاں دے دے۔ نئی اوپل ریکارڈ گاڑی ہو گی۔ اس میں سے سامان نکلوا کے کمرے تک پہنچا دیا جائے اور گاڑی محفوظ جگہ پہنچا دی جائے۔ پھر میں باوقار طریقے سے باہر نکلا۔ چوری کی موٹر سائیکل تک پہنچا۔ اور اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے ہوٹل فاران کی طرف چل پڑا۔ پون گھنٹے تک میں نے ہوٹل کے دروازے کو مدِنظر رکھتے ہوئے چہل قدمی فرمائی۔ اور مجھے اس وقت ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب محسن خاں اوپل ریکارڈ چلاتے ہوئے تشریف لائے اور مس رابعہ قاری اپنی شہرۂ آفاق سرخ رنگ کی فاکس ویگن میں آئیں بلکہ وہ دونوں ٹیکسی سے اُترے۔ محسن کو شیروانی، چوڑی دار پاجامے اور ترکی ٹوپی میں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عصا بھی تھا۔ ٹیکسی چلی گئی تو میں نے منہ میں انگلی ڈال کے لوفروں کی طرح سیٹی بجائی اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ اس نے رابعہ کو اندر جانے کو کہا اور خود سٹرک عبور کر کے میری طرف آیا۔ ”بے شرم نہیں آتی۔ شریف لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہو، بدمعاش!“ محسن خاں نے مجھے ڈانٹا اور عصا کو گھمایا۔

”معاف کرنا بہن۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شریف لڑکیاں ہیں۔ جیسے آپ کو نہیں معلوم کہ میں ڈاکٹر امجد ہوں۔ لاہور ہوٹل کے کمرہ نمبر ۸۸۸ میں مقیم ہوں اور آپ میرے شوفر ہیں۔ اب تک آپ کو میرا سامان لے کر وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ صورت سے آپ بالکل کارٹون لگ رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ محسن نے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”غالباً آپ کو بھی معلوم نہیں کہ ہم نواب ننھے خاں ہیں اور یہاں ہوٹل کے سوئٹ نمبر ۹ میں اپنی سسٹر کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ پرنسس صوفیہ کے ساتھ۔“

”میں یہاں محسن خاں شیروانی اور مس رابعہ قاری کو تلاش کرتا رہا۔ معذرت چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر امجد کی کار اور سامان لے کر لاہور ہوٹل پہنچ جانا نواب ننھے خاں! ورنہ شوفر کی نوکری بھی جائے گی۔“

”یس سر۔ صرف سامان لانا ہے؟ کوئی اور آنا چاہے تو ساتھ لاؤں یا نہ لاؤں؟“ وہ ترکی ٹوپی لہرا کے بولا۔

”پولیس اور چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے سوا جو بھی آنا چاہے تو چشم ما روشن دلِ ماشاد۔“ میں نے کہا اور موٹر سائیکل کو کک ماری۔ اس نے تھوڑا سا شور مچایا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے دوسری بار دولتی جھاڑی اور نتیجہ پھر وہی نکلا۔ جب لاتیں مار مار کے میری حالت غیر ہو گئی تو مجھے خیال آیا کہ پٹرول چیک کروں۔ ٹینک خالی برتن کی طرح بجنے لگا۔ میں نے اُسے ریزرو پر کیا اور چند منٹ بعد انجن غرایا۔

”عام طور پر یہ کاریں اور موٹر سائیکلیں بغیر پٹرول کے چلتی نہیں ہیں۔“ محسن خاں نے جاتے جاتے بے حد اہم انکشاف کیا اور میں نے چلّا کے کہا کہ ہم پر بھی حرام ہے جو اس میں ایک قطرہ پٹرول کا ڈلوائیں۔ ہم ایسی نامعقول سواری کو تین طلاق دے سکتے ہیں۔ موٹر سائیکل ریزرو پر آنے کے بعد بھی بیس کلو میٹر کے قریب جا سکتی تھی۔ اور اس سے پہلے ہی مجھے موٹر سائیکل کو کہیں چھوڑ دینا تھا۔ میں نے شیزان میں کافی پی اور رات دس بجے اسے وہیں دوسری موٹر سائیکلوں کی رفاقت میں چھوڑ کر براستہ بیڈن روڈ مارچ کرتا ہوا لاہور ہوٹل پہنچا تو محسن خان گاڑی کی اد...

کمرے کی چابیاں لیے کھڑے تھے۔ کلرک نے مجھے مطلع کیا کہ شوفر آپ کی گاڑی اور سامان وغیرہ لے آیا ہے۔

”شوفر؟ ہمارے دوست نواب ننھے خاں کو شوفر کہتے ہو؟“ میں نے برہم ہو کے کہا۔ ”میں منیجر سے شکایت کروں گا۔ میں بہت نادم ہوں حضور نواب صاحب!“ میں نے کورنش بجا لا کے کہا۔ ”آپ کے مزاج بخیر ہیں پرنسس صوفیہ؟“

”بس ڈاکٹر صاحب! ہم نے دیکھ لی زمانے کی طوطا چشمی۔“ محسن خاں نے سرد آہ بھری۔ ”شوفر آپ کا پیغام لایا تھا۔ ہم نے سوچا خود شرفِ ملاقات حاصل کریں مگر یہاں مقدر میں یہ عزت افزائی لکھی تھی۔ بخدا ہمشیرہ پرنسس صوفیہ اور والد ماجد نواب پھنّے خان کی رُوح مزارِ مبارک میں تڑپ اٹھی ہوگی کہ آج ریاست ہوتی تو ہم والیٔ ریاست ہوتے۔ اس گستاخ کے زن بچّہ کو کولھو میں پلوا دیتے۔ جو ہمیں شوفر، گویا کوچوان کہتا ہے۔ جی چاہتا ہے طمنچہ نکال کے دھائیں سے داغ دیں۔۔۔ اور خودکشی فرمائیں۔“

کلرک سخت بدحواس اور پریشان تھا اور بار بار غلط فہمی کی معافی مانگ رہا تھا۔ بالآخر رابعہ یعنی پرنسس صوفیہ نے مداخلت کی اور ہم اوپر اپنے کمرے میں پہنچے۔ ”کیسی رہی؟“ محسن خاں نے ٹوپی اور عصا پھینک کر کہا

”ہر جگہ ڈراما شروع کر دیتے ہو۔ اور اتنی اوور ایکٹنگ۔“ رابعہ نے کہا۔ ”آج کل نواب بھی ایسے حلیے میں نہیں ملتے۔ فیشن ایبل ہوتے ہیں۔“

”ہم ذرا وضعدار قسم کے نواب ہیں۔“ محسن نے کہا اور اچھل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”تمہارے لیے ایک اندوہناک اطلاع ہے بی بی۔ سناتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جانتی ہو یہ اسپتال کیسے پہنچا تھا۔ مس نازلی عرف نازو کی خاطر۔ اور حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہی کیس تھا کہ سنگ تجھ پر اٹھے اور زخم آئے مجھے۔ ٹیلی پیتھی سمجھو اسے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے نازو کے گولی لگنے کی اطلاع مل گئی اور اگر یہ دل سے دل کو راہ ہونے والا مسئلہ نہیں تو پھر بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔ بصورتِ دیگر ثابت یہ ہوتا ہے کہ جب نازو کو گولی لگی تو یہ اس کے بہت قریب تھے۔ کتنے قریب تھے؟ اس کی وضاحت کرو۔ ورنہ میرا کیا ہے۔“

رابعہ ہنسنے لگی۔ ”اکرام شیخ نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ گولی کیسے لگی۔“

”ارے بابا گولی کو مارو گولی۔ یہ پوچھو کہ اسے کس نے خبر دی؟“ محسن بولا۔ ”میں نے پوچھا تھا تو یہ گول کر گیا تھا۔“

ایک بار پھر میں ایک کمرے کی چار دیواری میں خوش و خرم اور محفوظ تھا۔ غمِ جہاں و غمِ دو جہاں سے بیگانہ۔ ایک دوست کے خلوص اور ایک عورت کی محبت کے ناقابلِ تسخیر حصار میں مان کی وہی مہربان صورتیں تھیں اور وہی باتیں۔ دل نے پھر وہی چاہا کہ کاش وقت اسی مقام پر ٹھہر جائے۔ صورِ اسرافیل کی صدا تک اس شب کی سحر نہ ہو یا موت خوشی سے بھرپور اسی لمحے میں چپکے سے آ جائے لیکن دوسرے لمحے یہ طلسمِ خیال باقی نہ رہا۔ میں نے روم سروس سے کافی کے لیے کہا اور نازو کے زخمی ہونے کی اصل کہانی سنانے لگا۔ وہ دم بخود سنتے رہے۔ پھر محسن سگریٹ لینے چلا گیا۔

”حالات تمہارے میرے اختیار سے باہر ہو گئے ہیں سکندر!“ رابعہ نے کچھ دیر بعد کہا۔

”ہاں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے مقابلہ تو کرنا ہی تھا۔ دوسری صورت وہی تھی کہ میں دلاور کی پیش کردہ شرائط کو قبول کر لیتا۔ اس کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاتا۔ میں نے صرف اپنے ضمیر کو قتل کر دیا ہوتا تو وہ سب لوگ قتل نہ ہوتے جو بعد میں ہوئے۔ لاکھوں کے نقصان کے بجائے مجھے لاکھوں کا فائدہ ہوتا۔“

”ایک تیسرا راستہ بھی تھا جو میں نے تلاش کیا تھا۔“ رابعہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ ایک دن ایسا نہ آ جائے جب میرے اور تمہارے لیے سارے راستے بند ہو جائیں اور آج وہ دن آ گیا ہے۔“

”مجھے افسوس تو ہے رابعہ۔ کہ اس دن میں نے تمہاری بات نہیں مانی جب تم نے کہا تھا کہ یہ سب چھوڑ دو اور اس دنیا سے نکل چلو۔ آدمی اپنی جنت کہیں بھی بنا سکتا ہے پھر ہمیں کیا ضرورت ہے اس جہنم میں رہنے کی۔ وہ اپنی ذات کی حد تک تحفّظ اور سلامتی کا راستہ تو تھا اور ہمارے لیے زندگی کے سارے خوابوں کی تعبیر کا ضامن بھی تھا لیکن فرار میرے نزدیک بزدلی تھا اور میں خود اپنی نظر میں بے عزّت ہو کے نہ خوش رہ سکتا تھا اور نہ مطمئن۔ ایک مسئلہ ذاتی انتقام کا تھا لیکن دوسرا مسئلہ زیادہ سوہانِ روح تھا۔ اگر میرے باپ کو بلیک میل کر کے قتل کرنے والے کیفرِ کردار کو پہنچتے تو میں صبر کر لیتا مگر دُکھ کی بات یہ تھی کہ وہ چور، ڈاکو اور قاتل سینہ تانے بے خوفی سے انصاف کے اصولوں کا اخلاقی قدروں کا اور معاشرے کی احتجاجی قوت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ انہیں کسی کی گرفت کا خوف نہیں تھا اور انہیں دولت کی طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے کیا نہیں کیا ہمیں تباہ کرنے کے لیے؟ مجھ سے اور تم سے بہتر یہ کون جانتا ہے مگر یہ کیسی بے بسی ہے اس پورے نظام کی رابعہ کہ غاصب کو حقدار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ناجائز کو جائز مان لیا گیا ہے اور بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی منصف بھی۔ ان کی فردِ جرم میں کیا نہیں ہے مگر ان کو دولت کی دیوار نے تحفظ ہی فراہم نہیں کر رکھا ہے، وہ اس معاشرے میں شریف، معزز اور معتبر ہیں۔ مجرم وہ ہے جو اُن پر انگلی اٹھائے۔ ان سے اپنا حق مانگے یا انصاف کی بات کرے۔ یہ بات نہ جانے کتنے لوگ جانتے ہیں مگر وہ سب خود غرض ہیں کہ منہ بند رکھنے میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جس سے ان کے دنیاوی مفادات وابستہ ہوں۔ اگر وہ اکٹھے ہوں تو بہت بڑی طاقت ہیں۔ ان کے پاس مواخذہ کرنے کا، احتساب کا اور عدل اور انصاف کا حق ہے مگر اسی خود غرضی کے باعث وہ الگ ہیں اور منتشر ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طاقتور وہ ہیں جو معاشرے کا ناسور ہیں۔ اعتراف سب کرتے ہیں کہ یہ ناسور سرطان بن گیا ہے مگر اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ہمت کوئی بھی نہیں کرتا۔ میرے لیے یہ پہلے بھی ممکن نہیں تھا کہ انہی خود غرض، بزدل اور بے ضمیر افراد میں شامل ہو جاؤں اور آج بھی نہیں۔ حالانکہ پہلے کے مقابلے میں آج حالات بہت سخت ہیں۔ پہلے میں قانون کی طاقت پر بھروسہ کرتا تھا' دوستی کے سہاروں پر انحصار کرتا تھا اور اس خوش فہمی کا شکار تھا کہ زبانِ خلق سچ کہنے والے کی حمایت ضرور کرتی ہے۔ آج میں اکیلا ہوں۔ قانون میرے خلاف، میرے دشمنوں کے ساتھ ہے۔ میرے سہارے ختم ہو چکے ہیں یا جھوٹے ثابت ہوئے ہیں اور زبانِ خلق خاموش ہے۔ اس کے باوجود ذہنی طور پر میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو خود کو شکاری سمجھتے ہیں جو شرافت اور انسانیت کے شکاری ہیں۔ حق و انصاف کے شکاری ہیں اور آدمی کے ضمیر کے شکاری ہیں۔ اگر میں بھی خوفزدہ ہو کے بھاگ گیا رابعہ تو اس معاشرے میں کتنے چوہدری دلاور اور پیدا ہو جائیں گے کتنے ڈی سلوا پھر جنم لیں گے۔ رحمت کباڑی، استاد پیڈرو اور کریم سیٹھ جیسے لوگ غالب آتے جائیں گے اور معاشرے کو اتنا بے بس کر دیں گے کہ کسی شریف یا کمزور آدمی کو زندہ رہنے کا حق بھی ان سے خیرات میں مانگنا پڑے گا۔"

"مگر ہم اکیلے..... ان سب سے نہیں لڑ سکتے۔" رابعہ نے مجھ سے نظر چرا کے کہا۔

"اکیلا کون ہے رابعہ! میرے ساتھ تم ہو' محسن ہے اور یہاں تک کہ استاد ٹیڈی جیسا بدمعاش بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا وقت کبھی نہیں آیا کہ دنیا میں سچ کہنے والے اور سچ کہنے والوں کا ساتھ دینے والے نہ رہے ہوں۔ ایسا ہوتا تو سچ کا لفظ ہی لغت میں نہ ملتا۔ پہلے میری جدوجہد صرف اپنے دشمنوں کے خلاف تھی مگر بات اب ذاتی انتقام کی نہیں۔ یہ لوگ تو سب کے دشمن ہیں، معاشرے کے' ملک اور قوم کے اور انسانیت کے۔ ان کے خلاف جہاد تو عبادت کی طرح فرض ہے۔ اگر اکثریت اس فرض کو نہیں سمجھتی یا سمجھنے کے باوجود پہلو تہی کرتی ہے تو میں اس کی تقلید نہیں کر سکتا۔ میں ان لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ خدا نے ہر دور میں ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا ہے۔ نعوذ باللہ۔ میں اپنی ذات کو خدا کی طرف سے نیکی اور سچائی کا [illegible] یافتہ مجاہد نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں صرف ایک آدمی ہوں مگر میں ایک تحریک بھی ہوں۔ سقراط سے گلیلیو، اور اُن سب تک جو غلامی کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ آزادی کے لیے کالے پانی میں قید کی ہر صعوبت جھیل کے مرے تو سر بلند اور سُرخ رُو ہوئے۔ لاکھوں گمنام سپاہی ہر عہد میں ایسے ہی کسی انسانی مقصد کی خاطر شیطانوں کے خلاف جہاد میں جان دے گئے۔ انہی میں سے ایک میں ہوں۔ میں ان کا غرور توڑ کر ان کو نیچا دکھاؤں گا۔ ان کے مذموم عزائم کو خاک میں ملا دوں گا۔ [illegible] کو وہ عبرتناک سزا دوں گا کہ پھر کوئی دلاور کسی وزیر خان کو مفلس و گداگر نہ کر سکے گا۔ یہ کام میں خود کر دوں گا جو حوصلہ مجھ میں ہے اور توفیق خدا دے گا۔ انجام کی مجھے پروا نہیں۔ میں [illegible] ہوں میری جگہ خالی کبھی نہ ہو گی۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب میں کسی پر انحصار نہیں کروں گا۔ سوائے اپنے خدا کے اور اپنی ذات [illegible]"

"مجھ پر بھی نہیں۔" رابعہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔

"تم مجھ سے الگ کہاں ہو۔" میں نے کہا۔ "میری ذات کا ایک حصہ ہو۔ ایسے ہی جیسے خدا پر میرا ایمان' میرے وجود کی تکمیل [illegible] ہے۔ محبت اور دوستی بھی تو میری طاقت ہے۔ یہ جنگ اب تو شروع ہوئی ہے رابعہ۔"

"معلوم نہیں تم کیا کرنا چاہتے ہو مگر جو کچھ بھی کرو گے [illegible] نہیں کرو گے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"میرے ساتھ رہو گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے رابعہ۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو سب کچھ داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے لیے اب کھلے میدان میں لڑنا ممکن نہیں رہا۔ میں دن کے اجالے میں کسی کے سامنے نہیں آ سکتا۔ مجھے رات کے اندھیروں میں شبخون مارنے ہیں اور چھپ کر رہنا ہے۔ جنگلوں میں اور ویرانوں میں [illegible] کو تلاش کرنا ہے اور ان کے ٹھکانوں پر حملے کرنے ہیں۔ میں اپنے حقِ وراثت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس [illegible] وزیر خاں کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد پر حقِ ملکیت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ذاتی انتقام کے جذبات سے دستبردار ہوتا ہوں۔ [illegible] بار سفر میں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے [illegible] حضرت علیؓ کا ایک واقعہ سنایا۔ کہ آپ نے دشمنِ اسلام کو زیر [illegible] اس نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ کا خنجر بکف ہاتھ رک گیا اور آپ نے دشمن کو چھوڑ دیا کیونکہ پہلے دشمنی کے جذبات میں ذاتی مخاصمت نہیں تھی۔ تو بی بی میں نے بھی ذاتی دشمنی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اب تو یہ ایک مقصد ہے معاشرے کو ظلم اور استحصال کے تسلط سے نجات دلانے کا۔ انسانی حقوق پامال کرنے والوں کے عزائم کو شکست دینے کا۔ قانون اور اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑا کے تماشا کرنے والوں کو تماشا بنانے کا۔ بدمعاشی اور زبردستی کے بل پر اکڑ کر چلنے والوں کی گردن توڑنے کا۔ قانون میرا ساتھ نہیں دے سکا تو نہ سہی۔ میں خود قانون کے مطابق سزا دینے کا فرض ادا کر دوں گا۔ کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے اور مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ میری یہ جدوجہد جاری رہے گی کیونکہ معاشرے کے یہ ناسور اپنی جڑیں بہت گہری کر چکے ہیں۔ مجھے ان کا قلع قمع کرنا ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے یا نہیں یہ مایوسی کا فلسفہ میں قبول نہیں کروں گا۔ جب تک یہ زندگی ہے میرا مشن جاری رہے گا۔ میں ایک راستہ تو بنا لوں۔ پھر دیکھوں گا اس پر چلنے کے لیے کون اگلا قدم بڑھاتا ہے۔"

"میں اب بھی تمہارے ساتھ رہنے کے ارادے پر قائم ہوں۔" رابعہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "خواہ تم جنگل میں رہو یا ویرانے میں۔ رات کے اندھیرے میں شکار کرو یا دن کے اجالے میں یلغار کرو۔ زمین پر رہو یا زمین کے نیچے یا پہاڑ کے اوپر۔ میں تم کو چھوڑوں گی نہیں سکندر! اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔ حالانکہ ابھی تک مجھ پر واضح نہیں ہے کہ تمہارا پروگرام کیا ہے۔"

"تم نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ اس راہ میں کتنی سختی کا سامنا ہو گا۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ "کتنے خطرات ہوں گے۔ کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔ پتھروں کی ٹھوکریں ہوں گی اور کانٹوں کا بستر۔ ہر قدم پر دشمن پیچھے ہوں گے اور موت مقابل۔ مجھے ایک ایک دشمن کا پتا چلانا ہے۔ اس کی فردِ جرم تیار کرنی ہے اور پھر اسے ٹھکانے لگانا ہے۔ تم انتظار کر سکتی ہو نا؟"

"نہیں۔ انتظار بہت مشکل ہے۔ اتنا صبر اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں کہ اکیلی تمہارے تصور میں نیند حرام کیے رات جاگ کر گزاروں اور دن خوف کے سائے میں لرزتے کانپتے۔" وہ اب رونے لگی تھی۔ "کسی امید کے بغیر' کسی سہارے کے بغیر' کسی یقین کے بغیر۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو سکندر۔ جو کچھ تم جھیل سکتے ہو' میں بھی جھیل سکتی ہوں۔ بھوک' پیاس' جسمانی عذاب۔ حالات کی سختی۔ زندگی یا موت۔ مجھے سب قبول ہے مگر تمہارے ساتھ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی شکایت نہیں کروں گی۔ کبھی پچھتاؤں گی نہیں اور تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تمہیں میری ضرورت ہو گی سکندر۔"

"ہاں۔ ضرورت تو ہو گی، روشنی کی جو مجھے راستہ دکھائے اور محبت کی جو مجھے قوت دے۔" میں نے [illegible]

"جیسے مجھے اس وقت اشد ضرورت ہے کافی کی اور کچھ زہر مار کرنے کی تاکہ میری فوتیدگی نہ ہو۔" محسن نے اچانک اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔ "اُف، یہ کیا غیر نوابی زبان استعمال فرما گئے ہم۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"نواب ننھے خاں۔ میں نے ابھی ابھی پرنسس صوفیہ کو مطلع کیا ہے کہ میں دشمنوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دشمن نے ہمارے لیے کھلے میدان میں مقابلے کو ناممکن بنا دیا ہے۔"

"میں تو شروع سے تیسرے طریقِ جنگ کی افادیت کا قائل نہیں۔" وہ بولا۔ "میاں وہ دن اب نہیں رہے کہ جنگ' پانی پت کے میدان میں ہوتی تھی اور اہالیانِ شہر چین کی نیند سوتے تھے اور جنگ بھی کرکٹ میچ کی طرح تھی کہ صبح ناشتے وغیرہ کے بعد طبلِ جنگ بجا تو صفیں وغیرہ درست کر لیں اور پھر کہا کہ قبلہ آئیے تو ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں اور ادھر سورج ڈوبا اور جنگ ختم۔ چوہدری دلاور جیسے دشمن جو قانون کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ان سے قانون کی جنگ لڑنے کا انجام دیکھ لیا مگر خیر۔ دیر آید درست آید۔ اب بھی تو نے فیصلہ کر لیا ہے تو ملا ہاتھ۔ دیکھتے ہیں کون بڑا شکاری ہے۔ وہ کہ ہم۔ براہِ راست مقابلہ ہو جائے۔ بیچ میں قانون نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہو۔"

"یہ اپنی پرنسس صوفیہ بھی شانہ بشانہ میدانِ کارزار میں اپنے جوہر دکھلانے پر کمر بستہ ہیں۔ حالانکہ نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" میں نے کہا۔

"ریوالور تو اٹھ جائے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"بالکل اٹھ جائے گا۔ یہ ایک بات ہے کہ نشانہ چوک جائے اور مارا جائے وہ جو پہلے ہی مارا ہوا ہے۔ تیغِ نگاہِ ناز کا۔ اور وہ کیا کہتے ہیں، عشوہ و غمزہ و ادا کا۔ اور ہجر و فراق کا۔" محسن خاں نے کہا۔ "کیا غضب کی اردو بول رہے ہیں ہم نورِ چشم۔"

"یہ تم اپنا ماجرائے دل بیان کر رہے ہو بیٹے۔" میں نے کہا "میں لکھ دوں گا شہلا کو۔ اور بولو۔"

"پرنسس۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے جو ترکیب بنائی تھی، وہ کامیاب رہی؟"

"ہاں۔ ورنہ وہ فرشتے تو ساتھ ساتھ آتے۔" رابعہ ہنسی۔ "تم نے بہت اچھا کیا کہ ڈٹ کر ہی نہیں آئے۔ ورنہ انکل رضوی تو اتنے برہم تھے کہ ہمیں کبھی معاف نہ کرتے۔ ان حالات میں، وہاں،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہنا ممکن تھا۔ پیچھا تو پہلے بھی کرتے تھے ان کے آدمی، مگر ... تو ... پہرہ بٹھا دیا تھا انہوں نے۔ ظاہر ہے یہ پابندی نہ تم قبول کر سکتے تھے اور نہ میں برداشت کرتی۔ میں گاڑی لے کر نکلی ہی تھی کہ ایک جیپ میرے پیچھے لگ گئی جو دروازے پر کھڑی تھی، ہم اور آگے والے دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔ "کوئی جال بچھایا تھا؟"

"ہاں محسن نے لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں دو دو انچ لمبی کیلیں لگا دی تھیں۔" وہ ہنسی۔ "میں نے انکل کے بڑے بچے کو بھیجا کہ جاؤ باہر جیپ میں دو آدمی بیٹھے ہیں، انہیں کہو آپ کا فون ہے۔ وہ سمجھے کہ ایس پی صاحب کوئی ہدایت دینا چاہتے ہوں گے۔ وہ اندر آئے تو ریسیور الگ رکھا تھا۔ البتہ لائن کاٹ دی گئی تھی۔ میں ایک منٹ کے لیے باہر نکلی اور دونوں پہیوں کے بالکل نیچے وہ لکڑی کے ٹکڑے رکھ آئی۔ دونوں میں کیلوں کے نوکیلے حصے اوپر تھے۔ چند منٹ بعد وہ دونوں باہر آئے اور سیدھے جیپ میں جا بیٹھے۔ دس منٹ بعد میں نے گاڑی میں سامان... رکھا اور باہر نکلی تو شاید انہوں نے وائرلیس پر ایس پی صاحب کو اطلاع دی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑھائی ہی تھی کہ دونوں کیلیں دونوں ٹائروں میں گھس گئیں۔ مشکل سے دس گز دور آ کے گاڑی رکوع میں چلا گیا۔ سمجھ تو گئے ہوں گے وہ کہ کسی نے جان بوجھ کے انہیں روکنے کا بندوبست کیا تھا لیکن انہوں نے ایس پی صاحب کے سامنے یہی کہا ہوگا کہ گاڑی اچانک پنکچر ہو گئی۔ ورنہ جھاڑ کھاتے کہ اندھے ہو، سو رہے تھے یا نشے میں تھے کہ کوئی سامنے کیلیں رکھ گیا۔ انہیں صرف تعاقب کا حکم تھا۔ گاڑی روکنے کا نہیں ورنہ وہ گولی چلا کے میری کار کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ بچارے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے اور میں نکل آئی۔ یک نہ شد دو شد۔ باری باری دونوں ٹائروں کو لات مار رہے تھے۔"

"اور اب گاڑی کہاں ہے؟" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "تم تو ٹیکسی میں آئی تھیں۔"

"گاڑی میں نے گیراج میں چھوڑ دی ہے۔ ایک ہفتے بعد ملے گی۔" وہ بولی۔ "سفید رنگ کرنے کو کہہ دیا ہے۔ وہ لال رنگ ہر جگہ نظر آتا تھا۔ نمبر تو بدلا جا سکتا ہے۔"

"یہ تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا پرنسس۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دونوں کے یوں غائب ہونے سے انکل رضوی سمجھ گئے ہوں گے کہ اب ہم سب سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کھلم کھلا قانون شکنی کا تہیہ کر چکے ہیں۔ میں تو مفرور اشتہاری مجرم تھا ہی، اب تم دونوں بھی ہو گئے۔ وہ تمہاری تلاش میں بھی دن رات ایک کر دیں گے۔"

"اب تو ہم دن کو نکلیں گے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "رات کو اپنا کام کریں گے اور دن سو کر گزاریں گے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اس طرح زیادہ عرصہ نہیں گزارا جا سکتا۔" رابعہ نے کہا۔ "ہمیں کچھ دن کے لیے اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں۔ ہم اس طرح بہت زیادہ دن چھپے نہیں رہ سکتے۔ ہمارے یہ نام ابھی تو ٹھیک ہیں مگر ہر نئی جگہ ہمارے نام بھی نئے ہونے چاہئیں۔" محسن نے کہا۔ "بلکہ ہو سکے تو ہمیں صورتوں کو بھی بدلتے رہنا چاہیے۔ ابھی تو صرف سکندر کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اور پولیس نے تو ایک بار اخبار میں اشتہار دے کر اپنی ضابطے کی کارروائی پوری کر دی۔ وہ ہر روز یا ہر ہفتے تصویر نہیں چھپوائیں گے مگر دلاور اینڈ کمپنی کے لیے ایسا کرنا مشکل نہیں۔ جب انہیں معلوم ہوگا کہ سکندر کے ساتھ ان کی..... وہ..... میرا مطلب ہے وکیل اور چچہ بکارِ خاص محسن خاں بھی روپوش ہیں تو وہ بہت خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کا کام آسان کر دیا۔ ایک آدمی کو ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر ایک گروہ کو تلاش کرنا آسان ہوتا ہے اور بفضلِ خدا اب ہم ایک دہشت پسند گروہ ہیں۔ میرا تو خیال ہے اس کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بنیادی اراکین ہیں جو اتفاقِ رائے سے ایک منشور بھی رکھتے ہیں۔ ہمارے علاوہ اعزازی رکن مس شہلا فرام اسلام آباد اور استاد ٹیڈی ہیں۔"

"میں اتفاقِ رائے سے خود کو اس کا تاحیات صدر منتخب قرار دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ جمہوری طریقہ ہے اور دہشت پسندوں کا جمہوری رویہ سے کیا تعلق۔" محسن نے اعتراض کیا۔ "یہ فیصلہ ڈوئل کے ذریعے ہوگا مگر ڈوئل میں جوڈو کے داؤ ممنوع ہوں گے۔ دیسی طریقے سے نورا کشتی ہوگی۔ ابھی جو بات میں سنجیدگی سے فرما رہا تھا وہ اشکالِ مبارک کی تبدیلی ہے۔ چوہدری دلاور ہمیں ہراساں رکھنے کے لیے اور انڈر گراؤنڈ رکھنے کے لیے ہماری تصاویر ہر روز یا ہر ہفتے برائے اشاعت دے سکتا ہے اور اسی طرح باقاعدہ سے ہماری تصاویر سے مزین پوسٹرز لگوا سکتا ہے۔ تاکہ مسلسل دیکھنے والوں کے ذہن میں ہماری صورت نقش ہو جائے جیسے روز ٹی وی پر یا فلموں میں بار بار نظر آنے والی ہیروئن کے ساتھ ہوتا ہے کہ بچاری شاپنگ کے لیے بھی انارکلی جائے تو پبلک پہچان جاتی ہے اور ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔"

"ہر روز اشتہار چھپوانے کا کوئی سبب بھی ہونا چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔

"سبب وہ ایجاد کرے گا۔ برادرم سکندر بخت کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔" محسن بولا۔ "میری تصویر اس عنوان سے شائع ہو سکتی ہے کہ مسمی فلاں بن فلاں جو ہمارے سیلز منیجر تھے فلاں تاریخ سے دس لاکھ کا غبن کر کے روپوش ہیں۔ ان کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا اور ان سے معاملہ کرنے والا اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔ ایسے اشتہار آتے ہی رہتے ہیں۔ رابعہ کا معاملہ زیادہ نازک ہے۔ یہ بھی اشتہار دیا جا سکتا ہے کہ میری زوجہ مسماۃ رابعہ بعارضہ خللِ دماغ فلاں تاریخ سے غائب ہے۔ اس کے بارے میں قریبی تھانے کو مطلع کیا جائے۔ تو نے کبھی غور کیا۔ جوان لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں غائب ہونے کی وجہ ہمیشہ یہی لکھی جاتی ہے۔ اگر صرف غائب ہے لکھ دیا جائے تو لوگ کہیں گے کہ بھاگ گئی۔ اب میرے اور رابعہ کے بارے میں اس قسم کا اشتہار ہمارے ہوتے ہوئے بھلا کون دے سکتا تھا۔ ہم اخبار کو بھی قانونی نوٹس نہ داغ دیتے؟ لیکن اب کوئی کچھ بھی لکھے، ہم نہ چیلنج کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تردید کرنے کے لیے سامنے آ سکتے ہیں۔ میں ایک فرضی کمپنی کا سیلز منیجر ہو سکتا ہوں تو رابعہ بھی ایک فرضی شخص کی منکوحہ ہو سکتی ہے۔ اگر انہوں نے ہماری تشہیر کی ٹھان لی اور ساری دنیا کو ہمارے پیچھے لگانے کا فیصلہ کر لیا تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔ سارے ملک کے اخبارات میں تصاویر چھپوا سکتے ہیں۔ ٹرینوں اور بسوں میں اور چند بڑے بڑے شہروں کے نمایاں مقامات پر پوسٹر لگانا بھی مشکل نہیں مگر اس سے ہمارے لیے کتنی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے۔ ابھی میری زیادہ پبلسٹی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود میں کئی جگہ پہچانا گیا۔" میں نے کہا۔ "اور بال بال بچا۔ حد تو یہ ہے کہ منظر کے پڑوس میں ایک خاتون نے اخبار نکال لیا جن کا اخبار سے کیا عقل سے بھی دور کا واسطہ نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ تو برقع اوڑھ کے پھر سکتی ہے۔ ہمیں یا تو میک اپ کرنا پڑے گا یا پھر مہینے دو مہینے میں شیو چھوڑ کر داڑھی مونچھیں کاشت کرنی ہوں گی۔ ہم سر منڈوا سکتے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل لگا کے، گلے میں ریشمی رومال ڈال سکتے ہیں اور بوسکی کے کرتے کے ساتھ ریشمی لاچہ پہن سکتے ہیں اور پان کھا کے اور کان میں بیڑی لگا کے....."

ہنستے ہنستے رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میرے لیے تو تصور کرنا بھی محال ہے۔ فرض کرو شہلا دیکھے محسن کو اس حلیے میں تو کیا کرے گی، قتل یا خودکشی۔"

"دونوں۔ پہلے میرا قتل پھر محسن کی خودکشی۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد کسی جوانِ رعنا سے عقد۔"

"آج کے ڈرامائی دور میں اتنا مشکل طریقہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" محسن بولا۔ "ہر سائز اور رنگ کی داڑھی مونچھوں کے سیٹ ملتے ہیں۔ ہر قسم کی وِگ دستیاب ہے۔ کنٹیکٹ لینز ہیں آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے اور لباس تو اس وقت بھی ہمارے پاس چار ہیں۔ ایک انسپکٹر کی وردی، ایک پوسٹ مین کی، ایک ڈاکیے کی اور ایک درویش کی خلعتِ فاخرہ۔ مزید حلیے حسبِ ضرورت اختیار کیے جا سکتے ہیں اور شہلا آ سکتی ہے۔"

"مذاق کی بات چھوڑو۔ کیا سچ مچ تم فیصلہ کر چکے ہو۔ یہ تمغا وغیرہ سب ختم۔" رابعہ نے کہا۔ "خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش ترک اور اس لاکھوں کی جائیداد سے کنارہ کشی جو تمہارا قانونی حق ہے؟"

"فیصلہ تو بہت پہلے بتا چکا ہوں میں رابعہ۔ مذاق کی کون سی بات ہے اس میں۔" میں نے کہا۔ "میں نے جس حد تک ممکن ہوا کوشش کی۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں، سوائے بغاوت کے۔ کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تم نے قانون پڑھا، اتنا عرصہ پریکٹس کی اور نام کمایا، پیسہ کمایا اور میرے ملتے ہی سب ختم۔ اب وکالت بھی ختم اور دنیا سے تعلق بھی ختم۔ الٹا تم کو ایک مفرور اشتہاری مجرم کے ساتھ خوار ہونا ہے اور ایک بالکل غیر قانونی جنگ میں شریک رہنا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ میں تو مجبور ہوں، تم مجبور نہیں ہو۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔ تم اپنی مجبوری کو سمجھتے ہو تو میری مجبوری سے کیوں انکار کرتے ہو؟" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"تمہارے لیے ابھی سوچنے کا وقت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو اپنی کشتیاں جلا چکا۔ تم اسے بے وقوفی کہہ سکتی ہو۔"

"نہیں کیونکہ میں نے اپنی کشتیاں تم سے پہلے جلا دی تھیں۔ اسی گھر کے ساتھ جس کی راکھ میں میرا ماضی بھی خاک ہو گیا۔ کون رابعہ اور کون ایڈووکیٹ ہائی کورٹ۔ میں تو پرنسس صوفیہ ہوں!!" وہ تلخی سے ہنسی۔

"میرا کام اور میرا مشن بہت کٹھن ہے رابعہ۔ کون جانے میں کدھر نکل جاؤں۔ لوٹ کر آؤں یا نہ آؤں۔ اپنے ماضی سے کٹ کر میں کسی مستقبل کی راہ کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ کل میں کیا تھا اور آج کیا ہوں۔ آنے والے دن کا پتا نہیں کہ مجھے کس حال میں نوشتۂ تقدیر کو قبول کرنا پڑے۔" میں نے کہا۔ "مرد کے لیے دنیا میں اکیلے رہنا کتنا بھی مشکل ہو، ناممکن نہیں ہوتا لیکن تم عورت ہو۔"

"کیا میں نے کبھی کہا ہے کہ میں عورت نہیں ہوں۔" وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

برہمی سے بولی "کسی بھی عورت کے مقابلے میں وفا کے کس امتحان میں پوری نہیں اتری میں۔ عورت اگر محبت دے سکتی ہے قربانی دے سکتی ہے اور سہارا دے سکتی ہے تو کیا یہ سب کچھ میں نے نہیں دیا؟ عورت اگر صبر و رضا اور استقامت رکھتی ہے، تو کیا میں کم ہوں اور بار بار اکیلی عورت کیوں کہتے ہو مجھے۔ میرے ساتھ تم نہیں ہو؟"

"آئی ایم سوری رابعہ۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہارا مقابلہ کوئی عورت نہیں کر سکتی۔" میں نے محسن کی موجودگی میں جذبات پر قابو رکھا ورنہ اس وقت رابعہ نے جس بیباکی سے اپنی محبت کا اعلان کیا تھا اس کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے عشق کا برملا اظہار کر دوں۔ خود محسن اس کی جرأت پر دم بخود رہ گیا تھا۔ یہ کوئی چھپ چھپ کے کی جانے والی، سماجی قیود سے ڈرنے والی مجرم محبت نہیں تھی۔ اس میں نا آسودہ خواہشات کی پکار نہیں تھی جسم کی پیاس نہیں تھی اور ناجائز تعلق کی بات نہیں تھی۔ یہ محبت ایک لازوال جذبہ تھی۔ ایک ہمہ گیر احساس تھی اور دیوانی قوت تھی۔ من تو شدم تو من شدی سے اگلی منزل جہاں منصور کہتا ہے انا الحق۔ وہ مجھ میں ہے اور میں اس کے وجود سے ہوں یا اس سے الگ کچھ نہیں ہوں اور فلمی شاعری کی زبان میں پیار کیا تو ڈرنا کیا۔

"آپ لوگ شدید جذباتی بحران میں مبتلا ہیں۔" محسن نے فوراً صورت حال کو سنبھالا۔ "اور میرا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے اعصابی کشیدگی کا۔ ہم اب چلتے ہیں۔ تو آرام کر کیونکہ کل رات بھی تو سویا نہیں تھا۔ میں رابعہ کو گھر چھوڑ کر ذرا اپنے استاد ٹیڈی کے پاس جاؤں گا۔ وہ قیدی سے تفتیش کر رہا تھا اور میرا خیال ہے طافو بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ وہ بزدل آدمی ہے اور اس کی کمزوری ہے اس کے بیوی بچے۔ وہ غداری کے جرم میں ایک بار سزائے موت کا مستحق ثابت ہو چکا ہے لیکن اسے ڈبل ایجنٹ کا رول دیا گیا تھا کہ وہ اپنی سابقہ غلطی کی تلافی کر دے۔ اب ناکامی کے بعد وہ ایک طرف سے تو گیا۔ چوہدری دلاور اور اگا تو کا اس کو سخت ترین عذاب دے کر ماریں گے۔ اس کے لیے کوئی چانس ہے تو ہمارا ساتھ دینے میں۔ وہ جو کچھ جانتا ہے سچ سچ بتا دے تو ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ اسے بحفاظت کہیں پہنچا دیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم معاف کرنے والے نہیں ہیں۔ دوسری بار دھوکا دیا تو اعتراف جرم کے ریکارڈ کیے ہوئے ٹیپ کے ساتھ چوہدری دلاور کے حوالے دیں گے۔ وہ بہت بری طرح پھنسا ہے۔"

"تو نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا محسن۔ تو کس طرح روپوش رہے گا۔" میں نے کہا۔ "تیرے ماں باپ ہیں اور ہے۔ تیرے خلاف کوئی سنگین الزام بھی نہیں۔ انکل شہروانی کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ تیرے معاملات کو ٹھیک بھی کر سکتے ہیں تو......"

"ایسی باتیں مت کر۔ جب پیدائش سے اب تک زندگی کے اتنے لمبے سفر میں ہر لمحہ ساتھ ساتھ قدم ملا کے چلتے رہے ہیں تو اب جدا کیسے ہو سکتے ہیں۔" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میرا گھر کیا ہے۔ فوزیہ اپنے گھر کی ہو گئی۔ عالیہ اس گھر سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ باپ اس کے بعد کتنے دن جیے گا۔ اگر ہو گا تو میرا اور تیرا گھر ایک ہی زمین پر ایک ہی جگہ ہو گا۔ دونوں پر چھت ہوا کا ایک ہی آسمان ہو گا۔ ورنہ جب تک یہ الجھن ہے تب تک تو یہ ساتھ ہے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور تو نے یہ کشتی جلا دی ہے تو ہمارے لیے واپسی کا راستہ ممکن ہے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ بہانے وہ کون سے جذبات تھے جو اشک بن کے آنکھوں سے چھلک گئے۔ یہ رابعہ کی محبت تھی اور محسن کا خلوص تھا اور تشکر و انتخار کا یہ احساس تھا کہ اتنی بڑی دنیا کے مقابل اکیلا ہو کے بھی میں اکیلا نہیں اور خدا ہے تو مجھے بھی اس نے سہارے فراہم کر دیے ہیں۔ اجنبی دشمنوں سے بھرے اس جنگل میں خون کی پیاس بجھانے کے لیے جا بجا تعاقب کرنے والے سفاک شکاری ہیں تو ... ان کے مقابلے کے لیے میری پہلی طاقت اس کی ذات پر یقین ہے جس کا بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ میری دوسری قوت رابعہ اور محسن ہیں جو محبت اور خلوص کے بے بہا خزانوں کے ساتھ ہر قدم پر اس جنگ میں میرے ساتھ شریک ہیں اور یہ خزانے چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کے ان دنیاوی مال و متاع کے خزانوں سے صد ہزار درجہ افضل و برتر ہیں جو خالی بھی ہو جاتے ہیں اور لٹ بھی جاتے ہیں۔ تیسری قوت اپنی ذات پر اعتماد اور ہر حال میں پُرامید رہنے کی صلاحیت ہے اور شکاری اگر تین طرف سے مجھے نرغے میں لیے ہوئے ہیں تو میں تینوں طرف مقابلے کی قوت رکھتا ہوں۔

رات کے بارہ بجے میں نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا کہ مجھے البرٹ وکٹر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کا نمبر دے۔ پانچ منٹ بعد گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا۔ "بات کیجیے۔" "ہیلو ایمرجنسی وارڈ؟" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی۔ ابھی تو بتایا ہے۔" کسی چڑچڑے اور خرد ماغ شخص نے کہا۔ "کیا یقین نہیں آیا؟"

"سوری ڈاکٹر۔ وہ آپریٹر تھا۔" میں نے کہا۔ "میں ڈاکٹر امجد بول رہا ہوں۔ آج شام حادثاتی طور پر گولی لگنے کا ایک کیس آیا تھا۔ مس نازلی شیخ......"

"نرس۔" اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے چلا کر کہا۔ "یہ نازلی شیخ کو پوچھ رہا ہے کوئی۔" وہ یقیناً رات کی شفٹ میں آنے والا کوئی نیا ڈاکٹر تھا۔ پہلے میں نے جس ڈاکٹر سے بات کی تھی وہ اتنا بدخو نہیں تھا۔ "ہاں جی۔ کیا پوچھنا ہے آپ کو؟"

"یہ پوچھنا ہے کہ اس کی حالت کیسی ہے۔" میں نے کہا۔ "خطرے سے باہر ہوئی یا نہیں۔"

"ابھی تو ایکس ٹینسو کیئر میں ہے۔" وہ بولا۔ "لیں ان کے بھائی سے بات کریں۔" لیکن میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اکرام شیخ خود بہن کے پاس موجود تھا اور میں اس کے ذہنی کرب کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس نے ادائے فرض کو مقدم رکھتے ہوئے بہن پر گولی چلا دی تھی مگر فرض اور محبت کی کشمکش کا وہ فیصلہ کن لمحہ گزر گیا تھا جب اس نے فیصلہ تو صحیح کیا تھا مگر اس کے نتائج بہت غلط نکلے تھے۔ اب وہ جذباتی بحران کا شکار ہو گا اور ہدفِ ملامت اس کی اپنی ذات ہو گی۔ جھوٹ بول کے اس نے الزام کسی پر نہیں آنے دیا تھا ورنہ اس وقت وہ ماں باپ کی نظر میں بھی فرض شناس پولیس افسر نہیں، بہن کا قاتل ہوتا۔ اس کی ہمت کی تعریف کرنے والے کم ہوتے، اس کی حماقت پر افسوس کرنے والے زیادہ۔ اب بھی وہ سوچ رہا ہو گا کہ ہوش آنے پر نازلی سے کیا کہے گا۔ اس سے معافی مانگے گا اور پھر اس سے کہے گا کہ ایک جھوٹ کو نباہنے میں مدد کرے۔ اپنے اس بھائی کی عزت رکھے جس نے اپنی طرف سے بہن کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور بہن کی زندگی کو اس لیے اہم نہیں سمجھا تھا کہ خود پولیس کی وردی میں تھا۔ ایک غلطی وہ پہلے کر چکا تھا جب بہن پر گولی چلانے کے بعد اس کے خون کو بہتا دیکھ کر وہ حوصلہ ہار گیا تھا اور اس نے بہن کی بات مان کے ایک مجرم کو فرار ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا ورنہ وہ دل کو پتھر کر لیتا تو بہن کو مرنے دیتا اور مجرم کو پہلے گرفتار کرتا۔ اب اس کے لیے اپنے احساسِ ندامت کا دہرا عذاب تھا۔ کہ اس نے نازو پر گولی کیوں چلائی تھی اور اگر چلا ہی دی تھی تو پھر اپنی کمزوری کا شکار کیوں ہوا۔ بہن کی جان جاتی لیکن وہ مقصد تو پورا ہوتا جس کے لیے وہ بھائی نہیں رہا تھا صرف پولیس افسر رہ گیا تھا۔ اب تو نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم والی بات تھی۔ اس نے نازو کی بات مان لی تھی۔ کیا نازو اس کی بات مان لے گی اور معاف کر دے گی؟ اگر اس نے بھائی کی خاطر جھوٹ بول دیا تب بھی اکرام شیخ تمام عمر اس کے سامنے شرمندہ رہے گا اور اس کے احسان کے بوجھ تلے دبا رہے گا۔ یہ انکشاف بھی اس کے لیے کم تکلیف دہ نہ ہو گا کہ اس کی بہن نے محبت بھی کی تو کس سے۔ ایک مجرم سے جسے قانون کا محافظ بھائی اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ وہ اپنی ضدی اور خودسر بہن کی جذباتی فطرت سے واقف تھا۔ ایک انتہا پر وہ خود تھا۔ دوسری انتہا پر بہن پہنچ گئی تھی اور نتیجہ اس تصادم کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ اکرام شیخ کے ذہن کے لیے ایک صدمہ یہ بھی ہو گا کہ اس بیوقوف بہن کی محبت کے سیلِ بے عناں کی راہ میں بند کیسے باندھے۔ اسے کیسے سمجھائے کہ نادان لڑکی! سکندر بخت تجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتا خواہ تو اس کی خاطر جان ہی کیوں نہ دے دے۔ اس کا جواب بھی شیخ کے لیے غیر متوقع نہ ہو گا۔ وہ صاف کہے گی کہ محبت کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ اگر سکندر مجھ سے محبت نہیں کر سکتا تو یہ اس کی مجبوری ہے اور اگر میں صرف سکندر کو چاہتی ہوں تو یہ میری مجبوری ہے۔ اپنی اپنی مجبوریوں کے ساتھ سب ہی جیتے ہیں اور نہیں جی سکتے تو مر جاتے ہیں۔ اسے بہن کی زندگی کی اس بے بسی اور تباہی کا دکھ ہو گا۔ نہ یہ ممکن ہو گا کہ وہ اس کے جذبات کا رخ موڑ سکے اور اسے مجبور کر سکے کہ وہ ماں باپ کی پسند کے مطابق شادی کر لے اور اس شخص سے محبت کرے جو اس کا شوہر کہلائے گا۔ بفرضِ محال سب نے جبر کیا اسے کسی کے ساتھ رخصت کر دیا تو خواہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے حسنِ صورت اور سیرت میں مثالی ہو وہ سکندر بخت نہیں ہو گا جسے نازو اتنی شدت سے چاہتی ہے۔ وہ کبھی کسی سے محبت نہ کر سکے گی اور مجبوری کا یہی زہر اس کی زندگی کو آخری سانس تک ایک عذابِ مسلسل بنا دے گا۔

مجھے نیند کی اشد ضرورت تھی لیکن ذہن پر ہر سمت سے پریشان کن خیالات کی یلغار اتنی شدید تھی کہ نیند قریب بھی نہ آ پاتی تھی۔ کئی بار میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر نہ جانے کب مجھے احساس ہوا کہ میں اندھیرے میں لیٹا چھت کو گھور رہا ہوں جس کی مدھم سی سفیدی تاریک سینما ہال کے پردے کی طرح میرے خیالوں کے عکس کو متحرک فلم کی طرح پیش کرنے لگتی تھی اور یہ خیالات خوشگوار تصورات پر مبنی نہیں تھے۔ اس میں رابعہ کے اور میرے ارمانوں کی کسی خوشی کا اجالا نہیں تھا اور کسی خوابِ آرزو کا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندیشہ ہائے دور و دراز تھے اور خوف کے بھیانک فریب تھے جو شکلیں بدل بدل کے مجھے ڈراتے تھے۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی نے سکوتِ شب کو منتشر کر دیا۔ اس کی آواز مجھے بمباری سے خبردار کرنے والے اس سائرن کی طرح لگی جو بلیک آؤٹ میں سہمے ہوئے بند دروازوں کے پیچھے دبکے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

...نے دہشت زدہ شہریوں کے اعصاب کو جھنجوڑ دے۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟ میں نے ریسیور کی طرف دیکھ کر سوچا۔ گھنٹی مسلسل چلاتی رہی۔ رابعہ اور محسن کے سوا تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ میں یہاں ہوں۔ آپریٹر نے کسی اور کمرے کی کال غلطی سے یہاں تو نہیں ملا دی؟ پھر میں نے ریسیور اٹھا لیا کیونکہ ٹیلیفون خاموش ہونے پر رضامند نہ تھا۔

"سوری سر" آپریٹر نے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ آپ سو رہے ہوں گے لیکن مجھے مجبور کیا گیا کہ جب تک آپ بیدار نہ ہوں رنگ دیتا رہوں۔ اور پھر بھی آپ نہ سنیں تو کسی کو بھیج کر جگایا جائے کیونکہ معاملہ زندگی اور موت کا ہے۔" مہذب آپریٹر یقیناً ڈر رہا تھا کہ میں نصف شب کے بعد آرام میں مخل ہونے پر برہمی کا اظہار کروں گا۔

"اِٹ از آل رائٹ" میں نے کہا۔ "بات کون کرنا چاہتا ہے؟"

"نواب ننھے خاں صاحب۔ بہت دھمکیاں دے رہے تھے کہ اپنے سمیت اٹھا کے لے جاؤں گا۔ ہوٹل خرید کے اصطبل بنا دوں گا۔"

"اچھا اچھا" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "بات کراؤ۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ آدمی بُرے نہیں ہیں۔"

"سکندر"، محسن کی آواز آئی اور میں حیران ہوا کہ اس نے ڈاکٹر امجد کیوں نہیں کہا۔ "یار کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

میں نے اس کی آواز پر غور کیا۔ گو لہجہ وہی تھا مگر آواز میں معمولی سا فرق تھا۔ محسن اتنا بے وقوف ہو گیا ہے کہ میرا اصل نام لے رہا ہے اور پھر کسی گڑبڑ کی بات فون پر کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ جانتا نہیں کہ درمیان میں آپریٹر بھی ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "نواب ننھے خان صاحب!"

"آپ اگر گھوڑے بیچ چکے ہوں تو سونا موقوف کریں اور نیچے آ جائیں۔" محسن نے کہا اور اپنی گاڑی لے کر بیڈن روڈ کے راستے مال پر آئیں۔ پھر زمزمہ کی طرف چل پڑیں۔ میں کسی جگہ بھی روک لوں گا۔ رفتار گولی سے کم رکھیں تاکہ میں دیکھ سکوں۔"

میں نے لائن منقطع ہونے کی آواز سنی اور یہ اندازہ بھی کر لیا کہ معاملہ یقیناً سنگین ہے، ورنہ محسن مجھے ایسے وقت میں بیدار نہ کرتا۔ اس نے فون پر کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ صرف ذہنی پریشانی کا اثر تھا کہ گفتگو کے آغاز میں اس نے میرا نام لے لیا۔ شاید خود اسے بھی احساس تک نہیں ہوا۔ ریسیور رکھتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ محسن نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ رابعہ کو ہوٹل میں چھوڑ کے خود استاد ٹیڈی کے پاس جائے گا اور اب اس نے جس سمت بلایا تھا اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ٹیڈی کے گھر کی طرف سے چلا ہے اور اس نے راستے میں کسی جگہ سے فون پر بات کی ہے۔ کپڑے اور جوتے پہننے میں مجھے دس منٹ بھی نہیں لگے۔ کاؤنٹر پر اس وقت دوسرا کلرک بیٹھا تھا۔ میں نے چابیاں اس کے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی کہ کوئی بھی میرا پوچھتا ہوا آئے اسے میرے کمرے کا نمبر ہرگز نہ بتایا جائے اور ملاقاتی ڈھیٹ ہو تو اسے یہیں ہی انتظار کرنے کو کہا جائے۔ اگر کسی کا پیغام وصول ہو تو نوٹ کر لیا جائے مگر فون پر بھی کمرے کا نمبر بہرحال کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ محض شکوک کا ازالہ کرنے کی خاطر میں نے وضاحت کر دی کہ میرے مریض اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو دن رات دیکھتے دیکھتے میں خود مریض بن گیا تھا چنانچہ اب کچھ دن چھپ کر آرام کرنا ہی میرا علاج ہے۔

فون موصول ہونے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں گاڑی میں بیڈن روڈ سے گزرا۔ دودھ کی ایک مشہور دکان اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی جہاں جان بنانے والے بڑے بڑے پیالوں میں لیڈر سول ملائی والا اُبلتا ہوا دودھ پھونک پھونک کر پی رہے تھے۔ اِکا دُکا موٹروں اور سائیکلوں کے سوا سڑک پر سے گزرنے والا کوئی نہ تھا۔ مال روڈ کے موڑ پر ایک جگہ مجھے گشت کرنے والی پولیس نے روکا اور عادت کے مطابق سوال کیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے عزا کے ریڈ کراس کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔ "نظر نہیں آتا کیا؟ ڈاکٹر ہوں اور مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔" میں نے ان کے سامنے سے ہٹتے ہی گاڑی چلا دی۔ پھر ان میں سے کوئی چلایا اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈنڈا گھماتا پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے ایک دم لائٹس آف کر دیں تاکہ وہ گاڑی کا نمبر نہ پڑھ سکے اور رفتار ایک دم بڑھا دی۔ صاف ظاہر تھا کہ بات کرنے والا تو مجھے نہیں پہچانا تھا مگر اس کے ساتھی نے غور سے دیکھ کر مجھے شناخت کر لیا تھا۔ میں بال بال بچ گیا تھا۔ ورنہ مجھے ان سے دست بدست جنگ لڑ کے راستہ بنانا پڑتا اور معاملہ سنگین واردات کہلاتا۔ اب تو وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ اچھا بھلا دس ہزار کا انعام تھا ہاتھ میں آ کے نکل گیا۔ اپنی کوتاہی اور نااہلی کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔

محسن نے مجھے جی پی او کے مین گیٹ کے سامنے روکا اور دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ "یار وہ طافو مر گیا۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "آگے سنت نگر سے سیدھا نکل....."

"طافو مر گیا؟ وہ کیسے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "استاد ٹیڈی کی تفتیش سے؟"

"نہیں۔ اس نے اور میں نے تھانے کا طریقہ بھی استعمال کیا تھا مگر بہت واجبی۔" محسن بولا۔ "اس نے خودکشی کر لی۔ وہ تھا ڈرپوک آدمی اور اسے جو کچھ معلوم تھا وہ اس نے بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم مطمئن نہیں تھے اور اسے گامے ماچھی کے سپرد کرنے کی دھمکی دیتے رہے تھے۔ ٹیڈی نے اسے غسل خانے میں بند کیا تھا۔ اس نے سیفٹی میں سے بلیڈ نکال کے گلا کاٹ لیا۔ ٹیڈی بہت پریشان ہے کہ خون نالی سے بہہ کر باہر چلا گیا ہے اور صبح صاف نظر آئے گا۔ میں اسے تسلی دے کر آیا ہوں کہ فکر نہ کرے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ ہم سارے سراغ مٹا دیں گے اور لاش کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"بچارہ۔ ایسے چکر میں پڑا کہ جان سے گیا۔" میں نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "وہ تو اپنی دانست میں صرف ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ تقدیر نے پانچ لاکھ کے جال میں پھنسا دیا تھا حالانکہ نہ اس کی نیت میں بے ایمانی تھی اور نہ دل میں دولت کی ہوس۔ نہ لیتا تو رحمت اور کریم سیٹھ مار دیتے۔ لیے تو مجرم بن گیا۔ ہماری پناہ میں آیا تو خود کو غدار سمجھنے لگا اور وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی تو گلے میں پھندا پڑ گیا۔ اسے اطمینان تھا تو صرف یہ کہ بیوی بچے بحفاظت نکل گئے ہیں اور ان کے پاس پیسہ ہے۔ اس نے سوچا ہو گا کہ خطرہ صرف میرے وجود سے وابستہ ہے۔ اب کسی کی ذات کو خطرہ نہیں۔"

"الٹا وہ مصیبت میں پڑ گئے ہیں جو اسے بلیک میل کر رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "حالانکہ ہم واقعی یہ چاہتے تھے کہ اس سے تمام معلومات فراہم ہو جائیں تو اسے نکال دیں۔ جہاں بھی وہ کہتا ہم اسے بحفاظت وہاں ضرور پہنچا دیتے۔ آگے اللہ مالک تھا لیکن اس نے بہت جلدی کی۔ سانده کلاں جانا ہے ہمیں۔"

"شاید اسے تمہارے وعدوں پر اعتبار نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے کوئی کام کی بات بتائی؟"

"ہاں۔ استاد ٹیڈی کو بتا رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی حویلی ہے۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔ "جو نقشہ اس نے بتایا وہ ٹیڈی کی سمجھ میں تو آیا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ قصرِ جمشید کا حوالہ دے رہا تھا۔ وہ بڑی عجیب کہانی ہے۔"

"مگر قصرِ جمشید کے کھنڈر میں اب کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ کس زمانے کی بات کر رہا تھا؟"

"زمانۂ حال کی۔" محسن نے کہا۔ "تجھے یاد ہے جب اس کھنڈر میں آگ لگائی گئی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ آگ بھی پردہ ہے۔ کھنڈر میں جلنے والی کون سی چیز تھی؟"

"تیرا مطلب ہے کہ وہاں واقعی تہہ خانہ ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "زیرِ زمین کچھ گڑبڑ ہے؟"

"طافو کی بات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" محسن بولا۔ "اس نے بتایا کہ وہ صرف ایک بار وہاں گیا تھا تو اس کے ساتھ غالباً چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو کے علاوہ دو آدمی اور تھے جن کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ ایک نالے میں اتر گئے تھے۔ کسی گٹر لائن کے مین ہول کا ڈھکنا ہٹا کے نیچے گئے تھے اور پھر ایک سرنگ جیسے راستے سے ہو کے نیچے ہی نیچے تقریباً سو گز تک گھٹنوں کے بل چلتے رہے تھے۔ وہ سرنگ اتنی اونچی نہیں تھی کہ کوئی کھڑا ہو سکتا اور اندر گھپ اندھیرا تھا اور اس کی سطح سخت اور کھردری تھی۔"

"گٹر لائن میں پانی نہیں تھا؟" میں نے کہا۔ "اگر گٹر لائن زیرِ استعمال تھی تو اس میں غلاظت ہو گی۔"

"نہیں۔ یہی تو میں نے بھی پوچھا تھا اور طافو نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ لائن خشک تھی اور وہ سرنگ بالکل نیچے سے شروع ہوتی تھی۔ انہوں نے اندر اترتے ہی اوپر کا ڈھکنا برابر کر دیا تھا۔" محسن بولا۔

"اس کا مطلب ہے وہ گٹر لائن تھی ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اوپر مین ہول کی طرح ڈھکنا لگا دیا ہو گا تاکہ وہ جگہ کسی کو مشتبہ نظر نہ آئے۔"

"اس نے دوسری قابلِ غور بات یہ بتائی تھی کہ مین ہول ایک ٹرک کے نیچے تھا اور ٹرک بھی ایک کوٹھی کے احاطے میں کھڑا تھا لیکن تہہ خانہ اس کوٹھی کا نہیں ہو سکتا کیونکہ کوٹھی مشکل سے ایک کنال پر ہو گی جب کہ وہ تہہ خانہ کئی کنال کی حویلی کا لگتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "سرنگ کے ختم ہوتے ہی سیڑھیاں آ گئی تھیں جہاں سے وہ سیدھے کھڑے ہو کر کچھ اوپر گئے تھے اور ایک کال بیل بجائی تھی۔ دروازے سے گزر کر پھر نیچے جانے والی سیڑھیاں آ گئی تھیں اور وہ تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے۔ جو حلیہ اس نے بتایا اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ساتھ جانے والے دلاور اور پیڈرو تھے۔"

"اور تہہ خانے میں کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس نے کیا دیکھا بھال گودام وغیرہ؟"

"یہی تو اس نے بتایا نہیں۔ اگر اس نے تہہ خانے کی وسعت کا اندازہ کر لیا تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔" محسن نے کہا۔

"اور یہ فرض کرنا بھی مشکل ہے کہ طافو کو آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ کچھ عجیب سی بات نہیں لگتی کہ اس نے باہر کا منظر تو اتنی تفصیل سے بیان کر دیا اور اندر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ لوگ اس کو قابلِ اعتماد سمجھتے ہوئے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لے ہی گئے تھے تو یہ بھی مشکل ہے کہ اسے کچھ نہ بتایا ہو۔ پھر وہ اس کو رکیوں گئے تھے۔"

"طافو نے تو یہ بیان دیا اور اسی پر قائم رہا کہ اندر اندھیرا تھا۔ وہ لوگ جو اس کے ساتھ تھے تہہ خانے کے راستوں سے واقف تھے اور ان کے ہاتھ میں ایک پین ٹارچ تھی جس کا اجالا صرف قدموں سے ایک فٹ آگے محدود دائرے میں پڑتا تھا۔ ایک طرف تو دیوار تھی جس کے ساتھ ساتھ وہ چل رہے تھے۔ درمیان میں کمرے بہت وسیع تھے اور دوسرے کنارے تک کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ آخری حصے میں پہنچ کے ایک حجرہ سا آگیا۔ وہاں ایک قبر سی بنی ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو تو ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ طافو اور اس کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو کدال اور بیلچے دے کر قبر کھودنے پر لگا دیا گیا۔ وہ پکی قبر تھی۔ اوپر سے سنگ مرمر کے تابوت کی طرح بنی ہوئی"

"نواب خسرو پرویز کی قبر،" میں نے اچانک کہا۔ "تجھے یاد ہے اس محل کے کھنڈر میں باغ کے ایک گوشے میں آج بھی چار ستونوں پر وہ سائبان کھڑا ہے۔ وہاں ملنے والے مالی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ نواب خسرو جمشید ہی کا مدفن ہے ان کی اصل قبر نیچے ہوگی۔ یہ رواج پہلے تھا کہ اوپر علامتی قبر رکھی جاتی تھی اور عین اس کے نیچے تہہ خانے میں اصلی قبر بنائی جاتی تھی۔ تاج محل میں ملکہ ممتاز محل کی قبر ایسے ہی ہے اور کراچی میں قائداعظم کے مزار میں بھی ایسا ہی انتظام ہے۔ فاتحہ خوانی کے لیے آنے والے اوپر ہی فاتحہ پڑھ جاتے ہیں۔ نیچے اصل قبر تک رسائی کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ خیر تو آگے بتا۔"

"وہاں اس قبر کو توڑ کے کھدائی کرنا بہت مشکل کام تھا۔ نیچے تک فرش انتہائی پختہ تھا اور شاید اسی لیے طافو کے علاوہ وہ جفاکش قسم کے مزدور ساتھ لیے تھے۔" محسن بولا۔ "دو گھنٹے کی سخت محنت کے بعد ایک لاش کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ چوہدری دلاور اور پیڈرو خاصے مایوس تھے۔ انہوں نے خود نیچے اتر کے دیکھا اور اِدھر اُدھر کی دیواروں کو ٹھوک بجا کے دیکھتے رہے۔ دلاور بہت برہم تھا کہ محنت رائیگاں گئی اور بار بار پیڈرو سے کہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے ڈھانچہ ہٹا کے نیچے سے بھی زمین کھودنے کا حکم دیا مگر وہاں سے مٹی ہی نکلی۔ سائڈ میں کھودنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ معلوم نہیں وہ کیا تلاش کر رہے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کا کوئی مدفون خزانہ۔ کوئی وصیت نامہ یا ان کے اہم ذاتی کاغذات۔ معاملہ پُراسرار تھا اور پُراسرار رہا۔ صبح ہوتے ہی انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا لیکن طافو کے ساتھ جانے والے دونوں افراد کو وہیں چھوڑ دیا گیا، گولی مارنے کے بعد۔ یہ بات بتاتے ہوئے طافو کی حالت غیر ہو گئی تھی اور وہ ایسے کانپنے لگا تھا دونوں قتل ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے ہوئے ہیں۔ اپنی موت کا بھی سو فیصد یقین تھا مگر اس سے پہلے کہ تبسری گولی اس کا خاتمہ کرتی وہ ان کے قدموں میں لوٹنے لگا اور جان کے لیے رونے دھونے اور منت سماجت کرنے لگا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور نہ جانے کیوں دلاور اور پیڈرو کو رحم آگیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ دو آدمی صرف اس رات کی بات کو چھپانے کیلیے مار دیے گئے ہیں اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اس بارے میں تمہاری زبان سے ایک لفظ غلطی سے بھی نکلا تو تمہیں ہی نہیں تمہارے بیوی بچوں کو بھی اسی طرح دفن کر دیا جائے گا۔ طافو اتنا دہشت زدہ تھا کہ اس نے خدا رسولؐ اور قرآن کی قسم کھا کے انہیں یقین دلایا کہ جب تک زندہ ہے اس کی زبان بند رہے گی۔ انہوں نے لاشوں کو قبر کے گڑھے میں ڈالا اور باہر آگئے۔"

"اور آج اس نے ہر قسم توڑ ڈالی؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ فیصلہ کر چکا تھا مرنے کا؟"

"مرتے وقت تو کوئی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ ہے کہ اس نے بیوی بچوں کی خاطر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ سوال جان بچانے کا ہو تو حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے۔ اسے یقین ہوگا کہ اتنے سنسنی خیز انکشافات کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہیں رہے گا کہ اسے جو کچھ معلوم تھا وہ اس نے نہیں بتایا۔ یہ تو تفتیش میں ہوتا ہی ہے۔ کوئی بھی ایک دم سارا سچ نہیں اگل دیتا اور اُگل دے تو پوچھنے والا پھر بھی سمجھتا ہے کہ کوشش کر کے کچھ اور اگلوایا جائے۔ یہی ہم نے بھی کیا تھا۔ اسے بتا دیا تھا کہ اگر خیریت چاہتا ہے تو سب بتا دے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے تہہ خانوں میں خالی کمرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ وہاں کوئی لیب یا فیکٹری ہوگی۔ کریٹ یا بوریاں ہوں گی لیکن وہ واقعی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا تو اور کیا بتاتا۔ شدید مایوسی کے عالم میں اس نے خودکشی کر لی۔" محسن نے کہا اور مجھے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑا سا فاصلہ ہم نے ایک تنگ گلی میں طے کیا جس میں کار نہیں جا سکتی تھی۔ یہ گلی سامنے سے بند تھی اور میں دونوں جانب زیادہ مکان نہیں تھے۔ محسن نے ایک دروازے پر دستک دی جس کے پیچھے بظاہر تاریکی تھی۔

"کون ہے؟" استاد ٹیڈی نے بہت قریب آ کے آہستہ سے پوچھا۔

"پولیس،" محسن نے لہجہ بدل کے کہا۔ "یہاں کسی کا قتل ہوا ہے؟" میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کیا حالانکہ یہ ہنسنے کا موقع نہ تھا۔ اندر سے چند سیکنڈ تک کوئی آواز نہیں آئی اور محسن اپنے مذاق سے محظوظ ہوا۔

"ارے یار! اس کا ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ذرا دمت استاد ٹیڈی! پولیس آئی تو پہلے ہمیں پکڑے گی۔"

"قسم مولا کی —" ٹیڈی نے حسبِ عادت دروازہ کھول کے شیخی ماری۔ "کون سالا ڈرتا ہے پولیس سے۔ اور آپ ہمارے ساتھ میں ہو۔ پولیس استاد ٹیڈی کی لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکتی ہے یاروں تک۔ بھون کے رکھ دوں پولیس کو۔"

"مگر استاد! یہ تم کانپ رہے ہو سردی سے یا تمہاری آواز کانپ رہی ہے؟" محسن نے کہا اور اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دوستانہ طریقے پر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، واقعی وہ کانپ رہا تھا۔

"ارے بھائی محسن! آپ بھی مذاق کر لو۔ یہ مصیبت بھی آپ ہی لائے تھے۔" وہ مجھ سے فریاد کے انداز میں بولا۔

"گھبراتے کیوں ہو۔ ارے ہم تمہارے ساتھ ہیں استاد تم سے پہلے لٹکنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "لاش کہاں ہے؟"

وہ مجھے اندر کے ایک کمرے میں لے گیا۔ لاش کو اس نے پلاسٹک بچھا کے کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے وہ غسلخانہ دیکھا جہاں میں طافو نے اپنا کام تمام کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے پر خنجر چلانا آسان نہیں ہوتا۔ کسی بلند عمارت سے کود جانے گاڑی کے آگے لیٹ جانے یا زہر کھانے میں ایک سیکنڈ لگتا ہے لیکن گلا کاٹنے میں قوتِ ارادی ہی نہیں اتنی جسمانی طاقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ ہاتھ اس وقت تک نہ رکے جب تک خنجر کی دھار شہ رگ کو بھی نہ کاٹ دے۔ طافو نے تو یہ مشکل کام بلیڈ سے کیا تھا اور کامیاب رہا تھا لیکن اس کوشش میں اذیت کے باعث وہ تڑپا تھا چنانچہ خون کے چھینٹے ہر طرف دیواروں پر پھیل گئے تھے۔ باقی خون فرش سے بہہ کر نالی کے راستے باہر نکل گیا تھا۔ ٹیڈی نے دیواروں کو دھو ڈالا تھا اور خاصا رگڑا تھا مگر چونے کی سفیدی میں جذب ہونے والی لہو کی لالی بدستور نمایاں تھی یا شاید مجھے نمایاں محسوس ہوتی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ داغ خون کے ہیں معلوم نہ ہوتا تو میں انہیں صرف داغ سمجھتا جو باتھ روم کی دیواروں پر ہو ہی جاتے ہیں۔ ٹیڈی نے فرش کو بھی دھو ڈالا تھا اور کافی مقدار میں پانی بہایا تھا۔

"خون تو کافی صاف کر لیا ہے تم نے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

"وہ جی میں نے تو گرم پانی ڈالا، بالکل ابلتا ہوا اور سوڈا لگا کے صابن سے رگڑا۔" وہ بولا۔

"گرم پانی سے باہر کی نالی میں بھی خون جما نہیں ہوگا اور پانی کے ساتھ بہہ گیا ہوگا۔ کوئی ٹارچ ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹارچ تو نہیں ہے۔ موم بتی لاؤں؟" ٹیڈی نے کہا اور میرے اقرار میں سر ہلانے پر اندر سے ایک انچ موٹی موم بتی روشن کر لایا۔

باہر گلی بالکل سنسان تھی اور کسی کے اچانک آجانے کا احتمال بھی نہیں تھا کیونکہ یہ بند گلی عام رہ گزر نہیں تھی۔ گلی کے مکیں سوئے پڑے تھے اور ہر طرف خاموشی کا تسلط تھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں محسن نے اور میں نے جھک کر گھر سے باہر آنے والی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے والی نالی کا معائنہ کیا۔ ٹیڈی نے اُبلتے پانی کے استعمال سے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ نالی پہلے ہی صاف نہیں تھی اور اس میں ملی جُلی غلاظت کا رنگ سیاہی مائل چکنی تہہ بن کے چمٹا ہوا تھا۔ اس میں خون کی سرخی کے آثار بہت کم تھے لیکن شک کی نظر سے دیکھنے والے کو واضح طور پر دکھائی دیتے تھے۔

"تمہارے پاس کالی نیلی کوئی روشنائی ہے؟" میں نے اندر لوٹ کر کہا۔ "یا کوئی پینٹ ہے؟"

"نیلی سیاہی ہے جی۔ اور کپڑوں میں دینے والا نیل ہے، ایک لال دوائی بھی ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"سب لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہاں کا مسئلہ حل کر لیں۔"

نیلی روشنائی کو میں نے باہر چھڑکا۔ جہاں بھی مجھے لہو کے رنگ کی جھلک محسوس ہوئی۔ باقی روشنائی کو میں نے اندر سے باہر آنے والی نالی کے دہانے پر شیشی توڑ کے پھیلا دیا۔ چھینٹے ہر طرف اچھلے اور کانچ کے ٹکڑے نالی میں گرے۔ یہ کیمو فلاج کا طریقہ تھا۔ اب خون کے لال رنگ پر نیلا رنگ غالب آگیا تھا اور گزرتے ہوئے دیکھنے والے کو ٹوٹی ہوئی دوات دیکھنے کے بعد نیلے رنگ کے سوا کچھ دکھائی دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میدانِ جنگ میں فوجی اپنے سر کے فولادی خود پر جھاڑیاں رکھ لیتے ہیں اور جنگل کی ہریالی میں گم ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے والے کو وردی کا خاکی رنگ نظر ہی نہیں آتا کیونکہ ہر طرف پھیلا ہوا ہرا رنگ غالب رہتا ہے۔ یہی نیلا پردہ میں نے باتھ روم کے اندر بھی ڈالا اور جہاں جہاں سرخی نمایاں محسوس ہوئی وہاں پانی میں نیل گھول کے چھڑک دیا۔ اندر کا معاملہ اتنا باعثِ تشویش نہیں تھا۔ شک کا آغاز ہوتا تو باہر سے ہوتا لیکن اب صبح ہونے تک خون کے داغ دب جائیں گے اور کہیں نیلے چھینٹوں میں کوئی لال چھینٹا بھی نظر آیا تو اسے کوئی خون نہیں سمجھے گا۔

"یہاں تو خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "طافو کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ جاننے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

والوں نے تو اسے لاہور سے ٹرک پر مال کے ساتھ کراچی بھیجا تھا. اس سے زیادہ ان کو کچھ معلوم ہے تو یہ کہ ٹرک ہم نے تباہ کر دیا۔ رحمت کباڑی کی لاش چوہدری صاحب کو ارسال کر دی اور چھوٹو بھاگ گیا. طافو کے بارے میں بھی وہ یہی فرض کر لیں گے کہ بھاگ گیا مگر صبح ہونے تک چوہدری صاحب کی خوش فہمی دور ہو جائے گی۔"

"کیا یہ بھی انہی کو ارسال کرنے کا پروگرام ہے؟" محسن نے کہا.

"ہاں مگر ویسے نہیں جیسے رحمت کباڑی کو ارسال کیا تھا۔" میں نے کہا "گھر میں زمین کھودنے کے آلات ہوں گے؟"

"بس ایک بیلچہ ہے. وہ بھی آگے سے ٹوٹا ہوا۔" ٹیڈی نے اپنی بے سروسامانی پر ندامت سے کہا.

"کافی ہے. ہمیں زیادہ نہیں کھودنا ہے. اسے فوراً لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "ہم اتنی دیر میں لاش کو لے جاتے ہیں۔"

طافو کی لاش اکڑ چکی تھی. مجھے اور محسن کو اس کے ہاتھ پیر سمیٹ کر کار کی ڈکی میں فٹ کرنے کے لیے مرنے والے کے ساتھ خاصی زبردستی کرنی پڑی. خون اب نہیں بہہ رہا تھا اور جو پہلے نکلا تھا وہ جم چکا تھا چنانچہ ہمارے ہاتھ اور کپڑے محفوظ رہے. پلاسٹک نے بھی خون کی نمی کو کمبل میں جذب ہونے سے روکا تھا. میں نے ڈکی بند کی اور اندر آ کے روشنی میں اچھی طرح اپنے جسم کو اور لباس کو دیکھا. صرف ہمارے ہاتھوں کی انگلیاں خون سے داغدار ہوئی تھیں. صابن سے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دھونے کے بعد کوئی نشان نہ رہا. ٹیڈی نے بیلچہ بھی لاش کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا. وہ خود پیچھے بیٹھا اور میں نے گاڑی کو ریورس کیا.

"ہم اب چوہدری دلاور صاحب کے دولت خانے پر تشریف لے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "تاکہ صبح ہونے سے پہلے ان پر ایک اور قتل کا الزام آ جائے. میرے خلاف اس کے پانچ الزامات ہیں، دو کا حساب تو برابر ہو۔"

"مگر اس وقت..... یہ ویسے بھی خطرناک ہے اور ہماری پوزیشن!" محسن نے کہا.

"فکر مت کر. ہماری پوزیشن وہی رہے گی جو اس وقت ہے۔" میں نے کہا "مگر چوہدری صاحب کی نہیں. رہا خطرہ تو وہ ہماری جان کے ساتھ ہے اور ہمیں یہی کرنا ہے کہ خطرے کو تقسیم کر دیں. جتنے خطرات سے ہم دوچار ہیں اتنے ہی خطرات فریقِ ثانی کو لاحق ہو جائیں تو ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں گے. ابھی ہم کانے ہیں، اگر وہ بھی کانے ہو گئے تو کون کس کو کانا کہے گا. ایک حمام میں سب ننگے ہوں تو کسی ایک پر ننگے ہونے کا الزام نہیں آتا۔"

"یہ ہماری دہشت پسند تنظیم کا پہلا کارنامہ ہو گا. کارنامے تو ہم پہلے بھی انجام دے چکے ہیں مگر اس وقت ہم منظم نہیں تھے۔" محسن بولا "کتنی خوشی کی بات ہے استاد ٹیڈی کہ ہم اب باقاعدہ دہشت گرد ہو۔"

"دہشت گرد؟ قسم مولا کی. دہشت کس بات کی؟ ... مُردوں سے کیا ڈرنا۔"

مجھے ہنسی آئی "کون کہتا ہے تم ڈرتے ہو. دہشت گرد کا مطلب ہوتا ہے۔ زور بازو سے اپنا حق حاصل کرنے والا، اور ... کے خلاف آواز اٹھانے والا. مثلاً تنظیم آزادیٔ فلسطین کو ... کشمیر لبریشن فرنٹ....."

"میاں جی. اپنی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔" ... بولا "ہم ٹھہرے ان پڑھ لوگ. تم جو کہو ٹھیک ہے۔"

"اپنے سکندرِ اعظم صاحب اچیئرمین کا انتخاب تو ایک نزعی مسئلہ ہے جس پر انشاء اللہ اختلاف جاری رہے گا۔" محسن ... کہا "لیکن تنظیم کے نام پر تو اتفاقِ رائے ہو سکتا ہے اور ابھی ... مجھ پر غیب سے ایک نام کا نزول ہوا ہے جو حسبِ حال ہے ... اس سے بہتر نام کوئی تجویز کر ہی نہیں سکتا. کرے گا تو شرمندہ ہو گا کیونکہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے. ایم آر ایس. کیسا نام ہے؟ مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔"

"گویا جس کی لاٹھی اس کی بھینس سوسائٹی۔" میں نے کہا "بہت خوب۔"

"آپ ایم آر ایس پر غور کریں. ایم سے یہ خاکسار. آر سے آپ کی وہ. اور ایس سے آپ خود۔" محسن بولا "کل پرسوں میں ... کے مونوگرام چھپوالوں گا. کیا زبردست پبلسٹی ملے گی اور کیا ... تاثر ہو گا۔"

"تو نے چوہدری دلاور کا گھر تو دیکھا ہے نا۔" میں نے ... کی بات کاٹ دی. "اب دھیان سے میری بات سن. میں گاڑی ذرا آگے سے موڑ کر پیچھے لاؤں گا. اُدھر تنگ سی گلی اور دلاور کی کوٹھی کی عقبی دیوار ہے جس میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے. ... فٹ اونچی دیوار میں چار فٹ کا ایک پٹ والا گیٹ جو عموماً مقفل نہیں رہتا اور اُدھر سے نوکر آتے جاتے ہیں یا دودھ والا آتا ... میں اسی راستے سے اندر جا کے لاش کو دائیں جانب ڈال دو ... پھر بالکل خاموشی کے ساتھ ہم سب بائیں طرف کے کھلے ... میں تھوڑی سی زمین کھودیں گے. اسی جگہ کے قریب جہاں ... ویل کی موٹر لگی ہوئی ہے. وہاں زمین نرم ہے اور ایک ... کھودنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا. بس آواز نہیں ہونی ..."

"طافو کو وہاں دفن کرنا ہے؟" محسن بولا. "اور پھر ... کو اطلاع دے دینی ہے کہ لاش نکال لے؟"

"نہیں باقی پلان بعد میں۔" میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور پھر انجن کو نیوٹرل کر لیا. گاڑی بالکل خاموشی سے دلاور کی کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے سے سیدھی گزر گئی. چوکیدار اندر کھڑا تھا اور پورچ میں صرف ایک گلوب روشن تھا جس کا اجالا کوٹھی کے دونوں طرف نہیں پہنچتا تھا. اس کے علاوہ روشنی صرف ایک روشندان میں تھی جو میرے خیال کے مطابق باتھ روم کا روشندان تھا کیونکہ اس کی بلندی سات فٹ کے قریب تھی. گاڑی چار کوٹھیاں چھوڑ کے بائیں طرف مڑی اور کارنر کی کوٹھی کا احاطہ ختم ہوتے ہی پھر بائیں جانب تنگ گلی میں داخل ہو گئی. موڑ پر ایک کھلا مین ہول تھا جو اچانک سامنے آ گیا تھا مگر اگلے دونوں پہیے دائیں بائیں رہے اور کھلا گٹر درمیان سے گزر گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ گاڑی کا ایک پہیہ مین ہول میں جاتا تو بہت بڑی مصیبت آ جاتی. ایکسل ٹوٹ جاتا یا قینچی ٹوٹ جاتی اور پھر گاڑی کو نکالنے میں کامیابی ہو جاتی تب بھی اس کو وہاں سے ہٹانا ناممکن تھا. صبح ہو جانے کے بعد لوگ مدد کے لیے آتے اور گاڑی کو "کرین" سے اٹھا کر اور لاد کے لے جانا پڑتا. اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی کہ ایک غیر متوقع حادثہ ہمیں پل بھر میں ناکامی سے دوچار کر سکتا تھا. سب سے پہلے تو ہم تینوں کو فرار ہونا پڑتا. کار کی ڈکی میں لاش تھی، ہم اسے اٹھا کے فرار نہیں ہو سکتے تھے اور یہ بھی ناممکن تھا کہ گاڑی کو ہم میں سے کوئی اٹھوا کیسے جائے. جائے حادثہ چوہدری دلاور کے گھر کے اتنے قریب تھی کہ اسے ضرور معلوم ہو جاتا اور ایسی صورت میں خود کو بچانے کی واحد صورت یہی ہوتی کہ ہم گاڑی کی ملکیت سے یکسر دستبردار ہو جائیں.

گاڑی کو عین چوہدری دلاور کے بنگلے کی دیوار سے ملا کے میں نے بڑی پھرتی سے ڈکی کھولی. لاش کو میں نے اور محسن نے اٹھایا اور دبے پاؤں مختصر سے گیٹ کے راستے اندر لے گئے. ٹیڈی نے اتنی دیر میں بیلچہ نکال کے ڈکی بند کی تو ایک دھماکا ہوا اور ایک لمحے کے لیے میں اور محسن مفلوج ہو گئے. ٹیڈی نے بونٹ کو آہستہ سے دبانے کے بجائے زور سے دے مارا تھا. چند سیکنڈ تک ہم دونوں دم سادھے کھڑے رہے. پھر ٹیڈی نمودار ہوا.

"اگر تم نے احتیاط نہ کی تو ہم اسی لاش کے ساتھ پکڑے جائیں گے۔" محسن نے کہا اور ٹیڈی نے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا. لاش اب دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی تھی. میں نے ان دونوں کو اشارہ کیا اور ہم ایک ایک قدم پھونک کر رکھتے ہوئے آگے بڑھے. ٹیوب ویل کی موٹر تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر تھی. وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو بند دروازوں اور چار کھڑکیوں کے سامنے سے گزرنا تھا. احتیاطاً ہم دیوار سے لگ کر رکوع کی حالت میں اپنا سر کھڑکی کی دہلیز سے نیچے رکھے گزرے. نہ جانے کیسے ٹیڈی کا سر دہلیز پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چھجے سے ٹکرایا اور ٹیڈی کے حلق سے "آہ" کی آواز نکلی. میں اور محسن منجمد ہو گئے اور ہم نے ایک ساتھ پلٹ کر ٹیڈی کو غصے سے دیکھا.

ٹیوب ویل کے پاس پہنچ کر میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ سے دیکھا. چوکیدار وہیں بندوق تانے کھڑا تھا. میں نے محسن اور ٹیڈی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے زمین صاف کرنے لگے. خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں احتیاط کے ساتھ ہٹانے کے بعد انہوں نے بیلچہ زمین پر رکھ کے پیر سے دبایا اور دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے اٹھا لیا. تقریباً ایک مکعب فٹ مٹی نکالنے کے لیے بیلچہ چار مرتبہ کام آیا. میری نظر چوکیدار پر تھی اور میں ہر آواز پر سانس روک لیتا تھا. میں اس کے لیے بھی تیار تھا کہ اگر چوکیدار یا خود دلاور اچانک نمودار ہو جائے تو اس سے مؤثر طور پر نمٹ لوں. میری جیب میں ریوالور بھی تھا اور میرے خالی ہاتھ بھی بہت کچھ کر سکتے تھے. ایسی صورت میں ہمارا مشن تو ناکام ہوتا لیکن مسئلہ اپنی جان بچانے کا ہو تو مشن قربان کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا. گڑھا میری ہدایات کے مطابق تین فٹ قطر کا رکھا گیا تھا. ابھی اس کی گہرائی ایک بالشت بھی نہیں ہوئی تھی کہ چوکیدار نے گیٹ پوسٹ سے روانہ ہو کے کوٹھی کا راؤنڈ لگانے کا فیصلہ کیا. میں نے خطرے کا سگنل دیا اور ہم ایک ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے روپوش ہو گئے. چوکیدار کے گھوم کر آنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے ہوں گے مگر ضبط کا یہ اعصاب شکن وقفہ مجھے بہت طویل لگا. میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دلاور نے حفاظت کے خیال سے کتے نہیں پال رکھے ہیں ورنہ ہمارا چوری چھپے اندر داخل ہوتے ہی پکڑا جانا یقینی تھا.

چوکیدار مخالف گوشے میں نظر آیا. اس سے بہت کم فاصلے پر وہ چھوٹا سا گیٹ تھا جس کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی لیکن وہ گوشہ تاریک تھا اور چوکیدار کی نظر کچھ نہ دیکھ سکی. تاہم باہر کھڑی ہوئی کار نے اسے متوجہ کیا. مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا. مجھے لاش نکالنے کے بعد کار کو آگے پیچھے کسی اور گھر کے سامنے کھڑا کرنا چاہیے تھا. چوکیدار گیٹ کی طرف گیا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا. گاڑی میں تو شک کی کوئی بات نہ تھی کہ چوکیدار کو نمبر نوٹ کرنے کا خیال آئے مگر گیٹ سے چند فٹ دور ایک لاش لیٹی ہوئی تھی. میں نے محسن کو خبردار کیا مگر اس نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا. چوکیدار آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا. گیٹ پر پہنچ جانے کے بعد وہ کچھ بڑبڑایا. غالباً اس نے ان کی مذمت کی ہو گی جو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

مہمان تو کسی اور کے گھر آئے تھے لیکن اپنی گاڑی کو چوہدری صاحب کے گھر کی طرف پارک کر گئے تھے۔ پھر وہ پلٹا اور گیٹ کی کنڈی لگانے لگا۔ ہم سب سانس روکے بیٹھے تھے۔ اس کی نگاہ غلطی سے بھی اس گوشے میں چلی جاتی تو وہ ضرور چونکتا۔ اور میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی چوکیدار نے لاش کے قریب جا کر تصدیق کی ضرورت محسوس کی، میں اسے جالوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس کے حلق سے آواز نہ نکلنے پائے۔

چوکیدار نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میں نے گہری سانس لی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے ماتھے پر سردی کے باوجود پسینے کی نمی پھیل گئی تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں سمجھ آئی کہ چوکیدار اس لاش کو کیوں نہ دیکھ سکا۔ لاش اگر عام کپڑوں میں ہوتی تو سیاہی میں سفیدی کی جھلک اسے ضرور متوجہ کرتی مگر لاش کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جاتے وقت اس کی نظر دیوار کے اوپر سے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی چھت کو دیکھ رہی تھی اور لوٹتے وقت اس کی پشت لاش کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رائفل اٹھائے ہمارے بہت قریب سے گزرا۔ اس وقت ایک چھینک بھی آجاتی تو بم کے دھماکے سے کم نہ ہوتی۔ مشن کی کامیابی کے امکانات شمار کرتے وقت انسان ایسی بدقسمتی کے امکانات کو کتنی آسانی سے نظرانداز کر دیتا ہے۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو کام پھر شروع کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ کام زیادہ جسمانی مشقت کا نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے بہت مشکل تھے۔ ابھی تک گڑھا ایک فٹ ہو گیا تھا اور ہم میں سے کسی نے خفیف سی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ بیلچہ انتہائی خاموشی سے مٹی نکالتا جا رہا تھا اور اس کی سرسراہٹ صرف ہمارے کان سن سکتے تھے۔ کوٹھی کے اندر کسی کلاک نے تین بجائے۔ ہمارے پاس اب زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تھے۔ اس عرصے میں ہمیں کئی کام نمٹانے تھے جن کی ترتیب میرے ذہن میں تھی۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو ہاتھ تیز چلانے کو کہا۔

"ایسے حکم چلا رہا ہے جیسے ہم خرکار ہوں" محسن نے زیرلب کہا "اور ہم کو بیگار میں پکڑ کے لایا ہو۔"

"میں ڈسپلن کا سخت قائل ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے چیئرمین کی حیثیت سے۔"

"چیئرمین کے انتخاب میں دھاندلی ہوئی ہے۔ میں نہیں مانتا۔" محسن نے کہا لیکن اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ کوئی کار ایک دم مڑ کر گیٹ کے سامنے آگئی تھی۔ ہیڈلائٹ کی روشنی سیدھی کوٹھی کے بائیں حصے کی خالی جگہ پر آئی لیکن زیادہ لائٹ گیٹ کے بند ہونے کی وجہ سے ہم پر نہیں پڑی۔ پلک جھپکتے میں ہم گڑھے میں سرنگوں ہو گئے۔ چوکیدار نے گیٹ کے دونوں پٹ کھولے تو روشنی کی تیز لکیر ہمارے اوپر سے گزری۔ پھر کار پورچ کی طرف مڑی تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ یہ چوہدری دلاور کی کار تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے آرہا تھا۔ شاید گامے ماچھی سے مل کر یا قصرِ جمشید کے تہہ خانے میں کوئی ضروری کام نمٹا کر۔ اس کے سب ناجائز دھندے رات کے اندھیرے میں ہی کامیابی سے چلتے تھے۔ دن میں وہ ایک شریف اور معزز صنعتکار تھا۔

"چوکیدار!" دلاور نے آواز دے کر کہا۔ "کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"کون آئے گا سرکار؟" چوکیدار نے کہا۔ "میں جو یہاں موجود ہوں۔"

"تم کیا توپ چلاؤ گے؟" دلاور نے حقارت سے کہا۔ "ایس پی صاحب نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا کہ اپنی حفاظت کی فکر کرو۔ وہ تینوں.... غائب ہو گئے ہیں۔" درمیان میں اس نے خاصی رواں سے ایک بھاری بھرکم گالی دی جو میرے، محسن اور رابعہ کے لیے بلاتخصیص استعمال ہوئی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ رضوی صاحب واقعی ذہین افسر تھے۔ انہوں نے قبل از وقت اندازہ کر لیا تھا کہ ہم تینوں اگر تخریبی کارروائی کریں گے تو اس کا پہلا نشانہ کون ہوگا۔ تقدیر کی کیا ستم ظریفی تھی کہ ایک فرض شناس پولیس افسر ایک ایسے شخص کو خبردار کر چکا تھا جس کے کالے دھندوں کے متعلق اسے کوئی شبہ نہ تھا اور وہ کل تک ہمارا محافظ و نگراں، دوست اور مددگار اور ہم سب کا انکل تھا مگر آج دشمنوں سے زیادہ دشمن تھا۔ رضوی صاحب نے دلاور کو اس لیے بھی گرفتار نہیں کیا تھا کہ اس کے خلاف انہیں کوئی ثبوت نہیں ملا تھا اور کوئی شہادت سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری پوزیشن مختلف تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس کے ریکارڈ پر کیا کچھ ہے جو ہمیں مجرم ثابت کرتا ہے۔

دلاور نے چوکیدار کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی اور اندر چلا گیا۔ ایک کھڑکی کے پٹ روشن ہوئے جو غالباً دلاور کا بیڈروم تھا۔ یہ مخالف سمت سے پہلی کھڑکی تھی، اس چھوٹے سے گیٹ کے بالکل سامنے جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے جس کی اندرونی دیوار کے ساتھ طافو کی لاش پڑی تھی اور بیرونی دیوار کے ساتھ ہماری جہازی سائز کی اوپل ریکارڈ کھڑی تھی۔ مجھے ایک بار پھر شدت سے کار کو وہاں پارک کرنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر میں دلاور سو جائے گا۔" میں نے کہا۔ لیکن اسی وقت چٹخنی کھلنے کی آواز آئی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ روشنی کا ایک مستطیل ٹکڑا باہر پھیلا اور اجالا ہر طرف منعکس ہونے لگا۔

دلاور نے زور سے کہا۔ "اُلّو کی پٹھی" اور ایک بلی کو باہر پھینک کر زور سے کھڑکی بند کی۔ خوف، کشیدگی اور پریشانی کے باوجود ہم سب نے بڑی مشکل سے ہنسی کو روکا۔ غالباً بلی ہر روز اس کے بیڈروم کو اپنا میٹرنٹی ہوم بنانے کی خاطر گھس جاتی ہوگی اور وہ ہر رات اسے نکالتے نکالتے عاجز آگیا ہوگا۔ بلیوں کے معاملے میں میرا اپنا تجربہ ایسا ہی تھا کہ وہ ایک بار گھر دیکھ لیں تو میلوں دُور چھوڑ آنے کے باوجود لوٹ آتی ہیں۔ یہاں تک کہ صاحب خانہ خود گھر سے نکلنے کی سوچنے لگتا ہے۔

"اسے کہتے ہیں تھیلے میں سے، بلکہ کمرے میں سے بلی نکالنا۔" محسن نے کہا۔ "سسپنس میں میرا دم نکلنے والا تھا۔ خیریت ہوئی کہ اس نے محض غصے کی وجہ سے گرد و پیش پر غور ہی نہیں کیا۔ ورنہ گاڑی تو اسے صاف نظر آجاتی اور وہ چوکیدار تو ہے نہیں کہ خلافِ معمول کچھ بھی دیکھتا تو نظرانداز کر دیتا۔ وہ تصدیق ضرور کرنے جاتا کہ گاڑی کس کی ہے؟"

"کیا طافو نے مخبری کرتے وقت گاڑی کے متعلق بھی بتا دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے نہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ جب انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا تو گاڑی منظر کے گھر کے سامنے نہ سہی، چند قدم کے فاصلے پر اسی گلی میں موجود تھی۔"

"انکل کا کچھ بھروسہ نہیں، یہ بھی ان کی چال ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو قبضے میں لے کر انہیں کیا ملتا۔ اب وہ گاڑی کا تعاقب تو کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہاں کی پولیس کے پاس وہ جدید قسم کے سگنل دینے والے آلات ہیں یا نہیں جن سے تعاقب بہت آسان ہو جاتا ہے۔ گاڑی اگر بھیڑ بھاڑ میں کھو جائے یا غچہ دے کر نکلنا چاہے تو پریشانی نہیں ہوتی۔ چھوٹا سا مقناطیسی ٹرانسمیٹر گاڑی کے نیچے کہیں چپکا دیتے ہیں اور وہ ایک مخصوص فریکوئنسی پر مورس کوڈ میں اپنے سگنل نشر کرتا رہتا ہے۔ پیچھے آنے والی گاڑی کے ریسیور میں اس کی ٹیں ٹیں صاف سنائی دیتی ہے۔ بس آواز کے پیچھے چلتے جاتے ہیں۔"

"اگر ایسا ہوتا تو وہ لاہور ہوٹل پہنچ کر ہم تینوں کو شرفِ ملاقات بخشتے۔" محسن بولا۔ "یا اب تک یہاں قدم رنجہ فرما کے اور ہماری کارروائی کو ملاحظہ کر کے ضرور خوش ہوتے۔"

"یار سکندر بادشاہ، گپ شپ چھوڑو۔" ٹیڈی نے ہانپتے ہوئے سرگوشی کی۔ "کیا یہاں کنواں کھودنا ہے؟"

"اچھا اچھا استاد۔ صاف کہو نا کہ دم نہیں رہا۔" میں نے کہا اور محسن نے تائید کی۔

"دُم کی بات مت کرو۔ قسم مولا کی۔" استاد ٹیڈی کو جوش آگیا۔ "تیل نکال کے دکھا سکتا ہوں یہاں سے۔"

"چلو چھوڑو۔ ہماری گاڑی میں پٹرول ہے ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس اب اس مٹی کو برابر کر دو۔"

استاد ٹیڈی کے ساتھ محسن نے بھی بے وقوفوں کی طرح میری طرف دیکھا۔ "لاش کا کیا کروں؟"

"لاش کو وہیں رہنے دو۔ زمین برابر کر دو اور چلو۔ وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔

"وقت کے گھوڑے، یہ بیگار کس لیے تھی؟ ہم اتنے بے کار تو نہیں تھے۔" محسن بولا۔ "ورنہ کپڑے پھاڑ کے سینا بھی جائز ہوتا۔"

"تنظیم کا بنیادی اصول ہے ڈسپلن۔" میں نے کہا۔ "اور میں بحیثیت چیئرمین کے حکم دیتا ہوں....."

"ایسی کی تیسی چیئرمین کی۔" محسن نے کھودی ہوئی مٹی واپس ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں انتخاب کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہوں۔"

گڑھے کو پھر مٹی سے پُر کرنا اسے کھودنے کے مقابلے میں بہت آسان کام تھا۔ دس منٹ میں یہ کام ختم ہو گیا اور ہم نے مٹی کو پیروں سے اچھی طرح دبا دیا۔ اس کے باوجود وہ جگہ نمایاں رہی جو کھودی گئی تھی۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم دبے پاؤں لوٹے۔ ایک بار پھر سیاہ کمبل میں لپٹے ہوئے طافو کے بے جان جسم کے پاس سے گزرے تو میرے قدم پل بھر کے لیے رُکے۔ نہ جانے کہاں ایک عورت اپنے بچوں کے ساتھ آنکھیں کھولے لیٹی ہوئی ہوگی۔ ہر روز کی طرح بچوں نے آج بھی پوچھا ہوگا کہ ابا کب آئے گا؟ اور اس نے انہیں تسلی دے کر سُلا دیا ہوگا کہ کل وہ ضرور آجائے گا۔ تمہارا ابا ٹرک چلاتا ہے نا اور کراچی تک جاتا ہے۔ اس کا ٹرک خراب ہو گیا ہوگا یا مالکوں نے اسے پھر کسی ضروری کام کے لیے کہیں بھیج دیا ہوگا اور جب بچے سو گئے ہوں گے تو اس کو اپنے چار لاکھ روپوں کا خیال آیا ہوگا جو اس کے پاس کاغذ کے بے مصرف ڈھیر کی طرح موجود تھے۔ یہ کاغذ اس کے شوہر کا نعم البدل نہیں تھے چنانچہ وہ جاگ رہی تھی اور اپنے اندیشوں سے نبرد آزما تھی۔ آج کی رات کے بعد بھی ایسی ہی اَن گنت راتیں آئیں گی جو انتظار کی اور تنہائی کے عذاب کی اور بے یقینی کے اندھیروں کی۔ بالآخر وہ کوئی جواب دے کر بچوں کو مطمئن کر دے گی لیکن یہ نہ بتا سکے گی کہ وہ اپنا اچھا بھلا گھر چھوڑ کے اس گوشہ گمنامی میں کیوں آگئے ہیں اور ابا آخر ٹرک لے کر کدھر نکل گیا ہے کہ لوٹ کر آنا ہی بھول گیا؟

"چیئرمین کی دُم" محسن نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "یہ تیرے بریک کہاں جام ہو گئے ہیں۔ کیا طافو کو بھی واپس لے جانا ہے؟ یہ کیا ایکسرسائز تھی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "طافو کو یہیں سونے دو۔ اس کی تجہیز و تکفین چوہدری [illegible] گے۔"

محسن نے اور [illegible] وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں لاش کو دفن کرنے کا منصوبہ تھا ہی نہیں بلکہ میں اس لاش کو کسی مؤثر قسم کی جارحانہ کارروائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گاڑی کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چابی اسے دی کیونکہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اگر یہ رات سکون سے سو کر گزر جاتی تو گزشتہ شب کی تھکان ختم ہو جاتی لیکن مقدر میں ایک اور شب بیداری لکھی تھی۔ اور یہ مسلسل دوسری رات تھی جو شدید اعصابی انتشار اور دباؤ سے میرا حوصلہ آزما رہی تھی۔

"گاڑی کو ریورس میں مت ڈالنا۔" میں نے کہا۔ "کونے پر گٹر کا مین ہول کھلا پڑا ہے۔"

"سامنے راستہ نہ ملا تو پھر بہت آگے سے لوٹنا پڑے گا۔" محسن نے کہا اور گاڑی کو الٹا چلاتا ہوا واپس لے گیا۔ میں ٹرن کے قریب پہنچ کر اُتر گیا اور محسن کو ہدایات دیتا رہا یہاں تک کہ گٹر کا اندھا غار گاڑی کے نیچے سے اگلے اور پچھلے دونوں پہیوں کے درمیان سے نکل گیا۔ میں پھر اپنی جگہ پہ آ بیٹھا اور گاڑی صاف سڑک پر بے آواز انجن کی بھرپور قوت کے ساتھ دوڑنے لگی۔

"اب کدھر جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟" محسن نے ٹیڈی کو اس کے گھر کے سامنے ڈراپ کرنے کے بعد کہا۔

"ہمارے حلیے خراب ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ پیر اور کپڑے سب مٹی میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں نہ ڈاکٹر امجد اپنے ہوٹل لوٹ سکتے ہیں اور نہ نواب ننھے خاں۔"

"یہ تو اس قسم کے مشن پہ آنے سے پہلے سوچنا تھا۔" محسن نے کہا۔ "واپس ٹیڈی کے گھر جا کر سو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سونا کیسا نورِ چشم۔ ایکشن تو اب شروع ہوگا۔ یہ تو ہم نے ایک سیٹ لگایا تھا اور اگلے سین کی شوٹنگ کا آغاز میری ٹیلی فون کال سے ہوگا لیکن یہ فون کسی پبلک کال آفس سے کرنا ٹھیک نہیں لگتا۔ لمبی کال ہوگی جو کوئی نہ سُنے تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔"

"کیوں نواب ننھے خاں اور پرنسس صوفیہ کی مٹی پلید کراتا ہے۔ اس مٹی کے ساتھ تشریف لے گئے تو ہوٹل والے سمجھیں گے کہ نوابی تو صرف نام کی ہے۔ ننھے خان پارٹ ٹائم گورکن ہیں۔" محسن بولا۔ "جو زیادہ غلط بھی نہیں۔"

"تو پرنسس کو فون کر۔" میں نے کہا۔ "راستے میں کسی بھی جگہ سے۔ اس سے کہہ کہ تیرے دو جوڑے لے کر نیچے آ جائے۔ بنڈل بنا لائے اور کاؤنٹر پر دے دے کہ ابھی کوئی لینے آئے گا۔ یا چھوڑ۔ وہ خود ایک بریف کیس میں ڈال لائے۔ ہم باہر گاڑی میں انتظار کریں گے اور کہیں بھی مناسب جگہ دیکھ کر بدل لیں گے۔ وہ جاگ ہی رہی ہوگی۔"

"تیرے فراق میں؟" محسن نے قہقہہ مارا۔ "مجھے تو شک ہے وہ بھاگ ہی نہ گئی ہو کہ بھاڑ میں گیا ایسا عشق جس میں سو پیاز اور سو جوتے۔ پھر سو پیاز اور پھر جوتے۔ محبت نہ ہوئی قید با مشقت ہو گئی۔"

"لگالے شرط وہ جاگ رہی ہوگی۔" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

"سو روپے کی ہو گئی۔"

مجبوراً محسن نے ہاتھ ملایا اور ہم نے میو اسپتال کے ایکسچینج سے ہوٹل فاران کا نمبر ملا کے پرنسس صوفیہ کا نمبر گھمایا۔ جسب توقع آپریٹر نے ... کہ پیغام دے دیا جائے۔ وہ محوِ خواب ہیں اور انہیں ڈسٹرب نہیں کیا جا سکتا۔"

"کون گستاخ ہے؟" محسن نے گلا پھاڑ کے کہا۔ "ابے ہم نواب ننھے خاں ہیں۔ غصہ آ گیا تو ہوٹل کو اصطبل بنا دیں گے۔ لات مار کے نکال دیں گے اور تیرا یہ ایکسچینج توڑ دیں گے۔ پرنسس کے چچا فوت ہو رہے ہیں نامعقول۔"

میو اسپتال کے ٹیلی فون آپریٹر نے ہمارے مشکوک حلیے دیکھ اور اس بے سروپا گفتگو پر غور کیا۔ میں نے اسے پچاس کا ایک نوٹ پیش کیا اور کندھے پر تھپکی دی تو اس نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ایک منٹ بعد محسن کا چہرا اتر گیا۔

"پرنسس۔ معافی ہم نے آپ کو خوابِ شیریں سے بیدار کیا..." محسن بولا۔

میں نے ریسیور چھین لیا۔ "تم سو رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کہاں چلا گیا ہے؟"

"تم ایسا کرو کہ اس کے دو جوڑے بریف کیس میں ڈالو اور نیچے آ جاؤ۔ گیٹ کے باہر ہم اسی اوپل ریکارڈ میں ملیں گے۔ دراصل ہمارے کپڑے خراب ہو گئے ہیں اور ان کپڑوں میں ہم اندر نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ محسن نے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ... نے پھر سر کھجایا۔ یہ کارروائی اس کی ناقص عقل میں کیسے آتی۔ ہم اسے حیران پریشان چھوڑ کے باہر نکل آئے۔ میں نے محسن کی گدی پہ ہاتھ مارا۔ "دھوکہ ... دہی چیمپین کے ساتھ، ہم نے آپ کو خوابِ شیریں سے بیدار کیا۔" ... اس کی نقل اتاری۔ "شیریں اپنے فرہاد کے لیے جاگ رہی تھی۔"

"تم دونوں نے مل کر بے ایمانی کی۔" محسن بولا۔ "تو نے ٹیلی پیتھی ... پیغام دیا اور اس نے جھوٹ بول دیا۔"

ساڑھے چار بجے رابعہ بریف کیس لیے نمودار ہوئی۔ "یہ کیا ... ہے؟" اس نے اندر منہ ڈال کے ہم دونوں کو باری باری ملاحظہ کیا۔ "کس لیے کیا ہے ایسا میک اپ؟"

"جاؤ بی بی۔ جاگ کے اب تو سو جاؤ۔" محسن نے بھنّا کے کہا۔ "ہماری اصل صورت ہے، میک اپ نہیں ہے۔"

"ہم ابھی دو منٹ میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں ... کرو۔" اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ سو گز کے فاصلے پر ایک تاریک اور ویران نظر آنے والی کوٹھی میں داخل ہوتے وقت میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

"ایم آر ایس کے معزز اراکین، یہاں لباسِ فاخرہ تبدیل کریں" میں نے کہا۔ "اندھیرا ابھی ہے اور تخلیہ بھی۔"

"یہ تو بڑی بے شرمی کی بات ہوگی۔" محسن نے کہا "اور ہم خاندانی نواب ابنِ نواب۔"

"نواب ... پردہ ہوتا ہے آنکھ کا۔ ہم اپنی آنکھیں بند کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور آپ کو تین منٹ دیتے ہیں۔"

پانچ منٹ بعد ہم صاف ستھرے شریفانہ لباس میں لوٹے تو رابعہ ہوٹل کے دروازے پر اکیلی کھڑی ہوئی پریشان ہو رہی تھی۔ آنے جانے والے اسے کوئی غلط قسم کی عورت سمجھ رہے تھے۔ اس وقت کون سی شریف عورت یوں تنہا کھڑی ملتی ہے اور وہ بھی ایک ہوٹل کے صدر دروازے پر۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور گاڑی اندر جا رکی۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے سر اٹھا کے ہمیں دیکھا اور غالباً اس مشکوک صورتحال پر غور کیا کہ پرنسس ابھی کچھ دیر پہلے مختصر سا سوٹ کیس لے کر کہیں گئی تھی اور واپسی میں اپنے بھائی نواب ننھے خاں کے علاوہ ایک اور شخص کو ساتھ لے آئی۔ لیکن ہوٹل میں یہ سب کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اور ایک معمولی کلرک کو وہاں صرف ریزرویشن کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔ پبلک کے افعال و کردار کی نگرانی کے لیے نہیں۔

"ہوٹل کلرک نے بھی میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی۔" رابعہ نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم مٹی کے پتلے بنے ہوئے آجاتے تو وہ ہمارے بارے میں اس سے بھی بری رائے قائم کرتا۔" محسن نے جواب دیا۔

"مگر بقول شاعر یہ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔ اصل رائے وہ ہے جو ہم اپنے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو چوہدری دلاور کا نمبر دیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی چنانچہ اس بات کا امکان نہیں تھا کہ آپریٹر ہماری گفتگو سنے گا۔ تین منٹ بعد دلاور کی آواز آئی۔ "ہیلو۔" نیند سے بوجھل آواز اور بیزار لہجے سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ابھی سویا ہی ہوگا اور ایسے وقت میں ٹیلی فون کی مداخلت اسے گراں گزری تھی۔

"ہیلو چوہدری صاحب، گڈ مارننگ۔" میں نے بشاشت سے کہا۔ "آپ کا پارٹنر بول رہا ہوں۔ الیگزنڈر دی گریٹ۔"

"اچھا۔ تو اب اتنی ہمت ہوگئی ہے تمہاری کہ تم...؟" وہ ایکدم غصے سے بے قابو ہوگیا۔

"میں نے تو آپ کی بھلائی کی خاطر فون کیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب دیکھیں نا جب اس سے پہلے ہم نے آپ کو ایک گفٹ پارسل بھیجا تھا تو پہلے سے اطلاع کر دی تھی کہ نہیں؟ ہر عت آپ کے لیے زحمت بن گیا تو ہمارا کیا قصور؟"

"تم فکر مت کرو۔ ایسے ہتھکنڈوں سے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سکندر۔" وہ بولا۔ "میری ضمانت منظور ہوگئی ہے اور مقدمہ بھی بالآخر ختم ہو جائے گا۔ میں تمہاری طرح مفرور نہیں ہوں۔"

"مفرور؟ لاحول ولا قوۃ چوہدری صاحب۔ آپ کے مقابلے پر ہم کس بات پر غرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "نہ آپ کے برابر عمر نہ تجربہ، دولت اور اثر و رسوخ۔ اور نہ خاندانی شرافت اور عزت۔ بس فرق یہ ہے چوہدری صاحب کہ سارے کھیل تقدیر کے ہیں۔ صبح ہونے تک تقدیر کیا گل کھلاتی ہے؟ یہ آپ نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔"

"فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ فون کیوں کیا تھا؟" اس نے لہجے سے بے نیازی کا تاثر دینے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کا تجسس آمیز خوف اسے بیدار کر چکا ہے۔

"ابھی تو آپ کو یہ بات فضول لگے گی مگر ہمارا کام تو وقت پر خبردار کرنا تھا۔ ہم کم ظرف دشمن نہیں ہیں کہ چھپ کر وار کریں۔ بلکہ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں کر لیں۔" میں نے کہا۔ "پھر صبح کا اجالا پھیل جائے گا تو دنیا دیکھے گی۔"

"کیا دیکھے گی؟ کیا مطلب ہے اس بکواس کا؟" دلاور نے کہا۔ اس کی آواز میں اب گھبراہٹ بہت نمایاں تھی۔

"مطلب تو اب تمہیں کھود کر نکالنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے محل کے پائیں باغ سے۔ مطلب کا نام ہے الطاف عرف طافو۔"

"کون طافو؟ میں کسی الطاف عرف طافو کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"صورت دیکھو گے قبر سے نکال کے تو شناخت کر لو گے۔ ہم رحمت کو بھی تو پہچان ہی لیا تھا تم نے۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "وہ کباڑی تھا اور یہ ٹرک ڈرائیور۔ پہلے ٹرک اللہ کو پیارا ہوا پھر رحمت صندوق میں چھپ کر تمہارے گھر پہنچا اور اب یہ طافو تمہارے گھر کی زمین میں گھس کر لیٹ گیا ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ یہ کہنا چاہتے ہو مجھ سے کہ تم اسے میرے گھر میں دفن کر گئے ہو؟" وہ نروس ہونے لگا۔

"کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ مشکل کام کیے ہیں۔"

"یہ... ناممکن ہے۔ گیٹ پر چوکیدار کھڑا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔" وہ بولا۔ "اسے یہی حکم ہے اور میں نے اس کو تمہاری تصویر بھی دے دی ہے۔"

"تصویر سے تو شاید وہ کچھ نہ بتا سکے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات کی تصدیق وہ کر سکتا ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اس نے تمہارے گھر کی عقبی دیوار کے قریب ایک کار کھڑی دیکھی تھی۔ ایک اوپل ریکارڈ ماڈل ۱۹۶۶ء۔ نیلا رنگ، چھ کور ہیڈ لائٹس۔ اور اس نے گاڑی کو دیکھ کے پیچھے کھلا ہوا گیٹ بھی بند کیا تھا۔ وہ چھوٹا سا گیٹ جو پیچھے کی طرف ہے۔ میں پھر فون کروں گا۔ دو منٹ بعد۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"اس نے ایکسچینج کو بتا دیا تو کال ٹریس ہو جائے گی۔" محسن نے تشویش سے کہا۔ وہ اور رابعہ میری گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔

"عام حالات میں وہ کرتا مگر ایک تو وہ نروس ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں نے اسے دو منٹ کی مہلت دی ہے۔ دو منٹ میں وہ چوکیدار سے بھی بات نہیں کر پائے گا۔ ایکسچینج سے کیا کہے گا۔"

"پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "عام لوگوں کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جن کے کمروں میں ٹیلی فون لائن نہیں ہے، نیچے ہال میں پبلک ٹیلی فون ہے۔ شیشے کا ایک کیبن سا ہے۔ اندر کی آواز باہر سنائی نہیں دیتی۔"

"اچھا! یہ تم نے کام کی بات بتائی عزیزہ۔" میں نے کہا۔ "تم قیام کرو۔ ہم نیچے سے دوسری کال کرتے ہیں۔"

اوپر سے نیچے تک آتے آتے ہمیں تین منٹ ہوگئے تھے۔ میں نے اور محسن نے کیبن میں گھس کر دروازہ بند کیا اور پھر نمبر ملایا۔ دلاور تصدیق کے بعد بہت بے چینی سے کال کا انتظار کر رہا تھا کہ اس نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا۔ "چوکیدار نے کسی کو نہیں دیکھا۔" وہ مجھ سے پہلے بولا۔ "گاڑی نہ جانے کس کی تھی؟"

"جی؟" میں نے آواز کو بھاری بنا کے اور لہجہ بدل کے کہا۔ "کیسا چوکیدار اور کس کی گاڑی؟"

"اوہ... وہ.... آپ کون ہیں؟" دلاور بوکھلا گیا۔ "دراصل میں ایک اور کال کے انتظار میں بیٹھا تھا۔"

"ہمیں خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم انتظار کر رہے تھے۔" میں نے اصل آواز میں کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ بکواس قرار دینے کے باوجود تم کو ہماری بات پر تھوڑا بہت اعتبار ضرور آگیا ہے۔ تقریباً ستر فیصد۔"

"تم اب پولیس کو فون کرو گے نا؟" دلاور کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "کہ دلاور کے گھر میں فلاں جگہ ایک لاش دفن ہے۔ کر دو۔ میں آج سارا دن گھر سے باہر رہا ہوں۔ رات تک جہاں جہاں میں گیا میری موجودگی کے گواہ ہیں۔"

میں نے قہقہہ مارا۔ "تم اتنے بے وقوف تو نہیں ہو دلاور۔ تم کو بھی معلوم تو ہوگا کہ ان گواہوں کی باری تو بہت دیر میں آئے گی اور کون جانے ان میں سے کتنے گواہ منحرف ہو جائیں۔ قتل کے کیس میں کوئی اپنی گردن نہیں پھنساتا چوہدری صاحب۔ اور ہم پولیس کو فون کریں گے یا نہیں؟ اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟" دلاور نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "کیا شرائط ہیں...؟"

"ہماری شرائط؟ تم پوری کر سکو گے؟ مثلاً میں کہوں کہ مجھ پر جتنے مقدمات ہیں سب ختم کرا دو صبح تک۔" میں نے کہا۔

"تم سے میں ایسی شرط کی توقع نہیں رکھتا۔ صبح تک تو نہیں۔ لیکن..."

اُردو ادب کا نیا رُخ

آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اثر نعمانی کے قلم سے

طنز و مزاح سے لبالب ہلکے پھلکے رومانی ناولوں کے دلچسپ سلسلے کی چار کتب ہیں

گھر کی مرغی

قیمت ۱۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

حکیمی ٹیکسی

قیمت ۱۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

بے وقوف

قیمت ۱۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

آپ کے سر پر

قیمت ۱۲۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۱۰ روپے

کوئی بھی دو کتب ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں کوشش کروں تو۔۔۔!"

"ہر مقدمے کا رُخ بدل سکتا ہے؟" میں نے کہا: "وکیلِ استغاثہ کے دلائل، گواہوں کے بیانات، ہر ثبوت اور شہادت کو بدلا جا سکتا ہے!"

میں نے کہا: "ویری گڈ۔ تم کچھ تعاون پر آمادہ نظر آتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم خود نہیں بدل جاؤ گے؟ تمہاری زبان پر کیسے اعتبار کر لوں؟"

"میں کیسے اعتبار کر لوں کہ تم مجھے بلاوجہ ہراساں نہیں کر رہے ہو؟" وہ جھلا کے بولا۔

"ارے چوہدری صاحب، آپ بھی ہراساں ہو سکتے ہیں؟ کبھی دیکھا نہیں آپ کو پریشان ہوتے۔" میں نے کہا: "ویسے بلاوجہ میں ہراساں کر رہا ہوں یا میری بات واقعی قابلِ توجہ ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو دیا تھا میں نے۔ دوسرا ثبوت خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیں۔ آپ کے گھر کے پیچھے جہاں پانی کی موٹر نصب ہے وہیں ٹارچ لائٹ سے دیکھیں۔ آپ کو الطاف کا مدفن نظر آ جائے گا۔ تازہ کُھدی ہوئی زمین ہموار کر دی جائے پھر بھی پتا تو چلتا ہے۔ اور آپ کی نظر تو ماشاء اللہ۔۔۔ چوہدری صاحب! ہیلو!"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور قہقہہ مارا: "بڑی افراتفری میں دوڑا ہے سالا۔ ابھی دن میں تارے۔۔۔ نہیں۔ اس وقت تو محاورہ یوں ہو گا کہ رات کو سورج نظر آ جائے گا۔" میں نے پھر ایک نمبر ملایا۔

"ہاں بھئی، کیا بات ہے؟" کسی نے خالص تھانیداروں کے لب و لہجے میں کہا۔

"ایس ایچ او سے بات کرنی تھی۔" میں نے کہا: "ایک قتل کا کیس ہے۔"

"تو ضروری ہے ایس ایچ او کو بتانا؟" ڈیوٹی پر موجود افسر نے کہا۔ "او میاں ہم بھی دس سال سے ایس آئی ہیں۔"

"اچھا ایس آئی صاحب، آپ کے علاقے میں قتل کی ایک واردات ہوئی ہے۔" میں نے کہا: "الطاف عرف طافو نام کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے آج دن میں چھرے سے ذبح کر دیا گیا ہے اور اس وقت قاتل اس کی لاش کو زمین میں گاڑ رہے ہیں۔ آپ اگر جلدی کریں تو جائے واردات پر پہنچ کے سب کو گرفتار کر سکتے ہیں اور لاش بھی برآمد کر سکتے ہیں جو وہیں پڑی ہے۔"

"تم کون ہو؟ یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟ نام بتاؤ اپنا۔" سب انسپکٹر ایک دم چوکنا ہو گیا۔

"میں اپنا نام نہیں بتا سکتا جی۔ اسی گھر کا ایک معمولی سا ملازم ہوں، ڈرتا ہوں۔" میں نے کہا: "چوکیدار رکھا تھا مجھے مگر جناب میں لعنت بھیجتا ہوں اس نوکری پر۔ کل کو یہی انجام میرا ہو سکتا ہے۔"

"اوہ یار! اپنی بک بک بند کرو۔ پتا بتاؤ۔ کس نے قتل کیا ہے؟" سب انسپکٹر گرم ہونے لگا۔

"وہ جی۔۔۔ چوہدری دلاور۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "فیکٹری کے مالک ہیں۔"

سب انسپکٹر نے مجھے گالی دی: "فیکٹری کا مالک ہو یا مل کا، ہمارے لیے تو ایک ہی پھانسی کا تختہ ہے۔"

"بس جی آپ جلدی کریں گے تو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے۔" میں نے کہا: "ابھی میں نے ایس پی ضامن رضوی صاحب سے بھی بات کی، انہوں نے کہا تھانے والوں کو بتا دو۔"

"ایس ایس پی۔۔۔ وہ کیا لگتا ہے تمہارا ماما؟" سب انسپکٹر کہنے لگا: "جلدی جلدی کرتا ہے، پتا بتاتا ہے نہیں۔"

میں نے اب پولیس کی بھرپور کارروائی کو یقینی بنا لیا تھا۔ انسپکٹر اب رشوت لے کر بیٹھنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے علم میں یہ بات ایس ایس پی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے ... کا پتا اور لاش کا محلِ وقوع دونوں بتا دیے تھے اور یہ بھی کہ ایس پی صاحب کا خانساماں میرا گرائیں ہے۔ اس لیے میں نے اتنی جرأت کی ورنہ ایک غریب چوکیدار میں تو تھانے فون کرنے کی ہمت ہی نہیں ... اوپر پہنچتے ہی محسن نے مجھے بڑے جوش سے گلے لگایا اور میرے ... بلائیں لے کر انگلیاں چٹخائیں۔

"برخوردار نورِ چشم۔ واللہ دل خوش کر دیا اس وقت تم نے ... تم واقعی چیئرمین بننے کے مستحق تھے۔" اس نے بیڈ پر ایک قلابازی لگائی اور حلق سے مرغ جیسی آواز نکالی۔ رابعہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"یہ تو اچھا بھلا گیا تھا نیچے۔" وہ بولی: "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"جو ہونے والا ہے وہ دوسرا ایٹم بم کا دھماکا ہے بی بی۔ یک نہ شد دو شد۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولا: "ہم بتاتے ہیں کیا ہونے والا ہے۔ ہماری آنکھیں سب دیکھ رہی ہیں۔ چوہدری دلاور نے چوکیدار کو ... لیا ہے۔ وہ کدال بیلچے کی تلاش میں بھاگا پھر رہا ہے۔ اسے گھر کے ... ہی سب مل گیا ہے۔ مالی اپنے باغبانی کے آلات گیراج میں رکھتا ہے ... اب وہ چلا رہا ہے اور چوکیدار کو گالیاں دے رہا ہے اور اسے ... کھودنے کا حکم دے رہا ہے۔ چوکیدار سخت پریشان اور ڈرا ہوا ... یہ کون ہے؟ اوہو۔ یہ تو اندر سے اس کی زوجہ نکل آئی ہے ... کی نہیں، چوہدری دلاور کی۔ وہ شور ہنگامے سے جاگ اٹھی تھی ... اسے اندر دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ آدھ گھنٹے میں وہ لاش برآمد کر لے گا اور کہیں پھینک آئے گا۔ مگر یہ کیا ... یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ روانہ ہو رہی ہے ... میں کون بیٹھا ہے۔ ایک تھانیدار، چار مسلح سپاہی مع ہتھکڑی ... اس وقت تھانیدار اتنی نفری کے ساتھ کہاں جا رہا ہے؟ اوہو ... چوہدری صاحب کے گھر جا رہے ہیں۔ چوہدری صاحب گڑھا کھودتے ہوئے پکڑے جائیں گے۔ کوئی نہیں ملنے گا کہ وہ لاش کھود کر نکال ... تھے۔ لاش تو پچاس فٹ دور کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی ہے اور یہ ... عرف طافو کی لاش ہے۔ وہ اسی کو گاڑنا چاہتے تھے۔ طافو کو واقعی ... گیا ہے اور حضرات و خواتین، کڑی سے کڑی مل گئی ہے۔ چوہدری صاحب تو پہلے ہی رحمت کباڑی کے قتل کے الزام میں ملوث تھے۔ اطافو بھی تو رحمت کباڑی کے ساتھ تھا۔ مقابلہ بہت سخت ہے اور لیجیے حضرات سکندر بخت کی ٹیم نے یہ دوسرا گول کر دیا ہے۔ بہت ہی خوبصورت موومنٹ بنائی تھی۔ سکندر نے محسن کو پاس دیا، محسن نے ٹیڈی کو، ٹیڈی سے طافو پھر سکندر کے پاس آیا۔ اور گول۔" وہ چلایا۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ اس پر اچانک انکشاف ہوا تھا کہ میں نے چوہدری دلاور کو دوسری بار کتنی صفائی سے شکار کیا ہے۔ اسے پھڑپھڑانے کی مہلت بھی نہیں ملی ہو گی۔

میں نے جوا کھیلا تھا اور فرض کر لیا تھا کہ پولیس اتنی ہی دیر میں جا پہنچے گی جتنی دیر میں دلاور گڑھا کھودنا شروع کرے گا یا اسے کھودنے کے بعد پریشان کھڑا ہو گا کہ آخر میرے اس مذاق کا مطلب کیا تھا۔ مجھے سو فیصد نہیں، نوّے فیصد امکانات پانسہ اپنے حق میں پلٹنے کے نظر آتے تھے لیکن میری چال کامیاب رہی یا نہیں، اس کا پتا صبح ہونے سے پہلے نہیں چل سکتا تھا۔

محسن اب تفصیل سے رابعہ کو بتا رہا تھا کہ چوہدری دلاور پر دوسرے قتل کا یقینی الزام آنے کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جانا بھی یقینی ہے۔ "بہت ہوشیار بنتا تھا اُلّو کا پٹھا۔ اب سمجھو لو کہ گیا پھانسی کے تختے پر۔ کس کس بات کو جھٹلائے گا۔ پہلے والا کیس بھی بہت خراب ہو گیا تھا کیونکہ پہلے اس نے انکار کیا اور انسپکٹر سے لڑ پڑا تھا۔ پاگل ہو جائے گا آج تو وہ۔ مگر ہتھکڑی اور جیل سے اس کا باپ بھی نہیں بچا سکتا اسے۔" وہ بہت جوش میں تھا اور پٹاخے کی طرح اُچھل رہا تھا۔ رابعہ کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور میں خود اعصابی ہیجان میں مبتلا تھا۔

"ایسے بچوں کی طرح شور مچانے سے کچھ نہیں ہو گا ننھے۔ میرا مطلب ہے نواب ننھے خان۔" میں نے کہا: "وہ لوگ بروقت وہاں پہنچ گئے تو ضابطے کی کارروائی میں کچھ وقت لگے گا۔ دلاور انھیں دے دلا کر معاملہ دبانے کی پوری کوشش کرے گا مگر اب وہ سب انسپکٹر ماننے والا نہیں ہے۔ اسے اپنی نوکری خطرے میں نظر آئے گی۔ ملزم سمیت وہ لوگ آٹھ بجے تک تھانے واپس آئیں گے اور ابھی بجے ہیں صبح کے ساڑھے چار۔ ڈھائی گھنٹے کے لیے میں سوتا ہوں۔"

"جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" محسن نے کہا: "ایم آر ایس کا چیئرمین کھوتا ہے۔"

میں جوتوں سمیت رابعہ کے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بستر میں سے اس کے وجود کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی حواس پر چھا جانے والی اور ہوش سے مدہوش کر دینے والی خوشبو جو اس کے قرب میں بھی محسوس ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے اعصاب کی کشیدگی کم ہونے لگی اور میرا ذہن پُرسکون ہوتا گیا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ مجھے تھپک رہے ہیں۔ تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر۔ رات کے آخری پہر میں اُترنے والی شبنم کی پھوار میں بڑی لطیف ٹھنڈک تھی۔ نسیمِ سحر کے جھونکے خوابیدہ کلیوں کو جگا رہے تھے اور سورج کی پہلی کرن کی نوید دے رہے تھے۔ اور کلی چٹکنے لگی تھی، مسکرانے لگی تھی، خوشبو اور رنگ کا جادو جگانے لگی تھی۔ گہرا نیلا آسمان حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا اور افق کی لکیر تک سرسوں کے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ رابعہ نیلے رنگ کی ساری میں پہلی بار مجھ سے ملی تھی تو اُس کے آنچل پر پیلے پھول جگمگا رہے تھے۔ "وہ پیلے پھولوں والی زرد ساری کہاں گئی؟"

محسن نے قہقہہ مارا: "بھیا چیئرمین۔ آج لے دیں گے تم کو زرد پھولوں والی ساری۔ شوق سے باندھ لینا۔ ابھی تو ہے نہیں۔"

پانی کے چھینٹے میرے منہ پر پڑے تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ محسن کو ہنستا دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آئی۔ پھر بھی میں یہ نہ سمجھا کہ بات کیا ہے۔ رابعہ کی طرف دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ محسن کی ہنسی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟ سینگ نکل آئے ہیں میرے سر پر سوتے میں؟" میں نے آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی۔

"ایسے کیا نظر آئے گا۔" محسن بولا: "شاعر کہتا ہے جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سوتے میں آپ خاتون ایڈووکیٹ سے سوال کر رہے تھے کہ وہ پیلے پھولوں والی نیلی ساری کہاں ہے؟ میں نے ان سے کہا بھی کہ ہے آپ کے پاس ہے تو دے دیں اسے مگر انہوں نے ڈانٹا۔ بلاوجہ۔ کہ میرے پاس تو ہے نہیں۔"

"اچھا؟" میں نے کہا: "نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟"

"اٹھتے ہی شروع ہو گئی لائن میں گڑبڑ۔ چلو تم اٹھ کے نہا لو تو ناشتا کریں۔"

"ارے ایسے نہیں رابعہ۔ یوں کہو۔ اجی اب اٹھ جائیں نا۔۔۔" محسن نے نقل اتاری: "اللہ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔۔۔ ارے۔۔۔ غضب خدا کا۔ مارتی کیوں ہو۔ اچھا بی بی مت کہو ایسے۔ ہماری طرف سے لٹھ مار کے اٹھاؤ۔"

میں تولیہ اُٹھا کے باتھ روم میں گھس گیا اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اس گھر کی زندگی کی ایک تصویر یا ایک جھلک جو ہنوز ایک خواب تمنا کی طرح ہمارے خیالوں میں آباد تھا اور اس کے خدوخال وقت کی سخت ترین آزمائش میں بھی روشن رہے تھے۔ ایک نہ ایک دن میرے خیالوں سے نکل کر وہ گھر زمین پر زندہ حقیقت کا رُوپ ضرور دھارے گا۔ بشرطیکہ زندگی نے مہلت دی۔ ایسا ہی ایک شہرِ آرزو اپنی آنکھوں میں بسائے یہاں سے میلوں کے فاصلے پر شہلا بھی آنے والے دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس تصویر میں اسی کی کمی محسوس ہوئی۔ جیسے چار رنگوں میں چھپنے والی تصویر مکمل تو ہو مگر ایک رنگ سے محروم رہ گئی ہو۔ وہ ہوتی تو میں بھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اسے چھیڑتا۔ یہ محسن کی ہمت تھی کہ وہ اکیلا ہی ہنس رہا تھا اور ہمیں بھی ہنسا رہا تھا۔ ورنہ باقی دنیا تو خون کے آنسو رُلانے پر آمادہ تھی۔

باتھ روم سے نکل کر میں نے محسن کا ہی سوٹ پہنا جسے رابعہ نے بڑی صفائی سے پریس کر دیا تھا۔ وہ رضوی صاحب کے گھر سے کوچ کرتے وقت اپنی سفری استری بھی رکھ لائی تھی جو بہت چھوٹی سی اور ہلکی پھلکی تھی مگر کام وہی کرتی تھی جو بڑی استری۔ جب اُس نے مجھے پیش کرتی ہوئی ٹائی دی تو ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظر ملی اور میرا دل مچلنے لگا کہ یہ سب کچھ چھوڑ دوں اور وہی کروں جو رابعہ نے بہت پہلے کہا تھا۔ اس زمین کے کسی دُور افتادہ اور گمنام گوشے میں وہ گھر بسا لوں جس میں رابعہ ہر روز مجھے اسی طرح بیدار کرے جیسے محسن نے کہا تھا اور وہ اسی طرح…

"بھائی یہ جوتے بھی میں نے پالش نہیں کیے ہیں۔ وضاحت ضروری ہے۔" محسن نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر کہا اور ہنسا۔

"تو اگر اسی طرح ہمارے ساتھ رہا تو حالت دن بدن ابتر ہو گی۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو بلوا لیتے ہیں۔"

"نہ جانے آج مجھے بھی وہ کیوں یاد آ رہی ہے۔" محسن نے آہ بھر کے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی اماں کی یاد آتی ہے تو میں اپنے آپ سے نظر نہیں ملا سکتا۔ مجھ سے زیادہ بدقسمت بیٹا کوئی ہو گا جس نے ماں کے قدموں کے نیچے آباد جنّت پل کے گنوا دی۔ اس وقت میں ان کی خدمت کر لیتا تو یہ تمام عمر کی خدمت سے بڑھ کر ہوتا۔"

وہ بے حد سنجیدہ اور جذباتی ہو گیا تھا۔ رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم آج ہی چلے جاؤ۔ اپنے ساتھ ہمیں احساسِ جرم میں مبتلا مت کرو۔ ان کی نظر میں تو گناہ گار ہم ہوں گے کہ ان کے بیٹے کو ان سے دور کر دیا ہے۔"

"نہیں۔ تم میری ماں کو نہیں جانتیں رابعہ۔" وہ اُداس ہو کے بولا۔ "انہوں نے تمام زندگی ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنا سکھایا۔ عام لوگوں کی نظر میں وہ ایک سخت گیر ماں تھیں اور ایک ایسی بیوی جو شوہر پر حاوی رہی لیکن یہ حقیقت ہے رابعہ کہ ان کے بغیر ہم لوگ اس ریوڑ کی طرح ہوتے جس کا گڈریا اتنا کمزور اور بے بس ہو کہ ان کی حفاظت نہ کر سکتا ہو، انہیں جنگلی درندوں سے اور جنگل کے راستوں سے بچا کے سلامتی کے ساتھ گھر نہ لا سکتا ہو۔ میرے والد سرکاری فائلوں پر یقیناً بہت اچھے نوٹ لکھتے ہوں گے اور صحیح فیصلے صادر کرتے ہوں گے مگر ان کے پاس گھر اور ازدواجی زندگی کی ذمّے داریاں نبھانے کے لیے وقت ہی نہ تھا اور وقت اس لیے نہیں تھا کہ ان میں اس کی صلاحیت نہ تھی۔ مجھے تعلیم کے لیے پردیس بھجوانے کا فیصلہ بھی میری ماں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ مائیں بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ اولاد سے جدائی ان پر بھی شاق گزری ہو گی مگر انہوں نے میری بہتری کی خاطر خود پر جبر کیا۔ اور یہ بات میں آج بتا رہا ہوں۔ جب میں نے ان کے متعلق ڈاکٹروں کا حتمی فیصلہ سُن لیا اور خود ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اب چند دن کی مہمان ہیں تو میں نے ان کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہوں نے کہا۔ 'محسن، تو یہاں رو کے میری کیا مدد کرے گا بے وقوف۔ مقدّر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے! زندگی کا تو ایک ایک لمحہ دستِ قدرت میں ہے اور کوئی چاہے نہ چاہے اس سے آگے ایک سانس کی مہلت نہیں ملتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اس وقت کے آنے سے پہلے کچھ معلوم نہیں ہوتا اور موت اچانک آ لیتی ہے۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ مجھے پہلے پتا چل گیا اور میں نے وہ سب کام کر لیے جو ضروری تھے ورنہ مجھے حسرت ہی رہتی کہ ذمّے داریوں کا بار نہ اتار سکی۔ اب فوزیہ اپنے گھر کی ہو گئی اور وہ خوش ہے۔ تیری فکر تھی تو خدا نے میری سُن لی اور گھر بیٹھے سب انتظام کر دیا۔ خدا کو رحم آ گیا مجھ پر کہ یہ بیمار کہاں چراغ لے کر ماری ماری پھرے گی۔ ہر ماں کو بہو لانے کا ارمان ہوتا ہے اور اس کی نظر خوب سے خوب تر کی تلاش میں اسے در در لیے پھرتی ہے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں تھا۔ شہلا نے میرے کلیجے کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اب مجھے تیری بھی کوئی فکر نہیں ہے کہ بعد میں تیری ……… زندگی کیسی گزرے گی۔ خدا تم دونوں کو لمبی زندگی دے۔ تم کو وہ ساری خوشی خود مل جائے گی جس کی سب تمنا کرتے ہیں مگر پاتے خوش نصیب ہی ہیں۔' اس کے بعد بھی میں ٹھہرنے پر مصر تھا مگر انہوں نے کہا کہ ایسے وقت میں سکندر کو مت چھوڑ۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا اور خود بھی بے حد افسردہ ہو گیا تھا۔ "یہی کہا تھا انہوں نے؟ وہ خفا نہیں مجھ سے؟"

"نہیں یار۔ یہی تو وہ فرق ہے جو میری آنکھ دیکھتی ہے۔" وہ بولا۔ "ان کی ناراضی وقتی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بچے کو اس کی غلطی پر جھڑک دے یا ایک تھپڑ مار دے اور پھر بھول جائے۔ تیرے لیے ان کے دل میں جذبات کی گہرائی اس سے کہیں زیادہ رہی ہے جتنی مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ایک بیٹا میں تھا تو دوسرا تو۔ شاید ان کی جذباتی وابستگی کا ایک سبب یہ تھا کہ تقدیر نے تیرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں کو چھین لیا تھا اور تو نے بچپن میں انہی کے دل میں ممتا کا درد پیدا کیا تھا۔ سالہا سال تک میں اور تو ایک گھر کی چھت کے نیچے رہے۔ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سوتے اور کھاتے رہے اور اسکول جاتے رہے۔ خیر جب میں نے بہت ضد کی تو انہوں نے کہا محسن، یہ حکم ہے میرا، ان کا یہی طریقہ تھا جب وہ کسی مسئلے پر قائل نہیں کر پاتی تھیں تو اس طرح بات ختم کرتی تھیں اور ہم اس کے بعد اختلاف کی جرأت نہیں کرتے تھے لیکن اس دن پہلی بار میں نے ان کے حکم کو بھی نہیں مانا تو انہوں نے خفا ہو کے مجھے قسم دی اور کہا کہ تو نے سکندر کو اکیلا چھوڑا اور اسے … ہو گیا تو میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔ اس کے بعد میں مجبور … گیا۔"

خاموشی کا ایک بوجھل اور سوگوار وقفہ آیا جس میں … مجھے دور اسلام آباد کے ایک گھر میں لے گیا جہاں دو بیٹوں کی ایک ماں خاموشی سے فرشتۂ اجل کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور دست بدعا تھی کہ "اے معبود! ان دونوں کی حفاظت کرنا۔ مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں کیونکہ میں نے جو چاہا وہ تیری رضا اور تیری عنایت سے پایا۔ ایسی ہی آسودہ … زندگی ان کو بھی دے جس میں کوئی پچھتاوا نہ ہو اور ہر خوشی بن مانگے ملے۔"

"تجھے ایک اور بات بتاؤں۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "فوزیہ کے معاملے میں انہیں مایوسی ضرور ہوئی تھی… اور تو یہی سمجھتا ہے نا کہ ان کی خفگی کا سبب اور کچھ نہیں۔ بے شک وہ خفا تھیں تجھ سے لیکن اب نہیں رہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ اگر تم دونوں کی شادی ہو جاتی تو شاید فوزیہ خوش نہ رہتی۔ تم دونوں ایک دوسرے کو خوش نہ رکھ پاتے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے سکندر۔ کوئی ماں کہہ سکتی ہے کہ اس کی بیٹی میں یہ…… خامی ہے۔ خامی ہی ہوئی نا کہ وہ جس کے ساتھ جائے اُسے خوش نہ رکھ سکے۔ تو میری نظر سے دیکھے تب بھی فوزیہ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اور عورتیں تو عام طور پر مردوں کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں مگر انھوں نے حقیقت کو تسلیم کیا اور رابعہ سے ملنے کے بعد انھوں نے صاف کہا کہ یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ اور خدا جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے مگر ہم اس کی مصلحت کو نہیں سمجھتے۔ جو بات انھوں نے میرے اور شہلا کے بارے میں کہی تھی وہی تم دونوں کے متعلق کہی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایسے وقت میں ان سے کوئی غلط بات منسوب کر سکتا ہوں میں؟"

نہ جانے یہ ذکر کیسے شروع ہوا تھا اور بات کہاں سے کہاں آ گئی تھی۔ میں جوتے کپڑے پہنے بالکل تیار کرسی پر بیٹھا تھا۔ محسن اور رابعہ مجھ سے پہلے تیار ہو گئے تھے۔ ہم ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال جانے والے تھے اور اس کے بعد ہمارا خیال تھا کہ چوہدری دلاور کی خیریت دریافت کریں۔ محسن نے تو تجویز کیا تھا کہ ہم مٹھائی کا ایک ڈبا حوالات میں پہنچا دیں جس کے اندر ایک کارڈ پر "ایم آر ایس" کے حروف لکھے ہوئے ہوں اور دلاور کو اس کا مطلب سمجھنے دیں۔ مگر اب ہماری بھوک اُڑ گئی تھی اور ہمیں چوہدری دلاور کا خیال ہی نہ تھا۔

"میں پھر کہتی ہوں محسن کہ تم آج گھر چلے جاؤ۔" رابعہ نے سکوت کے اس وقفے کو ختم کیا۔

"ہاں۔ انھوں نے تمہیں میرے ساتھ رہنے کی تاکید کی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ تو نہیں کہا تھا کہ کبھی خیریت بھی معلوم نہ کرنا۔"

"اگر تم ایک گھنٹے میں روانہ ہو جاؤ تو شام چار بجے تک گھر پہنچ سکتے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس وقت نو بجے ہیں۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کل تک لوٹ آؤں گا لیکن تم دونوں ایک وعدہ کرو۔ مجھے واپسی پر اسی جگہ ملو گے۔ میری عدم موجودگی میں کچھ نہیں ہو گا۔"

"چلو اب ناشتا کریں۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد پہلے تو چوہدری دلاور کے متعلق پوچھنا ہے۔ تجھے ایک کام کرنا ہے۔ یہ گاڑی اسی ڈیلر کے پاس لے جا جس سے خریدی تھی۔ کہنا ضرورت پوری ہو گئی اور کچھ پیسے کی ضرورت ہے۔"

"پیسے کی ضرورت ہے تو نکلوا لیتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ تو نکلوا ہی لیں گے۔ نقد پاس رہنا چاہیے ورنہ یہ نہ ہو کہ بنک بھی نہ جا سکیں۔" میں نے کہا۔ "میرا مقصد گاڑی بدلنا ہے۔ وہی ڈیلر محسن کو شناخت کرے گا تو ہزار دو ہزار کم پر گاڑی رکھ لے گا۔ اتنا تو ٹیکسی کا کرایہ بن جاتا اگر یہ گاڑی ہمارے پاس نہ ہوتی۔ ہزار دو ہزار ڈال کے کسی دوسرے ڈیلر سے بالکل مختلف گاڑی خرید لینا بہتر ہے جو کسی کی نظر میں نہ آئی ہو۔ اور اس کی رجسٹریشن پرنسس صوفیہ کے نام سے ہو گی تو میری طرف کس کا ذہن جائے گا؟"

ڈائننگ ہال میں بیٹھ کے میں نے ناشتے کا آرڈر دیا اور فون کرنے چلا گیا۔ بوتھ میں ایک صاحب پہلے سے موجود تھے۔ جب میں نے انہیں مسلسل غضبناک نظروں سے گھورنا شروع کیا تو انہوں نے دس منٹ بعد ریسیور رکھا اور مجھے انہی نظروں سے گھورتے ہوئے نکل گئے۔ میں نے پھر ڈائریکٹری سے پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کیا اور اس مرتبہ خود ایس ایچ او صاحب سے بات ہوئی۔ رات کی ڈیوٹی والا سارا عملہ بدل گیا تھا اور مجھے اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی میری آواز شناخت کر لے گا۔

"کس کے بارے میں معلوم کرنا تھا؟" ایس ایچ او نے بدتمیزی کی حد تک بے حس لہجے میں کہا۔

"وہ ہمارے ایک دوست ہیں، چوہدری دلاور صاحب۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدلا۔ "شاہدرے میں فیکٹری ہے ان کی۔ مجھے ان کے گھر سے فون ملا تھا کہ پولیس انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی ہے۔"

"کس تھانے میں فون کیا ہے سرکارِ عالی شان۔ رہتے کہاں ہیں یہ تمہارے چوہدری بہادر؟"

"بہادر نہیں، دلاور۔" میں نے کہا اور اس کے گھر کا پتا بتایا۔

"اچھا۔ تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ ہم نے اسے قتل کے کیس میں پکڑ لیا ہے؟ بہت چالاک بنتے ہو۔" وہ کتّے کی طرح غرّایا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ "چالاکی کیسی۔ جو بات مجھے معلوم ہوئی تھی وہ تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"بکواس نہیں کرو اُلّو کے پٹھے۔ ذرا نام پتا بتاؤ نا اپنا ہمت ہے تو۔ یا مجھ سے یہاں آ کے پوچھو تو میں بتاؤں تمہیں۔ قتل کیا دن میں سو ہوتے ہیں میرے علاقے میں؟ کہ مجھے یاد نہ رہیں۔ آخری واردات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک ہفتے پہلے ہوئی تھی اور وہ ایک ریڑھی والا تھا جس نے دوسرے ریڑھی والے کو چھرا مار دیا تھا۔ سمجھ آئی؟ خبردار جو پھر مذاق میں میرا وقت برباد کیا۔" اس نے جملے کا اختتام ایک اور بڑی گالی پر کیا اور ریسیور رکھ دیا۔ میں احمقوں کی طرح چند سیکنڈ تک ریسیور تھامے کھڑا رہا۔ پھر اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میں نے ایک جوا کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ کھیلا تھا اور ہار گیا تھا۔ بازی چوہدری دلاور نے جیت لی تھی۔ غلطی میرے اندازے کی ہوسکتی ہے یہ بات میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کہیں نہ کہیں گھپلا ضرور ہوا تھا اور دلاور نے میری چال کو ناکام بنا دیا تھا۔ گھپلے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ دلاور نے گرفتاری کے لیے آنے والوں کو خرید لیا ہو۔ یہ اتنا بڑا سودا تھا کہ وہ پانچ لاکھ کیا دس لاکھ بھی خرچ کرسکتا تھا۔ بصورتِ دیگر اسے جیل جانا پڑتا۔ اس کی ضمانت نہ ہوپاتی اور ایک کیس سے چھٹکارا پانے کی خاطر ہی اسے سو جتن کرنے پڑیں گے۔ دوسرے کیس کے بعد تو اس کے لیے نجات کے سارے راستے بند ہوجاتے بعد میں وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی آزادی، عزت اور زندگی سب کی قیمت لگا دی۔ اس نے سب کچھ مانگنے والوں پر چھوڑ دیا ہوگا۔ اور انہوں نے بڑا تیر مارا ہوگا تو ہر کانسٹیبل کے لیے ایک لاکھ اور سب انسپکٹر کے لیے پانچ لاکھ طلب کرلیے ہوں گے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ ریٹائرمنٹ تک اپنی ساری تنخواہ جمع کرتے رہتے تب بھی ٹوٹل کم ہی رہتا۔ رشوت کے کیس میں بھی یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ معاملہ ایس ایس پی کے علم میں ہے تو انہوں نے طے کرلیا ہوگا کہ صاف انکار کردیں گے۔ ایس ایس پی صاحب کون سے چشم دید گواہ تھے۔ ان سے کہا جاسکتا تھا کہ کسی نے بیہودہ مذاق کیا تھا۔ ورنہ دلاور نے ان کو تسلی دی ہوگی کہ ایس ایس پی صاحب سے ابھی معلوم کرلیتے ہیں۔ کسی نے ان کا نام لے کر جھوٹ بولا تھا۔ اگر ان کے خانساماں نے بتایا کہ اس کا کوئی بھائی میرے پاس چوکیدار ہے تو جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔ اور جب اس نے فون کیا ہوگا تو سب انسپکٹر کے لیے رازداری کی قیمت وصول کرکے رخصت ہوجانا مشکل نہیں رہا ہوگا۔ رضوی صاحب کے گھر میں سرے سے خانساماں ہی نہیں تھا تو اس کا بھائی کہاں سے آتا۔

"کیا ہوا؟" محسن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بارہ کیوں بج گئے ہیں صورت پر؟"

"بازی اُلٹ گئی۔ سارا کھیل چوپٹ ہوگیا۔" میں نے خفت سے کہا کیونکہ اپنی طرف سے میں نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ دلاور میرے بچھائے ہوئے جال میں اس طرح پھنس جائے گا جیسے چوہے دان میں چوہا پھنستا ہے۔

"وہ کیسے؟" محسن نے کہا اور میں نے اسے اپنی قیاس آرائی کے بارے میں بتا دیا۔ خود اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ لاہرکی قوت خرید نے معاملے کو دبا دیا۔ ہماری بھوک مرگئی تھی لیکن ہم نے جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناشتا زہر مار کیا۔ رابعہ نے ہمارا مذاق اُڑانا شروع کیا۔

"اوہو ہو۔ یہ تو دوسرا منظر ہے۔ تھانے سے ایک جیپ چوہدری صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہورہی ہے۔" رابعہ نے محسن کی نقل اتاری۔ "کیا کشف و کرامات ہیں۔ بند آنکھوں سے غیب کا سارا حال بیان کردیا تھا۔ بہت ہی خوبصورت موومنٹ بنائی ہے۔ سکندر نے محسن کو پاس دیا۔ محسن نے ٹیڈی کو۔ ٹیڈی نے پھر سکندر ... اور حضرات گول۔"

"تم بدلہ لے رہی ہو۔" محسن نے دانت نکال کے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیونکہ میں نے بھی تمہاری نقل اتاری تھی۔"

"اور محسن صاحب، گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔" میں نے کہا۔ "خاتون کیا گریں گی جو ہائی ہیل پہ چلیں۔"

پھر ہم نے سنجیدگی سے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس پر ہر پہلو سے بحث کی۔ ایک بہت بڑی کامیابی کا خواب جھوٹا ثابت ہوا تھا جس نے ہمیں وقتی طور پر تھوڑا سا صدمہ پہنچایا تھا۔ دلاور اس بار ہمارے جال سے بچ نکلا تھا چنانچہ اس بات کا یقینی امکان تھا کہ آئندہ وہ حفاظتی اور احتیاطی انتظامات زیادہ سخت کردے گا۔

"معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ سب انسپکٹر کون تھا جس نے رات کو مجھے بات کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تو نے اس سے نام نہیں پوچھا تھا؟" محسن بولا۔ اس کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔

"نہیں یار۔ لیکن نام کا پتا چلانا کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔"

"ہماری ناکامی کے ذمے دار وہی ہیں۔ ساتھوں نے طافو کی لاش کا سودا کیا ہے۔"

"یہ سودا انھیں مہنگا پڑے گا۔ وہ تو بغلیں بجا رہے ہوں گے کہ راتوں رات ایک احمق نے لکھ پتی بنا دیا۔" میں نے کہا۔ آہستہ آہستہ میرے لیے ناکامی کا احساس جھنجلاہٹ اور کوفت کا سبب بننے لگا تھا اور محسن کی طرح مجھے بھی غصہ آرہا تھا۔

"اب تم ان کو سزا دو گے؟" رابعہ نے ہمارے جذبات کا رُخ دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔ مجرم وہ ہیں جنھوں نے اپنے فرائض کی قیمت وصول کی۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایک ایک پیسے کا حساب دینا پڑے گا۔"

نکلتے نکلتے مجھے نازو کا خیال آگیا اور اس بار میں نے رابعہ سے کہا کہ وہ البرٹ ڈکٹر اسپتال فون کرے۔

"وہ ون آبزرویشن پر نہ ہوتی۔" محسن نے مجھے یاد دلایا۔ "انکل رحومی نفسیات بھی ہیں ــــــــ انھیں یقین ہوگا کہ ہم سب نازو سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔"

"ہم دونوں تو اسپتال میں اس کی حالت بھی دیکھ چکے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اور اس کے بعد ہم نہایت پُراسرار انداز میں باقاعدہ فرار ہوگئے تھے۔"

محسن بولا۔ "باہر نکل کے بات کریں گے۔"

رابعہ نے ایک ٹیلر کی دکان سے فون کیا جہاں سے وہ کسی زمانے میں اپنے کپڑے سلواتی تھی۔ محسن کار لے جا چکا تھا چنانچہ میں اور رابعہ ٹیکسی میں روانہ ہوئے تھے جسے ہم نے تین سو روپے میں رات آٹھ بجے تک کے لیے کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔ دس منٹ تک میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا پھر رابعہ دکان سے برآمد ہوئی۔ موٹر سائیکل پر گزرنے والے سیاہ کوٹ میں ملبوس ایک وکیل نے فوراً بریک لگائی اور رابعہ کا راستہ روک لیا۔ مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہوئی۔ رابعہ کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی تھا جس کا مجھے ابھی تک خیال نہیں آیا تھا۔ اسے ... دل وکیل صورت سے پہچانتے تھے اور اس کے بارے میں افواہوں، قیاس آرائیوں اور مخبروں کی بنیاد پر تجسس کا شکار ہوں گے اور پسِ پشت جتنے منہ ہوں گے، اتنی ہی باتیں ہوں گی۔ اتنی بڑی وکیل پریکٹس کو خیرباد کہہ دے۔ اس کے متعلق اخبارات میں سنسنی خیز واقعات آنے لگیں اور میرے نام کے ساتھ اس کا نام یوں منسوب ہوجائے کہ تعلق وکیل اور مؤکل کی حد سے زیادہ محسوس ہونے لگے تو رابعہ کی ذات کا وکلا کی برادری میں موضوعِ سخن بن جانا کوئی غیرمعمولی بات نہیں تھی۔

وکیل نے بالآخر رابعہ کی جاں بخشی کی۔ رابعہ تیز تیز قدم اٹھاتی ٹیکسی کی طرف آئی۔

"یہ کون تھا؟" میں نے پوچھا اور ٹیکسی کو چلنے کو کہا۔ رابعہ کا موڈ آف تھا۔

"تھا ایک وکیل۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "ایسے سیکڑوں ہیں جو مجھے جانتے ہیں۔ عورتیں گنی چنی ہیں نا۔"

"آخر بات کیا کر رہا تھا اتنی دیر تک؟" میں نے کہا۔

"فضول باتیں۔ مجھ سے زیادہ اس کو پریشانی لاحق تھی کہ میں نے پریکٹس کیوں چھوڑ دی ہے۔"

"خفا ہو کے خون جلانے سے کیا فائدہ۔ ایسے تو بہت ہوں گے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"لیکن یہ بہت فتنہ آدمی ہے۔ میں جانتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اِدھر کی بات اُدھر لگانے کا ماہر۔ غلط بیانی اور غیبت کا شوقین۔ اوّل درجے کا حاسد اور تنگ نظر۔ پریکٹس وغیرہ تو چلتی نہیں۔ مشہور ہے کہ دھندا چلانے کے لیے گھروں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ میاں بیوی کے اختلافات کو ہوا دیتا ہے اور جھوٹ فریب سے تعلقات کو طلاق اور علیحدگی تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر کمزور فریق کا مقدمہ لے لیتا ہے تاکہ ہار جائے تو اپیل تک روزگار لگا رہے۔"

"پھر تو پورا فن کار ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ جناب قانون پڑھنے کے بعد پریکٹس کرنا کون سے قانون کے تحت ضروری ہے۔" رابعہ بولی۔ "اور اگر کوئی وکیل یا ڈاکٹر وکالت چھوڑ کے پنساری کی دکان لگا لے تو کیا یہ خلافِ قانون ہے اور کوئی جرم ہے۔ ڈھیٹ آدمی ہے۔ کہنے لگا ..."

"کیا کہنے لگا۔ خاموش کیوں ہوگئیں۔ کوئی غلط بات کی تھی تو مجھے بتاؤ۔"

"ہاں تاکہ تم جا کے اس کے دانت توڑ دو یا اس کی گردن۔" رابعہ نے کہا۔ "ایسے قدم قدم پہ آ بیل مجھے مار کے فلسفے پر عمل کرو گے تو دو قدم نہیں چل سکو گے۔ دنیا تو نامعقول لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ جیسا ذلیل آدمی تھا ویسی ہی ذلیل بات کرگیا۔"

"تم بہت غصے میں ہو۔" میں ہنسا۔ "میں کچھ نہیں کروں گا۔ بات چھپانا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔"

"آخر کیا تک ہے اس جرح کی؟" رابعہ بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ بہت بدنام ہو رہی ہو سکندر کی وجہ سے۔ تمہاری اتنی عزت ہے۔ تمہیں مجرموں کے بجائے قانون کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں نے کہا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تم میرے گارجین نہیں ہو۔ اس لیے اپنی نصیحت کی پوٹلی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کہنے لگا کیا یہ سچ ہے کہ تم سکندر سے شادی کرچکی ہو؟ میں نے کہا ہاں یہ بالکل سچ ہے اور جا کے بار روم کے نوٹس بورڈ پر یہ 'اطلاعِ عام' چسپاں کردو تاکہ پھر کوئی اس طرح میرا راستہ روک کر مجھ سے سوال جواب نہ کرے۔ سب کے شکوک دور ہو جائیں گے۔" اس کا چہرہ کچھ غصے کے باعث اور کچھ حیا سے لال ہو رہا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اور اس نے سچ مچ نوٹس بورڈ پر لکھ کے لگا دیا تو ... خیر چھوڑو۔ نازو کی کیا خبر ہے؟"

"نازو کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" رابعہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے بھائی سے بات ہوئی تھی۔"

"اکرام شیخ سے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس نے تو آواز پہچان لی ہوگی تمہاری؟"

"میں نے خود ہی اسے بتا دیا تھا۔" رابعہ بولی۔ "وہ کہنے لگا کہ اسپتال آجاؤ۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"جانا کدھر ہے جناب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے سر گھما کے کہا۔ اب تک وہ اس امید میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیدھا جا رہا تھا کہ شاید کسی جگہ ہم خود ہی اسے دائیں بائیں کہیں مڑنے کو کہیں گے۔ لیکن ہم اپنی باتوں میں اتنے مگن ہوگئے تھے کہ اسے ہدایات دینے کا خیال بھی نہ رہا۔ اب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ مال روڈ کے آخری حصے میں کارپوریشن کے آفس تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے آگے ضلع کچہری تھی جہاں ہزاروں وکیلوں کا اژدہام تھا۔ میں نے ڈرائیور کو واپس چلنے کو کہا اور گارڈینیا ریسٹورنٹ کے سامنے رکوا لیا۔ اندر صبح کے وقت ہال خالی تھا اور صرف ایک میز پر دو لیلیٰ مجنوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ انھوں نے ہم شیریں فرہاد کے جوڑے کو نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

"اکرام شیخ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا؟" میں نے لیلیٰ مجنوں سے دُور بیٹھتے ہی کہا۔ "یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اُس نے استعفیٰ دے دیا ہے۔" رابعہ نے افسوس سے کہا۔ "کیا باضمیر آدمی کے لیے ایمانداری سے نوکری کرنا اتنا مشکل ہے؟"

"وہ انتہا پسند ہے۔ رضوی صاحب کی طرح۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی استعفے سے تمہارا کیا تعلق؟"

"اُس نے لکھا ہے کہ وہ مجرمانہ کوتاہی کا مرتکب ہوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس نے زخمی ہو جانے والی بہن کا خیال کیا اور فرار ہونے والے مجرموں کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان حالات میں وہ خود کو اس ملازمت کا اہل تصور نہیں کرتا۔ اس کا یہ فیصلہ حتمی اور ناقابلِ تنسیخ ہے۔"

"گویا میرا نام لیے بغیر اس نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرار کا موقع تو اُس نے مجھے ہی فراہم کیا تھا۔ نازو نے اسے روکا تھا اور وہ رُک گیا تھا۔ اس نے اپنے ضمیر کی خلش کو میرے لیے باعثِ ندامت بنا دیا ہے۔ بہت عجیب آدمی ہے شیخ بھی۔ حالات سے مصالحت کرنا جانتا ہی نہیں۔ اب نازو ہوش میں آنے کے بعد اس کی مرضی کے مطابق بیان دے گی تو وہ نظر ملا کے اس سے یہ بات کہہ سکے گا کہ دیکھ لو، تمہارے رشتے پر میں اپنی نوکری قربان کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے ادائے فرض سے روکا اور میں نے تمہاری ماں کے ایک جرم کیا تھا اس کا کفارہ بھی میں ہی ادا کر رہا ہوں۔ پھر بھی تم سے اسے کیا مشورہ کرنا تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ یہ قانونی معاملہ بنے گا۔ اقدامِ قتل کا کیس تو تھا ہی۔ گواہ وہ خود ہے یا نازو۔" رابعہ بولی۔ "عدالت کے روبرو صفائی بہرحال پیش کرنی پڑے گی۔ ایک الزام اس نے خود اپنے آپ پر عائد کر لیا ہے چنانچہ اسے وکیل کی ضرورت ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تو وکالت چھوڑ چکی ہوں اور آپ کو کیا وکیلوں کی کمی ہے۔ وہ بات کو طول دینا چاہتا تھا۔"

"یہ پتا چلانے کے لیے کہ تم نے فون کہاں سے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے سوا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے استعفے والی بات بھی محض کہانی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن زیادہ پریشانی مجھے اس لیے لاحق ہو گئی تھی کہ ... وکیل میرا دماغ چاٹ رہا تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے تو ڈر تھا کہ ... نہ آ پہنچے۔ چھ سات منٹ تو شیخ نے لگا ہی دیے تھے اور ... دوسرے فون پر ایکسچینج سے کہا جا سکتا ہے کہ نمبر نوٹ کرو۔ نمبر ... کا ہے جو مجھے جانتا ہے۔ اسی کے سامنے گرفتار ہو جاتی۔"

"وہ بعد میں تو پہنچ جائیں گے۔ اپنی دیسی پولیس ... لیے حرکت میں آتے آتے بھی وقت لگ جاتا ہے، ورنہ میں ... برطانیہ میں دیکھا تھا تین منٹ میں پولیس موجود۔ ان کے پاس ... اور گاڑیاں بہت ہیں اور یہاں عموماً تھانوں میں کچھ نہیں ہوتا ... ٹیکسی وغیرہ کو زبردستی پکڑ کے پہنچتے ہیں یا ٹرانسپورٹ کی فراہمی ... کا مسئلہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کو ... ترین وسائل سے لیس کر دیا جائے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے ... ان کی مستعدی اور کارکردگی کا تعلق ان کے مزاج سے ہے۔ یہاں ... حاکم اور فرعون ہیں۔ وہاں عوام کے خادم اور دوست۔ یہاں ... لوگوں کی حفاظت سے زیادہ لوگوں کو ہراساں کرنے کا ذریعہ ہے ... نے کہا۔ "وہاں کمزور کا محافظ ہے۔"

"یہ تو ہے۔ اب وہ میرے پرانے ٹیلر کو پریشان کرے ... رابعہ بولی۔ "وہ تسلیم کرے گا کہ رابعہ بی بی آئی تھیں اور آتی رہتی ہیں ... کو پوچھ گچھ کے لیے لے جائیں گے کہ بتاؤ ان کے ساتھ کون تھا ... آئی تھیں اور کہاں گئیں ہ پانچ سو ہزار اینٹھ لیں گے۔ میری ایک ... اسے بہت مہنگی پڑے گی۔"

"محسن دو بجے ملے گا۔" میں نے کہا۔ "دوسری گاڑی لے ... آئے گا۔"

"اسے تو گھر بھی جانا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"مگر یہ کام وہی کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تین چار بجے ... جا سکتا ہے وہ۔ رات تک پہنچ جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ ... میں تھانے سے اس سب انسپکٹر کا نام پوچھ لوں گا جس نے کل ... کو گرفتار نہیں کیا تھا۔"

"ابھی تو وہ ڈیوٹی پر نہیں ہو گا۔" رابعہ بولی۔

"تھانے میں کوئی بہت لمبا چوڑا عملہ نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "گنے چنے ... سب انسپکٹر اور انسپکٹر ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی شفٹوں میں بدلتی رہتی ... سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے بارے ... ساری معلومات رکھتے ہیں کہ کس نے کب کون سے کیس میں کتنا کھیلا ... وصول کیا، کسے بخشا اور کسے بلاوجہ پکڑا۔ کس کے پاس کتنا مال ہے ... ہے تو کہاں، کس کے نام پر اور کتنا کرایہ آتا ہے۔ کس کی ٹیکسی یا ویگن ... سے روٹ پر ہے۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں سب ... سب خود حفاظتی کا نظام ہے۔ کوئی ان پر الزام لگائے تو جواب میں وہ ...

... نہ سکیں۔ اس طرح سب ایک دوسرے کا پردہ رکھتے ہیں۔ رات ... جو انسپکٹر ... گیا تھا، اگر اس نے پانچ لاکھ لیے ہوں گے تو دو لاکھ ایس ... صاحب کو بھی نذر کیے ہوں گے کہ ان کی سرپرستی حاصل رہے۔"

"پھر تم اس کا نام کیسے معلوم کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ سب کے نام معلوم کر لیے جائیں۔" میں نے کہا۔ "اور پھر فرداً فرداً ہر ایک کا گھر دیکھا جائے اور براہِ راست ملاقات کی جائے۔ اصل مجرم کتنا بھی چالاک ہو، اپنے ردِ عمل سے پکڑا جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں دلاور سے بات کروں۔"

"وہ بہت چالاک آدمی ہے اور تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔"

"ایک چانس ہے کہ باتوں میں اس کی زبان سے خود ہی نام نکل جائے۔" میں نے کہا۔ "چائے پی لیں۔ نکلتے وقت بات کروں گا اس سے۔"

چوہدری دلاور آفس میں تھا۔ کال اس کے پی اے نے ریسیو کی۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"نام تمہیں نہیں بتا سکتا میں۔" میں نے کہا۔ "پرائیویٹ...."

"چوہدری صاحب کی ایسی کوئی پرائیویٹ بات نہیں ہوتی جو مجھے معلوم نہ ہو۔" وہ بولا۔

"بکواس بند رکھو اپنی ورنہ سیکرٹری آ کے دماغ درست کر دوں گا۔ ... تو ضائع ہو گا لیکن تم خود بھی ضائع ہو جاؤ گے۔ تمہارے چوہدری صاحب کو نہیں بچا پائیں گے۔ بات کی سمجھ آ رہی ہے نا؟" میں نے ... دھمکی کچھ کارگر رہی۔ اس نے مجھے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا اور دلاور سے انٹرکام پر بات کی۔ پھر لائن ملا دی۔

"کون رستم خاں ہے بھئی۔ دماغ تو میرا ابھی خراب ہے۔ یہاں آ کے درست کر دو۔" دلاور نے کہا۔

"اپنے چوہدری صاحب ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے مبارکباد پیش کرنی تھی، آپ نے تو کمال کر دیا۔"

وہ ہنسا۔ "اس میں کون سا کمال ہے سکندر صاحب۔ بچوں والی ... کی تھی تم نے۔"

"یہ تو تمہیں اس وقت پتا چلتا جب پولیس نے مجھ پر یقین کر لیا ... تھا۔" میں نے اچانک لہجہ بدل لیا۔

"یقین تو آ گیا تھا ان کو تمہاری بات پر۔" وہ بولا۔

"یہ تو مجھ سے بھی کہا تھا انھوں نے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ گمنام ٹیلی فون پر وہ کوئی کارروائی نہیں کرتے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ پولیس آئی ہی نہیں تھی؟" وہ تمسخر آمیز انداز ... بولا۔

"سب حرام خور بیٹھے ہیں۔ انھیں بہانہ چاہیے کچھ نہ کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"تم نے تو ایس ایس پی صاحب کے نام کا تیر بھی چلایا تھا۔

پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ نہ آتے۔" دلاور نے کہا۔ "مگر وہ سب انسپکٹر راجہ فخر شیر بھی شیر کا بچہ تھا۔ اس کا باپ شیر خان تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ بات کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کامیابی کے جذبات کو دبا کر مایوس لہجے میں کہا۔ "وہ اندھا تھا کیا؟"

"آنکھوں والے کو بھی کچھ ہوتا تو نظر آتا۔" دلاور کے لہجے سے اس کی کامیابی کے غرور کا اندازہ ہوتا تھا۔ "اس نے دیکھا کہ ہم ایک گڑھا کھود رہے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا کہ بھئی گڑھا کھود رہے ہیں اور کیا۔ کہنے لگا وہ کس لیے؟ میں نے کہا تفریحاً۔ کیا اپنے گھر کی حدود میں گڑھا کھودنا جرم ہے؟ وہ بولا کہ اتنی رات کو؟ میں نے پھر وہی سوال کیا کہ آدھی رات کے بعد کوئی اپنے صحن کے آنگن میں پیڑ پر چڑھ کے بیٹھنا چاہے یا گڑھا کھودے، اس کی مرضی۔ وہ مانا نہیں اور کہنے لگا کہ تم نے کوئی لاش دبائی ہے۔ میں نے اسے کدال بیلچہ پکڑا دیا اور اس کے ماتحتوں نے خاصی گہرائی تک کھودا۔ پھر میں نے منع کر دیا کہ ٹیوب ویل ہے۔ فی الحال دوسرے کنویں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ آنے جانے کا کرایہ دے دیا میں نے۔"

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔ یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے کہا۔

"اس مرتبہ ناکافی انتظامات سے تم کو موقع مل گیا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن آئندہ کی امید مت رکھو۔ تم تو یہ بھی معلوم نہیں کر سکو گے کہ میں

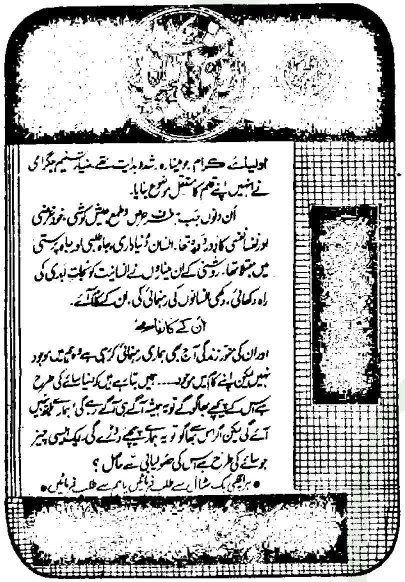

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہاں ہوں۔ میرے دس ٹھکانے ہیں سکندر اور دس ٹھکانے دس قلعے ہیں۔ میں نے بلٹ پروف کار کا بھی آرڈر دے دیا ہے اور میرے ساتھ مسلح باڈی گارڈ رہیں گے۔"

"کیا وہ فرشتۂ اجل کو بھی روک دیں گے؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "امریکی صدر کینیڈی کے حفاظتی انتظامات پر سی آئی اے اور ایف بی آئی جیسے ادارے کتنی رقم خرچ کرتے تھے چوہدری صاحب۔ موازنہ اس ایک گولی کی قیمت سے کریں جس نے سب کو چوپٹ کر دیا۔"

میں ریسیور رکھ کے باہر آیا تو رابعہ ٹیکسی میں بیٹھی ناخن کتر رہی تھی۔ یہ اعصابی کشیدگی کی علامت تھی جس کا شکار ہم سب تھے۔

"مختصر بات نہیں کر سکتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔ "اس کے آفس میں بھی دو فون ہیں۔"

"ہاں، میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ وہ اپنے پی اے سے کہہ سکتا تھا کہ کال ٹریس کرو۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں سے بہت دور شاہدرے میں تھا اور اس کے لیے فیکٹری کے فون کو آبزرویشن پر رکھوانا مشکل تھا۔ میں نے رسک لیا لیکن اس کے نتائج حسب توقع نکلے۔ سب انسپکٹر راجہ فتح شیر ولد شیر خان تھا۔ اب کام کچھ آسان ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکل کے تم اور کسی جگہ سے تھانے فون کرنا۔ کہنا میں فتح شیر کی بہن ہوں۔ میرا خیال ہے وہ راولپنڈی کے گرد و نواح کا رہنے والا ہو گا۔ مری کہوٹہ یا گوجر خان کے علاقے کا۔ تم بتانا کہ میں راولپنڈی سے آئی ہوں۔ اور انہیں اسٹیشن بھیج دیں۔ وہ ڈیوٹی پر نہیں ہے تو اسے اسٹیشن کون بھیجے گا۔ پھر تم گھر کا پتا سمجھ لینا۔ ہم کل پرسوں ملاقات کریں گے جب محسن واپس آئے گا۔"

یہ چال کامیاب رہی۔ تھانے میں کسی نے رابعہ کو راجہ فتح شیر کا پتا یوں سمجھا دیا کہ ہم کسی پریشانی کے بغیر پونے ایک بجے آرائے بازار کی ایک گلی میں جا پہنچے۔ میں نے اس کے مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کیا اور لوٹ آیا۔ ایک بجے ہم واپس ہوئے اور پونے دو بجے ٹیکسی کو ریگل کے چوک پر چھوڑ دیا۔ میں نے محسن کو ایک کورٹینا میں دیکھ لیا تھا۔ "مجھے روٹی کھانی ہے صاحب۔" خاموش طبع اور کام سے کام رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"تم اب جو چاہو کرو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔"

"لیکن.... آپ نے تو پورے دن کا سودا کیا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ اتر گیا۔

"ہم تمہیں معاہدے کے مطابق پوری ادائیگی کر رہے ہیں۔" میں نے اسے سو سو کے تین نوٹ پکڑائے۔ "جاؤ عیش کرو۔"

اس فیاضی پر خوش ہو کے اس نے ہمیں زبردست سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ پھر ہم سڑک پار کر کے محسن کی طرف گئے۔

"یہاں کیوں کھڑا ہے؟" میں نے کہا۔ "ہم نے گارڈن... کرنے کو کہا تھا۔"

"وہاں دال میں کچھ کالا تھا۔" وہ بولا۔ "پولیس آئی تھی۔"

"اچھا؟" میں نے رابعہ کے ساتھ پیچھے بیٹھتے ہوئے ... تو کب سے کھڑا ہے یہاں؟"

"ایک بجے سے۔ پولیس اس وقت جا رہی تھی۔" ... اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ہلکے نیلے رنگ کی یہ کورٹینا ... اور چھیاسٹھ کا ماڈل تھی۔ لیکن صرف ستاون ہزار میل چلی تھی اور ... تھی۔ فرسٹ اونر بھی کوئی بہت معقول آدمی تھا جس نے ... زوجہ کی طرح محبت سے سنبھال کے رکھا تھا چنانچہ مجھے ... وہ بہت مناسب لگی۔

"اب کہاں جانا ہے؟ میرے ... اتنا بڑا ... اس میں متعدد مرغ سیاروں کی طرح گردش کر رہے ہیں۔" ...

"مجھے چار شوروم دیکھنے پڑے اور کوئی چار میل پیدل ... صبح کا ناشتا بھی خاک کیا تھا۔"

"یہ خطرناک علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "گارڈینیا کے ... ٹیلر کی دکان پر بھی پولیس چھاپا مار چکی ہے اور یہ ٹیلر کی دکان ... جہاں تو گاڑی لے کر کھڑا تھا۔"

"کس کی تلاش تھی انہیں؟" محسن بولا۔

"پہلے آنے والوں کو رابعہ کی۔" میں نے کہا۔ "بعد میں وہ ... ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ انہیں بالترتیب اکرام شیخ اور ... ولادر نے ہماری فون کال ٹریس کر کے بھیجا تھا۔"

"گویا اب میری باری ہے۔" محسن ہنسا۔ "لیکن میں ... ریسٹورنٹ کھاؤں گا۔"

"ریسٹورنٹ میں کھانا یا ریسٹورنٹ۔" رابعہ ہنسی۔ "محترم ... زبان لڑکھڑا رہی ہے۔"

"پورا ریسٹورنٹ بی بی۔ جو کچھ کچن میں ملا وہ۔ کرسیاں ... سب کھا جاؤں گا۔" محسن نے اسے گھور کر کہا۔

کھانے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور ہم ... باغ کے بس اسٹاپ تک چھوڑنے گئے۔ "رات کے ساڑھے ... بجے تک گھر پہنچ جائے گا تو۔" میں نے کہا۔

"دس بجے ہمیں فون کر دینا۔" رابعہ بولی۔ "ہم انتظار کریں ... ہوٹل ذاران میں۔"

"میں بھی وہاں گیارہ بجے تک ملوں گا۔" میں نے ... لاہور ہوٹل جا کے سو جاؤں گا۔"

"اچھا کیا تو نے پہلے ہی وضاحت کر دی۔" محسن بولا۔ ... یہ نصیحت کرنے والا تھا۔ تاہم ایک نصیحت اور بھی کرنی ...

واپس آنے تک تمہیں ایک دوسرے کے سوا کسی سے نہیں ملنا ہے اور صرف مندرجہ ذیل کام کرنے ہیں۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرنا۔ ہلکے پھلکے رومانی مکالمے بولنا۔ دوگانے تحت اللفظ سنانا۔ سرد آہیں بھرنا اور خیالی پلاؤ زردہ پکا کے کھا لینا مگر اور کچھ نہیں۔ یہ نہ ہو واپسی پر میں تمہیں گلی کوچوں میں تلاش کرتا پھروں۔ تم نام بدل کے کہیں فرار ہو جاؤ یا چوہدری صاحب کے مہمان بن جاؤ۔"

ویگن کے روانہ ہوتے ہی ہم بھی چل پڑے۔ گاڑی کے شیشے بالکل بے رنگ اور شفاف نہیں تھے۔ ان میں ہلکا سبز رنگ جھلکتا تھا اور شیشے بند کر لینے کے بعد اندر بیٹھے ہوئے آدمی کی پرچھائیں سی نظر آتی تھی۔ صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی کیونکہ سڑک پر کوئی بھی ہمیں صرف سامنے سے دیکھ سکتا تھا۔ سائڈ سے کسی کی نگاہ پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے جہانگیر کے مقبرے کا رُخ کیا۔ صبح کے مقابلے میں اس وقت آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ میں اور رابعہ عقبی حصے کے لان پر ٹہلتے رہے۔ پھر میں گھاس کے ایک تختے پر لیٹ گیا اور بہت اوپر پھیلے ہوئے آسمان کے نیلے رنگ میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھتا رہا۔ رابعہ میرے قریب بیٹھی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ وہ باتیں جو ہم بھول گئے تھے۔ جن کے لیے نہ ہمیں فرصت ملی تھی اور نہ حالات کی اجازت۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آج ایک دن کے لیے میں صرف یہ یاد رکھنا چاہتا ہوں کہ میں سکندر ہوں اور تم رابعہ ہو اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمام حادثات اور مسائل، تلخیٔ آلام اور گرانباریٔ ایام۔ غیروں کی ریشہ دوانیاں اور اپنوں کی نامہربانیاں۔ ان سب پر آج کے دن عقل و نظر کے اور خیالوں کی گزرگاہ کے سارے دروازے بند کر دو۔ فرض کر لو کہ ہمارے سوا تمام دنیا بے وجود ہو گئی ہے۔ ہم آج ہی اس زمین پر اتارے ہوئے آدم و حوا ہیں جن کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں اور اب ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو اپنی دُنیا بسانے کا۔

"تم نے محسوس کیا رابعہ! اس احساس میں کیسی خوشی کی لذت اور سرور کی کیفیت ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسی کئی شاموں کی، بہت سی راتوں کی اور صبحوں کی یاد میرا سرمایہ ہے۔ ایک شام تم اور میں گھر سے نکلے تھے اور شہر کی سڑکوں پر پھرتے رہے تھے۔ ایک رات تمہارے ساتھ میں اس کوٹھی کے مختصر سے لان میں تمہارے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور ہم نے اپنی عمرِ گزشتہ کی کہانی سُنائی تھی۔ اور پھر چاند نکل آیا تھا مگر ہم بیٹھے رہے تھے۔ اور ایک بار آدھی رات کے بعد سے صبح ہونے تک ہم انکل رضوی کے لان میں تنہا تھے۔ کتنی پُرانے وقتوں کی بات لگتی ہے یہ سب جیسے میں سفر کے آغاز میں کسی صحنِ گلشن سے گزرا تھا اور اس کے بعد کوئی صحرا آ گیا۔ بے آب و گیاہ اور پُر عذاب۔ دھوپ کی تمازت میں جلتا ہوا۔ جس میں مصائب کے پُرخار کیکٹس تھے اور آج پھر اچانک میں محبت کی خوشبو سے معمور سایہ دار ٹھنڈے نخلستان میں ہوں۔"

"یہ راستہ بہت طویل ہو گیا ہے سکندر۔" رابعہ نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے کہا۔ "ہم چلے تھے منزل کی تلاش میں تو آنے والا دن اپنی دسترس میں لگتا تھا۔ راہ کتنی آسان تھی۔"

"راستے اور منزلیں ایسے ہی فریب دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہمارے قدم ٹھٹک گئے ہیں۔" اس نے گھاس کا ایک تنکا توڑ کے چبانا شروع کیا۔ "سوچو ہم کیا چاہتے تھے سکندر؟"

"آلو چھولے، آئس کریم، کوک صاحب۔" ایک دس بارہ سالہ لڑکے نے دُور سے ٹرے لہرا کے کہا۔

میں قہقہہ مار کے اٹھ بیٹھا۔ "تم نے سچ کہا استاد۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ جاؤ سب لے آؤ۔" رابعہ بھی ہنسی اور لڑکا کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ہنسا اور آرڈر کی تعمیل کرنے دوڑ گیا۔

"زندگی یہی ہے۔ آلو چھولے، آئس کریم اور کوک۔" میں نے کہا۔ "تلخ ترش اور شیریں۔ گرم اور نرم۔ کوک کی طرح سنسناتی ہوئی اور آئس کریم کی طرح سرد۔ اس لڑکے نے تو سارے سوالات کا جواب دے دیا۔"

شام ڈھلے ہم واپس ہوئے تو بچوں کی طرح خوش تھے اور بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ کئی ماہ کی جذباتی تھکن تھی اور تفکرات کا بار تھا اور ذہنی انتشار کا دباؤ تھا۔ آج کی شام مسیحائے غمِ دوراں بن کے آئی تھی۔ شبِ ابرِ غم میں اچانک رابعہ کے حُسن کا ماہِ کامل طلوع ہو گیا تھا اور محبت کی چاندنی نے دل میں اُتر کے مایوسی کی سب تاریکی مٹا دی تھی اور روح کے ہر گوشے کو روشن کر دیا تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا، آزاد اور بدلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہی جو میں تھا اور اب پھر ہونا چاہتا تھا۔ کل پھر وہی دشت کی مسافت ہو گی، نفرتوں، عداوتوں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور عقوبتوں کے کانٹوں سے پُر راستے ہوں گے اور زندگی کے امتحان بھی ہوں گے لیکن آج کی شام تو اپنی ہے اور اس کے دامن میں جتنے خوشبو کے پھول ہیں اپنے ہیں اور چاہتوں کے جتنے اجالے ہیں اپنے ہیں۔ آؤ کہ کوئی خواب نہیں کل کے واسطے۔

میں نے گاڑی کو ٹاؤنسٹن مارکیٹ کے سامنے روک دیا۔ "اب یہاں کیا کام ہے؟" رابعہ بولی۔

"ایک ساڑی خریدنی ہے۔" میں نے کہا۔ "جس کا رنگ آسمان کی طرح شفاف نیلا ہو اور اس میں زرد پھول ہوں۔"

"یہ کیا خبط ہے؟" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا اور شفق کا سارا رنگ اس کے عارض میں اُتر آیا۔

"جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ تمھیں نہ چاہنا میرے اختیار کی بات نہیں تو تم نے ایسی ہی ساڑی باندھ رکھی تھی اور حالانکہ وہ جیل کا کمرۂ ملاقات تھا لیکن تمھارا وہ روپ ایک لازوال نقش ہے۔ دل چاہتا ہے آج تمھیں پھر اسی انداز میں دیکھوں۔" پھر میں اس کے ساتھ انارکلی بازار کی بہت سی دکانوں پر گیا۔ یہ پروا کیے بغیر کہ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے اور میں نے ہر دکاندار سے ایک ہی سوال کیا۔ بالآخر میری جستجو کامیاب ہوئی۔ ایک دکاندار نے مجھے گہرے نیلے رنگ کی ہوا کی طرح سبک اور پردۂ آبشار کی طرح چمکتی ڈھلکتی ساڑی نکال دی جس کے شوخ پھولوں کی پیلاہٹ میں خوشبو بھی شامل لگتی تھی۔ رابعہ خاموش کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ دوپٹے کے ایک کونے کو انگلی پر لپیٹتی کھولتی رہی۔

"آج کی شام اور اپنی محبت کے نام۔" میں نے باہر آکے پیکٹ اس کی نذر کیا۔ "پھر برق فروزاں ہو سرِ وادیِ سینا اور وقت کا ایک بُجھا ہوا لمحہ جگنو بن کے میری مٹھی میں آجائے تاکہ میں سمجھوں کہ خواب میری دسترس میں ہیں۔"

"ایسی باتیں مت کیا کرو سکندر۔ وقت تو گزر جاتا ہے لیکن اس کی بازگشت آسیب بن کے میرا پیچھا کرتی ہے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے بولی۔ "کل بھی تو زندہ رہنا ہے مجھے۔ تنہائی میں یادیں زیادہ ستاتی ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور چند سیکنڈ کے لیے ماضی، حال اور مستقبل اس ایک نظر میں سمٹ گئے۔ سب کچھ کہے بغیر ہم نے عہدِ وفا کو استوار کیا۔ محبت کے یقین کی اتنی دولت سمیٹ لی کہ مسافتِ عدم تک دل کبھی مفلس نہ ہو اور وہ سب کہہ دیا جو ساری دنیا کے ساری زبانوں کے الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن سمجھا جاسکتا تھا۔

"کیا تمھارا دل نہیں چاہتا رابعہ کہ موت اسی لمحے کو جاوداں کر دے؟ سچ کہو۔"

"نہیں سکندر۔ میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی جب تک ہر خوابِ آرزو کو تعبیرِ منزل مل جائے۔ میں نے کتنے دن اور کتنی راتیں اپنے انہی خوابوں کو سجاتے سنوارتے گزار دی ہیں۔ اب تم چاہتے ہو میں ان سے دستبردار ہو جاؤں۔ یہ سمجھ لوں کہ وہ سب فریب تھا جو میں نے خود کو دیا۔ اور خواب سب جھوٹے ہوتے ہیں؟" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔ "چلو آگے چلو۔ رُکنے سے منزل نہیں ملتی۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ہوٹل فاران پہنچے تو رات اپنا آنچل پھیلا چکی تھی۔

"تم تیار ہو کے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اسی جگہ تمھارا انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ گزرے ہوئے وقت کی ایک خوبصورت یاد کس طرح پھر زندہ حقیقت بن کے سامنے آتی ہے۔"

"اتنا دیوانہ تو مجنوں بھی نہیں ہوگا۔" رابعہ نے خمارِ عشق میں ڈوبی ہوئی شرابی ادا کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ اسے لیلیٰ بھی تو ایسی نہیں ملی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ میں اسے اندر جاتے اور شفاف شیشے کے دروازے میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ دروازے میں رُک کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بھی ایک پیغام دے گئی کہ تھوڑا سا انتظار کرسکتے ہو نا۔ اور میرے دل نے کہا۔ ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔

میں اُٹھ کے تھوڑی دُور تک گیا اور ہوٹل کے آرکیڈ سے باہر ہی ایک چھوٹی سی دکان سے سگریٹ خریدنے لگا۔ رابعہ کا دس پندرہ منٹ سے پہلے واپس آنا مشکل تھا۔ میں دوسرے گیٹ سے ہوٹل کے کاریڈور میں لگے ہوئے فون تک گیا اور البرٹ وکٹر ہوسپٹل کا نمبر ڈائل کیا۔ ریسیور ایک نرس نے اٹھایا چنانچہ مجھے فوزیہ کی خیریت دریافت کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خطرے سے بالکل باہر تھی اور اس کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ باتونی نرس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اسے دو بار خون کی ضرورت پڑی تھی اور یہ خون دونوں بار فوزیہ کے بھائی نے ہی دیا تھا۔ بہن بھائی ایک جیسے تندرست اور خوش تھے۔ ان کا بلڈ گروپ تو ایک ہونا ہی تھا۔ میں اطمینان کے احساس کے ساتھ پھر باہر آیا۔ گاڑی مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اور دو درخت موڑ کے بعد کھڑی تھی۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر چابیوں کا خیال آیا۔ گاڑی کی چابیاں عادت کے مطابق میرے پاس نہیں تھیں۔ میں واپس فون تک گیا لیکن چابیاں وہاں نہیں تھیں۔ شاید میں سگریٹ خریدتے وقت چابیاں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا اور سگریٹ والے کے پاس گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"چابیاں کون اٹھاتا ہے جی۔ آپ نے یہاں رکھی ہوں گی تو یہیں مل جائیں۔" وہ بولا۔

"شاید گاڑی میں ہی لگی رہ گئیں۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میں واپس چلنے ہی والا تھا کہ ایک گاڑی نے زبردست بریک لگائی۔ پھر تصادم کی آواز آئی۔ اور میں نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا تو مجھے ایک اسکوٹر سڑک پر پڑا نظر آیا۔ میرے پہنچنے تک اسکوٹر والا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور شاید غلطی اسی کی تھی کہ اس نے خود کو سنبھال کے سوری کہا اور اسکوٹر اٹھانے لگا۔ کار والے کے علاوہ کچھ لوگوں نے اسے ہمدردی سے ملامت کی اور خدا کا شکر ادا کرنے کو کہا۔ اس کی جیب میں سے کچھ چیزیں نکل کر سڑک پر بکھر گئی تھیں۔ میں نے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں ایک پرس، کچھ سکے اور ایک قلم اٹھا کے اسے دیا۔ پھر مجھے اس کی کلائی کی گھڑی نظر آئی۔ وہ خود اتنا نروس اور بدحواس تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک پہلوان ٹائپ شخص اسے اپنے ساتھ لے گیا کہ ذرا دیر ٹھہر جائے...... اور ایک کپ چائے کا پی لے تاکہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔ اردگرد سے جمع ہونے والے بیشتر افراد بھی اس معمولی سے حادثے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے منتشر ہو گئے تھے لیکن کار وہیں کھڑی تھی اور اس کا انجن چل رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور مجھے احساس ہوا کہ رابعہ میری منتظر ہوگی۔ وہ سوا آٹھ بجے اندر گئی تھی اور اب آٹھ پینتیس ہو رہے تھے۔

ایک شخص میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "تم سکندر بخت ہو؟" اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں۔" میں نے راستہ کاٹ کے نکلتے ہوئے کہا اور حواس بحال رکھے۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" وہ پھر میرے سامنے آگیا۔ وہ جوان تو نہیں تھا لیکن صحت مند تھا اور شاید اسی کار سے اترا تھا جس سے اسکوٹر والا ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جتنی دیر میں حادثے سے متاثر ہونے والے کے لیے امدادی کارروائی میں شریک رہا تھا وہ مجھے دیکھتا رہا اور اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" میں نے ایک دم پیچھے ہو کے دفاعی پوزیشن لیتے ہوئے کہا لیکن اسی وقت کار کے دونوں دروازے کھلے اور میں نے پلٹ کر دو افراد کو باہر آتے دیکھا ہی تھا کہ پہلے شخص نے بڑی پھرتی سے مجھے بیل کی طرح سر سے ٹکر ماری۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا تو کار سے نکلنے والے ایک شخص نے مجھے تھام لیا اور میرا رُخ یوں بدلا کہ میں سیدھا کار کے کھلے دروازے کے اندر گیا۔ کار سے اُترنے والا دوسرا شخص میرے اوپر آیا اور میں نے آدھا اندر اور آدھا باہر ہونے کے باوجود اسے دونوں لاتیں ایک ساتھ ماریں۔ وہ پیچھے گرا۔ میں اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے پیچھے پلٹ کر ریوالور کو میرے حلق سے چند انچ کے فاصلے پر تھام لیا۔ وہ سیٹ پر بہت پیچھے جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ میں وہیں ساکت ہو گیا۔ باہر سے کوئی چلایا۔ "اوئے۔ ایہہ کی ہو گیا اے؟" لیکن انھوں نے بڑی پھرتی دکھائی۔ پیچھے والا دوسرا دروازہ کھول کے ایک نے مجھے اندر گھسیٹا اور دوسرے نے میری ٹانگیں موڑ کے اندر کر دیں۔ اور وہ دروازہ بند کیا جس میں سے مجھے اندر دھکیلا گیا تھا۔ جگہ بہت کم تھی اور وہ دونوں سیٹ پر بیٹھ کے مجھے دبائے ہوئے تھے۔ ورنہ مجھے ایک موقع اس وقت ملا جب ڈرائیور نے ریوالور اپنے ساتھی کو دیا۔ میں نے اٹھنے کی بھرپور کوشش کی اور تقریباً کامیاب بھی ہو گیا تھا مگر میرے سر پر سوار دونوں حملہ آوروں نے بیک وقت مجھ پر مکے برسائے۔ دو مکے میرے سر پر لگے اور دو سینے پر۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایڑیاں اٹھا کر مجھے پیروں سے کچلا اور میں پھر گر گیا۔ اب ریوالور کا رُخ میرے سر کی طرف تھا اور میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی نال کے آگے سائلنسر بھی ہے۔ اس کے ایک وار نے مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ پھر ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بندھا پڑا تھا اور وہ چاروں میرے سامنے موجود تھے۔ مجھے اچانک گرفتار کر کے اغوا کرنے والے شریف لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی عمروں میں فرق تھا لیکن حلیوں میں نہیں۔ سب سے کم عمر شخص پچیس چھبیس سال کا وہ ڈرائیور تھا جس نے سب سے پہلے مجھ پر ریوالور تانا تھا۔ سب سے زیادہ عمر میری راہ میں حائل ہونے والے کی تھی۔ ان کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ انجن آئل، گریس اور مختلف رنگوں کے دھبے دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کسی گیراج کے مالک یا ملازم تھے جو اپنی یا مرمت کے لیے آنے والی کوئی گاڑی لے کر پھر رہے تھے۔ مجھے انھوں نے اچانک اور اتفاقیہ پہچان لیا تھا۔

"یہ کون ہے ہو یہی جو تیرے دوبئی کے ویزا کی رقم لے کر بھاگ گیا تھا؟" ڈرائیور نے کہا۔

"او پاگل دے پُتر۔ ریوالور ایسے ہی نکال لیا تھا تُو نے؟" پہلے شخص نے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ گولی نہیں چلانی ہے۔"

"اور کیا کرتا میں؟" ڈرائیور نے تیز لہجے میں کہا۔ "مار پیٹ ہوتی وہاں تو ٹھیک تھا؟"

"وخت تو پہلے ہی پڑ گیا تھا استاد۔" دوسرے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "اس...... اسکوٹر والے نے بھی آج ہی سامنے آکے مرنا تھا۔"

"ایک مہینہ تیاری کی تھی۔ ایک منٹ میں ختم۔" تیسرا بھی سے بولا۔

"میرا کوئی قصور نہیں تھا اس میں۔" ڈرائیور نے تند لہجے میں کہا۔ "میں بہت احتیاط کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا لیکن وہ کنجر ہوٹل کے دروازے میں سے نکل آیا۔ جیسے سڑک پر کوئی نہیں۔ شکر کرو کہ اس کی جان بچا لی میں نے۔ ورنہ لمبا پھڈا پڑ جاتا۔ خواہ مخواہ پکڑے جاتے۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"تجھے کون الزام دے رہا ہے۔" استاد کہلانے والے نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ "سب ذراسی بات میں گھبرا جاتے ہو۔"

"یہ ذراسی بات ہے؟ لوگوں نے گاڑی دیکھ لی۔" پہلے نے کہا۔

"یار گاڑی کو گولی مارو۔ دوسری بھی مل جائے گی۔" ڈرائیور نے کہا۔ "لوگوں نے تو ہمیں بھی دیکھ لیا۔"

"کسی نے نہیں دیکھا ہمیں۔ اور دیکھا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" استاد نے کہا۔ "اتنی خلقت پھرتی ہے وہاں۔ سب کی صورتیں کون یاد رکھتا ہے۔ ہم کل جائیں گے تو کوئی نہیں پہچانے گا۔ لوگ بھی دوسرے ہوں گے اور راستہ بھی...."

"نہیں استاد۔ ابھی دوبارہ وہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" دوسرے نے کہا۔ "کوئی اور جگہ دیکھو۔"

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔" استاد نے بگڑ کے کہا۔ "اوپار، چھوٹی چھوٹی باتیں تو ہوں گی۔ کتنا سمجھا چکا ہوں تمھیں کہ اس میں خطرہ کم سے کم ہے اور فائدہ بہت زیادہ۔ بنک کی بات مت کرو۔ وہاں مسلح گارڈ ہوتے ہیں اور پھر پیسہ کتنا ملے گا ایسی دو چار لاکھ۔ بہت ہوا تو آٹھ دس لاکھ لیکن بنک ڈکیتی میں ساری پولیس فورس حرکت میں آجاتی ہے۔ ہوٹل میں کام بہت آسان ہے۔ چوکیدار بھی بس دروازے کھولنے کے لیے اور سلام کر کے ٹپ لینے کے لیے ہوتا ہے۔ آرام سے ایک آدمی نیچے سب کو قابو کر لے۔ باقی تین اوپر چلے جائیں۔ باری باری ہر مسافر کے دروازے پر دستک دیں اور جو کچھ اس کے پاس ملے رکھوالیں۔ سب بڑے لوگ ٹھہرتے ہیں وہاں۔ میں نے معلوم کر لیا ہے آج کل کون کون ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک تو کوئی پرنسس صوفیہ ہے۔ تم ہر ایک سے سارا نقد زیور لو اور اسے ناک آؤٹ کر کے باتھ روم میں ڈال دو۔ تین آدمی پانچ منٹ میں ایک کمرے سے فارغ ہوں تو آدھے گھنٹے میں اٹھارہ کمروں سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ساتھ والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ میں نے بیس نام نوٹ کیے ہیں۔ صرف انہی سے اتنا مل جائے گا کہ سب کو کافی ہو گا۔ نقد رقم، بانڈ، زیورات اور بہت کچھ۔ کیشیئر بھی خالی نہیں ہو گا۔ مجھے بیس پچیس لاکھ کی اُمید ہے۔"

"وہاں سے نکلنے کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے استاد۔" دوسرا بولا۔

"خاک ٹیڑھا ہے۔ میں نے بتا دیا ہے کہ کسی ایک مسافر کو یرغمالی بنا کے نکلیں گے۔" استاد نے کہا۔ "ہوٹل والوں کو خبردار کر دیں گے کہ انھوں نے پولیس کو بتایا یا تعاقب کیا تو ہم اسے مار دیں گے۔ فرض کرو ہم پرنسس کو ہی لے آئیں۔ ہوٹل والے دم نہیں ماریں گے۔ ایک تو وہ بدنامی نہیں چاہیں گے جس ہوٹل میں یوں ڈاکا پڑے وہاں کون ٹھہرنا پسند کرے گا۔ وہ تمام مسافروں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑیں گے اور ان کے نقصانات کی تلافی کر دیں گے۔ بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو گا تو ہوٹل والوں کا۔ مگر وہ اس نقصان کو برداشت کر لیں گے اور کاروبار کو تباہ ہونے سے بچائیں گے۔ پرنسس کے علاوہ وہاں ایک نیا جوڑا بھی ٹھہرا ہوا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی صنعت کار کی بیٹی ہے۔ لڑکا کسی زمیندار کا بیٹا ہے۔ دونوں نے چھپ کر شادی کی ہے۔ پرنسس کے ساتھ ہم انھیں بھی لے آئیں تو ہماری پوزیشن اور بہتر ہو جائے گی۔ ہوٹل والے یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ معاملہ تین مسافروں کے قتل تک پہنچے جب ان کو معلوم ہو گا کہ یرغمالی وی آئی پی قسم کے لوگ ہیں تو ان کی سٹی گم ہو جائے گی۔"

"صنعت کار کی بیٹی اور داماد کے بدلے کچھ وصول نہیں ہو سکتا۔" ڈرائیور بولا۔ "ماں باپ سے؟"

"نہیں۔ پھر کیس پولیس کے پاس ضرور چلا جائے گا۔" استاد نے سختی سے کہا۔ "ورنہ وہ معاملے کو دبائیں گے اور ہوٹل والوں کو بھی کچھ نہیں کرنے دیں گے۔ ان کی اپنی بدنامی ہو گی اگر خبر چھپی۔ یہ ہو سکتا ہے وہ مسافروں کا نقصان پورا کرنے میں ہوٹل والوں کے ساتھ مل کر تعاون کریں۔ دو چار لاکھ دے دیں اور یوں اپنے بچوں کے علاوہ اپنی عزت بچائیں۔ ہم چوبیس گھنٹے بعد سب کو رہا کر دیں گے۔ پولیس کے چکر سے سب بچتے ہیں۔ نقصانات کی تلافی ہو جائے گی تو سب خاموشی سے نکل جانا بہتر سمجھیں گے۔ ڈکیتی بنک کی ہو تو اخبار شور مچا دیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو ایسا دبے گا کہ بعد میں کسی مسافر نے ذکر بھی کیا تو ہوٹل والے اسے صاف جھوٹ قرار دیں گے اور اس کی تردید بھی شائع کر دیں گے، ہم بالکل محفوظ۔"

"استاد! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بندہ کیوں اٹھا لایا ہے؟"

"تم سب اندھے ہو گیا؟" استاد ہنسا۔ "اسے پہچانتے نہیں؟ یہ ایک مفرور اشتہاری مجرم ہے۔ اس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے۔ اسے ہم پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ دس ہزار کے علاوہ اس سے ثابت ہو جائے گا کہ ہم کتنے قانون پرست شہری ہیں۔ بعد میں کسی نے جھوٹے سے بھی شک کیا ہم پر تو ہمارے پاس یہ سند ہو گی کہ ہم مجرم نہیں، مجرموں کو پکڑ کے قانون کے حوالے کرنے والے شریف آدمی ہیں۔" اس نے فخر سے ان سب کی طرف دیکھا جو اسے استاد مانتے تھے۔ وہ سب اچانک اس کی استادی اور اس منصب کے لیے اس کی غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

میں بے ہوش بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ ستم ایجاد تقدیر کا یہ تازہ شاہکار تھا کہ اس وقت رابعہ کے پیکر میں حسن و ناز آفرینی اور اس کے جلووں کی دل وحشی کی حسرتوں کا نظارہ کرنے کے بجائے میں دست و پابستہ اس فرش خاک پر پڑا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں وہیں ستم کش انتظار رہتا۔ قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند۔ اگر صرف ایک منٹ پہلے ہی میں نکل گیا ہوتا وہ اسکوٹر سوار اس کار سے نہ ٹکراتا اور میں اس کی مدد کرنے کے لیے نہ رکتا تو میں اور رابعہ نکل جاتے۔ بے شک اس کے بعد ڈاکے کی نیت سے آنے والے ہوٹل کو پروگرام کے مطابق ضرور لوٹتے لیکن ہم بہر حال محفوظ رہتے۔ یہ سب قدرت کے کھیل تھے۔ عین وقت پر ایک شخص کو اسی طرح غیب سے نمودار ہو کے ان ڈاکوؤں کی گاڑی سے ضرور ٹکرانا تھا۔ قدرت کا مقصد محض ان کے اور میرے پروگرام میں رخنہ اندازی تھا۔ اسے حادثے سے دوچار کرنا نہیں۔ چنانچہ اسکوٹر والے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ نقصان مجھے صرف اس حد تک ہوا تھا کہ ایک شام جو اس کے حُسن آرائی انجمن آرائی کی شام تھی شب فراق کی تنہائی پر تمام ہوئی تھی۔ وہ من ہی من میں شرماتی آرائش خم کاکل سے اور جمالِ لب و رخسار سے جادو جگاتی، اسی لباس میں جانِ بہار اور رشکِ گلستان بنی آئی ہو گی۔ میری منتظر نگاہوں کی دید اور میرے اشتیاق و اضطراب کا نظارہ کرنے لیکن اسے کوئی نہ ملا ہو گا اور اس کا دل بجھ گیا ہو گا۔ آنکھوں میں ستاروں کی جوت مر گئی ہو گی اور اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ میری واپسی کا انتظار کیا ہو گا۔ یہ سمجھا ہو گا کہ اسے یوں محوِ انتظار دیکھنا بھی میری شرارت ہے اور میں اُسے کہیں سے چھُپ کر دیکھنے میں محو ہوں۔ پھر انتظار تشویش میں ڈھل گیا ہو گا اور اب وہ اندیشہ ہائے دور و دراز کا شکار اپنے کمرے میں پڑی رو رہی ہو گی۔ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو گی کہ اب وہ کیا کرے۔ اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہیں کہ اسے پولیس سے رجوع کرنا چاہیے یا نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ پولیس کے پاس جانے سے صورت حال کتنی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ وہ ہنسیں گے اور کہیں گے، بی بی، وہ اغوا ہوا ہے یا نہیں۔ ہم تو اسے پہلے ہی گلی گلی گھر گھر تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ رات کو محسن کا فون آئے گا تو وہ کیا بتائے گی۔ اور محسن کہے گا کہ میں اتنا سمجھا کے آیا تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چل پڑے گا۔ معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے اب تک اس کی کوئی کال آچکی ہو۔ میرے ہاتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ میں وقت دیکھنے سے قاصر تھا اور کمرے کے اندر رات کا اندازہ تو ہوتا تھا؛ وقت کا نہیں۔

اس غیر متوقع حادثے نے ہوٹل میں رہنے والوں کو اور منتظمین کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا۔ یہ ڈاکو اگر کامیاب ہو جاتے تو اس وقت اٹھارہ بیس دولت مند مسافر اپنا سب کچھ گنوا چکے ہوتے۔ تو میرج کے بعد ہنی مون منانے کے لیے اس ہوٹل میں قیام کرنے والے اب تک یرغمالی بن چکے ہوتے۔ صرف پرنسس صوفیہ ان کے ہاتھ نہ آتی مگر اس بارے میں بھی پورے یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار تھا۔ اگر وہ میرے خرمنِ عقل و ہوش پر بجلی بن کے گرنے کے لیے سولہ سنگھار میں دیر لگا دیتی تو میری مشتاق نگاہوں کی جگہ خون آشام ڈاکو اس کا استقبال کرتے۔ انہیں بعد میں پتا چلتا کہ وہ جسے پرنسس سمجھ کے اٹھا لائے ہیں، وہ ایک وکیل ہے۔ کون جانے وہ صنعت کار کی بیٹی بھی کسی ہیڈ کلرک کی دختر ہو اور زمیندار کا بیٹا اسی دفتر کا بابو۔ پرنسس کی طرح انھوں نے بھی اصلیت پر شان و شوکت کا پردہ محض خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے ڈالا ہو۔ ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ پرانے مجرم نہیں ہیں اور کسی خطرناک گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے پولیس کے پاس لے جانے اور میرے عوض دس ہزار کا انعام حاصل کرنے کی کبھی نہ سوچتے۔ دس ہزار کی رقم ڈکیتی کی اور رہزنی کی وارداتوں میں ملوث ہونے والے مجرموں کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ انھیں پولیس کے ریکارڈ پر خود کو نیک نام اور قانون کا معاون ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ پولیس انھیں یہ سند دیتی ہے۔ یہ اس میدان میں نووارد کھلاڑی تھے اور ان سے نمٹنا مشکل نہیں تھا۔

مجھے اغوا کر کے لانے والے مجھے نہتا کر چکے تھے لیکن ان کو یہ کہاں معلوم تھا کہ اپنے خالی ہاتھوں سے بھی ان سب کے آملیٹ بنا کے پارسل کر سکتا ہوں۔ میرا ابتدائی اندازہ بظاہر درست ہی تھا کہ وہ گیرج میں کام کرنے والے میکینک ہیں۔ جس کمرے میں انھوں نے مجھے ڈال رکھا تھا وہ بھی آئل اور گریس کی بُو سے معمور تھا۔ اس کے فرش پر میل کی سیاہ چکنی تہ تھی اور جو دیوار مجھے نظر آرہی تھی وہ بھی کسی گھر کی اُجلی دیوار نہیں تھی۔ کمرے میں فرنیچر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ چنانچہ یہ جگہ گیرج بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ کراہنا شروع کیا۔

"اسے ہوش آرہا ہے۔" نوجوان ڈرائیور نے کہا۔

"اس کا منہ بند رکھنا ضروری ہے استاد۔" دوسرے نے کہا۔ "یہ چلانے لگا تو...."

"ابے کیسے چلائے گا۔" استادِ محترم نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں اور کراہتے ہوئے پانی مانگا جو المونیم کے ایک گلاس میں پیش کیا گیا۔ استاد نے میرا سر تھام کے اٹھایا اور میں نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ لیے۔ ایک سُورما میرا ہی ریوالور لیے کے میرے سامنے کھڑا رہا۔ اس کا مقصد مجھ پر یہ واضح کرنا بھی تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں اور اگر میں نے ہنگامہ برپا کیا تو مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش بھی کیا جا سکتا ہے۔ چوٹ کا اثر باقی تھا اور میرے سر میں ہتھوڑے چل رہے تھے لیکن میں زندگی میں اس سے کہیں زیادہ سخت جسمانی تشدد برداشت کر چکا تھا۔

"میں.... میری بات.... سُنو۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ خیریت چاہتا ہے تو چُپ چاپ پڑا رہ۔" استاد نے کہا۔

"میں.... میں خاموش ہی ہوں.... میں وعدہ کرتا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں.... کھول دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں بائبل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

.... بالکل شور.... شور نہیں مچاؤں گا..."

انھوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ میری بے بسی کا نظارہ ان کو اپنی قوت کا احساس دلا رہا تھا۔ ان میں اعتماد پیدا کر رہا تھا۔

"تم.... تم کو.. کس بات کا ڈر ہے.." میں نے یوں کہا جیسے مجھ پر نزع کا عالم طاری ہے۔ "تم لوگوں.... کے پاس ریوالور ہے... میں خالی ہاتھ ہوں.... یہ میرا ہی ریوالور ہے.... اگر میں... کوئی ایسی ویسی بات.. کروں... تو تم مجھے گولی مار سکتے ہو... مار سکتے ہو یا نہیں؟.... اکیلا آدمی.... میں اکیلا ہوں۔ تم چار.... پھر بھی ڈر ہے....؟"

میرا سوال براہِ راست ان کی جرأت کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ انھوں نے پھر ایک دوسرے سے خاموش مشورہ کیا اور ذرا سی دیر کے لیے کمرے کے آخری گوشے میں چلے گئے۔ جہاں سے میں صرف ان کی سرگوشی سن سکتا تھا۔ بالآخر ان کی کانفرنس ختم ہوئی اور سب سے کم عمر اور جوان شخص یعنی ڈرائیور نے میرے ہاتھ پیروں سے لپٹی ہوئی رسّی کی گرہ کھولنے کا خطرہ مول لیا۔ استاد کے ساتھ دوسرا شخص بھی فلمی ولن کی طرح ریوالور لے کر میرے مقابل آگیا۔ اب ایک ہتھوڑا سا میرے دائیں ہاتھ پر تھا اور دوسرا بائیں ہاتھ کی جانب۔ وہ یقیناً خود کو اس آتشیں اسلحے کی توانائی کے سبب بہت بہادر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے دونوں پیر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اور ہتھوڑے سے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی ریوالور کے ٹریگر پر تھی جو ایک خطرناک بات تھی۔ کسی بھی اناڑی سے اندازے کی ذرا سی غلطی حادثاتی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

میں نے "آہ۔ اوہ۔ ہائے" کرتے ہوئے آہستہ آہستہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دی اور خاصی کوشش کے بعد دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ اب اس پورے کمرے کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ واقعی گیرج تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ موٹی سی لمبے تختے کی بینچ بنی ہوئی تھی۔ اس کے نچلے حصے میں بھدے اور بد وضع پٹ رکھے ہوئے تھے۔ کچھ بند اور کچھ کھلے ہوئے۔ اندر ہر قسم کا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ بینچ پر انجن کے پُرزے ڈھیر تھے اور نیچے دو نامکمل انجن رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار پر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا اسپینر اس ترتیب سے آویزاں تھے کہ سیٹ کا ایک اسپینر بھی کم ہو تو جگہ خالی نظر آئے۔ زیرِ مرمت گاڑیاں یا تو باہر سڑک کے کنارے کھڑی تھیں یا پچھلے حصے میں کوئی احاطہ یا میدان تھا۔ بیشتر گیرج اسی طرح زمین پر ناجائز تصرف سے چلتے ہیں۔

"میں... میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہاتھ سے کلائیوں کو رگڑتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔

"ہمیں معلوم ہے تو کیا کہے گا۔ یہی نا کہ تجھے چھوڑ دیں۔" استاد نے قائدِ حزبِ اختلاف کی حیثیت سے کہا۔

"وہ تمہاری مرضی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ مجھ پر کیا الزامات ہیں....؟"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی لاعلمی کی شرمندگی کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ "ہمیں معلوم ہے تجھ پر قتل اور ڈکیتی کے الزامات ہیں۔ ایسے ہی تو کوئی اشتہاری مجرم نہیں بنتا۔"

"میں نے پانچ قتل کیے.... کیے تو گیارہ ہیں مگر پولیس نے مقدمہ پانچ کا بنایا۔" میں نے بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیر کے سوچتے ہوئے کہا۔ میرے پُرسکون انداز میں بہت بڑے بدمعاشوں کی شانِ استغنا تھی جس سے وہ متاثر ہوئے۔ "چوری ڈکیتی کا حساب رکھنے والے رکھتے ہوں گے۔ میں تیسری بار جیل سے بھاگا ہوں۔ تم لوگوں نے تو ابھی جیل کو باہر سے دیکھا ہوگا۔"

تین کی نظروں میں اس اعزاز سے محرومی پر شرمندگی کے آثار نظر آئے۔ استاد صرف اس لیے استاد ثابت ہوا کہ وہی ایک مرد میدان تھا جس نے جیل یاترا کی تھی۔ "میں رہا ہوں چھ مہینے..." وہ بولا۔

"چھ مہینے...." میں نے ہنسنا شروع کیا۔ "جیب کاٹی تھی یا مار پیٹ کی تھی؟"

ایسے گھٹیا جرم پر ہی اتنی کم سزا ہو سکتی تھی لیکن میری ہنسی نے استاد کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ مشتعل ہونے لگا۔

"دیکھو... میں تمہارے فائدے کی بات کروں گا۔ ہو تم بھی اپنی ہی ذات کے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ہی نقشِ قدم پر چل رہے ہو تو ہم سے کچھ سیکھ لو۔ کام آئے گا۔ یہ ڈکیتی کی پہلی واردات تھی نا جو کرنے والے تھے؟"

میرے سوال پر وہ سب بڑی طرح چونکے۔ "تو مکر کر رہا تھا سؤر کے بچے۔" استاد نے میرے ایک لات ماری۔ میں اسے پیر کے پنجے سے پکڑ کر مگدر کی طرح گھما سکتا تھا اور ان سب کو اس مگدر سے لمبا لٹا سکتا تھا۔ وہ گولی چلاتے تو استادِ مکرم میں سوراخ کرنے کا خطرہ مول لیتے۔ لیکن میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ بلا نیچے لڑھکا اور پھر کراہتا ہوا اٹھا۔

"غلطی تم لوگوں کی تھی۔" میں نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "تم کو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ کیسے فرض کر لیا تھا تم نے کہ میں بہرا ہوں.... میں نے تمہاری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا ہے۔"

میں نے ایک مختصر سا ڈرامائی وقفہ دیا اور اپنی بات کا تاثر دیکھا۔ وہ سب ذہنی طور پر مرعوب ہونے لگے تھے۔

"میری فکر مت کرو۔ تم اپنے دس ہزار مجھ سے لینا چاہو تو لے لو۔ حکومت سے لینا چاہو تو تمہاری مرضی۔" میں نے کہا۔

"پہلی صورت میں تمہارے اور میرے درمیان دشمنی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری صورت میں میرے ساتھی تم سے دس ہزار واپس لے جائیں گے۔ تم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جیل سے تین مرتبہ انہی ساتھیوں کی مدد سے فرار ہوا تھا تو چوتھی بار بھی ہو جاؤں گا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔"

"کیسی خوش قسمتی ہے؟" استاد نے مایوسی سے کہا۔ "ایک معمولی سی بات تھی۔ سارے پروگرام کا ملبہ ہو گیا۔"

"استاد جی یہی تو خوش قسمتی ہے تمہاری۔" میں نے کہا۔ "تم پہلی واردات کر رہے تھے۔ کیا تیاری کی تھی تم نے ایک مہینے تک۔ تمہیں خاک بھی معلوم نہیں کہ تم وہاں جاتے تو انجام کیا ہوتا۔ ڈاکا ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حفاظتی نظام کیسا ہے۔"

"وہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تک نہیں ہوتا۔" استاد نے نخوت سے کہا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "ریوالور نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ تو نظر ہی نہیں آتا۔ مثلاً خفیہ الارم اور کیمرے۔ جو ہر جگہ لگے ہوتے ہیں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ منیجر اپنے کمرے میں سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہتا ہے۔ ذرا بھی شک ہونے کی صورت میں اسے صرف ایک بٹن دبانا پڑے گا۔ گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دے گی لیکن پولیس دس منٹ میں آ جائے گی۔"

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس.... تمہیں کیسے معلوم ہوا ہے یہ سب کچھ؟" استاد کا اعتماد اب متزلزل ہو رہا تھا۔

میں پھر ہنسنے لگا۔ "تم میرے مقابلے میں ابھی بچے ہو۔ مجھے بھی یہ سب کچھ سولہ سال میں معلوم ہوا ہے۔ جب میں نے پہلی بار ایک گھر میں چوری کی تھی تو میری عمر بھی سولہ سال تھی لیکن میں پکڑا نہیں گیا تھا۔ میں نے گھر اور گھر والوں کے متعلق ضروری معلومات پہلے سے حاصل کر لی تھیں۔ وہ زمانے اور تھے۔ خودکار الارم اور کیمرے استعمال نہیں ہوتے تھے لیکن اب یہ چیزیں عام ہیں۔ تم ثبوت مانگتے ہو تو واقعی ثبوت کوئی نہیں ہے لیکن تم خود سوچو، جو بات تمہاری کھوپڑی میں آئی ہے کیا اتنا بڑا ہوٹل چلانے والوں کے ذہن میں نہیں آئی ہوگی۔ ایک معمولی جوہری بھی دکان کھولتا ہے تو اپنی حفاظت کا انتظام کرنے کی پہلے سوچتا ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں میں بہترین حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ تم نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ میں یورپ اور امریکہ بھی جا چکا ہوں فرار ہو کے۔ اور وہاں گورنر کی طرح رہ کے آیا ہوں۔ ان کے تو اپنے پرائیویٹ سراغ رساں بھی ہوتے ہیں۔ ہوٹل والے جانتے ہیں کہ ان کے پاس ٹھہرنے والے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ڈاکا پڑنا تو اتنی بڑی بات نہیں لیکن انھیں اغوا کیا جا سکتا ہے۔ جیسے تم ایک پرنس کو اغوا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ان میں مخالف سیاسی لیڈر بھی ہوتے ہیں۔ ان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہوٹل محفوظ ہیں اور وہاں کوئی واردات نہیں ہوتی تو آخر کس وجہ سے؟"

استاد کے یقین کا غبارہ جو بہت بلندی پر اڑ رہا تھا ہوا نکلنے سے اتنا نیچا ہو گیا تھا کہ استادی کا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ "گروہ" کے جونیئر اراکین مجھے انتہائی عقیدت و احترام سے اور اپنے سرغنہ کو افسوسناک ملامت بھری اور سرکش نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔

"اس کی باتوں میں مت آؤ۔ یہ الو کا پٹھا پولیس سے بچنے کے لیے رُعب جھاڑ رہا ہے۔" وہ بولا۔

"میں نے تم کو بتایا نا کہ دس ہزار معمولی رقم ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔ "پولیس تم کو آسانی سے نہیں دے گی۔ پہلے تو وہ تفتیش کریں گے اور تمہیں اس میں شامل رکھیں گے۔ دس ہزار میں سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے ان کی کوشش یہ ہوگی کہ تم کو بھی میرا ساتھی ثابت کر دیں۔ تیرہ نمبر کے جوتے سے وہ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ ان کا مؤقف یہ ہوگا کہ تم نے باہمی اختلاف کے باعث مجھے پولیس کے حوالے کیا اور وہ تم سے ہزار طریقے آزما کر پوچھیں گے کہ اتنا خطرناک مجرم تمہیں کہاں ملا؟ تمہارے قابو میں کیسے آ گیا۔ مجھے کوئی خالی ہاتھ تو پکڑ نہیں سکتا۔ صبح تک انھوں نے تم کو بجایا تو تم میرا ساتھی ہونے کا اقرار کر دیا نہ کرو، اپنے دوسرے جرائم کا اقرار کر لو گے جن کی خبر انھیں بھی نہیں مثلاً بغیر لائسنس کا ریوالور رکھنے کا۔ وہ پوچھیں گے ریوالور کہاں سے حاصل کیا؟ کب سے تمہارے پاس ہے اور اب تک اس کا استعمال کہاں کہاں کر چکے ہو؟ دس ہزار جوتے کھا کے تم جیل چلے جاؤ گے۔ اور اگر عقل سے کام لیتے ہوئے انعام کی رقم آدھی کرنے پر تیار ہو گئے تو وہ ضابطے کی کارروائی مکمل کریں گے۔ پھر افسرانِ بالا کو رپورٹ کریں گے۔ معاملہ آئی جی تک جائے گا۔ وہاں سے منظوری آئے گی۔ پھر بل بنے گا اور سرکاری خزانے جائے گا۔ سال بھر تک پہلے تم چکر لگاتے رہو گے اور ان سے اپنا حق یوں مانگتے رہو گے جیسے خیرات مانگ رہے ہو۔ تم کو دس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ کسی پریشانی کے بغیر اور مجھ سے دشمنی کا خطرہ مول لیے بغیر۔ میں تم کو رقعہ دیتا ہوں۔ تم میں سے ایک جائے اور رقم لے آئے۔ دس کی جگہ پندرہ مانگو گے تو مل جائیں گے اور تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو جائے گا وہ واپس لوٹ کر بھی آئے گا؟" استاد نے کہا۔

"ضمانت میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس۔ تم مجھے کسی اور جگہ لے جا سکتے ہو اور اپنے ساتھی کو وہ پتا دے سکتے ہو۔ مجھے بتائے بغیر۔ وہ کسی کو پیچھے آتا دیکھے تو رقم واپس کر دے۔ لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ پیچھے کوئی نہیں آئے گا۔ جو یہ رقم دینا جانتے ہیں وہ تمہاری طرح گدھے نہیں ہیں۔ وہ بدعہدی کرنے والے کے خاندان

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تک کو نہیں چھوڑتے۔ وہ تمھارا سراغ لگالیں گے اور تمھیں یہ دس ہزار تو دینے ہی پڑیں گے، سود میں اپنی جان بھی دینی پڑے گی۔ ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ دس پندرہ ہزار کی خاطر وہ وقت برباد نہیں کریں گے اور یہ سمجھ لیں گے کہ سو بار دوسروں کو لوٹا، ایک بار خود بھی لُٹ گئے۔ آخر دنیا میں ایک ہم ہی تو نہیں ہیں۔ یہ دھندا دوسرے بھی کر رہے ہیں اور کسی نے غلط فہمی کے باعث اپنوں ہی کو لوٹ لیا۔"

میں نے انھیں سوچنے اور صورتِ حالات کو سمجھنے کا موقع دیا اور ان سے ایک سگریٹ طلب کی۔ جب میں وہ گھٹیا سگریٹ پی رہا تھا تو دوسرے کونے میں سر جوڑے وہ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ میں نے ذہنی طور پر ان کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ اب ان کے لیے پولیس کے پاس جا کے انعام وصول کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ انھیں احساس ہو رہا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ وہ تو رنگین تتلی کے پیچھے دوڑے تھے اور سامنے آ گیا آدم خور شیر۔ میں دل ہی دل میں ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سالے چلے تھے ڈاکا ڈالنے۔ حلال کی کما کے کھانے میں محنت کرنی پڑتی تھی اور خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا۔ عیش کے لیے کیش کا شارٹ کٹ انھیں یہی نظر آیا تھا۔ جرائم کی فلمیں دیکھ دیکھ کر اور جاسوسی ناول پڑھ کے انھوں نے سوچا ہوگا کہ ڈکیتی بہت آسان کام ہے۔ آسان نہ ہوتا تو اخبارات میں ہر روز ڈاکا پڑنے کی خبریں کیسے آتیں۔ پھر مل گیا ہوگا کہیں سے ایک ریوالور اور اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہوگی۔ میکینک لوگ تھے۔ نہ جانے کب کس کی گاڑی چُرائی اور اس کو بدل کے کیا بنا دیا۔ وہ تو خود پُرزے جمع کر کے گاڑی کھڑی کر سکتے تھے۔ استادِ مکرّم کے ذہن میں ہوٹل کے مسافروں کو لوٹنے کا اچھوتا خیال آیا اور گیرج میں تو استاد تھے ہی، گروہ کے استاد بھی کہلانے لگے۔ اب ہوا خراب ہو رہی تھی۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں پولیس کے حوالے نہ کریں۔" استاد نے اتفاقِ رائے سے ہونے والا فیصلہ مجھ تک پہنچایا۔ "لیکن تم اپنا وعدہ پورا کرو گے؟"

"کون سا وعدہ؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی کہ..... ہمیں پندرہ ہزار مل جائیں گے۔ ابھی۔" استاد نے کہا۔ "اور ہمارے تمھارے درمیان کوئی دشمنی نہیں رہے گی؟"

میں بڑے مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔ یوں جیسے میں نے فراخدلی اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے بچوں کی اس غلطی کو معاف کر دیا ہو۔

"یہ وعدہ چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"رقم کہاں سے ملے گی اور کون دے گا؟"

"اس کے لیے تمھیں وہیں جانا پڑے گا۔ ہوٹل غاران۔" میں نے کہا۔ "رقم پرنسس صوفیہ ادا کرے گی۔"

میری بات کا اثر وہی ہوا جو ہائی جیک ہونے والے مسافروں پر اس وقت ہوتا ہے جب ایک اُلّو جیسا مسافر اچانک کھڑا ہو کے دستی بم نکال لیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی نے حرکت کی تو جہاز دھماکے سے اڑا دیا جائے گا۔ کچھ دیر تو ساکت و صامت بیٹھے رہ جانے والے مسافروں کو یقین نہیں آتا کہ دھمکی انھیں دی گئی ہے اور جو گولا دھمکی دینے والا ہاتھ میں اٹھائے کھڑا ہے وہ واقعی دستی بم ہے۔ گیرج میں موجود سب لوگ صدمے سے سُن کھڑے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ میری اس بات میں مذاق کا کون سا پہلو ہے۔ میں اطمینان سے ٹانگیں لمبی کیے دیوار کے سہارے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔

"پرنسس صوفیہ سے کیا تعلق ہے تمھارا؟" استاد نے بہت دیر کے بعد کہا۔

"وہی جو کسی بھی بیوی کا اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

انھیں چار سو چالیس وولٹ کا ایک اور شاک لگا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ بے وقوف بنا رہے ہو ہمیں۔" استاد چلّانے لگا۔ "میں کہتا ہوں اس شخص کی چال میں مت آؤ۔ یہ بہت خطرناک اور عیار سا آدمی ہے۔ عیار اور مکار۔ ہمیں اُلّو سمجھتا ہے۔" لیکن اس کی چیخ و پکار سے کوئی متاثر نہیں ہوا۔ باقی تین مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔

"تم اُلّو ہو، سب اُلّو کے پٹھے ہو۔" میں نے کہا۔ "ہمت ہے تو گولی مار دو مجھے اور دفن کر دو اسی جگہ۔ کون ہے تمھارے جرم کا گواہ! اور پھر جاؤ ہوٹل میں ڈاکا ڈالو۔ اگر پھنس جاؤ تو رونا نہیں۔ میں نے تو تمھیں خبردار کر دیا تھا۔ پرنسس صوفیہ میری بیوی ہے۔ وہ تمھاری ان بیویوں کی طرح نہیں ہے جو گھر میں چولہے جھونک رہی ہیں، برتن مانجھ رہی ہیں اور بچے پیدا کر رہی ہیں۔ جو چھپکلی دیکھ کے تھر تھر کانپنے لگتی ہیں اور گھر میں چور کُود جائے تو بیہوش ہو جاتی ہیں۔ وہ خود پوچھ لے گی تم سے میرے بارے میں اور سارا حساب بے باق کر دے گی۔ میں نے ذرا ٹھنڈے دل سے کام لیا ہے۔ وہ عورت ہے اور جس عورت کا سہاگ کوئی چھین لے وہ بپھری ہوئی زخم خوردہ شیرنی کی طرح انتقام لیتی ہے۔" میں نے تھوڑا سا وقفہ دیا اور ایک گہری سانس لے کر پھر دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ "تم اس کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے نا۔ اب وہ اکیلی ہے۔ جاؤ لے اسے اٹھا لاؤ۔ سب مرد ہو اور بہادر ہو۔ پرنسس کے نام سے دھوکا کھا رہے ہو کہ وہ نازوں میں پلی نازک اندام شہزادی ہوگی۔ اب کہاں رہی ہیں شہزادیاں سوائے ولایت کے؟ ایسے معزز نام تو ہم اچھے لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ میں تم کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ میرا رقعہ لے جاؤ اور میری بیوی کے پاس سیدھے دھڑک پہنچ جاؤ۔ رقم لو اور واپس آ جاؤ۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنا اپنا راستہ لو۔"

"ٹھیک ہے۔ رقعہ لکھو۔" نوجوان ڈرائیور نے جوش میں آگے بڑھ کر کہا۔ "پروا نہیں استاد! اگر میں واپس نہ آیا تو اس کو زندہ گاڑ دینا۔ میں ایک رقعہ لے کر جا رہا ہوں۔ یہ کوئی جرم تو نہیں ہے کہ کوئی مجھے پکڑے۔ میں کہہ دوں گا کہ مجھے یہ شخص سڑک پر ملا تھا اور اس نے مجھے رقعہ پہنچانے کے سو روپے دیے تھے۔ میں کیا جانوں وہ کوئی مفرور اشتہاری مجرم تھا۔ پرنسس صوفیہ اس کی بیوی ہوگی تو پولیس خود اس سے پوچھ لے گی۔"

استاد نے ذہین شاگرد کو قابلِ تعریف نظروں سے دیکھا۔

مجھے ایک بوسیدہ ڈائری اور ایک بال پوائنٹ پن فراہم کیا گیا۔ سادہ صفحے کی تلاش میں ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ڈائری میں ایک نام کئی جگہ دیکھا۔ رنگ برنگ ڈینٹر اینڈ پینٹر۔ اس کے آگے مختلف رقوم لکھی ہوئی تھیں۔ اس گیرج میں گاڑیوں پر رنگ کا کام نہیں ہوتا ورنہ اس کے در و دیوار پر ڈیکو اسپرے کے سارے رنگوں کی پھوار نظر آتی۔ غالباً گیرج والوں کا رابطہ کسی ڈینٹر پینٹر سے بھی تھا چنانچہ وہ میکینکل کا کام خود کرتے تھے اور رنگ روغن کے لیے رنگ برنگ ورکشاپ سے اشتراک کرتے تھے۔ یہ انھی کا حساب ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک صفحے پر لکھا: "اسی وقت میری خاطر ان کو پندرہ ہزار دے دو۔" اور صفحہ پھاڑ کے آگے بڑھا دیا۔ استاد نے چھت سے معلّق شیڈ والے چالیس واٹ کے بلب کی مدّھم روشنی میں تحریر کو دیکھا اور باری باری گروہ کے اراکین کو ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ بات اتنی صاف اور سادہ تھی کہ شکوک پیدا کرتی تھی۔

"تم نے..... کسی کو مخاطب نہیں کیا..... اپنے دستخط وغیرہ نہیں کیے۔" استاد نے کہا۔

"تم عقل سے بالکل پیدل ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "استاد بنے پھرتے ہو۔ تمھیں تو ابھی دس سال شاگردی کرنی چاہیے میرے شاگردوں کی۔ ارے بھئی نام تمھیں بھی معلوم ہے۔ سیدھے پرنسس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ میری ہینڈ رائٹنگ پہچانتی ہے تو نام کیوں لکھوں میں؟ اور اس میں تمھاری ہی بچت ہے۔ خدانخواستہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔ حالانکہ اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں ہے تو اس ایک سطر سے تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم کس سے ملنے آتے تھے اور تمھیں کس نے بھیجا تھا۔ اس پرزے کو کہیں گرا دو گے تب بھی محفوظ رہو گے۔ تمھیں اصرار ہے تو لاؤ میں اپنا نام لکھ دیتا ہوں۔ یہ سوچ لو کہ تمھارے پاس سے یہ تحریر برآمد ہوئی تو تمھارے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔ تمھیں میرا آلۂ کار سمجھ لیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خود جاؤں گا۔" استاد نے کہا۔ "لیکن ہم کوئی خطرہ مول نہیں لیں گے۔ تمھیں ہاتھ پیر باندھ کے دوسری جگہ منتقل کرنا ضروری ہے۔"

میں نے رضاکارانہ طور پر انھیں یہ موقع فراہم کیا۔ اس وقت بھی وہ میری گرفت اور رسائی میں تھے اور اگر میں چاہتا تو پلک جھپکتے میں ان کے ہاتھ پیر توڑ کے سب کو ناکارہ کر سکتا تھا اور ان کا اسلحہ جیب ڈال کے رخصت ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے یہ ایکشن کو التوا میں رکھا۔ میں ان چاروں شوقیہ بدمعاشوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان سے اور کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور انھی کے ذریعے رابعہ کو اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی تشویش ختم ہو۔ بعد میں یہ لوگ بدعہدی کرتے تو میں ان سے مؤثر طور پر نمٹ لیتا اور اپنی رقم وصول کر کے واپس پہنچ جاتا مگر مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ ایسی صورتِ حال سے رابعہ کس طرح نمٹتی ہے۔ اسے آگے میرا ساتھ دینا تھا تو اس سے کہیں زیادہ خطرناک حالات کا سامنا کرنا تھا۔ یہ اس کی پہلی آزمائش تھی۔ اس کے صبر اور حوصلے کی، جرأت اور استقامت کی، مشکل گھڑی میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کی اور پُرسکون رہنے کی اور میری مدد کے لیے عملی طور پر کچھ کرنے کی ہمت کی۔

اس بار انھوں نے ایک اور احتیاط بھی ملحوظ رکھی کہ باہر لاتے وقت میری آنکھوں پر پٹی باندھی چنانچہ میں پھر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ علاقہ کون سا ہے۔ آس پاس خاموشی تھی۔ کہیں سے ٹریفک کے گزرنے کی اور کسی گھر میں سے زندہ انسانوں کے وجود کی خبر دینے والی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ گیرج آبادی سے دور کسی مضافاتی علاقے میں ہے ورنہ ابھی نصف شب نہیں ہوئی تھی کہ سناٹا اتنا گہرا ہوتا۔ مجھے گاڑی میں پیچھے بٹھایا گیا اور دو افراد میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ تیسرے نے ڈرائیونگ سنبھالی اور گاڑی خاصی تیز رفتاری سے روانہ ہوئی۔ حادثے کے وقت میں نے گاڑی پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ اور مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ گاڑی بالکل نئی نہیں تھی۔ لیکن میکینک ہاتھوں میں اس کی کارکردگی نئی سے بہتر ہو گئی تھی۔ اگر مجھے روانہ ہوتے وقت اس جگہ کی صرف ایک جھلک دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تو میں ہر موڑ کو ذہن نشین کرتے ہوئے اپنی منزل کے راستوں کا تعین کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے تینوں افراد خاموش تھے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکر نکیر بلاوجہ میری پسلیوں میں ریوالور کی نال چبھو کے مجھے یاد دلاتے تھے کہ میں بے بس اور اسیر ہوں جس سے میں خاصا محظوظ ہوتا تھا۔

"تمھارا استاد کیسے گیا ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "گاڑی تو ہم لے آئے۔"

"میں تمھارے ساتھ ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟" استاد نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آگے سے پلٹ کر جواب دیا۔
"اوہ ..... معاف کرنا۔ میں سمجھا تھا۔ خیر وہ شخص کیسے گیا ہے...؟"
"تم کیوں پریشان ہو؟" استاد نے کہا۔
"میں بالکل مطمئن ہوں۔ خصوصاً تم سب کے رویے سے۔"
میں نے کہا۔ "بس یہ خواہ مخواہ ریوالور کو دونوں طرف سے میری پسلیوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھیں سمجھاؤ کہ خود بھی آرام سے بیٹھیں اور مجھے بھی بیٹھنے دیں۔"
کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا لیکن دونوں طرف سے دباؤ کچھ کم ہو گیا۔
"کیا میرا پیغام لے جانے والا وہیں آئے گا جہاں تم مجھے لے جا رہے ہو؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔
"تم کو زیادہ بولنے کی عادت ہے۔" دائیں طرف والا بولا۔ "چُپ نہیں بیٹھ سکتے؟"
"کیا تمھیں خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ میری بیوی تعاقب کرتی ہوئی اس کے ساتھ آ جائے گی؟" میں نے کہا۔
"ہم اس خطرے سے نمٹنے کا بندوبست کر چکے ہیں۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اس بے وقوف عورت نے ایسا کیا تو ....؟"
"وہ بے وقوف تو ہے لیکن اسی بے وقوفی میں حد سے زیادہ خطرناک کام بھی کر جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے عورت ذات جان کے ناقص العقل اور کمزور سمجھنے والے مرد بھی بعض اوقات مارے جاتے ہیں۔"
گاڑی اچانک رُکی۔ میرے کان اب ٹریفک کی تھوڑی بہت آوازیں سُن رہے تھے۔ جو بند شیشوں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم شہر کے بارونق حصے میں ہیں۔ دروازہ کُھلا تو یہ آوازوں کا ریلا ایک دم اندر آیا۔ دوسرے لمحے دروازہ بند ہو گیا اور مجھ پر بیک وقت انکشاف ہوا کہ گاڑی میں تین نہیں، چار آدمی تھے۔ میرے محافظ اسی طرح دونوں طرف موجود تھے اور گاڑی پھر روانہ ہوئی تو ڈرائیور کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی۔ اس کے باوجود کوئی دروازہ کھول کے اترا تھا۔ یہ حقیقت حساب کے سوال کا جواب بن کے عیاں ہوئی۔ انھوں نے مجھے اندھیرے میں اور دھوکے میں رکھا تھا کہ چوتھا آدمی میرا نامہ بر بن کے الگ گیا ہے جبکہ اس نے بھی ہمارے ساتھ اسی گاڑی میں سفر کیا تھا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا کیونکہ ہدایات کے مطابق اس کو خود کو غیر موجود ثابت کرنا تھا۔ شاید ان کی مجبوری یہ تھی کہ جہاں وہ مجھے لے گئے تھے، وہاں کوئی اور سواری دستیاب نہیں تھی۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ ایک ہی گاڑی کو دونوں مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ میری منتقلی کے لیے بھی اور نامہ بر کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے بھی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے سے مجھے بے حد مسرت اور تقویت حاصل ہوئی کیونکہ

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں ہوٹل فاران کے سامنے ہوں۔ گھر... کی شدید خواہش سمندر کی طوفانی لہر کی طرح اٹھی لیکن میں نے اس کا... مقابلہ کیا۔ اگر یہاں میں ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود... ٹکر سے دونوں محافظوں کو ناک آؤٹ کر دیتا اور پھر ڈرائیور... گاڑی بے قابو ہو کے رُک جاتی۔ کسی درخت، کھمبے، عمارت یا... گاڑی سے ٹکرا کے گاڑی اُلٹ بھی سکتی تھی اور فٹ پاتھ پر... دو چار پیدل چلنے والوں کو بھی کچل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ... دونوں اناڑی بدمعاش گولی چلا دیتے تو دو گولیاں نہ جانے... سوراخ کرتیں۔ گاڑی میں یا مجھ میں۔ ایسا خطرناک قدم اٹھانے کی... ضرورت کوئی نہیں تھی۔
گاڑی نے دائیں جانب ایک موڑ کاٹا۔ وقت اور رفتار... کرتے ہوئے میں نے طے کیا کہ پہلا موڑ تقریباً دو تین فرلانگ... آیا ہے۔ اب میں نے سیکنڈ شمار کرنے کے فارمولے پر عمل... دستی بم پھینکنے والے پن نکالنے کے بعد گھڑی دیکھے بغیر... سیکنڈ اسی طرح شمار کرتے ہیں۔ میں نے زیرِ لب کہا۔ ایک ہزار... دو ہزار۔ تین ہزار۔ چار ہزار۔ پانچ ہزار۔ یوں پانچ سیکنڈ کے... وقفے گزرے۔ میں نے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں... پور پر حساب رکھا۔ ایک دفعہ میں پندرہ وقفے گزرے۔ دو... بار تیس ہو گئے یعنی ڈھائی منٹ۔ گاڑی نے پھر دائیں طرف موڑ... رفتار کو تیس میل کے اندر رکھتے ہوئے یہ فاصلہ کوئی ایک میل... تھوڑا سا زیادہ یا کم۔ میں پھر وقت کے حساب میں مصروف ہو گیا... پانچ سیکنڈ کے پندرہویں وقفے کے دوران میں گاڑی نے تیسرا... دایاں موڑ کاٹا۔ طے شدہ فاصلہ تقریباً نصف گویا آدھا میل... فرلانگ کے درمیان۔ اگر پہلا موڑ بھی تین چار فرلانگ کے بعد... تو میں تصور کی مدد سے طے کر سکتا تھا کہ ہم ایک ایسی مستطیل کے... چار اضلاع طے کر چکے ہیں جس کے دو ضلعے دو تین فرلانگ کے... باقی دو ایک میل کے ہوں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ہوٹل فاران... گرد چاروں طرف گھوم کر پھر وہیں پہنچ رہے ہیں۔ اس خیال کی... اس وقت ہو گئی جب دو منٹ بعد گاڑی پھر رُک گئی۔ اور میں... آوازوں پر غور کیا۔ ایک گنڈیری بیچنے والی کی صدا پر میرا دل... زور سے دھڑکا۔ جب چوتھا آدمی اُترا تھا تو یہی صدا آئی تھی... تے مٹھیاں، تے بڑیاں والیاں۔" اور یہ گنگناتی آواز اسی سُر میں پھر سنائی... میرا دل مسرت سے معمور ہو گیا تھا کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود... میں نے سب دیکھ لیا تھا۔ یہ ان کا مجھ پر اعتماد تھا یا بے وقوفی... حد تک بے خوفی کا مظاہرہ۔ لیکن وہ رقم وصول کر کے اپنے... وہیں سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اور شاید اس کے رقم... بخیر و عافیت لوٹ آنے کی صورت میں وہ مجھے کچھ دُور...

...مزا کیہ پر چھوڑ دیتے۔
میں نے مطمئن ہو کر انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے پھر ایک ہزار دو ہزار کی گردان شروع کی لیکن بہت جلد اس سے اکتا گیا۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دل کی تقویت کے لیے یہی احساس بہت تھا کہ میں اپنے ٹھکانے کے بہت قریب ہوں۔ رابعہ اگر کچھ کرنا چاہے تو اُسے دور نہیں جانا پڑے گا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کیا واقعی وہ کچھ کر سکے گی؟ میرے ساتھی اپنی طرف سے مجھے تاریکی میں رکھ کے مطمئن بیٹھے ہوئے تھے اور میرے رویے نے ایک طرف ان پر اپنی ذات کا اعتماد متزلزل کر دیا تھا تو دوسری طرف مجھ پر ان کا اعتماد جائز ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی۔ ڈکیتی اور بدمعاشی کے سلسلے میں ان کو مفید معلومات فراہم کی تھیں اور قابلِ قدر ہدایات دی تھیں چنانچہ میں استادوں کا استاد ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے گرفتاری کے لیے اٹھا کے انھوں نے کتنی بچگانہ حرکت کی تھی اور خدانخواستہ پہلے پہل وہ مجھے بیچ دیتے تو اپنی سلامتی کو گروی رکھ دیتے۔ ایک طرف پولیس سے دس ہزار وصول کرنا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا بن جاتا تو دوسری طرف میرے جیسے نامی گرامی بدمعاش کے شاگرد ان عزیزانِ گرامی کو جینے نہ دیتے۔ میرے لیکچر سے ان کی آنکھیں کُھل گئی تھیں اور انھوں نے فوراً اپنی غلطی کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے انھوں نے ایک بہت بڑے بدمعاش کے بہت بڑے دل کا کمال سمجھا ہو گا کہ میں اسیر کرنے والوں کو دھمکی نہیں دی۔ ان کی حق تلفی نہیں کی اور ان کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے دس کی جگہ پندرہ ہزار روپے کا انعام دے دیا۔ وہ بہت فائدے میں رہے۔ پیسہ زیادہ ہی ملا اور آئندہ کے لیے بھی ایک سرپرست کی حمایت کے امکانات پیدا ہو گئے۔ وہ چھوٹے بدمعاش تھے۔ چوریا اٹھائی گیرے ورنہ وہ مجھ سے پندرہ ہزار بھی کیوں لیتے۔ ڈکیتی میں بیس پچیس لاکھ کی امید رکھنے والے یکلخت اتنے گر گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اب ڈکیتی ان کو مشکل نظر آنے لگی تھی اور یہ پندرہ ہزار یقینی تھے۔
"کیا ہو گیا استاد گولی کو؟" میرے ساتھ والے نے کہا۔ "بیس منٹ سے زیادہ ہو گئے، یار ڈکی۔ ایسے کب تک کھڑے رہیں گے؟" دوسری طرف والے نے فوراً تائید کی۔
"آدھا گھنٹا تو صبر کرو۔" آگے والے نے قائم مقام استاد کی حیثیت سے انھیں ڈانٹا جسے ڈکی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔
"فرض کرو آدھے گھنٹے بعد بھی استاد نہ آیا؟" دائیں ہاتھ والا زیادہ مضطرب تھا۔
"پھر دیکھیں گے، بندہ تو ہمارے پاس ہے۔" ڈکی نے ٹالنے کے انداز میں کہا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے کا اہل ہی نہیں اور... خود ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہے۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ بیس منٹ بہت ہوتے ہیں۔ رابعہ کے پاس جا کے آنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے تھے۔ پانچ منٹ اس کے رکھ لیے جائیں کہ رابعہ نے سوال جواب کیے ہوں اور رقم شمار کی ہو۔ تب بھی پندرہ منٹ میں استاد گولی کو آ جانا چاہیے تھا۔ گو اس کا امکان کم تھا کہ رقم وصول کرنے کے بعد استاد گولی خود کو محفوظ رکھنے کی نیت سے رابعہ کو ناک آؤٹ کر کے یا باندھ کے ڈال آتے لیکن اس کا انحصار رابعہ کے رویے پر بھی تھا۔ اگر اس نے راست اقدام کرنا چاہا تو استاد گولی بہرحال مرد ہے اور مسلح ہے۔ وہ آسانی سے گرفتاری قبول نہیں کرے گا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن میں بھی اس پریشان کن خیال نے فساد پھیلانا شروع کیا۔ رابعہ ذہنی انتشار اور جذباتی بحران کا شکار ہو گی۔ اچانک میری تحریر دیکھ کر وہ ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی تو کیا کرے گی؟ پیغام لانے والے پر حملہ کر دے گی۔ اس کے کپڑے پھاڑ دے گی، بال نوچ لے گی اور اس کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کرے گی۔ چیخے گی، چلّائے گی اور پوچھے گی "بتا سکندر کہاں ہے؟"۔ لیکن رابعہ اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہے۔ وہ خود اغوا ہو چکی ہے۔ دشمنوں کی قید میں جسمانی عذاب جھیل چکی ہے۔ ماں کی موت کے بعد گھر کی تباہی کا صدمہ سہا چکی ہے اور ہر صدمہ برداشت کرنے کی اہل ہے۔
"بونٹ۔ کیا میں جا کے دیکھوں؟" دائیں ہاتھ والے نے کہا۔
"ڈکی سے پوچھ لے۔" دائیں ہاتھ والے نے بے چینی اور ناگواری سے کہا۔ مجھے ان ناموں پر ہنسی آئی۔ استادِ محترم گولی تھے تو شاگردوں میں سے ایک بونٹ تھا اور دوسرا ڈکی۔ اس سے ان سب کا موٹر مکینک ہونا ثابت ہوتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ ان کے موجودہ نام ماں باپ کے دیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہ گیراج میں استاد گولی کے عطا کردہ تخلص تھے۔ آگے والا ڈکی تھا۔ دائیں ہاتھ والا بونٹ۔ اب اُلٹے ہاتھ کی طرف کلچ یا گیئر ہو تو کچھ عجب نہیں۔ لیکن بعد میں وہ 'پانا' ثابت ہوا۔
"اب تو آدھا گھنٹہ ہو گیا ڈکی۔" بونٹ نے زیادہ بے قرار لہجے میں کہا۔
"تو میں کیا کروں؟" ڈکی برہم ہو گیا۔ "مجھے وقت نہیں دے کر گیا تھا استاد گولی۔ کہ اتنی دیر انتظار کرنا۔"
"پھر کیا ہم ساری رات انتظار کرتے رہیں گے؟" بائیں ہاتھ والے نے کہا۔
"مجھے اس میں کوئی چال نظر آتی ہے۔" بونٹ بولا۔
"اس نے بتا دیا تھا کہ وہ عورت بہت خطرناک ہے۔" بائیں ہاتھ والے نے تشویش سے کہا۔
"یار پانے، یہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم بتاؤ میں کیا کروں؟" ڈکی نے بے بسی سے کہا۔ "اس سے کیوں نہیں پوچھتے جو تمھارے ساتھ بیٹھا ہے۔ چال ہو گی تو اس کی ....!"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے کوئی غلط چال نہیں چلی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر طرح سے تعاون کیا ہے۔"

"پھر دیر کیوں ہو رہی ہے؟" ڈکی نے کہا۔ "تو ہوگا بہت بڑا بدمعاش۔ لیکن استاد گولی کو کچھ ہوا تو ہم تیری لاش تیری بیوی کو بھیج دیں گے۔ کوئی.... ہمیں پکڑ نہیں سکے گا۔" اس نے بیچ میں ایک گالی فٹ کی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی جھنجلاہٹ اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا اور خود میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں رابعہ کو آزمائش میں ڈال کے میں نے حماقت تو نہیں کی۔ اگر وہ آسانی سے پندرہ ہزار گن دیتی تو استاد گولی اب تک لوٹ کے آجاتا۔ مگر رابعہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کوئی جوابی کارروائی کی ہوگی۔ جوابی کارروائی کیا ہو سکتی ہے؟ ایک یہ کہ وہ استاد گولی کو میرے بدلے یرغمال بنا لے۔ اور انتظار کرے کہ کوئی اسے چھڑانے کے لیے خود آئے یا فون کرے تو اس سے سودا کرے کہ سکندر کو لاؤ اور استاد گولی کو لے جاؤ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ یا اس نے پندرہ ہزار دے کر ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا ہو کہ اس شخص کو روک لیا جائے اور پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ الزام لگا دے کہ استاد گولی اس کے کمرے سے پندرہ ہزار روپے چرا کے جا رہا تھا لیکن رابعہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ جانتی ہے کہ میرے کیس میں پولیس سے مدد لینا مشکل ہے۔ اگر وہ مجھے اغوا کرنے والوں کے قبضے سے رہا کرانے میں کامیاب ہو گئی تو پولیس پکڑ لے گی اور یہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے سے بدتر صورت ہو گی۔ نہیں، رابعہ ایسی حماقت نہیں کر سکتی۔ ایک آخری صورت یہ تھی کہ وہ تعاقب کرے۔ محسن ہوتا تو یہی کرتا لیکن رابعہ یہ کیسے کر سکتی ہے۔

"ڈکی! میں کہتا ہوں نکل چل۔" پانے نے اچانک کہا۔ "یہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

ڈکی نے اسے گالی دی۔ "ایسے ہی بھاگ جائیں؟ استاد گولی کو چھوڑ کر؟"

"یہاں بیٹھ کے ہم استاد گولی کے لیے کون سی توپ چلا دیں گے؟" بونٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"تجھ میں ہمت ہے تو جا کے دیکھ آ۔ مگر ہم بتا دیتے ہیں کہ تیرا بھی صرف دس منٹ انتظار کریں گے۔" پانا بولا۔

"اور خود میں ہمت نہیں ہے تو چل۔ یہاں کھڑے رہے تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔" بونٹ نے کہا۔

"آدمی ہمارے پاس ہے۔" پانا بولا۔ "خود باہر ہوں گے تو استاد گولی کے لیے کچھ کر سکیں گے۔ اس کی بیوی سے بات کریں گے کہ شوہر چاہیے تو گولی دے جاؤ۔"

"اپنی بولتے جا رہے ہو....." اس نے دونوں کو ایک [illegible] سے نوازا۔ "استاد گولی نہ آیا تو ہماری بھی خیر نہیں۔ وہ ہمیں [illegible] دے گا۔ اور اس کو مار کے بھی تم کو کیا ملے گا؟ دس دشمن [illegible] گے۔ بیوی بچوں سمیت چھپتے پھرو گے۔ ساری غلطی استاد [illegible] کہ اس کی باتوں میں آ گیا۔"

"ڈکی! میں پانچ منٹ اور دوں گا۔" بونٹ نے کہا۔ [illegible] پھر تجھے چلنا پڑے گا۔"

ڈکی نے اس کے لہجے کی خطرناک دھمکی کو محسوس کیا۔ [illegible] پھر بھی میں نے بات نہ مانی؟"

"تیرا تو باپ بھی چلے گا۔" بونٹ نے ریوالور میری پسلی [illegible] وہ شاید ڈکی پر اسے تان چکا تھا۔ پلنے نے بھی ریوالور میری پسلی [illegible] تھا۔ ان دونوں کو بغاوت پر آمادہ دیکھ کر ڈکی خونخوار نظروں [illegible] انھیں گھورنے کے سوا شاید کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ مسلح تھے اور [illegible] پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوگا۔ عہد [illegible] اور ذاتی سلامتی کے دوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہوگا کہ ترجیح [illegible] دے۔ وہ سب اندرونی و بیرونی دباؤ کا شکار تھے۔ میرے [illegible] ان کے جذبات میں شدت آتی جا رہی تھی۔

ابھی پانچ منٹ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ڈکی [illegible] اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی۔ انجن تھوڑا سا غرایا اور پھر [illegible] گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی اور سیدھی چلتی گئی۔ پھر [illegible] کے رک گئی۔

"اس سے پوچھو استاد کیوں نہیں آیا۔" ڈکی نے [illegible] کر میرے سر پر مکا مارا۔

"میں... میں تو تمھارے ساتھ ہی ہوں۔ جتنا تم [illegible] سکتے ہو اتنا ہی میں بھی بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے غیب تو ہے نہیں۔ کیا معلوم کیا ہوا؟"

اس مرتبہ بونٹ نے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ [illegible] ہے وہاں کیا ہوا ہوگا۔"

"تو نے اس پیغام کے بہانے کچھ اور لکھا تھا۔ [illegible] اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح مکے بازی میں شریک ہو [illegible]

"اس... اس میں کیا تھا....." میں نے کراہ کے کہا [illegible] دیکھا تھا۔ تھی ایسی کوئی بات؟"

"کوئی بات ضرور ہو گی۔ کوئی خفیہ اشارہ ہوگا۔" ڈکی نے [illegible] "جسے وہ حرافہ سمجھتی ہو گی۔"

"میرے متعلق تم جو چاہو کہو۔" میں نے کراہ کے کہا [illegible] کے متعلق بات کرتے وقت زبان کو قابو میں رکھو۔ میں [illegible] تمھاری مدد کرتا رہا ہوں اور میں نے تمھیں کسی مزاحمت

ہزار دینے کا وعدہ بھی اس لیے کر لیا تھا کہ تم کنگال ہو۔ بہت گھٹیا درجے کے بدمعاش ہو جن کو بدمعاش کہنا بھی بدمعاشی کی توہین ہے۔ تم شہدے اور لفنگے ہو۔ اچھا ہوتا اگر تم جلتے اور پکڑے جاتے۔ اس مار پیٹ سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ کسی کو باندھ کے مار ڈالنا بھی کوئی بہادری نہیں ہے لیکن کسی بہادر آدمی کو مارنے کے بعد نتائج کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ میں تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں اور وہ عورت جو میری بیوی ہے، یہ بات جانتے ہوئے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ جو شخص گیارہ قتل کر چکا ہو وہ تو پھانسی کے تختے کو بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ تم نے کبھی قتل کیا ہے؟ پھانسی چڑھنے کی ہمت ہے؟ تمھاری بیویاں تمھارے ساتھ سولی چڑھ سکتی ہیں؟"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بزدل تھے۔ میرے پُر اعتماد لہجے نے ان کے حوصلے کو بالکل پست کر دیا۔ انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ پہاڑ کے دامن میں پڑے ہوئے کنکر ہیں۔ ان کے مقابل گیارہ قتل کرنے والا، چوری ڈکیتی اور ہر قسم کے جرائم میں ملوث ایک مفرور اشتہاری مجرم تھا۔ وہ خود کچھ بھی نہیں تھے۔ اپنی بیویوں کا تصور کر کے ان کی حالت غیر ہو گئی۔ انھیں یقیناً میری بیوی پر رشک آیا ہوگا۔

"یہاں سے چلو۔" میں نے کہا۔ "پھر دیکھتے ہیں اب کیا قدم اٹھایا جائے۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔ جب ہم زبان دیتے ہیں تو اس پر قائم بھی رہتے ہیں۔ دھوکا دے کر نہیں مارتے۔ میں اسے فون کرتا ہوں۔"

"تمھارا دماغ خراب ہے۔" ڈکی نے کہا۔ "کہاں سے فون کرو گے اپنی بیوی کو؟ ہمارے پاس تو کوئی فون نہیں۔"

"پھر میں اس کے نام دوسرا پیغام دوں گا۔" میں نے کہا۔

ڈکی نے مجھے ایک اور گالی دی..... "اب چاہتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی جائے اور لوٹ کر نہ آئے۔ ایک ایک کر کے ہم سب جائیں اور پھنس جائیں۔" لیکن اس نے مجھے مکا نہیں مارا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "پیغام رسانی کے دیگر ذرائع بھی ہیں میرے پاس۔ مثلاً میں وائرلیس پر بات کر سکتا ہوں۔ میری کلائی گھڑی دیکھی ہے تم نے؟ اس سے سگنل نشر ہوتا ہے۔"

جھوٹ ہونے کے باوجود اس بات نے ان کو یقین کرنے پر مجبور کر دیا کیونکہ جاسوسی قصے کہانیوں میں اور فلموں میں وہ پین مارچ ریوالور، گیس لائٹر، فلم کیمروں اور سگریٹ کیس ٹرانسمیٹرز جیسی حیرت انگیز ایجادات کے بارے میں دیکھ اور پڑھ چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مجرم اور پولیس دونوں ایسی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔

"لیکن... وہ گھڑی تو استاد کے پاس تھی۔" ڈکی نے کہا۔

"استاد اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا ہوگا۔" پانے نے کہا۔ "وہیں ہو گی۔"

"مگر استاد نے کہا تھا کہ لوٹ کر وہاں نہیں جانا ہے۔" بونٹ نے انھیں یاد دلایا۔

"اگر استاد واپس آتا تو ہم اسے وہاں ملتے جہاں اس نے کہا تھا۔" ڈکی نے کہا۔ "مگر وہ آیا ہی نہیں تو... پھر ہم وہیں چلتے ہیں۔"

گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہوئی۔ انتظار ختم ہو گیا تھا اور ان کے شکوک اب یقین کی صورت اختیار کر گئے تھے کہ استاد گولی کسی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ ان کے یقین میں میرا یقین بھی شامل تھا مگر مجھے اس کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ بیس منٹ میں ہم پھر وہیں جا پہنچے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ مجھے اندر لے جا کر انھوں نے میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ ڈکی اور بونٹ دو ریوالور لے کر پھر میرے مقابل کھڑے ہو گئے اور پانے نے میرے ہاتھ پیر کھول دیے۔ میں نے ہاتھوں کی کلائیوں اور ٹخنوں کو رگڑا اور اطمینان سے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میں سگریٹ مانگنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سب اس بری طرح چونکے جیسے دستک دینے والا پولیس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان کی گھبراہٹ اور بدحواسی، خوف اور افراتفری اور چہروں پر اڑنے والی ہوائیاں دیکھ کر مجھے ہنسی آئی مگر میں ضبط کر گیا۔

"یہ..... یہ کون آ گیا یہاں؟" ڈکی نے کہا۔ "استاد گولی؟"

"استاد تو یہاں نہیں آ سکتا۔" پانے نے کہا۔ "اور پھر اتنی جلدی؟"

"ہو سکتا ہے ہمیں روانہ ہوتے دیکھ کر وہ ٹیکسی میں چل پڑا ہو۔" بونٹ نے کہا۔ دستک پھر ہوئی۔

ڈکی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی ہمارا تعاقب کرتا ہوا آیا ہے۔ میں اس کو نشانے پر رکھتا ہوں۔ تم دروازہ کھولو مگر ایک دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو اور ریوالور ہاتھ میں رکھے۔"

بونٹ نے دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کر ریوالور سنبھال لیا۔ پلنے نے دروازہ کھولنے سے پہلے کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں پلنے۔ استاد گولی۔" باہر سے آواز آئی۔ ایک دم ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔ مایوسی اور پریشانی کی جگہ مسرت نے لے لی اور وہ احتیاط کے سارے تقاضے بھول گئے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک ویٹر اندر آیا جو ہوٹل فاران کی وردی میں تھا۔ اس کے پیچھے رابعہ نمودار ہوئی جس نے ریوالور کو ویٹر کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ وہ سب انتہائے حیرت سے منجمد ہو گئے۔ کیونکہ ویٹر کی وردی میں استادِ محترم تھے۔ اب میرے لیے صبر و تحمل کا مزید مظاہرہ بے کار

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے سر کے بل فرش پر قلابازی کھائی اور میرے دونوں پیر ڈکی پر پوری قوت کے ساتھ پڑے۔ وہ پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ پھر اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ وہ بلبلایا مگر میں نے اُسے مُہلت نہ دی۔ پے در پے ٹھوکروں سے میں نے اُسے نیم جان کر دیا۔

"میں گولی مار دوں گا۔" بونٹ چلایا۔

"مارو۔" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے استاد کے دو ٹکڑے کر دوں گی میں۔ ریڑھ کی ہڈی توڑ دوں گی۔"

استاد گولی کی حالت قابلِ دید تھی۔ ریوالور کی نوک اس کی کمر میں گڑ رہی تھی۔ اور وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈکی فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ رابعہ کو اپنی پناہ میں لے کر میں نے آگے قدم بڑھایا۔

"کیا خیال ہے اب؟" میں نے کہا۔ "پولیس کے پاس چلیں؟ کانے کی اولاد پانے؟ دس ہزار مل جائیں گے تمھیں۔ تم کیا احمقوں کی طرح دیکھ رہے ہو بونٹ کے بچے۔ ریوالور نیچے ڈال دو۔ اور چلو سب لائن بناؤ۔"

بونٹ نے جان کی بازی لگا کے آخری کوشش کی اور ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کے حرکت میں آتے ہی میں غوطہ مار گیا تھا۔ گولی میرے سر کے اُوپر سے گزری۔ پھر میں نے جست لگائی اور بونٹ کو دبوچ لیا۔ پلک جھپکتے میں سر سے اوپر اٹھایا اور پانے پر دے مارا۔ وہ دونوں ایک ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ اسی وقت استاد گولی نے بھی ہمت کی اور بے بسی سے مارے جانے کے بجائے مقابلہ کر کے مرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اچانک پیچھے لات چلائی اور نیچے گر گیا۔ رابعہ نے گولی بعد میں چلائی۔ استاد گولی کی ایڑھی رابعہ کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تھوڑا سا چلائی اور میں نے استاد گولی کو اٹھ کے حملہ آور ہوتے دیکھا۔ "تم ہٹ جاؤ رابعہ۔" میں نے چلا کر کہا۔ اس وقت میں یہ بھول گیا کہ مجھے اس کا نام نہیں لینا چاہیے تھا لیکن یہ بات کسی نے نوٹ نہیں کی۔ میں نے جمپ لگائی اور اُڑتا ہوا گیا۔ فلائنگ کک اتنی زبردست تھی کہ استاد گولی ایک دھماکے سے چت ہوا۔ پانا اور بونٹ پھر ہمت کر کے کھڑے ہو گئے تھے لیکن اب میں آزاد تھا اور ایکشن کی فارم میں تھا۔ میں نے ان کو نمونے کے طور پر جالاکم بے دم زیادہ کیا۔ کراٹے کے وہ داؤ جو بے ضرر تھے انہیں ادھر سے اُدھر گھمانے، اڑانے، اچھالنے اور لٹانے اور گمن چکر بنانے میں کام آئے۔ وہ تینوں ایسے پٹ رہے تھے جیسے وہ جوان صحت مند نہیں بچے ہیں۔ ان کے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جو شخص بے بسی کے ساتھ ان کا قیدی بنا رہا تھا وہ خالی ہاتھوں سے ان کی کیا دُرگت بنا سکتا تھا۔ دس منٹ بعد وہ سب اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ ان میں سے کسی کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کسی کا خون نہیں بہا تھا اور کسی کا جوڑ نہیں ہلا تھا۔ مگر وہ بالکل بے جان سے فرش پر لیٹے ہانپ رہے تھے اور مجھے رحم کی التجا بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"چلو اٹھو سب ... فوراً۔ میں تین تک گنوں گا۔" میں نے کہا۔ "دیوار سے لگ کر ہاتھ اوپر کر لو۔ ایک ..."

وہ ہائے ہائے کرتے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ریوالور اب جیب میں رکھ لیا تھا۔

"استاد گولی! کتنا پیسہ ملا؟" میں نے کہا۔ "دس ہزار کہ پندرہ ہزار نکالو۔"

استاد گولی نے کانپتے ہوئے وردی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور براؤن رنگ کا ایک لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے رابعہ کی طرف اچھال دیا۔ "ایک گولی کتنے کی آتی ہے؟" میں نے کہا۔ "مثلاً اس ریوالور کی گولی جو تمہاری جان لے گی۔ تم نے کبھی سوچا تھا کہ ایک ذرا سی گولی قیمت میں تمہاری جان کے برابر ہو سکتی ہے؟ گیدڑ کی شامت آتی ہے نا تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ تمہاری شامت آئی تھی کہ تم نے ہوٹل فاران کا رُخ کیا۔ اور موت آئی تھی کہ مجھ پر ہاتھ ڈالا۔" میں نے اس کے گال پر دو طمانچے رسید کیے۔ "کتے، گلی کے آوارہ کتے شیر پر بھونکنے لگے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے گولی مارنے کی دھمکی دیتے تھے مجھے؟" میں آگے بڑھ گیا۔ "اور یہ سور کا مامعوں نے مجھے بندھا ہوا دیکھا تو زورِ بازو آزمانے لگے۔" میں نے پے در پے ان کے کئی رسید کیے۔ وہ بلبلا کے نیچے گر گئے لیکن میں نے ان کو پھر کھڑا کر دیا۔ ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

"پرنسس! ان کی جیب میں جو کچھ ہے سب نکال لو۔" میں نے کہا اور رابعہ نے آگے بڑھ کے ایک ایک کی جیب خالی کرنی شروع کی۔ مجموعی طور پر ان کی جیبوں سے تیرہ سو روپے نکلے۔ لیکن زیادہ اہم وہ کاغذات تھے جن سے ان کے نام پتے اور ان کے متعلق دوسری معلومات حاصل ہوتی تھیں۔

"تم لوگوں سے کیا کہا تھا میں نے؟" میں نے کہا۔ "اکثر لوگ میری بیوی کو عورت سمجھ کے کمزور اور ناقص العقل فرض کر لیتے ہیں اور پھر اسی طرح مارے جاتے ہیں جیسے تم لوگ مارے گئے۔"

رابعہ نے مجھے گھور کے دیکھا اور میں بے اختیار ہنسا۔ یہ بات ہم دونوں کے سوا کوئی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے خیال میں یہ کامیابی اور غرور کی ہنسی تھی جب کہ میں رابعہ کے گھورنے پر ہنسا تھا۔ رابعہ پر میرے فخر کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ "اوئے گیدڑ کے بچو! اب جب کوئی نشانہ بناؤ تو شیرنی کے انتقام سے ڈرو۔" میں نے کہا۔ "ہے تم چوہوں میں سے کسی کی بیوی ایسی؟ یہ تو اکیلی ہی کافی تھی تمھیں۔" کچھ میں کہہ رہا تھا وہ ایک بے پایاں مسرت کا ردِ عمل تھا۔ کیونکہ رابعہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کے ذہین، حاضر دماغ اور جرأت مند ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تو اس کے لیے آزمائش کو بہت سخت جانا تھا مگر اس نے خود کو میری رفاقت کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی شرمندہ کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے اب انھیں معاف کر دو۔" رابعہ نے کہا۔ "بہت سزا مل گئی۔ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"کیسی غلطی ڈارلنگ؟" میں نے پہلی بار رابعہ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔

"یہی اپنی اوقات فراموش نہ کرنے کی۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو معاف کر دیتے ہیں۔" میں نے وسیع القلب شوہر کی طرح کہا۔ "دے دو ان کے پیسے انھیں۔"

رابعہ نے براؤن لفافہ آگے بڑھایا۔ وہ سب ساکت و صامت کھڑے ایک دوسرے سے نظریں چُراتے رہے۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے لفافہ پکڑنے کی جرأت نہیں کی۔ وہ کیسے یقین کر سکتے تھے کہ اتنی پٹائی کے بعد انھیں یہ انعام ملے گا۔ ان کے دل میں تو یہی خیال آیا ہو گا کہ ہم پھر کوئی جان لیوا مذاق کر رہے ہیں۔ اور کسی نے ہاتھ بڑھایا تو اور پٹے گا۔

"لے لو۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "تمھیں ضرورت ہے۔ پرنسس! لفافہ نیچے رکھ دو۔"

رابعہ نے لفافہ نیچے رکھا اور میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی طرح بُت بنے کھڑے رہے۔

"آئندہ بھی کبھی پیسے کی ضرورت پڑے تو آ جانا۔" میں نے کہا۔ "ضرورت میں آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی کام کے لیے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا اس بات کا مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ میں ان کو اپنے "گروہ" میں شرکت کی دعوت دے رہا تھا۔ اس بات کے تو وہ قائل ہو چکے تھے کہ لاہور کا سب سے بڑا اور خطرناک ترین بدمعاش میں ہوں۔ میری دہشت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی اور میں انھیں اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا۔

"جو ہمارے کام آئے وہ نقصان میں نہیں رہتا۔" میں نے بدمعاشوں کے پُرغرور لہجے میں کہا۔ "جیسے ہم سے ٹکرانے والا فائدے میں نہیں رہتا۔ جتنا پیسہ ضرورت پڑے گی، ملے گا اور ہم حفاظت بھی کریں گے۔ تم سب کے نام پتے ہم ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ویسے بھی ایک بار شکل دیکھ کے ہم آدمی کو ایسے نکال لیتے ہیں جیسے کنویں میں ڈوبا ہوا ڈول۔ یہ جگہ بھی دیکھ لی ہے ہم نے۔ پرنسس! تم چل کے اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔"

"پرنسس کے سامنے میں یہ وردی نہیں مانگ سکتا تھا۔" میں نے استاد گولی سے کہا۔ "یہ ہوٹل فاران کی ہے اور ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کی کوئی چیز نہیں اٹھاتے۔"

"لیکن ... میں ..." استاد نے بمشکل تمام تھوک نگل کے کہا۔

"تمہارے ساتھ تین آدمی اور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ لا دیں گے تمھیں۔ یہاں کون دیکھنے والا ہے اپنوں کے سوا۔"

جب استادِ محترم نے شاگردانِ عزیز کے سامنے ویٹر کی وردی میرے حوالے کی تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بلاشبہ زمین شق ہو جاتی تو وہ اس میں سمانا پسند فرماتے۔ پہلے ہی ان کی کیا کم خاطر تواضع ہوئی تھی کہ چلتے چلتے میں نے ان کی عزت بھی اتار لی۔ وہ ایک کونے میں دبک کر اور منہ چھپا کے بیٹھ گیا۔

"میری بیوی کو حرافہ کس نے کہا تھا؟" میں نے وردی کو سمیٹ کر گولا سا بنا لیا۔ "تم نے؟" میں نے چٹکی بجا کے ڈکی کو متوجہ کیا جو اَب اٹھ بیٹھا تھا۔ "باہر جاؤ۔ گاڑی میں پرنسس بیٹھی ہیں۔ ان سے کہو کہ میں آپ کو حرافہ کہنے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں کُتا ہوں۔"

یہ بہت سخت سزا تھی۔ ڈکی جیسے مرد کو جو خود کو بدمعاش سمجھتا تھا، ایک عورت کے سامنے حاضر ہو کے معافی ہی نہیں مانگنی تھی، اپنے آپ کو کتا بھی کہنا تھا۔ خود اپنی تذلیل اس حد تک کرنا بہت مشکل کام تھا۔ چنانچہ وہ بیٹھا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ "جاتے ہو یا میں دوسرے طریقے سے لے جاؤں۔ کتے کی طرح گلے میں پٹا ڈال کے گھسیٹتا ہوا۔" میں نے ویٹر کی وردی میں سے چمڑے کی بیلٹ نکالی اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ یوں آگے بڑھا جیسے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہا ہو۔

"اتنا اونچا کہنا کہ میں سُن لوں۔ ورنہ مجھے پرنسس سے تصدیق کے لیے آنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی لیکن اسے مرعوب اور دہشت زدہ کرنے اور نفسیاتی طور پر مزاحمت کے ناقابل بنانے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ وہ گیا اور پھر اندر آ کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اپنے باپ کو دفنا کے آیا ہو۔

"اب ہم جا رہے ہیں۔" میں نے بارعب آواز میں کہا۔ "تمہاری گاڑی کے ڈسٹری بیوٹر کیپ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ شور مچانے کی تمھیں اجازت ہے۔ سب سے پہلے تمہاری مدد کے لیے ہم ہی آئیں گے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شب بخیر۔"

جب ہم اس گیرج سے دُور نکل آئے تو مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں اتنا ہنسا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ اور رابعہ نے بھی جو گاڑی چلا رہی تھی ہنستے ہنستے کہا۔ "خدا کے لیے بس کرو۔ گاڑی قابو سے باہر ہو جائے گی۔" لیکن میں ہنستا رہا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ باتیں تو بہت تھیں لیکن میں نے صبح پر اٹھا رکھیں۔ اور گاڑی لاہور ہوٹل کی طرف مڑ گئی۔

"واقعی۔ جیسی رُوح ویسے فرشتے۔" میں نے کہا۔ "تم نے تو اس وقت وہ کمال کر دکھایا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے...."

"کیا جی چاہتا ہے؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے روانی میں پوچھ لیا۔

"بس چھوڑو۔ جو دل چاہتا ہے اسکا اظہار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "سنسر کے قوانین بہت سخت ہیں۔"

"بدتمیزی نہیں چلے گی جی۔" رابعہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ چشم تصور سے میں نے اس کا حیا آلود چہرہ دیکھا۔

"دل کے جذبات کا اظہار کرنا بدتمیزی ہے یا نہ کرنا؟" میں نے کہا۔ "چلو یوں کرو، تم آج لاہور ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" رابعہ نے میری بات کا بالکل مختلف مطلب نکال کے کہا۔

"نہیں۔ بقائمی ہوش و حواس یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "لاہور ہوٹل کا یہ مطلب نہیں کہ میرے ہی کمرے میں۔ بھئی وہاں اور بھی کمرے ہیں۔ اور نہ ہوں تو کیا، کوئی فیملی سوئٹ مل سکتا ہے جس میں ہم ایک رات تو گزار سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان شرافت کی وہی دیوار حائل رہے گی جو اب تک رہی ہے۔ کیا میں شریف آدمی نہیں ہوں؟"

"اونہوں۔ تم نے ابھی خود کو سب سے بڑا بدمعاش ثابت کیا ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"خطرے کی بات تو نہیں۔ لیکن احتیاط بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تم فاران ہوٹل نہ جاؤ کیونکہ وہاں محسن بھی نہیں ہے، میں اپنے ہوٹل سے تمہارے ہوٹل ٹیلی فون کر دیتا ہوں کہ کوئی مہمان آئے تو نام پتا لے لیا جائے اور پیغام آئے تو لاہور ہوٹل میں ڈاکٹر امجد کو دے دیا جائے۔ محسن کی کال آئی تھی۔"

"آئی ہو گی تو ریسیو کرنے والا کوئی نہیں تھا۔" رابعہ نے کہا۔ گاڑی اس نے لاہور ہوٹل کے باہر روک دی اور میں اس کے ساتھ ریزرویشن آفس تک گیا۔

"ڈاکٹر امجد کے نام کوئی پیغام؟" میں نے کہا۔ "کسی ملاقاتی کا یا..."

"ایک فون آیا تھا اسلام آباد سے۔" کاؤنٹر کلرک نے ایک خانے میں سے کاغذ کا پرزہ اٹھایا۔ "صبح پھر بات کریں گے۔ کوئی نواب ننھے خاں صاحب تھے۔" اس نے مجھے کمرے کی چابیاں تھمائیں۔

"میری وائف آئی ہیں لندن سے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کمرہ بدلنا ہے۔ کوئی فیملی سوئٹ مل سکتا ہے؟"

"یور آر لکی سر۔ ابھی کچھ دیر پہلے ایک ائیر کنڈیشنڈ سوئٹ خالی ہوا ہے۔" بکنگ کلرک نے رجسٹر دیکھ کے کہا۔ "اس کے چارجز کچھ زیادہ ہیں... مگر وہ ہمارا سب سے اچھا سوئٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پورٹر سے کہو میرا سامان شفٹ کر دے۔" میں نے کہا اور مجھ سے پہلے رابعہ نے ہینڈ بیگ سے دو ہزار روپے نکال کر بکنگ کلرک کے سامنے ڈال دیے۔ سامان شفٹ ہونے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ یہ سوئٹ واقعی شاہانہ تھا۔ اس میں کنگ سائز بیڈ کے علاوہ ایک کمرہ ملاقاتیوں کے لیے تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا اور ایک سینٹر ٹیبل۔ اس میں چار افراد کے لیے کھانے کی گول میز تھی۔ فرش پر وال ٹو وال کارپٹ تھا اور بیڈ سائیڈ پر ایک چھوٹا سا ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ جتنی دیر میں میں نے غسل کیا، رابعہ نے کافی اور سینڈوچ منگوا لیے۔ شاندار باتھ روم میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ اور اس وقت گرم پانی سے غسل ایک نعمت ثابت ہوا۔ جس نے میری ساری تھکن دور کر دی۔ رابعہ نے صرف ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا۔

"کیا بدبختی کی انتہا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوچا کیا تھا، کیا ہو گیا۔ ایسا خوبصورت پروگرام بنایا تھا کہ رات کا کھانا تمہارے ساتھ چاندنی لاؤنج میں کھاؤں گا۔ یا کینڈل لائٹ ڈنر ہو گا جہاں صرف میں اور تم ہوں گے۔ اور اس کے بعد راوی میں بوٹنگ کریں گے کامران کی بارہ دری تک۔ قسمت کہاں لے گئی، ایک گیرج میں جہاں کھانے کو گالیاں ملیں اور تھپڑ ملے۔ ایک تو عشق کی مار۔ دوسری دردِ فرقت کی مار۔ تیسری بھوک کی مار اور چوتھی استاد گولی، بونٹ، ڈکی اور پلسنے کی مار۔"

رابعہ ہنسی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ویٹر نے ناک کیا اور اجازت ملتے ہی اندر آگیا۔

"کھانا تو تم نے بھی نہیں کھایا ہو گا؟" میں نے ٹرے کو غور سے دیکھا۔ "یہ تو بہت کم ہے۔" پھر میں ویٹر سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو اتنا ہی اور لاؤ۔ ذرا جلدی۔ اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو۔" ویٹر نے "یس سر" کہا اور غائب ہو گیا۔

"تم کو مایوسی تو بہت ہوئی ہو گی مجھے غائب پا کے۔" میں نے سینڈوچوں پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ "سمجھا ہو گا کہ میں پھر موقع محل کا خیال کیے بغیر کوئی مہم سر کرنے نکل گیا؟"

"نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاؤ گے۔"

وہ بولی اور ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔

"بالکل ٹھیک سوچا تھا تم نے۔ بخدا فرشتۂ اجل بھی آتا تو میں تھوڑی سی مہلت مانگتا کہ اک نظر اسے دیکھ تو لوں۔" میں نے کہا۔

رابعہ کے چہرے پر حیا کا رنگ بادل کے سائے کی طرح آیا اور گزر گیا۔ "میں بہت فکرمند ہو گئی تھی۔ میں کچھ دیر تو اسی امید میں کھڑی رہی کہ تم آ جاؤ گے۔ شاید سگریٹ وغیرہ لینے نکل گئے ہو کیونکہ چابیاں گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ پندرہ منٹ بعد میں نے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ اگر کسی نے زبردستی تم کو اغوا کیا ہوتا تو یہ بھی ایک حادثہ کہلاتا۔ کوئی نہ کوئی مجھے بتا دیتا لیکن کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ دوسری جانب ایک شخص نے صرف اتنا کہا کہ حادثہ تو ہوا تھا۔ ایک اسکوٹر والا کار سے ٹکرا گیا تھا مگر اللہ نے فضل کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔ میں آدھے گھنٹے تک پریشان رہی پھر کمرے میں لوٹ آئی۔"

"اور بستر پر لیٹ کر رونے لگی۔" میں نے کھاتے کھاتے لقمہ دیا۔ "ہوا تھا یہی کہ نہیں؟"

"جی نہیں۔" رابعہ جل کے بولی۔ "میں بہت خوش تھی چنانچہ بہت ہنسی اور پھر وہ گانا گانے لگی۔ تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا۔"

"اتنا پرانا! یہ تو غالباً تمہاری وہ.... میرا مطلب ہے نانی، دادی گاتی ہوں گی تقسیم سے پہلے۔" میں نے کہا۔ "جیسے میرے ابا گاتے تھے۔ چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔"

رابعہ ہنسی۔ "خیریت سے لوٹ آئے ہو تو شوخی سوجھ رہی ہے۔ یہاں میری جو حالت ہو رہی تھی، اس کا اندازہ ہے؟"

وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی اور اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے سینڈوچ رکھ دیا۔ رنج والم کا وہ غبار جو اس کے دل میں جمع تھا آنسو بن کے گھلتے ہی بہنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"ارے پاگل۔" میں نے کھانا چھوڑ کے اس کے دونوں ہاتھ ہٹائے۔ "رو رہی ہو۔ اس وقت تو اتنی ہمت سے ساتھ نبھایا اور اب رونا تو جب وقت گزر گیا ہے۔ خدا کی قسم رابعہ، میں اپنے دل کی کیا کہوں۔ الفاظ میں وہ کیفیت کیسے بیان ہو سکتی ہے۔ میری نظر میں تو تم تھیں۔ تمہارا وہ روپ جس کی یہ آنکھیں منتظر تھیں۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا تھا مجھ پر جو تقدیر نے کیا۔ اس زرد پھولوں والی نیلی ساڑی میں تم کو محوِ انتظار تصور کرتا تھا تو میرے دل پہ آرے چلنے لگتے تھے اور جگر کا خون آنکھوں میں آ آتا تھا۔ مگر میں نے اسے بھی ایک آزمائش سمجھ کے قبول کیا۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم نے دو گھنٹے کسی چاندنی لاؤنج یا کینڈل لائٹ ڈنر میں گزار لیے ہوتے تو ہمیں زیادہ خوشی ملتی یا اب چند گھنٹے کی جدائی کے بعد پھر مل کے حاصل ہوئی ہے۔ یہ خوشی کتنی بڑی، کتنی سچی اور انمول ہے۔ یہ رات ہماری محبت پر ایک اور صداقت کی مُہر ثبت کر گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ نہ ایک دوسرے کے بغیر مر سکتے ہیں اور نہ جی سکتے ہیں۔"

آہستہ آہستہ اس کے آنسو تھم گئے۔ پھر ویٹر دستک دے کر اندر آگیا اور میں تھوڑا سا خفیف ہو کے اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ویٹر نے مہذب ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے میاں بیوی کے "جھگڑے" کے متعلق بالکل تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن یہ غور کیا کہ ایک ٹرے کو ناکافی سمجھنے کے باوجود ہم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ وہ دوسری ٹرے رکھ کے نکل گیا تو میں نے رابعہ کو سینڈوچ پیش کیا۔ "رونے سے تمہارے دل کا اور آنکھوں کا غبار نکل گیا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "دُھل کے رنگ اور نکھر آیا ہے۔ چشم بد دور۔ اب کچھ کھا لو اور سلسلہ وہیں سے شروع کرو جہاں سے اشکوں کے سیلاب نے توڑا تھا۔"

وہ شرمیلے انداز میں مسکرائی۔ "تم ان لوگوں کے نرغے میں کیسے پھنس گئے تھے؟"

"پھنس گیا تھا! وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھو۔ کہاں چین سے لندن میں بیٹھا تھا۔ یہاں آ کے کہاں کہاں پھنس گیا۔" میں نے کہا۔ "کیوں اور کیسے کا جواب کوئی نہیں ہو سکتا۔ استاد گولی نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"میں نے بھی تمہاری تحریر پہچان لی تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "استاد گولی نے وہ ایک سطر کا پیغام پیش کیا تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔"

"اس میں تو گڑبڑ کا تذکرہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایس او ایس نہیں دیا تھا میں نے۔"

"اگر تم لکھتے کہ پندرہ ہزار دے دو۔" رابعہ بولی۔ "تو میں شک نہ کرتی۔ مگر اس میں تم نے لکھا تھا میری خاطر۔ اور یہی دو لفظ غیر ضروری تھے جو مجھے کھٹکے۔"

"میرا پھر وہی دل چاہتا ہے۔ مگر خیر۔" میں نے کہا۔ "تم نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا۔ یا میرے دل کی بات تمہارے دل نے سمجھ لی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا مقصد بھی اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے سامنے میں کیسے لکھتا کہ میری جان خطرے میں ہے۔ پھر وہ پیغام لے کر آتے ہوئے ڈرتے۔ میں نے ان کو تسلی دی تھی کہ پولیس کا چکر چھوڑو۔ تم خود چکر میں آ جاؤ گے۔ جاؤ اور میری بیوی سے دس کے پندرہ لے لو۔" میں نے کھانا ختم کیا اور کافی کا کپ لے کر بستر پر لیٹ گیا۔

"اور بہت تیر مارا تھا جناب نے یہ دعوٰی کر کے۔" وہ شرما کے ہنسی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔

"تیر بھی ماریں گے کسی دن۔ دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو دل پر تیر کھاتے بیٹھے ہیں۔ اس نے [illegible] گولی نے یہی کہا ہو گا تم سے۔ کہ آپ کے وہ منگا رہے ہیں؟"

رابعہ پھر ہنسی۔ "[illegible] نے کسی قسم کی [illegible] یا گھبراہٹ کا...."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اظہار کیا ہوتا تو وہ بھاگ جاتا۔ یا اپنی جان بچانے کے لیے میری جان لیتا۔ میں نے پیغام پر غور کیا اور اسے تشریف رکھنے کو کہا۔ اس سے پوچھا کہ سکندر صاحب خیریت سے تو ہیں۔ بولا، بالکل خیریت سے ہیں جی۔ بس وہ خود نہیں آسکتے تھے اس لیے مجھے بھیج دیا۔ میں نے کہا: 'تم دوست ہو ان کے؟' اور اس نے کہا: 'دوست کیا۔ خادم ہیں جی'۔ پھر میں نے پوچھا: 'یہ پندرہ ہزار کس لیے منگوائے ہیں انھوں نے؟' اور وہ بولا کہ 'ہوگی کوئی ضرورت۔ مجھے نہیں بتائی انھوں نے۔ بس یہ کہا تھا کہ وہ کوئی سوال کیے بغیر دے دیں گی۔'"

"وہ کون؟" میں نے شرارت سے کہا۔ "گویا میری زوجہ محترمہ۔ میں سمجھ گیا۔"

"اب تم شرافت سے نہیں سنو گے تو میں نہیں بولوں گی۔"

وہ لال ہو کے بولی "یہ منہ اور مسور کی دال۔"

"مسور کی دال؟" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "منہ تو خیر ٹھیک ہے۔ تم نے خود کو مسور کی دال کیسے سمجھ لیا؟ تم تو گھر کی مرغی ہو جو دال کے برابر ہوتی ہے۔ مگر دال کون سی ہوتی ہے۔ کلام کے ساتھ طعام جاری رکھو۔"

"وہ کچھ ڈرا ہوا تھا۔" رابعہ نے میرا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے جتنی دیر میں پندرہ ہزار نکالے اور گنے اتنی دیر میں ترکیب میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے بڑی شرافت سے چائے کے لیے پوچھا اور اس کے انکار کے باوجود گھنٹی دبا دی۔ وہ نروس تو ہوا تھا لیکن ویٹر کے آتے ہی میں نے نظر اٹھائے بغیر اسے فوراً چائے لانے کو کہا تو استاد گولی کے ذہن سے خطرے کا خیال ہی نکل گیا۔ میں نے نوٹ گننے کا عمل ذرا سست رکھا۔ ویٹر چائے لے کر آگیا تو میں نے استاد گولی سے کہا کہ چائے بنائے۔ اس نے مطمئن ہو کے ریوالور صوفے پر اپنے قریب رکھا اور چائے بنانے لگا۔ میں نے ویٹر کو روکا اور ڈانٹا کہ یہ کیا خالی چائے اٹھا لائے ہو۔ مہمان بیٹھے ہوں تو ساتھ کچھ کھانے کے لیے لانا چاہیے۔ ویٹر شرمندہ ہوا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد گولی نے اس کی طرف دیکھا اور اسے منع کر دیا۔ بس وہی ایک سیکنڈ تھا جب میں نے نوٹ پھینک کر جھپٹا مارا اور ریوالور پر قبضہ کر لیا۔ وہ اور ویٹر صدمے یا حیرت سے منجمد ہو گئے۔ استاد گولی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عورت جو اتنی شرافت کا سلوک کر رہی ہے اور نوٹ گننے میں مصروف ہے پلک جھپکتے میں کامیابی کو ناکامی میں بدل دے گی۔ میں نے کہا: 'اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ مجھے ریوالور چلانا نہیں آتا۔ کہو تو تمہارے کان کو اُڑا دوں؟' اس کی حالت غیر ہو گئی لیکن اس سے زیادہ ویٹر کو پریشانی ہوئی۔ میں نے اسے دروازے سے دُور ہو کے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ پھر استاد گولی سے مخاطب ہو کے میں نے کہا: 'ویسے تو میں تم کو پولیس کے حوالے بھی کر سکتی ہوں اور ہوٹل والے خود یہ کام کر سکتے ہیں مگر میں تم سے خود نمٹنا چاہتی ہوں۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ سکندر تمہارے پاس کیسے پہنچا؟' اس نے بتا دیا۔ پھر میں نے کہا: 'اس وقت وہ کہاں ہے؟' استاد گولی نے جواب دینے میں تاخیر کی تو میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے نشانہ لیا اور کہا: 'میں کسی تذبذب کے بغیر تم کو جان سے مار ڈالوں گی۔ میں اکیلی عورت ہوں اور تم ایک بدمعاش۔ ہوٹل میں مجھے لوٹنے کے لیے گھس آئے تھے۔ اس سے زیادہ سنگین الزامات بھی عائد کر سکتی ہوں میں اور ہوٹل والے میرے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔' ویٹر چلانے لگا کہ بیگم صاحبہ مجھے تو جانے دیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ خاموش کھڑا رہے تو بالکل محفوظ رہے گا۔ استاد گولی نے بتا دیا کہ سکندر ایک گاڑی میں میرے ساتھیوں کے ساتھ باہر موجود ہے اور پندرہ ہزار لیتے ہی ہم نیچے جا کے اُسے اتار دیں گے۔ میں نے کہا: 'اچھا، اٹھاؤ یہ پندرہ ہزار۔' اس نے پھر ایک امید میں پندرہ ہزار اٹھائے اور ایک لفافے میں ڈال لیے۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ گھنٹی بجا کے منیجر صاحب کو بلاؤ اور کہو بہت خطرناک معاملہ ہے۔ کسی کو بتائے بغیر میرے کمرے میں آجائیں۔" ویٹر نے تعمیل کی اور استاد گولی کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا نکلنا محال ہے۔ اس نے 'پرنس۔ تمہارے ..... شوہر نے دھوکا کیا ہے اور تم سمجھتی ہو طرح وہ بچ جائے گا۔ تم پندرہ ہزار تو بچا لو گی لیکن اس کی جان نہیں بچا سکو گی۔ اگر میں واپس نہ گیا تو اسے کوئی نہیں چھوڑے گا۔' میں نے کہا: 'تم اور ہم ایک ساتھ واپس جائیں گے۔ یہ سب کیوں ہوتے اتنی دیر میں منیجر حواس باختہ پہنچا اور دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی اس پر بجلی گری۔ اندر عجیب سنسنی خیز فلمی منظر تھا کہ میں ریوالور ایک اجنبی کو ہینڈز اپ کرائے کھڑی ہوں اور ویٹر تھر تھر کانپ رہا ہے۔ میں نے انگریزی میں بات کی تو استاد گولی کی حالت قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ کی ہر دھمکی رائیگاں گئی تھی اور وہ بڑی آسانی سے اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں ایسا پھنسا تھا کہ نکلنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ منیجر کے آنے کے بعد اسے کوئی اُمید نہ رہی۔ اب نہ وہ دھمکی سکتا تھا اور نہ فرار ہو سکتا تھا۔ میں نے منیجر سے کہا کہ کچھ لوگوں میرے شوہر ڈاکٹر امجد کو یرغمالی بنا لیا ہے۔ وہ لندن سے کراچی اور کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ ایئرپورٹ پر ان بدمعاشوں انہیں ٹیکسی میں بٹھا لیا اور اب ان کا ایک آدمی مجھ سے پندرہ روپے وصول کرنے آیا تھا جسے میں نے قابو کر لیا ہے۔ منیجر دم سنتا رہا اور پھر بولا کہ میڈم کو اس کیس میں خود کچھ کرنے کے بجائے پولیس کو طلب کرنا چاہیے۔ میں نے کہا: 'اگر کہیں پولیس میں گیا تو میرے شوہر کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ انھیں جان سے مار دیں گے۔' منیجر نے پوچھا: 'تو کیا آپ پندرہ ہزار دینا چاہتی ہیں؟' اور میں نے کہا کہ پندرہ ہزار تو میں دے چکی ہوں۔ آپ دیکھ لیں اس کی جیب میں موجود ہیں۔ اور منیجر نے دیکھا تو رقم برآمد ہو گئی۔ 'پھر اب کیا کرنا چاہتی ہیں آپ؟' وہ بولا اور میں نے کہا: 'مجھے اپنے شوہر کو چھڑا کے لانا ہے اور اس کام میں آپ میری مدد کریں گے۔' اس نے کہا: "مدد کیوں نہیں کروں گا میڈم آپ حکم کریں۔' میں نے کہا: 'ڈاکٹر امجد نیچے ہوٹل کے قریب ہی کسی گاڑی میں اس شخص کے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی اور انھیں ساتھ لے کر آؤں گی۔' منیجر نے کہا: 'یہ بہت خطرناک کام ہوگا میڈم۔' اور میں نے کہا: 'خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑے گا ورنہ یہ بدمعاش پندرہ ہزار روپے لے گیا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو مار دیا تو میں کیا کر لوں گی۔ ابھی تو میں اس کو گن پوائنٹ پر لے جاؤں گی۔ باہر میری اپنی گاڑی موجود ہے۔ یہ اسی میں جائے گا اور جب ڈاکٹر امجد کو چھوڑ دیا جائے گا تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔ وہ لوگ بھی نیچے کسی گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں لیکن نہ تو میں ان کی گاڑی پہچانتی ہوں اور نہ ان لوگوں کو۔' منیجر پریشان ہو گیا اور کہنے لگا۔

'میڈم معلوم نہیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ یہی کام پولیس بھی کر سکتی ہے۔ بے شک آپ کی ہمت اور جرأت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ آپ بہت غیر معمولی عورت ہیں کہ اپنے شوہر کی خاطر خود جان کی بازی لگا رہی ہیں لیکن میں کہتا ہوں یہ سب ضروری تو نہیں۔' میں نے کہا۔ 'منیجر صاحب، پولیس کو دیکھتے ہی انھوں نے میرے شوہر کو مار کے باہر پھینک دیا اور بھاگ گئے تو میں کیا کروں گی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہیں اور انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ ہمارا تو کوئی دشمن بھی نہیں اور یہ کام یقیناً بہت گھٹیا اور چھوٹے مجرموں کا ہے ورنہ وہ صرف پندرہ ہزار ہی کیوں مانگتے۔ پندرہ لاکھ مانگتے۔' منیجر نے کہا: 'اچھا بتائیے میں کیا کروں؟ لیکن بعد میں خدا کے لیے مجھے الزام مت دیجیے گا۔' میں نے کہا: 'آپ فکر مت کریں اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کا نام تک نہیں آئے گا اس کیس میں۔ بلکہ کسی کو معلوم تک نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر امجد کا اغوا ہوا تھا۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ایک ویٹر کی یونیفارم مجھے فراہم کر دیں۔' وہ اتنا حیران ہوا کہ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے وضاحت کی اور کہا: 'دیکھیے منیجر صاحب، یہاں سے میں کسی عام آدمی کے پیچھے ریوالور لے کر اور اسے ہینڈز اپ کرا کے نہیں جا سکتی۔ دس آدمی دیکھیں گے اور شک کریں گے۔ میں اس کو ویٹر کی وردی میں لے جاؤں گی۔ اس کے سر پر میرا سوٹ کیس ہوگا جسے یہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر رکھے گا چنانچہ اس کے دونوں ہاتھ تو خود ہی سر سے بلند ہوں گے۔ یہ آگے رہے گا اور میں دوپٹے کے نیچے ریوالور لے کر چلتی جاؤں گی۔ یہ گاڑی تک جائے گا۔ سوٹ کیس ڈکی میں رکھے گا تو چوکیدار کو بھی شک نہیں ہوگا۔ آپ میرے ساتھ گیٹ تک چلیں تا کہ کاؤنٹر پر کوئی مجھے چیک نہ کرے۔ پھر یہ گاڑی ڈرائیو کر کے لے جائے گا اور میں اس کے پیچھے والی سیٹ پر ریوالور لے کے بیٹھوں گی۔ آپ کا کام اور آپ کی ذمہ داری ختم۔ بعد میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہ آپ نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ کیا ہوا کیا نہیں ہوا، آپ کو کچھ معلوم نہیں۔" منیجر نے تھوڑی سی بحث کی مگر میں نے اسے قائل کر لیا۔ پھر اسی ویٹر کو کہا گیا کہ وہ اپنی وردی اتارے اور استاد گولی کو دے۔ خود استاد گولی کے کپڑے پہنے اور کمرے میں اس وقت تک موجود رہے جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔"

"پھر تو وہ غریب ابھی تک کمرے میں ہی قید ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور منیجر الگ پریشان ہوگا۔"

"استاد گولی کچھ پس و پیش کرنے لگا تو منیجر نے اس کے دو ہاتھ مارے اور کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو جان بچا کے نکلنے کا موقع مل رہا ہے۔" رابعہ بولی۔ "ورنہ لاش جاتی یہاں سے۔ اس نے باتھ روم میں جا کے کپڑوں کا تبادلہ کیا۔ اور میں نے اسے پھر منیجر کے سامنے پندرہ ہزار دیے۔ منیجر گواہ ہے اور ضرورت پڑنے پر استاد گولی کو پہچان سکتا ہے۔ میں نے ضروری کاغذات اور کپڑوں والا سوٹ کیس استاد گولی کے سر پر اٹھوایا اور ویٹر سے کہا کہ وہ چاہے تو کمرے کو مقفل کر کے جائے لیکن یہ نہ بھولے کہ آج جو کچھ اُس نے دیکھا یا سُنا وہ خواب تھا اور اس خواب کا وہ خواب میں بھی کسی سے تذکرہ نہ کرے۔ ہم یوں نکلے کہ آگے استاد گولی تھے، ہینڈز اپ اور لرزہ بر اندام، بالکل پیچھے میں تھی جس کے ہاتھ نے ریوالور کو دوپٹے میں یوں لپیٹ رکھا تھا کہ نالی کا رُخ مستقل استاد گولی کی طرف رہے۔ یہ بات ان پر واضح کر دی گئی تھی۔ منیجر نے اسے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ پرنس نے گولی مار دی تو ہوٹل والے کیا کہیں گے۔ ان کا مؤقف یہ ہوگا کہ کوئی بدمعاش ہوٹل کے بیرے کی وردی میں پرنس کا سوٹ کیس لے کر فرار ہو رہا تھا۔ روکنے پر اس نے مقابلہ کیا اور اپنے ہی ریوالور کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ پولیس بیان کا نہیں، رشوت کی زبان کا یقین کرتی ہے چنانچہ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ منیجر پریشانی کے باوجود 'یور ہائی نس۔ یور ہائی نس' کرتا بڑی شرافت سے گیٹ تک آیا اور لوٹ گیا۔ میں نے اس کو چابی دے کر سوٹ کیس ڈکی میں رکھوایا اور اس سے پوچھا کہ ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"اگر وہ انکار کر دیتا کہ نہیں آتی۔ پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر میں منیجر کو بلاتی اور اسے کہتی کہ مجھے ایک ڈرائیور چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن استاد گولی کی عقل مفلوج تھی۔ اس نے اقرار

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں سر ہلا دیا اور میں نے کہا۔ "گاڑی اسٹارٹ کرو اور ادھر ہی لے چلو جدھر تمہاری گاڑی ہے لیکن اس سے کچھ فاصلے پر روک لو۔ ہیڈ لائٹس آف رکھو اور اس وقت تک بیٹھے رہو جب تک تمہارے ساتھی مایوس ہو کے روانہ نہ ہو جائیں۔ میں ہوٹل کے سامنے ہی مار دھاڑ یا کشت و خون کا ڈراما نہیں چاہتی تھی۔ ان سب کا ٹھکانا بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ مشکل سے پانچ منٹ کے بعد آگے والی گاڑی چل پڑی۔ میں نے استاد گولی کو مناسب فاصلے سے تعاقب جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اور پھر بتا دیا کہ ذرا سی بھی بھول چوک ہوئی تو پیچھے سے کھوپڑی اڑا دوں گی۔ استاد گولی کے ساتھی محسوس ہی نہ کر سکے کہ کوئی ان کے تعاقب میں ہے۔"

"وہ استاد گولی کے نہ آنے سے بہت نروس تھے اور تقریباً خانہ جنگی کا شکار تھے۔" میں نے کہا۔ "صرف ایک تھا جو وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتا تھا۔ باقی مصر تھے کہ بھاگ چلو۔ انہی کی باہمی چپقلش میں میری تھوڑی سی ٹھکائی ہوئی لیکن تم کو کافی وقت مل گیا۔ اس کے باوجود تم نے آدھے گھنٹے میں بہت کچھ کر لیا۔ میرا دل پھر چاہتا.... خیر۔ آگے کہو۔"

"آگے کہنے کو کیا ہے۔" وہ خفا ہو کے بولی۔ "تم اپنے دل کے بریک ٹھیک رکھو جی۔ بار بار فیل ہو رہے ہیں۔ یہ نہ ہو مجھے سونے کے لیے واپس ہوٹل فاران جانا پڑے۔"

"تم جاؤ گی تو کیا مجھے نہیں جانا پڑے گا۔ منیجر قائل تو ہو کہ بہادر پرنسس کس طرح تن تنہا اپنے شوہر کو بدمعاشوں کے قبضے سے چھڑا لائی۔ ان میں سے ایک نے پرنسس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ ہم نے اسے معافی مانگنے کے لیے بھیجا تھا۔"

رابعہ بے اختیار ہنسی۔ "میں تو حیران رہ گئی اور ہنسی پر قابو نہ رکھ سکی جب اچھے خاصے ہٹے کٹے مرد نے چوہے کی طرح مریل آواز نکال کے کہا کہ پرنسس میں نے آپ کو حرافہ کہا تھا۔ میں کتا ہوں، مجھے معاف کر دیں۔ ہنسنے سے وہ اور خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا تم کون سے کتے ہو؟ دھوبی کے؟ یا وہ جو صرف بھونکتے ہیں کاٹتے نہیں؟ وہ احمقوں کی طرح کھڑا رہا۔ میں نے کہا، جاؤ اچھے کتے بن کے رہو۔ مالک کے وفادار۔ پاگل کتے کو لوگ گولی مار دیتے ہیں۔"

"اندر اس سے بھی دلچسپ منظر تھا۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "استاد گولی سے جب وردی اتروائی گئی تو شاگردان عزیز کے سامنے وہ سخت رسوا اور بے عزت ہوئے۔ چلتے چلتے میں نے استاد گولی کو گولی دی تھی کہ ہم ڈسٹری بیوٹر کیپ نکال کے لے جائیں گے جو ہم نہیں لائے۔ مگر ان کو صبح معلوم ہوگا جب وہ گاڑی چلانے کے لیے دوسری ڈسٹری بیوٹر کیپ لائیں گے اور سخت جھنجلائیں گے کہ گاڑی بالکل ٹھیک اور قابل استعمال تھی۔ وہ خواہ مخواہ رات بھر خوار ہوتے۔"

"دو بج رہے ہیں۔" رابعہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تم کو آرام کی ضرورت ہے؟"

"ضرورت تو ہے لیکن نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "دل چاہتا ہے تم ایسے ہی بیٹھی رہو اور باتیں کرتی رہو۔"

"باتیں لیٹ کر بھی کی جا سکتی ہیں۔" وہ بولی۔ "میں تو تھک گئی ہوں۔"

"اچھا۔ تو تم یہاں لیٹو۔" میں نے بستر سے اٹھ کے کہا۔

"اور... تم کہاں جاؤ گے؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"جانا کہاں ہے اس وقت۔" میں نے کہا۔ "یہیں لیٹ جاؤں گا........ میرا مطلب ہے نیچے۔ کارپٹ پر۔"

"صوفہ جو گھسیٹ لاؤ یہاں۔" رابعہ نے کہا۔

"یس۔ یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور دوسرے کمرے سے محنت کے بعد صوفہ گھسیٹ لایا۔

"تمہارے قد کے اعتبار سے تو یہ جھولا بہت ناکافی ہے۔" رابعہ مسکرائی۔

"اس کی تو مجھے فکر نہیں۔" میں نے کہا۔

"صبح اس کے آنے سے پہلے ہی صوفہ واپس ٹھکانے پر رکھ دینا۔" رابعہ نے لائٹ آف کی اور بیڈ سائڈ لیمپ جلا دیا۔ کمرے میں مدھم نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ باہر سردی تھی لیکن کمرے کے ایئر کنڈیشنر نے بڑی خوشگوار حرارت پیدا کر دی تھی۔ دو میں سے ایک کمبل میں نے لیا اور سر کو صوفے کے بازو پر رکھ کے لیٹ گیا۔

"ایسی پرسکون رات میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔" میں نے سگریٹ جلا کے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آگ اور دھواں تو چھوڑو خدا کے لیے۔" رابعہ نے سگریٹ میرے لبوں سے چھین کر پھینک دی۔

"ارے رے...." میں اٹھ کے دوڑا۔ "کارپٹ جل جائے گا۔ ابھی سے یہ فوجداری کنٹرول۔ ایسے ہی حالات میں کہا ہوگا کسی نے کہ۔ اکبر ڈرے نہیں کسی سلطان کی فوج سے۔ لیکن شہید ہو گئے بیوی کی نوج سے۔" میں سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھا کے پھر وہیں آ گیا۔ اپنی نظر کو میں نے رابعہ کے چہرے سے بھی دور رکھا جو اس خاموشی، اس ماحول اور اس روشنی میں یوں دمک رہا تھا جیسے کا چاند۔ اور مجھے اس کی کشش یوں تہ و بالا کر رہی تھی جیسے میں ہوں۔ اعصابی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے میں نے باتیں شروع کیں۔ چپکے چپکے، آہستہ آہستہ، سرگوشی میں ہم گزرے وقت کی باتیں کرتے رہے۔ پھر آنے والے وقت کی بات خود بخود میرے لبوں پر آئی اور میرے خواب میرے الفاظ میں ڈھل گئے۔ نہ جانے کب تک بولتا رہا۔ جب میں نے دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ سکون

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نیند میں بھی وہ مسکرا رہی تھی۔ اس بچّے کی طرح جو کہانی سُنتے سُنتے سو جائے اور خواب اسی کہانی کا تسلسل بن جائے۔ شاید خواب سنتے سنتے وہ انہی خوابوں میں کھو گئی تھی۔ میں بھی اطمینان سے کروٹ بدل کے سو گیا۔

اس رات میں نے بہت سے ایسے خواب دیکھے جو قوسِ قزح کے سارے اُجلے رنگوں سے مزیّن تھے۔ صحنِ گلشن میں گلوں کے رنگ پر اترنے والی تتلیاں اُڑتے اُڑتے نیلے آسمان کی وسعت میں گُم ہو جاتی تھیں اور ستارے بن کے چمکنے لگتی تھیں۔ پھر آسمان نیچے اترآتا تھا اور نیلے رنگ کی ساری کا پلّو بن کے اُڑنے لگتا تھا جس میں زرد پھول دمکتے تھے۔ برف پوش پہاڑ کی کسی چوٹی سے رابعہ مجھے پکارتی تھی اور اپنا ایک ہاتھ پھیلا دیتی تھی۔ "سکندر یہاں آؤ۔ یہاں سے دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے۔" اور میں کہتا تھا "مجھے سب کچھ تمہاری آنکھوں میں نظر آ رہا ہے۔" پھر شفق پھیلنے لگتی تھی اور رابعہ اپنے گالوں کو چھو کر کہتی تھی۔ "ارے یہ رنگ تو میرے گالوں پر اتر آیا ہے۔" اور اس کا شاخِ گل جیسا بدن بل کھا کے کمان ہو جاتا تھا۔ خوابوں کے یہ سلسلے کسی سلسلۂ کوہ کی طرح حدِ نگاہ تک پھیلے ہوتے تھے۔ اور آپس میں یوں ملے ہوتے تھے کہ ایک دوسرے کو جدا کرنا محال تھا۔ آخری خواب جو مجھے یاد رہا مَرّی اور نتھیا گلی کے کوہساروں کا تھا جہاں بلند و بالا یوکلپٹس کے گھنے درختوں کے ان گنت تنے تھے۔ اور ان کی شاخیں انتہائی اونچائی پر آپس میں یوں ملتی تھیں کہ سر سبز چھت کے سوراخوں میں سے بادل گزرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادل نیچے وادیوں میں معلق تھے اور ارد گرد کے جنگل میں بھی دھند کے پہاڑ بنے کھڑے تھے۔ غبار کے مرغولے بن کر گھوم رہے تھے اور دھویں کی چٹان بن کر ہماری راہ میں حائل ہو جاتے تھے۔ ٹپ ٹپ ٹپکتی بوندوں کے ساتھ یوکلپٹس کے بھیگے پتّوں کی مہک تھی اور گہری وادیوں میں گونجنے والا بارش کا شور اپنی بازگشت کے ساتھ سنائی دیتا تھا۔ "رابعہ!" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پکارا اور وہ اچانک ایک بادل سے نکل آئی۔ پھوار تیز ہو گئی۔

ہنسی کی آواز پر میں نے آنکھیں کھولیں۔ پانی کے چند اور چھینٹے مجھ پر گرے۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ رابعہ کی ہنسی جلترنگ بجانے لگی۔ "جناب، اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی۔"

"تو یہ تم تھیں جو مجھ پر چھینٹے اُڑا رہی تھیں۔ میں سمجھا بارش ہو رہی ہے۔" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔

"تمھیں تو اپنی نہیں میری زیادہ فکر تھی۔ نیند کی حالت میں بھی مجھے پکار رہے تھے ــــ" وہ پھر ہنسی۔ لیکن میں دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کے پیکرِ حسن کی تجلّی نے میری نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ ابھی ابھی غسل کر کے نکلی تھی اور اس کے دھلے ہوئے چہرے کے گلابی رنگ میں اتنی تازگی اور شگفتگی تھی اور وہ آب و تاب تھی کہ میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے بدن کے گرد وہی نیلی ساری لپٹی ہوئی تھی جس کے زرد پھول مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور شوخ اشارے کر رہے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں میں حیا کا رنگ تھا اور پیار کا رنگ تھا۔ غرور کا کا رنگ تھا اور وہ سب رنگ تھے جو محبت کے رنگ ہو...

"کھلی آنکھوں سے بیٹھے بیٹھے پھر سو گئے؟" رابعہ نے جھک کر کہا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایک شعر کی تفسیر۔ رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام ... موسمِ گل ہے تمہارے سامنے آنے کا نام۔ ترمیم کے لیے معذرت۔"

"نو بج رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" رابعہ بولی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "اُف۔ آ گیا وہ رنگ میں بھنگ ڈالنے والا۔" میں نے چھلانگ لگا کے اُترتے ہوئے صوفے کو گھسیٹا اور بڑی مشکل سے وہیں پہنچایا جہاں رات کو تھا۔ کمبل کو بیڈ پر پھیلایا اور تکیوں کو ساتھ رکھا اور ایک نظر اس سیٹ کو دیکھا جو بیڈ روم کا صحیح پیش کرتا تھا۔ ان میاں بیوی کے بیڈ روم کا جن کی ازدواجی زندگی انتہائی قابلِ رشک ہو۔ رابعہ نے آئینے میں سب کچھ دیکھا تو آئینہ بھی لال ہو گیا۔ پھر دستک ہوئی تو میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔ "کون آ گیا اتنی صبح صبح۔" اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نیند ہاتھوں کے طوطے کی طرح اُڑ گئی اور میں پیچھے ہٹا۔ میرے سامنے محسن کھڑا تھا۔ تھکا ہوا، پژمردہ، تباہ حال۔

"تم! رات کو فون آیا تھا، صبح خود آ گیا۔" میں نے کہا۔ رابعہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ اندر آ کے دھڑام سے کرسی پر گر گیا۔ "مجھے ... لیے فوراً آنا پڑا۔ کہاں تھے تم دونوں؟"

"ہم؟ .... ہم کہاں تھے۔ یہیں تھے۔ کیوں رابعہ؟" میں نے اس بچّے کی طرح کہا جس کی چوری پکڑی جائے۔ رابعہ نے مسکرا کے منہ پھیر لیا کیونکہ محسن بیڈ روم کے سیٹ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"جھوٹ بکتے ہو تم دونوں۔ نہ رابعہ اپنے ہوٹل میں تھی نہ تو یہاں تھا۔" محسن بولا۔ "رات کے بارہ بجے تک۔"

"وہ کچھ ایسا ہے ..... کہ ہم تو نیک بچّوں کی طرح سُورج ڈوبے لوٹ آنا چاہتے تھے مگر کھانے میں ذرا دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "ایک جگہ پکنک پر جانا پڑا ..... لیکن تیری شکل کیوں ایسی ہو رہی ہے۔ امّی تو ٹھیک ہیں نا؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا اور دیوار کو گھورتا رہا۔ "کل ان کا انتقال ہو گیا۔ صبح نو بجے کے قریب۔"

"انتقال ہو گیا؟" میں نے یوں کہا جیسے یہ ناممکن تھا۔ رابعہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر سے اٹھی اور محسن کے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔ ہم سب بے حس و حرکت اور ساکت و صامت خلا میں دیکھتے رہے۔ ان سب باتوں کی بازگشت ایک پُر آسیب سرگوشی بن کے کمرے میں پھیلنے لگی جو محسن نے مجھ سے اور رابعہ سے گزشتہ روز اسی وقت کی تھیں۔ وہی وقت تھا جب اس کی ماں کے سرہانے فرشتۂ اجل قرضِ جاں کی وصولی کے لیے پہنچا تھا اور بیٹے کی دید کی منتظر نظروں نے اسے تصوّر میں دیکھا تھا۔ اس کے مجبور دل نے آخری بار دھڑکنے سے پہلے اسے یاد کیا تھا اور یہ یاد سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وقت کی لہروں پر اس مقام تک پہنچی تھی جہاں بدقسمت بیٹا اس جنّت کی بات کر رہا تھا۔ جو ماں کے قدموں کے نیچے ملتی ہے۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ یہ ذکر اچانک کیسے چھڑ گیا۔ بات کہاں سے شروع ہو کے کہاں آ گئی؟ جواب میری سمجھ میں اب آیا۔ وہ ایک ہی وقت تھا جب ماں نے بیٹے کو یاد کیا اور بیٹے کو ماں کی یاد آئی۔ ٹیلی پیتھی۔ ربطِ باہمی کی پُراسرار قوت جو قلب و نظر کو ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ عالمِ بالا کی جانب محوِ سفر روح کے قیام کا مختصر وقفہ۔

"کتنی عجیب بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کل صبح اسی وقت ہم انہی کی باتیں کر رہے تھے۔"

"اور کتنی بدبختی کی بات ہے سکندر۔" محسن بولا۔ "کہ اس وقت ان کے پاس شہلا کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ شوہر نہ بیٹا۔"

"انکل آفس میں ہوں گے۔" میں نے دُکھ سے کہا۔ محسن کی آنکھوں سے بہنے والے خاموش آنسو اس کے رخساروں پر لکیریں بنا رہے تھے۔ اور اس کی گود میں گر رہے تھے۔

"نہیں۔ وہ اسپتال میں تھے۔ ایک دن پہلے ہی ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" محسن روتے روتے بولا۔ "معمولی سا درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹروں نے روک لیا۔ جب میں پہنچا تو تدفین بھی ہو چکی تھی۔ شہلا نے انکل رضوی کو فون کیا تھا مگر انھوں نے کہا کہ مجھے نہ تو محسن کا پتا ہے اور نہ رابعہ یا سکندر کا۔"

"یہ نہیں کہا انھوں نے کہ سب مفرور ہیں؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہاں کی پولیس کو خبردار نہیں کیا کہ ان میں سے کوئی بھی جنازے میں شرکت کے لیے آئے تو گرفتار کر لیا جائے، بہترین موقع ملا ہے؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "معلوم نہیں انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔" محسن بولا۔ "انھوں نے شہلا کو تسلی دی اور پھر اسپتال میں ڈیڈی سے بات کی۔ ڈیڈی کو اب تک کچھ نہیں معلوم۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ خبر سنانے میں خطرہ ہے۔ انکل رضوی نے ان سے بھی کچھ نہیں کہا ... بار ڈیڈی نے تو خیریت پوچھی تھی۔ اور انکل رضوی نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہیں، تم فکر مت کرو۔ وہ فرض شناس آدمی کتنا بھی سخت گیر نظر نہ آتا ہو، سینے میں تو آدمی کا دل رکھتا ہے۔ اور دل پتھر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی مجبور ہو گئے۔ پہلی بار انھوں نے افسری کو فراموش کر دیا اور جانتے بوجھتے اپنے نامۂ اعمال میں خود اپنے ہاتھوں ایک جرم لکھ دیا۔"

"یہ بات انکل شیروانی سے چھپائی تو نہیں جا سکتی؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ تو وہ اسپتال میں رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ خود آہستہ آہستہ انھیں ذہنی طور پر تیار کریں گے اور پھر بتا دیں گے کہ وہ اکیلے رہ گئے ہیں۔"

"تو اُن سے ملنے تو گیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "شہلا بھی جاتی ہوگی۔"

"اس بیچاری نے تو سب سے زیادہ ظلم برداشت کیا۔" محسن بولا۔ "کوئی اور ہوتا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا۔ دونوں طرف کی تیمارداری۔ گھر سے اسپتال اور اسپتال سے گھر۔ بے تُک گاڑی تھی لانے لے جانے کے لیے۔ اسپتال میں ڈاکٹروں نرسوں کی دیکھ بھال بہت اچھی تھی اور گھر پر بھی ڈاکٹر صبح شام آتا تھا۔ لیکن شہلا کی اعصابی کشیدگی کا علاج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ادھر گھر میں بھی ہر وقت خطرے کی تلوار کا سایہ۔ اسپتال میں بھی ہر لحظہ خوف کا آسیب اور یہ دھڑکا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ اسے تو کوئی تسلّی اور حوصلہ دینے والا بھی نہ تھا۔ اس کی توجہ ہٹاتا، کچھ دیر کے لیے تفکّرات سے نجات دلاتا اور تھوڑی بہت تفریح فراہم کرتا۔ اس کی ذہنی و جسمانی صحت کے لیے ضروری تھا۔ مگر وہ اکیلی تھی اور اس کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ ساتھی۔ فوزیہ ہوتی تو اسے کوئی ہم عمر تو ملتا باتیں کرنے والا لیکن وہ نہیں آ سکتی تھی۔ امّی کے انتقال کے بعد وہ ہمّت ہار گئی۔ ڈاکٹروں نے اسے سکون آور دوائیں دے کے سلا دیا۔ میں رات کو نو بجے پہنچا تو فوزیہ بھی آ چکی تھی، اس کا شوہر بھی تھا۔ وہ دونوں ابھی چہلم تک وہیں رہیں گے۔ میں رات ساڑھے نو بجے قبرستان گیا اور دس بجے اسپتال پہنچا۔ چہرے سے رنج و غم کے آثار مٹا کے، مسکراتا ہوا اور مطمئن۔ ڈیڈی بہت حیران ہوئے۔ کہنے لگے "رضوی صاحب نے بھیجا ہوگا تم کو؟ حالانکہ میں نے کہا تھا کہ کوئی سیریس بات نہیں۔"

"انکل رضوی جنازے میں شریک ہوئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ لاہور میں کچھ گڑبڑ تھی۔ اعلیٰ اختیاراتی میٹنگ تھی شام کو جو رات تک جاری رہی۔" محسن بولا۔ "انہیں بہت رنج تھا لیکن انھوں نے ٹیلی فون پر شہلا کو بہت تسلّی دی۔ اور میرا خیال ہے اس کی حالت کے پیشِ نظر 'سب خیریت ہے' کے سوا کچھ نہیں کہا۔ شاید ہم چلے جاتے تب بھی وہ اس موقعے پر فرض شناسی کا وہ مظاہرہ نہ کرپاتے جس کی وجہ سے وہ سنگدل اور بے حس مشہور ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میٹنگ میں شرکت بہانہ ہو۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"بہانہ ہی ہوگا۔ ورنہ یہاں تو کسی قسم کی گڑبڑ نہیں۔" میں نے کہا۔

"ان کو اندیشہ ہوگا کہ وہاں سب کا سامنا ہوگا۔ اور وہ آزمائش کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "چنانچہ وہ صاف دامن بچا گئے۔ جھوٹ بولتے پر بھی وہ اپنے آپ سے شرمندہ تو ہوں گے لیکن مطمئن بھی ہوں گے کہ ایک پُرالم موقعے پر ہمدردی اور غمگساری کے بجائے فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کی اذیت سے بچ گئے۔"

"تجھے ابھی وہیں رہنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر تم لوگ فون پر مل جاتے تو شاید میں سوئم کے بعد آتا۔" وہ بولا۔ "میں نے اسپتال سے واپس آتے ہی گھر سے فون کیا تھا۔ تمھارا نہ ملنا بہت غیر معمولی بات تھی کیونکہ میں تم کو بطورِ خاص ہدایت دے کر گیا تھا کہ میں فون کروں تو موجود رہنا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ شہلا تو سوئی پڑی تھی۔ میں نے فوزیہ سے کہا کہ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے، میں جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے روکنے کی واجبی سی کوشش کی مگر میں نے کہا کہ اب تم ہو اور تمھارا شوہر ہے۔ تم دونوں گھر کا، شہلا کا اور ڈیڈی کا خیال رکھ سکتے ہو۔ ویسے بھی جب میں نہ امی کے انتقال کے وقت پہنچ سکا نہ تدفین کے وقت تو اب رُک کے کیا کروں گا۔ سچ بات یہ ہے سکندر کہ مجھے اس گھر میں ویرانی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔ دیواریں کاٹنے کو دوڑتی تھیں اور ہر چیز مجھے ملامت کرتی نظر آتی تھی۔ میں بھاگ آیا۔ بارہ بجے فون کیا تھا۔ رات ایک بجے پھر امی کی قبر پر اجازت لینے گیا اور وہاں میں دل کھول کے رو دیا تو میری روح پر سے بارِ ندامت کچھ کم ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے امی نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ محسن! خدا نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ روتا کیوں ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "ان کی زندگی کا عذاب بہت سخت تھا۔ خدا ان کو سکون دے اور ان کی روح کی مغفرت کرے۔ جب انکل شیروانی کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ اس صدمے کے لیے ذہنی طور پر تو ہم سب بہت پہلے سے تیار تھے۔" محسن نے کہا۔ "یہ ان کی ریٹائرمنٹ کا آخری سال ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایل پی آر لے لیں۔ چھ مہینے کی چھٹی مل جاتی ہے نا۔ اور شہلا کے ساتھ لاہور آ جائیں۔"

"وہ یہاں آئے تو انھیں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو اب تک معلوم نہیں۔"

"لیکن وہ اسلام آباد میں نہیں رہ سکتے۔" محسن بولا۔ "ان کو سرکاری کوٹھی ملی ہوئی ہے جسے وہ زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اس گھر میں ان کا اکیلے رہنا انتہائی مشکل... میں وہاں ایک دن نہیں رہ سکا۔ اور تو کوئی جگہ نہیں ہے... وہ جا سکیں۔"

"وہ فوزیہ کے ساتھ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جا تو سکتے ہیں لیکن جائیں گے نہیں۔" محسن بولا۔ "پرا... خیال کے آدمی ہیں نا۔ فوزیہ اور اس کا شوہر بھی یہ چاہتے تھے... کا فیصل آباد والا گھر بہت بڑا ہے اور وہ اکیلے ہیں۔ ایک بزر... گھر میں موجودگی کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ا... سے مجبور ہو جائیں اور یہی کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تم نہا دھو لو تو ہم ناشتا منگو..." رابعہ نے کہا۔ "تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ میں بہت زیادہ تھکا ہوا ہوں۔" محسن نے اٹھ... روم کا رُخ کیا۔ میں اور رابعہ وہیں بیٹھے اسے ہمدردی سے دیکھ... رہے۔

ناشتے کے بعد محسن نے میرے اور رابعہ کے منع کر... کے باوجود ویلیم ٹین کی دو گولیاں کھائیں اور بے سُدھ ہو کے پڑ گیا۔ ہم نے اسے گزشتہ شب کی معرکہ آرائی کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا۔ میں نے رابعہ کو ساتھ لیا اور باہر نکل گیا۔ البرٹ وکٹر اسپتال فون کرنے سے ہمیں معلوم ہوا کہ نازلی اب ہوش میں ہے۔

"کیا ان کے بھائی موجود ہیں؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ ابھی ان کا بھی فون آیا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔ "وہ شام کو آئیں گے۔"

"ان کے پاس کون ہے؟" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ "مس نازلی کے پاس؟"

"صرف ان کی والدہ۔" نرس نے کہا۔ "اور ایک کانسٹیبل جو کمرے کے باہر بیٹھا ہے۔"

میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت نازلی کو دیکھنے کے لیے جانے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس نے میرے خیال کی شدت سے مخالفت کی۔ "انکل اور شیخ کا اعتبار نہیں۔ ہو سکتا ہے انھوں... سادہ کپڑوں میں پولیس وہاں متعین کر دی ہو۔ عملے میں پولیس... افراد شامل ہوں۔"

"نرس کے جوابات سے شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔" میں نے... کے کہا۔ "جتنا میں نے اس سے پوچھا تھا، نرس نے اس سے زیا... ہی بتایا۔"

"اچھا تو تمھارے ہوٹل چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو... پولیس کو فون کر دے کہ یہاں ایک پرنسس مقیم تھیں جو بالکل...

کا نشانہ ایڈیشن تھیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور۔ اپنے شوہر کو اغوا کرنے والوں سے چھڑانے کے لیے خنجرِ ابرو، تیرِ نظر اور شمشیرِ حُسن کے علاوہ ریوالور سے مسلح گئی تھیں مگر ابھی تک لوٹی نہیں ہیں۔"

"اور اگر اس نے پہلے ہی فون کر کے پولیس کو ساری کہانی سُنا دی ہو پھر؟"

"پھر کیا۔ پرنسس غائب۔" میں نے کہا۔ "منیجر ثابت کرتا پھرے کہ اس نے نشے میں کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ شام تک ہمیں ویسے بھی جگہ بدل لینی چاہیے۔ ہوٹل فاران میں اب تمھارا کیا ہے؟"

"میرا تو کچھ نہیں۔ اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس اٹھا لائی تھی بلکہ اُٹھوا لائی تھی۔" رابعہ بولی۔ "محسن کے کپڑوں کا سوٹ کیس ہے۔"

"محسن میرے کپڑے پہن سکتا ہے۔ لیکن ہمارے وہ خصوصی ملبوسات اہم ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک پولیس افسر، ڈاکیے اور ویٹر کی وردی اور وہ فقیری لباس۔"

"وہ سب میرے سوٹ کیس میں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "محسن کے سوٹ کیس میں جگہ نہیں تھی۔"

"ویری گڈ۔ پھر تو کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی لوٹ کر جانے کی۔" میں نے کہا۔ "میں منیجر کو مطلع کر دیتا ہوں۔"

جی پی او کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کار روکی اور فون کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ ہوٹل فاران کا نمبر مجھے ڈائریکٹری میں دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی بوتھ خالی ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد مجھے ہوٹل فاران کے آپریٹر نے منیجر کی لائن دی۔

"منیجر صاحب، دیکھیے آپ کے ہوٹل میں ایک پرنسس صوفیہ مقیم ہیں۔" میں نے کہا۔

"پرنسس صوفیہ۔" منیجر چلّایا۔ "کہاں ہیں وہ خود؟ تم کون ہو؟ کون سی منحوس گھڑی تھی جب پرنسس نے میرے ہوٹل میں قدم رکھا تھا۔ خدا معلوم وہ پرنسس تھی کہ بہرام ڈاکو کی بیٹی۔"

"کیا ہوا منیجر صاحب؟" میں نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

"ارے یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟" منیجر بولا۔ "اُلو کا پٹھا ہوں، گدھا ہوں میں کہ اس کی بات مان لی تھی۔ عقل خبط کر دی تھی اس نے میری مسکرا کر۔ اسی وقت پولیس کو بلوا لیتا تو یہ مصیبت نہ آتی۔"

"کیسی مصیبت؟ آپ نے ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔"

"ارے بھائی، کیا بتاؤں؟ دھماکا ہوا ان کے کمرے میں۔" فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "آج ہی صبح۔"

"ان کا کمرہ تو بند تھا۔" میں نے کہا۔ "اور چابیاں آپ کے پاس تھیں۔"

"یہی تو مصیبت بن گئی میرے لیے۔" وہ بولا۔ "مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

میں نے باہر دیکھا۔ کاؤنٹر سے خاصے فاصلے پر کھڑا ہوا ایک شخص مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے لیے باری کے انتظار میں نہیں تھا اور کسی کاؤنٹر سے ٹکٹ یا لفافے بھی نہیں خرید رہا تھا۔

"میں پرنسس کا پی اے ہوں۔" میں نے کہا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھا۔

"تو پی اے صاحب، خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔" منیجر بولا۔ "یہاں تو پولیس نے دھاوا بول دیا ہے۔"

"دھماکا کس وقت ہوا اور کیسے؟" میں نے کہا۔ "آخر کوئی تو اندر گیا ہوگا۔"

"یہی تو غضب ہے کہ اندر کوئی نہیں گیا۔" منیجر بولا۔ "ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ ایک شریف صورت شخص نے لیا تھا۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔ ریزرویشن کلرک نے دیکھا تھا۔ میجر شریف کہتا تھا خود کو مگر وہ خبیث نہ میجر تھا نہ شریف۔ اس نے درمیان کی دیوار میں سوراخ کیا اور اندر بم پھینک دیا۔ دونوں کے باتھ روم ملتے ہیں نا۔ اس نے باتھ روم سے باتھ روم میں دستی بم اچھالا اور بھاگ نکلا۔ دھماکے سے افراتفری پھیلی تو وہ غائب ہو گیا۔"

میں نے پھر شیشے کے کیبن سے باہر جھانکا۔ وہ اجنبی بڑی مستقل مزاجی سے ہاتھ باندھے وہیں موجود تھا۔ مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ یقیناً مجھے پہچان گیا ہوگا۔ میں نے اچانک ریسیور رکھا اور باہر نکل کے تیز تیز قدموں سے زینے کی طرف بڑھا۔ آدھا زینہ چڑھ کے میں نے پیچھے دیکھا تو وہ شخص میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ میں نے باقی زینہ طے کیا اور اوپر کی منزل کے مختلف راستوں، عملے کے افراد اور فائلوں کے بھرے کمرے سے گزرا اور دوسرے زینے سے نیچے اترا۔ اس وقت تک میں اپنے پیچھے آنے والے سے تقریباً پیچھا چھڑا چکا تھا۔ مجھے اس کی صورت ایک بار بھی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن دوسرے زینے سے دوسری راہداری میں اترتے ہی میری نظر اس پر پڑی۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کس راستے سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے باہر کا رُخ کیا تو وہ میری راہ میں حائل ہوا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور باہر کی طرف دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پھر اٹھنے تک میں رابعہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کے نکل جاؤں گا۔ لیکن گاڑی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ گاڑی آس پاس کہیں بھی نہ تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رابعہ جسے میں انتظار کرنے کی تاکید کر گیا تھا اچانک کہاں غائب ہو گئی۔

میں تنہا ہوتا تو رکشا ٹیکسی جو بھی سامنے آتا اسی میں بیٹھ کے فرار ہو جاتا لیکن مجھے یہ احساس بھی تھا کہ رابعہ لوٹ کر آئی اور اس نے مجھے غیر حاضر پایا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ تشویش کا شکار ہو گی اور اس کے دل میں ہزار اندیشے جنم لیں گے۔ دوسری طرف وہ اجنبی بدستور میرے تعاقب میں تھا جسے میں اب تک پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا کہ جب میں جی پی او کی عمارت کے ایک زینے سے اوپر غائب ہو گیا تھا تو اس نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ میں اترنے کے لیے کون سا دوسرا زینہ استعمال کروں گا۔ میرے دھکیلنے سے وہ لڑکھڑا گیا تھا اور میں نے اس کے دیوار پر سر ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی لیکن دوسری بار پلٹ کر دیکھنے پر میں نے اسے سر سہلا کے اور جھٹک کے کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے وقفے سے وہ محرابی دروازے میں نمودار ہوا جو پوسٹ آفس کے برآمدے میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بنے ہوئے تھے۔ میں اتنی دیر میں سیڑھیاں اتر کے گیٹ تک جا پہنچا تھا جہاں رابعہ کو کار سمیت موجود ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا ہی ہوتا تو یہی آدھے منٹ کا وقفہ مجھے کافی ہوتا۔ جتنی دیر میں وہ تعاقب کے لیے کوئی سواری دیکھتا ہم نکل جاتے اور گم ہو جاتے۔

میں نے ایک بار پھر پیچھے نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں وہ مفرور مجرم کو روکنے کے لیے ریوالور استعمال کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا۔ وہ عام آدمی بھی ہو سکتا تھا جس نے مجھے دس ہزار کا چلتا پھرتا انعام سمجھ کے فیصلہ کیا ہو کہ یہ رقم اس کے بنک اکاؤنٹ میں جانی چاہیے۔ وہ پولیس یا خفیہ پولیس یا بے حد خفیہ پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا جن کو قانونی طور پر یہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ وہ قانون کی گرفت سے نکل بھاگنے والے مجرم کو شوٹ کر دیں۔ وہ آدمی جس کے عزائم اور قوت تسخیر کے سامنے کوئی رکاوٹ کوئی دیوار اور کوئی ہمالہ جیسا پہاڑ حائل نہ ہو سکے، جسے کوئی زنجیر بھی بے بس دیا گرفتہ نہ کر سکے اور جو خلا کی وسعتوں سے سمندروں کی عمیق تاریکی تک سب مقامات آہ و فغاں سے خندہ زن گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اسے کتنی آسانی سے ایک چھوٹی سی گولی شکست دے کر رکھ دیتی ہے۔ وہ گولی جو اس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر بھی نہیں ہوتی وجود سے عدم کی مسافت کو ایک عمر سے ایک لمحہ بنا دیتی ہے۔

وہ شخص اب چلانے لگا تھا "روکو۔ پکڑو کوئی اسے" لیکن پوسٹ آفس میں اپنے اپنے ضروری کام سے آنے جانے والے بیشتر لوگ فارغ نہیں تھے اور کچھ لوگ متوجہ تو ہوئے تھے مگر سمجھ نہ پائے تھے کہ وہ کیوں شور مچا رہا ہے اور کسے پکڑنے کی اپیل کر رہا ہے۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا پھر پلک جھپکتے میں رواں دواں ٹریفک کے ریلے میں کود گیا۔ اور لہراتا بل کھاتا، گاڑیوں سے خود کو بچاتا اور کسی اچانک بریک لگانے والی گاڑی سے چھو کر نکلتا سڑک عبور کر گیا۔ نہ جانے کتنی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے مجھے کھڑکی سے سر نکال کے گالیاں دیں۔

"سالا خود تو مرتا ہمیں بھی مشکل میں ڈال جاتا۔"

"ابے مرنا ہے تو کسی ڈبل ڈیکر کے سامنے جا۔"

"پاگل کے بچے!! اندھا ہے کیا؟"

مختلف آوازیں اٹھیں۔ میں نے دو گاڑیوں کے تصادم کی آواز بھی سنی۔ شیشہ ٹوٹنے کی اور لوہے سے لوہے کے رگڑنے اور ٹکرانے کی۔ غالباً کوئی پیچھے والی کار جس کے بریک بہت زیادہ قابل اعتماد نہ تھے اگلی گاڑی میں گھس گئی یا اگلی گاڑی کی بریک لائٹ کام نہیں کر رہی تھی کہ پیچھے والی کار کا ڈرائیور کچھ نہ کر سکا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو قصوروار کہیں گے۔ اپنے اپنے نقصان کا اندازہ کریں گے اور بکتے جھکتے اپنی راہ لیں گے۔

سڑک عبور کرنے کے بعد میں نے پھر پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اب شور تو نہیں مچا رہا تھا لیکن اس کے ارادے نہیں بدلے تھے۔ میری طرح اقدام خودکشی کرنے کے بجائے وہ مجھ پر نظر جمائے ٹریفک میں مناسب وقفے کا انتظار کر رہا تھا جس سے اس کی مستقل مزاجی اور ٹھنڈے دل کے ساتھ کام لینے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میری بدقسمتی سے چند ہی سیکنڈ کے بعد ٹریفک کی لائن ٹوٹ گئی اور وہ گولی کی طرح میرے پیچھے آیا۔ میں اب سیدھا نیلا گنبد والے راستے کی طرف جا سکتا تھا مگر وہاں میں یقیناً پھنس جاتا۔ آگے انارکلی میں جانے والا راستہ بہت تنگ تھا اور وہاں دوڑ لگانا تو کیا بعض اوقات پیدل چلنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ دائیں بائیں انارکلی بازار میں ریس ناممکن تھی۔ چنانچہ میں سیدھا لائٹ ہاؤس اور یونیورسٹی کے عقب والی سڑک پر دوڑ سکتا تھا مگر یہ بہت زیادہ رکاوٹوں والی ریس یقیناً تھا نہ انارکلی پر ختم ہوتی۔ چنانچہ میں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوسٹل کا چکر لگا کے لوٹنا بہتر سمجھا۔ بہت سے لوگ اب ریس میں دلچسپی لے رہے تھے اور کچھ زیادہ جوشیلے عملی طور پر اس میں شریک ہونے کے خواہش مند نظر آتے تھے کیونکہ رائے عامہ مجھے جیب کترا قرار دے چکی تھی جو ہاتھ کی صفائی دکھا کے بھاگا تھا اور شور مچاتا پیچھے دوڑنے والا شخص اس کے سوا کون ہو سکتا تھا جس کی جیب ہلکی ہو گئی تھی۔ مجھے اب پہلے جتنی مشق تو نہیں رہی تھی، اس کے باوجود میرا خیال تھا

کہ میں خاصا تیز دوڑ سکتا ہوں۔ گھوڑے کے علاوہ اگر کسی سواری کی مدد سے کوئی مجھے پکڑ سکتا ہے تو موٹر سائیکل کی مدد سے لیکن اس شخص نے میرے خیال کو باطل کر دیا۔ وہ یقیناً ایتھلیٹ تھا یا رہ چکا تھا۔

جب اس کے اور میرے درمیان فاصلہ چند گز رہ گیا تو میں بک اسکوائر کی ایک گلی میں گھس کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی وہ شخص اندر آیا میں نے اسے دبوچ لیا اور کچھ کہے بغیر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے کرائے کے پیشہ وارانہ وار آزمانے سے گریز کیا اور مکے بھی اس شخص کی طرح چلائے جسے مار کٹائی کا تجربہ نہ ہو۔ ذرا سی دیر میں پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو گئے۔ میرا حریف بھی کم نہ تھا اور اس نے میرے مکوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ جارحانہ کارروائی بھی کی لیکن میں نے اپنا پورا دفاع کیا۔ جو مکے ہم نے ایک دوسرے کو مارے وہ قطعی بے ضرر ہے اور یہ جنگ دفاعی نوعیت کی ہی۔ نقصان اسے اپنی آواز کا ہوا جو مضحکہ خیز حد تک پتلی تھی اور اس کے بھاری بھرکم وجود سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی۔ شور تو اس نے بھی مچایا مگر میں نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا چلا کے اس کی آواز کو دبا دیا۔

"او میں آج جانے نہیں دوں گا۔" میں نے گلا پھاڑ کے کہا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر مکا مارا۔

"تو... تو کیسے... میں خود نہیں جانے دوں گا۔" وہ منمنایا اور اس نے ہاتھ گھمایا جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"ایک سال ہو گیا، آج کل کرتے۔ باپ کا مال سمجھ رکھا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جھنجھوڑنا، ایک دوسرے کے بال نوچنا اور کپڑے پھاڑنا جاری رکھا۔ کچھ لوگوں نے بالآخر مداخلت کی۔

"اوئے میاں... اوئے بندے دے پتر بنو۔" ایک چھوٹے فروش صوفی نے ہمیں الگ کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سر پر مکا مارا لیوں جیسے اتفاق سے اس کا سر نشانہ بن گیا۔ صوفی نے زور سے "ہو" کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"میں آج پیسے کے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" میں نے کہا "کپڑے اتروا لوں گا اس کے۔"

میرا حریف دم بخود رہ گیا۔ اس الزام نے اس کو اتنا حیران کیا کہ وہ لڑنا بھول گیا۔ "کون سے پیسے... بدمعاشی؟"

"یہ بدمعاشی تھی میری یا شرافت... وقت پر مدد نہ کی ہوتی تو اندر ہو جاتا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ لوگ اب ہمارے درمیان حائل ہو گئے تھے اور دو معتبر قسم کے افراد نے ثالثی کے فرائض سنبھالتے ہوئے سوال شروع کر دیے تھے۔

"بات کیا ہے؟ زبان سے بات کرو یار۔ دونوں پڑھے لکھے لگتے ہو۔" ایک عینک والے بنک افسر قسم کے آدمی نے کہا۔

"بات کیا ہے؟" میرے حریف نے کہا "جان بچا کے بھاگنا چاہتا ہے۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔"

"جان بچا کے تو بھاگ رہا ہے۔ سال بھر ہو گیا، پورے دس ہزار لیے تھے اس نے۔ کہتا تھا بیوی کا زیور بیچنا پڑے گا۔" میں نے چلا کے کہا "اب ملتا ہی نہیں، صورت نہیں دکھاتا۔ گھر جاؤ تو اندر سے..."

"جھوٹ بکتا ہے یہ۔" وہ چلایا "میں نے اس کا کچھ نہیں دینا۔ میں تو اس کو تھانے لے جاؤں گا۔"

"تھانے تو میں لے جاؤں گا تجھے۔" میں نے دہاڑ کر اس کو اور کچھ نہیں کہنے دیا "دس ہزار جوتے کھا کے دس ہزار دے گا۔"

"یہ ایک مجرم ہے۔ قاتل اور مفرور۔" بالآخر میرے حریف نے چیخ کر کہا۔

"کیا؟ مجھے دنیا جانتی ہے میں ڈاکٹر ہوں۔" میں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔

"ارے بھائی جب دونوں ہی تھانے جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔" کسی نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا لیکن میں نے یکلخت ثالث کو انگریزی میں مخاطب کیا اور کہا کہ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے اور میں لاہور ہوٹل میں مقیم ہوں۔

"یہ سکندر بخت ہے، میں جانتا ہوں اسے۔" میرے حریف نے کہا "پولیس نے اس کی گرفتاری پر دس ہزار روپے انعام رکھا ہے۔ اسے تھانے لے چلو سب معلوم ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں۔ تھانے چلو۔" میں نے اطمینان سے کہا "روکو کسی ٹیکسی کو۔" لیکن میرا اطمینان ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ اچانک دو افراد کو یاد آ گیا کہ میری صورت انہیں دیکھی بھالی کیوں لگتی ہے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں ہو گئے۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" ایک نے میرے حریف کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے شخص نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ کیونکہ پرانی ہو جانے کے باوجود میری اخبار میں شائع ہونے والی تصویر اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ کسی کے ذہن میں اس کا دھندلا سا نقش بھی نہ ہوتا۔ ایک ٹیکسی کے فوراً نمودار ہونے سے میری مشکل کچھ آسان ہوئی ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ اس مجمع سے مجھے پہچاننے والے اور بھی نکل آتے اور وہ مجھے باعزت طریقے پر لے جانے کے بجائے مارتے ہوئے اور گھسیٹتے ہوئے تھانے کی طرف لے جاتے۔

"چلو اب رک کیوں گئے؟" میں نے بلا وجہ اپنے مخالفین کو ڈانٹا۔ انگریزی میں بات کی اور پہلے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"ہاں ہاں، چلو۔ رُکا کون ہے؟" میرے حریف نے کہا اور وہ بھی ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

لیکن ذرا سی پیش قدمی کے باعث میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ انہیں میری چالاکی پر شبہ نہیں ہوا کہ اس طرح دوسرے دروازے کے ساتھ میں بیٹھ گیا ہوں۔ اور وہ مجھے دونوں طرف سے زغے میں لے کر نہیں بیٹھے۔ اس غلطی کا احساس کسی کو ہوا بھی تو دیر سے۔ جب پوزیشن بدلنے کا وقت گزر چکا تھا۔ درمیان میں میری جگہ وہ شخص آ گیا جس نے میرے حریف کی سب سے پہلے حمایت کی تھی۔ آگے والی سیٹ پر وہ بنک منیجر ٹائپ عینک پوش تھا جس کی ظاہری ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں اور جو ابھی تک پوری طرح قائل نہیں ہوا تھا کہ اتنی رواں اور شائستہ انگریزی میں بات کرنے والا ڈاکٹر امجد نہیں کوئی مفرور و مطلوب ملزم ہے۔ اسے شک تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا دشمن نمبر دو ایک بانکا سا نوجوان تھا جس کو اپنا ہیئر اسٹائل بار بار درست کرنے کی عادت تھی اور اپنی پتلون کی کریز کی بہت فکر تھی۔ چنانچہ اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اصل خطرہ دشمن نمبر ایک سے تھا جو دوسرے پچھلے دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ مگر بار بار گردن بڑھا کے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا تھا۔ اس کو یہ فکر لاحق تھی کہ میں دروازہ کھول کے کود گیا تو وہ کیا کرے گا؟ اس کا یہ اندیشہ برحق تھا۔

میں نے آدھا مسئلہ حل کر لیا تھا۔ ایک غضبناک ہجوم کی جگہ اب میرے ساتھ صرف تین افراد تھے۔ ٹیکسی والا غیر جانبدار تھا۔ چنانچہ طاقت کا توازن برابر تھا۔ طے مجھے یہ کرنا تھا کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں۔ دروازہ کھول کے چھلانگ لگاؤں اور بھاگ جاؤں۔ اس میں میری ٹانگ ٹوٹنے یا موچ سے پاؤں کے قابلِ استعمال نہ رہنے کے امکانات برابر تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں بقولِ شاعر۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ وہ پھر مجھے پکڑ لیں اور زیادہ سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ تھانے پہنچائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں دشمن اور اُس کے حامی کو اندر ہی ناک آؤٹ کر دوں۔ پھر عینک پوش سے درخواست کروں کہ وہ اُتر کر واپس جانے اور کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرے۔ سمجھ لے کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ رہ گیا ٹیکسی والا تو اسے پچاس کا نوٹ یا ریوالور دکھا کے چلتے رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تیسرا اور آخری طریقہ جو میری کامیابی کا سو فیصد ضامن ہو سکتا تھا یہ تھا کہ میں ریوالور نکال لوں اور ٹیکسی ڈرائیور کے علاوہ باقی سب کو کسی ایسی جگہ اتار دوں جہاں سے واپس جانے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ ہو۔ وہ اب لاہور ہوٹل کی طرف جا رہے تھے جو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ تو ثابت ہو جاتا کہ میں ڈاکٹر امجد ہوں مگر اس کے بعد ڈاکٹر امجد کا لاہور ہوٹل میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ اور لوگوں کو میرے ساتھ دیکھ کر لاہور ہوٹل والے تصدیق و تفتیش کے خبط میں مبتلا ہو جاتے اور میں نکل بھی نہ پاتا۔

تاہم یہ غنیمت تھا کہ انھوں نے براہِ راست تھانے پرانی انارکلی جانے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ یہ سب میرے حامی عینک پوش کی کوشش کا نتیجہ تھا جس نے تھانے سے گریز کی خاطر تجویز پیش کی تھی کہ پہلے اس بھلے مانس کی بات بھی سُن لو اور دیکھ لو کہ لاہور ہوٹل والے اسے ڈاکٹر امجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ سوائے میرے حقیقی دشمن کے سب ہی تھانے کی کارروائی سے بچنا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں یہ شبہ دور کرنے کا سب سے آسان طریقہ تھا۔ میری بات سچ ثابت ہو جائے تو میں اور فریقِ ثانی جانے۔ وہ اپنے اپنے راستے جائیں ورنہ دس ہزار کا انعام لینے والوں میں شامل ہو جائیں۔ غضب مجھے رالعبہ پر تھا جو مجھے کچھ بتائے بغیر نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔ وہ وہیں مل جاتی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا تو یہ سب چکر پڑتا ہی کیوں۔

اب مشکل یہ تھی کہ راستہ کہیں بھی غیر آباد نہیں تھا۔ میں خود اترتا تب بھی پکڑا جاتا اور انھیں اتارتا تو وہ فوراً کسی دوسری کار یا ٹیکسی میں تعاقب شروع کر دیتے۔ دشمن نمبر ایک میری دسترس سے کچھ دُور تھا۔ درمیان میں وہ ہیرو ونٹ ٹائپ ہیرو بیٹھا تھا۔ پہلے اسے انٹاغفیل کرتا تو اصل دشمن فوراً ہوشیار ہو جاتا۔ اور ٹیکسی کے اندر کی محدود جگہ میں حرکت پذیری کی گنجائش بہت کم تھی۔ میں اتنی آزادی اور پھرتی سے ہاتھوں اور پیروں کا استعمال نہیں کر سکتا تھا جیسے کھلے میدان میں۔ با دلِ ناخواستہ میں نے ریوالور نکالا۔ اتنے اطمینان کے ساتھ جیسے جیب سے سگریٹ نکال کے سُلگانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے درمیان میں نزاکت سے بیٹھے ہوئے شہزادہ گلفام نے ریوالور دیکھا۔ یہ آلہ اس نے ان گنت فلموں میں دیکھا ہوگا اور جب کسی ہیرو نے ڈرا ڈر کشتوں کے پشتے لگائے ہوں گے تو وہ بھی تالیاں بجانے والوں میں شامل رہا ہوگا لیکن اصلی ریوالور کے نظارے نے اس کے حواس گم کر دیے۔ اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کے منہ پر ماری۔ کہنی اس کی ناک پر لگی اور ضرب میری خواہش کے مقابلے میں زیادہ شدید ہو گئی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ بھی کٹ گیا اور ایک دانت بھی ہل گیا۔ اس کا سر پیچھے جا لگا۔

"بس... ایسے ہی پڑے رہو۔" میں نے اس کو کہنی سے دبا کے ریوالور کا رُخ دشمن کی طرف کر دیا۔

"میں بلا سبب قتل نہیں کرتا لیکن اپنی جان کی حفاظت کے ‌ے دس قتل بھی کرنے پڑیں تو کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ میرے لامی نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھا۔

"ٹیکسی کو ملتان روڈ پر لے چلو۔" میں نے سکون سے کہا۔ "تمہیں پو نہیں ہوگا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے فقط اقرار میں آہستہ سے سر ہلایا اور ٹیکسی دور لیا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جناب۔" وہ بولا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب... میرا مطلب ہے آپ جو بھی ہیں...." ے حامی عینک پوش نے کہا۔ "دیکھیے میں آفس سے ساتھ کر آیا نا... اور میں نے مخالفت تو نہیں کی تھی آپ کی...."

"آپ نے ڈیوٹی کے وقت میں سیٹ چھوڑ کے بہت لطی کی۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے ، بجائے لنچ کے بعد واپس کام کے لیے حاضر ہو جاتے تو آپ کو لل پریشانی نہ ہوتی۔ اب ایک طرف آپ فرائض سے غفلت تنے کے مرتکب ہوئے، دوسری طرف...؟"

میرے دشمن نے یکلخت حرکت کی اور مجھے غافل سمجھ کے یوالور چھیننا چاہا۔ میں نے ہاتھ کو الٹا گھمایا اور ریوالور سمیت بری قوت سے اس کی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ کراہ کے پیچھے گرا۔ میرے حمایتی کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور ے بہ آوازِ بلند درود شریف پڑھنا شروع کیا لیکن اسٹیئرنگ پر بی گرفت مضبوط رکھی اور سڑک پر بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہا۔ وہ شریف آدمی مصیبت سے نجات کے لیے خدا سے عاہی مانگ سکتا تھا۔

"میں اس ریوالور کے بغیر بھی تمہاری گردن کا منکا توڑ سکتا ملں۔" میں نے لہجے کو خطرناک بنا کے خونخوار لہجے میں کہا۔ "اس ے پھر بہادر مت بننا۔" ضرب اتنی کاری تھی کہ اس کا سر گھوم گیا تھا ر غالباً وہ مجھے صاف دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ پیچھے پڑے ہوئے وسرے شخص کی ناک سے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جسے وہ وال سامنے رکھ کر جذب کر رہا تھا۔ تکلیف کے آثار اس کی صورت ے عیاں تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"تو تم ڈاکٹر امجد نہیں ہو۔" میرے حمایتی نے افسوسناک ہے میں سر ہلایا۔

"ڈاکٹر امجد؟" میں نے فلمی دلن والا قہقہہ مارا۔ "وہ کون ا تھا ہے؟ میرا کیا تھا کسی بھی ہوٹل کا نام لے کر کہہ دیتا کہ ں گزر کا ماما ہوں۔ تم مان لیتے کیونکہ تم احمق تھے۔" عینک والے نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس میں اختلاف کی ہمت نہ رہی تھی۔ اب میں اس حد تک محفوظ تھا کہ بعد میں کوئی بھی فوراً لاہور ہوٹل جا کے کسی ڈاکٹر امجد کو تلاش کرتا تو خود کو گدھا سمجھتا۔ میں نے اپنے سچ کو جھوٹ تسلیم کر لیا تھا اور انھوں نے مان لیا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔

ملتان روڈ پر بھی ٹیکسی سیدھی چلتی گئی۔ پھر ڈرائیور نے کہا۔ "مجھے پٹرول لینا ہے۔"

"اچھا۔ تو تم گاڑی روکو اور جا کے پٹرول لو۔" میں نے کہا۔

"میں ٹیکسی لے جاتا ہوں۔ اس کے فیول میٹر کے مطابق ٹینک آدھا بھرا ہوا ہے۔" اپنی فضول سی کوشش پر ٹیکسی ڈرائیور یقیناً بہت نادم ہوا ہوگا۔ کیونکہ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس کی صورت رونے والی ہو رہی تھی۔ آبادی ختم ہو گئی تو میں نے ٹیکسی کو ایک پتلی سی سڑک پر موڑنے کا حکم دیا۔ جو دائیں طرف کسی نئی آبادی سے گزرتی تھی۔ آبادی کا نقشہ مکانوں کے رنگین ڈیزائن اور پُرکشش تفصیلات کے ساتھ ایک بہت بڑے بورڈ پر موجود تھا۔ لیکن وہ آبادی ہنوز معماروں کی خیالی دنیا اور فائلوں میں بسی تھی۔ زمین پر اس کی بنیادیں تک نہیں کھودی گئی تھیں۔ مجھے ایسے بہت سے سائن بورڈ ملے جن پر مستقبل کی کسی حسین ترین، پُرآسائش اور بارونق آبادی کا مژدہ سنایا گیا تھا لیکن مجھے ہر طرف زمین اپنی قدرتی حالت میں نظر آ رہی تھی۔

موڑ کاٹنے کے بعد ٹھیک تیسرے میل پر میں نے ٹیکسی رُکوا لی۔ "اب آپ اُتر جائیں۔" میں نے عینک والے سے کہا۔ "یہاں سے تین میل پیدل جانے میں آپ کو آدھا گھنٹہ لگے گا... آپ کو اتنا چلنے کی عادت تو نہیں ہو گی لیکن آج کے بعد آپ کی ایک عادت چھوٹ جائے گی، دخل در معقولات کی۔ پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا۔"

"آدمی تم پڑھے لکھے ہو۔ اور مجھے یقین آنے لگا ہے کہ ڈاکٹر امجد ہی ہو۔"

"تھینک یو۔ آپ مجھے ڈاکٹر کرسچن برنارڈ سمجھ لیں۔" میں نے تشویش کی علامات ظاہر کیے بغیر کہا۔ "اس نے بھی ایک انسانی دل بدلا تھا اور میں نے بھی آپ کا دل اس حد تک ضرور بدلا ہے کہ آئندہ آپ صدقِ دل سے وہی کام کریں گے جس کی آپ کو تنخواہ ملتی ہے۔" جب وہ چل پڑا تو میں نے دشمن نمبر دو کو آگے تشریف رکھنے کیلیے کہا۔ عینک پوش نے واقعی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"تم یقیناً یہ پسند نہیں کرو گے کہ میں تمہاری لاش اسی جگہ چھوڑ کر چلا جاؤں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کسی چیز کا غلط استعمال مت کرنا۔ نہ ہاتھوں کا، نہ عقل کا اور نہ ٹانگوں کا۔ تم گولی کی رفتار سے زیادہ تیز بھاگ سکتے ہو تو اور بات ہے۔"

چھٹے میل پر میں نے بانکے چھبیلے نوجوان کو اتار دیا۔ جسے اردو میں ٹانگ اڑانا کہتے ہیں اسے انگریزی میں ناک اڑانا کہتے ہیں۔ امید

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

ہے آئندہ تم کسی کے مسئلے کو اپنی ناک کا مسئلہ نہیں بناؤ گے۔ اچھی خاصی ناک ہے تمھاری۔ ابھی تو جبڑ جاتے گی لیکن کٹ گئی تو بُرا ہوگا۔ دانت نقلی لگ جاتے ہیں لیکن ناک نہیں لگتی۔ پیچھے پلٹ کے مت دیکھنا۔"

"دائیں طرف ایک میل جا کے گاڑی کو پھر دائیں طرف موڑ لینا۔" میں نے کہا۔ ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔

"دائیں طرف؟ ادھر کون سی سڑک ہے جی؟" اس نے نقشِ فریادی بن کے کہا۔

"مجھے بھی کوئی سڑک نظر نہیں آ رہی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "پھر بھی گاڑی موڑ لو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے طوعاً کرہاً تعمیل کی اور پرانی ٹیکسی ہموار لیکن کچے میدان میں دوڑنے لگی تو اس کا جوڑ جوڑ صدا دینے لگا۔ اندر جھٹکوں سے خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کنکریٹ مکسر میں سفر کر رہا ہوں۔ جھاڑیوں اور درختوں سے بچتا، خار و خس اور نوکیلے پتھروں سے گریز کرتا اور چھوٹے گڑھوں سے کتراتا ٹیکسی ڈرائیور میرے احکامات کے انتظار میں پُرامید نظروں سے اس شیشے میں سے دیکھتا رہا جس میں اب صرف میرا چہرہ ہی قابلِ دید رہ گیا تھا۔ چار میل سفر کرنے کے بعد میں نے ٹیکسی روک لی اور دشمن کو نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ باہر نکلا تو اس کی حالت مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ باقی دو کو میں نے رحم کھا کے چھوڑ دیا ہے لیکن اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو میری ساری پریشانی کا ذمہ دار تھا۔ "تم... تم مجھے یہاں قتل کرنے کے لیے لائے ہو؟" وہ تختۂ دار پر کھڑے ہوئے شخص کی طرح لرزنے لگا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اتنے قتل پہلے کیے ہیں، ایک اور سہی۔ وہ سب بھی مجبوری کے تحت کرنے پڑے تھے۔"

"خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بے ربط الفاظ میں بولا۔ "مجھے.... میری جان بخش دو۔"

"تم میرے عوض دس ہزار روپے لیتے تو کیا کرتے...؟ جب کسی نامی گرامی اشتہاری مجرم کی گرفتاری کا انعام ملتا ہے تو اس سے دشمنی کا تحفہ ساتھ آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنا بڑا بدمعاش اکیلا نہیں ہوتا۔ اس کے بڑے مضبوط سہارے ہوتے ہیں جو اس کے اَن گنت ہاتھوں کی طرح ہر طرف پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کی دسترس سے باہر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ جسے چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں چھڑا لاتے ہیں۔ میں تمھیں گولی مار نے کے بعد یہاں چھوڑ جاؤں تو تمھاری لاش گدھ یا پھر گیدڑ اور بھیڑیے کھا جائیں گے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور خوامخواہ مگر یہ گواہی کے چکر میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ یہ ... جانے کے بعد سب کچھ بھول جائے گا۔ کیوں بھئی! اگر ... کہاں رہے تو کیا کہو گے؟"

"میں.... میں.... جو آپ چاہیں گے۔ یہی کہو..." وہ حواس باختہ لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ تم ملتان روڈ کی طرف تو گئے بھی نہیں ... موچی بھاٹی اور شاہ عالمی تک آتے جاتے رہے۔"

"لیکن.... سر جی.... وہ دو.... انھوں نے ..." وہ بولا۔

"نہیں۔ ان کو میں نے اسی لیے پلٹ کر نہ دیکھنے ... تھی۔" میں نے کہا۔ اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم کون ہو! پولیس کے آدمی۔ یا خفیہ پولیس کے ..." میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔ "میرا ارادہ تمھیں پولیس کے ... لے جانے کا نہیں تھا۔ میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"کہاں؟ اپنی سسرال؟" میں نے اس کی بات ...

اس نے جیب سے ایک شیشی نکالی۔ "اس کی ... کر کے۔ یہ کلوروفارم ہے۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کے شیشی لے لی۔ اس کو ... سونگھنے کا خطرہ مول لینا مشکل تھا۔ میں نے اسے جیب میں ... میں بعد میں تصدیق کر لوں گا کہ اس میں کیا ہے، عرقِ گلاب ... تم مجھے بیہوش کیسے کرتے؟ آخر تم نے یہ کیسے فرض کر ... کام بہت آسان ہے؟ معاملہ الٹا بھی ہو سکتا تھا۔ یہی کو... اگر میں تم کو سُنگھا دیتا تو وہی گھوڑے والا کیس ہو جاتا جب... نلکی میں دوا ڈال کر پلانی چاہی تھی مگر مالک کے بجائے ... پہلے پھونک مار دی۔ دوسری بات یہ بتاؤ کہ کیا تم کو... شیشی اسی طرح جیب میں لیے پھرتے ہو؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس کے ... ماری، وہ نیچے گر پڑا اور بُری طرح چلاّنے لگا۔

"کوئی اُلّو کا پٹھا جیب میں کلوروفارم اس لیے ... پھرتا کہ اسے کوئی مفرور اشتہاری مجرم مل جائے گا تو وہ ... قابو کر لے گا۔" میں نے کہا۔ "کیا تمھارے فرشتوں نے خبر ... فلاں دن فلاں وقت پر اور فلاں جگہ تم کو سکندر بخت ... تم مجھے اگر پولیس کے پاس نہ لے جاتے تو کہاں لے ... مت بولنا ورنہ قتل کرنے سے پہلے ہڈیاں توڑ دوں ...

... میں تم کو گھر لے جاتا۔ میرا ارادہ یہی تھا۔ میرا ایک جاننے والا ... کا مخبر ہے۔ وہ مجھے دس ہزار کے آدھے دے کر تم کو لے جاتا۔ ... خود کبھی تھانے نہ جاتا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "ہر تھانیدار میرا جانی ... ہے۔"

میں نے پے در پے اُس کے مکّے مارے اور اس کو دوبارہ اوپر ... کے زمین پر پٹخا۔ وہ نیم جاں ہو گیا۔

"تم کون ہو آخر؟" میں نے کہا۔ "نہ مخبر ہو نہ پولیس کے آدمی۔ یہ ... کلوروفارم کیوں لیے پھرتے ہو؟ بچّوں کو اغوا کرتے ہو؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں ... کے زخمی کر دیا۔ "بچّوں کو بیہوش کر کے کہاں لے جاتے ہو؟ ... خرکاروں ... کے ہاتھ بیچ دیتے ہو؟ یا والدین سے رقم وصول کر کے ان کی زندگی کا ... کرتے ہو! میرا خیال ہے تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اب ... کس کس کے بچّے اٹھائے ہیں اور کہاں سے؟ ان کے یا والدین ... نام اور پتے بتاؤ۔ اگر جھوٹ ہوگا تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے ... اور جیب میں رکھ لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ بزدل آدمی تھا اور اس میں مار کھانے کا بالکل حوصلہ نہیں ... اگر وہ جنگل نہ ہوتا تو اس کی چیخ پکار سے سارا محلّہ جمع ہو جاتا۔ ... کے اعترافات کے بعد ٹیکسی ڈرائیور ہکّا بکّا کھڑا تھا۔ اب تک اس ... یال تھا کہ مجرم میں ہوں۔ اب اچانک اس پر انکشاف ہوا تھا کہ ... نفس کتنے مذموم جرائم کا مرتکب ہو چکا ہے جسے میں اغوا کر کے ... سے اتنی دُور لایا تھا۔

"یہ تو بڑا ..... ہے جی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے نفرت اور ... ارت سے کہا۔ "اوئے بچّے اُٹھاتا ہے خنزیر؟ آپ اس کو پولیس ... حوالے کر دیں جی؟"

"پولیس؟" میں نے طنز سے کہا۔ "وہ تو ایسے مجرموں کی معاون ... ان کے کاروبار میں برابر کی شریک ہے۔ وہاں سے یہ جوتے کھا کے ... رشوت کھلا کے چھوٹ جائے گا۔ یہاں سے بچ کر کیسے جائے گا۔ ... اسی وقت فیصلہ کرتا ہوں۔" میں نے چٹکی بجائی اور اس شخص کو ... ٹکڑوں پر کھڑا کر دیا۔ اُس کا رُخ پلٹ کے میں نے تلاشی لینے کے ... اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے مزاحمت کی اور میں نے اس ... چہرے کا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ بلبلاتا رہا۔ "ہائے ہائے مر گیا۔ ہائے ... گیا میں۔" اس کی جیب میں سے بائیس ہزار روپے کی رقم برآمد ... ہزار کی، دو گڈیاں تھیں۔ ہر گڈی میں سو کے سو نوٹ ... اور گڈی پر بنک کی مہر تھی۔ میں نے مہر دیکھی تو بنک اسکواڈ کے ... بنک کا نام صاف پڑھا جاتا تھا۔ باقی رقم کے نوٹ الگ ... تھے۔ ... نے نوٹ زمین پر یوں پھینک دیے جیسے وہ میرے ... بے مصرف کاغذ کے ٹکڑے ہیں یا کوئی بہت غلیظ چیز۔ ٹیکسی ڈرائیور مزید متاثر ہوا۔ اس کے خیال میں وہ شخص بدترین سزا کا مستحق تھا اور میں اس کے ساتھ بہت مناسب سلوک کر رہا تھا۔ کاغذات میں ایک کسی ڈاکٹر کا نسخہ تھا، ایک اسکول فیس کی رسید جس پر کسی بچی کا نام تھا۔ بچی چوتھی جماعت کی طالبہ تھی اور رسید پر آج کی تاریخ تھی۔ دونوں دستاویزات کار آمد تھیں لیکن تیسری چیز ایک ڈرائیونگ لائسنس تھا جس پر اسی شخص کی تصویر تھی۔

"یہ تمھاری بچی ہے نا؟" میں نے رسید لہرا کے کہا۔ "فرض کرو، میں تمھیں اسی جگہ درخت سے باندھ جاؤں اور کل صبح اسے اٹھا لاؤں۔ اس وقت جب وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے۔"

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "او بدمعاش! تُو نے بھی تو ایسے ہی دوسروں کے گھر برباد کیے تھے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے فرطِ جذبات میں اس کے ایک تھپڑ مار دیا اور اس کارِ خیر میں شریک ہونے کا ثواب حاصل کیا۔

"یہ بکواس کرتا ہے۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس نے سچ نہیں بتایا۔ جن کے اپنے بچّے اسکول میں پڑھتے ہوں وہ کسی کے بچّے نہیں اٹھاتے۔ یہ بیس ہزار کہاں سے ملے؟"

تھوڑی سی مار کھا کے اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے کبھی کسی کا بچّہ نہیں اٹھایا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی عقل خبط ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سچ کیا سمجھے اور جھوٹ کیا۔ حقیقت تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے مجرم سمجھا تھا جسے شریف لوگ تھانے لے جا رہے تھے کہ میں نے ریوالور کی مدد سے سب کو ہائی جیک کر لیا۔ پھر اس پر یہ عقدہ کھلا کہ بدمعاش تو وہ تھے جن کو میں پکڑ لایا تھا اور جو سب سے بڑا بدمعاش تھا، وہ کبھی ایک جرم کا اعتراف کرتا تھا تو کبھی دوسرے کا۔ میری حیثیت کا تعین وہ ابھی تک نہیں کر سکا تھا کہ میں پولیس کا آدمی ہوں تو اس کارروائی کا کیا جواز ہے۔ اصولاً مجھے یا تو مجرم کو برائے تفتیش تھانے لے جانا چاہیے تھا یا اب تک سودے کی بات کر کے رخصت کر دینا چاہیے تھا مگر میں نے تو اچھی خاصی رقم کو بھی پھینک دیا تھا اور اگر میں واقعی مجرم ہوں تو دوسرے مجرم کو سزا کیوں دینا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں اس کے سامنے کر رہا تھا وہ بہرحال جرم نہیں تھا۔ اگر میں ایسے مجرم کو زندہ گاڑ دیتا تب بھی وہ یہی سمجھتا کہ میں نے انصاف کیا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے یہ بیس ہزار روپے کسی بنک سے نکلنے والے سے چھینے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ اب سیدھا کھڑا نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ فرشِ خاک پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔

"کیسے؟ جیب کاٹنے والے کلوروفارم کی شیشی نہیں استعمال

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کرتے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ بتانے پر آسانی سے تیار نہ ہوتا تھا لیکن بظاہر اس کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اس پر مزید تشدد جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر وہ المیہ اداکاری کی دردناک آوازیں نکالنے کا اور عالمِ نزع طاری کرنے کا ماہر تھا۔ بعد میں اس کی قوتِ برداشت کہیں زیادہ ثابت ہوئی۔ میں نے اسے کچھ اور بجایا تو اس نے حقیقت اُگل دی۔ وہ بنک سے نکلنے والوں کو لوٹتا تھا۔ اس کے لیے وہ بنک اسکوائر کے مختلف بنکوں میں گھومتا رہتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے کسی دفتر کا کیشیر یا کوئی شریف بزنس مین مل جاتا تھا جو معقول رقم لے کر نکلتا تھا اور رکشا ٹیکسی یا اپنی سواری لے کر جانے کے بجائے پیدل روانہ ہو جاتا تھا۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ دن دہاڑے بھرے بازار میں اسے کون لوٹ سکتا ہے۔ وہ بیگ یا بریف کیس کو مضبوطی سے پکڑے رکھتے تھے اور اطمینان سے چلے جاتے تھے اور یہ بھی غور نہیں کرتے تھے کہ ان کے دائیں بائیں یا آگے پیچھے کون ہے۔ موقع پاتے ہی وہ کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ان کی ناک پر رکھ دیتا تھا اور جب وہ چکرا کے گر پڑتے تھے تو وہ فوراً انہیں سنبھال لیتا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ خود بھی اچانک بیہوش ہو جانے والے شخص کے ساتھ ہے جسے مرگی کا دورہ پڑا ہے یا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسے رکشا ٹیکسی میں ڈال کے اسپتال لے جاتے ہوئے وہ بیہوش آدمی کا نقد سرمایہ اپنے قبضے میں کرتا تھا اور اسپتال پہنچنے کے بعد رکشا ٹیکسی ڈرائیور کو ایمرجنسی وارڈ کے باہر روک کر انتظار کرنے کو کہتا تھا تاکہ وہ اندر سے اسٹریچر منگوا لے۔ لیکن وہ ایمرجنسی وارڈ میں ایک طرف سے داخل ہو کے دوسری طرف سے باہر نکل جاتا تھا۔ انتظار سے گھبرا جانے والا ڈرائیور جب کسی سے بات کرتا ہوگا تو پھنس جاتا ہوگا۔ کرنے والے اس سے نہ جانے کتنے سوال کرتے ہوں گے کہ مریض کون ہے؟ اس کا مریض سے کیا رشتہ ہے؟ مریض کو کیا ہوا تھا اور اسے لے کر کون آیا تھا؟ سب کا جواب اس کے پاس "مجھے معلوم نہیں" کے سوا کیا ہوتا ہوگا۔ پھر مزید غل غپاڑہ ہوش میں آنے والا کرتا ہوگا کہ وہ لُٹ گیا اور سب سے پہلے تو پولیس رکشا ٹیکسی کے ڈرائیور کو دھر لیتی ہوگی اور اس مفروضے پر بزورِ بازو یہ اعترافِ جرم حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوگی کہ وہ بھی اسی گروہ کا رکن ہے جو مل کر اس قسم کی واردات کرتا ہے۔ ایک آدمی تاڑتا ہے اور دوسرا فوراً رکشا لے کر پہنچ جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ تفتیش اس وقت تک جاری رہتی ہوگی جب تک پولیس کو یقین نہ آ جائے کہ اب ملزم کے منہ سے سچ نکلنے کے مقابلے میں اس کے تن سے جان نکلنے کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ یہ کام وہ مہینے میں ایک یا دو بار ہی کرتا تھا۔

یہ سب ٹیکسی ڈرائیور بھی سمجھتا تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس چار سو بیس اور شیطان نے لوگوں کا مال ہی نہیں کے ہم پیشہ افراد کی برادری کو بھی جھوٹے الزامات میں ملوث بدنام کیا تھا اور تھانوں میں تختۂ مشق بنوایا تھا۔ وہ ان سب بن کے سب کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ گالیوں کی کے ساتھ اس پر پل پڑا۔ میری تفتیش نے ملزم کو نیم جاں ورنہ وہ ٹیکسی ڈرائیور سے کبھی مار نہ کھاتا اور شاید ٹیکسی ڈرائیور اتنی جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اس وقت میں یہ سو کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگر میں خود مفرور مجرم نہ ہوتا مجرم کو پولیس کے حوالے کرنا اپنا فرض سمجھتا اور یہ فرض ادا مطمئن ہو جاتا۔ اب بڑا چور چھوٹے چور کو کس منہ سے کوتوال سامنے لے کر حاضر ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے انتقامی جذبے بجھا چکا تھا اور اگر میں یہ ذمہ داری اس کے سپرد کرتا تو کہ مجھے تو معاف رکھیے جناب۔ تھانے میں اپنی مرضی سے ممکن ہے وہاں سے آنا اپنی مرضی کی بات نہیں۔ وہ سب آنکھ سے دیکھتے ہیں اور ایک لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش وہ کہیں کہ ایں ہمہ بچہ شتر است تو بلی سے اعتراف کرا لیں اونٹ کی بچی ہے۔

اگر میں اس کو چھوڑ دیتا تو وہ اپنے جاننے والے کے ذریعے یہ خبر آگے پہنچا دیتا کہ ملزم سکندر بخت یہاں یوں پکڑا گیا اور فلاں ٹیکسی میں تھانے لے جانے والا روڈ کی سیر کرانے لے گیا۔

"اوئے ہٹا کٹا بندہ، ایسے کرتوت ..." ٹیکسی ڈرا گوشمالی کے بعد اسے راہِ راست پر لانے کے لیے تلقین سمجھی۔ اچانک مجھے اس کے ڈرائیونگ لائسنس کا خیال میں نے جیب کے اندر رکھ لیا تھا۔ یہ ہیوی وہیکل کا لا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ٹرک یا بس چلاتا رہا ہے۔ اس الف دین تھا۔

"الف دین تم کیا چلاتے تھے؟" میں نے تجدید کی تاریخ دیکھی۔ "بس یا ٹرک؟"

"ٹرک۔ لاہور سے کراچی آتا جاتا تھا۔" وہ بولا۔

"پھر یہ محنت کی کمائی چھوڑ کے اس بدمعاشی کے میں کیوں پڑ گئے؟" میں نے کہا۔

"آدمی خود کیا کرتا ہے جی! سب تقدیر کراتی ہے۔

"پولیس کی گالیاں کھانا اور ان کو حرام کھلانا بھی منظور تھا بھی کرتا تھا میں مزدور بن کے اور ڈھائی من کی بوری تھا۔ اطمینان تو تھا کہ میں اولاد کو حرام نہیں کھلاتا۔ ایک میری انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی ہے۔"

"میں نے رسید پر اسکول کا نام دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں تمہارے خیالات کیوں بدل گئے؟"

اس نے سرد آہ بھری۔ "بس جی۔ دنیا میں ہیرا پھیری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں ایک چکر میں آ گیا تھا۔ کراچی لے کر جا رہا تھا مال کہ چھاپا پڑ گیا۔ مجھے کہاں معلوم تھا کہ گڑ اور چاول کی بوریوں کے بیچ میں ایک بوری نشے کی بھی ہے۔ جن کا مال تھا وہ تو صاف مُکر گئے کہ ہم تو آڑھتی لوگ ہیں۔ ساری منڈی میں ساکھ ہے ہماری۔ یہ بوری اسی نے رکھی ہوگی۔ یہی بتائے گا کس کی ہے۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور بظاہر وہ آڑھتی ہی تھے۔ میرا کون تھا جو مجھے بچاتا۔ میں نے کریم سیٹھ کا حوالہ دیا۔ وہ تھانے آیا اور مجھ سے کہہ گیا کہ فکر مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہم تمہیں بچا لیں گے اور انھوں نے مجھے بچا بھی لیا لیکن نوکری سے جواب دے دیا۔ پولیس کے سامنے تو وہ بھی اجنبی بن رہا تھا، کریم سیٹھ۔"

"کس کریم سیٹھ کی بات کر رہے ہو؟" میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"کراچی کا بہت بڑا بدمعاش دلال ہے جی۔" وہ بولا۔ "ہر قسم کا ناجائز کاروبار کر کے سیٹھ بن گیا ہے۔ اسمگلنگ سے لاکھوں روپے بنائے ہیں۔ ہر قسم کا مال اِدھر سے اُدھر کرتا ہے۔ آج کل اسلحے کی ناجائز فروخت سے کروڑوں بنا رہا ہے۔"

"تم جانتے ہو، یہاں اس کا بزنس کس سے تھا؟" میں نے کہا۔

"پہلے تو منّو بھائی عجب دین اینڈ کمپنی سے تھا۔" وہ بولا۔ "آج کل سیٹھ دلاور سے ملا ہوا ہے۔"

اگر وہ جیب سے توپ نکال کر میرے کان کے قریب داغ دیتا تب بھی مجھ پر وہ اثر نہ ہوتا جو دلاور کا نام سن کر ہوا۔ بے شک وہ دنیا میں واحد دلاور نہیں تھا لیکن اس سے پہلے الف دین سیٹھ کریم کا نام بھی لے چکا تھا جو کراچی میں تھا اور ان دونوں ناموں کا باہمی تعلق اتفاق نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تو میری طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا لیکن الف دین سے میری حالت کا تغیر چھپا نہ رہ سکا۔ حالانکہ اپنے طور پر میں نے پوری کوشش کی تھی کہ صورت سے کچھ ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں چند منٹ تک بے یقینی کے خلا میں معلق رہا۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے حواس پر قابو پایا۔

"تم ... تم الطاف کو جانتے ہو؟ طافو نام تھا اس کا۔" میں نے کہا۔ اب بالآخر میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ جی پی او میں پہلی بار الف دین کو دیکھ کر مجھے اس کی صورت جانی پہچانی کیوں لگی تھی۔

اس نے سر ہلایا۔ "وہ میرا چھوٹا بھائی ہے جی۔" مگر اس کی صورت پر حیرانی نظر آنے لگی۔

"آج کل کہاں ہے وہ؟" میں نے کہا اور دونوں بھائیوں کی صورت کی مشابہت پر غور کرنے لگا۔

"معلوم نہیں، ٹرک لے کر کہیں گیا ہوگا۔" الف دین نے کہا۔

"تم سے آخری بار کب ملا تھا؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"ایک مہینہ ہو گیا۔ شاید دو چار دن اوپر۔"

"تم دونوں بھائی اسی طرح مہینے میں ایک بار ملتے ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ رہتا ہے وہ؟"

"نہیں جی۔ اس کا اپنا گھر بار ہے، بیوی بچے ہیں۔" الف دین بولا۔ "مجھے اسی نے ٹرک چلانے کا لائسنس دلوایا تھا اور پھر مستقل کام بھی۔ ہماری بیویوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی لیکن وہ بہت خیال کرتا تھا میرا۔"

"چھوٹا بھائی ہونے کا اچھا حق ادا کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ نہیں بتایا تھا کہ مستقل کام میں اندر ہو جاؤ گے۔"

"یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "وہ جانتے بوجھتے مجھے کنویں میں دھکا نہیں دے سکتا تھا، وہ دشمن نہیں تھا میرا۔"

"تم کو معلوم ہے وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹرک اس کا اپنا تھا۔ وہ کسی کا ملازم نہیں تھا۔"

"یہ بھی اس نے جھوٹ کہا تم سے۔" میں نے کہا۔

"آپ ... آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" الف دین کے لہجے میں اچانک تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔

"تم نے دلاور کے لیے کام کیا تھا۔ کبھی ملے تھے اس سے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کا صرف نام چلتا تھا کہ سیٹھ دلاور کا مال ہے۔" وہ بولا۔

"اور مال تمہارے حوالے کون کرتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ادائیگی کون کرتا تھا؟"

"اس کا ایک ایجنٹ، کوئی ملازم یا منشی۔" وہ بولا۔ "رحمت نام تھا اس کا۔"

"رحمت کباڑی؟" میں نے کہا۔ "کبھی اس کے ساتھ گاما ماچھی بھی آتا تھا۔ یا چھوٹو نام کا ایک کلینر۔"

"چھوٹو کو میں نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "گامے ماچھی کا نام بھی سُنا تھا۔ رحمت کا پورا نام رحمت کباڑی تھا۔ آپ اس کو جانتے ہیں؟"

"میں اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جن کا میں نے نام لیا، وہ سب دلاور کے کارندے ہیں اور افسوس کی بات یہ ہے الف دین کہ تمہارا چھوٹا بھائی طافو بھی اسی کے لیے کام کرتا تھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تھا کا کیا مطلب؟" وہ چونکا۔ "کیا اس نے وہ کام چھوڑ دیا ہے؟ یا وہ اندر ہو گیا ہے؟"

"وہ قبر کے اندر ہو گیا ہے، قیدِ حیات سے چھٹ گیا ہے الف دین۔" میں نے کہا۔

الف دین کی حالت ابتر ہو گئی۔ "جھوٹ... تم جھوٹ کہتے ہو۔ کب ہوا یہ حادثہ...؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"حادثہ؟ میں نے تو کسی حادثے کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ جھوٹ نہیں ہے الف دین کہ طافو مر چکا ہے۔"

"کیسے؟" وہ چلّایا۔ "اور کب؟"

"اسے دلاور نے مروا دیا ہے۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "جس کے لیے وہ کام کرتا تھا۔ اس بات کو آج تین دن ہو گئے۔"

اس کا جسم لرزنے لگا۔ "تین... تین دن ہو گئے... طافو کو مرے تین دن ہو گئے...؟" وہ کھوکھلے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ اسے بھی تمھاری طرح سازش کے جال میں پھنسا لیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی محنت مزدوری کر کے حق حلال کی کمائی کو اچھا سمجھتا تھا اور اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جس کے لیے کام کرتا ہے اس کا اصل دھندا کیا ہے۔ وہ اپنی ہزار روپے مہینہ کی تنخواہ میں خوش تھا۔ پھر سیٹھ کریم نے اس کے ساتھ زبردستی کی۔ اس نے دلاور کا ایک مال سے بھرا ہوا ٹرک غائب کر دیا۔ رحمت کباڑی اور طافو کو خاموش رہنے کے پانچ پانچ لاکھ دیے اور دلاور کو اطلاع کر دی کہ گودام پر چھاپا پڑ گیا ہے۔ اس نے کسی سے مل کر اخبار میں خبر لگوا دی تھی لیکن دلاور کو معلوم ہو گیا۔ اس نے رحمت کباڑی اور طافو کو مروانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ رحمت تو مارا گیا...." میں نے عمداً اس کی موت کے اصل واقعات بتانے سے گریز کیا۔ "طافو کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ رقم بیوی بچوں کے حوالے کر گیا اور انہیں تاکید کر گیا کہ وہ فرار ہو جائیں۔ طافو کو یقین تھا کہ دلاور کے کارندے انہیں کبھی تلاش نہیں کر سکتے۔ اپنی جان دے کر اس نے بیوی بچوں کی جان بچا لی ورنہ دلاور انہیں بھی نہ چھوڑتا۔ پیسہ ان کے پاس ہے۔ اُن کے لیے زندہ رہنا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ خوش رہیں گے۔"

"طافو کے بغیر؟" الف دین دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کیا پیسہ باپ ہوتا ہے؟ اس کی بیوی تو ہزار روپے مہینہ میں بھی خوش تھی۔ خوش نہ ہوتی تو اس کے ساتھ کیوں رہتی۔ کوئی بیوی اپنے گھر کو پانچ لاکھ میں بیچ کر خوش رہ سکتی ہے؟"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ طافو تو کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ اگر وہ پانچ لاکھ لینے سے انکار کرتا تو غبن کرنے والے اُسے مار ڈالتے۔ غبن کرنے والوں کا ساتھی بنا تو مالک سے نمک حرامی اور غدّاری کرنے کی سزا پائی۔ سزا سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر اس نے بیوی بچوں کے لیے کچھ تو کیا۔ صبر کرو اور ہمت سے کام لو۔"

"کیسے صبر کروں؟" وہ چلا چلّا کے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے بولا۔ "کہاں سے لاؤں ہمت...؟"

ٹیکسی ڈرائیور پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی سی دیر میں صورتِ حال اس حد تک کیسے بدل گئی کہ ظالم و مظلوم ایک ہو گئے۔ کچھ دیر پہلے میں جس کو زندہ گاڑ دینے اور اس کی لاش کو گدھوں اور گیدڑوں کے لیے چھوڑ جانے کی دھمکی دے رہا تھا اور مار مار کے جان سے مار دینا چاہتا تھا اب میں اس کے ساتھ ہمدردی کر رہا تھا۔ اسے ہمت سے کام لینے اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اچانک اس بدمعاش کے بھائی سے میرا تعلق نکل آیا تھا اور میں اس کے خاندانی معاملات پر بات کرنے لگا تھا۔ باقی سب نام اس کے لیے غیر اہم اور اجنبی تھے۔ رحمت کباڑی، دلاور یا گامے ماچھی کے نام سے اس کو مرنے یہ اندازہ لگانے میں مدد ملی ہو گی کہ وہ طافو کی موت کے ذمّے دار تھے۔ بے ایمان اور غلط قسم کا کاروبار کرنے والے لوگ تھے اور میرا بھی ان سے تعارف ضرور تھا۔ اب یہ خدا جانے کہ میں بھی ان کا کارندہ تھا یا قانون کا نمائندہ۔ بدمعاشوں کو پولیس بھی جانتی ہے اور اکثر جاننے والوں سے زیادہ جانتی ہے۔

میں الف دین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ بھی مار گزیدہ تھا اور بھائی کے قتل کی خبر نے اس کو زخم خوردہ سانپ کی طرح انتقام کی آرزو میں پاگل کر دیا تھا۔ اس کی دشمنی کے اسباب جُدا تھے۔ وہ مختلف وجوہات کی بنا پر دلاور اینڈ کمپنی کا دشمن ہو رہا تھا۔ اور اس کے نقصانات کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ لیکن دلاور کے خلاف اس کے اور میرے جذبات کی نوعیت یکساں تھی اور میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اس کے جذبات کو ہوا دینا اور اُسے اندھے انتقام کے جنون میں مبتلا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ وہ عقل و ذہانت میں اوسط درجے سے بھی کم تھا اور اگر میں احتیاط کے ساتھ اس کی ہمدردی حاصل کر کے اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں کہ اس کا اور میرا مشن ایک ہی ہے تو وہ بھی میرے لیے اتنا ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا جتنا استاد ٹیڈی ہوا تھا۔ وہ بھی ایک نچلے درجے کا بدمعاش تھا مگر ہم نے اسے عزت دی اور عزت نفس کا احساس دیا تو وہ شاطر اور عیار ذہن رکھنے والے، شریف و معتبر کہلانے والے دوست نما دشمنوں سے زیادہ مخلص دوست ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب کچھ اس جنگل میں اور اس ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کو کم سے کم معلوم ہو۔ الف دین کو اتنا ہی معلوم ہو جتنا اس کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے اور لائحہ عمل رابعہ اور محسن کی مشاورت میں ہو۔

"اچھا اب اٹھو۔" میں نے پھر ریوالور نکال لیا۔ "مجھے سوچنا پڑے گا کہ ان حالات میں تمھارے ساتھ کیا رعایت کی جائے۔ تم کسی طرح بھی قانون سے کوئی رحم کی اپیل نہیں کر سکتے۔ اگر تم جیل چلے گئے تو تمھاری بیوی کو معلوم ہو جائے گا کہ تمھاری آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ اب تک تم نے اسے کچھ نہیں بتایا ہوگا۔"

"نہیں، وہ سمجھتی ہے میں کمیشن کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اور مہینے میں ایک دو بار جتنی رقم اسے لے جا کر دیتے ہو وہ تمھارا کمیشن ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔ "جب یہ راز فاش ہو گیا تو اس کی سزا صرف تمھیں ہی نہیں، تمھارے بیوی بچوں کو بھی ملے گی۔ اس آمدنی میں وہ خاصی آسائش سے رہتے ہوں گے۔ تمھاری انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے والی بچی بڑے فخر سے کہتی ہوگی کہ میرے پاپا بزنس مین ہیں مگر یہ خبر چھپنے کے بعد اسے یقیناً اسکول سے نکال دیا جائے گا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "اسکول سے اسے کوئی نہیں نکال سکتا، اسکول میرا اپنا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "اسکول تمھارا ہے؟ وہ کیسے؟"

"ایسے کہ اسکول میرے پیسے سے بنا ہے اور میری بیوی اسکول کی سرپرست ہے۔" وہ بولا۔ "وہاں فیس آدھی لی جاتی ہے۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ پردہ اٹھتا ہے تو چشمِ تماشائی کو کیا کیا نظر آتا ہے۔ یہ دھوکے سے لوگوں کو لوٹنے والا شخص مالِ غنیمت سے اسکول چلا رہا تھا۔ قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی درس و تدریس کے معزز اور مقدس پیشے سے وابستہ تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چور اور گناہ گار تھا جو حرام کماتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تھما دیتا تھا اور یہ دوسرا ہاتھ کارِ خیر میں مصروف تھا۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔ شاعر نے یہ نکتہ نہیں سمجھایا کہ فیض کے اسباب بنانے کے لیے معاشی وسائل جائز طریقے سے پیدا کیے جائیں یا ناجائز طریقے سے، مجرم اور گناہگار وہ خود تھا مگر ایسا کام بھی کر رہا تھا جو فلاحِ انسانیت کا سبب تھا اور ثواب کا کام تھا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مالِ حرام سے جو تعلیم دی گئی وہ حرام تھی یا ناجائز تھی۔ اور وہ بچے قصوروار تھے جنہوں نے ایک چور، ڈاکو اور لٹیرے کے اسکول سے سند حاصل کی؟ نہیں، تعلیم تو تعلیم ہے۔ آدمیت کا لباس اور انسانیت کا گہنا۔ علم کی طلب میں آنے والے نیک نیتی کے ساتھ پہنچے اور خلوصِ نیت کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے۔ انھوں نے کبھی نہ جانا کہ اسکول کو چلانے والا پیسہ حلال کے راستوں سے آ رہا یا حرام ذرائع سے۔ وہ کالا دھن تھا یا سفید۔ اسکول کا پرنسپل گورا ہو یا کالا، اگر وہ پڑھاتا ہے اور چوری کرنا نہیں سکھاتا تو واجب ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے۔ میں نے الف دین کو جیل میں بند کرا دیا تو آمدنی کا وہ ذریعہ بند ہو جائے گا اور سیکڑوں بچوں کے لیے آدھی فیس پر اچھی تعلیم کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ کون یقین کرے گا کہ الف دین مجرم تھا۔ بد دعائیں جو معصوم بچے دیں گے اس کو ملیں گی جس نے حصولِ علم کا یہ سرچشمہ بند کیا۔ آخر ننانوے اعشاریہ ننانوے فیصد مجرم تو چوری اور ڈاکے، رشوت اور اسمگلنگ سے حاصل ہونے والی دولت کو ذاتی شان و شوکت، عیش و عشرت اور دنیاوی جاہ و عزت حاصل کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ کس بدمعاش نے آج تک بنک لوٹ کے اسکول بنایا؟ کس جیب کترے نے طلبا کو وظائف دیے؟ کس اسمگلر نے اسپتال قائم کیا؟ پھر الف دین کون ہے؟ مجرم اور گنہگار یا کارِ خیر کرنے والا محسنِ عظیم؟

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے سر کو ان بدخیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے جھٹکا۔ یہ قانون شکنی کا معاملہ ہے، اسے اخلاقی نقطۂ نظر سے یا مذہبی عقائد کی کسوٹی پر کیسے پرکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الف دین اپنی نوعیت کا منفرد مجرم تھا۔ ایسا کہ پہلے نہ دیکھا نہ سنا۔ مشہور تھا رابن ہڈ یا ہرام ڈاکو جو امیروں کی تجوریوں سے دولت نکال کر انہی میں بانٹ دیتے تھے جن کا خون چوس کے دولت اکٹھی ہوتی تھی مگر الف دین نے تو بالکل الگ ہی مثال قائم کی۔

"ٹیکسی میں بیٹھو۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اپنا سارا پیسہ اٹھا لو۔" وہ اب بھی اپنے بھائی کو یاد کر کے رو رہا تھا لیکن اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ٹیکسی اسی راستے سے واپس ہوئی۔ مجھے راہ میں وہ دونوں مسافر نظر نہ آئے جن کو بالترتیب تین میل اور چھ میل مارچ کرنے کے لیے اتار دیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ سڑک تک پہنچ کے کسی بس کے ذریعے واپس جا چکے تھے۔ ملتان روڈ سامنے نظر آنے لگا تو میں نے ٹیکسی کو روک لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمھارا وقت بھی ضائع ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو بلاوجہ پریشانی اٹھانی پڑی۔" میں نے دو سو روپے ٹیکسی ڈرائیور کی خدمت میں پیش کیے۔ "امید ہے یہ اس تلافی کے لیے کافی ہوں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے نوٹ لے لیے۔ "مہربانی جی۔ میں تو سمجھا تھا آج ٹیکسی گئی یا جان گئی۔"

"اگر تم تعاون نہ کرتے تو ایک چیز ضرور جاتی۔" میں نے کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"یہ دونوں آنی جانی چیزیں ہیں۔ آئندہ بھی جا سکتی ہیں اگر تم نے وعدے کے مطابق سب کچھ فراموش نہ کیا۔ وہ سب جو تم نے دیکھا اور سنا۔ تمھاری ٹیکسی کا نمبر ہمارے پاس ہے اس لیے ہم تو تم کو تلاش کر سکتے ہیں مگر ہمارا پتا تمھارے پاس نہیں ہے اس لیے تم دوبارہ اکیلے یا کسی کے ساتھ ہم سے ملنے نہیں آ سکتے۔" غیر شعوری طور پر میں نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا اور ابھی سے الف دین کو اپنے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

"خدا نہ کرے کہ پھر آپ سے ملاقات ہو جی۔ آج دو نفل پڑھوں گا شکرانے کے اور داتا صاحب کے مزار پر حاضری دوں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "آپ بھی کہا سنا معاف کر دیں تو بڑی مہربانی۔ اب میں جاؤں؟"

"جاؤ۔ یہاں سے سڑک تک پہنچنے میں تم کو دس منٹ بھی پیدل نہیں چلنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"پیدل؟" وہ چلایا۔ "دیکھو یہ ٹیکسی میری نہیں ہے۔ میں کرائے پر چلاتا ہوں۔ مالک کو کیا جواب دوں گا میں؟"

"شام کو چھ بجے ریلوے اسٹیشن پر دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی مل جائے گی۔"

ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ بے یقینی کے باعث قابلِ رحم ہو گیا تھا۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے الف دین کے کندھے پر ریوالور سے تھپکی دی۔ "وہ بائیس ہزار روپے اسے دے دو زرِ ضمانت کے طور پر۔"

اب الف دین کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے بائیس ہزار روپے ٹیکسی ڈرائیور کو دے دیے۔

"ہو سکتا ہے کہ تمھاری ٹیکسی کی قیمت اس سے زیادہ ہو ما تمھاری نظر میں۔" میں نے کہا۔ "ویسے اس چھکڑے کو خریدنا ہوتا تو میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ لیتا۔ پھر بھی یہ رقم ضمانت کے طور پر رکھو۔ شام کو ٹیکسی مل جائے تو واپس کر دینا۔ ورنہ مالک کو دے دینا۔ میرا خیال ہے وہ تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے رقم جیب میں رکھی اور نیچے اتر گیا۔ ابھی تک اس کو پوری طرح یقین نہیں آیا تھا کہ میں اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میرا رویہ بہت عجیب اور ناقابلِ فہم رہا تھا۔ اُسے اتارنے کے بعد میں اُسے گولی مار دیتا اور پھر رقم چھین لیتا تو اُسے بالکل تعجب نہ ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ مُردہ قدموں سے چل پڑا۔

"تم بس اور ٹرک چلا سکتے ہو تو یہ ٹیکسی تمھارے لیے کھلونا ہے۔" میں نے الف دین سے کہا۔ "ڈرائیونگ کرو لیکن میری ہدایات کو غور سے سنتے رہو۔ یہ بات مت بھولو کہ معمولی سی خلاف ورزی یا غلطی پر میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا اور ابھی تمھارا دم بھی نہیں نکلا ہو گا کہ میں لاش سڑک پر پھینک کے نکل جاؤں گا۔" الف دین نے کسی

ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر ڈرائیور کی جگہ کھسک کر ٹیکسی کو آگے بڑھایا۔ دو منٹ میں ہم ٹیکسی ڈرائیور کے پاس سے گزرے اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے میں نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ وہ ڈر کے ایک طرف ہو گیا تھا کہ کہیں ہم اسے کچلتے ہوئے گزرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ ٹیکسی گزر گئی تو اسے اطمینان نصیب ہوا اور اس نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا۔ مین روڈ پر ٹریفک میں شامل ہونے سے پہلے الف دین نے ٹیکسی کو روک کر دائیں بائیں دیکھا اور اسی وقت میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ وہ آواز نکالے بغیر اسٹیئرنگ پر جھک گیا۔ پیر کلچ پر سے ہٹا تو گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور اس کا انجن بند ہو گیا۔ میں اطمینان سے اُتر کے آگے آیا۔ الف دین کو ساتھ والی سیٹ پر لڑھکایا اور انجن پھر اسٹارٹ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آبادی میں پہنچتے ہی وہ ایس اوایس دینے لگے یا ایک دم کود کر فرار ہو جائے۔ ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ بظاہر وہ تعاون پر آمادہ تھا لیکن اس کے دل میں کیا ہے؟ میں یہ کیسے جان سکتا تھا۔

آبادی شروع ہونے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر کی دکانوں پر نظر رکھی اور جیسے ہی مجھے 'پبلک ٹیلیفون' کا سائن بورڈ نظر آیا میں نے ٹیکسی روک لی۔ الف دین سیٹ کی پُشت سے یوں آنکھیں بند کیے سر لگائے بیٹھا تھا کہ نیند میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے لاہور ہوٹل کا نمبر ملایا۔

"نواب ننھے خاں صاحب اگر کمرے میں ہوں تو بات کرا دیں؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر امجد کے کمرے میں ہوں گے؟"

"کیا کہوں ان سے؟" آپریٹر نے کہا۔ "کون بات کرے گا؟"

"نواب ننھے خاں کے ماموں؟" میں نے کہا۔ "لندن والے ماموں۔ وہ سو رہے ہوں تو ان کی ہمشیرہ پرنسس صوفیہ ہوں گی۔"

ایک منٹ کے بعد رابعہ نے ہیلو کہا تو میں نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ "کوئی حد ہوتی ہے نامعقولیت کی۔ یعنی ہم نے آپ کو وہاں چھوڑا تھا تو آخر کس لیے؟ آپ ایسے غائب ہوئیں جیسے ننھے خان کے سر سے سینگ...... مطلب وہی کے گدھے کے سر سے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔ "جہاں سے بھی بول رہے ہو خوب بول رہے ہو۔ کوئی اور بھی ہے ساتھ؟"

"ہاں۔ چچا اونگھتے خاں ساتھ ہیں۔ ٹیکسی میں سو گئے ہیں۔" میں نے ٹیکسی کی طرف ایک نظر ڈالی۔

"ٹیکسی کس کی ہے؟" رابعہ نے بے حد عقلمند ہونے کا ثبوت دیا۔ میں بہت خوش بھی تھا کہ وہ بخیریت واپس پہنچی۔

"ابھی تو اپنی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اِدھر ہی آ جاتے ہیں تم اپنی بگھی لے کر آ جاؤ ٹھنڈی سڑک پر۔"

میں نے ریسیور رکھا تو دکاندار مسکرا رہا تھا۔ اگر میں اتنا جلد

نہ ہوتا تو وہ میری گفتگو کو مذاق سمجھتا۔ میرے ٹیکسی تک جانے اور روانہ ہونے تک وہ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا کہ آج کل بھی نوابی کے کیسے کیسے نادر نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں نے الف دین کو سونے دیا۔ ابھی کم سے کم آدھے گھنٹے تک اس کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مال روڈ شروع ہوتے ہی میں نے ہر گاڑی پر نظر رکھی۔ جو سامنے سے گزری یا سڑک کے کنارے کسی نمایاں جگہ پر کھڑی ہوئی نظر آئی۔ رابعہ کی کورٹینا مجھے چڑیا گھر سے آگے گورنر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ملی۔ وہ خود ڈرائیور کی سیٹ پر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جو اسے وہیں چھوڑ کے کسی کام سے گیا تھا۔ اور ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ستم کش انتظار تھی۔ اس پر شک کیسے ہو سکتا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو اس کے پہلو سے لگا کے روکا۔ "اکیلی ہو؟" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔

"جی نہیں ماموں۔" محسن جو پچھلی سیٹ پر لیٹا تھا فوراً اُٹھ بیٹھا۔ "ہم بھی ساتھ ہیں۔" اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یہ نمونہ تو پہلے بھی دیکھا ہے۔" رابعہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر الف دین پر رہی۔

"اُنیس بیس کا فرق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ میں سمجھتا مُردہ پھر زندہ ہو گیا۔"

"بالکل۔ کیا یہ طافو کا بھائی ہے؟" رابعہ نے یوں کہا جیسے کوئی بہت مشکل سوال حل کر لیا ہو۔

"یہ باتیں کرنے کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے جنگی قیدی سمجھو۔ بہت اہم مُہرہ ہے جو بازی پلٹ سکتا ہے۔ اس کو گاڑی میں شفٹ کرنے کے بعد یہ طے کریں گے کہ اس کی حفاظت کے لیے کیا خصوصی اقدامات کیے جائیں۔"

میں نے اور محسن نے الف دین کو کار میں ڈالا۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے ٹیکسی کی چابی محسن کو دی اور اُسے کہا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کی جانب چلے۔ ٹیکسی کو اسٹینڈ پر روک کر انتظار کرے۔

"کس کا انتظار کروں؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص آئے گا اور بائیس ہزار میں ٹیکسی خریدے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بات پکی ہو گئی ہے۔ بیعانہ بھی دے دیا ہے۔"

"یہ چکر کیا ہے؟" محسن نے میری بات میں مذاق کا کوئی پہلو نہ پا کے کہا۔

"چکر کیسا؟" میں نے کہا۔ "وہ شخص ٹھیک چھ بجے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "ہلکے نیلے رنگ کی قمیص اور سفید رنگ کی شلوار۔ دُبلا پتلا آدمی ہے۔ خشخشی داڑھی اور تیکھی مونچھوں والا۔ جب تک پیسے نہ دے ٹیکسی کی چابی اُسے مت دینا۔"

"لاحول ولا قوہ۔ ہم گاڑیاں خریدتے تھے، چُرلتے تھے اور چھینتے تھے۔" محسن بولا۔ "یہ دھندا کب سے شروع کیا ہے اور یہ ٹیکسی آخر آئی کہاں سے؟"

"ابھی تو ملتان روڈ سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ ویسا ہی کریں جیسا میں فرما رہا ہوں۔ ہم تمھارے پیچھے ہیں اور پیچھے کار پارکنگ ایریا میں موجود ہوں گے۔ شک ہو تو پلٹ کر دیکھ لینا۔ خطرہ ہو تو دوڑ کر آ جانا۔ ڈزا ڈز کرتے کشتوں کے پُشتے لگاتے نکل جائیں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک چھ بجے اِدھر اُدھر دیکھتا نمودار ہوا اور سیدھا اپنی ٹیکسی کی طرف یوں بڑھا جیسے دیہاتی گمشدہ بھینس سے گلے ملنے لپکتا ہے۔ محسن خان ذرا فاصلے پر ٹہل رہے تھے معلوم نہیں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن چند منٹ میں صورتِ حال واضح ہو گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے رقم ان کے ہاتھ پر رکھی اور انھوں نے چابیاں دے کر ہاتھ ملایا۔ پھر ڈرائیور اپنی ٹیکسی لے کر روانہ ہو گیا اور محسن پلٹا۔

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "آدمی شریف تھا یا بزدل۔ ورنہ اکیلا نہ آتا۔"

"بائیس ہزار میں سودا بُرا نہیں رہا۔" محسن نے الف دین کو تھوڑا سا سمیٹ کر اپنے لیے پچھلی سیٹ پر تھوڑی سی جگہ بنائی۔ "میں نے اس سے کہا کہ خوش قسمت ہو ورنہ یہی ٹیکسی میں پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ میں نہ خریدتا۔ بہت حیران ہوا میری بات پر۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔ پیسے دینے سے انکار تو نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"کیا مطلب۔ میں نے کہا پھر چلو ٹیکسی کے مالک سے بات کر لو۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
گمراہ
۸ حصے شائع ہو چکے ہیں
ایک ایسے نوجوان کی داستان جو حالات کے بھنور میں پھنس کر جرائم کی دُنیا میں گرفتار ہو گیا
جبار توقیر کا منفرد اندازِ بیان
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

محسن بولا" اس پر اور حیران ہوا کہ کون مالک؟ میں نے کہا حسن نے جابیاں دیتے وقت کہا تھا کہ بائیس ہزار سے ایک پیسہ کم نہیں لینا ہے۔ وہ خود منٹ لے گا تم سے۔ اس کے بعد نہیں بولا۔ ویسے یہ ڈراما کیا ہے؟"

سانده کلاں میں استاد ٹیڈی کے گھر پہنچنے تک میں نے ان کو مختصراً وہ سب بتایا جو پوسٹ آفس میں الف دین سے ملاقات کے بعد سے اب تک پیش آیا تھا۔ میرے انکشافات ان کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوئے۔ ٹیڈی گھر پر نہیں تھا یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔ ہم اس بے ہوش آدمی کو کب تک کار میں ڈال کے گھوم سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس کا ہوش میں آجانا لازمی تھا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ شور ہنگامہ کرے پہلے تو میں اکیلا ہی تھا لیکن اب میرے ساتھ محسن بھی تھا۔ اس کے باوجود اسے ہوٹل لے جانے میں خطرہ تھا۔

"یہ بہت غلط بات ہے کہ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی کو واپس کیا۔

"تنظیم کا ایک مستقل ہیڈ کوارٹر ضرور ہونا چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اگر ہم اسی طرح ٹیڈی کے گھر کو استعمال کرتے رہے تو ایک نہ ایک دن ہماری وجہ سے ٹیڈی مشکل میں گرفتار ہو جائے گا اور ہم اس کی مدد بھی نہیں کر سکیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ہم کوئی چھوٹا سا مکان خرید سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "جو کسی گمنام سی جگہ پر ہو اور محفوظ ہو۔"

"مکان خریدنے کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے کی رقم درکار ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میں بنک سے اپنا سب پیسہ نکلوا لیتی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "ایک لاکھ سے اوپر ہی ہوگا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ انکل رضوی نے بنک والوں کو ہوشیار کر دیا ہو۔"

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "پولیس والے عدالتی احکامات کے بغیر کسی بنک منیجر کو پابند نہیں کر سکتے کہ وہ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کو اس کا پیسہ نہ دیں اور یہ بات انکل رضوی بھی سمجھتے ہوں گے کہ بنک منیجر صاف انکار کر دے گا۔ وہ کہے گا کہ اگر آپ خود گرفتار کر سکتے ہیں تو کر لیں، میں چیک نہیں روکوں گا۔"

"فرض کرو انھوں نے کہا کہ ہم میں سے کوئی چیک لے کر پہنچے تو پولیس کو اطلاع دے دی جائے؟"

"وہ تمہارے لیے ایسا کہہ سکتے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "میں نے ابھی تک کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ پولیس کے پاس میرے خلاف کون سی رپورٹ ہے؟"

"تم ایک مجرم کا ساتھ دے رہی ہو اور اس طرح شریک جرم ہو۔" میں نے کہا۔

"انکل کو پہلے میرے خلاف اس الزام کے تحت رپورٹ لکھوانی پڑے گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یہ کہنا تو آسان ہے ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایک وکیل کے خلاف۔"

"یہ آخری پوائنٹ بہت اسٹرانگ ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "کوئی عدالت آسانی سے پولیس کے الزام سے مطمئن نہیں ہوگی۔ الزام لگانے والے ایس ایس پی صاحب ہیں تو مقابل نہ کوئی عام عورت ہے نہ کوئی عام وکیل۔ تمہاری گڈول اب تک اچھی تھی۔"

"تھی کا کیا مطلب؟" رابعہ نے اسے ڈانٹا۔ "کیا اب خراب ہے؟"

"یہ مسئلہ متنازع ہے۔" میں نے رُک رُک کے کہا۔ "آج تمہیں ہم پیشہ وکیل ملا تھا۔ اس کے نقطہ نظر میں اچھی نہیں رہی جبکہ میرے خیال میں بہت بہتر ہے...... لیعنی، بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔"

"خیر کل صبح میں خود بنک منیجر سے ملوں گی۔" رابعہ بولی۔ "چیک اسی کو دوں گی۔ وہ میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔"

"کرنا بھی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جو نہ کرے وہ ذوقِ جمال سے عاری ہے۔ یا اس کی نظر کمزور ہے۔"

"وہ آدمی نہیں روبوٹ ہے۔" محسن نے فوراً تائید کی۔ "یا ابھی سنِ بلوغت کو نہیں پہنچا۔"

"یا وہ فرشتہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی نامحرم کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

"دنیا کی سب عورتوں کو اپنی ماں بہن یا بیٹی سمجھتا ہے۔" محسن نے گرہ لگائی۔

"اے ماؤں بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔" میں نے

"کیا مصیبت ہے۔ تم دونوں عامل معمول کی طرح بولنے پر آ ہو تو رُکنے کا نام نہیں لیتے۔" رابعہ نے جھنجلا کے کہا۔

"سوری۔ تو آپ فرما رہی تھیں کہ بنک منیجر مطلوبہ رقم آپ کو فوراً فراہم کر دے گا اور پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گا۔" میں نے کہا۔ "پولیس اگر وہاں پہلے سے موجود ہوئی، کسی نے آپ سے کچھ نہ کہا مگر آپ کے ساتھ ہو لیا تو پکڑا جاؤں گا میں یا من هو المطلوب۔"

"میں سیدھے راستے سے نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "منیجر کے پاس پہنچنے کے لیے بنک کا دوسرا راستہ بغلی گلی میں کھلتا تھا اور بنکنگ کے اوقات ختم ہو جانے کے بعد سامنے والا دروازہ تو مقفل کر دیا جاتا ہے، بعد میں یہی دوسرا راستہ استعمال

ہوتا ہے۔ ٹھیک ایک بجے بنک کے شٹر گرا دیے جاتے ہیں اور جو لوگ اندر موجود ہوں انھیں بھی اسی راستے سے نکالا جاتا ہے۔ اگر مجھے کوئی بات مخدوش نظر آئی تو میں منیجر سے بات کر لوں گی۔"

"ذرا مسکرا کے بات کرنا۔" محسن نے کہا اور رابعہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"مکان خریدنے کے بجائے کرائے پر لینا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ہم ایک فیملی ہیں جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا۔ اگر مکان چھوڑنا پڑا تو نقصان چار چھ ماہ کے ڈپازٹ کا ہوگا۔"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جس شخص نے نواب خسرو جمشید بن کے مجھے کوٹھی بیچی تھی وہ خود تو اتنے عرصے کے بعد مایوس ہو چکا ہوگا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے ہم سب کو اس کوٹھی کے نیچے بارودی سرنگ بچھا کے ایک ساتھ اُڑا دینے کا سوچا تھا لیکن اسکیم ناکام ہو گئی۔ اسے لاکھوں کا گھاٹا خواہ مخواہ ہوا۔ اب کیوں نہ اسے بھی فروخت کر کے نقد رقم محفوظ رکھی جائے۔"

"تم اسے بیچو گی کیسے بی بی؟" محسن بولا۔ "ایس پی صاحب خریدار بن کے پہنچ جائیں گے؟"

"ایس پی صاحب نہ ہوئے، فرشتۂ غیب ہو گئے کہ ہر جگہ موجود۔" رابعہ نے کہا۔ "میں منتظر کو پاور آف اٹارنی دے دوں گی، جنرل پاور آف اٹارنی۔ رقم وہ اپنے اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے اور فون کرنے پر ہمیں فراہم کر سکتا ہے۔ وہ بہت نڈر اور چالاک آدمی ہے۔ پولیس کے ایس پی صاحب بھی اسے چکر نہیں دے سکتے۔"

"تمہاری تجویز بھی قابلِ عمل ہے عزیزہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری بات سے ہمیں کچھ اور سُوجھ رہا ہے۔ کیوں نہ فی الحال ہم اسی کوٹھی کو اپنا مستقر بنا لیں جو آج تک مکینوں کو ترس رہی ہے۔ اپنی کوٹھی ہے، کچھ دن تو رہ لیں اس میں۔"

محسن اچھل پڑا۔ "موزوں ترین وقت پر آنے والا یہ موزوں ترین خیال ہے۔" وہ جوش سے بولا۔

وہ کوٹھی کس مپرسی کے عالم میں خانہ ویرانی کا مرقع عبرت بنی پڑی تھی جو رابعہ کے نام لاٹری کی طرح نکل آئی تھی۔ شکاری تو سمجھے تھے کہ ہم لاکھوں کا فائدہ دیکھیں گے تو فوراً اس میں منتقل ہو جائیں گے اور وہ دو چار لاکھ خرچ کر کے ایک ہی بار میں ہم سب کو شکار کر لیں گے۔ کوٹھی کی پیشکش کرنے والے نے ہمیں ایک انتہائی پُراثر اور دلگداز کہانی بھی سُنائی تھی تاکہ ہم شکوک کا شکار نہ ہوں۔ نواب خسرو جمشید بن کر آنے والے دو تھے جو ایک دوسرے سے ناقابلِ یقین حد تک مشابہ تھے۔ باری باری اصل بن کے آتے تھے لیکن دونوں جعلی تھے۔ ہم نے عقل سے کام نہ لیا ہوتا تو یقیناً ان کی سازش کا شکار ہو جاتے مگر اس قاتلانہ سازش کے بعد ہی ہم نے ایسا بندوبست کر لیا تھا کہ ایک کی موت یا عدم موجودگی میں دوسرا فوراً اس کا وارث اور جانشین ہو جائے اور ایک وصیت نامے کی رُو سے ہم سات افراد یکے بعد دیگرے قانونی طور پر حقِ وراثت استعمال کر سکتے تھے۔ ہماری اس چال نے دشمنوں کے لیے ہمارے قتل کو بے مقصد بنا دیا تھا۔ اب اس بات کو بھی زمانہ بیت چکا تھا اور یہ کوٹھی کاغذات میں رابعہ کی ملکیت ضرور تھی لیکن یاد کسی کو نہ تھی۔

اندر داخل ہونے کے بعد مجھے پرانے واقعات کی یادوں نے گھیر لیا لیکن رات ہونے لگی تھی اور ہمیں بہت کام کرنے تھے۔ میرے لیے سرِ فہرست کھانے کا مسئلہ تھا کیونکہ صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ الف دین ہوش میں آ چکا تھا اور اسے اندر منتقل کرنے کے بعد اس سے ضروری معلومات حاصل کرنی تھیں۔ کوٹھی میں پانی تھا لیکن اور کچھ نہیں تھا۔ مثلاً بجلی تھی لیکن کسی ہولڈر میں بلب نہیں تھا۔ مجھے نازلی کے بارے میں بھی اسپتال سے خیریت دریافت کرنی تھی۔ اور لاہور ہوٹل سے اپنا سامان بھی اٹھا کے لانا تھا۔ رابعہ کے پاس اب صرف اٹھارہ سو روپے تھے۔ محسن کے پاس آٹھ سو اور میرے پاس اللہ کا نام۔ الف دین کے بائیس ہزار الگ تھے جن کو ہم مالِ غنیمت کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ اس رقم پر الف دین کا قانونی یا اخلاقی حق نہیں بنتا تھا اور اصل مالک کا پتا چلا کے اسے رقم لوٹانا ناممکن تھا۔ اس قسم کی واردات کی خبر اخبار میں آتی بھی ہے تو یوں کہ فلاں علاقے میں کوئی شخص اتنے ہزار چھین کے بھاگ گیا۔ لٹنے والے کا صرف نام ہوتا ہے اور اگر اس کا سراغ لگانا ہو تو تھانے سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے جہاں وہ رپورٹ لکھوانے گیا ہو۔

میں نے اسی رقم سے دو ہزار لیے اور محسن کو الف دین کی نگرانی اور رابعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باہر نکلا۔ بلب تو مجھے قریب ہی ایک دکان سے مل گئے جو میں نے محسن کو پہنچا دیے تاکہ میری واپسی تک وہ اندھیرے میں نہ رہے۔ ریوالور محسن کے پاس بھی تھا لیکن الف دین کی جسمانی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مقابلہ کر سکتا۔ کار لے کر روانہ ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے نظر آنے والے صدر بازار کے ایک عام سے ریسٹورنٹ میں دو کپ چائے پی اور وہاں جو کچھ مل سکا غنیمت جان کے کھایا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے لاہور ہوٹل میں اپنا بل ادا کیا اور جتنی دیر میں پورٹر نے سامان میری کار میں رکھا، میں نے البرٹ وکٹر ہوسپٹل کا نمبر ملایا۔ نازلی بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔ واپسی پر میں نے بازار سے گزرتے ہوئے ضرورت کا بہت سا اسباب خریدا۔ ان میں دریاں اور لحاف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھے، تکیے اور تولیے تھے۔ بجلی کا ہیٹر اور برتن تھے اور چائے کافی بنانے کا سامان تھا۔ سگریٹ تھے اور بسکٹوں کے ڈبے تھے۔ حالی روڈ کی واحد کھلی ہوئی دکان سے میں نے ایک ٹیپ ریکارڈر لیا۔ پھر میں نے ایک ہوٹل سے لنچ باکس لیے اور واپس پہنچا تو رات کے نو بجے تھے۔ میری عدم موجودگی میں رابعہ نے محسن کو باہر بھیجا تھا کہ ایک جھاڑو لائے اور خود ریوالور لیے الف دین کی پہرے داری کے فرائض انجام دیتی رہی تھی جس کی عقل اتنی حسین اور جوان عورت کے ہاتھوں میں اتنا خطرناک آتشیں اسلحہ دیکھ کر خبط ہوگئی تھی۔ اسی عورت نے بعد میں انتہائی سگھڑ اور گھریلو خاتونِ خانہ کی طرح دوپٹے سے ناک منہ لپیٹ کے گرد آلود فرش کو جھاڑو سے صاف کیا۔ کہاں جھاڑو کہاں ریوالور۔ ایک ہتھیلی پہ حنا ایک ہتھیلی پہ لہو۔

جب میں پہنچا تو رابعہ گرد میں اٹی بنی کھڑی تھی اور محسن خان نے تفتیشی افسر کے فرائض سنبھال لیے تھے کوٹھی میں تو شاید چار باتھ روم تھے مگر ہم نے اسی ماسٹر بیڈ روم میں ڈیرے ڈال دیے جو سب سے بڑا تھا اور اسی سے ملحق باتھ روم کو استعمال کیا۔ جتنی دیر میں رابعہ نے مناسب فاصلے سے تینوں دریاں بچھائیں، یوں کہ محسن درمیان میں رہا، ان پہ تکیے رکھے اور لحاف رکھے میں نے ٹھنڈے پانی سے غسلِ صحت فرمایا اور تقریباً بیمار ہوکے نکلا۔ محسن نے میری تقلید کی لیکن رابعہ بزدل ثابت ہوئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے نہانے پر منہ ہاتھ دھونے کو ترجیح دی۔ پھر ہم سب نے کافی پی اور ہیٹر کو آن چھوڑ دیا تاکہ خالی کمرے میں کچھ حرارت پیدا ہو۔

"ابھی تک تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ مجھے جی پی او میں داغِ مفارقت دے کر تم کہاں نکل گئی تھیں؟" میں نے تازہ دم ہو جانے کے بعد سگریٹ جلا کے دیوار سے تکیہ لگایا اور نیم دراز ہوگیا۔

"جب تم نے پوچھا نہیں تو میں کیا بتاؤں؟ اور کیوں بتاؤں کہ میں اس شخص کو استاد پیڈرو سمجھ کے اس کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی تھی"۔ وہ بولی۔" وہ کامرس بنک کے سامنے گاڑی سے اترا اور مجھے دیکھ کر پھر گاڑی میں بیٹھا اور بڑی عجلت میں روانہ ہوگیا۔ اسی سے مجھے شک ہوا۔ میں نے کار اس کے پیچھے لگادی۔ ہائی کورٹ کے سگنل سے تو وہ سیدھا گزر گیا لیکن ہال روڈ کے چوراہے پر میں نے اُسے جالیا، وہ کوئی اور تھا"۔

"وہ کوئی اور تھا"۔ میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔" اگر وہ سچ مچ استاد پیڈرو ہوتا تو تم کون سی توپ چلاتیں۔ وہ پلٹ کر تم پر گولی چلا دیتا تو میرا انجام وہی ہوتا جو مجھ سے پہلے فرہاد اور مجنوں کا ہوچکا ہے"۔

"خواتین کو ویسے بھی سراغرسانی میں ٹانگ اڑانے سے گریز کرنا چاہیے"۔ محسن نے کہا۔" یہ جاسوسی ادب کی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی عورت آج تک شرلاک ہومز یا جیمس بونڈ نہیں ہوئی"۔

"تم متعصب اور تنگ نظر مرد ہو، دونوں"۔ رابعہ نے خفگی سے کہا۔" ابھی کل ہی میں نے استاد گولی والا کارنامہ انجام نہ دیا ہوتا تو فرہاد اور مجنوں بننے کا دعویٰ کرنے والے کہاں ہوتے؟ حوالات میں"۔

"مجھے شک ہے تمہارے کمرے میں دھماکا کرنے والا ... تھا"۔ میں نے کہا۔" استاد گولی کا گروہ۔ ان سے بھی پھر ملاقات کرنی ... گے اور اسے ہوٹل فاران کے منیجر کے پاس لے جائیں گے کہ پہچان ... کیا یہی وہ منیجر شریف ہیں؟ اسکی خاصی تذلیل ہوئی تھی اپنے رفقا کے سامنے"۔

"کیا تم لوگ رات بھر مجھے یہاں رکھو گے؟" الف دین نے مسلسل خاموشی کو ناقابلِ برداشت پاکے کہا۔

"ہاں۔ رات بھر یا مہینے بھر۔ سال بھر"۔ میں نے کہا۔

"یومِ حشر تک"۔ محسن نے کہا۔" یہاں تمہاری تدفین یا دیگر آخری رسومات کی راہ میں کون حائل ہے؟"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" الف دین بولا۔" میں نے تم سے کچھ چھپایا تو نہیں اور تم سے تعاون کیا"۔

"محسن! یہ طافو کا بھائی ہے"۔ میں نے بے نیازی سے کہا۔ "جسے دلاور نے مروا دیا تھا"۔

"وہ چوہدری دلاور کا ٹرک چلاتا تھا"۔ محسن نے بھی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا۔" پھر تو ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے"۔

"میری بیوی پریشان ہوگی، تھانے فون کردے گی"۔ وہ بولا۔

"اچھا۔ تو تمہارے گھر میں ٹیلی فون بھی ہے"۔ میں نے کہا۔" ... کر رہے ہو؟ یہاں لوگ سالوں انتظار کرتے ہیں اور ضرورت مند ... ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو فون نہیں ملتا اور تم جیسے بدمعاش کے گھر میں فون ہے"۔

"نمبر بتاؤ اپنا، ہم تمہاری بیوی کو بتا دیتے ہیں کہ تم آج نہیں آسکو گے"۔ محسن بولا۔" بہانہ کیا کرنا ہے؟"

"کہہ دینا... طافو کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی"۔ وہ بولا۔ اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

"میں دیکھتی ہوں آس پاس کہیں فون ہوگا"۔ رابعہ نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد کہا اور اکیلی باہر نکل گئی۔

"تمہاری بیوی بہت بہادر ہے"۔ الف دین نے کہا۔

"بہت بے رحم بھی ہے۔ ذرا کوئی بات ناگوار گزری اور ..." میں نے کہا۔" میں اس کا چوتھا... نہیں پانچواں شوہر ہوں"۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ دلاور نے تمہارے بھائی کی لاش ... ساتھ کیا ظلم کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

وہ چونکا۔" نہیں... مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے... تم بتاؤ"۔

"ہمیں بھی نہیں معلوم"۔ میں نے کہا۔" لیکن ہم معلوم کرسکتے ہیں۔ ... کی لاش اس کے گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ اس کام میں پولیس ... اس کی مدد کی۔ راجہ فتح شیر نام کا ایک سب انسپکٹر چار سپاہیوں ... ساتھ گیا تھا۔ اس نے رشوت لے لی اور لاش کو ادھر اُدھر کر ... ہم اس سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ لاش کہاں ہے؟"

"اور یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے قاتل کو بے گناہ ... نے کا کیا معاوضہ لیا ہے"۔ محسن بولا۔

"تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم پہلے کسی ... بات فروش کے لیے کام کرتے رہے ہو"۔ میں نے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ منشیات بھی بیچتا ہے"۔ الف دین نے احتجاج کیا۔" وہ گڑ چاول کا آڑھتی تھا"۔

"جب تم پکڑے گئے تو تم نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی" ... نے کہا۔" اس نے تمہیں رہائی دلائی ورنہ تم جیل جاتے اور تم نے ... کی نیکی کا یہ صلہ دیا؟"

"میں کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہتا تھا"۔ وہ بولا۔

"تمہارے چاہنے کی بات نہیں، یہ لوگ کمبل ہوتے ہیں"۔ میں ... کہا۔" کوئی انھیں چھوڑنا چاہے تو یہ اس کو نہیں چھوڑتے۔ کیونکہ ان ... ڈر ہوتا ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر نہ تل جائے"۔

"انھوں نے مجھے بھی وہی دھمکی دی تھی جو تم نے دی تھی"۔ وہ ... سے بولا۔" رحمت کباڑی نے کہا تھا کہ میری بچی کو میری نظروں کے ... سامنے ذبح کرکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا"۔

"تمہارا مطلب ہے رحمت کباڑی بھی پہلے منشیات کا دھندا ... تا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو مال میں لاہور سے کراچی کے ... کریم کے لیے لے جا رہا تھا اس میں چاول اور گڑ کی بوریوں ... درمیان ایک بوری میں ہیروئن تھی"۔ الف دین نے کہا۔" سب ... یاں ایک جیسی تھیں۔ انھوں نے اپنی شناخت کے لیے کوئی نشانی ... ہوگی۔ کراچی میں ٹول پلازہ سے آگے نکلتے ہی مجھے سڑک پر پولیس ... رینجرز کے جوان نظر آئے"۔

"رحمت کباڑی تمہارے ساتھ نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا لیکن اس نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ... ہے"۔ وہ بولا۔" مجھے کیسے شک ہوسکتا تھا۔ پولیس تو پشاور سے کراچی ... تک ہے اور ناجائز مال روز پکڑا جاتا ہے لیکن مجھے معلوم ہو ... تب بھی میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ... اس نے ایک دم دروازہ کھول کے چھلانگ لگائی اور کھیتوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے دوبارہ اس کو نہیں دیکھا۔ تھانے میں مجھے بہت مار پڑی لیکن میں وہی کہتا رہا جو سچ تھا۔ مال کے اصل مالک بھی مکر گئے اور سیٹھ کریم نے بھی پہلے تو مجسٹریٹ کے سامنے مجھے پہچاننے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ یہ ڈرائیور پہلی بار آیا ہے اور ہیروئن کی بوری اگر کسی نے رکھی ہوگی تو اسی کو معلوم ہوگا"۔

"ایک پوری بوری ہیروئن کی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس میں بھی گڑ اور چاول تھے"۔ الف دین بولا۔" درمیان میں چار کلو کی تھیلی چھپا دی گئی تھی۔ سیٹھ کریم بعد میں تھانے پہنچا اور مجھ سے ملا۔ اس نے رحمت کباڑی کے متعلق پوچھا اور یہ پوچھا کہ آخر پولیس کو کس نے خبر دی تھی؟ اسے یقین تھا کہ مخبر کی مدد کے بغیر پولیس کو کچھ معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ تھانیدار سے باتیں کرتا رہا اور اس رات مجھے زیادہ مار پڑی۔ پہلے وہ پوچھ رہے تھے کہ مال کس کا ہے؟ پھر وہ پوچھتے رہے کہ میں نے کس کو بتایا تھا جس نے کسٹم کے ایک اعلیٰ افسر کو فون کرکے ٹرک کا نمبر تک بتا دیا تھا۔ جب انھیں میری بے گناہی کا یقین آگیا اور میں مرنے کے قریب ہوگیا تو کریم سیٹھ پھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ معاملہ دبا دیا گیا ہے۔ آدھی رات کو مجھے چھوڑ دیا گیا۔ باہر رحمت کباڑی موجود تھا۔ اس نے مجھے جیپ میں بٹھا لیا اور وہ مجھے کسی کوٹھی میں لے گئے"۔

"کہاں؟ کراچی میں یا لاہور میں؟" میں نے کہا۔ اسی وقت رابعہ اندر آئی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔

"وہیں کراچی میں۔ مجھے تو اس علاقے کا نام بھی معلوم نہیں"۔ الف دین بولا۔" وہاں اور بھی دو افراد تھے"۔

"تم اگر تصویر دیکھو گے تو ان کو پہچان لو گے؟" میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی بہت عجیب عورت ہے"۔ رابعہ نے کہا۔ "میری اطلاع پر چلانے لگی کہ وہ مرنی ہوگا، اسے بیوی کا خیال نہیں، بھائی کی خاطر نکل گیا۔ گھر والی مرتی ہے تو مر جائے۔ پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ تو کون ہے اس کی؟"

"وہ زبان دراز عورت ہے۔ محبت کرتی ہے نا اس لیے ہمیشہ شک اور حسد میں مبتلا رہتی ہے"۔ الف دین بولا۔

میں نے اور رابعہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بھی کیا انداز ہے محبت کا۔ لیکن یہ خوبصورت مکالموں اور دوگانوں والی فلمی محبت نہیں تھی۔ حقیقی زندگی کی ایک تصویر تھی جس میں سارے رنگ سچے تھے۔ نفرت کے بھی اور محبت کے بھی۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم تصویر کی مدد سے سب کو شناخت کرلو گے؟" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے پہچان لوں گا"۔ وہ بولا۔

"اچھا آگے چلو۔ ان لوگوں نے کیا کہا تم سے؟" میں نے پوچھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہی جو میں نے بتایا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بدستور کام کرتا رہوں۔" الف دین بولا۔" ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اس تکلیف کے بدلے مجھے پانچ ہزار بھی پیش کیے لیکن میں نے انکار کر دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

"اگر وہ تمھیں قتل کر دیتے۔" محسن نے کہا۔" اور طافو کی لاش کی طرح تمھاری لاش بھی غائب کر دیتے؟"

"ان کا ارادہ یہی تھا لیکن میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور رو دھو کر انہیں قائل کر لیا کہ میں کبھی اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالوں گا۔" الف دین بولا۔" انہیں رحم آ گیا اور انھوں نے مجھے دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔"

"لیکن آج تم نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ہمیں ان کے خلاف معلومات فراہم کر دی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔ انھوں نے طافو کو مار ڈالا ہے۔ میں خاموش نہیں رہ سکتا۔" وہ بولا۔

"تم کیا کرو گے؟ بدلہ لو گے ان سے؟" محسن نے کہا۔

"میں ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ کروں گا۔" وہ بولا۔ "عدالت میں ان کے خلاف گواہی دوں گا۔"

"مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔" اور پولیس نے طافو کے قتل کا کیس تم پر بنا دیا پھر؟"

"مجھ پر؟ میں اپنے بھائی کو کیسے قتل کر سکتا ہوں؟" وہ بولا۔

"جیسے ہابیل نے قابیل کو کیا تھا۔" میں نے کہا۔" دنیا میں ہر روز ہوتا ہے یہ تماشا۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ کون کس پر کیا ثابت کر سکتا ہے اور تمھارے مقابلے میں ان کے پاس سب سے بڑی دلیل ان کی دولت ہے۔ طافو کا قتل پہلے ثابت ہو گا۔ اس کے بعد قاتل کی بات ہو گی۔ ابھی تو قتل کی خبر بھی صرف ہم کو ہے۔"

"یا اس سب انسپکٹر اور اس کے چار ماتحتوں کو جن کا منہ بند ہے۔" محسن نے کہا۔" ہم ان کا منہ کھلوانا چاہتے ہیں پھر وہ بتائیں گے کہ طافو کی لاش کہاں گئی۔ عدالت میں نہ دلاور پہ جرم ثابت ہو سکتا ہے نہ اس جرم پر پردہ ڈالنے والوں کے خلاف الزام لگایا جا سکتا ہے۔ یہ جرم بھی ہم ثابت کر سکیں گے اور انہیں قانون کے مطابق سزا بھی ہم دیں گے۔ تم کو ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ ہمت ہے تم میں؟"

"ہمت تو ہے۔ لیکن..... تم لوگ کون ہو؟" الف دین نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔" محسن نے کہا۔" ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ دلاور اور اس کے ساتھی ہمارے بھی دشمن ہیں۔ انھوں نے جتنا نقصان تمھیں پہنچایا ہے اس سے ہزار گنا نقصان ہمارا کیا ہے اور وہ پکڑے نہیں گئے ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ اپنی دولت اور اثر رسوخ سے وہ ثبوت اور شہادت خرید لیتے [illegible] ان کے خلاف ہوا اور وہ بھی جس سے ان کی سبکی [illegible]

"تم نے ذکر کیا تھا کہ دلاور نام کا ایک شخص [illegible] کے ناجائز کاروبار میں لاکھوں سے کروڑوں بنا رہا ہے [illegible] کہا۔" تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے طافو نے بتایا تھا۔ طافو کا ایسے لوگوں [illegible] الف دین بولا۔

"خود تم نے کبھی دلاور کو دیکھا تھا؟" رابعہ نے [illegible]

"نہیں۔ بہت سے اجنبی چہرے بھی سامنے آتے [illegible] دلاور انہی میں شامل تھا تو الگ بات ہے۔" الف دین [illegible]

رابعہ نے میرے بریف کیس میں سے ایک لفافہ [illegible] اس میں سے چند تصویریں نکال کے الف دین کے سامنے [illegible] "غور سے دیکھو، ان میں سے کس کس کو پہچان سکتے ہو [illegible]

الف دین نے ایک ایک تصویر اٹھا کے روشنی [illegible] غور سے دیکھی۔ میں اس کی صورت کے تاثرات کا غور [illegible] کرتا رہا کہ کسی تصویر کی شناخت کا ردِ عمل ظاہر ہو تو نوٹ کر[illegible] اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ ڈی سلوا، استاد پیڈرو، میر [illegible] اور دلاور میں سے وہ کسی کو نہیں پہچان سکا۔ اس سے [illegible] سی مایوسی ہوئی۔ رابعہ نے تصویریں واپس بریف کیس میں [illegible]

"جو ٹرک تم چلاتے تھے اس کا نمبر کیا تھا؟" میں نے [illegible]

"اب تو مجھے یاد نہیں۔" وہ بولا۔" ایک سال پہلے کی بات [illegible]

"اس ایک سال میں تم ٹرک ڈرائیوروں سے لٹیرے کیسے [illegible] میں نے کہا۔" جب کہ تم کوئی غلط کام کرنے کے خلاف تھے [illegible]

"میں نے تو کوشش کی تھی کہ ٹرک ڈرائیور ہی رہوں [illegible] دین نے کہا۔" لیکن ایک تو مجھے منع کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے [illegible] اگر تم ہمارے لیے کام نہیں کر سکتے تو پھر کسی اور کے لیے [illegible] کرو گے۔ تم کسی اور ٹرک پر نظر آئے تو تمھاری خیر نہیں [illegible] بھی ڈرتا تھا کہ ایسا ہی کھیلا پھر نہ ہو جائے۔"

"لیکن تم نے ڈرائیونگ لائسنس کی تجدید حال [illegible] ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ بس ایسے ہی کہ ضرورت پڑنے پر کام آ جائے [illegible] "اومنی بس کا ڈرائیور تو بن ہی سکتا ہوں میں۔ لاہور [illegible] روٹ پر لاری چلاتا رہا ہوں مگر وہ ڈیوٹی بہت سخت [illegible] میں دو پھیرے کرنے پڑتے تھے۔ آدھی رات کو گھر [illegible] تھا اور صبح چھ بجے پھر ڈیوٹی۔ میں بیمار پڑ گیا اور فاقو[illegible] آ گئی۔ ایک دن طافو مجھے دیکھنے آیا تو مجھے ایک ریوالو[illegible] اس نے کہا بھائی الف دین یہ کوئی زندگی نہیں ہے

[illegible] غلطی کرتے ہو۔ دیکھو کمانے والے کس طرح کما رہے ہیں [illegible] عیش کر رہے ہیں۔ ہمت نہیں ہے تو سب کو مار دو اور [illegible] دستی کر لو ورنہ اس سے کچھ کر کے دکھاؤ۔ یہ ہر خزانے کی چابی [illegible] میں بہت ڈرا اور اپنی بیوی سے بھی ریوالور چھپا لیا مگر [illegible] شیطان مجھے بہکانے لگا۔ ایک بار میرا سُسر آیا ہوا تھا۔ [illegible] نے زمین بیچ دی تھی اور وہ شہر میں کھڈی لگانا چاہتا تھا۔ [illegible] کے بیٹے سب کماتے ہیں اور باہر سے پیسہ بھیجتے رہتے ہیں۔"

"تم نے اسی کو لوٹ لیا۔" محسن نے کہا اور رابعہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

الف دین جھینپ کر مسکرانے لگا۔" اسے کون سی ضرورت [illegible] تھی پیسے کی۔ وہ سو رہا تھا کہ میں رات کو اٹھا، منہ پر چادر کا ڈھاٹا [illegible] اور اس کے کمرے میں گھس گیا۔ ریوالور دیکھ کر اس کی آواز بند ہو گئی۔ [illegible] ہزار روپے تھے اس کے پاس جو اس نے سرہانے رکھے ہوئے [illegible] تکیہ بنا کے سو رہا تھا۔ میں نے سب باندھ لیے۔ پھر اسے باندھا [illegible] اور کمرے کو باہر سے بند کر کے باہر گیا۔ سارا پیسہ زمین کھود کے [illegible] اور کپڑے بدل کے سو گیا۔ صبح میری آنکھ تو جلدی کھل گئی تھی [illegible] پڑا رہا۔ میری بیوی اٹھی اور اس نے باپ کو جگانا چاہا تو باہر کنڈی لگی دیکھی۔ جب اس نے چیخ پکار مچائی تو میں اٹھا۔ بڈھے پر شک ہونے کا سوال ہی نہ تھا لیکن طافو کو معلوم ہوا تو وہ [illegible] اور بہت خوش ہوا۔"

ایک بار پھر ہم سب کو زور سے ہنسی آئی۔" اچھا راستہ دکھایا چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو۔"

"سب قسمت کے کھیل ہیں۔ وہ خود کس راستے پر نکل گیا ہے [illegible] اب واپس ہی نہیں آئے گا۔" الف دین ایک بار پھر رونے لگا۔" شاید [illegible] لوگوں نے مجھے بچا لیا۔ میں خود کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ کسی [illegible] قتل کر دیتا تو پھانسی چڑھ جاتا۔"

"تمھارا وہ ریوالور اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔" اگر آج تمھارے پاس ہوتا تو کام نہ آتا؟"

"اسی ڈر سے میں نے ریوالور ساتھ رکھنا چھوڑ دیا تھا۔" الف دین [illegible] کہ کسی دن استعمال نہ کر بیٹھوں۔ ایک بار ستر ہزار کی رقم ہاتھ آ [illegible] وہ ایک بہانہ بن گیا۔ میرے دل میں لالچ جاگ اٹھا اور میں [illegible] کو لوٹا جو مجھ پر شک نہیں کر سکتے تھے۔ پاس پڑوس کے [illegible] والے، رشتے دار اور عزیز۔ مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ [illegible] کے گھر سے نقد یا زیور کی صورت میں زیادہ مال ملنے کی [illegible]۔ کہاں کون اکیلا ملے گا اور مقابلہ نہیں کرے گا اور کس کا گھر [illegible] ہو گا۔ اکثر گھروں کو میں نے اس رات کو نشانہ بنایا جب گھر کی [illegible] شادی کر کے لوٹی تھیں اور انھوں نے سارا گہنا پہن رکھا تھا۔

عام دنوں میں وہ زیور کو لاکر میں رکھتی تھیں۔ میں پہلے سے مشہور کر دیتا تھا کہ رات کو بس لے کر پنڈی جانا ہے اور خود اپنا حلیہ بدل کے پہنچتا تھا۔ دو گھر ایسے تھے جہاں نقد رقم صرف ایک رات کے لیے آئی تھی۔ ایک کا پرائز بونڈ نکلا تھا اور جس دن اسے پچاس ہزار نقد ملے اس روز دیر ہو جانے کی وجہ سے وہ رقم بنک میں جمع نہ کروائی جا سکی۔ دوسرے گھر میں ایک ٹھیکیدار رہتا تھا وہ کہیں سے رقم لے کر آ رہا تھا کہ بریف کیس کھل گیا اور سارے نوٹ گلی میں بکھر گئے۔ میں نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس کی مدد کی اور جب وہ ساری رقم سنبھال کے چلا گیا تو اس کے پیچھے گیا اور اس کا گھر دیکھ آیا۔ دیکھنے والے تو کتنے ہی لوگ تھے، وہ کس پہ شک کرتا۔ پھر ایک رات خلاف توقع میرا پردہ چاک ہونے لگا تو مجھے ریوالور استعمال کرنا پڑ گیا۔ وہ گلی کا ایک لڑکا تھا جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اسے کمزور اور بزدل سمجھتا تھا اور اس رات گھر میں وہ اکیلا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اور اس کے والدین تقریب میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ بیوی کی بیماری کے باعث نہ جا سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا اسکی بیوی کو شادی میں کتنا زیور ملا تھا جو وہ گھر میں رکھتی تھی۔ اس لڑکے نے میرا راستہ روک لیا، بیوی کے منع کرنے کے باوجود۔ شاید وہ نئی نویلی دلھن کے سامنے خود کو بزدل شوہر ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس پہ گولی چلانی پڑی اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہوا۔ ایک مہینے تک وہ لڑکا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا اور میں سخت اذیت میں۔ اگر وہ مر جاتا تو میرے لیے مصیبت ہو جاتی۔ معلوم نہیں میں کیا کرتا۔ تمام عمر ملامت کا عذاب جھیلنے کے بجائے میں دو چار سال کی قید کاٹنے کو ترجیح دیتا یا پاگل ہو جاتا۔ اس کے بعد میں نے ریوالور کبھی ساتھ نہیں رکھا۔ چوری ڈکیتی کی سزا دو چار سال ہی ہوتی ہے نا، پھانسی کے تختے پر تو نہیں لٹکنا پڑتا۔"

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم آدمی بُرے نہیں ہو۔" میں نے کہا۔" پہلے تم حالات کی سازش کا شکار ہوئے۔ پھر تمھیں غلط مواقع بھی ملے۔ ایک ریوالور ہاتھ آ گیا۔ مفت میں ستر ہزار ہاتھ لگ گئے۔ تم کچھ ذہین تھے کہ تم نے آغاز گھر سے کیا۔ لوگ نیکی پہلے اپنوں سے کرتے ہیں پھر غیروں سے۔ تم نے اس کا اُلٹا کیا۔ اگر تم پکڑے جاتے تو شاید تمھارے خلاف سخت کارروائی نہ ہوتی۔ اس بات کا امکان تھا کہ لوگ تمھیں مار پیٹ کے اور شرمندہ کر کے چھوڑ دیں۔ اس سے تمھاری حوصلہ افزائی ہوتی۔ یہاں تک کہ آج قسمت نے تم کو مجھ سے بھڑا دیا اور یہی تقدیر کی ستم ظریفی ہے۔ تم نے مجھے لوٹا نہیں تھا۔ میں نے تم کو لوٹ بھی لیا اور گرفتار بھی کر لیا۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم وہی کرو گے جو تم چاہتے ہو۔" وہ بولا۔" پھر مجھ سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیوں پوچھتے ہو؟

"تمھیں اندازہ نہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔ "ہمارے مراسم بہت اونچی سطح پر پولیس سے بھی ہیں۔ اگر ہم تم کو پولیس کے حوالے کردیں تو تمھیں اپنے سب گناہوں کی سزا مل جائے گی۔ وہ خود ایک ایک واردات کی تفصیل پوچھ لیں گے اور سب حساب برابر کردیں گے دوسرا طریقہ وہ ہے جو ہمارا طریقہ ہے۔ ہم تھانے کچہری کے لمبے چکر میں نہیں پڑتے جہاں چالان پیش ہونے سے آخری اپیل کے مسترد ہونے تک ہزار مرحلے آتے ہیں۔ سچ میں جھوٹ شامل کردیا جاتا ہے اور جھوٹ میں سچ۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا سب کچھ سمجھنے کے باوجود فیصلہ انہی شہادتوں پر کرتا ہے جو اس کے سامنے اور دنیا کے سامنے پیش کی جاسکیں اور اس عمل کو پیچیدہ بنا کے اتنا طویل کردیا جاتا ہے کہ فیصلہ کئی سال بعد ہوتا ہے اور بعض اوقات غلط ہوجاتا ہے۔ اس میں منصف کا نہیں نظامِ انصاف کی مشینری کا قصور ہوتا ہے۔ ہم حقائق سے آگاہی کے بعد ہی فیصلہ کرتے ہیں۔ مثلاً تم اپنا کیس لو۔ اب ہمیں کیا ضرورت ہے کسی ثبوت کی یا گواہ کی، بحث اور جرح کی۔ ہم تم کو وہی سزا دے سکتے ہیں جو قانون کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔"

"کیا تم نے قانون کی کتابیں پڑھی ہیں؟" الف دین نیم سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"ہاں، میں نے پڑھی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اپنا نام تمھیں نہیں بتاؤں گی لیکن نیچے سے اوپر تک سب وکیل، مجسٹریٹ اور جج مجھے جانتے ہیں۔ میں ہائی کورٹ میں مقدمات لڑ چکی ہوں۔ کبھی کوئی مقدمہ نہیں ہاری اور میرے ماتحت چار وکیل ہیں۔"

الف دین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اسے رابعہ کی کہی ہوئی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی عورت واقعی اتنی بڑی وکیل ہو تو اسے کیا ضرورت ہے ایک مفرور اشتہاری مجرم اور دوسرے اتنے ہی بڑے بدمعاش کا ساتھ دینے کی اور اپنی کوٹھی کو چھوڑ کر اس خاک دھول سے اٹی ہوئی زمین پر بسیرا کرنے کی۔ اگر رابعہ یہ کہہ دیتی کہ اس لاکھوں کی کوٹھی کی مالک بھی وہی ہے تو الف دین اسے سفید جھوٹ قرار دیتا۔ وہ رابعہ کو مٹی میں بھوت بنا جھاڑ دیتے بھی دیکھ چکا تھا اور ہاتھ میں ریوالور لے کر اس سنسان کوٹھی میں تنہا پہرہ دیتے بھی۔ اس نے رابعہ کو اندھیری رات میں تنہا باہر جاتے بھی دیکھا تھا اور خانہ دار عورت کی طرح بستر بچھاتے، چائے اور کافی بناتے بھی اور برتن دھوتے بھی۔ اتنی بڑی وکیل کیا ایسی ہوتی ہے؟ اوّل تو عورت وکیل ہوتی ہی کب ہے۔ جو چند نظر آتی ہیں ان میں اتنی ناموری کا دعویٰ کون کرسکتی ہے۔

"تم جاننا چاہو گے کہ تمھارے جرائم کے پیش نظر تمھاری سزا کیا ہوگی؟" رابعہ نے کہا۔ "تم سمجھو گے نہیں ورنہ میں ضابطہ ... کی دفعات کا حوالہ دے سکتی تھی۔ تم کو ایک لاکھ جرمانے ... کم سات سال قیدِ بامشقت کی سزا ہونی چاہیے۔"

"کیا تمھارا اپنا جیل خانہ بھی ہے؟" الف دین کچھ خوفزدہ ...

"جیل کیا ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔ "ایک ایسی جگہ جہاں ... اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ دوسروں کا غلام ہوتا ہے ... کا اپنا کوئی کام نہیں آسکتا۔ اس دنیا میں رہ کے بھی آدمی ... رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ زنجیروں کی ضرورت ہے ... کی۔ فرض کرو ہم جرمانے کے طور پر تمھاری ساری املاک ... تمھارے گھر کو آگ لگادیں جس کی کسی چیز پر تمھارا حق نہیں۔ ہم ... اندھا کردیں۔"

"نہیں، تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ دہشت زدہ ہو کے ...

"تم اندھیرے میں قید ہوجاؤ گے۔" میں نے اپنی بات جاری ... اندھیرے کی دیوار سے نکلنا تمھارے لیے جیل کی دیوار سے ... زیادہ ناممکن ہوگا۔ تم دوسروں کے غلام رہو گے اور اپنے ... سب تمھیں چھوڑ جائیں گے۔ کوئی تمھارے کام نہیں آئے گا ... گنوا دو گے پھر حاصل نہ کرسکو گے۔ اکیلے ہوجاؤ گے اور ... زیادہ عذاب جھیلو گے جو قیدِ بامشقت کاٹنے والے دیوار ... کے پیچھے جھیلتے ہیں۔ تمھارے بیوی بچے جو پُرآسائش زند... رہے ہیں اس سے محروم ہو کے فٹ پاتھ پر تمھارے ساتھ ... گے۔ بھائی ہوتا تو تمھارے کام آتا، شاید دو وقت کی رو...

"بس... بس کرو... خدا کے لیے بس کرو۔" وہ دیوا... لگا۔ "مجھے یہ سب کچھ مت بتاؤ۔"

"یہ سب تمھارے ہی سوال کا جواب ہے۔" میں ... سے کہا۔ "جرائم کا اعتراف تم کرچکے ہو، سزا دینے کا اختیار ... ہے اور اس کے ذرائع بھی ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تمھارا انتخاب ... تیسرا اور آخری راستہ توبہ کا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا اسے بھول ... زندگی کا آغاز کرو۔ جو سزا دنیا کا قانون تم کو نہ دے سکا وہ ... حساب آنے پر ضرور ملے گی۔ دنیاوی زندگی میں اس موقعے کو ... جانو اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو ورنہ تقدیر یہ موقع سب ...

"میں... میں وعدہ کرتا ہوں، میں محنت کروں گا ... کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔"

"تمھیں ابھی یہ خوش فہمی ہوگی کہ وعدہ کر کے تم ایک ... تو پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔" میں نے کہا۔ "تم نے دوبارہ ... اختیار کرلی تو ہم کو کیسے معلوم ہوگا؟ لیکن الف دین ہم ... پھر ہم تمھارے گھر آئیں گے۔ تم پولیس کو دھوکا دے سکتے ... نہیں۔ تم اس شہر سے چلے جاؤ تب بھی ہم تمھیں تلاش ...

اور جب ملیں گے تو کچھ پوچھیں گے نہیں، صرف اپنی سزا پر عملدرآمد کریں گے اور لوٹ جائیں گے۔"

میرا حربہ کارگر رہا۔ الف دین اتنا ڈر گیا تھا کہ کانپنے لگا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ تم مل گئے۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات ہم ویسے ہی طافو کے قتل کے سلسلے میں کچھ لوگوں کو سزا دینے کے لیے جانے والے تھے۔ وہ قاتل تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے قاتل کی مدد کی ہے اور... سزا دینے کا فرض ادا کرنے کے بجائے قاتل سے پردہ داری کی قیمت وصول کر کے اسے بچا لیا ہے۔ قاتل سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے ذرا ان کے مقدمے کا فیصلہ کرلیں جو قاتل کے مددگار بنے۔ ان کو سزا ہوگی تو قاتل کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کے حفاظتی انتظامات کتنے کمزور اور ناقص تھے۔ اسے پیغام مل جائے گا کہ بالآخر اس کا نمبر بھی آئے گا۔ ہم آج رات یہی معلوم کرتے کہ طافو کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگایا گیا ہے مگر لاش حاصل نہ کرتے۔ اب تم لاش کے وارث ہو۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ لاش کی صحیح طریقے پر تدفین ہو اور اس کی آخری رسوم ادا ہوں اور لاش نہ ملے تب بھی کیا تم ان کو سزا دینے والوں کے ساتھ نہیں رہو گے؟ ہمارا انصاف نہیں دیکھو گے؟"

"میں... میں خود ان کو سزا دوں گا۔" الف دین نے مٹھی بند کر کے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ میرا ایک ہی بھائی تھا، جیسا بھی تھا مجھ سے چھوٹا تھا، محبت بھی کرتا تھا مجھ سے۔ اگر میں اس کی جان مانگتا تو جان دے سکتا تھا۔" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے دس بجے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "رونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارا ساتھ دو۔ تم خود دیکھ لو گے کہ انصاف کیسے ہوتا ہے۔ اگلے چند دن میں ہم کیا کرنے والے ہیں، یہ بتانا قبل از وقت ہے لیکن ابھی ایک گھنٹے میں ہم کو تو جانہ بازار جانا ہے۔ ہاتھ منہ دھو کے کھانا کھالو۔"

ایک گھنٹے کے بجائے ہم صرف آدھے گھنٹے میں تیار ہوگئے۔ میں نے اپنا پورا پلان محسن کو بتایا اور الف دین کو اتنا ہی بتایا گیا تھا جتنا اس کے لیے جاننا ضروری تھا۔ میں نے تھانیدار کی وردی پہنی تو الف دین نے مجھے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ اگرچہ رابعہ آخری وقت تک پُرسکون رہی لیکن میں اور محسن باہر نکلے تو اس نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ "سکندر! ذرا احتیاط سے کام لینا، میری خاطر۔"

میں ہنسا۔ "مجھے لام پر جانے والے سپاہی کی بیوی کی طرح الوداع مت کہو۔ اس سے میرا حوصلہ کم ہوتا ہے۔ جیب میں تمھارا تصور کروں تو میرے سامنے تمھارا مسکراتا ہوا پُراُمید چہرہ ہونا چاہیے۔ پہلے بھی سمجھایا ہے تمھیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں تو سمجھتی ہوں، دل نہیں سمجھتا۔"

"وکیل صاحب۔ جب حسن کی عدالت میں عشق کا معاملہ پیش ہو تو دل کی دلیل سننا۔" میں نے کہا۔ "اپنے دل سے کہو کہ دنیاوی معاملات میں ٹانگ شریف نہ اڑایا کرے۔" میں نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو تھوڑا سا چھیڑ کر بکھیرا۔

"اُف۔ ارے بھئی رخصتی کا یہ جذباتی سین کتنی دیر چلے گا؟" محسن نے کہا۔

"گڑیا کی ماں... میرا مطلب ہے میری گھر والی بھی یہی کرتی ہے۔" الف دین بولا۔ "میں بس لے کر جاتا تھا تو امام ضامن ضرور باندھتی تھی۔ میں کہتا تھا نیک بخت ڈیوٹی پر جارہا ہوں۔ آخر دفتروں کے بابو، اسکول کے بچے اور کاروباری لوگ سب ہی روز جاتے ہیں۔ مگر شاید اسی لیے مجھ سے کبھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔"

"اور شاید اسی لیے میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔" محسن بولا۔

میں نے رابعہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ لائٹ آف کر کے سو جائے اور اسے ایک ریوالور بھی دے آیا تھا۔ پھر بھی دل کو عجیب سی بے کلی تھی کہ میں اتنے بڑے لق و دق گھر میں اسے تنہا چھوڑ کے جارہا ہوں۔ وہ بہت نڈر اور جرأت مند لڑکی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اچھے خاصے مردوں سے زیادہ بہادری کا مظاہرہ کرتی تھی۔ لیکن جب ضرورت نہیں ہوتی تھی تو وہ عام لڑکیوں سے زیادہ جذباتی، ڈرپوک اور کمزور نظر آنے لگتی تھی۔ کبھی شعلہ تو کبھی شبنم، کبھی چاندنی تو کبھی دہکتی آگ کا الاؤ۔ برگِ گل سے زیادہ نازک اور سنگِ خارا سے زیادہ سخت۔ یہی اس کے مزاج اور اس کی فطرت کے متضاد لیکن ساحرانہ قوت رکھنے والے رنگ تھے۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا کیونکہ راستہ صرف میرا دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ریوالور میں نے محسن کو پکڑا دیا تھا۔ وہ الف دین کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک ریموٹ کنٹرول مائیکروفون لیا تھا جس کی رینج زیادہ نہیں تھی۔ لیکن پچاس گز کے دائرے میں کار کے ایف ایم ریڈیو پر اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ یہ مائیکروفون سائز میں کار کی ڈبیا کے برابر تھا اور مجھے خاصا مہنگا ملا تھا۔ دکاندار ایسی خلافِ قانون ... فروخت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں چنانچہ میں نے پانچ سو روپے دینے کے علاوہ دکاندار کو مطمئن کرنے میں کوئی کسر ... تھی اور بالآخر وہ اندر سے مائیکروفون نکال لایا تھا ... اس وقت میری جیب میں تھا۔

رات کے دس بج کر دس منٹ ہوتے تھے ... نے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

جیپ کو اُس نے بازار میں راجہ فتح شیر کے گھر سے دس گز دور پہلے موڑ پر کھڑا کیا اور اکیلا اس کے دروازے تک گیا۔ سردی کی وجہ سے بیشتر لوگ سو چکے تھے اور ان کے گھروں میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ حسب توقع آج فتح شیر کی نائٹ ڈیوٹی نہیں تھی چنانچہ میں نے دستک دی تو وہ خود ہی باہر نکلا اور مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ "ایس آئی راجہ فتح شیر؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں فتح شیر ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ وہ چالیس سال سے اوپر کا بھاری بھر کم پیٹ والا پستہ قد آدمی تھا۔

"میں سب انسپکٹر ظفریاب ہوں۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ڈی آئی جی کرائمز کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"خیر تو ہے ناجی؟" فتح شیر نے کہا۔ "ایک منٹ ٹھہریں، میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔"

اگرچہ محسن کاسے کے ایف ایم ریڈیو کو ٹیون کر کے میری آواز صاف سُن سکتا تھا لیکن میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی کہ میں اور وہ آپس میں بات کر سکتے۔ گویا ہمارا مواصلاتی رابطہ یکطرفہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک دو طرفہ مواصلاتی نظام جسے عام طور پر "واکی ٹاکی" کہا جاتا تھا ہماری اشد ضرورت تھی۔ اگرچہ اس کا رکھنا سخت خلافِ قانون تھا مگر اسمگل کرنے والے باہر سے ہر وہ چیز لا رہے تھے جس کے یہاں ایک کی جگہ دس ملیں۔ ساری بات ضرورت..... کی تھی اور قوتِ خرید کی تھی۔ تلاش کرنے پر اور منہ مانگی قیمت دینے پر واکی ٹاکی بھی مل سکتا تھا۔ لندن میں رہ کر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بلحاظِ مالیت وہ پاکستانی کرنسی میں ہزار روپے سے زیادہ کی چیز نہیں ہو گی مگر یہاں نایابی کے باعث وہی چیز ملی تو دس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔

فتح شیر کا گھر باہر سے دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا لیکن اندر اس کے ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ اپنی تنخواہ کے علاوہ فتح شیر اپنے اختیارات کی کیا قیمت وصول کر رہا ہے۔

"گھر تو بہت شاندار ہے آپ کا راجہ صاحب۔" میں نے ایک قیمتی صوفے پر بیٹھ کے کہا۔

"بس جی گزارا کرتے ہیں۔" وہ عاجزی سے بولا لیکن اس کی ... کا غرور اس کے لہجے کی نفی کرتا تھا۔

... صوفہ مجھے یہاں کا تو نہیں لگتا۔" میں نے یوں کہا جیسے ... مبتلا ہو گیا ہوں۔

... کویت سے منگوایا تھا جی۔" وہ بولا۔ "میں یہ گھٹیا ... استعمال نہیں کرتا۔"

... پڑا آپ کو یہ صوفہ سیٹ۔ اور یہ سینٹر ٹیبل بھی تو باہر کی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں لانے کا خرچہ ڈال کے کوئی بیس ہزار میں صوفہ سیٹ آیا۔" وہ بولا۔ "سات ہزار کا یہ ٹیبل سیٹ۔"

"کمال ہے راجہ صاحب! اور اس کے باوجود آپ یہاں رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی کوٹھی لینی تھی گلبرگ میں۔"

وہ ہنسا۔ "کوٹھی تو بنوائی ہے گلبرگ میں۔ پورے چار کنال کی لیکن کرائے پر اٹھا دی ہے۔ بڑی مجبوری ہے جی۔ بندے کے دس سجن تو سو دشمن۔ فوراً کوئی اوپر رپورٹ کر دے گا اور پھر یہ اخبار والے....." اس نے ایک زبردست گالی عادت کے مطابق دی۔ "میں تو کسی ایسے ویسے کو اندر بھی نہیں بُلاتا۔ اب دیکھیں آپ، میں نے ایک ایک چیز باہر سے منگوائی ہے۔ پردے اور دوسرا سامان دوبئی اور کویت سے آیا ہے۔ یہ پنکھا اور دیواروں کا رنگ بھی باہر کا ہے۔"

"اچھا جی! بڑا خرچہ ہوا ہو گا اس پر تو؟" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مگر شوق کا کیا مول؟"

"مجھے کیا۔ میری گھر والی کہتی ہے کہ چیز ہو تو باہر کی۔ یہاں کا تو کپڑا بھی پسند نہیں آتا اسے۔" وہ بولا۔ "خیر یہ بتائیں اس وقت کیسے تکلیف کی؟ اور ٹھنڈ ہو رہی ہے، چائے تو پیو گے۔ ویسے گھر میں سب سو گئے ہیں۔"

"تکلف مت کریں راجہ صاحب۔ آپس کی بات ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "سب کو ایک دوسرے کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کل کوئی بات ہمارے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ میں تو آپ کو خبردار کرنے آیا تھا۔"

"میرے خلاف کسی نے کچھ لکھا ہے؟" تشویش کے آثار پہلی بار اس کے لہجے سے عیاں ہوئے۔ شاید اسے یہ بھی احساس ہوا کہ اب تک وہ میرے سامنے غیر محتاط انداز میں گفتگو کرتا رہا ہے۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو میں نے ڈاک روک لی ہے۔ بڑی لمبی درخواست دی ہے۔"

"میں نے تم کو پہلے بھی دیکھا ہے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "انسپکٹر کیانی بھی تو وہیں ہے۔"

"کیانی صاحب نے ہی کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو بس نام جانتا ہوں آپ کا۔ دو بار کیانی صاحب کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا وہ ایک کیس تھا دس پورے کا۔"

"اچھا اچھا..... وہ جو اہلِ محلّہ نے کیانی کے سالے کے خلاف درخواست دی تھی۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر بیٹھا تھا۔ دس پورے کا علاقہ اسی تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے کیس ہوں گے جن میں فتح شیر نے دھاندلی کی ہو گی۔

"کیا بنا تھا اس کیس کا؟ کیانی صاحب نے کہا تھا سب ٹھیک ہو گیا۔"

"او جی ٹھیک کیسے نہ ہوتا۔ سارے مدّعیان کو بلوا لیا تھا میں نے۔ ایک بڑا استاد بنتا تھا۔ کہتا تھا میں ہیڈ ماسٹر ہوں اسکول کا۔" وہ بولا۔ "دوسرا لڑکا کسی کالج کا لیکچرار تھا۔ سب کو سیدھا کر دیا میں نے۔ دو دن بعد گھر والے اٹھا کے لے گئے۔ خود چل کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اب کس نے شرارت کی ہے؟"

"آپ چوہدری دلاور کو جانتے ہیں؟" میں نے ہاتھ مل کے سوچتے ہوئے کہا۔

"کون..... کون چوہدری دلاور؟" وہ ایک دم نروس ہو گیا۔ "وہ شاہدرے والا؟"

"ہاں جی۔ اس کی فیکٹری ہے شاہدرے میں۔" میں نے کہا۔ "بڑا مشکل سا نام ہے۔"

"ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس۔" فتح شیر نے میری مدد کی۔ "اُس نے کچھ لکھا ہے؟"

"نہیں جی، وہ کیوں لکھے گا۔ اس کی مدد کی تھی آپ نے۔" میں نے کہا۔ "کوئی بندہ مر گیا تھا اس سے۔ اس کا کوئی ڈرائیور تھا الطاف جس کا معاملہ وہ آپ کے پاس لایا تھا۔"

"اس کی گمشدگی کا پرچا کٹوا دیا تھا میں نے۔" فتح شیر بے چین ہو کے بولا۔ "اور کیا چاہیے؟"

"وہ تو آپ نے ٹھیک کیا تھا اور ظاہر ہے اس نے بھی اتنا بڑا معاملہ دبانے کے لیے جو کچھ دیا اپنی جان بچانے کے لیے ہی دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اتنا سنگین معاملہ تھا کہ لاش اس کے گھر کے اندر موجود تھی اور وہ اس کو اپنی کوٹھی کے باغ میں گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے چھاپا مارا۔" فتح شیر نے برہمی سے کہا۔ "کوئی ٹیڑھا آدمی مل جاتا تو پانچ لاکھ میں بھی جان نہ چھوڑتا۔ پھانسی لگوا دیتا لیکن اس کو پھانسی لگنے سے طافو زندہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے بات ختم کی۔"

"سیانا بندہ تو بات ختم ہی کرتا ہے راجہ صاحب۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ چوہدری دلاور ذرا اوکھا بندہ ہے۔ کسی سے بنا کے نہیں رکھتا۔ معلوم نہیں اِدھر اُدھر کس سے لگتی ہے۔ کسی نے آدھی رات کو ہلچل دیکھی تو باہر نکل آیا اور دیوار کے اوپر سے سب دیکھتا رہا۔ اس نے درخواست دی ہے۔ نام نہیں لکھا....."

"اگر نام نہیں لکھا تو اس پر کارروائی نہیں ہو سکتی۔ گمنام درخواست دینے والوں کا کیا ہے؟"

"وہ سب تو مجھے معلوم ہے جی لیکن وہ آدمی بہت ہوشیار ہے۔" میں نے کہا۔ "اُس نے تو ڈی آئی جی صاحب کو بھی دھمکی دی ہے کہ تفتیش نہ کی گئی تو وہ کیس اخبار والوں کو دے دے گا۔ اس نے تھانیدار کو بھی دیکھا تھا اور اس کے ساتھ آنے والے چار ماتحتوں کو بھی اور وہ سب کو شناخت کر سکتا ہے۔ انھوں نے ایک لاش اٹھائی تھی جو کالے کمبل میں لپٹی ہوئی تھی اور چوہدری دلاور کے گھر میں پیچھے والے گیٹ کے قریب پڑی تھی۔"

"کون..... کون ہو سکتا ہے ایسا آدمی..... اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی اس نے سب دیکھا ہے۔" فتح شیر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔ "اور کیا لکھا ہے؟ یہ بھی لکھا ہے کہ لاش کو ہم نے جیپ میں ڈالا تھا؟"

"ہاں جی! اس نے جیپ کا نمبر تک بتایا ہے۔ نام صرف آپ کا لکھا ہے اور کہا ہے کہ باقی لوگوں کو دلاور نے نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان سب کو انسپکٹر فتح شیر حکم دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا؟ کوئی تصویر تو نہیں لی اس نے۔ کچھ ٹیپ تو نہیں کیا؟" فتح شیر کی حالت ابتر ہونے لگی۔

"لکھا تو نہیں ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ تفتیش کے وقت وہ اور ثبوت پیش کرے گا۔" میں نے کہا۔ "ایسے ثبوت جن کو جھٹلانا ناممکن ہو گا۔ تو ہو سکتا ہے کہ....."

"لیکن ظفریاب! رات کے اندھیرے میں فلیش کے ساتھ کوئی تصویریں اتارتا....." اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اٹھ کے کونے تک گیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ اس وقت پورے گیارہ بجے تھے۔

"سب انسپکٹر راجہ فتح شیر۔" اس نے سخت بیزار اور اکھڑ لہجے میں کہا۔ پھر میں نے اس کی صورت کا رنگ بدلتے دیکھا۔ "ہاں.. آج میری ڈیوٹی نہیں تھی اسی لیے گھر پہ ہوں۔ تم کون ہو... کیا؟... اس بکواس کا کیا مطلب ہے..... میں کسی چوہدری دلاور کو نہیں جانتا۔ یہ جھوٹ ہے..... میں پرسوں رات تھانے میں تھا اور تھانے سے باہر نکلا ہی نہیں۔ دس گواہ ہیں میرے..... گواہ جھوٹے ہیں اور تم سچے ہو؟ کون سے؟ ذرا نام بتاؤ نا اپنا تاکہ میں تصدیق کر لوں کہ تم رپورٹر ہو یا بلیک میلر..... کوئی ثبوت نہیں ہے تمہارے پاس۔" وہ خوفزدہ بھی تھا اور مشتعل بھی۔ اس کے ہر جواب سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ محسن نے کیا کہا ہو گا۔ راجہ فتح شیر کی کیفیت اس عورت سے مختلف نہ تھی جو ہسٹریا کے شدید دورے سے گزر رہی ہو۔ اس کی مٹھیاں بند تھیں اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ چلّانے لگا تھا اور اس کے جھاگ ٹوٹ رہے تھے، بے ربط الفاظ کی صورت میں ادا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ہو رہے تھے۔ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا اور آہستہ سے اس کے کاندھے پر تھپکی دے کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ فون کس نے کیا ہے؟ فتح شیر نے درشتی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور مجھے بیٹھنے کو کہا۔

"کیسی تصویریں؟ بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ گدھا سمجھتے ہو مجھے اُلو کے پٹھے۔" وہ گالیاں دینے لگا۔" رپورٹر کے تم! میں بھی تھانیدار ہوں۔ گھاس نہیں کھودی ہے میں نے سات سال تک۔ ایک بھی تصویر اتاری ہوتی تم نے تو فلیش کی چمک ہوتی۔ میں وہی تمھاری ...... کر دیتا۔ اچھا اچھا لاش غائب کی میں نے اور جیپ میں لے گیا۔ تم آئی جی کے باپ ہو۔ جا کے بتا دو اُسے کہ میں نے لاش غائب کی۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے نالہ لئی میں پھینک دی، کتوں کو ڈال دی۔ تم سمجھتے ہو میں ڈر جاؤں گا۔ لے آنا تصویریں بھی۔ ہاں مجھے بالکل یقین نہیں۔ کیا؟ کونسا کیمرا؟ کیسی لال شعاعیں..؟ اچھا تو وہ کیمرا اندھیرے میں تصویریں اتارتا ہے؟ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟ انفراریڈ کیا ہوتا ہے؟.... چلو وقت برباد مت کرو میرا۔ پھر فون کیا نا .... تو کر دوں گا۔"

اس نے دھڑ سے ریسیور رکھا اور ہانپتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے۔ اس نے دورانِ گفتگو ایک سے ایک فحش گالی دی۔

"کسی اخبار کا رپورٹر تھا۔" اس نے ایک اور غلیظ گالی دے کر کہا۔

"راجہ صاحب! آپ سیانے آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔" فون پر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ اخبار والے بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کسی نئی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔"

"وہ کوئی اخبار والا نہیں تھا۔" فتح شیر نے کہا۔" ہوتا تو اپنا نام بتاتا۔ اخبار کا نام تو بتاتا۔ وہ بلیک میلر تھا۔"

"فرض کر لیں ایک منٹ کے لیے۔" میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔" اگر وہ سچ مچ کوئی رپورٹر ہی ہوا جو آپ کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے تو اس نے یہ گفتگو ٹیپ کر لی ہوگی۔"

فتح شیر کا رنگ فق ہو گیا۔" ٹیپ کر لی ہو گی؟ .... نہیں ... وہ فراڈ تھا کوئی۔ ایک لاکھ مانگتا تھا مجھ سے۔ کہتا تھا دس لاکھ اکیلے ہضم کر جاؤ گے۔ اس کے باپ نے دیے تھے دس لاکھ۔ مجھے تو وہی دو لاکھ ملے تھے۔ ایک لاکھ ایس ایچ او کو نہ دیتا؟ اور وہ جو چار فرشتے میرے ساتھ تھے، پچاس پچاس ہزار سے کم میں ان کا منہ بند ہوتا؟"

"میرا تو خیال ہے آپ سودا کر لیں.... میرا مطلب ہے راجہ صاحب کہ لاکھ دے کر جان چھڑائیں۔" میں نے کہا۔" یہ معاملہ بڑھ نہ جائے۔ وہ انفراریڈ رے کیمرے کی بات کر رہا تھا نا؟ اخبار والوں کے پاس یہ کیمرے ہوتے ہیں۔ گھُپ اندھیرے میں فلم بنا لیتے ہیں یہ لوگ۔"

"میں سوچ رہا ہوں یہ اخبار والا دلاور کے آس پاس نہ منڈلا رہا ہو۔" فتح شیر نے پریشانی سے سر پکڑ کے کہا۔" وہ سب دیکھتا رہا اور تصویریں اتارتا رہا۔ ایک طرف گمنام درخواست دے دی میرے خلاف اور ادھر فون کر دیا۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔" اگر آپ نے اس کی بات نہ مانی تو پھر وہ تفتیش کے لیے پیچھے پڑ جائے گا اور یہی تصویریں تفتیش کے وقت پیش کر دے گا۔ ایک لاکھ دے دیے آپ نے تو خاموش ہو کے بیٹھ جائے گا۔"

"او نئیں یار۔ ایسے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے لاکھ لے کے بھی تصویریں آگے ارسال کر دیں اور تفتیش کا معاملہ نہ دبا تو میرے لاکھ حرام گئے نا؟"

"یہ خطرہ تو ہے۔ آپ کو کیا معلوم وہ جیپ کے پیچھے بھی گیا ہو۔"

فتح شیر نے نفی میں سر ہلایا۔" وہاں دُور دُور تک چڑیا کا بچہ نہیں تھا۔ ہم لاش کو راول ڈیم کے پاس لے گئے تھے اور اس کے پیروں کے ساتھ پتھر باندھ کے نیچے پھینک دیا تھا۔ پڑا ہو گا وہ نیچے تہہ میں۔"

"پھر بھی راجہ صاحب! آپ بندوبست کر لیں۔" میں نے کہا۔ "ایک طرف تو وہ درخواست ہے۔ پھر یہ اخباری رپورٹر کہتا ہے کہ اس کے پاس تصویریں ہیں اور اب اگر اس نے ٹیلی فون پر ہونے والی یہ ساری بات چیت ٹیپ کر لی ہو گی تو..."

"بکواس بند کرو۔ تم کیا مجھے ڈرانے آئے ہو؟" فتح شیر کا حوصلہ جواب دے گیا۔ نوکری چلی جائے گی میری؟ اور پھانسی ہو جائے گی مجھے؟ کیا ہو گا...؟"

"آپ خود جانتے ہیں کیا ہو گا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ کا جو دل چاہتا ہے کریں۔ مجھے فارغ کر دیں۔"

وہ چونکا۔" فارغ کر دوں؟ کیا مطلب.... تم اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔"

"آپ اتنے بھولے بادشاہ تو نہیں ہیں راجہ جی! اتنی رات کو میں یہاں جھک مارنے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔" کیا آپ چاہتے ہیں میں وہ درخواست ٹپ اپ کر دوں؟"

"تو صاف کہو کہ تم بھی سودا کرنے آئے ہو۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"ہاں، یہاں اکیلا کوئی نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔" مل بانٹ کے کھانا پڑتا ہے۔ تم نے ایس ایچ او کو بھی تو ایک لاکھ دیے تھے۔

پچاس ہزار مجھے بھی دے دو تو معاملہ ختم ہو جائے گا اور ایک بات سن لو، درخواست گمنام نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے تھے مجھ سے۔ کس نے دی ہے درخواست؟" وہ چلّایا۔

"نام بتانے کے پچاس ہزار۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔" وہ میرا جاننے والا ہے۔ میں اسے خاموش کر سکتا ہوں۔"

وہ ایک دم گالیاں بکنے لگا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔" پچاس ہزار درخواست آگے نہ کرنے کے، پچاس ہزار نام نہ بتانے کے، ایک لاکھ اس ...... رپورٹر کے۔ میرے دو لاکھ ختم۔"

"نوکری ختم ہو گئی راجہ جی تو دو لاکھ کس کام آئیں گے؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔" نوکری میں تو ہزار موقعے ملتے ہیں دو لاکھ بنانے کے اور آپ نے بنائے بھی ہیں۔ گلبرگ کی کوٹھی، یہ سازوسامان سب کتنے لاکھ کا ہے۔"

"میں تم کو.... غلط سمجھا تھا...." وہ یوں صوفے پر گر گیا جیسے اس کا دم نکل گیا ہو۔" میں سمجھا تھا تم میرے خیرخواہ بن کے آئے ہو لیکن تم کُتے ہو، لالچی کُتے۔ مردار کھانا چاہتے ہو۔ جہاں تم بیٹھے ہو وہاں تم کو کچھ نہیں ملتا تو تم دوسروں سے چھینتے ہو۔"

"تم کیا میرے مامے کے پُتر ہو کہ میں تمھارا خیرخواہ بن کے آتا؟" میں نے کہا۔" یہ نوکری کا نہیں، زندگی کا معاملہ بھی ہے فتح شیر۔ تم لٹک سکتے ہو اور میں گواہ ہوں اب تو۔ تم نے میرے سامنے سب کچھ تسلیم کیا ہے۔ میرے سامنے ٹیلی فون پر بات کی ہے۔ میں پچاس ہزار بہت کم مانگ رہا ہوں۔"

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوا۔" میں تیری زبان ہمیشہ کے لیے بند نہ کر دوں۔ تجھے بھی وہیں نہ ڈال آؤں جہاں الطاف کو ڈالا تھا؟"

میں نے اس پر ایک معمولی سا داؤ آزمایا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔" بس۔ وہیں سے بات کر فتح شیر! میں خالی ہاتھ آیا ہوں لیکن خالی ہاتھ جاؤں گا نہیں۔ اب میرا مطالبہ ایک لاکھ کا ہے۔"

فتح شیر پٹے ہوئے کتے کی طرح ہانپتا اور کانپتا رہا۔" ایک لاکھ، ٹھیک ہے، میں ایک لاکھ دے دوں گا مگر تم سوچو کیا یہ تاوان مجھے ادا کرنا چاہیے؟ جرم کیا تھا چوہدری دلاور نے۔ یہ اسی کو دینا پڑے گا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" میں نے کہا۔" تم اپنے پاس سے دے دو۔ سب مل کر دے دو یا دلاور سے لے کر دو۔"

"ہم سب.... نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں دے گا۔" وہ مایوسی سے بولا۔" سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ ماتحت کہیں گے ہمیں راجہ فتح شیر نے حکم دیا تھا اور دھمکی دے کر مجبور کیا تھا۔ ایس ایچ او صاف مُکر جائے گا لیکن دلاور دے گا۔ اس کا تو باپ بھی دے گا۔ اس کے پاس بہت ہے۔ اگر دس لاکھ اور نکال دے گا تب بھی غریب نہیں ہو گا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ اسے بتا دیتا ہوں کہ اس اخباری رپورٹر کی زبان بند رکھنی ہے تو رقم نکالو۔ درخواست دبانی ہے تو۔" وہ اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف لپکا۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ راجہ فتح شیر نے ریسیور کان سے لگاتے ہی گالی بکی۔ کریڈل کو بار بار دبایا اور محکمہ ٹیلی فون کی ماں بہن کو ایک کر دیا۔ "ابھی ٹھیک تھا ٹیلی فون۔ ابھی مر گیا۔ ڈیڈ۔ اب کسی جگہ سے فون کرنا پڑے گا۔ پھر بھی کون آ جائے گا اس وقت ٹھیک کرنے۔ اور کسی جگہ سے ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑایا۔

"ہم دلاور کے گھر جا کے بات کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔" یہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔"

"ہاں... تم نے ٹھیک کہا۔" وہ بولا۔" میں تیار ہو کے آتا ہوں۔"

"نہیں، راجہ فتح شیر! چلنا ہے تو اسی طرح چلو۔" میں نے کہا اور اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"کیا؟ میں بیوی کو بھی نہ بتاؤں؟" وہ رُک گیا۔

"مجھے کیا معلوم تم اندر جا کے بیوی کو بتاؤ گے یا ریوالور لے آؤ گے؟ مجھے شوٹ کرنے کے لیے۔ انھیں سونے دو۔"

"تم پاگل ہو۔ دلاور کے پاس خالی ہاتھ جا کے ایسی بات کرنا... بہت خطرناک ہے۔"

"میں خالی ہاتھوں سے دس دلاوروں کو قابو میں کر سکتا ہوں۔ ایک بچ کے نہیں نکل سکتا۔" میں نے کہا۔" تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔ تمھاری حفاظت بھی میں کر دوں گا۔"

فتح شیر کچھ دیر مجھے قاتلانہ نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ شلوار قمیص اور چپل پہنے ہوئے تھا اور یہ اس کے لیے سونے کا لباس تھا باہر جانے کا نہیں۔

"میں ایک سوئیٹر تو پہن لوں یا کمبل لے لوں۔" وہ بولا۔" باہر سردی ہے۔"

"اگر تم اندر جاؤ گے تو میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔" اور اگر تم نے بدمعاشی کی...."

"بدمعاشی تم دکھا رہے ہو۔" فتح شیر آپے سے باہر ہو گیا۔ "میرے ہی گھر میں۔ میں شور مچا سکتا ہوں۔"

"کوشش کر کے دیکھو۔" میں نے خطرناک لہجے میں کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔" ... کسی کو معلوم نہیں ہو گا تمھاری گردن کا منکا کیسے ٹوٹ گیا۔ دو چار لاکھ کی خاطر جان ... بیوی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو بیوہ اور بچوں کو یتیم مت کرو۔ یہ پیسہ بھی تم اپنی پاکٹ سے تو نہیں دے رہے ہو۔ ذلادر سے وصول کرنے جا رہے ہو۔ اسی طرح چلو۔“

”لیکن... ہم جائیں گے کیسے؟“ اس کا حوصلہ بالکل ختم ہو گیا۔ ”موٹر سائیکل ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں، کار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری طرح ڈرتا نہیں ہوں۔ گلبرگ میں ٹھاٹھ سے رہتا ہوں اور ہر سال کار بدلتا رہتا ہوں۔“

میں نے کار کے انجن کی آواز سنی۔ پھر محسن نے باہر سے سیٹی بجا کے سگنل دیا اور میں نے فتح شیر کو اشارہ کیا۔

”تم... تم طے کر کے آئے تھے۔“ وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم اغوا کرنے آئے تھے.... کون ہو تم؟... تم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔“ اس کا شک پل بھر میں یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپا لیکن اس کا حرام خور ڈھیلا جسم مقابلے کے قابل ہی نہ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر گرا کے ایک ٹانگ سے دبا لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ نے جیب سے کلوروفارم کی شیشی نکالی۔ اس کے چند قطرے رومال پر ڈال کے میں نے رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ اس نے چند جھٹکے لیے اور ساکت ہو گیا۔ میں نے سانس روک کے رکھا اور کلوروفارم کی شیشی بند کر کے دروازہ کھول دیا۔ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہوئے بھی مجھے رومال سے اٹھنے والی بو کی چبھن کا احساس ہوا مگر اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

”ویری گڈ۔“ محسن نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھول کے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”سب ریکارڈ ہو گیا۔ تو نے بھی کمال کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکرپٹ پہلے سے تیار تھا۔“

الف دین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ”میں باہر آؤں جی، مدد کے لیے؟“ اس نے جھک کر کہا۔

”نہیں۔ ہم دونوں کافی ہیں یہ جنازہ اٹھانے کے لیے۔“ میں نے کہا۔ پھر محسن نے میری مدد کی اور ہم ساجہ فتح شیر کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ گلی میں جھانک کر اطمینان کیا کہ باہر کوئی نہیں ہے اور فتح شیر کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے واپس ڈرائنگ روم میں جا کے رومال سے ہر اس جگہ کو صاف کیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ لائٹ آف کی اور دروازہ باہر سے بند کر کے نکل آیا۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم اسی راستے پر رواں تھے جس راستے سے آئے تھے۔

صدر بازار کا چوراہا پار کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دیں اور باقی راستہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس دھندلی روشنی میں طے کیا جو پارکنگ لائٹس سے پھیل رہی تھی۔ کوٹھی کے قریب پہنچ کے میں نے یہ چھوٹی لائٹس بھی بجھا دیں اور کار سیدھا عقبی حصے کے گیراج میں لے گیا۔ اوپر کی منزل کی کھڑکی روشن ہوئی تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ میں نے اور محسن نے فتح شیر کو الف دین کی مدد سے اٹھایا۔ الف دین نے اس کے درمیانی حصے کو نیچے سے سہارا دیا جو خاصا بھاری تھا اور ہم اسے سیڑھیوں کے راستے اوپر لے گئے۔ رابعہ دروازہ کھولے اور ہاتھ میں ریوالور لیے مہمان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔

الف دین نے تمام گفتگو گاڑی کے ایف ایم بینڈ کے ذریعے سُنی تھی چنانچہ وہ بے حد مشتعل تھا اور راستے بھر ہم سے پوچھتا آیا تھا کہ ہم اس شیطان کو کیا سزا دیں گے؟ وہ جاننا چاہتا تھا کہ راول ڈیم کی جھیل کتنی گہری ہے اور کیا اس کی تہہ سے طاہر کی لاش برآمد کی جا سکتی ہے اور اس کی دلی تمنا تھی کہ فتح شیر کو اسی طرح پاؤں میں بھاری پتھر باندھ کر اسی جگہ غرقاب کرنے کا موقع اسے فراہم کیا جائے جہاں فتح شیر نے اس کی لاش ڈبو دی تھی۔ ہم نے اس کے جذبات کو قابو میں رکھا اور اسے بار بار تلقین کرتے رہے کہ غصے اور جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب ہم نے فتح شیر کو فرش پر ڈال دیا تب بھی وہ وحشیانہ انداز میں اسے گھورتا رہا اور زیر لب کچھ کہتا رہا۔ اس کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کی موت اور غرقابی کا تصور اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ ذہنی طور پر نیم دیوانگی کی کیفیت سے دوچار تھا اور اس کے سامنے قاتل تو نہیں تھا مگر وہ مجرم ضرور تھا جس نے ایک لاش کا سودا کیا تھا اور اپنا ضمیر دو لاکھ میں بیچا تھا۔ لاش کی بے حرمتی کی تھی اور ایک آدمی کے تنِ مردہ کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ انتقام کے جذبات الف دین کو بار بار مغلوب کر لیتے تھے۔

”یہ ابھی فوراً ہوش میں نہیں آئے گا۔“ میں نے الف دین کو کھینچ کر فتح شیر سے دُور کر دیا۔ ”اور ہوش میں آنے کے بعد بھی کلوروفارم کا اثر رہے گا۔ اس سے صبح بات کریں گے۔“

”ابھی تم سو جاؤ۔“ محسن نے کہا۔ ”ہم بھی سونے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”اور رات کو یہ اٹھ کر بھاگ گیا پھر؟“ الف دین نے کہا۔

”جب ہم نے اتنی محنت سے اسے یہاں لانے میں کی تو کیا اتنی آسانی سے نکل جانے دیں گے؟“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے اسے باتھ روم میں ڈال دینا کافی ہے۔“ محسن بولا۔ ”یہ دروازہ توڑ کے نہیں جا سکتا۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا اور ایک بار پھر ہم نے فتح شیر کو گھسیٹا۔ اسے باتھ روم کے فرش پر لٹانے میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ کہیں اسے سردی نہ لگ جائے۔

”ایک رات میں نہیں مرتا۔“ محسن بولا۔ ”زیادہ سے زیادہ نونیا ہو گا، وہ ٹھیک کر لیں گے۔“

”اگر مر جائے گا تب بھی افسوس نہیں ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہر جرم کا اعتراف تو کر ہی چکا ہے۔“

”سزائے موت جرم کی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔“ محسن کے پیچھے سے رابعہ نے کہا۔

”لیکن اس کے اعمال کی مناسبت سے کم ہے۔“ محسن نے کہا اور دروازے کو کنڈی لگا دی۔ ہم دونوں ایک ہی لحاف میں گھس گئے۔

”کتنے ٹیپ استعمال ہوئے؟“ میں نے کہا۔ ”آواز صاف آ رہی تھی نا؟“

”بالکل صاف تھی۔ نوے منٹ کا ایک کیسٹ تقریباً دونوں طرف سے بھر گیا۔“ محسن نے کہا۔ ”مائیکروفون بہت حساس ہے۔“

”ریڈیو کے اسپیکر کی آواز باہر تو نہیں سُنائی دیتی تھی؟“

”شیشے بند تھے۔“ محسن بولا۔ ”اس کے علاوہ گلی میں سے دو ہی آدمی گزرے۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ کار میں کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے ریڈیو سے ٹیپ کے لیے ڈائریکٹ کنکشن لے لیا تھا۔“

”تو نے بی ایس سی کیا ہے محسن۔ تھوڑا سا وائرلیس اور ٹیلی کمیونی کیشن کی طرف توجہ دے۔ تیرا تو فطری رجحان ہے اس طرف۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے پاس دو طرفہ مواصلاتی رابطہ ہونا چاہیے۔“

”ہونا تو چاہیے۔ وا کی ٹاکی بازار میں نہیں ملیں گے کیا، اسمگل کیے ہوئے؟“

”معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر ملے بھی تو کراچی میں ملیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کراچی تو جانا ہی ہے ہمیں۔ وہاں دیکھ لیں گے۔ ورنہ پھر بنائیں گے۔“ محسن بولا۔ رابعہ اپنے لحاف میں گھس کے سر نکالے ساری گفتگو سُن رہی تھی۔ الف دین تیسرے لحاف میں بے سُدھ پڑا چھت کو گھور رہا تھا اور شاید یہ غور کر رہا تھا کہ ایک دن میں تقدیر اسے کہاں لے آئی۔ اگر وہ میرے پیچھے نہ لگتا تو پانچ ہزار لے کر گھر لوٹ جاتا اور چین سے سوتا۔ اسے یہ سب معلوم ہی نہ ہوتا کہ طاہر کیسے مرا اور مر کے کہاں پہنچا؟

”مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔“ رابعہ نے کہا۔ ”ٹیپ ریکارڈر مجھے دے دو۔“

”لیکن ہم کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”ڈیڑھ گھنٹے کا ٹیپ ہے، صبح سن لینا۔“

”میں ایئر فون لگا کے سُنوں گی۔“ وہ بولی۔ ”اسپیکر بند رہے گا۔“

محسن نے ٹیپ ریکارڈر اسے دے دیا۔ کمرے کی لائٹ جلتی رہی۔ پہلے محسن کو اور پھر مجھے نیند نے آ لیا۔ ریوالور جو میں نے رابعہ کو دیا تھا وہ اسی کے تکیے کے نیچے تھا۔ دوسرا محسن نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا تھا چنانچہ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک سوتا رہتا اگر محسن مجھے جھنجوڑ کر بیدار نہ کرتا۔ ”سکندر! وہ بھاگ گیا۔“ وہ بولا۔

”کون؟ کون بھاگ گیا؟“ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے کھڑکیوں کے شیشوں سے دن کا اُجالا نظر آیا۔ پھر رابعہ اور محسن کے متوحش چہرے دکھائی دیے۔

”الف دین کمینہ —“ محسن نے کہا۔ ”اور وہ ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیر گیا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔ ”فتح شیر کو اپنے ساتھ لے گیا؟“

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ ہوا میں مجھے ایک مخصوص مہک کا احساس ہوا جو گزشتہ شب اس کمرے کی محبوس ہوا میں نہ تھی۔ یہ بند کمروں کے گرد و غبار کی بُو نہیں تھی۔ نئی دیواروں پر سیمنٹ کے تازہ پلستر کی بُو نہیں تھی اور کوئی ایسی بُو نہیں تھی جو ہمارے وجود کی خبر دیتی ہو۔ یہ ایک دہشت زدہ کر دینے والی بُو تھی۔ میں اُٹھ کے باتھ روم کی طرف دوڑا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رُک گیا۔ باتھ روم کے فرش پر خون ہی خون تھا۔ خون کے چھینٹے اس کی دیواروں پر تھے اور خون سے اس کا فرش لال ہو رہا تھا۔ خون بہہ کے ڈبلیو سی میں چلا گیا تھا اور مجھے خون آلودہ ہاتھوں کے نشان باتھ روم کی دیواروں پر نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں فتح شیر مرا پڑا تھا۔ الف دین نے اس کو چھری سے پے در پے وار کر کے مار ڈالا تھا اور پھر اس کی گردن کاٹ کے الگ کر دی تھی۔ فتح شیر کا سر اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا اور میں نے گھبرا کے دروازہ بند کر دیا۔

رابعہ اور محسن کی نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ آخر اس لمحہ بھر کے سکوت کو محسن ہی نے توڑا۔ ”ہم نے اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیا تھا۔“

”اس نے... ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔“ میں نے بازی میں سب کچھ ہار جانے والے جواری کی طرح کہا۔ ”وہ تعاون کر رہا تھا اور اس کی کسی بات پر دیوانگی کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔“

”جب تک اس نے فتح شیر کی گفتگو نہیں سُنی تھی وہ نارمل تھا۔“ محسن نے کہا۔ ”میں اس کے ساتھ تھا اور کار ریڈیو میں سب کچھ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سُن کے اس کارِ عمل دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے رونے لگا تھا پھر گالیاں دینے لگا تھا اور قسمیں کھانے لگا تھا کہ وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ اس نے دوبارا اپنا سر ڈیش بورڈ پر مارا۔ میں نے اُسے قابو میں رکھا۔"

"ایسی حالت میں تو اس کو اکیلا چھوڑ کر بھی گیا ہوگا؟ جب تو فون کرنے گیا تھا؟"

"پہلے تو میں اسے چھوڑ کر چل پڑا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں فتح شیر کے گھر میں نہ گھس جائے اور ہنگامہ کر دے۔" محسن بولا۔ "پھر میں اسے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ ٹیلی فون کے تار بھی اسی نے کاٹے تھے۔"

"یہاں بھی وہ نارمل ہو گیا تھا یار۔" میں نے کہا۔ "چُپ چاپ پڑا تھا۔"

"لیکن وہ نارمل نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "اسی خیال نے اسے سونے نہیں دیا کہ مجرم اس کی دسترس میں ہے اور ہم اسے صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ وہ ہماری کارروائی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ خود کچھ کرنا چاہتا تھا اور فوراً لیکن اس کی راہ میں ہم حائل تھے۔ ہمارے سوتے ہی اسے موقع مل گیا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا محسن۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے تیرا یہ کام اس نے کب کیا؟"

"کم سے کم دو تین گھنٹے پہلے۔" محسن نے کہا۔ "سب سے پہلے میں جاگا تو مجھے باتھ روم کا دروازہ کُھلا دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں نے الف دین کی غیر موجودگی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واردات کر کے فرار ہو گیا ہے تو میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ قتل کس وقت ہوا؟ خون جما ہوا تھا اور کچھ سیاہ پڑنے لگا تھا۔ معمولی سی سیاہی کی جھلک ہے اب بھی۔"

"سردی میں خون جلدی ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور باتھ روم میں خنکی زیادہ تھی۔" میں نے کہا۔

"اس وقت سات بجے ہیں۔" محسن بولا۔ "پانچ ساڑھے پانچ بجے سے پہلے اُجالا نہیں پھیلتا۔ اگر وہ اندھیرے میں نکل گیا ہوگا تو کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔

"دیکھنے والا یہاں کون ہے؟" میں نے کہا۔ "جس نے بھی دیکھا ہوگا اسے سڑک پر پہنچنے کے بعد دیکھا ہوگا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑوں پر خون کے داغ ہوں گے۔ وہ یقیناً پکڑا جائے گا۔ پاگل کا کیا بھروسہ؟"

"ہو سکتا ہے وہ پاگل نہ ہوا ہو۔ اس نے پورے ہوش میں ساری کارروائی کی ہو اور اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے بعد ہوش آیا ہو تو وہ چھپتا چھپاتا گھر پہنچ گیا ہو۔ اُجالا پھیلنے" محسن بولا۔

"ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں محسن، اگر وہ پکڑا گیا تو ہم بھی پھنس جائیں گے۔ پولیس کے ہاتھ پڑنے کے بعد تفتیش ہوگی تو وہ سب بتا دے گا۔ وہ کم ہمت اور بزدل آدمی ہے۔ زیادہ بھی برداشت نہیں کرے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے سب کچھ معلوم ہم سب کے نام پتے۔ ممکن ہے گاڑی کا نمبر بھی یاد ہو۔ باہر کی دیوار پر خون میں بھرے ہوئے ہاتھوں کے نشانات ہیں۔ بھی الف دین کے ہاتھ کے ہوں گے۔ فتح شیر تو اٹھ بھی نہیں سکا۔ الف دین نے بیہوشی میں ہی اس کو قتل کیا اور اس کا سر کاٹ کر الگ ڈال دیا۔ ایسی وحشت اور ایسے جنون میں اس کو احتیاط کا کہاں رہا ہوگا۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ خون میں بھر گئے ہوں گے۔ جب اس نے دیوار کا سہارا لیا تو ہاتھوں کا پورا پرنٹ آگیا۔ شکر ہے کہ ہم نے اسے دلاور کا پتا نہیں بتایا تھا ورنہ وہ فتح شیر سے فارغ ہو کے دلاور کے گھر میں گھس جاتا و اس دیوانے یا تو خود مارا جاتا یا دلاور کا بھی یہی حشر کرتا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں"

"باتیں کب تک کرتے رہو گے؟ کچھ کرو۔" رابعہ نے پہلی لب کھولے۔ "یہاں سے نکلنے کی سوچو۔ اس لاش کا کیا کرنا ہے؟ یہ نہ ہو پولیس اس کے ساتھ آپہنچے۔"

"پولیس اتنی جلدی نہیں آسکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ پکڑا تب بھی اسے تھانے لے جایا جائے گا، وہاں اس کا بیان ہوگا۔ نام شاید وہ بتا دے.... لیکن اس کوٹھی کی نشاندہی کرنا اس کے لیے ہوگا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو بیہوش تھا۔ پھر ہمارے ساتھ گیا پیچھے بیٹھا رہا تھا اور گاڑی میں نے چلائی تھی۔ واپسی میں محسن نے راستہ بتاتا آیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔"

"لیکن اب اسے یاد ہوگا۔ ڈرائیور رہے ہیں جو راستوں کو کی الگ حس رکھتے ہیں۔ ایک بار سمجھنے کے بعد وہ راستہ نہیں" محسن نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"لاش کا ہم اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔ اتنا وقت ہی ہے کہ اسے سمیٹ کر اٹھائیں اور محفوظ طریقے پر لپیٹ کر کہیں جائیں۔" میں نے کہا۔ "دفن کریں یا دریا میں ڈالیں۔ باتھ روم دھو کے صاف کریں اور خون کے نشانات مٹائیں۔ ابھی بہتر ہے کہ ہم روپوش ہو جائیں اور اپنی موجودگی کے سارے مٹا جائیں۔ یہ تکیے بستر تو چھوڑ دو لیکن برتن سب اٹھا لو۔ فنگر پرنٹ ہوں گے۔ دروازوں پر یہاں بھی ہمارے ہاتھ ہوں گے۔ صاف کر دو اور نکل چلو۔ رات تک دیکھیں گے کیا مجھے معلوم ہے الف دین کا پتا کہاں سے ملے گا۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ہم سب نے بڑی پھرتی دکھائی اور رابعہ نے دس منٹ میں سب برتن وغیرہ سمیٹ کر ایک تکیے کے غلاف میں ڈال دیے۔ ہم نے رات کو سگریٹ پی تھیں اور ٹکڑے فرش پر ... کے بجھائے تھے۔ اس نے جھاڑو کی مدد سے سب اکٹھے کیے اور ہیٹر لگا کے اوپر ڈال دیے۔ ذرا سی دیر میں وہ راکھ ہو گئے۔ رابعہ نے جھاڑو سے فرش بھی صاف کر دیا۔ اور زینہ بھی جس کی گرد میں ہمارے نقش قدم نمایاں ہو گئے تھے۔ محسن نے اتنی دیر میں کپڑا لے کر سب دروازوں کے ہینڈل، کنارے اور کنڈیاں، لاک وغیرہ صاف کر دیے۔ میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے سب سامان کار کی ڈکی میں منتقل کیا۔ آخری بار میں اور محسن اس کمرے کا جائزہ لینے گئے جہاں ہمارا قیام صرف ایک رات سا تھا۔ یہ رابعہ کا اپنا گھر تھا جہاں سے وہ مجرموں کی طرح فرار ہونے پر مجبور تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے اپنے کیے کی سزا مل رہی تھی۔ اگر بعد میں پولیس تفتیش کے لیے آئی تو اخبار میں بھی خبر ہو گی کہ مشہور ایڈووکیٹ خاتون رابعہ قاری کی کوٹھی میں پولیس افسر کا بہیمانہ قتل۔ خاتون وکیل روپوش ہیں۔ باقی باتیں اخبارات زیب داستان کے لیے بنائیں گے، گڑے مردے اکھاڑیں گے۔ رابعہ سے منسوب افواہوں کو واقعات کی صورت میں پیش کریں گے اور قارئین کو یاد دلائیں گے کہ یہ وہی خاتون وکیل ہیں جن کا نام سکندر بخت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور سکندر بخت وہ مفرور اشتہاری مجرم ہے.... وغیرہ وغیرہ۔

کمرے میں اب تین بستر لگے رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ پولیس سراغرساں کتے استعمال نہ کرے جو بستر کو سونگھ کر ہمارے جسموں کی بو پہچان لیں۔ ایک بستر میں رابعہ سوئی تھی۔ میں اور محسن ایک ساتھ تھے۔ اور تیسرے بستر میں الف دین تھا۔ میری اور محسن کی ملی جلی بو سے کتے یقیناً کنفیوز ہوتے۔ الف دین اجنبی تھا چنانچہ صرف رابعہ تھی جس کے بدن کی خوشبو اس کے وجود کا سراغ دے سکتی تھی لیکن مجھے اس بات کا کوئی امکان نہیں نظر آتا تھا کہ قتل کی ایک واردات کے لیے پولیس اتنا اہتمام کرے گی۔ قتل ایک پولیس افسر کا تھا لیکن کسی غیر آباد کوٹھی میں کون آیا کون گیا؟ یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ بیان کے لیے پولیس، رابعہ کو یقیناً تلاش کرے گی اور شاید ضامن رضوی صاحب سے بھی رابطہ قائم کرے گی لیکن وہ کیا بتائیں گے۔ یہی کہیں گے کہ مجھے معلوم نہیں وہ یہاں سے نکل کے کہاں گئی۔ تاہم سامنے نہ آنے کے باعث رابعہ کی حیثیت بھی مفرور مجرم کی سی ہو جائے گی اور چونکہ کوٹھی کی مالک وہ ہے اس لیے جتنے منہ ہوں گے، اتنی باتیں۔ اس کے ہم پیشہ بھی اس کی داستان ماضی کے ہر ورق سے ایک کہانی کا سلسلہ قائم کر لیں گے اور یہ کہانی جہاں سنائی جائے گی، رنگ بدلتی جائے گی۔

باتھ روم میں پڑی ہوئی لاش سے بھی کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گزشتہ شب فتح شیر کے گھر میں کسی نے مجھے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بیوی بچوں نے بھی نہیں اور میں نے اسے اندر نہیں جانے دیا تھا تو یہ اچھا ہی کیا تھا۔ اب تو اس کی بیوی بھی کسی کو نہیں بتا سکے گی کہ رات کو اس کے سونے کے بعد راجہ فتح شیر کس وقت باہر گیا تھا اور کس کے ساتھ گیا تھا۔ وہ پہلے تو اس کی واپسی کا انتظار کرے گی۔ پولیس والے ہنگامی حالات میں کچھ بتائے بغیر بھی نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہ یہ سمجھے کہ چپ سے راجہ فتح شیر ڈرائنگ روم کی کنڈی باہر سے لگا کے گیا ہے تو کہیں قریب ہی گیا ہو گا۔ اس کی وردی اور جوتے سب گھر میں موجود ہوں گے۔ نو دس بجے سے پہلے وہ بچوں کو ادھر ادھر بھیج کر محلے میں کسی سے پوچھیں، جہاں بھی وہ جاتا ہو گا کسی دوست، عزیز یا رشتے دار کے گھر۔ تھانے میں وہ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد فون کرے گی اور تب اسے معلوم ہو گا کہ فون تو خراب ہے۔ دس گیارہ بجے سے پہلے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ نہیں ہو گی۔

میں نے نیچے آ کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج نکل آیا تھا لیکن اس کی دھوپ پر عجیب سی زردی اداسی اور مردنی تھی۔ ایک سوگوار سی فضا میں سکوت منجمد محسوس ہوتا تھا۔ میں چلنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک دیا۔ وہ باہر نکلا اور اس نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد زمین پر سے گیلی مٹی اٹھائی۔ باہر ایک نلکا قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور اس کے آس پاس کچی زمین پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گڑھے کے گرد کیچڑ تھی اور درمیان میں تھوڑا سا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے کیچڑ کو آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر یوں اچھال دیا کہ نمبر پڑھا نہ جائے لیکن یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کسی نے جان بوجھ کے ملی ہے۔ نظر یوں آئے جیسے گاڑی کہیں کیچڑ پانی سے گزری تھی تو دوسری گاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے نمبر پلیٹ پر یہ چھینٹے پڑ گئے ہیں۔

"اب کہاں چلیں؟" محسن نے تھکے ہوئے مایوس لہجے میں کہا۔ "اچھا ٹھکانا مل گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے ٹیڈی کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح کا وقت ہے، وہ مل جائے گا۔"

"الف دین کے بیس ہزار روپے بھی تو ہمارے پاس ہی ہیں۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ اس کے نہیں تھے۔ اگر چھوڑ گیا ہے تو کوئی قرض نہیں ہے ہم پر۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس سے بڑی تو وہ مصیبت چھوڑ گیا ہے ہم سب کی جان کے لیے۔ مجھے مل جائے تو...."

رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تم نروس ہو رہے ہو؟ ابھی سے...." وہ نرم پرسکون لہجے میں بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور سر کو جھٹکا۔ رابعہ کے لہجے نے مجھے شرمسار کر دیا تھا۔ میں اطمینان سے کار چلانے لگا۔

"تو نے کہا تھا کہ الف دین کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔" محسن نے پیچھے سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بچی کون سے اسکول میں پڑھتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسکول میں اس کا پتا ہو گا۔ نام اور کلاس رسید پر لکھے ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ الف دین رات اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔" رابعہ بولی۔ "اس نے جو کچھ کیا، پاگل پن کے دورے میں کیا۔ اگر یہ پاگل پن عارضی ہو گا تو وہاں سے بھاگنے کے بعد اس کو اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا ہو گا۔ ممکن ہے اس نے ہاتھوں اور کپڑوں کو دھو کر خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی ہو اور گھر پہنچ کے کپڑے بدل دیے ہوں۔ بیوی کو بتا دیا ہو کہ اس سے خون ہو گیا ہے۔"

"بیوی جیسی بھی ہے، شوہر کو بچانے کی پوری کوشش کرے گی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس سے اور ہم سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں سمیت بھاگ جائے۔" میں نے کہا۔ "اسے معلوم ہے، دلاور سے بچنے کے لیے طافو نے بھی بیوی بچوں کو غائب کر دیا تھا۔"

"لیکن پاگل پن کے اثرات شدید اور دیرپا ہوئے تو.... تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خودکشی بھی کر سکتا ہے۔"

"جو کچھ ہو گا، شام تک معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر شام تک اس کوٹھی میں کوئی نہ پہنچا تو میں اور محسن رات کو لاش نکال کے باتھ روم صاف کر آئیں گے؟"

"یہ حماقت ہو گی، جرأت نہیں۔" رابعہ بولی۔ "پولیس آس پاس سادہ کپڑوں میں موجود ہوئی تو پکڑے جاؤ گے۔"

"استاد ٹیڈی شام کو معلوم کر آئے گا کہ پولیس آئی تھی یا نہیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ ایک چکر تو لگائیں گے۔ جائے واردات کا معائنہ کریں گے، ایف آئی آر کاٹیں گے اور اگر اس کے بعد انہوں نے کوٹھی کی نگرانی کا فیصلہ کیا تب بھی لاش کو اسی جگہ نہیں پڑا رہنے دیں گے۔ یہ سب کارروائی ہو گی تو آس پاس کے لوگوں کے علم میں ضرور آئے گی۔ ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ٹیڈی کو ابھی بھیج دیں ایک گھنٹے کے اندر۔ اور اسے کہیں کہ وہ سارا دن دور ہی سے دیکھتا رہے۔"

"کیا پولیس رات کو نہیں آ سکتی؟" رابعہ نے کہا۔

"رات سے پہلے ہم الف دین کا سراغ لگا لیں گے۔ اگر وہ گھر سے بھی غائب ہوا اور کسی ٹھکانے میں بھی نہ ملا تو پریشانی اور خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ نہ پولیس کے، نہ ہمارے اور نہ دلاور کے۔"

"آج کے دن میں کوئی اور انتظام کر لو۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے اپنا پیسہ نکالنے دو اور تم لوگ کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لو۔ زیادہ بہتر ہے کہ کراچی چلو۔ اس شہر سے کچھ عرصے کے لیے نکل جاؤ۔"

"آج کا دن تو گزرنے دو۔" میں نے کہا۔ "ٹیڈی کے گھر ہم محفوظ ہیں۔"

"لیکن میں وہ پیسہ ضرور نکالوں گی۔ پیسہ پاس ہو تو سہارا رہتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "یہ نہ ہو بعد میں اپنا پیسہ بھی اپنا نہ رہے۔ جیسے اپنا کوئی گھر اپنا نہیں رہا۔ کوئی رشتہ اپنا نہیں رہا۔ پیسہ تو بہت بے وفا چیز ہے۔"

"پھر اس کو سہارا کیوں کہتی ہو؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "اور اتنا دکھ ہے رشتوں کے ٹوٹنے کا اور گھر سے بے گھر ہونے کا تو ابھی وقت ہے، لوٹ جاؤ۔"

"تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ میری بات کا الٹا مطلب کیوں نکال رہے ہو؟" رابعہ نے کہا۔

"مطلب نہیں نکال رہا ہوں، بات ہی الٹی ہے۔" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"اب بھی یہ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تم کو؟" رابعہ نے چلا کے کہا۔

"گاڑی روک یہاں۔" محسن نے کہا۔ "ڈرائیونگ میں کروں گا۔ تم دونوں پیچھے بیٹھ کے لڑو۔"

ہم نے جگہ بدلی اور میں پیچھے آ گیا۔ رابعہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے رو رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے معاف کر دو پلیز۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میری بات سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم سب اعصابی کشیدگی کا شکار ہیں، عدم اعتماد کا نہیں۔ بعض اوقات جو کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے۔ غلط الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ یا اہم الفاظ کا غلط مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جتنا ہم لوگ سمجھتے ہیں کوئی اور نہیں سمجھ..."

"یہ غلط ہے۔" محسن نے کہا۔ "دلاور نے بھی ہم کو جتنا سمجھا ہے، یہ وہی جانتا ہے۔ اتنا تو مجھے میرے باپ نے بھی نہیں سمجھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کی نظر میں آج بھی میں جلیبی کی طرح سیدھا ہوں۔ بھولا بھالا اور معصوم۔"

رابعہ کو روتے روتے ہنسی آگئی۔ میں مسکرانے لگا۔ فضا مُسکرانے لگی۔ اُمید کی ہر کرن مُسکرانے لگی۔

ٹیڈی ابھی سو یا پڑا تھا کہ ہم نے یلغار کی۔ وہ ہم سب کو ایک ساتھ اور ساز و سامان کے ساتھ دیکھ کر آلوؤں کی طرح دیدے گھمانے لگا۔" صبح صبح کہاں سے نکالے گئے ہو جی آپ سب لوگ!"

"کہیں سے نہیں۔" میں نے کہا۔" نکالے گئے نہیں، آئے ہیں۔ اتنے بے مروّت تو تم ہو نہیں کہ اندر بلانے سے پہلے ہی نکالنے کی بات کرنے لگو۔ نکال دینا بعد میں یا خود نکل جانا۔"

"مہمان تو باعث رحمت و برکت ہوتے ہیں۔" ٹیڈی نے سر ہلایا" خصوصاً بن بُلائے مہمان۔"

"اچھا اب تم نہا دھو لو۔" محسن نے ٹیڈی سے کہا۔" رابعہ تمھارے لیے ناشتا وغیرہ بناتی ہے لیکن ذرا پہلے باہر گاڑی سے سامان اٹھا لاؤ، شاباش۔ اور دیکھو تکلف مت کرنا۔ اپنا ہی گھر سمجھنا اسے حالانکہ تم اقلیت میں ہو اب۔"

صحیح صورتِ حالات ٹیڈی پر ایک گھنٹے کے بعد واضح ہوئی۔ وہ ہکا بکا سب سنتا رہا۔

"یہ تو بڑا لمبا مسئلہ ہو گیا۔" وہ ساری بات سُن کے بولا۔" اب کیا ہو گا؟"

"تم جاؤ سیدھے وہاں۔ ذرا دُور سے نظر رکھو اس کوٹھی پہ جہاں وہ شیر کا بچہ مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھ سے دلاور نے بڑے فخر سے کہی تھی یہ بات کہ فتح شیر بھی شیر کا بچہ ہے۔"

"جب اسے معلوم ہو گا تو اس پہ کیا بیتے گی؟" محسن بولا۔" اسے شک ضرور ہو گا کہ یہ بھی ہمارا کام ہے۔"

"مجھے تو ان چار کانسٹیبلوں کا خیال آ رہا ہے کہ ان پہ کیسی بجلی گرے گی۔ احساسِ جرم کا شکار تو وہ پہلے ہی ہیں۔"

"رابعہ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" محسن نے کہا۔" ہم بنک سے رقم نکلوائیں گے۔"

"اور میں الف دین کا سُراغ لگاؤں گا۔" میں نے جیب سے رسید نکال کے سب کو دکھائی۔

"اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تو ہے۔" محسن بولا۔" اس پہ پتا ہو گا۔"

"پتا اس کمپنی کا ہے جہاں وہ سب سے پہلے ٹرک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔" میں نے کہا۔" اس کا فائدہ نہیں کوئی۔"

ہم سب ایک ساتھ نکلے۔ کار کی نمبر پلیٹ تو گندی تھی ہی صفائی نہ ہونے سے پوری گاڑی گندی ہو رہی تھی اور ہم نے بہتر سمجھا کہ اسے صاف نہ کیا جائے۔ ٹیڈی کرشن نگر میں سُوری بلڈنگ کے اسٹاپ تک ہمارے ساتھ گیا۔ پھر اس نے بس یا رکشا سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور ہم نے اسے تاکید کی کہ وہ محتاط رہے۔" چابی چوکھٹ کے اوپر رکھی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔" جو پہلے پہنچے دروازہ کھول لے۔"

"ہم تو دروازہ کھولے بغیر بھی گھس جائیں گے۔" میں نے کہا۔" تم اندر مت ہو جانا۔"

"قسم مولا علی کی۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔" اتنی عقل اپنے پاس بھی تھی۔ آپ سب نے مل کر دماغ درست کر دیا۔"

"یہ ٹھیک کہا تم نے معلوم نہیں کس کس کا دماغ ہم نے درست کر دیا اور کس کس نے ہمارا دماغ خراب کر دیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ہم نکل گئے۔ کار میں نے محسن کے حوالے کی اور اس نے مجھے ضلع کچہری کے پاس اتار دیا۔ وہ گھوم کر مال روڈ پر ہو گئے اور میں پیدل چل پڑا۔ جس اسکول کا پتا رسید پر درج تھا وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں اسکول کی پرنسپل کے کمرے میں بیٹھا تھا۔" مجھے اس بچی سے ملنا ہے۔" میں نے رسید دکھا کے کہا۔" پتا مل جائے تو مزید بہتر۔"

"کس سلسلے میں؟" پرنسپل نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے مجھے دیکھا۔" کیا لگتے ہیں آپ اس بچی کے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے حقیقت کا اعتراف کرنا بہتر سمجھا۔ "میں ڈاکٹر امجد ہوں۔ اس بچی کا باپ اپنا پرس میرے کلینک میں بھول گیا جس میں خاصی بڑی رقم کے ساتھ یہ رسید بھی تھی۔ میں اس کی امانت اس تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجا کے چپراسی کو بلایا اور اسے کہا کہ الف دین کی بچی کو بُلا لائے۔ وہ پندرہ منٹ بعد لوٹا۔ اس تمام وقت میں پرنسپل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ جانے فائلوں میں کیا دیکھتی رہی۔ پھر چپراسی نے مجھے مطلع کیا کہ وہ بچی آج نہیں آئی۔

"ضرور وہ بیمار ہو گی۔" پرنسپل نے کہا۔" ورنہ ٹرمینل ٹیسٹ چل رہے ہیں۔ خیر میں آپ کو پتا بتا دیتی ہوں۔" اس نے ایک خاصا بڑا رجسٹر طلب کیا۔ جی لے آر یا جنرل ایڈمیشن رجسٹر۔ اس میں سے ایک سلپ پر کچھ نوٹ کیا اور سلپ مجھے تھما دی۔

الف دین کا پتا معلوم کرنا بھی کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا لیکن میں اس کے گھر تک پہنچا تو مجھے دروازے میں قفل نظر آیا۔ میں نے اِدھر اُدھر لوگوں سے دریافت کیا۔ اس وقت گھروں میں صرف عورتیں تھیں۔ انھوں نے مجھے سرسری طور پہ ٹال دیا۔" معلوم نہیں کہاں گئے ہیں۔ گئے ہوں گے کہیں کسی سے ملنے یا بازار۔ ہمیں بتا کے نہیں گئے۔ دوسری طرف والوں سے پوچھو۔" بالآخر سامنے کے دروازے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ میرے سوال پہ اس نے مجھے خاصی مشکوک نظروں سے دیکھا۔" کیا کام ہے جی آپ کو اس سے؟" وہ بولا۔

"کام اس سے ہے تو تم کو کیا بتاؤں؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "میرا فرینڈ ہے وہ۔"

"کیا ہے؟" اس شخص کا منہ حیرت سے کُھلا رہ گیا۔

"بھئی دوست ہے میرا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔" وہ کچھ پریشان تھا، اس نے کہا تھا کہ آپ راولپنڈی جائیں تو میری فیملی کو بھی جانا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر امجد ہے۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے ڈاکٹر صاحب۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔" وہ نکل گیا۔ صبح صبح میں نے دیکھا تو تانگے میں سامان لاد رہا تھا۔ میں نے پوچھا الف دین کدھر کا ارادہ ہے تو بولا کہ پنڈی جا رہا ہوں، سُسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔"

"تم نے کیسے اندازہ کیا؟" میں نے کہا۔

"لو جی! سُسر اس کی بیوی کا کون ہوا؟ باپ ہوا نا؟" وہ بولا۔ "جس کا باپ مرے گا وہ رونے دھونے کے بجائے گھر والے سے لڑے گی۔ لڑائی کی آواز تو میں نے صبح فجر کی نماز سے پہلے سُنی تھی۔ وہ تانگے میں بھی ایسے بیٹھی تھی کہ معلوم ہوتا تھا لڑ کر بیٹھی ہے۔ بچے بھی ڈرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سُسر کی موت پر کوئی اتنا سامان لے کر نہیں جاتا۔ آپ کی بات ٹھیک ہے۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ وہ چُپ چاپ نکل گیا۔"

اس کی دلیل نے مجھے قائل کیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس چل پڑا۔ میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت تھی کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں لگا، پاگل نہیں ہوا اور اس نے خودکشی نہیں کی۔ اس نے وقتی دیوانگی کے دورے سے مغلوب ہو کے ایک قتل تو کر دیا تھا لیکن اس کے بعد ہوش آیا تو وہ فرار ہو گیا۔ اسے میری دھمکی بھی یاد تھی کہ میں اس کی بچی کے اسکول سے پتا معلوم کر سکتا ہوں۔ اسے یہ بھی احساس ہو گا کہ اس نے جو غلطی یا حماقت کی ہے اس کی سزا میں کیا دوں گا اور میں نے خود کو قانون کیا دے گا۔ وہ شریک جرم بھی رہا تھا اور قانون سے زیادہ ہم سے خوفزدہ تھا جو مقدمہ چلائے بغیر سزا دینے کے قائل تھے۔ یہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

ایک بار پھر میرا ذہن مستعد اور فعال ہو رہا تھا۔ وہ خطرہ جس نے کچھ دیر کے لیے میری شکاری قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا بادل کے سائے کی طرح گزر گیا تھا اور صورت حال جو مخالف محسوس ہوتی تھی موافق نظر آنے لگی تھی۔ میں سوچتا گیا اور پیدل چلتا ہوا ریگل تک آ پہنچا۔ فتح شیر کو اپنے اعمال کی سزا ملی تھی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا۔ میں تو اس سے پوچھتا کہ اس نے دلاور کے ساتھ مل کر اور کیا گل کھلائے ہیں۔ اس سے وہ سب پیسہ وصول کرتا جو اس نے دلاور سے اس کے جرم کو چھپانے کے لیے لیا تھا اور پھر دلاور سے بات کرتا۔ اس ٹیپ کی موجودگی میں جو محسن نے کار کے ریڈیو سے میری اور فتح شیر کی گفتگو سن کر تیار کیا تھا، دلاور کو ایسے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا کہ وہ رہائی کی خاطر مُنہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہو جاتا۔ جو کچھ دلاور نے سب انسپکٹر فتح شیر کو دیا تھا اس کمائی کا حصّہ تھا جس پر مجھ سے پہلے میرے باپ کا حق تھا۔ یہ کمائی اس کی میرے باپ کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کرنے سے ہو رہی تھی۔ اس نے کاروبار ہی نہیں، اپنے مجرمانہ حربے استعمال کر کے میرے باپ کو اس کے جائز حصے کی ملکیت سے بھی محروم کیا تھا، پھر اس کو پیسے پیسے کا محتاج کر دیا تھا اور اس کی ساری کمائی چھین لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایمانداری اور محنت سے ترقی اور خوشحالی کی منزل حاصل کرنے والا مفلس و بے نوا، تنہا اور مجبور ہو کے زندگی کی آخری منزل تک پہنچا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک شکستہ دل کے سوا۔ ایک فریاد کناں لبِ خاموش کے سوا۔ اپنی زندگی کی تمام جدوجہد کے رائیگاں جانے کے خیال کے سوا اور اس احساس کے سوا کہ زندگی ایک سزائے ناتمام کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس نے اپنا پورا خاندان گنوا دیا، اپنا کاروبار گنوا دیا، محنت سے حاصل ہونے والی کامیابی کا فخر گنوا دیا، مجھے گنوا دیا جو مستقبل کے اعتماد کی علامت تھا اور یہ سب کچھ گنوانے کے بعد اگر اس نے جان گنوا دی تو کون سا احساسِ زیاں رہا ہو گا۔

لیکن اب مجھے سارا حساب برابر کرنا تھا۔ اگر میں دلاور کو قتل کر دیتا تو یہ اس کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی۔ مجھے اس کو اتنا ہی عذاب دینا تھا جتنا میرے باپ نے اٹھایا۔ اس سے وہ سب وصول کرنا تھا جو اس نے میرے باپ سے چھینا اور اسی طرح وصول کرنا تھا جیسے اس نے جمع کیا تھا۔

ریگل سینما کے ساتھ ہی روبینہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں نے پہلے چائے پی اور پھر دوپہر کا کھانا کھایا اور اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرا لائحۂ عمل مرتب کیا۔ مسئلہ دلاور سے رابطہ قائم کرنے کا تھا۔ الف دین کے اس انکشاف نے میری سوچ کا رُخ موڑ دیا تھا کہ وہ منشیات کے نہیں، اسلحے کے ناجائز کاروبار میں ملوث ہے — پہلے وہ صرف میرا دشمن تھا۔ اب میری نظر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں ملک و قوم کا دشمن بھی ہو گیا تھا اور جتنی سزا میں اسے دینا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ کا مستحق۔ اسے حالات ثابت کر رہے تھے۔ یہ اطلاع ابھی تصدیق طلب تھی کہ وہ اس ناجائز کاروبار میں کس طرح ملوث ہے؟ وہ ناجائز اسلحہ منگواتا ہے یا بھیجتا ہے؟ منگواتا ہے تو کہاں سے اور بھیجتا ہے تو کسے؟ بے شک ساری دنیا اسلحے کی منڈی بن گئی تھی اور فتنہ و فساد میں شیطان کی پیروی کرنے والے آدمی کو اب دنیا آباد کرنے کی، اسے آنے والے دن کے لیے زیادہ خوبصورت بنانے کی اور اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضمانت کے طور پر قائم رکھنے کے بجائے اسے تباہ و برباد کرنے کی فکر تھی، آدمی کے خون کے سمندر میں بدلنے کی خواہش تھی اور جہنم بنا دینے کی آرزو تھی، چنانچہ وہ جنگ و جدل اور قتل و خونریزی میں مصروف تھا اور اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ختم کرنے کے لیے ہر وقت ہر قسم کے اسلحے کی ضرورت تھی۔ بندوق کی گولی اور توپ کا گولا۔ بم اور ایٹم بم۔ اعصابی گیس اور مہلک جراثیم کے بم۔ گھنٹوں کے بجائے منٹوں میں اور منٹوں کے بجائے سیکنڈوں میں لاشوں کے زیادہ اونچے انبار لگانے کا یہ مقابلہ مسلسل جاری تھا۔ اس تخریبی جذبے کی شدت تعمیر کی ضرورت پر غالب آگئی تھی۔ اتنی ہی جدوجہد کا رُخ اگر آدمی کی خوشی اور خوشحالی کے حصول کی طرف ہوتا تو۔ مگر یوں نہ تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا، وہ نہیں تھا جو کہ ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ طافو کی اطلاع غلط نہ ہو۔

ابھی تو مجھے یہ طے کرنا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ ایک موقع تو ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن کیا دوسرے موقعے سے فائدہ اٹھانے کے امکانات پیدا نہیں ہو گئے ہیں؟ میں نے کھانا ختم کرتے کرتے دلاور سے رابطے کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ بل ادا کرنے کے بعد میں نے رکشا لیا اور ٹیڈی کے گھر پہنچا۔ محسن اور رابعہ کو بنک سے کیش لینے کے سوا کوئی کام نہیں تھا لیکن وہ بھی واپس نہیں آئے تھے۔ میں نے بنک میں کسی قسم کی گڑبڑ کے امکانات پر غور کیا اور رابعہ کے اعتماد کے پیشِ نظر مسترد کر دیا۔ رابعہ کہیں کرائے پر مکان لینے کے حق میں تھی اور یہ ہو سکتا تھا کہ وہ محسن کے ساتھ مکان کی تلاش میں نکل گئی ہو۔ چابی دروازے کی چوکھٹ کے اُوپر موجود تھی۔ اس بند گلی میں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ صبح شام بچے اور مرد آتے جاتے دکھائی دیتے تھے لیکن رات کی طرح اس وقت بھی گلی سنسان پڑی تھی۔ مرد فکرِ معاش میں نکلے ہوئے تھے اور بچے اسکول سے تو واپس آچکے تھے لیکن ابھی کھیل کود کے لیے باہر نہیں آئے تھے چنانچہ مجھے چابی اٹھاتے اور ٹیڈی کے گھر میں گھستے دیکھ کر اعتراض کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

دس منٹ میں فتح شیر کی گفتگو کا کیسٹ لے کر میں پھر باہر نکل آیا۔ کرشن نگر کی ہی ایک دکان سے میں نے اس کی دو کاپیاں بنوائیں۔ ضرورت تو مجھے صرف ایک کاپی کی تھی۔ دوسری میں نے احتیاطاً کسی ضرورت کے لیے بنوالی تھی۔ میوزک شاپ کا مالک مجھے اپنے آلات سے ہونے والی معیاری ریکارڈنگ بطور آزمائش اپنے کان پھاڑ اسپیکروں پر سنوانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ کیسٹ میں گانے نہیں ہیں بلکہ کچھ پرائیویٹ گفتگو ہے۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پرائیویٹ گفتگو کو پبلک کے سامنے سنوانے سے باز رہا۔ واپس لوٹتے ہوئے مجھے اس خیال نے کافی اطمینان بخشا کہ میری تصویر کی اشاعت کے بعد اچانک مجھے شناخت کر لینے والوں کی تعداد پہلے جتنی نہیں رہی۔ وجہ وہی تھی کہ تصویر پرانی ہو گئی تھی اور زیادہ تر لوگ زندگی کی مصروفیات میں اسے فراموش کر چکے تھے۔ اوّل تو کوئی غور سے ہر چہرہ نہیں دیکھتا اور اگر دیکھے تو فوراً یادداشت کے تہہ خانوں میں محفوظ لاتعداد تصویروں سے نہیں ملاتا۔ بلاشبہ میں سکندر بخت نہیں، دس ہزار کا نوٹ تھا لیکن اپنے خوش بخت ہونے پر کسی کا یقین اتنا کامل نہیں ہوتا کہ میری تصویر لے کر صبح سے شام تک کوچہ و بازار میں سرگرداں رہے اور دست بہ دعا رہے کہ راہ چلتے نصیب کھل جائیں۔

گلی کے نکڑ پر گاڑی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے رابعہ اور محسن کے مشورے کی ضرورت بھی تھی۔ محسن کی عملی مدد کی ضرورت بھی اور گاڑی کی بھی لیکن اندر صرف محسن کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔

"رابعہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ البرٹ وکٹر ہوسپٹل گئی ہے۔" محسن نے ٹیڈی کی بان والی چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا۔ وہ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں چھت کی جانب ارسال کر رہا تھا۔

"اور تو نے اسے جانے دیا؟" میں نے اس کے پاس ہی بید کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"وہ نازو سے ملنے گئی ہے، اپنی غیر سرکاری سوکن سے۔" محسن بولا۔ "بقول شاعر، ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے۔"

"اور وہاں جو ڈبل ایس آئی بیٹھا ہے، ہم سب کا مشترکہ دشمن۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"وہ اب سنگل ایس آئی رہ گیا ہے۔ صرف سید اکرام شیخ۔" محسن بولا۔ "اس نے پولیس کی نوکری کو لات مار دی ہے اور تارک الدنیا ہو گیا ہے۔ کسی سے نہیں ملتا اور کوئی بات نہیں کرتا۔

نازو بہت پریشان تھی۔ اس کے گھر والے بھی پریشان ہیں کیونکہ نازو خود کو مجرم سمجھتی ہے اور اکرام شیخ دہرے احساسِ جرم کے ردِعمل کا شکار ہے۔"

"جبکہ اس کے والدین ساری خرابی کا ذمے دار مجھے سمجھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہی نازو کو بلایا تھا۔"

"رابعہ آئے گی تو معلوم ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اس نے تو خیریت معلوم کرنی چاہی تھی۔ نازو نے خود بات کی اور اسے بلایا۔ رابعہ کچھ تامل کر رہی تھی لیکن نازو نے اسے یقین دلا دیا کہ اس میں کوئی چال نہیں ہے اور اکرام شیخ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں رہا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ یہ ایک شدید نفسیاتی ردِعمل ہے۔ نروس بریک ڈاؤن کی ایک صورت۔ اکرام شیخ کو نارمل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ابھی تو وہ چوبیس گھنٹے نازو کے پاس بُت بنا بیٹھا رہتا ہے۔ نہ کسی سے کچھ کہتا ہے نہ کسی کی بات کا جواب دیتا ہے۔ رات کو بھی اسے خواب آور گولیاں دے کر سلایا جاتا ہے۔ رابعہ نے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اسے کون گرفتار کر سکتا ہے۔ ابھی تک اس کے خلاف کوئی الزام نہیں ہے۔ بے شک وہ رضوی صاحب کے گھر سے فرار ہوئی تھی لیکن رضوی صاحب اس کو فرار نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں رہتی تھی۔ نظر بند نہیں تھی۔ یہ بات آن ریکارڈ آجائے کہ پولیس کو اس کی نگرانی یا تعاقب پر مامور کیا گیا تھا تو رضوی صاحب کو جواب دینا مشکل ہو جائے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟"

"وہ اب پھر ایسا ہی کریں تو انھیں کون روک سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسپتال سے کوئی اس کے پیچھے لگ جائے گا۔"

"وہ اسپتال سے سیدھی ادھر نہیں آئے گی۔" محسن نے کہا۔ "منظر کے پاس جائے گی۔ اسے اپنی رقم بھی منظر کو دینا تھی کہ اپنے اکاؤنٹ میں رکھے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نو سو اور کچھ۔ تقریباً پینتالیس۔"

"بنک میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"ہوئی تھی۔ منیجر کو۔" محسن بولا۔ "ڈیپازٹ میں اتنی کمی واقع ہو گئی۔ عین کلوزنگ سے پہلے۔"

"الف دین غائب ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر گیا تھا۔ وہ صبح مُنہ اندھیرے بیوی بچوں کو لے کر نکل گیا۔"

محسن ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ "اس کا مطلب ہے وہ پکڑا نہیں گیا۔"

"ہاں۔ اس نے پاگل پن میں موقعے سے فائدہ اٹھایا اور فتح شیر کو قتل کر دیا۔ اگر اسے دلاور کے ٹھکانے کا علم ہوتا تو اسی دیوانگی میں دلاور کو بھی مار جاتا۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمیں بھی مار کے جا سکتا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ہم جاگتے تو معلوم ہوتا کہ یومِ حشر ہے۔"

"وہ ہمیں مجرم نہیں سمجھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہی کرتا۔"

"اس نے تجھے مجرم سمجھ کے ہی پکڑنے کی کوشش کی تھی۔" محسن بولا۔

"ہاں، لیکن بعد میں حالات نے اس کی سوچ بدل دی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ ہو گیا تھا اور ہم اس کے مجرم نہیں تھے۔"

"مجھے ڈر ہے وہ اپنی بدحواسی کے باعث نہ پکڑا جائے۔" محسن نے کہا۔ "خوفزدہ ہو کے فرار ہونے والے مجرم کا رویّہ خود اس کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ رہتا تو ہم اسے کوئی بے وقوفی نہ کرنے دیتے۔ اب یہی حماقت کیا کم ہے کہ وہ بلاوجہ اپنا گھر چھوڑ، بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ گیا؟"

"اس کے ایک پڑوسی نے بھی اسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا۔"

"شک تو ہوگا۔ وہ جہاں بھی جائے گا کسی عزیز کے پاس یا کسی دوسرے شہر میں۔ کیا لوگ پوچھیں گے نہیں کہ ایسی کون سی آفت آرہی تھی لاہور میں جو تم نے ہجرت کی۔ بچی کا اسکول چھڑا دیا اور بیوی کو بے گھر کیا۔ اسے سب کو مطمئن کرنے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ بچی سے بھی کوئی جھوٹ تو بولا ہوگا اس نے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے ٹرمینل ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ مجھے اسکول جا کے معلوم ہوا۔" میں نے کہا۔

"جب بھی اس کا جھوٹ پکڑا گیا، وہ بھی پکڑا جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سب بک دے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ کم سے کم آج۔" میں نے کہا۔ "اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں ہوں۔ ظاہر ہے اب فتح شیر کی لاش کے دریافت ہونے کا امکان نہیں رہا۔"

"لیکن اب تک پولیس کو اس کی پُراسرار گمشدگی کا علم ہو گیا ہوگا۔"

"اس سے ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "پولیس اسے تلاش کرتی پھرے۔ البتّہ یہ خبر اپنے چوہدری دلاور صاحب کو ملے گی تو ان کے لیے فکر کی بات ہوگی۔ کل تک انھیں بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ فتح شیر کی گمشدگی کا دلاور سے بھی تعلق نہیں۔ ہے تو یہ بات صرف ہم جانتے ہیں یا اس پر وہ چار ماتحت شک کر سکتے ہیں جو اس کے شریکِ جرم تھے لیکن وہ بھی اپنے شک کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اگر یہ خبر کسی اخبار میں اشاعت کے قابل سمجھی گئی تو نہایت غیر نمایاں مقام پا کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گی اور ہو سکتا ہے اپنے چوہدری صاحب اخبار کا مطالعہ سرسری کرتے ہوں۔ مصروف آدمی سرخیوں پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن فرض کرو کل وہ خبر دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بھی کافی وقت ہے۔ ابھی سوا تین بجے ہیں۔ کل صبح سات سوا سات سے پہلے وہ اخبار نہیں دیکھیں گے۔ سولہ گھنٹے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تیری کھوپڑی میں کوئی پلان ہے تو اس کا بلیو پرنٹ نکال۔"

"بلیو پرنٹ؟ لاحول ولا قوۃ۔ میاں کس قدر عریانی و فحاشی بھری ہوئی ہے تمھارے افکار و خیالات میں۔ کیا صرف پرنٹ کہہ دینا کافی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "بلیو کا لفظ انتہائی غیر اخلاقی ہے میاں۔"

"لوگ صرف آسمان کیوں نہیں کہتے۔ نیلا آسمان کیوں کہتے ہیں۔" وہ بے حیائی سے بولا۔ "اور سمندر کے کنارے ایک کیڑا ملتا ہے 'بلیو بوٹل' اسے صرف بوٹل کیوں نہیں کہہ دیتے۔ بڑے زور سے کاٹتا ہے ظالم۔"

"مگر کسے نورِ چشم، انھی کو جو نیم عریاں اور نہایت بے شرمی سے مخلوط طریقے پر سمندر میں سرِعام نہانے کی جسارت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارا پلان نہایت پاکیزہ ہے۔ ہم چوہدری سے گلے ملنا چاہتے ہیں بلکہ گلے پڑنا چاہتے ہیں ان کے۔ اور اس وقت ہمیں ان کی بہت یاد آرہی ہے۔ ان کی آواز ہی سننے کو مل جائے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

"اچھا۔ اتنا آزردہ اور آبدیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" محسن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "باہر چل کر بات کر لیتے ہیں ان سے۔"

میں نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا۔ دو میں سے ایک فاضل ٹیپ کی کاپی ہم نے گاڑی میں رکھی اور اصل ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کر دی۔ دوسری کاپی کو ہم نے ٹیڈی کے گھر کے ایک محفوظ گوشے میں چھپا دیا۔ میں اور محسن مختلف دکانوں پر پھرتے رہے جہاں "پبلک ٹیلیفون" کا بورڈ نظر آیا لیکن ہر جگہ ٹیلیفون ایسی جگہ ملا کہ دکاندار سر پر موجود رہتا تھا اور تمام گفتگو سن سکتا تھا۔ پھر ایک ہوٹل کے لاؤنج میں ہمیں موقع مل گیا۔ وہ بہت بڑا ہوٹل تھا اور اس کے ہال میں کاؤنٹر بائیں جانب تھا تو ٹیلیفون دائیں طرف دوسرے کنارے پر ایک کیبن میں لگا ہوا تھا۔ میں نے محسن کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ نمبر ملاتے ہی اس کے پی۔ اے نے بات کی۔ میں نے ریسیور سے کان لگا دیا۔

"چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں۔" وہ عیاری سے بولا۔ "کیا کام ہے؟"

"جب وہ موجود ہی نہیں ہیں تو کام کیا بتاؤں۔" محسن آواز بدل کے بولا۔ "انھوں نے ہی کہا تھا کہ فون کر لوں۔"

"اچھا نام بتا دیں اپنا اور فون نمبر دے دیں۔" پی اے بولا۔ "آئیں گے تو بتا دوں گا۔"

"فتح شیر ہے میرا نام۔" محسن نے غرا کے کہا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"کیا بات ہے بھئی؟" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ وہ کسی انٹرکام پر تمام گفتگو سن رہا تھا اور شاید ٹیپ بھی کر رہا تھا۔ محسن نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"آپ کی گاڑی میں جو ریڈیو ہے اپنے چوہدری صاحب" میں نے کہا۔ "اس میں ایف ایم بینڈ تو ہوگا؟"

"سکندر، کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتے ہو؟" دلاور نے کہا۔ "یہ فتح شیر کون ہے؟"

"ریڈیو تو ہے تمھاری گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ "دو بینڈ کا ہوا تو ایک ایف ایم ہوگا دوسرا اے ایم۔ اگر تیسرا بینڈ ہوا تو شارٹ ویو ہوگا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ایف ایم پر بینڈ کو ٹیون کرنا۔ اگر تم پولیس کو بھی سامعین میں شامل کر دگے تو یقین کرو ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ تم کو گرفتار کر کے لے جائیں گے ہو سکتا ہے پہلے ہی لے جائیں لیکن نوّے منٹ بعد تمھاری آزادی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اکیلے ہی ہماری نشریات سنو۔ اور اس بات کو کھیل مت سمجھنا دلاور۔ تمھارے اور تختۂ دار کے درمیان یہی نوّے منٹ حائل ہیں۔ اقبال پارک زیادہ دُور نہیں ہے۔ قلعے کی دیوار کے پیچھے آواز صاف سنائی دے گی۔ فیکٹری میں شیشے بند کر کے بیٹھو گے کار کے تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ اینٹینا اُونچا رکھنا۔ ایف ایم بینڈ پر اس کے بغیر شور زیادہ آتا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین آگیا تھا۔ اگر چوہدری دلاور نے اسے مذاق سمجھا ہوتا تو وہ میری اتنی لمبی بات نہ سنتا اور درمیان میں دخل ضرور دیتا، برہم ہوتا یا دھمکیاں دیتا، میرا مذاق اُڑاتا یا سرے سے بات ہی نہ سنتا لیکن اس نے میری بات بڑی توجہ سے سُنی تھی۔

چوہدری دلاور کو اپنی کار میں فیکٹری سے پارک تک پہنچنے میں شاید بیس منٹ لگے ہوں گے۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ پہلے پہنچ جائے تاکہ ہمیں آتا نہ دیکھے۔ آدھے گھنٹے کے بجائے ہم نے چالیس منٹ بعد کار کو لاہور سے گوجرانوالہ جانے والی سڑک پر ٹریفک میں شامل کر دیا لیکن پل سے پہلے ہی اقبال پارک آگیا اور ہم دائیں طرف گھوم گئے۔ میری نظر نے چوہدری دلاور کی کار کو سو گز کے فاصلے پر بہت سی دوسری کاروں کے درمیان دیکھ لیا۔ اسے نمایاں کرنے والا اس کی گاڑی کے ریڈیو کا اینٹینا تھا جو دس فٹ کے قریب اُوپر نکلا ہوا ہوا میں جھول رہا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو اندازاً

چالیس گز کے فاصلے پر اس طرح پارک کیا جیسے بہت سی دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک دوسرے کے متوازی اور سڑک پر تھوڑی سی ترچھی۔ یہ سب یادگارِ پاکستان دیکھنے کے لیے آنے والے لوگ تھے جو ہر روز اسی طرح آتے رہتے تھے۔ ملک کے کسی بھی حصے سے لاہور آنے والوں کے لیے اس تاریخی حیثیت رکھنے والی یادگار کا نظارہ بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن خود لاہور کے رہنے والے بھی اقبال پارک میں سیر و تفریح کے لیے آجاتے تھے۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے پارک میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں لان پر جمع تھیں یا اِدھر اُدھر گشت کر رہی تھیں۔ ہماری اور دلاور کی کاروں کے درمیان کم سے کم بیس دوسری کاریں حائل تھیں۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا تب بھی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایف ایم مائکروفون نکالا اور وقفے وقفے سے دلاور کو مخاطب کرنے لگا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ دس منٹ سے ریڈیو کی سوئی کو اِدھر سے اُدھر گھما رہا ہوگا کہ کہیں سے کوئی آواز سنائی دے۔ وہ اینٹینا بلند کیے بیٹھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔ پانچ دس سیکنڈ بعد وہ پھر بینڈ کو ٹیون کرتا ہوگا۔ میں نے اسے دس منٹ دیے اور اس عرصے میں "ہیلو دلاور، ڈو یو ریڈمی؟ دِس اِز ایم آر ایس۔ ہیلو دلاور" کہتا رہا۔ ایک بار ٹیون کر لینے کے بعد میری آواز اس کے کانوں میں ریڈیو کے اسپیکر کی زبان سے صاف پہنچ رہی ہوگی لیکن وہ جواب دینے سے قاصر تھا۔ محسن نے باہر نکل کر اس کی کار کی پوزیشن پر غور کیا اور یہ دیکھا کہ کوئی دوسری گاڑی اسی وقت حرکت میں تو نہیں آئی۔ ہاتھ سے اس نے مجھے "آل اوکے" کا سگنل دیا لیکن میں وہی دہراتا رہا۔ "ڈو یو ریڈمی؟ دلاور۔ دس از ایم آر ایس" دل ہی دل میں اس نے ہزار بار کہا ہوگا۔ "یس۔ آئی ریڈ یو ایم آر ایس۔" لیکن اس بات پر سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوا ہوگا کہ یہ بات مجھے بتا نہیں سکتا۔ اضطراب اور سسپنس میں اس نے مجھے گالی دے کر یہ بھی کہا ہو کہ آگے بھی تو کچھ کہو، ایم آر ایس کی اولاد۔ ایم آر ایس کیا ہے؟ اس کے متعدد مفہوم نکال لینے کے بعد اس نے طے کیا ہوگا کہ یہ مہمل اصطلاح ہے اور ہم اس کی جگہ اے بی سی یا ایکس وائی زیڈ بھی کہہ سکتے تھے تاہم وہ بے وقوف نہیں تھا اور اس کا ایم آر ایس سے "محسن رابعہ سکندر" سمجھ لینا بعید از قیاس نہ تھا۔

دس منٹ تک یہی بکواس سن سن کر وہ پاگل ہونے کے قریب ہوگا لیکن اس کے لیے ریڈیو بند کر کے چلے جانا بھی اتنا ہی مشکل کام تھا۔ وہ میری آواز پہچان کے رُکنے پر مجبور تھا۔ بالآخر میں نے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگایا اور اس کا والیوم اتنا رکھا کہ آواز گاڑی سے باہر نہ جائے۔ سردیوں کی وجہ سے لوگ گاڑیوں کے شیشے بند ہی رکھتے تھے، خصوصاً اس سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے ورنہ گرمیاں ہوتیں تو ہماری حالت خراب ہو جاتی اور نہ جانے کتنے لوگ ہمیں مشکوک نظروں سے گھورتے۔ ایف ایم مائیکروفون کو ہم نے ٹیپ ریکارڈر کے اسپیکر کے بالکل سامنے رکھا۔ جہاں اسپیکر کی آواز مدہم پڑتی تھی وہاں میں والیوم بڑھا دیتا تھا۔ فتح شیر مر گیا تھا لیکن ٹیپ پر اس کی وہ آواز زندہ تھی جس میں اس نے گزشتہ شب اپنے ہر گناہ کا اور ہر جرم کا رضاکارانہ طور پر اعتراف کیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اس پر کتنے مقدمات قائم ہوتے؟ میں نے سوچا۔ طافو کی لاش کو راول ڈیم میں غرق کرنے کے علاوہ۔ راول ڈیم؟ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ راول ڈیم تو لاہور سے ایک سو اسّی میل دور تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رات کے آخری پہر میں اتنی دور جائے اور اگلے دن یوں لوٹ آئے کہ کسی کو اس کی غیر موجودگی کا احساس نہ ہو۔ ستر اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جانے والا بھی چار گھنٹے سے پہلے راول ڈیم تک نہیں پہنچ سکتا۔ شہر میں رفتار کا اوسط بہت کم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ فتح شیر نے اپنی کارروائی رات کے اندھیرے میں مکمل کر لی؟ ناممکن۔ وہ کسی طرح بھی صبح آٹھ نو بجے سے پہلے راول ڈیم نہیں پہنچ سکتا تھا اور آٹھ نو بجے سورج نکل آتا ہے۔ راولپنڈی کی کہر آلود منجمد صبح میں دھوپ بھی چاندنی لگتی ہے لیکن روشنی ضرور دیتی ہے۔ ایسے وقت میں کسی لاش سے من بھر وزن کا پتھر باندھنے اور اسے ڈیم کی جھیل میں غرق کرنے کی کارروائی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہت کچھ سچ بتا گیا تھا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی کہ اس نے مجھے بھی غلط بتائی۔ خود مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ محض ایک لاش کو ٹھکانے لگانے کی خاطر کون چار سو میل آتا جاتا ہے اور پھر پولیس والے؟ جو زندہ کو دن دہاڑے ٹھکانے لگا دیں، وہ ایک لاش لے کر راولپنڈی جائیں گے! راوی، جہلم اور چناب کو عبور کر کے راول ڈیم کی جھیل کے پانی میں لاش غرق کریں گے! معلوم نہیں اس وقت کیوں میں نے غور نہیں کیا۔ شاید میں نے غور سے سنا ہی نہیں تھا کہ وہ راول ڈیم کہہ رہا ہے۔ خیر، وہ نہیں تو کیا، اس کے ساتھ جانے والے چار ماتحت تو ہیں۔ لاش انھوں نے بحکم افسرِ اعلیٰ ٹھکانے لگائی ہوگی اور فرض شناسی، فرمانبرداری اور تعاون کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس منظاہرے کا انعام ان کو یہ ملا ہوگا کہ راتوں رات ان کے بینک بیلنس میں ایک لاکھ کے آدھے بڑھ گئے ہوں گے۔ وہ اب بھی صحیح بتا سکیں گے کہ لاش کہاں ہے۔ فتح شیر تو انہیں ہدایات دے کر گھر چلا گیا ہوگا۔ اصل کام کرنے والے تو وہی تھے۔ انھوں نے کس حد تک افسرِ اعلیٰ کے حکم پر عمل کیا یہ وہی بتائیں گے۔

کیسٹ ختم ہوا اور خودکار نظام نے کیسٹ ریکارڈ کو کھٹ سے آف کر دیا۔

"یہ انٹرول ہے چوہدری صاحب۔" میں نے کہا "کیسی فلم ہے؟" ظاہر ہے میرے سوال کے جواب میں دلاور نے کوئی زبردست گالی دی ہوگی لیکن وہ میں نے نہیں سنی۔ محسن ہنس پڑا۔

"تمھاری بے بسی پہ ہنسی آ رہی ہے مجھے۔" محسن بولا "تم ہماری آواز کتنی صاف سن رہے ہو مگر افسوس یہ ہے کہ ہم تین میل دور سے اپنی شبیہہ مبارک تم کو ارسال نہیں کر سکتے ورنہ تم ہمارا دیدار کر کے بھی خوش ہوتے۔"

"باہر زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں پکچر ٹیلی فون اور شارٹ سرکٹ یا کلوز سرکٹ ٹی وی عام ہیں۔" میں نے کہا "لیکن یہاں تو تمھارے جیسے وسائل رکھنے والے شخص کے پاس ایک ایم ایف مائکروفون تک ہیں۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ تم تو ہر چیز اسمگل کرتے ہو، یہ بھی منگوا لو۔" محسن بولا "جیسے ہم نے منگوایا ہے جرمنی سے۔" ہماری ان تمام باتوں کا مقصد صرف اسے گمراہ کرنا تھا تاکہ وہ سمجھے کہ ہم واقعی تین میل دور سے بات کر رہے ہیں اور تین میل کی رینج کا یہ ایف ایم مائکروفون ہم نے لوکل مارکیٹ سے نہیں لیا۔

"اگر تم کوشش کرو تو ہمارے درمیان وائرلیس رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ چھوٹا موٹا سو پچاس گز کی رینج والا مائک شاید ہال روڈ سے مل جائے۔" محسن نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم آج ہی کوشش کرو۔" میں نے کہا "شام کو پھر بات ہوگی تم سے۔"

"شام تو ہو گئی ہے۔" محسن نے مجھے ٹوکا "رات کہو۔ بیشک چوہدری صاحب کی نظر میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔"

"نہیں شام ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "ہم سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بات کرنا پسند کریں گے۔"

"پھر تو چوہدری صاحب کو اسی وقت جانا پڑے گا۔" محسن بولا "میرا مطلب ہے یہ مزاحیہ پروگرام ختم ہوتے ہی۔"

"ہاں یار، خیر اب باقی پروگرام شروع کرتے ہیں" میں نے کہا "چوہدری صاحب بہت بے چین ہوں گے۔"

"بے چین؟" محسن ہنسا "مشتعل ہوں گے بھائی! دے رہے ہوں گے۔ افسوس کہ ہم ایک نہیں سن رہے۔"

"یہ پہلا اتفاق ہے کہ گالیوں کی یکطرفہ ٹریفک ہے، ہم ان کے آبا و اجداد کا سارا شجرۂ نسب پڑھ کر گھر والوں سے ملا سکتے ہیں لیکن ہم شرفا ہیں۔" میں نے کہا "زبان خراب نہیں کرتے۔"

"لیجیے انتظار ختم ہوا۔ گالیاں مت بکیے۔ ڈراما" سلیے نے کیسٹ کو پلٹ کر آن کر دیا۔ میں نے اور محسن نے ... کر گاڑی لاک کی اور احتیاط کے ساتھ دوسری گاڑیوں ... میں آگے بڑھے۔ دلاور کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ ... کی تمام تر توجہ آواز پر ہوگی۔ بعد میں دوبارہ غور سے سننے کے لیے وہ سب ریکارڈ بھی کر رہا ہوتا تو عجب نہ تھا۔ میں اور محسن عین اس کی گاڑی کے پیچھے جا پہنچے۔ اب درمیان صرف ایک کار تھی۔ اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کے محسن نے ... تاکہ بیک ویو مرر میں نہ آئے۔ پھر اس نے دلاور کی کار کے پچھلے دونوں پہیّوں کے نیچے وہی لکڑی کے ٹکڑے رکھ دیے جن میں کیلیں ایک انچ اُوپر نکلی ہوئی تھیں اور جن سے ... نے ایک بار پولیس کی پیش قدمی روک دی تھی۔

ہم لوٹ کر آئے تو کیسٹ کا آخری حصہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ پانچ منٹ کے بعد اسپیکر میں صرف سر سر ... رہ گئی تو میں نے مائک اٹھا لیا۔

"فی الحال جو کچھ تم نے سنا اس سے زیادہ سنانے کو نہیں ہے۔" میں نے کہا "اس سے تم کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تم نے جس سہارے پر بھروسا کیا تھا وہ کتنا ناپائدار ہے۔ وقت آئے گا تو وہ خود کو بچائے گا تم کو نہیں اور کیسٹ کی موجودگی میں فتح شیر کے بچنے کی امید بھی نہیں، تم بچ ... گے۔ اس پر غور کر لو۔ تم نے ہماری آواز اور یہ گفتگو ٹیپ کا بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ اس ٹیپ کو ایک بار پھر سن لو۔ ... ہم سے بات کرنا چاہو تو دو گھنٹے بعد۔ اس وقت چھ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ پورے آٹھ بجے ریگل پر۔"

"ریگل پر ٹریفک کا شور و غل مخل ہوگا۔" محسن ...

"باغِ جناح کا پارکنگ ایریا جو لاہور جمخانہ کی طرف ہے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ تم نہ آئے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ تم بات نہیں کرنا چاہتے۔"

"یہ بات ذہن میں رکھنا کہ گفتگو ٹیلیفون پر نہیں ہو...

... نے کہا "الف ایم بینڈ ہماری گاڑی میں بھی ہے۔"

مائکروفون بند کر کے میں نے ٹیپ کو بھی آف کیا اور باہر دیکھنے لگا۔ محسن نے گاڑی کو تھوڑا سا بیک کیا اور مجھے دلاور کی کار کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ گاڑی تھوڑا سا پیچھے ہوئی اور ان لکڑی کے بلاکوں پر چڑھ گئی جن پر ایک انچ سے لمبی نوکیلی کیلیں اُبھری ہوئی تھیں۔ اسے جھٹکا سا لگا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی بیٹھنے لگی ــــ میں نے دلاور کو باہر آتے دیکھا۔ بے بسی کے ساتھ دونوں ٹائروں کو فلیٹ ہوتے دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ ہم نے اس کے انہماک سے فائدہ اٹھایا اور کار کو بے کار کر گئے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ یہ ایک بچگانہ سی خوشی تھی۔ پہلے تو دلاور کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ثابت ہوا ہوگا کہ ٹیلیفون پر میرا پیغام وصول کرنے کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے۔ کس کو ساتھ لے کر جانا چاہیے یا وہی کرنا چاہیے جو ہم نے کہا تھا۔ میں نے اتنے سنجیدہ لہجے میں بات کی تھی اور ایسے خطرناک الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ وہ ڈر گیا۔ اسے اب ہمارے متعلق خوش فہمی کوئی نہیں تھی۔ یہ خواب و خیال کی بات ہو گئی تھی کہ ہم بلحاظِ عمر کم ہیں یا ہمارا تجربہ اس کے مقابلے میں کم ہے۔ ہم بدمعاشی میں اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے یا اس کے مقابلے میں ہمارے وسائل بہت محدود ہیں اور وہ عیاری یا مکاری کے حربے استعمال کر سکتا ہے جو ہم سادہ لوح اور شریف لوگوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ اس کا سنا نا یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے ہمیں برابر کا حریف تسلیم کر لیا ہے اور ہماری کوئی بات اس کے لیے غیر اہم نہیں رہی۔ میری اور فتح شیر کی گفتگو سنتے ہی یہ احساس شدت سے اُبھر آیا ہوگا کہ دفاعی جنگ لڑنے والے اب جارحیت پر اُتر آئے ہیں اور وہ دشمن جو قانون کے مورچے میں رہ کر لڑ تا تھا لاقانونیت کی طاقت میں اس کے برابر ہونے کا ثبوت دینے کے لیے آگے بڑھ کر حملے کرنے لگا ہے۔ رحمت کباڑی کی لاش ارسال کر کے ہم نے دلاور کے غرور پر پہلی کاری ضرب لگائی تھی۔ ابھی وہ اس شکست کی تلخی کا ذائقہ بھولا بھی نہ تھا کہ ہم نے اسے طافو کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ محاذ پیسے کی طاقت سے سر کر لیا تھا لیکن اب اچانک اس پر خوف ناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ عارضی کامیابی اس کی کتنی بڑی شکست کا سامان بن گئی ہے۔ اس نے پانچ لاکھ گنوا دیے تھے۔ یہ خطرہ بدستور موجود تھا کہ اس پر دوسرے قتل کا الزام بھی آ سکتا ہے ... کے بعد اس کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی اور اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا۔

شاید وہ سیدھا فتح شیر کے پاس جاتا۔ اسے ٹیپ سناتا اور گالیاں دے کر کہتا کہ پانچ لاکھ واپس کر دو یا مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے کی صورت پیدا کرو ورنہ میرے ساتھ تم بھی گئے لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک ٹائر تو وہ بدل سکتا تھا لیکن دوسرے ٹائر کے لیے ضروری تھا کہ کسی پٹرول پمپ تک جائے اور پنکچر لگوا کے لائے۔ میں نے اسے ایریل نیچے کر کے چاروں طرف نگاہ ڈالتے دیکھا۔

"پاگل کا بچّہ۔" محسن ہنسا "دیکھ رہا ہے کہ ہم کہیں آس پاس ہیں تو کہاں ہیں۔"

"سخت طیش میں ہوگا کہ ہم نے اتنی جرأت کی۔" میں نے کہا "اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لوٹ گئے۔"

"اور اب وہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ جو لوگ اتنا قریب آ کے ٹائر فلیٹ کر سکتے ہیں وہ کار کے نیچے ٹائم بم رکھ کے یا ڈائنامائیٹ لگا کے بھی جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ اسی وقت دلاور نے ایک ٹیکسی روکی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک ٹائر کی جگہ اسپیئر وھیل لگا کے اسی ٹیکسی میں دوسرا ٹائر لے جائے گا اور پنکچر لگوا کے لے آئے گا مگر دلاور نے اتنی جسمانی مشقت اور ذہنی کوفت برداشت کرنے کے مقابلے میں کار کو وہیں چھوڑ جانا بہتر سمجھا۔ وہ خود ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا نکل گیا۔ غالباً اس نے طے کیا تھا کہ ڈرائیور بعد میں آ کے گاڑی لے جائے گا۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے محسن خان کہ ہم دلاور کی مدد کر دیں۔" میں نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے گاڑی کو یہاں سے لے جائیں؟" محسن نے خوش ہو کے کہا "یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔"

سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے
۸ حصے مکمل مفرور
۳ حصے مکمل طالوت
۵ حصے مکمل صدیوں کا بیٹا
کتابی شکل میں تیار ہیں
آج ہی خط لکھ کر طلب فرمائیں یا اپنے قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں
کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی نمبر ۱

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے کار کو دلاور کی گاڑی کے پاس لے جاکر روکا۔ ہم دونوں پورے اعتماد کے ساتھ اترے۔ میں نے دروازے کے بند شیشے میں جھانکا۔ ڈرائیور کی سہولت کی خاطر دلاور نے کار کی چابیاں لگی چھوڑ دی تھیں اور دروازہ لاک کر دیا تھا۔ اپنے حلیے اور اعتماد سے ہم کار چور نظر نہیں آتے تھے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک کار والا دوسرے کار والے کی مدد کر رہا ہے۔

ہمارا سابقہ تجربہ یہ تھا کہ گاڑیوں کے دروازے کھولنا مشکل نہیں ہوتا اور عموماً کوئی نہ کوئی چابی ڈور لاک میں لگ جاتی ہے۔ محسن نے یکے بعد دیگرے تین چابیوں کو آزمایا اور ایک کو تھوڑا سا ہلانے سے اندر کی وہ ڈور ناب اٹھ گئی جس نے دروازے کو مقفل کر دیا تھا۔ میں نے اطمینان سے چابیاں نکالیں اور پیچھے سے ڈکی کھولی۔ اسپیئر وھیل اور جیک نکالے اور محسن نے ایک پنکچر ہونے والے ٹائر کا وھیل کھولنا شروع کیا۔ کسی نے ہماری اس کارروائی کو قابلِ غور نہیں سمجھا۔ نہ ہمارے قریب سے پیدل گزرنے والوں نے، نہ کسی دوسری گاڑی میں آنے جانے والے نے۔ میں نے محسن کی مدد کی اور جتنی دیر میں وہ اسپیئر وھیل لگا کے فارغ ہوا میں نے گاڑی کے دوسرے وھیل کو جیک پر اٹھا لیا۔ اس سب کام میں پندرہ منٹ بھی نہیں لگے۔ پھر میں نے دوسرا ناکارہ ٹائر اپنی گاڑی میں رکھا اور اسے ایک پٹرول پمپ پر لے گیا جو کچھ پیچھے ایک موڑ پر تھا۔ پنکچر لگوا کے ہوا بھروانے اور واپس وہیں آنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس وقت تک اِدھر اُدھر کی گاڑیاں جا چکی تھیں اور ان کی جگہ نئی گاڑیوں نے لے لی تھی۔ محسن اطمینان سے بونٹ کا سہارا لیے کھڑا تھا اور گاڑی جیک پر یوں کھڑی تھی جیسے کوئی ایک مصنوعی ٹانگ پر سیدھا کھڑا ہو۔ میں نے ٹائر اس کے حوالے کیا اور اس نے دس منٹ میں اسے کس دیا۔ جیک کو گاڑی میں پھینک کر اس نے ڈکی بند کی اور اپنے ہاتھ صاف کیے۔ میرے یاد دلانے پر اس نے کپڑے سے جیک کو بھی صاف کیا اور ٹائر کو بھی تاکہ ہمارے فنگر پرنٹ کہیں نہ رہیں۔

"اب میں دلاور کی گاڑی لے کر جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تو باغِ جناح کی طرف جا۔"

"ابھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہے۔" محسن نے کہا۔ "میں تیرے ساتھ چلتا ہوں ورنہ تیرا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں آجاؤں گا ٹیکسی میں۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو دیر ہو جائے اور دلاور لوٹ جائے۔"

"دلاور اب ہماری مٹھی میں ہے، وہ کہاں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "وہ انتظار کرے گا۔"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ آدھے [illegible] شہر کی ٹریفک سے گزر کے صدر پہنچنا آسان کام نہیں تھا [illegible] ہم دونوں ماسٹر ڈرائیور تھے اور دونوں کو اپنی اپنی منزل کا [illegible] رش میں کئی جگہ ہم ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہو [illegible] پھر مل گئے۔ جب ہم نے دھرمپورے سے آگے صدر [illegible] قریب ریلوے کراسنگ کو عبور کیا تو آدھا گھنٹا ہو گیا تھا [illegible] کم سے کم دس منٹ کی مسافت باقی تھی لیکن اطمینان کی [illegible] تھی کہ واپسی پر ہمیں نصف سے بھی کم فاصلہ طے کرنا تھا [illegible] واپسی کا راستہ بھی صاف تھا۔ رابعہ کی اس کوٹھی کے قریب [illegible] میں فتح شیر کی لاش ایک باتھ روم میں سولہ سترہ گھنٹے [illegible] پڑی تھی، میں نے ٹیڈی کو دیکھا۔ غالباً وہ کار کو پہچان [illegible] آگے آیا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کے ہاتھ ہلایا اور دلاور کی کار [illegible] سیدھا کوٹھی کے گیراج میں لے گیا۔ ٹیڈی میرے پیچھے [illegible] آیا۔ میں اس وقت کپڑے سے اسٹیئرنگ وھیل، گیئر [illegible] دروازے کو صاف کر رہا تھا جہاں میرے ہاتھ لگے [illegible]

"یہ آپ نے کیا غضب کیا جی۔" ٹیڈی بولا۔ [illegible] یہاں پولیس ملتی آپ کو پھر؟"

"پولیس کیسے مل سکتی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ [illegible] ٹیلیفون جو مل گیا تھا۔"

"میرا ٹیلی فون!" ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا [illegible]

"قسم مولا علی کی.... میں نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ سب خیریت ہے؟" [illegible] اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا سکندر بادشاہ۔ یعنی حد ہے۔" اس [illegible] مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کے کہا۔

"اچھا چھوڑو۔ جب خیریت ہے تو خیریت [illegible] نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "بس ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ [illegible] پولیس نہیں آئی۔ ٹیلیفون کی جگہ تم نے ٹیلی پیتھی سے کام [illegible]

"کس سے جی....؟ ذرا اردو میں بتاؤ۔ ہم جاہل ہیں۔" وہ بولا۔

"ٹیلی پیتھی۔ یہ ٹیلیفون کی ساس ہوتی ہے۔" میں [illegible] کہا۔ "جیسے ٹیلی وژن سسر ہوتا ہے۔ چلو بیٹھو۔"

ٹیڈی مذاق کو نہ سمجھنے کے باوجود ہنسا اور پھر [illegible] ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "یہ تم کس کی شامت [illegible] میں آئے تھے؟" وہ بولا۔ "کوئی نیا چکر لگتا ہے مجھے تو۔"

"یہ سب پرانے چکر ہیں استاد! تقدیر کے چکر [illegible] نے کہا۔ "جنھوں نے ہمیں گھن چکر بنا دیا ہے۔"

"اور بقولِ شاعر، ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پندرہ منٹ ہیں میاں شیروانی۔"

"پھر تو ایک منٹ فالتو ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ چودہ منٹ میں باغِ جناح تک پہنچنے کے لیے اس نے کار کو سپر سانک جیٹ کی رفتار سے دوڑایا۔ میں تو اس قسم کی پُرخطر مہمات کا عادی تھا لیکن ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے کئی بار محسن کو ٹوکا۔ "کیا مروانا چاہتے ہو بھائی محسن!" محسن نے رفتار اور بڑھا دی۔ "یار سکندر بادشاہ، ایسے تو اُوپر پہنچ جائیں گے۔ کوئی پیچھے لگا ہوا ہے کیا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نہیں۔ محسن نشے میں ہے۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "اس وقت کسی کی نہیں سنے گا۔"

"یا میرے مولا! ابھی سے مت بلا لینا۔ یہ تو کنوارا ہی مارنے پر تلا ہوا ہے۔" وہ اُوپر منہ اُٹھا کے بولا۔

پہلے ہم چڑیا گھر کی طرف سے داخل ہوئے لیکن اوپن ائیر تھیٹر اور ریسٹورنٹ کی طرف جانے والی سڑک کو ریلوے لائن کے ٹکڑے گاڑ کر یوں بند کر دیا گیا تھا کہ درمیانی فاصلے میں سے موٹر سائیکل والے تو نکل ہی جاتے تھے لیکن کار کا گزرنا ناممکن تھا۔ اگر ہم دوسری طرف جاتے تو ہم کو دلاور کی گاڑی کے بہت زیادہ قریب محدود سے پارکنگ ایریا میں رکنا پڑتا اور ان حالات میں کہ ہمارے لیے اس کی گاڑی کو پہچاننا بھی مشکل تھا، یہ بہت خطرناک اقدام ہوتا۔ معلوم نہیں کہ وہ کس کی کار لے کر آیا تھا۔ ٹیکسی میں وہ اس لیے نہیں آسکتا تھا کہ عموماً ٹیکسیوں میں ریڈیو نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو دلاور کسی ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں ہم سے بات کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں ایک کار کا انتظام بھی کیا ہوگا اور شاید ہال روڈ سے کوئی ایف ایم مائکروفون بھی خریدا ہوگا۔

"جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں یہاں سے باغ کا دوسرا حصہ ایک فرلانگ دُور ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لاہور جمخانہ کے پاس موجود ہوگا اور ہر گاڑی کا نمبر نوٹ کر رہا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "مواصلاتی رابطہ قائم ہوتے ہی وہ سمجھ جائے گا کہ ہم کس کار میں آئے ہیں۔"

"اگر ہم ہال روڈ کے متوازی کچے راستے پر لیڈیز کلب سے ذرا پیچھے رُک جائیں؟" میں نے کہا۔

"گویا گورنر ہاؤس کے گیٹ کے بالکل سامنے؟" محسن نے کہا۔ "فوراً کوئی تفتیش کے لیے آجائے گا۔ آگے رُکیں گے تب بھی مشکوک نظر آئیں گے۔"

"یار کیوں نہ ہم جمخانہ میں ممبروں کے لیے مخصوص راستے سے اندر چلے جائیں۔" میں نے کہا۔ "چوکیدار روکے گا لیکن پروا نہیں تُو سیدھا گزر جا۔ میں بات کرلوں گا۔"

گاڑی نے ایک لمبا چکر کاٹا اور جمخانہ کی عمارت کے گیٹ میں پیچھے سے داخل ہوئی۔ حسبِ توقع ایک چوکیدار نے آگے بڑھ کے ہمیں بتایا کہ یہ جگہ صرف ممبروں کی گاڑیوں کے لیے ہے۔

"ہمیں بٹ صاحب نے یہاں ملنے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم ذرا پہلے آگئے ہیں، یہیں انتظار کریں گے۔"

"کون بٹ صاحب؟ قیوم بٹ صاحب یا نصیر بٹ صاحب؟" وہ بولا۔

"قیوم بٹ صاحب۔" میں نے بغیر سوچے کہا۔ "انھوں نے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت دیا تھا۔ ہم ان کے مہمان ہیں۔"

چوکیدار لوٹ گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مذکورہ قیوم بٹ صاحب موجود نہ تھے ورنہ ہمیں ان سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا پڑتا یا ان کے آنے سے پہلے جانا پڑتا۔ میں نے مائک آن کر کے دلاور کو مخاطب کیا۔

"ہیلو دلاور۔ ڈو یو ریڈ می؟ دِس اِز ایم آر ایس...."

محسن نے کار کے ریڈیو کو ایف ایم بینڈ پر ٹیون کرنا شروع کر دیا تھا۔ دلاور کی آواز اچانک آئی.... "یہ کیا بکواس ہے ایم آر ایس...."

"ویری گڈ۔ تمھیں بھی مل ہی گیا ایف ایم مائک۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس بکواس نہیں ہے اپنے چوہدری صاحب یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔"

"محسن، رابعہ اور سکندر۔" دلاور نے میری بات کاٹ دی۔ "آواز صرف ایم اور ایس کی سُنی ہے میں نے۔"

"ایم آر ایس کا ایک اور مطلب بھی نکلتا ہے دلاور۔" میں نے کہا۔ "اور وہ ہے مائٹ اِز رائٹ سوسائٹی۔ مطلب سمجھتے ہو نا اس محاورے کا۔ یعنی مالکانِ لاٹھی و بھینس سمجھ لو۔ یہ وہ تنظیم ہے جس کے تم بھی ایک ممبر ہو۔ ہم تو بعد میں شامل ہوئے۔ تم نے بہت پہلے اس اصول کو اپنا لیا تھا اور تم نے کیا، نہ جانے کب سے دنیا میں یہی اصول کارفرما رہا ہے۔ اسی نے لیگ آف نیشنز کے وجود کو بے مصرف بنا دیا تھا اور اسی نے اقوام متحدہ کو تماشا بنا دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ افراد، ادارے اور ممالک اس تنظیم کے رکن بنتے جارہے ہیں اور جس کی لاٹھی اس کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھینس کا فلسفہ بین الاقوامی سچائی سمجھا جانے لگا ہے، یونیورسل ٹروتھ۔"

"کیا تم نے مجھے یہی لیکچر دینے کے لیے یہاں بلایا تھا؟" دلاور کی آواز آئی۔

"نہیں۔ لیکچر دینے سے میرا ہی وقت ضائع ہوگا۔ میں تم کو حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور تھوڑا سا وقفہ دیا۔ "تم جہاں کھڑے ہو وہاں سے اپنی گاڑی نکالو اور کشمیر روڈ سے بانسوں والی سڑک پر چلو۔"

"میرے پاس دوسری گاڑی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہی ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا۔

"گاڑی کا میک ماڈل، رنگ اور نمبر بتا دو۔" میں نے کہا۔ "اور ٹھیک تیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے چلتے جاؤ۔"

"میں کہیں جانے کے لیے نہیں آیا۔ تم سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"انکار نہ میں کرنا چاہتا ہوں اور نہ تم کر سکتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سودا کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ میں خود کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتا۔ مجھے کیا معلوم تم اکیلے ہو یا مجھے قتل کرنے کے لیے اپنی شکاری ٹیم کے ساتھ ہو۔"

"یہ اندیشہ تو مجھ کو ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اب تمھیں قتل کیسے کر سکتا ہوں میں؟"

"تمھاری پوزیشن اس لحاظ سے بہتر ہے کہ تم اکیلے نہیں، پولیس بھی تمھارے ساتھ ہے۔" میں نے کہا۔ "جو کام تم خود سامنے آئے بغیر کرنا چاہو وہ پولیس سے بھی کروا سکتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارے آس پاس دوسری گاڑیوں میں سادہ کپڑوں والی پولیس کی نفری موجود نہیں، تم نے دو گھنٹوں میں کچھ تو کیا ہی ہوگا؟"

"مجھے پونے دو گھنٹے ملے تھے۔" وہ بولا۔ "اگر میں اپنی گاڑی وہاں چھوڑ کے نہ آتا اور اس کے دونوں فلیٹ ہو جانے والے ٹائروں کو بدلتا تو مجھے ایک گھنٹا وہیں لگ جاتا۔"

"پھر تم کیسے آئے؟ کسی باڈی گارڈ کی گاڑی میں؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ مجھے وہاں سے ٹیکسی لینی پڑی۔" دلاور بولا۔ "گھر سے میں نے ڈرائیور کو اپنی گاڑی لینے بھیجا اور خود یہاں دوسری گاڑی میں پہنچا ہوں جو میری بیوی کے استعمال میں رہتی ہے۔ واکس ہال ہے تین سال پہلے کا ماڈل۔ ڈارک گرین۔ نمبر ہے......"

"نمبر کو چھوڑو۔ دور سے نظر بھی نہیں آتا اور غلط بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گاڑی کو پہچان لوں گا۔ میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہوگی۔ میں کسی بھی رکشا یا ٹیکسی میں آؤں گا۔"

"یہاں بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ تم سامنے آئے بغیر بھی تو سودا کر سکتے ہو؟"

"دیکھو دلاور! میں اس کھیل سے اکتا گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ تمھاری پہلی آفر ٹھکرا کر میں نے ایک جذباتی حماقت کی تھی۔ اس کا میں نے کیا خمیازہ بھگتا، یہ تم بھی جانتے ہو لیکن اس وقت میری جگہ تم بھی ہوتے تو یہی کوشش کرتے۔ میں نیا نیا ولایت سے آیا تھا اور ذہنی طور پر اس شدید صدمے کے لیے تیار نہیں تھا جو مجھے یہاں پہنچتے ہی اٹھانا پڑا۔ ان حالات میں غصے نے مجھے پاگل کر دیا اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کر دی تو یہ میرا قصور نہیں تھا، میرے جوان خون کا ابال تھا۔"

"کیا اب تم خود کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو! اس عمر میں؟" وہ طنز سے ہنسا لیکن مجھے اس کے لہجے میں اطمینان کی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ اطمینان جو آخری وقت میں شکست کی خبر کی جگہ فتح کی نوید ملنے سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ بعد از خرابی بسیار میں راہِ راست پر آ گیا ہوں۔ وہ کب نہیں چاہتا تھا کہ یہ محاذ آرائی ختم ہو جس میں اندازوں کی غلطی کے باعث خود اسے بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ وہ عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھا اور مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب اس کا خیال تھا کہ حریف کی گوریلا جنگ کا نشانہ بر اہِ راست اس کی ذات ہونے لگی ہے، یہ اطلاع انتہائی تسلی بخش تھی کہ صلح کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ وہ صلح کے لیے مجھے منہ مانگی قیمت دے سکتا تھا۔ اس کے ذہن نے میری بات کا منطقی تجزیہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ نقصان اگر دلاور کو ہوا تھا تو بہت اس کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا تھا۔ میرے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو نقصان کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا۔ خون دونوں طرف سے بہا تھا لیکن میرا ساتھ دینے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ دلاور نے سمجھا کہ اسی حساب نے مجھے بے بس اور مجبور کر دیا ہے اور اب مجھ میں مزید نقصانات اٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ وہ کاروباری ذہن رکھنے والا غیر جذباتی آدمی تھا۔ اگر وہ فتح کو انا کا مسئلہ بنا لیتا تو یہ نہ دیکھتا کہ نقصانات کا تناسب کیا ہے۔ اس نے صرف اپنے نقصان کو دیکھا۔ صرف وہ شمار کیا جو اس نے گنوا دیا تھا اور آئندہ کے نقصانات کا تخمینہ لگایا۔ مجھے اگر دس گنا نقصان ہوتا تھا تو اس کے لیے کوئی فائدے کی بات نہیں تھی۔ فائدہ وہ تھا جو اپنے خسارے کو منافع میں بدلنے سے حاصل ہو سکتا تھا اور آج بالآخر وہ وقت آ گیا تھا کہ دشمن خود یہی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کر رہا تھا کہ جنگ میں جیت کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یقین کیا۔ محسن نے میرا اشارہ سمجھتے ہی ٹیڈی کو ہمراہ لیا اور باہر روانہ ہو گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ...... تمھیں چیلنج کروں۔ بوڑھا تو میں ہوں تمھارے مقابلے میں۔" وہ مجھے خاموش پا کے بولا۔

"ایک وقت تھا دلاور جب تم نے مجھے دس لاکھ مالانہ پر اپنے کاروبار میں شریک ہونے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دوسرا متبادل یہ رکھا تھا کہ میں پچیس لاکھ لے کر واپس چلا جاؤں۔"

"اس وقت سے آج تک تم نے اپنا اور دوسروں کا کتنا نقصان کر لیا ہے؟" وہ ہنسا۔

"اس کا حساب کیسے لگایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک آدمی کی زندگی کا کوئی بھی مول نہیں ہوتا۔"

"اور تمھارے پاس اب قربانی کے بکرے بھی نہیں رہے۔" اس کے لہجے میں فرعونیت کا غرور نمایاں ہونے لگا۔

"نہیں دلاور، ایسا مت کہو۔ قربانی کے بکرے تم نے خریدے تھے اور سب بکنے والے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "میری خاطر جان دینے والوں نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کسی انعام کی توقع نہیں رکھی تھی مجھ سے۔ میں ان کو کیا دے سکتا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ غصے میں مت آؤ۔" دلاور نے محسوس کیا کہ اس کا رویہ بننے والی بات کو بگاڑنے کا سبب ہو سکتا ہے۔ "لیکن مجھے اس بات کا یقین تو دلا دو کہ یہ تمھاری کوئی نئی چال نہیں ہے اور تم واقعی تصفیہ چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں دلاور کہ وقت نے میرے جذبات بدل دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہر غم کی شدت بالآخر کم ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جن حالات میں میرے والد کا انتقال ہوا اس کے ذمّے دار تم تھے اور اس وقت انتقام ہی میری واحد خواہش بن گیا تھا۔ کسی حد تک میں نے انتقام لے بھی لیا۔ آج تم مجھ سے ڈرتے ہو اور مجھ سے برابری کی بنیاد پر بات کرتے ہو۔ یہ نہیں سمجھتے کہ تم مجھے چٹکیوں میں مسل دو گے۔"

"لیکن اب تمھارے لیے مقابلہ جاری رکھنا مشکل ہے کیونکہ تم ہر طرف سے محصور ہو چکے ہو۔"

"تم مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں محصور ضرور ہوا ہوں دلاور لیکن مجبور نہیں۔ جب تک میں اکیلا بھی زندہ ہوں... ہتھیار نہیں ڈالوں گا... بات ختم۔"

"سنو سنو! بات ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دو کہ تم کیا چاہتے تھے اور کیوں؟" وہ بولا۔

"اس کا کیا فائدہ جب تم مصالحت کی پیشکش کو میری کمزوری سمجھنے پر مصر ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ تو سودا تھا۔"

"میں نے سودا کرنے سے انکار نہیں کیا۔ بس یہ سمجھا دو مجھے کہ تم کو سودا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"تم صاف سننا چاہتے ہو تو سن لو۔" میں نے کہا۔ "وہ بات کئی ماہ پرانی ہوئی، مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی کہ میں کبھی تم سے اپنا حق حاصل کر سکوں۔ اس دنیا کا قانون مجھے یہ حق دلانے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود کہ تمھارے پاس ایک سے ایک قابل وکیل ہے۔" وہ پھر طنز پر اتر آیا۔

"وکیل، عدالت میں دلائل کی جنگ لڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس جنگ میں جیت تمھاری ہو گئی ہے۔ میں کسی عدالت میں پیش نہیں ہو سکتا لیکن دنیا بہت بڑا میدانِ جنگ ہے۔ اس میں یہ جنگ غیر معینہ مدت تک جاری رہ سکتی تھی اور آئندہ بھی یہ امکانات مساوی ہیں کہ اس جنگ میں تم نہ رہو یا میں نہ رہوں۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ تمھارا کاروبار رہ جائے، تمھارے بیوی بچے رہ جائیں اور تمھاری موت کا جشن منانے کے لیے میں رہ جاؤں؟ ہم تم اکیلے ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن ہم دوسروں کے لیے زندہ بھی رہنا چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ اب تم کو کس کے لیے زندہ رہنے کی خواہش نے مجبور کر دیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"بس تو یہ سمجھ لو کہ میری وہی مجبوری تمھارے ساتھ سودا کرنے کا سبب بنی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس مجبوری کا نام رابعہ ہے۔" دلاور اب واقعی خوش تھا۔

"اس مجبوری کے بہت سے نام ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مجبوری بہت سے رشتوں کی آبرو کا نام ہے۔ دوسروں کی مجبوری کے سامنے اپنا سر جھکانے کا نام ہے۔ میرے آس پاس اور بھی لوگ ہیں جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

گھر مجھے عزیز ہے اور میں ان گھروں کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ میں اس مقابلے سے خارج ہو جاؤں لیکن یہ شکست نہیں کہلائے گی۔"

"تم اس کو اپنی مرضی سے جو نام دینا چاہو دے لو۔" دلاور نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس پورے سیٹ اپ سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ سکندر کب گیا اور کہاں گیا۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کہیں نظر نہ آئے، کسی زبان سے اس کا نام سنائی نہ دے اور اس کی غیر موجودگی ثابت ہو جائے تو دنیا جو چاہے تسلیم کر لے۔ یہ کہ وہ مارا گیا، اس نے خودکشی کر لی کیونکہ وہ مقابلے کے لیے ہمت ہار چکا تھا یا وہ روپوشی میں ہی ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ دنیا بہت مصروف ہے اور کسی ایک آدمی کے بارے میں سوچنے اور باتیں کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔ خود تم بھی کوشش کرو گے تو ہمیں تلاش نہ کر پاؤ گے۔"

"ہمیں؟ گویا تمھیں اور رابعہ کو۔ بھئی، مجھے بھی فرصت کہاں ہو گی۔ ہماری طرف سے دعا ہے کہ جہاں رہو خوش رہو۔"

"اب میں صورتِ حال کی اس سے زیادہ وضاحت کیسے کروں؟" میں نے کہا۔ "بات کو مختصر کرو۔ میں یہاں بات نہیں کر سکتا۔"

"کس بات کا ڈر ہے یہاں؟ آخر اتنی دیر سے ہم بات کر رہے ہیں۔"

"میں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم اکیلے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات ٹیپ نہیں کر رہے ہو۔ جب تم چلو گے تو میں دیکھ لوں گا کہ گاڑی میں تم اکیلے ہو اور تمھارے ساتھ دوسری گاڑیاں نہیں ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" دلاور نے کہا۔

"میں تم سے براہِ راست بات کروں گا تمھارے سامنے آ کے۔" میں نے کہا۔ "اگر بات بن گئی تو میں ٹیپ تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

"ایک ٹیپ دینے کے بعد یہ ضمانت کون دے گا کہ اس کی دوسری کاپی نہیں ہے؟"

"بھروسا تو تم کو کرنا ہی ہو گا دلاور۔ یہ جوا نہیں کھیلنا چاہتے تو تمھاری مرضی۔" میں نے کہا۔ "کچھ مجبوریاں تمھاری ہیں تو کچھ میری بھی ہیں۔ میں انھی مجبوریوں کا سودا کر رہا ہوں۔ میں عدالت کے ذریعے یا کسی اور طرح تم سے اپنا حق بھی نہیں لے سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ تمھاری مجبوری یہ ہے کہ تم عملی طور پر مالک ہونے کے باوجود غیر محفوظ ہو۔ اگر میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اپنے ساتھ تمھیں بھی تباہ کر دوں گا، تمھارے کاروبار کو، تمھارے ساتھ کاروبار کرنے والوں کو۔ تمھیں اور تمھارے گھر کو اسی طرح ختم کر دوں گا جس طرح میرا سب کچھ ختم ہوا۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچ جانے والا آدمی بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ مرنے کا فیصلہ کر لے تو اپنے ساتھ دس کو لے کر مرتا ہے۔ ایک آدمی کو پھانسی تو صرف ایک ہی بار دی جا سکتی ہے نا! میں آج مجبور ضرور ہوں اور اس لیے تم سے بات کر رہا ہوں کہ کچھ لو اور کچھ دو، جیو اور جینے دو۔ میں اس انتہا کو نہیں پہنچا ہوں جہاں میرے لیے عقل و ہوش سے کام لینا ممکن ہی نہ رہے۔ یہ نہ ہو کل تمھیں ایک مرد گنوا دینے کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ادا کرنی پڑے جو تم آج ادا کر سکتے ہو۔ میرا کیا ہے، روپوش ہوں اور روپو رہ سکتا ہوں۔ تم کھلے میدان میں میرے نشانے پر ہو۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ میں نے اس لمحے کے فیصلہ کن ہونے کا یقین کیا۔ اس ایک لمحے میں میری سار کوشش بے مصرف ثابت ہو سکتی تھی اور کامیابی میری ناکا بن سکتی تھی۔ "اچھا، یہ بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" دلاور نے کہا۔ "اور میں اگر یہ اطمینان کرنا چاہوں کہ تم بھی اکیلے ہو تو کیا کروں؟"

"تمھارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے پہلے تم کبھی نہیں ڈرے۔ میں نے تمھارے سامنے خود آ کے بات کی ہے یا تم نے مجھے بلوا لیا ہے۔ آ ابھی کچھ دیر پہلے بھی تم اکیلے آ گئے تھے۔"

"تم مال روڈ کے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں آ سکتے؟" د بولا۔ "میں اکیلا ملوں گا۔"

"یقیناً پولیس تمھارے ساتھ ہے دلاور؟" میں نے طن لہجے میں تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "تم کو میری گرفتاری کا انعا لینا ہے۔"

"اچھا بتاؤ تم کہاں بات کرو گے؟" وہ کچھ شرمندہ کے بولا۔

"میں تم کو اسی کوٹھی میں ملوں گا جو کسی جعلی نواب خ جمشید نے رابعہ کو فروخت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ناممکن۔ تم مجھے چوہے کی طرح چوہے دان میں پ چاہتے ہو؟"

"کیا فائدہ ہو گا اس سے مجھے؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اغوا کر کے قید رکھنے سے میرے خلاف مقدمات ختم ہو جا

گے؟ مجھے حقِ وراثت مل جائے گا؟ میں اگر تم کو قتل کر دوں گا تو میری فردِ جرم میں ایک اور قتل لکھ دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تو میرا عدالت میں حاضر ہونا اور وراثت کا سرٹیفکیٹ لینا ضروری ہے مگر عدالت اس کے ساتھ ہی مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی تھما دے گی۔ تم کو اغوا یا قتل کرنا ہوتا تو یہ کون سا مشکل کام تھا دلاور! تمھارے لیے کیا رسک ہے اس میں، رسک تو میں لے رہا ہوں۔"

"معلوم نہیں کیوں میرا دل یہ تسلیم نہیں کرتا کہ تم پُرامن تصفیے کی یہ پیشکش نیک نیتی سے کر رہے ہو۔" دلاور بولا۔ "میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس میں میرے لیے خطرہ ہے۔ تمھاری فطرت کے خلاف ہے یہ بات۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں سمجھتا ہوں کہ میرا انتظار کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک آخری بات۔ میں دھرمپورے سے صدر کی طرف آنے والی سڑک پر موجود رہوں گا، نو بجے سے سوا نو بجے تک۔ تم چوراہے سے سیدھے گزرو گے تو میں تمھاری گاڑی دیکھ لوں گا۔ شیشے کھلے رکھنا تاکہ میں تم کو پہچان سکوں۔ اگر مجھے یقین آ گیا کہ تمھارے ساتھ یا تمھارے پیچھے کوئی نہیں ہے تو میں تم کو ہاتھ کے اشارے سے روک لوں گا اور تمھارے ساتھ بیٹھ کے چلوں گا۔ پھر ہم براہِ راست سب معاملات طے کر لیں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ بولا۔ "اس وقت پونے نو بجے ہیں۔"

"ہاں، اپنا ریڈیو بند مت کرنا۔" میں نے کہا۔ پھر مائکروفون کو بند کر کے میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جمخانہ کی عمارت کے احاطے سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے گاڑی کی ہیڈلائٹس بند کر کے وہاں روکا جہاں سے میں دلاور کی گاڑی کو باہر آتے صاف دیکھ سکتا تھا۔ گہرے ہرے رنگ کی واکس ہال جو دور سے ڈارک براؤن نظر آتی تھی آگے نکلی۔ دوسری ایک ٹیکسی تھی جو اس کے پیچھے آئی۔ دونوں ایک ساتھ کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں ایک فرلانگ کے فاصلے سے پیچھے گیا اور بالسنول والی سڑک پر انکل رضوی کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ وقت کی یادوں نے میرا راستہ روکا لیکن میرا دھیان ان گاڑیوں کی طرف تھا جو آگے جا رہی تھیں۔ واکس ہال اور ٹیکسی سو گز کے فرق سے آگے پیچھے ایک ہی رفتار سے چل رہی تھیں۔ نہر کی طرف مڑنے کے بعد جب دونوں گاڑیوں نے نہر کا پل بھی ایک ساتھ عبور کیا اور پھر دھرمپورے کی سڑک پر بھی اسی فاصلے کے ساتھ رواں رہیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ دلاور اکیلا نہیں تھا۔ اگر وہ کار میں اکیلا تھا تو ٹیکسی میں اس کے ساتھ دوسرے افراد بھی تھے۔ اس کے اپنے ساتھی یا پولیس والے۔ دھرمپورہ تھانے کے بعد ٹیکسی آگے ہو گئی اور واکس ہال درمیان میں آ گئی۔ پھر میں نے رفتار بڑھائی اور دونوں سے آگے نکل گیا۔ اوورٹیک کرتے ہوئے میں نے ایک بس کو درمیان میں رکھا۔ بس پہلے ہی ان دونوں گاڑیوں کو اوورٹیک کر رہی تھی۔ جب میں نے بس کو اوورٹیک کیا تو سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ سامنے سے آنے والی ایک کار کی ہیڈلائٹس نے مجھے اندھا کر دیا۔ اس نے زبردست بریک لگائی اور میں نے انتہائی خطرناک طریقے پر دوبارہ بائیں طرف ہونے کی کوشش کی تو بس کے سامنے آ گیا۔ میری رفتار بھی ساٹھ میل سے زیادہ تھی۔ اگر میں سامنے والی گاڑی کے تصادم سے نہ بچتا تو یہ حادثہ انتہائی خوفناک ہوتا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والے کی رفتار بھی کم نہ تھی اور میں نے اس کے گزرنے کے لیے راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ جب میں ایک دم بائیں طرف ہوا تو بس کے اگلے حصے اور میری کار کے پچھلے حصے کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ بھی نہ رہا ہو گا۔ اگر میں ایک دم رفتار نہ بڑھاتا اور اس کے ساتھ ہی بس ڈرائیور فوراً بریک پہ پیر نہ رکھتا تو ٹکر خوفناک نہ ہوتی لیکن کار کا پچھلا حصہ یقیناً تباہ ہو جاتا۔ اس طرح اوورٹیک کر کے میں نے خود کو دلاور کی نظر میں آنے سے تو بچا لیا مگر خود بھی بال بال بچا۔ اس رفتار پہ کار کے بے قابو ہو کے الٹنے کے امکانات بھی تھے۔ سامنے سے آنے والی کار اور بس کے ڈرائیوروں نے یقیناً مجھے گالیاں دی ہوں گی۔ کسی نے یہ نہیں سمجھا ہو گا کہ میں ایمرجنسی کے باعث اتنی تیزی سے اور اتنے خطرناک انداز میں گاڑی چلا رہا ہوں۔ بیشتر لوگوں نے فرض کیا ہو گا کہ میں نشے میں ہوں۔ مجھے جدائی کا نشہ ہے یا میں کوئی جرم کر کے فرار ہوا ہوں۔

بس کے اچانک بریک لگانے اور مجھے بچانے کی خاطر بائیں طرف ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کے باوجود ٹیکسی کو نہ روک سکا اور وہ بس سے ٹکرائی تو پیچھے آنے والی واکس ہال بھی ٹیکسی میں گھس گئی۔ دونوں اپنی رفتار پہ کافی حد تک قابو پا چکے تھے چنانچہ نقصان کسی کا بھی زیادہ نہیں ہوا اور یہ سب مجھے بعد میں خود دلاور کی زبانی معلوم ہوا۔ اس وقت تو بس بھی رک گئی، ٹیکسی اور واکس ہال بھی۔ ہاں تھوڑی بہت گرما گرمی ہوئی ہو گی ٹیکسی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ڈرائیور اور دلاور نے مجھے آگے نکلتے نہیں دیکھا تھا
چنانچہ انھوں نے بس ڈرائیور کو گالیاں دی ہوں گی اور بس
ڈرائیور نے مجھے، پھر بس کے مسافروں کی گواہی سے یہ
ثابت کر دیا ہوگا کہ اس نے ایک حادثے سے بچنے کی
کوشش کی تھی اور یوں تھوڑی سی ہک ہک جھک جھک کے
بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا ہوگا۔ بس تو سرکاری تھی اور اس
کی خوبصورتی میں فرق پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ٹیکسی
والے نے اور دلاور نے اپنی اپنی گاڑی کے ڈینٹ نکلوانے
اور پینٹ کرانے کے اخراجات کا سرسری اندازہ کیا ہوگا اور
چل پڑے ہوں گے۔

اس وقفے سے مجھے دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو
میں آگے نکل کے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا جہاں ایک گلی
میں ہیجڑے رہتے تھے۔ اپنے روزمرہ کے کاروبار کے علاوہ
ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ یہ بھی تھا کہ وہ شادی بیاہ کے لیے
ڈھولک کرائے پر دیتے تھے۔ میرا مقصد تو خود چھپنا اور کار
کو چھپانا تھا۔ وہ بس ڈرائیور بعد میں دیکھتا رہا ہوگا کہ وہ کار نظر آ
جائے تو اس کے مالک کو بے نقط سنائے۔ اگر وہ چاہتا بھی
تو نمبر نوٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن نیلے رنگ کی کورٹینا کو پہچان
سکتا تھا۔ میں پیدل چلتا ہوا چوک تک گیا اور دوسرا فائدہ
یہ ہوا کہ میں دلاور کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک تاریک گوشے
میں جا کھڑا ہوا۔ اگر ان کا بس نے راستہ نہ روکا ہوتا تو وہ میرے
پہنچنے سے پہلے وہاں سے گزر جاتے۔ سوا نو کے بجائے میں
نے نو بج کر بیس منٹ پر پہلے ٹیکسی کو اپنے سامنے سے
گزرتے دیکھا لیکن اس کی رفتار بہت زیادہ تھی اور اس کے
شیشے بند تھے چنانچہ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ ٹیکسی
کو چلانے والا کون تھا اور اس میں وہ اکیلا تھا یا اس کے
ساتھ اور لوگ بھی تھے۔

دلاور کی گرین واکس ہال کار دو منٹ بعد آئی۔ میری ہدایات
کے مطابق اس نے سردی میں بھی کار کے شیشے کھول دیے
تھے اور وہ بہت آہستہ جا رہا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس گاڑی کی
عقبی سیٹ پر کوئی لیٹا ہوا ملتا یا دلاور نے کسی کو چالاکی سے
ڈکی میں چھپا دیا ہوتا لیکن اتنا دیکھنے کے لیے وقت ہی نہ تھا۔
اس کے علاوہ دلاور اپنے ساتھیوں کو ٹیکسی میں بھیج چکا تھا۔
چنانچہ کار میں کسی کو ساتھ رکھنے سے اس کے پلان کے فیل
ہونے کا امکان تھا۔ میں نے جوا کھیلا اور ایک دم کار کے
سامنے آ گیا۔ دلاور نے دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ
بیٹھ گیا۔ اگر کوئی پیچھے ہوتا تو اتنی دیر میں ریوالور میری گدی پہ
رکھ دیتا۔

"شیشے بند کر لو اور گاڑی اسی جگہ روک لو" میں نے ک
"یہاں؟ لیکن تم نے تو کہا تھا..."
"عقل سے کام لو دلاور! میں پہلے سے کوئی جگہ بتا کر
تم سے ملنے کیسے آ سکتا ہوں" میں نے کہا۔ "تم اگر مجھ پر اعتما
کرتے ہو تو اس لیے کہ تم اس پوزیشن میں ہو۔ میں کسی پر بھی اعتما
نہیں کر سکتا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔"
"بے وقوف تو تم ہو اپنے سکندر صاحب، معاف کرنا
وہ گاڑی روک کر بولا۔ "تمھیں کیا معلوم کہ میں اکیلا ہوں یا یہ
ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"
"مجھے معلوم ہے کہ ایک ٹیکسی میں کچھ افراد تمھارے سا
آئے ہیں" میں نے اطمینان سے کہا۔ "میں تعداد نہیں بتا سک
لیکن ٹیکسی کا نمبر بتا سکتا ہوں اور یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ ٹیکس
ابھی ابھی سیدھی گئی ہے۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر اند
نہیں کیا تھا کہ تمھارے ساتھ کار میں کوئی مسلح شخص پیچھے بی
ہو۔ تھوڑا بہت رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔"
"یہ سب تم نے اس وقت دیکھا ہوگا جب وہ ٹیکسی ب
سے اور میری کار ٹیکسی سے ٹکرائی تھی" وہ برہمی سے بولا۔
"مجھے نہیں معلوم یہ حادثہ کہاں پیش آیا" میں نے حیرا
سے کہا۔ "میں تو تمھارے پیچھے ہی تھا"
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ حادثہ ریلوے کراسنگ
پاس ہی تو ہوا تھا" وہ بولا۔ "کس الو کے پٹھے نے بس
آگے مرنے کی کوشش کی۔ بس والے نے اسے بچایا
ہم نہ بچ سکے۔ خواہ مخواہ مجمع بھی لگا اور ہزار بارہ سو
نقصان بھی ہوا۔ سرکاری بس نہ ہوتی تو معاملہ اتنی جلدی خ
بھی نہ ہوتا۔ مجھے ہی معافی مانگ کے نکلنا پڑا۔"
"اسی لیے تمھیں دیر ہوئی" میں نے کہا۔ "مزید پا
منٹ بعد میں چلا جاتا۔"
"تم وہ کیسٹ لائے ہو؟" دلاور نے ناگواری
کہا۔ اس کا موڈ حادثے اور اپنے منصوبے کی ناکامی پر آ
ہو گیا تھا۔
میں نے کیسٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "تم اس کو
سن کے اپنی تسلی کر سکتے ہو۔"
"تسلی کی بات مت کرو۔ میں اعتبار کرنے پر مجبور
وہ بولا۔ "تمھارے پاس ایک، دو یا دس نقلیں ہو سکتی ہ
"خود تم نے بھی تو ایک کاپی ضرور بنا کے دبا
رکھی ہوگی؟" میں نے کہا۔

میں اس حرامزادے فتح شیر کو سنوانا چاہتا تھا" وہ بولا۔
"لیکن وہ غائب ہے، کل رات سے۔ کیا وہ تمھاری قید میں
ہے؟ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھی جا چکی ہے۔"
"فی الحال میں اس پر تبصرہ نہیں کروں گا" میں نے کسی
گھاگ سیاستداں کی طرح کہا جس سے پریس کانفرنس میں کوئی
چالاک صحافی انتہائی خطرناک سوال کر بیٹھے۔ "تمھارے ساتھ
کون تھا اور انھیں ساتھ لانے کا مقصد کیا تھا؟"
"جواب وہی ہے جو ابھی تم نے مجھے دیا تھا" دلاور
نے تلخی سے کہا۔
"تمھاری اس حرکت نے اعتماد کی فضا باقی نہیں رہنے
دی" میں نے کہا۔ "اس لیے میں آگے نہیں جا سکتا۔ ایک بات
ذہن میں رکھنا۔ ریوالور اگر تمھارے پاس ہے تو میرے پاس
بھی ہے۔ تمھارے ساتھی تم سے کٹ گئے ہیں لیکن میرے
ہاتھ میرے ساتھ ہیں اور جتنا بھروسا تم اپنے ساتھیوں پر کرتے
ہو، اس سے زیادہ اعتماد مجھے اپنے ہاتھوں پر ہے۔"
"تم بھی مجھے بے وقوف بنا رہے تھے کہ تم تصفیہ کر کے
باہر نکل جانا چاہتے ہو۔"
"نہیں، وہ سچ تھا۔ میں اور رابعہ اپنی تمام عمر اس طرح
ضائع نہیں کرنا چاہتے" میں نے کہا۔ "بے شک پہلے نہ میں ایسا
سوچتا تھا اور نہ رابعہ کا یہ خیال تھا لیکن اس وقت حالات مختلف
تھے۔ رابعہ صرف میری وکیل تھی اور میں اس کا موکل۔ اب
ہم جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں چنانچہ میں اس دلدل
سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر میں اس میں زیادہ ہی دھنستا
جاؤں گا۔ میرا یہاں سے نکل جانا تمھارے مفاد میں بھی ہے
لیکن میں اور رابعہ تمھارے لیے نہیں، اپنے مستقبل کی خاطر
ایک سودا کر سکتے ہیں۔ تم ہمیں یہاں سے نکلنے کے مواقع
فراہم کرو۔"
"کس قسم کے مواقع؟" دلاور نے کہا۔ "تم نے تو زندگی
ولایت میں گزاری ہے۔"
"ہاں۔ اور میں ولایت ہی لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ رابعہ کو بیوی کی حیثیت
سے ساتھ لے جانا میرے لیے مشکل نہیں" میں نے کہا۔
"مشکلات یہاں ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا ہے۔"
"تمھیں پیسہ چاہیے؟" دلاور نے کہا۔ "کتنا؟"
"اپنے نفع نقصان کا حساب لگا کے بولی دو" میں نے
کہا۔ "یہ بھی ذہن میں رکھو کہ ہمیں زندگی گزارنی ہے۔"
"میری آفر دہی ہے" دلاور بولا۔ "دس لاکھ ماہانہ پر
وہاں میرے پارٹنر بن جاؤ یا پچیس لاکھ نقد لے لو۔"
"پارٹنرشپ پر لعنت۔ میں تم سے کسی قسم کا تعلق رکھنا
نہیں چاہتا" میں نے کہا۔ "آئندہ کبھی نہ تم میرا نام سنو اور نہ ہم
کبھی تمھارا ذکر سنیں۔ پہلے میں اکیلا تھا، اب ہم دو ہیں۔"
"تمھارا مطلب ہے میں رقم دگنی کر دوں؟" دلاور بولا۔
"پچاس لاکھ ٹھگنا چاہتے ہو مجھ سے؟..... اتنی کچی گولیاں

ذہانت، فطانت، چالاکی اور بہادری کی بے مثال کہانیاں
مشہور ترین چور نک ویلوٹ
جو بیش قیمت چیزیں گراں قدر
معاوضے پر چراتا ہے
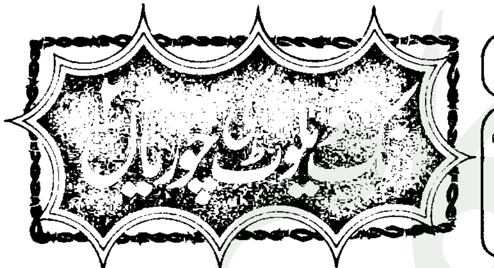
قیمت
۲۵ روپے
پیشگی رقم بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف
نک ویلوٹ کی چوریاں اب بھی محدود تعداد میں دستیاب ہے
کتابیات پبلی کیشنز ۞ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی ۱

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں کھیل ہیں میں نے سکندر۔"

"پہلے مجھ سے تمہارے بارے میں اندازوں کی غلطی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں تم کو کسی حد تک سمجھتا ہوں۔ اس کا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ اگر میں تمہاری باتوں میں آجاتا تو رابعہ کی خالی کوٹھی میں تمہارے ساتھی مجھے گرفتار کر لیتے اور پولیس کے حوالے کر دیتے۔ تمہارے سارے مسئلے ختم ہو جاتے۔ وہ ہوں گے کوئی دو ٹکے کے بدمعاش جن کو دس ہزار کے انعام کا لالچ ہوگا۔ شاید دس ہزار تم نے بھی دے دیے ہوں۔ مایوسی ان کو بھی تم سے زیادہ ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم سے پچاس روپے دھوکے سے حاصل کرنا مشکل ہے چہ جائے کہ پچاس لاکھ۔ تم یہ پچاس لاکھ مجھے نہیں دو گے، رابعہ کو دو گے۔"

"وہ کیسے؟ اور اس کے باوجود گارنٹی کیا ہوگی؟"

"تم اس کی کوٹھی خرید و گے پچاس لاکھ میں۔" میں نے کہا۔ "بے شک اس کی مالیت اتنی نہیں ہے لیکن کوئی ایک روپے کی چیز ایک لاکھ میں لینا چاہے تو یہ خرید و فروخت کسی طرح بھی غیر قانونی نہیں۔ اس کے خلاف کوئی الزام نہیں اور وہ تم سے سیل اگریمنٹ کر سکتی ہے۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ تم ادائیگی اس وقت کرنا جب تمھیں میرے لندن پہنچنے کا ثبوت مل جائے۔ تمہارے وسائل بہت وسیع ہیں، تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں لندن کب پہنچا اور وہاں کس نام سے مقیم ہوں۔ مجھے ایک بار وہاں سے تمہاری کوششوں کے طفیل ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔ مجھے نیا نام نئی شخصیت اور نیا پاسپورٹ حاصل کر کے لندن میں داخلہ ملے گا۔"

"اور تم پھر لوٹ کر پاکستان آ گئے تو مجھے کیسے معلوم ہوگا؟"

"میں یہاں کیوں آؤں گا اور کیا لینے آؤں گا؟" میں نے کہا۔ "دوبارہ انھی مقدمات میں پھنسنے کے لیے جن کی وجہ سے میں یہاں روپوش رہنے پر مجبور ہوں۔ میں جانتا ہوں میں ساری زندگی روپوش رہ کے نہیں گزار سکتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ رابعہ بھی میرے ساتھ ہے۔ غلط نام سے باہر جانے سے میرا ایک جرم اور بڑھ جائے گا اور اگر تم سال چھ ماہ مجھ پر نظر رکھو تو تمھیں یقین آجائے گا کہ میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تم انتقام کی خاطر مجھے قتل کرنے کے لیے آ سکتے ہو اور پھر فرار ہو سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیا تمہارے وارث، دوست اور ساتھی، کاروباری شریک اور وکیل سب مل کے بھی مجھے واپس نہیں بلا سکیں گے؟" میں نے کہا۔ "وہاں تو میں ہر وقت تمہاری گرفت میں رہوں گا۔ کسی بھی وقت برطانوی وزارتِ داخلہ سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ فلاں شخص جو اپنی بیوی کے ساتھ لندن میں فلاں جگہ مقیم ہے، درحقیقت سکندر بخت ولد وزیر خان ہے جسے سال بھر پہلے برطانیہ سے ڈی پورٹ کیا گیا تھا لیکن وہ جعلی دستاویزات کی مدد سے پھر وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے دوبارہ ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور واپسی پر مجھے پاکستان پولیس ریسیو کرے گی، تمہارے لیے تردد کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ رسک تو میں لے رہا ہوں۔"

"پچاس لاکھ کی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "لیکن یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں تم سے اتفاق کروں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ذہن میں تصفیے کا کوئی اس سے بھی بہتر فارمولا آجائے، کوئی ایسا طریقہ نکل آئے کہ تم اور رابعہ پچاس لاکھ لے کر نکل جاؤ اور خطرہ نہ تمہارے لیے رہے اور نہ میرے لیے، دونوں طرف ٹھوس ضمانت ہو۔"

"میں اس وقت پچاس لاکھ نہیں مانگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایک ہفتے میں تم میری تجویز کا ہر پہلو سے جائزہ لے سکتے ہو۔ میں تم سے پھر رابطہ قائم کر لوں گا۔ جب بھی اپنی گاڑی میں نکلو، ریڈیو کو آن رکھو اور اسی جگہ ٹیون کیے رہو جہاں اب ہے، بات کسی بھی وقت ہو جائے گی جیسے آج ہوئی تھی۔ تمہارا ریوالور کہاں ہے؟"

"میری جیب میں۔ لیکن میں ہتھیار ڈالنے نہیں جا رہا ہوں۔" دلاور غصے سے بولا۔

"میں بھی نہ مرنا چاہتا ہوں اور نہ گرفتار ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ریوالور اپنے پاس رکھو۔ صرف گولیاں نکال کے مجھے دے دو، پھر میں اتر جاؤں گا۔ اگر میں ویسے ہی اتر گیا تو تم مجھے بھاگنے کہاں دو گے۔ تم کار میں ہو اور میں پیدل ہوں۔" میں نے ریوالور نکال لیا تو دلاور نے بادلِ ناخواستہ ریوالور نکالا اور خالی کر کے گولیاں مجھے تھما دیں۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "ہم ایک دوسرے پر بالکل اعتماد نہیں کر سکتے۔" اور ریوالور کا رُخ اس کی طرف رکھتے ہوئے ایک دم گلوز کمپارٹمنٹ کھول لیا۔ اس میں سائیلنسر والا دوسرا ریوالور موجود تھا۔ دلاور کا چہرہ غصے اور احساسِ بے بسی سے سرخ پڑ گیا اور اس نے مجھے دانت پیس کر گالی دی۔

"ہم ایک دوسرے کی فطرت کو اسی طرح سمجھتے ہیں جس طرح سانپ اور نیولا ایک دوسرے کی جبلت کو۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ تیسرا ریوالور تمہاری سیٹ کے نیچے نہ ہو لیکن میں اتنا رسک لے لوں گا۔ میرے اترنے کے بعد پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا اور سیدھے جانا۔ مجھے ذرا بھی شک ہوا تو میں اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کروں گا۔ نہیں قتل کرنا پڑا تو اس سے بھی گریز نہیں کروں گا حالانکہ میں یہ نہیں چاہتا۔" میں نے دروازہ کھولا اور ریوالور کا رُخ دلاور کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ دلاور نے کار اسٹارٹ کی، وہ دس گز دور ہی گیا ہوگا کہ میں نے اس کے سائیلنسر والے ریوالور سے دو فائر کیے۔ اس کی کار کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو گئے۔ میں پلٹ کے بھاگا اور ایک گلی میں گھس گیا جو دو مکانوں کے بیچ میں خالی پلاٹ سے بن گئی تھی۔ موڑ پر طلوع ہوتے ہی میں نے اطمینان سے پیدل چلنا شروع کیا۔ فائروں کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی لیکن ٹائر برسٹ ہونے کی آواز دور تک گئی تھی۔ دلاور نے پہلے کار کو سنبھالا ہوگا اور پھر نیچے اتر کے مجھے دیکھا ہوگا مگر میں غائب ہو چکا تھا۔ صدر بازار کی سڑک عبور کر کے میں پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میری دو جیبوں میں تین ریوالور ہیں۔ ان میں سے ایک خالی ہے، دوسرا بھرا ہوا اور تیسرا سائیلنسر والا میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں ابھی تک بارود کی بو دے رہا ہے۔

کار وہیں موجود تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ایک نیم زنانہ نیم مردانہ شخصیت نے تالی بجا کے اور کمر لچکا کے پھٹے بانس جیسی آواز میں کہا۔ "اے لو، وہ تو جا رہے ہیں میری سرکار، نہ لینا نہ دینا، مفت کی سیر کرنے آئے تھے کیا؟" کوئی نہایت پھکڑ پن سے ہنسا اور میں نے دس کا ایک نوٹ پھینک کر جان چھڑائی۔ کار کو بیک کر کے واپس جاتے ہوئے میں بہت مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ محسن اور ٹیڈی بھی کامیاب لوٹنے والے ہوں گے۔ دراصل میری ساری کامیابی کا انحصار ہی ان دونوں کی بروقت کارروائی پر تھا۔ میں نے دلاور کو پندرہ بیس منٹ سے زیادہ روکے رکھا تھا جبکہ رابعہ کا گھر وہاں سے پانچ منٹ کی ڈرائیو بھی نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دلاور کے ساتھی رابعہ کی کوٹھی میں ہی موجود تھے اور میرے وہاں پہنچنے کے شدت سے منتظر تھے۔ ان کے لیے میں دس ہزار کا چلتا پھرتا نوٹ تھا۔ دلاور نے ان کو سمجھا دیا ہوگا کہ سکندر بخت اسی کوٹھی میں ملے گا چنانچہ انھوں نے نیچے اُوپر ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے باتھ روم بھی کھول کر دیکھے ہوں۔ اس کارروائی میں دس پندرہ منٹ لگ سکتے تھے کیونکہ کم سے کم ایک آدمی کو انھوں نے باہر بھی چھوڑا ہوگا کہ گرد و پیش پر نظر رکھے اور کسی قسم کا خطرہ دیکھے یا محسوس کرے تو فوراً سگنل دے۔ دوسرا کوئی ڈرائیور ہوگا جو ٹیکسی میں بالکل تیار بیٹھا ہوگا کہ ضرورت پڑنے پر ان کو لے کر نکل جائے۔ وہ یقیناً کوئی بہت ماہر ڈرائیور ہوگا۔ تاہم ٹیکسی کے متعلق میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ چوری کی ہوگی۔ اُوپر جا کے تلاشی لینے والا ایک ہی آدمی ہوگا یا زیادہ سے زیادہ دو ہوں گے۔ ہم نے وہاں سے چلتے وقت بیڈ بھی لگے چھوڑ دیے تھے۔ انھوں نے تینوں بستروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا ہوگا اور ہماری وہاں موجودگی کے آثار تلاش کیے ہوں گے۔

لیکن ناکامی کے اندیشے سے دوچار کرنے والا خیال صرف ایک ہی تھا کہ انھوں نے اُوپر والے باتھ روم کو دیکھا اور اس میں فتح شیر کی خون میں لت پت اور اکڑی ہوئی بے سر کی لاش دیکھ لی تو وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔ انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ انھیں یہاں بلانے کا مقصد اس سازش کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ قتل کے جرم میں پکڑے جائیں۔ وہ پکڑے جاتے ہیں یا نہیں، یہ محسن اور ٹیڈی کی مشترکہ کوشش کی کامیابی پر منحصر تھا۔ محسن کو اپنے رپورٹر دوست سے مدد لینی تھی اور اسے یہ سمجھانا تھا کہ وہ پولیس کے ساتھ اس پتے پر پہنچے تو اسے سب انسپکٹر فتح شیر کی لاش بھی مل سکتی ہے اور قاتل بھی ہاتھ آ سکتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کے رپورٹر کے لیے رات کے نو ساڑھے نو بجے ایک سنسنی خیز خبر بہت بڑا انعام ہوتی ہے۔ اگر وہ کامیاب رہا تو صبح صرف ایک ہی اخبار کی سرخی چلّا چلّا کر کہے گی کہ گمشدہ پولیس افسر کو قتل کر دیا گیا۔ لاش کا سر کاٹ کے پھینک دینے والے قاتل گرفتار۔ اور یہ خبر دوسرے تمام اخبارات کے مالکوں سے رپورٹروں تک سب کے لیے باعث شرم اور نا اہلی کے سرٹیفکیٹ کی طرح ہوگی کہ آخر انھیں کچھ معلوم کیوں نہیں ہوا۔ کہا یہی جائے گا کہ پولیس کی ملی بھگت ہے اور جس رپورٹر نے یہ تیر مارا ہے اس کا کوئی دوست یا رشتے دار پولیس میں ہوگا جس نے چپکے سے اسے بُلا لیا اور پولیس نے بھی کون سا ذہانت سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کام لے کر سراغ لگایا ہوگا کس نے مخبری کی ہوگی۔ بیشتر کامیابیوں کے ذمے دار مخبر ہوتے ہیں جو پس منظر میں رہ کے انعام پاتے ہیں۔ کامیابی کا سہرا پولیس کے سر باندھا جاتا ہے چنانچہ وہ مخبر بھی رپورٹر کا دوست ہوسکتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست تھی۔

محسن کی کامیابی بہت سے عناصر سے مشروط تھی۔ ایک یہ کہ اس کو اپنا رپورٹر دوست مل جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ فوراً اس کی بات پر یقین کر کے ساتھ چل پڑے، تیسرا یہ کہ تھانے میں کوئی اتنا ہی مستعد پولیس افسر بیٹھا ہو جو اس کامیابی کو اپنے ریکارڈ پر لانے کے معاملے میں ذرا بھی تساہل نہ برتے اور چوتھا یہ کہ وہ اس وقت رابعہ کی کوٹھی میں پہنچیں جب "ملزمان" اندر ہی موجود ہوں۔ دلاور کی گاڑی گیراج میں موجود تھی اور اس نے ابھی تک گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ بھی نہیں لکھوائی تھی۔ اگر وہ خود آجاتا تو کوئی جواب نہ دے پاتا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ بچ گیا لیکن باقی لوگ پکڑے گئے تب بھی دلاور بہرحال پھنسے گا کہ اس نے فتح شیر کو قتل کیا تھا اور اب اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ فتح شیر کی موت کم سے کم سولہ گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ سردی اور باتھ روم کے سرد خانے میں دو چار گھنٹے کا فرق پڑ جائے گا اور یہ تسلیم کیا جائے گا کہ موت کو بیس گھنٹے بھی ہوسکتے ہیں۔ ایسے موسم میں لاش کے سڑنے یا بُو دینے کا کوئی امکان نہ تھا۔

محسن کے مقابلے میں ٹیڈی کا کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسے لکڑی کے وہی بلاک ٹیکسی کے پیچھے والے پہیوں کے نیچے رکھنے تھے جن سے کچھ دیر پہلے ہم نے دلاور کی گاڑی کو جام کر دیا تھا تاکہ ٹیکسی بیک ہو تو وہیں بیٹھ جائے لیکن اس پلان کی کامیابی سو فیصد یقینی نہیں تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ٹیکسی باہر کھڑی ہوئی ملے۔ وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہاتھوں پیروں کے بل کوئی آہٹ کیے بغیر ٹیکسی کے بالکل پیچھے پہنچ سکتا تھا۔ ٹیکسی کے کوٹھی میں داخل ہو کر کھڑے ہونے کی صورت میں یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا اور میں نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال کر کوئی کام نہ کرے۔ اس کا دوسرا کام چند افراد کو جمع کرنا تھا۔ وہ آس پاس کے گھروں میں اور راہ چلتے لوگوں سے یہ کہہ سکتا تھا کہ ساتھ والی کوٹھی میں ایک لاش پڑی ہے اور وہ اس کوٹھی کا چوکیدار ہے اور اگر وہ دس پندرہ افراد کو جمع کرنے میں ہو جائے اور کسی سے پولیس کو فون بھی کرا دے تو خاموشی سے کھسک لے۔ لوگ خود مجرموں کا راستہ ر لیں گے اور جب محسن کا رپورٹر دوست پولیس کے پہنچے گا تو جائے واردات پر گواہ کافی مل جائیں گے۔ ملے گا تو وہی ایک نامعلوم شخص جو گواہوں کو مدد کر وہاں کھینچ لایا اور انھیں گواہی کے چکر میں ڈال کر خو ہو گیا۔ دلاور اس جگہ تک تو نہیں پہنچا تھا جہاں میں سے بڑا شکاری ہونے کا ثبوت دینے کی خاطر ایک جال پھیلایا تھا کہ وہ پھنس جاتا تو نکل نہ پاتا لیکن ا اس کی پوزیشن سو فیصد محفوظ نہ تھی۔ اس کی ایک کار تو واردات پر کھڑی تھی اور اگر وہ لوگ جو اس کے سا تھے پولیس کی گرفت میں آگئے تو وہ بھی اعتراف کر مجبور ہوں گے کہ ان کو وہاں بھیجنے والا دلاور تھا۔ پولیس محکمہ اپنے ہی ایک افسر کے بہیمانہ قتل کے مجرموں سے جرم حاصل کرنے میں کسی کے ساتھ بالکل رعایت نہیں گا۔ اگر تقدیر نے دلاور کا ساتھ نہ دیا تو وہ بھی پکڑا جا گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ اپنی دوسری یعنی کار میں جائے واردات کے اتنا قریب کیوں پہنچا تھا؟

اس سوال کا جواب وہ کیسٹ دے گا جس کی اصل پاس محفوظ تھی۔ بعد میں استغاثہ یہ ثابت کرے گا کہ دلا الطاف کو قتل کیا تھا اور اس قتل کو چھپانے کے لیے پانچ لاکھ روپے دیے تھے مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ اپنا نکالنے کے بعد اس نے قتل کے عینی گواہ کو بھی قتل ایسی جگہ لے جا کر جہاں الزام رابعہ پر آسکے۔ وہ اپ آدمیوں کے ساتھ لاش کو ٹھکانے لگانے پہنچا تھا کرنے کہ قتل کے جرم میں رابعہ کے خلاف رپورٹ د گئی ہے یا خود اسے ہی یہ کام کرنا ہوگا۔ فتح شیر تو م چنانچہ اس کے خلاف سارے جرم بھی ختم ہوگئے اس کے اعتراف کا خمیازہ اب دلاور کو بھگتنا تھا۔

میں ٹیڈی کے گھر پہنچا تو رات کے سوا دس تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ دروازہ بدستور مق رابعہ کو بہت پہلے لوٹ آنا چاہیے تھا اور میرا خیال وہ سخت انتظار کے کرب میں مبتلا ہوگی اور مجھ پر ب گی کہ بڑے شکاری بنے پھرتے ہو، یہ خیال نہیں کہ ہوں اور کتنی اذیت کا شکار ہوں۔ تالا کھول کے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ میں نے ایک سگریٹ پی اور کمر

تے ہوئے بار بار گھڑی دیکھی۔ محسن اور ٹیڈی کی واپسی کب ہوگی؟ یہ اپنی جگہ ایک سوال تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ پریشان کن خیال رابعہ کا تھا جو صبح صرف چیک کیش کرانے نکلی تھی۔ اس نے بینک سے رقم حاصل کر لی تھی اور محسن کے بیان کے مطابق اسے نازلی سے ملنے اسپتال جانا تھا اور پھر یہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم منظر کے پاس بحفاظت رکھوانی تھی۔ وہ خود بھی بحفاظت منظر کے پاس پہنچی تھی یا نہیں؟ یہ بھی ایک سوال تھا جس کا جواب صرف منظر دے سکتا تھا۔ یا شاید منظر بھی نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی عورت جس کے پاس ڈیڑھ لاکھ کی نقد رقم ہو، خطرات سے محفوظ نہیں سمجھی جا سکتی اور پھر رابعہ کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ وہ اسپتال پہنچ کے کسی مشکل صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئی؟ کیا مجھے دیوانگی کی حد تک چاہنے والی بے وقوف نازلی اپنے حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کے رابعہ کے خلاف دشمنی سے کام نہیں لے سکتی؟ وہ پاگل لڑکی جس نے میری خاطر جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اپنے بھائی کی مدد کر کے ایک تیر سے دو شکار نہیں کر سکتی؟ اس کا ناپختہ ذہن یہ یقین کر سکتا ہے کہ اگر وہ رابعہ کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے تو وہ مجھے حاصل کر لے گی؟

میں نے دماغ کو خراب کرنے والے خیالات سے گھبرا کے کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے اندر کی آواز ایک ہنسی کی طرح سنائی دی۔ نہیں ہو سکتا یا تم چاہتے ہو کہ ایسا نہ ہو؟ نازلی جیسی انتہا پسند لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے۔ وہ اپنی جان لے سکتی ہے تو کسی اور کی بھی لے سکتی ہے۔ وہ تو تمھیں بھی قتل کر سکتی ہے کہ سکندر تم اگر میرے نہ ہوئے تو کسی اور کے کیسے ہو سکتے ہو!

میں نے دروازے کو پھر تالا لگایا اور منظر کو فون کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔

"منظر!" میں نے کہا "یار وہ رابعہ تیرے پاس ہے؟"

"پاس سے کیا مراد ہے؟ آخر تیری بھوتنی کے؟" منظر نے کہا "اب اتنی پاس بھی نہیں....."

"بکواس بند کر۔ یہ بتا وہ تیرے گھر پہنچی تھی، اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اب؟..... اب میرے پاس ہے۔ پاس کا مطلب سمجھتا ہے نا تو؟" وہ ہنسا۔

"یار میں پریشان ہوں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "وہ ابھی تک وہاں کیا کر رہی ہے؟ واپس کیوں نہیں آئی؟"

"واپس کیوں نہیں آئی! یہ تیرے لیے واقعی پریشانی کی بات ہے اور ہونی چاہیے۔" وہ مکاری سے بولا "دراصل عورت کی ذات میں وفا نہیں۔ جیسے تجھ میں حیا نہیں۔ وہ مجھ سے عقدِ ثانی پر بضد ہے۔ اب میں کیسے انکار کروں۔ مجھ سے کسی کا دل نہیں توڑا جاتا۔ ویسے بھی اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے تھے..... تھے پر غور کر۔ کیا ہے وہ شعر، بن گیا رقیب آخر۔"

"میں ٹیلی فون پر گولی مار دوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا "اس سے میری بات کرا دے۔"

"دیکھ مجنوں کے چچا! میری بات مان اور اسے بخش دے۔ وہ عورت ذات تم دونوں کی معرکہ آرائی میں ہر جگہ ساتھ دینے کا حوصلہ تو رکھتی ہے مگر صرف حوصلے سے کیا ہوتا ہے؟"

"بجا فرمایا آپ نے، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ لیکن....."

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔" منظر نے میری بات کاٹ دی۔ "اس کا نروس بریک ڈاؤن تقریباً ہو چکا ہے۔ وہ ظاہر کچھ نہیں ہونے دیتی لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس سکون اور خاموشی کے نیچے اُبلنے والا آتش فشاں پھٹ گیا تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مار دھاڑ، قتل و غارت گری کے خونی منظر، مسلسل ہراس اور خوف کا آسیب، یہ سب مل کر اس کو اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں اور غیر معمولی قوت مزاحمت رکھنے کے باوجود وہ ٹوٹ رہی ہے۔ کیا تو نے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ اب پہلے والی رابعہ نہیں ہے؟ یاد کر تو نے اسے کب دیکھا تھا۔ کب چاہا تھا اور موازنہ کر آج کی حالت سے۔ تو اتنا اندھا تو نہیں ہو سکتا کہ فرق تجھے نظر ہی نہ آتا ہو۔ بس بات اتنی ہے کہ وہ محبت کے نام پر مر جانے کو بھی تیار ہے اور تو تیار ہے کہ اسے مار دے۔"

"تیری سوچ کا یہ انداز ہے منظر؟" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"میں تیری سوچ کے انداز کی بات کر رہا تھا۔" وہ برہمی سے بولا "یہ کون سا عشق ہے کہ؏ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ یہ سب بکواس میں سننا نہیں چاہتا کہ اس سے ایک پل کی جدائی مجھے منظور نہیں اور اس سے بچھڑ کے میں ایک لمحہ نہیں جی سکتا۔ چنانچہ میں جا رہا ہوں موت کے منہ میں مگر اسے ساتھ رکھوں گا۔ ارے بھائی! جدائی تو امتحان ہے اور تجھے واقعی اس سے محبت ہے تو جلد از جلد یہ امتحان پاس کرنے کے لیے محنت کر۔ محبت اور محنت میں ایک نقطے کا فرق ہے جو اوپر نیچے ہوتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔"

"یہ آج تو کیسی فلسفیانہ گفتگو فرما رہا ہے؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیا تو نے رابعہ سے بھی پوچھا ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی مرنے پر کیوں کمربستہ ہے؟ میں نے تو اس سے نہیں کہا....."

"بھوتنی کے۔ تو نے کیا نہیں کیا۔ ہر طرح سے تو خود کو عاشق صادق ثابت کر دیا ہے۔ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے سارے شاعروں کے دیوان پڑھ ڈالے۔ تمام فلموں کے ڈائلاگ بول دیے اور اب پوچھتا ہے میں نے کیا کیا۔ وہ عورت ذات، کمزور اور جذباتی وکیل ہے تو کیا۔ دل کے معاملے میں تو ہے وہی ناقص العقل۔ تیل تو نے چھڑکا، آگ تو نے لگائی۔ دعوت تو نے دی کہ اب کود پڑے بے خطر آتش عشق میں۔ اس سے کیا پوچھوں؟ وہ ابھی یہیں رہے گی میرے پاس۔ کم از کم ایک مہینہ — میں اس کے سارے معاملات ٹھیک کر لوں گا اور وہ ڈیڑھ لاکھ نقد لائی ہے، مکان بیچنا چاہتی ہے، مجھے اپنا اٹارنی بنانا چاہتی ہے اور اپنے آفس کے معاملات میرے سپرد کرنا چاہتی ہے تاکہ میں اس کی لیگل فرم اور ماتحت وکیلوں کے مقدمات کی نگرانی کروں۔ پریکٹس تو وہ اب نہیں کرے گی لیکن قانونی طور پر اس کی حیثیت محفوظ ہونی چاہیے تم دونوں کا انکل رضوی اور تیری ہونے والی سوکن کا بھائی... میرا مطلب ہے انسپکٹر شیخ" یہ سب اسے مفرور سمجھنا چھوڑ دیں۔ کون سا جرم کیا ہے اس نے تیرا ساتھ دینے کے سوا اور ساتھ کسی جرم میں تو نہیں دیا ہے۔ کسی ضابطۂ فوجداری میں یہ نہیں لکھا ہے کہ ایک وکیل خاتون کسی چور، ڈاکو یا قاتل سے عشق نہیں کر سکتی۔ یہ اس کا ذاتی فعل ہے جس سے اس کی ساکھ خراب ہو سکتی ہے مگر اس کو جرم کہنے والا خود مجرم۔ میں چاہتا ہوں وہ تیری چاہت کا اقرار کرنے کے باوجود اعتماد اور بے خوفی سے جیسے اور ایک معزز شہری کی طرح سر اٹھا کے چل سکے۔ بزدلوں کی طرح بھاگتی نہ پھرے۔"

"وہ تیری بات نہیں مانے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔" منظر نے کہا۔ "ابھی سو رہی ہے۔ میں نے ایک اسپیشلسٹ کو بلایا تھا اور کہا تھا کہ یہ میری بہن ہے۔ اس نے کہا مرض کوئی نہیں۔ وہی اعصابی کشیدگی، ڈپریشن، ذہنی و جسمانی تھکن اور فرسٹریشن ہے۔ وہ یہاں آرام کرے گی جب تک کہ اس کی صحت بحال نہیں ہوتی — میں اسے لاک کر دوں گا اور اس کا کھانا پینا سونا جاگنا سب میری مرضی سے ہوگا۔ ورنہ نہیں ہوگا خواہ تم دونوں غم کھاؤ اور خونِ جگر پیو۔"

"گویا میں اور وہ اب اگلے جہان میں ملیں گے بشرطیکہ تو نے میدانِ حشر میں بھی خدائی فوجدار ہونے کا عہدہ اپنی مرضی سے [illegible] میں نے کہا۔ "اتنا تو بتا دے ظالم سماج کہ دیدارِ یار کب [illegible] ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں تو کتنے ہیں، فائنل کرنے [illegible] میں ابھی کون سے ایئر میں ہوں؟"

"تو فرسٹ ایئر فول ہے ابھی۔ ایم اے کر کے تجھے آف عاشقی کی ڈگری لینی ہے۔" منظر ہنسا۔ "دیدارِ یار پہ کوئی [illegible] نہیں ہے۔ اگر دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار، جب گردن جھکائی دیکھ لی۔ ورنہ فوٹو مل سکتا ہے اور آپ خود ہتھیلی پر رکھ کے اور سر سے کفن باندھ کے آنا چاہیں تو [illegible] ہے موجود ہر بلا کے لیے۔"

"تو نے بہت پی لی ہے اور غالباً کسی شاعر کے [illegible] میں نے کہا۔ "صاف بتا دو کب تک رہے گی وہ وہاں ورنہ [illegible] ہوں اسے اغوا کرنے کے لیے اپنے گھر کو میری سسرال [illegible] چاہتا ہے الّو کے پٹھے۔ میں اب کچھ مشہور ڈائلاگ بولوں [illegible] وہ ساری زنجیریں توڑ دے گی۔ ساری دیواریں گرا دے [illegible] اور اس کا عشق سچا ہے تو اے ظالم سماج! شکست تیری [illegible] پیار کی جیت ہوگی۔ ہٰذا ھو المطلوب۔"

"اسے ایک مہینہ یہاں رہنے دے۔ میں اور وہ تیرے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" منظر بولا۔ "بس اپنی حماقت کا یقین [illegible] رہ اور ثبوت پیش کرتا رہ کہ — نہ تو فوت ہوا ہے اور نہ [illegible] میری طرح جلوۂ کثرتِ اولاد دکھانے سے پہلے مرنے کا [illegible] رکھتا ہے۔ مارنے پر کوئی پابندی نہیں جسے چاہے مار [illegible] سے زیادہ نصیحت میں نے کبھی اپنے کو بھی نہیں کی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا تو مجھے تھوڑی سی مایوسی [illegible] واپس لوٹتے ہوئے میں نے خود کو زیادہ سبکدوش [illegible] محسوس کیا۔ یہ احساس ہی کم ہمت افزا نہیں تھا کہ منظر ایک [illegible] بن کے رابعہ کے سامنے آ گیا ہے اور اسے عورت ذات یا مجرم اور غیر محفوظ سمجھنے کی غلطی کرنے والوں کو چیلنج [illegible] کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگرچہ رابعہ سے جدائی کے خیال میں کوئی [illegible] نہیں تھی مگر اس یقین میں بڑی طمانیت تھی کہ میں ہی نہیں رابعہ [illegible] محافظ اور بھی ہیں۔ مجھے ندامت بھی تھی اور میں نے رابعہ کی [illegible] کی انتہا کو دیکھا، یہ نہیں سوچا کہ اس کی قوتِ برداشت بالا [illegible] کی خواہشات کا ساتھ نہ دے سکی گی۔ افلاک پہ نظر رکھنے [illegible] تو کچھ نہیں ہوتا۔ طاقتِ پرواز محدود رہتی ہے۔ وہ لاکھ [illegible] کہ ہر طلبگارِ جاں مرحلے میں میرے ساتھ رہنے اور ہر وادی [illegible] میں قدم ملا کے چلے مگر کیا یہ اس کے ساتھ ظلم نہ ہوگا کہ اس کی [illegible] کا سہارا حاصل کرنے کے لیے میں اسے اپنے عذاب میں شریک رکھوں؟ آخر میری نظر اس فرق کو کیوں نہ دیکھ سکی جو منظر نے دیکھ لیا؟ اور اس نے ٹھیک دیکھا ہی نہیں، ٹھیک قدم بھی اٹھایا۔ رابعہ کو وہ سب تو نہیں مل سکتا جو اس نے میری خاطر گنوایا مگر بہت کچھ اب بھی مل سکتا ہے۔ ذہنی سکون، جسمانی آرام۔ اپنے پیشے کا وقار اور اپنی شخصیت کا احترام۔ اس سے وہ جذبہ کہاں مجروح ہوتا ہے جس سے میرے اور اس کے تعلق کی بنیاد ہے۔ مجھے واقعی اسے بخش دینا چاہیے۔ میں اور محسن اور ہمارے دوسرے مددگار، ہر شکاری کو شکار کرنے کے لیے ایک عورت کی مدد کے محتاج تو نہیں۔ وہ خود کو اور اپنے معاملات کو سنبھالے جو میرا ساتھ دینے کے لیے بگڑ گئے تھے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل ہم ہوں گے، یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔ اور جب فاصلے اہمیت اور وجود ہی نہ رکھتے ہوں تو جدائی کیسی؟

لیکن یہ سوال بھی ہے کہ کیا رابعہ اس منطقی فیصلے کو قبول کر لے گی۔ یہ معاملہ عقل کا تو نہیں ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ رابعہ اس پاسبانِ عقل کی نگرانی میں تحفظ کی ضمانت کو مسترد کر دے گی۔ وہ سختیٔ حالات کو میرے ساتھ برداشت کرنا پسند کرے گی۔ یہ نہیں چاہے گی کہ وہ تمام تفکرات سے بے نیاز اپنے ذہنی و جسمانی سکون کی خاطر میری رفاقت چھوڑ دے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دشمن کون ہیں، کہاں کہاں ہیں اور ان سے میری ذات کو لاحق خطرات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ میری فطرت کو بھی سمجھتی ہے ایسے میں یہ ناممکن تھا کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے اور منظر کے گھر میں پناہ گزین ہو جائے۔ میری ذات سے منسوب اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ نہ وہ جی سکے گی، نہ مر سکے گی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ مرنے جینے کو ترجیح دے گی جس سے یہ اطمینان تو ہوگا کہ اس جدوجہد میں وہ ہر قدم پر آخری لمحے تک میرے ساتھ تھی۔

میں نے خاصی قنوطیت اور کوفت کے ساتھ جسم کی ضرورت پوری کرنے کی خاطر ایک معمولی سے ریستوران میں چند لقمے زہر مار کیے اور واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ کھانے پینے کا وافر سامان لے آیا۔ محسن اور استاد ٹیڈی ہو کے واپس آتے تو یہی ان کا ڈنر بن جاتا ورنہ اگلی صبح ناشتے کا سامان ہوتا۔ دو کمروں کے اس بے حد مختصر سے مکان کے کمرے بھی اتنے مختصر تھے کہ ایک کمرے میں استاد ٹیڈی کی جھولا نما بان کی چارپائی نے نصف کمرہ گھیر لیا تھا، اس کا سامان ٹین کے ایک صندوق میں بند اسی چارپائی کے نیچے رکھا ہوا تھا اور سرہانے کی میز پر باقی سب کچھ تھا جو ٹیڈی جیسے شخص کی ضروریاتِ زندگی میں شامل تھا۔ شیرِ پنجاب سوپ اور زلفِ بنگال آملہ ہیئر آئل سے لے کر سگریٹوں کی راکھ، خالی پیکٹ اور تاش کی گڈیوں تک۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں نصف لنگی کو بطور پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ لنگی کا بقیہ نصف حصہ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں آویزاں تھا اور دونوں میں تقریباً برابر سوراخ تھے اور ایک جیسا میل تھا۔

میرے ذہن میں خلا تھا چنانچہ میں بان کی چارپائی پر جوتوں سمیت لیٹا سگریٹ کے دھوئیں کو جلے لگی چھت کی جانب اٹھتے اور تحلیل ہوتے دیکھتا رہا۔ میرا جسم تھکن سے چکنا چور تھا اور دماغ کی کیفیت اس گاڑی جیسی تھی جو مسلسل چلتی رہے اور اس حد تک گرم ہو جائے کہ انجن بند ہو جائے۔ میرا دماغ ٹھس تھا، نہ میں رابعہ کے متعلق سوچ رہا تھا نہ دلاور کے انجام کے بارے میں اور نہ اپنے مستقبل کے بارے میں۔ نہ جانے کس وقت سگریٹ میرے ہاتھ سے گر گئی اور مجھے نیند نے آ لیا۔ آنکھ کھلی تو صبح کے اجالے کو دیکھنے کے بعد میں نے کلائی کی گھڑی کو دیکھا اس میں نو بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ میں کم سے کم دس گھنٹے بیہوشی کی نیند میں سویا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو چارپائی کے قریب ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مارے دیوار سے ٹیک لگائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ وہ پچیس سال کے قریب عمر کا... دبلا پتلا اور درمیانے قد کا ایک جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا چنانچہ بڑھی ہوئی شیو کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال گھنے اور اس حد تک لمبے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے سال بھر سے کسی نائی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ وہ زین کی سفید پتلون اور آدھی آستین کی نیلی قمیص میں ملبوس تھا حالانکہ موسم اس وقت بھی خاصا سرد تھا۔ اپنا چشمہ اس نے ایک ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھی۔ اس نے سگریٹ کو پہلی اور دوسری انگلی کے درمیان چلم کی طرح پھنسا لیا تھا۔ جب اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک طویل کش لیا تب بھی اس کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ وہ گیان دھیان میں مستغرق درویش نہیں تھا چنانچہ میں نے فرض کیا کہ وہ سگریٹ کے ساتھ کوئی نشہ بھی کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے اطمینان کے ساتھ گھر میں موجود ہونے والا دوست ہی ہو سکتا ہے دشمن نہیں اور یہ دوست جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا محسن کا رپورٹر دوست ثابت ہوا۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے کھنکار کے کہا۔ "میں سکندر رنجت ہوں۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ آنکھیں کھول کے متعجب ہوئے بغیر بولا۔ "میں سیہ بخت بھی نام کا غالب ہوں لیکن اس وقت مغلوب ہوں کمینی خواہشات سے۔ مثلاً اس وقت یہ شدید اندیشہ ہے کہ مجھے چائے کی ایک پیالی نہ ملی تو میری پیاسی روح خود فریاد کرنے خدا کے حضور حاضر ہو جائے گی اور ممکن ہے لوٹ کر نہ آئے۔ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!"

میں ہنس پڑا۔ "تم محسن کے دوست... وہی رپورٹر ہو؟"

"دونوں سے میری سیہ بختی ثابت ہوتی ہے نا؟" وہ بولا۔ "رپورٹر سے زیادہ پورٹر نظر آتا ہوں اور محسن کی دوستی کے باعث بھوکا پیاسا ہوں۔ صبح سے یہ آگ اور دھواں پی رہا ہوں اور بس۔"

"میں ابھی چائے بنا کے لاتا ہوں۔ ہم دونوں پئیں گے۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "ذرا اپنی روح کو روک کر رکھنا۔"

وہ آدمی دلچسپ تھا اور اس کی بے تکلفی مجھے پسند آئی۔ وہ محسن کا قابلِ اعتماد دوست تھا تو برا آدمی کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ابھی تک میں اور وہ نہیں ملے تھے لیکن گفتگو سے مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ یقینی طور پر وہ گزشتہ شب کی ہنگامہ آرائی میں شریک تھا۔ محسن اور ٹیڈی دوسرے کمرے میں فرش پر کمبلوں میں سکڑے پڑے تھے اور غالباً بہت دیر سے لوٹے تھے کہ ابھی تک بے سُدھ تھے۔ میں نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیدھا کچن چلا گیا۔ پھر مجھے اس کافی کا خیال آیا جو میں رات کو مکھن اور ڈبل روٹی کے ساتھ خرید کر لایا تھا۔

"غالب صاحب!" میں نے کمرے میں لوٹ کر کہا۔ "اگر چائے کے بجائے کافی کا موڈ ہو تو بتا دیں؟"

"کافی؟" وہ اچھل پڑا۔ "یا مظہر العجائب۔ حوالات میں کافی؟ کیا واقعی کافی مل سکتی ہے یہاں؟ لاؤ لاؤ یار سکندرِ اعظم لیکن دیکھو بلیک۔ زلفِ محبوب یا بندۂ مجبور کی تقدیر کی طرح۔ نو شوگر۔ واہ بھئی واہ۔ اس وقت تو اپنے مولا سے کچھ بھی مانگ لیتا۔"

وہ میرے پیچھے کچن میں آگیا۔

"اب بھی وقت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مانگ کے تو دیکھو غالب صاحب۔"

"یہ دوسری بار گالی دے دی تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ صاحب مت کہنا۔ ایک صاحب تو پہلے ہوتا تھا سفید چمڑی والا صاحب بہادر تو خود تھا، خطاب چمچوں کو دیتا تھا۔ پھر رہ گیا کالا صاحب۔ آئی سی ایس اور اب سی ایس پی والا بیوروکریٹ صاحب۔ تو بھائی ہم غالب ہی اچھے۔ نہ مسٹر میں نہ مولانا۔"

"غالب کیسے بن بیٹھے؟ ضرورتِ شعری کے تحت بھی ہو جاتی ہے۔ شعر نہ کہو تو اور نہ سناؤ تو بھی غنیمت۔"

وہ ہنسا۔ "نہیں یار! بخت شرمندہ رہتا ہوں۔ چچا غالب سے لیکن حرکت یہ ابا جان کی تھی۔ میرا ہونا اور پھر یہ نام قصور میں نے نہیں کیے۔ نہ جانے کس حکیم نے لکھ دیا تھا نسخے کہ اولادِ نرینہ ہو تو غالب احمد نام رکھنا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ چودہ سال مجھ سے پہلا شعر تولد ہوا۔ شعر تھا کہ بس ایک بار اسے اور مر گئے۔ فرہاد و قیس سے بڑا کام کر گئے۔ گھر والوں نے کہا کہ میاں غالب تو تم ہو۔ غضب خدا کا! اصل سے پہلے نقل کی شہرت ہو گئی۔ ہم نے بھی مان لیا اور اٹھتے بیٹھے دنیا دانِ شعرا پر اس دورِ شباب کی غلطیاں شمار کرتا ہوں۔ ہوتا ہوں، پچھتاتا ہوں اور روتا ہوں کہ کاش میں نے یہ گناہ نہ کیے ہوتے مگر اپنی کوکھ کے جنے ہیں، کیسے نہ کہوں کہ مکروہ، بدصورت، غلیظ اور متعفن شعر میں نے نہیں کہے۔ خدا تو بندے کی غلطی شاید معاف کر دے، مرزا غالب میدانِ حشر میں ہی ہر شعر پر ستر جوتے ماریں گے کہ میرا نام لے کر کہتے تھے، اب کہہ کے دیکھو۔"

کافی کا مگ میں نے اُسے تھمایا اور ہم کمرے میں لوٹ آئے۔ وہ بے حد باتونی اور انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس کی گفتگو میں ہی نہیں، شخصیت میں بھی ایک مسحور کر لینے والی ادا تھی۔ کچھ اس کی بے تکلفی، کچھ بے باکی اور صاف گوئی اور سادگی۔

"رات تم لوگ کس وقت لوٹے تھے؟" میں نے ایک سلائس پر مکھن لگا کے اُسے پیش کیا۔

"رات کہاں تھی وہ! صبح کی پہلی گھڑی تھی۔" پھر وہ زمین پر پاؤں پھیلا کے دیوار کے سہارے بیٹھ گیا تھا۔

"چوہدری دلاور کا کیا بنا؟" میں نے کہا۔

"یار یہ چکر کچھ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ سلائس کو دانت سے کاٹتے ہوئے بولا۔ "ایک بار پہلے محسن نے مجھے دوڑایا تھا کہ ایک گرما گرم خبر ہے۔ چوہدری دلاور کے گھر پہنچو۔ وہاں پولیس بھی موجود ہے اور ایک لاش بھی۔ یہ نہ ہو کہ دلاور اپنے مال کے نیچے اس لاش کو دبا دے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں پہنچا اور کر خدا کا یہ ہوا کہ پولیس افسر بھی تھا اپنے ہی مطلب کا، چنانچہ مال سے دال نہیں گلی۔ اب کل پھر وہی ہوشیار، خبردار! اتنے بجے فلاں جگہ اسی گرما گرم خبر کا حصہ دوم ملے گا۔ یہ نہ ہو خبر رات کی میں گم ہو جائے۔ اب یہ اپنا یار محسن مذاق تو کرتا ہے اپنے ساتھ لیکن پہلی اور پہلی بار اس نے جو خبر دی تھی وہ اچھی خاصی سنسنی خیز تھی گئی۔ چوہدری صاحب نے ایڈیٹر کا منہ بند کر دیا تھا کہ نہ خبر کے اور نام کے ساتھ حوالہ نہ آئے۔

"اور اس بار؟ پوری تفصیلات ہوں گی؟" میں نے کہا۔ "پوری آب و تاب کے ساتھ؟"

"کہا تو تھا میں نے کہ تصویر کے ساتھ پوری سہ کالمی سرخی ہونی چاہیے۔" وہ بولا۔ "بڑی افراتفری میں ایک مختصر سا نیوز فیچر بنا کے دیا تھا۔ کاپی تیار تھی مگر میں نے جگہ نکالی۔ پتا نہیں کس نسل پرست نے افریقہ کی نسل پرست حکومت کے اقدامات کی مذمت کی تھی۔ میں نے وہ بیان خارج کیا اور چوہدری صاحب کے لیے جگہ نکالی۔"

"کیا کچھ دیا ہے اپنے نیوز فیچر میں؟" میں نے دلی اضطراب کو دبا کے ظاہری بے نیازی سے کہا۔

"حوالہ یہ دیا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور پہلے بھی اپنے ایک ڈرائیور رحمت کباڑی کے قتل کے الزام میں گرفتار اور ضمانت پر رہا ہوئے تھے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پھر انسپکٹر فتح شیر کی گمشدگی کا ذکر ہے۔"

"الطاف عرف طافو کا کوئی حوالہ نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"آیا ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ رحمت کباڑی اور الطاف نامی ڈرائیور ایک ہی ٹرک لے کر گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "طافو تا حال لاپتا ہے۔ دونوں زرعی مشینری کے پرزوں سے بھرے ہوئے ٹرک سمیت غائب ہو گئے تھے جو چوہدری صاحب کے کارخانے میں بنتے ہیں۔ انسپکٹر فتح شیر کے قتل کے سلسلے میں سامنے آنے والی شہادت ناقابلِ تردید لگتی ہے۔"

ایک شب کی تگ و دو رائیگاں نہیں گئی۔" میں نے کہا۔ "خوشی ہوئی یہ جان کر۔"

"کیوں بھئی! تمھیں کس بات سے خوشی ہوئی؟ قتل سے یا قاتل کی گرفتاری سے؟"

"قاتل کی گرفتاری سے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کچھ لوگ انسپکٹر فتح شیر کے جانی دشمن ہوں لیکن میں ان میں شامل نہیں۔ اس کا قتل بہر حال نہیں چاہتا تھا میں۔"

"گویا تم چوہدری دلاور کے دشمن ہو؟" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اور محسن نے مجھے یہ ایکس کلیوسو اسٹوری تو پہلے بھی دی تھی لیکن مزید کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ خیر اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ محسن کو اتفاق سے ایک بات معلوم ہو گئی تھی جو اس نے مجھے بتا دی تھی لیکن یہ سلسلہ کچھ اور ہے۔ وہ بھی چوہدری دلاور کی جان کا دشمن ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ اس نے کیا بھی اس لیے ہے کہ چوہدری صاحب کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ ہو جائے۔"

"کیا اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے؟" میں نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اب پھندا اُن کے گلے میں ہے۔" غالب نے کہا۔ "خبر بھیجنے کے بعد میرے ہاتھ بے حد اہم ثبوت لگے جس سے واردات کی پوری تفصیل میرے سامنے آگئی۔ میں نے ایڈیٹر سے کہہ دیا تھا کہ یہ خبر اسی طرح شائع ہو گی جیسے میں کہوں گا ورنہ میں جا رہا ہوں اس کے حریف اخبار میں کرائم رپورٹر بننے کے لیے اور کل تو سب اخباروں میں کچھ نہیں ہو گا مگر جو پرسوں آنے والا ہے، وہ دوسرا ایٹم بم ہے۔ کسی کے باپ کو وہ سب معلوم نہیں ہے جو مجھے معلوم ہے۔"

"تم کو سب کچھ معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی تو گڑبڑ ہے۔" وہ سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ مجھے سب کچھ معلوم نہیں۔ بے شک محسن نے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن وہ کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اُسے پہلے سے کیسے معلوم تھا اور اس کا یا تمھارا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"اچھا! میں سمجھا تھا تم جانتے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "محسن نے تم کو بتا دیا ہو گا۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "خبر کو پریس اور چوہدری صاحب کو جیل بھجوا کے میں اِدھر آیا کس لیے ہوں؟ ہر روز تو دس گیارہ بجے تک اِدھر اُدھر جھک مارتا تھا۔ کسی تھانے سے کچھ لیا، کسی اسپتال سے معلوم کیا اور اگلے دن کے لیے عدالتوں کے کیس دیکھے۔ پھر عموماً گھر لوٹ جاتا تھا ورنہ پھر جو دل وحشی کہے۔ کہ اے دوست ویرانے میں چل۔ یا کسی زہرہ جبیں کے کاشانے میں چل۔ لیکن میں نے محسن سے کہا کہ میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ اس نے چکر دے دیا مجھے کہ ابھی تو خیر سے لمبی تان کے سو جاؤ۔ صبح بتائیں گے سکندرِ اعظم خود۔"

"تم اخبار نویس ہو کے ظاہر کر رہے ہو کہ تم کو میرے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"علم تو ہے۔ اور پبلک سے کچھ زیادہ ہے۔ مگر پس پردہ بہت کچھ ہے جو محسن نے نہیں بتایا۔"

"وہ ایسا رازدار اور قابلِ اعتماد دوست ہے کہ جب تک میری مرضی نہیں ہو گی وہ چپ رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں ہے اسے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ کسی پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ آدمی بھروسے کے قابل ضرور ہوتا ہے مگر پس پردہ واقعات کا سلسلہ اتنا دراز ہے کہ بات تفصیل سے بتانے میں شام ہو جائے گی اور بات پھر بھی ادھوری ہو گی۔ یہ باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں۔ ابھی تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"معمّٰی عجیب پُراسرار معاملہ ہے۔" وہ دوسری سگریٹ جلا کے بولا۔ "کس کا یقین کیا جائے کس کا نہ کیا جائے! دلاور چلّا رہا تھا کہ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے اور اسے باقاعدہ جال پھیلا کے شکار کیا گیا ہے لیکن یہ بات اس نے پہلی واردات کا راز افشا ہونے پر بھی کہی تھی اور ہر مجرم کہتا تو یہی ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اگر واقعات کی شہادت اس کے خلاف جاتی ہو تو کہتا ہے دشمنوں نے اسے پھنسایا ہے۔"

"شک کس بات کا ہے؟" میں نے کہا "تم دلاور کو بے گناہ کیوں سمجھتے ہو؟"

"وہ... مجھے اس پر اداکاری کا گمان نہیں ہوا۔ ایسا لگتا تھا وہ سچ بول رہا ہے۔" غالب نے سوچتے ہوئے کہا "مگر دوسری طرف حالات و واقعات سے اس کا سچ بالکل جھوٹ ثابت ہوتا تھا۔ میں تو اخبار کے دفتر سے رپورٹ دے کر نکلنے ہی والا تھا جب محسن کا فون آیا کہ فوراً پہنچو۔ میں نے کہا 'آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا جا سکتا؟' وہ کہنے لگا کہ 'بعد میں شکایت نہ کرنا۔ یہ اسی خبر کی دوسری کڑی ہے۔ سیٹھ دلاور نے دو قتل کیے ہیں۔ ایک کی خبر سب سے پہلے تم نے دی تھی۔ یہ دوسری اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ دُہرے قتل کی واردات ہے اور ایک معاملہ تو بہت سنگین ہے۔ ایک پولیس سب انسپکٹر ہے فتح شیر' وہ راتوں رات غائب ہو گیا تھا۔ اس کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔' میں نے کہا 'تم کو کیسے معلوم ہوا؟' وہ کہنے لگا کہ 'خبر سے تعلق رکھو۔ کیوں اور کیسے مت کرو۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ سیٹھ دلاور نے رحمت کباڑی کے ساتھی ڈرائیور کو بھی قتل کر دیا ہے۔ وہ اس کو دفن کرنے والا تھا گھر کے عقبی حصے میں کہ کسی نے پولیس کو خبر دے دی۔' میں نے کہا 'خبر تم نے تو نہیں دی تھی؟' وہ کہنے لگا کہ یہی سمجھو۔ بہر حال انسپکٹر فتح شیر وہاں پہنچا اور اس نے سیٹھ دلاور کو لاش دفن کرنے سے پہلے پکڑ لیا۔ دلاور قبر کھود رہا تھا اور لاش وہیں کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی تھی لیکن دلاور نے انسپکٹر کو پانچ لاکھ دے کر معاملہ ختم کر دیا۔ انسپکٹر کے ساتھ چار سپاہی بھی تھے۔ انہیں اپنا حصہ ملا اور انچارج تھانہ کو بھی ملا ہو گا لیکن دلاور نے بعد میں فتح شیر کو ٹھکانے لگا دیا تا کہ گواہ کوئی نہ رہے اور اسے پھر بلیک میل نہ کر سکے۔' میں نے کہا 'میاں محسن۔ بھاڑ میں گئی ہماری صحافت۔ یہ تم اتنی بال کی کھال کیسے نکالتے ہو؟ نہ تم پولیس میں' نہ سی آئی ڈی میں۔ فرشتے بتا جاتے ہیں یہ سب کچھ تمہیں؟' وہ پھر کہنے لگا کہ 'اس وقت باتوں میں وقت ضائع کرو گے تو موقع گنوا دو گے۔ آخر میں دوست ہوں تمہارا' تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہا ہوں۔

میری بات غلط ثابت ہو تو مجھ سے کہنا۔' پھر میں کیا کرتا؟ ... مار کے گیا۔ ایک شیطانی چرخہ ہے اپنے پاس۔ ایک ... کی دو پہیوں والی سواری۔ اسی کو بھگاتے پھرتے ہیں ... ہیں۔ اب جو دیے ہوئے پتے پر پہنچا تو وہاں ایک مجمع ... بائیس افراد نے چار لفنگوں کو گھیر رکھا تھا جو ٹیکسی میں پہنچے ... کسی عقلمند نے ٹیکسی کی ہوا بھی نکال دی تھی۔ میں نے ... کہ میں بعد میں آیا ہوں اور بس لوگوں کے ساتھ پولیس کو د... رُک گیا تھا۔ پولیس کے ساتھ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ایک شخص ... خود کو اس خالی کوٹھی کا چوکیدار بتایا۔ یہ بھی کہا کہ کوٹھی رابعہ قار... ایڈووکیٹ کی ہے لیکن وہ اس میں رہتی نہیں ہیں۔ وہ ... میں ایک دن کے لیے شہر جاتا ہے بیوی بچوں سے ملنے ... باقی چھ دن یہیں رہتا ہے۔ اس نے آج واپس آنے کے ... عجیب سی بُو محسوس کی اور پھر دیکھا تو اوپر والے ایک ... میں لاش نظر آئی۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ جس وقت پولیس لاش کی شناخت کر رہی تھی اور ضابطے کی کارروائی ... مصروف تھی اس وقت خود کو چوکیدار کہنے والا کھسک گیا۔ ... کو اندر سے دلاور کی کار بھی ملی اور جب چاروں نے دیکھا کہ وہ ایک پولیس افسر کے قتل میں پھنس گئے ہیں تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ان کو دلاور نے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ یہاں ایک اشتہا... مجرم ملے گا جس کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے' پچیس ہزا... خود اس نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں پولیس نے چوکی... کو تلاش کیا تو وہ بھی غائب اور اس کے ساتھی بھی۔ جو بچے ... وہ صرف تماشائی تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے لیکن دھر لیے ... پولیس نے کہا یہ نہ ہو بعد میں ایک گواہ نہ ملے۔ وہ بہت روئے پیٹے مگر کسی نے ان کی ایک نہ سُنی۔ وہ آٹھ دس افرا... جو پہلے پیش پیش تھے اپنا کام کر کے نکل گئے تھے اور ا... بندۂ حقیر کا خیال یہ ہے کہ وہ صرف دلاور کو اور اس کے ساتھ... کو پکڑوانے کے لیے پہنچے تھے۔ یہیں سے مجھے شبہ ہوا ... کہ دلاور سچ نہ کہتا ہو اور واقعی اسے پھنسایا نہ گیا ہو۔ مگر ل... میں بہت سے دلچسپ انکشافات ہوئے۔ پولیس نے تو د... تفتیش کا آغاز کر دیا تھا۔ قتل کسی عام آدمی کا ہوتا تو وہ مشتعل ... ہوتے مگر ایک پولیس افسر کا قتل گویا پورے پولیس کے محکمے اور اقتدار اعلیٰ کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ عوا... ان کے نام سے تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان کو دیکھ کر اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جائیں اور ان کے اشارۂ ابرو پر عزت و آبرو دیا جا... مال کا نذرانہ پیش کر دیں۔ ان کی یہ ہمت کہ ایک پولیس افسر کو مار دیں' اسے قتل کر دیں جو قاتلوں کو پکڑتا ہے اور تفتیش کے نا...

پر قتل تک کے اختیارات اپنے پاس رکھتا ہے۔ بس جناب سکندرِ اعظم! انھوں نے خالی کوٹھی میں سے آلاتِ تحقیق اکٹھے کیے' ڈنڈے اور رسّے' درختوں کی ٹہنیاں اور اپنی بیلٹ۔ پہلے تو چار ملزمان کی شامت آئی۔ انھوں نے بہت جلد اُگل دیا کہ وہ کون ہیں۔ نوکھا اور پیر اندھی کے بدمعاش تھے۔ ٹیکسی چوری کی تھی۔ پھر گواہوں کی واجبی سی گوشمالی ہوئی مگر ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا کہ اس نے پولیس کو فون کیا تھا یا وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے جو کھسک گئے۔ وہ سب بڑے لوگوں کے شوفر اور نوکر وغیرہ تھے چنانچہ خاصے پُراعتماد تھے کہ ان کا صاحب انھیں تھانے سے چھڑا کے لے جائے گا۔ جب کوٹھی کے اندر ہی سے دلاور کی کار بھی دریافت ہوئی تو کچھ اور شواہد سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ گاڑی پر گرد نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گاڑی وہاں زیادہ عرصہ کھڑی نہیں رہی۔ اس کی بیٹری بھی ٹھیک تھی اور پٹرول ٹینک بھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ چاروں پہیوں میں ہوا پوری تھی صرف ڈکی میں رکھا ہوا ٹائر فلیٹ تھا۔ کاغذات دیکھتے ہی معلوم ہو گیا کہ گاڑی کس کی ہے۔ چابیاں اسی میں لگی ہوئی تھیں چنانچہ پولیس والے ادھر اُدھر بھاگے کہ دلاور زیادہ دُور نہیں ہو گا۔ اگر وہ بھی کرائے کے چار بدمعاشوں کے پیچھے لگا ہوا تھا تو پہلے سے کوٹھی میں موجود تھا مگر اس نے جب معاملہ بگڑتے دیکھا تو فوراً جائے واردات سے فرار ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت گاڑی میں نکلنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ پہلے اپنی جان بچانے کی فکر کی جائے' گاڑی نکالنے کی بعد میں۔ اب خدا آپ کا بھلا کرے' گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ چوہدری دلاور کی شامت آئی تو وہ بھی جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ معلوم نہیں کیوں رش پیدا سے اعتماد نہیں تھا کہ وہ کرائے کے مجرم اس اشتہاری مجرم کو پکڑ سکیں گے۔"

"تم نے اب تک اشتہاری مجرم کا نام نہیں لیا۔" میں نے موقع پا کے کہا۔

وہ ہنسا "بہت شوق ہے اپنا نام سُننے کا! میاں سکندرِ اعظم۔ تم کوئی غیر معروف شخصیت ہو گیا؟ ارے بھائی' کتنے دن کی بات ہے جب تمہاری تصویر ہر اخبار میں چھپی تھی۔ پبلک کا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے مگر ایک تو پولیس کو یہ چہرہ نہیں بھول سکتا۔ دوسرے ہم جیسے سر پھرے یادداشت پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ تمہارے نام سے منسوب داستانوں کو اس بندۂ حقیر نے ہی تحریر کیا تھا۔ اور خدا گواہ کہ اس میں زیبِ داستاں کے لیے کچھ نہیں بڑھایا تھا۔ ورنہ تو کرائم رپورٹر کی مرضی ہے قاتل کو فرشتہ بنا دے اور فرشتے کو قاتل۔ تمہارا نام رابعہ قاری ایڈووکیٹ کے ساتھ یوں آیا کہ مجھے رشک آیا۔ نہ مجنوں کی خاطر لیلیٰ نے خود کو یوں خوار و برباد کیا تھا' نہ فرہاد کے لیے شیریں نے۔ میں نے رابعہ کو دیکھا بھی ہے بلکہ اس کی پہلی شادی میں شریک بھی تھا۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "تم... تم جانتے ہو اس کے سابق شوہر کو؟"

وہ عیاری سے مسکرایا۔ "میں اس کا دوست تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی چاہیے اور سوچا بھی تھا کہ ایک شریف لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوستی کا بھرم رکھنا زیادہ اہم ہے یا سچ بولنا۔ اور ظاہر ہے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر وہ کہنے لگا کہ میرے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کروں گا اور خود کو بھی باعزت طور پر بچا لوں گا لیکن تم نے سقراط بن کے دخل اندازی کی تو میرا کچھ نہیں' میں خودکشی کر لوں گا۔ اور بات ختم۔ مگر اس کے بعد میرے والدین بھی زندہ نہ رہیں گے۔ سب کے قتل کا الزام لینے کی ہمت رکھتے ہو تو نیک کام میں دیر کیسی؟ ان کو خوشیوں سے محروم کر کے کیوں مارتے ہو' خوشی کی تمنا سے پہلے ہی قتل کر دو' مجھے اور انھیں زہر دے دو یا گولی مار دو۔ میں ایک تحریری بیان تھما جاتا ہوں تم کو کہ میں نے والدین کو قتل کر کے خودکشی کر لی ہے۔ تم اخبار نویس ہو۔ خبر کو مرضی کے مطابق بنا لینا۔ دنیا یہی سمجھے گی نا کہ میں پاگل ہو گیا تھا۔ یہ تو نہیں کہے گی کہ بے غیرت تھا۔ خیر میں نے اس سے بحث کی تو اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ کیا کرے گا۔ اس کی دھمکی سے میں ڈر گیا تھا۔ بعد میں وہی ہوا۔ یعنی اس نے رابعہ سے نکاح تو کیا مگر رخصتی کو ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ والدین دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ پھر اس نے رابعہ کو خاموشی سے طلاق دے دی۔ پرانی بات ہے یہ۔ میرا وہ دوست زندہ ہے اور بہت بڑے عہدے پر ہے۔ زندگی سے کسے پیار نہیں ہوتا۔ اب اگر قدرت نے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی تو کیا ہوا۔ باقی ہر لحاظ سے تو وہ ایک کامیاب اور مکمل انسان ہے۔ جینے کا حق تو ہے اسے۔"

"اچھا۔ تو خوب گاڑھی چھن رہی ہے؟" محسن نے دروازے میں نمودار ہو کے منہ پھاڑا اور جماہی لی۔ "رات کو کیسے گھوڑے بیچ کے سو گیا تھا۔ میں اور ٹیڈی گھوڑے کی طرح بحرِ ظلمات میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ ہماری کوئی فکر نہیں تھی جناب کو خوابِ شیریں کے مزے لے رہے تھے' شیریں یعنی رابعہ۔" اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔

"کیوں؟ شیریں یعنی شہلا کیوں نہیں؟" میں نے غرّا کے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا۔" ہم نے کبھی تیرے خواب سنسر کیے ہیں گھوڑے۔ ہاں جی غالب جی۔ اے ہنہناتے دیں آپ۔ بیان جاری رکھیں۔ پھر دلاور کہاں ملا؟" میں نے جانتے بوجھتے موضوع بدل دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ہم رابعہ کی بات ہی نہیں کر رہے تھے۔

"بس سمجھی سکندرِ اعظم۔" غالب معنی خیز انداز میں مسکرایا۔"پولیس تو ادھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی اور اکا دُکا راہگیروں سے فضول پوچھتی پھر رہی تھی کہ انھوں نے اس حُلیے اور اس قماش کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا۔ ایک پولیس والے کے سامنے کون تسلیم کرتا کہ اس نے دیکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ خبر تو بن ہی گئی۔ اب آفس چل کے لگا دیتے ہیں۔ فوری طور پر کچھ اور معلوم ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اب ضابطے کی کارروائی ہوگی تو نتائج سب کو ہی معلوم ہوں گے لیکن صبح کے کسی اور اخبار میں یہ سرخی نہیں ہوگی کہ" رحمت کباڑی کے قتل میں ضمانت پر رہا ہونے والے صنعت کار چوہدری دلاور پر انسپکٹر فتح شیر کے قتل کا الزام۔"

میرے ذہن میں ذیلی سرخیاں بھی تھیں اور کچھ خبر سے متعلقہ مواد۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اتنے کم وقت میں رحمت کباڑی اور دلاور کی تصویریں بھی نکالنی ہیں چنانچہ مجھے پہلے کہیں سے ایڈیٹر کو فون کر دینا چاہیے۔ اچانک میں نے سڑک کے درمیان رُکی ہوئی گاڑی کو دیکھا۔ وہ کچھ ترچھی کھڑی تھی۔ اس طرح کہ سڑک بلاک ہوگئی تھی۔ ادھر ٹریفک تو ہے نہیں اور رات کو تو بالکل نہیں ہوتی۔ ایک شخص کار کے پاس کھڑا تھا۔ میں سمجھا کہ گاڑی خراب ہوگئی ہے ورنہ شریف آدمی اپنی گاڑی کنارے پر کھڑی کرتے ہیں۔ اتنی دیر میں دلاور نے مجھے آواز دی۔ شامت اسی طرح بُلاتی ہے آدمی کو۔ وہ نہ بُلاتا تو میں اس کی صورت پر غور کیے بغیر نکل جاتا۔ مجھے فرصت بھی نہیں تھی کہ اس کی مدد کرتا اور گزشتہ ہفتے کی بیماری کے بعد اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ کم سے کم دھکا لگا کے گاڑی کو ایک طرف کرا دیتا۔ اس کی آواز پر میں مجبوراً گیا اور دلاور نے کہا کہ اس کی گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے چنانچہ میں اگر ہاتھ لگاؤں تو وہ گاڑی کنارے پر لگا دے۔ میری ناک دیکھی تم نے؟"

اس غیر متوقع سوال نے مجھے دنگ کر دیا۔" ناک؟ کیا ہوا تمھاری ناک کو؟ اور ناک کیسے آگئی یہاں؟"

" یہ بہت اسپیشل ناک ہے۔" وہ اپنی ناک پر ہاتھ پھیر کر بولا۔" تم اس کو کتے کی ناک کہو تو میں بُرا نہیں مانوں گا۔ لوگ تو میری عادتوں کی وجہ سے مجھے بھی کتے کی دُم کہتے ہیں۔ میری ناک حد درجہ حساس ہے۔ ہر قسم کی بُو کا بہت طاقت ور راڈار ہے۔ مجھے کچھ ٹائر جلنے کی بُو محسوس ہوئی۔ ٹائر برسٹ ہوتا ہے تو یہ بُو نہیں آتی۔ لیکن اس بُو سے الگ ایک بُو تھی۔ بارود کی ۔۔۔ کسی نے کچھ دیر پہلے پٹاخا چلایا ہو۔ لیکن پٹاخا اتنی رات کون چلاتا ہے اور چلاتا تو کیا میرے کان آواز نہ ۔۔۔ موقع شب برات کا بھی نہیں تھا اور اس وقت دور کسی ۔۔۔ کیا بٹے کا بھی پتا نہ تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے فلیٹ ہو جانے والے ٹائر میں سوراخ نظر آیا جس کے کنارے ۔۔۔ ہوئے تھے" یہ ٹائر خود تو برسٹ نہیں ہوا۔" میں نے ۔۔۔ " نیا ٹائر تھا۔"

" تم نے اندھیرے میں یہ سب کیسے دیکھا؟" میں نے ۔۔۔

" تمھیں کس نے بتایا کہ وہاں اندھیرا تھا؟" غالب نے مجھے غور سے دیکھا۔ یہ غلطی مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دلاور کی گاڑی پر میں نے کس جگہ ۔۔۔ کیا تھا اور جب غالب مجھے دلاور سے ملاقات کا حال ۔۔۔ رہا تھا تو میری آنکھیں اس مقام کو دیکھ رہی تھیں جہاں سے میں دلاور کو بے بس اور مجبور چھوڑ کے فرار ہوا تھا۔ وہاں اندھیری سڑک تھی اور کوئی اسٹریٹ لائٹ روشن نظر نہیں آرہی تھی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے تھے یا نہیں مجھے یاد نہ تھا اور میں نے فرض کر لیا تھا کہ اس اندھیری سڑک پر اندھیرا ہی رہتا ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت اسٹریٹ لائٹ بند ہو۔

" وہ ۔۔۔ دراصل تم نے خود کہا ہے نا کہ رات ۔۔۔" میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔" اور چاند کی آخری تاریخ تھی۔"

وہ کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔" ۔۔۔ آدمی ہو۔" اس نے بالآخر کہا۔" اچھا نکتہ تلاش کر لیا اپنے ۔۔۔ کے لیے مگر کیا اجالا صرف چاندنی سے ہوتا ہے؟ لاہور کارپوریشن نے اور کینٹ بورڈ نے سڑکوں پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں کر رکھا ہے؟ وہاں بھی ایک پول تھا اور اس کی روشنی پیچھے سے کار کی ڈکی کے نیچے پھیل رہی تھی۔ اسی روشنی میں مجھے گولی کا نشان نظر آگیا تھا اور قریب سے دیکھنے پر میری ناک زیادہ فعال ہوگئی تھی۔ میں نے دلاور کی خاموشی پر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے کچھ نروس نظر آیا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا لیکن میں نے اسے فوراً شناخت کر لیا۔ دراصل ۔۔۔ وہ بدمعاش بھاگ ۔۔۔ جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔' وہ بولا۔' لوٹنا چاہتا تھا مجھے۔ اتفاق سے ایک گاڑی آگئی۔' اس کی بات بالکل بے ربط تھی۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ وہ کسی سے دھکا لگانے کے لیے کہے اور مدد کرنے والا اسٹرلاک ہومز ثابت ہوگا کہ ایک سیکنڈ میں ۔۔۔

کے برسٹ ہونے کا سبب جان لے گا۔ اسے کچھ تو کہنا ہی تھا لیکن عذرِ گناہ بدتر از گناہ والی بات ہوگئی۔ میں نے کہا۔' عجیب بے وقوف آدمی تھا۔ پہلے اس نے آپ کو روکنے کے لیے گاڑی کے ٹائر پر فائر کیا اور یہ نہیں سوچا کہ اس طرح گاڑی بے قابو ہو کے اُلٹ بھی سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پٹرول ٹینک اس ٹائر سے چند انچ اوپر تھا۔ نشانہ ذرا بھی خطا ہوتا تو ٹینک برسٹ ہوتا اور گاڑی میں آگ لگ جاتی۔ پھر وہ کسے لوٹتا؟ اور پھر وہ گاڑی کو آتا دیکھ کر بھاگ گیا؟۔ وہ پولیس کی گاڑی تو نہیں تھی۔ اگر اس کا نشانہ اتنا ہی اچھا تھا تو وہ پروفیشنل ہوگا، پرانا پاپی۔ ایسے لوگ گھبراتے نہیں۔ وہ ریوالور کا رُخ آپ کی طرف کیے کھڑا رہتا اور مسکراتا۔ گاڑی والا دیکھتا تو مسکراتا کہ دو دوست باتوں میں مصروف ہیں اور سیدھا گزر جاتا مگر ۔۔۔ اب میری یہی بُری عادت ہے کہ ضرورت سے زیادہ بولتا ہوں۔' چوہدری دلاور بھنا گیا۔ کہنے لگا کہ' میں نے تم کو مدد کے لیے بُلایا تھا، دماغ چاٹنے کے لیے نہیں، سراغرساں کی اولاد۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔' میں نے کہا کہ' چوہدری دلاور صاحب۔ اگر میں دفع ہونے سے انکار کر دوں تو آپ کیا کریں گے؟' معلوم ہے اس نے جواب میں کیا کہا؟"

" اس نے تمھاری ناک پر مُکا مارا ہوگا اور اس کا راڈار سسٹم تباہ کر دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

" رائٹ۔ اس نے صرف راڈار سسٹم ہی نہیں میرے دوسرے سسٹم بھی تباہ کر دیے تھے۔ کیا کہتے ہیں ان کو؟ حواسِ خمسہ۔" غالب نے سگریٹ باہر اُچھال کے کہا۔" جیسے ہی میرے ہونٹوں سے اس کا نام نکلا اس کے ہونٹوں سے ایک گالی نکلی اور وہ اچھلا۔ پلک جھپکنے میں اس نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔' کون ہو تم کتے کے بچے؟' وہ دانت پیس کر بولا۔ اب اگر اس وقت میں کہتا کہ چوہدری صاحب، میں باپ ہوں آپ کا تو وہ مانتا؟ سچ بولتا تو جان سے جاتا۔ وہ مجھے اپنے خلاف اتنا بھاد دے کر اخبار کے دفتر میں کبھی نہ جانے دیتا۔ چنانچہ میں نے کہا' حضور۔ آپ کا پرانا نمک خوار ہوں، پہچانا نہیں آپ نے۔ ڈی سلوا صاحب کا اسسٹنٹ تھا بیڈن روڈ والے دفتر میں۔ اکاؤنٹ اسسٹنٹ۔' میرا مقصد تھا کہ اب کسی طرح جان چھڑاؤں اور گاڑی کی بجائے میں۔ دلاور کا شک دور کر کے جلد از جلد نکل جاؤں۔ میں نے کہا بھی کہ چلیے میرے ساتھ زور لگائیے مگر وہ گھوم کر میرے قریب آگیا۔' تم جھوٹ بول رہے ہو۔' اس نے میری صورت پر غور فرما کے کہا۔' تم کبھی اس کے اسسٹنٹ نہیں رہے لیکن تم نے اس کا نام استعمال کیا ہے اپنی جان بچانے کے لیے۔

سچ بتاؤ تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ تم کوئی بہت چالاک اور مکار آدمی ہو مگر خیال رکھنا کہ میں بھی کم بے رحم نہیں ہوں۔ آدمی کو اتنی ہی آسانی سے گولی مار دیتا ہوں جتنی آسانی سے کارپوریشن والے کتے کو مارتے ہیں۔ تمھاری شکل مجھے دیکھی ہوئی لگتی ہے لیکن ذہن میں نہیں آرہا ہے کہ تم دوست ہو یا دشمن۔ اس وقت تمھارا اور میرا یہاں ملنا اتفاق نہیں ہے۔' میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ شاید اتنی دیر میں اسے یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور ریوالور میرے سر پر مارا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ایک ریوالور تو میں نے دلاور سے خالی کرا لیا تھا۔ دوسرا سائلنسر والا خود گلوز کمپارٹمنٹ میں سے نکال لیا تھا اور اسی سے نشانہ لے کر ٹائر پھاڑا تھا۔ یہ وہی خالی ریوالور ہوگا جو میں چھوڑ آیا تھا اور دلاور نے غالب کے سر پر مارا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ غالب خاموش ہے۔ ٹیڈی بھی اب اٹھ چکا تھا اور محسن کے ساتھ کچن میں مصروف تھا۔

" پھر کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

" مجھے کیا معلوم؟" غالب بولا۔" خبیث نے ذرا بھی تو لحاظ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ گاڑی سمیت غائب ہو چکا تھا۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح غالب کو دیکھا۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

" ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔" غالب بولا۔" میں بے ہوش ہو گیا تھا اور گھنٹا بھر بے ہوش پڑا رہا تھا اس لیے صرف قیاس آرائی کی بنیاد پر بتا سکتا ہوں کہ اس نے پہیہ وہیں بدلا ہوگا اور گاڑی نے سڑک کو بلاک تو رکھا ہوگا مگر اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس وقت پارکنگ کے اصولوں کا خیال رکھنا کتنی خطرناک حماقت بن گیا ہے۔ وہ جائے واردات کے بہت قریب تھا اور اس کے لیے فرار ہونے میں ہی عافیت تھی۔ وہ پکڑا جاتا تو انکار کیسے کرتا اور کیا بتاتا کہ گھر سے اتنی دور وہ کیا لینے آیا ہے۔"

" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا سچ۔" میں نے کہا۔" پہلے تم نے کہا تھا کہ تم اس کے بارے میں تین کالمی سرخی اور تصویر کے ساتھ خبر دے چکے ہو۔"

" اس میں جھوٹ کیا ہے۔" وہ بولا۔" اخبار دیکھ لینا۔ یقین آجائے گا۔"

" لیکن تم نے یہ بھی تو کہا ہے کہ دلاور نے تمھیں ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اور تم ایک گھنٹا بے ہوش پڑے رہے تھے۔"

" یہ بھی سچ ہے لیکن خبر میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہوش

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ایڈیٹر صاحب کو فون کیا اور آخری کاپی رکوا دی۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کچھ لیٹ تو ہوا مگر.....؟"

"مگر مرزا غالب، دلاور گرفتار تو نہیں ہوا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں! میں نے کب کہا ہے کہ وہ گرفتار کر لیا گیا ہے؟" غالب نے سکون سے کہا۔ "خبر اتنی ہی ہے جو میں نے سنائی ہے اور اس میں گرفتاری کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف الزام کی بات ہے جو پولیس نے عائد کیا ہے کیونکہ اس کی گاڑی جائے واردات پر ملی اور اس کے خلاف چار افراد نے ایک ہی بیان دیا ہے۔"

"لیکن یہ تو دہرے قتل کی واردات تھی۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے پہلے طافو کو قتل کیا۔ پھر اس معاملے کو دبانے کے لیے انسپکٹر فتح شیر کو استعمال کیا اور بالآخر اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔"

"یہ تو وہ کہانی ہے جو مجھے محسن نے بھی سنائی تھی۔" وہ ہنسا۔ "میاں سکندرِ اعظم! ہر سنی سنائی بات خبر نہیں بنتی۔ ممکن ہے تفتیش ہو تو یہ بات بھی ثابت ہو جائے لیکن ابھی کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ نہ کوئی چشم دید گواہ، نہ لاش، نہ آلۂ قتل۔ یہ لکھ دیتا خبر میں کہ میرے دوست محسن نے بتایا ہے اس لیے یہ بھی سچ ہے؟"

"ثبوت بھی مل جائیں گے اور چشم دید گواہ بھی۔" میں نے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟"

"ابھی تک تو بکرا خیریت سے ہے۔" غالب بولا۔ "اب مجھ سے پوچھو کہ مجھے ناک آؤٹ کرنے کے بعد فرار ہو کے بکرا کدھر گیا ہوگا۔ بکرا گیا ہوگا کسی تھانے اور وہاں اس نے تھانیدار کو رشوت دے کر ایک رپورٹ لکھوائی ہو گی کہ میری گاڑی اس علاقے سے چوری ہو گئی ہے۔ فرض کرو کسی تھانے میں آخری واردات کی رپورٹ شام چار پانچ بجے درج ہوتی ہے، وہاں اگلی رپورٹ دس پندرہ منٹ کے فرق سے درج کی جا سکتی ہے۔ کسی نہ کسی تھانے میں گنجائش نکل آتی ہے۔ گنجائش تو مال سے نکلتی ہے۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ کسی کام سے آیا تھا اور گاڑی کھڑی کر کے گیا تھا۔ واپس آنے پر اس نے گاڑی کو غائب پایا۔"

"لیکن اس طرح لاہور کے ہر تھانے میں جانے کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟"

"بھولے شاہ۔ وہ اپنے کسی واقف تھانیدار کے پاس گیا ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "اور واقفیت کو گولی مارو۔ وہ سب سے قریب یعنی دھرمپورے کے تھانے میں پہنچا۔ ہزار روپیہ رکھا ایس ایچ او کے ہاتھ پر کہ ٹیلی فون کر کے اتنا معلوم کر دے کہ کس تھانے میں رپورٹ لکھوائی جا سکتی ہے۔ ایس ایچ او نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو دلاور کی مدد کر دی پھر دوسرے ایس ایچ او کو بتا دیا کہ ایک اسامی ارسال کر دی ہے۔ فرض کرو تھانہ کرشن نگر کا ایس ایچ او کہتا ہے کہ میں نے آخری ایف آئی آر پانچ بجے کاٹی تھی۔ دلاور نے آدھ گھنٹے میں کرشن نگر جا کے اپنی رپورٹ پر سوا پانچ بجے کا وقت لکھوا دیا۔ اس کی پوزیشن محفوظ ہو گئی۔ پانچ بجے کے بعد کار کہاں گئی، کیسے گئی، یہ پولیس معلوم کرے۔ رابعہ قاری کی کوٹھی میں ملی تو رابعہ قاری جواب دے ورنہ پولیس بتائے اور پولیس یہ بتائے گی کہ گزشتہ روز سرقے کی فلاں واردات میں یہی کار استعمال ہوئی تھی۔ کون تردید کرے گا پولیس کی؟"

"زبردستی کسی کے سر منڈھ دیں گے گاڑی بھی؟"

"میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے عبرت پکڑ سکتے ہو تو ضرور پکڑو۔" غالب نے کہا۔ "سال بھر پہلے پولیس نے دو ڈاکو پکڑے۔ انھوں نے ایک ڈاکٹر کو ریوالور دکھا کے اس سے کار چھینی تھی جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوست کے گھر سے لوٹ رہا تھا۔ پھر انہوں نے ایک تاجر کے گھر میں ڈاکا ڈالا جہاں سے ان کو دو لاکھ کے زیورات ملے، نقد اور پرائز بانڈ بھی اور این ڈی ایف سی کے شیئر سرٹیفکیٹ اور کالے دھن کا کوئی اندازہ نہیں۔ پولیس کی ایک گشتی پارٹی نے انھیں اس وقت گرفتار کیا جب وہ گاڑی چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ ڈاکوؤں سے تو معاملہ طے پا گیا۔ ففٹی ففٹی یا مال کے بدلے آزادی کے معاہدے پر۔ وہ گرفتار ہوتے تو کتنے کیس بنتے؟ گاڑی چھیننے کا ایک، ناجائز طور پر ریوالور رکھنے کا دوسرا ایکس پلوسو ایکٹ کے تحت، ڈاکا ڈالنے کا تیسرا۔ وہ کم سے کم سات سال کے لیے اندر جاتے۔ پولیس نے مال تقسیم کیا اور گاڑی قبضے میں کر لی کہ فلاں جگہ کھڑی ہوئی ملی۔ ان کی تحویل میں ایک مخبر بھی تھا جو پولیس کا اپنا آدمی تھا مگر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جس گھر میں وہ چوری کرنے گیا تھا اس گھر کے لوگوں نے چور کو تھانے پہنچایا اور بہت خوش ہوئے کہ بڑا تیر مارا۔ وہ ڈیڑھ لاکھ نقد چرا کے بھاگنے والا تھا۔ پولیس نے چور کو فوراً حوالات میں بند کر دیا اور اگلے دن تفتیش شروع کی۔ پہلے تو گھر والوں سے ثبوت مانگا گیا کہ ڈیڑھ لاکھ کہاں سے آیا تھا؟ کتنے دن کی کمائی تھی؟ بینک میں کیوں جمع نہیں کرائی تھی؟ انھوں نے کہا کہ بینک عید اور اتوار کی چھٹیوں کے باعث تین دن بند رہے تھے۔ پولیس نے کہا اچھا تو یہ تین دن کی کمائی تھی۔ انکم ٹیکس کتنا دیتے ہو؟ سرٹیفکیٹ نکالو۔ انھیں ہر روز تھانے بلا کے گھنٹوں بٹھایا جاتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور وہ دیکھتے تھے کہ چور واقعی حوالات میں بند ہے مگر خود ان کی اپنی حالت اس تفتیش کے چکر میں خراب ہو گئی۔ وہ کلڈ باز لوگ ہر روز کس طرح تھانے جاتے اور جاتے تو کاروبار کون سنبھالتا۔ رپورٹ کر کے پھنس گئے تھے۔ پانچ ہزار دے کر انھوں نے اپنی جان چھڑائی۔ پولیس کے پاس صرف مجرم رہ گیا۔ انھوں نے اس مجرم کو دوسری جگہ استعمال کیا جب گاڑی چھین کر ڈاکا ڈالنے والے پولیس سے سودا کر کے نکل گئے تو اس مخبر نے ڈکیتی کی واردات کی ذمہ داری قبول کر لی۔ میں خود ایس ایچ او کے کمرے میں موجود تھا جب وہ میاں بیوی آئے اور ان کے سامنے "ڈاکو" پیش کیا گیا۔ میاں بیوی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ اب "ڈاکو" مُصر ہے کہ آپ دونوں مجھے پہچانیے، میں ہی آپ کا خادم ہوں۔ وہ پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات بیان کر رہا ہے کہ میں نے فلاں جگہ آپ سے گاڑی چھینی تھی۔ اس رنگ اور ماڈل کی گاڑی تھی۔ اس میں یہ سامان تھا مگر میاں بیوی اَڑے ہوئے ہیں کہ یہ تو پہلوان ہے، وہ دُبلا پتلا لڑکا تھا، یہ کالا ہے وہ گورا تھا۔ پولیس بھی مُصر ہے کہ یہی وہ شخص ہے۔"

"اور وہ شخص چوری کے الزام سے بچ کر ڈکیتی کے الزام کو قبول کر رہا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

غالب ہنسا۔ "یہی تو کمال ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ پولیس چالان پیش کرے گی اعتراف جرم کے ساتھ تو عدالت میں ملزم بیان دے گا کہ اس سے زبردستی بیان حاصل کیا گیا ہے۔ پھر کار کے مالک آئیں گے ملزم کو شناخت کرنے کے لیے، شناختی پریڈ میں۔ وہ صاف کہیں گے کہ ان میں ڈاکو نہیں ہے۔ پولیس کا آدمی صاف چھوٹ جائے گا کہ پولیس نے غلط آدمی کو گرفتار کر لیا۔ اصل ڈاکو پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اس کی جگہ لینے والا رہا ہونے کے بعد بھی پولیس کی خدمت کرتا رہے گا اور اسی طرح غلط ملزم بن کے پیش ہونے کا معاوضہ وصول کرتا رہے گا۔ تو میاں سکندرِ اعظم! کوئی چور یہ مان لے گا کہ وہ تمھاری گاڑی لے گیا تھا اور واردات کے بعد اس نے گاڑی فلاں کوٹھی میں کھڑی کر دی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ کوٹھی کس کی تھی۔ چوہدری دلاور بھی محفوظ اور رابعہ قاری ایڈووکیٹ بھی محفوظ۔ وہ ملزم تو پولیس کے سایۂ عاطفت میں محفوظ رہے ہی۔ اب رہ گئے وہ چار کرائے کے بدمعاش۔ وہ کچھ بھی بھونکتے رہیں۔ کرائے پر ملنے والے بدمعاش نہیں ہوتے، غنڈے بھی نہیں ہوتے، بہت گھٹیا درجے کے شہدے ہوتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے مقابلے میں ان کی کون مانے گا۔ ٹیکسی کی چوری کا اعتراف ملزم کر ہی چکے ہیں۔ اب ایک آدھ واردات کا اعتراف پولیس کروا لے گی اور جب چالان پیش کرے گی تو چوہدری صاحب کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ نہ وہ عدالت کے روبرو ایسی کوئی بات کہیں گے کہ انھیں چوہدری صاحب نے کس لیے بھیجا تھا۔ انھیں پولیس کی طرف سے رعایت ملے گی اور چوہدری صاحب کی طرف سے انعام ملے گا۔ اب بولو تم چوہدری صاحب کے خلاف کون سے چشم دید گواہ لاؤ گے اور کیا ثبوت پیش کرو گے؟"

مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ دلاور کے نکل جانے سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا اور مجھے غالب کے بیان پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کا پیسہ اور اثر و رسوخ بہت بڑی طاقت رکھتا تھا جس کے مقابل پولیس بھی بے بس تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی بازی مات نہیں ہوئی۔ میری تحویل میں ایک کیسٹ تھا اور فتح شیر کے مارے جانے کے بعد بھی چار افراد موجود تھے جو فتح شیر کے ماتحت تھے، جتنے دادا تھے اور جرم میں شریک تھے۔ انھوں نے پچاس پچاس ہزار وصول کیے تھے اور طافو کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ راول ڈیم والی بات غلط تھی۔ طافو کو کہیں قریب ہی دریا کے سپرد کیا گیا تھا یا زمین میں گاڑ دیا گیا تھا۔ زمین میں دفن کرنا زیادہ قرینِ قیاس تھا کیونکہ دریا میں پھینکی جانے والی لاش بہتی ہوئی کہیں بھی برآمد ہو سکتی تھی اور وہ چاروں کرائے کے جنازہ بردار بتا سکتے تھے کہ انھوں نے طافو کو کہاں گاڑا تھا۔

"تمھاری خاموشی تمھاری بے بسی کی ترجمان بن گئی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ایسی کی تیسی خود کو بے بس سمجھنے والی کی۔" میں نے کہا۔ "ابھی میں نے سارے پتے نہیں پھینکے ہیں۔ وقت آنے دو، میں ثبوت بھی فراہم کر دوں گا اور شہادت بھی لے آؤں گا۔"

"اور خود عدالت میں حاضر ہو کے پیش کر دوں گا۔" غالب نے میرا مسخرا اڑانے کے انداز میں کہا۔

"میں نہ سہی، میرا کوئی وکیل تو یہ کام کر سکتا ہے۔" میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا اور ٹیڈی کو آواز دی۔

"کیا بات ہے سکندر بادشاہ؟" اس نے سامنے آ کے کہا۔

"ٹیڈی آج کے اخبار لاؤ دوست، جتنے اخبار نکلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"قسم مولا علی کی! پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں یا درم بجا۔ چوہے بھی اتنے بھوکے ہیں کہ اندر دل جگر گردے اور آنتیں سب کھا گئے ہیں۔ خبروں سے پیٹ نہیں بھرے گا۔" ٹیڈی

نے پیٹ پر ہاتھ مارا۔ "دیکھو کیسی ٹن ٹن کی آواز آ رہی ہے۔ بالکل خالی گھڑے جیسی۔ ذرا سا راشن ڈال لوں اس میں پھر لاتا ہوں اخبار۔ یہ نہ ہو بھوکا جاؤں اور کل خود خبر بن جاؤں۔"

محسن اسی وقت باقاعدہ ناشتا لیے نمودار ہوا۔ یہ خود تو صبح ہی پیٹ کا دوزخ بھر چکا ہے۔ اسے کیا معلوم ہم بھوکے فاقہ کش حقیر فقیر بندوں پر کیا بیت رہی ہے۔" اس نے درمیان میں اُبلتی ہوئی چائے کی کیتلی رکھی اور اطمینان سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔

"محسن بھائی، دری تو بچھانے دو۔" ٹیڈی نے کہا۔

"دری اس زمین سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ہندو اس دھرتی کو ماتا کہتے ہیں۔" محسن نے توس پر مکھن پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہم بالآخر اسی زمین کا حصّہ بنتے ہیں۔ دری اور بارہ دری سب دھری رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔ تم بھی بیٹھو یہاں اور زمین کی عطا کردہ نعمتوں کو کھاؤ۔"

"ایک سانس میں اتنی عقلمندی کی باتیں! تیرے دماغ پر بھوک کا اثر ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ سب کو اس کوٹھری میں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا۔" ٹیڈی جذباتی ہونے لگا۔ "آپ سب اتنے معزز لوگ ہیں، اونچے گھروں کے پڑھے لکھے اور عیش و آرام میں پلنے والے۔ میں ایک بدنام اور لاوارث شخص۔ جس کے پاس کچھ نہیں۔"

"تمھارا سب سے بڑا اثاثہ یہ زمین ہے۔" محسن نے اپنا فلسفہ جاری رکھا۔ "جس میں تمھارے خلوص کی خوشبو ہے استاد ٹیڈی۔ یہ خوشبو تو شرفا کی محفلوں میں بھی نہیں ملتی۔ اسی دوستی کی خوشبو نے ہم کو یہاں پہنچا دیا ہے اور ہمارے لیے تمھارا یہ گھر ماں کی گود سے زیادہ محفوظ اور پُرسکون جگہ بن گیا ہے۔"

"جب ایک بار تم کو دوست کہہ دیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم بادشاہ ہو یا فقیر۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے بھی تو دوستی کا حق ادا کر کے ہمیں جیت لیا ہے ٹیڈی۔ چوہدری دلاور ہمیں پچاس لاکھ دے کر بھی نہیں خرید سکا تھا مگر تم نے محبت سے ہمیں بے دام خرید لیا ہے۔ اب ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہی خاندان ہیں۔"

"میری زندگی بھی کتنی بدل گئی ہے اس خاندان میں شامل ہونے کے بعد۔" ٹیڈی بولا۔ "میں نے بہت کچھ چھوڑ دیا ہے جو میں پہلے کرتا تھا۔ وہ دوست اور قسم کے تھے اور دوست کہاں وہ تو دشمن تھے۔ اب تم جیسے دوستوں کے ساتھ میں خود کو بہت بڑا اور عزت والا محسوس کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کوئی مجھے بدمعاش کہے یا سمجھے۔ شہلا میری بہن ہو گئی ہے تو مجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس پر کل اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ کوئی اسے میرے نام کا طعنہ دے۔"

"ہونے والے سالے جی! ایسی باتیں مت کرو۔" محسن نے رقت طاری کر کے کہا۔ "یہ کس کا نام لے لیا کہ نوالہ حلق میں اٹک گیا ہے۔"

"نوالہ؟ میں تو سمجھا تھا جان حلق میں اٹک گئی ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

ناشتے کے بعد ٹیڈی اخبارات جمع کرنے نکل گیا تو میں، محسن اور غالب سگریٹیں جلا کے فرش پر نیم دراز ہو گئے۔ ہمارے کپڑے گرد و غبار سے خراب ہو گئے تھے اور ہم نے دو دن سے نہ شیو بنائی تھی اور نہ منہ ہاتھ دھویا تھا۔

"تم بہت عجیب لوگ ہو۔" غالب نے کہا۔ "کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

"اس کنبے کا نام ہے آر ایم ایس۔" محسن نے کہا۔ "تم کو اس کا رکن بنایا جا سکتا ہے۔ میری سفارش پر۔"

"آر ایم ایس؟ یہ کیا بلا ہے؟" غالب نے حیرانی سے کہا۔

"مائٹ از رائٹ سوسائٹی۔" میں نے کہا۔ "افسوس کہ تم دنیا کی سب سے بڑی، فعّال اور حقیقی طاقت رکھنے والی تنظیم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس میں دنیا کی سپر پاورز، ہر دہشت پسند تنظیم، دنیا بھر کے سرمایہ دار اور وڈیرے،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قانون کے نام پر لاقانونیت مسلط کرنے والے، استحصال پسند ظالم حکمران اور وہ سب شامل ہیں جن کا بول بالا ہے۔ یہ آج کے انسانوں کی تنظیم ہے جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے اور جو باقی دنیا کو بھینس کی طرح ہانک رہے ہیں۔ نظامِ انصاف انہی کا ہے۔ سچ وہی ہے جو لاٹھی والے کہتے ہیں۔ حق انہی کی عطا کردہ خیرات کا نام ہے خواہ وہ جینے کا حق ہو یا مرنے کا۔"

"تم اتنا سچ بولتے ہوئے ڈرتے نہیں؟" غالب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"پہلے ڈرتا تھا لیکن اب تو میں نے بھی لاٹھی اٹھالی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے کتابوں میں لکھی ہوئی خوبصورت مگر کوئی حقیقت نہ رکھنے والی باتوں کو فراموش کر دیا ہے۔ ویسے بھی جنگ میں لاٹھی کام آتی ہے، کتابی نظریات کا اخلاقی فلسفہ نہیں چلتا۔"

"اگر سب لوگ تمہاری طرح ہو جائیں تو دنیا کا کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"دنیا! کون سی دُنیا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایک تو وہ دنیا ہے جسے یوٹوپیا کہتے ہیں۔ انسان کی مثالی جنت کے خواب کی تعبیر۔ اس کا وجود کہاں ہے؟ دوسری یہ عملی دنیا ہے جس میں ہم اور تم زندہ ہیں۔ یہ دنیا ہی ایم آر ایس ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج کوئی سقراط نہ ہوتا؟ کوئی منصور نہ ملتا؟ کوئی مسیحا نہ اٹھتا؟ سچ کون بول رہا ہے۔ یہ اخبارات؟ یہ سیاستدان؟ یہ شیخ و برہمن؟"

ٹیڈی اخبارات کا ایک بنڈل لیے نمودار ہوا۔ غالب نے فوراً اپنا اخبار الگ کر لیا اور جلدی سے اندر کا صفحہ کھول لیا۔ اس کی نگاہ نے اوپر سے نیچے تک دلاور کا چہرہ تلاش کیا۔ رحمت کباڑی کی تصویر کو دیکھا اور میں نے غالب کی صورت پر مایوسی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ محسن نے اور ٹیڈی نے دوسرے اخبارات پر نظر ڈالی لیکن میں غالب کے تاثرات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اس نے ہر کالم میں اوپر سے نیچے تک چھوٹی بڑی ہر سرخی کو پڑھا اور آہستہ آہستہ اس کی مایوسی پہلے جھنجلاہٹ اور پھر برہمی میں بدلنے لگی۔ اچانک اس نے اخبار زمین پر پٹخ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا چہرہ اشتعال سے سُرخ ہو رہا تھا۔

"سالے لوگ۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر چلاتے ہوئے کہا۔ "بزدل، بے ضمیر، گھٹیا اور دو ٹکے پہ بکنے والے یہ سالے غلام ولد غلام ولد غلام۔ یہ اخبارات کے مالک بن گئے ہیں۔ ایڈیٹر اور صحافی کہلاتے ہیں۔ صحافت ان کے لیے دکان ہے جہاں یہ اپنا اخبار بیچتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کمشنر ان کی دکان بند نہ کرا دے۔"

"ہاں۔ لاٹھی والے ہر دکان بند کرا سکتے ہیں۔" میں بولا۔ "سچ کی دکان، ضمیر کی دکان اور حق کی دکان۔"

"بکواس بند کرو۔ لاٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔" غالب نے دہاڑ کر کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں قلم ہے۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "جو لاٹھی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ جب تم تقریریں کرتے تھے کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے تو تم بچے تھے۔ کالج یا اسکول میں پڑھتے تھے اس لیے ناتجربہ کاری کی باتیں کرتے تھے۔ آج تمہارا نیوز فیچر شائع نہیں ہوا تو تم کو جرنلزم کے سبق یاد آ رہے ہیں۔"

"نیوز فیچر کیا، چند سطروں کی خبر تک نہیں ہے۔ میں سمجھ لوں گا اس.... ایڈیٹر سے۔"

"تم لاٹھی اٹھانے پر کمربستہ نظر آتے ہو۔" میں نے کہا۔ "خبر دینا یا نہ دینا ایڈیٹر کا حق ہے۔"

"اس نے اپنا حق استعمال نہیں کیا بلکہ میرا حق چھینا ہے، حق کو بیچا ہے۔" غالب کسی زخم خوردہ درندے کی طرح ٹہلتا رہا۔

"خبر چھپ گئی ہے۔" محسن نے اچانک کہا اور قہقہہ لگایا۔

"لیکن یہ دوسرا اخبار ہے۔ ایک سرکاری اخبار۔"

غالب نے اس سے اخبار جھپٹ لیا اور خبر کو پڑھ کر میری طرف پھینک دیا، اپنے مالک اور مُدیر کی شان میں بھاری بھرکم گالیاں لڑھکاتے ہوئے۔ میں نے اخبار دیکھا۔ اس میں لکھا تھا کہ پُراسرار طور پر غائب ہو جانے والے انسپکٹر فتح شیر کی لاش ایک غیر آباد کوٹھی سے دستیاب ہوئی ہے۔ ان کو کسی نے انتہائی بے دردی سے گلا کاٹ کر ہلاک کر دیا تھا اور پولیس کا خیال ہے کہ یہ واردات کم سے کم چوبیس گھنٹے قبل ہوئی تھی۔ ابتدائی تفتیش سے سامنے آنے والے نتائج کے مطابق قتل کسی پرانی دشمنی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مرحوم کی بیوہ نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ انسپکٹر فتح شیر انتہائی ایماندار، اُصول پرست اور فرض شناس افسر تھے۔ انصاف اور قانون کے معاملے میں وہ کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ تاہم وہ ایک فرض شناس شوہر، شفیق باپ اور نیک انسان تھے اور ان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی لیکن خاندانی زمین کے مسئلے پر ان کا ایک پرانا تنازع چل رہا تھا۔ مرحوم کی میت کل ان کے آبائی گاؤں کھوڑ نزد راولپنڈی روانہ کر دی جائے گی۔ پولیس کے اعلیٰ حکام نے ان کی ناگہانی موت کو ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے پسماندگان سے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ قاتلوں کو بہت

جلد کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔ ضروری ہوا تو خاندانی تنازع کے اسباب کی تفتیش کے لیے ایک خصوصی ٹیم راولپنڈی روانہ کی جائے گی۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔

"گڈ۔ ویری گڈ۔" میں نے اخبار رکھ کے کہا۔ "ماٹٹ از رائٹ۔ خبر اسی طرح آئی جیسے چوہدری دلاور نے چاہا۔ ایسے نہیں جیسے تم نے چاہا تھا مائی ڈیر رپورٹر۔ تمہاری صحافت کے زرّین اصولوں کی ایسی کی تیسی۔"

"میں استعفا اس کے منہ پر ماروں گا۔ دوسرے اخبار میں چلا جاؤں گا۔" غالب نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "اس خبر کو بیچا گیا ہے۔ اس کا مالک اپنا مفاد دیکھنے والا خود غرض اور بزدل سرمایہ دار ہے۔ اس نے دوسرے سے کہا کہ یہ خبر ہے، بولو کیا لو گے؟ دوسرے نے شاید تیسرے سے سودا کیا ہوا اور تیسرے نے دلاور سے رابطہ قائم کر کے پوچھا ہوگا کہ حضورِ والا! آپ کی شان میں ایک معمولی رپورٹر نے گستاخانہ خبر ارسال کی ہے، اسے کیسے لگایا جائے؟"

"چنانچہ خبر میں سے سب کچھ گول۔ رابعہ قاری کا نام، چوہدری دلاور کا نام، گواہوں کے نام، ٹیکسی چوروں کے نام۔ کل مزید تفصیلات کون دے گا؟ کل دوسرا دن ہوگا اور دوسرے دن کی خبریں بھول گی۔" میں نے کہا۔ "کتنی مکمل خبر ہے کہ ایک غیر آباد کوٹھی، ایک پرانا تنازع۔ اگر ضروری ہوا، مائی فٹ۔ وہ ایماندار تھا۔ فرض شناس تھا اور نیک آدمی تھا۔ جھوٹے تم ہو صحافی کی دُم۔ استعفا منہ پر مارو گے تو کون سا تیر مارو گے۔ ہر اخبار صرف اخبار ہوتا ہے اور اس کا مالک کوئی مردِ مجاہد نہیں ہوتا جو نیکی بدی کی جنگ میں ملوث ہو۔ وہ صرف اخبار فروش ہوتا ہے۔ تم خود بھی اخبار نکالو گے تو یہی کرو گے مرزا غالب!"

"شٹ اپ۔ تم زیادتی کر رہے ہو۔" غالب نے چلا کے کہا۔ "پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ سب کو بُرا مت کہو۔ ان میں سچے اور کھرے صحافی بھی ہیں۔"

"وہ گھاس کھود رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مولانا ظفر علی خان مرحوم کے 'زمیندار' اخبار کا یا مولانا محمد علی جوہر کے 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ ماٹٹ از رائٹ کا زمانہ ہے۔"

"ایک اخبار ہے صدائے وقت۔" غالب نے محض میری دلیل کو رد کرنے کے لیے کہا۔ "دوسرا ہے روزنامہ حقیقت۔"

"پہلے اخبار کا ایڈیٹر جان بچا کے بھاگ گیا ہے۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اس کا مالک بس میں دفتر آتا جاتا ہے اور عملے سے ہر ماہ پوری تنخواہ نہ دینے کی معافی مانگتا ہے اور عملہ اسے معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہاں تم جیسے سر پھرے لوگ ہیں جو دال روٹی کھا کے سچ بولنے کے عہد پر کاربند ہیں۔ روزنامہ 'حقیقت' کا حال اس سے بھی ابتر ہے..... کسی دن کوئی چوہدری دلاور اسے خرید لے گا۔"

"ایم آر ایس کا منشور کیا ہے؟" غالب نے دھم سے زمین پر بیٹھ کے کہا۔

"حق و صداقت کی خاطر جان کی بازی لگا دینا۔ ہر جھوٹے اور ظالم فرعون کے خلاف آواز اٹھانا۔ جہاں ضمیر کی گواہی سچی ہو وہاں کسی کی گواہی تسلیم نہ کرنا۔ اثر رسوخ اور دولت کی طاقت کے بل پر انصاف کو گمراہ کرنے اور سزا سے بچ جانے والوں کو اپنی عدالتِ انصاف سے قانون کے مطابق سزا دینا اور اس پر عملدرآمد کرنا۔ ایک بے کردار معاشرے کی بدنام پولیس اور کمزور نظامِ عدل کے بجائے اپنے وسائل، اپنی قوتِ بازو اور اپنے خدا کی تائید پر بھروسہ کرنا۔" میں نے کہا۔

"میں اس منشور کے مطابق ایم آر ایس سے وفاداری کا حلف اٹھاتا ہوں۔" غالب نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔

"قسم مولا علی کی! ہم تو پہلے ہی ساتھ تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "لیکن ہم بھی آج حلف اٹھاتے ہیں۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

"ایم آر ایس کے چیئرمین تم کو مصافحے کا شرف بخشتے ہیں۔" میں نے غالب سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "وقت آنے پر تم کو دوسرے معزز ارکان سے ملوایا جائے گا۔ مسماۃ رابعہ قاری، شہلا خانم اور ایک غیر سرکاری رکن، مِس نازلی۔"

"ایم آر ایس کے سات ارکان کی طرف سے میں خود کو چیئرمین نامزد کرتا ہوں اور تمہارا تختہ الٹتا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"کورم پورا نہیں ہے، اس لیے میں آپ کو الٹتا ہوں۔" میں نے محسن کو بڑی پھرتی سے اٹھایا اور سر کے اوپر سے پلنگ پہ پھینک دیا۔ غالب دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کی نظریں مجھے حیرت سے بھی دیکھ رہی تھیں اور ستائش کے جذبات کے ساتھ بھی۔ ٹیڈی ہنس رہا تھا کیونکہ محسن ایک ہچکی لے کر یوں ساکت ہو گیا جیسے چیئرمین بننے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے گیا۔

"ابھی تو میں اپنے ایڈیٹر سے نمٹنے جا رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "شام کو کہاں ملو گے؟"

"اسی جگہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن خیال رکھنا، رازداری اب تمہارے لیے شرطِ اوّل ہے۔"

"پہلے مجھے ہر راز معلوم ہونا چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "پھر اوّل و آخر کرنا۔"

"شام کو ہم سب بتا دیں گے۔ اگر ہم نہ ملیں تو تشویش میں مبتلا نہ ہونا، انتظار کرنا۔" میں نے کہا۔

غالب کے جانے کے بعد میں نے محسن کو منظر سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ محسن نے اتفاق کیا کہ فی الحال رابعہ کا ساتھ نہ ہونا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سب کے مفاد میں ہے لیکن یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید رابعہ نہ مانے۔

"دلاور اپنی کامیابی پر بہت مسرور ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "خوشی سے بغلیں بجا رہا ہوگا۔"

"بجانے دے۔ وقت آئے گا تو دیکھنا ہم کیا بجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس عارضی فتح نے دلاور کو پھر اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ وہ خود کو ہم سے زیادہ چالاک اور اپنے اثر و رسوخ کو ہم پر حاوی سمجھتا رہے تو زیادہ اچھا ہے۔ ہم کو اب اپنی حکمت عملی یعنی اسٹریٹیجی بدلنی ہے۔ ہم اب کھلی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں۔ اسے دھوکا دو کہ ہم پسپا ہوگئے اور ہم نے خود کو کمزور مان لیا۔ خود کو کیموفلاج کیے بغیر ہم کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ کھل کر کارروائی کرنے سے کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ اب میری اور دلاور کی جنگ نہیں ہے، یہ ملک کی بقا کے لیے دشمنوں کی اور محب وطن طاقتوں کی جنگ ہے۔ ہم نے ایک جگہ سامنے آ کے ایک محاذ پر فتح حاصل کر لی تو وہ سب دشمن زیر زمین چلے جائیں گے جو اس وقت اطمینان سے وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ تو ثابت ہوگیا ہے کہ دلاور منشیات کا نہیں ناجائز اسلحے کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ ناجائز اسلحہ کسے فراہم کرتا ہے؟"

"چوروں اور ڈاکوؤں کو، سماج دشمن عناصر کو؟" محسن بولا۔

"یہ بھی ملک دشمن ہی کی صف میں آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے یہ کاروبار وسیع پیمانے پر نہیں ہو سکتا۔"

"تیرا مطلب ہے وہ ناجائز اسلحے کی درآمد برآمد کرتا ہے؟"

"بہت سے امکانات ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک تو یہ کہ وہ اسلحہ کسی بیرونی دشمن کو فراہم کرتا ہے لیکن دوسرا زیادہ سنگین مسئلہ اندرونی دشمنوں کا ہے۔ اس وقت کے سیاسی حالات پر غور کر۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کے حالات پر۔ جہاں کچھ شرپسند عناصر اور علیٰحدگی پسند عناصر کی تخریبی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان کی مدد کون کر رہا ہے؟ ایک تو ہمارا ہمسایہ اور پرانا دشمن ملک ہے جو یقیناً ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

"یہ اندیشے تو اب کھل کر سامنے آگئے ہیں کہ وہاں بیرونی مداخلت جاری ہے۔" محسن نے کہا۔

"دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے، ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے تیار بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن بات اندر کے دشمنوں کی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب کتنا ہے؟ کیا ان سب نے پاکستان کے وجود اور دو قومی نظریے کو صدق دل سے قبول کر لیا۔ ہندوؤں کا سرمایہ ہی علیٰحدگی پسندوں کی پشت پناہی کر رہا اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کی خاطر استعمال کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دلاور بھی وہاں اسلحہ بھیجتا ہے۔"

"یہ ایک امکان ہے جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔" کہا۔ "کیا یہاں غدار نہیں ہیں؟ بیس سال کی تاریخ کا سبق اور دلاور کا کردار ایک ضمیر فروش کا ہی نہیں، وطن فروش بھی ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت خطرناک چکر ہے۔" محسن نے کہا۔ "دلا... علاوہ نہ جانے ہمارے کتنے دشمن ہوں گے؟"

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دلاور کے مددگار دش... ایجنٹ ہوں۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان سے منہ مانگی قیم... وصول کرتا ہو اور پھر دشمن ملک کے راستے یہ اسلحہ... پاکستان پہنچتا ہو اور تخریب کاروں میں تقسیم کر دیا جاتا..."

"اور دلاور کو یہ اسلحہ کون فراہم کرتا ہوگا؟ کیا دلاور... ایجنٹ ہے؟" محسن بولا۔ "اسلحے کی تقسیم و ترسیل کے ل... ایک ذریعہ ہے؟"

"میں دوسرے امکان پر غور کرتا ہوں تو حالات سلجھتی نظر آتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ ا... بن رہا ہے، دلاور کی فیکٹری میں۔ ایم ڈبلیو ڈی کیمیکل... اسلحہ ساز ادارہ ہے۔"

محسن ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ ڈیڈ... صورت کو دیکھتا تھا کبھی محسن کی۔ ہم فارسی نہیں بول... تھے لیکن یہ باتیں اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔

"میں سخت شرمسار ہوں کہ یہ موٹی بات میری عقل... نہیں آئی۔ حالانکہ میں کافی باریک بین ہوں۔ یہ تو کوئی... نہیں یہاں جن مشینوں پر زرعی مشینری کے پرزے... وہاں ریوالور بھی بن سکتے ہیں۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ... کوئی معمولی فاؤنڈری نہیں ہے اور وہاں صرف ما... مشینیں نہیں ہیں۔ اس میں بالکل جدید قسم کی خودکار... ہے جس سے ہر پیچیدہ پرزہ تیار ہو جاتا ہے۔ پھر... پستول کیا چیز ہے۔ اس میں اعلیٰ فولاد سے ڈھلی ہ... کے علاوہ چند گنی چنی چرخیاں اور گراریاں ہی تو ہوتی ہیں... پرزے معمولی اور ساخت کے اعتبار سے سا... سارا کام بس مہارت اور معیار کا ہے۔ تو وہاں جو... وہ سوئی کے ہزارویں حصے کا فرق بھی نکال دیتی ہیں۔

...ٹھیک لگتا ہے۔ وہاں زرعی آلات کے بجائے یہ ...سامان تیار ہو رہا ہے۔ بھوکے انسانوں کا پیٹ بھرنے ...مشینری کے پرزے نہیں بن رہے ہیں بلکہ اسکی آڑ میں ...انسانوں کے پیٹ میں گولیاں اتارنے کا سامان بن ...ہے۔ لیکن سکندر! اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ کیموفلاج ...بہت ضروری ہے۔ دلاور کو یہی تاثر دینا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں اور یہ دشمنی ذاتی ہے۔ اس نے میرے باپ کو مارا، اس کا سب کچھ چھین لیا اور اسے بلیک میل کر کے خاموش رہنے پر مجبور کیا۔"

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "وہ جانتا ہے ہمیں اس کے کاروبار کی نوعیت پر بھی شک ہے۔"

"ہاں شک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں شک ہے کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے۔ ہمیں شور یہی مچانا ہے کہ ہمیں سب معلوم ہے۔ ہر جگہ یہی کہنا ہے اور دلاور کو بھی بتانا ہے کہ ہم منشیات کا یہ دھندا نہیں چلنے دیں گے۔ باقی میرے ذاتی انتقام کا جھگڑا ہوگا۔ دلاور مطمئن رہے گا کہ ہم غلط راستے پر بھٹک رہے ہیں چنانچہ اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں اور اس کے ایجنٹ بھی محفوظ ہیں۔ درپردہ ہم کو یہی کھوج لگانا ہے کہ اسلحہ کہاں بنتا ہے، کتنا بنتا ہے۔ کس طرح کون کون اسے آگے پہنچاتا ہے، اس کا راستہ کیا ہے اور اس راستے پر منزل سے پہلے کتنے اسٹیشن ہیں! منزل پر پہنچنے کے بعد یہ اسلحہ کس کے ہاتھ سے تقسیم ہوتا ہے۔ یہ ایک زنجیر ہے اور ہمیں ایک کڑی سے دوسری کڑی کو پکڑنا ہے۔ اگر ہمارا راز فاش ہوگیا تو نہ صرف ہم لاتعداد نامعلوم دشمنوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ ایک ناکامی سے سب کچھ بدل جائے گا۔ لوگ چہرے بدل لیں گے۔ نام بدل لیے جائیں گے اور راستے بدل لیں گے۔ اگر یہ اسلحہ واقعی مشرقی پاکستان جاتا ہے تو اس کے دو تین راستے ہوں گے۔ ایک راستہ کراچی سے بحری جہاز کے ذریعے چٹاگانگ تک ہے جو سب سے محفوظ اور آسان راستہ ہے۔ اس سے زیادہ مال کم خرچ پر بھیجا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے کریٹ کارٹن اور کنٹینر ہوں تو اسلحہ چھپانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ دوسرا متبادل راستہ خشکی کا ہے جو بحری راستہ بند ہونے کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ...پار کر اور راجستھان کے بعد بھارت کے اسمگلر یہ مال آگے پہنچا سکتے ہیں لیکن ہمیں گلگت اور کشمیر کی طرف سے لداخ اور ...کا دشوار گزار راستہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے مگر یہ ...ہیں۔ پہلے یہاں تصدیق کرنی ہے مکمل رازداری کے ساتھ۔"

"میرے خیال میں تو اب تصدیق غیر ضروری ہے۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آتی ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی ہے کہ میرے والد وزیر خان نے بھی اس کاروبار کی بو پالی تھی۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ ان کا داخلہ فیکٹری میں بند کر دیا گیا اور جب انھوں نے شک کا اظہار کیا یا کوئی دھمکی دی تو ان پر واضح کر دیا گیا کہ یہاں ان کی اور ولایت میں ان کے بیٹے کی زندگی ختم کر دی جائے گی۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہو لیکن میرے والد نے میری خاطر ان سے رحم کی بھیک مانگی ہوگی۔ انھیں اپنی زندگی عزیز نہیں تھی صرف میرا خیال تھا۔ میری خاطر انھوں نے دلاور کی ہر بات مان لی۔ جیسا اس نے کہا ویسا ہی کیا اور لب نہیں کھولے۔ اس نے جہاں کہا وہاں دستخط کر دیے اور جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کیا ویسی زندگی گزار لی۔ اس کے باوجود بھی دلاور اینڈ کمپنی مطمئن نہیں تھی۔ انھیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ وزیر خان چپکے سے بیٹے کو چٹھی نہ لکھ مارے چنانچہ وہاں میرے کمرے کی تلاشی لی گئی اور میرے سارے خطوط دیکھے گئے۔ میری مصیبتوں کا آغاز بھی اس لڑکی نے کیا تھا جو میرے کمرے میں میری میز کی درازوں سے کچھ نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اس لیے قتل ہوئی کہ پکڑی گئی۔ اس کی نگرانی کرنے والے شخص کتنے باخبر اور کتنے طاقتور تھے۔ پھر مجھے انگلستان سے یہاں بلوایا گیا تھا تو اس کا مقصد بھی یہ معلوم کرنا تھا کہ میں حقائق سے کس حد تک باخبر ہوں۔ ظاہر ہے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا چنانچہ میں زندہ ہوں۔ دلاور سے ذاتی دشمنی کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کاروبار کو صرف دلاور کی ملکیت کیسے بنایا جائے۔ اب تو میں نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ میرے مرنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تیری جگہ رابعہ، رابعہ کے بعد شہلا۔ یہ انتظام ہڈی بن کے اٹک گیا ہے ان کے گلے میں اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اب اس کھیل کو یونہی چلنے دیں تاکہ اصل کاروبار پر نقاب پڑی رہے۔ ہم بھی یہی کریں گے کہ انجان بنے دشمنی نبھاتے رہیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ اصل راز کو ہم پا چکے ہیں۔"

"ہم تین جو اس وقت یہاں موجود ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ان کے علاوہ یہ بات اور کسے معلوم ہوگی؟"

"غالب کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تیرے اور ڈیڈی کے بارے میں ہے۔" محسن نے کہا۔

"پھر اسے بتایا جا سکتا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اگر اس آئی شیخ واقعی مستعفی ہو چکا ہے تو اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔"

"شیخ کو۔ جو تیرا دشمن ہے۔ تو نے اس کا کیریئر، ذہنی سکون

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اوران کے گھر کی خوشی سب کو تباہ کردیا؟"

"تو شیخ کو نہیں جانتا۔ وہ میری ذات کا دشمن ہو سکتا ہے لیکن میرا مشن وطن دشمنوں سے جہاد ہو تو وہ ذاتی دشمنی کے جذبات کو فراموش کر سکتا ہے۔ میری حفاظت کے لیے اپنی جان دے سکتا ہے۔ اس کے لیے سب کچھ اس کے اصول ہیں۔ وہ ادائے فرض کے معاملے میں انتہا پسند ہے۔ وہ ایک انتہائی مضبوط سہارا ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ میں اور وہ ذاتی سطح سے ہٹ کر ایک عظیم تر مقصد کی خاطر اکٹھے ہو جائیں اور یہ ممکن ہے۔ اس نے پولیس فورس میں بھی اسی عزم اور یقین کے ساتھ شرکت کی تھی کہ وہ اپنی تمام توانائی بدی کے خلاف جنگ کرنے اور لوگوں کو قانون کی مدد سے تحفظ فراہم کرنے میں صرف کر دے گا۔ اسے شکست اس لیے ہوئی کہ وہ کھلی جنگ لڑ رہا تھا اور قانون کے دشمن اس لیے زیادہ طاقتور ہو گئے تھے کہ خود قانون کے محافظان کے پشت پناہ تھے۔ ہمارا مقصد بھی مختلف نہیں۔ وہ ذہین بھی ہے، یہ بات سمجھ لے گا مگر فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرنا ضروری نہیں۔ رابعہ کو جب تک یہ بات معلوم نہ ہو ٹھیک ہے لیکن بالآخر اسے شریکِ راز کرنا پڑے گا۔ وہ ثابت کر چکی ہے کہ ہمت اور حوصلے، قوتِ برداشت اور صبر و استقامت میں وہ لاکھوں مردوں سے بہتر ہے۔"

"اور مشن تیرا ہو تو تن من دھن بہت کچھ قربان کر سکتی ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔

"چل یوں ہی سہی مگر اسے بتانا ہوگا ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی مجھ سے۔" میں نے کہا۔

"ابھی شادی ہوئی نہیں اور تو نے ڈرنا شروع کر دیا؟ بعد میں تیرا انجام عبرتناک ہوگا زن مرید۔"

"تیری اس چوہیا کو کچھ بتانے سے نقصان ہو سکتا ہے جو ایک بزدل، بے وقوف اور کمزور لڑکی ہے۔ وہ امورِ خانہ داری میں تو بہت کچھ کر سکتی ہے لیکن باہر کچھ نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔

"میاں ٹیڈی۔" محسن چلایا۔ "لانا کوئی توپ وغیرہ۔ اس نامعقول نے ایک سانس میں کیا کیا بک دیا۔ ہم کو چوہا قرار دے دیا۔ اپنی اہلیہ محترمہ کے بارے میں یہ گستاخانہ کلمات ہم برداشت نہیں کر سکتے وہ کچھ نہیں کر سکتی مگر ہم تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم قتلِ عام کر دیں گے۔"

"جب آم کا موسم آئے تو قتلِ آم ضرور کرنا۔" میں نے کہا۔ "ابھی میرے ساتھ چل۔ کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا وہ کون لوگ ہیں۔" محسن بولا۔ "تو انسپکٹر فتح شیر کے ہمراہ جانے والے چار ماتحتوں سے ملنا چاہتا ہے نا؟ میرا خیال ہے پہلے مرزا غالب کو ان کے نام پتے معلوم کرنے دے اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔"

"یہ تیرا رپورٹر دوست غالب رہتا کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا والی وارث ہے کوئی؟"

"سب ہیں۔ کراچی میں باپ کا بزنس ہے۔ وہ چاہتا تھا بیٹا اس کا کام سنبھالے۔" محسن نے کہا۔ "ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی ریت کی دیواروں سے محل تعمیر کرتی تھی اور تا قیامت ان کی پائیداری اور استحکام کی ضمانت دیتی تھی۔ کوئی عمارت تعمیر کے فوراً بعد گری اور اس میں خاصے لوگ ہلاک ہوئے۔ بیٹے نے تحقیقات کیں باپ کے خلاف گواہی دی کہ جب سیمنٹ اتنا بھی نہیں ہو گا جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے تو عمارت کھڑی کیسے رہ سکتی ہے۔ اس نے باپ کی تمام دولت کی قلعی کھول دی اور اسے ان سب کا قاتل ٹھہرایا جو عمارت گرنے سے مرے تھے۔ باپ تو خیر رشوت سفارشوں کے زور پر بچ گیا لیکن اس نے ناخلف بیٹے کو عاق کر دیا جس کے سر پہ پہلے سے صحافت کا بھوت سوار تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں پیدائشی طور پر موسیقار۔ کرکٹر یا مصور، تو ایسے ہی صحافی بھی ہیں۔ شوق کے جراثیم موروثی طور پر خون میں شامل ہوتے ہیں عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق خبط بن جاتا ہے اور پھر جنون۔ دنیا کی کوئی چیز ان کے شوق کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "موسیقار نو... نے فلسفے میں ایم اے کیا، گولڈ میڈل لیا۔ پھر آئی سی ایس میں ... لی۔ اس زمانے میں کتنے مسلمان آئی سی ایس ہوتے تھے؟ ... بھائی بنے کیا؟ موسیقار۔ سب نام و نمود اور حرص و ہوس ... دھندوں کو چھوڑ دیا۔ گل جی کو دیکھو۔ انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ... بنے کیا؟ مصور۔"

"تو ایسے ہی اپنا یہ نیا مرزا غالب ہے۔ پیدا ہوا تو صحافی تھا، مرے گا تو صحافی۔" محسن نے کہا۔ "اب کبھی کبھی چوری چھپے لاہور جا کے ماں سے مل آتا ہے۔ ایک شادی شدہ بہن سرگودھا میں ہے کسی ایئر فورس آفیسر کی بیوی۔ اس سے مل آتا ہے۔ لیکن گھر سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہاں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ بہت کم وہاں ... ہے۔ آفس میں ٹیبل رکھ کے سو جاتا ہے کبھی پارک میں ڈیرے پہ پڑ جاتا ہے۔"

"رات کو سنتری بادشاہ نہیں پکڑتے آوارہ گردی پر؟ پکڑتے ہیں۔ پریس کارڈ دیکھتے ہیں تو رفو چکر ہو جاتے ہیں۔"

محسن بولا۔ "اچھی خاصی تنخواہ ہے مگر سب کھانے پینے میں اڑا دیتا ہے، یار دوستوں کے ساتھ۔ کپڑوں کے یہی دو جوڑے ہیں ایک دھوتا ہے تو دوسرا پہن لیتا ہے۔ پورا مردِ آزاد ہے۔ یار ... اپنی موٹر سائیکل ہے۔ اسے اپنی رفیقِ حیات کہتا ہے کہ ہر جگہ میرا ساتھ دیتی ہے۔"

"ایسا آدمی ہی ہمارے کام آسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جسے رشتے عزیز ہوں، وہ ڈرتا ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد تن آسانی ہے پیسہ کمانا ہو، وہ ڈرتا ہے۔ جو شہرت کا بھوکا ہو، وہ ڈرتا ہے لیکن جس آدمی کو کچھ مطلوب ہی نہ ہو اور جو صرف اپنے لیے جیتا ہو، وہ کیوں ڈرے گا۔ اس سے شام کو بات کریں گے۔ تیرا خیال ٹھیک ہے۔ ان چاروں سپاہیوں کا پتا وہ معلوم کر لائے گا تو باقی باتیں ہم معلوم کر لیں گے۔ لیکن اس وقت باہر نکل۔ ایک اور کام تو کر سکتے ہیں ہم۔ کام بڑا ہے مگر اس کا آغاز تو کیا جا سکتا ہے۔ الف دین نے بھی قصرِ جمشید کے نیچے ایک سرنگ کی موجودگی کی تصدیق کی تھی جو تہ خانے سے کسی دوسری جگہ نکلتی ہے۔ جہاں سے ایک ٹرک مال لے کر روانہ ہوتا تھا، ہم وہ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"

"قصرِ جمشید کے نیچے تہ خانہ ہے۔" محسن بولا۔ "یہ تو میں مانتا ہوں۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہاں سے نکلنے والی سرنگ کس طرف ہے؟"

"خدا نے جو چار سمتیں بنائی ہیں ان میں سے ایک سمت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے پہلے سمت کا تعین کرنا پڑے گا اور یہ بھی آسان کام بہرحال نہیں ہے۔ پہلے سروے کریں گے اور امکانات کا جائزہ لیں گے۔"

"اور سروے کرتے ہوئے پکڑے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟"

"مزار شریف۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اسی قصرِ جمشید کے تہ خانے میں۔ اکیلے نہیں ہوں گے ہم وہاں۔ دیگر ارواح بھی ہوں گی۔"

ٹیڈی نے باہر جا کے صورتِ حالات کا مشاہدہ کیا اور سب خیریت ہے کی رپورٹ دی تو میں اور محسن باہر نکلے ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت تھا اور سورج سر پر آنے لگا تھا۔ اس کی خوشگوار تمازت اور اجلی دھوپ نے دل میں جینے کی امنگ کو تازہ کیا اور میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا تو گزشتہ شب کی ناکامی کا صدمہ کم ہو چکا تھا۔ استاد ٹیڈی نے ہماری ہدایت پر ایک پولیس انسپکٹر اور ایک پوسٹ مین کی وردی ساتھ رکھ دی تھی تاکہ ضرورت پڑے تو ہم حلیہ بدل سکیں۔ ایک ایک ریوالور ہم سب کے پاس تھا۔ دلاور کا تحفہ سائلنسر والا ریوالور میں نے اپنے پاس رکھا تھا۔

"وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم شیو بنانا چھوڑ دیں۔" محسن نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہم دو ہفتے میں باقاعدہ قسم کی داڑھی مونچھ کے مالک بن سکتے ہیں۔ اصلی اور ناقابلِ انتقال۔ جن کو حسبِ ضرورت کاشت کیا جا سکتا ہے اور اپنے پسندیدہ شیڈ میں رنگا جا سکتا ہے۔ اس سے چہرہ پچاس فیصد بدل جاتا ہے۔"

"پچیس فیصد تبدیلی بالوں کا اسٹائل بدلنے سے لائی جا سکتی ہے۔" میں نے تائید کی۔ "مثلاً میں عالم لوہار کی طرح زلفیں رکھ لوں اور تو "یل برائنز" کی طرح اسمارٹ ہو جائے، سر کی شیو کرتا تھا وہ ہر روز۔"

ٹیڈی ہنس پڑا۔ "قسم مولا علی کی، کیا چیز لگو گے۔"

"میں بحیثیت چیئرمین اس تجویز پر عمل درآمد کا حکم دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آج سے شیو تا حکمِ ثانی معطل۔"

"مجھے منظور ہے لیکن عالم لوہار میں بنوں گا۔" محسن بولا۔ "یل برائنز کی طرح اسمارٹ تو ہو جا۔"

"ڈسپلن کے بغیر ایم آر ایس نہیں چل سکتی۔" میں نے غرا کر کہا۔ "آرڈر از آرڈر۔"

"میں علمِ بغاوت بلند کر چکا ہوں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟" محسن نے مسرت سے کہا۔ "تجھے گنجا ہونا پڑے گا۔"

"اچھا ہم ٹاس کر لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نفاق سے کیا فائدہ۔ ضد میری ہو یا تیری۔" میں نے گاڑی روک کر جیب سے سکہ نکالا اور اوپر اچھال کے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔

"چاند تارا۔ اگر چاند تارا ہوگا اوپر تو میں جیتا۔ میں اپنی مرضی کا ہیر اسٹائل منتخب کروں گا۔" محسن نے کہا۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ سکہ الٹا تھا یعنی چاند تارا نیچے کی طرف تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔ "منگواؤں استرا؟" میں نے کہا۔

"یہ بے ایمانی تھی۔" محسن نے کہا۔ "سکے پر چاند تارا تھا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ جیتنے والے کو اپنی مرضی کا ہیر اسٹائل اختیار کرنے کا حق حاصل ہوا ہے۔ ہارنے والے پر اپنی مرضی کا ہیر اسٹائل تھوپنے کا نہیں۔ بے شک اب تو چاہے تو عالم لوہار جیسی زلفیں رکھ سکتا ہے یا یل برائنز کی طرح فارغ البال ہو سکتا ہے۔ مگر میں مجبور نہیں ہوں گنجا ہونے پر۔"

"تو لفظوں سے کھیل رہا ہے۔" میں نے بلڑ مچایا۔

"ٹاس اسی لیے ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "ویسے میں بھی بدل لوں گا بالوں کا انداز۔ میں مکرانی ٹائپ بن سکتا ہوں یا افریقی۔ پاپ سنگر کا اسٹائل اختیار کر سکتا ہوں۔ بیا کے گھونسلے کی طرح۔"

اچانک میری نگاہ ایک دیوار پر گئی اور میں نے بریک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لگاکے گاڑی کو احاطے کے دروازے سے اندر موڑ لیا۔ "تم دونوں بیٹھو۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" میں نے اترتے ہوئے کہا۔

ایک بار میں پھر اسی اسکول کی پرنسپل کے مقابل پہنچا جس نے مجھے الف دین کا پتا فراہم کیا تھا۔

"یس....؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ "اب کیا چاہیے؟ میں نے الف دین کا پتا دے دیا تھا تمہیں۔"

"وہ پتا غلط تھا۔" میں نے اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

پرنسپل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیا؟ پتا غلط تھا؟ تم جانتے ہو میں نے خود رجسٹر سے لکھ کر دیا تھا؟"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ آپ نے پتا درست لکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے میں نے جانتے بوجھتے تم کو غلط پتا لکھ کر دیا تھا؟" وہ بگڑ کے بولی۔

"نہیں، میرا مطلب کچھ اور تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے الف دین وہاں نہیں ملا تھا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" پرنسپل چڑ کے بولی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ گھنٹی کی طرف بڑھا۔ میں نے گھنٹی اٹھالی۔

"مجھے وہ پتا دے دو، جہاں الف دین آج مل سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آج...؟ آج بھی اسے وہیں ہونا چاہیے اور اگر اس نے پتا بدل لیا ہے تو میں کیا جانوں وہ کہاں گیا ہے۔"

"آپ کو اپنی بڑی بہن کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

میرے الفاظ کا وہی اثر ہوا جو میں چاہتا تھا۔ پرنسپل کا رنگ اڑ گیا اور اس کے مزاج کا سارا کرارا پن رخصت ہو گیا۔ وہ شکست خوردہ اور نروس نظر آنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی رہیں۔

"وہ آپ کی بڑی بہن ہی نہیں، اسکول کی مالک بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ریکارڈ پر وہ ہیڈ مسٹریس ہیں حالانکہ وہ ایک ان پڑھ خاتون ہیں۔ پرنسپل آپ ہیں۔"

"تم... تم کون ہو۔ اور یہ سب کیسے جانتے ہو؟" پرنسپل نے میز پر سے گلاس اٹھا کے ایک گھونٹ پانی پیا۔

"مجھے خود الف دین نے بتایا تھا اور بھی باتیں تھیں جو شاید آپ کے علم میں بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کی اور بڑی بہن کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے لیکن کوئی شک بھی نہیں کر سکتا کہ الف دین کی جاہل بیوی سے آپ کا کیا ہے اور آپ اسی کی ملازم ہیں۔ میں اسے ملازمت نہیں بہن کی شفقت بھی سمجھتا ہوں اور ضرورت بھی۔ اسے اسکو چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور نہ اس میں اتنی صلاحیت تھی وہ کوئی بھی پرنسپل رکھ سکتی تھی لیکن چھوٹی بہن تعلیم یافتہ ہو سب سے بہتر۔ آپ کو باعزت روزگار مل گیا اور الف دین باعزت روزی کا ذریعہ۔ وہ بہت عظیم آدمی ہے۔ بہت اچھا ہے۔ اچھا آدمی وہ ہوتا ہے جس کا باطن اچھا ہو۔ ظاہر تو کسی بھی اچھا نظر آجاتا ہے...!"

"کیا اس نے تمھیں اس لیے یہ راز کیا تھا کہ تم اس تشہیر کرو؟" پرنسپل نے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بات صرف میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یا آپ ہیں۔ کسی تیسرے شخص کو اس کا علم نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال تھا وہ اپنے گھر جائیں گے۔ اپنے گاؤں" وہ افسردگی سے بولی۔ "لیکن الف دین بہت زیادہ خوفزدہ اس نے بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس نے کہا تھا کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے اور وہ ملتے ہی مجھے اطلاع کر دے گا۔ میں کیا بتاؤں کہ آج وہ کہاں ہے۔"

"اس کے کچھ دشمن ہیں۔ جو بہت بااثر اور طاقتور ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ کو خطرہ محسوس نہیں ہوتا کہ جو سوال میں نے آپ سے کیا ہے، وہی سوال لے کر الف دین کے دشمن بھی آسکتے ہیں؟ اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ یا تو صحیح جواب لے کر جائیں گے ورنہ آپ کو لے کر جائیں گے۔ آپ کے دو چیزیں ہیں، جسم اور جان۔"

پرنسپل کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔ "میں نے کہ یہ بات کوئی نہیں جانتا۔" وہ بولی۔

"اگر آپ کو اتنا ہی یقین ہے تو ٹھیک ہے لیکن مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہوں۔ آپ کا یقین... غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ جاننے والے سب جان لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے" وہ گھبراہٹ میں بولی۔

"آپ کو استعفا دے کر نکل جانا چاہیے۔ آج ہی" نے کہا۔ "کسی دوسرے شہر میں آپ پرنسپل نہیں ہوں گی ٹیچر تو بن ہی جائیں گی۔ کسی اجنبی شہر میں جہاں آپ کا شناسا کوئی نہ ہو۔ آپ ہوسٹل میں رہیں اور اپنے ... کا نام

ہیں۔ کم سے کم ایک سال تک۔ وہاں کون ہے، آپ کے آبائی گھر میں؟"

"کوئی نہیں۔ والدین تھے دو سال پہلے۔ اب گھر بند پڑا ہے۔" وہ بولی۔

"پھر فکر کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن میں یوں غائب ہو گئی تو بعد میں باجی سے کیسے رابطہ قائم ہوگا؟ ہو سکتا ہے الف دین خط لکھے۔"

"پہلے زندگی کو بچانے کی تدبیر کیجیے۔" میں نے کہا۔ "خدا چاہے گا تو ملاقات کی سبیل بھی نکل آئے گی۔ میں بس اتنا ہی کہنے کے لیے رکا تھا۔"

"اپنا نام پتا کچھ تو دے کر جاؤ۔" وہ ایک دم اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف سے کانپ رہی ہے۔

"سوری!" میں نے کہا۔ "بس اتنا ہی یاد رکھنا کہ میں ایک خیر خواہ تھا۔ خدا حافظ۔"

محسن اور ٹیڈی پانچ منٹ کے بجائے پندرہ منٹ تک انتظار کر کے بور ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے معذرت کی۔ "میرا خیال تھا کہ یہاں سے الف دین کا پتا مل سکتا ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"اب الف دین کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟" محسن نے جھنجھلا کے کہا۔

"وہ... دراصل اس نے وہ سرنگ دیکھی تھی۔ وہ جگہ دیکھی تھی۔" میں نے کہا لیکن میری بات نامکمل رہ گئی۔ میں نے ایک گاڑی کو تیزی سے اندر آتے دیکھا اور آخری وقت میں سامنے سے تصادم کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ گیٹ کافی بڑا تھا اگر پورا کھلا ہوا ہوتا تو دونوں گاڑیاں خیریت سے گزر جاتیں لیکن اس کا ایک لوہے کا پٹ بند تھا۔ دوسری گاڑی بند گیٹ سے ٹکرائی۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ گیٹ ایک دھماکے سے اکھڑ گیا اور دور جا گرا۔ میں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی سنی جو اندر جانے والی کار کی ہیڈ لائٹس کے پاش پاش ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ بے اختیار میرے ساتھ محسن اور ٹیڈی نے بھی سر گھما کے دیکھا۔

"کیا گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "یا ڈرائیور کا دماغ خراب ہے؟"

"اندر داخل ہونے کا کونسا طریقہ ہے۔ کوئی بچہ آ رہا ہوتا تو کیا ہوتا؟" محسن نے کہا لیکن اس وقت تک میں گاڑی روک چکا تھا۔ خلاف توقع وہ دوسری گاڑی رکی نہیں تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ سامنے سے اس کا حلیہ نہ بگڑا ہو لیکن لوہے کے گیٹ کو اکھاڑ پھینکنے والے اپنے نقصان کی پروا کیے بغیر سیدھے جا رہے تھے۔ اس قسم کے ایکسیڈنٹ سے عام آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے اور اگر جان بچ جائے تو خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ نقصان کتنا ہوا۔ عام شریف آدمی کسی بچوں کے اسکول میں یوں طوفانی رفتار سے گیٹ توڑ کر داخل بھی نہیں ہوتے اور اگر ان سے یہ غلطی گاڑی کے بے قابو ہونے کے باعث سرزد ہو تب بھی اس کا ردعمل مختلف نہیں ہوتا۔ لیکن اب مجھے شک ہو چلا تھا کہ یہ عام اور شریف لوگ نہیں تھے۔ میں نے اتر کے دیکھا تو سیاہ رنگ کی مورس پرنسپل کے دروازے کے مقابل ٹھہر چکی تھی۔ اس کے پیچھے بوگس نمبر پلیٹ تھی۔ کسی پرائیویٹ کار کے پیچھے کمرشل نمبر پلیٹ لگانا ان کی بہت بڑی حماقت تھی۔

"محسن! یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ پرنسپل کے پاس کیوں گئے ہیں؟"

"کیوں گئے ہیں؟" محسن نے میری طرف تشویش سے دیکھا۔ میری نظر نے تقریباً سو گز دور ایک شخص کو گاڑی سے اتر کے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک منٹ بعد وہی شخص پرنسپل کو گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ اسکول کے اندر ایک چیخ پکار مچ گئی تھی لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کے پرنسپل کو اغوا کرنے والے کا راستہ روکتا۔ خود میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں دوڑ کر سو گز کا فاصلہ طے کرتا یا گاڑی کو پھر اسٹارٹ کر کے موڑتا اور ان سے براہ راست تصادم کا خطرہ مول لیتا۔ میں دوڑ کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اندر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔

"تم دونوں اتر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ریوالور تیار رکھنا، میں ان کا راستہ کاٹتا ہوں۔"

"کیسے... تو اکیلا؟" محسن نے کہا۔ کار اب تیزی سے گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔

"باہر نکل۔" میں نے چیخ کر کہا اور ان دونوں کو ایک ساتھ باہر گرتے دیکھا۔ مورس دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کی رفتار کا اندازہ کیا اور خدا پر بھروسا کرتے ہوئے گاڑی کو موڑ کر گیٹ کے سامنے لے آیا۔ میرے پاس ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں دروازہ کھول کے باہر کود ہی تھا کہ مورس نے گیٹ بلاک کر دینے والی گاڑی کو ٹکر ماری اور تصادم کی قوت میں اسے چند گز دور تک گھسیٹتی لے گئی — دھات سے دھات کے ٹکرانے اور رگڑنے کی سمع خراش آواز کے ساتھ پھر شیشہ بکھرنے کا چھناکا سنائی دیا۔ ایک عورت نے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دلخراش چیخ ماری اور میں نے سیاہ مورس کا ونڈ اسکرین ریزہ ریزہ ہو کے غائب ہوتے دیکھا۔ گاڑی چلانے والا اچھلا اور اس کا لہولہان چہرہ انتہائی کرب میں نظر آیا۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے سارے چہرے میں چھرّوں کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔ ہماری کورٹینا ایک سائنڈ کے دونوں دروازوں کے پچک کر اندر گھس جانے کے بعد الٹ گئی تھی۔ سیاہ مورس کے پچھلے والے گیٹ سے دو افراد باہر کودے۔ ان میں سے ایک نے نشانے کے لیے ریوالور اٹھایا مگر محسن اور ٹیڈی غافل نہیں تھے۔ دوسرے فائر کی آواز کے ساتھ ہی میرا نشانہ لینے والا گھوما۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور اڑ گیا اور وہ منہ کے بل سڑک میں گر کے لوٹنے لگا۔ دوسرے نے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری اور اسے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کے گاڑی پر دے مارا۔ کورٹینا میں آگ لگ گئی تھی لیکن وہ کچھ دور تھی۔

"خیال رکھنا یہاں کوئی رکنے نہ پائے۔" میں نے چلا کر کہا اور محسن نے ایک گاڑی والے پر فائر کیا جو رکنے لگا تھا۔ گاڑی ایک دم رفتار پکڑ کے نکل گئی۔ ایک اور فائر ہوا اور گولی میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ میں نے اپنے حریف کو اٹھنے سے پہلے دوسری زبردست کِک مار کے الٹا تو وہ کو رٹینا پر جا پڑا۔ آگ نے اس کے کپڑوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چلایا اور خاموش ہو گیا۔ میں پلٹ کر سیاہ مورس کی طرف دوڑا۔ اس کا زخمی ڈرائیور اٹھ کے پیچھے پلٹ رہا تھا۔ میں نے اپنا سائیلنسر والا ریوالور اٹھا کے فائر کیا تو سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کی تاخیر نے اسے پہلے گولی چلانے کا موقع دے دیا۔ اس نے مجھ پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میری گولی لگتے ہی وہ گرا اور اس کا جسم باہر کی جانب لڑھک گیا۔ میں اور محسن ایک ساتھ جست لگا کے مورس تک پہنچے۔ میں نے ڈرائیور کی خون آلودہ جگہ سنبھالی اور جب گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ ہماری کورٹینا اب دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اسی کے ساتھ ایک بدمعاش کا ناپاک وجود بھی خاکستر ہو رہا تھا۔ سڑک پر چلنے والے دور رک کر خوفزدہ نظروں سے یہ بھیانک تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیر سے پہنچنے والوں کا خیال تھا کہ یہ حادثہ ہے مگر فائرنگ کی آواز سننے والوں کے نزدیک یہ حادثہ نہیں بدمعاشی کا مظاہرہ تھا۔

میں نے مشکل سے پچاس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا جب کورٹینا کا پٹرول ٹینک ایک دھماکے سے پھٹا اور میں نے دھوئیں کے بادل کے ساتھ بھڑکتے شعلے بھی اوپر اٹھتے دیکھے پھر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر محسن اور ٹیڈی پرنسپل کے بے جان جسم کو سنبھالنے ہکا بکا بیٹھے تھے۔ وہ میرے ساتھ کسی اور کام کے لیے نکلے تھے اور میں نے ان سے کہ یہاں میں صرف الف دین کا پتا معلوم کرنے کے لیکن ذرا سی دیر میں موت کا ایک اور خونی ڈراما ختم ہو ان کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب کیوں ہوا۔

"یہ... یہ زندہ ہے؟" میں نے کہا حالانکہ میرا بے مقصد تھا اور مجھے احساس تھا کہ میں خود فریبی کا سہا ہوں۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "گولی سر میں لگی تھی۔" او پھر وہ منظر دیکھا جب زخمی ڈرائیور نے اٹھ کر پیچھے فائر سیکنڈ کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کا فرق زندگی او کا فرق بن گیا تھا۔ میری ہار بن گیا تھا اور یہ سب جلد گئی تھی۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ پرنسپل کی خو لاش نے طنز سے کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس تھا کہ میں بس اتنا ہی کہنے کے لیے رکا تھا لیکن کیا یہ اسے کچھ دیر پہلے نہیں بتا سکتا تھا۔ مثلاً گزشتہ روز جب اس مشابہت کا احساس ہوا تھا۔ الف دین کی بیوی میں نے اس کے پرس میں دیکھی تھی اور پرنسپل کو خود تو عمر کے فرق کے باوجود میں نے صورتوں کے نقوش کو محسوس کر لیا تھا۔ دیر میں نے کی۔ میں ایک گھنٹا پہلے آسکتا تھا۔ آدھا گھنٹا یا پندرہ منٹ قبل بھی پہنچ سکتا منٹ پہلے اسے مجبور کر سکتا تھا کہ اسی وقت میرے سا چلے۔ میں نے گاڑی روک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ سرد سفاک قہقہہ میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ تم کچھ نہیں کر سکتے نہ کل، نہ آج، نہ ایک گھنٹا پہلے، نہ ایک منٹ پہلے کیونکہ جو فرشتہ اجل کے آنے اور جانے کا تھا اس وقت کو کیسے پہنچ سکتا تھا۔ وہ لمحہ کسی آدمِ فانی کی دسترس میں ہوتا جو فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔ "بس اتنا ہی یاد رکھنا کہ میں ایک تھا جیسے اپنے الفاظ کی بازگشت میری روح کے تا جھنجوڑنے لگی۔ اچھے عیلے ہو مریضوں کا خیال اچھا

محسن نے میرا کندھا ہلایا تو مجھے ہوش آیا۔ ہم ویران گلی میں کھڑے تھے لیکن اکا دکا گزرنے والوں کی سے جھانکنے والوں کی نظریں ہمیں گھور رہی تھیں۔ ایک کے گیٹ سے اور دوسری بار ہماری گاڑی سے ٹکرانے بعد سیاہ مورس کا سامنے والا حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ کے ریڈی ایٹر کا سارا پانی بہہ گیا تھا اور اب وہ چل بھی نہ تھی۔ اندر خون ہی خون تھا اور شیشہ ہی شیشہ تھا۔ سامنے اسکرین نہ ہونے سے گاڑی ایک کھنڈر نظر آتی تھی اور بیٹھے ہوئے ہم تین افراد اس صورت

تے تھے۔ ہمارے ہاتھ اور کپڑے بھی خون آلود تھے۔ ایسے میں کوئی بھی پولیس والا نمودار ہو جاتا تو ہمیں دھر لیتا اور ہم ایک لاش کے ساتھ پکڑے جاتے۔ باقی کسر اسکول میں درجنوں افراد کی گواہی پوری کر دیتی۔ ہم بھی تین تھے اور سیاہ مورس میں پرنسپل کو اغوا کر کے لے جانے والے بھی تین تھے۔ ایک منٹ کے مختصر وقت میں ان کی صورتوں پر غور کرنے کا موقع کسی کو نہ ملا ہو گا۔ سب ہم پر ہی انگلی اٹھا دیتے کہ یہی وہ مجرم ہیں۔

"اب یہاں سے نکلنے کی فکر کر۔" محسن نے کہا۔ "جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"

"یا اللہ میری توبہ!" ٹیڈی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ کیا نیا عذاب آ گیا۔"

"اس حلیے میں باہر نکلے تو فوراً پکڑے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "نہ ہم کسی کو مدد کے لیے بلا سکتے ہیں اور نہ اس کار میں فرار ہو سکتے ہیں۔ تو ایک گاڑی پیدا کر۔ ٹیکسی ہو تو بہتر ہے۔"

محسن باہر نکلا اور چند قدم چل کے گلی کے موڑ تک گیا۔ پرنسپل کا بے گناہ لہو اس کے دامن پر اور آستین پر پھیل گیا تھا اور ہر نگاہ سے فریاد کرتا تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ محسن عقل سے کام لے کر مسئلہ حل کر لے گا۔

"یہ کون تھی سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کیا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش اور ہمت والا بنتا تھا اس کا دل اتنا ہی چھوٹا تھا۔ گاڑیوں کی ٹکر، پرنسپل کا اغوا، فائرنگ اور خونریزی، ہماری گاڑی کی تباہی اور پرنسپل کی لاش کے ساتھ ہمارا فرار۔ یہ سب چند منٹ میں پیش آ جانے والے واقعات دیکھ کر اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

"تھی ایک بدنصیب ٹیڈی۔ اس کے مقدر میں بھی ہمارے سب اسی طرح مرنا لکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے اسے بچانے کی بے سود کوشش کی۔ جب میں اسے بچا نہیں سکتا تھا تو کیا ضرورت تھی مجھے یہ الزام اپنے سر لینے کی۔"

گلی کے موڑ پر ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ محسن ٹیکسی کو بہت تیزی سے بھگاتا ہوا لا رہا تھا۔ میں نے ٹیڈی کو ہوشیار کیا۔ ٹیکسی ایک سیکنڈ کے لیے رکی اور ہم کار سے ٹیکسی میں منتقل ہو گئے۔ محسن نے ٹیکسی کو پوری طرح روکا بھی نہیں تھا کہ پھر اسٹارٹ کر دیا۔ وہ بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتا تھا۔ ہم گلی کے آخری کنارے پر تھے جب پیچھے سے چند افراد دوڑتے ہوئے نمودار ہوئے۔ محسن نے ٹیکسی کو بار بار موڑا اور مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا خطرے کی حدود سے باہر نکل آیا۔ "بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔" محسن نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ٹیکسی والا مقابلے پر آمادہ تھا۔"

"تو نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں تو زخمی اور بیمار بن کے کھڑا ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "اس سے کہا، اسپتال لے چلو جو مانگو گے دوں گا۔ اس نے بٹھا تو لیا لیکن راستے میں کہنے لگا کہ تم زخمی تو نظر نہیں آتے۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور کہا کہ چپ چاپ نیچے اتر جاؤ لیکن وہ آدمی جی دار تھا۔ اس نے شور بھی مچایا اور مجھ پر حملہ آور بھی ہوا۔ اب یا تو میں گولی چلاتا یا اسے ناک آؤٹ کرتا۔ میں نے ریوالور کا دستہ دو بار اس کے سر پر مارا اور پھر اسے نیچے لڑھکا دیا لیکن اس کے ہنگامے نے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا اور وہ اتنا سخت جان تھا کہ سڑک پر گرا تو اس وقت بھی بے ہوش نہیں تھا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے بھاگے تھے۔ ایک دو پتھر بھی آ کے لگے تھے ٹیکسی پر مگر خطرہ ایک لونڈے نے پیدا کر دیا تھا جو موٹر سائیکل لے کر تعاقب پر آمادہ تھا۔ ایک ہوائی فائر کیا تو وہ ٹیکسی کا پیچھا چھوڑ کر پلٹ کر بھاگا مگر خطرہ یہ تھا کہ کوئی اور پیچھے نہ لگ جائے۔"

"ہم سب کے کپڑے خون آلود ہیں۔" میں نے کہا۔ "گاڑی الگ گئی ہاتھ سے۔ اب کیا کریں؟"

"میری جیب میں تقریباً ڈھائی سو روپے موجود ہیں۔" محسن بولا۔

"چار سو کے قریب میرے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"اپنی جیب میں تو سو بھی نہیں ہوں گے۔" ٹیڈی نے خفت سے کہا۔

"پیسے تو کافی ہیں۔ نئے کپڑوں کے تین جوڑے آ سکتے ہیں لیکن بازار جا کے لائے کون؟" میں نے کہا۔

تھوڑا سا غور فرمانے کے بعد ہم نے مسئلے کا یہ حل نکالا کہ ٹیڈی نے میری پتلون پہنی جس پر خون کا ایک داغ تو تھا لیکن اوپر کی جانب اور محسن کی قمیص جس کی ایک آستین پر خون کا رنگ آیا تھا۔ اس آستین کو اوپر چڑھا کے وہ قمیص یوں پہن سکتا تھا کہ دامن باہر رہے اور پتلون کے داغ کو چھپا لے۔ میری پتلون اسے بڑی تھی اور کچھ ڈھیلی بھی تھی۔ اسی طرح محسن کی قمیص اس کو ڈھیلی تھی لیکن وہ اپنی مضحکہ خیز حالت کی پروا کیے بغیر پیدل چلتا ہوا ایک دکان تک گیا۔ اپنا سائز اسے معلوم تھا اور میں نے اسے بتا دیا تھا کہ محسن کا اور میرا سائز میڈیم ہے۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم ایک محدود علاقے میں پھرتے رہے۔ ہم انارکلی کے قریب سے سیدھے مال روڈ پر زمزمہ تک جاتے تھے۔ چند منٹ قیام کرتے تھے اور واپس آ کے ٹیڈی کو دیکھتے ہوئے سیدھے نکل جاتے تھے پھر پاک ٹی ہاؤس کے قریب سے موڑ کاٹتے تھے اور نیلا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گنبد سے گھوم کر دوبارہ بنک اسکوائر کے پاس مال روڈ پر طلوع ہوتے تھے۔ ابھی دوسرا چکر جاری تھا کہ میں نے ٹیڈی کو بنڈل بغل میں دبائے یونیورسٹی کے بس اسٹاپ پر دیکھ لیا۔ ہم بھنگیوں کی توپ کے پاس سے گھوم کر آئے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ٹیکسی کو ہم نے میوزیم اور پنجاب پبلک لائبریری کے درمیان روک لیا جہاں نسبتاً خاموشی تھی اور دو چار گارڈوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ سب سے پہلے ٹیڈی گیا اور پنجاب پبلک لائبریری کے باتھ روم سے اپنے کپڑے بدل کے نکل آیا۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں ہے؟" میں نے کہا "کہ اندر کون گیا تھا اور باہر کون آیا؟"

"نہیں سکندر بادشاہ" وہ بولا "اندر تو قبرستان سے زیادہ خاموشی ہے۔ وہاں بھی چڑیاں کوّے تو بولتے ہیں۔ یہاں سب کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ کسی کی نظر اِدھر اُدھر جاتی ہی نہیں۔"

اب ٹیڈی باہر کھڑا ہوا اور اس نے ایک طرف سے شیشوں کو تھوڑا بہت کور کر لیا۔ دوسری طرف دیوار تھی۔ میں نے ٹیڈی کے بے داغ کپڑے محسن کو دیے۔ اس نے ٹیڈی کی روایت پر عمل کیا اور کچھ دیر بعد نیا شلوار قمیص پہنے نمودار ہوا۔ اس کے پاس دو جوڑے اتارے ہوئے بھی تھے جن کو اس نے بنڈل بنا کے بغل میں دبا رکھا تھا۔

"شک کی کوئی بات؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک آدمی مجھے گھور رہا تھا۔ وہ اتر کے آگے آیا بھی تھا لیکن میں راستہ کاٹ کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ اب تیرا اندر جانا ٹھیک نہیں۔" محسن نے کہا "کہیں اور چلتے ہیں۔"

تیسرا مسئلہ بنک اسکوائر کے عقب میں حل ہوا۔ اب ہم تینوں بے داغ نئے کپڑوں میں تھے اور یہ ضروری تھا کہ ہم اس ٹیکسی کو بھی کہیں چھوڑ دیں اور خون آلودہ کپڑوں سے بھی نجات حاصل کر لیں۔

"پیسے کتنے بچے ہیں؟" میں نے نیچے اتر کے کہا۔ ٹیکسی کو میں نے باغ جناح سے پہلے اسمبلی بلڈنگ کے پیچھے روک دیا تھا۔ وہاں اور بھی گاڑیاں تھیں لیکن لوگ بہت کم تھے۔ جو تھے وہ ہماری طرف متوجہ نہ تھے۔

"چار سو تیرے پاس ہیں؟ ٹیڈی نے مجھے سوا سو دیے ہیں۔" محسن بولا۔

"ابھی گزارے کے لیے کافی ہیں۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں اپنے اپنے کپڑوں کے بنڈل لیے پیدل روانہ ہو گئے۔

"اب پہلے کھانا کھاتے ہیں اور کافی پیتے ہیں تاکہ عقل ٹھکانے آ جائے۔" میں نے کہا۔

"پہلے ان کپڑوں کو کہیں پھینک دیں۔" محسن نے کہا "جیبوں میں سے ہر چیز نکال لی ہے نا؟"

"نکال لی ہے۔ منظر تو ابھی کورٹ میں ہوگا۔ یا کورٹ سے نکلا پڑا ہوگا تو راستے میں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"لیکن تمہاری گھر والی تو گھر میں ہے کبیر خان۔" محسن نے کہا "اسے فون کر دے۔"

میں چونک پڑا۔ نہ جانے کتنے عرصے بعد اس نے میرے بچپن کا نام لیا تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور محسن نے بھی محسوس کیا کہ یہ حرکت غیر شعوری تھی۔ ٹیڈی کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ہنسنے لگا۔ اس کے خیال میں مجھے محسن کا کبیر خان کہنا مذاق تھا۔ کپڑوں کو ہم نے موقع پا کر تین مختلف مقامات پر کھلے گٹر دیکھ کے غرق کر دیا۔ گٹر کے گندے پانی میں شہر کی غلاظت کے ساتھ ایک مجرم کا خون، ایک بے گناہ اور تعلیم جیسے پیشے کے مقدس پیشے سے وابستہ عورت کے خون کے ساتھ مل کر بہنے لگا۔ موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ انگریز کہتے ہیں گورے اور کالے، امیر و غریب، معصوم اور گنہگار سب مر کے رزقِ خاک ہوتے ہیں۔ وہی حشرات الارض ان کو کھاتے ہیں اور وہ ایک طرح مٹی ہو جاتے ہیں۔ بندۂ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ حشر انتظارِ مکافات کے سوا کچھ نہیں۔

مجھے بھوک نہیں تھی لیکن مال پر آنے کے بعد سب سے پہلے ریسٹورنٹ فیروز سنز کے ساتھ ہی نو تعمیر شدہ "گلیکسی" کے سکون پرور ماحول میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے کافی کے ساتھ سینڈوچ کھانے کا فیصلہ کیا۔ ٹیڈی نے باقاعدہ لنچ طلب کیا۔ میں نے ان کو مختصراً پرنسپل کے قتل کے اسباب بتائے۔

"اس کو تو مرنا ہی تھا۔" محسن نے کہا "دلاور اینڈ کمپنی جانتی تھی کہ وہ کس کی بہن ہے۔"

"الف دین بھائی تھا طافو کا۔" میں نے کہا "وہ الف دین سے پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ طافو نے اسے ہمارے بارے میں کچھ بتایا تھا یا نہیں۔ جب وہ نہیں ملا تو ان کا ذہن اس پرنسپل کی طرف گیا جو الف دین کی بیوی کی بہن تھی۔ وہ اس سے الف دین کے بارے میں ضرور پوچھتے اور اپنے طریقے سے پوچھتے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا تو وہ کیا بتاتی۔ ... کر کرتے مر جاتی مگر وہ سمجھتے کہ بہن کو بچا رہی ہے۔ اب وہ ظالم سے مری اور بہن کو بہرحال بچانے میں کامیاب۔"

"ہم اس واردات میں بلاوجہ ملوث ہوئے۔" محسن نے کہا "کل یہ خبر بہت ہلچل مچائے گی۔ اس بار مسئلہ ایک اسکول کی پرنسپل کا ہے۔ جیسے غنڈے دن دہاڑے اٹھا کے لے گئے اور قتل کر دیا۔ اس کی لاش تو مل ہی جائے گی۔"

"ہاں۔ پبلک کا اور پریس کا بہت دباؤ ہوگا پولیس پر۔" میں نے متفکر ہو کے کہا "ممکن ہے ٹیچرز ہڑتال کر دیں اور طلبا جلوس وغیرہ نکالیں۔ گورنر اور آئی جی بھی خصوصی تحقیقات کا حکم دیں گے۔"

"ہمارا تو پرنسپل سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ لیکن میں دوبار اس سے ملنے گیا تھا۔" میں نے کہا "نہ جانے کس کس نے مجھے دیکھا ہوگا۔ اب پولیس نے تصویریں دکھائیں تو شاید کوئی شناخت کر لے۔"

"پرنسپل کے پاس دن بھر میں بہت سے لوگ آتے ہیں۔" محسن نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا "اس کے علاوہ گرلز اسکول میں سب لیڈی ٹیچرز ہیں۔ وہ گواہی سے دور رہیں گی۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔ سب کو خوف ہوگا کہ تفتیش کا چکر لمبا ہوگا۔"

"کتنی بڑی کمزوری ہے یہ ہمارے قومی اخلاق و کردار کی۔"

"لوگوں کا اخلاق و کردار ٹھیک ہے۔ پولیس کا رویہ اور عدالتی طریقِ کار حوصلہ شکن ہوتا ہے اور اتنی پریشانی پیدا کرتا ہے کہ بڑے بڑے بااصول اور ہمت والے بھی جان بچاتے ہیں۔ صرف ایک بار کی بات نہیں ہوتی، برسوں عدالت اور تھانے میں چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اتنا فاضل وقت کس کے پاس ہے؟ اور پھر معاملہ کبھی تو سیدھا نہیں چلتا۔ بعض اوقات سچی گواہی بھی جھوٹی کر دی جاتی ہے اور گواہ پھنس جاتے ہیں۔ پھر قاتل کے محافظ یا وارث الگ پریشان کرتے ہیں کہ گواہ منحرف ہو جائے۔"

"تھے تو وہ دلاور کے ہی آدمی اور اگر وہ بچ کر نکل جاتے تو یقیناً ہمارے متعلق اپنے آقاؤں کو سب بتا دیتے مگر کچھ شک تو اب بھی ہوگا دلاور کو۔" میں نے کہا "اس کے آدمی گولیوں سے ہلاک نہ ہوتے تو وہ سمجھتا کہ یہ حادثہ تھا لیکن اس کیس میں پولیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ملے گی تو اس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ گاڑی کا ڈرائیور جب ریوالور کی گولی سے ہلاک ہوا ہے تو وہ دلاور کا ہی تھا۔ گاڑی تو جل کے خاک ہو جائے گی۔ بلکہ اب تک ہو چکی ہو گی۔ نہ ہی لاشیں رہ جائیں گی۔"

"چلو اچھا ہے۔" محسن بولا "دلاور یہ نہ سمجھے کہ ہم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ وہ تو کل بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے اور کتنا خرچ کیا۔"

"وہ ان چاروں کو اچھا انعام دے گا جو رابعہ کی کوٹھی میں گئے تھے میری گرفتاری کا انعام لینے مگر خود گرفتار ہو گئے۔" میں نے کہا "اتنے کم حوصلہ لوگ تھے کہ دو جوتے پڑے اور دلاور کا نام بک دیا۔"

"غلطی دلاور کی تھی۔ اس نے اتنے کم حوصلہ آدمی منتخب ہی کیوں کیے تھے؟"

"اسے تو ناکامی کا خیال تک نہ ہوگا۔" میں نے کہا "جیسے خود مجھے کامیابی کا پورا یقین تھا۔"

"وہ چاروں تو مارے گئے۔ دیکھ لینا دلاور انھیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" محسن بولا "آج کے تین آدمی بھی شمار کر و تو کل سے اب تک اس کے سات آدمی کم ہو گئے۔"

"مرنے والے بہت ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "کیونکہ مروانے والوں کے پاس پیسہ بہت ہے۔ یہ سب غربت اور معاشی بدحالی سے جنم لینے والی برائیوں کا شاخسانہ ہے۔ ایسے ہزاروں لاکھوں ہیں جو بچپن میں سختیٔ حالات کے باعث گھروں سے بھاگ جاتے ہیں یا اسکول نہ جانے کے باعث بُری صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہمت یا صلاحیت کی کمی ہوتی ہے اس لیے جرائم کی طرف راغب تو ہوتے ہیں مگر کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے کہ اپنی تقدیر بدل سکیں۔ یہی چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل جاتے ہیں اور باہر نکل کے پھر وہی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دلاور جیسے بڑے بدمعاش دس بیس ہزار میں ان مُہروں کو خرید لیتے ہیں۔ بساط ان کی ہوتی ہے، بازی ان کی ہوتی ہے اور چال وہ چلتے ہیں لیکن پِٹتے یہی مُہرے ہیں۔ ان کی اہمیت پیادوں سے زیادہ نہیں۔ شطرنج میں بادشاہ کے ساتھ وزیر ایک ہوتا ہے۔ فیل دو تو پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مفلسی اور بے روزگاری نے پیادوں کا حصول بہت آسان بنا دیا ہے۔ مایوس آدمی سوچتا ہے کہ ایسی زندگی سے کیا حاصل۔ دس بیس ہزار اکٹھے مل گئے تو واہ۔ ورنہ ہارنے کو کیا ہے؟"

"اب تک منظر اپنے گھر پہنچ گیا ہوگا۔" محسن نے کہا "کچھ دیر بعد اپنے چیمبر میں چلا جائے گا۔"

"تو فون کر اسے۔" میں نے کہا "اس سے کہہ کہ ہمیں بیس پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ کل تک انتظام کر دے۔"

"وہ نہ ملے تو رابعہ سے کہہ دوں کہ تمہارے ان کو ایک نئی گاڑی چاہیے۔" محسن اٹھتے اٹھتے بولا۔

"یار اس نے اپنی گاڑی دی تھی کہیں رنگ ہونے کے لیے۔" مجھے اچانک یاد آیا "اس سے کہنا کہ وہی گاڑی لے آئے اور اس کا ایک ٹرانسفر لیٹر بنا دے۔ کسی بھی فرضی نام سے۔ خواہ پرنسس صوفیہ ہی کے نام کر دے۔"

"اس کی نمبر پلیٹ پرانی ہو گی۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اوّل تو کسی کو یاد نہیں ہوگا وہ نمبر،" میں نے کہا۔ "اور ہوا تو ہم حسبِ ضرورت اسے بدلتے رہیں گے۔ اس طرح ابھی پیسہ خرچ کرنے سے بچ جائیں گے اور وہ گاڑی بے حد آزمودہ اور قابلِ اعتماد ہے۔"

"تو نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا اس کی تعریف۔" محسن بولا۔ "سگِ لیلیٰ کا زمانہ گزر گیا۔ اب لیلیٰ کی کار ہی ناقۂ لیلیٰ ہے۔"

"یہ ناقہ کیا ہوتا ہے سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے ڈکار لے کر کہا۔ "لیلیٰ تو ہم سمجھتے ہیں۔"

"ناکہ نہیں سمجھتے؟ بھئی یہ پولیس اکثر ناکہ بندی کرتی رہتی ہے تاکہ اسمگلر وغیرہ آسانی سے گزر جائیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جاتا ہے۔ کچھ مجرم ہوتے ہیں چیونٹی کے برابر۔ وہ ناکا بندی میں پکڑے جاتے ہیں۔ کچھ ہوتے ہیں اونٹ سے بھی بڑے۔ وہ ناکے سے نکل جاتے ہیں۔"

ٹیڈی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "اونٹ؟ ہم سے تو دھاگا نہیں گزرتا سوئی کے ناکے سے۔"

"یہی تو سارا فن ہے دوست... تم دھاگا نہیں گزار سکتے۔ گزارنے والے ناکے سے اونٹ گزار دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اٹھو اب چلیں۔ محسن خان اچکن واپس آ رہے ہیں۔"

"یہ آج کی باتیں اپنی کھوپڑی میں بیٹھ نہیں رہی ہیں۔" ٹیڈی نے سر کھجایا۔ "محسن نے تم کو کبیر خان کہا تھا اور اب تم اس کو اچکن کہہ رہے ہو۔ ہم سے بھی کچھ چھپایا ہے ہو دوست؟"

"ارے یار کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم سے کیا پوشیدہ ہے۔ کبیر خان میرے بچپن کا نام ہے اور اچکن کسے کہتے ہیں؟ شیروانی کو۔ اس کا نام محسن شیروانی ہے۔ اسی بات پر یاد آیا کہ ہم جو تم کو ہر وقت استاد ٹیڈی کے نام سے پکارتے رہتے ہیں تو آج تک تم نے اپنا اصل نام نہیں بتایا۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور وہ پلٹ کر ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔

"اصل نام تو ماں باپ نے نیک محمد رکھا تھا۔" ٹیڈی شرمسار لہجے میں بولا۔

"یہ شرمندگی کیسی؟ انھوں نے غلط نام نہیں رکھا تھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تم نیک آدمی ہو۔ نیک آدمی بُرے حالات میں پھنس جاتا ہے مگر اس کی فطرت کی نیکی ضائع نہیں ہوتی جیسے کیچڑ میں بھی ہیرے کی آب و تاب باقی رہتی ہے۔"

"وہ بقلم خود آ رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "فرقت کی ایک رات نے مجبور کر دیا۔ دونوں تھے آم دونوں کو مجبور کر دیا۔ ایک ہم ہیں، شرم و حیا کے نمونے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"نمونے تو نے اسے منع نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"میں ظالم سماج نہیں ہوں اور منع کرنے سے وہ شاہِ جنات کی محبوبہ مانتی ہے؟" محسن بولا۔ "وہ گاڑی بھی لے آئے گی۔ تیرا حال پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا بُرا حال ہے۔ کبھی کہتا ہے فرہاد کی طرح کے ٹو کو کاٹ دوں؟ کبھی کہتا ہے مجنوں کی طرح تھر کے صحرا کی طرف نکل جاؤں؟ کل رات اختر شماری کرنا چاہتا تھا مگر آسمان پر بادل تھے۔" اس کی بکواس ٹیکسی میں بیٹھنے تک جاری رہی۔ ٹیکسی کو ہم نے ہمیشہ کی طرح کچھ دور چھوڑا اور باقی فاصلہ پیدل طے کر کے ٹیڈی کی گلی میں پہنچے تو مرزا غالب کو عجیب کیفیت میں دیکھا۔ مقفل دروازے کے سامنے فرشِ خاک پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور پُرتکلف خوان میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔

"بہت مہمان نواز لوگ ہیں تمھاری گلی کے۔" وہ بولا۔ "میں بھوکا پیاسا بیٹھا تھا کہ ایک فرشتہ صفت بزرگ گزرے۔ احوال پوچھا تو میں نے کہا مسافر ہوں۔ جس سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں۔ انھوں نے کھانا بھجوا دیا۔"

"اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟" میں نے اس وقت کہا جب ٹیڈی دروازہ کھول رہا تھا۔

"وہ دراصل ان کے ساتھ ایک خاصی دلکش خاتون تھیں جو مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ میرا خیال ہے مجھ میں سیکس اپیل بہت زیادہ ہے۔ یہ انہی کی مہربانی ہوگی۔" وہ اپنا خوان اٹھا کے اندر آ گیا۔

"لیکن تم نے تو شام کو آنے کو کہا تھا اور تم اپنا استعفا ایڈیٹر کے منہ پر مارنے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"گیا تو تھا لیکن راستے میں مجھے تمھاری بات یاد آئی کہ استعفا منہ پر مار دو گے تو کون سا تیر مار دو گے۔ ہر اخبار کا مالک اخبار فروش ہی ملے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" وہ کھانا کھاتے بولا۔

"یہ تم نے بہت عقلمندی کا فیصلہ کیا۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کی رکنیت کے بعد تم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے وسائل کا بہترین استعمال کرتے ہوئے ہماری مدد کرو اور جتنے وسائل اس بڑے اخبار میں رہ کر تمھیں میسر ہیں وہ کسی چھوٹے اخبار میں نہیں ہوں گے۔ تم ایک قومی سطح کے اخبار کے کرائم رپورٹر ہو۔ چھوٹے اخبار میں جاؤ گے تو تمھاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی جو اب ہے اور ہمیں تمھاری یہ پوزیشن بہت فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ مثلاً تم ایک کام فوراً کر سکتے ہو۔"

"بولو، بولو۔" وہ کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"انسپکٹر فتح شیر کے ساتھ چار ماتحت چوہدری دلاور کے گھر گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے رشوت لے کر طافو یعنی الطاف کی لاش وہاں سے ہٹا دی اور دلاور پر کوئی حرف نہیں آیا۔ بعد میں وہ لاش کو کہیں اور پھینک آئے۔ دریا میں یا کسی اور جگہ۔ فتح شیر نے تو کہا تھا کہ راول ڈیم میں ڈال دی تھی مگر وہ جھوٹ تھا۔ راتوں رات راول ڈیم تک جا کے لوٹ آنا ناممکن تھا اور پھر اس کام کے لیے اتنے تردد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فتح شیر تو مارا گیا مگر وہ چار آدمی زندہ ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو کتنا پیسہ ملا تھا اور طافو کی لاش کہاں ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ہمیں ان کے نام پتے معلوم نہیں اور ہمارا ان سے ملنا بے حد ضروری ہے۔ ایک تو وہ دلاور کے خلاف گواہی دینے پر مجبور ہوں گے۔"

"گواہی کس کیس میں؟" غالب نے کہا۔ "میری دلاور سے بات ہوئی تھی۔ اس نے خاصے تعجب کا اظہار کیا کہ کل رات اس کی گاڑی رابعہ قاری کی کوٹھی میں ملی۔ اس نے کہا کہ چوری کی رپورٹ لکھوانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ گاڑی کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوگی اور پولیس نے یقین تو دلایا تھا کہ مل جائے گی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں نے اسے فتح شیر کی لاش اور وہاں پکڑے جانے والے چار افراد کے متعلق بتایا کہ وہ تمھارا نام لے رہے تھے تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ رپورٹر صاحب، اگر وہ آپ کا نام لے دیتے تو کیا ہوتا۔ میں نے اپنی اور اس کی ملاقات کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ آپ خدانخواستہ چرس یا ہیروئن سے تو شوق نہیں رکھتے۔ کل شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک میرے گھر میں پارٹی تھی اور اس میں خاصے معزز لوگ مدعو تھے۔ تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سب گواہ ہیں کہ میں ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا۔ ایسے آدمی کا تم کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

"یہ وقت بتائے گا کہ تقدیر کس کو بگاڑتی ہے اور تدبیر سے کس کا مقدر بنتا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے پیچھے دیکھا تو محسن مجھے بڑے مبہم سے اشارے کر رہا تھا۔ میں نے ان کا صحیح مفہوم اخذ کیا اور غالب سے اسکول میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ نہیں کیا۔ "تم ہمارا اتنا ہی کام کر دو۔ کبھی نہ کبھی کسی کیس میں یہ گواہ سامنے آئیں گے۔"

"وہ کیس کون کرے گا اور کب کرے گا؟" غالب بولا۔ "اور اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ گواہی کا مرحلہ آنے تک تمھارے یہ گواہ اس دنیا میں ہوں گے؟ عالمِ ارواح میں تو عدالت کے سمن نہیں پہنچتے۔"

"ہم کوشش کریں گے کہ انھیں خطرات سے آگاہ کر دیں اور تحفظ فراہم کریں۔ زندگی اور موت ہمارے بس میں نہیں لیکن گواہی ہم آج بھی لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے فتح شیر تو مر گیا مگر خود اپنے خلاف گواہی ہمارے پاس چھوڑ گیا۔ میں ابھی تمھیں سناتا ہوں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بزرگوار اندر آ گئے۔

"بھئی وہ مہمان تھے تمھارے میاں نیک محمد!" وہ بولے۔

"بڑی مہربانی آپ کی جناب۔" ٹیڈی نے برتن اٹھا کے کہا۔ "آپ نے ناحق تکلیف کی۔"

"تکلیف کیسی میاں! ارے بھئی ہمسایوں کا کچھ حق تو ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ کی صاحبزادی نے بہت اچھا کھانا پکایا تھا۔" غالب نے بھی شرافت سے کہا مگر بزرگوار اچھلے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ میاں نیک محمد! اتنے بدتمیز اور... بد اخلاق و بدزبان ہوتے ہیں تمھارے مہمان!"

"میں... میں بہت... بہت معافی چاہتا ہوں۔" ٹیڈی نے ہکلا کے کہا۔ "ان کو معلوم نہیں تھا۔"

"خاک معلوم نہیں تھا۔" بڑے میاں نے پیر پٹخ کے واک آؤٹ کرتے ہوئے کہا۔ "منکوحہ کو بیٹی کہتا ہے۔ نامعقول!"

"اُف! کیا کہہ دیا یہ تم نے سوچے سمجھے بغیر۔" ٹیڈی نے سر پکڑ کر کہا۔ "غالب بھائی! وہ اس کی چوتھی بیوی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ نظر کا دھوکا ہے۔ ہم نے تو کھانے کی تعریف کی تھی۔" غالب نے بے نیازی سے کہا۔ پھر وہ کیسٹ سننے لگا جس میں دلاور کی اور میری گفتگو الگ تھی جو ہم نے الیف ایم مائک سے ریکارڈ کی تھی۔ دوسرا کیسٹ وہ تھا جس میں فتح شیر کی اور میری گفتگو تھی اور جو میں نے اس سے گھر میں بیٹھ کے کی تھی۔ یہ گفتگو محسن نے باہر اپنی گاڑی میں ریکارڈ کی تھی۔ غالب بہت توجہ کے ساتھ سنتا رہا۔ پھر میں نے اور محسن نے اسے انگلستان میں قیام سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ضروری تفصیلات اور ترتیب کے ساتھ سنائے۔ غیر اہم واقعات کو ہم نے اس روداد میں سے خارج کر دیا مگر باقی سب بتا دیا جو چوہدری دلاور نے اور میر شرافت علی نے پہلے میرے والد وزیر خان کے ساتھ کیا تھا اور پھر ہم سب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے ساتھ۔ اُن میں رابعہ، محسن اور شہلا سب ہی کو نقصان ہوا تھا۔ جتنا نقصان ہم دلاور کو پہنچا چکے تھے وہ بھی ہم نے تسلیم کیا۔ اس آپ بیتی میں سب کا ذکر بالترتیب آیا تھا۔ فوما بخو سے لے کر رابعہ کی ماں، سلامت شاہ، عبدل اور اس کی ماں، شیدے، غلام علی اور ڈی سلوا سے لے کر کرائے کے بدمعاشوں تک سب کے مارے جانے کا ذکر تھا۔ ہم نے واقعات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا تھا پھر بھی بہت کچھ رہ گیا۔ باہر سے رابعہ کی کار کا ہارن سنائی دیا، میرا دل ایک دم دھڑکا اور میں نے ایک جست لگا کے دروازے تک پہنچنے اور دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کا ارادہ کیا مگر عقل کے پہرے دار نے مجھے روک لیا۔ دو منٹ بعد رابعہ اندر آئی اور چند لمحے ایسے گزرے جب ہم نے صرف ایک دوسرے کو دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اور اس کے درمیان جدائی کی صدیاں بیت چکی ہوں اور وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین اور دلربا لگی۔ ان چند لمحوں میں زمان و مکاں کے فاصلے مٹ گئے تھے اور وہ مجھ میں سما گئی تھی تو میں اس کے وجود کا ایک حصہ بن گیا تھا اور وقت ٹھہر گیا تھا۔ پھر محسن نے چھینک ماری جو بے سبب تھی اور ہنسا۔

"یہ کم بخت عشق، مشک اور رزکام چھپائے نہیں چھپتے۔" غالب بولا "اندر آئیں ناجی۔ اپنا ہی گھر ہے۔" رابعہ کا چہرہ ذرا سی دیر کے لیے اس کے گلابی لباس جیسا ہو گیا تھا "میرا نام غالب ہے۔ میں بالکل شاعر نہیں ہوں اس لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک سچا یعنی بے وقوف صحافی ہوں۔ آپ کو جانتا ہوں۔ آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ مجبوراً رابعہ نے بھی مصافحہ کیا۔ وہ اس کی عادی نہیں تھی لیکن غالب کی ادا میں بے ساختگی تھی۔ محض نیت کا خلوص تھا اور دوستی کا عہد تھا۔ چنانچہ مجھے یہ حرکت ذرا بھی معیوب نہیں لگی۔

"یہ ایم آر ایس کے نئے رکن ہیں اور اتنے ہی قابلِ اعتماد ہیں جتنے ہم سب۔" میں نے کہا۔

"تم نے ایم آر ایس کا مذاق بنا لیا ہے۔" رابعہ مسکرائی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"مذاق؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسی سمجھ دار خاتون ایک سنگین حقیقت کو مذاق کہے۔" محسن بولا "اس سے زیادہ سنجیدہ بات ہم نے پہلے کبھی کی ہے۔ کیوں میاں سکندرِ اعظم؟"

"میرا خیال ہے سنجیدہ بات کے لیے عقل و شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔" میں نے کہا "سنجیدہ ہوں آپ..."

رابعہ ہنسی "اب تم لڑنے لگو گے۔ یہ تمہاری... کیا ہوا؟"

"وہی جو اس سے پہلے دوسری گاڑیوں کا ہوا تھا..." نے کہا "اور اب تمہاری اس گاڑی کا ہو گا۔"

"خدا نے تمہیں عقل دی ہوتی تو پہلی بار کے بعد اپنی... اس شخص کو دینے نہ آتیں۔" محسن نے کہا "مگر وہ جو کہتے ہیں... کر خلل ہے دماغ کا۔ تو خیر بی بی! آپ یہ بتائیں کہ منظر... ہوتا ہے دخل در نامعقولات کرنے والا؟"

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ نروس ہو رہی ہے... ایک وجہ تو یہ تھی کہ محسن پر شوخی سوار تھی اور وہ دوسروں... موجودگی کا خیال کیے بغیر رابعہ کے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن دوسری... بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب اس کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا... شک گزرا کہ رابعہ نے غالب کو پہچان لیا ہے۔

"میں ابھی چند دن منظر کے گھر میں ہوں۔" رابعہ نے... "اپنے مکان کی فروخت کے سلسلے میں اس کو جنرل پاور آف اٹارنی دینی تھی۔ کل پرسوں یہ کام ہو جائے گا۔ آفس کا چارج... نے اسے دے دیا ہے۔ وہ فرم کے سارے کاروبار کی نگرانی کرے گا۔ دوسرے چاروں وکیل اپنا اپنا کام ویسے ہی کرتے رہیں گے جیسے پہلے کرتے تھے۔"

"ان میں سے کسی نے احتجاج نہیں کیا کہ یہ ذمے داری اسے کیوں نہیں سونپی گئی؟" میں نے کہا۔

"ان میں جو سب سے سینئر ہے، وہ میرے ساتھ سب سے... زیادہ مخلص ہے۔" رابعہ بولی "مجھے اتنے عرصے بعد آفس میں... کر وہ خوش بھی ہوئے اور افسردہ بھی۔ ان میں سے ایک شاید... جائے لیکن باقی تین نے کہا کہ جیسی آپ کی خوشی۔" پھر اس نے... ہینڈ بیگ میں سے ایک چابی نکالی جس کے ساتھ ایک ٹیگ... دھاگے سے بندھا ہوا چھوٹا سا کارڈ۔

"یہ مکان خالی ہے اور... اچھا ہے۔" وہ بولی "فی الحال... پوری کرے گا۔"

"کرائے پر لیا ہے تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ابھی کرائے پر ہی ٹھیک ہے۔ جب سے گڑھی... والا میرا مکان تباہ ہوا ہے میں بے گھر ہوں۔ اب یہ کوٹھی... جائے تو خیال ہے ایک مکان خرید لوں۔" وہ بولی۔ مجھے... بات کچھ عجیب سی لگی۔ پہلے کبھی اس نے نہیں کہا تھا کہ وہ بے... ہے۔ اس کو بے گھر کرنے کا ذمے دار بھی میں تھا چنانچہ مجھے شرمندگی... سے بچانے کے لیے وہ اس ذکر سے بھی گریز کرتی تھی۔ لیکن...

مجھے احساس ہوا کہ دل کے اندر محرومی کے ایک کانٹے کی کسک آج تک اسے تڑپاتی رہی ہے اور اگرچہ میری محبت کے جذبات قوی تر تھے لیکن ان سے خلشِ آزار کم ہوئی تھی، ختم نہیں ہوئی تھی۔

"یہ گھر بھی تو تمہارا ہی تھا۔" محسن نے کہا "جو تم بیچ رہی ہو۔"

"گھر جب بنائے جاتے ہیں تو بیچے نہیں جاتے، آباد کیے جاتے ہیں۔" وہ بولی "اس کوٹھی میں آباد کون ہو سکتا ہے؟ وہ تو ایک منحوس اور آسیب زدہ کھنڈر ہے جس کی دیواریں بھی جیل کی دیواروں سے زیادہ بے رحم ہیں۔ تم دیکھنا جب میں کوئی گھر خریدوں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"میں تم کو چھوڑ آؤں؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے کچھ باتیں کروں اور کچھ باتیں پوچھوں لیکن اس نے مجھے اور محسن کو ہاتھ سے منع کر دیا جو میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں ٹیکسی لے کر چلی جاؤں گی۔" وہ بولی "تم لوگ ذرا احتیاط رکھو۔ نقد کا انتظام تو اس وقت ہو نہیں سکا۔ میرے پاس یہ دو ہزار ہیں۔" اس نے ہینڈ بیگ سے نوٹ نکال کر محسن کو تھما دیے۔

"کیا بات ہے؟ تم بہت عجلت میں ہو۔" میں نے کہا "ذرا سی دیر بیٹھنے کی روادار بھی نہیں۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر ایک چیک نکالا "یہ بھی رکھ لو۔ کام آئے گا۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ چیک۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ یکلخت تمہارے لہجے میں یہ اجنبیت کیوں محسوس ہونے لگی ہے مجھے؟ تم صرف ہماری ضرورت پوری کرنے آئی تھیں؟ اپنے کاروبار، اپنے گھر اور اپنی ذات کے تحفظ کا خیال ہے تمہیں اور تم کہہ رہی ہو احتیاط رکھو۔ میرا خیال تھا تم منظر کے گھر میں رہنا منظور نہیں کرو گی۔ ان حالات میں تم ہمارے ساتھ رہو گی۔ کچھ کر دیا نہ کرو، سہارا ہی دو گی لیکن معلوم ہوتا ہے تم ڈر گئی ہو۔ اچانک تمہیں مصلحت اور عاقبت اندیشی کے تقاضوں کا احساس ہو گیا ہے۔ تم نفع نقصان سوچنے لگی ہو۔"

"اس وقت تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی "اس لیے میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔"

"صاف کہو کہ جواب دینا نہیں چاہتی ہو۔ ہمت نہیں ہے صاف جواب دینے کی۔" میں نے چلاّ کے کہا "میرا دماغ تو شروع سے خراب تھا مگر تمہارا دماغ اب ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ آدمی ایک کی مانتا ہے... دل کی یا دماغ کی۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے رابعہ!"

وہ اچانک پلٹی اور باہر نکل گئی۔ محسن نے گھور کر مجھے دیکھا اور رابعہ کے پیچھے دوڑا۔ چند سیکنڈ کے بعد فاکس ویگن کا انجن گرجا اور میں سمجھ گیا کہ محسن زبردستی رابعہ کے ساتھ اسے پہنچانے کے لیے نکل گیا ہے۔

غالب نے ایک قہقہہ مارا "کتنا غیر فلمی عشق ہے۔ سچا اور کھرا۔ قسم خدا کی میں نے کسی عورت کو کسی سے بھی یوں محبت کرتے نہیں دیکھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہ وکیل ہو گی لیکن یہ تو صرف عورت ہے۔ سچی اور کھری عورت۔"

"قسم مولا علی کی۔ تم نے اس وقت لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔" ٹیڈی نے غالب کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ میں کچھ دیر خالی الذہن کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اپنے ہی الفاظ کے طمانچے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگے۔ یہ میں نے رابعہ سے کیا کہہ دیا! یہ کیا تھا؟ حالات سے حسد و رقابت کا جذبہ، عشق کا جنون یا نروس بریک ڈاؤن؟ رابعہ ناراض ہو گی؟ نہیں۔ وہ مجھ سے ناراض کیسے ہو سکتی ہے! وہ جانتی ہے کہ الفاظ بہت بے وقعت ہوتے ہیں اور جتنی محبت میں اس سے کرتا ہوں وہ لفظوں کی زبان میں نہیں سمجھی جا سکتی۔ جب وہ سب کچھ سمجھتی ہے تو فکر کی کیا بات ہے۔

پندرہ منٹ بعد پھر فاکس ویگن کی آواز آئی جس کا مطلب یہ تھا کہ محسن اسے گھر تک نہیں، قریب ہی کسی جگہ چھوڑ آیا ہے۔ "چلو سر سے بوجھ کچھ تو کم ہوا۔" محسن نے اندر آتے ہی کہا "ایک مصیبت تو ٹلی۔"

"کہاں چھوڑ آیا ہے اسے؟" میں نے بے حد ڈھٹائی سے دانت نکال کے کہا "گھر تک جاتے ہوئے موت آتی تھی۔"

"وہ کہنے لگی، مجھے دلاور صاحب کے گھر کا پتا معلوم ہے۔" محسن نے کہا "اچھا ہے ان سے عقد کر لے گی تو آرام سے رہے گی۔ نہ کوئی مصیبت ہو گی نہ پریشانی۔ جتنا ہمارا ساتھ دینے میں کھویا ہے، اس سے زیادہ پا لے گی۔ میں نے تو کہا کہ دلاور ہر لحاظ سے بہتر ہے۔"

"شہلا کو بھی قائل کر۔ چوہدری صاحب بہت فراخ دل ہیں اور چار بیویوں کی بہرحال گنجائش ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تو بھی ان کا پارٹنر بن جا۔ چھوڑ اس تمام جھمیلے کو۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"محسن بولا "باپ مر گیا تو مر گیا، تو اپنا فائدہ دیکھ۔ ہم بھی اپنے گھر جاتے ہیں۔" اس کا موڈ آف تھا اور وہ لڑنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

"مجھے پتا ہے تو اس قسم کی زہریلی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ رابعہ نے بُرا مانا ہے میری باتوں کا؟" میں نے کہا۔

"بُرا مانا ہے؟ وہ رو رہی تھی اُلو کے پٹھے!" محسن نے اچانک چلا کر کہا "سب کے سامنے ذلیل کیا تو نے اسے۔"

"سب کے سامنے اس سے معافی بھی مانگ لوں گا میں۔" میں نے کہا "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" محسن نے اسی برہمی سے کہا "پولیس پہنچی تھی رضوی صاحب کے گھر۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی مگر کہا کہ غالباً وہ منظر ایڈووکیٹ کے گھر میں ہو گی۔"

"انھیں کس نے بتایا؟ مطلب یہ کہ انکل رضوی نے کیا منظر کے گھر پر پولیس متعین کر رکھی ہے؟"

"وہ ایس ایس پی ہیں۔ کیا نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "سادے کپڑوں میں پولیس دور سے نظر رکھتی ہو گی کہ کون آیا اور کون گیا۔ پولیس نے منظر کے گھر پہنچ کے رابعہ کا بیان لیا۔ منظر اس کے ساتھ تھا چنانچہ وہ مایوس لوٹے۔ وہ ایڈووکیٹ نہ ہوتی اور منظر کا گھر نہ ہوتا تو وہ سلسلہ آگے بڑھاتے یا دباتے کا معاوضہ لیتے۔ اس پولیس انسپکٹر کے قتل کے سلسلے میں اعلیٰ افسروں کا بہت دباؤ ہے۔ رابعہ نے تو کہہ دیا کہ وہاں سے کسی انسپکٹر فتح شیر کی لاش برآمد ہو یا ببر شیر کی۔ میں کیا بتاؤں جب کہ میں کئی ماہ سے اُدھر گئی ہی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ نے وہ کوٹھی کیوں خرید کے ڈال دی ہے؟ منظر نے کہا کہ اگر یہ خلافِ قانون ہے تو بات کرو ورنہ دفع ہو جاؤ۔ انھوں نے چند سوالات اور کیے تھے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ کا ملزم سکندر بخت سے کوئی رابطہ ہے اور رابعہ نے کہا کہ ہاں وہ میرا موکل ہے لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ وہ کہاں ہے۔ پولیس والے بتا گئے ہیں کہ وہ نام تو ایف آئی آر میں شامل نہیں کر رہے ہیں لیکن اس کیس میں ان کی گواہی بہرحال ہو گی اس لیے وہ پتا بدلیں تو پولیس کو ضرور آگاہ کریں۔ منظر نے کہہ دیا کہ پتا میرے گھر کا لکھ لو۔ میں ان کا وکیل بھی ہوں۔ آج کی خبر میں رابعہ قاری ایڈووکیٹ کا نام نہیں تھا مگر کل ہو گا جب دوسرے اخباری نمائندے تفصیلات حاصل کریں گے۔ رابعہ اس وقت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں پہنچی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر سادہ کپڑوں والے ہوں گے جو اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر وہ گیراج تک جاتی تو گیراج والے کی شامت آ جاتی۔ وہ منظر کی بیوی کا برقع پہن کر نکلی چنانچہ کسی نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ گیراج تک پہنچنے سے پہلے اس نے برقع اُتارا اور اپنی گاڑی لے کر یہاں آ گئی۔ وہ غالب کو اجنبی سمجھ کے اس کے سامنے کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ واپسی میں وہ پھر برقع پہن کر جائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ منظر کو کچھ معلوم ہو۔ اس کی بیوی کو سات بجے کسی بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور منظر نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے چھ بجے تک آ جائے گا۔ ظاہر ہے منظر کی بیوی کو برقعے کی ضرورت ہو گی۔ وہ دیر تک کیسے ٹھہرتی۔"

"میں شرم سے پانی پانی ہو چکا ہوں۔" میں نے کہا "اب میں بلبلہ ہوں پانی کا۔"

"شاعر نے سچ فرمایا ہے۔" غالب بولا "آدمی کے جسم میں ننانوے فیصد پانی ہی ہوتا ہے۔"

"چابی کس گھر کی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس نے اپنا آفس شفٹ کر دیا ہے۔" محسن بولا "اور ریکارڈ سمیت منظر کے حوالے کر دیا ہے۔ منظر کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے آفس کو چھوڑ کر رابعہ کے آفس کے معاملات سنبھالنے آ جاتا۔ منظر نے ایک بڑا فلیٹ لیا ہے جس کے ایک کمرے میں وہ خود بیٹھے گا اور باقی دو کمروں میں رابعہ کے ساتھ کام کرنے والے وکیل۔ کچھ قانونی کارروائی ایسی بھی ہو رہی ہے کہ رابعہ کی لیگل فرم مشترکہ طور پر رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کے نام سے رجسٹرڈ ہو جائے۔ چابی رابعہ کے پرانے آفس کی ہے۔ یہ کارروائی پوشیدہ طور پر نہیں کی گئی تھی چنانچہ پولیس بھی جانتی ہے اور اس کی خبر انکل رضوی تک بھی پہنچ چکی ہو گی۔ پرانے آفس کی طرف اب کسی کا دھیان ہی نہیں جائے گا۔ اس نے کہا ہے کہ ابھی دو چار دن پرانے آفس کو تالا لگا رہے اور وہاں رات کو بھی اندھیرا ہو تو اچھا ہے۔ اس کے بعد وہاں رہنے میں کوئی خطرہ نہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ الطاف کے قتل کو چھپانے میں فتح شیر کے علاوہ بھی کچھ لوگ شریک تھے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں۔ چار ماتحت تھے۔ کانسٹیبل ہوں گے یا ہیڈ کانسٹیبل۔" میں نے کہا۔

"کیسٹ سننے کے بعد میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا رابعہ کو دلاور کے خلاف استغاثہ دائر نہیں کر دینا چاہیے کہ اس نے فتح شیر کو مار کے یا مروا کے اس کے گھر میں پھینکا اور اسے خود کشی کا رنگ دے کے اس کا کیریئر اور اس کی گڈ وِل تباہ کرنے کی کوشش کی۔"

غالب بولا "اگر وہ گواہ بھی ہوں تو دلاور اب بھی پھنس سکتا ہے۔"

"رابعہ کے لیے کیس کرنا کیا مشکل ہے لیکن وہ یہاں کسی قانونی مسئلے میں اُلجھنا نہیں چاہے گی۔" میں نے کہا "گواہ تو ہیں اور ان کی گواہی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"اگر پولیس کے اپنے آدمی گواہ بن کے پیش ہو جائیں تو فتح شیر کا جرم ثابت ہو جائے گا۔" غالب بولا "اس کے بعد فتح شیر کی گفتگو کے کیسٹ پیش کر کے دلاور کو گھسیٹا جا سکتا ہے۔"

"ہاں۔ صرف گھسیٹا جا سکتا ہے کیونکہ کیسٹ صرف فتح شیر کے خلاف ٹھوس شہادت فراہم کرتے ہیں۔" میں نے کہا "دلاور کے خلاف نہیں۔ بے شک قتل کرنے کا سبب موجود ہے اور لاش بھی دستیاب ہو چکی ہے مگر ایک تو اس کے اپنے صفائی کے گواہ بہت مضبوط ہوں گے۔ دوسرے وہ ہمارے گواہوں کو گواہی سے پہلے بدل سکتا ہے یا ختم کر سکتا ہے۔"

"میں اس کے خلاف خود بھی استغاثہ دائر کرنے کو تیار ہوں۔"

"رہنے دو مرزا غالب۔" میں نے کہا "قانون کی بھول بھلیوں میں مت پڑو۔ جو حقیقت ہے وہ ہم بھی جانتے ہیں، تم بھی جانتے ہو۔ فتح شیر کو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ انھیں ہم خود سزا دیں گے جو اس کے شریکِ جرم تھے۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ اس رات تھانے میں ڈیوٹی پر کون لوگ تھے اور فتح شیر کے ساتھ گشت پر کون گیا تھا۔"

"چلو۔ مجھے اخبار جا کے اپنی رپورٹ دینی ہے۔" غالب بولا "یہ بھی پوچھ لیں گے۔"

جب ہم باہر نکلے تو رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو بہت سی پرانی یادوں نے مجھے آزردہ کیا۔ اس گاڑی کا رنگ زمانے کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں اور رابعہ اسی میں راتوں کو شہر کی سڑکوں پر پھرتے تھے۔ اس نے بہت سے مشکل وقتوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا اور ہماری ہر زیادتی برداشت کی تھی۔ اب اس کا رنگ سفید تھا اور یہ چمکتی دمکتی کار کسی نئی نویلی دلہن کی طرح پھر حقِ رفاقت ادا کرنے کے لیے موجود تھی۔ میں نے غالب کی ہدایات کے مطابق گاڑی کو مختلف تھانوں کے قریب روکا جہاں وہ چند منٹ کے لیے رکا اور لوٹ آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے ہم سب اندر بیٹھے ہوئے لوگ بالکل محفوظ تھے۔ بند شیشوں کے پیچھے کوئی ہماری صورت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخری جگہ وہ تھی جہاں فتح شیر سب انسپکٹر تھا۔ غالب وہاں سے دس منٹ بعد لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

"ان میں سے ایک تو آج ڈیوٹی پر آیا ہی نہیں۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا "دوسرے کا ڈیوٹی پر آتے ہوئے حادثہ ہو گیا۔ ایک ٹرک اسے کچلتا ہوا نکل گیا۔"

"اور ٹرک کا نمبر کوئی نوٹ نہیں کر سکا۔" میں نے تلخی سے کہا "کل تک دوسرے کے متعلق بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کو پچاس ہزار میں موت کیسے آئی۔ باقی دو کون تھے اور کہاں ہیں؟"

"ایک کانسٹیبل علی نواز ہے اور دوسرا ہیڈ کانسٹیبل چاند خاں۔" غالب نے کہا "دونوں ڈیوٹی پر ہیں، آٹھ بجے تک۔ دونوں کی حالت خراب ہے۔ بظاہر خود کو بیمار بتاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے وہ خوف زدہ ہیں۔ انھیں کوئی دھمکی ملی ہے یا وہ خود سمجھ گئے ہیں کہ ان کا انجام بھی مختلف نہیں ہو گا۔ چور تو ان کے دل میں ہے۔"

غالب کو اخبار کے دفتر میں چھوڑ کے ہم واپس گئے۔ مجھے اور محسن کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب دلاور باقی دو گواہوں کو زندہ چھوڑ دینے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔ ہمیں ان کو بچانا تھا اور یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس میں براہِ راست اُن سے تصادم کے امکانات بہت زیادہ تھے جو فتح شیر کی موت کے بعد اور الف دین کے غائب ہو جانے کے بعد فوری طور پر باقی چار افراد کے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ دو کو وہ ختم کر چکے تھے چنانچہ باقی دو کے لیے بھی بات صرف موقعے کی تھی۔ میں نے محسن کو تیار رہنے کو کہا۔ ہم جس مشن پر نکلے تھے اس کے لیے تمام ضروری سامان ہمارے پاس تھا۔ میرے پاس دلاور کا دیا ہوا سائلینسر والا پستول تھا جس میں ابھی چار گولیاں باقی تھیں۔ محسن کے پاس پورا بھرا ہوا ریوالور تھا اور ٹیڈی کے پاس کلوروفارم کی وہ شیشی تھی جو ہمیں الف دین سے ملی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہمیں ان ..... میں سے کسی کو اغوا کرنا پڑتا۔ اس کے لیے یہی سامان ہمارے کام آ سکتا تھا۔

تھانے سے کچھ فاصلے پر ہمیں ایک ٹرک کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور جب وہ کش لیتا تھا تو صرف ایک چنگاری سی روشن ہوتی تھی۔ اس کا اپنا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ دوسرا بمپر کے اوپر چڑھا بونٹ میں سر ڈالے بظاہر کسی خرابی کو رفع کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن یہ کسی بھی جگہ ٹھہرنے کا وہ طریقہ تھا جو شک پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈلائٹس

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

آف کر دیں۔

"یہ ٹرک پہلے تو نہیں تھا یہاں" میں نے محسن کو متوجہ کیا اور گاڑی کو ٹرک کے پیچھے لے جا کر روک لیا "یہ وہی ٹرک تو نہیں ہے جس نے ایک گواہ ختم کر دیا۔ شاید دو۔"

"محض شک کی بنیاد پر کیا ہو سکتا ہے؟" محسن بولا۔ "ہم جا کے کیسے پوچھ سکتے ہیں کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ علی نواز اور چاند خاں کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ ڈیوٹی کر کے نکلیں تو انھیں بھی کچل ڈالو۔"

"ٹیڈی! ایک کام کرو استاد" میں نے کہا "ذرا مکینک بن کے جاؤ۔ زبردستی اس شخص کی مدد کرو۔ میں ذرا پیچھے ہوں گا۔ ان کے رویّے سے اندازہ ہو جائے گا۔ محسن، وہ اسپیڈ بریکر نکال۔"

میں اور ٹیڈی آہستہ سے دروازہ کھول کے اترے۔ لکڑی کے دو گٹکے میرے ہاتھ میں تھے۔ جن پر موٹی کیلیں ایک ایک انچ ابھری ہوئی تھیں۔ ٹیڈی چند قدم آگے گیا اور رک گیا۔ میں سائڈ میں دبک کے بیٹھ گیا۔ کوئی آواز کیے بغیر میں نے لکڑی کے بلاک دو پہیوں کے ساتھ لگا کے یوں رکھ دیے کہ کیلوں کا رخ اوپر کی طرف رہے۔

"کیا بات ہے بھائی؟" ٹیڈی کی آواز آئی "کیا خرابی ہو گئی ہے؟"

"اپنا کام کر۔ خرابی کا ماما" انجن میں خرابی تلاش کرنے والے نے غرّا کے کہا۔

"میں ایسے ہی نہیں پوچھ رہا ہوں" ٹیڈی بولا "ٹرکوں کا کام کرتا ہوں۔ ایک نظر دیکھنے دو۔"

غالباً ٹیڈی نے بھی بمپر پر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک زبردست گالی سنی۔

"تو مکینک ہے تو میں جرّی مار ہوں۔ دفع ہو جا" ٹیڈی کو ایک اور گالی ملی۔

"پہلے دھکا دیا اب گالی دیتے ہو" ٹیڈی گرم ہو گیا۔ "نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔"

"کون ہے یہ؟" ٹرک کے ڈرائیور نے نسبتاً نرم لہجے میں سوال کیا۔

"ایسے ہی استاد۔ خواہ مخواہ متھے لگ رہا ہے کہ مکینک ہوں" پہلے والے نے کہا "کمبل ہو گیا ہے۔"

"میں واقعی بہت تجربے کار مکینک ہوں" ٹیڈی نے استاد کے پاس آ کے کہا "میں نے کوئی پیسے تو نہیں مانگے تھے ایسے ہی مدد کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے گالی بکی۔"

"اچھا بھائی معاف کرو" ڈرائیور نے کہا "خرابی کوئی نہیں اور ہو گی تو ہم ٹھیک کر لیں گے۔ تم جاؤ۔"

میرا شک اب یقین میں بدلنے لگا تھا۔ ٹیڈی اب چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا۔

"اب کیوں کھڑا ہے۔ جاتا کیوں نہیں ہے" ڈرائیور نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"اب سڑک پر کھڑے رہنے پر بھی پابندی ہے کیا" ٹیڈی بولا "دیکھ رہا ہوں تم سے ٹھیک نہ ہو تو میں..."

ڈرائیور ایک خوفناک گالی بک کے اترا "تو ایسے نہیں جائے گا۔ پابندی کے بچے۔"

"او چلا جا میاں۔ کیوں پنگا لیتا ہے" بمپر پر چڑھے ہوئے شخص نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا" ٹیڈی نے چیخ کر کہا "تمھارے باپ کی سڑک ہے۔ تم کھڑے ہو تو میں بھی کھڑا ہوں۔"

ٹیڈی کے الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ دونوں اس کی طرف لپکے اور ٹیڈی بھاگ کھڑا ہوا۔ پلک جھپکنے میں میں نے کھلے دروازے سے ٹرک کی چابیاں نکال لیں اور واپس ہوا۔ ڈرائیور کے واپس آنے تک میں کار کے اندر تھا۔ ٹیڈی کے پیچھے وہ مشکل سے بیس قدم دوڑ اور لوٹ آئے تھے۔ ان کا ارادہ تعاقب کرنے یا اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کا تھا بھی نہیں۔ ڈرائیور واپس لوٹ کر اوپر چڑھا اور پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ چابیاں غائب ہیں۔ اسے اچانک جانا پڑا تھا چنانچہ اس نے چابیاں نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ یہ کیسے فرض کر سکتا تھا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا ہے اور دو منٹ کے مختصر وقفے میں کوئی چابیاں نکال کر لے گیا ہے۔ ٹیڈی نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ لوٹ آئے گا اور اگر نہ آ سکا تو گھر پہنچ جائے گا۔ میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو دیکھا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اچانک میں نے ٹرک ڈرائیور کو چلاتے سنا۔ اس کا ساتھی اب بونٹ بند کر چکا تھا۔ میری طرح وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ عمل کی گھڑی آ پہنچی۔ آٹھ بجے ڈیوٹی سے آف ہونے والے اگر پانچ دس منٹ پہلے نکل آئیں تو انھیں تیار ہونا چاہیے۔ چنانچہ غیر ارادی طور پر "سب ٹھیک ہے" کا اعلان کرنے کے لیے اس نے چابیاں گھما کے یہ دیکھنا چاہا ہوگا کہ انجن بالکل ایک اشارے پر سٹارٹ ہو سکتا ہے؟ میں ان کی آوازیں صاف نہیں سن سکتا تھا لیکن ان کی بدحواسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ چابیاں نہ ملنے پر مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے اور ٹرک کے اندر اور اوپر نیچے چابیاں تلاش کر رہے تھے۔ ٹرک کا رخ دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلنے والے سپاہی کس طرف جائیں گے۔

"میں آگے جاتا ہوں" میں نے محسن سے کہا "تو جیسے ہی انھیں نکلتا دیکھے تھوڑے سے وقفے کے بعد گاڑی لے کر آگے آ جانا۔ امید ہے ہم انھیں نکال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" میں نے آہستہ سے کار کا دروازہ کھولا اور اترنے ہی والا تھا کہ محسن نے مجھے روک لیا۔

"میں ان کو پہچانوں گا کیسے؟ یہاں تو لوگ مسلسل آ جا رہے ہیں۔"

"وردی والوں کو چھوڑ دے۔ وہ ڈیوٹی ختم کر کے نکلیں گے تو بغیر وردی کے ہوں گے" میں نے کہا "اس کے علاوہ ان دونوں کی کوشش ہوگی کہ اکٹھے رہیں۔ ممکن ہے وہ خوفزدہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہر طرف دیکھیں اور روانہ ہونے کے بعد بھی مڑ مڑ کر دیکھتے جائیں۔ ٹرک والوں کا ردِ عمل بھی....."

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت تھانے میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ انھوں نے شلوار قمیص کے اندر کمبل سے یوں بکل مار رکھی تھی کہ سردی سے بچنے کے علاوہ اپنا چہرہ بھی چھپا لیں۔ وہ دونوں کچھ دیر گیٹ پر کھڑے رہے۔ پھر واضح طور پر ایک نے دوسرے کو سر کی جنبش سے چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تھانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک بار انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو میں روانہ ہو گیا۔

"اب کیا ہوگا..؟" ٹرک کے ڈرائیور نے گالی دے کر کہا اور ٹرک کے لات ماری جو ایک احمقانہ اور اضطراری حرکت تھی۔ "تو اندھا ہو گیا تھا۔"

"مجھے الزام مت دو استاد۔ یہاں کوئی نہیں آیا۔ تم اندر بیٹھے تھے تو چابیاں تمھارے پاس تھیں۔"

"یہ سب اسی... کا چکر ہے۔ کون تھا وہ؟" ڈرائیور نے جو گالی دی وہ ٹیڈی کے لیے تھی۔

"کمال کرتے ہو۔ وہ باہر مجھ سے بات کرتا رہا اور بھاگ گیا۔ تم نے ہی کہیں گرا دی ہے چابی" کلینر بولا۔

"کہاں گرا دی ہے؟ کتّے کی طرح بھونکتا جا رہا ہے۔ سب جگہ تو دیکھ لیا" ڈرائیور نے چیخ کر کہا۔

ان دونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے قطعی بے نیازی کا انداز اختیار کیا لیکن ان کی گفتگو کا کچھ حصہ ضرور سن لیا۔ فٹ پاتھ پر دبک کر ساتھ ساتھ جانے والے دونوں مجرم کسی نادیدہ دشمن کے خوف میں مبتلا تھے چنانچہ بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت ان کے دلی جذبات کیا ہوں گے۔ عام دنوں میں وہ چھوٹے موٹے کیس کو دس بیس یا سو پچاس میں نمٹا دیتے ہوں گے۔ قدرت نے پہلی بار ان کو پچاس ہزار یکمشت دلوائے تھے لیکن اب انھیں اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شیطان کا پھیلایا ہوا طمع کا جال تھا اور بازی الٹ جانے سے ان کی توقعات بھی غلط ہو گئی ہیں۔ انھوں نے پچاس ہزار میں کوئی بڑا کام کرنے کا سوچا ہوگا۔ کوئی مشکل حل کرنے کا سوچا ہوگا یا اس رقم سے اپنا مستقبل سنوارنے کا سوچا ہوگا۔ اب وہ خود مشکل میں تھے اور مستقبل خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اتنی عقل تو خدا نے ان کو بھی دی تھی کہ فتح شیر کے عبرتناک انجام کے بعد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے اور دوسرے کی اچانک گمشدگی کا سلسلہ ملا سکیں۔ میں پچاس قدم کے فاصلے سے ان کے پیچھے رہا۔ جب انھوں نے موڑ کاٹا تو میں نے رفتار بڑھائی اور فاصلہ کم کیا۔ دس منٹ بعد میں نے انھیں جا لیا۔

"تم چاند خاں اور علی نواز ہو نا؟" میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک کہا۔

وہ دونوں اچھل پڑے "تم... کون ہو تم؟ ہم تمھیں نہیں جانتے" ان میں سے ایک نے ہمت کر کے کہا۔

"ہاں، لیکن میں تمھیں جانتا ہوں" میں نے کہا "میں تمھارا دشمن نہیں دوست ہوں۔ دشمنوں نے تو پورا بندوبست کر لیا تھا کہ تم کو بھی ٹرک سے کچل کر ہلاک کر دیں لیکن میں نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ پیچھے مت دیکھو، چلتے رہو۔"

"کیوں... کیا ثبوت ہے تمھارے پاس اس بات کا؟" دوسرا خوفزدہ لہجے میں بولا "تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟"

"میں تم کو سب بتا دوں گا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم بھی فتح شیر کے ساتھ چوہدری دلاور کے گھر گئے تھے؟" میں نے کہا۔ "اور وہاں سے تم نے ایک لاش اٹھائی تھی۔ اس کام کے تمھیں پچاس پچاس ہزار روپے ملے تھے۔ فتح شیر مارا گیا اور تمھارے ساتھ جانے والا ایک آدمی بھی۔"

"اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا" پہلے نے تھوک نگل کے خشک حلق کو تر کیا۔

"دوسرے کے ساتھ بھی حادثہ ہی پیش آیا تھا۔ تم کو ابھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اگر میں کوشش نہ کرتا تو ابھی تم دونوں ایک ساتھ بالکل ویسے ہی حادثے کا شکار ہو جاتے۔ ایک ٹرک تم دونوں کے اوپر سے گزر جاتا۔ یقین نہیں تو ملک کے تھانے کے باہر دیکھ لو۔ وہ ٹرک ابھی موجود ہوگا اور شاید صبح تک وہیں کھڑا رہے گا۔"

"تم... تم کو کیا... میرا مطلب ہے تم نے ہمیں کس لیے بچایا ہے؟" پہلے نے کہا۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ہی دوست بن کے مل جاؤ۔" دوسرا بولا۔ میں نے پیچھے سے فاکس ویگن کی آواز سنی۔

"دیکھو۔ میں بھی واقعی دوست نہیں ہوں۔ میں چوہدری دلاور کا دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب وہ تمہارا دشمن ہو رہا ہے تو میں اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ گاڑی آرہی ہے۔ ہمارے ساتھ بیٹھو اور اپنے گھر چلو۔ پہلے بیوی بچوں کو کہیں پہنچا دو۔ کسی عزیز رشتے دار کے گھر جہاں وہ محفوظ ہوں۔"

فاکس ویگن قریب آرکی اور محسن نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلانے لگے۔

"بیٹھو۔" میں نے کہا۔

"چاند خاں! دھوکا ہے یہ۔" علی نواز نے کہا۔ "گاڑی میں مت بیٹھنا۔"

"جاؤ... جاؤ تم لوگ۔" علی نواز چلایا۔ مجبوراً میں نے ریوالور نکالا۔ ان دونوں کی آواز ایک دم بند ہو گئی لیکن وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ میں نے سامنے سے دو افراد کو آتے دیکھا۔ ان کی مداخلت کام خراب کر سکتی تھی۔ شاید محسن نے میری مشکل کا اندازہ کر لیا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ میں نے چاند خاں کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ گرنے سے پہلے اسے محسن نے سنبھال لیا اور گھسیٹ کر لے گیا۔ دوسرا اپنے ساتھی کا یہ انجام دیکھ کر رضاکارانہ طور پر آگے بڑھا۔ فاکس ویگن کے دو دروازوں نے ہمارے لیے تھوڑی سی مشکل پیدا کی۔ محسن ابھی چاند خاں کو پچھلی سیٹ پر ڈال ہی رہا تھا کہ دونوں راہ گیر چلانے لگے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اور ہماری طرف دوڑے۔ میں نے دیکھا تو پیچھے سے بھی تین آدمی شور مچاتے آرہے تھے۔ وہ ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے تھے چنانچہ دو کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے جو ٹرک کے بے کار ہو جانے کے بعد وقت ضائع کیے بغیر اپنے شکار کے تعاقب میں روانہ ہو گئے تھے۔

"فائر کر محسن!" میں نے چلا کر کہا۔ "ورنہ ہم پھنس جائیں گے۔" اور محسن نے جیب سے ریوالور نکال کے ایک ہوائی فائر کیا۔

ہماری طرف دوڑنے والے ایک دم رکے۔ ان میں سے ... گرا اور باقی پلٹ کر بھاگے۔

"ہیڈ لائٹس آف رکھنا۔" میں نے چاند خاں کو ... ڈال کے علی نواز کو دھکیلا اور خود محسن کے ساتھ بیٹھ کے ... بند کر لیا۔ محسن نے گاڑی کو پورا ایکسلریٹر دیا اور فاکس ویگن ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھی۔ فٹ پاتھ پر اب ... ہو گیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اور کلینر شور مچانے والوں میں ... تھے اور اغوا کی اس واردات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر ... تھے جو ایک تھانے کے سامنے پیش آئی تھی۔

دو منٹ میں فاکس ویگن کئی موڑ کاٹنے کے بعد جائے واردات سے بہت دور نکل آئی تھی اور ہم کسی فوری خطرے سے محفوظ تھے۔ ریوالور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا اور میں آگے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ سیٹ کے اوپر ... ریوالور کا رخ علی نواز کی طرف تھا جسے اپنی موت کا یقین ... تھا۔ محسن نے گاڑی کو فورٹریس اسٹیڈیم کی دیوار کے سائے میں روک لیا۔ "تمھیں پچاس ہزار روپے جیب میں ڈالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ جس شخص نے ایک لاش کو کسی ... جگہ پر دفن کرنے کا معاوضہ ادا کیا ہے وہ تمھاری لاش غائب کرنے کے لیے کسی اور کو بھی پچاس ہزار دے سکتا ہے۔" ... نے کہا۔

"چوہدری صاحب نے ہمیں بھی پچاس پچاس ہزار ... تھے۔" محسن بولا۔ "چار افراد کے نام تینوں کے ساتھ۔"

"اب تم یہ بتاؤ کہ تم کو کہاں مرنا قبول ہے؟" میں نے ...

"ایک فتح شیر تھا۔ اس کا سر اور باقی جسم ایک ساتھ قبر میں ... دیے گئے ہیں۔ دوسرے کی لاش کا قیمہ مردہ خانے میں پڑا ... اور تیسرے کی لاش ابھی دو چار دن بعد دریافت ہوگی۔ جب ... کر بو دینے لگے گی۔ بیوی بچوں سے کچھ کہنا ہے تو بتا دو۔ ... پہنچا دیں گے۔"

"دیکھیں جی! ہم سے غلطی ہوئی... مگر ہم کیا کرتے ... حکم کی تعمیل پر مجبور تھے۔ فتح شیر افسر تھا۔" علی نواز نے ... ہوئی آواز میں کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ وہ کس کی لاش تھی۔"

"یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ لاش کہاں ہے؟" میں نے ...

علی نواز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہم تمھیں چھوڑ بھی سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دیکھو ..." میں نے محسن کو مخاطب کیا۔

"ہاں استاد۔ یہ تو سودے کی بات ہے۔" محسن ... کہا۔ "ایک سودا ہم نے چوہدری صاحب سے کیا تھا ...

ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ چوہدری صاحب کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم اُن سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اِن کو موقع دے سکتے ہیں کہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر بھاگ جائیں اور پھر کبھی چوہدری صاحب کے سامنے نہ آئیں۔"

"مجھے... مجھے منظور ہے۔ دیکھو میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔" علی نواز رونے لگا۔ "پہلا بچہ ہے یہ میرا۔"

"روتا کیوں ہے۔ کیا تجھے یتیم پیدا نہیں ہوتے؟" میں نے بے رحمی سے کہا اور اس کے ایک چھانپڑ رسید کیا۔ "تیری بیوی تو جوان ہوگی۔ پال لے گی اسے کسی نہ کسی طرح۔ اور اگر تجھے منظور نہیں تو ہم اس کو بھی منگوا لیتے ہیں۔"

"خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔ تم کیا چاہتے ہو؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب لے لو۔" علی نواز نے کہا۔

چاند خاں نے آہستہ سے حرکت کی اور اٹھ بیٹھا۔ "بزدل بنتے!" وہ علی نواز کو حقارت سے دیکھ کر بولا۔ "اتنا ہی ڈرپوک تھا تو پولیس میں کیوں بھرتی ہوا تھا۔ کیا بگاڑ سکتے ہیں یہ میرے اور تیرے بیوی بچوں کا۔ انھیں کیا معلوم وہ کہاں ہیں؟"

علی نواز نیا بھرتی ہوا تھا۔ چاند خاں اس کے مقابلے میں پرانا ہی نہیں، دلیر بھی تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور پھر میری طرف دیکھا۔ "میں جانتا تھا تم دھوکے باز ہو۔ ریوالور سے کام نہ لیتے تم تو میں بتاتا تمھیں۔"

"استاد! یہ بہادر آدمی ہے۔" میں نے محسن سے کہا۔ "مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔"

"مرد کے بچے ہو تو خالی ہاتھ سامنے آؤ۔" چاند خاں نے ہیکڑی سے کہا۔ "ورنہ گولی مار دو — ہم مرنے سے نہیں ڈرتے ہیں۔"

"چلو استاد۔" محسن بولا۔ "اِن کو اپنے تھانے لے چلتے ہیں۔ وہاں مقابلہ بھی ہو جائے گا اور تفتیش بھی کر لیں گے۔ تم اپنے تھانے میں تو روز ہی تفتیش کرتے ہو گے چاند خاں۔ آج دیکھو کہ ہم کس طرح تفتیش کرتے ہیں۔"

اس وقت تک میں سمجھا نہیں تھا کہ "اپنے تھانے" سے محسن کی کیا مراد ہے۔ ان دونوں کو شیڈی کے ٹھکانے لے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں پورا محلہ آباد تھا اور وہ ہماری واحد جائے پناہ تھی۔ جہاں کسی قسم کی پُرتشدد کارروائی کرنا ہمارے حق میں بُرا ہوتا۔ دوسری جگہ وہ کوٹھی جہاں پہلے رابعہ کا آفس تھا اور جس کی چابی اب ہماری جیب میں تھی لیکن وہ جگہ بھی فی الحال محفوظ نہیں تھی۔ جب محسن نے گاڑی کا رخ رابعہ کی اسی کوٹھی کی طرف کیا جہاں فتح شیر کا قتل ہوا تھا تو میں نے اس کے انتخاب، اس کی ذہانت اور ہمت کی داد دی۔ لاش وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی اور تفتیش کا عمل بھی مکمل ہو چکا تھا۔ رات کے وقت وہاں اب ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی ہوگی ورنہ وہ بھی نہیں۔ پولیس نے عمارت کو سیل کرا دیا ہوگا اور یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس عمارت کے اندر پھر کوئی واردات کرنے جا سکتا ہے۔ سڑک اب خالی تھی اور فاکس ویگن کی آواز اتنی تھی کہ چاند خاں شور کرتا تب بھی بند شیشوں سے باہر اس کی کوئی نہ سنتا۔

"کہاں لے جا رہے ہو تم ہمیں؟" چاند خاں نے کہا۔ "تم کو پہچان لیا ہے میں نے سکندر بخت! تم خود ایک اشتہاری مجرم ہو اور تم نے ایک اور جرم کیا ہے دو پولیس والوں کو اغوا کر کے۔ پولیس والے سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کے منہ پر ریوالور کا بٹ مارا۔ وہ بلبلایا اور اس کے لبوں کے گوشوں سے خون بہنے لگا۔

"سرکاری ملازم کی اولاد! وہ سرکار کا کام تھا جو تو نے پچاس ہزار میں کیا تھا۔ مجھے میرا جرم بتاتا ہے۔ اپنا جرم یاد کر۔" میں نے کہا۔ "میں تو اشتہاری مجرم ہوں۔ جہاں اتنے قتل کیے ہیں وہاں ایک اور سہی لیکن دلاور جس کا نام ہے وہ اشتہاری مجرموں سے بڑا مجرم ہے۔ میں تو اتنا لحاظ کروں گا کہ تیرے جرم کی سزا صرف تجھ کو ہی ملے مگر وہ تیرے خاندان کے بچے بچے کو مار ڈالے گا۔"

"خدا کے لیے ہم اپنی غلطی مانتے ہیں۔" علی نواز کانپتے ہوئے بولا۔ "میں سب بتا دیتا ہوں۔"

میں نے اس کے بھی ایک چھانپڑ مارا۔ "ہمیں اس سورما سے پوچھنا ہے۔ تیری باری بعد میں آئے گی۔"

رابعہ کی اس کوٹھی کے گرد خاموشی تھی۔ اندر اندھیرا تھا اور آس پاس کسی کی موجودگی ثابت نہ ہوتی تھی۔ میں نے ریوالور محسن کو دیا اور خود نیچے اتر کے کوٹھی کے گرد ایک چکر لگایا۔ دیوار کے قریب سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھوں کے بل خود کو اوپر کھینچا اور اندر جھانکا۔ دو کرسیوں پر دو پولیس والے بیٹھے تھے جن میں سے ایک کے کندھے پر ایک ستارہ تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس اس کیس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی ہے اور رات کے وقت بھی ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل جائے واردات پر پہرا دے رہے ہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر مجھے ٹین کا ایک خالی ڈبا نظر آگیا جو نہ جانے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کب سے یونہی پڑے پڑے زنگ سے گل گیا تھا۔ میں نے ڈبا دیوار کے اوپر سے اندر اچھال دیا اور خود بھی اندر کود گیا۔ ڈبا فرش پر گرنے سے آواز پیدا ہوئی۔ میں دیوار سے چپک کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ حسبِ توقع افسر نے ماتحت کو بھیجا۔ کانسٹیبل ٹہلتا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آیا۔ وہ میرے سامنے سے گزرنے لگا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا جیسے گھات میں بیٹھی ہوئی بلی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے۔ اس کی آواز تک نہ نکلی اور میرے ہاتھ کی ایک ضرب نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے صاف جگہ پر لٹا دیا اور حلق سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ اے ایس آئی دوڑتا ہوا آیا۔ "کیا بات ہے... کون ہے؟" ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے زمین پر پڑے ہوئے کانسٹیبل کو فوراً دیکھ لیا۔ وہ بہت محتاط طریقے پر آگے بڑھا اور بے ہوش سپاہی پر جھک گیا۔ اسی وقت میں نے جست لگائی اور اے ایس آئی چند سیکنڈ کی مزاحمت کے بعد ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کا ریوالور اپنی دوسری جیب میں ڈالا اور باہر نکلا۔ فاکس ویگن سو گز کے فاصلے پر ایک شکستہ مکان کے پیچھے موجود تھی جس کی صرف دو دیواریں سلامت کھڑی تھیں۔ میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس جلا کے گاڑی کو اطمینان سے کوٹھی میں لے گیا۔

"باہر نکلو دونوں۔" میں نے حکم دیا۔ "اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔"

انھوں نے تعمیل کی اور محسن نے ان کی جیب سے ہر چیز نکال لی۔ دونوں کی جیب سے بارہ سو روپے برآمد ہوئے۔ محسن نے ان کی گھڑیاں بھی اتار لیں۔

"جب کسی ملزم کو تھانے لایا جاتا ہے تو تم بھی یہی کرتے ہو نا؟" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا پرائیویٹ تھانہ ہے اور ہم یہاں تمھارے ساتھ وہی کریں گے جو تم بعض اوقات بے گناہوں کے ساتھ بھی کرتے ہو۔" جامہ تلاشی کے بعد میں ان کو اوپر لے گیا اور اپنا ریوالور محسن کو دیا۔ "اگر یہ بہادر سپاہی مرنا چاہے تو بلا تکلف گولی مار دینا۔ سائلینسر کی وجہ سے آواز باہر نہیں جائے گی۔"

نیچے آ کے میں نے دونوں بے ہوش پڑے ہوئے پولیس والوں کو دیکھا۔ باری باری میں نے ان کو کندھے پر ڈالا اور اوپر لے گیا۔ محمود و ایاز کو ایک ساتھ خلعتِ فاخرہ سے محروم کرنے کے بعد میں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ ہمارے بستر اب بھی وہیں بچھے ہوئے تھے۔ ان کی چادروں کو پھاڑ کے میں نے رسّی کا کام لیا اور پھر ان کے حلق میں ... ٹھونس دیا۔

"یہ بھی تمھارے افسر تھے۔" میں نے چاند خان ... کہا۔ "باوردی افسر تھے اور ڈیوٹی پر تھے۔ ان کی حالت ... رہے ہو؟"

"یہ رات بھر ایسے ہی پڑے رہیں گے اور ... اکڑ کے مر جائیں گے۔" محسن بولا۔

"آؤ میں تم کو فتح شیر کا مزار بھی دکھاؤں۔" میں ... چاند خان کی گدّی پر ہاتھ رکھ کے ایک جھٹکا دیا۔ ... تھا کہ میں نے اسے لات ماری اور وہ آگے جا کے ... کے دروازے سے ٹکرایا۔ باتھ روم کا دروازہ کھل گیا ... چاند خان منہ کے بل گرا لیکن گرتے ہی پھر کھڑا ہو گیا ... نے ریوالور ایک ہاتھ میں رکھا اور دوسرے ہاتھ ... لائٹر جلایا۔

"یہ دیکھو۔ یہ سب فتح شیر کا خون ہے۔" میں ... "فرش پر اور دیواروں پر۔ اس کا سر یہاں پڑا تھا اور ... یہاں۔ تمھاری لاش کے چار ٹکڑے بھی کیے جا سکتے ... باہر نکلو۔"

"تم اس طرح مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔" ... نے کہا۔ وہ ضدی اور باہمت آدمی تھا۔

میں نے ریوالور ایک طرف رکھ دیا۔ "اب آ جا ... مقابل۔ ہم اور تم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔

چاند خاں نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ میں ... کو ٹھوکر مار کے کمرے کے آخری گوشے میں پھینک دیا ... کھڑا ہو گیا۔

"ڈرو نہیں۔ مقابلے میں کوئی مداخلت نہیں کرے ..." میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ چاند خاں کچھ دیر ساکت ... پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ ایک ... میں وہ نیچے لیٹ گیا اور اس نے مجھے اپنے اوپر سے گز... فرش پر پھینک دیا۔ اس کا اعتماد بے بنیاد نہیں تھا ... کے داؤ جانتا تھا۔ میں بڑی پھرتی سے الٹی قلابازی ... اٹھا۔ وہ میرے اوپر جست لگا کے آیا تھا لیکن میرے ... ہٹنے سے اس کا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر ... بل گرا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کے اٹھایا اور ... اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ جب میں نے ... تو وہ دیوار سے ٹکرایا اور ایک دم پلٹ کر آیا۔ میں ... کے سینے پر فلائنگ کک ماری۔ دُہرے تصادم کی قو...

... چت کر دیا۔ وہ اب غیظ و غضب کا طوفان بنا ہوا تھا۔ ...س کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور اس کے لبوں سے ... کے ساتھ لہو جاری تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے ... مجھے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا۔ میں نے دوسری لات اس کے سر پر ماری مگر اس نے اپنی گرفت نہیں چھوڑی۔ اگر میں ایک دم نہ پلٹتا تو وہ میری ٹانگ کو موڑ کر ناکارہ کر دیتا۔ ...میں نے پیچھے کی طرف جست لگا کے اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ وہ کمان بن گیا مگر میں اسے جھکاتا گیا۔ اگر وہ میری ٹانگ نہ چھوڑتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ آزاد ہوتے ہی میں نے اس کے پیچھے آ کر جھٹکا دیا اور وہ گھوم کر کھڑا ہوا تو میں نے اسے ایک اور چکر دے کر اٹھا لیا۔ کھیل ختم کرنے کے لیے میں نے اسے پوری قوت کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔ وہ چلّایا۔ نیچے گر کے اس نے ہاتھوں کے بل پر اٹھنے کی اپنی سی کوشش کی اور پھر گر گیا۔

"ہاں۔ اب بولو۔" میں نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پا کے کہا۔ "کون سیر ہے اور کون سوا سیر؟"

علی نواز کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سورما ساتھی کی حالتِ زار دیکھ رہا تھا۔

"اس کو بھی انٹروگیشن سیل دکھا دو استاد۔" میں نے کونے میں سے اپنا ریوالور اٹھا کے کہا۔

محسن نے علی نواز کے ایک لات ماری۔ "چل آ گے..." اس نے خالص پولیس والوں کے انداز میں گالی دی۔ علی نواز خود بخود باتھ روم کی طرف چل پڑا۔ جہاں محسن نے اسے منجمد سیاہ خون دکھا کے نفسیاتی طور پر مفلوج کر دیا۔

"ہاں بھئی، اب بتاؤ طافو کی لاش کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" چاند خاں نے کہا۔

"تمھارے تھانے میں جب ملزم لائے جاتے ہیں تو وہ بھی یہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان سے کیسے پوچھ لیتے ہو تم لوگ سب کچھ۔ استاد! اس چھوٹے بدمعاش کو بند کر دو اور ذرا اتارو اس کے کپڑے۔ میں لاتا ہوں اس کے باپ، مولا بخش کو۔"

محسن نے باہر کے درخت سے دو مضبوط شاخیں توڑیں اور ان پر سے پتے صاف کر دیے۔ گاڑی میں سے جیک ہینڈل نکالا اور پھر اوپر آ گیا۔ محسن نے میرے احکامات کی حرف بحرف تعمیل کی تھی۔

"تیرہ نمبر کا چھتر تو نہیں ہے ہمارے پاس لیکن اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار ہیں۔" میں نے ہری شاخ کو شائیں سے لہرا کے وار کیا۔ چاند خاں تڑپا اور بلبلایا۔ "آج تم عامل نہیں معمول ہو۔ ہر رات تھانے میں دوسروں پر طاقت آزماتے تھے۔ آج دیکھتے ہیں تم کتنے طاقتور ہو۔" میں نے پھر لچک دار شاخ سے وار کیا۔ چاند خاں کی جلد پر دو گہری سرخی مائل سیاہ لکیریں سی نمودار ہو گئیں۔ وہ کتے کی طرح چلّایا۔ محسن نے دوسری شاخ سے کام لیا۔ وہ پھر چیخا۔

"اس کی آواز بند کرو استاد۔" میں نے کہا اور محسن نے چادر پھاڑ کے اس کا منہ بند کر دیا۔ ہمارا ارادہ اس کو مارنے کا نہیں تھا لیکن اس کی فرعونیت اور ضد نے ہمیں مجبور کر دیا کہ اسے تھوڑی سی سزا ضرور دیں۔ دس منٹ بعد اس کی کھال اُدھڑ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ محسن نے باتھ روم میں سے دوسرے ملزم کو نکالا۔

"تم بھی تھانے میں روز اعترافِ جرم کراتے تھے، بے گناہوں سے۔ لاوارثوں سے۔" میں نے کہا۔ "اسی طرح۔" میں نے زمین پر پڑے ہوئے چاند خاں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں پچاس ہزار بھی دے دوں گا۔" وہ چلّانے لگا لیکن اسے بھی یہ بتانا ضروری تھا کہ جب "تفتیش" کی جاتی ہے تو زیرِ تفتیش ملزم پر کیا بیتتی ہے۔ ہر تھانے میں کسی بھی جرم کا سراغ لگانے کا سب سے مؤثر طریقہ تشدد کا ہے اور جس غیر انسانی بے رحمی سے وہاں لائے جانے والوں کو مارا جاتا ہے اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ ان میں سے آدھے مجرم تو سب اُگل دیتے ہیں۔ باقی آدھے مار کھا کے نکلتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پولیس نے صرف مار کے چھوڑ دیا ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ کسی جھوٹے مقدمے میں ملوّث کر کے جیل بھجوا دیتے۔ بلاوجہ حوالات میں بند ہو کے تشدد برداشت کرنے والے پولیس کے خلاف حبسِ بے جا اور تشدد کا کوئی مقدمہ نہیں کرتے۔ پولیس سے دشمنی مول لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف ثبوت اور شہادت پیش کرنا جوئے شیر لانے سے مشکل کام بن جاتا ہے۔

جتنی دیر میں وہ ہوش میں آئے، میں نے اور محسن نے اطمینان سے ایک ایک سگریٹ پی اور یہ طے کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کام میں زیادہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ رات کے دس بجنے والے تھے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چاند خاں پہلے ہوش میں آیا اور کراہنے لگا۔ میں نے ہری شاخ پھر اٹھالی۔

"ہاں بھئی چندا میاں؟" میں نے شاخ کو ہوا میں لہرایا۔ "طافو کی لاش کہاں ہے اور وہ پچاس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں بتا دوں گا۔" چاند خاں نے روتے ہوئے کہا۔ "اور مت مارو مجھے۔"

میں ہنسا۔ "بڑے کمزور دل ہو یار۔ یہ تو تم روز ہی دیکھتے تھے۔ کسی اور کی حالت پر بھی کبھی آنسو آئے تھے؟"

"میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں جہاں طافو کی لاش دفن ہے۔" چاند خاں نے بُری طرح کراہتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وہ پچاس ہزار بھی چاہئیں جو تم نے اس شیطانی کام کے لیے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں وہ بھی دے دوں گا۔ وہ بھی وہیں دفن ہیں۔" چاند خاں نے کہا۔ شکست اور احساسِ ذلت نے اسے موت سے بدتر عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ نامعلوم قاتلوں سے تو ڈر رہا تھا لیکن یہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی "پولیس کو پکڑنے والی پولیس" بھی ہے جن کے تھانے میں وہی سب کچھ ہوتا ہے جو عام تھانوں میں ہوتا ہے اور یہ سب اس کے ساتھ بھی ہوگا۔

"تم لوگوں نے اس لاش کو کہاں دفن کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"قصور جانے والی سڑک پر۔ یہاں سے آٹھ دس میل دور۔" چاند خاں بولا۔ "مجھے وہ جگہ یاد ہے۔"

"تم کہتے ہو کہ رقم بھی وہاں دفن ہے۔ رقم تمھارے گھر میں کیوں نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے پہلے گھر میں ہی رکھی تھی۔ آج فتح شیر کے قتل کی خبر سن کے میں ڈر گیا۔" وہ بولا۔

میں نے اچانک اس پر حملہ کیا اور شاخ سے پے در پے وار کیے۔ وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔

"اب بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا۔ رقم دفن کرنے کے لیے تو اتنی دور گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "آٹھ دس میل دور جہاں لاش دفن ہے؟ کیوں؟ لاش کے ساتھ ضروری تھا رقم گاڑنا۔ میں تجھے یہیں گاڑ جاؤں گا اگر سچ نہ بتایا۔"

"رقم دوسری جگہ ہے۔" چاند خاں کراہتے ہوئے بولا۔ "علی نواز سے پوچھ لو۔"

علی نواز اب ہوش میں تھا۔ اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں پورے ایک لاکھ دے دوں گا تمھیں۔ میرے گھر کے صحن میں دبے ہوئے ہیں۔"

میں نے محسن سے مشورہ کیا۔ "ان دونوں کو ساتھ لے چلتے ہیں۔"

"اور ان کا کیا کریں؟" اس نے فرش پر پڑے ہوئے اے ایس آئی اور پولیس مین کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کو یہیں چھوڑ جانا چاہیے۔ ان کی وردی، ریوالور وغیرہ سب۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دوسرا کیس ہو جائے گا۔"

"کیس تو اب بھی ہوگا۔ کیا یہ لوگ رپورٹ نہیں کریں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہم میں سے کسی کی صورت نہیں دیکھی انھوں نے۔" میں نے کہا۔ "ہوش آنے پر سب کچھ موجود پائیں گے تو خود کو شرمندگی سے اور محکمہ جاتی کارروائی سے بچانے کے لیے خاموش رہنا بہتر سمجھیں گے۔ ورنہ فرائض میں غفلت برتنے پر معطلی تو لازمی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ رابعہ سے مزید پوچھ گچھ ہو۔ رقم سب نکال لو وردی میں سے اور ان کو بستروں پر لٹا کے نکل چلو۔ سردی سے مریں گے نہیں اور کچھ دیر میں ہوش آ... تو اپنی اپنی وردی پہن کے پھر مستعد ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے پہلے تو دیکھیں گے کہ کسی نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو کیوں کیا تھا اور جب وجہ کوئی سمجھ میں نہیں آئے گی تو ایک دوسرے سے رازداری کا سمجھوتا کر لیں گے۔ اپنی عزت اور نوکری بچائیں گے۔ ان کے شناختی کارڈ، پیٹی، وردی اور ریوالور محفوظ رہنے چاہئیں اور ہماری یہاں موجودگی کا کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہیے۔ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ میرا ارادہ تھا پہلے کہ ریوالور اور اے ایس آئی کی وردی لے لوں۔ جو وردی ہمارے پاس تھی وہ تو گاڑی میں جل کے خاک ہوگئی لیکن پکڑ دیے... کہ پھر کیس بنے گا تو رابعہ کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے پلٹ کر ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ کپڑے پہن کر تیار ہو جائیں۔

"ان دونوں کو کہاں لے جانا ہے؟" محسن نے کہا۔

"جہاں یہ ہمیں لے جائیں۔" میں نے کہا۔ "پہلے طافو کا مدفن دیکھنا ہے۔ لاش نکالنی نہیں ہے۔ پھر اس چھوٹے علی نواز کے ساتھ جانا ہے۔ ایک لاکھ تو واپس لیں۔ اتنی سزا ضروری ہے ان کے لیے۔ یہ قانون کے محافظ کہلاتے ہیں اور اس طرح قاتلوں سے لاشوں کے سودے کرتے ہیں۔"

"اس کے بعد؟" محسن بولا۔ "ان کو کہاں چھوڑیں گے؟"

"یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "ان کو آزاد چھوڑ دیں یا چوہدری صاحب کو ارسال کر دیں؟"

"وہ ان کو قتل کر ڈالے گا۔" محسن نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ خس کم جہاں پاک۔" میں نے کہا۔ "دنیا کو ایسے بے ضمیر شیطانوں کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ ذرا اپنے چوہدری صاحب کو بھی تو پتا چلے کہ ایم آر ایس کا بھی ایک تھانہ ہے۔ جہاں مجرموں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔"

"کیا یہ لوگ چوہدری دلاور کو اس جگہ تک نہیں لے آئیں گے؟"

"مشکل ہے۔ رات کا وقت تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے کی عقل بھی ٹھکانے نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ راستہ کیا تھا۔"

"چاند خاں یہ تو بتا سکتا ہے کہ اس کوٹھی میں فتح شیر کو قتل کیا گیا تھا۔" محسن نے کہا۔

"وہاں ہمارے یہ فرض شناس اے ایس آئی اور ماتحت کانسٹبل ہوں گے جو اسے فضول بکواس قرار دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ رات بھر انھوں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ مجال ہے کوئی پرندہ بھی پر مارتا۔" میں نے کہا۔

ہم نے چاند خاں اور علی نواز کو اتنی مہلت دی کہ وہ ہاتھ منہ دھولیں اور اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ محسن نے ان پر نگاہ رکھی اور میں نے اتنی دیر میں دونوں پولیس والوں کو گھسیٹ کر بستر میں ڈالا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ وردیاں بھی انھیں پہنا دوں اور ہم انھیں وہیں ڈال دیں جہاں سے وہ پکڑے گئے تھے۔ محسن نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔

"اس طرح دونوں کو شک بھی نہیں ہوگا کہ کسی نے اوپر جاکے تفتیش وغیرہ کی تھی۔" محسن بولا۔

"وہ سمجھیں گے کہ حملہ آور چور لٹیرے تھے۔ جیب میں جو کچھ تھا وہ نکال کے لے گئے۔" میں نے کہا۔ "کتنی رقم ہاتھ لگی ان سے؟"

"اے ایس آئی کی جیب میں ساڑھے چار ہزار تھے۔ کانسٹبل کا شاید بُرا دن تھا۔ اس کی جیب سے صرف ساٹھ روپے نکلے۔" محسن بولا۔

"دونوں کی جیب میں دس دس روپے چھوڑ دے۔" میں نے کہا۔ "بالکل کنگال نہ ہوں۔"

اوپر سے اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹانے کے بعد میں نے کانسٹبل اور اے ایس آئی کو اسی جگہ لٹا دیا۔ بالکل اسی پوز میں کہ آنکھ کھلے تو وہ سمجھیں کہ لوٹنے کے سوا کسی نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ بفرضِ محال انھوں نے صبح ہنگامہ بھی کیا کہ کوئی چور ڈاکو رات کو ان کی جیب خالی کر گیا تو یہ رابعہ کے لیے تشویش کی بات نہیں ہوگی۔ کسی کے لیے فتح شیر کے قتل اور اس واردات کے درمیان تعلق ثابت کرنا ناممکن ہوگا۔ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور میں نے چاند خاں کو آگے بٹھایا تھا۔ اس کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور ہر جھٹکے پر اس کے حلق سے آہ نکلتی تھی۔ علی نواز میرے ساتھ چوہے کی طرح دُبکا بیٹھا تھا۔

"خیال رکھنا کہ ریوالور کی نال تمھارے سر کے پیچھے ہے۔" میں نے نال کو چاند خاں کی گدّی سے لگا کے کہا۔ "تمھارا کس بل تو نکال دیا ہے ہم نے لیکن بعض اوقات رسّی جل جاتی ہے اور بل نہیں جاتا۔ ذرا سی غلطی کا انجام یہ ہوگا کہ کسی آزار کے بغیر اس ریوالور کی گولی تمھارے سر میں سوراخ کر دے گی۔ ویسے میں خالی ہاتھ سے منکا توڑنا بھی جانتا ہوں۔"

"پیچھے والے کا بھی خیال رکھنا۔" محسن نے کہا۔

"پروا نہیں استاد۔ ذرا ہلے تو سہی۔ گردن مروڑ کر باہر پھینک دوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ ہمیں جلّو موڑ کی طرف لے گئے۔ جب ان دونوں نے اتفاق رائے سے کہا کہ اب وہ جگہ چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے تو میں نے محسن کو اور چاند خاں کو اتار دیا۔ "پہلے یہ بتائے گا کہ انھوں نے لاش کہاں گاڑی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو چاند خاں کو سنبھال۔ میں واپس آنے کے بعد دوسرے کو لے جاؤں گا۔ کسی نے غلط بتایا تو پتا چل جائے گا۔"

"خطرہ مول لینے کا فائدہ نہیں استاد۔" محسن نے کہا۔ "تو گاڑی یہاں چھوڑ دے اور اسے پیدل ٹہلاتا ہوا لے جا۔"

میں نے محسن کی تجویز سے اتفاق کیا اور گاڑی کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر سے میں تین سال پہلے بھی گزرا تھا۔ یہ سڑک بھارتی علاقے میں واقع قصبے کھیم کرن تک جاتی تھی اور یہ قصبہ فتح ہوا تو پاکستانی افواج نے اسے عوام کے لیے کھول دیا تھا چنانچہ لاہور کے جیالے جوق در جوق سائیکلوں، تانگوں اور اسکوٹروں پر کھیم کرن پہنچے تھے۔ میں لندن سے چند دن کے لیے آیا ہوا تھا اور شوقِ دید میں دشمن کی مفتوحہ سرزمین کو اپنے پیروں سے روندنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب سماں تھا۔ جلّو موڑ سے آگے ٹریفک بند تھی کیونکہ سڑک پر ملٹری کے ٹینک اور ٹرک، آرمرڈ کاریں اور کانوائے آ جا رہے تھے۔ لوگ کچی زمین پر پیدل میلوں چل کے کھیم کرن پہنچے تھے۔ وہ زمین بھی محاذِ جنگ ہی تھی چنانچہ ہل کے بجائے ٹینکوں نے کھود ڈالی تھی اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس مٹی میں چلنے والوں کے پاؤں ٹخنوں تک گرد میں دھنس جاتے تھے لیکن واماندگانِ شوق کے لیے یہ مسافت کی سختی کچھ نہ تھی۔ میں نے کیمم کرلی کے ویران قصبے میں ہزاروں افراد کو فتح کی خوشی میں سرمست گھومتے اور فاتح افواج کو ان کا استقبال کرتے دیکھا تھا۔ آج اسی سڑک پر ہر سو سناٹا اور اندھیرا تھا۔ میں ایک اور دشمن پر فتح پا کے یہاں پہنچا تھا لیکن اس سفر کے مقاصد یکسر مختلف تھے۔

پتلی سی سڑک پر ٹریفک نام کو نہ تھی لیکن میں نے احتیاط کو مقدم سمجھتے ہوئے سڑک سے کچھ فاصلے پر رہنا مناسب سمجھا۔ میں نے علی نواز کو دس قدم آگے رکھا تھا اور اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ شرافت سے چلتا رہے گا تو اسی راستے سے واپس بھی آئے گا ورنہ صبح تک اس کی تدفین بھی یہیں ہو جائے گی۔ جہاں سے طافو کا مدفن دور نہیں ہے۔ راستے میں جھاڑیاں تھیں، درخت تھے اور اچانک گڑھے آجاتے تھے۔ کئی بار علی نواز نے ٹھوکر کھائی اور خود میں بھی گرتے گرتے بچا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم تین فرلانگ آچکے تھے جب میں نے علی نواز سے کہا۔ ”اب کیا صبح تک چلتے رہنا ہے؟“

”پہنچ گئے جناب! وہ سامنے دیکھیں۔ کھجور کے تین درخت۔“ علی نواز نے کہا اور مجھے نیم روشن افق پر ان کا سایہ سا نظر آیا۔

تینوں درخت ایک دوسرے سے مساوی فاصلے پر تھے اور اگر ان کے درمیان خط کھینچا جاتا تو ایک مثلث بنتی۔ جس کے تینوں ضلعے برابر ہوتے۔ علی نواز وسط میں پہنچ کے رک گیا۔

”مجھے تو یہاں کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔

”طافو کو دفن کرتے وقت کوئی پتھر وغیرہ رکھا تھا؟“

علی نواز نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دلاور نے کہا تھا زمین اس طرح برابر کر دینا کہ پتا نہ چلے‘ یہی جگہ ہے وہ۔“

”پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہم طافو کی قبر پر کھڑے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ثبوت تو کھودنے سے ہی ملے گا۔“ علی نواز نے مایوسی سے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ گورکنی کا سامان تم اپنے ساتھ لائے تھے؟“ میں نے کہا۔ ”لائے تھے تو کیا واپس بھی لے گئے تھے؟“

”نہیں... سامان دلاور صاحب کی کوٹھی سے ملا تھا۔“ وہ بولا۔ ”اسے ہم یہیں پھینک گئے تھے۔“

”یہیں... یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یاد کرو کہاں پھینکا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”یا میں یاد دلاؤں؟“

”میں... میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔ وہ کچھ دیر درختوں کے گرد و نواح میں پھرتا رہا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات مشتبہ تھیں۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اچانک میں نے اسے ایک لات ماری۔ وہ منہ کے بل مٹی میں گرا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔

”ہائے جی میں مر گیا۔ اف اللہ جی۔“ اس نے لوٹتے ہوئے بلبلانا شروع کیا۔ ”یارب جی۔“

میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ”تم کو معلوم ہے کہ وہ سامان کہاں ہے۔ سیدھی طرح بتا دو ورنہ مار مار کے ہڈیاں توڑ دوں گا اور لاش اسی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔ گیدڑوں اور گدھوں کے کھانے کے لیے۔“

”وہ جی... میں بتاتا ہوں۔ لیکن ایک مہربانی کریں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے کہا۔ ”قبر نہ کھدوائیں مجھ سے۔ میں بہت بزدل ہوں۔ دہشت سے مر جاؤں گا لاش کا ڈھانچہ دیکھ کر۔“

”اس وقت ڈر نہیں لگا تھا جب اسے گاڑا تھا۔“ میں نے اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ پھر گر گیا مگر ہمت کر کے اٹھا اور ذرا سی دیر میں ایک گڑھے میں پڑا ہوا کدال اور بیلچہ نکال لایا۔ میں نے اس کے ساتھ واپس مارچ کیا اور پندرہ بیس منٹ میں پھر وہیں آ پہنچا جہاں محسن گاڑی سے باہر سخت سردی میں ٹہل رہا تھا۔ چاند خاں کو اس نے گاڑی میں بند رکھا تھا اور بتا دیا تھا کہ اس نے باہر قدم رکھا تو وہ گولی مار دے گا۔ چاند خاں کی جگہ علی نواز کو قید کر دیا گیا اور میں نے دوسری بار چاند خاں کے ساتھ اسی راستے کو طے کیا۔ چاند خاں چھ فٹے قد کا اور مضبوط جسم والا جوان تھا چنانچہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی سیدھا چل رہا تھا۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد اس نے بائیں طرف مڑنے کی کوشش کی جہاں سے ایک پگڈنڈی الگ ہوتی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کے شانے پر پستول کا بٹ مارا۔ وہ درد سے کراہا۔

”ابھی کتے کی دم سیدھی نہیں ہوئی۔“ میں نے کہا اور ایک درخت سے انگلی کے برابر موٹی شاخ توڑ لی۔ ”جگہ تو مجھے معلوم ہو گئی ہے اس لیے مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ اتنا ماروں گا کہ تڑپ تڑپ کے مر جاؤ گے۔ یہاں تمھاری چیخ پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ آوازیں سن رہے ہو تا بھوکے گیدڑوں کی۔ یہ صبح تک تمھارا گوشت نوچ کھائیں گے۔ دن میں گدھ ہڈیاں صاف کر کے چھوڑیں گے۔“ میں نے اس کو شاخ سے سونت کر رکھ دیا۔ وہ ہر ضرب پر چلاتا رہا۔ پھر کھجور کے تینوں درختوں کی طرف چل پڑا۔ وہ علی نواز کو گالیاں دے رہا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں تھی۔ جسمانی اذیت سے زیادہ اسے اپنی ذلت و رسوائی اور بے بسی کا ذہنی صدمہ تھا۔ اسے اپنے اختیارات پر ہی نہیں‘ اپنی قوتِ بازو پر بھی ناز تھا اور میں نے اس کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جیسا پرانا پولیس کا مثالی جوان جس نے ان گنت چور ڈاکو پکڑے تھے اور بڑے بڑے بدمعاشوں کو تکلے کی طرح سیدھا کر دیا تھا‘ کبھی خود ایک گھٹیا مجرم کی طرح کسی کے ”پرائیویٹ تھانے“ میں اتنی بے عزتی برداشت کرے گا اور وہ سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہو گا جو اس نے ہمیشہ دوسروں کا حق سمجھا تھا۔

”کھڑے کیوں ہو؟“ میں نے کہا۔ ”اٹھاؤ یہ بیلچہ اور کدال۔“

”یہ علی نواز نے لا کر دیے ہوں گے۔“ وہ حقارت اور نفرت سے بولا۔ ”اسی سے کہنا تھا تاکہ...“

جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں نے اس پر وہ شاخ توڑ ڈالی۔ ”زبان کے بجائے ہاتھ چلاؤ۔“

”اس لاش کو اب نکال کر کیا دیکھو گے۔ گل سڑ گئی ہو گی۔“ وہ زمین کھودتے ہوئے بولا۔

”اس کو میں تمھارے کندھے پر اٹھوا کے لے جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمھارے باپ کی قبر میں دفن کروں گا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”میرا کوئی باپ نہیں تھا۔ میری ماں کہتی تھی میرے دس باپ ہیں۔ کیا طافو بھی میرا باپ تھا؟“

میں نے محسوس کیا کہ چاند خاں کا ذہنی توازن جواب دے رہا ہے۔ لاش زیادہ گہرائی میں نہیں دفن کی گئی تھی۔ چاند خاں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے اور احساسِ شکست کے بعد وہ جرم و گناہ کے اور خوف کے ردِعمل کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا تھا، اچانک رک کر پیچھے گھورنے لگتا تھا اور پھر زمین کھودنے لگتا تھا۔ کئی بار وہ بلاوجہ ہنسا اور ایک مرتبہ میں نے اس پر وار کیا تو اس نے چیخ کر مجھے گالی دی۔ میں محتاط ہو گیا۔ اس تن و توش کے دیوانے آدمی کو میں آسانی سے قابو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بدبو کا ایک بھبکا آیا جو زمین کے کسی شگاف سے اٹھا تھا۔ چاند خاں چلا کے باہر نکل آیا۔ اس کے انداز و اطوار میں وحشت اور جنون کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے کدال اٹھا کے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے وار کو ایک ہاتھ پر روکا اور لات مار کے چاند خاں کو گرا دیا۔ وہ سیدھا قبر کے اوپر جا گرا جس کی نرم مٹی کا ڈھیر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دیوانگی کی چیخ بلند کی اور اٹھ کر بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے رکنے کو کہا۔

”چاند خاں! رک جاؤ۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔“

”چھوڑ دے مجھے۔ طافو چھوڑ دے مجھے۔ جانے دے مجھے۔“ چاند خاں نے چلانا شروع کیا اور اس کی رفتار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ”مر جاؤں گا طافو۔ مجھے معاف کر دے۔ طافو مجھے معاف کر دے۔“

”چاند خاں! میں گولی مار دوں گا۔“ میں نے محسوس کیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا ہے۔ وہ عالمِ وحشت میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا اور یوں چلا رہا تھا جیسے طافو اپنی قبر سے نکل کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گیا ہے۔ وہ یوں ہاتھ مار رہا تھا جیسے اپنے وجود سے چمٹ جانے والی متعفن لاش کو الگ کرنا چاہتا ہو۔ یہ اس بدبو کا اثر تھا جس نے چاند خاں کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کا ذہنی توازن رفتہ رفتہ بگڑ رہا تھا لیکن اس دہشت ناک آسیب زدہ اور انسانی گوشت کی سڑی ہوئی بدبو نے چاند خاں کا دماغ ایک دم الٹ دیا۔ وہ بدبو الطاف کے وجود کا احساس بن کر اس پر مسلط ہو گئی تھی۔

میں نے بہت احتیاط سے نشانہ لے کر اس کی ٹانگ پر فائر کیا تھا لیکن اس کی قضا تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ وہ ایک کٹے ہوئے درخت کے ٹھنٹھ سے ٹھوکر کھا کے گرا، جب وہ گر رہا تھا تو ریوالور سے نکلنے والی گولی نے اسے جا لیا اور وہ گولی جو زیادہ سے زیادہ اسے لنگڑا کر دیتی اس کے وجود میں پیوست ہو گئی۔ پشت میں شانے سے ذرا نیچے لگنے والی گولی شاید اس کے دل میں ہی رک گئی اور جب میں نے قریب پہنچ کر اور جھک کر اسے دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کا جسم بڑے بے ڈھنگے طریقے پر الٹا پڑا تھا اور خون نیچے کی مٹی کو سیراب کر رہا تھا۔ یہ قتل نہیں تھا۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا تھا بھی نہیں۔ وہ خود اپنی دیوانگی کا نشانہ بنا ورنہ میرا نشانہ تو خطا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ہم اس جگہ سے ایک فرلانگ دور نکل آئے تھے جہاں طافو کی تھوڑی سی کھدی ہوئی قبر کا شگاف اس کی لاش

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے موجود ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔
میں نے واپس جا کے محسن سے مشورہ کیا "یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ لاش کا کیا کریں؟"
"اگر اسے وہیں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا "کیا یہ امکان ہے کہ کوئی اسے دیکھ لے گا؟"
"یہ امکان تو بہت کم ہے" میں نے تسلیم کیا "سڑک سے دو فرلانگ کا فاصلہ تو ضرور ہو گا اور وہ ٹھوکر کھا کے گرا تھا تو ایک گڑھے میں گیا تھا۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں ہے لیکن سڑک پر سے گزرنے والا لاش نہیں دیکھ سکتا۔"
"اگر ہم نے اسے قبر کھود کے گاڑا تو بہت وقت لگے گا۔" محسن بولا "واپس لے جانا تو ناممکن ہے۔"
"لاش ایسے چھوڑ کے جانا بھی خطرناک ہے" میں نے کہا۔ "اگر کل یا پرسوں لاش کسی کو مل گئی تو اس کی شناخت بھی ہو جائے گی اور دلاور کو معلوم ہوا تو وہ سمجھ جائے گا کہ اسے یہاں لا کے مارنے والا ہمارے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جن کو اس نے قتل پر مامور کیا تھا، ان کا پروگرام دونوں کو ٹرک سے کچل دینے کا تھا۔"
"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آج رات میں اسے گیدڑ کھا جائیں۔ یہاں بھیڑیے بھی ہیں" محسن بولا۔
"میرا تو خیال ہے اسے بھی طافو کے ساتھ ہی دفن کر دیں" میں نے کہا "وہ قبر آدھی سے زیادہ کھدی ہوئی ہے۔"
علی نواز گاڑی میں تھا اور ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ محسن نے اسے باہر نکالا اور وہ دوسری بار ہم دونوں کے پہرے میں روانہ ہوا "اب کیا ہے؟ میں نے تو صحیح جگہ بتائی تھی" وہ بولا۔
"ہاں۔ اور اسی لیے ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے" میں نے کہا "تمھارے ساتھی چاند خاں نے ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ وہ مارا گیا۔ وہ بے وقوف آدمی تھا۔"
"چاند خاں... مارا گیا...؟" علی نواز دہشت زدہ ہو کے بولا "جھوٹ کہتے ہو تم۔ تم نے اسے مار دیا۔ اور اب تم مجھے بھی مارنے لے جا رہے ہو۔"
"تمھیں مارنا ہوتا تو ہم پہلے ہی نہ مار دیتے" میں نے کہا۔ "دوسری بار تمھارے ساتھ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب ہمیں چاند خاں کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہے۔ تم اگر مدد کرو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ تمھارا حشر بھی چاند خاں کی طرح ہو گا۔ تم زندہ رہنا چاہتے ہو علی نواز! کیونکہ تمھاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ تم پہلے بچے کے باپ بننے والے ہو اور اسے یتیم پیدا نہیں ہونا چاہیے۔"
میری بات نے علی نواز کا حوصلہ بلند کیا۔ اس کی منت سماجت جاری رہی کیونکہ اسے ہمارے وعدے پر پورا اعتماد نہ تھا لیکن وہ ہماری مدد کرتا رہا۔ اس نے قبر کھودی اور لاش کو گھسیٹ کر لایا۔ سردی کی وجہ سے خون جم گیا تھا چنانچہ زمین پر خون کی کوئی لکیر نہیں بنی۔ چاند خاں کے مقابلے میں علی نواز زیادہ مضبوط اعصاب کا آدمی ثابت ہوا۔ شاید اسے جینے کی زیادہ خواہش تھی جس نے اسے حوصلہ عطا کیا۔ اس نے طافو کی متعفن لاش کے اوپر چاند خاں کو لٹایا اور مٹی برابر کر دی۔ میں اور محسن کچھ فاصلے پر اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کھڑے تھے۔ اس تمام کارروائی میں ایک گھنٹا صرف ہوا اور جب ہم زمین کو ایک جیسا کرنے کے بعد کدال بیلچے کو دور پھینک کر واپس ہوئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔
"اب ہم تمھیں گھر کے قریب چھوڑ دیں گے" علی نواز نے کہا۔
"لیکن وہ پیسہ جو میرے پاس... میرے گھر کے صحن میں دفن ہے" وہ بولا۔
"اگر تم سمجھتے ہو کہ تمھاری زندگی کی قیمت ایک لاکھ ہے" میں نے کہا "تو یہ سمجھو کہ تم کو دوسری زندگی بہت سستی مل رہی ہے۔ چاند خاں خود اپنی غلطی سے مرا۔ غلطی تم نے بھی کی تھی لیکن اس کی سزا باقی ہے۔ وہ ایک لاکھ لے کر بھاگ جاؤ۔ اپنے بیوی بچوں سمیت غائب ہو جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری جان کے دشمن شکاری تمھارے پیچھے ہیں۔ ایک ہم اور ایک چوہدری دلاور کے کرائے کے قاتل۔ وہ تمھاری جان کا معاوضہ وصول کر چکے ہیں اور تمھیں جہاں دیکھ لیں گے وہیں مار دیں گے۔ یہی پوزیشن ہماری ہے۔ تم دوبارہ نظر آئے تو ہم بھی خطرہ محسوس کریں گے اور تمھیں قتل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ یہ سمجھ لو کہ تم کو دلاور کے ارادوں کا پتا چل گیا تھا اور تم جان بچا کر بھاگ گئے۔ ہم سے تمھاری ملاقات نہیں ہوئی۔"
"لیکن میں کہاں جاؤں گا؟" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "نوکری تو چھوڑ دوں گا۔ ماں باپ کو اور بھائی بہن کو۔ گھر کو۔ دوستوں، رشتے داروں کو بھی چھوڑ دوں؟"
"یہی تو تمھاری سزا ہے کہ اب تم اکیلے ہو۔ دنیا میں تمھارا کوئی دوست ہے نہ رشتے دار" میں نے کہا "نہ تمھارا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ یہاں رہو گے تو دو دن بھی نہیں جیو گے۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ بیوی بچوں کی اور اپنی زندگی عزیز ہے تو بھاگ جاؤ اور بھاگتے رہو۔ شکاری بہت ہیں۔ کوئی جاننے والا بھی نظر آ گیا تو سب کو خبر ہو جائے گی۔ اس لیے بالکل اجنبی ہو جاؤ۔ اتنی دور نکل جاؤ کہ پھر لوٹ کر نہ آ سکو۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مر گئے ہو۔ تمھارا واحد سہارا ایک لاکھ روپے ہوں گے۔ ان کی مدد سے زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہو۔ اپنے بیٹے کو پالو۔ شاید وہ بھی ایک سہارا بنے۔"
ہم نے ایک جگہ گاڑی روک کر اسے اتار دیا "میری بات یاد رکھنا" میں نے کہا "تم تھانے سے نکلے تو تمھیں ڈر تھا کہ دلاور کے آدمی تمھیں قتل کر دیں گے۔ اس لیے تم گھر گئے اور بیوی بچوں کو لے کر بھاگ گئے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ نہ تم ہم سے ملے، نہ ہمارے ساتھ کہیں گئے۔ اس کے علاوہ کچھ کہو گے تو اپنی موت کا سامان کر دو گے۔ ماں باپ یا بھائی بہن، یہ سب تمھیں نہیں بچا سکیں گے۔ اس لیے جاؤ، صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ۔ بیوی اگر تمھارا ساتھ دینے والی ہے تو اسے ساتھ رکھو اور کوئی بھی بہانہ کر دو۔ یا سچ بتا دو۔ اپنی زندگی بچانا اب تمھارا کام ہے۔ جیسے چاہو کرو۔"
گاڑی اسے سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس جا رہا تھا "الطاف کے قتل کا کیس تو ختم ہوا" میں نے کہا "دو کو دلاور نے مار دیا۔ فتح شیر کو الف دین ختم کر گیا۔ چاند خاں نے خودکشی کی اور اب علی نواز بچا ہے تو وہ لمبی سزا کاٹے گا۔"
"ہاں، مگر اصل مجرم پھر بھی محفوظ ہے۔ چھوٹے مہرے پٹ رہے ہیں" محسن بولا۔
"اسے بھی شہ مات ہونے لگی تھی" میں نے کہا "لیکن وہ بچ گیا۔ خیر۔ بازی ابھی جاری ہے۔"
ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہم آخری مہمان بن کے داخل ہوئے۔ رات کی ڈیوٹی والے روم سروس کے ویٹر نے فوراً ہمیں کچن سے وہ کھانا لا کر دیا جسے بچا کھچا کہا جا سکتا تھا اور مینو کی سب سے کم مقبول ڈش ہونے کی وجہ سے اس کی باقی ماندہ مقدار اگلے دن کے لیے اٹھا کر رکھ دی گئی تھی مگر اس وقت ہم تھکن اور بھوک سے بے حال تھے چنانچہ ہم نے بہت کم وقت میں ڈنر ختم کیا۔ بارہ بجنے کے بعد اگلا دن شروع ہو چکا تھا اور اصولاً یہ صبح کا وقت تھا چنانچہ محسن نے اس کھانے کو بریک فاسٹ قرار دیا۔ کافی کے لیے ہمیں مال کے ایک ریسٹورنٹ جانا پڑا۔
"معلوم نہیں ٹیڈی کدھر نکل گیا تھا؟" محسن نے کہا۔
"اگر وہ ناک کی سیدھ میں نکل گیا ہو گا تو پھر وہیں پہنچے گا" میں نے کہا "میں نے چھٹی کے جغرافیے میں دنیا کے گول ہونے کا یہی ثبوت پڑھا تھا اور بالکل یقین نہیں کیا تھا۔"
"ناک کی سیدھ میں بھلا کون سفر کر سکتا ہے" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا "خصوصاً شہر کا رہنے والا، کسی کھمبے یا عمارت سے نہ ٹکرایا تو کسی گاڑی کے نیچے آ جائے گا۔"
"پھر بھی پہنچے گا تو وہیں جہاں سے چلا تھا" میں نے کہا۔
"ایمبولینس میں، چارپائی پر یا چار کندھوں پر۔"
کھانے اور کافی کے علاوہ اس گفتگو کا مقصد ذہن کو اس بوجھ سے آزاد کرنا تھا جو گزشتہ چند گھنٹوں کے دوران پیش آئے تھے۔ میں اور محسن بار بار ہنسنے کی اور بے فکری سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کچھ ہی دیر بعد ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہم اپنے اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ میرے ذہن میں وہ قاتل ٹرک تھا جس کی خدمات سامان کو ادھر سے ادھر لے جانے کے بجائے چار انسانوں کو عالمِ فانی سے عالمِ ارواح پہنچانے کے لیے مستعار لی گئی تھیں۔ اس جیسے ان گنت ٹرک شہروں کے درمیان اور ہر شہر میں بار برداری کے لیے

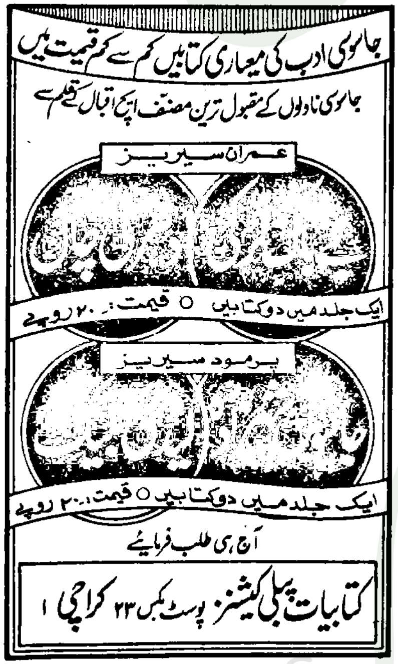

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

استعمال ہو رہے تھے مگر یہ کمال تھا ایک آدمی کے ذہن کا جس نے اس غلام مشین کو آلۂ قتل کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے وقتوں میں بادشاہوں کا عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ حکم دیتے تھے کہ مجرم کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے ڈال دیا جائے۔ اب دلاور جیسے بے تاج بادشاہ ہاتھی کی جگہ مشینی ہاتھی استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹرک اب تک وہیں کھڑا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے ڈرائیور اتنی دیر میں ڈپلیکیٹ چابی لے آیا ہو اور کلینر نے پنکچر ہونے والے ٹائر بدل دیے ہوں اور وہ اپنی ناکامی کی رپورٹ دینے جا چکے ہوں۔ دلاور کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ وہ دونوں سے سوال کرے گا کہ ٹائر کس نے پنکچر کیے تھے؟ انھوں نے کسی کو قریب آتے دیکھا تھا؟ وہ کس حلیے اور شکل کا آدمی تھا جو زبردستی ٹرک کی خرابی دور کرنے پر مصر تھا؟ پھر اس کا ذہن جس نتیجے پر پہنچے گا وہ بالکل درست ہوگا۔

پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی پر شاید وہ ڈرائیور اور کلینر کو تو ایک موقع اور دے۔ اسے ابھی کہاں معلوم ہوگا کہ بالواسطہ طور پر ہم نے بھی اس کی مدد کرتے ہوئے تیسرے آدمی کو ختم کر دیا ہے لیکن چوتھا آدمی اس کی دسترس سے نکل چکا ہے۔ خیر مجموعی طور پر اس کو اپنے مقصد کے حصول میں مایوسی نہیں ہوگی۔ چار میں سے تین گواہ تو مارے ہی گئے اور چوتھا جان بچا کے بھاگ گیا تو اب ڈر کس کا ہے وقت بھی کیسا بازی گر ہے۔ ابھی آٹھ بجے دونوں واجب القتل گواہ تھانے سے نکلے تھے تو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ تھے۔ ان کو مارنے والے تو نہ مار سکے مگر ہم نے ان میں سے ایک کو مار دیا حالانکہ ہم محافظ بن کے پہنچے تھے۔ چاند خاں کو بہرحال مرنا تھا، سڑک پر ٹرک سے کچل کر موت نہ آئی تو کسی ویران جنگل میں آئی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں مرتا تو اس کا خستہ تن لاشہ دنیاوی رسوم کے مطابق سپردِ خاک ہوتا۔ اب بھی وہ سپردِ خاک تو ہوا مگر اسے کوئی پرائیویٹ قبر نہ ملی۔ اسے ایک پہلے سے موجود مردے کے ساتھ قبر میں شیئر کرنا پڑا۔ جیسے مجبوری میں لوگ ایک کمرے یا ایک فلیٹ میں شیئر کرتے ہیں۔

"دلاور نے خود کو فتح شیر کے قتل میں ملوث ہونے سے صاف بچا لیا۔" محسن بولا۔

"ہاں، اس کے اور فتح شیر کے ٹیپ اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"اگر رابعہ کیس کر دیتی۔ یا جیسا کہ غالب چاہتا تھا، وہ نجی استغاثہ کر دیتا تو یہ ثبوت ہم ان کے حوالے کر سکتے تھے۔" محسن بولا

"رابعہ کو کسی لمبے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو الف دین کے کرنے کا کیس تھا۔ ہم اس کو یہ ثبوت دیتے اور وہ انھیں عدالت میں پیش کر دیتا لیکن اس نے ہی مسلک اختیار کیا اور اپنے مجرم کو خود ہی سزا دے کر جس کا وہ مستحق تھا۔ اس میں دلاور کے خلاف مدعی بننے کا ... نہیں تھا۔"

"اصل مجرم تو دلاور تھا۔" میں نے کہا۔ "قتل کرنا تھا اسے کرتا۔"

"الف دین جیسے شخص کا کوئی بھروسا نہیں۔" میں نے ... غائب تو ہوا ہے لیکن اس بات کا ثبوت کوئی نہیں کہ شہر سے نکل گیا ہے۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دلاور کی تاک میں ہو۔"

"تو نے اس ٹرک کا نمبر نوٹ کیا تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہاں اندھیرا ابھی تو تھا۔"

"ہاں، لیکن میں نے قریب جا کے دیکھا تھا۔" محسن ...

"اس وقت جب ٹیڈی زبردستی کلینر کے گلے پڑ رہا تھا کہ خرابی دور کر سکتا ہے اور تو ٹرک کے نیچے اسپیڈ بریکر لگا تھا۔ انھوں نے نمبر کو تھوڑا سا بدلا تھا۔ تین کو آٹھ بنا دیا تھا اور ایک کو سات۔ ای کو بھی الیف کر دیا تھا مگر ہم یہ چکر چلا ... میں نے اصل نمبر نوٹ کر لیا تھا۔"

"کیا خیال ہے اگر پولیس کو یہ نمبر دیا جائے اور بتایا جائے کہ اسی ٹرک نے ان کے دو آدمی مارے تھے؟"

"دلاور کچھ نہیں ہونے دے گا۔ ایک تو اس لیے کہ ... گمنام ٹیلی فون ہی کر سکتے ہیں اور اگر وہ کوئی سوال کر بیٹھے کہ تمھیں معلوم ہوا تو ہم جواب سے مطمئن نہیں کر سکتے۔" محسن بولا۔ "یہ ... ہے کہ ٹرک کے ٹائروں پر سے خون کے داغ ہزار بار دھو ... پر بھی نہیں مٹائے جا سکتے لیکن وہ ٹائر ہی بدل دیے جائیں تو ممکن ہے۔"

"ہم نے فتح شیر سے اور دلاور سے اعترافِ جرم کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔" میں نے کہا۔

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم وہ کیسٹ اپنے ... رضوی کو ارسال کر دیں۔" محسن بولا۔ "جسے سن کر بے شک وہ سمجھ ... کہ فتح شیر اور دلاور کے ساتھ دوسری آوازیں ہماری ہیں ... بھی اندازہ کر لیں گے کہ ہم نے چالاکی سے یہ گفتگو ریکارڈ ... مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے جس کا اعتراف ... بھی رضاکارانہ طور پر کیا ہے اور دلاور نے بھی۔ ہم نے ان ... زبردستی کچھ نہیں کہلوایا ہے۔ فتح شیر تو مر گیا اور اس کے ... نہ قانونی کارروائی ممکن ہے نہ محکمہ جاتی ..."

محسن نے کہا۔

"تیری بات قابلِ عمل لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ایس ایس ... صاحب نے تحقیقات کا حکم دیا تو اگلے مرحلے میں ہم یہ کر سکتے ... پولیس کو طافو کے مدفن سے آگاہ کر دیں۔ رحمت کباڑی ... کے قتل کا کیس پہلے سے چل رہا ہے۔ اگر طافو کی لاش کی شناخت ہو گئی تو دلاور کے لیے وضاحت مشکل ہو جائے گی کہ رحمت کباڑی ... دوسرا ساتھی پُراسرار طور پر گم ہو گیا تھا۔ تحقیقات میں یہ بات بھی سامنے آ جائے گی کہ طافو کے ساتھ برآمد ہونے والی دوسری لاش کس کی ہے۔ تھانے سے پتا چل جائے گا کہ فتح شیر کے علاوہ جو تین سپاہی مارے گئے ہیں وہی ہیں جن پر شک کیا جا سکتا ہے کہ وہ گشت کے بہانے نکلے تھے اور دلاور کے گھر جا کے انھوں نے طافو کی لاش پر پردہ ڈالنے کا معاوضہ وصول کیا تھا۔ یہ سوال تو خود بخود پیدا ہوگا کہ وہی چار آدمی ایسے پُراسرار حالات میں کیوں ہلاک ہوئے؟ اگر ایس ایس پی صاحب نے سختی سے کام لیا اور ٹرک ڈرائیور کو کلینر کے ساتھ طلب کر لیا تو وہ قبول دیں گے کہ انھیں دلاور نے کس کام کے لیے کہا تھا اور کیا معاوضہ ادا کیا تھا۔"

"ویری گڈ! ہم یہی کہتے ہیں۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی یہ تفتیش بھی کریں گے کہ ہم نے یہ گفتگو کہاں کب اور کیسے کی تھی اور اب ہم کہاں ہیں؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کو دلاور پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔ ہم کچھ زیادہ محتاط ہو جائیں گے اور انڈر گراؤنڈ رہیں گے۔ ایس ایس پی صاحب خصوصی تفتیشی ٹیم بھی تشکیل دے سکتے ہیں اور تفتیش کرائم برانچ یا سی آئی اے کے سپرد بھی کر سکتے ہیں۔"

"فوری طور پر دلاور کو نقصان ہو نہ ہو، اس پر نفسیاتی دباؤ تو بڑھے گا۔" میں نے کہا۔ "شکاری بھی خونخوار یا آدم خور شیر کا شکار کرتے ہیں تو اس کے گرد حلقہ تنگ کرتے ہیں۔ ڈھول پیٹ کر اور چاروں طرف سے مشعلیں لے کر آگے بڑھتے ہیں ... شیر خوفزدہ ہوتا ہے اور خود شکارگاہ کی جانب بڑھتا ہے۔ دلاور جیسے شکاری کو بھی اتنی الجھنوں میں اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا جائے تاکہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو جائے اور اس ... ہمارے خلاف کچھ کرنے کے بجائے اپنے دفاع میں کچھ کرنے کا خیال پریشان رکھے۔"

"یہ حکمتِ عملی مجھے پسند آئی۔ صبح کسی کے ہاتھ دونوں ... رپورٹ ارسال کر دیے جائیں۔" محسن نے کہا۔ "ٹیڈی ان کے ... بجائے آفس کے کسی کلرک یا چپراسی کو دے آئے اور وہاں ... نہیں۔ ہم میں سے کوئی بعد میں ٹیلی فون کر کے ٹرک کا نمبر

بتا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کام غالب کر سکتا ہے۔ وہ رپورٹر ہے اور رضوی صاحب اس کی بات کو ٹال نہیں سکتے۔ وہ اپنی معلومات کا ذریعہ بتانے کا بھی پابند نہیں۔"

"کچھ دن ہمیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "نکلنے کے لیے رات کا وقت موزوں ہے۔ یہاں کی پولیس یکلخت پھر ہماری جستجو میں سرگرم ہو جائے گی۔"

"یہاں سے تو اٹھ۔ ڈیڑھ بج رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ٹیڈی اگر گھر پہنچا ہوگا تو پریشان ہوگا۔"

ہمیشہ کی طرح ہم نے فاکس ویگن کو دو گلیاں چھوڑ کے ایک خالی پلاٹ پر کھڑا کیا اور پیدل گھر پہنچے۔ ٹیڈی جاگ رہا تھا اور خاصا پریشان تھا۔ "یار میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے تھے۔" وہ بولا۔

"غالب صاحب تشریف نہیں لائے؟" محسن نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں آیا۔ میں اکیلا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "وہاں دوڑ لگائی تو کافی آگے نکل آیا۔ پلٹ کے گیا تو تم لوگ غائب تھے۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔"

"اور وہ ٹرک وہاں موجود تھا؟" میں نے کہا۔ ٹیڈی نے اقرار میں سر ہلایا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم کو واپس وہاں جانے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟" محسن نے کہا۔ "اگر وہ تم کو پہچان لیتے تو کیا ہوتا؟"

"کیا ہوتا۔ میں نے کون سا جرم کیا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں تو اُن کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہی گھبرا گئے تھے کہ کہیں اُن کا بنا بنایا کام نہ بگڑ جائے۔"

"کام تو اُن کا بگڑ گیا۔" میں نے کہا۔ "وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہم اُن دونوں کو نکال لائے تھے۔ کانسٹیبل چاند خاں اور علی نواز کو...."

"اور ہم نے اُن سے سب کچھ پوچھ لیا۔" محسن نے اسے مسرّت سے اطلاع دی۔ "انھوں نے طافو کی قبر بھی بتادی اور یہ بھی بتادیا کہ انھوں نے اپنے حصّے کا ایک لاکھ کہاں چھپا رکھا ہے۔ ہمیں اُن پر تھوڑی سی سختی بھی کرنی پڑی کیونکہ اُن میں سے چاند خان ذرا ضدّی اور خود کو تیس مار خان سمجھنے والا آدمی تھا۔"

"اسی خوش فہمی کے باعث وہ مارا گیا۔ اس نے جسمانی طور پر مزاحمت کی مگر ذہنی طور پر وہ اتنا بزدل ثابت ہوا کہ طافو کی لاش نکلتے ہوئے اس کا دماغ الٹ گیا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اُس پر گولی چلانی پڑی۔ علی نواز کو ہم نے چھوڑ دیا۔"

"چھوڑ دیا؟" ٹیڈی نے حیرانی سے کہا۔ "ایسے ہی چھوڑ دیا؟"

"ایسے ہی کا کیا مطلب۔ اُس نے تو سب کچھ بتادیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم کیا اسے پھانسی چڑھا دیتے۔ ہمارے پاس تو اُسے قید میں رکھنے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔"

"اس کے علاوہ۔" محسن نے کہا۔ "ہم اُسے بتا چکے تھے کہ وہ کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ دلاور نے اُسے قتل نہ کروایا تو ہم اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ اور اُس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ ایک لاکھ لے اور اپنی نئی نویلی دُلھن کے ساتھ غائب ہو جائے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرپوک آدمی تھا۔"

"لیکن استاد! اگر اُس نے تمھاری بات نہ مانی اور دلاور کے پاس چلا گیا پھر؟" ٹیڈی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور اس نے تمھارے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ یہ بھی مان لیا کہ اُس نے طافو کی قبر کی نشاندہی کر دی ہے کیونکہ وہ مجبور تھا۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ سکندر اور محسن مجھے بھی چاند خاں کی طرح قتل کر دیتے۔"

"اسے ہمارے نام معلوم نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے ایک بار بھی نام لینے کی غلطی نہیں کی۔"

"لیکن اُس نے تم دونوں کے چہرے تو دیکھے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اگر اُس نے دلاور کے سامنے حلیہ بیان کیا تو کیا دلاور سمجھ نہیں جائے گا کہ علی نواز کس کا ذکر کر رہا ہے؟"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ بیک وقت ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ٹیڈی کی بات میں وزن ہے اور یہ ایسا نکتہ تھا جو ہمارے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ علی نواز جیسے کمزور بزدل شخص سے یہ حماقت بھی سرزد ہو سکتی تھی کہ وہ جان بچا کر فرار ہونے کے بجائے سیدھا دلاور سے معافی اور پناہ مانگنے جائے۔ ایک لاکھ بھی اُس کے سامنے رکھ دے اور اس کے پاؤں بھی پکڑ لے کہ میرا قصور معاف کر دیا جائے۔ اُس کے لیے فرار ہونا بھی مشکل کام تھا۔ بھاگنے والے میں اتنی خود اعتمادی چاہیے کہ وہ بھاگنے سے نہ ڈرے۔ یہ نہ سوچے کہ وہ بھاگ کر کہاں جائے گا اور کب تک بھاگتا رہے گا۔ یہ نہ سمجھے کہ فرار کے راستے بند ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔ راستے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں لیکن یہ ہمت سے زیادہ ذہانت کی بات ہے کہ ہر مشکل موڑ پر آدمی نئی راہیں نکال لے۔ آگے کے خطرات سے بے نیاز ہو کر خدا کے بعد اپنی ذات پر بھروسا رکھتے ہوئے آگے بڑھتا جائے۔ علی نواز میں نہ ہمت تھی اور نہ ذہانت۔ نہ اُسے یہ اعتماد تھا کہ اتنی بڑی دُنیا میں وہ کہیں محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ اس کا یقین تھا کہ وہ پھر کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ وہ نفسیاتی طور پر دلاور سے بہت دہشت زدہ تھا۔ ہم نے بھی اُسے خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ علی نواز کو اپنے جرائم کا فاش ہونے کا ڈر تھا اور وہ سمجھتا ہوگا کہ ایک پولیس مین فرار ہو کر کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کے محکمے کے ریکارڈ پر سب کچھ ہے، اس کا نام پتا، تصویر اور حلیہ۔ اگر اُس کے ساتھ ہی تمام ملک میں تشہیر ہوئی تو وہ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا۔ اُس بے وقوف آدمی سے کچھ بعید نہیں کہ وہ خود کو دلاور کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اُسی سے کہے کہ مجھے بچاؤ اور اُسی کے ہاتھوں مارا جائے۔ دلاور وہ شخص تھا جس کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو اس کا جذبات سے اتنا ہی رشتہ تھا جتنا پتھر کا زندگی کے احساس سے۔ شرافت اور انسانیت، رحم دلی اور نیکی یا مروّت اور لحاظ اُس کے لیے بے معنی الفاظ تھے تاوقتیکہ ان الفاظ سے اس کے مذموم شیطانی عزائم میں مدد نہ ملتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے جیتے جاگتے انسان اس کے اپنے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھے۔ ایک آدمی کا کم ہونا اس کے نزدیک ایک گولی کے نقصان سے زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا۔ وہ کبھی غور نہیں کرتا تھا کہ گولی صرف موت کا نامہ بر ہوتی ہے اور آدمی سے رشتوں کی آبرو ہے۔ گولی کا کسی سے کوئی جذباتی تعلق نہیں ہوتا۔ اُسے تو ریوالور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ جائے تو کس کو فرق پڑتا ہے اور جو قتل کرنے کی نیت سے کر آتا ہے وہ قتل ہو جاتا ہے تو مانگ کس کی اُجڑتی ہے؟ ممتا کس کی لہو روتی ہے اور یتیمی کس کا مقدر ہوتی ہے۔

چنانچہ علی نواز نے دلاور کے ہاتھوں کو مضبوط سمجھتے ہوئے اگر اعتراف کر لیا کہ جان بچانے کے لیے اس نے سکندر اور محسن کے سامنے اقبالِ جرم کر لیا ہے اور وہ جگہ بھی بتادی ہے جہاں طافو کو دفن کیا گیا تھا تو دلاور بڑی شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا کہ پریشانی کی اس میں کیا بات ہے؟ ڈر تو آدمی کے ساتھ ہے۔ اب دیکھ لو چاند خاں نہیں رہا تو اُسے کسی کا ڈر بھی نہیں رہا۔ تم کو بھی میں خوف اور پریشانی سے ہمیشہ کے لیے نجات بخشتا ہوں۔ جاؤ زیرِ زمین سکھ چین کی ابدی نیند سو جاؤ۔ یوں کہ قیامت تک نہ اٹھو اور نہ تم کو کوئی اُٹھا سکے۔

پھر وہ ایک گولی سے علی نواز کا سارا ڈر ختم کر دے گا۔ اور اُسے زمین کے کسی گمنام گوشے کے سپرد کر دے گا۔ آج نہ سہی کل علی نواز کا انجام بہرحال یہی ہونا تھا۔ دلاور نے فتح شیر سے معاملہ طے کرتے وقت ہی طے کر لیا ہوگا کہ طافو کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس کی مدد کرنے والوں کا وجود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بار پانچ لاکھ وصول کر لینے کے بعد بھی جب چاہیں گے اصل رقم کا سود وصول کرنے پھر آ جائیں گے۔ یہ کوئی اصول اور شرافت کی بنیاد پر ہونے والا سودا نہیں تھا۔ فتح شیر اور اس کے ساتھی دلاور کو بلیک میل کر سکتے تھے اور دلاور وہ شخص تھا جو جانتا تھا کہ بلیک میلر کی زبان پیسہ نہیں بند کر سکتا۔ پیسہ تو بلیک میلر کو حوصلہ دیتا ہے کہ وہ دستِ سوال کو ہمیشہ دراز رکھے۔ دلاور نے پانچ لاکھ دینے کے بعد انسپکٹر فتح شیر اور اس کے چاروں ساتھیوں کو موت کا فرمان بھی تھما دیا تھا جسے اس کی کوتاہ بین نظر نہ پڑھ سکی۔ فتح شیر کو ختم کرنے کے لیے دلاور کو تردد نہیں کرنا پڑا۔ اس کے چار میں سے دو ماتحت ٹرک کے نیچے آ گئے تھے۔ تیسرا چاند خاں "لاپتا" ہو گیا تھا اور چوتھا علی نواز، خود اُس کی خدمت میں حاضر ہو گیا کہ چوہدری صاحب! ایک لاکھ لیجیے اور مجھے تحفظ فراہم کیجیے تو دلاور اسے تمام دنیاوی مسائل خوف اور آلام سے محفوظ کر دے گا اور علی نواز کو طافو کی طرح کسی بے نشان مدفن میں لیٹ کر سوائے یومِ حساب کے کسی کا ڈر نہیں رہے گا۔ اس کے بعد دلاور کے لیے صرف دو افراد کا مسئلہ رہ جائے گا، ان دونوں کا جو ملک الموت نے ٹرک لے کر پھر رہے تھے۔ دو افراد کو کچل کر مطمئن تھے کہ نصف کامیابی تو ہو گئی۔ باقی نصف اُن کو یقینی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں دلاور نے ان کو ملک الموت مقرر کرنے کا کنٹریکٹ کتنے کی تھی تو اس کا مقصد لاکھ۔ مگر وہ چار لاکھ میں چار انسانوں کو مزاحمت کیے بغیر کا وعدہ کرنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کو یہ ٹھیکہ سنبھالنے کو ملک الموت ہی سمجھتا ہے اور چار لاکھ میں انھوں نے چار افراد کی زندگی کا سودا نہیں کیا، اپنی زندگی رہن رکھ دی ہے۔ پانچ افراد سے نجات پانے کے لیے دلاور نے دو کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دو کے لیے وہ کسی ایک سے بات کرے گا اور اس آخری آدمی کا قصّہ خود پاک کر دے گا۔

"پریشان مت ہو۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "علی نواز ہماری طرف سے جہنّم میں جائے۔"

"ہاں۔ ہمارا کیا بگاڑے گا وہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بے وقوفی کرے گا تو خود جان سے جائے گا۔"

"لیکن وہ دلاور کو اور بہت سی باتیں بتا دے گا۔ جو ہم نے اسے بتائی تھیں۔" محسن نے کہا۔ "وہ لاکھ بے وقوف سہی ہے تو پولیس مین۔ اس کی نظر نے بہت کچھ دیکھ لیا ہوگا۔ مثلاً اس کوٹھی کا نقشہ، جہاں سے فتح شیر کی لاش ملی تھی۔ سفید رنگ کی اس فاکس ویگن کا نمبر۔ رابعہ کی اس کوٹھی میں موجودگی۔ سب انسپکٹر اور پولیس مین کے ساتھ ہمارا سلوک ...."

"وہ انکار کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "علی نواز کی کون سُنے گا؟"

"دلاور۔" محسن بولا۔ "کوئی اور یقین کرے نہ کرے، دلاور جان لے گا کہ علی نواز جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

"اس سے معاملات بگڑ سکتے ہیں۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہمارے یا پولیس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور اپنا کام کر جائے گا۔ وہ طافو اور چاند خاں کی لاشوں کو غائب کرا دے گا اور اس کے بعد ہمارے فرشتوں کو بھی خبر دینے والا کوئی نہ ہوگا کہ وہ دونوں لاشیں کہاں گئیں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کتنے فاصلے پر الگ الگ یا ایک جگہ گاڑی گئیں۔ ان کے اعضا الگ الگ جلا دیے گئے یا غرق کر دیے گئے کسی بات کا سراغ لگانا ممکن نہ ہوگا۔ فتح شیر کے قتل کے الزام سے بچنے کا انتظام اس نے پہلے ہی کر لیا ہوگا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ہم نے کیسٹ پر جو گفتگو ریکارڈ کی تھی وہ انتہائی ناقص اور کمزور شہادت بن جائے گی۔ دلاور کے خلاف نہ کوئی مدّعی نہ شہادت۔ نہ ثبوت نہ گواہ۔ لاقتل اور لاش کچھ نہیں ملے گا تو محض کیسٹ پر ریکارڈ ہونے والی گفتگو کی کیا اہمیت رہے گی؟"

"وہ صاف انکار بھی کر سکتا ہے کہ یہ میری آواز نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"انکار کیسے کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ ابھی مرا تو نہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم کو واپس وہاں جا[illegible]ن بولا۔ "عام زندگی میں دو محسن [illegible] رنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ نقال لوگ بھی یہ [illegible] بھی لیتے ہیں۔ پہچان اس وقت اور مشکل ہو جاتی ہے جب آواز ٹیپ پر ہو۔ انسانی آواز تو ٹیلی فون پر بھی اصل آواز سے مختلف سنائی دیتی ہے۔ دلاور کہہ سکتا ہے کہ سکندر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر دوسری آواز میری نہیں ہے، کسی ایسے شخص کی ہے جو میری طرح اور میرے لہجے میں بول سکتا ہے۔ غالباً یہی مؤقف فتح شیر کے وکیل کا بھی ہوگا۔"

"پھر بھی کوئی طریقہ تو ہوگا اصل اور نقل میں فرق معلوم کرنے کا؟"

"ہاں۔ طریقہ بہت سائنٹیفک ہے۔" محسن بولا۔ "اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں ہوتی ہیں۔ اور یہ لہریں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ آواز کی ایک پچ ہوتی ہے۔ کسی کی آواز پتلی ہوتی ہے کسی کی بھاری۔ یہ پچ کا فرق ہے۔ باہر کے ملکوں میں ایسے حساس الیکٹرانک آلات موجود ہیں جن سے ہر شخص کی آواز کا گراف بنایا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے دل کی دھڑکن کا گراف بنایا جاتا ہے جو ای سی جی کہلاتا ہے۔ دماغ کی برقی لہروں کے گراف کو ای ای جی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گراف پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور فرق کا پتا چلا لیتے ہیں۔ ایسے ہی الیکٹرانک آلات سے آواز کا فرق معلوم کیا جاتا ہے۔ میری یا تیری آواز کا گراف دس دفعہ کیا ہزار دفعہ بنایا جائے تب بھی ایک ہی ہوگا۔ آواز کسی اور کی ہوگی تو فرق آ جائے گا خواہ سننے میں وہ آواز سو فیصد اصل آواز لگتی ہو۔ یورپ اور امریکا میں جہاں سکیورٹی کے انتظامات انتہائی سخت ہوتے ہیں، وہاں اب شناختی کارڈ چیک نہیں کیے جاتے۔ شناختی کارڈ تو کسی کے بھی بن جاتے ہیں۔ غلط آدمی کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے بعض جگہ فنگر پرنٹ کا نظام ہے۔ یعنی اندر جانے والا آدمی اپنا انگوٹھا ایک خاص مقام پر رکھے۔ اندر کسی کمپیوٹر میں پہلے سے فنگر پرنٹ موجود ہے۔ دونوں ایک ہوں گے تو کمپیوٹر کا خودکار نظام دروازہ کھول دے گا ورنہ الارم دے گا کہ سکیورٹی خطرے میں ہے۔ اس سے بھی جدید نظام یہ ہے کہ آپ دروازے کے مقابل کھڑے [illegible] نام بتائیں۔ اصل آواز کا گراف اندر کسی کمپیوٹر کے ذہن میں محفوظ ہے۔ جب آپ نام بتائیں گے تو کمپیوٹر نام کی پروا کیے بغیر صرف آواز کے گراف ملائے گا اور ایک ہوں گے تو آپ کو اندر جانے کی اجازت دے گا۔ نام آپ کچھ بھی بتا دیں۔ ظفر خان یا پھنّے خان۔ کمپیوٹر صرف اس گراف کو سمجھتا ہے جسے ساؤنڈ پکچر بھی کہا جاتا ہے۔ بیچارا شیکسپیئر تو اسی لیے بہت پہلے کہہ گیا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔"

مجھے اس مثال پر ہنسی آ گئی۔ "اس بات کا مطلب تو میں سمجھ گیا۔"

"تو اب یہ بھی سمجھ لو کہ جب دلاور انکار کرے گا تو اس کی آواز کی تصویر خوانی ضروری ہوگی۔" محسن بولا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کی کسی لیبارٹری میں اتنا جدید الیکٹرانک سسٹم موجود ہے یا نہیں جو دلاور کی اصل آواز اور ٹیپ کی آواز کو ایک ثابت کر سکے۔ اگر ہے تو وہ بیچارا کمپیوٹر خود عدالت میں حاضر ہو کے نہیں کہہ سکتا کہ مائی لارڈ! دلاور جھوٹ بولتا ہے اور ٹیپ پر اسی کی آواز ہے۔ یہ رپورٹ بھیجنے والے فرشتے بھی نہیں ہوں گے میرے تیرے جیسے سر پھرے بھی نہیں ہوں گے جو اپنی ذات پر 'ناقابلِ فروخت' کا بورڈ کسی تمغے کی طرح سجا کے سمجھتے ہیں دنیا فتح کر لی۔ حالانکہ دنیا ہماری اسی فطرت سے نالاں ہے۔ وہ جو علامہ مرحوم نے کہا تھا کہ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ تو نہ جانے وہ دور گزر گیا، اب آئے گا۔ فی الحال تو اس فلسفے کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ چنانچہ دلاور کو بھی سکۂ رائج الوقت میں مناسب اور قابلِ قبول قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ پھر اسے وہی رپورٹ مل جائے گی جو وہ چاہتا ہے اور کوئی راتوں رات دولت مند ہو جانے والا عدالت میں یہ رپورٹ دے گا کہ مائی لارڈ! سکندر بخت کا پیش کردہ کیسٹ جعل سازی کا نمونہ ہے۔ اس میں چوہدری دلاور کی آواز بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہے اور یہ ریڈیو ڈراما صداکاری کا کمال قرار دیا جائے گا۔ عدالت اسے مسترد کر دے گی۔ من ھو المطلوب۔"

"انکل رضوی تو یقین کریں گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ ضرور یقین کریں گے کہ دلاور اور فتح شیر نے مل کر کس جرم کی پردہ پوشی کی تھی اور دلاور نے اس کا کیا معاوضہ ادا کیا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ اتنے تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ فتح شیر نے حرام کی کتنی دولت کمانے کا اعتراف کر لیا تھا۔ اور یہ بھی سمجھ جائیں گے کہ کون نے ان دونوں کو کس طرح ٹیپ کیا ہوگا۔ مگر وہ کوئی قانونی کارروائی اس ٹیپ کو بنیاد بنا کر نہیں کریں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ان کو اتنا تو معلوم ہو کہ ہم کس کے خلاف صف آرا ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہماری جنگ کس سے ہے اور کیوں۔ ان کے نقطۂ نظر سے ہماری جدوجہد غیر قانونی ہے مگر ہم کبھی تو اس لیے مجبور ہیں کہ ان کا قانون ہمیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا اور مجرموں کے سامنے بے بس ہے۔ کیا وہ خود اپنی بے بسی کو نہیں سمجھتے"

"سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کو ادائے فرض سے غرض ہے۔ وہ نظامِ انصاف کی خامیوں اور کوتاہیوں کو عذر بنا کر فرض شناسی کے تقاضوں سے روگردانی نہیں کرتے۔" محسن نے کہا۔

رات کا آخری پہر تھا لیکن نیند ہم میں [illegible]

[illegible] ہو چکی تھی۔ محسن نے دو سگریٹیں جلائیں اور ان میں سے ایک مجھے پکڑا دی۔ "میاں نیک محمد! آخر ہم تمہارے مہمان ہیں۔ تم پر خاطر مدارات واجب ہے۔ اور کچھ نہیں تو چائے ہی پلا دو۔"

"اس وقت تو میرے دل کی کہی تم نے۔ میں اٹھنے ہی والا تھا۔" ٹیڈی بولا۔

"حالات سخت ہوتے جا رہے ہیں استاد!" میں نے کہا۔ "رات کو جاگنے اور دن کو سونے کا اثر یہ ہوگا کہ عادات و اطوار ہی سے نہیں صورت سے بھی ہم وہی نظر آئیں گے۔ الف سے الو۔ مگر مجبوری میں آدمی الو بنتا ہے۔"

"کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔" محسن نے کہا۔ "کبھی شامتِ اعمال کے باعث۔"

"لیکن تم محض دو الوؤں کی صحبت میں الو بن رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "جاؤ پیارے الو! چائے بنا لاؤ۔"

چائے بنانے کے لیے جانے سے پہلے استاد ٹیڈی نے دلائل سے ثابت کیا کہ اس وقت دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی کو الو بنا رہا ہے۔ بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو۔ بچے ماں باپ کو۔ سیاستدان عوام کو۔ شاعر سے لے کر تاجر تک اور مزدور سے لے کر آجر تک، سب ایک دوسرے کو الو بناتے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں انسان کوئی نہیں ہے سب الو ہیں یا الو کے پٹھے ہیں۔ پھر وہ واک آؤٹ کر گیا۔

"صبح کے اخباروں میں ایک خبر اس پرنسپل کے اغوا اور موت کی ہوگی۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ہاں۔ اور اس میں جو گاڑی ملوث پائی جائے گی اس میں سے صوفیہ کے نام کے کاغذات برآمد ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "پولیس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ نام پتا فرضی تھا۔ چنانچہ پولیس معلوم کرے گی کہ گاڑی کہاں سے خریدی گئی تھی اور وہ دکاندار الفاظ سے تیری تصویر بنا دے گا جس کے پاس تو دو مرتبہ جا چکا ہے۔ پہلے ایک گاڑی خریدنے کے لیے پھر اس کے بدلے یہ دوسری گاڑی لینے کے لیے۔"

"ممکن ہے تفتیش کا سلسلہ پرنسس صوفیہ کے ساتھ پیش آنے والے پرانے واقعات سے جا ملے اور ایک ہوٹل کا منیجر بھی گواہ بن کے دہائی دیتا آ جائے کہ اس آفت کی پرکالہ پرنسس صوفیہ کے باعث وہ خود کتنی تباہی و بربادی سے دوچار ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں نے شرفا کے اس ہوٹل میں مد دھاڑے بھرپور کتنا سنسنی خیز اور خونی ڈراما دیکھا تھا۔ وہ پرنسس کی تصویر اپنے الفاظ میں بنا دے گا۔ ممکن ہے دل سے کوئی پرنٹ نکال کر پولیس کو بتا دے کہ یہ تھی وہ غارت گرِ عقل و ہوش جس کا عکس اب تک دل کے آئینے میں ہے۔ اس کے بعد ہمارے انکل ایس ایس پی تک بات پہنچی تو وہ... اور دو چار سمجھتے ہیں چنانچہ اس نتیجے پر فوراً پہنچ جائیں گے کہ یہ سب کس کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ بھتے کی تھی تو اس کا مقصد سکندر۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی سے [illegible] مزاحمت کیے بغیر محسن خان۔ ذرا اپنے چاروں طرف دیکھو۔" سنبھالے

"اس کمرے میں نہیں میرا مطلب تھا اس دنیا کو دیکھو جس میں ہم بی رہ رہے ہیں۔ آج یہ کلیہ صرف حیوانوں ہی پر نہیں انسانوں پر بھی صادق آتا ہے کہ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے جانور مثلاً ڈینوسار خود ختم ہو گئے۔ اب شیر ہاتھی اور دوسرے بہت سے جانوروں کی نسل رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں بدلے ہوئے حالات میں ان کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ایک دن سچے، ایماندار اور اصول پرست آدمی کے لیے اس معاشرے میں جینا مشکل ہو جائے گا اور معاشرے سے اس کا وجود خود بخود مٹ جائے گا۔ مائٹ از رائٹ سوسائٹی میں ایسے آدمی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے یار۔" محسن نے کہا۔ "ڈھول تو بست پیٹا جاتا ہے کہ سب خیریت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دیانتداری اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ آج کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ ملازمت نہ کاروبار اور نہ محنت مزدوری۔ رزق حلال کما کے اپنا اور خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی چھابڑی بھی لگانا چاہے، تو پتھارے دار کا بھتہ ہے۔ پولیس کا بھتہ ہے۔ غنڈہ ٹیکس ہے۔ قلی بھی ٹھیکیدار کو بھتہ دیتا ہے اور فقیر بھی۔ کوئی مجبوری میں اپنا خون بھی بیچنا چاہے تو ہر ہسپتال کا ایک ٹھیکیدار ہے۔ پہلے وہ بھتہ لیتا ہے۔"

"یہی ہے مائٹ از رائٹ سوسائٹی دوست!" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہم آج ہیں، اسی کے طفیل ہیں ورنہ کیا ہم ایسے تھے؟ ہم نے تو اصول اور انصاف کے مطابق اپنا حق مانگا تھا۔ بہت مجبور ہو کے ہم نے مائٹ از رائٹ کے فلسفے کی بالادستی قبول کی۔ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ یہاں سکۂ رائج الوقت تھا۔ اس کے بغیر حق تو کیا کوئی ہمیں خیرات تک دینے پر تیار نہ تھا۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ ہم نے بھی اس معاشرے کی اصلاح کا ٹھیکا نہیں لیا ہے، ہم تو صرف اپنا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنا حق غصب کرنے والوں کو یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ جو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی سکت رکھتے ہیں۔"

جب ٹیڈی چائے لے کر اندر آیا تو ہم فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے پیر پھیلائے بیٹھے تھے۔ رات کے آخری پہر میں سردی بڑھ گئی تھی چنانچہ ہم نے پیروں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ میرے ہاتھ پھر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم کو واپس وہاں، اس پر بچھی ہوئی دری بھی مجھے ناکافی محسوس ہو۔"

"بہر حال یہ کرہ ہے" محسن نے گرم چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "مزہ آ گیا۔ آج سردی بھی زیادہ ہے۔"

"تم اس ایک کمبل میں سردیوں کا پورا موسم گزار دیتے ہو۔" میں نے ٹیڈی سے کہا۔

"ایک کمبل سے کیا ہوتا ہے جی۔" ٹیڈی بولا۔ "صبح تک آدمی کی قلفی جم جائے۔ میرا کمرہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ سردی باہر کتنی بھی ہو، اندر پتا بھی نہیں چلتا۔" اس نے پلنگ کے نیچے سے الیکٹرک روم ہیٹر نکالا اور پلگ لگا کے آن کر دیا۔ ڈبل بار والے ہیٹر کی چمکدار سطح سے روشنی کے ساتھ حرارت کمرے میں پھیلنے لگی۔ میں نے حیرانی سے ٹیڈی کی طرف دیکھا۔

"اُستاد ۔۔۔ یہ ہیٹر تو ستر اسی روپے کا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ دو ہزار واٹ کا ہیٹر ہے۔"

"اس کا بجلی کا خرچ تو بہت زیادہ ہو گا۔" محسن نے کہا۔

"پتا نہیں جی۔ ہم نے تو مالک مکان سے دس روپے مہینہ طے کر رکھا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"دس روپے مہینہ؟" محسن نے کہا۔ "اور مکان کا کرایہ کتنا دیتے ہو؟"

"پچاس روپے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"کمال ہے! اس طرح تم دو سو روپے کی تو بجلی خرچ کر دیتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مالک مکان تو روتا ہو گا۔"

"اس نے تو اپنے گھر کے تین کمروں میں ہیٹر لگا رکھے ہیں!"... ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "بالکل ساتھ والا مکان اُس کا ہے اور میٹر بھی اُدھر ہی ہے۔ بڑی ایمانداری سے ہر مہینے پندرہ بیس روپے کا بل ادا کرتا ہے۔"

"اچھا! گویا ڈائریکٹ کنکشن لے رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"یا وہ خود واپڈا میں ہے۔"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا سالا میٹر ریڈر ہے۔"

"دیکھا محسن خان! اس معاشرے میں ایک میٹر ریڈر کتنا بااختیار ہے۔" میں نے کہا۔ "حکومت کیا کرے اور نظامِ انصاف کیا کرے۔ پولیس کانسٹیبل سے لے کر کسٹم کے چپراسی تک سب کی طاقت اُن قوانین کی طاقت سے زیادہ ہو گئی ہے جو بدعنوانی کو ختم کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"قصور تو اُن کا ہے سکندر جو قانون شکن عناصر کا ساتھ دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے اُستاد ٹیڈی کا مالک مکان۔" محسن نے کہا۔ "وہ بھی سمجھتا ہے کہ قانون میرا کیا بگاڑ لے گا۔ ساری خدائی اک طرف، جورو کا بھائی اک طرف۔"

"کہیں جورو کا بھائی، کہیں پیسہ اور کہیں غنڈہ گردی۔" میں نے کہا۔ "یہی تو لاقانونیت کے سہارے ہیں جن کی وجہ سے یہ معاشرہ دو حصّوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک ظالم اور دوسرے مظلوم۔ ایک طرف چوہدری دلاور جیسے لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے چنانچہ وہ باقی سب کو بھینس سمجھتے ہیں اور جدھر چاہتے ہیں ہانک کر لے جاتے ہیں۔"

کمرے میں ہم تینوں وقت گزارنے کے لیے، عصابی کشیدگی کم کرنے کے لیے اور ذہن کو پریشان کن خیالات سے دور رکھنے کے لیے باتوں میں مصروف تھے مگر باہر مکمل سکوت تھا۔ دسمبر کی سرد رات کا منجمد اندھیرا تھا۔ کہیں بہت دور، ایک کتا رو رہا تھا اور وقفے وقفے سے چوکیدار کی سیٹی بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے رالعہ کا تصور کیا اور اپنے دل کو اس خیال سے بہلانا چاہا مگر دماغ پر دہشتناک واقعات کا اثر تھا۔ ایک نقش الف دین کی سالی اور اسکول کی پرنسپل کی المناک موت کا تھا۔ کیا عجیب اتفاق تھا الف دین کہ چوریاں کرتا تھا، ڈاکے ڈالتا تھا اور اسکول چلاتا تھا جہاں بچے کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں پڑھتے تھے کہ ہمیشہ سچ بولو۔ خدا سے ڈرو۔ کسی کا حق نہ مارو ۔۔۔ اور وہ بے گناہ عورت جو قوم کے نونہالوں کو یہ تعلیم دیتی تھی، اُستاد تھی اور جس کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ تین بدمعاشوں کے ہاتھوں اغوا کی ناکام کوشش کے بعد بے رحمی اور سفاکی سے قتل ہوئی۔ دوسرا نقش طافو کی گل سڑ جانے والی لاش کے ساتھ چاند خاں کی تدفین کا تھا۔ ایسے میں رالعہ کا خیال بھی کیا روح کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا تھا۔ ایک خلش اس احساس کی تھی کہ میں نے آج اپنے غلط رویے سے اس کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اور اس کے دل کو صدمہ پہنچایا تھا۔ محسن نے کہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بھی جاگ رہی ہو گی اور خود کو قصور وار سمجھ کے احساسِ پشیمانی میں مبتلا ہو گی؟

میری طرح محسن اور ٹیڈی بھی کچھ سوچ رہے تھے اور چائے پیتے ہوئے سکوت کا ایک مختصر سا وقفہ آ گیا تھا۔ خاموشی میں اچانک میرے کانوں نے کسی کے اندر کودنے کی آواز سنی۔ آواز واضح تھی کہ بیک وقت محسن اور ٹیڈی بھی میرے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریوالور خود بخود میرے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

"تیرا ریوالور کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دوسرے کمرے میں۔" محسن نے پیچھے ہٹ کر دروازے کا رُخ کیا۔

"ابھی دروازہ مت کھولنا ...... دروازہ ٹیڈی کھولے گا۔" میں نے محسن کو روکنے کے لیے کہا۔ ہم اس قدر آہستہ بات کر رہے تھے کہ باہر کوئی ہماری سرگوشی نہیں سن سکتا تھا۔

"دوسرے کمرے ہی میں ٹھہرنا۔"

"یا میرے مولا! آخر اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے سکندر بادشاہ!" اُستاد ٹیڈی نے گھبرا کے کہا۔

"میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم دروازہ کھولو اور اُسے اندر آنے دو۔"

"لیکن اندر آنے سے پہلے ہی اس نے مجھے گولی مار دی تو کیا ہو گا؟" ٹیڈی نروس ہو کے بولا۔ "تم تو بچ جاؤ گے دیوار کے پیچھے چھپ کر۔" باہر اب بالکل خاموشی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کر دی۔

"فکر مت کرو اُستاد۔" میں نے دیوار کے ساتھ چپک کر ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ "معلوم نہیں آنے والا دوست ہے یا دشمن۔ اگر دشمن ہو گا تب بھی گولی چلانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"کیا معلوم وہ کتنے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اور کون ہیں آخر؟"

"یہ تو دروازہ کھولنے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ابھی سے تمہارا دَم کیوں نکل رہا ہے؟"

"دَم کس کا نکل رہا ہے!" ٹیڈی نے تھوک نگل کے کہا۔ "لیکن وہ انتظار کیوں کر رہے ہیں، کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"ٹیڈی! وہ چاہتے ہیں کہ تم دروازہ کھول کے دیکھو۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "فرض کرو وہ ہمیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آگ لگا کے اندر ہی راکھ کر دینا چاہتے ہیں۔ جب وہ سامنے آئیں گے تب ہی معلوم ہو گا نا۔ تم کچھ بھی مت کرنا۔ ہاتھ اوپر اٹھا لینا۔ اور پیچھے ہٹ جانا۔ وہ ایک ہوں یا دس، اُن سے ہم نمٹ لیں گے، چلو کھولو دروازہ۔"

خود کو اُستاد ٹیڈی کہلا کے خوش ہونے والے اور اپنی بدمعاشی کی ڈینگ مارنے والے نیک محمد نے اپنی کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت پہلے بھی بار ہا دیا تھا مگر اس وقت مجھے ٹیڈی کی حالت پر ہنسی نہیں آ رہی تھی، تاؤ آ رہا تھا۔ وہ مردہ قدموں سے آگے بڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے کنڈی کھول لی۔ چند سیکنڈ وہ اس مجرم کی طرح کھڑا رہا جو تختہ دار پر کھڑا جلاد کے لیور کھینچنے کا منتظر ہو مگر اس کے سامنے قضا کو دیکھ نہ سکتا ہو۔ پھر میں نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا۔ صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ مختصر سے صحن کا ہر گوشہ اندھیرے کے باوجود اس حد تک روشن ضرور تھا کہ کوئی کسی کونے میں بھی کھڑا ہوتا تو نظر آ جاتا۔ کچن اور انتہائی مختصر باتھ روم کے دروازے کھلے ہوئے تھے چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ اندر کودنے والا چھپ گیا ہو۔ اس میں شک کی بالکل کوئی گنجائش نہ تھی کہ صحن کی آٹھ فٹ سے زیادہ بلند دیوار کو پھاند کر کوئی اندر آیا تھا۔ وہ خاموشی سے بھی اندر اتر سکتا تھا مگر اُس نے احتیاط کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھا تھا۔ اگر یہ حرکت اس نے جانتے بوجھتے کی تھی تو اس کا مقصد ہمیں متوجہ کرنا تھا۔ تاکہ ہم باہر نکل آئیں اور مزاحمت کیے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔ اگر کوئی کچن یا باتھ روم میں اپنا مورچا سنبھالے بیٹھا تھا تو یقیناً ہم سے بہتر پوزیشن میں تھا لیکن میں اپنے دشمنوں کو بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے طرزِ عمل سے بہت پہلے ہی ہم یہ ثابت کر چکے تھے کہ نہ ہم اتنے احمق ہیں اور نہ بزدل۔ کسی کے یوں دھم سے کودنے کا دوسرا سبب اس کی بدحواسی ہو سکتی تھی لیکن ایسا کون تھا جو گھبرا کے اس غریب خانے میں پناہ لے۔

"نظر تو کوئی نہیں آ رہا ہے اُستاد!" میں نے ٹیڈی کے کان میں کہا جو اَب پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"لیکن ... سکندر بادشاہ ۔۔۔ وہ آواز .....؟" ٹیڈی نے سر ہلایا۔ "کیا کوئی چور تھا ... جو بھاگ گیا؟"

"چور ہمارے گھر سے کیا لے جائے گا؟" میں نے کہا۔ "کوئی قیمتی چیز ہے تو ہماری جان۔"

محسن نے دوسرے کمرے سے جھانک کر دیکھا اور میرا اشارہ پا کے قریب آ گیا۔ کمرے میں روم ہیٹر کی مدھم سی روشنی بھی اس وقت بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ "باہر تو کوئی بھی نہیں ہے! اگر ہوا تو کچن یا باتھ روم میں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "میں پہلے کچن میں دیکھتا ہوں۔ تو مجھے کور کرنا۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میری جگہ ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے دروازے سے کچن کا دروازہ مشکل سے دس فٹ دُور ہو گا۔ میں نے ایک جست لگائی اور توپ کے گولے کی طرح کچن میں جا گرا۔ اگر کوئی دشمن بھی محسن کی طرح نشانہ لیے منتظر ہوتا تو اس برق رفتاری کے باعث آسانی سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن کچن میں کوئی نہیں تھا۔ اندر گرتے ہی میں یوں اٹھ گیا تھا جیسے ربر کی گیند زمین سے ٹکرا کے اٹھتی ہے اور میری نظر نے ہر گوشہ دیکھ لیا تھا۔ کوئی اندر ہوتا تو مجھے اتنی مہلت کیونکر ملتی۔ میں نے کچن کی لائٹ جلا دی۔ روشنی صحن میں بھی پھیل گئی اور میرے مقابل باتھ روم تک پہنچی۔ کھلے دروازے سے میں نے چار فٹ لمبے چار فٹ چوڑے غسلخانے اور اس سے ملحق لیٹرین کو دیکھا۔ نظر کہتی تھی کہیں کچھ بھی نہیں ہے لیکن عقل اُسے فریبِ نظر قرار دیتی تھی۔ وہ آواز صرف میرے کانوں نے نہیں سنی تھی، محسن اور ٹیڈی بھی اس آواز پر چونکے تھے اور انھوں نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا تھا جو میں نے۔ چنانچہ اس کو وہم نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک نظر میں نے دیوار کو دیکھا۔ کسی کے دیوار کے پیچھے ہونے کے امکانات پر غور کیا اور پھر ان امکانات کو مسترد کر دیا۔ دیوار کے پیچھے گلی تھی اور گلی میں چوروں کی طرح کھڑا رہنے والا پکڑا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

جاسکتا تھا۔ میں نے محسن کو آواز دی اور اسے باہر آجانے کو کہا۔ میں خود بھی صحن میں آگیا تو محسن سمجھ گیا کہ اب لائٹ جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم نے اطمینان سے اندر اور باہر دیکھا لیکن کوئی ہوتا تو ہمیں نظر آتا۔

"یار، میں نہیں مان سکتا کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر کوئی اندر کودا تھا تو پھر کہاں گیا؟" محسن بولا۔ "بلاوجہ اندر آیا اور لوٹ گیا۔"

"کوئی اتنی رات کو ہائی جمپ کی مشق نہیں کرتا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "اور وہ بھی دوسرے کے گھر میں۔"

"سکندر بادشاہ! ہو سکتا ہے کسی نے کچھ پھینکا ہو۔" ٹیڈی نے بالآخر لب کھولے۔

"تمھارا گھر ہے۔ تم خود غور کرو کہ کون سی چیز مشتبہ اور فالتو ہے، ہمارے سوا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔" ٹیڈی نے سر کھجا کے کہا۔ "یہاں ہے ہی کیا۔ فقیر کا ڈیرا ہے، وہی دو چار برتن ہیں اور اپنا بوریا بستر ہے۔"

مگر محسن کچھ سوچ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کے خیالات کی سمت کیا ہو گی۔ برسوں کے ذہنی اور جذباتی تعلق اور زندگی کے تجربات میں ہر قدم کی رفاقت نے ہمارے اندازِ فکر میں ایسی یکسانیت پیدا کر دی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں خاصے وثوق کے ساتھ بتا سکتے تھے کہ مخصوص حالات میں ہمارا ردِعمل کیا ہو گا۔

"میرا خیال ہے سکندر، کہ کوئی آیا ضرور تھا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن کچھ کرنے کی نیت سے نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم موجود ہیں یا نہیں۔"

"اور وہ خاموشی سے جائزہ لے کر چلا گیا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"خاموشی سے کیسے سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا۔ "وہ تو دھم سے کودا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن وہ اندر ٹھہرا نہیں، چند سیکنڈ میں پھر دیوار پر سے گلی میں اتر گیا۔" میں نے کہا۔ "جب لائٹ بجھا کے تم نے دروازہ کھولا تو شاید وہ دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔"

"اگر وہ دیوار کے اوپر ہی سے مجھے ڈز کر دیتا پھر؟ تم نے تو آگے کر دیا تھا مجھے!"

"وہ ڈز کرنے نہیں آیا تھا۔ ڈز کرنے والے بعد میں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو مخبری کرنے آیا تھا۔ دیوار کے اوپر سے اس نے مجھے اور محسن کو بھی دیکھ لیا ہو گا اور پانچ منٹ میں گلی سے [illegible] گیا ہو گا۔ اس کا مقصد ہمارے اس ٹھکانے کی تصدیق کرنا [illegible] ہو گئی۔ اب باقی کارروائی دلاور کی ہدایات کے مطابق ہو گی۔ [illegible] میں کام کرنے کا قائل نہیں اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا اور کب کرے گا۔"

"گویا اب یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی؟" محسن نے تشویش [illegible] "یار سکندر! اب یہاں سے نکل جانا چاہیے اور عقل مندوں نے کہا [illegible] آج کا کام کل پر مت چھوڑو۔"

"تو چاہتا ہے کہ ہم اسی وقت رختِ سفر باندھ لیں؟" میں [illegible]

"ہاں۔ اگر جانا ہی ہے تو یہاں سے فوراً چلے جانے میں [illegible] ہے۔" محسن بولا۔ "دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ تیرا خیال درست [illegible] ڈز کرنے والے بعد میں آئیں گے لیکن کیا وہ صبح ہونے سے [illegible] آ سکتے؟ اگر انھوں نے بھی سوچا کہ دیر کرنے سے نقصان ہو سک[illegible] وہ ابھی آ جائیں گے۔ انھیں ڈر ہو گا کہ موقع ہاتھ سے نکل جا[illegible] آج یہاں ہیں تو کل کہیں اور نہ چلے جائیں۔ ہم تو اپنے ٹھکانے [illegible] ہیں۔ معلوم نہیں کس طرح اور کتنی جدوجہد کے بعد وہ ہمارا [illegible] لگانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ کیوں خطرہ مول لیں گے [illegible] غائب ہو جائیں۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم لوٹ [illegible] جب خطرے کی بات نہیں رہے گی۔"

محسن کی دلیل نے مجھے قائل کر لیا۔ ابھی تو صرف دس منٹ [illegible] تھے۔ اگر واقعی کسی کو ہمارے اس ٹھکانے پر ہماری موجودگی [illegible] کے لیے بھیجا گیا تھا تو اس کے واپس جا کر رپورٹ دینے اور حملہ [illegible] کے آنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہمیں کتنی [illegible] ملے گی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باقی لوگ کسی گاڑی میں ساتھ ہی [illegible] اور گلی کے موڑ پر موقعے کے منتظر ہوں۔ ایسی صورت میں مہلت [illegible] کے برابر تھی۔ اگر مخبر نے دلاور کو کہیں سے فون کیا اور [illegible] دلاور نے اپنے کمانڈوز بھیجے تو اس کارروائی میں آدھا پونا [illegible] لگے گا۔ تیسری اور آخری صورت یہ تھی کہ مخبر خود دلاور کے [illegible] اسے تمام صورتِ حال سے مطلع کرے اور دلاور مکمل رازداری کے ساتھ کوئی مؤثر کارروائی کرنے کی منصوبہ بندی کرے۔

"محسن ٹھیک کہتا ہے استاد!" میں نے ٹیڈی سے کہا۔ "[illegible] اسی وقت بھاگ جانا چاہیے۔"

"لیکن... ہم جائیں گے کہاں؟" ٹیڈی نے پریشان[illegible]

"کہیں بھی جانا جہنم میں جلنے سے بہتر ہے۔" میں نے [illegible] جا کے سامان سمیٹنے لگا۔

"ابھی کوئی آ کے دستی بم پھینک گیا تو خواہ مخواہ مرنا [illegible]

[illegible] نے اپنا سوٹ کیس بھرنا شروع کر دیا۔

"اچھا، تم کہتے ہو تو میں بھی چلتا ہوں۔" ٹیڈی نے بہ امرِ مجبوری [illegible] "ساتھ کیا لوں؟"

"اپنی عقل ضرور ساتھ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "باقی جو کچھ تم [illegible] لے کر نکل سکو۔ اصل مسئلہ تو جان کی سلامتی کا ہے۔"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" محسن دروازے کی طرف لپکا۔ "کتنے [illegible] کاری آتے ہیں۔"

"ایسے مت جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ دروازہ کھولتے ہی تو [illegible] کا شکار ہو جائے۔"

"میرے پاس ریوالور ہے۔" محسن نے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں [illegible] اپنے ریوالور کے ساتھ اس کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ محسن نے [illegible]ازہ کھول کے گلی میں جھانکا اور پھر میری طرف دیکھا۔

"سامنے تو کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن گلی کے موڑ پر [illegible] ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔"

اب میں نے گردن نکال کے دیکھا۔ "ایک نہیں دو سائے [illegible]" میں نے کہا۔ "دو کے چار بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ناکا بندی۔" محسن بولا۔ "دوسری طرف سے [illegible]لنے کا راستہ ہی نہیں۔ گلی بند ہے۔"

"استاد! اگر گلی دونوں طرف سے بند ہو تو ہم دشمنوں کو نظر آئے [illegible]ر کس طرح نکل سکتے ہیں؟" میں نے ٹیڈی سے کہا جو میرے [illegible]چھے آ کھڑا ہوا تھا۔ "ہے کوئی صورت؟"

"مانا کہ ہم کچھ دیر قبل خود کو الو ثابت کر چکے ہیں مگر ہم اڑ [illegible] سکتے ورنہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہم کوٹھے ٹپ کر ہی جا سکتے ہیں سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے اوپر دیکھا۔ "گرمی کا [illegible] ہوتا تو یہ بھی مشکل ہو جاتا مگر آج کل سب نیچے کمروں میں [illegible] اوڑھے پڑے ہیں۔" "میرے گھر کی چھت مالک مکان کی [illegible] سے ملی ہے لیکن ہم چھت سے دوسری گلی میں نہیں اتر [illegible]"

"کیوں نہیں اتر سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ چھت سے جو زینہ نیچے جاتا ہے وہ صحن میں ختم ہوتا [illegible]" ٹیڈی بولا۔ "اور صحن پار کرنے کے بعد گلی میں کھلنے والا دروازہ [illegible] سامنے والے مکان دو دو منزلہ ہیں اور ان کی چھت بہت [illegible]"

"کیا ہم صحن پار نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔ "یا دروازہ مقفل [illegible]"

"دروازے کا مجھے صحیح علم نہیں، اندر سے بند کرنے کے بعد بڈھا تالا لگاتا ہے یا نہیں مگر وہ خود رات بھر جاگتا ہے۔ دمے کا مریض ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "ذرا سی آہٹ پر وہ نکل آئے گا۔"

"دیکھو میاں نیک محمد! یہ موقع ڈرنے اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں تقدیر نے اتنی مہلت فراہم کر دی ہے ورنہ شکاری تو تیار کھڑے ہیں۔"

"کیوں کھڑے ہیں؟" ٹیڈی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کس کا انتظار ہے انھیں؟"

"شاید مناسب وقت کا۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "قتل کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ اندر ایٹم بم پھینک جاتے یا مشین گن لے کر آتے اور سب کو بھون جاتے۔"

"ممکن ہے وہ ہمیں اغوا کر کے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔ یا ہم سے کچھ لینے آئے ہوں مثلاً وہ کیسٹ جس کی ایک نقل ہم چوہدری دلاور کو پہلے ہی دے چکے ہیں۔ یا چوہدری صاحب ہم سے پوچھنا چاہتے ہوں کہ ہم ان کے بارے میں کتنا جانتے ہیں اور کیا عزائم رکھتے ہیں۔" محسن نے کہا اور ایک بار پھر گلی میں جھانک کر دیکھا۔

"تیرا فرمایا ہوا بالکل درست تھا۔ دو کے چار ہو گئے ہیں وہ اور گلی کے اندر کھڑے ہیں۔" محسن بولا۔

"غالباً ان کو دلاور کا یا افسرِ بکارِ خاص کا انتظار ہے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے اطلاع دے دی ہو گی کہ آپ کے آدمی موجود ہیں۔ اور اس تصدیق کے بعد دلاور نے کہا ہو گا کہ وہیں رہو اور ان پر نظر رکھو۔ کوئی نکلنے نہ پائے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے پلان پر عمل کرے گا۔ تاکہ ناکامی کا امکان نہ رہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہم کو اٹھا لیا جائے۔ جیسے پولیس مجرموں کو تفتیش کے لیے اٹھواتی ہے۔"

"ہاں۔ بہت دن ہو گئے ہیں ہماری اس سے بالمشافہ گفتگو نہیں ہوئی۔" محسن نے کہا۔

"اور اس عرصے میں ہم نے اسے پریشان بھی بہت کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سمجھ چکا ہے کہ اب ہم سودا تو کریں گے نہیں۔ چنانچہ وہ خوفزدہ بھی ہو گا کہ کہیں ہم اس کے اصل کاروبار کا سراغ نہ لگا لیں۔ بس اب نکل چلو۔"

میں نے اور محسن نے اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے۔ ٹیڈی نے خاصی شرمندگی کے ساتھ ٹین کا ایک صندوق کندھے پر رکھا جس کو بند کرنے کے لیے اسے رسی لپیٹنی پڑی تھی۔ میرے سوٹ کیس میں کیسٹ کے علاوہ ایف ایم مائیکروفون بھی تھا۔ ایک ایک ریوالور میرے اور محسن کے ہاتھ میں تھا اور ایک ایک ہم دونوں نے سوٹ کیس میں چھپا لیا تھا۔ جو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا وہ سائلنسر والا تھا اور میں نے دلاور سے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چھینا تھا جتنی نقد رقم تھی وہ محسن کے پاس تھی۔ ان کے علاوہ ہمارے سوٹ کیسوں میں ہمارے کپڑے تھے ان میں ایک پوسٹ مین کی اور ایک ویٹر کی وردی بھی شامل تھی جنھیں میں استعمال کر چکا تھا۔ یہ سب سامانِ ضرورت تھا جسے ہم کہیں بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ ٹیڈی نے اپنے بکس میں کیا رکھا تھا یہ ہم نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اپنے کپڑوں یا پیسوں کے سوا وہ کیا لے گا مگر وہ گھر سے بے گھر ہونے پر مغموم تھا۔ چند منٹ پہلے وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے گھر کھلا چھوڑ کے بھاگنا پڑے گا اور وہ بھی آدھی رات کے بعد اتنی سردی میں۔ وہ زیرِ لب کچھ کہتا ہمارے پیچھے پیچھے چھت پر پہنچا تو سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"آج تو مروا دیا تم نے سکندر بادشاہ؟" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ بے شک سردی زیادہ تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آدمی ہلنے لگے۔ ٹیڈی پر سردی کا ہی نہیں خوف کا بھی اثر تھا۔

"سکندر بادشاہ کو بھی تقدیر نے مروایا تھا استاد" میں نے کہا۔ "دنیا فتح کرنے نکلا تھا اور ایک مچھر نے کاٹا تو ملیریا ہو گیا چنانچہ دنیا سے گیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ہم خالی ہاتھ تو نہیں ہیں۔"

ٹیڈی کے گھر اور اس کے مالک مکان کے گھر کی چھت کسی زمانے میں ایک رہی ہوگی جب اس نے گھر کے ایک حصے کو کرائے پر دینے کے لیے الگ کیا تو اس گھر کی چھت کو بھی چار فٹ کی دیوار اٹھا کے تقسیم کر دیا۔ میں نے اس "دیوارِ برلن" کو عبور کر کے خطرناک علاقے میں پہلے قدم رکھا اور محسن نے مجھے دونوں سوٹ کیس پکڑا دیے۔ پھر ٹیڈی نے مجھے رسی سے بندھا ہوا ٹین کا کھڑکھڑاتا صندوق پیش کیا۔ خلافِ توقع وہ بہت بھاری تھا اور میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ اگر وہ چھوٹ کر گر جاتا تو اس کا دھما کا مکان کے مالک کو بم کے دھماکے کی طرح سنائی دیتا۔ وہ دوڑتا ہوا آتا اور پھر اپنے فرار کے منصوبے کو ناکامی سے بچانے کے لیے ہمیں اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔

"کیا بھرا ہے اس میں استاد؟" میں نے کہا۔ "گولہ بارود یا سونا؟"

"دونوں سے آدمی کو اصل طاقت حاصل ہوتی ہے۔" محسن نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ ٹیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہم نے دبے پاؤں چھت کو عبور کیا۔ زینہ اس کے شمال مشرقی حصے میں نظر آرہا تھا۔ میں نے آخری زینے پر قدم رکھنے سے پہلے منڈیر سے نیچے جھانکا صحن میں اندھیرا تھا۔ اچانک بند کمرے کے کسی دروازے سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور ٹیڈی کا لینڈ لارڈ کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ ہم تینوں زینے میں دبک گئے۔ چند منٹ کی تاخیر نے ہمیں بچا لیا ورنہ ہم عین اس وقت پکڑے جاتے جب ہم دروازہ کھول رہے ہوتے۔ ایک دبلا پتلا اور بوڑھا سا آدمی آہستہ آہستہ چلتا

باتھ روم تک گیا۔ ہم دم سادھے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ "سکندر!" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "تو نے کچھ سنا؟"

ابھی تک میں نے کچھ نہیں سنا تھا لیکن اسی وقت میرے کانوں نے بھی دو افراد کو دھیمی آواز میں بولتے سنا۔ "یہ تو کوئی گھر میں معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ محسن نے اقرار میں سر ہلایا اور پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"وہ لوگ ہمیں غائب پائیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ہم کس راستے سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن بولا۔ "یہ ٹیڈی کا لینڈ لارڈ اندر جا کر بیٹھ گیا ہے کیا؟"

"وہ ہمارے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آئیں گے اور ہم کو اسی جگہ گرفتار کریں گے۔" میں نے کہا۔

"یا میرے مولا! اب کدھر جائیں؟" ٹیڈی نے لرزتی آواز میں کہا۔

"آگے کنواں، پیچھے خندق۔ اوپر وہ موت کے فرشتے نیچے تیرا لینڈ لارڈ۔" محسن نے کہا۔

"وہ اوپر آنے ہی والے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "میں جا کے انھیں روکتا ہوں۔ یہ نہ ہو وہ پیچھے سے اچانک نازل ہو جائیں یا ہمارے نکلنے کے بعد آئیں تو بے چارے مالک مکان پر مصیبت نازل ہو۔"

"مار دھاڑ اور کشت و خون کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے سکندر!" محسن نے مجھے روک لیا۔ "اور نہ یہ وقت ہے جنگ کا۔" اس کی نظر بھی بار بار اوپر جاتی تھی۔ ہم ہی جگہ چوہے کی طرح

"ہم اسی جگہ چوہے کی طرح دبکے ہوئے پکڑے جائیں محسن؟" میں نے کہا۔ "بہتر ہے ان کو مقابلہ کر کے روک دیا جائے۔ کسی لمحے کوئی نمودار ہو سکتا ہے۔"

"اس سے تو بہتر ہے کہ ہم دروازہ کھول کر نکل جائیں اور جاتے ہوئے باہر سے کنڈی لگا جائیں تا کہ کوئی فوراً ہمارے پیچھے نہ آئے۔" محسن بولا۔ "مالک مکان شور مچاتا ہے تو مچانے دو۔ شکاری ہمارے تعاقب میں آئیں گے تو وہ بتا دے گا کہ میں تو باتھ روم میں تھا نہ جانے کون اندر آگیا اور جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گیا۔ اس سے تو بہتر ہے نا کہ ہم میں سے کوئی مارا جائے یا ہم یہاں ایک دو مار کے اور باقی کو توڑ پھوڑ کے خود تو بھاگ جائیں اور بے چارہ بڈھا ہمیں پولیس کے ہاتھ پڑ جائے۔ اور میاں نیک محمد کو کوستا رہے کہ بڑا نیک کرایہ دار تھا۔"

ہماری کھسر پھسر بڑے میاں کے باتھ روم سے نکلنے سے پہلے ختم ہو گئی۔ ویسے بھی میں نے محسن کی تجویز سے اتفاق

کر لی تھی اور بڈھا باہر نہ نکلتا تو ہم بے خوف و خطر دندناتے ہوئے دروازہ کھول کے باہر نکل جاتے۔ ٹیڈی کے گھر میں سے پھر کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ آنے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔ نہ جانے کتنے پاپڑ بیل کر وہ ہمارا ٹھکانا تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ آسانی سے واپس جانے والے نہیں تھے۔

ٹیڈی کا بوڑھا لینڈ لارڈ آہستہ آہستہ چلتا اور زور زور سے کھانستا واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا اور ہم پر وہ وقت بھی گراں گزر رہا تھا جو وہ ایک قدم اٹھانے میں صرف کرتا تھا۔ بالآخر وہ زیرِ لب بڑبڑاتا، تقدیر کو کوستا اور اللہ کو یاد کرتا ہوا کمرے میں گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ ہم نے پیش قدمی کی۔ سب سے پہلے میں خالی ہاتھ آگے گیا اور میں نے بند دروازے کا جائزہ لیا۔ اندر زنجیر والی کنڈی تھی مگر اس میں کوئی قفل نہیں تھا۔ پوری احتیاط سے میں نے دروازے کے دونوں پٹ دبا کے کنڈی کو کھولا۔ دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور زنجیر کے الگ ہونے سے بھی معمولی سا کھٹکا ہوا۔ آواز بہت کم تھی لیکن اس وقت مجھے بہت زیادہ لگی۔ دونوں پٹ کھول کے میں نے گلی میں دیکھا موسمِ سرما کی ویران رات کی تاریکی اور رات کی آخری گھڑی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو "آل کلیئر" کا سگنل دیا۔ ایک منٹ میں وہ دونوں باہر آگئے۔ محسن کے ایک ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس تھا اور دوسرے ہاتھ میں میرا۔ ٹیڈی نے اپنا ٹین کا بکس بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ کیونکہ جلدی میں باندھی جانے والی رسی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اور اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ بکس کھل نہ جائے۔

میں نے دروازے کو بند کیا اور پھر اس بات کا خیال رکھا کہ دونوں پٹ ملیں تو آواز پیدا نہ ہو۔ ٹیڈی کی حالت ہم دونوں کے مقابلے میں قابلِ رحم تھی۔ وہ ہانپ بھی رہا تھا اور کانپ بھی رہا تھا۔ ہانپنے کا سبب تو وہ بوجھ تھا جو اس کے شکستہ حال صندوق میں بند تھا۔ کانپنے کو وہ سردی سے منسوب کرتا تھا مگر ہم جانتے تھے کہ وہ ڈرا ہوا بھی ہے۔

"میاں خوجی۔" میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ہم کو اپنی گاڑی تک پہنچنا ہو تو ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ صراطِ مستقیم پر چلنے میں جان جانے کا خطرہ ہے۔"

"جو پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ صراطِ مستقیم اور پل صراط میں کیا فرق ہے؟"

"معلوم نہیں آپ لوگ کیوں اتنی مشکل باتیں کرتے ہو۔" ٹیڈی چڑ کر بولا۔ "ادھر آؤ۔ لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔"

"خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو پہلے ہی لمبے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر چوکیدار نے یا گشت کرنے والی پولیس نے دیکھ لیا تو چکر زیادہ لمبا ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ "وہ سمجھیں گے ہم چوروں کا ٹولا ہیں اور کسی کا گھر صاف کر کے فرار ہو رہے ہیں۔"

"اور میاں خوجی! جب وہ ہماری صورتیں ملاحظہ کریں گے تو ہمارا جرم بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ ہم صورت ہی سے چور لگتے ہیں پھر مجبوراً ہمیں قتل بھی کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "جو بھی راستہ روکے گا مارا جائے گا۔"

ٹیڈی سمجھ گیا کہ ہم اسے ڈرا کے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ "یار سکندر بادشاہ! یہ دوسری بار تم نے مجھے خوجی کہا ہے۔ کوئی نیا نام رکھا ہے میرا؟" وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ تم بھی تو مجھے سکندر بادشاہ کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ سکندر ایک بہت زبردست اور بہادر بادشاہ گزرا ہے۔ خوجی بھی ایک بہت بہادر شخص تھا تمھاری طرح۔ تم اس کا نیا ایڈیشن ہو۔"

"قسم مولا علی کی۔ اپنی تو کوئی فکر نہیں۔" ٹیڈی جوش میں آگیا۔ "لیکن انھوں نے بڈھے کو مار پیٹا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ وہ ہے تو بیہودہ مگر اس نے میرے ساتھ کبھی برائی نہیں کی کوئی۔ میں اسے کچھ بتائے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ جانے وہ کیا سمجھے گا۔"

"کچھ بھی نہیں سمجھے گا۔" میں نے ٹیڈی کو تسلی دی۔ "اگر کوئی اس سے ہمارے متعلق پوچھے گا تو خود ہی سمجھ جائے گا کہ نہ تو وہ ہمارا ساتھی تھا اور نہ اس نے ہمارے فرار میں مدد کی ہوگی۔ حالات خود اس کو بے قصور ثابت کر دیں گے۔ تم دو چار دن بعد آجانا اور شور مچا دینا کہ لٹ گیا، برباد ہو گیا۔ کوئی ایسا بیان دینا کہ تم چند دن کے لیے کانا کاچھا یا چھانگا مانگا گئے تھے اور پیچھے سے چوروں نے ہاتھ صاف کر دیا۔"

"کس چیز پر ہاتھ صاف کر دیا؟" ٹیڈی بولا۔ "مالک مکان کو معلوم ہے کہ میں تو کرایہ بھی مشکل سے دیتا تھا۔ چور اس گھر میں کیا لینے آئیں گے؟"

"یار تم بات کو سمجھا کرو۔" میں نے کہا۔ "دنیا میں تم جیسے کنگال نظر آنے والے بہت ہیں جو لاکھوں دبائے بیٹھے ہیں۔ فقیرانہ حلیوں میں پھرتے ہیں مگر ان کی گدڑی میں لعل ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو فاقے کرتے نظر آتے ہیں مگر خاندانی زر و جواہر کو آباؤ اجداد کی نشانی سمجھتے ہوئے فروخت نہیں کرتے۔ تم بھی داغ دینا یہ بیان کہ دادی کی یادگار خالص سونے کی اور ہیرے کے نگینے والی انگوٹھی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

دادا جان کی تصویر تھی جو سونے کے فریم میں تھی۔ مرتے وقت ابّا وصیت کر گئے تھے کہ ان کی حفاظت جان سے زیادہ کرنا۔"

"سکندر! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "وہ گلی کے موڑ پر کیوں کھڑے رہے؟ اور جب وہ ٹیڈی کے گھر میں پہنچے تو ہمارے پیچھے کیوں نہیں آئے۔ فرار کا تو ایک ہی راستہ تھا۔ ہم کوئی جوتیاں بغل میں دبا کے بھی نہیں بھاگے تھے اُن کو کافی وقت ملا تھا۔"

"آج میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ تو مجھے بھی سوچنا چاہیے تھا!"

"مجھے ایسا لگتا ہے سکندر کہ وہ ہمیں ہانک رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "انھوں نے ہمیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اپنی موجودگی ہم پر ثابت کی۔ اُن کی توقع کے مطابق ہم انھیں چکما دے کر نکل آئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹیڈی کے گھر میں بھی اُس وقت داخل ہوئے جب ہم وہاں سے نکل گئے۔ مقصد صرف ہمارے لیے واپسی کا راستہ بند کرنا تھا تاکہ ہم آگے جائیں۔ اور ہم نے بالکل وہی کیا جو وہ چاہتے تھے۔ ہانکا کرنے والے جانتے ہیں کہ شیر اُدھر ہی جائے گا جہاں ایک نظر نہ آنے والا گڑھا موجود ہے۔"

میرے آگے بڑھنے والے قدم رک گئے۔ اس وقت جو بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی وہ محسن کی عقل نے اسے سمجھا دی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر یہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک دیوار کے سائے میں رکھ دیا۔ محسن اور ٹیڈی نے میری تقلید کی۔

"تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنا راستہ بدل دینا چاہیے۔"

"ہم نے بہت عقلمندی کی تھی کہ فاکس ویگن کو دو گلیاں چھوڑ کے کھڑا کیا تھا۔" محسن بولا۔ "انھوں نے ٹیڈی کا گھر معلوم کر لیا تو فاکس ویگن بھی تلاش کر لی ہوگی اور اب وہ وہیں ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"تُو نے اس وقت خود کو سکندر کا اُستاد افلاطون ثابت کر کے ہمیں بہت بڑے خطرے سے بچا لیا ہے۔" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "ورنہ ہم خود چل کر موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ اب تم کچھ فرماؤ میاں کھوجی! کہ ان حالات میں ہم بیچارے کدھر جائیں؟"

"کہاں جائیں اس وقت!" ٹیڈی نے کہا۔ "رکشا ٹیکسی تو ملے گی نہیں یہاں۔"

"اچھا اگر ہم سیدھے چلے جائیں۔ کسی اور سمت میں نکلنا چاہیں تو کون سا راستہ اختیار کریں؟" میں نے کہا۔

"یار سکندر بادشاہ! راستے تو بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "گلیوں ہی گلیوں میں ہم ہر جگہ جا سکتے ہیں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ قسمت کی بات ہے کہ ابھی تک نہ گشت کرنے والی پولیس پارٹی ملی ہے اور نہ ہمیں کسی چوکیدار نے ٹوکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں ... میرا مطلب ہے صندوق بہت بھاری ہے میرا ... اور مجھ میں اتنی ہمّت نہیں رہی۔ رات بھر جاگنے کا اثر ہے شاید۔"

"کس عقلمند نے کہا تھا تم سے کہ اتنا وزن ضرور لو۔ آخر ایسی کیا چیز ہے اس میں؟" میں نے کہا۔

"صرف کپڑوں اور عام ضرورت کی چیزوں کا اتنا وزن نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔ "کوئی فالتو اور بے مصرف چیز ہے تو اسے پھینک دو۔"

ٹیڈی کے ردِّ عمل نے ہمیں حیران کر دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر صندوق کے سامنے یوں کھڑا ہو گیا جیسے اسے ہم سے خطرہ لاحق ہو گیا ہو کہ ہم اس سے صندوق چھین لیں گے۔ "اس میں کوئی فالتو اور بے کار چیز نہیں ہے۔" اس نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور رسّی کو پھر صندوق پر مضبوطی سے لپیٹنے لگا۔

"فکر مت کرو۔ ہم تم سے یہ خزانہ چھین کر پھینکنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا تو بتا دو کہ کیا ہم صبح تک اسی طرح یہاں کھڑے رہ سکتے ہیں؟ ابھی کوئی آ گیا یا کسی نے دیکھ لیا تو تمھارے لیے بھی مشکل پیدا ہو جائے گی اور ہمارے لیے بھی۔ تم ایسا کرو کہ میرا سُوٹ کیس اٹھا لو۔ میں تمھارا صندوق اُٹھا لیتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں اپنا صندوق اپنے پاس رکھوں گا۔" وہ بولا اور ہم سے پہلے اس نے اپنا بوجھ اُٹھا لیا۔ ٹیڈی کا رویّہ میرے لیے بہت تعجب خیز تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر صندوق میں وہ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں ٹیڈی ہم پر بھی اعتبار نہیں کرتا لیکن یہ اپنے تجسّس کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ ہم پھر چلنے لگے مگر ابھی دس قدم بھی نہ چلے تھے کہ ٹیڈی لڑکھڑایا اور اس کا صندوق ایک زبردست دھماکے سے نیچے گرا۔ صبحِ کاذب کے سکوت میں یہ شور مجھے صورِ اسرافیل کی طرح لگا جو مُردوں کو اٹھا دے۔ نتائج فوراً ظاہر ہوئے۔ کسی نے دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ چند سیکنڈ تک میں بھی اسے دیکھتا رہا۔

"کون لوگ ہو تم؟" بالآخر اس شخص نے سخت اور مشکوک لہجے میں کہا۔ "کس کا سامان ہے یہ؟"

"معاف کیجیے گا، ہم لوگ مسافر ہیں۔" میں نے شائستگی سے انگریزی میں جواب دیا۔ "ریلوے اسٹیشن سے آ رہے ہیں۔ رکشا والا گلی میں آنے پر تیار نہیں ہوا۔ بھاری سامان تھا جسے خود اٹھا کے لا رہے ہیں مجبوراً۔"

"کس کے گھر جانا ہے؟" سوال کرنے والا ذرا مطمئن ہوا۔

"مولوی عنایت اللہ کے گھر۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر ایک نام لے دیا۔ "اس کا ہونے والا سسر ہے۔" میں نے محسن پر ہاتھ رکھا۔

"کون مولوی عنایت اللہ... وہ چوہدری عنایت اللہ؟" وہ سوچ کر بولا۔

"ہاں۔ ہم لوگ بے تکلفی میں اسے مولوی کہتے ہیں۔" میں نے بات بنائی اور ایک دم ٹیڈی کا صندوق اٹھا لیا۔

"آپ کی نیند خراب ہوئی معذرت چاہتے ہیں۔" محسن نے بھی انگریزی میں کہا۔

"آپ لوگ جالندھر کے چوہدری عنایت کے مہمان ہیں نا؟ وہ جو ٹھیکے دار ہے؟"

"جی ہاں۔ ہمیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"لیکن وہ اب وہاں نہیں رہتا ہے۔" اس شخص نے اوپر سے کہا۔ "ماڈل ٹاؤن چلا گیا ہے۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس نے یہ گھر بیچ دیا ہے آپ لوگوں کو نہیں معلوم؟"

"نہیں... ہمیں معلوم ہوتا تو یہاں کیوں آتے؟" میں نے پریشانی سے کہا۔ میری پریشانی کی وجہ ہرگز وہ نہیں تھی جو خوابِ غفلت سے جاگنے والا سمجھ رہا تھا۔

"اچھا میں نیچے آتا ہوں۔ آپ سامان اِدھر اٹھا لائیں۔" وہ بولا اور کھڑکی سے غائب ہو گیا۔

"مروا دیا نا اُلّو کے پٹھے۔" محسن نے غضبناک ہو کے کہا۔ "یہ شخص تو چوہدری عنایت ٹھیکیدار کو میرا سسر بنا کے دم لے گا۔ کوئی اور نام نہیں لے سکتا تھا تو!"

"کمبل ہو گیا ہے سالا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو بات کر کے پھنس گئے۔"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو دیکھنا چوہدری عنایت ٹھیکیدار جالندھر والا اپنے ہونے والے داماد کا کیا حشر کرتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "سب مولا کی دین ہے، جسے چاہے راہ چلتے سسر بخش دے۔"

"اندر آ جائیں جی۔" اس شخص نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ "سامان لے آئیں۔ دراصل میں بھی جالندھر کا ہوں۔ اپنی بڑی یاری ہے عنایت سے۔ شمشاد نام ہے میرا۔"

"اچھا جی!" میں نے کہا اور صندوق کو بیٹھک میں رکھ دیا۔ "مر گئے پھر تو۔"

"میں جی؟ کیا کہا آپ نے؟" وہ پلٹ کر بولا۔ "میں نے سُنا نہیں۔"

"میں کہہ رہا تھا کہ بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا اور بید کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو ان سے رشتہ ہوا ہے عنایت کی لڑکی کا۔" اُس نے دوسری کرسی پر بیٹھ کے محسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ محسن کا چہرہ غصّے سے لال ہو رہا تھا مگر شمشاد نے اُسے شرم و حیا کا نتیجہ سمجھا۔ "خیر سے آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"چھوٹا بھائی ہے میرا۔" میں نے متانت سے کہا۔

"اچھا اچھا۔ تو آپ دونوں سیالکوٹ سے آئے ہیں۔ وہیں رشتہ ہوا تھا اس کی بڑی لڑکی کا۔ بڑی نصیبوں والی ہے جی۔ میں نے سُنا تھا لڑکا دبئی میں پلمبر ہے۔ ماشاءاللہ سے آج دیکھ لیا۔" شمشاد نے محسن کو دیکھ کر مسرّت کا اظہار کیا۔ "اچھا آپ لوگ چائے شائے پی لیں پھر میں چھوڑ آؤں گا آپ کو۔"

"آپ تکلیف مت کریں۔" میں نے کہا۔ "بس ہمیں ماڈل ٹاؤن کا پتا بتا دیں۔"

"لو جی حد ہو گئی۔ اپنے گھر کی گڈی ہے۔ تکلیف کیسی!" شمشاد بولا۔ "عنایت کیا کہے گا کہ میرے گھر تک چھوڑتے موت آتی تھی۔ چنگا بھلا معلوم بھی تھا کہ پروہنے کہاں سے آئے ہیں۔" وہ اُٹھا اور اندر چلا گیا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی کیونکہ محسن کی حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جسے بہت زیادہ کھا لینے سے بدہضمی ہو گئی ہو۔ ٹیڈی نے مجھے ہنستے دیکھا تو خود بھی ہنسنے لگا۔

"پروہنے کے بچّے!" محسن نے غرّا کے کہا۔ "میں دبئی میں پلمبر ہوں۔ یہ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟"

"بہت فائدہ ہُوا ہے اس وقت نورِ چشم!" میں نے کہا۔ "خوار ہونے سے بچ گئے۔ پکڑے جانے سے بچ گئے۔ اور مارے جانے سے بچ گئے۔ صرف تیرے اس نادیدہ سُسر کے صدقے میں۔ بڑا مبارک نام آیا تھا زبان پر کہ سارے مسئلے حل ہو گئے۔ اب اطمینان سے گرما گرم چائے پیو۔ پھر اپنے گھر کی گڈی میں چلتے ہیں یہاں سے۔"

"اس کو کہتے ہیں جو نیکی کرے اسے دریا میں ڈال۔" محسن بات سمجھ کے ہنسا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں اپنے سُسر کے یار شمشاد جالندھر والے پیدل واپس آئیں گے تو پتا چلے گا کہ گھر کی گڈی کو غیر لے گئے آئندہ کسی بھی عنایت کے پُروہنے پر عنایت نہیں کریں گے۔"

"اب تو بھی بن جا ایک شریف اور سعادت مند داماد۔" میں نے کہا۔ "بھولا بھالا اور شرمیلا۔"

"یار اس کو بھی تو دیکھ لوں۔ جس کی نسبت سے ہم سب کو یہ عزّت ملی ہے۔" محسن بولا۔ "آخر کون ہے وہ نصیبوں والی۔ بھاگ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھری چھپن چھری۔ دخترِ چوہدری عنایت ٹھیکیدار۔۔۔"

اُس کی بکواس شمشاد کے اندر آ جانے سے ختم ہو گئی۔ شمشاد نے ہمارے سامنے چائے کی کیتلی رکھی جس میں دودھ، چینی اور پتی کا کھولتا ہوا لذیذ مکسچر تھا۔ اُس وقت جب ہمارے ہاتھ پیر سردی سے سُن ہو رہے تھے اور ہم جسمانی طور پر بھی تھکن کا شکار تھے، اس گرماگرم مشروب نے ہمیں وہ توانائی اور حرارت عطا کی، جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ شمشاد نے معذرت کی کہ ابھی گھر والے سو رہے ہیں۔ اِس لیے ناشتے میں کچھ دیر ہے۔ تاہم وہ ہمارے لیے ایک پلیٹ میں بسکٹ لے آیا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے تمام سامانِ خورونوش اپنے پیٹ میں منتقل کیا، شمشاد بھی تیار ہو گیا۔ گھر کی گاڑی ایک گیراج میں سے نکالی گئی۔ یہ تقریباً چار سال پہلے کی فیٹ تھی جو اتنی بے دردی سے استعمال کی گئی تھی کہ دس سال پرانی لگتی تھی۔ اُسے چلانے والا نہ جانے اس کو کتنی بار کس کس چیز سے ٹکرا چکا تھا کہ اب گاڑی کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں ڈینٹ کا زخم نہ ہو۔ ہمارا اسباب بڑے اہتمام کے ساتھ ڈکی میں رکھا گیا اور شمشاد نے مہمان نوازی میں یہ کام خود کیا۔ اس کی شرافت دیکھ کر مجھے شرم آئی کہ ہم اس شرافت کا کیا صلہ دینے والے ہیں۔ محسن نے غالباً ایسے ہی جذبات سے مغلوب ہو کر کہا کہ اچھا ہوا چائے میں نمک نہیں تھا اور با پ ہے بھی بیٹھے تھے ورنہ ہم نمک حرام بھی کہلاتے۔ سردی میں انجن ٹھنڈا پڑا تھا، چوک دینے کے باوجود اُسے سیلف اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو ہمارے میزبان نے شرم سے پانی پانی ہونے کے بعد ہم سے دھکا لگانے کی درخواست کی اور یہ تکلیف دینے پر ہم سے بار بار معافی مانگتا رہا۔ "نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے۔" اس نے متعدد بار وضاحت کی۔ ہم تینوں نے اسے تسلی دی اور بیس پچیس گز تک دھکا لگانے کے بعد گاڑی کا انجن غرّایا تو ہم سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شمشاد نے مزید شرمندگی سے بچنے پر اور ہم نے تھوڑی سی جسمانی توانائی بچنے پر۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم اسے دھکا لگاتے ہوئے ماڈل ٹاؤن تک لے جاتے اور جب محسن کی سسرال آ جاتی تو شمشاد کہتا "بس جی۔ ہم پہنچ گئے۔ گھر کی گاڑی میں یہی تو آرام ہے۔ آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی مگر نامراد بیٹری بیٹھ گئی ہے۔۔۔۔"

صبح کاذب کا اُجالا ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو چکا تھا جب ہم اسی سڑک پر سے گزرے۔ فیٹ کے شیشے بند تھے چنانچہ باہر سے کوئی ہماری صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگلی سیٹ پر میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بیٹھا تھا اور محسن کے ساتھ ٹیڈی پچھلی سیٹ پر تھا۔ گاڑی اس گلی کے سامنے سے گزری جس میں ٹیڈی کا مکان تھا تو میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کو دیکھا۔ یہ وہی ٹرک تھا جسے علی نواز اور چاند خاں کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دو افراد جو اس کا بونٹ کھولے بظاہر کسی خرابی کو دور کرنے میں مصروف لگتے تھے، وہی ڈرائیور اور کلینر تھے جن سے ٹیڈی کا جھگڑا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دو افراد کچھ فاصلے پر گلی کے اندر سے آ رہے تھے لیکن میں اُن کی صورت نہ دیکھ سکا۔ غالباً ٹیڈی کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اور اس کا یہ غریب خانہ جیسا بھی تھا سب کے لیے ایک پناہ گاہ تھا جہاں وہ ہر خوف سے بے نیاز اپنی آزاد زندگی گزارتا تھا۔ اپنی مرضی سے آتا جاتا تھا اور اپنی مرضی سے سوتا جاگتا تھا۔ ہمارا ساتھ کیا ہوا کہ وہ بھی گھر سے بے گھر ہوا۔ اس نے ایک خاصی سرد آہ بھر کے کہا۔ "واہ میرے مولا!" اور اتنی دیر میں فیٹ اس گلی سے بھی نکل گئی جس میں رابعہ کی فاکس ویگن تنہا اور اداس کھڑی تھی۔ وہی فاکس ویگن کبھی جس کا چمکتا دمکتا سُرخ رنگ کسی دُلھن کے ہاتھوں کی مہندی سے زیادہ شوخ تھا۔ گردشِ حالات اس فاکس ویگن کو بھی کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ وقت یوں بدلا تھا کہ فاکس ویگن کا حنائی رنگ بھی بدل گیا تھا اور اب سفید رنگ میں وہ سہاگن سے زیادہ بیوہ نظر آتی تھی۔ جس کی خوشیوں کو سفید کپڑوں کا کفن مل چکا ہو۔

راستے ہنوز غیر آباد تھے۔ کہیں کہیں ہمیں مخالف سمت سے آ جانے والی کوئی گاڑی مل جاتی تھی۔ پیدل یا سائیکل سوار نظر آ جاتے تھے۔ سحر خیزی میں سرِفہرست رہنے والے اخبار فروش۔۔ اور دودھ والے بھی ہر روز کی طرح شہر کے باسیوں کو تازہ خبر اور خالص دودھ فراہم کرنے نہیں نکلے تھے۔ نہ روزمرّہ کی ضروریات بیچنے والے دکانوں پر آئے تھے۔ اُن میں بھی سب سے پہلے سبزی گوشت اور دہی دودھ والے اوّل رہتے تھے۔ میں نے کئی جگہ گشت کرنے والی پولیس پارٹیوں کو پلٹتے دیکھا۔ اُفق پر صبح صادق کی لکیر روشن ہونے لگی تھی اور شمشاد مجھ سے نہ جانے کیا باتیں کرتا ماڈل ٹاؤن کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً وہ اپنے اور عنایت کے پرانے تعلقات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

"شمشاد صاحب!" میں نے ضلع کچہری سے ایک میل آگے نکل کر نرمی سے کہا۔ "گاڑی ایک طرف روک کر میری ایک بات سُن لیجیے۔"

وہ میرے لہجے پر چونکا اور میرے چہرے کی متانت پر غور کرنے لگا۔ "خیریت تو ہے نا جی؟"

"بالکل خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم کو ماڈل ٹاؤن جانا ہی نہیں تھا۔ ہم کو یہاں اُترنا ہے۔"

وہ کچھ چونکا، لیکن اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا۔ "چنگا مذاق ہے جی!"

"آپ نے جتنی بھی خاطر تواضع کی ہے" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اور جس شرافت کا ثبوت دیا، اس کے بعد ہمیں آپ کے ساتھ یہ سلوک بالکل زیب نہیں دیتا لیکن ہم مجبور ہیں۔ جو کچھ آپ نے کیا اس کا بہت شکریہ۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتی جی یہ بات۔ یہاں رُک کر ایسی باتیں کرنے کا مطلب۔۔۔" وہ اُس پستول کو دیکھ کر باقی جملہ بھول گیا۔ جو میں نے اپنی جیب سے نکال کر اس طرح گود میں رکھ لیا تھا کہ اُس پر میری گرفت برقرار تھی۔

"مطلب بہت سیدھا اور صاف ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ خود بہت سیدھے سادے آدمی ہیں، اس لیے آپ کو صاف الفاظ میں بتانا پڑے گا کہ ہمارا کسی چوہدری عنایت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم تو چور ہیں اور ایک گھر کا سامان لے کر نکل رہے تھے کہ آپ مل گئے۔ ہمارا ارادہ نہیں تھا آپ سے ملاقات کا مگر۔ یہ تقدیر کا لکھا تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ایک نام بک دیا تھا۔ باقی سب اتفاق تھا کہ آپ نے ہمیں سمجھنے میں غلطی کی اور ہم وہ بن گئے جو ہم نہیں تھے۔"

شمشاد کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس شریف آدمی کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اُس سے اتنے شائستہ لہجے میں انگریزی بولنے والے چور تھے جن پر اعتبار کر کے اس نے اپنے سادہ لوح ہونے کا نہیں، بے وقوف ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

"تم آدمی تو۔۔۔ پڑھے لکھے ہو۔۔۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "پھر۔۔۔ یہ غلط کام۔۔۔؟"

"غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم یہاں اس پر بحث میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ بہت سے پڑھے لکھے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، لاکھوں کی رشوت لیتے ہیں اور مالِ حرام سے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ اُن کو نہ عاقبت کا خوف ہے نہ ملک اور قوم کا خیال۔ پڑھے لکھے اسمگلر بھی ہیں، پولیس افسر بھی ہیں اور کسٹم افسر بھی۔ قانونی، مذہبی اور اخلاقی طور پر اُن کی اور ہماری کمائی کے طریقے ایک جیسے ناجائز ہیں مگر وہ چور نہیں کہلاتے۔ چور وہ کہلاتے ہیں جو بڑے چوروں کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ چوری بھی کرتے ہیں تو اس کے گھر میں جہاں حرام کا مال بھرا پڑا ہو اور جہاں چوری سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ کسی کی بیٹی کا جہیز رشوت میں ضبط نہیں کرتے۔ کسی کا گھر نیلام کرا کے ایک خاندان کو بے آسرا نہیں کرتے۔ آپ نے ہمیں حفاظت سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ پکڑے گئے۔ اب آپ سے ایک آخری مؤدّبانہ گزارش ہے کہ شور مچائے بغیر نیچے اُتر جائیں۔ اور یہ کار ہمارے حوالے کر دیں۔"

"کیا؟ تم اب میری گاڑی بھی لے جاؤ گے؟" شمشاد کی آواز اُس کے حلق میں پھنس گئی۔

"ہاں۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "چند گھنٹوں کے لیے۔ ہم یہ مالِ غنیمت کسی ٹیکسی میں تو نہیں لے جا سکتے۔ ٹیکسی ہے بھی کہاں!"

"اگر۔۔۔ میں نہ آتا تمہارے ساتھ۔۔۔ تب تم کیا کرتے؟"

وہ خوفزدہ نظروں سے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

"پھر ہم کسی کی گاڑی چھینتے۔" میں نے کہا۔ "اور اُسے اپنی گاڑی تو مل جاتی مگر رپورٹ درج کرانے کے کئی دن بعد۔ وہ پولیس کے پیچھے پھرتا۔ مجسٹریٹ سے ریلیز آرڈر حاصل کرتا اور اس کے بعد بھی پولیس کی تحویل سے گاڑی چھڑانے کے لیے بیلف کو اور متعلقہ تھانے والوں کو دو چار ہزار مٹھائی کے دیتا۔ آپ کی مہمان نوازی اور شرافت کی وجہ سے ہم آپ کو بالکل تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے گاڑی واپس مل جائے گی آپ کو۔"

"آپ کو کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

"آپ کو واپسی پر رکشا یا ٹیکسی ذرا دیر سے ملے گی۔" میں نے کہا۔ "خاموشی سے گھر جائیے اور گاڑی کے متعلق گھر والوں کو بھی کچھ نہ بتائیے۔ کہہ دیں کہ مہمانوں کو چھوڑنے گیا تھا۔ خراب ہو گئی۔"

"اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو اپنا نقصان کریں گے۔" محسن بولا۔ "پولیس کے چکر میں پڑے تو خوار ہو گے۔ بارہ بجے کے قریب آس پاس کی گلیوں میں دیکھ لیں۔ گاڑی موجود ہو گی اور چابی گلوز کمپارٹمنٹ میں ہو گی۔ اپنی گاڑی چلا کے گھر لے جائیں۔"

"ہاں۔ بارہ بجے تک گاڑی نہ ملے تو بے شک آپ ہمیں جھوٹا سمجھ کے پولیس کو رپورٹ کر دیں۔ ہم یہ آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"چنگی بھلائی ہے جی۔" وہ مُردہ آواز میں بولا۔ "بھلائی والے زمانہ ای نئیں رہے۔"

"ہم پھر معافی چاہتے ہیں۔ اب آپ اُتر جائیں۔ ہو سکتا ہے ابھی یا کچھ دیر میں آپ کو سواری مل جائے۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ ڈراما کرتے رہتے ہو۔" وہ بولا۔ "ڈائیلاگ اچھے یاد ہیں۔"

"بالکل ٹھیک خیال ہے آپ کا۔ جیسا آدمی ہوتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک بار نہیں، چار بار ہمیں زبردستی بھی کرنی پڑی۔ کچھ لوگ اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گولی سے بھی نہیں ڈرتے۔"

وہ فوراً اُتر گیا۔ "تم بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو مجھے۔ یہ نہ ہو تم گاڑی کو ڈاکا ڈالنے کی کسی واردات میں استعمال کرو اور میں خواہ مخواہ پکڑا جاؤں؟" وہ رونی صورت بنا کے بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "شمشاد صاحب! میں نے کہا نا کہ ہم تو بہت چھوٹے چور ہیں۔ آپ ڈاکا ڈالنے کی بات کرتے ہیں۔ میں خدا رسول کی قسم کھاؤں تب اعتبار کریں گے آپ؟ کیا جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا میں! گاڑی جیسی ہم نے لی ہے ویسی ہی آپ کو واپس ملے گی۔" میں نے اس کی جگہ سنبھالی۔ اور انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ چند منٹ میں شمشاد بہت پیچھے رہ گیا۔

"بیچارا۔ خدا کرے وہ پولیس کے پاس جانے کی غلطی نہ کرے۔" محسن نے کہا۔ "ٹھیک کہتا تھا کہ بھلائی کا زمانہ نہیں ہے۔ پھر کبھی کسی کے ساتھ بھول کے بھی بھلائی نہیں کرے گا۔"

"اور ایسے ہی آہستہ آہستہ یہ زوال پذیر معاشرہ اخلاقی ابتری کا شکار ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر مائٹ از رائٹ سوسائٹی غالب آ جائے گی جس میں دلاور جیسے بے اصول، بے ضمیر اور بے ایمان لوگ ایک طرف ہوں گے اور ان کے ظلم کا اور ان کی شیطانی ہوس کا شکار ہونے والے دوسری طرف۔" میں نے کہا۔ "میرے والد وزیر خان، میں، تو اور رابعہ شملا، اس کی ماں اور ان گنت لوگ جو حق و انصاف کی بات کرتے تھے، آج کتنے مظلوم ہیں لیکن ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو مٹ جاتا ہے اور ہم جیسے کمزور لوگ بھی بڑی سے بڑی طاقت کے دعویدار کے لیے چیلنج بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔۔۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے۔"

"تو دلاور کی گزشتہ شب کی کارروائی پر مشتعل ہے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں یار۔ آج اس کی وجہ سے ہمارے یار ٹیڈی کو بھی اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔" میں نے کہا۔

"بڑے شکاری بن کے آئے تھے۔ اب ہاتھ مل رہے ہوں گے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے دلاور سے بات کرنی پڑے گی۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ مجھے یا تجھے قتل کرنے سے اس کو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔"

"ممکن ہے یہی بات وہ تجھ کو سمجھانا چاہتا ہو کہ لڑائی میں دونوں کا نقصان ہو جائے گا۔ وہ پھر کسی سودے کی بات کرے گا۔"

"سودا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ چاہتا ہے کہ میں پیسہ لے کر الگ ہو جاؤں اور اگر مجھے پارٹنر بننا ہے تو میں سلیپنگ پارٹنر رہوں۔ کاروبار میں عملی طور پر دخل نہ دوں۔ یہ بھی پہلے کی بات ہے۔ اب وہ آفر بڑھا سکتا ہے۔ پچاس لاکھ کر سکتا ہے کہ یہ لو اور ملک سے چلے جاؤ جہاں دل چاہے۔ ایک کروڑ کا نقصان بھی برداشت کر لے گا وہ۔ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے۔ کیونکہ جس قسم کا دھندا وہ کر رہا ہے اس میں ایک کروڑ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر اس کا راز فاش ہو گیا تو اس کے کروڑوں جائیں گے۔ وہ ملک کا غدار اور مجرم کہلائے گا اور آج وہ جتنی عزت کے ساتھ زندہ ہے کل اتنی ہی رسوائی کے ساتھ مرے گا۔ وہ اسی خطرے کے خلاف تحفظ چاہتا ہے۔"

"وہ تو سمجھتا ہے کہ ہم اسے منشیات کے دھندے میں ملوث سمجھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ ابھی تو یہی سمجھتا ہے لیکن اسے ڈر تو ہے نا کہ ہم اس کے پیچھے پڑے رہے تو کسی کی غلطی۔ کسی کی غداری۔ بدقسمتی یا محض اتفاق کے باعث ہم اصل کاروبار کا کھوج لگانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"اس پریشانی کی وجہ سے جو ہم نے پیدا کر دی ہے اس کا کاروبار بھی متاثر ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"ہر کاروبار پوری توجہ چاہتا ہے۔ اور یہ تو ایسا کاروبار ہے کہ اس میں اپنوں سے بھی خطرہ رہتا ہے اور غیروں سے بھی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بات پھیل گئی کہ دلاور کے بھی بہت طاقتور دشمن پیدا ہو گئے ہیں تو اس کی ساکھ خراب ہوگی۔ اس پر اعتماد کرنے والے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں گے کیونکہ اُن کو اپنی سلامتی عزیز ہوگی۔ دلاور کے لیے ایک خطرہ وہ بھی بن جائیں گے جن کو آج وہ اپنا ساتھی تصور کرتا ہے۔ وہ ملک اور قوم کے دشمن ہیں اور غدار ہیں۔ خود کو بچانے کے لیے وہ دلاور کو ختم کرنا بہتر سمجھیں گے۔ ایسے کاروبار میں کون کسی کا دوست، کیسے اصول اور کہاں کی وفاداری!" میں نے کہا۔ گاڑی اب ماڈل ٹاؤن سے گزر رہی تھی۔

"یار۔ یہ ٹیڈی کیوں چپ ہے؟" محسن نے کہا اور اس کا کندھا پکڑ کے ہلایا۔ "میاں خوجی! واہ بھئی واہ! کیا مزے سے سو رہے تھے!"

"مزے سے تو اب قبر ہی میں سوئیں گے۔" وہ بولا۔ "ایسے ہی جھپکی آ گئی تھی۔ یہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟"

"محسن کے سسر سے ملنے۔" میں نے کہا۔ "کیا زبردست لطیفہ ہوا ہے۔"

"مسئلہ پھر وہی ہے کہ جائیں تو جائیں کہاں؟" محسن نے کہا۔ "گاڑی بھی وہیں رہ گئی۔ کیا اس وقت ہم رابعہ کے پرانے آفس جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ چابیاں دے گئی تھی اور چابیاں میرے پاس ہیں۔ وہاں رہنا تو مشکل ہے گاڑی کا کیا ہے، رابعہ خود لے جائے گی۔"

"اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہیں۔" محسن بولا۔ "سب سے اوپر والی منزل پر کچھ شاہانہ قسم کے فلیٹ ہیں جن میں وی آئی پی قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ چنانچہ چوکیدار دروازے پر ہی روک لے گا۔"

"ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ چابیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور ہم چور نہیں ہیں۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو ثابت کر چکا ہے کہ ہم چور ہیں۔ سچ کیا ہے؟"

"سچ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ کل یہ سچ تھا کہ زمین چپٹی ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ آج یہ سچ ہے کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"ہمارے پاس آٹھ دس ہزار ہیں۔" محسن بولا۔ "ہمیں رابعہ کے آفس جا کے خواہ مخواہ شکوک پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ آج دن میں کوئی کرائے کا مکان تلاش کر لیں گے بالکل ایسا ہی جیسا ہمارے دوست خوجی کا تھا۔ یار تم برا مت ماننا اُستاد ٹیڈی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اور میاں نیک محمد بھی ذرا مشکل ہے سب سے مناسب میاں خوجی ہے۔"

"آئندہ سے ہم تم کو میاں خوجی کہیں گے۔" میں نے کہا۔

"جو چاہو کہو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے ایک آہ بھر کے کہا۔ "ہم یاروں کی بات کا برا نہیں مانتے۔"

جب ہم ماڈل ٹاؤن سے گزر رہے تھے تو اُفق پر طلوع ہونے والے سورج کا اجالا بادل کے ٹکڑوں میں گہرا نارنجی رنگ بھر رہا تھا۔ پھر یہ رنگ زرد ہوا اور ہلکا پڑ گیا۔ میں نے واپسی کے خیال سے گاڑی کو موڑا تو وہ سڑک آ گئی جس پر پہلے میرا پرانا گھر تھا اور آگے قصرِ جمشید کا پُراسرار کھنڈر تھا جس کے متعلق ہم بہت سی باتیں سن چکے تھے۔ کچھ پرانی بے بنیاد اور کچھ ناقابلِ فہم۔ ایک کہانی وہ تھی جو ہمیں طافو نے سنائی تھی اور جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کھنڈر کے نیچے تہ خانہ ہے اور تہ خانے تک جانے کے لیے ایک سرنگ ہے۔ ہمارے ذاتی تجربات بھی بہت بھیانک تھے اور ہم نے اس کھنڈر کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کھنڈر کی آگ میں جل کر ہم بھی خاکستر ہو جاتے مگر قدرت کو ابھی کچھ اور امتحان منظور تھے کہ ہم بچ گئے اور آگ اسے کھا گئی جس کو قضا اس اجڑے دیار میں لے آئی تھی۔

اپنے پرانے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے گزرے ہوئے وقت کی بہت سی باتیں یاد آئیں اور بلا ارادہ میں رک گیا۔ چشمِ تصور سے میں نے اندر اپنے بچپن کی مانوس فضا کو دیکھا اور مجھے وزیر خان کی یاد آئی۔

نواب خسرو جمشید مرے تو انھیں قصرِ جمشید میں ہی ایک گوشۂ عافیت مل گیا۔ وزیر خان کو کہیں اماں نہ ملی۔ نہ اس کوٹھی میں جس کا وہ مالک کہلاتا تھا، نہ شہرِ خموشاں میں جہاں کوئی کسی کو ابدی نیند سے بیدار نہیں کرتا اور یومِ حشر تک کوئی پیچھے رہ جانے والی دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑتا۔ پھر وزیر خان بار بار جلا وطن کیوں ہوا؟ ایک بار تقسیمِ ہند کے وقت۔ دوسری بار میرے ولایت جانے کے بعد جب اسے اپنے ہی گھر سے نکلنا پڑا۔ اور تیسری بار میرے ہوتے ہوئے اس کی لاش سے اس کا مدفن چھینا گیا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔

"محسن! تجھے یاد ہے طافو نے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔ "قصرِ جمشید کے بارے میں؟"

"اس نے تو بہت کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"اس نے کہا تھا کہ قصرِ جمشید تک پہنچنے کے لیے وہ ایک مین ہول میں اترے تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ مین ہول عام گٹر کے مین ہول کی طرح نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ایک زیرِ زمین سرنگ کا راستہ تھا اور یہ سرنگ سیدھی قصرِ جمشید کے تہ خانے تک پہنچتی تھی۔ تہ خانے سے بھی اوپر جانے کا ایک راستہ تھا۔ مجھے یاد ہے۔ اس نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ ٹرک اسی مین ہول پر آ جاتا تھا۔"

"وہ بھی ایک سرنگ تھی جہاں سے ہم نے طافو اور رحمت کباڑی کو ٹرک میں مال بھر کے روانہ ہوتے دیکھا تھا اور وہ ٹرک نکلا بھی زمین میں سے تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اس ٹرک میں چھپ گئے تھے۔"

"ہاں۔ اوپر کوئی درگاہ بنا رکھی تھی۔" محسن بولا۔ "جب ٹرک آ جاتا تھا تو وہ زمین برابر کر دیتے تھے۔"

"اور ٹرک اسی زیرِ زمین راستے کو طے کرکے ایک گیراج کے احاطے میں نکلتا تھا اور وہاں سے سڑک پر آ جاتا تھا۔" میں نے کہا۔ "گیراج میں ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ مزار بھی ڈھونگ تھا جہاں گامے شاہ کا کام یہ تھا کہ وہ دلاور کے مال کو آگے بھجوا دے۔ دیہات کے سیدھے سادے عقیدت مندوں کے لیے یہ سوچنا بھی گناہِ کبیرہ سے کم نہیں کہ مزار شریف دراصل ناجائز کاروبار کا اڈا ہے۔"

"اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا مقصد کیا ہے؟" محسن نے کہا۔

"میں ایک بہت بڑی بات کہنے کے لیے جواز تلاش کر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ثابت ہو چکا ہے محسن کہ دلاور اور اس کے ناجائز کاروبار میں شریک افراد ایک گروہ کی صورت میں کام کرتے ہیں۔ ابھی یہ چھوڑ دے کہ وہ ناجائز کام کیا ہے، کام کے بارے میں صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں اور اندازے لگا سکتے ہیں لیکن طریقۂ کار ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ لوگ زیرِ زمین راستے استعمال کرتے ہیں۔ ایک سُرنگ میں ہم دونوں نے سفر کیا تھا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دوسری سرنگ کی بات بھی طافو کے دماغ کی اختراع نہیں تھی؟"

"شک مجھے اس وقت بھی نہیں تھا۔" محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ اور تو نے ایک بات کہی تھی کہ کھنڈر کو بلاوجہ آگ نہیں لگائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ عمارت پہلے بھی ویران تھی۔ اسے جلا کے تباہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم کبھی لوٹ کر ادھر نہ جائیں خواہ اس کے نیچے کچھ بھی ہوتا ہے۔"

"کسی کو خیال تک نہ آئے کہ اس جلی ہوئی دیواروں کے ڈھانچے میں بد روحوں کے سوا کسی کا گزر بھی ممکن ہے۔" محسن بولا۔ "اور کوئی شک بھی نہ کر سکے کہ یہاں کوئی ناجائز کاروبار ہو سکتا ہے۔"

"اگر کوئی اس خانہ ویرانی کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو اسے اندر جانے سے پہلے ایک چوکیدار روک دیتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا میری بات کا مطلب؟ چونکہ دلاور اپنی فیکٹری میں کوئی ناجائز کاروبار کر رہا ہے چنانچہ اس نے افشائے راز کے خوف سے میرے والد کو بھی دور رکھا۔ اور وہ مجھے بھی اسی لیے دور رکھنا چاہتا ہے کہ میری طبیعت اپنے والد سے مختلف نہیں۔ میں دلاور کا ہم خیال ہوتا تو وہ مجھے بڑی خوشی سے اپنے کاروبار میں شریک کرتا۔ ساری گڑبڑ اسی وجہ سے ہے کہ جو خطرہ اُسے وزیر خان سے محسوس ہوا تھا وہی مجھ سے بھی محسوس ہوتا ہے۔ دلاور کی فیکٹری سے مال قصرِ جمشید پہنچتا ہے جو اس کا اسٹور سمجھا جا سکتا ہے۔ وہاں سے یہ مال محلے شاہ کو ارسال کیا جا سکتا ہے جسے ہم سول ڈسٹری بیوٹر فرض کر لیتے ہیں۔ قصرِ جمشید سے کسی نے کبھی کوئی ٹرک نکلتے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہاں تو بس ویرانی ہے۔ ٹرک آتے جاتے تو سب کو شک ہوتا کیونکہ ٹرک کسی اور جگہ سے لوڈ ہوتے ہیں اور وہ جگہ قصرِ جمشید سے دور تو ہے مگر قریب بھی ہے۔" میں نے کوٹھی کے اندر دیکھا۔ جو صبح دم ویران اور خالی نظر آتی تھی۔ سڑک پر کھڑے رہنا شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ میں گاڑی کو اندر لے گیا اور گیٹ سے کافی اندر لے جا کر روک دیا۔ انجن کی معمولی سی آواز نے کوٹھی میں سونے والوں کو بیدار نہیں کیا تھا۔

"تجھے معلوم ہے میں یہاں کس لیے آیا ہوں؟" میں نے انجن بند کر کے کہا۔

محسن چونکا۔ "تیرا مطلب۔۔۔ تو کہنا چاہتا ہے۔۔۔؟"

"ہاں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ کیا قصرِ جمشید کے تہہ خانے تک جانے والا راستہ یہاں نہیں ہو سکتا؟ مرحوم وزیر خان کے پرانے گھر میں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ وزیر خان کے کاروبار میں شریک ہونے کے بعد دلاور نے رفتہ رفتہ اس کے جائز کاروبار کی آڑ میں اپنا ناجائز کاروبار پھیلایا ہو۔ اس کی پُشت پناہی نواب خسرو جمشید مرحوم کا بدبخت بیٹا کر رہا تھا جسے نواب صاحب نے عاق کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کا ہمشکل تھا اور انگلینڈ گیا تھا تو لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ فرض کر وہاں آنے کے بعد اسی نے دلاور کے ساتھ مل کر ناجائز کاروبار کا آغاز کیا اور ان دونوں نے مل کر یہ جال پھیلایا۔ انھیں کسی اور نے یہ مشورہ دیا یا خود اُن کے شیطانی ذہن میں یہ خیال آیا کہ کاروبار کے لیے برسوں سے پڑے ہوئے قصرِ جمشید کو استعمال کیا جائے۔ بعد میں اپنی حفاظت کے خیال سے اور اپنے کاروبار کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں سرنگ بنانے کا خیال آیا۔۔۔ اور اس کے لیے انھوں نے اپنے ہی ایک شریک کار سے بات کی یعنی وزیر خان سے۔۔۔ وزیر خان کی کوٹھی ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ اس کا لان کافی وسیع تھا اور اس کا فاصلہ بھی قصرِ جمشید سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی اور کے گھر میں سُرنگ کھودنا ناممکن تھا اور سرنگ کو میلوں دور لے جانا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔ انھوں نے وزیر خان کو سب سے پہلے یہ بتایا ہو گا کہ اس کاروبار میں کتنا زبردست فائدہ ہے مگر وزیر خان دنیا کے مالی فائدے کی خاطر عاقبت کے خسارے کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے انکار سے حالات کی خرابی کا آغاز ہوا۔ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید غلط امیدوں کے آسرے پر غلط آدمی سے غلط بات کرنے کی غلطی کر چکے تھے۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ بزنس میں برابر کا پارٹنر تھا اور اگر وہ مخالفت پر تن جاتا تو دلاور اور خسرو جمشید کا ٹھکانا جیل کے سوا کہاں ہوتا۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے وزیر خان مرحوم کے حالات کی یکلخت خرابی۔ اس کی ذلت و خواری۔ بلیک میل ہونے کے باوجود خاموشی اور اس کی پُراسرار موت کا سبب معلوم کر لیا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ محض قیاس آرائی کی بات نہیں محسن! اس مفروضے کا ایک منطقی استدلال بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "فرض کر آج وزیر خان کی جگہ میں ہوتا اور دلاور مجھ سے یہی بات کرنے آتا تو میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں اسے ذلیل و خوار کر کے نکال دیتا اور اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا۔ وزیر خان اس وقت تک دولت مند بارسوخ اور معزز صنعتکار تھا جس کی گڈ وِل بہت اچھی تھی۔ اس کی رپورٹ دلاور اور خسرو جمشید کا بیڑا غرق کر دیتی۔ اُن کے سارے

خواب اَدھورے رہ جاتے اور کروڑوں کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ایک پرانے وقتوں کے اصولوں پر بس کار بند رہنے والے خبطی بوڑھے کی ایمانداری پر اپنا مستقبل خراب کر لیں۔ انھوں نے وزیر خان کو لالچ کے بعد دھمکی دی ہو گی اور جب تمام حربے ناکام رہے ہوں گے تو انھوں نے طے کر لیا ہو گا کہ اب اس خطرے سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خطرے کو ختم کر دیا جائے۔ وزیر خان کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور وہ کسی بھی وقت اُن کے لیے تباہی و بربادی کا سبب بن سکتا تھا۔ آج میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تو قیاس آرائی کہہ سکتا ہے لیکن دیکھ لینا کسی دن یہ ثابت بھی ہو جائے گا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے وزیر خان کو کاروبار سے الگ کر دیا اور اسے گھر میں نظر بند کر دیا۔ شاید اسے ملنے کی اجازت بھی نہیں ہو گی۔ اس کی ٹیلی فون لائن بھی کاٹ دی گئی ہو گی اور اس کی نگرانی کے لیے دلاور نے ہیڈرشید یا کسی معتمدِ خاص کو مامور کر دیا ہو گا۔"

"انھوں نے وزیر خان کو قتل کیوں نہیں کر دیا؟" محسن نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قتل کے ارادے سے پہنچے ہوں اور وزیر خان نے ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگ لی ہو۔ وہ اپنے لیے نہیں میرے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور خسرو جمشید نے دھمکی دی ہو گی کہ یہاں اُسے اور ولایت میں مجھے قتل کر دیا جائے گا اور وزیر خان نے وعدہ کر لیا ہو گا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گا۔ جیسا وہ چاہیں گے ویسا ہی کرے گا اور ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گا بشرطیکہ سکندر بخت کو بخش دیا جائے۔ اب یا تو اُن کو رحم آ گیا یا میر شرافت علی نے پرانے تعلق کا کچھ لحاظ کیا اور وزیر خان کو بچا لیا۔ میر شرافت علی نے دلاور اور خسرو جمشید کے نئے اور نافع بخش کاروبار میں شرکت قبول کر لی ہو گی چنانچہ اس نے لالچی اور بے ضمیر ہونے کے باوجود اتنا ضرور کیا کہ وزیر خان کی جان بخشی کی سفارش کی۔ اس کے بعد وزیر خان نے اپنے وعدے کے مطابق ان کی ہر بات مانی لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے اس سے کوٹھی اس لیے چھین لی کہ اسے وہ اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے مشہور کیا کہ وزیر خان بیمار ہے اور اُسے چراغ دین کے گھر منتقل کر دیا۔"

"اگر یہ سچ ہے تو کتنا خوفناک سچ ہے سکندر!" محسن نے کہا۔

"وزیر خان اپنی مرضی سے اس نمک حرام چراغ دین کے گھر رہنے کے لیے نہیں پہنچا تھا محسن!" میں نے کہا۔ "دلاور جانتا ہو گا کہ چراغ دین کے خلاف وزیر خان نے مقدمہ قائم کیا تھا اور چراغ دین نے غبن کیا بھی تھا مگر اس نظامِ انصاف کی فنی باریکیوں اور خامیوں کے باعث جرم ثابت نہیں ہوا اور غبن کرنے والا سزا پانے کے بجائے دولت مند بن گیا اور معزز ہو گیا۔ دلاور نے وزیر خان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دیا کہ اس کی حفاظت کرو اور اسے کہیں مت جانے دو۔ کسی سے مت ملنے دو۔ چراغ دین کا گھر وزیر خان کے لیے ایک جیل تھی جہاں چراغ دین جیلر تھا۔ دلاور اور خسرو جمشید نے اسے بدلہ لینے کا موقع بھی فراہم کیا اور شاید اس سے کام لینے کا معاوضہ بھی ادا کیا۔ چراغ دین ایسا شخص تھا جو پیسے کی خاطر ہر کام کر سکتا تھا۔ اس نے وزیر خان کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا اور وزیر خان نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اب وزیر خان اس کی پکڑ میں آیا تو اس نے اپنی تذلیل کا انتقام لیا۔ اس نے وزیر خان کو گھر کے نوکر کی طرح رکھا۔ اسے جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا۔ ممکن ہے اس نے اٹھتے بیٹھتے وزیر خان کو گالیاں بھی دی ہوں۔ اور وزیر خان نے یہ سب میری زندگی کو ان سفاک شیطانوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر برداشت کیا۔ تو نے دیکھا مائٹ از رائٹ سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے۔ غبن چراغ دین نے کیا اور سزا وزیر خان کو ملی۔ وہ انصاف کے لیے فریاد تک نہ کر سکا۔ اُس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ کیا میری زندگی اتنی قیمتی تھی محسن؟"

"نہیں۔۔۔ وہ تیری زندگی نہیں اپنی زندگی بچا رہے تھے۔" محسن بولا۔ "وزیر خان کی جاں بخشی کرنے کے بعد انھوں نے اس کو ہر طرح سے آزمایا۔ اس سے جہاں چاہا دستخط کرائے اور اُسے پیسے پیسے کو محتاج کر دیا۔ اُسے چراغ دین جیسے کمینے اور کینہ پرور شخص کے سپرد کر دیا۔ اور ہر طرح سے اس کا حوصلہ آزمایا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ تیری زندگی بچانے کے لیے لب نہ کھولنے کے وعدے پر کس حد تک قائم رہتا ہے۔ وہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہا۔"

"اس کے باوجود وہ وزیر خان کو جیتے جی قتل کر دینے والے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے انگلستان میں مجھ پر نظر رکھی۔ میری ڈاک سنسر کی اور یہاں وزیر خان کے پرانے نمک خواروں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کی۔ یہاں تک کہ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ چراغ دین کی کوٹھی سے اٹھا اور اس کے دوست احباب، بہی خواہ اور پرانے ساتھی بھی دھوکا کھا گئے۔ وہ سمجھے کہ یہ کوٹھی بھی وزیر خان کی ہو گی۔ انھیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وزیر خان تو وہاں قیدِ بامشقت کاٹ رہا تھا لیکن اس کے دشمنوں کی کوشش کے باوجود کسی نہ کسی طرح یہ راز فاش ہو گیا اور وزیر خان کی موت کے بعد کسی کے ضمیر نے اسے اتنی ملامت کی کہ اس نے فوما پنجو کے ذریعے مجھے اصل صورتِ حالات سے آگاہ کر دیا۔"

"کیا یہ شخص خود فوما پنجو نہیں ہو سکتا؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ بھی وزیر خان کا پرانا ساتھی تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے پہلے لالچ یا خوف کے باعث وہ خاموش رہا ہو۔۔۔ لیکن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آدمی عمر کے آخری حصے میں پہنچتا ہے تو اسے دنیا سے زیادہ عاقبت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ شاید وزیر خان کی موت کے بعد فومانچو کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے جان پر کھیل کر مجھے حقائق سے آگاہ کر دیا۔ اس کی سزا فومانچو کو وہی ملی جو متوقع تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے برطانیہ سے نکلوا کر یہاں لے آیا گیا۔

"میرا بھی دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"یہ سچ ہے محسن۔ سچ کو گواہی کی یا دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔ "سچ کسی ثبوت کے بغیر اپنا وجود تسلیم کرا لیتا ہے۔ کبھی موقع ملا تو چراغ دین کی زبان اس سچ کا اعتراف کرے گی۔ ابھی تو وہ جیل میں اپنی سزا کاٹ رہا ہے مگر یہ اس جرم کی سزا ہے جو اسے بہت پہلے ملنی چاہیے تھی اور نہیں ملی تھی۔ جو کچھ اس نے بعد میں کیا اس کی سزا وہ جیل سے رہائی کے بعد پائے گا۔ ایک نہ ایک دن دلاور کی زبان یہ سچ بولے گی اور اگر مجھے خسرو جمشید ملا تو اس کی زبان بھی اس سچ کی تصدیق کرے گی اور تو دیکھے گا کہ ان تینوں کا سچ ایک ہے۔ سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جس کا احساس مجھے اس وقت ہو رہا ہے۔"

"اس کا یقین مجھے بھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اندر سے کوئی نکل آیا تو کیا کہیں گے؟"

"وہی جو سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کہہ دوں گا کہ یہ میرا گھر تھا۔ کیونکہ یہ میرے باپ کا گھر تھا۔"

"اس سے تجھے یہاں داخل ہونے کا قانونی حق نہیں حاصل ہوتا۔" محسن بولا۔ "نکل وزیر خان تو یہاں آنے سے پہلے کئی گھر بدل چکے تھے، کیا تو سب میں گھس سکتا ہے؟"

"دیکھ محسن! اب میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے تو اس کی تصدیق بھی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ تو دیکھنا ہی ہے کہ کیا واقعی یہاں کے کسی مین ہول سے شروع ہونے والی سرنگ قصر جمشید کے تہ خانے تک جاتی ہے۔"

"کوئی عقل کی بات کر سکندر۔" محسن نے کہا۔ "اس کی اجازت ہمیں کون دے گا؟"

"ظاہر ہے اجازت تو کوئی بھی نہیں دے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بھی اسی وقت کھدائی شروع کرنا نہیں چاہتا۔ پہلے تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب یہاں کون رہتا ہے اور اس نے یہ کوٹھی کس سے خریدی تھی۔"

"یہاں جو بھی ہوگا انہی کا ساتھی ہوگا۔ وہ ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔" محسن بولا۔

"پھر بھی مل لینے میں کیا ہرج ہے؟" میں نے کہا۔ "جو بھی ہوگا بات تو سنے گا ہماری۔"

"کیا کہے گا تو؟ یہ کہ میں سکندر بخت ہوں۔ بچپن میں یہاں رہتا تھا اور کوٹھی میرے باپ وزیر خان کی تھی چنانچہ میں ... کرنے آیا ہوں۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "وہ فوراً دلاور کو مطلع کرے گا کہ سکندر یہاں آیا تھا۔ یا پولیس کو طلب کرے گا کہ اپنے مفرور کو لے جاؤ۔ اگر اندر سے دلاور یا اس کا دستِ راست استاد ... نکل آئے تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔ ہم دشمن کے علاقے میں کھڑے ہیں سکندر اور یہ کس قدر بے وقوفی کی بات ہے کہ ہم نے رات کو جن سے جان بچانے کے لیے کتنی سخت جدوجہد کی اور صبح ہوتے ہی خود ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔"

"ہم اتنے بے دست و پا بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ لیکن میری مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور محسن کی عقل کے دلائل میرے جذبات پر غالب آتے جا رہے تھے۔

"تو پھر دیر کیسی؟" محسن نے برہمی سے کہا۔ "چل اندر۔ ریوالور لے کر چلتے ہیں جو سامنے آئے گا اسے گولی مار دیں گے۔ خونریزی کرنی تھی تو وہیں شوق پورا کر لینا تھا جہاں چار آدمی تھے۔ وہاں سے تو سامان اٹھا کر بھاگ آئے یہاں بلاوجہ مرنے کی ضد ہے۔"

"کیا ہوا۔ کیا ہوا؟" ٹیڈی نے اچانک کہا۔ "کیوں لڑ رہے ہو آپس میں؟"

"تم پھر سو گئے تھے میاں خوجی۔" میں نے کہا۔ "چلو اچھا ہے کہ تم نے کچھ سنا نہیں۔"

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"میرے باپ کی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "... ہے پہلے میرے سسر کے گھر چلو۔ اچھا بھائی! پہلے وہیں چلتے ہیں لیکن اب ڈرائیونگ تو کر۔ میں تھک گیا ہوں۔"

اس وقت تک سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ ہم نے شمشاد کے گھر میں چائے نہ پی ہوتی اور پاپے نہ کھائے ہوتے تو اب تک بھوک سے ہمارا برا حال ہوتا اور ہمیں بہت پہلے وقت کا احساس ہو جاتا۔ چابیاں اگنیشن سوئچ میں لگی چھوڑ کے نیچے اترا اور گھوم کر دوسری طرف گیا کہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں۔ میرے ساتھ ... پیچھے والا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے نکلا ... وقت کوٹھی کا سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک کارٹون نمودار ہوا۔ ... ستر سال کا بوڑھا شخص تھا جس کا جسم ہڈیوں کا چلتا پھرتا ڈھانچہ تھا جس پر گوشت نام کو نہ تھا۔ سیاہ کھال ہڈیوں پر منڈھی نظر آتی تھی۔ اس نے بہت پرانا گول شیشوں والا نظر کا چشمہ لگا رکھا ... کارٹون بنانے میں اس کے سوٹ کا اور ہیٹ کا بڑا دخل تھا۔ ... کا اصل رنگ شاید براؤن تھا مگر کثرتِ استعمال سے ایک ... نہیں رہا تھا۔ یہ رنگ کہیں گہرا تھا کہیں ہلکا۔ تراش خراش کے ... سے بھی سوٹ کم سے کم دس سال پرانا تھا۔ اس کی پتلون کے ... نکل آئے تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے اور کالر کے دھاگے ... تھے۔ قمیص کی حالت بھی ابتر تھی اور گلے میں بندھی ہوئی ... بالکل لٹکنے والے ازار بند کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کا فیلٹ ہیٹ بھی غالباً کسی انگریز کا چھوڑا ہوا تھا جب وہ ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو بہت سی ناکارہ چیزیں پھینک گئے تھے اور بہت سی برائیاں ورثے میں دے گئے تھے مثلاً نسلی تعصب، تنگ نظری، حاکمانہ ذہنیت اور اپنی شہرۂ آفاق "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی ۔۔۔ یہ ... صاحب بھی اسی دور کی نشانی تھا۔ اور مجھے خیال آیا کہ جب وہ باہر نکلتا ہوگا تو اس حلیے میں مذاق اڑانے والے اسے پاسنگ شو کہتے ہوں گے۔ ایک بڑے پرانے مقبول سگریٹ پر بنی ہوئی تصویر کچھ ایسی ہی تھی کہ وہ سگریٹ کا برانڈ تو ختم ہو گیا مگر اس پر بنے ہوئے صاحب بہادر کی تصویر کا نام رہ گیا۔ ایسے نمونے ہر جگہ پاسنگ شو کہلاتے تھے اور کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتے تھے۔

وہ بالکل سیدھا چلتا تھا مگر اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ... شان، تمکنت اور حاکمیت کی نشانی۔ اس نے چھڑی سے کار ... بجایا۔ "کون ہے تم؟ کیا کرتا اِدھر؟" اس نے متانت سے کہا۔ "تم کو ... نہیں کہ تم ٹریس پاس کرتا؟"

"سوری سر!" میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔ میں کسی طرح اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ ... یادگارِ زمانہ لوگ اپنے ماضی کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ میں نے وزیر خان کے دوستوں کو ترکی ٹوپی، اچکن اور سلیم شاہی جوتی میں بھی بڑے کر و فر ... ساتھ پیدل آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ مشرقی وضعداری کا نمونہ بھی کارٹون ... جاتے تھے۔

"سوری کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" اس نے پھر گاڑی کو بجایا۔ "ابھی ... نکل جاؤ۔ ورنہ ہم تم کو بہت سخت سزا دے گا۔ ہم تم پر کیس کرے ... ہم کو نہیں جانتا۔ ہم انگریز کا ٹائم میں بھی مجسٹریٹ تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج ریٹائر ہوا۔"

"آپ۔۔۔ آپ اس کوٹھی کے مالک ہیں سر؟" میں نے پُر تعظیم ... ہوئے انگریزی میں سوال کیا۔

"یس۔۔۔ اور ہم کیا سمجھتا تم کو ہنگ مین!" وہ بولا۔ "ہمارا پراپرٹی ... گیٹ آؤٹ۔"

"دراصل ہم آپ ہی سے ملنے آئے تھے سر!" میں نے مسرت سے ... طرف دیکھا اور پُر امید لہجے میں بولا۔ "یو سی۔ پہلے یہ میرا گھر تھا۔ میں یہاں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد نے خریدا تھا۔"

"کیا؟۔۔۔ یہ تمہارے والد کا گھر تھا؟" اس نے گوراشاہی اردو چھوڑ کر رواں انگریزی میں کہا۔

"یس سر! آج بہت عرصے کے بعد اِدھر سے گزرا تو میں نے سوچا کہ دیکھوں اب یہاں کون رہتا ہے۔ اور اگر وہ اجازت دے۔۔۔ تو میں اندر بھی جاؤں۔" میں نے کہا۔ میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔

"کیا نام تھا تمہارے والد کا؟" اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھور کر کہا۔

"وزیر خان۔" میں نے کہا۔ "آپ اس مکان میں کب سے ہیں سر؟"

"تیس سال ہو گئے مجھے۔" وہ ایک دم افسردہ ہو گیا۔ "میں نے یہ مکان اپنی بیوی کی پسند پر خریدا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا تھا یہ اولڈ اسٹائل بنگلو۔ مگر وہ مر گئی۔ اب میں اکیلا یہاں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں اسے بیچ رہا ہوں۔ بلکہ بیچ چکا ہوں۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو۔ مکان کسی وزیر خان کا ہی تھا لیکن میں نے اس کے اٹارنی سے خریدا تھا۔ اندر آؤ۔ میں اتنا بد اخلاق نہیں ہوں۔ میں غلط سمجھا تھا۔"

"غلطی ہماری تھی کہ ہم نے اجازت نہیں لی تھی اندر آنے کی۔ اور اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔" میں نے کہا۔ "میرا نام کبیر خان ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی ہے امیر خان۔ یہ ہمارا دوست ہے خواجہ۔ ہم اسے خوجی کہتے ہیں۔"

"ویل۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔" اس نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ ایک دم وہ برطانوی ادب آداب اور شائستگی کا مرقع بن گیا تھا۔ "میں کے سی پال ہوں، کرم چند پال۔ پلیز اندر آؤ۔ میں ایک اکیلا بوڑھا آدمی ہوں، تنہا ریٹائرڈ لائف گزارنے والا۔ جس کے سب دوست مر چکے ہیں یا جا چکے ہیں۔"

میں اور محسن اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے یوں اس گھر میں داخل ہوئے جیسے ہم نیند میں چل رہے ہوں۔ چند منٹ پہلے کے خواب کی تعبیر مل رہی تھی ۔۔۔ میں اپنے گزرے ہوئے وقت سے ملنے جا رہا تھا۔ اسی گھر میں جہاں کوئی میرا دشمن نہیں تھا۔ اگر وہ بوڑھا چند منٹ بعد آتا یا میں نے بحث کیے بغیر محسن کی بات مان لی ہوتی تو ہماری ملاقات نہ ہوتی اور میں اپنے ماضی کے بند دروازے پر دستک دیے بغیر لوٹ جاتا تو شاید کبھی پلٹ کر نہ آتا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ وہ کون سی غیر مرئی قوت تھی جس نے مجھے پھر میرے گھر میں پہنچا دیا؟ گزشتہ رات ٹیڈی کے گھر میں زمین پر بیٹھ کر سگریٹ یا چائے پیتے ہوئے میرے ذہن میں اس کا خیال تک نہ تھا۔ مگر پھر تقدیر کے ہاتھوں نے ایک چال چلی۔ ہم اس گھر سے نکلے شمشاد کے گھر پہنچے اور اس کی گاڑی میں یہاں آ گئے۔ آخر یہ سب انتظام کس نے کیا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ کل رات میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہاں آنے کے لیے کوئی منصوبہ بناتا؟ کامیابی کا کیا سوال، میں اس کے امکانات پر بھی غور نہ کرتا۔ خود میں اسے ناممکن سمجھتا جو صبح تک ممکن ہو گیا تھا۔

"کم اِن۔ رک کیوں گئے؟" پال نے شفقت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم جذباتی ہو رہے ہو۔"

"یو آر رائٹ سر!" میں نے کہا۔ "مجھے وہ وقت نظر آ رہا ہے جو ابھی تک اس گھر کی دیواروں میں موجود ہے۔ یہ احساس کی بات ہے۔ باقی دنیا کے لیے وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔"

"ہاں۔ کبھی کبھی وقت رک بھی جاتا ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے لیا محسوس ہوتا ہے کہ مریم میرے ساتھ ہے اور بالکل اسی طرح جیسے تین سال پہلے تھی۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ احساس میں زندہ رہتا ہے۔ خیر، اندر آؤ۔"

میں اور محسن ایک ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئے جو کبھی ہمارا ڈرائنگ روم تھا اور دم بخود کھڑے رہے۔ گھر کی پرانی دیواریں اپنے پرانے احساسِ شناسائی کے ساتھ موجود تھیں مگر ان کا رنگ بدل گیا تھا۔ کمرے کا فرنیچر بھی مختلف تھا اور اس کی ترتیب و آرائش کا انداز بھی جدا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بھی دوسرے تھے۔ چنانچہ ماحول اجنبی تھا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے گزر جانے والے وقت کی ایک ایک بات یاد آ گئی۔ چشم تصور سے میں نے گھر کا پرانا نقشہ دیکھا۔ کون سی چیز کہاں تھی اور کیسی تھی۔ میرے اپنے کمرے میں بیڈ کہاں تھا۔ کس جگہ پڑھنے کی میز تھی۔ کپڑوں کی الماری کس طرف تھی۔ اپنے والد کے کمرے میں پہنچ کر فرطِ جذبات سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے انہیں ہر انداز میں دیکھا۔ نماز پڑھتے ہوئے، اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ لان میں ٹہلتے ہوئے، کھانے کی میز پر۔

"یہ تمہارے والد کا کمرہ تھا؟" بوڑھے نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے میرے کندھے پر رکھا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم یہاں رونے نہیں آئے تھے۔" وہ بولا۔

میں نے آنکھوں کو رومال سے صاف کیا اور باہر نکل آیا۔ "آئی ایم سوری۔" میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

گھر میں سامان کی کمی نہیں تھی اور سامان زیادہ پرانا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود گھر میں خانہ ویرانی کا راج تھا۔ ہر چیز لاوارث لگتی تھی، توجہ کی طالب تھی اور اپنی کس مپرسی پر نوحہ خواں تھی۔ مجھے فرش پر ہی نہیں فرنیچر پر بھی گرد کی تہ نظر آئی۔ میز کی شفاف سطح پر گرد تھی۔ چوکھٹ اور دہلیز پر گرد تھی۔ چھت سے آویزاں فانوس پر، پنکھوں پہ گرد تھی اور ان کتابوں پر گرد تھی جو ہر جگہ ڈھیر تھیں۔ زندگی کی دلچسپیوں سے، مصروفیات اور ہنگامہ آرائیوں سے لگ کر اپنے کمرے میں بند ہو جانے والے اس ریٹائرڈ جج کی دنیا اب ... تھیں۔ مجھے بہت عجیب لگا کہ تین بیڈ روم کی اس کوٹھی میں وہ ... کیسے رہتا ہے۔

"آپ کے ساتھ اب کوئی نہیں ہے یہاں؟" میں نے واپس ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد کہا۔

"میرے ساتھ؟" وہ سوچ کے بولا۔ "عمر گزشتہ کی یادیں ہیں۔ نصف صدی میں یادوں کا اتنا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے کہ آدمی اکیلا رہنا چاہے تب بھی نہیں رہ سکتا۔"

"میرا مطلب تھا آپ کے بچے....."

"بچے تھے۔ ایک دو نہیں چھ۔" وہ دیوار پر نظر جما کے بولا۔ "تین اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تین دنیا کو۔ دو لڑکیاں ہمارے ساتھ آئی تھیں، ان کی شادیاں ہو گئیں۔ وہ ہر اتوار کو اپنے شوہر بچوں کے ساتھ آتی ہیں۔ بڑی لڑکی کا ایک بچہ ہے۔ بہت شریر۔ چھوٹی لڑکی کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔ وہ لنچ تک ٹھہرتے ہیں اور ہفتے میں چند گھنٹوں کے لیے میں زندہ ہو جاتا ہوں۔ ہفتے کے باقی دن میں کتابیں پڑھتے اور اتوار کا انتظار کرتے گزار دیتا ہوں جب چرچ سے وہ لوگ پھر آئیں گے۔"

"اور..... آپ کا لڑکا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ایک اداس اور تنہا زندگی گزارنے والے نیک دل بوڑھے کی باتوں نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی بالکل چپ بیٹھے تھے اور شاید میری طرح ان پر بھی اس گھر کی فضا کا اثر تھا۔

"مجھے یہ تو نہیں کہنا چاہیے کہ وہ مر گیا۔" وہ بولا۔ "لیکن ہماری زبان میں یہی کہتے ہیں۔ میں اس کو نیک آدمی بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ تھا بھی بہت نیک۔ میں نے اسے مشن چرچ کے سپرد کر دیا۔ جہاں وہ تین سال رہا لیکن نہ جانے کیوں وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا۔ فادر نے کہا کہ اسے شیطان نے بہکا دیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شیطان کو الزام دینا زیادتی ہے۔ اسے اتنی فرصت کہاں کہ ہر شخص کو بھٹکاتا پھرے۔ شیطان تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کمزور ہو تو وہ غالب آ جاتا ہے اور پھر آج کل نیک بننا بہت مشکل ہے۔ کیا تم کو یہ ایک خبطی اور سنکی بوڑھے کا نقطۂ نظر لگتا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا۔ "... ایسے ہیں کہ نیکی کے راستے پر چلنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ... بڑی آزمائش بن گیا ہے کہ شاید صوفیا اور اولیا ہی اس سے گزر سکتے ہیں۔"

"خدا تم پر اپنا کرم کرے۔ تم سمجھ دار آدمی ہو۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "غلطی میری تھی کہ میں نے اسے اتنی بڑی آزمائش میں ڈالا۔ وہ خدا کا

انسان ہی تو تھا۔ کوئی سینٹ نہیں تھا۔ اسے دنیا نے کھینچ لیا اور وہ نفسانی خواہشات کی ترغیب کا شکار ہو گیا جس سے کوئی محفوظ نہیں۔ اس نے کہا میں بہت سا پیسہ کمانا چاہتا ہوں تاکہ مجھے عزت اور طاقت حاصل ہو۔ میں نے کہا بے وقوف! کیا عزت اور طاقت کا سرچشمہ دولت ہے؟ خداوند یسوع مسیح کی قربانی کو دیکھ۔ یہ بتا ارسطو کے پاس کتنی دولت تھی؟ مگر وہ ہنسنے لگا کہ یہ بیسویں صدی ہے بابا اور اس میں سچائی کی اور علم کی طاقت سے کچھ نہیں ملتا۔ عزت تک نہیں ملتی۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے وقت کا خیال کیے بغیر مثال دی تھی۔ خیر وہ باہر چلا گیا۔ اور اب بہت سی دولت اکٹھی کرنے میں مصروف ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے باقاعدگی سے ایک کاغذ کا پرزہ بھیجتا رہتا ہے۔ جو میں اس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہوں۔ میرے گزارے کے لیے میری پنشن ہی کافی ہے۔"

"پنشن تو پرانی شرح پر بہت کم ہو گی۔" میں نے کہا۔ "آپ کو کیسے کافی ہوتی ہے؟"

"یہ تو ضروریات پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ ہیں یا کم۔ پیسہ کبھی خواہشات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔" وہ بولا۔

"پھر بھی مہنگائی تو بڑھتی جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف مہنگائی؟ بہت کچھ بڑھتا جا رہا ہے مائی سن!" وہ تاسف سے سر ہلا کے بولا۔ "زمین پر فتنہ و فساد۔ انسان کی فطرت میں لالچ اور کمینگی۔ مذہب اور اخلاق سے دوری۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میری عمر کا ہر آدمی اسی طرح سوچنے لگتا ہے اور دنیا کہتی ہے سٹھیا گیا ہے۔ تم بتاؤ کیا تم نے شادی کر لی ہے؟"

"نو سر! ابھی دنیا کے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم غلطی کر رہے ہو نوجوان! دنیا کے جھمیلوں میں جتنا الجھو گے الجھتے جاؤ گے۔ تم فرصت کو تلاش کرتے رہ جاؤ گے۔ فرصت اگر دنیا کے جھمیلوں کے لیے ہے تو شادی کے لیے کیوں نہیں ہے؟ مگر ایسا لگتا ہے کہ تم شادی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ تمہارا یہ بھائی بھی ایسے ہی سوچتا ہے؟" وہ بولا۔

"ہم دونوں ایک جیسے بے وقوف ہیں۔ دونوں ہی غلط وقت پر غلط کام کرتے ہیں چنانچہ نقصان اٹھاتے ہیں لیکن پھر وہی کرتے ہیں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے ہیں جو نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے بات کو گول مول کیا۔ "شادی کی اہمیت ہم دونوں کے لیے دنیا کے سارے جھمیلوں سے زیادہ ہے لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر کمبل آدمی کو نہیں چھوڑتا۔"

"پھر تو تمہارے والد بھی اکیلے رہتے ہوں گے؟" وہ بولا۔ "جب تم دونوں ان کے ساتھ نہیں ہوتے۔"

"ہاں۔ اکیلے ہی ہیں۔ اپنی قبر میں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ یہ کوٹھی بیچ کر کہاں جائیں گے؟"

"دیکھو نا، بالآخر تو مجھے بھی وہیں جانا ہے جہاں تمہارا باپ گیا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری روانگی کہاں سے ہوتی ہے۔ ویسے میری چھوٹی لڑکی کہتی ہے کہ میرے ساتھ رہو اور اس کا شوہر بھی بضد ہے۔ میرا خیال ہے میں انہی کے پاس چلا جاؤں گا۔ جو رقم اس کوٹھی کو بیچ کر ملے گی، وہ میں دونوں میں بانٹ دوں گا۔ جب سسر بوڑھا اور مرنے والا ہو اور اس کے پاس دولت بھی ہو تو داماد اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔" وہ بڑے مضحکہ خیز طریقے پر ہنسا۔

"کتنے میں سودا کیا ہے آپ نے اس کوٹھی کا؟" میں نے کہا۔

"ساڑھے پانچ لاکھ میں۔" وہ بولا۔ "میں سامان بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ مگر بعد میں یہ طے ہوا کہ جو سامان میرے داماد پسند کریں گے وہ ان کا ہو گا۔ بہت کم چیزیں ہیں ان کی پسند کی۔"

"اور خریدار کون ہے؟ معاف کیجیے گا یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں۔ لیکن یہ میرا بھی گھر تھا اور میرا اس سے بہت گہرا جذباتی تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ میں پھر کبھی آنا چاہوں تو مجھے آپ کی طرح خوش آمدید کہا جائے؟"

"میرا خیال ہے وہ اچھا آدمی ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کسی کا اٹارنی ہے اور اس نے مجھے بتایا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر اصل خریدار سامنے نہیں آ سکتا اور اس کا فوری طور پر اس کوٹھی میں رہائش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں ہے چنانچہ اس کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ جب تک چاہوں یہاں رہائش جاری رکھوں۔"

"ایسا کون بے وقوف ہے؟" میرے منہ سے نکل گیا۔ "میرا مطلب ہے اس کو اتنی جلدی کیا تھی..... یہ مکان خریدنے کی جب اسے رہنا نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میں نے پوچھا نہیں۔ ہر شخص اپنی ضرورت اور مصلحت کو بہتر سمجھتا ہے۔ ضروری تو نہیں وہ بے وقوف ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مکان اس کو اتنا پسند آ گیا ہو کہ وہ مجبور ہو گیا ہو۔ جیسے میں مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے خریدار تو بہت تھے چنانچہ دیر کی صورت میں مکان کوئی اور خرید لیتا۔ کچھ لوگ بازار سے جو چیز خریدتے ہیں وہ اپنی قوتِ خرید کے مطابق لیتے ہیں۔ کچھ ذاتی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پسند کی قیمت ادا کرتے ہیں شوق کی بات کہہ لو یا حسنِ نظر کی۔ ایک مکان بھی اتنا ہی خوبصورت ہو سکتا ہے کسی کے لیے۔ مثلاً جتنا تمہارے لیے یہ مکان ۔۔۔ کہ اگر تم کو اسے دگنی یا تین گنا قیمت پر بھی حاصل کرنا پڑے تو تم سمجھو گے پیسہ ضائع نہیں ہوا۔۔۔ لاکھوں کی پینٹنگ آخر کیوں خریدتے ہیں لوگ! مصوری کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے اور اس کی ایک جمالیاتی قیمت ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔۔۔ اصل بات جذبات کی ہے۔" میں بولا۔ "ایک عمارت بھی جذبات کو اسی طرح اپیل کر سکتی ہے جیسے ایک خوبصورت تصویر یا مجسمہ یا کمپوزیشن کرتے ہیں۔۔۔ آپ کو معلوم تو ہو گا کہ اتنا بڑا قدردان کون پیدا ہو گیا اس پرانی کوٹھی کا؟" میں نے کہا۔ "کس کا اٹارنی ہے وہ؟"

"دراصل میں نے بھی یہ معاملات ایک وکیل کے سپرد کر دیے ہیں۔" وہ بولا۔ "میرا اٹارنی اور اس کا اٹارنی تمام قانونی کارروائی مکمل کر لیں گے۔ وہی تم کو تمام تفصیلات فراہم کر سکتا ہے مگر تم کیا کرو گے جان کر؟"

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی ایک فضول سی خواہش تھی کہ شاید میں اس مکان کو پھر خرید سکوں۔۔۔ اور جیسا کہ آپ نے کہا۔ اگر دگنی قیمت پر بھی ملے تو کسی نئے یا بڑے مکان کی نسبت مجھے یہی مکان عزیز تر ہو گا۔" میں نے کہا۔

"آئی سی۔ آئی سی۔" وہ مسکرایا۔ "دگنی قیمت پر تو اب بھی بیچ دے گا وہ تم کو۔۔۔ اس کے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں۔ تمہارے لیے اس کی جذباتی قیمت ہے۔۔۔ اس کے لیے نہیں۔ اگر تم قیمت ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہو تو خریدار کے اٹارنی سے بات کر لو۔۔۔ ایڈووکیٹ اے ڈبلیو منظر سے۔"

"کس سے؟" میں نے یوں کہا جیسے دھوکا میرے کانوں کو ہوا ہے مگر بالکل خاموش بیٹھے ہوئے محسن اور استاد ٹیڈی بھی بری طرح چونکے تھے۔ میں نے ایک نظر محسن کو دیکھا جو میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائے بیٹھا تھا۔

"اے ڈبلیو منظر۔" بڈھا ہمارے چونکنے پر بہت حیران تھا۔ "مشکل سا نام ہے اس کا عبدالودود منظر۔۔۔"

"یہ مکان عبدالودود منظر خرید رہا ہے؟" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کس کے لیے؟" محسن نے بھی جادو کے اثر سے مفلوج ہو جانے والے شخص کی طرح کہا۔ "اتنا تو معلوم ہو گا آپ کو کہ وہ عورت ہے یا مرد؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے! عورت بھی خریدتی ہے پراپرٹی۔" وہ بولا۔ "تم لوگ اس قدر حیران کیوں ہو آخر؟"

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی نے اس کی بات نہیں کی اور اسی طرح دم بخود بیٹھے رہے۔۔۔ ہم سب کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع خبر تھی جس کے ردِعمل نے ہمیں رابعہ کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ وہ منظر کے ذریعے اس کوٹھی کو خرید رہی تھی۔ منظر نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی اس کوٹھی کو بیچنا چاہتی ہے جو اس نے نقلی نواب خسرو جمشید سے خریدی تھی۔ اسی کی قیمت سے رابعہ نے یہ گھر خریدنے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اور اس فیصلے کے پس منظر میں کیا جذباتی عوامل کارفرما تھے، یہ میں بھی اتنی ہی اچھی طرح سمجھتا تھا جتنی اچھی طرح محسن۔ وہ اس مکان کو میرے لیے خرید رہی تھی۔ بالکل سب سے الگ جذباتی عورت۔۔۔ اپنا گھر میری خاطر تباہ کر لیا اور مجھے میرا گھر لوٹانا چاہتی ہے۔۔۔ ایک قرض تو رابعہ کے اس گھر کا تھا جو میری وجہ سے اور صرف میری وجہ سے جل کے راکھ ہوا اور ملبے کا ڈھیر بن گیا۔۔۔ اسے بھی تو وہ گھر عزیز ہو گا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں بچپن سے جوانی تک اس کی تمام زندگی گزری تھی۔ جہاں سے پہلے باپ کا اور پھر اس کی ماں کا جنازہ بھی اٹھا تھا۔ کیا اس کو اپنی عمرِ گزشتہ کی وہ کتاب عزیز نہ تھی؟ جس کے ہر ورق پر یاد کا کوئی نقش تھا؟ اسے کوئی آرزو نہ تھی کہ اپنے نشیمن کی خاک پر نیا آشیاں بنائے؟ یکلخت وہ اپنی محبت کی تمام خوبصورتی کے ساتھ میرے تصور میں جلوہ گر ہوئی۔ "یہ تم کیا سوچ رہے ہو سکندر؟ جب میں نے خود کو تمہارے سپرد کر دیا تو میرا کیا رہا۔۔۔ میری جذباتی وابستگی تو اب اس گھر سے ہو گی جو میرا اور تمہارا گھر ہو گا اور جہاں خوشیوں کے سارے خزانے ہمارے ہوں گے۔ میں نے جب زندگی کے راستوں پر تمہاری رفاقت قبول کی تھی تو اپنے ماضی کے سارے رشتے توڑ لیے تھے۔ میرا سرمایۂ حیات میرا مستقبل ہے جو تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ اس وقت میں یہ کر سکتی تھی کہ تم کو ایک چھوٹی سی خوشی کا نذرانہ دے دوں۔ میرے اختیار میں ابھی یہی تھا۔ جب وقت ہمارے ساتھ ہو گا تو میں اپنی ہر خوشی تمہاری نذر کر دوں گی اور وہ وقت ضرور آئے گا۔ اعتماد کی یہ دولت تم نے مجھے بخشی ہے۔ محبت کے اس انمول خزانے کے بدلے جو تم نے بن مانگے میری جھولی میں ڈال دیا۔ میرا یہ حقیر نذرانہ کیا ہے۔ پھر تم خفا کیوں ہو؟ کیا مجھے تمہارے لیے اتنا کرنے کا بھی اختیار نہیں؟"

پھر وہ یکلخت غائب ہو گئی اور میں نے خود کو محسن کے

روبرو پایا۔ جس کی نظر میں میرے لیے ملامت تھی۔ میرے اس سلوک پر جو میں نے رابعہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔ میں نے اس کے دل کو اپنے طنز کے تیروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ آج وہ اپنے نفع نقصان کے متعلق سوچنے لگی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ آج اسے اپنے گھر کے تباہ ہونے کا دکھ ہے اور میں نے اس سے کہا تھا کہ آج اس کے رویے ہیں میرے لیے بے رخی اور بے التفاتی ہے اور یہ سب میں نے ایسے وقت میں کہا تھا جب وہ میرے لیے خوشیوں کا ایک بہت بڑا سودا کر رہی تھی۔۔۔ چنانچہ وہ رو رہی تھی۔ لیکن اس نے پھر بھی محسن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ بہت سی باتیں میری سمجھ میں آنے لگیں۔ منظر نے مجھ سے کہا تھا کہ رابعہ فی الحال میرے پاس رہے گی۔ کیونکہ اسے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس نے رابعہ کی لیگل فرم کا انتظام سنبھالنے کا ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ رابعہ کو وہ کوٹھی بیچنی ہے جو خالی پڑی ہے۔ اس نے یہ بھی دلیل دی تھی کہ رابعہ کو سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ عورت ذات ہے اور ہماری پُرخطر، مہم جو اور ہنگامہ خیز زندگی میں وہ ہر قدم پر ہمارے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے اور مجھے چاہیے کہ میں خود غرضی سے کام نہ لوں۔ اسے کچھ دن کے لیے بخش دوں۔ منظر نے سب بکواس کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کیا کرنا چاہتی ہے اور رابعہ نے اسے منع کر دیا تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ ورنہ میں اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہو جاؤں گا اور اسے وہ سب نہیں کرنے دوں گا جو وہ کرنا چاہتی ہے۔۔۔ آرام کا محض بہانہ تھا۔ اگر میں ساتھ رہتا تو وہ یہ سودا کیسے کرتی۔۔۔ یہی وہ ضروری کام تھے جو اسے مجھ سے چھپ کر کرنے تھے۔

"تم سب کو کیا ہو گیا ہے! میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" بڈھے کی آواز مجھے پھر حقائق کی دنیا میں کھینچ لائی۔ "تم نے ہی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تم دگنی قیمت بھی دے سکتے ہو اس مکان کی۔"

"یس سر۔۔۔ میں نے یہ کہا تھا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی آدھی قیمت بھی نہیں ادا کر سکتا۔ یہ محض ایک خواہش تھی اور خواہشات کا کیا ہے، وہ بے لگام اور منہ زور گھوڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔۔۔ کیا آپ نے اس مکان کا اشتہار دیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ اشتہار دیا تو نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "دینے کا ارادہ تھا۔ کچھ بروکر تھے جو کبھی کبھی کوئی پارٹی لے آتے تھے۔ جب وہ وکیل۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"عبدالودود منظر۔" میں نے کہا۔ یہ بالکل غیر ارادی حرکت تھی کہ میری زبان پر منظر کا نام آ گیا تھا۔

"یس۔۔۔ کیا تم جانتے ہو اسے؟" بڈھے نے کہا۔ "جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے سمجھا اسے بھی کسی بروکر نے ہی بھیجا ہو گا۔ اس نے پوچھا، آپ یہ مکان بیچنا پسند کریں گے؟ میں نے کہا، کوئی خریدار ملے گا تو ضرور بیچ دوں گا۔ ابھی تک تو جو آتے ہیں وہ دیکھ کر گئے تو لوٹ کر نہیں آئے کیونکہ پرانی طرز کی کوٹھی ہے۔ جن کے پاس پیسہ ہو وہ گلبرگ کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔ اس وکیل نے کہا کہ میں اپنے مؤکل کی طرف سے مکان خریدنا چاہتا ہوں تو مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہو گی؟ اور میں نے اسے قیمت بتائی تو اس نے او کے کر دی۔ اس سے پہلے جو لوگ آتے تھے انہوں نے بارگین کرنے کی کوشش کی تھی اور بروکرز نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بارگین کا مارجن رکھوں کیونکہ خریدار منہ مانگی قیمت دینی پسند نہیں کرتے۔ وہ کم ضرور کراتے ہیں۔ میں نے اس وکیل کو قیمت زیادہ بتائی تھی۔ تقریباً پچاس ہزار روپے کم کر سکتا تھا میں۔ لیکن اس نے بالکل اصرار نہیں کیا تو میں کیوں بولتا۔۔۔ ظاہر ہے وہ اپنی خوشی سے دے رہا تھا۔ کسی دباؤ کے تحت زیادہ قیمت نہیں دے رہا تھا۔"

"آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی دباؤ کے تحت یہ سودا نہیں کر رہا تھا؟" میں نے کہا۔ "آپ نے خود ہی ابھی کہا تھا کہ دباؤ جذباتی بھی ہو سکتا ہے۔ کسی من پسند چیز کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا جنون۔۔۔"

"ہاں۔ مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟" وہ بولا۔

"غالباً آپ تو کہیں جا رہے تھے، ہماری وجہ سے رک گئے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو۔۔۔ میں کہیں بھی نہیں جاتا۔ میں ایک بڈھا فالتو آدمی ہوں۔ دنیا بہت مصروف ہے۔" وہ بولا۔ "آج تم لوگ آ گئے تو کچھ باتیں کر لیں۔ افسوس یہ ہے کہ میں تم کو کچھ پیش نہیں کر سکتا۔ چائے کافی سب ہے۔ لیکن۔۔۔ ایک نوجوان ہے یہاں۔ وہ صبح کام پر چلا جاتا ہے اور پھر شام کو آتا ہے۔ یہاں سرونٹ کوارٹر میں اسے جگہ دے رکھی ہے، وہ میرے لیے ناشتا بناتا ہے اور دوپہر کا کھانا پکا کر رکھ جاتا ہے۔ رات کو میں کچھ نہیں کھاتا۔ میں اس کو نوکر نہیں سمجھتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس ہم آپ سے مل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیے اور آپ نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی یہی خلاق' چائے اور کافی سے بہتر ہے۔ ہم تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ وزیر خان کا اٹارنی کون تھا؟"

"ہاں۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے یہ، کسی نے اس کو قتل کر دیا۔" وہ بولا۔ "میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ اس کا نام تھا میر شرافت علی۔ وزیر خان تمھارے والد تھے تو انھوں نے مکان کیوں بیچا تھا؟"

"یہ حالات ہی ہوتے ہیں جو آدمی کو اپنا گھر۔ اپنا شہر۔ یہاں تک کہ اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں یہاں ہوتا تو وہ اٹارنی بھی کیوں مقرر کرتے۔ میں خود بیچ سکتا تھا مکان کو۔ اور شاید بیچا بھی سکتا تھا۔ لیکن میں ہزاروں میل دور لندن میں تھا۔" میں نے کہا۔

"کس لیے گئے تھے تم لندن؟" وہ بولا۔

"اپنی جان بچا کے بھاگا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہاں میری زندگی کے بہت دشمن پیدا ہو گئے تھے۔"

"اور تمھارے والد؟ ان کے ساتھ کون تھا؟"

"کوئی نہیں تھا۔ صرف خدا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کو شرم آنی چاہیے۔ جوان آدمی تھے۔ بوڑھے باپ کو چھوڑ کے چلے گئے تھے۔" وہ بولا۔ "زندگی بہت عزیز تھی تم کو۔ اور اگر تھی تو ان کو ساتھ لے جانے میں کیا حرج تھا؟"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ "مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ انھوں نے ضد کر کے مجھے فوراً روانہ کر دیا تھا اور میری نہیں مانی۔ میری عدم موجودگی میں دشمنوں نے ان سے بدلہ لیا۔"

"تمھارا مطلب ہے ان کو قتل کر دیا؟" وہ چونک کر بولا۔

"یس سر! انھوں نے میرے فرار کا ذمے دار انھیں قرار دیا۔" میں نے کہا۔ "پھر وہ مجھے قتل کرنے لندن پہنچ گئے تو میں یہاں بھاگ آیا۔"

"تم کو مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والا روپیہ ملا؟" وہ متفکر ہو کے بولا۔

"ابھی تو بہت کچھ نہیں ملا سر! میرے دشمن بھی نہیں ملے مجھے۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں آپ میرے یہاں آنے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ یہ نہ ہو خبر میرے دشمنوں تک پہنچ جائے اور وہ آپ کو پریشان کریں۔ آپ کی جان کے خواہ مخواہ دشمن ہو جائیں۔"

وہ ہنسا۔ "مجھ سے دشمنی کر کے کسی کو کیا ملے گا۔ پھر بھی تم کہتے ہو تو میں کسی سے بات نہیں کروں گا مگر تم یہاں ان سے چھپ کر کہاں رہو گے؟ اور تم آئے کیوں ہو آخر؟" وہ بولا۔

"بس اپنے معاملات ختم کر کے میں واپس چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس بوڑھے کو اصل حالات بتانا کچھ مناسب نہ تھا لیکن اس کو خاموش رکھنا ضروری تھا چنانچہ میں نے ایک قابلِ قبول جھوٹ پر مبنی حالات کی کہانی سنائی اور اسے مطمئن کر دیا۔

"تمھارا چھوٹا بھائی بہت کم گو ہے۔" اس نے کہا۔

"جی بچپن سے ہی یہ کچھ فاترالعقل ہے۔" میں نے کہا۔ "جب بولتا تھا، بونگی مارتا تھا اور میرے والد کی یا کسی اور کی بے عزتی ہو جاتی تھی۔ اس کو جوتے پڑتے تھے بعد میں۔ اس کو کمپلیکس ہو گیا اور اس نے بات کرنی ہی چھوڑ دی لوگوں سے۔ اس کو پیر مولا بخش لے جانے کا خیال ہے۔ یا پاگل خانے۔"

"واٹ نان سینس۔ تم لندن میں رہے اور باتیں ایسی کرتے ہو۔ پاگل خانے میں نہیں اسے نفسیاتی علاج کے لیے کسی کلینک میں داخل کرا دو۔" وہ بولا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے غصے سے محسن کو گھورا جو میری بات پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا مگر صورت سے بیچ بچ احمق نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ "چلو امیر خان۔ تم جاؤ خوجی کے ساتھ۔ ان کی گاڑی واپس کر دو۔ یہ تم کو ہوٹل میں چھوڑ دیں گے۔"

"میں ہوسٹل میں نہیں رہوں گا۔" محسن بولا۔ "لڑکے مجھے تنگ کرتے ہیں۔"

"ہوسٹل میں نہیں احمق! ہوٹل میں۔ اور سینٹ ہوٹل میں۔" میں نے کہا۔ "تم چلو میں آتا ہوں۔"

"دیر نہ کرنا ورنہ میں بھوک سے مر جاؤں گا۔" محسن اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"تم انتظار مت کرنا، کھانا کھا لینا۔" میں نے کہا۔

"مرغی کھاؤں یا مرغا؟" محسن نے معصومیت سے کہا۔

"جو تمھارا دل چاہے کھا لینا مگر اب میرا سر مت کھاؤ۔ جلو۔" میں نے درشتی سے کہا اور محسن سہم کر نکل گیا۔ بڈھا یہ طے نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے۔ ہماری بے سروپا باتوں پر ہنسنے سے پہلے اس نے ہماری صورتوں کی سنجیدگی کو دیکھا تو اسے بھی خاموش رہنا پڑا۔ وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

"تم کو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔" بوڑھے نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "وہ معذور ہے۔"

"بعض اوقات میں برداشت نہیں کر پاتا۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔

"جب تمھارے والد کا انتقال ہوا تو یہ کہاں تھا؟" بڈھے نے اچانک کہا۔

"اسے ہم نے پہلے ہی کراچی بھیج دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ایک رشتے دار کے پاس۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب بھی میں بہت سی باتیں اس کے سامنے نہیں کرتا کہ کہیں دوسروں سے نہ کہتا پھرے، میں نے اسی لیے اسے روانہ کر دیا ہے کہ مجھے آپ سے ایک ایسی ہی بات کرنی تھی۔ یہ بتائیے جب آپ نے یہ کوٹھی خریدی تھی تو کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کسی ٹرک کو اندر آتے جاتے دیکھا ہو؟"

وہ چونکا۔ "کبھی کا کیا مطلب۔ ایک ٹرک ہر روز اندر کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی ہوتا ہے۔"

"اب بھی ہوتا ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "کہاں؟ میرا مطلب ہے گیراج میں تو ٹرک کی گنجائش نہیں ہے۔"

"گیراج میں نہیں۔ ٹرک باہر کھڑا ہوتا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "دراصل وہی نوجوان جو میرے ساتھ رہتا ہے اور میرا کام کاج کر دیتا ہے، ٹرک ڈرائیور ہے۔"

"اچھا؟ تو پھر ٹرک یہاں کیوں کھڑا کرتا ہے؟ کمپنی کے پاس جگہ نہیں ہے کیا؟"

"معلوم نہیں مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ بولا۔ "کمپنی کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا کہ ڈرائیور ٹرک کو اپنے پاس رکھے، اس سے ڈرائیور کو آنے جانے کی سہولت رہتی ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ ڈرائیور صبح شام آپ کے لیے کھانا پکا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ صرف دن میں ٹرک چلاتا ہے؟"

"ٹرک رات کو بھی چلتے ہیں انھیں مال ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا ہوتا ہے۔ کراچی تک کا پھیرا ہو تو وہ ہفتہ ہفتہ لوٹ کر نہیں آتے۔"

"ہاں لیکن سب ٹرک شہر سے باہر نہیں جاتے۔ کچھ اندر ہی لوڈنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔ اور جس سوال کا جواب میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے مل گیا۔ دلاور اینڈ کمپنی کا یہ ٹرک مال کو فیکٹری سے قصرِ جمشید کے گودام تک اور یہاں سے گامے شاہ تک لے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دوسرا ٹرک تھا جس میں طافو اور رحمت کباڑی روانہ ہوئے تھے اور کراچی کے کسی سیٹھ کریم بھائی کو سامان پہنچانے نکلے تھے۔

"کیا وہ کوئی پرانا ٹرک ہے اور کیا اس کا نمبر ایل ای ڈی ایٹ ون۔۔۔؟"

"ہاں۔ بالکل یہی نمبر ہے۔ تم جانتے ہو اس ٹرک ڈرائیور کو؟" وہ خوش ہو کے بولا۔

"جانتا ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں میرے لیے بہت خطرناک بات ہے کیونکہ وہ میرے دشمنوں میں شامل ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھ لے تو اسی وقت قتل کر دے۔"

بوڑھے نے غیر ارادی طور پر انگلی سے سینے پر صلیب بنائی۔ "ہولی گاڈ۔ وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں۔"

"کوئی قاتل صورت سے پہچانا جائے تو پولیس اسے واردات سے قبل ہی گرفتار کر لے۔" میں نے کہا۔ "وہ آپ کے لیے واقعی بے ضرر ہے مگر میرے اس کے درمیان جانی دشمنی ہے۔"

"کیوں؟ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اس دشمنی کا سبب کیا تھا؟" وہ بولا۔ "جس کی وجہ سے تم کو فرار ہونا پڑا اور تمھارے والد پھر بھی قتل کر دیے گئے۔"

"یہ۔۔۔ ہم پٹھانوں کے خاندانی تنازعے ایسے ہی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نسل بعد نسل۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ میں ایڈیشنل سیشن جج تھا اور ضلع ہزارہ میں بھی رہا ہوں، وہاں یہ چیز عام تھی۔ لیکن تم نئے زمانے کے پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم بھی اس خون ریزی کی روایت کو نبھانا چاہتے ہو؟ تم معاف نہیں کر سکتے؟ انتقام کی خواہش سے دستبردار ہو کے انصاف کو خدا پر نہیں چھوڑ سکتے؟"

"یہ سب باتیں ہمیں خدا نے اپنی کتاب میں وضاحت سے سمجھا دی ہیں۔ حسنِ سلوک اور عفو و درگزر میں کتنا ثواب ہے، یہ ہمارے نبیؐ نے اور صحابہؓ نے اپنے عمل سے ثابت کیا۔" میں نے کہا۔ "پھر انگریز نے ڈیڑھ سو سال تک اپنے نظامِ انصاف کو ہم پر مسلط کیے رکھا اور سمجھانے والے ہمیشہ سمجھاتے رہے مگر روایت اپنی جگہ برقرار ہے۔ میں اکیلا کیا کروں؟ میں تو انھیں معاف کر دوں لیکن وہ مجھے بخشنے والے نہیں ہیں۔ میرا کوئی بیٹا تو ہے نہیں اور امیر خان کو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ سمجھے گا آپ کی بات؟ میرے بعد وہ بندوق اٹھا لے گا؟"

اس نے بڑے افسوس سے سر ملایا۔ "کتنا عجیب ہے یہ احساس! کہ میں اس وقت تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم سے مل کر خوش ہوا ہوں۔ تم بہت مہذب، شریف اور ذہین آدمی ہو۔ لیکن معلوم نہیں تم کب تک ہو۔ کسی دن مجھے یہ اچانک معلوم ہو گا۔ یا شاید کبھی معلوم نہ ہو گا کہ اب تم نہیں ہو۔"

"آپ سے پھر وہی درخواست کر رہا ہوں کہ کسی کو میرے آنے کی خبر نہ ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے دشمن مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہیں تو مایوس ہو جائیں اور قتل و خونریزی کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے لیکن ان کو معلوم ہوا کہ میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہاں ہوں تو وہ پھر مستعد اور سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ قدرتی طور پر وہ سمجھیں گے کہ میں اپنے والد کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ وہ پہل کرنے کا موقع تلاش کر رہے ہیں گے۔"

"میں نہیں بتاؤں گا۔ میں یہ گناہ اپنے سر کیسے لے سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے تو تمام عمر یہ احساس رہے گا کہ میری زبان سے ایک غلط بات نکلنے کے باعث ایک آدمی مارا گیا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔ لمبی عمر پاؤ۔ جتنی میری عمر ہے اس سے بھی زیادہ لمبی عمر۔ شادی کرو۔ جو شاید تم نے اسی وجہ سے اب تک نہیں کی اور اپنا گھر بساؤ۔ اور وہ گھر ایسا نہ ہو جیسا میرا گھر ہے، وہ ایک آباد اور خوشحال گھر ہو۔"

"یہ نیک تمنائیں اور دعائیں ضرور میری محافظ ہوں گی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "زندگی رہی تو میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ آپ مجھے کہاں ملیں گے؟"

"اگر قبرستان میں نہ ملا تو اپنی چھوٹی بیٹی کے پاس ملوں گا۔ میں تم کو اس کا پتا بتا دیتا ہوں۔" وہ جیب میں کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے ایک پرانی اور بوسیدہ نوٹ بک نکالی۔ دوسری جیب سے اتنا ہی پرانا قلم برآمد کیا اور نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑ کے آہستہ آہستہ کچھ لکھنے لگا۔ یہ صفحہ اس نے مجھے پکڑا دیا۔ "میں تم سب کو خوش آمدید کہوں گا۔"

"خدا حافظ مسٹر پال۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والا ایک پرانا آدمی تھا۔ اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس نے اپنے منصب کی آبرو کو کس حد تک مقدس جانا ہوگا۔ ہر فیصلہ کرتے وقت اس نے اپنے ضمیر کی آواز سنی ہوگی۔ اور خدا سے دعا مانگی ہوگی کہ اسے انصاف کرنے کی توفیق دے۔ تاکہ اس کے قلم سے صرف گناہ گار کو سزا ملے۔ اگر اس سے غلطی ہو تو گناہ گار کو چھوڑ دینے کی، بے گناہ کو سزا دینے کی نہیں۔

باہر آ کے میں آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ ابھی گیارہ بجے تھے اور مجھے امید تھی کہ ٹیڈی اور محسن میری ہدایت کے مطابق گاڑی کو خشاکے گھر کے آس پاس چھوڑ کر بارہ بجے تک اورینٹ ہوٹل میں کمرے حاصل کر لیں گے۔ امیر خان اور کبیر خان کے نام سے۔ آج کا دن بہت اہم تھا اور انکشافات کا دن تھا۔ میرے بہت سے اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ قصر جمشید کے تہ خانے تک پہنچنے والا راستہ اب بھی اسی جگہ سے شروع ہوتا تھا اور بے خوف و خطر استعمال بھی ہو رہا تھا۔ بہت ہوشیاری کے ساتھ دلاور اور میر شرافت علی نے یہ کوٹھی میرے والد سے ہتھیائی تھی۔ میر شرافت اس کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ اس کی معقول وجہ تھی۔ دنیا کو یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ وزیر خان بیمار ہے۔ وہ آفس تک نہیں جا سکتا تھا تو کوٹھی کو فروخت کرنے کی قانونی کارروائی کیسے پوری کرتا۔ فرض اس نے اپنے دوست اور پارٹنر میر شرافت علی کے سپرد کر دیا جس نے شرافت اور دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اگر کوئی سوال کرتا کہ وزیر خان نے یہ کوٹھی کیوں بیچی تھی تو اس کے دو معقول جواب تھے۔ پہلا تو یہی کہ اس کی چیز تھی، وہ بیچے یا رکھے اس کو اختیار ہے۔ دوسرا یہ کہ اس نے ایک کوٹھی بیچ کر دوسری خرید لی۔ کسی نے تصدیق کی ضرورت محسوس کی، نہ کوئی تصدیق کر سکتا تھا۔ جس کوٹھی سے وزیر خان کا جنازہ اٹھا وہ اس کی نہیں، اس کے ایک نمک حرام ملازم چراغ دین کی ملکیت تھی۔ وزیر خان کے لیے وہ ایک عقوبت گاہ تھی جہاں وہ چوبیس گھنٹے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کر رہا تھا۔

دلاور اینڈ کمپنی نے ایک احتیاط یہ بھی ملحوظ رکھی کہ وزیر خان کی کوٹھی ان میں سے کسی کے نام پر نہ ہو۔ انھوں نے کوٹھی کو اشتہار دے کر فروخت کیا ہوگا۔ ان کی قسمت کہ خریدار بھی ان کو اپنے مطلب کا مل گیا۔ ایک پرانے وقتوں کا اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والا اور باہر کی دنیا سے عملاً کوئی تعلق نہ رکھنے والا بوڑھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جسے اس نے کانونٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں۔ اور وہ صرف اتوار کو دو چار گھنٹے کے لیے باپ سے ملنے آتی تھیں چنانچہ ان کی طرف سے مداخلت کا سوال ہی نہ تھا۔ باقی رہ جاتی تھی صرف وہ عورت جو گھر کی مالکن تھی اور جس کی پسند پر اس کے شوہر نے یہ پرانی کوٹھی فوراً خرید لی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں پلٹا اور واپس چلنے لگا۔

دس منٹ بعد میں پھر کرم چند پال کے سامنے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔ "کوئی بات رہ گئی تھی؟"

"یس سر۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا تھوڑا سا وقت اور لوں گا۔" میں نے پھر وہیں بیٹھ کر کہا۔

"وقت تو میرے پاس ردی کاغذوں کا ڈھیر ہے۔ کوئی تھوڑا کیا جتنا چاہے لے لے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے لیے خود حفاظتی کی کتنی اہمیت ہے اس لیے میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا مقصد خدانخواستہ آپ کی نجی زندگی کے معاملات میں مداخلت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آج پہلی بار آپ سے ملا ہوں۔ آئندہ کا کوئی بھروسا نہیں کہ میں نہ رہوں یا آپ نہ رہیں اس لیے میری دلچسپی..."

"تمہید کے طور پر اتنی معذرت کافی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "آگے کہو۔"

"مجھے آپ سے چند باتیں اور کرنی چاہئیں۔ یہ خیال مجھے اتنے میں آیا چنانچہ میں نے لوٹ آنا بہتر سمجھا۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تو ڈرائیور سے متعلق ہے۔ مجھے اس کا نام نہیں بتایا تھا آپ نے۔ اس ڈر سے کہ پھر موقع نہ ملا تو میں کس سے پوچھنے جاؤں گا۔"

"اس کا نام تو دلدار ہے لیکن سب اسے کبوتر کہتے ہیں۔" وہ بولا۔

اس نام کی بازگشت میرے ذہن میں تھی لیکن مجھے یاد نہ آیا کہ پہلے یہ نام میں نے کب اور کہاں سنا تھا۔ "یہ دلدار آپ کے پاس کیسے آیا تھا؟ کیا آپ نے کسی ملازم کی ضرورت کا اشتہار دیا تھا یا کسی نے بھیجا تھا اسے؟"

"دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "ہمارے یہاں آنے کے دوسرے یا تیسرے دن وہ خود آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ سابقہ مالکوں کی اجازت سے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور ان کی جس حد تک خدمت کر سکتا تھا، اپنا اخلاقی فرض سمجھ کے کرتا تھا۔ کوٹھی بیچتے وقت مالک نے خالی قبضہ دینے کے لیے سرونٹ کوارٹر بھی خالی کرا لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ نئے مالکوں کی کچھ خبر نہیں، ممکن ہے ان کے نوکر ہوں، انھیں سرونٹ کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اگر نہ ہوں تو تم خود ان سے بات کر لینا۔ وہ تم کو رہنے دیں تو یہ ان کی مرضی۔ دلدار نے مجھے بتایا کہ وہ ٹرک چلاتا ہے اور صبح نو بجے ٹرک لے کر جاتا ہے تو شام کو چھ سات بجے لوٹ آتا ہے۔ صبح جانے سے پہلے اور رات کو آنے کے بعد وہ ہمارا سب کام کرے گا۔ بازار سے سودا سلف لانا، باغ کی دیکھ بھال، چوکیداری اور ڈرائیوری۔ ہم نے کہا گاڑی تو ہمارے پاس ہے نہیں۔ تم کو رہنے کے لیے جگہ چاہیے تو آ جاؤ۔ ہمارے پاس نوکر بھی نہیں ہیں اور سرونٹ کوارٹر خالی رہے گا تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ وہ اسی دن آ گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اس نے کہا تھا وہی کیا۔ ہمارا کوئی بیٹا بھی نہیں تھا چنانچہ میرے لیے ہر روز بازار جانا اور ادھر ادھر کے چھوٹے موٹے کام مشکل تھے، اس کے آنے کے بعد ہمیں بہت سہولت ہو گئی۔ وہ بہت اچھا اور فرماں بردار نوجوان ہے، مجال ہے جو اس نے کبھی کسی کام سے انکار کیا ہو یا ٹالنے کی کوشش کی ہو۔ بس ایک دفعہ بیوی اور وہ جانے کام کہا اور وہ دوڑتا ہوا گیا۔ میری بیوی تو اس کو بہت پسند کرتی تھی اور بالکل اپنے بچوں کی طرح رکھتی تھی۔ وہ ہم دونوں بوڑھوں کا محافظ بھی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایسے علاقوں میں چوریاں بہت ہوتی ہیں کیونکہ یہاں خوشحال لوگ رہتے ہیں اور یہ علاقہ دیکھنے میں غیر آباد لگتا ہے۔ ایک کوٹھی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی ساتھ والوں کو نہیں ہوتی۔ لیکن اس نے کہا کہ چور اس گھر میں آ گیا تو زندہ بچ کے نہیں جا سکتا۔ اس نے مجھے ریوالور بھی دکھایا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ایسی خطرناک چیز کیوں ساتھ لیے پھرتے ہو تو اس نے کہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور دوسروں کا مال لیے پھرتے ہیں۔ انھیں اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ چور ڈاکو لوٹ لیں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اتنی ذہانت سے تمام منصوبہ بندی کرنا یقیناً دلاور کا کام ہوگا۔ کتنی خوبی سے انھوں نے اپنا آدمی اسی گھر میں بٹھا دیا۔ انھیں سامنے بھی نہیں آنا پڑا اور جو مقصد وزیر خان کی موجودگی میں حاصل نہ ہوا تھا، وہ بہتر طور پر حاصل ہو گیا۔ ایک ایماندار اور اچھی شہرت رکھنے والے ریٹائرڈ ایڈیشنل سیشن جج پر کون شک کر سکتا ہے کہ اس کا گھر کسی ناجائز کاروبار کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اگر بدقسمتی کے باعث کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو وہ سب صاف بچ جاتے۔ دلدار عرف کبوتر غائب ہو جاتا اور ریٹائرڈ جج عذر بے گناہی پیش کر کے بچ تو جاتا مگر یہ رسوائی بھی اس کے لیے کم جان لیوا نہ ہوتی کہ اس کا نام منصفوں میں شامل تھا اور نیکنامی کی عمر کا سفر تمام ہوا تو یہ نام مجرموں کی طرح مشہور ہوا۔

"کبھی آپ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس کا ملازم ہے؟" میں نے کہا کیونکہ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تھا۔

"نہیں۔ اس کی مجھے کیا ضرورت تھی۔" وہ بولا۔ "اسے تنخواہ ملتی تھی اور پہلے مہینے اس نے کہا تھا کہ وہ کرایہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے کہا کہ تم مجھے ایک چھوٹی سی نیکی سے محروم کرنا چاہتے ہو تو جاؤ کرائے کا مکان کہیں اور لے لو۔ اس نے بہت معافی مانگی کہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کی بیوی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" میں نے کہا۔ "کیا وہ بیمار تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے دس سال کم تھی لیکن بیس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ میں تم کو اس کی تصویریں دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسرے کمرے تک گیا۔ اس کی واپسی تک میں ان امکانات پر غور کرتا رہا جو میرے ذہن میں تھے۔ وہ دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خاصی بڑی البم تھی۔

"اس میں ہماری سب تصویریں ہیں۔" وہ بولا۔ "شادی کے دن سے لے کر... اس کی آخری تصویر تک۔ ہمارے بچوں کی، ہمارے دامادوں کی۔ تم دیکھو۔ میں چائے بنا کے لاتا ہوں۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ چلا گیا اور میں نے البم کو پہلی تصویر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ہر یادگار البم کی طرح اس میں بھی کرم چند پال کی زندگی کے جاوداں لمحے حنوط شدہ لاشوں کی طرح اصل حالت میں موجود تھے۔ پہلی تصویر ۱۹۲۱ء کی تھی جس میں نوجوان ہینڈسم اور اسمارٹ کرم چند پال دولہا بنا اپنی بے حد حسین و جمیل بیوی کی باہوں میں باہیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے بہترین سوٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پہن رکھا تھا اور ٹائی باندھ رکھی تھی۔ اس کی بیوی سجائی ہوئی سفید لباس عروسی میں تھی اور وہ تمام تو بیاہتا جوڑوں کی طرح انتہائی پُر اعتماد، مسرور اور ایک دوسرے کی رفاقت پر نازاں نظر آتے تھے۔ میں صفحے پلٹتا گیا اور وقت آگے بڑھتا گیا۔ جس نومولود کی تصویر میں نے ماں کی گود میں دیکھی تھی اسے میں نے اپنے بچے کو گود میں لیے دیکھا۔ اس البم میں ان کی پوری زندگی کی کہانی محفوظ تھی۔ اور میں نے ایک عجیب سا کرب محسوس کیا۔ آدمی گھر کس لیے بساتا ہے؟ اس عمر میں تنہائی کا دکھ اٹھانے کے لیے؟ اپنی سب خوشیاں وہ اپنے بچوں میں بانٹتا ہے اور خود تہی دست رہ جاتا ہے اور کوئی اسے خوشی کی خیرات دینے والا بھی نہیں رہتا۔ تو وہ رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ یہ زندگی اسی طرح گزرتی تھی۔ ہم کو اس سے خوشیاں حاصل ہوئیں اور ہم نے وہی خوشیاں آگے تقسیم کر دیں۔ ہم سے پہلے ہمارے والدین نے یہی کیا تھا اور ہمارے بعد ہمارے بچے یہی کریں گے۔

"معاف کرنا۔ میں ذرا کاہل ہوں۔" وہ چائے کا ایک مگ میرے سامنے رکھ کر بولا۔ "ایک تو مجھے یہی بڑھاپے کا مرض ہے لیکن ذیابیطس کی وجہ سے میں چل پھر نہیں سکتا۔ کبھی کبھی ہمت کر لیتا ہوں چائے بنانے کی۔"

"یہ تصویر کتنی پرانی ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ کی بیوی کی وفات سے کتنا عرصہ قبل لی گئی تھی؟"

"شاید دو مہینے پہلے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ کر بولا۔ "تم نے دیکھا اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کو اتنی جلدی میرا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت زیادتی کی میرے ساتھ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس کے سہارے کا محتاج ہوں۔ اس کی مدد کے بغیر کیسے جیوں گا میں؟"

"آپ کو یقین ہے کہ انھیں کوئی بیماری نہیں تھی؟" میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا اور تصویر پر نظر رکھی۔ مریم کی صحت واقعی اچھی تھی۔ "بعض اوقات بلڈ پریشر یا ہارٹ ٹربل کا پتا نہیں چلتا۔"

اس نے بڑے وثوق کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ "میرا ایک دوست تھا، ڈاکٹر کرمانی۔ سول سرجن رہا اور ریٹائر ہونے کے بعد پریکٹس کرتا رہا۔ ابھی سال بھر پہلے انتقال ہوا ہے اس کا۔ وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر تھا۔ زبردستی مجھے اور مریم کو ہر چھ ماہ بعد چیک کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا تم اس عمر کو پہنچ چکے ہو جہاں یہ ضروری ہے۔ اس نے سب سے پہلے بلڈ شوگر لیول زیادہ ہونے پر خبردار کیا تھا اور میرے کھانے پینے پر پابندی لگائی تھی۔ مگر میں بہت بے پروا ہوں۔ میں سب کچھ کھاتا رہا۔ دوائیاں بھی۔" وہ ہنسا۔ "اور نتیجہ ظاہر ہے یہی نکلا کہ ذیابیطس کا روگ لگ گیا۔ ویسے بھی میرے خاندان میں موروثی ہے یہ۔ لیکن مریم بالکل صحت مند تھی۔ اس کا بلڈ پریشر کئی سال پہلے تھوڑا سا زیادہ ہوا تھا لیکن بہت جلد نارمل ہو گیا۔ دل ذرا بھی ابنارمل ہو تو سب سے پہلے کرمانی کو فکر ہوتی۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ اس صحت کو برقرار رکھو مریم! ضروری نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو تو بیمار بھی ہو۔ وہ یورپ اور امریکہ کی مثالیں بہت دیتا تھا جہاں لوگ صحت کی بہتری کے زیادہ قائل ہیں۔"

"اس کے باوجود آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ کیا انھیں اچانک کسی مہلک مرض نے آ لیا تھا؟"

کرم چند پال نے پھر پورے اعتماد سے انکار کیا۔ "ایک دن پہلے وہ بالکل تندرست تھی۔ وہ پیدل بازار تک گئی تھی اور شاید پانچ سیر سامان اٹھا کے اور دو میل پیدل چل کے لوٹی تھی۔ رات کو اس نے سوتے وقت یہ شکایت کی کہ اس کا دل گھبرا رہا ہے۔"

"کیا سونے سے پہلے وہ کچھ کھانے کی عادی تھیں؟" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ وہ ملٹی وٹامن کی ایک گولی کھاتی تھی۔" وہ بولا۔ "اور دودھ کا ایک گلاس پیتی تھی۔ ہم دونوں ہی دودھ پیتے تھے۔ یہ ہمارا پرانا معمول تھا کہ ہم رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے بے چینی سے کہا۔ "جب انھوں نے شکایت کی۔۔۔"

"ہاں۔ میں نے کہا، تم آرام کرو۔ بدہضمی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔ "یا تھکن کی وجہ سے۔ تم کو کیا ضرورت تھی گوشت سبزی اور پھل لینے کے لیے خود جانے کی اور اتنا وزن اٹھا کے پیدل آنے کی۔ دلدار لا دیتا۔ اور کیا واپسی میں سواری نہیں مل سکتی تھی؟ وہ کہنے لگی، دلدار نے تو مجھے معذور کر کے بند کر دیا ہے گھر میں۔ باہر کے سارے کام تو وہ کر دیتا ہے، مجھے بھی تھوڑا بہت چلنا چاہیے۔ خیر۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔ لیکن صبح تک وہ خدا کے پاس پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی تب مجھے معلوم ہوا۔"

"اور آپ نے اس کی موت کو طبعی سمجھ کے کیسے قبول کر لیا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"نہیں۔ طبعی اس اعتبار سے نہیں کہ عمر میں اس سے سینئر تو میں تھا لیکن یہ دل بہت ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ اس کا دل دھوکا دے گیا۔" وہ بولا۔ "چلتے چلتے اچانک بند ہو گیا۔"

"کس نے کہا تھا یہ آپ سے؟ آپ نے کسی ڈاکٹر کو بلایا تھا یا پوسٹ مارٹم رپورٹ لی تھی؟" میں نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ڈاکٹر آتا تو کیا کرتا؟ زندہ کر دیتا اسے؟" وہ برہمی سے بولا۔ "اور پوسٹ مارٹم کیوں کراتا میں؟"

"اس لیے کہ موت پُراسرار حالات میں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ دل بہت ناقابلِ اعتبار چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تمام سائنسی ترقی کے باوجود دل سے زیادہ پائیدار انجن نہیں بنا سکا۔ دل کبھی کسی وجہ کے بغیر اچانک جواب نہیں دیتا۔ دل تو اپنی خرابی کی اطلاع بہت پہلے دیتا ہے۔ اور اگر آپ کے دوست ڈاکٹر کرمانی نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہے یا انھیں کوئی کارڈیک تکلیف ہے تو میں یہ نہیں مان سکتا کہ ان کی موت حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہوئی تھی۔"

"آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" وہ چلایا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر! لیکن آپ ایڈیشنل سیشن جج تھے۔ آپ نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کے قتل کے بے شمار مقدمات کی سماعت کی ہو گی۔ لوگ کس کس طرح قتل کرتے ہیں، مجھے یہ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں لیکن آپ مجھے یہ بتائیے کہ ان حالات میں آپ نے موت کو طبعی کیسے مان لیا؟ آپ کو شک کیوں نہیں ہوا کہ انھیں قتل۔۔۔۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔ شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" وہ کھڑا ہو کے چلانے لگا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ "میری مریم کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو میرے سامنے۔ وہ فرشتہ سیرت عورت تھی جس نے کبھی اپنی زبان سے بھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ وہ سب سے محبت کرنے والی عورت۔ خداترس اور نیک دل۔ اسے کون قتل کرے گا یو ایڈیٹ۔ تمھارے دماغ میں یہ بے ہودہ خیال آیا کیسے؟ میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ لیکن مسٹر کرم چند پال!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے میرے یقین میں کوئی فرق نہیں آئے گا کہ کسی نے انھیں قتل کیا تھا۔ ان کی ملٹی وٹامن کی گولیوں میں ایک گولی زہر کی رکھ دی تھی۔ یا ان کے دودھ کے گلاس میں زہر ڈال دیا تھا اور یہ کام کسی ایسے شخص نے کیا تھا جو آپ دونوں کے معمولات پر نظر رکھتا تھا۔ وہ آپ کو بھی قتل کر سکتا تھا۔ اس کی بلا سے آپ دونوں مر جاتے۔"

"لیکن کیوں؟ کیا مل سکتا تھا کسی کو ہماری موت سے؟" وہ ایک دم بیٹھ گیا۔ "ہم تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ ہمارا جو کچھ ہے وہ ہماری بیٹیوں کا ہے اور ہمارے داماد بھی ایسے نہیں ہیں، وہ بہت نیک لوگ ہیں اور محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ لالچی نہیں ہیں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ آپ ان پر شک بھی کریں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مریم کا کوئی دشمن نہیں تھا اور وہ فرشتوں کی طرح نیک تھی مگر کرم چند پال! کیا شیطان ایسے ہی لوگوں کو راستے سے نہیں ہٹاتا؟ میں اپنے والد کے بارے میں یہی کہنا پسند کرتا ہوں کہ وہ بڑے ایماندار، خداترس اور نیک آدمی تھے۔ مگر ان کو قتل کر دیا گیا۔ خیر یہ بات پرانی ہو گئی۔ لیکن جس بات نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا وہ یہی تھی کہ میں آپ کو خطرے سے خبردار کر دوں۔ میری زندگی تو ہر لمحے خطرات میں گھری ہوئی ہے لیکن آپ نے بھولے سے بھی آج کی اس ملاقات کا یا ان باتوں کا کسی کے سامنے حوالہ دیا تو خود آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مریم کو قتل کرنے والوں نے آپ کو اس لیے بخش رکھا ہے کہ آپ ان کے لیے بے ضرر ہیں۔ آپ سمجھیں کہ نہ ہم یہاں آئے نہ آپ سے ملے اور نہ اپنے بارے میں کوئی بات کی۔ آپ نے کبھی ہمیں دیکھا ہی نہیں۔ کسی کو اپنا سمجھ کے بھی یہ بات نہ کہیں۔ خواہ اس پر آپ کا اعتماد اپنی ذات پر اعتماد سے زیادہ ہو۔ ورنہ وہ آپ کو بھی قتل کر دیں گے، سُنا آپ نے؟"

"گیٹ آؤٹ۔۔۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ پھر چلانے لگا۔ "تمھارا دماغ خراب ہے تمھارے بھائی کی طرح۔ تم خود کو صحیح دماغ کا سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ۔۔۔۔۔"

اس کی بات سننے بغیر میں واک آؤٹ کر گیا۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اس گھر میں قدم رکھ کر غلطی کی تھی۔ اس خبطی بوڑھے کا کیا بھروسا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود یہ بات کسی سے کہہ دے کہ آج دو پاگل بھائی آئے تھے، امیر خان اور کبیر خان۔ کہتے تھے کہ ہم وزیر خان کے بیٹے ہیں۔ اور ان میں سے جو بڑا تھا وہ بڑا پاگل تھا۔ کہتا تھا مریم کو کسی گھر کے آدمی نے قتل کیا تھا اور اب وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ وہ بہت ہنسے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مریم کے بعد دلاور کا ایجنٹ دلدار عرف کبوتر اس بوڑھے کو بھی ٹھکانے لگا دے گا۔ خود بوڑھے کی بیٹیاں کہیں گی کہ ہمارا باپ ذہنی طور پر تو اسی دن مر گیا تھا جس دن ہماری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اور اس عمر میں ان کو ذیابیطس کا ہرا ناعارضہ بھی تھا۔ چنانچہ یہ قتل بھی طبعی موت کا نام پائے گا۔

میں غصے میں تیز تیز چلتا گیا۔ غصہ مجھے اس پر بھی آ رہا تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی یہ مکان میرے باپ کے نام سے خریدنے کی۔ اگر یہ راز فاش ہو گیا کہ اب اس کا مالک کون ہے تو کیا اسے تباہ نہیں کر دیا جائے گا؟ شاید دلدار عرف کبوتر نے اب تک یہ خبر دلاور کو پہنچا دی ہو کہ اڈا ہاتھ سے گیا ہے۔ باقی سب وہ معلوم کرنے کا۔ میرے قدم اچانک ایک آواز پر رک گئے۔ ایک بچہ چلا چلا کر شام کا اخبار بیچ رہا تھا۔ "مشہور صنعتکار سیٹھ دلاور کا قتل۔ آج کی تازہ خبر!" میں نے جھپٹ کر بچے کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا اور اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanpoint

خبر بالکل نمایاں اور مکمل تھی۔ شہ سرخی اس لیے نہیں بنی تھی کہ چوہدری دلاور ایک مقامی صنعتکار تھا اسے ملک گیر یا بین الاقوامی سطح پر وہ شہرت حاصل نہیں تھی جو کچھ عرصہ قبل پاکستان کی معیشت پر حاوی "بائیس خاندانوں" کو ملی تھی لیکن خبر میں لہو کا رنگ تھا اور قتل کی لرزہ خیزی تھی چنانچہ اسے نمایاں جگہ ملی تھی۔ دلاور کی زندگی یا موت میں میری دلچسپی کے اسباب بالکل مختلف اور عیاں تھے کیونکہ اس کی ذات سے براہِ راست میری اپنی زندگی اور موت کے زمینی رشتے اور تنازعے منسوب تھے۔ ایسے چند اور بھی ہوں گے جن کے لیے دلاور کا جینا مرنا کسی اعتبار سے اہم تھا مثلاً اس کے خاندان میں شامل افراد۔ اس کے کاروباری حریف اور حلیف اور دوست آشنا۔ لیکن میں یہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ کسی بھی شخص کے قتل کی واردات میں غیر متعلقہ افراد کے لیے تجسس اور دلچسپی کے اسباب کیا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قتل کی خبر سنسنی خیز کہلاتی ہے اور اخبار میں شائع ہو تو اعلان بن جاتی ہے۔ زر۔ زمین یا زن کیلیے آدمی کے ہاتھوں آدمی کا قتل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ ہوس اور حسد کا وہ کمینہ جذبہ جو انسان کو شیطان کے ہاتھوں بے بس کر دیتا ہے آدمی کی سرشت میں شامل ہے۔ سڑک پر پیش آنے والے ٹریفک کے حادثات کی طرح قتل بھی روزمرہ کی زندگی کا جزو ہیں۔ اور جتنے افراد قتل کی وارداتوں میں یا حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں اس سے کئی ہزار گنا زیادہ افسوسناک اور پُر عذاب حالات میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں لیکن ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں دیتا اور کوئی جاننا نہیں چاہتا کہ وہ کیسے مرے اور کیوں مرے۔

دلاور کے قتل کی خبر کو بھی اخبار نے اور اخبار فروش نے زیادہ فروخت کا ذریعہ بنایا تھا اور اخبار خریدنے والے ایسے بھی تھے جو شاید دلاور کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے مگر قتل کے ساتھ سفاکانہ، بہیمانہ اور وحشیانہ کے الفاظ کا بے دریغ استعمال خبر کو مزید چٹ پٹا بنا دیتا ہے حالانکہ کسی بھی قتل کو شریفانہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آگ کو گرما گرم کہنا مضحکہ خیز ہے کیونکہ آگ کے یخ بستہ ہونے کا تصور ہی نہیں۔ مگر اب میری طرح دوسرے لوگ بھی بڑے انہماک اور اشتیاق کے ساتھ خبر کی تفصیلات میں گم تھے کہ قاتل کون تھا؟ قتل کیوں ہوا؟ اندازے کیا ہیں؟ پولیس کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے ساتھ لواحقین کی تصاویر جو لاش پر گریہ کناں ہوں اور ممکن ہو تو ایک تصویر خون آلودہ لاش اور جائے واردات کے منظر کی۔ شاید یہ سب کچھ پڑھنے اور دیکھنے کے بعد لاشعوری طور پر آدمی یہ اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے کہ وہ خود سو فیصد زندہ ہے اور زندگی کتنی پُر مسرت تعالیٰ قدرا اور اہم چیز ہے۔

اخبار بیچنے والا لڑکا میرے رویّے پر تھوڑا سا حیران ہوا تھا اور پھر اسی خبر کو چلا چلا کر نشر کرتا روانہ ہو گیا تھا۔ اُسے زیادہ حیران ہونے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس نے فرض کر لیا ہو گا کہ میں دلاور کا کوئی قریبی عزیز ہوں جسے اس خبر نے دوسروں کے مقابلے میں شدید تر ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا چنانچہ دلچسپی کی حد تک متاثر ہونے والے اطمینان سے اخبار خرید کر قیمت ادا کر رہے تھے تو میں نے اخبار جھپٹ کر چھین لیا تھا اور پانچ کا نوٹ پھینک کر ایسا حواس باختہ ہوا تھا کہ باقی پیسے لینا بھی بھول گیا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں سڑک کے درمیان میں کھڑا اخبار پڑھ رہا ہوں۔ پھر کسی شریف آدمی نے شانہ ہلا کر مجھے متوجہ کیا اور بتایا کہ سڑک سے ہٹ کر جو بنچ لگی ہوئی ہے اس پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے سر ہلایا اور چل پڑا۔

سرخی میں نے پڑھنے سے قبل ہی سن لی تھی۔ باقی تفصیلات کو ایک نظر ڈال کر ذہن میں نقش کر لینے کے بعد میں نے ہر لفظ کو غور سے پڑھا تھا۔ اخباری نمائندے اور پولیس کے اشتراکِ باہمی سے جو خبر بنی تھی وہ کچھ یوں تھی کہ رات کے وقت نامعلوم افراد نے چوہدری دلاور کو ان کی خوابگاہ میں گھس کر قتل کر دیا۔ قاتل نے کلہاڑی سے پے در پے وار کیے اور سر کے ٹکڑے کرنے کے بعد کلہاڑی وہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ چوکیدار نے جسے پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کیا تھا یہ بیان دیا کہ دلاور کے افرادِ خانہ راولپنڈی گئے ہوئے تھے اور ان کا پروگرام مری جا کے اسنو فال دیکھنے کا تھا لیکن سخت سردی کے باوجود اسنو فال کے لیے موسمی حالات سازگار نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ کسی عزیز کے گھر بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ برسنے کے بجائے بادل برف کے گالے بن کر گرنے لگیں تو وہ مری جائیں۔ چوکیدار کو علم نہیں تھا کہ راولپنڈی میں وہ کہاں ہوں گے۔ اس نے کسی کو بھی بنگلے میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور (پولیس کی جوتا کاری کے باوجود) یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ نشہ کرتا ہے یا رات کو حرامخوری کرتا ہے اور سو جاتا ہے۔ چوکیدار نے پورے وثوق کے ساتھ بیان دیا تھا کہ اس نے کوئی شور نہیں سنا۔ کسی کے اونچا بولنے، مار پیٹ کرنے یا چیخنے چلّانے کی آواز نہیں سُنی اور کوئی کھڑکی یا دروازہ کھلا نہیں دیکھا حالانکہ وہ ہدایات کے مطابق رات بھر کوٹھی کے گرد پھرتا رہا تھا۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ چوہدری دلاور جیسے شریف اور بااخلاق آدمی کا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا لیکن وہ خود صرف چھ مہینے پہلے ملازم ہوا تھا اس

لیے یقین کے ساتھ کچھ نہیں بتا سکتا کہ ان کے دوست کتنے تھے اور دشمن کتنے۔ وہ ان کی نجی زندگی کے معاملات سے باخبر ہونے کا دعوےٰ کیسے کر سکتا ہے۔ وہ اور گھر کے دوسرے ملازم کتنے بھی قابلِ اعتماد کیوں نہ ہوں بہرحال ملازم سے زیادہ کچھ نہیں۔ واردات کی شب چوہدری دلاور نصف شب سے کچھ پہلے سوئے تھے تو اکیلے تھے (پولیس کے سوال کے جواب میں) اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص کار میں چھپا ہوا تھا اور چوہدری صاحب کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہو گیا تھا تو وہ کیسے جان سکتا ہے۔ وہ چوہدری صاحب کی گاڑی دیکھتے ہی دروازہ کھول دیتا تھا اور رات کو بھی اس نے گاڑی کے گزر جانے کے بعد گیٹ بند کیا تھا۔ اس نے چوہدری صاحب کو گاڑی پورچ میں روک کر اترتے اور اندر جاتے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ گیٹ کو دھکیل کر مقفل کرنے میں مصروف تھا تاہم اس نے گاڑی کے رکنے کی اور دروازہ بند ہونے کی آواز ضرور سُنی تھی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ اکیلے اندر گئے تھے یا ان کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ دوسرے نوکروں کے متعلق اس نے بتایا کہ مالی صبح آتا تھا اور شام ہونے سے پہلے اپنے گھر لوٹ جاتا تھا۔ اس کا گھر کے اندرونی معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا چنانچہ اسے اندر جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ خانساماں ایک بوڑھا آدمی تھا جو اپنی بیوہ بہن کے ساتھ کئی سال سے اسی گھر میں مقیم تھا لیکن واردات کی شب وہ بھی گھر میں نہیں تھے۔ چوہدری صاحب نے ان کو بھی اپنی فیملی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ چوہدری صاحب معمول کے مطابق صبح سورج نکلنے سے پہلے لان میں ٹہلنے نہیں نکلے تو وہ سمجھا کہ شاید رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے وہ صبح اپنے وقت پر نہیں اُٹھ سکے۔ چوکیدار نے تسلیم کیا کہ چوہدری صاحب رات کو دیر تک جاگتے تھے اور ان کو نیند نہ آنے کی شکایت رہتی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور انھوں نے کسی وجہ کے بغیر چوکیدار کو ڈانٹا ڈپٹا تھا کہ وہ ہوشیار رہے اور اگر کبھی اس کی طرف سے غفلت کا ثبوت ملا تو اُسے برطرف کر دیا جائے گا۔ وہ چوکیدار کو ہزار روپے ماہانہ دیتے تھے جو عام چوکیدار کو ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں دگنی تنخواہ تھی چنانچہ چوکیدار خود بھی نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد مستعد رہتا تھا۔ چوہدری صاحب نے اُسے ایک ریوالور بھی لے کر دے رکھا تھا اور کئی بار کہا تھا کہ خطرہ محسوس ہو اور وہ کسی غلط آدمی کو زبردستی یا ناجائز طور پر اندر داخل ہوتا دیکھے تو بے دریغ گولی مار دے۔ باقی معاملات کو وہ خود سنبھال لیں گے۔

صبح نو بجے تک چوہدری صاحب کی گاڑی پورچ ہی میں کھڑی رہی تو چوکیدار کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ اندر سے تو وہ چلّا کر آواز دیتے تب بھی باہر سنائی نہ دیتی۔ اسی اندیشے کی وجہ سے وہ حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر اندر گیا اور چوہدری صاحب کے بیڈروم کے دروازے تک پہنچا اندر داخل ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس نے کھلے دروازے سے ٹیبل لیمپ کو روشن دیکھا۔ چوہدری صاحب فرش پر مردہ پڑے تھے اور ان کا خون قالین کے زرد رنگ پر پھیلا ہوا تھا۔ لاش کی حالت دیکھ کر وہ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ پہلے تو خود بیہوش ہو گیا۔ اُسے چکر سا آیا جس کے بعد وہ دروازے کے قریب ہی گر پڑا مگر چند منٹ میں وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے کی طرف ٹیلی فون کرنے بھاگا۔ ٹیلی فون تو بیڈروم میں بھی تھا مگر اس میں اندر جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دوسرا ٹیلی فون ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ اندر کے معاملات کی خبر رکھنے میں غیر ضروری دلچسپی نہیں لیتا تھا مگر اُسے خود چوہدری صاحب نے کئی بار ڈرائنگ روم میں بلایا تھا اس لیے وہ گھر کے نقشے سے واقف تھا اور اُسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے، اس لیے وہ ٹیلی فون کرنے ڈرائنگ روم میں گیا تھا۔ اُسے ڈائریکٹری میں کوئی نمبر تلاش کرنا نہیں آتا لیکن چوہدری دلاور نے اُسے پولیس اسٹیشن کا ٹیلی فون نمبر یاد کرا دیا تھا۔

ان تمام باتوں سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ چوہدری دلاور کو کسی دشمن کا ڈر تھا، چنانچہ اس نے غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے تھے اور اس کے باوجود وہ عدمِ اطمینان کا شکار تھا۔ اس منطقی نتیجے پر پہنچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چوکیدار کے اندازے کے مطابق گھر میں کوئی بھی چیز اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری دلاور کے ہاتھ کی بہت قیمتی گھڑی، اس کی ہیرے کے نگینے والی سونے کی انگوٹھی اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے سترہ ہزار روپے بھی محفوظ رہے تھے۔ کسی نے سیف کو توڑنے یا اس کا تالا کھولنے کی کوشش تک نہیں کی تھی اور سامنے رکھی ہوئی ہر قیمتی چیز چھوڑ دی تھی۔ کمرے کے اندر مزاحمت کے آثار ناپید تھے چنانچہ ڈکیتی یا چوری کو خارج از امکان قرار دے دیا گیا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ کسی جانی دشمن نے ان پر سوتے میں وار کیا اور قاتل اپنے جذبۂ انتقام میں وحشت اور جنون کا شکار تھا ورنہ وہ دوسرا وار نہ کرتا۔ سر تو کلہاڑی کے تیز دھار والے پھل کی پہلی ضرب سے ہی دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہو گا مگر قاتل نے چہرے کا قیمہ کر دیا۔ اخبار نے ایک پولیس افسر کے حوالے سے لکھا تھا کہ چوکیدار بظاہر بے قصور معلوم ہوتا ہے اور اصل حقائق کا انکشاف تو چوہدری دلاور کی فیملی کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

دیگر افراد کے بیانات اور مزید تفتیش کے بعد ہی ہوگا لیکن ابھی جو مفروضہ پیشِ نظر شہادتوں کی بنیاد پر قائم کیا جا سکتا ہے یہی ہے کہ چوہدری صاحب کا کوئی جانی دشمن گھر سے باہر ان کی گاڑی کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا رہا اور ان کے ساتھ اندر جا پہنچا یا وہ کوئی ایسا قابلِ اعتماد آدمی تھا جسے وہ خود اپنے ساتھ اندر لے گئے اور جسے چوکیدار نہ دیکھ سکا۔ اس شخص نے چوہدری صاحب کو قتل کرنے کے بعد انتظار کیا کہ چوکیدار اپنی جگہ سے ہلے تو وہ باہر نکلے اور جب بالآخر چوکیدار اپنی تسلی کے لیے اندر گیا تو قاتل اطمینان سے باہر نکل گیا۔ اسے قتل کے سارے سراغ مٹانے اور اپنے ہاتھوں یا کپڑوں کو نظر آنے والے ہر داغ سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔

خبر تفصیلی ہونے کے باوجود نامکمل تھی اور اسی جملے پر ختم ہوئی تھی کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وقت کی کمی کے باعث اخبار والوں کو چوہدری صاحب سے منسوب پرانی باتیں اپنے قارئین کو یاد دلانے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگلے دن اخبارات اپنی اپنی فائلوں سے گزشتہ واقعات کا پچھوڑ پیش کریں گے تو اس میں کیا ہوگا۔ جانی دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر میرا نام ہوگا۔ پھر میری کیس ہسٹری ہوگی۔ یہ تذکرہ ہوگا کہ چوہدری دلاور پہلے سے رحمت کباڑی نام کے ایک ڈرائیور کے قتل کے الزام میں ملوث تھے اور حال ہی میں انھیں انسپکٹر فتح شیر کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ کرنے والوں نے بروقت بندوبست کر لیا تو کل کے اخبارات مجھے شیطان بنا کے پیش کریں گے کہ برطانیہ میں قیام سے اب تک میں نے قانون شکنی کے کتنے ریکارڈ توڑے ہیں اور کس کس نوعیت کے سنگین الزامات میں اشتہاری مجرم کی حیثیت سے مطلوب ہوں۔ اس کے برعکس چوہدری دلاور کو فرشتہ سیرت ثابت کرنے کے لیے بتایا جائے گا کہ کس طرح وہ "خود ساختہ" یعنی اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت کے بل پر ترقی کر کے اس مقام تک پہنچنے والے آدمی تھے۔ کتنے خدا ترس تھے۔ کتنے رحمدل اور فیاض تھے۔ کتنے یتیموں کو پالتے تھے اور کتنی بیواؤں کی مدد کر چکے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مدح و ستائش یوں بھی ہر مرنے والے کا حق بن جاتی ہے اور اگر کوئی بُرا کہے تو لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے کی نیکی بدی اس کے ساتھ گئی۔ اب کرو تو دعائے مغفرت کرو یا لواحقین کے لیے صبرِ جمیل کی دعا۔ اگر اس اہتمام کے لیے دولت بھی صرف کر دی جائے تو چوہدری دلاور جیسے شیطان بھی مر کے عظیم انسان کہلاتے ہیں اور ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ عمر بھر بدنامی کمانے والے کے لیے نیک نامی کی سند خریدی جا سکتی ہے یہاں تک کہ ان کو جنتی قرار دینے والے بھی مل جاتے ہیں۔

لیکن مجھے چوہدری دلاور کے جہنمی ہونے کی نہ خوشی تھی اور نہ اس کا افسوس تھا میرے سامنے تو ایک ہی سوال تھا کہ یہ کس نے کیا؟ اور اس سوال کا جواب نہ ہونے کے باعث میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیا واقعی قتل و خونریزی کی ننگِ انسانیت داستان کا حرفِ آخر آ گیا؟ وہ طویل جنگ ختم ہوئی جس میں لاتعداد بے گناہوں نے زندگی کی رزم گاہ میں جان کا نذرانہ دیا؟ ان میں سے کچھ ایک طرف تھے اور کچھ دوسری طرف لیکن بیشتر کسی طرف بھی نہیں تھے مگر یہ تو ہر جنگ کا المیہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ وہی کام آتے ہیں جو امن اور صلح کے فلسفے پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی۔ جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔ کون کب مرا؟ کیسے مرا اور کہاں مرا؟ یہ سب بے معنی ہو گیا تھا اور سوال صرف ایک رہ گیا تھا کہ کیوں مرا؟ بالآخر دلاور بھی مر گیا تھا اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اُسے قانون کے ہاتھوں نے تختۂ دار تک پہنچایا یا کسی مظلوم نے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ مارا تو اسے ایک ہی بار جا سکتا تھا خواہ اس کی موت کتنی ہی ذلت آمیز اور عبرت آموز کیوں نہ ہو۔ اب صرف میں رہ گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ یکلخت وہ سب بارِ ملامت میرے کاندھوں پر منتقل ہو گیا ہے جو دلاور نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ مر کے سبک سر ہو گیا تھا اور میں سرگرداں کہ اب حساب دوں تو کیا اور جواب دوں تو کسے کہ یہ سب کیا تھا؟ معرکۂ حق و باطل! خیر و شر کی جنگ؟ خود کو زیادہ طاقتور، زیادہ خوش قسمت اور زیادہ چالاک شکاری ثابت کرنے کی کوشش۔ اگر انجام یہی ہونا تھا تو آغاز سے کیا حاصل تھا۔ اس کا معاملہ تو یومِ حشر پر گیا۔ جب اپنا اپنا دعویٰ رکھنے والے دلاور کا گریبان تھام لیں گے مگر اس دنیا میں صرف میرے وجود کا مسئلہ رہ گیا جس نے سارے مسائل کھڑے کیے تھے۔ دلاور چین سے قبر میں سوئے گا۔ میں بدستور آج کے غم اور کل کے اندیشوں میں گرفتار رہوں گا۔ چھپتا پھروں گا اور بھاگتا رہوں گا۔ کسی مقصد اور کسی سمت کے بغیر زندگی سے فرار کے عذاب کو جھیلتا رہوں گا اور سوچتا رہوں گا کہ اب اس ایم ڈبلیو ڈی کمپلکس کا کیا بنے گا جسے وزیر خان سے چھین لیا گیا تھا اور جس کا وارث میں تھا؟ اس کا وارث اب کون ہوگا اور وہاں اب کیا ہوگا؟ وہی جو پہلے ہونا تھا یا وہ جو پہلے نہیں ہوتا تھا؟ رابعہ... بیوقوف جذبات کی رو میں بہ کر تباہ ہو جانے والی لڑکی۔ تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے۔ اس ٹھکانے پر بنا لیا ہے جہاں تو نے فکرِ آشیاں بندی کی تھی۔ اس گھر کی دیواریں تو صرف وقت کے آسیب زدہ رہ سکتے ہیں جہاں وزیر خان نے ... رہا اور اب وہ تنہا ریٹائرڈ زندگی گزارنے والا سیشن جج بھی رہے گا۔ یہ جگ رین بسیرا بندے نہ تیرا نہ میرا۔

میں نے محسوس کیا کہ میں بیٹھا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میرے اردگرد کی دنیا بے وجود ہو گئی تھی جس میں انسان چلتی پھرتی اور آتی جاتی پرچھائیاں بن گئے تھے اور ٹریفک کے شور میں بھی ایک سناٹا تھا کہ صدا دیتا تھا اور شہر کو شہرِ خموشاں کی ویرانی نے یوں ڈھک لیا تھا جیسے ہزاروں صدیوں کی تہذیب کو مٹی ڈھانپ لیتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر خبر کو دیکھا جس کا ہر لفظ مجھے پہلے ہی ازبر ہو گیا تھا اور بنچ سے اٹھ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ نہ جانے کب مجھے خیال آیا کہ پیدل جانے کے بجائے میں ٹیکسی میں جا سکتا ہوں اور کم وقت میں زیادہ محفوظ طریقے سے اور ینٹ ہوٹل پہنچ سکتا ہوں جہاں محسن اور ٹیڈی میری واپسی کے منتظر ہیں۔ اس دشتِ تنہائی میں جہاں خیالات کی بادِ سموم میں راستہ سجھائی نہ دیتا تھا، یہ خیال کسی نشانِ منزل کی طرح تھا۔ میں نے ناامیدی اور احساسِ بیچارگی کو کم ہوتے محسوس کیا۔ ہاں۔ اس وقت مجھے رفاقت کی اور دستگیری کی ضرورت ہے۔ ان سہاروں کی ضرورت ہے جو میرے یقین کو اور میرے اعتماد کو بحال کر سکیں اور میں اس قابل ہو سکوں کہ اس نئی اور غیر متوقع صورتِ حالات کا جائزہ عقلِ سلیم کی مدد سے لے سکوں۔

ایک رکشا والے نے بکمال مہربانی مجھے بٹھا لیا اور اس بات پر بہت ناراض ہوا کہ میں نے اسے روکنے کے لیے رکشا کے سامنے آ کر لیٹنے کا طریقہ کیوں اختیار کیا حالانکہ میں پریشان خیالی کے باعث فٹ پاتھ سے سڑک پر اترتے وقت ایک گڑھے میں پیر پڑنے سے گرا تھا مگر فوراً کھڑا بھی ہو گیا تھا۔ سفر کے دوران میں بھی اس نے اپنی لن ترانی جاری رکھی اور مجھے متعدد مفید مشوروں سے مفت نوازا۔ ان میں ایک یہ تھا کہ میں اپنی ساری پریشانیوں کی تفصیل ایک خط میں لکھ کر پیر ڈھونگے شاہ کے مزار پر سوا روپے نقد اور سوا تولے چاندی کے ساتھ رکھ آؤں تو اسی رات بابا مذکور خواب میں نمودار ہو کے سارے مسائل کا حل بتا جائیں گے۔ غالباً میں صورت سے اتنا پریشان حال لگتا تھا کہ وہ رحم کھانے پر مجبور تھا۔ وہ نان اسٹاپ بولنے کا عادی تھا چنانچہ اس نے آخری وقت میں ان شکوک کا اظہار بھی کر دیا کہ اُسے میری صورت دیکھی ہوئی لگتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ابھی تک اس کے لاشعور میں یا تحت الشعور میں میری اخبار میں شائع ہونے والی تصویر محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کہ تصویر کا نقش شعور کے خانے تک پہنچتا میں نے رکشا رکوایا اور اس کی روانگی کے بعد پیدل چل کے اورینٹ ہوٹل پہنچا۔

خلافِ توقع محسن کو اور ٹیڈی کو ابھی تک اس خبر کا علم نہ تھا جو ہمارے لیے اتنی ہی بڑی خبر تھی جتنی دنیا کے لیے آخری ایٹم بم گرائے جانے کی ہوگی۔ انھوں نے انتظار سے اکتا کر قیلولہ شروع کیا تھا کہ میں نے دستک دی۔ اس سے پہلے کہ وہ مناسب الفاظ میں مجھے خوش آمدید کہتے اور میرے ساتھ وہی سلوک کرتے جو میں نے ان کے ساتھ اپنے پرانے (یا اب رابعہ کے) گھر میں کیا تھا انھوں نے میری صورت کے جغرافیے پر غور کیا اور نقشہ بدلا ہوا دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

"کیا ہے عزیزم!" محسن نے کہا۔ "تجھ پر چل چلاؤ کی سی کیفیت ہے!"

"قسم اللہ کی سکندر بادشاہ! تمھارا چہرہ تو گھنٹا گھر بنا ہوا ہے، بارہ بجے ہوئے ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے ان کے سامنے اخبار پھینک دیا اور خود ایک بیڈ پہ دراز ہو گیا۔

"مشہور صنعتکار چوہدری دلاور کا قتل۔" محسن نے زور سے پڑھا اور اس کے الفاظ پر ٹیڈی یوں اچھلا جیسے ہر لفظ ریوالور سے نکلنے والی گولی تھا۔

"کیا؟ کس کا... کون...؟" اس نے گڑبڑا کے کہا اور اخبار چھین لیا۔ محسن نے بلا ارادہ اسے ایک گالی دی اور اخبار پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر محسن نے اس کی درخواست پر خبر کو باآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ میں سگریٹ سلگائے خالی الذہن لیٹا چھت کو دیکھتا رہا جس پر گزرے ہوئے وقت کی پرچھائیاں اسی طرح گڈمڈ ہو رہی تھیں جیسے میرے خیالات... محسن نے خبر کو دوسری بار خاموشی سے اور زیادہ توجہ کے ساتھ دیکھا۔

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے یار..." اس نے طویل خاموشی کے ایک مضطرب وقفے کے بعد کہا۔

اخبار میں وہی آتا ہے جو ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کون سی نہ ہونے والی بات ہے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یقین نہیں آتا کہ چوہدری دلاور جیسے لوگ اتنی آسانی سے قتل کیے جا سکتے ہیں۔"

"قاتل بھی اس کی خوابگاہ تک اتنی آسانی سے نہیں پہنچا ہوگا، جتنی آسانی سے میں یہاں اس کمرے میں پہنچ گیا۔" میں نے کہا۔

"یار یہ... اتنا بڑا کارنامہ کون سر انجام دے سکتا ہے؟" محسن بولا۔ "ہم سے بڑا بھی کوئی شکاری تھا جو اس کی تاک میں تھا۔ کون تھا وہ شکاری؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اصل شکاری تو قضا کا نامہ بر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ جسے شکار کرنا چاہے کر لیتا ہے۔ اُسے بہانوں اور وسیلوں کی کمی نہیں۔ ہم کس زعم میں اس کی جاں کے طلبگار بنے پھرتے تھے۔"

"پھر بھی سوچنے کی بات ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ در پردہ اس کی دوستی کس سے ہے اور دشمنی کس سے۔ میں اسے کاروباری رقابت کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ جذباتی ہو کے قتل نہیں کرتے۔ ان کے لیے آدمی کی حیثیت مشین کے ایک پُرزے کی ہے جو صحیح کام کرتا رہے تو ٹھیک ہے ورنہ بدل دیا جاتا ہے۔ اسے بدلنے کے لیے وہ کوئی خاص تردد نہیں کرتے اور کوئی پریشانی مول نہیں لیتے۔ ریوالور کی ایک گولی سے سر میں ایک سوراخ کر دینا کافی سمجھتے ہیں اور لاش پھر سڑک پر پڑی رہے یا مردہ خانے میں، وہ بھول جاتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ تو کسی نے اس کے لہو سے انتقام کی پرانی آگ ٹھنڈی کی ہے اور وہ آگ اتنی شدید تھی کہ تھوڑے سے خون سے نہیں بجھ سکتی تھی جو ایک جان لینے والی گولی کے زخم سے بہتا ہے۔ اس نے دلاور کو اتنی بار قتل کیا کہ اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل جائے اور ایک نظریہ میرا یہ بھی ہے کہ اس قاتل نے خنجر سے دل پہ وار نہیں کیا اور ریوالور کی سب گولیاں سینے میں نہیں اتاریں۔ اس نے ایک شیطانی دماغ کو نیست و نابود کیا۔ جسم کے اس حصے کو تباہ کیا جو اس کے خیال میں سب سے زیادہ مجرم تھا۔"

محسن کی بات نے مجھے متوجہ کر لیا تھا۔ اس کی توجیہہ جذباتی نہیں عقلی تھی اور اس کی سوچ کا انداز میری سوچ کے مقابلے میں زیادہ ٹھوس اور منطقی تھا۔ "تیرے خیال میں ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟ ہمارے علاوہ؟" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں سب سے پہلے الف دین کا نام آتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اسی جنون کی کیفیت میں وہ فتح شیر کا سر کاٹ گیا تھا۔ طافو کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس کی لاش پر ڈھائے جانے والے غیر انسانی مظالم کے ذکر نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔ اس کی وحشت فتح شیر سے بدلہ لے کر کم نہیں ہوئی تھی۔ دیوانے کے دماغ میں ایک خیال سما جائے تو اسے کون سمجھائے۔ اس کی اپنی عقل سو فیصد یقین کے ساتھ خود کو حق بجانب قرار دیتی ہو تو وہ دنیا کی کیسے سُنے۔ اس نے بیوی بچوں کے ساتھ فرار اختیار کیا تو صرف اس لیے کہ کہیں جذباتی رشتوں کا خیال اس کے ارادوں کو کمزور نہ کر دے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا تو پہلے سب رشتوں کو ختم کرتا۔ پھر دلاور کو اور اس کے بعد اپنے آپ کو مگر وہ پاگل نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک خیال سے مغلوب ہو گیا تھا چنانچہ اس نے عقل کی ساری سپاہ کو ایک محاذ پر مجتمع کر لیا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جیسے طافو کے قاتل نہیں پکڑے گئے تھے، ایسے ہی دلاور کے قاتل کو کبھی کوئی نہ پکڑ سکے گا۔ طافو کا جسدِ خاکی بھی سامانِ عبرت بنا تھا اور دلاور کو بھی اس نے تماشائے عبرت بنا دیا۔"

"شاید تو ٹھیک ہی کہتا ہے!" میں نے کہا۔ "دشمن تو بہت تھے دلاور کے مگر ان میں الف دین کوئی نہ تھا۔ ہاں... اور اسی لیے یہ جرم خود بخود ہمارے نام لکھا جائے گا۔" محسن تلخی سے بولا۔ "الف دین کو بھلا کون جانتا ہے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ الف دین نے ہمارے لیے سلامتی کے در بند کر دیے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر دلاور زندہ رہتا تو شاید کسی دن ہم اُسے دنیا کی عدالت میں بھی ثبوت اور شہادتوں کے ساتھ گھسیٹ لاتے اور خود اس کی زبان سے اعتراف کرا لیتے کہ مجرم کون تھا۔ اب تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"میرا ذہن اس خبر کے بین السطور کچھ اور پڑھ سکتا ہے۔" محسن نے پھر اخبار پہ نظر جما کے کہا۔ "یعنی وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔"

"ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نہ ہم مدعی ہیں نہ منصف۔"

"حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مختلف زاویے سے دیکھا جائے تو حقیقت بدل جائے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تو ہو سکتا ہے کہ نگاہ کا زاویہ بدل جائے تو حقیقت کا ظاہری روپ بدل جائے لیکن حقیقت تو وہی رہتی ہے۔ زمین کی سطح پہ کھڑے ہو کر دیکھنے سے زمین نہ گول نظر آتی ہے اور نہ گردش میں محسوس ہوتی ہے۔ خلا کی بلندی سے یہ گول چمکتا ہوا سیارہ لگتی ہے۔ کبھی آدمی مریخ سے دیکھے گا تو کچھ اور لگے گی۔"

"بجا ارشاد! اب اس خبر کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پہلے خبر کی لاش پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کوئی خاص بات؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "خاص بات تو خود خبر ہے۔"

"کیا تو نے اس سے پہلے قتل کی کسی واردات کا اتنا تفصیلی ذکر پڑھا ہے؟" محسن نے کہا۔ "جو کچھ کل آئے گا وہ اس سے بھی زیادہ ہو گا اور اس میں دلاور بمقابلہ سکندر کیس کی تفصیلات ایک خاص زاویے سے پیش کی جائیں گی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ قتل کی خبر نہیں، قتل پیا ایک فیچر ہے جو کسی رپورٹر نے خاصی محنت سے تیار کیا ہے اور ظاہر ہے جب کوئی غیر ضروری محنت کرتا ہے تو بلا وجہ نہیں کرتا۔ اسے محنت کا معقول معاوضہ دیا گیا ہو گا۔"

"اس خیال یا مفروضے کی کوئی اہمیت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے مسترد کرتا ہوں۔"

"تو مجھے یہ بتا کہ اس فیچر میں تصویر کیوں نہیں ہے؟" محسن نے اخبار اٹھا کے کہا۔ "کیا اخبار والوں کو دلاور کی تصویر نہیں مل سکی تھی؟ عموماً مقتول کی تصویر بھی خبر کے ساتھ شائع ہوتی ہے، مردہ حالت میں یا زخمی چہرے کے ساتھ۔"

"اس کیس میں چہرہ اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ تصویر سے شناخت کیا جا سکے۔" میں نے کہا۔ "تصویر اتارنے سے فائدہ کیا ہوتا اور اگر..."

"اسٹاپ! پہلے یہی نکتہ توجہ طلب ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ چہرہ شناخت کے قابل نہیں رہا۔"

ایک دم مجھ پہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "تو پاگل ہو گیا ہے؟ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ دلاور کا چہرہ نہیں!"

"کیا یہ ناممکن ہے کہ چہرہ کسی اور کا ہو؟" محسن نے کہا۔ "شکل نہیں مگر کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ناممکن بھی ہے۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دلاور کی شناخت بغیر چہرے کے بھی ہو گئی ہے۔ پولیس نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور کو قتل کر دیا گیا ہے... اخبار بھی ذمے دار ہے..."

"کس نے شناخت کیا ہے چوہدری دلاور کو؟" محسن نے میز پر مکا مارا۔ "اس کے چوکیدار نے اور اس نے شناخت کی بنیاد بنایا ہے حالات اور واقعات کو۔ چونکہ گزشتہ شب گاڑی میں چوہدری دلاور ہی آیا تھا اور لاش بھی اس کے بیڈ روم میں پائی گئی۔ اس کے کپڑوں میں، اس کی گھڑی انگوٹھی کے ساتھ اور وہ لاش دلاور کے قد و قامت کے مطابق بھی ہے اس لیے وہ دلاور کے سوا کون ہو سکتا ہے اور کون چاہے گا کہ اس کے گھر میں کمرے میں اسی کے کپڑوں میں بولے اور فقط چاہنے سے کیا ہوتا ہے، میں اگر چاہوں کہ ہو بہو دلاور بن کے اس کے گھر میں اس کی خواب گاہ میں اسی کا لباس اختیار کروں اور پھر یوں مر جاؤں کہ شناخت ممکن نہ رہے... تو کیا یہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے!" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن اگر دلاور یہ چاہے کہ دلاور مر جائے تو ہو سکتا ہے۔" محسن نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تیرا مطلب ہے دلاور نے قتل کا یہ ڈراما ہوا سٹیج کیا ہے؟ وہ زندہ ہے اور اس نے کسی کو مار کر اپنی جگہ ڈال دیا ہے؟" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"میرا بالکل یہی مطلب ہے۔ میری ساتویں حس کہتی ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔" محسن بولا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کے دو چکر لگائے اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ "مجھے سخت شک ہو رہا ہے کہ اگر میں پاگل نہیں ہوا ہوں تو پھر تو پاگل ہو گیا ہے۔ باقی دنیا ویسی ہی ہے جیسی تھی۔"

"باقی دنیا پاگل ہے جو اس خبر پہ یقین کر چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "میں نے ابھی تک اس میں سے سچائی کے پچاس فیصد عنصر کو خارج کر دیا ہے... یا یوں سمجھ لے کہ اس میں پچاس فیصد جھوٹ کو تلاش کر لیا ہے۔ یہ خود تو بھی تسلیم کر چکا ہے کہ حقیقت کبھی پچاس فیصد نہیں ہوتی۔"

"دلاور یہ ڈراما اپنے لواحقین کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔ مگر لواحقین تو کسی نامعلوم عزیز کے گھر میں ہیں۔" محسن بولا۔ "اور انتظار کر رہے ہیں کہ مری میں برف گرنی شروع ہو تو وہ آگے جائیں۔ افسوس کہ وہ لاش کی شناخت کے لیے دستیاب نہیں۔"

"مگر آج نہیں تو کل انھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"چوکیدار اَن پڑھ ہے، اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا مگر مجھے معلوم ہے کہ کل سے مری میں برف پڑ رہی ہے۔" محسن بولا۔ "وہ واپس آ کے حیران یا پریشان ہو سکتے ہیں کہ انھیں یہ خبر نہیں ملی۔ مری کے اسنو فال میں اخبار نہیں پہنچتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری دلاور ان کے ساتھ ہی لوٹ آئے اور ان سے زیادہ حیران پریشان ہو کہ میرے گھر میں میرے نام سے کوئی مقتول ہو گیا اور پولیس بعد میں یہ گتھی سلجھاتی رہے کہ وہ کون تھا جس نے ایسا کیا؟ اور کیا تو کیوں کیا؟ ظاہر ہے ان سوالات کا دلاور کیسے جواب دے سکتا ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ مری میں برف باری کا نظارہ کر رہا تھا۔"

"پولیس چوکیدار کو پیش کرے گی۔ کیوں سکندر بادشاہ؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"چوکیدار کہے گا سوری! مجھ سے شناخت میں غلطی ہو گئی۔" محسن ہنسا۔ "اور دلاور کہے گا سوری! میں تم کو بتا کے نہیں جا سکا، میں اپنی گاڑی دفتر میں چھوڑ گیا تھا۔"

"پولیس سوال کرے گی کہ آپ اپنی گھڑی اور انگوٹھی گھر پہ چھوڑ گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"دلاور جواب دے گا کہ میرے پاس تین گھڑیاں اور چار انگوٹھیاں ہیں۔ میں اگر ایک بھی نہ پہنوں تو میری مرضی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اُلو کے پٹھے! سوال جواب کیسے جائے گا" یہ نہیں بتائے گا کہ دلاور کو اپنے قتل کا یہ ڈراما کر کے آخر کیا ملے گا؟" میں نے چلا کر کہا۔ "کیا فائدہ ہو گا اُسے؟"

"یہ تو ایک جواری بھی نہیں جانتا کہ کچھ داؤ پر لگانے سے کیا ملے گا۔" محسن نے کہا۔ "لیکن فرض کرو ہم اس خبر پر یقین کر لیتے ہیں یا اس کی صداقت جاننا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے ہم میں سے کوئی دلاور کی کوٹھی کا رُخ کرے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب سانپ مر گیا ہے تو بل میں انگلی ڈالنے سے کیا ڈرنا۔ ہم خود کو ماشاء اللہ بہت ذہین، چالاک اور بہادر بھی سمجھتے ہیں۔ ہم ہاتھ ملائیں گے، ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے کہ بڑا دلاور بنتا تھا، مارا گیا اسی خوش فہمی میں۔ اور ہم اس خوشی کے علاوہ خوش فہمی میں اگر دلاور کے گھر کے قریب پھٹکے یا جنازے میں شامل ہوئے اور قبرستان گئے تو پکڑوانے والے ہمیں فوراً پکڑوا دیں گے۔ یہ تو بعد میں ثابت ہو ہی جائے گا کہ الحمدللہ چوہدری دلاور بخیر و عافیت ہیں۔ اس جال میں پھنس کر ہم بخیر و عافیت نہیں رہیں گے۔"

"تیری بات سے میں قائل ہو جاتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ کا جال ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہاں بیٹھ کر صرف الفاظ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے تب بھی اور جھوٹ ہے تب بھی۔"

"تصدیق تو یقیناً کرنی پڑے گی۔" محسن بولا۔ "لیکن ہم بھی جوابی چال سوچ سمجھ کر چلیں گے۔ وہاں دلاور کی جگہ کوئی اور مر گیا ہے تو ہماری جگہ بھی کوئی اور پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً اپنے مرزا غالب ہیں۔"

"غالب نے دلاور کو قریب سے نہیں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے صرف ہم پہچان سکتے ہیں اور یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں کون کون ہمارے لیے چشم براہ ہے۔ استاد پیڈرو اور نواب خسرو جمشید گاما ماجھی — اس کا منیجر اور دلاور کے سب دست راست۔ جب جنازہ چوہدری دلاور کا ہو گا، تو یہ صورتیں تو ضرور نظر آئیں گی۔ خواہ وفات اصلی ہو یا نقلی۔"

"بس تو ایسا کرتے ہیں کہ بقلم خود چلتے ہیں اور چوہدری صاحب کی آخری رسوم میں شرکت فرما کے ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ اگر یہ دامِ اجل ہمارے لیے پھیلایا گیا ہو گا تو سب شکاری چوکنے ہوں گے۔"

"ہم تسلیم بجا لائیں گے اور کہیں گے کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" میں نے کہا۔ "آخر شرافت اور مروت بھی کوئی چیز ہے۔ وہ سب قبرستان سے گھر چلے جائیں گے اور ہم بڑے گھر۔"

"میں نے جو شعر ابھی پڑھا تھا اس پر دوبارہ غور فرمائیے۔" محسن بولا۔ "اس میں تماشائے اہلِ کرم کے ساتھ فقیرانہ بھیس کا بھی ذکر تھا۔ ہم ایسا بھیس بدلیں گے کہ خدانخواستہ قضا و... تو ایک بار خود فرشتۂ اجل بھی دھوکا کھا جائے۔"

"لیکن بھیس بدلنے کا فن مجھے تو نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "اب تک جو تھوڑا بہت ظاہری حلیہ بدل کے کام چلا... وہ مذاق تھا۔ صورت بدلنا اتنا آسان نہیں۔ وہاں ہر نظر کو تلاش ہو گی تو چھپنا محال ہو گا۔"

"ویسے تو میک اپ صرف خواتین ہی شوقیہ کرتی ہیں۔" محسن بولا۔ "لیکن فلم، اسٹیج اور ٹیلی وژن کی دنیا میں کچھ ایسے ماہر ہوتے ہیں جو میک اپ مین کہلاتے ہیں اور ایسا کمالِ فن رکھتے ہیں کہ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا کے دکھا دیں۔ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان کر دیں یہاں تک کہ ہم چاہیں تو تمھیں چوہدری دلاور اور استاد پیڈرو کا ایسا نقشِ ثانی بنا دیں کہ خود دلاور اور پیڈرو چکرا جائیں اور مشکل میں پڑ جائیں کہ اصلی کون ہے نقلی کون۔"

"تو جانتا ہے کسی ایسے ماہرِ فن کو؟" میں نے کہا۔ "ایک بات مت بھولنا نورِ چشم کہ یہاں جو کچھ ہم سوچ رہے ہیں ناہی دشمن بھی سوچ سکتے ہیں اور انکل رضوی بھی سوچ سکتے ہیں۔ انکل رضوی کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ان کی نظر چہروں کا ایکس رے کر سکتی ہے۔ وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچیں گے کیونکہ وہ بھی کسی الف دین کو نہیں جانتے اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ واردات ہم ہی کر سکتے ہیں۔"

"وہ دلاور کی موت پر یقین کر سکتے ہیں مگر یہ نہیں تسلیم کر سکتے کہ اس قتل میں ہمارا ہاتھ ہو گا۔" محسن نے پورے وثوق سے کہا۔ "وہ ہماری فطرت سے واقف ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ہم اپنے دفاع میں تو قتل کر سکتے ہیں لیکن کسی سوتے ہوئے شخص کو اتنی بے دردی سے ہلاک نہیں کر سکتے۔ ہم اتنے سفاک نہیں ہیں۔ تاہم ان سے وہاں ملاقات یقینی ہے۔"

"میرا خیال ہے ابھی تو لاش پولیس کے قبضے میں ہی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "وہ پوسٹ مارٹم کی قانونی کارروائی بھی... کریں گے۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہو گا کہ ہم اسپتال میں ہی چوہدری صاحب کے درشن کر لیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "پہلے وہاں جا کے دیکھتے ہیں کہ وارث بن کے کون آیا ہے اور لاش کون لے کر جاتا ہے۔ وہاں ناکامی ہوئی تو پھر گھر چلیں گے۔ وہ ہمارا انتظار کریں گے اور جنازہ رات سے پہلے نہیں اٹھائیں گے۔"

"رات ہونے میں کتنی دیر ہے۔ کیا اتنے کم وقت میں ہمارا چہرہ بدلا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے مرزا غالب پر انحصار کر رہا ہوں۔ اس کی ہر جگہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کے فلیٹ میں چلتے ہیں یا اس کے آفس سے معلوم کرتے ہیں۔ ویسے تو اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور کوئی وقت نہیں کہ کب کہاں ملے گا۔ پھر بھی کوشش کر کے دیکھنے میں ہرج نہیں۔"

"مجھے رابعہ سے بھی بات کرنی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کی گاڑی کہاں ہے؟"

"وہیں کھڑی ہے۔" محسن بولا۔ "ہم اس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔"

"شمشاد کی گاڑی کو کہاں چھوڑا تھا؟" میں نے کہا۔

"اس کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر۔ اب تک اسے مل چکی ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"رابعہ کو بتا دیتے ہیں کہ ہم اس کی گاڑی استعمال نہیں کر سکے۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہے وہ خود بھی گاڑی لینے نہ جائے۔ گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دے، پولیس پہنچا دے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ دلاور کے قتل کی خبر بھی اُسے مل ہی چکی ہو گی۔ اسے یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہمارا پروگرام کیا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر منظر سیدھا دلاور کے گھر چلا جائے تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مشہور آدمی کے جنازے میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے۔"

"اگر رابعہ ہمیں کہیں سے پک اپ کر لے تو بہت سی باتیں ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "اس کو یہ بتانا ہے کہ میں نے اپنے پرانے گھر میں جا کے کیا دیکھا اور اُس سے پوچھنا ہے کہ وہ اپنا پیسہ اس گھر کو خریدنے میں کیوں خرچ کر رہی ہے جس میں رہنا شاید ہمارے نصیب میں نہیں۔"

"نصیب کا لکھا کون جانتا ہے سکندر بادشاہ!" استاد ٹیڈی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "اب ہم کو ہی دیکھو۔ کل کہاں تھے آج کہاں ہیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی اور رابعہ کی نیت اچھی ہے تو نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا۔"

باہر سے بہت اونچی آواز میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ دو افراد کی آواز نمایاں تھی اور وہ نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہے تھے مگر وہی چھٹی حس جو انسانوں اور حیوانوں کو خطرات سے نمٹنے کے لیے قبل از وقت ہوشیار کر دیتی ہے، میرے کام آئی۔ "یہ شور کیسا ہے میاں خوجی؟" میں نے کہا۔

"میں دیکھتا ہوں!" خوجی نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"اس ہوٹل کا منیجر میں ہوں۔" دروازہ کھلتے ہی آواز صاف سنائی دی۔ "میں بتا چکا ہوں کہ یہاں کوئی نہیں۔"

"ہمارے پاس وارنٹ ہے۔" دوسری آواز نے کہا۔ "بندہ نہیں ملا تو ہم چلے جائیں گے۔"

"عجیب تماشا ہے! جہاں دل چاہا وارنٹ لے کر گھس گئے! ارے بھائی یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔ آپ لوگوں کا یہاں اس طرح تشریف لانا ہی بدنامی کا سبب بن جاتا ہے۔ میں تو کسی پولیس والے کو کرائے پر کمرہ نہیں دیتا۔ اگر وہ وردی میں ہو تو صاف انکار کر دیتا ہوں کہ کمرہ خالی نہیں ہے۔" منیجر نے برہمی سے کہا۔

"جس دن میں آؤں گا اُس دن دیکھوں گا۔" دوسرے شخص نے گرج کر کہا۔ "سارے کمرے خالی ملیں گے۔"

"ہاں ہاں! اپنے ساتھ توپ لے آنا۔" منیجر بولا۔ "جیل خانے کی گاڑی لے آنا۔ مسافروں کو اس میں بھر کر لے جانا اور توپ چلا کے ہوٹل گرا دینا۔ مجھے پھانسی لگا دینا یہیں۔ تم لوگ سب کچھ کر سکتے ہو اور کرتے ہو۔ بادشاہت ہے تمھاری۔ اسی لیے تو شریف آدمی تمھارے سائے سے بھی دور رہنا چاہتا ہے۔"

"بک بک مت کرو۔ یہ دوسرا کمرہ کھلواؤ۔"

خوجی کے اشارے سے قبل ہی صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔ پولیس وہاں کسی کو تلاش کرتی ہوئی پہنچی تھی۔ ابھی تک میں نے مجرم کا نام نہیں سُنا تھا لیکن سب سے بڑا مجرم میں خود تھا۔ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے، وہ میری گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے تھے۔ اگر وارنٹ کسی اور کے لیے تھے تب بھی میں محفوظ نہیں تھا۔ اسے تو پولیس اپنی خوش قسمتی شمار کرتی کہ وہ چھوٹے مجرم کو پکڑنے گئے تھے اور ہاتھ آ گیا بڑا مجرم۔

"کمرہ کس کے نام پر ہے؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے، ٹیڈی کا نام کیا لکھوایا ہے۔"

"خواجہ نیک محمد۔" محسن بولا۔ "کبیر خان تو لکھوا نہیں سکتا تھا۔ امیر خان بھی مجھے ٹھیک نہیں لگا تھا۔"

"پولیس تو یہاں بھی آ جائے گی سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے بدحواسی میں کہا۔

"کل کتنے آدمی ہیں باہر؟" میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

"تین تو پولیس والے تھے۔ رائفل لیے ہوئے۔" وہ بولا۔ "ایک تھانیدار قسم کی چیز تھا۔ ہوٹل کا منیجر تھا اور اس کے ساتھ دو بیرے تھے۔ آٹھ دس آدمی تھے۔"

"دروازے سے باہر نکلنے کی تو کوئی صورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم ذرا ہمت سے اور عقل سے کام لو۔ ابھی دروازہ بند رکھو اور ان کے دروازہ بجانے کا انتظار کرو۔ ہم یہاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بیٹھے ہیں تب تک؟"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے بوکھلا کے کہا۔ "مقابلہ کرو گے ان کا؟"

"نہیں۔ جب وہ دستک دیں تو تم ظاہر کرنا کہ سوتے سے اُٹھے ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم کھڑکی کے راستے باہر چلے جائیں تو پردہ برابر کر دینا۔ ان پر خفا ہونا کہ..."

"وہ میں کر لوں گا۔ لیکن تم کھڑکی سے کیسے نکلو گے؟ کمرہ تو چوتھی منزل پر ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"تم ہماری فکر مت کرو۔ ہم پیراشوٹ کے بغیر بھی کود جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پچاس فٹ کیا ہیں؟"

"تمھاری ہڈی پسلی سلامت نہیں رہے گی۔" ٹیڈی کا رنگ اُڑ گیا مگر میں دیکھ چکا تھا کہ کھڑکی سے سات فٹ نیچے ایک چھجا ہے جو تیسری منزل کے تمام کمروں کی کھڑکیوں کے اوپر سے گزرتا ہے۔ دو فٹ چوڑے اس شیلف نما سائبان کا مقصد بارش کو براہِ راست کھڑکی پر گرنے سے روکنا تھا لیکن ہوٹل میں رہنے والوں نے اُسے کوڑے دان کے طور پر بھی استعمال کیا تھا اور ہر فاضل چیز جو سڑک پر یا کسی راہگیر کے سر پر نہیں گری تھی، وہ چھجے پر جمع تھی۔

"ہم لندن میں تھے تو پارٹ ٹائم سرکس میں یہی کام کرتے تھے۔" محسن نے کہا۔ اس کے اطمینان سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی فرار کے اس راستے سے واقف ہے۔

"وہ تو سو فٹ کی بلندی ہوتی تھی جہاں سے ہم کپڑوں میں آگ لگا کے چھلانگ مارتے تھے اور سیدھے پانی کے تالاب میں غڑاپ۔" میں نے کہا۔ "اب بھی ہم چاہیں تو یہ پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔"

"اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔" باہر سے مینجر کی برہم آواز آئی۔ "دروازہ مقفل ہے۔"

"مجرم باہر سے دروازے مقفل کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔" زیادہ تجربہ کار اور خرانٹ انسپکٹر نے کہا۔

"بیٹھ جاتے ہوں گے مگر یہ ہوٹل ہے۔ جو کمرہ بُک نہ ہو اس کی چابی میرے پاس رہتی ہے۔" مینجر بولا۔

"یار گولی مارو چابی کو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔" انسپکٹر نے گرم ہو کے کہا۔ "ورنہ میں حکم دیتا ہوں دروازہ توڑنے کا۔"

"ایسا نارزن تو مجھے نہیں لگتا تم سب میں سے کوئی۔" مینجر نے طنزیہ کہا۔ "لیکن دیکھ لو۔ میں چابی منگواتا ہوں۔ یہ دروازے کاغذ کے بنے ہوئے نہیں ہیں تھانیدار صاحب۔ مارو ٹکر اگر دل چاہتا ہے تو۔"

"تم ضرورت سے زیادہ بھونکتے ہو۔" تھانیدار مشتعل ہو کے بولا۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔" مینجر نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ "تم کو نہیں معلوم کہ یہاں کون کون آتا ہے اور اس ہوٹل کے مالک کسے جانتے ہیں۔ تم تو مجھے بھی نہیں جانتے لیکن میں تم جیسے دس انسپکٹروں کو جانتا ہوں جو یہاں آئے اور گئے۔ تمھاری تنخواہ سے زیادہ یہاں ایک ویٹر کو تنخواہ ملتی ہے۔ مگر وہ رٹپ لیتے ہیں اور تم رشوت لیتے ہو۔"

"اچھی دلچسپ لڑائی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"مینجر بھی سیر کے مقابلے میں سوا سیر ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہر ہوٹل کے مینجر کو نڈر اور شہ زور بننا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھے خاصے ہوٹل کے مالک با اثر قسم کے بدمعاشوں کو یہ فرض سونپ دیتے ہیں تاکہ ہوٹل میں امن و امان رہے۔ غلط قسم کے لوگ ہوٹل میں داخل نہ ہونے پائیں اور ہو جائیں تو کوئی غلط کام نہ کر سکیں۔ مینجر، پولیس کی مدد کے بغیر ہی ان سے نمٹ لے۔ بدنام ہوٹل چلتا نہیں۔"

"اس کے علاوہ یہ لوگ پولیس کو پیسہ دیتے ہیں۔ ہر تھانے کو اپنے علاقے سے اسی بات کا وظیفہ ملتا ہے کہ جہاں کسی ہوٹل میں غیر قانونی یا غیر اخلاقی دھندے چلتے ہوں وہاں قدم بھی نہ رکھیں۔" محسن بولا۔ "اور یہ لوگ جن کا کھائیں انھی پر غرّائیں کو کون برداشت کر سکتا ہے۔"

"غالباً اس ہوٹل کا مینجر ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو غلط کام نہیں کرتا، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔"

"ممکن ہے اس کو اپنے اور مالکوں کے اثر و رسوخ پر اعتماد ہو۔" محسن بولا اور اس کا ثبوت فوراً ہی مل گیا۔

"لو دیکھ لو۔ چادر جھاڑ لو۔ تکیے کے اندر دیکھ لو۔ میز کے خانوں میں جھانک لو۔" مینجر نے دروازہ کھول کے کہا۔

"تم قانونی کارروائی میں رخنہ ڈال رہے ہو۔ میں تم کو بھی گرفتار کر لوں گا۔" انسپکٹر نے دہاڑ کر کہا۔

"پھر کیا ہو گا؟" مینجر نے تمسخر اُڑانے کے انداز میں کہا۔ "ابھی فون آ جائے گا تمھارے ڈی آئی جی صاحب کا تو تمھاری ساری اکڑ فوں نکل جائے گی۔ میں ان سے فون پر بات کر چکا ہوں کہ تم شریف مسافروں کو پریشان کر رہے ہو۔ اخباری بیان دے دیا تا میں نے کہ تم نے مسافروں کے کمروں سے سامان اٹھایا ہے اور کسی مسافر نے تائید کر دی نا تو یہ دونوں پھول اتر جائیں گے کندھے پر سے۔ مجھے تو مالک دس منٹ میں چھڑا کے پھر یہیں بٹھا دیں

گے۔ میری اور تمھاری نوکری میں فرق ہے۔"

"دیکھو مینجر صاحب! ہماری بھی مجبوری ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "ہمیں مخبر نے اطلاع دی ہے کہ اس نے ایک اشتہاری مجرم سکندر بخت کو خود یہاں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ہم تصدیق کیے بغیر کیسے رپورٹ دے سکتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ بعد میں اس نے کوئی ہنگامہ یا خون خرابہ کیا تو تمھارے لیے بھی پریشانی ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔ اس ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟"

"اس میں... خواجہ نیک محمد۔" مینجر نے غالباً رجسٹر سے تصدیق کر کے بتایا۔ انسپکٹر کی وضاحت کے بعد اس کا رویہ بھی مصالحت آمیز ہو گیا تھا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں کھڑکی کی طرف لپکے۔

"تم کھڑکی بند کرو اور پردے ڈال کے لائٹ بجھا دو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور ٹیڈی نے سر ہلایا۔ ہمارے پیچھے دروازے پر دستک ہوئی۔ محسن چوکھٹ سے لٹک کر نیچے اتر چکا تھا۔ میرے لٹکتے ہی ٹیڈی نے آواز پیدا کیے بغیر کھڑکی بند کر دی۔

میں اور محسن اب زمین سے چالیس فٹ اوپر دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ جس چھجے پر ہمارے قدم تھے اس کی چوڑائی اتنی نہیں تھی کہ ہم اس پر سیدھے چل سکیں۔ بہت نیچے ہر قسم کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں اور انسانوں کی بستی کھلونوں کی دنیا نظر آتی تھیں۔ راہ چلنے والوں میں سے کوئی اوپر مُنہ اٹھا کے نہیں چل رہا تھا لیکن بہت سے لوگ دکانوں کے تھڑوں پر اور گھر کے چبوتروں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سر اٹھاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ اس کے علاوہ تنگ سڑک کے پار دو منزلہ سہ منزلہ مکان بھی تھے۔ یہ شام کا وقت تھا اور سردی بڑھ گئی تھی اس لیے چھت پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور کھڑکیاں بھی بند کر دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود ہمارے دیکھے جانے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ میں نے محسن کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیلا کے سرکنے لگا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بلندی کے خوف کا نفسیاتی مرض نہیں تھا، ورنہ چکّر آ جاتا تو ہم پہلے بجلی کے تاروں کو شارٹ سرکٹ کرتے۔ برقی دفات پاتے اور تار توڑ کے گھروں میں اندھیرا کرتے ہوئے سڑک پر گرتے تو ہماری ہڈیاں پس از مرگ سرمہ ہو جاتیں۔

ہم ساتھ والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ چکے تھے جب کسی نے نیچے سے چیخ کر کہا۔ "او ئے اے کی ہو ریا ہے۔ مرن دی صلاح ہے؟" اور میں نے دیکھا تو نصف درجن کے قریب افراد اوپر مُنہ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ لہرا کے اشارے سے سب خیریت ہے کا مفہوم واضح کرنا چاہا اور مسکرایا بھی مگر اتنے نیچے کھڑے ہوئے لوگ تشویش میں مبتلا تھے کہ ہم کون ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں نشے میں سمجھا ہو گا۔ کچھ نے کہا ہو گا کہ پاگل ہیں اور خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور کچھ یہ بھی سمجھے ہوں گے کہ ہم بل ادا کیے بغیر ہوٹل سے فرار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی ہمارے اشاروں سے مطمئن نہیں ہوا اور دیکھتے دیکھتے وہاں اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر شیشے پر آہستہ سے مکّا مارا۔ شیشے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ محسن نے زیادہ عقلمندی سے کام لیا اور ہاتھ پر رومال لپیٹ کر پھر زیادہ قوت کے ساتھ مکّا مارا۔ چٹخنے کے بجائے شیشہ ٹوٹ کر اندر جا گرا اور اس کا چھناکا ہمیں بم کے دھماکے سے زیادہ محسوس ہوا۔ میں نے شیشے کے خلا میں ہاتھ ڈال کے چٹخنی کھولی اور کھڑکی کو تھوڑا سا دھکیلا لیکن اس کے پٹ مضبوطی سے ملے رہے۔ محسن نے دوسرے پٹ کی چٹخنی کھولی۔ نیچے سے مجمع اب اونچی اونچی آوازیں لگا رہا تھا اور یہ ضروری تھا کہ ہم فوراً اندر غائب ہو جائیں۔ نچلی منزلوں کے رہنے والے اس شور و غل پر متوجہ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی کھڑکی سے سر نکال کے اوپر دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن ان کے اور ہمارے درمیان چھجا حائل تھا۔ تاہم ہوٹل میں مقیم کچھ لوگ یقیناً سمجھ چکے تھے کہ اوپر کوئی گڑبڑ ہے جدھر مجمع اشارے کر رہا ہے۔

محسن نے چوکھٹ تھام کر کھڑکی کو کندھے سے دھکیلا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ اوپر سے بھی دونوں پٹ چٹخنی لگا کے بند کیے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا کام بہت مشکل ہو جاتا۔ زیادہ طاقت صرف کر کے دھکا لگانے میں ڈر تھا کہ ہم اچھل کر نیچے نہ جا گریں۔ دوسری مرتبہ کی کوشش سے اندازہ ہوا کہ پٹ کچھ جام ہیں۔ تیسری دفعہ دھکیلنے سے کھڑکی کھل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے ہاتھوں سے چوکھٹ کو تھاما اور اندر اتر گیا۔ محسن میرے پیچھے پیچھے آیا اور میں نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔

"لوگوں نے دیکھ لیا، یہ بہت بُرا ہوا۔" محسن بولا۔

"لوگوں سے زیادہ ہوٹل کی نچلی منزل پر رہنے والوں سے خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فون اٹھا کے کاؤنٹر پر کسی سے کہہ دیں گے کہ اوپر کیا ہو رہا ہے اور ہوٹل والے باہر نکل کر دیکھیں گے تو انھیں سب معلوم ہو جائے گا۔"

"پولیس ابھی ہوٹل میں ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ فوراً تاڑ لیں گے کہ اصل بات کیا ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" محسن بولا۔ "ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہیں۔ اس کمرے سے کیسے نکلیں گے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کمرے سے باہر نکلنا کیا مشکل ہے۔ کمرے باہر سے مقفل ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔" اندر سے تو چابی کے بغیر کھولے جا سکتے ہیں۔ ہوٹل سے نکلنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"بس جی ہو گئی تسلی؟" میں نے منیجر کی آواز سنی۔" میں جو کہہ رہا تھا کہ اس نام اور حلیے کا کوئی آدمی میرے سامنے سے نہیں گزرا۔" اس کے ساتھ ہی بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور میں نے ڈور لاک کے سوراخ پہ آنکھ رکھ کے دیکھا تو وارنٹ لے کر آنے والے واپس جا رہے تھے۔ انسپکٹر اور منیجر کی تکرار جاری تھی لیکن اب الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ یہ آوازیں دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں تو میں نے آہستہ سے دروازے کے گول ہینڈل کو گھمایا اور کوریڈور میں جھانک کر دیکھا۔ میرا اشارہ پاتے ہی محسن آگے بڑھا اور ہم باہر نکل آئے۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے پھر اپنے کمرے کا دروازہ بجایا، دروازہ فوراً کھل گیا۔ یوں جیسے ٹیڈی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"تم نے پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تمہارے سوا اب کوئی آ ہی نہیں سکتا۔" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔" میں دیکھ رہا تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا دیکھ رہے تھے تم؟"

"تالے کے سوراخ میں سے جھانک رہا تھا۔" ٹیڈی بولا۔

"اگر ہم نیچے کود گئے ہوتے تو اتنی جلدی لوٹ کر کیسے آ سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"ابے سکندر بادشاہ! اب ہم بے وقوف ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنا تم ہمیں بناتے ہو۔" ٹیڈی بولا۔" جب پولیس چلی گئی تھی تو میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا تھا۔ اس وقت تم دونوں ساتھ والے کمرے میں گھس رہے تھے۔"

"میاں خوجی! ہم تو سمجھے تھے مصیبت ٹل گئی لیکن نیچے لوگوں نے ہمارا سرکس مفت میں دیکھ لیا۔" محسن بولا۔

"ابھی پولیس نیچے پہنچے گی تو انھیں رپورٹ ملے گی کہ اوپر گڑبڑ ہے اور وہ باہر جا کے تفتیش کریں گے تو کوئی چشم دید گواہ بتا دے گا کہ دو بازیگر کس کمرے سے نکلے تھے اور کدھر گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔

"تم تو فوراً نکل جاؤ۔" میں نے کہا۔" باہر جاتے وقت چابی کاؤنٹر پر دے جانا۔ میں ویٹر کی وردی بدل کر نکلتا ہوں اور محسن کے ساتھ آتا ہوں۔ محسن لباس ہی بدل لے گا تو پہچانا نہیں جائے گا۔ تماشا دیکھنے والے دونوں کا حلیہ بتائیں گے تو یہ بھی بتائیں گے کہ انھوں نے کیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہم دروازہ مقفل کر آئیں گے... تم جاؤ۔"

"کہاں جاؤں۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟" وہ گھبراہٹ میں بولا۔

"رتن سینما کے اندر پوسٹر دیکھتے رہنا۔ ہم وہیں آ جائیں گے۔" میں نے اسے باہر دھکیل دیا اور سوٹ کیس کھینچ کر بیڈ کے نیچے سے نکالا۔ محسن نے اپنے لیے جو لباس منتخب کیا وہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے کریم کلر کی پتلون اور نیلی جرسی اتار کے دوسری جرسی پہن لی جس پر زرد اور سرخ آڑی دھاریاں تھیں اور سیاہ پتلون چڑھائی۔ اتنی دیر میں اپنے کپڑے اتار کے میں نے ویٹر کی سفید وردی پہنی جو مدت سے محفوظ پڑی تھی۔ اس پر ہوٹل کا نمبر اور مونوگرام نہیں تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اس وقت پولیس کی موجودگی کے باعث جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے اس میں کوئی میری صورت یا وردی کے بارے میں غور نہیں کرے گا۔ بڑی عجلت میں اپنے کپڑے سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد میں نے سوٹ کیس کو پھر بیڈ کے نیچے کیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی اور میں اپنے حلیے سے مطمئن تھا۔ ڈر یہ تھا کہ کسی بھی وقت پولیس پھر دوڑتی ہوئی اوپر آ جائے گی۔ میں کمرے سے ایک منٹ پہلے نکلا اور جب میں زینے سے اتر رہا تھا تو میں نے پولیس انسپکٹر کو دو سپاہیوں کے ساتھ اوپر لپکتے دیکھا۔ اسی وقت محسن کمرے سے نکلا اور اس نے دروازہ بند کیا۔ آٹومیٹک ڈور لاک سے کمرہ مقفل ہو گیا۔ میں سر جھکائے نیچے چلتا گیا۔ ظاہری اطمینان کے باوجود میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری آزادی اور اسیری کے درمیان کہیں ایک نامعلوم نظر آنے والا لمحہ حائل تھا۔ اگر اس لمحے میں کوئی بھی مجھے ایک نظر دیکھ لیتا اور میری صورت کے نقوش پر دھیان دیتا تو میں اسی زینے کے وسط میں پکڑا جاتا لیکن پولیس والے اپنی دھن میں اوپر جا رہے تھے اور کسی بھی ویٹر سے ان کو سروکار ہی نہ تھا۔ خود میں نے باادب باملاحظہ ہوشیار ہو کے انھیں راستہ دیا اور ایک کونے میں دبک گیا۔ وہ پیر کو زور زور سے پٹختے نکل گئے تو میں آگے بڑھا۔ ابھی مجھے محسن کی فکر تھی۔ وہ پولیس کو کوریڈور میں ملے گا اور پولیس کا کیا بھروسا کہ اسے پوچھ گچھ کے لیے روک لے۔ مگر اس کا امکان بہت کم تھا کیونکہ چشم دید گواہوں میں سے کوئی ساتھ نہ تھا اور ساتھ ہوتا بھی تو صورت سے محسن کو نہ پہچان پاتا۔ چالیس فٹ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے صرف کپڑوں کا رنگ دیکھا ہو گا۔ صورت ان کو کہاں نظر آئی ہو گی اور محسن اب بالکل مختلف کلر اسکیم میں تھا۔

آخری زینے پر قدم رکھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو محسن نے مجھے انگوٹھے کو بلند کر کے "آل اوکے" کا سگنل دیا۔

میں سیدھا نیچے گیا اور ایک ویٹر کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا کچن میں داخل ہو گیا۔ پرانا تجربہ میرے کام آیا۔ میں نے چائے کی ایک ٹرے اٹھائی اور اسے ہتھیلی پر جما کے کندھے کی طرف کر لیا۔ اس طرح میرا چہرہ جزوی طور پر چھپ گیا۔" یہ کہاں لے جا رہا ہے؟" کسی نے چلا کر کہا۔

"دو سو میں ہیں! ارجنٹ آرڈر ہے۔" میں نے کہا اور پرانے ویٹروں کی پھرتی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کاؤنٹر کے قریب خاصی گرما گرمی تھی۔ منیجر کے پاس دو پولیس والے کھڑے تھے اور کوئی درجن بھر شوقین مزاج لوگ جو ہماری بازیگری کے چشم دید گواہ تھے۔ منیجر کا موڈ سخت آف تھا۔ گواہ مصر تھے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا نظر کا دھوکا نہیں تھا اور سب متفقہ بیان پر قائم تھے چنانچہ سب کو جھوٹا بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ سب پولیس کے ساتھ مجاہدانہ اور رضاکارانہ جذبے کے تحت آئے تھے مگر اب پھنس گئے تھے کیونکہ پولیس والے ان کو تفتیش مکمل ہونے تک واپس جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ انھیں تھانے جا کے بیان لکھوانا تھا اور اگر مجرم پکڑے گئے تو ان کو شناخت کرنا تھا اور شاید ہر پیشی پر حاضرِ خدمت ہونا تھا۔ جب تک مقدمہ چلے اور فیصلہ ہو۔ وہ سب نوجوان، جوشیلے اور ناتجربہ کار لوگ تھے جن کے لیے قانون کی مدد کر کے مصیبت میں گرفتار ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ آئندہ وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے اور کسی مظلوم کو قتل ہوتا دیکھیں گے تو آنکھیں بند کر کے گھر میں گھس جائیں گے، دروازے بند کر کے سو جائیں گے اور زبان بند کر کے بیٹھ جائیں گے۔ سمجھدار وہ ہوں گے جو تھانے جا کر بھی خاموشی کا نذرانہ پیش کر دیں گے اور نجات پا کے انجان بنے لوٹ آئیں گے۔

منیجر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہوٹل تباہ ہو چکا۔ ایکبار تو اس نے ہر مہمان سے بڑی شرافت اور شائستگی کے ساتھ زحمت دینے پر معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ انھی کے مفاد میں ہے لیکن اب پولیس دوبارہ ہوٹل کو کھنگالنے پر آمادہ تھی اور ہر کونے کھدرے سے مجرم کو برآمد کیے بغیر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔" معلوم نہیں کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔" اس نے ٹیلی فون اٹھا کے بڑبڑاتے ہوئے کہا" ہیلو... ہیلو... ہاں جی... سر جی آپ فوراً آ جائیں اور معاملے کو سنبھالیں... یہاں میری کوئی نہیں سن رہا ہے۔ نہیں وہ ابھی تک نہیں گئے... آپ فون کرائیں تاجی کسی سے مگر ذرا جلدی... وہ بہت گڑبڑ پھیلا رہے ہیں۔" اس نے دھڑ سے ریسیور کو کریڈل پر مارا۔ غالباً اس نے مالکوں کو فون کیا تھا۔ اس وقت تک میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اگر اس کے سامنے یہ مجمع نہ ہوتا تو وہ ضرور مجھے روک کر پوچھتا کہ چائے باہر کہاں جا رہی ہے مگر مجھے بڑا اچھا موقع مل گیا تھا۔

یہ اندازہ مجھے باہر نکلنے کے بعد ہوا کہ ہوٹل کو ہر طرف سے پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان کے مسلح آدمی ہر گیٹ پر کھڑے تھے اور ہر آنے جانے والے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ٹیڈی پہلے ہی نکل گیا تھا۔

میں ہاف سیٹ چائے کی ٹرے اٹھائے لوگوں سے بچتا بچاتا فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ اب میں محفوظ تھا اور کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ یہ چائے کہاں سے لائے ہو اور کہاں لے جا رہے ہو۔ اچانک میرا پیر ایک رسّی میں الجھا جو کسی نے اپنے کینوس کے سائبان کو دکان پر پھیلانے کے لیے باندھی تھی اور اس کا ایک سرا فٹ پاتھ کے ساتھ لگے ہوئے کھمبے پر لپیٹ دیا تھا۔ مجھ سے ایک قدم آگے چلنے والے نے رسّی کو دیکھ لیا اور اس کے اوپر سے گزر گیا مگر مجھے اتنا وقت ہی نہ ملا۔ میں چائے کی ٹرے سمیت منہ کے بل گرا کینوس کے اس تنبو کے نیچے ایک عوامی ہیئر ڈریسر سیلون تھا جہاں اس وقت خلیفہ جی ایک گاہک کے سر کی کھیتی صاف کر رہے تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر مراقبے کی کیفیت میں سر جھکا کے بیٹھنے والے گاہک کے آدھے سر پر استرا پھر چکا تھا۔ برتن گرے تو غالباً چائے دانی گاہک کے سر پہ الٹ گئی۔ ورنہ وہ اس طرح بلبلا کے نہ اٹھتا۔ گرما گرم قہوے نے اس کے نصف سر کو زیادہ متاثر کیا ہو گا جس کی کھال پر بال نہیں رہے تھے۔ دودھ اور چینی کہاں گئے یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر دھڑ سے گری اور میرے ساتھ ہی تنبو نیچے آ گیا۔ میری ٹھوکر نے رسّی توڑ دی تھی۔ پھر بہت واویلا مچا۔ خلیفہ نے مجھے اندھا بیل اور بہت کچھ کہا اور میں نے خالص بیروں کی زبان میں جوابِ آں غزل عرض کیا۔ فٹ پاتھ پر سے یوں کراہتا ہوا اٹھا جیسے میری بیشتر ہڈیاں ٹوٹ جانے کے بعد میرا بچنا محال ہے اور اس قتل کا ذمے دار خلیفہ ہے جس نے مجھے گرانے کے لیے رسّی باندھی تھی۔ گاہک بار بار چلا رہا تھا اور سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔" اوئے تواڈا بیڑا غرق... اوئے میرا سر ساڑ دتا جے... اوئے خلیفہ! اوئے میرا باقی سر تیرا پیو صاف کرے گا۔" لوگ کسی کے طرفدار نہ تھے اور آگ بھڑکا کے تماشے کو طول دینے کے موڈ میں تھے چنانچہ وہ دونوں کو شہ دے رہے تھے اور ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔

جب میں خالی ہاتھ روتا بسورتا وہاں سے روانہ ہوا تو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

محسن بھیڑ میں سے میرے ساتھ ہولیا۔" شرارت کا کوئی وقت ہوتا ہے۔" اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔" اس شریف آدمی کے آدھے گنجے سر پر چائے کی کیتلی پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

" اگر میں نے پہلے سے دیکھ لیا ہوتا تو میں ہاف سیٹ چائے اس کی ہاف ٹینڈ پہ ٹونٹی سے گراتا لیکن میں تو خود گر گیا تھا..."

میں نے کہا۔" خلیفہ اگر ہوتا کوئی پہلوان تو اتنی آسانی سے نہ چلنے دیتا۔ میرا مطلب ہے ہم کُشتوں کے پُشتے لگائے بغیر نہ نکل پاتے۔ مار دھاڑ سے تو ہم نے ہوٹل میں بھی گریز کیا تھا ورنہ وہ تھانیدار اور اس کے چار یار کیا تھے، اسی کو اٹھا کے لے جاتے۔"

" ہمیں تو نکلنا مشکل نہ تھا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے سامان نکالنے کا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔

" اب خواجہ نیک محمد کو فوراً واپس بھیج دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔" تاکہ شک نہ ہو۔"

خواجہ نیک محمد عرف استاد ٹیڈی بڑے انہماک کے ساتھ رنگین پوسٹر دیکھ رہے تھے۔

" میاں خوجی!" محسن نے ان کو پیچھے سے یوں پکڑا جیسے باپ اسکول جانے والے بچے کو سینما ہال میں پکڑ لے۔" یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ پرائی بہو بیٹیوں کی تصویریں دیکھتے ہو... وہ بھی سرِ عام..."

" ہاں! واقعی یہ تو بڑی غلط بات ہے۔" میں نے کہا۔" لیکن ابھی تم کچھ نہ کہو۔ میاں خوجی تم واپس ہوٹل جاؤ۔ جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ لیتے جانا۔ پھل وغیرہ۔ معلوم یہ ہو کہ تم ذرا سی دیر کے لیے نکلے تھے۔"

" پولیس پھر سرگرمِ عمل ہے۔ ممکن ہے تم سے بھی پوچھے کہ اس کمرے سے ساتھ والے کمرے میں کون گیا تھا، کھڑکی کے راستے۔" محسن بولا۔

" انھیں کس نے بتایا؟" ٹیڈی نے پریشان ہو کے پوچھا۔

" نیچے جو بہت سے تماشائی جمع تھے نا انھوں نے پولیس کی مدد کی اور اب پولیس کی گرفت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

" تم ذرا گرم ہونا۔ کہنا کہ ابھی سوتے سے جگایا تھا۔ ذرا سی دیر کے لیے پھل لینے گیا تو یہ نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ ہوٹل ہے کہ شادی شدہ آدمی کا گھر۔" محسن بولا۔" پھر ہنگامہ کرنا کہ میرا بل بناؤ۔ میں جاتا ہوں اور آئندہ کے لیے اپنی سات نسلوں کو وصیت کر جاؤں گا کہ حوالات چلے جانا مگر فلاں ہوٹل میں مت جانا۔"

ٹیڈی نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ پھر پلٹا اور واپس آیا۔" تم لوگ اسی جگہ ملو گے؟ سامان لے کر آنے میں آدھا پون گھنٹا تو لگے گا۔"

" تم ایسا کرنا کہ وہاں سے تو سامان اٹھا کے ٹیکسی میں روانہ ہو جانا۔ گھوم پھر کے واپس آنا اور ہوٹل ویسٹ اینڈ میں اسی نام سے قیام کرنا۔ تھوڑا سا آگے ہے یہ ہوٹل۔ میں اور محسن رات کو کسی وقت تمھارے قریب ہی دوسرے ہوٹل میں آجائیں گے بڑا اوسس، سمجھ لو۔ ابھی ہم ذرا کام سے جا رہے ہیں اور کام تمھیں معلوم ہے اس لیے واپسی کا کوئی وقت نہیں بتا سکتے۔ تم اطمینان سے کھانا کھا لینا اور زیادہ انتظار مت کرنا۔ صبح ہم نہ ملیں تو پھر رابعہ سے ملنے کی کوشش کرنا یا منظر سے ٹیلی فون پر بات کرنا۔ اب جاؤ ورنہ وہ تمھارے کمرے کا تالا کھول لیں گے۔"

فرسٹ شو کا ٹائم ہو رہا تھا چنانچہ اندر اور باہر بڑی گہماگہمی تھی۔ ایک شخص نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ڈانٹا کہ اتنی دیر ہو گئی ہے اسے ہاف سیٹ چائے کے لیے انتظار کرتے ہوئے اور وہ فیملی کیبن نمبر دو میں ہے۔ میں نے کہا کہ خلیفہ نے رسّی نہ باندھی ہوتی تو چائے اب تک ضرور پہنچ جاتی اور اسے پہلی سے زیادہ پیچیدہ جواب پہ ہکا بکا چھوڑ کر چل پڑا۔ اندر ہی ایک ٹیلی فون کیبن تھا۔ میں نے منظر کا فون نمبر ملایا۔ وہ اس وقت گھر پہ مل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وقت اس کے چیمبر میں بیٹھنے کا تھا اور اپنے کام کے ساتھ اب وہ رابعہ کی فرم کا انتظام بھی سنبھال چکا تھا چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اب وہ کتنا مصروف ہو گا۔ ریسیور اس کے کسی بچے نے اٹھایا۔

" دیکھو بیٹے! تمھاری آنٹی رابعہ گھر پہ ہیں؟" میں نے آواز کو بدل کے کہا۔" یا منظر صاحب ہیں؟"

" آپ نام بتائیں اپنا۔" بچے نے کہا۔" میں ان کو بتا دوں گا۔ ابھی تو وہ بازار گئی ہوئی ہیں۔ ابو آفس میں ہیں۔"

" اچھا، آنٹی سے کہنا۔" میں نے سوچ کر کہا۔" کہ ریلوے کا ویٹر اب رتن سینما میں ہے اور اچکن کے ساتھ ہے۔" لڑکا اس پُراسرار پیغام پر یقیناً چکرایا ہو گا۔ اس نے دوبارہ پوچھا تو میں نے کہا کہ وہ لکھ لے۔ وہ کہیں سے پینسل کا غذ لایا اور بالآخر اس نے ہر لفظ پڑھ کے سنا دیا۔

" ابھی تو وہ گھر پہ ہی نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔" اور معلوم نہیں کب لوٹ کر آئے۔"

" جب بھی آئے گی پیغام پر غور کرے گی تو سمجھ لے گی۔" محسن بولا۔" تجھے وہ ریلوے ویٹر کی وردی میں دیکھ کر بڑی خوش ہوئی تھی۔ کہتی تھی بس یہی ایک لباس سجتا ہے۔ اچکن کا مطلب شیروانی بھی نکال لے گی۔"

لیکن ہم یہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔" پھر کوئی

بھیجنے کا آرڈر دے دے گا۔"

" ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" محسن نے کہا۔" اتنی دیر میں میو اسپتال ہو آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں چوہدری صاحب کا پوسٹ مارٹم ہو لیا ہے یا کسی اور کا۔"

" وہاں ہمیشہ پولیس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔" چوہدری دلاور کے چمچے بھی ہوں گے۔"

" ہم کوتا براہِ راست پولیس سرجن کے پاس جا کے پوچھیں گے۔" محسن بولا۔" یہ بات تو کسی سے بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔ شعبۂ حادثات' میں سب کو علم ہو گا۔"

" اور رابعہ یہاں پہنچے گی تو... خیر وہ انتظار کر لے گی۔" محسن نے کہا اور ہم رتن سینما کے احاطے سے نکل آئے۔ سینما آنے والے رکشا خالی ہو کے قطار میں کھڑے تھے۔ ایک نے ہمیں دس روپے لے کر زندہ سلامت میو اسپتال پہنچانے پر آمادگی ظاہر کی حالانکہ ہم نے رونی صورت بنا کے مردہ خانے کا نام لیا تھا۔

" تم دونوں مردہ خانے میں کام کرتے ہو؟" رکشا ڈرائیور نے روانگی کے بعد کہا۔

" ہاں۔ تم کو ضرورت پڑے تو آ جانا۔ ہم آدھے ریٹ پہ تمھارا پوسٹ مارٹم کر دیں گے۔" محسن نے بھنّا کر کہا۔

" اُلّو کے پٹھے! کیا ہم تمھیں مردے ڈھونے والے لگتے ہیں؟" میں نے کہا۔ وہ نہایت بدتمیز اور بدماغ رکشا والا تھا۔ گالی سنتے ہی اس نے رکشا روکنے کی بے وقوفی کی۔ خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے تھوڑی سی سزا دوں جس میں مروّت، لحاظ نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ہم نہ سہی کل کوئی مصیبت کا مارا واقعی مردہ خانے جانا چاہے گا تو یہ اس سے پانچ کے دس طلب کرے گا۔

" گالی کینوں کڈ ّی جے! شودے پُتر۔" اس نے نیچے اترتے ہی مجھے باہر کھینچ لیا۔ وہ تما تما تندرست آدمی تھا اور اس کی نظر میں میری اہمیت ایک ویٹر سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے اسے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ باہر آتے ہی میں نے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ بلبلا کے آگے آیا تو میں نے گھٹنا اٹھا دیا۔ وہ پلٹ کر سڑک پر گرا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پھر وہی داؤ آزمایا اور اس بار اسے مخالف سمت میں زیادہ دور پھینکا۔ پھر میں نے ہاتھ جھاڑ کر رکشا ڈرائیور کی جگہ سنبھالی اور رکشا اسٹارٹ کیا۔ جو کچھ ہوا اندھیرے میں ہوا اور دو کاروں اور چند راہگیروں کے سوا سڑک پر سے اس مختصر وقفے میں کوئی نہیں گزرا۔ اگر لڑائی لمبی ہوتی تو کوئی دوسرا رکشا ڈرائیور آ جاتا اور اپنی برادری کے ایک رکن کے ساتھ میدانِ کارزار میں کود پڑتا اور رکشا والوں کے معرکے میں ٹیکسی ڈرائیور بھی شامل ہو جاتے تو ہم پھنس جاتے۔ ہمارے پاس جنگِ عظیم کے لیے وقت نہیں تھا۔

میں نے رکشا چلانے کا پہلا تجربہ حاصل کیا اور خاصی مہارت کے ساتھ رکشا کو میو اسپتال میں لے گیا۔ ایک چوکیدار میرے پیچھے دوڑا۔" اوئے! رکشا اندر کہاں لے جاتا ہے۔" وہ چلّایا اور میں نے فوراً بریک لگا کے رکشا کو واپس کیا۔ چوکیدار سے معذرت کرنے کے بعد میں نے رکشا سڑک پر کھڑا کیا اور محسن کے ساتھ پیدل اندر پہنچا۔ اندر واقعی بہت پولیس تھی چنانچہ ہم نے خاصے فاصلے پر رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

" میاں محسن خان!" میں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ کہا۔" چشمِ بد دور۔ بہت اسمارٹ لگ رہے ہو اس وقت۔"

" اس وقت کیا، ہمیشہ سے ہوں۔" محسن نے کہا۔" تاریخ گواہ ہے۔"

" تاریخ مجھے یاد ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔" کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں اس خلعتِ فاخرہ میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا، جیسے کسی نرس سے گفتگو کرنا۔ اس حلیے میں تو یہاں کا کوئی بھنگی بھی مجھ سے مرعوب نہیں ہو گا اور مقصد ہمارا یہ معلوم کرنا ہے کہ ہمارے چوہدری دلاور کہاں ہیں... یہاں... گھر پر یا مرقد میں..."

" یہ کیا مشکل ہے۔" محسن بولا۔" تو اشارہ کر... کس کی طرف دیکھوں جو ریشہ خطمی ہو جائے۔ ایک تو مجھ میں مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے پھر یہ کہ میں نظر سے جادو کرتا ہوں۔"

" وہ جا رہی ہے تیری دور کے رشتے کی ایک کزن۔" میں نے کہا۔" تھپڑ مارے تو رونا نہیں، مسکراتے ہوئے مردانہ وار واپس آ جانا۔"

محسن خان دوڑ سے اور چند تیز تیز قدم اٹھا کے نرس کو جا لیا۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ محسن اسے روکے رکھنے میں تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نہیں سن سکتا تھا۔ غالباً محسن کو کامیابی نے میرے سامنے خفت سے بچا لیا۔ وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے میرے قریب سے گزرا تو میں چند قدم کا فاصلہ رکھ کے پیچھے ہو لیا۔" وہ اور میں ایک ساتھ تھے ڈاکٹر صاحب!" نرس بولی۔

" اچھا! تو وہ روم میٹ تھی تمھاری، اسی لیے مجھے شک ہوا تھا کہ میں نے تم کو دیکھا ہے۔ خیر، اچھا ہوا اس نے شادی کر لی... اب کہاں ہے وہ؟" محسن نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ دونوں باہر ہیں۔ کوئی کام تھا اس سے آپ کو؟"

"کام...؟ ہاں کام بھی تھا لیکن اصل مقصد تو ملاقات تھا۔ اس سے نہ سہی تم سے ہو گئی۔" محسن خاں نے پیشہ ور عاشقوں کے انداز میں پیش قدمی جاری رکھی۔ "تم شاید ڈیوٹی پر ہو۔"

"نہیں، ابھی آف ہوئی ہوں ڈیوٹی سے۔ ایمرجنسی میں تو حالت خراب ہو جاتی ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ارادہ تھا کہ...!"

"میرا خیال ہے کہ اب تم ارادہ بدل دو۔" محسن نے کہا۔ "میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور بدقسمتی سے اکیلا بھی ہوں۔ تفریح کروں تو جہاں اکیلا جاؤں گا احمق نظر آؤں گا۔ تم ساتھ دے سکتی ہو میرا۔ بس ذرا سی سیر۔ کہیں بیٹھ کے تھوڑی سی گپ شپ۔ کھانا تو آدمی کھا ہی لیتا ہے۔ پھر میں تم کو واپس ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن میرا ارادہ تھا کہ پہلے کپڑے بدل آؤں۔ اس وردی میں باہر کیسے جا سکتی ہوں۔ تم کہتے ہو کہ ارادہ بدل دوں۔"

"اوہ!" محسن نے خفت سے سر کھجایا۔ "دراصل تم ایسے بھی اچھی لگ رہی تھیں مگر یہ ٹھیک ہے۔ آؤٹنگ کے لیے وہ ہونا چاہیے۔ کیا کہتے ہیں اسے... سولہ سنگھار وغیرہ۔ او کے میں انتظار کرتا ہوں۔ تم تیار ہو کے آجاؤ۔"

"یہاں کھڑے رہو گے؟" وہ بولی۔ "ہوسٹل تک چلو۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا تمھیں۔ سب کے کزن آتے رہتے ہیں۔"

"ویری گڈ! کتنا اچھا ہوا کہ میں اور تم کزن بھی نکل آئے۔" محسن بولا اور وہ ہنسی۔

مجھے اس کی کامیابی پر جو رشک آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ نرس غالباً اپنی ہر شام کی تھکن اسی طرح اتارنے کی عادی تھی۔

میں پھر پیڑ کے نیچے آ کھڑا ہوا اور سگریٹ پینے لگا۔ میرے آس پاس لوگ آ جا رہے تھے مگر یہ کوئی تفریح گاہ نہیں تھی۔ یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ سب پریشان تھے اور تقدیر سے نالاں تھے۔ وہ بھی جو کے زخمی ہو کے یا قتل ہو کے پہنچے تھے اور وہ بھی جو اُن کی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور موت کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھے۔ دیہات میں ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے کہ نہ کام ہے نہ مریض کے علاج کی سہولت۔ نہ سوسائٹی اور نہ یہ گہما گہمی۔ شہر میں رہو تو یہ مصیبت کہ دن رات ایک سلسلہ ہے حادثات کا اور وارداتوں کا۔ لواحقین سے نمٹنا۔ پولیس کی ضابطے کی کارروائی اور کام کام کام۔ یا پیسہ پیسہ پیسہ۔ فرصتِ کاروبارِ شوق کسے۔ شوقِ نظارۂ جمال کہاں۔

"اچھا ہوا تو نے شرط نہیں لگائی تھی۔" محسن نے پیچھے سے آ کے میری گردن پر ہاتھ پر مارا۔ "کیسی رہی؟"

"تو آ گیا... اور وہ تیری کزن کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ بغرضِ تفریح میرے ساتھ جانے کے لیے بحالِ حسن و خوبی آنے والی ہے۔" محسن نے ذرا اکڑتے ہوئے کہا۔

"الو کے پٹھے! اس کام کا کیا بنے گا جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے؟" میں نے اس کی شاعری پر بھنا کے کہا۔

"وہ تو ہو گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ لیا تو" محسن ہنسا۔ "اب چلتے ہیں۔ میری کزن کی آج کی شام تو ضائع ہو گئی۔ نہ جانے کیوں سب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ انتظار کرتی رہے گی اور جب اُسے یقین آ جائے گا کہ میں کسی اور کے ساتھ نکل گیا ہوں تو اُسے دکھ تو یقیناً ہوگا ٹھکرائے جانے کا اور نقصان میں رہنے کا..."

"ابھی ایک جھانپڑ رسید کروں گا۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "کیا بتایا اُس نے؟"

"اُس نے تو بڑی عجیب بات بتائی۔ پہلے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا مگر اُس نے کہا کہ صبح سے اب تک وہی ڈیوٹی پر تھی اور اس کے ساتھ دوسری نرسیں بھی تھیں۔ سب تصدیق کر سکتی ہیں کہ اس قسم کا کوئی کیس نہیں آیا۔ نام تو اسے سب کے یاد نہیں تھے لیکن اس نے بتا دیا تھا کہ حادثات میں زخمی ہو کے کتنے آئے تھے اور لڑائی جھگڑے میں کتنے۔ ان میں سے کتنے مر چکے تھے، کتنے ہسپتال میں مرے، کتنے مرنے والے ہیں اور کتنے بچ جائیں گے۔ کوئی صنعت کار چوہدری دلاور ہوتا تو اتنا غیر اہم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کلہاڑی کے وار سے سر کے ٹکڑے کرنے کی واردات تو ایسی نہیں کہ روز ہو۔ اُس نے کئی مہینے پہلے ایک کیس دیکھا تھا جس میں کلہاڑی سے سر پر وار کیا گیا تھا۔"

"تجھے یقین ہے وہ سچ کہہ رہی تھی؟"

"یار، اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور کیا فائدہ اُسے جھوٹ بول کر۔ وہ تو ایک دن کی مصروفیات کا حال سنا رہی تھی اور میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ اخبار میں مشہور صنعت کار چوہدری دلاور کے قتل کی جو خبر ہے اس کے بارے میں پولیس نے کچھ بتایا۔ وہ حیران ہوئی اور کہنے لگی کہ اُس نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اس اسپتال میں یہ کیس نہیں آیا۔ اس کے علاوہ کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ اس کا مطلب ہے چوہدری دلاور کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ یا ہوا تو محض کاغذی خانہ پری کر لی گئی جس کا نرسوں کو علم نہیں۔"

"گویا لاش یہاں نہیں لائی گئی؟" میں نے کہا۔ "پھر اب چلتے ہیں واپس۔ رابعہ انتظار کر رہی ہو گی۔"

"کرنے دے اسے انتظار۔ انتظار میں جو مزہ ہے..." اُس نے کہا لیکن میں نے اس کی بات سننے کے بجائے ہانک لگا کے ایک رکشہ کو روک لیا۔

رابعہ سینما کے احاطے میں لیڈیز کے ٹکٹ کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تین ٹکٹ بھی تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ فلم دیکھنے آئی تھی مگر اس کے باقی دو ساتھی نہیں پہنچے۔ فلم کو شروع ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا چنانچہ اس کی پوزیشن خاصی خراب تھی۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص یا تو چلا جاتا ہے یا اندر جا بیٹھتا ہے۔ چند تماشا کرنے والے پوسٹرز کے ساتھ رابعہ پر بھی غور کر رہے تھے اور خود میں نے بھی محسوس کیا کہ بے جان تصویروں کے مقابلے میں وہ یقیناً بہت زیادہ قابلِ غور ہے۔ رابعہ کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر اپنے پیشے، تعلیم اور زندگی کے تجربات نے اس کے انداز و اطوار میں ایک پُر وقار متانت اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے اوباش قسم کے نوجوانوں کو بھی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس پر فقرہ بھی چست کر سکیں۔ پھر بھی وہ گیٹ کیپر اور سینما کے دوسرے ملازمین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے محسن بھائی!" اُس نے عمداً اونچی آواز میں برہمی سے کہا۔ "کھڑا کر کے چلے گئے مجھے یہاں... نہ میں کہیں آ سکتی ہوں نہ جا سکتی ہوں۔"

"معاف کرنا باجی۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ تمھارا موڈ اس سے زیادہ خراب معلوم ہوتا ہے۔ پھینکو اب یہ ٹکٹ۔ کل پرسوں دیکھیں گے۔"

وہ خاصے احتجاجی انداز میں محسن کے ساتھ روانہ ہوئی اور ان کی گفتگو نے کافی شکوک دور کر دیے جو بلاوجہ پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی وردی کو محسن اور رابعہ کے معزز لباس سے دور رکھا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی تعلق نظر نہ آئے مگر میں اُن کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ رابعہ نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر یوں کہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔

باہر آنے کے بعد میں آگے بڑھا اور ان کے ساتھ ہو گیا۔

"خادم آداب بجا لاتا ہے میم صاحب!" میں نے کہا۔

"مسٹر خادم! آداب بجا لانے سے پہلے آپ معافی مانگ لیں کیونکہ میں سخت ناراض ہوں۔" رابعہ مسکرائی۔ "اور کسی ایک قصور پر نہیں، قصور بہت ہیں تمھارے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج بھی تمھاری خیر خبر نہ ملی تو..."

"تو کیا؟" میں نے کہا۔ "بولو ڈرتی کیوں ہو؟"

"تو میں خود تمھاری خبر لینے نکل جاؤں گی اور ایسی خبر لوں گی۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔

"افسوس، مجھے تم نے کوئی موقع نہیں دیا شرمندہ ہونے کا معافی مانگنے کا اور منانے کا۔ داستانِ شبِ ہجراں اور فسانۂ روزِ فراق کہنے کا۔" میں نے ہاتھ مَل کے کہا۔ "میں نے خاصی ذہنی ریہرسل کی تھی کہ تم کو کس طرح بے وقوف بناؤں گا۔ میرا مطلب ہے عموماً یہ روٹھنا منانا بھی بہرحال ضروری ہوتا ہے۔ شاعر صاحب نے ایسے ہی تو نہیں فرمایا ہے کہ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

"میں کسی بیرے سے لڑتی اچھی نہیں لگوں گی۔" رابعہ نے کہا۔

"تم بہرحال میں اچھی لگو گی خواہ ویٹر سے لڑو یا ہیڈ ویٹر سے۔" میں نے کہا۔ "آخر اس ریلوے کے ویٹر کی بیوی بھی ہو گی جس کی وردی میں نے زیبِ تن فرما رکھی ہے۔ کیا اُسے یہ خیال آتا ہو گا کہ میں اپنے میاں سے لڑتے ہوئے کیسی لگ رہی ہوں؟"

"میاں جی! ذرا اندر رہیں۔ میرا مطلب ہے جامے کے اندر رہیں۔" محسن نے کہا۔ "جامے سے باہر نہ ہوں ابھی۔"

"تم آئی کس طرح تھیں۔ ذریعۂ آمد و رفت کیا اختیار کیا تھا تم نے عزیزہ؟" میں نے کہا۔

"پہلے بس پھر رکشا اور پھر ٹیکسی۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے وہم ہو رہا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہ ہو۔"

"اگر یہ وہم مجھے بھی ہو جاتا تو تم کو میں اس فینسی ڈریس میں نظر نہ آتا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "میں ذرا سا غیر محتاط ہو کے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ کوئی میرے تعاقب میں رہا اور ہوٹل تک پہنچ گیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔"

"گاڑی کہاں ہے تمھاری؟" رابعہ نے کافی دُور نکل آنے کے بعد کہا۔

"ہم فی الحال بے کار ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ جو تمھاری کار تھی نا، وہ بھی بے کار کھڑی ہے۔ ان حالات پر مفصل روشنی ڈالنے کے لیے وقت نہیں ہے پہلے چوہدری دلاور کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ تم نے اخبار دیکھا تھا شام کا۔"

"میں نے کبھی شام کا اخبار نہیں پڑھا۔ ایسی کون سی اہم خبر ہے؟"

"خبر ناقابلِ یقین حد تک اہم ہے۔" میں نے جیب سے ضمیمہ نما اخبار نکال کر اُسے تھما دیا۔ ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے رک کر اس نے صرف سرخی پر نظر ڈالی۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اُس نے چونک کر باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا۔

"کیا اس میں بھی ہماری شرارت ہو سکتی ہے؟" میں نے کہا۔ "بھئی یہ اخبار ہے کوئی ہینڈ بل یا پوسٹر نہیں ہے جو ہم نے چھپوا لیا ہو۔ بے شک اخبارات میں جھوٹ سچ سبھی کچھ ہوتا ہے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

لیکن یہ ہاتھی سے بڑا جھوٹ ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا اور یہ نہیں لکھا ہے کہ 'ایک افواہ کے مطابق' بلکہ اخبار کے رپورٹر نے پولیس کے حوالے سے تفصیلات ارسال کی ہیں۔"

رابعہ میری سننے کے بجائے خبر کا باقی حصہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ میں نے اخبار اس سے چھین لیا۔ "یہاں کھڑے رہ کر دو کالم کی خبر پڑھنے میں کوئی معقولیت نہیں۔ ہم خلاصہ بتا دیں گے۔"

"تم نے کچھ معلوم کیا کہ یہ حرکت کس نے کی؟ اور کیوں کی؟" رابعہ کا سوال بالکل فطری تھا۔

"ہم نے کچھ اور معلوم کیا ہے؟" محسن بولا۔ "چوہدری دلاور کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال نہیں لے جائی گئی۔"

"محسن خان کا نظریہ کچھ یہ ہے کہ قاتل الف دین ہو سکتا ہے جو انتقام کے جنون میں مبتلا تھا مگر ان کا دوسرا نظریہ جو پہلے نظریے کی نفی کرتا ہے کچھ اور ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ڈراما ہے۔" میں نے کہا۔

"یعنی چوہدری دلاور قتل نہیں ہوا۔" رابعہ نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور کل خبر آئے گی کہ مردہ زندہ ہو گیا۔"

"کل نہ سہی' دو چار دن میں یہ خبر آ سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایسے مت دیکھو مجھے۔ میں نے کوئی چرس کا دم نہیں لگایا ہے یا ٹھرا نہیں پیا ہے۔ میں اس نظریے پر قائم ہوں کہ مرنے والا دلاور نہیں تھا۔"

"پتا نہیں تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "چلو تم پہلے تو آدمی بنو اور یہ کپڑے بدلو۔" اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک قمیص اور پتلون نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے کچھ کپڑے میرے سوٹ کیس میں بھی پڑے تھے۔"

"چشم بد دور! تم نے بڑی دانائی کا مظاہرہ کیا سکندر کے لیے بخت آور۔" میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔ "تم نے ثابت کر دیا کہ قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے اور اگر مجھے قاضی مان لیا جائے..."

"قاضی جی! جب مجھے وہ پیغام ملا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کس حلیے میں ملیں گے اور آپ کے ساتھ کون ہو گا؟ میں اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ بھیس آپ نے شوقیہ نہیں بدلا ہو گا بلکہ ہو گی کوئی مجبوری اور جب مجبوری نہیں رہے گی تو پھر مناسب کپڑوں کا مسئلہ ہو گا۔ جو کہیں سے خریدنے پڑیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا باقی سامان بھی گیا۔"

"اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا۔" میں نے آداب بجا لا کے کہا اور ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ گلی خاصی تاریک تھی اور تھوڑا سا آگے جانے کے بعد مجھے ایک پرانے منہدم ہو جانے والے مکان کا ملبہ نظر آیا۔ مکان شاید خستہ حالی کے باعث کسی بارش یا سیلاب میں بیٹھ گیا تھا اور مکین ہجرت کر گئے تو اپنے مسکن میں ہی ان کا مدفن بن گیا تھا۔ اب یہ خالی جگہ مفـ عبرت سے زیادہ مقامِ ضرورت بنی ہوئی تھی اور مرجعِ خلا میں نے مشکل سے تین منٹ میں ویٹر کی وردی اتار کے قمیـ پتلون پہنی ہو گی پھر ویٹر کی وردی کا بنڈل بنا کے بغل میں دبا وہاں سے نکل آیا۔ جب میں دوبارہ سڑک پر پہنچا تو محسن نے اختصا کے ہنر سے کام لیتے ہوئے اہم واقعات کا خلاصہ دس منٹ کے لیکچر میں پیش کر دیا تھا چنانچہ رابعہ ہکا بکا کھڑی تھی۔ سے میرے دانت بجنے لگے تھے کیونکہ ویٹر کی وردی پھر بھ کچھ غنیمت تھی۔ پتلون قمیص تو گرمی کا لباس تھے۔ محسن نے ایک ٹیکسی کو روکا اور میں نے قدرے بہتر محسوس کیا۔

"تمہیں سو فیصد عاقل و بالغ اور دور اندیش ہونے کا سرٹیفکیٹ مل سکتا تھا اگر تم نے یہ بھی خیال رکھا ہوتا کہ اس درجۂ حرارت پر آدمی کم سے کم ڈبل نمونیے میں مبتلا ہوتا ہے۔" میں نے بتیسی بجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ٹرپل ہو چکا ہے۔"

"میرا ہینڈ بیگ کوئی بوری نہیں تھا کہ اس میں گرم کپڑے بھی بھر لاتی۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"اچھا تو اب کہیں سے لو بوری، وہی ڈالی لوں گا اپنی زندہ لاش پہ۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ محسن نے ٹیکسی کو رو اور ایک دکان میں گھس گیا۔ چند منٹ میں وہ خاصی موٹی او

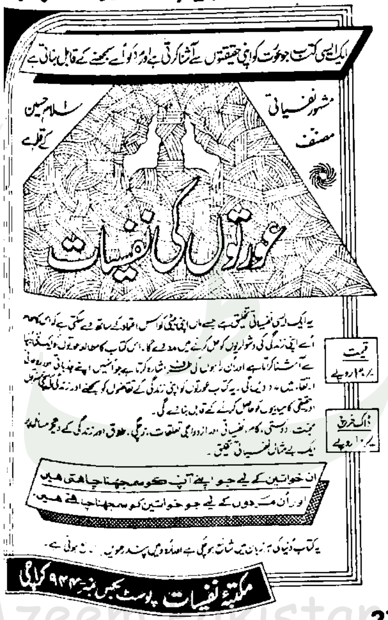

جاری جرسی لیے واپس آیا۔

"یہ لے، یہ ائیر کنڈیشنڈ جرسی ہے۔ زندہ ہے تو پہن لے۔" محسن نے جرسی مجھ پر اچھال کے کہا۔

"محسن نے آج تمہارا سہاگ سلامت رکھا۔ خدا اسے سلامت رکھے اور ہماری طرح یہ بھی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ آمین۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔ رابعہ نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اشارہ تھا کہ میں زبان کو قابو میں رکھوں اور ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کا خیال کروں۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکال رہا تھا اور ٹیکسی ایک چوک سے گزری تو میں نے رابعہ کے لال رنگ کو دیکھا۔ اس لالی میں حیا سے زیادہ غصّے کا عنصر شامل تھا۔

محسن کی ہدایات سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ ٹیکسی کو دلاور کے گھر کی طرف لے جا رہا ہے۔ سردی کی وجہ سے شیشے بند تھے اور ہم کسی قابلِ شناخت پرائیویٹ کار میں نہیں تھے چنانچہ اس سڑک پر سے گزر جانے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہم سب کی نظر ایک ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ دور سے اس کی کوٹھی کا گیٹ روشن نظر آیا۔ باہر دو کاریں اور ایک جیپ کھڑی دیکھ کر میں چوکنا ہوا۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی ورنہ اس وقت گیٹ بند ہوتا تھا اور آس پاس کی دوسری کوٹھیوں کی طرح موسمِ سرما کی ویرانی اور رات کا سناٹا ہر جگہ محیط نظر آتا تھا۔ عین سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کوٹھی کے اندر آٹھ دس افراد کو دیکھا، جو برآمدے میں کرسیاں ڈالے مغموم اور سرنگوں بیٹھے تھے۔ کوٹھی کا ہر کمرہ روشن تھا اور چار پانچ پولیس والے ذرا فاصلے پر بے مقصد کھڑے تھے۔ محسن کا نظریہ مجذوب کی بڑ ثابت ہوا تھا۔ کوٹھی میں قتل کی واردات ضرور ہوئی تھی۔ اب صرف یہی بات تصدیق طلب رہ جاتی تھی کہ کیا مرنے والا دلاور تھا' یا اس نے کسی اور کو مار کے اپنی جگہ ڈالا ہے اور خود غائب ہو گیا ہے؟ اور اس کی کارروائی کا مقصد ہمیں ٹریپ کرنا ہے۔ فوری طور پر مجھے کوئی ایسی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہم اس مفروضے کو تسلیم کریں تو اس کی صداقت کا ثبوت کیسے حاصل کریں۔ اس کے لیے لاش کو ایک نظر دیکھنا تو ضروری تھا ہی، یہ بھی ضروری تھا کہ ہم اس ڈرامے کے پلاٹ کو سمجھتے ہوئے کلائمکس کو اینٹی کلائمکس میں تبدیل کر دیں۔

اگر ہم اسی وقت اندر تشریف لے جاتے تو دلاور کے زندہ ہونے کی صورت میں بھی پکڑے جاتے اور زندہ نہ ہونے کی صورت میں بھی۔ میں اتنی رفتار سے اور اتنی دور سے گزرتے ہوئے تعزیت کے لیے آنے والوں کی صورت پر غور نہیں کر سکا تھا مگر ان میں ہمارے دشمنوں کا موجود ہونا یقینی تھا۔ پولیس بھی ہر صورت میں مجھے پہلے گرفتار کر کے لے جاتی اور قتل کی تفتیش بعد میں کرتی۔

ہمیں اتنی مہلت ہی نہ ملی تھی کہ ہم مرزا غالب سے رابطہ قائم کرتے اور اس کے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے میک اَپ سے بدلی ہوئی صورت میں دلاور کے گھر میں داخل ہو جاتے۔ میرا یقین پہلے بھی کامل نہیں تھا اب شک کی گنجائش بہت کم رہ گئی کہ وہ محسن کی بے مہار سوچ تھی ورنہ موت وہ حقیقت ہے جس میں ڈرامے کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم یہ بات میں نے فوراً نہیں کہی۔

"اب کدھر چلنا ہے صاحب جی؟" ڈرائیور نے قدرے بیزاری سے کہا۔

یہ شاید محسن نے بھی نہیں سوچا تھا اور اس کا ذہن بھی دلاور کی کوٹھی میں نظر آنے والے منظر کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔ رابعہ اس لیے نہیں بولی تھی کہ اس کا خیال تھا جواب ہم دیں گے۔

"او جی کچھ بولو! کیا ایسے ہی سیدھا چلتا جاؤں' مجھے گاڑی بند کرنی ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جھلا کر کہا۔

"ہاں ہاں! تم ایسا کرو کہ اگلے موڑ پر ہمیں اتار دو یا کسی ایسی جگہ جہاں سے ہمیں کوئی دوسری سواری مل سکے۔" میں نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے خاصی مشکوک نظروں سے مجھے پلٹ کر دیکھا۔ "پھر بھی آپ کو جانا کہاں تھا؟ یہاں کون سی دوسری ٹیکسی ملے گی آپ کو؟ زنانی سواری ہے آپ کے ساتھ۔"

"اچھا تو تم ہمیں کرشن نگر پہنچا دو۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں رابعہ کی گاڑی کا خیال آیا تھا۔ اگر اس وقت ہمارے پاس اپنی گاڑی ہوتی تو ہم کسی کے ذہن میں شکوک پیدا کیے بغیر کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔

ڈرائیور نے ہماری بے وقوفی پر افسوس سے سر ہلایا۔ ہم سیدھا راستہ اختیار کرتے تو اپنا پیسہ بچاتے اور اس وقت تفریح کے لیے نہ یہ جگہ تھی اور نہ یہ موسم تھا چنانچہ وہ کچھ بڑبڑایا اور پھر ہمیں طوفانی رفتار سے کرشن نگر لے گیا۔ دس منٹ بعد ہم پچاس روپے ادا کر کے سڑک پر کھڑے رہ گئے۔

"اب یقین آ گیا کہ تیری کھوپڑی الٹی ہے۔" محسن نے ڈھٹائی سے کہا۔ "نہ جانے کیوں میں اپنی ساتویں حس کو غلط اور ناقابلِ اعتبار سمجھنے پر تیار نہیں۔ خیر' دلاور اگر مرا ہے تو اچھا ہے اور نہیں مرا ہے تو معلوم ہو جائے گا۔ مگر وہاں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے لیکن ہم میں سے کوئی اندر جا کے پوچھ نہیں سکتا کہ کیا ہوا ہے۔"

"غالب پوچھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت وہ اخبار کے دفتر میں ہو گا۔ اُسے فون کر لیتے ہیں۔"

"فون کرنے کے لیے اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔" رابعہ نے کہا۔ "گاڑی کتنی دور ہے یہاں سے؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"گاڑی تو ایک فرلانگ آگے گلی میں ہوگی اور یہاں تک میں ٹیکسی اسی لیے لایا تھا مگر میری چھٹی حس..."

"تم دونوں کی چھٹی اور ساتویں حس بھی تمہاری طرح دخل در معقولات کی عادی ہے۔" رابعہ نے جھلّا کر کہا۔ "جیسی روح ویسے فرشتے۔ آدمی کے حواسِ خمسہ درست ہونے چاہئیں۔ کیا خطرہ ہے گاڑی لانے میں؟ آخر ہماری اپنی گاڑی ہے اور کوئی ہمیں چور سمجھ کے تو روک نہیں سکتا۔"

"کوئی اور تو روک سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً فرشتۂ اجل۔ وہ بغیر اپائنٹمنٹ کے ملتا ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی ہے۔ کوئی نہ کوئی گیراج کھلا مل جائے گا۔ ہم پیچھے رہتے ہیں۔ رابعہ چابی لے کر آگے جائے اور کسی مکینک سے بات کرے۔ اُسے بتلائے کہ میری گاڑی فلاں جگہ بند ہوگئی ہے۔ خرابی کوئی معمولی سی لگتی ہے۔ ذرا مسکرا کے بات کرے، وہ سر کے بل جائیں گے اور طاقت کے بل پہ گاڑی کو کھینچ کر بھی لانا پڑا تو لے آئیں گے۔"

"وہ کہیں گے آپ ہمارے ساتھ چلیں بیگم صاحبہ!" رابعہ نے منہ بنا کے کہا۔

"تو تم کہنا، ہائے اللہ میں تو پہلے ہی اتنی تھک گئی ہوں دم نکلنے لگا ہے میرا۔" میں نے نخرے دار زنانہ آواز بنا کے اور ہاتھوں کے ساتھ نرت کر کے کہا۔ "پھر مسکراہٹ سے بجلی گرانا۔"

"شرم تو نہیں آتی۔" رابعہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کہتا یہ ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں آگے گیراج کہاں ہے۔ مکینک کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

"اور اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ وہ جائے گا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے لے آئے گا۔" میں نے کہا۔ "تم کچھ حیرانی کا اظہار کرنا اور پچاس روپے دے دینا اُسے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ کوئی تاک میں ہوگا تو سامنے آجائے گا اور پیچھا کرے گا تو ہم دیکھ لیں گے۔ نہ وہ مکینک کو روک سکیں گے نہ رابعہ کو اور اگر کوئی نہ ہوا تو ہم کو رابعہ آگے سے پک اپ کرے گی۔ آدھے گھنٹے میں گاڑی ہمارے پاس ہوگی۔" پھر میں نے اُسے بتایا کہ گاڑی کس گلی میں ہے۔

"اگر کوئی تعاقب کرتا ہوا آئے تو میں اُسے کہاں لے جاؤں؟"

"اس سے پوچھ لینا... افوہ! ناراض کیوں ہوتی ہو۔" میں نے کہا۔ "کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں چکّر دے کر نکلنے کی کوشش کرنا ورنہ کسی چوک میں پولیس کی مدد لینا۔ اور جب یقین ہو جائے کہ وہ بھاگ گئے ہیں تو اب سے ایک گھنٹے بعد ہوٹل ویسٹ اینڈ میں خواجہ نیک محمد کے کمرے میں انتظار کرنا۔"

"گیراج!" محسن نے انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ ایک دکان کا آدھا شٹر گرا ہوا تھا لیکن اندر روشنی تھی اور باہر لگے ہوئے بدنما سائن بورڈ پر آٹو ورکشاپ کے الفاظ پڑھے جاتے تھے۔ میں نے چابیاں رابعہ کو دیں اور پھر سمجھانا چاہا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن وہ میری سُنے بغیر روانہ ہوگئی۔

"تیری جورو ہے شیر کی بچی۔" محسن خان نے ارشاد فرمایا۔ "تو نے اُسے چوہیا کہا تھا قاضی کے بچے۔"

"اچھا چل تیری جورو چوہیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپس کی بات ہے۔ خفا کیوں ہوتا ہے۔" اور اُسے سگریٹ پیش کی۔ سردی بڑھ گئی تھی لیکن اب سردی سے زیادہ بھوک کی اہمیت بڑھنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو کھلے شٹر کے نیچے سے جھک کر بات کرتے اور پھر کسی کو باہر آتے دیکھا۔ ان کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی۔ حسبِ توقع وہ اندر گیا اور پھر کچھ اوزار اٹھا کے باہر نکلا۔ رابعہ جھک کر گیراج میں داخل ہوگئی۔

مکینک نوعمر لڑکا سا تھا جس نے تیل اور گریس کے داغوں سے سیاہ نظر آنے والی ڈانگری پہن رکھی تھی۔ غالباً استاد نے معمولی خرابی کا ذکر سُن کے اُسے روانہ کر دیا تھا اور خود بیگم صاحبہ کو اطمینان سے تشریف رکھنے کو کہا تھا۔ اب وہ ہم سے دس قدم آگے چل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو بغل میں دبائے اور سر کو جھکائے۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد یقیناً تھکا ہوا تھا اور اس سردی میں یہ کام جو غیر متوقع طور پر آگیا تھا اسے بیگار لگتا ہوگا۔ وہ خود استاد اور گیراج کا مالک ہوتا تو کبھی باہر نہ نکلتا مگر زمانے کے گرم و سرد کا مزہ چکھے بغیر استاد بھی کون بنتا ہے۔ سڑک پر آمد و رفت برائے نام تھی۔

"تو نے کسی شکل کو پہچانا تھا" دلاور کے گھر کے سامنے گزرتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن تو نے ایک بات نوٹ کی؟" محسن بولا۔ "لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کیا کوٹھی کے اندر جگہ نہیں رہی تھی؟ زیادہ لوگ ہوتے تو باہر گاڑیاں بھی زیادہ ہوتیں۔ یہ کوئی گرمیوں کا موسم تو نہیں ہے۔"

"اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" میں نے سخت حوصلہ شکن لہجے میں کہا۔ "اندر باہر سب دلاور کا گھر ہے۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ باہر شکاری بیٹھے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اور شکار کا انتظار کر رہے تھے۔"

"تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ پولیس والے جعلی تھے اور دلاور کے آدمی تھے جو وردیاں پہن کے کھڑے ہوگئے تھے کہ ہم کو... یہ مطلب ہے بھیّا ان کے اشارے پر گرفتار کر لیں۔" میں نے کہا۔

"میں سب کچھ کہہ سکتا ہوں اور کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" محسن نے چلّا کر کہا اور مکینک نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا اور سڑک پار کی۔ اس کے خیال میں ہم دو راہ گیر تھے اور کسی مسئلے پر اونچا بول رہے تھے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔

"میں صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ کہ دلاور کی جگہ کسی اور کی لاش پڑی ہے۔ ابھی ہم غالب سے پوچھ لیں گے اور اس کو بتا دیں گے کہ ہمیں کیا شک ہے۔ وہ معلوم کر آئے گا۔"

گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم نے فاکس ویگن کو اسی جگہ کھڑا دیکھا جہاں میں نے اُسے آخری بار پارک کیا تھا۔ مکینک گلی میں مڑ گیا اور ہم سیدھے گزر گئے۔ اس گھر کی عقبی دیوار سے ٹیڈی کے مالک کی دیوار ملتی تھی۔ مجھے اس بوڑھے کا خیال آیا جو سوچتا ہوگا کہ آخر نیک محمد کچھ بتلائے بغیر کہاں غائب ہوگیا۔ اسی گلی میں آگے شمشاد کا گھر تھا جسے ہم نے مروّت اور مہمان نوازی کا یہ صلہ دیا تھا کہ اُس سے گاڑی چھین لی تھی۔ خیر اب تک گاڑی اسے مل چکی ہوگی۔ وہ آئندہ سب کو بتائے گا کہ کس درجہ شریف اور مہذب چور اس کے مہمان ہوئے تھے اور وہ کتنے با اصول لوگ تھے۔

دھماکا اسی وقت ہوا۔ ہم تیسری گلی کے قریب پہنچ کر رکے تھے اور واپسی کی سوچ رہے تھے کہ درمیانے درجے کے کسی بم کے پھٹنے کی آواز نے ہمیں بوکھلا دیا۔ ہم گھبرا کے ایک ساتھ پلٹے کیونکہ دھماکا پیچھے ہوا تھا۔ رات ابھی زیادہ نہیں ہوئی تھی اس لیے کئی گھروں سے نکلنے والے دوڑ دوڑ کر اس جگہ تک آرہے تھے جہاں فاکس ویگن کے ڈھانچے کو آگ کھا رہی تھی۔ اس کے منتشر ہو جانے والے ٹکڑے دور دور تک پھیلے تھے اور جہاں گرے تھے وہیں روشن تھے۔ خالی پلاٹ کے تین طرف آباد گھر تھے۔ ان کی دیواروں میں سوراخ نظر آرہے تھے اور اندر سے عورتوں بچوں کے چیخنے کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کوئی گھر گرا نہیں تھا لیکن یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ دھماکے کی شدت نے بالکل ساتھ والے گھروں میں کھڑکیوں کے شیشے چورا کر دیے ہوں گے۔ اندر الماریوں اور شوکیسوں کے شیشے والے پٹ بکھر گئے ہوں گے اور آرائش سے برتن گرے ہوں گے۔ چنانچہ دھماکے نے اور پھر اس کے نتائج نے گھر کے مکینوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ شاید ایک لمحہ پہلے وہ بڑے سکون اور قناعت کے ساتھ دروازے بند کیے ہیٹر جلائے گرم کمروں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ڈراما دیکھ رہے تھے اور اس انہماک اور اطمینان کو یکلخت دھماکے نے منتشر کر دیا تھا۔

فضا میں عجیب سی بُو تھی۔ تیل اور پٹرول کے جلنے کی، ٹائروں اور سیٹوں کا ربڑ جلنے کی۔ بارود کی اور ان سے الگ گوشت کے جلنے کی۔ صرف ہم جانتے تھے کہ یہ انسانی گوشت کے جلنے کی بُو ہے۔ وہ نوجوان مکینک جو تھکا ہوا ہونے کے باوجود اس سردی میں ایک عورت کی مدد کرنے اور اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے کچھ کمانے کی خاطر چل پڑا تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ اس خوب صورت عورت کو فرشتۂ اجل نے اپنا نامہ بر بنا کے بھیجا ہے اور اپنی مسکراہٹ کی دلکشی سے اور ادائے حسن کی ساحری سے اس نے جھوٹ کا جو جال پھیلایا ہے، وہ موت کا جال ہے۔ اب اس نوجوان کی زندگی کا وجود ایک تصور رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کے اجزا منتشر ہو کے راکھ ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب خواب بھی راکھ ہو رہے تھے جو خود اس نے کامیابی کے لیے اور خوشحالی کے لیے دیکھے تھے اور اس کے ماں باپ اور اس کے بھائی بہن اپنے گھر میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہو چکے تھے جن کی آنکھیں ہمیشہ انتظار کرتی رہتی ہیں اور روتی رہتی ہیں مگر آنسوؤں سے امید کی وہ کرن نہیں بجھتی جو دل میں روشن رہتی ہے اور دھوکا دیتی رہتی ہے کہ دروازہ کھلا رکھنا، وہ آئے گا۔ وہ ہمیں چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہے۔ وہ تو کسی مصیبت زدہ عورت کی گاڑی ٹھیک کرنے گیا تھا۔ بڑا ماہر کاریگر بن گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اب تک اس نے خرابی دور نہ کی ہو۔

"ہوش میں آ سکندر!" محسن نے مجھے کندھا پکڑ کے جھنجوڑا۔

"میں رابعہ کو لے کر آتا ہوں۔"

میں نے چونک کر دیکھا تو ہم اس گیراج کے قریب کھڑے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں وہاں تک کیسے پہنچا۔ یہ خطرے سے دور ہو جانے کی لاشعوری خواہش تھی جس نے مجھے محسن کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میرا ذہن تو نہ خطرے کے متعلق سوچ رہا تھا اور نہ فرار کے بارے میں۔ "کیا... کچھ کہا تھا میں نے؟" میں نے کہا۔

"تو بار بار کہہ رہا تھا وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔" محسن نے کہا اور گلی میں غائب ہوگیا۔

میری آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ فاکس ویگن دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور اس کے آس پاس جمع ہو جانے والے سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے ہوا؟ یہ کس کی گاڑی تھی اور کون ہے اس کا مالک؟ انھیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس کی مالک بڑے اطمینان سے ایک گیراج میں بیٹھی ہے جہاں خوش اخلاق مالک نے اسے ایک کرسی فراہم کر دی ہے۔ گیس ہیٹر کو اس کے قریب کر دیا ہے اور اس کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہے غلیظ بھوٹے سے بدنما کپ میں گرما گرم چائے منگوالی ہے۔ اور یہ لالچ نہیں نیکی کا جذبہ ہے اور شرافت کا سلوک ہے ورنہ وہ انکار بھی کرسکتا تھا کہ اس وقت اتنی دور جانے والا۔۔ کوئی نہیں ہے صبح گاڑی سے آنا ٹھیک کر دیں گے۔ ایک کار کے جلنے کا نظارہ دیکھنے والوں کو یہ بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ ایک بم کا دھماکا تھا جو اسی لیے انجن میں فٹ کیا گیا تھا کہ ایک شخص سکندر بخت ولد وزیر خان اور اس کے کچھ مخلص و جاں نثار دوست اس میں فرار ہونے کے لیے انجن اسٹارٹ کریں تو ان کے وجود سے وابستہ مسائل پلک جھپکتے میں حل ہو جائیں لیکن تدبیر سے بڑھ کر تسکاری تقدیر ہے۔ شکاری جن کو ختم کر دینے کا بندوبست کر چکے تھے، وہ سلامت رہے اور ان کے حصے کی موت ایک بیگناہ محنت کش نوجوان کا مقدر ہوگی مگر کیا کوئی کسی کی جگہ مر سکتا ہے؟ یہ تو دستِ قدرت کے فیصلے ہیں جن میں تحریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص اپنی موت مرتا ہے۔ کسی اور کی موت نہ وہ لے سکتا ہے اور نہ کوئی اسے اپنی موت دے سکتا ہے۔ اس میں وقت کے ایک ثانیے کا یا مقام کے فرق کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ چنانچہ ہماری جگہ وہ نوجوان مکینک پہنچا اور اس نے زندگی پر مکمل اعتماد رکھتے ہوئے اگنیشن میں چابی لگا کے دیکھنا چاہا کہ گاڑی آخر اسٹارٹ کیوں نہیں ہوتی۔ اگر قدرت کو اسے زندہ رکھنا منظور ہوتا تو وہ انکار کر دیتا جانے سے۔ اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دیتا یا انجن کو اسٹارٹ کرنے سے پہلے کھول کر دیکھ لیتا۔ شاید اسے دیکھے بھالے انجن کے درمیان کسی غیر مانوس چیز کی موجودگی کا پتا چل جاتا۔

لیکن یہ سب ایسے ہی اور اسی وقت ہونا تھا اور میرا پشیمانی کا احساس جو میرا جرم بن رہا تھا، بے مقصد . . . بے مصرف تھا۔ میں نے رابعہ کو محسن کے ساتھ سڑک عبور کر کے آتے دیکھا اور پھر بلا ارادہ ان کے ساتھ چل پڑا مگر میرا دماغ غیر حاضر تھا۔ وہ بُو کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہی تھی جو ایک جیتے جاگتے انسان کے جسم کے جلنے کی بُو تھی۔ جو ایک سیکنڈ پہلے تھا اور دوسرے سیکنڈ میں نہیں تھا۔

"تمہاری حالت کیوں غیر ہو رہی ہے سکندر!" رابعہ نے میرا بازو تھام کر کہا۔

"میں ہی تو ذمے دار ہوں اس کی موت کا رابعہ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اسے جھوٹ کے خوب صورت جال میں گرفتار کر کے مرنے کے لیے بھیج دینا۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم کو کہاں معلوم تھا کہ انجام یہ ہوگا۔" رابعہ نے نرمی سے کہا۔

"انجام کے بارے میں سوچ لینا چاہیے تھا مجھے۔" میں نے کہا: "میں نے خود کو بچا لیا اور اسے اپنی جگہ۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہارا تو صرف یہ خیال تھا کہ شاید کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا آئے گا۔ کوئی تمہارا پتا چلانے کے لیے وہاں موجود ہوگا تو معلوم ہو جائے گا۔ تم اس کے دشمن تو نہیں تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن یہ خیال تو میرا ہی تھا۔" میں نے کہا: "کیا میں نے"

"یہ خیال تو مجھے بھی آسکتا تھا اور محسن کو بھی اور زندگی یا موت تو خدا کی مرضی سے ہے۔" رابعہ نے کہا: "ایسا نہ ہوتا تو اب تک ہم کب کے مارے جا چکے ہوتے۔"

محسن اور رابعہ خود بھی احساسِ پشیمانی کا شکار تھے لیکن میری جذباتی کیفیت ان سے مختلف تھی۔ ان کو افسوس تھا کہ وہ نوجوان مکینک بے گناہ مارا گیا تو مجھے خیال تھا کہ وہ میری وجہ سے مارا گیا۔ رابعہ اور محسن کے تسلی دیتے اور ان کی منطقی باتوں سے دلائل سے اور تسلی سے میرے ضمیر کا بوجھ فوراً کم نہیں ہو سکتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ خلش آزار بھی میری روح میں کانٹا بن کے موجود رہے گی۔

"اس گیراج میں اور کون تھا؟" میں نے رابعہ سے پوچھا۔

"ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔" رابعہ نے کہا: "بڑی شرافت سے پیش آیا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ تمہارا بیٹا تھا جو گاڑی ٹھیک کرنے گیا ہے۔ کہنے لگا خدا نہ کرے کہ میری ایسی اولاد ہو۔ بچپن میں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ زمانے بھر کی ٹھوکریں کھاتا رہا اور گاڑیاں صاف کرتے کرتے گاڑیاں ٹھیک کرنے لگا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے نکالا گیا کیونکہ ایک بُری عادت چوری کی پڑ گئی تھی۔ ورکشاپ میں تو ہر قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو مالک نقد رقم وغیرہ تک بھول جاتے ہیں، یہ سب غائب کر دیتا تھا۔ کبھی کسی کا ریڈیو نکال لیا، کسی کا پرزہ مار لیا۔ ورکشاپ کے سیکڑوں اوزار ہوتے ہیں۔ کوئی سب پر نظر نہیں رکھ سکتا لیکن یہ پکڑا جاتا تھا بالآخر۔ اس نے بتایا کہ چاہے تو اچھا کام کر سکتا ہے اور بہت کما سکتا ہے مگر نشے کی لت میں برباد ہو رہا ہے۔ اب محنت بھی کرتا ہے تو اسی لعنت کی خاطر اور چوری بھی کرتا ہے تو اسی کے لیے۔ جوانی کا ناس کر لیا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ ماں باپ کچھ نہیں کہتے۔ تو ہنسنے لگا کہ سات سال میں گھر سے نکلا تھا اب اکیس سال کا ہے۔ اُسے خود بھی یاد نہیں کہ سیالکوٹ میں اور کون تھا۔ ایک بار اپنے محلے میں گیا تھا مگر نہ گھر ملا نہ کوئی جاننے والا۔ میں نے کہا کہ تم ہی منع کیا کرو۔ وہ بولا کہ جو ماں باپ کا نہ ہوا اُس کے لیے میرے کچھ کرنے سے کیا ہوگا اور وہ سُننے کا کب میری۔ بس

چھوڑ کر چلا جائے گا۔ کام تو مل ہی جاتا ہے کاریگر کو۔ ایسی زندگی بھی ہوتی ہے سکندر۔ یوں بھی جیتے ہیں لوگ۔ کسی رشتے کے بغیر۔"

"ہم سے اس کی زندگی کس طرح مختلف تھی۔" میں نے کہا: "ہم بھی تو اکیلے ہی ہیں۔"

"نہیں سکندر! ہم اکیلے نہیں ہیں۔" رابعہ نے کہا: "تمہارے ساتھ تو پہلے بھی محسن تھا۔ اکیلی تھی تو میں لیکن اب میرے ساتھ تم ہو اور محسن ہے تنہا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو زندگی سے پیار ہے۔ ہم جینا چاہتے ہیں اور اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی خوب صورت دنیا بنانے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ لڑکا آج یوں نہ مرتا تو کل زیادہ عذاب جھیل کے مرتا۔ نشے کی لت اُسے چور تو بنا ہی چکی تھی۔ وہ جیل جاتا۔ نکلتا تو بڑا چور بنتا اور نشے کی عادت اسے تباہ کرتی۔ وہ اس کے لیے ڈاکے ڈالتا یا دوسروں کو یہ زہر بانٹتا۔ وہ تو خود اپنی زندگی کا دشمن تھا اور کسی کو دلچسپی نہ تھی کہ اس کو زندگی سے محبت کرنا سکھاتے۔"

محسن نے بالآخر ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ میں نے اندر بیٹھ کر اس بوجھ کو بہت کم محسوس کیا جو ابھی تک میرے لیے ناقابلِ برداشت بنا ہوا تھا۔ قیمت تو کسی زندگی کی کم نہیں مگر کچھ لوگ مرتے ہیں تو جینے والوں کو مار جاتے ہیں اور سارا دکھ ان کے حصے میں آتا ہے جو زندہ رہنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن اس نوجوان مکینک کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ آج اگر تھا تو مجھے تھا۔ کل کو شاید وہ ایک گھر بنا لیتا تو اس کے بیوی بچے ہوتے جو اس کے اعمال کی سزا بھی کاٹتے اور عدم تحفظ کے باعث دنیا کے ہاتھوں بھی ان کا جینا دوبھر ہوتا۔

"یہ تو معلوم کرے گی پولیس کہ وہ گاڑی کس کی تھی۔" محسن نے انگریزی کے بجائے گفتگو کے لیے فرانسیسی کا سہارا لیا کیونکہ خاموش بیٹھنا بھی مشکل تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے اردو یا انگریزی میں اظہارِ خیال میں خطرہ تھا۔ بیروزگاری کے سبب گریجویٹ ٹیکسی ہی نہیں چلا رہے تھے، دفتروں میں چپراسی کی جگہ بھی لینے پر تیار ہوتے نکلے تھے۔

"انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ گاڑی میں کوئی شخص جل کر مرا ہے۔" میں نے کہا اور جواب فرنچ میں ہی دیا۔ "ممکن ہے اس کی شناخت بھی ہو جائے۔"

"اس گیراج کا مالک بھی رابعہ کا حلیہ ضرور بیان کرے گا۔" محسن بولا۔ "اور پھر پولیس، رابعہ کو تلاش کرے گی۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ رابعہ اسی وقت جائے اور اپنی کار کے گم ہونے کی رپورٹ درج کرائے۔ طریقہ وہی استعمال کرے جو چوہدری دلاور نے استعمال کیا تھا یعنی رپورٹ درج کرانے کا وقت کم سے کم ایک گھنٹا پہلے کا ہو۔"

"تو رابعہ کے ساتھ چلا جا۔ تاکہ تھانیدار سے نوٹوں کی زبان میں بات کر سکے۔ اگر اس کے پاس گنجائش نہ ہوئی تو وہ خود کسی تھانے سے معلوم کرلے گا۔ جہاں بھی وقت کا فرق زیادہ سے زیادہ ہو وہاں چلے جانا۔"

"اور تو کہاں جائے گا؟ اتنی دیر کیا کرے گا؟"

"مجھے مرزا غالب کے دفتر کے سامنے اتار دینا۔" میں نے کہا: "اس سے مل کر میں ہوٹل اوسس چلا جاؤں گا اور ایس بی کے خان کے نام سے کمرہ لوں گا اور تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔"

ایس بی کے خان میرے دونوں ناموں کا مجموعہ تھا۔ سکندر بخت کبیر خان اور محسن نے جس انداز سے سر ہلایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی سمجھ گیا ہے۔ جب ٹیکسی مجھے اتار کے چلی گئی تو میں نے خود کو اخبار کے دفتر کی عمارت کے سامنے تنہا پایا۔ اس علاقے میں یہی ایک بلڈنگ روشنی اور گہما گہمی کا مرکز نظر آتی تھی۔ باقی کاروباری اداروں کے دفاتر تاریک اور ویران پڑے تھے۔ باہر ایک طرف موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں قطار میں کھڑی تھیں تو دوسری جانب کاریں صف بستہ تھیں۔ میں ذہنی و جسمانی طور پر تھکن کا شکار تھا۔ دماغ پر ابھی تک اس نوجوان مکینک کی موت کا اثر تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بار بار اس کی وہ تصویر آ جاتی تھی جب وہ ہم سے دس قدم آگے ڈانگری پہنے اور ہاتھ بغل میں دبائے چل رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو خواہش کے باوجود کھانا کھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اب یہی ایک صورت تھی کہ ہم اپنے اپنے طور پر جو ملے اسی سے پیٹ بھر لیں۔ سردی کے باعث مجھے گرم چائے یا کافی کی خواہش الگ تھی۔

اخبار کے دفتر میں میرا بنفسِ نفیس قدم رنجہ فرمانا کوئی دانش مندی کی بات نہ تھا۔ کوئی مجھے پہچان لیتا تو تازہ ترین خبر میری گرفتاری کی لگ جاتی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اخباری دنیا کے دانشور لوگ اس وقت کتنے مصروف ہوں گے۔ ایک مختصر سے وقفے میں شہر کی، ملک کی اور دنیا کی خبروں کو جمع کرنا، الگ کرنا اور طباعت کے آخری مراحل تک پہنچا کے صبح دم پورا اخبار پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ تھے جو ہر روز جوئے شیر لاتے تھے۔ ہر صبح اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوتے تھے کہ انھوں نے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہر شام اس احساس کے ساتھ لوٹتے تھے کہ انھیں پہاڑ کاٹنا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے۔ چنانچہ ایسے مصروفیت کے وقت میں ان کی ذہانت، قوتِ مشاہدہ اور یادداشت پر کام کا دباؤ ہوگا اور کوئی نہ مجھے قابلِ توجہ سمجھے گا نہ نظر اٹھا کے دیکھے گا۔

کاؤنٹر پہ بھی رش تھا۔ لوگ پریس ریلیز دے کر جا رہے تھے اور مصر تھے کہ ان کی انجمن کی تقریب یا ان کے جلسے کی خبر، کوئی بیان یا کوئی تصویر صبح کی اشاعت میں شامل کی جائے حالانکہ اب اس کا وقت گزر چکا تھا۔ پھر اندرونِ ملک نامہ نگاروں کے ٹیلی فون آ رہے تھے اور وہیں بیٹھا ہوا آپریٹر مسلسل چلّا رہا تھا اور اِدھر کی لائن اُدھر ملا رہا تھا۔ اس ہڑبونگ میں میری آواز بھی بڑی مشکل سے سنی گئی۔ "کیا ہے جی؟ کس کو بلانا ہے؟" آپریٹر نے دسویں بار پوچھا۔

"ارے بھئی مرزا غالب کو۔ کہو رابعہ بی بی ان کا انتظار کر رہی ہیں۔" میں نے کہا اور اس مرتبہ آپریٹر نے لائن ملا کے میری بات دُہرائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرزا غالب نے خود ریسیور اٹھایا تھا۔ میں کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا۔ غالب دس منٹ بعد نمودار ہوا۔ جاگر ٹائپ جوتے، ڈینم کی گھٹنے نکلی ہوئی اور پیوند لگی پتلون اور چمڑے کی جیکٹ۔ پریشان بال اور پریشان صورت۔ وہ مجھے دیکھے بغیر میرے سامنے سے نظریں گھماتا گزر گیا۔ اس کے ذہن میں رابعہ کا نام تھا چنانچہ وہ صرف ایک مانوس زنانہ چہرے کو تلاش کر رہا تھا۔ باقی چہرے اُسے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ میں چند قدم اس کے پیچھے چلا اور جب وہ باہر نکل کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو میں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔

"السلامُ علیکم مرزا!"

وہ چونک کر پلٹا۔"ارے تم سکندر بادشاہ! تو یہ تم تھے۔"

"یار ذرا آہستہ۔ اچھا ہوا کہ تم نے باہر آ کے میرا نام لیا۔" میں نے کہا۔" مجھے کام ہے تم سے۔ فرصت کب ہو گی؟"

"بھئی ہمارا کام تو ختم ہو گیا تھا۔ بس ایسے ہی دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑا رہے تھے۔" وہ بولا۔" لوگ جب کہتے ہیں کہ ایک کام ہے تو عموماً پیسے ادھار مانگتے ہیں۔ دس روپے ہوں گے تمھارے پاس؟"

میں ہنس پڑا۔" دس کیا سو لے لینا۔ لیکن کام ذرا لمبا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

"اور کیسے چلیں بھئی! اپنا ہوائی گھوڑا لے لیں؟" وہ بولا۔ "مگر اس وقت بحرِ ظلمات کی جگہ بحرِ منجمد شمالی میں گھوڑے دوڑانے والی بات ہو گی۔۔۔۔۔۔ اسلاف میں شامل ہو جائیں گے۔"

"موٹر سائیکل چھوڑو ویسے ہی چلتے ہیں۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔"

"وہ تو ہم نے بھی نہیں کھایا۔ آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا۔" غالب نے کہا۔"کس قسم کا کھانا کھاؤ گے؟ بور ریستوران یا پرانا"

"جیسا قریب ملے اور کھایا جا سکے۔" میں نے کہا۔" لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ چوہدری دلاور کے کیس کی تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟"

"چوہدری دلاور کا کیس؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔"کون سا کیس؟ کوئی نیا گُل کھلایا ہے اُس نے؟"

"یار اتنی سردی میں گرماگرم لطیفے بھی مزہ نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔

"یار حد ہو گئی! ہم تو خود مانتے ہیں کہ ہم اُلّو ہیں۔ اب آپ کیوں اُلّو بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ بخدا ہم کو اس کے کسی کیس کی خبر نہیں۔ بڑا کیس ہوتا تو بڑی خبر بنتی اور ہم بھی سن لیتے۔" وہ بولا

"یعنی چوہدری دلاور کا قتل اتنی چھوٹی خبر ہے کہ کسی نے پڑھی ہی نہیں؟" میں نے بھنّا کے کہا۔

غالب چونکا اور ایک دم رک گیا۔"قتل! اُسے قتل کر دیا ہے کسی نے؟" وہ چلّایا۔"یہاں آ کے بتا رہے ہو مجھے یہ بات۔ چلو واپس۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچنا شروع کیا۔" اسٹاپ پریس نیوز لائن ہے۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔" ایک منٹ ٹھہرو۔ کیا واقعی تم کو نہیں معلوم؟"

"قسم خدا کی! ابھی اس شہر میں کسی اخبار والے کو معلوم نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔" دیکھو سکندر بادشاہ اپنا تو یہی کیریئر ہے۔ تم "ایکس کلیوسو" اسٹوری لائے ہو۔ جو معلوم ہے وہ بتاؤ۔۔۔ اتنا بڑا دھماکا۔۔۔"

"مرزا غالب! کیا تم نے شام کا اخبار نہیں دیکھا؟ جو صبح کے بعد آیا تھا۔" میں نے اسے پھر روک لیا۔

"کون سا اخبار؟" غالب نے کہا۔" شام کے سارے اخبار میری ڈیسک پر پڑے ہیں۔"

"اور ان میں یہ خبر نہیں دیکھی تم نے؟" میں نے برہمی سے کہا۔" بے وقوف بنانے کا ڈراما اب بند کرو۔"

"لاحول ولاقوۃ! تم نام بتاؤ اخبار کا۔ ہم تو ہر اخبار کی پرنٹ لائن تک خوردبین سے دیکھتے ہیں۔ ہماری اس عینک کے شیشے وہ بھی پڑھ لیتے ہیں جو شائع نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔"کس اخبار کی بات کر رہے ہو تم؟"

میرا دماغ چکرا گیا۔ غالب سنجیدہ تھا اور ہوش میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اُسے نام بتایا تو وہ مجھے پانچ منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر واپس گیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ صرف ایک ہی اخبار کے

ندے کو سب سے پہلے خبر ملی ہو اور اس نے دوسروں کو بتائے بغیر دھماکا کیا ہو مگر دھماکے کو بھی اب تو دس بارہ گھنٹے ہو چکے۔ یہ خبر تو جنگل کی آگ بن کر پھیلنے والی تھی۔ اگر اس کو دبانا مقصود ہوتا تو اس وقت کچھ ہو سکتا تھا جب پہلا اخباری نمائندہ نمودار ہوا تھا۔ ایک اخبار میں چھپ گئی تو گویا سب میں چھپ گئی لیکن کمال ہے کہ اتنے بڑے اخبار کا ایک اتنا سینیئر اور پرانا صحافی ابھی تک بے خبر ہے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں غالب پھر نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں وہی شام کا اخبار تھا۔" لو یہ دیکھو۔ بتاؤ کہاں ہے وہ خبر؟" اُس نے اخبار مجھے تھما کر کہا۔" یہی اخبار تھا نا؟"

"ہاں! اخبار تو یہی تھا۔" میں نے پہلے صفحے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور میری عقل خبط ہو گئی۔ میں نے اخبار کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس میں ہر خبر مختلف تھی۔ میں نے نظر اٹھا کے غالب کو دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی سمجھدار باپ اپنے شریف زادے کو پہلی بار نشے میں گم لوٹتے پر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرا ہاتھ اندر کی جیب میں گیا اور میں نے وہ اخبار نکال لیا جو اتفاق سے ابھی تک محفوظ تھا۔ ورنہ میرے محسن اور رابعہ کے پڑھ لینے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی کہ اُسے ضرورت کے لیے سنبھال کر رکھا جاتا۔ میں نے وہ اخبار غالب کی طرف بڑھا دیا۔

غالب نے تہہ در تہہ اخبار کو کھولا اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کے رُخ کر کے پڑھا۔ وہ ایک دم ہنسا۔" سکندر بادشاہ! تم وقت سے چوبیس گھنٹے پیچھے چل رہے ہو۔" وہ بولا۔" یہ کل کا اخبار ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" میں نے اخبار اُس سے چھین کر تاریخ دیکھی۔ تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔" یار غالب تم یہ مت سمجھنا کہ میں نے دانستہ نادانستہ چرس بھری سگریٹ پی لی ہے یا میرا دماغ ویسے ہی چل گیا ہے۔ یہ اخبار میں نے آج خریدا تھا اور ایک ہاکر سے۔ وہ چلّا چلّا کے اخبار بیچ رہا تھا اور یہی اعلان کر رہا تھا۔ تم دیکھو یہ خبر۔"

"خبر تو ہے مگر یہ کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ اخبار دیکھ کر بولا۔ "چلو پہلے کچھ کھا پی لیں۔ پھر یہ معمّا بھی حل کرتے ہیں۔ تمھارے ساتھ کوئی فراڈ ہوا ہے۔"

"اخبار والوں نے فراڈ کیا ہے؟" میں نے کہا۔" ان کو کتنے نفل کا ثواب ملا ہو گا؟"

"اس میں ثواب عذاب کا کیا ذکر! ہم سمجھ رہے ہیں بات کو۔ ابھی تم کو بھی سمجھا دیتے ہیں۔" اس نے ایک ریسٹورنٹ کا دروازہ

کھولا۔ اندر سے گرم ہوا کا جھونکا آیا جس میں کھانوں کی اور چائے کی خوشبو تھی لیکن میری بھوک غائب ہو گئی تھی۔ البتہ غالب میرے مقابلے میں زیادہ پُرسکون رہا۔ اُس نے اصرار کر کے مجھے بھی کھانا کھلایا اور خود بھی ڈٹ کر کھایا۔ پھر اُس نے کافی منگوائی اور میرے پیکٹ میں سے سگریٹ جلائی۔ درمیان میں اُس نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔

"اب سناؤ ذرا احوالِ واقعی! آخر یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا؟" وہ بولا۔

میں نے اُسے کم سے کم الفاظ میں بتایا کہ کس طرح ہم ٹیڈی کے گھر سے فرار ہوئے تھے اور کس طرح شامتِ اعمال ہمیں اُس گھر میں لے گئی تھی جہاں پہلے میرے والد رہتے تھے اور اب ایک ریٹائرڈ جج رہتا ہے۔ میں نے جج کی زبانی ہونے والے انکشافات کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اخبار میں نے واپسی میں ساڑھے بارہ ایک بجے کے قریب لیا تھا۔ بظاہر وہیں سے کوئی میرے پیچھے لگ گیا تھا جس نے اورینٹ ہوٹل تک میرا تعاقب کیا اور پولیس کو اطلاع دی۔ ہم وہاں سے کیسے نکلے، کس طرح رابعہ سے ملے اور اس وقت کہاں سے آ رہے تھے، یہ سب غالب نے بڑی توجہ سے سُنا پھر میں نے محسن کے خیال کا تذکرہ کیا جسے اب تک مجذوب کی بڑ سمجھتے ہوئے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیکن اب میں اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ محسن واقعی صاحب کشف و کرامات ہے۔

"لاحول ولاقوۃ! ابھی اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا، نشانے پر لگ گیا۔ ایسے تو سب ولی ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں۔ وہ باپ بیٹے تھے نا جو کہتے تھے کہ دنیا میں ہم سے سچا کوئی نہیں۔ باپ کہتا تھا کل بارش ہوگی بیٹا کہتا تھا کل بارش نہیں ہوگی۔ کبھی ایک کی بات سچ ثابت ہوتی تھی کبھی دوسرے کی۔ میں ابھی کہوں کہ صبح زلزلہ آئے گا۔ آگیا تو میں صاحبِ کشف و کرامات ورنہ پاگل۔"

"مرزا غالب! اگر دلاور مرا نہیں ہے تو کون مرا ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تم کو معلوم کرنا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے وہ بات بتاؤ جو میری ناقص عقل میں نہیں آرہی ہے۔ یہ ایک تاریخ کے دو اخبار کیسے ہوگئے؟"

"جہاں تک ہماری فہم و فراست کو دخل ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ فراڈ اخبار والوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کل جب اخبار چھپ گیا تو اس کی وہ کاپی چرا لی گئی یا کسی بے ایمانی سے خرید لی گئی جو بے مصرف ہوگئی تھی۔ مطلب اس کاپی سے ہے جس پر خبریں جوڑی جاتی ہیں اور اخبار چھاپا جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اسی جگہ کل دوسری خبر تھی۔ کسی افریقی ریاست میں فوجی انقلاب آنے اور ناکام ہونے کی خبر تھی۔ کسی نے اس خبر کو نکال دیا اور ایک نئی خبر کی کتابت کرائی گئی۔ سرخی لکھوائی گئی اور اصل خبر کی جگہ لگادی گئی۔ کتابت تو ٹھیک ہے لیکن خبر کی زبان صحافیانہ نہیں ہے۔ اس میں کچھ "پرسنل ٹچ" ہے۔ رپورٹنگ میں اور اسٹوری رائٹنگ میں فرق ہے اور یہ کسی رپورٹر کی زبان نہیں۔ اس میں افسانوی رنگ ہے۔ خیر تو یہ کل کی کاپی کافی مہارت کے ساتھ بدلی گئی۔ یہ خاصا ٹیکنیکل کام ہے اور بہت پلاننگ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ اسکیم پہلے ہی تیار کرلی گئی ہوگی۔ سرخی کے ساتھ خبر بھی کتابت کرائی جاچکی ہوگی۔ کسی کاپی جوڑنے والے سے بھی بات طے ہوگی۔ اب ممکن ہے یہ کوئی نہ بتا سکے کہ کاتب کہاں سے لیا گیا تھا اور کاپی جوڑنے والا کہاں سے۔ تاہم انھوں نے بھاری معاوضے پر یہ کام کردیا۔ ایک کاتب یا کاپی پیسٹر کے لیے دس ہزار بھی بھاری معاوضہ ہے۔ پھر دن کے وقت کسی اخبار کے پریس میں مشین مین وغیرہ کی مدد سے بدلی ہوئی خبر کے ساتھ اخبار کی سو پچاس کاپیاں چھاپ لی گئیں۔

"کیا ان کو الہام ہوا تھا کہ اس وقت میں فلاں جگہ سے گزروں گا؟"

"ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ تم کہاں ہو۔" غالب نے کہا۔ "انھوں نے کسی لڑکے کو چند منٹ کے لیے وہاں کھڑا کردیا اور اس نے تم کو دیکھتے ہی اناؤنسمنٹ شروع کردی۔ چند منٹ میں اس کے پاس سے کتنے اخبار نکلے ہوں گے۔ یہی چار پانچ اور بھی غیر متعلقہ افراد نے محض تجسس میں خرید لیے ہوں گے یا انھوں نے جو پڑھتے ہی شام کا اخبار ہیں۔ خبر شہر میں کیسے پھیل سکتی ہے۔ اب تو ہم کہیں کہ خریدار بھی انہی کے تھے تو بعید از قیاس نہیں۔ اگر تم ادھر نہ جاتے تو یہ اخبار کسی اور جگہ تمھارے ہاتھ میں تھمایا جاتا۔"

"لیکن ہم تو کسی پروگرام کے بغیر ادھر چلے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ تم کو ہانک کر ٹیڈی کے گھر سے نکالا گیا تھا۔" غالب بولا۔ "اور ان کی توقعات کے مطابق تم نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ تم پیچھے سے فرار ہوئے تھے جہاں وہ تم کو دیکھ رہے تھے۔ خلافِ توقع صرف ایک بات ہوئی تھی جب تم شمشاد کے گھر میں چلے گئے تھے اور پھر اس کی کار میں روانہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے انھوں نے بعد میں شمشاد سے ہی پوچھا ہوگا کہ وہ مہمانوں کو کہاں چھوڑنے گیا تھا اور اس نے بتا دیا ہوگا۔"

"اسے ہم نے ضلع کچہری سے ذرا آگے اتار دیا تھا۔ اس نے کیا بتایا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"باقی ان کا اندازہ تھا جو درست ثابت ہوا۔" غالب نے کہا۔ "تمھارا رُخ کدھر تھا آخر؟ اسی سمت میں جہاں تم اکثر جاتے رہتے ہو۔ گاڑی کہاں کھڑی کی تھی تم نے؟"

"اپنے پرانے گھر کے اندر۔" میں نے کہا۔

غالب ہنسا۔ "انھوں نے گاڑی دیکھ لی ہوگی۔ کتنی دیر کھڑی رہی تھی وہاں گاڑی؟"

"کافی دیر تک۔ میرا خیال ہے ڈیڑھ دو گھنٹے تک۔" میں نے احمقوں کی طرح کہا۔

"کافی مہلت دی تم نے انھیں۔" غالب بولا۔ "شمشاد تو آدھے گھنٹے بعد ہی واپس اپنے گھر پہنچ گیا ہوگا۔ اور اس کو کیا ضرورت تھی تمھارے غیر شریفانہ سلوک کے بعد کچھ چھپانے کی۔ وہ ڈرا ہوگا یا ڈرا دیا گیا ہوگا کہ جھوٹ بولنے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ انھیں بہت زیادہ وقت تو نہیں ملا لیکن ان کی خوش قسمتی تھی یا تمھاری بدقسمتی کہ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور تم ماڈل ٹاؤن میں دریافت ہوگئے۔ باقی انتظام مکمل تھا۔"

"مرزا غالب! محسن کی بات کو تمھاری بات کے ساتھ ملا کے سمجھا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے لیکن ابھی اس میں ایک بہت بڑا سقم ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ٹیڈی کے گھر سے نکالنے والوں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ ہم زندہ سلامت نکل جائیں۔ انھوں نے تو رابعہ کی گاڑی میں بم فٹ کرکے ہمارا کام تمام کرنے کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔ پھر یہ اخبار کے ذریعے جعلی خبر مجھ تک پہنچانے کا انتظام انھوں نے کیوں کیا تھا؟ یہ انتظام پہلے کرلیا گیا تھا اور بم بعد میں رکھا گیا۔ وہ مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے تو اخبار کے ذریعے جھوٹی خبر پہنچانے کا بندوبست تو بے مقصد ہو چکا تھا۔ کیا وہ اس کی کاپی مجھے عدم آباد ارسال کرتے؟"

"ہم نے آپ کی بکواس بڑے تحمل سے سُنی۔" غالب بولا۔ "اب آپ بھی ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے ایک حقیقت کو تسلیم کریں جس پر سے ہم پردہ اٹھانے والے ہیں۔ چوہدری صاحب کو ہرگز آپ کی وفات مطلوب نہیں تھی۔ رابعہ کی کار میں بم رابعہ کو ختم کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔"

مجھ پر دہشت سے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ "رابعہ کو؟ اب وہ اس حد تک گر گئے ہیں!"

"وہ مقولہ ہمیشہ صحیح رہے گا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "امریکی آج بھی کہتے ہیں کہ ہم ایٹم بم استعمال نہ کرتے تو جاپان ہتھیار نہ ڈالتا اور جنگ جاری رہتی تو اس سے کہیں زیادہ لوگ مارے جاتے جتنے ایٹم بم سے ہلاک ہوئے تھے۔ یہ جمع تفریق کا سیدھا سا سوال تھا لیکن اس کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھا گیا کہ ایٹم بم سے ہلاک ہونے والے جارحیت کا ارتکاب کرنے والے ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتا تو مرنے والے دوسرے ہوتے جو بقول فاتح کے امن پسند تھے۔ چنانچہ برادرِ کلاں! رابعہ کا قتل ایک ایٹم بم ہوتا جس کے بعد تم جنگ میں اپنی ہار مان لیتے۔ اس نقصانِ عظیم کے بعد تمھارے لیے فتح بے مقصد ہو جاتی اور تمھارا حوصلہ اتنا پست ہو جاتا کہ شاید تم انتقام کے پاگل پن میں سیدھے دلاور کو قتل کرنے پہنچتے اور پھر خود کو گولی مار لیتے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ چنانچہ دلاور وقتی طور پر غائب ہوگیا اور تم کو یقین دلا دیا گیا کہ وہ خود بھی قتل ہوگیا۔ اب تم انتقام بھی لوگے تو کس سے۔ صرف اپنے آپ سے۔ دنیا کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔ پاگل ہو جاؤ گے یا خودکشی کرلو گے۔ یہی دلاور چاہتا تھا۔ اس کی اسکیم کسی کی تدبیر سے فیل نہیں ہوئی بلکہ ایک اور صداقت کا وجود قائم رکھنے کے لیے یہ اہتمام تقدیر نے کیا۔ صداقت یہ ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہے۔ شکاری رابعہ کے پیچھے پیچھے پہنچے تھے۔ جب وہ تمھارے پاس گئی تو اُن کو معلوم نہ تھا کہ وہ گاڑی تمھارے سپرد کرنے گئی ہے۔"

یکلخت مجھے ایک خیال آیا۔ "غلط۔ وہ مشکل سے چند منٹ رکی تھی پھر محسن اسے چھوڑنے گیا تھا اور اگر اس عرصے میں انھوں نے بم رکھ دیا ہوتا تو وہ دونوں مارے جاتے مگر محسن دس منٹ میں لوٹ آیا تھا۔"

"اچھا، تو پھر انھوں نے بم بعد میں رکھا۔" غالب بولا۔ "محسن اور رابعہ کے آنے سے ان کو وقت نہیں ملا ہوگا اور وہ چھپ گئے ہوں گے۔ دس منٹ بعد وہ دیکھ نہیں سکے ہوں گے کہ گاڑی میں صرف محسن واپس آیا ہے یا اس کے ساتھ رابعہ بھی واپس آئی ہے۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ دونوں کسی کام سے گئے تھے اور جلدی ہی لوٹ آئے۔ پھر انھوں نے بم فٹ کیا اور چلے گئے۔ ان کو وہاں رُکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دوسری ٹیم تھی جس نے تم کو ٹیڈی کے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کیا اور عقبی گلی سے نکالا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم سامنے سے نکلو اور گاڑی میں جاؤ۔ ان کے خیال کے مطابق رابعہ اندر ہی تمھارے ساتھ تھی اور جب تم نکلے تو تمھارے ساتھ نہیں تھی۔ ظاہر ہے ان کو اپنی کامیابی کا یقین تھا کہ اب رابعہ اپنی گاڑی میں ہی واپس جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور گاڑی وہیں کھڑی رہی۔ کل کے اخبار میں گاڑی میں بم کا دھماکا ہونے کی خبر

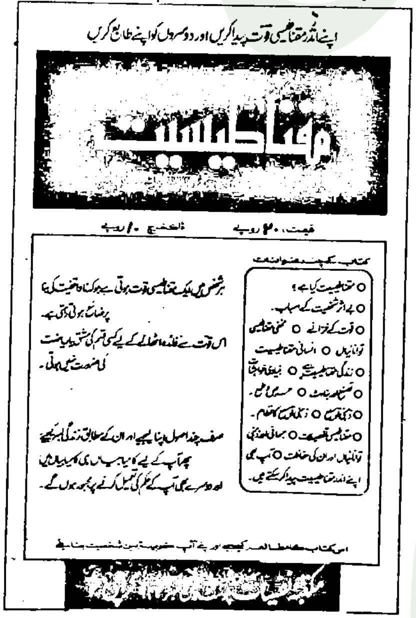

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہ ہوتی تو دلاور شاید ایک نمبر ٹیم سے پوچھتا کہ یہ کیا ہے اور وہ دیکھتے جاتے لیکن اب اُسے معلوم ہو جائے گا کہ ایک نمبر ٹیم بھی کامیاب رہی اور دو نمبر نے بھی اپنا کام بالکل پلاننگ کے مطابق کیا اور بوگس خبر والا اخبار سکندر بخت کو پہنچا دیا۔"

"اور وہاں سے پولیس کا کوئی مخبر میرے پیچھے لگ گیا۔" میں نے کہا۔ اس خیال سے میرا وجود ابھی تک لرز رہا تھا کہ بم کے دھماکے سے سچ مچ رابعہ ماری جاتی تو میرا کیا ہوتا۔ شاید وہی ہوتا جو دلاور چاہتا تھا۔ ذرا سی احتیاط پسندی کی عادت کے باعث میں نے رابعہ کو روک لیا اور رابعہ کی جگہ وہ مکینک مارا گیا۔

"اب دلاور کو خبر مل چکی ہوگی کہ رابعہ اس کار میں جل کے مر گئی۔ وہاں کچھ گواہوں نے بھی تصدیق کر دی ہوگی مثلاً گیراج کے مالک نے کہ ایک عورت آئی تو تھی۔ اور اسے کوئی بلا کے لے گیا تھا۔" غالب نے کہا۔ "مرنے والا ایک مکینک تھا۔ کل تک یہ غلط فہمی رفع ہو جائے گی کیونکہ رابعہ اپنی کار کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے گئی ہے۔ رپورٹ لکھوانے کا وقت دھماکے سے بہت پہلے کا ہوگا۔ دلاور سمجھ جائے گا کہ دھماکے سے رابعہ نہیں مری، مکینک مارا گیا ہے۔"

"لیکن اس ناکامی کی خبر دلاور کو بہت مشتعل کرے گی۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔" اور وہ ایک ناکامی سے دل برداشتہ ہونے والا آدمی نہیں ہے۔ رابعہ کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہے غالب۔"

"میں اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "وہ دوسرا ایٹم بم بہت جلد گرائیں گے۔"

مجھے فوراً کچھ کرنا ہوگا غالب۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "رابعہ کو اس طرح نہیں پھرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میری شکست کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ ہر جگہ ہر وقت شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہے اور ہر شکاری دشمن کے لیے سب سے آسان نشانہ ہے۔" میں نے سو کا ایک نوٹ میز پر رکھا اور باہر نکل آیا۔

"تم کیا کرو گے؟ اسے جیب میں ڈال کے پھرو گے یا جادو سے غائب کر دو گے؟" غالب نے کہا۔ "اور صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اُسے دور بھیج دیا۔ کسی ایسی جگہ جہاں کسی کے خیال و گمان کا گزر نہ ہو۔ تو پہلی بات یہ کہ وہ ایسی جگہ جانا قبول ہی نہیں کرے گی۔ بعد میں یہ ہوگا کہ خود تم جدائی کی تاب نہ لا سکو گے۔ اُدھر وہ تمہاری فکر میں نیم جاں، اِدھر تم اس کے غم میں ہلکان۔ یہ تم سے نہ ہوگا۔"

"یہ تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ وقتی دوری کی مجبوری اور زندگی میں سے ایک کا انتخاب کیے بغیر چارہ نہیں۔ دشمن نے بزدلی اور بزدلی کا حربہ آزمایا تو میں شرافت اور اصول کو پہلے بالائے طاق رکھ چکا ہوں۔ پھر مجھے بھی یہی کرنا پڑے گا گر میں نے کبھی نہیں کی لیکن جواب ہمیشہ اینٹ کا پتھر سے دیا ہے وہ رابعہ کے بعد محسن کو میری کمزوری بنا کے وار کر سکتا ہے تو میں بھی اس کی کمزوریوں کو اپنی شہ زوری بنا سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس کی بھی ایک فیملی ہے، بیوی بچے ہیں۔ اس نے جنگ اپنی اور میری ذات تک محدود نہ رکھا تو نقصان دونوں طرف برابر کا ہوگا۔"

"اتنی سردی میں تمہارے دماغ کا انجن بہت گرم ہو رہا ہے۔ اس لیے ابھی یہ بات ختم کرو۔ بس اتنا طے ہے کہ تم کو رابعہ کی حفاظت کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے؟ یہ بعد میں اس وقت سوچنا جب دماغ سوچنے کے قابل ہو۔ اسی کام سے آئے تھے تم ہمارے پاس؟" غالب نے کہا۔ "یا کچھ اور بھی ہے؟"

"اصل کام تو میں نے تم کو بتایا ہی نہیں۔" میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "تم کو ابھی دلاور کی کوٹھی پہ جانا ہے۔ وہاں کچھ سوگواران جمع ہیں اور پولیس بھی ہے لیکن وہ سارا اسٹیج ہمارے لیے بنایا گیا ہے۔ تم یہ جعلی خبر والا اخبار لے کر پہنچ جاؤ اور دیکھو کہ مرنے والا کون ہے۔ ان کا ڈراما خلاب ہو جائے گا۔"

"گویا آپ فرما رہے ہیں کہ چڑھ جا بیٹا سولی، رام بھلی کریں گے"

"یار تمہارے لیے ڈرنے کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری روانگی کے بعد میں ایک فون کر دیتا ہوں دلاور کی کوٹھی کے نمبر پہ کہ کچھ ایسی بات ہے اور ہمارا ایک نمائندہ مسمی مرزا غالب بقلم خود تصدیق کے لیے آ رہا ہے۔ اس سے بڑی افراتفری پھیلے گی وہاں۔ وہ تم کو غائب کرتے سے رہے۔ ڈراما ختم کر دیں گے۔ یا تو لاش کو فوراً تدفین کے لیے ارسال کر دیں گے اور تم سے کہہ دیں گے کہ وہ غلط فہمی کسی شرپسند نے پھیلائی تھی اور الحمدللہ کہ چوہدری صاحب سو فیصد زندہ ہیں۔ اور مری لیں میں۔ صاف انکار کر دیں گے کہ یہاں اصلی یا نقلی کوئی چوہدری دلاور نہیں مرا۔"

"از روئے قانون رات دس بجے کے بعد کوئی لاش تدفین کے لیے قبرستان لے جانے پہ پابندی ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔

"پھر وہ صبح ہوتے ہی اس دلاور سمجھ لیے جانے والے یا دلاور کی جگہ استعمال ہونے والے کو ٹھکانے لگانے کے لیے روانہ کریں گے۔" میں نے کہا۔ "تم پولیس کو پیچھے لگا دو۔ وہ معلوم کریں کہ کون قتل ہوا تھا۔ ہوا تھا تو اس کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہیں دی گئی۔ اصل اور نقل اخبار کا اسکینڈل اور چھوڑ دو۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔"

"ہمیں اپنے ہوائی گھوڑے پر جانا پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "منجمد حالت میں پہنچیں گے ہم۔"

"میں بھی سر سے کفن باندھ کے پیچھے بیٹھوں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک پر اتار دینا۔ ہوٹل اوسس کے سامنے اور واپسی میں وہیں آنا۔ ایس بی کے خان کے نام سے میرا کمرہ بک ہوگا۔"

مرزا غالب تھوڑی دیر بعد سر پہ کنٹوپ چڑھائے دستانے پہنے موٹر سائیکل لیے نمودار ہوا اور میرے پاس آ رکا۔ میں نے اُس کے پیچھے بیٹھنے کے بعد دونوں پاؤں کہیں ٹکانے کی جگہ تلاش کی مگر دونوں طرف فٹ اسٹینڈ تھے ہی نہیں۔ پیچھے کیریئر کا سہارا بھی نہیں تھا چنانچہ موٹر سائیکل کے کسی بھی جگہ نیچے سے نکل جانے کے امکانات بہت روشن تھے۔ خود موٹر سائیکل پہ دو افراد کا سوار ہونا بے رحمی کا مظاہرہ لگتا تھا۔ وہ خاصی بے جان چیز تھی۔ "یہ کیا مصیبت ہے مرزا جی! میں اپنے پیر کہاں رکھوں؟" میں نے کہا۔ "ٹکانے کی جگہ ہی نہیں۔"

"ہوائی گھوڑے کی رکاب نہیں ہوتی۔" غالب نے چلا کر کہا۔ سائیں سائیں کرتی سرد ہوا میرے کانوں کو سن کرتی گزر رہی تھی۔ میرے دونوں پیر بریکٹ کی شکل میں سڑک سے چند انچ اوپر تھے اور گردش کرتے ہوئے پہیے سے بھی دور تھے۔ اس پوزیشن کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر پیر ذرا نیچے کرتا تو سڑک سے جا لگتے اور موٹر سائیکل زوم سے نکل جاتی تو میں سڑک پہ کھڑا یا پڑا رہ جاتا۔ اندر کرتا تو میری پتلون ضرور پہیے میں پھنس جاتی۔ جگہ ہوتی تو میں سیٹ کے پچھلے حصے پر اکڑوں بیٹھنا پسند کرتا لیکن اب میری حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ آخر کوئی شخص کب تک پیروں کو ہوا میں معلق رکھ سکتا ہے اور وہ بھی اتنی سخت سرد ہوا میں اور ناہموار سڑک پر۔ میرے پیر اکڑنے لگے تھے۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری کیونکہ سفر مختصر تھا۔ پانچ منٹ بعد جو میرے لیے پانچ گھنٹے کی مشقت تھے میں ہوٹل اوسس کے سامنے اترا تو میرے لیے سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ میری ٹانگیں بدستور بریکٹ بنی ہوئی تھیں۔ یوں کہ ٹخنوں کے درمیان فاصلہ چھ انچ کا تھا تو گھٹنوں کے درمیان ایک فٹ کا۔

"یار مجھے کمرہ دلا جاؤ۔ خالی ہاتھ جاؤں گا تو ہوٹل والے شک کریں گے۔" میں نے ٹیکسی بجاتے ہوئے کہا اور میرا خیال درست تھا۔ اگر مرزا غالب اپنا اخبار کا پریس کارڈ نہ دکھاتے تو مجھے جگہ نہ ملتی۔ میں نے ایڈوانس ادائیگی کی اور کمرے میں جاتے ہی پہلے ہیٹر جلایا پھر ہوٹل ویسٹ اینڈ فون کیا۔ گیس ہیٹر کی حرارت سے میری ٹانگیں کانپنا بند ہو گئیں۔ ایک ہوٹل کے آپریٹر نے دوسرے آپریٹر سے بات کی اور نمبر مانگا۔ میں ریسیور تھامے لحاف میں گھس گیا۔

"میں ایس بی کے خان بول رہا ہوں لحاف کے اندر سے۔" میں نے کہا۔

"باہر مت نکلنا، میں آ رہی ہوں۔" رابعہ ہنسی۔ "ابھی پانچ منٹ میں۔"

"وہ بھی کسی کے ساتھ۔ نیک محمد اور محسن زندہ ہوں تو انھیں ہی لے آنا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار میں نے روم سروس کو چار افراد کے لیے چار گیلن کافی اور چار پونڈ سینڈوچز ارسال کرنے کو کہا۔ کاؤنٹر کلرک نے مجھے بھی خبطی اخبار والا سمجھ کے صرف "یس سر!" کہا اور پھر پوچھا کہ کیا میرے مہمان آنے والے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ ایک تو مہمان نہیں، بلائے جان ہے۔ اور اسے وہ شعر سنایا کہ بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات، عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دس منٹ بعد دستک ہوئی تو میں نے لحاف کے اندر سے ہی چلا کر کہا۔ "یس!" پھر محسن نے لحاف کھینچ کر نیچے پھینک دیا۔ میں اُٹھ بیٹھا اور میں نے محسن کا ہاتھ عقیدت سے پکڑ کے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

بچوں کے مشہور ادیب شکیل انجم کی مقبول ترین کتابیں

آئندہ ماہ کے ناول

کرنل پرویز سیریز نمبر ۱۹
بین الاقوامی سازش پر مبنی سنسنی خیز ناول
پکارتی لاشیں
کیا لاشیں پکار سکتی ہیں۔ جی ہاں! لاشیں پکار رہی تھیں۔ اس عمارت میں زبردست دھماکا ہوا اور ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ سدو بھائی کو ایک شخص نے گہرے سمندر میں پھینک دیا۔ ایک خوبصورت لڑکی جو زہریلی ناگن تھی!!!

کرنل پرویز سیریز نمبر ۲۰
خوف و دہشت میں ڈوبی ہوئی ہولناک ناول
جہنم کی بلائیں
فیصل، ندیم اور سدو بھائی جہنم کی بلاؤں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اس ویران حویلی میں ایک بہت بڑا باتھ برآمد ہوا اور سدو بھائی کو اپنی مٹھی میں دبا کے لے گیا۔ سدو بھائی کا کیا حشر ہوا یہ بات تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہو سکتی ہے!!

قیمت فی کتاب ۱۰ روپے

قابوط سیریز نمبر
مزاح، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور
مسٹر چکرم
وہ عجیب شخص تھا جو سر کے بل کھڑا ہو کر کتے کی طرح بھونکتا تھا۔ قابوط بھی اس

قابوط سیریز نمبر
قدم قدم پر چونکا دینے والا ناول
تیسرا روپ
اس کے تین روپ تھے اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف اور سنسنی خیز۔ انسپکٹر خورشید

کتابیات پبلی کیشنز ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ۔ کراچی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"اتنی سی دیر میں دشمنوں نے کچھ کر دیا؟" رابعہ نے تشویش سے کہا۔

"وہ سب گستاخیاں جو میں نے اب تک آپ کی شان میں فرمائیں۔" میں نے کہا "اور آئندہ فرماؤں گا۔ ان سب کو معاف کیا جائے تو یہ بندہ حقیر آپ کو اپنا پیر بلکہ منگل اور بدھ تک تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ میں بکواس کرتا تھا اور آپ سچ کہتے تھے۔ دلاور زندہ ہے اور صرف اس لیے زندہ ہے کہ ہمیں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ثابت کر سکے۔"

"جمع کا صیغہ مت استعمال کر۔" محسن نے بیٹھتے ہوئے گرج کر کہا۔ "ہم پہلے ہی جانتے تھے۔"

"یار سکندر بادشاہ! کتنا اچھا ہوتا اگر یہ چوہدری صاحب سچ مچ مر جاتے۔" استاد ٹیڈی نے آہ بھر کے کہا۔ غالباً محسن اسے پوری طرح بریف کر چکا تھا۔

"تم لوگوں نے کیا تیر مارا، رپورٹ لکھوا دی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ پانچ سو روپیہ سکۂ رائج الوقت نے کام آسان کر دیا۔" محسن بولا۔ "میں نے تو تھانیدار سے صاف بات کی کہ بھئی نقد سودا ہے۔ تکلف کیسا لاؤ اور اس نے کہا کہ صاحب ہم بیٹھے ہی خدمت کے لیے ہیں۔ اب دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ دھماکا ہونے سے دو گھنٹے قبل مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ گاڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوانے خود تھانے آئی تھیں۔ غالب ملا؟"

"ہاں۔ مجھے یہاں چھوڑ کے چوہدری دلاور کے گھر گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا؟"

"ہاں۔ بس اپنے خواجہ نیک محمد کے کمرے میں کچھ چر لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نے دستک دی اور کافی کے ساتھ سینڈوچز لے کر دو ویٹر اندر آئے۔ انھوں نے اپنی اپنی ٹرے ایک ہی میز پر رکھی اور کچھ کہے بغیر نکل گئے تو میں نے ان کو بتایا کہ غالب سے ملاقات کے کتنے سنسنی خیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

"دلاور کی موت ہی جعلی نہیں تھی، وہ خبر بھی جعلی تھی، اخبار بھی جعلی تھا!" رابعہ نے سخت حیران ہو کے کہا۔ "کیا زرخیز ذہن ہے چوہدری دلاور کا، ایسے شیطانی منصوبے بناتے ہیں۔"

"اور جتنا وہ چالاک ہے تم اتنی ہی وہ ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا کہتے ہیں اسے محسن... عورت کو...؟"

"ہاں ہاں، ناقص العقل ہوں میں۔ تم بڑے عاقل خاں بالغ خاں ہو۔" رابعہ نے کہا۔

"آخر کیا کسی حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ اپنا سرمایہ اس گھر کو خریدنے میں لگاؤ؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھی تھی تم کو خوشی ہوگی۔" رابعہ نے رونی شکل بنا کے کہا۔ "میں تمھارے مستقبل سے ہی نہیں، ماضی سے بھی اپنا تعلق قائم کر رہی تھی۔" اس نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ "مگر تمھارے نزدیک میری یہ جذباتی حرکت، حماقت ہے۔"

میں سخت شرمندہ تھا کہ میں نے مذاق میں وہ بات کہہ دی جس نے ایک عورت کے جذبات کے آبگینے کو ٹھیس پہنچائی۔ رابعہ نڈر اور بے باک تھی، خود مختار اور جرأت مند تھی، بلند حوصلہ اور عام عورتوں کے مقابلے میں خطرناک ترین حالات میں ثابت قدم رہنے کی اہل تھی لیکن اس کے باوجود وہ اندر سے وہی عورت تھی جو محبت کرتی ہے تو جذبات و احساسات کی ساری وابستگی کے ساتھ........ اپنی چاہتوں کے سارے خزانے، اپنے وجود کی ساری خوشیاں اور راحتوں کے سامان، اپنی ذات کے سب رشتے ایک محبت پر قربان کر دینے والی۔ اسے بے وقوفی کہنا میری سب سے بڑی بے وقوفی تھی۔

"دیکھو رابعہ! آئی ایم سوری۔" میں نے کہا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔ آہستہ سے اس کے ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے اور اس کے آنسو صاف کیے۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ تم کو میری نیت پر شک تو نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو کیوں کر رہی ہو۔ اور یہ تو ایسی بات ہے جو دنیا جانتی ہے۔ بات صرف وقت کی ہے ورنہ ہم نے زندگی بھر کی رفاقت کا جو عہد کیا ہے اس میں سب سے بڑا عنصر اعتماد کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک عقلی فیصلہ ہے چنانچہ ہم کسی کے سامنے نادم نہیں اور پچھتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

اس وقت محسن نے بہت عقلمندی سے کام لیا۔ اس نے سگے بھائی کی طرح رابعہ کا سر اپنے کندھے پر رکھا۔ "سکندر کے بارے میں تم کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ وہ مذاق میں کچھ کہتا ہے تو اس میں کوئی برا ماننے والی بات ہوتی ہے۔ میں نے تم کو آج باجی کہا تھا لیکن کہنے سے پہلے بھی کیا میں ایسا ہی سمجھتا بھی نہیں تھا؟ اور کیا مجھے معلوم نہیں کہ سکندر کے لیے شہلا واقعی چھوٹی بہن ہے۔ سگے سوتیلے کچھ نہیں۔ یہ حقیقی رشتے ہیں۔ آپس کے یقین اور اعتماد پر مبنی۔ صرف نیک نیتی اور خلوص کے مظہر۔ ہم سب مل کے ساتھ چل رہے ہیں تو اسی اعتماد کے سہارے پیار اور اسی امید پر کہ کل ہمارا ہے۔ اور گزرے ہوئے کل کے مقابلے میں آنے والا دن ہماری دائمی خوشیوں کا ضامن ہے۔ وہ ایک ہی گھر اور ایک ہی خاندان ہوگا جس میں تم اور سکندر، میں اور شہلا ساتھ ساتھ ہوں گے۔"

"ہاں جی۔ بس ایک ہم رہ جائیں گے فٹ پاتھ پر کشکول لے کر بیٹھے ہوئے۔" ٹیڈی نے ایک سرد آہ بھر کے زور سے کہا۔ اور اس کی بات ایسی تھی کہ انتہائی بوجھل اور افسردہ فضا کے

باوجود ہم سب بے اختیار ہنس پڑے۔ خود رابعہ ہنسنے لگی۔

"تمھارا کشکول بھی خالی نہیں رہے گا دوست!" میں نے کہا۔ "بادل برستا ہے تو سب سوکھے کھیت سیراب ہوتے ہیں۔"

"مجھے تمھاری طرف سے بہت تشویش لاحق ہو گئی ہے رابعہ!" محسن نے کہا۔ "اگر دلاور نے وہی چاہا تھا جو غالب کا خیال تھا تو یہ بہت خطرناک چال ہے۔ اس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے بعد ہمیں محتاط تو رہنا ہی ہوگا۔ تم کو بھی سوچنا ہوگا کہ دلاور جیسے شکاری کی اس چال کو ناکام بنانے میں تم کس طرح ہماری مدد کر سکتی ہو۔"

"تم کو یاد ہوگا، میں نے بہت پہلے ایک بات کہی تھی۔" رابعہ نے نظر جھکا کے کہا۔ "کہ اگر کبھی میں گھر بناؤں گی تو اس گھر کی دیواریں میرے لیے اجنبی نہیں ہوں گی۔ جو بات اس گھر میں ہے کسی نئے گھر میں نہیں ہو سکتی تھی۔"

"میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور یہی میرے لیے دنیا کی سب سے بیش بہا دولت ہے لیکن حالات کچھ حقیقت پسندی کا تقاضا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!"

"کیا کبھی نہیں رہ سکتے؟" اس نے کافی بناتے بناتے کہا۔ "آج نہ سہی۔"

"یہ کون کہتا ہے! مستقبل کے یقین پر ہی تو ہماری جدوجہد کا انحصار ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی تو میں نے کہا ہے کہ آنے والا کل ہمارا ہے۔" محسن بولا۔

"لیکن وہ مکان آج برائے فروخت تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "کوئی اور اسے خرید لیتا تو پھر معلوم نہیں کیا ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کل وہ مالک کسی قیمت پر مکان ہمیں نہ دیتا یا اسے گرا کر اس کی جگہ ایک الٹرا ماڈرن اسٹرکچر کھڑا کر دیتا جو ہمیں بالکل نہ پہچانتا۔ میں نے تو کل کی خوشیوں کی ایک انشورنس پالیسی لی ہے۔ جو اپنے وقت پر ہی کام آئے گی۔"

اس زاویے سے میں نے واقعی نہیں سوچا تھا۔ رابعہ نے بروقت فیصلہ کیا تھا ورنہ تمام عمر میں اس گھر کے باہر سے گزرتے ہوئے پچھتاوے کا شکار رہتا۔ یہ سوچتا رہتا کہ اگر میں لندن نہ گیا ہوتا تو وزیر خان سے یہ مکان کوئی نہ چھین سکتا اور اس کا مالک میں ہوتا۔ رابعہ نے میرے بچپن کی یادوں کا موہنجو داڑو خرید لیا تھا اور مجھے اپنے ہی وقت کی ٹوٹی ہوئی ڈور سے منسلک کر دیا تھا۔ اب میں کہہ سکتا تھا کہ یہ گھر میرا تھا اور میرا ہے۔

"کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔ "سارا قصور میرا ہے۔ میں دماغ سے سوچ رہا تھا اور تم نے دل سے سوچا تھا اور آج کے مسائل نے مجھے اتنا گھیر رکھا ہے کہ میں کل کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میں اب شکریہ ادا کر کے تمھارے جذبے کی توہین نہیں کروں گا۔ تم نے واقعی بہت اچھا کیا ورنہ موقع نکل جاتا تو سب کچھ مل جاتا مگر یہ گھر نہ ملتا اور اس کے بغیر میری زندگی میں ایک خلا رہ جاتا۔ ابھی ہم بھی انتظار کر رہے ہیں، اس گھر کو بھی انتظار کرنے دو۔ یہی احساس کی خوشی کیا کم ہے کہ وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے ہیں۔"

"تم ابھی کہاں جاؤ گی میری پیاری باجی!" محسن نے کہا۔ "مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اب کہ قاتلانہ حملے کی اس واردات کا نشانہ تم تھیں اور نشانہ خطا ہو جانے سے شکاری اپنے عزائم نہیں بدلیں گے۔ تمھارا موجودہ ٹھکانا ان کے علم میں ہے اور تمھاری وجہ سے منظر کا گھر بھی خطرے کی جگہ ہے۔ وہ براہِ راست حملہ کریں گے تو تمھارے ساتھ منظر اور اس کے بیوی بچے بھی زد میں آئیں گے۔"

"کم سے کم منظر کو ہم سے دوستی کا یہ خمیازہ نہیں بھگتنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اس نے جس طرح ہماری مدد کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے، اس کا یہ صلہ نہیں کہ ہم اسے بھی خطرات کی دلدل میں پھنسا دیں۔"

"وہ جس حد تک ہم سے بے تعلق رہے اچھا ہے۔" محسن بولا۔ "اس طرح وہ رابعہ اینڈ منظر ایڈووکیٹس کی لیگل فرم کو بھی سنبھال سکے گا اور ہمارے قانونی مسائل سے بھی نمٹ سکے گا۔ پہلے تو رابعہ کا ایک سہارا یہی تھا، اب منظر کے سوا کون ہے۔"

"لیکن میں منظر کے گھر کے علاوہ کہاں رہ سکتی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔

"ایک تجویز تو یہ ہے کہ تم اسلام آباد چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔ "شہلا کے پاس۔"

"میں اس شہر سے دور نہیں جا سکتی۔" رابعہ نے قطعی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر روز نہ سہی وقتاً فوقتاً تمھاری، تم سب کی خیریت معلوم ہونی چاہیے۔"

"پھر دوسری تجویز یہ ہے۔" میں نے رک کر کہا۔ "کہ تم کسی گمنام آبادی میں گم ہو جاؤ لیکن وہاں تم اکیلی کیسے رہو گی اور ایسی جگہ ہم نے آنا جانا جاری رکھا تو تم کو فوراً غلط اور مشتبہ کردار کی عورت قرار دے دیا جائے گا۔ اس لیے میری تیسری تجویز یہ ہے..." میں نے ایک بار محسن اور رابعہ کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کہ تم انکل رضوی کے پاس چلی جاؤ۔"

میری بات کا اثر میری توقعات کے مطابق ہوا۔ وہ دونوں چونکے تو نہیں لیکن حیرت اور تذبذب کا شکار ہو گئے۔ "ان کو تم سے تھوڑی بہت شکایت ضرور ہوگی۔" میں نے خاموشی کے طویل وقفے کے بعد کہا۔ "مگر وہ میرے جرم کی سزا تم کو نہیں دے سکتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

...نے معقول آدمی ہیں کہ تمہاری مجبوری کو بھی معاف کر سکتے ہیں کہ تم مجھ سے اپنی جذباتی وابستگی کو میری قانونی پوزیشن کے باعث ختم نہیں کر سکتیں۔ نہ وہ تم سے توقع رکھیں گے کہ سکندر کو گرفتار کرانے میں ان سے تعاون کرو اور نہ تمہاری مجبوری کی وجہ سے مجھے کوئی رعایت دیں گے۔ رعایت تم کو مل سکتی ہے اگر تم ان سے جا کر کہو کہ میری زندگی کسی اور جگہ محفوظ نہیں رہی۔ حالات سے وہ پوری طرح باخبر ہوں گے۔ دل سے وہ بھی قائل ہوں گے کہ میں مجرم نہیں ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اس لیے کر رہا ہوں کہ قاعدے قانون اور ضابطے مجھے میرے درد کا درماں فراہم نہیں کر سکے اور مایوسی نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن وہ خود کیا کر سکتے ہیں۔ جب تک یہ سروس ہے وہ سروس رولز سے انحراف نہیں کریں گے مگر تمہارے لیے وہ گھر اپنے گھر سے کم نہیں۔ اور خدا کے بعد اگر کوئی تمہاری زندگی کی حفاظت کر سکتا ہے تو وہ انکل رضوی سے بہتر طور پر کوئی نہیں کر سکتا۔ وہی ایک جگہ ہے جہاں چوہدری دلاور جیسے بھی تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

"یہ... یہ سب تو ٹھیک ہے سکندر۔" رابعہ نے کہا۔ "لیکن میں اب کس منہ سے وہاں جاؤں۔"

"تمہارا یہ منہ اچھا خاصا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سالے سے پوچھ لو۔"

ایک طویل مدت کے بعد میں نے محسن کو سالا کہا تھا۔ وہ بھولے بسرے وقتوں کی بات تھی جب اس کی بہن فوزیہ سے قریبی تعلق کو میں نے محبت سمجھ لیا تھا۔ وہ دونوں خاندانوں کی قربت اور اپنائیت کے ماحول کا اثر تھا کہ بچپن سے میں نے فوزیہ کو سب سے قریب اور سب سے بہتر پایا اور عمر کے ساتھ اس انس کو محبت سمجھ لیا۔ دونوں کے خاندان پہلے سے ایک تھے چنانچہ ہمارے ایک ہونے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسی نے ہمارے تعلق کو ایک آفیشل قسم کی نسبت دے دی اور اس رشتے سے محسن میرا سالا بن رہا۔ پھر وقت کے ساتھ جذبات میں پختگی آ گئی اور عقل کے تقاضے تو بدلے ہی تھے، حالات بھی یوں بدلے کہ فوزیہ میری نظر میں وہ مثالی رفیقِ حیات نہ رہی جس کے ساتھ میں تمام عمر کا سفر طے کر سکتا۔ مجھے اس کی اور اپنی فطرت، مزاج اور عادات کا وہ فرق نظر آنے لگا جسے پہلے میری نظر نہیں دیکھ سکتی تھی اور عین اسی وقت رابعہ نے ایک بند دروازہ کھول کے میری زندگی میں دوبارہ قدم رکھا تو فوزیہ خود بخود فیڈ آؤٹ ہو گئی۔ آج سے پہلے بھی محسن نے رابعہ کو اسی طرح بڑی بہن سمجھا تھا جیسے وہ زندگی میں مریم کو سمجھتا تھا لیکن اچانک اس نے رابعہ کو باجی کہنا شروع کر دیا تھا۔ میری بات پر وہ چونکا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ یہ سب کچھ رابعہ نے بھی دیکھا اور نوٹ کیا اور میں نے خفت محسوس کی۔

"ان کے لیے ہم سب بچے ہیں۔ بچے نادان بھی ہوتے ہیں۔" میں نے بات جاری رکھی۔ "سرکش اور نافرمان بھی مگر بڑے انکل رضوی جیسے حقیقت پسند اور معقول ہوں تو عمر کے ان تقاضوں کو سمجھتے ہوئے سب معاف بھی کر دیتے ہیں۔"

"وہ... یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ کوئی چکر ہے... اور تم نے مجھے بھیجا ہے جاسوس بنا کے؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ انکل رضوی مجھے اور محسن کو پیدائش کے وقت سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ کبھی یقین نہیں کر سکتے کہ ہم ان کو بھی دشمنوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان سے ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ ہم کو مجرم سمجھ کے ہتھکڑی بھی لگا سکتے ہیں لیکن یہ بات نہیں بھول سکتے کہ ہم ان کے بچے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے خلاف بھی قانون کے معاملے میں رعایت نہیں کریں گے۔ جو دکھ ان کو ہوگا وہ اپنی جگہ ہے۔ دکھ ان کو اب بھی بہت ہوگا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس سے اپنے لیے مشکلات میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں اور وہ ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ بھی کم پریشان نہیں ہوں گے۔ تم جاؤ گی تو انہیں تھوڑی سی تسکین ملے گی۔ یہ احساس ہوگا کہ ان کے بچے اس گھر کو اب بھی اپنا گھر سمجھتے ہیں اور جب دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی تو لوٹ آتے ہیں۔ ان کی عمر کے آدمی کو یہ یقین بہت سہارا دیتا ہے کہ اس کے بچے اسے برا نہیں سمجھتے اور اس کا احترام کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔"

"تم کو اپنی نالائقی کا اعتراف کرنا مشکل تو ہوگا لیکن میرا خیال ہے تم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے۔" محسن بولا۔ رابعہ نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اسی وقت دروازے پر دھماکا ہوا اور مرزا غالب وارد ہوئے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہم سب بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر مار پیٹ کے نشانات تھے۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
پانچواں حصہ

پسندیدہ ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت ... تشریف لائیں

شکاری

... کے ان ناسور ... کی رُوداد جو گوشت پوست
کے ... انسانی ہڈیوں میں اُتر رہے تھے ... ایسے
کفن بردوش نوجوانوں کی کہانی جن کے روز و شب
موت کی بستی میں گزر رہے تھے ... سُلگتی راتیں
آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں
زندہ کرداروں پر مشتمل روایت شکن سلسلہ

"یہ کیا ہوا غالب؟" مَیں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا لیکن وہ سیدھا بیڈ کی طرف گیا اور جوتوں سمیت لحاف کے اندر گھس گیا۔

"ارے بھائی، یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا۔" وہ لحاف کے اندر سے بولا۔"مثلاً ثابت یہ ہوا کہ ہم سے بڑا احمق اگر کرۂ ارض پر اس وقت کوئی ہے تو آپ دونوں حضرات میں سے کوئی ہے۔ مانتے ہو یا نہیں؟"

"چلو تمھارا دل رکھنے کو مان لیتے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کو بلائیں؟"

"نہیں۔ابھی ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔"دردِ دل کی دوا کرے کوئی۔کسی ایسی خوب صورت نرس کو بلا دو!!"

"نرس تو نہیں، ایک وکیل ہے۔وصیت نامہ لکھوانا ہے تو بتاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"سردی سے یہ پانی کا بلبلہ منجمد ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔"کوئی صورت ہے لحاف کے اندر ہی کافی پہنچانے کی۔"

محسن نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو میرے ساتھ کیا تھا۔لحاف ہٹتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا۔رابعہ نے اسے کافی دی۔"دوستو! کلیجہ تھام لو پہلے، سنو پھر داستاں میری۔" وہ کافی کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔"یہ جو میری حالت ہے..."

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھاری خاصی ٹھکائی ہوئی ہے۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں۔وہ تو بس انھوں نے اُٹھایا اور باہر پھینک دیا تھا۔" وہ بولا۔"مگر مَیں ہاتھ جھاڑ کے واپس کیسے آجاتا۔مَیں پھر اُن سے اُلجھنے اندر گیا۔مَیں نے کہا تھا کہ بھئی چوہدری صاحب مریں یا جئیں، مجھے میرا اخبار تو واپس دے دو۔"

"اخبار چھین لیا انھوں نے؟" مَیں اور محسن ایک ساتھ چونکے۔

"ہاں۔اسی لیے تو مَیں نے کہا تھا کہ ہم تینوں حماقت میں لاثانی ہیں۔" وہ بولا۔"آخر ہم میں سے کسی کی عقل میں کیوں نہیں آیا کہ جب وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہے تو میرے ساتھ کیا ہوگا۔وہاں سناٹا تھا۔نہ سوگواران تھے اور نہ پولیس والے۔چوکیدار خبیث مجھے روک سکتا تھا مگر اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔فون کس نے کیا تھا؟"

"مَیں نے لیکن مقصد تو تمھاری حفاظت تھا۔" مَیں نے کہا۔

"اُس سے میری حفاظت نہیں ہوئی۔وہ پہلے سے ہوشیار ہوگئے۔سارا اسٹیج ہٹا دیا اور سارا تماشا ختم کر دیا۔مَیں نے اندر جا کے کہا کہ بڑا افسوس ہوا چوہدری صاحب کی وفاتِ حسرت آیات کا۔اور وہ شعر بھی پڑھا کہ حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کِھلے مُرجھا گئے مگر جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا کہنے لگا کہ کیا بکتے ہو۔مَیں نے کہا کہ بکتا نہیں سناتا ہوں اور اخبار میں جو شائع ہوا تھا وہ سنانے لگا۔بس اس نے ایک ہاتھ مارا۔پہلے اخبار پر اور پھر میرے اور دو آدمی اسکے اشارے کے منتظر تھے۔وہ مجھے باہر پھینکنے کے لیے اُٹھا کر لے گئے۔اخبار کی واپسی کے مطالبے پر تھوڑی سی ہاتھا پائی ہوئی۔پائی تو نہیں صرف ہاتھا ہوئی۔اُن کے ہاتھوں میری صورت خراب ہوئی اور مَیں پھر باہر پھینکا گیا۔اپنی موٹر سائیکل کے پاس۔گیٹ بند ہوگیا اور مَیں اُٹھ کے تمھاری بیوقوفی پر آنسو بہانا آگیا۔"

"واقعی یار! ہمیں اس اخبار کو تمھارے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مَیں نے کہا۔

"اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہی دے دیتے۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"فوٹو اسٹیٹ کاپی اتنی رات کو بھلا کہاں سے بنتی ؟" رابعہ نے سوال کیا۔

"بن جاتی سکندر کے لیے بخت آور۔" غالب نے کہا۔"جب میں اپنے آفس کے سامنے کھڑا اس جعلی خبر کو پڑھ رہا تھا تو میری عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اوپر اپنے آفس میں جا کے اس کی دس فوٹو کاپیاں بنوالوں۔ اصل کو محفوظ چھوڑ کر جا سکتا تھا لیکن میں اور سکندر بھوکے تھے اس لیے ہماری عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی۔"

"اب معلوم نہیں باقی دو چار جعلی اخبار کس نے لیے تھے۔"

"کسی نے بھی لیے ہوں مگر اب ہمیں کیسے مل سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ وہاں کوئی لاش تھی ؟"

"اندر جانے سے پہلے ہی تو میں دو بار باہر پھینکا گیا، میں کیا بتاؤں"! غالب بولا۔

"یہ تو ناممکن ہے کہ اتنے کم وقت میں انھوں نے لاش کو کہیں دفن کرنے کے لیے بھیج دیا ہو۔" میں نے کہا۔" حالانکہ بہت سے آدمی تھے مگر جیسا کہ تم نے بتایا' رات کو تدفین کی اجازت نہیں"

"تدفین ضروری بھی نہیں۔" محسن بولا۔"اُسے دریا میں ڈالا جاسکتا ہے یا سڑک پر۔"

"تم نے ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے ؟"

غالب نے اقرار میں سر ہلایا۔"اُن میں سے ایک استاد پیڈرو تھا۔"

میں اور محسن اچھل پڑے۔"تم کو کیسے معلوم ہوا ؟" محسن نے کہا۔

"ایک شخص نے اس کا نام لیا تھا۔"غالب نے کہا۔

"مرزا غالب ! تمھارا کوئی دوست میک اَپ مین بھی ہے ؟" محسن نے کہا۔"جو اپنے کام کا ماہر ہو۔"

"دوست تو نہیں ہے، جان پہچان ہے۔" غالب نے کہا۔

"اگر ہم اس وقت یہ چاہیں کہ وہ ہمارا میک اَپ کر دے" محسن بولا۔"تو کیا یہ ممکن ہے ؟"

"اس وقت !" غالب بھونچکا رہ گیا۔"آدھی رات کو ؟"

"اس وقت کہاں ملے گا وہ ؟" میں نے محسن کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔"اس کے گھر پر میک اَپ کا سامان ہوگا ؟"

"میں... کچھ کہہ نہیں سکتا۔" غالب بولا۔"اگر آدھی رات کے بعد کسی کو بیدار کر کے یہ درخواست کی جائے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ میک اَپ کے بغیر ہی حلیہ بگاڑ دے۔"

"اگر اس کو ایک ہزار روپے فی کس دیے جائیں۔" میں نے کہا۔"تو وہ مجھے اور محسن کو کیا بنا سکتا ہے ؟"

"وہ ہے تو لالچی آدمی۔" غالب سوچتے ہوئے بولے۔"ایک بار میں نے افواہ سنی تھی کہ اس نے کسی مجرم کی مدد کی تھی اور وہ ملک سے فرار ہوگیا تھا۔ جاتے جاتے اسے آنا دے گیا کہ اس نے اپنا مکان بنا لیا۔ ثبوت کوئی نہیں تھا اس لیے وہ پکڑا نہیں گیا تھا مگر دوست! دھواں تو وہیں سے اُٹھتا ہے نا جہاں آگ ہو۔ کچھ بات تو ہوگی۔"

"میرا خیال ہے تمھارا یہ دوست بہت صحیح آدمی ہے۔" میں نے کہا۔"اسے ایک رات کی محنت کا معقول صلہ ملے گا تو وہ ہمیں اپنا باپ بنانے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔"

"لیکن اس کا باپ بن کے تم کیا کرو گے ؟" غالب بولا۔"وہ تو مر چکا ہے۔"

"ہم بھی مر جائیں گے اگر ضروری ہوا۔" محسن نے مذاق میں ایک فضول سی بات کہی لیکن اس جملے نے میرے ذہن میں ایک نئے خیال کو جنم دیا۔ یہ خیال ایٹمی ٹیکنالوجی کی اصطلاح میں "چین ری ایکشن" کہا جاسکتا ہے۔ جیسے ایک دوسرے سے ملے ہوئے فیوز یکے بعد دیگرے اڑتے جائیں یہاں تک کہ دھماکا ہو جائے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال زنجیر کی کڑی بنتا گیا اور آخری خیال نے ایک بالکل نئے امکان کو روشن کر دیا۔ یوں جیسے پُر پیچ گلیوں میں پھرتے پھرتے جہاں ہر قدم پر راستہ بند ملنے کا اندیشہ ہو آدمی اچانک کسی شاہراہ پر آنکلے۔

"مرزا غالب ! محسن نے ٹھیک کہا۔ ضرورت پڑی تو ہم بھی مر جائیں گے۔" میں نے کہا۔" دیکھو نا اگر چوہدری دلاور زندہ رہتے ہوئے بھی ہم کو یقین دلانے کی کوشش کر سکتا ہے تو کیا یہ کوشش ہم نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا مگر ضروری تو نہیں کہ ہم بھی ناکام ہوں۔ فرض کرو پہلے مرحلے میں کل صبح میرا انتقال ہو جائے۔ آج کی صبح تو ہونے والی ہے چند گھنٹوں میں۔ یہ فرض کر لو کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہے اور کل تم یہ خبر چھاپ دو کہ مشہور مفرور مجرم سکندر بخت یوں تیرِ قضا کا نشانہ بنا۔ اور اگر دنیا یقین کر لے تو میرے لیے دنیا کے قانونی جھمیلے ختم۔ انتظام ایسا ہو کہ دلاور جیسا ہوشیار آدمی بھی نہ سمجھے کہ کوئی میرا داؤ مجھ پر ہی آزما رہا ہے۔"

وہ سب منہ کھولے بیٹھے تھے اور ان کے لیے وہ بات سمجھنا محال تھی جو میرے ذہن میں تھی۔

لیکن محسن کے اور میرے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی تھی، وہ غیر محسوس طریقے پر کچھ ٹیلی پیتھی جیسے مواصلاتی رابطے کا کام کرتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جو بات میرے دماغ میں آتی تھی، وہ اس کے دماغ میں یوں پہنچتی تھی جیسے ایک ٹی وی اسٹیشن سے کیمرے کی آنکھ کوئی منظر دیکھے اور آواز کے ساتھ تمام تفصیلات اور سایے رنگ ٹی وی سیٹ میلوں دُور لے سے پلک جھپکنے سے بھی پہلے دکھا دے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مگر یہ شاعرانہ بات ہے۔ سائنسی وضاحت پیش کرنے والوں کا نظریہ یہ ہے کہ خیالات کی لہریں بھی ایک فریکوئنسی رکھتی ہیں اور جہاں دو افراد کے خیالات کی یہ فریکوئنسی مل جائے، وہاں الفاظ کا وسیلہ ضروری نہیں رہتا۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ مشاہدہ میں نے بارہا کیا تھا کہ بات ابھی میں نے کہی نہیں تھی کہ محسن نے سمجھ لی تھی، یہی اس وقت بھی ہوا۔

"کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔" محسن نے سوچ کر کہا۔" اور پلان کی کامیابی کا انحصار سب کی مشترکہ کوشش پر ہے... کیوں مرزا غالب..."

"یارو... غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" مرزا غالب نے نقشِ فریادی بن کر کہا۔" ابھی تو پٹ کر لوٹا ہوں۔"

"کیسے بزدل صحافی ہو تم ؟" میں نے کہا۔" کیا تم نے سُنا نہیں کہ قلم میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے۔"

"ہوگی... ضرور ہوگی... لیکن مقابلہ تلوار سے نہیں ہے برادرانِ عزیز... بندوق کی گولی سے ہے... فرق صاف ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو قلم ہی چلانا ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔" توپ نہیں چلانی ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم کرتے جانا ہے کہ وہ لاش کس کی تھی جسے دلاور مرحوم بنا کے رکھا گیا تھا اور جو دراصل لاش نہیں تھی، شکاریوں کا پھیلایا ہوا جال تھا کہ ہم تجسس سے مجبور ہو کے ان کا آخری دیدار کرنے جائیں تو یہ دنیا دی زندگی میں ہمارا آخری ایڈونچر ہو۔"

"اب بھی آپ لوگوں کے عزائم بُرے نہیں ہیں چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ انجام بھی وہی ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"تم ایسی باتوں سے ہمارا حوصلہ کم نہیں کر سکتے... ہمارے ساتھ خواجہ نیک محمد جیسے سورما ہیں۔" میں نے کہا۔

"خواجہ نیک محمد ؟" غالب حیران ہو کے بولا۔" یہ کون اُلّو کا پٹھا ہے ؟"

استاد ٹیڈی نے اسے رضائی میں سے باہر کھینچ لیا۔" وہ ہم ہیں۔" وہ غالب کی ناک سے ناک ملا کے بولا۔" اچھی طرح دیکھ لو تاکہ غلط فہمی نہ رہے... ورنہ قسم مولا علی کی..."

میں نے فوراً ٹیڈی کو پیچھے کھینچ لیا۔ محسن اور رابعہ دانت نکالتے رہے۔"کیا کرتے ہو استاد !" میں نے کہا۔" خانہ جنگی کے لیے ایم آر ایس میں بالکل گنجائش نہیں۔ سب لاٹھی والے مل کر رہتے ہیں تاکہ ہر بھینس ان کی رہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" غالب نے پھر لحاف میں پناہ لی۔" اے بھائی ہمیں کیا معلوم کہ تمھارا ایسا شریفانہ نام بھی ہوسکتا ہے۔"

"دیکھ لو سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے اکڑ کر مونچھوں کو تاؤ دیا۔" اب یہ کارٹون ہمیں بدمعاش کہہ رہا ہے۔ اپنے ہمارا نام شریفانہ ہے، تو کیا ہم خود شریف نہیں ہیں ؟"

"شریف کیا تم بدمعاش بھی نہیں ہو۔ مجھے تو تمھاری یہ مونچھیں بھی نقلی لگتی ہیں۔" غالب نے چلّا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ ایم آر ایس کے دو مستند اور معزز اراکین بہیچ مچ نہ سہی اصطلاحاً تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مقابلے پر آجاتے، ہم سب نے دخل در معقولات کیا اور جنگ بندی کرانے کے بعد انھیں زبردستی ایک دوسرے سے گلے ملوایا۔ یہ کارروائی گلے ملنے سے زیادہ گلے پڑنے کے مترادف تھی۔

"لاش کے بارے میں قیاس آرائی کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" ہم کو جا کے دیکھنا ہی پڑے گا اور چونکہ رات کے وقت اس کوٹھی کا نے لگانا مشکل ہے اس لیے مجھے لاش کے کوٹھی میں ہی مل جانے کے امکانات خاصے روشن نظر آتے ہیں۔ جو کام آسانی سے کیا جاسکتا ہو اسے مشکل طریقے سے کوئی نہیں کرتا۔ کم سے کم دلاور گھبراہٹ میں جلدی کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ ابھی تو اسے افسوس ہوگا کہ اس نے اتنی محنت سے جال پھیلایا تھا' اس امید میں کہ پکڑا جائے گا شیر لیکن آپھنسا گیدڑ۔"

"غالباً آپ خود کو شیر سے اور مجھے گیدڑ سے تشبیہ دے رہے ہیں۔" غالب نے لحاف سے سر نکال کر کہا۔

"جی۔" میں نے کہا۔" دلاور غصّے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگا۔ اسے لاش کی فکر نہیں ہوگی، اپنی ناکامی کا صدمہ ہوگا۔ اسے فوری طور پر یہ ڈر نہیں کہ ہم میں سے کوئی اس وقت وہاں جانے کی حماقت کر سکتا ہے چنانچہ لاش کا کیا ہے، صبح کہیں گاڑ دی جائے گی اور دوستو ! جنگ کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ حملہ اس وقت کرو جب دشمن کو اس کی ذرا بھی توقع نہ ہو تاکہ اسے دفاع کا موقع ہی نہ ملے۔ جنرل آئزن ہاور نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فرانس سے نازی جرمنی کی فوجوں کو نکالنے کا سب سے خطرناک مرحلہ ایک ایسی رات میں سر انجام دیا تھا جب موسم انتہائی خراب تھا۔ اُس نے منصوبے کو آخری لمحے تک خفیہ رکھا اور چھ جون کو جسے "ڈی ڈے"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی کہتے ہیں، رات کے وقت اتحادی فوجوں کو سخت بارش اور طوفان میں نارمنڈی کے ساحل پہ پیراشوٹ سے اتار دیا۔ نازی فوجی مطمئن تھے کہ کم سے کم آج کی رات اتحادی افواج کوئی کارروائی نہیں کریں گی اور وہ فراغت کے احساس سے سرشار کچھ جشن منا رہے تھے چنانچہ بے خبری میں مارے گئے اور فرانس سے نکالے گئے۔ آئزن ہاور کا جُوا کامیاب رہا۔ پس اے سرفروشانِ ایم آر ایس، ہم بھی آج کی رات کو "ڈی ڈے" فرض کرتے ہوئے جاتے ہیں۔"

"لاکھ رُپے کی بات کہی سکندر بادشاہ تم نے۔" ٹیڈی نے کہا جو تاریخ کی ایک مشہور روایت کے ذکر سے سخت متاثر ہوا تھا۔ باقی لوگ جنگِ عظیم کی تاریخ کے متعلق جانتے تھے چنانچہ وہ خاموش رہے۔

"اگر لاش کوٹھی کے اندر ہی مل جاتی ہے تو ہم لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" محسن کہنے لگا۔ "جا کے اپنے چوہدری دلاور سے کہیں گے کہ میں اندر حاضر ہو سکتا ہوں جناب۔ اور وہ انتہائی شائستگی سے کہے گا کہ چشمِ ما روشن دلِ ما شاد... تشریف لائیے۔ پھر ہم کہیں گے کہ ازراہِ عنایت وہ لاش عنایت فرمائیے جو ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی جگہ لیٹی تھی اور وہ کہے گا کہ ابھی پیش کرتا ہوں۔ وہ لاش کیا آپ میری اصل لاش بھی لے جانا چاہیں تو بصد شوق لے جائیں۔ اس سے زیادہ لاشیں درکار ہوں تو میں آپ سب کو بھی لاش بنا دیتا ہوں۔"

رابعہ کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ اتنے سنجیدہ اور بھیانک موضوع پر محسن کا اندازِ بیان مسخروں والا تھا۔

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ میں تمھیں میک اَپ مین کے پاس لے جاؤں۔" غالب نے کہا۔ "تاکہ وہ تمھاری شکل بگاڑ دے۔"

"بہتر تو یہی ہوتا کہ ہم چہرے بدل کر جاتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کام زیادہ ہے۔ اسے کم سے کم تین چہرے بدلنے ہیں... میرا... محسن کا اور ٹیڈی کا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کام میں تین گھنٹے تو ضرور لگیں گے۔ اس وقت رات کے پونے دو بجنے والے ہیں۔ پانچ بجے کے بعد چوہدری دلاور کے گھر پہنچے تو دیر ہو جائیگی۔"

"دیر کیوں ہو جائے گی؟" محسن بولا۔ "سورج سوا سات بجے سے پہلے نہیں نکلتا، چھ بجے تو فجر ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ کام تو وہاں لمبا نہیں ہے۔" میں نے محسن کی بات پہ غور کیا۔ "آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ کیوں غالب خاں مغلوب؟ ہم اس وقت نکل جائیں اور تمھارے اس لالچی دوست یعنی میک اَپ مین کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک گھنٹا فی چہرہ محنت کر کے ہمیں پانچ بجے تک کچھ اور بنا دے۔ فلمسٹار رنگیلا، ہٹلر یا شاہِ جنات کا ہمشکل؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" غالب بولا۔ "اس کا کام ہے" وہی بتا سکتا ہے کہ تمھارے یہ چاند سے مکھڑے کتنی دیر میں ڈینٹ پینٹ کیے جا سکتے ہیں تاکہ ان کو گرہن لگ جائے۔"

"ہم معلوم تو کر سکتے ہیں اس سے۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

"ہاں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کام پہ رضامند ہو جائے۔" غالب بولا۔ "لالچی آدمی بھی بعض اوقات اڑ جاتا ہے یا ڈر جاتا ہے۔"

"آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے کہا۔ "تم کو اسی لیے تو ساتھ لے جائیں گے ہم کہ وہ مطمئن ہو جائے، تم اسے یقین دلا سکو کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں اور ہم اپنے ساتھ صرف پیسہ لائے ہیں، خطرہ نہیں۔"

"اڑنے کی بات الگ ہے۔ اس کا علاج بھی الگ ہے۔" محسن نے جیب سے ریوالور نکالا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

رابعہ کچھ پریشان تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس خطرناک مشن پہ روانہ ہوں۔ لیکن وہ ہماری فطرت کو بھی سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ منع کرنے سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔ اس کے نقطۂ نظر سے ہم خرابی میں مزید خرابی کا سامان کرتے چلے جا رہے تھے اور ہمارے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کا نتیجہ اب تک اس کے سوا کچھ نہیں نکلا تھا کہ معاملات زیادہ اُلجھ گئے تھے لیکن وہ شرطِ وفا نبھانے پر مجبور تھی اور بہت پہلے اپنی زندگی پر میرے کامل اختیار کو دل کا فیصلہ سمجھ کے قبول کر چکی تھی چنانچہ اب وہ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" کی عملی تصویر تھی۔ وہ خود کچھ نہیں تھی، اس کے لیے جو کچھ تھا میں تھا اس کی عقل، اس کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی سب میری خوشی تھی۔

"میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔" اُس نے اچانک کہا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے!" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"دماغ تو ہم سب لوگوں کا خراب ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "ہمارے درمیان یہ دیوانگی کا رشتہ نہ ہوتا تو ہم سب بہت پہلے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ چکے ہوتے۔"

"لیکن تمھارا وہاں کوئی کام نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم طے کر چکے تھے کہ تم انکل رضوی کے پاس لوٹ جاؤ گی۔"

"کیا میں آدھی رات کے بعد ان کو جگا کے کہوں گی کہ... کہ میں جھک مار کے واپس آ گئی ہوں۔" اس کی شکل رونے والی ہو گئی۔

"نہیں عزیزہ۔ تم وہ شعر پڑھنا کہ شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ۔ محفل میں اس خیال سے پھر آ گئی ہوں میں۔" غالب نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ہمارے ساتھ رابعہ بھی مسکرانے پہ مجبور ہو گئی۔

"میرا مطلب تھا کہ اس وقت کیا میں اکیلی ہوٹل واپس جاؤں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "تم سب لام پر جا رہے ہو۔"

"تم کہیں بھی نہ جاؤ، یہیں دروازے بند کر کے سو جاؤ۔" محسن بولا۔ "اور ہماری بالکل فکر نہ کرو۔"

"اچھا! اب مجھے فکرمند ہونے کا حق بھی نہیں۔" رابعہ نے طنز سے کہا۔ "تم اطمینان سے سو سکتے تھے اگر میری جگہ ہوتے؟"

"چلو سونا ضروری نہیں تو صبح تک ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" میں نے کہا۔

"صرف انتظار ہوتا تب بھی عذاب کم نہ ہوتا۔ اب ہزار جان لیوا اندیشے بھی ہوں گے اور میں اکیلی۔ مجھے اپنے ساتھ رکھو پلیز۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کل ڈھیٹ بن کر انکل رضوی کے گھر چلی جاؤں گی۔" وہ ہسٹریا سے لرزنے لگی تھی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو رابعہ۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اس وقت ہمارے پاس اپنی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ ایک تمھاری گاڑی کا آسرا تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔"

"بالآخر ہم گاڑیاں تباہ کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیں گے۔" محسن نے مسرت سے کہا۔

"اس وقت ہم چار آدمی ہیں اور کسی ٹیکسی میں پانچویں سواری کی گنجائش نہیں ہوتی۔" میں نے محسن کو گھور کر کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی رات کو ٹیکسی ہی نہ ملے اور ہمیں... اپنی مدد آپ کے اصول پر متبادل انتظامات کرنے پڑیں۔"

"یعنی کسی سے گاڑی چھینو گے اس وقت؟" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"ضروری نہیں... کوئی شریف آدمی ہمیں لفٹ دینے پر تیار ہو جائے تو اچھا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔ "لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہم صبح تک اس شریف آدمی کے انتظار میں کھڑے نہیں رہ سکتے اور صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے کہ کاروں کے شوروم کھل جائیں تو ہم پھر چلتی کا نام گاڑی لے لیں۔"

"دیکھو یارو، میں نے ایم آر ایس سے نظریاتی اتفاق کیا تھا۔" غالب بولا۔ "لیکن ایسے مشکل کام میں نہیں کر سکتا۔ یہ مار دھاڑ اور مرنا مارنا، کشتوں کے پشتے لگانا..."

"یہ کام ہمارے لیے چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "ایک اکیلا دو گیارہ۔ میں اور محسن گیارہ کے برابر ہیں لیکن ٹیم میں بارھواں کھلاڑی ضرور رکھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بارہویں کھلاڑی ہیں۔ اس کے بعد تم..."

"تیرہ نمبر... یا میرے خدا! کیا منحوس عدد ملا ہے۔" غالب نے کہا۔ "اپنی قسمت ہی ایسی ہے۔"

"اس وقت ہم چاروں کو جانے دو۔" میں نے رابعہ سے بات جاری رکھی۔ "کسی عورت کے ساتھ گھومتے ہوئے ہم یوں بھی مشتبہ نظر آئیں گے اور اگر ہم نے ماٹ ازرائٹ کے بنیادی فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ذرائع نقل و حمل کا بندوبست کیا تو تمھاری موجودگی ہمارا راز فاش کر دے گی۔ رپورٹ لکھوانے والے کو کسی اور کا چہرہ یاد رہے نہ رہے تمھارا ذکر تو وہ یوں کرے گا کہ رپورٹ بھی غزل محسوس ہوگی اور جاننے والے جان لیں گے کہ یہ کس کا ذکر ہے۔"

محسن ہنسا اور رابعہ کا رنگ لال ہونے لگا۔ "صبح تک میں یہیں ہوں۔ کب تک لوٹو گے تم لوگ؟"

"سورج نکلنے تک۔" میں نے کہا۔ "لیکن دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔ انکل کے گھر چلی جانا۔"

"وعدہ کرو تم اپنا خیال رکھو گے۔" رابعہ نے روایتی بیویوں کی طرح کہا جو شوہر کو لام پر بھیجتے وقت بھی یہ جملہ کہتی تھیں اور اب خود میکے جاتے ہوئے بھی ٹرین میں بیٹھ کے کہتی ہیں۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"ارے بابا! میں اکیلا تو نہیں ہوں اپنا خیال رکھنے والا۔ میرے ساتھ میرا خدا ہے، میرا اعتماد ہے، محسن اور فوجی ہیں اور مرزا غالب ہیں... اور تم ہو... تمھارے خیال کی رفاقت بھی تمھارے ساتھ سے کم تو نہیں۔"

"جو کچھ میرے پاس بچا ہے۔" رابعہ نے فوراً میرے جذبات کے دھارے کا رُخ موڑ دیا کیونکہ محسن کے علاوہ ٹیڈی اور مرزا غالب یکلخت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ "اس سے کل کوئی دوسری گاڑی لے لینا... اور..."

"آپ بالکل فکر مت کرو آپا جی۔" ٹیڈی اچانک بولا۔ "قسم مولا علی کی! ہم نے ابھی تک یاروں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا، سوائے باتوں کے... ہمیں بڑی شرم آتی ہے جی آپ کو دیکھ کر... آپ کے سکندر کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کا خیال ہم رکھیں گے اور آپا جی... اب سارا انتظام ہم کریں گے۔ جان کی ضرورت ہوگی تو جان دیں گے اور مال کی ضرورت پڑے گی تو مال... استاد ٹیڈی ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے ہی استاد نہیں بن گئے ہیں ہم۔"

ہم سب اسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ ایکدم جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے پہلی بار رابعہ کو آپا جی کہہ کے مخاطب کیا تھا اور اس کے لہجے میں پہلی بار مجھے یقین اور اعتماد کی کمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بڑ نہیں ہانک رہا تھا۔ معلوم نہیں اس میں یہ انقلاب کیوں آیا اور اس نے یہ اعتراف کیوں کیا کہ ابھی تک وہ دوستی کے کھوکھلے دعوے کرتا رہا ہے اور اس نے حقِ دوستی ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اس بات کا کیا مطلب ہے استاد کہ ابھی تک تم سامنے نہیں آئے تھے؟" محسن نے مذاق میں کہا۔

"وقت آنے پر اس بات کا مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ اب چلو اٹھو۔" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ محسن نے اپنی جیب سے ایک ریوالور نکال کے رابعہ کو دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم چند منٹ میں باہر آ گئے اور رابعہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سردی اپنے شباب پر تھی اور سب سے زیادہ خراب حال غالب کا تھا۔ وہ ہوٹل چند قدم کے فاصلے پر تھا جہاں ہمارا سب اسباب خواجہ نیک محمد کے کمرے میں پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے نیچے دیوار کے سائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ مرزا غالب اور ٹیڈی اوپر گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلح ہونے کے لیے گئے تھے۔ اب تک ہم نے مختلف ذرائع سے جو اسلحہ حاصل کیا تھا اُس میں بارہ ریوالور تھے۔ لیکن ان میں سے آدھے ضائع ہو گئے تھے۔ باقی چھ میں سے ایک ریوالور سائلنسر والا میرے پاس تھا جو میں نے دلاور سے چھینا تھا۔ حلیہ بدلنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک ویٹر کی وردی رہ گئی تھی۔ محسن نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہمارے پاس ایک پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر ہونا چاہیے اور ایک ایسی گاڑی جس میں ریڈیو فٹ ہو۔ کار کے ریڈیو عام ہیں اور ان میں "ایف ایم" بینڈ ہوتے ہیں۔ ایف ایم ریڈیو ہو تو ٹیلی فون کے بغیر ایف ایم مائکرو فون کے ذریعے بات کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور پکڑے جانے کا ڈر بھی نہیں رہتا۔ جو "ایف ایم" مائکروفون ہم نے پہلے ہال روڈ سے خریدا تھا، وہ بھی اب ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم نے طے کیا کہ اس بار زیادہ رینج کا مائکروفون لیں گے تاکہ ہم ایک میل دُور رہ کے بھی بات کر سکیں عمداً ہم نے مالی وسائل کے ذکر سے گریز کیا۔ پیسہ رابعہ کے پاس تھا اور اس سے لیا بھی جا سکتا تھا لیکن بار بار ضرورت کے لیے اس سے کچھ مانگنا معیوب لگتا تھا۔ یہ احساس اپنی جگہ تھا کہ رابعہ کا جو کچھ ہے میرا ہے۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میری وجہ سے پہلے اس کی آمدنی کے وسائل ختم ہوئے۔ اب آمدنی نہ ہونے کے بعد میں اس کا بچایا ہوا پیسہ ختم کرتا جا رہا ہوں۔ جب یہ پیسہ ختم ہو جائے گا تو وہ کیا کرے گی اور پیسہ کہاں سے لائے گی اور اپنی ذاتی ضروریات کس طرح پوری کرے گی؟ یہ معاشی مسائل کا دوسرا غور طلب پہلو تھا۔ فی الحال نہ میں کچھ کر رہا تھا اور نہ محسن۔ ہم خرچ بھی اس انداز سے کر رہے تھے کہ مالی مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ ہوٹلوں کا خرچ تھا۔ باہر کھانے پینے کا خرچ تھا اور ہزار دیگر ضروریات کے اخراجات تھے۔ محسن اپنے تنخواہ دار اور محدود آمدنی رکھنے والے باپ سے کچھ نہیں منگوا سکتا تھا اور ہم دونوں میں سے کسی کو نہ جاگیر سے آمدنی تھی، نہ کاروبار سے نہ ملازمت سے

چنانچہ صاف نظر آتا تھا کہ بہت جلد یہ صورت حالات سنگین تر ہو جائے گی۔ کہنے کو میں لکھ پتی باپ کا لکھ پتی وارث تھا اور ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس میں آدھے کا مالک لیکن وہی قانون جو مجھے چوہدری دلاور کے کاروبار میں برابر کا شریک تسلیم کرتا تھا اور مجھے میرا حق دلوا سکتا تھا، اس وقت میرے خلاف استعمال ہو رہا تھا اور جو کچھ میرا تھا اس میں سے مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش بارہا کی تھی کہ آخر ایم ڈبلیو ڈی کے اثاثے، کاروبار اور گڈوِل سب کی مجموعی مالیت کیا ہو گی؟ جتنا دلاور مجھے دینا چاہتا تھا اُس حساب سے تو میرا حق بہت زیادہ بنتا تھا۔ شاید پچاس لاکھ سے بھی زیادہ۔ مگر وہ پچاس لاکھ لینے کے لیے مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا اور عدالت مجھے ایک ہاتھ میں وراثت کا سرٹیفکیٹ تھماتی تو دوسرے ہاتھ میں موت کا فرمان۔ وہ رقم میرا عالی شان مقبرہ تعمیر کرانے کے سوا کسی کام نہ آتی۔ رابعہ کی فرم اب منظر نے سنبھال لی تھی تو یہ امید کی جا سکتی تھی کہ رابعہ کو پانچ دس ہزار روپے ماہانہ کا منافع ملنے لگے مگر وہ غیر یقینی تھا اور ناکافی تھا۔ رابعہ نے وہ کوٹھی تو بیچ دی تھی جو اسے نواب خسرو جمشید سے ملی تھی مگر رقم محفوظ رکھنے کے بجائے رابعہ نے میرے والد کی پرانی کوٹھی خریدنے میں لگا دی تھی۔ میں اسے ایک جذباتی قدم تو کہہ سکتا تھا، حماقت نہیں کہہ سکتا تھا۔ رابعہ کی سوچ کے انداز کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے مستقبل کے ساتھ وہ میرے ماضی میں بھی شریک ہو گئی تھی اور اس نے اپنے لیے جو گھر منتخب کیا تھا، وہ میرا گھر تھا۔ چنانچہ جس گھر سے وزیر خان کو نکلنا پڑا تھا، وہ ہمارا گھر ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کا گھر۔ وزیر خان کے بیٹے کا اور اس کی ہونے والی بہو کا گھر۔ کیا خواب تو انہوں نے بھی دیکھے ہوں گے کہ جب بیٹے کے علاوہ گھر میں بہو ہو گی تو گھر کتنا آباد ہو گا مگر اس خواب کی تعبیر دیکھنا ان کے مقدر میں نہ تھا اور ابھی تو میں اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے اور رابعہ کے خوابوں کو وہی تعبیر ملے گی یا نہیں جو ہم چاہتے ہیں۔ فقط چاہنے سے خواب سچ ہوتے تو دنیا جنت ہوتی۔

"آج دال تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں۔" مرزا غالب نے ریوالور لہرا کے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "اس نمائش کا مقصد کیا ہے۔ یہیں دھر لیے جائیں گے کچھ کرنے سے پہلے۔"

"یہ تم نے کس کے ہاتھ میں کیا چیز تھما دی ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "یہ خود بھی مرے گا ہمیں بھی مروائے گا۔"

"اصل بات تو یہی ہے یارو۔" غالب نے ریوالور کو فوراً جیب میں رکھ لیا۔ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ ہم جو

اپنی صورت سے اتنے چغد لگتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان یا قلم کے سوا ہم کچھ چلا ہی نہیں سکتے تو آج دیکھنا ہم کیا کر دکھاتے ہیں۔ تم میں سے جس کو دعوئے ہو ابھی آزما لے۔"

ظاہر ہے کہ نہ وہ جگہ نشانہ بازی یا جرأت اور ہمت کے مظاہرے کے لیے مناسب تھی اور نہ یہ وقت آپس میں مقابلے کا تھا چنانچہ ہم نے فوراً روانہ ہو جانے میں عافیت دیکھی۔ غالب نے بادلِ ناخواستہ چند قدم پیچھے رہ کر خواجہ نیک محمد کے ساتھ چلنا منظور کیا۔ ان کے درمیان خلوص اور دوستی کے سوا کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ غالب ایک اعلیٰ خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اخبار نویس تھا۔ خواجہ نیک محمد نے جیب کاٹنے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور چوریاں کرتے کرتے بدمعاشی کے منصب پر فائز ہوئے تھے تو استاد ٹیڈی کہلانے لگے تھے۔ ٹیڈی نہ پڑھا لکھا تھا اور نہ اس کو اپنے حسب نسب پر ناز تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان یہی فرق تھا جس کی وجہ سے ان کی آپس میں ٹھن جاتی تھی۔ میں نے جب حضرتِ غالب سے پیچھے ٹیڈی کے ساتھ رہنے کو کہا تھا کہ غالب نے احتجاج کیا کہ ایک شریف آدمی کو ایک بدمعاش کے ساتھ رکھنا گھوڑے گدھے کو ایک لاٹھی سے ہانکنے والی بات ہے۔ اس پر ٹیڈی نے چراغ پا ہو کے کہا کہ وہ جانتا ہے گدھا کون ہے اور گھوڑا کون اور خود کو شریف کہنے والے کتنے شریف ہوتے ہیں اور آئندہ کسی سالے نے اس کو بدمعاش کہا تو وہ بتلائے گا کہ بدمعاشی کیا ہوتی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں خاموش کیا اور ڈسپلن بحال کیا۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں چلتے رہے جیسے وہ میاں بیوی جو الگ ہو چکے ہوں۔

میں نے بہت مظلوم و مسکین بن کے سرگزرنے والی کار کے مالک کو لفٹ کا اشارہ کیا کیونکہ اس وقت ٹیکسی رکشا کا دور دور تک پتا نہ تھا لیکن کاریں زن زن گزرتی گئیں۔ اس ویران سڑک پر اتنی رات گئے کسی اجنبی کو بٹھانے کا خطرہ مول لینے پر کوئی تیار نہ تھا۔ بالآخر میں نے محسن سے مشورے کے بعد سڑک کے ایک کنارے پر پوزیشن لی۔ محسن دوسرے کنارے پر درخت کی اوٹ میں چھپا کھڑا رہا اور ہمارے باقی دو ساتھی خاصے فاصلے سے تماشا دیکھتے رہے۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں تو محسن سامنے آیا اور اس نے پہلے انگوٹھا دکھایا پھر گزرتی ہوئی کار پر پتھر کھینچ مارا۔ کار فوراً رک گئی اور حسب توقع اس کا مالک سخت مشتعل ہو کے باہر نکلا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے؟" وہ ڈینٹ پر انگلی پھیر کر بولا۔ "یا خود کو بدمعاش سمجھتے ہو؟"

"میں نے شرافت سے لفٹ مانگی تھی۔" محسن نے دانت

نکال کے کہا۔ "تم نے کار کیوں نہیں روکی؟"

"اُلّو کے پٹھے۔" کار والے نے محسن کے مُکّا مارنا چاہا... "تمھارے باپ کی..."

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اُسے دبے پاؤں پیچھے سے آ کے دبوچ لیا۔ اپنا ایک ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھا اور اسے گھسیٹ کر دُور لے گیا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا چنانچہ اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے مجھے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارنا پڑا۔ تاہم میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اسے چوٹ زیادہ نہ آئے۔ اسے وہیں سڑک سے دور فٹ پاتھ پر ڈال کے میں کار کی طرف لپکا۔ محسن کار میں لگی ہوئی چابیوں کی مدد سے انجن پہلے ہی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ہماری ہدایات کے مطابق ٹیڈی اور غالب بھی پیچھے بیٹھ چکے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی کار روانہ ہو گئی۔

"میاں سکندرِ اعظم! قتل کر دیا ایک اور؟" غالب نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں مرزا جی۔ بس تھوڑی سی دیر کے لیے لٹا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی دس منٹ میں اٹھ کھڑا ہو گا یا گشت کرنے والے پہریدار اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"تم لوگ تو پیشہ ور مجرم ہو اور میں جذباتی ہو کے ایم آر ایس میں شامل ہو گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"اس بات کا اختیار تم کو ہمیشہ حاصل رہے گا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "لیکن پھر کبھی ہم کو پیشہ ور مجرم کہنے کی غلطی مت کرنا۔ ہم نے تو پیشہ ور مجرموں کی بیخ کنی کے لیے ایک ٹیم بنائی ہے اور ہمارا مشن نیک ہے۔ صرف وسائل کے حصول کا طریقہ غلط ہے لیکن یہ ہماری مجبوری ہے۔"

"ہر مجرم کسی نہ کسی مجبوری کو جواز بنا لیتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ اگر میرا حق مجھے مل جاتا تو ایسی دس کاریں خرید سکتا تھا میں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مگر میں اس وقت ایک ٹیکسی بھی حاصل نہیں کر سکتا تو کیا کروں۔ نہ کاریں چرانا میرا شوق ہے اور نہ پیشہ۔"

"قسم مولا علی کی، اب ایک لفظ بھی نکلا تمھاری زبان سے تو میں..." ٹیڈی نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

غالب ہنس پڑا۔ "یعنی گولی مجھ پر چلاؤ گے؟ ضرور چلاؤ۔ میں صرف سچ سے ڈرتا ہوں مگر سچ بولتے ہوئے نہیں ڈرتا۔"

"خدا کے لیے بند کرو یہ ڈراما۔ نہ یہ تم پر گولی چلا سکتا ہے اور نہ تم اتنے بہادر ہو۔ تم بھی یہ بات جانتے ہو ورنہ کوئی راہ چلتے نقلی پستول بھی دکھا دے تو تم کپڑے اتار کے دے دو گے۔" محسن نے سر گھما کے کہا۔ "یہ بتاؤ جانا کدھر ہے؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

غالب کا دوست جو پہلے اسٹیج پر میک اپ کرتا تھا اور اب ٹیلی وژن سے بھی نکالا جا چکا تھا، کوئینز روڈ کی ایک گلی میں رہتا تھا۔ ہم نے کار کو چوراہے سے کچھ دُور کھڑا کر دیا۔ جہاں اور بھی بہت سی گاڑیاں خاموش اور سرد رات میں چپ چاپ کھڑی ٹھٹھر رہی تھیں۔ محسن نے کار ہی سے ایک کپڑا اٹھا کر فنگر پرنٹ مٹانے میں چند منٹ صرف کیے۔ پھر ہم سب گلی میں غائب ہو گئے۔ غالب کے ساتھ میں ایک عمارت کی تیسری منزل تک پہنچا۔ محسن اور ٹیڈی دو زینے طے کر کے رک گئے۔ بلڈنگ کے سب مکین سوئے پڑے تھے، اس کے باوجود ہم نے احتیاط سے کام لیا تھا اور دبے پاؤں اوپر گئے تھے۔ غالب نے کال بیل کا بٹن دبایا اور ایک دروازے کے پیچھے سے بزر کی کرخت آواز سنائی دی۔ کچھ دیر خاموشی سے انتظار کرنے کے بعد غالب نے پھر بٹن دبایا۔ اندر سے کسی نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے بھائی۔" اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے غالب کے دوست کو دیکھا۔ وہ دُبلا پتلا اور گنجا صورت سے بیمار نظر آنے والا اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کا رنگ اندھیرے میں نظر بھی نہ آتا تھا۔ اس نے اندر کی لائٹ جلائی تو میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ شکل سے ہی کمینہ، لالچی اور عیار لگتا تھا۔ ایسے آدمی پر بھروسا کرنے میں یقیناً خطرہ تھا مگر اس وقت ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ "غالب بھائی تم... اس وقت..." وہ اپنی حیرانی پر قابو پا کے بولا۔

"ہاں موسلے بھائی۔" غالب نے خوشدلی سے کہا۔ "تم تو ایسے پریشان ہو رہے ہو جیسے میں قبر سے اُٹھ کر آ گیا ہوں۔ ارے بھئی میں زندہ سلامت اپنے پیروں پر چل کے تمہارے دروازے تک پہنچا ہوں... تمہارا مہمان ہوں... کیا رات بھر باہر ہی رکھو گے سردی میں۔"

"نہیں! ایسی بات کاہے کو ہونا غالب بھائی۔" وہ خفیف ہو کے پیچھے ہٹا۔ "اندر آؤ۔"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میرے ساتھ چند مہمان بھی ہیں۔ ایک تو یہ دوست ہیں ہمارے ایس بی کے خان جو مجھ سے زیادہ شریف آدمی ہیں۔" پھر اُس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

موسلے بھائی ہنسا۔ "ارے ہم کیا تم کو جانتا نہیں ہے کہ تم کتنا شریف آدمی ہے۔ ایک دم لفڑے باز۔"

"یہ ساری دنیا ایک لفڑا ہے۔ یہاں ہر شخص لفڑے باز ہے۔" مرزا غالب نے متانت سے کہا۔ "دروازہ کیوں بند کر دیا ابھی سے، میرے باقی مہمانوں کو بھی اندر آنا ہے۔"

"دیکھو یار غالب! ابھی میرے کو تھوڑا پریشانی ہونے لگا ہے۔" موسلے بھائی کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہو گئی۔ "یہ ایک مہمان تو ٹھیک ہے لیکن اپنا گھر میں کوئی جلسہ جلوس کرنے کا جگہ نہیں ہے اور ابھی میرے کو سچ سچ بتا دے کہ تیرا کیا مقصد ہے، آدھی رات کے بعد یہاں آنے کا... میں اکیلا ہوں گھر میں۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "ویسے ایک بیوی تو تھی تیرے پاس جو ہر سال..."

"وہ ابھی اپنے میکے کے لیے گئی ہے۔ اپنا بھائی کا شادی بنانے کو۔" موسلے بھائی نے جلدی سے کہا۔ اسی وقت پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق محسن نے دروازے پر دستک دی۔ ہم نے محسن اور ٹیڈی کو بتا دیا تھا کہ ہمارے اندر پہنچ جانے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ آ جائیں۔ موسلے بھائی سے پہلے غالب نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چٹخنی کھول دی۔ محسن اور ٹیڈی کے اندر آتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

"موسلے بھائی! یہ بھی اپنے جگری یار ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ میاں کھوجی اور یہ دوسرا مسٹر اچکن۔"

موسلے بھائی کا رنگ متغیر ہونے لگا تھا۔ "اچھا اچھا۔ تم سب بیٹھو۔" وہ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کمرے میں صرف ایک پرانی وضع کا صوفہ سیٹ تھا اور ایک گھسا ہوا قالین۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر گرد تھی اور پرانے اخبار تھے۔ دواؤں کی آدھی پوری شیشیاں تھیں اور مجموعی طور پر کمرے کی ابتری سے مکینوں کی غربت کا اور عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ موسلے بھائی سوتے سے اٹھا تھا چنانچہ خود اس کے کپڑے شکن آلود اور میلے تھے۔ اس کی آنکھیں جو چہرے کی مناسبت سے بہت چھوٹی اور کچھ گول تھیں، انتہائی مشکوک انداز میں ہم سب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے وہ کسی ویرانے میں بسنے والا اُلّو نظر آیا جس کی تنہائی میں ہم سب مخل ہوئے تھے اور یہ بات اسے سخت ناگوار گزری تھی مگر وہ بے بس تھا۔ اس نے غالب کو دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ غالب اور موسلے بھائی کے درمیان دوستی کے رشتے کی بنیاد خلوص یا محبت پر نہیں ہے۔ بہت جلد اس کی تصدیق ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تم کو خوشی نہیں ہوئی مجھ سے اور میرے دوستوں سے مل کر۔" غالب نے کہا۔ "ایک ہم ہیں کہ تمہاری یاد آئی تو آدھی رات کو چلے آئے۔"

"دیکھ یار غالب۔ ابھی ایسا چکر مت دے میرے کو۔" موسلے بھائی نے تیز لہجے میں کہا۔ "تو اُلّو سمجھتا ہے مجھے؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ [illegible]

کہ اُلّو اس کا کتنا بُرا مانیں گے... تم اُلّو نہیں... اُلّو کا پٹھا ہے... پٹھا سمجھتا ہے نا... شاگرد... جیسے ہر پہلوان کا پٹھا ہوتا ہے۔"

"فالتو بات مت کر... کیوں آیا ہے تو اس وقت؟" موسلے بھائی نے بگڑ کر کہا۔ "اور یہ کون لوگ ہیں تیرے ساتھ... اچکن... اور کھوجی... اور یہ کیا اے بی سی ڈی خان... یہ کیا بکواس ہے! ان کا نام بھی تو نے غلط بتایا ہے۔"

"تم جیسے دولت مند آدمی کو اتنا کنجوس نہیں ہونا چاہیے موسلے بھائی۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھایا اور سگریٹ کا پیکٹ لے لیا۔ "اتنی بڑی کوٹھی کے مالک ہو۔ ساڑھے تین ہزار روپے ماہانہ کرایہ آتا ہے۔ شاہ عالمی گیٹ کے اندر تمہارا جو میڈیکل اسٹور ہے اس کی جائز ماہانہ آمدنی بھی تین چار ہزار سے کم نہیں ہو سکتی۔ میڈیکل اسٹور کے نام پر تم کیا کچھ بیچتے ہو... اور کس کس کو بیچتے ہو۔"

"غالب! تو سالا رپورٹر نہیں، ایک دم خبیث بلیک میلر ہے۔" موسلے بھائی کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"میں نے کبھی تم کو بلیک میل نہیں کیا موسلے بھائی۔" غالب بولا۔ "کبھی ضرورت پڑتی ہے تو تمہارے پاس آ جاتا ہوں لیکن اس میں کونسی بُری بات ہے۔ دنیا میں سب ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ پہلے میں تمہارے کام آیا تھا اور وہ کام اتنا بڑا تھا کہ اب تم میرے لیے جو کچھ کرتے ہو وہ اصل کا سود ہوتا ہے۔ تم خود سوچو کہ میں نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو اس وقت تم کہاں ہوتے۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے لیکن بات ایسی ہے کہ چالیس سال بعد بھی تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بات ختم ہو گئی۔ ان چار سالوں میں کتنی بار آیا ہوں میں تمہارے پاس؟ شاید چار بار۔ مجموعی طور پر تم نے مجھے دس بارہ ہزار روپے دیے ہوں گے۔ وہ بھی اس لیے کہ میں واقعی ضرورت مند تھا، بے روزگار تھا اور سالے دوست ایک وقت کھانا کھلاتے تھے تو احسان کرتے تھے۔ ادھار تو کوئی بھی نہیں دیتا تھا۔ میں اس پوزیشن میں ہمیشہ تھا کہ چاہتا تو تم سے ہر ماہ دو ہزار روپے کا وظیفہ لیتا رہتا اور تم یہ وظیفہ دیتے موسلے بھائی۔ تم چیختے چلاتے، گالیاں دیتے، مجھے قتل کرنے کی سوچتے یا خودکشی کرنے کی مگر مجھے دو ہزار ملتے رہتے۔ اس لیے کہ تم میں نہ مرنے کا حوصلہ ہے نہ مارنے کا۔ مگر میں نے تم سے انتہائی مجبوری میں کبھی دو ہزار لیے تو کبھی تین ہزار اور جب میرا سخت وقت گزر گیا تو میں کبھی پلٹ کر نہیں آیا۔ تم کو کیا معلوم کہ تم جیسے آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے میرے دل پہ کیا گزرتی تھی لیکن مجبوری آدمی سے سب کچھ کراتی ہے، چوری سے قتل تک۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

موسلے بھائی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اچھا! ابھی بولو کیا چاہیے۔ میرے پاس زیادہ کیش نہیں ہے۔"

غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایک لکھ پتی کے مُنہ سے ایسی بات سن کر دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم کروڑ پتی ہو گئے ہو تو برا مت ماننا کہ میں نے لکھ پتی کہہ کے تمہیں بے عزت کر دیا۔ تم کو دس بیس ہزار تو ہاتھ میں رکھنے ہی چاہئیں ہم جیسے بے غیرت لوگوں کے مُنہ پر مارنے کے لیے... اور کنگلے فقیروں کا کیا ہے... آدھی رات کو ہاتھ پھیلانے آ جائیں۔"

"قسم خدا کا غالب! ابھی اپنے پاس ایک ہزار بھی نہیں ہو گا لیکن تو بول، تیرے کو کتنا چاہیے۔ میں صبح بنک کھلتے ہی منگوا دوں گا۔" موسلے بھائی نے مردہ آواز میں کہا۔

میں نے پانچ ہزار کے نوٹ جیب سے نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ موسلے بھائی کی نظریں نوٹوں پر جم گئیں۔ پھر اُس نے باری باری ہم سب کی صورتوں کو دیکھا۔

"اٹھا لو موسلے بھائی۔" غالب نے کہا۔ "پورے پانچ ہزار ہیں۔ آج میں تم سے کیش لینے نہیں، تم کو کیش دینے آیا ہوں۔ اس کو میرے حساب میں شمار مت کرنا۔ وہ دس بارہ ہزار الگ ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔"

"پھر یہ کیا ہے؟" موسلے بھائی کی حالت غیر ہو گئی۔

"یہ ایک کام کا معاوضہ ہے جو تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "تم اپنے فن کے ماہر ہو۔ میرے تینوں دوستوں کے چہرے بدل دو۔ کام ارجنٹ ہے اس لیے معاوضہ بھی اتنا بڑا ہے ورنہ تم کو اسٹیج پر تین افراد کے میک اپ کا کیا معاوضہ ملتا؟ زیادہ سے زیادہ سو روپے۔"

"لیکن... یہ کون لوگ ہیں... تم نے ان کا اصلی نام نہیں بتایا میرے کو..."

"نام کو چھوڑ موسلے بھائی، کام سے اور دام سے مطلب رکھو۔" غالب نے کہا۔ "جب میں نے کہا کہ میرے دوست ہیں اور تجھے تیرے کام کا پیسہ مل رہا ہے تو فضول سوالات میں وقت ضائع نہ کر۔ فرض کر لے کہ ان میں سے ایک نے سات خون کیے ہیں، دوسرا جیل سے فرار ہوا ہے اور تیسرا جاسوس ہے۔ صبح ہونے میں ساڑھے چار گھنٹے ابھی باقی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں ان کی صورت بالکل بدل جانی چاہیے اور یہ میک اپ نہ نہیں ہونا چاہیے کہ مُنہ پر پانی کا چھینٹا پڑے اور نیچے سے اصل چہرہ دکھائی دینے لگے۔ ان کو کافی عرصہ بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ گزارنا ہے اس لیے کام پکا ہو گا۔"

"کیسا بات بولتا ہے غالب... تین گھنٹے میں۔" موسلے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھائی نے گھبرا کے کہا۔

"ہاں تین گھنٹے میں۔" غالب نے دھڑ سے میز پر ہاتھ مارا اور جیب سے ریوالور نکال لیا۔ "تین گھنٹے سے ایک منٹ اوپر نہیں۔ کام کرانے کے دو طریقے ہیں اور ابھی میں نے دوسرا طریقہ آزمانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

خوف سے موسلے بھائی کا دم نکلنے کو تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ریوالور کو دیکھتا تھا تو کبھی پانچ ہزار کے نوٹوں کو۔ پھر باری باری ہم سب کے منجمد اور بے حس چہروں پر نظر ڈال کے وہ غالب کو گھورنے لگتا تھا۔ خود میں اور محسن بھی دم بخود بیٹھے تھے کیونکہ غالب کے ہاتھ میں وہ ریوالور نہیں تھا جو اسے ہم نے فراہم کیا تھا۔ اس کے پاس ایک انتہائی بیش قیمت، بالکل نیا اور غیر ملکی ساخت کا آٹومیٹک ریوالور تھا جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ میرے سامنے اس وقت وہ غالب نہیں تھا جو بات بے بات شعر پڑھتا تھا، صورت اور حلیے سے کارٹون لگتا تھا، بے وقوف اور بزدل نظر آتا تھا اور صرف صحافی تھا جس کو سچ کی مار نے خوار کیا تھا، گھر سے بے گھر کیا تھا اور در بدر شہر بہ شہر بھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔ جو بظاہر ایک کاہل آدمی تھا، زندگی کے تمام تفکرات سے بے پروا اور سارے مسائل سے بے نیاز۔ ایک غیر سنجیدہ اور بے مصرف زندگی گزارنے کا عادی۔ یہاں اس کا لب و لہجہ تک بدل گیا تھا۔ وہ کسی جرائم پیشہ تنظیم کا سرغنہ، کوئی خطرناک دہشت پسند یا جیمس بونڈ کا پاکستانی ایڈیشن بنا ہوا تھا۔ اس کا یہ بدلا ہوا روپ ایک دھماکے سے ہمارے سامنے آیا تھا چنانچہ حیرت کی انتہا کے ساتھ ساتھ ہم سب کو خوشی کا احساس بھی تھا کہ جسے ہم ایم آر ایس کا عضوِ ضعیف سمجھتے تھے، وہ درحقیقت کتنا مضبوط اور قابلِ اعتماد سہارا تھا۔

"تین گھنٹوں میں سے پانچ منٹ گزر چکے ہیں موسلے بھائی۔" غالب کی آواز آئی۔

"تم میں سے کون پہلے آئے گا۔" موسلے بھائی نے سر ہلایا۔ اور نوٹ اٹھانے لگا۔

غالب نے ریوالور سے نوٹوں کی گڈی اپنی طرف کھسکالی۔ "پہلے کام... پھر دام... اور جیسا کام ویسے دام۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کو اس سے زیادہ مل جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمھیں ایک پیسہ نہ ملے۔ یہ فیصلہ میں کروں گا کہ تم کو صرف معاوضہ ملنا چاہیے یا انعام بھی ملنا چاہیے۔ یا دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے اور صرف سزا ملنی چاہیے۔ تم ایکشن خان سے پہلے نمٹ لو۔ ایک احتیاط لازمی ہے۔ کسی کی جیب میں ہاتھ مت ڈالنا۔ ہر جیب میں اسی قسم کی فضول چیزیں بھری پڑی ہیں۔" اس نے اپنا ریوالور لہرایا۔ اس کی بات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے میں نے اپنی جیب سے سائیلنسر والا ریوالور نکالا، موسلے بھائی کو دکھایا اور جیب میں رکھ لیا۔ ذرا سی دیر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ موسلے بھائی بیہوش ہو کے گر جائے گا اور ہمارا کام دھرا رہ جائے گا۔

"تم اطمینان سے اپنا کام کرو موسلے بھائی۔" میں نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ "پانچ ہزار تمھارے۔"

موسلے بھائی کے ساتھ محسن اندر چلا گیا تو اس کمرے میں میرے ساتھ غالب رہ گیا اور استاد ٹیڈی جو بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔

"تم بڑے چھپے رستم نکلے استاد۔" استاد ٹیڈی نے موقع پاتے ہی کہا۔

غالب ہنسا۔ "ارے بھئی ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ بس دنیا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

"یہ ریوالور تم نے کہاں سے لیا؟" میں نے کہا۔

"پولیس سے۔" غالب بولا۔ "ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ ضبط کیا ہوا ناجائز اسلحہ اور اسمگلروں سے، تخریب کاروں سے یا ڈاکوؤں سے چھینا ہوا اسلحہ۔ اخبار میں تو صرف خبر آتی ہے۔ یہ کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ اسلحہ کتنا تھا اور کس قسم کا تھا۔ زیادہ تر کیس فائلوں میں رہ جاتے ہیں۔ مثلاً رات کو کسی پولیس پارٹی کا اور ڈاکوؤں کا آمنا سامنا ہو گیا تو کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر یہ خبر لیں آتی ہے کہ ڈاکو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے یا جنگل میں روپوش ہو گئے۔ کبھی سچ مچ کسی کو پکڑنا پڑ جائے تو اخبار میں ملزم اور اسے گرفتار کرنے والے کی تصویر کے ساتھ تھوڑا بہت اسلحہ بھی دکھا دیا جاتا ہے تاکہ پبلک متاثر ہو اور اپنے پیارے وطن کی فرض شناس پولیس کی جراتِ مندانہ فرض شناسی کی دھوم مچ جائے۔ دھوم کبھی نہیں مچتی کیونکہ اب پبلک بھی سارے ڈرامے کو سمجھتی ہے۔ اب اسی ریوالور کی مثال لو۔ کوئی باہر سے لایا تھا، مخبری ہو گئی اور وہ شخص پکڑا گیا۔ پولیس نے اسے ائیرپورٹ پر گرفتار کیا اور تھانے لے آئی۔ اس وقت میں ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ساری بات میرے سامنے ہوئی۔ اس شخص نے ریوالور سے دستبرداری قبول کی۔ پانچ ہزار روپے ایس ایچ او صاحب کی خدمت میں "بچوں کی مٹھائی" کے لیے پیش کیے اور صبح ہونے سے قبل رخصت ہو کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ ائیرپورٹ پر اسے پکڑنے والے مطمئن کہ ملزم کو حوالۂ پولیس کرنے کے بعد ان کا کام ختم۔ بعد میں کون آتا ہے پوچھنے اور مصیبت میں پڑنے کے لیے۔ ایس ایچ او نے مجھے ٹالنے کی ... کوشش کی تھی مگر مجھے ریوالور پسند آ گیا تھا چنانچہ میں کرسی سے چپک گیا اور جب سارے معاملات طے ہو گئے تو میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ ایس ایچ او بہت جزبز ہوا مگر میں نے کہا کہ اپنے ساتھ بھی سودا کر لو گے تو فائدے میں رہو گے۔ تم پانچ ہزار کی مٹھائی گھر لے جاؤ، یہ خطرناک کھلونا مجھے دیدو، ورنہ میں ساری تفصیلات کے ساتھ خبر چھاپتا ہوں۔ میں نے تو پکڑے جانے والے مسافر کا نام پتا اور پاسپورٹ نمبر سب ازبر کر لیا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کس فلائٹ پر کہاں سے آیا تھا۔ ایس ایچ او مجبور ہو گیا۔ اب تک اس کی گولیاں بھی فراہم کرتا ہے مجھے۔ بازار سے نہ یہ اعلیٰ قسم کا ریوالور مل سکتا ہے اور نہ اس میں کام آنے والی گولیاں۔ ایکبار خراب بھی ہو گیا تھا میرے اناڑی پن کے باعث۔ میں نشانہ بازی کی مشق کرتا تھا اور ظاہر ہے جس چیز کا استعمال نہ آتا ہو وہ خراب تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں ایس ایچ او صاحب کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کہ کسی ماہرِ اسلحہ کی خدمات مطلوب ہیں۔ اس نے مجھے پولیس کے ایک نائیک سے رجوع کرنے کو کہا۔ کاظم نام تھا اس کا۔ کیا بتاؤں تمھیں یار، وہ کیسا ایکسپرٹ آدمی ہے۔ اس نے کام بھی کیا اور یہ بھی سمجھایا کہ ولایتی ریوالور ہے، اس میں دیسی گولیاں کبھی استعمال نہ کروں۔"

"یہ گولیاں چلاتے کہاں ہو مرزا غالب؟" میں نے کہا۔ "خدا کی قسم، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسا چغد صورت آدمی اتنا خطرناک ہتھیار رکھ سکتا ہے۔"

"ارے بھائی سکندرِ اعظم! من آنم کہ من دانم۔" وہ اسی انکساری سے بولا۔ "ہم کسی سے کچھ کہتے نہیں مگر ہم نے کہا تھا، نا کہ وقت آنے دو، ہم بتا دیں گے کہ قلم کے علاوہ ہم کیا کچھ چلا سکتے ہیں۔"

"تمھارا نشانہ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" غالب اٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے کونے میں سے فرش پر پڑی ہوئی موم بتی اٹھائی۔ "اسے جلاؤ اور خواجہ صاحب کے ہاتھ میں دو۔"

میں نے لائٹر سے موم بتی جلائی۔ پھر موم بتی ٹیڈی کی طرف بڑھا دی۔ ٹیڈی کا رنگ فق ہو گیا۔ "اب تم دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ بتاؤ کہ موم بتی کو صرف بجھانا ہے یا درمیان سے دو ٹکڑے کرنا ہے۔"

"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی چلایا۔ "قسم مولا علی کی میں یہ کام نہیں کرنے کا۔ موم بتی نہیں یہ میرا ہاتھ اڑا دے گا۔ میں ٹنڈا ہو جاؤں گا... یہ موم بتی نہیں بجھائے گا، میری زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔"

"واہ استاد، کیا بات کہی ہے۔" میں نے کہا اور موم بتی لے کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ غالب نے پورے اعتماد کے ساتھ نشانہ لیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور موم بتی بجھ گئی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ گولی موم بتی کو چھوئے گی بھی نہیں۔ غالب کا نشانہ قابلِ رشک تھا۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟" اندر سے موسلے بھائی دوڑ کر آیا۔ "گولی کس نے چلائی ہے۔"

"کسی نے نہیں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" غالب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ موسلے بھائی نے سب کو زندہ پا کے اطمینان کا سانس لیا اور اندر لوٹ گیا۔

صبح کے پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب موسلے بھائی نے اپنا کام ختم کیا اور مجھے اس کے فن کی مہارت کو تسلیم کرنا پڑا۔ محسن اور ٹیڈی کی صورت دیکھنے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب اگر میں خود سکندر بخت کے خلاف ایک اور رپورٹ لکھوانے کے لیے حشمت خان کے پاس چلا جاؤں یا اکرام شیخ کے پاس تو مجھے صرف آواز اور لہجہ بدل کے بات کرنا ہو گی۔ وہ مجھے ہرگز شناخت نہ کر پائیں گے۔ میرے بال گھنگریالے اور مہندی رنگ کے ہو گئے تھے، میرے چہرے پر اسی رنگ کی مُشت بھر داڑھی تھی۔ ناک میں دو اسپرنگ سے لگے ہوئے تھے جن سے نتھنے بہت پھیل گئے تھے اور میری ستواں ناک پکوڑا بن گئی تھی۔ موسلے بھائی نے مجھے بتایا کہ یہ اسپرنگ کس طرح نکالے جا سکتے ہیں اور پھر کس طرح لگائے جا سکتے ہیں۔ میرے سامنے کے دو دانت سونے کے نہ ہونے کے باوجود سونے کے بنے ہوئے نظر آتے تھے اور میری آنکھوں کا رنگ جو پہلے سیاہ تھا، اب سبز ہو چکا تھا۔ یہ کنٹیکٹ لینسز کا کرشمہ تھا۔ موسلے بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ اس چہرے کے ساتھ میں چارخانے کی لنگی باندھ لوں اور کندھے پر دستر خوان نما رومال ڈال کر رکھوں۔ قمیص کے بجائے کھدر کا بغیر گلے والا کرتا استعمال کروں جس سے میری گردن لمبی نظر آئے۔ جوتے کی جگہ پرانی پشاوری چپل استعمال کروں اور ممکن ہو تو تھوڑا سا جھک کر چلوں۔ اس کی ذہانت کا قائل میں یوں بھی ہوا کہ اس نے سو فیصد یہی حلیہ محسن کا رکھا تھا اور ہم دونوں کی شکلوں کو ناقابلِ یقین حد تک یکساں کر دیا تھا۔ قد و قامت میں ہم پہلے ہی برابر تھے۔ صورت مل جانے کے بعد جڑواں بھائی نظر آنے لگے۔ میں نے پانچ ہزار موسلے بھائی کو پیش کیے۔

"ابھی آپ دونوں ایک جیسا کپڑا پہن لے گا تو بھائی غالب بھی دھوکا کھا جائے گا۔" موسلے بھائی نے اپنے فن کی قیمت سے زیادہ مہارت کی تعریف پر خوش ہو کے کہا۔ "فق

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

صرف دانت کا رکھا ہے میں نے۔"

"ویری گڈ۔ تم نے بہت سے مسائل حل کر دیے ہیں" میں نے محسن کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "اب اصل اور نقل میں کوئی فرق نکالے گا بھی تو کیسے۔ پہلے کی جگہ دوسرا اور دوسرے کی جگہ پہلا آسانی سے لے سکے گا۔"

یہ بالکل نیا خیال تھا اور اپنی صورت کے بدل جانے سے زیادہ خوشی مجھے اس خیال پر ہوئی کہ اب ہم دو ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ ہمشکل بن کے ہم دلاور اینڈ کمپنی کی عقل خبط کر سکتے تھے۔

اب تک میں نے ایسی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں اور ایسے بہت سے ناول پڑھے تھے جن کی کہانی کا تانا بانا ایک جیسی صورت رکھنے والے دو افراد کے کارناموں سے بنایا جاتا ہے اور ہر قسم کی صورتِ حال محض صورتوں کی مشابہت کو بنیاد بنا کے پیدا کی جاتی تھی۔ بعض اوقات مضحکہ خیز اور بعض اوقات لرزہ خیز، کبھی ایک کے کیے پر دوسرا پکڑا جاتا اور کبھی دونوں مل کر کچھ کریں تب بھی خود کو بے گناہ ثابت کر دیں۔ غالباً یہی خیال محسن کے ذہن میں بھی جاگزیں تھا کہ وہ اچانک ہنسا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"یہ ہوئی نا وہی بات کہ ایک نہ شد، دو شد" محسن نے کہا۔

"اگر فارسی ہی بولنا ضروری ہے تو کہو کہ من تو شدم تو من شدی" مرزا غالب نے محسن کو ٹوکا۔ "یعنی تو میں ہو گیا، اور میں تو۔"

خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی کو بھی موسیٰ بھائی نے ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ چوہدری دلاور پر اس انقلاب سے جو گزرے گی سو گزرے گی، ہمارے اس حلیے سے رابعہ کتنی محظوظ ہو گی اور اگر شہلا نے محسن کو دیکھا تو کتنا ہنسے گی۔ منظر ہمیں روبرو پا کر کتنی گالیاں دے گا لیکن اس تبدیلی سے لطف اندوز ہونے کا مرحلہ ابھی دور تھا۔ فوری طور پر شخصیت بدل جانے سے ہم محفوظ ہو گئے تھے اور ہمارے لیے شہر کی سڑکیں اور گلیاں، ہوٹل اور بازار علاقہ ممنوعہ نہیں رہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت حائل تھی اور ہمیں اس مسافت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

ہم روانہ ہونے ہی والے تھے کہ موسیٰ بھائی نے جیب سے پانچ ہزار کے نوٹ نکالے اور غالب کی طرف پھینک دیے "یہ اپنے ساتھ لے جاؤ غالب بھائی۔ اپن کا حساب برابر ہے" وہ بولا۔

"حساب برابر ہے کا کیا مطلب؟" غالب نے حیران ہو کے کہا "کون سا حساب؟"

"مطلب تم نے سمجھنا ہے غالب بھائی۔ ہم نے بولا تھا تم کو ابھی کہ یہ سب چکر ہے اور تم اُلّو بناتا ہے ہم کو۔ یہ بات ہم ایسے ہی نہیں کہا" موسیٰ بھائی ہنسا "ابھی ایک کارڈ تمہارا ہاتھ میں تو ایک ہمارا ہاتھ میں ہے۔ ایک بار تم نے ہمارا زندگی ہم کو دیا تھا، آج ہم تمہارا دوست سکندر بخت کا زندگی تم کو دیتا ہے۔ یہ حساب برابر ہو گیا نا؟ پھر کبھی ادھر مت آنا اور موسیٰ بھائی کو بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ ہم اندھا ہے۔ ارے غالب بھائی! ہم تو نقلی چہرہ دیکھ کر اصلی چہرہ بنا دیتا ہے۔ تم اپنا دوست کو ایس بی کے خان بنا کے لایا تو ہم دھوکا نہیں کھایا۔ ہم جانتا ہے اس کا گرفتاری پر کتنا انعام ہے، پانچ ہزار سے زیادہ، اور ہم یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی کا قیمت کوئی نہیں ہوتا۔ ابھی تم بولے گا تو ہم بھی بولے گا۔ ہم کو پھانسی ہو گا تو تمہارے فرینڈ کو بھی پھانسی ہو گا۔ تم چپ رہے گا تو ہم بھی چپ رہے گا۔ اسی لیے تو ہم بولا کہ حساب برابر۔"

"ہاں موسیٰ بھائی" غالب نے خاموشی کے طویل وقفے کو توڑا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ حساب آج بیباک ہوا۔ پھر بھی یہ پانچ ہزار تم رکھ لو کیونکہ یہ تمہارا حقِ محنت ہے۔ تمہاری خاموشی کی قیمت نہیں ہے۔ آئندہ ضرورت نے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیا تو میں یہ ہاتھ تمہارے سامنے نہیں پھیلاؤں گا۔"

موسیٰ بھائی ہنسا "ابھی تم بولا تھا کہ ہمارا پاس بہت دولت ہے۔ تم ٹھیک بولا تھا۔ ہم یہ پانچ ہزار لے کر کیا کرے گا۔ تم اپنا پاس رکھو یا اپنا دوست کے پاس رکھوا دو۔ جب ضرورت پڑے تو مانگ لینا۔ کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جاؤ گے۔ تم سالا صحافی لوگ بھکڑ رہے گا ہمیشہ... تم خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے لیکن تم ایک دم... ارے بابا زمانہ کو دیکھو۔ تم کو خدا نے چانس دیا تھا۔ تم دو ہزار نہیں ہم سے تین ہزار روپیہ ہر مہینے لے سکتا تھا مگر تم نہیں لیا۔ ابھی کوئی چانس نہیں کیونکہ حساب برابر ہو گیا ہے۔ اب تم جاؤ۔ ہم محنت کا کچھ نہیں لے گا۔ یہ محنت ہم اپنا گلا سے پھانسی کا پھندا نکالنے کے واسطے کیا تھا۔ تمہارا مدد کے واسطے نہیں" اس نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔

ہم سب شکست خوردہ اور شرمسار سے زینے میں کھڑے رہ گئے۔ موسیٰ بھائی نے صحیح وقت پر ترپ کا پتا پھینک کر بازی جیت لی تھی۔ ہمارے کام نہ پانچ ہزار روپے آئے تھے اور نہ ہمارے ریوالور۔ ہم خاموشی سے نیچے اُترے اور اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس کا مالک شاید تھانے میں بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا ہو گا اور اپنی عقل کا ماتم کر رہا ہو گا کہ اس نے ایک پتھر کو نظر انداز کر دیا ہوتا تو یوں بے کار نہ ہوتا۔ یہ اندازہ تو میں نے موسیٰ بھائی کے گھر پہنچ کر فوراً ہی کر لیا تھا کہ غالب سے اس کا تعلق کسی خاص نسبت سے ہے اور غالب وہاں سچ مچ غالب ہے۔ غالب نے پہلے یہ تو بتا دیا تھا کہ موسیٰ بھائی نے کسی مجرم کی مدد کی تھی جو اسے ملک سے فرار ہوتے وقت بہت کچھ دے گیا تھا لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ مجرم کون تھا اور اس نے اپنی زندگی میں کیا جرم کیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس مجرم سے غالب کا بھی کوئی تعلق تھا لیکن اس تعلق سے غالب نے فائدہ کیسے اٹھایا اور موسیٰ بھائی کو مغلوب کس طرح رکھا، یہ اب بھی ایک راز تھا۔ گاڑی سنسان سڑکوں پر تیزی سے دوڑتی ہوئی چوہدری دلاور کے گھر کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ غالب سے اس مجرم کے فرار کی داستان سنتے اور یہ پوچھتے کہ وہ خود اس ڈرامے کا ایک کردار کیسے بن گیا تھا۔ میری ساری توجہ اس ڈرامے پر تھی جو گزشتہ شب چوہدری دلاور کے گھر میں ہوا تھا اور بری طرح فلاپ ہو گیا تھا۔ اس نے کسی کو چوہدری دلاور بنا کے صرف ہم پر یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اس کا مقصد ہمیں شکار کرنا تھا مگر ایک انتہائی ذہانت سے تیار کی جانے والی اسکیم آخری وقت میں فیل ہو گئی تھی۔ اب ہم جوابی چال چلنے والے تھے اور کامیابی یا ناکامی کا انحصار حسنِ تدبیر سے زیادہ خوبیٔ تقدیر پر تھا۔

"میرے خیال میں اس سے آگے گاڑی لے جانا ٹھیک نہیں" محسن نے کار کو چوہدری دلاور کے گھر سے دو فرلانگ دور روکتے ہوئے کہا "گاڑی کا مالک رپورٹ درج کرا چکا ہو گا۔"

"اور اس نے ہمارے حلیے بھی لکھوا دیے ہوں گے" ٹیڈی نے اتفاق کیا "اور اس سے پولیس نے یہ اندازہ بھی کر لیا ہو گا کہ گاڑی چھیننے والے کون تھے۔"

"مگر ہم اب وہ نہیں رہے" میں نے کہا "یہاں ہمیں تلاش کرتا ہوا کون آ سکتا ہے۔ گاڑی دور ہو گی تو واپسی پر ہمارے لیے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ ممکن ہے ہمیں فرار ہونا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں ایک لاش اُٹھا کے ساتھ لانا پڑے... گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے سیدھا گزار کے لے جا اور موڑ کاٹتے ہی دیوار کی اوٹ میں روک دے تاکہ ہم ضرورت پڑنے پر دیوار پھاند کر گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

"مرزا غالب! یہ تو ثابت کر دیا ہے تم نے کہ تمہیں بیوقوف سمجھنے والے زیادہ بیوقوف تھے اور تم قلم کے نہیں، تلوار کے بھی دھنی ہو" محسن نے گاڑی کی رفتار بڑھا کے کہا "یہ بتاؤ ڈرائیونگ بھی آتی ہے؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں" مرزا غالب نے کہا "ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔ جب اسلاف نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیے تھے تو کیا ہم شہر کی سڑکوں پر گاڑی بھی نہیں دوڑا سکتے ہیں؟"

"ویری گڈ، تم کار میں شیشے بند کر کے بیٹھنا" میں نے کہا "تاکہ اگر کوئی چوکیدار گشت کرتا ہوا گزرے تو تم نظر نہ آؤ لیکن تیار رہنا۔"

محسن نے گاڑی کو چوہدری دلاور کی کوٹھی کے ساتھ ساتھ موڑا اور روک لیا۔ گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر کا جائزہ لے لیا تھا۔ گیٹ لائٹ کے سوا تمام کمروں کی لائٹس آف تھیں اور کوٹھی آخرِ شب کے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بند گیٹ کے پیچھے میں نے چوکیدار کو بھی دیکھ لیا تھا جو ایک آتشدان میں لکڑیاں جلائے بیٹھا تھا۔ اتنی سردی میں چوکیدار بھی زیادہ مستعد نہیں رہا تھا اور اسے شاید یہ بھی یقین تھا کہ اس وقت کسی دوست دشمن کے آنے کا امکان نہیں۔ ہماری گاڑی گزری تھی تو اس نے فقط سر اُٹھا کے دیکھا تھا مگر پھر ہاتھ تاپنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ سڑک پر سے ایسی سیکڑوں گاڑیاں گزرتی ہی رہتی تھیں۔

میں اور محسن پوری احتیاط کے ساتھ نیچے اُترے۔ دروازے کو ہم نے آواز پیدا کیے بغیر کھولا اور اتنی ہی احتیاط سے بند کر دیا تھا۔ "میں چوکیدار کو قابو کرتا ہوں" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اس کے بعد تم دونوں اندر آ جانا۔ ٹیڈی لان کے کسی درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرے گا اور ہم دونوں باری باری گھر میں داخل ہوں گے۔"

"اور میں... میں... میں کتنی دیر تک انتظار کروں گا... سکندر بادشاہ" ٹیڈی کانپتا ہوا بولا۔

"یہ کیا میں میں لگا رکھی ہے" میں نے کہا "تم ہمارے واپس آنے تک ٹھہرو گے۔ خدانخواستہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں تو آگے آنا ورنہ نہیں۔ ہم دس پندرہ منٹ میں نکل آئیں گے، اندر گڑبڑ ہو گی تو تم کو آواز دے لیں گے لیکن خدانخواستہ گرفتار ہو گئے تو دشمن سے ہمیں تم ہی چھڑانے آؤ گے۔ ہمت کے ساتھ ذاتی عقل کو بھی استعمال کرنا اور ضرورت محسوس کرو تو غالب کو بھی بلا لینا۔" اس آخری بات کا ٹیڈی نے خاصا بُرا مانا لیکن میں اور محسن دیوار پر چڑھ گئے۔ محسن دیوار کے موڑ پر رُک گیا مگر میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ درختوں کی وجہ سے دیوار پہ اندھیرا تھا اور میں خود ایک سایہ بن گیا تھا۔ ہر قدم اُٹھانے کے بعد میں رُک جاتا تھا تاکہ چوکیدار کی نگاہ کو کسی مسلسل حرکت کا احساس نہ ہونے پائے۔

تیس بتیس سال کا جوان چوکیدار مجھے خالی ہاتھ نظر آ رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی جیب میں کوئی انتہائی مؤثر اور خطرناک قسم کا خودکار آتشیں اسلحہ ضرور ہو گا۔ دلاور بیوقوف نہیں تھا کہ کسی کو روایتی قسم کا دربان بنا کے مطمئن ہو جاتے جن کا ایک کام تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقائے ولی نعمت یا ان کی بیگم صاحبہ کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شاہی سواری ہیں آتے جاتے دیکھیں تو دروازہ کھول دیں اور گاڑی گزر جائے تو مؤدبانہ سیلیوٹ جھاڑ کر دروازہ بند کر دیں۔ ان کا دوسرا کام ہر ایسے غیرے کو درِ خاص کی حد سے دُور رکھنا ہوتا ہے تا کہ بارگاہِ خاص تک صرف انھی کی رسائی ہو جو اس کے اہل ہوں۔ دوسری قسم کے چوکیدار سرکاری عمارات اور بنکوں کے دروازوں پر محافظت کی رسمی کارروائی پوری کرتے ہیں لیکن وقت آنے پر اپنی فرسودہ اور ناکارہ رائفل سے زیادہ بے مصرف ثابت ہوتے ہیں۔ دلاور جانتا تھا کہ اسے خطرہ کس سے ہے اور اس نے جسے حفاظت پر مامور کیا ہوگا اسے بہت سوچ سمجھ کے منتخب کیا ہوگا۔ پٹھان چوکیدار بہت صحت مند اور جسمانی طور پر مضبوط نظر آتا تھا اور اس کا اطمینان یہ ثابت کرتا تھا کہ خالی ہاتھ بھی وہ آسانی سے مغلوب ہونے والا نہیں ہے۔

میں ابھی گیٹ لائٹ سے چند قدم دُور تھا کہ چوکیدار اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں فوراً دیوار کے اُوپر سیدھا لیٹ گیا۔ احاطے کی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اُونچی تھی مگر اس کی چوڑائی ایک فٹ سے بھی کم تھی چنانچہ اس پر پیٹ کے بل سانس روک کر اور توازن برقرار رکھتے ہوئے لیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے جسم کو اکڑا لیا تا کہ دیوار کی سرد سطح اور سرد ہوا سے طاری ہونے والی کپکپی رُک جائے۔ میں ایک پتلون قمیص اور صرف ایک جرسی پہنے ہوئے تھا جو آخرِ شب کی نمی اور کھلی فضا میں محسوس ہونے والی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ چوکیدار آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس وقت میں کھڑا ہوا یا بیٹھا ہُوا ہوتا تو دیوار کی ہموار سطح پر اندھیرے میں بھی نمایاں ہو جاتا لیکن دیوار پر چپک جانے کے بعد میں اس کی بلندی کا حصہ بن گیا تھا اور ساکت و صامت ہونے کے باعث بیس فٹ دُور سے گزرنے والا چوکیدار مجھے دیکھ نہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں یہ دُعا مانگی کہ دوسری دیوار پر محسن بھی عقل سے کام لیتے ہوئے خود کو کیموفلاج کر لے۔

اچانک کوٹھی کے عقب سے ایک کتے نے بھونکنا شروع کیا۔ چوکیدار کے قدم رُک گئے۔ پھر دائیں اور بائیں جانب سے دو جرمن شیپرڈ نسل کے کُتے نمودار ہُوئے۔ وہ تربیت یافتہ محافظ کتے تھے جو اجنبی آدمی کی بُو پر خطرے کے الارم کی طرح بجنے لگتے تھے۔ چوکیدار نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ریوالور نکال لیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا پھر کوٹھی کے چاروں گوشوں پر نصب سرچ لائٹس نے اندھیرے کو اُجالے میں بدل دیا اور چوکیدار نے میری طرف دیکھا کیونکہ ایک کتا تیر کی طرح میری طرف آ رہا تھا۔ دوسرے کتے کو میں نے دائیں جانب کی دیوار کا رُخ کرتے دیکھا

جہاں سے محسن کو اندر کودنا تھا۔ ہوا کے غلط رُخ نے قبل از وقت ہماری موجودگی کا راز فاش کر دیا تھا اور اب مجھے چند سیکنڈ میں فیصلہ کرنا تھا کہ میں دیوار سے باہر کی طرف کُود کر فرار ہو جاؤں یا مقابلے کے لیے اندر اُتر جاؤں۔ اگر میں اسی طرح لیٹا رہتا تو وہ خوں آشام کتا ایک زبردست جست لگا کے مجھے دیوار پر سے نیچے کھینچ لیتا یا شاید اس سے پہلے ہی چوکیدار مجھے شوٹ کر دیتا۔ اسے یہی احکامات ہوں گے کہ وہ مشکوک افراد کو دیکھے تو بلا تامل گولی مار دے اور میں یہ فرض کرتا کہ چوکیدار کا نشانہ خطا ہو جائے گا تو یہ بڑی جان لیوا خوش فہمی ہوتی۔

میرا فیصلہ ایک فوری اور غیر شعوری ردِ عمل کا نتیجہ تھا۔ عین اس وقت جب کُتا جست لگانے کو تھا، میں نے خود کو دیوار سے نیچے گرا دیا اور کوٹھی کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے سائلنسر والے ریوالور کی دبی دبی آواز سُنی۔ یہ گولی یقیناً چوکیدار نے چلائی تھی اور اگر میں نے اندر اُترنے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر بھی کی ہوتی تو یہ گولی میرے وجود میں پیوست ہو جاتی۔ جست لگانے والا کُتا دیوار سے ٹکرایا اور میں نے بالکل نیچے سے اس پر فائر کیا۔

میں دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان کی جگہ میں لیٹا ہُوا تھا اور کھلی جگہ کے مقابلے میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ کتے نے ایک بھیانک آواز نکالی اور جھاڑیوں پر گرا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور گھٹنوں کے بل چوپایوں کی طرح چلتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ واپس ہُوا۔ چوکیدار کی چلائی ہوئی دوسری گولی بھی ضائع ہوئی۔ اس نے اندازے کی بنیاد پر اس جگہ کا نشانہ لیا تھا جہاں کتا گرا تھا مگر میں چند قلابازیوں میں اس مقام سے دس فٹ دُور ہو چکا تھا۔ میں ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے تیسرے فائر کی آواز سُنی اور دوسرے کتے نے بھونکتے بھونکتے ایک کرب ناک صدا بلند کی۔ میں سمجھ گیا کہ محسن نے بھی وہی کیا ہے جو میں نے کیا تھا۔ رات کی خاموشی میں دونوں دم توڑتے کُتوں کی ہولناک آوازیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ رہی تھیں لیکن ان آوازوں نے دشمنوں کو پوری طرح ہوشیار کر دیا تھا۔ ہمارے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی صورت تھی۔ ہم جھاڑیوں میں چھُپ کر بھی نہیں رہ سکتے تھے اور بے دھڑک باہر نکل کر خودکشی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چوکیدار بڑی آسانی سے ہم دونوں کو باری باری نشانہ بنا لیتا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ محسن کی پوزیشن کیا ہے۔ اس نے دیوار کے اُوپر سے کتے کو شوٹ کیا تھا یا میری طرح اندر گر کے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ باہر کُود گیا ہو۔ ایسی صورت میں چوکیدار کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ٹیڈی کو اس وقت اندر آنا تھا جب ہم گھر میں داخل ہو جاتے۔ فائرنگ اور

کتوں کی چیخ و پکار سنتے ہی وہ بھاگ گیا ہوگا اور گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا اور شاید غالب کو مجبور کر رہا ہوگا کہ صورتِ حال کے خطرناک ہو جانے کے باعث انھیں تو نکل ہی جانا چاہیے۔ یہ عجیب بات تھی کہ پریشانی میں اُستادی کا درجہ حاصل کرنے والا ٹیڈی جرأت اور ہمت میں سب سے کمتر تھا۔ اس کے برعکس محض روایتی صحافی نظر آنے والا غالب کسی خطرناک ترین بدمعاش سے کم نہ تھا۔

اچانک چوکیدار نے ایک ٹارچ روشن کی۔ یہ بہت بڑی ٹارچ تھی جس کی روشنی کسی متحرک سرچ لائٹ کی طرح قدِ آدم جھاڑیوں کو کھنگال رہی تھی۔ اس کا دائرہ آہستہ آہستہ میری طرف سرک رہا تھا۔ میں نے اس کی زد میں آنے کے تناسب کا اندازہ کرتے ہوئے خود کو بچانا شروع کیا اور پیچھے ہٹتا گیا۔ پھر ایک اور فائر ہونے کی دبی ہوئی آواز سنائی دی اور ٹارچ کی روشنی غائب ہو گئی۔

"واہ مرزا غالب!" میں نے دل ہی دل میں بے اختیار کہا۔ کسی تذبذب یا سوچ بچار کے بغیر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کارنامہ وہی شخص سرانجام دے سکتا ہے جو موم بتی کے شعلے کو گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ فائرنگ کی آوازیں سُن کر خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی، اگر رزم گاہ سے فرار ہوئے ہوں گے تو مرزا کو غیرتِ مردانہ اور جرأتِ رندانہ نے بے خطر آتشِ نمرود میں کُود پڑنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ خود کو تہ سے محفوظ پا کے میں نے قدرت کی عطا کردہ مہلت سے فائدہ اٹھایا اور ریوالور نکال کے ایک سرچ لائٹ کو گُل کر دیا۔ اسی وقت دوسری سرچ لائٹ بھی گُل ہو گئی۔ یہ بھی مرزا غالب کی ذہانت اور نشانے کی مہارت کا نتیجہ تھا کیونکہ فائر کی آواز بہت کم تھی گولی محسن نے چلائی ہوتی تو اس کا دھماکا انتہائی خوفناک ہوتا۔ ابھی تک جتنی گولیاں چلائی گئی تھیں ان سے اردگرد کے رہنے والوں کی نیند پر اثر نہیں پڑا تھا اور کسی طرف سے بھی کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کتوں کی چیخ نے کسی کو بیدار کیا ہو لیکن کتے کی آواز کو کون اہمیت دیتا ہے۔ سخت سردی نے بھی ہمیں مداخلت بیجا سے محفوظ رکھا اور گولیاں چلنے کی معمولی سی آواز بند دروازوں کے پیچھے لحافوں میں منہ لپیٹ کر سونے والوں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

عقبی حصّے کی سرچ لائٹس براہِ راست ہم پر نہیں پڑ رہی تھیں مگر ان کی منعکس ہونے والی روشنی لان تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے چوکیدار کو ریوالور ہاتھ میں تھامے پوری طرح چوکس ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ کھلی جگہ پر وہ میرے اور غالب کے نشانے پر تھا اور غالب جیسا ماہر نشانے باز آسانی سے اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکتا تھا لیکن ایک چوکیدار سے ہماری کوئی دشمنی نہ تھی۔ ہاں وہ میرے لیے براہِ راست خطرہ بن جاتا اور میں محسوس کرتا کہ اب اس پر گولی چلائے بغیر میرا بچنا ممکن نہیں تو میں بھی کوئی رعایت نہ کرتا یا کرتا تو صرف اس حد تک کہ چوکیدار کی جان نہ لیتا۔ اس کے دل یا سر کے بجائے اس کے شانے کو نشانہ بناتا اور اس ہاتھ کو ناکارہ بنا دیتا جو مجھ پر ریوالور اٹھا سکتا تھا۔

کوٹھی کے اندر ابھی تک کوئی ہلچل کے آثار نہیں تھے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اندر کوئی ہے ہی نہیں؟ یا ہے تو اتنی گہری نیند میں ہے کہ باہر کے شور سے بے خبر ہے؟ یہ دوسری بات عقل کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ چوہدری دلاور کا عیار ذہن تو اُس وقت پوری طرح ہوشیار اور بیدار رہتا ہوگا جب آنکھیں محوِ خواب ہوتی ہوں گی۔ ایک تیسری صورت یہ تھی کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں دھوکے میں مبتلا رکھنا تھا اور یہ تاثر دینا تھا کہ چوکیدار کے سوا کوٹھی میں کوئی بھی نہیں تا کہ ہم کسی طرح چوکیدار پر غالب آ کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس پُرفریب خاموشی کے جال میں گرفتار ہو جائیں۔ میں ابھی کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ میں نے چوکیدار کے پیچھے دوسرا سایہ متحرک دیکھا۔ کوئی دبے پاؤں چوکیدار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ محسن تھا یا غالب۔ اتنی دُور سے میں صورت کے نقوش بھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور چال سے بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ آگے بڑھنے والا پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ میں سانس روکے اور پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور اسی وقت دوسرا سایہ جست لگا کے بڑھا۔ چوکیدار کو پلٹ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس کے پیچھے ایک ہاتھ کو بلند ہوتے اور تیزی سے نیچے آتے دیکھا۔ محسن یا غالب میں سے کسی نے چوکیدار پر ریوالور کے دستے سے وار کیا تھا اور شاید پہلے اس کا منہ دبا لیا تھا کہ چوکیدار کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

اب میدان صاف تھا۔ میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر مختصر ترین راستہ اختیار کیا اور سر جھکا کے دوڑتے ہوئے لان کو عبور کر گیا۔ قریب پہنچنے پر میں نے محسن کو شناخت کر لیا۔ چوکیدار اس کے قدموں میں ڈھیر پڑا تھا۔ محسن کے اشارے پر میں نے ریوالور کو جیب میں ڈالا اور ہم دونوں نے مل کر چوکیدار کے بھاری بھر کم جسم کو دونوں طرف سے اٹھایا۔ لان کے آخری حصّے میں جھاڑیوں کی دو فٹ سے کچھ کم اُونچی باڑھ تھی۔ ہم نے چوکیدار کو اس کے سائے میں لمبا لِٹا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر میں نے نبض کی رفتار پر غور کیا اور پھر سر جھکا کے دل کی دھڑکن سُنی۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محسن کا وار خاصا کاری تھا۔ چنانچہ چوکیدار کے آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ شکاری دشمنوں سے مسلسل معرکہ آرائی نے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن کو بھی گوریلا جنگ کا ماہر بنا دیا تھا۔ جس انداز سے اس نے چوکیدار کو بے بس کیا تھا وہ اس کا ثبوت تھا۔

"کیا اندر کوئی نہیں ہے؟" محسن نے سرگوشی میں کہا۔ ہم اب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔

"اندر کوئی نہ ہوتا تو دروازے پر چوکیدار کو کیوں بٹھایا جاتا۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس خاموشی کا مقصد ہمیں ٹریپ کرنا ہے۔" محسن بولا۔

"چنانچہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کھلی آنکھوں سے یا کسی کیمرے کی آنکھ سے ہم کو بھی دیکھ رہے ہوں اور ہماری مار دھاڑ کی ساری کارروائی کو ایک کامیڈی سمجھ رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا کریں؟ اندر چل کے کہیں کہ آ بیل مجھے مار؟"

محسن بولا۔ "بیل محوِ انتظار ہوگا۔"

"اس کے سوا ہم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ واپسی بھی ہمارے اختیار کی بات نہیں۔ وہ ہمیں جانے نہیں دیں گے اور یہاں تک پہنچ کے اور آ کے کچھ کر کے لوٹ جانا بے وقوفی کی بات ہوگی۔ غالب کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم گولی بالکل مت چلانا۔" محسن بولا۔ "پھر وہ ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ دوبارہ نمودار ہوا تو کہنے لگا کہ پیچھے سے جاؤ اور چوکیدار کا راستہ روکو اور پھر غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ تو گاڑی میں تھا، اندر کیسے آ پہنچا؟" میں نے کہا۔

"خواجہ صاحب کتے کی آواز سنتے ہی دوڑ کر کار میں گھس گئے تھے اور بضد تھے کہ نکل چلو۔ غالب نے الٹا یہ کیا کہ ہمارا ساتھ دینے نکل آیا۔" محسن بولا۔ "اب معلوم نہیں کہاں ہے؟"

"میرا اندازہ بھی بالکل یہی تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ غالب تو کمال کا پراسرار آدمی ہے یار، باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ ہم بھی اس کی شخصیت کے ظاہر سے دھوکا کھا گئے۔ خیر اب میں ایک طرف سے جاتا ہوں تو دوسری طرف سے جا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" محسن بولا۔ "وہ ہر دروازے پر ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہو سکتے ہیں۔"

"اچھا تو آگے میں جاتا ہوں۔ تو پیچھے آ۔" میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھائے۔ غالب کی عدم موجودگی مجھے بے سبب نہیں لگتی تھی۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ اس کارروائی میں پوری طرح شریک رہنے کے بعد وہ لوٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا ہوگا۔ امید یہ تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں مصروف ہوگا اور دشمن کے قلعے میں ہمارے ساتھ داخل ہو جانے کے بعد ہمارے خیال سے غافل نہیں ہوگا۔

میں نے اپنے سامنے آ جانے والے پہلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پوری احتیاط کے ساتھ آہستہ سے گھمایا۔ معمولی سی کلک کے ساتھ پٹ تھوڑا سا وا ہوا اور میں نے گھپ اندھیرے میں قدم رکھا۔ محسن نے اندر آ کے دائیں جانب اور میں نے بائیں جانب چلنا شروع کیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھوں اور پیروں سے راستہ بناتے جا رہے تھے لیکن وہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں جو ہماری راہ میں حائل ہوتی۔ بالآخر میں کمرے کے ایک کونے میں پہنچ گیا۔ دوسرے کونے میں سگریٹ لائٹر کا ننھا سا شعلہ روشن ہوا اور بیک وقت میں نے اور محسن نے اس خالی کمرے کو دیکھا جس کے وسط میں صرف ایک لاش پڑی تھی اور یہ الف دین کی لاش تھی۔ ذہنی صدمے نے چند لمحوں کے لیے ہم دونوں کو مفلوج کر دیا اور ہم پلک جھپکائے بغیر اس دیوانے کی لاش کو دیکھتے رہے جو خود اپنے انتقام کی آگ میں جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس کی لاش الٹی پڑی تھی۔ یوں کہ دونوں ہاتھ آگے پھیلے ہوئے تھے اور دونوں پیر پیچھے کی طرف۔ بائیں ہاتھ کو دائیں پیر کی سیدھ میں رکھا گیا تھا اور دائیں ہاتھ کو بائیں پیر کی سیدھ میں، چنانچہ وہ جو الف دین تھا فرشِ خاک پر انگریزی حرف ایکس کی طرح نظر آتا تھا لیکن اس کو یوں سٹانے والوں نے ہماری آنکھوں کے لیے دوسرا پیغامِ عبرت الف دین کی کمر پر نقش کیا تھا۔ کمر کے ہموار حصے پر اس کی کھال کو داغ کر "ایم آر ایس" کے تین حروف لکھے گئے تھے۔ یہ کام جتنی سفاکی سے کیا گیا تھا اتنی ہی صفائی سے بھی کیا گیا تھا۔ لوہے یا کسی اور دھات کے دہکتے ٹکڑوں کو الف دین کے جسم پر یوں چپکایا گیا تھا کہ کھال جل گئی تھی اور نقش گہرے سیاہی مائل سرمئی رنگ کے زخم کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ زخموں کے ہر نقش کی گہرائی بتاتی تھی کہ وہ آگ کتنی بے رحم ہوگی جس نے ایک زندہ جیتے جاگتے آدمی کے گوشت کو جلایا تھا۔ یہ تین حرف ایک پرعذاب موت کی پوری کہانی کہتے تھے۔ الف دین کی موت میں ہمارے لیے ایک پیغام تھا کہ شکاری دشمن ہماری ہر چال سے باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایم آر ایس کیا ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "ماسٹرز آف رائٹ سوسائٹی" کے مقابلے میں ان کی طاقت ہم سے کتنی زیادہ ہے۔ الف دین نے بیوقوفی کی تھی کہ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ طافو اگر بھائی تھا تو صرف اس کے لیے۔ اس کے قاتلوں کے نزدیک وہ صرف ایک غدار تھا۔ ایک حقیر پیادہ جو بساط پر سب سے پہلے مرتا ہے کیونکہ وہ سب سے آگے رہتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ شاہ کو مات نہ ہو۔ شاہ ایک ہوتا ہے اور وزیر ایک ہوتا ہے مگر پیادے آٹھ ہوتے ہیں۔ بالکل... اسی طرح طافو جیسے ڈرائیور آٹھ ہوں تب بھی چوہدری دلاور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں اور محسن گھٹنوں

کے بل الف دین کی لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ لائٹر کے کپکپاتے شعلے کا مدھم اجالا ہر زخم کے نقش کو اجاگر کرتا رہا۔

"اسے پہلے قتل کیا گیا۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جسم کو موت کے بہت دیر بعد داغا گیا۔"

"ہاں، کسی زخم سے لہو کی سرخی عیاں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بیچارہ اپنی دیوانگی میں اس انجام تک پہنچا۔" محسن نے کہا۔

"آیا ہوگا بھائی کے قاتل کو قتل کرنے اور خود قتل ہوا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔"

"مگر مرنے سے پہلے اس سے وہ سب کچھ اگلوا لیا گیا ہوگا، جو اس کے علم میں تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سوختہ تن کی تحریر سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "وہ تشدد کے تمام حربے جانتے ہیں اور الف دین کوئی فولاد کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے 'ایم آر ایس' کے متعلق بھی بتا دیا۔"

"غالباً یہی وہ لاش تھی جس کو چوہدری دلاور کا جنازہ بنا کے رکھا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم تدفین میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے تو دشمنوں کی چال کامیاب رہتی مگر وہ ڈراما چل نہیں سکا۔"

"اس کے سارے کردار، وہ پولیس والے، سوگوار لواحقین اور تعزیت کے لیے آنے والے سب نکل گئے۔ خود چوہدری دلاور نے اپنا ٹھکانا بدل لیا۔" محسن بولا۔ "اسے ہمارے سارے عزائم کی خبر الف دین سے مل گئی ہوگی۔"

"پھر کوٹھی پر چوکیدار کھڑا کرنے کا مقصد کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے وہ صرف اس لاش کی حفاظت کر رہا ہو۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ ابھی ہم نے دوسرے کمروں میں کہاں دیکھا ہے، اندر کوئی تو تھا جس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں۔"

"ہم اس وقت شکارگاہ میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ کسی عام آدمی کا نہیں چوہدری دلاور کا گھر ہے۔ اگر ہر گوشے سے کسی کیمرے کی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہو اور ہر دیوار کے کان ہماری باتیں سن رہے ہوں تو عجب نہیں لیکن جب اوکھلی میں دیا سر تو پھر موصلوں کا کیا ڈر۔ اب دوسرے کمروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

دوسرے سب کمرے خالی تھے۔ ایک ایک کر کے ہم سارے دروازے کھولتے گئے۔ دروازہ میں کھولتا تھا، محسن ریوالور سے مجھے کور کرتا تھا مگر یہ دفاعی نظام اتنا کمزور تھا کہ ہم خود بھی اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ چوہدری دلاور نے حفاظت کے خیال سے کوٹھی خالی کر دی تھی اور اپنی فیملی کو کسی نامعلوم مقام پر شفٹ کر دیا تھا۔ شاید اسے خطرہ ہوگا کہ رابعہ پر نامعلوم قاتلانہ حملے کی کوشش کا ردعمل کیا ہوگا۔ کوٹھی میں ایک تنکا تک نہیں چھوڑا گیا تھا اور صفائی اتنی مکمل تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر جگہ سے فنگر پرنٹ تک مٹا دیے گئے ہوں گے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اسی کوٹھی میں چوہدری دلاور اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور شاہانہ ساز و سامان کے ساتھ آباد تھا۔

"غالباً چوکیدار صرف لاش کی حفاظت کر رہا تھا۔" میں نے باہر آ کے کہا۔

"رائٹ۔ اور صبح ہونے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے والے آئیں گے۔" غالب نے اچانک سامنے آ کے کہا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"چھت پر۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اگر کوئی تمہیں ہینڈز اپ کراتا تو میں اسے ہینڈز اپ کرا لیتا۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس پرانی وضع کی کوٹھی کے ہر کمرے میں روشندان ہیں۔ گزشتہ رات میرے یہاں چکر لگانے کے بعد ان لوگوں نے خطرہ محسوس کیا ہوگا کہ کہیں میں اصلی پولیس لے کر نہ پہنچ جاؤں۔ وہ سب الف دین کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ چوکیدار کو شاید معلوم بھی نہیں تھا کہ اندر ایک لاش پڑی ہے۔ وہ گیٹ پر پہرہ دیتا رہا۔ پولیس آتی تو وہ پکڑا جاتا اور کچھ نہ بتا پاتا کہ لاش کس کی ہے اور اندر کیسے پہنچی...."

"مگر اندر کوئی اور بھی تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو غالباً فرار ہو گیا۔ اس نے سرچ لائٹس جلائی تھیں...."

ہمارے قدم اچانک رک گئے۔ چوکیدار جسے ہم نے بیہوش کر کے جھاڑی کے پیچھے ڈالا تھا، برآمدے کے سامنے مرا پڑا تھا۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی تھی اور وار کسی تیز دھار آلے سے کیا گیا تھا کہ باقی جسم کے ساتھ سر کا رشتہ برائے نام رہ گیا تھا۔ خون ابھی تک بہہ رہا تھا اور جسم گرم تھا۔ خطرہ کسی صدائے بازگشت کی طرح بار بار پکارنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "اندر یقیناً کوئی اور بھی تھا جس نے یہ قتل کیا ہے مگر اب ہمارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ یہ کوئی سازش ہے۔"

غالب کا خیال غلط نہیں تھا۔ اچانک ایک گاڑی گیٹ کے سامنے آ رکی اور میں نے جیپ سے اترنے والی پولیس کو دیکھا۔ وہ گیٹ کھولنے کے لیے اترے تھے۔ ہم تینوں ایک ساتھ اس دیوار کی طرف لپکے جس کے پیچھے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

"کون ہے؟ خبردار!" کسی نے چیخ کر کہا۔ "ٹھہر جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا" لیکن ہم نے رکے بغیر دوڑنا جاری رکھا۔ پھر ایک فائر ہوا لیکن گولی کسی کو چھوئے بغیر نکل گئی۔ اگر گیٹ بند نہ ہوتا تو ہمیں اتنی مہلت بھی نہ ملتی کہ ہم دیوار تک پہنچ سکیں۔ محسن دیوار کے اوپر تھا جب دوسری گولی آئی اور دیوار میں اس جگہ پیوست ہو گئی جہاں میں نے محسن کو دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گولی محسن کو لگی ہے مگر دیوار

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھر سے ریت کے ذرات آڑے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ غالب اور میں سر جھکا کے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ باہر سے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ہمارے پیچھے پولیس کی جیپ گیٹ سے سیدھی اندر آئی۔

"یہ میرا ریوالور لو اور جاؤ" غالب نے کہا "میں پولیس سے نمٹ لوں گا"

"کیسے؟" میں نے ریوالور لے کر کہا "وہ پوچھیں گے..."

"ارے یار میں اخباری نمائندہ ہوں! کہہ سکتا ہوں مجھے کسی نے گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہونے کی اطلاع دی تھی" غالب بولا "مگر میرے پاس سے ریوالور برآمد نہیں ہونا چاہیے۔ تم جاؤ"

غالب کے ریوالور کو میں نے جیب میں ڈالا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ کسی نے چلا کے پھر کہا "کون ہے" مگر میں باہر کود چکا تھا۔ محسن کار کو تیزی سے آگے لایا۔ اس کا اگلا دروازہ پورا کھلا ہوا جھول رہا تھا۔ ابھی کار کی رفتار کم ہوئی ہی تھی کہ میں اندر جا گرا۔ دروازہ بند ہوتے ہی محسن نے ایکسیلیٹر دبا دیا۔

"خطرے کی اب کوئی بات نہیں رہی" میں نے سیدھا بیٹھ کے کہا "آہستہ چل"

"کیوں؟ پولیس کی جیپ ہمارے تعاقب میں آسکتی ہے" محسن نے کہا۔

"نہیں، جیپ اندر پہنچ چکی ہے" میں نے کہا "اور اندر ہمارے صحافی دوست مرزا غالب موجود ہیں"

"وہ پھنس جائے گا" محسن نے تشویش سے کہا "اندر دو لاشیں پڑی ہیں"

اس نے ہمیں پھر بچا لیا ہے" میں نے کہا اور غالب کی بات دُہرا دی۔

صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم نے کار کو ایک سڑک پر چھوڑا اور اس میں سے اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹا دیے۔ ہم بڑی افراتفری میں فرار ہوئے تھے لیکن سازش کے ایک اور جال سے بال بال بچ کے نکل آئے تھے... چوہدری دلاور ہماری توقعات سے زیادہ چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لیے رابعہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ بات نہیں بھولا تھا کہ میرے انتقام کا نشانہ اس کی فیملی بھی ہو گی چنانچہ اس نے کسی کو بتائے بغیر اپنے خاندان کو ساز و سامان سمیت کہیں منتقل کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک جعلی اخبار کی جھوٹی خبر کے ذریعے مجھے متوجہ کیا تھا اور اگر میری جگہ مرزا غالب نہ پہنچتے تو میں اس کی "تدفین" سے پہلے گرفتار ہو جاتا۔ پھر اس نے بڑی ہوشیاری سے وہ جعلی اخبار بھی واپس حاصل کر لیا اور اس دوران میں شامت کا مارا الف دین اس کے جال میں پھنس گیا تو اس نے پہلے الف دین سے ہماری تمام خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں سب معلومات حاصل کر لیں یہاں تک کہ ہماری اس تنظیم کا نام تک پوچھ لیا جو درحقیقت کوئی تنظیم نہ تھی۔ یہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر چند افراد کی جدوجہد تھی...

الف دین کی لاش پر "ایم آر ایس" کا نام کندہ کر کے اس نے بالواسطہ طور پر ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ ہم جو بزعمِ خود تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں اس کی نظر میں کیا ہیں۔ آخری کام اس نے ایک مفروضے کو بنیاد بنا کے کیا تھا یعنی اپنے کسی معتمد کو الف دین کی لاش کے پاس چھوڑ کر یہ سمجھا گیا تھا کہ اگر ہم چکر لگائیں تو اسے کیا کرنا ہے۔ معتمد نے وہی کیا جو اسے کہا گیا تھا۔ چوکیدار اس بکرے کی طرح مارا گیا جسے شیر کا شکار کرنے والے مچان پہ بیٹھ کے نیچے باندھتے ہیں اور جو شکاریوں کی زبان میں گارا کہلاتا ہے۔ شیر اس بکرے کو کھانے آتا ہے اور خود شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں دلاور کے معتمد نے چوکیدار کو قتل کر کے پولیس کو مطلع کر دیا تھا کہ قاتل اندر ہی موجود ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غالب ہمت کر کے پولیس سے نمٹنے کے لیے نہ رکتا تو میں دہرے قتل کے ایک اور الزام میں گرفتار ہو جاتا، شاید یہ میری آخری گرفتاری ہوتی مگر میں بچ کر نکل آیا اور چوکیدار کی جان بلاوجہ گئی۔

افق کے آخری کناروں پر صبح کا دھندلکا نمودار ہونے لگا تھا۔ ذہنی و جسمانی طور پر میں تھکا ہوا تھا اور مجھے ایک شب کی جدوجہد کے رائیگاں جانے کا افسوس تھا۔ ٹیڈی کچھ شرمندہ تھا کہ پوری طرح ہمارا ساتھ نہ دے سکا اور محسن کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی اس صورتِ حالات پر تشویش اور اضطراب کا شکار ہے۔ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اعتماد کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری قوتِ عمل ہمارا ساتھ دے۔ ہم حالات کے مطابق مستقبل کے لیے صحیح لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ ہمارے حلیے اتنے مضحکہ خیز نہ ہوتے تو ہم ہوٹل واپس لوٹ جاتے اور ایک دن سکون سے سو کر گزار دیتے تو شام تک وقتی ناکامی کے اس حوصلہ شکن ردِعمل کا اثر باقی نہ رہتا لیکن فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میں نے محسن کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے کہیں بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا۔ بازار ابھی بند تھے چنانچہ ہمیں ریلوے اسٹیشن تک مارچ کرنا پڑا۔ اسٹیشن کے باہر بہت سے ہوٹل تھے جو ہمیشہ کی طرح آباد تھے اور گرد و پیش کی رونق میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے نظر اٹھا کے ہمیں واجبی سی دلچسپی سے دیکھا۔ کیونکہ میں اور محسن الگ الگ لباس میں ہونے کے باوجود ہی ایک جیسی صورت سے نمایاں نظر آتے تھے۔ بلیشتر لوگوں نے ہمیں جڑواں بھائی تصور کیا لیکن ان کا وقتی تجسس زیادہ پریشان کن ثابت نہیں ہوا۔ اس ریسٹورنٹ یا چائے خانے کے آخری گوشے میں بیٹھ کر میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی اور چائے کے انتظار میں خاموش بیٹھے دھوئیں کے ساتھ اپنے اپنے خیالات کی پرواز میں گم رہے۔ گرم چائے کا ایک کپ ہمارے جسم میں حرارت بن کر پھیل گیا تو ہم نے بہت بہتر محسوس کیا۔

"کیا واقعی غالب کسی مشکل میں نہیں پڑے گا؟" محسن نے خاموشی کے بوجھل وقفے کو ختم کیا۔

"میرا خیال ہے وہ اپنے تعلقات کی وجہ سے محفوظ رہے گا" میں نے کہا "اس کے مددگار بہت ہیں۔ ویسے بھی الف دین یا اس چوکیدار کے ساتھ غالب کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کوئی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ اس نے اتنے سفاکانہ طریقے پر الف دین کو مارا اور جلایا اور چوکیدار کا گلا کاٹا۔ پولیس کو وہاں گولیوں کے خول ملیں گے۔ فائرنگ میں نے کی تھی، چوکیدار نے اور غالب نے مگر اس کے پاس سے کوئی ریوالور برآمد نہیں ہو گا اور جائے واردات پر تین قسم کی گولیوں کے خول ایک معمّا بن جائیں گے"

"ممکن ہے پولیس کو تلاش کرنے پر وہ خنجر مل جائے جس سے چوکیدار کا گلا کاٹا گیا تھا" محسن بولا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا" میں نے کہا "خنجر پہ فنگر پرنٹ نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ سوال وہی ہو گا کہ قتل کیوں ہوا؟ غالب پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ چالاک آدمی ہے۔ پولیس کو چکر میں ڈال دے گا کہ وہ تین ریوالور تلاش کرو جن سے تین قسم کی گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک میرا اعشاریہ بور کا کولٹ تھا جو مجھے اپنے چوہدری دلاور سے ملا تھا۔ اس کا کوئی لائسنس کسی کے نام پر نہیں۔ دوسرا غالب کا اعشاریہ تین آٹھ کا "بیریٹا" ہے جو اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے میرے حوالے کر دیا۔ اس کا بھی کوئی ریکارڈ نہیں کیونکہ یہ مالِ غنیمت تھا۔ وہاں صرف چوکیدار کا ریوالور ملے گا"

"وہاں چوکیدار کا ریوالور بھی نہیں ملے گا" محسن ہنسا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر رک گیا "وہ میں نے بھاگنے سے پہلے اٹھا لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ سائلنسر والا ریوالور ہے، چھوڑا کیوں جائے مگر وہ کچھ عجیب سی ساخت کا ہے"

"فکر اب غالب کی نہیں اپنی کرنی چاہیے" میں نے کہا۔ "صورت سے تو ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا مگر بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم لوٹ کر واپس ہوٹل نہیں جا سکتے"

"استاد ٹیڈی تم بہت چپ ہو" محسن نے کہا۔

"میں کیا بولوں محسن بھائی!" ٹیڈی زبردستی مسکرایا "اللہ نے خیریت رکھی ورنہ... میں تو شرمندہ ہوں"

"شرمندگی کیسی یار! ہر کام ہر آدمی نہیں کر سکتا" میں نے اسے دلاسا دیا "یہی کیا کم ہے کہ تم ہمارا ساتھ دے رہے ہو اور ایسے حالات میں کہ اپنے پرائے سب چھوڑ چکے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار تمھارے گھر نے ہمیں پناہ دی اور ہم نے تم سے وہی گھر چھین لیا۔ تم کو تو ہماری دوستی بہت مہنگی پڑی"

"یہ سب قسمت کا لکھا ہے سکندر بادشاہ" ٹیڈی بولا۔ "تم نے مجھے عزت دی اور عزت کے ساتھ جینا سکھایا۔ مجھے اپنا سمجھا اور آج میرا ایک خاندان ہے۔ ورنہ میں اکیلا تھا اور اکیلا رہتا تو اسی غلط راستے پر چلتا رہتا۔ اب مجھے یہ خوشی ہے کہ میں برائی سے بچ گیا اور خدا نے مجھے توفیق دی کہ برائی کے خلاف جنگ میں شریک ہو کر تمھارے ساتھ رہوں۔ مجھے معلوم ہے میں نے ابھی کوئی تیر نہیں مارا اور کوئی بہت بڑا کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا"

"دل چھوٹا کیوں کرتے ہو استاد" میں نے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا "تمھارا ساتھ دینا ہی اتنا بڑا کام ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اب تم یوں کرو کہ یہاں سے سیدھے رابعہ کے پاس جاؤ۔ اسے ساری بات بتا دو اور پھر انکل رضوی کے گھر چھوڑ آؤ۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے۔ اسے بتا دینا کہ ہم اپنا حلیہ کیا بنا چکے ہیں تاکہ کبھی وہ دیکھے تو پہچان لے۔ اس سے کہنا کہ جتنی نقد رقم فراہم کر سکتی ہے کر دے۔ ہم کو سب سے پہلے تو سر چھپانے کا کوئی مستقل ٹھکانا بنانا ہے۔ پھر ہمیں ایک اور گاڑی بھی چاہیے"

"کرامت مانا سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا "اپن عورت کی کمائی کے قائل نہیں"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیڈی نے میری غیرت کے منہ پر طمانچہ مار کے مجھے بے عزت کر دیا ہے مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اسے سخت جواب دینے سے گریز کیا "قائل تو میں بھی نہیں ہوں"

"ساری بات حالات کی ہے استاد!" محسن نے میری بات کاٹ دی "عام حالات میں کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا مگر سکندر کی اور میری پوزیشن مختلف ہے۔ سکندر محتاج یا مفلس نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس نے دلاور کے پچاس لاکھ قبول نہیں کیے تھے۔ اس لیے کہ وہ ناجائز تھے۔ جائز طور پر اس کی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے تو سکندر کے پاس اس سے دگنی مالیت کا کاروبار ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ حق تسلیم ہو گا مگر اس وقت کے آنے تک ہم سب کو اپنے اپنے وسائل پر بھروسا کرنا ہے"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اس کے علاوہ رابعہ مختلف قسم کی عورت ہے۔" میں نے برہمی سے کہا "کم سے کم میرے لیے۔"

"وہ تو ہے سکندر بادشاہ ۔" ٹیڈی عاجزی سے بولا "میں جانتا ہوں کہ اس نے تمہارے لیے اور تم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن تم اس سے شادی کر لو گے اور جتنا آج اس نے دیا ہے، اس سے ہزار گنا واپس کر دو گے۔ تمہارا سب کچھ اسی کا ہو گا۔ پھر بھی آج مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ جب ہم خود ایک کام کر سکتے ہیں . . ."

"وہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے ہم صرف ڈاکا ڈال سکتے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "چیک نہیں کاٹ سکتے۔ کسی سے ادھار نہیں مانگ سکتے۔ ہمارے پاس تو بیچنے کو بھی کچھ نہیں ہے۔"

ٹیڈی اُٹھ کھڑا ہوا "چلو چھوڑو سکندر بادشاہ! یہ بتاؤ پھر کہاں ملو گے؟"

"رابعہ سے کہنا کہ ویسٹ اینڈ ہوٹل سے اپنا اور تمہارا سامان اُٹھا لے۔" میں نے کہا "میرا بل کلیئر کرے اور تمہارے ساتھ انکل رضوی کے گھر چلی جائے۔ اپنا سب سامان الگ کر لے۔ باقی سامان کے ساتھ تم 'زمیندار ہوٹل' پہنچ جانا، ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک پر۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے کہا "کس نام سے کمرہ لوں؟"

"وہی امیر خاں کبیر خاں کا نام چلانا۔" میں نے کہا "دو کمرے کافی ہوں گے۔ اگر رابعہ نے کوئی بندوبست کر دیا تو کل کرائے کے کسی گھر میں منتقل ہو جائیں گے۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ اب لاہور میں رہنے کا فائدہ نہیں۔ آج چوہدری دلاور نے اپنا گھر بدل دیا ہے، کل تک وہ اپنا کاروبار بھی بدل دے گا۔ جب تک ہم اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کریں گے، وہ اپنی پوزیشن محفوظ کر لے گا۔ وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس سے اپنے مجرمانہ کاروبار کا ہر سُراغ مٹا دے گا اور یہ کاروبار کسی اور جگہ شروع کر دے گا۔ پھر اس کے لیے فیکٹری کو آگ لگا کے تباہ کرنا یا دھماکے سے اڑا کے ملبے کا ڈھیر بنا دینا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اس قسم کی تخریبی کارروائی کو آسانی سے میرے نام منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فوری طور پر اس کے خلاف کوئی ٹھوس قدم اُٹھائیں۔"

"لیکن ابھی تو اس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ . . . کہاں غائب ہو گیا ہے۔"

"چوہدری دلاور کو گولی مارو۔" میں نے کہا "کیا ہم گامے شاہ پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ رحمت کبا ڑیا اور طافو مارے گئے، پھیدو لاپتا ہے۔ نقلی نواب خسرو جمشید کا کوئی سراغ نہیں لیکن گامے شاہ کا ٹھکانا ہم نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں ایک سیٹھ کریم بھائی ہے۔ اس کا پتا گامے شاہ سے مل سکتا ہے۔ کراچی میں ہی پیار علی ہے جو یہاں سے جانے والے مال کو کلیئرنس دلواتا ہے۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دست و بازو ہیں۔ ان کو ختم کر دیا جائے تو چوہدری دلاور ختم ہو جائے گا۔"

"یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"کام کوئی بھی آسان نہیں ہوتا اور ہم نے تو راستہ ہی وہ منتخب کیا ہے جس میں مشکلات کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے مقابل بہت طاقتور، منظم اور خطرناک شکاری ہیں لیکن ہم بھی اب اکیلے تو نہیں ہیں۔ تمہارے علاوہ غالب کو ملا کر ہم چار افراد ہیں اور ہم سب مسلح ہیں۔ سائلنسر والے تین ریوالور اس وقت بھی ہمارے پاس ہیں بغیر سائلنسر کے بھی تین ریوالور ہیں۔ غالب ہماری مدد کرے تو پولیس کے اسلحہ خانے سے اور بھی بہت کچھ دلوا سکتا ہے۔ ہمیں ریموٹ کنٹرول مائک مل سکتے ہیں اور لانگ رینج کے واکی ٹاکی مل سکتے ہیں۔ ملنے کو کیا نہیں مل سکتا۔ اسی شہر میں دستی بم اور ٹائم بم مل سکتے ہیں۔ بس نقد پیسہ چاہیے۔" میں نے کہا "اتنا پیسہ کہ لٹایا جا سکے۔"

"چھوڑو سکندر بادشاہ! تم بھی پیسے کی فکر کرتے ہو۔" ٹیڈی بولا "ارے ہم کو دیکھو۔ ہمارا تو نام ہی ٹیڈی ہے۔ ٹیڈی پیسہ کیا ہوتا ہے۔ مگر اب دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں۔ اب تک نہیں کیا مگر اب کریں گے۔"

"کیا کرو گے اُستاد!" محسن ہنس پڑا "سرکاری خزانے کی چابیاں ہمارے حوالے کر دو گے؟"

لیکن جواب دینے کے بجائے ٹیڈی چل پڑا "دس گیارہ بجے تک میں آ جاؤں گا۔" وہ جاتے جاتے بولا۔

"کیا عجیب آدمی ہے یہ بھی۔" اس کے جانے کے بعد محسن نے کہا "اُستادی کا زور بھی نہیں رہا مگر پھر بھی ڈینگ مارنے سے باز نہیں آتا۔"

"قسم مولا علی کی۔" میں نے ٹیڈی کے لہجے میں کہا "یاروں کا یار ہے اور سچا سہارا ہے۔ کمزور سہارے بھی بعض اوقات بھرم رکھ لیتے ہیں۔ کشتی ڈوب جائے تو ایک تختہ ساحل تک لے جاتا ہے۔"

اس وقت تک سورج نکل آیا تھا اور اُجلی دھوپ کی حرارت پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اور محسن نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈبل بند مکھن اور چائے منگوا کے ناشتے سے فراغت حاصل کی اور بل ادا کر کے باہر نکل آئے۔ ہمارے پاس نقد رقم کی صورت میں اب ساڑھے سات سو روپے رہ گئے تھے اور اس میں سے کچھ رقم ہمیں اپنے لباس کو اپنے حلیے کے مطابق بنانے میں صرف کرنی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہم انار کلی میں تھے۔ میں نے محسن کو کپڑے لینے بھیجا۔

اور خود جنرل پوسٹ آفس کی طرف چل پڑا۔ میں اخبار کے دفتر یا پولیس اسٹیشن فون کر کے غالب کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس اس کو اپنے ساتھ تھانے ضرور لے گئی ہو گی اور اس نے وہاں سے اپنے دوستوں کو اور ساتھیوں کو مطلع ضرور کیا ہو گا کہ وہ کس مشکل میں پھنس گیا ہے۔ غالب جائے واردات پر پکڑا گیا تھا اور اسے ثابت کرنا تھا کہ کسی نے اسے واقعی گمنام فون کر کے چوہدری دلاور کے گھر میں ہونے والے قتل کی اطلاع دی تھی۔ اس کے اخبار کے ساتھی اپنی گواہی سے اس کو صاف بچا کر لے جا سکتے تھے، خود غالب کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی مگر میں اپنا اطمینان چاہتا تھا۔ چہرے بدل جانے کے بعد میرے اور محسن کے لیے لاہور کی سڑکوں پر بے خوف و خطر پھرنا ایک تجربہ تھا۔ مجھے ایک بار خیال ضرور آیا تھا کہ موٹے بھائی نے مجھے پہچان لیا تھا اور وہ پولیس سے رابطہ قائم کر کے انھیں بتا سکتا تھا کہ مطلوبہ ملزم کس حلیے میں پھر رہا ہے مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ حساب برابر ہے۔ کوئی ٹرمپ کارڈ غالب کے پاس بھی تھا جس کی وجہ سے موٹے بھائی اب تک دبا ہوا تھا۔ خود اس نے مانا تھا کہ اب پھانسی دونوں کو ہو سکتی ہے، مجھے بھی اور اسے بھی۔ وہ میری گردن پھنسانے سے پہلے اپنی گردن ضرور بچائے گا کیونکہ وہ غالب کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہی خیال میرے لیے تسلی کا باعث تھا۔

میں نے محسن سے جی پی او کے گیٹ پر ملنے کو کہا تھا۔ ابھی میں نیلا گنبد کی طرف سے گزر ہی رہا تھا کہ میں نے ایک کار کو سامنے سے آتے دیکھا۔ یہ چھوٹی سی "فیٹ . . . ٦٠٠" تھی جسے ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اس کے ساتھ ہی بے اختیار میرے قدم رک گئے کیونکہ وہ لڑکی نازو تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گاڑی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی طرف کاروں کی قطار میں لگ چکی تھی اور نازو اسی انداز محبوبی کی ساری معصومیت کے ساتھ شاخِ گل کی طرح لچک کر باہر نکل رہی تھی جس کے نظارے سے نے جانے کتنے دل خون کیے ہوں گے۔ اس کا رنگین آنچل لہرایا اور وہ سرتاپا قیامت ہی ایک دکان میں داخل ہو گئی۔ میرے تصور میں صرف اس کے پیرہن کے رنگ رہ گئے اور پرانی یادوں کا سیلِ بے عناں مجھے بہا کر لے گیا۔ میں زمانے سے چھپتا پھر رہا تھا مگر اس لڑکی سے منہ چھپاتے ہوئے مجھے شرم آئی جس نے عملاً مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ شرمندگی کا یہ بار تو میں نہ جانے کب سے اٹھائے پھر رہا تھا کہ اس شعلۂ جوالہ، سیماب صفت اور فتنۂ محشر لڑکی کو اس کی بے طلب چاہت اور دیوانہ وار اُلفت کے جواب میں میرے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس وقت بھی میں دامن بچا کے نکل جاتا تو یہ بارِ ندامت دگنا ہو جاتا۔

میں نے سڑک عبور کی اور اس کی گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کراکری کی دکان سے کچھ لینے آئی تھی۔ میں اسے دکان دار سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے رقم ادا کی اور دکان کا کوئی ملازم لڑکا گتے کا خاصا بڑا ڈبا اٹھائے باہر آیا۔ نازو اس کے ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھی۔ ملازم نے ڈبے کو پچھلی نشست پر رکھ دیا اور لوٹ گیا۔ نازو پھر وہی تھی۔ اسپتال میں موت اور زیست کی کشمکش سے گزرنے والی نازو کا رنگ روپ ذرا بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ صحت مند ہو جانے کے بعد وہ پھر برگِ گل کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ تھی اور اس کے حُسن کی جاں آفرینی کا سلسلہ طلسم وہی تھا۔ کوئی زخم اگر دل میں رہ گیا تھا تو اسے میرے سوا کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے آس پاس پھرنے والے دل پھینک قسم کے پیشہ ور عاشقوں کی نظریں طواف کر رہی تھیں لیکن وہ اسی الھڑپن سے کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اور پھر بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ سب کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ حد درجہ بھولی بھالی اور نازک دکھائی دینے والی لڑکی ایک چلتا پھرتا آتش فشاں ہے۔ اگر غلطی سے کوئی اس کی طرف ہوس پرست ہاتھ بڑھاتا تو وہ برق بن کے گرتی اور دوسرے لمحے وہ بدنیت اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ لیے سڑک پر یوں چت نظر آتا کہ پھر اسٹریچر پر اٹھایا جاتا۔

گاڑی بالکل نئی نہیں تھی مگر زیادہ پرانی بھی نہ تھی اور اس نے حال ہی میں لی تھی۔ ممکن ہے بھائی نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر کے روٹھی ہوئی بہن کو منانے کے لیے یہ رشوت دی ہو۔ وہ خود رشوت لینے والا آدمی نہیں تھا مگر یہ محبت کی رشوت اسے دینا ہی پڑتی تھی کیونکہ وہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی۔ میرے دل میں خلشِ آزار بڑھ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بیک کر کے پوری احتیاط سے آگے بڑھائی۔ میں ابھی تک خاموش کھڑا تھا مگر اچانک مجھے یوں لگا جیسے نازو نے جس گولی کا راستہ روک کر مجھے بچایا تھا، وہ اب میرے جگر میں پیوست ہو گئی ہے۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے مجھے بچانے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ اس کی شرربار نظروں نے میری ہیئت کذائی کا جائزہ لیا مگر وہ مجھے پہچان نہ سکی۔

"آنکھوں والے اندھے ہو یا عقل کے اندھے؟" اس نے برہمی سے کہا "خود مر جاتے اور مجھے مصیبت میں ڈال جاتے۔"

"نہیں نازو۔" میں نے آہستگی سے کہا "مرنا ہوتا تو اسی دن مر گیا ہوتا۔"

"سکندر!" وہ چیخ کر بولی "تم . . . ." پھر الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اس کی چیخ نے بہت سی نظروں کو متوجہ کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے کار کا ساتھ والا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا "یہاں سے نکل چلو۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے تم دفعی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مصیبت میں پڑجاؤ۔" میں نے کہا۔

"سکندر! ایسے نصیب میرے کہاں!" وہ بے وقوف لڑکی ایک دم نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ ہی نہیں، اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور مجھے یوں لگا تھا کہ وہ بیہوش ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں وہ گاڑی چلاتی تو یقیناً حادثہ ہو جاتا۔ نہ جانے کب سے رُکے ہوئے آنسو اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"چلو ہٹو اپنی جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی میں چلاؤں گا۔" اور نیچے اُتر کر سامنے سے اُدھر آیا جدھر وہ بیٹھی تھی۔ کچھ لوگ اس تماشے کو حیرت، دلچسپی اور شکوک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ناز و جیسی آفت کی پرکالہ کو میرے جیسے کارٹون کے ساتھ دیکھ کر ایک لڑکے نے گزرتے گزرتے اپنے ساتھی سے کہا۔ "پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت!" اور وہ دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔ میں نے ناز و کو زبردستی آگے کھسکایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ مسلسل مجھے گھور رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"یہ تم... تم واقعی... سکندر ہو نا؟ یا میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہے، تم ایسے تو نہ تھے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

"ہاں۔ لیکن تم ذرا سیدھی طرح بیٹھو اور ہوش میں رہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سڑک پر ہیں۔ میں ایسا بھیس بدلنے پر مجبور تھا، ورنہ اس شہر میں نہیں رہ سکتا تھا۔"

"یہ سب کیوں کر رہے ہو سکندر اور کب تک کرتے رہو گے؟" اس نے سر کو میرے کندھے پر سے ہٹا لیا مگر رونا جاری رکھا۔ "بتاؤ اس سے کیا ملے گا تمھیں؟ کیا ملا ہے آخر اب تک؟ سب کچھ تو گنوا دیا ہے تم نے، سب کو تو گنوا دیا ہے۔ اب تم کونسی دُنیا میں ہو، جہاں کوئی پہنچنا بھی چاہے تو نہیں پہنچ سکتا۔"

"مگر میں تو تم تک پہنچ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب میں تم سے دُور تھا تب بھی تمھارے خیال سے تو غافل نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک سہارا تمھاری یادوں کا بھی تھا۔"

ناز و کا چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے برستے بادلوں سے نکلنے والے چاند کی روشنی سے آسمان پر اُجالا پھیل جائے۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان مسکرا کے نظریں اُٹھائیں تو اس کے رُخسار گلابی ہو رہے تھے۔ "سچ... تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو مجھ سے؟ تم واقعی مجھے یاد کرتے تھے؟ بہت یاد کرتے تھے؟"

"ہاں، میں بھی یاد کرتا تھا۔ رابعہ بھی یاد کرتی تھی۔" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

ناز و کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی اور اس کا چہرہ بجھ گیا۔ "رابعہ... وہ بھی تمھارے ساتھ ہے؟" وہ آنسو پونچھ کے خفت سے ہنسی۔ "میں تو بھول ہی گئی تھی اسے۔ ظاہر ہے وہ تمھارے ساتھ ہی ہو گی۔"

میں نے نوکِ خار کی چبھن کو دل میں محسوس کیا۔ "ہاں، اس کے علاوہ محسن بھی ہے۔ ہم سب ساتھ ہیں۔"

"ہاں۔ بس میں اکیلی ہوں۔" وہ اداسی سے بولی۔ "کتنے اچھے تھے وہ دن جب..." وہ چپ ہو گئی۔

"ہاں، جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تھا۔" میں نے دُکھی دل سے کہا۔ "جب اکرام شیخ میرا دوست تھا اور رضوی صاحب کا گھر میرا گھر تھا۔ اب میں کسی کا نہیں ہوں اور اس دنیا میں سکندر بخت بن کے جینا میرے اختیار میں نہیں رہا مگر تم نے تو سب سُنا ہوگا، اپنے بھائی سے اور دیکھا بھی ہوگا۔ ان اشتہاروں میں جن میں میری تصویر تھی۔ تم نے اخبارات میں سب پڑھا بھی ہوگا۔ تم دیکھ رہی ہو اب میں کیا ہوں۔ آج تم کو دیکھا تو نظر چُرا کے نہ گزر سکا۔ تم نے اپنی جان کا قرض میرے لیے چھوڑ دیا ہے جو میں کسی طرح نہیں چُکا سکتا۔"

"تم یہ قرض چُکانا چاہتے ہو؟" اس نے نظروں سامنے رکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میری جان ہی لینی تھی تو اپنی جان دے کر کیوں بچائی تھی؟" میں نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ مجھے تمھاری جان کا قرض جان سے وصول کرنا ہے۔ میں تو تم سے دل کا قرض بھی نہیں مانگتی کیونکہ میں سمجھتی ہوں، تمھارا ایک ہی دل ہے جو تم رابعہ کو دے چکے ہو۔" وہ پھر رونے لگی۔ "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنا سمجھو۔ اسی طرح جیسے تم محسن کو اپنا سمجھتے ہو، شہلا کو سمجھتے ہو، مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ میں تمھارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں سکندر۔"

"کیا میں جانتا نہیں کہ تم میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"اس کے باوجود تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟" وہ دُکھ سے بولی۔ "دیکھو، میں رابعہ کا حق نہیں چھینوں گی۔ میں تم سے نہیں کہوں گی کہ مجھے اس طرح چاہو جس طرح تم رابعہ کو چاہتے ہو لیکن مجھے اتنا حق تو دو کہ میں تمھیں چاہ سکوں، تمھارے قریب رہ سکوں۔ اس تمام عرصے میں جب تم میری نظروں سے اوجھل تھے..."

"دیکھو ناز و، اس دیوانگی سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے ندامت ہوتی ہے اس احساس سے کہ میں تم کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ تم بہت اچھی، بہت پیاری لڑکی ہو۔ مگر خدا کے لیے حقیقت کی دُنیا میں زندہ رہنا سیکھو۔ میرا خیال چھوڑ دو، مجھے بھول جاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہ ساری دُنیا تمھاری ہے۔ تمھاری قوتِ تسخیر مثالی ہے۔ تمھاری زندگی کی راہوں میں پھول ہی پھول ہوں گے۔ اپنے دامن کے لیے

کانٹوں کی آرزو کیوں کرتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے ملتا رہوں گا، تم سے رابطہ رکھوں گا۔ یہ بتاؤ، کیا واقعی تمھارے بھائی نے استعفا دے دیا ہے؟"

"ہاں۔ اور مجھ سے زیادہ وہ تمھارے منتظر ہیں۔" ناز و بولی۔ "تم کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"کس لیے؟" میں نے کہا۔ "تاکہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے؟"

"نہیں سکندر! جب سے انھوں نے نوکری چھوڑی ہے، ان کی حالت بدل گئی ہے۔ وہ عجیب سی ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ بار بار کہتے ہیں کہ میں بزدل تھا۔ میں نے نوکری کے قاعدوں اور ضابطوں کے لیے دوستی کے تقاضوں کو چھوڑ دیا حالانکہ وہ ضابطے کھوکھلے تھے اور سارے قاعدے قوانین ایک ڈھونگ تھے مگر دوستی کے تقاضے حقیقی تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم مجرم نہیں تھے مگر قانون کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے والوں نے تم کو مجرم بنا دیا اور وہ تمھاری مدد نہ کر کے پچھتا رہے ہیں۔ تم ان سے مل لو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ناز و!" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ پر میں اعتبار کیسے کر سکتا ہوں؟"

"تم مجھ پر تو اعتبار کرتے ہو نا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔ "نہیں کرتے ہو تو کہو۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ تم سے زیادہ میرے لیے کون قابلِ اعتبار ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو میں کہہ رہی ہوں کہ بھیا سے ملو۔ وہ تمھارے ساتھ ہوں گے، تمھارے خلاف نہیں۔ گرفتار کرانے کا کیا سوال! وہ تمھیں بچائیں گے اور اسی طرح جیسے میں نے بچایا تھا۔" وہ بولی۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن شدید اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا... دھڑکتا ہوا دل کہتا تھا کہ یہ لڑکی تم کو دھوکا دے سکتی تو اپنی جان نہ دے سکتی۔ عقل کہتی تھی کہ عورت کی فطرت کو سمجھنے کا دعوٰی کرنا حماقت ہے اور جو عورت محبت کی انتہا میں جان دے سکتی ہے، وہ جان کا نذرانہ لے بھی سکتی ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے تو عشق کے جذبے کی تسکین انتقام سے ہوتی ہے۔ میں گاڑی کو مال روڈ پر سیدھا چیرنگ کراس سے بھی آگے تک لے آیا تھا اور اب گورنر ہاؤس بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے محسن کا خیال تھا مگر یہ بھی یقین تھا کہ وہ کم سے کم آدھا گھنٹا میرا انتظار ضرور کرے گا، چنانچہ میں فورٹریس اسٹیڈیم سے پہلے ہی بنک کے قریب سے واپسی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ ناز و سے گفتگو کے دوران میں مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ ناز و سے یوں غیر متوقع اور سرِ راہ ملاقات ایک ایسا جذباتی حادثہ تھا جس نے مجھے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا تھا۔ پھر ناز و کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ اسے ہسٹریا سے بچانے کی جدوجہد میں مجھے اور کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا، جب ایک جیپ نے اچانک سامنے آ کر میرا راستہ روکا۔ کھلی جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا۔ وہ کُود کر میرے سامنے آ گیا۔ باقی دو اطمینان سے اُترے۔

اگر میں ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو شاید کچھ پھرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریوالور نکالتا مگر بریک لگانے اور گاڑی کو سنبھالنے کی کوشش میں مجھے بالکل مہلت نہ ملی۔ وہ نہ جانے کب سے ہمارے پیچھے تھے اور شاید اسی انتظار میں تھے کہ گورنر ہاؤس سے آگے مال روڈ کا نسبتاً غیر آباد علاقہ شروع ہو تو ہمارا راستہ روکیں۔ پہلے اُترنے والے کو میں نے پہچان لیا۔ وہ دلاور کا پی اے تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں، اسٹین گن تھی۔

"ہوشیار ناز و، اب جو کچھ کرنا ہے تمھیں کرنا ہے۔" میں نے کہا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کے باہر نکل آیا۔ بعد میں اُترنے والوں میں سے ایک نے ناز و کو باہر کھینچ لیا۔ وہ میرا نام لے کر یوں چلائی جیسے مدد کے لیے پکار رہی ہو مگر وہ چاہتی تو پلک جھپکتے میں دونوں کو ہڈی پسلی توڑ کے ڈال سکتی تھی۔

"اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔" اسٹین گن والا بولا۔ "تم دونوں اس کی تلاشی لو، ذرا دھیان سے۔"

بعد میں اُترنے والوں میں سے ایک نے جھٹکا دے کر ناز و کو بازو سے کھینچا اور دلاور کے سیکریٹری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ دوسرے نے میری جامہ تلاشی لی اور دونوں ریوالور نکال لیے۔

"ان میں سے ایک میرا ہے۔" میں نے دلاور کے سیکریٹری سے کہا۔ "دوسرا تمھارے باپ... میرا مطلب ہے صاحب کا۔"

"تم کو متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے کارخانے میں تم ہی ایک شریف آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "مگر تم دلاور کے پی اے ہو تو شریف آدمی کیسے ہو سکتے ہو۔ اس کے کسی بھی آدمی کو شریف سمجھنا..." میری بات نامکمل رہ گئی۔ ناز و نے جو مناسب موقعے کی منتظر تھی، ہاتھ جوڑ کے رونا دھونا اور منت سماجت کرنا شروع کیا اور ان سے التجا کرنے لگی کہ مجھے چھوڑ دیا جائے۔

"چھوڑ کیسے دیں بلبل جان؟" دلاور کا پی اے بولا۔ "تمھاری ہی مہربانی سے تو یہ شکار ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اسے بہت پہلے ایک بار تمھارے ساتھ دیکھا تھا۔ آج اگر تم نے اس کا نام نہ لیا ہوتا تو میں کبھی نہ پہچان سکتا۔ یہ میری خوش قسمتی یا اس کی شامتِ اعمال ہے کہ اسی جگہ میں بھی موجود تھا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ایک شخص نے بالآخر وہاں کار روک کر سوال پوچھنے کی ہمت کی ورنہ اس وقفے میں کم سے کم چار دوسری گاڑیاں گزر چکی تھیں اور یا تو ڈرائیوروں نے اپنے انہماک میں سڑک کے کنارے ہونے والی اس غیر معمولی کارروائی پر غور ہی نہیں کیا تھا یا وہ عمداً جان بچا کے نکل گئے تھے۔ اسٹین گن کا نظارہ بڑے بڑے سورماؤں کا دم خشک کر دیتا ہے۔

"تمھارے باپ کی شادی ہو رہی ہے۔" دلاور کا پی اے دہاڑ کر بولا اور اس نے اسٹین گن کا رُخ کار والے کی طرف کیا۔

"دفع ہو جاؤ ورنہ تمھارا چہلم ہو جائے گا۔" کار والا سخت بدحواسی کے عالم میں فرار ہوا لیکن اس کی مداخلت نے نازو کو موقع فراہم کر دیا۔ ابھی تک اسٹین گن کا رُخ میری طرف تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے رُخ بدلا تو نازو بجلی کی طرح حرکت میں آئی۔ اس نے ایک ایڑی پر گھوم کے دوسری لات اٹھائی اور یہ لات پوری رفتار کے ساتھ اسٹین گن والے کے پیٹ سے ذرا اوپر یوں لگی کہ وہ اچھل کر پیچھے گرا اور اس کے ہاتھ سے اسٹین گن نکل گئی۔ ایک مسلسل حرکت میں نازو نے دلاور کے پی اے کو زمین تک پہنچنے سے قبل ہی ہاتھ پکڑ کے گھما دیا اور وہ بلبلا کے اپنی ہی قوت میں سیدھا گیا اور جیپ کے عقبی حصّے سے ٹکرایا۔ اسٹین گن اس سے ذرا دیر پہلے کھلی جیپ میں گری تھی۔ دونوں آوازیں میں نے اس وقت سنیں جب میں اپنی جامہ تلاشی لینے والے کو اوپر اٹھا کے زمین پر مار چکا تھا۔ میری نظر شروع سے نازو پر تھی چنانچہ اس کے حرکت میں آتے ہی میں بھی یوں جھپٹا تھا جیسے نازو کو اور مجھے ایک ہی اسپرنگ کی قوت نے روک رکھا تھا۔ مجھ سے ریوالور لینے والا دونوں ریوالور جیب میں رکھ رہا تھا اور مطمئن تھا کہ وہ خود محفوظ ہے کیونکہ میں اسٹین گن کی زد میں تھا۔ وہ بے خبری میں مارا گیا اور میں نے اسے ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کے پھینکا تو وہ اٹھ نہ سکا۔ اس کا سر بڑے غلط طریقے پر فٹ پاتھ کے اونچے کنارے پر لگا اور غالباً اسی جھٹکے نے اس کی گردن توڑ دی۔ دلاور کا پی اے بھی اتنی دیر میں جیپ کے پچھلے ٹائروں کے قریب لمبا لیٹ چکا تھا۔

"تم جاؤ سکندر!" نازو نے چلّا کے کہا، کیونکہ کچھ فاصلے پر گاڑیاں رُکنے لگی تھیں۔

میں تیسرے شخص سے نمٹنا چاہتا تھا مگر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ نہتّا ہے۔ اگر اس کے پاس بھی کوئی ریوالور یا پستول ہوتا تو وہ اتنی دیر میں مجھے شوٹ کر دیتا یا نازو کو گولی مار دیتا۔ غالباً وہ ڈرائیور تھا اور اس نے ایک اسٹین گن اور ایک ریوالور رکھنے والے دو محافظوں کی موجودگی میں خود کو مسلح رکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو گی مگر ایک منٹ میں اس کے دونوں محافظ اسلحے سے بھی محروم ہو گئے

اور ہوش و حواس سے بھی تو وہ بھاگا۔ پھر بھی اس نے دیر ر دی[illegible] پہلے تو کچھ دیر اسے یقین بھی نہ آیا ہو گا کہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہ نظر کا دھوکا نہیں ہے اور ایک نازک سی اور بہت حسین لڑکی نے خالی ہاتھوں سے اسٹین گن لے کر آنے والے جوان اور صحت مند آدمی کا پٹڑا کر دیا ہے۔ نازو کی ایکٹنگ کام آ گئی تھی اور اسے کمزور سمجھ کر نظر انداز کرنے کا انجام سب کے سامنے تھا۔ تیسرے شخص کو نازو نے ٹانگ پکڑ کر جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ہی کھینچ لیا تھا۔

"خدا کے لیے تم جاؤ۔" نازو نے پھر چلّا کے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی خطرے میں گھرنے لگا ہوں۔ نازو کے لیے تیسرے آدمی سے نمٹنا مشکل نہیں تھا لیکن اس وقت پولیس آ جاتی یا فرار کا راستہ مسدود ہو جاتا تو زیادہ پریشانی میرے لیے پیدا ہوتی۔ میں جلدی سے اس شخص کی طرف لپکا جو فٹ پاتھ کے پاس پڑا تھا۔ اس کی جیب سے دونوں ریوالور نکالتے وقت مجھے احساس ہوا کہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کا ریوالور بھی نکال لیا اور جیپ کی طرف بھاگا۔ اچانک تیسرا شخص درد سے چلّایا اور میں نے دیکھا کہ نازو نے پے در پے وار کر کے اس کے ہاتھوں پیروں کو ناقابلِ استعمال بنا دیا ہے۔ غالباً اس کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا اور بڑے مضحکہ خیز طریقے سے کندھے پر لٹک رہا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے گھٹنا پکڑے چیخ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نازو نے جوتی کی نوک پر رکھتے ہوئے چپنی کی ہڈی کا بھی ملبہ کر دیا ہے۔

"میں ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔" نازو میرے قریب آ کر بولی۔ "تمھارا نام بھی نہیں آئے گا لیکن مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

"میں جیپ لے جا رہا ہوں۔" میں نے سر ہلا کے نازو کو خدا حافظ کہا اور آخری وقت میں آنے والے ایک خیال کے تحت دلاور کے پی اے کو سڑک پر سے اٹھا کے جیپ میں ڈال دیا۔ چابیاں انجن میں ہی لگی ہوئی تھیں چنانچہ میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی جیپ کو اسٹارٹ کر دیا۔ دور دور کھڑی ہو جانے والی بہت سی گاڑیوں سے اُترنے والے اب اکٹھے ہو کر دوڑتے ہوئے آ رہے تھے، چنانچہ واپسی اختیار کرنے کے بجائے میں نے جیپ کو سیدھا آگے بڑھا دیا۔ کچھ لوگ مجھے بھی مشتبہ سمجھ کے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ میں بھی ایک لڑکی پر حملہ کرنے والوں کا ساتھی ہوں اور اب فرار ہو رہا ہوں۔ ان میں سے کچھ "پکڑو۔ پکڑو" چلّانے لگے۔ ایک نے چلتی جیپ میں چڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں سیدھے ہاتھ کے وار سے وہ سڑک پر گرا۔ وہ بیوقوفی کی حد تک

آدمی تھا یا ایک خوبصورت لڑکی کے سامنے ہیرو بن کے اپنی قسمت کو جگانا چاہتا تھا۔ بہر صورت مجھے اس کو گرا کے افسوس ہوا۔ جیپ کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی چنانچہ اسے سڑک پر گرنے سے چوٹ آئی ہو گی۔ وہ پیچھے آنے والی کسی بھی گاڑی کے نیچے آ سکتا تھا یا خود اسی جیپ کے پہیوں کے نیچے آ سکتا تھا جسے میں چلا رہا تھا۔ آگے سڑک صاف تھی چنانچہ میں نے جیپ کو جیٹ طیارے کی رفتار سے دوڑایا اور پانچ منٹ میں فورٹریس اسٹیڈیم سے آگے نکل کے بائیں جانب مڑ گیا۔ پھر انفنٹری روڈ آ گیا اور میں اسی پرانے راستے سے گزرا جس پر سے ہزار بار گزر چکا تھا۔ دھرم پورے کی نہر کا پل پار کر کے میں گڑھی شاہو کی طرف گیا تو بے اختیار میری نظر بائیں طرف گئی، جدھر بانسوں والی سڑک پر انکل رضوی کا گھر تھا اور میں نے سوچا کہ اب تک استاد ٹیڈی نے رابعہ کو انکل رضوی کے گھر پہنچا دیا ہو گا۔

بغل میں کپڑوں کا بنڈل دبائے محسن جی پی او کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ٹہل رہا تھا کہ میں نے جیپ اس کے سامنے جا روکی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹا اور کچھ دیر مجھے احمقوں کی طرح دیکھتا رہا یوں جیسے اسے شک ہو کہ میرا حلیہ بدل کے کوئی اور اس کے سامنے آ گیا ہے۔

"یہ تیرا آدھا گھنٹا ہوا ہے؟ اُلّو کے پٹھے۔" وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

"پہلے بیٹھ جا آرام سے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "دیکھ تیرے لیے کیا شاہی رتھ لے کر آیا ہوں۔ تو پیدل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا۔ ہم نے سوچا 'یار' کے لیے اتنا تو کریں۔"

"اس وقت ہمارے پروگرام میں کسی سے جیپ چھیننا نہیں تھا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، پروگرام تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرے ماموں سسر ہیں نا بڑے پیسے والے اور بہت فراخدل ہیں۔ انھوں نے جیپ بھجوا دی تو میں کیسے انکار کرتا۔ بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ تو نے سنا ہو گا ان کا نام 'چوہدری دلاور' کہلاتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو میکلوڈ روڈ کی طرف موڑ لیا۔

"یہ دلاور کی جیپ ہے؟" محسن بولا۔ پھر اس کی نظر پیچھے گئی اور وہ بھونچکا رہ گیا۔

"اب تو کوئی شک کی بات نہیں رہی نا، یہ دلاور کا پی اے ہے۔" میں نے مسرت سے کہا مگر محسن کچھ نہیں بولا۔ وہ دلاور کے پی اے کو پہچانتا تھا۔ جیپ میں اسے پڑا دیکھ کر بھی وہ اتنا ہی حیران تھا جتنا اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی اسٹین گن کو دیکھ کر۔

"تو نے آدھے گھنٹے میں جھک مار کے کیا خریدا…. دو لنگیاں، دو کرتے، دو جوتے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم اتنی دیر میں کیا غضب کے تحفے اٹھا لائے۔ ایک اسٹین گن، ایک ریوالور، ایک

جیپ اور ایک پی اے۔ سب بالکل اصلی اور بے حد کار آمد۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک گل بدن، گل پیرہن، غنچہ دہن، شیریں سخن سے بھی ملاقات کی۔ کچھ دور کار پر اس کے ساتھ مال روڈ پر سیر کی، پھر….."

"سیدھی طرح بتا تُو کہاں گیا تھا؟ یہ سب کیا ہے؟" محسن نے جھنّا کے کہا۔ میں نے اسے آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آنے کے اسباب و واقعات اور نتائج سے آگاہ کیا اور کم سے کم الفاظ میں اسے نازو سے ملنے اور اس کو چھوڑ کر آنے تک کی ساری کہانی کہہ دی۔

"اس نے پھر تجھے بچا لیا اور خود مصیبت میں پڑ گئی۔" محسن نے افسوس سے کہا۔

"وہ مصیبت میں نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "مصیبت میں وہ شخص گرفتار ہو گا جس کو نازو نے چکنا چور کر دیا ہے۔"

"معاملہ تھانے کچہری تک جائے گا کیونکہ ایک آدمی مر گیا ہے۔" محسن متفکر ہو کے بولا۔

"مگر یہ قتل نہیں کہلائے گا۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی پر دو غنڈوں نے کار روک کر حملہ کیا تھا۔ لڑکی کراٹے جانتی تھی۔ اس نے خود کو بچایا تو کوئی غلطی نہیں کی۔"

"وہاں لوگ بھی تو جمع ہوتے ہوں گے۔" محسن بولا۔ "جنھوں نے تجھے دیکھا ہو گا اور اس جیپ کو۔"

"ہاں، ممکن ہے نمبر بھی نوٹ کیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اس سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ معلوم ہو ہی جائے گا کہ جیپ کس کی تھی۔ سب نے یہی سمجھا ہو گا کہ جیپ میں تین افراد تھے جو غالباً لڑکی کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا، ایک پکڑا گیا اور تیسرا جیپ لے کر بھاگ گیا۔ بھاگنے والے کو صرف ایک شخص نے قریب سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اس کا حلیہ بھی وہی بیان کرے گا۔ ظاہر ہے یہ حلیہ نہ مفرور ملزم سکندر بخت کا ہو گا نہ اس کے ساتھی محسن خان بٹبروانی کا۔ نازو صرف دلیر اور حوصلہ مند ہی نہیں ذہین بھی ہے۔ وہ پولیس کو کنفیوز کرے گی اور مجھے محفوظ رکھنے کے لیے بالکل مختلف حلیہ بتلائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ تشہیر اور خواہ مخواہ کے اسکینڈل سے بچنے کے لیے سب کو چکر دے کر نکل جائے۔ مددگار اور ہمدرد سر کھجاتے رہ جائیں کہ وہ لڑکی تھی یا چھلاوا۔ اب وہ پولیس کو کیا بتائیں کہ کیا ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا اور کس کے ساتھ ہوا تھا۔"

"اس کی گاڑی کا نمبر تو کسی نے دیکھا ہی ہو گا،" محسن بولا۔

"جب میں نے نہیں دیکھا تو اور کسی نے کیا دیکھا ہو گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "نازو اپنی جان بچا کے فرار ہو گی تو ایسے نہیں ہو گی کہ پھر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھنس جائے۔ اگر ایک بار وہ جائے واردات سے غائب ہوگئی تو پھر وہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ کوئی لاکھ کہے وہ صاف مکر جائے گی۔ نہ وہ کہیں گئی تھی، نہ کسی سے ملی تھی اور نہ اس پر جیپ میں سوار تین غنڈوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ کوئی اور ہوگی چشم دید گواہوں کو چشمے لگا کے دیکھنا چاہیے تھا۔ اسے سچا ثابت کرنے والے بہت۔"

"چل وہ تو ٹھیک ہے مگر اب اس سب کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "تو جو اتنا مالِ غنیمت سمیٹ لایا ہے یہ کہاں لے جائیں؟ اتنا اسلحہ جس میں ایک اسٹین گن بھی ہے اور اس لاش کو لے کر ہم زمیندار ہوٹل میں نہیں جاسکتے۔ یہ جیپ بھی خطرناک ہے۔ اسے بہت دُور چھوڑنا چاہیے۔"

"باغ جناح چلتے ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ لباس بھی بدل لیں گے۔ اپنا اسلحہ پرانے کپڑوں میں لپیٹ لیں گے۔ اور جیپ وہیں چھوڑ آئیں گے۔"

"اس آدمی کا کیا ہوگا؟ اگر اسے ہوش آگیا تو ــــ"

"ہوش آگیا تو پھر بے ہوش کردیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت کام کا آدمی ہے۔ دلاور کا پی اے۔ وہ سب جانتا ہوگا جو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو تفتیش کے لیے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ چوہدری دلاور کے لیے اس سے بڑی پریشانی کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری اسٹین گن اور دو محافظوں کی موجودگی میں اغوا کر لیا جائے۔ اور وہ بھی اسی کی جیپ میں۔"

"اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ذمے دار ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی اب محفوظ نہیں رہی سکندر۔" محسن بولا۔

"یہ واقعی پریشانی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ معذور ہوکے گرفتار ہونے والے کو پولیس سے چھڑا کے لے جائیں گے اور قتل کرنے سے پہلے اس سے سب پوچھ لیں گے کہ لڑکی کون تھی۔ کیسی تھی، کس کے ساتھ تھی، دونوں کا حلیہ کیا تھا۔ وہ کہاں سے آئی تھی اور کدھر جارہی تھی۔ گاڑی کا نمبر یاد رہا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں مگر اس معذور شخص نے یہ بتا دیا کہ گاڑی کون سی تھی، رنگ اور ماڈل وغیرہ کی تفصیل دے دی تب بھی چوہدری دلاور کے لیے نازو کو تلاش کرنا دشوار نہیں ہوگا۔ اس شہر میں اسی رنگ کی کتنی فیئٹ ۔۔ ۶ ہوں گی؟ اور اُن کو چلانے والی لڑکیاں کتنی ہوں گی؟ پھر ان میں سے کتنی جوڈو کراٹے کی ایسی ماہر ہوں گی؟ ــ شاید نازو کے سوا کوئی نہیں ــ"

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے بچانے کے لیے وہ مصیبت میں پڑ گئی۔"

"نہیں محسن۔ اب خواہ مجھے خود کو دلاور کے حوالے کرنا پڑے، نازو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو شملہ پہاڑی سے ذرا آگے دائیں طرف موڑ کے کھڑا کر لیا۔ پہلے

میں اپنے نئے کپڑے لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ پینٹ قمیص کی جگہ لنگی اور کرتا اور بوٹ کی جگہ پشاوری چپل پہن کر میں نے آئینہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ جیپ کے باہر لگے آئینے میں ایک دیہاتی نظر آرہا تھا جس کے گھنگھریالے بال مہندی رنگ کے تھے۔ اسی رنگ کی داڑھی کے ساتھ وہ کھدر کے ڈھیلے کرتے اور نیلی دھاریوں کے چیک ڈیزائن کی لنگی باندھے پچاس سال کا بوڑھا آدمی نظر آتا تھا۔ ناک نقشے میں تبدیلی کا تاثر اس لباس میں مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ موسیٰ بھائی نے یہ رنگ رُوپ بدلتے وقت جو ہدایات دی تھیں وہ کتنی اہم تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا تھا۔ قمیص پتلون میں صرف بال بدلا تھا۔ لباس کے بدلتے ہی میری پوری شخصیت میں انقلاب آگیا۔ اور خود محسن نے ہنستے ہنستے اعتراف کیا کہ مجھے راوی بھی نہیں پہچان سکتی۔ کچھ دیر میں وہ بھی میری دُوسری کاپی بن کے آگیا تو ایک دُوسرے کے مقابل کھڑے ہوکر ہم نے موسیٰ بھائی کے کمال فن کا اعتراف کیا۔ ایک سے لباس میں ہم دونوں کے درمیان فرق محسوس کرنا آسان نہیں تھا اور ہم میں سے کوئی بھی ایک دُوسرے کی جگہ لے سکتا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر میں اپنے نقلی سونے کے دانت دکھا کے فرق کو واضح کر سکتا تھا۔ پرانے کپڑوں کو ہم نے جیپ میں ڈال لیا اور وہاں سے چل پڑے کیونکہ اِکا دُکا راہگیر ہمیں بڑی دل چسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی قریب آجاتا تو اسے جیپ میں لاش کی طرح پڑا ہوا ایک آدمی بھی نظر آجاتا۔ اور ہمارا آتشیں اسلحے کا ذخیرہ بھی۔ میں نے جیپ کو ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑایا اور محسن نے جیپ کی تلاشی لی مگر اس میں کاغذات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شاید اسے لانے والے محتاط تھے کہ جیپ پکڑی جائے تو وہ نہ پکڑے جائیں۔" محسن بولا۔

"تیرا خیال بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔ "جب دلاور کے پی اے نے مجھے دیکھا تھا تو وہ کسی مشن پر نہیں تھا۔ میرا ملنا محض اتفاقی تھا ورنہ وہ اپنے کسی کام سے نکلے تھے چنانچہ یہ فرض کرنا غلط ہے کہ گاڑی انھوں نے کسی اور سے لی ہوگی۔"

"کیا وہ اسی طرح اسٹین گن لے کر شہر میں گھومتے تھے؟" محسن نے کہا۔

"جیسے اِن کے دھندے ہیں ویسے ہی حفاظتی انتظامات بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "خطرناک کام کرتے ہیں تو خطرے سے نمٹنے کے اسباب بھی رکھتے ہیں۔ اب یہ بہت ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اس جیپ سے نجات حاصل کر لیں۔ چوہدری کے کتے شہر بھر میں پھیل گئے ہوں گے اور جیپ کو ڈھونڈ

پھر رہے ہوں گے۔"

محسن نے اپنی سیٹ کو ہٹا کے دیکھا۔ اس کے نیچے پلاسٹک پیپر میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ محسن نے پلاسٹک ہٹایا تو اندر سے کاغذ کا ایک لفافہ نکلا۔ ایک ایک کر کے محسن نے اس میں سے نوٹوں کی چار گڈیاں نکالیں۔

"چالیس ہزار روپے!" محسن نے حیرت اور مسرت سے سیٹی بجائی۔ "تیرے ماموں سسر واقعی تجھ پر بہت مہربان ہیں اور تیری ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔"

"اللہ بڑا کارساز ہے محسن خان۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ہم زمیندار ہوٹل میں جائیں۔ اتنا اسلحہ اور ایک بے ہوش آدمی ساتھ لے کر ہم وہاں جاتے بھی کیسے۔ اب کوئی ٹھکانا تلاش کرنا ہوگا جہاں ہم بھی رہ سکیں اور یہ سب بھی ہمارے ساتھ رہے۔" اچانک مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر "کرائے کے لیے خالی ہے۔" کا نوٹس نظر آیا جو لکڑی کے پرانے دروازے پر کسی نے چاک سے لکھا تھا۔ دروازہ ایک پرانی اینٹوں سے بنی ہوئی بیرک جیسی عمارت کا تھا جو تقریباً ساٹھ فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی تھی۔ اس کے اوپر ورکشاپوں جیسی ڈھلوان چھت تھی۔ اور چوڑائی کے رُخ جو سڑک کی طرف تھا بیک وقت دو نام لکھے ہوئے تھے۔ ایک عبارت کسی پینٹر نے انگریزی کے نیلے حروف سے لکھی تھی۔ اور یہ بتاتی تھی کہ اس جگہ کوئی آرا مشین رہی ہوگی۔ بیشتر حروف مٹ رہے تھے یا مٹ چکے تھے۔ دوسری عبارت بد صورتی کا شاہکار تھی اور غالباً کسی پرائمری فیل نے بقلم خود لکھی تھی۔ "یہاں ہر قسم کا فرنیچر بنایا جاتا ہے۔" یہ تحریر سیاہ تارکول کی تھی چنانچہ پڑھی جاتی تھی۔

"کیا خیال ہے محسن؟" میں نے جیپ روک کر کہا۔ "یہ کچھ تائیدِ غیبی نہیں ہے؟"

"یہ جگہ ہر لحاظ سے ہماری ضروریات کے سارے تقاضے پورے کرتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ ہم بات کس سے کریں۔ خیر، میں پیچھے اُتر کے دیکھتا ہوں۔"

وہ علاقہ ملتان روڈ کا تھا لیکن زیادہ آباد نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے اسی قسم کی بہت سی تعمیرات نظر آئیں جن میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کا سلسلہ تھا مگر لکھنے والوں نے ان پر فیکٹری اور مِل کے نام بھی لکھ مارے تھے۔ رہائشی مکان ان سے الگ نہیں تھے چنانچہ وہ رونق یہاں نظر نہیں آتی تھی جو صرف رہائشی آبادیوں میں ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ ویران لگتا تھا۔ میں نے محسن کے جانے کے بعد اپنی سیٹ ہٹا کے دیکھی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے نیچے اسٹین گن کے راؤنڈ رکھے ہوئے ہیں

میں نے سیٹ کو پھر برابر کر دیا۔ زیادہ باعثِ تشویش وہ شخص تھا جو پیچھے بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اسٹین گن نکالی اور احتیاط کے ساتھ آگے والی دونوں نشستوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے اوپر میں نے وہ کپڑا پھیلا دیا جو گاڑی کو صاف کرنے کے لیے رکھا گیا تھا پھر میں نے دلاور کے سیکرٹری کو ہلا جُلا کے سیدھا کیا۔ اور اس کا سرسری میڈیکل چیک اپ کرنے کے لیے نبض کی رفتار دیکھی جو قدرے سُست تھی لیکن دل کے دھڑکنے کا عمل نارمل تھا۔

"خیر ہے ناپُتر؟" کسی نے بہت قریب سے کہا۔ "کی ہو گیا ہے ایہنوں؟"

میں نے چونک کر خمیدہ کمر بڈھے کو دیکھا۔ "کچھ نہیں چاچا۔ بیمار اے، اسپتال لے جا رہے آں۔"

"اچھا اچھا رب خیر کرے گا۔" بوڑھے نے جاتے جاتے کہا۔ اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کوئی شکی مزاج پولیس مین نہیں تھا۔ ورنہ میرے لیے اس کو مطمئن کرنا مشکل ہو جاتا۔ آدھے گھنٹے تک میں یوں بیٹھا رہا جیسے واقعی کسی بیمار شخص کا تیمار دار ہوں۔ انتظار مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا اور محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ میں نے چار افراد کو اسی طرح مطمئن کیا۔ ان میں سے ایک زیادہ متجسس تھا اور اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ بیمار کو کیا بیماری ہے، میں اسے لے کر سڑک پر کیوں کھڑا ہوں؟ کس ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں، جیپ کا ڈرائیور ایسی حالت میں گاڑی چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے اور کیوں چلا گیا ہے، مریض بے ہوش ہے کہ سو رہا ہے؟ میں نے اس کو بھی اطمینان بخش جوابات دے کر چلتا کیا۔ دھوپ اب تیز ہو گئی تھی اور مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں بیمار کو ہوش نہ آجائے۔

بالآخر محسن ایک پستہ قد اور موٹے آدمی کو ساتھ لیے نمودار ہوا۔ اس نے قفل کھولا اور وہ دونوں اندر غائب ہو گئے۔ محسن نے عمداً میری طرف نہیں دیکھا تھا تاکہ میرے اور اس کے درمیان کسی قسم کا تعلق ثابت نہ ہو۔ اور وہ جیپ پر غور نہ کر پائے۔ پستہ قد اور موٹا شخص یقیناً لینڈ لارڈ تھا اور محسن کی جستجو کامیاب رہی تھی۔ میں نے دعا مانگی کہ ان کے مذاکرات بھی کامیاب رہیں۔ دعا فوراً قبول ہوئی اور وہ دونوں باہر نکلے تو موٹا آدمی بہت خوش تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے قفل کی چابی محسن کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ جدھر سے آئے تھے واپس ادھر ہی چلے گئے۔ انتظار کے اگلے دس منٹ زیادہ صبر آزما ثابت ہوئے پھر محسن کی صورت دکھائی دی۔

"ہو گیا مسئلہ حل۔" محسن نے پُرمسرت لہجے میں اطلاع

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دی ـ" تیرے ماموں سُسر کا پیسہ کام آگیا ورنہ معاملہ لمبا ہوجاتا۔"

"کتنے میں بات ہوئی؟" میں نے کہا۔

"ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ پر۔" محسن بولا۔ "بچارا سخت ضرورت مند تھا۔ پہلے کسی کو آرا مشین لگانے کی اجازت دی تھی۔ اُس نے دُنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے دن کے وقت آرا مشین چلائی، رات کو اس جگہ جعلی نوٹ چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جب چھاپا پڑا تو اس کے ساتھ مالک مکان بھی گرفت میں آیا اور بڑی مشکل سے بچا۔ اس کے بعد کسی نے فرنیچر بنانا شروع کیا تھا۔ اُس کا دھندا نہیں چلا اور وہ چھ ماہ کا کرایہ واجب الادا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں نے سال بھر کا کرایہ پیشگی دیا تو ساری جرح بھول گیا ورنہ بہت پُوچھ رہا تھا کہ کیا کام کروگے؟ اور کوئی ضامن ہے یا نہیں۔ اب کہہ رہا تھا کہ کرایہ نامہ وغیرہ ہوتا رہے گا۔ دراصل مقروض ہے بچارا۔ یکمشت ملنے والے اٹھارہ ہزار کیسے چھوڑتا ہے"

"یہ بہت اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "اب میں یہ سارا سامان تیری تحویل میں یہاں چھوڑتا ہوں اور خود یہ جیپ لے کر جاتا ہوں۔"

"میں یہاں اکیلا کب تک انتظار کروں گا تیرا؟" محسن بولا۔ "میں بھی چلتا ہوں۔"

"نہیں۔ ویسے تیرا دل چاہے تو تالا لگاکے اپنے لینڈ لارڈ کے پاس چلے جانا اور گپ لگاکے پھر آجانا۔" میں نے کہا۔ "میں دو گھنٹے بعد واپس آؤں گا۔ خواجہ نیک محمد کو اور اپنے تمام سامان کو ساتھ لے کر۔ صبح میں غالب کے متعلق بھی معلوم نہیں کرسکا تھا، اس کا پتا چلے تو اسے بھی بتاؤں کہ اب ہم کہاں ہیں۔ پھر نازو کی خیریت دریافت کرنی ہے۔ دونوں گئے تو اس قیدی کی حفاظت کون کرے گا۔ میں اس بات کا انتظام کرجاؤں گا کہ یہ ہوش میں آجائے تو بھی آواز نہ نکال سکے اور ہل جل نہ سکے مگر پھر بھی تیری نگرانی اشد ضروری ہے۔"

میں نے جیپ کو دروازے سے ملایا اور محسن نے قفل کھولا۔ جیپ میں چار ریوالور تھے۔ تین سائلینسر والے اور ایک سائلینسر کے بغیر۔ اسٹین گن اور اس کے راؤنڈز اندر منتقل کرتے ہوئے میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں کسی گوریلا تنظیم کے ہیڈکوارٹر میں ہوں۔ یہ جگہ ظاہری طور پر اتنی ویران اور غیر نمایاں تھی کہ ہم کسی مکان کے مقابلے میں خود کو یہاں زیادہ محفوظ سمجھ سکتے تھے۔ آخر میں ہم نے دلاور کے پی اے کو منتقل کیا اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اسے باندھ کر ڈالنے کے لیے ہم نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے پھاڑے۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر میں نے محسن سے ایک ہزار روپے لیے اور جیپ میں روانہ ہوگیا۔ ایک میل آگے جاکے میں نے جیپ کو ایک ویران احاطے میں روکا۔ اس کے پچھلے حصے میں پٹرول سے بھرا ہوا جیری کین تھا جو پٹرول کا اضافی ذخیرہ رکھنے کے کام آتا تھا۔ دو گیلن پٹرول جیپ میں بہا کر میں نے سگریٹ لائیٹر سے ایک کاغذ جلایا اور درمیان میں رکھ دیا۔ پٹرول کی آگ بھڑکی تو میں دوسری طرف سے دیوار پھاند گیا۔ جب پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا سُنائی دیا تو میں اس جگہ سے سو گز دُور تھا۔ میں پیدل چلتا گیا۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد مجھے خالی تانگہ نظر آیا۔ تانگے والے نے آدھے گھنٹے میں مجھے مزنگ چوک پہنچایا۔ وہاں سے رکشا میں زمیندار ہوٹل تک پہنچنے میں ہیکر مزید بیس منٹ صرف ہوئے۔ مجھے غالب کا خیال بھی تھا اور نازو کا بھی لیکن پہلے میں خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی سے مل کر رابعہ کے متعلق معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ خیریت کے ساتھ انکل رضوی کے گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں۔ ٹیڈی نے میری ہدایات کے مُطابق دو کمرے امیر خاں کبیر خاں کے نام سے لیے تھے اور میرے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے ساتھ تمام اسباب سمیٹ لایا تھا جو اس سے پہلے دو ہوٹلوں میں پڑا تھا۔ اس میں ٹیڈی کا وہ پُراسرار ٹین کا صندوق بھی تھا جس کے راز سے ہم ابھی تک واقف نہ ہوسکے تھے۔ جب میں ہوٹل مینیجر سے پوچھ کر اُدھر گیا اور دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ٹیڈی کو وہی صندوق کھولے دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے صندوق کو ایک دم بند کردیا اور اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی لیکن میری نظروں سے اس کی صورت کا تغیّر پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے وہ میرے صندوق کا تالا توڑ رہا تھا کہ میں نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا۔

"کیا ہوا استاد!" میں نے کہا۔ "رنگ کیوں اُڑ گیا ہے تمھارا؟ کیا ہے آخر اس صندوق میں؟"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ "تم بھی کمال باتیں کرتے ہو۔ صندوق میں کیا ہوگا بھلا سوائے پھٹے پُرانے دو جوڑوں کے۔"

"ہمیں بھی جھکڑے دیتے ہو دوست۔ یہ صندوق میں نے بھی اٹھایا تھا۔ اتنا وزن تو دو سو جوڑوں کا بھی نہیں ہوسکتا اور اگر واقعی پھٹے پرانے دو جوڑے ہیں تو پریشانی کی کون سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"پریشان کون اُلّو کا پٹھا ہے۔" ٹیڈی نے بیزاری سے کہا۔ "اور اگر پریشانی ہے تو اس کی وجہ تم ہو کہ مجھے یہاں بھیج دیا اور بھول گئے۔ اب کہاں جاؤں اور کس سے معلوم کروں تمھارا پتا؟"

"چلو ناراضگی چھوڑو۔ میں تم کو ساتھ لے جانے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہوٹل ہوٹل کب تک بھٹکتے رہیں گے۔ اس بار ایسا محفوظ انتظام کیا ہے کہ کوئی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ صبح سے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ ملی؟ اُسے انکل رضوی کے گھر پہنچا دیا؟"

استاد ٹیڈی کا چہرہ بے جان ہوگیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش میں لب ہلائے مگر آواز اس کے حلق سے نہ نکلی۔ وہ نظر چُرا کے دُوسری سمت دیکھنے لگا اور نروس نظر آنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور اپنا سوال دُہرایا۔ ٹیڈی کی خوفزدہ آنکھیں ٹھہر گئیں جیسے اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"اُس نے میری بات [illegible]" ٹیڈی نے مُردہ آواز میں کہا۔

"کیا بات نہیں مانی؟" میں نے حیران [illegible]

"وہی ایس پی صاحب کے گھر چلنے کی۔" ٹیڈی بولا۔ "[illegible] تو بتا دیا تھا کہ سکندر نے مجھے کس لیے بھیجا ہے۔ وہ دوسری باتیں پُوچھنے لگی کہ رات کیا ہُوا تھا اور سب لوگ اس وقت کہاں ہیں۔ میں نے بتا دیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی۔ تم یہ سامان وغیرہ سمیٹو اور جاؤ۔ میں پہلے غالب کا پتا کروں گی اور پھر وہیں پہنچ جاؤں گی۔ غالب کو وکیل کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور محسن یا سکندر میں سے کسی کے لیے کچھ کرنا مشکل بھی ہوگا اور خطرناک بھی۔ میں نے کہا کہ مجھے تو سکندر نے تاکید کی تھی کہ آپ کو بحفاظت رضوی صاحب کے گھر پہنچاؤں۔ تو سکندر بادشاہ معاف کرنا جو اُس نے کہا، وہی میں دُہرا دیتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ ایسی کی تیسی تمھارے سکندر بادشاہ کی اور تم ان کی تاکید بھی واپس اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ان سے کہنا میری فکر نہ کریں، اپنی فکر کریں۔"

"اچھا۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد تم اپنا بوریا بستر سمیٹ کر یہاں آگئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تمھارے ساتھ یہاں سے بھی نکلنا تھا مگر رابعہ کے بخیر و عافیت لوٹ کر آنے تک میں انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔"

"ابھی تو یہاں آکے بیٹھے بھی نہیں تھے۔" ٹیڈی نے فریادی لہجے میں کہا۔ "اب کہاں جانا ہے؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ محسن کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ سخت حیرت زدہ سُنتا رہا۔

"میں تو محسن سے کہہ آیا تھا کہ میں دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اب وہ بھی سوکھتا رہے گا۔"

"معلوم نہیں یہ اچھا ہُوا کہ بُرا۔" ٹیڈی نے سر کھجا کر کہا۔ "بے شک یہ لڑکی بھی توپ سے کم نہیں۔ قسم مولا علی کی، ہم نے تو تمھاری زبان سے اس کی باتیں اتنی سُنی ہیں کہ وہ شاہِ جنّات کی بیٹی لگتی ہے۔ اب تو ہمیں بھی شرم آتی ہے عورت کی ذات کو کمزور اور بُزدل کہتے ہوئے۔ اور اس کی ہمّت کو دیکھ کے وہ سب بھی ہمیں بس اپنی ہی طرح شہدے لگتے ہیں جو خود کو بدمعاش کہتے ہیں... یا کہلواتے ہیں۔"

"سچی بات نکلی ہے تمھارے مُنہ سے اُستاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اصل طاقت اپنے سے کمزور پر ہاتھ اُٹھانے کا نام نہیں۔ طاقت تو اپنے دفاع اور اپنے سے کمزوروں کی حفاظت کی صلاحیت کا نام ہے۔"

"مجھے اس لڑکی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا مگر اس کا بھائی بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔" ٹیڈی نے متفکر ہوکے کہا۔

"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب پہلے والا اکرام شیخ نہیں رہا۔ وہ ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔"

"ارے چھوڑو سکندر بادشاہ۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ چکر دینا چاہتا ہے اپنی بہن کو بھی اور ہمیں بھی۔" اُستاد ٹیڈی نے کہا۔ "ہم اس پہ بھروسا کریں اور پکڑے جائیں۔ یہی اس کا مقصد ہوگا۔"

"نہیں اُستاد! وہ استعفا بھی دے چکا ہے پولیس کی نوکری سے۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو اس نے جھُوٹ بولا ہو اپنی بہن سے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "وہ جانتا ہے کہ بہن سے مدد کی اُمید رکھنا حماقت ہے۔ وہ ایک بار پہلے تم کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے کی کوشش کر چکی ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ گئی ورنہ شیخ صاحب پر اپنی ہی بہن کے قتل کا الزام آجاتا اور میں تو سمجھتا ہوں، وہ ایسا آدمی ہے کہ عدالت میں بھی سر اُٹھا کے کہتا... اور اُسے کوئی شرمندگی نہ ہوتی کہ اس کی بہن اس کے فرض کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔"

"تمھارا یہ تجزیہ غلط نہیں ہے اُستاد مگر جہاں تک مجھے معلوم ہُوا ہے، اس واقعے کا اکرام شیخ کے ذہن پر ایک منفی اثر ہُوا۔" میں نے کہا۔ "آدمی فولاد کا عزم رکھتا ہو، فولادی اعصاب کا مالک نہیں ہوتا۔ نازو اس کی ایک ہی بہن تھی اور بہن بھی ایسی جس پر کوئی بھی فخر کرسکتا ہے۔ فرض شناسی کا دورہ ختم ہوتے ہی جذبات کی یلغار نے ضمیر کے صحیح فیصلے کو بھی باعثِ شرمندگی بنا دیا ہوگا۔ پھر والدین کی ملامت ہوگی اور ندامت جو نازو کو موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار دیکھ کر محسوس کی ہوگی۔ اُس نے کہیں اماں نہ پاکے خود کو فرض کے بارے سبکدوش کرلیا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"دیکھو یار سکندر بادشاہ، ہم اتنی باریکی میں تو جاتے نہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "موٹی عقل کے آدمی ہیں۔ فرض کرو کہ نازو کے بچ جانے کے بعد اس کے خیالات پھر تبدیل ہو گئے۔ کسی شخص کی فطرت ایسے نہیں بدلتی کہ وہ راتوں رات فرشتے سے شیطان بن جائے۔ جیسے ہم ہیں۔ آہستہ آہستہ پُرانی عادتوں کو چھوڑا... یادوں کو چھوڑا اور اب اتنے عرصے بعد سب کچھ چھوڑ کر تمھارے ساتھ ہو گئے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ پُرانی زندگی اب بھی بہت یاد آتی ہے۔"

"اکرام شیخ کی بات کرتے کرتے تم اپنی بات کرنے لگے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے بعد میں اکرام شیخ پر اُلٹا اثر پڑا ہو۔ وہ سمجھنے لگا ہو کہ تمھاری وجہ سے اس کے ہاتھوں اپنی ہی بہن کا خون ہونے والا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "شرمندگی کے بعد اس نے تم کو ساری خرابی کا ذمّے دار سمجھنا شروع کر دیا ہو۔ اس کا یہ خیال بھی ہو گا کہ تمھاری وجہ سے اس کی بہن پاگل ہوئی۔ یہ پاگل پن ہی ہے نا اس کے نقطۂ نظر سے۔ وہ اسے عشق نہیں سمجھتا ہو گا اور اس کے ذہن میں یہی ہو گا کہ نازو کو اس عشق کی بیماری سے نجات دلانے کی ایک ہی صورت ہے کہ بیماری کے سبب کو ختم کر دیا جائے۔"

"تمھارا مطلب ہے اکرام شیخ مجھے ختم کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے خواجہ صاحب!"

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تمھارے ساتھ رہنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہُوا ہے کہ ہم دُنیا کی اُونچ نیچ کو تھوڑا بہت سمجھنے لگے ہیں۔ تم اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرتے ہو اور محسن بھی ساتویں حس سے کام لیتا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہمیں بھی ہماری آٹھویں حس...."

"آٹھویں حس!" مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "اچھا خیر۔ آگے کہو، مگر پہلے کچھ کھانے پینے کو منگوا لو۔"

"بس ہمیں کچھ ایسا لگتا ہے کہ اکرام شیخ، بہن کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔" ٹیڈی نے تعمیلِ حکم کے بعد کہا۔ "اس کی مدد سے وہ تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمھارا ساتھ دینے کی بات کرے اور بہن اس پر اعتبار کرتے ہوئے تم کو پھنسا دے۔ وہ ہمارا حمایتی بن کے آئے اور ہم سے سب کچھ معلوم کرنے کے بعد ہمیں ایسا گھیرے کہ ہمارے لیے نکلنے کی کوئی صُورت نہ رہے۔ یہ پولیس والے ایسے چکّر چلاتے ہیں بعض اوقات۔ نازو کو کیا پتا کہ اس نے سچ مچ استعفا دے دیا ہے یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس نے استعفے کی نقل دیکھ لی ہو گی مگر یہ نازو کیسے معلوم کر سکتی ہے کہ یہ استعفا آگے پہنچایا گیا تھا اور منظور بھی ہُوا تھا یا نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ نازو پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، اس کے بھائی پر نہیں۔"

"تم نے مجھے شش و پنج میں مُبتلا کر دیا ہے دوست۔" میں نے کہا۔ "میں خوش بھی ہوں کہ تم سوچنے لگے ہو اور بالکل صحیح سمت میں سوچنے لگے ہو۔ پھر بھی میرا ذہن یہ قبول نہیں کرتا کہ اکرام شیخ اس حد تک پتھر دل ہو سکتا ہے کہ ایک بار اپنی بہن کو گولی کا نشانہ بنانے کے باوجود بھی وہ شرمندہ نہ ہو اور پھر دوبارہ اُسے دُکھ دے۔"

"شرمندگی کیسی سکندر بادشاہ۔ آدمی غلط کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے اور اکرام شیخ تو سمجھتا ہو گا کہ وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "اس کے خیال کے مطابق غلطی اگر کر رہی ہے تو نازو اور نازو کو وہ ایک ناتجربہ کار اور جذباتی لڑکی سمجھتا ہو گا۔ وہ تم سے کھُلم کھُلا دشمنی کا اظہار کرے تو نازو اس کے مقابلے میں تمھارا ساتھ دے گی اور تمھاری مدد کرتی رہے گی لیکن وہ بہن کو قائل کر لے کہ اب وہ خود بھی سکندر کے ساتھ ہے تو تمھاری مدد کرنے والی نازو اس کی چال میں آ جائے گی اور کسی نہ کسی طرح خود ہی تم کو اس سے ملوا دے گی۔ وہ بہت بے وقوف لڑکی ہے سکندر بادشاہ۔"

"کیوں۔ اس نے ایسی کون سی حماقت کی ہے؟"

"بُرا مت ماننا۔ یہ بے وقوفی نہیں اس کی تو اور کیا ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "کیا اُسے معلوم نہیں کہ تم کبھی اس کی محبّت کا جواب محبّت سے نہیں دے سکتے۔ پھر کیا ضرورت ہے اُسے تم سے ہی پیار کرنے کی۔ آدمی غلطی سے تو دیوار سے ٹکرا جاتا ہے مگر وہ تو جانتے بوجھتے دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے۔ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس سے دیوار کا کچھ نہیں بگڑے گا، دیوار پر کوئی اثر نہیں ہو گا لیکن جو شخص عقل کے بجائے جذبات کا غلام ہو اور اس حد تک کہ اپنا بُرا بھلا بھی نہ سوچ سکتا ہو، وہ میری رائے میں بے وقوف ہے۔"

دلائل کے مطابق ٹیڈی کی بات بالکل دُرست تھی لیکن جو عشق نازو نے کیا تھا، وہ عقل کی دسترس سے بہت بالاتر تھا اور اس میں دل والوں کے لیے سب سے بڑی سند وہی دیوانگی تھی جس نے قیس بن عامری کو مجنوں کہلوایا۔ فرہاد کو تیشۂ سنگ دیا کہ پتھر کے پہاڑوں سے جوئے شیر لائے اور پھر اپنے وجود سے جوئے خون بہا کے اس میں شامل کر دے۔

"اُستاد ٹیڈی! کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی سوچ سمجھ کے عشق کرے؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں۔" ٹیڈی نے گڑبڑا کے کہا۔ "جب ہو گا تو پتا چلے گا۔"

"ہاں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ جب ہو گا تو پتا چلے گا۔ ابھی تم اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہو۔ ایک تم ہی کیا سارا زمانہ کہے گا کہ وہ بے وقوف ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے نازو کو ذرا بھی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اس کے بھائی کا خیال بالکل اُلٹ ہو گا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے میری دلیل کو مسترد کر دیا۔ "وہ سمجھتا ہو گا کہ ساری خرابی سکندر بخت کی وجہ سے ہے۔ سکندر بخت نہیں ہو گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نازو بھی کچھ دن روئے گی، دھوئے گی یا بھائی سے بات نہیں کرے گی۔ کھانا پینا چھوڑ دے گی اور مرنا چاہے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر زخم بھر جاتا ہے۔ لوگ ان سب کو بھول جاتے ہیں جن کے بغیر وہ سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہو گا۔ میں نے ان والدین کو دیکھا ہے جن کے جوان بیٹوں کو موت نے اچانک جُدا کر دیا۔ ان بیویوں کو دیکھا ہے جن کے سہرے کے پھُول مرجھائے بھی نہیں تھے کہ ان کے سہاگ اُجڑ گئے۔ میں نے ان کا غم بھی دیکھا ہے جسے دیکھ کر کلیجہ پھٹتا تھا مگر بعد میں یہ بھی دیکھا ہے کہ جو اُن کی قبروں سے لپٹ کر روئے تھے، وہ سال گزرنے سے پہلے جمعرات کے جمعرات قبر کے سرہانے چراغ جلانا بھی بھُول گئے اور دُنیا کے کاموں میں ایسے اُلجھے کہ انھیں برسی بھی یاد نہ رہی۔"

میں حیرانی سے ٹیڈی کو دیکھتا رہا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن عقلِ سلیم سے بے بہرہ نہیں تھا۔ اور ذہانت تو ایک خُداداد چیز ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس ذہانت کے غلط استعمال میں بہت آگے بڑھ جاتا، قدرت نے اسے ہم سے ملوا دیا اور اس کی زندگی کی منزل بدل گئی۔ اپنی قوتِ مشاہدہ سے اُس نے مجھے پہلے بھی متاثر کیا تھا لیکن اس وقت تو میں قائل ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی ہم سے کم نہیں۔ میرے اور محسن کے پاس ڈگری تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا جس سے آدمی کے لیے انسان ہونے کی شرط پُوری ہوتی ہے۔ عقل و شعور، ذہانت اور شرافت، خلوص اور محبّت اور دردِ دل۔ رشتوں کے احترام کی صلاحیت اور نیکی پر یقین رکھنے کی طاقت۔

دروازے پر اُسی وقت دستک ہوئی تو میں چونکا لیکن وہ ویٹر تھا جو چائے لے کر آیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تہی دست ہوں۔ میں نے اپنے بدلے ہوئے رُوپ پر اتنا بھروسا کیا تھا کہ بے خوف و خطر خالی ہاتھ چلا آیا تھا۔ مجھے ان امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اس ہوٹل تک کوئی بھی شکاری، ٹیڈی کا یا رابعہ کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچ سکتا تھا۔ ظاہری صُورت میں تبدیلی صرف ٹیڈی کی شکل میں ہوئی تھی، رابعہ وہی تھی۔ اور خُدانخواستہ کوئی اُسے پہچان لیتا تو اس کے پیچھے پیچھے ہر جگہ جا سکتا تھا۔ ایک تشویش ناک بات یہ بھی تھی کہ میرے اس بدلے ہُوئے حُلیے کو چوہدری دلاور کے کم سے کم تین آدمی دیکھ چکے تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا تھا۔ دوسرا ہماری تحویل میں تھا لیکن تیسرا پولیس کی تحویل میں چلا گیا تھا اور یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ اُسے دلاور اینڈ کمپنی نے چھُڑا لیا ہو گا تو اب تک وہ ہماری محنت پر پانی پھیر چکا ہو گا اور بتا چکا ہو گا کہ سکندر بخت کا چہرہ اب کیسے پہچانا جائے گا۔ بے شک محسن کا دُہرا چہرہ میری حفاظت کے لیے تھا پھر بھی افشائے راز کے بعد یہ حفاظتی انتظام سو فیصد مؤثر اور قابلِ اطمینان نہیں رہتا تھا۔ اس میں پچاس فیصدی بے یقینی کے خدشات بھی شامل ہو جاتے تھے۔

دوسری بار کسی نے دروازے پر دستک دی تو میں نے چوڑیوں کی جھنکار بھی سُنی اور اس نغمۂ ساز کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہو گئی تو میں نے جان لیا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ ٹیڈی نے دروازہ کھولا اور میں نے مرزا غالب کے ساتھ رابعہ کو اندر آتے دیکھا۔

"لو بھئی، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" غالب نے اپنی فطری شگفتگی اور مسخرے پن کے ساتھ کہا۔ "اور پہچان سکو تو دل کی آنکھ سے پہچانو۔"

رابعہ کے لیے دونوں چہرے اجنبی تھے مگر وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائی۔ پھر اس پر ہنسی کا دَورہ پڑا۔ میرے کھدّر کے کُرتے، چار خانے کی لُنگی اور پشاوری چپّل کے ساتھ مہندی رنگ کے گھنگریالے بالوں کو اور اسی رنگ کی مُشت بھری داڑھی کو دیکھ کر شاید رابعہ کو میرا اصل رُوپ یاد آیا جو اس کے حُلیے کے برعکس تھا۔ کہاں وہ روایت پسندی کی برطانوی عادت کہ میں سُوٹ کے ساتھ وہ ٹائی بھی نہیں باندھتا تھا جو میچ نہ کرتی ہو اور لباس کے معاملے میں اپنے جمالیاتی ذوق کو بہت اہمیت دیتا تھا اور کہاں یہ دیہاتی وضع قطع۔ لباس سب قابلِ احترام ہوتے ہیں مگر یہ لباس میری شخصیت سے متصادم تھا۔

"ایمان سے بالکل وہی لگ رہے ہو۔" رابعہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں۔ کہہ دو کارٹون۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔ ٹیڈی مجھ سے زیادہ شرمسار کھڑا جھینپ رہا تھا۔

"کارٹون تو خیر نہیں۔ جب میں چھوٹی سی تھی نا تو ایک شادی میں گئی تھی۔" رابعہ نے اپنی ہنسی پر قابو پا کے کہا۔ "وہاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک تماشا دیکھا تھا۔ ایسے ہی دو آدمی آگئے تھے اور انھوں نے حاضرین کے سامنے ایک ایکٹ کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا تھا۔ ان میں سے ایک باپ تھا اور دوسرا بیٹا۔ دونوں کے ہاتھ میں جوتے کے تلے کی شکل کے بڑے بڑے چمڑے کے ٹکڑے تھے۔ ان میں سے ایک سوال کرتا تھا اور دوسرا کوئی نہایت ہی نامعقول قسم کا جواب دیتا تھا اور وہ چمڑے کو لیں ایک دوسرے کے رسید کرتے تھے کہ آواز تو بڑی زوردار آتی تھی لیکن چوٹ بالکل نہیں لگتی تھی۔ ان صوتی اثرات کے ساتھ انھوں نے مار مار کے ایک دوسرے کا بُرا حال کر دیا لیکن اس سے زیادہ بُرا حال انھوں نے حاضرین و سامعین کا کیا۔ ایک تو انھوں نے باری باری سب کو رگڑا۔ سب کا تمسخر اُڑایا اور جس نے انھیں کچھ دے دیا اُسے تو بخش دیا مگر کنجوسی کرنے والے کے تو خاندان کی بھی ایسی تیسی کر دی، مذاق مذاق میں کہ کوئی بُرا مان ہی نہ سکے۔ ہنس ہنس کے لوگ الگ بے حال ہوئے اور ان کے ذومعنی جملے اور چٹکلے . . .“

”میں بتاتا ہوں آپ کو خاتون۔ وہ بھانڈ کہلاتے ہیں“ میں نے کہا ”یا میراثی۔ کہو تو تماشا بھی دکھا دیں“

”ابھی نہیں، جب تمھارا وہ جوڑی دار ہو گا تب ہو گا تماشا تو“ وہ بولی ”ایک ایک جوتا دونوں ہاتھ میں رکھنا“

”پروا نہیں اُستاد“ میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا ”بدتمیز لوگوں کو ہنسنے دو۔ ہیرا تو ہمیشہ ہیرا ہی رہتا ہے“

”خواہ وہ کھیرا نظر آئے“ مرزا غالب نے فرمایا ”میرے پیارے کوہِ نُور ہیرو تم دونوں ہیرو نہیں زیرو ہو جاتے اگر گزشتہ شب میں نے تمھاری سب بلائیں اپنے سر نہ لی ہوتیں“

”ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے“ میں نے کہا۔

”مرگِ ناگہانی سے بھی نہ جانے کس کی نیکی نے بچا لیا“ مرزا غالب نے کہا ”ورنہ ایک گولی کافی ہوتی“

”مجھے ایک تو تمھاری طرف سے تشویش تھی“ میں نے کہا۔ ”مزید پریشانی خاتون نے پیدا کر دی تھی“

”رابعہ نے تو بہت جلد میری گلوخلاصی کرا دی“ غالب بولا ”وہاں سب اس فکر میں تھے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس چکر میں ڈال دیں۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا اور انھیں دھمکی بھی دے دی کہ صبح تک اخبار کا مالک اور مدیر زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ حالانکہ ان کو خاک خبر نہیں تھی کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ وہ آدھی رات کے بعد اخبار پریس میں بھیج کر گھر جا چکے تھے۔ انھیں معلوم ہوتا بھی تو شام کو... رابعہ کے آتے ہی پولیس والوں کو پریشانی ہونے لگی حالا... اس سے پہلے ایک انسپکٹر بڑی خباثت دکھا رہا تھا کہ کیا او... ریوالور ڑ قتل نہیں کر سکتے۔ وہ بضد تھا کہ میں چوکیدار کے قتل کا اعتراف تو کر ہی لوں۔ رابعہ نے وہ ڈانٹ ڈپٹ کی... معافی مانگنے پر اُتر آیا۔ میں نے تو کہا کہ تم نے میرے ایڈیٹر بڑا... کی مستعدی دیکھی۔ اور کچھ دیر ہو جاتی تو تم پر حبسِ بے جا... مقدمہ ہو جاتا۔ نوکری چلی جاتی تمھاری“

”چلو ابھی تو خدا نے سب کی عزت و آبرو رکھی“ میں نے کہا ”تم نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ ورنہ سازش کامیاب ہو جاتی مگر یار یہ سب باتیں کرنے کے لیے وقت چاہیے اور میں نے محسن سے کہا تھا کہ دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا“

”کہاں واپس آ جاؤں گا؟“ رابعہ نے حیرانی سے کہا ”ہوٹل سے تو سامان اُٹھا لیا تھا“

”وہ بھی کوئی ہوٹل تھا“ میں نے کہا ”ہم اب دوسرے فائیو اسٹار بلکہ سکس اسٹار ہوٹل میں ہیں۔ خواجہ نیک محمد! میں غالب اور رابعہ باہر نکلتے ہیں، تم سامان اُٹھاؤ اور . . .“

”یہ کیا مصیبت ہے“ ٹیڈی نے خفگی سے کہا ”ابھی دو تین گھنٹے پہلے دو کمرے لیے تھے۔ امیر خان، کبیر خان کے نام سے“

”کوئی بات نہیں“ میں نے اُسے تسلی دی ”کہہ دینا کہ اب وہ نہیں آ سکتے۔ دونوں غریب خان فقیر خان ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی اس میں کوئی بات خلافِ قانون نہیں، کوئی ایک دن کے لیے کمرہ لے اور ایک گھنٹے کے بعد چلا جائے۔ ادائیگی تو چوبیس گھنٹے کی کر ہی دو گے“

میں رابعہ اور غالب ہوٹل کے اس حصے سے گزرے جو استقبالیہ سمجھا جا سکتا تھا۔ تو منیجر اور چند دوسرے لوگوں نے ہم تینوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ دلچسپی کا سب سے بڑا سبب رابعہ کا حسن تھا۔ پھر میری ہیئت کذائی تھی۔ غالب صورت سے احمق لگتا تھا تو رابعہ کی شخصیت میں دلکشی کے ساتھ ایسا وقار تھا جو سب سے جُدا تھا اور دیکھنے والوں کو ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک نظر نہ آتی تھی۔ ٹیڈی کے دوبارہ نمودار ہونے تک ہم کچھ فاصلے پر انتظار کرتے رہے اور اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے انھیں وہ سب واقعات سنا دیے جس سے وہ بے خبر تھے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ ٹیڈی نے نازو کے بھائی ڈبل ایس آئی شیخ کی نیت پر کس قسم کے شبہات کا اظہار کیا ہے۔ غالب نے اس کے خیال کی تائید کی۔

”ان حالات میں اندھے اعتماد سے بہت نقصان ہو سکتا ہے“ غالب بولا۔

”اس کے علاوہ وہ ہمارا ساتھ دینے سے نازو کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی“ رابعہ بولی ”وہ ہم سے الگ رہ کے ہماری زیادہ مدد کر سکتی ہے“

”ابھی تو معلوم کرنا پڑے گا کہ اس نے بعد میں صورتِ حال سے کیسے نمٹا“ غالب نے کہا ”تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے سکس اسٹار ہوٹل کا جغرافیہ پوری طرح سمجھا دو۔ میں ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جاؤں گا“

”اور اس ایک گھنٹے میں تم کیا کچھ کرو گے؟“

”ایک تو اپنے ایڈیٹر کو بتاؤں گا کہ رات کیا کچھ ہُوا تھا“

”کیا مطلب۔ اُسے کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے“ میں نے کہا۔

”یار میں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ تمھارا حوالہ تک نہیں ہو گا“ غالب نے بُرا مان کے کہا ”مانا کہ صورت سے میں چُغد نظر آتا ہوں لیکن اتنا عقل سے پیدل نہیں ہوں۔ اس کو یہی بتاؤں گا کہ مجھے ٹیلی فون پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری دلاور کی کوٹھی میں قتل ہو گیا ہے اور میں تصدیق کے لیے گیا تھا تو پھنس گیا تھا۔ ایڈیٹر کو معلوم تو ہونا چاہیے نا۔ وہ کہے گا کہ تم کو کتنا عرصہ ہو گیا رپورٹنگ کرتے ہوئے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہر گمنام فون پر دوڑ جانا کوئی عقل کی بات نہیں۔ اکثر لڑکے شرارت کرتے ہیں لیکن جانا ہی تھا تو بتا کر جاتے۔ پھر مجھے یہ پتا چلانا ہے کہ چوہدری دلاور کے گھر سے اُٹھائی جانے والی الف دین کی اور اس چوکیدار کی لاشوں کے سلسلے میں پولیس نے کیا رپورٹ لکھی ہے اور آخری بات یہ کہ مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم کرنا ہے جسے تم نازو کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے“

”اگر وہ ٹوٹنے پھوٹنے کے باوجود زندہ بچا ہو گا تو اُسے پولیس لے گئی ہو گی“ میں نے کہا ”تم اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم کرنا کہ اپنے بیان میں اس نے کیا کہا ہے۔ میرے متعلق کچھ بتایا ہے یا نہیں“

”میرا خیال ہے کہ بیان سے پہلے اُسے وہی لوگ لے گئے ہوں گے جنھوں نے اُسے بھیجا تھا“ رابعہ بولی۔

غالب نے تائید میں سر ہلایا ”اور اُس نے وفات پانے سے پہلے تمھارا نقشہ اپنے الفاظ سے کھینچ دیا ہو گا۔ خیر۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا“

”مرزا جی“ میں نے کہا ”تمھارا یار موسے بھائی تو کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟“

غالب ہنسا ”اس میں اتنی ہمت نہیں۔ اپنی جان کا دشمن کوئی نہیں ہوتا“

”تم نے اس سے کچھ قرض وصول کرنے کی بات کی تھی اور اس نے بعد میں کہا تھا کہ حساب برابر ہو گیا“ میں نے کہا۔

”ہاں یار وہ اس کا حساب بھی بہت پُرانا تھا“ غالب نے سوچ کر کہا ”اس نے موقعے سے فائدہ اُٹھا لیا۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو بہت اچھا فوٹوگرافر تھا لیکن اس نے اپنے پیشے سے غلط فائدہ اُٹھایا۔ اس کا چھوٹا سا اسٹوڈیو تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑھ گیا۔ جیسا کہ میں نے سُنا تھا۔ وہ کچھ بلیک میلنگ کرتا تھا“ غالب نے تذبذب کے ساتھ رابعہ کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ کھُل کر بات کرتے ہوئے جھجک رہا ہو۔

”مرزا جی! یہ خاتون بڑی نامور وکیل ہیں۔ بلکہ رہی ہیں“ میں نے کہا ”ہر طرح کے مقدمات میں ان کی شہرت تھی اور ڈاکٹر کے علاوہ صرف وکیل کا پیشہ ایسا ہے جس میں کوئی بھی حقائق کو چھپاتا نہیں“

”وہ کچھ لڑکیوں کا چکر تھا“ غالب نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ ”اُس نے لڑکیوں کو اور اُن کے والدین تک کو بلیک میل کیا۔ پھر کچھ غلط قسم کے لوگوں نے اس کی خدمات حاصل کرنا شروع کر دیں جو خود بلیک میلر تھے۔ ظاہر ہے اُسے بہت پیسہ ملا لیکن اس کے بعد کرنا خدا کا ایسا ہُوا کہ ایک لڑکی نے اُسے چکر میں ڈال دیا۔ ہم نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا کہ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔ اس کو ایسا عشق ہُوا کہ سب بھول گیا۔ بھائی کے ذریعے اس نے نامہ و پیام دیے اور بات خاصی اُمید افزا حد تک آگے بڑھ گئی تھی کہ لڑکی کے بھائی نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ خود اس فوٹوگرافر کے ہاتھوں بلیک میل ہو کے بہت نقصان اُٹھا چکا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ ایسا بدقماش آدمی اسی کی بہن کا رشتہ ڈالے۔ اس نے اگر یہ سمجھا تھا کہ اب بہن بلیک میل ہو گی، تو غلط نہیں سمجھا تھا۔ جب فوٹوگرافر نے موسے بھائی کے ذریعے شادی کا باقاعدہ پیغام دیا تو لڑکی کا بھائی سخت مشتعل ہُوا۔ اس نے موسے بھائی کو بے عزت کر کے نکال دیا اور لڑکی پر سختی کی۔ لڑکی اَڑیل تھی۔ باپ کے اور بھائی کے سامنے اَڑ گئی کہ شادی کہیں اور نہیں کروں گی اور اگر زبردستی کی گئی تو گھر سے بھاگ کر عدالت میں شادی کر لوں گی۔ بھائی سخت پریشان ہُوا کہ اب بہن کو کیسے سمجھائے۔ لیکن صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ مزید تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ موسے بھائی بھی کم نہیں اور اپنے فوٹوگرافر بھائی کی طرح بدنام ہیں۔ اس نے بہن کو بتایا کہ وہ فوٹوگرافر لڑکا خود بھی بدنام ہے اور اس کا بڑا بھائی بھی۔ ایک بلیک میلر ہے اور دوسرا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مجرموں کا معاون۔ بہن نے سن کر یقین کیا یا نہیں کیا، غضب یہ کیا کہ ایک دن اپنے بھائی کو اپنے عاشق کے سامنے کھڑا کر دیا اور بتا دیا کہ تم پر کیا الزامات ہیں۔ پھر معلوم نہیں بات کتنی بڑھی اور کس نے کس سے کیا کہا۔ انجام یہ ہُوا کہ لڑائی ہوئی' لڑکی کے بھائی نے فوٹوگرافر پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ لڑکی وہیں بے ہوش پڑی رہ گئی اور فوٹوگرافر وہاں سے بھاگ گیا۔ موٹے بھائی اُسے رات کے وقت میرے گھر لے کر پہنچا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ اسے رات بھر کے لیے چھپا لو۔ میں نے پُوچھا بھی کہ آخر اس پر الزام کیا ہے مگر موٹے بھائی نے کہا کہ الزام قتل کا ہے لیکن جھوٹا ہے۔ اگر تم اس کے حق میں گواہ بن جاؤ تو یہ بچ جائے گا۔ موٹے بھائی کی حالت دیکھ کر مجھے ترس آ گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا تم جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ پولیس اس کو تلاش کرتی ہوئی تمھارے پیچھے پہنچے۔ آدھی رات کے بعد یہی ہُوا۔ مجھے خُدا نے بچا لیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ اس چکر میں خود میں بھی پھنس جاؤں گا۔ میں موٹے بھائی کے بھائی کے ساتھ نکل گیا۔ اُسے ایک ہوٹل میں چھوڑا اور خود اپنے آفس چلا گیا۔

پولیس نے لڑکی کے بیان پر موٹے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کے بھائی کا پتا پُوچھا۔ پہلے تو موٹے بھائی نے انجان بننے کی کوشش کی اور لاعلمی کا اظہار کیا مگر ہماری پولیس کسی کی زبان پر اعتبار کرنے والی نہیں ہے۔ وہ موٹے بھائی کو تھانے لے گئے اور تھوڑا سا بجایا تو موٹے بھائی نے بک دیا کہ قاتل کہاں چھُپا ہُوا ہے۔ پولیس دو بجے رات کو میرے فلیٹ پر پہنچی تو میں غائب تھا لیکن انھوں نے اجازت کا رسمی تکلف نہیں کیا اور قانونی اجازت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے تالا توڑ دیا۔ وہاں ان کو ناکامی ہوئی تو وہ اخبار کے دفتر پہنچے۔ ایک تو میں پہلے ہی سے وہاں اپنے دفاعی انتظامات مکمل کر چکا تھا۔ پھر پولیس خود ایک غیر قانونی کام کر چکی تھی۔ ان کو بعد میں پتا چلا تھا کہ گھر کسی اخبار والے کا ہے۔ اُلٹا میں نے انھیں پکڑ لیا کہ ابھی خبر لگاتا ہوں اور ایس پی سے بات کرتا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے گلو خلاصی کرا کے بھاگے اور میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا کہ چلو میں تم کو معاف کرتا ہُوں اور تمھاری نوکری تمھیں بخشتا ہُوں۔ تم میرے دوست موٹے بھائی کو بخش دو اور گھر جانے دو۔ میری مدد سے موٹے بھائی صبح تک گھر پہنچ گیا۔ پھر اُس نے میری خدمت میں حاضر ہو کے کہا کہ آئندہ عمر بھر کے لیے وہ میرا غلام۔ کیونکہ میں نے اس کے بھائی کی جان بچا لی۔ اس نے تھوڑی سی مدد اور چاہی۔ اپنے بھائی کے لیے اس نے دو پاسپورٹ بنوا لئے۔ ایک اصل صورت کی تصویر کے ساتھ۔ دُوسرا میک اپ سے بدلی ہُوئی تصویر والا۔ اس کا بھائی بدلی ہوئی صورت لے کر باہر نکل گیا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے کہ میں نے اور موٹے بھائی نے پاسپورٹوں پر ویزا اسٹمپ کس طرح لگوائی۔ باہر جانے کے بعد اس نے میک اپ اُتار دیا اور میک اپ کی تصویر والا پاسپورٹ بھی ضائع کر دیا۔ اب وہ اصلی نام اور پاسپورٹ کے ساتھ باہر آباد ہے ....

میں .... یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے جُرم کی نوعیت بھی مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ میری مدد اور خاموشی کے بغیر موٹے بھائی کا بھائی محفوظ نہیں تھا۔ اس کے خلاف پورا کیس موجود ہے اور وہ ایک مفرور مجرم ہے۔ قتل کے کیس میں مقدمہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بلا ارادہ اور کچھ اپنی حماقت کے باعث میں بھی شریکِ جُرم ہو گیا تھا۔ موٹے بھائی نے اس لیے میری مدد سے کبھی انکار نہیں کیا اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی صرف انتہائی ضرورت پڑنے پر اس سے رجوع کیا، اُسے بلیک میل کرنے کی نیت سے نہیں۔ بمبئی میں نے اس کی مدد کی تھی تو کیا اس کا فرض نہیں تھا کہ میری مدد کرتا۔ اس خبیث نے تم کو پہچان لیا ظاہر ہے اب حساب برابر ہے۔ میں بھی نہیں بول سکتا اور اس کے بولنے کا تو سوال ہی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے تم دونوں کی تصویر میک اپ میں اُتار لی ہو مگر کوئی بات نہیں۔" غالب چُپ ہو گیا کیونکہ خوجی یعنی خواجہ نیک محمد عُرف استاد ٹیڈی سخت برہمی کے عالم میں تشریف لا رہے تھے۔ باقی اسباب تو ایک قلی نما مزدور نے اُٹھا رکھا تھا لیکن ان کا وہ موہنجودڑو کے آثارِ قدیمہ کا نمونہ صندوق خود ان کے پاس تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کا بوجھ اُٹھا کے چلنا ان کے لیے بہت ہی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

"آج کچھ بھی ہو جائے" میں اس صندوق کو ضرور کھول کر دیکھوں گا۔" غالب نے کہا۔

"ہاں یار۔ آخر اسے یہ صندوق اتنا عزیز کیوں ہے جسے کباڑی لوہے کے بھاؤ بھی نہ خریدے۔" میں نے کہا۔ "اور... اس زنگ خوردہ صندوق میں آخر ہے کیا۔ اتنا بھاری تو صرف سونا ہی ہو سکتا ہے۔"

"سونا" غالب ہنسا۔ "بیس سیر سے زائد سونا ہوتا اس کے پاس تو یہ ہمارے ساتھ ہوتا۔"

"کیا بات ہے۔ کیوں ہنس رہے ہو تم لوگ؟" ٹیڈی نے ہانپتے ہوئے کہا اور پھر قلی سے مخاطب ہوا۔ "رکھ دے سامان اِدھر ہی فٹ پاتھ پر۔ اور دیکھ یہ تو ہیں اپنے یار۔ تو کیوں دانت نکال رہا ہے۔" اس نے پُرانی عادت کے مطابق فحش گالی بک دی۔

جس کا اُسے قطعی احساس نہیں ہُوا۔ "سارے دانت نکال کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"کیوں اتنے غصے میں ہو خواجہ صاحب؟" میں نے کہا۔ قلی سخت بدحواسی میں فرار ہُوا۔

"بھاڑ میں گئے خوجی صاحب اور خواجہ صاحب۔" ٹیڈی نے صندوق کو نیچے رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "قسم مولا علی کی اپنا پُرانا خون کبھی کبھی جوش میں آ جاتا ہے۔ ابھی ایک بیرا بچ گیا ورنہ انتڑیاں ڈھیر کر دیتا۔ پہلے مجھ پر فقرہ کسا اور میں پی گیا۔ پھر صندوق کے بارے میں ایک بات کہی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ سالا آخر میں کہنے لگا کہ امیر خان کبیر خان اتنی جلدی غریب خان فقیر خان ہو گئے۔ میں نے کہا۔ اُلّو کے پٹھے میں تجھے، تیرے ہوٹل کو، اس کے مالک کو اور تیرے سارے خاندان کو خرید کے کوڑیوں کے مول بیچ سکتا ہوں۔ دوسرے درمیان میں پڑ گئے مگر وہ بھی سب کھی کھی کر رہے تھے۔ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہُوا۔ ایک تو میری صُورت ایسی بنا دی ہے کہ اَمّاں بھی خواب میں دیکھیں گی تو ڈر جائیں گی۔"

ہم سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ٹیڈی نے ہم سب کو ہنستے دیکھا اور پھر خود بھی ہنس پڑا۔ ایک بار پھر ٹیکسی حاصل کرنے کا مسئلہ پیدا ہُوا۔ غالب نے پہلے ہی الگ جانے اور بعد میں پہنچنے کو کہہ دیا تھا۔ میں نے اُسے سگریٹ کا ایک پیکٹ پھاڑ کر اُس جگہ کا نقشہ بنا دیا جہاں محسن تمام اسلحہ اور جنگی قیدی لیے ایم آر ایس کی ہائی کمان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے یقینِ کامل کے ساتھ کہا کہ وہ ہمارے سکس اسٹار ہوٹل کو تلاش کر لے گا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمارے لیے ٹیکسی کے حصول کا مسئلہ حل کیا کیونکہ شریفانہ درخواست پر کوئی ٹیکسی والا ایسے ویران علاقے میں جانے کو تیار نہ تھا، جہاں سے اس کو واپسی کی سواریاں ملنے کی اُمید نہ ہو۔ غالب نے ایک کانسٹیبل کو اپنا پریس کارڈ دکھا کر ڈانٹا اور کانسٹیبل نے تقریباً ٹیکسی کے سامنے خودکشی کی نیّت سے کُود کر ایک ڈرائیور کو بیگار میں پکڑا۔ "خبردار جو صاب سے پیسے لیے۔" کانسٹیبل نے غرّا کے کہا۔

"پھر تو آپ بھی بیٹھ جاؤ صاب۔" ٹیکسی ڈرائیور نے طنز سے کہا۔ "مفت کی سواری ہے۔"

"نہیں بھئی۔ ہم موڈ میں نہیں ہیں۔" غالب نے کہا اور واپس چل پڑا۔ باقی سامان رکھنے سے پہلے ڈرائیور نے غلطی سے ٹیڈی کا صندوق اُٹھانا چاہا جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ چنانچہ ہاتھ سے چھُوٹا تو پیر پر گرا۔ جلے بھُنے ڈرائیور نے صندوق کو اور اس کے [illegible] نے والے کو گالی دینے پر اکتفا کی۔

وہ اس کے مالک کے بارے میں کچھ ارشاد کرتا تو پچھتاتا۔ ٹیڈی نے اُسے ڈانٹا کہ جب دَم نہیں ہے تو نازک چیز کو ہاتھ کیوں لگاتے ہو اور صندوق خود اُٹھا کے ڈِکّی میں رکھ دیا۔ ڈرائیور نے دم نہ ہونے والی بات کا اتنا بُرا نہیں مانا جتنا اس بے ہودہ صندوق کو "نازک چیز" کہنے پر حیران ہُوا۔ اس نے کہا کہ ابھی تو اس نازک چیز نے پیر ہی توڑا ہے، کہیں آگے جا کے گاڑی کا ایکسل ہی نہ توڑ دے۔ ہم سب اس قِسم کی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس سے زیادہ لُطف ہمیں اس وقت آیا جب منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے اُسے سو کا نوٹ دیا اور اس سے باقی رقم اپنے پاس رکھنے کو کہا۔

"ہم کسی پر ظُلم نہیں کرتے۔" میں نے فیاضی سے سرپرستانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن ضروری ہے کہ تم لوگ بھی ظُلم کرنا چھوڑ دو۔ ٹیکسی میں سب ضرورت مند لوگ ہی بیٹھتے ہیں۔" ٹیڈی نے اُسے مشورہ دیا۔

جب ٹیکسی نظر سے اُوجھل ہو گئی تو میں نے اشارے سے وہ جگہ بتائی جو ابھی وہاں سے سو گز دُور تھی۔ "یہ ہے وہ سکس اسٹار ہوٹل جہاں قیدی کے ساتھ جیلر بھی بند ہے۔" میں نے کہا۔

"سکندر بادشاہ اتنی دور کیوں روک لیا ٹیکسی کو۔" ٹیڈی نے اپنے بھاری بھرکم صندوق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو کیا عین دروازے کے آگے روکتے۔ جہاں سے بالکل میرا ہمشکل دُوسرا نکل آتا۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی والا یاد رکھتا۔ تم چھوڑ دو یہ صندوق میں اُٹھا لیتا ہُوں۔"

"نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں۔" ٹیڈی جلدی سے بولا۔ "اسے تو میں اُٹھا لُوں گا۔ بس ذرا میرے سر پر رکھوا دو۔"

جب میں نے صندوق اُٹھوانے کے لیے ہاتھ لگایا تو ایک بار پھر مجھے اس کے غیر معمولی وزن کا احساس ہُوا اور میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس عزم کا اعادہ کیا کہ آج اس صندوق کے راز سے آگاہی حاصل کر کے ہی دَم لیں گے۔

دروازے پر پہنچتے پہنچتے ٹیڈی کی حالت غیر ہو گئی لیکن اس نے صندوق کو گرنے نہیں دیا۔ میں اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ.... صندوق کے گرد وہی ایک رسّی لپٹی ہوئی ہے جو ہم نے ٹیڈی کے گھر سے فرار ہوتے وقت صندوق کو بند رکھنے کے لیے باندھی تھی۔ یہ رسّی بھی اب ڈھیلی ہو چکی تھی اور اگر صندوق گر جاتا تو کھُل جاتی یا ٹوٹ جاتی۔ اس رسّی کے علاوہ مجھے صندوق کو بند رکھنے والی ایک پُرانی کنڈی بھی نظر آئی تھی مگر صندوق

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گرتا تو یہ گُنڈی یقیناً الگ ہو جاتی۔ مجھے تو صندوق کے بارے میں بھی شبہ تھا کہ اتنے وزن کے ساتھ گرا تو اس صندوق کا کیا بنے گا۔ مجھے اچانک شرارت سوجھی اور میں نے پیچھے سے ٹانگ آگے بڑھا کے ٹیڈی کی ٹانگ میں اڑا دی۔ وہ پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا چنانچہ مُنہ کے بل گرا۔ صندوق اس کے سر سے کافی فاصلے پر آگے گرا۔ میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں خود ٹھوکر کھا کے سنبھل نہیں سکا تھا۔ رابعہ نے میری شرارت دیکھی تھی اور مُسکرا رہی تھی۔ مگر مسٹر ٹیڈی سچ مچ یہ ہی سمجھا کہ ہم دونوں کا تصادم ایک حادثہ تھا۔

"معاف کرنا یار۔" میں نے خود اُٹھنے کے بعد ٹیڈی کو اُٹھایا۔ "چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔" وہ لنگڑاتا ہُوا اُٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔

ٹین کا صندوق اس شیڈ نما عمارت کی دیوار سے ٹکرایا تھا جو میں نے اور محسن نے کچھ دیر پہلے کرائے پر لی تھی۔ آواز پر محسن نے دروازہ کھولا۔

"آ گئی بارات؟" محسن بولا۔ "بڑی دُھوم دھام اور دھماکے کے ساتھ آئی ہے۔"

"اور کتنی پابندیٔ وقت سے۔" میں نے اُسے چڑانے کے لیے کہا۔ میں دو گھنٹے کا کہہ کر چار گھنٹے میں لوٹا تھا۔

"آپ اکیلے تشریف نہیں لا سکتے تھے؟" اُس نے رابعہ کو دیکھ کر کہا۔ "یہاں خواتین کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"تین کہاں محسن بھائی! میں اکیلی ہُوں۔" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا اور ہنسی۔ "اس کے علاوہ میں خود ہی ساتھ آ گئی۔"

"ہاں۔ سکندر تو جب لائے گا تب لائے گا۔ ابھی تو مان نہ مان میں تیری مہمان اور بلائے جان۔" محسن بولا اور رابعہ نے اُسے گھور کر دیکھا مگر وہ باہر نکل آیا تھا اور سامان اُٹھانے میں مدد کر رہا تھا۔ ایک سُوٹ کیس رابعہ کا تھا، ایک محسن کا اور ایک میرا۔ آخر میں، ہم نے مل کر ٹین کے صندوق کو دونوں طرف سے اُٹھایا کیونکہ اس میں کبھی کوئی ہینڈل تھا تو بہت پہلے داغِ مفارقت دے چکا تھا۔

"ابے مروا دیا۔ اس مصیبت نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا ہمارا؟" محسن اندر پہنچ کے ہانپتے ہوئے بولا۔

"میاں شیروانی۔ اس میں خالص سونا ہے۔ تقریباً ایک من تو ہو گا۔" میں نے کہا تو محسن نے ایک دم ہی صندوق کو چھوڑ دیا۔

"لعنت اس سونے پر جس سے ٹوٹیں ہاتھ۔" محسن نے محاورے میں مناسب تبدیلی کر کے کہا۔

"لعنت تجھ پر۔" میں نے کہا۔ "ابھی محاورے کا ہی نہیں پیر کا بھی بیڑا غرق ہو جاتا۔"

"یہ کوئی میری بیوی کی سُسرال نہیں ہے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "یعنی میرے باپ کا گھر نہیں ہے کہ چلے آ رہے ہیں ایم بی ایس" اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ٹیڈی جلدی سے اپنے صندوق پر بیٹھ گیا۔

"یہ ایم بی ایس کون ہے؟" رابعہ نے جگہ کا مُعائنہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میاں بیوی بچّوں سمیت۔" محسن نے کہا۔ "کون آیا ہے یہاں؟ سوچنا چاہیے کہ آس پاس رہنے والے اعتراض کر سکتے ہیں۔ آخر ہم بھی ہیں کہ جو شکر کے ساتھ جُدائی کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں۔"

"کون سی گھڑیاں؟ رِسٹ واچ، ٹیبل کلاک یا پھر وال کلاک؟" رابعہ نے شرارت سے کہا۔ پھر اس کی نظر جنگی قیدی پر پڑی، جو اس وسیع و عریض ہال نما بیرک کے ایک نیم تاریک گوشے میں سیدھا بیٹھا تھا۔

"یہاں لائٹ نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ دروازہ بند کر دینے سے اندر بہت کم روشنی رہ گئی تھی۔

"لائٹ تو ہے لیکن اندر صرف ایک ہی فیوز بلب لگا ہُوا ہے۔" محسن بولا۔ "ٹیڈی سے کھانا بھی منگوا لے اور بلب بھی"

"اس کو کب ہوش آیا؟" میں نے آہستہ سے پُوچھا اور ٹیڈی کو سو کا ایک نوٹ دے دیا۔

"دو گھنٹے ہو گئے۔" محسن بولا۔ "میں بہت پریشان تھا کہ اس نے کوئی غلط حرکت کی تو کیا کروں گا۔"

"میں کہہ گیا تھا کہ گولی مار دینا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ایسی حرکت تو نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں۔ لیکن ہو سکتی تھی اور ہم اسے یہاں قتل کرنے کے لیے تو نہیں لائے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اس سے کچھ پُوچھا؟" میں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ٹیڈی جا چکا تھا اور رابعہ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔

"پُوچھا تھا۔ سالا کچھ بتانے پر آمادہ نہیں اور جو کچھ بتایا ہے وہ سب بکواس ہے۔" محسن نے کہا اور ہم دونوں اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ چالیس پینتالیس سال سے زیادہ کا آدمی تھا مگر جسم کی ساخت کے باعث کچھ نوجوان نظر آتا تھا۔ ایک وجہ اس کے گھنے بال بھی تھے جن کا رنگ قدرتی سیاہ تھا یا ہیئر کلر کے استعمال سے سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں اس وقت بھی کپڑا ٹھنسا ہُوا تھا لیکن وہ پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی مکّار آنکھیں ہلکے اندھیرے میں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ اُس نے سر اُٹھا کے ہمیں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اپنی بے بسی کے باوجود وہ ہماری بے بسی کا تمسخر اُڑا رہا ہے۔ میں نے اُس کے مُنہ سے کپڑا نکال دیا۔

"یہ تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو نا کہ یہاں تمھارا کوئی حامی اور مددگار نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور آ جائے تو لوٹ کر جا نہیں سکتا۔ تم کو ہماری طاقت کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہُوا ہو گا۔ وہ ایک لڑکی تھی جس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قیامت ہے۔ تین جوانمرد جو مسلح تھے اور اسٹین گن لے کر آئے تھے اس کمزور سی لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکے تھے جو خالی ہاتھ تھی۔ ہمارا مقابلہ تو تمھارے چوہدری صاحب کی پوری فوج بھی نہیں کر سکتی۔"

رابعہ اُسی وقت اسٹین گن لے کر یوں ہمارے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی جیسے پی ایل او جیسی تنظیم کی کوئی مجاہدہ ہو حالانکہ وہ اس قتلِ عام میں کام آنے والے اسلحے کے طریقۂ استعمال سے بھی نا واقف تھی پھر بھی اس نے اپنا پوز بالکل دُرست رکھا اور یوں مستعد کھڑی رہی جیسے ہمارے اشارے پر قیدی کے جسم کو چھلنی کر دے گی۔

"اس کی ضرورت نہیں رابعہ۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے رابعہ کا نام لینے کی غلطی کی ہے مگر رابعہ نے فوراً میری غلطی کی پردہ پوشی کی۔

"یہ ہر روز نام بدلنے سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "جب تک ضرورت نہ پڑے۔۔۔"

دلاور کے پی اے کی ہنسی نے رابعہ کو خاموش کر دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہی ہو۔" وہ بولا۔

"پھر تو تم سب کے بارے میں صحیح معلومات رکھتے ہو گے؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"ہاں تم میں سے ایک سکندر بخت ہے اور دُوسرا اس کا دوست محسن خان شیروانی۔" وہ بولا۔

"کیا اتنا سچ بول کے تم بے وقوفی نہیں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تمھیں جانے دیں۔ تم تو ہمارے بارے میں ساری خفیہ معلومات کو نشر کر دو گے۔ سب کو بتا دو گے کہ ہم کہاں ہیں اور۔۔۔"

"لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہاں سے میرے زندہ سلامت نکلنے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔" وہ بولا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ فوری طور پر تمھاری رہائی ممکن نہیں۔ ۔۔۔ سکتا ہے کہ ہم تمھیں قتل نہ کریں۔"

"اس کا انحصار تمھارے رویّے پر ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر تم تعاون کرو۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "یہ پولیس والا رویّہ اختیار مت کرو۔ میں تم سے کس طرح تعاون کر سکتا ہوں۔ جبکہ میں تمھارا دشمن ہُوں اور اگر میں یہ بے وقوفی کروں گا تو کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے جو تمھارے دشمن ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میرے لیے زندگی کی اُمید رکھنا محض خود فریبی ہے۔ خواہ میں تم کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔ چوہدری صاحب تو مجھ پر یقین نہیں کریں گے نا۔ وہ بالکل یہی سمجھیں گے کہ میں اپنی جان بچانے کی خاطر ان سے جھُوٹ بول رہا ہوں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک ایسا شخص جو دشمن کی قید میں ہو، وہ کچھ بتائے بغیر نکل آئے خصوصاً تم جیسے ہوشیار دشمنوں کا قیدی سب کچھ بتائے بغیر نجات کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ ہماری جاہل پولیس اپنے دقیانوسی طریقوں سے سب کچھ اگلوا لیتی ہے، تم ان کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چالاک ہو۔"

"اس خراجِ تحسین کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "تم چوہدری دلاور کے پی اے تھے اور قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ پھر تم بے وقوف کیسے ہو سکتے ہو۔ مگر انتخاب تو تمھیں کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم تم سے ایک ایک بات معلوم نہیں کر لیں گے اور اس کی تصدیق نہیں کر لیں گے، نہ تم کو مرنے دیں گے اور نہ ہی جینے دیں گے۔ تم یقیناً مرنا چاہو گے مگر یاد رکھو کہ تمھارے لیے یہ بھی آسان نہیں ہو گا۔"

وہ پھر ہنسا۔ اس کی ہنسی میں عجیب سی آسیب زدہ ویرانی تھی۔ وہ ہنس نہیں رہا تھا، دغا باز تقدیر کو رو رہا تھا جس نے اس کے اعتماد کو بُری طرح شکست دی تھی۔ "کیا آسان ہے اور کیا مشکل، یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"تم اتنے مایوس کیوں ہو؟" میں نے کہا۔ "تم زندہ رہنے کی کوشش تو کر سکتے ہو۔"

"کوشش کسی اُمید پر کی جاتی ہے۔" وہ بولا۔ "میں کس سے اُمید رکھوں؟"

"خُدا سے اور کس سے۔ اتنی بڑی دُنیا میں تم ایک گوشہ تلاش نہیں کر سکتے جہاں تم چھُپ کر رہ سکو۔ تم ہمیں دیکھ رہے ہو۔ ہم کس طرح اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔" میں نے کہا۔

"ہاتھ تو ڈالا تھا تم پر لیکن تم اکیلے تھے۔ جان کی بازی لگا کے نکل گئے۔" وہ بولا۔ "میں بھی اکیلا ہوتا تو مجھے کیا بُرا تھا مرنا لیکن میرے ساتھ میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ ان سب کے ساتھ نہ میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کہیں گم ہو سکتا ہوں اور نہ ہی میں تمام عمر بھاگتے ہوئے گزار سکتا ہوں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ فرض کرو کہ ہم تمھیں ابھی چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔ "تم سے کوئی سوال جواب کیے بغیر۔"

"میں باہر نکلتے ہی خودکشی کر لوں گا۔" وہ بولا۔ "صرف یہی ایک صورت ہے میرے بیوی بچوں کے بچنے کی۔ پھر دلاور کو یقین آجائے گا کہ میں وفاداری کے امتحان میں ناکام نہیں رہا۔ میں نے جان دے کر ان سے کیے ہوئے عہد کو نبھایا۔ یہ عہد ان سب کو کرنا پڑتا ہے جو چوہدری دلاور کے اتنے قریب ہوں کہ ان کا اعتماد حاصل کر لیں۔ انھیں ثابت بھی کرنا پڑتا ہے کہ وقت آنے پر انھوں نے اپنے سینے میں دفن رازوں کو اپنے ساتھ دفن کرنا قبول کیا۔ پھر اس کو نہ سہی اس کے لواحقین کو جاں نثاری کا صلہ ضرور ملتا ہے ورنہ وہ غدار کہلاتے ہیں اور ان کی سزا میں بیوی بچے بھی شریک ہوتے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمھارے لیے یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے ذمّے دار تم خود ہو۔ تم نے چوہدری دلاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں امکانات کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اب تک تقدیر نے تمھارا ساتھ دیا اور تم چوہدری دلاور کا ساتھ دیتے رہے۔ اندازوں کی غلطی کہو اسے یا مکافاتِ عمل۔ نوشتۂ تقدیر سمجھو یا اپنی شامتِ اعمال کہ تم نے پوری قوت کے ساتھ ایک بہت چھوٹے سے مورچے کو سر کرنا چاہا مگر تمھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور تمھارے بیوی بچوں کا بھی خدا نگہبان ہے لیکن تمھاری جگہ میں ہوتا تو مرنے سے پہلے یہ موقع غنیمت جانتا۔ میں کوشش کرتا کہ اپنے بارِ گناہ کو جس حد تک کم کر سکوں کر لوں۔ یہ تم بھی کر سکتے ہو۔ تم نے اب تک دلاور کے انعام و اکرام اور دُنیاوی نعمتوں کو ترجیح دی لیکن وقت نے آج تمھیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے تم اپنی دُنیاوی زندگی کے اعمال کو بھی دیکھ سکتے ہو اور یہ بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ تمھاری عاقبت کیا ہوگی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور جو کچھ بھی کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے وہ خلافِ قانون تھا۔ گناہِ کبیرہ سے کم ہرگز نہ تھا اور اس کی معاشرے میں کچھ بھی حیثیت ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ معاشرے کا بھی مجرم ہے اور ملک کا بھی۔ تم اس کے ساتھ تھے چنانچہ شریکِ جرم کی حیثیت سے تمھاری پوزیشن بھی مختلف نہیں۔ دلاور کبھی نہ کبھی دُنیا کے قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا اور ہماری کوشش بھی یہی ہے کہ اسے وہ سزا ضرور ملے جس کا وہ دُنیا میں مستحق ہے۔ اس نے کتنے لوگوں کی زندگی کو اپنی ناجائز خواہشات پر قربان کیا، کتنے گھر اُجاڑے، کتنے بچّوں کو یتیم کیا اور کتنی عورتوں کو بیوہ کیا۔

مالِ حرام سے کیا گناہ کیے۔ یہ سب تم جانتے ہو لیکن اب قدرت نے تمھیں دُنیا کی ذلت و رسوائی اور زمین کے قانون کے تحت ملنے والی سزا سے خود بچانے کا موقع فراہم کیا ہے یا یوں سمجھو تم مجبور ہو گئے ہو۔ اگر میں کہوں کہ اس وقت بھی تم صحیح سمت میں ایک قدم اُٹھا سکتے ہو، وہ کر سکتے ہو جو تم کو کرنا چاہیے تو۔ لیکن تم نے نہیں کیا تھا۔"

"اب بھی میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ ایک دم ہنسا۔ "تم کیا چاہتے ہو آخر؟"

"تم کو یقیناً معلوم ہوگا کہ چوہدری دلاور کیا کرتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ ناجائز اسلحہ فروخت کرتا ہے۔ اسمگل بھی کرتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "بناتا بھی ہے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "ہمارا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اسلحہ وہ آخر کہاں سے منگواتا ہے؟"

"دُنیا میں جہاں سے بھی سستا ملے۔"

"اور کسے فروخت کرتا ہے؟" محسن خان شیروانی نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے زیادہ سے زیادہ قیمت دینے والے کو۔" وہ بولا۔ "آج کل مشرقی پاکستان بھیج رہا ہے۔"

اس سنسنی خیز انکشاف نے مجھے اور محسن کو ذرا سی دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ قیاس آرائی تو ہم نے بھی کی تھی مگر اب شک و شبہ کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ دلاور صرف ہمارا ہی نہیں اس سرزمین کا بھی دُشمن تھا۔ وہ غدار تھا جسے موت کے بعد اس زمین میں گاڑنا بھی اس مٹی کی رسوائی ہوتا ہے۔ یہ مادرِ وطن کی آبرو کو نیلام کرنے والا فرزند تھا جس کو دُنیاوی مال و دولت کی ہوس نے بے ضمیر کر دیا تھا۔ میں بھول گیا کہ وہ میرے باپ کا قاتل تھا اور اس نے مجھے میرے حق سے محروم کر رکھا تھا۔ وہ تو اس ملک کی خاطر قربانی دینے والے لاکھوں افراد کی اُمیدوں کا اور اُمنگوں کا قاتل تھا۔ وہ شہیدوں کے اس خون کا سودا کر رہا تھا جو اس ملک کو حاصل کرنے والوں نے راہِ طلب میں نذر کیا۔ ان لاکھوں جگر فگار انسانوں کے رشتوں کی آبرو کا تاجر تھا جن کے پیارے منزلِ مُراد تک پہنچنے سے قبل ہی جان دے کر سرخرو ہوئے۔ میرا ایک گھر یا دلاور کا ایک گھر کیا تھا، ایسے ہزاروں گھر جس مقصد کے لیے جل کر خاک ہوئے وہ اسی مقصد کو بیچ رہا تھا۔ اسی شاخ کو کاٹ رہا تھا جس پر کاروانِ آزادی کے ساتھ مسافت کی ناقابلِ بیان صعوبت اُٹھا کے بسیرا کرنے کی فکرِ آشیاں بندی کر رہے تھے۔ انھی بنیادوں کا سودا کر رہا تھا

جن پر ایک اللہ اور ایک رسول کے نام لیوا اپنے لیے ایک جنّتِ ارضی بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اشتعال کی ایک لہر نے مجھے مغلوب کر لیا اور میں نے دلاور کے پی اے کو پے در پے لاتیں اور ٹھوکریں ماریں۔

"اوہ، تم ضمیر فروش شیطان۔ تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کے ناپاک ہاتھوں سے کاغذ کے نوٹوں کی گڈیاں لیتے رہے۔ اس غدارِ وطن کے وفادار رہنے پر فخر کرتے رہے۔ اسی زمین سے اُگا ہوا اناج کھاتے رہے اور اسی کو دُشمنوں کے ہاتھ بیچتے رہے۔ اب امان کس سے چاہتے ہو؟ کیوں اُمید رکھتے ہو کہ تمھارے مالِ حرام سے پلنے والے بچّوں کو یہ زمین پناہ دے۔" میں نے وحشت میں اُس کو قتل کر دیا ہوتا مگر محسن نے مجھے روک لیا۔

"ہوش میں آ سکندر۔" محسن نے کہا۔ "یہ اکیلا نہیں، ایسے غدار اور بھی ہیں۔ ہم صرف اسے مار کے سب کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایک چھوٹا سا سپنولیا ہے نہ جانے کتنے سانپ اور اژدھے ابھی باقی ہیں۔"

"میں پاگل ہوں، تم پاگل ہو، ہم سب پاگل ہیں۔" دلاور کے پی اے نے اپنی دیوانگی میں ہنسنا شروع کیا۔ اس کے لبوں سے لہو بہہ رہا تھا اور وہ کراہ رہا تھا مگر وہ خاک و خون میں غلطاں ہوش کی منزل سے گزر رہا تھا۔ "وہ اژدھے تم سب کو نگل جائیں گے۔"

"کون ہیں وہ وطن دُشمن؟ وہی تخریب کار اور دہشت گرد جو مشرقی حصّے میں علیحدگی پسندوں کی حمایت کر رہے ہیں؟" میں نے جھک کر کہا۔ "یہ اسلحہ انھی کو جاتا ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ان کو بھی اور دُوسروں کو بھی۔۔۔"

"دوسرے کون؟" محسن نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"سرحد پار۔" وہ بولا اور پیٹ پکڑ کے دُہرا ہو گیا۔

"سرحد پار سے بھی یہ اسلحہ آگے وہیں جاتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب ایک ہیں۔ علیحدگی پسند۔ ان کی حمایت کرنے والے۔ جو اندر رہ کر ان کی مدد کرتے ہیں اور جو باہر سے امداد دے رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔" محسن نے کہا اور اُسے سیدھا کر دیا۔ "سرحد پار کون ہیں؟"

"وہ بھی دُشمن ہیں۔" وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور ہانپنے لگا۔ "سرحد پر گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔"

"اور یہاں سے یہ اسلحہ لے جانے والے کون ہیں؟" محسن نے صبر و ضبط کے ساتھ جرح جاری رکھی۔

"میرے جیسے سیہ بخت۔ جن کے لیے دُنیا و عاقبت میں رسوائی ہے۔" وہ بولا۔ میری بات نے اس پر اثر کیا تھا یا خود اس نے اپنے آپ کو موت کی سرحد پر پا کے اپنی تمام عمر کی غلطی کو محسوس کر لیا تھا مگر زندگی کے یہ چند لمحات اس کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے بالکل ناکافی تھے۔ یوں بھی وہ توبہ قبول نہیں ہوتی جو دمِ آخر کی جائے۔ مجھے اس پر ترس آیا۔

"تم ان کے نام پتے جانتے ہو؟" محسن نے کہا۔

"نہیں۔ ان کے نام نہیں ہوتے۔" وہ شدید کرب کے باوجود ہنسا۔

"کیوں۔ آخر ڈی سلوا ایک نام تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے میر شرافت علی ایک نام تھا۔"

"تم کسی نواب خسرو جمشید کو جانتے ہو؟" محسن نے کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نواب تو نہیں ہے۔"

"ہاں نواب تو نہیں ہے لیکن وہ دلاور کے کاروبار میں شریک ہے۔" میں نے کہا۔ "کہاں ملے گا وہ؟"

"کہیں نہیں۔ اس کا کوئی۔۔۔ ٹھکانہ نہیں۔ بس آتا جاتا رہتا ہے۔"

"اور اس کے کاروبار میں کون شریک ہے؟" محسن بولا۔

"ایک۔۔۔ ایک ڈی ایس پی۔۔۔ سراج۔" وہ بولا۔ "یہاں سے اسلحہ بارڈر کے پار بھجوانے کا وہی ذمّے دار ہے۔" وہ بڑی مشکل سے ایک ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔ سراج کے نام نے مجھے بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ اس کے نام سے میری زندگی کے اوّلین تلخ ترین تجربات کی یاد وابستہ تھی۔ دیارِ غیر سے ارضِ وطن پہ قدم رکھنے کے بعد مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار کرنے والا ایک درندہ صفت، بے اعتبار اور بے ضمیر شکاری جس نے بے خبری میں بھرپور وار کیا تھا اور وہ سمجھا تھا کہ وہ اپنی ایذا رسانی سے جسم کے ساتھ میرے عزم کو بھی شکست دے سکے گا۔ میں ایک قانون پرست جمہوری ملک کے مُعاشرے سے لوٹنے والا مہذب آدمی تھا۔ ایک دولت مند کا ناز و نعم میں پلا ہوا بیٹا تھا جو گھر سے ولایت تک حصولِ علم کی نیّت لے کر گیا تھا اور جوانی کی راتیں اُمنگوں کے دن بڑی بے فکری سے گزارتا تھا۔ گھر لوٹتے ہی مجھے زنداں کی عقوبت سے پالا پڑا اور میرے ساتھ وہ غیر انسانی سلوک ہوا کہ میں آدمیت بھول گیا۔ اُس نے مجھے ایک کم ہمّت اور بے سہارا، ناتجربہ کار اور ناپختہ ذہن کا مالک اور کھلنڈرا لڑکا سمجھا تھا۔ ایک قانون کے محافظ کہلانے والے افسر نے میرے جسم پر اتنی مشقِ ستم کی تھی کہ اس کی یاد اتنا عرصہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

گزر جانے کے بعد بھی میرے لیے ایک لرزہ خیز خواب کی طرح تھی۔

"گامے شاہ بھی ان کا ساتھی ہے؟" محسن نے کہا۔

"اس نے نفی میں سر ہلایا۔" باقی سب ایجنٹ ہیں، ملازم ہیں اور کارندے ہیں۔"

"کراچی کا سیٹھ کریم بھائی بھی، کسٹم کا پیارعلی بھی۔" میں نے وہ نام گنوا دیے جو مجھے یاد تھے۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔" میں صرف گامے شاہ ہی کو جانتا ہوں۔"

"گامے شاہ کے علاوہ کسی کو آتے جاتے دیکھا تھا، یاد کرو اور بتاؤ۔ کسی کا فون نمبر یاد ہے؟"

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔" سب دلاور کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی نوٹ بُک میں۔"

"تم بکتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔" میرا غصہ پھر بھڑک اُٹھا۔" جب تم اس کے اتنے قریب تھے تو تم کو بہت کچھ معلوم ہوگا۔ سارے نام، سارے پتے، ٹیلی فون نمبر۔" میں نے اُسے پھر پسلیوں پہ ٹھوکریں ماریں اور ہر ٹھوکر کے ساتھ وہ بلبلا کے لڑھکتا گیا۔" سب بتانے پڑیں گے۔ ابھی۔" میں نے اُسے اُٹھایا اور دیوار پہ دے مارا۔ محسن نے پھر مجھے روکا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور میری کنپٹی میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ رالعہ نے میری آستین پکڑ لی۔

"ایسے تو تم اس کو جان سے مار ڈالو گے۔" رالعہ نے کہا اور مجھے دُور کھینچنے لگی۔

"یہ زندہ رہنے کا مستحق بھی کہاں ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس کو دس بار ماروں۔ ہر بار زیادہ عذاب کے ساتھ۔"

"سب بے کار ہے سکندر۔" محسن نے اچانک جھک کر کہا۔ "یہ ہر عذاب کی حد سے گزر چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے رالعہ کے ہاتھ سے آستین چھڑائی اور محسن کے پاس گیا۔" کیا یہ مر گیا ہے؟"

"ہاں۔ لیکن تمھاری مار سے نہیں۔ یہ بہت پہلے ہی مرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔" محسن بولا۔

میں نے دیکھا تو مجھے اس کی پتلیاں ٹھہری ہوئی نظر آئیں۔ قریب سے مجھے کڑوے باداموں کی بُو کا احساس ہُوا۔

"سائنائیڈ؟" میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ رالعہ دہشت زدہ اور سہمی ہوئی سی میرے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔" اسی لیے تو یہ اپنا فیصلہ بتا چکا تھا کہ یہاں سے نکلے گا تو خودکشی کر لے گا۔ موت اس کی دسترس میں تھی۔ غالباً اسی لیے اسے موت کا خوف نہیں رہا تھا۔"

"لیکن زہر اس کی جیب میں تو نہیں تھا۔" میں نے کہا

"نہیں۔ میں نے تلاشی لی تھی۔" محسن بولا۔" لیکن ایسے لوگ جن کے لیے زندگی کا ہر لمحہ پُل صراط کا سفر ہو، خود کو موت سے زیادہ شدید تر عذاب کے لیے تیار رکھتے ہیں اور جب ضرورت محسوس کرتے ہیں تو دُشمن کی قید سے یوں نکل جاتے ہیں کہ پہرے بٹھانے والے اور حصار قائم کرنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہم بھی اسے روک نہیں سکتے تھے۔"

"چلو اچھا ہُوا مرتے مرتے کچھ نیک کام کر گیا۔" میں نے کہا اور رالعہ کے کندھے پر تھپکی دی جو خوف سے کانپ رہی تھی۔ ٹیڈی نے کچھ دیر پہلے اندر آ کے بلب لگا دیا تھا۔ دو سو واٹ کے بلب سے بھی اس بیرک میں واجبی سی روشنی ہوئی تھی۔ جو کھانا ٹیڈی لایا تھا، وہ ایک بینچ پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا لیکن اب کسی کو کھانے کی خواہش نہ تھی۔

"میں نے تو اُسے کوئی زہر کھاتے نہیں دیکھا تھا۔" رالعہ نے کہا۔

"زہر اس کے کسی دانت میں محفوظ تھا۔" محسن نے کہا۔" یہ ایک مصنوعی دانت میں سائنائیڈ بھر کے لگوا لیتے ہیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو دانتوں سے دبا کے اس کی سیل توڑ دیتے ہیں۔"

"کیا عام زندگی میں خطرہ نہیں ہوتا کہ کھانے پینے میں سیل ٹوٹ جائے۔" رالعہ متحیر ہو کے بولی۔

"نہیں سیل اتنی کمزور بھی نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔" اور یہ لوگ خیال بھی رکھتے ہیں کہ اس طرف سے کوئی سخت چیز نہ چبائی جائے۔ ابھی اس نے فرش پہ سے کوئی کنکر، پتھر درمیان میں رکھ کے دبا لیا ہوگا۔ پوٹاشیم سائنائیڈ جیسے زہر سے چند سیکنڈ میں جسم سے روح کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"چند سیکنڈ میں؟" ٹیڈی نے جھرجھری لے کر کہا۔" کوڑیالے سانپ کے زہر کا سُنا تھا۔"

"تیرا کیا خیال ہے محسن کہ جتنا اُسے معلوم تھا وہ سب بتا گیا؟" میں نے کہا۔

"نہ بتانا ہوتا تو کچھ نہ بتاتا۔" محسن بولا۔" اتنا بھی نہ بتاتا۔"

"اس کی بات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل کاروبار کو چلانے والے اور مالک تین ہیں۔" میں نے کہا۔" ایک وہ نقلی نواب خسرو جمشید، دُوسرا وہ خبیث سراج جو قانون کا محافظ کہلاتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کیوں یقین نہیں آتا۔ ضمیر فروش کس محکمے میں نہیں ملتے؟" محسن بولا۔" اب تو مجھے کوئی شک

کی جان کیوں گئی۔ ان کو اس وطن دُشمن کاروبار کی خبر مل گئی ہوگی؟"

"ہاں۔ اور مجھے شک ہے کہ میر شرافت علی بھی اسی میں مارا گیا۔" میں نے کہا۔" جب اُسے علم ہُوا ہوگا کہ وزیر خان کے ساتھ کیا ہُوا تو مجبوراً وہ دلاور سے مل گیا ہوگا اس ڈر سے کہ کہیں اس کا حشر بھی وہی نہ ہو جو وزیر خان کا ہُوا لیکن وہ انکار کرنے پر موقعے کی تلاش میں رہا کہ مجھے مطلع کر سکے۔ منشی فوما پچو کو اسی نے نامہ بر بنایا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے والد کا پُرانا شناسا تھا اور کوئی بہت پارسا آدمی تو نہیں تھا مگر والد نے اُسے کاروبار میں شریک کیا تھا۔ وہ کسی بھی غلط آدمی کے ساتھ کبھی شراکت نہ کرتے۔ دلاور بعد میں گھسا اور وزیر خان کو نکال باہر کیا۔ میر شرافت علی کے بارے میں اُس کو جیسے ہی خبر ملی کہ وہ اندر ہی اندر رنجی لفت رکھتا ہے تو اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ شرافت علی کو پیڈرو کے ہاتھوں مروا دیا اور مجھے پاکستان بُلا کر قتل کے الزام میں ملوث کر دیا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اچھا کیا جو اپنے ہاتھوں سے شرافت علی کو نہیں مارا۔ وہ وقت مجھے یاد آتا ہے جب وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور میرے سامنے گھگیا کر ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ وہ واقعی بے قصور تھا لیکن میرے سر پر خون سوار دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ اگر میرا دل گواہی دیتا کہ میرے باپ کا قاتل وہی ہے تو مجھے کبھی اس پر ترس نہ آتا۔"

"یہ سراج کا نام تو بہت عرصے کے بعد سامنے آیا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ لیکن اس کی وجہ ہوگی۔" میں نے کہا۔" اس زمانے میں وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر اُسے جان بوجھ کے پیچھے ہٹا لیا گیا۔ تاکہ زیادہ بدنامی سے اس کو نقصان نہ ہو۔ اس کی پوزیشن سے دلاور اینڈ کمپنی کو بہت فائدہ حاصل ہوتا ہوگا۔ ایک تو پولیس والا اور وہ بھی افسر۔ اعلیٰ افسران کی نظر میں آ جاتا تو کسی دُور دراز کے علاقے میں تعینات کر دیا جاتا۔ یہاں وہ دلاور سے اشتراک کر کے جتنا فائدہ حاصل کر رہا ہے، اتنا تو ساری عمر بھی حاصل نہ کر پاتا۔"

"دیکھنا پڑے گا کہ اس کی پوسٹنگ کہاں ہے۔" محسن بولا۔

"اس نے اپنی پوسٹنگ خود کسی ایسی جگہ کرا رکھی ہوگی جہاں کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ کسی غیر منافع بخش جگہ پر اپنی خوشی سے جانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا اور عموماً وہ افسر جو معتوب ہوں یا جن کے پیچھے کسی زبردست آدمی کا ہاتھ نہ ہو، وہ ایسے ناپسندیدہ مقامات پر پھینک دیے جاتے ہیں یا ہیڈ کوارٹر میں انتظامی نوعیت کے افسر بنا دیے جاتے ہیں، سکیورٹی کی ڈیوٹی کے لیے نامزد ہو جاتے ہیں یا افسر بکارِ خاص بن کے جھک مارتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" محسن سے پہلے ٹیڈی نے کہا۔" ہم نے تو تھانے فروخت ہوتے دیکھے ہیں جس علاقے میں غریب اور لاوارث لوگ رہتے ہوں یا جہاں جرائم کے اڈّے زیادہ ہوں وہاں پوسٹنگ کرانے کے لیے ایس ایچ او کو پچاس ہزار سے ایک لاکھ روپے نقد تک اُوپر والوں کو دینے پڑتے ہیں اور ہر ماہ کے نذرانے کا مُعاملہ الگ ہوتا ہے۔ بالکل کھُلی بولی لگتی ہے سکندر بادشاہ۔ جو زیادہ دینے کا حوصلہ اور ارادہ رکھتا ہے وہی کامیاب رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے دو حصّے رکھتا ہے تو ایک حصّہ ان کے لیے جو اُس کو موقع فراہم کرتے ہیں کہ جیسے چاہے قسمت آزمائے۔ نیچے والے بھی زیادہ آمدنی کے تھانے میں جانے کی خاطر یا تو اُونچی سفارش لگاتے ہیں یا پھر نقد خرچ کر کے کام نکالتے ہیں۔ کوئی تھانہ چاندی کی کان ہے تو کوئی سونے کی اور کوئی ہیرے کی کان ہے۔"

محسن ہنسا۔" یہ اچھی مثال دی تم نے۔ اب بھلا گلبرگ تھانے جا کے کسی کو کیا ملے گا جہاں سارے ہی پھنّے خاں رہتے ہوں اور پولیس افسر تک ان سے ڈرتے ہوں۔ وہ تو تھانے دار کو بھی ذاتی ملازم سمجھتے ہیں۔"

"تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے یار۔" میں نے کہا۔" یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے، اس کا کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟ وہی جو دوسروں کا ہُوا۔" محسن بولا۔" پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا۔"

"اس نے اپنے بیوی بچّوں کو دلاور اینڈ کمپنی کے عتاب سے محفوظ رکھنے کی خاطر مرنا قبول کیا تھا۔" میں نے کہا۔" اس کا یہ مقصد پُورا ہونا چاہیے۔"

"اس کے کیے کی سزا اس کے بیوی بچّوں کو واقعی نہیں ملنی چاہیے۔" محسن نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"غالب نے ٹھیک کہا تھا کہ عشق نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔" میں نے کہا۔" اکیلا آدمی صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور ہر سختی جھیلنے اور ہر آزمائش سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے لیکن شادی کر کے وہی آدمی بُزدل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے انجام سے نہیں، بیوی بچّوں کے انجام سے ڈرنے لگتا ہے۔ خود ہر تکلیف اُٹھاتا ہے مگر اپنے بیوی بچّوں کو ذرا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ خاندان اس کی ایسی کمزوری بن جاتا ہے جس سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اور پھر بھی لوگ شادیاں کرتے ہیں؟" اُستاد ٹیڈی بولا۔

"ہاں۔ اور پھر اسی طرح سارے خاندان پر ایک سائبان بن کے رہتے ہیں" میں نے کہا۔ "سائبان انھیں دُھوپ سے اور بارش سے بچاتا ہے۔ زمانے کی گرم سرد ہَوا سے محفوظ رکھتا ہے۔ سارے پتھر جو دُنیا کے سنگسار کرنے والے ہاتھ اُٹھاتے ہیں اپنے سینے پر روکتا ہے اور انھیں ہر آفت سے پناہ دیتا ہے۔ اب دیکھ لو اس نے جان دی تو صرف اس لیے کہ انھیں یہ پناہ حاصل رہے۔ وہ دلاور کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے مرنا گوارا کیا، کسی کو کچھ بتایا نہیں لیکن اس کی لاش یہاں ملی تو دلاور اینڈ کمپنی کو شک ہوگا کہ مرنے والے نے وفادار رہنے کے عہد پر جان قربان کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ وہ گرفتار ہو کے اس مقام تک آنے سے پہلے ہی کیوں نہ مر گیا۔ عہد تو سب کرتے ہیں مگر اس اُمید میں کہ جان دینے کی آزمائش کا مرحلہ کبھی نہیں آئے گا۔ جب وقت آتا ہے تو کون بے دھڑک اپنی زندگی قربان کرتا ہے اور کون ڈر کے پیچھے ہٹ جاتا ہے یا تذبذب کا شکار ہوتا ہے۔ دلاور یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے پی اے نے بھی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ پہلے اپنی جان بچانے کی کوشش کی ہو۔ ہم سے سودا کیا ہو کہ اگر وہ سب کچھ بتا دے گا تو اِسے بخش دیا جائے گا۔"

"دلاور جانتا ہے کہ ہم نے براہِ راست تشدد کے حربے آزمانے سے گریز کیا ہوگا۔ پہلے تو سمجھا بجھا کر اسے تحفظ کی ضمانت دی ہوگی اور اس سے تھوڑا بہت معلوم کر لیا ہوگا۔ پھر اس یقین کے ساتھ کہ وہ بہت زیادہ جانتا ہے اور جو کچھ اس کے ذہن میں ہے وہ سب اُگلوانے کے لیے جبر کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ اس جسمانی اذیت کی تاب نہ لا کے وہ خودکشی پر مجبور ہُوا۔ مجبوری کی اس انتہا تک پہنچنے سے پہلے وہ کتنے راز افشا کر گیا؟ یہی اس کی قربانی کو ناقابلِ قبول بنا دے گا۔" محسن خان شیروانی نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"اور خمیازہ بھگتیں گے بیوی بچے جن کی خاطر وہ جان سے گیا۔ انھیں سزا نہ ملی تو وفاداری کا بعد از مرگ انعام بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم والی بات ہو جائے گی۔"

"پھر اب کیا کریں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ظاہر ہے یہ لاش اِدھر پڑی نہیں رہ سکتی۔" میں نے کہا۔

"یہ تحفہ بھی چوہدری دلاور صاحب کو بھیج دیں؟" ٹیڈی نے کہا۔

"نہیں دوست۔ اس کو میدانِ کارزار میں ڈال آتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پتا چلے کہ یہ وہیں لڑتا رہا مگر اسیر ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔"

"کون سے میدانِ کارزار میں؟" محسن نے کہا۔ "اسی جگہ جہاں اس کا اور تیرا مقابلہ ہُوا تھا؟"

"ہاں۔ وہی سب سے مناسب جگہ ہے۔"

"لیکن یار۔ وہاں لوٹ کر جانے میں خطرہ بھی ہے۔" محسن بولا۔ "اور اب اس سے کیا فائدہ۔ سب کے سامنے تو وہاں سے فرار ہُوا تھا۔ نازو رہ گئی تھی اور ایک لاش۔ پھر وہاں پولیس پہنچ گئی ہوگی اور اب ہمارے مرزا غالب آ کے بتائیں گے کہ نازو نے اس تیسرے شخص کا کیا حشر کیا تھا۔ وہ بھی اس خوفناک حسینہ کے ہاتھوں شہید ہُوا یا پولیس کے ہاتھ لگا اور پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا یا نازو اسے لمبا لِٹا کے خود وہاں سے نکل گئی تھی؟"

"تیری بات میں سمجھ رہا ہوں" میں نے کہا۔ "ہر صُورت میں جو لوگ وہاں ذرا سی دیر کے لیے رُک گئے تھے" وہ ذرا دیر نہیں ٹھہرے ہوں گے اور پولیس کے آنے تک کوئی چشم دید گواہ نہیں رہا ہوگا۔ ہُوا بھی تو اس چکّر میں نہیں پڑے گا اور اپنی جان چھُڑائے گا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔"

"پھر بھی پولیس نے جائے واردات پر پہنچ کر ضابطے کی... کارروائی کی ہوگی" محسن بولا۔ "اور وہاں نازو ملی ہو یا نہ ملی ہو، ان کو ایک لاش ضرور ملی ہوگی۔ ممکن ہے دُوسرا بھی زندہ یا مُردہ ہاتھ لگا ہو۔ انکی رپورٹ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ اِس لاش کو اتنی دیر بعد وہاں ڈالنا بے وقوفی ہوگی۔ کون مانے گا کہ یہ بھی وہاں پڑا تھا لیکن کسی نے دیکھا نہیں۔ اس سے تو ثابت ہوگا کہ بعد میں ہم اسے ڈالنے وہاں پہنچے تاکہ دلاور پر واضح ہو جائے کہ یہ بھی ہمارا ہی کارنامہ تھا۔"

"تو مجھے اتنا احمق کیوں سمجھتا ہے جتنا خود ہے۔" میں نے کہا۔ "لاش کو جائے واردات سے تھوڑا سا ہٹ کے ڈال دیں گے۔ کسی جھاڑی یا درخت کی اوٹ میں۔ معلوم یہ ہو کہ جنگ کا پانسہ پلٹتا دیکھ کے یہ وہاں سے نکل گیا تھا لیکن فرار کے راستے مسدود تھے۔ چنانچہ کسی کے ہاتھ پڑنے سے پہلے اس نے اپنا خاتمہ کر لیا اور لاش ایسی جگہ تھی کہ فوراً کوئی نہ دیکھ سکا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تصدیق ہو جائے گی کہ موت کس طرح واقع ہوئی۔ دلاور مطمئن ہو جائے گا کہ وہ کسی کے ہاتھ نہیں پڑا اور اسی جگہ خودکشی کر کے اپنا عہد نبھا گیا۔ لاش ابھی نہ سہی صبح تک ضرور دریافت ہو جائے گی۔ یہ ابھی چند گھنٹے پہلے کی بات ہے، پولیس بھی اب تو وہاں سے تفتیش کر کے رُخص... جا... "

میری بات نے محسن کو قائل کر لیا۔ ٹیڈی نے ہمیں یاد دلایا کہ شام ہونے والی ہے اور جو کھانا ہمیں دوپہر کے وقت کھانا تھا وہ ایسے ہی پڑا ہُوا ہے۔ خواہش نہ ہونے کے باوجود ہم نے چند لقمے زہر مار کیے اور پھر اُس جگہ کا جائزہ لیا۔ بیرک اندر سے ویسی ہی تھی جیسی کسی ورکشاپ کی عمارت ہو سکتی ہے۔ چھت کی کڑیوں سے جالے اور گھاس پھُوس لٹک رہے تھے اور بجلی کے تار ہر طرف پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ دیواروں پر کبھی رنگ نہیں ہُوا تھا چنانچہ سیمنٹ کے پلاستر کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ لمبائی کے رُخ دونوں دیواروں میں دو دو کھڑکیاں تھیں مگر ان کو اندر سے لکڑی کے تختے ٹھوک کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ دوسرا دروازہ آخری حصّے میں تھا اور مختصر سے احاطے میں کھُلتا تھا۔ احاطے میں پانی کا ایک نل تھا اور سابقہ کرائے داروں کا بے مصرف سامان، لکڑی کے تختے، خالی ڈرم اور پُرانے ٹائر۔ باہر سے جو تھوڑی بہت روشنی اندر پہنچتی تھی، ان روشندانوں کے ذریعے پہنچتی تھی جو دروازوں کے اور کھڑکیوں کے اُوپر بنے ہوئے تھے۔ روشندانوں کے پٹ بھی بند تھے لیکن کسی کا ایک شیشہ بھی سلامت نہیں تھا چنانچہ ہَوا اور روشنی کے ساتھ چھت کے نیم تاریک اور ویران سہاروں پر گھونسلے بنانے والے پرندے بھی اس راستے سے اندر آتے تھے۔ نیچے فرش پکّا تھا اور غالباً توڑ کر دوبارہ بنایا گیا تھا — آمنے سامنے کی دونوں لمبی دیواروں کے ساتھ اور رکھڑکی سے متصل لکڑی کی بھاری بھرکم اور بھدّی بنچ نما میزیں تھیں جن کے پائے زمین میں پیوست تھے۔ اس پر فرنیچر بنانے والے لکڑی پر رندہ مارتے ہوں گے یا شاید اس جعلی نوٹ چھاپنے والے نے اپنی مشینیں لگا رکھی تھیں۔ تاہم یہ سامان ساتھ لے جایا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ یہیں رہ گیا تھا۔ مجھے کئی لٹکتے ہوئے سوئچ بورڈ نظر آئے۔ ایک کونے میں تھری فیز کنکشن کے میٹر اور مین سوئچ کا بورڈ البتہ سلامت تھا۔ پاور لائن کے کئی پوائنٹ فرش سے ذرا اُوپر دیے گئے تھے جو ہمارے لیے بے کار تھے۔ اُوپر چھت پر کئی ٹیوب لائٹوں کے کھوکے لٹکے ہوئے تھے جن میں نئی ٹیوب لگا کے اندر خاطر خواہ روشنی کا انتظام ہو سکتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ میٹر بند ہے اور اس کی سیل بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ حکومت کی بجلی کو مالِ مُفت سمجھ کر فراخدلی سے استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن اجازت دینے والا میٹر ریڈر ہر ماہ اپنا وظیفہ وصول کرنے ضرور آتا ہوگا۔ پچاس روپے اس کی نظر کرو اور پانچ سو بجلی کے بل میں سے بچاؤ۔ جیو اور جینے دو کا منفی فلسفہ۔

"اس جگہ پر مزدور اور کاریگر قسم کے لوگ تو رہ سکتے ہیں" میں نے فیصلہ دیا۔ "مثلاً ہم تینوں حضرات۔ لیکن محترمہ خاتون، آپ کو اپنا بندوبست کہیں اور کرنا ہوگا ورنہ شکوک پیدا ہوں گے اور آپ کی وجہ سے ہمارا یہ ٹھکانہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔"

"یہ ٹھکانہ نہیں، اسلحہ خانہ ہے" رالعہ نے کہا۔ "کہاں سے آ لیے یہ سب کچھ بھاآخراتنے ریوالور کس کے ہیں اور یہ اسٹین گن جیسی خطرناک چیز!"

"نازو اس کھلونے سے نہیں ڈرتی تھی" میں نے کہا۔

"ڈری تو میں بھی نہیں تھی" رالعہ نے کہا۔ "کیا میں نے اس کو بالکل ٹھیک نہیں پکڑا تھا؟ میں نے تو یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔"

"اسٹین گن کی ساخت ہی بتا دیتی ہے کہ وہ یورپی یا امریکی طرز کی نہیں" میں نے کہا۔

"یہ وہی اسلحہ ہے جو ایک طرف سے اسمگل ہو کے آتا تھا اور دوسری طرف اسمگل کر دیا جاتا تھا" محسن بولا۔ "ادھر کی چیز کو اُدھر کرنے والے دونوں طرف کے ضرورتمندوں سے زیادہ فائدے میں رہتے تھے۔"

"میری بات پہ غور نہیں کیا تم نے؟" میں نے کہا۔

"ہم نے غور فرمایا اور بات کو فضول قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔" رالعہ ہنسی۔

"کیا مطلب؟ گویا تم اسی کارخانے میں ہمارے ساتھ رہنے پر مُصر ہو؟" میں نے کہا۔

"کارخانے سے پاگل خانے بلکہ مُردہ خانے تک میں تمھارے ساتھ رہوں گی۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"تمھارا جذبہ فلمی عشق سے زیادہ صادق ہے مگر تمھارے ناقص العقل ہونے کا ثبوت ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ الزام تو ہم عورتوں کی ذات پر ہے اور رہے گا۔" رالعہ بولی۔ "میں نے اپنا فیصلہ بتا دیا۔"

"یہ کیا احمقانہ ضِد ہے۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تمھاری وجہ سے ہم بھی پریشانی میں مُبتلا رہیں گے۔"

"پھر میں کیا کروں! پریشانی ہے تو سب کے لیے ہے۔ نہیں ہے تو کسی کے لیے نہیں ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔

"لیکن اس طرح یہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔"

"اس طرح نہ سہی، میں بھی اپنی وضع قطع بدل لوں گی۔" رالعہ نے کہا۔ "جو تم کہوگے بن جاؤں گی۔"

"دیس چھُڑائے بھیس چھُڑائے کیا کیا کرے نہ پریت۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ہم تو کارٹون بن گئے ہیں۔ تم کو اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔ "فیصلہ ہو گیا تھا کہ تم انکل رضوی کے پاس چلی جاؤ گی۔"

"فیصلے بدل بھی جاتے ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "میں اب کہیں نہیں جا رہی ہوں اور تم اگر کارٹون بن کے رہ سکتے ہو تو میں بھی رہ سکتی ہوں لیکن الگ تھلگ رہ کے وہ ذہنی اذیت قبول نہیں کر سکتی جو اندیشوں اور وسوسوں سے ملتی ہے اور بے یقینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔"

"تم ہمارے لیے اضافی مسائل پیدا کر دو گی، اپنی حفاظت کے لیے۔"

"ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کے خیال سے ساتھ ہیں اور کون ہے جو دوسرے کو پریشانی یا مسئلہ سمجھتا ہے؟ کس موقع پر میں نے تمہارا ساتھ دینے میں کمزوری کا مظاہرہ کیا؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"بی بی! تم ناحق خفا ہو رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری داستانِ شجاعت سے کون واقف نہیں لیکن تمہاری مدد کی نوعیت مختلف ہوتی تو زیادہ کارآمد تھی۔ تم الگ رہ کر ہمارے لیے زیادہ کچھ کر سکتی ہو۔ مثلاً ہماری قانونی مدد، مالی مدد۔ اور ہمیں حالات سے باخبر رکھنے کا کام۔"

"میں الگ رہنا ہی نہیں چاہتی تو بات ختم۔" وہ بولی۔ "قانونی مدد میں نے پہلے کی تھی، اب نہیں کر سکتی کیونکہ تمہارے معاملات قانون کی حدود سے بہت باہر نکل گئے ہیں۔ مالی مدد کا یہ ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے لو۔ ایک گھر کے سوا جسے میں نے بیچنے کے لیے نہیں خریدا ہے۔ رہی حالات سے باخبر رہنے کی بات، تو تم کبھی حالات سے بے خبر نہیں رہے لیکن میں تمہاری جانب سے بے خبر رہ کے دیکھ چکی ہوں۔ مجھ میں اب اکیلا رہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" محسن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا۔ "اس بات پر مت لڑو لیکن ایک بات سمجھ لو۔ ہم یہاں کچھ لکڑی کا کام کریں گے۔ کام کیا خاک کریں گے، ایک پردہ رکھیں گے تا کہ ہم پس پردہ کچھ بھی کرتے رہیں۔ ہمارا حُلیہ تم دیکھ رہی ہو۔ اس کاروبار کے لیے یہی سب سے بہتر حُلیہ ہے۔ تم بھی یہاں مس رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ بن کے نہیں رہو گی۔ وضع قطع سے تمہارا الگ نظر آنا غلط ہو گا۔"

"میں بن جاؤں گی وہی جو تم ہو۔" رابعہ نے پورے یقین سے کہا۔

"لیکن وہ لینڈ لارڈ۔ کیا وہ اعتراض نہیں کرے گا؟ جگہ کام کے لیے دی تھی، رہائش کے لیے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اس سے اپنی مجبوریاں بیان کر دیں گے کہ الگ گھر نہیں لے سکتے اور ایک عورت کھانے پکانے کے لیے ساتھ ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری بہن ہے۔" محسن نے کہا اور ہم کمرے کے ایک حصّے میں پردہ ڈال کے کچھ گھریلو سا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ زنان خانہ بنا سکتے ہیں۔ دو چار برتن اور چارپائی ڈالنے کی جگہ ہے مگر یہ سب کل دیکھیں گے۔"

"ہاں۔ غالب آجائے تو صورت حال کا پتا چلے۔" میں نے کہا۔ "مجھے نازو کی طرف سے تشویش ہے۔"

"عزیزہ۔ کیا اس بدبخت کی تشویش پر تم کو تشویش محسوس نہیں ہوتی؟" محسن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اس تشویش کے بارے میں تم تفتیش کر کے مشورہ دو، کیا واقعی مجھے تشویش میں مُبتلا ہونا چاہیے؟" رابعہ نے قدرے مُسکرا کے کہا۔

"بات مذاق کی نہیں یار۔ نازو تو چھلاوا ہے۔ کسی نہ کسی طرح نکل جائے گی۔" میں نے کہا۔ "وہ شخص جسے میں نازو کے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا، کہیں اس نے ہمارا راز نہ فاش کر دیا ہو۔ ہمیں پھر ٹھکانہ بدلنا پڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ کل گامے شاہ سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ایک نام کا سلسلہ دوسرے نام کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ گامے شاہ کسی اور کے متعلق بتا سکے۔"

"گامے شاہ تک پہنچنا آسان نہیں۔" محسن بولا۔ "ایک تو ہمارے پاس کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس چالیس ہزار چہرۂ شاہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سکّۂ رائج الوقت اور اس کے لطف سے یہ بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ گامے شاہ واقعی انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے زیرِ زمین راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہم عقیدت مند بن کے حاضری دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنی موجودہ صورت میں ہم کو بھلا کون پہچان سکتا ہے۔ ایک اسٹین گن سُوٹ میں تو نہیں چھُپائی جا سکتی لیکن اس لُنگی کے اُوپر اور کھدّر کے اس ڈھیلے ڈھالے کُرتے کے نیچے تو ہم بھی بہت کچھ کی توپ باندھ کر لے جا سکتے ہیں۔ اس کو نکال لائیں زندہ سلامت تو بات بن جائے۔"

"وہ بھی دلاور کے پی اے کی طرح مر جانا قبول کرے گا۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"ہم اسے مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک بار تجربہ ہو گیا، اب یہ غلطی نہیں ہو گی۔"

ہم اپنی گفتگو میں اتنے مگن تھے کہ ہم نے ٹیڈی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ پھر اچانک میری نظر نے اُسے اپنے صندوق کو ٹٹولتے ہوئے دیکھا اور میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نہ صندوق ٹوٹا ہے اور نہ ہی کھُلا ہے۔ جب میں نے ٹیڈی کو گرایا تھا تو میرا مقصد اس شرارت سے یہ تھا کہ کسی طرح صندوق پر لپٹی ہوئی رسّی کٹ جائے یا اس کا ڈھکنا ٹوٹ جائے مگر محسن نکل آیا تو میں یہ بات بھُول گیا۔ اب پھر مجھے تجسّس نے آگھیرا کہ آخر اس صندوق میں کیا ہے کہ ٹیڈی اسے جان سے عزیز تر رکھتا ہے۔ صندوق پر رسّی کے بل اتنے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ کسی کُنڈی کی عدم موجودگی میں صندوق کھُل جانا چاہیے تھا لیکن صندوق اب بھی بند تھا اور ٹیڈی اس کو چاروں طرف سے دیکھ کر نہ جانے کس بات کا اطمینان کر رہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا اور ہم دبے پاؤں ٹیڈی کی طرف بڑھے۔ وہ اتنا بے خبر تھا کہ اُسے ہمارے سر پر پہنچ جانے کی خبر تک بھی نہ ہوئی اور پھر بیک وقت میں اور محسن صندوق پر جھپٹے۔

"میاں خوجی! آج تو ہم نے قسم کھائی تھی۔" میں نے کہا اور ٹیڈی کو ایک طرف دھکیل دیا۔

"کیا یہ پنڈورا کا باکس ہے؟" محسن بولا۔ "کہ تم اس کو کھولتے ہی نہیں۔"

ٹیڈی اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں اور محسن صندوق پر قبضہ کر چکے تھے لیکن ہماری یہ جدوجہد بے ثمر ثابت ہوئی۔ ہم صندوق کو کھول نہ سکے۔ میں نے اور محسن نے اسے ہر طرف سے اُلٹ پلٹ کے دیکھا لیکن وہ بند رہا۔ اس میں کوئی خفیہ تالا نہیں تھا اور تین فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا یہ ڈبا ہر طرف سے ایک ہی جیسا تھا۔ وہ جگہ جہاں ایک لکیر سی نظر آتی تھی اور جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈھکنا الگ ہے، وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اس لکیر کے ساتھ ساتھ ٹین کے باکس کو ٹانکے لگا کے ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ میں نے اور محسن نے خفت اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف اور پھر ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ مایوس، کچھ دل گرفتہ اور کچھ پریشان سا بیٹھا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا کہے۔

"یہ تو ہر طرف سے بند ہے!" میں نے صندوق پر ایک مکا مارا۔

"اور یہ تم ہمیں بھی دھوکا دے رہے تھے اُستاد؟" محسن نے کہا۔ "رسّی لپیٹ کر بے وقوف بنا رہے تھے!"

"محسن خان۔ یہ صندوق بھی دھوکا ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ سہلا کے کہا۔ "ایسے زنگ خوردہ اور پتلی چادر کے بنے ہوئے صندوق پر میں نے اتنی قوت سے مکّا مارا تھا کہ اس ضرب سے تو نئی چادر بھی اندر بیٹھ جاتی لیکن اس صندوق کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔"

"تم اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔" ٹیڈی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے اندر بارہ گیج کی فولادی چادر کا ایک باکس ہے۔ اُوپر والا ٹین صرف لفافہ ہے۔ بے شک پھاڑ کے دیکھ لو۔"

"یہ کیا اسرار ہے اُستاد؟" میں نے کہا اور تعجب سے محسن کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے اس پُراسرار صندوقچی کا راز؟" محسن نے میرے ساتھ ہی کہا۔ ٹیڈی منجمد بیٹھا اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کُترتا رہا۔ ہماری گفتگو میں دلچسپی کے باعث رابعہ بھی ہمارے قریب ہی آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "میں بتا چکا ہوں۔" اس کا لہجہ بالکل کھوکھلا تھا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری۔ ہم معلوم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "بس اتنا ہمیں بتا دو کہ اس صندوق میں شاہِ جنّات تو قید نہیں ہیں؟"

"یا پھر یہ کوئی بم تو نہیں ہے کہ دھماکا ایک ہو اور بیوہ دو کو کر دے، بیوی بننے سے پہلے ہی؟" محسن بولا۔

دروازے پر دستک نے ہمیں صندوق کے راز سے واقفیت کی خواہش سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک نظر دلاور کے پی اے کی طرف دیکھا جس کی لاش کمرے کے آخری کونے میں بالکل سیدھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رابعہ کو مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کیا۔ خود ایک ریوالور لے کر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ گیا اور پھر محسن خان شیروانی نے دروازہ کھولا۔

"ہم سب دیکھ رہے تھے باہر سے۔" مرزا غالب نے مسّرت سے اعلان کیا۔ "دروازے کی جھری میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ماشا اللہ سب بہت محتاط ہو اور ہوشیار بھی۔"

"بہت دیر کی مہربان آتے آتے۔" میں نے ریوالور کو ڈب میں ڈال کر کہا۔

"ارے بھائی! خُدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ بالآخر صحیح جگہ پہنچے۔" غالب نے اندر آ کے بیرک پر ایک نظر ڈالی۔ "ورنہ ایسی ہی جگہ تھی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وہ بھی۔ جہاں سے ہم کوئی دس منٹ پہلے نکالے گئے۔ بلکہ باہر پھینکے گئے تھے۔"

"کیا ضرورت تھی تصدیق کیے بغیر وہاں گھسنے کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "نام یاد نہیں رہا تھا کیا؟"

"کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی یہ" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "اس پہ بھی کچھ فرنیچر فیکٹری ہی لکھا ہوا تھا۔ ان کی بھی غلطی تھی نا یار دروازے کھلے رکھ کے بیٹھے تھے۔"

"تم کو سوچنا چاہیے تھا کہ ہم کبھی دروازے کھلے نہیں چھوڑ سکتے۔" میں نے کہا۔ "خیر یہ بتاؤ خبر کیا لائے ہو؟"

"خبر؟" غالب نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "وہ تو میں بالکل بھول ہی گیا۔"

"کیا بھول گیا یعنی یہ بھول گئے کہ تم کو کہاں جانا تھا اور کیا کرنا تھا!" میں نے جھلّا کر کہا۔

"ارے نہیں یار۔ وہ خبر تو باہر ہی رہ گئی۔" غالب دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"پہلے بتاؤ کون ہے باہر؟" میں نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔

"ارے بھئی بڑی اچھی خبر ہے۔" غالب مسکرایا۔ "کم از کم ہمیں تو بہت اچھی لگی۔ نازو ہے اس کا نام بلکہ اس خبر کی سُرخی ہے جو اس کے لبوں پر لپ اسٹک بن کر پھیلی ہوئی ہے اور رُخسار کے عارض۔۔۔"

"تم اسے یہاں لے آئے!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم سے پوچھے بغیر؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے سکندر۔" رابعہ نے آگے آ کے کہا۔

"وہ بے چاری کیا باہر کھڑی رہے گی۔" اس نے دروازہ کھول دیا۔ غالب باہر گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ میں اور محسن پیچھے ہٹ گئے۔

"میں نے تم سے کہا تھا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے مجھے یاد دلانا چاہا۔

"ہاں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا لیکن اسے میں نہیں لے کر آیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ غالب نے اچھا نہیں کیا۔" محسن سوچتے ہوئے بولا۔

اتنی دیر میں نازو نے اندر قدم رکھا۔ اُس نے ایک نظر مجھے پھر محسن اور رابعہ کو دیکھا۔

"کیا تم لوگ خوش نہیں ہو میرے آنے سے؟" وہ ہم سب کی سنجیدہ صُورت دیکھ کر بولی۔

"تمھارا یہاں آنا کسی بھی صُورت میں مناسب نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر میں اکیلی نہیں آئی ہُوں۔" وہ بولی۔ "بھیّا بھی ساتھ آئے ہیں۔"

یک لخت مجھے بجلی کا جھٹکا لگا۔ "کون۔۔۔ اکرام شیخ۔۔۔!" میں نے کہا اور اس کے بعد بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پر چلا گیا۔

"ہاں میں۔" اکرام شیخ نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "مگر میں دوست بن کے آیا ہوں۔"

میں اور محسن دم بخود کھڑے رہ گئے مجھے غالب پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے اس کو مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ نادان کی دوستی جی کا جنجال۔ وہ میدانِ صحافت کا شہسوار، کاغذ کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑانے والا ذہین تھا مخلص تھا اور جرأت مند بھی تھا۔ اس کی زندگی کے تجربات شاید ہم سے بھی زیادہ تھے اور وہ شریف نظر آنے والا بہت بڑا بدمعاش بھی تھا مگر اس کو اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے دوست کون ہیں اور دشمن کون۔۔۔ ہم ہر کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے اور اکرام شیخ کو ہم پرکھ چکے تھے وہ اپنی سرشت کے اعتبار سے قانون پرست تھا ہمارا دوست کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم اور وہ دریا کے دو کنارے تھے جن کے درمیان بُعد ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

"دوستی کے نام پر ہم دشمنوں کے فریب میں آنے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور لائٹ جلا دی۔

"اور زبانی دعوے سے نہ کسی کی دوستی ثابت ہوتی ہے نہ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس دعوے کو پرکھ سکیں۔" محسن نے کہا۔

"قصور تمھارا نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے ندامت زدہ لہجے میں کہا۔ "تمھارے حالات کا ہے کہ تم رسّی کو بھی سانپ سمجھ کے ڈرتے ہو۔"

"اور بہ زبانِ غالب۔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہُوں۔" غالب نے کہا۔

"ہماری جگہ تم ہوتے تو بِلا سوچے سمجھے اعتماد کرنے کی غلطی کر سکتے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن میرے بارے میں تم جانتے ہو۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہاں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم ایک انتہائی ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر ہو۔"

"میں پولیس افسر تھا مگر اب استعفا دے چکا ہُوں۔" شیخ نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی تم کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "کل تک تم کچھ اور کہتے تھے اور بالکل مختلف لہجے میں بات کرتے تھے۔"

"میں کل بھی تمھارا دوست تھا اور میں نے۔۔۔"

"کل ہم سے زیادہ تم قانون کے دوست تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جب انتخاب کا وقت آیا تھا تو تم نے ہماری دوستی کو اپنی فطرت کے تقاضوں پر قربان کر دیا تھا۔ قانون کے تقاضوں کو تم بلا چون وچرا پُورا کرتے تھے اور اپنے فرض کی راہ میں کسی رشتے کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کیا میں وہ وقت بھول سکتا ہُوں جب تم نے نازو کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا؟"

"میں اپنی اس غلطی، اس گناہ یا جرم کا کفّارہ ادا کرنا چاہتا ہُوں۔" وہ بولا۔

"کفّارہ؟" میں نے طنز سے کہا۔ "بچھّو اگر کسی کو ڈنک مارنے کے بعد یہ کہے کہ سوری۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا تو میں اسے بھول کی طرح بے ضرر سمجھتے ہوئے ہتھیلی پر نہیں بٹھا لوں گا۔ مجھے تو شک ہے کہ کفّارہ تم اس کوتاہی کا ادا کرنا چاہتے ہو جو تم سے ایک مجرم کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ جو تمھاری گرفت میں آ کے نکل گیا تھا۔ تمھاری فطرت میں اتنا بڑا انقلاب۔۔۔"

"سکندر۔۔۔۔۔! یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔" نازو نے چلّا کر کہا۔

"تم مت بولو نازو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔" میں نے برہمی سے کہا لیکن اپنی نظر شیخ پر رکھی اور اپنے ریوالور کا رخ بھی نہیں بدلا۔ محسن اور رابعہ کے ساتھ اب ٹیڈی بھی آ کھڑا ہُوا تھا اور برائے نام روشنی میں اندر کھڑے ہوئے افراد کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک طرف ہم چار تھے جن کے درمیان خیالات و نظریات قول و فعل اور جذبات و احساسات کی مکمل ہم آہنگی تھی اور ناقابلِ شکست اعتماد کا رشتہ تھا۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے تین افراد میں سے غالب نے خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر دیا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جلد بازی کے باعث اور انجانے میں ایک غلطی کر بیٹھا تھا اور خود کو صفِ مجرماں میں پا کے برہم بھی تھا اور شرمسار بھی۔ نازو قدرتی طور پر ایک جذباتی صدمے سے دوچار تھی کہ ابھی تک وہ مجھے اپنی نیّت کے خلوص کا یقین نہیں دلا سکی لیکن بات اس کی نہیں اس کے بھائی کی تھی۔ نازو کو یہ دُکھ تھا کہ میں نے اس کے کہنے کے باوجود اس کے بھائی پہ اعتبار نہیں کیا۔ یہ اُس کی اور میری سوچ کا نہیں نظر کا فرق تھا۔

وہ اکرام شیخ کو بہن کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ میں اکرام شیخ کو ایک اچھا آدمی ضرور سمجھتا تھا لیکن اسے موجودہ حالات میں اپنا دوست تسلیم کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ وقت بدل گیا تھا جب میرے اور اس کے درمیان پُرخلوص دوستی کا قابلِ رشک رشتہ تھا۔ میرا ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ وقت کے ساتھ کسی کی فطرت بھی بدل سکتی ہے۔ چنانچہ میں تذبذب کا شکار تھا تو یہ ایک قدرتی ردِ عمل تھا۔

"اچھا۔" اکرام شیخ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اب تو میں یہاں آ گیا ہوں۔ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو تمھیں اختیار ہے۔ میرا ضمیر صاف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی غلطی کی ہو۔"

"تمھارا ضمیر اس وقت بھی صاف تھا جب تم نے دوستی کو بھلا کے مجھے ایک مجرم کی حیثیت سے زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس وقت بھی تم یہ سمجھتے تھے کہ تم غلطی پہ نہیں ہو۔"

"غلطی مجھ سے ہوئی کہ تمھیں یہاں لا کے بے آبرو کیا۔" غالب نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ آبرو کا نہیں، زندگی یا موت کا سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اچھے انسان ہیں لیکن ہمارے درمیان آج کے رشتوں کی نوعیت مختلف ہے اور رشتوں کی پہچان وقت کے ساتھ ہوتی ہے جب مجھے یہ ڈر نہیں ہو گا کہ تمھارے خلوص میں کوئی کھوٹ نہیں، تم نیک نیّتی کے ساتھ مجھے گرفتار کرنے نہیں بلکہ میری مدد کرنے آئے ہو اور دوست کے پردے میں درحقیقت کوئی پولیس افسر چھُپ کر نہیں آیا ہے تو میں اسی طرح تم پر اعتماد کروں گا جیسے اِس سے پہلے کرتا تھا اور جیسے آج محسن پر کرتا ہُوں۔"

"اور مجھ پہ نہیں کرتے؟ ابھی تک نہیں کرتے!" غالب نے برافروختہ ہو کے کہا۔

"محسن کا نام تو مثال دینے کے لیے تھا ورنہ تم ہو، ٹیڈی ہے، رابعہ اور شہلا ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کس طرح خود کو اعتماد کا اہل ثابت کر سکتا ہُوں؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "اپنی نیّت کے صاف ہونے کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"اس کا کوئی ایسا ٹیسٹ نہیں جو نصاب کے مطابق ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے عمل سے تم بہت کچھ ثابت کر سکتے ہو۔ پیشہ ور افراد کسی کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہیں تو اس کی آزمائش بھی کرتے ہیں۔ تم ہمیں جرائم پیشہ افراد کا گروہ فرض کر لو۔ یہ تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہمیں دیکھنا ہی پڑے گا کہ تم میں مجرمانہ صلاحیت کتنی ہے اور کہیں مجرم کے بھیس میں تم مخبر تو نہیں ہو۔ ہمارا اطمینان ہونے تک تم کو محتاط رہنا ہوگا۔ محسن، شیخ صاحب کی تلاشی لے۔"

"تمھارا رویہ بہت ہتک آمیز ہے سکندر۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"یہ احتیاط کا تقاضا ہے جسے میں تمھاری خاطر نظر انداز نہیں کروں گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "تم اور غالب ایک طرف ہو جاؤ۔ تم اپنے ہاتھ اُٹھا لو شیخ اور اس بات کو ذہن میں رکھو کہ جس طرح تم نے ضرورت پڑنے پر گولی چلاتے ہوئے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، ایسے ہی میں بھی سوچوں گا نہیں۔ میری اُنگلی ٹرائیگر پر ہے۔"

شیخ نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ اُٹھا دیے۔ محسن نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی اور اس کی جیب میں سے ایک ریوالور کے علاوہ باقی چیزیں بھی نکال لیں۔ نازو کا چہرہ آتشِ قہر و غضب سے لال بھبھو کا ہو رہا تھا، غالب کا رنگ خفّت سے زرد تھا مگر ٹیڈی خوش تھا کہ میں نے اس کے مشورے کو قابلِ غور سمجھا۔

"صرف ریوالور اپنے پاس رکھو، باقی چیزیں اکرام شیخ کو دے دو۔" میں نے کہا اور محسن نے میرے احکامات کی اس طرح تعمیل کی جیسے میں دہشت پسندوں کی کسی تنظیم کا کمانڈر ہوں۔ پھر میں نے بھی اپنا ریوالور ہاتھ میں رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ کشیدگی کی فضا جو میرے غیر دوستانہ رویّے سے پیدا ہوئی تھی پھر بھی برقرار رہی۔

"ہم یہ سمجھتے تھے کہ اپنا چہرہ بدل کے اور اس محفوظ مقام پر سکونت اختیار کرنے کے بعد فوری طور پہ ہمارے لیے خطرے کی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تحفظ کا یہ احساس پہلے کی طرح اطمینان بخش نہیں رہا۔"

"تم بتاؤ کہ مجھے تمھارے اطمینان کے لیے کیا کرنا ہوگا؟" اکرام شیخ نے تلخی سے کہا۔

"اس کمرے کے آخر میں دیکھو۔" میں نے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "کچھ نظر آتا ہے؟"

اکرام شیخ نے گھور کر دیکھا۔ "یہ... یہ کون سو رہا ہے اُدھر...؟"

"ایک بدبخت، جس نے زندگی حرام کی اور پھر اپنے لیے حرام موت قبول کی۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ "کون ہے یہ؟ میں اسے نہیں جانتا۔"

"یہ چوہدری دلاور کا سیکریٹری تھا۔" میں نے کہا۔ "نازو اس کو پہچان لے گی۔"

"یہ... یہ تو دہی ہے بھیّا۔" نازو نے قریب جا کے بھائی کا بازو تھام لیا۔ "یہی تو اسٹین گن لے کے اُترا تھا۔"

"اس کو قتل کس نے کیا ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"اب بھی پولیس کے لہجے میں ہی سوال کر رہے ہو؟" محسن بولا۔ "اس کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم اسے قتل کر دیتے لیکن اس نے خود کو عذاب سے محفوظ رکھا۔"

"اب ہم نے طے کیا ہے کہ اس لاش کو جائے واردات کے قریب ڈال دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ لاش کل تک دریافت ہو جائے اور سمجھا یہ جائے کہ اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔ تم یہ کام کر سکتے ہو...؟"

"کون سا کام؟" اکرام شیخ چونک کر پیچھے ہٹا۔

"یہی کہ اس لاش کو لے جاؤ اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے صحیح جگہ ڈال آؤ۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ میرے پاس تو کوئی گاڑی بھی نہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے وسائل خود پیدا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ ابھی تک تم دوستوں سے محروم نہیں ہوئے ہو۔ کوئی بھی تمھاری مدد سے انکار نہیں کر سکتا۔"

اکرام شیخ نے فرداً فرداً ہم سب کے چہروں کو دیکھا۔ "اگر میں پکڑا گیا...؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"ہم تمھاری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "اُلٹا ہمیں یہ جگہ چھوڑ کے فرار ہونا پڑے گا۔ یہ تمھاری ہمّت کے لیے ہی نہیں، عقل اور ذہانت کے لیے بھی ایک چیلنج ہوگا کہ خود کو بھی محفوظ رکھو اور ہمیں بھی۔"

"ٹھیک ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں جاتا ہوں۔ کوئی گاڑی منگواتا ہوں یا خود لے کر آتا ہوں۔"

"ہم کو غافل یا کمزور مت سمجھنا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ساتھ اگر مسلح پولیس کی پلاٹون آجائے تب بھی ہمیں آسانی سے نہیں پکڑ سکے گی۔ بہت کشت و خون ہوگا اور ہم زندہ ہاتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم سے مطلب ہے، تمھارے علاوہ ہم چھ افراد جن میں نازو بھی شامل ہے۔ یہ پہلی آزمائش ہے بشرطِ کامیابی اصل مرحلہ کل درپیش ہوگا۔"

"اور ہمارے ساتھ ہر مرحلے میں کامیابی کا مطلب زندگی اور ناکامی کا مطلب موت ہو سکتا ہے۔" محسن خان شیروانی نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اکرام شیخ نے سر ہلایا پھر دروازے کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔ "مجھے اپنی حفاظت کے لیے ضبط شدہ ریوالور تو دے دو۔"

"اگر اپنی حفاظت کے لیے چاہیے تو ضرور لے جاؤ۔" میں نے کہا اور محسن نے ریوالور اس کی طرف اُچھال دیا۔ اکرام شیخ نے ریوالور کو کیچ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" بوجھل خاموشی کو نازو کی آواز نے ختم کیا۔

"ابھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا اچھا ہُوا اور کیا بُرا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہو سکتا ہے کل خود تم کہو کہ میں نے اچھا کیا تھا۔ تمھارا بھائی میرا بہت قابلِ اعتماد دوست تھا مگر آج میں خود کسی کے لیے قابلِ اعتماد نہیں رہا تو میں آگے بڑھنے والے ہر ہاتھ سے ڈرتا ہوں کہ میری دستگیری کرنے والا ہاتھ کس کا ہے اور میرے دامن تک پہنچنے والا کس کا۔ اگر اکرام شیخ نے واقعی فیصلہ کر لیا ہے کہ میری دوستی زیادہ اہم ہے تو اسے مجھ سے زیادہ جاں نثار دوست بھی کوئی نہ ملے گا اور دوستی کی آڑ میں یہ دشمنی کی چال ہے تو مجھ سے زیادہ خطرناک دشمن بھی اس کا کوئی نہ ہوگا۔ اس میں جو کچھ کرنا ہے تمھارے بھائی کو کرنا ہے۔ میرے ردِّعمل کا انحصار اس کے رویّے پر ہے۔"

"اس نے تمھاری شرط قبول کر لی ہے۔" نازو نے ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میرا بھائی مُنافق نہیں ہے۔ کل جو کچھ وہ کرتا تھا یقینِ کامل کے ساتھ خود کو یا کسی اور کو دھوکا دیے بغیر مردانہ وار کرتا تھا۔ آج بھی اس نے ثابت کر دیا کہ وہ میرا بھائی ہے۔"

میں ہنسا۔ "تم نے بھی تو ثابت کر دیا تھا کہ تم کس کی بہن ہو۔"

"طوفان کی بہن بجلی۔" غالب نے ایک گہری سانس لے کر یوں کہا کہ اتنی کشیدگی کے باوجود سب کے لبوں پر ہنسی آگئی اور پھر نازو ایک گہری سانس لے کر اُسی جگہ فرش پر بیٹھ گئی۔

"اُف! ارے غضب خُدا کا۔" غالب نے کہا۔ "اپنی قبائے ریشم اور اس رنگِ پیراہن کو خاک میں ملا دیا۔"

"یہاں سب کو خاک ہونا ہے مرزا غالب۔" نازو نے کہا۔ "عرش نشینوں کو بھی اور فرش نشینوں کو بھی۔" پھر اس سے پہلے کہ مرزا غالب اس فتنۂ محشر کی اس شعلہ بیانی پر مزید فریفتہ ہوتے، اس نے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مرزا غالب بھد سے اس کے قریب گرا۔ فرش سے نہ جانے کب کی جمی ہوئی دھول اُڑی۔ اس کی حالت اور اس کا چہرہ دیکھ کر میں ہنسا اور میں نے محسن کو کھینچ لیا۔ ٹیڈی ایک دم خود قلندرانہ شان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"فرض کر لو کہ یہاں وال ٹو وال کارپٹ ہے۔" میں نے رابعہ کو تذبذب میں دیکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فرض ہی کرنا ہے تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ بکنگھم پیلس ہے اور ہم سب شاہی خاندان کے افراد ہیں۔" محسن بولا۔

"شاہی خاندان!" غالب نے حقارت سے کہا۔ "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے اس خاک کے پُتلے اور پانی کے بُلبلے کا کیا حشر کیا جس کو میں تمھارے سپُرد کر آیا تھا؟" میں نے نازو سے مخاطب ہو کے کہا۔

"اس کا حشر تو باقی سب کا حشر دیکھ کر ہی خراب ہو گیا تھا۔" نازو بولی۔ "جب تم نکل گئے تو میں نے اس کی تھوڑی سی پٹائی کی اور اس کے بعد وہ فوراً ہی معافی مانگنے پر اُتر آیا۔"

"پھر...؟ مُعاف کر دیا تم نے اُسے...؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں تو چاہتی تھی کہ جو ہُوا سو ہُوا، اب نکل جانا چاہیے۔" نازو بولی۔ "لیکن وہاں میرے ہمدرد بہت جمع ہو گئے تھے۔"

"ہمدرد کا لفظ ذرا... متنازع ہے، جمع ہونے والوں کے صحیح جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا۔" غالب نے کھنکار کر کہا۔

"ان کے صحیح جذبات نے ہی تو مجھے مشکل میں ڈالا۔" نازو نے غالب کو ڈانٹ کے کہا۔ "سب تم جیسے کھڑے تھے۔ آگئے تھے بعد میں مجرم کو پکڑ کر تھانے لے جانے کی بہادری کا مظاہرہ کرنے۔ میں نے بہت کہا کہ بابا مجھے جانے دو۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں لیکن بدقسمتی سے کسی نے پولیس کو فون کر دیا تھا، وہ اپنی کوٹھی میں سے یہ مار دھاڑ دیکھ رہا تھا اور پولیس آگئی۔ انھوں نے لاش کو دیکھتے ہی ضابطے کی کارروائی شروع کر دی کہ یہ کیسے مرا اور کیوں مرا۔ میں نے بہت کہا کہ اسی سے پوچھو لیکن وہ نہ مانے۔ اصل عینی شاہد تو پولیس کو دیکھتے ہی فرار ہو گئے تھے۔ باقی سب نے بھی یہی کہا کہ انھیں کچھ نہیں معلوم۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اب ظاہر ہے پولیس یہ تو نہیں مان سکتی کہ مرنے والا طبعی موت مرا اور ایک شخص جو واویلا کر رہا ہے وہ بلا وجہ کر رہا ہے۔ پولیس لاش اور اس نیم جان کو جلوس کی صورت میں تھانے لے گئی۔ جلوس میں باقی تماشائی تھے۔ پولیس ان سب کو عینی گواہ بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ جنھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"تمھارے سوا کسی کو نظر بھی کیا آتا۔" غالب نے کہا۔ "آنکھیں خیرہ ہو گئی ہوں گی۔"

"میں ایف آئی آر سنا رہی ہوں اور تم شاعری کر رہے ہو۔" نازو نے کہا اور غالب نے جس طرح سر کھجایا اس سے سب محظوظ ہوئے۔

"جس شخص نے فون کیا تھا وہ سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ کیا ہے ضرب المثل، بھس میں چنگاری ڈال جمالو دور کھڑی۔" نازو بولی۔ "اس نے تھانے میں بھی فون کیا کہ فساد کی جڑ صرف وہی لڑکی ہے یعنی یہ خاکسار... ! ہے نا غضب؟"

"بجا ارشاد بی جمالو۔ زمانہ ایسا ہے کہ کسی کو سچ بولنا ہی نہیں چاہیے۔" غالب نے اتفاق کیا۔

"تھانیدار میری گرفتاری کے خیال سے خاصا خوش تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے کیا معلوم وہاں کیا ہوا تھا۔ میں تو بس وہاں سے گزر رہی تھی، لوگوں کو جمع دیکھا تو رک گئی۔" نازو نے کہا۔ "جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی ماننے پر آمادہ نہیں تو میں نے کہا کہ اچھا آپ ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے فون کر کے پوچھ لیں۔ وہ میرے ضامن نہ ہوں تو آپ کو اختیار ہے کہ بند کر دیں۔ تھانیدار کی ساری اکڑفوں غائب ہو گئی۔ پھر میں نے کہا کہ اے ایس آئی اکرام شیخ میرا بڑا بھائی ہے۔ اُسے غالباً استعفے کے منظور ہو جانے کی خبر نہیں تھی۔ اُس نے کہا کہ اچھا بی بی! آپ جائیں۔ ہم کسی اور کو ملزم بناتے ہیں۔ ایک ملزم تو ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی تھا مگر ملزم تھا۔ وہ اسی کو بجاتے رہے اور کچھ زیادتی کر گئے کہ وہ مر گیا۔"

"پولیس کی مار سے مر گیا... ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ کیا پولیس کی مار سے لوگ مرتے نہیں ہیں؟" نازو نے حیران ہو کے کہا۔ "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"تمھارے سامنے مارا تھا اسے؟" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"نہیں میرے سامنے تو نہیں۔" نازو بولی۔ "لیکن میں وہیں تھی جب ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اُس نے تھانیدار کے کان میں کچھ کہا اور تھانیدار بھی پریشان ہو کے اُٹھا۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہو گیا کہ تشدد کے دوران میں کوئی ضرب کاری پڑ گئی اور وہ بے چارہ جاں بحق ہو گیا۔ تھانیدار کے سامنے سب قسمیں کھا رہے تھے کہ ابھی تو ریہرسل بھی شروع نہیں ہوئی تھی، تمہید کے طور پر دو چار چھتر رسید کیے تھے۔ وہ کچھ تھا ہی نازک یا بیمار تھا اور اسے مرنا ہی تھا۔" نازو کے بیان نے میرے شبہات کی تصدیق کر دی تھی کہ دوسرا آدمی بھی خودکشی سے مرا تھا۔

"ان پولیس والوں کی دفاعی منطق ایسی ہی ہوتی ہے۔" غالب نے اتفاق کیا۔ "ثابت یہ کرتے ہیں کہ موت کا ایک دن معین ہے اور اگر کوئی اس دن تھانے پہنچ کے فوت ہو جائے تو پولیس خواہ مخواہ بدنام ہو جاتی ہے۔ اچھے خاصے صحت مند آدمی کے بارے میں سند بھی لے آتے ہیں کہ یہ مرض الموت میں مبتلا تھا یا نفسیاتی مریض تھا جس نے طے کر رکھا تھا کہ تھانے میں خودکشی ضرور کرنی ہے تاکہ پولیس کا امیج خراب ہو۔"

"تمھارا اور مرزا غالب کا ملنا تو سمجھ میں آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں... کیا یہ بھی ستاروں کا کھیل ہے؟" محسن نے کہا۔ "اور جن کو ملنا ہو وہ تھانے میں بھی مل جاتے ہیں۔"

مرزا غالب نے دانت نکال کے مسرت کا اظہار کیا اور نازو کی طرف دیکھا جو محسن کے غلط مطلب نکالنے پر کچھ برہم نظر آ رہی تھی۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمھارے بھیا کہاں سے ساتھ ہو گئے؟ کیا وہ بھی تھانے میں موجود تھے؟" میں نے نازو سے کہا۔

"نہیں۔ میں وہاں سے روانہ ہونے کو تھی کہ یہ پہنچے۔" نازو نے کہا۔ "مجھے پہچانتے تو تھے نہیں۔ مجھ سے ہی پوچھنے لگے کہ کیا آپ مس نازلی کے ساتھ ہیں۔ میں نے مذاق میں پوچھا کہ یہ نازلی کیا بلا ہے تو کہنے لگے کہ بھائی وہ بلا ہی تو ہے، آتش فشاں ہے اور مار دھاڑ سے لبریز عہدِ قدیم کی ہیروئن نادیا کا نیا ایڈیشن ہے۔ مار دھاڑ کو جوتی کی نوک پہ مارتی ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اپنا تعارف عملی طور پر کرا دوں مگر پھر مجھے خیال آ گیا کہ میں تھانے کی حدود میں ہوں جہاں ابھی ابھی میں نے خود کو شرافت کا پیکر اور قطعی طور پہ بے ضرر ثابت کیا ہے۔"

"واللہ ہم تو دریائے حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہو گی کوئی چھ فٹ قد کی روڈ رولر ٹائپ چیز۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اس نزاکت اور قد و قامت اور اس حسن و لطافت سے قتلِ عام کا خیال تو آتا ہے مگر جنگ و جدل کا نہیں۔"

خلافِ توقع غالب کے اس بے باکانہ خراجِ تحسین نے نازو کو برہم نہیں کیا۔ عورت بہرحال عورت ہے۔ میں نے سوچا اپنی تعریف سن کے خوش ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کے نازو انداز اور عشوہ طرازِ حسن نے اور اس کی ساحرانہ معصومیت نے غالب کے عقل و نظر کو اور ہوش و خرد کو جنوں میں مبتلا کر دیا ہے لیکن نازو ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی کی باتوں سے متاثر ہو جائے۔ عجیب اتفاق یہ تھا کہ خود مرزا غالب کی شخصیت کا ظاہر بہت دھوکا دیتا تھا اور خود ہم جو اُس کے ساتھ روز و شب کی رفاقت رکھتے تھے اُس کے نام، پیشے اور اس کی باتوں سے فرض کر بیٹھے تھے کہ وہ احمق اور بزدل قسم کا عملی طور پر ناکارہ شخص ہے۔ وقت پڑنے پر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ ہمارے اندازے کتنے غلط تھے۔ نازو اور مرزا غالب میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں یکساں خطرناک تھے مگر وہ ایک جیسے بے ضرر نظر آتے تھے۔ چنانچہ صورت سے غلط فہمی کا شکار ہونے والا مارا جاتا تھا۔ ابھی تک نازو بھی وہی سمجھ رہی تھی جو ہم سمجھے تھے جس دن غالب کا دوسرا روپ سامنے آئے گا اس دن وہ کتنی حیران ہو گی۔ شاید اتنی ہی جتنا غالب اس کی صورت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"خیر، میں نے تسلیم کیا کہ آپ کی نظر کو جس کی تلاش تھی اور جسے ڈھونڈتے ہوئے آپ یہاں تک آ پہنچے ہیں...." نازو بولی مگر اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"گویا کوئے یار سے سوئے دار تک آ پہنچے ہیں۔ خیر آگے کہیے۔" غالب نے دخل در معقولات اور معذرت ایک ساتھ ہی کی۔

"پھر انھوں نے بتایا کہ تم کو میری طرف سے پریشانی لاحق ہے۔" نازو نے کہا۔

"پریشانی نہیں، تشویش۔" اب محسن نے بات کاٹی۔ "کیوں رابعہ بی بی! تشویش کی تفتیش۔"

"ان لوگوں کی زبان ان کے قابو میں نہیں اور یہ خود بھی کسی کے قابو میں نہیں ہیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بولنے دو انھیں۔"

"میں نے پوچھا کہ سب لوگ ہیں کہاں؟" نازو نے مطمئن ہو کے کہا۔ "تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ابھی میں بھی نہیں جانتا لیکن نقشہ میرے پاس ہے تو میں نے کہا کہ پھر کیا مسئلہ ہے۔"

"وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" محسن خان شیروانی نے تسلیم بجا لا کے کہا اور میری جوابی کارروائی کے ڈر سے مجھ سے ذرا دور ہٹ گیا۔

"قصہ مختصر... میں نے کہا بھیا بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں اور یہ بتایا کہ وہ بھی بہت مخلص اور جاں نثار دوست ہیں تو اپنے غالب صاحب نے کہا کہ دوستوں کی تو ہمیں اشد ضرورت ہے۔" نازو بولی۔ "میں نے گھر فون کیا اور ان سے کہا کہ بھئی انتظار اور بھوک، دونوں کام مشکل ہیں۔ یہ فرمانے لگے کہ جب جیب خالی ہو تو آدمی کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مجبوراً میں ہی ان کو لنچ کے لیے لے گئی اور پھر بھیا صاحب بھی وہیں پر آ گئے، مجھے ڈانٹنے اور بل ادا کرنے کے لیے۔"

"گویا دیر اس لیے ہوئی کہ جناب دعوت اُڑا رہے تھے؟" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا۔

"جتنا خوار انسان کو اُس کا پاپی پیٹ کرتا ہے اُتنا دلِ بیمار بھی نہیں کرتا۔" مرزا غالب نے ایک آہِ سرد کے ساتھ فرمایا۔

"اب مسئلہ یہ ہے نازو کہ جس حال میں ہم ہیں، وہ خود ہمارے لیے باعثِ عبرت ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو ان معاملات سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ہم سب تو بے گھر لوگ ہیں... خانہ بدوش اور جاں بکف پھرتے ہیں۔ ایک گھر محسن کا تھا جو ماں کی وفات اور بہن کی رخصتی کے بعد خالی ہو گیا کیونکہ والد اسپتال میں ہیں۔ خواجہ نیک محمد نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ رابعہ کا گھر تباہ کر دیا گیا اور میرا گھر مجھ سے چھین لیا گیا۔ چنانچہ ہم اور خانہ خرابی کے سامان لازم و ملزوم ہیں۔ تم بہت بلند حوصلہ اور بڑی بہادر لڑکی ہو لیکن تمھارے والدین بھی ہیں اور...."

"وہ مجھے اور بھیا کو ہمیشہ یہی تعلیم دیتے تھے کہ راہِ حق میں کسی قربانی سے دریغ کرو گے تو اس الزام کی شرمندگی مجھے ہو گی اور ضمیر کی آواز نہیں سنو گے، تب بھی مجرم میں خود کو سمجھوں گا کہ میں تمھاری شخصیت اور کردار کی صحیح تعمیر نہ کر سکا۔ تم نے مفاد پرست، بزدل یا خود غرض ہونے کا ثبوت دیا تو مجھے احساس ہو گا کہ مجھ سے تمھاری تربیت میں کوتاہی ہوئی۔ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تم نے بھیا کے کردار کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بدکھاہے، آبا ان پر فخر کرتے تھے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ تمہارے کسی فعل سے تمہارے والد کی بدنامی ہوئی، ان کو دُنیا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا، ان پر الزام آیا کہ اُن کی بیٹی ایسے افراد کا ساتھ دیتی رہی ہے جو قانون کی نظر میں مجرم ہیں اور ان کا بیٹا بھی قانون کی محافظت کا فرض ادا کرتے کرتے قانون شکن عناصر کا آلۂ کار بن گیا ہے تو کیا انھیں دُکھ نہیں ہوگا؟ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، ہمارے نقطۂ نظر سے دُرست ہے لیکن پھر بھی قانون کی خلاف ورزی کہلاتا ہے۔ وجہ تم جانتی ہو۔ اصل مجرموں نے قانون کی پُشت پناہی حاصل کر لی ہے۔ ہوئے ہیں اہلِ ہوس مدّعی بھی، منصف بھی۔ چنانچہ ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ ہمیں مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں کیونکہ ہم ان کے معزّز اور شریفانہ چہروں سے نقاب ہٹا کے ان کا مکرُوہ اور گھناؤنا چہرہ دُنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قانون غلط ہے یا پھر انصاف کرنے والے نادان ہیں، ساری بات یہ ہے کہ قانون بہت مظلوم ہو گیا ہے۔ اس کو غلط استعمال کیا جا رہا ہے اور اس کا غلط مطلب نکالنے والے بے ضمیر لوگ قانون کو کمزور کی حفاظت کے لیے استعمال نہیں کر رہے ہیں، کمزور کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ وقت آئے گا جب ہم مجرموں کے خلاف ثبوت اور شہادت جمع کر لیں گے تو خود عدالت میں حاضر ہو جائیں گے اور اپنے ملک و قوم کے اور انسانیت کے ان دُشمنوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے اور مارے گئے تو کیا۔ ہمارا مقصد تو زندہ رہے گا۔"

"قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم... اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے۔" غالب نے جذباتی ہو کر کہا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہُوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اپنے والدین کی خاطر ہمارے ساتھ مت رہو ورنہ اس بڑھاپے میں ان کی مٹی پلید ہو گی۔ ان کو تھانوں میں گھسیٹا جائے گا، ذلیل کیا جائے گا۔ شکاری ان کے پیچھے لگ جائیں گے تو ان کا جینا اجیرن کر دیں گے۔ تمام عمر کی کمائی ان سے چھین لیں گے۔ زندگی کی جدوجہد کا حاصل یہ سُکھ چین ہے جو اُن کو بڑی مشکل سے ملا ہے اور وہ تم ہو، تمہارا بھائی ہے۔ یہ سب نہ رہا تو وہ کتنے دُکھی ہوں گے اور خدانخواستہ مرتے وقت ان کے لیے صرف تمہارے دیے ہوئے پچھتاوے اور عذاب ہوں گے تو تم سے زیادہ یہ ہم سب کے لیے ندامت کی بات ہو گی۔

ہم خود کو ان کا مجرم سمجھیں گے کہ ان پر جو افتاد آئی، اُس کا سبب ہم تھے اور ہماری دیوانگی تھی۔ تم اپنے گھر جاؤ تاکہ ان کی عزّت و آبرو اور ان کے بڑھاپے کا سکھ چین غارت نہ ہو۔"

"گویا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔" نازو نے سخت دل گرفتہ اور مایوس لہجے میں کہا۔

"کرنے کا کیا مطلب! جب آدمی کسی کے لیے نیک تمنائیں رکھتا ہے تو بہت کچھ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اخلاقی سہارا دیتا ہے، تب بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ تم ہماری کامیابی کے لیے دُعا کر سکتی ہو۔"

"صرف دُعا!" نازو نے اسی افسوس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔ دُعا بھی بہت بڑی طاقت ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جو دُعا نیّت کے خلُوص اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے مانگی جائے، دُنیاوی دولت و جاہ و حشم کے لیے نہ مانگی جائے، صرف راہِ حق و انصاف پر چلنے والوں کے لیے ربّ العالمین کی رحمت کی خاطر مانگی جائے، وہ مستجاب ہوتی ہے اور مشکل وقت میں کام آتی ہے۔ ابدی شہرت رکھنے والے نابینا شاعر مِلٹن نے کیا کہا تھا کہ خدمت تو وہ بھی کرتے ہیں جو صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ کبھی ہم خود تم سے کچھ کرنے کو کہیں، کوئی ایسا کام جو ہمارے لیے مشکل ہو۔ ہم آزادی اور آسانی کے ساتھ دُنیا میں گھوم پھر نہیں سکتے۔ کوئی ایسا بھی تو ہونا چاہیے جس پر کوئی نگرانی نہ ہو، جو ہمارے شکاری دشمنوں کے شک و شبہے سے بالاتر ہو اور پسِ پردہ رہ کے ہمارے لیے مُفید ثابت ہو۔"

"تم تو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہو۔" محسن خان شیردانی نے اچانک کہا۔

"رائٹ۔ ففتھ کالم بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے محسن کے خیال کی تائید کی۔

"کبھی اُردو بھی بولا کرو سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تاکہ ہم اَن پڑھ بھی سمجھ لیں۔ تم یا تو بہت مشکل اُردو میں شعر وغیرہ پڑھ جاتے ہو یا پھر انگریزی میں کچھ کہہ دیتے ہو۔"

"ففتھ کالم کا مطلب بہت سے پڑھے لکھے نہیں جانتے۔" میں نے اُسے تسلّی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ پہلے جب فوجیں کسی شہر پر حملہ کرتی تھیں تو چاروں طرف سے یلغار ہوتی تھی اور چار حصّوں میں بٹ کر حملہ آور ہونے والی فوج کا ہر حصّہ ایک کالم کہلاتا ہے۔ پانچواں کالم اُسے کہتے تھے جو شہر کے اندر موجود ہو اور شہر والوں کا نہیں، حملہ آوروں کا مددگار ہو۔ اس میں خریدے ہوئے غدّاروں کے علاوہ مظلوم و معتوب بھی ہوتے تھے جو انتقام کے آرزومند ہوں۔ اپنے حاکم کے مقابلے میں حملہ آور سے زیادہ ہمدردی رکھنے والے یا حملہ آور کو بہتر حاکم سمجھنے والے بھی ہوتے تھے اور بعض اوقات چوری چھپے اندر گھس جانے والے بھی۔ فوج باہر سے حملہ کرتی تھی۔ یہ لوگ اندر تباہی پھیلا دیتے تھے۔ اندر کی گڑبڑ اور انتشار سے اپنی مدافعت کرنے والوں کو دُہری مصیبت پڑ جاتی تھی کہ ایک دشمن تو باہر کھُلے میدان میں ہے اور دُوسرا اندر انہی کی صفوں میں گھسا ہُوا شکست کے اسباب پیدا کر رہا ہے۔ نازو ہمارا ففتھ کالم بن سکتی ہے۔ یعنی دُشمن کے ساتھ مل کر دشمن ہی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

ٹیڈی نے میری وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔ "ہاں۔ فرض کر دیہ اور اس کا بھائی کسی طرح دلاور اینڈ کمپنی سے مل جائیں۔" میں نے کہا۔

"وہ بہت عیّار آدمی ہے۔ فوراً ہی تاڑ جائے گا۔" محسن بولا۔

"اس کو قائل کرنا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "نازو کہہ سکتی ہے کہ سکندر کمینہ ہے۔"

"اس میں کون سی نئی بات ہو گی۔" محسن نے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے اور میں نے رابعہ کو بھی سمجھایا......"

میں نے ہاتھ گھمایا لیکن محسن غوطہ مار گیا اور شرافت سے مہاتما بُدھ کی طرح بیٹھا ہوا ٹیڈی اس کی زد میں آ گیا۔ اس نے زور سے "ہاہ" کی اور فرش پر لڑھک گیا۔

"خونِ ناحق کر دیا ایک نیک آدمی کا۔" محسن نے شور مچایا۔ "خواجہ نیک محمد کو مار دیا۔ ایسا ہی زمانہ ہے کہ نیکی نہ کرو اور جو نیکی کرے اُسے دریا میں ڈال دے۔" نازو اور رابعہ نے ہنستے ہوئے ٹیڈی کو اُٹھایا۔ وہ کافی دیر تک اپنے سر کو جھٹکتا رہا۔

"میری بات سمجھ میں آئی کہ نہیں۔" میں نے امن بحال ہوتے ہی کہا۔ "تم ذاتی عقل و ذہانت سے کام لیتے ہوئے دلاور سے رابطے کی صُورت پیدا کرو۔"

"صُورت اچھّی خاصی ہے۔ رابطہ ہو جائے گا۔" محسن نے پھر شرارت سے کہا اور اس مرتبہ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ پلک جھپکتے میں نازو لہرا کے اُٹھی اور اس نے محسن کو ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور نہ جانے کیسے پنجے پر اُٹھا لیا۔ وہ ایک مسلسل حرکت تھی۔ جھٹکے سے محسن اُوپر آ گیا تو پنجے نے سہارا دیا اور محسن کو میں نے قلابازی کھا کے فرش پر چت ہوتے دیکھا۔ میرے اور رابعہ کے لیے اس کی پھُرتی کا یہ مظاہرہ غیر متوقع اور نیا نہیں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ٹیڈی کا منُہ کھُلا رہ گیا ہے اور غالب بھی دریائے حیرت میں ڈوب چکا ہے۔ وہ کبھی نازو کو دیکھتا تھا تو کبھی محسن کو، محسن نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اُٹھنے کی زحمت نہیں کی اور دُور لیٹا مُسکراتا رہا۔ نازو اپنے ہاتھ جھاڑ کے بیٹھ گئی۔

"تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دلاور سے ملو۔" میں نے یوں کہا جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ "تم اسے یقین دلا سکتی ہو کہ میری وجہ سے تمہارے بھائی کو مستعفی ہونا پڑا، تمہاری زندگی خطرے میں پڑی اور بھائی کے ہاتھوں بہن کا خون ہوتے ہوتے رہ گیا اور تاثر کچھ ایسا دینا کہ تمہاری اَنا مجروح ہوئی ہے اور تم بھی گویا کسی عام عورت کی طرح انتقام کی آگ میں جل رہی ہو۔ تم کو اپنی اداکاری سے دلاور کو یقین دلانا ہو گا۔ اور یہ بہت مشکل کام ہو گا کہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو۔ اس سے نقد سودا کرو گی تو کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ ایسے لوگوں سے جس طرح بھی لیا جائے اور جتنا بھی لیا جائے، جائز ہے کیونکہ خود اس نے بھی یہ دولت غلط ذرائع سے جمع کی ہے مگر ہمارے مقصد اور مشن کے لیے پیسہ بھی اہم ہے۔ وہ سمجھے گا کہ تم لالچ سے بھی مغلوب ہو اور انتقامی جذبات سے بھی۔ اگر اکرام شیخ کی مظلومیت کو بھی استعمال کرو تو اچھا ہے کہ سکندر کی وجہ سے اس کی نوکری گئی اور اب وہ بے روزگار بیٹھا ہے۔ کچھ پیسہ ہو گا تو کوئی چھوٹا موٹا بزنس کر لے گا۔ یہ کام تمہارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہو گا کیونکہ دلاور ایسا شخص ہرگز نہیں جس کو اپنی باتوں سے بے وقوف بنایا جا سکے....."

"خواہ باتیں کرنے والی تم جیسی ہی کیوں نہ ہو اور اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہو۔" محسن خان شیردانی نے دُور سے کہا۔

"کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں؟" نازو نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس طرح تمہاری مدد ہو گی؟"

"کیوں نہیں ہو گی۔ تم اس کے تمام جاننے والوں کو جان لو گی۔ تم میں پُوری صلاحیت ہے، دلاور جیسے شخص کا اعتماد حاصل کرنے کی اور اس کی سیکرٹری بننے کی۔" میں نے کہا۔ "اور خطرہ تمہارے لیے کوئی نہیں کیونکہ تم اپنا دفاع کر سکتی ہو۔ ایک بار تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ دلاور کو چکر دینا آسان نہیں لیکن تقدیر جب آدمی کو چکر میں ڈالتی ہے تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بڑے بڑے سُورما اور افلاطون چت ہو جاتے ہیں۔ عورت جیسی کمزور اور ناقص العقل کہلانے والی مخلوق کے ہاتھوں شکست کھانے والے فاتحین سے تاریخ بھری پڑی ہے اور کون جانے کہ جو کام ہم اپنی طاقت سے اور ذہانت سے نہ کر سکے، وہ تم اپنی نزاکت سے کر لو۔ پھُول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔"

"تم کیا مشورہ دے رہے ہو مجھے؟ یہ کہ میں اس پر ڈورے ڈالوں؟" نازو نے یک لخت برہمی سے کہا۔

"ڈورے ڈالنا کیا ہے، شکار کے لیے جال پھیلانا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "ضروری تو نہیں کہ تم خود اس جال میں گرفتار ہونے کی کوشش کرو۔ یہ تو شکاری خود طے کرتے ہیں کہ کہاں، کس موقعے پر ان کو شکار کے لیے کیسا جال پھیلانا ہے۔ جو جال تم پھیلا سکتی ہو، وہ ہم نہیں پھیلا سکتے۔ وہ خود کو بہت بڑا شکاری سمجھتا ہے اور اس کے شکاری کتّے بھی کم خونخوار نہیں مگر عیّار لومڑی۔۔۔!"

"لومڑی۔" محسن نے قہقہہ مارا۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں بیٹھا تھا چنانچہ خاصا محفوظ تھا۔

"میں اس کہانی کا حوالہ دے رہا تھا جس میں لومڑی نے عقل سے کام لے کر شیر کو کنویں میں کُودنے پر مجبور کر دیا تھا۔" میں نے کچھ خفّت سے کہا۔ "وہ شیر ہر روز ایک جانور کھاتا تھا اور اس دن لومڑی کی باری تھی۔ لومڑی اس کا کیا مقابلہ کرتی۔ اس نے شیر کو دھکّا بھی نہیں دیا تھا صرف پانی میں اُس کا عکس دکھا کے کہا تھا کہ یہ آپ کا حریف ہے۔ پہلے اس سے نمٹ لیں تو بندی کی جان حاضر ہے اور جنگل کا بادشاہ ہونے کے باوجود شیر کی مت ماری گئی۔ اگر دلاور کی مت ماری گئی تو وہ آ جائے گا تمھارے چکّر میں اور اس کا حشر جنگل کے بادشاہ کی طرح ہو گا۔"

"اگر تم چاہتے ہو تو میں کروں گی۔" نازو نے میری طرف دیکھے بغیر زیرِ لب کہا۔ "یہ بھی کروں گی۔"

میں نے رابعہ کو دیکھا، وہ نازو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اور اس ایک لمحے میں نازو کے لیے اُس کی آنکھوں میں حسد اور رقابت کا جذبہ اُتر آیا۔ اُسے نازو کا لہجہ اور اس کا جذبۂ ایثار اپنے عشق کی ہمسری کے دعوے کی طرح لگا۔ اُس نے یُوں محسوس کیا جیسے نازو اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی ہے اور یہ بتانا چاہتی ہے کہ ایک تم ہی نہیں، سکندر کے لیے میں بھی ہوں۔ جتنا تم کر سکتی ہو اتنا ہی حوصلہ میرا بھی ہے اور اگر قسمت جُدا ہے تو کیا۔ ہم پر مشترک ہیں احسان غم الفت کے۔ رابعہ جس مقام پر تھی، وہاں وہ کسی اور کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی قبول کر سکتی تھی۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ ایک عورت کی نظر سے دیکھ رہی تھی کہ دوسری عورت جانتے بوجھتے کوشش ضرور کر رہی ہے کہ یہی مقام اُسے بھی حاصل ہو جائے۔ آج کی ناکامی کے دُکھ سے وہ کل کی کامیابی کی خوشی کا رشتہ استوار کر رہی تھی اور جھُوٹی اُمیدوں کے سچ ہو جانے کا خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ اس ایک لمحے میں نازو نے بلا ارادہ رابعہ کے مقابل آ کے کہا کہ سکندر کس کا ہے، یہ فیصلہ تو ابھی ہونا ہے اور رابعہ نے بڑے غرور سے اور حقارت سے کہا کہ فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا ہے بے وقوف لڑکی۔ وہ صرف میرا ہے۔ کل بھی تھا اور کل بھی ہو گا۔

"یہاں کوئی کسی کی خاطر کچھ نہیں کر رہا ہے۔" میں نے ذرا رابعہ کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ "ہم سب ایک نیک اور عظیم تر مقصد کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ پہلے یہ ذاتی انتقام کا مسئلہ تھا اور مجھے اپنا حق غصب کرنے والوں کو سزا دینا تھی۔ لیکن اب یہ وطن کے دُشمنوں سے نمٹنے کا مُعاملہ ہے۔ یہ جنگ غدّاروں کے خلاف ہے اور یہ اہلِ وطن کی سلامتی کی جدوجہد ہے اور ہم سب کے مستقبل کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ تم کو اسی مقصد کی خاطر کام کرنا ہے۔"

نازو کا چہرہ مایوسی کے سائے سے بجھ گیا۔ "ہاں میرا بھی یہی مطلب تھا۔ کچھ اور نہیں۔" اس کے خفّت زدہ لہجے میں تلخی کا زہر گھل گیا جسے میں نے ہی نہیں، رابعہ نے بھی محسوس کیا اور وہ اپنے آپ سے شرمندہ نظر آنے لگی یا شاید یہ اُس کے ذہن میں آنے والے خود غرضانہ خیالات کا ردِّ عمل تھا جسے وہ چھپا نہ سکی تھی۔

"پھر، وعدہ کرو تم واپس جاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "اور ویسا ہی کرو گی جیسا کہ میں نے کہا؟"

نازو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کوشش ضرور کروں گی۔"

"سب کوشش ہی کر سکتے ہیں۔" غالب نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

"کامیابی سب کا نصیب نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا جو اب قریب آ بیٹھا تھا اور سنجیدہ تھا۔ "پھر بھی اُمید کون چھوڑتا ہے۔"

"احتیاط تمھارے لیے سب سے بڑی آزمائش ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تم کو ہمارے دشمن کا ساتھ دینا ہے تو اس رول کو نبھانا بھی ہے۔ وہ تم پر ہر گھڑی نظر رکھیں گے۔ تمھاری نقل و حرکت پر نہیں، تمھارے ٹیلیفون پر نجی گفتگو پر، یہاں تک کہ تمھارے گھر میں آنے جانے والوں کی نگرانی ہو گی۔ ان کے وسائل ان کے ارادوں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کی دسترس سے باہر کچھ

بھی نہیں۔ وہ تمھارے گھر کے اندر خفیہ مائیکرو فون لگا دیں گے اور تمھارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ تمھاری گاڑی میں ٹیپ ریکارڈ فٹ کر دیں گے اور تمھیں معلوم نہ ہو گا۔ ان کے جاسوس تمھارے تعاقب میں رہیں گے اور تمھیں احساس نہیں ہو گا۔ تم خود سمجھ دار ہو لیکن میں تم کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں انھیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھاری ایک چھوٹی سی غلطی سارا کھیل چوپٹ کر دے گی اور تم ان کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام رہو گی تو ان کے عتاب کا نشانہ بن جاؤ گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم اس خطرناک کھیل کا آغاز کر کے پچھتاؤ۔ اگر اپنی ذات پر بھروسا ہے تو اپنا راستہ خود بناؤ ورنہ اطمینان سے گھر بیٹھو۔ اپنے لیے اور والدین کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا نہ کرو۔"

"میں تمھارے پلان کو سمجھ گئی ہوں۔" نازو نے کہا۔

"لیکن تم اکیلی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "تمھارا بھائی بھی ہے، کیا وہ مخالفت نہیں کرے گا؟"

"اسے میں منا لوں گی۔ وہ جانتا ہے، میں کتنی ضدّی لڑکی ہوں۔" نازو مسکرائی۔

"تو آج سے ہم تم دشمن۔" میں نے کہا۔ "زبانی ہی نہیں، بالکل عملی طور پر۔ دوستی کا خیال اگر ہے تو ذہن میں، لفظ۔ ن کے زبان پر نہ آئے۔ یہ چوبیس گھنٹے مسلسل ایک اداکاری ہو گی اور تم کو اس کردار کو حقیقی رُوپ دینے کے لیے اپنی تنہائی میں بھی نبھانا پڑے گا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ نادیدہ آنکھیں تمھیں دیکھ رہی ہیں اور دیواروں کے بھی کان ہیں۔ وہ تم کو آزمائیں گے اور دلاور کی شیطانی ذہانت کا مقابلہ آسان نہیں۔"

"نازو کو تم نے بھی نہیں سمجھا۔" وہ جیسے خود سے بولی۔ "دلاور کیا ہے؟"

"نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے۔" مرزا غالب نے اشارہ فرمایا۔ "یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں۔" اس نے نازو کے بازوؤں کی طرف اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا۔ شعر کے اس مفہوم نے اس وقت بڑا مزہ دیا لیکن اسی وقت باہر سے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ انجن ایک مرتبہ زور سے غرّایا اور پھر کسی نے دروازہ بند کیا۔

"سب اِدھر سے اُدھر۔" میں نے ایک دم اُٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔ "محسن اور غالب! تم ریوالور اُٹھا لو اور میرے ساتھ رہو۔ دروازے کے ایک طرف میں ہوں گا۔ اس کے پیچھے دوسری جانب تم دونوں، رابعہ کے ساتھ ٹیڈی ہو گا۔ اُدھر لاش کے پاس۔" دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" نازو نے اطمینان سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو افراتفری کا شکار دیکھ کر کہا لیکن باقی سب احتیاط کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ میں نے میز کے نیچے سے اسٹین گن اُٹھائی اور دروازے کے ساتھ دائیں طرف لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں سائلینسر والے ریوالور ہاتھ میں لے کر محسن اور غالب نے مخالف سمت میں پوزیشن سنبھالی اور ٹیڈی نے تیسرا ریوالور اُٹھا لیا۔ دوسری بار دستک کے ساتھ اکرام شیخ کی آواز بھی آئی۔

"اب تم دروازہ کھولو۔" میں نے نازو کو حکم دیا اور وہ محاذِ جنگ کے مورچے کی طرح نظر آنے والے منظر کو حیرت سے دیکھتی ہُوئی آگے بڑھی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ ہم نے جس شخص کو خود ہی ایک کام کے لیے بھیجا تھا، اس کی واپسی پر سراسیمہ ہونے کی کیا ضرورت ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ ہم اپنے موجودہ حالات میں ایک فیصد خطرے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس کھیل میں کچھ بھی بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ بظاہر اکرام شیخ بھی دوست بن کے آیا تھا مگر ابھی ابھی ہم نے نازو کو ایک سبق پڑھایا تھا کہ اس کو دوستی کے پردے میں دشمن تک کیسے رسائی حاصل کرنا ہے۔ اکرام شیخ پہلے پولیس کا ایک ذہین افسر تھا اور اس کے ساتھ ہمارے انکل رضوی جیسے سحر بکار اور گھاگ افسر تھے۔ یہ ناممکن نہیں تھا کہ ایسا ہی کوئی سبق انھوں نے اکرام شیخ کو پڑھا دیا ہو۔

نازو نے دروازہ کھولا اور شیخ اکرام سیدھا اندر آ گیا۔ میں نے لات مار کے دروازہ بند کیا تو وہ چونک کر پلٹا اور اس کی نظر نے میرے ہاتھ کی اسٹین گن کو پہلے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" شیخ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تمھاری نیّت بدل گئی ہے؟"

"نہیں، احتیاط کا تقاضا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھاری نیّت صاف ہے تو ڈر کیسا؟"

"میں گاڑی لے آیا ہوں۔" شیخ نے کہا۔

میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر جھانکا۔ باہر کوئی کار نہیں تھی۔ ایک ٹرک کھڑا تھا جس کا رنگ اندھیرے میں کالا نظر آ رہا تھا۔ "ایک لاش کو لے جانے کے لیے ٹرک؟" میں نے کہا۔ "کس کا ہے یہ ٹرک؟"

"کسی کا بھی نہیں۔" شیخ نے کہا۔ "کرائے پر لایا ہوں۔"

"کرائے کے ٹرک میں لاش لے جاؤ گے؟" میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"یہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں ہے جس پر تم اسے سہاروں کی طرح لٹا سکو۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ یہ لاش تمھیں مُردہ خانے نہیں پہنچانی ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے کہا۔ مال روڈ پر ایک جگہ چھنگنی ہے یا چھپائی ہے۔

"ٹرک والا دیکھے گا نہیں؟" محسن بولا۔ "اسے کس طرح مطمئن کرو گے؟"

"میں ایک صندوق بھی لایا ہوں۔" شیخ نے موقع پا کے کہا۔ "تم لوگ بولے چلے جا رہے ہو۔"

میں نے پھر دروازہ کھول کے دیکھا مگر مجھے اتنے فاصلے سے ٹرک پر رکھے ہوئے باکس کے سائز کا اندازہ نہ ہو سکا۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا۔ "تم جا کے دیکھو کیسا صندوق ہے؟"

"میرا خیال تھا کہ..... کہ ہم صندوق اندر لے آتے۔" شیخ بولا۔ "پھر لاش اس میں ڈال کے لے جاتے۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہو گا کہ ہم لاش اٹھا کے لے جائیں اور باکس میں ڈال دیں؟"

"ڈرائیور کو شک ہو گا۔" شیخ نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ نروس ہے۔

"ڈرائیور کو اس وقت شک نہیں ہو گا جب ہم باکس اٹھا کے لائیں گے اور پھر لے جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"صندوق بہت بڑا ہے۔" محسن نے لوٹ کر واپس آنے کے بعد کہا اور لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔ "ایک لاش کو لے جانے کے لیے اس کے چوتھائی سائز کا صندوق بھی کافی تھا۔"

"مجھے اس وقت یہی ملا۔" شیخ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "یہاں سے لاش کو ٹرک تک اٹھا کے لے چلو۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تمھیں کوئی پرائیوٹ گاڑی نہیں مل سکتی تھی؟" میں نے کہا۔ "اس کی ڈکی میں جگہ ہوتی ہے۔"

"میں نے کوشش کی تھی۔" شیخ بولا۔ "لیکن دوستوں میں سے ایک ملا نہیں، ایک نے انکار کر دیا۔"

اس وقت تک شیخ کے رویے نے میرے شکوک کو مزید تقویت پہنچا دی تھی۔ "میں پہلے صندوق کو کھول کر دیکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "باہر چلو میرے ساتھ۔"

"خالی صندوق میں کیا دیکھو گے؟" وہ بولا۔

"اگر صندوق واقعی خالی ہے تو ہم اسے اندر لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"واقعی کا کیا مطلب؟" شیخ نے برہمی سے کہا لیکن میں نے دروازہ کھول کے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ "تم دونوں میرے ساتھ رہو، ذرا پیچھے اور دائیں بائیں۔" میں نے غالب سے کہا اور شیخ کی حالت میں واضح تغیر محسوس کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے چلنے لگا۔

قریب پہنچ کے مجھے ٹرک کا نیلا رنگ نظر آیا۔ اس کے پیچھے والے کھلے حصے پر تقریباً چھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا صندوق رکھا ہوا تھا جس کی گہرائی تین فٹ ہو گی۔ صندوق بالکل نیا تھا لیکن مقفل نہیں تھا۔

"تم ذرا شیخ صاحب کا خیال رکھنا۔" میں نے کہا اور خود ٹرک پر چڑھ گیا۔ "لگتا تو خالی ہے۔" میں نے صندوق کو لات ماری۔ آگے سے ڈرائیور نے سر نکالا اور پیچھے دیکھا۔ اس کا چہرہ اور اس کی مونچھیں دیکھتے ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ ٹرک بھی پولیس کا تھا اور ڈرائیور بھی۔

"غالب ذرا ڈرائیور صاحب پر نظر رکھنا۔" میں نے کہا اور الفاظ ابھی میرے لبوں سے نکلے بھی نہ تھے کہ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے جست لگائی۔ اس نے کودتے کودتے فائر کیا مگر اس کے مقابل غالب تھا جو محاورے کے مطابق نہیں، عملاً اڑتی چڑیا کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا فرق رکھتے ہوئے پہلے فائر کیا اور میں نے نیچے گرنے والے ڈرائیور کے لبوں سے ایک غلیظ گالی سنی۔ غالباً ڈرائیور کے ہاتھ کا ریوالور اسی طرح اڑ گیا تھا جیسے شیخ کے ہاتھوں کے طوطے فائر ہوتے ہی اڑ گئے تھے۔ اگر محسن نے اسے نشانے پر نہ رکھا ہوتا اور میرے ہاتھ میں اسٹین گن نہ ہوتی تو یا لنسر یقیناً پلٹ جاتا۔ ڈرائیور کچھ دیر بے بسی سے پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے بند صندوق کی دونوں کنڈیاں لگا دیں، جو بظاہر خالی لگتا تھا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" غالب نے کہا۔ "اور ٹرک سے لگ کے کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم کو کچھ کہنا ہے؟" میں نے پتھر کے بت کی طرح مبہوت کھڑے ہوئے شیخ سے کہا۔

شیخ کی نظر صندوق پر رہی اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔ صندوق کے اندر اب بھی کوئی نقل و حرکت نہیں تھی۔

"اگر میں اس خالی صندوق کو چھلنی کر دوں تو تمھیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔" شیخ چلایا۔

"کیوں؟ کیا بہت مہنگا صندوق ہے؟" میں نے کہا۔

"ہماری زندگی سے بھی زیادہ قیمت ہے اس کی؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹین گن کا رخ صندوق کی طرف کیا۔ شیخ نے محسن کی پروا کیے بغیر مجھ پر جست لگائی اور میری اسٹین گن پر حملہ کیا۔ یہ بات تو وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ میرے ہاتھوں سے اسٹین گن چھینی نہیں جا سکتی۔ اس کے حملے کا مقصد نشانے کا رخ بدلنا تھا لیکن میں نے اسے قریب آنے کی مہلت بھی نہ دی۔ میں نے ایک ایڑھی پر گھوم کے دوسری ٹانگ اٹھائی تو پنجہ شیخ کے سینے پر لگا۔ وہ ٹرک سے نیچے گر گیا۔ دروازے میں کھڑی ہوئی نازو نے چیخ ماری اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ بیرک کے دروازے سے رابعہ اور نازو باہر آ چکی ہیں۔

"یہ کیا ہوا سکندر؟" نازو نے چلا کے کہا۔

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اگر میں بیوقوف ہوتا اور احتیاط پسند نہ ہوتا تو بہت کچھ ہو جاتا۔ میں نے تمھاری طرح تمھارے بھائی پر اعتماد نہیں کیا اور یہ بات مجھے بھی ڈیڈی نے سمجھائی تھی کہ انسان کی عادت بدل سکتی ہے، فطرت نہیں۔ شیخ نے وہی کیا جو اس کی فطرت کا تقاضا تھا، جو ایک ذمے دار، فرض شناس اور ذہین پولیس افسر کو کرنا چاہیے۔"

"تم نے مجھے پھر دھوکا دیا تھا۔" نازو کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم ایک بیوقوف لڑکی ہو۔" شیخ نے بے خوفی سے کہا۔ "ایک دن پچھتاؤ گی۔"

"میں تو اب بھی پچھتا رہی ہوں۔" نازو نے منہ چھپا کے رونا شروع کیا۔ "پہلی بار میں نے تمھاری غلطی کو معاف کر دیا تھا۔ اس غلطی کا خمیازہ تو مجھے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑتا۔ تمھیں ترقی ملتی یا پولیس میڈل ملتا۔"

"شیخ نے مضبوط لہجے میں کہا۔" اور نہ یہ میری غلطی ہے۔ "وہ میری غلطی نہیں تھی۔"

"کیا تمھارے لیے کوئی رشتہ اہم نہیں رہا؟" نازو نے بڑے دکھ سے کہا۔ "تم اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو بھی گولی مار سکتے ہو؟"

"ہاں، اگر وہ قانون شکنی کے مرتکب ہوں گے تو میرے لیے ان کی حیثیت ایک عام مجرم کی سی ہو گی۔"

"یہی بات ہے تو میں تھوکتی ہوں تمھارے اس رشتے پر، جس کی قیمت تمھاری نظر میں ہر ماہ ملنے والی تنخواہ سے زیادہ نہیں رہی۔" نازو انتہائی جذباتی ہو گئی۔

"رشتوں کو پیسوں سے مت تولو نازو!" شیخ سیدھا کھڑا رہا۔

"تم میری پیدائش کے دن سے میرے بھائی تھے، اپنے ماں باپ کے بیٹے تھے۔" نازو نے روتے روتے کہا۔ "لیکن اب تم ملازمِ سرکار ہو۔ تمھارے جسم پر وردی ہے اور ہاتھ میں ریوالور اور تمھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہو گولی مار دو، کتنے دن کی بات ہے یہ، صرف تین سال پہلے تم ہم میں سے تھے.. ہمارے تھے۔ آج اس پیسے کی خاطر جو تمھیں مل رہا ہے، تم نے قواعد و ضوابط کو ہم سے زیادہ اہم سمجھ لیا ہے۔ پہلے تم نے دوستی کو قربان کیا، پھر بہن کی محبت کا خون کیا۔ سکندر کی گرفتاری کے لیے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے آلۂ کار بنایا، اب میرے منہ پر کہتے ہو کہ تم ماں باپ کو بھی قتل کر سکتے ہو۔ جاؤ، اب ہم سب تمھارے لائق نہیں رہے۔ ہم سب مجرم ہیں اور تم پولیس افسر ہو۔ اپنی فرض شناسی کے ساتھ رہو۔ مت کہنا آئندہ مجھے بہن۔ اپنی زبان سے میرا نام مت لینا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ نازو کے ہسٹریا میں شدت آتی جا رہی ہے۔ بھائی کی چالبازی نے اسے شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا اور اتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کا اور حوصلہ مندی کا دعویٰ رکھنے والی نازو جذبات کے ریلے میں کمزور تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ میں نے رابعہ کو اشارہ کیا کہ اسے اندر لے جائے، رابعہ کے لیے یہ کام زخم خوردہ شیرنی کو کان سے پکڑ کر لے جانے سے کم مشکل اور خطرناک نہیں تھا مگر نازو نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ خود کسی ہمدرد و سہارے کی متلاشی تھی چنانچہ وہ رابعہ کے کندھے پر سر رکھے روتی ہوئی لوٹ گئی۔ شیخ اسی طرح کھڑا رہا۔

"اس صندوق میں کتنے آدمی ہیں؟" میں نے اطمینان سے سوال کیا۔

"تم خود کھول کے دیکھ سکتے ہو۔" شیخ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"میں بتا چکا ہوں کہ میں اتنا احمق نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ پنڈورا کا باکس ہے۔ اسے کھولتے ہی نہ جانے کتنی بلائیں ہم پر نازل ہو جائیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں چھ آدمی چھپ کر بیٹھ سکتے ہیں۔ کیا وہ سب مسلح ہیں؟"

"دشمن کے شہر کی فصیل کے اندر اپنے لشکر کو پہنچانے کے لیے سب سے پہلے ٹروجن ہارس کا استعمال کیا گیا تھا۔ لکڑی کے اس دیوہیکل گھوڑے کے پیٹ میں مسلح جنگجو چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور شہر والے خود ہی اسے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اس کے بعد علی بابا کے گھر میں ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے چالیس چوروں کو پہنچانے کے لیے تیل کے سوداگر کا بھیس بدلا تھا اور چالیس مشکوں میں چالیس چوروں کی فوج علی بابا کے گھر میں اتار دی تھی۔ تم نے بیسویں صدی کے علی بابا کا رول ادا کیا۔ کیا ہم بھی وہی کریں جو علی بابا کی ہوشیار ملازمہ مرجینا نے کیا تھا؟ مرجینا کا رول رابعہ بخوبی ادا کر سکتی ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم جو چاہو کر دو۔" شیخ نے چلّا کے کہا۔ "جہاں اتنے قتل پہلے کیے ہیں...."

"ابھی تک ہم نے کوئی قتل نہیں کیا۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "کچھ لوگوں نے ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔ ہم نے ہمیشہ اپنا دفاع کیا، جس کا ہمیں قانونی طور پر پورا حق حاصل ہے۔"

"علی بابا کے اس صندوق...." ابھی غالب کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ سائلینسر والے ریوالور کا دھماکا سنائی دیا اور ٹرک ڈرائیور آواز نکالے بغیر نیچے گر گیا۔ اس نے غالب کو مصروفِ گفتگو پا کے غافل سمجھنے کی غلطی کی تھی اور بڑی پھرتی سے اچھل کر غالب کے فلائنگ کِک مارنی چاہی تھی لیکن غالب کا ذہن اس کی توقعات سے زیادہ مستعد تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور کے پیر غالب کو چھوتے، غالب کے ریوالور کی گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی سر میں داخل ہو گئی اور وہ نیچے گرا تو لاش تھا۔ میڈیکل سائنس کی اصطلاح میں اصل موت دماغ کی موت ہے تو اس ڈرائیور کے دماغ کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔ اس کا جسم رگوں میں دوڑنے والے لہو کی حدّت کے باعث کچھ دیر پھڑکتا رہا، پھر ساکت ہو گیا۔

"کیا تم اسے قتل کہو گے؟" میں نے شیخ سے کہا۔ "میرا خیال ہے ٹرک ڈرائیور نے خودکشی کی ہے اور اس کی موت کے تھوڑے بہت ذمّے دار تم بھی ہو جو اسے یہاں لائے تھے۔ غالب نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور کو معلوم تھا کہ اس قسم کی غلط حرکت کا انجام کیا ہو گا۔ آنکھوں والا جانتا ہے کہ اندھے کنویں میں گرنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ پھر وہ قدم آگے بڑھائے تو قصوروار کون؟ ہاں کوئی اسے دھکا دے یا مجبور کرے تو وہ مجرم۔ تم اب محسن کے ساتھ اندر جاؤ اور وہ لاش اُٹھا لاؤ۔"

وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ اپنی سازش کی ناکامی، شکست اور بے بسی کے احساس نے اسے خفّت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ سلوک وہ تھا جو نازو نے اس کے ساتھ ہم سب کے سامنے کیا تھا۔ محسن نے اسے کندھے سے پکڑ کے دھکیلا تو وہ آگے بڑھا۔

"قسم خدا کی میں تم سب کو چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"یہ بات ہم کئی بار سُن چکے ہیں کئی لوگوں سے۔" محسن نے کہا۔

"جذبات کو قابو میں رکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "وہ غلطی مت کرنا جو ٹرک ڈرائیور نے کی تھی۔"

"جس طرح تم فرض کی ادائیگی کے خیال سے غافل نہ ہوتے، ایسے ہی ہم اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا اور اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ میں صندوق پر ایسے لات ماری جیسے ڈرم بجانے والا کبھی کبھی کے نیچے رکھے ہوئے بڑے ڈرم کو ٹھوکر مارتا ہے۔ اندر ایک گونج سی پیدا ہوئی۔

"ہیلو حضرات! میں باہر کی دنیا سے بول رہا ہوں" نے خوشدلی سے کہا۔ "آپ لوگ اتنے گُم صُم کیوں ہیں گپ شپ کریں۔ اتنے لوگ ہیں اور سب چپ ہیں اور نہیں تو خدا کا شکر ہی ادا کریں کہ موت اتنی قریب آئی اور ٹل گئی۔ صرف اس لیے کہ ہم کچھ رحمدل ہیں اور بے سبب خون نہیں کرتے۔ یقیناً آپ سب کو بہت احتیاط کے ساتھ منتخب کیا گیا ہو گا۔ آپ سب جرأت اور ہمّت میں لاثانی ہوں گے اور ممکن ہے تربیت یافتہ کمانڈوز ہوں لیکن اس وقت چو چوہوں کی طرح اس چوہے دان میں بند ہیں۔ میرے پا اسٹین گن ہے۔ اس کا ایک راؤنڈ چلا دوں تو گولیاں دوسر طرف سے نکلیں گی آپ سب کی ارواحِ خبیثہ کے ہمراہ۔ سے آپ میں سے کسی کا پیشاب تو خطا نہیں ہو گیا۔"

میرے الفاظ کا فوری ردِّعمل ہوا۔ اندر سے کسی باکس پر سر یا مکّا مارا اور مجھے ایک فحش ترین گالی دی۔ "دفع سوّرا! مینوں کلے نوں بار آن دے۔ فیر میں دساں تینوں۔" پھر اندر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ایک شخص بولنے سے سب کی موجودگی کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ان کا یقیناً ان کے ساتھ تھا لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر استعمال کرتے۔ اس کے علاوہ انھیں نقل و حرکت کے لیے جگہ در احتیاطاً میں نے اپنی جگہ بدل لی اور بچ گیا۔ کسی نے اندھا فائر کیے اور گولیاں ٹین کی چادر میں سوراخ کرتی نکل گئیں۔ صندوق میں نظر آنے والے چھید مختلف فاصلوں پر ذرا اوپر نیچے تھے اور اگر میں پرانی جگہ پر کھڑا رہتا تو کسی نہ کسی گولی کا نشانہ ضرور بن جاتا۔ نے اسٹین گن کا ایک برسٹ مارنے کا سوچا اور پھر ارادہ بدل دیا۔ والوں نے خود ہی اشتعال میں پاگل ہو جانے والے کو قابو کر تھا۔ ان کی باتوں سے اور اس محدود جگہ میں ہونے والی کشمکش کی آوازوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ ریوالور کی ہر گولی کا دھماکا اندر سے سننے والوں کے کان وقتی طور پر ضرور سُن ہو گئے ہوں گے مگر یہ آوازیں باہر بھی سکوتِ شب کو منتشر کر چکی تھیں۔

"خبردار جو پھر کسی نے یہ حرکت کی۔ بھوسن کے رکھ دوں گا۔" میں نے غرّا کے کہا اور فوراً گھوم گیا۔ اب میں مخالف سمت میں صندوق کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے شیخ کو لاش اُٹھا کے باہر نکلتے دیکھا۔ لاش بالکل اکڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسے ایک طرف سے غالب نے بھی سہارا دے رکھا تھا۔ قریب آنے پر شیخ نے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ سے صندوق نہ کھولنے کی وجہ جاننا چاہتا ہو۔

"لاش کو اوپر اٹھاؤ اور ٹرک میں لمبائی کے رُخ ڈال دو۔" میں نے کہا۔

"صندوق میں لے جاتے تو اچھا تھا۔" شیخ نے دبی آواز میں کہا۔

"کیا اچھا ہے اور کیا بُرا، یہ فیصلہ کرنا تمھارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی اکڑی ہوئی لاش صندوق میں نہیں آ سکتی۔ اس میں پہلے ہی کافی لاشیں ہیں۔"

"لاشیں؟ کیا تم نے ان سب کو مار دیا ہے؟ خبیث!" شیخ چلّایا۔

"تم کو یقین نہیں تو ادھر سے آ کے یہ سوراخ گن لو۔" میں نے صندوق کی طرف اشارہ کیا مگر اندر والوں نے گالیاں دے کر اور مکّے چلا کر مجھے جھوٹا ثابت کر دیا۔ غالب اور شیخ نے لاش کو آدھے کھلے ٹرک کی دیوار کے اوپر سے گرا دیا۔

"تم پیچھے ہٹو۔" میں نے شیخ سے کہا۔ "اور مرزا غالب! ٹرک میں دوسری لاش کو لٹانے کے لیے بہت جگہ ہے۔ خیال رکھنا، یہ پہلے ہمارے دوست تھے۔" میں نے شیخ کی طرف اشارہ کیا جو اوپر چڑھ چکا تھا۔

"شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی، شکر ہے زندگی تباہ نہ کی۔" مرزا غالب نے شیخ کے سامنے بیٹھ کر کہا۔

"میں سب کو ٹھکانے لگا کے آتا ہوں۔" میں نے ٹیڈی کو آواز دے کر کہا۔ "محسن میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

جب میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا تو اردگرد کے رہنے والے دُور کے مکانوں سے سر نکال کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا ڈز ڈز ہو رہی ہے۔ "ابے کی رولا پایا ہے۔" کسی بزرگوار نے کہا۔

"پٹاخے نیں چلا چا پٹاخے۔" ایک نوجوان نے اعلان کیا۔

"کیوں؟ تیرے پیو دی جنج اے سُوَر دے پُتّر!" بزرگ نے اس گمراہ کُن اعلان پر سیخ پا ہو کے کہا۔ "ایہہ صاف گولیاں دی آواز اے۔" ہم جائے واردات سے اچھے وقت پر دور نکل گئے تھے۔ کسی نے ٹرک کا نمبر تو کیا، ٹرک بھی غور سے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ شیخ نے کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" محسن متفکر لہجے میں بولا۔ "نہ اپنے ساتھ، نہ بہن کے ساتھ اور نہ ہمارے ساتھ۔"

"اس کے اعمال کو اپنے ضابطۂ اخلاق پر نہ پرکھ۔" میں نے کہا۔ "یہ سوچ لے کہ اب کیا کرنا ہے۔"

"شیخ کو کسی بھی جگہ اُتار دیں۔ جہاں سے وہ فوراً کچھ نہ کر سکے۔" محسن بولا۔ "اس نے جگہ دیکھ لی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے سارے لاہور کی مسلح پولیس کے ساتھ ہمیں گھیر لے گا۔"

"ابھی نہ سہی، صبح تو یہ ٹھکانا بدلنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "غالب کی حماقت سے اچھی خاصی محفوظ جگہ بھی گئی اور اٹھارہ ہزار بھی گئے۔"

"وہ کون سے ہمارے تھے۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔" محسن بولا۔ "جگہ بھی دوسری مل جائے گی۔"

"میں جگہ کے بارے میں نہیں، نازو کے بارے میں متفکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

"تو کمبل کو چھوڑتا ہے، کیا کمبل بھی تجھے چھوڑ دے گا نورِ چشم؟" محسن بولا۔

"یہ تو مجبوری ہے۔ نازو کی وجہ سے ہمارے لیے خطرات میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہمارے دشمن بڑھ جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہو گی کہ نازو کے والدین کو بیٹی کی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ ان کی رسوائی الگ ہو گی اور ہمارے دشمن ان کے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ انھیں اس عمر میں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے۔ میں نازو کو مجبور کر دوں گا کہ وہ واپس جائے۔"

"وہ جبر کے آگے جھکنے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"ایسی کی تیسی جبر کرنے والے کی۔ ارے بھئی اس کو ماں باپ کے گھر پہنچانا ہے، پہنچا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "اپنی خوشی سے نہیں جائے گی تو بنڈل بنا کے چھوڑ آئیں گے۔ آگے وہ خود... سنبھالیں گے اور نازو جائے گی بھی کہاں۔ ہم پھر روپوش ہو چکے ہوں گے۔ اگر اسے ہمارے لیے کچھ کرنا ہی ہے تو پھر وہی کرے جو اسے سمجھا دیا گیا ہے۔"

"اس پروگرام میں شیخ بھی شامل تھا۔" محسن بولا۔ "نازو کے ساتھ۔"

"نازو چاہے تو اکیلی بھی وہ کام کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ کی اہمیت پہلے بھی ثانوی تھی۔"

"مگر یہ ناممکن ہو گا۔ کیا شیخ اسے اجازت دے گا کہ وہ ہمارے لیے کام کرے اور دلاور کے کیمپ میں گھس جائے۔ اس کی سیکریٹری بنے؟ چوہدری دلاور جیسے افراد کی سیکریٹری کوئی نیک نام نہیں ہوتی۔" محسن نے کہا۔

"یہ بات تو ہے۔ اگر شیخ نے مخالفت کی تو نازو کچھ نہ کر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سکے گی۔ خیر وہ کچھ نہ کرے۔ اس کا کچھ نہ کرنا ہمارے لیے کچھ کرنے سے بہتر ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے جہاں صبح میری اور تازو کی چوہدری دلاور کے ساتھیوں سے دست بدست جنگ ہوئی تھی، وہاں اب اندھیرا تھا اور ویرانی تھی جس میں وقفے وقفے سے گزرنے والی کوئی گاڑی خلل انداز ہوتی تھی۔ وہاں اب کوئی لاش نہیں تھی۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اس شخص کی لاش مُردہ خانے بھجوا دی ہوگی جس کی گردن فٹ پاتھ سے ٹکرانے کے بعد ٹوٹ گئی تھی۔ دوسرا مجروح تھانے میں خودکشی کر چکا تھا اور شاید اس کی لاش بھی اپنے ساتھی کی لاش کے ساتھ میو اسپتال کے مُردہ خانے میں پڑی تھی۔ صبح تک اس تیسری لاش کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔ میں نے ٹرک روکنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ چوہدری دلاور کے سیکریٹری کی لاش کو کس بنگلے کی دیوار کے ساتھ یا جھاڑی کے پیچھے ڈالنا مناسب ہوگا۔ اسی وقت میں نے غالب کے چلانے اور پھر فائر کرنے کی آواز سنی۔

جب میں چھلانگ مار کے اُترا تو مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دو سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں رواں نظر آئے۔ بلاشبہ ان میں جو آگے تھا وہ ایس آئی اکرام شیخ تھا۔ وہ نہ جانے کیسے غالب کو جُل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر زیادہ مستعد اور پھرتیلا تھا لیکن یہ کام ذہانت کے بغیر ناممکن تھا۔ یوں پہل کر جانے سے وہ چالیس پچاس قدم کی برتری حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے سیدھا دوڑنے کے بجائے لہراتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یقیناً پہلی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ ہماری فردِ جرم تو پہلے ہی کم طویل نہیں تھی۔ اس میں قتل یا اقدامِ قتل کے ایک اور الزام کا اضافہ کسی صورت مستحسن نہ تھا۔ اسی الزام کی سنگینی یوں بھی زیادہ ہو جاتی کہ جس پر گولی چلائی گئی تھی وہ پولیس آفیسر تھا۔ اس کا مستعفی ہونا فقط ڈراما تھا۔ اسے تو بطورِ خاص ہر قسم کی امداد دے کے ہمارے پیچھے لگایا گیا تھا۔ وہ دوسرے گروہ کا شکاری تھا جو خود کو قانون کا محافظ سمجھتے تھے اور ہمیں قانون شکن۔ شکاریوں کے اس دوسرے گروہ میں سب دشمن نہیں تھے۔ ان میں اگر اکرام شیخ جیسے پرانے اور مخلص دوست شامل تھے تو انکل رضوی جیسے مہربان اور شفیق لوگ بھی تھے جن کی عنایات اور محبتوں کا بدل نہ تھا۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ شیخ اور انکل رضوی اپنے فرائضِ منصبی کے باعث انہی کا ساتھ دیتے تھے جو روزِ اوّل سے میری دشمنی پر مامور تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میرا واسطہ شکاریوں کے پہلے گروہ کے نمائندے استاد پیڈرو سے پڑا تھا جو مجھے میر شرافت کے قتل میں ملوث کرنے پر مامور تھا اور اس نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ پھر مجھے دوسرے شکاری لے گئے تھے جن میں انسپکٹر حشمت خان سے ڈی۔ایس پی سراج تک مختلف سطح کے لوگ تھے اور انھوں نے بھی مجھے زیرِ دام لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ پہلی قسم کے شکاری بھی چوہدری دلاور کے زرخرید تھے اور دوسری قسم کے شکاری بھی اس کے حکم کے تابع تھے جو ایک طرف عوام کے ٹیکس سے بھرنے والے خزانے سے تنخواہ وصول کرتے تھے تاکہ عوام کو قانون کے ذریعے جان و مال اور آبرو کا تحفظ فراہم کریں مگر دوسری طرف چوہدری دلاور جیسوں سے ضمیر فروشی کا معاوضہ وصول کرتے تھے کہ اگر کوئی قانون کا نام بھی لے تو اس کی زبان پر تالے ڈال دیں یا اُسے کاٹ دیں۔

چنانچہ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہمارے دونوں طرف شکاری تھے۔ ایک وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو اور انصاف کے عمل کی بالادستی قبول کرو۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو کہتے تھے کہ قانون کیا ہے؟ قانون ہماری طاقت ہے اور ہماری دولت کی قوتِ خرید کا نام ہے اس لیے یا تو ہمارا ساتھ دو ورنہ ہم اسی قانون کے ہاتھوں تمھیں نیست و نابود کرا دیں گے جس کو تم اپنا محافظ سمجھتے ہو۔ یہ اللہ کا کرم تھا یا قدرت کا نظامِ توازن کہ جس نے ہمیں دونوں جانب سے محتاط رہنے کا شعور عطا کیا تھا اور اپنی حفاظت آپ کرنے کا اہل بنایا تھا۔ شکاریوں کے ایک گروہ میں جو تمام تر جرائم پیشہ، کردار فروش اور انسانیت سے دشمنی رکھنے والے افراد کا گروہ تھا، فوما پچو اور غلام حسین جیسے افراد بھی شامل تھے جو اپنی جان دے کر اصولوں کی سچائی اور وفاداری کی عظمت کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ اسی طرح شکاریوں کے دوسرے گروہ میں سب برائے فروخت نہیں تھے۔ ان میں اکرام شیخ اور انکل رضوی جیسے بھی تھے جو فرض شناسی اور اصول پرستی کی راہ میں کسی رشتے کو اور اپنی ذات کی کسی انسانی کمزوری کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے تاہم ایسے اصولی پولیس والوں کا تناسب کم تھا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا شیطانی ٹولہ شکاری تھا اور ان سب کا شکار ہم تھے جو حق اور انصاف کے لیے لڑ رہے تھے اور ہمارے دو مقاصد واضح تھے۔ ایک یہ کہ اس پورے نظام کی سازش کو ناکام بنا دیں جو ہمیں مجرم سمجھتا تھا کیونکہ ہمارے خلاف بے بنیاد شہادتوں کا سلسلہ بہت دراز تھا اور ہمیں مجرم ثابت کرنے والے جھوٹے گواہ دنیا کے بازار میں بڑی آسانی سے دستیاب تھے۔ ہمارا دوسرا مقصد انھیں مجرم ثابت کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا جو ہر شیطانی خصلت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود عزت داروں میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنے جرم کی ہر شہادت اور ہر گواہ کو سامنے آنے سے قبل ہی ختم کر دینے یا خرید لینے کی طاقت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ہم انھیں قصوروار نہیں کہہ سکتے تھے جو انصاف کے فیصلے سناتے تھے کیونکہ وہ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے اور دلوں کے بھید نہیں جانتے تھے۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کو گواہوں اور شہادتوں تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔

لیکن ہم مجبور نہیں تھے چنانچہ ہم خدا کی عطا کردہ عقل کی روشنی میں اور ضمیر کی راہنمائی کرنے والی قوت کے سہارے پر دونوں طرف سے محصور کرنے والے شکاریوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ہماری تنظیم "ایم آر ایس" کا بنیادی مقصد تخریبی نہیں تعمیری تھا۔ ہم انصاف کو بہ زورِ بازو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہم قانون کی مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ان سب کو سزا دینا چاہتے تھے جو سزا کے مستحق تھے مگر سزا سے بچے ہوئے تھے کیونکہ وہ قانون کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے۔ اس طرح ہم بھی شکاری تھے مگر ان کے جو شرافت اور انسانیت کے دشمن تھے، ان کے جو آدمی کے ضمیر کو بھی بازار کی جنس جانتے تھے۔ سچائی کو قابلِ شکست سمجھتے تھے اور خود کو فرعون۔ ہم ان کے شکاری تھے جو کمزوروں کا شکار کرتے تھے۔ ہم ان سب کے شکاری تھے جو انصاف کے طلب گاروں کا شکار کرتے تھے۔ ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کا شکار کرتے تھے۔ ہم خود انہی کی چیرہ دستی اور استحصالی قوت کا شکار تھے مگر پھر بھی ہم ان کے لیے شکاری تھے۔ بازی اب کچھ یوں چل رہی تھی کہ چوہدری دلاور کا شیطانی ٹولہ ہمارا شکاری تھا اور اس میں ان کے تمام زرخرید شامل تھے۔ پولیس ہمارے لیے شکاری تھی کیونکہ ہم اپنے خلاف مختلف دفعات کے تحت درج ہونے والی رپورٹوں کے مطابق مفرور اور مطلوب مجرم تھے اور ہم مٹھی بھر لوگوں کو جن کی ساری طاقت ان کا خلوصِ نیت تھا، اس نیکی پر یقینِ کامل تھا جسے نہ نمرود مٹا سکا تھا، نہ یزید۔ اس ذات پر اعتماد تھا جس کا بچانے والا ہاتھ، مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زیادہ طاقتور رہا ہے۔ ہم سب شکاریوں کے شکاری تھے۔

اس وقت ہم پولیس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہونے سے بچ گئے تھے مگر ابھی ہم خطرے کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے تھے اور ہر جگہ خطرے میں تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غالب کے ہاتھوں شیخ مارا جائے اور یہ بھی میں کسی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہو۔ غالب اپنے دفاع کا حق استعمال کیے بغیر مارا جائے اور ہم ایک اچھے دوست کے سہارے سے محروم ہو جائیں۔ میں نے ٹرک کی دوسری جانب سے محسن کو دوڑتے دیکھا۔

"غالب! گولی مت چلانا۔" محسن نے چلا کر کہا۔

غالب کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ہماری نظر کے سامنے شیخ نے جست لگائی اور ایک بنگلے کی دیوار پر چڑھ گیا۔

"اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہوگیا ہے محسن۔" میں نے محسن کا بازو تھام لیا۔ وہ حرکت میں تھا۔ اس جھٹکے سے وہ خود بھی نہ سنبھل سکا اور میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ اس اتفاق نے ہماری جان بچالی۔ شیخ نے دیوار پر رک کر فائر کیا اور گولی ہمارے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزری۔ میں نے بے اختیار اپنا ریوالور اٹھا کے فائر کر دیا حالانکہ ابھی چند لمحے قبل میں خود ہی غالب کو اس حرکت سے روکنے کے حق میں تھا۔ جب اپنی زندگی کے وجود اور عدم کا مرحلہ آیا تو عقل کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔

"یہ تو نے کیا کیا!" محسن نے میری کلائی تھام لی اور دیوار کی طرف دیکھا۔ اس پر کھڑا ہوا اکرام شیخ کا سایہ جو رات کے اندھیرے سے جدا نظر آتا تھا، غائب ہو چکا تھا۔ "تو نے اُسے مار دیا!"

"ہوسکتا ہے وہ اندر کود گیا ہو۔" میں نے کہا۔ گرنے کے بعد ہم غالب کے قریب ہو گئے تھے۔ "تم نے مجھے روک دیا تھا۔ ورنہ وہ بچ سکتا تھا؟" غالب نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا۔ جوابی فائر کی آواز پر وہ فوراً لیٹ گیا تھا اور دوسری بار شاید صحیح نشانہ لینے کے موڈ میں تھا مگر محسن کی آواز پر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔

"میں نے بھی اس کا صحیح نشانہ نہیں لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس جوابی کارروائی کی تھی۔"

"اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکلو۔" محسن نے اُٹھ کر کہا۔ اسی وقت شیخ کی چلائی ہوئی گولی نے رات کے سکوت کو منتشر کر دیا۔

"شیخ اس بنگلے کے اندر مورچہ بند ہے۔" میں نے محسن کو پھر زمین پر کھینچ لیا۔ "آگے کھسکتے جاؤ۔" "اس کے پاس ریوالور کہاں سے آیا سکندر؟" محسن بولا اور میرے ساتھ رینگنے لگا۔

"واقعی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"مرزا غالب! تم بیٹھے تھے اس کی نگرانی کے لیے۔"

"وہ... اس نے بڑا دھوکا دیا... بہت عیار آدمی ہے۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "مجھ سے کہنے لگا کہ اُدھر لاش پڑی ہے اور جگہ کم ہے۔ کیا میں ڈرائیور کے کیبن میں دلاور کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟ میں نے اُسے صاف بتا دیا تھا کہ چالاکی سے کام لوگے تو تمھارا یہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

فعل خودکشی کہلائے گا مگر وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی سرک چکا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے کسی خفیہ جگہ سے کوئی ریوالور برآمد کرلیا۔ اس صندوق کے نیچے سے یا کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کے۔ بس میں اس کے ہاتھ کو حرکت کرتے نہ دیکھ سکا۔ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا ہوگا اُس نے۔ ریوالور ہاتھ میں آتے ہی اس نے چھلانگ لگا دی۔ اس وقت ٹرک بھی رک چکا تھا۔"

"چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں ایک جھاڑی کے عقب میں کچی زمین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے اور کیچوے کی طرح اپنے وجود کو گھسیٹتے ہوئے تقریباً دس گز کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ رگڑ سے میری کہنیاں چھل گئی تھیں اور جب میں تھوڑا سا اُٹھ کر گھٹنے سمیٹتا تھا تو سخت زمین مجھے شیشے کی کرچیوں کا فرش لگتی تھی۔

"شیخ ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں۔ وہ ابھی یہی ظاہر کرے گا کہ وہ بنگلے کی دیوار کے پیچھے موجود ہے اور پھر اچانک غائب ہو کے اندر چلا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اور اندر سے وہ بہ آسانی پولیس ہیڈ کوارٹر فون کرلے گا۔" غالب نے کہا۔ "آخر وہ ایک پولیس افسر ہے اور اپنے بااختیار ہونے کا ثبوت بھی دے سکتا ہے۔ اس قسم کی کوٹھی میں فون نہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔"

"وہ ہمیں فائرنگ کر کے اس جگہ دبکے رہنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اُسے یقین ہوگا، نا کہ جب تک ہم ٹرک میں رکھی ہوئی لاش کو ٹھکانے نہیں لگا دیں گے، واپس نہیں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"ایمرجنسی پولیس بیس منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "شیخ جانتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔"

"پولیس کے آتے ہی وہ ہر طرف سے ناکہ بندی کرا دے گا۔ ہم محصور ہو جائیں گے۔" غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس ٹرک کے اندر رکھے ہوئے باکس میں کم سے کم چھ مسلح سپاہی ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "بھاگنے کے بجائے اگر شیخ ایک فائر سے تالا توڑ دیتا تو باکس میں بند سپاہ باہر آجاتی۔ پھر ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

"مقابلہ کرنا پڑتا تو ضرور کرتے۔ اتنی آسانی سے خود کو اُن کے سپرد نہ کر دیتے۔ بلا سے ہم تین مارے جاتے اور وہ سب۔" میں نے کہا۔

"اب دیر سے کچھ حاصل نہیں۔ لاش پڑی ہے رُل رہی۔" میں نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ "ہم نکل جاتے ہیں۔ پولیس یہاں سے سیدھی اُدھر جائے گی جہاں رابعہ اور خواجہ نیک محمد ہماری بخیر و عافیت واپسی کے لیے دعاگو ہیں۔"

ہم تینوں ایک ساتھ اُٹھے اور بھاگے۔ کوئی گولی ہمارے تعاقب میں نہیں آئی۔ ٹرک اب ہم سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بظاہر شیخ ہمارے اندازوں کے مطابق ٹیلی فون کر چکا تھا چنانچہ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور ہمیں بہت دُور پہنچنا تھا۔

گورنر ہاؤس سے بہت پہلے ایک ٹیکسی ہمارے قابو میں آگئی۔ اس کا ڈرائیور رات کے وقت کسی ایسی جگہ جانے پر رضامند نہ تھا جہاں سے واپسی کی سواری ملنا یا خود اپنی واپسی مشکل ہو جائے لیکن ہم نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ مُنہ مانگی قیمت پر تیار نہ ہوا تو ہم اُسے زبردستی لے جائیں گے اور پھر مُنہ مانگی قیمت دے کر چھوڑیں گے۔ ہمارے لہجے سے زیادہ اسے ریوالور کے نظارے نے قائل کیا جو مرزا غالب نے اُسے دکھا کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا۔ سارا راستہ وہ ہماری منّت سماجت کرتا رہا۔

"دیکھو ڈاکو صاب... آپ شہنشاہ لوگ ہو۔ دس سال تک میں نے دوسروں کی ٹیکسی چلائی۔ پھر یہ ٹیکسی بھی قسطوں پر لی تھی اور ابھی صرف دو مہینے پہلے قرضہ ختم ہوا ہے۔ اب آپ اسے ڈاکے میں استعمال کرو گے تو میں پھنس جاؤں گا۔ ٹیکسی پہلے پکڑی جائے گی۔ میں اس کے بعد پکڑا جاؤں گا اور اس کے بعد... اللہ میاں توبہ... پولیس مجھ سے آپ لوگوں کا پتا پوچھے گی۔ میں کیا بتاؤں گا"

"ہم تمہیں اپنا پتا بتا دیں گے۔ پریشانی کی کون سی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ مذاق کرتے ہو جی... پولیس والے تو یہی فرض کریں گے کہ میں بھی آپ کا ساتھی تھا۔" وہ تقریباً رونے لگا۔ "میت مرنے کے بعد بھی وہ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اگر کیا تب بھی ٹیکسی تو گئی نا رشوت میں۔"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟" نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔

"بس جی آپ مجھے بخش دیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا اور پھر جلدی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"ایسے ہم کس کس کو بخشتے رہیں گے۔" محسن نے کہا۔ "کب تک بھئی؟"

"ہاں۔ صبح سے تین کو تو بخش چکے ہیں۔ ایسی ہی درد

"اتنے رقیق القلب لوگ ہیں ہم۔"

ایبل پر۔" میں نے کہا: "بھئی یہ ڈاکا ڈالنے والے قتل بھی تو کر دیتے ہیں۔" غالب نے ہمیں یاد دلایا۔

ٹیکسی ڈرائیور چلّانے لگا۔ "حضور ڈاکو صاحب! میری بیوی یتیم ہو جائے گی۔ بچے بیوہ ہو جائیں گے۔"

"اچھا بھئی! تم کو بھی بخش دیتے ہیں۔" میں نے بے حد مجبور لہجے میں کہا۔ "بس اسی جگہ ٹیکسی روک دو۔ ہم اتر جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کوئی دوسری گاڑی مل جائے۔" ٹیکسی ڈرائیور کی بدحواسی پر غالب کو ہنسی آگئی۔

"اس مرتبہ کوئی ایسی ٹیکسی روکنا جس کا ڈرائیور اتنا بزدل نہ ہو اور بخش دینے کی بات نہ کرے۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ ٹیکسی والے نے ہم سب کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور ٹیکسی روک دی۔ نہ ہماری صورت ڈاکوؤں والی تھی اور نہ گفتگو۔ جب نیچے اتر جانے کے بعد ہم نے اُسے پچاس کا نوٹ دیا تو اُس کا شرمندگی سے بُرا حال ہوگیا۔ اُس نے ہمیں بڑی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔

"آپ تو... شریف آدمی ہیں... میں بڑا گدھا ہوں۔ آپ لوگوں کو ڈاکو سمجھا تھا۔"

"ہم شریف ڈاکو ہیں گدھے۔" محسن نے گرج کر کہا اور ٹیکسی ڈرائیور ہوا ہوگیا۔ وہ بیرک ہمیں اپنے سامنے مشکل سے پچاس گز کے فاصلے پر دکھائی دے رہی تھی جہاں سے ہم ڈیڑھ گھنٹا پہلے روانہ ہوئے تھے۔

"کیا ہم رات کو یہاں قیام کریں گے؟" غالب نے کہا۔

"اگر ہم بیوقوف ہیں تو اتنے نہیں ہیں۔" محسن نے بُرا مان کر کہا۔ "سب بندوبست رکھتے ہیں۔"

"عزیزم! ہم اگر جائیں گے تو کہاں جائیں گے اور کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایک صورت تو یہی ہے کہ ہم دادِ شجاعت دیتے ہوئے یہیں جامِ شہادت نوش کریں۔" محسن بولا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ میں کسی ٹریول ایجنسی کو فون کر دوں۔ ہم کوئی چارٹرڈ پلین منگوالیں اور یہاں سے جا کر قطب شمالی پر پیراشوٹ سے اتر جائیں۔"

"تیسری اور آخری صورت بھی بتا ورنہ تیری صورت بگاڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تیسری آسان سی صورت یہ ہے کہ ہم اپنا بوریا بستر یہاں سے بھی گول کریں۔ ہمارے مقدر میں یہی خانہ بدوشی ہے اور زمین کے کسی گوشے میں پناہ نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "آج سے پہلے کب سوچا تھا کہ ایک جگہ سے اُٹھے تو پھر کہاں بیٹھیں گے۔ چلے جائیں گے کہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا اسباب۔ اور اہلِ خانہ۔" میں نے کہا۔ "دو زنانہ سواریاں بھی تو ہیں۔"

"ان میں ایک یرغمالی ہے۔" محسن بولا۔ "اُسے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"اور اگر وہ نہ رُکی۔" غالب نے کہا۔

"اس کا تو باپ بھی رُکے گا۔" میں نے کہا۔

"بھائی تو رُکا نہیں۔ باپ کیسے رُکے گا۔" غالب نے ہنس کر کہا۔

"تم لوگ اسباب سمیٹو۔ میں ایک ہارس پاور کی رولز رائس لاتا ہوں۔" محسن نے کہا اور دروازے کے قریب سے پلٹ گیا۔ ہماری آواز نے اندر رابعہ کو متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے دستک سے پہلے خود ہی دروازہ کھول دیا۔

"خیریت رہی نا؟" رابعہ نے کہا

"خیریت... یہ تو اس مار دھاڑ اور دھوکے فریب سے بھرپور حسینہ سے پوچھو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مجھے الزام مت دو۔ اس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں نے اُسے سزا دی اور اس کو چھوڑ دیا۔" نازو غرائی۔

"وہ الگ بات ہے۔ اُس نے تمہیں سامنے رکھ کر اعتماد حاصل کرنے کا ڈراما کیا تھا۔ تمہیں کوئی سزا ہونی چاہیے یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "اور تمہاری معصومیت نے مجھے بھی دھوکا دیا بلکہ ہم سب کو دھوکا دیا۔"

"یہ تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" وہ چلّائی۔ "کہ مجھے سب کچھ معلوم تھا؟"

"ہاں تم کو سب کچھ معلوم تھا۔ اسی لیے تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا اور اچانک اپنے ساتھ بھائی کو لے آئیں۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تم نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟"

"سکندر! تمہاری قسم...!"

"میری قسم کوئی چیز نہیں۔ تمہاری یہ بات میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے بھائی نے سازش کا اتنا بڑا جال پھیلایا۔ اس نے تم کو یقین دلا دیا کہ وہ مستعفی ہو چکا ہے۔ اس نے تمہیں قائل کر لیا کہ وہ تمہاری خاطر ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔ وہ پورا بندوبست کر کے یہاں تک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آپہنچا اور تم کو خبر نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں تم اتنی نادان تو نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ اس نے میری جان تک لینے کی کوشش کی تھی۔" نازو ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی۔

"لیکن نادم نہیں تھا۔ اور سیدھی صاف بات یہ ہے کہ تمھیں جال بنا کے وہ مجھے پکڑنے کی کوشش آئندہ بھی کرے گا۔ میں یہ خطرہ کیوں مول لوں؟" میں نے کہا۔ "نہ تم سے رابطہ ہوگا نہ میرے لیے خطرے کی کوئی بات ہوگی۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن تم کو ساتھ لے کر نہیں۔ تمھارا بھائی کچھ دیر میں اپنی فوج کے ساتھ آ جائے گا ... یہ جائے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" نازو نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی بھی تھی، منت سماجت کا انداز بھی تھا تو کھلی دھمکی کا رنگ بھی۔ "میں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔ تمھارے ساتھ ہی رہوں گی۔ تم اتنی جلدی بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا!"

"وہ حالات کچھ اور تھے جب ہم نے تمھیں بھی اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اور اب حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے تو ہم جانتے بوجھتے کنویں میں نہیں گر سکتے۔"

"تم نے تو ہماری آٹھویں حس کا مذاق اڑایا تھا سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "ہم نے تو بتا دیا تھا کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا اور تم نے دیکھا، اکرام شیخ نے بہن کو قائل کر لیا تھا کہ وہ بھی اب ہمارے ساتھ ہے اور یہ اُسے ہمارے پاس لے آئی۔"

"لیکن وہ دوبارہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔" نازو چلائی۔ "مجھ پر اعتبار کرو خدا کے لیے۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دلاور کا اعتماد حاصل کروں اور اس کی سیکرٹری بن جاؤں۔ اور تمھیں اس کے عزائم سے باخبر رکھوں۔ میں اس سے بھی زیادہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"وہ سب کچھ اب ممکن نہیں رہا۔ تمھارا بھائی اس کی اجازت ہی نہیں دے گا اور اگر اس نے اعتراض نہ کیا تو صاف بات ہے کہ تمھیں ذریعہ بنا کر وہ ہم پر نظر رکھے گا۔ تم اس کا کام بہت آسان کر دو گی۔ ادھر تم نے ہم سے رابطہ قائم کیا، ادھر اسے خبر ہو جائے گی۔ تمھارا ہم سے ملنا، ہمیں ٹیلی فون کرنا، کسی کی معرفت پیغام دینا یا کسی کو ہمارے پاس بھیجنا، سب ہمارے لیے خطرے کا سامان ہوگا۔"

"ویسے بھی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھائی تو مجرموں کی جان کا دشمن ہو اور بہن انھی مجرموں کی آلۂ کار بنے۔ وہ بھائی بھی کوئی احمق نہیں ہے۔ تمھارے ہاتھ پر بہت ... چلتے ہیں مگر اس سے تم شیخ جیسے ہوشیار پولیس افسر کے شاطر ذہن کو شکست دینے کا سوچتی ہو تو یہ تمھاری خام خیالی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم واپس جاؤ۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ تم مجھے زبردستی واپس نہیں بھیج سکتے۔" نازو چیخ کر بولی۔ وہ مقابلے پر آمادہ تھی اور اس کا مقابلہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ اسی وقت محسن اندر آیا اور سب کو ساکت و صامت دیکھ کر ٹھٹکا۔

"تم لوگ سامان اٹھاؤ اور نکلو۔ میرا سوٹ کیس غالب اٹھا لے گا۔" میں نے کچھ دیر بعد پُرسکون لہجے میں کہا اور نگاہ نازو پر رکھی۔

"شاہی سواری پیچھے کھڑی ہے۔" محسن نے کہا لیکن سب کی صورتوں پر تشویش آمیز سنجیدگی کم نہیں ہوئی۔

"دیر مت کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "سامان نکالو، میری صورت مت دیکھو۔"

"کیا... تم... تم نہیں چلو گے۔" رابعہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"میں تمھارے ساتھ ہی جاؤں گا۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "محسن ان سب کو لے جا اور میرا انتظار کر۔"

نازو کی حالت میں رونما ہونے والا تغیر بہت واضح تھا۔ اس کی منت سماجت بھی رائیگاں گئی تھی اور دھمکی نے بھی کسی کو مرعوب نہیں کیا تھا۔ میرا درشت رویہ اسے سب کی نظر میں ذلیل کر رہا تھا اور وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو اپنی شکست کے احساس کو کسی ردِ عمل کے بغیر تسلیم کر لے۔ اپنے عزم کا اظہار وہ پہلے ہی کر چکی تھی اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اپنی بات منوانے کے لیے وہ کس قسم کی احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کرنے کی اہل ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی خطرناک چمک پیدا ہوئی جو کسی چیتے کی آنکھوں میں شکار پر جست لگانے سے پہلے نظر آتی ہے۔ اس کے جسم سے ایک کھنچاؤ کی کیفیت کا اظہار ہونے لگا اور اس کی نگاہ مجھ پر مرتکز ہو گئی۔ میں نے محسن اور غالب کو سوٹ کیس اٹھا کے احاطے کی طرف سے باہر جاتے دیکھا۔ رابعہ بدستور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بت بنی کھڑی تھی۔ شاید اُسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے چنانچہ وہ بےحد خوف زدہ تھی۔

"نازو! خدا کے لیے سمجھو۔" رابعہ چلائی۔

"میں تمھارے ساتھ جاؤں گی۔" نازو نے اس کی طرف دیکھے بغیر خطرناک اور سپاٹ لہجے میں غرا کے کہا۔ "اور مجھے روکنا ہے تو چلاؤ مجھ پر گولی۔ میرا بھائی تمھیں نہیں میری لاش کو لے جائے گا۔"

میں نے اپنا ریوالور نکالا۔ "یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر گولی چلانے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"سکندر!" رابعہ نے دہشت زدہ ہو کے چیخ ماری اور ایکدم آگے بڑھی۔ "پاگل ہو گئے ہو تم!"

ابھی وہ میرے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں نے بائیں ہاتھ کو پھیلا کے اُسے پیچھے دھکیل دیا اور وہ دور جا گری۔ "اس بیوقوف عورت کو باہر لے جاؤ۔" میں نے ٹیڈی کو مخاطب کر کے کہا جو اپنے بھاری بھرکم، تجوری جیسے فولادی صندوق کو گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر اس نے سہارا دے کر رابعہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ رابعہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"انھیں سمجھاؤ۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ روتے روتے بولی۔

"سکندر سب ٹھیک کر لے گا۔ تم باہر چلو۔" ٹیڈی نے اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے باہر کی طرف گھسیٹا۔ اس تمام عرصے میں میرے کان ہر آواز سنتے رہے اور میں ذہنی طور پر گرد و پیش سے غافل نہیں ہوا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے بھی نازو پر سے نہیں ہٹی اور نہ اسی لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مجھ پر جھپٹ پڑتی۔ محسن نے عقلمندی یہ کی تھی کہ سب سے پہلے تمام اسلحہ سمیٹ لیا تھا۔ سوائے اسٹین گن کے جو اُس نے کندھے سے لٹکا لی تھی۔ سب ریوالور اس نے میز پر سے اٹھا کر اپنے سوٹ کیس میں بھر لیے تھے۔ نازو کو یقین آ چکا تھا کہ اب میرے ارادے میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ عین اس وقت جب میں نے محسوس کیا کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے اور خوف کے احساس سے بیگانہ ہو کے مارنے یا مارے جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، میں نے اپنا ریوالور ایک طرف اُچھال دیا۔ ریوالور پھسلتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا کے ایک ایسی جگہ پر ٹھہر گیا جو میرے اور نازو کے درمیان دس فٹ کے مساوی فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری چال کامیاب رہی کیونکہ نازو نے بڑی پھرتی سے گھوم کر جست لگائی اور ریوالور اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نازو کو دبوچنے کے لیے جست لگائی مگر اس نے میری چال کو سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک دم قلابازی کھا گئی اور اس کے پیروں نے مجھے اوپر سے گزار دیا۔ دیوار قریب نہ ہوتی تو میں دس بارہ فٹ دور تک جاتا۔ کم فاصلے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میرا سر دیوار سے نہیں لگا، ورنہ تصادم کی قوت مجھے ہوش سے بیگانہ کر دیتی۔ میرے پیر دیوار پر پڑے۔ ناکامی کے احساس نے مجھے ایک دم چوکس کر دیا۔ میں بھول گیا کہ میرے مقابل ایک لڑکی ہے اور وہ لڑکی عام آدمی پر بھاری پڑ سکتی ہے مگر میری حریف ثابت نہیں ہو سکتی۔ میں نے دیوار کو پیروں سے دھکیلا تو اسپرنگ کی قوت نے مجھے واپس پھینکا اور میں نے سیکنڈ کے سویں حصے میں گھوم کر قدم زمین پر جماتے ہی نازو کی طرف الٹی قلابازی کھائی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ میرے اٹھے ہوئے پیروں کے درمیان آیا تو میں نے دونوں پنجے ملا کے شکنجہ سا بنا لیا اور نازو کی کلائی کو گرفت میں محسوس کرتے ہی جھٹکا دیا تو نازو کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ نصف دائرے میں گھوم کر گھسٹتی ہوئی مجھ سے تقریباً چھ سات فٹ تک دور گئی۔ اگر اس کے بعد بھی وہ مقابلہ جاری رکھتی تو فیصلے میں چند سیکنڈ لگتے مگر نہ جانے کیسے اس کے ہاتھ میں آئے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ نازو نے ریوالور پر انحصار کرتے ہوئے پوری کوشش کی تھی کہ یہ ہتھیار اس کی گرفت سے نہ نکلنے پائے اور جیسے ہی موقع ملے وہ مجھے ہینڈز اپ کرا دے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ خالی ہاتھوں سے میرا مقابلہ بے سود ہوگا۔ ریوالور مل جانے کے بعد طاقت کا توازن اس کے حق میں ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُسے یہ موقع ملتا تو وہ کیا کرتی۔ کیا وہ سچ مچ مجھ پر گولی چلا دیتی یا صرف دھمکی پر اکتفا کرتی۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی اور جب آدمی اپنی عقل سے زیادہ اپنی حیوانی جبلت سے مغلوب ہو تو وہ دوست دشمن یا اپنے پرائے میں تمیز کیسے کر سکتا ہے۔ غلطی مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے ریوالور پھینکتے وقت اس کے سیفٹی کیچ کو دیکھا نہیں تھا۔ ظاہر ہے سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور انگلی پر اتفاقیہ دباؤ سے گولی چل گئی۔

فائر کی آواز کا فوری ردِ عمل مجھ پر ہوا۔ میں ایک دم ہوش میں آ گیا اور میں نے اپنے جسم کی منہ زور وحشی قوت کو سرکش گھوڑے کی طرح عقل کی لگام کھینچ کر قابو میں کیا۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہ آیا کہ نازو نے وہ گولی مجھ پر چلائی تھی لیکن اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ یہ ذہنی صدمہ بہت شدید تھا۔ اس نے مجھے اپنے دفاع کی خاطر رک جانے پر مجبور کر دیا۔ نازو اگر اس حد تک پاگل ہو چکی تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ شکست تسلیم کرنے کے بجائے پہلے مجھے مار دے اور پھر خود کو۔ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھے مگر اس وقت جب میں نے دیکھ لیا کہ اس گولی سے خود نازو کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ پھر باہر سے میں نے رابعہ کی چیخ سُنی۔

"خبردار! میرے قریب مت آنا۔" وہ ریوالور ایک ہاتھ میں تھام کر پیچھے ہٹنے لگی۔ "میں گولی چلا دوں گی سکندر۔" رابعہ طوفانی بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی، دوسرے لمحے میں وہ میرے سامنے تھی اور اس کے دونوں ہاتھ پھیل چکے تھے اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ اپنے جسم کو میرے لیے ڈھال بنا چکی تھی۔ "اگر تم کو اتنا ہی شوق ہے تو اب پہلے مجھ پر گولی چلاؤ۔" اس نے چیخ کر کہا۔

نازو کے کپڑے پشت کی جانب سے پھٹ گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پر دہ گیا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لمحہ جو کسی کی جان کا طلب گار بن کے آیا تھا اپنا نذرانہ لیے بغیر لوٹ گیا ہے۔ اس کے بعد آنے والا لمحہ پچھتاوے لے کر آیا تھا۔ پچھتاوا کچھ نہ کر سکنے کا اور پچھتاوا اس کا جو ہو چکا تھا۔ ریوالور اب نازو کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور وہ خود پلک جھپکائے بغیر رابعہ کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، میں تم پر گولی نہیں چلا سکتی۔" شکست کے احساس سے دوچار نازو نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ اتنے بہادر بھائی کی بہن ہو۔" رابعہ نے تلخ اور نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"میرا بھائی واقعی بہادر ہے۔" نازو ایک دم ہنسی۔ اس کی ہنسی میں دیوانگی کی پکار تھی۔ "کون بھائی اتنا بہادر ہوتا ہے کہ اپنی ہی بہن پر گولی چلا سکے اور یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ اُس بھائی کی بہن پر میں بھی گولی چلا سکتی ہوں مگر میں اپنی ہار نہیں مان سکتی۔ میں ان سب کو شکست دے سکتی ہوں جو سمجھتے ہیں کہ جیت ان کی ہوئی۔"

"ہار کیسی نازو؟" میں نے رابعہ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور اُسے ہٹا دیا۔ "یہ ہار جیت کا تو مسئلہ ہی نہیں۔"

"تمھارے لیے نہیں ہے لیکن میرے لیے ہے۔" وہ پھر ہنسی۔ "جب میں نے تمھارا اعتماد کھو دیا تو کیا یہ میری ہار نہیں۔ تم مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھتے۔ تم سمجھتے ہو میں نے جانتے بوجھتے سب کو دھوکا دیا۔ تم مجھے بھی اس ڈرامے کا ایک کردار سمجھتے ہو جو میرے بھائی نے کیا تھا۔ تم سب کو یقین ہے کہ مجھے اپنے بھائی کے دھوکے کا علم تھا۔ تم یہ ماننے کو تیار نہیں کہ دھوکا میرے ساتھ بھی ہوا اور تم سب مجھ سے ڈرتے ہو، مجھے اپنے لیے خطرہ تصوّر کرتے ہو۔ مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔"

وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اس پر ہپناٹزم کا اثر ہو اور میں بڑی احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ رابعہ سانس روکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ غالب اور محسن دروازے کے فریم میں ساکت کھڑے تھے۔

"رک جاؤ سکندر!" نازو یکلخت ہوش میں آگئی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "مجھے معلوم ہے تم مجھ کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے۔ لیکن میں تم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ بھائی میری لاش لے جا سکتا ہے... مجھے نہیں۔"

"ہم تمھیں ساتھ لے چلیں گے نازو۔" رابعہ نے کہا۔

نازو ہنسی اور مزید ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ "تم بزدل ہو سکندر۔ اور جھوٹے ہو۔ نہ تم میں اتنی ہمت تھی کہ مجھے ساتھ رکھتے اور نہ تم میں مجھ پر گولی چلانے کی ہمت تھی۔ تمھاری مشکل کو میں آسان کر دیتی ہوں۔" اس نے ریوالور اٹھایا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

"نازو! میری طرف دیکھو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"جھوٹ۔ اس وقت بھی جھوٹ بول کے بے وقوف بنانا چاہتے ہو مجھے؟" وہ ہنسی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے نازو۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دیدو۔" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "تاکہ پھر تم مجھے ناک آؤٹ کر کے یہیں چھوڑ جاؤ مسٹر بلیک بیلٹ عرف سکندرِ اعظم۔"

"میں اس کی ضمانت دیتی ہوں نازو کہ ایسا نہیں ہوگا۔" رابعہ آگے بڑھی۔ "تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" نازو ہنسی۔ "مگر تم سکندر کی وکیل بھی ہو۔ اس لیے دلائل تو دو گی — سکندر سے کہو کہ تمھاری قسم کھائے۔ کیا تمھاری جھوٹی قسم کھا سکتا ہے سکندر؟ نہیں کھا سکتا نا، مجھے معلوم تھا۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں نازو کہ ہم جہاں بھی جائیں گے تمھیں ساتھ لے کر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "لاؤ، اب یہ ریوالور میرے حوالے کر دو۔"

نازو کی آنکھوں میں بے یقینی کے ایک لمحے کی جھلک اُبھری۔ میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ہٹائی نہیں تھیں۔ اسی تذبذب کا عکس دیکھتے ہی میں نے جست لگائی۔ دوسرے لمحے میں نازو اس مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی جیسے ڈوری کا ایک جھٹکا پانی سے خشکی پر پھینک دے۔ اس کا نازک وجود اس پودے کی طرح زمین بوس ہو گیا جس پر پہاڑ ٹوٹ کر آ گرا ہو۔ میرے ہاتھ نے اس کی کلائی کو جھٹکا۔ ایک گولی نہ جانے کس سمت میں پرواز کر گئی اور ریوالور فرش پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔

"چھوڑ دو... چھوڑ دو مجھے۔ مر جانے دو مجھے۔" نازو نے بل کھانا اور چلّانا شروع کیا۔ میں نے اس کے رخساروں پر زور سے طمانچے مارے۔ ہر تھپیڑ سے اس کا چہرہ گھوم جاتا تھا اور اس کی مزاحمت ختم ہونے لگتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز کم ہونے لگی اور اس کا سر ڈھلکنے لگا۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور دروازے کی طرف چل پڑا جو چند قدم کا فاصلہ تھا۔ نازو کے دونوں ہاتھ میری پشت کی جانب جھول رہے تھے اور اس کا سر بھی کسی بے جان نعش کی طرح ڈول رہا تھا۔ آگے صرف اس کی ٹانگیں تھیں۔ رابعہ خود بخود میرے ساتھ ہو گئی۔ دروازے میں کھڑے رہ کر تماشا دیکھنے والے محسن، غالب اور ٹیڈی نے راستہ چھوڑ دیا اور آگے آگے چلے گئے۔ میں نے باری باری سب کی صورتوں کو دیکھا۔

اس صورتِ حال نے سب کو متفکر اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی بھی نازو کو اپنے ساتھ رکھنے کے حق میں نہیں تھا مگر نازو نے ایکبار پھر جان کی بازی لگا کے اپنے لیے یہ حق حاصل کر لیا تھا۔ اس میں شک کی کوئی بات نہ تھی کہ رابعہ نے بروقت مداخلت نہ کی ہوتی اور میں نے طاقت کے بجائے اس بحران سے نمٹنے کے لیے عقل استعمال نہ کی ہوتی تو نازو اپنے لہو سے خود کو معتبر ثابت کر دیتی۔ لیکن اس کے بعد ہم سب خود اپنی نظر میں موردِ الزام ٹھہرتے۔ وہ جذبات کے طوفان میں قیامت بن جانے والی لڑکی زندگی اور موت دونوں کو کھیل سمجھتی تھی۔ اس کا ہمارے ساتھ رہنا بھی کسی طور سود مند نہ تھا۔ ایک جذباتی مسئلہ میرے لیے تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق دو پیر دو کشتیوں میں رکھنے والا ڈوب جاتا ہے۔ ڈوبنا مجھے کبھی منظور نہ تھا لیکن کبھی ڈوبنا ہی ہوتا تو میں رابعہ اور صرف رابعہ کی خاطر ڈوبنا پسند کرتا۔ کسی اور کی وجہ سے یا کسی اور کی خاطر میں زندگی کے کسی بھنور میں اترنا قبول نہیں کر سکتا تھا اور اپنی محبت کو رابعہ کی امانت سمجھ کے اس کی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا مسئلہ ہم سب کے لیے وہ خطرہ تھا جو نازو کے وجود سے الگ نہ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ شیخ کی غیرت کے لیے یہ چیلنج بہت بڑا ہوگا۔ وہ فرض کے جنون کا شکار پولیس آفیسر کسی رشتے کی تقدیس کو کسی طرح بھی پیشے کے تقاضوں سے زیادہ اہم نہیں مانتا تھا۔ یہ اس کے مُنہ پر طمانچے سے کم نہ ہوگا کہ اسی کی بہن جرائم پیشہ افراد کے ساتھ گھر سے نکل جائے۔ کسی بھی بھائی کی عزت پر حرف آئے تو وہ برداشت نہیں کر پاتا۔ اکرام شیخ کے لیے یہ دُہری جنگ ہوگی۔ ایک ادائے فرض کی خاطر، دوسری ناموس کے تحفظ کی خاطر۔ اس کی فرض شناسی میں اب انتقام کی آرزو بھی شامل ہو جائے گی۔

"اچھی طرح دیکھ لو۔" احاطے کی دیوار کے قریب پہنچ کر میں رکا۔ "پیچھے تو کچھ نہیں چھوڑا ہے نا۔"

"ایک لاش چھوڑ دی ہے تاکہ سند رہے اور کام آئے۔" محسن بولا۔ "اسے ساتھ لے جا نہیں سکتے۔"

"لاش؟ کس کی لاش؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"اس ڈرائیور کی جو پولیس کا ٹرک چلا کے یہاں تک لایا تھا۔" غالب نے مجھے یاد دلایا۔ "اور جس نے مجھے شوٹ کرنا چاہا تھا۔"

"اچھا ہوا کہ میں نے دیکھ لیا۔ ورنہ لاش باہر ہی پڑی رہ جاتی۔" محسن بولا۔

"لاش اب کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "مجھے تو نظر نہیں آئی تھی۔"

"لاش اندر ہے، میزوں کے نیچے —" محسن نے جواب دیا۔ "کہو تو اٹھا لائیں۔"

"ابھی کچھ دیر میں پولیس پہنچنے ہی والی ہو گی۔ وہ لے جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ "تم خود نکلو ورنہ وہ تمھیں بھی لے جائیں گے۔"

باری باری غالب اور ٹیڈی دیوار پر چڑھے۔ انھوں نے ہاتھ نیچے بڑھایا اور رابعہ کو اوپر کھینچ کر دوسری طرف اتار دیا۔ پھر انھوں نے نازو کو کھینچا اور اس کا بوجھ میرے کندھے سے دیوار پر منتقل ہو گیا۔ میں اور محسن دوسری طرف کودے اور نازو کو اسی بیہوشی کے عالم میں محسن نے اٹھا لیا۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پر مجھے ایک تانگا نظر آیا۔

"اس وقت کون جیالا کوچبان مل گیا؟" میں نے کہا۔

"تو میرے لینڈ لارڈ کی توہین تو نہیں کر رہا ہے۔" محسن ہنسا۔ "تانگا اسی کا ہے۔"

"تو نے اسی لیے ٹیکسی کو چھوڑ دینے پر اعتراض نہیں کیا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ دن میں میرا پیارا مالک مکان مجھے اپنے پیارے سے گھر میں لے گیا تھا تو وہاں میں نے اس کا پیارا سا تانگا اور پیارا سا گھوڑا دیکھا تھا۔" محسن بولا۔ "مجھے بہت پسند آیا تھا۔ بالکل نئے ماڈل کا گھوڑا ہے۔"

"تم لوگوں کے ساتھ تو نیکی کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔" رابعہ بولی۔

"وہ کیسے بی بی؟" محسن نے سخت بُرا مان کے کہا۔ "نیکی تو ہم نے کی ہے۔ اسے یکمشت اٹھارہ ہزار دے دیے۔ اس کا قرض بے باق ہو گیا اور ہم ایک دن بھی یہاں نہیں رہے۔ یہی کہے گا کہ رحمت کے فرشتے تھے۔"

"جو آئے اور تانگا گھوڑا کھول کر لے گئے۔" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔"
"اس تانگے گھوڑے کی قیمت بھی نکال دو تو وہ فائدے میں رہا۔کم سے کم دس بارہ ہزار اسے خواہ مخواہ مل گئے۔کل تک وہ اتنی رقم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" محسن نے برہمی سے کہا کیونکہ غالب کی بات پر رابعہ ہنس پڑی تھی۔
"کل تک وہ تمہارے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ تم تانگا چور ہو۔" رابعہ نے محسن کو چھیڑا۔
"تانگا ہم اسے واپس کر دیں گے، کل تک۔اپنی ضرورت کے لیے اس وقت یہی سواری دستیاب تھی۔" محسن نے کہا۔"اور یہ تو ہم نے عزت افزائی ہی کی ورنہ ہم اس سے پہلے کاریں حاصل کرتے رہے ہیں۔"
"لینڈ لارڈ صبح دیکھے گا کہ کرائے دار بھی غائب اور تانگا گھوڑا بھی تو سمجھ جائے گا کہ کرائے داری تو محض بہانہ تھی۔" ٹیڈی نے کہا۔" اصل مقصد گھوڑے تانگے کی چوری تھا۔جیسے وہ دیہاتی جس کا روپیہ مال کھو گیا تھا میلے میں۔ وہ کہتا پھرتا تھا کہ میلہ کیا تھا سب میرا روپیہ مال چوری کرنے کا کھیل تھا۔
"صبح تو وہ حوالات میں ہوگا۔" میں نے کہا۔"ممکن ہے شیخ اس کی گلو خلاصی کرا دے ورنہ ہمیں پناہ دینا اس کو بہت مہنگا پڑے گا۔پولیس ابھی تھوڑی دیر میں ہی اُسے جگا کے پوچھے گی کہ وہ لوگ کہاں گئے اور اسے بھی لاش کے ساتھ لے جائے گی۔یہ خبر شاید اُسے حوالات میں ہی ملے گی کہ تانگا گھوڑا بھی نہیں ہے۔ وہ کیا بتائے گا کہ کرائے دار کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے۔"
"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا مرزا غالب۔" محسن نے کہا۔ اور تانگے میں آ کے بیٹھ گیا۔
"ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔" غالب نے آہ سرد بھر کے فرمایا۔" ہمارے لیے اس فتنۂ محشر کا آنا واقعی قیامت کے آنے سے کم نہیں ثابت ہوا مگر مجھے کیا معلوم تھا۔اگر اس کا وہ خبیث بھائی ساتھ نہ آتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"
"گھوڑے کا اگنیشن سوئچ کہاں ہوتا ہے۔" محسن نے لگام تھام کے کہا۔" کلچ اور ایکسیلیریٹر گیئر اور بریک سب کچھ یہ لگام ہے؟"
میں نے نازو کو آگے ڈال دیا اور اس کے پیر سمیٹ دیے۔وہ گٹھڑی سی بنی اس تھوڑی سی جگہ میں سما گئی جو اگلی سیٹ کے نیچے اور تانگے کے سامنے والے حصّے کے درمیان تھی۔اسے سیدھا بٹھانا ناممکن تھا اور گود میں لٹا کے لے جانا خطرناک تھا۔راستے میں گشتی پولیس پارٹی دیکھتی تو یہی سمجھتی کہ ہم کسی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔محسن اپنے حُلیے سے بالکل تانگے والا لگتا تھا۔اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ٹیڈی بھی دیہاتی نظر آتا تھا۔ہم نے ٹیڈی کے ساتھ غالب کو آگے بٹھایا تھی کیونکہ وہ کچھ دور جانے کے بعد اترنا چاہتا تھا اور اخبار کے دفتر پہنچ کر حاضری دینے کے موڈ میں تھا۔میں اور پیچھے بیٹھے اور اپنے پیر ان سوٹ کیسوں پر رکھ لیے جن میں سے ایک میرا تھا اور ایک محسن کا۔
"استاد ٹیڈی! تمہاری تجوری کدھر ہے؟" محسن نے چلانے سے قبل کہا۔
"وہ صندوق! نیچے ہے۔" ٹیڈی نے سیٹوں کے نیچے خلا کا حوالہ دیا۔" تم کو اس کی اتنی فکر کیوں رہتی ہے؟"
"فکر ہمیں رہتی ہے؟" میں نے کہا۔" چلو ٹھیک ہے، اس فکر سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ اسے تانگے میں ہی چھوڑ دیں..."
"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ٹیڈی نے گھبراہٹ... کہا۔اس کی گھبراہٹ نے ایک بار پھر مجھے اس پُراسرار صندوق... متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا جس کے راز سے آگاہی ابھی تک حاصل نہ ہو سکی تھی۔ محسن خان نے ماہر کوچبان ہونے کا ثبوت یوں دیا کہ لگام کھینچ کر گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا... ہنہنا کے اُچھلا۔میں اور رابعہ گرتے گرتے بچے۔
"آپ نے پہلے کبھی تانگا یا گھوڑا چلایا ہے؟" رابعہ... کہا۔"نہیں تو گھوڑے سے جگہ بدل لیں۔"
"ایک ڈاکٹر نے بھی اپنے مریض سے ایسا ہی احمقانہ... کیا تھا کہ کیا آپ پہلے کبھی فوت ہوئے ہیں؟" محسن نے گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی:" ہر کام آدمی کو زندگی میں پہلی... کرنا پڑتا ہے۔وہ پہلی بار پیدا ہوتا ہے، پہلی بار عشق کرتا ہے... بدل جائے تو اس کا کیا قصور۔اگر میں ایسا ہی سوال آپ سے... کہ آپ نے پہلے کبھی شادی کی ہے؟"
بیک وقت میں نے اور رابعہ نے محسوس کیا کہ سوچے سمجھے بغیر بولنے والا محسن ہمیں طنز کا نشانہ بنا رہا ہے۔کیا اس... یہ بات دانستہ کی تھی؟ مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میرا پہلا عشق فوزیہ... اب میں دعوےٰ کرتا ہوں کہ میرا پہلا عشق رابعہ ہے۔اور رابعہ... جو شادی کی تھی وہ اس کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ثابت ہوا... بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو۔تیرے بھی صنم جھوٹے... بھی صنم جھوٹے۔شاید محسن کو احساس بھی نہیں تھا کہ مذاق... میں اس نے کتنی بڑی حقیقت کے زخموں کو کُرید دیا... اُس نے بالآخر گھوڑے پر قابو پا لیا تھا اور اب کسی ماہر کو... کی طرح تانگا چلاتے ہوئے حلق سے وہ آوازیں نکال رہا... جو تانگے والے اور اس کے گھوڑے... کو ڈی...

ہوتی ہیں۔غالب اور ٹیڈی ہنس رہے تھے۔
تقریباً تین چار فرلانگ دور آ جانے کے بعد ہمیں رات کو گشت کرنے والے سپاہیوں کی پیدل ٹولی ملی۔" کی حال اے سنتری بادشاہ بخیر ہووے۔" اس نے پھر گھوڑے سے عبرانی یا لاطینی میں کچھ کہا سنتری خاموشی سے گزر گئے۔
"اب ارادہ کدھر کا ہے؟" میں نے محسن کی بات سے پیدا ہونے والی چور خلش سے نجات پانے کے لیے کہا۔
"گھوڑا آٹومیٹک ہے۔کسی کی مرضی کا غلام نہیں۔چل بھئی میرے شیر تے سوا شیر۔" محسن بولا۔
"یار مجھے تو اتار دے۔" غالب نے کہا۔" میں ایڈیٹر صاحب کو اپنی شکلِ مبارک دکھا دوں۔کوئی تو گواہ ہو میری بے گناہی کا۔ شیخ صاحب چاہیں گے تو انھیں گواہی بھی فراہم کر دیں گے کہ ہم رات بھر وہیں تھے۔"
"اچھا۔اس دنیا میں پھر کہاں ملاقات ہوگی؟ جلتے جلتے یہ تو بتا جاؤ۔" محسن نے کہا اور نہ جانے کیسے گھوڑے کو بریک لگا کے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔" اور ہو گی یا نہیں ہو گی؟"
"مجھ سے آفس میں ہی رابطہ قائم کر لینا۔میں کل صبح اخبار شائع ہونے کے بعد وہیں سو جاؤں گا۔" غالب نے اترتے ہوئے کہا۔" چوکیدار کو بتا دوں گا کہ کوئی ملاقاتی آئے تو جگا دے۔ فون اسی کمرے میں ہو گا۔"
"تمہاری امانت بھی اسی کوٹھے آئیں۔آخر وہ چوکیدار ہے؟" محسن نے کہا۔وہ سخت شرارتی موڈ میں تھا۔غالب نے آگے جا کے نازو کو دیکھا، ایک سرد آہ بھری اور چل پڑا۔اسی وقت دُور سامنے سے موٹر سائیکلوں کی روشنی نمودار ہوئی اور پولیس کے سائرن سنائی دیے۔"تم لوگ تانگے کو گلی میں موڑ لو۔" غالب نے جلدی سے کہا۔" میں ان سے بات کرتا ہوں۔"
گھوڑے کو اس گلی میں موڑنا آسان نہیں تھا مگر محسن فوراً نیچے اترا اور اس نے لگام کو تھام کر گھوڑے کو گلی میں کر لیا۔ خالی اور خاموش گلی گھوڑے کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔محسن نے گھوڑے سے آگے پیدل چلنے کو ترجیح دی۔
"یہ غالب ان سے کیا بات کرے گا؟" محسن نے سوال کیا۔" اور بات کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"
"ان کا دھیان ہماری طرف نہیں جائے گا۔" میں نے کہا۔" غالب کا کیا ہے۔اس کے پاس پریس کارڈ ہے۔"
"اور اگر ان کے ساتھ شیخ بھی ہوا؟" محسن بولا۔" وہ غالب کو پہچان لے گا۔"
"نہیں۔میرا خیال ہے اُسے گولی لگ گئی تھی۔" میں نے کہا۔" میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ وہ ساتھ نہیں آسکتا۔"
"ہو سکتا ہے یہ پولیس پارٹی ہماری تلاش میں نہ آئی ہو۔" محسن بولا۔
"ادھر اس وقت کوئی پولیس پارٹی چھاپا مارنے آئی ہے تو نوّے فیصد امکانات یہی ہیں کہ وہ ہم سب کو گرفتار کرنے کے لیے آئی ہوگی۔اگر ہمارا تانگا راستے میں ملتا تو ہو سکتا ہے وہ چیک کرتے اور ظاہر ہے ہمیں پہچان لیتے۔غالب بیوقوف نہیں ہے۔وہ ان سے کوئی ایسی بات کرے گا کہ ان کا ذہن گمراہ ہو جائے اور ان کا دھیان تانگے کی طرف نہ جائے۔ ویسے بھی شاید انھوں نے ہمارے تانگے کو گلی میں مڑتے نہ دیکھا ہو۔ اس کی لائٹس نہیں جل رہی تھیں۔" میں نے کہا۔
" اور اگر دیکھ لیا ہو گا تو وہ سیدھے گلی میں آ جائیں گے۔" رابعہ نے کہا۔ ان کی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی روشنی بہت تیز تھی
" اس وقت نہ ہم فرار ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" میں نے رابعہ کے خیال کی تائید کی۔
محسن نے اچانک تانگے کو ایک کھلے گیٹ میں موڑ کر گھنے درختوں کی آڑ میں روک لیا۔گیٹ کسی پرانی وضع کی کوٹھی کا تھا جس کے حدود دیوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔میں نے اس کی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور قوتِ فیصلہ کو سراہا۔اس وقت بڑے خطرے سے نجات پانے کے لیے محسن نے ایک چھوٹا خطرہ مول لے لیا تھا جو بالکل صحیح قدم تھا۔ہم دونوں نے ایک ساتھ سوٹ کیس اتار کے جھاڑیوں کے پیچھے رکھے جو بیرونی احاطے کے متوازی تین طرف پھیلی ہوئی تھیں اور بلندی میں احاطے کی دیوار سے اونچی نکل گئی تھیں۔ دیوار اور جھاڑیوں کے درمیان بہت کم جگہ تھی لیکن جہاں گیٹ تھا وہاں سے کچھ دور تک دیوار سے لگ کر کھسکنے کی گنجائش تھی۔سوٹ کیس رکھتے ہی میں نے رابعہ کو اس محدود سی جگہ میں دھکیلا۔سخت خشک اور نوکیلی جھاڑیوں کی رگڑ سے اس کے چہرے پر اور ہاتھوں پر خراشیں آئیں اور اس کے کپڑے بھی جگہ جگہ الجھ کر پھٹے۔وہ تھوڑا سا کراہی مگر پھر چہرے کے سامنے دونوں ہاتھ رکھ کے آگے بڑھنے لگی۔جب میں نازو کو اٹھانے کے لیے واپس ہوا تو ٹیڈی اپنے فولادی صندوق کو اٹھا کے لانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ محسن نے صندوق کو تانگے کی سیٹوں کے نیچے سے نکال کر ٹیڈی کے سر پر رکھ دیا تھا لیکن اس بوجھ کے ساتھ جھاڑیوں اور دیوار کے درمیان کی جگہ میں گھسنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔جب میں نازو کو اٹھا چکا تھا تو میں نے ایک دھما کا سُنا۔صندوق ٹیڈی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے سر پہ سے گر گیا تھا اور وہ اُسے پوری طاقت لگا کے کھُردری اور ناہموار زمین پر گھسیٹ رہا تھا۔ مَیں نے سانس روک کر کوٹھی کی جانب دیکھا اور میرے ساتھ سب نے ٹیڈی کو گھورا جو ندامت کے باعث کسی سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔

اندر سے کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔ کوئی دریچہ روشن نہیں ہوا۔ کسی چوکیدار نے ہمیں نہیں للکارا اور کوئی کتا بھونکتا ہوا نہیں نمودار ہوا تو مَیں نے اطمینان کا سانس لیا۔ محسن نے پھر گھوڑے کی لگام تھامی اور اسے اپنے ساتھ کوٹھی سے باہر لے گیا۔ مَیں نے کچھ دیر اس کی ٹاپوں کی آواز سُنی۔ پھر اچانک گھوڑے کے ہنہنانے اور سرپٹ بھاگنے کی آواز آئی۔ مَیں نے نازو کو گیٹ کے پیچھے ڈال دیا اور خود ٹیڈی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

نازو آہستہ سے کراہی۔ "مر جلنے... وہ... مجھے..."

"اسے بھی ابھی ہوش آنا تھا۔" ٹیڈی نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔ "خواہ مخواہ اٹھا لائے۔"

"اس کی آواز تمہارے اس منحوس شکل والے صندوق کے دھماکے سے بہت کم ہے۔" مَیں نے کہا۔ "تم بھی تو اس مصیبت کو خواہ مخواہ ہی اٹھائے پھرتے ہو۔"

"کیا مَیں پاگل ہوں سکندر بادشاہ؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اتنے عرصے سے تم مجھے جانتے ہو۔"

"تمہارے اس صندوق کو اٹھائے پھرنے کی حرکت اگر دیوانگی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" مَیں نے کہا۔ ٹیڈی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کسی کو ویٹ لفٹنگ کا شوق ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "ذرا آہستہ بات کرو۔"

"اور بوجھ کیا کم ہیں۔ ہم سب پر ایک دوسرے کی ذمے داری کا بوجھ ہے۔ سب کے ساتھ اپنے اپنے گناہوں کا بار ہے اور اس پر ہماری زندگی کے سارے جھمیلوں کا بوجھ ہے۔" مَیں نے کہا۔ "ذرا اپنی حالت کا تصور کرو۔"

"اس وقت تو ہماری ٹانگوں پر ہمارا وجود بھی ایک بوجھ ہے۔" رابعہ بولی۔ "کیا ہم اسے یہاں رات بھر اٹھائے کھڑے رہیں گے۔"

"نہیں۔ ابھی کچھ دیر میں کوٹھی کا سخی، مہمان نواز اور فرشتہ سیرت مالک مسکراتا ہوا نکلے گا اور انتہائی شائستگی کے ساتھ اپنے مہمانوں کو خاطر مدارات کے لیے اندر لے جائے گا۔" مَیں نے کہا۔ "پھر ہاٹ شاور باتھ۔ پھر پُرتکلف طعام۔ مغلئی، چینی اور انگلش کھانوں کا مزہ۔ گرماگرم کافی۔ اس کے بعد سینٹرل ہیٹنگ والے پُرآسائش بیڈروم۔ یہاں کھڑے کھڑے ان سب کا تصور کرو تو بہت آرام ملے گا۔"

"آج سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"سردی سے زیادہ مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"مقدر میں تو صرف دھکے کھانے لکھے ہیں۔" رابعہ بولی۔ "آخر چین سے بیٹھنا کب نصیب ہو گا۔"

"نکلنا تو یہاں سے بھی پڑے گا۔" ٹیڈی بولا۔ "نہ جانے یہ کس کا گھر ہے۔" اسی وقت نازو پھر بڑبڑائی۔

"نازو کو کچھ ہو نہ جائے۔" رابعہ نے فکرمندی سے کہا۔

"ہسٹریا کا دورہ اتنا شدید اور طویل نہیں ہوتا۔ کہیں تم نے ضرورت سے زیادہ جرأتِ مردانہ کا مظاہرہ تو نہیں کیا تھا؟"

"اگر اسے فوراً کمبل میں لپیٹ کر لٹا دیا جاتا اور کوئی گرم چیز پینے کو دی جاتی تو یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں آ جاتی لیکن ہم اسے کس طرح اٹھائے پھر رہے ہیں اور اب کہاں ڈال رکھا ہے۔" مَیں نے کہا۔

گلی کی خاموشی میں بھاری موٹر سائیکل کی آواز گونجی۔ یہ آواز قریب آئی اور مَیں نے گیٹ کے سامنے روشنی دیکھی۔ تھوڑا سا جھک کر اور گیٹ کے گرل والے حصے میں سے جھانک کر میرے شبہات کی تصدیق ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر کوئی پولیس انسپکٹر یا سب انسپکٹر تھا۔ وہ مین گیٹ کے سامنے رکا اور پھر دونوں قدم زمین پر جمائے اس نے موٹر سائیکل کو موڑا تو ایک لمحے کے لیے میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ تھوڑا سا آگے آیا اور اس نے ایکسیلیٹر دبایا تو ہیڈ لائٹ نے گیٹ سے اندر آنے والے راستے کو روشن کر دیا۔ مَیں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلا کے واضح کیا کہ وہ بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہے۔ موٹر سائیکل کا انجن دو تین بار بڑی قوت سے گرجا اور روشنی تیز ہوئی۔ ہم دم سادھے پتھر کے بُت بنے کھڑے رہے۔ معلوم نہیں وہ موٹر سائیکل کی روشنی میں اندر کیا دیکھ رہا تھا اور اس نے خاص طور پر اسی کھلے گیٹ کو قابلِ توجہ کیوں سمجھا تھا۔ اگر وہ اندر آ جاتا تو ہمارا وہاں چھپے رہنا مشکل ہو جاتا۔ جب وہ واپس جاتا تو ہیڈ لائٹ میں ہم سب بالکل نمایاں نظر آتے اور لائٹ کی حرکت کے ساتھ اسے دیوار پر ہمارے متحرک سائے فوراً متوجہ کر لیتے۔ مَیں طے کر چکا تھا کہ اگر وہ اندر آیا تو مَیں اسے مہلت نہیں دوں گا اور پیچھے سے جست لگا کے یوں دبوچ لوں گا کہ اس کی آواز بھی نہ نکلنے پائے لیکن یہ بہت

جھاڑیوں سے نکلنے کی معمولی سی آواز پر چوکنا ہو جاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ مقابلہ کرنے کی گنجائش نہ دیکھتا تب بھی شور ضرور مچاتا۔ پھر اس کی موٹر سائیکل بھی گرتی تو کم آواز نہ کرتی۔

جب لائٹ کا رُخ بدلا اور موٹر سائیکل واپس ہوئی تو مَیں نے محسوس کیا کہ میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے۔ آدھے گھنٹے کی اعصابی کشیدگی نے ہم سب کو شدید ذہنی و جسمانی کرب میں مبتلا رکھا تھا۔ خوف کا احساس کم ہوا تو مَیں نے رابعہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کانپ رہی تھی مگر سردی سے نہیں۔ محسن ایک دم کود کر اندر آ گیا۔

"کیا پولیس آئی تھی یہاں؟" محسن نے بڑی تشویش سے کہا۔

"آئی تو تھی لیکن آ کے ٹل گئی۔" مَیں نے سکون کی گہری سانس لے کر کہا۔ "نہ اس کا یہاں رکنا میری سمجھ میں آیا نہ اس کا یوں لوٹ جانا۔"

"کیا اسے شک ہو گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"شک ہوتا تو اسے اندر آنے سے کون روک سکتا تھا۔" مَیں نے کہا۔

"مجھے تو سب سے زیادہ ڈر نازو کی طرف سے تھا کہ ایکدم ہوش میں آ کر چلّانے نہ لگے۔" ٹیڈی بولا۔

"تو نے تانگے اور گھوڑے کو کہاں چھوڑا؟" مَیں نے کہا۔

"یہاں سے ایک فرلانگ آگے جا کے چوک سا آتا ہے۔ تین سڑکیں ملتی ہیں۔" محسن بولا۔ "مَیں نے ایک سڑک پر گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہوئے مسلسل چابک مارے اور اسے سرپٹ بھاگنے دیا۔ نہ جانے کہاں جا کے رکا ہو گا۔"

"خدا کے لیے یہاں سے نکلو۔" رابعہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔"

"نکل کر کہاں جائیں؟" مَیں نے سوچتے ہوئے کہا۔ بھوک سردی اور تھکن سے خود میری حالت ابتر ہونے لگی تھی۔ رابعہ تو عورت تھی اور اس نے ابھی تک جتنی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا وہ غیر معمولی تھا۔

"کہیں بھی چلو۔ کوئی جگہ ہو بیٹھنے کی۔" رابعہ بولی۔ "ورنہ مَیں بے ہوش ہو کے گر جاؤں گی تو یک نہ شد دو شد والا مسئلہ پیدا ہو جائے گا تم سب کے لیے۔ نازو ایسے ہی پڑی رہی تو مر جائے گی۔ اسے نمونیہ ہو جائے گا۔"

"کیا انہیں جگائیں؟ رات بھر کے لیے پناہ مانگیں۔" مَیں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ نہ ہو سکندر بادشاہ کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔" ٹیڈی نے کہا اور مجھے اس کی آواز بھی کانپتی ہوئی لگی۔

"تم ایک منٹ یہیں رکو، مَیں دیکھ کر آتا ہوں۔" محسن بولا۔ "کوئی یہاں رہتا بھی ہے یا نہیں۔"

"تھوڑی سی ہمت سے کام لو۔ ابھی کچھ کرتے ہیں۔" مَیں نے رابعہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔

"بلا سے کھانے کو کچھ نہ ملے۔ اتنا تو ہو کہ ہم اس سرد رات میں کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر کر مرنے سے بچ جائیں اور صبح تک زندہ رہیں۔" رابعہ نے کہا۔ پھر وہ محسن کو آگے جا کر کھڑکیوں دروازوں کا جائزہ لیتے دیکھتی رہی۔

"تقدیر کا یہ کیسا امتحان ہے۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔ "تم اتنی بڑی اور نامور وکیل! مَیں ایک صنعت کار۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس اور کیا نہیں ہے۔ اس وقت بھی ہمارے پاس بائیس تیئس ہزار کی نقد رقم ہے۔ اسٹین گن تک ہے ہمارے پاس لیکن ہم کیسے چوہوں کی طرح دبکے پڑے ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"اس وقت ایسی مایوسی کی باتیں کر کے کیا ملے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"محسن بہت تیز تیز قدم اُٹھاتا آ رہا ہے۔ کوئی خوش خبری لایا ہے شاید۔" مَیں نے کہا۔

"خوش خبری یہ ہے۔" محسن نے قریب آتے ہوئے میری بات سن لی تھی۔ "کہ مکان خالی اور مقفل ہے۔"

"پھر اب کیا ہو گا؟" رابعہ نے مایوسی سے کہا۔ "اب کہاں جائیں گے؟"

"سائڈ میں ایک گیراج ہے۔" محسن بولا۔ "رات وہاں گزاری جا سکتی ہے۔ کافی جگہ ہے ہم سب کے لیے۔"

"تو نازو کو اٹھا۔" مَیں نے باہر آ کے جیسی بجائی۔ "میں دونوں سوٹ کیس اُٹھاتا ہوں۔ خواجہ نیک محمد! تم اپنا مصیبت خانہ خود اٹھاؤ یا چاہو تو اس کے ساتھ یہیں پڑے رہو۔"

چند منٹ بعد ہم گیراج میں تھے۔ مَیں نے جیب سے لائٹر نکال کے روشنی کی تو مجھے ایک دیوار پر لائٹ کے سوئچ نظر آئے۔ چھت سے ایک بلب بھی نیچے لٹکا ہوا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر مَیں نے بٹن دبا دیا۔ سو واٹ کے بلب کی روشنی میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ مَیں نے گیراج کے دروازے کی طرف دیکھا۔ "اس کو بند کرنا ضروری ہے۔" مَیں نے کہا۔

"شٹر کھینچا تو بہت آواز ہو گی۔" محسن نے کہا۔

"اس وقت کون سُنے گا۔" مَیں نے ہاتھ اونچا کر کے شٹر کو نیچے لانے کے لیے زور لگایا۔ میرا ساتھ محسن نے دیا اور شٹر جو کافی عرصے سے استعمال نہ ہونے کے باعث جام تھا بڑی چیخ پکار کے ساتھ تھوڑا تھوڑا نیچے آتا گیا۔ ٹین کے کھڑکھڑانے کا اور دھات کی رگڑ سے پیدا ہونے والا شور مجھے رات کی خاموشی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا لیکن سردی کو روکنے اور روشنی کو چھپانے کے لیے شٹر گرانا ضروری تھا۔ بالآخر شٹر ایک جگہ ایسا پھنسا کہ ایک اپنچ نہ ہلا۔

"یہ... اپنے خواجہ صاحب!" میں نے ہانپتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "کیا وہ سچ مچ وہیں رہ گیا! اپنی تجوری کے ساتھ۔"

"میں لاتا ہوں اس کو۔" محسن نے کہا اور اس دو فٹ کے خلا میں سے گزر گیا جو فرش اور شٹر کے درمیان باقی رہ گیا تھا۔ میں نے گیراج کا جائزہ لیا۔ اس کے فرش پر گاڑی کھڑی کرنے کے آثار واضح تھے۔ سیمنٹ پر انجن آئل کے دھبے تھے۔ کچھ بہت پرانے لیکن کچھ ہفتہ دس دن پہلے کے۔ صاف ظاہر تھا کہ جب کوٹھی کے مکین یہاں تھے تو اپنی گاڑی بھی یہاں کھڑی کرتے تھے۔ ایک گوشے میں دو پرانے ٹائر اور گاڑی کے ناکارہ پرزے پڑے تھے، جن کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گیراج میں جیپ کھڑی کی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے دوسرے کونے میں لگی ہوئی پرانی چارپائی اور لپٹے ہوئے بستر کو دیکھ کر ہوئی۔ غالباً یہ بستر ڈرائیور کا تھا جو اب مالکوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ میں نے رابعہ کی مدد کی اور بستر کو پھیلا دیا۔ بستر بہت میلا تھا۔ گدّے اور تکیے کی حالت ایک سی خستہ تھی اور تکیے پر سفید غلاف تیل سے چکنا ہو کے سیاہ پڑنے لگا تھا۔ لحاف اور گدّے میں سے ایک جیسی بُو اٹھ رہی تھی۔ مگر ان حالات میں یہ غلیظ اور متعفن بستر کسی شاہزادی کے ریشم و کمخواب کی نرمی اور لطافت رکھنے والے معطّر اور پُرتکلف بستر سے کم نہ تھا۔ میں نے نازو کو پہلے لٹایا جو اب پہلے کی نسبت زیادہ ہوش میں تھی اور مسلسل "مجھے مر جانے دو... مجھے قتل کر دو۔" کی گردان کرنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اس کے ساتھ بستر میں گھسنے پر مجبور کر دیا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ سردی سے رابعہ کے ہونٹ بھی نیلے پڑ رہے ہیں اور اس کا گلابی چہرہ بے جان نظر آنے لگا ہے۔ جسمانی توانائی کی بحالی کے لیے اسے بھی آرام کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی نازو کو۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو کچھ دیر میں یقیناً رابعہ بھی بیہوش ہو کر گر پڑتی۔

جب شٹر سے کسی کے ٹکرانے کی آواز آئی تو پلٹ کر دیکھے بغیر میں نے اندازہ کیا کہ یہ محسن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا مگر اُسی وقت رابعہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تو میں نے گھوم کر دیکھا اور اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ بائیس بور کی دو نالی شکاری بندوق کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا اور یہ بندوق ایک عورت کے ہاتھوں میں تھی۔ عورت کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ موٹاپے کی طرف مائل تھی لیکن اسے موٹی نہیں کہا جا سکتا تھا مزید یہ کہ موٹی ہونے والی عورتوں کی طرح اس کا جسم غیر متناسب اور بھدّا نہیں ہوا تھا۔ اس کا رنگ روپ اب بھی عہدِ رفتہ کی کہانی سُنا تا تھا جب اس نے اپنے حسن و شباب کی غارت گری کے چرچے خود بھی سُنے ہوں گے۔ اس کے بالوں میں سیاہی پر سفیدی غالب تھی اور وقت نے چہرے پر مکڑی کے جالے کی طرح جھرّیوں کو پھیلانا شروع کر دیا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک اب تک دھندلی نہیں پڑی تھی۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک بارعب اور باوقار تمکنت تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ چہرہ میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔

"میں اکیلی عورت ہوں اور جوان بھی نہیں ہوں۔" وہ متانت سے بولی۔ "لیکن اسے میری کمزوری مت سمجھنا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ اور میں تم کو صفائی کا موقع دیے بغیر گولی مار دوں تب بھی کوئی مجھے قصوروار نہیں سمجھے گا۔ اس کے علاوہ میرا بیٹا..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ باہر سے استاد ٹیڈی اور محسن جھگڑتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔ "خبردار جو حلق سے آواز بھی نکالی۔" عورت نے ایک کونے میں پوزیشن سنبھال کے کہا۔ "میرے بیٹے نے جاتے وقت کہا تھا کہ جسے چاہو گولی مار دینا۔"

استاد ٹیڈی کا بدصورت اور بدوضع صندوق پہلے اندر آیا۔ ٹیڈی کے ساتھ محسن نے اسے باہر سے اندر دھکیلا اور پھر خود بھی سر جھکا کے اندر آ گئے۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہی انھوں نے بندوق کی نال کو دیکھا۔ عورت نے انھیں میری طرف کھسکنے کا اشارہ کیا اور وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے میرے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آسمان سے گریں گے تو اس طرح کھجور میں اٹک جائیں گے۔

"کون ہو تم لوگ؟" عورت نے اسی سپاٹ آواز میں کہا۔

"ہم چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو میں نے اندازہ کر لیا تھا کیونکہ تمھارے ساتھ عورتیں ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن تم شریف آدمی بھی نہیں ہو۔"

"یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟" میں نے محسوس کیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور اگر میں اس عورت کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر ہمارے حق میں بہت اچھا ہو گا۔

"اس لیے کہ شریف آدمی نہ راتوں کو اس طرح جوان عورتوں کے ساتھ پھرتے ہیں اور نہ ایسے بلا اجازت لوگوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ "کیا سمجھ کے ڈیرا ڈال لیا تھا یہاں؟ معلوم ہے میرا بیٹا کون ہے؟"

"ہم سمجھے تھے کہ گھر میں کوئی ... تالا پڑا ہوا تھا۔" محسن نے کہا۔

"تو کیا تم لوگ یہی کرتے ہو؟" وہ بولی۔ "جو گھر خالی نظر آئے اس پر قابض ہو جاؤ۔"

"قبضہ کرنا ہوتا تو ہم اس گیراج میں پناہ نہ لیتے۔ قفل توڑ دیتے۔" میں نے کہا۔

"قفل توڑتے تو کتے کی موت مارے جاتے۔" وہ بولی۔ "جب میرا بیٹا گھر میں نہیں ہوتا تو میں یہی کرتی ہوں۔ سامنے سے تالا ڈال کے باورچی خانے سے اندر چلی جاتی ہوں اور اندر کی ساری کنڈیاں بند کر لیتی ہوں۔ میرے بیٹے نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی ہے۔"

"کیا بیٹے ماں کو سختی سے تاکید کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا ماں بیٹے کا معاملہ ہے جی! تم کون ہوتے ہو مجھے لیکچر دینے والے۔" وہ برہمی سے بولی۔ "سیدھی طرح بتا دو کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟ صورت سے تم لوگ فقیر تو نہیں لگتے۔ پھر کون ہو؟ بردہ فروش یا ان عورتوں سے..."

"کیا یہ عورتیں صورت سے آپ کو ایسی نظر آتی ہیں؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اچھی نظر ہے آپ کی... ہم آپ کو چور ڈاکو نہیں لگتے۔ فقیر نہیں لگتے؟"

"پھر تم خود ہی بتا دو کہ تم کون ہو؟" عورت نے کہا۔ "ورنہ میرا بیٹا سب معلوم کر لے گا وہ تم جیسوں سے نمٹنا جانتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ! آپ کا بیٹا آخر کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ آئے گا تو کون سی توپ چلا دے گا۔ ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو صرف یہی کہ سردی سے بچنے کے لیے گیراج میں پناہ لے لی اور وہ بھی مجبوری میں۔ ہم چلے جاتے ہیں۔"

"ٹھہرو! پہلے بتاؤ کہ ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے تمھیں آدھی رات کے بعد اور اس موسم میں گھر سے بے گھر کیا اور تم یوں میرے گھر میں آ گھسے۔" وہ بولی لیکن اب اس کا لہجہ پہلے کے مقابلے میں بہت نرم تھا۔ "دیکھو جھوٹ بالکل مت بولنا اور مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ ورنہ میرا بیٹا..." وہ ذرا سی دیر کے لیے رُکی۔ "خیر تم اس سے ملو گے تو تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ توپ چلا کے تمھیں توپ دم کر سکتا ہے یا نہیں۔"

"آپ ہماری غلطی کو معاف کر دیں ماں جی۔" رابعہ نے اُٹھ کر نرمی سے کہا۔ "ہم گیراج خالی کر دیتے ہیں۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔ رات بھی اب کتنی رہ گئی ہے۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" عورت کا رویّہ ایک دم مشفقانہ ہو گیا۔ "میں تو جاننا چاہتی ہوں کہ آخر تم لوگوں پر کیا آفت آ گئی تھی کہ تم گھر سے بے گھر ہوئے ہو۔ اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تو سہی، شاید میں تمھاری کوئی مدد کر سکوں۔ میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا، غصّے میں کہہ دیا تھا۔ اس کا بُرا مت ماننا۔ تم صورت اور لہجے سے اچھے گھر کی لگتی ہو۔ چلو تم بستر میں لیٹ جاؤ۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔"

"آپ اس دو نالی توپ کو ہٹائیں تو ہم کچھ کہیں۔" میں نے کہا۔ "کہیں گولی چل گئی تو..."

"گولی کبھی خود نہیں چلتی۔" وہ مسکرائی۔ اس نے بندوق کو نیچے کر لیا اور اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ "اب بولو۔"

"ہم بڑے مصیبت زدہ ہیں بیگم صاحبہ!" میں نے مظلوم صورت بنا کے کہا۔ "سارے زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔ میرا نام اوّل خان ہے۔ یہ میری گھر والی ہے خیرات النسا مگر سب خیراتن کہتے ہیں۔ یہ سالا ہے میرا خیرات محمد۔ اسے سب خیراتی کہتے ہیں۔ اور وہ جو لڑکی لیٹی ہے نا وہ میری سالی ہے۔ خیراتی اور خیراتن کی بہن... نازو۔"

"اور یہ شخص؟ یہ تم میں سے کسی کا بھائی نہیں لگتا۔" عورت نے غور سے استاد ٹیڈی کو دیکھا۔

"یہ میرا دوست ہے جی۔ اس نے ہم سب کی زندگی بچا لی۔" میں نے مظلوم لہجے میں اپنی فریاد جاری رکھی۔ "ورنہ ہم سب مارے جاتے۔"

"کس کے ہاتھوں؟ کھل کے بات کرو۔ جب میرا بیٹا آئے گا تو سب... اسے بھی بتانا۔" اس عورت کو اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا۔ "جس نے بھی ظلم کیا ہو گا تم پر سب کا دماغ درست کر دے گا۔"

"بات یہ ہے بی بی جی۔ ابھی ہماری شادی ہوئی ہے چھ مہینے پہلے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تحصیل و ضلع گوجر خان کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گاؤں ہے کلیام اعوان۔"

"تم کلیام اعوان کے ہو؟" وہ بولی۔ "میں ایک رات رہی تھی وہاں۔ جب میرا بیٹا گوجر خان میں تھا۔"

ایسی کی تیسی اس کے بیٹے کی۔ ہر جگہ ٹپک پڑتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "میری بیوی نے تھوڑا سا پڑھ لیا تھا۔ دس جماعت تک میں نے بھی پڑھا ہے اور خیراتن نے بھی۔ اس کا رشتہ پہلے سگے چاچے کے لڑکے سے ہوا تھا۔ اس وقت یہ بچّی تھی۔ دوسری یا تیسری میں پڑھتی تھی۔ دس جماعت پڑھ کے یہ گوجر خان میں پڑھانے لگی جہاں میں بھی پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا۔"

"اور یوں تم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ پھر تم ایک دوسرے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سے محبت کرنے لگے اور تم نے شادی کرلی۔" عورت بولی۔
میں نے احمقوں کی طرح مُنہ کھول کر اس عورت کو دیکھا۔
"ہاں جی... بالکل۔"
" اور وہ چچازاد بھائی جس کی منگیتر تم نے چھین لی تھی تمھلا دشمن ہوگیا۔" عورت ہنس کر بولی۔
" آپ کو... یہ سب آپ کو کس نے بتایا جی "! میں نے ہکلا کے کہا۔
" ایسا ہی ہوتا ہے بھئی۔ کون ہے وہ تمھارا دشمن ؟"
" وہ بڑا بدمعاش ہے جی۔ پرائمری میں تھا تو اسکول سے بھاگ گیا۔ ماں باپ کی عزت کا دشمن ہوگیا۔ پہلے چھوٹی موٹی چوریاں کرتا تھا پھر ڈاکے ڈالنے لگا اور جیل گیا۔ ماں باپ اسی دکھ میں مر گئے۔" میں نے ایک فی البدیہہ کہانی کا تانا بانا تیار کر لیا۔" جیل سے چھوٹا تو بہت بڑا غنڈہ کہلانے لگا۔ اب ایسے شخص سے را... خیراتن کی شادی ہو سکتی تھی... اس نے مجھے بھی بہت دھمکیاں دیں اور خیراتی کو بھی۔"
" خیراتی اور خیراتن کے ماں باپ نہیں کیا ؟"
" نہیں بیگم صاحبہ۔ خیراتی ہی بڑا بھائی تھا۔ وہ غنڈہ اس کا بھی دشمن ہوگیا مگر کون بھائی جانتے بوجھتے اپنی بہن کو جہنم میں جھونکتا ہے۔" میں نے کہا۔
" ظاہر ہے ایسا ظلم کوئی نہیں کرتا۔" عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور میں نے ان سب کو دیکھا جو ہنسی ضبط کیے بڑی سنجیدہ صورت بنائے میری کہانی سن رہے تھے۔ گرم بستر کی حرارت پاتے ہی نڈھال ہو جانے والی نازو کو نیند آگئی تھی۔
" بس جی شادی کے بعد ہماری زندگی عذاب ہوگئی۔" میں نے لہجے میں رقت پیدا کی:" ہم پولیس میں گئے رپورٹ لکھوانے تو پولیس نے مجھے بند کر دیا۔ اس غنڈے نے پولیس سے سازباز کر لی تھی۔"
" اچھا۔ یہ بات ہے ؟ آنے دو میرے بیٹے کو..." عورت نے خفگی سے کہا۔
" پھر جی میرے یار نے تھانیدار کو دو ہزار رشوت کے دیے تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" میں نے کہا" لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بعد میں کچھ ہوا تو میں ذمے دار نہیں۔ تھانیدار بھی تو ڈرتا تھا اس غنڈے سے۔"
" اچھا۔ کیا نام ہے اس تھانیدار کا۔ خیر... میرا بیٹا معلوم کرے گا۔"
" ہم بڑی مشکل سے پہننے کے کپڑے لے کر نکلے تھے مگر کسی نے اس کو خبر کر دی۔" میں نے کہا" وہ ہمارے پیچھے لگ گیا۔ ہم اگر بس یا ٹرین سے آتے تو وہ ضرور ہمیں قتل کرا دیتا۔ اس سے چھپتے چھپاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ حالت دیکھ لیں آپ ہم سب کی۔"
" تم سب نے کلیام اعوان سے لاہور تک پیدل سفر کیا ہے ؟" عورت نے بے یقینی سے کہا۔
" سارا راستہ تو نہیں جی... کبھی تانگے میں بٹھا لیا کسی نے کبھی بیل گاڑی میں۔" میں نے کہا۔ لیکن عورت ان خراشوں کو دیکھ رہی تھی جو ہم سب کے ہاتھوں پہ اور چہروں پہ لمبی لمبی خونی لکیروں کی صورت میں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خراشیں اسی عورت کے گھر کی جھاڑیوں میں چھپنے سے آئی تھیں مگر ہماری دُکھ بھری کہانی نے اس کے دل میں رحم کے جذبات جگا دیے تھے۔ وہ غور کرتی تو یہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ زخم تازہ ہیں اور ہمارے پیروں میں اتنے لمبے سفر کے بعد بھی آبلے نہیں پڑے ہیں۔ اس نے رابعہ کے اور نازو کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے کپڑوں کو بھی دیکھا اور ان کی بیمار صورتوں کو بھی۔ پھر وہ بندوق ایک طرف رکھ کے آہستہ آہستہ آگے آئی۔" اس لڑکی... کیا نام بتایا اس کا... نازو... اسے کیا ہوا ہے!" وہ لحاف اٹھا کے دیکھنے کے بعد بولی۔
" کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔ یہ بیچاری دسویں میں پڑھتی تھی۔ وہ غنڈہ بعد میں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ چلو چھوٹی بہن ہی دے دو، مگر بات تو ایک ہی تھی۔ خیراتی نے ایک بہن پر ظلم برداشت نہیں کیا تو دوسری پر کیسے ہونے دیتا۔" میں نے کہا" ہم اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اور بس عزت کے ساتھ جان بچا کر نکل آئے۔ نازو پر سردی کا اثر ہے۔ دو دن سے بھوکی بھی ہے۔"
" کھانے کا کسے ہوش تھا بیگم صاحبہ۔" محسن بولا۔" یہاں سر چھپانے آگئے تھے۔"
" چلو اٹھاؤ اس لڑکی کو... اور تم سب بھی اندر چلو۔ یہاں تو یہ لڑکی مر جائے گی۔" عورت نے کہا۔" میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں اور تمھارے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے تم سب ہی مرنے والے ہو۔"
میں نے باری باری محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ صورتِ حالات میں یہ تبدیلی ہمارے لیے خوش آئند بھی تھی اور باعثِ تشویش بھی۔ وہ کسی بہت بڑے تیس مار خاں کا گھر تھا جس میں ہم انتہائی مجبوری کے عالم میں پناہ گزین ہوئے تھے کیونکہ آج کی رات ہمارے لیے کسی ہوٹل میں قیام کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چوہدری دلاور کے گُرگے تو پہلے ہی ہماری بدلی ہوئی صورتیں ملاحظہ کر چکے تھے اب پولیس کو بھی پتا مل گیا تھا کہ ہمارا حلیہ اب کیا ہے۔ میک اپ سے بھیس بدل کر پھرنے کا مقصد غارت ہوگیا تھا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ ہم اپنی اصل شکل کو ملاقات کے تقاضوں کے مطابق کیموفلاج کرتے رہیں۔ اور ہمیں صبح تک کی مہلت مل جاتی تو ہم یقیناً اس حلیے کو تبدیل کر لیتے۔ دھوکا ہمیں مقفل دروازے نے دیا اور ہم گھر کو خالی سمجھے۔ دونالی شکاری بندوق والی خاتون بے خبری میں بلائے ناگہانی بن کے نازل ہو گئیں۔ بات بات پہ بیٹے کی دھمکی دینے والی اس عورت کو آسانی سے قابو کیا جا سکتا تھا لیکن ایک تو عورت عمر رسیدہ اور ہم سب کی ماں کے برابر تھی۔ پھر یہ کہ وہ خطرناک نہیں لگتی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے دل کے آئینے کی طرح صاف نظر آتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے مطمئن کر کے ٹال دوں لیکن میری جھوٹی کہانی نے بھی اس کے دل کو دکھی کر دیا اور جتنی آسانی سے اس نے ہمارا اعتبار کر لیا اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنی سادہ لوح ہے۔ اس کا رویّہ ذرا سی دیر میں ہمدردانہ اور محبت بھرا ہوگیا تھا۔ اگر ہم ضرورت کو دیکھتے تو مہمانداری کی یہ پیشکش بہت بروقت تھی۔ ہم سب کو صرف ایک گوشۂ عافیت کی ہی نہیں آرام کی اور خوراک کی بھی اشد ضرورت تھی لیکن دوسری طرف اس گھر میں قیام سے ہمارے جھوٹ کا پردہ چاک ہونے کا ڈر بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس عورت کا بیٹا کوئی پولیس افسر تھا اور ہم جیسے مجرموں کا کسی پولیس افسر کے گھر مہمان ہونا ایسا ہی تھا جیسے برتوں کے غول کا بھوکے شیروں کی کچھار میں بسیرا کرنا۔ ایک خطرہ نازو کی طرف سے بھی تھا کہ ہوش میں آتے ہی وہ پھر چیخنا چلّانا شروع کر دے اور ہماری دُکھ بھری آپ بیتی سفید جھوٹ کا پلندا بن جائے۔
" سامان اٹھاؤ۔ میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔" عورت نے ڈانٹ کر کہا اور پھر اپنی بندوق اٹھا لی۔
" چلیے خواجہ صاحب! اٹھائیے یہاں سے بھی اپنا یہ صندوق۔" میں نے کہا۔
" چاہو تو اس ٹین کے ڈبے کو پڑا رہنے دو۔ کوئی نہیں اٹھائے گا۔" عورت نے ٹیڈی کے خستہ حال صندوق کی طرف اشارہ کیا۔
" نہیں بیگم صاحبہ۔ اسے میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔" ٹیڈی نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔
" کوئی بہت اہم اور قیمتی سامان ہے اس میں ؟" وہ مسکرائی " کیا نام ہے تمھارا۔"
" یہ نیک محمد ہے بیگم صاحبہ۔" محسن نے فوراً کہا۔ پھر اس نے نازو کو اٹھا لیا۔ میں نے ٹیڈی کے ساتھ مل کر بستر کو دوبارہ لپیٹا اور رسّا کس کے بنایا۔ دونوں سوٹ کیس پھر میں نے اٹھائے اور اس عورت کے پیچھے چل پڑا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سب ایک کمرے میں تھے جس میں آرام و آسائش کے سب اسباب مہیا تھے۔ بیڈ صرف ایک تھا مگر فرش پہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو قالین بچھا ہوا تھا اس کی دبازت کسی بھی گدّے سے کم نہ تھی۔ اس عورت نے کونے میں رکھے ہوئے ڈبل راڈ والے ریفلیکٹر ہیٹر کو آن کر دیا۔
" میں کچھ کمبل بھجوا دیتی ہوں۔" وہ بولی۔" یہ مہمانوں کا کمرہ ہے، اس لیے بیڈ تو یہاں دوسرا نہیں لگ سکتا۔ تمھیں نیچے ہی سونا پڑے گا۔ عورتوں کو بیڈ دے دو۔"
" جی بہت بہتر۔" میں نے کہا۔" آپ کو ہماری وجہ سے بہت زحمت ہوئی۔"
" زحمت کیسی۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوں۔ مجھے جگہ کم تو نہیں پڑ رہی ہے۔" وہ بولی۔" پہلے میں ڈاکٹر کو فون کر دوں۔"
" نہیں بیگم صاحبہ۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔" نازو بیمار نہیں ہے... بس... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"
" ہاں... اچھا دیکھو تم لوگ اگر ہاتھ مُنہ وغیرہ دھونا چاہو تو اس باتھ روم میں سب کچھ ہے۔ گرم پانی بھی ہے۔ میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔"
مجھے اب واقعی شرمندگی ہونے لگی تھی۔" آپ آدھی رات کو کیا انتظام کریں گی۔"
وہ ہنسی۔" ارے بیٹا، تھوڑا بہت تو فریج میں سے نکل آئے گا۔ پھر میرے ساتھ خادمہ ہوتی ہے۔ اسے جگا لوں گی۔ وہ ہی کرے گی سب کچھ۔ تم لوگوں کے پاس پہننے کے کپڑے تو ہوں گے۔" اس نے ہمارے سوٹ کیسوں کی طرف دیکھا۔" آتنی دیر میں بدلنا چاہو تو بدل لو۔"
کچھ دیر پہلے میں نے مذاق میں ایک بات کہی تھی کہ آرام دہ بستر، گرم پانی سے غسل، بہترین کھانے اور گرماگرم کافی کا تصور کرو تو اس میں بھی بڑی راحت ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خواہش ایک دعا بن کے ہفت افلاک سے اوپر خدا کے حضور اس وقت پہنچی جب قبولیت کی گھڑی تھی اور پھر اس کا حکم ہوا تو خواب کو تعبیر ملی اور جو ناممکن سمجھا جا سکتا تھا وہ ممکن ہوا۔ جب وہ عورت چلی گئی تو کمرے میں ہم چاروں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر ایک ساتھ ہنس پڑے۔" اسے کہتے ہیں معجزہ۔" میں نے کہا" اور بھی کچھ مانگتے خدا سے تو مل جاتا۔"
" ابھی کی تو کوئی بات نہیں۔ صبح اس عورت کا توپ چلانے والا بیٹا آگیا تو کیا ہوگا ؟" رابعہ بولی۔
" صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔" میں نے رابعہ کو بازو پکڑ کے کھڑا کر دیا۔" ابھی تو تم جاؤ اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غسل کرلو۔ اپنے کپڑے لیتی جاؤ اور دیر مت لگانا۔ ہم سب اپنی باری کے منتظر ہیں۔"

"میرے کپڑے تو تمہارے سوٹ کیس میں ہیں۔۔۔ اور سب۔۔۔ میرا مطلب ہے اچھے ہیں۔ شہری وضع کے۔"

"میں اسی لیے تم کو استانی قرار دے چکا ہوں۔" میں نے اسے کپڑے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "نازو کے کپڑے ابھی ٹھیک ہیں۔"

"ابھی تو نازو تھکن سے نڈھال ہوگئی ہے، اس لیے سو رہی ہے۔" محسن نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ نیند کا وقفہ بہت مختصر ہوگا۔"

"میرا خیال ہے اکیلی رہنے والی یہ خاتون اعصابی سکون کے لیے کوئی دوا ضرور استعمال کرتی ہوں گی۔ تنہائی ان کا روگ ہوگی اور اس عمر میں کوئی بھی دن رات سو کر وقت نہیں کاٹ سکتا۔" میں نے کہا۔ "ان سے کوئی ایسی دوا مل جائے تو اچھا ہے کہ نازو ذرا پرسکون ہو جائے۔"

محسن کے سوٹ کیس میں سب سے اوپر ہمارا اسلحہ تھا۔ اس نے سب ریوالور کپڑوں کے نیچے چھپا دیے۔ اسٹین گن کسی سوٹ کیس میں نہیں آسکتی تھی چنانچہ میں نے اسے گیراج ہی میں پلنگ کے نیچے چھوڑ دیا تھا۔ عورت کے اندر سے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں دروازہ کھول کے نکلا اور دو کمروں سے گزر کے کچن تک جا پہنچا۔ باہر سے پرانی نظر آنے والی کوٹھی اندر سے شاہانہ طرز پر آراستہ تھی اور میرے اندازے کے مطابق انتہائی بیش قیمت فرنیچر بھی امپورٹڈ تھا۔ اتنی بھاری اور جگہ گھیرنے والی اشیاء کو باہر سے منگوانے پر کتنی لاگت آئی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن یہ دولت مندی کی نمائش، یہ شان و شوکت اور سامان تعیش کی یہ فراوانی دیکھنے کے بعد مجھے یقین آگیا کہ بڑی بی کا بیٹا واقعی بڑی چیز ہوگا۔ حسب توقع مجھے ان سے ویلیم کی گولیاں مل گئیں۔ میں نے پانی کا گلاس بھی کچن سے لے لیا جہاں ایک ادھیڑ عمر خادمہ بہت مصروف ہوگئی تھی۔ میں کمرے میں واپس آیا تو رابعہ غسل کے لیے جا چکی تھی اور محسن نے اپنے اور میرے لیے شلوار قمیص نکال لیے تھے۔ جو پہلے کے استعمال شدہ تھے مگر پھر بھی بہت صاف تھے۔ ٹیڈی اپنے ساتھ اس صندوق کے سوا کچھ نہ لا سکا تھا چنانچہ اسے بھی ہمارے ہی کپڑے ملے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو نازو آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے ماحول بدلا ہوا تو نظر آیا تھا لیکن یہ اس کے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ اگر اس کی آنکھ تانگے میں کھلتی جب وہ ہمارے پیروں کے قریب گھوڑے کے چارے پر سمٹی پڑی تھی یا اسے گیسٹ کے پیچھے ہوش آتا جب وہ مٹی دھول پر جھاڑیوں میں اور پتھریلی زمین پر لیٹی ہوئی

تھی تو شاید وہ خوفزدہ ہو کے چلانے لگتی مگر اب وہ صاف ستھرے بستر پر ایک سجے سجائے کمرے میں تھی اور اس کے آس پاس جانے پہچانے لوگ تھے۔ جذباتی ہیجان کا دورہ تھا لیکن گزر جانے والے سیلاب کی طرح اپنے آثار چھوڑ گیا۔ وہ بیحد کمزور، تھکی ہوئی اور بیمار نظر آرہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں نا سکندر؟" وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے اس کا سر اور ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ دبا لیا۔ "تم ہمارے ساتھ ہو اور ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔"

اس کے زرد چہرے پر تھوڑی سی سرخی جھلکی۔ "تم واپس جانے کے لیے تو نہیں کہو گے؟"

"کبھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"کبھی مجھے دھوکا دے کر تو نہیں چھوڑ جاؤ گے؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے کبھی ایسا کیا نا۔۔۔ تو میں مر جاؤں گی۔۔۔ اسے مذاق مت سمجھنا۔ میرے لیے مرنا بہت آسان ہے۔" وہ بولی۔

"میں وعدہ کر چکا ہوں پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ۔۔۔ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔" وہ اداس ہو کے بولی۔ "یہ سمجھتے ہو کہ میں نے بھی تمہارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"اب میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم میرے لیے اتنی ہی قابل اعتبار ہو جتنی رابعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لو اٹھو۔ اب یہ دوا کھا لو۔"

"کیسی دوا ہے یہ؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" وہ حیران ہو کے بولی۔

"ہاں۔ ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دوا ذہنی وا عصابی سکون کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔

نازو نے خاموشی سے گولیاں لے لیں اور پانی کے ساتھ نگل لیں۔ "ان کی ضرورت تو نہیں تھی، تمہاری باتوں نے زیادہ سکون دیا ہے مجھے۔"

اسی وقت رابعہ باتھ روم سے نکلی۔ تولیہ اس کے شانوں پر اور پشت پر پھیلا ہوا تھا اور گیلے بال تولیے پہ پھیلے ہوئے تھے۔ نازو کی بات اس نے بھی سُنی اور میری طرف غور سے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کا رنگ روپ گرم پانی سے دُھل کر ایسا نکھرا کہ نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی ایک بار کے پہنے ہوئے تھے اور ان پر استری بھی نہیں تھی مگر ریشمی کپڑے کی آب و تاب باقی تھی اور جس طرح یہ پیرہن اس کے قالب کے سانچے میں ڈھلا تھا اس سے تناسب کا حسن نکھر آیا تھا۔ پتا چلتا تھا کہ حسنِ ملبوس اور ملبوس سے پیدا ہونے والے حسن کسی ماہرِ فن درزی کا کمال ہے۔

نہیں لگتی تھی۔ مٹی کیچڑ دھو کر صاف کر دینے کے بعد ہیرے کو پتھر کہہ کر کسی اندھے کو بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس دیہاتی وضع قطع کے اور کم قیمت کپڑے تھے ہی نہیں۔ میٹرک پاس استانی

"یہ گھر کس کا ہے سکندر؟" نازو نے لیٹے لیٹے کہا۔

میں چونکا۔ "یہ۔۔۔ یہ ہے ایک ایسی جگہ جہاں ہم آج رات بھر کے مہمان ہیں۔" میں نے کہا اور محسن کو تولیہ لے کر باتھ روم میں گھستے دیکھا۔

"کل ہم کس کے مہمان ہوں گے، یہ ہم بھی نہیں جانتے۔" رابعہ نے بال سلجھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"اب تم نے خود ہی گھر بار چھوڑ کے ہمارے ساتھ خانہ بدوشی اور خواری قبول کی ہے تو آنے والے دن سے امیدیں ضرور وابستہ کرو مگر اس کو یقین مت بنانا۔" میں نے کہا۔ "اب تمہیں نیند آنے لگی ہے لیکن ابھی مت سونا۔ ہماری میزبان ایک نیک دل خاتون ہیں۔ وہ تمہارے لیے گرم دودھ کا ایک گلاس لے کر آرہی ہیں۔"

"کون ہیں وہ خاتون، نام کیا ہے ان کا؟" نازو بولی۔

"نام تو ہمیں ان کے مرحوم خاں بیٹے کا بھی معلوم نہیں جس کا یہ محل ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے مظلوم لوگ ہیں۔ ہم نے انھیں ایک ایسی کہانی سنائی تھی کہ پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ تم نازو ہو۔ رابعہ تمہاری بڑی بہن ہے مگر اس کا نام خیرات النساء عرف خیراتن ہے۔ محسن خاں تم دونوں کا بھائی ہے۔ خیرات محمد عرف خیراتی۔ میں رابعہ کا گھر والا ہوں اوّل خان۔"

"لو بھئی۔ یہ دودھ پلا دو اسے۔ اور اسے سونے دو۔" بڑی بی نے اندر آتے ہوئے کہا۔

نازو سونے لگی تھی اور شاید اس نے میری پوری بات سنی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کے ہلایا تو اس نے پھر آنکھیں کھولیں۔

"لو بیٹی، شاباش! اٹھ کر تھوڑا سا گرم گرم دودھ پی لو۔ اور یہ اسپرین کھا لو۔" بڑی بی نے اپنی تمام شفقت نچھاور کرتے ہوئے نازو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ لو تم اس کو دودھ پلاؤ۔" بڑی بی نے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب وہ واپس جانے کے لیے مڑیں تو ان کی نظر نے رابعہ کو دیکھا، ان کے قدم رک گئے۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔" بڑی بی نے کہا۔ "خدا نظرِ بد سے بچائے۔ میں بھی کتنا غلط سمجھی تھی۔ مجھے معاف کر دینا بیٹی!"

"آپ کیوں شرمندہ کرتی ہیں اماں۔" رابعہ نے حیا سے سُرخ ہو کے کہا۔

"خدا نہ کرے کہ کسی پر بُرا وقت آئے۔ ہیرے کی قدر پتھر کے برابر نہیں رہتی۔" بڑی بی نے کہا۔ "اتنی مہذب شریف صورت اور نیک سیرت لڑکی کیا بن گئی تھی۔ میں تو کہتی ہوں کہ لاہور کی رہنے والی بڑے بڑے گھروں کی فیشن ایبل لڑکیاں تمھیں دیکھ لیں تو رشک سے مر جائیں۔ کھانا تیار ہے، تم نے ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔" بڑی بی نے مجھے ڈانٹا۔

"بس ابھی دس منٹ میں ہم سب تیار ہو جاتے ہیں۔" میں نے ندامت سے کہا۔ بڑی بی کی شرافت اور شفقت میرے لیے باعثِ ندامت بن گئی تھی۔ وہ ہم سے یوں پیش آرہی تھیں جیسے ہم انہی کے بچے ہیں۔ ہم نے ضرورت کے تحت ایک جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ خیال میری شرمندگی کا سبب بن گیا تھا کہ ہم نے ایک نیک دل عورت کی ساری عنایات اسے دھوکا دے کر حاصل کی ہیں اور اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو اسے کتنا صدمہ ہوگا اور کیا پھر وہ ہمارے ساتھ یہی سلوک روا رکھے گی؟ نہیں۔ وہ تو اپنے بیٹے سے ہمیں واقعی توپ دم کرا دے گی۔

نہا دھو کر کپڑے بدلنے اور کھانے سے فراغت پا کے سوتے سوتے ہمیں صبح کے تین بج گئے۔ کھانا جیسا بھی تھا اس وقت کسی دعوتِ شاہانہ سے کم پُرلطف نہیں لگا۔ کھانے کے بعد کافی تو نہیں ملی مگر گرم چائے مل گئی اور جب محسن نے ڈھیٹ بن کے سگریٹ مانگے تو بڑی بی نے اندر سے نیا پیکٹ لا دیا۔ ان کا بیٹا گھٹیا سگریٹ نہیں پیتا تھا چنانچہ ایک مدت کے بعد مجھے ہر آرزو کی تکمیل سے جو آسودگی ملی وہ میرے سارے رنج و غم اور دکھ درد کا مداوا بن گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے یوں سویا جیسے مُردے سوتے ہیں اور میری طرح کسی کو بھی رات کے صبح میں اور صبح کے دوپہر میں ڈھل جانے کا احساس نہیں ہوا۔ سب سے پہلے نازو جاگی تھی۔ اس نے مجھے بیدار کیا۔ اندر سے مجھے بڑی بی کے علاوہ کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

"غالباً بڑی بی کا بیٹا آگیا ہے۔" میں نے جماہی لے کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "دوپہر کے دو بج گئے! میرا خیال تھا کہ صبح نو دس بجے تک نکل جاتے۔" پھر میں نے محسن کو زور زور سے ہلایا۔ اس نے رابعہ اور ٹیڈی کو جگایا۔

"ہم بہت دیر تک سوتے رہے۔" محسن نے کہا۔ "اب بڑی بی کے جرنیل بیٹے سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوگا۔"

"اخلاقاً اگر اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کر دیا جائے تو کیا ہرج ہے؟" رابعہ نے کہا۔ "وہ ہمیں کھا تو نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جائے گا۔"

"بشرطیکہ وہ پولیس والا نہ ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے کہ...!"

"تم بھی کمال کرتی ہو ماں!" مرد نے ایک دم بہت اونچی آواز میں کہا۔ "کیا ضرورت تھی آخر انھیں گھر میں لانے کی؟"

"ارے بیٹا، وہ شریف اور مصیبت کے مارے ہیں۔" بڑی بی نے کہا۔

"آپ کو ساری دنیا شریف لگتی ہے مگر ایسا نہیں ہے ماں۔" مرد نے بگڑ کر کہا۔ "شریف نظر آنے والے چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔"

"ارے چل رہنے دے، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" ماں نے کہا۔ "میں شرافت کو پہچانتی ہوں۔"

"اُف! آخر میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ہر اجنبی کو مہمان بنالینا کوئی عقلمندی نہیں۔" بیٹا چلانے لگا۔ "کسی دن آپ کو نقصان ہوگا تو آپ مانیں گی کہ میں غلط نہیں کہتا تھا۔ آپ اکیلی ہوتی ہیں۔ کوئی سب کچھ لوٹ کر لے جائے گا اور آپ کو قتل کر کے ڈال جائے گا۔ آپ کی انھی باتوں کی وجہ سے تو میں پریشان رہتا ہوں۔ ایک تو گھر سے باہر رہنے کی مصیبت۔ نہ وقت پر کھانا، نہ آرام۔ اوپر سے آپ کی طرف سے فکر کہ پیچھے کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔" اسے بالکل خیال نہیں تھا کہ اس کی بات کا ہم پر کیا اثر ہوگا۔

"میں خود اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔" ماں نے کہا۔ "آخر اس عمر میں بندوق چلانی سیکھی ہے۔"

"اس کا کیا فائدہ۔ کوئی چور ڈاکو آگیا تو اس کے پاس ریوالور ہوگا۔ یا اسٹین گن ہوگی۔" بیٹے نے کہا۔ "کیا کر لیں گی آپ بندوق سے۔ ہزار بار کہا ہے کہ رات کو کسی کے لیے دروازہ مت کھولیں۔ آپ نے پوری پلٹن کو گھر میں ڈال لیا۔ معلوم نہیں کون چور آ چکے ہیں۔ سب ایسے ہی گروہ بنا کے واردات کرتے ہیں۔ بڑی معزز اور شریف نظر آنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں ان کے ساتھ...!"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ آواز مجھے کچھ سنی ہوئی لگتی ہے محسن۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں اٹھ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی نیک اور شریف ماں کا بیٹا اتنا بداخلاق اور بدمزاج ہو سکتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں آخر یہ کون لوگ ہیں۔" مرد کی آواز آئی اور میں اُٹھتے اُٹھتے بیٹھ گیا۔ میرے ایک اشارے پر سب پھر سوتے بن گئے۔ رابعہ اور ناز و نے بیڈ کا رُخ کیا اور لحاف میں گھس کر ساکت ہو گئیں۔ نیچے ہم سب نے کمبل میں سر لپیٹ لیے لیکن میں نے کروٹ لے کر کمبل کا ایک کونا تھوڑا سا اٹھائے رکھا کہ ایک آنکھ سے اندر آنے والے کی صورت دیکھ سکوں۔

"ایسے سوئے پڑے ہیں جیسے باپ کا گھر ہے۔" مرد کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازے کے فریم میں نمودار ہوا۔ روشنی اس کے چہرے پر مقابل کی دیوار کی کھڑکی سے پڑ رہی تھی۔ ایک اَدھ کھلی آنکھ سے میں نے اس کا پورا چہرہ دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے خون میری رگوں میں منجمد ہو چکا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ڈی ایس پی سراج کھڑا ہوا تھا جو میرا سب سے پرانا اور سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ کینہ دشمن تھا۔ اسی شخص نے مجھ پر سفاکانہ مظالم سے میرے مصائب کے دور کا آغاز کیا تھا اور تب میں نے جانا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں کتنے شیطان صفت درندے چہروں پر نقاب ڈالے پھر رہے ہیں جو آدمی نظر آتے ہیں لیکن ان کا وجود آدمیت کی تذلیل ہے۔ اس سے پہلے مجھے آدمی کی سرشت میں شامل نیکی پر کامل اعتماد تھا اور میری نگاہ صرف آدمیت کے تقدس کو دیکھتی تھی۔ ایک بے رحم رات کی یاد نے میرے جسم پر کپکپی طاری کر دی اور میری روح نے پرانے وقت کے آزار کو دوبارہ اسی طرح محسوس کیا۔ میرے وجود میں اُبلنے والا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت میرے ہاتھ میں اسٹین گن ہوتی تو میں اپنے سامنے کھڑے ہوئے دشمن کے جسم کو چھلنی کر دیتا۔ میں نے انتقام کی سرکش قوت کو اس لیے قابو میں رکھا کہ میں نے ایک شریف النفس بوڑھی عورت کے گھر کا نمک کھایا تھا اور اس عورت نے ہم میں سے کسی کو بیٹا کہا تھا تو کسی کو بیٹی۔

وہ بڑی نخوت اور بددماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے آیا۔ نیچے جھک کر اس نے میرے چہرے پر سے کمبل کھینچ لیا۔ "اُٹھیے حضور! صبح ہو گئی۔" وہ حقارت آمیز طنزیہ لہجے میں بولا۔ "خدام ناشتا لیے دست بستہ کھڑے ہیں۔" میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور بے وقوفوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سراج نے اسی طرح ٹیڈی اور محسن کے کمبل کھینچ لیے تھے۔

"شرم آنا چاہیے تم لوگوں کو۔" وہ بولا۔ "ایک رات کے لیے جگہ مل گئی، کھانے کو مل گیا، اب دفع کیوں نہیں ہو جاتے۔"

"ہم تو رات ہی کو جا رہے تھے سرکار۔" محسن نے کہا۔ "آپ کی اماں نے روک لیا۔"

"میری ماں... کیا اس [illegible] گھر پر رات ایک ... یہ تک اینڈتے رہنا۔" سراج کا چہرہ نے چوبیس گھنٹے کا کرایہ ادا کیا ہے؟ دوپہر کے کیا جہان [illegible] بعد رات کا کھانا بھی مفت ملنے کی امید ہو گی نا۔" اس نے باری باری ہم تینوں کی طرف نفرت سے دیکھا۔ ہماری بدلی ہوئی صورتوں کی وجہ سے وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا مگر میری اور محسن کی ایک جیسی شکل و شباہت پر وہ حیران نظر آتا تھا۔ وہ وردی میں تھا اور پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا لیکن جو چیز نہیں بدلی تھی، وہ اس کی فطرت کی خباثت تھی۔

"کیا تم دونوں بھائی ہو؟" وہ ہمارے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "جڑواں بھائی ہو؟"

"ہاں جی۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سراج کی ماں سامنے نہیں تھی۔ اسے میں نے بتایا تھا کہ محسن میرا سالا اور رابعہ کا بھائی ہے۔

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟" وہ بولا۔ "تمھاری صورت اتنی زیادہ تو نہیں ملتی۔"

"بس جی۔ خدا نے جتنی ملادی، ملادی۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"باقی حلیہ خود تم دونوں نے ملا کے ایک کر لیا۔ کیوں؟" وہ بولا۔ "ہے نا یہی بات؟ ایک جیسے بال اور ایک جیسی داڑھی اور بالوں کا ایک جیسا رنگ۔ یہ سب مجھے قدرتی نہیں لگتا۔"

میں نے اور محسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی نظریں ہم دونوں پر جمی رہیں۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا اور عیاری اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ اس کی زندگی کے شب و روز مجرمانہ سرگرمیوں میں گزر رہے تھے اور اس ملازمت میں اس کا بیشتر وقت مجرموں کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے گزرتا تھا۔ آدمی ذہین تھا مگر اس کی ذہانت منفی تھی چنانچہ صفِ اوّل کے مجرموں نے خود ہی اسے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے موزوں سمجھ کے منتخب کر لیا ہوگا۔

"یہ عورتیں کون ہیں؟ تمھاری کیا لگتی ہیں؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"ان میں سے ایک میری بیوی ہے۔ دوسری اس کی بہن۔" میں نے کہا۔ "یہ ان کا بھائی ہے نیک محمد۔" میں نے ٹیڈی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس نے مجھ سے جرح شروع کر دی اور وہ ساری کہانی پھر سنی جو میں اس کی ماں کو سنا چکا تھا لیکن وہ مسکراتا رہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری کسی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کا سلوک ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے ہم اس کے گھر میں نہیں، تھانے میں ہیں۔ اور وہ ہم سے تفتیش پر مامور ہے۔

"ان دونوں عورتوں کو اٹھا کر میرے سامنے لاؤ۔" اس نے مجھے حکم دیا۔

اس کے ذلیل کرنے والے اندازِ تخاطب کو نظر انداز کر کے میں نے رابعہ اور ناز و کو اٹھایا اور میرے کہنے پر وہ سراج کے سامنے آگئیں۔ میرے علاوہ سراج کو محسن نے بھی شناخت کر لیا تھا مگر اس نے بھی میری طرح جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس وقت تک انجان بنے رہنا بہتر سمجھا تھا جب تک کہ خود سراج پہل نہ کرے اور ہمارے خلاف عملی قدم نہ اٹھائے۔ رابعہ نے بھی سراج کو پہچان لیا اور اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اُڑ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ سراج جیسے شخص سے یہ تبدیلی پوشیدہ رہی ہو۔

"تم اس شخص کی بیوی ہو؟" سراج نے تمسخر اڑاتے ہوئے سوال کیا۔

رابعہ نے سر جھکا لیا۔ مجھے اس کے اقرار کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ بہت نیچرل اور بہت دلنواز۔

"بولتی کیوں نہیں؟" سراج نے ایک دم گرج کر کہا۔ "تو بیوی ہے اس کی؟ خیر لوتن ہے تیرا نام؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے بمشکل تمام کہا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی ناز و سمٹ کر پیچھے ہو گئی۔

"اور تم سب کلیام اعوان کے رہنے والے ہو؟" اس نے ہم سب کی طرف ایک نظر ڈالی۔ "تو پڑھاتی ہے گوجر خان میں؟"

"جی سرکار۔" رابعہ نے میری طرف نظر اٹھا کے دیکھا۔ اگر سراج اس سے اسکول کا نام پوچھتا تو وہ کبھی نہ بتا پاتی لیکن سراج نے ایک دم ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ ہمیں آہستہ آہستہ نروس کرنے کے سارے طریقے آزمانا چاہتا تھا۔ اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور ٹہلتا ہوا رابعہ کے بالکل سامنے اس سے چند انچ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

"میری طرف دیکھو۔" اس نے حکم دیا اور پھر اپنے ہاتھ سے رابعہ کا چہرہ زبردستی اوپر کر دیا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور خون کی سنسناہٹ میرے کانوں میں سنائی دینے لگی۔ محسن نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے تمھاری صورت کچھ دیکھی ہوئی لگتی ہے۔" سراج نے کہا۔ "کہاں دیکھا تھا میں نے تم کو؟"

"میں کیا بتاؤں جناب!" رابعہ نے کہا۔ وہ اب واقعی خوفزدہ تھی۔

"اچھا تو میں بتاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمھارا اصل نام

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کچھ اور ہے۔ غالباً رابعہ۔ اور تم وکیل ہو۔" سراج نے کہا۔
میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا اور مجھے یوں لگا جیسے رابعہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ سراج ایک دم پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر میں رک گیا۔ بظاہر کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اچانک سراج کی ماں دروازے سے اندر آئی۔
"سراج۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ چلا کے بولی۔
"ڈراما ہو رہا ہے ماں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تم بھی دیکھو، کیسے کیسے کردار ہیں۔ ان کے اصل چہرے دیکھو گی؟ اچھا جاؤ اپنی بندوق اٹھا لاؤ۔ آج استعمال کا وقت آ گیا ہے۔"
"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" سراج کی ماں نے ہم سب کی طرف دیکھا۔
"جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ تم ساری دنیا کو شریف سمجھتی ہو اپنی طرح۔ میں ابھی تم کو دکھا دیتا ہوں کہ دنیا کیا ہے۔" وہ بولا۔
میں نے نظر اٹھا کے نازو کی طرف دیکھا۔ وہ سراج کے پیچھے پہنچنے کے لیے آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔
"جب میں نے تمھیں پہچان لیا رابعہ بی بی... بس رابعہ تمھاری ایڈووکیٹ۔" سراج پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تو پھر دوسرے چہروں کو پہچاننا کیا مشکل ہے۔ ان دو جوکروں میں سے کوئی بھی تمھارا خصم نہیں۔ میرا مطلب ہے قانونی طور پر۔ ویسے تم جسے چاہو خصم بنا لو۔ ایک تمھارا موکل ہے۔ سکندر خان ولد وزیر خان۔ دوسرا اس کا ہمزاد۔ محسن حسن خان۔ دونوں کے کارناموں کی تفصیل سنانے لگوں تو آرسین لوپن، بلیک شرٹ اور بہرام ڈاکو کے کارنامے ہیچ نظر آئیں۔ لیکن تم سب کچھ جانتی ہو تو وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ گیدڑ کی جب موت آتی ہے نا تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ تم کو تقدیر کہاں لے آئی۔ مہمان بھی تم ہوئے تو کس کے۔"
سراج کی ماں دو نالی بندوق کے ساتھ پھر اندر آئی۔ اپنے بیٹے کی بات سے زیادہ اسے ہماری مجرمانہ خاموشی نے شکوک میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر ہم سچے ہوتے تو تردید کرتے۔ احتجاج کرتے اور جھوٹ کو جھوٹ تو کہتے۔ سراج نے ماں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت جب وہ میرے قریب سے گزر رہی تھی مجھے خیال آیا کہ میں اسے دبوچ لوں۔ ماں کی خاطر بیٹا ہم سب کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا اور ہم ماں کو یرغمال بنا کے اپنی جان بچا سکیں گے لیکن سراج کے ریوالور کا رخ ہم تینوں کی طرف تھا۔ وہ کسی کو بھی گولی مار دیتا۔ اس جیسے بیٹے سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ ماں کی پروا بھی نہ کرے۔ پھر خود میرے ہاتھ اس بوڑھی عورت کی طرف نہ اٹھ سکے اور میں نے انتظار بہتر سمجھا۔ میری ساری توقعات نازو سے وابستہ تھیں۔ نازو کی پہلی کوشش کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا کیوں کہ سراج کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اکیلی کھڑی رہ گئی تھی۔ نازو اب خاموشی سے سرکتی ہوئی سراج کی پشت کی جانب پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کے پیر ایک ایک انچ کا فاصلہ یوں طے کر رہے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتی ہوئی محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔
"تم اس عورت کو زد میں رکھو ماں۔" سراج نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ذرا بھی حرکت کرے تو اس کی کھوپڑی اڑا دینا۔"
"لیکن بیٹا۔ یہ بے چاری تو اسکول ٹیچر ہے۔" سراج کی ماں نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔
"اسکول ٹیچر؟" سراج قہقہہ مار کے ہنسا۔ "میری بھولی اور بے وقوف ماں، یہ مکار عورت وکیل ہے۔ اس کا نام رابعہ نہیں، رابعہ قاری ہے۔ یقین نہیں آتا تو پوچھ لو اس سے اور یہ اس کا گھر والا نہیں، اس کا یار ہے۔ ایک بدنام مجرم....."
سراج کی ماں نے رابعہ کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ دو نالی بندوق کا رخ اس کی طرف کر دیا۔
"مسٹر اول خان، پہلے تم ادھر آؤ۔" سراج نے مجھے اشارہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننا بہت آسان کام ہے مگر میری یہ بہادری رابعہ کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی۔ وہ عورت کسی تذبذب کے بغیر گولی مار دیتی۔ میں نے خود کو صبر کی تلقین کی اور تعمیل حکم کے لیے آگے بڑھا۔ سراج کے ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس نے کسی وحشی درندے کی طرح میری نقلی داڑھی نوچ ڈالی اور میرے گھنگریالے مہندی رنگ کے بالوں کی وگ کے ٹکڑے کر دیے۔ میں اپنی اصل صورت میں پٹے ہوئے مہرے کی طرح کھڑا رہ گیا۔ سراج زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔
"دیکھا تم نے ماں۔ تم اسے شریف اور مصیبت کی ماری کہتی تھیں۔ اب اس کی صورت پہچانو۔" سراج بولا۔ "اگلی باری میں دوسرے کو بھی اصل روپ میں تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ جو خیراتن کا گھر والا تھا نا۔ یہ سکندر بخت ہے۔ کبیر خان ہے اور بہت کچھ ہے۔ اس کے اتنے ہی نام ہیں جتنے اس کے جرائم۔ یہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا ہے۔ گاڑیاں چھیننا اس کا شوق ہے۔ یہ سب مجرم ہیں۔"

وہ میرے جرائم کی تفصیل اپنی ماں کو بتا رہا تھا اور میری نظر نازو پر تھی۔ میں اس کے اشارے کے انتظار میں تھا۔ نازو سراج کے بالکل پیچھے اس سے ایک فٹ دور رہ گئی تھی۔ جب اس نے اپنا بایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کے مجھے سگنل دیا۔ میں اڑتا ہوا گیا اور سراج کی ماں پر جا گرا۔ اس کی رائفل سے ہونے والے فائر کی آواز کمرے میں گونجی پھر وہ خود چلائی۔ میں نے رائفل کو اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گرتے دیکھا۔ جب میں سراج کی ماں کو اٹھا رہا تھا تو میں نے سراج کے بلبلانے کی آواز سنی۔ نازو نے اسے کرسی سمیت پیچھے الٹ دیا تھا۔ نازو کی نازک ہتھیلی کے ایک وار سے ڈی ایس پی صاحب کا مضبوط مردانہ بازو یوں ٹوٹ گیا جیسے کچی لکڑی والی شاخ۔ ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز خود میں نے سنی۔ نازو نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا اور جب میں نے سراج کی ماں کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا تو میں نے سراج کو انتہائی طیش کے عالم میں ٹوٹے ہوئے بازو کی پروا نہ کرتے ہوئے نازو کو لات مارنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ نازو نے بڑی پھرتی سے اس کا پنجہ تھام لیا اور اسے اپنے ہی زور میں گھما کے پھینک دیا۔ سراج صوفے پر گرا اور نیچے لڑھکا۔ اس کا بازو کلائی سے ذرا اوپر ٹوٹا تھا اور بڑے مضحکہ خیز طریقے پر جھول رہا تھا۔ سراج کو حیران ہونے کا موقع تک نہ ملا تھا۔ اس کو اصل خطرہ مجھ سے تھا یا ہم تینوں مردوں سے تھا۔ اس نے رابعہ کا بھی بندوبست کر لیا تھا مگر اس نے نازو کو بالکل اہمیت نہیں دی تھی جو ایک کمزور نظر آنے والی معصوم صورت دبلی پتلی اور دھان پان سی لڑکی تھی۔ میں نے رابعہ کو بھی اپنے قریب کر لیا اور تماشا دیکھنے لگا۔
سراج اپنی مردانگی اور پولیس افسری کا بھرم رکھنے کے لیے آخری بار اٹھا اور آہستہ آہستہ نازو کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے انتہائی پھرتی کے ساتھ نازو کو ٹکر مارنی چاہی۔ نازو صرف تماشا دکھانے کے لیے غوطہ مار کے فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے دونوں پیر لپور کی طرح اوپر اٹھے اور سراج اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ نازو نے تھوڑا سا جھٹکا دیا اور سراج ہوا میں کاغذی جہاز کی طرح تیرتا گیا۔ اس کے دیوار سے ٹکرا کے گرنے کی آواز پر اس کی ماں چلائی۔ سراج بے حس و حرکت پڑا رہا۔
"چھوڑ دو۔ خدا کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو بیٹی۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمھارے سامنے۔" اس نے دہاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ "میں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اگر کوئی نیکی کی تھی تو اس کا واسطہ۔"
"ماں جی۔ آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ اگر ہم آپ کے مہمان نہ ہوتے تو آج ڈی ایس پی صاحب کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ اس کا ہاتھ ٹوٹا ہے، دس پندرہ دن یا مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے آنے اور جانے کے متعلق کسی سے کچھ نہ کہیں۔ سراج کہہ سکتا ہے کہ وہ گر گیا تھا جس سے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" جیسے ہی میں نے اسے چھوڑا وہ چیخ مار کر سراج کی طرف لپکی اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگی۔
محسن نے آگے بڑھ کر ریوالور اٹھا لیا۔ اس ماں کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا جو ہر بات پر اپنے بیٹے کا حوالہ دیتی تھی کہ وہ زمین اور آسمان ایک کر سکتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک کم عمر اور کمزور لڑکی کے سامنے بھی وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کی ماں تا کے جذبات بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ دکھ بن گئے تھے جو آنسو بن کے آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ "تم سب کمینے اور بے غیرت ہو۔ ٹھیک کہتا تھا میرا بیٹا کہ تم سب مجرم ہو، وہ میری غلطی نہیں میرا گناہ تھا کہ میں نے تم کو مہمانوں کی سی عزت دی۔"
"یہ تو وقت خود آپ کو بتائے گا ماں جی کہ مجرم کون تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم بے اختیار لوگ تھے اس لیے مجرم بنا دیے گئے اور دنیا نے اس کی بات کو سچ مانا جو با اختیار تھا۔ میری ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی ماں نہیں ہے۔ آپ نے ہمیں اپنے گھر میں ماں کی شفقت دی۔ ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ تو فقیروں کو خیرات میں بھی مل جاتی ہے لیکن آپ نے جس عزت اور شفقت کے ساتھ ہمیں گھر میں مہمان رکھا اس جذبے کی کوئی قیمت نہیں اور آپ کا یہ احسان ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔"
"بہت جلد بدلہ دیا تم نے اس احسان کا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح میرے گھر میں چور ڈاکو اور قاتل گھس کر بیٹھ گئے ہیں۔ ورنہ میں تمھیں گولی مار دیتی۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ مجھے دھوکا دیا۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔
"ہم مجبور تھے ماں جی۔" محسن بولا۔ "ہم سچ بولتے تو سر چھپانے کے اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو جاتے۔ ہم تو شاید سردی، بھوک اور تکان سب برداشت کر جاتے مگر یہ لڑکی ضرور مر جاتی۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی تھی۔"
"اچھا تھا مر جاتی۔ جی کے بھی کیا کرے گی یہ۔ اگر اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عمر میں گھر سے نکل کے یہ تم جیسے بدمعاشوں کے ساتھ اس قسم کے دھندوں میں پڑ گئی ہے۔" وہ بیٹے کا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کے بولی۔ "دیکھ حرافہ۔ کیا حال کیا ہے تو نے میرے بیٹے کا۔ کتنی بھولی لگتی ہے صورت سے ناگن۔"

"اگر آپ کے بیٹے نے بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک کیا ہوتا جو آپ کا تھا تو ہم اسے بھی سلام کر کے رخصت ہوتے مگر اس نے تو ہمیں جیل پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہی کام ہے اس کا۔ تم کو جیل نہ پہنچاتا تو کیا مہمان بنا کے رکھتا۔" عورت چلائی۔

"لیکن ہم اس طرح گرفتار نہیں ہو سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "جب تک ہم باہر تھے تمہارا بیٹا اور اس جیسے بہت سے ہمیں نہ پکڑ سکے۔ جب ہم اپنے پیروں سے چل کے خود اس گھر میں آ گئے تو ہمیں گرفتار کرنے میں کون سی بہادری ہے؟"

"ایسی ہی بہادری کا مظاہرہ ہم کرتے ماں جی تو کیا یہ گھر آپ کے بیٹے کے آنے تک محفوظ رہتا؟" محسن بولا۔ "یہ لڑکی جس نے صاحب بہادر کو دو منٹ میں چت کر دیا، کیا آپ سے بندوق نہیں چھین سکتی تھی؟ جو کچھ آپ نے دیا وہ ہم نے شکریے کے ساتھ احسان سمجھ کے قبول کیا۔ ہم آپ کو اور آپ کی خادمہ کو بند کر کے جو چاہتے خود لے لیتے۔ اور آپ کا بیٹا گھر لوٹتا تو اسی طرح پکڑا جاتا جیسے چوہے دان میں جا کر چوہا پکڑا جاتا ہے۔"

"ہم تالا توڑ کے گھر میں نہیں گھسے تھے حالانکہ ہمارا خیال تھا گھر خالی ہے مگر ہم نے اسی گیراج کو کافی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔

سراج کراہنے لگا۔ "میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔"

"اس گھر کے باہر ہماری اور تمہاری کھلی جنگ ہے، ڈی ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "جنگ میں نہ تم نے کبھی رعایت کی اور نہ ہم کریں گے۔ ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کبھی تمہاری جان بخشی ہوئی تو اس ماں کی دعاؤں کے طفیل ہوگی جس کا تم ایک ہی سہارا ہو۔ اور جو تم پر اسی طرح ناز کرتی ہے جیسے ہر ماں کرتی ہے۔ ہم اس رات کی میزبانی اور اس سلوک کے بدلے جو تمہاری ماں نے ہمارے ساتھ کیا صرف ایک بار تم کو ضرور چھوڑ دیں گے خواہ اس وقت تمہاری جان لینے کے لیے انگلی کو تھوڑا سا ہلانا ہی کافی ہو۔ صرف ایک بار سراج۔ دوسری بار کا کوئی وعدہ نہیں۔"

"تم کو ایک موقع بھی نہیں ملے گا۔" سراج نے اشتعال میں گالیاں دیتے ہوئے اپنی ماں کی موجودگی کا اور... کا بھی لحاظ نہیں رکھا۔

"ایک موقع تو اس وقت بھی ہمارے ہاتھ میں..." میں نے کہا۔ "لیکن ہم اس کو موقع شمار نہیں کرتے کیونکہ... اس گھر میں خود کو اب بھی مہمان سمجھتے ہیں۔ نیت بدلی... میزبانوں کی۔ ہم نے تو وہ روایت بھی سنی ہے کہ بیٹے... میں مہمان ہونے والے باپ کے قاتل سے بھی انتقام نہیں... تھا۔" پھر میں نے محسن سے ریوالور لے لیا۔ "تم سامان گاڑی... میں رکھو۔ استاد تم گیراج میں سے باقی سامان لے آؤ۔"

"کون سی گاڑی میں؟" محسن نے کہا۔

"جو بھی گھر میں ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سامان سر پر... کے خواتین کے ساتھ پیدل تو نہیں جا سکتے نا۔ ڈی ایس... صاحب ہمیں اپنی جیپ کی چابیاں دینے سے انکار نہیں... کریں گے۔"

"میں تم کو چابیاں دوں گا!" سراج نے چیخ کر کہا... میں اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ ہل گیا تھا۔

"اچھا ہم خود لے لیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا... ڈی ایس پی صاحب کو فرسٹ ایڈ دو۔"

محسن کے ساتھ ٹیڈی بھی نکل گیا۔ وہ "باقی سامان"... مطلب سمجھ گیا تھا۔ رابعہ آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل... کے پاس بیٹھ گئی۔ "میں اس ہاتھ کو صحیح طرح سے باندھ د... ہوں تاکہ تکلیف نہ ہو۔" وہ بولی۔ "اور ہلنے جھلنے سے زیادہ... خرابی نہ ہو۔ بعد میں تو آپ پلاسٹر کرا ہی لیں گے۔"

عورت نے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے بہنے والے... آنسوؤں کو دوپٹے کے کونے میں جذب کرتی رہی۔ سراج... شدید غصے اور احساسِ ذلت و شکست کا شکار زخمی سانپ... کی طرح پھنکارتا رہا اور اپنی آنکھوں سے زہر برساتا رہا۔

"مجھے دو سیدھی لکڑیاں چاہئیں، پتلی اور چھوٹی۔ تقریباً... چھ انچ کی۔" رابعہ نے مجھ سے کہا۔

صرف سراج کو متاثر کرنے کے لیے میں نے ہاتھ... وار سے اسی کرسی کے ٹکڑے کیے جس پر سراج بیٹھا تھا... ہاتھوں نے یہ کام اسی مہارت اور صفائی سے کیا جیسے قصا... کے ہاتھ ہڈی پسلی کو بھاری چھرے کے وار سے کاٹتے ہیں... دو منٹ سے بھی کم وقت میں میں نے رابعہ کو اس کی ضرورت... مطابق دو لکڑیاں فراہم کر دیں۔ اس نے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو... کیا اور ہڈی کو اندازے سے بٹھایا۔ پھر اوپر نیچے دونوں لکڑیاں... کو متوازی رکھا۔ اب اسے پٹی کی ضرورت تھی۔ سوچے سمجھے...

اس نے اپنا دوپٹا الگ کیا اور سراج کی کلائی کے گرد مضبوطی سے لپیٹنے لگی۔ سراج بہت تکلیف میں تھا۔ پھر بھی وہ رابعہ کی یہ نیکی برداشت نہ کر سکا۔

"اسے اپنا دوپٹا دے دو ماں۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ماں نے اس کی بات کا مطلب کچھ غلط لیا۔ اس نے اپنا دوپٹا رابعہ کے سر پر ڈال دیا۔ رابعہ اپنے دوپٹے کو لپیٹنے میں مصروف رہی۔

"میں نے... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اپنا دوپٹا میرے ہاتھ پر باندھنے کے لیے دینا تھا۔" سراج بولا۔

"ایک ہی بات ہے۔ ماں کے سر کا دوپٹا میرے سر پر میری عزت کا اتنا ہی رکھوالا ہے جتنا یہ دوپٹا تھا۔" رابعہ نے پٹی لپیٹنے کا کام ختم کرتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"چابیاں تو گاڑی میں ہی لگی ہوئی مل گئیں۔" محسن نے اندر آ کے کہا اور اسٹین گن میری طرف اچھال دی۔ میں نے اسے تربیت یافتہ اور پیشہ ور کمانڈوز کی طرح ہوا میں ہی پکڑ لیا۔ محسن اندر گیا اور تھوڑی دیر میں دونوں سوٹ کیس لیے گزرا۔

"یہ دیکھا آپ نے سراج صاحب۔" میں نے کہا۔ "ہم کتنے طاقتور تھے۔ خالی ہاتھوں ایک لڑکی نے تمہارا پتّا کر دیا۔ خالی ہاتھ ہم مل کر تمہاری ایک پلٹن کا بیڑا کر دیتے۔ پھر اس ہتھیار کے سامنے بھلا کون ٹھہر سکتا تھا لیکن دیکھ لو ہم نے خالی سمجھنے کے باوجود تمہارے گھر کا تالا تک نہیں توڑا تھا اور تمہاری ماں کے ساتھ اتنی ہی تعظیم کا سلوک کیا تھا جتنا ہر ماں کا حق ہوتا ہے۔ ہم اس گھر سے ایک سوئی بھی اٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ لے جا رہے ہیں تو بارِ احسان یا تھوڑی سی شرمندگی کا احساس کہ آپ کی وجہ سے تھوڑی سی زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ تم دونوں چل کے گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے رابعہ اور نازو کو اشارہ کیا۔

"ہم سے جو کچھ ہوا۔" رابعہ نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ "اس کے لیے ہمیں معاف کر دینا ماں جی۔"

"اور مجھے بھی۔ ایک نہ ایک دن آپ کو یقین آ جائے گا کہ ہم ویسے نہیں تھے جیسا آپ نے سمجھا تھا۔" نازو بولی۔

"خدا تمہیں سیدھی راہ دکھائے۔" بڑی بی نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ سراج دیوار کا سہارا لیے سیدھا بیٹھا رہا۔

"تمہاری ماں کو تم پر بہت فخر ہے سراج۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "ہم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن اس طرح تمہارے سارے جرائم کا پردہ بھی چاک ہو جاتا۔ اگر تمہاری ماں یقین کر لیتی تو اس کے غرور کی شکست کتنی اندوہناک ہوتی چنانچہ ہم اسے کچھ نہیں بتائیں گے لیکن تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ غرور کب تک سلامت رہے گا؟ حقیقت سات پردوں میں اپنے وجود کو تسلیم کرا لیتی ہے اور سچ سامنے آتا ہے تو جھوٹ پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے یہ صدمہ زیادہ شدید ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گھپ اندھیرے کمرے سے دوپہر کی دھوپ میں قدم رکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔"

"میں ایسا کام نہیں کر رہا ہوں کوئی۔ تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو آخر؟" وہ عیاری سے بولا۔ اس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ ہمیں اس کے اور دلاور کے گٹھ جوڑ اور ان کے کاروبار کی اصل نوعیت کے بارے میں کیا معلوم ہے۔

"تم اور دلاور آج منشیات کا زہر بیچ کر تباہ ہو جانے والوں کی زندگی کا معاوضہ وصول کر رہے ہو اور اپنی تجوریوں میں اپنے لیے جہنم کی آگ بھر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم انسانیت کی اگلی نسل کو تباہ کر رہے ہو۔ مجھے صرف اس بات کی سزا دے رہے ہو کہ میں نے تمہارے شیطانی کاروبار میں تمہارا ساتھ نہیں دیا، دولت کے لیے اپنے ضمیر کو نہیں بیچا۔ تم کو مجھ سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں میں تمہاری سونے کی کان کو تباہ نہ کر دوں۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا لیکن یہ بات خود بھی یاد رکھنا اور اپنے آقاؤں کو بھی سمجھا دینا کہ جب تک وہ میرا وجود نہیں مٹا دیں گے، میں ان کے منشیات کے کاروبار کے لیے مستقل خطرہ بنا رہوں گا۔ آج وہ بھی اکیلے نہیں اور میں بھی اکیلا نہیں۔ لیکن تم دیکھو گے کہ کل وہ اکیلے ہوں گے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے یا اپنی قبر میں۔"

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں اسے یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا کہ میں کتنا گمراہ ہوں اور حقائق سے کتنا بے خبر ہوں۔ اسے یقین آ گیا کہ میں سراب کے تعاقب میں ہوں۔ وہ ناجائز اسلحہ بنانے، اسمگل کرنے، بلیک میں فروخت کرنے اور ملک دشمن عناصر تک پہنچانے کا جو مذموم دھندا کر رہے ہیں، وہ میری نظر سے پوشیدہ ہے اور میں نے خود ساختہ مفروضات کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا بزنس منشیات کی ترسیل و تقسیم ہے۔ وہ یقیناً میرے اس احمقانہ یقین پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا ہوگا لیکن صورت سے اس نے بھی مجھے بے وقوف بنانے کی اداکاری جاری رکھی تھی۔

"یہ کاروبار پہلے بھی چلتا رہا ہے۔ تمہارے باپ نے مخالفت کر کے ہمارا کیا بگاڑ لیا۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور خود تم

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے کون سا تیر مار لیا؟ ماری ہے تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ خود کو ہی نہیں، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تباہ کیا ہے۔ تم دلدل میں اُتر چکے ہو اور تمھارا واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہم بدستور کنارے پر ہیں۔"

"تم آنے والے سیلاب سے بے خبر ہو۔" میں نے کہا۔ "کنارے پر ہونے کو تم تحفظ اور سلامتی کی ضمانت سمجھے ہوئے ہو مگر اسی یقین کے ساتھ تم سب ڈوبنے والے ہو۔ اگر تم صرف ایک پولیس افسر رہتے تو تمھاری جان و مال اور عزت سب بچ جاتے لیکن اب کوئی تم کو بچانے والا بھی نہیں ہے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"جانے کے لیے اب ہمیں تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن تمھاری ماں سے ایک اجازت ضرور لینا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی خطرہ مول لے سکیں اور یہاں سے نکل کے کسی محفوظ مقام تک پہنچنے سے قبل ہی پکڑ لیے جائیں۔ ہمیں کوئی ایسا بندوبست ضرور کرنا پڑے گا کہ ہمارے جانے کے بعد تم کچھ نہ کر سکو۔" پھر میں اس کی ماں کی طرف مڑا۔ "انتخاب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں آپ کے بیٹے کو ساتھ لے جاؤں اور پھر ہم ان کو کسی بھی جگہ چھوڑ دیں جہاں سے یہ واپس آجائیں۔"

"نہیں۔ اسے مت لے جاؤ۔ یہ زخمی ہے۔" سراج کی ماں چلائی۔ "اس کی جگہ مجھے لے چلو۔"

"آپ کو تکلیف ہوگی اور سراج کی طرف سے ہمارا اطمینان پھر بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ ہم آپ کو اور سراج کو ایک ساتھ لے جائیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ میں آپ دونوں کو ایک ساتھ یا الگ الگ کمروں میں باندھ کر ڈال جاؤں۔ کچھ دیر میں کوئی نہ کوئی آپ کو آزاد کرانے والا آجائے گا۔"

"کیا تم میرے وعدے پر اعتبار نہیں کر سکتے کہ میں خاموش رہوں گی۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ کی بات پر میں یقیناً اعتبار کر لوں گا۔ لیکن آپ کے بیٹے کی بات پر نہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی اتنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ آپ کو کسی کمرے میں مقفل کر دوں۔ ہاں آپ صرف اپنے قول کی پابند رہیں گی۔ سراج کو میں دوسرے کمرے میں رکھوں گا۔ اب آپ مجھے بتا دیں کہ کس کمرے میں جانا پسند کریں گی، میرا مطلب ہے کس باتھ روم میں، اگر آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کو باندھا نہ جائے۔ سراج کے لیے کوئی رعایت نہیں۔"

"مگر باتھ روم میں... اور... اس حالت میں تم سراج کو باندھ کر ڈالو گے۔"

"مجبوری ہے ماں جی۔ باقی سب کمروں میں کھڑکیاں ہوں گی۔ انھیں مقفل نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "سراج کا صرف ہاتھ ٹوٹا ہے۔ وہ معذور نہیں ہوا ہے۔ اس کا ہمارے پیچھے دوڑتا یا ہمارے تعاقب میں آنا خود اسی کے لیے خطرناک ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی دوسرا ریوالور استعمال کرے۔ جواب میں ہمیں بھی گولی چلانی پڑے گی۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔" میں نے اسٹین گن لہرائی۔

"نہیں نہیں۔" سراج کی ماں چلائی۔ "میں اس کو کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ تم جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اسے کمرے سے بھی نہیں نکلنے دوں گی۔ کوئی تمھارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"آپ کا بیٹا ایک پولیس افسر بھی ہے ماں جی۔ اس نے آپ کی بات نہ مانی تو آپ کچھ بھی نہیں کر سکیں گی۔" میں نے کہا۔ "اب آپ دیر نہ کریں۔ آپ اسی کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی جائیں۔ انھیں آپ بھی سراج صاحب۔" سراج بے گالیاں بکتا اور دھمکیاں دیتا اٹھا۔

"اچھا اس کو باندھ کر مت ڈالو۔ ایسے ہی دروازہ باہر سے بند کر جاؤ۔" سراج کی ماں نے التجا کی۔

"بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ "آپ دونوں باتھ روم میں بالکل خاموش رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے میں نے شور مچانے کی آواز بھی سنی تو میں واپس آکے اس کی ٹانگ بھی توڑ جاؤں گا۔ غسل خانے کے دروازے کی چابی کہاں ہے۔"

تمام دروازوں کی چابیاں ایک گچھے میں تھیں۔ میں نے سراج کی ماں کو بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے اور اسے سمجھاتے مناتے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ سراج طیش سے پاگل ہو رہا تھا اور ایسی ذلت آمیز شکست کے ساتھ اپنی بے بسی کا احساس اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ ماں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہے۔ یہ خود اپنی نظر میں اور دوسروں کی نظر میں عزتِ نفس کو مزید مجروح ہونے سے بچانے کی فضول کوشش تھی۔ میں نے دروازے کو قفل لگا کے تمام چابیاں ایک میز کی دراز میں ڈال دیں تاکہ خادمہ بھی شور پر متوجہ ہو کر آئے تو فوراً دروازہ نہ کھول سکے۔ چابیاں تلاش کرنے یا دروازہ توڑنے میں جتنا وقت لگتا وہ ہمارے لیے کافی تھا۔

باہر آکے میں نے ٹیلیفون کی لائن کو دیکھا۔ جہاں یہ لائن دیوار سے گزر رہی تھی، وہاں میں نے اسٹین گن کے دستے سے کئی بار چوٹ ماری اور پھر تار کو موڑ کر الگ کر دیا۔ محسن جیپ میں سامان رکھنے کے بعد ٹیڈی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ رابعہ اور ناز و پچھلی سیٹ پر تھیں اور سامان بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسٹین گن کو ایک سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ سراج کا ریوالور میں نے محسن کو دے دیا۔

"چلو دھکا لگاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب... گاڑی تو ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔

"مطلب باہر جا کے سمجھاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "دیر مت کرو۔ شاباش۔" میں نے رابعہ سے اسٹیرنگ سنبھالنے کو کہا۔ ہم تینوں کے زور لگانے سے جیپ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھی۔ سڑک تک آنے میں ہمارے دو منٹ صرف ہوئے۔ آگے معمولی سا نشیب تھا۔ ہم سب کی متحدہ کوشش سے جیپ کی رفتار اتنی بڑھ گئی کہ ہمیں ساتھ دوڑنا پڑا۔ ذرا سی دیر میں ہم سراج کے گھر کو کافی پیچھے چھوڑ آئے۔ محسن اور ٹیڈی کا سانس پھولنے لگا۔

"یار یہ کیا مصیبت ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" محسن نے جھلا کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور کیوں دیکھ رہے ہیں؟ بدتمیز لوگ، پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔"

"پردے دار خواتین کیا مزے سے بیٹھی دانت نکال رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جیسے گدھا گاڑی ہے تین گدھوں والی۔"

"یار سکندر بادشاہ! جس مصیبت کو ہم اتنی دیر میں یہاں تک خود کھینچ کر لائے ہیں۔" ٹیڈی ہانپتے ہوئے بولا۔ "اسے چلا کر لاتے تو اب تک دو میل دُور نکل گئے ہوتے۔"

"اچھا!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی! چلو بیٹھو۔"

محسن نے فوراً ڈرائیونگ سنبھال لی۔ چابی گھماتے ہی انجن غرایا۔ "اب کدھر چلیں؟"

"جہاں سینگ سمائیں... یا جہاں تقدیر لے جائے۔"

"سینگ تو ہمارے سر سے غائب ہو چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور جس پر ہم بیٹھے ہیں اسے جیپ کہتے ہیں، تقدیر نہیں۔"

"یہ جیپ بھی اُدھر ہی جائے گی جدھر اسے ہماری تقدیر لے جائے گی۔" میں نے کہا۔ "جیسے رات کو وہ گھوڑا خود تو بچ گیا مگر ہم پھنس گئے۔ ہماری شامت آئی تھی۔"

"یا جیسے ہم نکل گئے اور ہمارا لینڈ لارڈ پھنس گیا۔" محسن بولا۔ "اس کی بھی شامت آئی تھی۔"

"میں نے حضرت سراج کو مع والدہ ماجدہ باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے کہا تھا کہ خبردار جو جیپ کے روانہ ہونے تک آواز بھی نکالی۔ واپس آکے ٹانگیں بھی توڑ دوں گا۔ وہ ابھی تک دم سادھے بیٹھے ہوں گے کہ جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی۔ اب سمجھ میں آگیا کہ میں نے اتنی دُور آکے انجن کیوں اسٹارٹ کیا تھا؟"

ٹیڈی نے گھوڑے جیسا سر ہلایا۔ "پھر تو وہ نہ جانے کتنی دیر ویسے ہی بیٹھے رہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ابھی ہم نکلے نہیں۔"

"اس جیپ کو ہم شہر میں اپنے ساتھ لے کر نہیں پھر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"پھر بھی اس علاقے سے تو نکلنا ہی ہے جہاں ہمیں رات کو پولیس نے تلاش کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ ابھی تک ناکابندی کیے بیٹھے ہوں۔ کسی پولیس والے کی جیپ کو کوئی نہیں روکے گا۔"

تھوڑا سا آگے جانے کے بعد میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے کئی جگہ پولیس والوں کو گاڑیاں روک کر اندر جھانکتے دیکھا۔ وہ ٹانگوں پر بھی نظر ڈال رہے تھے اور بسوں، ٹرکوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ اگر اس وقت ہم کسی پرائیویٹ کار یا ٹیکسی میں ہوتے تو ضرور پکڑے جاتے۔ پولیس کی جیپ اپنے رنگ کی وجہ سے دُور سے پہچانی جاتی تھی اور اس پر انگریزی میں لکھے ہوئے "[illegible]" کے حروف اتنے نمایاں تھے کہ ہمیں کسی نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ راستے میں ہمیں مخالف سمت سے آنے والی اسی قسم کی دو جیپوں سے واسطہ پڑا مگر وہ زن سے گزر گئیں۔ کسی نے غور بھی کیا ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ کسی پولیس افسر کی فیملی بیٹھی ہے۔

خطرے کی حدود سے بہت دُور آجانے کے بعد میں نے محسن سے جیپ کو روکنے کے لیے کہا۔ میں نے اور ٹیڈی نے تمام سامان اُتار کے سڑک سے ذرا دُور رکھا۔ یہ میانی صاحب کے قبرستان کا عقبی حصہ تھا۔ اسٹین گن کو میں نے سوٹ کیسوں کے پیچھے چھپا دیا۔ "اب تو جیپ کو آگے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور یہاں سے ایک میل دُور چھوڑ کر ٹیکسی میں لوٹ آؤ۔"

"کہاں جانے کے لیے؟" محسن نے کہا۔ "میں ٹیڈی کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

"دروغہ والا۔" میں نے کہا اور محسن نے سر ہلایا۔ وہ جیپ لے کر ہوا ہو گیا۔ رابعہ اور ناز و سامان پر بیٹھ گئیں۔

"تم لوگوں کی جرأت بہت بڑھ گئی ہے۔" ناز و نے بہت دیر بعد ایک بات کی۔ "کسی بات سے نہیں ڈرتے؟"

"ہمارے لیے شاعر نے کہا تھا۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب تو احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیسے سنگین خطرات سے دوچار تھے۔ کسی نہ کسی صورت نکل

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہی آتے ہیں۔ بھیگنے کا ڈر اس وقت تک رہتا ہے جب تک آدمی دُور کھڑا ڈرتا رہے۔ جب ایک بار پانی میں غوطہ مار لیا تو ڈر ختم۔ کیا تم بہت خوفزدہ ہو؟"

"وہاں تو تھی، سراج کی کوٹھی میں۔" وہ بولی۔ "وہ بھی پولیس افسر ہے نا؟"

"لیکن وہ تم کو پہچانتا تو نہیں تھا کہ تم اکرام شیخ کی بہن ہو۔"

"اگر پولیس کے فون پر تمھارے بارے میں کچھ بتاتا تو میرے بارے میں بھی بتاتا۔" نازو بولی۔ "پھر اسے معلوم ہو جاتا۔"

"کیسے معلوم ہو جاتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمھاری عقل کو؟" رابعہ نے کہا۔ "اسے بھائی اب تک اکرام شیخ اپنی بہن کے اغوا کیے جانے کی رپورٹ لکھوا چکا ہو گا اور یہ رپورٹ ہر تھانے کو مل چکی ہو گی۔ اغوا کنندہ تمھارے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ ایف آئی آر میں ہم سب کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

مجھے افسوس ہُوا کہ اتنی موٹی بات میری عقل میں نہیں آئی۔ "اکرام شیخ کیا کہے گا؟ یہ کہ ہم نازو کو گھر سے اُٹھا لائے؟"

"نہیں، وہ کہے گا کہ میں بہن کو رہنما بنا کے مجرموں کے ٹھکانے پر چھاپا مارنے گیا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"لیکن مجرم زیادہ طاقتور تھے۔ مقابلہ کر کے نکل گئے۔" میں نے کہا۔ "اور میری بہن نازو کو بھی لے گئے۔ یہ بات وہ ثابت کیسے کرے گا؟ وہاں اسے کوئی چشم دید گواہ نہیں ملے گا جو کہے کہ یہاں پولیس آئی تھی اور ان کا مجرموں سے مقابلہ ہُوا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ معطل ہو جائے گا۔ اس نے افسرانِ بالا کو کامیابی کا پورا یقین دلانے کے بعد اس قسم کی کارروائی کا اختیار حاصل کیا ہو گا لیکن نتیجہ کیا نکلا! ڈرائیور مارا گیا جو گرفتار کرنے گئے تھے خود گرفتارِ بلا ہو گئے۔ سارے آپریشن کی ناکامی کا ذمے دار اکرام شیخ کو ٹھہرایا جائے گا جس کے اندازے غلط تھے —— منصوبہ بندی غلط تھی اور توقعات غلط تھیں۔"

"معلوم نہیں غالب پر کیا بیتی۔" رابعہ نے کہا۔

"اسے تو اب رات ہی کو فون کریں گے کہیں سے۔" میں نے کہا۔ "جب وہ آفس میں ہو گا۔"

"اکرام شیخ کے بیان پر وہ حوالات میں بھی ہو سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کسی اے ایس آئی کا بیان ایک اخبار کے ادارتی عملے کے بیان کو رد نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "غالب کے دوست بہت ہیں۔"

"داروغہ والا میں کون ہے؟" نازو نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس اس جگہ سے جتنی دُور ہوں اتنا ہی بہتر۔" میں نے کہا۔ "آج کی رات تو ہم ہوٹل میں بھی دیکھیں گے کسی جگہ پناہ مل جائے تو اچھا ہے۔ کرائے کا کوئی مکان سب سے بہتر رہے گا۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں اپنے یہ شہری چہرے اور لباس بدل ڈالو۔"

"لباس تو بدل جائے گا، چہرہ کون بدلے گا؟" نازو مسکرائی۔

"وہ کیا مشکل ہے۔ اپنے پرسیٹ کیے ہوئے کسی ہیئر ٹانک کے اشتہار میں نظر آنے والے بال بکھیر لو۔ ان میں سا کڑوا تیل چپڑ کے خانہ بدوش عورتوں کی طرح گوندھ لو۔ مٹی پڑ گی تیل میں تو بال چکٹ نظر آئیں گے۔ ایسے شاداب چہرے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور تمھاری طرف کسی کی نگاہ بھی نہ اُٹھے تو اچھا ہے۔ مُنہ پہ تھوڑی بہت سیاہی مل لو۔ عورتیں تو خود میک اپ کی ماہر ہوتی ہیں۔ اپنے ذہن میں کسی جاہل دیہاتی عورت کا حلیہ رکھو اور خود کو ویسا ہی بنا لو۔" میں نے کہا۔ "کپڑے ہم لا دیں گے۔ گھگھرا، انجولی یا لمبا کرتا اور دھوتی۔ ہاتھ میں حق میں آپ دونوں سے مخاطب ہوں۔"

رابعہ اور نازو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ "ہم یہ نہیں کر سکتے۔" انھوں نے مشترکہ اعلامیہ جاری کیا۔

"کیوں؟" میں نے ماتھے پہ بل ڈال کے کہا۔ "میں اور محسن بھی تو کارٹون بن کے پھر رہے تھے۔ وہ تو سراج نے ہمارا میک اپ خراب کر کے ہمیں پھر وہی بنا دیا جو ہم ہیں، ورنہ کیا تھے؟ اور آئندہ بھی ہم ایسے بہروپ کے تو نہیں پھر سکتے۔ ہمیں بھی بھیس تو بدلنا ہی پڑے گا۔ اس بار میرا خیال کچھ اور ہے میک اپ کے بغیر کچھ حقیقی رنگ دینے کا۔"

"کیا؟" رابعہ نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے ہم سر صاف کروا دیں۔" میں نے کہا۔ "میدان۔ بے آب و گیاہ۔ پگڑیاں باندھ لیں اور دھوتی کے ساتھ چُغنے پہن لیں۔ ہاتھ میں وہی حقہ۔ پیروں میں کھُسا ملتانی، کانوں میں مُندریاں اور اس آن بان شان سے ہم سب صبح گامے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کے معتقد بن کے کوئی منت ماننے جائیں اور ان کے مریدوں میں شامل ہونے کی کوشش کریں۔ اجازت ملے تو وہاں چلّہ کاٹیں۔ گامے شاہ کے چیلم کا پکا بندوبست ہو جائے۔" محسن اس وقت ٹیکسی لے کر نمودار ہُوا۔ اس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری دی کہ ڈرائیور کی مہربانی سے مکان بھی

ٹیکسی ڈرائیور مجذوب صفت آدمی تھا اور اس نے داروغہ والا کی جانب لے جاتے ہُوئے اپنے عجیب و غریب نظریات کی تبلیغ کی جو سارے زمانے سے نرالے تھے مگر ہم نے سے اجتناب ہی کیا۔ وہ بہت جلالی شخص تھا اور اس کو دعوے تھا کہ اب تک وہ چوبیس نافرمان جنات کو نیست و نابود کر چکا ہے۔ ہم آدمِ خاکی و فانی اس کے عتاب کو دعوت دینے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ شالیمار باغ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ہمیں مادھو لال حسینؒ کے بارے میں متعدد ایسی روایات سے روشناس کیا جو مبالغہ آمیز اور کچھ گمراہ کن بھی لگتی تھیں مگر ہم نے ان کی تاریخی سند پر بھی اصرار نہیں کیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس نے ہم سے کوئی شرافت کی سند نہیں مانگی اور دو جوان عورتوں کو بے پردہ اپنے ساتھ لے کر گھومنے پہ ہدفِ ملامت نہیں بنایا۔ موقع پاتے ہی میں نے اس سے مکان کے بارے میں سوال کیا۔

"مکان کیسا ہے!" وہ بولا۔ "سوہنا۔ اس کی چار دیواراں ہیں۔ اُتے پکّی چھت ہے۔ اندر جان اور باہر آن کا رستہ ہے۔ ہور کی چاہیدا ہے؟ ذرا پُرانا ہے تو تم کون سے نویں جمّے ہو؟"

یہ بڑی منطقی دلیل تھی۔ کیا پُرانا ہے اور کیا پُرانا نہیں ہے۔ یہ سب حالات اور دیکھنے والے کی نظر کا فیصلہ ہے۔ خریدار کے نکتۂ نظر سے دس سال پُرانا مکان پُرانا ہے۔ بیچنے والے کے لیے نیا بنا ہُوا۔ کچھ لوگوں کے لیے گزشتہ سال کا کار ماڈل بھی پُرانا ہے کچھ کے لیے دس سال پہلے کی کار بھی نئی ہے۔ پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی اسلام آباد نیا شہر رہے گا۔ آدمی نیا پُرانا کب ہوتا ہے؟ سال بھر کا بچہ، دس سال کا لڑکا، بیس سال کا جوان۔ سب پُرانے ہیں۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ ہم کون سے آج پیدا ہوئے ہیں کہ خود کو نیا کہیں اور مکان کی اس نے ایک جامع تعریف کر دی تھی کہ اس میں بنیادی طور پر کیا کچھ ہونا چاہیے۔ باقی سب چونچلے ہیں، آسائش ہے یا عیاشی کے سامان ہیں۔ کیا دری اور کیا قالین۔ کیا پنکھا اور کیا ایئر کنڈیشنر۔ کیا تخت اور کیا فوم ربر کا کنگ سائز بیڈ۔ جہاں تک چاہو پاؤں پھیلاتے جاؤ۔

"لو جی اس مکان میں بھی چار جنات نے وخت ڈال دیا تھا۔" وہ بولا۔ "ہم ذرا غافل ہُوئے اور نامُرادوں نے کر لیا قبضہ۔ کرائے دار کو چک کے باہر سٹ دیا۔ وہ منجی بسترا فیر اُٹھا کے لایا۔ انھوں نے فیر الٹ دیا۔ سویرے وہ نس گیا۔ فیر جی ہم نے ... ... نُدو جا بندہ رکھا، اس کا بھی حشر نشر کر دیا۔ چار کرائے دار نسا دیے جی۔ ہم نے کہا کہ اچھا بھئی۔ اب یا تم نہیں یا ہم نہیں۔ چالیس دن کا عمل تھا۔ خود ہم سُولی پر لٹک گئے مگر رب دی شان۔ ہم نے سب کا خانہ خراب کر دیا۔"

"کچھ غور فرمایا آپ نے؟" رابعہ نے کہا۔ "ہم جس مکان میں جا رہے ہیں وہ آسیب زدہ ہے۔"

"ہے نہیں سوہنو۔ تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کے کان بہت تیز تھے۔

"ہم جہاں ڈیرا ڈالتے ہیں وہاں سے بھوت خود بھاگ جانا پسند کرتے ہیں۔" محسن بولا۔ "ورنہ خانہ جنگی کا امکان رہتا ہے۔"

"اور بھوت کیا، ان کے آباؤاجداد بھی ہم سے بگاڑ مول نہیں لیتے۔" میں نے کہا۔

"ضرور آپ کے پاس ہمارے پیر سائیں گامے شاہ کا تعویذ ہو گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

"گامے شاہ... ہاں انھی کی تو کرامت ہے سب۔" میں نے فوراً کہا۔

"بڑی اُچّی ذات ہے جی ان کی۔" ٹیکسی ڈرائیور خوش ہو گیا۔ "ہم نے بڑی خدمت کی ان کی تو انھوں نے بڑا کرم کیا اور ساتوں دس دتا اپنا خاص علم۔ بس جی اس دن دے بعد اُسی تے کر دِتا کونڈا جنات دا۔ گامے شاہ دی کیا بات ہے، شاہِ جنات نوں غلام بنا لیا... کسی عورت تے جن آ جاوے۔ بس اک نظر اور جن دا بیڑہ غرق۔"

"اچھا جی، گامے شاہ جن اُتارتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اور وہ بھی خواتین کے سر سے۔"

"لو جی! اور جن کیا مردوں کے سر آتے ہیں۔" وہ بولا۔

"بس جی آپ نے تو ہماری مشکل آسان کر دی۔" میں نے کہا۔ "یہ میری گھر والی ہے اور یہ اس کی۔ دونوں پہ جنات کا اثر ہے۔ ہم اگر جائیں گامے شاہ کی خدمت میں تو جن اُتر جائیں گے؟"

"اُترنے والے جن تو نہیں ہیں۔" محسن آہستہ سے بولا اور رابعہ نے اس کو کُہنی مار کے خاموش کیا۔

"آپ جا کے تو دیکھو۔ رب دی شان وڈی۔" وہ بولا۔ "مگر ایس طرح نہ لے جانا۔ میرا مطلب ہے عورت ذات نوں۔ چادر وادر ضرور ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب کا حکم ہے کہ کسی زنانی دا مُنہ نہیں دیکھنا۔ بُوتھا چھپا کے جانا۔"

"برقع پہنا کے لے جائیں گے جی۔ گامے شاہ کو بُوتھا کسی کا نظر نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ عین اسی وقت ٹیکسی رک گئی۔ چنانچہ ٹیکسی ڈرائیور نے اس موضوع پہ گفتگو ختم کی اور نیچے اُتر کے ایک پرانے کواڑوں والا دروازہ کھولنے لگا۔ گلی میں دونوں طرف ایسے ہی پُرانے مکان تھے۔ بیشتر ایک منزلہ لیکن کہیں کہیں دو منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے۔ سب کا رنگ وہی تھا جو اینٹوں کا رنگ تھا اور موسمی اثرات سے سیاہی مائل بھورا ہو گیا تھا۔ گلی کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ ٹیکسی کے کھڑے ہو جانے سے راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا اور باقی ماندہ جگہ میں سے کوئی پیدل چلنے والا ہی نکل سکتا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنا اسباب ٹیکسی سے آنا کے اندر منتقل کیا... ایک سائیکل سوار نے ویٹ لفٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہُوئے ابنی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سائیکل دونوں ہاتھوں میں سر سے اُوپر تُلند کی اور اسی جگہ میں سے گزر گیا۔ دوبارہ سائیکل پر بیٹھ کے ہوا ہونے سے قبل اس نے بہ آواز بلند ٹیکسی والے سے جو کچھ کہا، اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ آخر وہ اپنی ضعیف والدہ کو یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے جواب میں برابر کی بات چلّا کے کہی مگر بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اسی وقت مخالف سمت سے دوسری ٹیکسی آگئی اور اس نے ہارن دینے کے علاوہ گلے بازی بھی شروع کی۔ "اوئے، کون اے ایس گواچی گاں دا مالک" اس نے بنکار کے کہا۔ "اوئے ہٹا اینوں نئیں تے اسی آتوں لنگ جاواں گے۔"

"کیڑا اسے بھئی اُتوں لنگن والا؟" ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلا۔

"اینان تا ولا ایں تے فیر سے جا!"

ہم اپنا سامان اُتار چکے تھے اور ٹیکسی کا کرایہ بھی دے چکے تھے مگر مکان کے کرائے کے معاملات ابھی تصفیہ طلب تھے۔ ادھر دونوں ٹیکسی والوں میں براہِ راست تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں مقابلے پر ہارن بجا رہے تھے اور ایک دوسرے سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ پیچھے جائے۔ پیچھے جانے پر کوئی آمادہ نہ تھا اور دونوں جانب رُک جانے والے صرف اس بات میں دلچسپی لے رہے تھے کہ دیکھیں بالآخر کون اپنی منواتا ہے۔ ایک کہتا تھا کہ تُو ادھر سے کیوں آیا تو دوسرا پوچھتا تھا کہ تُو ادھر کیوں آمرا۔ ان کی جنگ ختم ہونے والی نہیں تھی کیونکہ فریقِ ثانی سیریس نہیں تھا اور اس قدر قلندرانہ وضع کے ٹیکسی ڈرائیور کو مشتعل کر کے مزہ لے رہا تھا تاکہ پبلک بھی کچھ فقرے بازی سے لطف اندوز ہو۔

"خدا کے لیے پہلے ہم سے بات کر لو" میں نے چلّا کے کہا۔ "کرایہ لے لو اس مکان کا۔"

"کرایہ کیسے لے لیں جی؟" وہ جھلّا کے بولا۔ "لو، ہے نا کمال دی گل۔ رہے ابھی ایک دن بھی نہیں۔ کرایہ لے لو۔ او میاں، جب رہو گے تو لے لیں گے کرایہ بھی۔ چل اوئے پچھاں کر اپنی بے بے نوں۔"

میں اندر آگیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ان کی آپس میں تکرار کی آواز کچھ دیر بعد آنی بند ہو گئی۔ معلوم نہیں ان میں سے کس نے اپنی ہار مان کر ٹیکسی پیچھے کی۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں ضدی تھے۔ اپنی ٹیکسی پیچ پر کچھ دوسرے کی ٹیکسی کے اوپر سے گزار کے لے گئے ہوں تو عجب نہیں۔ مکان واقعی آسیب زدہ تھا۔ نقشے کے اعتبار سے عام قسم کا غریبانہ مکان جس کے دو کمرے تھے، دونوں ساتھ ساتھ۔ ان کے سامنے مختصر سا کچن، باتھ اور لیٹرین۔ آنگن بمشکل اتنا بچتا تھا کہ دو چارپائیاں ڈالی جا سکیں۔ دونوں کمروں کی ایک ایک کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی اور ایک ایک برآمدے ... ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں فٹ تھیں ــــ خالی کر ... گرد سے اندازہ ہوتا تھا کہ آسیب زدہ مشہور ہونے کے ... گھر میں کوئی آباد ہونے آیا تھا تو یہ بہت پرانی بات تھی ... کرائے دار کے ذاتی تجربات مختلف تھے اور ان کا ذہن ... سے منسوب واقعات سے خود بخود متاثر ہو گیا تھا۔

"وہ ٹیکسی ڈرائیور تو ہمیں یہاں چھوڑ کے ایسے ... جیسے ہم بھی خدانخواستہ وہ ہیں ... جنات" محسن بولا۔

"اس میں شک کی کونسی بات ہے" رابعہ بولی ... سے تھوڑا آدم زاد لگتے ہیں آپ حضرات ...!"

"خواتین کو آپ نے ارواحِ خبیثہ کے قبیلے سے الگ ... فرمادیا" محسن بولا "چڑیلیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں!"

"یار، یہ لڑائی مت شروع کرو۔ ان کو گھر صاف کر..." میں نے کہا۔

"کیا فائدہ" رابعہ نے ٹہلتے ہوئے گھر کا معائنہ جاری ... "تم کون سے یہاں ٹک کر رہو گے۔"

"ارے بھئی ارادہ تو ہے" میں نے کہا۔ "کل کے ... تقدیر میں کیا لکھا ہے، یہ کون جانتا ہے؟"

"میں جانتی ہوں کہ کل ہم خود فرار نہ ہوئے تو یہاں ... بھی نکالے جائیں گے" رابعہ نے کہا۔ "بس جب تک یہاں ... ہے ایسے ہی رہو، کوئی سازوسامان نہیں، کوئی تکلف ..."

"تو کیا اسی طرح مٹی کے فرش پر سوئیں گے؟" ... نے کہا۔

"اے خاک کے پُتلے۔ ایک دن تجھ کو مٹی کے ذ... ہی سونا ہے" محسن نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

"میں جا کے دری وغیرہ لاتا ہوں۔ کم سے کم فر... جھاڑ لو" میں نے کہا۔ "کھانا بھی بازار سے لے آئیں گے ... فرض کرو، ہمیں یہاں رہنے کی مہلت ملی! ایک مہینے تک ہم ... سے لا کر یا بازار جا کر نہیں کھا سکتے۔"

"چائے تو بازار کی پی ہی نہیں سکتے۔" محسن نے میر... تائید کی۔

ایک بار پھر میں اور محسن بازار کی تلاش میں نکلے ... کافی سامان ہمیں وہیں سے مل گیا۔ ہم خواتین کی حفاظت کے ... میڈی کو چھوڑ آئے تھے چنانچہ کافی مطمئن تھے۔ رضائیاں ... کے لیے ہمیں صدر جانا پڑا۔

"آخر یہ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ کیوں نہیں لے کر گیا؟" میں نے کہا۔

"وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ صبح تک کیا ہوتا ہے" محسن بولا۔ "جنات ہمیں رہنے بھی ... دیتے ہیں یا نہیں۔ ابھی وہ ہم سے مہینہ بھر کا کرایہ لے لیتا اور صبح ہم تھر تھر کانپتے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے کہ بھائی ہمیں معاف کرو اور کرایہ واپس کرو۔ اگر ہم نہ رکے تو وہ کرایہ بھی لے جائے گا۔"

"اس نے ہمیں اپنا پتا تک نہیں بتایا۔"

"بتائے گا، نہیں بتائے گا تو ہم معلوم کر لیں گے" میں نے کہا۔ "ٹیکسی کا نمبر مجھے یاد ہے۔"

"کیا اس کا اپنا گھر اس سے بھی بڑا اور اچھا ہو گا کہ وہ خود یہاں نہیں رہتا؟" محسن بولا۔

"ممکن ہے اسے بھی جنات نے یہاں نہ رہنے دیا ہو" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم سے کرایہ تو ملے گا ورنہ لوگ آسیب زدہ مکان سے دُور بھاگتے ہیں۔ نہ کرائے دار ملتا ہے نہ خریدار۔"

"مجھے تو وہ آدمی خبطی لگتا ہے۔ آخر اس نے خود ہی کیوں بتایا کہ یہاں جن بھوت ہیں" محسن بولا۔

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صاف گو آدمی تھا اور دھوکے باز نہیں تھا" میں نے کہا۔ "اس نے پہلے سے اپنی پوزیشن محفوظ کر لی، اس ڈر سے کہ ہمیں بعد میں معلوم ہو تو ہم اسے قصوروار سمجھیں گے۔ ہمیں اس نے ایک کام کی بات بتا دی ہے۔ گامے شاہ کے بارے میں ــ ہمیں گامے شاہ کی خدمت میں حاضر ہونا ہی تھا۔"

"ہمارے چہرے تو پھر اصلی ہو چکے ہیں" محسن بولا۔ "ہم وہاں جائیں گے تو گامے شاہ فوراً پہچان لے گا۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا" میں نے کہا۔ "نقلی چہرے بہت سے لوگوں کی نظر میں آ چکے تھے۔ اب کچھ اور کریں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم کسی دوسرے گاؤں سے آنے والے عقیدت مند بن کر جائیں۔ ہمارا حلیہ بالکل دیہاتیوں والا ہو۔"

"گامے شاہ کی نظر پھر بھی ہمیں شناخت کر لے گی۔"

"بات یہ ہے عزیزم!" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس مہم میں خواتین آگے رہیں اور اس کے لیے میرے ذہن میں جو اسکیم ہے وہ یہ ہے کہ کل رابعہ اور نازو پرانے دیہاتی وضع کے کپڑے اور میلے بُرقعے اوڑھ کر گامے شاہ کی درگاہ تک جائیں۔"

"ان کے لیے کپڑے اور بُرقعے کہاں سے ملیں گے۔ نئے تو مل جاتے ہیں مگر پرانے کون دے گا؟"

"وہ بھی مل جائیں گے۔ شہر کی کسی بھکارن سے خرید لیں گے" میں نے کہا۔ "سو دو سو میں وہ اپنی خلعتِ فاخرہ کیوں نہیں دے گی جب کہ اسی قیمت میں نئے کپڑے مل جاتے ہیں۔ سو خلعتِ فاخرہ ان کی آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ڈیوٹی کے بعد وہ امپورٹڈ کپڑے کے سوٹ پہنتی ہوں گی" محسن بولا۔

"ارے یار، فقیرنی سے نہ سہی کسی غریب عورت سے لے لیں گے" میں نے کہا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہے ہمارے گامے شاہ تک پہنچنے کا اور اسے قابو کرنے کا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ اگر نازو اور رابعہ برقعے اوڑھ کے عام عقیدت مندوں کے ساتھ اندر داخل ہو جائیں اور پھر کسی طرح وہاں ٹھہرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب تک کہ وہاں کوئی نہ رہے..."

"گامے شاہ کی درگاہ میں حاضری تو سب دے سکتے ہیں مگر وہاں ہر وقت مجمع رہتا ہے" محسن بولا۔ "اس کے چیلے چانٹے ہر ایک پر نظر رکھتے ہوں گے، جیسے وہ فراڈ گامے شاہ ایک بار اپنی نظرِ کرم سے نواز دے اسے فوراً رخصت بھی ہونا پڑتا ہو گا۔ عرضِ مدعا اور گامے شاہ کی دُعا کے بعد وہاں رُکنے کا کیا سوال۔ نازو اور رابعہ کو اتنی دیر کون ٹھہرنے دے گا کہ تخلیہ ہو جائے۔"

"وہ کوشش کریں تو ٹھہر سکتی ہیں" میں نے کہا۔ "مثلاً وہ کہیں کہ ہمیں بشارت ہوئی ہے اور ہم یہاں چوبیس گھنٹے کا چلّہ کاٹنے کی آرزو مند ہیں، یا ہمیں حکم ہے کہ گامے شاہ کی درگاہ میں اپنا وظیفہ مکمل کرو۔ کوئی بھی کہانی سُنا دیں کہ وہ کونسی مُراد پانے کے لیے حاضر ہوئی ہیں۔ زیادہ تر عورتیں ان جعلی پیروں فقیروں سے کیا مانگتی ہیں؟ اولاد یا شوہر کی توجہ۔ سوکن کی موت یا ساس کے مظالم سے چھٹکارا۔ بیماری سے نجات خواہ وہ اپنی ہو یا اولاد کی۔ نازو اور رابعہ بھی گریہ وزاری کریں، روئیں اور مچلیں اور گامے شاہ کی درگاہ میں صبح سے شام تک نوافل پڑھنے کی اجازت حاصل کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ پبلک کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکیں گے۔ انھیں کوئی خطرے کی بات بھی محسوس نہیں ہو گی۔ اگر دو عورتیں ایک گوشے میں وظیفہ پڑھتی ہیں یا نوافل تو پڑھتی رہیں۔ اس طرح رابعہ اور نازو کو موقع مل سکتا ہے۔ رابعہ کے پاس بھی ریوالور ہو گا اور نازو کے پاس بھی لیکن خدانخواستہ ان سے اسلحہ چھن جاتا ہے اور وہ بدمعاش جو گامے شاہ کے ساتھ ہیں، انھیں قابو کر لیتے ہیں پھر نازو وہی کر سکتی ہے جو اس نے سراج کے ساتھ کیا تھا۔ وہ سب کے ہاتھ پیر توڑ سکتی ہے اور ہمارے لیے راستہ صاف کر سکتی ہے۔"

"فرض کرو نازو کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر ہم کیا کریں گے؟" محسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ میں نے ابھی نہیں سوچا" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہم باہر منتظر ہوں اور وہ گامے شاہ کو اس کے مریدوں سمیت ــ بے بس کر کے لے آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دوسری طرف سے داخل ہوں۔ گامے شاہ کی درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے لیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک زیرِ زمین راستہ بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک گیراج میں نکلتا ہے۔ ہم ایک مرتبہ ادھر سے باہر نکلے تھے۔ اگر ہم کسی اندر جانے والے ٹرک پر قابض ہو جائیں تو اندر پہنچنا مشکل نہیں۔ اندر ہماری فوج کا دُوسرا بازو۔۔۔"

" ایم آر ایس کی زنانہ فورس۔" محسن نے کہا۔

" ہاں، زنانہ فورس اندر سے آملے تو دشمن کا مورچا سر۔" میں نے کہا۔

" تیری تجویز خطرناک مگر قابلِ عمل ہے۔" محسن بولا۔

" سراج سب کو خبردار کر چکا ہوگا۔ ان حالات میں دیر کرنے میں نقصان کا اندیشہ ہے۔" میں نے کہا۔

" وہ پاگل کا بچّہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم گدھے ہیں اور ہمیں ان کے اصل کاروبار کا علم ہی نہیں۔" محسن بولا۔

" ہمیں غالب سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

" اس نے کہا تھا کہ مجھے آفس میں فون کر لینا۔"

غالب ہمیں آفس میں سوتا ہوا ملا۔ ٹیلیفون پر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ اب بھی سو رہا ہے۔ "ہاں بھائی، ہاں۔ ہم سو رہے تھے۔ اور کیا کریں۔ مقدر میں سونا ہے یار رونا۔" وہ بولا۔

" رات کو خیریت رہی نا؟" میں نے کہا۔ "شیخ صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟"

" ہوئی تھی۔ ہم نے کہا کہ میاں جاؤ۔ کیوں ہم قلندروں کے منہ لگتے ہو۔ ہم نہ کہیں گئے نہ کہیں سے آئے۔" غالب نے جماہی لے کر کہا۔ "جھک مار کے تشریف لے گئے، البتہ ایک خبر ہے تمھارے لیے۔ تمھارے وہ چوہدری صاحب ہیں نا، وہ بھروہیں آباد ہیں اسی پرانی کوٹھی میں اور مُصر ہیں کہ وہ نہ کہیں گئے تھے اور نہ کہیں سے آئے ہیں۔ کوٹھی کبھی خالی نہیں رہی۔"

" وہ ڈرامے کرنے والا آدمی ہے۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ جب ہم واپس پہنچے تو رابعہ اور نازد جھاڑو دے چکی تھیں۔ ایک صحن میں لگا ہوا ہینڈ پمپ چلا رہی تھی اور دوسری اپنا منہ دھو رہی تھی۔ جھاڑو انھوں نے پڑوس میں سے مانگی تھی۔ خواجہ نیک محمد عرف استاد ٹیڈی بغور اپنے پُراسرار صندوق کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونکا لیکن میں نے اسے کھینچ کر الگ کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آج تو صندوق کھول کر دیکھوں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

ٹیڈی نے ہمارے تیور دیکھے اور ہمارے عزائم کا اندازہ کر لیا۔ میرے دھکے سے وہ کچھ دور جا گرا تھا لیکن اس نے اٹھنے کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا اور مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔

" آج سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ تمھارے اس [illegible] تک کون سا قارون کا خزانہ ہے۔" میں نے کہا۔

" یہ صندوق ایک معمّا بنا ہوا ہے۔" محسن نے [illegible] کی۔ "یہ ہماری عقل کے لیے ایک چیلنج بن چکا ہے۔"

" اور عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی ہم نے تم سے [illegible] تم ٹال گئے۔" میں نے کہا۔ "اور جب خود ہم نے اپنے [illegible] اس راز سے آگاہی کا فیصلہ کیا تو کوئی نہ کوئی بات ایسی [illegible] پکھ نہ کر سکے۔"

" آخر تم اس کو معمّا کیوں سمجھتے ہو؟" ٹیڈی نے کہا۔ "[illegible] کو جاننے کی فکر میں دُبلے کیوں ہو رہے ہو۔"

" ہم سے زیادہ تم اس کی حفاظت کے غم میں [illegible] رہے ہو۔ ہر جگہ یہ بوجھ اٹھائے پھرتے ہو اور اس [illegible] میں مبتلا رہتے ہو جیسے تمھاری جان اس ڈبے میں [illegible]" محسن بولا۔

" جیسے پرانے قصّوں کہانیوں میں ہوتا ہے کہ فلاں [illegible] میں ایک جزیرہ ہے، اس جزیرے کے فلاں دشوار گزار [illegible] ایک غار ہے۔ غار میں ایک پنجرہ ہے اور پنجرے [illegible] اس طوطے میں کسی ظالم کانے دیو کی جان ہوتی تھی۔" میں [illegible]

" خواہ مخواہ خواجہ نیک محمد کو مشتعل کیوں کر رہے ہو۔" [illegible] کہا۔ "نہ یہ کانا ہے، نہ ظالم اور نہ دیو۔"

" اس ڈبے میں بھی کون سا طوطا ہے۔" میں نے [illegible] "جو کچھ ہے، وہ ہم دیکھ لیتے ہیں۔"

" قسم مولا علی کی، ایسے تمھیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم کوشش [illegible] دیکھ لو۔" ٹیڈی نے سنجیدہ رہتے ہوئے کہا۔

" پھر کیسے معلوم ہوگا؟" محسن بولا۔ "تم سمجھتے ہو ہم اس [illegible] کو کھول نہیں سکیں گے؟"

" ہاں۔ ایسے خالی ہاتھوں سے تو بالکل ہی ناممکن [illegible] چھینی ہتھوڑی سے بھی مشکل ہے۔" ٹیڈی بولا۔ "کسی ویلڈ[illegible] پاس لے جاؤ گے تو وہ اپنی ویلڈنگ ٹارچ سے کاٹ [illegible] ہے مگر اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو۔ بات یہ ہے [illegible] بادشاہ کہ ہمیں تم سے کچھ چھپانا ہوتا یا تمھیں بتانا منظور [illegible] تو ہم اسے یوں ساتھ لیے پھرتے؟ اس صندوق کو کہیں [illegible] چھپایا جا سکتا تھا۔ اپنے ایسے بہت سے ٹھکانے تھے [illegible] صندوق رکھ دیا جاتا تو کسی کو شک بھی نہ ہوتا۔ میں اس [illegible] نئے سوٹ کیس میں ڈال کر اوپر اپنے کپڑے رکھتا اور سوٹ [illegible] کو تالا لگا کے کسی بھروسے کے آدمی کے حوالے کر دیتا کہ [illegible] تو لے لوں گا۔ اوّل تو کوئی کھول کر ہی نہ دیکھتا اور دیکھ[illegible]

میں اس صندوق کو کسی جگہ گاڑ دیتا تب بھی اس کا کیا ملتا اسے۔ کچھ نہ بگڑتا۔ تم خود سوچو کہ جب میں نے اس کو بند رکھنے کے لیے ایسا انتظام کیا تھا کہ گھر میں چور بھی آجاتا تو جھک مار کے لوٹ جاتا، اس پر اپنے بیہودہ صندوق پر وقت ضائع نہ کرتا۔ پھر یہ کون سا مشکل کام تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ اٹھائے پھرنے کی مصیبت مول لینے کے بجائے تمھارے ساتھ خالی ہاتھ پھرتا اور اس صندوق کی طرف سے بے فکر رہتا کہ صندوق محفوظ ہے مگر قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ، ہم تو جس کے دل سے ہوگئے اس کے لیے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ یاروں سے راز کو چھپایا تو وہ یاری کیسی۔ ایک نہ ایک دن تو تمھیں بتانا ہی تھا کہ آخر اس بوجھ کو گدھے کی طرح لاد کر پھرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم سب کا شک میں مبتلا ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے سب کچھ سنا اور خاموش رہا۔"

" کیوں خاموش رہے۔ اتنا سسپنس پیدا کرنے میں بھی کوئی مصلحت تھی؟" میں نے کہا۔

" نہیں۔ بس ایسے ہی تماشا دیکھ رہا تھا تم سب کے تجسّس کا۔" ٹیڈی بولا۔ "پہلے تم سب حیران ہوئے تھے۔ پھر ناراض ہونے لگے تھے کہ یہ کباڑ خانہ ساتھ لیے پھرنے کی کیا تُک ہے۔ اس کے بعد تمھارے شکوک میں اضافہ ہوتا گیا۔ تم لوگوں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ کبھی اسے قارون کا خزانہ کہا، کبھی پنڈورا کا باکس اور کبھی پُراسرار صندوق۔ مجھے پتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تم اس کو کھول کر ہی دم لو گے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اسے لے جاؤ اور کھلوا کے دیکھ لو کہ اس میں کیا ہے۔"

" گویا تم خود نہیں بتاؤ گے؟"

" یہ بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "اس صندوق میں کم سے کم نصف وزن کا سونا ہے۔ باقی آدھا وزن تم اس فولادی سیف کا شمار کر لو جو ہر طرف سے بند ہے۔ اس کی مالیت کا اندازہ میں نہیں لگا سکتا۔ تم یہ حساب کتاب کر سکتے ہو کیونکہ تم پڑھے لکھے ہو لیکن یہ سچ ہے سکندر بادشاہ کہ اس میں قارون کا خزانہ ہے۔"

جب ٹیڈی نے اپنی بات شروع کی تھی تو رابعہ اور نازد بھی آکھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ہماری طرف اور ہم نے ان کی طرف ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھا لیکن ٹیڈی کی متانت میں فرق نہیں آیا تھا اور اس کی بات کو مذاق سمجھ کے نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ قارون کا خزانہ تو ایک محاورہ تھا لیکن ٹیڈی کی بات کو حقیقت مان لیا جاتا تو اتنے سونے کی قیمت ہمارے لیے قارون کے خزانے سے کم نہ تھی۔

" تمھارے خیال میں یہ کتنا سونا ہوگا؟" ٹیڈی نے ہم سب کی حیرت زدہ خاموش صورتوں کو دیکھ کر کہا۔

" تمھارے اس صندوق کا وزن بیس سیر سے زیادہ ہی ہوگا، اگر ایک من نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو تیس سیر فرض کر لیتے ہیں۔"

" اور تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پندرہ سیر سونا ہے؟" محسن نے کہا۔ "خواجہ صاحب! ایک تولہ سونا بھی آج کل دو سو روپے میں ملتا ہے اور ایک سیر میں ہوتے ہیں اسی تولے۔"

" پھر تو آپ مجھے بھی حساب لگا کے بتا دو کہ یہ سب سونا کتنے کا ہوا؟" ٹیڈی اسی سادگی سے بولا۔

" حساب تو ہم لگالیں گے لیکن ٹیڈی، اتنا سونا تمھارے پاس آیا کہاں سے؟" میں نے کہا اور سب دم بخود اس کی صورت کو دیکھتے رہے۔

" یہ بھی بتا دوں گا، پہلے حساب تو لگاؤ۔" ٹیڈی نے کہا۔ "پتا لو چلے کہ ہم کتنے دولت مند ہیں۔ تم ہمیشہ فکرمند رہتے تھے کہ مالی ضروریات کیسے پوری ہوں گی اور میں نے ایک دن کہا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں اور وقت آئے گا تو ہم بتا دیں گے کہ دوستوں کی خاطر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

اس سے پہلے بھی تم نے کم تو نہیں کیا استاد۔" میں نے اس وسیع القلب، مخلص اور طبعاً نیک شخص کو دیکھا جسے قدرناشناس زمانہ ٹیڈی بدمعاش کہتا تھا لیکن جس کی ذات میں آدمیت کے تمام اوصافِ حمیدہ ان سب سے زیادہ تھے جو خود ساختہ یا زرخرید معیاروں کی کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھتے تھے تو انسانِ کامل ہونے کا دعوے کرنے لگتے تھے۔ ہم نے رفاقت کے اس دور میں جس کو حالات کی کسوٹی سمجھا جا سکتا ہے، ٹیڈی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کی فطرت کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو ہماری فطرت کا حصّہ ہیں۔ بے شک وہ اپنی تعلیم، اپنے ماضی کے رشتوں، اپنے ماحول اور اپنے ظاہری اعمال کے اعتبار سے مختلف نظر آتا تھا مگر اس کی باطنی صفات کا حسن ہماری نگاہ میں تھا۔ اس نے آزمائش کے ایسے دور میں دوستی کا حق ادا کیا تھا جب دنیا کی نظر بھی ہماری دشمن تھی۔ ہماری اور ٹیڈی کی دوستی کی عمر بہت کم تھی لیکن ہم نے شناسائی سے دوستی تک کے تمام مرحلے بہت کم وقت میں طے کر لیے تھے۔ کیونکہ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا اور جان لیا تھا۔

" پہلے ہم نے کون سا تیر مارا ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "کچھ بھی تو نہیں۔ جتنا کرنا چاہیے تھا، اتنا بہرحال نہیں کیا مگر تم نے بھی تو ٹیڈی بدمعاش کو خواجہ نیک محمد بنایا۔ اسے اپنا سمجھا اور [illegible]

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ عزت دی جو پہلے کسی نے نہیں دی تھی۔ دولت کا کیا ہے، ناجائز ذرائع سے سب ہی حاصل کر لیتے ہیں مگر پیار کے رشتے، اعتماد، محبت اور خلوص، اپنائیت کا یقین اور اعتبار، یہ ناجائز ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے، بازار میں نہیں ملتے اور اسمگل کر کے نہیں لائے جا سکتے۔ آج میں ایک دوسری دنیا کا آدمی ہوں۔ ہم سب ایک خاندان ہیں تو میں اس کا ایک رکن ہونے پر فخر کرتا ہوں تم لوگ مجھ سے مذاق کرتے ہو تو مجھے وہ خوشی ملتی ہے جو پہلے کسی بدمعاش کو نیچا دکھا کے حاصل نہیں ہوتی تھی۔ میں تاریک راستوں کا مسافر تھا۔ تم نے مجھے اپنایا اور میرا ہاتھ تھام کے اپنے ساتھ رکھا اب میں روشنی کو دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے ایک اندھے کو منزل کی راہ دکھائی۔ کیا تمہارا یہ احسان کم ہے۔ کیا اس اطمینانِ قلب اور تسکینِ روح کا بدلہ میں سارے زمانے کی دولت دے کر بھی ادا کر سکتا ہوں جو مجھے آج میسر ہے؟ میں شہلا کا بھائی ہوں۔"

"میرے بھائی نہیں ہو؟" رابعہ نے اسے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھ کر کہا۔

ٹیڈی ہنس پڑا۔ "ایک بہن کا بوجھ بھی کم نہیں ہوتا۔ تم بھی ڈال دو اس رشتے کا بوجھ مجھ پر۔ میرے دونوں کندھے خالی تھے کیونکہ میں کسی کا بھی نہیں تھا۔ اب دو بہنوں کا بھائی ہوں۔"

"لے بھائی محسن ایک نہ شد دو شد۔ ہم دونوں اب کیا کریں۔" میں نے کہا۔ "ساری خدائی ایک طرف..."

"اور ہم دونوں ایک طرف۔" محسن نے مظلوم لہجے میں رقت کے ساتھ یوں کہا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

"اب دیکھو لڑکیو! تم یہاں بے کار وقت ضائع مت کرو۔" میں نے رابعہ اور نازو کو ڈانٹا۔ "یہ کوئی شریفانہ لچھن نہیں ہیں کہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کے جوان لڑکیاں گپیں کریں۔ جاؤ اپنا ہانڈی چولہا کرو۔ چائے بناؤ۔"

"چولہے میں گیا ہانڈی چولہا۔" رابعہ نے کہا۔ "اپنا اپنا کام کرو سب، ہم نوکر نہیں ہیں کسی کے۔"

"ہاں۔ تم نوکر نہیں کنیز ہو۔" محسن نے کہا۔ "تو اے کنیزانِ خوبرو..."

"اپنے بھائی کے لیے ہی کچھ کر لو قسم مولا علی کی، نہ جانے خالی پیٹ میں دم کیسے اٹکا ہوا ہے۔" ٹیڈی بولا۔

"اچھا بھئی، مجبوری ہے تو تمہارے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔" رابعہ بولی۔

"خواجہ صاحب، اپنی ہمشیرہ سے ہماری بھی سفارش فرمائیے۔ دیکھیے نا، رابعہ کے رشتے سے سکندر تو ہوا آپ کا جیجا جی اور میں بھی شہلا کے رشتے سے ہوا آپ کا بہنوئی۔" محسن بولا۔

"بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔" رابعہ نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ "ایک سیر ہے تو دوسرا سوا سیر۔"

"ایک شیر ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو دوسرا سوا شیر بلکہ ڈیڑھ شیر۔"

"حساب کچھ یوں بنا نیک محمد کہ ایک سیر سونا تقریباً سولہ ہزار کا ہوا۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری بات کو سچ مانتے ہوئے ہم فرض کر لیں کہ صندوق میں تقریباً پندرہ سیر سونا ہے تو کل مالیت تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب ہو گی۔"

"ڈھائی لاکھ...؟" محسن نے یوں آنکھیں چڑھائیں جیسے ابھی پٹ سے بیہوش ہو کے گر پڑے گا۔ "لاکھ وہی ہیں نا جس میں سو ہزار ہوتے ہیں؟"

"تو نے اس سردار جی کی بات کی جو کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ایک پلیئر نے سنچری بنائی تو بہت شور مچا۔ سردار جی نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے ہنگامے کا سبب پوچھا۔ اس نے بھی کہا کہ سنچری اور نعرہ لگا کے ٹوپی اچھالنے لگا۔ سردار جی نے اسکور بورڈ کی طرف دیکھا اور پوچھا رن کتنے ہوئے؟ ٹوپی اچھالنے والے نے کہا پورے سو سردار جی۔ سردار جی نے افسوس سے سر ہلایا اور کہا۔ اچھا۔ سو کی رکھی تھی سنچری۔" اور خود بھی تالیاں بجانے لگے۔

"اپنی خاندانی تاریخ بعد میں سنانا۔" محسن بولا۔ "ہم یہ سن کر انگشت بدنداں ہیں کہ چشم بددور اپنے پیارے دوست خواجہ نیک محمد لکھ پتی ہیں۔"

"ظاہر ہے، یہ جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے کہ ایک روپے سیر بکنے والے ٹین کے صندوق میں دو سو روپے کا سونا بھرا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے..."

"ایک سوال نہیں، بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ سونا کیسا ہے؟"

"سونا خالص ہے۔" استاد ٹیڈی نے سادگی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ مال حرام ہے یا مالِ غنیمت ہو کہ بعض صورتوں میں مالِ غنیمت کو حرام نہیں سمجھا جا سکتا اور لشکر میں اس کی تقسیم اسلامی تاریخ کے حوالے سے ثابت ہے۔ سونا ٹیڈی کے پاس کہاں سے آیا اور کب سے ہے۔ اس نے سونے کی حفاظت کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ اسے ذاتی استعمال میں لانے سے کیوں پرہیز کیا؟ کیا یہ کسی کی امانت ہے؟ اگر امانت ہے تو اب ہمارے لیے اس میں خیانت... باقی سوالات میں حسبِ ضرورت ایجاد کروں گا۔"

"میں تمہیں اوّل سے آخر تک سب بتا دوں گا۔"

بولا۔ "حرام حلال اور جائز، ناجائز کا فیصلہ تم خود کر لینا۔"

رابعہ نے چائے کی ایک کیتلی ہمارے سامنے رکھی۔ سلور کی اس کیتلی میں صرف قہوہ تھا۔ چینی اور پاؤڈر کا دودھ نازو نے دو مگ بھر کے الگ رکھے۔ پھر چائے بھی مگ میں ڈال کے دی گئی اور میں نے دودھ ملائے بغیر استعمال کی۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ تمام بندوبست استاد ٹیڈی نے کیا تھا۔ وہ کسی مقامی بیکری سے ایک کیک بھی لایا تھا اور خاصی مقدار میں انڈے، مکھن اور ڈبل روٹی بھی۔ سگریٹ کے کارٹن ہم لائے تھے۔ اس وقت زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہوئے اور چائے پیتے ہوئے میں نے سکون اور اطمینان کے احساس کی آسودگی کو محسوس کیا۔ یہ احساس وقتی اور عارضی تھا مگر پھر بھی اس دورِ مصائب و آلام میں بہت غنیمت تھا۔ بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ مجھے مرحوم انشا اللہ خان انشا کی یہ بات بہت حسبِ حال لگی۔ کل ہم کہاں تھے، کل کہاں ہوں گے، اس کی آج کیوں فکر کریں اور اس کا ذکر بھی کیوں کریں۔ شاید میری طرح دوسروں کو بھی احساس تھا کہ اس وقت ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور محفوظ ہیں۔ باہر کی دنیا کی دسترس سے دور ہیں اور جس حال میں بھی ہیں ایک دوسرے کی رفاقت، اس گوشۂ عافیت اور قناعت سے ملنے والے احساسِ طمانیت کی ساری خوشی ہماری ہے۔ بے شک اس وقت کوئی کسی سے بھی پوچھتا کہ اس لمحے ان کے دل کی وہ کون سی تمنا ہے جس کی تکمیل کی خاطر وہ ایسی ہزاروں خواہشوں کو قربان کر سکتے ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ تو سب کا جواب یہی ہوتا کہ کاش وقت یہیں رک جائے۔ اس احساسِ تحفظ و طمانیت کو دوام عطا ہو اور پھر خواہ ساری عمر اسی گھر میں اسی حال میں گزر جائے۔

میں نے اور محسن نے سگریٹ جلائی تو مجھے سراج کی ماں یاد آئی۔ یہ اسی کے دیے ہوئے سگریٹ تھے۔ اپنے دشمن کے گھر کی مہمانی کا تجربہ بھی اس اعتبار سے منفرد تھا کہ ہم وہاں شامتِ اعمال کے باعث جا پھنسے تھے اور پھر تقدیر کی یاوری سے بخیر و عافیت نکل آئے تھے۔ "کیا جو کچھ سراج کے ساتھ ہوا، اس کی خبر بنے گی؟" محسن بولا۔

"اب چھوڑ دے یہ فکر کہ اخبار میں ہمارے متعلق کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "ایک وقت آئے گا کہ ہمارے بارے میں خبروں کی سنسنی خیزی بھی نہیں رہے گی، کچھ اور زیادہ اہم سرخیاں توجہ کا مرکز بن جائیں گی۔"

"نازو خاموش ہے۔" محسن نے نازو کی اتری ہوئی صورت کو دیکھا۔ محسوس تو میں نے بھی یہی کیا تھا مگر اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ضرور تھی لیکن ذہنی طور پر وہ عدم اطمینان اور اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ یہ ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ ہم سب اپنے جذباتی رشتوں کی قید سے آزاد تھے۔ ہم میں سے صرف محسن کی ایک بہن تھی جو اپنے گھر میں شاد و آباد تھی اور جسے بھائی کی خبر ہی نہیں تھی۔ محسن کبھی کبھار اسے چند سطروں پر مشتمل خط ڈال کے اپنی خیریت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اگر اپنے والد یا اخبارات کی معرفت اسے ہماری غیر قانونی، باغیانہ اور خطرناک مصروفیات کی اطلاع ملتی تھی تو وہ رونے دھونے، ہمارے لیے دعائے خیر مانگنے اور صبر کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی اور خود محسن اس کے لیے خیریت کی جھوٹی اطلاع دینے پر قانع نہ رہتا تو کیا کرتا۔ محسن کے والد عملاً دنیا سے منہ موڑ چکے تھے اور آخری اطلاع کے مطابق وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ تھے۔ جو انہیں بڑے اصرار کے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ بھی محسن کے لیے عملاً کچھ کرنے سے قاصر تھے اور محسن کا ہونا نہ ہونا ان کے لیے برابر تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کا زندہ رہنا یا نہ رہنا محسن کے لیے ایک جیسے دکھ کا سبب تھا۔ میں، رابعہ اور ٹیڈی خون کے ان رشتوں کی کسی زنجیر کے غلام نہ تھے مگر نازو نے ابھی ابھی سب رشتوں سے قطعِ تعلق کیا تھا۔

اس نے اپنے بھائی کو سب کے سامنے ذلیل کیا تھا اور وہ ماں باپ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کی طبیعت بلا کی جذباتی تھی اور یہ زندگی کے سب سے بڑے جذباتی فیصلے کا ردِ عمل تھا کہ وہ چپ تھی۔ اس پر مثبت اور منفی حقائق کا دباؤ تھا۔ عقل کے تقاضے مصلحت کو مدِ نظر رکھنے کے حق میں تھے تو دل کا فیصلہ جذبات کی صدا پر لبیک کہنے کے حق میں تھا۔ اگرچہ وہ دل کی بات مان چکی تھی مگر عقل اسے پریشان کر رہی تھی اور شاید اسے بار بار ان نتائج سے خبردار کر رہی تھی جو اس کی اپنے گھر سے وابستگی کی صورت میں برآمد ہوں گے۔ گھر کے رشتے جن کی جڑیں بچپن میں ہوش سنبھالنے کے زمانے سے بھی پہلے کے وقت تک پہنچتی ہیں، آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور اگر ٹوٹتے ہیں تو آدمی کی شخصیت میں بہت شکست و ریخت کرتے ہیں۔ اسے ہماری طرح ہم جیسا بننے کے لیے ابھی کہیں زیادہ سخت سے سخت آزمائشوں کے جان لیوا مرحلے طے کرنے ہوں گے۔ میں نے بڑے ملال سے سوچا، کیا اس وقت تک وہ اپنے عہدِ وفا کو استوار رکھ سکے گی؟ ہم نے تو اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اس راہِ پُرخار میں ہمارے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ساتھ چلنے پر اصرار نہ کرے جہاں ایسے سخت مقام بھی آجاتے ہیں کہ پیروں کے ہر آبلے سے رسنے والے لہو کے ساتھ انگاروں پر بھی چلنا پڑتا ہے مگر اس نے اپنے دل کی بات مانی تو اس میں کسی کا کیا قصور۔

"تم نے میرے کسی سوال کا بھی جواب نہیں دیا ہے استاد۔" محسن نے کہا اور میں خیالات سے حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے باقی سب لوگ بھی خاموش تھے مگر وہ منتظر تھے کہ استاد ٹیڈی ڈھائی لاکھ روپے سے زائد مالیت کے اس سونے کے بارے میں بات کرے جو آج تک ایک زنگ خوردہ اور پرانے صندوق میں بند اس کے گھر میں بے مصرف پڑا ہوا تھا لیکن میں نازو کو دیکھ رہا تھا۔ میری یہ حرکت غیر ارادی تھی۔ میرا ذہن اس کے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ میری نظر بھی اسی پر تھی اور وہ نظریں جھکا لینے کے بجائے میرے انہماک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تقسیم ہند کے وقت میں اپنے والدین کے ساتھ کشمیری بازار کے عقب میں رہتا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں اس کہانی کو بہت پیچھے سے اس لیے شروع کر رہا ہوں کہ تم سب لوگ میری زندگی کے حالات کو سمجھنے کے بعد جو فیصلہ کرو، وہ غلط نہ ہو۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اچھا یا برا، استاد ٹیڈی ہوں یا خواجہ نیک محمد، انھی حالات کی وجہ سے ہوں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ہر شخص اپنے حالات کے باعث ہی استاد ٹیڈی یا نیک محمد بنتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی اور اس کے والدین کی خواہش کیا ہوتی ہے؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایسے تو سارے ماں باپ ہی کہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو انجینئر اور بیٹی کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ خود بچوں کے دماغ میں بھی کامیاب مستقبل ایک ایسا خواب ہو جاتا ہے جس کی تعبیر کو وہ اپنے اختیار کی بات سمجھتے ہیں۔ مگر بعد میں ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ کرتی ہے تقدیر کرتی ہے۔ کشمیری بازار والے گھر میں میری عمر تیرہ سال تھی چنانچہ مجھے اس وقت کی ہر بات یاد ہے۔ مڈل کے امتحان میں مجھے وظیفہ ملا تھا۔ اس زمانے میں آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات کو مڈل کا امتحان کہا جاتا تھا۔ میری ذہانت اور شرافت پر والدین ناز کرتے تھے جن کی میں واحد اولاد تھا۔ میری پیدائش کے وقت کوئی ایسی بات ہو گئی تھی کہ میری ماں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی اور ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا جب ڈاکٹروں نے یہ انتخاب میرے باپ پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جسے چاہے بچانے کی اجازت دے دے۔ ماں اور بچے میں سے ایک کی زندگی بچائی جا سکتی تھی اور میرے باپ نے صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اس نے میری زندگی قربان کر کے اپنی بیوی کی زندگی بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بے شک اس نے مجھ سے بہت توقعات وابستہ کر رکھی ہوں گی مگر میرا وجود صرف ایک امید تھا جبکہ بیوی اس کی شریک حیات تھی اور ایک زندہ حقیقت تھی۔ مجھ سے اس کی جذباتی وابستگی اتنی نہیں ہو سکتی تھی جتنی بیوی سے تھی۔ خیر بعد میں خدا نے کرم کیا کہ دونوں کو بچا لیا گیا لیکن ڈاکٹروں نے صاف بتا دیا کہ میرے بعد وہ کسی بچے کی ماں نہیں بن سکتی۔ ان حالات میں ماں باپ مجھ کو کتنا عزیز رکھتے ہوں گے، اس کا اندازہ تم لوگ کر سکتے ہو۔ میرا باپ ایک ہنر مند کاریگر تھا۔ وہ سونے کے ڈلے کو زیورات میں ڈھالتا تھا تو ان کا حسن اور نقش و نگار کی خوبصورتی لوگوں کو حیران کر دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اتنی صفائی تھی کہ ماہر سنار اس کے بنے ہوئے زیور کو ایک نظر دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ ایسے باکمال کاریگر کو کام کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ اسے معاوضہ بھی اچھا ملتا تھا۔ اگر کوئی بات اس کو ناگوار گزرتی تھی تو وہ فوراً کام چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا جہاں اس کی آؤ بھگت بھی زیادہ ہوتی اور معاوضہ بھی بہتر مل جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی آمدنی سے اتنا بچا لیا کہ خود اپنی دکان چلا سکے۔ بعد میں پرانے مالکوں نے اسے بدنام کیا کہ وہ ڈنڈی مارتا رہا۔ جو زیورات بناتا اس میں کھوٹ ملاتا رہا اور ماشہ ماشہ بچاتا رہا کیونکہ وہ کام لاتا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا باپ کوئی بہت ایماندار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ اس پیشے میں سو فیصد ایمانداری سے کام کون کرتا ہے۔ زیادہ تر سنار ہندو ہی تھے۔ ان کی گڈ وِل ہر کاروبار میں بہت اچھی تھی۔ یہ پیشے ہمارے ہاتھ میں آئے تو بدنام ہو گئے۔ میرے باپ کو بھی نئے مالکوں کے ساتھ دو سال بڑی مشکل سے کاٹنے پڑے۔ میں میرے باپ نے اندرونِ بھاٹی گیٹ دکان کھولی اور اسی علاقے میں رہائش اختیار کی۔ اس کے کام کی شہرت پہلے ہی تھی۔ وہ چھوٹی سی دکان رفتہ رفتہ گاہکوں کی توجہ کا مرکز بننے لگی۔ کام بڑھنے لگا۔ میرے باپ کو اس پیشے کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں معلوم تھا۔ اس نے پہلے ایک کاریگر کو رکھا۔ بہت اچھا معاوضہ دیا لیکن بات صرف معاوضے کی نہیں۔ فنکار عزت بھی مانگتا ہے خواہ وہ سنار ہو یا مجسمہ ساز یا پتھر کو خوبصورتی تو اسی کے ہاتھ دیتے ہیں۔ میرے باپ نے اس کی قدر بھی کی اور اسے بھائیوں کی طرح سمجھا۔ کاروبار اور پھیلا تو اس نے دوسرے کاریگر کو بلا لیا۔

"اس نے تمہیں اس پیشے میں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟" میں نے کہا۔ "عموماً سنار بچپن ہی سے اولاد کو موقع پاتے ہی تربیت دیتے ہیں تاکہ وہ بڑے ہو کر ان کا ہاتھ بٹائے اور ان کے کاروبار کو چلا سکے۔"

"یہ اس کی جذباتی غلطی تھی۔" ٹیڈی نے سوچ کر کہا۔ "پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا اور اگر وہ مجھے یہ کام سکھاتا تو آج شاید میں بھی اس کی طرح ایک ماہر کاریگر ہوتا — اور زیادہ کامیاب رہتا مگر اس کی سوچ کا انداز عملی نہیں تھا۔ وہ بیوی سے کہتا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو سنار نہیں، ڈاکٹر بناؤں گا۔ سنار کے پاس سونا ہوتا ہے، ڈگری نہیں ہوتی۔ اس کو پیسہ ملتا ہے لیکن وہ عزت نہیں ملتی جو ڈاکٹر، پروفیسر یا وکیل کو ملتی ہے، انجینئر یا سرکاری افسر کو ملتی ہے۔ وہ مجھے بہت پڑھانا چاہتا تھا۔ اتنا پڑھانا چاہتا تھا کہ عزت مجھے بن مانگے مل جائے۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پیسے کی مجھے کوئی کمی نہ ہوگی۔ وہ میرے لیے اتنا چھوڑ جائے گا کہ مجھے دولت کی آرزو ہی نہ رہے۔ میں صرف غریبوں کا علاج کروں اور سب شفا پانے والوں کی دعائیں لوں۔ وہ طے کر چکا تھا کہ جس دن میں ڈاکٹری شروع کروں گا، اسی دن وہ سنار کا پیشہ ترک کر دے گا۔ میں ایک ڈاکٹر کا باپ کہلانا پسند کروں گا اور اس کے کلینک میں کمپاؤنڈر کا کام بھی کروں گا تو بڑے فخر کے ساتھ۔ نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سنار کی عزت نہیں ہوتی۔ خیر، میں بات کر رہا تھا کاروبار کے پھیلنے کی۔ تین سال بعد اس نے دکان کو مال روڈ پر منتقل کر دیا جہاں پہلے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اخبار کا دفتر ہوتا تھا، اس کے بالکل سامنے مال روڈ کے دوسرے کنارے پر۔ اس نے دکان تو مہنگی لی ہی تھی، اس کی آرائش پر بھی بہت پیسہ خرچ کیا۔ اندر شیشے کے سارے شوکیس آئینوں والے تھے اور جب خوبصورت روشنیاں جلتی تھیں تو اس آئینہ خانے میں کئی عکس نظر آتے تھے۔ دکان بہت بڑی اور بہت زیادہ بھری ہوئی لگتی تھی اور اندر قدم رکھنے والے کی آنکھیں اس چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ میں اس زمانے میں ایف ایس سی کے فرسٹ ایئر میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا۔"

"تم... تم نے ایف ایس سی تک پڑھا ہے؟" رابعہ اپنی حیرت کے اظہار پر مجبور ہو گئی۔

ٹیڈی شرمندگی سے ہنسا۔ "ایف ایس سی کیا نہیں۔ امتحان دیتا تو فرسٹ ڈویژن ضرور لیتا۔ یہ میرا خیال ہی نہیں، میرے اساتذہ کا خیال بھی تھا۔ اس کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بہت آسان تھا۔ تقدیر ساتھ دیتی تو میں اپنے ماں باپ کو کبھی مایوس نہ کرتا اور پانچ سال میں ان کو ڈاکٹر بن کے دکھا دیتا مگر تقدیر کو ایسا منظور نہ تھا۔ ایک سال میں دکان نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی اور میرا باپ صفِ اوّل کے جیولرز میں شمار ہونے لگا۔ ہم کرشن نگر میں سوری بلڈنگ کے قریب ایک بہت بڑے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس گلی کے ایک کمرے والے مکان کو تم نے دیکھا ہی ہے جہاں میں اب رہتا تھا، ہمارا وہ گھر اس کوٹھری سے زیادہ دور نہیں تھا اور میں آتے جاتے اسے دیکھتا تھا۔"

"لیکن تم نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"بتانے سے کیا ہوتا۔ تم یقین نہ کرتے اور کر لیتے تو کون سا فرق پڑتا۔" وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا۔

"تمہارے دل میں کبھی اس گھر میں لوٹ کر جانے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟" رابعہ نے کہا۔

"کیا تم اس گھر کو خرید نہیں سکتے تھے؟" نازو بولی۔

"کوشش کرتا تو ضرور خرید لیتا لیکن اس کے بعد میں وہاں رہ نہیں سکتا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس گھر میں صرف پرانی یادیں ہیں جو بہت تلخ ہیں۔ وہاں ہر چیز اجنبی ہے۔ رہنے والے ہی نہیں ان کا سازوسامان تک نیا ہے۔ مکان کی صورت بھی وہ نہیں جو پہلے تھی۔ نئے مالکوں نے اسے نئے فیشن کی کوٹھی میں ڈھال دیا ہے۔ نہ جانے کیوں خوش قسمتی ہمیں راس نہیں آئی۔ ابھی نئی جگہ کاروبار کو سال ہی ہوا تھا کہ لاہور میں .... فسادات شروع ہو گئے۔ مذہبی اختلاف نے بہت جلد جنون کی صورت اختیار کر لی اور اس میں شرپسند عناصر غالب آ گئے۔ غنڈہ گردی اور لوٹ مار سے سن سینتالیس کا نقشہ سامنے آ گیا اور عام لوگوں کے لیے جان و مال اور آبرو کی حفاظت مسئلہ بننے لگی۔ پیشہ ور بدمعاش ہر طرف دندناتے پھرتے تھے اور انھیں کسی کے مذہب سے سروکار نہیں تھا۔ وہ جسے چاہتے تھے، لوٹ لیتے تھے اور افواہوں پر دکانیں اور مکان نذرِ آتش کر دیتے تھے۔ نہ جانے کس نے پرانی دشمنی کا بدلہ لیتے ہوئے ہمارے بارے میں.... غلط باتیں پھیلا دیں اور.... ایک مشتعل ہجوم نے دکان کو گھس کر کے پہلے لوٹا اور پھر اسے آگ لگا دی۔ دشمنی کا الزام میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ بات صرف دکان کی تباہی پر ختم نہیں ہوئی۔ کسی نے دکان لوٹنے والوں کو یہ بھی بتایا کہ ہم کہاں رہتے ہیں اور کچھ لوگ پورے انتظام کے ساتھ کرشن نگر پہنچے۔ انھوں نے وہاں بھی شرپسندوں کو اکسایا اور ہمارے گھر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ہم سوئے پڑے تھے۔ انھوں نے ہر طرف پیٹرول چھڑک کے آگ لگائی اور فرار کے راستے بند کر دیے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آگ بڑی تیزی سے پھیلی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہے تھے مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ ان کی مدد کے لیے جانے کے بجائے اپنی جان کی فکر کی اور زینے سے چھت پر چڑھ گیا کیونکہ مجھے باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ ہی دکھائی نہ دیا۔ آگ کے شعلے ہر طرف سے بھڑک رہے تھے۔ میں اپنے پاگل پن میں چھت سے نیچے کود گیا۔ میری ایک ٹانگ ٹوٹی لیکن زیادہ نقصان سر کی چوٹ سے ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گنگارام اسپتال میں تھا اور مجھے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔ میں جل کر خاک ہونے سے بچ گیا تھا لیکن میری یادداشت ختم ہوگئی تھی۔ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر آتے تھے جو مجھ سے باتیں کرتے تھے، بڑی نرمی سے اور محبت سے۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ ذہنی صدمے کا اثر ہے۔"

"تمھیں گنگارام اسپتال کون لے گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہی تو ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تھا کوئی شیطانوں میں انسان۔ اس نے اتنا کیا کہ مجھے ہجوم سے نکال لیا ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی مارا جاتا۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارے والدین اندر ہی جل کر مر گئے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمھاری طرح وہ بھی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے ہوں۔" محسن نے سر ہلایا۔

...یقین کے ساتھ میں کیا کہوں۔ اپنی آنکھوں سے میں نے ...دیکھا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ ان کے لیے باہر ... ممکن تھا۔ اگر کمرے کی کنڈی باہر سے لگا دی گئی ہوگی تو وہ اندر قید ہوگئے ہوں گے۔ دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ اسے توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں تھیں اور قاتلوں نے انھی سلاخوں میں سے پٹرول یا مٹی کا تیل اندر پھینکا تھا۔ میرے جسم پر بھی جلنے کے نشانات تھے مگر بہت معمولی اور ڈاکٹر ان سے کچھ اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اسپتال پہنچانے والا کسی کو میرے متعلق کچھ بتائے بغیر بھاگ گیا تھا۔ اسے اپنی جان کا ڈر تھا یا وہ پولیس کی قانونی کارروائی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔"

"تمھارے دوست، رشتے دار اور جاننے والے بھی تو ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ان میں سے کوئی نہیں پہنچا؟"

"کیسے پہنچتا؟ کسی کو معلوم ہوتا کہ میں گنگارام اسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہوں، تب ہی آتا نا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "جس خدا کے بندے نے میری جان بچائی تھی یا تو وہ اجنبی تھا جو میرے دوستوں رشتے داروں کو جانتا ہی نہیں تھا۔۔۔!"

"لیکن وہ تمھارے پڑوس کے لوگوں کو تو بتا سکتا تھا؟"

محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ وہ شخص ..." ٹیڈی نے کہا۔ "کسی حادثے کا شکار ہوا یا اس کے ساتھ ... ایسی ہی افسوسناک واردات ہوئی۔ ویسے سب عزیزوں، واقفوں، دوستوں اور ہمسایوں کو یقین تھا کہ ہم میں سے ... نہیں بچا ہوگا۔ مکان میں جو کچھ تھا جل گیا تھا۔"

"کیا کسی کی تدفین نہیں ہوئی تھی؟" میں نے سوال ...

"ہوئی تھی۔ بتلانے والوں نے بعد میں بتایا کہ دو کو... ہو جانے والی لاشیں جو پہچانی نہیں جاتی تھیں، ایک ... گاڑ دی گئی تھیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اس وقت کسی کو خیال نہیں آیا کہ گھر میں تین افراد ... آیا ہوگا لیکن تفتیش کون کرتا اور رپورٹ کرنے کون ..." ٹیڈی نے کہا۔ "بعد میں حالات پر قابو پانے کے لیے ... نافذ کرنا پڑا تھا۔ یہ مارشل لا صرف لاہور تک محدود تھا ... اس وقت فوج نے شہر کا نظم و نسق بحال کیا تھا ... پڑوس کے لوگوں کو یہ بھی امید ہوگی کہ میں لوٹ آؤں ... حالات کے معمول پر آنے کے بعد بھی میرا کوئی سراغ ... سب نے یقین کر لیا کہ میں زندہ نہیں۔ میرا اپنا یہ حال تھا ... دماغ میں خلا تھا۔ میری یادداشت ایک کورے کاغذ ... ہوگئی تھی۔ میں اپنے متعلق ڈاکٹروں کو کچھ بھی نہیں بتا سکا ... نے تین مہینے تک علاج کے علاوہ بھی سب کچھ کر کے ... مگر انھیں مایوسی ہوئی۔ وہ آخر کب تک مجھے بستر پر لٹائے ..."

"وہ تمھاری تصویر تو اخبار میں شائع کرا سکتے تھے ..."

"یہاں وہ سب کون کرتا ہے جو ہونا چاہیے۔" ... بولا۔ "مُردہ خانوں میں جا کے دیکھو کتنی لاوارث لاشیں ... ہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب لاوارث نہیں ہوتے۔ دیہات ... دور دراز مقامات سے آئے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جو حادثہ ... کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب وارث خود ہی پولیس کو گمشدگی ... رپورٹ لکھوائیں اور پھر تمام اسپتالوں میں پتا کرنے پہنچ ... تو الگ بات ہے ورنہ کسے پروا ہوتی ہے۔ نہ پولیس کو، ... اسپتال والوں کو، ورنہ ان کے بھی فوٹو اخبار میں دیے جا سکتے ... جب میں بھاگا تھا تو رات کے کپڑوں میں تھا۔ میری جیب ... کچھ بھی نہیں تھا جس سے میری شناخت ممکن ہوتی۔ ایک ... مجھے اسپتال سے بھی فارغ کر دیا گیا اور میں لاہور کی سڑکوں ... بھٹکتا پھرا۔"

"یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمھاری یادداشت ... بحال ہونے کے بعد۔۔۔ تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" میں ...

"میں بارہ سال تک یادداشت سے محروم رہا۔" ٹیڈی بولا۔ "اس کے بعد دوسرا حادثہ پیش آیا۔ ایسا تو فلموں میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ بالکل یہی ہوا۔ میری یادداشت اچانک چلی گئی تھی اور اچانک لوٹ آئی اور اس کے بعد بے خبری کے دور میں بھی جو کچھ میں نے کیا تھا، وہ سب مجھے یاد آگیا۔ گنگارام اسپتال سے نکلنے کے بعد لاہور میں ہی پھرتا رہتا تو اس بات کا امکان تھا کہ کسی دن کوئی جاننے والا مل جاتا اور مجھے شناخت کر لیتا مگر ہوا یہ کہ میں بے مقصد پھرتا ہوا اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ وہاں ایک گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور پشاور پہنچ گیا۔ اگر گاڑی آگے جاتی تو میرا سفر بھی جاری رہتا لیکن پشاور آخری اسٹاپ تھا۔ میری حالت دیوانوں جیسی تھی۔ میرے جسم پر وہی پرانے کپڑے تھے اور میں ننگے پاؤں تھا۔ مجھے ہاتھ منہ دھوئے بھی کئی دن ہوگئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر سے مانگ کر پیٹ بھرا تھا۔ پشاور میں دو بار مجھے پولیس نے آوارہ گردی کرتے پکڑا اور تھانے میں بند کر دیا لیکن بہت جلد وہ مجھے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ میں ان کے کسی کام کا نہ تھا۔ نہ میں مخبری کر سکتا تھا اور نہ وہ مجھ پر کسی قسم کا الزام تھوپ سکتے تھے۔ پہلی پیشی پر ہی مجسٹریٹ مجھے ذہنی مریض یا پاگل قرار دے کر فارغ کر دیتا۔ اسی طرح پھرتے پھراتے میں فقیروں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھ سے پشاور کی سڑکوں پر بھیک منگواتے رہے اور میری ساری آمدنی اپنے پاس رکھتے رہے۔ عملی طور پر میں ان کا قیدی تھا۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ میں جوان اور صحت مند آدمی تھا اور لوگ مجھے بھیک کم دیتے تھے، طعنے اور گالیاں زیادہ دیتے تھے۔ وہاں ایک سے ایک بڑا فنکار تھا۔ کچھ آنکھوں والے اندھے تھے۔ کچھ ایسے بیمار بن کے نکلتے تھے اور یوں فٹ پاتھ پر پڑے رہتے تھے کہ لگتا تھا ابھی دم توڑ دیں گے۔ انھوں نے مجھے بھی لیپ پوت کے کوڑھی بنانا شروع کر دیا۔ وہ میرے چہرے اور پیروں پر نہ جانے کیا کچھ تھوپ دیتے تھے اور مجھے ارباب روڈ پر ہاتھ سے دھکیل جانے والی ایک گاڑی میں بٹھا کے چھوڑ جاتے تھے۔ مجھے دھکیل کر لانے والا ہٹا کٹا اور مشٹنڈا فقیر کیپارام بلڈنگ کے سامنے ڈراما کرتا تھا مگر درحقیقت مجھ پر نظر رکھتا تھا۔"

"پھر وہاں سے تمھاری گلو خلاصی کیسے ہوئی؟" رابعہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"اللہ نے ایک نیک بخت کو اس کا سبب بنا دیا۔" ٹیڈی مسکرایا۔ "فقیروں کے ڈیرے پر عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے جو بوڑھی اور خرانٹ تھیں، وہ تو دوسرے مردوں کی طرح صبح ہوتے ہی کمائی کے لیے نکل جاتی تھیں۔ جوان ڈیرے کو سنبھالتی تھیں۔ وہ صرف فقیر ہی نہیں بردہ فروش بھی تھے۔ ان کے پاس دس سال سے سترہ اٹھارہ سال تک کی لڑکیاں آتی تھیں، کچھ دن ان کی قید میں رہتی تھیں اور پھر اجنبی لوگوں کے ساتھ چلی جاتی تھیں۔ بعض اوقات ان کو باندھ کر یا نشہ پلا کے رکھا جاتا تھا اور سخت جسمانی اذیت دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ مزاحمت کرنا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایک لڑکی ان کے ہاتھوں مر بھی گئی تھی۔ ایک نے خودکشی کر لی تھی۔"

"اور تم۔۔۔ تم یہ سب کچھ برداشت کرتے تھے! اپنے ساتھ بھی اور دوسروں کے ساتھ بھی؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ میں ان سے ڈرتا تھا۔" ٹیڈی نے اعتراف کیا۔ "کیونکہ میں ان کا بہت ظلم برداشت کر چکا تھا۔ پولیس کو وہ باقاعدگی سے بھتہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پولیس سے مدد مانگنے پر میری کھال ہنٹر مار مار کے اُدھیڑ دی گئی تھی اور مجھے الٹا لٹکا دیا گیا تھا۔ ایک خبیث، وقفے وقفے سے میرے زخموں پر نمک ملا گرم پانی ڈالتا تھا۔ ذہنی طور پر میں ان کی طاقت سے اتنا خائف تھا کہ خود کو بے بس سمجھتا تھا اور سب کچھ دیکھنے کے باوجود کچھ نہیں کرتا تھا۔ میری سب سے بڑی کمزوری میرا یہ احساس تھا کہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں اور بھائی بہن نہیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اسی ڈیرے پر میرے سامنے نہ جانے کتنی لڑکیاں ہلاک ہوگئیں اور میں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اپنی بزدلی پر آج شرم سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ شاید میری ساری عمر اسی ڈیرے پر بیت جاتی مگر ہوا یہ کہ فقیروں کے سرغنہ کی بچی جو میری آمد کے وقت چھ سال کی تھی، کچھ سالوں میں جوان ہوگئی۔ خود میں سولہ سال کی عمر سے اٹھائیس سال کا ہوگیا اور نہ جانے کیا بات ہوئی کہ وہ مجھ پر مرنے لگی۔ بات یہ ہے سکندر بادشاہ کہ اپنی جوانی میں ہم بھی تم سے کم نہیں تھے۔"

اس کی بات نے ایک دم سب کو ہنسا دیا۔ "تم اب بھی کسی سے کم ہو استاد۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "بزرگوں میں تو شامل نہیں ہوتے۔"

"...سی سیریس لائف اسٹوری میں کیا زبردست رومانس آیا۔" محسن بولا۔

"بالکل پاکستانی فلم کہ ابھی ہیروئن زار و قطار گا رہی تھی کہ ... بدلا اور رنگیلا آگیا۔" رابعہ نے کہا۔

"سنو یار سنو! ایسی دردناک کہانی ہے اور تم لوگ ہنس رہے ہو۔" محسن بولا۔ "ہاں استاد۔۔۔ تو پھر کیا ہوا؟ کچھ ہیروئن کے بارے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں بتاؤں:

"کیا بتاؤں اس کے بارے میں" استاد ٹیڈی سنجیدہ ہوگیا۔ "اس نے ایک دن مجھے شرمندہ کیا۔ کہنے لگی 'تم کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کتنی خراب ہے۔ بھیک مانگنا کوئی اچھی بات ہے، آدمی بے غیرت ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اب غیرت کا کیا سوال' وہ ناراض ہوگئی کہ مرد ہو کے خود کو بے غیرت کہتے ہو۔ جاؤ ڈوب مرو۔ میں نے سمجھایا کہ میں کتنا مجبور ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی اور کہنے لگی کہ جوان آدمی ہر مجبوری سے نمٹ لیتا ہے۔ میں تو عورت ذات ہوں اور اس کے باوجود میں سوچتی ہوں کہ کچھ کروں۔ تم ہمت کرو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ڈرتا تھا مگر اسے جب بھی موقع ملتا تھا، وہ مجھے اکسانے آجاتی تھی۔"

"اکسانے یا ورغلانے" محسن نے کہا۔ ایک دفعہ پھر سب کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"جو چاہو سمجھو" ٹیڈی نے دانت نکال کے کہا۔ "آہستہ آہستہ وہ مجھے مجبور کرنے لگی کہ ہم دونوں کو یہاں سے نکل جانا چاہیے، بڑی عجیب لڑکی تھی وہ۔ کسی فقیروں کے ڈیرے میں اتنی حسین لڑکی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں سب چیتھڑوں میں رہتے تھے۔ گدڑیوں میں سوتے تھے۔ غلیظ نظر آتے تھے مگر وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ہوتی تھی۔ کچھ فقیر اس پر طعنہ بھی کس دیتے تھے کہ ہے فقیر کی بیٹی مگر رہتی ہے شہزادیوں کی طرح۔ اس کا باپ بڑا سخت گیر اور بے رحم تھا، اس لیے زیادہ نہیں بولتے تھے۔ بری نظر سے دیکھنے والے بھی زبان نہیں کھولتے تھے۔ تم لوگ پھر ہنسو گے مگر سچی بات یہ ہے سکندر بادشاہ کہ ہیں وہ بالکل اس کی طرح لگتی تھی، فلم سٹار نیلو کی طرح۔ ویسا ہی رنگ روپ بھی تھا اس کا اور میں بھی اسے دیکھتا ضرور تھا مگر ہمت مجھ میں بھی نہیں تھی کہ اس سے بات ہی کر سکوں۔ جب خود اس نے بات کی تو یوں سمجھو کہ میری ساری بزدلی ختم ہوگئی۔ ہم روز ملنے لگے اور چھپکے چھپکے ہم نے فرار کا پورا منصوبہ بنا لیا۔ وہ لڑکی جاہل تھی لیکن ذہانت میں کم نہ تھی۔ اس نے ہی سب طے کیا کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ وہ موقع پاتے ہی نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا نکال لائے گی۔ اس کے باپ نے بہت سے نوٹ تکیے کے غلاف میں بھر رکھے تھے اور اسے سرہانے رکھ کے سوتا تھا۔"

"نام تو بتا دو اس کا۔ یا نام لینے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی؟" محسن بولا۔ "آپا جی کہتے تھے؟"

"فاطمہ تھا اس کا نام" ٹیڈی نے سب کی ہنسی کے درمیان کہا۔ "فاطمہ نے کہا کہ اسے کچھ اندازہ نہیں کہ تکیے میں کتنی رقم ہوگی مگر جتنی بھی ہے کافی ہے۔ ہم یہاں سے نکلیں گے تو سب فقیر شہر کے کونے کونے میں ہمیں تلاش کریں گے۔ [illegible] ان کی مدد کرے گی اور ہم کو ہر بس اسٹاپ پر اور ریلوے اسٹیشن پر پکڑنے جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم رات کو نکلیں۔ سب نو بجے تک انٹا غفیل ہو جاتے تھے۔ کچھ نشے میں اور باقی دن بھر کی تھکن کے بعد جلدی سو جانا ضروری سمجھتے تھے۔ خیبر میل وہاں سے رات کو دس بجے روانہ ہوتی تھی۔ فاطمہ کا خیال تھا کہ اگر ہم دس بجے خیبر میل سے نکلے تو رات کو ڈھائی بجے پنڈی جا اتریں گے۔ راولپنڈی بہت بڑا شہر ہے اور رات کے ڈھائی بجے سے صبح ہونے تک ہمیں چھپنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔ یہاں ہماری گمشدگی سے صبح تک کھلبلی مچے گی مگر اس وقت تک فرشتے بھی ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ فاطمہ نے ہی مجھے سمجھایا کہ میں نے ہمت نہ کی تو خود بھی تمام عمر اسی جہنم میں رہوں گا اور اس کو بھی کسی فقیر کے پلے باندھ دیا جائے گا۔ اس سے بھی بھیک منگوائے گا اور اس کے بچوں سے بھی۔ اس نے کہا کہ ہم بعد میں کسی گاؤں کے مولوی کے پاس جا کے سب کچھ بتا دیں گے اور شادی کر لیں گے۔ رفتہ رفتہ اس کی باتوں سے میرا دل بڑا ہوگیا۔ محبت آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

"سچ کہتے ہو بھائی" محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے" اور میری طرف دیکھا۔

"آپ تو کبھی آدمی نہیں تھے" میں نے کہا۔ "اور ہم ہمیشہ آدمی رہیں گے۔"

"اچھا۔ گویا آپ انکار کر رہے ہیں کہ کبھی شوہر نہیں بنیں گے" محسن نے آنکھیں نکال کے کہا اور فوراً دور کھسک گیا۔

"تمہارے والد ماجد بھی ایک شوہر تھے" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مگر کیا تو آدمی کا بچہ نہیں ہے؟"

"اُفوہ — تم دونوں بھی مصیبت ہو۔ شروع ہوگئی اب دونوں کی کائیں کائیں" رابعہ نے ہمیں ڈانٹا۔ حالانکہ اس کا چہرہ [illegible] ہو رہا تھا اور نازو اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "آگے چلو بھائی نیک محمد۔"

"ایک رات خدا نے ہمیں موقع دیا۔ فاطمہ کا باپ چرس کا دم لگا کے غافل ہوگیا تھا اور اس کی ماں بخار کی وجہ سے لپیٹ کر پڑ گئی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ فاطمہ نے کہا کہ اس سے اچھا موقع ہاتھ نہیں آئے گا" ٹیڈی بولا۔ "اس نے باپ کے سر کے نیچے سے نوٹوں والا تکیہ کھسکایا اور مجھے پکڑا دیا۔ میں بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ سردی سے اور کچھ خوف سے۔ [illegible] نے کہیں سے ایک پلاسٹک اٹھایا اور ہم دبے پاؤں باہر نکل آئے۔

باہر نکلتے ہی ہم نے بھاگنا شروع کیا۔ فقیروں کا ڈیرا شہر سے باہر تھا۔ کینٹ اسٹیشن تک کا فاصلہ کسی طرح بھی دو میل سے کم نہیں تھا۔ یہ پورا راستہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر طے کیا۔ ہمارے پیر کیچڑ میں بھر گئے اور کپڑے پانی میں شرابور ہوگئے لیکن ہم نے اس تکیے کو بھیگنے سے محفوظ رکھا۔ میں ٹکٹ لینے گیا تو میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ خیبر میل کی روانگی میں دس منٹ رہ گئے تھے، جب ہم ایک کمپارٹمنٹ میں گھس گئے۔ ایک بڈھے نے بڑی شفقت کا ثبوت دیا اور فاطمہ پر اپنا کمبل ڈال دیا۔ سفر مشکل سے چار ساڑھے چار گھنٹے کا تھا۔ جب ہم آدھی رات کے بعد راولپنڈی کے اسٹیشن پر اترے تو غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہمارے کپڑے بالکل خشک نہیں ہوئے تھے چنانچہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں فاطمہ بیمار نہ پڑ جائے۔ ہم باہر نکلتے تو خالی ہاتھ سڑک پر پھرتے ہوئے پکڑے جاتے اور ہمارا تمام سرمایہ جو تکیے میں تھا، پولیس ضبط کر لیتی۔ میں نے رات پلیٹ فارم کے مسافر خانے میں گزارنے کا سوچا اور فاطمہ کو کئی مرتبہ گرم چائے لاکر پلائی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ یہاں سے نکل چلو۔ بالآخر میں نے فاطمہ کے ساتھ ریلوے لائن پر چلنا شروع کیا۔ کچھ آگے لکڑی کا ایک کیبن سا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور بستر بچھا ہوا تھا مگر کیبن خالی تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بستر سمیٹا اور کندھے پر رکھ کے بھاگا۔ فاطمہ نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ایک باڑ عبور کی اور خود کو سڑک پر پایا۔ ذرا آگے مال گودام تھا۔ میں نے اس کی بیرونی دیوار کے ساتھ فاطمہ کو بستر میں لپیٹ کر لٹا دیا اور خود بھی کونے میں دبک گیا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ سورج نکل آنے کے بعد ایک پولیس والے نے میرے لات رسید کی تو میں جاگا۔ ہمارے آس پاس دوسرے لوگ بھی کھڑے تھے اور ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم پولیس والے کے کسی سوال کا جواب اطمینان بخش نہ دے سکے اور وہ ہمیں تھانے لے گیا۔ راستے میں میں نے فاطمہ سے کہا کہ کیوں نہ اسے کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کریں۔ فاطمہ نے انکار کر دیا اور پولیس اسٹیشن جانے کو ترجیح دی۔ پولیس اسٹیشن میں اس نے اپنا پورا بیان لکھوایا جو تمام اس کے باپ کے خلاف تھا۔ تھانیدار تو ہمیں معاملات کی تصدیق تک حوالات میں بند رکھنے پر آمادہ تھا لیکن ہماری خوش قسمتی کہ وہاں تھانیدار کا باپ بیٹھا تھا۔ وہ صورت سے نیک دل اور مہربان لگتا تھا اور اس کے کہنے پر تھانیدار نے ہمیں ایک ماتحت کے گھر بھیج دیا۔ تھانیدار نے کہا کہ یہ معاملہ تو لمبا جائے گا۔ پنجاب کی پولیس، سرحد کی پولیس سے رابطہ قائم کرے گی وہ چھاپا مارنے کا انتظام کریں گے اور اس کے بعد جب سارے ملزم گرفتار ہو جائیں گے تو مقدمہ درج ہونے سے پہلے ہمیں سب کی شناخت کرنا ہوگی۔ تھانیدار کے بزرگ والد کے خیال میں ہم مظلوموں کو اتنا عرصہ حوالات میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔ جس ماتحت پولیس والے کے ساتھ ہمیں بھیجا گیا تھا وہ حوالدار تھا اور تھانے کی حدود میں ہی رہتا تھا۔ فاطمہ بڑی چالاکی سے تکیے کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بستر اور تکیے کے علاوہ ہمارے پاس کپڑوں کا ایک بکس تھا جو کوئی رات کو لے گیا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ فی الحال ہم خود کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ میں اس کی ہر بات مانتا جا رہا تھا مگر بہت ڈر رہا تھا کہ اب نہ جانے معاملات کیا رخ اختیار کریں گے اور اس سے کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی مگر فاطمہ بہت پُرامید تھی۔ حوالدار کے گھر میں کپڑے بدلنے اور کھانے کے بعد فاطمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ حوالدار کی بیوی کھانے کے بعد سو گئی تھی۔ فاطمہ نے اس کا برقع اوڑھا، باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور پچھلی طرف سے ہم دونوں فرار ہوگئے۔ تکیے میں بھری ہوئی رقم ہمارا بہت بڑا سہارا تھی۔ ہم نے بازار سے کپڑے جوتے اور ایک صندوق خریدا اور لباس کے ساتھ ہی ہمارا حلیہ بالکل تبدیل ہوگیا۔ شام تک ہم کرائے کا ایک مکان تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے لیکن میں نے فاطمہ کو صاف بتا دیا کہ دنیا کے سامنے ہم میاں بیوی ہوں گے مگر ایک دوسرے کے سامنے نہیں۔ ہم اس وقت تک ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں جب تک ہمارا نکاح نہیں ہو جاتا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے آخری وقت تک اس عہد کو نبھایا۔ اگلے دو تین دن تک ہم نے اخبار میں کوئی ایسی خبر نہیں دیکھی جس سے فقیروں کے کسی بردہ فروش گروہ پر چھاپا پڑنے کا ذکر ہوتا۔ غالباً تھانیدار نے معاملہ گول کر دیا۔ اس نے ماتحت کو سخت بے عزت کیا ہوگا۔ ماتحت نے بیوی کی گوشمالی کی ہوگی۔ تھانیدار نے والد ماجد کو اس کوتاہی کا ذمے دار ٹھہرایا ہوگا۔ ہم سب سے بے نیاز اپنا گھر بنانے میں لگے رہے۔ ہم نے برتن خریدے اور گھر کا تھوڑا بہت دوسرا سامان۔ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ اس تکیے میں سے سینتالیس ہزار کی رقم نکلی تھی مگر ہم بہت محتاط تھے۔ ہمارا مالک مکان بھی ایک سبزی فروش تھا جس نے مجبوری کے تحت اوپر والا کمرا ہمیں پچاس روپے مہینہ پر دے دیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ صبح مزدوری کے لیے جاتا ہوں اور شام تک لوٹ آتا ہوں اور ہم جو کچھ خرچ کر رہے ہیں، وہ اپنی بچت میں سے کر رہے ہیں۔ ایک ہفتے بعد میرے لیے فاطمہ کے ساتھ اس کے اتنے قریب اور اس سے اتنا دور رہنا مشکل ہوگیا۔ میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے ایک چھوٹی سی مسجد کے مولوی صاحب سے بات کی اور اس سے تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ایک ہندو لڑکی کو مشرّف بہ اسلام کر کے اس سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ لڑکی کے گھر والے اس پر تیار نہیں، اس لیے لڑکی اکیلی آئے گی اور کلمہ پڑھ لے گی۔ مولوی صاحب مان گئے۔ انھوں نے نکاح پڑھانے کے دو سو لیے اور "روپ متی" کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے بدنیّتی سے کچھ نہیں کیا تھا۔ بےشک وہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور نیتّوں کا حال بھی وہ جانتا ہے کہ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ جو کچھ کیا، گناہ سے بچنے کے لیے کیا۔ اس روز فاطمہ میری بیوی بن گئی اور میں نے خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تصوّر کیا۔ ہم نے چھ مہینے بڑے سکون سے گزارے اور وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت زمانہ تھا جس کی یاد آج بھی مجھے خون کے آنسو رُلاتی ہے پھر فاطمہ اُمید سے ہوئی اور ہم نے وہ سب باتیں کیں جو میاں بیوی پہلی اولاد ہونے سے پہلے کرتے ہیں۔ ابھی خوابوں کی تعبیر ملنے میں تین مہینے باقی تھے کہ دشمن ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ پہنچے۔

اس دن مجھے اٹک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی اور میں گھر پہنچا تو بہت خوش تھا۔ اب ہم اپنی غربت اور سختی کو خیرباد کہہ سکتے تھے۔ بڑے اور زیادہ آرام دہ مکان میں منتقل ہو سکتے تھے اور گھر کو صحیح معنوں میں گھر بنا سکتے تھے۔ اب ہم مالِ غنیمت کو خرچ کرنے کا جواز پیش کر سکتے تھے۔ ایک محنت مزدوری کرنے والا ٹھاٹ سے نہیں رہ سکتا مگر ایک کلرک رہ سکتا ہے۔ لوگ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے پاس ناجائز آمدنی کے ذرائع ہوں گے اور حسد کرنے یا صبر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ میں گھر پہنچا تو فاطمہ سارے دروازے بند کیے بیٹھی تھی اور میرے لیے بھی اس نے دروازہ کئی بار کی تصدیق کے بعد کھولا۔ فاطمہ کا رنگ زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"یہ کیا ہوا ہے تمھیں؟" میں نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ "پاگل تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"تم کو نہیں معلوم..." وہ کانپتے ہوئے بولی۔ "آج میں نے اسے دیکھا ہے..."

"کسے دیکھا ہے؟ جن بھوت کو یا ملک الموت کو۔؟" میں نے جھنجھلا کے کہا۔ اسے خوشخبری سنانے کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جانے سے مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور اس کا برف جیسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ ملک الموت ہی ہے۔ وہ نیچے کھڑا تھا اور جب میں نے کھڑکی کھولی تو وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں اتنی ڈر[illegible] کہ ایک دم پیچھے بھی نہ ہٹ سکی۔" وہ لرزتی ہوئی آواز [illegible] "اور جب میں نے پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند [illegible] ہو چکی تھی۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچان گیا تھا کیونکہ وہ مسکر[illegible] اور اس کی مسکراہٹ بہت خطرناک تھی۔ پھر وہ چلا گیا [illegible] کے بعد شام ہوتے ہی وہ دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں [illegible] تو وہ اسی جگہ موجود تھا۔"

"آخر اس کا کوئی نام بھی ہوگا۔" میں نے ضبط سے [illegible] لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ہسٹریائی [illegible] بیگانگی کی حد تک نہ جا پہنچے۔

"میرا باپ چاہتا تھا کہ میری شادی اس سے ہو [illegible] بولی۔ "پہلے وہ کام چور تھا۔ میرے باپ نے شرط رکھی [illegible] جب تک سو روپے روز لا کے دو، تو بات کروں گا۔ دس مہینے [illegible] وہ سو کی جگہ ایک سو دس ہر شام میرے باپ کے ہاتھ پر رکھتا [illegible]

"ایک سو دس روز کے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "مہینے کے تین ہزار تین سو۔ دس مہینے میں تینتیس ہزار۔"

"ہاں۔ اپنے آدھے بھی وہ میری خاطر میرے باپ کو [illegible] رہا تھا۔" وہ بولی۔ "اور ظاہر ہے اس کی شرط کو تقریباً پورا [illegible] چکا تھا۔"

"آخر وہ یہاں تک کیسے پہنچا؟" میں نے کہا۔ "ضرور تم کو دھوکا ہوا ہے۔ اس سے ملتا جلتا ہوگا کوئی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے میں نہیں پہچانوں گی [illegible] پہچانے گا۔" وہ بولی۔

"لیکن ہمارے اس ٹھکانے کا تو پولیس کو بھی علم نہیں [illegible] وہ ہمیں پہلے پکڑتے۔" میں نے کہا۔

"پولیس اس کیس کو بھول چکی ہے۔ میرا باپ مجھے نہیں [illegible] ہوگا اور تمھیں بھی۔" فاطمہ نے کہا۔ "فقیروں کے آپس میں [illegible] خفیہ قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس نے یہاں کے فقیر[illegible] ہمارے پیچھے لگا دیا ہوگا۔"

"مگر ہم تو اب فقیر نہیں ہیں۔ تلاش کرنے والے مخصوص ٹھکانوں پر ہی جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"افوہ۔ تم عقل سے بالکل پیدل ہو۔" وہ بولی۔ [illegible] فقیر کھڑے کہاں ہوتے ہیں۔ اہم شاہراہوں پر، بارونق بازار[illegible] میں، اسپتالوں کے دروازوں پر، چوراہوں پر اور ہر ایسی جگہ [illegible] سے سب گزرتے ہیں۔ تم کو کسی نے دیکھ لیا ہوگا۔ پھر تمھیں [illegible] نہیں چلا اور تمھارا پیچھا کرتا ہوا کوئی یہاں تک آ گیا۔"

"ہوں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے متفکر [illegible] کہا: "گزشتہ دنوں میں کچھ زیادہ ہی پھرتا رہا ہوں میں۔ کام کی تلاش میں بھی اور بازار آنا جانا بھی رہا ہے۔"

"بس اب جیسے بھی ہو یہاں سے نکل چلو۔ اسی وقت۔" وہ بولی۔

"اسی وقت؟ اس وقت کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "دوسرا مکان تو تلاش کریں۔"

"مکان مل جائے گا ڈھونڈنے سے۔ ان کے آنے سے پہلے نکل جانا اچھا ہے۔" وہ بولی۔

"ایسے تو مالک مکان بھی ہمیں نہیں بھاگنے دے گا۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک مہینے کا نوٹس نہ سہی کرایہ تو دے دیں۔"

"تو جاؤ ابھی دے دو۔ تمھارے پاس پیسے کی کمی تو نہیں ہے۔ وقت کم ہے۔" وہ بولی۔

"خدا کے لیے کچھ ہمت سے کام لو مجھے کچھ سوچنے دو۔" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے بھی نروس کر رہی ہو۔ اب تو رات ہوگئی ہے۔"

"رات کے اندھیرے میں، ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

"اور ہوا تو ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ چل پڑے گا ہمارے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "رات کو خالی مکان بھی نظر نہیں آتے اور یوں سامان سمیت پھرنے والے کو مکان ملتا بھی نہیں، صبح دیکھیں گے۔"

"صبح۔" وہ سپاٹ اور کھوکھلے لہجے میں بولی۔ "صبح تو بہت دور ہے۔ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"سب تمھارا وہم اور خوف ہے۔" میں نے اسے تسلّی دی۔ "ایک رات میں قیامت نہیں آ جاتی۔ کھڑکیاں دروازے سب بند کر کے سوئیں گے۔ مالک مکان کی عادت کو تم جانتی ہو۔ وہ خود سونے سے پہلے سارے دروازے مقفل کرتا ہے۔ صبح میں تم کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ہم دونوں کل مکان تلاش کریں گے۔ حالانکہ کل پہلا دن تھا اور مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔"

"ڈیوٹی۔ تو کیا تمھیں نوکری مل گئی ہے؟" وہ خوش ہو کے اپنا سب خوف بھول گئی۔

"ہاں۔ تم نے مہلت ہی نہیں دی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں تو گھر میں قدم رکھتے ہی تمھیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔"

"ایک خوشخبری تو میرے پاس تھی۔ فیصلہ کر لو کس کی خوش خبری بڑی ہے۔" اس نے میرے کان کے قریب سر لا کر سرگوشی کی۔ میں نے خوشی سے ایک چیخ ماری اور فوراً تسلیم کر لیا کہ اس نے جو خوشی کی خبر سنائی ہے، وہ انمول ہے۔ میری نوکری

تو صرف تین سو روپے مہینہ کی تھی۔ اس کا ہمارے ہونے والے بچے کی زندگی اور اس کے مستقبل اور اس کے وجود سے وابستہ ہماری خوشیوں کی قیمت سے کیا مقابلہ۔ میرے تسلی دینے اور سمجھانے پر وہ ایک رات کے لیے رک گئی۔ میں رات کو ہی مٹھائی لینے گیا اور میں نے دو ڈبے مالک مکان کے گھر میں بھی دیے۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ دو ڈبے کیوں۔ میں نے اسے دہری خوشخبری سنائی تو وہ نیک دل آدمی بھی خوش ہوا جس کے گھر میں ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی اور جس کا رویّہ ہمارے ساتھ بزرگوں کی طرح مشفقانہ تھا لیکن فاطمہ کے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے۔ ہم آپس کی باتیں کرتے نہ جانے کتنی دیر تک جاگتے رہے تھے۔ میری آنکھ عجیب سے شور کو سن کر کھلی۔ یہ شورِ قیامت میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ میرے ذہن نے اس کو تحت الشعور کے گہرے مدفن میں دبا دیا تھا۔ مجھے پاگل ہونے سے بچانے کے لیے میرے دماغ نے یہ چال چلی تھی کہ ایک ذہنی صدمے کی شدت کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ دوسری بار اس حادثے کا پیش آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی اوپر سے مندمل ہو جانے والے زخم کو نوکِ خنجر سے چیر دے۔ میں دہشت سے چیخ مار کے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ نیچے سے مالک مکان کے چیخنے چلّانے کی آواز آ رہی تھی اور اس کے بیوی بچے آہ و بکا کر رہے تھے لیکن ان کے لیے بھی فرار کے راستے بند ہو چکے تھے اور پورے مکان کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس رات ہوا بھی نہیں چل رہی تھی کہ آگ اتنی تیزی سے پھیل جاتی۔ وہ آگ اس طرح لگائی گئی تھی کہ ایک دم بھڑک اٹھے اور ہر طرف پھیل جائے۔ دھواں تیزی سے کمرے میں بھر رہا تھا اور آگ کے شعلوں کی زبانیں چھت کی کڑیوں تک پہنچنے لگی تھیں۔ اندیشہ یہ تھا کہ چند منٹ میں ہمارا دم گھٹ جائے گا اور اگر ہم بیہوش ہو کے گر گئے تو جلی ہوئی چھت ہمارے اوپر گرے گی اور صبح ہماری کوئلہ لاشیں اسی طرح ملبے سے نکلیں گی جیسے میرے والدین کی لاشیں نکلی تھیں۔ میں نے فاطمہ کو صبر اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی اور گلی میں کھلنے والی کھڑکی کو دیکھا۔ اس کی اونچائی کم سے کم بارہ فٹ تھی لیکن اس وقت زندگی اور موت کے درمیان یہی بارہ فٹ حائل رہ گئے تھے۔ کھڑکی سے کود جانا خطرناک بھی ہو سکتا تھا اور مہلک بھی۔ مگر کمرے میں ٹھہرنا تو خودکشی کے مترادف تھا۔ میں نے ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ پلنگ کی پائنتی سے بندھی ہوئی رسّی کو کھولنے کے لیے وقت نہ تھا۔ پلک جھپکتے میں مَیں نے فاطمہ کو اٹھا کے کندھے پر ڈال لیا۔ میری اس وقت کی ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی جسے میں آج

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بیان کرنا چاہوں تب بھی نہیں کر سکتا۔ میرے کانوں میں جو شور گونج رہا تھا' وہ کچھ اور تھا۔ میرے دماغ میں اپنے والدین کی چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر پکار رہے تھے۔ یہ مالک مکان کے بیوی بچوں کی چیخ و پکار سے بالکل الگ آوازیں تھیں اور اتنی واضح تھیں کہ ایک بار میں نے چلّا کے جواب بھی دیا اور کہا "میں آرہا ہوں۔" اس وقت میرا وجود دو حصّوں میں بٹ گیا تھا۔ میری دوسری شخصیت جو بارہ سال تک مجھ پر حاوی رہی تھی' میری اصل شخصیت سے مغلوب ہو رہی تھی۔ میں پھر وہی بن رہا تھا جو تھا لیکن یہ انقلاب رفتہ رفتہ آرہا تھا۔ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا لیکن حال سے بے خبر نہیں تھا۔ میں نے فاطمہ کو اٹھا کے کھڑکی کا رخ کیا۔ پہلے اپنے پیر باہر لٹکائے پھر توازن قائم رکھتے ہوئے دہلیز پر بیٹھ کر فاطمہ کو باہر نکالا جو بیہوش ہو چکی تھی، خوف سے یا دم گھٹنے سے۔ پھر اللہ کا نام لے کر میں باہر کود گیا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو میں سیدھا کودتا۔ پنجوں کے بل اترتا اور خود کو سنبھال لیتا مگر فاطمہ کے بوجھ کو کندھے پر لٹکا کے میرا کودنا اور اتنی بلندی سے گرنا برابر تھا۔ فاطمہ میرے کندھے پر سے اچھل کے نہ جانے کدھر گئی۔ اس بار میری دوسری ٹانگ ٹوٹ گئی لیکن میں ہمت کر کے اٹھا اور چلّاتا ہوا فاطمہ کی طرف لپکا۔ وہ دیوار کے سہارے بڑے عجیب طریقے پر اوندھی پڑی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور ایسے مڑی ہوئی تھی کہ زندہ آدمی کی گردن مڑ ہی نہیں سکتی۔ میں پاگلوں کی طرح چیخا "فاطمہ!" اور اسے گود میں اٹھا کے بھاگا۔ نہ جانے کیا چیز میری راہ میں حائل ہوئی اور میں ٹھوکر کھا کے گرا تو میرا سر کسی سخت چیز سے لگا اور میں فاطمہ کی لاش کے ساتھ ہی گر گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی اور اتنا ہی بڑا حادثہ تھا جو میرے بچپن میں بارہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ میرے گھر میں اسی طرح آگ لگی تھی۔ اسی طرح آگ نے میری دنیا کو خاکستر کیا تھا' ایسے ہی میری ٹانگ ٹوٹی تھی اور اسی طرح میرے سر میں چوٹ آئی تھی۔ یہ واقعات دوبارہ اس طرح پیش آئے جیسے کوئی پوری فلم دوبارہ چل جائے۔ ایسی ہی ایک فلم میں نے بارہ سال قبل دیکھی تھی مگر میں بھولا ہوا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے پرانی فلم کے سارے واقعات یاد آگئے اور ذہن نے جب بارہ سال پیچھے سے سفر شروع کیا تو زمانہ حال تک ہر گزرا ہوا لمحہ ایک زنجیر کی کڑی بن گیا۔ فاطمہ کی موت سے مجھ پر کیا بیتی' اس کا بیان میں الفاظ میں کیسے کروں۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ میرا گھر' میرے بیوی بچے ... ری ملازمت' مستقبل میری خوشیاں اور میری امیدیں۔ سب اس آگ میں جل کر راکھ ... ے۔ بیاسی بیالیس ہزار کے نوٹ بھی اسی آ ... میں جل گئے

ہوں گے لیکن ان کا مجھے خیال تک نہیں آیا جو اس بکال ہونے ... میں پایا مگر چوتھے دن میں اسپتال سے فرار ہو گیا۔ ٹرین ... لاہور آ پہنچا۔ یہ خدا کی بڑی مہربانی تھی کہ اس نے مجھے زندہ ... کا اور اس صدمے کو برداشت کر جانے کا حوصلہ دیا۔ مجھے ... دی کہ ان حالات پر غور کر سکوں اور فیصلہ کر سکوں کہ مجھے کیا ... فاطمہ مر چکی تھی اور میری دیوانگی اسے واپس نہیں لا سکتی تھی ... پیار کا جو دیا وہ میرے دل میں روشن کر گئی تھی' اس کا اجالا ... تھا۔ کئی بار میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے ... دے گئی کہ میں ہمت نہ ہاروں اور اپنے سب دشمنوں سے ... ضرور لوں۔ بدلہ لینا آسان نہیں تھا کیونکہ میں اکیلا تھا ... ساری قوت میری عقل ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے فاطمہ سے ... کیا کہ عقل سے کام لیتے ہوئے میں اس کے قاتلوں اور ... دشمنوں سے حساب ضرور چکاؤں گا اور اس کی محبت کو کسی ... نایاب کی طرح دل میں چھپائے مصروفِ عمل گیا۔ مجھے اپنی ... پرانی دکان تلاش کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا ... دکان کا نام بدل گیا تھا اور دکان پہلے کے مقابلے میں دگنی ... تھی۔ غالباً کوئی ساتھ والی دکان بھی خرید کر اسی کے رقبے ... شامل کر لی گئی تھی لیکن اس کے باوجود اندر کا نقشہ کافی حد تک ... تھا۔ میرا حلیہ فقیروں سے بھی بدتر تھا مگر میں اس عالی شان ... دمکتی دکان میں بے خوفی سے داخل ہو گیا' اس یقین کے ساتھ ... آخر میں ہی تو اس کا مالک ہوں۔

"دکان کا مالک سیٹھ یا منیجر کہاں ہے؟" میں نے ... شوکیس کو انگلی سے بجا کر ایک سیلز مین کو متوجہ کیا۔

سیلز مین نے حقارت اور غصّے سے میری طرف دیکھا ... ٹوٹ جائے گا ایسے!"

"سالے فقیر بھی بدمعاش بن گئے ہیں۔ کس رعب سے ... کرتے ہیں!" دوسرے سیلز مین نے کہا۔

"باہر نکل سیٹھ کی اولاد!" تیسرے سیلز مین نے ایک ... طرف پھینک کر کہا۔

"اپنی بکواس بند کرو!" میں نے دہاڑ کر کہا "جو میں نے پوچھا ... اس کا جواب دو!"

انھوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "کیا ... تمھیں سیٹھ یا منیجر سے ہے؟" ایک نے کہا۔

"کام مجھے سیٹھ یا منیجر سے ہے۔ تم سے نہیں کہ تمھیں ..." میں نے متانت سے کہا "میرے سوال کا جواب دو۔"

"ابے یہ اونچا کاری گر ہے۔ سیٹھ یا منیجر سے جب ..." ایک سیلز مین میرا تمسخر اڑا ... ہ تیری جوتی کی ...

نہیں لے گا۔"

"شٹ اپ! میں اس دکان کا مالک ہوں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"ابے یار یہ تو کریک ہے۔" ان کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ "نکالو اسے باہر۔"

"یہ پڑھا لکھا پاگل!" دو سیلز مین مجھے دھکّے دینے کی نیت سے آگے بڑھے۔ میں نے گاہکوں کو بٹھانے کے لیے استعمال ہونے والا اسٹول اٹھا لیا۔

"اگر تم میں سے کسی نے بے وقوفی کی تو میں سارے شیشے اور شوکیس چکنا چور کر دوں گا!" میں نے کہا۔

وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ یہ ایسی خطرناک دھمکی تھی کہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ میں اس آئینہ خانے کو پاش پاش کر سکتا تھا اور ٹیلیفون کر کے پولیس کو وہ بعد میں بلاتے یا چار دس مل کر مجھے قابو کر لیتے مگر اس سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کسی پاگل اور فقیر نظر آنے والے کو پولیس کے ہاتھوں اتنا پٹوایا جائے کہ وہ مر جائے۔ اس سے بھی نقصان تو پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

"جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتا دو!" میں نے کہا "مجھے دکان کے مالک یا منیجر سے بات کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" ان میں سے ایک بولا "تم یہ اسٹول رکھ دو۔ منیجر صاحب تو کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ مالک گھر پر ہوں گے' میں فون پر بات کر لیتا ہوں۔"

میں نے سر ہلا کے اسے فون کرنے کی اجازت دی۔ تیسری گھنٹی پر ہی ریسیور میں نے لے لیا۔ "ہیلو!" کسی مرد نے کہا۔

"میں خواجہ نیک محمد بول رہا ہوں!" میں نے کہا "اس دکان کے اصل مالک کا بیٹا!"

چند سیکنڈ کی خاموشی سے میں نے اندازہ کیا کہ میرے الفاظ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ "آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟" بہت دیر کے بعد دکان کے مالک کی آواز آئی تو بالکل بدلی ہوئی تھی۔

"اپنی دکان سے۔ یہاں ملازموں نے میرے ساتھ سخت بدتمیزی کا سلوک کیا مگر میں ان کو معاف کرتا ہوں کیوں کہ یہ مجھے نہیں پہچانتے۔" میں نے کہا "اب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں!"

"بہت بہتر۔ میں حاضر ہوتا ہوں!" وہ بولا "آپ ریسیور منیجر کو دیجیے!"

"منیجر کسی کام سے گیا ہوا ہے!" میں نے کہا "اپنے سیلز مین سے بات کر لیں!" اور ریسیور اسے تھما دیا۔ وہ کچھ دیر یس سر یس سر کرتا رہا۔ اس کی حیرت اور بدحواسی دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آرہی تھی لیکن میں نے اپنی مالکانہ متانت میں فرق نہیں آنے دیا اور صرف مسکراتا رہا۔ باقی سیلز مین بھی دم بخود کھڑے تھے۔

"آپ آفس میں تشریف رکھیے!" سیلز مین ریسیور رکھ کے بولا۔ "ہم سے بڑی غلطی ہوئی!"

"کوئی بات نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا!" میں نے اسی شان سے کہا اور آفس میں بیٹھ گیا۔ جو اتنی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا کہ کسی چیز پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ منیجر پہلے آیا اور اپنے آفس میں ایک فقیر کو رونق افروز دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے گالیاں دیتا کسی سیلز مین نے اسے اشارہ کر دیا جو اس نے شیشے کی پارٹیشن سے دیکھا اور باہر چلا گیا۔ چند منٹ میں وہ سر ہلاتا آیا اور مجھے خونی نظروں سے گھورتا' خون کے گھونٹ پیتا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ سیٹھ تھوڑی دیر بعد آیا مگر وہ اکیلا نہیں تھا' اس کے ساتھ پولیس بھی آئی تھی مگر انھوں نے احتیاط سے کام لیا تھا۔ دکان کا مالک صرف ایک انسپکٹر کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے مالک کو حلیہ بدل جانے کے باوجود شناخت کر لیا۔ وہ اندر آنے کے بعد مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

"تم کہتے ہو خود کو خواجہ نیک محمد؟" وہ بولا۔

"کہنے کا کیا مطلب' میں خواجہ نیک محمد ہوں!" میں نے کہا "اور میں نے تمھیں بھی پہچان لیا ہے۔ تم وہی کاریگر ہو نا جس نے بھاٹی گیٹ کی دکان میں میرے والد کے ساتھ کام شروع کیا تھا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی "اس جعلساز کو گرفتار کر لیجیے انسپکٹر صاحب!"

میں نے بہت شور مچایا لیکن کسی نے میری ایک نہیں سنی۔ سیلز مین نے وہ سب کہہ سنایا جو میں نے کہا تھا۔ پولیس مجھے تھانے لے گئی اور کسی رپورٹ کے بغیر بند کر دیا۔ ایک بہت بڑے جیولر کے ملازم کا یہی کہہ دینا کافی تھا کہ میں نے اندر گھس کر توڑ پھوڑ کرنے اور دکان کو تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے ان کو اپنی کہانی سنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سب اندھے بہرے کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے تین دن مار مار کر مجھے یہ جھٹلانے کی کوشش کی کہ میں خواجہ نیک محمد ہوں۔ مگر میں بہت ڈھیٹ تھا۔ میری ڈھٹائی کا مطلب میرا حوصلہ تھا جو مجھے سچائی عطا کرتا تھا۔ میں خود کو کیسے قائل کر لیتا کہ میں کوئی اور ہوں۔ جو نوکر تھا' وہ غاصبانہ طور پر مالک بن چکا تھا اور اس نے مالک کو پاگل قرار دے کر بند کرا دیا تھا۔ میں مر جاتا مگر اصل حقیقت سے کبھی انحراف نہ کرتا۔ خدا نے میری یوں مدد کی کہ چوتھے دن ایک اور حوالاتی کا ملنے والا آیا جو وکیل تھا۔ میں اپنی سرگزشت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

اس حوالاتی کو سُنا چکا تھا اور شاید وہ اس پر یقین بھی کر چکا تھا کہ اس نے اپنے ملاقاتی سے میراذ کر کیا۔ وکیل نے مختصراً بات سُنی اور پھر آنے کو کہہ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار کے شور مچانے کی آواز آئی اور وہی وکیل پھر نمودار ہوا۔ اس نے تھانیدار کو دھمکی دی تھی کہ بغیر فردِ جُرم عائد کیے، کسی قسم کی شکایت یا ایف آئی آر کی عدم موجودگی میں یہ حبسِ بے جا کا کیس ہے۔ اس نے مجھے اپنا بھائی ظاہر کیا اور تھانیدار کو بہت ڈرایا دھمکایا کہ وہ اس کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کر دے گا۔ تھانیدار اتنی آسانی سے مجھے نہ چھوڑتا لیکن وکیل سیانا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی کا دماغی توازن درست نہیں اور ہم اسے تین دن سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وکیل کی یقین دہانی پر تھانیدار نے مجھے آزاد کر دیا لیکن وکیل سے درخواست کی کہ مجھے سنبھال کر رکھے۔ تین دن میں وکیل کے گھر رہا اور وکیل نے میری ساری بات سننے کے بعد کہا کہ وہ تصدیق کرے گا۔ اگر تصدیق پر میری بات درست ثابت ہوئی تو وہ میرا کیس لڑے گا لیکن اس کے بعد شرط یہ ہوگی کہ میں اسے ایک لاکھ بطور فیس کے ادا کروں گا۔ ظاہر ہے یہ سودا مجھے دس لاکھ میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ تین دن بعد اس نے مجھے بتایا کہ میں مر چکا ہوں۔

"یہ مذاق میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"اس میں مذاق کی بات ہی نہیں۔ یہ عدالت کا فیصلہ ہے۔"

"عدالت ایک زندہ آدمی کو مُردہ قرار نہیں دے سکتی۔" میں نے کہا۔

"تم قانون کو نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "اصل صورتِ حال یوں ہے کہ جب تمھارے گھر میں آگ لگی تھی تو گھر کے اندر تین افراد تھے۔ تمھارے ماں باپ اور تم۔ ملبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں نکلیں۔ ان کی شناخت ناممکن تھی چنانچہ انھیں تمھارے والدین کی لاشیں قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔ تمھاری لاش نہیں ملی تھی چنانچہ تم لاپتا رہے۔ تمھارے قریبی عزیز تو تھے نہیں۔ پاس پڑوس کے لوگ اور تمھارے والد کے دوست کیا کر سکتے تھے۔ وہ تمھاری واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ تمھارا جلا ہوا مکان اسی طرح لاوارث پڑا رہا۔ تمھارے والد کے ایک پارٹنر نے سات سال گزر جانے کے بعد عدالت کو درخواست دی کہ تمھاری موت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے۔ از روئے قانون سات سال تک لاپتا رہنے والے کو مُردہ قرار دے دیا جاتا ہے چنانچہ تمھارا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی مل گیا اور یوں وہ شخص جو نصف کاروبار کا مالک تھا پورے کاروبار کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے کوئی خلافِ قانون کام نہیں کیا تھا چنانچہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اگر تمھارا کوئی چچا تایا یا دادا ہوتا تو الگ بات تھی۔ خود تم والدین کے اکلوتے تھے، اسے چیلنج کون... سات سال میں کوئی دعویدار سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ دکان... حقِ ملکیت حاصل کرنے کے بعد اس نے دوسرا چکر چلایا... ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو بنیاد بنا کر تمھاری جلی ہوئی کوٹھی بھی فروخت کر دی۔ اس نے کافی لوگوں کو پیسہ کھلایا۔ کاغذات میں رد و بدل... اور مکان کا اسٹرکچر زمین سمیت ایک ایسے شخص کو بیچ دیا جو پر قابض رہنے کا اہل تھا۔ آج کل اس مکان میں ایک خطرناک اسمگلر رہتا ہے۔ اب تمھارا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ تم کو عدالت میں درخواست دینا ہوگی کہ میں زندہ ہوں۔ اپنی شناخت کے ثبوت اور گواہ لانے ہوں گے۔ ان حالات کے گواہ پیش کرنے ہوں گے جن کی وجہ سے تم بارہ سال روپوش رہنے پر مجبور ہوئے۔ یہ معاملہ تمھاری یادداشت کی گم شدگی کا ہے۔ جس اسپتال میں تم زیرِ علاج تھے وہاں بارہ سال پہلے کا کوئی ڈاکٹر ہے اور نہ ریکارڈ۔ اب تمھیں کسی میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا جس میں ماہرِ نفسیات اور ڈاکٹر سب ہوں گے اور وہ مل کر طے کریں گے کہ کیا واقعی بارہ سال تک تمھاری یادداشت تمھارے ساتھ نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب فقیر اس کے گواہ ہوں گے، وہ تو تمھارے دشمن ہیں اور تمھیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ یہ ایک نہیں ایک درجن مقدمات ہیں۔ فوجداری اور...

تمھارے لیے ہر قدم پر قانونی ضابطوں کا مرحلہ ہے۔ خواجہ نیک محمد ثابت کرے گا یہ ثابت کرنا کہ تم بارہ سال کہاں... میڈیکل بورڈ کو قائل کرنا۔ یاد رہے کہ تمھارا حریف لکھ پتی ہے۔ تمھارے خلاف ہر ثبوت کو جھوٹ بنا سکتا ہے اور ہر گواہ کو... کر سکتا ہے، منہ مانگی قیمت دے کر۔ وہ تمھیں مردا بھی سکتا ہے۔ تمھارا تو مدعی بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ جو مرحلے ہیں... دکان اور مکان کا قبضہ لینے کے ہیں۔ دونوں مقدمات دیوانی نوعیت کے ہیں اور فریقِ ثانی اس پوزیشن میں ہے کہ مقدمہ طول دے کر ہائی کورٹ تک لے جائیں اور اگر فیصلہ بیس سال بعد بھی تمھارے خلاف ہو تو بعید از امکان نہیں۔ پھر ذاتی دشمنی الگ ہے۔ اس جیولر سے تمھارے مکان میں رہنے والے تک سب بدمعاش ہیں یا بدمعاش خرید سکتے ہیں۔ تم ان سے... کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اور تم کیا، میں ان سے نہ قانونی لڑ سکتا ہوں نہ غیر قانونی۔ کل کو وہ مجھے ایک لاکھ نقد دے... تمھاری وکالت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیں گے اور... انکار نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ تم سے مجھے فوری طور پر... ملنے کی امید نہیں۔ تم ایک لاکھ کی جگہ دس لاکھ بھی دو گے تو... کب دو گے۔ دس سال بعد

...لیے خطرہ بنے رہو گے۔ شاید مجھے اپنے پتے سے ہاتھ... دھونا پڑے۔ آخری بات یہ کہ تمھارے دعوے کی... کھلانا پڑے۔ دعوے دائر کرنے کے لیے اس پر کم سے کم پچیس ہزار تک پہنچتی ہے۔ کورٹ فیس لگے گی، وہ کون دے گا۔ قصہ مختصر۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور مجھے اتنا ہی غنیمت جاننا چاہیے کہ وہ مجھے پولیس کے قبضے سے نکال لایا ورنہ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیا جاتا۔ اب بہتر یہی ہے کہ میں جان بچا کے نکل جاؤں۔ زندگی کی قیمت ایک مکان اور ایک جیولر کی دکان سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا بھاڑ میں گیا مکان اور جہنم میں گئی دکان۔ مجھے تو بدلہ لینا ہے اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے اور سزا دینی ہے غاصبوں کو۔ وکیل دل کا بُرا نہیں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھے سمجھایا کہ بندے کو عفو اور درگزر سے کام لینا چاہیے، سزا و جزا کو یومِ حشر پر اٹھا رکھنا چاہیے مگر اس نے دیکھا کہ میں عقل سے سوچنے کے قابل ہی نہیں تو اس نے مجھ کو ایک آدمی کا بتا دیا کہ وہ تمھاری مدد کر سکتا ہے۔ اس شخص کا نام تو کچھ اور تھا مگر وہ بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ بہت طاقتور شخص تھا۔ سوا چھ فٹ قد اور بے حد مضبوط کسرتی جسم کا مالک لیکن اس کی اصل طاقت کچھ اور تھی۔ وہ بہت بڑا بدمعاش تھا اور اس کے مقابلے میں خود کو بڑا بدمعاش کہنے والے جوکر لگتے تھے۔ اور بالکل اس اونٹ کی طرح تھے جس نے پہاڑ نہ دیکھا ہو۔ اکثر لوگوں نے صرف اس کا نام سنا تھا، اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ عام بدمعاشوں سے بہت مختلف بھی تھا۔ اس کے چیلے چانٹے بھی معمولی حیثیت کے بدمعاش نہیں تھے۔ چونکہ میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے، اس لیے میں بہرام دادا کے متعلق وہ سب جانتا ہوں جو اس کی ذات سے وابستہ افسانوں اور روایات کی بنیاد بنا۔ بہرام دادا کو آپ چور ڈاکو اور قاتل سب کچھ کہہ سکتے ہیں مگر اس کے چند اصول تھے جن پر وہ مرتے دم تک کاربند رہا۔ ایک تو وہ ان کو لوٹتا تھا جن کی دولت کا ذریعہ ناجائز آمدنی یا حرام کی کمائی ہو۔ مشہور ہے کہ غلطی سے ایک بار اس نے کسی گھر میں ڈاکا ڈالا اور تقریباً دو لاکھ کا زیور اکٹھا کر لیا۔ زیور کسی سیٹھ نے بیٹی کے جہیز کے لیے بنوایا تھا۔ سیٹھ اس کے قدموں میں گر گیا۔ اس نے بہرام دادا کو بتایا کہ وہ دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اس کا نام ہاتھی کے دانتوں کی طرح رہ گیا ہے جو محض دکھانے کے لیے ہوں۔ اس کے قرض خواہ بہت جلد اس کا سب کچھ نیلام کرا دیں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح بیٹی کو باعزت طریقے پر رخصت کر دے اور جو اسے دینا ہے وہ دے کر اپنا بھرم رکھ لے۔ اگر زیور چلا گیا تو شادی نہیں ہوگی۔ وہ دیوالیہ ہو گیا تو اس کا سب کچھ قرض خواہ لے جائیں گے اور پھر شاید اسے بھی جیل جانا پڑے۔ بہرام دادا کو معلوم تھا کہ سیٹھ نے اسمگلنگ سے مال اکٹھا کیا تھا۔ مگر اسمگلر پر بھی بُرا وقت آجاتا ہے۔ اس کی سزا بیٹی کو مل رہی تھی۔ اس نے سارا زیور واپس کر دیا۔ سیٹھ سے وعدہ لیا کہ آئندہ اسمگلنگ نہیں کرے گا اور اس کے قرض خواہوں کا نام پوچھا۔ اگلے دن سارے قرض خواہوں کو بہرام دادا کا پیغام ملا کہ وہ سیٹھ کے قرضوں کی رسیدیں اسے واپس کر دیں اور انھیں ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ دو نے پولیس میں جانے کی حماقت کی اور بہرام دادا کو خود ان سے رسیدیں لینے کے لیے جانا پڑا۔ باقی نے مجبوراً دل پر پتھر رکھ کے یہ گھاٹا کھانا منظور کیا۔ وہ بہرام دادا کو سب کچھ دینے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ایک سیٹھ کا تھوڑا سا قرض معاف کر دیں۔ وہ سیٹھ سنبھل گیا۔ اس کی بیٹی کی شادی میں بہرام دادا بھی شریک تھا۔ اور ڈائس پر بیٹھا تھا لیکن اسے کوئی نہ پہچان سکا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بہرام دادا نے کبھی ان سیٹھوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جنھوں نے اس کے کہنے پر رسیدیں واپس کر دی تھیں بلکہ انھیں ٹیلی فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس مثال سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ بہرام دادا کس قسم کا آدمی تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا۔ انتہائی معزز نظر آتا تھا لیکن خود اس کے خاص آدمی بھی نہیں جانتے تھے کہ اس وقت وہ کہاں ملے گا۔ پولیس کبھی اس پر کوئی جرم ثابت نہ کر سکی۔ چشم دید گواہ عدالت میں بیان سے منحرف ہو جاتے تھے یا شناخت میں غلطی کر جاتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ کہانیاں بھی مشہور ہیں کہ وہ اچانک کسی حقیقی ضرورت مند کے پاس جا پہنچا اور تعارف کرائے بغیر اس کی مدد کر کے لوٹ آیا۔ خیر یہ سب میں نے نہیں سنا تھا کیوں کہ میں بارہ سال سے شہر بدر تھا۔ اس وکیل کے کہنے پر میں نے بہرام دادا کی تلاش شروع کر دی۔ میں ہر جگہ پہنچا اور ہر بدمعاش کے اڈے سے معلوم کیا۔ لوگ مجھ پر ہنستے رہے یا مجھے ڈراتے رہے مگر میں نے اپنی جستجو جاری رکھی۔ ہر جگہ میں یہی کہتا کہ خدا کے بعد دنیا میں میرا کام بہرام دادا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ کام کیا ہے؟ یہ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن میں میری کوشش کے نتائج ظاہر ہوئے۔ میں ایک جگہ چائے پی رہا تھا کہ ایک مظلوم و مسکین اور مریل سا آدمی اسی ٹیبل پر آ بیٹھا۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ درمیان میں اس نے اچانک کہا کہ مجھے بہرام دادا نے بلایا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کہاں بلایا ہے تو وہ بولا کہ تمھیں اس سے کیا۔ وہ جہاں ہوگا مل جائے گا۔ میں نے اور کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اُٹھ کر اس جیرڑی مار جیسے شخص کے ساتھ ہو لیا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی اِدھر اُدھر سے دو افراد نمودار ہوئے اور انھوں نے دروازے بند کر دیے۔ میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے دیکھا کہ دروازوں کو اندر سے کھولنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

"تم کو بہرام دادا سے کیا کام ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

"جو کام مجھے بہرام دادا سے ہے وہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔

"میں ہی بہرام دادا ہوں۔" ڈرائیور نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ کہا۔ میں دوسری بار صدمے سے بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ میرے دونوں طرف اور آگے بہرام کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی سب مسلح تھے مگر بالکل خاموش تھے۔

"میری کہانی لمبی ہے۔ کیا ہم کہیں بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"ہم کھڑے ہوئے نہیں ہیں۔" بہرام دادا نے کہا۔ "گاڑی سارا دن چل سکتی ہے۔ اس شہر کی سڑکیں لمبی ہیں یا تمھاری بات ان سے بھی لمبی ہے؟"

میں نے اسے اوّل تا آخر سب بتا دیا۔ معلوم نہیں اسے پوری آپ بیتی سنانے میں میرا آدھا گھنٹا صرف ہوا یا ایک گھنٹا۔ لیکن جتنی دیر تک میں بولتا رہا سب خاموش رہے۔ صرف ایک بار درمیان میں بہرام دادا نے کہا تھا "سگریٹ" اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اسے سگریٹ جلا کر دی تھی۔ گاڑی ایک ہی رفتار سے مسلسل چلتی رہی۔

"اگر یہ سب سچ ہے۔" بہرام دادا نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ "تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔" پھر اس نے گاڑی رکوائی اور مجھے اترنے کے لیے کہا۔ "کل اسی جگہ تم کو جواب مل جائے گا۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے گاڑی روانہ ہو گئی۔ میری نظر نمبر پلیٹ پر گئی مگر پلیٹ اوپر اٹھی ہوئی تھی اور الٹی تھی۔ اگلے دن میں اسی ریسٹورنٹ میں اسی میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا کہ بہرام دادا میرے مقابل آ بیٹھا۔ وہ ہمیشہ اتنی غیر متوقع بات کرتا تھا کہ دوسرے آدمی کے ہوش گم ہو جائیں۔

"تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔" وہ بولا۔ "ورنہ تمھاری قبر تیار تھی۔ اب میں نے اسے پیغام بھجوا دیا ہے کہ قبر تیار رہے۔"

"کسے پیغام بھجوا دیا ہے؟" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"اسی کو جس نے تمھارے کاروبار پر قبضہ جما رکھا ہے۔" وہ بولا۔ "تم کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو تمھارا حق ہے۔"

"بہرام دادا، ابھی تو آپ حق دلوا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں میری حفاظت کون کرے گا؟"

"تم خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔" وہ مجھے شرمندہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا چاہتے ہو آخر؟"

"میں انتقام لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میرے والدین کو اسی سور کے بچے نے مروا دیا تھا جو اب مالک بنا بیٹھا ہے۔ میں اپنی بیوی اور اپنے بچے کے قتل کا بدلہ بھی لینا چاہتا ہوں۔ میں ان بارہ سالوں کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا ہوں جب مجھے مجبور کیا گیا کہ میں بھیک مانگوں۔ مجھے پیسہ نہیں، مجھے بدلہ لینا ہے۔" میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ بہت سے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے مگر بہرام دادا بے نیازی سے بیٹھا رہا۔

"اچھا چل میرے ساتھ۔ باپ سب کے ہی مرتے ہیں۔" اس نے مجھے تسلی دینے اور لوگوں کو سنانے کے لیے کہا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ باہر اس کی وہی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے اندر بیٹھتے ہی دو آدمی نمودار ہوئے اور آگے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج شیشوں پر پردے تھے چنانچہ میں باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب گاڑی رکی تو میں نے خود کو ایک کوٹھی میں پایا۔ مجھے ایک کمرا دے دیا گیا اور یہ سمجھا دیا گیا کہ میں کوٹھی سے باہر نہ نکلوں۔ کوٹھی کے اندر میرے کہیں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور میں ایک [illegible] سے دوسرے میں جا سکتا تھا۔ کوٹھی میں دن بھر سناٹا رہتا تھا۔ بہرام دادا سے بھی میری پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسرے دن مجھے میز پر ایک اخبار نظر آیا۔ "مشہور صراف کی دکان میں ڈاکا۔" مجھے بہرام دادا نے دھمکی دی تھی۔ بدنصیب مالک کا بیان۔ میں نے خبر کو غور سے پڑھا۔ یہ میری ہی دکان کے بارے میں تھی اور خبر میں یہ بھی تھا کہ ڈاکو دکان میں جھاڑو پھیر گئے ہیں۔ اس سے میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ میرے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے نے بہرام دادا کے پیغام کو نظرانداز کیا ہو گا۔ وہ پہلے شرافت سے اپنا مطالبہ پہنچا دیتا تھا۔ پولیس کے سامنے اس شخص کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بہرام سے ٹکر لینے کے لیے قانون کا سہارا لیا ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی نہ مجھے بہرام دادا نظر آیا اور نہ پولیس کو اس کے بارے میں کوئی مصدقہ شہادت دستیاب ہوئی۔ جس رات ڈاکا پڑا بہرام دادا ایک شادی میں شریک تھا اور سارے باراتی ہمہ وقت اس کی موجودگی کے گواہ تھے۔ میں اس قیدِ تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ میں نے گھر کے ملازموں سے کہا مگر وہ خود نہیں جانتے تھے کہ بہرام دادا کون ہے، کب آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ ساتویں دن ایک شخص آیا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ پشاور جانا ہے۔ باہر ایک سی کار کھڑی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور شاہدرہ کا پل پار کرنے کے بعد دو افراد گاڑی رکوا کے ہمارے ساتھ آ بیٹھے۔ ان دونوں کو میں نے پہچان لیا۔ یہی مجھے پہلے دن بہرام دادا کے ساتھ کار میں نظر آئے تھے۔ میں نے ان سے بات کرنا چاہی تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا۔

"کیا تم مجھے بہرام دادا کے پاس نہیں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ تم نے کیسے فرض کر لیا؟" ان میں سے ایک نے غرا کے کہا۔

"مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" میں نے خواہ مخواہ بات بڑھانے کے لیے کہا۔

"اسے تمھارے شکریے کی ضرورت نہیں۔" دوسرا بولا۔ "اب بولو گے تو گاڑی سے اتار دیں گے۔"

پشاور پہنچنے میں ہمیں چھ گھنٹے بھی نہیں لگے۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ گاڑی کو کتنا تیز چلا کے لائے ہیں۔ لاہور سے پشاور تک کا فاصلہ پونے تین سو میل ہے۔ جی ٹی ایس اڈے کے پاس گورنمنٹ بوائز اسکول آیا تو گاڑی رکی اور بہرام دادا نے ڈرائیور کی جگہ سنبھالی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ یوں جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اس نے نہ اپنے کارنامے کا تذکرہ کیا نہ پروگرام کا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو اس کے ایک ساتھی نے پھر مجھے خاموش کر دیا۔

"تم راستہ بتا دو۔" وہ بولا۔ "فقیروں کا وہ ڈیرا کہاں ہے؟"

"اس وقت تو وہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب رات کو آتے ہیں۔ بس کوئی ہوا تو عورتیں ہوں گی یا پھر وہ لڑکیاں جو کہیں سے لائی گئی ہوں گی۔"

"ہم دیکھ لیں گے۔" وہ بولا۔ میں ان کی رہنمائی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈیرا سامنے نظر آنے لگا۔ گاڑی سڑک پر سیدھی کوہاٹ کی جانب نکل گئی۔ تقریباً ایک میل آگے جا کر ہم واپس ہوئے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد بہرام دادا اور اس کے دو ساتھیوں نے میرے ساتھ پیدل چلنا شروع کیا۔ میں انھیں پیچھے کی طرف سے لے گیا تھا۔ ایک چٹان کی اوٹ سے بہرام دادا نے پورے علاقے کا جائزہ لیا اور ہم واپس آ گئے۔ بہرام دادا نے مجھے وہیں چھوڑ دیا اور انتظار کرنے کو کہا۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں لیکن میں بہرام دادا کی مخالفت کیسے کرتا۔ دوپہر سے شام اور پھر رات ہو گئی۔ بھوک پیاس سے میرا برا حال ہو گیا اور میں ایک چٹان کے پیچھے لیٹ گیا۔ رات کے آٹھ بجے ڈیرے کی طرف کچھ شور ہوا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے کچھ عورتوں کو دیوانہ وار سڑک کی طرف جاتے دیکھا۔ اسی وقت ڈیرے کو چاروں طرف سے آگ نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ آگ اتنی تیزی سے آگے بڑھی کر چند سیکنڈ میں میرے اور ڈیرے کے درمیان آگ کا دریا حائل ہو گیا۔ اندر رہ جانے والوں میں کسی کے لیے بھی بچ کر نکل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیرے کی ہر جھونپڑی جل رہی تھی اور اس کے آس پاس کا علاقہ پچاس گز تک جل رہا تھا۔ کوئی نکلتا بھی تو کدھر سے نکلتا۔ میں اس نظارے میں محو تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم یہاں تماشا دیکھنے نہیں آئے تھے۔" بہرام دادا نے کہا۔ "ویسے بھی تماشا تو ختم ہو گیا۔"

"کیا وہ سب موجود تھے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، میں نے ان سے پوچھ لیا تھا اور انھوں نے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔" وہ بولا۔ "لڑکیوں کو میں نے چھوڑ دیا۔"

میری ذہنی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میرے ذہن پر سے آدھا بوجھ اتر گیا تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے قاتلوں سے انتقام لے چکا تھا۔ ان سب کا انتقام لے چکا تھا۔ جن کے گھروں کی آبرو کو ان غیر نظر آنے والے ڈاکوؤں نے نیلام کیا۔ میں ان کو نہیں جانتا تھا لیکن میرا ان سے انسانیت کے نام پر رشتہ تو تھا۔ میں اپنی ذلت و خواری کا انتقام لے چکا تھا جو میں نے بے غیرت بن کے زندگی کے لیے ہاتھ پھیلا کے اٹھائی تھی۔ یہ سب اس سے بھی زیادہ سخت اور عبرتناک سزا کے مستحق تھے مگر خدا ایک حد تک ظالم کی رسّی دراز کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ رسّی پھانسی کا پھندا بن کے انھی کے گلے میں اٹک جاتی ہے۔ واپس لاہور پہنچنے کے بعد مجھے بہرام دادا نے [illegible] سڑک کے کنارے اتار دیا۔ میرا کام ابھی باقی تھا چنانچہ میں نے اسے روکنے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ میں پھر کب اور کہاں اس سے مل سکتا ہوں لیکن وہ جواب دیے بغیر نکل گیا۔ تین دن تک میں لاہور کی سڑکوں پہ جھک مارتا رہا۔ بہرام دادا کا کوئی پتا ٹھکانا میرے علم میں نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ بہرام دادا کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور کچھ پیشہ ور مجرم محض یہ نام اپنی دہشت بٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن کچھ اسے بہرام ڈاکو ثانی سمجھتے تھے۔ کچھ اس لیے کہ نام کے اعتبار سے بھی وہ بہرام تھا اور کچھ اس کے مذہب، شجاعت اور ذہانت کی روایت کے باعث جن سے وہ سیٹھ ساہوکاروں کا دشمن اور غریبوں کا ہمدرد ثابت ہوتا تھا۔ [illegible] کیفیت پولیس کی تھی۔ اصل بہرام دادا ایک صنعت کار تھا اور اسے دولت کی کوئی کمی نہ تھی مگر اس کی شخصیت بے حد پُراسرار تھی۔ کئی بار اسے جائے واردات پر موجود افراد نے شناخت کیا، تصویر سے بھی، اور صورت سے بھی.... کئی بار اس کی تصویر تک اتاری گئی مگر بعد میں ہر شہادت غلط ہو گئی۔ بہرام دادا کے زیادہ معتبر اور عزت دار گواہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کہیں اور موجود تھا۔ وہ صرف ایک بار گرفتار کیا گیا تھا لیکن اس کی فوراً ضمانت ہو گئی تھی اور جلد ہی اس نے پولیس کے خلاف متعدد مقدمات قائم کر دیے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کا اس سے میل جول تھا لیکن نیچے والے سمجھتے تھے کہ اپنی دولت اور اپنے تعلقات کے باعث وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بہرام دادا بنا ہوا ہے مگر بعد سے اس خیال کے بھی حامی تھے کہ بہرام دادا سنسنی خیز خبریں پھیلانے والے صحافیوں کے ذہن کی اختراع ہے جنھوں نے پبلک کے لیے ایک دلچسپ کردار بنا دیا ہے تو دولت مندوں کے لیے ہوّا کھڑا کر دیا ہے۔ بعد میں ایسے لوگ بھی ملے جو سمجھتے تھے کہ بہرام دادا ہی صنعت کار ہے مگر وہ ایک ذہنی مریض ہے اور دُہری شخصیت کا مالک ہے۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں ہے۔ جرم کرنا اس کی دماغی بیماری ہے، جیسے کچھ لوگوں کو سوتے میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ خیر، تین دن کی آوارہ گردی میں میرا گزر ایک بار اپنی دکان کے سامنے سے ہوا۔ دکان بند پڑی تھی۔ اس کے شٹر گرے ہوئے تھے اور باہر موٹے موٹے تالے پڑے تھے۔ اسی روز میں نے خبر پڑھی کہ انشورنس کمپنی نے دکان میں ہونے والی چوری کے نقصانات کی تلافی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ پولیس نے دُکان کے مالک کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی ہے کیونکہ جائے واردات سے چوری ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ ایک سیلز مین نے یہ بیان بھی دیا ہے کہ اپنی دکان کا سارا مال خود سیٹھ کر بیمہ کمپنی سے رقم وصول کرنے کا منصوبہ خود سیٹھ نے بنایا تھا اور اسے بھی شریک کرنا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اب پولیس اس سے جعلسازی کا اقرار کرانے کے لیے تفتیش کے تمام حربے آزما رہی تھی اور اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ خود اپنی دکان میں ڈاکا ڈال کے اس نے مال کہاں چھپایا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر میرا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ اس خبیث نے جو کچھ کیا تھا اس سے زیادہ بھگت رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس میں بہرام دادا کا اثر و رسوخ کارفرما ہے۔ اسی نے پولیس کو یہ لائن دی ہوگی۔ جب خود پولیس چوری کو چوری نہیں ماننے کی تو مدعی کیسے ثابت کرے گا کہ چوری تھی۔ رہی سہی کسر سیلز مین کے بیان نے پوری کر دی تھی۔ شاید اسے بھی بہرام دادا نے ہی سمجھایا ہوگا کہ کس قسم کا بیان دینے سے وہ محفوظ رہے گا۔ اگر بیمہ کمپنی نقصانات کی تلافی کر دیتی تو وہ سنبھل جاتا مگر اسے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ بہرام دادا کے خلاف بیان دینے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ دوسرے دن میں اپنے مکان کو دیکھنے گیا تو وہاں عجیب منظر تھا۔ ہر طرف پولیس مسلح کھڑی تھی ــــ شاید اِدھر اُدھر سادے کپڑے والے بھی ہوں گے جو ہر آتے جاتے مشکوک آدمی پر نگاہ رکھتے ہوں گے۔ کوٹھی کی دیواروں پر سرچ لائٹس نصب کی جا رہی تھیں اور بیرونی دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ لگائی جلد ہی تھی۔ تار لگانے والوں کے ساتھ الیکٹریشن کام کر رہے تھے، جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ تاروں میں کرنٹ بھی چھوڑیں گے۔ یہ تمام انتظام خود ثابت کرتا تھا کہ اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر کو بہرام دادا کا کوئی پیغام ملا تھا اور اس نے چیلنج قبول کرتے ہوئے

اپنی حفاظت کے لیے ایسا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ بچہ بھی پر نہ مار سکے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ سب ہے اور بہرام دادا کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں یہ جانتا تھا کہ بہرام دادا نے اس کوٹھی میں رہنے والے اسمگلر سے کہا ہوگا۔ غالباً یہ کہ جس طرح جعلسازی کے ذریعے وہ کوٹھی کا مالک بن بیٹھا ہے اسی طرح شرافت سے وہ کوٹھی اصل مالک نیک محمد کے نام کر دے۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہوگا اور کہا ہوگا کہ تم میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑ لو۔

اگلے دن کے اخبار میں تفصیل آ گئی۔ اس بلڈنگ کو بم سے اُڑا دیا گیا تھا۔ حفاظت کرنے والے اسی طرح گورا ... پولیس باہر کھڑے رہ گئے۔ جو اندر تھے وہ مکینوں کے ساتھ ہی ... ہوئے۔ پولیس کو یقین تھا کہ باہر سے کسی نے کوئی بم نہیں پھینکا بارودی مادہ عمارت کے نیچے کسی جگہ رکھا گیا تھا جس سے عمارت کی دیوار بھی سلامت نہیں بچی تھی۔ ابتدائی تفتیش میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ دھماکا کرنے والوں نے پچھلی طرف سے گٹر لائن میں اپنا راستہ بنایا تھا اور غالباً پولیس کی وردی میں تھے کہ کسی نے ان کی صورتوں پر غور نہیں کیا اور وہ اندر کے حصے میں چار جگہ بارود ... سے چلے گئے جہاں گٹر لائن کے ڈھکن تھے۔ اس بات کی وضاحت وہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ اس بارودی مادے کو آگ کس نے اور کیسے دکھائی۔ کیا انھوں نے خودکار فیوز استعمال کیے تھے۔ اس ... صرف ایک رپورٹر نے اشارہ کیا تھا کہ ممکن ہے خود انھی میں سے کسی نے تخریبی کارروائی کی ہو جو حفاظتی انتظامات کر رہے تھے۔ اسمگلر نے دھمکی ملنے کے بعد اپنے بیوی بچوں کو کہیں منتقل کر دیا تھا چنانچہ وہ اکیلا ہی مارا گیا۔ اس عمارت کے ملبے پر بعد میں ... نے دوسری عمارت کھڑی کی جو اب تک موجود ہے لیکن اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جس جس سے مجھے انتقام لینا تھا لے چکا تھا مگر اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ آخر مجھے بھی تو کچھ ملنا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میرا ہی تھا جو ... ہوا۔ بارہ سال تک میں بھیک مانگتا رہا اور میرے ساتھ جو زیادتی زمانے نے کی، اس کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ زندہ رہنے کے لیے بھی تو کوئی سہارا ہونا چاہیے۔ بے شک یہ سب جو میرا تھا، میں قانونی طور پر حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اگر بہرام دادا کی مدد سے کر لیتا تب بھی اس پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر مجھے دس بیس ہزار ہی مل جاتے تو میں کوئی کام شروع کر دیتا۔

ان دنوں میں مجھے بہرام دادا کی ہر وقت تلاش رہتی تھی۔ اس امید میں کہ شاید کوئی پھر مجھ سے رابطہ قائم کرے ... اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتا جہاں پہلی بار ایک شخص مجھے بہرام

کے پاس لے جانے کے لیے پہنچا تھا اور میں جاتا بھی اسی وقت تھا جو تھے۔ میری توقعات پوری ہوئیں اور ایک شخص مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں پردہ نشینوں والی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو وہی شخص چلا کے لے گیا۔ نہ جانے کتنے موڑ گھومنے کے بعد کار چلتے چلتے رُکی تو میں اُترا۔ اس کوٹھی میں آنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لانے والے کا چہرہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھا اور اس نے کسی قسم کی گفتگو نہیں کی تھی۔ کوٹھی میں بھی ویسی ہی مجھے اندیشے ہوئے۔ اندر مکمل سکوت تھا۔ ایک سے دوسرے کمرے میں ہوتا ہوا میں بالآخر اس شخص کی رہنمائی میں آخری دروازے تک پہنچا۔ اندر ایک بیڈ کے گرد دو نرسیں بے داغ سفید یونیفارم پہنے کھڑی تھیں۔ ایک ڈاکٹر سرہانے لگی ہوئی بہت سی مشینوں پر نظر رکھے کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر اس شخص پر جھکا ہوا تھا جو بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور وہ پورا کمرا کسی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کی طرح نظر آتا تھا۔ بستر پر لیٹے ہوئے آدمی کو میں نے قریب جا کے پہچانا۔ وہ بہرام دادا تھا۔ اس کے چہرے اور سر کے گرد پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور باقی جسم سرخ کمبل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ دائیں بائیں گلوکوز اور خون کی بوتلیں لٹکی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک ایک قطرہ ٹپک کر بہرام دادا کی رگوں میں اُترتا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ باہر نکالا اور ہلکا سا اشارہ کیا۔ مجھے ساتھ لانے والے نے چٹکی بجائی۔

"آپ سب لوگ ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے جائیں۔" وہ بولا۔

"ہم اس حالت میں۔۔۔" ان میں سے سینئر نظر آنے والے ڈاکٹر نے احتجاج کیا۔

"حالت کا کوئی سوال نہیں، یہ حکم ہے۔" وہ بے رُخی سے بولا۔ "چلیں جلدی کریں۔"

"لیکن ہماری عدم موجودگی میں کچھ ہوا تو اس کے ذمے دار ہم نہیں ہوں گے۔" ڈاکٹروں نے باہر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے آپ لوگوں پر کوئی ذمے داری عائد نہیں کی جائے گی۔" اس شخص نے کہا اور خود بھی سب کے ساتھ نکل گیا۔

"بہرام دادا! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" میں نے دروازہ بند ہوتے ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کچھ نہیں۔ چوٹ لگ گئی ہے معمولی سی۔" وہ بولا۔ "تیرا کام تو ہو گیا نا؟"

"کیا یہ چوٹ میرا کام کرتے ہوئے آئی ہے؟" میں نے صدمے سے نڈھال ہو کے کہا۔

"کس نے بتایا ہے تجھے؟" وہ بولا۔ "خیر چھوڑ، اصل

بات کر جس کے لیے میں نے تجھے بلایا ہے۔ تُو نے کہا تھا کہ مجھے مال و دولت کچھ نہیں چاہیے، تُو صرف بدلا لینا چاہتا تھا۔ مال تیرا تھا اور تجھے اس کو لینے کا پورا پورا اختیار تھا مگر تُو ڈرتا تھا۔ میں نے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ تیرا حق تجھے مل جائے اور تجھ پر حرف بھی نہ آئے۔ تیرے اصل دشمن جو تجھے جانتے تھے، باقی نہیں رہے۔ پھر بھی ذرا بچ کے رہنا۔"

پھر اس نے مجھے کاغذ کا ایک پُرزہ دیا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اس نقشے کے مطابق صحیح جگہ پہنچ کر اپنا حق حاصل کر لوں۔ یہ حقیقت ہے کہ بہرام دادا کو اس حال میں دیکھنے سے پہلے میں یہی سوچ کر پچھتا رہا تھا کہ مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا۔ اب مجھے بہت کچھ مل رہا تھا تو میں زیادہ پچھتا رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر بہرام دادا نے اعتراف کر لیا تھا کہ اس کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی تھی۔ میں رونے لگا کہ بہرام دادا اب مجھے کچھ نہیں چاہیے آپ کی زندگی کے سوا مگر اس نے

مجھے ڈسمس کر دیا۔ اس نے سرہانے لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا تو وہی شخص پھر نمودار ہوا اور مجھے باہر لے گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں صنعت کار بہرام دادا کے انتقال کی خبر پڑھ لی۔ خبر میں موت کی وجہ حرکتِ قلب بند ہونا بتائی گئی تھی۔ میں اس کے جنازے میں شریک تھا لیکن کسی نے میری طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں مجھے اعلیٰ پولیس حکام بھی نظر آئے مگر ان میں سے کوئی دکھائی نہ دیا، جو مجھے لاتے لے جاتے رہے تھے۔"

اُستاد ٹیڈی خاموش ہو گیا۔ تب بھی ہم سب ہمہ تن گوش بیٹھے رہے۔ یوں جیسے ٹیڈی کی بات ابھی تمام نہیں ہوئی۔ بات ختم ہو گئی تھی مگر ٹیڈی کی آواز کسی صدائے بازگشت کی طرح ہمارے ذہنوں میں گونج رہی تھی اور ہمارے تصور میں ایک فلم چل رہی تھی جس کا ہر منظر حقیقی زندگی میں ہمارے تجربات کا حصہ لگتا تھا۔ ٹیڈی استاد ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ آدمی ہے! اس نے آلام و مصائب کے کتنے صبر آزما اور جان لیوا مرحلوں سے گزر کے جینا سیکھا ہے۔ زندگی کی مسافت میں آغازِ سفر سے اب تک وہ انگاروں پر چلتا رہا ہے لیکن اس نے کبھی اپنے دُکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی اور کسی کو دل کے زخم نہیں دکھلائے۔ کبھی ہم سے بھی فسانۂ غمِ دل نہیں کہا کہ ہم اسے کہانی سمجھ کے اس کا تمسخر نہ اُڑائیں۔ ہمارے لیے وہ ایک بیوقوفی کی حد تک سادہ دل، ادنیٰ درجے کا بدمعاش اور لاوارث آدمی تھا، جس کو ہمارے خلوص نے اپنا لیا تھا۔ ہم نے بات بات پر تمسخر، مولا علی کی، کہنے والے اور اپنی بہادری کی ڈینگ مارنے والے کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بزدلی بھی دیکھی تھی۔ اسے خوجی بھی کہا تھا اور اس کے ساتھ پر مذاق رویہ رکھا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم اسے اپنے سے ہمیشہ کمتر سمجھتے رہے۔ ہم نے اس کے خلوص اور اس کی شرافت کا ہمیشہ اعتراف کیا مگر یہ بات ہم سب کے ذہن میں تھی کہ اسے اپنی دوستی اور اپنائیت کے حلقے میں شامل کر کے اور اس کو جذباتی رشتوں کا امین بنا کے ہم نے اس کی عزت افزائی کی تھی اور ایک انسانی نیکی بھی ورنہ وہ غلط راستوں پہ چلتے چلتے نہ جانے کس عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتا۔ ہم سب نے فرض کر لیا تھا کہ وہ بھی ان ہزاروں، صراطِ مستقیم سے بھٹک کر بدی کی راہ اختیار کرنے والوں کی طرح ہوگا۔ جن کا ماضی محض مفلسی اور احساسِ محرومی سے عبارت ہوتا ہے اور زندگی میں ان کی غلط روش درحقیقت ایک انتقامی ردِ عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب ہم سب خود اپنی نظر میں شرمسار تھے۔ ٹیڈی کا ماضی کسی طرح بھی ہمارے اپنے ماضی سے کم قابلِ فخر اور باعزت نہ تھا۔ وہ ہم سب سے زیادہ ناز و نعم کا پروردہ تھا۔ اسے والدین کی محبت ہم سے زیادہ ملی تھی کیونکہ وہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا اور جو کچھ اس نے گنوا دیا تھا وہ بھی ہم سب کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ اس کی داستانِ حیات اور ہماری سرگزشت میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اس کی زندگی کے بھی تین دَور تھے۔ ایک وہ جو خوش بختی، خوشحالی اور خوش باشی کا دَور تھا۔ دوسرا وہ جس میں وہ اپنے آپ سے بچھڑ گیا تھا اور بارہ سال تک بے خبری کا شکار رہا تھا اور تیسرا عمر یہ دَور تھا جس میں اُس نے اپنی پُرانی زندگی کی طرف لوٹ کر دیکھا تھا۔ اسے ہر طرف غاصب اور شکاری نظر آئے تھے اور اس نے سب سے انتقام لینے کے جنون میں جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی محبت کا تھوڑا سا تڑپ پیدا کرنے کے لیے فاطمہ نام کی ایک لڑکی آئی تھی اور اپنی یادوں کا دُکھ دے کر چلی گئی تھی۔ یہی میری آپ بیتی تھی اور یہی رابعہ کا افسانۂ حیات تھا۔ ہم بھی والدین کی آغوشِ شفقت سے اسی طرح محروم کیے گئے تھے۔ ہم سے بھی غاصبوں نے ہمارے جینے کے سہارے چھین لیے تھے اور اب ان سے ہمارے انتقام کی جنگ جاری تھی۔ فاطمہ کی طرح میری زندگی میں فوزیہ آ کے نکل گئی تھی اور رابعہ کو ایک ایسے شخص نے نکاح کے بعد چھوڑ دیا تھا جو کسی طرح بھی شادی کے قابل نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹیڈی کے ذاتی انتقام کی آگ بہرام دادا کی مدد سے بجھ گئی تھی اور اس نے حقِ وراثت کی جنگ کو اسی کے ساتھ ختم کر دیا تھا۔ اب ہم سب واقعات، حادثات اور اتفاقات کے اس سلسلے پہ غور کر رہے تھے اور ہمارے ذہن پر سوالات کی یلغار تھی۔ وہ صندوق جسے ہم نے حقارت اور تمسخر کے ساتھ ہر خطاب دیا تھا، بیک وقت قارون کا خزانہ بھی ثابت ہوا تھا اور پنڈورے کا باکس بھی۔ اس میں دو لاکھ سے اوپر کا سونا تھا اور استاد ٹیڈی کہلانے والے خواجہ نیک محمد کا پُرعذاب ماضی سب بے رحم یادوں کے ساتھ بند تھا۔

"تو اس میں وہی سونا ہے جس کا پتا تمھیں بہرام دادا نے دیا تھا؟" بالآخر محسن نے خاموشی کے اس جمود کو توڑا۔

"ہاں، وہ نقشہ بہت پیچیدہ نہیں تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "میں اسی کے مطابق گیا اور یہ صندوق نکال لایا۔"

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟" رابعہ بولی۔

"تقریباً چار سال ہوگئے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور تم چار سال سے اس خزانے کو اسی طرح لیے پھر رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "کسی مقصد کے بغیر؟"

"تم نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا؟" رابعہ نے کہا۔ "بلاوجہ غربت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے رہے؟"

"حالانکہ اس سے تم بہت کچھ کر سکتے تھے۔" محسن بولا۔ "اور جو کچھ تم کرتے وہ اس سے یقیناً بہتر ہوتا جو تم کرتے تھے۔"

"تم لوگ تو مجھے بیوقوف ہی کہو گے۔" وہ بولا۔ "لیکن سکندر بادشاہ! جب بھی مجھے خیال آتا تھا کہ میں اس سونے کو نکالوں تو مجھے بہرام دادا کی یاد آجاتی تھی۔ وہ میری وجہ سے مارا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اسمگلر کی کوٹھی میں داخل ہوتے ہوئے کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ مہلک طور پر زخمی ہوگیا تھا۔ آخر میری خاطر اس نے جان کا خطرہ کیوں مول لیا؟ کیا لگتا تھا وہ میرا؟ کون سی نیکی کی تھی میں نے اس کے ساتھ کہ اس نے قرض چکایا تھا؟ وہ ایک دولت مند آدمی تھا اور دنیا اسے صنعت کار ہی سمجھتی تھی۔ وہ صنعت کار تھا یا مجرم یا ذہنی مریض۔ میرے لیے اُس نے جان کیوں دی؟ اور مجھے اس کا موقع بھی نہیں چھوڑا کہ میں اس کا قرض چکا سکوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے وارث کون ہیں ورنہ میں ان کے لیے ہی کچھ کرتا۔ سونا مجھے بہرام دادا کے خون میں لتھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں اس کا جائز وارث ہوں۔ یہ سب میرا ہی تو تھا۔"

"کیا تم نے اسی لیے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں، جب میں نے تمھاری بات سُنی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ میری ہی زندگی کی کہانی ہے سکندر بادشاہ! اور میں نے سوچا کہ اُستاد ٹیڈی، بدمعاشی تو بہت کر لی، اب کچھ نیکی کر کے تو آگے بڑھو۔ تم بہرام دادا کی خاک ماتھے، نہیں، مگر اس کے برابر کچھ تو کر سکتے ہو۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا اور تم بہت چھوٹے آدمی ہو لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نیکی کا جذبہ تو ہر دل میں برابر ہی ملتا ہے۔ جو قرض بہرام دادا نے چھوڑا تھا وہ ادا کرنا چاہو تو قدرت نے ایک موقع فراہم کیا ہے۔ بہرام دادا اگر جان کی بازی نہ لگا سکتے۔ مقصد تو وہی ہے۔ آج اگر کوئی کسی اندھے کو سڑک پار کراتا ہے تو یہ نیکی کرنے والا اپنی راہ لیتا ہے مگر کبھی وہ خود اندھا ہو جائے تو اس کا ہاتھ تھام کے سڑک پار کرانے کے لیے وہی اندھا نہیں آتا، کوئی اور آتا ہے۔"

"تم بہرام دادا سے کسی طرح بھی کم عظیم آدمی نہیں ہو دوست!" میں نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کے کہا۔

"ہمیں معاف کر دینا کہ ہم سے آج تک تمھاری عظمت کی شناخت نہیں ہو سکی۔" محسن بولا۔ "تم اسی طرح ہنستے رہے، مسکراتے رہے، ہمارے مذاق کو برداشت کرتے رہے۔ تم نے کبھی نہیں کہا کہ تم بھی مظلوم ہو۔"

"تمھارا ظرف ہم سے زیادہ تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ہم نے انسانوں کی زیادتی کو، ان کے مظالم کو اور اپنی محرومی کو اتنی فراخدلی کے ساتھ برداشت نہیں کیا اور سخت حالات میں اتنے پُرسکون نہیں رہ سکے جتنے تم رہے۔"

"چیخنے چلانے سے مجھے کیا مل جاتا۔ دُنیا مجھ پہ ہنستی۔" ٹیڈی بولا۔ "دُنیا نے میری پہلے کب مدد کی تھی۔ حشر تو میرا بھی وہی ہوتا جو تمھارا ہُوا، شاید اس سے بدتر ہوتا لیکن مجھے بہرام دادا مل گیا تھا۔"

"آخر کون تھا یہ بہرام دادا؟" میں نے کہا۔ "تم نے بعد میں اس کا سُراغ لگانے کی کوشش نہیں کی؟"

"اس کی زندگی میں کوئی اس کا سراغ نہ پا سکا تو اس کے مرنے کے بعد وہ کیسے مل سکتا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"اور اس کے ساتھی؟" محسن نے کہا۔ "وہ پھر نظر نہیں آئے؟"

ٹیڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کبھی نہیں۔"

"تم لاہور میں پھرتے تھے۔ کبھی ان کوٹھیوں میں ایسی کوئی کوٹھی نہیں ملی جہاں تم جاتے تھے؟"

"نہیں، ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ میں دیوانہ وار ان علاقوں میں پھرتا تھا جہاں ایسی کوٹھی مل سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔ "لیکن میری تلاش رائیگاں گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب جادو کا کھیل تھا۔ ایک جادوگر نے میری مدد کی تھی۔ اس کا ایک شاہی محل تھا اور اس کے غلام جنات تھے۔ جادوگر کی موت کے ساتھ ہی سب غائب ہوگئے۔ بہرام دادا تھا یا نہیں، یہ آج بھی کوئی نہیں جانتا، حالانکہ میانی صاحب کے قبرستان میں اس کی قبر بھی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھاری پوری داستانِ حیات میں بہرام دادا کا کردار بے حد افسانوی لگتا ہے۔" رابعہ بولی۔ "رابن ہڈ کے کردار کی طرح۔ اس کا نام اور ذکر تو میں نے بھی سُنا تھا مگر جیسا کہ تم نے کہا، اکثر و بیشتر بہرام دادا کو اخبار والوں کا اسسٹنٹ سمجھتے تھے۔ جرائم کی خبروں کو زیادہ سنسنی خیز اور پُرلطف بنانے کے لیے اس کردار کا نام کسی منچلے نے ایجاد کیا اور پبلسٹی ملی تو بہت جلد مقبول ہوگیا۔ صنعت کار بہرام دادا صرف نام کی مشابہت کے باعث موضوعِ سخن بنا تھا۔ بدنام نہیں ہوا تھا لیکن حقیقت کو تم نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"تم اس حقیقت کو تمام تفصیلات کے ساتھ غالب کے گوش گزار کر دو۔" محسن بولا۔ "وہ اس سچی آپ بیتی کو شائع کرے گا تو تہلکہ مچ جائے گا۔"

"تمھارا مطلب ہے میں اب بہرام دادا کے نام کو بیچ دوں؟" ٹیڈی ایک دم بھڑک اٹھا۔ "اس کی نیکی کا یہ صلہ دوں کہ اسے ایک دلچسپ اور پُراسرار کہانی بنا دوں جس سے اخبار خوب بکے؟"

"سوری اُستاد! میں مذاق کر رہا تھا۔" محسن نے خفت سے کہا۔

"عملاً بھی یہ بہت خطرناک کام ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بہرام دادا مر گیا ہے مگر وہ سب تو زندہ ہوں گے جو اس کے نمک خوار اور حلیف تھے اور ایسے رازدار تھے کہ آج تک خاموشی اور گمنامی قبول کیے بیٹھے ہیں، وہ چھوڑیں گے ٹیڈی کو؟"

"چلو چھوڑو یہ بات۔" رابعہ نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا تم کو افشائے راز کا اندیشہ نہیں تھا؟ تم پھر بھی صندوق ہمارے ساتھ لے کر پھرتے رہے۔ ہمیں شک تو ہونا ہی تھا۔"

"مجھے معلوم تھا مگر میں ایک فیصلہ کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم پوچھتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ بالآخر میں نے طے کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ جب میں نے تمھارا ساتھ دینے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ لی سکندر بادشاہ! تو یہ سونا کیا ہماری جان سے زیادہ ہے؟"

"مگر اس کو ہم نہیں لیں گے۔" محسن بولا۔ "یہ صرف تمھارا ہے، جتنا تمھیں ملنا چاہیے تھا اس کا سواں حصہ بھی تم کو نہیں ملا۔ جو ملا وہ ہم کیسے لیں؟"

"چار سال سے یہ سونا میرے پاس پڑا تھا، شاید اسی دن اور اسی مقصد کے لیے۔" وہ بولا۔ "یہ تمھارے کام بھی نہ آیا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو پھر کس کے کام آئے گا۔ تم نے پوچھا تھا کہ یہ مالِ حرام تو نہیں ہے۔“

”اب اور شرمندہ مت کرو استاد۔“ میں نے کہا۔

”آج سے یہ استاد اور ڈیڈی جیسے نام کوئی نہیں لے گا۔“ رابعہ نے کہا۔ ”پھر کبھی تم نے خوجی کہا نا میرے بھائی کو تو تمھیں نہیں چھوڑوں گی۔“

”ہم بھی تمھیں نہیں چھوڑیں گے، قسم مولا علی کی۔“ میں نے سخت عاشقانہ انداز میں آہ بھر کے کہا۔ سب کی سنجیدگی ایک دم ختم ہوگئی۔ محسن نے زبردست قہقہہ لگایا اور میری کمر پر ہاتھ ملا۔ رابعہ کا رنگ اپنی بات کے یوں الٹ جانے سے گلنار ہوگیا مگر نازو بھی جو اسی طرح چپ بیٹھی رہی۔

”تم کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے ہی اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”گھر یاد آرہا ہے؟“

نازو نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ایک بار پھر سب سنجیدہ ہوگئے اور سب کی نظر نازو پر جم گئی۔

”ہم نے تو کہا تھا۔“ محسن بولا۔ ”مگر خیر، اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ تم واپس جاسکتی ہو۔“

”میں واپس نہیں جاؤں گی۔“ نازو نے سر اٹھا کے کہا۔ ”مجھے امی اور ابو کا خیال آرہا ہے۔“

”وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اور قصوروار مجھے سمجھیں گے۔“

”تمھیں کیوں؟ جو کچھ کیا ہے میں نے، وہ میرا فیصلہ تھا۔“ وہ بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ یہ بات ان کو بتا دوں۔“

”تمھارے بتانے سے ان کی مشکل آسان نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”لڑکیوں کا گھر سے چلے جانا عزت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔“

”وہ اس مسئلے کو الجھانے سے گریز کریں تو ان کی مشکلات میں کمی آسکتی ہے۔“ نازو بولی۔

”اور تم ان کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ وہ اس مسئلے کو کس طرح ہینڈل کریں؟“ محسن بولا۔ ”آل رائٹ، چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ کسی پبلک ٹیلیفون پر ان سے بات کرلو۔“

”ہوسکے تو غالب کو بھی بتا دینا کہ ہم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہم شیر ہیں اور لوہے کے جال میں ہیں۔“ محسن نے آغا حشر کا ڈائلاگ دہرایا۔

”ہم احمق ہیں اور حماقتوں کے جال میں گرفتار ہیں۔“ میں نے تردید کی۔ ”تم اپنے والدین کو کیا سمجھاؤ گی؟ یہ تو بتا دو۔“

”میں ان سے صاف کہہ دوں گی کہ میری واپسی کا انتظار نہ کریں۔“ وہ بولی۔ ”اور بلاوجہ میری تلاش میں اس بات کی تشہیر نہ کریں کہ میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ میں انھیں اپنی خیریت سے مطلع کرتی رہوں گی۔ وہ مطمئن رہیں اور مجھ پر اعتماد رکھیں۔ میں جن لوگوں کے ساتھ ہوں، ان کو دنیا جو چاہے سمجھے اور کہے مگر میں خود کو ان کے درمیان اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے گھر میں کرتی تھی۔“

”وہ تمھاری اس جذباتی تقریر کو تمھاری کم عقلی کی دلیل سمجھیں گے۔ اور کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔

”میرا فرض اتنا ہی ہے کہ انھیں سمجھا دوں۔“ وہ بولی۔ ”وہ اپنی رسوائی چاہتے ہیں تو جتنا شور چاہیں کریں۔ اخبار میں میری تصویر شائع کرادیں اور پولیس کے ہر تھانے میں میری تصویر لگوا دیں۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کہا اور کہہ دیں کہ مجھے تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا گیا ہے یا میری خالہ بیمار ہیں اور میں پشاور میں ہوں۔ بات بگاڑنے سے کیا فائدہ۔ وہ چاہیں تو بات بنا سکتے ہیں، نہ چاہیں تو میرا کوئی نقصان نہیں۔“

جب وہ محسن کے ساتھ چلی گئی تو میں اور نیک محمد بیٹھے رہے۔ میں نازو کے بارے میں سوچتا رہا جو ناقابلِ یقین حد تک ضدی، نڈر، حوصلہ مند، خوبصورت اور خطرناک تھی۔ اس کی ہر خوبی انتہا تک پہنچتی تھی۔ مقابلہ حسن کا ہوتا تو وہ رابعہ سے کہیں زیادہ حسین تھی مگر معاملہ دل کا تھا چنانچہ اپنی تمام معصومیت، ادائے حسن کی ساری غارت گری اور وفا کے ہر امتحان سے سرخرو گزرنے کی صلاحیت کے باوجود وہ کبھی رابعہ کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ کچھ لوگ پاگل پن کی حد تک امید پرست ہوتے ہیں۔ کیا نازو بھی انھی میں شامل ہے؟ میرے دل نے سوال کیا۔ اس نے ایک موہوم سی امید کی نازک ڈور کا سہارا لے لیا ہے کہ جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ مگر صحرا کے آبلہ پا مسافر بھی تشنہ لب اسی طرح سراب کے تعاقب میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو امید کس طرح دامِ فریب دیتی ہے۔ رابعہ سب کے لیے بستر بچھانے کے بعد مٹی کے تیل کا بتیوں والا چولہا سلگا رہی تھی۔ اس نے میرا، محسن کا اور نیک محمد کا بستر ایک کمرے میں لگا دیا تھا۔ دریاں اور ان کے اوپر کھیس۔ تکیے غیر موجود مگر سر کے نیچے رکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ لحاف کو یوں لپیٹ کر سونا کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ کمر کے نیچے بھی آجائے۔ نیک محمد شاید پرانی یادوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور بہرام دادا کو یاد کر کے ملول تھا۔ کتنا گہرا اور بھرا سرا انسان تھا وہ شخص جسے ہم نے سطحی نظر سے پرکھا تھا۔ اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پہلے بھی کم نہ تھی مگر اب وہ واقعی بہت قابلِ تعظیم ہوگیا تھا۔ اس کی وقعت کو دو ڈھائی لاکھ کے سونے میں نہیں تولا جاسکتا تھا۔ انمول اس کا دل تھا، اس کی شانِ قلندری تھی اور اس کی انسانیت تھی جو آدمی میں جوہرِ نایاب کی طرح عنقا ہوتی جارہی ہے۔

محسن آدھے گھنٹے بعد نازو کے ساتھ لوٹا تو نازو کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کا سبب پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ والدین کو اپنی سنا کے اور ان کی ان سنی کر کے لوٹی تھی۔ اس نے والدین کی دھمکی، التجا اور خفگی سب کو نظر انداز کیا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کسی دن اس انتہا پسند لڑکی کا وجود میرے لیے مسائل پیدا کردے گا۔ وہ ناکامی اور شکست کو قبول کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اگر اس نے نوشتۂ دیوار کو پڑھ لیا اور جان لیا کہ میرا اور اس کا میل مشرق اور مغرب کے میل کی طرح ناممکن ہے تو وہ کیا کرے گی؟ خاموشی سے اپنی دنیا میں لوٹ جائے گی؟ نہیں، اس طوفان بکف آتش فشاں، سیماب صفت اور محشر خیز لڑکی سے خاموشی کو کیا نسبت! وہ جان دے سکتی ہے اور جان لے سکتی ہے مگر ہار نہیں مان سکتی۔ بفرضِ محال اسے جان لینے یا دینے کا مرحلہ درپیش ہوا تو وہ کس کو ترجیح دے گی۔ جان دینے کو یا جان لینے کو؟ اس سوال کا جواب کوئی ماہرِ نفسیات، کوئی ریاضی داں، سائنسٹسٹ یا کمپیوٹر، نجومی یا دست شناس نہیں دے سکتا تھا۔ جواب صرف وقت دے سکتا تھا اور میں صرف اندازہ کرسکتا تھا کہ جان لینے کا مرحلہ آیا تو وہ کس کی جان لے گی۔ وہ میری خاطر اپنی جان دینے کی اہل ہے۔ میری جان وہ کبھی نہیں لے سکتی مگر رابعہ اس کے لیے غیر اہم ہے۔ وہ رابعہ کو اپنا حریف مان لے تو اسے بلا جھجک ختم بھی کرسکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ میرے لیے قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ میرا دماغ اس سوچ کے بھنور میں الجھ گیا تھا۔ نہ جانے یہ لڑکی کیا کرے گی۔ اس کا ساتھ کسی ایسے ٹائم بم کا ساتھ تھا جس کے فیوز پر کسی کا کنٹرول نہ ہو۔ اسے نہ ٹھکرایا جاسکتا تھا اور نہ الگ کیا جاسکتا تھا، یہ اس کے پرخلوص جذبوں کی توہین ہوتی۔ وہ ایم آر ایس کے مشن کے نکتۂ نظر سے بے حد کارآمد تھی اور وہ کرسکتی تھی جو کوئی اور نہیں کرسکتا تھا مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ وہ رابعہ کے سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار تھی اور میرے لیے یہ انتہائی ضروری تھا کہ میں رابعہ کی حفاظت کے خیال کو نازو کی رفاقت سے زیادہ اہم سمجھوں۔

رات کے کھانے کے بعد ہم سوئے تو صبح کوئی بھی سورج نکل آنے کے بعد بھی نہ اٹھا اور شاید ہم ابھی مزید گھنٹا دو گھنٹا اسی طرح پڑے رہتے اگر ہمارے لینڈ لارڈ نے دروازے کو طبلِ جنگ کی طرح بجانا شروع نہ کیا ہوتا۔ بیک وقت میں اور محسن اٹھ بیٹھے اور ہم نے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ یہ بن بلایا مہمان کون ہوسکتا ہے۔

”اجی اٹھو سوہنیو، سرکار سویر ہوگئی اے۔“ ... نے بنگارنا شروع کیا۔ ”اچھا اسی فیر چلتے۔“

”او جی ٹھہرنا۔“ میں نے نعرہ لگا کے کہا اور دروازہ کھولنے دوڑا۔ ایک بار پھر وہ ٹیکسی کو گلی کے اندر لے آیا تھا۔ میں نے نقصِ امن ہونے سے پیشتر ہی معاملات طے کیے اور باہر نکل کے بات کی۔

”اب آپ کرایہ بتا دیں۔“ میں نے کہا۔ ”مکان ہمیں پسند آیا اور بھوت بھی پرانے آشنا نکلے۔“

”ہں جی؟“ اس نے ہونقوں کی طرح کہا۔ ”فیر آگیا جے کوئی نامراد۔ اچھا آج شام کو ہم اسے بھی ملیامیٹ کردیں گے اور صبح تک یا وہ نہیں یا فیر ہم نہیں۔ اِک رات دا عمل اے۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اب دات کو عمل وغیرہ کچھ نہیں کرنا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ آپ کرایہ بتائیں۔“

”کرایہ کی سوہنیو۔ جو خوشی نال مل جائے اوہی چنگا۔“ وہ بولا اور میرے بہت اصرار کے باوجود اس نے کوئی رقم نہیں بتائی اور جب میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو روپے رکھے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”او سچا رب تواڈوں خوش رکھے، تسی مینوں خوش کیتا جے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن سچ بولو جی! آپ نے اپنی خوشی نال دیا ہے، زور زبردستی کوئی نہیں، دل وچ ناراضگی تے کوئی نئیں؟“

میں نے اسے یقین دلایا کہ پانچ سو دے کر میں واقعی خوش ہوں اور حالات سازگار ہوتے تو اسی مکان کے پانچ ہزار دے کر بھی میں اتنا ہی خوش ہوتا۔ اس مردِ قلندر نے بے اختیار نوٹوں کو چوم کر اپنی واسکٹ نما قمیص میں رکھا اور مجھے گلے لگا کے ضرورت سے زیادہ دبایا لیکن میں نے برا نہیں مانا۔ اس کی خوشی کا ستیاناس مخالف سمت سے نمودار ہونے والی ٹیکسی نے کیا۔

”اوئے... اوئے فیر اپتھے لا کھڑا کیتا جے بے بے نوں؟“ دوسرے ڈرائیور نے عادتاً ہارن بجا کے جنگ کا آغاز کیا۔ میں فوراً اندر گھس گیا۔ ان کے درمیان شوخ جملوں کا اور بے ضرر گالیوں کا تبادلہ کچھ دیر جاری رہا۔ پھر معلوم نہیں کس نے ٹیکسی پیچھے ہٹائی۔ اندر نازو اور رابعہ نے ناشتے کا اہتمام کیا۔ بہت عرصے بعد تحفظ کا احساس بڑی تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ رات کو مجھے بڑی پرسکون نیند آئی تھی اور میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں کی حالت بتاتی تھی کہ ان کی بھی یہی کیفیت رہی۔ ہینڈ پمپ چلا کے بالٹی بھرتے ہوئے تھوڑا سا فساد ہوا لیکن بالآخر پرچی نکال کے معاملہ طے کیا گیا۔ غسل خانے میں جانے کے لیے پہلا نمبر نیک محمد کا نکلا، آخری محسن کا اور اس نے قرعہ اندازی میں الیکشن کمشنر یعنی مجھ پر دھاندلی کا الزام عائد کیا۔ میں نے نازو کو حکم دیا کہ اس ناہنجار کو ڈسپلن خراب کرنے کی سزا دے مگر وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی اور شاید رات کو روتی بھی رہی تھی۔ وہ بے دلی سے مسکرا کر

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہ گئی۔ بعد میں محسن نے مجھے اس کی اور والدین کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ والدین نازو کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہ تھے اور انھوں نے نازو کو واپسی کے لیے چوبیس گھنٹے دیے تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے مجموعی صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ ہمارے پاس مختلف مواقع پر مختلف افراد سے چھینے ہوئے اسلحے کی پوزیشن کچھ اس طرح تھی۔ کل آٹھ ریوالور تین سائلینسر والے تو پانچ بغیر سائلینسر کے۔ ہر ریوالور میں سے ایک دو گولیاں چلائی گئی تھیں مگر باقی میگزین میں تھیں۔ اسٹین گن کا ایک ہی راؤنڈ تھا اور یہ... خطرناک ترین ہتھیار صرف ایک بار کسی ایسی جنگ ... کام آ سکتا تھا جب ہم ہر سمت سے محصور ہو جائیں اور ریوالور بھی غلط نکلنے میں ہمارے مددگار ثابت نہ ہوں۔ اس کے بعد مزید راؤنڈ دستیاب ہونے تک اسٹین گن کو صرف ڈنڈے کی طرح گھما کے ... میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ریوالور کے لیے ہر سائز کی گولیاں خفیہ ٹھکانوں سے بلیک میں خریدنا ممکن تھا مگر اسٹین گن کے راؤنڈ حاصل کرنا ناممکن تھا۔

"یہ قتلِ عام کرنے کا اسلحہ استعمال کہیں نہیں ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اس کا دیدار ہوتے ہی سامنے سے مسلح شکاری اپنی بٹالین کے ساتھ ہتھیار ڈال دیں گے یا پسپا ہو جائیں گے۔"

"کرنا بھی یہی ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں ضروری نہ ہو وہاں بھی اسٹین گن کو ساتھ رکھنے سے دہشت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آج ہم کچھ بھی نہ کریں؟" رابعہ نے کہا۔

"کچھ نہ کرنے سے کیا مطلب؟ پلکیں بھی نہ جھپکائیں، سانس بھی نہ لیں!" محسن نے کہا۔

"ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ایک پرانے اور کبھی نہ بخشنے والے دشمن کی قید سے نکل آنے پر جشن منائیں۔" رابعہ نے کہا۔ "بیٹھ کے گپ لگائیں، کچھ ہنسیں۔ پلاؤ زردہ وغیرہ پکا کے غریب اور مسکین لوگوں کو یعنی اپنے آپ کو کھلائیں۔ تم ایک ریڈیو ٹیپ ریکارڈر لاؤ تاکہ کچھ گانے سنیں۔ ایک دن کے لیے عام انسانوں کی زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ جو کبھی ہماری زندگی بھی تھی۔"

"ہاں، ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی ہم کو محروم ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔" محسن گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے بولا۔

"کسی بڑے مقصد کے حصول کی راہ میں زندگی کے چھوٹے اور غیر اہم تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم بڑی خوشیوں کے پیچھے بھاگتے جا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ کب تک بھاگتے رہیں گے۔ ہمیں دکھ، مجبوری اور محرومی، رسوائی اور ناامیدی کے سوا کیا ملا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"آخر یہ کیا ہے، فرسٹریشن یا ڈپریشن؟" میں نے کہا۔

"یہ تمھارا اسرار ہے۔ ایک دن میں آخر کیا ہو جائے گا؟" ... نے چڑ کر کہا۔

"گزرے ہوئے ایک دن کو دیکھو۔ اس ایک دن میں کیا کچھ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اگلے چوبیس گھنٹوں میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہم ذرا سی کوتاہی یا غفلت کے باعث کوئی موقع گنوا دیں تو پچھتانے کا عذاب بھی جھیلنا پڑے۔"

"کچھ بھی ہو۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ ایک دن ... ئی جائے۔"

"یہ دل کا معاملہ نہیں ہے نیک بخت۔" میں نے کہا۔ "... سے کام لو۔"

"اب اس ناچیز ناقص العقل عورت ذات کے پاس کہاں ... نہیں۔ نہ دل، نہ دماغ۔" رابعہ بولی۔

"ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی۔" محسن ... بھر کے بولا۔ "چاہے ہے سو آپ کرے ہے ہم کو عبث بدنام کیا۔"

"گویا تو بھی بغاوت پر آمادہ ہے؟" میں نے اسے ...

"تم کیا کہتے ہو نیک محمد؟"

"ہم تو وہی کہتے ہیں سکندر بادشاہ جو ہماری بہن کہتی ہے۔" نیک محمد دانت نکالنے لگا۔

"پھر تو ہو گئی ساری خدائی اک طرف۔" میں نے ہار مان ... کہا۔ "اچھا بھائی آج چھٹی، پکنک مناتے ہیں گھر میں۔"

وہ دن بڑے مزے میں گزرا۔ محسن پسکیم بازار ... پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر لے آیا اور کچھ فضول سے گانوں ... کیسٹ بھی۔ سارا دن ہڑبونگ رہی۔ میں اور محسن ... لگاتے رہے اور ہر بول کو رابعہ یا شہلا سے منسوب کرتے رہے۔ رابعہ اور نازو نے کھانے میں بڑا تکلف کیا اور نیک محمد نے ان ... ضرورت کا سارا سامان لا دیا۔ وہ پکانے میں مصروف رہیں اور ... اوٹ پٹانگ رقص فرماتے رہے۔ سوائے انگریزی ڈانس کے ... میں نے اور محسن نے انگلستان میں سیکھے تھے، ہمیں کچھ نہیں آتا ... چنانچہ جب محسن نے "کتھا کلی" اور میں نے "بھنگڑا" پیش ... خواتین کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ رات کو میرا دل چاہتا تھا کہ ... رابعہ سے وہی نیلے آسمان کے رنگ کی ساڑی باندھنے کی فرمائش کروں ... جس پر زرد پھولوں کے ستارے روشن تھے اور پھر اس کے ساتھ ... شملہ پہاڑی کے کسی نکتے کنج میں دل کی باتوں سے اپنے ... خواب سنوں جو میرے اتنے قریب اور پھر بھی مجھ سے بہت دور ... لیکن میں نے آرزو دلِ ناشاد کو تھپک کر سلا دیا۔ خوابیدہ ... کو جگانے سے کیا حاصل، میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ خواب ... میں پڑاؤ کے بعد حقیقتوں کی دنیا میں لوٹ کر کانٹوں پر سفر کو جاری ... زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر مجھے محسن کا خیال بھی تھا کہ اس ...

وہ خود کو زیادہ تنہا محسوس کرے گا۔ اگر میں رابعہ سے پوچھتا تو اس کے دل کی بات کہتا۔ وہ خود بھی چاہتی ہوگی کہ اس کی زندگی میں جو ہر دم رواں پیہم رواں ہے، ایک ہنگامۂ دار و گیر ہے اور مسلسل تگ و دو ہے اور قدم قدم رسن و دار کے مرحلوں سے عبارت ہے، فرصت اور فلوت کے چند پیار بھرے لمحے میسر آجائیں تو وہ کہے اور میں سنوں۔ پھر میں کہوں اور وہ سنے مگر میں نے مصلحت کے پیشِ نظر یہ تجویز پیش کر دی کہ ہم سب رات کے کھانے کے لیے باہر چلیں۔

رات کے وقت پہچانے جانے یا کسی دشمن سے سرِ راہ ملاقات کے امکانات کم تھے مگر تھے تو ہم نے انھیں نظر انداز کیے رکھا اور بڑی بے خوفی سے ہر جگہ گئے۔ ہم نے ایک مدت کے بعد شیزان میں پُرتکلف چائے پی۔ پھر ایک انگریزی فلم دیکھنے چلے گئے جو خلافِ توقع بہت اچھی ثابت ہوئی۔ رات کو ہم دار لکباب سے چکن تکے کھا کے پھر "لارڈز" سے کافی پی کر لوٹ رہے تھے کہ مجھے محسن کے والد کا خیال آیا۔ وہ آخری اطلاع کے مطابق ریٹائر ہونے کے بعد فوزیہ کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔

"آج موقع بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کی خیریت تو پوچھ لے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمھیں شہلا سے بات کرنے کی اجازت بھی ہوگی۔" رابعہ نے کہا۔ "واضح ہو کہ تمھاری منگنی ہو چکی ہے۔"

"ہاں، اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں بھی سکندر کی طرح بے شرم ہو جاتا۔ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔" محسن نے سرد آہ بھری۔

فوزیہ کے گھر کا نمبر فوراً ملانے کے لیے ہم نے ٹیلیفون کال آفس کے ایک بہت بااختیار چپراسی سے مذاکرات کیے اور اس کو ٹیلیفون ڈیپارٹمنٹ کی فلاح و بہبود کے لیے پچاس روپے پیش کیے جسے اس نے جیبِ خاص میں ڈال لیا اور ہمارے دل کی مراد پوری کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ جب محسن نے بات شروع کی تو ہم باہر فٹ پاتھ پہ کھڑے اس کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک وہاں ایک موٹر سائیکل آ رکی۔ اس سے پہلے کہ موٹر سائیکل والا ہماری طرف متوجہ ہوتا میں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ حشمت خان تھا۔ میں نے رابعہ اور نیک محمد کو پیچھے کھینچ لیا اور ہم سائے میں ہو گئے۔

"نازو جیسے بھی ہو اس خبیث کو اندر جانے سے روکو۔" میں نے کہا۔ "یہ انسپکٹر حشمت خان ہے۔" اس سے زیادہ کچھ کہنے کا وقت ہی نہیں تھا کیونکہ حشمت خان موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پہ ٹکا کے اندر جانے ہی والا تھا۔ اگر وہ اندر چلا جاتا تو محسن کو فوراً دیکھ لیتا اور بے خبر محسن ہینڈز اپ کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پاتا۔ نازو ایک دم آگے بڑھی۔ معلوم نہیں اس نے حشمت خان سے کیا کہا۔ وہ دونوں اتنے فاصلے پر تھے کہ ہم ان کی گفتگو کے الفاظ صاف نہیں سمجھ سکتے تھے۔

"یہ کیا لمبی بحث ہو گئی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ اندر سے محسن نکل آئے۔"

"اگر نازو اسے زبان سے قائل نہ کر سکی تو اپنے ہاتھوں سے کرے گی۔" رابعہ نے کہا اور اس کی بات درست ثابت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ محسن اپنی بہن سے بھی بات کرے گا تو اتنے عرصے کے بعد باتوں کا سلسلہ دراز ہوگا۔ ممکن ہے وہ شہلا سے بھی بات کرائے۔ رات کے وقت آدھے ریٹ پر وہ آدھا گھنٹا بات کرتا تب بھی ٹرنک کال کا بل بھی سو روپے ہی رہتا یا اس سے بھی کم۔ خلافِ امید محسن بہت جلد نکل آیا۔ ابھی تک حشمت خان کو وہاں سے کھسکانے میں نازو کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ محسن ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں سے اترا تو حشمت خان نے سر گھما کے اسے دیکھا۔ اس کی نظر محسن پر جم گئی۔ میں بلا ارادہ ایک قدم آگے بڑھا لیکن نیک محمد نے مجھے روک لیا اور اس نے اچھا ہی کیا ورنہ محسن کے ساتھ میں بھی حشمت خان کی نظر میں آجاتا۔

اس کے بعد وہ ہوا جو نہ ہوتا تو بہتر تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

"تمھاری یہ جرأت بدمعاش۔" نازو نے چلا کے کہا اور حشمت خان نے حیران ہو کے نازو کی طرف دیکھا ہی تھا کہ نازو کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ ایک بہت بے ضرر قسم کا زنانہ تھپڑ۔ "لفنگے، شہدے، میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"سور کی بچی۔" حشمت خان نے غضب ناک ہو کے اسے دوسری گالی دی، جو پولیس والے ہی دے سکتے ہیں۔ "یہ تو میں بتاؤں گا۔"

"ارے جا، تو کیا بتائے گا۔ شریف لڑکیوں کو اکیلا سمجھ کے چھیڑتا ہے۔ ماں بہن نہیں ہیں گھر میں۔" نازو نے اس کے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو معاملہ حشمت خان کی قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے نازو کی نازک کلائی تھامنے کی غلطی کی۔ کچھ لوگ دور سے یہ تماشا دیکھ ہی رہے تھے۔ ان کی حیرت زدہ آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ ایک دھان پان سی نوعمر اور بے حد حسین لڑکی نے اپنے سے چار پانچ گنا وزن والے خطرناک صورت کے پہلوان ٹائپ غنڈے کو اسی تو ندیت یوں اوپر اچھال دیا جیسے اس میں صرف ہوا بھری ہوئی تھی اور دوسرے لمحے وہ شخص بھد سے ٹیلیفون آفس کی سیڑھیوں کے سامنے کنکروں کے فرش پر گرا۔ وہ زخم خوردہ شیر کی طرح اچھل کے اد...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غرّا کے اُٹھا مگر پھر وہی ہُوا۔ اس لڑکی نے پینترا بدل کے کِک ماری۔ کِک مارنے سے پہلے وہ ذرا سی دیر کے لیے دونوں پیر اٹھا کے ہوا میں بلند ہوئی۔ پھر اس کے پیر بہت قوت کے ساتھ ریلیز ہونے والے اسپرنگ کی طرح پھیلے اور اس بھاری بھرکم شخص کے سینے پر لگے۔ وہ ایک دم اُلٹ گیا۔ لڑکی نے انتہائی برق رفتاری سے پیروں کو سمیٹا اور پھر زمین تک پہنچ کے توازن برقرار رکھتے ہُوئے انھی پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ دوسری بار وہ بھاری بھرکم آدمی یوں دیوار سے جا ٹکرایا تھا جیسے کوئی جنگلی بھینسا دوڑتے ہوئے ڈبل ڈیکر بس کو ٹکر مار دے۔ ٹیلیفون آفس کی عمارت ٹھیکے پر بنائی گئی تھی مگر ٹھیکیدار انگریزوں کے عہد کے تھے چنانچہ دیوار کا کچھ نہیں بگڑا۔ حشمت خان بڑے مضحکہ خیز طریقے پر ٹکرا کے لڑھک گیا اور ساکت ہو گیا۔

محسن اپنی جگہ پر منجمد کھڑا رہا۔ اچانک اسے ہوش آیا تو وہ آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں کچھ ناظرین بھی اس مردِ ہا ڑے سے بھرپور حسینہ کے لیے نعرہ ہائے داد و تحسین بلند کرتے چلے آ رہے تھے۔ نازو اچانک موٹر سائیکل کی طرف لپکی۔ حیران ہونے کی باری اب میری تھی۔ بڑے کمال کے ساتھ اس نے موٹر سائیکل کو سنبھال کے چابی گھمائی جو حشمت خان نے تھانیداری کے زعم میں نکالنا ضروری نہیں سمجھی تھی۔ ایک کِک میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔

"قلندر بخش!" وہ محسن کی طرف دیکھ کر بولی "پیچھے بیٹھو۔" یہ نام اس نے اتنی اونچی آواز میں لیا تھا کہ دوسروں نے بھی سُنا۔

"لیکن گلبدن خانم! یہ موٹر سائیکل ہم نہیں لے جا سکتے۔" محسن نے اس کی بات کا جواب بالکل صحیح دیا۔

"قلندر بخش! چلو۔ نکلو پہلے یہاں سے۔ موٹر سائیکل ہم تھانے پہنچا دیں گے۔" نازو نے کہا۔ "اس بدمعاش کے ساتھی نہ آ جائیں۔"

"گلبدن خانم! اس طرح یہ تم کو اغوا کر کے نہیں لے جا سکتے۔" محسن موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا۔ قریب آنے والے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے تھے۔ ان میں سے کسی میں ہمت نہ تھی کہ قلندر بخش اور گلبدن خانم کی راہ میں حائل ہو سکتا۔ وہ ہکا بکا اور آنکھیں پھاڑے کھڑے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ابھی تک انھوں نے لاہور کی سڑکوں پر ہر قسم کے تماشے دیکھے تھے۔ لڑکیوں کو سائیکلوں پر کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔ غنڈے بدمعاشوں کی سینڈل سے مرمّت کرتے بھی دیکھا تھا لیکن جو اس وقت دیکھا تھا وہ صرف فلموں میں دیکھا تھا۔ حقیقی زندگی میں اس کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اس معصوم صورت اور پتلی سی لڑکی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اپنے ساتھی کو بھگا لے گئی۔ یہ بیسویں صدی کا رومانس تھا۔ گلبدن اور قلندر

پہلے مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصّے دیکھنے والوں کو اس کے مقابلے میں مضحکہ خیز محسوس ہوئے ہوں گے جتنے اب جنگِ عظیم سے قبل کی گاڑیوں کے ماڈل لگتے ہیں یا پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر کے مقابلے میں بھونپو والا گراموفون باجا لگتا ہے، جس کو چابی گھما کر چلایا جاتا تھا۔

"چلو اب ہم بھی نکل چلیں۔" میں نے مسرت سے رابعہ کے کندھے پر وہ ہاتھ مار دیا جو مجھے نیک محمد کے رسید کرنا تھا اور پھر اپنی غلط حرکت پر معذرت کی۔ رابعہ کافی دیر تک کندھے کو اوپر نیچے کرتی رہی۔

"اس وقت نازو نے حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کیا۔" میں نے کہا۔

"موٹر سائیکل بھی چلا لیتی ہے وہ تو۔" نیک محمد نے سر ہلایا۔ "اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ توپ چلا لے، جیٹ چلا لے۔"

"تمھیں مل جائے ایسی لڑکی تو تم کیا کرو گے؟" رابعہ نے کہا۔

"ہمہ صفت۔"

"میں طبعی موت مرنا پسند کروں گا۔" میں نے کہا اور اس کی بات کا کوئی دوسرا مطلب بھی تھا تو گول کر گیا۔ "کیونکہ میں اسے لڑکی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی خطرناک قسم کی خودکار ایجاد ہے جو تباہ کن عشق سے تباہ کن جنگ تک سب کچھ کر سکتی ہے مگر اس وقت میں تعریف کر رہا تھا اس کے دماغ کی۔ کتنی خوبی سے اس نے چشم دید گواہوں کو قائل کر لیا کہ اس نے ایک غنڈے کی ٹھکائی کی ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کا نام بھی بتلا دیا اور محسن نے بھی ویسا ہی نام پُچھا۔ دیکھنے والے یہ نام نہیں بھول سکتے۔"

"مگر حشمت خان اب کیا کرے گا؟" نیک محمد بولا۔

"جب ہوش میں آئے گا تو اپنے سر کے بال نوچے گا اور گواہوں کو تھانے لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"غیرت مند ہوتا تو کہیں اور جا کے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرتا۔" رابعہ بولی۔

"تھانے میں بہت گڑبڑ پھیلے گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "حشمت خان کہے گا کہ اس نے محسن کو دیکھا تھا اور وہ لڑکی اسی کے ساتھ تھی ——— گواہ انکار کریں گے اور بتائیں گے کہ لڑکی کا نام گلبدن بیگم تھا اور اس کے ساتھی کا قلندر بخش۔"

"معلوم نہیں وہ شہلا کے منگیتر کو اغوا کر کے کدھر لے گئی اور واپس آئے گی بھی یا نہیں۔" رابعہ نے تشویش سے کہا۔

"وہ ہم سے پہلے گھر میں موجود ہو گی۔" میں نے کہا۔ "وہ بے ایک دنیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے منگیتر کو اسی طرح بارات سے نکال لے جائے گی۔ اگر اس شامت کے مارے نے کسی اور سے عقد

رچانے کی تو وہ فلمی انداز میں بروقت نمودار ہو کے یہی کہے گی کہ ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی بلکہ گھوڑے یا بائیک پر سوار ہو کے پہنچے گی اور دولھا کو اسی طرح اڑا لے جائے گی جیسے پر تعلوی رلج سو ٹمبر سے بنو گتا کو لے گیا تھا۔"

"خدا مرزا غالب کی مغفرت کرے۔" رابعہ بولی۔

"آمین۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "گویا تمھاری نظر بھی اس کے دل کے چور کو پکڑ چکی ہے۔"

"دل کا چور کہاں چھپ سکتا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کی نظر کی مظلومیت تو سوال کرتی نظر آتی ہے کہ اللہ کے نام پر ایک نظرِ کرم کا سوال ہے بابا۔ ہے کوئی ایک غریب صحافی سے پیار کرنے والا۔"

"ہے وہ بھی بڑا چھپا رستم۔ اس اعتبار سے دونوں کے ستارے ملتے نظر آتے ہیں بلکہ ٹکراتے نظر آتے ہیں۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔

نہ صرف محسن اور نازو گھر پہنچ چکے تھے بلکہ مرزا غالب بھی بقلم خود موجود تھے۔

"کمال کر دیا آج تو تم نے۔" نیک محمد نے بے اختیار نازو کی پیٹھ تھپکی۔

"ذرا سنبھل کے نیک محمد۔" میں نے کہا۔ "تم نے اٹم بم کو ہاتھ لگانے والوں کا حشر دیکھا ہے تم نے۔"

"حشمت خان کی شاہی سواری کہاں چھوڑی؟" رابعہ نے کہا۔

"خواہ مخواہ ایک سرکس کے سامنے کھڑی کر دی۔" محسن بولا۔ "میں نے تو کہا تھا کہ چلو اندر موت کا کنواں بھی ہے۔"

"کسی نے دیکھا نہیں ہو گا ورنہ خود اصرار کر کے لے جاتے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، آگے جا کر میں نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔" محسن بولا۔ مرزا غالب کبھی ایک کا منہ دیکھتے تھے کبھی دوسرے کا۔ جب اس کو تازہ ترین واقعات کی تفصیل سے آگاہ کیا گیا تو اس کی حالت دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آ گئی۔

"واللہ مس نازو، خیال تو آتا ہے کہ تم پر ایک پورا تصویری فیچر چھاپ دوں۔" غالب نے کہا۔ "کہ دنیا کی سب سے خطرناک اور خوبصورت لڑکی... مگر اپنے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ ایڈیشن تو اتنا بک جائے گا کہ میرے لیے بہترین مزار بنانے کا خرچ نکل آئے۔"

"ابھی تک تمھارے مزار کی نہیں، تمھاری ضرورت ہے۔" نازو نے کہا اور میں نے اس کے چہرے پر حیا کی لالی کو دیکھا تو مجھے اپنے الفاظ واپس لینے کا خیال آیا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ لڑکی نہیں

ہے مگر وہ بالکل لڑکی تھی۔ غالب کے خراجِ حسن کو اس نے جس اندازِ محبوبی کے ساتھ قبول کیا تھا وہ دیکھ کر مجھے علّامہ مرحوم کا ایک ہی مصرع یاد آ رہا تھا۔ پھول کی پتی اور ہیرے کے جگر والا۔ نازو کے لیے یہ سب سے موزوں عنوان تھا۔ متضاد صفات کی حامل اس لڑکی کو اور کیا سمجھا جا سکتا تھا جسے سمجھنے کی کوشش کرنے والا پاگل ہو جائے۔

"ہم کل ایک اہم معرکہ سر کرنے والے ہیں۔" میں نے غالب کو مطلع کیا۔ "آج ہی کر لیتے۔"

"مگر ہمارے گھر میں سے تحریکِ التوا پیش کر دی گئی۔" محسن نے کہا۔ غالب ہنس پڑا۔ ہاؤس کی جگہ محسن نے "گھر میں سے" کی اصطلاح کا استعمال کر کے رابعہ کو چھیڑا تھا۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنی بیوی کا حوالہ دیتے وقت اسی طرح "ہمارے گھر میں سے" کہتے تھے۔ اس کے بعد میں نے ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں اس فیصلہ کن معرکے کی تفصیلات پر بحث کی گئی اور اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیا گیا۔ غالب کو ہمارے اقدامِ خودکشی سے اختلاف تھا۔

"گامے ماچھی کی طاقت کا اندازہ ہے تمھیں؟" اس نے کہا۔ "تمھیں کیا معلوم وہاں اس نے کیا حفاظتی انتظامات کر رکھے ہوں گے۔ اس کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہو گا اور اندر کتنے افراد سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔"

"تمھارے خدشات بجا۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم کوئی الٹی میٹم دے کر کُھلی جنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"ایم آر ایس تو گوریلا جنگ ہی لڑ سکتی ہے۔" محسن نے کہا۔

"مگر تم تو گوری... میرا مطلب ہے گوریلا لڑکیوں کو آگے بڑھا رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

"یہی تو ان کی یعنی ہماری اسکیم کی خوبصورتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ گامے ماچھی کے ہیڈ کوارٹر کو نہیں، گامے ماچھی کو تباہ کرنے کی اہل ہیں۔ اگر وہ یرغمال بنا لیا جائے تو مور چا سر۔ جہاں تک مجھے امید ہے اس کے اردگرد سب اسی کے چمچے موجود رہتے ہوں گے، جو اس کے باڈی گارڈ بن کے ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے ہوں گے۔ وہ شک کی صورت میں مردوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ان کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں مگر عورتوں کی بات مختلف ہے۔"

"فرض کرو ان کا مشن پورا ہو گیا۔" غالب نے کہا۔ "لیکن دوسری طرف سے تمھارا حملہ ناکام ہو سکتا ہے۔ اگر تم اندر نہ داخل ہو سکے تو کیا ہو گا؟"

"پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہو گا۔" محسن نے کہا۔ "سوئم ہو گا، چہلم ہو گا۔ کیا اتنا کافی نہیں؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم قلعے کے بیرونی حصار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اگر کسی وجہ سے اندر جانے کا راستہ نہ بنا سکے تو یہ گوری گوری... میرا مطلب ہے دو گوریلا لڑکیاں ہی اندر مردانگی کے 'سوری' زنانگی کے جوہر دکھائیں گی۔ گامے ماچھی کے سر پر کفن باندھ کے اور اس کی جان ہتھیلی پر رکھ کے آگے لائیں گی اور بند دروازے کھلوانے میں کامیاب رہیں گی۔ شرط یہی ہے کہ ایک گامے ماچھی کو ڈھال بنائے رکھے اور دوسری اپنی حفاظت کرے۔ پہلا کام گلبدن بیگم کر سکتی ہیں اور دوسرا دکیلن بیگم۔ ریوالور تو دونوں کے پاس ہوگا اور انھیں دُہرے قتلِ عام کی اجازت ہوگی۔ ایک تیرِ نظر اور بندوقِ حسن اور شمشیرِ ادا سے اور دوسرا گولیاں چلا کے۔"

"پہلے اس کو کیا کہتے تھے، میمنہ اور میسرہ" غالب نے کہا "دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے حملہ کرنے والے۔ تو کیا بائیں بازو میں ہم بھی شامل ہو جائیں"۔

"اب تک تم کدھر ہو؟" میں نے کہا "بہتر ہے کہ تم جہاں ہو وہیں رہو۔ کوئی ہم پر قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات کہنے والا اور شہدائے الفت کی شہادت کی خبر لگانے والا بھی تو ہونا چاہیے۔ تم ریزرو فورس میں ہو"۔

"لیکن صبح سے شام تک ہم کیا کریں گے" غالب بولا "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے؟" اس نے چوری چوری نازو کی طرف دیکھا لیکن نازو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس مشن میں اہم ترین رول اس کا بھی ہو سکتا ہے مگر یہ رول کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کب پڑے گی، یہ فیصلہ وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا"۔

"آج سراج آیا تھا" غالب نے اچانک کہا۔

"کس لیے؟" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ کہا۔

"بظاہر تو مجھ سے ہی ملنے آیا تھا" غالب نے کہا "ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ گلے میں پڑا ہوا تھا۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کو کہاں مل سکتا ہوں۔ بڑی اکڑفوں میں تھا جیسے مجھے تھانے میں اُلٹا لٹکا کے میری کھال میں بھُس بھروا دے گا اور سب کے بارے میں پوچھے گا۔ وہاں واسطہ پڑ گیا ایڈیٹر سے۔ وہ ایک خردماغ آدمی۔ اس نے کہا کہ ڈی ایس پی صاحب کوئی پولیس رپورٹ ہے یا وارنٹ ہے؟ نہیں ہے تو یہ بتلایئے کہ آپ کو اوپر آنے کی اجازت کس نے دی؟ اسٹاف کو پریشان کرنے آئے ہیں آپ؟ وہ کہنے لگا کہ میں کہیں بھی آنے جانے کا اختیار رکھتا ہوں اور کسی کو بھی شک میں گرفتار کر سکتا ہوں۔ ایڈیٹر تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ تم ہو کون؟ اسی وقت نکل جاؤ ورنہ دھکے دے کر نکلوا دوں گا اور سارے رپورٹر تمھارے پیچھے لگا دوں گا۔ بال کی کھال نکالنے والے اور کھال کے جوتے بنا کے مارنے والے۔ تمھارے اگلے پچھلے سارے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھاپ دوں گا" اس کی حالت غیر ہو گئی۔ جس قسم کا دھندا وہ کر رہا ہے اس میں یہ دھمکی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چور نہ ہوتا تو ڈرتا کیوں۔ فوراً ٹھنڈا ہو گیا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ایڈیٹر نے کہا کہ مطلب کی ایسی تیسی، میں جانتا ہوں اس علاقے کا ڈی ایس پی کون ہے۔ تم کہاں سے آ گئے، میرے اخبار کے دفتر میں گھس کر افسری کا اور اختیارات کا رعب جمانے کے لیے۔ میں نے کہا کہ یہ موی ایس پی سراج صاحب ہیں اور غالباً بارڈر ڈیوٹی پر ہیں۔ ایڈیٹر اچھل پڑا کہ اچھا! حضرت بارڈر سے آؤٹ آف بارڈر ہیں۔ میں بات کرتا ہوں ابھی آئی جی سے کہ ان کا ایک بہت فرض شناس افسر بے لگام ہو رہا ہے، اسے نکیل ڈال کے لے جائیں۔ سراج سخت مشتعل ہو کے گیا۔ چلتے چلتے میں نے پوچھ لیا کہ ڈی ایس پی صاحب! یہ ہاتھ بارڈر پر کسی معرکے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے ٹوٹا ہے کیا؟ یا کسی اور کا تمغۂ شجاعت ہے۔ بڑا قدر ناشناس محکمہ ہے۔ نہ ایک ایسے افسر کی ایمانداری پر انعام دیتا ہے نہ اس کی بہادری کی خبر۔ مت پوچھو، اس نے دل ہی دل میں مجھے کتنی گالیاں دی ہوں گی۔ وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ سڑک پر ہوتا تو مجھے گولی مار دیتا"۔

ہم سب کو سراج کی حالت کا تصور کر کے بہت ہنسی آئی۔

"تم نے کچھ پتا چلایا کہ وہ کہاں ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اتنا تو اس کے رویّے سے اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ وہ واقعی بارڈر کے کسی ضلعے میں ہے" غالب نے کہا "کہاں ہے یہ بھی پتا چل جائے گا"۔

صبح میں اور محسن الگ الگ گھر سے روانہ ہوئے۔ میرا کام زیادہ مشکل تھا۔ میری بغل میں زنانہ کپڑوں کے دو جوڑے تھے۔ دونوں رابعہ کے تھے اور خاصے قیمتی تھے۔ ان کے بدلے کوئی بھی غریب عورت اپنا پھٹا پرانا جوڑا مجھے دے سکتی تھی لیکن کسی عورت سے اس موضوع پر بات کرنا آسان نہ تھا۔ اس کا شک میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا۔ کئی جگہ میں نے غریب عورتوں کو کام کاج میں مصروف دیکھا۔ ان میں سڑک پر جھاڑو دینے والی بھی تھیں اور زیرِ تعمیر مکانوں میں مزدوری کرنے والی بھی لیکن مجھے کسی سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی چنانچہ پہلے میں نے اپنا مسئلہ حل کرنے کا سوچا۔ مال روڈ پر ایسی دکانیں تھیں جہاں ملازمین کے لیے ہر قسم کی وردیاں تیار کی جاتی تھیں لیکن وہاں مجھے نئی وردیاں ہی مل سکتی تھیں۔ اچانک مجھے ایک دھوبی نظر آیا۔ وہ ریڑھے پر اپنی گھر والی کو میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بٹھائے جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔

"مہینہ بھر میں کپڑے دھو کر کتنے کما لیتے ہو؟" میں نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"اب تو گزر اوقات بھی مشکل سے ہوتی ہے جی۔ ڈرائی کلینر نے آ گئے ہیں اور کپڑے دھونے والی مشینیں آ گئی ہیں۔ ہزار روپے مل جائیں تو سب کے ساتھ اس جناور کا پیٹ بھی بھرنا پڑتا ہے" اس نے گدھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا ایک بات تمھارے فائدے کی ہے" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "یہ سب پرانے کپڑے ہیں نا؟ اگر ان میں سے کوئی کھو جائے یا پھٹ جائے تو کیا کرتے ہو؟"

"بس جی ہاتھ پیر جوڑ کے معافی مانگ لیتے ہیں" وہ بولا۔

"اچھا فرض کرو میں تم سے چند جوڑے خریدنا چاہوں" میں نے کہا "دو بہت پرانے اور زنانہ۔ ان کے بدلے تم کو یہ دو جوڑے دوں"۔

"یہ میرے کس کام کے جی" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مطلب کیا ہے آپ کا؟"

"اگر میں تم کو ایک ہزار نقد دوں ابھی" میں نے صاف بات کرنا مناسب سمجھا "اور تم سے دو زنانہ جوڑے مانگوں، تین مردانہ۔ ایک ایک جوڑے کی قیمت دو دو سو روپے۔ تم تو پورے ہزار کے فائدے میں رہو گے۔ ہاتھ پیر جوڑ کے نقصان معاف کرا لو گے"۔

"یہ کیا چکر ہے جی! آپ پرانے کپڑوں کے ایک ہزار کیوں دے رہے ہو؟" وہ بولا۔

"کوئی چکر نہیں۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو" میں نے کہا۔ "اگر ایک ہزار کم ہیں تو پندرہ سو لے لو"۔

"پندرہ سو" اس کی آواز بند ہو گئی "دیکھو سرکار! یہ ضرور کوئی گڑبڑ معاملہ ہے۔ پرانے کپڑے لنڈا بازار میں ملتے ہیں"۔

"مجھے بھی معلوم ہے" میں نے کہا "مگر وہاں میموں کے کپڑے ہوتے ہیں۔ مجھے انگریزی کپڑے نہیں، دیسی کپڑے چاہئیں اور وہ بھی پرانے۔ ہم ایک ڈراما کر رہے ہیں کالج میں، جس کے لیے میلے اور پرانے کپڑوں کی ضرورت ہے ورنہ ایسے نئے اور قیمتی کپڑوں کی تو ہمارے گھروں میں بھی کمی نہیں۔ تم کو دینے ہوں تو دو ہزار میں دے دو ورنہ میں کسی اور دھوبی سے بات کرتا ہوں"۔

"لے لیں سرکار لے لیں" وہ مجھے روانگی اختیار کرتے دیکھ کر بولا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں دھوبی گھاٹ چلا گیا تو اس سے آدھی رقم میں میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں نے کپڑوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر تین پرانے مردانہ جوڑوں کا انتخاب کیا۔ تینوں کسی ہمارے قد و قامت کے آدمی کی وردیاں تھیں۔ ایک خاکی، ایک نیلی اور ایک سفید۔ پھر کچھ سوچ کے میں نے صرف نیلی وردی رہنے دی اور دو زنانہ جوڑے منتخب کر لیے۔ دونوں جوڑے بہت میلے تھے۔ ان میں سے ایک رابعہ پہن سکتی تھی اور دوسرا نازو۔ دونوں ہی کسی غریب عورت نے اپنے ہاتھ سے سیے تھے چنانچہ ان کا فیشن سے دُور کا تعلق نہ تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ رابعہ اور نازو کو تھوڑے بہت ڈھیلے ہی رہیں گے۔ دونوں بہت معمولی سوتی کپڑے کے پرنٹ تھے۔ پھر میں نے دو سفید لٹھے کے مینٹ ٹاپ برقعے منتخب کیے تو دھوبی نے واجبی سا احتجاج کیا کہ سودے میں یہ شامل نہیں تھا اور اس مرتبہ میں مرعوب نہیں ہوا بلکہ اسے معاہدہ منسوخ کرنے کی دھمکی دے دی۔ وہ چپ ہو گیا اور میں نے گن کر اس کے ہاتھ پر سو سو کے بیس نوٹ رکھ دیے۔ دھوبن منہ کھولے اس کارروائی کو دیکھتی رہی۔ سو کے اتنے نوٹ اس نے ایک ساتھ پہلی بار دیکھے ہوں گے۔ وہ دھوبی کے مقابلے میں بہت صحت مند اور جوان تھی۔

"تھینک یو میڈم" میں نے دھوبن کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا کے کہا اور تقریباً رکوع میں چلا گیا۔ دھوبن مسکرائی۔

"چلو، اب جاؤ۔ یہ تھیٹر والی مسخری مت کرو ہماری جورو کے ساتھ" دھوبی نے بُرا مان کے کہا اور گدھے کے ایک دولتی ماری۔ گدھے نے بے سبب تشدد پر واجبی سا احتجاج کیا اور چل پڑا۔ گدھے کو کیا معلوم کہ درحقیقت دھوبی نے دولتی میرے رسید کی تھی۔ کپڑوں کے بنڈل کو بغل میں دبانے سے پہلے میں نے ایک گٹھڑی سی بنائی۔ نیلی وردی کے علاوہ میں نے ایک برقعے میں چار زنانہ جوڑے ڈالے۔ دو نئے اور ریشمی، دو پرانے اور سوتی۔ دوسرا برقع بھی اسی میں ڈالا "برقع در برقع" میں نے گٹھڑی کو کندھے پر ڈالتے ہوئے خود سے کہا اور واپسی اختیار کی۔ مجھے تین وردیاں خریدتے وقت یاد آ گیا تھا کہ دو وردیاں تو پہلے سے ہمارے پاس ہیں۔ ایک ویٹر کی اور ایک پوسٹ مین کی۔ اسی خیال نے مجھے "فضول خرچی" سے روک لیا تھا۔

میں واپس پہنچا تو محسن لوٹ کر آ گیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ ٹیکسی تھی جو گلی میں پھنسی کھڑی تھی۔ تھوڑا سا غور کرنے پر میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ہمارے لینڈ لارڈ کی ٹیکسی تھی۔

"یہ ٹیکسی کہاں سے مل گئی تجھے؟" میں نے کہا۔

"بس ایسے ہی سرِ راہ ان سے ملاقات ہو گئی" محسن بولا۔ "زبردستی مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا کہ سوہنیو، ایہہ وی ستے گڈی ہی اے۔ چنگا بھلا چلدی پے" اس نے مالک مکان کی نقل اتار کے بتایا۔" میں نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا۔ جبھی جو کام چٹکی بجانے سے ہو جائے اس کے لیے مُکا مارنے کی کیا ضرورت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت آپ خوب ملے۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی گڈی کی تلاش تھی جو چلتی ہو۔ ان سے دن بھر کے لیے معاملہ طے کر لیا۔ بہت وضعدار آدمی ہے۔ کہتا تھا کہ آپ کی گڈی ہے، جو خوشی ہو دے دینا۔ یہ بہت مسئلہ بن جاتا ہے۔ جب کوئی سب کچھ ہماری خوشی پر چھوڑ دے۔"

"ہاں، اپنے منہ سے وہ مانگتا تو کتنا کرایہ مانگتا۔ تین سو، زیادہ سے زیادہ چار سو۔" میں نے کہا "میری خوشی پر چھوڑا تو مجھے پانچ سو روپے دینے پڑ گئے۔"

"میں نے بھی تین سو دیئے۔" محسن نے کہا "اور یہ بھی بتا دیا کہ رات کو دیر ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ ہو سکتا ہے ہم ٹیکسی کو دو دن استعمال کریں۔"

"اگر ہم لوٹ کر ہی نہ آئے۔" میں نے کہا "یا کسی وجہ سے بھاگنا پڑا تو ٹیکسی کیسے واپس کریں گے اور اگر اس معرکے میں ٹیکسی بھی کام آ گئی تو کیا ہوگا۔"

"اسے قیمت دے دیں گے۔ اتنی کہ وہ اس سے بہتر حالت کی گاڑی خرید لے۔" محسن بولا "ویسے ہم واپس آئیں گے۔"

میں نے سر ہلا کے اس کے یقین کی تائید کی "اب آپ خواتین ذرا یہ میدان جنگ کا لباس بدل کے آئیں۔" میں نے کہا۔

جب وہ ڈھیلے، بدوضع اور انتہائی میلے کپڑے پہنے، اور سر پہ نہایت واہیات طریقے سے دوپٹہ ڈالے واپس آئیں تو ہنستے ہنستے میری اور محسن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رابعہ نے مجھے تھوڑا سا جھک کر اپنی چال بھی دکھائی اور بدلی ہوئی آواز بھی سنائی۔ پھر ہم نے وردیاں زیب تن فرمائیں۔ ان کی حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔

"تم پر تو یہی ویٹر کی وردی جچتی ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، کیونکہ میں واقعی ویٹر ہوں، انتظار کرنے والا۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور آنکھیں بند کر کے انتہائی عاشقانہ انداز میں کہا "کتنے جنم بیت چکے تھے تمہارے انتظار میں مگر یہ ویٹر پھر بھی انتظار کر رہا تھا۔" رابعہ کا رنگ لال ہو گیا۔

"ہم سب ویٹر ہیں، انتظار کر رہے ہیں۔" محسن نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا "اپنی اپنی امیدوں کے بر آنے کا۔ اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے کا۔ دنیا میں ہر شخص ویٹر ہے۔ کسی نہ کسی کا انتظار کر رہا ہے، وقت کا، خوش قسمتی کا، اس محبوبہ کا جو رقیب رو سیاہ کے چھ بچوں کی ماں بن چکی ہے، گاڑی کے لیٹ ہونے کا۔"

"ان دونوں کو موقع ملنا چاہیے۔ ایک مصرع کہتا ہے تو دوسرا گرہ لگاتا ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہنستے نازو سے کہا جو خود بھی ہنس رہی تھی۔

"یہ گاڑی کے لیٹ ہونے کی کیا بات ہوئی؟" نکالے...

"وہ ہے ایک لطیفے کی بات، خواتین سے معذرت..."

وہ بولا "ایک سردار صاحب ہر روز ایک ہی فلم کو کئی دن دیکھ...

رہے ـــ ایک خاص وقت پر ٹکٹ لے کر پہنچتے اور فوراً ہی... تقدیر کو کوستے نکل آتے۔ بالآخر ایک دن بکنگ کلرک نے... پایا کہ یہ چکر کیا ہے۔ سردار جی نے سر پہ ہاتھ مار کے کہا کہ چکر یہ...

تقدیر کا ہے۔ مجال ہے جو گاڑی ایک منٹ لیٹ ہو جائے... فلم میں ایک سین تھا جب ہیروئن کسی جھیل میں غسل کا ارادہ... ہے اور اتنی دیر میں ٹرین آنے سے اس کے غسل کا منظر غائب ہو جاتا تھا۔ ٹرین کے گزر جانے کے بعد پانی میں صرف اس کا...

نظر آتا تھا۔"

"بے شرم بے شرم۔" رابعہ نے چلا کے کہا "شرم آنا چاہیے تم اپنی بات کو سردار جی سے منسوب کرتے ہو۔"

"چلو بھئی اب تیاری پکڑو۔" میں نے فوراً مداخلت کی... سب کی ہنسی بند ہی نہ ہوتی "آپ دونوں کے پاس ایک... سائیلنسر والا ریوالور ہوگا۔ اسے کہاں محفوظ طریقے پر چھپایا... جا سکتا ہے۔ یہ آپ دونوں کا مسئلہ ہے۔ ہم لوگ آپ کے... نہیں جا رہے ہیں۔ آپ دونوں برقعے میں نکلیں اور کسی تانگے والے... سے بات کریں۔ وہ آپ کو گامے ماچھی... میرا مطلب ہے گامے شاہ کی درگاہ تک پہنچانے کے بیس پچیس روپے لے... آگے کیا کرنا ہے "یہ میں سمجھا چکا ہوں۔ سب کچھ آپ دونوں کی... اداکاری اور حاضر دماغی پر منحصر ہے۔"

"تم لوگ کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے؟" رابعہ نے کہا۔

"میرا اندازہ ایک گھنٹے کا ہے۔" میں نے کہا "اگر... کچھ ہماری توقعات کے مطابق ہوا تو ہم دو بجے اندر ہوں گے... دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تم گامے ماچھی کو اور اس کے کسی چیف سیکرٹری... ہولڈ اپ رکھو گی۔ گن پوائنٹ پر انہیں کھڑا رکھنا اور ہمارے... کی آواز سن کر اندر سے راستہ کھلوا دینا۔ ہم پہلے روانہ ہو رہے...

ٹیکسی کی ڈرائیونگ محسن نے سنبھال لی۔ اس کے ساتھ... میں رہا اور نیک محمد پیچھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم نے... کو گامے ماچھی کے اڈے سے سو گز کے فاصلے پر روکا۔ تانگا... گھنٹے میں ٹھیک ایک بجے پہنچا اور ہم نے برقعے میں چھپی... رابعہ اور نازو کو تانگے سے اتر کے درگاہ کی جانب بڑھتے... میری نگاہ دروازے پر گئی، جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے...

وہ شخص صورت آشنا لگا اور عین اس وقت جب میں اسے دیکھ رہا تھا اس کی اور میری نظریں ملیں۔ ہم اپنی ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے اس شخص سے بہت دور تھے اور درمیانی فاصلہ ڈیڑھ دو سو گز کے درمیان تھا چنانچہ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ شخص مجھے پہچان لے گا۔ ایک تو میں وردی میں تھا اور میرے سر پر جو پی کیپ تھی وہ میرے آدھے چہرے کو چھپا لیتی تھی پھر یہ کہ میرا چہرہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے تھا۔ اس کے برعکس وہ پوری روشنی میں تھا اور اس کی صورت کو میں ہر پہلو سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں بیٹھا ہوا خوف مجھے پریشان کرنے لگا۔

"یار محسن! اب اچانک مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ ہم نے دونوں لڑکیوں کو اکیلا بھیج کر اچھا نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"دونوں اور اکیلی؟" محسن دانت نکال کر بولا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ چور اور لاٹھی دو۔ میں اور بابو اکیلے۔"

"ان کے ساتھ شہلا ہوتی تو یہ تینوں کو اکیلا مان لیتا سکندر بادشاہ۔" نیک محمد بولا۔

"بات مذاق کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس شخص کو غور سے دیکھو جو گامے شاہ کے مزار کی عمارت کے بڑے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس کے تیور خطرناک ہیں۔"

"اس کا مونچھوں کو بل دینے کا انداز بھی خطرناک ہے۔ اس کی مونچھیں بھی خطرناک ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یہ تو سارا مشن ہی خطرناک ہے۔ اس میں کسی ایک آدمی کے خطرناک ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا تجھے اس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے کہا۔

"تجھے اور مجھے ہر رسی اگر سانپ نظر آتی ہے تو قصور ہماری نظر کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس شخص سے ہماری سابقہ ملاقات انتہائی غلط حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات اس وقت بھی سازگار نہیں ہیں۔" محسن نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ..... کہ ہم میں سے کسی کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔" میں نے اترنے کی نیت سے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" محسن نے میرا بازو تھام لیا۔ "وہ اندر جا چکی ہیں۔ تو ان کی طرح داخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے تجھے شناخت کر لیا تو سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"اگر نیک محمد چلا جائے؟" میں نے قائل ہو کر مایوسی سے کہا۔ "اسے کون پہچانتا ہے۔"

"میں..... میں اکیلا کچھ نہیں کر سکوں گا سکندر بادشاہ، سچی بات ہے کہ ہم تمہارے کہنے پر توپ سے لڑ جائیں مگر خود اپنی عقل سے کام لینا پڑے تو ساری ہوشیاری دھری رہ جاتی ہے۔" نیک محمد نے خفت اور عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"یہ نہ ہو بنا بنایا کام بگڑ جائے۔"

"اب منصوبے میں کوئی تبدیلی ہوئی تو کنفیوژن پیدا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "بس اب آگے چلو۔"

ابھی دل اور دماغ کی کشمکش جاری تھی کہ محسن نے ٹیکسی کو آگے بڑھا دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد اس نے سڑک کو چھوڑ کر سیدھے ہاتھ پر کچا راستہ اختیار کیا جو تانگوں، بیل گاڑیوں اور موٹروں کی آمد و رفت سے مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ راستے کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک وقت میں اس پر سے ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی چنانچہ سامنے سے تانگا نمودار ہوا تو محسن کو ٹیکسی انتہائی بائیں طرف کرنا پڑی۔ اس کے دو پہیے ایک کھیت کی منڈیر پر تھے اور دو کچے راستے پر۔ اس سے ٹیکسی بہت زیادہ ایک طرف جھک گئی تھی۔ گھوڑے کی ہر ٹاپ کے ساتھ گرد اڑتی تھی۔ تانگا گزر گیا تو محسن نے ایک دم کلچ دبا کے ایکسلریٹر دبایا اور انجن گرجا تو پیچھے دھول کا بادل سا اٹھا۔ تانگے والے نے ہماری شان میں کیا ارشاد فرمایا، وہ ہم کانی آگے نکل جانے کی وجہ سے نہ سن سکے۔ ہم اب ایک خاصی چوڑی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔

"راستہ تو وہی ہے لیکن مجھے بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تبدیلی تو ایک قدرتی امر ہے۔ بہت سے مکانات نئے بنے ہیں اور پرانے مکانات کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس مسجد کو پہچان رہا ہوں۔ یہ بھی بہت پھیل گئی ہے۔"

"اس سے آگے دائیں طرف جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "گیراج سامنے آئے گا۔"

گیراج کا بیرونی احاطہ موڑ کاٹتے ہی نظر آ گیا۔ محسن نے فوراً ٹیکسی کو روک لیا اور نیچے اتر کے بونٹ اٹھا دیا۔ چند منٹ وہ اس کے اندر گھسا انجن کا معائنہ کرتا رہا پھر میں بھی اتر گیا اور میں نے اس کی مدد کی۔ میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کھولی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور محسن نے اس کے اندر گھومنے والا "روٹر" نکال لیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس پر ایک پتھر سے ضرب لگائی۔ روٹر کے دو حصّے ہو گئے۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ دونوں حصّوں کو آپس میں ملا کے میں نے پھر ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر لگا دیا لیکن اس کا اپنی جگہ پر ٹھہرنا محال تھا۔ میں نے کیپ بند کی اور محسن نے بونٹ گرا دیا۔ اب ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اناڑی ڈرائیوروں کی طرح محسن نے اگنیشن سوئچ کو آن کیا اور سیلف کو گھماتا رہا۔ بیٹری کہاں تک ساتھ دیتی۔ ذرا سی دیر میں سیلف کے گھومنے کی رفتار کم ہو گئی اور کاربوریٹر میں بہت زیادہ پٹرول آ گیا۔ 'اوور' ہو جانے سے پٹرول کی بو آنے لگی۔ اب اگر بیٹری میں جان ہوتی تب بھی گاڑی دھکا لگائے بغیر اسٹارٹ نہیں ہو سکتی تھی لیکن محسن نے سیلف کو گھمانے کا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ بیٹری ڈسچارج ہو گئی اور ریڈی ایٹر کا پنکھا آخری بار تھوڑا سا ہل کے ساکت ہو گیا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی گھمانے سے اب 'کٹ کٹ' کی آواز سنائی دیتی تھی اور ہارن کا بٹن دبانے سے ایک بیٹھی ہوئی بے سُری اور مضحکہ خیز آواز نکلتی تھی۔

سر ہلا کے ہم نے ایک دوسرے سے "اوکے" کہا اور ہمارے اشارے پر نیک محمد بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے پیچھے سے گاڑی کو دھکیلنا شروع کیا اور محسن کے ساتھ مل کر میں نے کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر زور لگایا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو بھی کنٹرول کیا اور بیس منٹ کی سخت مشقت کے بعد ہم ٹیکسی کو گیراج کے بیرونی احاطے تک لے گئے۔ دوپہر کا سورج ڈھل چکا تھا چنانچہ دھوپ ہمارے چہروں پر سیدھی پڑ رہی تھی۔ نیچے زمین ناہموار تھی اور گرد میں آدھے دھنسے ہوئے پہیّوں والی گاڑی کو دھکا لگانے میں دُگنا زور صرف ہوتا تھا۔ گیراج کے بیرونی احاطے کی دیوار اتنی ہی بلند تھی جتنی پہلے تھی مگر اس کے اوپر پانچ پانچ گز کے فاصلے سے اینگل آئرن کے پول کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ہر پول کی بلندی تین فٹ تھی اور اس سے اوپر کا حصّہ باہر کی جانب تقریباً ایک سو دس درجے کے زاویے پر مڑا ہوا تھا۔ اس مڑے ہوئے حصّے کی لمبائی ایک فٹ تھی۔ خاردار تاروں کی تین قطاریں ایک دوسرے کے متوازی اور آپس میں ایک فٹ کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی جاتی تھیں۔ پول کے باہر کی جانب جھکے ہوئے حصّے پر ایسی دو قطاریں تھیں چنانچہ ان کا درمیانی فاصلہ چھ چھ انچ رہ گیا تھا۔ اتنا زبردست حفاظتی نظام خود شکوک کو دعوت دیتا تھا۔ گیراج کوئی ٹکسال یا سرکاری خزانہ، جیل یا انتہائی اہم اور ٹاپ سیکرٹ سرکاری ادارہ ... جہاں مداخلتِ بے جا کو جرم تصوّر کیا جائے۔

"کیا ان تاروں میں کرنٹ بھی ہوگا؟" نیک ... ہانپتے ہوئے سر اٹھایا۔

"اگر ہو تو مجھے تعجب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا ... تصدیق کے لیے تم کسی تار سے جھول کے دیکھ لو۔"

"ارے سکندر بادشاہ، کیوں اس دنیا سے ... ہو۔" نیک محمد بولا۔ "ابھی تک تو کسی کا برا بھی نہیں ... ہم نے۔"

فصیل نما احاطے کی دیوار کے وسط میں لوہے ... ہی گیٹ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اندر پانچ گاڑیاں کھڑی ... تھیں۔ ایک بس تھی جس کے چاروں ٹائر غائب تھے ... ڈھانچہ اینٹوں کے سہارے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ... نوجوان لیٹے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ دوسرا ٹرک تھا جو ... سے الگ کھڑا ہوا تھا اور بظاہر اس میں کسی خرابی کا ... نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ٹرک نیا تھا۔ ایک کار پر رنگ ... رہا تھا اور اس کی حالت قبر سے نکلے ہوئے ڈھانچے ... لگتی تھی کیونکہ آگے پیچھے کی تمام لائٹس، بمپر اور شیشے ... لیے گئے تھے۔ اس کی باڈی پر سلیٹی سا رنگ تھا جسے ... کم عمر لڑکے پانی ڈال کے ریگ مال سے گھسنے میں مصروف ... تھے اور بار بار اس کی ہموار سطح پر ہاتھ پھیر کے دیکھتے ... تھے۔ ورکشاپ میں نظر آنے والے حصّے کے مقابل ایک گاڑی ... بونٹ آگے سے اٹھا ہوا تھا اور دوسری کا پیچھے سے ... گاڑی فاکس ویگن تھی مگر اس کا انجن غائب تھا اور غالباً ... اوور ہال کرنے کے لیے نکالا گیا تھا۔ ان دونوں گاڑیوں ... کوئی بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہم نے ٹیکسی کو ٹرک اور ورکشاپ کے درمیان ... روکا۔ ہمارے قدموں کی آواز اور ٹیکسی کے مختلف حصّوں ... برآمد ہونے والی فریاد و فغاں نے بس کے نیچے لیٹے ... نوجوانوں کو متوجہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنے منہمک ... تھے کہ انہیں گرد و پیش کی خبر نہ ہوتی۔ ان میں سے ... تھا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور مشکل سے سولہ سال کا تھا ... تیور بتاتے تھے کہ اپنے آپ کو بدمعاش ظاہر کر کے ... حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا بیس بائیس سال کا نستعلیق ... صورت مکینک تھا۔

"کیا بات ہے جی؟ حکم کرو۔" بڑے لڑکے نے کہا۔

"حکم صرف یہ ہے مونتیاں والیو کہ اس گڈی ... دلو۔" نیک محمد بولا۔

چھوٹا لڑکا ہنسنے لگا۔ "او جی! اس نے اب نہیں چلنا۔ اتنی عمر میں تو بندہ بھی فوت ہو جاتا ہے۔"

اس کے جواب سے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیکسی واقعی ستّر اسی برس پورے کر چکی ہے۔ "تم اس عمر میں بے شک فوت ہو جانا لیکن یہ ٹیکسی ہے کاکا۔" نیک محمد نے خفگی سے کہا۔

"استاد کدھر ہے تمہارا؟" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ورنہ ان کی زبانی جنگ بڑھ جاتی۔

دوسرا جوان آگے بڑھا۔ "ہمیں بتاؤ جی کیا ہوا ہے؟"

"بتایا نا کہ گاڑی چل نہیں رہی ہے۔ اسے چالو کر دو۔" میں نے کہا۔ نوجوان نے بونٹ کھول کر انجن کا ایک نظر میں جائزہ لیا، پلگ ہلا کے دیکھے۔ کوائل اور کنڈنسر کے تار چیک کیے اور محسن سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ محسن نے تعمیل کی مگر پنکھا تھوڑا سا ہل کر رک گیا۔ مکینک نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا کہ بیٹری بالکل گل ہو گئی ہے، خرابی کیسے چیک کی جائے۔

میں نے اتنی دیر میں گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ احاطہ دو کنال کا تھا۔ ورکشاپ اس کے دائیں جانب دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصّہ تو وہی عارضی سا شیڈ تھا جس کی دیواریں بھی لکڑی کی تھیں اور جس پر ٹین کی چھت تھی۔ دونوں زیرِ مرمّت کاریں اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ دوسرا حصّہ کچھ ہوائی جہازوں کے ہینگر کی شکل کا تھا مگر اتنا بڑا نہیں تھا۔ یہ اینٹوں کی پختہ عمارت تھی جس کی دو دیواریں پندرہ فٹ اونچی اور تیس تیس فٹ لمبی تھیں پچھلی طرف سے اس کی دیوار وہی تھی جو بیرونی فصیل پر اٹھائی گئی تھی اور اس طرح یہ بیرک ایک کونے میں سما گئی تھی۔ مجموعی طور پر ورکشاپ اور بیرک نے احاطے کا نصف کے قریب حصّہ گھیر رکھا تھا۔

بیرک کے سامنے والا حصّہ دو بھاری بھرکم کواڑوں پر مشتمل تھا جو لوہے کی موٹی چادر پر اینگل آئرن کو ویلڈ کر کے بنائے گئے تھے اور اس وقت مقفل تھے۔ انہیں کھولنے کا نظام نیچے والے دروازوں کی طرح نہیں تھا۔ پندرہ فٹ چوڑے دونوں پھاٹک دھکیل کر اِدھر سے اُدھر کیے جا سکتے تھے اور فرش کی ریلنگ پر چلتے تھے۔ احاطے کا دوسرا حصّہ بالکل مخالف سمت میں تھا اور رہائش کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ چنانچہ یہ بات بلا شک و شبہ کہی جا سکتی تھی کہ گاما ماچھی کے اڈے تک جانے والا زیرِ زمین راستہ اس مقفل بیرک میں ہی تھا۔

"تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ استاد کو بلاؤ۔" محسن نے مکینک کو ڈانٹا۔

"بیٹری گُل ہے تو استاد بھی کیا کرے گا۔" مکینک نے اپنی سُبکی کو نظر انداز کر دیا مگر استاد کا وقار بلند رکھا۔ "وہ چھوٹا کام نہیں کرتا۔"

"چھوٹے کام کے بچّے، وہ دوسری بیٹری لگا کے نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے ایک دم گرج کر کہا۔ "اتنی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ سب میں بیٹری ہوگی۔ پھر لگا دینا چارجر پر۔"

مکینک پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے چھوٹے کی طرف دیکھا اور استاد کو بلانے کے لیے رہائشی مکان کی طرف چل پڑا۔ میں نے استاد کو گھر کے دروازے پر لہرانے والا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے باہر آتے دیکھا۔ معلوم نہیں مکینک نے اسے کیا بتایا کہ وہ سر ہلا کے نپے تلے قدم اٹھاتا ہماری طرف آیا۔ وہ درمیانے قد لیکن مضبوط جسم کا آدمی تھا جس نے ڈھیلی ڈھالی اور میلی سفید جرسی کے ساتھ براؤن رنگ کی گرم پتلون پہن رکھی تھی۔ میں بے نیازی سے مخالف سمت میں دیکھتا رہا۔ اصل مقصد اسے اپنا چہرہ نہ دکھانا تھا۔ استاد نے کسی سے بات کیے بغیر انجن کو دیکھا اور پھر شاگردِ محترم کے ایک جھانپڑ رسید کیا جو اس کی گُدّی پر پڑا۔

"حرام خور، بس تار دیکھ لیے اور کام ختم۔ یہ ڈسٹری بیوٹر کیپ تیرا باپ کھولے گا۔" استاد نے کہا اور کھٹ سے کلپ ہٹا کے کیپ کا اوپر والا حصّہ الگ کر دیا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے سینئر اور مظلوم صورت شاگرد کے دوسرا ہاتھ بڑی پھرتی سے مارا جس کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔ "کیا ہے یہ ہدّوٹر کو دیکھ۔ یہ گاڑی چل سکتی ہے۔" پھر وہ محسن سے مخاطب ہوا جو اس کے بالکل سامنے آ گیا تھا۔ "یہ چیز لے آئیں۔ شہر ہی سے ملے گی۔" وہ ٹوٹے ہوئے روٹر کے دونوں حصّے محسن کو تھما کے بولا۔

"ارے استاد، ان میں سے کسی گاڑی کا روٹر ڈال دو۔" محسن نے کہا۔

"وہ میرے باپ کی گاڑیاں نہیں ہیں۔ اگر کسی میں کیپ کا سائز یہی ہوا تب بھی گاہک کے ساتھ بے ایمانی ..."

"بے ایمانی کیسی استاد۔" محسن نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ "تم بعد میں نیا منگوا کر لگا دینا۔ پیسے ہم سے لے لو، آنے جانے کے بھی مگر ہمارا کام کر دو۔"

استاد نے اضافی منافع کے امکان پر غور کیا اور محسن پر رحم کھاتے ہوئے سر ہلایا۔ "دیکھا! اس فاکسی کے انجن میں سے روٹر لگا دے۔ اسے تو ابھی کھول کر باندھنے میں ہفتہ لگے گا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

استاد کو اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مہلت دینا بے سود تھا۔ اصل مقصد یہ جاننا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہم کس گاڑی کی کیپ سے سالم پُرزہ نکال کے اپنی ٹیکسی کو رواں کر سکتے ہیں۔ میں نے اطمینان سے اپنا ریوالور نکالا اور استاد کی پشت سے لگا دیا۔ سامنے سے محسن نے یہی حرکت کی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے نیک محمد نے تیسری طرف پوزیشن سنبھال لی جہاں دو بچے کار کی گھسائی میں مصروف تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ رک گئے اور ان کی صورت پر خوف سے زیادہ حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ خطرناک کھلونا اس سے قبل انہوں نے صرف فلموں میں استعمال ہوتے دیکھا تھا لیکن یہاں نہ مار دھاڑ ہو رہی تھی اور نہ کوئی ایسی صورتِ حال نظر آئی تھی کہ سچ مچ کے ریوالور نکال لیے جائیں۔ میں نے اس وقت استاد کی صورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی صورت بھی اجنبی نہیں تھی مگر ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آیا کہ پہلے یہ صورت کب اور کہاں نظر آئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں حافظے کا ساتھ نہ دینے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ دلاور اینڈ کمپنی سے معرکہ آرائی میں مختلف مواقع پر ان کے ساتھ آنے والے چمچے بھی بہت ملے تھے اور ان سب کے نام تک ہمیں معلوم نہ ہو سکے تھے۔ ان میں سے کچھ کو قضا لائی تھی کہ وہ رزقِ خاک ہوئے اور دوبارہ نہیں ملے۔ یہ دونوں بھی ایسے ہی کرائے کے گوریلے یا حکم کے غلام تھے جو دلاور اینڈ کمپنی کی شیطانی بساط پر پیادوں سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

"اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟" استاد نے اپنی خود اعتمادی اور ظاہری حالت کے سکون کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم بہت کچھ بے مقصد بھی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کچھ لوگ بے مقصد جیتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "لیکن بے مقصد مرنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ تم بھی یہی چاہو گے۔"

"مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" استاد نے غرّا کر کہا۔ اس کو اب یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم اسے بے سبب قتل نہیں کریں گے۔ ہمیں یہی کرنا ہوتا تو اب تک تین طرف سے تین گولیاں اس کو پنکچر کر چکی ہوتیں۔ شاگردوں کے سامنے اس کو یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ وہ واقعی استاد ہے اور ہر قسم کی خرابی سے نمٹ سکتا ہے خواہ وہ انجن کی ہو یا حالات کی۔

"سب سے پہلے تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سب کے ہاتھوں میں جتنے ریوالور ہیں اصلی اور ایک جیسے مہلک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کی صورت سے بھی اندازہ لگانے کی غلطی مت کرنا۔ ہم سب ایک جیسے بے رحم ہیں۔ دشمن کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے قائل نہیں اور کسی کو کہے کے بغیر گولی چلاتے ہیں۔ ہم سب کا نشانہ بھی خطا نہیں"

"اس فضول بکواس کا مطلب کیا ہے؟"

"تمہیں یہ بتانا کہ ہم تمہیں قتل کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں مگر تم ہمارے ہاتھوں مرنا چاہو تو بہادری یا بے وقوفی کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر تم ویسا ہی کرو جیسا ہم کہیں گے تو کل بھی زندہ نظر آؤ گے۔"

"ویسے تو موت کا ایک دن معین ہے۔" محسن بولا۔ "تمہارے کیس میں وہ آج کا دن ہے تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔"

"تمہارے یہ شاگردانِ عزیز تو بچے ہیں۔" میں بولا۔ "ان کو بھی سمجھا دو کہ دخل در معقولات نہ کریں۔ بہتر ہوگا یہ رضاکارانہ طور پر گیراج میں چلے جائیں اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں۔ منہ دیوار کی طرف سر سے اوپر۔"

استاد نے میری بات کو ظاہری بے نیازی سے سنا اور سیدھا کھڑا رہا۔ اس کے شاگرد بھی ساکت و جامد

"تم ان سب کے سامنے پٹنا چاہتے ہو؟" میں نے

"ابھی اپنی عزت بچا سکتے ہو کیونکہ تم تین طرف سے گھرے اور ریوالور کا مقابلہ کوئی عقلمند آدمی نہیں کرتا جو خالی ہاتھ ہو۔"

"تم اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت تیس سیکنڈ میں سکتے ہو۔" محسن نے کہا۔ "ان سے کہو شرافت سے گیراج میں جائیں اور الٹے لیٹ جائیں۔ لیٹ کر ایک دوسرے سے گپ شپ کریں یا اظہارِ افسوس مگر آواز کا والیوم رکھیں، باہر کوئی کچھ نہ سنے۔"

"پہلے استاد کو خالی ہاتھ تو کر دو۔" میں نے محسن سے کہا۔ "یہ خود کو مسلح سمجھتے ہوئے خواہ مخواہ موقع ملنے کا فرما رہے ہیں۔"

صورتِ حال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں تھی۔ بڑے اطمینان کی بات تھی لیکن یہی اطمینان ایک غلطی کا سبب بن گیا۔ نیک محمد نے طے شدہ پروگرام کے مطابق اتنی دیر میں گیراج کا باہر والا گیٹ بند کر دیا تھا اور اس کی بلیک بورڈ والی سطح پر چاک سے واضح الفاظ میں تھا۔ "استاد کی زوجہ کے عقد کے باعث گیراج بند ہے" جو بڑی فضول سی بات تھی مگر محسن کا خیال تھا کہ آس

کے رہنے والے بھی کم فضول نہیں ہیں چنانچہ وہ اس نوٹس کو دیکھ کر خاموشی سے لوٹ جائیں گے اور اسے بالکل مذاق نہیں سمجھیں گے۔ رنگ ہونے والی گاڑی کو ریگ مال سے گھسنے والے بچے قطعی بے ضرر تھے اور ہم نے انہیں اہمیت نہیں دی تھی مگر باقی دو سینئر شاگردوں کو سامنے رکھا تھا۔ غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ ہم نے انہیں استاد کے برابر خطرناک نہیں سمجھا اور عین اس وقت جب محسن نے میرے کہنے پر استاد کی جیب سے اسلحہ برآمد کرنے کے لیے قدم بڑھائے مظلوم صورت نظر آنے والے نوجوان نے بڑی پھرتی سے اچھل کے لات ماری۔ محسن اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ محسن لڑکھڑا کے پیچھے گیا اور وہ نوجوان نیچے گرا مگر اس سے پہلے ہی استاد نے ایک لات پیچھے کی طرف چلائی اور دوسرے پیر کی ایڑی پر گھوم کر میرے سامنے آنا چاہا۔ اس کا ہاتھ خود بخود ریوالور نکال چکا تھا مگر اس نوجوان کے محسن پر حملہ آور ہوتے ہی میں ذہن اور جسم کے خودکار عمل سے پوری طرح مستعد ہو چکا تھا۔ نیک محمد نے دونوں جوانوں کو للکارا اور پھر ایکشن کھڑا کر دیا۔

میں نے ہاتھ کو استاد کی ٹانگ کی ضرب سے بچایا اور دوسرے ہاتھ سے اسی ٹانگ کے پنجے کو گرفت میں لے لیا۔ ادھر استاد نے ایڑی پر گھومنے کی کوشش کی ادھر میں نے جھٹکا دیا اور استاد کا توازن بگڑ گیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے باوجود استاد نے پلٹ کر فائر کرنا چاہا لیکن میں اپنا ایک پیر اس کے ہاتھ پر رکھ چکا تھا۔ وہ درد سے کراہا۔

"بس استاد! اسے سجدۂ شکر سمجھو۔" میں نے کہا۔ "شاید خدا کو منظور نہیں تھا کہ تمہاری بیوی اس عمر میں بیوہ ہو اور تمہارے جتنے بھی بچے ہیں وہ یتیم کہلائیں لیکن یہ بالکل آخری موقع تھا۔ سو فیصد آخری۔"

محسن نے جھک کر ایک جھٹکے سے استاد کا ریوالور قبضے میں کر لیا۔ "استاد کہلاتے ہو تم۔ ایسے اناڑی پن کا ثبوت تو نہیں دے سکتے کہ ایک ہی جھٹکے میں چت ہو جاؤ۔ اور کتنا مال ہے تمہارے پاس؟" محسن نے ایک دم اس کی جرسی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ پیٹ کے قریب ایک نمایاں ابھار واضح طور پر دوسرے ریوالور کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔

"میں ستم دونوں کی....." استاد نے چیخ کر کہا۔ اس کی گالی نے مجھے مشتعل نہیں کیا لیکن اس کے چلانے کی وجہ سے میں نے اس کے منہ پر کک ماری۔ بوٹ کی ٹو اس کے جبڑوں پر پڑی اور وہ تلملایا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے خون رسنے لگا۔ محسن نے دوسرا ریوالور بھی اپنی پتلون کی دوسری جیب میں رکھ لیا۔

"میں نے تم کو خبردار کیا تھا کہ آواز باہر نہ جائے۔" میں نے کہا۔ "اس پستول کے فائر کی آواز بھی باہر نہیں جاتی۔"

"چلو بچو اندر۔" نیک محمد نے ان دونوں لڑکوں کو مخاطب کیا جو بہت سہمے ہوئے کھڑے تھے اور گاڑی ریگ مال سے گھسنا بھول چکے تھے۔ انہوں نے فوراً ریگ مال کے ٹکڑے پھینک دیے اور سیدھے شیڈ میں جا کر الٹے لیٹ گئے۔ محسن نے استاد کے جانشین ہونے والے نوجوان کو چٹکی بجا کر متوجہ کیا۔ ان میں سے ایک نے جان پر کھیل کر نمک خوار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے جانشینی کا مقابلہ بظاہر جیت لیا تھا اور زیادہ بہادر بننے والا اب زیادہ شرمندہ نظر آتا تھا کہ خود کو جانشین ثابت کرنے کا یہ سنہرا موقع اس نے کچھ نہ کر کے گنوا دیا تھا۔

میں نے استاد کے مڑے ہوئے ہاتھ پر سے پیر کا وزن ہٹایا۔ وہ ایسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ زور لگاتا تو مونڈھے پر سے اس کا بازو اتر جاتا یا کلائی کے پاس سے ہاتھ ٹوٹ جاتا۔ وہ ہاتھ کو دباتا اور جرسی کی آستین سے منہ کو صاف کرتا اٹھا۔ سفید جرسی پر مٹی کا اور خون کا رنگ نظر آنے لگا۔

"اب ہماری گفتگو سننے والا کوئی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "ہم تینوں کو تم ایک سمجھو۔"

"تم مار پیٹ کیے بغیر بھی اپنا مطلب بیان کر سکتے تھے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میں ہنس پڑا۔ "کیا واقعی تم شرافت کی زبان میں بات کر سکتے ہو؟ صورت سے تو ایسے نظر نہیں آتے مگر خیر، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے جو سلوک تمہارے ساتھ روا رکھا وہ کس حد تک جائز تھا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں سے منشیات اسمگل ہونے کے لیے جاتی ہیں۔"

"منشیات؟" وہ چونکا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو استاد۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کی ضرب لگائی۔ وہ پیچھے مڑ گیا۔ "دوبارہ خود کو میرا شاگرد مت کہنا۔ میری بے عزتی ہوتی ہے۔"

وہ اسی لب و لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا اور میری برتری کو تسلیم کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر اس نے مجھے استاد کہہ دیا تھا۔ میں اس کو ذہنی طور پر مرعوب رکھنا چاہتا تھا اور جسمانی طور پر مغلوب۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام؟" وہ پھر کھڑا ہوگیا۔

"یہی تو میرا بھی سوال ہے کہ ایک گیراج میں منشیات کا کیا کام ہے؟" میں نے پھر اس کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "لیکن ابھی میں نے اس سوال کا جواب مانگا ہی نہیں تھا۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ تھپڑ کے مقابلے میں میری کک سے زیادہ چوٹ آئے گی۔"

"ہاتھ میں ریوالور لے کر بہادری کے دعوے کرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی۔" وہ اٹھ کر بولا۔

میں نے ریوالور محسن کی طرف اچھال دیا جو اسے کیچ نہ کر سکا کیونکہ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ نیا محمد خود ہی گیراج میں چلا گیا تھا اور چاروں فرش خاک پر لیٹے ہوئے جنگی قیدیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ محسن نے خود ہی جھک کر زمین پر گرنے والا ریوالور بھی اٹھا لیا۔ اب دو ریوالور اس کی جیب میں تھے اور دونوں ہاتھوں میں بھی دو ریوالور تھے۔

"میں یہ عرض کر رہا تھا استاد صاحب،" میں نے دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر پھونک ماری۔ "کہ یہاں سے کئی بار ایک ٹرک کو جاتے دیکھا گیا ہے جس میں اوپر زرعی آلات اور مشینری کے پرزے ہوتے ہیں لیکن نیچے والے کریٹ منشیات سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ٹرک لے کر رحمت کباڑی اور طافو روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کلینر چھوٹو بھی تھا۔ اس ٹرک کا نمبر بھی بتا سکتا ہوں میں لیکن آدمی اور نمبر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ اس ٹرک کا کیا حشر ہوا تھا۔ زیادہ افسوس ان دو افراد کے انجام پر ہونا چاہیے۔ رحمت کباڑی اور طافو کیسے مارے گئے تھے، کیا یہ تم نہیں جانتے؟"

استاد کا رنگ متغیر ہوگیا۔ "میں کسی کو نہیں جانتا۔ خدا کی قسم میں نے یہ نام پہلی بار سنے ہیں۔"

میں کچھ دیر اس کی صورت کو دیکھتا رہا۔ "ہم جھوٹ کو سچ سے الگ کرنا جانتے ہیں۔ اس میں آدمی کو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی ناخن کو گوشت سے جدا کرنے میں ہوتی ہے۔ کیا تم اس محاورے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم آدمی ہی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہوتا ہے کہ رشتے توڑے نہیں جا سکتے لیکن سر توڑے جا سکتے ہیں تو رشتے کیوں نہیں توڑے جا سکتے

فرض کرو ابھی میں تمہارے سب سے بڑے بیٹے یا بیٹی کو منگوا لوں ...."

استاد نے ایک دم مجھ پر حملہ کیا۔ وہ میری طرف آیا اور میں نے اسے ایک قدم پیچھے اور تھوڑا سا دائیں ہو کر پلٹ دیا۔ ایک قلابازی کھا کے وہ نیچے گرا مگر کھا کے پھر اتنی تیزی سے چھپٹا جس کی مجھے امید نہ تھی۔ اس نے میرے قدم اکھڑتے ہی پے در پے وار کیے۔ اسے ماہر نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ کراٹے جانتا تھا۔ اس کی ہتھیلی کی ضرب سے میرے دونوں باز و شل ہو گئے۔ اس نے لات گھمائی جو میری ٹانگ پر گھٹنوں سے اوپر لگی۔ میں گیا اور وہ اچھل کر میری پسلیوں میں کک مارنے لگا مگر پلٹا کھایا اور دوسری ٹانگ گھمائی۔ لات اس کے سینے پڑی اور ایک لمحے کے لیے اس کا منہ پورا کھل گیا کیونکہ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے بازوؤں کی توانائی اب بحال ہو گئی تھی۔ وہ گر کے پھر اٹھا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔ چند منٹ میں اس کو اندازہ ہو گیا کہ مجھے چیلنج کرتے وقت اس نے اپنی صلاحیت کو بہتر اور میری صلاحیت بہت کمتر سمجھنے کی غلطی کی تھی اور خالی ہاتھ بھی میں اس کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک ہوں۔ اب اس کے لیے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو مارا نہیں تھا، جسمانی گزند نہیں پہنچایا تھا اور اس کی ہڈیاں سلامت چھوڑ دی تھیں مگر پھر بھی وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے اس کو ایک گھنٹے تک کنکریٹ مکسر میں ڈال کے گھمایا ہو۔

"تو بات تھی ناخن سے گوشت کے جدا ہونے کی۔" میں نے اطمینان سے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ "اگر تمہارے بیوی، بچے تم سے جدا کر دیے جائیں تو تم کو کتنی تکلیف ہو گی اور اس کے بعد ہم تمہارے سامنے ان کے گوشت سے ناخن جدا کریں تو تکلیف سے کون زیادہ چلائے گا؟ تم، تمہاری بیوی یا تمہارے بچے؟"

"دیکھو میں ان بچوں کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ "میں نے کسی کباڑی یا طافو کے انجام کے بارے میں نہیں سنا۔ میں چھوٹو کو جانتا ہوں۔"

"کون ہے چھوٹو؟"

"وہ اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ رہتا ہے جو ٹرک لے جاتا ہے۔" استاد نے کہا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا نام بتاؤ۔" محسن نے کہا۔

"ٹرک ڈرائیور کوئی ایک نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ہر مرتبہ نیا آدمی ہوتا ہے۔"

تو یہ گامے ماچھی یا چوہدری دلاور کا نیا طریقۂ واردات ہے۔ میں نے سوچا۔ ہر بار آدمی بدلنے سے اتنا فائدہ یقیناً ہوتا ہے کہ کسی کو واقف راز ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ پرانے ڈرائیور صرف اس لیے مارے گئے کہ وہ کچھ جان گئے تھے اور ان کا قابل اعتماد ہونا ہی بالآخر نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ یہ زیادہ محفوظ اور آسان طریقہ تھا کہ کسی ضرورت مند اور نئے بے وقوف اور بے خبر ڈرائیور سے ایک ٹرک کو کراچی تک لے جانے کا سودا کر لیا جائے۔ اگر وہ سلامتی کے ساتھ پہنچ جائے تو اس کو توقع سے زیادہ معاوضہ ادا کر دیا جائے، وہ پکڑا جائے تو کچھ نہ بتا سکے۔

"تمہارا اپنا نام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"برکت۔" وہ بولا۔ "مگر تم لوگ کون ہو؟ پولیس کے آدمی ہو؟"

"تمہیں کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے غرّا کے کہا۔ "استاد برکت، یہ ٹرک جو اس وقت بھی یہاں کھڑا ہوا ہے، یہ روانہ کب ہوگا؟"

"جب چھوٹو آئے گا، کسی ڈرائیور کو لے کر۔" وہ بولا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ "تم نے بھی تو ڈرائیور فراہم کیے ہوں گے۔ تمہارا گیراج ہے۔"

"ہاں۔ دو.... تین ڈرائیور تھے ایسے جن کو کام کی ضرورت تھی، میں نے ان کی سفارش کر دی تھی۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تینوں کون تھے اور اب کہاں ہیں؟"

"وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ میں کبھی ان کے پتے ٹھکانے پر نہیں گیا۔ وہ میرے دوست تو نہیں تھے۔" برکت بولا۔

"تم شروع سے اس گیراج کے مالک نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ گیراج کس کا تھا؟"

"پیڈرو نام کا ایک شخص تھا۔ استاد پیڈرو کہلاتا تھا۔ میں نے اسی سے لیا تھا۔" وہ بولا۔

"استاد پیڈرو۔" میں نے فاتحانہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ "چوڑی ناک، مکوڑیوں جیسے بال، کانوں میں مندریاں۔"

"تم.... تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"تم نے پھر سوال کیا! یہ آخری بار معاف کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اگلے سوال کے جواب میں دانت توڑ دوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے یہ گیراج کتنے میں لیا تھا اور کب لیا تھا؟"

"تقریباً دو مہینے پہلے۔ اس کا صرف کرایہ دیتا ہوں میں۔" برکت نے کہا۔ "صرف چار سو روپے مہینہ۔"

"صرف چار سو روپے مہینہ! اتنا تو تم روز کماتے ہوگے۔" میں نے کہا۔ "اتنا کم کرایہ لینے کی کوئی وجہ تو ہو گی؟"

"وجہ..... وجہ کیا۔ اس کی مرضی۔" برکت نے کہا اور میں نے اس کی اچھی طرح پٹائی کی۔ اسے میں نے تین بار زمین سے اٹھایا اور اس کے منہ پر اور پیٹ پر مکّے مارے۔ وہ نیم جان ہوگیا۔

"وجہ یہ تھی استاد برکت کہ استاد پیڈرو نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ تھی کہ کبھی کبھی ان کے ٹرک پر یہاں سے سامان لوڈ ہوگا۔" میں نے ہینگر ٹائپ بیرک کی طرف اشارہ کیا۔ "اور تم اعتراض نہیں کرو گے بلکہ اس کا ذکر بھی نہیں کرو گے۔ یہ بیرک بدستور انہی کے قبضے میں رہے گی۔ یہی شرط تھی نا؟"

استاد برکت نے بڑی مشکل سے اقرار میں سر ہلایا۔

"اس دروازے کو کھولو۔" میں نے اسے پیروں پر کھڑا کر کے حکم دیا۔

"میں..... میں کھولوں....۔" وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ "کیسے کھولوں؟ اس کی چابی چھوٹو کے پاس ہوتی ہے۔"

"تمہارے گیراج میں گاڑیوں کی ڈینٹنگ پینٹنگ بھی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈینٹر کے لیے ویلڈنگ ٹارچ ضروری سامان میں شامل ہے۔ اس سے وہ ٹیڑھی چادر کو گرم کر کے نرم کرتے ہیں، جوڑ لگاتے ہیں اور مجھے تمہاری ورکشاپ میں دونوں طرح کی ویلڈنگ کا انتظام نظر آ رہا ہے۔ گیس ویلڈنگ کے لیے تمہارے پاس آکسیجن اور ایسی ٹیلن کے سلنڈر بھی ہیں اور تم الیکٹرک ویلڈنگ بھی کرتے ہو۔ تالے کو کاٹ دو۔"

"کاٹ دوں! اس سے کچھ نہیں ہوگا۔" برکت ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "گیٹ اندر سے بھی بند ہیں۔ اوپر نیچے تین جگہ لوہے کی سلاخیں فٹ ہیں۔"

"اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ سلاخیں اوپر نیچے درمیان میں، ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر کہاں کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن فرض کرو تمہیں یہ لوہے کے گیٹ اوپر سے نیچے تک کاٹنے پڑیں، الیکٹرک ویلڈنگ ٹارچ سے تو یہ کتنی دیر میں ختم ہونے والا کام ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم..... تم سمجھتے نہیں۔ یہ بہت خطرناک کام ہے۔" وہ بولا۔ "اس نے... استاد پیڈرو نے مجھے بتایا تھا کہ کبھی کسی کے کہنے یا مجبور کرنے سے میں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو بہت برا ہو گا۔"

"کیا برا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"اس نے کہا تھا کہ دھماکا ہو گا اور..... ن کو ویسے بھی پتا چل جائے گا۔" برکت بولا۔ "اس کے اندر الارم لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "پاگل کے بچے، تمہیں شک نہیں ہوا تھا کہ یہ خطرناک کام ہے۔ تم نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ آخر اتنا زبردست حفاظتی انتظام کرنے کا مقصد کیا ہے۔"

"پوچھا تھا۔ اس نے کہا اپنے کام سے کام رکھو اور منہ بند رکھو۔" برکت بولا۔ "اور مجھے یہ بہت فائدے کا سودا لگتا تھا۔ میں اپنا نقصان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی شرط منظور کر لی۔"

"فائدے اور نقصان کا تو اب پتا چلے گا تمہیں۔" میں نے کہا۔ "الیکٹرک ویلڈنگ کا تار وہاں تک پہنچ جائے تو بہتر ورنہ گیس کے سلنڈر اٹھواؤ اور جہاں سے ضروری ہو وہاں سے گیٹ کاٹ دو۔"

"میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خودکشی ہو گی۔ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ ہم تمہیں اور صرف تمہیں مارنا نہیں چاہتے۔ اگر اس کام میں کوئی خطرہ ہے تو وہ خطرہ ہمارے لیے بھی ہو گا۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو یقین دلا سکتا ہوں کہ دھماکا کسی قسم کا نہیں ہو گا۔ پہلے تالے کو کاٹو۔ پھر ادھر کی کنڈی کھولو۔ اس کے بعد اندر کی طرف کی سلاخیں اپنے اندازے کے مطابق کاٹو۔ اس کے لیے تمہیں گیٹ میں شگاف کرنا ہو گا۔"

"خدا کے لیے مجھے اس پر مجبور مت کرو۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" استاد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ہماری بات نہ مانی تو ہم بھی تمہیں مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم پسند کرو گے کہ ہم تمہارے گھر میں گھس کر تمہاری بیوی کو باہر گھسیٹ لائیں۔ اس کے منہ میں اسی کے کپڑے ٹھونس کر، ویلڈنگ ٹارچ کو چھوڑ دو، دیا سلائی بھی جلا کے بجھا دی جائے اور فوراً جلد پر لگا دی جائے تو تکلیف کم نہیں ہوتی۔"

"نہیں، نہیں....." وہ ہکلانے لگا۔ "تم اتنے بے رحم نہیں ہو۔ تم ایسے نہیں ہو سکتے۔"

"یہ وضاحت میں نے آتے ہی کر دی تھی کہ ہم ایک جیسے بے رحم ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم ہماری عملی مظاہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر قائل نہیں... ٹھیک ہے۔ محسن ذرا ہماری استانی جی کو لے آ... کے بغیر۔"

"ٹھہر جاؤ..... میں دروازہ کھولتا ہوں۔" برکت نے محسن کو پلٹتے دیکھ کر کہا۔ "مگر مجھے یہ بتا دو کہ ان سے میں کہوں گا؟"

"جب تم دروازہ کھول دو گے تو ہم تمہیں اور تمہارے شاگردوں کو ہاتھ پیر باندھ کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر گیراج میں ڈال دیں گے۔" میں نے کہا۔ "جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہم نے تمہیں بے بس کر دیا تھا اور پھر باقی کام خود... تم سب کو اپنی جان پیاری ہے تو اسی بیان پر قائم رہنا... وہ خود ویلڈنگ کر کے دروازہ کاٹتے رہے تھے۔ تم ہمارا... بھی غلط بتاؤ گے ورنہ یاد رکھنا، ہم دوبارہ آ جائیں گے۔"

استاد برکت نے آہستہ آہستہ گیراج کی طرف... شروع کیا جہاں نیک محمد بھی چار افراد کو الٹا لٹائے... کے کام سے بور ہونے لگا تھا۔ وہ چاروں شور مچا رہے... کہ انہیں کمر کے بل لیٹنے کی اجازت دی جائے اور ان... سے ایک باقاعدہ بھوں بھوں کر کے رو رہا تھا۔

"چپ کرو سُوّر کے بچو۔" نیک محمد نے کہا۔ "تمہیں ہم دفن بھی الٹا کریں گے۔"

"انہیں اٹھنے دو بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ استاد برکت کی مدد کریں گے۔"

"اٹھو، دُئے سُوّر کے بچو۔" استاد برکت نے طیش میں سب کے ایک ایک لات رسید کی۔ "کتنے مزے سے پڑے ہیں سالے۔"

وہ مزے میں بالکل نہیں تھے اور دونوں طرف... ان کو ایک جیسے خطابات دیے گئے تھے مگر وہ احتجاج کیے... اٹھے۔ استاد برکت کے حکم پر انہوں نے ویلڈنگ کا سامان... گھسیٹا اور ہیرک کے گیٹ تک لے گئے۔ گیٹ بیس گز کے فاصلے... پر تھا لیکن خوش قسمتی سے الیکٹرک ویلڈنگ کا کیبل بیس... سے زیادہ لمبا تھا۔ استاد برکت کے ہاتھ کانپ رہے تھے... میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی وہ شاگردوں کے سامنے... اس کی بے عزتی کا سبب بن رہی تھی مگر وہ مجبور تھا... نے ایک منٹ سے بھی پہلے تالے کو کاٹ دیا۔ وہ جھوٹ...

... کہ اپنی جان بچانا چاہتا تھا ورنہ اس کو اندر کی جانب جمی ہوئی لوہے کی سلاخوں کی بالکل صحیح پوزیشن معلوم تھی۔ اس نے نیچے بیٹھ کر اس جگہ کو کاٹنا شروع کیا جہاں دونوں پٹ ملتے تھے۔ ذرا سی دیر میں چادر کٹ گئی اور شگاف اتنا بڑا ہو گیا کہ اس کے پیچھے پھنسی ہوئی ایک انچ موٹی سلاخ نظر آنے لگی۔ ویلڈنگ ٹارچ سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ استاد برکت نے اپنی آنکھوں کے سامنے گہرے رنگ کے شیشوں والا ٹین کا ڈھکنا سا کر لیا تھا چنانچہ اندھا کر دینے والی روشنی اس کی آنکھوں کے لیے قابلِ برداشت ہو گئی تھی مگر ہم سب دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ میں نے برکت کے دونوں سینئر شاگردوں کو اور دونوں بچوں کو سامنے کھڑا کیا تھا اور ریوالور ہاتھ میں رکھا تھا۔ خیرہ کن شعلے کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود میں برکت کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پھر بیٹھ گیا۔

دس منٹ بعد پہلی سلاخ کٹ گئی تو میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ وہ جگہ اب بھی انگارے کی طرح دہک رہی تھی جہاں سے دروازہ کاٹا گیا تھا۔

"دھماکا تو کوئی نہیں ہوا نا۔" میں نے برکت کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "تم کو ڈرا دیا گیا تھا خواہ مخواہ۔"

"لیکن الارم تو بج رہا ہے۔" وہ بولا اور میں نے دروازے سے کان لگا کے سنا۔ اندر سے واقعی ایک سائرن کی ہلکی سی آواز کی گونج آ رہی تھی۔

"اب تم جلدی کرو۔" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "وقت کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہارا کام ختم ہونے سے پہلے وہ لوگ آ جائیں۔" مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اندر ناز و اور رابعہ کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو کیا ہو گا۔ ان کو بحفاظت نکالنے کے لیے ہمارا مقررہ وقت کے مطابق اندر پہنچنا ضروری تھا۔ الارم کی آواز میرے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور میں اس اندیشے سے دوچار تھا کہ ہم دشمن کے حفاظتی انتظامات سے گزر سکیں گے یا نہیں۔ یہ تو ہمیں اس حصار میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا کہ شکاری کتنا ہی پُراعتماد اور ہوشیار کیوں نہ ہو اپنی حفاظت کے خیال سے غافل کبھی نہیں ہوتا۔ دشمن کو کمزور سمجھنا ہی بے وقوفی کہلاتا ہے۔ کسی الارم سسٹم کی موجودگی کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور ہم نے فرض کر لیا تھا کہ ہم زبردستی اور طاقت کے بل پر اس سرنگ نما راستے کے ایک کنارے سے داخل ہو گئے تو دندناتے ہوئے گاما ماچھی کے اڈے تک چلے جائیں گے۔ اب ایسا مشکل نظر آتا تھا۔ الارم نصب کرنے والوں نے اور بھی بہت کچھ نصب کر رکھا ہو گا جس سے غیر متعلقہ افراد کے داخل ہونے کی صورت میں مزاحمت کی جا سکے۔ اب الارم کی آواز نے انہیں خبردار کر دیا ہو گا اور وہ جوابی کارروائی کے لیے اپنی قوت مجتمع کرنے میں مصروف ہوں گے۔

"محسن! تو ٹرک کو اسٹارٹ کر کے یہاں لے آ۔" میں نے کہا۔

"اس میں چابیاں نہیں ہیں، سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ محسن سیلف کو ڈائریکٹ کرنٹ دے کر اسٹارٹ کرے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اتنی دیر میں ان سب بچوں کو واپس گیراج میں لے جاؤ۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھنا گیراج میں تار بہت ہوں گے۔ وہی تار دوسرے آدمی کے لیے بھی استعمال ہو جائے تو اچھا ہے۔ دونوں کی پشت مل جائے۔ پھر دونوں کو ایک ساتھ جوڑ کر کسی کھمبے یا کھونٹے سے باندھ دینا۔ اور ہاں، ان کے منہ بند کرنا مت بھولنا۔ اندر پرانا سوت بھی ہو گا۔ نہ ہو تو انہی کے کپڑے پھاڑ لینا مگر یہ سب پھرتی سے کرنا۔ کوئی گڑبڑ کرے تو بس ایک گولی چلانا۔ سر کا بھیجا نکال دینا۔"

برکت کے چاروں شاگردوں نے احتجاجی شور بلند کیا۔

"یہ کیا ظلم ہے استاد؟"

"چپ کرو ظلم کے تخم۔" استاد برکت نے پلٹ کر کہا۔ "اس کے بغیر جان نہیں بچے گی۔"

"ہاں، تم کو یہی کہنا ہے کہ ہمیں مار باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ نہ ہمارے نام بتانا ہیں نہ حلیہ۔ نام تم نے کسی کی زبان سے سنا ہی نہیں تھا اور حلیہ تم اس لیے نہیں دیکھ سکے کہ حملہ آور منہ پر نقاب ڈال کر آئے تھے۔ اگر تم نے کچھ اور کہا تو دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔ پہلے وہ ماریں گے۔ انہوں نے چھوڑ دیا تو ہم ماریں گے۔ اب جاؤ۔" وہ نیک محمد کے ساتھ چل پڑے۔ اسی وقت محسن نے ٹرک کو میرے قریب لا کے کھڑا کیا۔ میری پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ اسٹین گن نکال لائے۔ اس کے اترتے ہی میں ڈرائیور کی سیٹ پر چڑھ بیٹھا۔ اس کا انجن بند نہیں کیا۔

"نیک محمد!" میں نے چلا کے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں تم یہ ٹیکسی لے کر نکل جانا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نیک محمد گیراج کے دروازے تک آیا۔ "کہاں چلا جاؤں؟" وہ چلّا کے بولا۔ "واپس گھر؟"

"نہیں، گامے شاہ کے مزار پر۔ دروازے کے سامنے ہمارا انتظار کرنا۔" میں نے کھڑکی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم اگر شام تک نہ آئیں تو واپس گھر جا کے انتظار کرنا۔ ہو سکے تو غالب کو بلا لینا۔"

محسن ٹیکسی میں سے اسٹین گن نکال کے دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اسٹین گن کے استعمال کی ضرورت اچانک پڑ سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ مشکل مرحلہ اس کے بغیر ہی سر ہو گیا تو پھر اس کی ضرورت نہ جانے کب پڑے۔ تُو تیار ہے نا؟"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "تو اپنی توجہ ڈرائیونگ پر رکھنا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ٹرک کو نکال کرلے جانا۔ کوئی سالا سامنے آئے تو اسے بھی مت دیکھنا۔"

"استاد برکت!" میں نے پھر چلّا کر سر نکالا۔ "ہٹ جاؤ سامنے سے۔"

"ابھی..... اوپر والی سلاخ باقی ہے۔" وہ ٹرک کو آگے بڑھتا دیکھ کر چلّایا۔

"تم اتنے اوپر تک کیسے پہنچ گئے؟" میں نے ٹرک کی رفتار بڑھائی اور اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"گیٹ تمہارے اوپر گرے گا۔" برکت نے چیخ کر کہا اور ایک طرف چھلانگ مار دی۔ اس وقت تک ٹرک اور گیٹ کا درمیانی فاصلہ گھٹ کر بیس فٹ کے قریب رہ گیا تھا۔ میں نے ایکسیلیریٹر کو دبایا اور طاقتور انجن کی گرج کے ساتھ ٹرک ایک دم آگے بڑھا۔ اس نے کسی دیو ہیکل اور بھاری بھرکم گینڈے کی طرح لوہے کے دروازے کو ٹکر ماری۔ ٹرک کی قوت کے سامنے پٹ یوں وا ہو گئے جیسے وہ لوہے کے گیٹ نہیں تھے، کپڑے کے دو پردے تھے جن کو اوپر سے ٹانکا لگا کے ایک ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ اوپر کی سلاخ کے باقی رہ جانے سے دونوں پٹ ایک دم نہیں گرے۔ جتنی دیر میں سلاخ کا رشتہ ٹوٹا، ٹرک نیچے سے اپنا راستہ نکال چکا تھا۔ تصادم کے جھٹکے نے مجھے اور محسن کو بھی ہلا دیا تھا مگر ہم اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ہمارے کانوں نے مضبوط بمپر کی رگڑ کو سنا۔ پھر ہیڈ لائٹس کا شیشہ بکھرنے کی آواز آئی اور ٹرک کی باڈی ——— دروازے کو ادھیڑتی اور اس کی فولادی پنجوں جیسی رگڑ سے مجروح ہوتی گزری۔ سائڈ مرر ٹوٹ کر الگ ہوئے اور مڈ گارڈ کھڑکھڑائے۔ ایک سیکنڈ میں ٹرک کو راستہ مل گیا۔ میرے سامنے ایک

تاریک اور نشیبی راستہ آ گیا۔ ٹرک کی رفتار میں یکلخت اضافہ ہوا اور میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے بالآخر دونوں ہیڈ لائٹس جلانے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی وقت دروازے کے دونوں آہنی پٹ ایک خوفناک دھماکے سے ہمارے پیچھے گرے پھر دیواروں پر اینٹوں کی بارش ہونے لگی جو لوہے کے دروازے کو مضبوطی سے قائم رکھنے کی ضامن تھیں۔ چند سیکنڈ میں ہو جانے والی اس تباہی کا نظارہ میں نے صرف ایک بار پیچھے دیکھ کر کیا اور مجھے یقین آیا کہ ہم بال بال بچ گئے ہیں۔ اگر دروازہ زیادہ مضبوط ہوتا یا ٹرک کی قوت میں کمی رہ جاتی تو شاید ہم اس صفائی کے ساتھ نہ نکل پاتے اور کہیں الجھ جاتے تو دونوں فولادی گیٹ ہمارے اوپر گرتے جو اب چند فٹ پیچھے رہ گئے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سامنے دیکھا۔ وہ سرنگ نما راستہ جسے ٹرک کی ایک سالم رہ جانے والی لائٹ نے کچھ روشن کر دیا تھا اتنا ہی چوڑا اور بلند تھا جتنا کہ اس میں داخل ہونے کا راستہ۔ اوپر چھت بھی پختہ تھی اور دونوں جانب کی دیواروں پر سیمنٹ کا پلستر تھا۔ ٹرک کے انجن کی آواز سے سرنگ میں زبردست گونج پیدا ہو رہی تھی۔

"ہم زمین کی کتنی گہرائی میں سفر کر رہے ہیں!" محسن نے رومال سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ۔" میں نے کہا۔

"لیکن خدا کا شکر ہے کہ زندہ سلامت سفر کر رہے ہیں اور یہ عالمِ بالا کی جانب روح کا سفر نہیں ہے۔" کم روشنی کی وجہ سے میں نے ٹرک کی رفتار کو بہت کم کر دیا تھا۔

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں، سکندر بادشاہ!" محسن نے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے شق ہو جانے والے دروازے کی روشنی بہت دور لگی۔ "مجھے تو حیرت ہے کہ ابھی تک ہماری راہ میں کوئی حائل نہیں ہوا۔ کیا انہوں نے خطرے کا الارم نہیں سنا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے سن لیا تھا تو انہوں نے کیسے نہیں سنا ہوگا۔ الارم نے اپنا کام کیا تھا۔ وہ خبردار ہوں گے۔"

"اور خبردار ہونے کے باوجود وہ چپ بیٹھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "یا سب خیریت ہے یا خیریت بالکل نہیں ہے۔"

"ماشاء اللہ، کس قدر ذہانت کی بات کہی ہے تو نے۔" میں نے اسٹیئرنگ کو سنبھالے رکھا کیونکہ راستہ خم کھاتا تھا تو ٹرک کے ذرا سے بے قابو ہونے کی صورت میں شکستہ حال باڈی کے دیوار سے ٹکرانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

"میں حیران ہوں کہ اتنی لمبی سرنگ کی موجودگی سے سب بے خبر رہے۔" محسن بولا۔

"اب نہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "آج دوسروں نے بھی دیکھ لیا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے کہ استاد برکت کو کچھ بھی علم نہ ہو پھر بھی تُو نے اسے چھوڑ دیا۔"

"اسے اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔ ہمارے ہاتھوں نہ سہی کسی اور کے ہاتھوں سہی۔" میں نے کہا۔

"تیرا خیال ہے کہ وہ گامے ماچھی کے ساتھیوں میں شامل نہیں ہے؟" محسن بولا۔

"صرف اس حد تک کہ اس نے سرنگ کے راستے ٹرک کے مال کے آنے جانے کے راز کو راز رکھا۔" میں نے کہا۔ "صرف اپنے فائدے کی خاطر وہ چپ رہا یا پھر خوف کے باعث۔ اسے تو یہ بھی ہم نے ہی بتایا ہے کہ ٹرک میں منشیات روانہ کی جاتی تھیں۔"

"یہ معلوم ہو جانے اور افشائے راز کے بعد وہ کیا کرے گا؟"

"سمجھداری سے کام لے گا تو وہی کرے گا جو ہم نے سمجھایا تھا اور بے وقوفی کرے گا تو بھاگ جائے گا۔ مگر بھاگ کر وہ کہاں جائے گا۔ استاد پیڈرو اسے پھر پکڑ لے گا۔ وہیں سے جہاں سے وہ پہلے لایا تھا۔" میں نے کہا اور ٹرک کو روک لیا کیونکہ اب میرے سامنے کا راستہ بلندی کی جانب اٹھتا نظر آتا تھا۔

"یہ سرنگ ایک فرلانگ لمبی تو ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "کتنا خرچہ آیا ہوگا اس کو بنانے پر؟"

"کروڑوں کا بزنس کرنے والے لاکھوں خرچ کرتے ہیں تو اپنے فائدے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"اب ہم گامے شاہ کے مزار کے احاطے میں ہیں۔ عین اس کے نیچے۔" محسن نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

"ہاں ... اور آگے جو پچاس ساٹھ گز کی بلندی ہے، یہ ڈھلانی راستہ ہے جس سے ٹرک اندر اترتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے خود دیکھا تھا کہ کچھ لوگوں نے مل کر اس راستے کے اوپر سے زمین ہٹا دی تھی۔"

"ہاں۔ لان کی گھاس پر اس خلا کا پتا بھی نہیں چلتا تھا مگر ان لوگوں نے ایک پورا تختہ الگ کر دیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس تختے پر مٹی ڈال کے گھاس اگائی گئی تھی۔ جب اسے لان کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا تو لان برابر اور ایک جیسا نظر آتا تھا۔ اسے اٹھا لینے سے نیچے جانے کا راستہ بن جاتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس میں کوئی مشینی نظام نہیں تھا اور نہ کوئی ایسا دروازہ تھا جیسا ہم اپنے پیچھے گرا آئے ہیں۔ اب میں ٹرک پوری رفتار سے اوپر لے جاتا ہوں۔ ٹرک کی باڈی کا اوپر والا حصہ اس تختے کو اٹھا کے ساتھ لے جائے گا اور ہم احاطے کے وسط میں طلوع ہوں گے۔"

"پہلے سوچ لے کہ باہر طلوع ہونے پر جو صورتِ حال درپیش ہوگی کیا ہوگی؟"

"غیب کا علم رکھنے کا دعویٰ میں نے کبھی نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "صورتِ حال جیسی بھی ہوگی اس سے نمٹنا تو ہے۔"

"یہ پُراسرار خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔" محسن بولا۔ "انہوں نے ابھی تک کارروائی کیوں نہیں کی جبکہ انہوں نے ایسے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی ساری رکاوٹوں کو عبور کرکے اندر داخل ہو چکا ہے۔ جو اُن کا اپنا آدمی نہیں ہے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ جب ہم پھر خدا کی بنائی ہوئی سطحِ زمین پر نمودار ہوں تو وہ دونوں جانب ٹینک اور توپیں لیے انتظار کرتے ملیں۔" میں نے کہا۔ "ان کے مقابلے میں ہماری اسٹین گن دھری رہ جائے۔"

"تاریک پہلو کو مت دیکھ۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ رابعہ اور نازو کی ٹیم نے اس غیر قانونی مملکت کے بے تاج بادشاہ سلامت کو یرغمالی بنا رکھا ہو۔" محسن بولا۔ "اور اعلانِ عام کر دیا ہو کہ کسی نے جارحانہ کارروائی کی تو وہ بادشاہ سلامت کی جان کا دشمن ہوگا۔"

"خیر اب جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔" میں نے ٹرک کو پھر گیئر میں ڈالا۔ "خدا کرے نیک محمد وہاں سے نکل گیا ہو۔ کوئی تو ہو ہماری خبر پہنچانے والا۔ آگے غالب ہے جو سب کی خبر لے سکتا ہے۔"

"بس تو پھر چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کریں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ٹرک چلا ہی تھا کہ سیکنڈ گیئر میں ڈال دیا۔ ٹرک بڑی گھن گرج کے ساتھ اوپر چڑھا۔ آگے فرش کی بلندی میں بتدریج اضافہ ہوا مگر چھت اسی مناسبت سے اوپر اٹھنے کے بجائے ہموار رہی اور اس کا ٹرک کے سب سے اوپر والے حصے سے فاصلہ بتدریج کم ہوا پھر ٹرک کی باڈی چھت سے لگی اور چھت ایک دم اٹھ گئی۔ ٹرک آگے بڑھا تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چھت اس کے اوپر آگئی اور ٹرک اندھیرے سے اچانک اجالے میں پہنچا تو ذرا سی دیر کے لیے میری آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ ٹرک اس سرنگ سے باہر آنے کے بعد گامے شاہ کے مزار کے عقبی حصے میں لان پر پہنچ چکا تھا۔ میری حیرت زدہ نظروں نے ہر سمت خالی پڑے ہوئے میدان کو دیکھا۔ میں نے انجن کو بند کیا اور سوالیہ نظروں سے محسن کی طرف دیکھا جو خود بھی اس خاموشی اور ویرانی کا مطلب اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

پہلے میں اترا اور میں نے اترنے سے پہلے اپنا ریوالور محسن سے واپس لیا۔ میرے بعد محسن نے نیچے قدم رکھا۔ وہ اسٹین گن لیے کھڑا رہا اور میں ریوالور تھامے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ایک طرف قطار میں حجرے بنے ہوئے تھے۔ انہی حجروں سے متصل گامے شاہ کے مزار کی عمارت تھی جو ایک وسیع اور بلند دیواروں والے کمرے اور چاروں طرف بنے ہوئے برآمدے پر مشتمل تھی۔ برآمدہ بھی سطح زمین سے چھ سات فٹ اونچا تھا اور اس کی چھت محرابی دروازوں پر قائم تھی۔ وسط میں مزار کی عمارت کی ہر دیوار بیس فٹ بلند تھی اور سب سے اوپر نیلے رنگ کا گنبد تھا۔ عمارت کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ تھا مگر اس وقت ہر دروازہ کھلا ہونے کے باوجود نہ کوئی آ رہا تھا، نہ جا رہا تھا۔

"یہ معاملہ تو مجھے خطرناک لگتا ہے محسن۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ رابعہ اور نازو کو بھی لے گئے؟" محسن نے وہ بات کہہ دی جو میں نہ کہہ سکا تھا۔ "لیکن کچھ فرض کرنے سے کیا حاصل۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔ پہلے ان حجروں میں جھانک لیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میں آگے رہوں گا۔ تو اسٹین گن کے ساتھ میرے پیچھے آ۔"

ہر حجرے کی خاموشی ایک ہی کہانی کہتی تھی۔ وہاں چارپائیاں تھیں، بستر اور میلے کپڑے تھے مگر وہ لوگ نہیں تھے جو ان حجروں میں رہتے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سکندر کہ وہ سب بھاگ گئے ہوں؟ وہ اتنے کمزور لوگ نہیں تھے۔ ان کا دھندا ایسا نہیں تھا کہ وہ آتنی آسانی سے میدان چھوڑ دیتے۔" محسن نے کہا۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اپنا ایک اڈا بنا رکھا تھا جو ہر جگہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے وہ کیسے خالی کر سکتے ہیں۔"

"مجھے ان کی نہیں، رابعہ اور نازو کی فکر ہے۔" میں نے بد دلی سے کہا۔ "وہ ہماری حماقت کی بھینٹ نہ چڑھ گئی ہوں۔ ہم نے انہیں ضرورت سے زیادہ بہادر اور نڈر سمجھ لیا تھا۔ ان کو تھپکی دے کر ایک ایسی مہم پر روانہ کر دیا تھا جسے سر کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تھیں تو وہ لڑکیاں ہی۔ اور ان کے مقابلے پر تھے پیشہ ور بدمعاش مرد۔"

"ان کو کچھ بھی نہیں ہوا ہو گا۔" محسن نے مجھے تسلی کے لیے کہا مگر مجھے اس کے لہجے کا کھوکھلا پن اچھا نہیں لگا۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ وہ انہیں قتل نہیں کریں گے۔ قتل کا مطلب صرف جان لینا ہی تو نہیں ہوتا۔ وہ انہیں زندہ رکھتے ہوئے بھی سو بار قتل کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہم شکستہ دل، آزردہ اور ملول ایک حجرے سے دوسرے حجرے میں جھانکتے گئے۔ کہیں ہمیں کوئی بھی نہ ملا جو ہمیں کچھ بتا سکتا اور ہمارے ذہن پر یلغار کرنے والے سوالات کے جواب دے سکتا۔

"یہاں تو ان کے کارندے رہتے تھے۔ ڈرائیور اور اِدھر اُدھر اور مال اِدھر سے اُدھر کرنے والے۔" محسن بولا۔

"مزار کے مجاور کہاں گئے؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "گامے شاہ کے چیلے چانٹے کہاں گئے؟"

"تو ابھی سے پاگل کیوں ہو رہا ہے۔" محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "چل، ہم مزار میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"وہاں بھی کچھ نہیں ملے گا محسن۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنی بے وقوفی کے باعث ہم نے ان دونوں کو کھو دیا ہے۔"

"اگر وقتی طور پر کھو دیا ہے تو ہم انہیں پھر پا لیں گے سکندر۔" محسن نے دوست کی حیثیت سے غمگساری کا فرض ادا کرتے ہوئے کہا۔

"پا لیں گے مگر کیا کچھ گنوانے کے بعد۔" میں نے کہا اور ہم مزار کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اس وقت تک شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور مزار کے اندرونی حصے میں باہر کی نسبت گہرا اندھیرا تھا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک ہی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ہماری ذہنی کیفیت ان کمانڈوز کی طرح تھی جو ہتھیلی پر جان رکھ کر اور سر سے کفن باندھے دشمن کے کسی مورچے کو سر کرنے جائیں اور انہیں پتا چلے کہ دشمن تو بہت پہلے مورچا چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ بہت آگے نکل آئے ہیں اور محصور ہو چکے ہیں۔ ایک نامعلوم خوف اپنے وجود کا پتا دیتا تھا جو ہماری رگوں میں دوڑنے والے خون کو سرد کرتا تھا اور ہمارے حوصلوں کو مفلوج کرتا تھا۔

بلند و بالا اور وسیع و عریض حجرے کے وسط میں فرش پر کوئی چیز پڑی تھی۔ اچانک بہت اوپر گنبد کی چھت سے روشنی کا ایک دھارا پھوٹا اور یہ روشنی دس فٹ کے اس دائرے پر محیط ہو گئی جس کے درمیان میں گامے ماچھی کا بے جان جسم درد و کرب کے اس آخری لمحے کی تصویر بنا پڑا تھا جب روح نے (جو بے وجود ہے) جسم کا ساتھ چھوڑا (جو فانی ہے)۔ بے اختیار میری نگاہ نے بہت بلندی پر آویزاں نظر آنے والے روشنی کے منبع کو دیکھا اور آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ موت کی تصدیق کے لیے گامے ماچھی کے دل کی دھڑکن کو سننے یا نبض کی رفتار کو محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی کھلی آنکھوں کی ساکت پُتلیوں میں زندگی کی رمق ہی نہ تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے اوپر اٹھایا۔ ہاتھ دو جگہ سے مڑ گیا۔ ایک کہنی کے پاس سے اور پھر کہنی سے اوپر شانے کے قریب سے۔ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔

"یہ تو کیا کر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی فکر کر۔ کہیں پولیس نہ آ جائے۔"

میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور پہلو کے بل پڑے ہوئے گامے ماچھی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی گردن سے نیچے کی کالر بون بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ سے دبا کر دیکھنے پر مجھے اس کے سینے میں دائیں جانب لچک محسوس ہوئی کیونکہ اس طرف سب سے نیچے والی دو پسلیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں لیکن اس کی موت کا سبب وہ چھوٹا سا سوراخ تھا جو بائیں طرف عین دل کے مقام پر سرخ دائرے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس سے رسنے والا خون زمین میں ایک ہی جگہ پیوست ہو گیا تھا اور بہت کم تھا۔ گامے ماچھی کے سینے پر بائیس بور کا ریوالور رکھ کر گولی چلائی گئی تھی یا زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کے فاصلے سے۔ گولی دل میں اتر کے اپنا کام کر گئی تھی اور شاید ابھی تک دل میں چھپی بیٹھی تھی۔

"سکندر! یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔" محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "باہر نیک محمد ٹیکسی لے آیا ہو گا۔"

"لیکن ابھی ہم کیسے جا سکتے ہیں۔" میں نے کھڑے ہونے کے بعد کہا۔

"مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ آخر سب لوگ کہاں گئے؟" محسن نے کہا۔

"ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ رابعہ اور نازو کدھر گئیں۔" میں نے کہا۔ اضطراب، خوف یا پریشانی کے بجائے میرے ذہن پر عجیب سا اعتماد اور یقین دینے والا سکون غالب آنے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے چیخنے چلانے، رونے دھونے اور واویلا کرنے سے گریز کیا۔ میں نے ایسا جانتے بوجھتے نہیں کیا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اگر میں دیوانگی کا مظاہرہ کرتا تو یہ منظر کی ... اس کی بنیاد منفی نوعیت کے جذبات پر ہوتی۔ یوں تو وجودِ آدم ہی تخلیقِ کائنات کا سب سے بڑا کرشمۂ قدرت ہے مگر اس کی ذات میں پوشیدہ قوت کے مظاہر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ وہ کتنے بڑے چیلنج کو قبول کر سکتا ہے، سختیٔ حالات کو ذہنی و جسمانی طور پر کس انتہا تک برداشت کر لیتا ہے، قوتِ ارادی کے بل پر کیسے ناقابلِ یقین کارنامے سرانجام دیتا ہے جن کی عقلی طور پر توجیہہ ناممکن ہے۔ عام حالات میں ایک عام آدمی جتنی صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے، غیر معمولی حالات میں وہ اس سے سو گُنا یا ہزار گُنا ہمت کے ساتھ بڑی سے بڑی قیامت سے گزر جاتا ہے۔ یہ ایک مثبت ردِعمل ہوتا ہے اور میری ذہنی کیفیت بھی اس وقت میرے حق میں حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

"جب وہ یہاں نہیں ہیں اور ہمیں بتانے والا بھی کوئی نہیں ہے، تو ہم کس سے پوچھیں۔ یہ دیواریں تو کچھ بتانے سے رہیں۔" محسن نے کہا۔

"دیواریں بھی بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ اسی وقت وہ دروازہ بند ہوا جس سے ہم اندر آئے تھے اور ہم دونوں اچھل پڑے۔

"ہاں، یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" ایک آواز نے کہا جسے ایک لمحے کے لیے میں نے محسن کا جواب فرض کیا مگر ابھی وہ لمحہ گزرا بھی نہ تھا کہ میں اور محسن منجمد ہو گئے۔ وہ اجنبی آواز جس کی کوئی سمت نہ تھی، اپنی شناخت رکھتی تھی اور ایسے ہی وقت میں احساس دلا سکتی تھی کہ شکاری بے خبر نہیں تھے مگر ہم یہ بات بھول گئے تھے کہ یہ دلاور کی آواز تھی۔

"اگر دیواروں کے کان سب کچھ سُن سکتے ہیں تو کیا ان کے لب کچھ نہیں بتا سکتے؟" اسی آواز نے کہا جو اس ویران مرقد کی دیواروں میں گونج رہی تھی اور اوپر سے آتی ہوئی روشنی کے ساتھ نیچے پہنچتی محسوس ہوتی تھی مگر ان بے جان اور بے حس دیواروں کے "لبِ گویا" کو نہ میری نظر دیکھ سکتی تھی اور نہ محسن کی۔

"وہ کیا کہتے ہیں اپنے سکندر صاحب! کہ آپ کے لبوں پر یہ مُہرِ خاموشی کیسی؟" دلاور کی طنز اور تمسخر آمیز آواز نے کہا۔ آواز کسی پوشیدہ اسپیکر سے ہم تک پہنچ رہی تھی جو اوپر کسی دیوار میں نصب تھا، لیکن آواز بہت صاف تھی اور اصل آواز سے بہت مشابہ تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اسپیکر بہت اچھی کوالٹی کا تھا اور کم والیوم پر اس کی آواز میں خفیف سی سرسراہٹ تک نہ تھی۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"سانپ کیوں سونگھ گیا ہے تمہیں۔" دلاور آہستہ سے ہنسا۔ "میں نے تو بڑے چرچے سنے تھے تمہاری بہادری کے۔"

"رابعہ اور نازو کہاں ہیں دلاور؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ پھر ہنسا۔ "کیا مجنوں نے کبھی کسی سے یہ سوال کیا تھا کہ میری لیلیٰ کہاں ہے؟ اگر تم اسے تلاش کرنے نکلے ہو تو غالباً غلط جگہ آ گئے ہو۔"

"اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں کہ اب وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری طرح میری نگاہ بھی انھیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے میں کیا بتاؤں کہ اب وہ کہاں ہیں۔ ہاں تمہارے بارے میں بڑے وثوق سے بتا سکتا ہوں تمہیں بھی اور تمہیں تلاش کرنے والوں کو بھی کہ تم کہاں ہو۔" دلاور نے بڑی عیاری سے کہا۔ "تم کچھ دیر پہلے آ گئے ہوتے تو یہی شخص تم کو بہت سے سوالات کے جواب دے سکتا تھا جس کی لاش پر تم ریوالور اور اسٹین گن لیے کھڑے ہو۔ ڈرو نہیں، یہ لاش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"میں نے رابعہ اور نازو کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"تم نے انہیں خوامخواہ زحمت دی۔ عورتوں سے وہی کام لینے چاہییں جو اُن سے سب لیتے ہیں۔" وہ معنی خیز طریقے پر ہنسا۔ "بھئی! اگر اس شخص کو تم زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے تو مجھ سے کہہ دیتے۔ چلو تمہارا کام تو ہو گیا مگر اپنے سکندر صاحب! یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی ناکہ عورتوں کو برقعے پہنا کے اور ریوالور دے کر بھیج دیا۔"

"میں تمہارے کسی کارندے کا ذاتی دشمن نہیں ہوں۔ اس قتل کو مجھ سے منسوب مت کرو۔"

"پھر کس سے منسوب کر دوں؟" دلاور کی آواز میں حیرت نمایاں ہو گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ایک ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر دی تھی اور اب مجھ سے یوں مخاطب تھا جیسے پہلے سے لکھے ہوئے اسکرپٹ کے ڈائیلاگ کوئی منجھا ہوا اداکار اسٹیج پر بولتا ہے۔

"اب تمہیں نہیں معلوم کہ استاد برکت کی موت کیسے واقع ہوئی۔" دلاور نے خاموشی کے مختصر سے وقفے سے فائدہ اٹھایا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ "تم نے اسے بھی مار ڈالا! شیطان کی اولاد!"

"کیسی بے معنی گالی دیتے ہو۔" دلاور ہنسا۔ "شیطان لاولد ہے۔ پولیس سے اتنا واسطہ پڑ چکا ہے۔ ابھی تک گالیاں دینے کا فن بھی نہیں سیکھا اور کچھ تو کیا کر سکتے تھے تم!"

"میں کہتا ہوں برکت کا کیا قصور تھا۔ اسے تم نے ... سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ تمہاری بات نہ مانتا تو کیا تم سچ مچ اسے ... ڈالتے؟" دلاور نے کہا۔ "تمہاری بات مانی تو ہم نے اسے ... اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ انتخاب برکت کے ... میں نہیں رہا تھا اپنے سکندر صاحب! تم یہ دخل در معقول... نہ کرتے تو اس کی زندگی یوں مختصر نہ ہوتی۔ وہ کل بھی گ... گاڑیاں ٹھیک کرتا رہتا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال... اس عورت کی دیوانگی کا اندازہ کرو جس کے شوہر کو زندہ ... دیا گیا ہو، ویلڈنگ ٹارچ سے۔"

اس سے پہلے کہ غیظ و غضب سے پاگل ہو کر ... دلاور کو گالیاں دیتا اور اسے بتاتا کہ گالیاں دینا اگر ... تو پولیس کو مجھ سے سیکھنا چاہیے، اسپیکر سے ایک شور ... ہوا جس میں کسی عورت کے دیوانہ وار چیخنے، بین کرنے کوسنے کی آوازوں کے ساتھ بہت سے بچوں کے بلک ... کر رونے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں شامل تھیں ... میں نے سُنا وہ میرے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ... نے بڑی ذہانت سے یہ دہشت زدہ کرنے والی آوازیں ... کر میرے ذہن کو ایک حوصلہ شکن الیکٹرک شاک د... اگر وہ اپنی زبان سے اس عورت کی حالتِ زار کا نقشہ ... کرتا تو اس کا یہ اثر نہ ہوتا جو ایک مختصر سے دورانیے ... اثرات دینے سے ہوا۔ یہ حقیقی زندگی کا المیہ تھا۔ دلاور ... مجھے انسانیت کی لاش پر ننگے ناچنے والے شیطانوں ... زیادہ بھیانک لگا۔

"تم اس کی موت کا ذمے دار مجھے نہیں ٹھہرا سکتے ..." نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کے کہا۔ "یہ سب تم نے ..."

"مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والا کون ہے؟" دلاور ... غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ غلط ہے۔ تم نے اس کی مجبوری کے عذر کو ... نہیں کیا۔"

"کیا تم نے اس عذر کو قبول کیا تھا؟" دلاور نے ... سے کہا۔ "اس نے یقیناً انکار کیا ہوگا۔ بتایا ہوگا کہ ... انجام کیا ہو سکتا ہے۔ خود تم بھی اندازہ کر سکتے ہو کہ ... سے مکینک کی کیا حیثیت ہے۔ پھر بھی تم نے جبر کیا ... نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ پارٹنر! میری عادت اور میری ... سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ رعایت دینے کی گنجائش ... میں اُن چاروں کو بھی ...

... باندھ کر بھاگ گیا تھا ...."

"تو کیا تم نے ان بچوں کو بھی قتل کر دیا ہے ....؟" میں نے چیخ کر کہا اور میرے لبوں سے مغلظات کا دھارا پھوٹ بہا۔

"بھئی میں خود کچھ بھی نہیں کرتا۔ اب یہ کام بھی میں کرنے لگوں تو دوسرے کام کون سنبھالے۔" دلاور نے بڑی سفاک بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ "لوگوں نے تو بس یہی دیکھا کہ کسی نے ان چاروں بچوں کو جن میں دو خاصے جوان تھے اور ماں باپ کا سہارا تھے، ایک اکلوتا تھا اور اس کا باپ کئی سال سے مفلوج پڑا ہے، دوسرا چار بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ ان سب کو کسی نے اکٹھا کیا اور ان کی گردنوں کے گرد ایک ہی تار لپیٹ کر اتنا کس دیا کہ ان کا دم نکل گیا۔ بے چارے تڑپ بھی نہ سکے۔ تم لوگوں نے انہیں باندھ دیا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔"

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں جگنو کی طرح چمکا۔ دلاور جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے مجھے جو فریاد و فغاں کا اور آہ و زاری کا شور سنوایا تھا وہ پہلے سے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بارِ ملامت جو چٹان سے بڑھ کر کوہِ ہمالیہ سے زیادہ بڑا ہو چکا تھا اور جس کے نیچے میری مجرم روح تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی اور مجھے چار معصوم لڑکوں کا قاتل قرار دے رہی تھی، ایک مکینک کے خون کا ذمے دار کہہ رہی تھی اور میری شرافت اور انسانیت کے دامن پر آنے والے لہو کے ہر داغ کو میرا کارنامہ قرار دے رہی تھی، وہ پہاڑ یکلخت بخارات کی طرح فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں اب انسانوں کی طرح سانس لے سکتا تھا کیونکہ میرا ضمیر میری فردِ جرم واپس لے چکا تھا۔ میں نے کسی مفلوج باپ سے بڑھاپے کا سہارا نہیں چھینا تھا۔ چار بہنوں سے ایک بھائی کی محبت کا خزانہ نہیں چھینا تھا۔ ایک عورت سے اس کا سہاگ نہیں چھینا تھا اور اس کے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ نہیں چھینا تھا۔ اگر سچ مچ میری وجہ سے اتنے قتل ہو جاتے اور اتنی سی دیر میں ہر قتل کی خبر بھی عام ہو جاتی تو کیا اب تک مشتعل، انتقام کی خواہش سے مغلوب، مجرموں کو قانون کے حوالے کرنے کے خواہشمند، قتل ہونے والوں کے لواحقین اور غمگسار ایک فرلانگ سے بھی کم لمبی سرنگ کے راستے ہم تک نہ پہنچ چکے ہوتے۔ انہیں روکنے والا کون تھا۔ سرنگ کا ٹوٹا ہوا دروازہ تو خود خبر دیتا تھا کہ قاتل اسی طرف گئے ہیں مگر ابھی تک اس طرف سے ... آہٹ بھی سنائی نہ دی تھی۔

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے باوجود میں نے دلاور پر کچھ ظاہر نہیں ہونے ... ماتے محسن کو اشاروں میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دلاور صرف ہماری آواز ہی نہیں سُن رہا ہوگا، عین ممکن ہے کہ اس سرچ لائٹ جیسی روشنی میں کسی کیمرے کی آنکھ سے وہ میری صورت کے تاثرات کا مشاہدہ بھی کر رہا ہو۔

"تم جیسے لوگ ضمیر کی ملامت سے بڑی جلدی پریشان ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بنتے بہت بہادر ہیں۔"

"بنتے بہت دلاور ہیں۔" میں نے تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "حالانکہ خود شیطان بھی چاہے تو دلاور نہیں بن سکتا۔"

"اچھا لطیفہ پیدا کیا تم نے الفاظ سے۔ پڑھے لکھے آدمی ہو نا۔" دلاور طنز سے بولا۔ "افسوس یہ ہے کہ تم نے اپنی عقل کا کبھی صحیح استعمال نہیں کیا، ورنہ تم کو کرنے کے بعد یوں نہ پچھتانا پڑتا۔"

"میں اپنے اعمال کی سزا کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ اگر میرے لیے سزا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی تو یہ اس کی مرضی۔ وہ نیتوں کا حال خوب جانتا ہے۔"

"گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہارے احمقانہ جرأت کے مظاہرے کے باعث جتنے لوگ مارے گئے ان کی موت کا تمہیں کوئی صدمہ نہیں... خیر... اس طرح معلوم نہیں تم کسے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ مجھے یا اپنے آپ کو۔ کیا تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں کہ اس وقت تم کہاں ہو؟" دلاور نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"تم صرف رابعہ اور نازو کے متعلق جاننا چاہتے ہو کہ تمہاری زنانہ فوج کی ان دلیر اور خوب صورت کمانڈوز پر کیا بیتی۔" دلاور نے ہنس کر کہا۔ "لڑکیاں مجھے دونوں پسند آئیں لیکن میں شوقین مزاج آدمی نہیں ہوں۔ میں نے انھیں اپنے کمانڈوز کے سپرد کر دیا۔ سیمی فائنل میں چار جوانمرد پہنچے تھے۔ قرعہ اندازی سے میں نے دو کے حق میں فیصلہ کر دیا۔"

"تم بھونکتے ہو، بکواس کرتے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تم تو سچ سے بھی ڈرتے ہو۔" دلاور نے کہا۔ "اچھا بھئی، انھیں ہم نے عزت و احترام کے ساتھ لوٹا دیا۔"

"دیکھو دلاور، میرا انجام کچھ بھی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی میری زندگی مجھ سے چھین لے۔ تمہارے یہ انصاف کے ٹھیکے دار، خود تم یا تمہارے بھیجے ہوئے قاتل۔" میں نے کہا۔ "لیکن رابعہ یا نازو کو کچھ ہوا...."

"تو تم جھینگیوں کی توپ سے بھی بڑی توپ لا کے ان سب کو توپ دم کر دو گے جو اُن کے ساتھ کوئی زیادتی کریں گے... ذکر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خوب صورت لڑکیوں کا ہو تو زیادتی کا لفظ بہت شریفانہ ہے۔ تم تو سانس بھی اس لیے لے رہے ہو سکندرِ اعظم کہ میں نے تمھیں رعایت دے رکھی ہے اور میں بے سبب قتل کرنے یا کرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایک آدمی صرف ایک آدمی ہوتا ہے جسے ایک گولی ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ کیا میرے پاس کوئی گولی نہیں تھی؟ تم اس وقت اُس چوہے سے زیادہ بے بس ہو جو سینہ تان کے چوہے دان میں گھس گیا ہو۔"

"یہاں مجھے روکنے والا کون ہے۔" میں نے کہا۔" دروازہ میرے سامنے ہے۔"

"لیکن دروازہ بند ہے اور ہر دروازہ آسانی سے نہیں کھولا جا سکتا۔ تم کوشش کر کے دیکھو۔" وہ بولا۔

"جو میری راہ میں آئے گا مارا جائے گا اور میں مرا تو کم سے کم دس کو ساتھ لے کر مروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔" دلاور نے کہا۔"میں باہر موجود ہوں۔ یہ گفتگو تو ریموٹ کنٹرول کے.... ایف ایم مائکروفون کے ذریعے ہو رہی ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہوں گا کہ تم کیسے نکلتے ہو۔"

خاموشی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب میرے لیے دلاور کے دیے ہوئے چیلنج کو باعزت طور پر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں اس روشنی کے دائرے سے نکل گیا اور محسن کی طرف ہو گیا۔

"سب دروازے باہر سے بند ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"دلاور بکواس کرتا ہے کہ اس نے برکت کو اور اس کے شاگردوں کو قتل کروا دیا ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" محسن بولا۔" رابعہ اور نازو کے متعلق بھی دلاور کی بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر بھی معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ گئیں کہاں؟" میں نے کہا۔" ابھی تو صرف یہ اندازہ ہوا ہے کہ اندر داخل ہونے کے بعد نازو نے گامے ماچھی کو قابو کر لیا تھا اور غالباً مزاحمت کرنے کی وجہ سے ہی گامے ماچھی کی ہڈی پسلی ٹوٹی۔ بعد میں اس کو بے بس دیکھ کر کسی نے گولی مار دی۔ کیا نازو اور رابعہ کو اپنے ریوالور نکالنے کا موقع ملا ہو گا؟"

"اگر گامے ماچھی کا یہ حشر نازو نے کیا تھا تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک رابعہ اپنا ریوالور نکال کے پوزیشن سنبھال چکی ہو گی۔ ریوالور سے انھوں نے کیا کام لیا یا اپنا دفاع کرتے ہوئے نکل گئیں یہ دو چار کو مارنے کے بعد... ماری گئیں یا کچھ

کرنے سے پہلے ہی پکڑ لی گئیں؟ یہ ہم یہاں کھڑے کھڑے نہ جان سکتے۔"

"ہاں۔ خدا کی مرضی کے بغیر تو کچھ ہو نہیں سکتا۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔" اور تقدیر کے لکھے کو ہم مٹا نہیں سکتے۔ مقدر میں اتنا ہی ساتھ تھا تو ہمت ہارنے سے کیا ہو گا۔ اگر اُن کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی... ہوئی اور ہم ایک بار یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تو بدلہ ضرور لیں گے۔"

"دروازہ باہر سے کس نے بند کیا ہے؟" محسن نے...

"ہمیں تو کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"لیکن اب تو شک کی بات نہیں رہی۔ باہر نہ جانے کتنے لوگ موجود ہوں گے یا اتنی دیر میں آ چکے ہوں گے۔"

"کہاں سے آ چکے ہوں گے؟" محسن بولا۔

"سرنگ کے راستے، اگر دلاور باہر موجود تھا تو ممکن ہے... بھی ہو۔" میں نے کہا۔" لیکن یہاں جتنے حجرے خالی پڑے ہیں ان میں رہنے والے لوٹ آئے ہوں گے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔" جو لوگ ایک ٹرک گزرنے کے لیے پوری سرنگ بنا سکتے ہیں اور اتنی رازداری کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر حجرے کے نیچے حجرہ ہو۔ کوئی تہ خانہ ہو اور ہمارے اندر آنے سے پہلے... کے سب انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہوں۔"

"اتنا عمدہ اور کارآمد خیال تیری عقل میں کچھ پہلے آ جاتا تو شاید ہم اس صورتِ حال سے دوچار ہونے سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"انھوں نے تمام حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔" محسن بولا۔" ظاہر ہے اس بات کا خیال رکھنا یہ لوگ نہیں بھول سکتے تھے کہ اچانک چھاپا پڑ جانے کی صورت میں وہ خود کہاں جائیں گے اور مال کو کہاں چھپائیں گے۔"

"افسوس، یہ سب ہمیں وقت پر نہیں سوجھا۔" میں نے کہا۔" لیکن جو ہونا تھا اُسے کیا رونا۔ اب یہاں سے نکلیں کیسے..."

"ہم واقعی چوہوں کی طرح یہاں بند ہو گئے ہیں۔" محسن نے... سپاٹ دیواروں کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہم ابھی تک گفتگو کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور باری باری اپنا کان... کے ہونٹوں کے سامنے رکھ کر اتنی دھیمی آواز میں بول رہے تھے... مائکروفون ہمارے ہاتھ میں ہوتا تب بھی ایک لفظ نشر نہ... سکتا تھا۔ چھت کے وسط میں گنبد کی وسیع گولائی تھی جس... طرف محرابی در تھے اور ایک دائرے میں بنے ہوئے یہ در... فٹ نیچے سے کھڑکی کے

شیشہ تھا جس سے باہر کی روشنی تو آتی تھی مگر گرد رُک جاتی تھی۔ جو گنبد باہر سے گہرا نیلا تھا، وہ اندر سے انڈے کی طرح سفید تھا۔ محرابی دریچوں میں سرخ، نیلے، زرد اور سبز رنگ کے شیشے تھے چنانچہ اس وقت گنبد کے زیریں حصّے کے ساتھ ساتھ ایک رنگین جھالر سی دکھائی دیتی تھی۔ باہر شام کی روشنی ابھی باقی تھی لیکن کچھ دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا۔ ہمارے لیے کسی سہارے کے بغیر دیواروں پر چڑھنا اور شیشہ توڑ کے دریچوں سے باہر نکلنا بالکل ناممکن تھا۔

"ہم نے نیک محمد کو شام تک انتظار کرنے کو کہا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"وہ رات تک انتظار کرے گا اگر پکڑا نہ گیا۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں دلاور سچ کہتا تھا کہ وہ باہر موجود ہے۔" میں نے کہا۔" یا دھوکا دے رہا تھا اور وہ اوپر چڑھا بیٹھا ہے۔"

محسن نے اوپر دیکھا۔" کیا تو اپنا نشانہ آزمانا نہیں چاہتا؟"

"تیرا مطلب ہے اس روشنی کو گُل کر دوں؟" میں نے ریوالور نکالا۔" اس سے کیا ہو گا؟"

"یہ تو روشنی کو گُل کرنے کے بعد معلوم ہو گا۔" محسن بولا۔" کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ یہ نہ ہو کوئی اس روشنی کے دائرے کو گھٹا کے ہم پر لے آئے۔ اندھیرا زیادہ موثر پناہ فراہم کرتا ہے۔"

"رائٹ۔" میں نے کہا۔" تُو بھی نکال اپنا ریوالور، ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

"اس طرح تو معلوم ہی نہیں ہو گا کہ کس کا نشانہ خطا ہوا۔"

"ہم یہاں آپس میں نشانہ بازی کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔" میں چاہتا ہوں کہ ہم صرف ایک کوشش میں کامیاب ہو جائیں۔ گولی کسی کی بھی لگے۔ دوسری کوشش پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔"

محسن نے سر ہلایا اور اپنا ریوالور نکال لیا۔ ہم نے نشانہ لے کر چند سیکنڈ تک انتظار کیا پھر میں نے ون ٹو تھری کہا اور اندر دو فائروں کی آواز گونجی۔ مزار یکلخت تاریک ہو گیا اور گنبد کے گرد بنی ہوئی محرابی دریچوں کی رنگین جھالر پہلے سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگی۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ دیوار سے لگ کر ایک دروازے کے قریب کھڑا ہو جائے۔ خود میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسرے دروازے سے جا لگا۔

"دلاور۔" میں نے چلّا کر کہا۔" تم نے دیکھا، میں باہر نکل گیا۔ تم اتنے بے وقوف نہیں ہو کہ باہر نکلنے کے راستے بند کر کے کسی حصار میں قدم رکھ دو۔ میں چوہے دان میں پکڑا جانے والا چوہا نہیں ہوں دلاور۔"

میں نے چند سیکنڈ جواب کا انتظار کیا مگر روشنی کے ساتھ ہی آواز بھی گُم ہو گئی تھی۔ شاید اسی روشنی کے ساتھ اسپیکر تھا یا ہم دونوں میں سے کسی ایک کی گولی نے ساؤنڈ سسٹم کو اُڑا دیا تھا۔ تاہم میں نے اس امکان کو مسترد نہیں کیا کہ مائکروفون بچ گیا ہو اور دلاور ہماری آواز سُن سکتا ہو لیکن جواب نہ دے سکتا ہو۔ مکمل خاموشی میں سانس روکے میں ہمہ تن گوش رہا۔ ایک منٹ گزر گیا پھر میرے کانوں نے دیوار کی دھمک سُنی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسی دیوار کے کسی حصّے سے زینہ منسلک ہے جس پر کوئی بہت تیزی سے نیچے اترتا آ رہا ہے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ خود محسن نے میری تقلید کرتے ہوئے دیوار کی آہٹ سُن لی تھی۔ دو دروازوں کے درمیانی فاصلے کو اس نے طے کیا اور باقی دو کو میں نے دیکھا۔ آواز ایک دروازے کے بالکل پیچھے سنائی دی تو میں رک گیا اور میں نے محسن کو ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ محسن دیوار کے ساتھ ساتھ پھسلتا ہوا آیا۔

ابھی وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دروازہ ایک دم کھل گیا اور بیک وقت دو افراد نے اندر آتے ہی ہمارے چہروں پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کے پیچھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا مگر ہم نے اندازے سے وار کیا۔ ان دونوں کی پوزیشن ہم نے دروازہ کھلتے ہی دیکھ لی تھی۔ محسن نے ایک کے سر پر اسٹین گن کا بٹ مارا۔ میں نے اس کی دردناک آواز سُنی "ہائے میں مر گیا۔" پھر وہ فرش پر گرا۔ دوسرے نے میرا ہاتھ اُٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے گولی تو چلائی مگر وہ میری ضرب سے نہ بچ سکا۔ میرے بائیں ہاتھ میں شانے سے ذرا نیچے آگ بھر گئی اور میں سمجھ گیا کہ گولی ضائع ہو گئی ہے۔ یہی گولی چند انچ سینے کی طرف آتی تو میرے دل میں جگہ بناتی اور میرے لیے قبر میں جگہ بناتی۔ بازو میں پیوست ہو کے بھی گولی زیادہ نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔ اگر بازو کی ہڈی ٹوٹ جاتی تو میں مہینہ بھر اس ہاتھ کو گلے کا ہار بنا کے پھرتا اور ہڈی کا چُورا ہو جاتا تو شاید بائیں بازو کا نہ رہتا یا میرے جسم کے جینوئن پارٹس میں ہڈی کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کی راڈ شامل ہو جاتی لیکن مجھے یقین تھا کہ ہڈی محفوظ ہے اور جتنی تکلیف ہے وہ گوشت کے پھٹ جانے سے ہے۔ تھوڑی سی سرجری اور ڈریسنگ اور معمولی سے علاج کے بعد زخم کا مندمل ہو جانا یقینی تھا۔

میرا زخم خوردہ ہاتھ اپنا کام بہرحال کر گیا تھا۔ میں اس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شخص کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا جو اس ضربِ کاری کا نشانہ ہوا۔ میں اس وقت اپنے دشمن کو رعایت دے کر خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا وار مُہلک ثابت ہوا۔ اس شخص کی گردن خاصی آواز کے ساتھ ٹوٹی۔ اس کے حلق سے ایک ہچکی سی نکلی پھر ٹارچ فرش پر گری۔ وہ شخص خود فرش پر گرا تو مر چکا تھا۔ بغیر دیکھے مجھے اس کا یقین آچکا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں نے وہ ٹارچ اٹھالی جو سلامت بچ گئی تھی اور واپس اسی دروازے کی طرف بھاگا جس سے وہ دونوں اندر آئے تھے۔ میرے بازو کے زخم سے خون بہہ کر آستین کو تر کرنے لگا تھا۔

"اسے رہنے دے محسن۔" میں نے چلّا کر کہا کیونکہ محسن اپنے حریف کی جیب میں کچھ تلاش کر رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ ریوالور نکالنا چاہتا ہے مگر ٹارچ کی روشنی میں میری نظر نے ایک چمکتی ہوئی لکیر سی دیکھی جو محسن کے ہاتھوں ناک آؤٹ ہو جانے والے کی کمر سے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ یہ کسی وائرلیس، ریسیور یا ٹرانسمیٹر کا ایریل تھا جو اس شخص کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ محسن کے ماہر ہاتھوں نے بیلٹ کھولنے میں دیر نہیں لگائی اور وہ ایریل سے منسلک چار انچ چوڑے، اس سے دگنی لمبائی کے ایک انچ موٹے ریڈیو کو نکال لینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دوطرفہ نظام والا پورٹیبل ریڈیو ریسیور بھی تھا اور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی عام طور پر اسے واکی ٹاکی بھی کہا جاتا ہے۔ محسن نے اس کے انٹینا کو دبا کے فولڈ کیا اور سیٹ کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اُڑس لیا پھر ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے تو ہمیں اپنے مقابل سیڑھیاں نظر آئیں۔ سوچے سمجھے بغیر ہم اوپر چڑھنے لگے۔ محسن کے ہاتھ میں اسٹین گن فائر کے لیے بالکل تیار تھی۔ سات آٹھ زینوں کے بعد ایک موڑ آیا۔ ایک طرف کچھ اور سیڑھیاں تھیں لیکن دوسری طرف دروازہ تھا۔

"کیا دلاور اوپر ہوگا؟" محسن نے رک کر کہا اور تشویش سے میرے بازو کے زخم کو دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اتنے قریب آنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ وہ یقیناً باہر سے بات کر رہا تھا۔ اوپر یہی دونوں تھے۔"

"پھر اوپر جانے سے کچھ حاصل نہیں، میرا خیال ہے کہ ہمیں دوسرا دروازہ باہر جانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ تھوڑا سا ہلا مگر اس کے پٹ بند رہے۔ "یہ اندر سے بند ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ صرف اوپر سے چٹخنی چڑھا دی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"صرف چٹخنی ہوگی تو نکل جائے گی۔" محسن نے کہا اور ہم نے ایک ساتھ دروازے کو اپنے شانوں سے ٹکر ماری، خلافِ توقع چٹخنی بہت کمزور ثابت ہوئی۔ پٹ ایک دم وا ہو گئے اور میں اپنے ہی زور میں آگے نکل گیا۔ آگے زینہ تھا جو نیچے جا رہا تھا۔ میں سنبھل نہ سکا اور پہلے زینے سے منہ کے بل گرا۔ ٹارچ مجھ سے آگے گئی اور سات آٹھ زینوں سے ٹکراتی نیچے پہنچ کر بجھ گئی۔ آخری وقت میں محسن نے مجھے پکڑنا چاہا تھا لیکن اس کا ہاتھ میرے شانے تک ہی پہنچا۔ بازو کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے ہاتھ نے میرے زخم کو چھوا اور آستین کو پکڑ لیا۔ آستین اگر خون آلود نہ ہوتی تو شاید محسن کی گرفت میں آجاتی اور اگر میرے وزن کو نہ سنبھال پاتی تو پھٹ کر الگ ہو جاتی مگر خون کی چکناہٹ کے باعث محسن کا ہاتھ میرے خون سے بھر گیا تھا۔ آستین اس کی انگلیوں سے پھسل کر نکل گئی۔ اس جھٹکے نے مجھے پوری قوت سے نہ گرنے دیا ورنہ میرا سر چوتھے، پانچویں زینے کے سخت دھار والے کونے سے ٹکراتا۔ میں تھوڑا سا ترچھا ہو کے گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پہنچا۔ مجھے پکڑنے کی اس ناکام کوشش نے محسن کا توازن بھی بگاڑ دیا اور وہ بھی اسی طرح میرے پیچھے آیا۔

ہم دونوں ذرا سے فرق سے فرش پر گرے۔ ہر پلٹے کے ساتھ میرے بازو کا زخم میرے ہی جسم کے بوجھ تلے دب جاتا تھا اور سخت کھردرے زینے کی رگڑ سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بچھو کے ہاتھ میرے زخم کو ادھیڑ رہے ہیں۔ چوٹ میرے سر، میری کمر اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی آئی تھی مگر بازو کے زخم کا درد اتنا شدید تھا کہ مجھے کسی اور درد کا احساس بھی نہ ہوا۔ محسن کے ہاتھوں سے بھی اسٹین گن چھوٹ گئی تھی۔ محسن نے عقل مندی یہ کی کہ وائرلیس سیٹ کو سنبھالا اور اس پر دونوں ہاتھ رکھ کے پیٹ کو دبا لیا۔ اسٹین گن ٹوٹنے والی چیز نہیں تھی مگر واکی ٹاکی زینے پر گرتا تو ناکارہ ہو جاتا۔ اسٹین گن بڑی آواز کے ساتھ ہر زینے سے ٹکراتی نیچے تک آئی اور میرے گھٹنے پر لگی۔ واکی ٹاکی کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں محسن خود کو نہ بچا سکا۔ ورنہ وہ دونوں ہاتھ اپنے سر کو بچانے کے لیے استعمال کرتا۔ مشکل سے آدھے منٹ کے بعد وہ میرے اوپر آگرا۔ ایک بار پھر میرا زخمی بازو دب گیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ اپنی فکر کرنے کے بجائے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ہم اب ایک حجرے میں پہنچ چکے تھے۔

"تجھے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" ہم دونوں کے لبوں سے ایک ہی جملہ نکلا پھر ہم نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا اور اس افسوسناک حالت میں ہونے کے باوجود ہنس پڑے۔ خدا نے ہم دونوں کو محفوظ رکھا تھا اور جو چوٹیں آئی تھیں وہ معمولی تھیں۔ "تیرے بازو کے زخم کی حالت خراب ہو رہی ہے۔" محسن نے تشویش سے کہا۔

"زخم خطرناک نہیں ہے اور ہو بھی تو یہاں تیرے اور میرے پاس کیا ہے۔" میں نے کہا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ گولی کا زخم ہے۔ سیپٹک ہو سکتا ہے۔" محسن بولا اور اس نے بھی اسٹین گن اٹھالی۔

"اتنی جلدی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور ٹارچ کو اٹھا کے جھٹکا۔ وہ پھر روشن ہو گئی تو مجھے خوشی ہوئی۔

محسن نے اسٹین گن کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد دیوار سے ٹکا دیا پھر اس نے بیلٹ سے لگے ہوئے واکی ٹاکی کو نکالا اور اس کا ایریل کھینچا۔ اس کے سامنے والے حصے میں صرف دو بٹن تھے۔ ایک آواز کو کم زیادہ کرنے والا اور دوسرا فریکوئنسی ملانے والا۔ آن آف کرنے کا سوئچ سائڈ میں تھا۔ محسن نے اس کی پوزیشن دیکھی پھر اسے آن کر دیا۔ چھوٹا سا اسپیکر ایک دم سگنل دینے لگا۔ سگنل مورس کوڈ میں تھا۔ محسن نے والیوم کم کیا اور ہم دونوں نے اسپیکر کی ٹیں ٹیں کو دھیان سے سنا۔ پیپ پی ی ی پ... پیپ... پی ی ی پ... ڈاٹ اور ڈیش... نقطے اور لکیریں جو اے سے زیڈ تک انگریزی زبان کے سب حروف تہجی بناتے تھے۔ مورس کوڈ ہم نے لندن میں شوقیہ سیکھا تھا اور اس طرح پیغام رسانی کے بین الاقوامی نظام کی زبان کو سمجھنے لگے تھے۔ ہمیں جوابی پیغام دینا بھی آتا تھا لیکن اس واکی ٹاکی میں ایسی کوئی "کی" نہیں تھی جس کو دبا کے ہم مورس کوڈ میں بات کر سکتے۔ یہ بھی حیرانی کی بات تھی کیونکہ واکی ٹاکی براہِ راست گفتگو میں کام آنے والا آلہ تھا۔ ایک طرح کا چلتا پھرتا ٹیلی فون۔ اس میں مورس کوڈ سگنل نشر کر کے پیغام کی ترسیل کا رازداری کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ عام فہم زبان میں گفتگو کرنے سے یہ خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے کہ پیغام کسی اور ریسیور پر سن لیا جائے گا یا ایف ایم شارٹ ویو یا اے ایم ٹرانسمیٹر سے نشر ہونے والے ہر پیغام کو عام آدمی اپنے گھر کے ریڈیو پر بھی سن سکتا ہے اور اس کے لیے زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑتا جیسے کوئی بھی اسٹیشن کیچ کرنے کے لیے بینڈ کا انتخاب کرنے کے بعد سوئی گھمانی پڑتی ہے اور جہاں مطلوبہ اسٹیشن کی آواز سنائی دے وہیں روک دی جاتی ہے۔ ایسے ہی سوئی گھماتے ہوئے کسی پیغام کا اتفاقیہ ریڈیو پر سنائی دے جانا عین ممکن ہے۔ غالباً اسی لیے یہ لوگ مورس کوڈ میں بات کر رہے تھے جو ریڈیو پر بظاہر ٹیں ٹیں لگتا ہے مگر یہ بے معنی ٹیں ٹیں نہیں ہوتی۔ تربیت یافتہ لوگ مثلاً تار گھر میں تار بھیجنے والے اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم عام آدمی اس سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر سکتا۔

"یہ لوگ پوچھ رہے ہیں کہ جواب کیوں نہیں دیتے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں مگر یہ کون لوگ ہیں اور کیا جواب چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جب تک یہ معلوم نہ ہو..."

"ہم جواب دے بھی کس طرح سکتے ہیں۔" محسن نے سیٹ کو اوپر نیچے سے دیکھا۔

"کیا وہ لوگ ہماری گفتگو نہیں سن رہے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

محسن نے مجھے دوسری سائڈ پر لگا ہوا "آن آف" جیسا دوسرا سوئچ دکھایا جو اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر "ریسیور" لکھا ہوا صاف پڑھا جاتا تھا۔ ذرا نیچے "ٹرانسمیٹر" کا لفظ چمک رہا تھا۔ اگر یہ سوئچ نیچے ہوتا تو ہماری گفتگو کا ایک ایک نقطہ نشر ہو جاتا۔ محسن نے پلاسٹک کور کی بیک پر لکھے ہوئے باریک حروف کو ٹارچ کی روشنی میں پڑھا۔

"یہ چھ وولٹ کی سی بیٹری پر چلتا ہے۔" محسن نے کہا، "اور اس کی رینج دو سو میٹر ہے۔ ایک فرلانگ سے کچھ زیادہ۔"

"کیا تو نے ان دونوں کی صورت پر غور کیا تھا؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی، سالوں نے اندھا کر دیا تھا۔"

"جو میرے سامنے آیا تھا وہ تو مارا گیا۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹرانسمیٹر دوسرے کے پاس تھا۔ وہ کیسے جواب دیتا ہوگا۔"

اسپیکر پھر بولنے لگا۔ وہ اب پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی فنی خرابی ہو گئی ہے یا خطرے کی بات ہے۔

"ان کو کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی چاہیے۔" میں نے کہا "تاکہ وہ مطمئن رہیں اور دور رہیں۔"

"اگر میں نے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ آواز کے فرق کو محسوس کر لیں گے۔" محسن نے کہا۔

"آواز تو میری بھی مختلف ہوگی۔" میں نے کہا۔ "خیر میں ایک چال چلتا ہوں۔ شاید کامیاب رہے۔"

میں نے محسن کو انگلی سے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور واکی ٹاکی کے سوئچ کو نیچے ٹرانسمیٹر کی پوزیشن پر کر دیا۔ اسپیکر خاموش ہو گیا اور مائکروفون کام کرنے لگا۔ میں نے پلاسٹک باڈی پر انگلی بجائی۔ ایک ڈاٹ کے لیے ایک بار کھٹ، ڈیش کے لیے باڈی پر رگڑ۔ دو نقطوں کے لیے کھٹ کھٹ، دو ڈیش لگانے کے لیے باڈی کے اوپر ناخن سے دو بار رگڑ۔ اس رگڑ سے ہلکی سی مگر مسلسل آواز پیدا ہوتی تھی۔ باڈی کے اندر کا مائکروفون اسے یوں نشر کرتا ہوگا کہ سننے والوں کو اپنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اسپیکر پر چند سیکنڈ کی کھر کھر سنائی دیتی ہوگی۔ اس طرح میں نے لندن میں بہت سے شوقین لوگوں کو پریکٹس کرتے دیکھا تھا۔ وہ کسی بھی چیز سے کام چلا لیتے تھے۔ ایک کیل کو دیوار پر مار کے اور اسی سے لکیر کھینچ کر وہ ڈاٹ اور ڈیش بنا لیتے تھے۔ چمچے کو میز پر بجا کے اور رگڑ کے نقطوں اور لکیروں کا مفہوم پیدا کر لیتے تھے۔ نہ جانے کیسے مجھے خیال آگیا تھا کہ مورس کوڈ کو سمجھنے والا اگر واکی ٹاکی پر جواب دے گا تو اسی طرح دے گا۔ میں سیٹ پر ناخن مارتا رہا اور ناخن سے لکیریں بناتا رہا جو کچھ اس طرح سنائی دیتے تھے۔ ٹک ٹک... کھر... ٹک... کھر کھر... جو پیغام میں نے دیا وہ یہ تھا: "سب خیریت ہے... ہم آرہے ہیں۔" پھر میں نے سوئچ کی پوزیشن بدلی اور اسے "ریسیو" پر کر دیا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اسپیکر نے چہکنا شروع کیا۔

"کیا تم کامیاب رہے؟ اوور۔"

محسن کا چہرہ کھل اُٹھا۔ آواز نکالے بغیر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پھر ریسیور کی پوزیشن بدلی۔

"یس..." میں نے جواب دیا۔ "ہمارا انتظار کریں، اوور اینڈ آل۔" اور اس کو بند کر دیا۔

"ہم توقع کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے خطرہ ٹلا۔" محسن بولا۔ "حالانکہ ہم ابھی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"ہم خوش بھی ہو سکتے ہیں کہ اس مزار کی قید سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ ہم ابھی اندر ہی ہیں۔"

"لیکن اب اگلا مرحلہ اصل آزمائش ہے... ہم کو یہاں سے نکلنا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔

"پھر دیکھیں گے کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں ہوا۔" میں نے کہا۔ "رابعہ اور نازو کی فکر کریں گے۔"

محسن نے حجرے کا دروازہ دوسری طرف سے کھولا۔ ہمارے سامنے وہی صحن آگیا جس میں خستہ و شکستہ ٹرک ہمارے ظلم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ ہم نے زبردستی کر کے بالکل نئے ٹرک کو اسکریپ کر دیا تھا لیکن اس میدان میں کم سے کم دس افراد اسی راستے میں دیوار بنے کھڑے تھے جو باہر کی دنیا تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔ ہم اسی راستے سے اندر آئے تھے لیکن اس وقت کسی نے ہمیں نہیں روکا تھا۔ اتنے کم وقت میں دس مسلح افراد کی فوج کا نمودار ہو جانا کوئی معجزہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ حجروں میں چھپے ہوئے تھے لیکن ہماری نظر اُن کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ محسن نے دروازہ پھر بند کر دیا۔ مخالف سمت کی دیوار میں ایک اور دروازہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم دوسرے حجرے میں پہنچے۔ اس دوسرے حجرے میں بھی دو دروازے تھے۔ ایک صحن میں کھلنے والا اور دوسرا آگے والے حجرے سے ملانے والا۔ آگے بڑھتے جانا بے سود تھا۔ ہر جگہ باہر نکلنے کا وہی ایک راستہ تھا جس کے سامنے دلاور کے جاں نثار اور اس کے زر خرید کارندے موت کے نامہ بر بنے کھڑے تھے۔ میں نے اپنے قدم پچھلے حجرے میں روک دی۔ اس کا دروازہ کھولنے سے ہم براہِ راست ان کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ درمیان میں ٹرک آجاتا تھا اور تھوڑا سا ہمت سے کام لیتے ہوئے آدھے صحن کو عبور کر کے ٹرک تک پہنچ سکتے تھے۔ ٹرک کے اوپر سے لکڑی کا وہ لمبا چوڑا تختہ اتار لیا گیا تھا جس پر وہ آگ لگائی گئی تھی اور جو زیرِ زمین راستے کو بند کرتا تھا۔

"ابھی کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں سرچ لائٹ روشن ہو جائیں گی۔" محسن بولا۔ "ابھی یہ لوگ ایک ہی راستے کی دیوار بنے کھڑے ہیں پھر یہ پھیل جائیں گے کہ کہیں ہم دیوار پھاند کر نہ نکل جائیں۔"

"اس قلعے کی فصیل کو بھلا کون آسانی سے عبور کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہمیں سیڑھی یا رسّی فراہم کر دی جائے تب بھی یہ ناممکن ہوگا اور اسی لیے یہ لوگ مطمئن ہیں کہ ہم کسی طرف سے بھی نکل نہیں سکتے۔ سوائے اس ایک راستے کے جو وہ روکے ہوئے ہیں جب تک انھیں نہ ہٹا دیا جائے ہماری نجات مشکل ہے۔"

"مگر یہ ہٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"میں ہٹانے کی بات کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ٹرک تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو..."

میری بات نامکمل رہ گئی کیونکہ میں نے ساتھ والے پانچویں حجرے میں سے باتیں کرنے کی آواز سُنی۔ دو افراد چپکے چپکے آپس میں کسی مسئلے پر الجھ رہے تھے۔ اختلافِ رائے کے سبب ہمیں اس لیے معلوم نہ ہو سکا کہ گفتگو کے الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم نے ادھر اُدھر دیکھ کر کمرے کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پلنگ کو منتخب کیا۔ میں اور محسن اس کے نیچے گھس گئے۔ اس طرح کہ اُلٹے لیٹنے کے بعد ہم سر اٹھا سکتے تھے اور اپنے ہاتھ بھی کسی طرف پھیلا سکتے تھے۔ اپنے بہت قریب مجھے کوئی بھی چیز نہیں آئی تو میں نے ٹارچ کو دور پھینک دیا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وہ دونوں اندر آگئے۔

"تم نے بھی سُنی تھی کوئی آواز؟" ایک نے کہا۔

"اور کیا میں تمھیں بہرا لگتا ہوں جو کہ رہا تھا۔" دوسرا بولا۔

"ذرا ٹارچ جلا کے دیکھو۔"

"کوئی باہر تو نہیں گیا؟" پہلے نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ان کے قدم ایک ساتھ آگے بڑھے۔ میں نے اور محسن نے اپنے دائیں ہاتھ آگے بڑھا کے ان کی ایک ایک ٹانگ کو ٹخنے سے اوپر پکڑا اور جھٹکا دے کر پیچھے کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی ہم باہر نکلے۔ وہ منہ کے بل پکے فرش پر گرے۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھتے میں ایک کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے اور مجھے گرانے کی کوشش میں وقت ضائع کر دیا ورنہ اتنی دیر میں وہ چلا کے باہر سے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ میں نے اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس کے لیے بال آسانی سے میرے ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ ایک زوردار "آہ" کر کے بے حس و حرکت ہو گیا۔ پھر میں نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ محسن نے اُسے بھی بالکل اسی طرح ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی مگر ہمیں ریوالور کے سوا کچھ نہ ملا۔ فی الحال ہمیں مزید ریوالور درکار نہیں تھے چنانچہ ہم نے چیمبر سے گولیاں نکال کے جیب میں ڈال لیں۔

"کیا ان کے چہرے بھی تجھے شناسا محسوس ہوتے ہیں؟" محسن نے پھر اسٹین گن اُٹھالی۔

"نہیں... یہ سب دوسرے اور تیسرے درجے کے خدمت گزار ہیں جو صرف جاں نثاری کا صلہ لیتے ہیں اور کوئی سوال نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کس کے لیے کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟ اپنی زندگی کی طرح یہ اپنی موت پر بھی دنیاوی آقاؤں کا جبر و اختیار تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ آقا بھی عام فانی انسان ہوتے ہیں خدا نہیں ہوتے۔"

محسن نے اس دروازے کو دیکھا جس میں سے وہ دونوں گزر کے آئے تھے۔ بظاہر وہ بھی اسی قسم کا حجرہ تھا جس میں ہم کھڑے تھے لیکن اس میں ایک روشن مستطیل سی نظر آرہی تھی۔ میں نے محسن کو ایک چادر سے لمبی سی پٹی پھاڑتے دیکھا۔ چادر اسی پلنگ پر بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے ہم نے پناہ لی تھی۔ چادر بالکل نئی تو نہیں تھی مگر بہت صاف تھی۔ میرے بازو کا زخم زور آزمائی کے سبب پھر رسنے لگا تھا۔ محسن نے آستین کا نصف حصہ پھاڑ کے الگ کیا اور زخم پر پٹی اس طرح لپیٹ دی کہ خون رُک جائے۔

"تو نے دیکھا یہ دونوں تہ خانے سے اوپر آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"تہ خانے کے سوا اور کہاں سے نکل سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"پہلے ہم انہی حجروں سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت سب خالی پڑے تھے۔"

"یہ زیرِ زمین راستہ شاید بیچ کے حجرے میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔" میں نے ساتھ والے کمرے کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہمیں فوری طور پر نازو یا رابعہ کے بارے میں تردد کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ نیک محمد کا خیال ضرور تھا کہ وہ انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو کر نکل گیا تو ہمیں اپنے فرار کے وسائل خود پیدا کرنے ہوں گے اور بعد میں اگر غالب نے کوئی عملی قدم اُٹھایا تو یہاں آنے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن فوری طور پر ہم صرف اپنے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اگر ہم اس بار شکاریوں کے نرغے سے نکل گئے تو دوسروں کے لیے بھی کچھ کر سکیں گے ورنہ خدا کے بعد دوسروں کی مدد کے طلب گار ہوں گے۔ زخم کا اثر اب پورے بازو تک پھیلنے لگا تھا اور درد کا احساس میری انگلیوں کی پوروں تک اتر آیا تھا مگر میں اس بازو کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

پانچویں حجرے سے نیچے اترنے والا راستہ ایک چوکھٹے پر مشتمل تھا۔ بالکل کسی کھڑکی جیسا جو دیوار کے بجائے فرش میں نکالی گئی ہو۔ یہ چوکھٹا بالکل درمیان میں ہوتا تو پہلی بار اس کے اوپر سے گزرتے ہوئے ہمیں اس کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا۔ سیمنٹ کے پختہ فرش پر چلتے چلتے ہمارے قدموں کے نیچے لکڑی کا فرش آجاتا جس کے نیچے خلا تھا تو ہمارے پیروں کی دھمک بالکل جدا اور بالکل واضح ہوتی مگر چوکھٹا ایک گوشے میں تھا اور اسی مقام پر تھا جہاں دوسرے حجروں میں پلنگ لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں اس کمرے میں سے پلنگ ہٹا دیا گیا تھا ورنہ وہی چوکھٹا کسی پلنگ کے نیچے آجاتا تو ہمیں بالکل دکھائی نہ دیتا۔ اس خیال نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"محسن! ایسے سوچے سمجھے بغیر نیچے جانا ٹھیک نہیں۔" میں نے کہا۔

"سوچنے سمجھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہمیں تہ خانے میں پہنچانے کا انتظام ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک قید سے آدھے تو نکل آئے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بدتر قید میں پوری طرح گرفتار ہو جائیں۔ پہلے زمین کے اوپر تھے۔ اب نیچے چلے جائیں تو کوئی مددگار بھی نہ پہنچ سکے۔"

"تو خواہ مخواہ ڈر رہا ہے۔"

"ڈر تو رہا ہوں مگر خواہ مخواہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو ذرا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

واقعات کو ذہن میں رکھ۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہاں اسیر رکھنے والوں نے آزاد چھوڑنا کیوں ضروری خیال کیا، وہ ہمیں بند رکھنا چاہتے تو رکھ سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے ہمیں گرفتار کرنے کے لیے ایسے اناڑیوں کو کیوں بھیجا۔ کیا ان کو معلوم نہیں تھا کہ ہم آسانی سے قابو میں آنے والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ چوہدری دلاور کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ہمیں بڑی خوب صورتی سے ٹریپ کیا تھا اور جس طرح ہم سے مخاطب تھا وہ بھی اس کی عقل و فراست کا ثبوت تھا۔ گامے ماچھی کی لاش کو وہیں چھوڑ دینا بھی ایک ڈرامائی تاثر دینے کی کوشش تھی۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم جو کچھ پلان کرتے ہیں اسے پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر اس کو کس نے بتایا کہ ہم یہاں آنے والے ہیں؟"

"یہ اسے رابعہ اور نازو میں سے کسی نے بتا دیا ہو گا۔" محسن بولا۔ "میرا قیاس کہتا ہے کہ نازو اپنے مشن میں کامیاب رہی تھی مگر گامے ماچھی کو یرغمالی رکھنا بے سود ثابت ہوا۔ گامے ماچھی کے کسی اپنے آدمی نے جو اوپر والوں کا ایجنٹ تھا، فوراً گامے ماچھی کا کام تمام کر دیا۔ اس سے قبل کہ نازو اسے اپنا اسیر بنا کے اس سے کچھ پوچھتی یا قیدی کو ہمارے حوالے کرتی اس کو قتل کر دیا گیا۔ ممکن ہے اس کے بعد قاتل بھی مارا گیا ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کارِ خیر کے بعد وہ بھاگ گیا ہو۔" میں نے قائل ہو کے کہا۔ "اور چوہدری دلاور کو خبر پہنچا دی ہو کہ دقیانوسی بیٹھے کے تسلی کاک برقعوں میں دکمانڈوز خواتین نے گامے ماچھی کا تختہ اور خود گامے ماچھی کو الٹ دیا تھا مگر اس نے بر وقت وہ زبان بھی خاموش کر دی جس سے افشائے راز کا ڈر تھا۔ باقی بندوبست خود چوہدری صاحب نے کر لیا۔ اس نے فوراً تاڑ لیا ہو گا کہ یہ کمانڈوز کون ہو سکتی ہیں اور ان کا آنا کس کے آنے کی تمہید ہے۔ چوہدری دلاور نے جانتے بوجھتے ہمارے مقابلے پر دو پیدل بھیج دیے۔ ان کے ہاتھ میں تو ریوالور تھا مگر وہ عقل سے بھی پیدل تھے۔ وہ مارے گئے تو کوئی بات نہیں۔ ہم کو غلط فہمی تو ہو گی نا کہ ہم مردانہ وار لڑ کے نکل آئے۔ تو خود سوچ، کیا فرار کے دروازے عقیدت مندوں پر بند کیے جا سکتے ہیں لیکن باہر عام لوگوں کے آنے جانے۔۔۔ میں استعمال ہونے والے دروازے پر ضرور کوئی نوٹس ہو گا یا عبارت ہو گی کہ خانقاہ کو مرمت، تزئین اور آرائش کے بعد کھولا جائے گا۔ چوہدری دلاور نے مائکرو فون کے ذریعے ہم سے مذاکرات کیے۔ کیا ایسے

نظام کو نصب کرنے کے وسائل رکھنے والا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ اندر بیہوش کرنے والی گیس چھوڑ دیتا۔ کلورین یا امونیا کی تھوڑی سی مقدار کافی تھی مگر اس نے ہمیں نکل جانے دیا۔ اس طرح کہ ہم اسے اپنی کامیابی سمجھیں۔ پھر اس نے ہمیں ۔۔۔ بھی فراہم کیا۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے درخواست کرنا چوہدری دلاور کی شان کے خلاف تھا۔ اس نے مورس کوڈ میں پیغام دیا اور ہمارے جوابی پیغام سے وہ بہت خوش ہوا ہو گا کیونکہ ہم نے اس کے اندازے کو ثابت کر دیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہ ولایت پلٹ جو اتنا کچھ جانتے ہیں، مورس کوڈ سے بھی واقف ہوں گے۔ ہم نے جواب دیا تو اس نے مان لیا کہ جواب دینے والے اسی کے آدمی ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہو گا کہ جواب ہم دے رہے ہیں۔ واکی ٹاکی میں مورس کوڈ کے استعمال کا ممکن ہے۔ براہِ راست گفتگو میں کیا حرج تھا۔"

"مسئلہ رازداری کا بھی ہو سکتا تھا۔"

"او ہو۔۔۔ اتنی سی دیر میں پیغام کے کہیں اور سنے جانے اور اس سے کسی قسم کا نقصان ہونے کے امکانات ہزار میں ایک بھی نہیں تھے۔ دس ہزار میں ایک بھی مشکل تھے۔" میں نے کہا۔ "بس وہ چاہتا تھا کہ اپنی آواز نہ سنائے اور ہم مورس کوڈ میں جواب دیں۔ وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے کہ وہ ہمارے دھوکے میں آ گیا ہے۔ ہم تو ہر طرف سے محصور ہیں اور اس کی قید میں ہیں۔ چوہدری دلاور اندر کیوں نہیں آ جاتا؟ اسے ڈر کا ہے؟"

"اچھا تیری بات مان لی جائے تو پھر اب کیا کرنا ہے؟" محسن نے کہا۔

"یہ کھڑکی یا زیرِ زمین راستہ بھی عمداً کھلا چھوڑ دیا گیا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "ورنہ اس راستے سے باہر والے اسے بند کر کے بھی آ سکتے تھے۔ دوسرے کمرے والی جگہ بیڈ لگا ہوا ہے۔ یہاں سے بیڈ بھی اٹھا دیا گیا ہے اور روشنی بھی ہے۔ یہ ٹریپ ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جو سامنے مسلح فوج کا ایک پورا دستہ کھڑا ہوا ہے پیادے ہیں۔۔۔ حکم کے غلام جن کو مہلک اسلحہ پکڑا کے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ سب مارے جائیں گے ہیں اور ان کی موت سے آقاؤں کو صرف اتنا فائدہ ہو گا کہ ڈرامے کا ایک سین بالکل حقیقی نظر آئے گا۔ ہو سکتا ہے بعض نے زندگی میں پہلی مرتبہ ریوالور اٹھایا ہو۔"

"میں نے مان ا

"۔۔۔ اب بتا آگے بڑھنا ہے، نیچے اترنا ہے یا یہیں رُکنا ہے؟"

"اگر دلاور چاہتا ہے کہ ہم سب کچھ دیکھ لیں اور پھر خیریت سے ساتھ نکل جائیں تو ایسا ہی ہو گا۔" میں نے کہا۔ "چل نیچے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دلاور کا مقصد کیا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کہ وہ ایک چھوٹے ڈرامے سے، جیسے ریڈیو ڈراما کہنا چاہیے، ہمیں پہلے ہی شرمندہ اور ڈی مورالائز کر چکا ہے۔ اس نے مکینک برکت یا اس کے کسی شاگرد کو قتل کیے بغیر ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ ہماری وجہ سے ان کی جان گئی۔ اب وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے، یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔۔۔ چل نیچے۔"

محسن نے مجھ سے پہلے زینے پر قدم رکھا اور نیچے اترنے لگا۔ روشنی کسی زیرِ زمین کمرے سے آ رہی تھی اور ہمیں راستہ دکھلانے کے لیے کافی تھی۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے اور سرآہٹ پر کان دھرتے ہم تہ خانے میں اترتے گئے یہاں تک کہ میں نے خود کو ایک طویل ہال میں پایا۔ اُسے ایک بہت لمبا برآمدہ یا سرنگ نما راہداری بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ پندرہ فٹ چوڑا اور تقریباً آٹھ فٹ گہرا یہ پختہ فرش اور دیواروں والا تہ خانہ اوپر کے دس حجروں کی چھت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی چوڑائی تو پندرہ فٹ ہی تھی مگر لمبائی ڈیڑھ سو فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ درمیان میں کہیں کہیں سیمنٹ کنکریٹ کے کالم چھت کو سہارا دیتے تھے اور ایک ایک ستون چھوڑ کر جو لائٹس نصب کی گئی تھیں وہ بہت تیز تھیں۔ ایک کا رخ میری طرف تھا تو دوسری کا مخالف سمت میں اور یوں درمیان کا پورا علاقہ روشن تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا طویل اور پختہ تہ خانہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔

میں نے اور محسن نے اِدھر اُدھر نگاہ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا جاری رکھا۔ کسی بھی ستون کی اوٹ سے کسی کے اچانک نکل آنے اور ہم دونوں کے جسم چھلنی کر دینے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محسن ایک دم جھکا اور اس نے فرش پر سے کوئی چیز اٹھالی۔ یہ شفاف پلاسٹک کی چھوٹی سی سربند تھیلی تھی۔ چائے کی پتی کی چار چار آنے والی پڑیوں کے برابر۔ "یہ سفید چینی تو نہیں ہو سکتی۔" محسن نے کہا۔

"اتنے چھوٹے پیکٹ چینی کے نہیں ہو سکتے۔" میں نے کہا اور اس ننھی سی تھیلی کو محسن سے لے لیا جس کا وزن مشکل سے سو گرام ہو گا۔ "چینی آدھا سیر یا سیر کی تھیلی میں ہو سکتی تھی۔ نہ یہ نمک ہے نہ باریک پھٹکری۔"

"پھر یہ کیا ہے، ہیروئن؟"

میں نے تھیلی کا ایک کونا دانت سے کاٹ کر اس سفید چیز کو ہتھیلی پر نکالا اور ایک انگلی کی پور پر لگا کے چکھا۔۔۔ "ہیروئن۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ دیا اور ایک طرف تھوک دیا۔ "میرا خیال غلط نہیں تھا۔"

"یہ خیال میرا تھا کہ یہ ہیروئن ہے۔" محسن نے کہا۔

"میں دلاور کے متعلق رائے دے رہا تھا۔" میں نے کہا اور ہیروئن کے پیکٹ کو جیب میں رکھ لیا۔ آخر تک جانے سے ہمیں مختلف کونوں میں پڑے ہوئے دو پیکٹ اور ملے بلاشبہ ان میں ہیروئن تھی اور جس انداز سے پیکٹ پھیلائے گئے تھے اس سے خیال یہی آتا تھا کہ یہ پیکٹ مال اٹھاتے وقت گر گئے اور کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ تہ خانے کے انتظامات اور تہ خانے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ فرض کیا جاتا تو غلط نہ ہوتا کہ یہ گودام ہے جہاں بہت زیادہ مال آتا جاتا ہے اور سیکڑوں ہزاروں تھیلیوں میں سے کسی جگہ ایک تھیلی کا گر جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ پھر یہ کہ تھیلی سڑک پر تو نہیں گری، گودام میں ہی رہی، اگلی بار اٹھالی جائے گی۔

"مبارک ہو عزیزم کہ بزعم خود اپنی ذات کو احمق الاحمقین ثابت کرنے والے بالآخر چوہدری صاحب کے طفیل ضمانت کی اعلیٰ ترین سند حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔" میں نے کہا۔

"سلیس اردو میں ارشاد ہو کہ آپ کیا بک رہے ہیں؟"

"ہم یہ فرما رہے ہیں کہ اپنی کوشش کامیاب رہی۔" میں نے کہا۔ "ہم چوہدری دلاور کو جس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے اس بات کا انھوں نے یقین کر لیا۔ ہم یہ ظاہر کرنے میں مصروف تھے کہ ہمیں اصل کاروبار کی خبر ہی نہیں۔ وہ بیچتے اور بھیجتے ہیں اسلحہ اور گولہ بارود مگر ہم انھیں منشیات فروش سمجھتے ہیں۔ ان کو یقین آ گیا ہے کہ ہم اصلیت کو نہیں جانتے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمیں ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا جائے۔ ثبوت ہماری جیب میں پہنچ چکا ہے۔ ہم اب چوہدری دلاور کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو یہی نا کہ اس خانقاہ کو منشیات کا اڈا ثابت کرنے کے لیے یہ تین تھیلیاں پیش کریں گے؟ اس سے کیا ہو گا؟ کیا ان تھیلیوں پر امپورٹر یا ایکسپورٹر کی مہر ہے یا ٹریڈ مارک ہے؟۔۔۔ نہیں تو کچھ نہیں۔ ہم ضعیف الاعتقاد اور جاہل عقیدت مندوں کے جذبات کو مشتعل کریں گے جو مجاور کی ذات پر ایسے ناپاک الزام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم چوہدری دلاور سے واکی ٹاکی پر بات کریں گے۔ اس پر واضح کریں گے کہ ثبوت ہمیں مل چکا ہے اور بہت جلد ہم ثابت بھی کر دیں گے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش ہو گا اور کہے گا کہ تم نے پہلے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میرا کیا بگاڑ لیا ہے۔ جو کرنا چاہتے ہو شوق سے کرو۔ اپنی دانست میں وہ ہمیں گمراہ سمجھتا ہے۔ خالی گودام میں ہیروئن کے تین پیکٹ پھینک کر اس نے ہمیں صراطِ مستقیم سے زیادہ دور کر دیا ہے۔ اُس نے ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ وہ واقعی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس طرح اپنے اصل کاروبار کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ ہم بھٹک کر غلط راستے پر چلنے والے احمق ہیں محسن خان صاحب!"

"میں آپ کی حد تک اس رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔" محسن کھنکار کر بولا۔ "ماشاءاللہ آپ بچپن سے ہی حماقتوں میں طاق تھے۔"

"اب اس بے وقوف بنانے اور بننے والے ڈرامے کا سب سے مشکل سین آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو ڈزاوڑ گولیاں چلاتے غنیم کی صفوں کو چیرتے ہوئے نکل جائیں گے۔ اپنے اسی ٹرک میں سوار ہو کے جسے ہم نے ٹینک سے زیادہ بدصورت بنا دیا ہے!"

اوپر شام کا اندھیرا بڑھتے بڑھتے رات کے اندھیرے میں ڈھل چکا تھا اور احاطے کی فصیل کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں مگر وہ صفِ دشمناں اپنی جگہ پر موجود تھی۔ وہ عجیب کاٹھ کے الو تھے کہ ان کے ہاتھ میں بندوق دے کر انھیں جہاں کھڑا کر دیا گیا تھا، وہاں سے وہ ایک انچ بھی ہلنے پر آمادہ نہ تھے۔ شاید ان کے آقاؤں کا ان کو یہی حکم تھا۔ معلوم نہیں ان کو کیا سمجھایا گیا تھا کہ وہ جان کے خوف سے بے نیاز ایک راستے کو بند کیے کھڑے تھے۔ شاید ان سے کہا گیا ہو کہ اُدھر سے دو بدمعاش گزرنے کی کوشش کریں گے۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس صرف خنجر ہوں گے۔ میں نے افسوس سے سوچا۔

"اب صورتِ حالات زیادہ موافق ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہم سر جھکا کے ایک قطار میں دوڑ لگاتے ہیں۔ قدموں کی آہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ ترچھا جانے سے ہم ٹرک کے پچھلے پہیّوں کی آڑ میں رہیں گے۔"

"اگر ضرورت نہ پڑے تو قتلِ عام مت کرنا۔ ریوالور سے کام نکالنے کی کوشش کرنا۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے اتفاقِ رائے سے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جانا مناسب سمجھا۔ ٹرک ہم سے کوئی پچاس گز دور کھڑا ہوا بہت مظلوم لگ رہا تھا۔ آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے لیے زخمی بازو کی کہنی پر جسم کے بوجھ کو آگے گھسیٹنا مشکل ہو گیا۔ میں رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگا اور سر کو گھاس پر رکھ کے لیٹ گیا۔ محسن نے میری ہمت بندھائی اور پانچ منٹ بعد میں نے باقی راستہ طے کرنے کے مشکل سفر کا آغاز کیا۔ ٹرک تک پہنچنے میں مجھے جسمانی کمزوری اور تھکن کے سوا کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوا مگر میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کیا میں اس دیوہیکل ٹرک کو چلا کے نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ اس کے اسٹیئرنگ وھیل کو کنٹرول کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی قوت درکار تھی جبکہ میرا ایک بازو عملاً ناکارہ ہو رہا تھا۔ ٹرک کے قریب پہنچ کر میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سا آیا۔ میں نے ہینڈل کو تھاما تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"سکندر! تو چلا سکتا ہے ٹرک کو؟" محسن نے میرا کندھا ہلا کے پوچھا۔ "آگے سرنگ ہے۔"

"میں... میرا خیال ہے کہ مجھ سے حادثہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر تو پیچھے جا۔" محسن نے اسٹین گن مجھے تھمائی۔ "اسٹین گن چلائے گا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا لیکن اسٹین گن پکڑنے سے پہلے میری حالت میں کچھ بہتری کے آثار نمودار ہوئے۔ ٹرک میں سوار ہو کے اسٹین گن چلانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ایک تو ٹرک کے چلنے سے پہلے میں اس پر چڑھتا تو سامنے کھڑی ہوئی فوج مجھے دیکھ لیتی۔ وہ مجھے اتنی مہلت کبھی نہ دیتے۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا تھا کہ جیسے ہی ٹرک گھومے اور سرنگ کی طرف چلنے لگے، میں دوڑ کر اس کے عقبی حصّے میں پائدان پر قدم جما لوں اور پھر چھلانگ مار کے دو فٹ سے زیادہ اونچے تختے پر سے اندر کود جاؤں پھر فوراً ہی پلٹ کر پوزیشن سنبھالوں اور جیسے ہی اندھا دھند دوڑتا ہوا ٹرک اس کرائے کی فوج کو روندنے کی نیت سے آگے بڑھے میں فائر کھول دوں۔ یہ بہت پھرتی اور مستعدی کا مشکل کام تھا جو ڈرائیونگ سے زیادہ توجہ اور حاضر دماغی مانگتا تھا۔ میں نے گردن ہلائی اور اوپر چڑھ گیا۔

ڈرائیونگ کیبن کے اندھیرے میں میرے دشمن مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں ونڈ اسکرین کے پیچھے سیدھا بیٹھا انھیں گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے مفروضات کی بنیاد پر غلط نتائج اخذ کر لیے ہوں اور سامنے کھڑے ہوئے دشمن اناڑی نہ ہوں، مجھ سے بڑے شکاری ہوں۔ جن کو میں نے کاٹھ کا الو سمجھ لیا تھا وہ سچ مچ خطرناک قسم کے خونی قاتل ہوں جو اپنے ریوالور مجھ پر خالی کر دیں اور کسی ریوالور کی ایک گولی بھی ضائع نہ جائے۔

"کیا سوچ رہا ہے؟" محسن نے میرے قریب سے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا اور اگنیشن سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سیٹ پر بیٹھا ہوا میں بہت اونچا تھا۔ میں نے چابی گھماتے ہی سر کو جھکا لیا۔ انجن غرّایا اور ایک سیکنڈ کا توقف کیے بغیر میں نے کلچ کو چھوڑ دیا۔ ٹرک کسی زخمی درندے کی طرح دہاڑ کر آگے بڑھا۔ سامنے سے آنے والی گولی نے ونڈ اسکرین پر مکڑی کا جالا پھیلا دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ وھیل کو اپنے ہاتھوں سے پھسلتے محسوس کیا۔ اسے پورا چکر دینے کے لیے ایک ہاتھ کی طاقت ناکافی تھی اور دوسرے ہاتھ کی رگیں کھنچ کر ٹوٹنے لگی تھیں۔ میرا سر کچھ اور جھک گیا اور میں نے تیز رفتار ٹرک کو لہراتا محسوس کیا۔ ٹرک جسے سیدھا جانا چاہیے تھا، ایک دم دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اُسے سنبھالا تو ٹرک تیزی سے بائیں جانب گیا۔ دوسری گولی ٹرک کی باڈی سے ٹکرائی پھر مسلسل فائر ہوئے۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو...؟" محسن چلّایا۔ "کدھر جا رہا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ "اچھا اچھا... راستہ تو ادھر رہ گیا۔" میں نے کہا اور ٹرک کو پھر موڑا لیکن اسٹیئرنگ میرے قابو میں نہیں تھا۔ کبھی وہ ضرورت سے زیادہ گھوم جاتا تھا اور کبھی گھومنے سے انکار کر دیتا تھا۔ میں نے اسٹین گن کے فائر کی مسلسل آواز سُنی۔ یہ بڑی خوفناک اور خونی آواز تھی۔ ٹرک کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹا۔ ٹرک لڑکھڑایا۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا۔ دشمن تتر بتر ہو رہے تھے مگر میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے۔ راستہ میرے سامنے تھا لیکن نہ جانے کون بیچ میں آ گیا۔ پڑا تھا۔ پلک جھپکتے ہی ٹرک اس شخص کے اوپر سے گزر گیا۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں مگر میں ٹرک کو نیچے اتار لے جانے میں کامیاب رہا۔ ٹرک کی ایک ہیڈ لائٹ کام کرتی تھی لیکن میں نے اسے روشن نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ سرنگ میں آگے ایک موڑ بھی ہے۔ میں نے دائیں پیر کا وزن بریک پر ڈالا اور سیدھے ہاتھ سے لائٹ کا سوئچ کھینچا۔ بایاں ہاتھ اتنی دیر میں اسٹیئرنگ کو چھوڑ چکا تھا۔ جب ایک ہیڈ لائٹ کا اجالا اس اندھیرے کی سرنگ میں پھیلا تو میں نے ایک دم سیدھے ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو پکڑ کے الٹے ہاتھ کی جانب گھمایا مگر اس عمل میں سیکنڈ کے ہزارویں حصّے کی دیر ہو گئی۔ ٹرک کی باڈی نے سرنگ کی دیوار کو رگڑ دیا۔ ٹرک الٹتے الٹتے بچا۔ اس کی وہ سائڈ جو دیوار کی جانب تھی ٹوٹ کر گری اور اگلا مڈگارڈ ٹائر کے ساتھ ٹکرانے لگا۔ پیچھے کسی نے پیچھے سے گولی چلائی اور ٹرک کا دوسرا پچھلا ٹائر پھٹا۔ سرنگ میں اس کی آواز کسی بم کے دھماکے کی طرح سنائی دی۔ اگر پیچھے دونوں طرف دو دو ٹائر نہ ہوتے تو ٹرک پیچھے سے بیٹھ جاتا اور ایک قدم آگے نہ جاتا۔

میں نے سر اٹھا کے سامنے دیکھا۔ موڑ ایک دم آ گیا اور میرے بچانے کی جدوجہد کے باوجود اس مرتبہ ٹرک کی دوسری سائڈ نے دیوار سے رگڑ کھائی۔ لکڑی کی باڈی بکھر گئی اور میں نے دوسری بار ٹرک کو الٹنے سے بچایا۔ میرا تمام جسم سردی کے باوجود پسینے میں تر تھا اور میری جسمانی توانائی بڑی تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے شاید پیچھے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ محسن نے پے در پے ریوالور سے فائر کیے۔ ہر فائر کی آواز اس سرنگ میں گونجتی رہی پھر ساری جدوجہد ختم ہو گئی۔ کسی گولی نے پیچھے والا دوسرا ٹائر بھی پھاڑ دیا۔ ٹرک ایک دم گھوما اور بریک لگاتے لگاتے بھی دیوار سے ٹکرا گیا۔ تصادم کی قوت نے ٹرک کو تھوڑا سا گھمایا اور میں باہر جا گرا۔ میں نے محسن کو چیسس کے نیچے سے رینگ کر آتے دیکھا۔ ٹرک ترچھا ہو کے سرنگ میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ نہ اُسے آگے کھسکایا جا سکتا تھا نہ پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ اس کی موجودہ ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے ایک بالکل نیا ٹرک تھا۔

محسن نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے کھڑا کیا اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ میں اس کے ساتھ یوں چلتا رہا جیسے انجن کے ساتھ بوگی چلتی ہے۔ یہ محسن کا سہارا تھا، میری قوتِ ارادی تھی یا زندہ رہنے کی خواہش جس نے مجھے گرنے نہ دیا۔ میرے سامنے اب وہ پھاٹک تھا جسے کاٹ کر اور گرا کر ہم اندر گئے تھے۔ اس کا آہنی وجود فرشِ خاک پر سرنگوں پڑا تھا۔

"ذرا سنبھل کے۔" محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور اگلا قدم اٹھایا مگر اندازہ غلط ہو گیا۔ میں لوہے کے پھاٹک پر مُنہ کے بل گرا۔ اندھیرے میں کئی گولیاں میرے سر پر سے سنسناتی گزر گئیں۔ وہ بہرحال کاٹھ کے الو اور اناڑی نہیں تھے۔ وہ ابھی تک مقابلہ کر رہے تھے اور پیچھے آ رہے تھے۔ محسن نے گھوم کر دو فائر کیے اور خالی ہو جانے والا پستول پھینک دیا پھر اُس نے مجھے اٹھایا۔ میرے ٹخنوں اور گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی۔ محسن نے مجھے سہارا دیا اور میری کلائی تھام لی۔ "بس چند قدم۔" محسن نے کہا۔ "ہم باہر نکل آئے ہیں۔ تجھے تو بخار ہو گیا ہے۔"

"بخار... نہیں... وہ تو بس ایسے ہی۔" میں نے کہا۔

اسی وقت میں نے نیک محمد کی آواز سُنی۔ تازہ ہوا میں میری طبیعت کچھ بحال ہوئی، ہمارے تعاقب میں آنے والے شاید

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مایوس ہو کے یا ڈر کے واپس چلے گئے تھے۔

"تم نیک محمد!" محسن نے اندھیرے سے نکل کر سامنے آنے والے سائے سے کہا۔ "تم یہاں کہاں؟"

"ہم نے تو تمھیں خانقاہ کے دروازے پر انتظار کرنے کو کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو میں وہیں تھا۔" نیک محمد نے میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی اور سہارا دینے کے لیے وہی بازو پکڑ لیا جو زخم خوردہ تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" میں نے کراہ کے کہا۔ "گولی کا زخم ہے۔"

"گولی... کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے سکندر بادشاہ؟" وہ گھبرا کے بولا۔ گیراج کے احاطے میں بالکل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔

"نہیں... معمولی سا زخم ہے۔ ہڈی بچ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اگر ابھی تک تم وہیں انتظار کر رہے تھے تو کیا تم نے فائرنگ کی آواز نہیں سُنی تھی۔" ہم احاطے سے نکل کر نیک محمد کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

نیک محمد نے سر ہلایا۔ "بالکل نہیں! سُنی ہوتی تو میں وہاں مجمع اکٹھا نہ کر لیتا۔"

"آج وہاں لوگ کیوں نہیں آ رہے تھے؟" محسن بولا۔

"میں نے ایک شخص سے پوچھا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "وہ دروازے تک جا کے لوٹا تھا۔ اس نے بتایا کہ گامے شاہ صاحب کا چلّہ ہے چالیس دن کا۔ وہاں دروازے کے باہر کوئی مجاور بیٹھا تھا۔ وہی آنے والوں کو واپس جانے کا کہہ رہا تھا۔"

"ان کا تو اب چالیس دن بعد چہلم بھی شاید ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ مارا جا چکا ہے۔"

"تم نے ہدایات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ اگر ہم ادھر سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو تم نہ ملتے پھر ہم فرار کیسے ہوتے؟"

"تم لوگ ادھر سے نہیں نکل سکتے تھے۔" نیک محمد نے کہا۔ "میں نے دیکھا تھا، دروازے کے باہر اتنا بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے تالے کا سائز بتایا جو خاصا مبالغہ آمیز تھا۔ تربوز کے سائز کا تالا بھلا کہاں ہوتا ہے۔ "اس کے علاوہ وہاں کچھ اور بھی آدمی تھے ان کے سکندر بادشاہ... وہ وہیں آس پاس پھر رہے تھے اور باہر بیٹھے ہوئے مجاور سے بھی بات کر لیتے تھے۔ میں وہاں بلاوجہ ٹھہرتا تو وہ مجھے بھگا دیتے۔ میں نے ظاہر یہ کیا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے اور بونٹ کھولے کھڑا رہا۔ ان میں سے ایک نے قریب آ کے کہا بھی تھا کہ یہ ٹیکسی اسٹینڈ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اسٹیئرنگ کا بال بیرنگ ٹوٹ گیا ہے اور میں مکینک کا انتظار کر رہا ہوں... بیرنگ لینے کے لیے شہر گیا ہے۔"

"لیکن ہم نے کہا تھا کہ مغرب کے بعد گھر چلے جانا اور ... غالب کو بتانا۔"

"ہاں ہاں... وہ ٹھیک ہے سکندر بادشاہ۔ ... پہلے میری بات تو پوری سُن لو۔"

"یہاں کھڑے ہو کر بات کرنے میں کون سی عقل مندی ... یہاں سے تو نکلو۔" محسن نے کہا اور نیک محمد نے ٹیکسی چلا ...

"وہاں میں فالتو نہیں کھڑا رہا۔" نیک محمد نے کہا ... "ایک ہوٹل ہے سڑک کے کنارے، وہاں چائے پینے ... بہت دیر بیٹھا رہا۔ ہوٹل کا مالک پہلے سے دیکھ رہا تھا کہ ... میری ہے۔ وہ باتیں کرنے لگا اور باتوں باتوں میں اس نے ... گامے شاہ بڑے جلال میں تھے۔ اُن کا مقابلہ جنوں کی فوج ... ایک بہت بڑے جرنیل سے پڑ گیا۔ میں نے کہا کہ کیا جنات ... بھی کرنل جنرل ہوتے ہیں۔ وہ بولا کہ جنات کی ایک سلطنت ... ہے۔ شاہِ جنات اس کا نظام بغیر فوج کے کیسے چلا سکتے ہیں ... جہاں بادشاہ ہوتا ہے وہاں وزیر بھی ہوتے ہیں اور ... کے عہدیدار بھی۔ خیر میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ دو ... آئی تھیں کسی دور دراز کے گاؤں سے۔ اُن میں سے ایک ... آتا تھا اور سارے عامل اس سے ہار چکے تھے۔ سب کا ... جاتا تھا اور خود جن اتارنے کی کوشش کرنے والے کی ... لالے پڑ جاتے تھے۔ خون کی اُلٹیاں شروع ہو جاتی تھیں ... وہ ذبح کیے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑکتا تھا۔ رسّی سے ... کے رکھنا مشکل ہو جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا! وہ کوئی معمولی ... تھا، جرنیل جن تھا۔ گامے شاہ صاحب نے بھی اُس نے ... پچھاڑ شروع کی۔ سُنا ہے بڑی اُٹھا پٹخ ہوئی اندر۔ پھر ... کو نکال دیا گیا اور شاہ جی کے ساتھ اس جرنیل جن کے ... دو ہاتھ ہوئے۔"

"وہ عورتیں کون تھیں؟"

"اپنی رابعہ اور نازو۔" نیک محمد نے یوں کہا جیسے ... سوال نے اُسے مایوس کیا ہے کیونکہ وہ مجھے اتنا کند ذہن ... سمجھتا تھا۔ "میں نے اس ہوٹل والے سے حلیہ بھی پوچھا ... اور حلیہ انہی کا تھا۔"

"اچھا تو جن جرنیل اور گامے شاہ کے ڈوئل کا انجام ... ہوا؟" محسن بولا۔

"ہوٹل والے کے بیان کے مطابق ان عورتوں کو ... دیا گیا تھا۔" نیک محمد بولا۔ "مگر اس کے بعد ہی گامے شاہ کا پلّہ شروع ہوا۔ گامے شاہ نے بھی صاف کہہ دیا کہ یا وہ جرنیل جن نہیں یا ہم نہیں۔ چالیس دن کا بڑا سخت عمل ہے۔ وہ پہلے کی طرح اُسے الٹنے کی کوشش کرے گا۔ اب دیکھو کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ گامے شاہ کے مُرید تو سخت پریشان ہیں، کیونکہ ایسا زبردست مقابلہ پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انھیں ڈر ہے کہ گامے شاہ کے عمل میں شیطان رخنہ ڈالنے نہ آ جائے۔ جرنیل جن کے ہاتھوں گامے شاہ کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

"بہت خبیث اور چالاک لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا کہانی گھڑی ہے۔"

"اور گامے شاہ کی موت کو باعزت بنانے کے لیے کیسے موافق حالات پیدا کر دیے ہیں۔" محسن بولا۔ "سب کہیں گے، ایک اجنبی عورت کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔ خلقِ خدا کو ارواحِ خبیثہ سے محفوظ رکھنے کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔"

"اس کو بھی یہیں گاڑ دیں گے اور لوحِ مزار پر اس لعنتی آدمی کے سیاہ کارنامے لکھنے کے بجائے القاب و آداب اور اشعار لکھ کے آئندہ سال سے اس کا عرسِ مبارک شروع کر دیں گے۔ داستانیں پھیلا دیں گے کہ جرنیل جن کے ساتھ مقابلے میں ان کی شہادت کا کیا درجہ ہے اور بے چارے سادہ لوح دیہاتی، کمزور عقیدے والے اور پریشان حال لوگ آنے لگیں گے ڈھول ڈھمکا لے کر چادریں چڑھانے۔" میں نے کہا۔

"یار بھاڑ میں گیا جن جرنیل اور جہنم میں گیا گامے شاہ۔ وہ خواتین کہاں گئیں؟" محسن بولا۔

"ان کی بھی عجیب کہانی ہے۔" نیک محمد نے ٹیکسی کو سڑک پر روک لیا۔ "اسی کی وجہ سے میں ادھر آ گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس راستے سے اندر چلا جاؤں اور تمھیں دیکھوں۔"

"ہم کیا سامنے کھڑے تھے کہ نظر آ جاتے؟" محسن بولا۔ "تم اکیلے گھس رہے تھے دشمنوں کے قلعے میں؟"

"یہی بات ہے سکندر بادشاہ! ڈر تو بہت لگ رہا تھا مگر میں نے سوچا جہاں تک چھُپ کے جا سکا، جاؤں گا۔ واپس لوٹ کر جانے پر طبیعت راضی نہیں ہوتی تھی پھر جب اس ہوٹل والے کی بات سُنی تو اور کچھ سُوجھا ہی نہیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ عورتیں گرتی پڑتی باہر نکلی تھیں۔ باہر ان کے گھر والے موجود تھے۔"

"گھر والے!" میں نے اور محسن نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔

"کون گھر والے؟ ایک تو ہوتے ہیں بھائی، بہن، ماں، باپ وغیرہ۔" محسن بولا۔

"دوسرا مطلب عام فہم زبان میں خداوندِ مجازی سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم ایک کا گھر والا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔"

"مگر باہر دو آدمی ان کے گھر والے... میرا مطلب ہے، ان کے وہ... شوہر بنے کھڑے تھے۔" نیک محمد نے خداوندِ مجازی جیسے مشکل لفظ سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "انھوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ عورتوں نے بھی اور مردوں نے بھی۔ مرد زبردستی کر رہے تھے اور ان کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ عورتیں... میرا مطلب ہے رابعہ اور نازو بھلا ایسے مان سکتی تھیں! انھوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ وہ ان کی صورت سے بھی واقف نہیں مگر مردوں نے اپنی بات منوا لی۔ لوگوں سے کہا کہ دونوں پر جنات کا اثر ہے اسی لیے گامے شاہ کے پاس لائے تھے کہ وہ کسی طرح یہ جن اتار دے۔ دورے کی حالت میں یہ اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں اور گھر کے ہر فرد کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہیں۔ نہ جانے کس کس کے نام لیتی ہیں جو سب جن ہی ہو سکتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ کیا وہ انھیں لے گئے؟" میں نے چلّا کے کہا۔

"ہاں سکندر بادشاہ! وہاں ان کی کون مدد کرتا جہاں سارے ایسے ہی الّو کے پٹھے موجود ہوں۔" نیک محمد نے کہا۔ "سب کی ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ کچھ سُنی ہوئی اور کچھ اپنے ناکارہ دماغ کی پیداوار۔"

"نازو نے کچھ نہیں کیا؟ اُس کے ساتھ زبردستی کرنا آسان تو نہیں تھا۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"ہوٹل والے نے ہی بتایا تھا کہ ایک لڑکی پر بڑا شہ زور جن سوار تھا۔" نیک محمد بولا۔ "اس نے پہلے تو اپنے گھر والے کو کئی بار دھوبی پٹخا دیا اور پھر کئی حمایتی مٹا دیے۔ اس کے گھر والے کی تو حالت خراب تھی مگر پھر اتنے سارے لوگ چمٹ گئے کہ ہر طرف سے نازو بے بس ہو گئی۔ کسی نے ان کی ایک نہیں سُنی اور انہیں باندھ کر گاڑی میں ڈال دیا۔"

"او مائی گاڈ... ان جاہلوں نے تو گاڑی کا نمبر تک نہیں دیکھا ہو گا۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔

"وہ ہوٹل والا کچھ سیانا ہے سکندر بادشاہ! میرا خیال ہے، وہ سامنے بیٹھا رہتا ہے اس لیے گامے شاہ کے مریدوں کی کلاستانی دیکھتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گامے شاہ کی پیری مریدی کا فراڈ کس طرح چلتا ہے مگر اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا تو کاروبار ہی گامے شاہ کے عقیدت مندوں کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بدولت چلتا ہے۔ اگر وہ خود کو گامے شاہ کا سچا عقیدت مند نہ ظاہر کرے تو مجاور لوگ اس کا ریسٹورنٹ دوسرے دن اٹھوا دیں۔ یہی سوال میں نے اس سے کیا تھا کہ گاڑی کا نمبر بھی دیکھا تھا کسی نے؟ وہ چونکا اور مجھے گھورتا ہوا پھر کہنے لگا کہ میں نے دیکھا تھا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ بدمعاش ان عورتوں کے گھر والے نہ ہوں اور لوگوں کی مدد سے انھیں اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ خدانخواستہ ایسی بات ہوئی تو پولیس تک جائے گی مگر پولیس کو کم سے کم گاڑی کا نمبر تو معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر تو وہ کارروائی کا آغاز ہی نہیں کریں گے۔ پولیس کو حرامخوری کے لیے بہانہ چاہیے۔ ہوٹل والے نے کہا کہ تم بندے سیانے ہو اس لیے تمھیں بتا دیتا ہوں۔ نمبر اس نے پنسل سے دیوار پر لکھ لیا تھا۔" نیک محمد نے اپنی ہتھیلی سامنے کی جس پر وہ بال پوائنٹ سے نمبر اتار لایا تھا۔

"نمبر کے علاوہ بھی کچھ دیکھا تھا اس نے؟" محسن بولا۔

"نمبر غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ لال رنگ کی شیورلٹ گاڑی تھی، وہ پرانا امپالا ماڈل جس کا پچھلا حصہ جہاز کے پروں کی طرح اٹھا ہوا اور پھیلا ہوا لگتا ہے۔" نیک محمد بولا۔ "ہوتی بھی وہ گاڑی جہاز کے برابر ہی ہے۔ اس کے پیچھے کی ایک لائٹ ٹوٹی ہوئی تھی اور پیچھے والا بمپر بھی غائب تھا۔"

"ویری گڈ۔ اس شخص سے ملنا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔

ہوٹل میں رات کے وقت بہت کم لوگ تھے۔ رش نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مریدوں نے خانقاہ پر آنے والوں کو شاہ جی کے چلّے کی خبر سنا کے لوٹا دیا تھا پھر بھی ایک دو میزوں پر کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ سامنے کے 'ریسٹورنٹ' والے حصے کو آڑی ترچھی لٹکی ہوئی ٹیوب لائٹوں نے روشن کر رکھا تھا۔ پچھلے حصے کی جانب کھلے صحن میں کم سے کم سو چارپائیاں لگی ہوئی تھیں اور کاؤنٹر کے قریب لگی ہوئی تختی پر 'منجی بسترا پانچ روپیہ' لکھا ہوا تھا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے مقابل بنے ہوئے سرائے نما ہوٹلوں میں رات بھر کے لیے منجی بسترا ایک روپے میں ملتا ہے مگر یہاں اس کے بھی بلیک کے ریٹ چل رہے تھے کیونکہ دور سے آنے والوں کے لیے قیام و طعام کا دوسرا ٹھکانہ کوئی نہیں تھا۔ ہمارے ایک میز پر بیٹھتے ہی پروپرائٹر بقلم خود آیا۔ اس نے نیک محمد کو پہچان لیا تھا۔ نیک محمد نے اس سے پرانے دوستوں کی طرح ہاتھ ملایا۔

"ہم کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔ "جو بھی ملے گا کھا لیں گے۔"

"اور اس کے بعد تم سے کچھ بات کریں گے۔" محسن بولا۔ "تم ہمارے دوست کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ بہت چالاک آدمی ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی گاڑی میں خرابی کوئی نہیں تھی۔ یہ ایسے ہی یہاں کھڑا تھا۔"

"ارے نہیں استاد..." نیک محمد نے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی۔

"نہیں کیا... نہ کوئی مکینک آیا نہ تم نے کچھ کیا۔" وہ بولا۔ "گاڑی لے کر چل پڑے۔"

"تم ہر چیز کو بہت غور سے دیکھنے کے عادی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور تمھاری نظر سب پر رہتی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

"ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں کہ ہمارے اس دوست نے وہ سب بتا دیا تھا جو تم نے اسے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اس کے علاوہ تو کوئی بات ہے نہیں جو میں بتاؤں۔" وہ بولا۔ "اور کیوں بتاؤں؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو؟"

"تم یقین کرو یا نہ کرو۔" میں نے افسردہ لہجے میں مغموم صورت بنا کے کہا۔ "ان میں ایک اس کی بہن تھی اور دوسری میری بیوی۔"

"یہ سالا ہے تمھارا۔" وہ محسن کو غور سے دیکھ کر بولا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیوں؟ سالوں کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ سالے ہیں۔" محسن نے برا مان کے کہا۔ "وہ بہن تھی میری۔"

"تم لوگ پولیس کے پاس کیوں نہیں گئے؟" اس نے ایک جائز اور منطقی سوال کیا۔

"اگر خود کچھ نہ کر سکے تو جائیں گے۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "معاملہ عزت کا ہو تو پولیس کے پاس نہ جانا ہی اچھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ غیرت مند آدمی مار دیتا ہے یا مر جاتا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے میرے نکتہ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا۔

"بس تو پھر ہماری کچھ مدد کر دو۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "اللہ تمھیں اجر دے گا۔"

"اللہ تو اجر آخرت میں دے گا۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اس کے بندے دنیا میں میرا کڑھائی گوشت نہ بنا دیں۔"

"تم جن بندوں کی بات کر رہے ہو، انھیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔" محسن بولا۔ "ہم تمھاری پوزیشن کو سمجھتے ہیں۔"

"اچھا جی۔ جو سوہنے رب نوں منظور۔" وہ چوتھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپنے بھی بیوی بچے ہیں۔ ان کا خیال کرنا۔"

"تم نے گاڑی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کا حلیہ بھی بتا دو۔ تم نے یقیناً انھیں بھی غور سے دیکھا ہوگا۔"

"ایک تو تھا جی قد اکٹھا۔ پانچ فٹ سمجھ لو۔" وہ بولا۔ "جان تھی اس کی بھی۔ منہ اس کا تھا کچھ رنگیلے ورگا۔ آپ واہ واہ تو دیکھتے ہو گے۔ اس نے لال اچار رنگ کے کا ریشمی لاچا باندھا ہوا تھا اور اپنی دو گھوڑا بوسکی کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ دوسرا اُچا لما جوان تھا، یہی آپ کے قد کا۔ وہ ذرا رنگ کا بھی صاف تھا۔ اس نے پہنی ہوئی تھی آسمانی رنگ کی قمیص اور سفید لٹھے کی شلوار۔ وہ جو گٹھا تھا، وہ بات کرتا تھا تو تھوڑا ہکلاتا تھا۔ اور دوسرا... اس کی آواز کڑیاں ورگی تھی۔ زنانہ آواز تھی مگر ایسی جیسے اس نے اچار کھا کے اوپر سے یخ ٹھنڈا پانی پی لیا ہو۔"

"وہ ایک دوسرے کو کس نام سے پکار رہے تھے؟" میں نے دل ہی دل میں اس شخص کی قوت مشاہدہ کا اعتراف کیا۔

"ایک تو تھا نکو۔" وہ سوچ کر بولا۔ "وہی گٹھا جس کا قد پانچ فٹ تھا۔ دوسرا تھا کولمبو۔"

"کیا؟" میں نے کہا۔ "یہ نام تو نہ ہوئے عرفیت ہو گی۔"

"چلو جی کچھ بھی ہو، جو ہم نے سنا بتا دیا۔ اب پورا نام تو راشن کارڈ والے جانیں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"یار تم تو بلاوجہ خفا ہو گئے۔" محسن نے اسے فوراً ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ "کچھ بتا سکتے ہو وہ کون تھے؟ پہلے کبھی ان کو یہاں دیکھا تو ہو گا تم نے...؟"

"ایک کو دیکھا تھا... کولمبو کو۔" وہ بولا۔ "وہ ایک موٹی سی کالی مجھ ورگی عورت کے ساتھ آتا تھا۔ وہ ماں تھی اس کی۔ گامے شاہ سے تعویذ لینے آتی تھی۔ ایک بار ادھر روٹی کھائی تھی اس نے تو کسی سے کہہ رہی تھی کہ 'منڈا ویاہ لئی ہاں نئیں کردا۔' اس کی کوئی مانگ تھی۔ منگیتر بولتے ہیں نا جی اسے۔ وہ غریب بیٹھی تھی کئی سال سے ماں پیو کے گھر۔" اس نے ایک شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم سمجھ گئے۔ مگر یار اس کی ماں نے بھی بیٹے کا اصل نام نہیں لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"لو کر لو گل... وہ تو میرا پتر میرا پتر کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں تھی۔ ہاں وہ تھی ذات کی مراثن اور اس کا ایک کان تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ادھر تیس میل دور کسی پنڈ سے آتی ہے۔ پنڈ کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ نکو، کولمبو، بھینس کی ہم وزن اور ہم رنگ ایک کان والی میراثن جس کا گاؤں شمال میں تیس میل دور ہے۔" میں نے تمام نکات کو انگلیوں پر شمار کیا۔ "پرانے ماڈل کی لال شیورلٹ' امپالا یا بیلیئر جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا بمپر نہیں ہے۔ تم نے تو اتنا بتا دیا ہے جتنا پولیس کی خصوصی تفتیشی ٹیم ایک مہینے میں معلوم کر کے نہ بتا سکتی۔"

"اب تم روٹی کھلاؤ ہمیں اور پھر ہم چلتے ہیں۔ ہمارے بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔" محسن بولا۔

"یہ بات تو میں کہنے والا تھا۔" وہ سر ہلا کے اٹھا۔ "دال فرائی دوں کہ آلو قیمہ۔"

کھانے کی خواہش کسی کو نہیں تھی مگر کھانا جسمانی ضرورت تھا اور جسم کی مشین اس ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ رہی سہی کسر کھانے کی اعلیٰ کوالٹی نے پوری کر دی۔ اس کے باوجود ہم نے ایک ایک روٹی کے ٹکڑے کو پانی کی مدد سے بہا کر حلق سے اتارنے میں کامیابی حاصل کی۔ صورت سے گاؤدی نظر آنے والے مگر بے حد ذہین، باریک بین اور چالاک آدمی کا شکریہ ادا کیا جس کی مدد کے بغیر ہم اپنے راستے کا تعین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب اتنا تو تھا کہ ہم شمال کی سمت تیس میل تک اپنا سفر جاری رکھنے کے بعد مزید معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ ہوٹل کا مالک آخری وقت تک ہمیں دیکھتا رہا۔ وہ ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ ہم سے اتنی باتیں کر کے اس نے غلطی تو نہیں کی؟

"اس کے میلومیٹر پر نگاہ رکھو۔ اس وقت کیا ریڈنگ ہے؟" میں نے ٹیکسی میں پیچھے لیٹ کر کہا۔

"تیئس ہزار سات سو نوے۔" نیک محمد نے کہا۔ "آٹھ سو بیس پر روک لوں گا۔"

"یہ محسن کدھر رہ گیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔ محسن نہ جانے کون سی ضروری بات پوچھنے کے لیے واپس چلا گیا تھا۔

"میں نے سوچا کہ اس عالم فاضل شخص سے کسی ڈاکٹر، حکیم وید کا پتا ہی پوچھ لوں۔" محسن نے واپس آ کے آگے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"پھر کچھ بتایا اس نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہاں سے تیس میل دور ڈونگا پتن میں کوئی ایسا حکیم ہے جس کے سامنے دنیا بھر کے میڈیکل اسپیشلسٹ ہیچ ہیں۔"

"ڈونگا پتن! ٹھیک تیس میل؟" میں اٹھ بیٹھا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ہاں۔ اس بہت ہوشیار آدمی نے ہمیں اس بھلے گاؤں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کا نام بھی بنا دیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو وہ پہلے سے جانتا تھا مگر اس کی صحیح نشاندہی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ تیس میل کے دائرے میں تیس گاؤں تو ایسے ضرور ہوں گے جہاں کم سے کم ایک حکیم لقمان کا شاگرد ضرور رہے گا مگر اس نے پتا دیا اتنی دور کا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ میاں سیدھے وہاں چلے جاؤ۔ سب کچھ مل جائے گا۔"

"تمہارا فیول میٹر کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے ٹینک فل کرا لیا تھا۔ ابھی تو تین چوتھائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔" نیک محمد نے جواب دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ بخار کا اثر اب مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسے وقت میں اسپرین بھی مل جاتی تو بہت کارآمد ثابت ہوتی لیکن تقدیر لے جا رہی تھی کسی ڈونگا پتن کے نیم حکیم کے پاس جو شاید نیم کے درخت کے نیچے اپنا کلینک قائم کرکے بیٹھا ہوگا اور نُہوا کشافی کہہ کے ہر مرض کا علاج نیم کی چھال، نیم کے پتوں یا تمبولیوں کی گولیاں کھلا کے کرتا ہوگا۔ ویسے زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

پچھلی سیٹ پر آرام سے لیٹنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میری آنکھ جھٹکوں سے کھلی۔ ٹیکسی رُک رُک کر ہچکیاں لیتی چند گز چلی اور رک گئی۔ "کیا ڈونگا پتن آ گیا؟" میں نے سر اٹھا کے کہا۔

"ابھی ہم منزلِ مقصود سے ایک محتاط اندازے کے مطابق آٹھ دس میل دور ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور خواجہ نیک محمد صاحب کے محتاط اندازے کے مطابق جمود کی یہ کیفیت انجن کی کسی خرابی کا نتیجہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اندھیرے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے جنگل کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"کچھ نہیں، پٹرول ختم ہو گیا ہے۔" محسن نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صرف بائیس میل میں؟" "اس وقت پانچ گیلن کے قریب تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت یہ گاڑی ایک گیلن میں بائیس میل جاتی تھی۔ اب بائیس گیلن میں ایک میل کر رہی ہے تو ہم کیا کریں۔" محسن بولا۔

"یار یہ کیا بکواس ہے۔ فیول میٹر غلط نہیں تھا۔ نیک محمد خود ٹینک فل کرا کے لایا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ خواجہ صاحب کا دعویٰ ہے۔ ہو سکتا ہے پٹرول پمپ والے نے میٹر کو زیرو پہ نہ کیا ہو۔" محسن بولا۔ "اب تو ٹینک خالی ہے۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ اُس نے چھ گیلن پٹرول ڈالا تھا۔ زیرو سے چھ تک میں خود دیکھتا رہا تھا۔" نیک محمد نے کہا۔

"پھر کیا پٹرول بہہ گیا یا کسی نے نکال لیا؟" محسن نے چلا کر کہا۔

"یار سکندر بادشاہ... یہ تو بڑی زیادتی ہے نا۔ اب میں دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔" نیک محمد روتی صورت بنا کے بولا۔

"یار محسن! اتنی پرانی گاڑی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی فیول لائن لیک کرنے لگی ہو۔" میں نے کہا۔

نیک محمد نے اتر کے دیکھا تو میرا خیال درست ثابت ہوا۔ سڑک پہ سیاہ تارکول میں ایک زیادہ سیاہ لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً پہیّوں سے اچھل کر کوئی نوکیلا پتھر پٹرول ٹینک کے زیریں حصے میں لگا تھا اور پرانے زنگ خوردہ ٹینک کی چادر میں سوراخ ہو گیا تھا۔ سوراخ بہت چھوٹا تھا مگر اس میں سے بہنے والی پتلی سی پٹرول کی دھار نے ہمارے سفر کو وسیلۂ ظفر نہیں ہونے دیا تھا۔ اب ہم انگریزی زبان میں سفر کر رہے تھے۔

"کیا ہم رات بھر اس سنسان سڑک پر کھڑے رہیں گے؟" میں نے باہر سر نکال کے کہا۔

"اس خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذرا مختلف انداز سے سوچیے۔" محسن نے گاڑی کا سہارا لے کر سگریٹ جلائی۔ "فرض کریں یہ ایک پکنک ہے یا ایڈونچر ہے۔ لیلےٰ کی جستجو میں قیس سر سے کفن باندھ کے نکلا ہے۔ محملِ لیلےٰ کا سراغ ابھی نہیں ملا اور ناقۂ مجنوں پنکچر ہو گیا ہے۔"

"اونٹ پنکچر نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"کیا سہانا سماں ہے۔" محسن نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جنگل میں منگل ہے... سوری... جنگل میں بدھ ہے۔ ہر طرف بھوت ڈسکو کر رہے ہیں۔ ارواحِ خبیثہ کی دلکش آوازیں، گیدڑوں کی سُریلی تان، الوؤں کا چہچہانا..." وہ بات ادھوری چھوڑ کے دوڑا۔ دُور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی تھیں۔ محسن سڑک کے درمیان میں ہاتھ پیر پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ قریب آنے والی نئی اور بیش قیمت کار کے خرد ماغ مالک نے بریک لگا کے دروازہ کھولا۔

"میں اگر چاہتا تو تمہاری خودکشی کی کوشش کو کامیاب کر سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "اور تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ایڈیٹ۔ واٹ ڈو یو وانٹ۔"

"چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں۔" محسن نے صاف انگریزی میں جواب دیا۔ "مثلاً یہ کہ آپ ہمارے لیک کرنے والے پٹرول ٹینک کا سوراخ بند کر دیں اور پھر اس میں پانچ گیلن پٹرول بھر دیں۔ مگر یہ آپ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپ ہمیں ڈونگا پتن پہنچا دیں۔"

"ڈونگا پتن؟" اس شخص نے حیرانی سے کہا۔ "وہاں گاڑی نہیں جا سکتی اور پھر یہاں سے ڈونگا پتن ہے بھی کتنی دور... زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ۔" اس نے بائیں طرف گھنے جنگل کی سمت اشارہ کیا مگر مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

"دو فرلانگ... آپ کا مطلب ہے اسی جگہ سے دو فرلانگ؟" محسن نے کہا۔

"ہاں۔ تم پہلے کبھی ادھر نہیں آئے؟" وہ شخص بولا جو بہترین سوٹ و نکٹائی میں تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔

"پھر تو واقعی افسوس ہے کہ میں نے آپ کو روکا اور بلاوجہ خودکشی کا ڈراما کیا۔" محسن نے کہا۔ "بہرحال بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔"

"ایسے وقت میں جب ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم منزلِ مقصود سے آٹھ میل دور ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ۔" وہ شخص آگے بڑھا اور اُس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "کوئی بیمار ہے؟"

"جی... بہت سے روگ لاحق ہیں اسے... سب ناقابلِ علاج۔" محسن بولا۔

"ڈونگا پتن میں قبرستان بھی ہے۔" وہ شخص اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ چند منٹ میں اس کی گاڑی کی ٹیل لائٹس بھی ہماری نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ سڑک ایک بار پھر ویران ہو گئی۔

"کیا زبردست آٹومیٹک گاڑی ہے۔ صحیح جگہ پہنچ کر خود بخود رک گئی۔" محسن بولا۔

"غالباً اُس نے سُن لیا تھا۔" میں نے تائید کی۔ "مگر اس ایک کان والی بھینس کا اندازہ کتنا غلط تھا جس نے ڈونگا پتن کو تیس میل دور بتایا تھا... کملبو کی ماں۔"

"عورتوں کا حساب اور پھر دیہاتی عورت کا حساب۔" میں نے کہا۔ "وہ عقل سے بڑی چیز قابلِ معافی ہے محسن خان۔"

"دو فرلانگ تو ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں سکندر بادشاہ۔" نیک محمد نے کہا۔

"تم لوگ جا سکتے ہو، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو ہم ڈونگا پتن تک ہو آتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اتنے چھوٹے سے گاؤں میں اتنی بڑی شیورلٹ چھپی نہیں رہ سکتی۔"

"تم یہیں لیٹے رہو۔ بہتر ہے سو جاؤ۔" نیک محمد نے مجھے نیک مشورہ دیا۔

"کوشش کروں گا لیکن تم اکیلے کوئی معرکہ سر کرنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ گاڑی نظر آ جائے تو پتا ٹھکانا دیکھ کر لوٹ آنا کہ کس گھر کے سامنے کھڑی ہے اور کس کی ہے۔ گاؤں میں شاید ایک ہی گاڑی ہوگی۔ یہاں لوگ ایسی گاڑیوں کو لاک کرنے کا تکلف نہیں کرتے۔ تم کاغذات دیکھ سکو گے۔"

"تو بالکل فکر مت کر۔ ہم دھاوا بولنے نہیں، سراغ لگانے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "جو کارروائی کرنی ہوگی مل کر کریں گے۔"

"دو فرلانگ آنے جانے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو تلاش کرنے میں شاید ایک گھنٹا بھی نہ لگے۔ اس قسم کے گاؤں کی حدود بہت مختصر ہوتی ہیں۔ میں دو گھنٹے بعد تشویش میں مبتلا ہو جانے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"بخار کے ساتھ تشویش میں مبتلا ہونے سے فائدہ ہوتا ہے۔ بخار کے جراثیم کو بھی تشویش لاحق ہو جاتی ہے اور وہ ختم ہونے لگتے ہیں۔" محسن بولا۔ "تیرے پاس ریوالور ہے؟"

"ہے۔ لیکن مجھے ریوالور کی اتنی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "جتنی تم دونوں کو ہے۔ اسٹین گن لے جاؤ۔"

"وہ ایک ڈنڈے سے زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔" محسن ہنسا۔ "اس کے راؤنڈ ختم ہو چکے ہیں۔ ریوالور سے کام چلائیں گے۔"

جب وہ چلے گئے تو میں ان کو ٹیکسی کی کھلی کھڑکی سے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر ان کے باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دیتی رہی پھر اجنبی رات کی آسیب زدہ خاموشی نے مجھے گھیر لیا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ اچانک میرے سر پر بجلی کا کوندا لہرایا۔ میں نے حیرانی سے آسمان کو دیکھا۔ بادل چپکے چپکے امڈ آئے تھے اور اب اپنی صف در صف سیلاب فوج کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ بجلی کی چمک کے ساتھ ہی گرج کی ہلکی سی آواز آئی اور ہوا ایک دم تیز ہو گئی۔ بڑے بڑے درخت سنسنانے لگے جن کا وجود کالے آسمان کے کینوس پر سیاہی سے بنی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ ہوا میں جھومتے ہوئے ان کی شاخیں یوں آگے جھکتی تھیں جیسے میرے خیالوں کے عفریت مجھے اپنے منحوس بازوؤں میں اٹھا لینا چاہتے ہوں۔ میں نے رابعہ کا تصور کیا۔ اس کے رُخِ زیبا کی چاندنی سے اس رات کی تاریکی کو منور کیا جو میرے رگ و پے میں تنہائی کا خوف بن کے اترنے لگی تھی لیکن میرے اپنے خیالات میرے دشمن ثابت ہوئے۔ انہوں نے رابعہ کی وہ تصویر پیش کی جو میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرا تصور بھٹک رہا تھا اور یہ اذیت میرے لیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے تمام خیالات کو ذہن سے خارج کرنا چاہا تاکہ میں سو سکوں۔

یکلخت میری پلکوں پر روشنی کی جھلملاہٹ اتری۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ یہ بجلی نہیں چمکی تھی۔ پیچھے سے ایک کار آ رہی تھی۔ اس کی روشنی نے پیچھے سے ٹیکسی کے اندر اجالا پھیلا دیا۔ میں نے ایک کہنی کے بل اٹھ کر دیکھا۔ کار تیزی سے آئی اور ٹیکسی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ شاید کسی نے تجسس یا انسانی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کے گاڑی روکی ہو گی۔ بارش سر پیٹتی کھڑی ہے اور ایسے میں کون ہے جس کی ٹیکسی اس بیاباں میں نقشِ فریادی بنی کھڑی ہے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں اور انجن چل رہا تھا۔ ڈرائیور دوسری طرف تھا چنانچہ میں اسے نہ دیکھ سکا لیکن میں نے اس شخص کو فوراً پہچان لیا جو میری طرف والے دروازے سے اتر چکا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں ریوالور نکالا۔ اس شخص نے جست لگائی اور میں نے دوسری بار ٹریگر دبایا۔ ہلکی سی "کلِک کلِک" کی آواز آئی۔ ریوالور کے میگزین میں ایک ہی گولی تھی جو شاید میں ضائع کر چکا تھا۔ پھر ایک اور شکاری نمودار ہوا اور چار مضبوط ہاتھوں نے مجھے گھسیٹ کر کار میں ڈال دیا۔

بیماری اور تھکن نے مجھے جسمانی طور پر مقابلے کا اہل نہیں چھوڑا تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے مجھے قابو نہ کر پاتے۔ میں نے واجبی سی مزاحمت کی مگر ان کا اسلحہ بھی ان کی بہت بڑی طاقت تھا۔ میرے گاڑی میں گرتے ہی ان میں سے ایک نے ریوالور کے دستے سے میرے سر پر وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ چشم زدن میں ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ ریوالور کی جس گولی نے میرے بازو کو ناکارہ کر دیا تھا اس کے درد کی شدت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ بے ہوشی نے مجھے اذیت کے عذاب سے بھی نجات عطا کی۔ آخری خیال محسن اور نیک محمد کا تھا کہ واپسی پر وہ مجھے غیر موجود پائیں گے تو کتنے پریشان ہوں گے۔

دوبارہ ہوش اور احساس کی دنیا میں واپسی ایک انتہائی ناخوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ درد میرے بازو سے میرے سارے وجود تک اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے سر کو بھاری پتھر کی دو چٹانوں نے شکنجے کی طرح دبا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں شدید گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار تھا۔ میں نے سیاہی کو پہلے کی طرح ہر سمت محیط دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید میری بصارت ابھی بحال نہیں ہوئی ہے۔ روشنی تو ہے لیکن میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ میں نے کوشش کر کے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دی تو مجھے یقین آیا کہ میں آزادی سے حرکت کر سکتا ہوں۔ میں کسی بستر پر لیٹا ہوا تھا جو بہت آرام دہ تھا لیکن جسم کو رسیوں یا زنجیروں سے باندھ کر رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس بات کا یقین بھی آنے لگا کہ بصارت ابھی باقی ہے اور قصور میری آنکھوں کا نہیں کہ...... مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاید یہ وہی رات تھی جب شکاری مجھے بے بس و تنہا پا کے اٹھا لائے تھے۔ درمیانی وقفے کا اندازہ کرنا محال تھا۔ یہ اس رات سے اگلی رات بھی ہو سکتی تھی اور اس کے بعد آنے والی رات بھی۔ میرے شکاری مجھے ایک بار زیرِ دام لانے کے بعد ایک دن یا دو دن بے ہوش رکھنے پر قادر تھے تاہم عقل کہتی تھی کہ میری بے ہوشی کا وقفہ بہت زیادہ طویل نہیں رہا اور بالآخر دن نکلے گا تو مجھے وقت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور اپنی اسیری کی غرض و غایت، اسیری کے مقام اور اسیر کرنے والوں کے بارے میں کچھ تو معلوم ہو گا۔

میری بے قراری اور میرے ذہنی اضطراب میں زیادہ دخل جسمانی کمزوری کا تھا۔ میرا بدن بخار میں جل رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مکّے مار مار کے میرے بدن کو پلپلا کر دیا ہے۔ یہ کسی بے ہوش رکھنے والی دوا کا اثر بھی ہو سکتا تھا اور بخار کی تیزی کا بھی جو بارود کے زہریلے اثرات کے خون میں سرایت کر جانے سے چڑھا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یاد آنے لگا کہ میں کہاں تھا اور وہ کون لوگ تھے جو مجھے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے شناخت کر لیا تھا جو میرے پاس آ کے رکنے والی گاڑی میں سے پہلے اترا تھا۔ اس نے اپنی شناخت کی بہت سی علامات کو مٹا دیا تھا یا بدل دیا تھا مثلاً اس نے گھنگھریالے مکرانیوں جیسے سخت سیاہ بالوں پر وگ لگا لی تھی اور اپنے کانوں میں پڑی ہوئی پیتل کی مندریاں ہٹا دی تھیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی صورت کے نقوش کو بدلنے میں ناکام رہا تھا اور میں نے استاد پیڈرو کو پہچان لیا تھا۔ اندھیرے میں اس کے سیاہی مائل رنگ کے باعث چہرہ چھپا رہتا مگر اس نے بولنے کی غلطی کی تھی اور یہ آواز ایسی تھی کہ میں برسوں بعد بھی سنتا تو شناخت کر لیتا۔ پھر جب انہوں نے مجھے گاڑی میں ڈالا تھا تو دروازے کھلنے سے گاڑی کے اندر کی لائٹ جل گئی تھی اور اس کی روشنی میں میری آنکھوں نے پیڈرو کی صورت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اتنے کم فاصلے سے مجھے اس کے کانوں کی لو کے سوراخ نظر آ گئے تھے جن میں برسوں پیتل کی مندریاں لٹکتی رہی تھیں۔ چنانچہ سوراخوں کے نیچے کا گوشت بھی کچھ لٹک گیا تھا۔

پیڈرو کے ساتھ دوسرا شخص وہی تھا جس نے ہمیں کار روک کے "ڈونگا پتن" کا راستہ بتایا تھا۔ وہ معزز آدمی جو بہترین سوٹ میں تھا اور جس کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس سال لگایا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت اس کی عمر کے مقابلے میں ناقابلِ یقین حد تک زیادہ تھی جب وہ ہمیں ڈونگا پتن کا پتا سمجھا رہا تھا تب بھی مجھے شک ہوا تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں گفتگو نہیں کر رہا ہے مگر میں نے اس خیال کو اہمیت نہیں دی تھی کہ آخر اس سڑک سے گزرنے والے کسی اجنبی کو آواز بدل کر بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ بعد کے واقعات نے بالآخر یہ ثابت کر دیا تھا کہ میرا شک قطعاً غلط نہیں تھا اور اب میں یہ بھی فرض کر سکتا تھا کہ اس کی پوری شخصیت بدلی ہوئی تھی ــــ وہ ہمارے ہی تعاقب میں آیا تھا مگر وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مخالف سمت میں کہیں استاد پیڈرو موجود تھا۔ غالباً ہمارے تعاقب میں آنے والوں نے ہم پر نظر رکھی تھی اور آگے پیچھے سے ہمارے لیے فرار کے راستے مسدود کر دیے تھے۔ اگر پٹرول ختم ہو جانے کے باعث ہماری ٹیکسی اس جگہ کھڑی نہ ہوتی تو تھوڑا سا آگے جانے کے بعد پیڈرو ہمارا راستہ روک لیتا اور ہم واپس بھاگنا چاہتے تو وہ سوٹ والا گاڑی میں آ جاتا۔

لیٹے لیٹے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سوٹ والے نے گاڑی روک کر ہمیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور پھر جانتے بوجھتے غلط پتا بتا دیا تھا۔ اس نے ہمارے اندازے کو غلط ثابت کر دیا تھا حالانکہ اپنے حساب کے مطابق ہم ڈونگا پتن سے کچھ نو میل دور تھے اور یہ حساب ٹھیک تھا۔ محسن کو اور بیلا کو غلط راستے پر ڈالنے کا مقصد مجھے اکیلا کرنا تھا۔ اس مقصد میں وہ کامیاب رہا۔ اس کی خود اعتمادی قابلِ تعریف رہی تھی ہم نے کسی تذبذب کے بغیر اس پر یقین کر لیا تھا۔ یہ نیا کردار تھا یا پیڈرو کی طرح روپ بدل کر آنے والا پرانا چہرہ تھا۔ پھر جو ہو گا سامنے تو آئے گا۔ میں نے سوچا۔

ہمت کر کے میں اس بیڈ پر سے اٹھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک میری آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس نہیں ہوئی تھیں اور ایک گہرے سیاہ خلا کے علاوہ میں اپنے آس پاس کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ اگر اس کمرے میں کوئی دروازہ ہوتا تو اس کی درز سے باہر کی روشنی دکھائی دیتی اور اندھیرے کی چادر میں سفید ڈوری نظر آتی۔ کہیں کوئی کھڑکی ہوتی تو اس کے شیشوں کا رنگ اندر کی سیاہی کے مقابلے میں سفیدی کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتا لیکن اس کمرے میں تو جیسے دیواریں بھی سیاہ تھیں۔ اس کی چھت بھی کالی تھی۔ کھڑکیوں، دروازوں پر کالا پینٹ تھا اور ان پر کالے پردے پھیلے ہوئے تھے۔ میں اندھوں کی طرح ایک ہاتھ آگے بڑھا کر ٹٹولتا ہوا قدم قدم رکتا آگے بڑھا۔ مجھے مزید حیرانی ہوئی جب میری راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوئی۔ میرے زخمی ہاتھ میں اینٹھن ہو رہی تھی اور اس کی خفیف سی حرکت سے بھی درد کی ٹیس کسی الیکٹرک شاک کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ بالآخر میرے تندرست ہاتھ کی انگلیوں نے دیوار کے سخت اور سرد لمس کو محسوس کیا۔ میں نے اپنا رخ بدلا اور دیوار کے متوازی چلنے لگا۔ وقفے وقفے سے میں نے دیوار کے اوپر نیچے کی سطح کو دیکھا مگر مجھے سپاٹ دیوار میں کسی دریچے کے آثار بھی نہ ملے۔

کمرا بہت بڑا بھی نہیں تھا اور اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اسے جیل کی کوٹھری سمجھا جاتا۔ میرے اندازے کے مطابق کمرے کی لمبائی اور چوڑائی آٹھ اور دس فٹ تھی۔ یہ اندازہ میں نے دو دیواروں کا ہاتھ سے چھو کر جائزہ لینے کے بعد قائم کیا۔ تیسری دیوار میں اچانک دروازہ آ گیا۔ تقریباً ڈھائی فٹ چوڑا اور ساڑھے چھ فٹ اونچا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اندر سے اس کی سطح دیوار سے مل گئی تھی۔ اور اس میں اوپر نیچے کوئی کنڈی، ہُک یا چٹخنی اور ہینڈل نہیں تھے۔ دروازہ کمرے میں کھلتا ہو گا چنانچہ اس کے قبضے چوکھٹ کے بیچ میں آ گئے تھے۔ دروازے کو بڑی صفائی سے فٹ کیا گیا تھا۔ کہیں کوئی جھری تھی تو میری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر تھیں اور ہاتھ پھیرنے سے بال برابر فرق کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے دروازے کو اندر کی طرف کھینچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ ٹکر مار کے میں اپنے کندھے توڑ سکتا ہوں مگر دروازے کو ہلا بھی نہیں سکتا۔

آدھے گھنٹے بعد میرے لیے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ میں ایک قید خانے میں ہوں جہاں ازراہِ مروّت مجھے سونے، لیٹنے یا بیٹھنے کے لیے ایک بیڈ تو فراہم کر دیا گیا ہے مگر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پا بہ زنجیر یا دست بستہ رکھنا بھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ضروری نہیں تھا۔ خالی ہاتھوں سے اس زنداں کی دیواروں سے صرف میری روح نکل سکتی تھی۔ میں کمرے کے اندر پھرتے پھرتے اتنا تھک گیا تھا کہ بے دم ہو کے دوبارہ بیڈ پر گر گیا۔ مجھے بخار کی حرارت اپنے جسم سے خارج ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ جو سانس میرے نتھنوں سے خارج ہوتی تھی وہ گرم ہوا کی طرح تھی اور میرا چہرہ تپ رہا تھا۔ یہ عجیب کسمپرسی اور بے کسی کا عالم تھا کہ مجھے مناسب دیکھ بھال کی، خوراک، دوا اور آرام کی ضرورت تھی لیکن میں گھپ اندھیرے کی قید میں اکیلا تھا۔ مجھے محسن کا اور نیک محمد کا خیال آیا کہ شاید وہ "ڈونگا پٹن" کو تلاش کرنے میں ناکام ہو کے لوٹ آئے ہوں۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ انہیں بے وقوف بنایا گیا تھا اور اس طرح گمراہ کر دینے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ مجھے اغوا کر لیا جائے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ بعد میں انہیں بھی الگ الگ اغوا کر لیا گیا ہو اور اب وہ بھی میری طرح کسی تاریک زنداں کی تنہائی کے اسیر ہوں۔ میری طرح انہیں بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہیں اور باقی دو کے بارے میں صرف خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتے ہوں۔ مجھے رابعہ اور نازو کا خیال بھی آیا جو ہم سے پہلے اغوا ہو گئی تھیں۔ نہ جانے تقدیر کو اب کیا منظور تھا کہ اس نے ایم آر ایس کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور ہم سب کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کر دیا تھا جیسے خزاں کی ہوا ایک ہی ٹہنی سے گرنے والے پتوں کو مختلف سمتوں میں اڑا لے جائے۔

یہ سب جرأتِ رندانہ میں حد سے گزر جانے کا شاخسانہ تھا۔ ہم نے اپنی قوتِ تسخیر کا غلط اندازہ کیا تھا اور دشمن کے حصار میں قدم رکھ دیا تھا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اتنی بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی حفاظت کے لیے مناسب انتظام نہیں کیا تھا۔ اس امکان کو ذہن میں نہیں رکھا تھا کہ ناکامی کی صورت میں کوئی ہماری مدد کے لیے پہنچ سکے گا یا نہیں۔ کم از کم دو افراد عملاً ہمارے کام آ سکتے تھے۔ عبدالودود منظر اور مرزا غالب لیکن ان دونوں کو علم ہی نہیں تھا کہ ہمارے عزائم کیا ہیں اور اب تو ہم خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ہم کہاں ہیں تو کسی اور کو یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ جب تک ہم ایک ساتھ تھے ہمارا اعتماد ناقابلِ شکست تھا اور ہماری قوت ہمارا اتحاد تھا مگر اب ہم اکیلے ہو چکے تھے اور ایک دوسرے کی مدد کی امید بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

میں نے چشمِ تصور سے ہر مہربان صورت کو ... کرنا چاہا۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں ہنستا مسکراتا اور اکٹھا دیکھوں لیکن میرا ذہن مایوسی کے احساس ... شکست خوردہ تھا۔ میں نے ان سب کو اپنی ہی طرح میں ... بے بس اور اکیلا دیکھا۔ ان سب کو ایک دوسرے کا خیال تھا اور ایک دوسرے کی مدد سے رہائی کی توقع تھی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ سب ایک ... بے بس ہیں۔ ذہنی انتشار کی اس کیفیت میں مجھے خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے ہم سب ایک دوسرے سے بہت قریب ہوں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں یا اوپر نیچے کے کمروں میں قید ہوں۔ مگر ذہنی طور پر اس احساس کا شکار ہوں کہ ہمارے درمیان طویل فاصلے حائل ہیں جو ... سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

میں نے جسمانی اذیت کے احساس کو مٹانے کے لیے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ ... کلائی پر سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی ورنہ میں اس کا ... توڑ دیتا اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر سوئیوں کی ... سے وقت دیکھنے کی کوشش کرتا۔ مجھے اتنا تو معلوم ... کہ صبح کی منزل کتنی دور ہے۔ اس حالت میں نیند کا ... بھی جرم لگتی تھی اور اس کی خواہش ایک فریب مگر ... کے لیے ضرورت بن گئی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے کروٹیں ... رہا۔ بار بار میں آنکھیں بند کر کے ذہن سے خیالات جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا مگر مجھے احساس ہوتا تھا کہ ... بھی کم اذیت ناک نہیں۔ میری آنکھیں خود بخود کھل ... تھیں اور خیالات بے قابو بلاؤں کی طرح ساری ... کو گراتے میرے ذہن کو تاخت و تاراج کرنے لگتے۔

اب میں دیواروں کا نہیں وقت کا اسیر تھا۔ آزادی سے زیادہ صبح کا اجالا دیکھنے کی فکر لاحق تھی اور ... روشن افق کا تصور میری ساری خواہشوں کا حاصل تھا مگر وہ رات تھی کہ طولِ شبِ فراق سے کہیں ... صبر آزما بنتی جا رہی تھی۔ اس کا ہر لمحہ ایک درد کی گھڑی ... ہر گھڑی ایک لمبی کالی رات کی طرح تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس رات وقت رک گیا ہے یا اس کی رفتار کم ہوتی جا رہی ہے۔ انتظار کا عذاب مجھے پاگل ... لگا۔ میرے چار سو سناٹا تھا اور ایسی خاموشی تھی جو ... دیواروں سے زیادہ منجمد محسوس ہوتی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا ... اندھیرے کو گھورتا رہا۔ پھر ننگے پاؤں فرش پر چلنے لگا۔

... میں نے دروازے کو بجانا اور چلانا شروع کیا ... کے ساتھ ساتھ۔ "کوئی ہے۔ کوئی ہے۔" مگر دروازہ بھی بےسود ثابت ہوا۔ اس پر مکے مارنے سے اتنی ہی آواز ہوئی جتنی دیوار پر مکے مارنے سے ہوتی۔ معلوم نہیں اس دروازے کے پیچھے کیا تھا کہ اس کی آواز میں گونج نہیں تھی۔

میرے جسم پر صرف میرے کپڑے تھے۔ میری جیب میں سے ہر چیز نکال لی گئی تھی اور کمرے میں ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی جو میں دروازے پر مار سکتا۔ میری نقاہت بڑھتی جا رہی تھی اور دروازے پر طاقت آزمائی کے بعد میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر بستر پر لیٹ کر میں نے جسم کی تھکن کے احساس کو کم کرنا چاہا لیکن میں زیادہ دیر نہ لیٹا رہ سکا۔ میں چاہتا تھا کہ اب خواہ جلاد ہی آئے مگر مجھے اس قید خانے کی سیاہی سے نکالے۔ مجھے بتائے کہ میرے لیے کیا سزا تجویز کی گئی ہے اور پھر چاہے تو میری گردن اڑا دے۔ چوہدری دلاور، استاد پیڈرو میں سے کوئی بھی سامنے آئے، میرا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دے یا مجھ سے پوچھے کہ میں نے اس احمقانہ جرأت کا مظاہرہ کیوں کیا تھا؟ مجھ پر تشدد کرے اور مجھ سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرے۔ مجھے جسمانی اذیت منظور تھی۔ یہ اندھیرا، خاموشی اور اپنی تنہائی میرے لیے ایک ناقابلِ برداشت ذہنی عذاب بن رہی تھی۔

میں نے چارپائی کو ہلا کے دیکھا۔ وہ لوہے کے پائپ کا بنا ہوا بھاری بیڈ تھا جس کے درمیان میں لوہے کے اسپرنگ تھے۔ اس کے سرہانے کی طرف کا کچھ حصہ اٹھا ہوا تھا اور ایسے بستر میں نے اسپتالوں میں استعمال ہوتے دیکھے تھے۔ اسے توڑنا ناممکن تھا ورنہ میں ایک پٹی الگ کر لیتا اور دروازے پر مارتا۔ میں نے لوہے کے بیڈ کو گھسیٹ کر دروازے سے ٹکرانے کی فضول سی کوشش کی اور مجھے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر میں دیوانگی کی سرحد کے کتنا قریب ہوں۔ اگر جسمانی طور پر میں بالکل صحت مند ہوتا تب بھی اس لوہے کی چارپائی کو دروازے پر مار کے دروازے کو توڑ دینے کی امید نہ رکھتا۔ اپنی موجودہ حالت میں تو میں اس کو ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔

"دلاور!" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کون سی بہادری ہے ذلیل کتے۔ سور کے بچے۔ بیمار اور زخمی آدمی کو دھوکے سے اٹھا لیا اور اس طرح قید کر دیا۔" میری آواز کے جواب میں بازگشت بھی نہیں آئی۔ ہر سو وہی بے حس اور سفاک خاموشی نوحہ خواں رہی۔ میں نے دروازے پر لاتیں ماریں اور دلاور کو چلا چلا کر گالیاں دیں۔ پیڈرو کو پکارا اور پھر وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد پھر مجھے ہوش آیا۔ وہی بھیانک کالی رات ابھی تک مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے وہ رات نہیں، نہ مٹنے والی سیاہی ہے جس میں میرا وجود غوطہ زن ہے۔ میں کاجل کے پہاڑ میں گھس گیا ہوں اور اب روشنی کا ایک ذرہ دیکھنے کے لیے دیوانہ وار اس منجمد تاریکی سے لڑ رہا ہوں جس کو شکست دینا میرے بس کی بات نہیں۔ رحم۔ رحم۔ میں نے خدا سے فریاد کی۔ میں اس رات کے منحوس اندھیرے سے پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی روشنی چاہیے۔ کاش کوئی مجھے بتا سکے کہ صبح ابھی کتنی منزلوں کی مسافت پر ہے۔ وقت کا احساس فنا ہونے کے بعد میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس رات کی کوئی سحر نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا گیا ہوں اور اب مجھے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں مل سکتی۔ یہی رات میرا مدفن ہے اور یہی رات میرا مقتل ہے۔

ہوش اور بے ہوشی کے مختلف وقفوں میں مجھے صرف اتنا احساس رہا کہ میں فرش پر پڑا ہوا ہوں۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور میری آواز مر چکی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے جسم پر میرا کنٹرول ختم ہونے لگا ہے اور میں فرش پر اپنی ہی پھیلائی ہوئی غلاظت میں لوٹ رہا ہوں۔ میں نے فرض کیا کہ یہ جانکنی کا عالم ہے اور اس کے بعد موت ہے۔ یہ خیال بڑا تسکین دہ تھا کہ بہت جلد میرا سارا عذاب ختم ہو جائے گا مگر بہت جلد میں بھی بہت دیر تھی۔ میرے جسم کی ہر حیوانی جبلت مجھے مغلوب کر رہی تھی۔ وہاں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ اس وقت کمرے میں گھاس پھوس، کنکر پتھر کچھ بھی ہوتا میں چبا ڈالتا۔ نیم دیوانگی کی کیفیت میں میرے ہاتھوں نے خود اپنے کپڑے پھاڑ کر چبانے اور نگلنے کی بے سود کوشش کی۔ میری زبان سوکھ کر چمڑا ہو رہی تھی اور میرے منہ میں اتنا لعاب بھی نہ تھا جو کپڑے کو تر کر سکتا۔ معلوم نہیں اس کمرے میں زندگی کی ایک بنیادی ضرورت کہاں سے پوری ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی تازہ ہوا ضرور پہنچ رہی تھی کہ میں دم گھٹنے سے ہلاک نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ میری جلد چٹخنے لگی۔ میرے بدن کا پانی خشک ہو رہا تھا اور میں اپنی موت کو قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت محسن یا رابعہ کا خیال تک نہیں آیا۔ میں صرف اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا اور ایک ایک سانس کی خاطر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے اب تک یقین آچکا تھا کہ یہ رات نہیں کوئی تاریک زنداں ہے جس کے راستوں سے سورج کی روشنی کی ایک کرن کا گزرنا محال ہے۔ باہر کی دنیا کے مقابلے میں یہ قید خانہ ایک قبر کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کا عذاب قبر کے عذاب سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ باہر نہ جانے کتنی بار سورج نکل کر غروب ہو چکا تھا۔ گھڑیوں کی سوئیاں نہ جانے کتنی بار چکر کاٹ کے پھر وہیں پہنچ چکی تھیں۔ دنیا کی مصروفیات اور زندگی کے کاروبار اسی طرح چل رہے تھے مگر یہاں اندھیرا منجمد ہو گیا تھا اور رات ٹھہر گئی تھی۔ یہ رات موت کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بڑے بے رحم اور سفاک قاتل تھے جنہوں نے مجھے ایک طویل رات کے عذاب سے مارا۔ وہ مجھے بہت پہلے زیادہ آسانی کے ساتھ مار سکتے تھے لیکن وہ خونی شکاری بڑے اذیت پسند تھے۔ وہ مجھے گھیر کر اس اندھیرے کے جال تک لے آئے جو موت کی کمیں گاہ تھی۔

مجھے دوبارہ زندگی کب ملی؟ یہ میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ وہ قاتل سیاہ رات چوبیس گھنٹوں پر محیط تھی، اڑتالیس گھنٹوں تک پھیلی ہوئی تھی یا اس سے بھی زیادہ، اس کا اندازہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ احساس اور ہوش ختم ہونے سے قبل ہی میں وقت پر اپنی گرفت کھو چکا تھا۔ آزاد انسانوں کی دنیا میں صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، سائے گھٹتے بڑھتے ہیں، اندھیرا روپ بدلتا ہے اور اجالا سمٹتا پھیلتا ہے تو گھڑی پر نگاہ ڈالے بغیر بھی وقت کے مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی خبر ملتی رہتی ہے۔ یہ نہ ہو تب بھی نیند اور بھوک کی ضرورت انسانی جسم کو وقت سے آگاہ رکھتی ہے مگر میں ایک ایسی مصنوعی رات کے اندھیرے کا قیدی تھا جس میں وقت کا تصور بھی محال تھا۔ بہت پہلے مجھے یقین آچکا تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اسی کیفیت میں موت یوں آئے گی کہ مجھے خبر بھی نہ ہو گی۔

اچانک ٹھنڈک نے میرے جسم میں پھیلنا شروع کیا۔ زندگی... کا پہلا جھٹکا الیکٹرک شاک کی طرح تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں جھلسا دینے والی ریت پر پڑا ہوا تھا کہ مجھے اٹھا کر برف میں دفن کر دیا گیا ہے۔ میرا بکھرتا ہوا وجود پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹنے لگا۔ آبِ حیات کا ایک ایک قطرہ میرے خشک حلق سے اترتا جا رہا تھا۔ میری خشک چمڑے جیسی زبان ہر قطرے کو چوس رہی تھی، جذب کرتی جا رہی تھی اور نمی کا اثر پھیلنے لگا تھا۔ یہ کرب کی ایک نئی کیفیت تھی۔ جب میرے جسم کا صحرا ایک ہی بار میں سمندر کو پی جانے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن برسوں کی کڑی دھوپ میں جلنے والی زمین پر بادلوں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ آرزو کی شدت سے میرا [illegible] اینٹھنے لگا۔ دوبارہ زندگی پلنے میں بھی اذیت کا [illegible] لیکن اس میں میری جدوجہد کو تقدیر کی یاوری کا سہارا [illegible] پانی میں غالباً گلوکوز کی مٹھاس تھی اور ہلکی سی نمکینی [illegible] "اور پانی۔" میں نے اپنے ہونٹوں سے ادا ہونے والے [illegible] کو اپنے کانوں سے سنا۔

"ہاں ہاں۔ یہ لو۔" میری آواز کا جواب آیا۔ جواب دینے والی کوئی عورت تھی۔ پھر چمچہ میرے دانتوں سے ٹکرایا۔ ایک چمچہ پانی میرے حلق سے اتر گیا۔ "تھوڑا تھوڑا کر کے [illegible] ایک دم نہیں۔" چمچہ کسی گلاس کے کنارے سے لگا۔

میرے بے قرار ہاتھوں نے اچانک حرکت کی اور اندھیرے میں گلاس پر قبضہ کرنا چاہا تاکہ میں سارا پانی ایک سانس میں غٹاغٹ چڑھا سکوں۔ گلاس فرش پر گرا اور پانی کے چند چھینٹے میرے چہرے تک پہنچے۔

"گرا دیا سارا پانی۔" اسی عورت نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے ہی فائدے کے لیے ایک بات کہی مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آئی — اب صبر کرو۔"

"پانی... خدا کے لیے... میں پھر ایسا نہیں کروں گا۔" میں نے کراہ کے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" وہ ایک جھٹکا دے کر درشت لہجے میں بولی اور اپنی کلائی چھڑا لی۔ میرے ناتواں ہاتھوں میں اتنا دم ہی نہیں تھا کہ میں اپنی گرفت قائم رکھ سکتا۔ "مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ٹھہرو۔ میری بات سنو۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "مجھے یہ تو بتا دو کہ میں کہاں ہوں... تم کون ہو؟"

جواب میں میرے کانوں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی لیکن اس سے میرے گرد پھیلی ہوئی تاریکی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب وہ میرے قریب تھی اور میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا تھا تب بھی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ فقط ایک آواز تھی۔ اندھیرے کی آواز۔ اس کی صورت کا اور اس کے پیکر کا تصور کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے آخری بار چلا کر اسے روکنا چاہا اور اٹھنے کی کوشش بھی کی مگر نقاہت کے باعث میں وہیں گر گیا۔ میرے ہاتھوں نے فرش کی نمی کو محسوس کیا جہاں پانی گرا تھا اور بے اختیار میں نے اس ٹھنڈک پر اپنے رخسار رکھ دیے۔ ایسا کرنے سے [illegible] اپنی بصارت کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اگر میرا چہرہ اوپر ہوتا اور میری آنکھیں کھلی ہوتیں تو سوا نیزے پر یکلخت اتر آنے والے سورج کی خیرہ کن روشنی مجھے ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیتی۔ مسلسل تاریکی میں رہنے کے بعد میری آنکھیں اس قابل نہیں رہی تھیں کہ ہزاروں واٹ کی سرچ لائٹ سے یلغار کرنے والی روشنی کو برداشت کر سکیں۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کسی طاقتور اور طوفانی سمندری موج کی طرح میرے جسم سے ٹکرائی ہے۔ میں اپنی جگہ پر اس طرح سمٹ گیا جیسے خطرے کا احساس ہوتے ہی کچھوا اپنے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ میں نے چہرے کو نیچے کر لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس روشنی کو روکا جو بند پلکوں سے گزر کے آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"تم اس حالت میں کتنے قابلِ رحم لگ رہے ہو۔ ایک کیچوے سے بھی زیادہ حقیر اور کمزور۔" ایک آواز کی گونج نے کہا۔

"خدا کے لیے اس روشنی کو بند کرو۔" میں چلایا۔

اس آواز کا قہقہہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "روشنی سے اتنا ڈرتے ہو؟ تم یقیناً تمام زندگی اسی اندھیرے میں گزارنے کے خواہش مند تو نہیں تھے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ پھر اُجالا دیکھو۔ اگر ہم چاہتے تو ایسا ہو سکتا تھا۔ تم جس اندھیرے میں تھے قبر کا اندھیرا اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ تم کو معلوم بھی نہ ہوتا اور تمہارے وجود کو اس جگہ سے تمہاری خاک کے ابدی زنداں میں منتقل کر دیتے مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔"

"کیوں نہیں کیا؟" میں نے ہاتھوں کو تھوڑا سا زمین سے اوپر اٹھایا اور آہستہ سے تھوڑی سی آنکھیں کھولیں۔

"اس لیے کہ ہم تمہیں سچ بول کر اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع دینا چاہتے تھے۔" اس آواز نے کہا۔

میں اب بھی سجدے میں پڑا ہوا تھا اور میرا چہرہ زمین کی طرف تھا۔ اس طرح کہ دونوں ہاتھوں نے دونوں جانب سے آنکھوں کو پردہ فراہم کر رکھا تھا۔ ہتھیلیاں فرش سے آدھا انچ اوپر اٹھانے سے بھی جتنی روشنی آئی اس نے مجھے پھر پلکیں بند کرنے پر مجبور کر دیا لیکن میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پھر آنکھیں کھولیں۔ دونوں طرف مجھے فرش یوں نظر آیا جیسے دوپہر کا سماں۔ میری آنکھوں کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ جیسے میرے سوکھے ہونٹوں پر بوند بوند پانی کے ترسے ہوئے جسم کو تھوڑا تھوڑا پانی دینا ضروری تھا ورنہ وہی آبِ حیات میرے حق میں زہر بن جاتا۔ ایسے ہی میری اجالے کو ترسی ہوئی آنکھوں کو تھوڑی تھوڑی روشنی دی جا سکتی تھی اور اس کی مقدار میں آہستہ آہستہ اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم مجھ سے کیا سچ جاننا چاہتے ہو۔" میں نے کہا اور ہتھیلیوں کو کچھ اور اوپر اٹھا لیا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ موت کی جانکنی کی اذیت میں تم نے کتنا وقت گزارا؟"

"نہیں۔ لیکن مجھے اس اذیت کا اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا اور آنکھیں کھلی رکھیں۔

"کیا دوسری بار اسی تجربے سے گزرنے کے بجائے تم موت کو قبول کر لو گے؟" اس آواز نے کہا جسے میں ابھی تک شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ دلاور کی آواز بہرحال نہیں تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے مرنے نہیں دو گے۔" میں نے کہا اور ہاتھ فرش سے اٹھا لیے۔ اب میری آنکھیں روشنی کو براہِ راست تو نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن میں فرش سے منعکس ہونے والی روشنی کو دیکھ سکتا تھا۔

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔ تم سچ بولو گے۔" وہ ہنسا۔ "لیکن ہمیں جلدی نہیں ہے۔ ہم پہلے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تم مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں آجاؤ۔ جب تمہاری ذہنی و جسمانی توانائی بحال ہو جائے گی تو تم بہتر طور پر سمجھ سکو گے کہ تمہارے لیے سچ بولنا کتنا ضروری ہے۔ اگر تم نے مزاحمت کی تو عذاب کا دوسرا دور طویل تر ہو گا اور جتنا اذیت ناک ہو گا اس کا تم ابھی تصور نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم تمہیں موقع دیں گے کہ تم صحیح فیصلہ کر سکو۔ تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تم اپنی قوتِ ارادی کے بل پر اس عذاب کو جھیلنے میں کامیاب رہے تو اگلے عذاب سے بھی گزر جاؤ گے۔ تمہاری قوتِ برداشت کے غیر معمولی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے ناقابلِ شکست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے سر اٹھا کر کہا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ ہنسا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ میں کہاں ہوں؟" میں نے کہا۔

"اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ اگر میں کہہ دوں کہ تم زمین پر نہیں، آسمان پر ہو۔ اپنا پتا جان کر تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔ تمہیں اس پتے پر کون سی ڈاک منگوانی ہے۔" وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ "جو بات تمہارے پوچھے بغیر میں بتا سکتا ہوں اور جو تمہارے لیے صحیح فیصلے کو آسان بنا سکتی ہے، یہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے کہ میں تم کو تمہارے دوستوں کے بارے میں بتاؤں یہ کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔"

میں سانس روکے بالکل سیدھا بیٹھا رہا۔ اب میں دیوار کی طرف منہ کیئے آنکھیں کھولے اس کمرے کو جزوی طور دیکھ سکتا تھا جس میں مجھ پر ستم کی طویل سیاہ رات گزری تھی۔ میری آنکھیں روشنی کی عادی ہو رہی تھیں لیکن میں براہ راست اس اندھا کر دینے والی روشنی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا جو میرے پیچھے والی دیوار پر نصب تھی۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ میرے مقابل کی دیوار شاید دس فٹ لمبی تھی۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کی دیواریں آٹھ فٹ کی تھیں مگر سب پر جیسے تارکول مل دیا گیا تھا۔ اس سیہ خانے کی چھت بھی اندھیری رات کے آسمان سے زیادہ سیاہ تھی۔ چنانچہ میں فرض کر سکتا تھا کہ پیچھے والی دیوار اور اس کمرے کے واحد دروازے کا رنگ بھی کالا ہوگا۔ انتہا یہ تھی کہ کمرے کے فرش پر بھی کالک مل دی گئی تھی۔ اس پورے منظر میں جو میری نظروں میں تھا کہیں کوئی در، یا دریچہ، کوئی روزن یا روشندان نہ تھا جس سے روشنی یا ہوا کا گزر ممکن ہوتا۔ پھر بھی کمرے میں نہ حبس تھا اور نہ گھٹن تھی۔ اس میں یقیناً ہوا کو گردش میں رکھنے کا کوئی نظام پوشیدہ تھا۔

"ابھی تم آرام کرو۔" اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "کچھ کھاؤ پیو اور سوچو۔ سوچنے کے لیے تمہارے پاس بہت اچھا دماغ ہے اور تم اپنے علاوہ دوسروں کے بارے میں سوچ سکتے ہو۔ تم امکانات پر غور کر سکتے ہو۔ مثلاً تم رابعہ اور محسن کے متعلق سوچو کہ اگر وہ بھی ہماری تحویل میں ہوئے تو کہاں ہوں گے؟ کیا ان کے ساتھ بھی وہی ہوا ہوگا جو تمہارے ساتھ ہوا۔ کیا ان میں بھی اتنی ہی مزاحمت کی صلاحیت ہے جتنی تم میں ہے؟ اور اگر ہم نے تمہارے بعد ان سے سچ معلوم کرنے کی کوشش کی تو کیا ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ذمّے دار تم ہوں گے۔ تم انہیں بچا سکتے ہو یا بہادروں کی طرح جان دے سکتے ہو اور اپنا عذاب منتقل کر سکتے ہو۔ تمہارے بعد محسن، اس کے بعد رابعہ پھر وہ احمق جو دُم چھلے کی طرح تمہارے ساتھ لگا پھرتا ہے۔ خواجہ نیک محمد عرف خوجی عرف استاد ٹیڈی۔"

میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے کہ اسی وقت روشنی مدھم ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ۔ یوں جیسے آفتاب غروب ہوتا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کیا وہ اعصاب شکن اندھیرا پھر ایک لامحدود رات کی صورت میں نازل ہو رہا ہے۔ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ روشنی چھت کے اور دیوار کے سنگم پر نصب تھی اور اب ایک دہکتے سرخ انگارے کی طرح تھی۔ پھر یہ انگارہ بھی بجھنے لگا اور ایک بار پھر میری آنکھیں اندھے کی طرح اس سیاہ دیواروں والے زنداں میں بھٹکنے لگیں۔

"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" میں چلّایا لیکن ابھی کمزوری کا اثر باقی تھا۔ تھوڑے سے گلوکوز اور نمک ملے ہوئے پانی سے میری طاقت گویائی ضرور بحال ہو گئی تھی مگر میں جسمانی توانائی سے محروم تھا۔ میری سانس پھول گئی اور میں یوں ہانپنے لگا جیسے سخت مشقت نے مجھے نڈھال کر دیا ہو۔ میری آواز کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ پھر میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور اٹھ کر بھاگا۔ نہ جانے مجھ میں ایک دم اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ میں پوری قوت کے ساتھ بند دروازے سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ کمرے کے اندر ہی کوئی قہقہہ مار کے ہنسا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہیرو؟" وہ بولا اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھ سے کسی خفیہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ اب میری نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی اس بار کمرے میں سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن کر آیا ہے۔

"تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن میں تم کو دیکھ رہا ہوں" وہ بولا۔ "کیونکہ میں نے مخصوص عدسوں والی عینک لگا رکھی ہے۔"

میں مخصوص عدسوں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ انفرا ریڈ شعاعوں کی مدد سے اندھیرے میں فوٹو گرافی کرنے والے کیمروں میں بھی استعمال ہوتے تھے۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لایا ہوں۔" وہ بولا اور اس مرتبہ آواز دوسری سمت سے آئی۔ وہ محتاط تھا کہ کہیں میں آواز کی سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پر حملہ نہ کر دوں۔

"تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟" میں نے بڑی مشکل سے خود کو اٹھایا۔

"ہمیں اس کی جلدی نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔" وہ بولا۔ "اب تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ تاکہ میں باہر چلا جاؤں۔"

"ہٹ کر کدھر جاؤں جب کہ میں کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "ناک کی سیدھ میں روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں دیوار تک پہنچنے سے پہلے روک لوں گا۔" وہ دوسری طرف سے بولا۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ چالاک آدمی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ سوپ تھوڑا تھوڑا کر کے پینا اور اسی طرح پانی بھی۔" وہ دروازے کی سمت آ گیا۔ "ابھی میرے جانے کے بعد اتنی روشنی کر دی جائے گی کہ تم یہ چیزیں دیکھ سکو گے۔ فی الحال تمہیں بہت زیادہ تو کچھ بھی نہیں دیا جا سکتا مگر وقفے وقفے سے اشیائے خور و نوش کی فراہمی جاری رہے گی۔"

دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی روشنی لوٹ آئی مگر اس بار میری آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں۔ میں نے کمرے کے ایک گوشے میں دو پیالے فرش پر رکھے ہوئے دیکھے۔ بظاہر دونوں میں پانی ہی نظر آتا تھا لیکن ایک میں گرم اور نمکین سوپ تھا۔ اسے میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے چمچے کی مدد سے پینا شروع کیا۔ درمیان میں وقفے وقفے سے میں پانی کے گھونٹ بھی لیتا رہا۔ ابھی میں اپنی آزادی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کرنے کے قابل ہونے کے لیے میرا ذہنی و جسمانی طور پر کسی قابل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے بلاوجہ عقل کے کمزور گھوڑوں کو بحرِ ظلمات میں دوڑانے سے گریز کیا۔ معلوم نہیں اس پیالے کے سوپ میں کیا تھا کہ میری کھوئی ہوئی طاقت تیزی سے بحال ہونے لگی لیکن ابھی اس لنچ یا ڈنر سے فارغ ہوئے مجھے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں سو کر اٹھا تو مجھے اسی جگہ دونوں خالی پیالوں کی جگہ دو بھرے ہوئے پیالے نظر آئے۔ اس مرتبہ میں ضبط سے کام نہ لے سکا اور ندیدوں کی طرح سوپ پر ٹوٹ پڑا۔ یہ سوپ زیادہ گاڑھا تھا۔ اسے میں نے چمچے سے کچھ پیا اور کچھ کھایا پھر پانی سے بھرا ہوا پیالہ حلق میں انڈیلا اور خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔ نیند نے دوسری بار مجھے دس منٹ میں آ لیا۔ سونے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ خوراک میں مجھے خواب آور یا ذہن کو سُن کرنے والی کوئی دوا دی جا رہی ہے۔ سوپ کے ذائقے سے کچھ پتا نہیں چل سکتا تھا۔ پانی کا ذائقہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میں پھر سو کر اٹھا تو وہ پیالے اسی طرح بھرے ہوئے رکھے تھے۔ یہ سب ایک پُراسرار اور طلسماتی کھیل لگتا تھا۔ بالکل کسی جادوئی کہانی کی طرح۔ میں کسی دیو کی قید میں تھا اور وہ جگہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا خیالوں کی سرحد سے بھی دور تھی جہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا مجھے سُلا دیتا تھا اور میری نیند کے دوران میں کوئی دو خالی پیالے اٹھا کے بھرے ہوئے پیالے رکھ جاتا تھا اور ان پیالوں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ نہ میں نے پہلے چکھا تھا اور نہ دیکھا تھا۔

بھوک محسوس کرنے کے باوجود میں نے کھانے کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ سوچ سکوں۔ کمرے میں وہی ایک لائٹ اس چراغ کی طرح جل رہی تھی جس کی لَو انتہائی کم کر دی گئی ہو۔ یہی لائٹ تیز ہوتی تھی تو اس کی طرف دیکھنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کا خیال آیا جو مجھ سے لاؤڈ اسپیکر پر مخاطب تھا اور بعد میں کمرے کے اندر آ کر مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے۔ اس نے خاص قسم کے شیشوں والی عینک کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ مجھے انفرا ریڈ یا الٹرا وائلٹ شعاعوں کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ سورج کی روشنی کے سات رنگ ہوتے ہیں مگر ان میں بھی یہ شعاعیں انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مخصوص کیمرے اس روشنی کو دیکھ لیتے ہیں اور ایسی فلمیں بھی ہوتی ہیں جن پر ان شعاعوں سے تصویر اتاری جا سکتی ہے۔ ریموٹ کنٹرول والے آلات انہی شعاعوں سے کام کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت اندھیرے میں وہ مخصوص قسم کی روشنی کس طرف سے آ رہی تھی جسے میری آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی؟

میں نے دیوار کا اور چھت کا بغور معائنہ کیا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور دروازے میں بھی کوئی درز تک نہ تھی۔ اگر اس مخصوص روشنی کی صرف ایک لکیر ہوتی یا وہ کسی محدود دائرے میں پڑتی تو وہ شخص مجھے پورے کمرے میں چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چھت میں نصب واحد لائٹ کے عین نیچے جا کر دیکھا۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبی اور آٹھ انچ چوڑی چوکور لائٹ تھی جس کے اوپر روشنی کو تیز کرنے والا عدسہ لگا ہوا تھا لیکن عدسہ پوری لائٹ کے فریم پر نہیں پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف تقریباً تین انچ چوڑی پٹی میں لکیریں سی نظر آ رہی تھیں۔ ان لکیروں کے پیچھے اسپیکر تھا۔ لائٹ دیوار میں چُنی ہوئی تھی اور ایسے زاویے پر لگائی گئی تھی کہ روشنی سامنے کے حصّے میں پورے کمرے کو روشن کر دے۔ اس وقت بھی روشنی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہر حصے میں پہنچ رہی تھی، سوائے اس جگہ کے جو لائٹ کے بالکل نیچے تھی. چراغ تلے اندھیرا والی بات تھی مگر اندھیرا وہیں تھا جہاں دروازہ تھا. اگر میں اس جگہ کھڑا ہو جاتا تو دروازہ نہ کھلتا اور انہیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ میں دروازے کے پیچھے موجود ہوں.

پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے دو خیال آئے. ایک یہ کہ جب روشنی تیز ہوتی ہے تو اسی میں پوشیدہ کیمرے کا لینس ایک سو اسّی درجے کے زاویے پر کمرے کو فوکس کرتا ہے چنانچہ جب وہ مجھ سے بات کر رہا تھا تو کسی ٹی وی اسکرین پر میری تصویر بھی دیکھ رہا تھا. ابھی یہ لائٹ عام قسم کی روشنی تھی. اتنی کم روشنی میں کلوز سرکٹ کیمرا کام نہیں کر سکتا تھا. دوسرا خیال زیادہ حوصلہ افزا تھا. وہ مخصوص رنگ کی روشنی جس میں کیمرا تاریک محسوس ہوتا تھا اُسی سرچ لائٹ سے خارج ہوتی ہوگی. گویا اس ایک سرچ لائٹ کے تین فنکشن تھے. اس وقت یہ ایک بلب کی طرح جل رہی تھی. اگر یہ تیز ہو جاتی تو کلوز سرکٹ کیمرے کی فلیش گن کا کام کرتی اور بند ہو جاتی تو اسی سے وہ مخصوص روشنی خارج ہونے لگتی جو نظر نہیں آتی.

یہ دریافت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی. میں نے کمرے کا دوبارہ جائزہ لیا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس زنداں کا سارا جادو ایک لائٹ میں پوشیدہ ہے. اگر میں اس کا شیشہ توڑ سکتا تو شاید اس کے امکان پر غور بھی کرتا مگر میں خالی ہاتھ تھا. میرے پاس صرف چینی کے دو پیالے تھے. اگر وہ میں لائٹ پر کھینچ مارتا تو لائٹ کا کچھ نہ بگڑتا اور دونوں پیالے ٹوٹ جاتے کیونکہ لائٹ کے اوپر لوہے کی حفاظتی جالی بھی تھی. اس کے علاوہ لائٹ کے ٹوٹتے ہی انہیں معلوم ہو جاتا اور وہ مسلح ہو کر آ پہنچتے. میرے پاس سوچنے کی مہلت کم تھی. اصولاً جاگنے کے بعد مجھے کھانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا اور میں بھوک محسوس بھی کر رہا تھا مگر میں اس من و سلویٰ کو کھا پی لیتا تو پھر سو جاتا جبکہ میں ذہنی و جسمانی طور پر بہت مستعد اور فعال محسوس کر رہا تھا اور اس زنداں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرنے پر آمادہ تھا. رابعہ اور محسن کے خیال کو میں نے پیچھے دھکیل دیا تھا کیونکہ ان کے بارے میں سوچنے سے ذہن میں مایوسی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوتی تھی. اس سے صرف [illegible] پست ہوتا تھا. عمل کی قوت کا منفی ردِ عمل سے دوچار ہونا بہت نقصان دہ تھا. میرے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ پہلے خود آزادی حاصل کر دوں اور پھر دوسروں کے متعلق ... ممکن ہے شکاری صرف مجھے گرفتار کر کے لانے میں ... ہوئے ہوں لیکن دوسرے بھی ان کی قید میں ہیں تو پھر ... قیدی کی حیثیت سے میں ان کی رہائی کے لیے کچھ ... تب بھی نہیں کر سکتا.

ترکیب فوراً میرے ذہن میں آگئی. میں نے کو... کے پیالے کو اٹھایا اور فرش پر کم سے کم جگہ پر پھیلا دیا ... اندازہ تھا کہ خواب آور دوا پانی میں ہے مگر یہ اندازہ غلط ... بھی ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے کوئی رسک نہیں لیا. ... پیالہ پانی بہت زیادہ نہیں تھا. میں نے اسے اور ... کے اپنے کپڑوں کو بھگو لیا اور زمین پر نہیں گرنے دیا. خالی ... پیالوں کو اپنی جگہ پر رکھ کے میں عین اسی جگہ پر لیٹ گیا ... جہاں میں نے کھانے کا پیالہ خالی کیا تھا. گاڑھا سوپ ... میرے کپڑوں کے نیچے آگیا. میں نے لائٹ کی طرف پشت ... رکھی اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کے علاوہ فرش پر گوند کی ... طرح چپکنے والے سوپ کو روشنی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہا. مجھے یقین تھا کہ اندر آ کے خالی پیالے لے جانے اور دو خوراک سے بھرے ہوئے پیالے چھوڑ جانے والا ایسے وقت میں آتا ہوگا جب دیکھنے والے کیمرے کی آنکھ سے مجھے نیند میں مدہوش دیکھ لیتے ہوں گے. اگر لائٹ تیز ہوگئی تو میرے خیال کی تصدیق ہو جائے گی. میں نے سوچا اور اسی پوز میں بے حس و حرکت پڑا رہا.

اسی وقت کمرا روشنی سے جگمگانے لگا. اگرچہ سیاہ دیواریں چھت اور فرش روشنی کو جذب کر رہے تھے مگر میری آنکھیں اس کی چکا چوند کو محسوس کر سکتی تھیں. میں نے پلٹ کر دیکھنے سے گریز کیا اور آنکھیں بند کیے لیٹا رہا. یقیناً اس وقت وہ مشاہدہ کر رہے ہوں گے کہ ان کی دی ہوئی خوراک کے زیرِ اثر میں پھر خوابِ غفلت میں کھو گیا ہوں یا نہیں. آخر ان کا مقصد کیا تھا؟ اگر میں اسی طرح سوتا جاگتا رہتا تو میرے ذہن پر کیا اثرات مرتب ہوتے؟ ایک صلاحیت سے تو میں اب بھی محروم ہو چکا تھا یعنی وقت میرے احساس کی گرفت سے نکل چکا تھا. مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات، آج پیر ہے یا منگل، مہینے کی کون سی تاریخ ہے اور میں اس قید خانے میں کتنے دن گزار چکا ہوں.

روشنی اچانک کم ہوئی اور میرا دل دھڑکا. وہ لوگ مجھے بے حس پا کے مطمئن ہو گئے تھے. اب کو... نہ کوئی آنے والا ...

... اور کتنی دیر میں، میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا. کب ... تھا. یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنے والا مسلح ہو یا جسمانی طور پر ... طاقت ور حریف ثابت ہو کہ میں اس پر غالب نہ آ سکوں.

"سکندر! کیا تم اس وقت جاگ رہے ہو؟" لاؤڈ اسپیکر نے کہا.

میں نے کوئی جواب نہیں دیا.

"تم اس آواز کو سن سکتے ہو سکندر." وہ بولا. "تمہارا جسم سویا ہوا ہے لیکن تمہارا ذہن بیدار ہے. تم اپنی مرضی سے ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکتے کیونکہ تمہارے دماغ کا تمہارے جسم پر کوئی کنٹرول نہیں ہے."

وہ بہت عجیب باتیں کر رہا تھا اور میں اس کے مفروضات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا.

"تم صرف وہی کر سکتے ہو جس کا تمہیں حکم دیا جائے گا." وہ بولا. "تمہارے اور میرے درمیان عامل و معمول کا رشتہ ہے. تم معمول ہو اور میں عامل ہوں. تم میری آواز کے تابع ہو."

میں نے خاموشی سے اس کی یکطرفہ بکواس سننا جاری رکھا. ابھی تک اس نے صرف میری کیفیت بیان کی تھی. مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا. آخر وہ کون تھا؟ کوئی مسمریزم کا ماہر یا ماہرِ نفسیات، جادوگر یا عامل؟

"میں نے تم کو ہپناٹائز کر کے سونے پر مجبور کر دیا ہے. تمہارا دماغ اس نیند سے نجات نہیں پا سکتا. تم اگر جاگنا چاہو تب بھی نہیں جاگ سکتے. تمہاری ذہنی اور جسمانی مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہو گئی ہے. جو دوا تم کو دی گئی تھی اس نے تمہارے شعور کو سلا دیا ہے لیکن تمہارا لاشعور جاگ رہا ہے سکندر بخت. یہی وجہ ہے کہ تم میری آواز سن رہے ہو اور ایک ایک لفظ کو سمجھ رہے ہو. سمجھ رہے ہو نا."

"ہاں..... میں..... سن رہا ہوں." میں نے نیند میں ڈوبی ہوئی بوجھل اور بھاری آواز میں رک رک کر جواب دیا.

"جب تم خواب دیکھتے ہو تو بہت کچھ کرتے ہو." وہ بولا. "تم دوسروں سے باتیں کرتے ہو اور دوسرے بھی تم سے بہت کچھ کہتے ہیں. بعض اوقات آنکھ کھلنے کے بعد تمہیں سب یاد آ جاتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت کوشش کرنے کے باوجود تم کو خواب یاد نہیں آتا. تم سمجھتے ہو کہ گزشتہ رات تم نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا. بات یہ نہیں ہوتی. تمہارا ذہن سوتے میں کوئی کام نہیں کرتا. سارا کام لاشعور کرتا ہے. وہ بہت سی باتیں خواب بنا کے دکھاتا ہے. اور ان میں سے کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو بھلائے رکھنا تمہارے حق میں بہتر ہوتا ہے. کیا یہ بات تم نے سمجھ لی؟"

"ہاں..... تم غلط کیسے کہہ سکتے ہو. یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے." میں نے اسی بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا اور یہ ثابت کیا کہ ایک مکمل طور پر مطیع ہو جانے والے معمول کی طرح میرا اپنے عامل پر اعتقاد کتنا راسخ ہو چکا ہے.

"ویری گڈ." وہ میرے جواب سے خوش ہوا. "تم کو یہ بھی سمجھنا ہوگا سکندر کہ اس وقت بھی تم مجھ سے خواب میں ہمکلام ہو. جب تم جاگو گے تو تمہیں کوئی بات یاد نہیں رہے گی. اسی میں تمہارا فائدہ ہے. تم خود کو ذہنی پریشانی سے بچاؤ گے سکندر اور مجھ سے تعاون کر دو گے. اگر تم نے تعاون نہ کیا تو رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گی. اس کی موت انتہائی پُر اذیت ہوگی. تم اس کی موت کا منظر دیکھو گے تو پاگل ہو جاؤ گے."

"خدا کے لیے رابعہ کو چھوڑ دو. تم اس کی سزا مجھے دینا چاہو تو دے لو." میں نے کہا.

"تم واقعی رابعہ سے بہت محبت کرتے ہو. کیا اس کی خاطر تم سچ بولو گے؟"

"میں سچ بولوں گا. کیا اس کے بعد تم رابعہ کو چھوڑ دو گے؟" میں نے کہا.

"ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا." وہ بولا. "مجھے تمہارے سچ پر اعتبار آ گیا تو اسے چھوڑ دیا جائے گا."

"تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں چوہدری دلاور اور اس کے ساتھیوں کے کاروبار کی اصل نوعیت کا علم ہے؟" وہ بولا.

"ہاں. مجھے سب معلوم ہے."

"تمہارے علاوہ رابعہ اور محسن کو بھی معلوم ہے؟" وہ بولا.

"ہم سب جانتے ہیں. جو بات ایک کو معلوم ہو وہ سب کو معلوم ہوتی ہے."

"تمہارے خیال میں چوہدری دلاور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا غیر قانونی کام کر رہا ہے؟" وہ بولا.

"وہ منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہے."

"تم جھوٹ بول رہے ہو سکندر. تم اصل بات نہیں بتا رہے ہو." وہ بولا.

"میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں." میں نے کہا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہیروئن کے پیکٹ میرے پاس ہیں۔"

"یہ پیکٹ تمہیں کس طرح ملے تھے؟" وہ بولا۔

"گامے ماچھی کے اڈے سے۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک جعلی پیر ہے اور مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اسی کی خانقاہ کے تہ خانے سے یہ پیکٹ ملے تھے۔"

"تم وہاں کیوں گئے تھے؟"

"یہی دیکھنے کے لیے کہ کیا واقعی وہاں کے تہ خانوں سے ہیروئن باہر بھیجی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو یہ کس نے بتایا تھا کہ وہ تہ خانے ہیروئن کے گودام ہیں؟"

"مجھے مختلف ذرائع سے اطلاعات ملتی رہی تھیں۔" میں نے کہا۔ "جب میں انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھا۔ تو..."

"تو کیا سکندر؟" وہ بولا۔ "کیا تمہارے والد نے تم کو کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں۔ انہوں نے اپنا شک ظاہر کیا تھا۔ خط لکھ کر۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو سکندر۔" وہ بولا۔ "ہمیں ان کا ایسا کوئی خط نہیں ملا تھا۔"

"ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اس خط کو فوراً جلا دیا تھا۔"

"اس کے علاوہ تمہیں کس نے بتایا تھا؟" وہ بولا۔

"بہت سے لوگ تھے۔ ایک اکاؤنٹنٹ تھا غلام علی۔" میں نے کہا۔ "وہ بس کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے منشی فیاض نے اطلاع دی تھی۔ پھر میں نے ڈی سلوا کی گاڑی میں لاکھوں روپے کی ہیروئن دیکھی تھی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا سکندر۔" میری غلط بیانی نے اسے کنفیوز کر دیا تھا۔ "وہ گاڑی کسی اور کی ہو گی۔"

"ڈی سلوا کا گھر بھی ہیروئن کی اسمگلنگ کا ایک ٹھکانا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے وہاں گاڑیوں کی ڈکی میں ہیروئن بھری ہوئی دیکھی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ہیروئن تھی؟" وہ ڈی سلوا کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ دریں وہ اس نے دوسرا کاروبار بھی شروع کر رکھا تھا جس کی خبر دلاور کو بھی نہیں تھی۔

"میں ہیروئن کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"اور وہ لوگ کون تھے جو ڈی سلوا سے ہیروئن لے جاتے تھے؟" وہ بولا۔

"میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔ اگر ڈی سلوا حادثے کا شکار نہ ہوتا تو میں اس سے سب کے نام پوچھ لیتا۔" میں نے کہا۔ "وہ مجھ سے اسی لیے خوفزدہ رہتا تھا کہ میں سب کچھ جان چکا تھا۔"

"کیا تم نے ان گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لیے تھے؟" وہ بولا۔

"کیے تو تھے مگر پھر ایک نوٹ بک میں لکھ لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بوگس ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ڈی سلوا کی کار کی ڈکی میں کتنی ہیروئن تھی؟ کتنا وزن تھا اور وہ ہیروئن کہاں گئی؟" وہ بولا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ پولیس لے گئی ہو۔ وزن کا بھی مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ بہت سی تھیلیاں تھیں۔ پانچ سو گرام اور ایک کلو کی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ گامے شاہ کے اڈے سے ہیروئن کہاں جاتی تھی؟" وہ بولا۔

"مجھے ابھی تک صرف یہ پتا چلا ہے کہ ہیروئن کراچی پہنچائی جاتی تھی۔"

"تم ان لوگوں سے بھی واقف ہو جو یہ کام کرتے تھے؟" وہ بولا۔

"مجھے طافو نے کچھ نام بتائے تھے۔ جو ڈی سلوا کے ایجنٹ تھے۔" میں نے کہا۔ "مگر طافو مارا گیا۔"

"وہ کیا نام تھے؟ تم کو ان کا پتا بھی معلوم ہوگا؟"

"نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سب لوگ اڈے پر پہنچ کر ٹرک سے اپنا اپنا مال پہچان کے ساتھ وصول کرتے تھے۔ ایک لالوکھیت کا بابو مستری تھا۔ دوسرا لیاری کا شاہ محمد اور ایک قصبہ کالونی کا ہزار خان تھا۔" میرا جھوٹ اسے یقیناً مطمئن کر رہا ہوگا۔

"تمہیں یاد ہے کہ تم نے ایک ٹرک تباہ کر دیا تھا۔ اس میں تو ایسی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔" وہ بولا۔

"اس میں ڈی سلوا نے اپنا مال گھر سے رکھوایا تھا۔ رحمت کباڑی اس کا ایجنٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "رحمت کباڑی نے مرنے سے پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ دلاور کے علاوہ ڈی سلوا کے لیے بھی کام کرتا تھا اور دونوں کے مال کا ذمے دار تھا۔ اس نے کبھی دلاور کو معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ چوری چھپے ڈی سلوا اپنا کاروبار بھی کرتا ہے۔ رحمت کباڑی کو دونوں طرف سے فائدہ تھا۔"

"یہ اس نے تم کو خود بتایا تھا؟"

"ہاں۔ آسانی سے تو نہیں بتایا تھا۔ شرافت سے بتا دیتا تو مارا کیوں جاتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو سکندر؟ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔" وہ بولا۔ "تم سے زیادہ رابعہ کو اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

"میں رابعہ کی قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ سچ ہے۔" میں نے کرب زدہ لہجے میں کہا۔ میں نے رابعہ کی جھوٹی قسم کھائی تھی مگر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ایسے مخصوص حالات میں جہاں زندگی کو خطرہ لاحق ہو، مذہب نے بھی حرام و حلال کے فرق کو نظر انداز کرنے کی اجازت دی ہے۔ میرا مقصد اپنی حفاظت تھا اور رابعہ کو بچانا تھا اور اس کے لیے دشمنوں کو اپنے سچ کا یقین دلانا ضروری تھا۔ جتنا جھوٹ میں نے بولا تھا اس کو بھی گناہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے بغیر نجات کی توقع عبث ہوتی۔ میں نے بہت سے جھوٹ ان سے بھی منسوب کیے تھے جو اب دنیا میں نہیں تھے اور ان کے اعمال کا حساب قدرت کے سپرد ہو چکا تھا۔ تاہم یہ بھی دشمن کے خلاف فنا و بقا کی جنگ کا ایک حصہ تھا اور میرے کسی فعل کو بدنیتی پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"اگر تم یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گامے ماچھی نے پیری فقیری کی آڑ میں ہیروئن کا دھندا چلا رکھا ہے..."

"مجھے یہ بات معلوم تھی۔ اور یہ ثابت بھی ہو گیا تھا۔"

"اس کے بعد تم کیا کرتے؟" وہ بولا۔

"میں معلوم کرتا کہ کراچی میں کون کون لوگ اس کاروبار میں ملوث ہیں۔ پھر ہم پولیس کو بلا لیتے۔"

"تم خود پولیس کو کیسے بلا سکتے تھے۔ سب سے پہلے تم خود پکڑے جاتے۔" وہ بولا۔

"میں انکل رضوی کو بتاتا تو وہ مجھ پر یقین کرتے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ نہ بتاتا کہ کہاں سے بول رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک دوست عبدالودود منظر ایڈووکیٹ بھی ہے۔ وہ پہنچنے میں بھی دیر نہ کرتا خواہ کال گمنام ہوتی۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا سکندر۔" وہ بولا۔ "یہ کاروبار ہمیشہ ہی چلتا تھا اور تمہارے والد کی مخالفت کے باوجود چلتا رہا۔ نقصان کسے ہوا؟ تم نے اتنی پریشانی اور مصیبت اٹھا کے یہ بات معلوم کر لی تو کون سا تیر مار لیا۔ مجرم تم ہی بنے اور جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ سب تم نے گنوا دیا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ دلاور جب ہیروئن اسمگل کرتا ہے تو اس کاروبار میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے مددگار ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجود ہیں جو منافع میں برابر کے شریک ہیں۔ ان میں پولیس بھی ہے جو ابھی کچھ دیر میں یہاں آئے گی اور تم کو سوتے میں اٹھا کے لے جائے گی۔ تم پر چوری، ڈکیتی —— اغوا اور قتل کے کتنے مقدمات ہیں! کیا ان سب کی سزا پھانسی سے کم ہو سکتی ہے؟"

"مجرم تم لوگ ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارے خلاف لڑتا رہوں گا۔" میں نے کہا اور بہت اطمینان کا سانس لیا کہ اپنی کوشش سے بالآخر ایک جھوٹ کو سچ بنانے میں کامیاب رہا۔ اب میرے دشمنوں کو یقین تھا کہ مجھے ان کے اصل کاروبار کا علم نہیں اور میں اسلحے کی خرید و فروخت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ ان کے لیے یہ ایک اچھا انکشاف تھا کہ مجھے ڈی سلوا کی وجہ سے ہیروئن کے کاروبار کا پتا چلا اور میں غلط راہ پر چل پڑا۔ ڈی سلوا نے دلاور کے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اپنا کاروبار الگ چلا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی زندگی میں یہ بات دلاور کو معلوم ہو جاتی تو ڈی سلوا بہت پہلے مارا جاتا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ذات سے منسوب ایک برائی کا انکشاف ہو رہا تھا مگر وہ سزا کی حد پار کر چکا تھا اور اس کی خرابی اس لیے قابلِ معافی ہو گئی تھی کہ اسی کی وجہ سے ہمارے شکوک و شبہات کی بنیاد غلط ہو گئی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور فوری طور پر دشمن مطمئن ہو گئے ہیں کہ ان احمقوں سے کوئی خطرہ نہیں جو بزعم خود بڑے تیس مار خاں اور سراغرساں بنے پھرتے ہیں۔

تشویش کی بات میرے لیے یہ تھی کہ وہ مجھے پولیس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد وہ یہاں سے نکل جائیں گے اور پولیس کو میرے بارے میں بتا دیں گے۔ پولیس بھی تو انہی کی ہے اور ان سے زیادہ میری دشمن ہے۔ لائٹ ایک دم بہت کم ہوئی تو میں نے کروٹ بدلی۔ میری ایک سائڈ بالکل سُن ہو گئی تھی اور اگر مجھے فوراً اٹھنا پڑتا تو میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا بخار باقی نہیں رہا تھا اور میرے اس بازو کی حالت بھی بہتر تھی جس میں گولی کا زخم تھا۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ میری نیند یا بے ہوشی میں وہ مجھے اینٹی بایوٹک دوا کے انجکشن لگاتے رہے تھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور شاید سوپ میں دوائیں شامل کرتے رہے تھے۔ ان کا مقصد میری جان بچانا نہیں تھا۔ وہ مجھے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

آہستہ آہستہ میں نے خود کو ایک بازو کے سہارے پر اٹھایا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد سیدھا بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے کپڑے نمی اور غلاظت میں بھر گئے تھے لیکن مجھے ایک امید کا سہارا حاصل ہو گیا تھا۔ اگر خدا نے یہ امید کا وسیلہ بھی نہ پیدا کیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس قید خانے میں کسی سے کچھ کہے بغیر پاگل ہو جاتا اور دیواروں سے سر پھوڑ کر مر جاتا۔ عام زندگی میں آدمی روشن دیواروں کے درمیان رہتا ہے۔ زمین کی..... سرسبزی اور آسمان کی نیلاہٹ کے درمیان رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہاں ہر سو تاریکی کا احساس تھا اور روشنی ان کالی دیواروں میں اتنی پُرآسیب لگتی تھی کہ خوف آتا تھا۔ اوپر نیچے اور اپنے چاروں طرف ایک ہی سیاہ رنگ کو دیکھتے رہنے سے ذہن اور اعصاب پر اس آسیب کا اثر ہونے لگتا تھا۔ اب میں بے چینی سے منتظر تھا کہ کچھ ہو۔ تفتیش کے عمل کے بعد یکسانیت، جمود اور خاموشی پھر مجھے خوفزدہ کرنے لگے تھے۔ میں اس خیال سے بھی دور رہنا چاہتا تھا کہ میری امید کی کرن فقط سرابِ آرزو ثابت ہوئی تو کیا ہو گا۔

دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سن کر میں فوراً لیٹ گیا اور اپنا رخ یوں رکھا کہ میرے کپڑے اور فرش کی آلودگی اندر آنے والے کو فوراً نظر نہ آئے۔ وہ صرف یہ دیکھے کہ میں آنکھیں بند کیے مدہوش پڑا ہوں۔ میں نے آنکھوں کو اس وقت تک بند رکھا جب تک کوئی دروازہ کھول کے اندر نہیں آ گیا۔ میں قدموں کی چاپ پر کان رکھے لیٹا رہا۔ آہٹ میرے قریب آئی۔ کسی نے آہستہ سے میرے زخمی ہاتھ کو ٹھوکر ماری۔ میں درد کی ٹیس کو برداشت کر گیا اور اسی طرح پڑا رہا۔ ٹھوکر مارنے کا مقصد یہ اندازہ کرنا تھا کہ کہیں میں مکر تو نہیں کر رہا ہوں۔ اگر میں چاہتا تو اس وقت بھی ٹھوکر مارنے والے کو گھسیٹ کر گرا سکتا تھا۔ یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ اندر آنے والا کوئی مرد ہے۔ وہ عورت نہیں جس نے پہلی بار مجھے چمچے سے آبِ حیات پلایا تھا۔ آخر وہ کون تھی؟ اس کا لہجہ نامہرباں نہیں تھا اور اگر وہ آتی رہتی تو شاید میرے لیے کچھ کرتی۔ عورتوں کا دل کسی کو مصیبت میں دیکھ کر نسبتاً جلد پسیج جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے بعد میں عورت کو نہ بھیجا

گیا ہو کہ میں جسمانی توانائی کی بحالی کے بعد اسے ... میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔

پیالوں کی آواز پر میں نے ایک آنکھ کھول کر ... وہ پیالے نیچے رکھ چکا تھا اور اب دونوں خالی پیالے ... رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی چنانچہ وہ مجھے ... دیکھ سکا۔ یہ میرے لیے زندہ رہنے کے لیے جان کی بازی ... دینے کا آخری موقع تھا۔ ہار جیت کی پروا کیے بغیر مجھے ... تھا۔ اسی احساس نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کی اور میں ... جست میں اس کے اوپر جا پڑا۔ آخری وقت میں ... ہو گیا تھا کہ میں نے اسے دھوکے میں رکھ کر حملہ کر دیا ہے ... وہ ایک دم پلٹا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ جیب کی طرف ... میں نے اس کے بازو پر لات ماری اور ایک ہاتھ مار کے ... نیچے گرا دیا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ وہ فرش پر گرا تو اس ... کا سر بڑی آواز کے ساتھ نیچے لگا اور وہ بلبلایا۔ وہ ... سال کا نوجوان لڑکا تھا مگر جسمانی طور پر اس کی صحت ... گوریلے سے کم نہ تھی۔ اس کا قد بھی ساڑھے چھ فٹ کے قریب ... تھا اور وزن شاید ڈھائی سو پونڈ سے زیادہ تھا۔ اس ... توش کے باوجود وہ پھرتیلا تھا اور سخت جان بھی تھا۔ ... پھر اٹھ کر لپکا اور میری طرف آیا۔ میں نے جھک کر اسے ... اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے گھما کے دیوار پر دے مارا ... کے فرش پر گرتے ہی میں پھر اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

میں نے اسے اٹھایا تو وہ شرابی کی طرح جھولنے لگا ... میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ "... تمہارا صرف ایک بازو ٹوٹا ہے۔" میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ... ہٹایا اور نال کو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ "اسی وار سے ... تمہاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ میں نے تم کو زندہ رہنے کا ... ایک موقع عطا کیا ہے۔"

وہ بالکل سیدھا کھڑا اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا ... ٹوٹ جانے والا بازو مضحکہ خیز طریقے پر جھول رہا تھا اور اسے ... یقیناً بہت تکلیف ہو رہی ہو گی لیکن وہ درد کو برداشت ... رہا تھا۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔

"اب میں اس کے بغیر بھی یہاں سے نکل جاؤں گا۔" ... میں نے کہا۔ "تمہارے علاوہ جو بھی میری راہ میں حائل ہونے ... کی کوشش کرے گا، مارا جائے گا۔ اس ریوالور کی ہر گولی سے ... ایک آدمی تو یقیناً مرے گا۔ تم پر میں گولی ضائع نہیں کروں گا۔"

"تمہاری مدد کر کے بھی میں مارا جاؤں گا۔" وہ ...

"اور بعد کی موت زیادہ تکلیف دے گی۔ تم انتظار مت کرو ..."

ہاتھ مار دو اور منکا توڑ دو۔" اس کی آواز اس کے بھاری بھرکم وجود کے مقابلے میں بہت پتلی تھی۔ کسی حد تک زنانہ۔

"تم کسی کو مدد کے لیے نہیں پکار رہے ہو۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"یہاں سے کوئی آواز باہر تک نہیں پہنچ سکتی۔" وہ بولا اور اس نے سر گھما کے سرچ لائٹ کی طرف مایوسی سے دیکھا۔

"میں سمجھ گیا۔ یہ دو طرفہ نظام اس وقت کام نہیں کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو تم مدد نہ کرو، یہ تو بتا دو کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "آخر میں کسی نہ کسی طرف سے تو آیا ہی تھا۔"

"باہر نکلنے سے پہلے مجھے کتنے لوگوں سے مقابلہ درپیش ہو گا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ تین آدمی بھی دیکھے ہیں میں نے اور چھ بھی۔ میرا بس یہی کام تھا۔"

"کیا تم ان کے ساتھی ہو۔ یہ بتا سکتے ہو کہ ان کے نام کیا ہیں؟ حلیے کیا ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ ایک دوسرے کو نمبروں سے یاد کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے ایک نمبر نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ تہ خانے میں ایک بہت خطرناک مجرم ہے۔ اس کو کھانا پہنچانا ہے جب بھی ہم کہیں۔ میں صرف نمبر ایک کو پہچان سکتا ہوں۔ وہ سیاہ فام مکرانی ہے۔ لمبے لمبے کانوں والا۔"

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ وہ استاذ پیڈرو ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس کے پاس کون لایا تھا؟"

"نمبر ایک نے مجھے چیئرنگ کراس سے اٹھایا تھا۔" وہ بولا۔ "وہاں میں بے روزگار بیٹھا تھا، ڈرائیوروں، بیروں اور خانساماؤں کے ساتھ۔ اس نے پوچھا کہ گاڑی چلا سکتے ہو۔ میں نے کہا ہاں۔ اس پر وہ بولا کہ گولی چلا سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ بولا آؤ میرے ساتھ اور مجھے اپنی گاڑی میں یہاں لے آیا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ گولی کس پر چلانا ہے؟"

"نہیں کچھ لوگ ایسے چوکیدار بھی رکھتے ہیں جو بندوق چلا سکتے ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کتنے دن ہوئے تم کو یہاں کام کرتے؟"

"دس دن ہوئے ہیں۔" وہ بولا۔ "اس نے دس دن کی بات کی تھی۔ اور دس ہزار دیے تھے۔"

"دس دن کے دس ہزار۔ تم نے کسی شک کے بغیر قبول کر لیے؟"

"مجھے پیسے کی بہت ضرورت تھی۔ اور دس ہزار میں تو میرے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے۔" وہ بولا۔ "میں انکار کیسے کرتا۔"

"خواہ وہ تم کو کسی بے گناہ پر گولی چلانے کو کہتا۔"

"اس نے مجھ پر کام کی نوعیت واضح کر دی تھی۔" وہ بولا۔ "اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے جانا پڑے گا۔"

"تم بہت احمق اور ناتجربہ کار لڑکے ہو۔ تم کو اندازہ نہیں کہ دس ہزار لے کر تم نے اپنی زندگی ان کے پاس رہن رکھ دی۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں زندہ جانے دیں گے؟"

"تو کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اب اس دیوزاد سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی نادانی کے باعث ایک ایسی ذمے داری قبول کر بیٹھا تھا جس کی صحیح نوعیت کا خود اسے بھی علم نہ تھا۔ پیڈرو بہت چالاک اور پرانا شکاری تھا۔ ملکہ کے مجسمے والے مختصر سے باغیچے میں بیٹھنے والے بے روزگاروں کے ہجوم میں سے اس نے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا تھا تو میں یہ فرض کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے طور پر ضرورت مند کے کوائف پہلے جمع کر لیے ہوں گے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہو گا کہ اس کام کو ان میں سے کون سب سے بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہو رہا تھا جو مجھ سے دانستہ ہوئی تھی مگر ایک غلط فہمی کے باعث۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ لڑکا میرا دشمن نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ کر رہا ہے مجبوری میں کر رہا ہے تو میں اس کو بے بس کر دیتا اور صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد چھوڑ دیتا۔ اب مجھے یہ مشکل نظر آتا تھا کہ میں اس حال میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کوتاہی پر اسے موت سے کم سزا نہیں ہو گی۔ کوئی بھی اس کا عذر قبول نہیں کرے گا اور رحم کھا کے اسے معاف نہیں کرے گا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا بازو ٹوٹا۔ یہ ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ ہم یہاں سے جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔"

"میرا نام تو ماں باپ نے نزاکت علی رکھا تھا۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"سب پہاڑ خان کہنے لگے۔"

ایسی خطرناک اور سنگین صورتِ حال میں بھی مجھے ہنسی آگئی۔

قصوروار والدین بھی نہیں تھے جن کو نام رکھتے وقت قطعی اندازہ نہ ہوگا کہ ان کا نرم و نازک بچہ بڑا ہو کے پہاڑ بن جائے گا اور اس کے ساتھ نزاکت کا تصور ہی مضحکہ خیز محسوس ہوگا قصوروار دنیا والے بھی نہیں تھے جو پہاڑ کو پہاڑ ہی کہہ سکتے تھے۔

"دیکھو پہاڑ خان! جیسے میں تمہاری مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ایسے ہی تم بھی میری مدد کے بغیر شاید لوٹ کے زندہ گھر نہ جا سکو۔ گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"گھر؟ ایک تو ہے مامے کا گھر۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہاں مامی نہیں چین لینے دیتی۔ تیسری بیوی ہے مامے کی۔ دوسرا گھر چاچا کا ہے۔ اس کا بس چلے تو مجھے زہر دے کر ختم کر دے۔ ماں باپ اس کے حوالے کر گئے تھے مگر وہ دشمن ہے میرا۔"

"وہ کیوں؟ آخر تم اس کے بھائی کی نشانی ہو۔"

"وہ میرا گھر ہے۔ اس میں سب کچھ میرے ماں باپ کا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ سب ہمیں دے جو ہم نے تجھے چھوٹی سے پہاڑ بنانے میں لگایا۔" وہ بولا۔ "جتنا کھلایا، جو پہنایا، جو مصیبت تجھے پالنے اور زندہ رکھنے میں اٹھائی، سب کا معاوضہ دے تو مکان دیں گے۔ میں نے اتنا تو نہیں کھایا جی ان کا۔ دس سال کا تھا تب سے تو گھروں میں برتن دھونے پر رکھوا دیا تھا۔ دس سال سے اپنا کما کے کھا رہا ہوں۔ انہیں الٹا اپنی کمائی دیتا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا، پھر کریں گے یہ باتیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے چاچا سے بھی نمٹ لیں گے۔ اب یہاں دیر کرنے میں خطرہ ہے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ تم نے کھانا رکھ کر آنے میں اتنی دیر کیوں کی۔"

"ان کو کیا معلوم۔" پہاڑ خان بولا۔

"ان کو سب معلوم رہتا ہے بے وقوف۔ وہ تم پر بھی نگاہ رکھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم ریوالور چلا لیتے ہو؟"

"ہاں جی۔ کچھ عرصہ میں ایک کرنل صاحب کا چوکیدار رہا تھا۔ انہوں نے سکھایا تھا۔"

"نشانہ کیسا ہے تمہارا؟" میں نے ریوالور نکال کے اسے تھما دیا۔

"آپ خود دیکھ لیں۔ اپنی جیب میں سے چونی نکال کے اچھالیں۔" وہ ریوالور اٹھا کے بولا۔

"نہیں نہیں۔ عملی مظاہرے کا یہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بس ضرورت پڑے تو لحاظ مت کرنا۔ جو سامنے آ کے راستہ روکے، اسے شوٹ کر دینا۔ ورنہ وہ تم کو شوٹ کر دیں گے۔"

"کیوں جی! میں نے کیا جرم کیا ہے ایسا؟" وہ ... کر بولا۔

"بات جرم کی نہیں۔ اور تمہارا یہ جرم کیا کم ہے کہ تم میرے ساتھ فرار ہو رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے تم سے جھوٹ کہا تھا کہ میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

"اچھے شریف آدمی ہو جی۔ میرا بازو توڑ دیا۔" وہ بولا۔

مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ بازو ٹوٹنے کا یوں ذکر کر رہا تھا جیسے کوئی تکلیف وہ بات نہیں، صرف افسوس کی بات ہے۔ درد کو برداشت کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بلبلاتا رہتا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پہاڑ خان۔" میں نے کہا۔ "خطرناک مجرم یہ لوگ ہیں۔ یہ مجھے اغوا کر لائے تھے اور قتل کر دینا چاہتے تھے۔ وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ اب نکل چلو۔ تم آگے رہو۔"

"اور تم خالی ہاتھ چلو گے؟" پہاڑ خان نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"تم تو دیکھ ہی چکے ہو کہ میں خالی ہاتھوں سے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کس طرف سے آتے تھے؟"

"وہ کمرا الگ ہے۔" پہاڑ خان نے کہا۔ "اس کے آگے دروازہ مگر اس میں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"کیا وہ بھی ایسا ہی سیاہ خانہ ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ دیواریں تو اس کی دھوئیں سے کالی ہو رہی ہیں کچھ۔" وہ بولا۔ "لیکن اس میں بس ایک کھڑکی ہے بہت اوپر اور اس میں بھی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔"

مجھے پہاڑ خان کی سادہ لوحی اور ذاتی عقل پر اعتماد سے محرومی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جس کا جسم عام جوان آدمی کے مقابلے میں قابلِ فخر حد تک بڑھ گیا تھا لیکن اس کا دماغ اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا اور ایک ناتجربہ کار لڑکے کا دماغ تھا۔ بہت سے چودہ سالہ بچے بھی اس سے زیادہ ذہین اور چالاک تھے لیکن وہ خداداد ذہانت سے محروم تھا تو اس میں قدرت کو موردِ الزام کیسے ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ خدائی کے رموز اور اس کے ہر کام میں پوشیدہ مصلحت کو خدا ہی جانتا ہے۔

پوست کے پہاڑ کی ذہنی استعداد کی پیمائش کرتے تو اس کا آئی کیو "بہت کم" بتاتے اور شاید اپنی اصطلاح میں اسے "مورون" قرار دیتے۔ عام آدمی کی اوسط عقل بھی نہ رکھنے والا۔ ایسے لوگ بہت زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ قوتِ فیصلہ سے محروم ہوتے ہیں یا تمام عوامل و عواقب کا تجزیہ کیے بغیر فوری فیصلے کرتے ہیں تو ان کے فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔ وہ معمولی سی مشکل میں گھبرا جاتے ہیں اور باریک بات ان کی موٹی عقل میں نہیں آتی تو وہ لوگوں کی تفریح اور تمسخر کا سامان بن جاتے ہیں۔ بچپن سے جوانی تک بے وقوف اور احمق کا خطاب پاتے پاتے، وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعی اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں سے بہت کمتر حیثیت کی مخلوق ہیں۔

پہاڑ خان نے سوچے سمجھے بغیر استاد پیڈرو سے دس ہزار روپے لے لیے تھے۔ شاید اتنی رقم اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ وہ بہت خوش ہوا ہوگا کہ اب اپنے دوستوں اور ہمیشہ ذلیل کرنے والے رشتے داروں کے سامنے وہ بڑے فخر سے اعلان کر سکے گا اور قسم کھا کے کہہ سکے گا کہ یہ سب رقم اس نے کہیں سے چرائی نہیں ہے بلکہ اپنی محنت سے کمائی ہے۔ شاید اس طرح اپنی ذات پر پہاڑ خان کا اعتماد بحال ہوا ہوگا کہ وہ بھی بڑے کام کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کی محدود عقل کے ساتھ اس کا تجربہ بھی محدود تھا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ایسے کاموں میں کیا خطرات مضمر ہو سکتے ہیں۔ اس نے تو جو کہا وہ کیا اور اس کے نقطۂ نظر سے کوئی بھی غلط کام نہیں کیا۔ کسی خطرناک مجرم کو کھانا پہنچانے میں گناہ یا جرم کی تو بات ہی نہیں تھی کہ وہ تذبذب یا شک میں پڑتا۔ کوئی اسے چوری کرنے یا قتل کرنے کو کہتا تو وہ یقیناً بھاگ جاتا۔

مگر جتنی آسانی سے وہ پیڈرو کی باتوں میں آ گیا تھا، اتنی ہی آسانی سے اس کے دماغ نے میری بات کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ وہ ایسا بچہ تھا جسے کوئی بھی ہوشیار آدمی باتوں میں لگائے تو انگلی پکڑ کے جہاں چاہے لے جائے۔ ذرا سی دیر میں پیڈرو کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور اس نے میری بات مان لی تھی کہ خطرناک مجرم میں نہیں، وہ ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر، کوئی ثبوت مانگے بغیر اور اپنی عقل سے مشورہ کیے بغیر۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ ایک طرف تو اسی دنیا میں وہ ہیں جن کے لیے شاعرِ مشرق نے کہا تھا کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ دوسری طرف پہاڑ خان جیسے بھی تھے کہ دل تو رکھتے تھے مگر پاسبانِ عقل نہیں رکھتے تھے۔ یہ جب تک جیتے تھے دوسروں کی عقل انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کا سوال ہوتا تھا تو ان کی زندگی کو داؤ پر لگا کے قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اگر قدرت نے یوں ہم دونوں کو نہ ملایا ہوتا تو شکاری کامیاب ہو جاتے مگر مارنے والے ہاتھ سے بچانے والا ہاتھ ہمیشہ زبردست رہا ہے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے زندگی کی امید بن گئے تھے۔

باہر بھی گھپ اندھیرا تھا لیکن میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تو باہر پہنچنے والی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک سرنگ نما راستہ نظر آیا۔ راستے کی بلندی آٹھ فٹ اور چوڑائی اس سے نصف تھی۔ یہ راستہ میرے سامنے بیس پچیس گز تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے دونوں جانب سپاٹ دیواریں تھیں جن کا رنگ اسی قید خانے کی طرح سیاہ تھا جس میں سے مجھے تین دن کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ میں نے تنہائی اور عذاب کے تین ہفتے موت اور زیست کی کشمکش میں گزار دیے تھے۔ اس سے پہلے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر مجھے یقین تھا کہ عام آدمی کچھ کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ گزار سکتا ہے۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا کہ صرف تین دن میں میری قوتِ برداشت صفر سے بھی کم ہو گئی؟ تین دن میں میرا یہ حال ہو گیا کہ میرا اپنے جسم پر کوئی کنٹرول نہ رہا اور بھوک پیاس سے میں مرنے کے قریب ہو گیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اس سے پہلے ایسے بہت سے دن آئے تھے جب میں نے اور محسن نے صبح سے شام تک اور پھر شام سے صبح تک کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور مسلسل اپنے دشمنوں سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ اس وقت ہمیں بالکل احساس تک نہیں ہوا تھا کہ تھکن یا نیند کی کمی اور بھوک پیاس کا ہمارے جسم کی توانائی پر اتنا برا اثر پڑا ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مزید چوبیس گھنٹے اسی طرح گزرے تو ہم اسٹریچر پر ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے ورنہ اٹھ بھی نہیں سکیں گے اور تیسرے دن اس دارِ فانی سے کوچ فرماتے نظر آئیں گے۔

یقیناً تین دن تک مجھے کوئی ایسی چیز دی گئی تھی جس نے میری ساری توانائی سلب کر لی۔ مجھے کوئی زہر دیا گیا تھا یا کوئی نشہ کہ میں شدید جسمانی اذیت میں بھی مبتلا ہوا اور میرے حواس بھی بحال نہ رہے۔ پھر جب اس کا اثر زائل ہوا اور مجھے مناسب خوراک کے ساتھ آرام ملا تو میری جسمانی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قوت کی بحالی میں وقت نہ لگا۔ اس برآمدے نما کوریڈور کے آخری حصے تک دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے ذہن میں یہ سب خیالات آئے اور گزر گئے۔ میں نے چند قدم چلنے کے بعد اپنے پیچھے سے آنے والی روشنی کو سیاہی میں دم توڑتے محسوس کیا۔ باقی راستہ میں نے پہاڑ خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے پیچھے چلتے ہوئے طے کیا۔ یوں جیسے وہ آنکھوں والا ہے اور میں اندھا ہوں۔ میری نظریں سامنے بھی دیکھ رہی تھیں۔ جہاں یہ سرنگ نما راستہ ختم ہوتا تھا وہاں چھت سے ایک بلب معلق تھا۔ بلب کی روشنی بہت کم تھی اور اس کے اوپر شیڈ تھا جو روشنی کو نیچے ایک مختصر دائرے تک محدود رکھتا تھا۔ دائرے کے تین جانب مجھے تین بند دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک بالکل سامنے، دوسرا دائیں جانب اور تیسرا بائیں طرف۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے میرے کان ہر آہٹ پر تھے۔

پہاڑ خان میرے لیے ایک ڈھال بھی بنا ہوا تھا۔ اگر اچانک کوئی کمرے سے نکل آتا تو ایک سرسری نگاہ میں شاید مجھے دیکھ ہی نہ پاتا اور مجھے بہت قریب پہنچ کر حملہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ جب آخری دروازے تک کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لے کر پہاڑ خان کے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ بائیں طرف کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو میں بھی بڑی پھرتی سے اندر پہنچ گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر کوئی دوسرے دروازے سے جھانک کر دیکھ لیتا اور جنگ اچانک چھڑ جاتی۔ اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ پہاڑ خان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی ساری دیواریں ہموار تھیں۔ صرف ایک دیوار میں چھت سے ملی ہوئی ایک فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی کھڑکی تھی جسے روشندان کہنا زیادہ مناسب ہوگا مگر اس میں لمبائی کے رخ آڑی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر سلاخ آدھ انچ موٹی تھی اور روشندان کے دونوں طرف کی دیواروں میں پیوست تھی۔ ایک فٹ کی چوڑائی میں ایسی تین سلاخیں تھیں چنانچہ اس روشندان سے اسی صورت میں گزرا جا سکتا تھا جب میں اپنے قالب کو بلی کے قالب میں ڈھالنے پر قادر ہوتا۔ پھر بھی سلاخوں سے نظر آنے والے روشن آسمان کی جھلک نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ ”ذرا آہستہ بات کرنا۔“ میں نے پہاڑ خان سے کہا۔ ”کیا وہ لوگ ہر وقت موجود رہتے ہیں؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ پہاڑ خان بولا۔ ”مجھے اس کمرے سے نکل کر سامنے والے کمرے میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔“

”کیا یہ تیسرا دروازہ باہر جانے کے لیے ہے؟“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”ہاں۔ مگر اس میں اوپر سے نیچے تک تین قفل ہیں۔“ پہاڑ خان بولا۔ ”ہر ایک کی چابی الگ ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے حیرانی سے کہا کیونکہ مجھے پہاڑ خان کی قوتِ مشاہدہ پر بالکل اعتبار نہیں تھا۔

”میں نے انہیں ایک بار باہر جاتے دیکھا تھا۔“ وہ بولا۔ ”پہلے ایک شخص نے ایک چابی لگا کے گھمائی پھر دوسرے نے۔ آخر میں نمبردن نے تیسری چابی لگائی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازہ کھولنے کے لیے تین سے نمٹنا پڑے گا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”دروازہ توڑنے کا تو سوال ہی نہیں۔“

”اگر تم نے میرا ہاتھ نہ توڑا ہوتا تو میں یہ سلاخیں توڑ دیتا۔“ وہ بولا۔

”یہ ٹوٹنے والی سلاخیں نہیں ہیں۔ تم ان کو موڑ سکتے تھے یا دیوار سے نکال سکتے تھے؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہارے ہاتھ میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟“

”ہاں، پہلے تو زیادہ درد نہیں تھا۔ اب ہو رہا ہے۔“ وہ رونی شکل بنا کے بولا۔

”اچھا فکر مت کرو۔ ابھی باہر نکلنے کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر تمہارا بازو بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس مختصر کمرے میں جو آٹھ فٹ لمبا چوڑا تھا اور کچن کے طور پر استعمال ہو رہا تھا، چند برتن تھے اور ایک مٹی کے تیل کا چولھا۔ ایک طرف زمین پر وہ بستر بچھا ہوا تھا جس پر پہاڑ خان سوتا ہوگا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس کمرے میں چوبیس گھنٹے قیدِ تنہائی کے دس دن پہاڑ خان کیسے گزارتا ہوگا وہ دن میں ایک دو بار اندر جا کے مجھے کھانا دے آتا تھا۔ کھانا تیار کرنے میں اس کا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا صرف ہو جاتا ہوگا۔ باقی تئیس گھنٹے وہ کیا کرتا ہوگا۔

”پہاڑ خان! یہاں تمہارے لیے کوئی باتھ روم تک نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی نما چیز رکھی تھی۔ ”میں یہی استعمال کرتا تھا۔ پانی کی ایک بالٹی بھری ہوئی تھی جو اب خالی ہو گئی ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے

ادھر کر دو۔“

غسل کی خواہش کرنا بھی غلط تھا مگر میں منہ پر چند چھینٹے ضرور مارنا چاہتا تھا۔ اب اس کو بھی میں نے التوا میں رکھا اور فرض کر لیا کہ میں حالتِ جنگ میں ہوں۔ دشمن کے علاقے میں، کسی مورچے پر ڈٹے ہوئے یا خندق میں بیٹھے ہوئے سپاہی کے لیے اپنی مرضی کے یا ضرورت کے مطابق کھانے پینے یا نہانے دھونے کا کیا سوال۔ وہی اس کا بیڈ روم، وہی اس کا ڈائننگ روم، وہی باتھ روم۔ اور وقت آجائے تو وہی بے نشاں مدفن۔

”کیا وہ خود تمہیں کھانے پکانے کا سامان لا کر دیتے تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ وہ جو کہتے تھے، میں ویسا ہی کرتا جاتا تھا۔“ پہاڑ خان بولا اور مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معمولی سے کام کے لیے انہوں نے دس ہزار خرچ کیے اور ایک آدمی کی زندگی خرید لی۔ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے پہاڑ خان کی مدد کے اتنے محتاج تو نہ تھے مگر بات وہی تھی کہ تقدیر دھوکا دیتی ہے تو شامت کا مارا گیدڑ شہر کا رخ کرتا ہے اور بہت سیانا مجرم ذرا سی حماقت کرتا ہے تو کامیابی کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھوں گرا دیتا ہے۔ اگرچہ ابھی میرے لیے بھی کامیابی کا دعویٰ قبل از وقت تھا مگر حالات جس حد تک پہلے میرے مخالف تھے، اب اتنے ہی موافق محسوس ہوتے تھے۔

”ہمیں یہاں سے زندہ بچ کے نکلنے کے لیے کوشش تو کرنا ہی پڑے گی پہاڑ خان۔“ میں نے کہا۔ ”اور کسی ایک کی کوشش سے کام نہیں بنے گا۔ شاید اسی لیے تمہارا اور میرا ساتھ ہو گیا۔ اب جو میں کہتا ہوں، وہ کرو۔“

”میں وہی کروں گا جو تم کہو گے۔“ پہاڑ خان نے اپنی زبان سے یہ بات دہرا کے گویا عہدِ وفاداری کیا۔

”معلوم نہیں اس وقت اندر کون کون ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ان سب سے ایک ساتھ مقابلہ کیا تو ہم مارے جائیں گے۔ تم انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ۔“

”اچھا۔ میں پہلے ایک کو بلاتا ہوں۔“ پہاڑ خان دروازے کی طرف بڑھا۔

”سنو! ایسے نہیں۔“ میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھ کے کوئی برتن زمین پر مارو جس سے شور ہو۔ مثلاً یہ بالٹی لو اور اس کو اٹھا اٹھا کے نیچے پھینکو۔ ذرا دروازے سے دور، دوسری طرف میں کھڑا ہو کے انتظار کرتا ہوں۔“

پہاڑ خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ٹین کی بالٹی کو ہینڈل سے پکڑ کر زمین پر مارنا شروع کیا۔ اس سے نہایت بے ہودہ اور کرخت آواز پیدا ہوئی اور بے اختیار میرا ذہن اس رات کی طرف چلا گیا جب ایسی ہی ایک بالٹی کو تھالے میں میرے سر پر الٹا کے بجایا گیا تھا۔ میرا منہ گردن تک بالٹی میں تھا اور بالٹی کو لوہے کی سلاخ سے کوٹنے کا اعصاب شکن شور میرے کانوں کے پردے پھاڑ تا رہا تھا اور پھر میرے دماغ میں یوں گونجنے لگا تھا کہ مجھے یہ شور اپنے وجود کو آری کی طرح ہر جگہ سے کاٹتا ہوا، کنکریٹ مکسر کی طرح گھماتا ہوا اور روڈ رولر کی طرح پیستا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اس شور نے میرے ذہن کو اس طرح مفلوج و ماؤف کیا تھا کہ میری ساری مزاحمت ختم ہو گئی تھی۔ میں وقتی طور پر دیوانہ ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلا تو میں ایک دم چونکا اور یادِ ماضی کے عذاب سے نکل کر حقیقتِ حال سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اندر آنے والے نے چیخ کر کہا اور اس کی نگاہ پہاڑ خان پر گئی۔ میں ایک دم حرکت میں آ گیا اور میں نے کھڑی ہتھیلی سے اس کے کان کے قریب وار کیا۔ میں بہت محتاط تھا اور اوچھے وار سے اس کے بچ جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ لڑکھڑا کے گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔

”شاباش۔ بالکل اسی طرح نمٹا جا سکتا ہے ان بدمعاشوں سے۔“ میں نے جوش میں ہاتھ مل کے آہستہ سے کہا اور اس اجنبی شخص کو گھسیٹ کر دروازے سے دور اپنے پیچھے والے کونے میں ڈال دیا۔

”اب تم ایک چیخ مارو گے۔“ میں نے کہا۔ ”آواز کو بدل کے۔“

”میری آواز بدل سکتی ہے؟“ حیرت سے پہاڑ خان کا منہ کھلا رہ گیا۔

”اچھا تم خاموش ہی رہو عقلمند۔“ میں نے کہا اور حلق سے ایک کربناک آواز بلند کی۔

”دیکھو۔ اب ہو سکتا ہے کہ ایک کی جگہ دو آجائیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک سے تم نمٹ لینا۔ سر پر ریوالور مارنا۔“

”کون ہے..... کیا ہو رہا ہے یہ؟“ بیک وقت دو افراد نے چلا کر کہا اور تقریباً ایک ساتھ دوڑتے ہوئے اندر آگئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھا اور اس کے ہاتھ کا ریوالور ایک دم اٹھا۔ میں ایک دم جھک گیا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزری تو میرے دونوں کان سن ہو گئے۔ میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے اسے دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ میرے ہاتھوں نے اسے پیچھے پھینک دیا۔ پھر میں بڑی پھرتی سے پلٹا اور دائیں پیر سے اس کے ہاتھ پر لگ ماری۔ وہ بلبلایا۔ ایسی شدید ضرب کے بعد اس کی کلائی کی ہڈی سلامت رہنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے اسے دوسرا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ اوپر اٹھا اور اپنے زور میں دوڑتا ہوا گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ دیوار بہت قریب ہے اور وہ خود کو روک بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس کے دہاڑنے کی آواز پہلے سنی، اس کے دیوار سے ٹکرانے کی بعد میں۔ جب وہ نیچے گر کر ساکت ہوا تو عجیب مزاحیہ انداز میں پڑا رہا۔ اس کا سر سجدے میں تھا، پچھلا دھڑ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے کانوں کو ڈھک لیا تھا۔ ایک زمانے میں سول ڈیفینس کی ٹریننگ میں مجھے بتایا گیا تھا کہ بمباری ہو رہی ہو تو میں اسی طرح کی حفاظتی تدبیر کروں اور اسی طرح زمین پر پڑا رہوں۔

دوسرے دشمن کو ٹھکانے لگاتے ہوئے میرا دھیان پہاڑ خان کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب میں نے دیکھا تو وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ میری لڑائی کو دیکھ رہا تھا۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے دوسرے آدمی کو ریوالور کا دستہ مار کے ناک آؤٹ کر دیا تھا اور وہ آدمی بالکل چت پڑا ہوا تھا۔ اگر ان دونوں کے علاوہ بھی وہاں کوئی ہوتا تو اتنی دیر میں ضرور پہنچتا۔ اب میں نے ان تینوں کی شکل کو غور سے دیکھنے کے لیے انہیں ایک قطار میں لٹا دیا۔ دو چہرے بالکل نئے تھے لیکن تیسرا وہ تھا جسے میں نے گامے ماچھی کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا۔ میں نے ان کی جیبوں کو ٹٹولا۔ ان دونوں کی جیب میں سے ایک ایک چابی برآمد ہوئی جو میرے مقابلے پر آئے تھے۔ ان میں نمبر دن یعنی استاد پیڈرو شامل نہیں تھا چنانچہ تیسری چابی مجھے نہ مل سکی۔ میں اپنے گندے کپڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ایک کی قمیص اور دوسرے کی پتلون پہنی۔ دو ریوالور پتلون کی دونوں جیبوں میں رکھے اور تیسرا ہاتھ میں رکھا۔ ان کی جیبوں میں سے مجموعی طور پر دو ہزار سات سو کی رقم برآمد ہوئی جو میں نے قمیص کی جیب میں رکھی۔ پھر میں نے پہاڑ خان کو اشارہ کیا۔

"اب یہاں سے باہر جانے میں کوئی رکاوٹ تو نظر نہیں آتی" میں نے کہا۔ "لیکن ہو سکتا ہے کہ تیسری چابی کے بغیر دروازہ نہ کھلے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی زیادہ چالاک شخص ابھی چھپا ہوا ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاؤ۔ اپنا ٹوٹا ہوا بازو سامنے رکھنا۔ ہائے مر گیا کا شور مچا دینا۔"

"وہ مجھے ماریں گے تو نہیں جی؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ وہ سمجھیں گے تم کو میں نے مارا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "کوئی ہو تو تم یہی کہنا۔ وہ باہر ضرور آئے گا۔ پھر میں اسے سنبھال لوں گا۔ باہر نہ آیا تب بھی دروازہ تو کھولے گا۔ میں اسے ہینڈز اپ کرا لوں گا۔"

پہاڑ خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے دروازہ بجاتے ہوئے "ہائے۔ ہائے مر گیا" کا شور مچایا۔

میں ابھی پہلے کمرے سے نکلا ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا اور پیڈرو باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ خود میں نشانہ لیے تیار کھڑا تھا اور میری ذرا سی احتیاط پسندی اور مستعدی پہاڑ خان کے لیے زندگی کا بہانہ بن گئی۔ جب پیڈرو نے ریوالور اٹھایا تو میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہوگا۔ پیڈرو نے پہاڑ خان کو اس کی بے وقوفی اور نااہلی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غالباً اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں قید سے نکل گیا ہوں اور شاید اس نے اپنے ساتھیوں کے واپس نہ آنے کا سبب بھی دریافت کر لیا تھا۔ مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جب میں اپنے قید خانے سے نکلا تھا تو میں نے روشنی کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پیڈرو نے دور سے اسی کھلے دروازے کو دیکھا ہوگا جو تاریکی میں روشنی کی مستطیل نظر آتا تھا اور سب سمجھ گیا ہوگا کہ خود اس سے بھی ایک غلطی سرزد ہوئی تھی جب اس نے میرے محافظوں میں پہاڑ خان جیسے بے عقل آدمی کو شامل کیا تھا۔ اس کی نظر میں سکندر بخت ایک بہت چالاک اور خطرناک شکاری تھا جسے شکار کرنے کے بعد اسیر رکھنے کے لیے حفاظتی انتظامات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ بس نادانستگی میں اس نے پہاڑ خان کا انتخاب کر لیا جو دیکھنے میں واقعی پہاڑ تھا مگر عقل کے اعتبار سے ان کے حفاظتی حصار کا سب سے کمزور حصہ تھا۔ میں اسی کمزور حصے ہی سے راستہ بنا کے نکل گیا تھا۔ پہاڑ خان کو ویسے بھی مرنا ہی تھا۔ اب اس کا بے وقوف ثابت ہونا ناقابلِ معافی جرم بن گیا۔

پیڈرو نے ریوالور اٹھایا ہی تھا کہ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا۔ اس کا ارادہ اس کی آنکھوں میں داہنے بن کے اتر آیا تھا جب آدمی کسی دوسرے آدمی کی جان بنا ہے یا میری چھٹی حس نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر استاد پیڈرو کے ریوالور اٹھاتے ہی میں نے فائر کر دیا اور جب میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک زندگی کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ ریوالور پیڈرو کے ہاتھ سے دور جا گرا اور اس کے ہاتھ کی پشت سے خون ٹپکنے لگا۔ اس نے ایک غلیظ گالی بکی اور ایک دم واپس پلٹا۔

"ٹھہر جاؤ پیڈرو" میں نے چیخ کر کہا اور گولی چلا دی مگر وہ بڑی تیزی سے پلٹ کر پھر کمرے میں گھس گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ ہاتھ کا نشانہ لینے کے بجائے میں نے اس شیطان کی کھوپڑی کیوں نہ اڑا دی۔ میں اسے زندہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اسی لاشعوری خواہش نے پیڈرو کو نکل جانے کی مہلت دے دی۔ میں سمجھتا تھا کہ پیڈرو بلا وجہ استاد نہیں کہلاتا۔ اس کے ہاتھ سے ایک ریوالور نکل گیا تھا لیکن اس بنیاد پر اسے خالی ہاتھ سمجھ لینا بے وقوفی ہوتا۔ کمرے کے اندر اس کے پاس سب کچھ ہو سکتا تھا۔ ریوالور سے مشین گن تک۔

"دروازہ توڑ دو پہاڑ خان" میں نے باہر آتے ہی چلا کے کہا۔ "میں اور تم مل کے زور لگاتے ہیں۔"

پہاڑ خان کا ایک ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا لیکن وہ حیرت انگیز جسمانی قوتِ برداشت اور طاقت کا مالک تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اپنے دوسرے بازو کے شانے سے دروازے کو ٹکر ماری۔ میں نے اس کا ساتھ دیا۔ دروازہ بڑے زور سے ہلا مگر نہ ٹوٹا اور نہ کھلا۔

"میرے ہاتھ میں مشین گن ہے سکندر بخت۔" اندر سے پیڈرو نے چلا کر کہا "میں تم کو چھلنی کر دوں گا۔"

ذرا سی دیر کے لیے میں رک گیا پھر عقل نے مجھے جھنجوڑا۔ یہ دھوکا ہے سکندر بخت۔ اگر پیڈرو کے پاس مشین گن ہوتی تو اب تک وہ ایک برسٹ مار چکا ہوتا اور مشین گن کی گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی تمہارے جسم کے بھی پرخچے اڑا چکی ہوتیں۔ وہ تمہارا لحاظ کبھی نہ کرتا۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ وہ خود محصور ہو اور اپنی زندگی کے لیے تم کو خطرہ سمجھتا ہو۔

"تم کر دو چھلنی مجھے پیڈرو" میں نے چیخ کر جواب دیا۔ "آج یا تم نہیں یا میں نہیں۔"

میں نے پھر پہاڑ خان کو اشارہ کیا اور اس نے میرے ساتھ زیادہ قوت صرف کرتے ہوئے دوسری ٹکر ماری۔ دروازہ ایک دم پورا کھل گیا۔ اس کے اوپر نیچے کی چٹخنی نکل گئی تھی۔ پہاڑ خان اندر جا گرا۔ قدرت کو اسے بچانا منظور تھا۔ پیڈرو کے ریوالور کی گولی اس کے اوپر سے نکل گئی اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ پیڈرو کو میں نے اپنے بالکل سامنے دیکھا۔ وہ دوسرا ریوالور لیے بقا کی جنگ میں اپنے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھا۔ یکلخت مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں نے پیڈرو کو پاکستان میں وارد ہونے کے بعد ائرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھا تھا وہ مجھے اپنے ساتھ سلامت علی کے گھر لے گیا تھا۔ پھر وہ اس وقت نظر آیا تھا جب میں شرافت علی کے گھر سے نکل رہا تھا۔ مجھے قتل کے پہلے جھوٹے جرم میں ملوث کرنے والا یہی شخص تھا جس نے میر شرافت علی کا خون کیا تھا اور میں یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ اسی نے سلامت علی کو بھی مارا تھا۔ بعد میں مارے جانے والے ہر بے گناہ شخص کے لہو کے داغ اس کے دامن پر صاف نظر آتے تھے۔ یہ انتقام کا اندھا جذبہ تھا یا ایک ایسے دشمن کو کم کرنے کی خواہش جو میرے محسن اور رابعہ کے تمام مصائب کا ذمے دار تھا اور جس کے لیے موت سے کم کوئی سزا کافی نہ تھی۔ کہ میں نے اندھادھند فائر کیے اور دیوانہ وار پیڈرو پر جا پڑا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے جواب میں کتنی گولیاں چلائیں۔ جب میں نے اسے زمین پر پڑا ہوا اور خود کو اس کے اوپر سوار دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ میں زندہ ہوں اور پیڈرو زخمی ہے۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے میری فائرنگ سے بچنے اور بھاگ نکلنے کی کوشش کی تھی اور اسی بدحواسی میں گولی چلائی تھی لیکن وہ نشانہ نہ لے سکا تھا۔ مجھ پر خون سوار تھا۔ میں نے پیڈرو کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

"تیرا وقت آ گیا پیڈرو۔" میں نے دہشت زدہ آواز میں کہا جو اس حد تک بدلی ہوئی تھی کہ میرے کانوں کو بھی اپنی آواز نہیں لگی۔ "میں تجھے چند سیکنڈ دوں گا کہ خدا سے ہر گناہ کی اور ہر جرم کی معافی مانگ لے۔" میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ مکے مارے۔ "بول اپنے منہ سے۔ خدا کے سامنے اقرار کر کہ تو نے میر شرافت علی کو مارا، منشی فوما بخو کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مارا، اس کی بیوی کو مارا، بیٹے کو مارا، سلامت علی کو مارا، غلام علی کو مارا،" ہر بار میں اس کی گردن کو دبا کے اس کا سر اٹھاتا تھا اور فرش پر دے مارتا تھا۔

"اس کو گولی لگ گئی ہے۔" پہاڑ خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "پھر اسے کیوں مار رہے ہو؟"

ایک دم مجھے ہوش آ گیا۔ ایک بے عقل نے مجھے عقل کی لگام ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ روکتا تو پیڈرو وہیں میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ میں نے سر سے دیوانگی کو جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔ گولی پیڈرو کی ٹانگ میں لگی تھی اور اب وہ بے ہوش پڑا تھا۔ پشیمانی کے ردِعمل نے مجھے مغلوب کر دیا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں پیڈرو کے سر میں اندرونی چوٹ ایسی نہ آئی ہو کہ وہ ہوش میں ہی نہ آئے اور مر جائے۔ پیڈرو جیسے دشمن کا ہاتھ میں آنا تو دشمن کے سب سے مضبوط قلعے کی تسخیر سے بڑا کارنامہ تھا۔ مجھے اب جوش سے نہیں، ہوش سے کام لیتے ہوئے پیڈرو کو زندہ رکھنا تھا۔ وہی ایک شخص تھا جو اوّل تا آخر ہر راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا اور وہ سب کچھ بتا سکتا تھا جو میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کی فردِ جرم بہت طویل تھی اور اگر ہم کسی طرح اس سے اعترافِ جرم کرانے میں کامیاب رہتے تو خود کو بہت سے الزامات سے بچا سکتے تھے اور قانون کے سامنے اصل مجرم کو پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ہم کس حد تک بے گناہ ہیں۔

اچانک میں نے اپنے پیچھے آہٹ سی سنی اور میں تیزی سے پلٹا۔ نیچے گرتے گرتے میں نے گولی چلائی اور وہ شخص جو ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کر خاموشی سے اندر آ گیا تھا، چکر کھا کے نیچے گرا۔ اس نے پہاڑ خان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریوالور چھیننے کی کوشش کی تھی اور کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا لیکن وہ گولی نہ چلا سکا۔ میری گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور جب اس نے گولی چلائی تھی تو خود اسے علم نہیں تھا کہ اس کا نشانہ کون بنا۔ میں یا کوئی دیوار یا چھت۔

وہ حلق سے بڑی کربناک آوازیں نکال رہا تھا اور فرش پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کی گردن سے پھوٹنے والا خون کا فوارہ دیکھ کر پہاڑ خان کا رنگ لاش سے زیادہ سفید ہو رہا تھا۔ اچانک وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس نادان لڑکے نے جسمانی طاقت کا مظاہرہ تو پہلے بھی دیکھا ہوگا اور خود بھی اس میں شریک رہا ہوگا۔ اپنے دعوے کے مطابق ایک کرنل نے اسے گولی چلانا بھی سکھایا تھا مگر کسی جیتے جاگتے آدمی کا خون بہتے اس نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہ نفسیاتی کمزوری بہت عام ہے اور بہت سے لوگ جو بہت بہادر، نڈر اور جرأت مند کہلاتے ہیں، اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہن یا جسم کا ایسا ردِعمل ہوتا ہے جسے وہ روکنا بھی چاہیں تو نہیں روک سکتے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ سرجیکل شاک بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ اسی قسم کی کیفیت تھی۔

میں نے پہاڑ خان کو وہیں چھوڑا اور پلٹ کر کمرے میں آیا تا کہ باقی دو افراد کو ہوش میں آنے سے پہلے ہی باندھ کر ڈال دوں۔ انہیں باندھنے کے لیے میں نے انہی کے کپڑے پھاڑے اور دونوں کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے۔ پیروں کو ملا کر ٹخنے کے قریب سے باندھ کر بعد میں نے ان کو یکجا کیا۔ اس طرح کہ ان کی کمر سے کمر ملی رہی لیکن منہ مخالف سمتوں میں رہے اور دونوں کا ایک بنڈل بنا دیا۔ اس میں ان کے تقریباً تمام ہی کپڑے استعمال ہو گئے جن میں میرے پرانے کپڑے بھی شامل تھے۔

اب دیر کرنا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا۔ ابھی تک مجھے دوسرے کمرے کے بارے میں غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اطمینان سے دیکھنے پر مجھے ایک ٹیبل پر تین چیزیں نمایاں نظر آئیں۔ ایک ٹی وی، دوسرا ٹیپ ریکارڈر اور تیسرا ویسا ہی واکی ٹاکی جیسا ہم نے گامے ماچھی کے اڈّے سے ملا تھا یا وہاں کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے حوالے کیا گیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دونوں سیٹ ایک ہی فریکوئنسی پر ٹیون کیے ہوئے ہوں۔ اسی چیز کو صرف باہر سے اسمگل کر کے لایا جا سکتا تھا۔ ہمارے لیے یہ انتہائی کارآمد چیز تھی۔ بظاہر یہ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر تھا جس سے طویل فاصلوں تک پیغام رسانی ممکن ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی باہمی رابطہ قائم رکھنے کی اس سے بہتر صورت کوئی نہیں ہو سکتی۔ ٹیپ ریکارڈر میں یقیناً وہ سب گفتگو محفوظ ہوگی جو ہم سے سچ پوچھنے کے نام پر کی گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ سچ دشمنوں تک پہنچ جائے چنانچہ میں نے صرف واکی ٹاکی اٹھایا اور باقی چیزوں کو چھیڑنے سے گریز کیا۔ ایک دیوار کے ساتھ اسٹول سے ذرا بڑی میز پر ایک چپٹا سا باکس رکھا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اندر اس سارے نظام کو کنٹرول کرنے والا سوئچ بورڈ دکھائی دیا۔ اس میں بٹن اور درجن کے قریب پُش بٹن، گھومنے والی ناب اور سلائیڈنگ لیور تھے۔ اسی سے وہ ..... کنٹرول ہوتی تھی

بھی بھی ان کی حیرانی تھی۔ کبھی مجھے بصارت عطا کر دیتی تھی، کبھی مجھے صرف میرا مقلد بنا دیتی تھی اور کبھی میری حالتِ زار کی تصویر اتار کے آگے ارسال کرتی تھی۔ میں نے ریوالور نکالا اور پے در پے اس پر فائر کیے۔ اس میں سے چنگاریاں اڑیں، دھواں اٹھا اور دھماکے سنائی دیے۔ میں نے وہی قرار محسوس کیا جو شاید میں پیڈرو کے سینے کو چھلنی کر کے محسوس کرتا اگر مصلحت کے تقاضوں نے مجھے روک نہ لیا ہوتا۔ انسانوں کے ساتھ یہ آلات بھی میرے دشمن تھے اور اس مشین سے میں نے تین دن کی اذیت کا بدلہ لے لیا۔ پھر میں نے دوسرا خالی ہو جانے والا ریوالور بھی پھینک دیا۔

اب مجھے کئی مسائل درپیش تھے۔ سب سے پہلے مجھے پہاڑ خان کو ہوش میں لانا تھا۔ اس کو پہاڑ خان کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اُسے نزاکت علی کہنا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات ہوتی۔ ایک جگ میں مجھے تھوڑا سا پانی ملا۔ میں نے پہاڑ خان کے منہ پر چھینٹے مارے اور ایک چمچے کی مدد سے کچھ پانی اس کے حلق میں اتارنے میں کامیاب رہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تو میں نے اس کے گال تھپکے۔ "پہاڑ خان... شاباش اُٹھو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہمت سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ اور لوگ آ جائیں۔" میں نے اُس کے کانوں میں کہا۔

"اور کون آ سکتا ہے؟" وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

"کیا معلوم اُن کے کتنے ساتھی تھے اور اس وقت وہ کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

پہاڑ خان کے اتنی جلد ہوش میں آ جانے سے مجھے خوشی ہوئی۔ اگر مجھے اس پہاڑ کو اٹھا کر لے جانا پڑتا تو یہ کام آسان نہ ہوتا۔ ابھی میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کے بازو کو ٹوٹے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور میں چاہتا تھا کہ جتنی جلد اس کے ہاتھ پر پلاستر چڑھ جائے اور اُسے درد کو کم کرنے والی دوائیں مل جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم جلد از جلد اس جگہ سے نکل جائیں۔ معلوم نہیں ہم کس بستی یا ویرانے میں تھے اور کسی سڑک سے کتنی دُور تھے۔ مجھے پیڈرو کو بھی اٹھا کے لے جانا تھا اور اپنی موجودہ حالت میں مجھے یہ بوجھ اُٹھا کے بہت زیادہ فاصلہ طے کرنا محال لگتا تھا لیکن ناممکن کو ممکن بنانا پڑتا تب بھی مجھے خدا پر بھروسا کرتے ہوئے یہ کام ضرور کرنا تھا۔

میں نے پیڈرو کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور میرے ہاتھ ہر تالے کی چابی آ گئی۔ ایک تالا جو مضبوط اور موٹے پٹوں میں نصب تھا، سب سے اوپر والے حصّے میں تھا۔ دوسرا وسط میں اور تیسرا بالکل نیچے۔ ان کے صرف سوراخ باہر نظر آتے تھے اور جس ترتیب سے تالے لگائے گئے تھے اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ دیواروں کا حصّہ بن جانے والے دروازے کو اتنی آسانی سے نہیں توڑا جا سکتا تھا جتنی آسانی سے ہم نے اندر والے دروازے کو کھول لیا تھا۔ اس کی تو ہر چٹخنی عام قسم کی تھی لیکن یہ تالے بہت مضبوط تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے تیسرے ریوالور کو بالکل تیار رکھا کہ باہر بھی کسی پہرے دار کا سامنا ہو تو اس سے نمٹا جا سکے لیکن انھیں اپنے حفاظتی انتظامات کے ہر طرح سے مکمل ہونے پر اتنا اعتماد تھا کہ باہر کسی چوکیدار کی موجودگی کی ضرورت کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

مجھے اپنے مقابل کچھ سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں شوق و اضطراب میں دوڑتا ہوا اوپر گیا۔ زینے پر آخری قدم رکھتے ہی میں نے خود کو ایک کھنڈر میں دیکھا۔ یہ کوئی پرانا مکان تھا۔ پتھروں سے بنے ہوئے بیرونی احاطے کی دیوار مجھ سے سو گز دُور تھی اور مکان یا قدیم حویلی کے چاروں طرف اس کا فاصلہ اتنا ہی تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں یہ باغ رہا ہو مگر اب ایک جنگل تھا۔ کیکر کے خودرو کانٹے دار درخت تیزی سے پھیلے تھے اور بیشتر رقبے پر قابض تھے۔ کہیں کہیں ان سے اوپر نکل جانے والے شیشم اور پیپل کے درخت بھی تھے۔ نیچے لمبی لمبی تیز دھار کے پتوں والی خشک اور زرد گھاس پھیلی ہوئی تھی جس میں سانپ، گرگٹ اور دوسرے رینگنے والے جانوروں کی بھرمار ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔

باقی مکان کی دیواریں بھی باہر سے پرانے پتھروں کو جوڑ کر اٹھائی گئی تھیں۔ مختلف کمروں کے درمیان اگر دروازے تھے تو وہ نکال کر لے گئے تھے چنانچہ سب کمرے مل کر ایک ہو گئے تھے۔ چھت صرف ایک کمرے پر باقی رہ گئی تھی مگر اس کے شہتیر اور کڑیاں بھی اتنے جھک گئے تھے کہ درمیان میں خم محسوس ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ چھت ابھی سر پر آ پڑے گی۔ باقی کمروں میں چھت کا ملبہ کمروں کی دیواروں میں ڈھیر تھا۔ پچھلی طرف جا کر دیکھنے سے مجھے باہر جانے کا راستہ نظر آیا۔ کم سے کم بیس فٹ چوڑے اور کنکروں والے راستے پر بھی جگہ جگہ گھاس اُگ آئی تھی جسے حال ہی میں گاڑیوں نے روندا تھا۔ یہ کچلی ہوئی گھاس مجروح تھی مگر پھر بھی سر اُٹھا رہی تھی۔

میں بیرونی فصیل کے گیٹ تک گیا اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ویرانی کو مایوسی سے دیکھا۔ میری نظر کسی آبادی کے آثار تلاش نہ کر سکی۔ ہر سمت ویسا ہی بیابان تھا جیسا فصیل کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے فصیل کی دیوار پر چڑھ کے دیکھا تو دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے سڑک نظر آ گئی۔ میرا حوصلہ ایکدم

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بلند ہو گیا۔ میں فوراً واپس ہوا۔
"پہاڑ خان! ہمیں دو فرلانگ تک جنگل سے گزر کے سڑک تک پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے وہاں کوئی نہ کوئی سواری ضرور ملے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم لاہور سے کتنی دُور ہیں۔"
"میں دو فرلانگ تک پیدل جا سکتا ہوں۔" اُس نے فخر سے یوں کہا جیسے یہ کام اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔
"تمھارے ہاتھ میں یقیناً بہت تکلیف ہو گی۔" میں نے کہا۔ "تم دوسرے ہاتھ میں ریوالور رکھنا۔ میں اس شخص کو اپنے کندھوں پر ڈال لیتا ہوں۔"
"دو اور بھی تو ہیں۔" اس نے مجھے یاد دلایا۔
"ان کو ساتھ نہیں لے جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف استاد پیڈرو کو اُٹھانا ہے۔"
"اس کا نام تمھیں کیسے معلوم! یہ تو نمبر وَن تھا۔" پہاڑ خان نے حیران ہو کے کہا۔
"میں جانتا ہوں ان سب بدمعاشوں کو۔" میں نے کہا۔ "جو بات میں سمجھانا چاہتا ہوں، وہ کچھ اور ہے۔ دو فرلانگ کا راستہ بہت لمبا ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ ہم باری باری اسے اٹھائیں گے۔ اس کا وزن بہت زیادہ ہے۔"
"تم فکر مت کرو۔ اس کو اُٹھا کے میرے کندھے پر ڈال دو۔" پہاڑ خان نے کہا۔ "اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اگر میرا ایک بازو ٹوٹا ہوا نہ ہوتا تو میں ایسے ایسے دو کو اُٹھا کے دو میل بھی جا سکتا تھا۔"
"تم واقعی پہاڑ سے زیادہ مضبوط ہو۔" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "مگر یہ نام پہاڑ خان کچھ اچھا نہیں لگتا۔"
"تو تم مجھے نزاکت علی کہہ سکتے ہو۔" وہ بولا۔
"میں تمھیں فولاد خان کہوں گا۔ تم فولادی آدمی ہو۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اُٹھا لیا۔
"ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا تاکہ مجھے پیڈرو کو زیادہ اوپر نہ اٹھانا پڑے۔
"میں... تم سمجھ لو کہ میں بھی نمبر وَن ہوں۔" میں نے کہا اور پیڈرو کو اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ "نمبر وَن لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نمبر وَن بدمعاش اور نمبر وَن شریف۔ نمبر وَن چالاک اور نمبر وَن احمق۔"
وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہا اور پھر آسانی سے کھڑا ہو گیا۔ "تمھارا نام کوئی نہیں؟"
میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اُسے بتا دیا کہ میرا نام سکندر ہے۔ اس جیسے نادان سے کچھ چھپانے میں نہ کوئی نقصان تھا نہ اس سے کوئی فائدہ تھا لیکن اس سے آئندہ کبھی نقصان ہو سکتا تھا۔ صرف اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنا نام بتا دیا تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے فولاد خان کو ساتھ رکھنے کے سوا چارہ نظر نہ آتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے الگ ہو کے کہیں جانا پسند بھی نہیں کرے گا۔ جب تک میری نگرانی کے باعث اس کا ٹوٹا ہوا بازو ٹھیک نہیں ہو گا اسے تیمارداری کی ضرورت ہو گی اور اس وقت تک وہ سب سے مانوس ہو جائے گا۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے سگے ماں اور چچا کے گھر میں جگہ نہ ہو کسی بھی ایسے گھر میں رہنے کو ترجیح دے گا جہاں کوئی اس سے نفرت نہ کرتا ہو۔ زمانے بھر کے دھتکارے ٹھکرائے اور ترسائے ہوئے ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ ایک چھپر کے نیچے جمع ہو رہے تھے۔ یہ کسی اینٹ، چونے کی دیوار پر پڑا ہوا چھپر نہیں تھا۔ کسی گھر کی چھت کا سایہ نہیں تھا جسے ہم میں سے کوئی اپنا کہہ سکتا۔ یہ تو رفاقت اور عہدِ وفا، خلوص اور اپنائیت کے احساس، محبت اور اعتماد کا وہ چھپر تھا جو سب کو تحفظ فراہم کر سکتا تھا اور سب کے کام آتا تھا۔ اس چھپر کا نام ہم نے شرارت میں ایم آر ایس رکھ دیا تھا۔
میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں واکی ٹاکی۔ میں نے جنگل میں سے گزرنے والا راستہ دیکھ لیا تھا مگر اس سے ہٹ کر چلنا پسند کیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک سامنے سے کوئی گاڑی نمودار نہ ہو جائے۔ پیڈرو کو وہاں کا نگران اعلیٰ بنا کے جانے والے کسی بھی لمحے آ سکتے تھے۔ انھوں نے تفتیش کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں واقعی کسی کے خیال کا بھی گزر نہ تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ تفتیش خاطر خواہ ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے سچ اگلوانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے تشدد کا حربہ آزمانے سے گریز کیا تھا اور زیادہ سائنٹفک بنیادوں پر کام کرتے ہوئے ایسی دوائیں استعمال کی تھیں جو واقعی ذہن کو مفلوج کر کے لاشعور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک دوا 'اسکوپولیمائن' تھی مگر یہ پرانا زمانہ تھا۔ شاید اب زیادہ مؤثر اور سریع الاثر دوائیں ایجاد ہو چکی ہوں۔ میڈیکو لیگل کیس میں اس قسم کی تفتیش ضروری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی شخص پہلے بقائمی ہوش و حواس قتل کرے اور پھر پھانسی سے بچنے کے لیے پاگل بن جائے اور ثابت کرنا چاہے کہ اس کا یہ فعل ہوش سے بیگانگی کا نتیجہ تھا چنانچہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ ان دواؤں کے زیر اثر جھوٹ بول ہی نہیں سکتے چنانچہ اسے 'ٹرتھ سیرم' یا سچائی کی دوا کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ شکاری مجھے کوئی ایسی ہی دوا دے چکے تھے جس کے بعد میں

اُدھر پہلے سے موجود تھی۔ وہ کیسے فرض کر سکتے تھے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس تفتیش کے نتائج ان کے نقطۂ نظر سے بہت اطمینان بخش تھے۔ اب وہ مطمئن ہو کر بیٹھ سکتے تھے کہ اتفاقات اور غلط سوچ کے علاوہ ان کی کوشش سے ہم غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ میں ہم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کریں گے کیونکہ ہم تو ہیروئن کے دھندے کو ختم کرنے کے چکر میں پڑ چکے ہیں۔ آئندہ بھی ہمیں گمراہ رکھنے کے لیے وہ مزید ثبوت فراہم کریں گے کہ وہ واقعی ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔
سڑک کوئی قومی شاہراہ نہیں تھی بلکہ کسی گاؤں، قصبے کو جانے والی ذیلی سڑک تھی۔ میں نے فولاد خان یعنی سابقہ پہاڑ خان سے ایک پلیا کے نیچے انتظار کرنے کو کہا۔ صرف دو فرلانگ چلنے سے میرا سانس پھول رہا تھا اور میں کمزوری محسوس کرنے لگا تھا لیکن فولاد خان پر تھکن کا بالکل اثر نہ تھا حالانکہ وہ پیڈرو کا وزن بھی اُٹھا کے لایا تھا۔
"تم اس پر نگاہ رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اس کو اُٹھنے مت دینا۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"
"اگر یہ ہوش میں آ جائے تو کیا کروں؟" فولاد خان نے سر ہلایا۔
"اس کو پھر بے ہوش کر دینا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے آس پاس اتنے پتھر پڑے ہیں۔"
"پتھر... پتھر مارنے سے اس کا سر پھٹ جائے گا۔" وہ بولا۔
"اچھا، یہ لو ریوالور..." میں نے کہا۔ "اس کو ہلنے مت دینا اگر یہ ہوش میں آ جائے۔"
وہ کسی چھوٹے سے برساتی نالے کا پُل تھا جو اس وقت خشک پڑا تھا۔ سڑک اس کے اوپر سے گزر رہی تھی اور اینٹوں سے بنے ہوئے واحد محرابی دروازے کے سائے میں چھ فٹ بلند اور چھ فٹ چوڑی جگہ بہت محفوظ تھی۔ میں باہر نکلا اور برگد کے ایک درخت کے بہت چوڑے تنے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے میں دونوں جانب سڑک کو دُور تک دیکھ سکتا تھا مگر سڑک پر سے گزرنے والے کسی شخص کی نگاہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ درخت کے آگے پیچھے وہ جال سا تھا جسے برگد کی داڑھی کہا جاتا ہے اور اس کے ریشے زمین میں جڑوں کی طرح پیوست ہو کر چھوٹے موٹے درختوں کا تنا نظر آتے تھے۔ طویل اور پُرعذاب انتظار کی قید سے رہائی کے بعد اب پھر انتظار تھا کہ سڑک پر کوئی سواری نظر آئے تو ہم منزل کا نشان پوچھیں اور آگے روانہ ہوں۔ منزل کے تصور کے ساتھ ہی رابعہ کا خیال اندھیری رات کے مسافر کے لیے چاند کی طرح ابھرتا تھا اور میری بے قراری میں اضافہ کرتا تھا۔ ابھی تک میں خود آزاد نہیں تھا تو میں نے خیال کو بھی پابند کر رکھا تھا مگر اب دلِ ناصبور کے لیے ساعتِ دیدار کی خواہش ایک تڑپ بنتی جا رہی تھی۔ میں اس کے جمالِ لب و رخسار اور اس راحتِ قلب و جاں کی محبت کے خیال کے طلسم میں گرفتار، ہر دھڑکن کو شمار کر رہا تھا جو عالمِ فراق میں گزرتے ہوئے وقت کی خبر دیتی تھی اور اس وقت جب میں اسے رگِ جاں سے بھی قریب تر دیکھتا تھا، وہ نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے بارے میں آخری خبر یہ تھی کہ اسے شکاری اغوا کر کے ڈھونگا پتن نام کے کسی گاؤں کی طرف لے گئے تھے اور عین اس وقت جب ہم ڈھونگا پتن کے قریب تھے شکاری اپنی دوسری چال میں کامیاب رہے تھے اور مجھے بہت دُور کسی نامعلوم مقام پر لے گئے تھے۔ محسن اور نیک محمد کامیاب لوٹے ہوں یا ناکام، مجھے غائب پا کے بہت پریشان ہوئے ہوں گے۔ کیا معلوم وہ رابعہ اور نازو کی تلاش میں جانے والے خود بھی گرفتار ہو گئے ہوں اور اب آس لگائے بیٹھے ہوں کہ میں ان کی رہائی کے لیے کچھ کروں گا کیونکہ میں آزاد ہوں۔
یہ تقدیر کی عجب ستم ظریفی ہو گی کہ وہ مجھے آزاد فرض کیے اور مجھے خدائی مدد کا وسیلہ سمجھے امید اور عذاب کی گھڑیاں کاٹ رہے ہوں ـــ جبکہ میں ایسی جگہ قید تھا جہاں سے میرا زندہ بچ کے نکل آنا ہی تائیدِ ایزدی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ میری پوزیشن مختلف تھی۔ میرے بارے میں ان کو علم نہیں تھا کہ دشمن مجھے کس طرف لے گئے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے ان میں سے کسی کے آنے اور مجھے رہائی دلانے کی امید بالکل نہیں تھی اور یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں میں قید تھا لیکن ان کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ ڈھونگا پتن کی سمت گئے ہوں گے۔ واپسی پر ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ ملا تو میری تلاش کا آغاز ڈھونگا پتن سے ہی ہو گا۔ جو واقعات گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ پر پیش آئے تھے ان کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ نازو اور رابعہ کو وہیں سے لے جایا گیا تھا پھر محسن اور نیک محمد میرے ساتھ ان کو تلاش کرنے نکلے تھے تو ان کا اتنا سراغ پایا تھا کہ دو افراد جن میں سے ایک لمبا اور دوسرا چھوٹا تھا انھیں ایک ایسی پرانے ماڈل کی شیورلیٹ میں ڈال کے لے گئے ہیں جس کی ایک ٹیل لائٹ نہیں ہے اور پچھلا نمبر غائب ہے۔ اس کے بعد کوئی ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا اور ٹھیک وقت پر شکاری آ پہنچے تھے۔
اس سوٹ والے نے جو کار میں گزرا تھا اور جس نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہمیں بتایا تھا کہ ڈونگا پتن قریب ہی ہے صرف ہمیں اسی جگہ روکنے کے لیے غلط بیانی کی تھی اور آگے جاکر اپنے ساتھی استاد پیڈرو کو بلا لایا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شکاری صرف مجھے پکڑنا چاہتے تھے؟ نہیں۔ اگر میں ان کو وہاں نہ ملتا تو وہ مجھے ڈونگا پتن میں آ کے پکڑ لیتے انھوں نے محسن اور نیک محمد کو بھی پکڑ لیا ہوگا جو ٹیکسی کو اسی جگہ چھوڑنے کے بعد زیادہ دور نہیں جا سکے ہوں گے۔ ممکن ہے ڈونگا پتن پہ سچ مچ وہاں سے قریب ہو جہاں انھوں نے رابعہ اور نازو کو رکھا ہوا اور بعد میں نیک محمد اور محسن کو بھی انھی کے ساتھ قید کر دیا ہو جو شامتِ اعمال کے باعث خود چل کے اپنے زنداں تک جا پہنچے تھے۔

لیکن انھوں نے سب کو گرفتار کیا ہوتا تو وہ سب کو ایک ہی جگہ رکھتے۔ میں نے خالی سڑک پر ادھر اُدھر نگاہ ڈال کے سوچا۔ جو "سچ" انھوں نے مجھ سے اگلوایا وہی "سچ" دوسروں سے بھی پوچھتے۔ اس کالے قید خانے میں تو سب کے لیے جگہ تھی اور وہاں سے کسی کا نکلنا ناممکن تھا۔ قدرت کی بات الگ ہے جس نے فولاد خان جیسے شخص کو مدد کے لیے بھیج دیا تھا حالانکہ اس کے پہاڑ جیسے وجود کی سب سے اوپر والی منزل تقریباً خالی تھی۔ شاید شکاری اس بار زیادہ محتاط تھے۔ انھوں نے سب کو الگ الگ رکھا ہوگا اور سب سے اپنے طور پر "سچ" اگلوانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے، کون اس آزمائش اور عذاب کو جھیل کر وفا کے امتحان میں سرخرو ہوا اور کس نے ہمت ہار دی؟ جھوٹ بالآخر جھوٹ ثابت ہوگا یا میرا سچ ہی سب کا سچ بن جائے گا" اس کا علم مجھے سب سے ملے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

تشدد کے حربے کا مقابلہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی کیونکہ سب کی قوتِ برداشت ایک جیسی نہیں ہوتی اور سارے حربے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر انھوں نے محسن اور نیک محمد کو تشدد کا نشانہ بنایا ہوگا تو کچھ اور طریقے اختیار کیے ہوں گے اور نازو یا رابعہ سے کچھ پوچھنا چاہا ہوگا تو دوسرے طریقے آزمائے ہوں گے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو سائنٹیفک طریقۂ کار مجھ پر آزمایا گیا تھا وہی انھوں نے باقی سب پر آزمایا ہوگا تو سب نے واقعی سچ بتا دیا ہوگا۔ میں تو اس لیے بچ گیا تھا کہ میں ایک بات کو سمجھ گیا تھا اور قدرت نے مجھے اس ذہن کو متاثر کرنے والی دوا سے بچنے کا ایک موقع عطا کر دیا تھا۔ ضروری نہیں کہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ ان دواؤں کے زیرِ اثر مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی چاہے بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر انھوں نے الگ

الگ حاصل ہونے والے بیانات کا مقابلہ کیا تو ان کو سارا معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹ صرف میں نے بولا تھا اور وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم حقیقت سے باخبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ منشیات کا نہیں اسلحے کی اسمگلنگ اور ناجائز خرید و فروخت، تقسیم اور ترسیل کا کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ پیڈرو کو میری حفاظت کے لیے چھوڑ کر کسی جگہ اکٹھے ہوئے ہوں اور ہم سب کے بیان سے اصل سچ اخذ کرنے کے بعد یہ طے کرنا چاہتے ہوں کہ ایسی صورت میں ہمارا انجام کیا ہونا چاہیے۔

اگر انھیں واقعی علم ہو گیا کہ ہم سب جانتے ہیں تو وہ ہمیں زندہ چھوڑنے کا خطرہ کیوں مول لیں گے۔ اس کے بعد ان کے لیے تشویش کی صرف ایک بات رہ جائے گی کہ ہم نے اور کس کس کو شریکِ راز کیا ہے؟ کون کون جانتا ہے کہ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا اصل دھندا کیا ہے؟ پھر وہ اپنے اڈے بدلیں گے اور ایجنٹ بدلیں گے۔ نیچے سے اوپر تک سب کو خبردار کریں گے کہ محتاط ہو جائیں کیونکہ راز فاش ہو چکا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ بڑی مایوس کن اور حوصلہ شکن بات ہوگی۔ ہمارا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا اور "ایم آر ایس" جس کا مشن ملک و قوم کے غداروں کو چن چن کر ٹھکانے لگانا تھا ناکام ہو جائے گی۔ پھر چوہدری دلاور کے خلاف میری جنگ صرف ذاتی انتقام کی جنگ رہ جائے گی اور یہ جدوجہد صرف حقِ وراثت کی جدوجہد بن جائے گی جس میں اب تک بہت سے بے گناہ اپنی اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہیں۔

انتظار میرے لیے اتنا ہی صبر آزما ثابت ہو رہا تھا جتنی پریشان خیالات کی یلغار میرے حوصلوں کو پست کرنے لگی تھی کہ اچانک میں نے ایک چیخ سنی۔ یہ نیم مردانہ نیم زنانہ چیخ فولاد خان کی تھی۔ میں ایک دم بھاگا لیکن پھر بھی مجھے دیر ہو گئی۔ غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ اس جگہ سے کچھ دور آ گیا تھا جہاں میں نے بے ہوش پیڈرو کو بیوقوف فولاد خان کی تحویل میں چھوڑا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ ریوالور ہوگا تو پیڈرو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں نے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ آدمی کی اصل طاقت تو اس کی عقل ہوتی ہے۔ اسلحہ بھی عقل کے بغیر استعمال کیا جائے تو فائدے کی جگہ نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔ میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ پھر مجھے پیڈرو ہاتھ میں ریوالور لیے نظر آیا۔ اگر میں فوراً درخت کے تنے کے پیچھے نہ چھپ جاتا تو پیڈرو کی نگاہیں یقیناً مجھے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتیں۔

وہ کچھ دیر مجھے تلاش کرتا رہا اور ایک بار اس درخت کی سمت بھی آیا جس کے پیچھے میں دبکا ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ریوالور کتنی بڑی طاقت ہے اور مسلح آدمی کے مقابل تہی دست آدمی کتنا بے بس ہوتا ہے۔ اس وقت پیڈرو میری جھلک دیکھ لیتا یا میری آہٹ بھی پا لیتا تو مجھے شوٹ کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔ وہ سخت مشتعل تھا اور ناکامی کے ردِعمل نے اسے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں اسے قتل کرنے والا تھا کہ ایک کم عقل شخص نے مجھے روک کر اس کی زندگی بچالی تھی اور پیڈرو نے اس احسان کا بدلہ یوں چکایا تھا کہ سب سے پہلے اپنے اسی محسن کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی شکست کا بدلہ مجھ سے لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ دلاور کی موجودگی میں ایسے متعدد مواقع آئے تھے جب وہ مجھے قتل کر سکتا تھا مگر دلاور نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے قتل کرنے سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اصل شکاری صرف دلاور تھا جو پُرسکون رہتے ہوئے عقل اور ذہانت سے چال چلتا تھا اور جال بچھاتا تھا لیکن اس وقت یہاں صرف پیڈرو تھا جس کو گولی چلانے سے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے ایک تو یہ صدمہ تھا کہ اب دلاور کے سامنے وہ میرے فرار ہو جانے کے الزام کو قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ بے شک وہ اسے مطلع کرے گا کہ پہاڑ خان کو جس کی کوتاہی سے سکندر فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا وہ سزا دی جا چکی ہے جس کا وہ مستحق تھا اور جو اس کا مقدر تھی مگر میرے ہاتھوں اس کی جو درگت بنی تھی اور پھر جس طرح میں اس کو اٹھا لایا تھا، اس پر پیڈرو کا احساسِ ذلت میں مبتلا ہونا اور مجھے بھی قتل کرنے کے جنون کا شکار ہونا فطری ردِعمل تھا۔

اگر وہ میرے اتنے قریب آ جاتا کہ میں ایک جست لگا کر اس پر جا پڑتا تو اپنے خالی ہاتھوں سے بھی میں اس کا کام تمام کر دیتا لیکن درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔ وہ پلٹ کر میرے حرکت میں آنے سے پہلے فائر کر سکتا تھا اور یہاں اس کا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اسے انتقام کی خواہش نے پاگل کر رکھا تھا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو اتنی بے خوفی سے میری نظروں کے سامنے نہ پھرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہوتا۔ ایسی صورت میں وہ کتے کی موت مارا جاتا۔ میں اطمینان سے اس کا نشانہ لے کر اس کی کھوپڑی اڑا دیتا اور پھر اس کی لاش کو حشرات الارض، جنگلی جانوروں اور گدھوں کا لقمہ بننے کے لیے چھوڑ جاتا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی۔

مجھے اس وقت خیال آیا کہ کس طرح جلد بازی میں اور جذباتی ہو کے میں نے دو ریوالور خالی کر ڈالے تھے اور پھینک دیے تھے۔ اس شیطانی نظام کو ناکارہ بنانے کے لیے تو ایک گولی بھی کافی تھی۔ میں اُسے زمین پر مار کے بھی چور چور کر سکتا تھا لیکن میں نے اس پر فائر کھول دیا تھا۔ وہ میرا انتقامی ردِعمل تھا جس کا خمیازہ میں اب بھگت رہا تھا کہ شکار میرے نشانے پر تھا مگر میں خالی ہاتھ ہونے کے سبب اپنی جان بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا حالانکہ اس وقت نزاکت علی عرف پہاڑ خان عرف فولاد خان کی موت کے صدمے نے میرے ذہن کو شدید صدمہ پہنچایا تھا اور میں اس شخص کی بے بسی کی موت کا انتقام بھی لینا چاہتا تھا جو اپنا بُرا بھلا تک نہیں سمجھتا تھا۔ جو نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن۔ فقط ایک تماشا تھا دستِ قدرت کی صنعت گری کا۔ ایک دیوزاد جس کا دماغ بچے جتنا تھا۔ اس کو مکر و فریب کی دنیا میں اسی طرح دوسروں کے مذموم مقاصد کے لیے استعمال ہو کے ایسے ہی مرنا تھا کہ نہ کوئی اُسے رونے والا ہو نہ اس کی کمی کو محسوس کرنے والا۔ اب اس کے لالچی اور کمینے چچا کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی۔ اس کا احمق بھتیجا جو اس کا خون تھا اپنا حق مانگنے کی بات کرنے کے لیے بھی نہیں آئے گا۔

بالآخر پیڈرو نے میری تلاش ترک کر دی۔ مجھے اس کو جاتے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ یہ جنگل نہ ہوتا تو میں اس کا تعاقب کرتا لیکن یہاں پیچھا کرنا ناممکن تھا۔ خشک پتے اور سوکھی ٹہنیاں میرے قدموں کے نیچے چلانے لگتے اور اُسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ میرے آس پاس صرف پتھر پڑے تھے اور میں چاہتا تھا کہ پتھر مار کے اس کا سر پھاڑ دوں مگر مجھے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں تھا اور نشانہ خطا ہو جانے کے تمام نقصانات میرے ذہن میں تھے۔ پیڈرو اسی راستے پر چلا گیا، جدھر سے کچھ دیر پہلے ہم آئے تھے۔ جب مجھے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور اس چھوٹے سے پل کے نیچے گیا جہاں میں نے پیڈرو کی زندگی پر فولاد خان کو اختیار دیا تھا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ میں بھول گیا تھا کہ زندگی اور موت پر اختیار صرف کسی کے ہاتھ میں ریوالور تھما دینے سے نہیں مل جاتا۔ یہ تو کاتبِ تقدیر کا وہ فیصلہ ہے جو کسی بھی فانی انسان کی مرضی کی بات ہی نہیں۔ دنیا سے اسے ہی جانا پڑتا ہے جس کے لیے قدرت کی عطا کردہ فرصتِ عمر تمام ہو جاتی ہے۔

فولاد خان اپنے ہی خون میں غلطاں فرشِ خاک پر چت پڑا تھا اور برساتی نالے کی سوکھی مٹی اب تک اس کے رسنے والے لہو کو پی رہی تھی۔ یہ خون اس کے دل اور سینے کے سوراخ میں سے ہو کر باہر آ رہا تھا۔ فولاد خان مر چکا تھا اور اس کی کھلی آنکھیں تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہی تھیں۔ پہلے اُسے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دس ہزار دے کر ایک شکاری نے اسیر کیا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور دے کر کہا کہ دیکھو یہ خطرناک مجرم بھاگنے لگے تو اسے گولی مار دینا پھر اسی خطرناک مجرم نے کہا کہ میں تو شریف آدمی ہوں اور خطرناک مجرم یہ ہے اور اس دوسرے شکاری نے بھی اس کو ریوالور تھما کے وہی بات کہی۔ وہ کس کی مانتا اور کس کی نہ مانتا۔ اس کی محدود عقل تجزیہ اور فیصلہ کرنے سے قاصر رہی اور انجام یہ ہوا کہ خود اسے مرنا پڑا۔ اس کے قریب بیٹھ کر میں نے بڑے دکھ سے اس وقت کو یاد کیا جب میں نے سوچا تھا کہ پہاڑ خان اب فولاد خان بن کے "ایم آر ایس" کا رکن ہو جائے گا جہاں اسے وہ سب ملے گا جو دنیا نے نہیں دیا۔ پیار، محبت، خلوص اور اعتماد، عزت نفس اور حوصلہ۔ ہم اسے بھی اس کا حق دلوائیں گے اور وہ ہم سب کا ہو کر ہمارے درمیان رہے گا۔ میں نے تو اس سے جینے کا حق بھی چھین لیا تھا۔

مجھے معاف کرنا میرے معصوم دوست! میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا اور خدا میری نیّت کا گواہ ہے پھر بھی میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا کہ اصل کوتاہی مجھ سے ہوئی تھی۔ مجھے تمہارے ہاتھ میں وہ قاتل کھلونا پکڑانا ہی نہیں چاہیے تھا جو تمہارے قاتل کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پیڈرو مکر کیے پڑا رہا ہوگا اور موقع پاتے ہی ایک جست میں اس نے ریوالور پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ ان سب باتوں کو میں نے پہلے سے ذہن میں رکھا ہوتا تو میں یہ غلطی نہ کرتا لیکن خود میرا ذہن گزشتہ تین دن کی اذیت برداشت کرنے کے بعد سو فیصد فعال اور مستعد نہیں ہوا تھا۔ یہ بھول مجھ سے زیادہ میرے نادان نجات دہندہ کو مہنگی پڑی۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کی تدفین کا انتظام بھی کر سکتا چنانچہ میں نے خدا سے ہاتھ اٹھا کے دعا مانگی کہ اس بدبخت کی مغفرت فرما جس نے سکندر بخت کے لیے حقِ دوستی ادا کر دیا تھا۔

میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ پیڈرو کو دو فرلانگ جانا تھا۔ وہاں اس کے دو ساتھی بندھے پڑے تھے اور اتنی دیر میں ان کا ہوش میں آ جانا بھی یقینی تھا۔ وہ تینوں واپس لوٹے تو پھر مجھے تلاش کریں گے۔ میں ایک سے تو بچ گیا تھا، تین سے کیسے بچوں گا۔ یہی سوچ کر میں پھر سڑک تک گیا اور اندازے سے سمت کا تعین کر کے چلنے لگا۔ دھوپ میں اب تیزی آنے لگی تھی میرے جسم کے لیے اس سڑک پر پیدل سفر کرنا مشکل ہونے لگا اور ایک میل بعد میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ابھی تک مجھے آبادی کے آثار کہیں نظر نہ آئے تھے جو بہت عجیب بات تھی۔ آخر وہ سڑک کس لیے بنائی گئی

تھی۔ ایک سڑک تو متعدد گاؤں اور بستیوں کو ملاتی ہے پھر آمد و رفت کیوں نہیں؟ کوئی تانگا یا ریڑھا بیل گاڑی ابھی تک میرے قریب سے نہیں گزرے تھے اور مجھے جانب صرف جنگل نظر آ رہا تھا۔ اگر کھیت ہوتے تو شاید میں کام کرنے والے کسی نہ کسی آبادی کا پتا ضرور بتا دیتے۔

تین دن.... ایک سیاہ خانے میں تین برسوں کی تنہائی اور سخت ترین اذیت کی سزا کے برابر تھے۔ چنانچہ صحیح خوراک کی اور آرام کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی نہ جانے کب سے میں نے ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ کافی اور چائے تک نہیں پی تھی۔ اس وقت ایک وحشت کی ویرانی میں گزرا ہوا وقت یاد آیا۔ وہ وقت جو کسی اور کی زندگی کا خواب تھا۔ جو ولایت میں شہزادگی کے شب و روز میں بسر ہوا اور عیش کوشی کا وہ زمانہ جو میں نے اور محسن نے حسیناؤں کے دلوں پر قسم کے جھنڈے گاڑتے گزارا۔ وقت جو اس کے بعد رابعہ کے حسن و لآرام کے لطف و عنایات کا صلہ ہوا۔ رفاقتوں کے رنگ سے مہکتا گزرا اور دوستوں کے خلوص کا بن کے ملا۔ ایسے وقت میں جب میں سب سے جدا اپنی تنہائی خوف اور مایوسیوں کے حوصلہ شکن آسیب میں گھرا ہوا تھا وہ دوستی اور محبتوں سے معمور دن بہت یاد آئے۔ ان سب سہاروں کی ضرورت آج بھی تھی۔

اچانک میرے کانوں نے قریب آتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز سنی۔ اس راستے پر ابھی تک مجھے ایک آدمی بھی گزرتا نظر نہیں آیا تھا۔ ادھر کسی گاڑی کا آنا چہ معنی دارد یہ تشک پر سوال بالکل منطقی تھا چنانچہ میں تھوڑا سا کھسک کر ایک درخت اور اس کے دامن میں اگی ہوئی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا اس سناٹے میں انجن کی آواز کو میرے کانوں نے اس وقت سن لیا تھا جب گاڑی ایک فرلانگ سے بھی زیادہ فاصلے پر تھی۔ چند منٹ بعد ایک جیپ دھول اڑاتی میرے سامنے سے گزری اور مجھے شک گزرا کہ میں نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر چوہدری دلاور کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ خاکی سفاری سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر گرد سے بچنے کے لیے فیلٹ ہیٹ رکھ لیا تھا جس سے اس کا پورا چہرہ میری نظر نہیں آیا۔ میں نے اس کا سائڈ پوز دیکھا اور وہ بھی گزرتی گاڑی کے کھلے دروازے میں۔ جیپ کے آگے والے دروازے تھے ہی نہیں کیونکہ وہ ۱۹۵۲ء کی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا جھاڑی کے پتّوں کے خلاء سے تھا اس کے باوجود میرا شبہ

دلاور کی تھی۔ یہ شک اس لیے بھی بے سبب نہیں لگتا تھا کہ جیپ کا رخ اسی قید خانے کی طرف تھا جہاں سے میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا تھا اور جہاں اب اپنی نااہلی کا اعتراف کرنے اور اس جرم کی سزا پانے کے لیے پیڈرو اپنے دو نائبین کے ساتھ موجود تھا۔

میں پھر اٹھا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ پتلی سی نیم پختہ سڑک ایک نسبتاً بڑی سڑک سے جا ملی اور میں نے سڑک پر دونوں طرف سے تانگے آتے دیکھے۔ میں رک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ میری پھولی ہوئی سانس قابو میں آ جائے۔ دونوں تانگے بھرے ہوئے تھے اور میرے سامنے سے گزر گئے۔ کسی نے مجھے وہاں تنہا کھڑا دیکھ کر حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ پھر ایک سائیکل والا نوجوان نمودار ہوا اسے میں نے اشارہ کر کے روک لیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے جوان؟" میں نے نرمی اور شفقت سے پوچھا۔

"یہ سڑک ہے جنابِ عالی۔" نوجوان میرے سوال پر دم بخود رہ گیا۔

"سڑک تو ہے... لیکن یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ "ادھر پیچھے شیخوپورہ جانے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ آگے لاہور والی بڑی روڈ ہے۔"

"ادھر ادھر کوئی گاؤں ہے؟" میں نے کہا۔ "کوئی آبادی ہے؟"

"ہے جنابِ عالی۔ آپ ادھر چلے جاؤ۔" اس نے میرے دائیں ہاتھ کی طرف پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ "ایک چک آئے گا۔ یا دوسری طرف جانا ہو تو موضع کرماں والی ہے۔ مگر آپ نے جانا کدھر ہے۔"

"میں شکار کے لیے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "راستہ بھول گیا۔ اب بھوکا پیاسا بھٹک رہا ہوں رات سے۔"

نوجوان کی صورت پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ "آؤ جی، بسم اللہ... میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں۔ کرماں والی تک ایک میل ہے۔" اس نے مجھے بڑے خلوص کے ساتھ سائیکل پر تشریف رکھنے کی دعوت دی۔ میں دونوں پیر بائیں جانب لٹکا کے اور ہینڈل تھام کے بیٹھ گیا اور نوجوان نے بڑی پھرتی سے سائیکل کو پیڈل مارنے شروع کیے تو میں نے سکون، فراغت اور تحفظ کے احساس کی وہ آسودگی محسوس کی جو میرے لیے ایک نیا مسرت بخش تجربہ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے

آدم خور قبائل کے چنگل سے نکل بھاگنے کے بعد مہذب دنیا کی طرف لے جانے والی پہلی فلائٹ پر سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ میرے تھکے ہوئے جسم کو جتنا آرام اس سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ کر ملا اتنی ہی تسکین میرے ذہن کو ملی۔

"یہ کرماں والی بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے نوجوان سے کہا۔

"وہ ایک بڑی کرماں والی تھی جنابِ عالی۔ سائیں پاپڑ والے کی مہربانی سے ملنگ ہو گئی۔" وہ بولا۔

"سائیں پاپڑ والے؟" میں نے کہا۔

نوجوان نے میری حیرت پر تاسف سے سر ہلایا۔ "ہاں۔ وہ صرف پاپڑ کھاتے تھے۔ نذر لانے والے بھی صرف پاپڑ لاتے تھے۔ غریب تو وہی دال کے پاپڑ لاتے تھے لیکن کبھی کسی کے من کی مراد پوری ہو جاتی تھی تو وہ چاندی یا سونے کے پاپڑ بھی خوشی سے نذر کرتا تھا۔"

"سونے چاندی کے پاپڑ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "لوہے کے چنے چبانے کا محاورہ تو سنا تھا۔ سونے چاندی کے پاپڑ کھانے کا آج پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"لو جی۔ سائیں وہ پاپڑ کھاتے نہیں تھے۔ وہ تو انھیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔" وہ بولا۔ "کہتے تھے یہ ہوس اور لالچ کا زہر ہے۔ اسے مٹی میں گاڑ دو... فنا کر دو۔ ان کی خوراک صرف دال کے پاپڑ تھے، جو بچتے تھے وہ تبرک کے طور پر بانٹ دیتے تھے۔"

"اچھا؟ اور کیا واقعی وہ سونے چاندی کے پاپڑ گاڑ دیے جاتے تھے؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں جی۔ ان کے حکم سے کوئی انکار کر سکتا تھا۔ وہ تو بس نذر قبول ہو جاتی تھی۔" نوجوان بولا۔ "اس کے بعد وہ مٹی میں مل کر مٹی۔ سب کو ایک دن مٹی ہو جانا ہے۔ پھر یہ سونا چاندی کیا ہے۔"

نوجوان کے فلسفے نے مجھے سائیں پاپڑ والا کی عیاری اور ذہانت کے عقیدت مندوں کی سادہ لوحی کا قائل کر لیا۔ سونے چاندی کے پاپڑ لانے والے حرص و طمع سے بے نیاز پیر سائیں کی شانِ قلندری سے بے حد متاثر ہوتے ہوں گے اور اتنا ہی کافی سمجھتے ہوں گے کہ ان کے نذرانے کو سائیں پاپڑ والے نے مسترد نہیں کیا۔ پھر وہ پیر کے ڈیرے کے آس پاس کہیں بھی وہ پاپڑ تھوڑی سی مٹی ہٹا کے گاڑ جاتے ہوں گے۔ گہری قبر کھودنے کی نہ وہ ضرورت محسوس کرتے ہوں گے اور نہ ان کے پاس زمین کو کھودنے کے لیے آلات ہوتے ہوں گے۔ آخر خالی ہاتھوں سے کوئی کتنی گہرائی تک کھودے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک فٹ۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سائیں پاپڑ والے کے معتمد چیلے دیکھتے رہتے ہوں گے کہ "ہوس اور لالچ کا زہر" کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یا بعد میں رات کے وقت خود سائیں پاپڑ والے کو تازہ کھدی ہوئی مٹی دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہ ہوتا ہوگا کہ مال کہاں ہے۔ سب کے سامنے دال کے پاپڑ کھلانے والا کتنا دولت مند ہوگا' اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سونے چاندی کو شہر کے ہوشیار ایجنٹ سناروں تک پہنچا کے دام کھرے کرتے ہوں گے۔ سائیں پاپڑ والے کی سالانہ آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا چنانچہ وہ انکم ٹیکس کے جھمیلوں سے بھی محفوظ تھا جن سے محنت کر کے رزق حلال کمانے والوں کے لیے مفر نہیں۔

" ان کے پاس دولت مند اور رئیس تو سونے کے پاپڑ ہی لاتے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

" ہاں جی۔ جن کو خدا نے دیا ہے وہ راہِ خدا میں بھی دیتے ہیں۔" نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔" اور بزرگوں' پیروں فقیروں کے آستانے پر تو غریب امیر سب کو آنا ہی پڑتا ہے۔ امیروں کو خدا سب دیتا ہے تو کبھی ایسی بیماری دے دیتا ہے جس کا علاج نہیں ہوتا اور کبھی اولاد نہیں دیتا' یا بیٹی پر بیٹی دیتا جاتا ہے مگر ایک بیٹا نہیں دیتا۔"

" اور سائیں پاپڑ والے کے حاضر اسٹاک میں بیٹے موجود رہتے تھے کہ جیسا کسی نے مانگا فوراً اسٹور سے نکال کر دے دیا۔" میں نے کہا۔" اور جبر سے سائیں میڈیکل اسپیشلسٹ بھی تھے۔"

" لو جی۔ آپ کیسی کفر کی باتیں کرتے ہو۔" سائیکل سوار نے برا مانتے ہوئے کہا۔" وہ تو سب کو دعا ہی دیتے تھے۔"

" کیا وہ سب جو اُن کے پاس مراد مانگنے آتے تھے' خود دعا کرنا نہیں جانتے تھے؟" میں نے کہا۔" یا خدا کسی کی دعا قبول ہی نہیں کرتا تھا' سوائے سائیں پاپڑ والے کی دعا کے؟"

" آپ میرے مہمان ہو جی۔ اس لیے میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نوجوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔" مگر ایسی باتیں گاؤں میں مت کرنا ورنہ برا ہوگا۔"

ایک میل کی مسافت بھی طے ہو چکی تھی چنانچہ میں نے اپنی شر انگیزی بند کی۔ ایسی باتیں ان سادہ دل لوگوں کے ذہن میں انتشار پیدا کرتی تھیں۔ ان کے جذبات کو عقل کی تائید سے ٹھیس لگتی تھی۔ وہ فوراً تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ اب تک اُن کا عقیدہ غلط تھا اور ایسی بات ذہن سے خارج بھی نہیں کر سکتے تھے جو خود اپنی صداقت کا ثبوت ہو۔ کرماں والی میں مشکل سے دو سو گھر ہوں گے۔ ان میں بیشتر کچے تھے۔ مسجد کے مینار کی بلندی اور سفیدی سب سے جدا تھی اور دائیں طرف ایک

پیپل کے درخت سے بندھے ہوئے چھوٹے بڑے مختلف رنگ کے گوٹے کناری والے رنگ برنگ جھنڈے اعلان کرتے تھے کہ وہی سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ ہے۔

" یہ سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ ہوگی؟" میں نے کہا۔

" یہ ان کا مزارِ شریف ہے۔" نوجوان نے کہا۔" وہ شہید ہو چکے ہیں۔"

" شہید؟ کیا انھوں نے پاک بھارت جنگ میں دشمنوں کے خلاف جہاد کیا تھا؟" میں نے کہا۔" یا راہِ حق میں جان دی تھی؟"

" آپ شہری لوگ بڑے ہیر پھیر ڈالتے ہو۔" نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔" ان کے آستانے پر ایک رات شیطانوں کے لشکر نے بدبخت ڈاکوؤں کے بھیس میں حملہ کیا۔ آپ نے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔"

" ڈاکو سب مالِ غنیمت لے گئے ہوں گے!" میں کہتے کہتے رک گیا۔ سائیں پاپڑ والے کے آستانۂ عالیہ سے ان کو سونے کے پاپڑ سیروں کے حساب سے ملے ہوں گے۔ پاپڑ کا کوئی بین الاقوامی معیاری وزن تو مقرر ہے نہیں' سلانے والے ایک تولے کا پاپڑ بنوا لاتے ہوں گے اور ایک چھٹانک کا بھی۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت مگر سائیں پھر بھی شہادت کے منصب پر فائز ہوئے خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

" اب وہاں کرماں والی مجاور ہے۔" نوجوان نے کہا۔" اس کی کرامات کا شہرہ دُور دُور تک ہے۔"

لیکن میں اب پیروں فقیروں کی عیارانہ کرامات پر اظہارِ خیال فرما کر اپنے میزبان کے جذبات کو زیادہ مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مشتعل ہو کے وہ مجھے مجروح کر دے۔" یہ ڈونگا پتن بھی ایک گاؤں ہے؟" میں نے کہا۔" یہیں آس پاس۔"

" ہاں جی' ہے۔" وہ چونکا۔ اس نے اب اپنی سائیکل کا ہینڈل ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور ہم دونوں کھیتوں کی کچی منڈیر پر آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔" یہاں سے پانچ کوس پر ہے۔"

" گویا دس میل۔ اگر میں وہاں جانا چاہوں تو کیسے جاؤں؟" میں نے کہا۔

" ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ تانگے پر چلے جائیں۔" نوجوان بولا۔" گاؤں میں دو تانگے ہیں۔ ایک چوہدری صاحب کا۔ دوسرا ایک موچی کا۔ موچی کا بیٹا چلاتا ہے۔ وہ آپ سے بیس روپے لے گا۔"

" اور دوسرا طریقہ کیا ہے؟" میں نے بے خیالی میں کہا۔

" دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ شام تک انتظار کریں۔" وہ بولا۔" ڈونگا پتن کے نمبردار سادھو رام جی ہر جمعرات کو کرماں والی کی

خدمت میں حاضری دینے آتے ہیں اور سائیں پاپڑ والے کے مزار شریف پر چراغ جلا کے لوٹ جاتے ہیں۔"

" سادھو رام؟ یہ تو ہندوانہ نام ہے۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔

" ہاں جی۔ سادھو رام ہندو ہے مگر دل سے سائیں پاپڑ والے کا اور کرماں والی کا معتقد ہے۔" نوجوان بولا۔" آخر ہندوستان میں بھی کتنے ہندو ہیں جو خواجہ نظام الدینؒ اولیا اور اجمیر کے خواجہؒ صاحب کی درگاہ میں جا کے منت مانتے ہیں۔ بمبئی میں حاجی علی مراد کی درگاہ پر سب جاتے ہیں۔ ہندو' مسلمان' پارسی۔"

" تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟" میں نے اُسے غور سے دیکھا۔" تم نے پڑھا ہے یا ہندوستان جا چکے ہو؟"

" یہ سب سادھو رام جی نے بتایا ہے۔ انھوں نے بہت سی باتیں بتائی ہیں کہ گرو نانک جی ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور پھر کبیر داس تھے۔ راجہ اکبر ہندو اور مسلمان دونوں مذہب کو مانتا تھا اور اس نے دونوں مذہب کی عورتوں سے شادی کی تھی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ گاؤں کا یہ جاہل لڑکا کیسی دانشورانہ گفتگو کر رہا تھا۔ بے شک بہت سے حوالوں سے یہ سب باتیں غلط بھی ثابت ہوتی تھیں لیکن کرماں والی میں یہ باتیں پھیلانے والا سادھو رام تھا۔ اس نے اپنی چالاکی سے گاؤں والوں کے ذہن کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ ہندو تھا اور اسلامی سمجھے جانے والے عقائد پر عمل پیرا تھا۔ مگر اس نے اپنی عقیدت مندی کا جواز تاریخ کے حوالے سے پیش کر دیا تھا اور اب گاؤں والے اس کی فراخدلی' نیکی اور عظمت کے معترف تھے۔ یہ بات میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا تھا۔ آج پاکستان کے ایک گاؤں میں جو شخص نمبردار بنا بیٹھا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ تھا اور ان کی تعلیمات سے جذباتی وابستگی ظاہر کرتا ہے تو یہ ڈھونگ ہے۔ وہ اپنے مظاہر میں سچا ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کے ملک میں اپنے آبا و اجداد کا دھرم اور اسی دھرم کا نام سنبھالے کیوں بیٹھا ہے؟

" تمھارا مطلب ہے میں سادھو رام کے ساتھ ڈونگا پتن چلا جاؤں؟" میں نے کہا۔

" ہاں جی! وہ اپنی گاڑی میں آتے ہیں۔ بہت لمبی سی گاڑی ہے نا۔" نوجوان نے کہا۔" آپ کو ضرور ساتھ لے جائیں گے وہ۔"

نوجوان کے گھر میں اس وقت صرف اس کی ماں تھی اور ایک بہن۔ اس کا باپ اور بھائی کھیتوں کی طرف گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری آؤ بھگت میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مجھے پاؤ بھر خالص مکھن کے ساتھ ایک فیملی سائز روٹی دی گئی۔ میں نے دونوں کا بیس فیصد حلق سے اتارا اور پھر میزبانوں کا دل رکھنے کے لیے بالٹی جتنے لسی کے گلاس کو بھی آدھا خالی کر دیا مگر اس

کے بعد میری حالت اس شخص کی طرح ہو گئی جس نے ایک ساتھ کئی ولیمے کھا لیے ہوں۔ میں خوش خوراکی کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر کی باتوں کا جواب بھی دے رہا تھا لیکن میرا ذہن سادھو رام کی طرف تھا۔

" وہ جو لمبی سی گاڑی ہے۔" میں نے اچانک کہا۔" کیا وہ شیورلیٹ ہے۔ ۱۹۵۲ء کے ماڈل کی۔"

" کیا جی؟" نوجوان ہکا بکا رہ گیا۔" وہ گاڑی ہے جی... موٹر کار... کالے رنگ کی..." ظاہر ہے وہ کاروں کے ماڈل اور فرق کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے کچھ سمجھایا اور پھر اپنی مصوری کی صلاحیت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں کاپی پینسل قسم کی کوئی چیز نہیں تھی مگر کوئلہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ میں نے فرش پر ایک ڈرائنگ بنائی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں نے گاڑی کی بہت صحیح تصویر بنائی ہے۔ نوجوان نے سر ہلا کے اقرار کیا کہ سادھو رام کی گاڑی بالکل ایسی ہی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کار کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں اور میرے لیے شبہے کی گنجائش نہ رہی کہ سادھو رام کی گاڑی وہی ہے جس میں رابعہ اور نازو کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ سائیں پاپڑ والے خود بھی فراڈ تھے اور یہاں دیہات کے رہنے والوں کی سادہ مزاجی اور خوش اعتقادی تھی کہ انھوں نے اس لٹیرے کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے کے باوجود شہید کہنا شروع کر دیا۔ وہ خود کچھ نہیں کہتے تھے' وہی کہتے تھے جو مشہور کر دیا جاتا تھا اور یہ سائیں پاپڑ والے کے چیلوں کی عیاری کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے فوراً سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ تعمیر کر دی اور اس جگہ نذر نیاز کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ سال کے سال عرس مبارک کا سوانگ رچانے کا موقع الگ ہاتھ آیا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ سائیں پاپڑ والے کی جانشین ایک عورت کیوں بنی؟ یہ سارا کھیل دھوکے بازی کا تھا اور اسے کوئی دھوکے باز ہی جاری رکھ سکتا تھا۔ کیا کرماں والی دوسرے مریدوں اور چیلوں سے زیادہ سائیں پاپڑ والے کی جانشینی کے قابل تھی؟ اس میں مردوں سے زیادہ ذہانت اور صلاحیت تھی کہ اسے مجاور اور صحیح گدی نشین تسلیم کر لیا گیا؟ یا دوسرے چالاک مریدوں نے اس کو اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ وہ کوئی بے وقوف عورت ہے جو بدمعاشوں کے ہاتھ میں کھیلنے پر مجبور ہے۔ اگر اس فراڈ کا بھانڈا پھوٹنے کا وقت آیا تو وہ غائب ہو جائیں گے۔ پیچھے رہ جائے گی ایک مجہول' فاترالعقل قسم کی عورت جسے سب نے مجذوب کا درجہ دے رکھا ہے۔ سادھو رام کا اس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جگہ آنا بے سبب نہیں تھا۔ ملاورا اینڈ کمپنی کا ڈونگا پتن سے تعلق ثابت ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی جگہ ایسی تھی جہاں نازو اور رابعہ کو لے جایا گیا تھا۔ جس گاڑی میں ان کا جانا ثابت ہوتا تھا، وہ سادھو رام کی ملکیت تھی اور سادھو رام، ڈونگا پتن سے یہاں آتا تھا تو یہ عجیب سی مثلث بنتی تھی۔ ملاورا اینڈ کمپنی..... ڈونگا پتن، کرماں والی؟

میں نے کرماں والی کے ڈیرے پر جانے کا فیصلہ کیا مگر مناسب یہ سمجھا کہ اپنے ارادے کو اپنے میزبان سے پوشیدہ رکھوں۔ یہ نہ ہو کہ میرے عزائم کی خبر مجھ سے پہلے صفِ دشمن تک پہنچ جائے۔

"کیا یہ گاؤں شروع سے کرماں والی کے نام پر مشہور ہے؟" میں نے کہا۔ "یا پہلے پاپڑ والا کہلاتا تھا؟"

نوجوان تھوڑا سا حیران ہوا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ پہلے یہ ایک گاؤں تھا۔ چک دو سو بارہ الف۔ پھر پاپڑ والا کہلانے لگا۔ مگر ابھی دو سال پہلے سائیں پاپڑ والا کے حکم پر اسے کرماں والی کہا جانے لگا۔"

"ہلاکت کے بعد ان کا حکم کیا عزرائیل کے ذریعے پہنچا تھا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "یا وہ کرماں والی کو خواب میں نظر آئے تھے؟"

"وہ خواب میں نظر آئے تھے۔" نوجوان نے برہمی سے کہا۔

"اسی طرح جب کرماں والی کسی دن ماری جائے گی تو اس گدی پر بیٹھے گا کوئی کرماں والا یا نصیباں والا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ جو شروع میں چک نمبر دو سو بارہ الف تھا پھر پاپڑ والا ہوا پھر کرماں والی بنا۔ کہلانے لگے گا نصیباں والا۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تمھاری مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔ میری باتوں کا بُرا مانا ہو تو معاف کر دینا۔"

نوجوان کی ساری خفگی دُور ہو گئی۔ "روٹی کھا کے جانا تھا جی۔ اب آپ ڈونگا پتن جاؤ گے؟"

"نہیں بھائی۔ میں لاہور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کھانا ابھی تو کھایا ہے۔ اچھا ماں جی اجازت۔"

"اچھا پتر، رب راکھا۔ چنگا سی جے روٹی کھا کے جاندا۔" نوجوان کی ماں نے کہا اور میں ان سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ نوجوان نے مجھے سڑک تک سائیکل پر لفٹ پیش کی اور اس وقت تک سڑک پر کھڑا رہا جب تک میں ایک لاری کو روک کر سوار نہیں ہو گیا۔ میری جیب میں اتنی رقم تھی کہ میں آسانی سے لاہور پہنچ جاتا مگر وقت کم تھا۔ میں نے ڈونگا پتن کا ٹکٹ مانگا تو کنڈکٹر نے بہت بُرا منایا۔

"یہ کوئی ادمنی بس ہے۔ ایک اسٹاپ چڑھ کے اگلے پہ اتر گئے۔" وہ بولا۔ "ٹکٹ لاہور تک کا لگے گا۔"

"جو تواڈی خوشی شہنشاہو۔" میں نے دیہاتی لہجے میں کہا اور اُسے پانچ کا نوٹ پیش کر دیا۔ اس نے کسی حساب کے بغیر بقایا پیسے لوٹا دیے۔ بس ایک منٹ کے لیے رُکی تو میں سڑک پر کود گیا۔ اب مجھے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اندازے سے ڈونگا پتن کی سمت سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے ایک گاؤں دیکھا جو کرماں والی کے مقابلے میں قصبہ تھا۔ وہاں اگر دو سو گھر تھے تو یہاں دو ہزار مزور تھے۔ زیادہ فکر مجھے اپنا حلیہ بدلنے کی تھی۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کھٹا کھٹ کی آواز آئی۔ یہ کھڈی پر کپڑا بُننے کے عمل کا شور تھا۔ میں نے ایک بڈھے کو ہاتھ کی دیسی کھڈی پہ کام میں مصروف دیکھا۔

"چاچا! مینوں چاہیدا اے اک لاچا۔" میں نے دروازے میں سر ڈال کر کہا۔ "اسلام علیکم۔"

چاچا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "سلام پہلاں کہیدا اے پتر۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے ایک سوتی لاچا اور ایک کھیس صرف چالیس روپے میں دے دیا اور مجھ سے غیر ضروری سوال بھی کیے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں اور کدھر جا رہا ہوں؟ میں نے سب کے غلط جوابات دیے اور لاچا بدلنے کے بعد کھیس لپیٹ کر چل پڑا۔ ایک بار پھر میں نے سابق موضع پاپڑ والا اور اب کرماں والی کا رُخ کیا۔ مجھے ایک کچا راستہ نظر آ رہا تھا جس کی چکنی مٹی میں سائیکل کے ٹائروں، تانگوں اور بیل گاڑیوں کی آمد و رفت کے نشانات بہت نمایاں تھے۔ دس میل کا راستہ بہت لمبا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کوئی بھی سواری مل جائے۔ دونوں گاؤں کے درمیان چلنے والی واحد تانگہ ایکسپریس میری امید تھی مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ سارا راستہ مجھے پیدل طے کرنا پڑا جو کھیتوں اور کہیں کہیں جنگل سے گزرتا تھا۔ مجھے ایک جگہ سانپ بھی نظر آیا جو سڑک پہ سے رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے گزر جانے کا انتظار کیا۔ وہ دوسری طرف کے جنگل میں غائب ہو گیا۔ کسی اور سانپ یا اژدھے سے ملاقات کا مجھے اتنا ڈر نہیں تھا جتنا راستے سے بھٹک جانے کا۔ جنگل کے سانپ اور دوسرے جانور بھی جو عام طور پر خطرناک سمجھے جاتے ہیں، آدمی سے ڈرتے ہیں جو خدا کی پیدا کردہ مخلوق میں سب سے زیادہ ہلاکت خیز جانور ثابت ہوا تھا۔ اور جب تک انسان کو چھیڑا نہ جائے یا وہ مجبور نہ ہو جائیں آدمی کے سامنے سے دُور ہی رہتے ہیں۔

اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ پیدل چلنے سے میں بُری طرح

تھک گیا تھا اور مجھ پر بھوک بھی غالب آنے لگی تھی لیکن میں پھر موضع کرماں والی میں کسی کے سامنے نمودار ہونے سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر میں نے سمت کا تعین کیا اور اس رُخ دوسری جانب سے اس پیپل کے درخت تک گیا جس کے نیچے کرماں والی کا ڈیرا اور سائیں پاپڑ والے کا مزار شریف تھا۔ بیرونی راہ میں ایک برساتی نالہ آیا جس کے بعد قبرستان تھا۔ یہ گاؤں کا قبرستان تھا چنانچہ اس کی وسعت زیادہ نہیں تھی۔ زیادہ تر قبریں کچی تھیں اور ان پر کتبے بھی نہیں تھے۔ انھیں لیپ پت کر اور کنکر پتھروں سے گھیر کر محفوظ رکھنے کی کوشش ناکام نظر آتی تھی۔ موسمی حالات خصوصاً برسات کی یلغار آدمِ خاکی کے فنا ہو جانے کا نقشِ عبرت بھی مٹاتی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ قبرستان کے بائیں جانب زمین کی بلندی بتدریج بڑھتی چلی گئی ہے یہاں تک کہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر پتھریلی زمین کا سلسلہ پتھر کی سیاہ چٹانوں سے جا ملتا ہے۔ پھر یہ چٹانیں بلند ہونے لگتی ہیں اور افق پر معمولی بلندی کی پہاڑیاں ایک سیاہ لکیر کی طرح پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سمت سے بارش کا ریلا آتا تھا تو نشیب کی سمت سیلِ آب کچی قبروں کو روندتا جاتا تھا اور یہ پانی برساتی نالے میں بہہ جاتا تھا۔ کچی قبروں کی خستہ حالی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔

قبرستان سے نکلنے کے لیے میں نے دائیں جانب کا رُخ کیا اور درختوں کے اس جھنڈ سے گزرا جس کے بعد پیپل کا وہ بہت بڑا درخت تھا جو رنگ برنگے جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایک مختصر سا جنگل تھا جس کی وسعت دائیں اور بائیں طرف ایک ایک فرلانگ سے بھی کم تھی مگر زیادہ تر درخت شیشم اور پیپل کے یا "دریک" کے تھے۔ دریک بالکل نیم کی طرح کا درخت تھا اور معلوم نہیں کس فرق کے باعث مقامی لوگ اسے دریک کہتے تھے۔ یہ سب اونچے، مضبوط تنوں والے درخت تھے جن کی شاخیں زمین سے تقریباً پندرہ بیس فٹ اوپر جا کے پھیلتی تھیں۔ پہلی شاخیں موٹے موٹے تنوں کی طرح تھیں اور ان سے پھوٹنے والی شاخوں کا سلسلہ بلندی تک یوں پھیلتا تھا کہ ہر شاخ سے کئی شاخیں پھوٹتی تھیں جو چھوٹی اور پتلی ہوتی جاتی تھیں اور ان کے پتے چاروں طرف ایک سرسبز چھتری سی تان دیتے تھے۔ درختوں کے درمیان زمین کی سطح ہموار اور صاف تھی۔ تنے کسی عمارت کو سہارا دینے والے ستونوں کی طرح لگتے تھے اور اوپر کہیں کہیں شاخیں آپس میں یوں مل جاتی تھیں کہ گھنے پتوں کا سائبان سا بن جاتا تھا جس میں سے آسمان کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ نیچے روشنی کم تھی اور ایک مربع فرلانگ کا یہ جنگل گرد و نواح کے روشن علاقے کے مقابلے میں تاریک محسوس ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نیچے خودرو نباتات کی کمی تھی۔

اچانک مجھے درختوں کے بیچ میں کچلی ہوئی گھاس اور مسلے ہوئے پودوں کے ساتھ ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے یہ نشانات تازہ لگے کیونکہ پھول اور پتیاں ابھی خشک نہیں ہوئے تھے حالانکہ ان کے نازک تنے اور باریک ریشوں جیسی شاخیں پس کر الگ ہو گئے تھے۔ کوئی گاڑی ابھی ابھی اس جگہ سے گزری تھی، زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے پہلے۔ اس سے زیادہ وقت گزرا ہوتا تو پھول اور پتیاں کمھلا چکے ہوتے اور ان کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہوتے۔ میرے خیال کی تصدیق آگے جانے سے بھی ہوئی۔ بھاری ٹائروں کے نشان زمین پر نقش چھوڑ گئے تھے اور ایک ہی سمت کی نشاندہی کرتے تھے۔ ایک جگہ پر نشان اتنے نمایاں تھے کہ میں نے ٹائروں کے پرنٹ کی چوڑائی دیکھ لی۔ یہ میری ایک بالشت سے زیادہ تھی۔ اتنے چوڑے ٹائر کسی ٹرک کے ہی ہو سکتے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے درخت ہی درخت نظر آئے لیکن غور کرنے پر میں نے اندازہ کیا کہ ایک ماہر ٹرک ڈرائیور انہی درختوں میں سے راستہ نکال سکتا ہے۔ بے شک اس کا راستہ سیدھا نہیں ہو گا۔ اسے دائیں بائیں نظر رکھتے ہوئے ایسے درخت تلاش کرنے پڑتے ہوں گے جن کی بلندی ٹرک کی راہ میں حائل نہ ہو اور جن کے درمیان سے بھی ٹرک کو گزارا جا سکتا ہو۔

ذرا سی دیر میں وہ راستہ بھی میری نظر نے تلاش کر لیا۔ اس پورے راستے پر ٹرک کے بھاری پہیوں کے گزرنے سے جو نقش باقی رہ گئے تھے وہ خود راستے کی نشاندہی کرتے تھے مگر جو بات میں نے نوٹ کی وہ مختلف درختوں پر جگہ جگہ نظر آنے والا زرد رنگ تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے تنوں پر زمین کی سطح سے دس فٹ اوپر گہرے اور شوخ زرد رنگ کا چمکیلا دائرہ بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ فلوریسنٹ پینٹ تھا جو اندھیرے میں روشنی پڑنے پر روشن نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ یہ زرد دائرے رات کے وقت آنے والے ٹرک کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اندھیرے میں ٹرک کی ہیڈ لائٹس سے یہ دائرے روشنی کے سگنل نظر آتے ہوں گے اور ٹرک آدھی رات کے بعد آتے ہوں گے کہ گاؤں کے لوگ تو زیادہ سے زیادہ عشا کی نماز پڑھنے تک جاگتے تھے۔ اب میں نے محتاط ہو کے آگے بڑھنا شروع کیا۔

کرماں والی کا ڈیرا ایک پختہ عمارت تھی۔ اس کے لیے اینٹیں، سیمنٹ اور راج مزدور سب شہر سے لائے گئے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوں گے۔ عمارت کے دو حصّے تھے۔ سامنے والا حصّہ ایک بڑے اور اونچی چھت والے حصّے پر مشتمل تھا جس کے چار گوشوں پر چار چھوٹے گنبد تھے اور وسطی گنبد کے ساتھ یوں لگتے تھے جیسے تربوز کے چاروں طرف چار سیب رکھے ہوں۔ اس پوری عمارت پر سبز رنگ تھا جو عام طور پر پاکیزگی اور طہارت کا مظہر سمجھا جاتا ہے مگر یہاں اس کا مقصد عمارت کو کیموفلاج کرنا معلوم ہوتا تھا تاکہ گھنے سبز درختوں میں یہ سبز عمارت دکھائی ہی نہ دے۔ عقبی حصّے میں ایک بہت بڑا سیمنٹ کا پلیٹ فارم سا تھا جو میرے اندازے کے مطابق پچاس گز لمبا پچاس گز چوڑا اور زمین کی سطح سے ایک گز اونچا تھا۔ اس پلیٹ فارم پر سبز عمارت کی عقبی دیوار کا ایک دروازہ کھلتا تھا جو اس وقت بند تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کسی خانقاہ کے ساتھ اس قسم کے پلیٹ فارم کا کیا مصرف ہو سکتا ہے۔

مجھے عمارت کے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں قریب جانے سے احتراز کر رہا تھا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی جس نے میرے قدم روک لیے۔ بظاہر ایک غیر معروف گاؤں کی اس غیر معروف خانقاہ میں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کی بو کو واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اپنی قوتِ مشاہدہ یا سراغ رسانی کے باعث بہت سی غیر معمولی باتیں دریافت کر لی تھیں۔ ایک یہ کہ قبرستان اور جنگل کی سمت سے یہاں ٹرک آتا ہے۔ ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ ٹرک کیوں آتا ہے؟ پھر یہ کہ ٹرک اس خفیہ اور پوشیدہ راستے... سے عموماً رات کے وقت آتا ہے اور ٹرک کو یہاں لانے والے اتنے ہوشیار ہیں کہ انھوں نے تاریک جنگل میں روشن ہو جانے والے نشان لگائے ہیں جو دن میں کسی دیہاتی کے لیے شک کا باعث نہیں بن سکتے۔ لیکن اس طرح ٹرک کو سیدھے اور آسان راستے سے لانے کے بجائے مشکل اور پوشیدہ و پیچیدہ راستے سے لانے کا مقصد بھی نیک نہیں ہو سکتا۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مرحوم سائیں پاپڑ والے بھی کوئی نیک مقصدِ حیات نہیں رکھتے تھے۔ کیا وہ پیری فقیری کے ڈھونگ اور سونے چاندی کے پاپڑ جمع کرنے کے علاوہ بھی کوئی خفیہ اور خطرناک کاروبار کرتے تھے۔ گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کا راز فاش ہو جانے کے بعد مجھے سائیں پاپڑ والے کا مزار شریف بھی بالکل شریف نہیں لگا۔ یہاں کچھ اور بھی ہو رہا تھا...... ڈونگا پتن کا سادھو رام یہاں عقیدت مندین کے صرف چراغ جلانے کے لیے نہیں آتا تھا۔

قدرتی طور پر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سائیں پاپڑ والے کی "شہادت" میں ڈاکوؤں کے علاوہ بھی کسی کا ہاتھ ہو۔ ممکن ہے کسی غلطی یا غلط فہمی کے باعث سائیں پاپڑ والے کو مجبوراً مرنا پڑا ہو، ان کی "خودکشی" کرا دی گئی ہو یا بہتر سمجھا گیا ہو کہ اب ان کا مزار بنا دیا جائے۔ بعض اوقات زندہ پیر سے مردہ پیر زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

ابھی میں گامے ماچھی سے ڈونگا پتن کے سادھو رام اور کرماں والی کے ڈیرے تک سب کے درمیان مفادات کے مشترک رشتے کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ کسی گاڑی کا طاقتور انجن گرجا۔ میں فوراً دو درختوں کے پیچھے ہو گیا جن کے تنوں کے درمیان ایک قدِ آدم جھاڑی پھیل گئی تھی۔ آواز بہت دُور سے آئی تھی مگر میرے کانوں نے اس کی سمت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ وہ میرے ہی دریافت کردہ راستے سے کرماں والی کے ڈیرے کی طرف آرہا تھا چنانچہ اس کی رفتار بہت کم تھی۔ جب میں نے اسے دیکھا تو ٹرک بڑی احتیاط کے ساتھ دو قریب قریب درختوں کے درمیانی تنگ راستے سے نکل رہا تھا اور ڈرائیور اپنے سامنے والے درخت سے بچا کے دائیں جانب موڑنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ بیڈ فورڈ ٹرک تھا جس کا پچھلا حصّہ ایک ہموار سطح کی طرح تھا۔ اس حصّے پر لکڑی کے باکس ایک دوسرے پر رکھے ہوئے جیسے گڑے ہوئے تھے۔ سب باکس ایک ہی سائز اور ایک ہی شکل کے تھے۔ سب کی لمبائی میرے اندازے کے مطابق چھ فٹ اور چوڑائی دو فٹ تھی۔ ہر باکس اتنا ہی گہرا بھی تھا چنانچہ یہ سب تابوت لگتے تھے۔ صندوقوں کو لمبائی کے رُخ ٹرک پر لادا گیا تھا۔

ٹرک میرے سامنے تقریباً دس فٹ دور سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ لمبائی کے رُخ تین تابوت نما باکس رکھے گئے ہیں۔ چوڑائی کے رُخ مجھے چار باکس نظر آئے۔ ہر باکس کے اوپر چار باکس تھے۔ اس طرح میرے حساب سے ٹرک میں ساٹھ باکس لدے ہوئے تھے۔ کسی بھی نوعیت کے سامان کی پیکنگ اور ٹرانسپورٹ کے لیے یہ بہت عجیب سائز کے صندوق تھے۔ پھل انڈے اور سبزیاں بہت چھوٹے کریٹ میں پیک کیے جاتے ہیں۔ مشینری بھی باہر بھیجی جائے یا باہر سے منگوائی جائے تو ان کے باکس تابوت نما نہیں ہوتے اور کرماں والی کے ڈیرے کا مشینری کی درآمد یا برآمد سے کیا تعلق؟ ایک قابلِ غور بات یہ بھی تھی کہ سب باکس بڑی اچھی لکڑی سے اور بہت صفائی کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ اگر ان پر سیاہ رنگ کر دیا جاتا تو یہ تابوت تسلیم کیے جاتے اور کسی بھی ملک کی کسٹم چیک پوسٹ سے گزارے جا سکتے تھے بشرطیکہ ان میں لاش کا چہرہ نظر آتا۔ ٹرک میرے بائیں ہاتھ پر بیس فٹ دور جا کر رکا

تھا۔ اس کو ریورس گیئر میں ڈال کے گھمایا اور اس کا پچھلا حصّہ پلیٹ فارم سے ملا دیا۔ اگلے حصے سے ڈرائیور کے علاوہ دو آدمی اترے۔ پھر سائیں پاپڑ والے کے مزار کا عقبی دروازہ کھلا اور دو افراد سبز یونیفارم جیسا لباس پہنے نکلے۔ اس وقت میں نے غور کیا کہ ڈرائیور کے ساتھیوں نے بھی سبز کپڑے پہن رکھے ہیں۔ صندوقوں کے اوپر بھی سبز رنگ ہے اور ٹرک پر بھی۔ یہ سب کیموفلاج کرنے کے لیے تھا۔ اوپر سے یا دُور سے دیکھنے والے کو جنگل میں ہونے والی کوئی پُراسرار کارروائی نظر نہیں آسکتی تھی۔ ٹرک میں سے اترنے والے مزدور اوپر چڑھ گئے تھے لیکن خود ڈرائیور اپنے ہاتھ میں اسٹین گن لیے مستعد کھڑا رہا۔ اس کی نگاہ ہر طرف تھی۔ غور سے دیکھنے پر میں نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے سامنے والے ہوٹل کا پروپرائٹر تھا جس سے ہم نے رابعہ اور نازو کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے عینی شاہد کی حیثیت سے جو دیکھا تھا سب بتا دیا لیکن بعد میں اسی نے ہمارے بارے میں اور ہمارے عزائم کے بارے میں ولاور اینڈ کمپنی کے شکاریوں کو تمام معلومات فراہم کر دیں۔ ان میں سے ایک شکاری ہمارے تعاقب میں آیا اور ہمیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ٹرک پر چڑھنے والے دو مزدوروں نے باری باری ہر باکس کو نیچے کھسکا کے ان دو افراد کے سپرد کرنا شروع کیا جو سائیں پاپڑ والے کے مزار سے نکلے تھے۔ صندوقوں کے دونوں جانب کنڈے تھے مگر مزدوروں کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ باکس کتنے بھاری ہیں۔ ان کے بازوؤں کے رگ پٹھے کھنچ جاتے تھے تو اس مشقت سے ان کے چہرے بھی لال ہو جاتے تھے۔ یہی کیفیت نیچے کھڑے ہوئے مزدوروں کی تھی۔ وہ بوجھ کو سنبھالتے ہوئے لڑکھڑا جاتے تھے۔ اگر ہر باکس کا وزن ایک من ہوتا تو وہ صحت مند افراد کے لیے زیادہ نہیں تھا لیکن جتنی محنت انھیں کرنی پڑ رہی تھی، اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وزن کسی طرح بھی دو من سے کم نہیں ہوگا۔ جو باکس نیچے اتارے جاتے تھے انھیں وہی دو افراد کھینچتے ہوئے مزار کے اندر لے جاتے تھے۔ ابھی پہلا مال اترا بھی نہیں تھا کہ میں نے پھر ایک موٹر کے انجن کی آواز سنی مگر یہ آواز ٹرک کے انجن کی آواز کے مقابلے میں دھیمی تھی۔

درختوں کی اوٹ سے جہازی سائز کی شیورلیٹ امپالا نمودار ہوئی اور ٹرک کے قریب جا رکی۔ جب کار میرے سامنے آئی تھی تو میں نے ڈرائیور کے چہرے کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کار تھی اور ڈرائیور کی صورت اسی کھڑکی میں نمایاں تھی جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن کو دوسرا زیادہ شدید جھٹکا لگا کیونکہ سادھو رام کی گاڑی میں مجھے کوئی روایتی قسم کا ہندو نظر نہیں آیا تھا جس کے گنجے سر پر چوٹی ہوتی، ماتھے پر تلک اور گلے میں جنیو ہوتا اور جو واسکٹ دھوتی اور نہرو کیپ پہنے ہوتا۔ وہ سوٹ میں تھا اور مجھے اس کو پہچاننے میں ذرا دیر نہیں لگی۔ اسی شخص نے ہمیں ڈونگا پتن کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں گاڑی نہیں جا سکتی اور پیدل پہنچنا ممکن ہے چنانچہ محسن اور نیک محمد مجھے ٹیکسی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور یہ خبیث آگے جا کے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے آیا تھا۔ وہ بھی ایک شکاری تھا جو مجھے لے جانے والوں کا مددگار بنا تھا۔ میرے ذہن میں سادھو رام کی یہ صورت ہرگز نہ تھی اور اب مجھے بالکل شبہ نہ رہا کہ سادھو رام کا ظاہر اور باطن ایک مکر و فریب ہے۔

سادھو رام گاڑی سے اترا اور پلیٹ فارم کے چند زینے چڑھ کر عقبی راستے سے پاپڑ والے کے مزار کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ مزدور بدستور باکس اتار اتار کے اندر پہنچاتے رہے۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ اس عمارت میں جو سائیں پاپڑ والے کے مزارِ مبارک اور کرماں والی کی کرامت کے باعث مرجعِ خلائق ہے اتنا سامان کہاں رکھا جا سکتا ہے اور کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ مزدور ایک پھیرا تقریباً چھ منٹ میں پورا کر رہے تھے۔ اگر انھیں باکس اندر چھوڑ کے آنا ہوتا تو یہی کام اس سے نصف وقت میں ہو جاتا۔ زیادہ وقت اس لیے صرف ہو رہا تھا کہ وہ باکس کو نیچے لے جا رہے تھے۔ انھیں سیڑھیاں اتر کے کسی تہ خانے میں پہنچا رہے تھے اور جو کچھ میرے سامنے تھا اس سے میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ اوپر سے جو سیمنٹ کا مضبوط پلیٹ فارم نظر آتا ہے وہ درحقیقت ایک تہ خانے کی چھت ہے۔

خالی ہو جانے والا ٹرک روانہ ہو گیا مگر کار وہیں کھڑی رہی۔ تقریباً دس منٹ بعد سادھو رام پھر نکلا لیکن اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے سر سے پیر تک میکسی ٹائپ سبز چغہ پہن رکھا تھا۔ وہ کوئی بہت عمر رسیدہ عورت نہیں تھی لیکن وہ بےحد صحت مند تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ضرور تھا اور جسمانی طور پر وہ بےحد فٹ نظر آتی تھی مگر اس کے چغے نے جسم کے خدوخال کو چھپا رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت کی قلندرانہ وضع بھی ایک بہروپ ہے۔ اچانک مجھے آسمان کی طرف سے عجیب قسم کی آواز سنائی دی۔ سادھو رام مُنہ اُٹھا کے اوپر دیکھنے لگا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہ آواز مجھے بھی اپنے پیچھے جنوب مشرق کی سمت سے سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتی تھی جیسے کوئی بغیر سائلنسر والی موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔ جیسے جیسے آواز قریب آتی گئی اس کی شناخت نمایاں اور واضح ہوتی گئی۔ یہ کوئی ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے خود کو گھنے درختوں کے سائبان کے نیچے اس طرح چھپا لیا کہ اوپر سے پائلٹ یا اس کا کوئی ساتھی دوربین لگا کے دیکھتا، تب بھی میں نظر نہ آتا۔ نیچے سادھو رام اور گیروے رنگ کے چغے والی صحت مند عورت اب آپس کی باتیں چھوڑ کر ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھ رہے تھے جو ہنوز میری نظر سے اوجھل تھا۔ عورت کے بارے میں یہ فرض کرنا غلط نہیں تھا کہ وہی ڈبا پیر سائیں یا پڑ والے کی اس فراڈ خانقاہ کی گدی نشین کرماں والی ہو گی۔ سادھو رام کے اور ان کے درمیان کوئی بہت پُراسرار قسم کا تعلق تھا جس کو سادہ دل دیہات کے رہنے والوں نے سادھو رام کی عقیدت مندی سمجھا تھا۔ میرے سامنے ایک مرتبہ سادھو رام نے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر کرماں والی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ اب وہ مجسم تصویرِ انتظار و اشتیاق بنے کسی تیسرے فریق کے لیے چشم براہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آنے والا کون ہو گا چنانچہ وہ نہ حیرت زدہ تھے اور نہ خوف زدہ۔

سیمنٹ کے وسیع و عریض پلیٹ فارم کی تعمیر کا ایک مقصد مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہیلی پیڈ تھا اور یہاں ہیلی کاپٹر کو بحفاظت اتارنے کا یہ بندوبست کسی غیر معمولی ضرورت کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ جب ہیلی کاپٹر قریب آیا تو میں نے اس پر بنے ہوئے نشان کو آسانی سے پہچان لیا۔ یہ ایک پڑوسی دشمن ملک کا فوجی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے اس پر لکھا ہوا نمبر بھی پڑھا اور آنکھیں بند کر کے زیرِ لب کئی بار دہرایا تاکہ... ذہن نشین ہو جائے۔ ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ سیمنٹ کے اس پلیٹ فارم یا ہیلی پیڈ کے آس پاس سے درخت یقیناً صاف کر دیے گئے تھے۔ سادھو رام نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کے آنے والوں کو خوش آمدید کہا یا انھیں سگنل دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے اس شور سے فائدہ اٹھایا جو ہیلی کاپٹر کے اترنے اور درختوں کے پتوں کے تیز ہوا میں ہلنے سے پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت سادھو رام اور کرماں والی کی ساری توجہ بھی ہیلی کاپٹر کی طرف تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ہیلی پیڈ کے سب سے قریبی جھاڑ جیسے درخت کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھے اور میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ خطرہ مجھے صرف یہ تھا کہ کہیں ان پر میری موجودگی کا راز فاش نہ ہو جائے۔ ایک چھینک بھی ایسے وقت میں بم کے دھماکے سے کم تباہ کن ثابت نہ ہوتی۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور ان کا مسلح ہونا شبہے سے بالاتر تھا۔ اگر وہ مجھے خفیہ مائکروفون کی طرح اتنے قریب دریافت کر لیتے تو بلاتوقف تباہ بھی کر دیتے۔ وہ جنگل کی زمین تھی جس پر حشرات الارض کا بسیرا تھا۔ کوئی دخل در معقولات کرنے والا اچانک مجھے کاٹ لیتا تو اس کی یہ حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ بعد میں وہ کیڑا مجھے دس بار کاٹنا چاہتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

ہیلی کاپٹر کے اوپر گھومنے والا دیو ہیکل پنکھا انجن کے بند ہو جانے کے بعد بھی کچھ دیر گھومتا رہا۔ اس کے مقابلے میں کوتاہ نظر آنے والے دُم کے پنکھے کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ ہیلی کاپٹر سے ایک بلند قامت، صحت مند اور سیاہی مائل گندمی رنگت والا شخص پہلے اترا۔ اس نے گرے پتلون اور آدھی آستین کی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کے بال گھنے سیاہ تھے چنانچہ اس کی عمر کا اندازہ مشکل کام تھا۔ وہ چالیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس سے زیادہ کی عمر کا بھی۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ جوان، جوشیلا اور مستعد نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً ڈیڑھ فٹ کی پتلی سی سیاہ چھڑی تھی جس کے نسبتاً موٹے کنارے پر چاندی کی چمکیلی دھات کی منقش پتری چڑھی ہوئی تھی۔ اس چھڑی سے وہ عادتاً اپنی پتلون کے پائنچوں کو جھاڑتا تھا۔ یہ چھڑی اس کے فوجی ہونے کی علامت تھی۔ اس کے بال بھی فوجی طرز کے تھے اور اس کی چال میں فوج کی افسری کا نظم و ضبط بھی تھا اور متوازن انداز بھی۔ سادھو رام کے قریب پہنچ کر اس نے چھڑی کو ایک خاص انداز سے بائیں جانب بغل میں دبا لیا۔ یہ بھی ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ چونکہ میں بہت توجہ اور انہماک سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اس لیے یہ باتیں خود میری نظر میں آ گئیں۔

"نمستے کرنل صاحب۔" سادھو رام نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا اور خوشامدانہ انداز میں مسکرایا۔

"ہیلو سادھو رام۔" کرنل نے دایاں ہاتھ بڑھا کے اس سے مصافحہ کیا۔ "کیا حال ہے؟"

"سب بھگوان کی کرپا ہے۔" سادھو رام نے کہا۔

"آپ خیریت سے ہیں کرنل جگن ناتھ۔" کرماں والی نے باری باری ہاتھ ملا کے کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ کی گداز سفیدی کا اور اس کی آواز کا لوچ محسوس ہوا۔ اس کے لہجے میں ایک ادا بولتی تھی جو سمجھتی تھی کہ اس کی ناز آفریں شوخی کے جادو کا توڑ نہیں۔

"اینڈ ہاؤ آر یو مائی سویٹ گرل۔" کرنل جگن ناتھ مسکرایا۔

اسی لمحے میں نے سادھو رام کا چہرہ دیکھا جو کوشش کے باوجود اپنے جذبات کو چھپانے سے قاصر رہا تھا۔

"اس بار تو بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔" ...سویٹ گرل نے کسی وفا پیشہ محبوبہ کے شکایتی لہجے میں کہا جس نے فراق کے ... اور ہجر کی راتیں آہیں بھرتے گزاری ہوں۔

"وہ بس۔ ساری بات تو مناسب وقت اور موقع ملنے کی ہے۔" جگن ناتھ نے کہا۔ "پھر یہ کہ مجھے نوین لینڈ سے واپسی میں تاخیر ہوئی۔ اچانک ہی میرا شیڈول اپ سیٹ ہو گیا۔"

"نوین لینڈ کی صورتِ حال کیا ہے کرنل صاحب؟" سادھو رام معنی خیز لہجے میں مسکرایا۔

"حالات ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔" کرنل نے کہا۔ "سنہرے ریشے کی زمین اب ریشہ دوانیوں کی سرزمین ہے۔ وہ سچ مچ نوین لینڈ ہوتی جا رہی ہے۔ ایک تو وہی بیورو کریسی ہے جو سب ٹھیک ہے کا تاثر دیتی ہے۔ پھر مقامی انتظامیہ ہے جو اپنے طور پر تخریب کاری سے نمٹنے میں ناکام ہے۔ کس کس کو پکڑیں اور کہاں کہاں حفاظتی دستوں کو بلائیں۔ ہمارے لیے سب سے زیادہ موزوں وہی نیم فوجی گوریلا تنظیمیں ہیں جن کی قیادت علیحدگی پسند کرتے ہیں۔ مختلف مقامات پر انتشار برپا کرنے والے۔ اس کے علاوہ چھاترو لیگ یعنی طلبہ کی تنظیم جو حد درجہ جوشیلی اور جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے والی ہے۔ ہمارے مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کے لیے سب سے موثر افرادی قوت طلبا ہی ہیں جن کو استحصال اور استعمار کے نعروں سے کسی بھی سمت میں لے جایا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ مکتی باہنی، شانتی باہنی اور سیاسی جماعتوں کے متحارب گروپ جو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لا اینڈ آرڈر کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں چنانچہ خانہ جنگی اور انارکی کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں سادھو رام کہ وہ خطۂ زمین اب کسی کا بھی نہیں اور سب کا ہے۔ حکومت کسی کی نہیں مگر سب حاکم ہیں... ایک صوبے میں دس سیاسی اور نظریاتی ریاستوں کے درمیان محاذ آرائی ہو گی تو اور کیا ہو گا۔ ہم تو اس صورتِ حال کو ایک ایسی سول وار میں بدلنے میں مدد کر رہے ہیں، جہاں کسی ایک فریق کی طرف سے ہمیں براہِ راست مداخلت کرنے کی دعوت ملے۔ اور ظاہر ہے سادھو رام کہ ہم اسی فریق کی دعوت قبول کریں گے جو غالب ہو۔ ہمارے دشمن کا دشمن ہو اور بعد میں ہمارے مفادات کا تحفظ کر سکے۔"

"آپ کو بھگوان کی آشیرباد حاصل ہے کرنل صاحب۔ ایک دن ایسا ہی ہو گا اور وہ دن دور نہیں ہے۔" سادھو رام نے کہا۔

"نہیں سادھو رام، یہ کام بہت مشکل ہے۔ ابھی تک مزاحمت کرنے والوں کی قوت بہت زیادہ ہے۔" کرنل جگن ناتھ نے ... کہا۔ "جذباتی اور ذہنی طور پر وہ خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں ... ان کی تو بت پرستی کا یہی جذبہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی ... بہرحال تم بتاؤ کہ اس عرصے میں تم نے کیا کچھ جمع کیا ہے۔"

"جتنا ہم نے کیا وہ آپ کی توقع سے زیادہ ہی ہو گا۔" کرماں والی نے مسکرا کے کہا۔

"ویری گڈ۔ میں اس دفعہ زیادہ توقعات لے کر آیا تھا۔" جگن ناتھ نے کرماں والی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے مسرت کا اظہار کیا۔ "خاص طور سے مجھے گزشتہ بار اپنے حریف کرنل راما راؤ کے مقابلے میں شرمندگی ہوئی۔ وہ راجستھان کی طرف سے تین ٹرک نکال لایا۔ حالانکہ وہ راستہ زیادہ لمبا اور دشوار گزار ہے۔"

"اس راستے پر نگرانی اتنی کڑی نہیں ہے کرنل صاحب۔" سادھو رام نے کہا۔ "ریگستانی سرحد سے دن میں اونٹ بھی گزر جائے تو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ میلوں تک غیر آباد علاقے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر سادھو رام تم خود سوچو کہ ہم کتنا رسک لے کر آتے ہیں۔" کرنل جگن ناتھ نے ایک سگار سلگا کے کہا۔ "ہمیں بہت لو لیول پر فلائنگ کرنی پڑتی ہے کہ راڈار کی آنکھ سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر بھی اس ہیلی کاپٹر کی آواز۔ ڈیم اٹ۔ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ بارڈر پٹرول نے سن لی تو وہ صرف ایک فائر کریں گے۔ یہ کوئی سپرسانک فائٹر پلین نہیں ہے۔ اینٹی ائر کرافٹ گنز سے اس کا نشانہ لینا اتنا ہی آسان ہے جتنا میرے لیے پستول سے تمہارے دل کا نشانہ لینا۔"

"میرا دل تو ویسے ہی نشانہ بن چکا ہے جگن ناتھ۔" عورت ہنسی۔

"اس مرتبہ آپ کرنل راما راؤ کے مقابلے میں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔" سادھو رام نے جلدی سے کہا۔

"ایڈیٹ۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس بار تمھیں بہت زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی امید ہے۔ تم بہت لالچی ہوتے جا رہے ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

"صرف مجھے تو الزام نہ دیں کرنل صاحب۔" سادھو رام نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "جب آپ زیادہ مال لے کر جائیں گے تو کیا آپ کو زیادہ فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ کو بھی تو وہی لوگ پیسہ دیتے ہیں۔ وہ بھی ضرورت مند ہیں اور ہم بھی۔ آپ دو ضرورت مندوں کے درمیان کمیشن ایجنٹ بنے ہوئے ہیں کہ اِدھر کا مال اُدھر پہنچا دیتے ہیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو کیا دیتے ہیں۔ اور ہمارا منافع زیادہ ہے یا آپ کا کمیشن۔"

"تم بدگمانی کا شکار معلوم ہوتے ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"آپ کو غلط بات نہیں کہنی چاہیے کرنل صاحب۔" سادھو رام بولا۔ "لالچی ہم ہیں تو آپ کون سی ملک و قوم یا انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور کیا آپ کا یہی کام ہے جو آپ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں۔ ہزاروں کرنل صرف تنخواہ لیتے ہیں۔"

"شٹ اپ۔" کرنل جگن ناتھ نے بجھ جانے والے سگار کو دور پھینک دیا۔ "میں وہی کر رہا ہوں جو مجھ سے کرنے کو کہا گیا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے اور یہ ایسا کام نہیں ہے جو ہر ایرا غیرا کرنل کر سکے۔ یہ انٹیلی جنس کا مشن ہے اور میں کمانڈوز کے آپریشن پلان کرتا ہوں۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ میں کتنے خطرات مول لیتا ہوں۔ میں ہر جگہ جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری کامیابی کا انعام کیا ہے۔ ایک میڈل، تھوڑی سی زمین یا محض تعریف لیکن میری ناکامی کی سزا بہت سخت ہے۔ خواہ میں سرحد کے ادھر پکڑا جاؤں یا ادھر۔ تم کیا کر رہے ہو؟ میرے دیے ہوئے پیسے سے اسلحہ خرید رہے ہو اور بس۔ تمہارے لیے کوئی رسک نہیں ہے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو مگر اپنا رسک میں جانتا ہوں۔" سادھو رام نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں ہندو ہوں اور میری وفاداری پہلے سے ہی مشکوک ہے۔ میرے بارے میں ایک اطلاع کافی ہے جو تم بھی دے سکتے ہو۔ میں ملک کا غدار ہوں۔ مجھے کتے کی موت مار دیا جائے گا اور تمہارا دیا ہوا پیسہ مجھے نہیں بچا سکے گا۔ قانون کی سزا سے پہلے یہی لوگ میری تکا بوٹی کر دیں گے جو آج مجھے سلام کرتے ہیں۔"

"میرے خیال میں تم دونوں خواہ مخواہ کی بحث میں الجھ گئے ہو۔" کرماں والی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "کیا فائدہ ان باتوں سے۔ چلو اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔"

"تو۔ یہاں مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔ "تم یہاں کافی لا سکتی ہو مائی ڈیئر۔"

"وعدہ کرو کہ تم دونوں پھر کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔" کرماں والی مسکرائی۔ "بلکہ بہتر ہو گا کہ اگر تم نیچے جا کر مال کا اندازہ کر لو۔ اتنی دیر میں کافی بنا کے میں باہر ہی لے آتی ہوں۔"

"ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔" کرنل مسکرایا۔ "چلو سادھو رام ابزنس کی بات پہلے ہو جائے۔"

وہ تینوں سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھول کے اندر چلے گئے۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اور دیکھا تھا، وہ حقائق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ کرماں والی اور سادھو رام ملک دشمن ایجنٹ تھے اور دلاور کے مال کو کرنل جگن ناتھ کے ہاتھ بیچ رہے تھے۔ وہ اسلحے کی قیمت ادا کرتا تھا اور اسے بھارت کے راستے مشرقی بنگال کے علیحدگی پسند تخریب کاروں تک پہنچاتا تھا۔ تخریب کار غیر ملکی قوتوں کے آلۂ کار تھے اور انھیں سرمائے کی کمی نہیں تھی چنانچہ دلاور کا مال دھڑا دھڑ بک رہا تھا۔ کرماں والی اور سادھو رام کے خزانے بھر رہے تھے اور اگرچہ کرنل جگن ناتھ اپنی حکومت کی پالیسی اور ہدایات کے مطابق کام کر رہا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس مشن سے بے حساب مالی فوائد بھی حاصل کر رہا تھا مگر اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جو بات اب تک ایک خیال تھی یا مفروضہ تھی، وہ اچانک حقیقت بن کے میرے سامنے آ گئی تھی اور میں خوف زدہ

بیٹھا تھا۔

خوف مجھے اپنی جان کے جانے کا نہیں تھا۔ اس وقت رالعہ یا محسن اور اپنے سب دوستوں کی زندگیوں کو لاحق خطرات کے احساس سے بھی بے گانہ تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر خوف زدہ ہو رہا تھا کہ کرنل جگن ناتھ یا راما راؤ کے علاوہ کتنے وطن دشمن اپنے پیسے کی طاقت سے اور اپنے مذموم سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر میرے ملک کے دو حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی سازش میں مصروف ہیں۔ کتنی کرماں والی جیسی پُر فریب عورتیں اور سادھو رام جیسے کتنے وطن فروش دولت کی ہوس میں غداری کر رہے ہیں۔ نوین لینہ انھوں نے مشرقی پاکستان کو کہا تھا جہاں بیرونی طاقتوں کی مدد سے انتشار پسند قوتیں ہر محاذ پر سرگرم عمل تھیں۔ وہ معاشی محاذ پر محب وطن بنگالیوں کو شکست دے رہے تھے۔ ناپختہ ذہن رکھنے والے طلبا کی صفوں میں قدم جما رہے تھے۔ اور ان کے خیالات کا رُخ وطن دشمنی کی طرف موڑ رہے تھے۔ وہ مزدوروں میں نفرت کا زہر پھیلا رہے تھے اور کاشت کاروں میں تعصب کا بیج بو رہے تھے۔ بے چینی کے اسباب پیدا کر کے عوام کو حکومت سے بدظن کر رہے تھے مسائل اور مشکلات سے بغاوت کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ طلبا لیڈروں اور سیاسی بے ضمیروں کو خرید کر عوام کو گمراہ کر رہے تھے جھوٹ اور بے بنیاد باتوں پر مبنی پمفلٹ، کتابچے اور پوسٹر شائع کر کے ایک صوبے کو پورے ملک کے خلاف کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے گوریلا جنگ کے لیے مختلف ناموں سے باغی تنظیموں کو ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر دی تھی چنانچہ ملک کے اس حصے میں جگہ جگہ بموں کے دھماکوں سے بے گناہ ہلاک ہو رہے تھے۔ معیشت تباہ ہو رہی تھی۔ کارخانوں کی ہڑتالوں سے پیداوار رک گئی تھی، بے روزگاری مزید مسائل کو جنم دے رہی تھی۔ پُل اور ریلوے لائنوں کی تباہی سے ذرائع مواصلات درہم برہم ہو رہے تھے چنانچہ ملک تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مقامی اور غیر مقامی کے فرق کو نمایاں کر کے اور ان کے درمیان نفرتوں کو ابھار کر دوری والے فاصلے پیدا کر کے مہاجر کو انصار سے، بھائی کو بھائی سے، مسلمان کو مسلمان سے لڑانے کی سازش کامیاب ہوتی نظر آتی تھی۔

میرا رُواں رُواں غیظ و غضب کی آگ میں جل رہا تھا لیکن اس سے زیادہ عذاب اپنی بے بسی کا تھا کہ میں کرماں والی اور سادھو رام جیسے شیطانوں کے خلاف کارروائی میں سرکاری سطح پر کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا کیونکہ ملکی قانون کے تحت میں ایک مفرور قاتل اور متعدد وارداتوں میں مطلوب مجرم ہوں۔ میری سننے سے پہلے ہی مجھے پابندِ سلاسل کر دیا جائے گا اور میری زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھے قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں جو کچھ کرنا تھا مجھے خود ہی کرنا تھا

ہوئے اور اپنے چند رفیقانِ باصفا کی مدد پر بھروسا کرتے ہوئے۔ ایسے ان گنت سادھو رام ہوں گے اور نہ جانے کتنی کرماں والیاں ہوں گی جو اس ملک میں رہ کر اسی کی تباہی کے دشمنوں سے ضمیر کے سودے کر رہے ہوں گے۔ میں اکیلا ان سب کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ خدا نے مجھے کوئی غیبی قوت نہیں دی تھی اور مافوق الفطرت صلاحیت نہیں بخشی تھی۔ جو کچھ تھا، میرا عزم تھا اور میرا حوصلہ تھا۔ یہ یقین تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اگر میں ان وطن دشمنوں کے خلاف سر سے کفن باندھ کے نکلوں گا تو اور نکلیں گے اور قافلے بنتے جائیں گے۔ قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم۔ اور سب کو یقین ہے کہ جتنے بھی ملک دشمنوں کو ٹھکانے لگا سکا، وہی یوم حشر میری سرخروئی کی سند ہو گا۔

سادھو رام اور جگن ناتھ کے باہر آ جانے سے میرے خیالات کا تسلسل باقی نہ رہا۔ انھوں نے مشکل سے دس منٹ اندر گزارے ہوں گے لیکن دس منٹ میں مجھے کچھ آرام مل گیا تھا، ورنہ میں کشیدہ اعصاب اور ذہنی تناؤ کی کیفیت میں بے حس و حرکت اور ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی کرماں والی ٹرے میں کافی کے مگ لیے نمودار ہوئی۔ مگر اب وہ کرماں والی نہیں رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ گیروے رنگ کے چغے کی جگہ اس نے بہت چُست قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ قمیص کی آستینیں بہت تنگ تھیں اور اس کے صحت مند بازوؤں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ قمیص کے سُرخ رنگ میں اس کی بے داغ جلد کا مرمریں رنگ بہت روشن دکھائی دیتا تھا۔ یہی روشن خیالی قمیص کے گلے سے بھی عیاں تھی جو کسی لیڈیز فیشن ڈیزائنر نے ایجاد کیا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے، میلے اور بے رونق، خاکستری بالوں کی وگ بھی ہٹ چکی تھی اور نیچے سے اس کے کندھوں تک آنے والے، بڑی نفاست سے تراشے ہوئے اور بہت سلیقے سے سیٹ کیے ہوئے بال نمودار ہو گئے تھے جو ریشم کے سرکتے ڈھیر کی طرح پھسلتے ہوئے اس کے چہرے پر آ جاتے تھے اور پھر موجِ آب کی طرح لوٹ جاتے تھے۔ اس کا یا کلپ چند منٹ لگے تھے چنانچہ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ لباس گیروے چغے کے نیچے پہلے سے موجود تھا۔ چغے کے ساتھ ہی اس نے وگ بھی اتار دی تھی۔ بالوں کو تھوڑا سا برش کر لیا تھا اور جتنی دیر میں کافی تیار ہوئی تھی، اس نے لب و عارض کو تھوڑا سا رنگ دے دیا تھا۔ اس تبدیلی کا تاثر انتہائی مسحور کن تھا۔ یکلخت وہ ایک نہایت تند خو اور پُر شباب عورت بن گئی تھی جس کے حسن کی کشش سے کوئی مرد انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"کرماں والی! کاش مجھے آج تھوڑی سی فرصت ہوتی۔" کرنل جگن ناتھ نے بہت دیر تک کرماں والی کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔

"اب تو مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو تم۔" وہ شرما کے بولی۔

"سوری دلربا۔ تمہارا تو نام بھی وہی ہے جو تم ہو۔" کرنل جگن ناتھ نے کہا۔

"یہ نام اس نے بعد میں رکھا تھا۔" سادھو رام نے ناگواری سے کہا۔ "ماں باپ نے تو۔۔۔"

"چھوڑو اس نام کو۔ اس کا نام یہی ہونا چاہیے تھا۔" جگن ناتھ نے کہا۔

"وقت کم ہے جگن ناتھ۔ سودے کی بات کرو۔" سادھو رام نے رقابت کے پُر حسد لہجے میں کہا۔

"مال میں نے دیکھ لیا ہے۔" جگن ناتھ بولا۔ "دام تم بتا دو۔"

"پندرہ لاکھ نقد۔" سادھو رام بولا۔

"پندرہ لاکھ!" جگن ناتھ نے حیرانی سے دُہرایا۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو سادھو رام؟"

"پندرہ لاکھ میں سے نصف پاکستانی کرنسی، نصف انڈین۔" سادھو رام نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔" جگن ناتھ نے برہمی سے کہا۔

"جب تم نے سرحد عبور کر لی تو حد کہاں رہی۔" سادھو رام نے عیاری سے کہا۔ "تم کہاں بیٹھے ہو۔۔۔؟"

"یہ۔۔۔ یہ تم دھمکی دے رہے ہو مجھے؟" جگن ناتھ نے ایکدم ریوالور نکال لیا۔

"ناتھ۔۔" دلربا چلائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے جھپٹ کر ریوالور والے ہاتھ کو دبوچ لیا۔

"یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" جگن ناتھ نے پھنکار کے کہا۔

"ہاں۔ کسی کے نقطۂ نظر سے بھی یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔" سادھو رام بولا۔ "جاؤ، تم اچھے اچھے کام کرو۔ جتنا مال اب تک کمایا ہے، اس سے اپنے جیون کا پرائسچت کرو۔ اناتھ آشرم۔۔۔ ہر دوار میں کوئی مندر، کوئی ودھوا آشرم بناؤ۔۔۔ یہ بُرے کام چھوڑ دو میرے لیے۔۔۔ میں کرنل راما راؤ سے بات کروں گا۔"

"سادھو رام! میں نہیں چاہتا کہ تم کو واقعی قتل کر دوں۔۔۔" جگن ناتھ نے ریوالور جیب میں رکھ کر دلربا کے ہاتھ پر تھپکی دی اور سگار جلانے لگا۔ "اگلی مرتبہ دلربا تمھیں نہیں بچا سکے گی۔ یہ اس سے نصف قیمت کا مال ہے جو تم مانگ رہے ہو۔"

"قیمت کوئی چیز نہیں ہوتی کرنل صاحب۔" سادھو رام بولا۔ "صرف ضرورت ہوتی ہے اور ضرورت کو پوری کرنے کے لیے آدمی سب کچھ کرتا ہے۔ غلامی سے اسمگلنگ تک ضرورت زیادہ ہو تو قیمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ تم کو تو یہ معمولی سی بات سمجھ ہی لینی چاہیے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آگے جا کے تمھاری ضروریات میں اضافہ ہوگا۔ مال اتنا ہی ہوگا اور مانگنے والے زیادہ تو کون لے جائے گا؟ وہی جو قیمت زیادہ لگائے گا۔ اس میں کون سی غلط بات ہے۔ منافع ہمیشہ تو زیادہ نہیں ہوتا جب یہ دن گزر جائیں گے تو ہمیں کون پوچھے گا۔ آج کچھ کما سکتے ہیں تو کیوں نہ کمائیں۔"

"تمھاری یہ بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔" جگن ناتھ نے کہا۔ "میں اس کے دس لاکھ دے دوں گا۔"

"پورے پندرہ لاکھ جگن ناتھ۔ مجھے معلوم ہے پیسہ تمھاری جیب سے نہیں جا رہا ہے۔" سادھو رام نے کہا۔ "لیکن تمھارے حصے کا منافع یقیناً کم ہو رہا ہے تو اس کا توڑ تمھارے پاس ہے۔ تم بھی وہی کرو جو میں کر رہا ہوں۔ جن کو مکتی چاہیے ان سے کہو کہ مکتی کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ قیمت نہیں دے سکتے تو ڈنڈوں سے لڑیں۔ چمٹا چمکنی اٹھا لیں۔ چاقو چھری لے لیں۔"

"تم بہت بڑے رذیل ہو سادھو رام۔" کرنل جگن ناتھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹے بڑے کیا یہاں تو سب ایک ہیں۔" سادھو رام بولا۔ "لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ جو میرا نام سو تمھارا نام۔"

ہیلی کاپٹر کا پائلٹ نیچے اتر کر خاصے فاصلے پر ٹہل رہا تھا۔ دلربا اس کو بھی ایک مگ کافی کا ایک واجبی سی مسکراہٹ کے ساتھ دے آئی تھی۔ غالباً اسے قریب آنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ مذاکرات کی رازداری برقرار رہے۔ اس نے جگن ناتھ کو اٹھتے دیکھا تو سگریٹ پھینک کر آگے بڑھا۔

"میرا دل چاہتا ہے دلربا کہ کسی دن تم کو بھی اڑا لے جاؤں۔" جگن ناتھ نے چلتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" دلربا نے شوخی سے کہا۔ "نیل گگن کے اس پار، فلمی زبان میں۔"

"کہیں بھی۔ ہیلی کاپٹر کو کسی پہاڑی کی چوٹی پر اتار دوں۔" جگن ناتھ ہنسا۔

"اور اتر نا پڑا بحر اکاہل میں، تو تمھارے ساتھ میرا بھی بیڑا غرق۔" دلربا ہنسی۔ اس کے سارے ناز و انداز طوائفوں جیسے تھے۔

"اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ بھاگ چلو تو؟" جگن ناتھ مسکرایا۔ "کیا کرو گی تم؟"

"میں تو ہر وقت تیار ہوں۔" دلربا ہنسی۔ "تم بھگوڑے ہو جاؤ گے۔ اور تمھاری وہ دھرم پتنی جو تمھارے سات بچوں کی پروڈیوسر ہے، وہ بھی ساتھ ہولی تو تم کیا کرو گے؟"

سادھو رام یہ چونچلے اور چاہت کے جھوٹے سلسلے بھی بڑی مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر اڑ گیا تو وہ پھٹ پڑا۔

"مجھے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس کے سامنے مجھے نظر انداز کر دیتی ہو۔۔۔ سب کچھ بھول جاتی ہو۔"

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں تمھاری دھرم پتنی نہیں۔" دلربا نے تڑخ کر کہا۔ "میری ہی وجہ سے وہ تم کو اتنی قیمت دے رہا ہے۔ وہ تمھارے مال کی نہیں میری مسکراہٹ کی قیمت دیتا ہے۔ جو کچھ میں کرتی ہوں، وہ کاروباری ضرورت ہے۔ اس میں میرا ہی نہیں تمھارا بھی فائدہ ہے۔"

سادھو رام کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لیکن دلربا۔۔۔ دیکھ لینا اسی پاگل پن میں کسی دن میں اس کو گولی مار دوں گا۔"

دلربا ہنسی۔ "جس دن یہ کام کرنا ہو مجھے بتا دینا۔ میں یہ زیادہ آسانی سے کر سکتی ہوں۔"

"سچ دلربا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اس پر ریجھ گئی ہو۔۔۔ دماغ خراب ہے میرا۔"

"دیکھو سادھو رام! ہم نے اور تم نے مل کر ایک کام شروع کیا تھا۔ سائیں پاپڑ والے کا تم نے کام تمام کیا۔ پھر تقدیر نے ایک بہت بڑے کام کے لیے ہمیں منتخب کر لیا۔" دلربا نے کہا۔ "اب تک کتنا کما چکے ہیں ہم۔"

"سینتالیس لاکھ اس کاروبار میں۔ تین لاکھ تمھاری پیری مریدی سے۔" سادھو رام بولا۔

"پیری مریدی کو گولی مارو۔ یہ تو ایک اڈا ہے کاروبار کے لیے۔" دلربا نے کہا۔ "مجھے اپنی جوانی یہاں جاہل مردوں کو اولاد کے لیے تعویز لکھ کر دینے اور بدبخت، بدصورت لڑکیوں کی ماؤں سے پیلے کرانے کے نذرانے لیتے نہیں گزارنی ہے۔ لڑکی بدصورت ہو تو کوئی بات نہیں، بدنصیب نہ ہو۔ بدنصیبی کا تعویذ کہیں نہیں ملتا اور جو بے اولاد ہیں ان کو بھلا میں اولاد کہاں سے دلوا سکتی ہوں۔ جب تم نے مجھے سائیں پاپڑ والا کی مریدی میں دیا تھا تو ہمارا ایک ہی مقصد تھا۔"

"مجھے۔۔۔ نہ جانے کیوں شک ہونے لگتا ہے کہ تم مقصد کو بھول نہ جاؤ۔" سادھو رام نے خفت سے کہا۔

"وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔" دلربا بولی۔ "سمجھو یہ آخری سودا۔۔۔ سب ملا کے ہمارے پاس ایک کروڑ لگ بھگ ہو جائیں گے۔ تیس چالیس لاکھ کے سونے چاندی کے پاپڑ بھی تو ہیں میرے پاس۔ اب ہمیں نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں دلربا! میں بھی کچھ دنوں سے ایک انجانا خوف محسوس کرنے لگا ہوں۔" سادھو رام بولا۔ "جیسے وہ سب کچھ جو ہم نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوگا۔ میں اور تم دونوں آگ کے۔۔۔

ہر طرف دشمن ہیں۔ حقیقت آشکار ہوتے ہی یہ سب تمھارے خون سے پیاس بجھا کے بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال کر بھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ ذہن پر آسیب سوار ہے جسے صرف میں محسوس کرتا ہوں۔ بعض اوقات میں رات کو سو نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی اندر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سادھو رام۔۔۔ میں تمھاری موت کا۔۔۔"

"کیوں کرتے ہو ایسی باتیں۔" دلربا نے کہا۔ "دماغ پر زور مت دو۔ چند دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ اندر چلیں۔"

"تم بھی اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ شام ہونے والی ہے۔" سادھو رام نے کہا اور دلربا کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"تمھارے خوف کا آسیب ایک زندہ حقیقت ہے سادھو رام۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بس تم یہ نہیں جانتے کہ اس کا نام سکندر بخت ہے اور وہ اس وقت بھی تمھارے بہت قریب ہے۔ وہ تم کو دیکھ سکتا ہے مگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ آج رات تم پھر مجھے دیکھو گے۔"

ایسا لگتا تھا کہ اب کچھ دیر میں سادھو رام کی واپسی ہوگی۔ اس وقت میں اندر جا کے کوئی تیر نہیں مار سکتا تھا اور باہر بھی سادھو رام کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ اسلحہ بردوش تھا چنانچہ اس کا مسلح ہونا یقینی بات تھی۔ وہ مجھے قریب آنے کی مہلت دیے بغیر گولی مار دیتا۔ سادھو رام کی گاڑی مجھ سے پچاس گز دور کھڑی تھی۔ میں درختوں کی آڑ میں بڑھنا شروع کیا اور سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتا گاڑی تک جا پہنچا۔ حسب توقع چابیاں گاڑی کے اندر ہی لگی ہوئی تھیں۔ یہاں سادھو رام کو یہ خطرہ کسی سے نہیں تھا کہ کوئی اس کی گاڑی لے جائے گا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ میں گاڑی لے کر سادھو رام سے پہلے ڈونگا تین جا پہنچوں مگر کچھ سوچ کر میں نے اس پروگرام پر عمل درآمد کے پروگرام کو مسترد کر دیا اور دوسرا زیادہ خطرناک پروگرام بنا لیا جس میں کامیابی کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ میں نے چابیاں اگنیشن سوئچ سے نکالیں اور اس جہازی سائز گاڑی کی ڈکی کھول کر واپس اسی سوئچ میں لگا دیں کہ سادھو رام دیکھے بھی تو اسے شک نہ ہو۔ پھر واپس آ کر میں ڈکی میں اترا۔ ڈکی میں اسپیئر وہیل اور جیک وغیرہ کے ساتھ انجن آئل کا ایک ڈبا اور بریک آئل کا ایک ڈبا پڑے تھے۔ ڈکی خاصی کشادہ تھی۔ میں نے اپنی جگہ بنائی اور قفل کو کھولنے والے میکنزم کو غور سے دیکھنے کے بعد ڈکی کو بند کر دیا۔ ڈکی اب مقفل تھی اور اس کو چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

اس محدود سی جگہ میں آرام سے لیٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک کروٹ ملا ہوا تھا۔ ڈکی میں ہر طرف کونے نکلے ہوئے تھے اور نٹ بولٹ تھے جو میرے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اس کی سخت سطح پر گرد تھی اور اندر رکھی ہوئی چیزوں کی ملی جلی بو تھی اور گھپ اندھیرا تھا۔ ڈر نے کی صرف ایک بات تھی کہ سادھو رام واپسی میں کوئی پیٹی یا بھاری بھرکم چیز نہ اٹھا لائے جس کو ڈکی میں رکھنا ضروری ہو۔ تاہم اس خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ ڈکی کھولے گا تو اس کے قفل میں چابی لگنے کی آواز آئے گی اور ایک سیکنڈ بعد مضبوط فولادی اسپرنگ ڈھکنے کو خود ہی اٹھا دیں گے۔ اس وقت سادھو رام مجھ سے ایک ڈیڑھ فٹ دور ہوگا اور ڈکی میں میری یا کسی اور کی موجودگی اس کے لیے ناقابل یقین سی بات ہوگی۔ اس کی حیرانی ختم ہونے سے قبل ہی میں اچھل کر باہر نکلوں گا اور اس کی گردن دبوچ لوں گا یا ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اندر کھینچ لوں گا۔ اس طرح کہ رکوع کی حالت میں سادھو رام کا جسم جھکا ہے۔ اس کا سر اندر میری گرفت میں ہو اور ٹانگیں باہر ہوں۔ اس حالت میں اس سے اسلحہ چھیننا بھی ممکن ہوگا اور اس کی مدد کے لیے آنے والے کو روکنا بھی۔

یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا کہ کرماں والی درحقیقت سادھو رام کی ایجنٹ ہے جس کو خود اسی نے سائیں پاپڑ والے کو قتل کرنے کے بعد پیری فقیری دی ہے۔ کرماں والی کے بھیس میں وہ ایک غلیظ بالوں سے میلی کچیلی نظر آنے والی، گندے اور پرانے کپڑے لباس میں ملنگ نظر آنے والی عمر رسیدہ عورت تھی جسے لوگ مجذوب کہتے تھے کیونکہ وہ فرشِ خاک پر بیٹھتی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتی تھی جسے گاؤں والے "معرفت" کے اسرار و رموز سمجھتے تھے۔ دنیا دی اسبابِ ظاہری سے بے تعلق نظر آنے والی یہی عورت دلربا کے روپ میں ایک خوب صورت عورت تھی۔ صاف ستھری اور نکھری ہوئی جو آرائشِ جمال کے فن سے آشنا تھی۔ لباس کی حسن آرائی کے انداز جانتی تھی۔ مردوں کے دلوں کو اپنی عشوہ گری سے غلام بنا سکتی تھی اور ایک خطرناک گروہ کی آلۂ کار تھی۔ اس کو سادھو رام نے کہاں سے حاصل کیا؟ یہ سوال غور طلب تھا۔ وہ کوئی مقامی عورت نہیں تھی، اس کے فیشن اسے شہری ثابت کرتے تھے اور اپنی باتوں سے وہ تعلیم یافتہ لگتی تھی۔ اس کی اداکارانہ صلاحیت کو تسلیم نہ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ وہ اپنی شانِ قلندری میں بھی یکتا تھی اور اپنے اصل کاروبار میں بھی۔ گمان کہتا تھا کہ وہ دشمن کی منتخب کی ہوئی اور ان کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی۔ اسے سادھو رام کے پاس اسی لیے بھیجا گیا تھا کہ اس مشکل مشن کے لیے کوئی بہتر عورت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ سادھو رام کے پاس کیسے پہنچی تھی مگر بعد میں سادھو رام نے اسے سائیں پاپڑ والے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دلربا نے سائیں پاپڑ والے کی عقل خبط کر دی ہوگی اور

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

دلربا کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد اس نے سینئر مریدوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دلربا کو اپنا گدی نشین بنا دیا۔ گاؤں والوں نے...... سائیں پاپڑ والے کی زندگی میں ہی دلربا کو اس کا جانشین بھی تسلیم کر لیا ہوگا اور اس کی پیری فقیری کا دھندا چل پڑا ہوگا تو سادھو رام نے اُسے ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔

اب دلربا جسے یہ مقام سادھو رام کی مدد سے حاصل ہوا تھا' اسے یقین دلا رہی تھی کہ ایک کروڑ کا ہدف حاصل ہوتے ہی وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس گاؤں سے اور پھر اس ملک سے لیکن صاف نظر آتا تھا کہ دلربا کو سبز باغ دکھا کر یہاں لانے والا اب دلربا کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہ جگن ناتھ کے عشق میں مبتلا نظر آتی تھی اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس تثلیث کا وہ ضلع باقی نہیں رہے گا جو سادھو رام کہلاتا تھا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔ سادھو رام رقابت میں اچانک جگن ناتھ کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک کروڑ کی رقم اتنی تھی کہ سادھو رام باقی دو کو بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا اور یہی کام دلربا بھی کر سکتی تھی۔ یہ اعتماد کا کھیل نہیں تھا۔ اس میں محبت بھی دھوکا ہو سکتی تھی۔ جگن ناتھ ایک خطرناک' بہادر، دلیر اور خرانٹ شخص تھا۔ جذبات کو عقل کے تابع رکھے بغیر کوئی بھی کمانڈر ایسے مشن میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ پھر وہ شادی شدہ اور بقول دلربا کے سات بچوں کا باپ تھا۔ بے شک وہ ایک دلکش اور وجیہہ مرد تھا مگر دلربا جیسی عورت کو سات بچوں کے باپ پر فریفتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خود جگن ناتھ کی دل لگی کو دل کی لگی سمجھنا محال تھا۔ وہ دلربا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لیے اس کے عشق کی دیوانگی کا ناٹک رچا رہا تھا۔ یہ بلی چوہے کا کھیل تھا جس میں یہ طے کرنا بھی آسان نہ تھا کہ بلی کون ہے اور چوہا کون۔ وہ سب موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے وجود کو ختم کر سکتے تھے۔

میرا جسم درد سے اینٹھنے لگا تھا جب میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ پھر گاڑی کا دروازہ کھُلا اور بند ہو گیا۔ گاڑی کا انجن دو مرتبہ غر کے خاموش ہوا اور تیسری مرتبہ اسٹارٹ ہو گیا۔ سادھو رام نے ریس دی اور گاڑی ایک جھٹکے سے واپس ہوئی۔ دلربا نے سادھو رام کو سی آف کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید وہ پھر جوگن کا بھیس بنائے بے وقوف عقیدت مندوں کو جھوٹی دعائیں اور بوگس تعویذ دے رہی تھی اور ان کے نذرانے ظاہری حقارت کے ساتھ ٹھکراتی جا رہی تھی۔ دال کے پاپڑ، چاندی کے پاپڑ، سونے کے پاپڑ۔ راہِ طلب میں آدمی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

گاڑی نے موڑ کاٹا اور اونچے نیچے راستوں پر دوڑنے لگی۔ ہر جھٹکے پر میرا جسم ڈکی میں تہ و بالا ہو جاتا تھا اور بعض اوقات کیل کانٹوں کے چبھنے یا کسی نوکیلے کونے سے لگنے والی چوٹ کی ٹیس سے میری آہ نکل جاتی تھی تاہم میری آواز کے سادھو رام تک پہنچنے کا ڈر نہیں تھا۔ اتنی لمبی کار میں وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا جہاں انجن کا شور زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ پھر دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ڈکی میں دھواں بھر رہا ہے۔ سائلنسر جو ڈکی کے نیچے سے گزرتا تھا کسی جگہ سے لیک کرتا تھا اسی لیے گاڑی کی آواز بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی لیکن میرے لیے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ اس سوراخ سے خارج ہونے والا زہریلا دھواں اوپر اُٹھ کر ڈکی میں داخل ہو رہا تھا۔ ڈکی ایئر ٹائٹ نہیں تھی۔ ڈکی کے نیچے والے حصے میں سوراخ تھے جن سے ڈکی دھونے کے بعد پانی نکل جاتا ہے مگر اب انہی سوراخوں سے وہ دھواں اندر آ رہا تھا جس میں انجن سے خارج ہونے والی کاربن مونو آکسائیڈ گیس کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر یہ گیس ڈکی میں جمع ہوتی رہتی اور میں اسی زہریلی ہوا میں سانس لیتا رہتا تو کچھ دیر میں بے ہوش ہو جاتا اور بالآخر اسی بے ہوشی میں دنیائے فانی سے کوچ کر جاتا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ ڈونگا تین تک فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور میرا اتنے کم وقت میں انتقال فرما جانا مشکل لگتا تھا۔ آدمی کے جسم میں زندگی کے لیے جدوجہد کی قدرتی مدافعت کی صلاحیت کم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ڈکی میں تھوڑی بہت تازہ ہوا بھی آ رہی تھی۔ چنانچہ ڈکی میں کاربن مونو آکسائیڈ کے جمع ہونے کی رفتار کم تھی۔ میں خود بھی آکسیجن خرچ کر رہا تھا اور کاربن مونو آکسائیڈ خارج کر رہا تھا۔ اگر میں آدمی نہ ہوتا پودا ہوتا تو اس عمل کو الٹ سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور کسی فارمولے کے بغیر حساب لگانے کی کوشش کی کہ اندر کی ہوا میں آکسیجن کو ختم ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟ گاڑی پہلے ڈونگا تین پہنچے گی یا میرے ہوش و حواس پہلے ساتھ چھوڑ جائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

چند منٹ بعد میرا سر بھاری ہونے لگا اور میری طبیعت مالش کرنے لگی۔ یہ کاربن مونو آکسائیڈ کے زہریلے اثرات کا نتیجہ تھا۔ الوداع رابعہ! میں نے دکھی دل سے سوچا۔ تمہارا عاشق دیوانہ جو ہزار جان لیوا مرحلے طے کر کے تمہارے حضور پیش ہونے کا آرزومند تھا' ناشاد و نامراد اس دنیا سے جاتا ہے۔ اب ملیں گے عرصۂ محشر میں دیوانے تیرے۔ چوہدری دلاور کے بچ جانے کا داغ دل پر ہے۔ مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ نہایت فضول اور بے سر و پا خیالات کے ساتھ آہستہ آہستہ میں بے ہوشی اور بے حسی کے سمندر میں غرق ہو گیا جہاں نہ رابعہ تھی اور نہ دلربا۔ بس ایک خلا تھا جو موت کے بعد کی بے خبری سے کم نہ تھا۔

معلوم نہیں مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ اندھیرا اب بھی میرے گرد محیط تھا لیکن میں بہت کچھ محسوس کر سکتا تھا مثلاً یہ کہ جسم اکڑ چکا ہے اور اب حرکت کرنا بھی باعثِ آزار ہے۔ میرا سر اندھوں پر رکھی ہوئی چٹان لگتا تھا اور میری توانائی کا لیول صفر تھا۔ تاہم اپنے خود کو اسی دنیا میں پا کے خوشی ہوئی اور یہی خوشی میرے لیے حوصلے اور توانائی کے حصول کا سبب بن گئی۔ غالباً گاڑی کے رک جانے سے انجن کی زہریلی گیس کا اخراج بند ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ ڈکی میں زندگی بخش تازہ ہوا بھرتی گئی تھی۔ اگر گاڑی چلتی رہتی تو میرا ہوش میں آنا ناممکن تھا۔ میں نے خاصی کوشش سے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور درد کی اذیت کو برداشت کیا۔ میرے کان کسی آواز کو سننے کی کوشش میں ناکام رہے۔ گاڑی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

بالآخر میں اس قابل ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کے ڈکی کے قفل کو اندر سے کھول سکوں۔ اس کے لیے مجھے اندازے کی مدد سے ایک لیور کو ہٹانا تھا جسے ایک اسپرنگ نے دبا رکھا تھا۔ ڈکی کے ڈھکنے کو اوپر اُٹھانے والے اسپرنگ بھی اپنا کام کر رہے تھے چنانچہ لیور بڑی سختی سے ہک میں دبا ہوا تھا۔ اُسے ہٹانے کے لیے ضروری تھا کہ ڈکی کو اوپر سے دبایا جائے۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ڈکی کے ڈھکنے میں اندر کی جانب لگی ہوئی فولادی پٹیاں ایک کراس کی شکل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے ہاتھ نے ایک پٹی کو گرفت میں لے کر نیچے کھینچا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے میں نے لیور کو دبایا۔ لیور ہلا اور ہک سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈکی کا ڈھکنا اُٹھ گیا اور میں نے تازہ کھلی فضا میں سانس لے کر اپنے سر پر پھیلے ہوئے تاریک آسمان کو دیکھا جس کی وسعت کو ستاروں نے سجا رکھا تھا۔

میں ایک جست میں باہر آ گیا۔ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ گاڑی ایک کچی فصیل کے اندر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف باغ تھا یا جنگل۔ دوسری طرف ایک مختصر سی عمارت تھی جس کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے مگر شیشوں کے پیچھے روشنی تھی۔ یہ روشنی کسی گھریلو قسم کے جنریٹر سے پیدا ہونے والی بجلی کے دم سے تھی۔ پٹرول یا مٹی کے تیل سے چلنے والے جنریٹر کی آواز سکوتِ شب میں صاف سنائی دیتی تھی۔ میں اسی آواز کی طرف بڑھا۔ یقیناً یہ سادھو رام کا گھر تھا۔ میں اس کو اپنے شہری معیار سے مختصر عمارت قرار دے رہا تھا مگر گاؤں میں یہی ایک حویلی تھی۔ پکی اینٹوں کی بنی ہوئی اس عمارت میں چار پانچ کمرے ہو سکتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اکیلا رہتا ہے یا بیوی بچوں کے ساتھ تاہم حویلی میں نوکروں کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے پورے مکان کا ایک چکر لگاتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ خود دیوار کے سائے میں رہوں اور میرے قدموں کی آہٹ تک سنائی نہ دے۔ اچانک ایک دروازہ کھُلا اور کوئی شخص باہر نکلا۔ میں دیوار سے چپک گیا مگر وہ اپنے خیال میں سیدھا گزر گیا۔ میں نے اس کو فصیل کے دروازے کی طرف جاتے دیکھا جو شاید سو گز کے فاصلے پر تھا۔ گاڑی اسی راستے سے اندر آئی تھی اور وہاں کھڑی ہوئی تھی جہاں ایک میدان سا آتا تھا۔ میں اندر داخل ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں تیزی سے گاڑی کی طرف گیا اور اس کا دروازہ کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دروازہ مقفل نہ پا کے مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اندر جھک کر ڈلیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ پھر گلوز کمپارٹمنٹ کو دیکھا۔ اس میں کاغذات تھے مگر درمیان میں کوئی سخت ابھار سا تھا۔ میں نے کاغذات کو باہر کھینچا تو کوئی چیز آواز کے ساتھ گاڑی کے فرش پہ گری۔ ربر میٹ کی وجہ سے آواز زیادہ نہیں ہوئی اور میں نے جھک کر سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھا لیا۔

یکلخت میں ایک بے بس آدمی نہیں رہا۔ میں ایک طاقت بن گیا ایک ایسی طاقت جس کے سامنے وہ چالاک اور دھوکے باز سادھو رام کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح جیسے طوفان کے مقابل گھاس کا تنکا اور سیلاب کی یلغار کے سامنے ریت کی دیوار کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اب تک میرے ساتھ صرف میرا عزم تھا اور میری قوتِ ارادی تھی اور میرا یقین تھا لیکن میرے ہاتھ خالی تھے۔ اب میں نے جانا اور مانا کہ اسی یقین نے مجھے پھر وہ قوت عطا کی جو ریوالور کی صورت میں میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی کہ وہ دستِ غیب میرے ساتھ ہے جو حق و باطل کی معرکہ آرائی میں ہمیشہ ان کے لیے اسی قسم کے اسباب فراہم کرتا ہے جو اپنے یقین کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنے اندر کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے اسی روشنی کو راہنما رکھتے ہیں جو ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے۔

میں نے ریوالور کو چوما اور اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس کے ہر خانے میں گولی تھی۔ اعشاریہ چار پانچ کیلیبر کی یہ عام سائز کی گولیاں نہیں تھیں اور اس قسم کے ریوالور پولیس یا لازمی سروس کے ارکان کو ہی ملتے تھے لیکن اسمگلنگ اور ہیرا پھیری نے کسی بھی چیز کا حصول آسان بنا دیا تھا۔ ابھی تک میں خاموشی سے موقع محل اور حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھ رہا تھا کہ خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں کیا کچھ معلوم کر سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ رابعہ اور نازو میں سے کوئی اب تک یہاں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کہاں ہے اور سادھو رام کے حفاظتی انتظامات کس نوعیت کے ہیں۔ بعد میں اپنی پوری قوت کے ساتھ میں واپس آؤں تو میری کامیابی کے امکانات کیا ہوں گے۔ لیکن اب میں نے اندر گھس کر تنِ تنہا وہ کام آج ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو پہلے میں کل پہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اُٹھا رکھنا چاہتا تھا۔

مَیں اسی دروازے سے اندر گیا جس سے نکل کر کوئی باہر گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک دروازہ اپنے سامنے دکھائی دیا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے روشن کمرے کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہ سادھورام کا ڈرائنگ روم تھا جو اپنے جدید ترین طرز کے سامانِ آرائش سے لاہور یا کراچی کے کسی بھی فیشن ایبل علاقے کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھا اور ڈونگا پتن جیسے پسماندہ علاقے میں اس منظر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیم پختہ حویلی کو باہر سے دیکھنے والا بھی کچھ نہیں جان سکتا تھا مگر یہ سب اس دولت کا کرشمہ تھا جو اس بے ضمیر شخص نے وطن فروشی کے کاروبار میں کمائی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹس کا دودھیا اجالا تھا اور ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا وہ ایک مختصر سی راہداری یا ڈیوڑھی تھی۔ دوسرا دروازہ مجھے دائیں ہاتھ پر دکھائی دیا جو بند تھا۔ بائیں جانب دو دروازے تھے۔ ان میں سے ایک کھلا ہوا تھا اور اس کی روشنی بھی باہر آ رہی تھی۔ یہ سادھورام کا بیڈ روم ہو سکتا تھا۔

"سیوک، کہاں مر گیا کم بخت؟" کسی عورت نے تیز اور اونچی آواز میں چلا کر کہا۔

"ابھی خود تم نے اسے ملک صاحب کے گھر بھیجا ہے۔ آتے جاتے کچھ وقت تو لگے گا اسے۔" سادھورام کی آواز آئی۔

"ایک نوکر سے کام نہیں چلتا۔ ہزار بار کہا ہے تم سے مگر تم کو کیا۔" عورت اسی آواز میں بولی جو کان کو چھیدتی محسوس ہوتی تھی۔

"کہاں سے لاؤں دوسرا نوکر؟" سادھورام بولا۔ "یہ ایک بھی کسی نے بھیج دیا ہے ورنہ کون ہے اعتبار کے قابل۔ یہاں کے لوگ سب ہمارے دشمن مُسلے ہیں جن کو میں نے بڑی کوشش سے دوست بنا رکھا ہے۔ پھر بھی ان کی دوستی پر اعتبار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچھو یا سانپ کو دودھ پلا کے پالے اور پھر اس سے توقع رکھے کہ وہ ڈنک نہیں مارے گا۔ کوئی اور مسلمان گھر میں نوکر بن کے آ گیا نا تو سارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ اُسے معلوم تو ہو ہی جائے گا۔"

"بس شروع ہو گیا تمہارا بھاشن۔" عورت نے جھلا کر کہا۔ "سر میں پہلے ہی درد تھا۔ ایک پیالی چائے بنانے کے لیے بھی خود ہی جانا پڑے گا۔"

"کومل! تم لیٹو، میں چائے بنا لاتا ہوں۔" سادھورام نے نرمی سے کہا۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بائیں ہاتھ کے دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا کیونکہ اس آدھے کھلے دروازے سے مجھے اندھیرا نظر آیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ کچن ثابت ہوا۔ سادھورام چائے بنانے کے لیے اِدھر ہی آیا تھا۔ مَیں نے دل ہی دل میں اس گھر کا نقشہ بنانے والے کو اُلّو کا پٹھا کہا۔ پیسہ آنے سے سلیقہ اور زندگی کے مہذب طور طریقے تو نہیں آ جاتے۔ یہ عجیب نقشہ ہوا کہ صدر دروازے کے فوراً بعد کچن۔ پھر بیڈ روم میں ڈرائنگ روم۔ شہر میں یہ نقشہ بڑا مضحکہ خیز جاتا۔ ہونا اس کا اُلٹ چاہیے تھا۔ یعنی پہلے ڈرائنگ روم اور آخر میں کچن مگر اس وقت گھر کا نقشہ نہیں بدلا جا سکتا تھا۔ نقشہ تو میری اسکیم کا ایک دم بدل گیا تھا۔ مَیں نے کے پیچھے پناہ لی اور ریوالور سنبھال کے سادھورام کا استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔

سادھورام اندر آیا اور اس نے دوسری طرف ہاتھ بڑھا کے کوئی سوئچ آن کیا۔ کچن میں پچیس واٹ کے بلب کی روشنی پھیل گئی۔ ٹیوب لائٹس اور چھوٹے بلب استعمال کرنے کی غالباً یہی تھی کہ ایک جنریٹر سے پورے گھر کو روشن رکھنا فریج چلانا ضروری تھا اور جنریٹر کی پیداواری صلاحیت زیادہ نہیں تھی۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے ماچس سے مٹی کے تیل کا چولہا جلا لیا۔ اسی وقت مَیں آگے بڑھا اور مَیں نے ریوالور اس کی گدی پر رکھ دیا۔

"آواز مت نکالنا سادھورام۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔ "ورنہ وہ تمہارے حلق سے نکلنے والی آخری آواز ہو گی۔"

سادھورام اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ "تم... کون ہو... کون ہو تم...؟" وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہکلایا۔

"مَیں سائیں پاپڑ والے کا سالا اور تمہارا باپ نمبر دو ہوں۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں ہے اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔" مَیں نے اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔

"کیا... آخر کیا چاہتے ہو تم...؟" وہ بولا۔ "میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تمہارے پاس تمہاری جان تو ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اور کچھ نہ ملا تو مجبوراً وہی لینی پڑے گی۔"

"تم... وہی ڈاکو ہو جس نے... اس علاقے میں رکھی ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تو میرا ایک شاگرد کا پٹھا ہے۔ شاگرد کا نام اُلّو۔" مَیں نے کہا۔ "سنسنی اس وقت زیادہ پھیلے گی جب جی کی لاش کو گاؤں والے کسی درخت سے انتہائی افسوسناک حالت میں اُلٹا لٹکا ہوا دیکھیں گے اور تمہاری دھرم پتنی کے کٹے ہوئے بال بھی اسی درخت کی شاخوں پر ڈیکوریشن پیس کی طرح لٹکے ہوئے ہیں گے۔"

سادھورام کے جسم کی کپکپی کو مَیں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ "بھگوان کے لیے سب کچھ لے لو...؟" وہ گڑگڑانے لگا۔

"جو کچھ چاہیے مجھے اپنے دے چاہیے۔ بھگوان کو اس دنیاوی مال و متاع، سونے چاندی کے پاپڑوں اور گولہ بارود کے ذخیروں سے کیا؟" مَیں نے کہا۔

میرے الفاظ کا خاطر خواہ ردِّعمل ہوا۔ وہ ایک دم پلٹا اور مَیں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے اس کو گھسیٹ کر دروازے کے پیچھے کر دیا۔

"سادھورام! یہ کیسی آواز تھی؟" اندر سے اس کی بیوی نے پکارا۔ مَیں خاموش کھڑا رہا۔

"سادھورام... جواب کیوں نہیں دیتے؟" سادھورام کی بیوی نے زیادہ تشویش کے ساتھ چلا کے کہا۔

"آہ..." مَیں نے حلق کی گہرائی سے ایک درد بھری آواز نکالی۔ "کومل..."

میری صداکاری رائیگاں نہیں گئی۔ کومل دوڑتی ہوئی آئی۔ اُس کو دیکھ کر مَیں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ کومل ذرا بھی نازک نہیں تھی۔ نزاکت کا اس سے اتنا بھی واسطہ نہیں تھا جتنا اس کے پتی کا شرافت سے۔ وہ پانچ فٹ لمبی تھی تو تین فٹ چوڑی بھی تھی۔ کمر اور پیٹ کا محیط شاید چھ فٹ سے بھی بڑھ جاتا۔ وزن اور رنگ کے اعتبار سے بھی وہ کسی بھینس کی قبل از وقت جوان ہو جانے والی صاحبزادی لگتی تھی۔ اپنے کالے رنگ کو غیر اہم سمجھتے ہوئے اس نے سرخ ساٹن کا لہنگا اور چولی زیب تن کیے تھے اور گھر کے اندر ہونے کی وجہ سے دوپٹہ یا چنری بے خبر آ گئی تھی۔ اپنی بدصورتی میں اس نے میک اَپ سے خاصا اضافہ کر لیا تھا۔ کالی چمڑی پر پاؤڈر یوں لگتا تھا جیسے دھوئیں سے سیاہ ہو جانے والے باورچی خانے کی دیواروں پر اناڑی ہاتھ نیلے بالی جیسے چونے سے سفیدی پھیر دیں۔ موٹے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخ تہ جم کر خشک ہو جانے والے لہو کی طرح نظر آتی تھی۔ ایسی بے ڈول اور بھاری بھرکم چیز کا نام کومل رکھنا اتنا ہی ظلم تھا جتنا گوبھی کے پھول کو پھولوں کی نمائش میں رکھنا۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے کائیں کائیں کی طرح حلق سے سیٹی بجانے کے لیے منہ کھولا مگر مَیں نے فوراً کچن کا ایک میلا کپڑا (جسے عرفِ عام میں صافی کہا جاتا ہے) اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ چیخ اس کے گلے میں گھٹ گئی اور مَیں نے اس کی چٹیا پکڑ کے ایک جھٹکا دیا تو وہ اندر آ گری۔ پھر اس نے اپنے پتی دیو کو لمبا لیٹا دیکھا۔

"افسوس کہ تم وِدھوا ہو گئی ہو۔" مَیں نے کہا۔ "تمہارے سر کے درد کا اب کیا حال ہے۔ کہو تو اس کا بھی علاج کر دوں۔ مَیں سر توڑ کے اندر سے خرابی پیدا کرنے والی سب چیزیں نکال دیتا ہوں۔ مثلاً غرور، ہوس، لالچ کے جذبات..."

وہ اپنی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ خوف نے اس کی عقل کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے وہ کپڑا بھی نہ نکال سکی جس نے اس کا منہ بند کر رکھا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اچانک اُس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر دل کی جگہ رکھا اور مَیں نے اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوتے دیکھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اس قد کے ساتھ اتنے وزن کی عورت ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہو سکتی ہے۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بھی آتش فشاں تھی اور سادھورام کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ایک مسلسل خوف کے سائے میں بسر ہو رہی تھی۔ خوف اس کا کہ دولت مند اور اسمارٹ سادھورام اسمگلر ہے اور کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہے یا مارا جا سکتا ہے، خوف اس کا کہ ایسے خطرناک کام کرنے والا اسے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے اور پھر کسی خوب صورت عورت سے بیاہ رچا سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کرماں والی کے اصل روپ سے بھی واقف ہو۔ ایسی صورت میں سادھورام کی طرف سے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر دلربا کے ساتھ بھاگ جائے گا۔ غالباً ان کی اولاد بھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ سب سے مضبوط بندھن جو میاں بیوی کو ہزار اختلافات کے باوجود یکجا رہنے پر مجبور کر دیتا ہے اُن کے درمیان مفقود تھا۔ تفکرات کے روگ اور خوف سے متاثر ہونے والے اعصاب کے ساتھ ہائی بلڈ پریشر جیسا دشمن بھی شامل ہو جائے تو دل کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔

مَیں نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا تو میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا دل شدید صدمے کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور اب اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی مگر مَیں اس کو پانی پلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں سے اُس نے گلاس کو منہ لگا کے دو گھونٹ پیے اور بے ہوش ہو گئی۔ مَیں نے اس کو بڑی مشکل سے اٹھایا اور بیڈ روم تک لے گیا۔ بستر پر سیدھا لٹا کے مَیں نے اس کی نبض دیکھی جو بہت سست تھی۔ مَیں بہرحال کوئی ڈاکٹر نہیں تھا کہ نبض کی رفتار دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکتا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیا ہوا ہے مالکن کو؟" کسی نے میرے پیچھے سے کہا۔
میں چونک کر پلٹا۔ کون... سیوک... غالباً ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے... گھر میں کوئی دوا ہے؟"
"دوا تو ہے مگر تم کون ہو؟" سیوک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔
"بتادوں گا یار... عجیب آدمی ہو تم بھی... یہ نہیں دیکھتے کہ پہلے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔
سیوک نے ایک میز پر رکھی ہوئی بہت سی شیشیوں میں سے ایک اٹھائی۔ "ان کا منہ کھولیں۔" اس نے مجھے حکم دیا۔ میں نے تعمیل کی اور سیوک نے ایک ڈراپر سے کومل کے حلق میں چند قطرے ٹپکا دیے۔
"میں سادھو رام جی سے ملنے آیا تھا۔" میں نے سیوک رام کی نظروں میں پرانے سوال کو پڑھ کے کہا۔ "وہ کہیں گئے ہوئے تھے میں کومل کے پاس بیٹھ گیا۔"
"جب میں گیا تھا تو وہ یہیں تھے۔" سیوک نے کہا۔ "ان کو کہیں بھی نہیں جانا تھا۔"
"جب وہ آجائیں تو پوچھ لینا کہ تم سے اجازت لیے بغیر انھوں نے کہیں جانے کی جرأت کیسے کی۔ تم نوکر ہو ان کے یا مالک۔"
"تم کومل... سادھو رام کو کیسے جانتے ہو؟" وہ بولا۔
"میں تو تم کو بھی جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ملک صاحب کے گھر گئے تھے۔ مجھے کومل نے بتایا تھا۔"
"میں نے تم کو پہلے کبھی اس گھر میں نہیں دیکھا!" سیوک کا شک برقرار رہا۔ اس کا لہجہ ہرگز نوکروں کی طرح نہیں تھا۔ وہ مجھ سے جرح کر رہا تھا اور مطمئن ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی دشمنوں کا ایجنٹ تھا جو نوکر کے بھیس میں سادھو رام پر نظر رکھتا تھا۔ کرماں والی بھی دشمنوں کی تربیت یافتہ ایجنٹ تھی اور انھیں جس مشن پر بھیجا گیا تھا اس میں سادھو رام ان کا مددگار تھا لیکن وہ اس پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دو آدمی اس کے ساتھ لگا دیے تھے۔ وہ تینوں ایک ہی کام کر رہے تھے۔ یعنی پاکستان سے اسلحے کو بھارت کے یا دیگر ممالک کے راستے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں تک پہنچانے کا انتظام۔ مگر ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کی نگرانی کا کام بھی کرتے تھے تاکہ کسی کی نیت بدلتی نظر آئے تو اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔
"تم نے ابھی زندگی میں بہت کچھ نہیں دیکھا میرے لختِ جگر۔" میں نے کہا۔ "مثلاً کیا تم نے ایٹم بم دیکھا ہے؟"
"بکواس بند کرو۔" سیوک نے مشتعل ہو کے کہا۔ "ایٹم بم کے بچے۔"
"میں ایٹم بم کا بچہ نہیں، خود ایٹم بم ہوں۔" میں نے ایکدم ریوالور نکال لیا۔ "بزبانِ شاعر۔ میں خود ہی تماشا ہوں اور خود ہی تماشائی۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم کیا ہو؟"
میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ سیوک گھریلو نوکر نہیں ہے چنانچہ میں اس کی طرف سے محتاط تھا۔ اپنے سامنے ریوالور دیکھ کر بھی وہ ہراساں نہیں ہوا۔ اس نے بڑی پھرتی سے جست لگائی اور فلائنگ کک مار کے گرانا چاہا۔ میں غچہ دے گیا اور وہ کمر کے بل فرش پر گرا لیکن قالین پر اس کو چوٹ نہیں آئی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور پلٹ کر آیا۔ اس نے ایک ٹانگ کی ایڑی پر گھوم کر دوسری ٹانگ میرے شانے پر ماری۔ میں لڑکھڑا کے گرا تو وہ ہوا میں اڑتا ہوا میرے اوپر آگرا۔ میں نے ایک جھٹکا لیا اور اس کو دونوں پیروں کی مدد سے پیچھے اچھال دیا۔ پھر مجھے اٹھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ آگے آیا ہی تھا کہ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ پیچھے جا کر دیوار سے ٹکرایا اور سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش میں ہی تھا کہ ... لگا۔ میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ گھونسے مارے یہاں تک کہ وہ نیم جان ہو گیا اور سیدھا منہ کے بل گرا۔ اس کا ماتھا باورچی خانے کے فرش پر لگا اور یہ آخری ضرب اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں کافی ثابت ہوئی۔ میں نے ہاتھ جھاڑ کر سادھو رام اور سیوک کو دیکھا تو مجھے "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" والا مصرع یاد آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں وہ کھڑے نہیں تھے پڑے تھے اور یہ صفِ مجرماں تھی۔
سیوک کے فوراً ہوش میں آجانے کا اندیشہ کم تھا لیکن ... اس کو کسی مردہ کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا اس کے بیڈ روم تک لے گیا اور اسے قالین پر ڈال دیا۔ پھر میں نے اس کی بیوی کا معائنہ کیا۔ میری نگاہ نے فوراً زندگی اور موت کے فرق کو دیکھ لیا۔ سانس کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والی خفیف سی حرکت بھی مفقود تھی۔ دل کا دورہ مہلک ثابت ہوا تھا۔ بلا اختیار میری نظر نے وہ ... تلاش کی جو سیوک نے دلِ بیمار کو زندگی کی جدوجہد کی توانائی دینے کے لیے استعمال کی تھی۔ بہت سی شیشیوں میں بھی اس کو تلاش کرنا دشوار ثابت نہ ہوا کیونکہ وہ ایک ہی شیشی تھی جس کو ... ڈبے میں نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ میرے سامنے وہ ایک زرد رنگ کے ڈبے میں سے نکالی گئی تھی۔ تصدیق کے لیے میں نے دوسری شیشیوں کو دیکھا لیکن وہ سب یا تو بڑی چھوٹی تھیں یا ان کے رنگ مختلف تھے۔ پھر مجھے زرد رنگ کا ڈبا ... آگیا جس میں سے یہ شفاف رنگ کی اور پانی جیسے محلول ... نکالی گئی تھی۔ ڈبے پر وٹامن بی کمپلیکس کے شربت کا نام ... والی کمپنی کا نام، خوراک اور اجزائے ترکیبی سب لکھے ہوئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ دل کے دورے میں وٹامن بی کمپلیکس کے شربت کے چند قطرے کیا اعجازِ مسیحائی دکھا سکتے تھے۔
میں نے اس شیشی کا ڈھکنا کھولا اور احتیاط کے ساتھ بے رنگ محلول کو سونگھا۔ یقین تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ وٹامن بی کمپلیکس کا شربت نہیں ہے جو بہت گاڑھا، زرد، نارنجی یا سرخی مائل زرد ہو سکتا تھا مگر بے رنگ نہیں۔ پھر بی کمپلیکس کی مخصوص بو ہے جو کچھ عرصہ استعمال کے بعد پسینے سے بھی خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بو بالکل جدا تھی۔ یہ ایک سفاک قاتل بو تھی۔ یہ کڑوے باداموں کی بو تھی۔ یہ سائنائیڈ کی بو تھی جو اتنا زود اثر زہر ہے کہ خود مرنے والے کو موت کی خبر نہیں ہونے دیتا۔
میں نے شیشی کو مضبوطی سے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس جنگ میں سب سے پہلے ایک عورت کام آئی تھی۔ سیوک نے تاڑ لیا تھا کہ سارے حفاظتی اور دھوکے دینے والے انتظامات ناکافی ثابت ہوئے ہیں اور ایک خطرناک دشمن اندر آگیا ہے۔ وہ عام آدمی نہیں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ بھی کوئی سربکف کمانڈو ہوگا جو اس قسم کی صورتِ حالات سے نبرد آزما ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ راز کو راز رکھنے کی سب سے کم صلاحیت اسی عورت میں ہے جو سادھو رام کی بیوی تھی۔ اس نے سب سے پہلے کومل کی زبان کو خاموش کر دیا۔ مجھے کومل کی موت کا بالکل افسوس نہیں ہوا۔ جس قسم کے کھیل میں وہ شریک تھی اس میں خاموش تماشائی بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وہ کچھ کرتی تھی یا نہیں کرتی تھی، سادھو رام کی نصف بہتر ہونے کا جرم ایسا تھا کہ اسے نہ اپنے معاف کر سکتے تھے اور نہ بیگانے۔ اس کے دشمن دونوں طرف تھے کیونکہ اس کے شوہر کا دوست کوئی نہیں تھا۔ انگریزی کا وہ مقولہ ہمیشہ سچ ہے گا کہ جاسوس اور غدار کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔
ایک چادر پھاڑ کر میں نے احتیاطاً سادھو رام کے ہاتھ پیر باندھے اور پھر باورچی خانے میں آیا جہاں سیوک اسی طرح بے سُدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کو میں گھر کے تیسرے کمرے میں لے گیا۔ تلاشی لینے پر مجھے اس کے پاس سے بھی ایک خودکار ریوالور اور بہت خطرناک ... خنجر ملا۔ وہ خنجر کے استعمال پر بھی پوری طرح قادر ہوگا۔ ریوالور ... ہو جانے یا چھن جانے کی صورت میں وہ دو چار دشمنوں کی گردن ... سکتا تھا یا پیٹ چاک کر سکتا تھا۔ اس کے پاس شناخت کی کوئی ... دستاویز نہیں تھی۔ اگر وقت ہوتا تو میں اس سے پوچھ گچھ کرتا ... کے مقابلے میں سادھو رام سے تفتیش کے نتائج جلد برآمد ہونے کی امید تھی۔ میں نے دوبارہ دوسرے بیڈ روم کا رخ کرنے سے پہلے سیوک کو ایک رسی کی مدد سے جکڑ کر بیڈ کے ساتھ باندھ ... اس کے دونوں ہاتھ پیچھے تھے اور بیڈ کے ایک کنارے سے ... ہوئے تھے تو سر دوسرے کنارے سے۔ اس کے منہ میں میں نے اتنا کپڑا ٹھونس دیا کہ اس سے زیادہ یا کم منہ کھولنا اس کے اختیار کی بات نہ رہا۔
سادھو رام کو ہوش میں لانے کے لیے پانی کے چند چھینٹے اور تھوڑا سا گلوکوز ملا ہوا پانی کافی رہا جو میں نے چمچے کی مدد سے اس کے حلق سے اتار دیا۔ اس کے مکمل طور پر ہوش میں آنے تک میں ریوالور لیے اس کے سامنے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ میں نے کچن میں ریفریجریٹر بھی دیکھا تھا۔ اس میں مجھے کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے بھی مل جاتا لیکن ایک ہندو کے گھر کا کھانا کھانے پر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ وہ ہندو بھی کوئی نیک چلن اور پارسا نہیں تھا۔ وہ میرے لیے ایک نجس کتے سے زیادہ ناقابلِ برداشت تھا۔ کیونکہ وہ نمک حرام میرا ہم وطن ہونے کے باوجود میرے وطن کے دشمنوں کی سازش میں شریک تھا۔ اگر میں اس کے گھر کا نمک کھا لیتا تب مجھے احساس ہوتا کہ میرے اور اس کے درمیان دشمنی کی بنیاد میں فرق آگیا ہے۔ بالآخر وہ ہلا اور اٹھنے لگا۔
"جہاں ہو وہیں اٹھ کر بیٹھ جاؤ سادھو رام۔" میں نے ریوالور کے اشارے سے کہا۔
"کیا... یہ..." اس کی نظر اپنی بیوی کے ساکت جسم پر جم گئی۔
"ہاں۔ اُسے تمھارے سیوک نے زہر دے کر مار دیا ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ... نمک حرام..." سادھو رام چلّایا۔
"نمک حرام۔" میں ہنسا۔ "یہ تو تم اپنی بات کر رہے ہو۔ جیسے تم تھے ویسا ہی وہ تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"
"میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا!" وہ مٹھی بند کر کے بولا۔
"اگر وہ زندہ رہتا تو تمھیں بھی زندہ نہ چھوڑتا۔" میں نے کہا۔
"خیر تمھارا کام میں نے کر دیا۔ اب صرف تم بچے ہو۔ جب تم بے ہوش پڑے تھے تو میں تم کو آسانی سے قتل کر سکتا تھا۔"
"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ تلخی سے بولا۔
"کیا تم کو زندگی سے پیار ہے سادھو رام؟" میں نے کہا۔
"زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔
"میرا بھی یہی خیال تھا۔ جب آدمی فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینے کی سوچے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس کے پاس ساری دنیا کی خوشیاں خرید لینے کے لیے دولت ہو، وہ کبھی مرنا نہیں چاہے گا۔ اسی لیے میں نے تم کو نہیں مارا کہ میں تم کو ایک چانس دینا چاہتا تھا۔"
"کیسا چانس؟" اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔
"اس دولت کو خرچ کرنے کے لیے زندگی کی مہلت دینے کا چانس جو تم نے بڑے ناجائز مگر جان لیوا ذرائع سے حاصل کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھی۔" میں نے کہا۔ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی کیا کرتے ہیں۔"

" میں نہیں سمجھا کہ تم میرے کون سے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

" دیکھو سادھو رام! صبح سے پہلے یہ کھیل ہر صورت میں ختم ہو جانا ہے۔" میں نے کہا۔" تم کو جگن ناتھ... کرنل جگن ناتھ سے جتنا لینا تھا، وہ تم لے چکے۔ باقی پندرہ لاکھ کا صبح تک نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ کرماں والی دلربا بڑی حسین عورت تھی۔ تھی میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی زندگی کے باقی رہ جانے والے چند گھنٹوں کو شمار کرنے کا کیا فائدہ۔ موضع کرماں والی کے عقیدت مندوں کو صبح سے پہلے ایک المناک حادثے کا شکار ہونا پڑے گا۔"

"تم کون ہو... وہی..." سادھو رام کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

" ہاں۔ میں سائیں جھا پڑ والا ہوں۔" میں نے کہا۔" سائیں پاپڑ والے کا باپ... میں نے تم کو... کرنل جگن ناتھ کو اور دلربا کو اصلی روپ میں دیکھ لیا ہے۔ دلربا کے لیے کوئی چانس نہیں۔ تم وہ سب دولت جو تمہارے پاس ہے اپنے ساتھ لے کر روپوش ہونا چاہو تو میں تمہیں ایک موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ یاد رکھو افشائے راز کے بعد تمہارے لیے نہ اِدھر پناہ ہو گی اور نہ اُدھر۔ شاید وہی جو اَب تک تمہارے دوست تھے، تمہارے زیادہ بڑے دشمن ہو جائیں گے۔ لیکن خدا کی بنائی ہوئی زمین پر تم جیسے حشرات الارض کہیں بھی گم ہو سکتے ہیں۔ سادھو رام بنو، بوٹا سنگھ یا راک ہڈسن... تمہاری دولت تمہاری زندگی کی اور اس کی خوشیوں کی ضامن ہو گی لیکن تمہارے لیے ایک بہت سادہ سی شرط ہے۔"

" کون سی شرط..!" میری باتوں نے سادھو رام کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

" رابعہ اور نازو؟ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنے۔" وہ بولا۔ میں اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔" میں سچ کہتا ہوں۔" سادھو رام نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور اوپر دیکھا۔ میرے جوتے کی ٹو سے اس کی ٹھوڑی پر ٹک پڑی۔ وہ پیچھے گرا تو میں نے اس کی پسلیوں میں، اس کے سر پر اور پیٹ میں اتنی ٹھوکریں ماریں کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔

" اب یاد آیا... رابعہ اور نازو کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک رات تم نے ان کو گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے باہر سے اپنی گاڑی میں اٹھایا تھا۔"

" اچھا... تم ان کی بات کر رہے تھے... میں اُن کے نام نہیں جانتا تھا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

" اسی رات تم نے میرے دو ساتھیوں کو گمراہ کر کے گاؤں کی طرف بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔" تاکہ مجھے اغوا کر سکو۔"

" ان لڑکیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا..!" سادھو رام نے کہا۔

" چھوڑ دیا گیا تھا یا میرے ساتھی چھڑا کے لے گئے تھے؟" میں نے کہا۔

" وہ ... وہ دونوں انھیں نکال کر لے گئے تھے۔" سادھو رام نے کہا اور میں نے خود کو بہت پُرسکون محسوس کیا۔ اگر یہ اطمینان جھوٹا تھا تب بھی بہت غنیمت تھا۔ اس کی تصدیق کی جا سکتی تھی کہ سادھو رام کی بات میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔

" اٹھو سادھو رام۔" میں نے کہا۔" تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں... اس وقت..!" سادھو رام نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

" مجھے معلوم ہے وہ لڑکیاں کہاں ہوں گی۔ اگر وہ وہاں نہ ملیں تو تمہارا یہ چانس ضائع ہو جائے گا۔ صرف ایک ہی چانس تھا تمہارے پاس۔" میں نے کہا۔

میں نے سادھو رام کو اٹھتے ہی ناک آؤٹ کر دیا۔ پھر میں نے اس کو باندھ کر باہر کھڑی ہوئی گاڑی کی ڈکی میں منتقل کیا۔ دوسرے چکر میں سیوک بھی ڈکی میں بند ہو گیا۔ اب گھر میں صرف ایک لاش رہ گئی تھی۔ میں نے اس کو بھی اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ایک لاش مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے سب کھڑکیاں اور دروازے بند کیے۔ باہر قفل ڈالے اور پھر جنریٹر کو آف کر دیا۔ پوری عمارت تاریک ہو گئی۔ میں نے گاڑی کا ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور سوئچ آن کر کے فیول میٹر کو دیکھا۔ ٹینک میں کم سے کم تین گیلن پٹرول تھا جو میری ضرورت کے لیے بہت کافی تھا۔

چند منٹ بعد لمبی چوڑی شیورلیٹ سڑک کی طرف رواں تھی۔ کچے راستے پر مجھے ہچکولے محسوس ہو رہے تھے۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ ڈکی میں پڑے ہوئے سادھو رام اور سیوک کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ یہ کچا راستہ تقریباً چار میل لمبا تھا۔ دھول اور مٹی اڑاتی کار بالآخر پکی سڑک پر پہنچی۔ سمت کا تعین کرنے کے لیے میں نے قطبی ستارے کو دیکھا اور پھر دائیں جانب چل پڑا۔ سڑک پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس بہت دُور تک اجالا پھیلا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی میرے سامنے سے نمودار ہوتی تھی تب مجھے لائٹس ڈم کرنا پڑتی تھی کیونکہ تنگ سڑک پر راستہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میری رفتار غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ نکلا کہ ایک گاڑی جب اتنی ہی رفتار سے مخالف سمت میں جلنے کے

[...] کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کا فاصلہ اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ دوسری گاڑی والا کچھ نہ کر سکا۔ جتنی دیر میں اس نے بریک لگا کے گاڑی روکی ہو گی اور نیچے اتر کے رگڑ سے سائڈ میں پڑ جانے والے ڈینٹ کو دیکھا ہو گا اتنی دیر میں شیورلیٹ کئی میل کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ دوسری گاڑی کا نقصان یقیناً زیادہ ہوا ہو گا کیونکہ وہ نسبتاً چھوٹی گاڑی تھی اور اتنی مضبوط بھی نہیں تھی جتنی ۱۹۵۲ء ماڈل کی یہ شیورلیٹ۔ نمبر وہ خاک نوٹ کرتا۔ شیورلیٹ کا نہ پچھلا بمپر تھا اور نہ ٹیل لائٹس تھیں۔ مجھے نقصان کی ذرّہ برابر پروا نہیں تھی۔ میں تو ایک وجدانی کیفیت میں خیالوں کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار میرے تصور کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی جس میں رابعہ کی صورت کے سوا کچھ نہیں تھا اور یہ ایک ایسی قوت تھی جس کی کشش مجھے نتائج کی پروا کیے بغیر تیز سے تیز تر چلتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب تک اس کی امید اور اس کا خیال نہ تھا میرے دل کی یہ حالت نہ تھی مگر اب اس ایک ساعتِ دیدار سے پہلے چند منٹوں کا یہ انتظار ایک صدی تک ہجر کے عذاب کو جھیلنے کا کرب بننے لگا تھا۔

جس گلی میں ایک ٹیکسی داخل ہو جاتی تھی اس میں شیورلیٹ امپالا جیسی جہازی کار نہیں جا سکتی تھی۔ مجبوراً میں نے اسے گلی کے نکڑ پر چھوڑا۔ دروازے کا قفل خراب تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے چابی نکال کے قفل میں گھمائی مگر دروازہ پھر بھی کھل گیا۔ میرے لیے ایک پریشانی کی وجہ وہ لاش بھی تھی جو پچھلی سیٹ پر پڑے پڑے اکڑ گئی تھی۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر مجھے اس لاش کو یہاں تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سادھو رام کے گھر میں کوئی لاش چھوڑ کے آنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے اس کے گھر کو ایسے بند کیا تھا کہ بعد میں کوئی آئے تو اُسے کوئی شک پیدا کرنے والی بات نظر نہ آئے۔ وہ یہی سمجھے کہ گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ مگر گھر سے نکلنے کے بعد لاش باہر کہیں بھی گرائی جا سکتی تھی۔ راہ میں کئی سنسان موڑ آئے تھے اور ویران علاقے آئے تھے۔ لاش کو کسی گڑھے یا ندی نالے میں ڈالا جا سکتا تھا۔ یہاں اس کی موجودگی میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ بے شک باہر اندھیرا تھا اور اس وقت گزرنے والے بھی بہت کم تھے لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ پیچھے کسی گلی میں لوگ اندر جھانکنے لگیں یا دروازہ کھول کر شور مچا دیں۔ ڈکی میں قید دونوں افراد کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ تھا تو یہ کہ وہ ہوش میں آ کے اندر ہی لاتیں نہ چلانے لگیں۔ ان کے ڈکی کو کھول کر فرار ہونے کا امکان بہت کم تھا۔

چند منٹ تذبذب میں گزر گئے۔ پھر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں سب سے بچھڑا ہوا، دوستی کے سہاروں سے محروم ہو جانے والا، محبت کی روشنی کے گم ہونے سے مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا وہ مسافر تھا جو پھر اپنے رفیقانِ ہمسفر سے آملا تھا۔ پھر محبت کے اُجالے کو دل میں یوں اترتا محسوس کر رہا تھا جیسے دامنِ ابر سے برسنے والی چاندنی ہر گوشۂ چمن کو منور کر دے۔ اور اس مرحلے پر جب مجھے بے خطر آتشِ نمرود میں بھی کود پڑنا چاہیے تھا، میری عقل کیوں محوِ تماشائے لبِ بام تھی۔ میں نے اپنی وارفتگیٔ عشق اور جذبات کی بے خودی کے سامنے سر خم کیا اور اس دروازے کی طرف لپکا جو اپنائیت، خلوص اور یگانگت، تحفظ اور عافیت اور اعتماد اور چاہت کے شہر کا دروازہ تھا۔ دھڑکتے دل کو سینے میں دبائے، میں نے آہستہ سے دستک دی۔ دروازہ غالب نے کھولا۔

" تم... سکندر بخت..!" اس نے فرطِ جذبات میں میرے بازو تھام لیے..." تم آگئے... تم تو مرحوم ہو گئے تھے۔"

" میں مرحوم ہو گیا تھا... تم سب سے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔" ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟"

" وہ... ہم ذرا یقین کر رہے تھے بھائی کہ تم بقلم خود ہو... بھوت نہیں ہو سکندر بخت کے۔" غالب نے آنکھیں مل کر کہا۔

" بھوت کے بچے... باقی سب کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

" باقی سب بھوت کے بچے کہاں ہیں؟" غالب نے کہا۔" آؤ... اندر آؤ... اطمینان سے بیٹھو۔"

" میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

" لوٹ کر تو آنا ہے نا؟" غالب نے کہا۔" نہیں آنا تو مجھے بتاؤ، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

" یار مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں..." میں نے گھر کی ویرانی سے گھبرا کے کہا۔

" اپنے بھائی محسن حسن خان تو گئے ہیں بھیس بدل کے اسلام آباد۔" غالب نے کہا۔

" کیوں؟ بھیس بدل کے کیوں؟"

" اور کیا کرتا بے چارہ باپ کے جنازے کو کندھا تو دے نہیں سکا۔" غالب نے کہا۔" دل ہلکا کرنے کو قبر پر فاتحہ پڑھے گا... اپنی بدبختی کا نذرانہ کچھ آنسو قبر کی مٹی پر بہائے گا۔ بہن سے ملے گا اور لوٹ آئے گا کل تک۔"

" اوہ... تو انکل شیروانی بھی دنیا کے دکھوں سے چھوٹ گئے۔" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

" ہاں، اولاد کا سکھ دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا آخری وقت میں ان کے لب پر محسن کا ہی نام تھا۔" غالب نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا: "مگر نہ اتنے کم وقت میں محسن کو بلایا جا سکتا تھا اور نہ وہ جا سکتا تھا۔ چلا جاتا تو واپس نہ آتا۔"

"اور شہلا... وہ کہاں رہے گی اب؟" میں نے کہا اور وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ابھی تو فوزیہ کے ساتھ ہی تھی۔ ظاہر ہے اس کا وہی ایک ٹھکانا ہے۔" غالب نے کہا۔

پہلی بری خبر سن کے میرا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا تھا اور اشتیاق کا جذبہ دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ میں ایک بار پھر خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور تھا۔ یہ میری دوستی نبھانے کی سزا تھی جو انکل شیروانی نے برداشت کی۔ ان کا بیٹا جو اُن کے آخری دنوں کا سہارا بن سکتا تھا اُن کا نہ رہا اور وہ نہ چاہتے کے باوجود اسی بیٹی کے گھر میں پناہ گیر ہوئے جسے وہ اپنے گھر سے رخصت کر چکے تھے۔ وہ پرانی وضع پر قائم رہنے والوں میں سے تھے۔ داماد کے گھر میں رہنا ان کو سخت گراں گزرا ہو گا مگر انھوں نے یہ بے غیرتی بھی بیٹے کی وجہ سے برداشت کی۔ محسن کی قربانی اتنی بڑی تھی کہ میں نے خود کو بہت چھوٹا محسوس کیا۔ کیا یہ سب کچھ میں کر سکتا تھا؟ شاید نہیں۔ محسن نے دوستی کا حق ادا کرنے میں حد سے گزر کر وہ روایت قائم کر دی تھی جو شاید کسی نے نہ کی ہو گی۔ اس کو آخری وقت میں باپ کے پاس نہ ہونے کا کتنا رنج ہو گا، اس کا میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے محسن کے دل سے غم کا بارِ گراں کم نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ غم کی خلش اس کے دل سے کبھی نہ جائے گی اور وہ کبھی فیصلہ نہ کر سکے گا کہ اس نے میرا ساتھ دے کر والدین کو جو دکھ دیے تھے وہ تقدیر کے گناہ تھے یا تدبیر کی مجبوری کے جرم۔ اس نے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا مگر وقت نے اس فیصلے کو غلطی بنا دیا۔ اس نے کبھی نہ چاہا تھا کہ وہ دوستی پر والدین کے حقوق کو قربان کرے مگر آزمائش کے یہ مرحلے بعد میں پیدا ہوئے اور پھر وہ بے بس ہو گیا۔ اس کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ والدین کے لیے کچھ کر سکے۔ والدین نے اس کی مجبوریوں پر اُسے معاف کر دیا تھا کیونکہ وہ سب جانتے تھے۔ پھر کیا خدا اس کے گناہوں کو معاف نہیں کرے گا جو نیتوں کا بھید جانتا ہے۔

"نازو اسپتال میں ہے۔" غالب نے خاموشی کے وقفے کو توڑنے کے لیے کہا۔

"اسپتال میں! کیا ہوا اسے؟" میں نے چونک کر سر اٹھایا اور وہ آنسو پونچھ دیے جو میری اجازت کے بغیر ہی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

"وہ زخمی ہو گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "مگر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اس کا بھائی اور والدین اس کے ساتھ ہیں۔"

"کس اسپتال میں؟" میں نے کہا۔ "زخمی کیسے ہوئی تھی وہ؟"

"رابعہ کو نکال کر لانے کی کوشش میں۔" غالب نے کہا۔ "محسن اور تمھارا وہ استاد ٹیڈی، خواجہ نیک محمد تو بعد میں پہنچے تھے۔ تم تو جانتے ہو نا اسے۔ اسے بھلا کون قید رکھ سکتا تھا۔ وہ تو تیغ کیا چیز ہم توپ سے لڑ جاتے ہیں، کی عملی تفسیر ہے۔ بس نکل آئی مار دھاڑ کر کے اور رابعہ کو بھی لے آئی۔ پھر اچھا ہوا کہ محسن اور نیک محمد مل گئے وہ بے ہوش ہونے ہی والی تھی۔ یہاں اس کی دیکھ بھال نہیں ہو سکتی تھی اور اسے کسی پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا بھی ناممکن تھا۔ وہ اس قسم کے کیس لیتے ہی نہیں۔ نازو کے شانے میں ایک گولی لگی تھی اور پسلی ٹوٹی تھی۔ غالباً دائیں جانب کی... میاں سکندر بخت، تم سب کی شانِ سکندری ایک طرف اور اس نازک سی لڑکی کی مردانگی ایک طرف۔ اسے تو شاید موت بھی آسانی سے تسخیر نہ کر سکے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے سرکاری اسپتال لے جائیں۔ میں نے اُسے شعبۂ حادثات میں پہنچایا اور ڈاکٹروں کے سپرد کر کے اس کے بھائی کو اطلاع دے دی۔ میرے پریس کے کارڈ نے مجھے پولیس کے چنگل سے محفوظ رکھا۔ میں نے کہا کہ تحقیق تفتیش جو چاہو کر لینا۔ اس کا بھائی بھی سب انسپکٹر ہے، ابھی آ جاتا ہے۔"

"انھوں نے پوچھا تو ہو گا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم۔" غالب بولا۔ "میں تو مال روڈ پر گورنر ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ فائر کی آواز سنی اور ایک چیخ۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ ایک گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ نمبر وغیرہ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس لڑکی کو میں پہچانتا تھا چنانچہ میں اسے لے کر اسپتال بھاگا۔ اس کا بھائی میرا بھی دوست ہے۔ میرا بیان وقتی طور پر چل گیا اور میں نے دیکھا کہ موقع ہے تو پچھلی طرف سے بھاگ لیا۔ سیدھا اپنے اخبار کے دفتر پہنچا اور کام میں لگ گیا۔ شیخ پہنچا تو میں غائب تھا۔ پولیس والے جو شعبۂ حادثات میں ڈیرا ڈالے رہتے ہیں کچھ بھی نہ بتا سکے۔ اِدھر اُدھر دیکھا ہو گا مجھے اور سمجھ گئے ہوں گے کہ میں چکر دے کر نکل گیا۔ میرا نام یاد تھا انھیں۔ بعد میں شیخ کا فون آیا۔ میں نے کہا کہ نازو زخمی ہوئی وہ کیسے؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے معلوم تھا تم یہی پوچھو گے اور ثابت بھی کر دو گے کہ تم اخبار کے دفتر سے نکلے ہی نہیں، بہرحال تم نے اپنا اخلاقی فرض تو پورا کیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ میں نے کہا کیا میں نے اپنا قانونی فرض پورا نہیں کیا؟ تو کہنے لگا کہ وہ الگ معاملہ ہے۔ خیر اتنا کے بعد نازو کی طرف سے ہمیں بے فکری ہو گئی۔ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔"

"مرزا غالب! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ اس لڑکی کا قرض کیسے چکاؤں۔" میں نے کہا۔ "میرے..."

"اکثر لوگ قرض لے کر بھول جاتے ہیں، مثلاً ہم۔" غالب نے کہا۔ "تم بھی یہی کرو۔ عزت آنی جانی چیز ہے۔ کبھی کوئی قرض خواہ مل جاتا ہے تو..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ وہ قرض نہیں ہے مرزا غالب۔ میں احساس کے قرض سے نجات پا کے کدھر جاؤں۔ وہ تو مجھ کو اسی طرح زیرِ بار کرتی رہے گی۔ ایک بار اس نے مجھے میری زندگی دی تھی۔ رابعہ کو بچا کے اس نے مجھے دوسری بار زندگی دی ہے۔"

"رابعہ بھی اسپتال میں ہے۔" غالب نے کہا۔ شاید وہ میرے ذہن کو آہستہ آہستہ ہر صدمے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ میں نے غالب کا گریبان تھام لیا۔ "جو کچھ بتانا ہے ایک ہی بار میں بتا دو... میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

"یہ تم اپنے اسی حوصلے کا ثبوت دے رہے ہو؟" غالب نے مزاحمت کیے بغیر نرمی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے اُسے چھوڑ دیا۔ "کیا وہ بھی زخمی ہوئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ جسمانی طور پر وہ بالکل ٹھیک ہے۔" غالب نے اپنی قمیص کا کالر ٹھیک کیا۔ "وہ ایک نفسیاتی معالج کے زیرِ علاج ہے۔"

"نفسیاتی معالج! صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"تم جیسے معقول آدمی کو ایسی نامعقول بات نہیں کرنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "نفسیاتی مسائل، اعصابی کشیدگی، ذہنی دباؤ، صدمات اور تفکرات۔ ان سب سے ذہن کا متاثر ہونا پاگل پن نہیں کہلاتا۔ کوئی آدمی فولاد کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔ عورت جذباتی طور پر بھی زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ ہسٹریا اس کے جذباتی دباؤ کے حد سے گزر جانے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوتا رہا ہے وہ اس نے عام عورت کے مقابلے میں بہت زیادہ حوصلے کے ساتھ برداشت کیا مگر بالآخر اس میں ہمت نہ رہی۔"

"اب کیا حال ہے اس کا؟ میرا مطلب ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیفیت ٹھیک ہے۔ وہ کسی کو کاٹنے کے لیے نہیں دوڑتی۔ کپڑے نہیں پھاڑتی اور چیختی چلاتی نہیں۔" وہ بولا۔ "گم صم بیٹھی رہتی ہے۔ اور صرف خواب آور انجکشن دینے سے سوتی ہے۔ پہلے اڑتالیس گھنٹے تک اس نے پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس کے علاوہ... وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ وہ اپنے پُرعذاب ماضی سے کٹ گئی ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو ایک شاعر نے بیان کی ہے کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"اور اس کی یہ کیفیت کب تک رہے گی؟" میں نے کہا۔

"تم یہ سمجھ لو کہ وہ ریت کا ایک کمزور پشتہ تھی۔" غالب بولا۔ "اس نے ہر سیلابِ بلا کا مقابلہ کیا اور اُسے روکے رکھا مگر بالآخر سیلاب اُسے بہا کر لے گیا۔ جب سیلاب گزر جائے گا تو اس پشتے کی تعمیر پھر کرنی ہو گی۔ تمھیں... مجھے... ہم سب کو..."

"وہ کون سے نفسیاتی اسپتال میں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ اسپتال نہیں ہے، ایک ڈاکٹر کا گھر ہے۔" غالب نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر بہت مشہور نیورو فزیشن ہے۔ ماہرِ نفسیات اب صرف تحلیلِ نفسی کرنے والے نہیں ہوتے، اسپیشلسٹ ہوتے ہیں۔ برین اسپیشلسٹ۔ ذہن کے مخصوص امراض عارضی ہوں یا دیرپا، سب کا علاج کرتے ہیں، اسی طرح جیسے دوسرے اسپیشلسٹ جسم کے دوسرے حصوں کا علاج کرتے ہیں۔ دواؤں سے اور خصوصی آلات سے۔ وہ ڈاکٹر میرا جاننے والا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ میری بہن ہے اور اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اگر اس کے بارے میں کوئی افواہ بھی پھیلی تو رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اس نے مکمل رازداری کی خاطر رابعہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ وہ بالکل محفوظ ہے اور بہت اچھے ہاتھوں میں ہے۔"

"تم نے بھی موقع پاتے ہی مجھ پر ایک احسان کا قرض لاد دیا۔"

"یہ تمھارا کمپلیکس بنتا جا رہا ہے۔ اگر کوئی تمھارے لیے کچھ کرتا ہے تو اس لیے کہ تم دوست ہو۔ دوستی میں احسان کا لفظ گالی سے کم نہیں ہوتا سکندر بخت۔" مرزا غالب نے کہا۔ "کیا ضرورت پڑنے پر تم میرے لیے کچھ نہیں کرو گے؟"

"کیا میں رابعہ کو دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "آج رات تو میرے پاس وقت نہیں... لیکن کل..."

"ڈاکٹر کا خیال ہے۔ اور ہم سب اس خیال سے متفق ہیں۔" غالب نے کہا: "کہ اس کی ذہنی صحت کی بحالی میں دعا اور دوا کے بعد سب سے اہم کردار تمھارا ہے۔ تم ہی اسے واپس اپنی دنیا میں لا سکتے ہو۔ تمھارے بغیر وہ اس دنیا میں لوٹنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو گی۔ اور تم کو بھی اسے یہ یقین دلانے کی جدوجہد کرنی ہو گی کہ تمھاری دنیا بھی بدل گئی ہے۔ تمھاری وہ دنیا جس میں دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری تھے۔ نفرتوں کے، قتل و غارت گری کے، ظلم اور ناانصافی کے، تشدد اور بے رحمی کے عفریت منڈلاتے تھے۔ موت کے خطرات کے سائے تعاقب کرتے تھے۔ خانہ بدوشی اور دربدری تھی۔ زندگی ایک مسلسل فرار تھی یا تعاقب تھی۔ شاید وہ اس دنیا میں لوٹ کر آنا ہی نہ چاہے۔ پھر تم کو اسے یقین دلانا ہو گا کہ اب تم اسی دنیا میں ہو جس کے خوابوں کی تعبیر تلاش کرتے کرتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ تمھاری دنیا سے اتنی دور چلی گئی۔ تم اسے بتاؤ گے کہ اب دنیا ہی جنت ہے جسے وہ آباد کرنا چاہتی تھی۔ تمھارے ساتھ مل کر۔ پھر ہم سب اسے واپس لے آئیں گے۔ وہ یقیناً واپس آئے گی۔"

"غالب! تم اب بھی اصل حقیقت کو مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"اصل حقیقت یہی ہے جو میں نے بتا دی۔" غالب نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"مجھے شک ہے کہ رابعہ کی یہ ذہنی کیفیت نفسیاتی مسائل اور صدمات کا نتیجہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا اس پر تشدد ہوا تھا؟ اسے اغوا کر کے لے جانے والوں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی۔"

"رابعہ سے ان کو کیا معلوم ہو سکتا تھا؟"

"وہی جو انھوں نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان کو ہماری طرف سے یہ اطمینان نہیں تھا کہ ہم ان کے اصل کاروبار کے بارے میں کتنا علم رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کو تاثر دیا تھا کہ ہمارے نزدیک وہ ہیروئن کے اسمگلر ہیں اور خود انھوں نے بھی کوشش کی تھی کہ خود کو منشیات کے دھندے میں ملوث ثابت کر دیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ سنگین جرم میں ملوث تھے۔ وہ اسلحے کی اسمگلنگ کر رہے تھے اور یہ اسلحہ مشرقی بنگال کے غیر ملکی تخریب کاروں اور ان کا ساتھ دینے والے علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ منشیات کا دھندا تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی جرم تھا۔ انھوں نے خود اپنے خلاف اپنے جرم کے ثبوت مہیا کیے اور ہمیں موقع دیا کہ ہم یہ ثبوت دیکھ لیں... یہ کوشش ہمیں گمراہ رکھنے کے لیے تھی۔ اگر کوئی لڑکا شراب پیے تو اُسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ شرابی کو ماں باپ اور سارے گھر، خاندان اور محلے میں کتنی مخالفت اور نفرت کا سامنا ہوگا۔ وہ خود اپنے بارے میں مشہور کرائے کہ اس کو جوئے کی عادت ہے تو سب اسے بُرا کہیں گے مگر شرابی کے مقابلے میں جواری پھر بھی قابلِ قبول ہوتا ہے۔ انھوں نے مجھے اسی لیے اغوا کیا تھا کہ مجھ سے حقیقت جان سکیں۔ انھیں اطمینان ہو جائے کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہی ہے جس کا ہم اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کیا۔ انھوں نے مجھ پر جسمانی تشدد نہیں کیا۔ میرے ذہن کو مطیع کیا۔ ایسی دوائیں دینے کی کوشش کی جن سے میرا ذہن میرے اختیار میں نہ رہے اور اگر مجھے شبہ نہ ہوتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن میں بچ گیا۔ یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ کیسے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا یہی رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا؟ اور کیا اس کے ذہن پر انہی دواؤں کا اثر ہے؟"

"تمھارا اندازہ درست ہے۔" غالب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد یہ اعتراف جرم کرتے ہوئے کہا۔ "رابعہ پر بھی ذہنی تشدد ہوا تھا۔"

"اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "لیکن کیا اس نے قبول دیا کہ ہم حقیقت کو جانتے ہیں؟"

"یہ وہ خود تو بتا نہیں سکتی۔ نازو کے کہنے کے مطابق اس نے بھرپور مزاحمت کی۔" مرزا غالب نے کہا۔ "اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے دماغ پر منفی اثرات اسی مزاحمت کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح جسمانی تشدد کے خلاف قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسم ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور ناکارہ ہو جاتا ہے ایسے ہی ذہن پر ہونے والے تشدد کو برداشت کرنے سے ذہنی معذوری اور شکست و ریخت ہوتی ہے۔ علاج سے جسم بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ علاج سے اس کا ذہن بھی نارمل ہو جائے گا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔"

"اس وقت میں اتنی دیر رکنے کے لیے نہیں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے ساتھ ایک خطرہ لیے پھر رہا ہوں۔ مجھے آج رات ایک کام ختم کرنا ہے جو کل نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے تم واپس جاؤ گے؟" مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ مجھے مدد کی ضرورت تھی۔ تم تینوں میں سے کوئی میرے ساتھ رہتا تو اچھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن محسن ہے نہیں اور نیک محمد بھی غائب ہے۔"

"میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" مرزا غالب نے کہا۔

"اور بعد میں نیک محمد آئے گا تو پریشان ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کل محسن بھی آ جائے گا۔"

"میں ان کے لیے پیغام چھوڑ جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے چند سطروں میں بتا دو کہ فکر نہ کرے۔ میں خیریت سے واپس آ گیا ہوں اور ضروری سمجھے تو یہ اطلاع رابعہ یا نازو کو بھی دے دے۔ محسن کو بتا دے کہ ہم ڈونگا گلی سے آگے موضع کریاں والی میں ہوں گے۔ اوّل تو ہم صبح تک لوٹ ہی آئیں گے لیکن کسی وجہ سے نہ آ سکے تو محسن اور نیک محمد کے علم میں ہوگا کہ ہم کہاں گئے تھے۔"

غالب نے یہی بات کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھی اور پیغام کو ایک نمایاں جگہ پر رکھ دیا۔ میں نے غالب کو اپنے ساتھ دو ریوالور رکھنے کو کہا اور اپنے لیے بھی ایک اور ریوالور اٹھا لیا۔ مسروقہ، ضبط شدہ اور مالِ غنیمت کی صورت میں ہمارے پاس اتنا اسلحہ جمع ہو گیا تھا کہ ہم جہاں جاتے تھے ایک اسلحہ خانہ لیے پھرتے تھے۔ ویسے تو ہمارے پاس دشمن سے چھینی ہوئی اسٹین گن بھی تھی لیکن اس کے راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد وہ ہمارے لیے بے مصرف ہو گئی تھی۔ اس ملک میں ایک معمولی ریوالور بھی پرمٹ اور لائسنس کے بغیر نہیں ملتا تھا اور لائسنس حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے مقابلے کی یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ ہم دشمنوں سے ہی ان کا اسلحہ چھین کر جمع کرتے جائیں اور ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والا اسلحہ رکھیں۔ ابھی تک اسلحے کی ضرورت پوری کرنے میں سب سے زیادہ مددگار چوہدری دلاور کے شکاری ہوئے تھے جو ہمارا شکار بنے تھے۔ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے یا بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے تو اپنا اسلحہ چھوڑ گئے تھے۔

غالب نے دروازے کو مقفل نہیں کیا۔ دونوں پٹ ملا کے چھوڑ دیا۔ جب میں چلنے لگا تو مجھے زہر کی وہ شیشی یاد آئی جو میری جیب میں پڑی تھی۔ میں نے واپس اندر جا کے اسے ایک محفوظ مقام پر چھپا دیا جہاں اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر میں غالب کے ساتھ گلی کے موڑ تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں رابعہ اور نازو، محسن، نیک محمد اور غالب سب کو اپنی اچانک آمد سے حیران کر دوں گا اور ان کی خوشی سے بھرپور گالیاں سن کے اور ان کی مسرت سے لبریز آنسو پونچھ کے لوٹ جاؤں گا۔ اسے کہتے ہیں اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، مجھے ویرانے میں تنہا بھٹکنے والی روح کی طرح غالب ملا تھا۔ باقی سب غیر حوصلہ شکن ملی تھیں۔ پانچ دس منٹ کے بجائے مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا تھا اور اب میں ڈر رہا تھا کہ اتنی دیر میں ایک حقیقی اور دو زندہ لاشوں کے وجود کا راز فاش نہ ہو گیا ہو۔

وہ مختصر سا مجمع میں نے دور سے ہی دیکھ لیا جو شیورلیٹ کے آس پاس حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ حلقہ بنائے کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ سب باتیں میں فرصت پر اٹھا رکھتا تو اس نئی آفت سے بچ جاتا لیکن باتوں باتوں میں آدھا گھنٹا گزر گیا اور اتنی دیر میں کسی نے گاڑی میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھ لیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔

"مرزا غالب!" میں نے کہا۔ "اس گاڑی میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی، ایک ہندو عورت کومل کی لاش۔"

"لاش... اور وہ بھی ایک عورت کی... عورت بھی ہندو!" مرزا غالب نے سر پکڑ لیا۔ "سبحان اللہ... کیا بات ہے جناب کی۔ اپنے لیے مصیبت بھی تلاش کرتے ہیں تو ایسی کہ 'ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔'"

"شاعری مت کرو، کام کرو۔" میں نے کہا۔ "اس مصیبت سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری ہے۔ دیر کی تو مصیبت تین گنا ہو جائے گی۔ دو بہت خطرناک قسم کے بندے ڈکی میں بھی بندھے پڑے ہیں۔ آؤ اب ہم قریب جا کے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ گاڑی والے کی واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ممکن ہے کسی کو بھیج چکے ہوں کہ پولیس کو بلا لائے۔" مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر صورت میں تم قریب جا کے لوگوں سے بات کرو۔ عام تماشائی کی طرح پوچھو کہ بات کیا ہے۔ پھر جاؤ اور کسی باوردی پولیس مین کو پکڑ لاؤ۔ اُسے دو چار سو کی جگہ ہزار بھی دینے پڑیں تو کوئی بات نہیں۔ کسی صورت اسے یہاں تک لے آؤ۔ اور اس سے کہو کہ مجمع کو منتشر کر دے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے بھگا دے۔ تمھارا پریس کارڈ کام آ سکتا ہے۔"

"کوئی پولیس والا اگر مل بھی گیا تو کیا وہ خود لاش کو نہیں دیکھے گا؟" غالب نے کہا۔

"ایک پولیس والا ایک آدمی ہوتا ہے۔ اُس سے نمٹا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنے بڑے مجمع سے میں اکیلا نہیں نمٹ سکتا۔"

"چلو میاں سکندر... تمھاری دوستی میں جو بھی ہو جائے کم ہے۔" مرزا غالب نے آہ بھری۔ "تم تو پوری کوشش کر رہے ہو کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی فوت کر دو مگر نہ جانے کیوں تقدیر ہمیں بچا رہی ہے۔"

گاڑی کے آس پاس دس بارہ آدمی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ دہشت زدہ سے کھڑے تھے اور کچھ گاڑی کے شیشوں سے ناک لگائے اور اندر تاریکی میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر یہ شارعِ عام ہوتی تو اتنی دیر میں دس بارہ نہیں سو ڈیڑھ سو افراد کا ہجوم ہوتا۔ میں نے اور غالب نے انجان بن کے اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

"کیا ہوا ہے جی؟" میں نے ایک بابو ٹائپ شخص سے کہا۔

"گاڑی میں لاش پڑی ہے۔" اس نے بے حد پُراسرار انداز میں سرگوشی کی۔

"اچھا! کس کی لاش؟" میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

"عورت کی۔" بابو نے کہا۔ "دیکھو... دیکھو تم بھی..."

"گاڑی کس کی ہے؟" میں نے اسی رازدارانہ انداز میں پوچھا اور لاش کو دیکھنے سے گریز کیا۔

"معلوم نہیں... یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے کوئی۔" بابو نے بتایا۔

"تمھارا مطلب ہے گاڑی یہاں رہنے والے کسی شخص کی نہیں ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

بابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنی بڑی گاڑی ہو سکتی ہے یہاں کسی کے پاس۔ یہاں تو کسی کے پاس سائیکل بھی ہو تو وہ اسے گاڑی کہتا ہے۔"

"ابھی آ جاتی ہے جی پولیس۔" کسی نے بہ آوازِ بلند کہا اور میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے اس لاؤڈ اسپیکر کو دیکھا۔ وہ کوئی پہلوان لگتا تھا۔

"کیا کوئی گیا ہے پولیس کو بلانے کے لیے؟" مرزا غالب نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں۔ بھیجا تو تھا ایک بندہ۔" پہلوان بولا "اب وہ گھر جا کے بیٹھ گیا ہو تو پتا نہیں... سب ڈرتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ... ڈرنے کی کیا بات ہے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں لاتا ہوں ابھی پولیس کو... مگر آپ لوگ ایسا کریں کہ یہاں مجمع بالکل اکٹھا نہ ہونے دیں... آپ پہلوان جی... اور آپ مولانا صاحب... خان صاحب آپ بھی... آپ تینوں سب کو چلتا کریں اور کسی کو مت رُکنے دیں۔"

"چنگا جی..." پہلوان نے فوراً یہ ذمے داری قبول کر لی۔ "آپ ذرا فٹافٹ پولیس کو لے آؤ... اور ہاں... چلو باقی سب اِدھر سے چلتے پھرتے نظر آؤ... کوئی دنگل نہیں ہو رہا ہے یہاں۔"

"ہاں بھئی توبہ استغفار کرو۔" مولانا نے کہا۔ "اپنے گھر جاؤ اور موت کو تماشا مت سمجھو... خود ہمیں بھی مرنا ہے ایک دن۔"

"واہ اوئے صوفی... بات ایسے کرتا ہے جیسے خود کو نہیں مرنا۔" ایک نوجوان نے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ "خود بھی تو گھر جا۔"

"چل اوئے سُور دے پُتّر... گھنس مار کے دند کڈ دیاں گا..." پہلوان نے غرا کے نوجوان کی بات کا جواب دیا۔ لوگ فوراً کھسکنے لگے۔ تیسرا شخص میں تھا جس کو غالب نے خان صاحب کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بھی حسبِ توفیق اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لیا اور بالآخر وہاں ہم تین رہ گئے۔ اس کے بعد ہم نے کسی کو بھی وہاں نہیں رُکنے دیا۔

غالب دس منٹ بعد ایک وردی والے ٹریفک کانسٹیبل کے ہمراہ نمودار ہوا۔ بے شک یہ ٹریفک کا مسئلہ نہیں تھا مگر کانسٹیبل تو کانسٹیبل ہی ہوتا ہے۔ اس نے قانون کے محافظ کی حیثیت سے فوراً جائے واردات کا معائنہ کیا۔

"تھانے کون چلے گا؟" کانسٹیبل نے پہلوان اور مولانا کی طرف نظر ڈالی۔

"میں تو مسجد جا رہا تھا۔ عشا کا وقت ہو گیا ہے۔" مولانا نے کہا۔ "مجھے تو آپ معاف ہی رکھیے۔"

"تم چلو گے خان صاحب؟" غالب نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں جی... مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"چلو ایہہ چنگا ہویا، میں وی جانا سی۔" پہلوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کل دنگل اے... کالو پہلوان توں ملنا سی۔"

جب میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر چابی لگائی تو کانسٹیبل حیران ہوا۔ "یہ گاڑی تمھاری ہے... تم نے پہلے نہیں بتایا؟" وہ مجھے ڈانٹ کر بولا۔ ہم تینوں آگے بیٹھ گئے۔ کانسٹیبل دوسری طرف آخر میں رہا۔

"تم نے پوچھا ہی کب تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ابھی تو کہا ہے نے کہ مجھے جانا ہی پڑے گا... گاڑی میری نہ ہوتی تو میں جاتا؟"

"پھر تو میاں جی پھانسی ہو گئی تمھیں... بیوی کو قتل کر کے کہاں پھینکنے جا رہے تھے؟" کانسٹیبل نے ماہر سراغ رساں کی طرح مفروضات پر کیس بنانا شروع کیا۔ "کس سے لگائی تھی یاری؟"

"میں اپنا بیان تھانے جا کر دوں گا۔" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "راستے میں بک بک کرو گے تو ایک جھانپڑ دوں گا۔" ٹریفک کانسٹیبل کا میری گستاخی پر غصے سے برا حال ہو گیا...

"جھانپڑ دے گا... مجھے... تیری تو..."

"ہاں تمھیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "دوسرا اور تیسرا جھانپڑ میں رسید کروں گا۔" اس وقت تک گاڑی بہت دور آ چکی تھی اور ایک سنسان سڑک پر ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کانسٹیبل کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"چھوڑو یار! اسے بھی ٹھنڈا کرو... بہت گرمی دکھا رہا ہے۔" میں نے غالب سے کہا۔

"تم... تم دونوں ساتھی ہو...؟" کانسٹیبل کا رنگ اڑ گیا۔ "قتل تم دونوں نے کیا تھا؟"

"ہاں۔ ہم یہ کام مل کر کرتے ہیں۔" مرزا غالب نے کہا۔ "جتنے قتل کیے ہیں اتفاقِ رائے سے کیے ہیں۔ ویسے تم رہتے کہاں ہو؟"

"کیوں... میرے گھر سے کیا لینا ہے تم کو۔" کانسٹیبل اب سچ مچ پریشان ہونے لگا تھا۔

"ہم تمھاری سہولت کے لیے پوچھ رہے تھے۔" مرزا غالب نے کہا۔ "تمھارے دروازے پر ہی ڈال دیتے تمھیں۔"

"ورنہ لواحقین پریشان ہوتے پھریں گے مردہ خانوں، پاگل خانوں اور جیل خانوں میں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو یار، میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا ہے... مجھے جانے دو۔" کانسٹیبل کی حالت غیر ہو گئی۔

"اچھا... تم کو ہم یہاں گرا دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ڈراپ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شرط یہ ہے کہ تم پلٹ کر نہیں دیکھو گے چالیس قدم ناک کی سیدھ میں سفر کرو گے۔ ذرا بھی گردن گھمائی تو خودکشی کہلائے گی۔"

"توبہ... میرے باپ کی بھی توبہ جو میں مڑ کے دیکھوں... اب مجھے جانے دو۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے ذرا سی دیر کے لیے گاڑی روکی اور اُسے اتر جانے کا موقع دیا۔ اُس نے ہمیں ایک مشترک گالی دی اور سرپٹ بھاگا۔

"اُس کو واپس وہاں پہنچنے کے لیے پانچ چھ میل چلنا پڑے گا، جہاں یہ ڈیوٹی پر تھا۔" مرزا غالب نے ہنس کر کہا۔

"کیا یہ ہمیں پھر تلاش نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔ "جہاں گاڑی کھڑی ہوئی تھی وہاں تک تو پہنچ ہی جائے گا۔"

"وہاں کیا معلوم ہو گا... میں ملتا نہیں۔" غالب نے کہا۔ "تم کئی دن سے غائب تھے۔ لوگوں کے لیے ہم بھی اجنبی تھے۔ اتنی بڑی گاڑی کے مالک کا پتا اسے کون بتائے گا مگر اب آپ یہ فرمائیں کہ اِس بُت کافر نے آپ پر اپنی جان کیوں فدا کی؟"

میں نے اُسے کم سے کم الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو میرے اغوا ہو جانے کے بعد سے میری واپسی تک ہوا تھا۔

"اس لاش سے تو کچھ معلوم ہو نہیں سکتا۔" مرزا غالب نے ساری روداد سُن کر کہا۔ "اسے کیوں لیے پھر رہے ہو؟"

"کبھی نہ کبھی آدمی کو حماقت بھی کرنی پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم جہاں کہو اس کا کریا کرم کر دیتے ہیں۔"

"اس میں سوچنے کی کونسی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "اسے پھر وہیں چھوڑ دیں گے جہاں سے اٹھایا تھا۔ ہم واپس جا رہے ہیں نا؟"

"ہاں! ابھی تو سادھو رام کے گھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے قبضے میں دشمن کے بہت اہم آدمی ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن سیلوک سے یا دلراج سے ایک رات میں کچھ معلوم کرنا مشکل ہو گا۔ یہ عام لوگ نہیں ہیں کہ فوراً سب کچھ بتا دیں۔ ان کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کا مزاج اور ان کی فطرت سب بدل جاتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ جان دے دیتے ہیں مگر بتاتے کچھ نہیں۔ بہت سخت جان لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہوتے تو گوشت پوست کے انسان ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جسم کے عذاب جھیلنے کی حد بالآخر آ جاتی ہے۔"

"بالکل آ جاتی ہے۔ لیکن ہمارے پاس تو آج کی پوری رات بھی نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور یہ رات بھی ہم تفتیش کرتے نہیں گزار سکتے۔ میرا خیال ہے کہ صرف سادھو رام کو آئندہ استعمال کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ تمام ضروری معلومات اسی سے حاصل ہو جائیں گی۔ باقی سب کی کسی کو ضرورت نہیں۔ نہ ہمیں نہ ہمارے دشمنوں کو۔ فیصلہ ہم نے چھوڑ دیا تب بھی وہ ماردیں گے اور ہمارے مقابلے میں زیادہ عذاب دے کر ماریں گے۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی۔ ہمیں پہلے وہ کام کرنا تھا جو فیصلہ کن ضروری تھا اور جسے صبح ہونے سے پہلے ختم کرنا تھا۔ سادھو رام کے ذہن میں سے مفید معلومات برآمد کرنے کا عمل جراحی اس وقت تک جاری رہ سکتا تھا جب تک ہمیں یقین نہ آ جائے کہ اب اس غدار ضمیر فروش کی کھوپڑی خالی ہو چکی ہے۔ میں نے گاڑی کو کچے راستے پر اتارا اور دس منٹ میں ہم پھر سادھو رام کی حویلی میں تھے۔ میں نے جنریٹر چلا دیا، دروازے کھولے اور بیڈ روم کی لائٹ جلائی۔ غالب نے میری مدد کی اور ہم کومل کی لاش کو واپس اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں لے گئے۔ ہم نے اُسے یوں لٹا دیا کہ وہ فطری انداز میں سوتی ہوئی دکھائی دے۔

"بس اب جتنا مالِ غنیمت مل سکتا ہے وہ سمیٹو اور چلو۔" میں نے کہا۔ "ہے تو یہ ہمارے ہی دشمنوں کا مال۔"

"تو مالِ غنیمت جمع کر، میں دیکھتا ہوں کاغذات اور دستاویزات۔" غالب نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے کام کرنے والے کوئی ثبوت گھر میں نہیں رکھتے جو کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو مصیبت بن جائے۔"

"منطقی طور پر یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر بھی تلاش کرنے میں کیا ہرج ہے۔"

میں نے گھر کے اندر مختلف خانوں اور الماریوں کی درازوں سے چالیس ہزار روپے کی پاکستانی کرنسی برآمد کی۔ تقریباً اس سے دگنی مالیت کی انڈین کرنسی ایک سوٹ کیس میں بند تھی۔ معلوم نہیں سادھو رام نے اُسے کس مقصد کے لیے جمع کیا تھا۔ غالباً آڑے وقت کے لیے جب اسے اچانک بھاگنا پڑے تو وہ ایک سوٹ کیس لے کر سرحد پار کر جائے۔ مصیبت کے وقت سب سے بڑا دوست اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سہارا پیسے کا ہی ہوتا ہے جو سارے مسائل حل کر دیتا ہے اور تمام مشکلات سے نجات دلا دیتا ہے۔ سادھو رام جیسے لوگ بے یقینی کے خوف کے سائے میں جیتے ہیں۔ انھیں ایک طرف اپنے خزانوں کے بھرے جانے سے خوشی ملتی رہتی ہے تو دوسری طرف یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ تقدیر نامہرباں ہو گئی تو ایک چھوٹی سی غلطی بہت بڑی سزا بن جائے گی۔ پھر پناہ کون دے گا۔ جن کی تھالی میں کھایا اور پھر انہی کی تھالی میں چھید کیا، وہ تو بُرا حشر کریں گے جن کے لیے یہ سب کیا تھا، وہ بھی اس چھوٹی سی غلطی کو ناقابلِ معافی جرم بنا دیں گے۔ پیسہ ہو گا تو کسی گوشۂ گمنامی میں چھپ چھپا کے بھی زندگی گزارنے کی گنجائش رہتی ہے۔ میں نے اس سوٹ کیس کو بھی باہر لے جا کر ڈکی میں ڈالا۔

سادھو رام بدستور بے ہوش تھا لیکن سیلوک ہوش میں آ چکا تھا اور آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر گرا دیا اور پھر اپنے پیروں پر کھڑا کیا لیکن وہ دوبارہ گر گیا۔ میں اس کو گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اس کے منہ میں سے کپڑا نکال کر اسے ڈرائنگ روم کے قالین پر ڈال دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تمھارا اصل نام کیا ہے سیوک؟" میں نے کہا اور ریوالور لے کر اس کے سامنے یوں بیٹھ گیا کہ وہ سائلینسر کو بھی دیکھ لے۔

"اصلی نقلی نام سے تم کو کیا لینا ہے؟" وہ بولا۔

"ویسے تو تم سادھو رام کے ملازم تھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن درحقیقت سادھو رام تمھارا ملازم تھا۔ کیا تمھارا تعلق بھی آرمی سیکرٹ سروس سے ہے۔ کرنل جگن ناتھ کی طرح۔ یا تم کمانڈوز میں سے ہو؟"

"معلوم نہیں تم یہ فضول سوالات کیوں کر رہے ہو؟" وہ حقارت سے بولا۔ "تم مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں تمھیں سوالات کے درست جواب بھی دوں گا۔ فرض کرو میں کہوں ہاں۔ اور یہ بتاؤں کہ میرا نام کیپٹن ٹام، میجر ڈک یا کرنل ہیری ہے۔"

"ٹام ڈک اینڈ ہیری۔ ایرا غیرا نتھو خیرا۔" میں نے کہا۔ "واقعی نام میں کیا رکھا ہے لیکن تمھارے جواب سے مجھے تمھارے تعلیم یافتہ ہونے کا پتا چل گیا ہے۔ تمھارے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم خصوصی مقاصد کے لیے منتخب کیے جانے والے خاص آدمی ہو۔ ایسے خطرناک مشن کی نگرانی معمولی لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ بات دلربا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ واقعی بہت غیر معمولی عورت ہے۔ میں نے اس کو اصل روپ میں دیکھا ہے اس لیے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ وہ حسن و شباب کے اسلحے کو بے دریغ استعمال کرنا جانتی ہے مگر اس سے زیادہ خطرناک وہ ذہانت ہے جس سے کام لے کر وہ دلربا سے کرماں والی بن گئی۔ اس نے اپنی جگہ بنانے کے لیے سائیں پاپڑ والے کو غائب کر دیا۔ یہ اس کرماں والی کی کرامت تھی یا اُسے وہاں پہنچانے والوں کی۔ مگر اُس نے بہت ہوشیاری سے گاؤں والوں کے سامنے اپنی قلندری کا سوانگ رچایا۔ اس ڈبل رول میں وہ بہت کامیاب رہی۔ لیکن وہ بات آج بھی پسچ ہے کہ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔ تم نے فرض کر رکھا تھا کہ اس ملک کی انٹیلی جنس سوئی ہوئی ہے جب کہ وہ کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہے تھے۔"

"یہ میرے لیے کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں۔" وہ بولا۔ "جب کوئی اس قسم کے مشن پر دشمن کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اسے کوئی خوش فہمی نہیں ہوتی۔ دشمن کو بھلا کون بے وقوف اور کمزور سمجھتا ہے۔ سب ہی جان ہتھیلی پر رکھ کے سرحد پار کرتے ہیں۔ اگر دوسرے ملک کی انٹیلی جنس باخبر ہے تو حیرانی کیسی! جنھیں جان عزیز ہوتی ہے وہ ایسے کام کرتے ہی نہیں۔"

غالب کا خیال ٹھیک تھا۔ سیوک جیسے تربیت یافتہ جاسوس یا کمانڈو سے کچھ بھی نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔ اسے موت کی پروا ہی نہیں تھی۔ "پھر بھی صبح تک تم سوچ لو۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے تمام ساتھیوں کے پتے ٹھکانے بتانا پسند کرو گے یا زندہ رہنا؟"

"تمھاری پیش کش احمقانہ ہے۔ میں غداری کا مرتکب ہونے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ خود کو گولی مار لوں۔" وہ بولا۔

"تمھاری مرضی۔ ہمیں سادھو رام سے بھی کچھ نہ کچھ تو معلوم ہو گا۔" میں نے کہا۔

"اس اُلو کے پٹھے کو تو میرا اصل نام تک معلوم نہیں۔" سیوک ہنسا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس نے کتنا اسلحہ کتنی رقم میں بیچا تھا۔ جگن ناتھ... دلربا... یہ سب نام بے مقصد ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس ہیلی کاپٹر کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا تھا وہ سب بھی بوگس تھا۔" میں نے کہا۔ "خیر... ہم معلوم کر لیں گے... ہم بہت کچھ معلوم کر چکے ہیں لیکن تمھیں نہیں معلوم۔"

"تمھارا تعلق بھی آرمی انٹیلی جنس سے ہے؟" وہ بولا۔

"بھی؟" میں مسکرایا۔ "گویا تم نے اپنے آرمی انٹیلی جنس سے تعلق کو تسلیم کر لیا ہے۔ بس میرا تعلق بھی اسی سے ہے۔ تمھارے سب ایجنٹ... ان کی سرگرمیاں... ٹھکانے اور عزائم... ان کا ساتھ دینے والے ضمیر فروش، پیسے کے لالچ میں ملک کو بیچنے والے یہ سب سامنے آتے جا رہے ہیں۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" وہ بولا۔

"مجھے کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔" غالب نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "اس سے کچھ معلوم ہوا؟"

"معلوم تو ہو جاتا لیکن وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں سادھو رام کو لاتا ہوں۔ دہلی جانا بھی ہے۔"

غالب نے میری جگہ سنبھال لی اور ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔

میں دوسری بار باہر گیا اور سادھو رام کو اُٹھا لایا۔

"دوبارہ غور کرنے پر میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "سادھو مہاراج کو ہمارے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ یہ بہت کارآمد چیز ہے۔ اگر اسے ہم یہاں چھوڑ گئے اور کوئی چھڑا کے لے گیا یا تباہ کر گیا تو نقصان ہمارا ہو گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ چلو اسے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر صبح واپس آئیں گے تو مسئلہ ہو گا۔ یہ گاڑی ہمیں واپس نہیں لانی ہے۔"

"نکال لیں گے اس کا بھی کوئی راستہ۔" غالب نے کہا۔ "مال کتنا ملا؟"

"چالیس نقد... سونا ہے کافی۔" میں نے کہا۔ "انڈین کرنسی کا ایک سوٹ کیس بھرا ہوا تھا جو میں نے گاڑی میں رکھ دیا ہے۔"

"یار بھوک لگی ہے۔" ہم نے وہاں سے اپنی موجودگی کے سارے نشانات مٹا دیے تھے۔ (جلنے سے) والے تھے کہ غالب کہا

"ہوں... ہاں... بھوک تو لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یار ہندو کا گھر ہے۔"

"کھانا تو ہندو نہیں ہوتا۔" مرزا غالب نے دلیل دی۔ "مثلاً بسکٹ پاکستانی ہیں۔ انڈے پاکستانی مرغیوں نے دیے ہیں۔ اور یہاں اس گھر میں تو جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ آخر ان گھروں میں ہم جیسے مسلمان ہی رہتے ہیں جو سادھو رام کے ہم مذہب چھوڑ گئے تھے۔"

"اچھا تو پھر آ جو ملے۔ اللہ کا نام لے کر کھائیں گے تو پاک ہو گا۔" میں نے کہا۔ "بعد میں نہ جانے کب کچھ ملے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو سادھو رام اور سیوک دونوں پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ڈکی میں بند تھے۔ ہم میں سے کسی کو پروا نہیں تھی کہ وہ مر جائیں گے۔ مزا توان کو بہرحال تھا۔ موضع کرماں والی تک کا راستہ رات کے وقت بہت دشوار گزار ثابت ہوا۔ اگر میں اس راستے سے پہلے نہ گزرا ہوتا تو ہم مشکل میں پھنس جاتے۔ ہیڈ لائٹس کو ہم نے آف کر رکھا تھا اور پارکنگ لائٹ کی روشنی جو صرف آگے تھی، راستہ دکھانے کے لیے ناکافی تھی۔ جب مجھے کرماں والی کا ڈیرا نظر آنے لگا تو میں نے گاڑی روک لی۔ رات کے وقت کچے راستے سے کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ لیکن میں نے گاڑی کو تھوڑی دور لے جا کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کیا جہاں اُسے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

غالب نے اور میں نے باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں سائلینسر والے ریوالور بالکل تیار تھے۔ دور گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے اور آدھی رات کے سناٹے میں جھینگر اور مینڈک ہر طرف بولتے سنائی دیتے تھے۔ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ سب سے مشکل اور خطرناک مرحلہ اب درپیش ہے۔ اس میں کامیابی کا انحصار تائیدِ ایزدی پر تھا ورنہ ہم دونوں کیا تھے۔ سیمنٹ کے پلیٹ فارم پر چڑھ کے ہم دبے پاؤں آگے بڑھے۔ غالب کی مسکینی اور صورت پر برسنے والی حماقت آمیز بے چارگی سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا لیکن میں اس کی جرأت رندانہ کا، بے جگری کا اور ہلاکت آفریں جارحانہ انداز کا، اس کے نشانے کے بے خطا ہونے کا مشاہدہ کر چکا تھا اور اس کی مدد پہ اتنا ہی بھروسا کر سکتا تھا جتنا اپنی ذات کی صلاحیت پر۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے غالب کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا اور دستک دی۔ تیسری دستک پر کسی نے اندر سے پوچھا۔ "کون ہے... نام بتاؤ اپنا؟" آواز کسی مرد کی تھی مگر جگن ناتھ کی نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر اور لوگ بھی تھے۔

"میں ہوں سادھو رام۔" میں نے کہا۔ "دلربا سے بڑا ضروری کام ہے۔"

دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ میں پوری طرح مستعد اور گوش بر آواز کھڑا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے جواب نے انھیں مطمئن نہیں کیا تھا۔

"سادھو رام۔ تمھاری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے؟" اس مرد نے پوچھا۔

"مجھے گلے...!" میں نے کھانس کر کہا۔ "زکام سے گلا خراب ہو رہا ہے۔"

"کیا تمھارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں۔ سیوک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس جرح کا مقصد؟ اتنی رات کو یہاں میرے سوا اور کون آئے گا؟"

سیوک کے حوالے نے اسے مطمئن کر دیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور میں ریوالور ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوتے ہی فرش پر گر گیا۔ پہلی گولی جو یقیناً کسی نے مجھ پر چلائی تھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے دلربا کے چلّانے کی آواز سنی اور اس کے بعد دوسری گولی کی جس کے ساتھ ہی کوئی مرد بڑی دلخراش آواز میں چلّایا اور اس کا بھاری بھرکم وجود دھم سے فرش پر گرا۔

"باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار۔" غالب نے اتنی خطرناک اور خونی صورتِ حال میں بھی اپنی عادت کے مطابق کہا۔ "کسی نے فوت ہونے کی کوشش بھی کی تو گولی مار دوں گا۔ الف کی طرح سیدھے کھڑے رہو۔"

میں نے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور کھڑا ہو گیا۔ غالب نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو مغلوب کر لیا تھا۔ مارا جانے والا شخص وہ تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ غالب کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا چنانچہ وہ میرے زمین پر گرنے کے بعد اندر آیا۔ اس وقت شاید ایک ہی شخص کا ریوالور اٹھا ہوا دکھائی دیا تو اس نے مہلت دیے بغیر اسے گولی مار دی۔ غالب کی گولی کا نشانہ بننے والا اب فرش پر تڑپ رہا تھا۔ گولی نے اس کے حلق میں سوراخ کر دیا تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا، غالب کے نشانے کا کمال تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کی دائیں آنکھ غائب کر سکتا تھا یا بائیں نتھنے سے گولی اندر اتار سکتا تھا۔ خون کا فوارہ گردن کے سوراخ سے اُبل کر جعلی خانقاہ کے فرش کو رنگین کر رہا تھا اور مرنے والے شخص کے حلق سے بڑی بھیانک خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔

حجرے میں میرے مقابل چند قدم کے فاصلے پر دلربا کھڑی تھی۔ غالباً اسے سوتے سے اُٹھایا گیا تھا چنانچہ وہ جس قسم کے لباس شب خوابی میں تھی اس کا تصور موضع کرماں والی کے عقیدت مند کر ہی نہیں سکتے تھے اور خود میرے لیے اس کا نائٹ گاؤن باعثِ حیرت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ پیرس نہیں بلکہ پاکستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کا ایک دور افتادہ گاؤں ہے مگر دُہری شخصیت رکھنے والی دلربا۔ سادھو رام۔ سیوک اور جگن ناتھ کی جنڈال چوکڑی اپنے مالِ حرام سے عیش کررہی تھی۔ ان کی بھی زندگی وہی تھی جو اوباش طبع دولت مندوں کی ہوسکتی ہے۔ دلربا کی خوبصورت آنکھوں میں خوف سے زیادہ پریشانی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ اس کی پیری فقیری کا پردہ چاک ہوگیا ہے اور اسے ایک ملنگی کے روپ میں دیکھنے والے اس حالت میں دیکھیں گے تو اس کا کیا حشر کریں گے۔ سائیں پا پڑ والے کا ڈھونگ جو کئی سال سے چل رہا تھا' بڑی بے آبروئی کے ساتھ ختم ہوگا۔ ابھی اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خود اس کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے اور اس کے ولن دُغمس کاروبار کا اور اس کی ساری کمائی کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے جو اس نے خود کو اور اپنے ضمیر کو بیچ کر اکٹھی کی تھی۔ اس کی میلی ملگجی اور دھندلائی ہوئی نظر آنے والی غلیظ آنکھیں' اس وقت سیاہ اور روشن لگتی تھیں اور اجڑے میلے کچیلے بکھرے بالوں کی وگ نہ ہونے کے باعث اصل تراشے ہوئے بالوں کے ریشمی غلاف نے اس کے آدھے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ دلربا بلاشبہ ایسی عورت تھی کہ اس کی خاطر جو شِ رقابت میں کرنل جگن ناتھ اور سادھو رام ایک دوسرے کی جان بھی لے سکتے تھے۔

دلربا کے علاوہ کمرے میں دو افراد اور بھی تھے۔ یہ سب کرماں والی کے کاروباری ایجنٹ یا اس کے محافظ تھے۔ جو دن کے اجالے میں جعلی خانقاہ کے خادم اور کرماں والی کے خصوصی عقیدت مند نظر آتے ہوں گے۔ وہ سب بھی سوتے سے اٹھے تھے اور عام انسانوں کی طرح شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ غالب کی مستعدی نے ان کو بے بس کردیا تھا اور ان کے ہاتھ اپنے اسلحے تک نہ پہنچ پائے تھے۔ وہ سب خطرناک قسم کے لوگ تھے جو کرماں والی کے کاروبار میں اس کے قابلِ اعتماد معاون تھے۔

"حضرات و خواتین۔ میرا مطلب ہے خاتون۔" غالب نے کہا "ہتھیار ڈال دیجیے۔ سیدھے ہاتھ سے نہیں' اُلٹے ہاتھ سے اپنا اپنا ریوالور نکالیے آہستہ آہستہ۔ پھرتی کا مطلب خودکشی ہوگا۔ ریوالور اپنے قدموں میں پھینک کر سب پیچھے والی دیوار کے ساتھ لگ جاؤ اور اپنے اپنے ہاتھ اوپر کرلو۔"

"ہوسکے تو دونوں پیر بھی اٹھالو۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

"کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے اچانک فائر کیا اور ایک موم بتی کو گل کردیا مگر موم بتی اسی طرح کھڑی رہی۔ "میرا نشانہ آج تک خطا نہیں ہوا۔ نمونہ آپ سب کے سامنے ہیں۔ دوسری جانب۔" اس نے مرجانے والے کی طرف اشارہ کیا۔

سب سے پہلے دلربا نے خود کو سنبھالا اور اپنا ریوالور نیچے پھینک دیا۔ ریوالور غالب کے پیروں کے پاس پہنچا۔ دلربا نے بڑی اچھی چال چلی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید غالب جھک کر ریوالور اٹھانے کی حماقت کرے گا اور اسی ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باقی دو محافظ کچھ ضرور کریں گے لیکن غالب صرف مسکرایا اور سیدھا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے صورت سے بے وقوف سمجھنے والے پہلے بھی خود بے وقوف بن چکے تھے۔ اس نے تیسری گولی چلائی جو دونوں محافظوں میں سے ایک کے کان کو چھو کر گزر گئی۔ ان دونوں نے ایک دم ریوالور نیچے پھینک دیے اور پیچھے ہٹے۔ دیوار سے چپک کر ہاتھ اُٹھانے کے بعد وہ دلربا کو دیکھنے لگے جو ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

دلربا ذہین اور چالاک عورت تھی۔ صورتِ حالات اس کے قابو سے باہر ہوچکی تھی مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور ہمارے مقابلے پر ایک عورت کی طرح اتر آئی۔ اس نے مسکرا کر ایک ہاتھ سے زلفوں کو پیچھے کیا۔ "آخر کون ہو تم؟" وہ اپنی خمیر میں مترنم آواز میں بولی۔

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟" غالب نے میری طرف دیکھ کر افسوس سے سر ہلایا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" دلربا نے ایک انگڑائی لے کر کہا جو یقیناً لاجواب تھی۔

"چاہتے ہیں خوب دُکھوں کو اسد۔" غالب نے پھر شاعرانہ جواب دیا۔ "چاہتوں کے یہ سلسلے بڑے دراز ہیں مس دلربا۔"

"کرنل جگن ناتھ بھی تم کو چاہتا تھا اور سادھو رام بھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ وہ تم سے زیادہ دولت کو چاہتے تھے۔ خود تم کیا تھیں؟ اس کا بھی تمھیں علم ہے۔"

"لیکن تمھیں جان کر خوشی ہوگی کہ اب اس کا علم ہمیں بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"موضع کرماں والی کے سادہ دل لوگ سائیں پاپڑ والے کی مرید خاص کرماں والی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مثلاً دعا۔ اولاد کے لیے' بیماری سے شفا کے لیے یا روزگار کے لیے۔ مگر انھیں معلوم نہیں تھا کہ کرماں والی درحقیقت دلربا ہے جو ایک غدار اور بے ضمیر عورت ہے۔ طوائف سے بدتر۔ طوائف تو صرف خود کو بیچتی ہے مگر کرماں والی نے تو اس زمین کو بیچنا چاہا تھا جس نے اسے جنم دیا تھا اور جس میں اس کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں بھی دفن ہیں۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ سادھو رام اور سیوک جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر تم رات کی تاریکی میں کیا کررہی ہو اور کرنل جگن ناتھ کے ساتھ ذہب سودے میں کتنا فائدہ حاصل کررہی ہو۔"

"اور تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس کا بھی ہمیں علم ہے کہ تم دل برا مت کرو۔ قسمت کو بھی برا مت کہو کیونکہ جیسی تم ہو ویسی ہی تمھاری قسمت تھی مگر جیسے تمھارے ظاہر سے لوگ دھوکا کھاتے تھے ویسے ہی تم قسمت کے دھوکے میں آگئیں اور دیکھنے میں تم جتنی خوبصورت لگتی ہو شاید تمھیں اپنا مستقبل بھی اتنا ہی خوبصورت ہوگا۔ مگر عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔"

"تم بہت دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" دلربا مسکرائی۔ میری طرف

مائل ہوکر اس نے غالب پر اپنا جادو چلانے کی کوشش کی جو بے سود ہی تھی۔ غالب عورت سے تو احمق لگتا ہی تھا۔ جسمانی طور پر بھی وجیہہ اور پُرکشش مردانہ شخصیت کا مالک نہیں تھا اور کسی خوبصورت عورت کا اس پر فریفتہ ہونا مشکل لگتا تھا۔ دلربا یہ مشکل کام کرکے ایک جُوا کھیلنے پر آمادہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تیغ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے لیکن ہیرے کا جگر مگر غالب کی عقل کو کسی عورت کا حسن شکست نہیں دے سکتا۔ میں نے بہت پہلے محسوس کرلیا تھا کہ نازو اس کارٹون ٹائپ جمال کو پسند کرنے لگی ہے مگر اس کے دل میں غالب کے لیے چاہت محض پہلی نظر کے عشق کا نتیجہ نہیں تھا اور فلمی قسم کا جذباتی حادثہ نہیں تھا بلکہ آہستہ آہستہ اس نے غالب کے اندر چھپے ہوئے مرد کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا تھا۔ پھر یہ اعتراف ایک احترام میں ڈھل گیا تھا اور احترام نے رفتہ رفتہ نازو جیسی حسین اور خونخوار لڑکی کے دل کو موم کردیا تھا۔ غالب ایک ناقابلِ تسخیر قوت کا نام تھا۔ اس کی جاں نثاری۔ سرفروشی۔ دوستی۔ نشانہ بازی۔ ذہانت اور بے غرضی سب اس کی شخصیت کے ایسے اجزائے ترکیبی تھے جو ایک نظر میں سامنے نہیں آتے تھے۔ اسے جاننے کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کے سارے اسرار و رموز کھلتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ کیا ہے۔

"میں یہاں باتیں کرنے نہیں آیا ہوں۔" غالب نے اچانک تھانیداروں والا لہجہ اختیار کرکے اپنا جملہ ایک انتہائی خوف ناک گالی پر ختم کیا جو عام حالات میں کوئی مرد کسی عورت کی موجودگی میں نہیں لے سکتا۔ یہ دلربا کے ذہن کو حقیقت سے آشنا کرنے والا دوسرا وار تھا۔ غالب آگے بڑھا اور اس نے دلربا کے سنبھلنے سے پہلے اس کے چہرے پر اُلٹے ہاتھ کا زبردست تھپڑ رسید کیا۔ دلربا ایک چیخ کے ساتھ گر پڑی۔ غالب نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے اُٹھایا اور دیوار کی طرف پھینک دیا۔ وہ پھر چلائی مگر غالب نے اسے زمین پر نیلا کرنے دیا۔ "سیدھی کھڑی ہوجا۔" اس نے دوسری گالی دی۔

اچانک میں غالب کی چال سمجھ گیا۔ وہ دلربا کے ساتھ یہ ناشائستہ سلوک صرف اس کے محافظوں کو مشتعل کرنے کے لیے کررہا تھا جو اس کے حقیقی جاں نثار تھے۔ دلربا جیسی عورت اپنے پالتو جانوروں کو اپنے پیچھے دُم ہلاکے آنے پر مجبور کردینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی خواہ کتے کتنے ہی خونخوار کیوں نہ ہوں۔ ایک کتے نے غرا کے جست لگائی اور غالب غوطہ مار کے ایک طرف ہوگیا۔ حملہ آور سیدھا میری طرف آگیا اور میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ محاورے کی بات الگ ہے۔ جاپانی فنِ حرب جوڈو کراٹے میں آڑے ہاتھوں کے وار بڑے کارگر ہوتے ہیں۔ ایسی خطرناک عورت کے محافظ بھی کم خطرناک نہیں تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اسی وقت ہوگیا جب میری سمت بڑھنے والے نے ہوا میں اچھل کر

مجھے فلائنگ کِک لگانا چاہی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا مگر میں لڑکھڑا کے سنبھل گیا اور وہ زمین تک پہنچ کے اُٹھنے نہ پایا تھا کہ میں نے اسے جالیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ غالب ریوالور لیے بہت ہوشیار کھڑا ہے مگر میرے درمیان میں آجانے کا نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ دوسرا کتا اس پر چھلانگ مار دے۔ غالب بلا کا نشانے باز تھا مگر دست بدست جنگ میں وہ یقیناً مار کھا جاتا۔ وہ میری طرح خالی ہاتھوں سے لڑنا نہیں جانتا تھا جب کہ دلربا کے دوسرے محافظ کی جسمانی صحت بہت بہتر تھی اور یہ بھی یقینی بات تھی کہ وہ جوڈو کراٹے پر آگیا تو غالب کے مرحوم ہونے میں دیر نہ لگے گی۔

میں نے پہلے حملہ آور کو ہاتھ کی کلائی کے قریب سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور وہ آگے آیا تو میں نے گھٹنا اوپر اٹھا کے مارا۔ وہ بلبلایا اور اوپر اُٹھ کے نیچے آیا۔ اس کا ایک ہاتھ گھوما اور میں فوراً خود کو بچانے کے لیے جھک گیا ورنہ وہ ضرب میری گردن پر پڑ جاتی تو فیصلہ کن اور مہلک ثابت ہوتی۔ میری گردن ٹوٹ جاتی اور مجھے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی تک کا سفر طے کرنے میں ایک منٹ بھی نہ لگتا۔ کراٹے کے ایسے وار صرف جانی دشمنی میں اس وقت استعمال کیے جاتے ہیں جب مقصد ہی حریف کو ختم کرنا ہو اور اس جنگ میں جاپانیوں کے فنِ حرب کے اخلاقی اصولوں کی ویسے بھی گنجائش نہ تھی۔ ایک فوری ردِعمل کے طور پر میں نے وہی جوابی وار کردیا اور دوسرے لمحے میرا حریف کٹے ہوئے درخت کے تنے کی طرح گر گیا۔ مجھے اپنی جلد بازی پر افسوس ہوا لیکن میرا فعل غیر ارادی تھا۔

"ان کو مزید مہلت مت دو۔" غالب نے کہا۔ "یہ نہ ہو ان کے ساتھی آجائیں۔ معلوم نہیں اور کتنے ہوں گے۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں انھیں باندھ کر ڈالتا ہوں۔"

دلربا اور اس کے ایک ساتھی کو اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ کتنے بے بس ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے اور انھیں آگے چلنے کا حکم دیا۔

"تہ خانے کا راستہ کدھر ہے؟" میں نے کہا۔

"کون سا تہ خانہ؟" دلربا نے سرکش لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔

"ابھی تک یہ گستاخ لہجہ۔" میں نے کہا۔ "یہاں ایک ہی تہ خانہ ہے اور اس کا راستہ ہم خود بھی تلاش کرسکتے ہیں۔"

دلربا بگڑ کے اٹھی۔ "کرسکتے ہو تو کرلو۔" وہ بولی۔ "میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہاں کوئی تہ خانہ ہے تو اس میں قدم رکھنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ انجام کیا ہوگا۔ تمھارے پرخچے اُڑ جائیں گے۔"

"اس تہ خانے کا دروازہ تمھارے باپ کے گھر کا دروازہ نہیں ہے کہ دستک دو اور کھل جائے۔" دلربا کا محافظ بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اگر وہ تمھارے باپ کے گھر کا دروازہ ہوگا تب بھی میں کھلواؤں گا۔" غالب نے کہا۔ ظاہر ہے اس نے دلربا کی دھمکی کا اثر نہیں لیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تب بھی ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے اور جھوٹ تھا تو اس کے فریب میں آنے والے نہیں تھے۔

اندر والے ہال جیسے وسیع و عریض کمرے کے وسط میں سائیں پاپڑ والے کی قبر تھی جس پر نہ جانے کتنے ریشمی، سنہرے اور گدپیلے غلاف پڑے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے اصل قبر چھپ گئی تھی۔ اوپر ایک فانوس روشن تھا جو کسی عقیدت مند یا صاحبِ مُراد کا تحفہ نہیں تھا تو پاپڑوں کی کمائی سے بنوایا گیا تھا۔ اس کی روشنی میں کتبہ صاف پڑھا جاتا تھا۔ سائیں پاپڑ والے کے نام سے پہلے بہت سے القاب و آداب تھے اور ایک شعر بھی تھا لیکن کارآمد معلومات صرف اس حد تک تھیں کہ موصوف انیس سو چودہ میں غالباً پہلی جنگِ عظیم کرانے کے لیے دنیا میں وارد ہوئے اور سن ۱۹۷۱ء میں جہنم رسید ہوئے۔ اس کے فریب میں آ جانے والوں نے بہرحال لکھے رحمۃ اللہ علیہ اور شہید وغیرہ لکھا تھا۔ قبر کے گرد چمکتی ہوئی سنہری جالی تھی۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا۔

"کیا یہ ٹھوس سونا ہو سکتا ہے؟" میں نے غالب کی طرف دیکھا۔

"سونے کے پاپڑوں سے سونے کا کلیجہ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تم کیا ساروں کی طرح پرکھ رہے ہو۔ اپنے مستقبل کی منکوحہ کے لیے نیکلس بنوانے کا خیال آ رہا ہے کیا؟"

"ہاں یار۔ ماں باپ تو ہیں نہیں جو بہو کے لیے بنواتے۔" میں نے کہا۔ "مگر خیر۔ میں زیرِ زمین جانے کا راستہ دیکھتا ہوں۔"

چاروں دیواریں سپاٹ تھیں۔ میں نے ایک راؤنڈ میں ہر دیوار کو ریوالور کے دستے سے بجا کے دیکھا کہ کوئی دیوار اندر سے کھوکھلی ہو تو پتا چل جائے مگر میرے کانوں نے صرف ٹھوس دیواروں کی آواز سُنی۔ میں نے دلربا کو بڑی حوصلہ شکن مسکراہٹ کے ساتھ گھورتے دیکھا۔ میری ناکامی اسے وقتی خوشی دے رہی تھی۔ اس کا ساتھی شکست خوردہ اور مظلوم صورت بنائے کھڑا تھا اور بظاہر مقابلے کے خیال سے دستبردار ہو چکا تھا مگر ہم اب ظاہر سے دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ خود غالب بھی ہر بات سمجھتا تھا لیکن دلربا کا واحد جاں نثار غالب کو نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے فرض کر لیا کہ غالب اب مطمئن اور بے فکر ہے اور اس کو بے خبری میں اچانک مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دم پلٹا اور اس نے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کے باوجود سر سے ٹکر مار کے غالب کو گرانا چاہا۔ غالب اطمینان سے ایک طرف ہو گیا اور جب وہ گزر گیا تو اس کو پیچھے سے گھما کے لات ماری۔ اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس کا سر خوفناک آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی بدقسمتی کہ جہاں اس کا سر لگا وہاں دیوار میں ایک کھونٹا سا لگا ہوا تھا۔ ایسے کھونٹے ہر دیوار کے وسط میں تھے اور معلوم نہیں ان کا مصرف کیا تھا لیکن وہ کھونٹا آخری محافظ کے کاسۂ سر کو توڑتا ہوا مغز میں پیوست ہو گیا۔ وہ بڑا دردناک اور دل گداز منظر تھا۔ وہ شخص نہ کھڑا ہوا تھا، نہ بیٹھا ہوا اور نہ لیٹا ہوا۔ وہ ایک کھونٹے سے اٹکا ہوا تھا اور بری طرح تڑپ رہا تھا۔ شدید اذیت کے باعث اس کے حلق سے دلخراش چیخوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ کھونٹے میں پھنسے ہوئے سر کے ساتھ پورے جسم کی حرکت سے اس کی اذیت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ کرب میں بل کھا رہا تھا اور ہاتھ پیر چلا رہا تھا مگر جو کھونٹا سر میں سوراخ کر کے گھسا تھا وہ اس حرکت سے اور اندر چلا گیا تھا۔ بے شک اس کے اعمال ہی ایسے تھے کہ اجل نے اس کے لیے ایک عبرت آموز موت کا اہتمام کیا تھا مگر ہم جیسے انسان جو سینوں میں پتھر نہیں، دل رکھتے تھے اپنے دشمن پر بھی رحم کھا سکتے تھے۔ اس کے عذاب کو ختم کرنے کے لیے میں نے ریوالور اٹھا کے نشانہ لیا اور اس کے سر میں بہت قریب سے گولی مار دی۔ وہ ایک بار تڑپا اور ساکت ہو گیا۔

"تم نے دیکھا دلربا! قدرت سزا بھی دیتی ہے تو کس طرح۔" میں نے کہا۔

"تمھاری موت اس سے بھی زیادہ عذاب ناک ہو سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔

دلربا بالکل ساکت و صامت کھڑی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ سب کھیل تماشا ختم ہوا۔ نہ سیوک رام کام آیا، نہ کرنل جگن ناتھ اور نہ سائیں پاپڑ والا۔ اس کی دولت، سونے کے پاپڑ، وطن کی حرمت کی قیمت، جسم کا معاوضہ۔ وہ عقل اور ہمت جس پر اعتماد کرتے ہوئے اس نے کرماں والی بننا منظور کیا تھا۔ اسلحے کی اسمگلنگ کرنے والوں کے پُرخطر مشن میں شرکت کی تھی۔ سب رائیگاں گئے۔ دولت سے اس نے مستقبل کے خوابوں کے جتنے سنہرے محل کھڑے کیے تھے کھنڈر بن گئے۔ اس کے چاروں طرف لاشیں پڑی تھیں اور وہ اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اس کے لیے اب جھوٹی امید پر تکیہ کرنا بھی مشکل تھا۔

"تمھیں موقع دیا جا سکتا ہے کہ جان بچا کے جہاں چاہو چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ پیشکش کرو گے۔" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ "میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں؟"

"یہ تو ہے۔ تمھارے دشمن دونوں طرف ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "دوست کسی طرف نہ ملے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم یہ رعایت کی رشوت کیوں دے رہے ہو۔ تم مجھ سے تہ خانے کا راستہ پوچھنا چاہتے ہو۔" وہ بولی۔ اس کی حقیقت پسندی نے مجھے اس کی بہادری کا قائل کیا۔ ورنہ اور عورت اب تک بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ "اگر تم اتنی سمجھ دار ہو تو راستہ خود ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے سودا کر سکتے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی اور میں نے اس کے اندازِ حسن کی غارت گر قوت کو پوری طرح محسوس کیا۔ اس کام کے لیے وہ موزوں ترین عورت تھی۔ بدقسمتی سے اس کا واسطہ میرے اور غالب جیسے مردوں سے پڑ گیا تھا جن کے سامنے اس کی قوتِ تسخیر بے اثر تھی۔

"سودا؟" میں نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ سودا کر سکو؟"

"نہیں۔ مگر رعایت کی پیشکش خود تم نے کی تھی۔" وہ بولی۔

"تم یہ کیوں سمجھنے لگی ہو کہ ہم کبھی راستہ تلاش نہیں کر سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں دیر لگے گی۔ اور پریشانی ہوگی۔" وہ بولی۔ "پھر تم مجھ پر تشدد کرو گے۔ بالآخر مجھے قتل کر دو گے لیکن اس میں تمھارا بہت وقت ضائع ہوگا۔ میں تمھارا وقت بچا سکتی ہوں۔"

"کس شرط پر؟" میں نے سوچ کر کہا۔

"تم مجھے آسان موت دو گے۔" وہ بولی۔ "میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ مرنے سے پہلے اپنے لیے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگتی۔ میرا معافی مانگنا شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنا، آئندہ کے لیے توبہ کرنا سب غلط ہوگا اور جھوٹ ہوگا۔ جب میں نے اس راستے پر قدم رکھا تھا تو مجھے معلوم تھا کہ میری منزل ایک نہیں ہے۔ یہ راستہ دو منزلوں تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اپنا بے حساب سرمایہ بیرونِ ملک منتقل کر کے کرنل جگن ناتھ اور سادھو رام کے سب ساتھیوں کو ٹھکانے لگا کے کہیں نکل جاتی اور ساری عمر عیش و عشرت کی زندگی گزارتی۔ میرے پاس فرانس یا سوئٹزر لینڈ دونوں جگہ شہریت حاصل کرنا ممکن تھا اور وہاں کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں یورپ کے کسی صنعتکار، بینکر یا فلم میکر سے بھی شادی کر سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ جگن ناتھ یا سیوک ہی مجھے ٹھکانے لگانے میں پہل کر جاتے۔ سادھو رام میں اس کی ہمت نہیں تھی۔ ان کی جگہ تم آ پہنچے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ مجھے سنہرے خوابوں کی منزل نہ ملی۔ آسیبوں کی تعبیر مل گئی۔ یہ ایک جوا تھا اور یہ جوا میں ہار گئی۔ میں نے جیت کی امید میں جوا نہیں کھیلا تھا۔ جیت میری ہوتی تو میں اسے اپنی کامیابی نہیں، تقدیر کی یاوری سمجھتی۔ چنانچہ مجھے ہارنے کا افسوس نہیں۔"

"تم ایک بہادر اور سمجھدار عورت ہو۔" میں نے کہا۔ "نادان دوست سے دانا دشمن کی قدر کرنا بہتر ہوتا ہے۔ اگر تم نے وطن کے دشمنوں کے بجائے وطن کے محافظوں کا ساتھ دیا ہوتا تو یہ مٹی تم پر فخر کرتی۔ میں تمھاری شرط منظور کرتا ہوں۔ میں تم کو وہ موت دینے کی کوشش کروں گا جس میں تمھارے لیے عذاب کا احساس ہی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ "قبر سے ساری چادریں اور غلاف ہٹا دو۔ نیچے جانے کا وہی راستہ ہے۔"

میں نے غالب کی طرف اور غالب نے میری طرف حیرانی سے دیکھا۔ گاؤں کے جاہل، کمزور عقیدے رکھنے والے اور ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھنے والے سیدھے سادے لوگوں کے درمیان سائیں پاپڑ والا کی خانقاہ کتنا زبردست مکر و فریب کا کارخانہ تھی جس کی حقیقت کو بڑے بڑے عاقل اور افلاطون نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ جس مرقد پر دنیا عجز و انکسار کے ساتھ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگنے آتی ہے، وہ مرجعِ خلائق ایک ضمیر فروش ٹولے کے اسلحہ خانے کا راستہ ہے اور پیرِ طریقت کے مزار کا ہر غلاف مکر و فریب کا ایک پردہ ہے۔ کسی کے دھیان میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ قبر کی جگہ ایک خلا ہے جس میں کبھی کسی سائیں پاپڑ والے کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی لاش تو نہ جانے کہاں پھینک دی گئی تھی، کسی دریا میں، کنویں میں یا جنگل میں۔ اسے ہلاک کرنے والے ڈاکو نہیں، دشمن کے ایجنٹ تھے اور ان کا آلۂ کار کرماں والی تھی۔ انھوں نے بڑی ہوشیاری سے ایک ایسا اڈا حاصل کر لیا تھا جہاں ان کا وطن دشمن کاروبار بھی جاری رہ سکے اور انھیں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے سرمایہ بھی فراہم ہوتا رہے۔ سونے کے پاپڑ ملتے رہیں اور وطن کی یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے والوں تک اسلحہ پہنچتا رہے۔

میں نے ایک ایک کر کے سارے غلاف ہٹا دیے اور ان کپڑوں کا ایک ڈھیر لگ گیا جن میں سے عطر کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یہ خوشبو اتنی کرخت تھی کہ دماغ میں چبھتی تھی۔ اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اندر سالہا سال سے سلگنے والی اگربتیوں کی اور لوبان کی خوشبو کے ساتھ ان عطر میں بسے ہوئے غلافوں کی خوشبو خانقاہ کے اندر ہوا میں بسی ہوئی تھی اور دیواروں سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اندر قدم رکھنے والوں کے حواس پر یہ خوشبو یکلخت حملہ کرتی ہوگی اور وہ تقدس و احترام کے ماحول میں ذہنی طور پر وہ سب خود کو انتہائی کمزور اور بے بس پاتے ہوں گے۔

آخری غلاف کے ہٹتے ہی پکی بنی ہوئی قبر کا چوکھٹا نمودار ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس قبر میں اوپر کی طرف سنگِ مرمر کا استر نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک دروازہ تھا جسے انگریزی میں "ٹریپ ڈور" کہا جاتا ہے۔ ایک کنڈی کھولتے ہی اس کے دونوں پٹ نیچے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گر گئے اور تین فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا جس میں جانے والا زینہ دو فٹ نیچے سے شروع ہو جاتا تھا۔ زینہ روشن تھا۔ اس کے آخری حصے کی روشنی اوپر بھی آ رہی تھی۔ میں نے غالب کو اشارہ کیا اور اس نے دلربا کو آگے دھکیلا۔ میں نے غالب سے کہا کہ وہ دلربا کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دے۔ جب وہ نیچے اتر گئی تو اس کے پیچھے میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا۔

"یار کیا میں بھی نیچے تمہارے ساتھ چلوں؟" غالب نے اشتیاق اور تجسّس کو دبا کے کہا۔

"اوپر کا خیال کون رکھے گا؟" میں نے کہا۔ "اگر کوئی اچانک آگیا؟" پھر میں نے اس کا مایوس چہرہ دیکھا۔ "اچھا بھائی۔ آپ بھی آجائیں۔ اللہ مالک ہے اوپر کا۔"

"بے شک اللہ اوپر نیچے سب کا مالک ہے۔" غالب نے سر ہلا کے کہا۔

آخری زینے سے اندر قدم رکھتے ہی میں اور غالب پتھر کے بت بنے کھڑے رہ گئے۔ وہ ایک بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی اتنی ہی تھی جتنی اوپر ہیلی پیڈ کے طور پر استعمال ہونے والے پلیٹ فارم کی۔ دائیں جانب دیوار کے ساتھ ساتھ وہی لکڑی کے تابوت نما صندوق رکھے تھے جو ایک ٹرک سے اتارے گئے تھے۔ سامنے ذرا مختلف قسم کے بکس تھے سائز میں کچھ چھوٹے مگر اونچائی میں زیادہ۔ میری اور غالب کی نظر ایک کونے سے دوسرے کونے تک اور تیسرے کونے سے چوتھے کونے تک پہنچی۔ ہر دیوار کے ساتھ صندوق تھے۔ ہر صورت اور سائز کے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان سب میں اسلحہ بھرا ہوا ہے اور اتنا بڑا اسلحے کا ذخیرہ میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے تابوت نما صندوق کو پہلے کھولنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اندر ہی ایک ہتھوڑی اور کچھ دوسرے اوزار بھی مل گئے جو عموماً بڑھئی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہ اوزار صندوقوں کو بند کرنے اور کھولنے کے کام آتے تھے۔ سامان لے جانے والے بھی پہلے ہر بکس کو کھول کر اپنا اطمینان ضرور کرتے ہوں گے کہ اس میں پتھر تو نہیں بھرے ہوئے ہیں۔ پہلے تابوت نما صندوق کو کھولنے میں مشکل سے دس منٹ صرف ہوئے۔ میں نے ایک درز تلاش کی اور اس میں لوہے کی وہ سلاخ پھنسا دی جس کا دوسرا کنارا پیچ کس کے سرے کی طرح چپٹا تھا۔ سلاخ کے دوسرے حصے کو نیچے دبا کر میں نے درز کو چوڑا کیا۔ مضبوطی سے لکڑی میں جڑی ہوئی کیلوں نے احتجاج کیا لیکن اس لیور کی طاقت کے سامنے کیلوں کی ایک نہ چلی۔ ڈھکنا آہستہ سے اوپر اٹھا اور میں

نے سلاخ کو آگے بڑھا کے زور لگایا تو ڈھکنا الگ ہو گیا۔ میں نے بکس میں کسی لاش کو نہیں، خود کار رائفلوں کو دیکھا جو اوپر تلے پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے شمار کیا تو اس ایک تابوت میں بارہ رائفلیں تھیں۔ اس ایک تابوت سے کتنے جیتے جاگتے انسان لاشوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ شاید سیکڑوں، ہزاروں۔ ہر رائفل نہ جانے کس کس کے ہاتھ میں جائے گی۔ جب رائفل کو تھامنے والا ایک ہاتھ بے جان ہو گا تو یہ دوسرے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ دوست کے ہاتھ میں یا دشمن کے ہاتھ میں۔ رائفل اور رائفل کی گولی نہ کسی کے دوست ہوتے ہیں، نہ دشمن۔

"کس سوچ میں پڑ گیا ہے بھائی۔ یہ موت و حیات کے فلسفے پر غور کرنے کا نہ مقام ہے نہ وقت۔" غالب نے کہا۔

میں چونک پڑا۔ "ایسے ہی خیال آگیا تھا یار کہ یہ کتنے بے گناہوں کی موت کا سامان ہے۔ کون حساب کر سکتا ہے اس کا؟"

"ہم اس ذخیرے کو تباہ کر دیں گے۔" غالب نے مجھے یقین دلایا۔

"ہاں۔ مگر ایسے اور کتنے ذخیرے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ بھی معلوم ہو جاتا۔" "مگر خیر۔ ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت ہے۔"

میں نے سب بکس نہیں کھولے۔ ہر نمونے کا ایک بکس کھولا اور دیکھ لیا کہ اس میں کیا ہے۔ مختلف سائز اور شکل و صورت کے صندوقوں میں وہ سب کچھ تھا جو موت کہلاتا ہے۔ گولہ بارود، پستول اور ریوالور، گولیاں اور مشین گنوں کے راؤنڈ، دستی بم اور مشین گنیں، بموں کے فیوز، ڈائنامائیٹ اسٹکس، بارودی سرنگیں۔ ایک بکس میں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی تھا، مجھے گھڑیاں سی نظر آئیں۔ یہ ٹائم بم تھے۔ میں آتشیں اسلحے کا ماہر نہیں تھا۔ چنانچہ یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ہر بم کی تباہ کاری کا دائرہ کس حد تک ہو سکتا ہے۔ مرزا غالب نے صحافت کے پیشے میں بہت پاپڑ بیلے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں محاذ پر بھی خاصے گھومے تھے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ بم بہت بڑے تو نہیں ہیں لیکن ہر ٹائم بم سے ایک ریلوے پل یا عمارت تباہ ہو سکتی ہے۔

"کون سی عمارت؟" میں نے اس بیان کو مبہم قرار دیا۔

"عمارت تو یہ بھی ہے اور الفلاح بلڈنگ بھی۔"

"میرا مطلب درمیانے درجے کی عمارت سے تھا۔ مثلاً کوئی دفتر یا ریلوے اسٹیشن۔" غالب نے کہا۔

"کون سا ریلوے اسٹیشن؟" میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "لاہور کا یا ٹھنڈا چوہا؟"

"ٹھنڈا چوہا؟" غالب نے سر کھجا کے کہا۔ "یہ تو عمارت نہ ہوئی۔ جانور اور وہ بھی...."

"یہ ایک اسٹیشن کا نام ہے۔" میں نے شرط لگانے کے انداز میں کہا۔ "پنڈی سے لاہور تک پسنجر ٹرین میں سفر کرو تو ضرور اتفاق ہوگا ٹھنڈا چوہا دیکھنے کا۔ ایکسپریس اور میل ٹرین کوئی ٹھنڈا چوہا..."

"بھاڑ میں گیا ٹھنڈا چوہا اور گرم چوہا۔" غالب نے کہا۔ "نہیں مانتے تو نہ مانو۔ یہ ٹائم بم نہیں، خربوزے ہیں۔"

"وہ... یار دراصل... میرا مطلب تمہیں ابوجہل ثابت کرنا نہیں تھا۔" میں نے خفّت سے کہا۔ "تم ان کو سیٹ کر سکتے ہو؟"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوشش کر سکتا ہوں مگر اسے خودکشی کی کوشش بھی کہا جا سکتا ہے اور وہ تم بھی کر سکتے ہو۔"

"پھر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ہم کچھ اور کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی دستی بم پھینکا ہے؟"

"یار میں صحافی کی حیثیت سے محاذ پر گیا تھا۔ سپاہی کی حیثیت سے نہیں۔" غالب نے بھنّا کر کہا۔

"میں پھینک سکتا ہوں۔" میں نے اعلان کیا۔ "منہ سے پن نکالی۔ پانچ سیکنڈ شمار کیے اور پھینک دیا۔"

"یہ سب تو میں نے بھی فلموں میں دیکھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "چھ سیکنڈ ہو گئے تو کیا ہوگا؟"

"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ ہم غیر فوجی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔"

میں نے اور غالب نے لکڑی کے صندوقوں کو دیوار سے دور ہال کے وسط میں جمانا شروع کیا۔ یہ دشوار اور تھکا دینے والا کام تھا۔ ہماری نظر دلربا پر بھی تھی لیکن وہ عملاً دنیا سے قطع تعلق کر چکی تھی اور فرش پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اسے نہ ہمارے کام سے سروکار تھا، نہ ہماری باتوں سے لیکن میں پھر بھی محتاط تھا کہ وہ اچانک کچھ کر نہ بیٹھے۔ مثلاً کوئی دستی بم اٹھا لے اور منہ سے پن نکال کے آخری قہقہہ لگائے۔ انگریز کہتے ہیں کہ اپنی کامیابی پر ہنسنے والوں کو ہنسنے دو۔ یہ دیکھو کہ آخری ہنسی کس کی ہوتی ہے۔ ہم نے ٹائم بم والے بکس کو اتفاقِ رائے سے الگ رکھا۔ ان کے بارہ ٹائم بم صحیح وقت پر ہمارے لیے بھی کارآمد ہو سکتے تھے۔ فی الحال تو سب کی سوئیاں بارہ بجا رہی تھیں مگر صحیح وقت کا تعین کرنا سیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے سب سے نیچے دستی بم رکھے۔ ان کے اوپر بندوقوں کی گولیاں، ریوالور، پستول اور مشین گنوں کے راؤنڈ والے صندوق سجائے اور سب سے اوپر خالی مشین گنیں۔ خودکار

رائفلیں اور ریوالور وغیرہ رکھ دیے۔ سارا بارود سے بھرا ہوا اسباب نیچے تھا اور اس کو دھماکے سے اڑا کے ہی باقی اسباب تباہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایک رائفل، پستول یا مشین گن کو توڑنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ یہ سارا کام ایک گھنٹے میں ختم ہو گیا تو میں اوپر گیا۔

سائیں پاپڑ والے کے مرقد پر عقیدت سے چڑھائے جانے والے سارے غلاف اور سب چادریں اسی طرح ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے انھیں ایک ایک کر کے زینے سے نیچے پھینکا۔ پھر نیچے جا کر میں نے ایک چادر کے کونے کو دوسری چادر سے باندھا اور غلافوں کو پھاڑ کر ساتھ ساتھ رکھتا گیا۔ تہ خانے کے درمیان میں صندوق کے گرد لپیٹ کر میں نے اس کپڑے کی زنجیر کو زینے تک فرش پر بچھا دیا اور زینے پر جاتا ہوا اوپر لے گیا۔ جعلی خانقاہ کے عقبی دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی چادریں ختم ہو گئیں۔ دروازہ اب مشکل سے ایک گز دور رہ گیا تھا جو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ اگلا مرحلہ زیادہ دشوار تھا جس پر ہماری کامیابی کا انحصار تھا۔

میں سادھو رام کی کار تک گیا۔ دروازہ کھول کے میں نے سوئچ آن کیا۔ فیول میٹر کی سوئی آگے بڑھنے لگی۔ میرا دل اس کی حرکت کے ساتھ چلنے لگا۔ شاباش۔ شاباش۔ اور آگے۔ میں نے ریس کورس میں بیٹھے ہوئے تماشائی کی طرح کہا۔ جو اپنے گھوڑے کو سب سے آگے دیکھنا چاہتا ہو۔ بالآخر سوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" میں نے خوشی سے نعرہ لگایا کیونکہ ٹینک تقریباً فل تھا۔ گاؤں میں رہنے والا سادھو رام احتیاطاً اپنی گاڑی کا ٹینک فل رکھنے کا عادی ہوگا۔ اس کی یہ احتیاط پسندی آج میرے حق میں سود مند ثابت ہوئی۔ میں نے ڈکی کھولی جس میں کار کا مالک اور اس کا غلام یعنی سیوک اکٹھے بندھے پڑے تھے۔ وہ زندہ ضرور تھے لیکن ہوش سے بیگانہ تھے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے پر مجھے پلاسٹک کا نرم شفاف پائپ بھی مل گیا۔ میں سائیں پاپڑ والے کے اڈّے میں گیا اور اندر سے ایک بالٹی اٹھا لایا۔ پائپ کو میں نے پٹرول ٹینک میں ڈالا اور اس کے دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے سانس اندر کی طرف کھینچا۔ پٹرول تیزی سے آیا اور میں نے اس کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا۔ پٹرول کی شفاف دھار بالٹی میں گرنے لگی۔ پٹرول ٹینک بہت اوپر تھا اور بالٹی بہت نیچے تھی چنانچہ سائفن سسٹم سے پٹرول بالٹی میں منتقل ہوتا رہا۔ میں نے دوبارہ تھوکا لیکن پٹرول کا تلخ ذائقہ میرے منہ میں باقی رہا اور میرے ہونٹوں پر معمولی سی جلن برقرار رہی۔

بالٹی کے بھرتے ہی میں نے پلاسٹک کی نلکی کو کھینچ لیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میرے اندازے کے مطابق بالٹی میں دو ڈھائی گیلن پٹرول تھا اور اتنا ہی گاڑی میں بھی ہونا چاہیے تھا۔ پٹرول ٹینک کی کیپ کو لاک کر کے میں نے بالٹی اٹھائی اور سائیں پاپڑ والا کی خانقاہ کا نام و نشان مٹانے کی نیت کر کے چل پڑا۔ میں بہت محتاط تھا کہ کسی ٹھوکر سے یہ پٹرول کی بالٹی نہ چھلکے۔ گاڑی میں سے دوبارہ اتنا پٹرول نکالنا مشکل تھا۔ جب میں بالٹی لے کر نیچے پہنچا تو دلربا کسی بات پر غالب کو گالیاں دے رہی تھی اور غالب مسکرا رہا تھا۔

"خیال رکھنا اپنی دلربا کا۔" میں نے کہا۔ "یہ بالٹی نہ الٹ دے۔"

"تم اب کہاں جا رہے ہو بے؟" وہ بولا۔ "وقت کم ہے۔"

"ہاں — میں ذرا مس دلربا کے ہمسفر کو لے آؤں۔" میں نے کہا۔ "راہِ عدم پر اکیلی کیسے جائے گی بے چاری عورت۔"

دلربا کے اعصاب طویل انتظار کے باعث جواب دے چکے تھے۔ وہ ہسٹریا کا شکار تھی اور اپنے بال نوچ رہی تھی، چلّا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے مار دو۔ خدا کے لیے مجھے مار دو۔ میں لوٹ کر باہر گیا تو ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس میں سے سیوک کو کھینچ کر باہر نکالا اور ڈکی بند کر دی۔ اب میں اتنا تھک چکا تھا کہ سیوک رام کو اٹھا کے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ سیوک رام میرے کندھے پر سے نیچے گر گیا۔ میں نے رک کر سانس لیا اور پھر سیوک رام کو گھسیٹنا شروع کیا۔ دروازے کے اندر تک میں اسے آسانی سے کھینچ کر لے گیا۔ اسے اٹھا کے قبر کے گرد بنے ہوئے سنہرے جنگلے سے قبر کے کھلے حصے تک پہنچانا پھر مشکل بن گیا۔ میں نے اسے بوری کی طرح اٹھا کے لڑھکا دیا۔ زینے سے اس کو کندھے پر اٹھا کر لے جانے میں یہ خطرہ تھا کہ میں خود بھی ساتھ ہی لڑھک جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے سیوک کو پہلے روانہ کر دیا۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گیا۔ مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا نہیں۔ پھر میں خود اطمینان سے نیچے اترا۔

سیوک رام کو میں نے گولہ بارود کے ڈھیر پر رکھ دیا۔

"کیا غضب کی چتا ملی ہے اسے!" میں نے کہا۔ "لاکھوں روپے کی آتش فشاں چتا۔ سب اسمگل کیے ہوئے اور مقامی اسلحے کی وہ کھیپ ہے جو بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی تھی مگر بڑی آسانی سے سیوک کو پرلوک پہنچا دے گی۔" میں نے کہا۔ "اور ہماری مس دلربا کو جہنم تک پہنچنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔"

"نہیں۔" دلربا نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری اور دہشت سے کانپنے لگی۔

"میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس سے آسان موت کیا ہو گی۔ ایک دھماکا اور سب ختم۔ کسی زہر کا اثر بھی اتنی جلدی نہیں ہوتا۔ میں تمھیں گولی مار دیتا۔ تب بھی کچھ دیر لگتی تمھاری جان نکلنے میں۔"

"خدا کے لیے۔" دلربا نے چیخ ماری۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔" اس کا حوصلہ آخری وقت میں اس شخص کی طرح جواب دے گیا تھا جسے پھانسی دینے کے لیے تختے کی جانب قدم بڑھانے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ وہ ایک دم اٹھی اور چیختی ہوئی بھاگی۔ غالب کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے نیچے آیا۔ سر پر ریوالور کی ضرب کاری پڑی اور دلربا اٹھتے ہی پھر گری تو بے حس ہو گئی۔ میں نے غالب کی مدد کی اور ہم نے اسے بے ہوشی کے عالم میں سیوک کے ساتھ لٹا دیا۔

ایک مگ کی مدد سے میں نے اس کپڑے پر پٹرول ڈالنا شروع کیا جو نیچے سے اوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ کپڑے کی تہ اتنی موٹی تھی کہ پٹرول جذب ہوتا گیا۔ میں آگے بڑھتا گیا اور پٹرول کی بھری ہوئی بالٹی آہستہ آہستہ خالی ہونے لگی۔ غالب نے ٹائم بم اٹھائے اور بکس کو گھسیٹتا ہوا زینے تک لایا۔ اس کو اٹھانا خاصا مشکل کام تھا۔ چنانچہ میں نے غالب کی مدد کی اور بکس کو اوپر تک ہم دونوں نے مل کر اٹھایا۔

دروازے تک پہنچتے پہنچتے پٹرول بہت کم رہ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ پٹرول نہ اڑ جائے جو میں نے پہلے ڈالا تھا مگر کپڑے کی نمی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ دروازے کے قریب آخری مگ ڈالنے کے بعد میں نے دیکھا تو تھوڑا سا پٹرول باقی تھا۔ میں دوڑ کر نیچے گیا اور یہ پٹرول صندوقوں کے آس پاس پھیلے ہوئے کپڑے پر الٹ دیا۔ آگ کا اب یہاں تک پہنچ جانا چند منٹ کی بات تھی۔ اس کے بعد خشک لکڑی کے بنے ہوئے صندوقوں کو آگ سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے غالب کو دیکھا تو وہ ماچس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"تم جا کے گاڑی اسٹارٹ کرو۔" غالب نے کہا۔ میں گاڑی کی طرف لپکا ہی تھا کہ مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ ہیلی کاپٹر سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ میں کرنل جگن ناتھ سیمنٹ کے چبوترے پر اتر جائے گا۔ میں نے چلّا کر غالب کو آواز دی۔ معلوم نہیں وہ دیر کیوں کر رہا تھا۔ ابھی تک مجھے ماچس کا شعلہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

بالآخر ماچس کا شعلہ نظر آیا اور میں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔ اس کے بغیر ہم گھنے جنگل کے مخصوص راستوں سے گزر ہی نہیں سکتے تھے۔ غالب دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ بیٹھا ہی تھا کہ میں نے گاڑی چلا دی۔ جھٹکے سے دروازہ جو ابھی بند بھی نہ ہوا تھا پھر کھل گیا۔ میں اس وقت گاڑی موڑ رہا تھا۔ کھلا دروازہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا اور ٹوٹ کر نیچے گر گیا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ مجھے رات کے اندھیرے میں ہیلی کاپٹر کسی دیوہیکل پرندے کی طرح اپنے سر کے اوپر منڈلاتا نظر آیا۔ پھر اس کی سرچ لائٹ جیسی تیز روشنی چبوترے پر پڑی۔ پائلٹ نے سابقہ تجربے کی بنا پر اب تک تاریکی میں سفر کیا تھا اور ہیلی کاپٹر کو بالکل ٹھیک جگہ تک لے آیا تھا مگر اب اُسے لینڈ کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے ہیلی پیڈ کو دیکھ سکے۔

میں ایک منٹ بعد گاڑی کو بحفاظت سو گز دُور لے جا چکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں درختوں پر چمکنے والے زرد رنگ کے دائرے بالکل ٹریفک سگنل کا کام دے رہے تھے اور میری رہنمائی کر رہے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے سکندر بادشاہ...؟" غالب نے اعصابی کشیدگی میں پلٹ کر دیکھا۔ "دھماکا کیوں نہیں ہوا۔"

"کہیں آگ بجھ نہ گئی ہو۔" میں نے دل میں چھپے ہوئے اندیشے کا اظہار کیا۔

"نہیں یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔" غالب بولا۔ "سب کپڑے پٹرول میں بھیگے ہوئے تھے۔ شروع سے آخر تک ایک پٹرول لائن تھی۔ آگ رک نہیں سکتی۔"

اُسی وقت پہلا دھماکا ہوا جو اتنا شدید تھا کہ مجھے نیچے کی زمین ہلتی محسوس ہوئی۔

"وہ مارا پاپڑ والے کو۔" غالب نے نعرہ لگایا اور قہقہہ مار کے ہنسا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔

"میرا خیال ہے جگن ناتھ بھی انہی کے ساتھ گیا۔" میں نے کہا۔ مسرت سے میرے جسم کا رُواں رُواں سرشار ہو رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میں نے زندگی کے اس انوکھے تجربے کی لذت کو محسوس کیا جو ہیجانی کا انعام تھی۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم۔ اب تک میرا اور ایم آر ایس کا یہی نصب العین اور مقصدِ حیات رہا تھا۔ اس فاتحِ عالم محبت کے ان گنت روپ تھے۔ ایک محبت وہ تھی جو مجھے ولایت سے پاکستان کھینچ لائی تھی۔ یہ خون کے رشتے کی محبت تھی جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام کے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ محبت کا دوسرا روپ بن کے راجہ نمودار ہوئی تھی اور یہ محبت میری زندگی کی روشنی تھی جو ہر جگہ ہر لمحہ میرے ساتھ میری شریکِ سفر تھی۔ محبت کا ایک اور روپ ان سب کے خلوص اور رفاقت کے عہد میں نظر آتا تھا جو دوستی کی آن پر جان دینے کے لیے میرے ساتھ سر کف پھر تے تھے۔ محسن اور نیک محمد۔ غالب اور نازو۔ وطن کی مٹی سے جذباتی وابستگی محبت کا سب سے انمول روپ تھی جس نے مجھے ذاتی انتقام کے جنون کی راہ سے ہٹا کے اس راستے پر گامزن کر دیا تھا جس پر چلنے والے غازی اور مر جانے والے شہید کہلاتے ہیں۔ وہ سب میرے بھی دشمن تھے جو میرے وطن کے دشمن تھے۔ اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کا مقصد بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔ میرے ذاتی انتقام کے جذبات اس مقصد کے سامنے کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ میں وہ شخص تھا جو ریت کے ایک ٹیلے کو سر کرنے کی سوچتا تھا مگر قدرت نے مجھے اس عزم سے نوازا جو ہمالیہ سے بھی اونچے پہاڑ کو سر کر سکتا تھا۔

دھماکے ایک تسلسل سے ہو رہے تھے۔ غالباً ہر پیٹی جس میں ہر قسم کے بم بھرے ہوئے تھے اور بارودی سرنگیں تھیں، باری باری آگ پکڑ رہی تھی۔ آخری دھماکا اتنا لرزہ خیز تھا کہ ارتعاش سے گاڑی کے شیشے بجنے لگے۔ میں نے گاڑی روک دی کیونکہ اب ہم خاصے محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نیچے اترا اور سائیں پاپڑ والے کو اس کی مریدِ خاص کرماں والی کو اور اس کے ساتھ سیوک کو بے وجود ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ باطل اعتقادات اور جھوٹی کرامات پر یقین کے ایک سلسلے کی شکست تھی۔ چشمِ تصور سے میں نے دلربا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا حسن و شباب بارود کی تباہ کن قوت سے بکھر کر ریشہ ریشہ اور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور اس کے خوب صورت جسم کے ذرات دور دور تک مٹی میں مل گئے تھے یا راکھ بن کے اُڑ گئے تھے۔

اپنے وعدے کے مطابق میں نے اُسے جو موت کا سامان فراہم کیا تھا، اس میں احساس کی اذیت کا وقفہ انتہائی مختصر تھا۔ مجھے سیوک کا کوئی خیال نہیں آیا۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو میں اسے کسی شہر کے چوک میں پھانسی دیتا اور اس کی لاش کو درسِ عبرت دینے کے لیے وہیں لٹکتا چھوڑ دیتا مگر میرے پاس اس کارِ خیر کے لیے وقت نہیں تھا۔

"اگر ہیلی کاپٹر ساتھ ہی تباہ نہ ہوتا تو اتنی دیر میں یقیناً اڑ جاتا۔" غالب نے کہا۔

"ہیلی کاپٹر اور کرنل جگن ناتھ کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہیلی کاپٹر اس پلیٹ فارم پر اتر چکا تھا جس کے نیچے سلا آتشگیر مادہ ڈھیر کیا گیا تھا۔ بقولِ شاعر... بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھا تھا پرندہ۔"

"ہاں، میرے کان بھی اس کے انجن کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "انجن پہلے دھماکے سے چند سیکنڈ قبل ہی خاموش ہوا تھا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"چند سیکنڈ میں تو وہ ہیلی کاپٹر سے نکل بھی نہ پائے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "صرف ایک سیکنڈ پہلے بھی کرنل جگن ناتھ کے تصور میں دلربا کا حسین چہرہ ہوگا۔ دوسرے سیکنڈ میں اس نے خود کو پرلوک میں پایا ہوگا تو سخت حیران ہوا ہوگا۔"

"حیران تو اس وقت موضع کرماں والی کے رہنے والے بھی ہوں گے کہ کیا واقعی قیامت آگئی۔ قربِ قیامت کی نشانیاں تو بڑے بوڑھوں کو ہر دور میں نظر آتی رہی ہیں۔" غالب بولا۔

"دوسروں کی جوانی کے دور میں۔" میں نے کہا ——— "دھماکے تو شاید ڈونگا پتن اور گرد و نواح کے دیہات میں بھی سُنے گئے ہوں گے ——— اب وہ سادے بے مراد کہاں جائیں گے جو ہر خواہش کی تکمیل کے لیے منّت ماننے یہاں آجاتے تھے۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ جو دستِ دعا اٹھا کے تجھ سے کچھ مانگنے یا جدوجہد کرنے کے بجائے اس فراڈ سائیں بابڑ والے سے رجوع کرتے تھے۔"

"انھیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "آس پاس کوئی دوسرا اچّھا پیر پہلے سے موجود ہوگا اور اپنی پُرفریب کرامات کا ڈھونگ رچا کے سیدھے سادھے دیہاتیوں کو لوٹ رہا ہوگا۔ یہ سائیں بابڑ والا تھا جو صرف بٹیر کھاتا تھا کہیں ہوگا سائیں مُرغے والا جو صرف مُرغے مُرغے کھاتا ہوگا اور چاندی کے مرغرے جمع کرتا ہوگا۔ نہ ہوا تو بہت جلد یہ ایکنسی پُر کرنے کوئی ضرور آجائے گا۔ سائیں کبوتر والا۔ پیر لنگوٹ شاہ۔ بابا درختاں والا جو زمین پر قدم نہیں دھرتا۔ کسی شاخ پر بسیرا کرتا ہے۔ یہ ایک پیشہ ہے سکندر بادشاہ! اگر تو بھی اختیار کرلیتا تو بڑا کامیاب رہتا۔ اس بزنس میں صرف ذہانت اور موقع شناسی کام آتی ہے۔ تقدس کا نقاب تو بڑی آسانی سے چڑھایا جاسکتا ہے۔ قلندرانہ وضع اختیار کرنے کے لیے رنگ برنگے چُغے، موٹے موٹے منکوں کی مالا، بکھرے بالوں کی وِگ۔ ہر رنگ اور سائز کی داڑھی مونچھ یہ سب سامان آسانی سے مل جاتا ہے۔ کرامات کا شعبدہ کرنے کے لیے دو چار ڈرامے کافی ہوتے ہیں۔"

"اور کمال افسوس کی بات یہ ہے مرزا غالب کہ لوگوں کو ان دھوکے بازوں کے اصل چہرے دکھانے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم کرماں والی کو اس انجام تک پہنچانے سے پہلے اس کے تمام عقیدت مندوں کا اجلاسِ عام بلاتے جس میں وہ خود اپنی زبان سے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرتی اور لوگ اس کا اصل روپ بھی دیکھتے۔"

"اب یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" غالب نے کہا۔

میں نے دھوئیں اور گرد و غبار کے اس بادل کو دیکھا جو اندھیرے میں سیاہ بگولے کی طرح اُٹھا تھا لیکن اب رات میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ دُور سے میں لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن رہا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ موضع کرماں والی کے سب زن و مرد، بچے اور بوڑھے گاؤں پر نازل ہونے والی اس آفتِ ناگہانی کا نظارہ کرنے آپہنچے ہیں۔ ان میں زیادہ کمزور عقیدہ رکھنے والے اسے بھی سائیں بابڑ والے کی کسی کرامت کا نام دے دیں گے کہ بستی کے اعمال خراب تھے جس سے زمین پھٹ گئی اور سائیں بابڑ والا کرماں والی کو اپنے ساتھ لے کر جنت کی طرف پرواز کر گئے۔ یا وہ اسے قہرِ خداوندی کے نازل ہونے کا شگون قرار دیتے ہوئے توبہ استغفار کریں گے کہ اب دنیا بھی ختم ہونے ہی والی ہے۔ وہ جو حقیقت کو جانتے تھے، میں اور غالب ہی نہیں تھے۔ سرحد کے پار کرنل جگن ناتھ اور دلربا کو اس مشن پر بھیجنے والے بھی تھے۔ ان کے تین آدمی مارے گئے تھے تو کیا ہوا۔ اگر جل گیا اِک نشیمن تو کیا غم۔ ابھی دوسرے ٹھکانے ہیں، دوسرے راستے ہیں اور دوسرے بہت سے قابلِ خرید غدار ہیں جن کے لیے پیسہ سارے اخلاقی و روحانی اور جذباتی رشتوں سے زیادہ اہم ہے۔

اگر سائیں بابڑ والا کی جعلی خانقاہ کے آس پاس درخت ہوتے تو یقیناً جنگل بھی آگ کی لپیٹ میں آجاتا لیکن انھوں نے ہیلی کاپٹر کے اترنے کے لیے ایک طرف پلیٹ فارم بنایا تھا اور باقی تین طرف پچاس گز تک درخت صاف کر دیے تھے۔ میں ساتھ والی کی شیورلیٹ کو اس جنگل سے گزار کے ڈونگا پتن جانے والی کچی سڑک پر لے گیا۔ اگر کسی شاہراہ تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ تھا تو میرے علم میں نہیں تھا اور اس رات کی سحر ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں یہ وقت اسی علاقے میں بھٹکنے کا تجربہ کرتے نہیں گزار سکتا تھا۔ واپسی پر مجھے پھر سادھو رام کی حویلی کے سامنے سے گزرنا پڑا اور سب مجھے اس بدبخت عورت کا خیال آیا جس نے سادھو نام کے شیطان کے ساتھ مقدس آگ کے گرد سات پھیرے کیے تھے اور اس سے عہدِ رفاقت کا گناہ کیا تھا۔ شاید اس وقت بھی دل نے اسے دھوکا دیا ہوگا جو سادھو رام پر آگیا ہوگا۔ وہ ایک وجیہہ مرد تھا اور جوانی کے جذبات میں کوئی بھی لڑکی اس پر فریفتہ ہو سکتی تھی۔ دل نے سادھو رام کی دھرم پتنی کو پھر دھوکا دیا تھا۔ اسی دل نے پہلے زندگی کا سکون چھینا تھا اور خوشیاں چھینی تھیں۔ اسی دل نے اب زندگی چھین لی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو فلاسفر بادشاہ؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں مرزا جی۔" میں نے چونک کر کہا۔ "بس ایسے ہی طبیعت دنیا کی بے ثباتی کے خیال سے قنوطی ہو رہی تھی۔"

بڑی سڑک اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ دُور اُفق پر صبح کاذب کا دھندلکا نمودار ہو کے غائب ہو چکا تھا۔ صبح صادق قریب تھی۔ میں نے اب تک بڑی محنت اور انہماک کے ساتھ ذہنی ... بھی چنانچہ میں ذہنی طور پر بھی تھک چکا تھا اور جسمانی اعتبار سے بھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر مجھے بائیں طرف ایک نشیب سا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی اس میں اتار دی۔ یہ کوئی خشک ہو جانے والا برساتی تالاب تھا۔ شاید برسات کے موسم میں یہ پانی سے بھرا رہتا ہوگا، چکنی مٹی میں بھینسوں کے کھُروں سے چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے۔ عقل سے بڑی نہ سمجھی جانے والی بھینس کس حد تک صفائی پسند ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر جوہڑ کے باتھ روم میں غسل فرمانے والی بھینسوں کی نازو ادا سے کیا جاسکتا ہے۔

گاڑی ہچکولے لیتی اچانک ایک گہرے کھڈے میں سرنگوں ہوئی۔ اس کے دونوں اگلے پہیّے کھڈے میں اتر گئے اور ناک کھڈے کے دوسرے کنارے سے ٹکرا کے چپٹی ہوگئی۔ جھٹکے نے مجھے بھی ہلا دیا اور مرزا غالب نے تو سامنے والے شیشے کو ٹکّر ماری۔ کچھ دیر ہم دونوں صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کرتے رہے۔

"شیشۂ دل تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔" غالب سر کو دبا کے بولا۔

"غالباً نازو کے جوڑ کر لے کی ادائے ناز سے۔" میں نے کہا۔

"کاسۂ سر کو تم نے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" غالب نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا اور یوں اعتراف کرلیا کہ نازو اس کے خیالوں سے کبھی دُور نہیں رہتی۔

"سر کا کیا ہے!" میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ "اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا۔"

"یہ بازاری سر نہیں ہے۔ ایک سچے صحافی کا سر ہے۔" مرزا غالب کراہتے ہوئے اترے۔ میں نے ڈکّی کھول کر سادھو رام کو باہر نکالا۔ اُسے اُٹھانا مشکل تھا۔ میں نے اور غالب نے رسّی کا ایک ایک کنارا تھاما اور اُسے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے چلے۔ اس طرح کہ سادھو رام کی ٹانگیں زمین سے رگڑ کھا رہی تھیں مگر باقی جسم تھوڑا سا اوپر اُٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا لیکن وہ مرا نہیں تھا، بے ہوش تھا۔ اُسے بلندی کی جانب گھسیٹ کر لے جانا بھی سخت آزمائش بن گیا۔ بالآخر ہم سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک آسمان کے مشرقی کنارے روشن ہو گئے تھے اور درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ آشیانوں سے نکلنے والے طیور اوپر چکر لگا رہے تھے اور تلاشِ رزق میں نکلنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"اس حالت میں ہم خود کو نہیں سنبھال سکتے۔" مرزا غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اسے کہاں تک سنبھالیں گے۔"

"ابھی تو گاڑی میں بھی ہمارا اسباب پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت نہ ہو تو وہ بیٹی اُٹھا لائیے جس میں ٹائم بم ہیں۔"

"کیوں نہ میں ایک ٹائم بم پر وہیں بیٹھ جاؤں اور اس وقت کا انتظار کروں جب ساری مشکلیں آسان ہو جائیں۔" وہ جھنّا کے بولا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تمھیں ٹائم بم سیٹ کرنا نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "خیر تم یہاں کچھ آرام کرو۔ ان درختوں کے پیچھے کوئی بھی تم کو نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہاں ہے کون دیکھنے والا۔ ہم خود ہی تماشا ہیں اور خود ہی تماشائی۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں فوراً لوٹ آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پہلے انتقال مت کرنا، میرا مطلب ہے کہیں مت جانا۔"

"تم بھی میری طبعی موت کا وقت آنے سے پہلے لوٹ آنے کی کوشش ضرور کرنا۔" غالب نے کہا۔

میں سڑک تک گیا اور پیدل چلتا رہا۔ میری جسمانی طاقت کا ذخیرہ تمام ہو چکا تھا اور اب میں قوتِ ارادی کے سہارے پر چل رہا تھا۔ اس اونٹ کی طرح جو ریگستان میں اپنے ہی کوہان کی چربی کو فیول کے طور پر استعمال کرلیتا ہے۔ سڑک پر دور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ سورج میرے سامنے عین سڑک کے وسط میں طلوع ہوا اور اس کی پھیکی روشنی میرے سرد جسم کو بالکل چاندنی کی طرح بے اثر لگی۔ دس منٹ بعد دھوپ میں تھوڑی سی تمازت آگئی اور چلنے سے میرے جسم میں حرارت پیدا ہوگئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب قوتِ ارادی کا فیول ٹینک بھی خالی ہوگیا ہے۔ عین اس وقت جب میں سڑک پر گرنے والا تھا، ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ میں زمین پر بیٹھ کے اس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بیل کتنی کاہل مخلوق ہے۔ دو بیل ایک گاڑی کو بادلِ ناخواستہ یوں کھینچ رہے تھے جیسے ان کے درمیان سست رفتاری کا مقابلہ ہے۔ اس گاڑی کو ایک گھوڑا دس گنی رفتار سے دوڑا کے لے جاسکتا تھا۔ بالآخر چرچوں کرتی ہوئی گاڑی میرے سامنے آئی۔

"کیا ہوا ہے رے بھائی؟" بیل گاڑی کے پائلٹ نے بیلوں کو رُکنے کا سگنل دے کر کہا جو مخور بیل فوراً رک گئے۔ پائلٹ جو ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا دھوتی سنبھال کے نیچے کودا۔ وہ اوپر صرف ایک واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جوان آدمی ضرور تھا مگر بہت زیادہ صحت مند نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سردی کے احساس سے بیگانہ لگتا تھا۔ وہ میرے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"میں بیمار ہوں بھائی۔" میں نے بمشکل کمزور کانپتی آواز میں کہا۔ "ڈونگا پتن پہنچا دو... اللہ اجر دے گا۔"

"اور کھانے کو کون دے گا بھائی؟" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسی کفر کی بات کرتے ہو بھائی۔" میں نے کہا۔ "کھانے کو بھی وہی دیتا ہے۔"

"مگر پکّی پکائی تو حاضر نہیں کرتا بھائی۔" ... تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کمائی ہی پڑتی ہے۔ مجھے منڈی پہنچنا ہے۔"
"میں تم کو معاوضہ بھی ادا کروں گا بھائی۔" میں نے کہا۔ "آج منڈی کی چھٹی کرو۔"
"منڈی کی چھٹی کیسے ہو سکتی ہے بھائی۔" وہ بولا۔ ہم دونوں کے درمیان بھائی بھائی کی تکرار مسلسل جاری تھی۔
"جیسے دفتر سے چھٹی ہوتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی بہانہ کر دینا۔ مثلاً یہ کہ بیل کے ماموں جان کا انتقال ہو گیا تھا۔"
"بیل کے ماموں جان؟" وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں اپنے ماموں کو مار سکتا ہوں بھائی... لیکن پیسہ کتنا دو گے؟"
"کتنے کے ہیں تمہارے ماموں بھائی... میرا مطلب ہے تم ہی بتا دو کہ وہ کتنی رقم میں وفات پا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔
وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ "بیس روپے ہوں گے بھائی۔"
"مجھے منظور ہے بھائی۔" میں نے اٹھ کر گاڑی کا رخ کیا۔
"ادھار نہیں چلے گا بھائی۔" اس نے مجھے روک لیا۔ "وہاں پہنچ کر تم نے خالی جیب دکھا دی یا بیہوش ہو گئے تو میں کیا کروں گا۔"
میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچاس کا ایک نوٹ نکالا۔ "تم بڑے باسٹرڈ ہو بھائی... میرا مطلب ہے بہت اچھے آدمی ہو... یہ لو۔"
"میرے پاس واپس دینے کے لیے تیس روپے نہیں ہیں بھائی۔" وہ نوٹ اچک کے بولا۔
"میں واپس کب مانگ رہا ہوں بھائی۔" میں نے گاڑی میں نیم دراز ہو کے کہا۔ "سب رکھ لو لیکن میرا ایک کام اور بھی ہے۔"
"ہر کام پیسے سے ہوتا ہے بھائی۔" اس نے پھر کاک پٹ میں پائلٹ کی جگہ سنبھال لی اور بیلوں کو فرسٹ گیئر میں ڈالا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مجبوراً اس نے ایک نوکیلی لکڑی سے وہی کام لیا جو گاڑی کے ٹھنڈے انجن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چوک سے لیا جاتا ہے۔ بیل چل پڑے اور رینگنے لگے۔
"بیلوں کے رِنگ پسٹن جواب دے گئے ہیں بھائی۔" میں نے کہا۔ "ان کی پک اپ ختم ہو چکی ہے۔"
"کیا ختم ہو چکی ہے بھائی؟" میرے منہ بولے بھائی نے سخت تشویش سے کہا۔
"ڈھونگا پتن کے راستے میں تمھیں دو اور بھائی ملیں گے بھائی۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی بیمار ہیں۔"
"اللہ انھیں بھی شفا دے گا بھائی۔" اس نے بیلوں کو ٹاپ گیئر میں ڈالنے کے لیے ایک نہایت نازیبا حرکت کی۔
"شفا اسپتال میں ملتی ہے بھائی۔" میں نے کہا۔ "اگر تم انھیں شہر تک پہنچا دو تو پورے پچاس تمہارے۔"

"یہ تو ایک طرف کا کرایہ ہوا بھائی۔" وہ کچھ سوچ کر اور مجھے گھور کر بولا۔ "ایک نوٹ اور دے سکتے ہو؟"
"دے سکتا ہوں بھائی۔" میں نے کہا۔ زیرِ لب میں نے اس کو ایک گالی بھی دی۔ سو پچاس کی رقم میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی مگر وہ جس یہودی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ قابلِ مذمت تھی۔ عموماً دیہات میں بیل گاڑی چلانے والے اتنے چالاک اور کاروباری ذہن کے مالک نہیں ہوتے۔ بھائی بھائی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ اللہ کے فضل سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے یعنی مقامی درس گاہ سے (جو کہ ایک مڈل اسکول تھا) اعلیٰ ترین سند حاصل کر چکا ہے۔ چنانچہ اب پٹواری کا افسرِ بکارِ خاص ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس آٹھویں جماعت پاس جان کو پیسے اینٹھنے کا فن ورثے میں نہیں ملا۔ اس کا باپ تو سیدھا سادا شریف آدمی ہو گا مگر پٹواری کی صحبت میں اس نے سب کو بھائی کہہ کر سب کی جیب پر ڈاکا ڈالنا سیکھ لیا تھا۔ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ پٹواری خود حرام کھاتا تھا۔ اسے دیکھ کر افسرِ بکارِ خاص کو حرام خوری کا شوق ہوا اور انتہا یہ تھی کہ اب بیل تک حرام خور ہو چکے تھے۔ انہی کے لیے غالب پریشان تھا کہ اب یہ سادہ دل بندے کہاں جائیں؟
بھائی نے کسی کام سے انکار نہیں کیا لیکن ہر کام کی قیمت وصول کی۔ جیسے جیسے اس کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہماری قوتِ خرید بہت زیادہ ہے اس کے نرخ بھی چڑھتے گئے۔ اس نے تالاب نما گڑھے میں پڑی ہوئی گاڑی سے نکال کر سامان کو بیل گاڑی تک لانے اور اس سامان کو شہر تک ڈھونے کے مزید سو روپے طلب کیے۔
"یہ تمھاری گاڑی ہے بھائی؟" اس نے سادھو رام کی کار کو دیکھ کر کہا۔ "گڑھے میں کیسے گر گئی؟"
"اللہ کو یہی منظور تھا بھائی۔" غالب نے کہا۔
"میں اسے بھی کھینچ کر باہر نکال سکتا ہوں بھائی۔" وہ بولا۔ "بس دو سو روپے..."
"تم ایسا کیوں نہیں کرتے بھائی۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "کہ اپنی گاڑی ہمیں دے دو... اور خود یہ کار کھینچ کر لے جاؤ۔"
اس کے بعد بھائی چارے کی فضا میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ میں اور غالب ہچکولے کھاتی بیل گاڑی میں آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ بیل گاڑی کا وہ حصہ جو ایک جھنگلے کی طرح فرش سے دو فٹ کے قریب اونچا تھا ہماری کمریں اور پسلیوں میں گڑتا رہا اور ٹاپ گیئر میں بھی بیل یوں چلتے رہے کہ ہم اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پیدل جا سکتے تھے لیکن سارا مسئلہ انرجی کا تھا۔ ہم میں تو اب بیٹھنے کی طاقت بھی نہ تھی۔ مزید ظلم یہ کہ ہم سگریٹ پی رہے تھے۔ خالی پیٹ میں دھواں بالکل اشک آور گیس کی طرح پھیلتا تھا۔ جبیں سادھو رام کی طرف سے

[...]رہی تھی کہ وہ تفتیش کے عمل کا آغاز ہونے سے قبل ہی وفات [...]ہے۔ بالآخر شہر کے مضافات شروع ہوئے اور مجھے سڑک [...]ایک کیفے "ڈی پھونس" نظر آیا۔ میں نے اپنی لوکل انجن اسپورٹس [...]کو روک لیا اور نیچے اتر گیا۔ اس چھپر نما عمارت کا پروپرائٹر دنیا و [...]سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے خشک بسکٹوں کا سارا [...]خرید لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک وقت میں جتنی چائے بنا [...]ہو بنا لائے۔ اس نے فٹافٹ گوبر کے اپلوں پر سلور کی کیتلی بھر [...]جو دھوئیں سے اتنی کالی ہو گئی تھی کہ اب اور کالی نہیں ہو سکتی [...]چنانچہ اسے صاف کرنے کی کوشش بہت پہلے ترک کر دی گئی [...]آدھے گھنٹے میں ہمارے سامنے تقریباً ایک لیٹر چائے بیٹھی [...]جس میں پانی کے بعد سب سے زیادہ مقدار دودھ کی تھی۔ پھر [...]اور سب سے کم پتی کی۔ یہ مشروب ایک "ٹانک" ضرور سمجھا [...]سکتا تھا مگر وہ چائے نہیں تھی جو ہم شہری پیتے ہیں اور اپنی صحت [...]برباد کرتے ہیں۔ تاہم اس وقت خشک بسکٹ اور یہی گرما گرم [...]پینے سے میری اور مرزا غالب کی زندگی میں چند سانسوں [...]اضافہ ہو گیا۔
[...]سفر پھر شروع ہوا تو ہمارے جسم میں توانائی یوں بھر گئی تھی [...]پنکچر ہو جانے والے ٹائر میں پنکچر لگانے کے بعد ہوا بھر [...]ہے۔ ہم زور زور سے ہنسنے اور باتیں کرنے لگے اور سگریٹ [...]لمبے لمبے کش لینے لگے۔ ہماری اس کایا پلٹ پر بیل گاڑی کا [...]اور پٹواری کا افسرِ بکارِ خاص سخت حیران تھا۔ اس نے کبھی [...]بیماروں کو صرف چائے سے شفا پاتے یوں چٹکی بجاتے [...]صحت مند ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کو یہ بھی حیرانی تھی کہ ہم [...]اپنے بیمار کو یہ آبِ حیات کیوں نہیں پلایا جبکہ ہم اس کی استطاعت [...]رکھتے تھے اور تقریباً دو پیالی چائے بچ بھی گئی تھی۔ بالآخر اس سے [...]
[...]اس کو تم نے چائے کیوں نہیں دی بھائی؟" وہ بولا۔
[...]اسے پی کر چائے اس کے لیے زہر ثابت ہوتی بھائی۔" میں نے کہا۔
[...]تمہارے لیے تو زہر نہیں بنی بھائی۔" وہ جرح کے انداز میں بولا۔
[...]ہم تو اس بیمار کو اٹھا کر لانے سے بیمار ہو گئے تھے بھائی۔" میں [...]ورنہ ہم بیمار نہیں تھے... جیسے کہ یہ ہے۔"
[...]لیکن چائے تو..."
[...]فضول بک بک مت کرو بھائی۔" غالب نے کہا۔ "اب ہر [...]جواب ہم پانچ روپے میں دیں گے۔"
[...]پانچ روپے نہیں کاٹیں گے بھائی تو ایک جھانپڑ دیں گے۔"
[...]سوچ لو کہ تمھیں کیا قبول ہے بھائی؟" غالب بولا۔ "پانچ [...]یا ایک جھانپڑ۔"

برادرانہ تعلقات اس کے بعد بالکل منقطع ہو گئے اور ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے غالب سے انگریزی میں بات شروع کی تو ہمارے سابقہ بھائی نے ہمیں گھور کر دیکھا مگر خاموش رہا۔
"یہ بہت چالاک اور خطرناک بھائی ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ سادھو رام کی کار کو اس علاقے میں سب پہچانتے ہوں گے۔ جب یہ بات پھیلے گی تو اس کے کانوں تک بھی پہنچے گی اور یہ بک دے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔"
"میرا تو خیال ہے کہ یہ سیانا کوا خطرے سے دور رہے گا۔" غالب بولا۔ "اسے ہم سے بھی تو ڈر رہے گا۔"
"ہم سے کس بات کا ڈر...!" میں نے کہا۔ "یہ ہمارے حلیے بیان کر دے گا۔"
"اس نے ہم سے دو سو روپے لیے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ شریک جرم سمجھا جائے گا۔"
"میرا خیال ہے اس کو اب رخصت کر دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "جب یہ واپس چلا جائے تو ہم باقی فاصلہ کسی ٹیکسی میں طے کر لیں۔"
"ٹیکسی یہاں کہاں ہے؟"
"ہے نہیں تو آ جائے گی۔ ورنہ کوئی رحمدل کار والا لفٹ دے دیگا۔" میں نے کہا۔ "اس خبیث کو اپنے ٹھکانے کا پتا نہیں ہونا چاہیے۔"
"ہم یہاں اتریں گے بھائی۔" غالب نے اتفاق کیا اور پائلٹ کے کندھے پر تھپکی دی۔ "یہاں روک لو اپنی شیر ایکسپریس۔"
"مجھے جو کہنا ہے کہہ لو بھائی۔" وہ بُرا مان کے بولا۔ "لیکن میری بیل گاڑی کو گالی مت دو..."
جب ہم نے اپنا سامان اتار لیا اور سادھو رام کو سڑک کے کنارے لٹا دیا تو اس نے بیلوں کو واپسی کا سگنل دیا اور ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہے جب تک کہ بیل گاڑی دو فرلانگ دور نہیں چلی گئی۔ صبح کے نو بجنے والے تھے اور سڑک پر ٹریفک میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا کئی سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں والے ہم پر نگاہ ڈالے بغیر گزر گئے۔ چند ایک نے ہمیں واجبی سے تجسس کے ساتھ دیکھا شک کی کوئی بھی بات نہیں تھی۔ ہم دونوں عام قسم کے انسان تھے۔ میں وضع قطع سے دیہاتی لگتا تھا اور غالب کوئی کلرک ٹائپ چیز... ہم کسی بیمار کے ساتھ کسی سواری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے اور ہمارے سامان میں بھی کوئی بات عجیب نہ تھی۔ یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ دیہاتی نظر آنے والا وہ سکندر بخت ہے جس کے پیچھے ہر طرف سے شکاری لگے ہوئے ہیں۔ ایک شکاری پولیس ہے جس نے مجھ پر ان گنت مقدمات قائم کر رکھے ہیں اور جو مجھے خطرناک اشتہاری اور مفرور مجرم قرار دے چکی ہے۔ دوسرے شکاری میرے آبائی چوہدری دلاور اور اس کے گرگے ہیں اور تیسرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اپنے ہی نامہرباں دوست ہیں جن میں آنکل رضوی اور ڈبل ایس آئی شیخ شامل ہیں۔ وہاں سے گزرنے والے یہ بھی تصور نہیں کر سکتے تھے کہ لکڑی کے باکس میں بارہ خطرناک قسم کے ٹائم بم ہیں اور جو شخص بیمار نظر آتا ہے وہ درحقیقت ایک خطرناک وطن دشمن ہے جسے ہم ایک معرکۂ شب کے بعد گرفتار کر لائے ہیں۔ کوئی یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ ہمارے سوٹ کیس میں نقد چالیس ہزار روپے ہیں۔ اس سے زیادہ مالیت کی انڈین کرنسی ہے اور اس سے بھی زیادہ قیمت کا سونا ہے۔ ایسے بے سروسامان مہاجر نظر آنے والے کتنے بے ضرر لگتے تھے مگر کتنے دولت مند تھے اور کتنے خطرناک تھے۔

غالب نے بالآخر ایک ریڑھے کو خالی آتے دیکھا اور روک لیا۔ اس سے پہلے جتنے ریڑھے گزرے تھے وہ سب دودھ والوں کے تھے جو خالی برتن لے کر واپس جا رہے تھے۔ غالب نے ریڑھے والے سے پچاس روپے میں معاملہ طے کیا اور ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ اب ہم پہلے کی نسبت زیادہ رفتار سے جا رہے تھے اور ریل گاڑی کے مقابلے میں ریڑھا ایک لگژری کوچ محسوس ہوتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم نے ریڑھے کو گلی کے نکڑ پر روک لیا۔ ریڑھے والا بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے سامان اتار کے نیچے رکھا۔ پچاس روپے جیب میں ڈالے اور پلٹ کر دیکھے بغیر سیدھا نکل گیا۔ غالب وہیں کھڑا رہا اور میں چلتا ہوا اس گھر کے دروازے تک پہنچا جہاں اب نیک محمد کے سوا کوئی ہمارا منتظر نہ تھا۔ نہ وہاں رابعہ تھی اور نہ نازو... رابعہ میرے خیال و خواب کی دُنیا میں تو میری تھی لیکن اس کے خیالوں کی دنیا میں شاید میں بھی نہیں تھا۔ صرف خلا تھا۔ نازو دُہرے عذاب میں اسیر تھی۔ ایک طرف اس کے جذبات کا طوفانی دھارا تھا جس کی راہ میں کوئی بند نہیں باندھ سکتا تھا لیکن دوسری طرف رشتوں کے محافظ تھے جو اس کے سامنے دیوار بن گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی سب زنجیریں توڑ کر اور تمام دیواریں گرا کے اپنے جسم کے زخموں کی پروا کیے بغیر یوں نکل پڑے گی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ رابعہ کے بارے میں یہ سوچ کر میرا دل آگ پر رکھے ہوئے شیشے کی طرح چٹخنے لگتا تھا کہ اس کی واپسی کب ہوگی۔ جسمانی طور پر اس کا لوٹ آنا بے مقصد تھا۔ وہ اپنی چاہت کے سارے جانفزا جذبوں کے ساتھ پھر کب میرے دل کی تنہائی اور ویرانی دُور کرنے آئے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

استاد ٹیڈی نے دروازہ کھولا اور چند سیکنڈ دم بخود کھڑا رہا۔ پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "یہ... یہ تم ہو سکندر بادشاہ..." وہ مجھے زور زور سے ہلاتے لگا۔ "واقعی تم ہو... یا میری آنکھیں خواب دیکھ رہی ہیں؟"

"میں آگیا ہوں نیک محمد..." میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "میں پہلے بھی آیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔"

"ہاں! میں نے غالب کا چھوڑا ہوا رقعہ دیکھ لیا تھا۔" وہ بولا۔

"غالب کہاں ہے؟"

"وہ گلی کے نکڑ پہ کھڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ اور اُسے لے آؤ۔"

"کیا وہ خود نہیں آسکتا تھا؟" نیک محمد کا چہرہ تشویش اور پریشانی کی تصویر بن گیا۔

"اُسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" میں نے نیک محمد کو تسلی دی۔ "اُس کے پاس کچھ سامان ہے جو ذرا بھاری ہے۔ وہ خود اُٹھا کے نہیں لا سکتا تھا... اور ایک مہمان بھی ہے۔"

"کون مہمان؟"

"خود جا کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہاں تم سوالات کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا تو مرزا غالب بھی لیٹ جائے گا۔ اس کا بھی تھکن سے بُرا حال ہے۔"

"میں جاتا ہوں سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "تم لیٹو... آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"نیک محمد..." میں نے آواز دے کر کہا۔ "رابعہ کیسی ہے؟"

"وہ ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے ٹھیک ہے۔" ٹیڈی نے دروازے میں رک کر کہا اور پھر غائب ہوگیا۔ میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ ایک بار پھر میں اپنے گھر کی چھت کے نیچے تحفظ کے سائے میں تھا اور یہ احساس ہی اتنا سکون بخش تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ جو کچھ مجھ پر بیت چکی تھی نقشِ ماضی بن گئی۔ گزشتہ چند دن کے واقعات محو ہوگئے اور میرا ذہن نیند کے تاریک خلا میں پناہ لینے کے لیے وقت سے کٹ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن کا اجالا کمرے کے باہر صحن میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اپنے قریب ہی دوسری چارپائی پر غالب گھٹنے سمیٹ کر سینے سے لگائے گٹھری کی طرح پڑا نظر آیا۔ نہ جانے کس وقت نیک محمد نے مجھ پر لحاف ڈال دیا تھا۔ وہ خود شاید دوسرے کمرے میں تھا اور کسی سے چپکے چپکے باتیں کر رہا تھا۔

"نیک محمد۔" میں نے آواز دے کر اُسے بلایا اور اُٹھ بیٹھا۔

"اُٹھ گئے سکندر بادشاہ۔" وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ "قسم مولا علی کی... یوں گھوڑے بیچ کر سوتے ہم نے تمھیں پہلی بار دیکھا۔"

"تم باتیں کس سے کر رہے تھے؟" میں نے کہا۔

"اپنے مہمان سے۔" وہ ہنسا۔

"وہ زندہ تو ہے نا؟" میں نے کہا۔

"زندہ تو اُسے رہنا پڑے گا۔" نیک محمد نے کہا اور ...

... بیٹھ گیا۔ "میں اسے مرنے کہاں دوں گا۔"

"آج دن اور تاریخ کیا ہے اُستاد؟" میں نے انگڑائی لے کر ... "میں کب سے سو رہا ہوں؟"

"کل دوپہر سے تم اور غالب دونوں ہی مُردوں کی طرح پڑے ..." نیک محمد نے کہا۔ "میں نے تو کئی بار آ کے دیکھا ... کہ سانس چل رہی ہے یا نہیں۔" میں ہنس پڑا۔ "ارے ... استاد! ہم بڑی ڈھیٹ چیز ہیں ورنہ کب کے مر گئے ہوتے۔"

"یہ تمھاری حالت کیا ہو رہی ہے سکندر بادشاہ۔" نیک محمد ... "قسم اللہ کی! میں تو ذرا سی دیر کے لیے چکرا گیا تھا تمھیں دیکھ ... میں سمجھا کسی گاؤں کی مسجد کے پیش امام صاحب آگئے ہیں۔ ... داڑھی... زلفیں اور... یہ لباس..."

میں نے اپنی کئی دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ تو غیر ... ضرورت کا عطیہ ہے۔ مجھے مرنے کی فرصت نہیں تھی۔ ہاتھ مُنہ تک ... نہیں دھویا تو شیو کہاں سے بنوا آتا۔ لیکن باقی سب بھی ضروری تھا۔ ... یہ لباس میں نے خریدا تھا۔ بال کٹوائے ہوئے زمانہ ہوگیا اس لیے کچھ ... ضرورت سے زیادہ لمبے ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنی اس ... وضع قطع کو فی الحال برقرار رکھوں۔"

"ضرور رکھو۔ لیکن نہا تو لو۔" نیک محمد نے کہا۔ "یا میل کو بھی ... جسم پر برقرار رکھنے کا ارادہ ہے۔"

نیک محمد نے مجھے غسل کے لیے گرم پانی فراہم کیا۔ میل کے ساتھ میرے جسم کی تھکن بھی بہہ گئی اور میں بالکل تازہ دم ہو کے ... باہر نکلا تو مرزا غالب چارپائی پر مہاتما بدھ کی طرح آلتی پالتی مارے ... آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے دھکیلا تو وہ لڑھک گیا۔ ... بیٹھے بیٹھے پھر سو گیا تھا۔ نیک محمد کے کہنے پر وہ اُٹھا۔

"تمھارے ساتھ کیا کم دھکے کھائے ہیں کہ اب تم بھی دھکے ... دیتے ہو۔" مرزا غالب نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ نہا دھو کے پھر آدمی بن جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے کہ اس وقت زندہ آدمی ہوں... مردہ ... آدمی بن جاؤں۔" غالب نے کہا۔ "اے ظالم! اتنی سردی میں بے ... وہ آپ کرتے ہو۔ ڈبل نمونیا تو مجھے قسل کا مُن کے ہی ہونے ... لگا ہے۔" لیکن ہم نے اس کی ایک نہیں سُنی اور اُسے غسل خانے ... میں بند کر دیا۔ وہ اندر سے چلاتا رہا کہ میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا ... اور اب نہالوں تو میری میت کو دوبارہ مت نہلانا۔ وہ شخص جو ... رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن ... کی عملی تفسیر تھا۔ بے خطا آتشِ ... نمرود میں کود پڑنے والا جگر رکھتا تھا۔ دوستی کے نام پر جان بیچنے کو آسے ... جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ... کے اصول پر عمل کرتا تھا اور موت کے روبرو ... مسکراتا تھا۔ سردی میں نہاتے ہوئے مرا جا رہا تھا۔

میں نے کپڑے بدلے اور پھر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا تو مجھے استاد ٹیڈی کی حیرانی حق بجانب محسوس ہوئی۔ میں واقعی بہت بدل گیا تھا۔ میری صحت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ مسلسل سختی حالات۔ بے آرامی اور فاقہ کشی اور مسلسل تگ و دو میرے جسم پر اثر انداز ہوئی تھی۔ میرا وزن یقیناً پہلے کے مقابلے میں پندرہ بیس پونڈ کم ہوگیا تھا۔ میرا چہرہ سُتا ہوا لگتا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہوگئے تھے۔ میرے رخساروں کے گرد بے قاعدہ قسم کی خشخشی داڑھی بھی نمودار ہوگئی تھی جس کا سلسلہ مونچھوں سے جا ملتا تھا۔ عمداً میں نے بال پیچھے کی طرف بنائے تو مجھے اپنی صورت میں کسی میک اپ کے بغیر خاصی تبدیلی کا احساس ہوا۔ نیک محمد کچن میں ناشتے کا اہتمام کر رہا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا جہاں سادھو رام بندھا پڑا تھا۔ غالب یا استاد ٹیڈی نے اسے چارپائی پر لٹا کے اس کے ہاتھوں پیروں کو الگ الگ چارپائی کی پٹی سے باندھا تھا اور اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ وہ اب ہوش میں تھا اور بے چینی سے گردن کو اِدھر اُدھر جھٹک رہا تھا۔ اس کا رنگ نقاہت سے سفید ہو رہا تھا۔

"کیوں سادھو رام!" میں نے کہا۔ "کیا دریا کی یاد آرہی ہے؟ اُس سے ملنے کے لیے تمھیں بہت دُور جانا پڑے گا۔ اور معلوم نہیں پھر بھی وہ بے وفا عورت تمھیں ملے گی یا نہیں۔ وہ دنیا میں کبھی کسی کی نہیں تھی مگر دنیا سے کرنل جگن ناتھ کے ساتھ گئی۔ کیا پتا پرلوک میں وہ اسی کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ دنیا میں تو اس کا دھرم ایمان، مہر و وفا اور پیار محبت سب پیسہ تھا۔"

سادھو رام کی آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ اُس نے میری بات کو بے یقینی کے ساتھ سنا تھا مگر میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ پر یقین کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے اور اُسے سیدھا بیٹھنے میں مدد دی۔ اپنے مُنہ میں سے کپڑا خود اس نے نکال دیا۔ پھر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس صورتِ حالات میں وہ کوئی غلط حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ شور مچانا اس کے لیے بے سود تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے آتے وہ ایک غدار اور وطن فروش ہندو کا نام سنتے ہی اس کی تِکا بوٹی کر دیتے۔ فرار کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ وہ تو سیدھا بیٹھتے ہوئے بھی دشواری محسوس کر رہا تھا۔

"یہ بات تو پرانی ہو چکی..." میں نے کہا۔ "لیکن تمھارے لیے یقیناً ایک خبر ہوگی کہ ہم نے سائیں پایٔے والے کی اس خانقاہ کو اُڑا دیا جو تمھارا اڈا تھی۔ سیوک رام اور دریا کو ہم نے تمام گولا بارود اور اسلحے پر رکھ دیا تھا۔ ان کی تو راکھ بھی نہیں ملے گی۔ کرنل جگن ناتھ کو اس کی قضا ٹھیک وقت پر لے آئی۔ وہ اپنے ہیلی کاپٹر سے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اتنا ہی تھا کہ اڑ گیا، ہیلی کاپٹر سمیت۔ اور اس مرتبہ کرنل کی پرواز سیدھی پرلوک پہنچی۔"

وہ کانپتے ہاتھوں سے ہاتھوں کی کلائیوں اور ٹخنوں کو رگڑتا رہا اور جھومتا رہا۔ اس کے لیے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تمہارے لیے اور بھی بہت سی دلچسپ خبریں ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے... مجھے تھوڑا سا پانی... دے دو..." وہ بولا

"جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے وہ تم کو ضرور ملے گا... جب تک تمہارا آب و دانہ نہیں اٹھتا۔" میں نے کہا: "ابھی تمہیں پانی ہی نہیں، چائے بھی ملے گی۔ کھانے پینے کو بھی ملے گا اور موت کے سوا جو مانگو گے ملے گا۔ یہی ایک چیز ہمارے اختیار میں نہیں۔"

اسی وقت نیک محمد اندر آیا: "کیا حکم ہے سکندر بادشاہ؟"

"اس کتے کو کچھ کھانے کے لیے لا دو نیک محمد... اور دو گھونٹ پانی بھی پلا دو۔" میں نے کہا: "اور پھر باندھ دو۔"

"تم بھی تو ناشتا کر لو۔" نیک محمد نے کہا: "غالب زندہ سلامت باتھ روم سے نکل آیا ہے۔"

استاد ٹیڈی نے میری ہدایت پر عمل کیا اور چند منٹ میں سادھو رام کو پھر بے بس کر کے ڈال دیا۔ غالباً گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اسے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ملتا رہا تھا ورنہ اب تک وہ زندہ نہ رہتا۔

"ہم ابھی کچھ دیر میں پھر حاضر ہوں گے۔" میں نے کہا: "اس وقت تک تم تازہ خبروں کی روشنی میں سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ تمہاری بیوی بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ نہیں... وہ کسی کے ساتھ فرار نہیں ہوئی ہے۔ وہ اس دنیا سے ہی چلی گئی ہے جس میں تم جیسے بے ضمیر اور کمینے شخص کو وہ اپنا شوہر تسلیم کرنے پر مجبور تھی۔ میرا خیال ہے اب تک اس کا بھی کریا کرم ہو چکا ہوگا اور کریا کرم کرنے والے وہی ہوں گے جو تمہارے آقا تھے۔ جن کے اشارے پر تم کتے کی طرح دُم ہلاتے جاتے تھے اور جو تم کو پیسے کا راتب ڈال کر تمہاری وفاداری خرید لیتے تھے۔ تم سے تو کتا بھی بہتر ہے جو اپنے مالک سے وفاداری کو نہیں چھوڑتا۔ تمہارے ان جگن ناتھ اور سیوک جیسے ایجنٹوں نے اب تک گرد و نواح کا سارا علاقہ کھنگال ڈالا ہوگا۔ وہ کرماں والی کے ڈیرے کے آس پاس سرگرم عمل ہوں گے اور یہ جاننے کی فکر میں ہوں گے کہ یہ کارروائی کس دشمن کی ہے لیکن اطمینان رکھو، ان کے فرشتے بھی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتے۔ کچھ دیر بعد ہم تمہیں بہت سی چیزیں دکھائیں گے جو تمہارے لیے فیصلے کو آسان کر دیں گی۔ تمہیں ابھی بہت سے مشکل فیصلے کرنے ہیں۔"

سادھو رام جانتا تھا کہ یہ مشکل فیصلے کیا ہوں گے۔ چار پانچ دن کی قوتِ مزاحمت کو کم سے کم کر دینا چاہتے تھے۔ اُسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے اور اس بات کا امکان ایک فیصد بھی نہیں کہ بازی پھر پلٹ جائے۔ میں اس کی ہر امید کو ختم کر دینا چاہتا تھا کہ وہ خوش فہمی کے فریب کا شکار نہ ہو اور یہ نہ سوچے کہ اس کو بچانے والے یہاں تک پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں جو بےحد ذہین اور نڈر ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ہم کچھ بھی نہیں۔ ہم نے کوئی غلطی ضرور کی ہوگی جو ہمارا سراغ دے گی اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے جن کے لیے وہ آج تک سب کچھ کرتا رہا تھا۔ ایک بنیادی حقیقت اس نے پہلے نہیں سمجھی تھی تو اب سمجھ لے گا کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔

غالب کے ساتھ میں نے لنچ کے وقت ایک پُرتکلف ناشتا کیا جو مجھے بہت دن بعد ملا تھا۔ اس چائے کے ذائقے کو میری زبان ترس گئی تھی۔ تاہم ہر لحظہ مجھے اپنے اطمینان اور آسودگی کے احساس میں وہ کمی محسوس ہوئی جو رابعہ اور نازو کی عدم موجودگی کے باعث گھر میں ویرانی کا تاثر بن کے پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے بغیر یہ گھر خالی لگتا تھا اور دیواروں کے حصار میں افسردگی کا سونا پن کاٹتا تھا۔

"یار، میری نوکری کا کیا بنے گا؟" غالب نے کہا: "اخبار والے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔"

"نہیں مرزا غالب! اس دنیا میں کسی ایک آدمی کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا: "کاروبارِ حیات جاری رہتا ہے۔ زمین کی رفتار... سورج، چاند ستاروں کا نکلنا، ڈوبنا۔ پرانے ہو جانے والوں کا نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دینا۔ انسانوں کا سونا جاگنا... ہنسنا رونا... محبت کرنا اور نفرت کرنا سب وہی رہتے ہیں خواہ تم نہ رہو یا میں نہ رہوں۔ کیا تمہاری غیر حاضری میں اخبار شائع نہیں ہوا تھا؟ ذرا پوچھ کر دیکھنا۔"

"مجھے نہ اخبار کی فکر ہے نہ دنیا کی۔ فرق تو مجھے پڑے گا۔ جس کی نوکری نہیں رہے گی۔" غالب نے بھنا کر کہا: "معلوم نہیں اب تک کسی نے میری پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ نہ لکھوا دی ہو۔"

"میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ تم آج سے پھر صحافت شروع کر دو۔" میں نے کہا: "تمہارے ڈبل رول سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔ تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس پر کوئی الزام نہیں اور لگایا بھی نہیں جا سکتا۔ تم ہمارے ساتھ بھی ہو لیکن اس دنیا میں بھی ہو جس سے ہمارا کوئی براہِ راست رابطہ نہیں۔ اچھا ہے اگر تمہاری یہ پوزیشن برقرار رہے۔ تم ہمارے بہت سے کام کر سکو گے جو ہم نہیں کر سکتے۔"

"ہو سکتا ہے آج محسن بھی لوٹ آئے۔" استاد ٹیڈی نے کہا: "اور شہلا کو بھی لے آئے۔"

دروازے پر دستک سُن کے ہم سب چونکے: "کون آ سکتا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"تم ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ذرا احتیاط کے ساتھ استاد۔" میں نے کہا اور اپنا ریوالور لینے لپکا۔ غالب میرے ساتھ آیا۔ ہم نے کمرے کے دونوں دروازوں کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ ان میں سے ایک صحن میں کھلتا تھا اور دوسرا ساتھ والے کمرے میں۔ دستک دوبارہ ہوئی اور اس مرتبہ چوڑیوں کی جھنکار بھی سنائی دی۔ ٹیڈی کے قدم رک گئے۔ پھر اس کا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھا۔

"اندر آ جاؤ۔" ٹیڈی نے دروازہ کھولے بغیر دیوار سے لگ کر کہا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلا اور پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ ایک لڑکی اندر آئی جو بالکل دلہن لگتی تھی۔ وہ نئی دلہن تھی چنانچہ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بہت شوخ تھا۔ اس کی مانگ میں افشاں بالکل یوں لگتی تھی جیسے تاریک رات کے آسمان پر کہکشاں۔ اس نے دلہنوں کی طرح سرخ عروسی جوڑا نہیں پہن رکھا تھا مگر اس کے ریشمی لباس اور کرن والے دوپٹے کی مسکراہٹ اعلان کرتی تھی کہ وہ دلہن ہے۔ اس کے عارض پر حیا کی لالی اور اس کی آنکھوں کی پُرغرور فتح مند چمک بتاتی تھی کہ وہ کسی کی ہو گئی ہے اور کسی کو جیت چکی ہے۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے نیکلس، کانوں کے جھلمل کرتے آویزے اور ہاتھوں میں کھنکتی سونے کی چوڑیاں سب پکار پکار کے کہتے تھے کہ وہ ایک دلہن ہے اور یہ دلہن شہلا تھی۔ دروازے کے سامنے استاد ٹیڈی منجمد کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہاتھوں میں ریوالور تھامے میں اور غالب منجمد کھڑے ہوئے تھے۔ یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ ابھی ہم نے محسن کا اور شہلا کا نام ہی لیا تھا کہ وہ آ گئے۔ ایسے لمحے زندگی میں صرف ایک بار آتے ہیں جب آدمی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ پلک جھپکتے میں سچ ہو جاتے ہیں۔

"کیا مجھے یہیں کھڑا رکھو گے بھیا۔ اندر نہیں آنے دو گے؟" شہلا نے کہا اور یکلخت خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"شہلا! میری مُنی سی بہن۔" ٹیڈی نے ریوالور پھینک کر اُسے گلے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا: "تو دلہن بن گئی۔ بھائی کو بھی نہیں بتایا۔ بھائی تو خود آتا۔" فرطِ جذبات سے اس کی آواز لڑکھڑا گئی: "یہ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ دلہن میری بہن ہے۔"

میں اور غالب آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ شہلا آگے آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ میں بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ کچھ بھی نہ بول سکا۔ پھر محسن نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں دو سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے جو اس سے غالب نے لے لیے۔

وہ ایک دم میری طرف آیا اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے آنسوؤں کو آنکھوں تک نہیں آنے دیا۔ آنسو میرے دل میں سمندر کی طوفانی لہریں کے اُٹھے اور انھوں نے میرے وجود کو اندر سے تہس نہس کر دیا لیکن میں نے اپنے مقابل شہلا کو دیکھا اور ضبط کی ساری قوت سے آنسوؤں کے بہالے جانے والے ریلے کو روک لیا۔

"خوشی کے اس موقعے پر روتا ہے پاگل۔" میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر خود پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کے کہا: "تو شہلا کو اس گھر میں دلہن بنا کے لایا ہے۔" پھر میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ابا نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ محسن کو رونے مت دینا۔" محسن نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا: "اس وقت میں ان کے ساتھ نہیں تھا، ورنہ وہ یہی بات مجھ سے کہتے۔ اور خدا گواہ ہے میں ان کی قبر پر جا کے بھی نہیں رویا تھا۔ رو رو کے فوزیہ کا اور شہلا کا برا حال تھا۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیے تھے۔"

"پھر اب رو کے ان کی روح کو کیوں تکلیف پہنچاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مجھے کیا ہو گیا تھا۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گیا... غالب خاموش تماشائی بنا سب کی صورتوں کو دیکھتا رہا۔

استاد ٹیڈی نے شہلا کو سنبھال لیا تھا: "بیٹھ جا... تو بھی بیٹھ جا میری مُنی سی بہن۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے... معلوم نہیں کتنے عرصے کے بعد تجھے دیکھا ہے۔ آخری بار دیکھا تھا تو... شاید تو چھوٹی سی بچی تھی... یا مجھے لگتی تھی۔ کتنی خوب صورت لگ رہی ہے تو اس لباس میں۔" وہ بےحد جذباتی ہو رہا تھا اور شہلا کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

"معلوم ہے ابھی کیا ہوا!" میں نے کہا: "ایک معجزہ۔ اُسے کوئی کچھ بھی کہے لیکن میں نے ایسا ہوتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ ابھی خواجہ نیک محمد نے تمہارا نام لیا ہی تھا... صرف محسن کا نہیں... شہلا کا بھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے آج محسن اور شہلا آ جائیں۔ اور اسی وقت شہلا نے دستک دے دی۔ اس کے لبوں سے الفاظ کے نکلتے ہی... بڑی طویل عمر ہوگی تم دونوں کی۔"

"معلوم نہیں شہلا کا خیال مجھے کیوں آیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا: "ہمارا خیال تو یہ تھا کہ محسن اسے فوزیہ کے پاس چھوڑ کر آئے گا۔ کوئی وجہ نہیں تھی ایسا سوچنے کی۔"

"دنیا میں بہت کچھ بے سبب بھی ہوتا ہے استاد۔" میں نے کہا: "مثلاً محبت... جادو، ٹیلی پیتھی کی عقل کیا توضیح کرے گی۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ یہ محبت کا کرشمہ تھا کہ تیرے دل میں وہ خیال آیا جو کسی اور کے دل میں نہیں آ سکتا تھا... اور یہ محبت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ تھی جو سچ کی قوت رکھتی تھی۔ اُس نے خیال کو حقیقت بنادیا اور سچ کردیا۔ اس وقت تم کچھ اور کہتے تو وہ سچ نہ ہوتا۔"

"میاں خوجی اور سکندر بادشاہ..." غالب نے اچانک ہاتھ مل کے کہا۔ "مَیں اتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں ظالم سماج کی طرح دو محبت کرنے والوں کے درمیان حائل ہو... ایسے نہیں چلے گا... چلو ہٹو دونوں۔"

"یہ میری بہن ہے مرزا غالب کے بچے۔" استاد ٹیڈی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ تھی تمہاری بہن۔ اب اس کے ہاتھ پیلے... سوری لال ہوچکے اور اس کی رخصتی ہونے کے بعد یہ صرف محسن کی بیوی ہے اور تم سالے... کتے زیادہ سے زیادہ..." غالب نے کہا۔ "کیونکہ تم نے سُنا ہوگا کہ بہن کے گھر میں بھائی کتا۔"

"وہ رخصت ہو کے میرے گھر میں آئی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھونکتے ہو۔"

"یہ اب محسن اور شہلا کا گھر ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "رخصت تم کو ہونا پڑے گا۔ ورنہ اسے دوبارہ رخصت کرنا ہوگا۔ کہیں اور۔"

"ارے لڑتے کیوں ہو بھائیو!" محسن بولا۔ "یہ ہم سب کا گھر ہے، ہم میں سے نہ کوئی رخصت ہوگا نہ کسی کو رخصت کرے گا۔ شہلا اپنے میکے میں بھی ہے اور سسرال میں بھی۔ اس گھر کا ڈبل رول ہے۔"

"ڈبل رول ہے تو ٹھیک ہے۔" غالب بیٹھ گیا۔ "اب یہ بتاؤ کہ ایسا کیوں ہوا کب ہوا کیسے ہوا؟"

"ڈیڈی کی آخری خواہش یہی تھی۔" محسن بولا۔ "انھوں نے فوزیہ سے کہا تھا کہ اس نیک کام میں دیر مت کرنا۔ میرے سوئم چہلم کا انتظار ہرگز نہ کرنا۔ مَیں نے محسن کے آخری وقت میں قریب نہ ہونے کا قصور معاف کردیا۔ صرف اس شرط پر کہ وہ میری اس وصیت پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہ کرے۔ اس کو سمجھا دینا کہ مَیں اُسے بالکل روتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر اسے میرا ذرا بھی خیال ہے کہ میری روح کو تکلیف نہ ہو تو وہ اس طرح شہلا سے شادی کرے جیسے مَیں اپنی زندگی میں کرتا۔ فوزیہ نے سب مجھے بتادیا... پھر مَیں مجبور ہوگیا۔ جس دن مَیں پہنچا اس دن ان کا سوئم تھا۔ اگلے دن ہماری شادی ہوگئی۔ مَیں سادگی سے نکاح چاہتا تھا لیکن فوزیہ نے کہا کہ ابا کی آخری خواہش کچھ تو پوری ہو۔ اس نے ہی شہلا کو مہندی لگانے پر مجبور کیا اور دلہن بنایا۔"

ہم سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ چشمِ تصور سے مَیں نے اس گھر کو دیکھا جس میں نوحۂ ماتم تھم بھی نہ ہوا تھا کہ نغمۂ شادی گونجنے لگا۔ دنیا نے کیا سمجھا ہوگا اور کیا کہا ہوگا۔ لیکن پھر میرے تصور میں انکل شیروانی کا مسکراتا ہوا چہرہ آیا۔ تم تو جانتے ہو سکندر کہ دنیا کیا دیکھتی ہے اور کیا سمجھتی ہے۔ اصل بات وہ سچ ہے جسے ہمارا دل یا ہمارا ضمیر قبول کرتا ہے۔ یہ دنیا کی خوشی کا معاملہ نہیں تھا۔ میری ماں اور شہلا کی اور ہم سب کی خوشی کا سوال تھا۔ کیا تم خوش نہیں ہو اس وقت سکندر؟

"چلو اب تم دونوں ہاتھ مُنہ دھو کے یا نہا کے تازہ دم ہو جاؤ۔ بڑے لمبے سفر سے آئے ہو اور تھکے ہوئے ہو۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ہم تو لنچ یا ناشتے سے ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ تمہارے ساتھ پھر شریک ہوں گے۔"

"پھر تم آرام کرنا۔ مفصل باتیں ہوتی رہیں گی۔" مَیں نے ٹیڈی کی تائید کی جو شہلا کو باہر لے جاچکا تھا۔

"مجھے تیری شکل دیکھ کر ہول آرہا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تو بالکل مجنوں لگ رہا ہے۔ دو دن کے فراق نے یہ حال کردیا تیرا۔"

"معلوم نہیں یہ دو دن کی بات ہوگی کہ دو برسوں کی۔" مَیں نے کہا۔

"کیا تو اس سے ملا نہیں؟" محسن نے کہا۔

مَیں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کے اور نازو کے بارے میں معلوم تو ہوگیا تھا۔ ملنے کی فرصت ابھی تک نہیں ملی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" محسن نے کہا۔

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔" مَیں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حقیقت کسی خیال سے نہیں بدلتی... اس سے ملوں گا تو پتا چلے گا کہ وہ کہاں ہے۔ نازو یہ تو جانتی ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"شاید رابعہ تجھے دیکھے گی تو خود کو پہچان جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "اس کی شناخت تجھ سے تھی اور کوئی بھی اس کی ذات کے خلا کو پُر نہیں کرسکتا چنانچہ وہ خود کو نامکمل محسوس کرتی ہے اور ادھوری ہے۔"

"محسن کا خیال بہت حقیقت پسندانہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس قسم کے نفسیاتی کیس میں 'شاک ٹریٹمنٹ' کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ ایک صدمہ ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ دوسرا خوشگوار صدمہ مثبت اثرات کا حامل ہو تو ذہنی توازن پھر قائم ہو جاتا ہے۔ مَیں کوئی ماہرِ نفسیات تو نہیں ہوں لیکن رابعہ کے معاملے میں بہت پُرامید ہوں کہ اُسے واپس لایا جاسکتا ہے۔ بس اس کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پہلا صدمہ کارگر نہ ہو... تم یہ کرسکتے ہو کہ اُسے ماضی کی کسی خوشگوار یاد کی تصویر دکھا دو۔ مثلاً اُسے وہاں لے جاؤ جہاں..."

"مَیں سمجھ گیا مرزا جی۔" مَیں نے کہا۔ "اور اب مَیں پہلے سے زیادہ پُرامید ہوں۔"

شہلا غسل خانے سے نکل آئی تھی اور اُس نے لباس بھی بدل لیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا رنج ہوا کہ ہم سب اس خوشی میں پوری طرح شریک نہ ہوسکے اور شہلا کی شادی جس دھوم دھام سے ہونی تھی، وہ انکل شیروانی کے لیے بھی حسرت ہی رہی۔ محسن کی ماں۔ فوزیہ اور ہم سب کے لیے بھی حسرت رہی اور شاید خود شہلا کے لیے بھی۔ بھلا کون لڑکی نہیں چاہتی کہ اس کی شادی روایتی طریقے پر پورے انتظام و اہتمام کے ساتھ ہو جس میں ڈھولک بجے، مہندی کے گیت گائے جائیں۔ گھر سجے اور چراغاں ہو۔ زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں۔ تحفے تحائف، دعائیں اور مبارکباد ملے اور دعوتوں کے سلسلے ہوں۔ پھر شہلا کی تو ساری زندگی ہی ایک المیہ تھی۔ تقدیر نے جتنا اُسے دیا تھا اس سے زیادہ چھین لیا تھا۔ میرا دل خوف سے بیٹھنے لگا... بے اختیار میرے دل سے دعا نکلی کہ خداوندا! اب تو اس لڑکی کو وہ سب خوشیاں بخش دے جن سے وہ اب تک محروم رہی ہے۔ اگر اس کو آئندہ زندگی میں محبت کی رفاقت اور چاہت کے اعتماد کی مسرت حاصل رہی تو اس کی سب محرومیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ بینڈ باجے اور دھوم دھام سے ہونے والی شادی کی مسرت تو وقتی ہوتی ہے۔ اگر اس کے بعد خوشیوں کے خواب جھوٹے ثابت ہوں تو دامن میں پچھتاوے کے سوا کیا رہ جاتا ہے جو تمام عمر ساتھ چلتے ہیں۔ اس سے وہ شادی لاکھ درجہ بہتر ہے جو خاموشی سے ہو جائے مگر مستقبل کی لازوال اور لامحدود خوشیوں کی ضمانت کا تحفہ دے جائے۔

"یہ دوسرے کمرے میں کون صاحب تشریف فرما ہیں؟" محسن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ تولیہ کندھے پر ڈال کر غسل خانے تک جانے کے لیے اُٹھا تھا کہ اُس کی نظر نے سادھو رام کو دیکھ لیا۔

"اپنے مہمان ہیں... اور ابھی کچھ دن رہیں گے۔" مَیں نے کہا۔ "تو نہا دھولے، پھر تعارف بھی ہو جائے گا۔"

نہانے دھونے کے بعد استاد ٹیڈی نے اپنی چھوٹی بہن کو زبردستی ڈانٹ ڈپٹ کے سلا دیا۔ اُس نے شہلا کے آتے ہی تمام برادرانہ حقوق اپنے نام محفوظ کرالئے تھے اور اس اجارہ داری کو قائم رکھنے پر مُصر تھا۔ مَیں نے یہی سلوک محسن کے ساتھ کرنا چاہا مگر وہ شہلا کی طرح فرمانبردار اور شریف نہیں تھا۔ اس نے نہایت سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے سے انکار کردیا۔

"مَیں کون سا لمبا سفر کرکے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ "صبح ویگن میں بیٹھے تھے اور وہ ائرکنڈیشنڈ کوچ تھی۔ مَیں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں اور اگر تم لوگوں نے میری موجودگی میں پیش آنے والے واقعات نہ بتائے تو مجھے رات کو بھی نیند نہیں آئے گی۔"

"اچھا تو چلو اُدھر دوسرے کمرے میں۔" استاد ٹیڈی نے حکم دیا۔ "یہاں میری بہن سو رہی ہے۔"

"سالے... یہ تھانیداری نہیں چلے گی۔" محسن نے غرّا کے کہا۔

"ساری خدائی اک طرف، جورو کا بھائی اک طرف۔" ٹیڈی نے آستین چڑھا کے کہا۔ "کیسے نہیں چلے گی تھانیداری۔"

مَیں محسن کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں اپنی داستانِ مہم جوئی کا کچھ حصہ مَیں نے سنایا اور کچھ مرزا غالب نے۔ نیک محمد اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ سائیں باپڑ والے اور کرماں والی کے گروہ کا ایک رکن ان کے سامنے تھا اور اس تفصیلی تعارف کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ سادھو رام کو شرفِ مہمانی بخشنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ غالب نے وہ سوٹ کیس کھول کے رکھا جس میں مالِ غنیمت تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً چالیس ہزار کی پاکستانی کرنسی تھی۔ شمار کرنے پر انڈین کرنسی کی مالیت ستّر ہزار روپے بنی۔ سونے کا تخمینہ استاد ٹیڈی نے اس سے نصف لگایا۔

"یہ سب تو ہاتھ کا میل ہے ہمارے لیے۔" محسن نے کہا۔ "ہمارے استاد ٹیڈی بھی ایک قارون کا خزانہ رکھتے ہیں۔"

"انڈین کرنسی کسی مرحلے میں ہمارے کام آسکتی ہے۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن سب سے نایاب چیز یہ ٹائم بم ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔ پہلا تو سادھو مہاراج کے نیچے رکھیں گے۔" محسن بولا۔

"سادھو مہاراج اتنے قیمتی نہیں ہیں۔" مَیں نے اُسے ڈانٹا۔ "کہ ان پر ایک ٹائم بم ضائع کیا جائے۔ انھیں ویسے ہی ضائع کردیں گے۔ ایک پتھر کافی ہوگا۔ یہ بتا تجھے ٹائم بم سیٹ کرنا آتا ہے۔"

"مَیں اس کا عملی مظاہرہ ابھی کرسکتا تھا۔" محسن نے سادھو رام پر حسرت کی نظر ڈالی۔ "آخر بی ایس سی پاس ہوں اور سول ڈیفنس کے دو کورس کرچکا ہوں۔ ایک عام کورس۔ دوسرا بم ڈسپوزل کورس۔"

"مَیں تو اب اپنے اخبار کے دفتر جاتا ہوں دوستو!" غالب نے اُٹھ کر کہا۔ "صبح ملاقات ہوگی۔"

"مَیں بھی رابعہ کو دیکھنے جاؤں گا۔" مَیں نے کہا۔ "نیک محمد کو ساتھ لے جاؤں یا تمہارے ساتھ چلوں؟"

"میرے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "رکشہ کے پیسے بچ جائیں گے۔"

"اب ایک گاڑی پھر ناگزیر ہوگئی ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اور... موجودہ حالات میں اگر دو گھر ہوں اور دو گاڑیاں تو مزید بہتر۔"

"اتنی فضول خرچی کا جواز پیش کیجیے۔" محسن نے کہا۔

"جواز دوسرے کمرے میں خوابیدہ ہے اور آپ اپنے ساتھ لائے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "نئے دولہا دلہن کو کچھ عرصہ مار دھاڑ اور کشت و خون کرنے والوں کی صحبت سے دُور کہیں ہنی مون منانا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چاہیے؟"

"ایسی کی تیسی ہنی مون کی۔" محسن نے کہا۔

"کیا کہا؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تیرا تو باپ... میرا مطلب ہے میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں جاتا تو ہنی مون پر... نیک محمد... کل ایک چھوٹا سا گھر تلاش کرو جو یہاں سے پانچ میل دور ہو۔ اُسے دلہا دلہن کی ضروریات کے مطابق آراستہ کرو۔ ان کے لیے دروازے پر ایک کار کھڑی کرو۔ بلکہ کار یہاں سے آئے۔ ہم انھیں باندھ کر لے جائیں گے اور وہاں ڈال آئیں گے۔ دوسری گاڑی کا انتظام میں کر دوں گا جو ہمارے کام آئے گی۔"

"جو حکم سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے خوش ہو کے کہا۔

"یار یہ کیا پاگل پن ہے... ہمیں یہیں رہنے دو۔" محسن نے بے بسی سے کہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں کا گھر الگ ہوگا۔ اس گھر کا ہمارے کاروبارِ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم شہلا کو ان تمام معاملات سے الگ رکھنا چاہتے ہیں جو ہمارے لیے خطرات کا باعث ہیں۔ یہ ہم سب کی مشترکہ ذمے داری ہے۔ اس کے علاوہ ہم سب کے لیے وہ گھر بھی ایک گوشۂ عافیت ہوگا۔ وہاں کوئی بھی پناہ لے سکے گا۔ یوں سمجھ لے کہ یہ "اسٹینڈ بائی" قسم کا انتظام ہے۔ ایک گاڑی نہ رہی تو دوسری ہوگی۔ یہ گھر نہ ہوا تو دوسرا ہوگا۔ تاہم جب تک ممکن ہوا ہم اس دوسرے گھر کو ٹاپ سیکرٹ رکھیں گے۔ ممکن ہے مجھے رابعہ کو وہاں لے جانا پڑے اور اُسے شہلا کی تیمارداری کی ضرورت ہو اور جناب! اس کے بعد سال بھر کے اندر اندر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ معاملہ الٹ جائے یعنی شہلا کو رابعہ کی تیمارداری کی ضرورت پڑے۔"

"بڑی دور کی کوڑی لائے جناب لیکن اب میں کیا کروں۔ شرم سے لال ہو جاؤں؟ شہلا ہوتی تو یہی کرتی۔" محسن ہنسا۔

"میاں جب شادی کی ہے تو اور بھی سب کچھ ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جو ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ کوئی چاچا کے منصب پر فائز ہوگا تو کوئی ماما بنے گا۔ مرزا غالب پھر ماما غالب کہلائیں..."

"تم کہاں سے بن بیٹھے ماما؟" ٹیڈی نے پھر اعلانِ جنگ کر دیا۔ "ماما صرف میں ہوں... ٹیڈی ماما۔"

"ٹیڈی ماما۔" غالب نے اس کی نقل اتاری۔ "شکل دیکھی ہے اپنی میاں نوجی... ہر وقت کی دھونس نہیں چلے گی۔"

"قسم مولا علی کی... دھونس بھی چلے گی اور دھاندلی بھی..." ٹیڈی نے میز پر مُکا مارا۔ "ماما بن کے تو دیکھے کوئی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" محسن کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ "سوت نہ کپاس۔ جولاہے سے لٹھم لٹھا۔"

میں مرزا غالب کو فوراً اپنے ساتھ لے گیا ورنہ ماما چاچا کی بے سبب جنگ عظیم چلتی رہتی۔ وہ مجھے لٹن روڈ کی ایک کوٹھی میں لے گیا جس کے دروازے پر بہت خطرناک عزائم رکھنے والا کتا بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدم رک گئے۔

"بالکل بے ضرر اور پالتو قسم کا جانور ہے۔" غالب نے مجھے یقین دلایا۔ "اور میں کوئی اجنبی ہوں؟"

"لیکن میں تو اجنبی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ تو کتے کے موڈ کی بات ہے کہ دوست کو کاٹتا ہے یا دشمن کو۔"

"چلو میں آگے چلتا ہوں... کیا نام ہے اس کا... لاحول ولا قوۃ..." مرزا غالب نے کہا۔ "ہیلو... ٹائیگر... ڈبلو... اور بتاؤ نا یار کیا نام ہوتے ہیں کتے کے۔"

"کتے کو کسی بھی نام سے پکارو، وہ کتا ہی رہے گا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ اسی وقت کتے نے غرانا شروع کیا اور پھر باقاعدہ بھونکنے لگا۔ بظاہر وہ مرزا غالب ہی سے زیادہ خفا لگتا تھا۔ اندر سے کسی نے اُسے ڈانٹا۔ وہ کتا کال بیل بھی تھا جس نے ہماری آمد سے اہلِ خانہ کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد غالب نے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ پیش قدمی کی۔ برآمدے میں بارہ سال کا ایک گول مٹول لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ بھی موش سے ڈرتے ہیں انکل!" وہ بولا۔

"موش؟ یعنی چوہے سے؟" غالب نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ اللہ کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔"

"مگر موش کے بھونکنے پر آپ رُک گئے تھے۔" لڑکے نے کہا۔

"موش! اس کا نام موش ہے؟ سُنا تم نے سکندر!" غالب نے کہا اور السیشن نسل کے گدھے کے برابر کتے کو دیکھا۔ "خیر چھوڑو موش کو... تم اس کا نام فیل بھی رکھ دو تو کیا... جا کے ابا سے کہو انکل غالب آئے ہیں۔"

"وہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔" لڑکا بولا۔ "وہ ڈرائنگ روم میں آپ کے منتظر ہیں... چلیے۔"

ڈرائنگ روم میں جس شخص نے ہمارا استقبال کیا وہ عمر میں غالب سے بہت زیادہ تھا۔ اس کے سر کے بال گھنے مگر بالکل سفید تھے۔ سرخ و سفید چہرے اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر بہت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"یہ غالباً سکندر بخت ہیں۔" وہ بولا۔ "تمھارے دوست۔"

"آپ آدمی کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صورت دیکھ کر نام بتا سکتے ہیں۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف ہیں۔ مشہور ماہرِ نفسیات۔ نیورو فزیشن۔"

...نے کہا۔ ان کی ڈگریوں میں اے سے زیڈ تک تمام حروف ...ہیں مگر ترتیب مجھے یاد نہیں۔ تم پوچھ لینا۔ میں تو چلتا ہوں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے لڑکے۔" ایک معمر خاتون نے دروازے ...نمودار ہو کے ڈانٹنا شروع کیا۔

"آنٹی! کئی دن سے بھاگا ہوا ہوں ڈیوٹی سے۔" غالب نے ...معصوم صورت بنا کے کہا۔ "بہت مار پڑے گی اگر آج بھی دیر سے ...پہنچا۔" وہ خدا حافظ کہہ کے بھاگ گیا۔ میں نے خاتون کو کھڑے ہو ...کے آداب کیا۔ پینتالیس پچاس کی عورت تھی جس نے بڑے ...سلیقے سے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کی صورت کے نقوش ...اب بھی اتنے دلکش تھے کہ اس کی جوانی کے حسنِ بے مثال کا ...تصور کیا جا سکتا تھا۔

"بیٹھو بیٹا۔ تم سکندر ہی ہو نا۔" وہ بولی۔ میں پھر چونکا قاضی ...کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ یہ اس کی مثال تھی۔

"آپ نے اتنا صحیح اندازہ کیسے لگا لیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم ایسے ہی ہو سکتے تھے۔" وہ مسکرائی۔ "بس میرے ذہن میں ...تم کو دیکھ کر خیال آیا کہ تم اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اور پھر تم آئے بھی تو ...غالب کے ساتھ تھے۔ چائے پیو گے یا کافی۔"

"کافی بڑے شوق سے پیوں گا۔" میں نے کہا۔ ان کے شفیق ...رویے نے اجنبیت کا احساس یوں ختم کر دیا تھا کہ چند منٹ ...میں یہ گھر مجھے اپنا گھر محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہاں میں پہلی بار نہیں ...آیا بلکہ بچپن سے آتا رہا ہوں۔ اس احساس نے مجھے بڑی تسکین دی۔ ...رابعہ کو ایسے ہی گھر کے ماحول اور ایسے ہی لوگوں کی توجہ کی ضرورت ...تھی۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ غالب کے ساتھ ان ...کا رویہ تھا۔ غالب نے تو ڈاکٹر کو اپنا دوست کہا تھا مگر عمر کے ...اتنے فرق کے ساتھ وہ دوست نہیں ہو سکتے تھے۔

"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا ...کہ آپ غالب کے دوست ہوں گے!"

"اب شک کیوں ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر لطیف نے مسکرا کے ...کہا۔ "بھئی اس کا باپ تو کالج کے زمانے میں میرا دوست بنا تھا۔ ...یہ اس وقت ملا تھا جب ہم دونوں کو دنیا میں آئے ہوئے تقریباً ...بیس سال ہو گئے تھے مگر یہ لڑکا تو پیدائش کے روزِ اول سے میرا ...دوست ہے۔"

"غالب نے... مجھے کبھی اپنے والد کے بارے میں نہیں بتایا۔" ...میں نے خفت سے اعتراف کیا۔

"ہاں۔ وہ عموماً کسی کو نہیں بتاتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ ...وہ ایک ماہر سرجن تھا۔ وہ بیٹے کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ اسی ...لیے پریکٹس میں اس کے اور اس کے درمیان لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں کہتا

تھا کہ زبردستی کسی کی شخصیت کو مت بگاڑو۔ اسے اپنی زندگی پر اتنا اختیار تو دو کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان کے مطابق کچھ کر سکے... اکتسابی علم اور فطری صلاحیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غالب کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں زبردستی ایم بی بی ایس کی ڈگری ٹھونسنا مشکل تھا۔ وہ فنکار قسم کا آدمی تھا۔ تخلیقی ذہن رکھنے والا... اور بے حد عملی آدمی۔ چنانچہ تم دیکھو کہ وہ کیا بنا۔ اس کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط تھی کہ وہ گھر سے نکل گیا۔ ایک ہی لڑکا تھا ماں باپ کا۔ ماں باپ نے اسے اپنی انا اور اپنی ضد پر قربان کر دیا۔ یہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہی رہتا ہے اور والدین کی دلیل ایک ہی ہوتی ہے کہ ہم تمھارا بُرا تو نہیں چاہتے۔ مگر ان کی اچھائی بالآخر بُرائی بنتی ہے۔ غالب لوٹ کر گھر نہیں گیا۔ وہ دونوں ایک حادثے میں مارے گئے۔ میاں بیوی ایڈنبرا میں ہونے والی کوئی عالمی ادارۂ صحت کی کانفرنس اٹینڈ کر کے آ رہے تھے کہ جہاز گر گیا۔ غالب کو یقیناً پتا چلا ہوگا مگر وہ پھر بھی نہیں آیا۔ غالباً اپنے احساسِ جرم اور پشیمانی کے ساتھ وہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا گھر ابھی تک مقفل پڑا ہوا ہے۔ دس سال ہو گئے۔ معلوم نہیں اس کا کیا ہوگا۔ اچھی خاصی آٹھ دس لاکھ کی کوٹھی ہے اور بھی سامان ہے مگر اسے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرا بھائی ہوتا یا کوئی بہن ہوتی تو اُسے مل جاتا۔ اب لاکھوں کی جائداد غارت ہو رہی ہے۔"

"آپ نے کبھی غالب کو سمجھایا نہیں۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ میرے کانوں میں مرزا غالب کی آواز آئی۔ آج تم نے جانا سکندر کہ میں کون ہوں۔ میں کیا تھا۔ میں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ نہیں ہوں۔ مگر میں غالب ہوں۔

"ایک بار سمجھانا چاہا تھا۔ وہ غائب ہو گیا۔ دوبارہ بڑی مشکل سے ہاتھ آیا اور اس شرط پر یہاں آنے لگا کہ اس کے والدین اور ان کی چھوڑی ہوئی جائداد کے مسئلے پر بالکل بات نہیں ہوگی۔ میرے پاس کوئی قانونی اختیارات نہیں۔ ایک وارث کی موجودگی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ اور وارث کچھ نہیں کرتا۔ ارے بھائی اگر تم کو یہ سب نہیں چاہیے تو کسی کو دے دو۔ بیچ کر رقم کسی رفاہی ادارے کو دے دو۔ ریڈ کراس کو یا بلڈ بینک والوں کو۔ کوئی وارڈ بنوا دو کسی اسپتال میں۔ ٹرسٹ بنا دو غریبوں کے علاج کے لیے۔ مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کرتا۔ خیر چھوڑو۔ کبھی موقع ملے تو خود ہی بات کر کے دیکھنا۔ شاید وہ تمھاری مان لے۔ تم رابعہ کو دیکھنا چاہو گے پہلے۔ مگر میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے غالب نے سب بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟" میں نے سنبھل کر کہا۔ اسی وقت ڈاکٹر لطیف کی بیوی ٹرے لے کر اندر آ گئی تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ سب جو ضروری تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میرے نقطۂ نظر سے مجھے تمہارا انتظار تھا کیونکہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"رابعہ کے سلسلے میں ہاں" میں نے کہا۔ "وہ اب کیسی ہے؟"

"ویسے تو ٹھیک ہے۔ جسمانی طور پر بالکل صحت مند ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وقت پر سوتی ہے۔ کھاتی پیتی ہے۔ ایک عام آدمی اُسے دیکھ کر کوئی غلط رائے نہیں قائم کرے گا۔ اگر اسے کسی سے ملوایا جائے گا تو وہ بڑی شائستگی سے ملے گی۔ تعارف کرایا جائے گا تو کہے گی "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" پھر جب بیٹھے جائے گی۔ سوال کیا جائے گا تو صحیح جواب دے گی۔ اُٹھنے کو کہا جائے گا تو اُٹھ جائے گی۔ بیٹھنے کو کہو تو بیٹھ جائے گی۔ اس سے کہو کہ چائے پی لو تو چائے پی لے گی۔ منع کرو کہ چائے مت پیو، شربت پیو تو چائے کا کپ رکھ دے گی اور شربت کا گلاس اُٹھا لے گی۔ اُس نے خود کو مکمل طور پیچھے ہٹا لیا ہے۔ وہ ڈرا کر لیا ہے۔ مطلب یہ کہ ذہنی طور پر اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا ہے تو میری اطاعت کرے گی۔ میری بیوی کے سامنے ہوگی تو اس کے تابع ہوگی۔ بالکل ایسے جیسے عامل اور معمول کا رشتہ ہوتا ہے۔ خود معمول کی نہ کوئی سوچ ہوتی ہے اور نہ قوتِ ارادی۔ اس کی اپنی شخصیت بالکل صفر ہو گئی ہے۔ اُس نے مدافعت یکسر ختم کر دی ہے۔ تم بھی اس سے کہو گے کہ رابعہ آگے بڑھو اور اس کھڑکی سے نیچے کود جاؤ۔ تو غالباً وہ کود جائے گی۔ اپنے تمام ذہنی فیصلے وہ خود نہیں کر رہی ہے... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"جی... مگر ایسا کیوں ہوا؟" میں نے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن تلاش کرنے کی جدوجہد کی۔

"اسباب... ان کا صحیح تعین مشکل ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بہت سے عوامل تھے۔ اس کی نجی زندگی کے حادثات۔ کچھ جذباتی صدمات۔ شدید اعصابی دباؤ۔ مسلسل دباؤ۔ مگر اس کے علاوہ نروس بریک ڈاؤن میں کچھ... اذیت۔ جسمانی اذیت۔ میری تشخیص کے مطابق اس کے ذہن کو بریک اَپ کرنے کے لیے کچھ دوائیں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی دوائیں ہیں۔ ان کا اثر وقتی ہوتا ہے مگر اس کیس میں ابھی تک باقی ہے۔"

"اور کب تک باقی رہے گا ڈاکٹر صاحب؟ کیا ایسی دوائیں نہیں ہیں جو اُن کا اثر زائل کر سکیں؟" میں نے کہا۔

"میں محض تحلیل نفسی نہیں کر رہا ہوں۔ یعنی صرف نفسیات کے اصولوں کے مطابق علاج نہیں کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں اُسے دوائیں بھی استعمال کرا رہا ہوں اور مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس کی پروگریس بہت حوصلہ افزا ہے۔ ویری پازیٹو۔"

"کیا اس کے سامنے آپ نے کبھی میرا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"میرے متعلق کوئی بات کی؟"

"ہاں۔ لیکن اس کا ریسپونس بہت مبہم رہا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کچھ کنفیوز ہو گئی۔ ویسے تو اسے بھی ایک ردِّعمل ہی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ کسی اور کے نام پر وہ سوچ میں نہیں پڑتی... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود کو کچھ یاد دلانا چاہتی ہے مگر اس میں ناکام ہے۔ وہ لاشعور کے بند دروازوں کے پیچھے سے دستک سنتی ہے مگر اس کا شعور خوابیدہ ہے۔ وہ دستک کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ نام کے ساتھ میموری کی ایسوسی ایشن ضرور ہے۔ صورت کے ساتھ یہ وابستگی زیادہ شدید ردِّعمل پیدا کر سکتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم اوپر جاؤ۔ سیدھے ہاتھ پر دوسرا بیڈ روم۔" اس نے ایک زینے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسی جگہ انتظار کرتا ہوں۔"

میں دھڑکتے دل کو سنبھال کے اُٹھا۔ بے یقینی کے اس عذاب سے میں پہلے کبھی نہ گزرا تھا۔ پہلے کبھی میں نے نہ سوچا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب رابعہ بھی مجھے نہ پہچانے گی۔ پہچاننا چاہے گی مگر نہ پہچان پائے گی اور ان سب کی طرح ہوگی جو جانتے ہیں کہ میں مجرم نہیں اور چاہتے ہیں کہ میری مدد کریں لیکن مدد کر نہیں پاتے۔ زینے پر اُٹھنے والے ہر قدم کے ساتھ میں نے ایک دعا مانگی اور اس وقت کے خوف سے مغلوب ہوتا گیا جب میری ترسی ہوئی پیاسی آنکھیں اس کے دیدار کی دولت سے روشنی پائیں گی۔ اس وقت رابعہ کی آنکھوں میں کیا ہوگا؟ اقرارِ شناسائی یا بے التفات اجنبیت؟ کوئے یار سے سوئے دار تک وسوسوں اور اندیشوں کے کانٹے بچھے ہوئے تھے مگر میں امنگوں اور امیدوں کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ چلتا گیا۔ بند دروازے پر ایک بار پھر میرے قدم رُکے۔ ٹھہرنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے۔

دستک دیے بغیر میں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کیا اور میری نظر نے اُسے دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پر وہ پلٹی اور اس کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی۔ میں ٹھہر گیا۔ میرے ساتھ میرے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی۔ وقت ٹھہر گیا۔ مگر انتظار کا لمحہ امیدوں کو شکست دے رہا تھا۔ وہ پیکرِ رعنائی کسی سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے مجسّمے کی طرح کھڑی لاشعور کے بند دروازوں کی دستک سن رہی تھی مگر وہ بے بس تھی۔ میرے نام کے بعد میری صورت سے شناسائی کا احساس بھی اس کے خوابیدہ شعور کو جگانے میں ناکام رہا تھا۔

"رابعہ..." میں نے سخت جدوجہد سے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھا۔ "تم رابعہ ہی ہو نا؟"

"میں... ہاں... رابعہ ہی ہوں۔" اُس نے کھوکھلے لہجے میں کسی یقین کے بغیر کہا۔

"کس نے بتایا ہے تمہیں کہ تم رابعہ ہو؟" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں... مگر سب کہتے ہیں کہ میں رابعہ ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میں سکندر ہوں... سکندر بخت..." میں نے کہا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا اور اُس کی آنکھیں ویران رہیں۔ پھر اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسے مجھ سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور اگر میں خود کو سکندر بخت کہتا ہوں تو ٹھیک ہے۔

"کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ الجھن کے آثار اس کی آنکھوں میں نظر آتے تھے۔ "میں نے آپ کو... پہلے دیکھا ہے کہیں۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یاد کرو ہم کیا چاہتے تھے... ہم اپنا گھر بنانا چاہتے تھے۔ میں اور تم، محسن اور شہلا نے تو شادی کر لی ہے۔ وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی۔"

رابعہ نے پھر آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا اور مان لیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے وہ تسلیم کرتی ہے۔

"دیکھو رابعہ! کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم اور نازو کہاں گئی تھیں۔ تم کو میں نے گامے ماچھی کے پاس بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔

"نازو اور گاما ماچھی کون ہیں؟" وہ بولی۔

"گاما ماچھی تو مارا گیا۔ وہ چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا۔" میں نے مختلف ناموں سے اس کے ذہن کو جھنجوڑنا جاری رکھا۔ "اور تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ چوہدری دلاور کون ہے۔"

"ہاں۔ یہ نام میں نے سُنا ہے... وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔" رابعہ کے لہجے میں پہلی بار تھوڑا سا یقین اترا۔

"ہاں رابعہ... وہ ہمارا دشمن تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کی دشمنی کے باعث میرے والد مارے گئے تھے۔ وزیر خان... اور تمہاری والدہ کے انتقال کے بعد اس نے تمہارے گھر کو بم سے اڑا دیا تھا... اُن کا جنازہ اٹھتے ہی۔"

کرب کے آثار رابعہ کی صورت پر عیاں ہوئے۔ اس کے دل کے ناسور کو چھیڑ کر میں احساس کو جگانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ "اور رابعہ! اس چوہدری دلاور کے ساتھ استاد پیڈرو نام کا بدمعاش ہے۔" میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ "اس نے میرے شرافت علی کو قتل کرا دیا تھا اور اس قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کرا دیا تھا۔ ان کا ایک ساتھی ڈی ایس پی سراج بھی ہے۔ وہ اب تک بہت سے لوگوں کو قتل کرا چکے ہیں۔ یاد ہے تمہارے پاس لال رنگ کی ایک فاکس ویگن تھی۔"

"ہاں! ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی... کہاں گئی وہ؟" رابعہ کا لہجہ اب سپاٹ نہیں رہا تھا۔ وہ دُکھی نظر آنے لگی تھی۔

"اسی چوہدری دلاور نے تمہاری فاکس ویگن کو دھماکے سے تباہ کرا دیا تھا۔ وہ تم کو قتل کرانا چاہتا تھا لیکن خدا نے تمہیں بچا لیا تھا۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ پھر بلیک ہو گیا۔ اس ٹی وی کے اسکرین کی طرح جو بجلی جاتے ہی خالی سی ہو جائے۔ میں نے اسے اور بہت سے واقعات یاد دلائے۔ بہت سے نام لیے مگر وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ایک وقت میں اس کا ذہن جس حد تک اپنے ماضی کی طرف پیش قدمی کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ وہ اب مجھے زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی مگر میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم میری ملاقات رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اسے چوہدری دلاور کا نام یاد آنے لگا تھا اور اسے اپنی فاکس ویگن یاد آ گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ میں اسے پرانی یادوں کے روبرو کروں۔ اسے جانے پہچانے مقامات پر لے جاؤں۔ اسے محسن اور شہلا اور استاد ٹیڈی کی صورت دکھاؤں۔ موجودہ حالات میں فوری کامیابی کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی لیکن اس امید کی بنیادیں استوار ہو گئی تھیں کہ رفتہ رفتہ رابعہ کو ذہنی خود فراموشی کے اس بحران سے نکالا جا سکتا ہے۔ یہ صبر آزما کام تھا اور بلاشبہ اس میں دوا علاج کے بعد سب سے اہم کردار میرا تھا مگر دوسرے لوگوں کو بھی اس جدوجہد میں اپنا اپنا کردار حسبِ ضرورت ادا کرنا تھا۔

"اچھا رابعہ! میں اب جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم... پھر آؤ گے؟" وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی اور اس کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا تھا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں پھر آؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" رابعہ نے کہا اور نظر اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا۔

"کیوں رابعہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں کوئی آشنا جذبہ تلاش کرنے کی بے سود کوشش کی۔

"تم... اچھے آدمی ہو..." وہ بہت سوچ کر بولی۔ اس تمام عرصے میں اس کی نظر مجھ پر جمی رہی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے کی غیر شعوری جدوجہد کر رہی ہے لیکن اس کی یادوں کے زنداں میں تاریکی ہے اور اسے کہیں کوئی کھلا دروازہ نظر نہیں آتا۔ کسی دیوار میں کوئی روزن نہیں اور کوئی دریچہ نہیں۔ وہ اس اندھیرے میں مہرباں آوازوں کی سرگوشی سن سکتی ہے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مانوس صورتوں کے نقوش سایوں کی طرح متحرک دیکھ سکتی ہے اور وقت کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی کرچیاں چن سکتی ہے مگر وہ بھٹک رہی ہے اور اس کے لیے آوازوں اور صورتوں کو یکجا کرنا مشکل کام ہے۔ اس کے ماضی کا ہر لمحہ یاد کی ایک تصویر تھا جو تاریخ کی ترتیب اور وقت کے تسلسل کے ساتھ یادداشت کے فریم میں محفوظ تھا۔ ایک زلزلے نے اس تصویر خانے کو تہس نہس کر دیا۔ ہر تصویر اپنے فریم سے نکل گئی اور فریم گڈمڈ ہو گئے۔ اب ہر تصویر کو صحیح فریم میں فٹ کرنا اور فریم کو وقت کی ترتیب کے ساتھ یادوں کے تصویر خانے میں لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چاہت کا ختم نہ ہونے والا جذبہ اپنی شدت اور قوت کے باعث صرف اس حد تک جاگا تھا کہ پسندیدگی کے اظہار کا ذریعہ بن گیا تھا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ تم اچھے آدمی ہو۔ اگر میں اُس سے پوچھتا کہ وہ مجھے اچھا آدمی کیوں سمجھتی ہے تو وہ زیادہ کنفیوز ہوتی کیونکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے چنانچہ میں نے اس سے پھر آنے کا وعدہ کیا اور لوٹ آیا۔ اس سے مختصر سی ملاقات نے مجھے بہت سکون اور قرار دیا تھا۔ امید اور یقین دیا تھا اور حوصلہ دیا تھا۔ میں اب ذرا بھی مایوس نہیں تھا۔

"کیسی رہی ملاقات؟" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ "بہت جلد واپس آ گئے تم۔"

"زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا اس نے تمہیں بالکل نہیں پہچانا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ اور اپنی گفتگو کا ہر لفظ اس کے سامنے دہرایا۔

"یہ حوصلہ افزا علامات ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "پھر تم اتنے مایوس کیوں ہو؟"

"شاید اس لیے کہ میں ضرورت سے زیادہ توقعات لے کر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال ہوگا کہ تمہیں دیکھتے ہی اس کا ذہنی ردِعمل شدید ہوگا... اور یہ شاک اسے نارمل کر دے گا۔" ڈاکٹر لطیف مسکرایا۔

"جی... میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔" میں نے خفت سے کہا۔ "کسی معجزے کی امید رکھنا میری بے وقوفی تھی۔"

"نہیں ینگ مین... اس عمر میں سب ہی امید پرست ہوتے ہیں اور پھر محبت کرنے والے..." وہ ہنسا۔ "ان کے یقین کی ایک جذباتی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بے بنیاد یقین رکھتے ہیں۔ ہم سب اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کب تک؟" میں نے کہا۔ "جیسے تو امید پر تمام عمر بسر ہو جاتی ہے۔"

"اب تک علم غیب پر کوئی کتاب میڈیکل سائنس کے کسی کورس کے لیے نہیں لکھی گئی۔" وہ بولا۔ "کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک اندازے کے مطابق پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ دو چار دن یا چار ہفتوں میں صحت حاصل ہو جائے گی لیکن دماغ کا عمل بہت پیچیدہ ہے۔ اس کے سب اسرار و رموز ابھی تک سامنے نہیں آئے۔ اس کی شعوری کیفیت کو کسی حد تک EEG سے سمجھا جا سکتا ہے مگر لاشعور اور تحت الشعور میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے یہ ہم کبھی نہ جان سکیں گے۔ تشخیص کے لیے ہم کتنے بھی پیچیدہ آلات اور مشینیں بنا لیں۔ ایکس رے۔ ای سی جی۔ پیتھالوجی۔ ریڈیو گرافی۔ الٹرا سونک اور ایکو گرافی۔ یہ سب ٹسٹ مادی وجود رکھنے والے جسمانی نظام کے لیے ہیں۔ ذہن کا عمل کوئی مادی وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں نہیں بتا سکتا کہ ہماری کوشش دو ہفتوں میں بارآور ہوگی دو ماہ میں یا دو سال اور بارآور ہوگی بھی یا نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" یکلخت میری امیدوں کا ٹمٹماتا چراغ گل ہونے لگا۔ "کیا یہ کیفیت دائمی بھی ہو سکتی ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے ینگ مین۔ خود کو بدترین خبر کے لیے ہمیشہ تیار رکھو۔" وہ بولا۔ "پھر تمہیں ہر خبر ایک خوشخبری لگے گی۔ یہ مت سوچو کہ صرف وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ لیکن ویسا ہی ہو جائے تو یو آر لکی... میں بھی سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی مگر ڈاکٹروں کے اندازے بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ رابعہ بیمار ہے اور کسی بھی مرض میں یہ ہو سکتا ہے کہ نئی علامات نمودار ہو جائیں۔ اگر تمہارا دعا پر اعتقاد ہے تو تمہارے پاس ایک بہت بڑا سہارا ہے۔ اس کے لیے دعا کرو کہ دعا کارگر ہو۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ باقی سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دوا یا دعا دونوں کا رابعہ کے لیے فائدہ مند ہونا یا نہ ہونا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اسے ہر روز دیکھنے کے لیے آ سکتا ہوں؟"

"بالکل۔ کسی بھی وقت۔ جب تم چاہو۔" وہ بولا۔ "تم بھی ڈاکٹر سے کم تو نہیں ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ کل یا جب آپ اسے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "تو اسے اپنے ساتھ کچھ ایسی جگہوں پر لے جاؤں جہاں اس کے ذہن کو بہت کچھ یاد آ سکتا ہے۔ اس کی جذباتی وابستگی بہت شدید رہی ہے، بہت طویل رہی ہے ان مقامات سے۔"

میری واپسی تک رات ہو چکی تھی۔ رابعہ سے مل کر مجھے دل کو قرار بھی ملا تھا اور میری بے قراری بھی بڑھی تھی۔ میں گھر پہنچا تو طبیعت اداس تھی اور میری نظروں میں رابعہ کی تصویر پھر رہی تھی۔

خاموش۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے۔ بے حسی اور جمود کا شکار نظر آنے والی۔ پتھر کی منجمد مورت جس میں کسی سنگتراش کے فنکار ہاتھوں کی صناعی نے حسن کو مجسم کر دیا ہو۔ کچھ سوئی سوئی۔ کچھ جاگی ہوئی۔ ماضی اور مستقبل کے درمیان بے یقینی کے صحرا میں سرگرداں۔ خود اپنا سراغ پانے کی جستجو میں حیران۔ کانوں میں اس کی آواز گونجتی تھی... تم پھر آؤ گے نا؟ تم اچھے آدمی ہو۔ اس کے اتنے ہی الفاظ دلِ ناصبور کے لیے مژدۂ امید بن گئے تھے۔ امید کہتی تھی کہ آج اس نے دل کے کسی نامعلوم جذبے کی صدا سنی تھی۔ ایک دن اس کا دل اُس کی زبان بن کر پکارے گی کہ تم میرے ہو... تم میرے سکندر ہو۔ جو کبھی کسی کے نہ تھے اور نہ ہو سکو گے۔ جیسے رابعہ تمہاری تھی اور ہے... اور رہے گی... مگر وہ دن کب آئے گا۔

محسن اور نیک محمد کے درمیان کسی فضول سی بات پر ٹھنی ہوئی تھی اور شہلا ان کی زبانی جنگ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ تنازعہ شہلا کی بات پر شروع ہوا تھا۔ اُس نے نیک محمد سے کہا تھا کہ آخر وہ اپنا گھر بسانے کی کیوں نہیں سوچتا۔ استاد کے کچھ عرض کرنے سے پہلے محسن نے خیال ظاہر کیا کہ گھر آباد کرتی ہے کوئی لڑکی اور وہ بدبخت لڑکی ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی جو اجڑی صورت والے نیک محمد کی زوجہ کہلا کے دنیاوی عاقبت میں رسوا ہو۔ نیک محمد کے آگ لگ گئی۔ اس نے جواب میں محسن سے کہا کہ اپنی شکل پہلے دیکھ لی ہوتی جو گھسے ہوئے سول والی پشاوری چپل کی طرح ہے جسے کباڑیا بھی نہ لے۔

"اس صورت پر تو حسینانِ عالم فریفتہ ہیں۔ ایک تمہارے سامنے موجود ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "باقی کے نام صیغۂ راز میں ہیں۔"

"یہ تو احسان ہے شہلا کا کہ تم پہ ترس کھا کے اس نے تمہارا رشتہ قبول کر لیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "میری بہن نہ ہوتی تو تم جھک مارتے رہتے۔"

"تمہاری بہن میرے پاؤں کی جوتی ہے۔" محسن نے ایک جوتے کو زور سے فرش پر مارا۔ "محاورے کے مطابق۔"

"یہ جوتی تمہارے سر پڑنی چاہیے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"اچھا اپنی بہن کو اٹھا کے میرے سر پہ مار دو۔" محسن نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ..." میں نے ریفری کی طرح ہاتھ اٹھایا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے!"

"کچھ نہیں!" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "ایسے ہی وقت گزارنے کے لیے لڑ رہے تھے۔"

"وقت گزارنے کے لیے یہی مشغلہ رہ گیا ہے۔ پھر شادی کیوں کی تھی؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "اور لڑنا ہے تو بیوی سے لڑو... کچھ فائدہ تو ہوگا اس ریہرسل کا۔ ورنہ ساری زندگی بغیر لڑے کیسے کٹے گی۔"

"تیری ملاقات کیسی رہی؟" محسن بولا۔ "اس نے بھوت کہہ کر چیخ تو نہیں ماری تھی؟"

"نہیں یار۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنی رہی۔ حالات امید افزا ہیں۔"

"پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔" محسن نے کہا۔ "اگر اللہ نے چاہا تو اس صدی کے ختم ہونے کے بعد تیرا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔ ورنہ کتبہ کچھ یوں لکھا جائے گا کہ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔"

"مجھے خوشبوئے پلاؤ آتی ہے۔" میں نے ناک کے راڈار کو گھما کے سوں سوں کی۔ "اور کچھ بوٹی کباب۔"

"آج ہماری طرف سے آپ سب کی دعوتِ ولیمہ ہے۔" محسن نے اعلان کیا۔ "کچھ فقیروں مسکینوں کو بھی دینا چاہیے ایسے مواقع پر۔"

"سب میں پکا رہی ہوں سکندر بھائی۔" شہلا نے شرماتے ہوئے اعلان کیا۔

"یہ بھی سمجھا دو کہ پہلا تجربہ ہے۔ سب اپنی ذمے داری پر کھائیں گے۔" محسن نے کہا۔ "نہ کھانے کا کوئی سوال نہیں۔ کھانے کے بعد تعریف ضروری ہے۔"

چونکہ ابھی کھانے میں دیر تھی اس لیے میں نے محسن کو دوسرے کمرے میں بلا لیا۔ سادھو رام کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ میری غیر حاضری میں اُسے کچھ کھانے پینے کا موقع بھی ملا تھا اور آرام کرنے کا بھی۔ تاہم وہ بندھا ہوا تھا اور اس کے حلق میں کپڑا بھی تھا۔ میں نے یہ کپڑا نکال دیا۔

"سادھو رام! کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟" میں نے اُس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

سادھو رام نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عملاً خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ وہ بازی ہار چکا تھا اور اس کی حیثیت جنگی قیدی سے بھی کم ہے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں اس کی مدد کے لیے کوئی آ بھی نہیں سکتا اور وہ اگر خود فرار ہو کے جانا چاہے تو کہیں نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی گھر نہیں رہا تھا اور کوئی دوست آشنا نہیں رہا تھا۔ دلریا اور سیوک سب مارے جا چکے تھے اور سائیں پاپڑ والے کا اڈا پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کی تحویل میں تھا۔ اگر وہ ادھر کا رخ بھی کرتا تو پکڑ لیا جاتا اور ہم سے تو وہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر زندگی کا سودا بھی کر سکتا تھا۔ انٹیلی جنس والے اس کے سر میں سے تمام مفید معلومات نچوڑ کر نکال لیتے اور پھر اسے ٹانگ دیتے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ ٹھیک ہے سادھو رام کہ یہاں اب تمہارے جینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم چاہو تو کسی نئے نام سے، نئی جگہ پر نئی زندگی کے اسباب پیدا کر سکتے ہو۔ ہم تمہیں ایک موقع دے سکتے ہیں۔"

"اس موقعے کے ساتھ جو شرط ہوگی وہ مجھے معلوم ہے۔" سادھو رام نے مایوسی سے کہا۔

"کیا تم اب بھی پرانے آقاؤں سے وفاداری کے عہد پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے ہو؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تمہیں بحفاظت ان آقاؤں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ تو یہ بھی بہت گھاٹے کا سودا ہوگا۔ وہ تمہیں زیادہ اذیت دے کر ماریں گے۔ تم ہمیں کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ، وہ اپنے طور پر یقین کرنا چاہیں گے کہ تم وفاداری کے امتحان میں پورے اترے تھے؟ تو بھی وہ تمہیں خلعت فاخرہ اور سند کے ساتھ انعام و اکرام سے نہیں نوازیں گے۔ تم ان کے لیے بے مصرف ہو چکے ہو... وہ تمہارا کریاکرم تک نہیں کریں گے کہ تمہاری آتما ہی سُکھی رہے۔"

"ہماری شرط بہت آسان ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ موقع تمہیں صرف ہم سے سودا کر کے مل سکتا ہے۔ کسی اور سے نہیں۔"

"تم ان سب کے نام بتا دو جن کو تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اُدھر بھی اور اِدھر بھی۔"

"صرف نام بتانے سے کیا ہوگا۔" سادھو رام نے کہا۔

"سب کے پتے تمہیں نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں۔" میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔ "جتنے نام پتے یاد آئیں وہ ایک کاغذ پر لکھ کر ہمیں دے دو۔ تم اس کاروبار میں کس کس سے ملتے رہے ہو اور کہاں ملتے رہے ہو؟ یہ کاروبار کب سے جاری ہے؟ تم کب سے شریک ہو؟ کس نے کتنا منافع کمایا؟ پہلے تم پاکستان میں رہنے والوں کے متعلق بتاؤ۔"

"میں... میں سب کو نہیں جانتا۔" سادھو رام بولا۔ "یہ بندوبست ہی ایسا تھا کہ کوئی بھی سب کو نہیں جان سکتا۔"

"یہ ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ خرابی کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور ایسے کاروبار میں ہر شخص زنجیر کی صرف ایک کڑی ہوتا ہے جسے ابتدا اور انتہا کی خبر نہیں ہوتی۔ مگر وہ اپنے پیچھے اور آگے والی کڑی سے ضرور منسلک ہوتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملانا ہمیں آتا ہے۔ تم صرف ان کے بارے میں بتاؤ گے جن سے تمہارا رابطہ تھا۔ باقی رابطے ہم معلوم کر لیں گے۔"

"تمہاری یادداشت تازہ کرنے کے لیے میں صرف ایک نام لیتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "یہ زنجیر کی پہلی کڑی ہے اور اس کا نام چوہدری ملاور ہے۔"

"اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان میں اس زنجیر کا دوسرا سرا ایک پولیس افسر ڈی ایس پی سراج ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہماری سرحد میں یہ زنجیر اور لمبی ہو۔ ہمیں درمیانی کڑیوں کا سراغ لگانا ہے۔"

"اس میں بھی ہم کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مثلاً ہم ڈی سلوا کو جانتے تھے جو مارا گیا۔ گاما ماچھی بھی درمیانی کڑی تھا۔ ایک استاد پیڈرو ہماری نظر میں ہے۔ جس طرح گامے ماچھی کے اڈے سے ہمیں ڈونگا بتن کا راستہ ملا۔ وہاں سے سائیں بابا پڑ والے کا اور کرماں والی کا پتا چلا۔ دلربا اور کرنل جگن ناتھ کے نام معلوم ہوئے۔ تم سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ایک نام جاننے سے ہوا۔ گامے ماچھی کے نام سے۔ اب تمہاری مدد سے ہمیں ایک بھی نیا نام معلوم ہو جائے تو اس سے مزید نام پوچھے جا سکتے ہیں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تم سے ایک نہیں، زیادہ نئے نام معلوم ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تمہیں بتا کے ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اب کسی کو خبردار نہیں کر سکتے۔ کسی کو نہیں بتا سکتے کہ ہم کتنا جانتے ہیں۔ تمہارے لیے یہاں سے ہماری اجازت کے بغیر زندہ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ تم خود سوچ لو کہ ہم کس درجہ خطرناک لوگ ہیں اور ہمارے عزائم کیا ہیں۔ ہماری مدد کر کے تم جاں بخشی کا وعدہ لے سکتے ہو مگر یہ یاد رہے کہ مدد میں دھوکے کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں ہوگی... ہم تصدیق کریں گے اور کوئی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔"

"دوسری بات یہ کہ تم جتنا جانتے ہو سب بتاؤ گے۔ ایک فیصد بھی چھپاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔" محسن بولا

"ہم تمہیں کل تک سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو تعاون کر کے جان بچاتا۔ پرانے دوست اب بالکل کام نہیں آ سکتے۔ وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ ہمارا ساتھ دے کر دیکھو، شاید تمہیں پناہ اور عافیت مل جائے۔"

ہم باری باری بولتے رہے تھے اور ہم نے سادھو رام کو بالکل نہیں بولنے دیا تھا۔ ہمارا مقصد اس کے دماغ میں یہ ڈالنا تھا کہ اس پر زندگی کے سب دروازے بند نہیں ہوئے۔ ایک دروازہ ایسا بھی ہے جس کی چابی ہمارے پاس ہے اور وہ چاہے تو یہ چابی اسے مل سکتی ہے۔ فیصلہ اُسے کرنا تھا۔ ہمارا مقصد کسی دشواری کے بغیر اس سے سب کچھ اگلوانا تھا اور ہمارا مقصد اسے تصویر کا دوسرا رُخ دکھانا بھی تھا۔ میں نے کپڑا دوبارہ اس کے منہ میں ٹھونسا اور ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جہاں سے اشتہا انگیز خوشبو براہِ راست ہمارے معدے پر حملہ کر رہی تھی۔ نہ جانے کب سے

ہماری زندگی ایک بیہودہ معمول بنی ہوئی تھی جس میں کسی بات کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ نہ کھانے کا نہ سونے کا۔ نہ مرنے کا نہ جینے کا۔ وہ وقت خواب کی صورت لگتا تھا۔ ہم گھومتے پھرتے تھے۔ ہوٹلوں میں دعوتیں اُڑاتے تھے۔ قہقہے لگاتے تھے اور مسکراتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ چین کی نیند سوتے تھے اور اپنے شب و روز کے ہر لمحے کی مسرت پر مکمل اختیار رکھتے تھے۔ اب تو یہ تھا کہ جہاں جو ملا، کھا لیا۔ نہیں ملا تو گزارا کر لیا۔ پسند ناپسند کا کوئی سوال نہ تھا۔ سوکھی روٹی بھی خواہش سے نہیں ملتی تھی۔ بے خواب راتیں، خوف، پریشانی اور بھاگ دوڑ میں گزرتی تھیں اور جسم مجبور ہو جاتا تھا تو سولی پر بھی نیند کی ضرورت پوری کر لیتا تھا۔

بہت عرصے بعد مجھے یہ پناہ گاہ ایک گھر کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ گھر جو بچپن میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ پھر کئی سال سفر میں گزرے۔ دیارِ غیر میں گھر کا صرف تصور ساتھ تھا۔ واپس آیا تو بے گھر ہو چکا تھا۔ گھر جانے اور بسانے کی آرزو کو رابعہ نے نئی زندگی بخشی تھی مگر وہ گھر بھی ہنوز ایک خواب تھا جس کی تعبیر کے امکان تک خیالوں کی رسائی بھی نہ رہی تھی۔ تقدیر نے مجھے اور رابعہ کو ملا کے بھی دُور رکھا تھا اور اس کے لیے بھی کوئی گھر نہ چھوڑا تھا۔ انکل رضوی کا گھر۔ رابعہ کی ماں کا گھر۔ فوزیہ کا گھر۔ انکل شیروانی کا گھر۔ نادرہ اور اکرام شیخ کا گھر۔ استاد ٹیڈی کا گھر۔ سارے گھر عارضی پناہ گاہیں ثابت ہوئے تھے جہاں سے ہم ایک بار نکلے تھے تو لوٹ کر نہ جا سکے تھے۔ یہ مکان بھی ایک ایسی ہی پناہ گاہ تھی مگر یکلخت اسے شہلا نے قدم رکھتے ہی یوں آباد کر دیا تھا کہ اس کی دیواروں کی حیثیت باقی نہ رہی تھی اور یہ ایک آباد گھر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور فرش پر دری بچھا کے اتنے قرینے سے کھانا لگایا تھا کہ میں بہت دیر تک اس منظر کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ایسی پُرتکلف دعوت کا میں صرف چوبیس گھنٹے پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تو بہت خوش قسمت ہے محسن۔ تجھے تیری منزل مل گئی۔" میں نے کہا۔

"آہ! افسوس جو مزہ منزل کی آرزو میں اور راستے کی مسافت میں تھا وہ نہ رہا۔" محسن نے دردناک لہجے میں کہا۔ "منزل پر پہنچنے کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔"

"ابھی وہ ماسے چاچے والی منزل باقی ہے۔" میں نے اُسے یاد دلایا اور محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ شہلا کا رنگ لال پڑ گیا اور وہ اندر بھاگ گئی۔ "یہ تو ایسا سفر ہے جس میں ایک منزل سے اگلی منزل کا نشان ملتا ہے۔" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "جب تو صاحب اولاد ہوگا تو تیری منزل ہوگی ان کی تعلیم و تربیت۔ جب وہ پرورش کے مرحلے سے گزر جائیں گے تو ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم نے اپنے والدین کے ساتھ کیا تھا یعنی ہم دنیا سے رخصت ہوں گے تو وہ دنیا کے جھمیلوں میں پڑے ہوئے اور ہم سے بہت دور ہوں گے۔"

"اتنے بدقسمت صرف میں اور تو ہی تھے سکندر۔" محسن نے اداسی سے کہا۔

"نہیں یار! یہ اتفاق ہے یا پھر دنیا کا چلن ایسا ہو گیا ہے کہ آپ بیتی بھی جگ بیتی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔"

"غالب کے ساتھ؟" محسن نے کہا۔ "اُس نے تو کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"ہاں۔ لیکن اس ڈاکٹر نے مجھے آج سب کچھ بتا دیا جو رابعہ کا علاج کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ غالب کے سرجن باپ کا دوست تھا۔"

چونکہ شہلا ابھی کھانا لگانے کے عمل میں مصروف تھی اس لیے میں نے چند منٹ میں مختصراً وہ سب بتا دیا جو ڈاکٹر لطیف سے معلوم ہوا تھا۔ استاد ٹیڈی اور محسن دم بخود سنتے رہے۔ ایک ٹیڈی کی سرگزشت ہی کیا کم عبرت آموز تھی کہ غالب کے افسانۂ حیات کا المیہ عیاں ہو گیا۔ دونوں بڑے سطحی نظر آنے والے، اپنی ذات کے محاسن پر خاموشی کا پردہ ڈال کر رہنے والے، زندگی کے ہر دکھ پر خوش باشی کی مسکراہٹ کا پردہ ڈالے رکھنے والے اور کبھی حرفِ شکایت زباں پر نہ لانے والے لوگ تھے۔ اندر سے ان کی شخصیت کے رنگ بالکل جدا تھے۔ وہ ہم سے زیادہ مردم گزیدہ تھے اور ان کے غم کی جڑیں ان کے وجود کی گہرائی میں اتری ہوئی تھیں مگر کسی نے ان کو روتے نہ دیکھا تھا۔ ان میں اب بھی دوسروں کے غم کا بار اٹھا لینے کی سکت تھی۔ دنیا نے ان کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا تھا مگر ان کا دل پھر بھی پتھر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی خلوص و مہر و وفا پر یقین رکھتے تھے اور دوستی یوں نبھاتے تھے کہ جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی۔ ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے والے کے لیے استاد ٹیڈی ایک بدمعاش تھا اور غالب ایک صحافی مگر ہم نے دیکھا تھا کہ دونوں ہی انسان تھے اور انسانیت کی صفات کی خوبیوں کا حُسن دونوں کے باطن میں جلوہ گر تھا۔

دروازے پر ایک دھماکا ہوا تو ہم تینوں اُچھل پڑے۔ جو بڑی بے صبری سے شہلا کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ کون ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف ریوالور لینے لپکا۔

"کون ہے بھئی؟" استاد ٹیڈی نے ڈانٹ کر کہا۔

"ایک اور اُلو کا پٹھا۔" غالب نے دروازے پر لات ماری۔

میں رک گیا اور محسن نے دروازہ کھول دیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"آئیے... آئیے۔ بڑے وقت پر آئے۔" محسن بولا۔"چشم ما روشن دل ما شاد۔"

"نہ میرا دل شاد ہے اور نہ میری آنکھ روشن ہے۔" غالب نے چلا کر کہا اور اپنا ٹوٹا ہوا چشمہ لہرایا۔" میں اندازے سے یہاں بیٹھا ہوں۔"

وہ اتنا برہم تھا کہ اس نے دعوت کے سامان کی طرف بھی نہیں دیکھا اور اس خوشبو پر بھی توجہ نہیں دی جو کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھ کے پاس ایک نیل تھا جو مار پیٹ کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ہوا چچا غالب؟" میں نے کہا۔

"وہی جو تم لوگوں کے ساتھ رہ کر ہو سکتا ہے۔" غالب نے برہمی سے کہا۔" اتنا پرانا صحافی ہوں میں۔ اور میری کتنی خدمات ہیں اس اخبار کے لیے۔ اسے فٹ پاتھ پر ٹکے سیر بکنے والے اخبار سے ایک معتبر اور باا ثر اخبار بنانے میں میرا خون پسینہ ایک ہوا۔ آج وہ ایڈیٹر کی اولاد چند دن کی غیر حاضری پر مجھے برطرف کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے کہاں مر گئے تھے؟ میں نے کہا مر گیا تھا تو تم نے خبر لی؟ کہنے لگا خبر تو اب لوں گا میں تمہاری بہت اچھی طرح۔ ابھی چھٹی کر دوں گا تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر بدتمیزی کا نام لیا تو دودھ کی کھیر بنا دوں گا۔ پھر اس نے مکا گھمایا جو میری ناک پر لگا۔" غالب نے پھر ٹوٹی ہوئی عینک کو واقعاتی شہادت کے طور پر پیش کیا۔" اور میں نے عینک ٹوٹ جانے کے بعد مکا تو اس کے سر پر مارا تھا مگر لگا اس کے دانتوں پر۔ میں ادھر آ گیا۔ وہ دندان ساز کے پاس چلا گیا۔"

ہنستے ہنستے ہم سب کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔" اب کیا ہو گا مرزا غالب... تمہارا، اس کا اور اخبار کا؟"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب کیا ہو گا۔" غالب نے کہا۔" کل میں اور وہ دونوں اس واقعے کو بھول جائیں گے۔ اخبار تو نکالنا ہی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ نہ لڑائی ہوتی، نہ تم دعوتِ ولیمہ میں شرکت کے لیے پہنچتے۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری کمی واقعی محسوس ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔" آؤ... بیٹھ جاؤ۔"

"اب تک ہمارے ساتھ دھکے کھاتے رہے ہو یا جوتے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔" آج پلاؤ زردہ کھا لو۔"

"یار آج اس دشمن کا بھی قلع قمع کرا دو۔" غالب نے مکا لہرایا۔

"پلاؤ زردہ تو اس کے سوئم پر بھی ملے گا۔"

"میں تو سوئم کا انتظار بھی نہیں کروں گا۔ تم مر کے دیکھو۔ اسی دن زردے کی دیگ تقسیم کروں گا اخبار والوں میں۔" ٹیڈی بولا۔

"چلو چلو۔ ہر وقت لڑتے ہو۔" شہلا نے آ کر سب کو ڈانٹا۔" آرام سے بیٹھو۔"

"ہاں۔ آرام سے بیٹھو۔" محسن نے فوراً تائید میں سر ہلایا۔" جیسا کہ ہماری زوجہ محترمہ نے حکم دیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو دعوتِ ولیمہ سے اٹھا کے باہر گلی میں پھینک دیا جائے گا۔"

"اوواہ بھئی واہ..." کسی نے کھلے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔" کیسی سوہنی خوشبو آ رہی ہے۔ ہم نے تو لنگڑے لنگڑے تقاری مار کے یہ کیا معاملہ ہے شہنشاہو؟"

یہ ہمارا لینڈ لارڈ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔" آؤ بھئی آؤ... تمہاری ہی کسر تھی۔"

"او جی ہم تو آ ہی گئے ہیں۔" وہ جوتیاں اتار کے ہمارے ساتھ آ بیٹھا۔" لیکن وسو تے سہی ایہہ گل کی اے موتیاں والیو۔"

"یہ جو اپنا یار ہے نا۔" میں نے محسن کی طرف اشارہ کیا۔" یہ شادی کر کے آیا ہے۔"

لینڈ لارڈ نے غور سے لجائی ہوئی شہلا کو دیکھا۔" پر... ایہہ تے والد صاحب کے فوت ہونے پر گئے تھے؟"

"ہاں جی... مگر وہاں حالات ایسے ہوئے کہ بیوی کو ساتھ لانا پڑا۔" میں نے کہا۔

"اچھا جی... تیرے مُنہ کی آکھاں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے سر کھجایا۔ "بڑا افسوس ہے... یا بڑی خوشی ہے... چلو جی رب جو کروالے چنگا کروالے۔ اج خیر پرجائی نے سب خود پکایا ہے... واہ بھئی وا... شروع کرو نا موتیاں والیو... یا ہور کسے دا انتظار اے؟"

ہم سب ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ غالباً شہلا کو پہلے سے اندازہ تھا کہ ہم ترسے ہوئے لوگ ضرورت سے زیادہ کھائیں گے خواہ ہمیں ہیضہ ہو جائے۔ یا پھر اندازے کی غلطی کے باعث اس نے زیادہ پکا لیا تھا کہ دو افراد کے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کھانے کے دوران میں بھی ایک جنگ محسن اور ٹیڈی کے درمیان ہو لی۔ ایک کا اصرار تھا کہ میری بہن سے اچھا کھانا کوئی نہیں پکا سکتا۔ محسن نے گرج کے کہا کہ میری بیوی سے اچھا تمہاری بہن نہیں پکا سکتی... پھر شہلا نے محسن کو اس کے الفاظ یاد دلا کے شرمندہ کرنا چاہا جو اُس نے اپنے کھانا لگنے سے پہلے کہے تھے۔ محسن نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ وہ ہر بیان سے منحرف ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔ درمیان میں باہر سے کسی نے چلانا شروع کیا۔

"اوئے... ایہہ تیرے پیو دی گلی اے۔ ہٹا اپنی ایس ماں نوں۔"

یہ ہمارے لینڈ لارڈ کا دیرینہ دشمن دوسرا ٹیکسی ڈرائیور تھا جس کی ٹیکسی پھر مخالف سمت سے نمودار ہو گئی تھی۔ لینڈ لارڈ نے حسب عادت اپنی ٹیکسی گلی میں یوں پارک کی تھی کہ راستہ بلاک ہو گیا تھا۔

[مشت]عل ہو کے جوابی کارروائی کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ ٹیڈی نے اُسے [روک ل]یا اور خود دروازے تک گیا۔

"یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے... شرفاء کا محلہ ہے یہ۔" ٹیڈی [گر]ج کر کہا۔

"او بھائی شرفا... یہ ٹیکسی ہٹوا دو... کدھر ہے اس کا مالک [دوس]را ٹیکسی والا بولا۔

"وہ میو اسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔" گاڑی کو اُٹھا کے [لے] جا سکتے ہو تو لے جاؤ۔"

"میو اسپتال میں؟" دوسرا ٹیکسی ڈرائیور ایک دم فلیٹ ہو [گی]ا۔" کیا ہوا تھا جی اُسے... کون سے وارڈ میں ہے؟"

"دل کے وارڈ میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔" اس کی گاڑی کو دل [کا] دورہ پڑا تھا۔"

"اوہ... رب خیر کرے۔" دوسرے ڈرائیور نے بدحواسی میں [گ]اڑی کو ریورس کیا اور ٹیڈی کی بات پر غور نہ کر سکا۔

ہمارے لینڈ لارڈ نے گلا پھاڑ کے ہنسنا شروع کیا۔" اوواہ جی واہ... کس طرح دوڑ گیا اے پاگل دا پتر... گڈی نوں دل دا دورہ!" اس نے پھر کھانے پر حملہ کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس ہنگامے [م]یں ساڈھورام کی موجودگی نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا۔ وہ دوسرے [کم]رے میں چپ چاپ بندھا پڑا رہا۔ بن بلایا مہمان یعنی ہمارا لینڈ [لا]رڈ جانے لگا تو اس نے شہلا کے سر پہ ہاتھ پھیر کر باقاعدہ دعا [د]ی اور سر سے ٹوپی اتاری۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے گن کر اکیاون روپے نکالے اور شہلا کو پکڑا دیے۔

"لے لے پتر... او بھئی شادی کوئی بار بار ہوندی اے۔ سانوں وی اک وار ہی ملے سن۔" وہ بولا۔ پھر اس نے باقی نوٹوں کے ساتھ ٹوپی کو احتیاط سے سر پہ جمایا اور باہر نکل گیا۔ اس کی ایک معمولی سی جذباتی حرکت نے ہم سب کو خاموش کر دیا تھا۔ اکیاون روپے نہیں اس کا جذبہ انمول تھا۔ اس کی وضعداری انمول تھی اور خلوص کی سادگی انمول تھی۔ وہ باہر جا کے پھر اندر آیا۔

"اور میاں جی۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔" تو کدھر لے گیا تھا میری گڈی کو... بیڑہ غرق کر کے لایا... مگر یہ حساب فیر کدی کر لاں گے... اج تے خوشی دا موقع اے۔" وہ پھر پلٹا اور اپنی گاڑی کو سیدھا لے گیا۔ مجھے یہ سوچ کر پھر ہنسی آئی کہ اگر دوسرا ٹیکسی ڈرائیور میو اسپتال پہنچا اور دل کے وارڈ میں ہمارے لینڈ لارڈ کو تلاش کرتا پھرا تو مایوس ہو کے لوٹے گا اور سمجھ جائے گا کہ اسے بیوقوف بنایا گیا تھا۔ پیشہ ورانہ مخاصمت اپنی جگہ۔ تھا وہ بھی دل کا اچھا آدمی۔ مگر واپسی پر اس کی اور ہمارے لینڈ لارڈ کی جنگ دلچسپ ہو گی۔

اس رات کوئی سونے کے موڈ میں نہ تھا۔ رات گیارہ بجے شہلا نے کافی بنائی جو اتنی سرور آور تھی کہ آسودگی اور راحت کا احساس میرے رگ و پے میں اترنے لگا۔ وقت بہت ناقابلِ اعتبار تھا۔ آج اس نے سب کو ملا دیا تھا اور سب کچھ دے دیا تھا۔ ایک رابعہ کی کمی کا احساس سب کو تھا لیکن عمداً کسی نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ ہماری طرح خوش ہو سکتی تو ہم اُسے بھی لے آتے مگر اب دل کی تسلی کے لیے یہ خیال غنیمت تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔ یہ کس نے کہا تھا؟ یہ مجھے فوزیہ نے لکھا تھا۔ وقت کی راہیں بدل گئی تھیں اور منزلیں بدل گئی تھیں۔ وقت ہر گھڑی ہر لمحہ آدمی پہ حاوی ہے۔ وقت آدمی کی تقدیر ہے۔ ناقابلِ فہم، غیر یقینی، خیال کی گرفت میں نہ آنے والا۔

ہم نے محسن اور شہلا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لیے کسی ہوٹل میں کمرا لے لیں کیونکہ یہاں ساڈھورام کی موجودگی سب سے بڑا فتنہ تھی۔ ایک کمرے کو ہم حوالات کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور وہاں کسی کا رات کو جاگتے رہنا ضروری تھا خواہ یہ کام باری باری کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ ہم پانچ افراد تھے۔ ہمارا سامان تھا اور کمرے زیادہ بڑے نہیں تھے لیکن شہلا اور محسن نے تنگی میں گزارا کرنے کو ترجیح دی۔ شہلا تو کسی دوسرے گھر میں جانے کے لیے بھی تیار نہیں تھی مگر میں نے اُسے باتوں سے قائل کر لیا۔

"یہ بھی کوئی گھر ہے۔" میں نے کہا۔" تمہارے لیے ہم ایسا گھر لیں گے جسے تم واقعی گھر بنا سکو۔ اس گھر میں جس میں ہم سب آرام سے رہ سکیں، اسے تم اپنی مرضی سے سجانا۔ سارا سامان خود خریدنا۔ فرنیچر، پردے، برتن، وہ تمہارا اور محسن کا گھر ہو گا۔ ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر نہیں ہو گا۔ اُسے ہم ہر خطرے سے اور ہر آفت سے محفوظ رکھیں گے۔ جب ہم وہاں آئیں گے تو اپنے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں لائیں گے۔ وہاں ہم پیار لے کر آئیں گے۔ خوشی لے کر آئیں گے۔"

"جیسے کہ بھائی اپنی بہن کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں! اور ہم سُکھ چین، خوشی اور آرام کے لیے وہاں آئیں گے۔" میں نے کہا۔" ہماری ذمے داری اب بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے بھی ہم ایک دوسرے کے محافظ تھے مگر اب محسن کو تمہارے لیے اور تم کو محسن کے لیے جینا ہے اور ہمیں تمہارے گھر کی حفاظت بھی کرنی ہے۔ ہم تمہارے خطرات اور تمہارے مصائب کا بار اٹھا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کر سکتے..."

"کیا نہیں کر سکتے۔" محسن نے میری بات کاٹ دی۔" تم یہ سمجھتے ہو کہ اب میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا تو تمہارا خیال غلط ہے۔ میری زندگی کی ذمے داری تم سب نے بانٹ لی ہے تو پھر مجھے کس بات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کا غم۔ مجھے تم ایم آر ایس سے خارج نہیں کر سکتے۔"

"چپ کر کے سو جاؤ۔ ایم آر ایس کے بچو۔" غالب نے آنکھیں کھول کر کہا اور تب ہمیں احساس ہوا کہ وہ جہاں بیٹھا تھا، وہیں لڑھک کر سو چکا ہے۔ استاد ٹیڈی کچھ کہنے والا تھا کہ میں نے اُسے منع کر دیا۔ وہ رات ہم نے باری باری جاگتے اور پہرا دیتے گزاری۔ صبح شہلا نے پھر ایک سگھڑ اور امورِ خانہ داری میں ماہر بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے سب کے لیے بہترین ناشتا تیار کیا۔ ہم نے اس دن کے کام تقسیم کر لیے۔ استاد ٹیڈی نے سادھو رام کے سونے کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری قبول کی۔ جتنا سونا خود استاد ٹیڈی کے پُراسرار صندوق میں تھا اسے وہ پہلے ہی صحن میں دفن کر چکا تھا۔ اس مختصر سے غریبانہ گھر میں وہ سونا بہت محفوظ تھا اور ایسے وقت میں ہمارے کام آسکتا تھا جب ہمارے وسائل باقی نہ رہیں۔

"یہ ہمارے مستقبل کی ضروریات کے لیے ایک ضمانت رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اگر کبھی ہمیں اچانک بھاگنا پڑا تب بھی بعد میں ہم ہی اس خزانے کو نکالیں گے۔ ہماری جگہ کوئی بھی آئے، اسے مدفون خزانے کا سراغ کبھی نہیں ملے گا۔"

"اور اگر ہم نہ آسکے؟" غالب نے کہا۔

"کب تک نہیں آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ایک نہ آیا تو دوسرا آئے گا، تیسرا آئے گا۔"

"یہ خطرہ تو بہرحال رہے گا کہ اس کچے صحن میں کوئی بھی نئی عمارت کے لیے بنیادیں کھودے تو سونا نکال لے۔"

"بنیادوں کی حد تک کوئی خطرہ نہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔ "میں نے اُسے چار فٹ کی گہرائی میں دفن کیا ہے۔"

"کسی نے ہینڈ پمپ لگایا یا کنواں کھودا تو...؟"

"اچھا تم بیٹھ جاؤ یہاں ڈنڈا لے کر۔" ٹیڈی نے بھنّا کے کہا۔ "جو بنیادیں کھودے گا یا کنواں کھودے گا وہ پہلے تمہاری قبر کھودے گا۔"

"تمہارا خزانہ ہے تم بیٹھ جاؤ اس پہ ناگ بن کر۔ اب تک بیٹھے ہی تھے۔" غالب نے آگ بگولا ہو کے کہا۔

میں نے اُن کی لڑائی فوراً بند کرا دی۔ "جو ہمارے مقدر میں ہو گا وہی ہو گا۔ ابھی تو نیک محمد تم جاؤ، یہ سونے کے زیورات کسی کو دے آؤ۔ ان سے بھی پچپن ساٹھ ہزار ضرور ملیں گے۔ پھر آج رات کو اسی صحن میں دوسری جگہ انڈین کرنسی کو گاڑ دو۔ اس کی بھی جب ضرورت پڑے گی تب ہی کام آئے گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں زنجیر کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے ہندوستان سے گزرنا پڑے اور مشرقی پاکستان تک جانا پڑے۔ وہاں بھی انڈین کرنسی چل جاتی ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے سردار؟" محسن نے غیر موجود مونچھوں پہ تاؤ دے کر کہا۔

"تم کوئی اچھا سا مگر محفوظ گھر دیکھو۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو ساتھ رکھو۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل۔"

"ناقص العقل۔" محسن نے کہا۔

"تم دونوں بیس ہزار روپے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "آدھی رقم سے مکان کا ایڈوانس دو۔ آدھی سے ضرورت کا سامان خریدو۔ بیوی کو شاپنگ کراؤ۔ اس کی پسند سے سب چیزیں لو اور اس گھر میں پہنچا کے شام تک یا رات تک واپس آجاؤ۔ گھومو پھرو۔ میں آدھی رقم لے کر جاتا ہوں اور کوئی گاڑی دیکھتا ہوں۔ اس کے کاغذات وغیرہ مکمل کراتا ہوں... اور مرزا غالب..."

"غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!" وہ مُنہ بنا کے بولا۔ "ہم تو میاں یہاں سو رہے ہیں لمبی تان کے۔"

"پھر اُٹھ قامت۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر غیرت والے ہو تو..." اور فوراً باہر نکل گیا ورنہ غالب اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"ٹھیک ہے چچا غالب۔" میں نے کہا۔

"یار یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے کل سے تم نے... میں چچا ہوں تمہارا؟" غالب نے دھرنا مار کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیڈی کے خلاف موثر جوابی کارروائی نہ کر سکنے کے باعث جھلایا ہوا تھا۔

"اچھا تایا غالب۔ تم آرام کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تمھیں رات کو جاگنا ہوتا ہے۔ گھر پہ بھی کسی کو سادھو رام کی حفاظت کے لیے رہنا تو تھا۔ بس ذرا محتاط اور چوکس رہنا۔"

"یہ نہ ہو کہ واپسی پر معاملہ اُلٹا ملے۔" محسن نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ "تم بندھے پڑے ہو اور سادھو رام..."

"جاؤ بابا جاؤ! کیوں فقیروں سے دل لگی کر کے بددعا لیتے ہو۔" غالب نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم سب اُسے چھیڑنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم سب اپنے اپنے راستوں پر نکل چکے تھے۔ میں نے محسن اور شہلا کو ایک ساتھ رکشا میں روانہ ہوتے دیکھا۔ انھوں نے پلٹ کر ہاتھ ہلایا اور میں ان کے مسرت سے دمکتے چہروں کو دیکھتا رہا۔ شہلا کے رنگ روپ میں صبحِ بہار کی تازگی اتر آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پا لینے کی خوشی کے احساس سے سرشار تھے! ان کی خوشی کو قائم و دائم رکھنا خدا ہی نے چلتے چلتے دعا کی: اگر ضرورت ہو تو میرے مقدر کی خوشیاں بھی ان کے دامن میں ڈال دینا۔ میں تو ابھی اس خوشی سے بہت دور ہوں اور اپنی محرومی کے دُکھ سے سمجھوتا کر کے بھی جی سکتا ہوں!

گاڑی خریدتے ہوئے مجھے اچانک رابعہ کا خیال آیا۔ میں اس سے پہلے تین شو روم دیکھ چکا تھا۔ چوتھے شو روم میں مجھے سرخ رنگ کی ایک فاکس ویگن نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے میری نظر کو میرے تصور نے فریب دیا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ وہی گاڑی ہے جس میں رابعہ پہلی بار میرے پاس آئی تھی۔ نیلے آسمان کے رنگ کی ساری باندھے جس پر زرد پھول ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے اور جس میں اس کا چہرہ ماہتاب کی طرح روشن نظر آتا تھا۔ اسی گاڑی میں ایک رات میں اور رابعہ شہر کی رات کی تنہائی میں سرگرداں رہے تھے۔ وہ رات بھی ماضی کا قصہ بن گئی تھی اور یادوں میں زندہ تھی لیکن وہ گاڑی دوسرا جنم پا کے میرے سامنے آگئی تھی۔ رابعہ کو یہ گاڑی یاد تھی۔ اس کو دیکھ کر اُسے اور بہت کچھ یاد آسکتا تھا۔ اگر میں اس کے لیے ایک ویسی ہی ساری خرید کر لے جاؤں اور اسے کہوں کہ میرے ساتھ چلے۔ شاید آج کی رات پھر میں گزرے ہوئے وقت کی یادوں کو رابعہ کے رُوبرو کر سکوں۔

"آپ کو فوکس ویگن پسند ہے تو اس سے اچھی حالت میں نہیں ملے گی۔" ڈیلر نے میری محویت کو دیکھ کر کہا۔

"جی... ہاں... اس کی قیمت بتائیے۔ سودے بازی نہیں ہو گی۔ بس ایک اور بالکل آخری بات کیجیے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے جناب! یہ ایک خاتون وکیل کی گاڑی ہے۔" ڈیلر بولا۔

"کس خاتون وکیل کی؟" میرا دل ایک دم دھڑکا۔ لاہور میں کئی عورتیں وکالت کر رہی ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا۔

"مس رابعہ فاری ایڈووکیٹ۔" ڈیلر نے کہا۔ "ان کو سولہ ہزار کی آفر مل چکی ہے۔ سترہ میں آپ لے جائیں۔"

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میں خطرے کے حصار میں داخل ہو گیا ہوں۔ وہ ڈیلر بھی یقیناً ایک شکاری تھا یا کسی شکاری کا ایجنٹ تھا۔ یہ کوئی دھوکے کا جال تھا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جو گاڑی بم کے دھماکے سے پُرزہ پُرزہ ہو گئی ہو وہ اپنی اصل صورت میں پھر نمودار ہو جائے اور اس کے حقوقِ ملکیت، رجسٹریشن نمبر وغیرہ سب وہی رہیں۔ میں نے اپنی بے نیازی کا پُراعتماد انداز برقرار رکھا اور گاڑی کو ہر طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے کے بہانے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی کہ خدانخواستہ میرے آس پاس دشمن چہرے نظر آئیں تو میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤں۔

"اس کے کتنے اونر تھے پہلے؟" میں نے اپنی جانب کا دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ اندر سیٹ کور تک وہی تھے۔

"یہ فرسٹ اونر کار ہے صاحب۔" ڈیلر بولا۔

"مالک کیوں بیچ رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے جاپانی کار لے لی ہے۔ ٹویوٹا کورونا مارک وَن۔" ڈیلر بولا۔

"آئی سی۔ آپ ان سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہاں مل سکتی ہیں وہ؟"

"اُن سے مل کر آپ کو کیا لینا ہے؟" ڈیلر بولا۔ "گاڑی پسند کیجیے اور لے جائیے۔"

میں مسکرایا۔ "آپ تو کمیشن ایجنٹ ہیں۔ جس کی گاڑی ہے اُن سے ٹرانسفر لیٹر تو لینا ہی ہو گا۔"

"وہ ہمارے پاس ہے۔ اوپن لیٹر۔" وہ بولا۔ "ہم ان کو رقم ادا کر کے تمام کاغذات لے چکے ہیں۔ آپ کو ٹرانسفر کرا کے دیں گے، اپنی ذمے داری پہ جناب۔"

"وہ میں کرا لوں گا۔" میں نے کہا اور اپنی نظر ہر طرف رکھی۔ شو روم کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ "آپ مجھے کاغذات دکھا دیں۔"

ڈیلر اندر گیا اور کاغذات اُٹھا لایا۔ یہ اوریجنل کاغذات تھے۔ اسی گاڑی کے کاغذات جو رابعہ کے پاس تھی۔ مجھے شامتِ اعمال یہاں لے آئی تھی۔ میں سب سمجھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔ میں اس گاڑی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

"آپ اس کا انجن نمبر اور چیسس نمبر چیک کر لیں۔" ڈیلر نے کہا۔

میں نے اناڑی پن کا مظاہرہ کیا اور انجن میں نمبر تلاش کرنے کے بہانے اس کے پُرزوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ رابعہ کی گاڑی کے ایئر کلینر پہ درمیان میں ایک ڈینٹ تھا۔ اس میں نیا کاربوریٹر ڈالا گیا تھا۔ اس کے کوائل پر سفید اسپرے پینٹ تھا۔ جو انجن میرے سامنے تھا اس میں یہ پہچان کی نشانیاں نہیں تھیں لیکن انجن پہ نمبر وہی تھا۔ آخری چیز چیسس نمبر تھا۔

"چیسس کا نمبر فاکس ویگن میں پیچھے والی سیٹ کے نیچے ہوتا ہے صاحب۔" ڈیلر نے کہا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کے ڈرائیور کی سیٹ کو آگے جھکایا اور پیچھے والی سیٹ اٹھائی۔ اندر روشنی کم تھی مگر میں نے جعلسازی کے نشانات دیکھ لیے۔ یہ کسی دوسری گاڑی کا چیسس تھا جسے رگڑ کر مٹانے کے بعد اسی جگہ نئے نمبر پنچ کیے گئے تھے۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھماکے سے گاڑی کا چیسس تباہ ہو گیا تھا اور باڈی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ چیسس اور باڈی دوبارہ نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ انجن پیچھے تھا۔ اس کو جزوی نقصان پہنچا۔ انجن کے باہر کے حصے یقیناً تباہ ہو گئے ہوں گے۔ وائرنگ، ڈسٹری بیوٹر کیپ اور کوائل۔ سیلف اور کاربوریٹر وغیرہ۔ لیکن درمیانی حصہ جس میں اسپارک پلگ لگتے ہیں اور نمبر ہوتا ہے محفوظ رہا ہو گا۔ کسی نے اُسی حصے کے ساتھ باقی سب پُرزے ڈالے۔ باڈی کسی اور گاڑی کی تھی۔ اس کا اصل نمبر مٹا دیا گیا اور رابعہ کی گاڑی کا چیسس نمبر پنچ کر دیا گیا۔ کاغذات شاید گاڑی کو تباہ کرنے والوں نے پہلے ہی نکال لیے تھے۔ اب اسی نمبر اور نام سے دوسری گاڑی کھڑی کر دی گئی ہے۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی نئی بنوا کے لگا دی گئی ہے اور اب چیکنگ ہو تب بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جعلسازی کہاں ہوئی ہے۔ چیکنگ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں بھی دیکھنے والے صرف کاغذات دیکھتے ہیں۔ رجسٹریشن، اونر شپ سرٹیفکیٹ، انشورنس، ڈرائیونگ لائسنس، انجن نمبر کون دیکھتا ہے اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو باہر نکال کے سیٹ کے نیچے جعلی اور اصلی نمبر کے فرق کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جو سوال میرے ذہن میں تھا وہ کچھ اور تھا۔ یہ سب کارروائی کس نے کی تھی؟ کسی کباڑیے نے گاڑی کا ڈھانچہ اٹھا لیا اور کسی میکینک کو بیچ دیا۔ نہیں... میکینک کو جعلسازی کر کے ایک ختم ہو جانے والی کار کو پھر زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر کباڑیے نے کاغذات کہاں سے حاصل کیے۔ یہ کام تو اسی نے کیا جس نے کاغذات چرا لیے تھے۔

"بولیں صاحب! اسٹارٹ کروں گاڑی؟" ڈیلر نے میرے تذبذب کو دیکھ کر کہا۔

"کرو!" میں نے سر ہلایا۔

ڈیلر نے چابیاں میری طرف بڑھائیں "آپ ٹرائی لے لیں۔ چکر لگا آئیں۔"

"نہیں۔ تم چکر لگا کے دکھاؤ۔" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں اگنیشن کے ساتھ ہی دھماکا ہونے کا خیال بھی تھا۔ اگر یہ ولاور اینڈ کمپنی کا ایجنٹ تھا اور یہ چکر انھوں نے چلایا تھا تو سب کچھ ہو سکتا تھا۔

"آپ ساتھ تو بیٹھیں گے۔" ڈیلر نے کہا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی یا میں خریدنے سے پہلے کسی گاڑی کو ڈرائیو کرنے کا رسک لینے والوں میں نہیں ہوں۔ میرے انکار نے اُسے حیران کیا۔

"میں اکیلا گاڑی لے جاؤں اور چلا کے لے آؤں؟" وہ بولا۔ "ایسے آپ کو کیا پتا چلے گا صاحب!"

"پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی چلے گی تو چلتی ہوئی نظر آئے گی۔ چلتی کا نام گاڑی۔" میرا جواب سخت احمقانہ تھا لیکن میں ڈیلر کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے حیرانی سے سر ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بلا ارادہ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور چابی نکال کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ پھر اُس نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی۔ میں نے ہاتھ سے گاڑی کے کاغذات نیچے گرا دیے اور انھیں اٹھانے کے بہانے نیچے جھکا۔ اس طرح میں کم سے کم چھ گاڑیوں کے پیچھے ہو گیا۔ میں ابھی جھکا ہوا ہی تھا کہ میں نے انجن کے گرجنے کی آواز سُنی۔ میں نے بے یقینی میں چند سیکنڈ گزارے اور پھر آہستہ آہستہ سیدھا ہو گیا۔ گاڑی قطار سے نکل کر سڑک پر چلی گئی تھی۔ کوئی دھماکا نہ ہونے سے مجھے خفت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں مار دھاڑ، قتل اور غارت گری سے بھری ہوئی فلموں کے مناظر تھے۔ جاسوسی ناولوں کے سین تھے اور وہ سب کچھ تھا جو افسانوی لگتا تھا مگر میرے ساتھ ہو چکا تھا۔ گاڑی میری نظروں کے سامنے سڑک پر جا رہی تھی اور میں اُسے بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اب بھی مجھے کسی انہونی کے ہونے کی امید تھی۔ ممکن ہے گاڑی کے پہیئے نکل جائیں یا اس کے بریک فیل ہو جائیں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گاڑی جو میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی کسی راؤنڈ اباؤٹ سے لوٹی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے سے مگر دوسری جانب کی سڑک پر دوڑتی ہوئی گزری۔ ڈیلر نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور سیدھا گزر گیا۔ چند منٹ بعد وہ دائیں طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کو میرے سامنے فاتحانہ انداز میں یوں روکا جیسے وہ کسی تجرباتی خلائی پرواز کے بعد کامیاب لوٹا ہے۔ اُس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اب کیا خیال ہے جناب؟" وہ بولا۔ "لے دن گاڑی ہے۔ اگر آپ میری مانیں..."

"میں نے تمھاری مان لی ہے۔" میں نے کہا اور جیب سے دس دس ہزار کی دو گڈیاں نکالیں۔ اس میں سے تین ہزار الگ کیے اور باقی اُسے تھما دیے۔ "گن کر اپنی تسلی کر لو اور پھر میرے ساتھ چلو۔"

"میں چلوں؟ کہاں صاحب۔" وہ رقم گنتے ہوئے بولا۔ "رسید تو میں ابھی دیتا ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ رجسٹریشن آفس تک تمھاری ذمّے داری ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں کوئی گھپلا ہو گا تو کون ذمّے دار ہو گا؟"

"ذمّے داری تو ہم لیتے ہیں۔ لیکن میرا کمیشن..."

"تمھاری وکیل صاحبہ کو سولہ کی آفر ملی تھی؟ ان کو ساڑھے سولہ دو۔ باقی تمھارا کمیشن۔" میں نے کہا۔ "اور اب چلو..."

اس نے رقم اپنے آفس کی تجوری میں بند کی اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے وہ آدمی بالکل بے ضرر لگا۔ یہ اس کی اداکاری نہیں تھی۔ اسے شاید کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اگر معلوم تھا تو صرف یہ کہ چیسس نمبر بدلا گیا ہے مگر یہ اس کے لیے پریشانی کی بات نہیں تھی۔ اُسے ٹرانسفر کی ساری کارروائی کسی ایجنٹ کو سو روپے دے کر مکمل کرانی تھی۔ چیکنگ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے آدھے راستے میں گاڑی روک کر ریوالور نکال لیا۔

"یہ... یہ کیا ہے صاحب؟" اس کی زبان ریوالور دیکھ کر لڑکھڑانے لگی۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس کس طرح آئی...؟ سچ سچ بتا دو گے تو چھوڑ دوں گا، ورنہ تمھاری لاش گرا کے نکل جاؤں گا۔"

اس نے بہ آوازِ بلند کلمہ پڑھا۔ "دیکھیں صاحب! جس نے گاڑی بیچی تھی اس نے اتنا ہی بتایا تھا۔"

"وہ خاتون ایڈووکیٹ مر چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "کاغذات اصلی ہیں۔ انجن بھی وہی ہے مگر باڈی وہ نہیں ہے۔ چیسس کا نمبر بدلا گیا ہے۔ مگر رنگ، نمبر پلیٹ، سیٹ کور سب وہی ہیں۔"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "آپ نے... آپ نے دیکھ لیا تھا کہ نمبر میں گڑبڑ ہے... قسم خدا کی..."

"قسم مت کھاؤ۔" میں نے ریوالور اس کی پسلیوں میں چبھو دیا۔ "نام بتاؤ اس کا جو یہ گاڑی لایا تھا... میں دس تک گنوں گا۔"

"یا میرے خدا... اب کدھر جاؤں..." وہ بلبلانے لگا... "الریح نے مروا دیا مجھے... صاحب میں اس کو نہیں جانتا... بلکہ ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ آیا تھا جو اس کو استاد پیڈرو کہہ رہا تھا۔"

"استاد پیڈرو..." میں بُری طرح چونکا۔ "تم کو اچھی طرح یاد ہے؟"

"بالکل صاحب... یہ نام ذرا عجیب لگا تھا مجھے... اس نام کی تو ایک انڈین فلم تھی۔" ڈیلر بولا۔ "اس میں شیخ مختار کے ساتھ بیگم پارہ تھی۔ اسی لیے مجھے یاد رہ گیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ پندرہ سے اوپر جتنے ملیں میرے... لیکن انھوں نے کہا تھا کہ خریدار کو یہی بتانا ہے جو ہم کہیں اور جب کوئی اس قسم کا خریدار آئے... انھوں نے آپ کی تصویر دکھائی تھی صاحب... تو ہمیں بتا دینا۔"

"تم ان کو کیسے بتاتے؟" میں نے کہا۔ "وہ اپنا پتا یا فون نمبر کچھ دے گئے تھے؟ مگر پہلے استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟"

ڈیلر نے جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا۔ "وہ ہر شام معلوم کرنے آتے ہیں... یا اُن کا فون آ جاتا ہے۔"

میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ شکاری جال پھیلا کے انتظار کر رہے تھے۔ شکار کا پھنس جانا کبھی یقینی نہیں ہوتا لیکن کامیاب شکاری کا صبر اور حوصلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ ہم پرانی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ انھیں بدلتے رہتے ہیں اور چھوڑ بھی دیتے ہیں مگر اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ وہ لال رنگ کی اس فاکس ویگن سے میری جذباتی وابستگی کو سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال درست تھا کہ کبھی میں اس گاڑی کے سامنے سے گزروں گا تو میرے قدم خود ہی رُک جائیں گے۔ ڈیلر کو انھوں نے جو سمجھایا تھا اس میں کوئی بات غلط یا خطرے کی نہیں تھی کیونکہ کاغذات اصل تھے اور ان پر واحد اونر کا نام بھی وہی تھا جو اس نے بتایا تھا۔ اس سودے میں وہ دو ہزار بنا چکا تھا، جو چیسس نمبر کے فرق کو چھپانے اور خریدار کے بارے میں یہ اطلاع دینے کے بہت تھے کہ وہ تصویر والا ہی تھا۔ باقی کام استاد پیڈرو یا اس کے ساتھی کر سکتے تھے۔ وہ موٹر رجسٹریشن آفس سے معلوم کر سکتے تھے کہ گاڑی کس کے نام ٹرانسفر ہوئی ہے مگر اس میں غلط نام اور پتے کے اندراج کا امکان تھا۔ انھوں نے کچھ اور سوچا ہو گا۔ گاڑی کے صحیح آدمی کے ہاتھ فروخت ہونے کی اطلاع پاتے ہی وہ ایک طرف پورے شہر میں اپنے جاسوس چمچوں کو ہوشیار کر دیتے تو دوسری طرف پولیس کو اطلاع کر دیتے کہ ان کا مجرم بڑی شان سے اس نمبر کی لال فاکس ویگن میں گھوم رہا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔

"دو ہزار تم کو مبارک ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن دو ہزار سے زیادہ زندگی ہے جو میں تمھیں بخش رہا ہوں، صرف ایک شرط پر... تم استاد پیڈرو کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"مگر وہ پوچھیں گے کہ گاڑی کہاں گئی۔"

"کہنا کہ اُسے منٹگمری کے چوہدری نعمت اللہ مالک بے مثال ٹیکسٹائل مل نے خریدا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کہو گے؟"

ڈیلر نے لفظ بہ لفظ وہی دُہرا دیا جو میں نے کہا تھا۔

"شاباش! اگر تم نے ذرا بھی غلط بیانی کی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر تمھیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دو ہزار میں بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر لیا۔ استاد پیڈرو نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ گاڑی کسی اور کو نہیں بیچنی ہے۔"

"نہیں جی... یہ تو نہیں کہا تھا۔" ڈیلر نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"پھر تمھارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ہرگز مت کہنا کہ گاڑی اسی نے لی ہے جس کی تصویر تھی۔ اس کے علاوہ تم جو چاہو کہہ دو... کچھ بھی نام بتا دو اور جو حلیہ چاہو بیان کر دو۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مجھے منٹگمری، فیصل آباد یا ایبٹ آباد کا بتانا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں لیکن میرا اصل حلیہ بتایا یا اس گفتگو کا حوالہ دیا جو اس وقت ہو رہی ہے تو پھر وہی ہو گا جو ابھی نہیں ہوا۔ تم شریف آدمی ہو۔ لالچ میں یہ بھول گئے تھے کہ یہ بڑے بدمعاشوں کی جنگ بھی ہو سکتی ہے۔ ہاتھی لڑتے ہیں تو حشرات الارض پس جاتے ہیں۔ تم اپنے دو ہزار رکھو اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ سچ بول کے بچ گئے۔"

"جھوٹ بول کر جناب..." وہ بولا۔

"جھوٹ تو اب بولو گے... ابھی تک نہیں بولا ہے۔" میں نے کہا اور اس کو دو ہزار روپے پکڑا دیے۔ "یہ میری طرف سے۔ میں بھی تم سے جو کام لے رہا ہوں اس کا معاوضہ ادا کر رہا ہوں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کام میری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو صرف ایک چیز لوں گا۔ تمھاری جان... اب اتر جاؤ اور چل پڑو۔"

وہ نیچے اترا اور واپس چل پڑا۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور یہ یقین بھی آیا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ ضرور بولے گا۔ وہ حد سے زیادہ دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی نہیں کہے گا کہ گاڑی وہی شخص لے گیا ہے جس کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ استاد پیڈرو بھی اس کے سینے پر ریوالور رکھ دے اور اسے سچ بولنے پر مجبور کر دے۔ اسے فیصلہ اور انتخاب تو کرنا ہی پڑے گا کہ کس کے ہاتھوں مارا جائے؟ سمجھدار ہوگا تو دوسرے بدمعاش سے نمٹنے کا بندوبست پہلے سے کرے گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔

اس گاڑی کو لے کر پھرنے میں خطرہ تھا مگر فوری نہیں۔ میں نے یہ انیس ہزار روپے کا جوا کھیلا تھا۔ صرف اس امید پر کہ شاید اس گاڑی میں میرے ساتھ چل کے رابعہ کا ذہن اپنے ماضی کے مانوس راستوں کو اور آشنا لمحوں کو پہچان لے۔ یہ مقصد حاصل ہو جاتا تو میں سمجھتا کہ انیس ہزار کی بازی میں نے جیت لی۔ رابعہ کی ایک پرانی محبت بھری مسکراہٹ پر ایسے انیس ہزار کو میں انیس ہزار بار قربان کر سکتا تھا۔ اگر میں اپنے مقصد میں ناکام رہا تو میں کیا کروں گا، یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ شاید میں گاڑی کو ایک ٹائم بم کے ساتھ چوہدری دلاور کے دروازے پر چھوڑ آؤں گا اور دھماکا ہوگا تو وہ خود ہی میرے پیغام کو سمجھ لے گا۔ پھر مشکل میں وہ کار ڈیلر پڑے گا جو مجھے سیلز مین لگتا تھا۔ استاد پیڈرو اسے جھوٹ بولنے کی سزا دے گا۔ اس نے خدا سے ٹھیک فریاد کی تھی کہ میں کدھر جاؤں۔ اب وہ سچ بھی نہ بولے اور جھوٹ بھی نہ بولے تو پھر کیا بولے۔ بہتر ہے کہ وہ کچھ نہ بولے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گول ہو جائے۔ کسی دوسرے شوروم میں چلا جائے لیکن کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد۔

ہر گاڑی اپنی مخصوص پہچان رکھتی ہے اور جو اسے چلاتا ہے وہ گاڑی کی عادتوں کو جانتا ہے۔ گاڑی کی پک اپ کیسی ہے۔ بریک کس حد تک ٹائٹ ہیں اور کتنی رفتار پر گاڑی کم سے کم کتنے فاصلے پر روکی جا سکتی ہے۔ کلچ کو کتنا دبانا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ انجن یا باڈی کے کس حصے سے کوئی مخصوص آواز آتی ہے، کیوں آتی ہے۔ جو گاڑی ایک ہی ہاتھ پر رہے اس کے مالک کے کان معمولی سی نئی آواز پر خود بخود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رابعہ کی گاڑی بھی اتنا عرصہ میرے پاس رہی تھی کہ میں اس کی چال پہچانتا تھا اور اس کے انجن کی آواز کو سمجھتا تھا۔ اس گاڑی کو چلاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے یہ گاڑی دھوکے باز ہے۔ اس نے میک اپ سے رابعہ کی پرانی فاکس ویگن کی صورت بنالی ہے لیکن جیسے کوئی ایکٹریس ماہر ترین میک اپ مین کے ہاتھوں رابعہ کی شکل و صورت اختیار کر کے، اسی کے لہجے میں بات کر کے اور اسی کے انداز و اطوار اپنا کے بھی رابعہ نہیں بن سکتی تھی، ایسے ہی یہ گاڑی ظاہر کی مشابہت سے مجھے دھوکا دینے میں ناکام تھی۔ تاہم یہ گاڑی اسی طرح اس کام آسکتی تھی جس طرح کوئی ایکٹریس کسی رول میں اپنا کردار نبھاتی ہے۔ فلم بنانے والے اور دیکھنے والے سب ہی جانتے ہیں کہ یہی ایکٹریس جو دیہاتی لڑکی کا کردار کر رہی ہے، فلاں فلم میں کلب ڈانسر بنی تھی مگر دونوں فلموں کو یکساں دلچسپی سے دیکھنے والوں کے ذہن ظاہر کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہانی اور فلم کے تاثر کو قبول کرتے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ رابعہ پر اس گم گشتہ رفیق اور یادگار عہدِ رفتہ کو پھر دیکھنے سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جاتے ہوئے مجھے استاد پیڈرو پر ہاتھ ڈالنے کے اس موقعے کے ضائع ہو جانے کا خیال بھی تھا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ ابھی کار ڈیلر کو صرف پانچ ہزار کا بیعانہ ادا کرتا اور اس سے کہتا کہ باقی رقم میں شام چھ بجے ادا کروں گا۔ شام چھ بجے یا رات کو۔ اس کی اطلاع پاتے ہی استاد پیڈرو یا اس کا کوئی حکم کا غلام اپنی شکاری فوج کے ساتھ ضرور نمودار ہوتا۔ میں جان پر کھیل کر استاد پیڈرو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا مگر ایسی کوشش میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ میرے ساتھ غالب اور محسن یا نیک محمد کے سوا کون جا سکتا تھا اور وہ دوستی میں جان کی بازی لگانے سے گھبرانے والے لوگ نہیں تھے مگر مقابلے میں کوئی بھی مارا جاتا تو مجھے پیڈرو کی گرفتاری مہنگی پڑتی۔ میں ان میں سے کسی کے کم ہونے کا رسک لے ہی نہیں سکتا تھا۔ محسن تو ایک نئی دلہن کے لیے مانگ کی افشاں تھا۔ ہاتھوں کی حنا کا رنگ پھیکا پڑنے سے قبل ہی اس کو بیوگی عطا کرنے کا گناہ اتنا بڑا ہوتا کہ میں تمام عمر خود کو بدترین سزا دے کر بھی مطمئن نہ ہوتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیڈرو کے ساتھ پولیس بھی محاصرہ کر لیتی اور ہم مقابلہ کیے بغیر گرفتار ہو جاتے۔ بے شک مجھے پیڈرو سے ہر قتل کا اعترافِ جرم کرانا تھا جن میں سب سے پہلا قتل میرے باپ وزیر خان کا تھا اور اس سے پوچھنا تھا کہ وزیر خان کو اس نے مرنے کے بعد مدفن سے کیوں محروم کیا تھا اور پھر اس کی ہڈیوں کو زمین کے کس گمنام گوشے میں چھپایا تھا لیکن اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی خطرے میں ڈال کر یہ کام کرنا ہرگز عقل مندی نہ کہلاتا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ کبھی نہ کبھی میں شکاری بن کے اس طرح پیڈرو کو ضرور اسیر کروں گا کہ اس کی زبان خود اپنے ہر گناہ کا اور ہر جرم کا اقرار کرے گی اور اسے سارے قرضے چکانے ہوں گے۔ میرا یقین ابھی سلامت تھا کہ وہ دن ضرور آئے گا۔

ابھی پیڈرو کی گرفتاری سے زیادہ اہم رابعہ کی آزادی تھی۔ وہ فراموشی کے زنداں میں قیدِ تنہائی کاٹ رہی تھی جہاں نہ امید تھی نہ انتظار تھا۔ نہ خیالِ ماضی و حال تھا، نہ احساسِ ہجر و وصال تھا۔ دوستی نہ غم کا سوال تھا اور نہ اپنے آپ پر ملال تھا۔ اس کو پھر بیچ درمیان لانا تھا اور اس کے احساس کو زندہ کرنا تھا کہ ہمارے درمیان، میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ نہ وقت کے فاصلے، مقام کے اور نہ احساس کے۔ جو نہ تھے، نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر لطیف کے گھر جانے سے پہلے میں نے گاڑی کو لاکالج کے سامنے کھڑی ہوئی قطاروں میں شامل کر دیا۔ اور خود پیدل انارکلی کی طرف گیا۔ میرے حلیے میں قدرتی تبدیلی اتنی زیادہ آچکی تھی کہ میں خود کو بہت پُراعتماد محسوس کرتا تھا۔ خوف اب بھی تھا کہ کسی کی خوردبین نے مجھے غور سے دیکھا تو پہچان جائے گی مگر انارکلی کی گہما گہمی میں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ سب اپنے کام سے اور اپنے خیال میں گزرتے جاتے تھے اور جو چہرے نظر آتے تھے انھیں صرف آنکھ دیکھتی تھی۔ یہ عکس دماغ کے کمپیوٹر تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ انارکلی کی بھیڑ میں کھڑے ہو کر کسی شناسا صورت کو تلاش کرنا ایک الگ بات تھی اور انارکلی سے گزر جانا ایک مختلف عمل تھا۔ میں بھی کسی طرف دیکھے بغیر چلا گیا۔ بانو بازار اور اس کے آس پاس ساریوں کی دکانیں چھان لینے کے بعد میں مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری پسند پر پورا اترنے والی ایسی ساری کہیں نہ تھی جس کی گہری نیلی زمین پر شوخ زرد رنگ کے چھوٹے پھول ہوں۔ ایسا گزشتہ بار بھی ہوا تھا اور ایک مرتبہ پھر آخری دکان پر مجھے ساری مل گئی۔ یہ بالکل ویسی ہی ساری تھی جیسی میں پہلے لے جا چکا تھا۔

"آپ تو پہلے بھی ایسی ساری تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔" دکاندار نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا... میں... مجھے یاد نہیں تھا کہ یہی وہ دکان ہے..." میں نے بے وجہ نروس ہو کے کہا۔ اس نے یقیناً مجھے خبطی سمجھا ہوگا۔ جو ایک ہی عورت کے لیے دوسری بار ویسی ہی ساری لے جا رہا تھا یا ہر عورت کو ایک ہی قسم کی ساری پیش کرنے کے خبط کا شکار تھا۔

"ایسی چھ ساریاں بنی تھیں، یہ آخری ہے۔" وہ ساری کو پیک کرتے ہوئے مسکرایا۔

"گویا آئندہ... خیر... مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ایک بلاؤز بھی سلوانا ہے۔" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"بلاؤز کا کپڑا اسی میں شامل ہے۔" دکاندار نے مجھے سمجھایا۔ "ہم ٹیلرنگ بھی کرتے ہیں۔ آپ پیمائش لا دیں۔ کوئی دوسرا بلاؤز، ڈھیلی قمیص ہو۔"

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ تو لمبا چکر ہے۔ اب مجھے گھر جانا ہوگا اور رابعہ کے سامان میں سے پیمائش کے لیے کچھ لا کر دینا پڑے گا۔ پھر یہ ٹیلرنگ بھی آناً فاناً تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے اپنی مشکل کا ذکر کیا تو دکاندار نے میری ناتجربہ کاری کو معاف کرتے ہوئے بتایا کہ بلاؤز ریڈی میڈ بھی مل جاتے ہیں بشرطیکہ رنگ میچ کر جائے۔ میرا یہ مسئلہ ایک اور دکاندار نے حل کیا جو اس معاملے میں مجھ سے زیادہ سمجھدار تھا۔ جب میں بلاؤز لے کر نکلا تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے ساتھ ایک چیز اور ہوتی ہے جو پیٹی کوٹ کہلاتی ہے۔ اس نے میری گھبراہٹ پر مسکراتے ہوئے پیٹی کوٹ بھی نکالا اور میں نے دکان سے باہر آکر اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ بالآخر معرکہ سر کر لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے میرا خیال صرف اصلی معرکے کی طرف تھا جو مجھے ابھی سر کرنا تھا۔

شام پانچ بجے میں گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے اندر لے گیا تو موش بھونکتا ہوا دوڑا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا کیونکہ اب میں محفوظ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ فاکس ویگن کو کاٹ سکتا تھا مگر اس نے یہ حماقت نہیں کی اور واپس لوٹ گیا۔ السیشن نسل کے کتے قد میں اونچے اور صحت مند تو ہوتے ہی ہیں۔ موش کچھ زیادہ ہی بڑا تھا چنانچہ اس کا نام واقعی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اندر سے پھر وہی لڑکا نکلا اور اس نے موش کو عادتاً ڈانٹا۔ پھر وہ مجھے سرخ رنگ کی گاڑی سے نکلتا دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے گاڑی کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"اگر کبھی میں نے گاڑی لی تو فاکس ویگن ہی لوں گا۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ "اور وہ بھی سرخ رنگ کی... بالکل ایسی ہی۔"

"بس تو پھر نیک کام میں دیر کیوں!" میں نے کہا۔ "یہی لے لو۔"

"ابھی... ابھی تو مشکل ہے۔" وہ سوچ کر بولا۔ "اور یہ تو آپ کی ہے۔"

"میری؟" میں نے کہا۔ "یہ تم سے کس نے کہہ دیا ______"

"وہ جو تمھارے گھر میں رابعہ آنٹی ہیں نا... یہ ان کی ہے۔"

"میں سمجھ گیا، آج ہی وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میرے پاس ایک لال رنگ کی فاکس ویگن تھی۔ نہ جانے کہاں گئی۔"

"اچھا؟ اور کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"اور... اور پوچھ رہی تھیں کہ کیا آج سکندر صاحب آئیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تو کسی سکندر کو نہیں جانتا۔ سوائے سکندرِ اعظم کے۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ میں تو سمجھتا تھا کہ انھیں ہنسی آتی ہی نہیں۔" وہ بولا۔ "ہنستی ہوئی وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے اپنے حوصلے کو دوچند محسوس کیا اور اندر گیا تو مجھے مسز لطیف نظر آئیں۔

"یہ بہت باتونی لڑکا ہے۔" انھوں نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ "بالکل باپ پر گیا ہے۔"

"جی... یہ بھی بہت اعتماد کے ساتھ بات کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے رابعہ کیسی ہے؟"

"بہت بہتر۔ جب سے وہ یہاں آئی ہے میں نے پہلی بار خوش دیکھا ہے۔" وہ مسکرائیں۔ "اور اس خوشگوار تبدیلی کے ذمے دار تم ہو۔"

"میں آج ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو ابھی کلینک سے نہیں لوٹے۔ رابعہ سے ملنا ہے تو ان سے اجازت لینی ضروری نہیں۔" مسز لطیف نے کہا۔ "تجربہ کیا ہے؟"

"وہ... میں رابعہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے لیے میں کچھ کپڑے لایا تھا۔ ان کپڑوں سے اس کی کچھ یادیں وابستہ ہیں... اُسے بہت سی باتیں یاد آسکتی ہیں... اور میں اس کی گاڑی بھی لایا ہوں... جو اس کی نہیں ہے۔"

"تم کچھ کنفیوز ہو رہے ہو۔" مسز لطیف نے ہنس کر کہا۔ "جاؤ، اگر وہ جانا چاہے تو لے جاؤ... ہمارے ساتھ تو کہیں جاتی نہیں۔"

میں نے اوپر پہنچ کر دروازے پر دستک دی اور رابعہ کی آواز سُن کر اندر داخل ہوگیا۔

"سکندر صاحب!" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "معلوم نہیں کیوں اس وقت مجھے آپ کا خیال آیا تھا۔"

"کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں رابعہ؟" میں نے دلی مسرت کو چھپا کے کہا۔

"انتظار؟ نہیں... میرا مطلب ہے ہاں..." وہ بولی۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ میں پھر آؤں گا۔"

"ہاں... اور دیکھو میں آگیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ایک تحفہ بھی لایا ہوں تمھارے لیے۔"

اس کی مشتاق سوالیہ نظریں اُٹھیں اور میں نے ساری کو اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "اسے پہچانتی ہو؟"

اس کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ "یہ... یہ تمھیں کہاں سے ملی... یہ تو... ہاں... میں اسے پہچانتی ہوں۔"

"یہ تمھاری ساری ہے نا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں... مگر یہ تمھارے پاس... تم میری چیز مجھے ہی تحفے میں دینے کے لیے لائے ہو؟" وہ بولی۔

"تمھیں یاد نہیں ہے رابعہ... یہ وہی ساری ہے مگر یہ میرے پاس محفوظ تھی۔ تم اسے میرے پاس بھول آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا... اسی لیے تو میں حیران تھی۔" وہ مطمئن ہوگئی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم یہ ساری باندھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں...؟" وہ بولی۔ "اچھا تم بیٹھو... میں تیار ہو جاؤں۔"

اس نے میرے جواب سے پہلے کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا لہجہ اور اس کا چہرہ اب پہلے کی طرح جذبات سے عاری اور سپاٹ نہیں رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی امنگوں اور مسرتوں کے جاگتے خوابوں کا رنگ اتر آیا ہے اور اس کے رخسار دمکنے لگے ہیں۔ آرام اور علاج کے ساتھ صحیح دیکھ بھال نے اس کو صحت کی شادابی اور رعنائی تو عطا کر دی تھی لیکن وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ خوشی کے احساس کی روشنی پھیلی تو مجھے رابعہ کے قالب میں اپنی رابعہ دکھائی دینے لگی۔ میرے خیالوں کو امید کے پَر لگ گئے تھے۔ اور میں خود کو اس خلانورد کی طرح محسوس کر رہا تھا جو چاند کی سطح پر اترنے والا ہو... میرے خوابوں کی مسافت سیکڑوں صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن بالآخر میرے تصور کو حقیقت کی منزل تک پہنچانے والا لمحہ آرہا تھا۔ میں اس لمحے کی سرگوشی سن سکتا تھا جو کامیابی کا نقیب تھا۔ یقینِ محکم عملِ پیہم محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت فاتحِ عالم... پیچھے غالباً ٹی وی پر قوال بڑے زور شور سے گا رہے تھے... محبت فاتحِ عالم...

رابعہ یکلخت نمودار ہوئی۔ میں نے خود کو ایک زنداں میں دیکھا جہاں اس کے وجود نے پتھر کی دیواروں اور آہنی سلاخوں میں امیدوں کے گلشن کھلا دیے تھے۔ وفا کی خوشبو کا پہلا جھونکا... محبت کی چاندنی کی اوّلین کرن اور چاہت کا پہلا نغمہ بن کر وہ میرے احساس پر چھا گئی تھی۔ پھر وقت بدل گیا۔ میں نے اُسے ایک رات اپنے بہت قریب پایا۔ اس رات شہر کی سڑکوں کا رازداں اندھیرا ہم آوارگانِ کوئے تمنا کو کہاں کہاں لے گیا تھا۔ مال سے شملہ پہاڑی کی مہکتی خلوتوں تک اس شب کے دامن میں عہدِ وفا کے یادگار لمحے خوابیدہ تھے۔ اس رات بھی رابعہ کا یہی نیلے آسمان کا تاروں بھرا پیرہن تھا۔ پھر تیسری بار میں نے خواہشوں کی بے تابی سے مجبور ہو کے اسے کہا تھا کہ چلو رابعہ... آج پھر اسی مہرباں رات سے ملنے چلتے ہیں۔ ہم سختیِ آلام اور تلخیِ ایام سے بھاگ کر صرف ایک شب کے لیے اپنی یادوں کے سائے میں پناہ لیتے ہیں مگر اس رات وہ محوِ انتظار رہ گئی تھی اور شکاری مجھے اغوا کر کے لے گئے۔ یہ چوتھی بار تھی کہ میں نے یادِ ماضی کے خوب صورت جزیرے کی طرف لوٹ جانے کا اہتمام کیا تھا جہاں میرے اور رابعہ کے خوابوں کی حسین دنیا آباد تھی۔ مجھے دیوانہ کر دیا تھا، غمِ روزگار نے اور رابعہ دشتِ تنہائی میں بھٹک رہی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ ان منزلوں کے نشان تلاش کریں جو کشمکشِ حیات میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" رابعہ کے سوال نے مجھے چونکا دیا اور مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اس پیکرِ رعنائی کے نظارے میں گم تھا جس کی پہلی جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ حیا سے اس کے عارض میں شفق کے اجالے کی روشنی اتر آئی تھی۔

"تمھیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور جی چاہتا ہے تم اسی طرح کھڑی رہو اور تمھیں ایسے ہی دیکھتا رہوں... تمام عمر..."

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن تم نے تو کہیں باہر چلنے کو کہا تھا۔"

"وہ... ہاں... آؤ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ وہ آگے تھی اور میں پیچھے تھا چنانچہ میری نظر نے ڈاکٹر لطیف کی آنکھوں میں کامیابی کی پیشگی موصول ہونے والی مبارک باد دیکھی اور ان کو دو انگلیوں سے کامیابی کا نشان بنا کے دکھایا۔ ان کی بیگم ہمارے پیچھے پہنچنے کے بعد آئیں اور وہ رابعہ کو دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"کدھر کے ارادے ہیں بھئی؟" ڈاکٹر لطیف نے خوش مزاجی سے پوچھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تیاری تو بڑے زوروں کی ہے۔"

"دیکھو جی نظر مت لگا دینا میری بچی کو۔" ان کی بیوی نے رابعہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "خدا تم دونوں کی خوشیوں کو سلامت رکھے۔"

اس دعا میں جتنی بے غرضی تھی اور جتنا خلوص تھا، جتنا پیار تھا اور جتنی ممتا تھی اس نے مجھے جذباتی کر دیا۔ صرف میری اپنی ماں ہی دل کی اتنی گہرائیوں سے یہ دعا مانگ سکتی تھی۔ مگر اس ماں کا میرے ذہن میں کوئی تصور نہ تھا۔ بزرگانہ شفقت کا ایک روپ میں نے فوزیہ کی ماں یعنی محسن کی مرحومہ والدہ کی محبت میں دیکھا تھا لیکن ایک وقت ایسا آیا تھا جب اُن کا دل بھی مجھ سے بدگمان ہوا تھا۔ تھوڑی سی شفقت مجھے بیگم رضوی نے بھی دی تھی مگر جب میں قانون کا مجرم بن گیا تو انھوں نے اپنے فرض شناس پولیس افسر شوہر کا ساتھ دیا اور مجھے فراموش کر دیا۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے مجھ سے میرا ماضی اور حال نہیں پوچھا تھا۔ اس سے سروکار نہیں رکھا تھا کہ قانون کی نظر میں میری حیثیت کیا ہے اور رابعہ سے میرے تعلق کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شرفِ انسانیت پر یقین رکھنے والے صاف دل لوگ تھے۔ خدا نے اُن کے ہاتھ میں شفا دی تھی لیکن وہ صرف جسم کے روگ دُور نہیں کرتے تھے، دلوں کے دکھ بھی بٹاتے تھے اور خوشیوں سے محروم ہو جانے والے تنہا انسانوں کی جدوجہد میں بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ صرف دوا سے نہیں اپنے پیار سے بھی اعجازِ مسیحائی دکھاتے تھے۔ ان میں ریاکاری تھی اور منافقت نہیں تھی۔ وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں دیکھتے تھے۔ رابعہ ان کے لیے ایک مریضہ تھی جس کی صحت یابی ان کا مشن تھی۔ ان کے لیے حقیقی مسرت کا سرچشمہ یہی احساس تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں۔ ان کی کوشش سے ہمیں اپنی خوشی کی تعبیر مل جائے تو یہی کامیابی ان کا انعام تھی۔ وہ اس معاملے میں کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے کہ دنیا مجھے کیا سمجھتی ہے یا کیا کہتی ہے۔ ان کی نظر نے مجھے پہچان لیا تھا اور ان کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا۔ شاید وہ اپنے دوسرے مریضوں کے ساتھ بھی ایسے ہی حُسنِ سلوک سے کام لیتے تھے۔

"اب جاؤ بھئی..." ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کیا روایتی انداز میں ہم سے اجازت ملنے کے انتظار میں کھڑے ہو۔"

میں شرمندہ ہوگیا۔ "آپ کی عنایات کے بعد کیا مجھے سعادت مندی کے اتنے مظاہرے کی اجازت بھی نہیں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم تو ایسے رخصت ہو رہے ہو جیسے واپس آنے کا ارادہ ہی نہیں۔" بیگم لطیف نے کہا۔

"ہوسکتا ہے رابعہ واپس نہ آئے۔ یہ دونوں اپنے گھر چلے جائیں گے۔" ڈاکٹر لطیف نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"تم چاہتے ہو کہ یہ واپس نہ آئیں؟" بیگم لطیف نے خفگی سے کہا۔ "رابعہ کو نکالنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "میں تو چاہتا ہوں کہ ایک مریض کی حیثیت سے رابعہ ڈسچارج ہو جائے۔ پھر بعد میں جب یہ آئیں گے تو اس طرح نہیں آئیں گے۔"

"اور جس طرح ہم آئیں گے اس سے آپ زیادہ خوش ہوں گی۔" میں نے کہا اور رابعہ کو لے کر باہر نکل گیا۔

رابعہ نے اپنی گاڑی کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن دیکھی۔ "یہ... یہ وہی گاڑی ہے سکندر؟" رابعہ نے کہا۔

"ہاں! تمھیں شک کیوں ہے؟" میں نے دروازہ کھولا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"کیا تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو؟" رابعہ نے اچانک کہا۔ "وہ گاڑی... وہ تو شاید... کیا ہوا تھا اُسے... وہ چوری ہوگئی تھی شاید... نہیں... آگ لگ گئی تھی اس میں..."

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور ریورس میں باہر لے گیا۔ رابعہ کی یادداشت جاگ رہی تھی۔ اس کے لاشعور کے دروازے وا ہونے لگے تھے اور یادوں کی دستک سے اس کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ وہ ونڈ اسکرین سے باہر خلا میں دیکھ رہی تھی۔

"تم بتاتے کیوں نہیں..." وہ اچانک میری طرف پلٹی۔ "کیا ہوا تھا میری گاڑی کو... یہ گاڑی میری نہیں ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

" یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" میں نے کہا اور گلوو کمپارٹمنٹ میں سے کاغذات نکال کے اُسے تھما دیے۔" کیا یہ کاغذات ثابت نہیں کرتے کہ گاڑی تمھاری ہے۔"

اس نے کاغذات میرے ہاتھ سے لے کر دیکھے اور اس کی الجھن بڑھ گئی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا... وہ سوچ کی لہروں کے ساتھ بہنے لگی تھی۔ سمندر کی موجوں کی طرح جو بہا کے لے جاتی ہیں اور اپنے مدّو جذر میں تہ و بالا کرنے کے بعد پھر ساحل کی طرف اچھال دیتی ہیں۔

" یہ مال روڈ ہے نا؟" وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔" کیا تم شملہ پہاڑی کی طرف جارہے ہو؟ یا باغِ جناح میں۔"

" ابھی میں نے طے نہیں کیا تھا۔" میں نے انجان بن کے کہا۔" تم کہاں جانا پسند کرو گی؟"

" وہیں... جہاں ایک بار میں اور تم گئے تھے۔" وہ بے خیالی میں بولی۔" اس رات پورا چاند تھا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکا۔" میں تم سے محبت کرتا ہوں رابعہ..."

" مجھے معلوم ہے۔" وہ بولی۔" لیکن تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔" اس کے لہجے میں دُکھ تھا۔

صورتِ حال خلافِ توقع بہت تیزی سے معمول پر آنے لگی تھی۔ میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ اس کے وجود میں بپا ہونے والے انقلاب نے اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پرانی رابعہ نئی رابعہ پر حاوی آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں اس کش مکش کا انجام ہسٹریا نہ ہو۔

" میں تمھیں کہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا رابعہ۔" میں نے کہا۔" میں محسن کے ساتھ گیا تھا... اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا نا۔"

" انکل شیروانی کا؟" وہ ایک دم بولی۔ یاد کا ایک اور دریچہ کھُل گیا تھا۔" کب؟"

" ایک ہفتہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔" محسن اور شہلا کی شادی ہو گئی ہے۔"

یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔" ان کی شادی ہو گئی... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

" میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے نارمل رہتے ہوئے کہا۔" محسن مجبور تھا۔ وہ شہلا کو کہاں چھوڑتا... اُسے وہ ساتھ ہی لے آیا۔"

رابعہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔" یہ مجھے کیا ہو گیا ہے سکندر... مجھے یہ سب کیوں معلوم نہیں...؟"

" اب تو معلوم ہو گیا ہے نا..." میں نے کہا اور گاڑی کو باغِ جناح میں روک لیا۔" آؤ اوپر چلیں۔"

" نہیں... نہیں سکندر... مجھے شہلا اور محسن کے گھر لے چلو۔ وہ کہاں رہتے ہیں؟" رابعہ نے میرا بازو تھام کے کہا۔

" اُن کے گھر ہم کل چلیں گے۔" میں نے کہا۔" انھوں نے کہا تھا کہ ہم سب کی دعوت کریں گے... میری تمھاری... استاد ٹیڈی اور مرزا غالب کی۔"

" یہ... استاد ٹیڈی... اور مرزا غالب..." وہ چلتے چلتے رک گئی۔" یہ مجھے دیکھنے کیوں نہیں آئے سکندر... میں بیمار تھی اور اسپتال میں پڑی تھی۔"

" نازو بھی تو اسپتال میں پڑی ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔" کیا تمھیں معلوم ہے؟"

" نازو..." رابعہ نے ایک چیخ ماری۔" کیا ہوا ہے اُسے... اُسے... ہاں... اُسے گولی لگی تھی... کیسے لگی تھی اسے گولی؟"

" تمھیں یاد نہیں؟" میں پہاڑی پر سرسبز درختوں اور پھولوں سے گھرے ہوئے کنج کے درمیان لگی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھیں اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ گرد و پیش سے بے خبر ہے۔ اس کا ذہن ماضی کے اُلجھے ہوئے راستوں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ وہ بھول بھلیّوں میں بھٹک رہی تھی مگر اسی اُمید کے ساتھ کہ بالآخر وہ بند راستوں سے لوٹے گی تو کسی دوسرے راستے سے باہر جانے کی راہ ملے گی۔

" تمھیں گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ سے نازو کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔" وہ تمھیں ایک بہت بڑی سیاہ گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

" وہ کون؟" رابعہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔" کون گاما ماچھی؟"

" وہ جو چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا... وہ مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔

رابعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔" مجھے وہ... گاڑی تو یاد ہے لمبی سی کالے رنگ کی گاڑی تھی... مگر اور کچھ نہیں..."

" اچھا... آؤ میرے ساتھ چلو۔" میں نے مایوس ہونے سے پہلے ہر کوشش کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔" میں تمھیں وہاں لے چلتا ہوں۔"

رابعہ چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا ذہن پھر پسپائی اختیار کر گیا ہے۔ وہ ایک وقت میں جتنا اپنی یادداشت کی گہرائی میں جا سکتی تھی جا چکی تھی۔ اس سے زیادہ فی الحال ممکن نہیں تھا۔ وہ جدوجہد کرتے کرتے تھک گئی تھی اور اس کے اعصاب دُہری کش مکش کا دباؤ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ شاید مجھے تھوڑا سا وقفہ دینے کی ضرورت تھی کہ جو کچھ اُسے یاد آیا ہے

سی کے مانے بانے میں اُلجھی رہے۔ اس کے لیے ایک جست میں حال اور ماضی کے درمیان حائل خلیج کو عبور کرنا محال تھا... وہ بوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی اور ٹھہر کر دھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی۔ پہچاننے کی کوشش کرتی کہ وہ کہاں ہے در کس کے ساتھ ہے۔ اس نے لبھوں کو پہچان لیا تھا۔ محسن اور شہلا۔ نازو اور استاد ٹیڈی اور مرزا غالب... یہ سارے نام اسے یاد آ گئے تھے مگر اس کے ذہن میں جو خوف بیٹھا ہوا تھا وہ دشمنوں و پہچاننے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

گامے ماچھی کی جعلی خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی وہ خالی نظروں سے دونوں جانب دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار ضرور عیاں ہوئے تھے مگر وہ خود اس خوف کی نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ مجھے اب مایوسی ہونے لگی تھی۔ واپسی پر میں نے ایک اور جوا کھیلا۔ میں رابعہ کو استاد ٹیڈی کی پرانی رہائش گاہ کی طرف لے گیا۔ کرشن نگر کے آخری حصّے میں اس گلی تک پہنچنے سے قبل ہی رابعہ کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔

" سکندر... اُدھر مت جاؤ... اُدھر خطرہ ہے۔" وہ میرا بازو پکڑ کے بولی۔

" خطرہ؟ کس سے خطرہ ہے؟" میں نے انجان بن کے کہا۔ اسی وقت رابعہ کی نظر نے اس گیراج کو دیکھا جس کا ایک نوجوان مستری رابعہ کی کار میں دھماکے کے ساتھ ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری۔

" یہ... یہ وہی جگہ ہے۔" وہ ہکلانے لگی اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

میں نے گاڑی روک دی۔" یہ کیا ہوا؟" میں نے کہا۔" معلوم ہوتا ہے گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اچھا میں اس گاڑی کو دھکیل کر ایک طرف گلی میں کھڑی کرتا ہوں۔ تم جا کے اس گیراج سے کسی میکینک کو بلا لاؤ۔"

" نہیں..." رابعہ نے چلّا کے کہا۔" وہ اس کو بھی بم سے اڑا دیں گے... انھوں نے میری کار کو بھی اُڑا دیا تھا۔"

" یہ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔" کیا یہ تمھاری کار نہیں ہے... اسے کون بم سے اُڑائے گا بھلا؟"

" وہی جو... جو میری اور تمھاری جان کے دشمن ہیں۔" رابعہ دیوانہ وار چلّانے لگی۔" دلاور اور اس کے ساتھی... مجھے بیوقوف مت بناؤ... یہ میری کار نہیں ہے... واپس چلو سکندر... یہ نہ ہو کہ انھوں نے تمھیں دیکھ لے... تم ہٹو... گاڑی میں چلاؤں گی۔"

" کہاں جانا ہے اب؟" میں نے گاڑی سے اتر کے دوسری طرف جاتے ہوئے کہا۔ رابعہ میری جگہ آ گئی اور اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے میری طرف دیکھا۔ میں بے تعلق بیٹھا رہا۔ میں اس وقت بھی کچھ نہیں بولا جب اُس نے گاڑی واپس کی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ مجھے کہاں لے جاتی ہے؟

رابعہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت محتاط تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کس توجہ اور انہماک کے ساتھ گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ہر سمت سے آنے والی گاڑیوں، ٹریفک کے قواعد سے بالاتر ریڑھوں اور تانگوں، شور مچاتے رکشاؤں، فیل پیکر دو منزلہ بسوں، سائیکل سواروں اور پیدل چلنے والوں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ میری نگاہ صرف اس پر ہے۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح حاضر تھی اور کوئی بھی اس کی گفتگو یا انداز و اطوار سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ یہ ذہنی عدم توازن سمجھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ اپنے ماضی کی سب دکھ دینے والی یادوں اور پُرآزار لمحوں کو وہ طاقِ نسیاں پر رکھ کر بھول گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو یقیناً پاگل ہو جاتی لیکن کچھ عرصہ یادِ ماضی سے دامن چھڑا کے جینے سے اس کے عزم و یقین اور حوصلے کی تھکن دُور ہو گئی تھی اور آہستہ آہستہ ذہنی و جسمانی صحت کی بحالی کے ساتھ وہ پھر اس قابل ہو گئی تھی کہ سختیٔ حالات اور مصائب و آلام کا بار اُٹھا سکے اور میرے ساتھ قدم ملا کے چل سکے۔ اس کی مثال کسی ایسے بوجھ ڈھونے والے مزدور سے دی جا سکتی تھی جو اپنی جسمانی قوتِ برداشت سے زیادہ محنت کرتے کرتے بالآخر اتنا تھک جائے کہ کام کو بھول کر سو جائے اور جب تک سوتا ہے اسے یہ احساس ہی نہ ہو کہ ابھی اس کے لیے اپنے بارِ گراں سے نجات نہیں لیکن سو کر اٹھے تو پھر مشقت کے لیے تیار ہو۔ نیند جو احساس سے بیگانگی کا وقفہ ہوتی ہے ذہنی و جسمانی قوت کے خرچ ہو جانے والے ذخیرے کو پھر بھر دیتی ہے۔

رابعہ بھی اپنے ماضی سے آنکھیں بند کیے خود فراموشی اور احساس سے بیگانگی کا وقت گزار چکی تھی اور میرے آتے ہی آہستہ آہستہ اس کا ذہن پھر حال اور مستقبل کے مسائل کو سمجھنے کے لیے بیدار ہو رہا تھا۔ پہلے میری باتوں نے پھر اس ساری نے جو اب رابعہ کے وجود پر رنگِ گل اور پیرہنِ بہار کا عنوان بنی ہوئی تھی اور آخر میں سرخ رنگ کی اس فاکس ویگن نے اس کی خوابیدہ یادوں کو جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے پہچان رہی تھی۔ پرانے راستوں کو پہچان رہی تھی اور اس وقت کو پہچان رہی تھی جو اِن راستوں سے نسبت رکھتا تھا۔ اُسے وہ چہرے خدوخال کی تفصیل کے ساتھ یاد آ رہے تھے جو میری اور اس کی ذات کے حوالوں سے دوستی اور دشمنی کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس کی سوچ میں ہر نقش ابھر رہا تھا جو خود فراموشی کے مختصر وقفے میں اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ چہرے۔ مقامات۔ رشتے۔ خوف اور اندیشے۔ رنج و غم کے واسطے اور خوشیوں کے وسیلے۔ نفرتوں کے صلے اور چاہتوں کے سلسلے۔ خواہشوں اور ارمانوں کے روشن جذبوں کے رنگ اور ناامیدی کے تاریک سائے، یہ سب اس کے سامنے آتے جا رہے تھے اور اسے پکار رہے تھے۔ رابعہ ہم سب تمہارے وجود کا حصہ تھے اور ہیں... ہمیں جانو... پہچانو اور مانو۔

گاڑی ریلوے اسٹیشن سے علامہ اقبال روڈ کی طرف مڑی اور گڑھی شاہو کے مختصر سے بارونق بازار سے گزری۔ میں نے سوچا کہ اُسے کچھ یاد دلاؤں۔ پھر یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس کے ذہن کو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنی خود اعتمادی کے سہارے پر یادوں کی زنجیر تھامے چلتی جائے، جہاں تک بھی اسے گزرتے ہوئے وقت کی روشنی نظر آئے وہ خود ہر لمحے کی شناخت کرے اور احساس کی اُلجھی ہوئی ڈور کو سلجھاتی جائے۔ بالکل ٹھیک جگہ پر اور میری توقع کے عین مطابق اس نے گاڑی کو کراؤن سینما والی سڑک پر سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لیا۔ میری نظر بار بار رابعہ کی صورت پر جاتی تھی اور لوٹ آتی تھی۔ میں ایک عجیب سی بے چین کر دینے والی اور اعصاب شکن کیفیت سے دوچار تھا کیونکہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ رابعہ کو ایک دم سب کچھ یاد آ جائے گا سو عالم نزع یادوں کی یلغار سے دہشت زدہ ہو جائے گی یا اپنے خوف پر قابو پا لے گی۔ اپنے گھر کے بے نشاں آثار پر اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ وہ چیخ مار کے بیہوش ہو جائے گی یا دیوانہ وار گاڑی سے اتر کر بچپن سے جوانی تک ساتھ دینے والے مہربان گھر کے تصوّر سے لپٹ کر رونے لگے گی۔ وہ بالکل چُپ تھی مگر اس کے جذباتی انتشار کا عکس اس کی صورت کے تغیر میں دکھائی دیتا تھا۔

رابعہ کے والدین کا گھر اور وہ گھر جہاں اس نے ہوش سنبھالا، آغازِ شباب کی امنگوں کو خوش آمدید کہا۔ برسوں میرے تصوّر سے خانۂ خیال کو آباد رکھا۔ وکالت کے کامیاب دَور کا آغاز کیا۔ رسمِ دنیا نباہنے کے لیے ایک ایسے مرد کو شوہر مانا جو اس قابل ہی نہ تھا اور پھر رخصتی سے قبل ہی واپس دوشیزگی اختیار کی۔ مجھ سے ملی اور سب سے بچھڑی، ماں سے محروم ہوئی اور بالآخر بے گھر ہوئی۔ یہ سب فنا ہو جانے والے وقت کے عکس تھے جو اس کے ماضی کی یادوں سے پھر تصوّر میں جھلملائے اور وہ ساکت و صامت اس گھر کی جگہ ایک ملبے کے ڈھیر کو دیکھتی رہی جس کے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہی تھی۔ کھنڈر کے جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی ہر چوکھٹ پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔ اب ضرورت مند اینٹیں نکال نکال کر لیے جا رہے تھے۔ تھڑے بنانے کے لیے، منڈیر جوڑنے کے لیے، مسند دفنوں کے نیچے رکھنے اور کسی تخت یا چارپائی کے ٹوٹے پائے کی جگہ استعمال کرنے کے لیے جسے بھی دو چار یا پانچ دس اینٹوں کی ضرورت پڑتی تھی وہ اس لاوارث اور بے آسرا گھر کے ملبے سے یا اس کی چار دیواری سے نکالتے ہوئے نہیں شرماتا تھا۔

"سکندر..." رابعہ نے اچانک کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں میں یہاں کیوں آگئی... یہاں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں کہیں اور جانا چاہیے۔" میں نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔ رابعہ کی یادداشت لوٹ رہی تھی اور وہ وقت کی زنجیر تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ جو درحقیقت پیچھے کا سفر تھا۔ وہ خود فراموشی کے اندھے کنویں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھی اور اس کی آنکھیں اوپر کھلے آسمان کی وسعت میں روشنی دیکھنے لگیں۔ رابعہ نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس ہوئی۔ اتنے عرصے بعد کسی نے بھی رابعہ پر اور لال گاڑی پر توجہ نہیں دی۔ کوئی اس کھنڈر کے پرانے مکینوں کو یاد کرنے والا نہ تھا۔ سب زمانۂ حال میں جینے والے لوگ تھے جو گزر جانے والوں کو بھولنے میں دیر نہیں کرتے تھے، ورنہ رابعہ وہی بچّی تھی جو اِن کی نظروں کے سامنے پیدا ہوئی۔ پَلی اور بڑھی اور اسے پہچاننے والے سب پرانے لوگ ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ رابعہ کی آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک ٹپکا۔ یہ زندگی کی علامت تھی۔ احساس کو ٹھیس پہنچنے، سوچ کے سمندر میں طوفان اٹھنے اور خیالوں کی برف کے پگھلنے کی علامت تھی۔ رابعہ جاگ رہی تھی اور اپنی پرانی دنیا کی جانب لوٹ رہی تھی۔ میرا مشن کامیابی سے ہمکنار ہونے لگا تھا مگر میرے لیے اس خوشی کے اظہار پر قدغن لگانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"تم مجھے بتاتے کیوں نہیں سکندر! مجھے کہاں جانا ہے؟" رابعہ نے اچانک کہا۔

"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔ ہماری منزل الگ تو نہیں ہے۔"

رابعہ نے گاڑی کو نہر کے پُل سے پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف موڑا۔ وہ انکل رضوی کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں میرے لیے کتنا خطرہ ہے مگر میں نے پچاس فیصد امید کا آسرا ... مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ان کی کوٹھی پر گارڈ متعین ہوئی تو وہ نئے محافظ ہوں گے اور اتنے مستعد کہاں ہوں گے کہ ہر گزرنے والی گاڑی میں سکندر بخت کی صورت تلاش کرتے ہوں۔

... رضوی یا بچّوں میں سے کوئی لال رنگ کی فاکس ویگن کو بھی پہچان ... تھا۔ مجھے بھی اور رابعہ کو بھی مگر ان سے امید نہ تھی کہ وہ انکل ... کی طرح قانون پرستی اور فرض شناسی کا مظاہرہ کریں۔ البتہ خود ... رضوی سے مڈبھیڑ ہو جانے کی صورت میں بچنا محال تھا۔ ابھی ... کوٹھی کے دروازے سے دور ہی تھے کہ رابعہ نے ایک دم بریک ... کے گاڑی روک دی۔

"یہ... اُدھر تو انکل رضوی مل سکتے ہیں۔" وہ گھبراہٹ میں بولی۔ ... کیا مُنہ بند کیے بیٹھے ہو۔ مجھے روکتے بھی نہیں۔" اس نے بڑی ... عجلت میں گاڑی کو واپس موڑنا چاہا مگر فاکس ویگن اپنے بڑے ... پہیوں کے باعث کم جگہ میں پورا چکر نہیں کاٹ سکتی۔ رابعہ کو سڑک ... کے دوسرے کنارے سے جہاں میو گارڈن کی خاردار باڑھ تھی، کار ... ریورس میں لینا پڑا۔ ہمارے پیچھے آنے والی ایک کار ذرا سی دیر ... کے لیے رُکنے پر مجبور ہوئی۔ فاکس ویگن جب آگے بڑھی تو میں نے ... اس کار کے ڈرائیور کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے میرے دل کی ... دھڑکن رک گئی۔ وہ انکل رضوی کا ڈرائیور تھا جسے ہم نے ... سرونٹ کوارٹر سے بے دخل کیا تھا اور ترقی کا جھانسہ دے کر الیاس کو ... بنایا تھا کہ اس نے ہمارے جوتے تک پالش کیے تھے۔ رات کا ... اندھیرا پھیل چکا تھا اور بانسوں والی سڑک پر تاریکی زیادہ ہی محسوس ... ہوتی تھی۔ ایک بار ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر گاڑیاں ایک ... دوسرے کو کراس کر گئیں۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو انکل رضوی کی ... کار ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے والے شیشے میں سے مجھے دو ... تین سر نظر آئے مگر فاصلہ بڑھ جانے کے باعث میں فیصلہ نہ کر ... سکا کہ اس وقت کار میں خود انکل رضوی تھے یا ان کی فیملی تھی۔ ... ڈرائیور نے یقیناً انھیں بتا دیا تھا کہ ابھی ابھی اتنے قریب سے گزرنے ... والی فاکس ویگن میں کون تھا۔ انکل رضوی ہوتے تو پلک جھپکتے ... میں باہر نکلتے اور فاکس ویگن کے ٹائروں پر فائر ضرور کرتے یا ... ڈرائیور سے کہتے کہ گاڑی کا تعاقب کرو۔ مگر کار چند سیکنڈ کے ... توقف سے پھر روانہ ہو چکی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ گاڑی ... میں بیگم رضوی اور بچے تھے۔ لیکن مجھے تھوڑی سی تشویش بھی لاحق ... ہو گئی۔ ہم نے اس چند صورت ڈرائیور کے ساتھ کبھی اچھا سلوک ... نہیں کیا تھا بلکہ کسی حد تک اُس سے دشمنی مول لے لی تھی۔ وہ ... یقیناً ایس ایس پی صاحب کو بتائے گا کہ مفرور ملزم سکندر بخت ... اور مسماۃ رابعہ قاری ایڈووکیٹ اپنی سرخ فاکس ویگن میں کوٹھی ... کے آس پاس مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے پائے گئے تھے۔

"تم نے ابھی تک لائٹ نہیں جلائی۔" میں نے کہا۔ "ویری ... گڈ..."

"اس میں ویری گڈ کی کون سی بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تمہیں یاد دلانا چاہیے تھا۔ خیریت ہوئی کہ..."

"اگر میں نے تمہیں یاد دلا دیا ہوتا تو خیریت ہرگز نہ رہتی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نمبر پلیٹ اندھیرے میں کسی سے نہیں پڑھی جاتی۔ روشنی ہوتی تو وہ مونچھ والا فوراً نمبر دیکھ لیتا!"

"کون مونچھ والا...؟" رابعہ نے حیرانی سے کہا۔

"انکل رضوی کا ڈرائیور... ابھی ابھی جو کار گزری ہے نا، اُسے وہی چلا رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "آنٹی پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"اوہ مائی گاڈ..." رابعہ نے ایک دم رفتار بڑھا دی... "انھوں نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔"

"ہاں! لیکن انھوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "خدا انھیں اس نیکی کا اجر دے۔"

"انھیں بہت دُکھ ہوا ہوگا کہ ہم اُن سے مل بھی نہیں سکے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور یوں اجنبی ہو کے نکل گئے ہیں۔"

یہ ہماری کتابِ زندگی کا ایک اور باب تھا جو رابعہ کو یاد آچکا تھا۔ میں اپنی کامیابی پر بے حد مسرور تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے رابعہ کو ہار کر پھر جیت لیا ہے۔ میرے دماغ میں قوالی کے بول یوں گونج رہے تھے جیسے ریکارڈ گھس جانے سے سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہو۔ "محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت..."

"اب تو بتا دو کہ ہمیں کدھر جانا ہے؟" رابعہ نے بے بسی سے کہا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے رابعہ..." میں نے کہا۔ "میری زندگی کے سفر میں ہر لمحہ ہر قدم تم میرے ساتھ رہی ہو... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں راستہ کہاں تک یاد ہے۔"

"تم مجھے آزما رہے ہو؟" وہ مسکرائی۔ "اچھا میں ایک کوشش اور کرتی ہوں..."

رابعہ نے گاڑی کو دائیں جانب موڑا اور نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ راستے میں صرف ایک جگہ اس نے رفتار کم کی جہاں سڑک کے بیچ میں دو پولیس والے رائفل لیے کھڑے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ عموماً اس قسم کی چیکنگ پولیس والے نصف شب کے بعد شروع کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے خوف نے مجھے مغلوب کر لیا۔ شاید یہ ناکہ بندی آخر کس لیے؟ کیا اتنی سی دیر میں انکل رضوی نے پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ ایک لال رنگ کی فاکس ویگن کو اسی علاقے میں تلاش کریں جس میں مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت موجود ہے۔ میں رابعہ سے کہتے کہتے رک گیا کہ وہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایکسیلیریٹر دبا کے گاڑی کو نکال لے جائے اور اس بات کی پروا نہ کرے کہ راستہ روکنے والے مارے جاتے ہیں یا اپنی جان بچاتے ہیں۔ پھر مجھے عقل نے لگام دی۔ پولیس والے مسلح تھے اور اگر وہ بچ جاتے تو بڑی آسانی سے ایک فائر کر کے ہماری گاڑی کو لنگڑا لُولا کر دیتے۔ اس کے علاوہ پولیس کی جیپ سڑک سے ذرا ہٹ کے کھڑی ہوئی تھی اور اس میں کسی افسر کا ہونا یقینی تھا، کیونکہ جیپ کے سامنے والے حصے پہ وائرلیس کا انٹینا لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ریوالور سے ہمارے ٹائر چھلنی کر دیتا اور ہمارے پاس جو تھوڑا بہت چانس تھا کہ پہچانے نہ جائیں، وہ گرفتاری کے بعد ختم ہو جاتا۔ رابعہ نے میری طرف دیکھا اور بریک لگا دیئے۔ ایک پولیس مین نے دائیں طرف آ کے اور دوسرے نے بائیں جانب سے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔ وہ بادلِ ناخواستہ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے بھئی...؟" میں نے متانت اور سکون کے ساتھ کہا۔

"کس کس کو بتائیں جی کہ کیا بات ہے؟" کانسٹیبل نے بیزاری سے کہا۔ "ایک ڈاکا پڑا ہے۔"

"جاؤ جی جاؤ..." دوسرے نے آل کلیئر کا سگنل دیا کیونکہ پیچھے دوسری کار آ گئی تھی۔ جب ہم سو گز دور نکل گئے تو میری جان میں جان آئی۔ اس وقت بھی جب ہماری کار ٹھہری ہوئی تھی، وائرلیس پہ انکل رضوی کا پیغام موصول ہو سکتا تھا اور میرا مشن جس کا مقصد رابعہ کی واپسی تھی، پسِ دیوارِ زنداں پہنچ کے پورا ہوتا جہاں سے پھر نکلنے کی امید رکھنا بھی محال تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ جتنے دی کھوتی اد تھے آن کھلوتی۔ سارا عشق دھرا رہ جاتا۔ مادرِ وطن کے لیے جان کی بازی لگا دینے کے سارے منصوبے خاک میں مل جاتے۔

"اس وقت تو بال بال بچے۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھ کر کہا جو مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم کافی ڈر گئے تھے۔" وہ مسکرائی اور اسی وقت گاڑی نہر کی منڈیر پر چڑھ گئی۔ رابعہ نے ایک دم بریک نہ لگائے ہوتے تو دوسرے لمحے میں ہم فاکس ویگن کے ساتھ سوئمنگ کر رہے ہوتے۔

"تم سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "فی الحال میں تم کو دیکھتا ہوں کیونکہ میں فارغ بیٹھا ہوں... تم مجھے بعد میں دیکھ لینا۔"

رابعہ ہنسی۔ اور مجھے اس ہنسی میں وہی پرانی رفاقتوں کی بے تکلف نغمگی محسوس ہوئی۔ پرانی اپنائیت کا بے ساختہ پن محسوس ہوا اور چاہت کے صادق جذبوں کی سرخوشی محسوس ہوئی۔ رابعہ نے کلچ دبایا اور گاڑی واپس نیچے اتر آئی۔ اس سڑک پر روشنی نہ ہونے کے برابر تھی اور فاکس ویگن کی ہیڈ لائٹس میں چھ واٹ کے بلب تھے چنانچہ ان کی روشنی بھی سڑک پر چند گز آگے تک ہی تھی۔

"انکل رضوی کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے تم رُک کیوں گئی تھیں؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی تھی... اور مجھے یاد نہیں آتا کہ بات کیا تھی... لیکن اُدھر کچھ خطرہ تھا۔" رابعہ نے کہا۔ "مجھے عین وقت پر خیال آیا کہ ہمیں اُدھر نہیں جانا چاہیے تھا... اگر ہمیں کوئی دیکھ لیتا تو اچھا نہ ہوتا۔"

"اور تم کو یہ بالکل یاد نہیں کہ وہاں ہم کیوں نہیں جا سکتے؟"

میں نے کہا۔ رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بہت سے واقعات یاد دلائے جو انکل رضوی کی کوٹھی میں قیام کے دوران پیش آئے تھے مگر اس کو صرف ایک بات یاد تھی کہ ایک رات ہم اس کوٹھی کے لان میں رات بھر شبنم سے بھیگی ہوئی چاندنی میں بیٹھے رہے تھے۔ اسے ہر اچھی بات یاد تھی۔ ہر ناخوشگوار یاد کو اس کے ذہن نے حافظے سے خارج کر دیا تھا تاہم اسے نامعلوم خطرات اور اندیشوں کے وجود کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے ساتھ گزر جانے والا وقت حادثات و واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ اس نے یادِ ماضی سے منسوب ہر خوشگوار تاثر کو قبول کر لیا تھا۔ جن باتوں سے اس کے ذہن کو صدمہ پہنچ سکتا تھا وہ اسے یاد ہی نہیں آتی تھیں۔ اس کو اپنے اغوا۔ دلاور اور ڈھی سلوا سے تصادم۔ نواب خسرو جمشید کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات، قصرِ جمشید کی آتش زدگی اور گامے ماچھی کے اڈے سے اپنے اغوا کے بعد کے واقعات بالکل یاد نہیں تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا موازنہ کسی ایسے مریض سے کیا جا سکتا ہے جس نے حالات کے دباؤ اور اعصابی کشیدگی کے باعث خودکشی کی کوشش کی ہو اور جس کی حالت اب ڈاکٹروں کی کوشش سے خطرے سے باہر ہو مگر ڈاکٹر صرف انہی لوگوں کو ملنے کی اجازت دینے پر تیار ہوں جن سے ملاقات کا ردِ عمل ناخوشگوار نہ ہو اور انھیں مریض کے سامنے جانے کی اجازت نہ ملے جن سے اندیشہ ہو کہ ان کو دیکھ کر مریض نفرت یا غصے کے ردِ عمل کا شکار ہوگا اور یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے یہ ذہنی صدمہ کسی پاگل پن یا جنون کے دورے کی شکل اختیار کر جائے۔ رابعہ بھی اپنی یادداشت سے فی الحال پُرمسرت یادوں کو منتخب کر رہی تھی۔ یہ ایک لاشعوری عمل تھا۔ وہ ماضی کی محفوظ گلیوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے لیے فوری طور پہ قتل و خونریزی، تباہی و غارت گری اور جان لیوا خطرات کی یادوں سے رشتہ استوار کرنا ایک غیر محفوظ عمل تھا۔ اس کی ذہنی صحت کی مکمل بحالی تک یہ حفاظتی انتظام ضروری تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ مکمل خود فراموشی کا دور ختم ہو چکا ہے، تو رفتہ رفتہ اس کا ذہن تلخ حقائق کو بھی قبول کرنے لگے گا اور جب اس کا اعتماد بحال ہو جائے

وہ سب یاد آ جائے گا جو لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور کی گہرائی میں دفن ہو گیا ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ آج کے لیے میری اتنی کامیابی ہی بہت تھی کہ اس نے مجھے، محسن اور شہلا کو، انکل شیرازی اور انکل رضوی کو، غالب کو اور استاد ڈیڈی کو پہچان لیا تھا اور اس نے اپنے آدھے ماضی سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور اس آدھے وقت سے اس کی ہر یاد مسرت کے احساس کی ضامن تھی۔ اُس نے مجھے اور میری محبت کو قبول کر لیا تھا۔ ایک ازلی اور ابدی حقیقت کے طور پر محبت ابتدا سے تھی۔ اس ابتدا کے وقت کا... تعین وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف یہ خیال تھا کہ میرے علاوہ اس نے کسی کو چاہا نہ تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ مجھے کبھی فراموش کر سکے۔ اُسے کل احساس نہ رہا تھا کہ درمیان میں خود فراموشی کا ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب وہ مجھے بھی پہچاننے سے قاصر رہی تھی۔ اگر کسی بچے سے ہوش سنبھالنے کے بعد کسی دن اچانک یہ پوچھا جائے کہ تمھیں سر پر آسمان کی موجودگی کا احساس کب ہوا تھا تو وہ پریشان ہو جائے گا اور کہے گا کہ آسمان تو شروع سے ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو بغیر آسمان کے تصور کر سکے۔ یہی حال رابعہ کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ محبت سے اس کی زندگی نہ کبھی خالی تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ اگر میں اس سے کہتا کہ وہ دن یاد کرو جب تم پہلی بار مجھ سے ملنے کے لیے میری وکیل بن کر جیل میں ملاقات کے لیے آئی تھیں اور اس دن تمھارا لباس یہی تھا تو اُسے بالکل یاد نہ آتا اور میں اس کو بتاتا کہ وہی میری اور اس کی محبت کے آغاز کا پہلا لمحہ تھا جب میں نے اس کا یہ روپ دیکھا تھا تو وہ حیران ہوتی۔

اس نے سمن آباد میں میرے آبائی گھر میں گاڑی روک دی۔ گھر ویران تھا، تاریک اور آسیب زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے سب دروازے بند تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے اُجڑے باغیچے میں پلانے درخت سرنگوں کھڑے تھے اور سناٹے میں جھینگر روتے محسوس ہوتے تھے۔ کسی دور افتادہ گوشے سے ایک مینڈک کے ٹرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی، ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ میں رابعہ کو چھوڑ کر بہت پیچھے نکل گیا تھا۔ چند لمحوں میں میری آنکھوں نے اپنے بچپن کی یادوں کے اَن گنت زندہ عکس دیکھ لیے جو میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ پھر مجھے وہ ریٹائرڈ سیشن جج یاد آیا جو اس گھر میں اکیلا رہ گیا تھا اور جس نے یہ مکان رابعہ کو دے کر مجھے میراث سے عاق کر دیا تھا مگر خود اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا تھا۔ چشمِ تصور سے میں نے اپنے گزرے ہوئے وقت کو ان دیواروں میں محبوس دیکھا۔ ہر وقت مجھے پکارتا تھا کہ بتاؤ کبیر خاں... تم کب تک ہمیں تنہائی کی اس قید میں رکھو گے۔ آؤ اور وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے اس گھر کے چراغ روشن کرو۔ دیواروں سے اداسیوں کے جالے نوچ کر پھینک دو اور ویرانی کو بے دخل کر دو۔ اس کی فضا میں خوشی کے نغمے اور مسرت بھرے قہقہے پھیلا دو۔ یہ وقت رابعہ کے لیے بانہیں پھیلائے کھڑا تھا کہ آؤ... تم رُک کیوں گئی ہو۔ تم تو اس گھر کی مالکن ہو۔ تمھیں تو اس گھر کو جنت بنانا ہے۔ اپنی محبت، توجہ اور پیار سے اس میں زندگی کے سارے شوخ رنگ بھرنے ہیں اور اس گھر کو وہ خوشی، خوب صورتی اور خوشحالی دینا ہے جو وزیر خان کا ارمان تھی۔ خواب تھی اور حسرت تھی اور اب اس کی روح کی خلش ہے جسے تم ہی دور کر سکتی ہو۔ اس کی بے کل روح تب ہی قرار پائے گی جب اس ویرانی کے جمود کو اس کا پوتا یا پوتی دنیا میں اپنی آمد کے اعلان سے توڑیں گے اور پھر اپنی معصوم ہنسی اور شریر قلقاریوں سے بھر دیں گے۔

"سکندر!" رابعہ نے میرے شانے پر سر رکھ کے کہا۔ "یہ گھر تو ہمارا ہے نا... یہاں آ کے تو میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

میں نے اس کے سر کو پیار سے تھپکا۔ "یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ لیکن آج اس کے دروازے بند ہیں۔ ایک دن یہ دروازے تم اپنے ہاتھوں سے کھولو گی۔ اس دن تمھارے ہاتھوں میں مہندی ہوگی اور تمھاری مانگ میں افشاں۔ اس گھر کے دروازے پر وزیر خان اپنی... بہو کا استقبال کرنے کے لیے خود موجود ہوگا۔ یہاں چراغاں ہوگا۔ سیج کے لیے پھولوں کی خوشبو ہوگی اور شادمانی کے نغمے ہوں گے اور جب تم لباسِ عروسی میں میرے ساتھ اس گھر میں قدم رکھو گی تو پھر یہ گھر ہمارا نہیں ہوگا۔ ہم اس گھر کے ہو جائیں گے... ہمیشہ کے لیے..."

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ چاندنی اس کے رُخ پر نثار ہو رہی تھی اور اس کی بند آنکھیں خواب کو حقیقت کی طرح دیکھ رہی تھیں۔ وہ تصورات کی دھنک کے جھولے میں پرواز کرتی جا رہی تھی اور خوشیوں کو آسمان کے تاروں کی طرح اپنی جھولی میں بھرتی جا رہی تھی۔ اس ماحول اور اس کے ساحر حسن کا طلسم بے خودی کا احساس بن کر چھا گیا اور اس وقت کا نقش دائمی ہو گیا۔ میں نے اپنی خوش بختی پر ناز کیا کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور میرے ساتھ میری محبت ہے اور رابعہ ہے جس کے حسنِ بے مثال کی تابندگی سے کائنات روشن ہے اور میرے دل میں اجالا ہے۔ دوسرے لمحے یہ خواب ٹوٹ گیا جو حقیقت سے زیادہ حقیقی تھا۔ رابعہ نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور آہستہ سے مسکرائی۔ چاندنی کچھ اور نکھر گئی۔ دل کچھ اور مچل گیا لیکن میں رابعہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے میں اس کے دل میں اتر گیا۔ "محبت فاتحِ عالم... محبت فاتحِ عالم... اجی ہاں ہاں... محبت فاتحِ عالم..." ہر طرف سے صدا آنے لگی۔

"چلو رابعہ..." میں نے چونک کر کہا۔ "میں تمھیں واپس لے چلتا ہوں... رات بہت ہو گئی ہے..."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیاتم رات سے ڈرتے نہیں سکندر۔" وہ بولی۔ "میں بہت ڈرتی ہوں... میں اکیلی رہ جاتی ہوں نا... مجھے اپنے ساتھ لے چلو یا میرے ساتھ چلو... ڈاکٹر لطیف کے گھر۔"

"میں وہاں نہیں رہ سکتا رابعہ۔" میں نے کہا۔ "اور تمھیں اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا۔ کل میں پھر آؤں گا۔ پھر میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمھیں محسن اور شہلا کے گھر لے چلوں گا اور پھر تم ان کے ساتھ ہی رہو گی۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔ "کھاؤ میری قسم۔"

"میں تمھاری اور تمھاری محبت کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کل تمھیں ضرور لے جاؤں گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔ "وعدہ کرو آج رات تم نہیں ڈرو گی۔ سکون سے سوتی رہو گی۔"

"اگر نیند نہ آئی تو میں تمھاری یاد کو ساتھ رکھوں گی۔ پھر مجھے ڈر نہیں لگے گا۔" وہ بولی۔ "اور نیند آئی تو خواب میں تمھیں ساتھ رکھوں گی... یہ کیسی عجیب بات ہے سکندر کہ یہاں مجھے بالکل ڈر محسوس نہیں ہوتا حالانکہ یہاں کتنی ویرانی ہے، اندھیرا ہے اور خاموشی ہے مگر ڈاکٹر لطیف کے گھر میں سب کے درمیان رہ کے بھی میں ڈرتی تھی... پریشان رہتی تھی۔"

"مجھے تو اب بھوک پریشان کر رہی ہے۔" میں نے رونی آواز میں کہا۔ "اگر میں نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر کہیں بیٹھ کر چکن تکے نہ کھائے تو رات کو خواب میں مجھے مرغے ڈرائیں گے... کہ تمھارے لیے ہم جان سے گئے اور تم نے ہمارے تکّے چکھے بھی نہیں۔"

رابعہ ہنس پڑی۔ "اگر تم کہتے کہ چائنیز کھانے چلتے ہیں تو میں انکار کر دیتی۔ میں خود چکن تکّے کھانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ اور بھوک مجھے اس وقت ہی لگ گئی تھی۔"

"اور اپنے ساتھ مجھے بھی بھوکا پیاسا لیے پھرتی رہیں...؟" میں نے مصنوعی غصّے سے کہا۔ "چلو ہٹو... اب گاڑی میں چلاؤں گا ورنہ تمھارا کیا ہے... لے جاؤ گی کہیں اور... ہمیں جانا ہے وارلکیب۔"

رات کے گیارہ بجے میں نے بے خیالی میں گاڑی کو ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی میں موڑا۔ میں رابعہ کے قریب اور اس کے ساتھ گزری ہوئی شام کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا کہ موش نے دہاڑ کر حملہ کیا۔ میں اچھل پڑا اور میں نے بے اختیار موش کو اُلّو کا پٹھا کہا۔ "ڈاکٹر لطیف بھی کمال کرتے ہیں۔ اس کا نام رکھ دیا موش یعنی چوہا۔ گدھے کے برابر کتا ہے۔ خرکار قسم کا نام رکھتے۔" میں نے کہا اور رابعہ ہنسی۔ گاڑی کی آواز پر ڈاکٹر لطیف باہر آئے اور انھوں نے موش کو بھگایا۔

"آپ ماہرِ نفسیات ہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے نیچے اتر کر کہا۔ "آپ کے پاس آنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ ان کا تو نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہوگا۔ یہ کیا خطرناک چیز رکھ دی ہے آپ نے استقبالیہ پر..."

ڈاکٹر لطیف ہنسنے لگے۔ "ارے بھئی وہ شوق ہے ہمارے ولی عہد کا... ویسے بہت بے ضرر چیز ہے۔"

"کون؟ آپ کا ولی عہد؟" میں نے کہا۔ "بالکل ہوگا مگر بھلا ... اس کی تو آواز سے ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے... آپ ایسا کریں، سچ مچ کا چوہا پال لیں۔ وہ واقعی بے ضرر ہوتا ہے۔ ایسے موش کہنا ایسا ہی ہے جیسے بم کو ٹافی کہنا۔"

رابعہ پھر ہنسی اور ڈاکٹر لطیف کا چہرہ مسرت سے دمک اُٹھا۔ انھوں نے رابعہ کی اس خوشی کا اندازہ کر لیا جو ہنسی میں اس کے لبوں تک آئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے چاندی کے روپے کے کھوٹے یا اصلی سونے کا اندازہ اس کی کھنک سے کیا جاتا تھا۔ فرش پر بجنے والی خالص چاندی خود اپنی پہچان بتاتی تھی۔

"کیسی رہی تم لوگوں کی شام؟" ڈاکٹر لطیف نے انگریزی میں کہا۔

"بہت اچھی۔" میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ کو اچھی نہیں لگ رہی ہے؟" رابعہ شرما کے ہنسی اور اندر غائب ہو گئی۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم کامیاب رہو گے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے؟"

"ساٹھ فیصد تو یقیناً ہوئی۔ اگر میں مغالطے سے کام نہ لوں۔" میں نے کہا۔ "کل وہ محسن اور شہلا کے گھر جانا چاہتی ہے... میرا خیال ہے وہاں رہ کے وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں تمھارے یقین کی نفی نہیں کرتا... مگر کیا وہ وہاں محفوظ رہے گی؟"

"اگر مجھے ایک فیصد بھی شبہ ہوتا تو میں یہ رسک نہ لیتا۔ اس گھر سے محفوظ تر جگہ کا میرے ذہن میں تصور ہی نہیں لیکن یہاں رابعہ خود کو ایک کلینک میں محسوس کرتی ہوگی۔ بے شک آپ کا رویّہ اور یہ گھریلو ماحول ہرگز کلینک والا نہیں۔ یہ اس کے دماغ میں تو ہو سکتا ہے... جہاں وہ جانا چاہتی ہے وہ اپنے گھر کی طرح ہے... اپنے گھر لوٹ کر آنے کے بعد ہر مریض ذہنی طور پر خود کو صحت یاب محسوس کرتا ہے...؟" میں نے کہا۔

"میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں... جب اُسے اپنے والے ہوں گے اور وہ ماحول سے مطابقت پیدا کرے گی تو سارے ٹوٹے ہوئے رشتے قائم ہو جائیں گے مگر احساسِ تحفظ کی شرط ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

میں نے ان کو شب بخیر کہا اور گاڑی کو واپس لے گیا۔ بے اختیار میری نظر اوپر کے ایک روشن دریچے پر گئی۔ روشنی کے مستطیل فریم میں رابعہ کا پیکرِ حسن ایک عکسِ جمیل کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے ہاتھ اُٹھایا اور میں نے جواب میں ہاتھ ہلا کے دل پر رکھ لیا۔ یہ وہی تھی مگر اس کی چاہت کا احساس نیا تھا۔ عشق کی وارفتگی میں ہم وصال کے بعد ہجر کی شب کی کسک میں بھی ایک لذت آزار تھی، وہ نئی تھی۔ میں اس کی مئے حسن کے نشے اور خمارِ ... میں گم تھا۔ میری نظر میں اس کا چہرہ تھا اور میرے کانوں میں اس کی آواز... مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ تھی اور میں ذہن کے ... عمل کے تابع گاڑی کو ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے ... جا رہا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کار کہاں سے میرے ...

رات کے ساڑھے گیارہ بجے سڑکیں ویران تھیں۔ شاید یہی وجہ ... ایک جگہ موڑ کاٹتے ہوئے میں نے رفتار کم کی تو عادت کے مطابق ... دیکھا۔ ایک کار کی ہیڈ لائٹس کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ کار ... پیچھے تھی۔ چنانچہ میں نے انڈیکیٹر لائٹ نہیں دی اور مڑ گیا۔ پھر ... نے دیکھا تو وہ گاڑی اتنے ہی فاصلے پر مجھے اپنے پیچھے نظر آئی۔ ... نے رفتار کم کی اور بیس پچیس میل پر آ گیا۔ وہ گاڑی اس کے باوجود ... رہی۔ اس کا فاصلہ بھی کم نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو ... پہلے ساٹھ ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے میرا تعاقب کر رہی تھی اب ... کی رفتار بھی بیس پچیس میل کر لی گئی تھی ورنہ وہ چند منٹ میں ... ہاوورٹیک کر جاتی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ تصدیق کے لیے میں نے رفتار بڑھائی۔ میرے سامنے ایک سیدھی اور خالی سڑک تھی جس ... ستر اسّی میل فی گھنٹا کی رفتار ممکن تھی۔ مجھے اس سڑک پر ایک ... آگے جا کے پھر دائیں طرف مڑنا تھا لیکن میں سیدھا چلتا گیا۔ ... شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب پیچھے آنے والی کار ... اتنے ہی فاصلے پر موجود رہی۔ اس کی رفتار بھی اسّی میل ہو ... تھی اور اس کار میں جو بھی تھا، وہ ماہر ڈرائیور تھا کہ دُور ہونے ... باوجود اپنی رفتار کو ضرورت کے مطابق کم زیادہ کر لیتا تھا لیکن ... درمیانی فاصلے میں فرق نہیں آتا تھا۔

میرے ذہن سے رابعہ کا خیال نکل گیا اور ایک رومانی شام ... پُرکیف خیالات کا بیڑا غرق ہو گیا۔ دشمن اچانک نمودار ہوا تھا ... اس کے ساتھ ہی خطرے کا احساس تمام خیالوں پر غالب آ گیا ... میرا ذہن چوکنا اور مستعد ہو گیا تھا اور میرے جسم کا رُواں رُواں ... مقابلے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ فوری طور پر مجھے ایک خیال یہ آیا کہ ... تعاقب کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ شکاری تھے تو کون سے شکاری؟ ... سب سے پہلے اور خطرناک شکاری چوہدری ولاور اینڈ کمپنی والے تھے۔ ... دوسرے شکاری قانون کے محافظ تھے جن کو ہر جگہ اور ہر وقت ایک ... مفرور اشتہاری مجرم سکندر بخت کی جستجو تھی۔ اب تیسری قسم کے ... شکاری سامنے آ چکے تھے جو میری ذات کے دشمن نہیں تھے، میرے ... ملک کے دشمن تھے لیکن ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میں نے ... انھیں اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ یہ کرنل جگجیت ناتھ، سیوک اور سادھو رام ... جن کو پہلے سے پہچانے جانے والے شکاری تھے۔ سائیں بابا پیر جھوا لے اور دلربا کے اڈّے کی تباہی کے بعد اگر یہ شکاری بھی میرے پیچھے لگ چکے ہوں تو عجب نہیں۔ وہ انٹیلی جنس کے لوگ تھے اور ان کے مخبر و معاون ہمارے درمیان موجود تھے۔ ان کے لیے میرا سراغ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ تیسری قسم کے شکاری اپنی خونریزی اور تباہ کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے پہلے نمبر پر آتے تھے۔ ان کے لیے ایک فرد یا ایک گھر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ ایک بستی کو اپنے مذموم عزائم کی بھینٹ چڑھا سکتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا۔

دوسرا خیال مجھے یہ آیا کہ آخر تعاقب کرنے والے کب سے میرے پیچھے ہیں؟ میں تو رابعہ کے ساتھ دنیا و مافیہا سے غافل و بیگانہ تھا۔ کیا وہ ہر جگہ میرے پیچھے تھے لیکن بازاروں اور سڑکوں کی ٹریفک میں وہ نمایاں نہ ہوئے تھے۔ ان کا ارادہ میری جان لینے کا ہوتا تو وہ اسی وقت گولیاں برساتے ہوئے نکل جاتے جب میں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی تھی لیکن وہ بڑی مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے ایک موڑ کاٹا اور تقریباً دو فرلانگ تک نسبتاً چھوٹی سڑک پر چلنے کے بعد دوسری بڑی سڑک پر مڑ کے واپس ہو گیا۔ یہ دوسری سڑک پہلی سڑک کے متوازی تھی۔ مجھے اس کار ڈیلر کا خیال بھی آیا۔ کیا اس نے استاد پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ گاڑی سکندر بخت لے گیا؟ رضا کارانہ طور پر نہ سہی اس نے گن پوائنٹ پر یہ اطلاع دے کر اپنی جان بچائی ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہوا تو کل اس خبیث کی خیر نہیں۔ ابھی تو مجھے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

میری نظر نے اچانک بائیں ہاتھ پر ایک کوٹھی دیکھی جس کے دو دروازے تھے۔ ایک اندر جانے کے لیے اور دوسرا باہر آنے کے لیے۔ گیٹ کھلا ہوا اور خاصا کشادہ تھا اور اس کے اوپر لائٹس تھیں چنانچہ راستہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اندر پورٹیکو میں کوئی گاڑی نہیں ہے اور گیٹ پر چوکیدار نہیں ہے۔ میں کوٹھی کو ذہن میں رکھتے ہوئے سیدھا گزر گیا۔ میرے ذہن میں ایک اسکیم آ رہی تھی لیکن اس پر عمل کرنے سے پہلے میں ہر قسم کے امکانات پر اچھی طرح غور کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے چند لمبے گہرے سانس لیے اور گاڑی کی رفتار کم کر کے سکون سے بیٹھ گیا۔ تقریباً سو گز کے بعد ایک چوک سا آ گیا جس میں دائیں اور بائیں جانب دو گلیاں تھیں۔ بائیں طرف کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی نقشہ نہیں تھا لیکن دائیں جانب مڑ جانے کے بعد مجھے پھر اسی بڑی سڑک پر پہنچ جانے کی امید تھی جس سے میں چند منٹ پہلے گزرا تھا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے ایک مستطیل میں سفر کیا جس کے دو متوازی ضلعے دو فرلانگ لمبی اور زیادہ چوڑی سڑکوں پر مشتمل تھے اور چوڑائی کے رُخ کے دونوں ضلعے پتلی گلیاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھیں جو سو گز یا اس سے کچھ کم لمبی ہوں گی۔

ایک بار پھر میں بڑی سڑک پر پہنچا تو موڑ کاٹتے ہوئے میں نے دوسری کار کو دیکھا۔ وہ پچاس ساٹھ گز پیچھے تھی اور تعاقب کرنے والے بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دے رہے تھے۔ میرا پورا چکر تقریباً پون میل بنتا تھا اور پیچھے آنے والے بیوقوف نہیں تھے۔ وہ یقیناً سمجھ چکے ہوں گے کہ مجھے تعاقب کا علم ہو گیا ہے اور میں نے جان بوجھ کر انھیں چکر دیا ہے۔ اب میں پھر اس راستے پر دوسری بار رواں تھا جس پر سے پانچ دس منٹ قبل گزرا تھا۔ میرا منصوبہ میرے ذہن میں مکمل ہو گیا تھا اور اس کے تمام خطرات کو سامنے رکھتے ہوئے بھی میں نے اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اسپیڈو میٹر پر نگاہ ڈالی۔ میری رفتار تیس میل فی گھنٹا تھی۔ دو فرلانگ بعد میں دائیں طرف مڑا اور بائی لین میں سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پھر دائیں طرف موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہ اسی محدود علاقے میں میرا دوسرا چکر تھا جس کی حد بندی چار سڑکوں سے ہوتی تھی۔

وہ کوٹھی جس کے دو گیٹ کھلے ہوئے تھے، اپنی مخصوص ساخت کی گیٹ لائٹس کے باعث مجھے دور ہی سے نظر آ گئی تھی۔ میرے دشمن ابھی پیچھے تھے۔ بڑی سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسیلیٹر کو دبایا اور فاکس ویگن جس کے انجن کی پک اپ کا مقابلہ بہت کم گاڑیاں کر سکتی ہیں، اپنی قوت میں گرجا۔ گاڑی کسی چیتے کی طرح جست لگا کے بڑھی اور دو ہی سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اس کی رفتار اسّی میل تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ میرے پیچھے آنے والی کار پچھلا موڑ کاٹتی، میں کوٹھی کے پہلے گیٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ اندر جاتے ہوئے میں نے رفتار کو قابو میں رکھنے کے لیے بریک پر پاؤں کا پورا دباؤ ڈال دیا تھا۔ گاڑی کے پہیوں کی گردش رک گئی مگر گاڑی اپنے زور میں گھسٹتی ہوئی بڑھتی گئی۔ ٹائر کھردری زمین پر رگڑ کھا کر گھوم گئے اور گاڑی خود بخود نوّے درجے کے زاویے پر مڑ گئی۔ اتنی زیادہ رفتار پر اچانک بریک لگنے سے یہی ہوتا ہے۔ ڈرائیور پہلے سے تیار ہو اور ہوشیار ہو تو گاڑی کو گھوم جانے کے باوجود سنبھال لیتا ہے۔ ہموار سطح والی سڑک پر گاڑیاں اس حد تک بھی گھوم جاتی ہیں کہ ان کا رُخ پلٹ جاتا ہے۔ اور سطح حد سے زیادہ چکنی ہو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ گاڑی اُلٹ سکتی ہے یا کئی قلابازیاں کھا سکتی ہے۔

یہاں میری توقع کے مطابق ناہموار کنکروں کی نیم پختہ سڑک پر گاڑی نے تھوڑا سا ٹرن لیا تو میں نے بریک پر سے پاؤں ہٹا لیا اور گاڑی پھر آگے بڑھی۔ گیٹ کے اندر مجھے ایک نیم دائرہ سا نظر آیا۔ پہلے گیٹ سے شروع ہونے والا راستہ پورٹیکو سے نکلتا ہوا دوسرے گیٹ تک جا رہا تھا اور یہ نصف دائرہ کوٹھی کی چوڑائی تک پھیلا ہوا تھا۔ میں پورچ کے نیچے سے دوسرے گیٹ پر پہنچ کے میں نے گاڑی روک لی مگر انجن بند نہیں کیا۔ میرے حواس اب اس شکاری سے زیادہ بیدار تھے جو اندھیرے سنسان جنگل میں کسی مچان پر بیٹھا شیر کے قریب آنے کی ساری علامات نوٹ کر رہا ہو۔ میں نے اس یقین پر جوا کھیلا تھا کہ میرا پیچھا کرنے والوں نے مجھے کوٹھی کے گیٹ میں غائب ہوتے نہیں دیکھا ہو گا اور وہ سڑک کو اچانک خالی پا کے حیران بھی ہوئے ہوں گے اور پریشان بھی کہ زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ احتیاطاً میں نے گاڑی کی لائٹس بھی آف کر دی تھیں اور گاڑی کا سُرخ رنگ رات کی سیاہی کا جزو بن گیا تھا۔ فاکس ویگن کے انجن نے کوٹھی کے اندر رہنے والوں کو اپنی آمد کی اطلاع اپنی آواز سے دے دی تھی لیکن ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ پورچ کی لائٹ آن ہو گئی تھی۔ میں آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ چند سیکنڈ کے انتظار کا یہ وقفہ بہت مختصر ہونے کے باوجود انتہائی اعصاب شکن ثابت ہوا۔ جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا، اس میں میری کامیابی کا انحصار میرے اندازے کی درستگی پر تھا۔ ایک سیکنڈ کے فرق سے بھی میرا نشانہ خطا ہو سکتا تھا۔ میں ایک پاؤں سے کلچ دبائے اور دوسرا پاؤں ایکسیلیٹر پر رکھے اسی طرح بیٹھا تھا جیسے شکاری بندوق کے ٹرائیگر پر انگلی رکھے نشانہ لیے شکار کے اس جگہ تک پہنچنے کا انتظار کرتا ہے جہاں اس پر چلائی جانے والی گولی کا ہلاکت آفریں اثر یقینی ہو اور زیادہ سے زیادہ ہو۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے اس کار کی آواز کو بہت قریب سے سنا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سے پہلے والے گیٹ کے سامنے کا کچھ حصہ روشن ہوا۔ پھر میں نے کار کو پہلے گیٹ کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ پہلے اور دوسرے گیٹ کا درمیانی فاصلہ مشکل سے تیس گز تھا۔ میرے دماغ کے کمپیوٹر نے از خود مجھے اطلاع دی کہ دوسرے گیٹ کے سامنے سے وہ گاڑی کتنی دیر بعد گزرے گی۔

بالکل ٹھیک وقت پر اسی خودکار ذہنی نظام سے مجھے گرین سگنل ملا اور میں نے اللہ کا نام لے کر کلچ پر سے پیر ہٹا لیا۔ ایکسیلیٹر پر دباؤ پڑتے ہی گاڑی اندھیرے میں سے یوں باہر نکلی جیسے گھات میں بیٹھا ہوا خونخوار درندہ اپنے شکار کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر جھپٹتا ہے۔ عین اس وقت جب وہ کار دوسرے گیٹ کے سامنے تھی، فاکس ویگن نے پوری قوت کے ساتھ اس کی سائڈ میں ٹکر ماری۔ آگے فاکس ویگن کا انجن نہیں تھا۔ خالی ڈکی اور اس سے آگے بہت مضبوط بمپر تھا۔ بمپر دوسری کار کے اگلے دروازے پر لگا تو ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اس تصادم کے لیے تیار تھا، چنانچہ میں نے سر اور سینے کو بچانے کی کوشش میں اسٹیئرنگ پر دونوں کہنیاں ٹکا دی تھیں اور کچھ جھک گیا تھا۔ پھر بھی تصادم کی قوت نے مجھے سیٹ سے اچھال دیا اور میں چھت سے ٹکرا کے پھر نیچے آیا۔ میرے کانوں نے شیشہ ٹوٹنے اور دھات کی چادر کے

چیخنے کی آواز سُنی اور اپنے ہاتھوں پر اور چہرے پر سوئیوں کی سی چبھن محسوس کی۔ یہ شیشے کے ذرات تھے جو اُڑ کر میرے جسم کے مختلف حصّوں پر لگے تھے۔ اگر میں نے آنکھیں مضبوطی سے بند نہ رکھی ہوتیں تو یہ ننّھے میری آنکھوں میں اتر جاتے۔ ان کی نوکیلی تیز دھار آنکھ کے پردے کو چیر دیتی اور میں ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جاتا۔ اب مجھے ماتھے، چہرے اور بازوؤں پر آنے والی گہری خراشوں کی ٹیس کا احساس ہو رہا تھا اور جو خون بہہ کر لبوں تک پہنچا تھا اس کا تلخ ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو نقشہ بدل چکا تھا۔ دوسری گاڑی کو فاکس ویگن نے غیر متوقع طور پر بائیں جانب سے اس قدر اتنی قوت سے ٹکر ماری تھی کہ وہ ...... اُلٹ گئی تھی اور قلابازیاں کھانے کے بعد سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک اور کوٹھی کی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ دیوار بہت زیادہ مضبوط نہیں تھی اس لیے ٹوٹ گئی تھی اور اس کا ملبہ بھی اُلٹی ہوئی گاڑی پر گرا تھا۔

میری اپنی گاڑی کا سامنے کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اس کا بونٹ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور درمیان سے اوپر اُٹھ گیا تھا۔ بمپر ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا اور مڈگارڈ چیتھڑا بن کے لٹک رہے تھے۔ ظاہر ہے ہیڈ لائٹس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ ڈکی کچھ اور دب جاتی تو پیٹرول ٹینک پھٹ جاتا مگر فاکس ویگن میں بمپر کے بالکل پیچھے اور ڈکی میں سب سے آگے اضافی ٹائر رکھا رہتا ہے جس میں ہوا ہوتی ہے۔ اس فاضل ٹائر نے جس میں ہوا کا دباؤ تیس پونڈ فی مربع انچ تھا، دوسرے "نیومیٹک" بمپر کا کام کیا اور شاک کو کم کر دیا۔ اسٹپنی ٹیڑھی ہو گئی مگر پیٹرول ٹینک بچ گیا ورنہ گاڑی میں آگ لگ جانا یقینی تھا۔

تصادم کے پہلے دھماکے کے بعد کئی دھماکے تسلسل سے ہوئے تھے۔ دوسری گاڑی کے ہر بار اُلٹنے سے ایک دھماکا ہوا تھا۔ اس کے دیوار سے ٹکرانے کے بعد ایک دھماکا ہوا تھا اور جب شکستہ دیوار کی اینٹوں نے گاڑی کو سنگسار کیا تھا تو دھماکے ہوئے تھے۔ ان دھماکوں کا شور اور آواز رات کے سنّاٹے میں دور تک گئی تھی اور وہ سب جو اپنے اپنے گھروں کے اندر بستروں میں دبکے ہوئے تھے، کھانے کی میز پر تھے، ٹی وی دیکھ رہے تھے یا ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ گپ لڑا رہے تھے چونک کر باہر آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے آگے اسی کوٹھی کا مکین تھا جس کی حدود میں غیر قانونی طور پر داخل ہو کے میں نے یہ تخریبی کارروائی کی تھی۔ اب میں اس کے گیٹ سے باہر نکل چکا تھا اور پھر سڑک پر تھا۔

میری گاڑی نے روڈ کو بلاک کر رکھا تھا اور میں قریب آنے والوں کی آوازیں سُن رہا تھا۔ ہوش بحال ہوتے ہی میں نے چابی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چابی اپنی جگہ پر موجود تھی اور سوئچ آن تھا۔ ڈائل کے ننھے ننھے سرخ دائرے روشن تھے۔ میں نے چابی گھمائی تو انجن نے اسٹارٹ ہونے میں دیر نہیں لگائی اور دونوں روشن نقطے غائب ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ آئل پریشر نارمل ہے اور ڈائنمو بھی چارجنگ کر رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر خدا کو یاد کر کے اس سے امداد مانگی اور گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھی اور میں نے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی سڑک پر چل پڑی تو میں نے وہی اطمینان کی خوشی محسوس کی جو دشمن کا ایک مضبوط مورچا کسی جانی نقصان کے بغیر سر کر لینے سے کسی کمانڈر کو ہو سکتی ہے۔ گاڑی کا نقصان کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی صرف صورت بگڑی تھی، کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گاڑی کے وہیل آؤٹ ہو جاتے۔ اس کا ایکسل ٹوٹ جاتا یا ٹیڑھا ہو جاتا۔ بال جوائنٹ یا ٹائی راڈ ناکارہ ہو جاتے۔ میں نے ایک بڑا خطرہ مول لیا تھا مگر اس کے دامن میں نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے خطرات پوشیدہ تھے۔ گاڑی کے ٹوٹے پھوٹے مڈگارڈ سے، بمپر کے لٹکتے ہوئے حصے اور دوسرے شکستہ حصوں سے بہت سی عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں مگر گاڑی چل رہی تھی۔

میں نے اپنے پیچھے بہت چیخ و پکار سُنی۔ یہ دونوں طرف کی کوٹھیوں سے نکل آنے والے تھے جو دیکھ رہے تھے کہ تصادم کے بعد ایک گاڑی فرار ہو رہی ہے۔ انھیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ حادثہ کیسے ہوا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ حادثہ نہیں، ایک جنگی اقدام تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کو ٹینک کی طرح استعمال کرتے ہوئے غنیم کی قوت پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے ختم کر دیا تھا۔ اندھیرے میں کوئی بھی گاڑی کا نمبر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں سے کسی نے پتھر بھی پھینکا جو گاڑی کے پچھلے حصے پر لگا اور اتنی خطرناک صورتِ حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ بے بس لوگ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ "شاباش شیر کی بچّی۔" میں نے فاکس ویگن سے کہا اور خود ہی ہنسا۔ مجھے اپنی حالت کا بالکل خیال نہ تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ میں ایک نادیدہ دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا چکا ہوں اور میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کے جو بازی لگائی تھی وہ میں نے جیت لی ہے۔ وہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے، یہ جاننا اتنا اہم نہیں تھا۔ وہ میرے خیر خواہ بہرحال نہیں تھے اور نیک عزائم ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

ایک دھماکا سن کر میں نے گاڑی روکی اور پیچھے دیکھا۔ آواز بہت دور سے آئی تھی لیکن میرے کانوں نے سن لی تھی۔ یہ تباہ ہو جانے والی کار کے پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ جہاں وہ گاڑی اُلٹی تھی وہاں اب ایک الاؤ روشن تھا اور شعلے بھڑک کر رقصِ اجل پیش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں اس گاڑی میں کتنے آدمی تھے، کتنے زخمی ہوئے تھے اور کتنے مر گئے تھے۔ لوگ کسی کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے یا نہیں؟ میں نے سوچا۔ خیال یہی کہتا تھا کہ ان میں سے کوئی نہیں بچا ہوگا۔ اس قسم کے حادثے میں کون سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی فوراً ہلاک نہیں ہوتا تو ڈھانچے میں پھنسا رہ جاتا ہے جسے نکالنے کے لیے اکثر ڈھانچے کو کاٹنا بھی پڑتا ہے۔ مدد کے لیے آنے والوں کو اتنا وقت ہی کہاں ملا تھا کہ وہ کسی زخمی کو نکال سکتے۔ پٹرول ٹینک پھٹنے کا اندیشہ سب کو اپنی حفاظت پر مجبور کرتا ہے اور کسی کو قریب جانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کوئی جوشِ جذبات میں بہت آگے بڑھ گیا ہوگا تو اسے قضا نے ہی مجبور کیا ہوگا۔

میں نے پھر گاڑی آگے بڑھائی۔ معلوم نہیں یہ نئے شکاری تھے یا پرانے اور کیا چاہتے تھے؟ آدمی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارا کھیل تو تقدیر کا ہے۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی یا ملک دشمن عناصر کے آلۂ کار تھے تو ان کو اس مشن سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس کام کا معاوضہ لیتے وقت انھوں نے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ سوچا ہوگا کہ یہ کون سا مشکل کام ہے اور کام کے مقابلے میں معاوضے کی رقم ان کو اتنی بڑی محسوس ہوئی ہوگی کہ وہ موت کو بھول کر مستقبل کے منصوبے بنانے لگے ہوں گے جو دولت کے بغیر ہوائی قلعے تھے۔ اب وہ اپنے منصوبوں اور ان کی تکمیل کے خوابوں، امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ راکھ ہو رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کاغذ کے نوٹ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، ان کے کاغذی خیالوں کے محل ان کے وجود کے ساتھ جل کر فنا ہو رہے تھے۔

اب تک میں سیدھا چلتا جا رہا تھا اور ذہنی انتشار کی کیفیت میں یہ بھولا ہوا تھا کہ میں سڑک پر ہوں۔ نہ جانے کتنی گزر جانے والی گاڑیوں نے فاکس ویگن کے شکستہ ڈھانچے کو دیکھا ہوگا اور کیا سمجھا ہوگا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جائے واردات پر جمع ہونے والوں میں سے کوئی اپنی کار نکال کر میرے تعاقب میں روانہ ہو سکتا ہے اور کسی دشواری کے بغیر مجھے پکڑ بھی سکتا ہے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ فوراً اس گاڑی سے نجات حاصل کر لوں۔ یہ رابعہ کی اصل گاڑی نہیں تھی لیکن کاغذات اس کو یہی ثابت کرتے تھے چنانچہ اس کا رابعہ کی یا ہماری رہائش گاہ کے قرب و جوار میں پایا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اسے پُل پر سے دریائے راوی میں غرق کر دیتا مگر اس حال میں میرا پُل تک پہنچنا ہی ناممکن تھا۔ پھر میں گاڑی کو کہاں چھوڑوں؟ میں نے سوچنا شروع کیا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ تھا جہاں رات کے وقت چھوٹی بڑی سڑکوں پر ایک جیسی ویرانی تھی۔ میں نے ابھی تک اپنے راستے کا تعین نہیں کیا تھا اور صرف یہ کوشش کرتا رہا تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو خطرے کی حدود سے گزر جاؤں۔ اب میں اتنی دور آ چکا تھا کہ تعاقب میں آنے والے مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں سوچے سمجھے بغیر چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر دائیں بائیں چھا لیا تھا اور ماڈل ٹاؤن تک آ گیا تھا۔

پھر میں نے ایک موڑ کو پہچان لیا۔ یہاں سے قصرِ جمشید زیادہ دور نہیں تھا۔ قصر بہت پہلے کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کھنڈر کو چوہدری دلاور اینڈ کمپنی نے بھی استعمال کیا تھا اور جب اس خفیہ اڈے کی پوزیشن مشتبہ ہونے لگی تھی تو وہ اسے آگ لگا کے رہی سہی کسر پوری کر گئے تھے اور اس کھنڈر کے ملبے کو اپنے ماضی پر نوحہ خواں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا اور مجھے اس وقت وہی ایک ایسی محفوظ جگہ نظر آئی جہاں میں اس کار کے ڈھانچے کو چھوڑ سکتا تھا اور جہاں یہ ڈھانچہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا لیکن بعد میں اپنی تباہی کی داستان سُنا کے چوہدری دلاور تک ہمارا پیغام ضرور پہنچا سکتا تھا کہ انھوں نے ہمارے لیے جو نیا جال پھیلایا تھا ہم اس میں گرفتار نہیں ہو سکے۔

قصرِ جمشید رات کے اندھیرے میں ایک پُرآسیب گوشہ لگتا تھا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کی ویرانی میں قبرستان کا سکوت تھا اور موت کی ہولناکی سایہ فگن تھی۔ ایک بار پھر میرے دل کو دنیا کی بے ثباتی کے خیال نے درسِ عبرت دیا۔ اجاڑ باغ کے ایک گوشے میں قصرِ جمشید کے معمار اور مالک نواب خسرو جمشید کا ڈھانچہ اب تک موجود تھا اور شاید ان کی روح اپنی آنکھوں سے عہدِ رفتہ کی شان و شوکت۔ تزئین و آرائش اور حسن و زیبائش کے وہ گم شدہ آثار تلاش کرتی تھی جو دولت پر غرور کی دنیاوی علامت کا طرۂ امتیاز تھے۔ شاید وہ جھونپڑیاں اب بھی آباد تھیں جن میں اس قصرِ عالیشان کے دربان، غلام اور فراش رہتے تھے مگر محل اور محل والے افسانۂ فردا بن گئے تھے۔

گاڑی کو میں گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ پر سے گزارتا ہوا پچھلے حصّے میں لے گیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس کے بغیر یہاں تک پہنچ جانا ہی تائیدِ ایزدی کی علامت تھا، ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں کسی دوسرے حادثے کا شکار ہو جاتا یا پکڑ لیا جاتا۔ گاڑی کی اور میری حالت دیکھ کر گشت کرنے والی پولیس میرے پیچھے لگ جاتی۔ میں ان سے بچ کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اونچے نیچے ناہموار راستے پر گاڑی بہت شور کرنے لگی تھی اور جھٹکوں سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں زخمی ہی نہیں اندرونی چوٹوں سے بھی خستہ حال ہوں اور میرا پورا وجود درد کا درماں مانگتا ہے۔ گاڑی کو روکنے کے بعد میں بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر، شانے اور ٹانگوں کے پٹھے اکڑ گئے تھے تاہم زمین پر کھڑا ہونے کے بعد میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہڈیاں سلامت تھیں۔ میں نے کوشش سے بازو گھمائے اور اوپر نیچے کیے۔ ٹانگوں

...ت دی اور چند قدم چلا۔ میری پیشانی پر، مُنہ پر اور ہاتھوں پر گہری ...توں سے نکلنے والا خون جم چکا تھا۔ حرکت سے یہ زخم کھنچنے لگے۔ تھوڑا سا گھوم پھر کے میں نے کھنڈر کے ایک حصّے کو منتخب ...س کی ایک دیوار اندر کی جانب گر جانے سے کھلا راستہ بن گیا ...یں نے فرش پر بکھری ہوئی اینٹوں کو اس طرح ہٹایا کہ گاڑی کے ...پہیّوں کے لیے گزرگاہ بن جائے۔ اس میں مجھے جزوی کامیابی ...میرے لیے سارے ملبے کو صاف کرنا عملاً ناممکن تھا اور ...ی کا اندر پہنچنا اب بھی دشوار نظر آتا تھا لیکن میں اس وقت ...ہ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھا اور ...ے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا پیچھے لے گیا۔ اندھیرے میں وہ صاف ...ستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا جو میں نے دو پہیّوں کے لیے بنایا تھا۔ ...ں نے اپنی ڈرائیونگ کی صلاحیت سے زیادہ خدا کی مدد پر بھروسا ...یا اور گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا اپنے اندازے کے مطابق سیدھا ...ے گیا۔

میرا اندازہ بہت زیادہ غلط نہیں ہوا۔ گاڑی اچھلتی جھٹکے ...تی اس ملبے پر چڑھ گئی اور آدھی سے زیادہ کمرے کی تین دیواروں ...یں داخل ہو گئی۔ میں نے گاڑی کے فرش کے نیچے زبردست رگڑ ...سنی اور گاڑی کئی بار اوپر اُٹھ کے نیچے گری۔ اینٹوں کے ڈھیر نے درمیان ...ے گاڑی کے فرش کو اُدھیڑ دیا تھا اور دونوں جانب کے مڈگارڈ ...باہ کر دیے تھے۔ میں نے ایک آخری کوشش کی اور گاڑی کو فرسٹ ...گیئر میں رکھتے ہوئے ریس دی۔ گاڑی آخری بار اُٹھی اور کسی ملبے ...ے ڈھیر کو عبور کر کے اتری تو سامنے والی دیوار سے ٹکرا گئی۔ میرا دل ...ذرا سی دیر کے لیے دہل گیا۔ اگر تصادم کی قوت زیادہ ہوتی تو دیوار ...بھر بھرا کر گرتی۔ پھر بے سہارا چھت نیچے آتی جو اب تین دیواروں پر ...ٹکی ہوئی تھی۔ دو دیواریں اس کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھیں۔ پھر وہ ...دیواریں بھی چھت کے ساتھ زمین بوس ہو جاتیں اور میں اسی ...فاکس ویگن کے تابوت میں دفن ہو جاتا۔

باہر نکل کے میں نے بہت سی گھاس پھوس اور خشک ...لکڑیاں جمع کر کے گاڑی میں ڈالیں۔ کوڑے کرکٹ میں کاغذ و ...ے ٹکڑے بھی تھے۔ دیاسلائی دکھاتے ہی کاغذ نے اور پھر گھاس ...نے آگ پکڑ لی۔ میں اس ملبے سے دُور ہوتا گیا اور آگ کو پھیلتے دیکھتا ...ا۔ فضا میں اب چمڑے کے جلنے کی بُو بھی شامل ہو گئی تھی جس ...کا مطلب یہ تھا کہ آگ نے سیٹوں کو جلانا شروع کر دیا ہے۔ میں ...اندھیرے کی پناہ میں دروازے کی طرف چلنے لگا۔ ایک محفوظ ...فاصلے پر رک کر میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر میرے کانوں ...نے پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا وہ دھماکا سُنا جو سب کچھ تباہ ...کر دیتا تھا۔ آگ کا بگولا سا اُٹھا مگر اس کے ساتھ ہی عجیب سی

گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اور میں سمجھ گیا کہ دھماکے نے باقی تین دیواروں کو اور چھت کو گرا دیا ہے۔ فضا میں گرد کا طوفان سا اُٹھا۔ ایک چھت کے گرتے ہی اس کے اوپر قائم دیواریں بے سہارا ہو گئیں۔ اوپر کی منزل کا ایک پورا حصّہ مسمار ہو گیا اور آگ کا شعلہ غائب ہو گیا۔ فاکس ویگن ملبے کے ایک بہت بڑے پہاڑ کے نیچے دفن ہو چکی تھی اور اس بات کا فوری طور پر کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اس کو اپنے مدفن سے کھود نکالے گا۔ رابعہ کی سرخ فاکس ویگن کا یہ دوسرا جنم بھی تمام ہو چکا تھا۔

جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے آس پاس کے کچھ لوگوں کو باہر نکل کے باتیں کرتے سُنا۔ وہ شور سن کر یہ سمجھے تھے کہ زلزلہ آ گیا ہے لیکن انھوں نے دیکھا کہ ایک پُرانا کھنڈر گر گیا ہے تو وہ مطمئن ہو کے اپنے اپنے محفوظ گھروں کی خواب گاہوں میں لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر پیدل چلتا گیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک سائیکل سوار نمودار ہوا۔ وہ رات کو گشت کرنے والا چوکیدار تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ رُک گیا۔

"مجھے ایک گاڑی والا ٹکر مار کے بھاگ گیا بھائی۔" میں نے کہا: "خدا کے لیے مجھے کسی اسپتال تک پہنچا دو۔"

"اسپتال تک تو میں نہیں جا سکتا بابو۔" وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری اسی علاقے میں گشت کی ڈیوٹی ہے۔ کتنی دُور جانا ہے تم کو؟"

"باغبان پورہ سے آ گئے۔" میں نے مسکین صورت بنا کے اور کراہتے ہوئے کہا۔

"باغبان پورہ سے آ گئے؟ اس وقت؟" چوکیدار حیران ہو کے بولا۔ "اتنی دور جانے کے لیے تو سواری بھی ملنا مشکل ہے۔ تم کیا پیدل چل پڑے تھے؟"

"نہیں چاچا... سائیکل لے کر نکلا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا بھی بیڑا غرق کر دیا کم بخت نے... اوپر سے کار گزار دی۔"

"چلو مٹی ڈالو سائیکل پر... شکر کرو جان بچی۔" وہ ہمدردی سے بولا۔ "تم نے نمبر نوٹ کیا تھا؟"

"نمبر کیسے نوٹ کرتا چاچا... ٹکر لگی تو میں ادھر جا کے گرا... دس گز دُور..." میں نے کہا۔ "ہوش میں آنے سے پہلے تو وہ گاڑی لے کر بھاگ گیا۔ سائیکل کا چورا کر دیا... کباڑیا تول کر لے گا تو لے گا۔"

"پھر وہی سائیکل... او میاں اگر سائیکل بچ جاتی اور گاڑی تیرے اوپر سے گزر جاتی پھر کیا ہوتا۔ کباڑیا تجھے تول کر بھی نہ لیتا۔ عجیب ناشکرا آدمی ہے۔" چوکیدار خفا ہو گیا۔ "آخر آفت کیا تھی اس وقت نکلنے کی۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"چاچا جی فوت ہو گئے ہیں... ان کے گھر جا رہا تھا... ابھی ڈیوٹی سے آیا تو ماں نے بتایا۔" میں نے رونے کی اداکاری کی۔

"اتنی رات کو ڈیوٹی سے آیا تھا؟" چوکیدار نے اپنی جرح جاری رکھی۔

"ہاں... سینما میں گیٹ کیپر ہوں... آخری شو ختم ہوتا ہے تو چھٹی ہوتی ہے۔" میں نے کہا اور ہائے بلند کی۔ ادھیڑ عمر چوکیدار شاید رات کے وقت مشکوک حالت میں گھومنے والوں سے اسی طرح پوچھ گچھ کرتا تھا۔ میں اس علاقے میں اجنبی بھی تھا اور میری حالت یقیناً شکوک پیدا کرتی تھی تاہم میری اداکاری نے اسے میری مظلومیت کا قائل کر لیا اور وہ میری مدد پر تل گیا۔

"بیٹھ سکتا ہے ادھر سائیکل پہ...؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔" بڑی مہربانی ہوگی۔ باغبانپورے لے..."

"میں باغبانپورے نہیں جا سکتا... میں تجھے ایک اور جگہ لے چلتا ہوں...!" وہ بولا۔ "رب نے چاہا تو تیرا کام ہو جائے گا۔"

اپنی پرانی چرخ چوں کرتی سائیکل پر وہ میرے بوجھ کو گھسیٹ کر تقریباً آدھے میل تک لے گیا اور پھر ایک کوٹھی کے عقبی حصے میں سرونٹ کوارٹر تک لے گیا۔ مجھے اپنی سائیکل پکڑوا کے اور فرار نہ ہونے کی تاکید کر کے اس نے دیوار پھاندی جو مشکل سے تین فٹ اونچی تھی۔ میں نے اس کو ایک کوارٹر کے دروازے پر دستک دیتے سُنا۔ کوارٹر کے روشندان میں لائٹ نے کسی کے بیدار ہونے کی خبر دی۔ میں سوچتا رہا کہ چاچا کو چاچی کے فوت ہونے کی کہانی سُنا کے اور اس کے ساتھ یہاں تک آ کے میں نے اپنا وقت تو ضائع نہیں کیا۔ لیکن مجھے کوئی نہ کوئی کہانی تو سنانا ہی تھی اور پھر اس جھوٹ کو نباہنا بھی تھا، ورنہ میری حالت تو ایسی ہو رہی تھی جیسے میں جوئے کے اڈے سے ہار کے اور مار کھا کے یا دنگے فساد میں بہادری کے جوہر دکھا کے آ رہا تھا۔ چوکیدار کے مذاکرات نتیجہ خیز رہے اور وہ پانچ منٹ میں پھر دیوار پر نمودار ہوا۔

"لے بھئی تیرا کام بن گیا... یہ بھانجا ہے اپنا... تجھے چھوڑ آئے گا جہاں تو کہے گا۔" وہ بولا۔ "تو اسی جگہ انتظار کر... میں جاتا ہوں گشت پہ..."

میں دس منٹ تک وہیں کھڑا بھانجے کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب میری تشویش بھی مایوسی میں ڈھلنے لگی تھی، ایک کونے کی جانب سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پھر اس کے سُموں کے سڑک پر بجنے کی آواز آئی۔ وہ کارنر پلاٹ پر بنی ہوئی کوٹھی تھی جس کا ایک دروازہ بڑی سڑک کی طرف میرے سامنے تھا تو دوسرا کہیں سائڈ روڈ کی جانب۔ تانگا ادھر سے ہی نمودار ہوا جسے کوچبان چلاتا ہوا لا رہا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی نکیل تھام رکھی تھی اور خود آگے آگے چل رہا تھا۔ اس آدھی رات کی ناوقت ڈیوٹی سے گھوڑے اور اس کے آقا دونوں کو یقیناً بیگار میں پکڑے جانے کا احساس تھا اور وہ دونوں ابھی تک سوئے ہوئے لگتے تھے تاہم گھوڑا اپنے مالک کا اور مالک اپنے ماموں کا فرمانبردار تھا۔

"معاف کرنا بھائی... تمھیں میں ہرگز تکلیف نہ دیتا... وہ تو تمھارے ماموں نے مجبور کر دیا...!" میں نے کہا۔

"تم کو کیا مجبور کر دیا؟" تانگے والا بولا۔ "مجبور تو ہم کو کر دیا لیکن کیا کروں... ایک ہی ماما ہے... دو ہوتے تو اس وقت جگانے پر ایک کو گولی مار دیتا... سارا دن کے بعد رات کو بھی آرام نہ ملے تو بندے کی زندگی پر لعنت...!"

"اللہ تو تمھیں اس کا اجر دے گا ہی۔" میں نے تانگے میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ "میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔" میں نے جیب میں سے سو کا ایک نوٹ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ تانگے کے لیمپ کی مدھم روشنی میں اُس نے یقین کیا کہ نوٹ جعلی نہیں ہے اور پلک جھپکتے میں اس کی بیزاری اور خفگی کافور ہو گئی۔ اس نے نوٹ کو چوم کر جیب میں اُڑسا اور اپنا چابک لہرا کے گھوڑے کو رسید کیا... "چل اوئے نامراد... بحر الکاہل..." اس نے زور سے کہا۔ گھوڑے کے لیے یہ سلوک بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ ہنہنایا، اچھلا اور ہوا ہو گیا۔ سو کے نوٹ نے تانگے والے کی بشاشت میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔

"میرا ماما آپ کا کیا لگتا ہے جی؟" وہ بولا۔ "کیا یار ہے وہ آپ کا...؟"

"ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کی مدد کرتا ہے تو وہ یار ہی سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے ایک فلسفیانہ جواب دیا۔

"شریف آدمی...؟" بھانجے نے طنز سے کہا۔ "اس کے کرتوت تو میری ماں سے پوچھتے... مر گئی بیچاری... تمام عمر وہ جوڑتی رہی اور یہ لے جاتا رہا۔ ایک مراثن کو دیتا رہا جو اس کو لارے دیتی رہی اور بھاگ گئی ایک کباڑیے کے ساتھ۔ اس نے کباڑیے کو تلاش کیا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ تین سال جیل میں کاٹے... پھر ایک بھنگن پہ مر مٹا..."

سو روپے کی آسامی لانے والے ماموں کو بھی نافرمان بھانجا رسوا کرنے پر تلا ہوا تھا حالانکہ وہ ماما جی کی لائف اسٹوری سے یہ اقتباسات پیش نہ کرتا تو میں اس کا زیادہ شکرگزار ہوتا کیونکہ میں سکون سے سوچنا چاہتا تھا مگر سفر ختم ہونے تک بھانجے نے میرا دل بہلانے کا شغل جاری رکھا یعنی اپنی بکواس جاری رکھی۔ ماما جی کی رنگین جوانی میں مراثن اور بھنگن کے ناکام رومانس کے

بعد بھی کئی پردہ نشینوں کے نام آئے جو میں نے نہیں سُنے۔ "اب چور بنے ہیں چوکیدار..." وہ بولا۔

"بس مجھے اسی جگہ اُتار دو۔" میں نے کہا۔ "کسی دن ماما جی ملے تو اُن سے میں تمھاری بابت ضرور پوچھوں گا۔ تم بھی مجھے فرشتے نہیں لگتے۔ جیسے میں خود ایک گنہگار آدمی ہوں ویسے ہی سب ہیں۔ کیا ماما کیا بھانجا... کیا راجہ کیا پرجا...!"

تانگے والا میری علمیت اور میری درویشانہ گفتگو سے دم بخود رہ گیا۔ دل میں وہ شرمندہ ضرور ہوگا کیونکہ اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر تانگا موڑا۔ گھوڑے کو بلاوجہ گالی دی اور چابک رسید کیا اور فرار ہو گیا۔ میں اُس وقت تک کھڑا رہا جب تک تانگے کے سائڈ لیمپ میری نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ پھر میں پیدل چلتا ہوا گلی کے نکڑ تک گیا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ بند دروازے پر رُک کر میں نے چند سیکنڈ توقف کیا۔ دروازے کے پیچھے روشنی تھی اور وہ لوگ جاگ رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے رات کے تین گھنٹے بجنے کی آواز آئی۔ اسے رات نہیں صبح ہی کہا جا سکتا تھا۔ میں سارا دن اور تقریباً رات بھر غائب رہا تھا۔ شام کے بعد بھی وہ رات نو دس بجے تک انتظار کرتے رہے ہوں گے مگر اس کے بعد تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے اور اب یقیناً پریشان ہوں گے۔ میرے دستک دیتے ہی اندر کھلبلی مچی... "کون ہے؟" محسن نے کہا اور میں نے درز میں سے جھانک کر دیکھا۔ تو وہ ریوالور لیے کھڑا ہوا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے بلکہ اس کی پناہ لیے کھڑی تھی اور ان دونوں کے سوا کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

"پولیس...!" میں نے بارعب اور بھاری آواز بنا کے کہا۔ "خبردار جو کسی نے فرار ہونے کی کوشش کی... تم محصور ہو گئے ہو۔" میں نے پھر درز میں سے اندر جھانکا۔ شہلا کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے محسن کے کان میں سرگوشی میں کچھ کہا۔ محسن کا اطمینان دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ اس نے شہلا کے بازو پر تھپکی دی اور اسے حوصلہ رکھنے کو کہا۔ اسی وقت خواجہ نیک محمد نمودار ہوئے جو غالباً دوسرے کمرے میں یا دروازے کے باہر دفاعی مورچا سنبھالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی۔ "دروازہ کھولتے ہو یا ہم توڑ دیں؟" میں نے دوبارہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے لات ماری... معلوم نہیں میری آواز میں فرق پڑ گیا تھا یا محسن پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ یہ حرکت میری ہے۔ بچپن سے اب تک کی رفاقت اور دن رات کے ساتھ نے ہمیں ایک دوسرے کی اتنی پہچان کرا دی تھی کہ اب ہم ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نہ چہرہ بدل کے فریب دے سکتے تھے اور نہ آواز بدل کے... اگر میں یہ کہوں کہ بند دروازے کے پیچھے سے بھی اس نے میری خوشبو سونگھ لی تھی تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔

"آپ دروازہ توڑ دیں۔" محسن نے کہا۔ "بلکہ سر مار کے دیوار توڑ دیں... ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

"اچھا بھئی ہم پولیس نہیں ہیں... ایک بھوکے پیاسے... زخموں سے لہولہان یتیم اور لاوارث شخص ہیں... لاوارث اور یتیم ہیں۔"

"نہ یہ یتیم خانہ ہے نہ اسپتال اور نہ قبرستان۔" محسن نے کہا۔ "یہاں شرفاء رہتے ہیں۔"

"شرفاء کی اولاد... جہاں سب یتیم رہتے ہیں وہ یتیم خانہ نہیں تو کیا ہے۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"اس دلیل نے ہمیں قائل کیا۔" محسن بولا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازے سے لگا کھڑا تھا اور اتنی دیر میں اصل صورتِ حال سب پر واضح ہو چکی تھی چنانچہ شہلا مسکرا رہی تھی اور استاد ٹیڈی کی بتیسی دکھائی دے رہی تھی لیکن مجھے دیکھتے ہی اُن کی ساری شوخی کافور ہو گئی۔

"بھائی جان... یہ کیا ہوا ہے آپ کو؟" شہلا چلائی۔

"سکندر بادشاہ... قسم مولا علی کی... ایک بار بتا دو تمھارا کس سے جھگڑا ہوا ہے؟" استاد ٹیڈی نے عادت کے مطابق اپنی ہانکی اور مجھے اس کی دو منٹ پہلے کی حالت کا تصور کر کے ہنسی آگئی۔

"آخر یہ کیا حرکت ہے؟" محسن بولا۔ "بظاہر تو شدید مجروح اور قریب المرگ ہے مگر پھر بھی دانت نکال رہا ہے۔"

"آرام سے بیٹھ جاؤ ساتھیو...!" میں نے چارپائی پر بیٹھ کے کہا۔ "کلیجہ تھام لو پہلے سنو پھر داستان میری۔"

"بھاڑ میں گئی داستان۔" شہلا لپک کر میرے پاس آئی۔ "پہلے کپڑے بدلیے... میں گرم پانی لاتی ہوں... زخم صاف کر کے دوا لگا دوں پھر آپ لیٹ جائیں۔"

"لیٹ جائیں گے... ہم لیٹ آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کی وجہ بھی تو بتا دیں۔" مگر شہلا نے میری ایک نہیں سُنی... محسن اور ٹیڈی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میری چوٹیں اور خراشیں معمولی ہیں ورنہ میں اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ ہو سکتا اور اس طرح بات بھی نہ کرتا۔ یہ صرف میں جانتا تھا کہ تھکن اور جسم کی چوٹوں کے درد... بھوک اور ایک خونریز معرکے نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر کتنا بے حال کر دیا تھا لیکن میں دروازے سے پہلا اندر قدم رکھتے ہی گر پڑتا تو وہ سب بدحواس ہو جاتے۔ میں نے سخت جدوجہد کر کے اپنی بشاشت کو برقرار رکھا تھا اور انھیں اطمینان

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دلانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شہلا نے وہ کام کیا جو صرف ایک عورت کرسکتی ہے۔ اس نے میری باتوں کو اور وضاحتوں کو غیر اہم سمجھتے ہوئے پہلے میرے آرام اور علاج کی طرف فوری توجہ دی۔ اس نے مجھے زبردستی پلنگ پر لٹا دیا اور مجھے لیٹتے ہی اتنا سکون ملا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور راحت کا احساس میری رگ رگ میں سکون بن کے اترنے لگا۔

دس منٹ میں شہلا پانی گرم کرلائی... اس نے ایک صاف کپڑا بھگو کے میرے جسم کی خراشوں پر جم جانے والے خون کو صاف کیا۔ درد کی ٹیسیں پھر اٹھیں اور گرم پانی زخم پر تیزاب کی طرح لگا مگر مجھے اس تکلیف میں بھی مسرت کا احساس ہوا۔ یہ خیال آیا کہ موت سے متصادم ہونے کے باوجود میں اس وقت زندہ ہوں اور اپنوں میں ہوں۔ باہر کی دنیا کے خطرات سے محفوظ ہوں اور اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب ہوں۔ شہلا کے ہاتھوں میں بہن کا پیار تھا اور ماں کی ممتا تھی۔ یہ وہ ہاتھ تھے جو دوا کے ساتھ دعا بھی دیتے تھے اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعا قبولیت کا شرف پا کے لوٹتی تھی تو پیغام شفا دیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی ٹکور سے میرے وجود کا درد و کرب مٹ رہا تھا اور درد کھینچ کر نکلتا جا رہا تھا۔ وہ ایک نرس تھی... ڈاکٹر تھی اور ایک کمزور لڑکی ہونے کے باوجود اعجازِ مسیحائی کی ناقابلِ فہم قوت رکھتی تھی۔ اس نے میرے کپڑے بھی خود ہی بدلے اور اس کام کو ایک مقدس فرض کی طرح سرانجام دیا۔ یکلخت اس نے صورتِ حال کی سب ذمے داری قبول کرلی تھی۔ سب کی کمان سنبھال لی تھی اور اب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے شوہر سمیت سب اس کے حکم کے تابع ہو چکے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں وہ زخم صاف کرکے خشک کر چکی تھی اور جہاں ضروری تھا وہاں اینٹی سیپٹک پاؤڈر چھڑک چکی تھی یا مرہم لگا چکی تھی۔ اس کے حکم پر ہی محسن نے دودھ گرم کیا تھا اور گلاس بھر لایا تھا... پھر ڈانٹ کھا کے وہ دودھ میں گلوکوز ملانے گیا اور تیسری مرتبہ سر کھجاتا ہوا گیا تو اسپرین کی گولیاں لے کر آیا۔ پھر شہلا نے مجھے سہارا دے کر اٹھانے کے احکامات جاری کیے اور ٹیڈی آگے بڑھا ہی تھا کہ میں اٹھ بیٹھا۔

"بہت ہو چکا میرا پوسٹ مارٹم..." میں نے کہا... "میں ہٹا کٹا ہوں۔"

"اور بہت بڑا الّو کا پٹھا ہوں... یہ بھی فرمائیے۔" محسن نے کہا۔ "قسم خدا کی اتنی خدمت اس نے کبھی میری نہیں کی... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ تم دونوں کی بہن زیادہ ہوگی... میری بیوی تو پارٹ ٹائم رہے گی۔"

"بس... ہوگیا جل کے کوئلہ۔" میں نے کہا "کل میں تیرا ایسا ہی حال کردوں گا... فکر مت کر۔"

"چلیں بھائی جان، یہ گولیاں کھا کے دودھ پئیں اور سو جائیں۔" شہلا نے تنک کر کہا۔

"اور اگر میں یہ حکم نہ مانوں...؟" میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

"تو میں... میں رو پڑوں گی۔" شہلا نے عاجز آکے کہا۔

"ویری گڈ! بالکل مت ماننا اس کی بات سکندر..." محسن بولا۔ "کل کو یہ بات بات پر مجھے بھی رونے کی دھمکی دے گی۔"

استاد ٹیڈی نے ریوالور نکال کے میری کنپٹی پر رکھ دیا۔ "میں دس تک گنوں گا۔ اس وقت تک دودھ ختم ہو جانا چاہیے۔"

"اور کچھ بچ گیا تو..." میں نے فوراً گولیاں منہ میں ڈال کر دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"تو میں گیارہ سے آگے گنتی شروع کردوں گا۔" ٹیڈی نے ریوالور جیب میں رکھ کے کہا۔ میرے ساتھ شہلا بھی ہنس پڑی مگر اس نے دودھ ختم کرنے کے بعد بھی مجھے بولنے نہیں دیا... محسن اور ٹیڈی بھی میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات جاننے کے لیے اتنے ہی بے چین تھے جتنے میں بتانے کے لیے تھا مگر شہلا کے آگے کسی کی نہیں چلی۔

"باتیں صبح بھی ہو جائیں گی... آپ فوراً سو جائیں۔" وہ بولی۔

"نیک دل خاتون... اگر آپ غور فرمائیں تو آپ دیکھ سکتی ہیں کہ صبح ہو رہی ہے۔" میں نے کہا "رات گزر رہی تو ور کا تڑکا ہوا۔ ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا۔"

"بس اب چپ..." شہلا نے کہا۔ "چلو جی تم دونوں اُدھر یا پھر خاموشی سے یہاں لمبے ہو جاؤ۔"

"یہ شادی سے پہلے کتنی مسکین بنتی تھی... ہٹلر کی بچی..." محسن نے زمین پر لیٹنے کی تیاری کی۔ "اصل روپ اب سامنے آیا ہے۔"

"ایک سوال کی اجازت دو بی بی۔" میں نے کہا۔ "وہ قیدی کس حال میں ہے؟"

"اسے ہم نے زندہ رکھا ہے۔ وہ ابھی نہیں مرے گا۔" شہلا نے کہا اور وہیں دوسری جانب دراز ہوگئی۔ استاد ٹیڈی نے خاموشی سے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ آرام دہ بستر، گرم دودھ اور اسپرین نے میرے تھکے ہوئے ٹوٹے ہوئے اور شکستہ حال جسم کو اتنا آرام پہنچایا تھا کہ نیند سے میری آنکھیں خود ہی بند ہونے لگی تھیں۔ شہلا کے حکم نے میری ذہنی مزاحمت بھی ختم کردی ورنہ شاید میں جاگتا رہتا۔ چند منٹ میں مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔

میری آنکھ کھلی تو دن کی روشنی میں سب سے پہلے میں نے

شہلا کو دیکھا۔ شاید وہ اسی وقت میرے قریب آکے کھڑی ہوئی تھی۔ میری حالت بہت بہتر تھی۔ جسم کا درد تقریباً ختم ہو چکا تھا اور ذہنی طور پر میں بالکل مستعد تھا۔

"کیسی طبیعت ہے بھائی جان؟" شہلا نے مسکرا کے کہا۔

"میری ننھی سی بہن، تیرے ہوتے ہوئے مجھے کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ تیرا میاں نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ غالب بھائی کے ساتھ گئے ہیں... نئے گھر کو ٹھیک کرنے۔" شہلا شرما کے بولی۔

"اچھا؟ تو ہم سب یہاں کیوں بیٹھے ہیں... بلکہ پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم بھی چلتے ہیں۔"

"ہم... ہم چلیں گے! پہلے آپ ناشتا تو کرلیں۔ وقت تو دوپہر کے کھانے کا بھی گزر چکا ہے۔" شہلا بولی۔

"کیا بجا ہے؟" میں نے گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے تین... تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے کئی وقت کا ناشتا کرنا ہے۔"

"تم تو پورا اصطبل بیچ کے سو گئے تھے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے نمودار ہو کے کہا۔

"اچھا ہوا اس اصطبل میں تم نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اس صحافت کے بحرِ ظلمات کے گھوڑے کا کیا بنا؟"

"وہ پھر بچ گیا میرے ہاتھوں قتل ہونے سے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "قسم مولا علی کی، اس کے اخبار میں اسی کے سوئم کا اشتہار آ جاتا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری شکل ہرگز شہلا کا بھائی بننے کے لائق نہیں۔"

"پھر کس لائق ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"کہتا تھا کہ تم ڈریکولا کے بھائی بن سکتے ہو۔" ٹیڈی نے سادگی سے کہا۔ "وہ خود ڈریکولا کی اولاد..."

"میرا مطلب تھا کہ اس کی اخبار کے ایڈیٹر سے جو جنگ ہوئی تھی اس کا انجام کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"وہ نورا کشتی تھی۔" ٹیڈی نے حقارت سے کہا۔ "اگلے دن پھر دونوں عاشق معشوق بنے ہوئے تھے۔ غالب نے اس کو سائیں بابر والے کے اڈے پر دھماکے کی رپورٹ دی اور فوٹوگرافر کو ساتھ لے گیا۔ اس خبر نے تہلکہ مچا دیا۔"

"غالب نے اصل واقعات اور حالات کی طرف تو اشارہ نہیں کیا؟" میں نے تشویش سے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ تو نہیں لکھ مارا کہ وہاں جو عورت کریاں والی بنی ہوئی تھی وہ کون تھی اور کیا کرتی تھی۔ کرنل جگن ناتھ۔ سیوک یا سادھو رام کا حوالہ تو نہیں دیدیا؟"

"یار سکندر بادشاہ! یہ غالب کمینہ ضرور ہے مگر بیوقوف

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے، جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۸ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو پاکیزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کالی کہانیاں
جرائم، جادو، شیطان ازم، ارواح، طنز و مزاح، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۳۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے۔
قیمت جلد اول ۴۰ جلد دوم ۴۰
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"وہ کمینہ بھی نہیں ہے استاد۔" میں نے کہا۔" اس کمینی دنیا میں ہمارا واسطہ جن کمینوں سے پڑ رہا ہے ان کے مقابلے میں وہ ہیرا ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ وہ ایسا ہی دل رکھتا ہے جو خلوص کی ایک نظر سے پگھل جاتا ہے مگر تم جانتے ہو فطرت کے اعتبار سے وہ کتنا سخت جان ہے۔ گولی کیا توپ کا گولا اس سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے۔"

"معلوم نہیں سکندر بادشاہ! کبھی کبھی تم عجیب باتیں کرنے لگتے ہو جو اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔" ٹیڈی نے مایوسی سے کہا۔

"خبر تو دوسرے اخبارات نے بھی دی ہو گی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ خبر کہاں چھپائی جا سکتی تھی۔" ٹیڈی بولا۔" سب نے ہی اپنے اپنے نمائندوں کی معرفت موصول ہونے والی خبر کو شائع کیا تھا۔ حقیقت کسی کو نہیں معلوم۔ کسی نے اُسے پُراسرار دھما کا قرار دیا ہے تو کسی نے صرف ایک بم کا دھماکا۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ وہاں ڈاکوؤں کا ٹھکانہ تھا۔ دوسرے نے لکھا ہے کہ وہاں غیر قانونی طور پر آتش بازی کا سامان تیار ہوتا تھا۔ ایک نے حد کر دی۔ اس نے انکشاف کیا ہے کہ وقوعہ کی شب وہاں جوا ہو رہا تھا اور جوا کھیلنے والوں میں سے ایک شخص اپنا سب کچھ ہار جانے کے بعد دستی بم پھینک کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ بم اس کے گھر پر تھا اور وہ ہارنے کے بعد مشتعل ہو کے گھر سے لایا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ باقی سب نوسرباز ہیں۔ میرا خیال ہے سکندر بادشاہ کہ جان بوجھ کر اصل بات کو چھپایا گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے استاد کہ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔" ان اخبار نویسوں کو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس والوں نے قریب کہاں پھٹکنے دیا ہو گا۔ انھیں وہاں سے اسلحے کی موجودگی کے یقینی سراغ ملے ہوں گے۔ اصل بات عام ہو جاتی تو تفتیش مشکل ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے پولیس یا ملٹری کے ذرائع نے خود ہی پریس کی بریفنگ کی ہو اور انھیں مطمئن کر کے ٹال دیا ہو یا پھر دشمن کے ایجنٹوں نے یہ افواہیں پھیلائی ہوں۔ وہ بھی اسی علاقے میں موجود اور مصروفِ عمل ہوں گے۔ یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ اس تباہی کے پیچھے کسی کا ہاتھ تھا یا محض حادثے کے باعث ان کا ذخیرہ تباہ ہوا۔ ملٹری کی انٹیلی جنس کو تو سب معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہاں کس قسم کا اور کتنا اسلحہ تھا۔ انھیں ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے بھی ملے ہوں گے۔ اب یہ ایک سیاسی معاملہ بھی بن چکا ہے اور اس کی تحقیقات بہت اعلیٰ سطح پر ہو گی۔ مفادِ عامہ میں نہ سمجھا گیا تو کسی کو حقیقت کی تشہیر نہیں ہونے دی جائے گی۔"

"پھر بھی وہ لوگ تو خبردار ہو گئے ہوں گے سکندر بادشاہ جو یہ کام کرتے تھے۔"

"ہاں! وہ اپنے ٹھکانے بدل دیں گے۔" میں نے کہا۔" لوگ بہر حال وہی رہیں گے۔ وہ اس کاروبار سے تائب نہیں ہو جائیں گے مگر اس حادثے یا واردات کے بعد وہ نئی حکمتِ عملی وضع کریں گے۔ بلکہ نئے افراد کا انتخاب کریں گے اور ہو سکتا ہے پرانے راستوں کو چھوڑ دیں۔ وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ کسی کی مخبری کا نتیجہ تو نہیں تھا اور اگر کسی نے مخبری کی تھی تو وہ کون تھا۔ وہ غدّار اپنے درمیان کسی غدّار کو تلاش کریں گے۔"

"کیا ان کا ذہن ہماری طرف نہیں جائے گا؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ضرور جائے گا... لیکن ہم اس ڈر سے اپنا کام تو نہیں روک سکتے۔" میں نے کہا۔" ایم آر ایس کا مشن تو ختم نہیں ہو سکتا... جب تک کہ ہمارے اور ملک کے دشمنوں کا پتا چلا کے ان کے ایک ایک ٹھکانے کو... سب ساتھیوں کو اور تمام وسائل کو بالکل ختم نہ کر دیا جائے۔ ہم نے ابھی تک کوشش کی ہے کہ یہ جنگ زیرِ زمین رہے لیکن کھلی جنگ کی نوبت آ گئی، تب بھی جنگ تو بہر حال جاری رہے گی۔"

"جنگ... جنگ... جب دیکھو جنگ۔" شہلا نے ناشتے کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہا۔" تم لوگ ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کر سکتے... مل کر بیٹھو گے تو آپس میں لڑنے لگو گے۔ خواجہ صاحب اور غالب کی ٹھنی رہے گی۔ سکندرِ اعظم اور محسن خان لڑتے رہیں گے۔"

میں نے قہقہہ مارا۔" چار دن ہوئے ہیں اس لڑکی کو گھر والی بنے ہمیں کیسے ڈانٹ رہی ہے جیسے ہم بچے ہیں۔"

"جب تک آدمی خود گھر والا نہ ہو بچہ ہی رہتا ہے۔ ابھی کوئی ذمے داری کا بار نہیں ہے سر پر۔ اس لیے شتر بے مہار بنے پھرتے ہو۔" شہلا نے ہمیں مزید ڈانٹا۔" محسن کو تو میں سیدھا کر دوں گی۔"

"وہ بے چارا تو پہلے ہی کتے کی دُم سے زیادہ سیدھا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔" اوپر سے مل گئی ہے تم جیسی بیوی جو جلیبی سے زیادہ سیدھی ہے۔ رب نے ملائی جوڑی..."

استاد ٹیڈی نے سر کھجایا۔" یار سکندر بادشاہ... کیا زمانہ آ گیا ہے۔ نئی دُلہنیں کیسی بے شرمی سے مُنہ پھاڑ کر اپنے گھر والے کا نام لیتی ہیں۔ ایمان سے ہماری اماں تو کہتی تھیں۔ اجی سنیے۔ یا نیک محمد کے ابا... حوالہ دینا ہوا تو یوں کہ اُن کو بتاؤں گی... یا وہ آئیں گے تو پوچھوں گی... نام لینے سے تو کہتے ہیں کہ نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔"

"اور اوپر سے دھونس دیکھو۔ کہ میاں کو سیدھا کر دوں گی... ...ونکہ وہ سرتاج ہوتا ہے اور خداوندِ مجازی کا عہدہ رکھتا ہے۔" ...ہنے کہا۔" مگر میاں نیک محمد زمانہ اُلٹا آ گیا ہے اور یہ سب قربِ ...ت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے جورُو کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا ...ب جورُو کے غلام ان کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ شوہر زن مرید ...ہو تو بیوی کر سکتی ہے ایسا دعویٰ۔" میں نے ایک ٹھنڈی ...انس بھری۔

"قسم مولا علی کی! ہم تو زبان کھینچ لیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ ...ہی لیے تو اب تک کنوارے پھر رہے ہیں کہ لڑکیوں کی زبان تو ...ے گز بھر کی۔ گھونگھٹ کیا سر پہ دوپٹا تک نہیں۔" شہلا ایکدم ...ہنس پڑی۔

"شہلا بی بی۔" میں نے ناشتے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔" کیا تم ...بھی اپنے میاں کو نظر بند کر دو گی کہ خبردار جو گندے بچوں کو مُنہ لگایا ...ور آوارہ گردی کی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ چراغ جلے گھر واپس نہ آئے ...زماق کر دوں گی... وغیرہ وغیرہ..."

ہنستے ہنستے شہلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" یہ سب تو ...رنا ہی پڑے گا... اگر اس نے تمہارا ساتھ نہ دیا... شادی میں نے ...س لیے نہیں کی ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ جائے اور تمہاری جگہ اسے ...یرا خیال رکھنے کی فکر ہو جائے۔"

"تم کو اپنے سہاگ کو داؤ پر لگاتے ڈر نہیں لگتا؟" میں ...ے کہا۔

"میں نے تو اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا رکھا ہے۔" وہ بولی۔ ...اور میری زندگی کیا ہے؟ تم سب کی زندگی... مجھے معلوم ہے کہ ...ین کی حفاظت مجھ سے بہتر طور پر تم کر سکتے ہو۔ یہاں رشتے اہم ...نہیں کہ کون کس کا شوہر ہے اور کس کا بھائی ہے۔ وہ اتحاد زیادہ ...ہم ہے جس کی بنیاد پر یہ رشتے قائم ہیں۔ کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو ...یں تمھیں کہیں بھی مقابلے کے لیے اکیلا جانے دوں گی کہ میرے ...شوہر کو تو چھوڑ جاؤ... یا خود محسن میرے منع کرنے سے تمہارا ...ساتھ چھوڑ دے گا... ہم اگر اتنے کمینے اور خود غرض ہوتے تو اجنبی ...ہونے کے باوجود ایک خاندان نہ بناتے۔ میں دعوے سے کہہ ...سکتی ہوں کہ ہمارا خاندان اور خاندانوں سے زیادہ مضبوط ہے جو ...ن اور خونی رشتوں کے باعث اپنا وجود برقرار رکھنے پر مجبور ہیں۔"

شہلا کی باتیں میرے جذباتی رشتوں کی تقویت کا سامان ...فراہم کر رہی تھیں تو اس کا تیار کیا ہوا ناشتا مجھے جسمانی قوت دے ...رہا تھا۔ یہ نہ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا نہ رات کے کھانے ...کا جتنا اہتمام ... ملازار اور سگھڑ خاتونِ خانہ ہونے کا ثبوت

دیتے ہوئے سینڈوچ بنائے تھے اور کافی تیار کی تھی۔ دونوں چیزوں کا اہتمام اس نے میری بھوک کا اندازہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ پھر بھی میں سب صاف کر گیا۔ وہ مسلسل مجھے تمیز سے کھانے اور آہستہ آہستہ کھانے کی تاکید کرتی رہی مگر میں نے ندیدوں کی طرح کم سے کم وقت میں سب کچھ پیٹ کے اندر پہنچانے کی کوشش کی اور پھر نہایت بدتمیزی سے اور مانگا۔ شہلا نے کہا کہ اب رات کو کھانا ملے گا۔ اس وقت تک صبر کرو۔ مجھے معلوم تھا وہ یہی کہے گی۔

میرے جسم کا درد برائے نام رہ گیا تھا اور خراشوں کی حالت بھی بہت بہتر تھی۔ میں اُٹھ کر دوسرے کمرے میں سادھو رام کو دیکھنے کے لیے گیا۔ بے شک وہ زندہ تھا لیکن اس کی حالت ابتر تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا اور برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ اُسے ہم نے بستر پر مُنہ باندھ کے ڈال رکھا تھا اور اس طرح پڑے رہنے سے وہ مفلوج ہو رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگائی اور ایک کش لیا تو وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سگریٹ پیو گے سادھو مہاراج؟" میں نے کہا اور اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے سگریٹ اس کے لبوں کی طرف بڑھائی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں کپڑا تھا۔ میں نے کپڑا نکالا تو اس کے ہونٹ سگریٹ کو گرفت میں لینے کے لیے ہلے۔ میں نے ایک بار سگریٹ آگے تک لے جا کے پیچھے ہٹا لی... اطمینان سے ایک اور کش لیا اور وِلن کے انداز میں دھواں اُس کے مُنہ پر چھوڑا۔ وہ کچھ نہیں بولا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ دوسری بار بھی میں نے یہی حرکت کی لیکن تیسری مرتبہ جلتی ہوئی سگریٹ میں نے اچانک اس کی گردن پر لگا دی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا مُنہ دبا لیا۔ وہ تڑپا مگر اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میرے ہاتھ نے سگریٹ کو اس کی جلد پر دبائے رکھا یہاں تک کہ سگریٹ بجھ گئی اور اس کی کھال میں ایک گہرا بدنما گڑھا نمودار ہو گیا۔ گوشت کے جلنے کی بُو جو چکن تکّوں اور کبابوں سے اُٹھتی ہے تو بڑی اشتہا انگیز لگتی ہے۔ انسانی جسم سے اُٹھے تو کراہیت، ظلم اور بربریت کا احساس ہوتا ہے مگر اس وقت یہ بُو میرے اعصاب پر گراں نہیں گزری۔ اس نے میرے جذبۂ انتقام کو ایک وحشیانہ مسرت عطا کی۔ جو شخص میرے سامنے تھا، وہ میرا بدترین دشمن تھا۔ اگر وہ میرے باپ کا قاتل ہوتا تب بھی میں اس کے خلاف اتنے شدید نفرت کے جذبات میں مبتلا نہ ہوتا۔ میں اسے قانون کے حوالے کر دیتا یا خود انصاف کرتا تو اسے کم سے کم اذیت کے ساتھ موت کے حوالے کر دیتا مگر یہ میرے وطن کا دشمن تھا اور اس کے لیے سزائے موت بہت کم تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ عذاب کے ساتھ ہلاک کر کے بھی مجھے احساس رہتا کہ اس کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جرم کی مناسبت سے بہت کم سزا ملی۔ اس نے جتنا اسلحہ دشمنوں تک پہنچایا تھا اس سے کتنے بے گناہ مارے گئے تھے۔ ملکی معیشت کو کتنا نقصان پہنچا تھا۔ دشمنوں کے ہاتھ کتنے مضبوط ہوئے تھے اور ملک کی سالمیت کو لاحق خطرات میں کتنا اضافہ ہوا تھا۔ اس سب کا اندازہ کرنا ناممکن تھا۔

جب میں نے سادھو رام کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو وہ تقریباً بے ہوش تھا اور آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ "آخر... تم مجھے کب تک اس حال میں رکھو گے...؟" وہ کراہ کے بولا۔

"یہ تو ہم بھی نہیں جانتے اور اگر جانتے تو تمھیں پھر بھی نہ بتاتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری پوری کوشش ہوگی کہ تمھارے لیے موت سے زیادہ کربناک موت کا انتظار ہو۔ ابھی سے کیوں پریشان ہو... موت ابھی تم سے بہت دُور ہے۔ بس اس کی آرزو کرتے رہو اور دیکھتے رہو کہ موت کتنے بھیانک سوپ میں ایک ایک انچ، ایک ایک سُوت تمھاری طرف بڑھ رہی ہے۔ تمھارے وجود کا رُواں رُواں مقروض ہے سادھو رام... یہ لہو ہے تمھاری دولت کے عوض اپنی جان نذر کرنے والے معصوم بچوں کا۔ بوڑھوں کا اور عورتوں کا جو تمھارے جیسے لالچی شیطانوں کی لعنت بھری سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ لہو ہے ان اصولوں کا اور نظریات کا جن کی بقا کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے رشتے جانثار دیں۔ آبا و اجداد کے ترکے۔ ان کی یادگاریں اور ماضی کے ورثے سب قربان کر دیے تھے اور یہ لہو ہے ان کے اعتماد کا اور یقین کا جس پر وطن کی مٹی ناز کرتی تھی مگر جس میں تم جیسے مارِ آستیں بھی چھپے بیٹھے تھے جنھوں نے سب کو دھوکا دیا۔ تمھارا رُواں رُواں اس لہو کا قرض ادا کرے گا سادھو رام... تمھارے جسم کا ریشہ ریشہ اپنی موت مرے گا۔ تمھارے ناپاک خون کا ہر قطرہ تمھارے وجود کے ناسور سے پیپ بن کے ٹپکے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے تمھارے ہاتھ مر جائیں جو طلبِ زر میں خونی قاتلوں کے سامنے پھیلائے گئے تھے۔ پھر تمھارے پیر مریں گے جو تم کو غدّاری اور وطن فروشی کے راستے پر لے گئے۔ پھر تمھاری آنکھیں مر جائیں گی جو ایک طرف زر و جواہر کے انبار سے حاصل ہونے والی دنیاوی خوشیوں کے خواب دیکھتی تھیں تو دوسری طرف اس ملک کی تباہی و بربادی کا نظارہ کرتی تھیں جسے تم نے کبھی صدقِ دل سے ایک علیحدہ نظریاتی مملکت تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ پھر تمھارے کان مر جائیں گے تم دلربا اور رنگین ناتھ جیسے سوداگروں کے سکّوں کی کھنک تو سنتے تھے جو شرافت اور انسانیت کا ضمیر خریدتے پھرتے تھے مگر خود اپنے ضمیر کی آواز سننے سے قاصر تھے۔ پھر تمھارا دماغ مرے گا جو اصل مجرم ہے۔ جس نے تمھیں سادھو سے شیطان بنا دیا۔ تمھاری موت کی تو فلم بننا چاہیے، سلو موشن میں۔ ان کیمروں سے جو کلی کو کھل کر پھول بنتا اور ایک پتّی کو کھلتا دکھا دیتے ہیں حالانکہ یہ اتنا سست رفتار عمل ہوتا ہے کہ آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ پھر تمھاری موت کے ہر لمحے کی یہ تصویرِ عبرت تم جیسے ہر غدارِ وطن کو سزائے موت سنانے سے پہلے دکھانا چاہیے۔"

سادھو رام آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ وہ اتنا بے بس تھا کہ ہم سے رحم کی التجا تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چیخنا چلّانا بھی بے کار ہے کیونکہ ہم اس کی ایک نہیں سنیں گے اور وہی کریں گے جو ہم پہلے سے طے کر چکے ہیں۔ پہلے اگر اس کے دل میں اُمید کی کوئی کرن ہوگی کہ شاید اس کا کوئی نجات دہندہ اسے اغوا کرنے والوں کا سراغ لگا لے اور اس کو چھڑا کر لے جائے تو اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ اُمید بھی دم توڑ چکی ہوگی۔ ہمارے اطمینان اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی شکست کو پوری طرح قبول کر چکا تھا۔ استاد ٹیڈی میرے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اور میری گفتگو سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

"ہم نے تمھیں ایک پیش کش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس پر غور کرنے کے لیے تمھیں کافی وقت ملا ہے۔ تم کسی نہ کسی نتیجے پر اب ضرور پہنچ گئے ہو گے؟"

"میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ بولا اور اس کی آنکھوں سے کرب کے آنسو بہنے لگے۔

"تم بتانا نہیں چاہتے تو سمجھ لو کہ تمھارے لیے اپنی مرضی پر کاربند رہنا کل کے بعد ممکن نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر واقعی تم کچھ نہیں بتا سکتے، کیونکہ تمھیں کچھ معلوم ہی نہیں تو تمھاری وفات سے قبل تمھارے دماغ کے ہر پُرزے کو کھول کر ہم خود دیکھ لیں گے۔"

"ابھی تو ہم نے تفتیش شروع ہی نہیں کی۔ تم نے ایم آر ایس کا تھانہ نہیں دیکھا۔" استاد ٹیڈی بولا۔

"تب تک یہ زخم تمھیں یاد دلاتا رہے گا کہ کل تک انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے کپڑا پھر اُس کے مُنہ میں ٹھونسا اور واپس ہو گیا۔

شہلا دوسرے کمرے میں تنہا کھڑی تھی اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ غالباً اس نے میری کارروائی دیکھی تھی اور سادھو رام کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی سُنی تھی۔ مزاج کے اعتبار سے شہلا بالکل مختلف تھی۔ نہ وہ رابعہ کی طرح مضبوط قوتِ ارادی کی مالک اور حوصلہ مند تھی اور نہ اس کو نازو کی طرح خطرات سے کھیلنے کی عادت تھی۔ [illegible] ہمارے ساتھ

زور گزارا تھا جس میں ہمارے ساتھ اس نے معرکہ آرائی میں شرکت کی تھی اور زندگی کی رزم گاہ میں ہمارے ساتھ موت کو نبرد آزما دیکھا تھا لیکن اس کے بعد بیشتر وقت اس نے انکل شیروانی کے گھر کی محفوظ چار دیواری میں گزارا تھا۔ وہ عام قسم کی لڑکی تھی جو اتنے دُکھ اٹھا چکی تھی کہ اس کے اعصاب مزید صدمات برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے کمزور اور بزدل ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پہلے کی طرح اب اس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے لیے جینا نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسے محسن کے لیے جینا ہے اور شاید اس کی آنکھیں مستقبل کو دیکھتی تھیں تو اسے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ اسے اپنے بچّے کی ماں بن کے بھی بہت ساری ذمّے داریاں پوری کرنی ہیں۔

"تم ڈر رہی ہو شہلا بی بی۔" میں نے ہنس کر اس کے سر کے بالوں کو چھیڑا۔

"مجھے اس آدمی سے ڈر لگتا ہے بھائی جان۔" وہ بولی۔

"وہ ایک مجبور اور بے بس قیدی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ گھر ہے، قید خانہ نہیں۔" شہلا نے کہا۔ "اور معلوم نہیں کیوں مجھے اس کا وجود ایک منحوس علامت کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی نے گھر کو آسیب زدہ کر دیا ہے۔ یہ احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

"چلو آج کا دن تھا... وہ بھی گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "شام ہو گئی ہے۔ رات تک تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گی اور وہ صرف تمھارا گھر ہوگا... قید خانہ نہیں۔"

"یہ نحوست زدہ شکل والا تو وہاں نہیں جائے گا نا؟" شہلا نے کہا۔

"ہرگز نہیں جائے گا... تم دوبارہ یہ شکل نہیں دیکھو گی..." میں نے کہا۔

محسن اور غالب دس منٹ بعد آئے تو بڑی عجلت میں تھے کیونکہ غالب کو ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ انھوں نے تمام اسباب سمیٹا اور ایک ریڑھے میں ڈال کر لے گئے۔ استاد ٹیڈی کا خزانہ دیکھنے میں سب سے نامعقول چیز لگتا تھا اور اس پرانے زنگ خوردہ صندوق کو دیکھنے والا کبھی اس کی اصل مالیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ وزن اس لکڑی کے بکس کا تھا جس میں بارہ ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ وقت کی سوئیوں کے ساتھ موت کا پیغام پہنچانے والے اور زندگی کے سفر کی آخری ساعتوں کو لمحہ لمحہ شمار کرنے والے۔ ابھی وہ چابی کے کھلونے سے زیادہ بے ضرر تھے مگر چابی دینے کے بعد ان کی ہلاکت خیزی وقت کا دوسرا نام بن جاتی تھی اور وہ وقت ایک منٹ سے بارہ گھنٹے کے درمیان کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جب تمام سامان اور اسلحہ وغیرہ رکھا جا چکا تو ریڑھے کے ساتھ محسن روانہ ہوا۔ میں شہلا اور غالب تانگے میں پیچھے رہے اور تانگے ریڑھے کی باہمی چپقلش شروع ہوئی تو دونوں کے پائلٹ مقابلے پر اتر آئے۔ انھوں نے سڑکوں پر اندھا دھند گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے جیسے لاہور نہیں، بحرِ ظلمات ہے۔ جن کو اپنی جان عزیز تھی وہ بر وقت راستہ دیتے گئے۔ لاہور کے رہنے والے اس قسم کے مقابلوں کے عادی ہیں اور زندہ دلی کا یہ عکس صرف تانگوں کی دوڑ تک محدود نہیں۔ میں نے بسنت پر سابقہ منٹو پارک اور اب اقبال پارک میں بڑے پتنگ بازی کے مقابلے دیکھے تھے جن میں محمود و ایاز یکساں جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے اور کاروں کی قطاریں دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا تھا کہ یہاں پتنگ بازی کا مقابلہ نہیں، سرکاری پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ پھر میں نے پتنگ بازوں کو ہزاروں کی شرطیں ہارتے اور پتنگ کے ساتھ سو سو کے نوٹ لگا کر اڑاتے دیکھا تھا اور اس قسم کے مقابلوں میں پبلک پتنگ بازوں کا اتنے ہی اشتیاق سے ساتھ دیتی تھی جتنے شوق سے اپنے حلقے کے سیاسی امیدواروں کا۔

ریڑھے اور تانگے کی دوڑ میں پہلے ریڑھا آگے رہا۔ پھر تانگا آگے نکل گیا اور تانگے بان نے گزرتے گزرتے مُنہ پر ہاتھ رکھ کے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور حلق سے عجیب سی آواز نکالی جو اپنے حریف کو غیرت سے ڈوب مرنے کا سگنل تھا۔ ریڑھے والے نے جواب دینے کے بجائے گھوڑے کو ایک دلچسپ گالی سے نوازا اور اس پر کوڑے برسانے لگا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے چند منٹ میں ریڑھا آگے نکل گیا اور اب ریڑھے کے ڈرائیور نے حلق سے وہی صدا بلند کی اور اپنا رُخ تانگے والے کی طرف رکھتے ہوئے جوابی کارروائی کے طور پر قہقہہ مارا۔ "بس اوئے... پھوک نکل گئی۔ اوئے ایس ٹٹّو نوں کباڑی کول لے جا... چھوٹے مل جان گے۔"

اب تانگے والے کی غیرت جاگی۔ اس نے اپنے گھوڑے پر ندامت کا غصّہ اتارا۔ "حرامخور... تینوں تے اج بجلی لاواں گا۔" اس نے گھوڑے کو چابک رسید کیے اور اسے بجلی بھی لگائی جو ایک نہایت غیر شریفانہ اور نامعقول حرکت تھی مگر نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ ریڑھا ابھی دس گز آگے ہی تھا لیکن اس فاصلے کو کم کرتے کرتے پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر ایکدم گھوڑا آگے نکل گیا۔ تانگے والے کا جوشِ انتقام اُبل پڑا۔ اس نے مُنہ پر ہاتھ رکھ کے بڑھک ماری۔

"بس اوئے... ٹٹّو دے پتر..." اس نے ریڑھے والے کی طرف دیکھا اور ہانک لگائی۔ "اوئے ہُن تے معاف کر دے اپنے پیو نوں... جوان مرد بن تے آپ ایدی جگہ لے لے۔" یہ بہت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اشتعال انگیز بات تھی کہ ریڑھے والے کو اس کے گھوڑے کی ضعیفی کا طعنہ دیا جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ وہ ضعیف جانور اس کا باپ ہے جس کے ساتھ وہ نہایت ناروا سلوک کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ خود ریڑھا کھینچے اور گھوڑے کو اپنی جگہ بٹھا دے۔ اس کے بعد بہت سخت مقابلہ ہوا جس میں ایسا وقت بھی آیا جب دونوں گھوڑے ایک رفتار سے جان کی بازی لگاتے رہے (مسافروں کی جان کی بازی) اور ریڑھا تانگا بہت کم چوڑی سڑک پر متوازی دوڑتے رہے۔ ایک بار دونوں کی باڈی مس ہوئی اور شہلا کا خوف سے بُرا حال ہو گیا۔ اس کو یقین تھا کہ دونوں کے پہیے ٹکرا کے نکل جائیں گے اور ایک ایک پہیے پر دوڑنے والے تانگے ریڑھے کے معزز مسافر بچارے اور ان کا اسباب سڑک پر یوں بکھر جائیں گے جیسے منتشر ہو جانے والے جلسے میں پبلک کے جوتے ٹوپیاں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ایک طرف سے محسن اور دوسری طرف سے مرزا غالب دونوں کوچبانوں کو شہہ دے رہے تھے اور مقابلے میں شدت پیدا کرنے کے لیے آگے نکل جانے پر شاباش کا ہلڑ مچاتے تھے تو ہارنے پر غیرت کو للکارنے لگتے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اس ریس میں دخل در معقولات کی واجبی سی کوشش کی اور پھر چھلانگ مار کے اپنی جان بچائی۔ وہ بھی لاہوریا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس وقت قانون کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہے فتح ہے یا شکست ہے۔

بالآخر میں نے مجبور ہو کے تانگے والے سے کہا "بھائی… خدا کے واسطے ہماری خطا معاف کرو۔"

تانگے والا بھونچکا رہ گیا "کیوں شہنشاہو… کی ہویا جے؟"

"ہوا تو کچھ نہیں مگر ہو جائے گا۔ یہ لڑکی بیمار ہے۔ حادثہ ہوا، پھر تو سب ہی اللہ کو پیارے ہوں گے مگر یہ اس سے پہلے ہی مر جائے گی۔" میں نے کہا "میں مان لیتا ہوں کہ تم ریس جیت گئے۔"

تانگے والے کا دل ٹوٹ گیا۔ اسے ہم سے ایسے حوصلہ شکن رویّے کی امید نہیں تھی۔ اس وقت وہ آگے نکل چکا تھا اور اس کے عزائم بلند تھے۔ ہمارے مجبور کرنے پر اس نے گھوڑے کو بریک لگائے اور پلک جھپکتے میں ریڑھا آگے نکل گیا۔ ریڑھے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ تانگے والا مقابلے سے دستبردار ہو گیا ہے اور ریڑھے کو واک اوور مل گیا ہے۔

"ہا… اوئے مک گیا تیرا ٹٹو۔" ریڑھے والے نے حلق سے قلقاریاں ماریں اور بہت ہاؤ ہو کی "ایس نے کی مقابلہ کرنا سی میرے شیر تُر دا۔"

تانگے والے کا خفت سے بُرا حال ہو گیا "اوئے گھوڑا تے میرا وی شیر تُر ہے… پر کی کراں… سواریاں…"

جو بات اس نے ہمارے بارے میں کہی وہ ہمارے لیے باعثِ شرم تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے پر الزام نہیں آنے دیا اور صاف کہہ دیا کہ گھوڑا تو کبھی نہ ہارتا مگر سواریاں ہی ایسی ملی ہیں۔ اس نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس سے ہم بزدل… بے غیرت… احمق اور نہایت گھٹیا درجے کی مخلوق ثابت ہوتے تھے۔ تاہم اس الزام کو قبول کرنا موت کو قبول کرنے سے بہتر تھا جب دونوں گھوڑے وقت کے معمولی سے فرق کے ساتھ آگے پیچھے رُکے تو دونوں کے ڈرائیور ایک ساتھ اترے اور چائے پینے چلے گئے۔ مقابلہ ختم ہو جانے کے بعد معاملہ بھی ختم اور دل صاف۔ دوستی بحال… یہ وہ چیز تھی جسے انگریزی میں اسپورٹس مین اسپرٹ کہا جاتا ہے۔ وہ دونوں ہم سے ناراض تھے اور چائے پینے کے لیے جانا عدم تعاون کی تحریک تھی جس میں دونوں حریف ایک ساتھ شریک تھے۔ مجبوراً ہم نے اپنا سامان خود ہی اتارا اور گھر کے اندر لے گئے۔

وہ دونوں دس منٹ بعد سگریٹ کے سُوٹے لگاتے ہوئے نمودار ہوئے تو میں نے ان کو سو سو کے نوٹ پیش کیے۔

"یہ تم دونوں کا انعام! مقابلہ زبردست رہا۔" میں نے کہا۔

"او جی مٹی پاؤ مقابلے تے…" تانگے والے نے کہا "اسی کوئی پیسہ لے کے تماشا دکھا رہے سی؟"

"سانوں پورے پیسے چاہیدے نے جناب… اپنا انعام اپنے کول رکھو۔" ریڑھے والے نے بے رُخی سے کہا۔ میں نے شرمندہ ہو کے سر کھجایا اور انھیں پچیس پچیس روپے دے دیے۔ ان کے جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ان کے لیے پیسہ اور انعام غیر اہم تھا۔ مقابلہ تو لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ… کی روایت تھی اور میں نے ان کا لہو ٹھنڈا کر دیا تھا تو اس کی تلافی پیسہ نہیں کر سکتا تھا۔

گھر مزنگ کی ایک گلی میں تھا اور باہر سے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا جتنا اندر سے اچھا تھا۔ اس میں چار کمرے تھے۔ باہر کے بڑے کمرے کو جو ڈیوڑھی سے ملحق تھا ڈرائنگ روم کا نام دیا جا سکتا تھا۔ یہ پرانی طرز کا مکان تھا اور اسے بنانے والوں نے باہر کی طرف مردان خانہ رکھا ہو گا۔ ڈیوڑھی کے بعد مختصر سا دالان آ جاتا تھا جو شاید بیس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ باقی تین کمرے دالان عبور کرنے کے بعد آتے تھے اور نسبتاً چھوٹے تھے۔ تینوں کمروں کے دروازے صحن میں ہی کھلتے تھے۔ ان کے درمیان کی دیواریں ہر کمرے کو بالکل جدا رکھتی تھیں۔ دائیں جانب ایک برآمدہ سا تھا اور بائیں طرف کے حصے میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ باتھ روم کا وہ حصہ جس میں باتھ نہیں کیا جاتا اوپر چھت پر تھا۔ جیسا کہ لاہور کی پرانی آبادی کے ہر گھر کے

باوجود مکان روشن اور نیا بنا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اندرونی حصے میں وسیع پیمانے پر مرمّت کی گئی تھی۔ دیواروں پر سارا پلستر نیا تھا اور رنگ نیا تھا۔ پرانی کھڑکیوں کی جگہ نئی بڑے شیشوں والی کھڑکیاں لگائی گئی تھیں۔ غالباً پلستر جھڑ چکا تھا اور پرانی کھڑکیوں کی لکڑی میں دیمک لگ گئی تھی۔ اب جو کھڑکیاں دروازے لگائے گئے تھے ان کے فریم لوہے کے تھے۔ گھر کی پرانی وائرنگ بھی بدل گئی تھی جو پچاس سال پہلے کی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ باہر سے پرانا نظر آنے والا مکان اندر سے نیا بنا ہوا لگتا تھا۔ نئے پن کے اس تاثر کو نئے انداز کے فرنیچر اور نئی آرائش سے بھی بہت مدد ملی تھی۔ اس نئے گھر میں سب سے زیادہ شہلا خوش تھی۔ بالآخر اسے اپنی منزل اور اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا تھا۔ اس کے لیے تمام سامان اس نے اپنی مرضی کے مطابق خریدا تھا۔ وہ سامان جو انکل شیروانی کی بیگم نے شہلا کو جہیز میں دینے کے لیے جمع کیا تھا ابھی فوزیہ کے گھر میں رکھا تھا۔ بیگم شیروانی کو قدرت نے بہت کم مہلت عطا کی تھی۔ فوزیہ کے لیے انھوں نے تمام عمر جمع کیا تھا مگر اس کی شادی کے بعد جب شہلا ان کے پاس پہنچی تو وقت اتنا نہیں تھا کہ وہ اپنے ارمان نکال سکیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شہلا کی پوزیشن کیا ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا جہاں سے اس کی رخصتی ہوتی۔ اسے انکل شیروانی کے گھر سے رخصت ہو کے اسی گھر میں رہنا تھا۔ وہ ان کی بیٹی بھی تھی اور بہو بھی۔ بیگم شیروانی نے اندازہ کر لیا تھا کہ انھیں شہلا کی شادی ماں بن کے کرنا ہو گی اور پھر اسے بہو بنا کے گھر میں رکھنا ہو گا۔ دوسرے مرحلے کے آنے سے قبل ہی انھیں اجل نے آ لیا مگر پہلے مرحلے کی تیاری میں انھوں نے دیر نہیں کی تھی۔ وہ بہت کچھ بنا گئی تھیں اور جو کسر رہ گئی تھی وہ انکل شیروانی نے یوں پوری کی تھی کہ اپنا سارا بینک بیلنس شہلا کے نام کر دیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ یہ اس کو باپ سے ملنے والی رقم ہے جس سے وہ جہیز کا باقی سامان خود خریدے۔ یہ رقم بہت زیادہ نہیں تھی۔ شہلا کے کہنے کے مطابق تقریباً اسّی ہزار تھی۔ انکل شیروانی ایک وضعدار، خدا ترس اور دیانت دار افسر نہ ہوتے تو یہ رقم اسّی لاکھ ہوتی۔ وہ نقد رقم اتنی نہ چھوڑتے تب بھی پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ایک کوٹھی ضرور چھوڑ جاتے۔ ان کے لاکھوں کے شیئرز مختلف منافع بخش کاروبار میں ہوتے یا محسن ایک فیکٹری کا مالک ضرور ہوتا لیکن انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری کوٹھی خالی کر دی تھی اور بیٹی داماد کے پاس زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ اپنی پرانی گاڑی انھوں نے داماد کو دے دی تھی جو پروفیسر تھا اور اسے صرف فیملی کے ساتھ آنے جانے میں استعمال کر لیتا تھا۔ غالب، نیک محمد اور میں، ہم اس کے نالائق بھائی ثابت

ہوئے تھے جو اس کے لیے کچھ نہ کر پائے تھے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو شرمندگی کا احساس تھا اور اپنی ایک بہن کی خوشیوں کے لیے ہم سب کو بہت کچھ کرنا تھا۔

مرزا غالب نے چلتے چلتے شہلا کے سر پر پیار کیا "تیرے نصیب میں یہی بن مانس لکھا تھا بہنا۔ اللہ کی رضا سمجھ کے اس یتیم لاوارث کو قبول کر لینا اور خوش رہنا۔"

"خواجہ صاحب کے برادرِ ان لا کو بن مانس کہہ کر تم پاگل کتّے کی دُم کھینچ رہے ہو مرزا جی۔" میں نے کہا "وہ ہوتا تو تم کو بھی اللہ کی رضا سمجھ کے بہت کچھ قبول کرنا پڑتا۔ مثلاً ٹوٹی ہوئی ناک۔ سوجے ہوئے جبڑے اور غالب کا سرمہ۔"

"خیر ہم اسے بتا دیں گے۔" محسن نے کہا "سکندر نے بھی اسے پاگل کتا کہا ہے۔ ابھی تم جا ڈرا اپنے پاگل خانے ورنہ وہ ایڈیٹر پھر تمھیں کاٹنے کو دوڑے گا اور تم اسے کاٹو گے۔" شہلا کو بہت ہنسی آ رہی تھی۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی چنانچہ اس کا چہرہ کھِلا جا رہا تھا۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس نے مجھے روک لیا کہ کھانا کھا کے جانا۔ اس وقت کچھ پکانے کا سوال ہی نہ تھا۔ محسن مزنگ چوک تک گیا اور دارالماہی سے تلی ہوئی مچھلی لے آیا۔ میں نے محسن کو گزشتہ دن کے واقعات سنائے جس میں گاڑی کی خریداری سے تباہی تک سب کچھ آ گیا۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا اور شہلا تو کھانا بھول گئی۔ اس کے لیے ایک دن کے یہ واقعات ایک پوری فلم کی اسٹوری سے زیادہ حیران کن اور سنسنی خیز تھے۔

"اگر رابعہ کو فائدہ نہ ہوتا تو میں یقیناً یہ کہتا کہ تو نے سولہ ہزار روپے غارت کر دیے۔" محسن بولا "مگر اس کی ذہنی کیفیت میں اتنی پیش رفت ہوئی ہے تو سولہ ہزار کچھ بھی نہیں۔ تجھے کل بھی سولہ ہزار خرچ کرنے کی اجازت ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس ہفتے کے ختم ہونے تک وہ پرانی رابعہ پھر ہمارے درمیان ہو گی۔" میں نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" محسن نے کہا "لیکن یار وہ کون لوگ تھے جو تیرے پیچھے لگ گئے تھے؟"

"شکاری۔" میں نے مختصراً جواب دیا "اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔"

"یہ تو ویسی ہی بات ہے جو ایک تھانیدار نے چوری کی واردات میں بہت تحقیق و تفتیش کے بعد کہی تھی۔" محسن بولا "کہ واردات میں چوروں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ ارے بابا شکاری تو سب ہیں۔"

"میں اپنے جواب پر قائم ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ شکاری کس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پولیس سے، چوہدری دلاور اینڈ کمپنی سے یا سادھو رام کے ساتھیوں سے۔ یہ کارروائی اندھیرے میں ہوئی تھی اور میں وہاں سے فوراً بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

"تو نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ تیرے پیچھے کہاں سے لگے... کیسے لگے...؟"

"میں صرف ایک چیز دیکھ رہا تھا برادرم۔" میں نے کہا۔ "میں کچھ اور دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے والی کیفیت تھی۔ رابعہ کی تلاش میں میرا تعلق باقی دنیا سے کٹ گیا تھا۔"

محسن نے سر ہلایا اور میری دلیل کو تسلیم کیا۔ "پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے گاڑی کا پتا کیسے چلا لیا؟"

"ایک نظریہ تو یہ ہے کہ اس سیلز مین نے خود استاد پیڈرو کو مطلع کر دیا اور انھوں نے شہر بھر میں اپنے کتے چھوڑ دیے جنھوں نے بالآخر ہمیں ڈھونڈ نکالا۔ اب وہ ہمارے پیچھے اس لیے لگے ہوئے تھے کہ ہمارا موجودہ ٹھکانا دیکھ لیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس شوروم کے سیلز مین کو سچ بولنا پڑا ہو۔ سامنے بندوق کی نال سے موت جھانک رہی ہو تو کوئی بہادر بننے کی بے وقوفی نہیں کرتا لیکن دوسرا نظریہ یہ بھی ہے کہ گاڑی کو وہاں کھڑا کرنے کے بعد اور سیلز مین کو تمام ہدایات دینے کے باوجود استاد پیڈرو نے اپنے انتظامات کو ناکافی سمجھا اور شوروم کے باہر کسی کی ڈیوٹی لگا تا رہا جس کا علم شوروم والوں کو بھی نہ ہو اور وہ شخص دیکھتا رہا کہ مکھی کب مکڑی کے جالے میں آتی ہے۔ یہ ایسا جوا تھا جس میں کامیابی کے امکانات دس فیصد بھی نہیں تھے کیونکہ شہر میں دسیوں شوروم ہیں جہاں سیکڑوں کاریں برائے فروخت کھڑی ہیں۔ یہ استاد پیڈرو کی نہیں چوہدری دلاور کی ذہانت کا کرشمہ تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ وہ سکندرِ اعظم کا گھوڑا، اسے فاکس ویگن پسند ہے اور لال رنگ کی فاکس ویگن تو اس کی جذباتی کمزوری ہوگی۔ جیسے مجنوں کو سگِ لیلیٰ سے بھی پیار تھا۔ ایسے ہی سکندر کوئی پرانی گاڑی تلاش کرنے نکلا تو ممکن ہے اِدھر آجائے اور پھنس جائے اور جناب محسن خان شیروانی... ہم جو کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے عاشق اور احمق ہیں، اس کی توقعات پر پورے اترے اور پھنس گئے۔ اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال اور دلاور کی خوش قسمتی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ ہم پیچھا کرنے والوں کو دلاور کے نمائندے مان لیں۔" محسن بولا۔

"میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اسی کے بھیجے ہوئے شکاری تھے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ پولیس ہوتی تو ہمارے نقشِ قدم... میرا مطلب ہے نقشِ ٹائر پر کیوں چلتی رہتی؟ ہمیں گرفتار نہ کر لیتی۔"

"ہماری عقل مند پولیس بعض اوقات وہ نہیں کرتی جو اُسے کرنا چاہیے۔" محسن بولا

"بعض اوقات! پولیس کبھی وہ نہیں کرتی جو اسے کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "مگر رات کی بات مختلف تھی۔ اگر وہ وطن دشمن ہوتے تو اتنی دیر کبھی نہ لگاتے۔ وہ چند منٹ میں ہم پر بم پھینکتے یا ہمیں مشین گن سے بھونتے ہوئے نکل جاتے۔"

"یار یہ کیا ہے؟" محسن نے اچانک اخبار کا ایک صفحہ میرے سامنے کر دیا جس میں وہ مچھلی لے کر آیا تھا۔ صفحہ تیل سے چکنا ہو رہا تھا اور کچھ پھٹ بھی گیا تھا مگر اس خبر کو پڑھا جا سکتا تھا جس پر محسن نے انگلی رکھی تھی۔ خبر کے ساتھ جو تصویر تھی اسے بھی میں نے فوراً شناخت کر لیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ یہ گزشتہ شام شائع ہونے والا ضمیمہ تھا۔

"یہ تو وہی سیلز مین ہے محسن۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس کا خون کس کے حساب میں لکھا جائے گا؟ ایک طرف میں اسے دھمکی دے آیا تھا تو دوسری طرف وہ تھے جو دھمکی بھی نہیں دیتے تھے لیکن معاف بھی نہیں کرتے تھے۔"

"اس نے یقیناً تیرے متعلق بتانے سے انکار کیا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "اور جھوٹ بولا ہوگا کہ گاڑی کوئی دوسرا شخص لے گیا ہے۔"

"اور ان کے اپنے ذرائع سے یا طاقت کے استعمال سے حقیقت سامنے آگئی ہوگی۔ سیلز مین کو اسی کی سزا ملی۔" میں نے کہا۔ "اب تو کوئی شک کی بات ہی نہیں رہی کہ پیچھا کرنے والے استاد پیڈرو کے آدمی تھے۔"

"آدمی ان میں کوئی نہیں... وہ قاتل ہیں یا غدار ہیں، شیطان ہیں یا ضمیر فروش ہیں اور درندے ہیں۔ خونخوار شکاری درندے مگر آدمی نہیں ہیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ کیسی فضول خبر ہے۔ چند نامعلوم افراد کی کاروں کے شوروم پر فائرنگ۔ ایک شخص ہلاک۔ شوروم کے مالک کا کہنا ہے کہ وہ گاڑی یا اس کا نمبر کچھ نہیں دیکھ سکا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکے کی نیت سے آئے تھے مگر باہر کھڑے ہوئے سیلز مین نے ان کی نیت بھانپ لی اور شور مچایا جس پر وہ فرار ہونے پر مجبور ہو گئے... خوف و ہراس پھیلانے کے لیے انھوں نے گولیاں چلائیں، ان میں ایک سیلز مین کو لگ گئی۔ سب جھوٹ بکواس۔ وہ اطمینان سے آئے ہوں گے اور انھوں نے شوروم کے سیلز مین کو گردن سے دبوچ کر پوچھا ہوگا کہ وہ لال گاڑی کون لے گیا؟ اور اس نے کہا ہوگا کہ نظگمری کے چوہدری شجاعت بخش تو انھوں نے ریوالور سیلز مین کے سر پر رکھ کر ایک گولی چلائی ہوگی جس سے اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا ہوگا۔ پھر وہ مالک کو سچ بیان دینے کی تاکید کر کے چلے گئے ہوں گے۔ مالک نے وہی بیان دیا جو جان بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ نامعلوم افراد تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ وہ کون تھے۔ اس نے انھیں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ ان کی گاڑی اور گاڑی کا نمبر سب اُسے معلوم ہے مگر وہ بول حق کا بول بالا کرے۔ اسے زندہ رہنا ہے۔"

"میں اب چلتا ہوں یار! بہت دیر ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "استاد بڈی اکیلا بیٹھا ہم سب کی جان کو رو رہا ہوگا۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔" محسن نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے سر دبا کے پھر بٹھا دیا۔

"خبردار جو باہر نکلنے کا سوچا۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہاں یا شہلا اکیلی رہے گی؟"

"یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو... ایسے بالکل نہیں چلے گا۔" محسن نے برہمی سے کہا۔ "تم لوگ مجھے سچ مچ کا پالتو شوہر بنا کے گھر میں قید کرنا چاہتے ہو۔ اپنے سے الگ کر رہے ہو۔"

"نہیں۔ جب تمھاری ضرورت ہوگی تو ہم کہیں گے کہ اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آج کی رات تو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ کوئی کام نہیں ہے۔ میں تیرے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر تو شہلا کے جذبات کی قدر کر۔ شب بخیر... صبح کسی وقت ہم دونوں آئیں گے۔" باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور گلی میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مزنگ چوک سے مجھے ایک رکشا ملا جو درحقیقت ایک متحرک جھولا تھا اور آگے تو خیر چلتا ہی تھا مگر دائیں بائیں بھی ڈولتا تھا۔ تمام راستے مجھے اندیشہ رہا کہ اس کا کوئی حصہ یا تمام حصے کسی ایک طرف گر جائیں گے۔ پھر میں سڑک پر بیٹھا رہ جاؤں گا اور رکشا والا اپنی سیٹ پر براجمان اس حصے کے ساتھ نکل جائے گا جس میں دو پہیے اور انجن باقی بچے ہوں گے لیکن اللہ نے فضل کیا اور میں پورے کا پورا منزلِ مقصود تک پہنچا۔ دونوں گھروں کے درمیان چھ سات میل کا فاصلہ تھا مگر میٹر کے حساب سے چودہ میل ثابت ہوا۔ غالباً جھولا جھلانے کے چارجز الگ تھے۔ میں پرانے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ ابھی میں جس گھر کو پیچھے چھوڑ آیا تھا وہ سچ مچ کا گھر تھا۔ جیتا جاگتا... محفوظ... خوشیوں سے معمور اور بارونق... اس گھر میں اب کچھ نہیں رہا تھا جہاں سادھو رام قید تھا۔ سب کے چلے جانے کے بعد یہ واقعی ایم آر ایس کا تھانہ رہ گیا تھا اور ایک عارضی پناہ گاہ۔ دروازے کے سامنے مجھے اپنے لینڈ لارڈ کی ٹیکسی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ "آؤ بھئی سوہنیو۔" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ہم تو آئے تھے کہ پھر کچھ تر مال ملے گا مگر یہاں تو بندہ ہے نہ بشر۔"

"کیوں! ہمارے نیک محمد صاحب کو آپ بندوں میں شمار نہیں کرتے۔" میں نے کہا اور استاد ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خلافِ معمول کچھ اترا ہوا تھا۔

"بندہ تو اُدھر بھی ایک رکھا ہوا ہے تم نے۔" وہ بولا۔ "مگر ایسے... جیسے چوری کا مال ہو... کیا قصّہ ہے جی؟"

"قصّہ بڑا عجیب ہے جناب۔" میں نے سب کے ساتھ فرش پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ بھارتی جاسوس ہے۔"

لینڈ لارڈ ایسے اُچھلا جیسے میں نے پیچھے سے آکر اس کے کان کے پاس پٹاخہ چلا دیا ہو۔ "کو... کون... بھارتی جاسوس... یار، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے... ابھی یہ تمھارا دوست کہتا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اس لیے باندھ کر ڈالا ہوا ہے اور یہ تمھارے ماموں کا پتر ہے... تم کہتے ہو بھارتی جاسوس ہے۔"

"یہ واقعی بھارتی جاسوس ہے۔" میں نے کہا۔ "نیک محمد میری مرضی کے بغیر تم کو اصلیت نہیں بتا سکتا تھا۔"

"یا میرے مولا۔" لینڈ لارڈ نے سر ہلا کے فریاد کی۔ "یہ بھارتی جاسوس کدھر سے آگیا یہاں... اویار، خدا کا کچھ خوف کرو... کیا بھارتی جاسوس بھی کوئی بٹیرا ہوتا ہے جو تمھارے ہاتھ لگ گیا۔"

"ایک تو ہمیں تمھارا نام معلوم نہیں... کچھ بتایا تو ہوگا تم نے...؟" میں نے کہا۔

"میرے تو بہت نام ہیں جی... ماں باپ نے کچھ رکھا تھا۔ یاروں نے کبھی کچھ کر دیا۔" وہ بولا۔ "کبھی کچھ... آج کل مولا جیٹ کہتے ہیں۔ یہ جیٹ چلاتا ہوں نا جو آپ کے دروازے پر کھڑا ہوا ہے۔ بیوی چن ماہی کہتی ہے۔"

"واہ واہ... سب سے اچھا یہی ہے... چن ماہی۔" میں نے کہا۔ "تو بھائی چن ماہی... ہم نے اس بھارتی جاسوس کو بڑی جدوجہد اور کوشش سے گرفتار کیا ہے..." میں نے اور ٹیڈی نے بیک وقت ریوالور نکالے اور جیب میں ڈال لیے۔

"تم نے گرفتار کیا ہے... کون ہو آخر تم لوگ؟" چن ماہی کا رنگ اڑ گیا۔ "پولیس والے یا فوجی؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "ہمارا کام یہی ہے اس لیے ہم خود کو چھپا کے رکھتے ہیں اور اپنے بارے میں اصلیت کسی کو نہیں بتلاتے۔ نہ اپنا صحیح نام اور نہ پتا۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر والوں کی زندگی بھی محفوظ نہ رہے۔"

"وہ... وہ تو ٹھیک ہے جناب عالی..." چن ماہی کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ "لیکن کسی کو معلوم ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟"

"کسی کو آخر کیسے معلوم ہوگا؟" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ہم خود تو بتانے سے رہے۔ تمھاری زبان سے ہی کچھ نکلے گا تو بات پھیلے گی، ورنہ یہاں کسی کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ تمھارا مُنہ بند رہنا چاہیے۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"رب دی سوں... میں نے مرنا ہے جی منہ کھول کے۔" وہ بولا۔ "لیکن جنابِ عالی..."

"یہ کیا جنابِ عالی، جنابِ عالی شروع کر دی ہے تم نے... اسے بھی ہم تمہارے کرائے دار ہیں اور اس کے علاوہ دوست ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس حد تک ہم میں کوئی فرق نہیں کہ ہم بھی سچے پاکستانی ہیں اور تم بھی ہو۔ یہ جاسوس بھی خود کو پاکستانی ہی کہتا تھا اور تقسیم کے وقت ہجرت کر کے نہیں گیا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے اس کے ساتھ محبت کا سلوک کیا اور اسے برابر کی عزت دی۔ کبھی اسے ہندو سمجھ کے اس سے تعصب نہیں برتا۔"

"یہ ہندو ہے؟" چن ماہی پھر اُچھلا۔ "کیا نام ہے اس کا؟"

"نام تم کو بتا دیتے ہیں۔ اس کا نام ہے سادھو رام۔" میں نے کہا۔ "کام یہ خبیط نوں والے کر رہا تھا۔ یہ پاکستان سے بھارت کی سرحد تک اسلحہ پہنچاتا تھا اور وہاں سے اسلحہ آگے جاتا تھا مشرقی پاکستان... جہاں ہمارے دشمن ملک کے اندر گڑبڑ پھیلانے میں مصروف ہیں اور بھائی کو بھائی سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔"

"توبہ رب دی!" چن ماہی نے دونوں گالوں پہ ہلکے ہلکے تھپّڑ مارے۔ "ایسے ذلیل بندے کو آپ نے زندہ کیوں چھوڑا ہوا ہے بادشاہو! آپ تو بس مجھے اجازت دو کہ میں اس کی گچی مروڑ دوں۔"

"ابھی نہیں۔ بعد میں اپنی خواہش ضرور پوری کرنا۔" میں نے کہا۔ "پہلے ہمیں اس سے پوچھ گچھ کرنے دو۔ ہمیں اس سے ان سب کے نام پوچھنے ہیں جو یہاں اس کے مددگار تھے اور پھر ان کو بھی پکڑنا ہے... یہ کام بہت مشکل اور خطرناک ہے لیکن تم کو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔"

"لو جی! ڈرتا کون کافر ہے۔" چن ماہی بولا۔ "ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ جان کب تک بچا کے رکھیں گے اور اگر مرنا ہو تو سب سے اچھی موت وہی ہے جی جو... جو شہادت کی موت ہو... وطن کے لیے نصیب ہو یا کسی نیک کام میں جان قربان کرتے ہوئے ملے۔ وہ کیا شعر ہے جی علامہ صاحب کا...؟"

"مسلماں کے لیے دنیا و دیں میں سرفرازی ہے۔" میں نے کہا۔ "مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی ہے۔"

"اللہ بھلا کرے آپ کا۔ میں نے کسی سے سُنا تھا۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر مجھے غازی یا شہید کر دو۔"

مجھے اس کی بات پہ ہنسی آئی مگر اس کی حُبّ الوطنی کے جذبات نے مجھے متاثر بھی کیا۔ "تم اس جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو چکے ہو چن ماہی... اس گھر کو استعمال کرنے کی اجازت دے کر اور رازداری کی قسم کھا کر تم ہمارے ساتھی بن گئے ہو۔ بس تمہارا اتنا ہی کام ہے کہ کسی کو کچھ پتا نہ چلنے دو۔ یہی کہتے رہو کہ ہم تمہارے کرائے دار ہیں اور کوئی ہرج نہیں اگر اسے پاگل بنا دو۔ ہم دیسی کسی کا بھی رشتے دار کہہ دو۔"

"خدا نہ کرے ایسے ذلیل رشتے دار ہوں جی آپ کے۔" چن ماہی بولا۔ "مگر آپ بالکل فکر مت کریں۔ آپ کسی کے منہ سے کچھ سنو تو مجھے غدار کہہ کے گولی مار دینا۔"

"اوّل تو تمہیں نقصان ہو گا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہوا تو گورنمنٹ تمہیں اس کا معاوضہ دے گی... مثلاً یہ گھر..."

"توبہ توبہ... معاوضہ کس بات کا جی۔ اپنا پیارا پاکستان اس گھر سے کم ہے کیا؟ ایسے ہزار گھر وطن پہ قربان۔" چن ماہی بولا۔ "اب آپ نے ساتھی بنا لیا ہے تو ساتھ دیں گے مردوں کی طرح۔ بولو تو اپنا یہ جیٹ طیارہ سیدھا بارڈر کے پار لے جاؤں۔"

"تمہارا جیٹ طیارہ ایک بار جنگ میں کام آ چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر ضرورت پڑے گی تو لے لیں گے۔ سارا خرچہ گورنمنٹ کا اور تم اگر باقاعدہ طور پہ اس مشن میں شامل ہونا چاہتے ہو تو بتاؤ... ہم تمہاری سفارش کریں گے۔ تمہیں تربیت دی جائے گی اور کچھ عرصہ تم ہمارے ساتھ کام کرو گے۔ جب تک تربیت جاری رہے گی تم کو وظیفہ ملے گا پانچ سو روپے ماہانہ علاوہ اخراجات۔"

چن ماہی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "پانچ سو روپے... علاوہ اخراجات ...یعنی کھانا پینا... کپڑا سب مفت۔"

"ہاں... اور اگر تم نے تربیت کے سخت مراحل سے گزر کے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا تو چھ مہینے بعد ہم دوسری رپورٹ دیں گے کہ تم کو لیفٹیننٹ کا عہدہ دے دیا جائے۔" میں نے یوں کہا جیسے میں ملٹری انٹیلی جنس کا کوئی بہت بڑا اور بااختیار افسر ہوں۔

"لیفٹین... میں... میں لیفٹین...؟" چن ماہی ہکلانے لگا۔ "آپ مذاق تو نہیں کرتے جی... میں لیفٹین بن سکتا ہوں... پکا لیفٹین..."

"ہاں بھئی... مگر دیکھو... ہم لوگ وردی نہیں پہنتے۔" میں نے کہا۔ "نہ میں کسی کو بتاتا ہوں کہ میں کرنل ہوں اور نہ نیک محمد بتاتا ہے کہ یہ کیپٹن ہے۔ یہ سب خفیہ عہدے ہیں ایم آر ایس کے..."

چن ماہی کبھی میری صورت کو دیکھتا تھا تو کبھی نیک محمد کی۔ "ایم آر ایس... یہ کیا مطلب ہوا جی..."

"وہ میرے منہ سے نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "تم کبھی نام بھی مت لینا اس کا... ملٹری انٹیلی جنس سروس بنتا ہے اس سے۔"

ان پڑھ چن ماہی یہ نوٹ نہ کر سکا کہ اس سے تو ایم آئی ایس بنتا ہے۔ وہ مسلسل انکشافات سے اور یہ سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوری چھوڑ کے وہ صرف چھ ماہ میں لیفٹین بن سکتا ہے۔ اس نے مجھے کرنل مان لیا تھا اور استاد ٹیڈی کو کیپٹن

...ملک کے معاملے میں وہ بے حد جذباتی تھا اور اب صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہ راز کو کس حد تک راز رکھ سکتا ہے۔ پھر اسے اپنا ساتھی بنانے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔

"ایک بات بہت اچھی طرح سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "اس کام میں جان کو ہتھیلی پہ رکھ کے پھرنا پڑتا ہے مگر اس سے زیادہ اہم مسئلہ رازداری کا ہے۔ ورنہ اِدھر بات منہ سے نکلی اُدھر دشمن کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور پھر ہر کامیابی کے بدلے ناکامی ملتی ہے۔ ہم نے تو اپنی بیویوں کو بھی نہیں بتایا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم پولیس میں ہیں اور ہمارا کام اسمگلروں کی نگرانی کرنا ہے۔ تم بھی اپنی بیوی سے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہو کیونکہ اس کام میں بعض اوقات رات رات باہر رہنا پڑتا ہے۔ آدمی پھنس جائے تو ہفتہ ہفتہ لوٹ کر نہیں آتا اور تقدیر ساتھ نہ دے تو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ سب کر سکتے ہو؟"

"میں... میری خوش قسمتی ہو گی جناب... آپ میری سفارش کر دیں اور مجھ سے قسم اٹھوا لیں۔ میری ماں کے سر کی قسم... بچوں کی زندگی کی قسم... میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کے وعدہ کر سکتا ہوں کہ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی کروں گا۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اپنی زبان بند رکھوں گا۔ بس آپ سفارش کر دیں تو مجھے لیفٹین بنا دیا جائے..."

"چن ماہی! وہ وقت ابھی دور ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کو بھرتی کیا جا سکتا ہے مگر تم لیفٹین چھ مہینے سے پہلے نہیں بن سکتے۔ ان چھ مہینوں میں ہم تمہاری کارکردگی پہ نظر رکھیں گے۔ تم سے ہر کام لیں گے اور تم کو ہر طرح آزمائیں گے۔ اگر تم ہر آزمائش میں پورے اترے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم لیفٹیننٹ نہ بن جاؤ۔ کیا آج رات تم دیکھو گے کہ ہم جاسوسوں سے کس طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں؟ تمہارا دل مضبوط ہے نا؟"

"چن ماہی کا دل فولاد بھی ہے اور شیشہ بھی... آپ دیکھ لو گے۔" وہ بڑے غرور سے بولا۔

"واہ! کیا بات کہی ہے تم نے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ تم نے تو بالکل علامہ اقبال کی طرح کہا ہے۔"

"او جی، ہم جاہل اَن پڑھ بندے علامہ اقبال کی جوتیوں کی خاک بھی نہیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "کیا فرمایا ہے انھوں نے؟"

"ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن۔" میں نے کہا۔

"ذرا اردو میں بتاؤ جی۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "بڑی مشکل فارسی ہے۔"

"مطلب وہی ہے کہ مسلمان کا دل دوستوں کے لیے شیشہ ہے تو دشمنوں کے لیے فولاد۔" میں نے کہا۔ "تم نے بھی تو یہی کہا تھا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس وقت تم کہیں سے ایک ٹب لا سکتے ہو؟"

"ٹب؟" وہ حیران رہ گیا۔ "ٹب تو نہیں... ڈرم لا سکتا ہوں۔"

"اچھا تو ڈرم لے آؤ... اور یاد رکھو... ہمارے پیشے میں صرف حکم کی تعمیل ہوتی ہے... سوال کیے بغیر۔" میں نے کہا۔

"ڈرم تو چھت کے اوپر پڑا ہے جی... میں ابھی اُتار لیتا ہوں۔" وہ بولا اور صحن کی دیوار پر چڑھ گیا۔

"سکندر بادشاہ! یہ کیا ڈراما کر رہے ہو؟" ٹیڈی نے موقع پاتے ہی کہا۔ "قسم مولا علی کی، مجھے تو لگتا ہے تم پر بھی رابعہ کی طرح کچھ... وہ ہو گیا ہے۔"

میں ہنسا۔ "ارے میاں خوجی... دیکھتے جاؤ... ہمارا یہ چن ماہی بھی ہیرا ہے دل کا... اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے چن ماہی کو اپنے ماضی کی پوری الف لیلےٰ کی کہانی سنانا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو پاگل ہو جائے گا سوچتے سوچتے کہ کس پہ یقین کرے اور کس پہ نہ کرے اور جب اسے معلوم ہو گا کہ ہمارے تین طرف شکاری ہیں تو وہ ڈر جائے گا کہ بیک وقت پولیس سے اور شہر کے بدمعاشوں سے بھی دشمنی اور ملک کے دشمنوں سے بھی جنگ۔ ابھی تو ہم جو کچھ کریں گے وہ جذبۂ حُبّ الوطنی میں ہمارا ساتھ دے گا۔ تم نے دیکھا لیفٹیننٹ بننے کی سن کر اس کا خوشی سے کیا حال ہوا تھا۔ وہ ہماری مدد کرے گا تو دل ہی دل میں فخر کرے گا کہ وہ وطن کی خدمت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ جو کوئی بہت زیادہ غلط بات بھی نہیں ہو گی کیونکہ پہلے جو میری دلاور کے ساتھ ذاتی دشمنی تھی وہ اب ذاتی معاملہ نہیں رہی۔ میں دلاور کو صرف اپنے باپ کے قاتل کی حیثیت نہیں دیتا۔ اس سے بڑھ کر وہ غدارِ وطن کی حیثیت سے سزا کا مستحق ہے۔ مجھے پہلے ایک وطن دشمن کو بے نقاب کرنا ہے اور پھر اس پر اپنے باپ کے قتل کی فردِ جرم عائد کرنا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ یہ سارا سلسلہ ایک ہی تھا۔ میرے والد کو کاروبار سے الگ کرنا۔ ان کو بلیک میل کر کے خاموش رہنے پہ مجبور کرنا اور بالآخر ان کی جان لینا۔ یہ سب اسی لیے ہوا کہ میرے والد بھی دلاور کے کاروبار کی اصل نوعیت کو سمجھنے لگے تھے یا سمجھنا چاہتے تھے۔ دلاور نے اس ملک کے خلاف سازشی عناصر کا ساتھ دے کر پیسہ کمانا اسی وقت شروع کر دیا تھا اور آج تک وہ جو کچھ کر چکا ہے وہ سب وطن دشمنی ہے۔ اس میں وہ چند افراد کے خون کو قطعی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے والد بھی اس کے عزائم کو ناکام بنا سکتے تھے چنانچہ دلاور نے انھیں ختم کر دیا۔ غالباً میر شرافت علی بھی اسی لیے مارا گیا کہ اس کو وزیر خان کی موت تک اصل حالات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

جیسے ہی دلاور کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اس نے میر شرافت علی کو بھی ختم کر دیا۔ میں مزاحمت کر رہا ہوں تو میرا انجام تمہارے سامنے ہے۔ جس جس نے بھی اس کی مخالفت کی یا جس پر کبھی اسے شک ہوا کہ وہ خطرے کا سبب بن سکتا ہے، اسے دلاور نے ختم کر دیا۔ اب تو ہمارے اور اس کے درمیان کھلی جنگ ہے اور یہ جنگ اب صرف دلاور کے خلاف نہیں رہی، وطن دشمن ایجنٹوں تک پھیل گئی ہے۔ اگر چن ماہی بھی ہمارا ساتھ صرف اسی وجہ سے دے سکتا ہے تو اسے اپنے ذاتی مسائل اور معاملات بتانے سے کیا فائدہ۔"

"لیکن سکندر! کبھی اسے معلوم ہو گیا تو..." ٹیڈی متفکر ہو کے بولا۔

"کیسے معلوم ہو گا۔ وہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے تو رابطہ قائم کرنے سے رہا۔" میں نے کہا۔ "وہ تو اب اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا کیونکہ اس نے تم کو ایم آر ایس کا کیپٹن اور مجھے کرنل مان لیا ہے۔ میرا خیال ہے محسن کو میجر بنا دوں اور غالب کو... اسے بھی میجر تو بنانا ہی پڑے گا۔ ہماری آئندہ کی سب کارروائیاں منظم طریقے پر ایک ہی مقصد کی خاطر ہوں گی۔ پھر اسے شک کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ہم سادھو رام کی زبان سے جو کچھ اگلوائیں گے اس سے ہماری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"لیکن یہ ڈرم... اس ڈرم کا تفتیش سے کیا تعلق؟" ٹیڈی نے کہا۔

"اگر بالٹی کا تفتیش سے تعلق ہو سکتا ہے تو ڈرم کا کیوں نہیں ہو سکتا کیپٹن۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے ڈی ایس پی سراج نے پہلے ہی دن مجھ سے کس طرح اقبال جرم کرایا تھا۔ مجھے ایک بالٹی سر کے اوپر ٹوپی کی طرح اڑھا کے اور ڈنڈے سے کوٹ کر... میں آج بھی اس کا تصور کرتا ہوں تو میرا سارا وجود لرزنے لگتا ہے۔"

"تم نے اس کا ذکر کیا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "مگر یہ چن ماہی اتنی دیر سے اوپر کیا کر رہا ہے۔"

اسی وقت چن ماہی کی آواز آئی۔ "او بھائی ذرا باہر نکلو... نیچے سے پکڑو... یا میں ڈرم کو نیچے گرا دوں؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے صحن میں آ کے کہا۔ "نیچے گراؤ گے تو سارا محلہ پہلے ہی جاگ اٹھے گا۔"

"اتنی دیر سے کیا کر رہے تھے تم چن ماہی؟" استاد ٹیڈی نے سر اٹھا کے کہا۔

"ڈرم خالی کر رہا تھا۔" چن ماہی بولا۔ "اس میں ریت بھری ہوئی تھی۔ چھت پر پلستر کرایا تھا تو بچ گئی تھی۔"

میں نے اور ٹیڈی نے نیچے سے ڈرم کو تھاما اور صحن میں اتار لیا۔ یہ وہی پینتالیس گیلن والا تارکول کا ڈرم تھا لیکن اسے خاصا صاف کر لیا گیا تھا اور اندر کی دیواروں پر صرف تارکول کی سیاہی رہ گئی تھی۔ میرے کہنے پر ٹیڈی نے اسے دھویا اور اندر سادھو رام کے کمرے میں پہنچا دیا۔ پھر چن ماہی اور استاد ٹیڈی نے اس کو بھرنا شروع کیا۔ وہ بالٹی بھر کے پانی لاتے تھے اور ڈرم میں انڈیل دیتے تھے۔ سادھو رام اس کارروائی کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اسے پانی میں غوطے دے کر اس سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں یا سردی کے موسم میں اس کو پانی میں ڈال کر ٹھنڈ سے ہلاک کرنے کے موڈ میں ہوں لیکن میرا پروگرام اس سے بالکل مختلف تھا۔

"تم نے کچھ سوچا سادھو رام؟" میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول کے اُسے آزاد کر دیا۔ "کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

سادھو رام نے ہاتھوں پیروں کو حرکت دی اور ادھر کو اوپر نیچے جھکایا۔ اس کی جسمانی حالت آج بہت بہتر تھی۔ "جو کچھ کرنا ہے، تم کو کرنا ہے۔" وہ بولا۔ "تشدد کرنا ہے یا قتل کرنا ہے۔ قید کرنا ہے یا آزاد کرنا ہے۔ بیمار کرنا ہے یا پاگل کرنا ہے۔"

"میں واقعی یہ سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اس سے بہت زیادہ بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم کو تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ صرف وہ نام اور پتے بتانے ہیں جو تمہارے دماغ میں محفوظ ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ سوائے اُن کے جن سے تم مل چکے ہو۔" وہ بولا۔

"کرنل جگن ناتھ اس زنجیر کا اگلا سرا یا اگلی کڑی تھا۔" میں نے کہا۔ "دلربا درمیانی کڑی تھی۔ اس کے پیچھے والی کڑی تم تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے پیچھے اس زنجیر کی کون سی کڑی تھی۔ میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم کرنل جگن ناتھ سے آگے کی کڑی کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ تمہیں پیچھے کی کڑی کا علم نہ ہو۔"

استاد ٹیڈی کے ساتھ اب چن ماہی بھی کمرے میں رک گیا تھا اور وہ دونوں بھی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ آدھا ڈرم بھر جانے کے بعد میں نے انہیں ڈرم میں مزید پانی ڈالنے سے منع کر دیا تھا۔ چن ماہی کا جوش اور جذبہ، اشتیاق اور تجسس قابل دید تھا۔

"سادھو رام! تم زندہ رہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اپنی حد تک میں وعدہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں نکل جانے دوں۔ اس کے بعد تمہارے پرانے دوست تم کو زندہ نہ چھوڑیں تو میں ذمے دار نہیں۔ ان سے خود کو بچانا اور محفوظ رکھنا تمہارا اپنا کام ہو گا اور میں یہ بھی یقین دلا دوں کہ تم کو میں نے کبھی دوبارہ دیکھا تو چھوڑوں گا نہیں۔ لیکن تم سکتے ہو یہ ملک کراچی سے گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ تم راجستھان بارڈر کراس کر کے اپنے ہم مذہب لوگوں میں شامل ہو سکتے ہو اور نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے پکڑے جانے کے امکانات کم ہوں گے یا نہ پکڑے جانے کے زیادہ۔ اس کا انحصار تمہاری عقل اور ذہانت پر ہے اور تم اس صلاحیت سے محروم نہیں ہو۔ تم خود کو کہاں چھپاتے ہو اور کیسے چھپتے ہو، یہ تمہارا گیم ہے۔ شکاری تمہارے پیچھے لگے رہیں گے مگر ہمیشہ نہیں۔ اگر تم سال بھر بھی گمنام رہنے میں کامیاب رہے تو پھر کبھی نہیں پکڑے جاؤ گے۔ لیکن..." میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ "لیکن تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو اس شب کی سحر نہ دیکھو گے۔ تمہاری لاش کل گدھ، کتے اور چیل کوے کھائیں گے۔"

"میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔" وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔"

"سادھو رام! یہ آخری موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اسلحہ کون لاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ یہاں سے اسلحہ سرحد کے پار تک کس کی مدد سے پہنچاتا تھا؟ کرنل جگن ناتھ بھارتی ایجنٹ تھا۔ تمہارے سیوک رام اور اس کے دونوں ساتھیوں کی طرح... کرنل جگن ناتھ تم کو صرف ادائیگی کرنے آتا تھا اور مال چیک کرتا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تم کچھ لوگوں کو جانتے ہو... مثلاً وہ کون ہیں جو ٹرک لے کر سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ تک آتے تھے اور سارا اسلحہ لوڈ کر کے لے جاتے تھے۔ تم نے اُن کو دیکھا ہے؟"

"میں نے ان کو دیکھا ضرور تھا لیکن وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے۔" سادھو رام بولا۔ "وہ کہتے تھے کہ تم کو رقم مل گئی۔ اب اپنے کام سے کام رکھو۔"

"تم نے اس ٹرک کا نمبر وغیرہ تو دیکھا ہو گا؟"

"نمبر ہمیشہ بدلا ہوا ہوتا تھا۔" سادھو رام بولا۔

"کیا ٹرک ہمیشہ وہی ہوتا تھا؟" میں نے کہا۔ "ڈرائیور اور اس کے ساتھی سب وہی ہوتے تھے؟"

سادھو رام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ سب بی ایس ایف کے لوگ تھے۔"

"گڈ! تم نے کچھ تو بتایا۔" میں نے کہا۔ "بی ایس ایف میں ان کے رینک کیا تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"پھر تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بی ایس ایف کے آدمی تھے؟" ملک نے کہا۔

"کرنل جگن ناتھ نے کہا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "مگر اس نے کسی کا نام نہیں بتایا تھا۔ وہ سب آپس میں بھی بات نہیں کرتے تھے اور بالکل خاموشی سے کام کر کے چلے جاتے تھے۔"

"وہ ٹرک کون سا تھا... کس کمپنی کا بنایا ہوا؟"

"بیڈ فورڈ کمپنی کا۔" سادھو رام بولا اور میرا ہاتھ بجلی کی طرح گھوم کر اس کے منہ پر پڑا۔ کمرہ اس کی آواز سے گونج گیا۔ "وہ انڈین ٹرک تھا۔ اشوک ٹاٹا کمپنی کا بنایا ہوا۔" میں نے کہا۔ "وہ ہیلی کاپٹر جس میں کرنل جگن ناتھ آتا تھا اس کا نمبر تو تم نے دیکھا ہو گا؟"

"وہ ایک ہی ہیلی کاپٹر میں نہیں آتا تھا۔" سادھو رام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہر بار مختلف..."

میں نے اس کے دوسرے گال پر اُلٹا ہاتھ مارا۔ وہ نیچے گر گر گیا مگر میں نے اُسے پھر کھڑا کر دیا۔ "یہ دروازہ بند کر دو۔" میں نے ٹیڈی سے مخاطب ہو کے کہا۔ "ہاں تو سادھو رام! یاد کر کے بتاؤ کہ گزشتہ بار وہ جس ہیلی کاپٹر میں آیا تھا اس کا نمبر کیا تھا؟"

"مجھے... مجھے نہیں یاد..." سادھو رام نے لرزتے ہوئے کہا۔

"اس کا نمبر میں بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور نمبر دہرا دیا۔ "یہ ٹھیک ہے نا؟" سادھو رام نے اقرار میں سر ہلایا اور میں نے اس کے ایک اور چھانپڑ رسید کیا۔ "اگر یہ ٹھیک ہے تو پہلے کیوں کہا تھا کہ مجھے نمبر معلوم نہیں۔... خیر... وہ ہیلی کاپٹر بھی تمہاری دلربا کے ساتھ اُڑ گیا۔ اب سوچنے کی بات نہیں... یہ بتاؤ کہ جو رقم تم کو کرنل جگن ناتھ دیتا تھا، وہ تم سے کون لینے آتا تھا؟"

"میں... میں اُسے نہیں جانتا۔" سادھو رام نے آستین سے وہ خون صاف کیا جو اس کی ناک سے بہنے لگا تھا۔

"تم اُسے جانتے ہو۔" میں نے اس کی ناک پر مُکا مارا۔ "وہی شخص تم کو اسلحہ بھی پہنچاتا تھا۔ ممکن ہے وہ ایک آدمی نہ ہو، ایک گروہ ہو... تم بہر حال سب کو جانتے ہو گے۔ وہ تم سے حساب لیتے ہوں گے... تم صرف کمیشن ایجنٹ تھے... اور ہر کمیشن ایجنٹ دونوں پارٹیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔"

"میرے پاس چار آدمی آتے تھے... کبھی کوئی کبھی کوئی..." سادھو رام نے رو کے کہا۔ "مجھے کیا معلوم وہ اپنا جو نام بتاتے تھے وہ صحیح ہوتا تھا یا غلط۔"

"تم غلط نام ہی بتا دو۔" میں نے کہا۔ "پہلے ان کے سرغنہ کا۔ پھر باقی افراد کا۔"

"سرغنہ... سرغنہ تو نمبر ون کہلاتا تھا۔" سادھو رام بولا۔ "وہ کبھی ساتھ نہیں آیا... وہ اس کا حوالہ دیتے تھے۔ باقی چار کے نام... لال دین... چوہدری بشیر... عبدالرزاق... اور کمال خاں تھے۔"

اس نے ہر نام بہت سوچ کے لیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ نام اس نے ابھی ابھی گھڑے تھے اور اسی لیے وہ سوچنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر مجبور ہوا تھا۔ اصل نام بتانے کے لیے اس کو سوچنا ہرگز نہ پڑتا۔ پھر جھوٹ اس کی صورت پر خوف بن کے پھیل گیا تھا۔ ہم سے پہلے وہ خود جانتا تھا کہ یہ سب ناقابلِ یقین ہوگا اور ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔

"اچھا..." میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا "یہ لوگ کس طرح آتے تھے؟ ٹرک میں یا کار میں؟"

"مال ٹرک میں لاتے تھے۔" سادھورام بولا "پیسہ لینے کے لیے کار میں آتے تھے۔"

"اور ٹرک میں بھی وہی لوگ آتے تھے جو کار میں آتے تھے؟" میں نے کہا۔

"پیسہ وصول کرنے کے لیے ایک آدمی آتا تھا، ہر ہفتے۔"

"ٹرک اور کار کے نمبر کے بارے میں تم پھر وہی کہو گے کہ ہر بار بدلے ہوئے ہوتے تھے؟" میں نے کہا۔

سادھورام نے اقرار میں سر ہلایا "کبھی وہ نمبر پلیٹ پر مٹی پھیر دیتے تھے یا اُسے ہٹا دیتے تھے۔"

"ٹرک کون سا ہوتا تھا؟"

"بیڈ فورڈ کا۔" سادھورام بولا۔

"اور کار..." میں نے کہا "اس کا رنگ ماڈل.. تمہارے پاس کار ہے اس لیے تم ضرور جانتے ہو گے؟"

"کار... فورڈ زیفر بھی لاتے تھے... اُنیس سو ساٹھ ماڈل۔" سادھورام بولا "اس کا رنگ نیلا ہوتا تھا۔ دوسری اوپل ریکارڈ تھی۔ اسی سال کا ماڈل۔ رنگ اوپر کالا، نیچے سے سرخ۔"

"اب ذرا سوچ کے بتاؤ کہ یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"سوا سال پہلے... گزشتہ سال اگست کے مہینے سے۔" سادھورام بولا۔

"پہلا سودا کیسے ہوا تھا... وہ تم تک کیسے پہنچے تھے؟"

"دلربا کے ذریعے۔" سادھورام نے کہا۔

"اور اس پہلے سودے میں تمہارا کمیشن کتنا بنا تھا؟"

"سترہ ہزار روپے۔" سادھورام بولا "سترّ ہزار دے گئے تھے۔"

"اس کے بعد؟" میں نے کہا "کتنی بار آئے وہ لوگ؟"

"یہ سب... مجھے تفصیل سے تو یاد نہیں..." وہ بولا "آئے ہوں گے دس بارہ مرتبہ۔"

میں نے اس کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور جب وہ گر گیا تو ٹھوکریں مار مار کے اس کا حال خراب کر دیا "ابھی کہا تھا کہ ایک آدمی تم سے ہر ہفتے پیسے لینے آتا تھا۔ مال آیا سوا سال میں دس بارہ مرتبہ۔ پیسے لینے والے آتے رہے ہر ہفتے۔ میرا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ تم اب بھی جھوٹ بولنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔" میں نے اسے پھر پیروں پہ کھڑا کر دیا اور دیوار سے لگا کے اس کے سینے پر اپنی ایک کہنی سے دباؤ ڈالنے لگا "اب ایک بار پھر بتاؤ کہ وہ چار آدمی کون تھے؟ اُن کے کیا نام تھے؟"

"بتاتا ہوں... بتاتا ہوں..." سادھورام بلبلانے لگا "ہائے میں مر گیا... میرا سانس رُک جائے گا۔" وہ چلّانے لگا اور دیوانہ وار چیخنے لگا۔ میں اپنا سوال دُہراتا رہا۔ دوسری بار اس نے جو نام بتائے، وہ بالکل مختلف تھے۔ اُسے امید نہ تھی کہ ہر سوال پھر پوچھا جائے گا اور چونکہ اس نے جھوٹ بولا تھا اس لیے وہ ناموں کو غلط ملط کر گیا۔ اس نے بشیر خاں، چوہدری رزاق، کمال دین اور لال خان بتا دیے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"تم نے سُنا کیپٹن۔" میں نے استاد ٹیڈی کو مخاطب کیا۔ "اس نے پہلے کیا نام لیے تھے۔"

"یس کرنل۔" استاد ٹیڈی بولا "اس نے لال دین، کمال خان، چوہدری بشیر اور عبدالرزاق کہا تھا۔ کیوں لیفٹیننٹ؟"

چن ماہی بھونچکّا رہ گیا۔ اسے ابھی سے لیفٹیننٹ کہہ کے مخاطب کیا گیا تھا "یس سر۔" وہ فوراً سنبھل کر بولا "یہی نام تھے۔"

"یہ جو کچھ کہتا رہا ہے وہ سب جھوٹ تھا۔" میں نے کہا "میں نے اسے جو موقع دیا تھا، وہ اس نے گنوا دیا۔ اب تم اس کے ہاتھ پیر باندھو اور اسے ڈرم میں ڈال دو۔ اس کا مُنہ پانی سے باہر رہے۔ گلے میں رسّی باندھ کے پانی میں معلق کر دو اور رسّی کا سرا اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس طرح کہ یہ اُچھلے تو خود کو پھانسی دے۔ جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا ٹوٹ جائے۔ ابھی یہ اُچھلے گا... بہت اُچھلے گا... شور بھی بہت کرے گا اس لیے اس کے مُنہ کو بند کر دو۔"

میں نے سادھورام کے ڈرم میں ڈالے جانے کی تمام کارروائی کی خود نگرانی کی اور چونکہ ڈرم نصف کے قریب بھرا ہوا تھا اس لیے سادھورام کے گھٹنے موڑ کر پیچھے کر دیے گئے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو باندھ کر اسی رسّی سے پیر بھی باندھے گئے اور سادھورام کو پانی میں ڈالا گیا تو وہ گھٹنوں کے بل ڈرم میں کھڑا ہو گیا۔ اس کا مُنہ پانی کی سطح سے اوپر رکھنے کے لیے وہی رسّی جس سے سادھورام کے ہاتھ پیر باندھے ہوئے تھے اس کی گردن میں پھندا بنا کے ڈالی گئی اور پھر اس رسّی کا آخری سرا ڈرم کے کنارے پر سے گزار کے ہاتھ میں پکڑ لیا گیا۔ اب سادھورام انتہائی تکلیف دہ پوزیشن میں ڈرم کے اندر غرق ہو چکا تھا۔ نصف بھرے ہوئے ڈرم میں سادھورام کے ڈالے جانے سے پانی کی سطح بلند ہو گئی تھی اور پانی کناروں سے تھوڑا ہی نیچے تھا۔

اگر سادھورام کے پاؤں گھٹنوں کے پاس سے کاٹ دیے جاتے تو اس کا قد چار فٹ سے بہت کم رہ جاتا۔ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا وہ ساڑھے تین فٹ کا ہی رہ گیا تھا اور سخت اذیت میں تھا چونکہ رسّی نے اس کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا اور وہ ڈرم کی ایک طرف کے ساتھ یوں لگا ہوا تھا کہ بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے نے اُسے پیچھے کھینچ رکھا تھا چنانچہ اس کا وجود ڈرم کے تین چوتھائی حصّے میں سما گیا تھا۔ وہ بہت دہشت زدہ تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کارروائی کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ خود استاد ٹیڈی اور چن ماہی سخت کنفیوژن کا شکار نظر آتے تھے۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہو گئی تو میں دوسرے کمرے میں گیا اور بجلی کا وہ راڈ ہیٹر اٹھا لایا جو ہم غسل کا پانی گرم کرنے اور چائے کا پانی بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایک ہزار واٹ کا یہ ہیٹر جرمنی کا بنا ہوا تھا اور محسن خرید کر لایا تھا۔ اس کی دو الگ الگ شاخیں تھیں جن کی موٹائی پنسل کے برابر یا کچھ کم ہو گی۔ آخری حصّے میں یہ دونوں شاخیں ایک کوائل یا لچھے کی شکل میں ملی ہوئی تھیں اور گرم ہونے والا تار ان کھوکھلی پنسل نما شاخوں کے اندر تھا۔ یہ بہت عام چیز تھی جو کسی بھی بجلی کے سامان کی دکان سے تیس چالیس روپے میں مل جاتی تھی اور اس کی مجموعی لمبائی آٹھ انچ کے قریب تھی۔ اسے پانی سے بھری ہوئی کیتلی میں بھی لٹکایا جا سکتا تھا اور بالٹی میں بھی۔ اس کی تمام حرارت پانی کے اندر جذب ہوتی تھی چنانچہ پانی سے بھری ہوئی جو بالٹی چولہے پر ایک گھنٹے میں گرم ہوتی وہ اس ہیٹر سے دس منٹ میں اتنی گرم ہو جاتی تھی کہ پانی کھولنے لگتا تھا۔ ایک کیتلی پانی تو دو چار منٹ میں اُبل جاتا تھا۔

ڈرم میں کئی بالٹی پانی تھا چنانچہ اس کے درجۂ حرارت کو بائلنگ پوائنٹ تک پہنچانے کے لیے میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس منٹ درکار تھے۔ راڈ ہیٹر کو دیکھتے ہی استاد ٹیڈی بھی سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور سادھورام کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ اس نے دہشت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رحم کی التجا کی مگر میں نے سمجھ لیا تھا کہ سادھورام آسانی سے سب کچھ نہیں بتائے گا۔

"تم دیکھ رہے ہو نا سادھورام کہ میرا ارادہ کیا ہے؟" میں نے تار کو کھول کر پلگ پوائنٹ تک لے جاتے ہوئے کہا "میں تمہارا سوپ بنانا چاہتا ہوں... افسوس یہ ہے کہ تمہارے بیوی بچّے نہیں ہیں ورنہ وہ تمہارا سوپ بنتا دیکھ کر محظوظ ہوتے۔ میں ان کو یہ سوپ پلاتا۔ کالی مرچ نمک اور کھٹا میٹھا مسالہ ڈال کے۔ اب یہ سوپ پینے والا کوئی نہیں۔ بکرے کا گوشت عموماً ایک گھنٹے میں گل جاتا ہے۔ گائے بھینس کا گوشت زیادہ وقت لیتا ہے۔ تمہارا گوشت حرام ہے۔ سُوّر کے گوشت سے بھی زیادہ۔" میں نے راڈ ہیٹر کو پانی میں ڈال دیا۔

"ہیٹر آن کر دوں کرنل؟" چن ماہی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"او یس لیفٹیننٹ۔" میں نے کہا "دیکھو اس وقت ہمارے پاس کیسی نایاب ڈش ہے۔ افریقہ کے جنگلی قبائل جو آدم خور ہوتے ہیں اس ڈش کو بڑے چٹخارے لے کر کھاتے ہیں مگر مہذّب دنیا میں سالم مرغ اور سالم دُنبہ روسٹ کر کے کھانے والے تو ملتے ہیں، سالم غدّار کو ہضم کرنے والا کوئی نہیں... مجھے پھر ملال ہوتا ہے کہ ڈش ضائع ہو جائے گی۔"

"کیوں سر! کیا کتّے بلّیاں اسے نہیں کھا لیں گے؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"نہیں کیپٹن۔ یہاں کے تو جانور بھی حُبّ الوطنی کا جذبہ یا حیوانی جبلّت رکھتے ہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "ہر جانور کوئی ایسی چیز نہیں کھاتا جو اس کے لیے نقصان دہ ہو۔ ہاں اس جیسے دو چار ہمارے ہاتھ لگ جاتے تو ہم ان کی ضیافت کرتے اور آدھے سادھورام کا پلاؤ پکاتے تو آدھے سادھورام کا قورمہ۔ اب تو یہ گلنے کے بعد پانی میں ہی گھل جائے گا۔ اس کا حلیم بن جائے گا۔ ذرا دیکھو، پانی کا ٹمپریچر کیا ہے؟"

استاد ٹیڈی نے انگلی ڈال کے پانی کو دیکھا "ابھی تو معمولی سا گرم ہوا ہے سر۔"

"اچھا کیپٹن، سادھورام کو اُبلنے دو۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "تم کافی بناؤ... چن ماہی اس کی رسّی ڈھیلی مت کرنا۔"

"نو سر!" چن ماہی نے فرض شناس ماتحت کی طرح کہا "آپ فکر ہی نہ کریں۔"

میں دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے رکا اور پلٹ کر سادھورام سے مخاطب ہوا "اب تمہارے لیے مہلت بہت کم رہ گئی ہے سادھورام! آدھے گھنٹے میں پانی اتنا گرم ہو جائے گا کہ تمہارے جسم کو جلانے لگے گا۔ چالیس پینتالیس منٹ میں تم فُل بوائل ہو جاؤ گے... مگر مرو گے نہیں... میں تم کو ہاف بوائل کرتا رہوں گا... صبح تک۔" میں نے سادھورام کو بے چینی سے سر ہلاتے دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے کی اجازت طلب کرتے محسوس کیا اور اس کی صورت پر موت کے خوف کا سایہ لرزاں دیکھا لیکن میں پروا کیے بغیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"مان گئے سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی بولا "کیا آسان نسخہ ایجاد کیا ہے زبان کھلوانے کا... نہ کوئی مار پیٹ کی محنت مشقت،

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہ وقت کی بربادی... سالا ابھی سب کچھ بتائے گا۔"

"ضرورت ایجاد کا باپ ہے استاد۔" میں نے کہا۔"ایسے بہت سے طریقے ہمارے ہاتھ میں تھے لیکن اس سے پہلے کوئی ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جو ہاتھ لگے تھے، وہ خود مر گئے یا مار دیے گئے۔ پہلی بار دشمن کا ایک اہم ٹیپ ہمیں ملا ہے۔ اس کو بجا کے پورا سننا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سادھو رام ہاف بوائل ہونے کے بعد بجنے لگے گا۔"

"تم نے اچھا کیا جو شہلا کو ساتھ نہیں لائے۔" ٹیڈی بولا۔"لیکن محسن کیوں نہیں آیا؟"

"آج اپنے گھر میں ان کی پہلی رات ہے۔" میں نے کہا۔"پھر شہلا اکیلی نہ جاتی تو ڈرتی... یہاں کی کارروائی میں محسن کی موجودگی غیر ضروری تھی۔ میں اکیلا ہوتا تب بھی کافی تھا۔"

"یار سکندر بادشاہ! یہ تم کو ڈرم کا خیال کیسے آیا؟" استاد ٹیڈی بولا۔"اگر اس وقت ڈرم نہ ملتا تو...؟"

"میں ڈرم کو بہت پہلے دیکھ چکا تھا استاد۔" میں نے ہنس کر کہا۔"ڈرم نہ ہوتا تو آج میں دیگ کا انتظام کر لیتا۔"

دوسرے کمرے میں جن ماہی نے سادھو رام کو مخاطب کر کے اپنے غم و غصّے کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ وہ سادھو رام کو غدار، نمک حرام... بے غیرت، کافر... وطن فروش وغیرہ کے علاوہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے ہر جملے میں سادھو رام کی والدہ یا ہمشیرہ کا حوالہ مختلف انداز سے آتا تھا۔ وہ سادھو رام کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کر رہا تھا اور اسے کے سامنے اگلے آدھے گھنٹے کی اذیت کا نقشہ بڑے مؤثر طریقے پر کھینچ رہا تھا۔

جن ماہی کے لیے اب ہمارے مشن کی نوعیت اور خود ہمارے بارے میں ایک فیصد شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے سادھو رام کی زبانی سب کچھ سن لیا تھا اور وہ بہت جوش میں تھا کہ آج رات وہ قومی سلامتی کے اتنے بڑے مشن میں ایک کرنل اور ایک کیپٹن کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔ وہ خود کو بے حد اہم اور ذمے دار محسوس کرنے میں حق بجانب تھا۔ اس کے آس پاس تمام ہم وطن اور اس کے تمام سابق ہم پیشہ سوئے پڑے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے معمولی سے گھر میں کتنی اہم کارروائی ہو رہی ہے۔ اسی شہر میں ایک سے ایک جانباز بہادر پڑا تھا۔ نہ جانے کتنے اعلیٰ عہدوں والے افسر تھے اور دولت مند تھے مگر یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔ قدرت نے جن ماہی کو اس عظیم قومی خدمت کے لیے منتخب کیا تھا۔

میں نے اطمینان سے کافی ختم کی اور سگریٹ جلا کے اس کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔ مجھے رابعہ کا خیال بھی آیا اور اس گھر کا بھی جہاں محسن اور شہلا کم سے کم آج رات غمِ جہاں سے بے نیاز تھے۔ یہ ایک رات بھی بہت غنیمت ہے۔ کیا خبر کل صبح نکلے کس طرف سے آفتاب... خوب صورت اور مہرباں وقت جب اپنی گرفت میں ہو تو اس کے ہر لمحے سے مسرّت کشید کر لینا چاہیے تاکہ گرانباریٔ ایام میں اور حالات کی تشنہ کامی میں خمارِ شب ہی حسرتوں کے ساتھ ہو۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ وقت کا کیا بھروسا کہ کب پھر مہلت دے۔

"ہاہا... اب بول تیری..." جن ماہی کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لیا۔"اچھل... اور اچھل... ابھی تو تیرا جسم پھٹے گا۔ بوٹی بوٹی پھٹے گی۔ اندر تیرا دل جگر سب پھٹے گا۔ تیرا گوشت خون اور ہڈیاں سب صبح تک گل جائیں گی۔ تمہیں گلیں گی تو میں کھانے کا سودا ڈالوں گا۔ اور پھر تیرا حلیم تیرے یاروں میں تقسیم ہوگا سرحد کے پار... اب تو گائے کو اماں کہنے والے اسے کھانے بھی لگے ہیں۔ اوئے تم بڑے... ہو... ماں کو کھا جاؤ... بس چلے تو بہن کو کھا جاؤ... باپ کو کھا جاؤ... بڑے مزے لے لے کر کھائیں گے تیرے یار تیرا حلیم... میں خود سرحد پار کر کے جاؤں گا اور تقسیم کروں گا۔ کون سا گاؤں ہے تیرا۔ خیر میں معلوم کر لوں گا... ہو سکا تو تیرے گاؤں والوں کو کھلاؤں گا۔ وہاں تیرے مامے چاچے اور اُن کے پتّر بھی ہوں گے۔ ایسے مسالے ڈال کر لے جاؤں گا کہ وہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔"

جب میں پھر دوسرے کمرے میں گیا تو سادھو رام شدید عذاب میں مبتلا تھا۔ میں نے انگلی ڈبو کے پانی کا ٹمپریچر دیکھا۔ پانی اتنا گرم ہو چکا تھا کہ سخت سردی میں بھی اس سے نہانا مشکل تھا۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھنے والی حرارت سادھو رام کے جسم نے بھی جذب کی تھی اور اس کا وجود اندر باہر سے اتنا ہی گرم ہو چکا تھا۔ کچھ بھاپ اُٹھنے سے اور کچھ اندر کی گرمی کے خارج ہونے سے سادھو رام کا چہرہ پانی میں اور پسینے میں تر تھا... وہ نہایت بے ہنگم طریقے پر اچھل رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ اس کے گھٹنے بار بار ڈرم کے فرش پہ لگتے تھے اور وہ دیوانگی کی کیفیت میں کوشش کر رہا تھا کہ راڈ ہیٹر کو کھینچ لے اور اس کا تار الگ کر دے مگر جن ماہی نے رسّی کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ سادھو رام کے ہاتھ پاؤں پیچھے بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ صرف اپنے مُنہ سے کوشش کر سکتا تھا مگر مُنہ میں بھی کپڑا تھا۔ لیکن کپڑا نہ ہوتا اور وہ کسی طرح اپنے دانتوں سے تار کاٹ دیتا تو کرنٹ پانی میں آ جاتا اور وہ فوراً ہلاک ہو جاتا۔ میں نے اس کے مُنہ سے کپڑا نکال دیا۔

سادھو رام نے بلبلا کے چیخ ماری۔"ہائے... ارے ظالم... ارے میں مر گیا... اف... ارے بھگوان کے لیے... تم کو تمہارے رسول اور خدا کا واسطہ... اسے بند کر دو... مجھے معاف کر دو... میں سب بتاتا ہوں۔"

میں نے سوئچ آف کر دیا۔ اس سے پانی کا درجۂ حرارت کم یں ہوا مگر سادھو رام کو ایک نفسیاتی قرار حاصل ہوا کہ پانی اس ے زیادہ گرم نہیں ہوگا۔"مجھے باہر نکالو... ہائے گرمی... رام رام... ب ے شریر میں اگنی بھر گئی ہے... مارے کوئی ہے... دوڑو... ردکرو... یہ مجھے قتل کر رہے ہیں۔" اس نے اچانک چیخنا شروع دیا۔ میں نے فوراً اس کا مُنہ بند کر دیا۔ اس نے گردن کو اِدھر اُدھر ا کے کپڑے سے بچنے کی بے سود کوشش کی۔ گلے میں پڑی ہوئی تی نے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔ یوں گردن ہلانے سے رسّی گوشت ں گڑ گئی اور سادھو رام کی گردن کے چاروں طرف خراشیں آ گئیں ن سے خون رسنے لگا۔

باہر سے کسی نے دروازہ بجانا شروع کیا۔ یہ یقیناً سادھو رام ے چیخ پکار سے جاگ کر آنے والے ہمسائے تھے۔ میں نے ن ماہی کو اشارہ کیا کہ وہ صورتِ حال کو سنبھالے اور سادھو رام کے گلے کی رسّی ٹیڈی کو تھما دی۔ پھر میں خود دوسرے کمرے میں جا کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے بال بکھرا کے اور کپڑے بے ترتیب کر کے اچھلنا اور مچلنا شروع کیا۔"ہائے... اُف مار ڈالا... قتل کر دیا..." میں نے چارپائی پر کسی غیر موجود مخلوق سے کشتی لڑتے ہوئے شور مچانا جاری رکھا۔"آہ... میں مر گیا... ارے کوئی آؤ... خدا کے لیے بچاؤ... یہ مار دے گا مجھے..."

دروازہ پھر بجا تو جن ماہی نے کنڈی کھولی... تین آدمی اندر آ گئے جو خاصے برہم نظر آتے تھے۔"یہ کیا ہو رہا ہے آدھی رات کو؟" ان میں سے ایک بزرگ نے خفگی سے کہا۔

"معاف کرنا چاچا جی..." جن ماہی بولا۔"یہ میرے سالے کا سالا ہے... گاؤں سے آیا ہے... اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں... گاؤں کے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ اس پر جن سوار ہے۔" میں نے اس وقفے میں اچھلنا کودنا، قلابازیاں کھانا اور جن سے لڑنا جاری رکھا۔ میں اسے مُکّے مارتا رہا اور خود بھی گرتا رہا۔

"یہ تو... بڑی مشکل ہے..." بزرگوار نے کہا۔ ان کا غصّہ ایک دم ہمدردی میں بدل گیا تھا۔

"ہاں جی... اب علاج کراؤں گا..." جن ماہی نے مظلوم شکل بنا کے کہا۔

"علاج کیا میاں... اس کو لے جاؤ کسی اچھے سے عامل کے پاس۔" بزرگ نے کہا۔"داتا صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔"

"اسے پاگل خانے لے جاؤ جی۔" دوسرے سر پھرے اور ہائی قسم کے جوان نے کہا۔"اس کا یہاں رہنا خطرناک ہے۔"

"نہیں بھائی... یہ خطرناک نہیں ہے... بے شک آپ قریب جا کے دیکھ لو... آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔" جن ماہی بولا۔

بزرگوار آگے بڑھے اور انھوں نے میرے شانے پر تھپکی دی۔"نوجوان... آیت الکرسی پڑھو۔"

"بابا جی... مجھے بچاؤ..." میں بزرگوار سے لپٹ گیا۔"میں مر گیا... ہائے... بڑا بے رحم... قاتل... ہائے..."

بزرگوار نے بمشکل تمام خود کو چھڑایا۔ میں شور مچاتا رہا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا... باہر اتنی دیر میں کچھ اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ بزرگوار نے کچھ پڑھ کے مجھ پر پھونک ماری۔ میں نے ان کو یہ عمل کرتے دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ میں میرا شور و غوغا کم ہو گیا۔ پھر میں ساکت ہو گیا اور پلنگ پر آنکھیں بند کر کے پڑ گیا... بزرگوار اپنے عمل کی کامیابی سے یقیناً بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

"اچھا میاں... ہم چلتے ہیں..." وہ بولے۔"خدا رحم کرے اس پر... دوبارہ دورہ پڑے تو ایک بار آیت الکرسی اور دو بار سورۃ فاتحہ پڑھ کے پھونک دینا... قرار آ جائے گا... اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔"

باغی خیالات رکھنے والا جوان کچھ نہ بول سکا کیونکہ باقی سب بزرگوار کے ہم خیال ہو گئے تھے اور ہمسائے ہونے کے ناتے جن ماہی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ سب کو جن ماہی سے ہمدردی تھی۔ چند منٹ میں وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو جن ماہی نے کنڈی لگا دی۔

"مان گئے سوہنیو... میرا مطلب ہے کرنل صاحب۔" وہ بولا۔

"دیکھو! آئندہ کبھی مجھے کرنل صاحب کہنے کی غلطی مت کرنا۔" میں نے کہا۔"تمھیں عادت پڑ گئی تو باہر بھی تمھارے مُنہ سے کرنل ہی نکلے گا... ہم پرانے ہو گئے ہیں اس لیے بھولتے نہیں۔ تم بالکل اسی طرح اپنے لہجے میں بات کرتے رہو تاکہ کسی کو شک ہی نہ ہو۔"

"اچھا مائی باپ... غلطی ہو گئی۔" جن ماہی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"اب ویسا ہی کروں گا جیسا آپ کہو گے۔"

"جن ماہی! تمھارے لیے یہ آزمائش کا زمانہ ہے... اگر تم غلطیاں کرتے رہے تو ہم تمھاری سفارش نہیں کر سکیں گے... اور تم کو بتائے بغیر غائب ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔"تم کبھی ہمیں تلاش نہ کر سکو گے لیکن کسی سے ہمارا ذکر بھی کرو گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور تمھیں بہت نقصان ہوگا۔ ہم بھیس بدل کر آنے والے جاسوسوں کو نہیں چھوڑتے تو تم کیا ہو۔"

جن ماہی کا رنگ اُڑ گیا۔"آپ بالکل فکر نہ کریں جناب! میرا پکا وعدہ ہے کہ آپ لیفٹیننٹ بنائیں یا نہ بنائیں، میں جس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حد تک آپ کی خدمت کر سکا ضرور کروں گا اور پھر کبھی میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو آپ سے پہلے میں خود اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گا۔"

یہ چن ماہی کی برین واشنگ تھی اور اس کے ذہن کو مکمل طور پر اپنے اختیار میں رکھنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا اور اس سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہونے کی امید تھی۔ ایک تو اس کا یہ گھر تھا جسے ہم استعمال کر رہے تھے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا اور شہر بھر میں گھوم پھر کے ہمارے لیے ہر قسم کی خبریں فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ وہ خبریں جو کسی خبر رساں ایجنسی یا اسٹاف رپورٹر کے ذریعے مرزا غالب تک نہیں پہنچتی تھیں وہ چن ماہی اکٹھی کر سکتا تھا اور ہم اسے ٹیکسی کے ساتھ کہیں بھی بھیج سکتے تھے۔ مثلاً یہ ہو سکتا تھا کہ کبھی وہ ہمارے دشمنوں کو ٹیکسی میں بٹھا لے۔ اس کے لیے وہ پہلے سے ان کے ٹھکانے کے قریب موجود ہو... اور اگر ٹیکسی میں بیٹھنے والے آپس میں گفتگو کریں تو وہ سن بھی سکتا تھا اور ریکارڈ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی ٹیکسی میں ٹیپ ریکارڈ فٹ کرنا معمولی کام تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو عام طور پر لوگ اہمیت نہیں دیتے اور اس کی موجودگی کو رازداری کے لیے غیر اہم سمجھتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور ایک غیر جانبدار فریق ہے جو دن بھر سب کی سنتا ہے مگر اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔

میں نے دوسرے کمرے میں آکے دیکھا تو گرم پانی میں پڑے رہنے سے سادھورام کی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی اور وہ تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ میں نے اسے ذرا سی دیر کے لیے باہر نکالا۔ اس کے جسم پر ایک بالٹی بھر کے ٹھنڈا پانی انڈیلا اور اسے پھر ڈرم میں ڈال دیا۔ مجھے دوبارہ سوئچ آن کرتا دیکھ کر سادھورام اچھلا۔ وہ دوبارہ اسی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا جس کی اذیت وہ آدھے گھنٹے تک برداشت کرتا رہا تھا۔ اب میں نے کسی قسم کے خوف کے بغیر اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔

"تم کو شور مچانے کی اجازت ہے سادھورام..." میں نے کہا۔ "جو تمہاری مدد کر سکتے تھے، وہ آکے چلے گئے۔ اب وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

سادھورام مجھے گالیاں بکنے لگا۔ میں مسکراتا رہا۔ بند کمرے سے اس کی آواز سنائی دیتی ہو گی لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سادھورام کی قوتِ مزاحمت میری توقع سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھی۔ ابھی تک اس نے سچ نہیں بولا تھا حالانکہ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں رہی اور پانی کے اُبلنے تک وہ ہوش کھو بیٹھے گا اور صبح تک اُبل اُبل کے بالآخر مر جائے گا۔ اس کے سامنے موت کا جو نقشہ کھینچا گیا تھا وہ غلط نہیں تھا اور سادھورام جانتا تھا کہ یہ موت اتنی ہی خوفناک اور بھیانک ہو گی۔ مجھے اب یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کچھ بتانے سے پہلے ہی سادھورام کا دماغ الٹ گیا تو میری ساری کوشش رائیگاں جائے گی لیکن یقین کہتا تھا کہ دماغ مزاحمت کرے گا اور موت کو قبول کرنے کے بجائے شکست تسلیم کرنے کو ترجیح دے گا۔ سادھورام کا گالیاں بکنا اور دیوانوں کی طرح چلاّنا بھی مکر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اسے پاگل تسلیم کر لیں اور اپنی کوشش ترک کر دیں مگر میں تہیہ کر چکا تھا کہ خواہ سادھورام پاگل ہو یا اُبل کے مر جائے میں کوشش جاری رکھوں گا۔

دس منٹ میں سادھورام کا پاگل پن درست ہو گیا۔ وہ تقریباً اُبلتے پانی میں زور زور سے اُچھلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کے لیے جہنم کے اس عذاب سے نکلنا ناممکن تھا۔ اس کی کھال کا رنگ عجیب سا ہو گیا تھا اور اس نے اپنے گھٹنے یقیناً زخمی کر لیے ہوں گے۔ بالآخر اس کی دردناک چیخوں کا سلسلہ رُک گیا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا۔ "میں سب... سب کچھ بتاؤں گا... میں بتاؤں گا... جو پوچھو گے... سب سچ..." اس نے گردن کو ادھر اُدھر یوں مارنا شروع کیا کہ اس کا سر ڈرم کی چادر سے ٹکرانے لگا اور گردن کے گرد زخموں کے حلقے گہرے ہو گئے... میں نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ استاد ٹیڈی اور چن ماہی نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش پر ڈال دیا۔ اس کے جسم پر ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی ڈالی گئی تو اسے ہوش آگیا لیکن وہ اسی طرح پڑا رہا۔ ہاتھ پیروں کی رسّی کھول دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں مڑا ہوا لیٹا رہا اور کراہتا رہا۔ میں نے جھک کر اس کی کھال کو چھوا تو وہ چلاّیا... یوں جیسے میں نے انگلی نہیں، اسے انگارا چھوا دیا ہو۔ اس کی کھال کچی پڑ گئی تھی۔ اس پر سے سارے بال اتر گئے تھے اور آہستہ آہستہ وہ کھال آبلہ بننے لگی تھی۔

"بولو سادھورام..." میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اسلحہ لے کر کون آتا تھا؟ ان کے نام بتاؤ۔"

"وہ... وہ دو آدمی تھے..." سادھورام نے بڑی مشکل سے کہا اور چپ ہو گیا۔

"شاباش... نام بتاؤ ان کے... نام پتے بتا دو گے تو تمہارا کام ختم... پھر تمہارا علاج کیا جائے گا... تمہیں آرام کا موقع ملے گا اور جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے تو تم کو جانے کی اجازت ہو گی..." میں نے کہا۔ "تم آزاد ہو جاؤ گے... نہیں بتاؤ گے تو ہم پھر تمہارا سوپ بنائیں گے...!" وہ مردے کی طرح لیٹا رہا تو میں نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ وہ تڑپا اور چلاّیا مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ "بتاؤ اسلحہ کون لاتا تھا... تم سے پیسہ کون وصول کرتا تھا؟... بولو... بولو ورنہ مار ڈالوں گا۔"

"وہ... وہ چوہدری دلاور کے آدمی تھے۔" سادھورام تڑپتے ہوئے بولا۔

میں نے بازو کا گوشت چھوڑ دیا۔ "کیا تم نے چوہدری دلاور کو دیکھا ہے...؟"

اس نے زور زور سے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ "میں نے اس کا صرف نام سنا تھا..."

"کیا تم کو اس کے کسی ٹھکانے کا علم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میرا واسطہ صرف دو آدمیوں سے پڑتا تھا۔" سادھورام بولا۔ "ان میں سے ایک استاد پیڈرو تھا..."

"اور دوسرا..." میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا اور اس کی ران پر زور سے چٹکی نوچی۔

"دوسرا... دوسرا ایک سب انسپکٹر ہے... پرویز وکٹر..." وہ چلاّیا۔

"کیا یہ پرویز وکٹر کسی ڈی ایس پی سراج کا حوالہ دیتا تھا...؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اس کا نام میں نے کئی بار سنا... مگر میں نے اسے دیکھا نہیں..." وہ بولا۔

"استاد پیڈرو کا حلیہ بتاؤ؟" میں نے کہا۔

سادھورام نے اس کا جو حلیہ بتایا وہ بالکل ٹھیک تھا... اس حلیے کا دوسرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"کیا استاد پیڈرو نے کبھی سکندر بخت... محسن یا رابعہ کا نام لیا؟" میں نے کہا۔

"سکندر بخت کا نام وہ اکثر لیتا تھا... کہتا تھا کہ اس کے باپ کو نہ مارتے تو بیٹا آسانی سے قابو میں آجاتا... اور وہ کہتا تھا کہ سکندر بخت کے ٹکڑے اپنے کتوں کے سامنے نہ ڈالے تو پیڈرو نام نہیں۔" وہ بولا۔

"رابعہ یا محسن... استاد ٹیڈی یا شہلا کا کبھی نام نہیں لیا اس نے...؟"

"مجھے یاد نہیں... کبھی لیا ہو گا تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔" سادھورام بولا۔

"یہ استاد پیڈرو کہاں رہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کی گاڑی کا نمبر بتاؤ..."

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتا ہے۔" سادھورام بولا۔

"گرم پانی کی ایک پیالی میں دو چمچے نمک کے گھول کر لاؤ۔" میں نے ٹیڈی کو حکم دیا۔ ٹیڈی نے تعمیل کی۔

"ذرا دماغ پر زور دو۔" میں نے نمک ملا ہوا پانی سادھورام کی گردن کے زخموں پر ٹپکا کے کہا۔ "اس کا کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

سادھورام بلبلا کے تڑپا۔ اس کے گھٹنے جو اب تک مڑے ہوئے تھے سیدھے ہو گئے..."وہ... وہ کل آئے گا... پیسے لینے۔ جس دن جگن ناتھ مال لے جاتا تھا اس کے تیسرے دن وہ آتا تھا۔ یا پرویز وکٹر آتا تھا۔" سادھورام نے روتے اور ہانپتے ہوئے کہا... اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ نشے میں محسوس ہوتا تھا مگر یہ مدہوشی ناقابلِ برداشت جسمانی تکلیف کا نتیجہ تھی۔

"وہ اب نہیں آئیں گے... انھیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ ہو چکا..." میں نے کہا۔ "ان کا دوسرا ٹھکانا بتاؤ۔"

"وہ... ایک ایمبولنس... نمبر ایل آر زیڈ... سیون زیرو سکس زیرو..." سادھورام کراہا۔ "اس پر ریڈ کراس کا جعلی نشان ہے۔ اسلحہ اسی ایمبولنس میں آتا ہے۔ مائکرو بس ہے فاکس ویگن کی... اوپر گھومنے والی لائٹ ہے... اسے کوئی نہیں روکتا جب وہ سائرن بجاتی ہوئی گزرتی ہے... اسے پرویز وکٹر کا بھائی چلاتا ہے... ان کی بہن نرس کے لباس میں ساتھ رہتی ہے... سونیا وکٹر۔"

"ماشاء اللہ! پورا خاندان ہی غداری میں سند رکھتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں مجرموں کے حسنِ انتظام کو سراہا۔ واقعی جب کوئی ایمبولنس سائرن بجاتی گزرتی ہے تو سب لوگ سہم کر ایک طرف ہو جاتے ہیں اور راستے کھلے چھوڑ دیتے ہیں جو زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ سائرن موت کی آواز بن کے ڈرانے لگتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ عین اس لمحے جب زندگی کی ساری گہما گہمی عروج پر ہے۔ بچے اسکولوں میں آنے والے دن کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا درس لے رہے ہیں۔ دفتروں میں قلم اور ٹائپ رائٹر چل رہے ہیں تو فیکٹریوں میں مشینیں اور دنیا بھر کی سڑکوں پر کاروانِ حیات رواں دواں ہے۔ بسوں اور چھکڑوں، ہوائی جہازوں اور بلٹ ٹرین میں لوگ مسکرا رہے ہیں، جامِ صحت پی رہے ہیں اور محبت کر رہے ہیں، تو ایک آدمی زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے اور جب ایمبولنس گزر جاتی ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ نہ جانے اس کشمکش میں جیت کس کی ہو گی اور پھر اپنی صحت اور زندگی کے احساس سے ان کا دل بھر جاتا ہے۔ وہ خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس وقت جو ایمبولنس گزری تھی اس میں وہ خود نہیں تھے اور ان کا اپنا پیارا کوئی نہیں تھا۔ ایمبولنس انسان اور موت کے درمیان جدوجہد کی علامت ہے اور اس سے امیدِ زیست وابستہ ہے۔ کوئی بھی یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ کسی ایمبولنس میں مریض اور اس کی زندگی کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے والے مسیحا کی جگہ موت کا سامان ہو سکتا ہے۔ جاں بر لب مریض کی جگہ گولا بارود

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اسمگلروں کے بھیس میں وطن کی آبرو کے سوداگر ہو سکتے ہیں۔ ایمبولنس کی آواز پر ٹریفک رک جاتی ہے اور کانسٹیبل راستہ صاف چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ڈرائیور سے لائسنس نہیں مانگتا۔ کاغذات طلب نہیں کرتا اور رشوت نہیں لیتا سنا کا بندی کرنے والے' محافظ' پہریدار... سب ایک ایک لمحے کی اہمیت سمجھتے ہیں اور ایمبولنس تمام رکاوٹوں سے صاف گزر جاتی ہے۔

بے شک مجرموں نے بہت چالاک ہونے کا ثبوت دیا تھا اور بے حد ذہانت سے کام لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ یہ بھی چوہدری دلاور کے شیطانی ذہن کی فطانت ہوگی۔ وہ ڈرامے کرنے کا ماہر تھا اور ایمبولنس بھی ایک چلتا پھرتا ڈراما تھی۔ اس کو ایک بھائی چلاتا تھا۔ بہن اس میں نرس کے فرائض سرانجام دیتی تھی اور پچھلے حصے میں رہتی تھی۔ بھائی اُسے سسٹر سونیا کہتا ہوگا تو بالکل ٹھیک کہتا ہوگا۔ وہ تینوں بھائی بہن اینگلو انڈین کرسچین ہیں، چنانچہ انگریزی فر فر بولتے ہوں گے۔ اگر کبھی کسی نے غلطی سے یا شک کی بنا پر ایمبولنس کو روکا ہوگا تو عقبی حصے سے سفید وردی والی نرس نے انگریزی میں شور مچا دیا ہوگا کہ خداوند یسوع مسیح سے ڈرو... ایک منٹ کی دیر بھی ہو گئی، تو تم بھی مارنے والوں میں شمار کیے جاؤ گے اور ممکن ہے درمیان میں اسٹریچر پر سفید چادر اوڑھے مریض کو لیٹا دیکھ کر دیکھنے والے دہل گئے ہوں۔ حالانکہ چادر کے نیچے رائفلیں ہوں گی اور سیٹوں کے نیچے دستی بم۔

سادھو رام اب بے ہوش ہو چکا تھا اور استاد ٹیڈی کے ساتھ چمن ماہی منتظر تھا کہ میں کچھ کہوں۔ بالآخر ٹیڈی نے ہمت کی "اب کیا کرنا ہے سر؟" وہ کھنکار کر بولا۔

"کچھ... کچھ نہیں... ابھی اسے چارپائی پر ڈال دو۔" میں نے کہا۔ "جب ہوش میں آئے گا تو دیکھیں گے۔"

چمن ماہی اور استاد ٹیڈی نے سادھو رام کو ٹانگیں اور ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور بستر پر ڈال دیا۔ اس کی کھال نرم اور چکنی ہو رہی تھی۔ جیسے اس پر گوند مل دیا گیا ہو۔ اس کا رنگ بھی سفید پڑ گیا تھا اور سادھو رام کی شکل بہت ڈراؤنی لگتی تھی۔

"تم اب جاؤ چمن ماہی۔" میں نے کہا۔ "یہ ٹیکسی چھوڑ جاؤ اور اگر صبح ٹیکسی سڑک پر کھڑی ہوئی نہ ملے تو گھبرانا نہیں... تمہیں گورنمنٹ کی طرف سے پورے دن کا کرایہ ملے گا۔" میں نے سو کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں جناب! میں کچھ نہیں لوں گا اس کام میں۔" وہ بولا۔

"رکھ لو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں اپنی جیب سے کچھ نہیں دے رہا ہوں اور تم گورنمنٹ کے لیے کچھ کرو گے تو کیا گورنمنٹ تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گی... تم کو ہم نے بیگار میں نہیں پکڑا ہے بس یہ خیال رکھنا کہ معاملہ ملکی سلامتی اور رازداری کا ہے۔ اگر تم نے اپنی بیوی سے ذکر کیا تو بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔"

"توبہ جی! عورت ذات کو راز کی بات بتانے کا مطلب ہے' بات کو لاؤڈ اسپیکر پر نشر کرنا۔" چمن ماہی بولا۔

"رائٹ... بیوی تمہارے سر کی قسم کھائے یا بچوں کی جان کی... اس پر بھروسا نہیں کرنا ہے اور کوئی دوست کتنا ہی پیارا اور قابلِ اعتماد کیوں نہ ہو' اسے بھی کچھ نہیں بتانا ہے... یہ کہ ہم کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ بننے کی خوشی میں بے قابو مت ہو جانا' ورنہ پہنچ جاؤ گے جیل کے پیچھے... اور وہ عام جیل نہیں ہوگی۔ لاہور کے شاہی قلعے کے نیچے جانے والے بہت کم اوپر آتے ہیں۔ ہاں اگر تم نے تربیت کے مرحلے طے کر لیے تو تمہاری سفارش میں خود کروں گا اور جب تم لیفٹیننٹ بن جاؤ گے تو سب کو پتا چل ہی جائے گا۔ سال بھر کی بات ہے مگر سال میں ایک دن کی غلطی تم کو ڈسکوالیفائی کرا دے گی۔ آخری دن بھی غلطی کی تو سب ختم۔"

وہ سر ہلا کے اور چابیاں دے کر نکل گیا تو میں نے استاد ٹیڈی کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے نیک محمد کہ یہ اور کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہا... اب اسے ہوش نہیں آئے گا۔"

"تمہاری ہمت ہے سکندر بادشاہ کہ اس سے کچھ معلوم کر لیا۔" ٹیڈی بولا۔ "ورنہ یہ بتانے والا نہیں تھا۔"

"ہمارے لیے نئے راستے کھل گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ایس آئی پرویز وکرٹ کا پتا چلانا ہے۔ وہ اس ضمیر فروش ایس پی سراج کا لوکل ایجنٹ ہوگا۔ اب اس پورے نظام کی کچھ تصویر میرے سامنے ہے۔ چوہدری دلاور کے کسی ٹھکانے سے پرویز وکرٹ مال لے کر ایک ایمبولنس میں سادھو رام تک پہنچاتا ہوگا۔ سادھو رام کی بیوی دل کی مریضہ تھی چنانچہ مہینے میں ایک بار اس کے گھر کسی ایمبولنس کے آنے پر کوئی پریشان نہیں ہوتا ہوگا۔ سادھو رام یہی کہتا ہوگا کہ بیوی کو دورہ پڑا تھا اور اچانک اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ اس کے گھر کے ملازم بھی یہی بات مشہور کرتے ہوں گے۔ سادھو رام کے گھر میں ان کی موجودگی کے اسباب بھی زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔ وہ مال وصول کرتے ہوں گے اور یہ دیکھتے ہوں گے کہ ہر چیز آرڈر کے مطابق ہے۔ وہ سادھو رام پر بھی نظر رکھتے ہوں گے کہ کسی اور سے سودا نہ کرے۔ سادھو رام کا ایمان پیسہ تھا کوئی کرنل جگن ناتھ سے زیادہ دینے والا مل جاتا تو سادھو رام پس و پیش نہ کرتا مگر اس کی نگرانی کرنے والے وہاں اسی لیے رکھے گئے تھے کہ سادھو رام کو بدعہدی نہ کرنے دیں اور پھر سادھو رام کے گھر سے وہ مال سیوک اور اس کے دونوں ساتھی دلربا کے اڈے تک

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یعنی سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ تک پہنچاتے ہوں گے۔"

"مگر تم نے مال کسی ٹرک میں آتے دیکھا تھا؟" ٹیڈی بولا۔

"ہاں۔ وہ ضرورت کے وقت ٹرک منگوا لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس وائرلیس ہوگا یا ٹیلی فون۔" میں نے کہا۔ "پیغام ملتے ہی کہیں سے ٹرک آ جاتا ہوگا۔"

"سکندر بادشاہ! ابھی تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ انڈین ٹرک تھا... اشوک ٹاٹا کا۔"

"وہ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر لگا۔" میں نے کہا۔ "غالباً ایمبولنس کے دو پھیروں میں جتنا سامان سادھو رام کی حویلی میں جمع ہوتا ہوگا، وہ ایک ٹرک میں سائیں پاپڑ والے کے ڈیرے پر پہنچا دیا جاتا ہوگا۔ وہاں سے دلربا اپنے کرنل جگن ناتھ کو سگنل دیتی ہوگی کہ ڈلیوری ہو گئی ہے۔"

"کیا... کیا ہو گیا ہے؟" استاد ٹیڈی نے گڑبڑا کے کہا۔ "ہر مہینے..."

میں بے اختیار ہنسا۔ "میرا مطلب تھا کہ وہ سامان وصول ہو جانے کی اطلاع دیتی ہوگی اور کرنل جگن ناتھ ادائیگی کرنے آ جاتا ہوگا۔ مال دیکھتا ہوگا اور رقم دلربا کو دے جاتا ہوگا۔ اس کے بعد کسی وقت سرحد پار سے ٹرک آتا ہوگا اور یہ مال لوڈ کر کے لے جاتا ہوگا۔ سرحد پار کرنے میں ایک طرف سے تو کوئی دشواری نہیں۔ دوسری طرف ہمارے دشمنوں کے یار ایس پی سراج موجود ہیں۔ وہ اپنی وطن فروشی کی قیمت وصول کر کے ٹرک کو بحفاظت دوسری طرف پہنچاتے ہوں گے اور جب دوسری طرف سے مال مل جانے کی اطلاع دلربا کو ملتی ہوگی تو وہ اپنا کمیشن کاٹ کر سادھو رام کو ادائیگی کر دیتی ہوگی۔ سادھو رام اپنا کمیشن وضع کر کے باقی رقم پرویز وکٹر کو دیتا ہوگا جو اس رقم کو چوہدری دلاور تک پہنچاتا ہوگا۔ پرویز وکٹر کی فیملی بھی یا تو کمیشن لیتی ہوگی یا چوہدری دلاور کی ملازم ہوگی۔ اب ہم نقطۂ آغاز سے چلیں گے یعنی سب سے پہلے پرویز وکٹر کو تلاش کریں گے۔ پھر اس کے بھائی بہن تک پہنچیں گے۔ ان کی ایمبولنس کا سراغ لگائیں گے اور دیکھیں گے کہ اب وہ مال کہاں پہنچاتے ہیں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی بولا۔ "وہ بھائی بہن ہمیں قریب کہاں پھٹکنے دیں گے۔"

"ظاہر ہے یہ کام آسان ہوتا تو تم اکیلے بھی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "وکٹر فیملی تک پہنچنے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم چھپ کر اور بھیس بدل کر ان کے آگے پیچھے لگے رہیں اور دوسرا یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ دونوں صورتوں میں خطرہ برابر ہے مگر تیسری صورت کوئی نہیں ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ ساتھ یا ان کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا تب ہی ہمیں ہر راستے کا اور ہر منزل کا سراغ ملے گا۔"

"ٹھیک ہے کرنل! جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"میرے چاہنے کی کیا بات ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی سب پتا چل جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میرا پروگرام ہے۔ باقی سب خدا کی مرضی اور تائید پر منحصر ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر سے کیا ہوتا ہے۔"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" ٹیڈی نے بھی بڑی سنجیدگی سے نصف شعر پڑھا۔ "اور اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ ساتھ نہ ہوتا تو ہم سب کیسے ملتے؟ اسی نے ہمیں ملایا کیونکہ وہ ہم سے کوئی بڑا اور نیک کام لینا چاہتا ہے اور اسی نے ہمیں حوصلہ دیا۔ اس نے مدد نہ کی ہوتی تو کیا اب تک ہم زندہ ہوتے۔ وہ آئندہ بھی حق کا ساتھ دے گا۔"

میں نے ٹیڈی کو گلے سے لگا لیا۔ "تمہارا یقین اور ایمان دیکھ کر مجھے سہارا ملتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔"

ٹیڈی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ کوئی بہت عالم فاضل شخص نہیں تھا کہ ایسی جذباتی تقریر کر سکتا لیکن یہ اس کے دلی جذبات تھے۔ خالص اور کھرے۔ جو خود بخود الفاظ میں ڈھل گئے۔

"اب اس کا سوچو سکندر بادشاہ... یہ کہیں مر نہ جائے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے استاد کہ یہ مرنے والا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو اس کو دنیا کے عذاب سے نجات دلا دیں۔ دنیا کو اس کی اور اسے دنیا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"

ہم دونوں نے مل کر سادھو رام کو اٹھایا اور باہر کھڑی ہوئی ٹیکسی کی ڈکی میں ڈال دیا۔ پھر میں پیچھے بیٹھا اور استاد ٹیڈی نے ڈرائیونگ شروع کی۔ ٹیکسی سڑک پر آئی اور میں نے ٹیڈی کو دریا کی سمت چلنے کو کہا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ سادھو رام کو شہر سے باہر لے جا کر گولی مار دوں اور ہم اسے دفن کر آئیں مگر پھر میں نے سوچا کہ اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے غرقِ دریا کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے اور سڑکوں پر ہُو کا عالم تھا۔ جگہ جگہ ہمیں گشت کرنے والے چوکیدار ملے لیکن ٹیکسی کو کسی نے نہیں روکا۔ ٹیکسی نے شاہی قلعے کے پیچھے اور اقبال پارک کی درمیانی سڑک سے نکل کر شاہدرے جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ دس منٹ بعد ہم پل پر پہنچے۔ وہاں پولیس تھی اور اگر خطرہ تھا تو اسی جگہ کہ وہ روک کر تلاشی نہ لیں مگر عین وقت پر پولیس چوکی والوں کا ایک ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا شروع ہو گیا۔ میرے

...نے ڈرائیور نے پولیس کانسٹیبل کو تھپڑ مارا۔ کانسٹیبل کے ساتھی نے ...ل کے کندے سے ڈرائیور پر حملہ کیا اور اس کو بڑی بے رحمی سے ...شروع کیا۔ اندر سے دو اور پولیس والے نکلے اور ان تینوں نے ...ور کا حلیہ بگاڑ دیا مگر اتنی دیر میں پیچھے کھڑے ہوئے ٹرکوں کی قطار ...ے ڈرائیور اتر اتر کے آنے لگے۔ ان سب کے ہاتھوں میں سریے ...وھیل اسپنر تھے اور جیک کو گھمانے والے ہینڈل تھے۔ اپنی ...دری کے ایک رکن کے ساتھ پولیس کے ظلم کے خلاف وہ سب ...ہو گئے تھے اور اب پولیس کا مار کھانا یقینی تھا۔ یہ الگ بات ...کہ بعد میں پولیس کی بالادستی قائم رکھی جائے اور سب ...اوروں کو گرفتار کر کے الگ الگ تھانوں میں اس سرکشی کی سزا ...نا جائے۔

"ٹیکسی نکال لو استاد..." میں نے ٹیڈی سے کہا۔ "موقع اچھا ...ہے۔"

"ہاں!" ٹیڈی چونکا۔ "میں خود پولیس کی پٹائی کا سین دیکھنے ...نا تھا..."

پولیس اور ٹرک ڈرائیوروں کی مارپیٹ کے باعث پل پر ...ب طرف سے آنے والا ٹریفک جام ہو رہا تھا تو دوسری طرف ...ے ٹریفک رک گیا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے نکل آنے کے بعد صرف دو ...اریں اور پل تک آئیں۔ کاریں زن سے آگے نکل گئیں۔ اب پل ...کے آخری حصے میں کوئی نہیں تھا۔ پنڈی کی طرف سے آنے والی بسیں ...اور ویگنیں بھی رات کو کم ہو جاتی ہیں مگر گوجرانوالہ سے اور گرد و نواح ...کے دیہات سے دودھ والوں کے ٹرک آنے شروع ہو گئے تھے۔ ...نصف سے زیادہ پل عبور کرنے کے بعد میں نے ٹیڈی کے کندھے ...تھپکی دی۔

"یہاں روک لو استاد... اس طرح کہ ڈکی سائے میں رہے۔" ...میں نے کہا۔ "خود بونٹ کھول کے کھڑے ہو جاؤ۔"

ٹیڈی نے گاڑی کنارے پر روکی اور گیئر کو نیوٹرل رکھا۔ تھوڑا سا کھسکنے سے ڈکی ایک شہتیر کے سائے میں آ گئی۔ ٹیڈی نے مجھے ...چابی دی اور خود بونٹ کھولنے چلا گیا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا ...اور فوراً ڈکی میں چابی لگا دی۔ اس کا پچھلا حصہ اٹھ گیا۔ میں نے سادھو رام کو کھینچ کر نکالا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اب اِدھر اُدھر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا کم سے کم وقت میں کرنا تھا۔ مخالف سمت سے کوئی گاڑی نمودار ہو جاتی تو ہیڈ لائٹس کی روشنی ...سیدھی مجھ پر پڑتی۔ میں نے سادھو رام کو ایک عمودی شہتیر پر ...ٹکا اور خود اوپر چڑھ کے دوسری جانب اتر گیا۔ ایک بار پھر اسے ...منھ کے بل ڈالا اور دوسرے شہتیر پر رکھ دیا۔ میں ایک ترچھے شہتیر ...پر قدم جمائے کھڑا تھا اور دریائے راوی کا پانی میرے نیچے شاید سو فٹ کی گہرائی پر خاموشی سے بہتا جا رہا تھا۔ اگر میرا پیر پھسل جاتا یا توازن بگڑ جاتا تو سادھو رام وہیں لیٹا رہ جاتا اور میں نیچے دریا میں جا گرتا۔ میں اس جگہ جہاں پانی کی گہرائی سب سے زیادہ تھی لیکن اس سے میرے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہوتی۔ استاد ٹیڈی فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کے بھاگ جاتا اور میں تیر کر کنارے جا لگتا مگر سادھو رام بچ جاتا۔ اسے کوئی نہ کوئی اسپتال پہنچا دیتا جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے سادھو رام کو دھکا دیا اور دوسرے لمحے اس کے جسم کو اندھیرے میں ایک فولادی شہتیر سے ٹکرا کے اچھلتے اور پھر نیچے جاتے دیکھا۔ مجھے اس کے پانی میں گرنے کی آواز بالکل سنائی نہیں دی اور نہ میں نے اس کا انتظار کیا۔ میں فوراً اوپر چڑھا اور شہتیر پر سے سڑک پر کود گیا۔ ایک کار میرے قریب رکی۔

"یہ تم کیا کر رہے تھے؟" کار سے اترنے والے ایک شخص نے کہا۔ وہ مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے میں تخریب کار ہوں۔

"میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہا تھا۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "یہ ٹیکسی گھنٹا بھر سے خراب پڑی ہے اور یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے... میں کب تک برداشت کرتا۔ ادھر سے ٹریفک بند پڑی ہے۔"

وہ آدمی ہنس پڑا۔ "میں سمجھا تم... خیر... آئی ایم سوری۔"

وہ پھر کار میں بیٹھا اور کار روانہ ہو گئی۔

"تمہاری انگریزی کام آ گئی سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے فوراً بونٹ بند کیا اور اندر آ بیٹھا۔

"ہاں۔ انگریزی بڑے بڑے کام نکال دیتی ہے۔ انگریزی بولنے والا معتبر ہو جاتا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انگریزی شرافت کی سند بن جاتی ہے۔"

"معلوم نہیں کون تھا... خواہ مخواہ اڑ گیا۔" ٹیڈی بولا۔

"اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی رک جاتا۔" میں نے کہا... "آدھی رات کے وقت کوئی پل پر چڑھے تو شک یہی ہوتا ہے کہ کہیں پل کو اڑانا تو نہیں چاہتا... بم تو نہیں رکھ رہا ہے۔ گاڑی اب موڑ لو۔"

"سادھو رام کا کریا کرم تو ہو گیا۔" ٹیڈی نے گاڑی کو نصف دائرے میں موڑ لیا۔

"ہاں... ابھی وہ زندہ تھا۔ وقت ہوتا تو میں اس کے وجود سے راوی کے پانی کو گندہ نہ کرتا۔" میں نے کہا۔ "اسے زندہ گاڑ دیتا کسی ویرانے میں... یا جنگل میں پھینک آتا گولی مار کے۔"

ٹرک ڈرائیوروں اور پولیس کا جھگڑا ختم ہو چکا تھا مگر ایک پولیس والے نے ٹیکسی روک لی کیونکہ ٹیڈی کے پاس ٹول ٹیکس کی پرچی نہیں تھی۔ "جاتے وقت پرچی کیوں نہیں لی تھی؟" سنتری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غرّایا۔

"وہ جناب عالی! آپ کا اور ٹرک والوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔" ٹیڈی نے معصومیت سے کہا اور پچاس کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ "یہ پرچی یہاں کون دیتا۔۔۔ اب یہ لیں آپ۔۔۔"

"چلو سنتری بادشاہ! یہ جرمانہ سمجھ کے رکھ لو۔" میں نے کہا اور سنتری نہایت ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ٹیکسی کو آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہم واپس پہنچے تو ہم نے ٹیکسی سڑک پر ہی روک دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے غالب کو دیکھا۔ وہ چوکھٹ سے سر لگائے سو رہا تھا۔ ٹیڈی نے تالا کھولا اور پھر کنڈی مگر اسے خبر نہ ہوئی۔ جب دروازے کے پٹ کھلے تو وہ اندر کی جانب لڑھک گیا اور سر سہلاتا اٹھا۔

"لاحول ولا قوۃ! تم آدمی ہو کہ سانڈ۔" غالب نے ٹیڈی کو گھور کے کہا۔ "نہ آواز نہ دستک۔۔۔ گھسے چلے آئے ہو شریف لوگوں کے بے حد پرائیویٹ خواب میں۔ سر کے ساتھ اچھا بھلا خواب توڑ دیا اور وہ بھی دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا تھا۔"

"میں تو سمجھا تھا کوئی پاگل کتا آ کے دروازے پر بیٹھ گیا ہے۔" ٹیڈی نے جواب میں غرّا کے کہا۔ "اچھا ہوا پتھر نہیں مارا۔"

"اور میاں غالب۔ یہ گلی میں بیٹھ کے استنے پرائیویٹ خواب شریف لوگ دیکھتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"خواب میرے ہیں یا تمھارے۔" غالب نے تیوری چڑھا کے کہا۔ "میں گلی میں بیٹھ کے دیکھوں یا کلرٹی وی کے اینٹینا پر بیٹھ کر یا گرم توے پر بیٹھ کر۔"

"اچھا بھائی۔۔۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔" میں نے پلنگ پر بیٹھ کے کہا۔ "یہ تو بتا دو کہ خواب کس کا تھا؟"

"تھا خواب میں خیال کو ان سے معاملہ۔ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"ان سے کیا مراد ہے۔ وہی جبڑے توڑ ٹانگ موڑ اور سر پھوڑ حسینہ۔" میں نے کہا۔ "کتنی بار پٹخ چکی تھی؟"

"تم تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہو سکندر بادشاہ۔" غالب نے کہا۔ "بھلا تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

"بلّی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آئیں گے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھی خواب دیکھو گے تو اس سے مار کھانے کا۔"

"تمھارے باپ نے بھی کبھی محبت کی تھی کسی سے۔" غالب برہم ہو گیا۔ "تم کیا جانو پیار کی مار۔۔۔ اور پھر دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ وہ بھی تو خواب میں مجھے ہی دیکھ رہی ہو گی۔ تم آ کے دکھاؤ کبھی کسی کے خواب میں۔"

"بس بس۔۔۔ امن صلح آشتی۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم آج آفس میں کیوں نہیں پڑے رہے۔ کیا ایڈیٹر نے نکال دیا؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ اس وقت کون سی توپ چلا کے آ رہے ہو۔" غالب بولا۔ "کیا مورننگ واک کے لیے گئے تھے۔"

میں نے اُسے بتایا کہ ہم نے سادھو رام کو پرلوک پہنچا دیا ہے اور اس نے عالمِ فانی سے کوچ کرنے سے قبل جو مفید معلومات فراہم کی تھیں وہ کیا ہیں۔ استاد ٹیڈی نے اتنی دیر میں ہمارے لیے کافی تیار کی۔ ہمارے ساتھ رہنے سے اس کے مزاج، عادات واطوار اور ذوق میں نمایاں تبدیلی آئی تھی جو بے حد خوشگوار تھی۔ اس نے ذہنی طور پر ہمارے ساتھ مطابقت ہی نہیں کی تھی، ہماری سوچ کا انداز بھی اختیار کر لیا تھا۔ بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ذہین تھا اور ایک اچھے خاندانی پس منظر کا مالک تھا۔ حالات نے اسے جس ماحول میں پھینک دیا تھا وہاں اس کی شخصیت پر عامیانہ پن اور گھٹیا معیارِ زندگی کی گرد جم گئی تھی جسے اس نے ہماری رفاقت سے دھو ڈالا تو اندر سے وہی پیارا اُجلا نیک محمد نکل آیا جو استاد ٹیڈی نہیں تھا۔ وہ اب ہم میں سے ایک تھا تو ہمارے ہی سانچے میں ڈھل رہا تھا اور میں پیشن گوئی کر سکتا تھا کہ ایک دن اس میں، محسن میں اور مجھ میں ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں رہے گا۔ وہ کپڑے ڈھنگ سے پہننے لگا تھا۔ گفتگو میں ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ کافی پینے کا عادی ہو گیا تھا اور اپنے ماضی کو فراموش کر چکا تھا۔

"سادھو رام کے ساتھ تو تم نے ٹھیک کیا۔" غالب نے کافی پیتے، سگریٹ کا دھواں پھیلاتے اور غور فرماتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری صحافتی حس کہتی ہے کہ تم نے چن ماہی پر بہت زیادہ اعتماد کر لیا ہے۔ یہ ڈراما چلے گا نہیں۔"

"کیوں نہیں چلے گا۔۔۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"بالکل ہے۔۔۔ لیکن حد سے زیادہ جذباتی ہونا اس کی کمزوری ہے۔ ایسے لوگ بعض اوقات جوش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مرواتے ہیں یا ان کے جذبات کا رو یکلخت منفی ہو جائے تو وہ اتنے ہی خطرناک دشمن بھی ہو جاتے ہیں جتنے اچھے دوست تھے۔ اعتدال پسندی سے ہی مستقل مزاجی آتی ہے۔"

"یہ تم نے بہت عقل مندی کی بات کہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"میرا مشورہ ہے کہ فی الحال ہم غائب ہو جائیں۔" غالب نے کہا۔ "یہ نہ ہو کل چن ماہی کی کسی جذباتی حماقت کے باعث ہم اسی جگہ ایسے پکڑے جائیں کہ نکل ہی نہ سکیں۔"

"مگر وہ آدمی ہمارے کام آ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرورت پڑنے پر کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے مگر اُسے جیب میں لیے پھرنے اور اس پر بھروسا کرنے کو عقل مندی نہیں کہا جا سکتا۔" غالب نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا کیا کہ سادھو رام کو اس کے سامنے سپردِ آب نہیں کیا۔ اب اُس کے لیے ایک رقعہ چھوڑ دو کہ ہم سادھو رام کے ساتھ ایک ٹاپ سیکرٹ مشن پر جا رہے ہیں اور مکان کو تالا لگا کے کھسک لو۔ جب بھی ضرورت پڑے گی اس سے رابطہ قائم کر لیں گے اور مکان کی چابی ہمارے ہی پاس ہو گی۔"

"چن ماہی اگر لیفٹیننٹ نہ بن سکا تو سخت مایوس ہو گا۔ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کو لیفٹیننٹ بنا دینا سال بھر بعد۔ درمیان میں اس سے کام لیتے رہنا اور اسے وظیفہ بھی دینا مگر اس کے سامنے جانے کی اور اپنا نیا ٹھکانا بتانے کی ضرورت نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس عرصے میں پتا چل ہی جائے گا کہ وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔"

"تیری بات میرے دل کو لگتی ہے غالب کے بھتیجے۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہم غائب ہو جاتے ہیں مگر غائب ہو کر جائیں گے کہاں؟"

"پائے گدا لنگ نیست۔۔۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔۔۔" غالب نے کہا اور گدا کو جانتے بوجھتے گدھا کہتے ہوئے ٹیڈی کی طرف دیکھا۔

"سکندر بادشاہ! سمجھا لو اس صحافی کی دُم کو۔ پہلے اس نے مجھے سانڈ کہا تھا اب گدھا کہہ دیا ہے۔" ٹیڈی بگڑنے لگا۔

"تم نے بھی مجھے پاگل کتا کہا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور تم تو سر جھوٹ بک رہے تھے، میں سچ کیوں نہ بولوں۔"

ایک بار پھر میں نے ان کے درمیان سیز فائر کر دیا۔ "چلو ہم فی الحال محسن میاں کی زوجہ کے سایۂ عاطفت میں چلے جاتے ہیں۔ پھر کوئی نیا ٹھکانا تلاش کریں گے۔"

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے غالب کی بات میں دور اندیشی نظر آئی۔ چن ماہی پر اعتماد کا مظاہرہ ٹیڈی کو بھی پسند نہیں آیا تھا اور میں نے مذاق کی بات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ چن ماہی کی نیت کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دماغ سے زیادہ دل کی بات پر عمل کرتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی جو ایک دم نہیں بدل سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ بھی سمجھ جائے کہ یہ دل کے معاملے نہیں ہیں اور دماغ کے فیصلوں کو فوقیت دینے لگے لیکن فوری طور پر اس کی جذباتی طبیعت میں اس کے نادان دوست ثابت ہونے کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ہمارا یہاں اب بہت کم سامان رہ گیا تھا اور جو تھوڑا بہت بچا تھا وہ ٹیکسی میں لے جایا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی کی چابی ہمارے ہاتھ میں تھی اور چن ماہی کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا کہ ٹیکسی نہ ملی تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ پندرہ منٹ میں ہم نے اپنا اسباب اُٹھا لیا اور گھر کے دروازے میں قفل ڈال دیا۔ غالب نے اپنی تحریر میں دروازے کی کنڈی میں ایک رقعہ لکھ کر پھنسا دیا۔ اس میں صرف ایک جملہ تھا: "ہم ایک خطرناک مشن پر ٹمبکٹو جا رہے ہیں۔"

صبح کا ملگجا اجالا شہر پر اترنے لگا تھا جب ہم ٹیکسی میں ایم آر ایس کے اس ٹھکانے سے بھی رخصت ہوئے جسے ہم نے کچھ عرصے کے لیے بہت محفوظ فرض کر لیا تھا۔ سادھو رام کے یہاں آنے سے خطرے کا احساس خواہ مخواہ ساتھ آ گیا تھا اور مجھے کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ کہیں دشمنوں کے ایجنٹ کتے ہماری بو سونگھتے ہوئے یہاں بھی نہ پہنچ جائیں۔ وہاں سے نکل کر میں نے خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا کہ ہم بہت مناسب وقت پر وہاں سے نکل آئے۔

"میں نے ابھی تک تمھارے ایک سوال کا جواب نہیں دیا۔" غالب نے اونگھتے اونگھتے سر اٹھا کے کہا۔ "سوال بتاؤ۔"

"پہلے تم جواب بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں سوال دوبارہ بنا لوں گا۔"

"میں جو آفس کی میز پر لمبی تان کے سونے کا عادی ہوں۔" غالب بولا۔ "اور اخبار کی آخری کاپی چلے جانے کے بعد ایڈیٹر کو شب بخیر تک نہیں کہتا۔ صبح سے پہلے اس در پہ کیوں آ پڑا تھا۔"

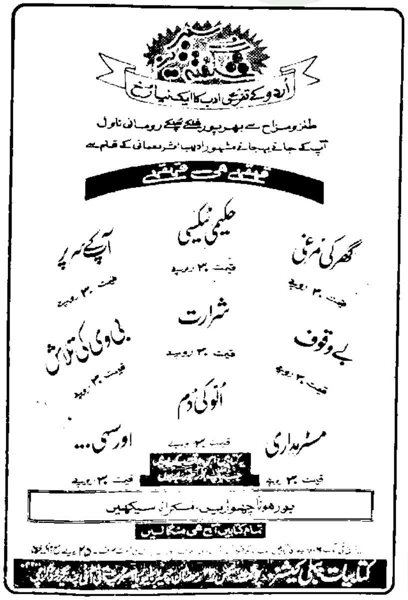

"ہاں، یہی میرا سوال تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ایڈیٹر نے باہر پھنکوا دیا ہوگا کہ رات کو دفتر میں کوڑا کرکٹ نہیں رہنا چاہیے۔"

"کبھی ایسا ہوا تو تم دیکھو گے کہ باہر کوڑے کے ڈھیر پر ایڈیٹر پڑا نظر آئے گا۔" غالب بولا۔ "مجھے تو ایک پیغام ملا تھا بلکہ میں یوں کہوں کہ میرے لیے کسی کا پیغام آیا تھا تو زیادہ رومانٹک بات ہوگی۔ اس نے مجھے الٹی میٹم دے دیا ہے۔"

"کس نے... نازو نے؟" میں نے کہا۔ "کیا کہا ہے کہ آدمی بن جاؤ ورنہ عاق کر دوں گی۔"

"اس نے کہا ہے کہ شام چار بجے تک مجھے اسپتال سے لے جاؤ۔" غالب نے کہا۔ "ورنہ آدھے اسپتال کو تباہ کر کے نکل جاؤں گی اور پھر تم کو اخبار کے دفتر آ کے تباہ کر دوں گی۔ میں بہت سخت دہشت زدہ ہوں۔ اخبار کی تو کوئی بات نہیں، لوگ دوسرا پڑھ لیں گے لیکن غالب دوسرا کہاں سے آئے گا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا..."

"اور وہ جو تم کہتے تھے کہ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس وقت تک مجھے نازو سے یعنی نازو کو مجھ سے... گویا کوئی وہ نہیں تھا... جو آپ کو رالعہ سے یا رالعہ کو آپ سے ہے۔ امید ہے آپ سمجھ رہے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ وَن وے ٹریفک ہے مرزا جی... آگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی نازو کے منہ سے کچھ سنا؟" میں نے کہا۔

"جو سنا ہے وہی تو سنا رہا ہوں۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔" وہ بولا۔ "بھئی اس نے صرف مجھے ہی پیغام کیوں بھیجا؟ یہ کیوں کہا کہ آ کے مجھے لے جاؤ۔ آخر تم بھی تو بڑے ٹارزن بنے پھرتے ہو۔"

"لیکن مجھے وہ کس پتے پر پیغام بھیج سکتی تھی؟" میں نے کہا۔

"ایک تم ہی تو تھے جس کے بارے میں وہ جانتی ہوگی کہ اخبار کے دفتر میں مل جاؤ گے۔"

"گویا تم نہیں مانو گے۔" غالب نے بھنا کے کہا۔ "میرے چاند! وہ کہلوا سکتی تھی کہ ٹارزن اور رستم سے کہہ دینا مگر اس نے براہِ راست مجھ سے کہا کہ آ کے لے جاؤ۔ غور کریں آپ 'مجھے آ کر لے جاؤ' پر...! یہ ہیروئن کی پکار ہے جو ظالم سماج کی قید میں ہے... ایسے میں ہیرو کیا کرتا ہے؟"

"پہلے تو ایک گانا گاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا ادھر ایک بند ہیروئن گاتی ہے اِدھر دوسرا بند ہیرو گاتا ہے... اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ تمھارے بس کی بات نہیں۔ صرف فلموں میں ہو سکتا ہے۔"

بھاڑ میں... میں کل اسے لینے جا رہا ہوں۔"

غالب نے کہا۔ "آدھے اسپتال کو وہ تباہ کر دے گی۔ باقی آدھے کو میں کر دوں گا... پھر کون روکے گا ہمارا راستہ... ہم سیدھے چلے جائیں گے قطبِ شمالی کی طرف یا ٹانگانیکا۔"

"کیا اس کی حالت اب ایسی ہے کہ وہ سچ مچ کچھ کر سکے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تقریباً صحت مند ہے لیکن اس لیے اسپتال میں کچھ دن اور رہنا چاہتی ہے کہ اسے لوٹ کر گھر جانا منظور نہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ سمجھتی ہے کہ گھر سے پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا اور اسٹاف رپورٹر نے خبر دی ہے کہ مس نازو بفضلِ خدا فل آف ایکشن ہیں۔ وہ تو اکیلی بھی نکل آتی لیکن وہ جو اس کا بے حد چالاک بھائی ہے نا... وہ سب سمجھتا ہے اور اس نے بڑے سخت حفاظتی انتظامات کیے ہیں۔ اسپتال میں کمرے کے دروازے کے باہر ایک شخص بیٹھا رہتا ہے جو مسلح بھی ہوتا ہے اور سنا ہے سابق کمانڈو ہے۔ وہ نازو کو ہاتھ پیر توڑ کے مزید دو ماہ کے لیے لٹا سکتا ہے۔ اندر بھی یا تو شیخ خود موجود رہتا ہے، عموماً دن میں... رات کو اس کے ابا ہوتے ہیں۔ شیخ سے یوں نمٹنا مشکل ہے کہ وہ ہمیں فوراً پہچان جائے گا اور اس کے ابا کو ناک آؤٹ کرنا اس لیے مشکل ہے کہ وہ ایک شریف اور وضعدار آدمی ہیں... بزرگ ہیں۔"

"یہ سب اطلاعات اس پیغام کے ساتھ ملی تھیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں... وہ دراصل... پیغام ملنے کے بعد میں نے کچھ جاسوسی کی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔" غالب نے سر کھجا کے خفت سے کہا۔

"فکر مت کرو دوست۔" میں نے مرزا کے کندھے پر ہاتھ مارا... "تم کو ایسے ملوا دیں گے جیسے اب خوابوں میں ملتے ہو۔"

ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ ہم تنے گھر کے دروازے پر جا اترے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو استاد ٹیڈی سویا پڑا تھا۔ وہ جاگ رہا ہوتا تو اتنی دیر خاموش نہ رہتا اور کسی نہ کسی بات پر اس کی غالب سے جھڑپ ضرور ہوتی۔ میں نے دستک دی تو محسن آنکھیں ملتا نکلا۔ اتنی صبح ہمارے آنے کی شہلا بھی نہیں سوچ سکتی تھی چنانچہ وہ بھی اپنے گھر والے کے پیچھے متفکر نظر آئی۔

"آخر... [illegible] ہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "شرفا کیا ابھی تو مرغے بھی سوئے پڑے ہیں۔"

"ہم کیا کریں... علامہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" میں نے سامان اتارتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں غریب نہیں ہوں۔" محسن بولا۔ "میں عجیب و غریب ہوں... وہ میرا سالا وہیں بھول آئے ہو کیا؟"

"نہیں... وہ پچھلی سیٹ پر مرا پڑا ہے۔" غالب نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بلاتا ہوں اُسے۔" محسن نے کہا اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ پھر ٹیڈی کے کان پر مُنہ رکھ کے سائرن کی طرح آواز نکالی۔ ٹیڈی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس نے کان میں انگلی ڈال کے ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ صورِ اسرافیل تھا مُردے۔" غالب نے کہا" اپنی قبر سے نکل آ۔"

اندر پہنچ جانے کے بعد ہم نے محسن کو اپنی ہجرت کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا اور سادھو رام سے تفتیش کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ پیش کیا۔ شہلا نے فوراً امورِ خانہ داری سنبھال لیے تھے اور ہمارے لیے چائے ناشتے کا انتظام کرنے میں لگ گئی تھی۔ اس نے سادھو رام سے تفتیش اور اس کے انجام کے بارے میں کچھ نہیں سنا' ورنہ وہ خواہ مخواہ دہشت زدہ ہوتی۔

"تم لوگ وہ سب کچھ وہیں مدفون چھوڑ آئے؟" محسن بولا۔

"استاد ٹیڈھی کا خزانہ اور وہ انڈین کرنسی۔"

"اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے کھود کر ساتھ لاتے۔" میں نے کہا۔" اور پھر ابھی اس کی ضرورت بھی کہاں ہے۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لائیں گے۔ اسے ساتھ لیے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"لیکن ایک چیز ہے جسے بہر حال نکال کے لانا ہے۔" غالب نے کہا" وہ زیادہ مشکل کام ہے۔"

میں ہنسا۔" معاف کرنا دوست... میں اُسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔"

"یہ کس چیز کا ذکر ہو رہا ہے؟" محسن بولا۔" میں نے اُسے نازو کے پیغام کے بارے میں بتایا۔

"یہ کام تو خطرناک ہے۔" محسن نے کہا۔

"وہ لڑکی بھی بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا" اس نے جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسی ٹیم کی ضرورت ہے جو سادھو رام سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کچھ کر سکے۔ رابعہ کے نکل جانے سے اور شہلا کے بیاہ رچا لینے سے ایم آر ایس کا زنانہ شعبہ خالی پڑا ہے۔ رابعہ کا کچھ پتا نہیں کہ وہ پھر کب ہمارا ساتھ دینے کے قابل ہوگی اور شہلا کو ہم ساتھ رکھنے کے خلاف ہیں۔ نازو ہی وہ لڑکی ہے جو کسی بھی خطرناک مشن پر ہمارے ساتھ جا سکتی ہے۔ نازو جیسی لڑکی ہر مرحلے میں کام آ سکتی ہے۔"

تم لوگ بہت خود غرض ہو کے سوچتے ہو۔" غالب نے کہا۔

"اسے صرف اس لیے لانا چاہتے ہو کہ وہ تمہارے لیے کارآمد ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ نازو ہے اور اس لیے نہیں کہ میں چاہتا ہوں۔"

"وہ ویسے بھی وہاں رُکنے والی نہیں ہے۔" میں نے کہا" اور جہاں تک اس کے کارآمد ہونے کا تعلق ہے تو مرزا جی ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں اور سب پار اتر جائیں گے یا سب ڈوب جائیں گے۔ مگر وقت آنے پر ہاتھ پیر تو سب ہی چلائیں گے۔"

"اب تم نے طعنہ دے دیا ہے تو خواہ کچھ بھی ہو جائے... آج اُسے لے آئیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن کیسے؟ جہاں وہ قید ہے وہاں محاورے کے مطابق پرندہ پر نہیں مار سکتا۔" غالب نے کہا۔

"ہم پرندے نہیں ہیں۔" محسن بولا۔" اور اگر کچھ مارنا ہی ہو تو ہم پر نہیں مارتے گولی مارتے ہیں۔"

"صبح صبح کس کو گولی مار رہے ہو۔" شہلا ناشتا لے کر اندر آئی۔

ناشتا کرتے ہوئے ہم نے نازو کو نکال لانے کا پلان اتفاق رائے سے منظور کیا۔ پھر ہم جو رات بھر کے تھکے ہوئے تھے سو گئے اور محسن ضروری انتظامات کرنے چلا گیا۔ فی الحال ہم نے ٹیکسی واپس کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب ہم سو کر اٹھے تو محسن واپس آ چکا تھا۔ اس نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا کہ سب بندوبست ہو گیا ہے اور کھانے کے بعد ہم ٹھیک دو بجے روانہ ہوں گے تو ان شاء اللہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔ شہلا نے دوپہر کے کھانے میں بھی بڑا اہتمام کیا تھا۔

"لوگ کچھ بھی کہیں... شادی کے فائدے بہت ہیں سکندر بادشاہ..." مرزا غالب نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ بیوی نازو جیسی نہ ہو۔" میں نے کہا" کہ سال کے چھ مہینے آدمی ہسپتال کا کھانا کھائے۔"

"اور سال کے باقی چھ مہینے اس سے مار کھائے۔" استاد ٹیڈھی نے تائید کی۔

"تم دونوں کو لیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔" ایک تو ویسے ابھی لنڈورے ہی پھر رہے ہیں۔ دوسرے کو وہ پہچانتی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے وہ جانتے بوجھتے ایسا کر رہی ہے۔ یادداشت کھو جانے کا بہانہ ہے ورنہ وہ تو پیچھا چھڑانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔"

زیادہ باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے محسن اور شہلا کو تیار ہو جانے کا سگنل دیا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

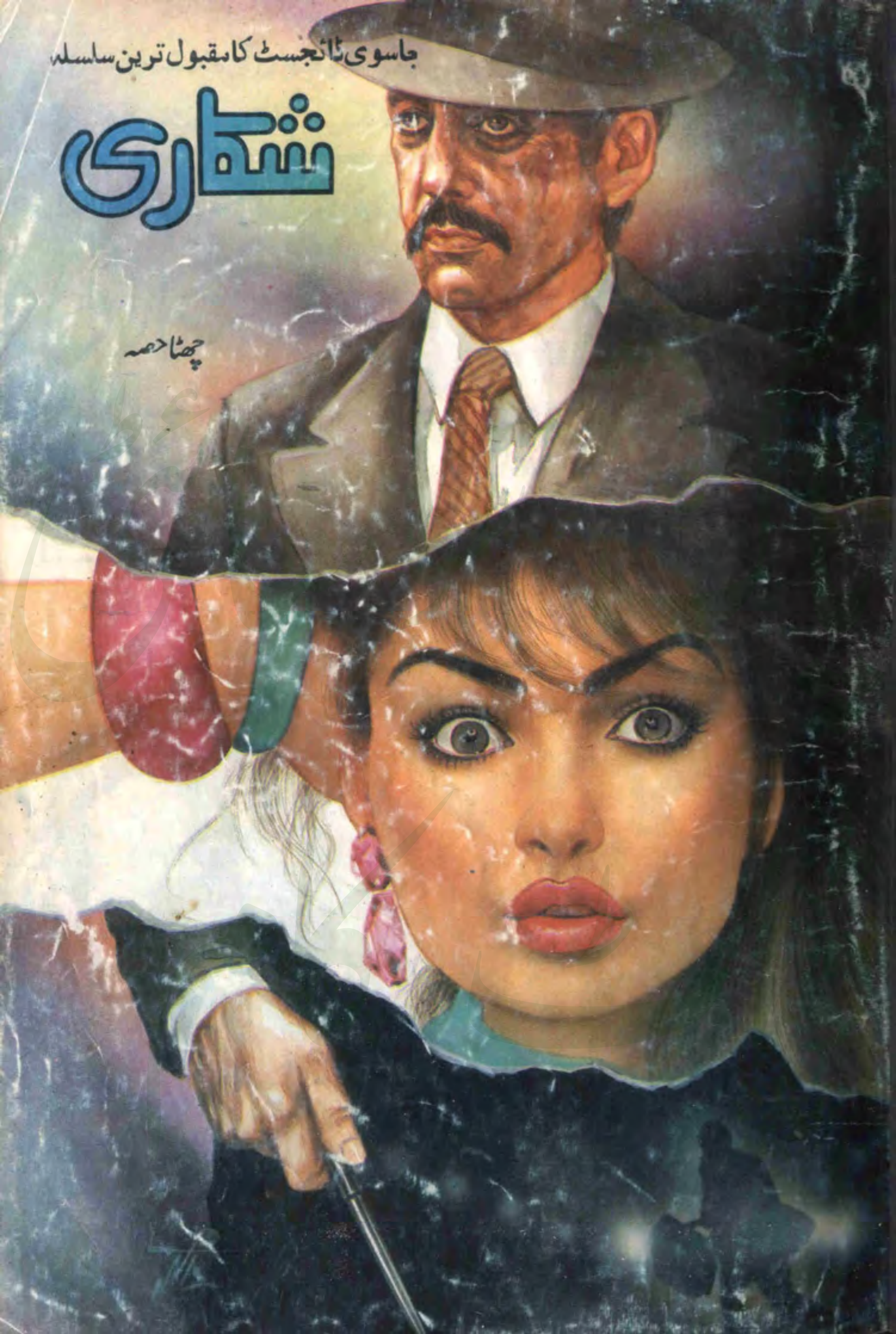
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
چھٹا حصہ

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد پیر روڈ ۔۔۔ گاہ روڈ ۔۔۔

معاشرے کے اُن ناسوروں کی رُوداد جو گوشت و پوست کے گرد کر مذیبوں میں اُتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے

زندہ کرداروں پر مشتمل جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا سلسلہ

نئی سوچ نیا رنگ نیا لہجہ نیا آہنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

شہلا بہت مدت کے بعد ہمارے ساتھ کسی مہم میں شرکت کے لیے جا رہی تھی اور اگرچہ صحیح معنوں میں اسے مہم کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ نازو کو بہ رضا و رغبت اور صحیح سلامت اسپتال سے ہائی جیک کرانے میں مار دھاڑ اور قتل و خونریزی کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ جب شہلا نے نرس کا لباس پہنا تو سب سے زیادہ محسن کے دل پر اثر ہوا۔

”دل چاہتا ہے اسی وقت بیمار ہو کے یہیں لمبا لیٹ جاؤں“ اس نے نہایت رومانٹک آہ بھر کے کہا۔

”لیٹ جا۔ نرس صرف تیمار داری کر سکتی ہے“ میں نے کہا۔

”علاج تو میں ہی کروں گا نا۔ اور میرا طریقہ علاج ایسا ہے کہ آئندہ ہونے والے امراض بھی بھاگ جاتے ہیں۔ مریض کو میں نہیں بھاگنے دیتا۔“

”اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے“ غالب نے کہا۔ ”ارے بھائی مریض یہاں نہیں میو اسپتال میں چشم براہ ہے۔ ان میاں بیوی کا تو فرسٹ ایئر ہے۔ فرسٹ ایئر فول شوہر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور بیویاں ان سے زیادہ احمق کہ خوش ہوتی ہیں۔ تم لوگ جاؤ ورنہ نکالے جاؤ گے۔“

چن ماہی کا جمبو جیٹ گلی کے رن وے پر لایا گیا تو ہائی جیکرز جن کی تعداد چار تھی فوراً اس میں سوار ہو گئے۔ میں ایک ڈاکٹر کے روپ میں اسپیشلسٹ لگتا تھا۔ میں نے شیو کرنا چھوڑ رکھا تھا چنانچہ میری داڑھی ایک مشت کے لگ بھگ ہو گئی تھی مگر جھاڑ جھنکاڑ نہیں تھی۔ نفاست سے تراشی ہوئی تھی اور اوپر سے بالوں کی بڑھی ہوئی قلموں سے مل جاتی تھی۔ محسن کے مشورے پر میں نے ہائیڈروجن پراکسائڈ سے سیاہ رنگ کو سنہری مائل بھورا کر لیا تھا۔

میرے سر کے بال پہلے تو درویشوں جیسے ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ایک ہیر آرٹسٹ کے مشورے سے ان بالوں کو درمیان سے بنانا شروع کیا اور گدی پر سے بڑھا لیا تھا۔ روانگی سے چند لمحے پہلے میں نے آنکھوں میں نیلے رنگ کے کنٹیکٹ لینسز لگائے تو بقول مرزا غالب کے میں ”ملعون فرنگی“ نظر آنے لگا۔ گاؤن اور گلے میں اسٹیتھسکوپ ڈال کر میرے لیے میو اسپتال کے سیکڑوں جونیئر اور سینئر ڈاکٹروں کی بھیڑ میں شامل ہو جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا خصوصاً اس حالت میں کہ ایک مکمل نرس مکمل ساز و سامان کے ساتھ ہمراہ ہو۔ غالب کو عمداً ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا تھا۔ اس کا ہر جگہ ہمارے ساتھ نظر آنا اور ہر جائے واردات پر پایا جانا دانش مندی کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ وہ پس منظر میں رہتے ہوئے ہماری بہت زیادہ مدد کر سکتا تھا۔ اخباری دنیا سے پرانے تعلق کے باعث اس کے مراسم اور اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ ہر جگہ سے

نہیں لا سکتا تھا۔ غالب کو ہمراہ نہ لے جانے کی اصل وجہ یہی تھی مگر ٹیڈی نے کہا کہ وہ مجسم عاشق ہے اور نازو کو دیکھتے ہی اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تو وہ اول فول بکنے لگے گا اور سب کا کونڈا کردے گا۔ غالب نے جواب میں کہا کہ عقل آخر بھینس سے بڑی چیز ہے۔ گھاس نہیں کھائے گی تو بھوسا کھائے گی مگر جس کے سر میں پہلے ہی عقل کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہو اس جانور کو خود گھاس کھانی چاہیے۔ ان کی لڑائی محسن نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ختم کردی۔

میرا اسپتال کے اندر پہنچ کر ٹیڈی نے محسن کی جگہ لے لی۔ اس نے مجھے ایمرجنسی کے گیٹ پر اتارا۔ پھر ٹیکسی کو واپس لے گیا اور اسی بلاک کے پیچھے شہلا کو اتار دیا۔ شہلا کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چند شیشیاں۔ ایک پیالی میں روئی اور تھرمامیٹر وغیرہ تھے۔ اس کی اور میری ملاقات ایمرجنسی وارڈ کے اندر یوں ہوئی کہ برآمدے کے پچھلے حصّے سے وہ نمودار ہوئی اور دوسری جانب سے میں اندر گیا۔ وہ دائیں جانب مڑی اور میں بائیں طرف مڑا۔ تقریباً ایک ہی جگہ ہم ساتھ ہو گئے۔ اس طرح کہ کسی کو احساس تک نہیں ہو سکا حالانکہ وہاں ایمرجنسی کیس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس والے اور لواحقین جمع تھے۔ ڈاکٹرز، نرسیں اور وارڈ بوائے سب کا اجتماع تھا لیکن سب کی مصروفیت اور انہماک کا یا افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔ ماتحت نرسوں کی طرح شہلا مجھ سے دو قدم پیچھے رہی اور میں ڈاکٹروں کی سی شانِ بے نیازی سے کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر چلتا گیا۔ ہم تیسرے دروازے سے نکلے اور اسی طرح آرتھوپیڈک یعنی ہڈیوں کے وارڈ تک گئے۔ وہاں محسن گیٹ کے سامنے درخت کے نیچے گم صُم کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی مریض کے ساتھ آیا ہے جس کی حالت تشویش ناک ہے چنانچہ وہ لوٹ کر گھر بھی نہیں جا سکتا اور منتظر ہے کہ موقع ملے تو نظر بچا کے وارڈ کا ایک چکر لگا لے۔ بائیں جانب کچھ فاصلے پر ٹیڈی اپنی خاکی بشرٹ اور پتلون کے ساتھ پی کیپ پہنے بالکل ٹیکسی ڈرائیوروں کے انداز میں بونٹ کا سہارا لیے موجود تھا اور کسی سواری کا انتظار کرتا نظر آتا تھا مگر وہ محسن کے اشارے کا منتظر تھا جب اسے ٹیکسی کو ٹھیک وارڈ کے دروازے کے سامنے سیڑھیوں تک لے جانا تھا۔

ہم نے سر کی خفیف سی جنبش سے ایک دوسرے کو سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ پھر میں شہلا کے ساتھ اس وارڈ میں سے گزرا جو جنرل وارڈ تھا۔ دو چار مریضوں کے پاس خواہ مخواہ رکا اور ان کے بیڈ سائڈ پر آویزاں چارٹ وغیرہ دیکھے۔ ایک مریض کو تسلی دی جو بہت شور کر رہا تھا اور دوسرے کی شکایت سنی جسے سب سے گلہ تھا۔ نرسوں سے ڈاکٹروں تک اور ناقص دواؤں سے خرابیٔ تقدیر تک۔ اس وارڈ سے نکلتے ہی سیمی پرائیویٹ وارڈ شروع ہو گئے جہاں ایک کمرے میں دو مریض رکھے جاتے تھے۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ سات نمبر کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت کوئی ڈاکٹر پہلے سے موجود ہوتا تو میں اپنی ایک جھلک دکھاتا اور "سوری" کہہ کر دروازہ پھر بند کر دیتا۔ دوسرا ڈاکٹر یہی سمجھتا کہ میں غلطی سے سات نمبر میں داخل ہونے والا تھا لیکن اندر نازو کے علاوہ صرف ایک عورت تھی جو غالباً کسی حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور یہ ٹانگ چھت سے معلق اسپرنگ والے ہینگر میں یوں رکھ دی گئی تھی کہ اسے خفیف سا جھٹکا بھی نہ لگے۔

نازو بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے نرس اور ڈاکٹر کے آنے پر بے زاری کے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ دوسرے لمحے میں اس نے شہلا کو پہچان لیا۔ اس کے لبوں پر ایک مسرت خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ کمرے کے باہر دروازے پر بیٹھے ہوئے پولیس کے اے ایس آئی نے ہم پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر اخبار دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لیے ایک ڈاکٹر کا کسی نرس کے ساتھ آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ پوچھنا بھی ضروری نہیں تھا کہ ہم دو میں سے کس مریض کے چیک اپ کے لیے آئے ہیں۔ دوسری زخمی عورت نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور کراہنے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ بڑی تکلیف ہے ٹانگ میں۔ کمر تختہ ہو گئی ہے۔ اوپر سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ گھنٹی دبا دبا کے میری انگلیاں درد کرنے لگتی ہیں۔ کوئی پانی پلانے بھی نہیں آتا۔" اس نے ایک ہی سانس میں ذاتی تکالیف اور مسائل کا رونا شروع کیا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں آپ کو بی بی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس مریض کو ڈسچارج کرنا ہے پہلے۔"

"مجھے تو ڈاکٹر صاحب سوئی لگا دیں۔ کچھ آرام آجائے۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔" وہ اسی طرح بولتی رہی لیکن میں نازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا بات ہے مس نازو؟" میں نے کہا۔ "تمہارے ساتھ کوئی محافظ نہیں ہے؟"

"بھائی جان ہیں۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ "سگریٹ پینے گئے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔" ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ شیخ اندر آگیا۔ میں نے فوراً شہلا کی طرف پلٹ کر ٹرے میں سے تھرمامیٹر اٹھا لیا اور نازو کے منہ میں لگا دیا۔ شیخ چپ چاپ ہمارے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے بلڈ پریشر چیک کرنے والا آلہ اٹھایا اور بیڈ سائڈ پر رکھ کر نازو سے آستین اوپر کرنے کو کہا۔

نازو نے منہ بناتے ہوئے آستین اوپر کرلی اور میں نے ماہر ڈاکٹر کی طرح اس کے بازو پر پٹی لپیٹ کر کس دی جو بلڈ پریشر چیک کرنے والے آلے سے منسلک تھی۔ پھر میں نے ربر کے غبارے کو ہاتھ سے دبا کے ہوا ابھرنا شروع کی اور پارے کو اس آلے کی نالی میں چڑھتا دیکھتا رہا۔ ایک خاص بلندی تک پہنچ جانے کے بعد پارا نیچے آنے لگا اور میں نے ہوا کو تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتے ہوئے نظر بلڈ پریشر کی ریڈنگ پر رکھی۔

"یو آر فائن مس نازلی۔" میں نے کہا۔ اس وقت میری آواز بھی اتنی بدل گئی تھی کہ شیخ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اندیشہ شہلا کی طرف سے تھا مگر اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنی پشت اکرام شیخ کی جانب رکھی۔

"یار، یہ تو میں آپ لوگوں سے پہلے بھی کہتی تھی۔" نازلی نے کہا۔

"آپ کے کہنے اور ہمارے کہنے میں فرق ہے۔" میں نے کہا۔ "فیصلہ کرنا ڈاکٹر کا کام ہوتا ہے۔ ابھی آپ کو کمزوری ہے۔ بلڈ پریشر ۷۰/۱۱۰ ہے جو ۸۰/۱۲۰ ہونا چاہیے۔ وزن کچھ بڑھائیے۔ سلم رہنے کے شوق میں ڈائٹنگ کا روگ پالنے سے انیمیا بڑھ جائے گا۔"

"میں تو بہت کھاتی ہوں ڈاکٹر صاحب۔" نازو نے کہا۔

"کیا کھاتی ہوں، اَلا بَلا۔" شیخ نے پیچھے سے کہا۔ "یہ بھی بتا دو۔ چھولے اور دہی بھلّے۔ قلفی فالودہ۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ پروٹین ہونے چاہئیں غذا میں۔ گوشت، انڈے، کلیجی۔ سیب کا جوس ایک گلاس ہر روز پی سکیں تو سب سے بہتر۔ مکمل ریسٹ۔ ویسے کسی چیز سے پرہیز نہیں۔"

"یعنی گول گپے۔ آلو چھولے۔ دہی بھلّے کھا سکتی ہوں میں؟" نازو نے مسرت سے کہا۔

"ہاں۔ مگر دیکھیے، یہ خوراک نہیں ہے۔ زبان کا چٹخارا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوائیں کیا ہیں؟" میں نے میز پر رکھی ہوئی دواؤں پر ایک نظر ڈالی اور پھر چارٹ پر۔ "ایمپی کلاکس بند کردیں۔ آٹرین کیپسول صبح شام۔ درد ہو تو نیا ڈول لے لیں ورنہ نہیں۔ سریکس ایک کردیں۔ صرف رات کو۔ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"بھائی ہیں میرے۔" نازو نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور اکرام شیخ کرسی سے اٹھ کر آگے آیا۔ اس نے اخلاقاً مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ میرے لیے سب سے خطرناک لمحہ تھا۔ وہ مجھے شناخت کر لیتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا۔ اس کارروائی پر دوسری عورت سائرن کی طرح چلّانے لگتی تو اسے بھی فوراً خاموش کرنا ضروری ہو جاتا لیکن اکرام شیخ نے میری صورت سے زیادہ میری بات پر توجہ دی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ شک نہیں تھا کہ میں کوئی جعلی ڈاکٹر ہوں ورنہ وہ بہت ذہین اور انتہائی تیز نظر رکھنے والا آدمی تھا۔

"آپ ان کو گھر لے جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آفس سے سلپ بنوا لیں۔ ایمبولینس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیکسی میں بھی جا سکتی ہیں۔"

"میرے پاس ٹرانسپورٹ ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں گھر فون کر کے والد صاحب کو بلا لیتا ہوں۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور دوسری عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہلا نے یوں رُخ بدلا کہ وہ میری اوٹ میں رہی۔ اتنی دیر میں اکرام شیخ بھی باہر جانے کے لیے دروازے کا رُخ کر چکا تھا۔ میں نے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دوسرے کیس کو بھی دیکھا۔ شہلا نے نازو کو اٹھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ شہلا میری ہدایات کے مطابق زخمی عورت کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے اس کے بازو پر پٹی لپیٹ رہی تھی کہ میں نے دروازہ کھول کے سر نکالا۔

"انسپکٹر۔ یہ جو صاحب ابھی نکلے تھے۔ انسپکٹر اکرام شیخ۔" میں نے کہا۔ "ذرا اسے فوراً بلا لاؤ۔ وہ ایمرجنسی میں گیا ہے ڈاکٹر اشرف کے پاس۔"

انسپکٹر بادلِ ناخواستہ اٹھا اور پتلون کو اوپر کھینچ کر مخالف سمت میں چل پڑا۔ کاریڈور کے آخری حصّے میں کھڑے ہوئے محسن نے جواب کپڑوں پر لیب اسسٹنٹ کا سفید کوٹ پہن چکا تھا ایک اسٹریچر کو دھکیل کر آگے لانا شروع کیا۔ ٹائمنگ ابھی تک بالکل ہمارے پلان کے مطابق جا رہی تھی۔ محسن کو دروازے پر متعین پولیس والے کے ہلتے ہی آگے آنا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے نازو کو نکل جانے کا اشارا کیا۔ شہلا اسے آہستہ سے کہہ چکی تھی کہ انھی کپڑوں میں جانا ہے اور چادر ساتھ لے جانی ہے۔ میں دوبارہ اس زخمی عورت کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سرہانے بہت سے ایکس رے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ایکس رے کو روشنی کے رُخ کر کے دیکھا۔ قدرتی طور پر عورت کی نظر بھی اِدھر ہی رہی اور اس نے نازو کو چادر بغل میں دبا کے چوروں کی طرح نکلتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر کیا ہوگا۔ نازو فوراً اسٹریچر پر لیٹ جائے گی اور شہلا اس پر چادر کو یوں پھیلا دے گی جیسے نیچے کوئی لاش ہے۔ جہاں زندگی اور موت کا کھیل دن رات جاری رہتا ہو اور ہر روز ایسے ہی درجنوں افراد رخصت کیے جاتے ہوں وہاں اسپتال کا عملہ بالکل متوجہ نہیں ہوتا۔ ان کے لیے وہ زیادہ قابلِ توجہ ہوتے ہیں جن کے لیے زندگی کی جدّ و جہد جاری ہو۔ صرف غیر متعلقہ افراد جو مریضوں کے لواحقین ہوتے ہیں، اس سفر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں دعا کرتے ہیں کہ ان کے عزیز یا دوست کی واپسی یوں نہ ہو۔ وہ بھی اسٹریچر دھکیلنے والوں کی طرف نہیں، اس کی طرف دیکھتے رہتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں جو امیدِ شفا لے کر آیا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ موت تو پہلے ہی سے یہاں اس کے انتظار میں ہے۔

میں نے عورت کو پھر تسلی دی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ اس عورت کو پہلے تو سمجھ ہی نہ آئی ہوگی کہ ایک معتبر اور سنجیدہ صورت ڈاکٹر نے ایسی حرکت کیوں کی۔ اگر اسے دال میں کالا محسوس ہوا ہوگا تو اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا ہوگا، کسی کو پکارنا شروع کیا ہوگا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے لیے تو بستر سے اٹھنا بھی محال تھا۔ اسپتال کا عملہ اتنا مستعد نہیں تھا کہ گھنٹی سنتے ہی آجاتا اور دروازے پر بیٹھنے والا اے ایس آئی کسی ایمرجنسی وارڈ میں شیخ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا یا کسی ڈاکٹر اشرف کو پوچھ رہا ہوگا۔ اشرف نام کا ڈاکٹر مل گیا تو زیادہ مزے کی بات ہوگی۔ وہ کہے گا کہ ابھی اے ایس آئی اکرام شیخ آپ کے پاس آیا تھا۔ ڈاکٹر کہے گا کہ میں کسی اکرام شیخ کو نہیں جانتا تو وہ کہے گا کہ اچھا آپ چلیں سات نمبر یعنی پرائیویٹ میں۔ ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے ڈاکٹر مزید چراغ پا ہوگا کہ ایمرجنسی کا آرتھوپیڈک سے کیا تعلق اور یہاں سے میں وہاں کیسے جاسکتا ہوں۔ کون ہے وہ ڈاکٹر جو مجھے بلا رہا ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے کھڑکی سے دور ہو کے اینٹوں سے بنے ہوئے تین فٹ چوڑے راستے پر چلنا شروع کیا اور پھر سڑک کی طرف مڑ گیا۔ اسٹیتھسکوپ اب میرے ہاتھ میں تھا۔ بہت سے میڈیکل کے جونیئر طلبا نے مجھے بلا وجہ یا عادتاً سلام کیا۔ میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گیٹ کی طرف سے باہر آیا اور نیلا گنبد تک چلتا گیا۔

دس منٹ تک بے مقصد کھڑے رہنے کے بعد مجھے تشویش ہونے لگی۔ دس منٹ میں ٹیکسی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اندیشوں نے مجھے گھیر لیا۔ کہیں شہلا اور محسن کا اس وقت تو اکرام شیخ سے آمنا سامنا نہیں ہوگیا جب وہ اسٹریچر کو دھکیلتے لے جارہے تھے؟ محسن کے پہچانے جانے کے امکانات بھی اتنے ہی تھے جتنے شہلا کے۔ اکرام شیخ بے خیالی میں تو پاس سے گزر جاتا مگر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھے یا شہلا کو پہچان کے بھی انجان بنا رہا ہو اور خاموشی سے باہر نکل گیا ہو۔ تاکہ ہماری گرفتاری کو یقینی بنانے کے لیے صحیح انتظام کرسکے۔

پندرہ منٹ بعد میری بے چینی بڑھ گئی اور میں ہر دس سیکنڈ کے بعد گھڑی دیکھنے لگا۔ ٹیکسی کو پانچ سات منٹ میں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ٹیکسی دوسری گاڑیوں کی طرح ایک مشین تھی جس کے ان گنت پرزے اسے حرکت اور قوت دیتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک فعال پرزہ خراب ہوجائے یا ٹوٹ جائے تو اسے معمولی واقعہ کہا جاسکتا ہے۔ حادثہ یہ صرف ان کے لیے ہوتا جو ٹیکسی میں سوار تھے۔ ٹائر کا فلیٹ ہوجانا تو بہت عام سی بات تھی مگر وہ پہیہ بدلنے لگتے تو اس عمل میں دس منٹ لگ جاتے اور اتنی دیر میں تعاقب کرنے والے آجاتے۔ معاملہ منٹوں کا تھا گھنٹوں کا نہیں، دس منٹ سے کم وقت میں اے ایس آئی واپس لوٹ آیا ہوگا جسے میں نے دروازے کی پہریداری سے اٹھا کے ایمرجنسی وارڈ میں خواری کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اکرام شیخ بھی لوٹا ہوگا اور اندر سے دروازہ بند پانے کے بعد انھیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی ہوگی کہ معاملہ کیا ہے۔ دروازہ توڑنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اکرام شیخ بھی پچھلی طرف جا کر کھڑکی کے راستے کمرے میں پہنچا ہوگا اور وہاں اس موٹی عورت نے سب کچھ بتا دیا ہوگا جو ایک ٹانگ جھولے میں رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ یہ تفتیش تو بعد میں ہوگی کہ وہ ڈاکٹر کون تھا اور وہ نرس کون تھی۔ اکرام شیخ فوراً سمجھ جائے گا اور اپنی بہن کو اغوا کر کے لے جانے والوں کو گولی مار دینے کے لیے دوڑے گا۔ وہ اے ایس آئی جسے دروازے پر پہرا دینے کے لیے بٹھایا گیا تھا مفت میں مارا گیا۔ اس کو فوراً معطل کر دیا جائے گا۔ کوئی یہ عذر قبول نہیں کرے گا کہ حکم دینے والا ڈاکٹر تھا یا کمشنر۔

بیس منٹ بعد میرے وسوسے یقین میں بدلنے لگے کہ محسن اور ٹیڈی کے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس نے انھیں روک لیا یا پھر پلان بدل کے کسی اور سمت میں نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا اور پھر واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ وہ نکل چکے ہیں یا اندر ہی پھنس گئے ہیں۔ دوسری صورت میں مجھے ان کی مدد کرنا تھی اور ہر طرح ان کو گرفتار ہونے سے بچانا تھا ورنہ ان پر بہت سے سنگین الزامات عائد ہو جاتے اور ایک طرف تو نئے نویلے میاں بیوی آج رات اپنے بیڈ روم کے بجائے حوالات میں بسر کرتے تو دوسری طرف نازو کو گھر لے جا کر سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ قید کر دیا جاتا۔ واپس جاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس بار نازو پکڑی گئی تو والدین اس کے پاگل پن کا روایتی علاج کریں گے یعنی اسے فوراً بیاہ کر اپنے گھر سے اس بلا کو نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں کریں گے جس کی وجہ سے ان کی ناک کٹنے کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔

ٹیکسی وہاں نہیں تھی جہاں میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ میں اندر کی سڑکوں سے واقف تھا۔ ٹیکسی اگر اس راستے سے نہیں آسکی تھی جدھر سے میں آیا تھا تو یہ ہوسکتا تھا کہ دوسری طرف کے راستے سے نکل گئی ہو۔ ابھی میں کینٹین کے پیچھے پہنچا ہی تھا کہ میں نے ٹیکسی کو زمین پر بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ اس کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو کر فلیٹ ہوچکے تھے اور غالباً ٹیکسی بے قابو ہو کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گئی تھی۔ ٹیکسی کے چاروں دروازے کھلے ہوئے تھے اور اندر کوئی نہیں تھا۔ باہر دس گز کے فاصلے پر کچھ لوگ ایک حلقہ بنائے کھڑے ہوئے تھے اور ٹیکسی کے پاس دو مسلح پولیس مین کھڑے سب کو دفع ہوجانے کی تلقین کر رہے تھے لیکن تجسس کے مارے ہوئے تماشا دیکھنے والے زیادہ مستقل مزاج تھے اور وہیں جمع تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ نازو کو بحفاظت نکال لینے کا منصوبہ ناکام ہوگیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ حضرات و خواتین پر کیا بیتی۔

اگر میں اس مجمعِ عام میں پہنچ کر براہِ راست سوال کرتا کہ جب قافلہ لٹا تو مسافر کہاں گئے، تو ایک ڈاکٹر نظر آنے والے کے لیے بہت نامناسب بات ہوتی۔ براہِ راست پولیس سے بھی کچھ پوچھنے میں خطرہ تھا چنانچہ میں چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے طلبا کے ایک گروپ کی طرف بڑھا۔ گروپ میں دو طالب علم، ایک خاصے دلکش نقوش والی نرس اور ایک واجبی صورت والی طالبہ شامل تھے۔

"یہ کیا ہوا ہے یہاں؟" میں نے آواز کو بارعب بنا کے انگریزی میں کہا اور اپنے پیچھے اشارا کیا۔

"فلمی ڈراما۔" ایک طالب علم نے ہنس کر کہا "ڈزا ڈز۔ مار دھاڑ بہت دلچسپ سین تھا۔"

"ایک مریضہ کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے جارہے تھے۔" دوسرے نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اسپتال کے کپڑوں میں تھی پھر ایک پولیس کے آدمی نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ اسکوٹر پر آیا تھا۔" ان سب کے ہاتھوں میں کولڈ ڈرنک کی بوتلیں تھیں۔

"اور اس نے اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے لٹا دیا تھا۔ ٹیکسی اس کے اوپر سے گزر جاتی۔" پہلے والے طالب علم نے کہا۔

"لیکن وہ بہت پھرتیلا تھا۔ اسکوٹر کو بالکل ٹیکسی کے سامنے گرا کے وہ خود جمپ لگا گیا۔" دوسرے نے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے باوجود ٹیکسی نکال کر لے جانے کی کوشش کی۔ اسکوٹر والے نے دو فائر کیے اور ٹائر پھاڑ دیے۔"

"وہ بھی پولیس والا تو نہیں لگتا تھا۔" نرس نے نیل پالش پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"سب پولیس والے وردی میں نہیں ہوتے۔" خوبصورت نرس کے مقابلے میں کم توجہ پانے والی بدصورت طالبہ نے حقارت سے کہا۔

"چلو خیر۔ پکڑے گئے سب کہ نہیں؟" میں نے کہا۔ "اسپتالوں میں بھی اس قسم کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

"ابھی تو آپ نے ٹائٹل دیکھا ہے سر۔" پہلے والے طالب علم نے ہنس کر کہا۔ "اصل فلم تو بعد میں شروع ہوئی۔ ٹیکسی کے درخت سے ٹکراتے ہی۔۔۔ آپ کوک پئیں گے؟"

"نو پلیز۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ سب بھاگ گئے؟"

"ہاں۔۔۔ مگر اس وقت تو ہم نے یہاں کھڑے رہ دیکھا کہ ٹیکسی کے رکتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا اور اندر سے ایک عورت باہر آگری جس نے اسپتال کے مریضوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔" دوسرے طالب علم نے کہا۔ "ہم بھی سمجھے کہ وہ بے ہوش ہے۔ باہر گر کے بھی وہ پڑی رہی اور وہ پولیس افسر بالکل سر پر پہنچ گیا جس نے فائر کر کے ٹیکسی روک دی تھی۔ اس نے چلا کر کہا کہ خبردار جو کسی نے باہر آنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اتنا ہی بولا تھا کہ بے ہوش پڑی ہوئی عورت۔۔۔"

"عورت نہیں۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔" پہلے غیر سنجیدہ اور چھبیلے طالب علم نے کہا۔ "بالکل فلم اسٹار رانی۔"

"اس لڑکی نے ایک دم اچھل کر ٹیکسی پر فائر کرنے والے کو ناک آؤٹ کر دیا۔" دوسرے طالب علم نے مسکرا کے بات جاری رکھی۔ "اس نے ایک ہاتھ مار کے ریوالور گرا دیا اور دوسرا ہاتھ مار کے ریوالور والے کو۔"

"بالکل بجلی تھی بجلی۔" پہلا طالب علم بولا۔ "میں بال بال بچ گیا ورنہ وہاں لیٹا ہوتا۔" اس نے ہاتھ سے اشارا کیا۔ "میں کچھ ہیرو بننے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا یہ کہ دو اچھے خاصے پہلوان ٹائپ مرد آگے بڑھے اور پلک جھپکتے میں غتربود ہوگئے! فلیٹ ہوگئے!"

"کیا مطلب؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"مارے گئے۔ ملیہ ہوگیا ان کا۔ اندر یا باہر سے۔" پہلا طالب علم ہنسا۔ "وہ لڑکی جوڈو کراٹے جانتی تھی۔ ایسے ہاتھ پیر چلائے اس نے کہ جو آگے بڑھا اس کا چورا ہوگیا۔ وہ اپنی مرضی سے اغوا ہو کے جا رہی تھی۔ بلکہ مجھے تو شک ہے کہ وہی اغوا کنندہ تھی۔"

"یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"اس لیے کہ سب کچھ تو اسی نے کیا تھا۔" پہلا لڑکا بولا۔ "مگر کیسے پڑی رہی اور تم سے زیادہ تندرست مرد جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس کے دھوکے میں آگیا۔ چند سیکنڈ میں اس نے میزیں الٹ دیں۔ یہ انگریزی محاورہ ہے۔ پھر اس نے دخل در معقولات کرنے والوں کو فنا کیا اور ریوالور اٹھا لیا۔ اس نے چلا کے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یار نکل جاؤ۔ وہ بھی کم نہیں تھے۔ وہ ٹیکسی سے نکلے اور انھوں نے ڈاکٹر کیکٹس کو روک کر اس کی موٹر سائیکل چھین لی۔"

"کون ڈاکٹر کیکٹس؟" میرے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"آپ ڈاکٹر کیکٹس کو نہیں جانتے؟" نرس نے بے حد اٹھلا کر حیرت کا اظہار کیا۔ "وہی اناٹومی والے۔ جن کے باغ میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہر قسم کے کیکٹس کے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اچھا... وہ" میں نے کہا۔ "پھر وہ لڑکی کدھر گئی؟"

"ابھی اس کی تلاش جاری ہے" پہلا طالب علم ہنسا۔ "اگر وہ پکڑی گئی تو میڈیکل بورڈ چیک اپ کرے گا کہ وہ لڑکی تھی یا بھوت یا چھلاوہ۔ اُدھر اس کے دونوں ساتھی موٹر سائیکل لے کر بھاگ گئے اِدھر وہ فرار ہوگئی۔ کسی نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ خالی ہاتھ بھی وہ کم خطرناک نہیں تھی۔ ریوالور اٹھا لینے کے بعد تو وہی اس کے سامنے جاسکتا تھا جس کے ہاتھ میں توپ ہو۔"

ان کی گفتگو میں ابھی تک شہلا کا کوئی حوالہ نہیں آیا تھا۔ نازو نے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کا راستہ روکنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ شیخ بعد میں اس دن کو روئے گا جب اس کے گھر والوں نے نازو کو جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کرنے کی اجازت دی تھی، نازو نے دلیل دی ہوگی کہ اپنے دفاع کے لیے اپنے ہاتھ پیر استعمال کرنے کا فن سب کو آنا چاہیے۔ خصوصاً لڑکیوں کو جن کو کمزور سمجھ کے اس معاشرے میں غلط قسم کے لوگ راستہ بھی نہیں چلنے دیتے۔ اب یہ دفاع کا فن اپنے ہی گھر والوں کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ بڑے بھائی جو تھانیدار تھے مسلح ہونے کے باوجود پٹ گئے تھے محسن اور ٹیڈی بھی موٹر سائیکل پر نکل بھاگے تھے۔ ان کے ساتھ شہلا ہوتی تو اس گروپ کے چار افراد مجھے یہ بھی بتلاتے کہ موٹر سائیکل پر دونوں مردوں کے ساتھ ایک نرس بھی فٹ ہو گئی تھی۔ وہ اس واردات کے عینی شاہد تھے اور اس وقت بھی یہیں کھڑے سردی کے موسم میں ٹھنڈا کوکاکولا پی رہے تھے جب یہ واردات ہوئی۔ ایک نرس دوسری نرس کو یوں فرار ہوتا دیکھتی تو چپ نہ رہتی مگر ان میں سے کسی نے شہلا کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ان سے یہ پوچھنے میں کوئی عقلمندی نہیں تھی کہ کیا ان کے ساتھ ایک خوبصورت سی نرس نہیں تھی اور وہ مار دھاڑ کرنے والی حسینہ فرار ہو کے کس سمت گئی۔

میں نے باوقار طریقے پر "تھینکس" کہا اور کینٹین میں داخل ہوگیا۔ جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ انھیں میرا چہرہ اجنبی لگا ہوگا۔ میری دلچسپی انھیں عجیب لگی ہوگی اور ان کو میرا اس کینٹین میں جانا عجیب لگا ہوگا جو نچلے درجے کے لینی پیرا میڈیکل اسٹاف کے لیے تھی۔ ڈاکٹرز کی کینٹین دوسری طرف تھی اور عموماً ڈاکٹر اپنے کمپلکس کے باعث بھی اس طرف آنا کسرِ شان سمجھتے تھے میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا اور فوراً باہر نکل آیا لیکن واپسی کے بجائے میں دوسری طرف روانہ ہوگیا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جائے واردات اور کینٹین میرے راستے پر آ گئے تھے اس لیے میں رُک گیا تھا۔ کینٹین کے پیچھے ایک بیرک تھی۔ بیرک کا چکر کاٹ کر میں پھر اسپتال کی مرکزی عمارت کی جانب ہولیا میرا ذہن سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ ان حالات میں مجھے لوٹ جانا چاہیے یا نازو کو اور شہلا کو تلاش کرنا چاہیے آخر محسن اور ٹیڈی کے ساتھ شہلا کیوں نہیں تھی؟ اور اگر تھی تو وہ اس کو کیوں چھوڑ گئے۔ مجھے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی کہ محسن جیسا عاشق نامزد شوہر اپنی دلہن چھوڑ کر بھاگ جائے۔ یا تو شہلا پہلے ہی الگ ہوگئی تھی یا حادثے کے بعد وہ کسی اور طرف نکل جانے میں کامیاب نہ ہی تھی اور محسن نے دیکھ لیا تھا کہ شہلا خطرے کی حدود سے دور جا چکی ہے۔

مرکزی عمارت میں وہی گہما گہمی اور آنے جانے والوں کا رش تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ اکرام شیخ کو شاید ایمرجنسی میں پہنچایا گیا ہوگا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد وہ ہوش میں آ گیا ہوگا اور اب وہ بھی اسپتال میں اسی طرح پھر رہا ہوگا جیسے جنگل میں زخم خوردہ شیر گھومتا ہے۔ اس نے پولیس بلالی تھی یا واردات کے بعد پولیس خود آپہنچی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوا ہوگا کہ ٹیکسی میں سے نکلنے والے دو مرد تو ایک موٹر سائیکل چھین کر بھاگ گئے تھے مگر وہ لڑکی جس نے اچھے خاصے مردوں کو تہس نہس کر دیا تھا اندر کی طرف گئی تھی تو ممکن ہے وہ نازو کو تلاش کرے۔ مریضوں کے کپڑے پہن کر وہ گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتی تھی لیکن نازو سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ گیٹ کیپر کو بھی لٹا دے۔ ایک دھان پان سی لڑکی کے سامنے آ کر سب غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔ آنکھیں اس کے چکا چوند پیدا کرنے والے حسن کا نظارہ کرتی رہ جاتی ہیں اور ذہن سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی نازک کمزور اور دبلی پتلی سی لڑکی جو نقشِ چغتائی نظر آتی ہے آفت کی پرکالہ ہے۔ برقِ خرمن بار ہے اور آتشِ سوزاں ہے۔

میں محتاط طریقے پر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ میں نے ہلکی سی "شش شش" سنی۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے پلٹ کر اس گوشے میں دیکھا جو ایک دیوار کے ستون اور زینے کے نچلے حصے میں تھا۔ وہاں شہلا دبکی کھڑی تھی۔

"تم... یہاں کیا کر رہی ہو بے وقوف؟" میں نے اس کی طرف پشت کر لی۔

"میں نازو کو تلاش کر رہی تھی۔" وہ بولی۔

"یہ کون سا طریقہ ہے تلاش کرنے کا کہ کونے میں گھسی ہوئی ہو؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "تم کو نکل جانا چاہیے تھا۔"

"وہ... جیسے آپ گزرے اور میں نے دیکھ لیا۔ ایسے ہی میرا خیال تھا کہ کہیں نازو بھی مل جائے گی۔" وہ بولی۔ "میں اس سے پہلے تین بار جگہ بدل چکی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد۔"

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ محسن اور ٹیڈی بھاگ گئے۔ تم کو کسی نے نہیں دیکھا تھا؟"

"جب اکرام شیخ ہمارے پیچھے آیا تو ہم گھبرا گئے تھے۔ نازو نے کہا کہ میری فکر مت کرنا۔ جیسے موقع ملے وہ نکل جائے۔" شہلا نے کہا۔ "حادثہ ہوا تو وہ باہر گر گئی۔ دوسری طرف کا دروازہ خود ہی کھل گیا تھا۔ میں چپ چاپ نکل کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے نازو کو بھائی سے لڑتے دیکھا تھا۔ محسن کو میری فکر تھی لیکن میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ نکل جائے۔ وہاں کچھ میڈیکل کے لڑکے ایک نرس کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ وہ یہی سمجھے کہ میں پہلے سے اس جگہ موجود تھی اور حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انھوں نے مجھے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں۔ انھوں نے ہی سب بتایا تھا مجھے۔"

"لوگ بھی یہی سمجھے کہ میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ اِدھر نرسوں کی ایک کینٹین ہے۔" شہلا بولی۔ "میں اندر جا کے بیٹھ گئی تھی۔"

اچانک میری نگاہ نے اکرام شیخ کو دیکھ لیا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ سے بچتا بچاتا میری طرف آ رہا تھا اور اس کی نظر ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ "شہلا۔ اب یہاں مت رُکنا۔" میں نے کہا۔ "اکرام شیخ آ رہا ہے۔ سیدھی گھر جانا یہاں سے۔" اتنی دیر میں اکرام شیخ بہت قریب آ چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے جان لیا کہ اس کی نگاہ میری صورت کے اصل نقوش میں شناسائی کے آثار تلاش کر چکی ہے۔ ظاہری تبدیلی نے اسے وقتی طور پر دھوکا دیا تھا۔ غور سے دیکھتے ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ میں ایک دم پلٹا اور بھاگا۔ میرے لیے سب سے بڑے اطمینان کی بات یہ تھی کہ شیخ کے پاس ریوالور نہیں ہے۔ اس کا ریوالور نازو لے جا چکی تھی۔ اس نے بھائی کو معمولی سے وار سے بے ہوش کیا تھا۔ چنانچہ ہوش میں آتے ہی اکرام شیخ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

مجھے فرار ہوتا دیکھ کر شیخ میرے پیچھے لپکا۔ میں نے برآمدے میں دوڑتے ہوئے ایک نرسنگ بوائے کو گرایا۔ دو نرسیں چیخ مار کر ہٹ گئیں ورنہ میں اس گاڑی کی طرح ان پر سے گزر جاتا جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں۔ برآمدے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ شیخ مسلسل میرے تعاقب میں تھا اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر دروازے نظر آ رہے تھے مگر میں رسک نہیں لے سکتا تھا کہ کسی کمرے میں محصور ہو جاؤں۔ دوسری طرف کھلا میدان سا تھا لیکن لمبی دوڑ میں میرا پکڑا جانا ممکن تھا کیونکہ شیخ اب شور بھی مچا رہا تھا۔ اس کی "پکڑو۔ پکڑو" سن کر ایک ساڑھے چھ فٹ قد کے گوریلے نے میری راہ میں مزاحم ہونے کی غلطی کی۔ اسے اپنے ڈیل ڈول پر ناز تھا۔ وہ بالکل میرے سامنے آ گیا اور ہاتھ پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدم فرش پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ میں ایک سیکنڈ کے لیے رک گیا اور اسے حملہ کرنے کا موقع دیا۔ اس نے اپنے بڑے بڑے ریچھ جیسے بازوؤں میں مجھے گھیرنے کے لیے جست لگائی اور میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ وہ زد میں آ گیا تو اسے دوسرے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور سر سے گزار کے پیچھے پھینک دیا۔ وہ فرش پر دھماکے سے گرا اور گلا پھاڑ کے چلایا۔ "ہائے رب جی!" میرے پیچھے دوڑنے والے دو چار جیالے اس رکاوٹ کے اچانک سامنے آ جانے سے منہ کے بل گرے۔ سامنے والوں نے ہائے رب جی کی فریاد سن کر عبرت پکڑی اور مجھے راستہ دے دیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیخ بدستور میرے تعاقب میں تھا۔

"سکندر۔ رک جاؤ۔ سکندر ورنہ میں گولی مار دوں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔ "تم بچ کر نہیں نکل سکتے سکندر بخت۔" اس کی دھمکی کا مجھ پر کیا اثر ہوتا لیکن اس کی چالاکی نے مجھے قائل کیا۔ میرا نام بار بار لے کر وہ گواہ پیدا کر رہا تھا کہ جس شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ سکندر بخت تھا۔ کل کو وہ ثابت کر سکے گا کہ ڈاکٹر کے بھیس میں نازو کو اغوا کرنے والا سکندر بخت ہی تھا اور اسی نے اسپتال میں اتنی ہٹر بونگ مچائی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان مشکل سے بیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میں نے برآمدے کی دیوار کے ساتھ ایک خالی اسٹریچر دیکھا اور رک کر اسے زور سے پیچھے دھکا دیا۔

"میرا ناں استاد پیڈرو ہے ڈڈو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "چوہدری دلاور دا پُتھا آں میں۔" یہ بات ان سب نے سُنی جو اکرام شیخ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ بھاگنے والا مجرم ہے یا اپنی جان بچا کے بھاگ رہا ہے۔ وہ پکڑنے والے کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ اکرام شیخ نے اسٹریچر کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا اور اپنی اسپیڈ پر کنٹرول نہ کر سکا۔ وہ اسٹریچر سے ٹکرایا اور میں پلٹ کر بھاگا۔ میرے سامنے اوپر سے ایک لفٹ آ کر رُکی اور اس میں سے چار مرد عورتیں باہر آئے۔ دو آدمی آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے انھیں دھکا دیا اور وہ دور جا گرے۔ لفٹ مین نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے گھسیٹ لیا۔ میں نے ایک بار پھر دُہرایا کہ میں کون ہوں اور دھمکی دی کہ کسی نے لفٹ میں قدم رکھا تو مارا جائے گا۔ اس کے باوجود اکرام شیخ عین اس وقت اندر پہنچ گیا جب لفٹ کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور میں اسے ساتویں فلور تک لے جانے کے لیے بٹن دبا چکا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے قبل ہی میں نے اکرام شیخ کو دبوچ کر دیوار سے لگا دیا۔ "کیا چاہتے ہو تم آخر؟" میں نے غرا کے کہا۔ "مجھے گرفتار کرنا؟ ایسا نہ تمھاری زندگی میں ہوگا اور نہ میری زندگی میں۔"

"تم... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟" اکرام شیخ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہانپتے ہوئے بولا۔

"اسے میں نہیں لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن اور ٹیڈی کے ساتھ گئی تھی۔"

"لیکن اس گروہ کے سرغنہ تم ہو۔ یہ سارا پلان تمھارا تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں کمرے میں رہ گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ باہر کیا ہوا۔ لوگوں نے نازو کو الگ فرار ہوتے دیکھا تھا۔"

لفٹ اوپر پہنچ چکی تھی۔ میں نے پھر گراؤنڈ کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ رُکی اور پھر نیچے چلنے لگی۔

"میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "بس تم نازو کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں نے ہمیشہ نازو کو یہی سمجھایا ہے کہ وہ گھر میں رہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کبھی نہیں کہا کہ ہمارا ساتھ دے۔ اگر وہ خود ہی گھر میں رہنا نہیں چاہتی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"سب قصور تمھارا ہے۔" اکرام شیخ نے چیخ کر کہا۔ "جب تک اس نے تمھیں نہیں دیکھا تھا وہ ایک شریف لڑکی تھی۔"

"وہ اب بھی ایک شریف اور معصوم لڑکی ہے۔" میں نے اکرام شیخ کا گلا دبوچ لیا۔ "اگر وہ ہمارے ساتھ رہے گی تو یہ مت سمجھو کہ وہ بدمعاشوں کے ساتھ رہے گی۔ ہم اس کی عزت کرتے ہیں۔ ہر عورت کی عزت کرتے ہیں جو کسی کی ماں ہوتی ہے یا بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ ہم اس کی عزت کی حفاظت کرنے کے اہل ہیں۔ اس بارے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے لفٹ کو پھر اوپر جانے کے لیے بٹن دبا دیا۔

"سکندر۔ میں تمھارا دوست تھا۔ اب بھی دوستی کا وہ پرانا رشتہ استوار ہو سکتا ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"رشتہ جو ٹوٹ جائے اس میں گرہ آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھاری اور میری دوستی مختلف حالات میں ہوئی تھی۔"

"حالات پھر بدل گئے ہیں۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "میں پھر تمھارے ساتھ ہوں۔" میں نے لفٹ کو اوپر ہی روک دیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہماری فطرت ایک ہے مگر ہمارے جذبات کی نوعیت الگ ہے۔ تمھارے والد بھی ایک شریف، امن پسند اور قانون پرست شہری ہیں، تم انھی کے بیٹے ہو۔ تمھارے ساتھ وہ سب نہیں ہوا جو میرے ساتھ ہوا۔ ہوتا تو تم خود کو قانون کے حوالے کر دیتے اور اس کے فیصلے کو غلط ہونے کے باوجود قبول کر لیتے۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں وہ تم کبھی نہ کرتے۔ میں ایک باغی ہوں۔ مجرم ہوں اور تمھارے قانون کی نظر میں چور، ڈاکو اور قاتل ہوں۔ صرف میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔

میرا ضمیر صاف ہے مگر اس ضمیر کو عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا اور قانون کی نگاہ ضمیر کو نہیں دیکھ سکتی۔ میرے سامنے ایک مشن ہے جو میرے نزدیک جائز ہے اور بہت نیک ہے۔ اتنا اہم اور مقدس ہے کہ میں اس کو جہاد سے کم نہیں سمجھتا لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں تم کو اس میں شریک نہیں کر سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم بھی اس کو جہاد سمجھو گے مگر تمھارے اور میرے طریق کار میں بڑا فرق ہے۔ تم قانونی راستہ اختیار کرو گے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس راستے کو اختیار کرنے سے شکست میری ہوگی کیونکہ دشمن بہت طاقت ور ہیں اور بہت بااثر ہیں۔ قانون کے لمبے ہاتھ ان کو چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ چھپ جائیں گے یا فرار ہو جائیں گے۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دیں گے اور میرے مشن کو ناکام بنا دیں گے کیونکہ ان کے ساتھی ہمارے اپنے بھی ہیں۔ ہماری صفوں میں غدار ہیں۔ ففتھ کالم کہلانے والے ہیں۔ اس لیے میں مجبور ہوں اکرام شیخ۔ شاید پھر کبھی ہم ملیں گے تو دوست ہوں گے۔"

وہ میری بات بڑے دھیان سے سن رہا تھا جب میں نے یکلخت اس کی کنپٹی پر مکا مارا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا لفٹ کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور زینے کی طرف چلنے لگا۔ زینے کے راستے کچھ لوگ شور مچاتے اوپر آ رہے تھے۔ میں نے ان سب کو اوپر آنے کا موقع دیا۔ چار جوان آدمی یکے بعد دیگرے بے خبری میں میرے ہاتھ لگے اور بلا مقابلہ لیٹ گئے۔ میں نے گاؤن اتار کے اسٹیتھسکوپ کے ساتھ پھینکا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔

"وہ نیچے بھاگ گیا۔" میں نے چلا کر کہا اور اوپر آنے والے کچھ لوگ فوراً پلٹ گئے۔ انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ آواز آگے جانے والے چار افراد میں سے کسی کی تھی۔ سیکنڈ فلور پر آ کے میں نے لفٹ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس فلور پر وارڈ تھے جہاں سے ملاقاتی نکالے جا رہے تھے۔ ملاقات کا وقت تو بہت پہلے ختم ہو چکا تھا مگر ڈھیٹ قسم کے لوگ اندھیرا ہونے تک براجمان تھے۔ مجھے ان سب کے درمیان مل کر نکلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ طویل برآمدے کے دوسرے کنارے والے زینے سے اتر رہے تھے۔ میں اسی ہجوم میں شامل رہا اور محفوظ رہا۔ مجھے اس اندھیرے نے بھی پناہ فراہم کی جو میو ہسپتال کے زینے میں بلب نہ ہونے کے باعث پھیلا ہوا تھا۔ فیوز ہو جانے والے بلب کو بدلنے کی ضرورت پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی اور بدانتظامی کا یہ بہت چھوٹا سا نمونہ تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔

پبلک کے اس ریلے نے مجھے باہر پہنچا دیا ورنہ ہر گیٹ پر پولیس موجود تھی۔ یہ بے حسی اور عدم دلچسپی قومی مزاج کا ایک حصہ بن گئی تھی جس نے فرض شناسی میں مستعدی اور دیانت داری کے جذبے کو کھا لیا تھا۔ پولیس نے گیٹ پر ناکا بندی کر کے ضابطے کی کارروائی ضرور پوری کی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے پہلے سے فرض کر لیا ہوگا کہ اتنے بڑے ہسپتال میں ایک مجرم دو دن روپوش رہ سکتا ہے یا اس کے دس دروازوں میں سے جب چاہے نکل سکتا ہے۔ معلوم نہیں اس کی داڑھی اصل تھی یا نقلی۔ وہ سوٹ پر سفید گاؤن پہن کر آیا ہوگا تو صرف سوٹ میں نکل جائے گا۔ چالاک مجرم تو برقع اوڑھ کر بھی نکل جاتے ہیں۔ چونکہ پولیس بہت زیادہ تردد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ بہت سے بہانوں کی آڑ لے سکتی تھی۔ دوسری بار نیلا گنبد پہنچ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پینے کے بعد میں نے سگریٹ جلائی اور اس عرصے میں شہلا کے اور نازو کے بارے میں سوچتا رہا۔ محسن اور ٹیڈی کی مجھے قطعی فکر نہیں تھی۔ وہ اب تک خیریت کے ساتھ گھر پہنچ چکے ہوں گے اور ہماری واپسی کے شدت سے منتظر ہوں گے۔ شہلا کے لیے بھی واپسی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ صرف نازو کے متعلق کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا جانتی تھی اور دس مردوں کا حلقہ توڑ کر نکل سکتی تھی لیکن الجھن یہ تھی کہ نکل کر وہ کہاں جائے گی۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ نازو جسمانی طور پر بالکل فٹ تھی۔ اگر اسے گولی لگی تھی تو اس کا زخم سطحی تھا یا اسے صرف خراشیں آئی تھیں۔ وہ خود بھی تو ہسپتال سے اسی طرح مار دھاڑ کر کے فرار ہو سکتی تھی۔ پھر اس نے غالب کو پیغام کیوں بھیجا تھا؟ وہ غالب سے پوچھ سکتی تھی کہ آج کل تم لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب ہم اسے لینے آتے ہیں یا نہیں۔ ہم نے تو خود ہی اسے واپس اپنے گھر والوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم انکار کر دیں گے۔ اس نے غالب کو آزمایا۔ ہر عورت جانتی ہے کہ وہ کسی شہ زور مرد کی کمزوری بن سکتی ہے۔ وہ غالب کی نظر کا مفہوم سمجھ چکی تھی اور اس کے دل کی آواز سن چکی تھی۔ میری طرف سے مایوسی نے اس کو غالب کی طرف ملتفت کیا تھا۔ آہستہ آہستہ غالب نے اس کے خیالوں میں جگہ بنالی تھی۔ آگ جو پہلے ایک طرف لگی تھی اب دونوں طرف تھی برابر لگی ہوئی۔ نازو نے غالب کو پیغام بھیجا کہ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو آؤ اور مجھے لے جاؤ۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جیت بالآخر کس کی ہوتی ہے۔ مصلحت کے تقاضوں کی یا وارفتگی عشق کی۔ عقل کی یا جنون کی۔

اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ نازو نے ہمیں کیوں بلایا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ ہسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔ شہلا احمق تھی جو ہسپتال میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں اُٹھ کر کاؤنٹر تک گیا اور ٹیلی فون کرنے کی اجازت مانگی۔

"غالب سے بات کرنا ہے۔" میں نے آپریٹر کی آواز سن کر کہا۔

"غالب صاحب آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔" آپریٹر نے کہا۔ "آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا چچا ہوں۔ وہ کچھ بتا کے نہیں گئے؟" آپریٹر نے نفی میں جواب دیا۔

"وہ کسی خاتون کے ساتھ گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دبلی پتلی نازک سی لڑکی کے ساتھ؟"

"جی... جی..." آپریٹر نے حیرانی سے کہا۔ "کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتا ہوں۔ کوئی پیغام؟"

"پیغام؟" میں نے سوچ کر کہا۔ "ہاں... کہہ دینا... آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالب۔" اور فون رکھ دیا۔ بل ادا کر کے میں باہر نکلا اور رکشا میں بیٹھ گیا۔ رات کے آٹھ بجے میں شہلا اور محسن کے گھر پہنچا تو حسبِ توقع وہاں سب موجود تھے۔ شہلا کچھ دیر پہلے پہنچی تھی اور نازو اس کے بعد غالب کے ساتھ آئی تھی۔ اب ان کو میرا ہی انتظار تھا۔

"مجھے تو فکر ہونے لگی تھی آپ کی طرف سے۔" شہلا نے کہا۔

"میں تو اسی وقت نکل آئی تھی۔"

"میں ذرا مسٹر نازو کے ڈرامے کا آخری سین کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "خاصے لوگ بلاوجہ پٹے۔"

"ہم نے ایک شریف آدمی کو موٹر سائیکل سے اتار کے پھینک دیا تھا۔" محسن ہنسا۔ "اس کی موٹر سائیکل میوزیم کے سامنے کھڑی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ڈاکٹر کیکٹس تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ بھی آتا ہی ہوگا یہاں۔ ممکن ہے اس کے ساتھ اکرام شیخ بھی آ پہنچے۔"

"اسے کیا معلوم کہ اب ہم کہاں ہیں۔" محسن نے کہا۔

"یہ نازو سے پوچھو۔ آخر کیا ضرورت تھی اس کو غالب کے نام ایس او ایس بھیجنے کی۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "کیا یہ خود نکل کر نہیں آ سکتی تھی؟"

"نکل کر یہ کہاں جاتی؟ اس کو بھی ہمارے موجودہ ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"تم سب گدھے ہو۔" میں نے کہا۔ "اب نازو یہاں تک کیسے آ گئی؟ یہ غالب کے پاس پہنچی اور غالب اسے یہاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لے آیا۔ کیا ہم سب کو وہاں بلا کے ہنگامہ آرائی کا خطرہ مول لینے پر مجبور کرنا ضروری تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ نازو زخمی ہے اور جسمانی طور پر اُٹھنے کے بھی قابل نہیں۔ اس طرح تو یہ خود بھی نکل سکتی تھی۔ اکرام شیخ کو اس نے ناک آؤٹ کر دیا تو وہ تھانیدار جو دروازے پر بیٹھا تھا، کیا اسے ناک آؤٹ کرنا مشکل تھا۔ پھر جیسے یہ اب پہنچی غالب کے پاس اسی طرح پہنچ جاتی۔“

”یا تو مجھے معلوم تھا کہ تم شک کرو گے۔“ نازو نے افسردگی سے کہا۔

”شک کی بات نہیں۔ تم نے بے وقوفی کی۔ خدانخواستہ ہم میں سے کوئی وہاں پھنس جاتا تو کیا ہوتا؟“ میں نے کہا۔ میری بات دوسروں نے بھی سمجھ لی تھی اور سب کی سوالیہ نظریں اب نازو پر جمی ہوئی تھیں۔

”مجھے بے وقوف کہنے سے پہلے تم کو میری بات سُن لینی چاہیے تھی۔“ نازو نے غصے میں بل کھا کے کہا۔ ”تم سے مجھے گلہ ہے سکندر کہ تم نے مجھے کبھی اعتماد کے قابل نہیں سمجھا حالانکہ میں نے ایک بار نہیں، متعدد بار جان کی بازی لگا کے اپنے جذبات کا، نیک نیتی کا اور خلوص کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی ہے۔ کیا وہ بھی ڈراما تھا جب میں نے تمھاری جان لینے والی گولی کا راستہ روک لیا تھا؟ رابعہ سے پوچھنا کہ میں کس طرح اسے نکال کر لائی تھی، یہ ہے اس کا صلہ؟“

”آئی ایم سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ”میں نے تم کو بے وقوف ضرور کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ ہم تمھیں غیر سمجھتے ہیں۔ تمھارے جذبات کی قدر نہیں کرتے اور تم پر بھروسا نہیں کرتے۔“

”یار سکندرِ اعظم سے اب تم افلاطونِ اعظم بھی بن رہے ہو۔“ نازو نے تلخی سے کہا۔ ”بہت ناز ہے تم کو اپنی عقل پر لیکن اس عقل سے تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ سو فیصد غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسا نہ کرتی تو کبھی تم تک نہ پہنچ پاتی۔ میرا بھائی بھی میری طرح ضدی اور انتہا پسند ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جس طرح میں چھوٹے بڑے کا، خاندان کی عزت کا اور خون کے کسی رشتے کا لحاظ نہیں کرتی اسی طرح وہ بھی مجھے چھوٹی بہن کی حیثیت سے کوئی رعایت نہیں دے گا اور جان، میری جائے یا اس کی، وہ مجھے تم تک نہیں پہنچنے دے گا۔ یہ اَنا اور خاندانی وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میرے والد بہت غیر جانبدار رہتے ہیں مگر یار وہ بھی کیا کریں کہ میں لڑکی ہوں۔ وہ دنیا سے نہیں کہہ سکتے کہ اولاد ناخلف اور باغی ہے۔ لڑکا ہوتا تو اسے نافرمان اور سرکش کہہ کر خود کو بچا لیتے یا عاق کر دیتے۔ لڑکی کے معاملے میں سارا الزام والدین

پر آجاتا ہے کہ انھوں نے پرورش میں کوتاہی کی اور پھر بدنامی بھی انھی کو ملتی ہے۔ ماں تو مجھے رو رو کر کوستی تھی کہ ہمیں دنیا میں یوں رسوا کرنے سے تو بہتر تھا کہ تُو پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ وہ مجھے دھمکی بھی دیتی تھی کہ میں نے اپنی روش نہ بدلی تو کسی دن وہ کچھ کھا کے سو جائے گی۔ ان کی باتوں نے بھیّا کو بہت پریشان کر رکھا تھا اور انھوں نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ بحث کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ مجھے ویسے ہی رہنا ہو گا جیسے سب لڑکیاں اپنے ماں باپ کے اور پھر شوہروں کے گھر میں رہتی ہیں۔ لڑکے باہر کچھ بھی کرتے پھریں انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا مگر لڑکیاں ہر حال لڑکیاں ہوتی ہیں۔ وہ کسی غیر شخص کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوں اور گھر تک چھوڑ دیں تو لوگ اس کا مطلب کچھ اور نکال لیتے ہیں۔ کوئی نہیں مانتا کہ وہ حق اور انصاف کا پرچم بلند کرنے نکلی ہیں اور مظلوم کی حمایت میں جہاد کرتی پھر رہی ہیں۔“

”اور اس کے باوجود تمھارے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی؟“ محسن نے کہا۔

”خیالات تو آدمی کی فطرت کا عکس ہوتے ہیں۔“ نازو نے کہا۔ ”میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو کیسے بدل دوں۔ جب میں شہلا کو دیکھتی ہوں اور رابعہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے غیرت آتی ہے۔ یار آخر وہ بھی تو بے بس، ناقص العقل اور کمزور سمجھی جانے والی عورتیں ہیں۔ وہ کس طرح ساتھ نبھا رہی ہیں؟ میں اتنی خود غرض کیسے ہو جاؤں کہ صرف اپنی زندگی کی خوشیوں سے تعلق رکھوں اور باقی سب بھول جاؤں۔ میں اپنی آنکھیں بند کر سکتی ہوں، ذہن کی سوچ کے راستے بند نہیں کر سکتی۔ اکرام شیخ نے بھی مجبور ہو کے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر میرا راستہ روکے گا۔ فلموں میں ڈائیلاگ ہوتا ہے نا کہ تم کو میری لاش پر سے گزر کے جانا ہو گا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ وہ مجھے صاف بتا چکا تھا کہ سکندر بخت کا مظلوم اور برحق ہونا اپنی جگہ، مگر والدین کی آبرو سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ میں اس کو سمجھتی ہوں چنانچہ میں نے اس کی نیت کو بھی سمجھ لیا۔ پھر یار بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ میں نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنے خیالات میں رونما ہونے والے انقلاب کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے باتوں باتوں میں بھائی سے اپنے سابقہ رویّے پر ندامت کا اظہار کیا۔ یہ کہا کہ سکندر جیسے شخص کے لیے میرا جذباتی ہونا میری بے وقوفی تھی۔ وہ رابعہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ میری بات پر اکرام شیخ نے سکندر کے خلاف الزامات اور اس کے جرائم کی تفصیل بتا کے مجھے سمجھایا کہ سکندر ایسی دلدل میں اتر چکا ہے جس میں سے وہ مر کے ہی نکلے گا۔ اس کے گرد دشمنوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہاں تک

بھاگے گا اور کب تک چھپے گا۔ شکاری ہر سمت سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چوہدری دلاور کے ساتھی، پولیس کی ہر سراغرساں ایجنسی اور اس کی گرفتاری پر ایک لاکھ کا انعام حاصل کرنے کے خواہشمند، سب اُسے تلاش کر رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ میں نے سکندر بخت کے خلاف اپنی نفرت کے جذبات کو نمایاں کیا۔ یہ تبدیلی اگر فوراً آجاتی تو فریج تاڑ جاتا۔ مگر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے اسپتال میں لیٹ کر اطمینان سے سوچنے کے بعد میں ایک منطقی نتیجے پر پہنچی ہوں۔ جو میرے منفی ردِ عمل کا نتیجہ ہے کہ اگر جان کا نذرانہ دے کر رشتوں کو ٹھکرا کر اور رسوائی مول لے کر بھی میں ایک شخص کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکی تو شدید مایوسی نے مجھے نفرت پر مجبور کر دیا ہے۔“

ذرا سی دیر کے لیے وہ خاموش ہوئی۔ میں اور محسن اور شاید ہمارے ساتھ ٹیڈی اور شہلا بھی ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی نازو نے بھائی سے جھوٹ بولا تھا اور حقیقت اس کے برعکس تھی، وہ اب تک مجھ سے محبت کرتی ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں رابعہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا! یہ کیسا عشق ہے اور کیسی دیوانگی ہے کہ جس پتھر کے موم ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہ ہو وہ اسی پتھر کو پوجتی رہے اور اسی سے سر ٹکرا کے مر جانے کے عہد پر قائم ہو۔ غنیمت تھا کہ رابعہ سامنے نہ تھی ورنہ اس عشق کی انتہا شاید اسے بھی شرمسار کر دیتی اور حسد میں مبتلا کر دیتی۔ مجھ پر اور میری وفا پر کامل اعتماد رکھنے کے باوجود وہ اس خیال سے کیسے دامن چھڑاتی کہ مجھے کوئی اور بھی چاہتا ہے، کوئی اور بھی مجھے دل سے پیار کرتا ہے اور یہ وہ عشق ہے جو بے طلب ہے جو حقیقی ہے۔ عشقِ مجازی کی اگلی منزل ہے اور سودا کہیں، جنوں کہیں، وحشت کہیں اسے۔ مگر اس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ پیار میں کوئی بھی عورت کسی کی جذباتی شراکت بھی گوارا نہیں کر سکتی خواہ یہ شراکت یکطرفہ ہی ہو۔ میرے سامنے غالب تھا جو نازو کے عشق میں اسی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے شک اب نازو بھی اس کی طرف ملتفت تھی مگر غالب کے احساس سے یہ بات فراموش نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کی محبت نازو کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید یہ محبت نہیں نارسائی کی خیرات ہے۔ مجبوری ہے یا حالات کی ضرورت ہے۔ نازو محبت کے جس آسمان تک پہنچنا چاہتی تھی وہاں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ وہاں پہلے سے رابعہ اپنی محبت کا حصار کھینچ چکی تھی۔ نازو نے اس بلندی سے ذرا نیچے غالب کو پایا تھا اور اس کا سہارا لینا منظور کر لیا تھا کیونکہ وہ عرش سے فرش تک گرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ تاہم اس کی نظر اب بھی اوپر تھی۔

”جب بھیّا کو یقین آنے لگا کہ میرے جذبات کا رُخ بدل گیا ہے۔“ نازو نے کہا۔ ”تو آہستہ آہستہ انھوں نے مجھے اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ وہ مجھے قائل کرنے لگے کہ سکندر بخت کا خود کو قانون کے حوالے کر دینا ہی سب سے بہتر ہے ورنہ اس کے معاملات خراب سے خراب تر ہوتے جائیں گے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ انھوں نے افسوس سے کہا کہ کاش اس کا سراغ مل سکتا تو میں خود اس سے بات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ میں آج بھی اس کا دوست ہوں اور اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ اچھے وکیل اس کے حالات کی مجبوریوں کو جواز بنا سکتے ہیں اور اعلیٰ عدالتوں میں سزا محض جرم دیکھ کر نہیں دی جاتی۔ عدالت مجرم کی ذہنی کیفیت اور اسے جرم کے ارتکاب تک لے جانے والے تمام عناصر پر غور کرتی ہے۔ بالآخر ایک دن میں نے غالب کا نام بتایا کہ شاید وہ سکندر بخت کے متعلق بتا سکے۔ بھیّا نے مایوسی کا اظہار کیا کہ وہ بہت چالاک صحافی ہے۔ نہ اسے قائل کیا جا سکتا ہے اور نہ مجبور۔ پھر میں نے بے شرم بن کے کہا کہ یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ اگر میں اسے بلاؤں تو کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔“

”سرکار تو مگر بیٹھے رہے، جان کی بازی لگانے پہنچ گئے دوسرے۔“ محسن نے کہا۔

”کچے دھاگے سے نہیں ان کو نائلون کی مضبوط رسّی سے باندھ کر لایا جا سکتا تھا۔“ ٹیڈی بولا۔ ”جیسے لوگ منڈی سے بکرا لاتے ہیں۔“

خفت اور شرمندگی سے غالب کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ سخت بے عزتی محسوس کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ نازو اس کی طرف لپکی اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

”کمال ہے یار! میں نے تو کچھ نہیں کہا تم سے۔“ وہ ہاتھ پھیلا کے بولی۔ ”تم جانتے ہو میں جھوٹ نہیں بولتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آجاؤ گے لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمھیں یہ لوگ نہیں آنے دیں گے۔“

”میں اپنے آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ غالب نے افسردگی سے کہا۔ ”تمھاری نظر سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات... بس تم نے ہمارا نام استعمال کر لیا۔“

”غالب۔ میری طرف دیکھو۔“ نازو نے کہا۔ ”میری آنکھوں میں دیکھو یار۔ تمھیں کیا نظر آتا ہے۔ میری نظر میرے دل کا آئینہ ہے۔“

معلوم نہیں غالب نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا جو ہم نہ دیکھ سکے مگر دوسرے لمحے میں سب کچھ بدل گیا۔ وہ پلٹا تو اس کی صورت پر مسکراہٹ تھی۔ یہ زبردستی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس مسکراہٹ میں جیتی جاگتی، سچی اور کھری خوشی کی ایک روشن کرن تھی اور اُمید کا سب سے دلکش رنگ تھا۔ اس میں احساس کی ندامت نہیں تھی، غرورِ عشق کی خود فراموشی تھی۔ نازو نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ سچ مچ کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غالب کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتا خصوصاً دوستوں کے مذاق سے لیکن آج ہماری بات سے اس کے جذبات مجروح کر دیے تھے۔

"تم واقعی روٹھ کر جا رہے تھے یا صرف اداکاری کا نمونہ پیش کر رہے تھے!" ٹیڈی نے کہا۔

"ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔ اب کیا اداکاری بھی نہ کروں!"

"ضرور کرو۔ بس محبت میں اداکاری مت کرنا۔" شہلا نے اچانک کہا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی بات نے سب کو متحیر کر دیا۔ اس کی بات سب پر چسپاں ہو گئی تھی۔ نازو ہنس پڑی۔

"اب آ گیا تم لوگوں کی سمجھ شریف میں کہ غالب کو بلانے میں کیا مصلحت تھی؟ بھیا کو غالب کا انتظار تھا، تم لوگوں کا نہیں۔ اگر غالب آ جاتا تو خاموشی سے اس کا پیچھا کیا جاتا یا پھر ایسا بندوبست ہوتا کہ کوئی پولیس مین سادہ کپڑوں میں ٹیکسی لے کر نمودار ہو جاتا اور غالب کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔ ظاہر ہے میں غالب کو بتانے پر مجبور ہو جاتی کہ یہ چال ہے اور وہ مجھے جہاں چاہے لے جائے مگر سکندر بخت کے پاس نہ لے جائے۔ میں نے ایک جوا کھیلا تھا جو کامیاب رہا۔ غالب کے بجائے تم لوگ آ پہنچے اور بھیا دھوکا کھا گئے۔ اگر تم لوگوں کے آنے کا ذرا بھی شک ہوتا تو اسپتال میں اور آس پاس پولیس کی نفری بھاری تعداد میں موجود رہتی۔ سادہ کپڑوں میں بھی اور مسلح بھی۔ غالب کو ایک صحافی اور بے ضرر سمجھتے ہوئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور یہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا کہ میں غالب کے ذریعے سکندر بخت کے موجودہ ٹھکانے کا پتا چلاؤں اور پھر بھیا کو مطلع کر دوں۔ اب انھیں سخت رنج اور غصہ ہوگا کہ میں نے انھیں بے وقوف بنایا اور دھوکا دے کر نکل گئی۔ شاید یہ میرے لیے آخری چانس تھا۔ میں دوبارہ ان کے ہاتھ لگی تو کبھی زندہ نہ نکل سکوں گی۔ انھوں نے تو اس مرتبہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ.... کہ بس اب وہی کیا جائے گا جو لڑکیوں کے معاملے میں آخری علاج سمجھا جاتا ہے۔"

"وہ کون سا علاج ہے؟" شہلا نے سادگی سے کہا۔

"ارے یار وہی جو تم نے کیا۔ شادی۔" نازو نے بے تکلفی سے شہلا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ہم سب ہنس پڑے۔

"کون تھا وہ بدبخت جسے تمھاری غلامی میں دیا جا رہا تھا؟"

"معلوم نہیں کون تھا یار۔ میں کون سا گھونگٹ نکال کے سر ہلا دیتی۔" نازو نے کہا۔ "اگر زبردستی کی جاتی تو عین وقت پر اٹھ کھڑی ہوتی اور کہتی کہ اسے قبول کرنے والے پر لعنت۔ اسلام میں تو زبردستی سے منع کیا گیا ہے لیکن یہاں ہوتی ہے زبردستی اور لڑکی کی مجبوری کو اس کی فرمانبرداری سمجھا جاتا ہے۔ میں [illegible] کر دیتی سب کو [illegible]"

"دریں چہ شک۔" غالب نے کہا۔ "یہ پہلا کیس ہوتا جو میں دلہن کے ہاتھوں دولھا کو حجلۂ عروسی سے گلی میں پھینکا جاتا اور اسٹریچر پر واپس کیسے لے جایا جاتا۔" ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"یار تم اب جاؤ اپنے اخبار کے دفتر۔ مجھے شک ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو وہاں بھیج چکے ہوں گے۔" نازو نے کہا۔ "یہ لالچ [illegible] لیے ہی دی تھی۔ اب وہ خود اس پر چلیں گے۔ تم کو ادھر آنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کم سے کم ایک ہفتہ۔"

"ایک ہفتہ!" غالب نے مردہ آواز میں کہا۔ "ایک ہفتہ تم لوگ میری صورت دیکھے بغیر رہ سکو گے؟"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب ایک ہفتہ تم کسی کی صورت دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔" محسن ہنسا۔

"اب جاتے ہو کہ نہیں۔" نازو نے ڈانٹ کر کہا۔ "یا پھر بائی ایئر گلی تک ارسال کر دوں؟"

"جاتا ہوں بابا جاتا ہوں۔" غالب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے کہ تمھاری بات نہ مانوں۔ لیکن اتنا تو بتا دو کہ یوم حشر سے پہلے ملنا ہو تو۔ میرا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں۔"

"تو ہم خود رابطہ قائم کر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں تلاش کر لیں گے۔ تم تو رات کو بھی آفس ٹیبل پر ہی ملو گے۔"

"اس کا.... کوئی گھر نہیں ہے؟" غالب کے جانے کے بعد نازو نے حیرانی سے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے یار!"

"ہاں۔ یہ مردِ قلندر وہ ہے جس کے بارے میں کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ — نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے" میں نے کہا۔ "اس کا باپ ایک مشہور سرجن تھا اور یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کناڈا گیا تھا کسی میڈیکل کانفرنس میں۔ واپسی پر جہاز کریش ہو گیا۔ غالب کے ماں باپ دونوں مارے گئے تھے مگر غالب اس سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکا تھا۔"

"مگر.... مجھے تو کچھ اور بتایا تھا اس نے!" محسن چونکا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر لطیف نے اصل بات مجھے بتائی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ اس کے والد کے دوست تھے۔ باپ چاہتا تھا کہ بیٹا اس کی طرح نامور ڈاکٹر بنے۔ بیٹے میں صحافت کے اور شاعری کے فنکارانہ جراثیم پیدائشی طور پر موجود تھے اور مزاج میں درویشی تھی۔ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مہاتما بدھ کی طرح گھر سے نکل گیا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد پلٹ کر گھر نہیں گیا۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ لاکھوں کی کوٹھی بند پڑی کھنڈر ہو رہی ہے۔ تمام ساز و سامان برباد ہو رہا ہے۔ [illegible] ہے۔ یہ نہ ادھر جاتا ہے نہ اسے بیچتا ہے نہ کسی کو دیتا ہے۔ اس موضوع پر بات کرو تو خفا ہو جاتا ہے۔"

"گویا نفسیاتی کیس ہے۔" نازو نے سوچ کر کہا۔

"ہاں.... یہی سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے چونک کر کہا۔ "شدید احساس جرم اس کے لاشعور میں موجود ہے۔ اب وہ اپنے اس باپ کا وارث بنتے ہوئے خود کو مجرم محسوس کرتا ہے جس کی خواہش کو ٹھکرا کے وہ گھر سے رشتے توڑ آیا تھا۔ وہ کس دل سے اس گھر میں جائے۔ ڈاکٹر لطیف نے سمجھایا تھا کہ سب بیچ ڈالو اور رقم کسی رفاہی ادارے کو دے دو۔ کوئی ٹرسٹ بنا دو۔ کسی اسپتال میں وارڈ بنا دو۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس میں شاید ہمت نہیں ہے۔ یہ سب اس کے باپ کی تمام عمر کی کمائی تھی۔ یہ اسے مل سکتی تھی مگر وہ خود اس سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اب اس کا حقِ وراثت حاصل کرے تو مشکل اور پھر اسے بیچے تو مزید مشکل چنانچہ وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس نے خود کو پشیمانی اور پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لیے سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"کیسی عجیب بات ہے سکندر بادشاہ!" ٹیڈی نے کہا۔ "کوٹھی کار اور بھرا ہوا گھر سب ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اپنا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آفس میں ٹیبل جوڑ کے سو جاتا ہے۔ تم کہتے ہو اس میں ہمت نہیں۔ ہم نے تو اس کا نشانہ دیکھا ہے۔ گولی سے موم بتی کا شعلہ گل کر دیا تھا مگر موم بتی کھڑی رہی تھی اور ہمارے ساتھ جان کی بازی لگانے میں وہ کب پیچھے رہا۔"

"وہ ہمت کچھ اور ہے استاد۔ بڑے بڑے بہادر اور نڈر لوگ کسی نہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے ایک بہت خطرناک مجرم کو دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کتنے قتل کر چکا تھا۔ خون بہتے دیکھ کر اسے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ کانپنے لگتا تھا۔ وہ پکڑا بھی ایسے ہی گیا تھا۔ کہیں ڈاکا ڈالنے گیا تھا۔ عورت کو اس نے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ ایک بچہ سوتے سے اٹھ گیا۔ پانچ سات سال کا بچہ تھا وہ رونے لگا اور اس کے پیروں سے لپٹ گیا کہ میرے ڈیڈی کو مت مارو۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے کیونکہ وہ خنجر کا ایک وار کر چکا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور زخمی شخص کو خود اسپتال لے کر دوڑا۔ بچہ مسلسل روتا رہا کہ تم نے میرے ڈیڈی کو مار دیا اور وہ اسے چپ کراتا رہا کہ نہیں بیٹا۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اسپتال میں پولیس نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں پھانسی ہو گئی اسے۔ جو کام پولیس اپنے وسائل کی طاقت سے نہیں کر سکتی تھی وہ ایک بچے کے آنسو کر گئے۔ غالب بھی اس گھر کے آسیب سے ڈرتا ہے۔"

"اس کا آسیب میں دور کر دوں گی۔" نازو نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اسے اسی گھر میں۔"

"آمین۔ اور اس کے بعد تم دونوں باقی عمر ہنسی خوشی اسی گھر میں رہو گے۔" میں نے کہا۔ "دودھوں نہاؤ گے پوتوں پھلو گے۔"

نازو کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے لال پڑ گیا۔ اسے امید نہ تھی کہ میں اس کی بات کو یوں موڑ دوں گا۔ رات کے ساڑھے نو بجنے کو تھے۔ ٹیڈی بازار سے روٹی سالن لے کر آیا تو ہم سب نے پیٹ بھرا اور پڑ کے سو گئے۔ میں اور ٹیڈی ایک کمرے میں رہے ہمارے ساتھ والا بیڈ روم شہلا اور محسن کا تھا۔ نازو کو اس کے مقابل کا بیڈ روم دے دیا گیا۔ ٹیڈی بہت جلد گہری نیند میں خراٹے لینے لگا۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ جو ٹیکسی اسپتال میں رہ گئی تھی اس کی مدد سے پولیس مالک کا سراغ لگا لے گی اور اس سے ہمارے متعلق معلوم کرے گی تو وہ سب کچھ بک دے گا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ نہ ہم خفیہ پولیس کے آدمی تھے، نہ ملٹری انٹیلی جنس کے کرنل میجر بلکہ مفرور اشتہاری مجرم تھے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے پولیس سے تعاون کرے گا اور ہمارے بارے میں ہر بات تفصیل سے بتا دے گا۔ ٹیڈی کو یہ ڈر تو نہیں تھا کہ پولیس ہمارا سراغ لگا لے گی مگر اس دولت کی فکر تھی جو ہم ٹیکسی ڈرائیور رحمن ماہی کے گھر میں مدفون چھوڑ آئے تھے۔ ایک صندوق سونے کا بھرا ہوا اور ایک انڈین کرنسی سے بھرا ہوا اس گھر کے آنگن میں دفن تھے اور انھیں فوری طور پر نکال لینے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ میں نے ٹیڈی کو تسلی دی کہ ابھی ہمیں اس پیسے کی ضرورت بھی نہیں۔ جب ضرورت پڑی تو دیکھا جائے گا۔

ٹیڈی نے محسوس کیا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوں اور یہ سمجھا کہ میں تھکن کے باعث نیند سے مغلوب ہوں چنانچہ وہ منہ پھیر کے سو گیا مگر میں جاگتا رہا کیونکہ میں رابعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک دن اس کے دیدار سے محرومی کی نذر ہو گیا تھا۔ کیا اس نے میرا انتظار کیا ہوگا؟ یقیناً کیا ہوگا اور کیا خبر وہ اس وقت تک جاگ رہی ہو اور میرے متعلق سوچ رہی ہو کہ آخر میں کیوں نہیں آیا۔ اس کے اور میرے درمیان احساس کی اجنبیت کے فاصلے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دو دن۔ میں اس کی نظر کے علاوہ اس کا دل بھی مجھے پہچان لیتا۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھتا اور ان تمام مقامات پر لے جاتا جہاں کبھی وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے محسن اور شہلا کے گھر لاتا۔ اتنے مہرباں آشنا چہرے دیکھ کر وہ تنہائی کے اس جنگل سے نکل آتی جہاں اس کے ساتھ خوف اور بے یقینی کے ڈراؤنے سائے تھے اور خود شناسائی کے احساس سے محرومی کا اندھیرا تھا۔ وہ روشنی مانگتی تھی اور میں اسے روشنی کی طرف لیے جا رہا تھا۔ وہ روشنی دیکھنے لگی تھی مگر آج میں نے اس کو پھر نا امید کیا۔ انتظار کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بعد ناامیدی کتنی دل شکن ہوتی ہے۔

اس وقت نہ جانے کیوں دلِ ناصبور نے مجھے اتنا بے اختیار کیا کہ میں چپکے سے اٹھا اور دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ گلی میں آدھے چاند کا اجالا تھا۔ رات کے گیارہ بجے لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ تھی اور بیشتر گھروں کی تاریکی مکینوں کے بے خبر سونے کی خبر دیتی تھی۔ اتنی رات گئے ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا اخلاق و آداب کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن رالعہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں نے خود کو بدتمیز اور بدتہذیب کہلوانا منظور کیا۔ ابھی میں پچاس قدم ہی چلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سے رکشا کی آواز آئی۔ وہ کسی سواری کو اتار کے خالی لوٹ رہا تھا مجھے یوں لگا جیسے تقدیر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ چند منٹ بعد میں رکشا میں سوار اپنی منزل کی سمت رواں تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے رکشا اپنے انجن کی طاقت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے اور انجن کو پٹرول کی توانائی حرکت نہیں دے رہی ہے۔ یہ مقناطیسی کشش جیسی لیکن اس سے بہت زیادہ عظیم محبت کے جذبے کی کشش تھی۔ جو مجھے رالعہ کی طرف دھکیل رہی تھی اور میرے ساتھ رکشا بھی اسی سمت میں جا رہا تھا جدھر رالعہ تھی۔ میرا تصور مجھ سے بہت آگے محوِ پرواز تھا اور اس کے ہر روپ کی تصویر یوں پیش کر رہا تھا جیسے سینما کے اسکرین پہ سلائڈ پروجیکٹر ایک کے بعد ایک اشتہار دکھاتا جاتا ہے۔

گیارہ بج کر بیس منٹ پر ڈاکٹر لطیف کی کوٹھی کے دروازے پر اتر جانے کے بعد میں نے خود کو سست احمق تصور کیا جسے اپنے آپ پر ذرا بھی اختیار نہ تھا۔ دل کے ہاتھوں یہ دیوانگی اب میری ذات سے بڑھ کر دوسروں کے لیے زحمت کا سبب ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر لطیف کی فراخدلی اور روشن خیالی کا صلہ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ میں وقت بے وقت ان کے دروازے پر کھڑا نظر آؤں۔ ان کا یہی احسان کیا کم تھا کہ میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور رالعہ کا نام و نسب پوچھے بغیر اپنے گھر میں جگہ بھی دی اور علاج کے ساتھ وہ ماحول بھی فراہم کیا جو اس کے لیے نئی زندگی کا ضامن ہوا۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا تو میرے جذبات پر عقل غالب آنے لگی اور میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ آگے بڑھوں یا لوٹ جاؤں۔ چند گھنٹوں کی ایک رات گزر ہی جائے گی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موش نے بڑی گھن گرج کے ساتھ گیٹ پر یلغار کی۔ میں گیٹ سے باہر تھا اس کے باوجود میں اچھل کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ غالباً یہ ڈاکٹر لطیف کی ظرافتِ طبع کا نتیجہ تھا کہ اچھے خاصے صحت مند بکرے سے بڑے کتے کا نام موش رکھ دیا گیا ورنہ لوگ تو ٹائیگر قسم کے نام رکھتے ہیں۔ ناسمجھ جانور نہیں جانتا تھا کہ اسے چوہا کہہ کر بلایا جا رہا ہے ورنہ سخت سبکی محسوس کرتا۔

موش کے دہاڑنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اندر ڈاکٹر لطیف کو میری آمد کی اطلاع مل گئی۔ ایسی کرخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں بھونکتا ہوا کتا کہاں اور وہ سریلی ڈنگ ڈانگ والی کال بیل کہاں جس کو صرف انگلی سے چھونا پڑتا ہے۔ اندر کے کمرے سے ڈاکٹر لطیف نے گیٹ لائٹ آن کی اور کھڑکی میں سے مجھے کھڑا دیکھا۔ اتنی دور سے انھوں نے مجھے پہچانا تو نہیں ہوگا مگر ایک آواز سے انھوں نے موش کو سچ مچ موش بنا دیا۔ وہ چوہے کی طرح دم دبا کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تو میں گیٹ کھول کر اندر گیا اور موش کے عزائم سے ہوشیار پورے دفاعی انداز میں چلتا ہوا برآمدے تک پہنچا جہاں ڈاکٹر لطیف گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "اس وقت مجھے آنا تو نہیں چاہیے تھا۔ آپ سو رہے ہوں گے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "اس عمر میں نیند کی ضرورت بہت کم ہو جاتی ہے ینگ مین۔ میں ایک بجے تک ضرور جاگتا ہوں۔ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ عموماً پڑھتا ہوں ورنہ خطوں کے جواب لکھتا ہوں۔ آؤ اندر آؤ۔" وہ آگے آگے چلنے لگے۔

"اتنے خط کسے لکھتے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"لوگوں کو۔ جو مجھ سے مشورے مانگتے ہیں۔" وہ بولے۔ "اگر معمولی مسائل ہوں تو انھیں کلینک میں نہیں بلاتا۔ زیادہ تر مسائل تو محض لاعلمی یا وہم کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی نیند نہ آنے کا مرض۔ اب میری عمر کا آدمی دس گھنٹے کی گہری نیند مانگتا ہے تو اسے بیماری کوئی نہیں۔ یہ کم علمی کی بات ہے۔ اسے بتا دیتا ہوں کہ بھائی نیند نہ آئے تو کوئی کام کرو۔ یہ گولیاں وغیرہ کچھ نہیں کریں گی۔ نیند نہ آنے کے غم کو روگ مت بناؤ۔ جب نیند آئے سو جاؤ۔ نہ آئے تو کوئی بات نہیں۔ عورتیں زیادہ خوش قسمت ہوتی ہیں نیند کے معاملے میں مثلاً ہماری بیگم۔ تم نے اچھا کیا کہ اس وقت آ گئے۔ ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا آپ کا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تمہارا کافی وقت لوں گا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس لیے پہلے میں کافی بنا لیتا ہوں۔ پیو گے نا؟"

"بڑے شوق سے۔" میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ کچن میں پہنچ کر انھوں نے مجھے ایک اسٹول پیش کیا اور خود الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈالنے لگے۔

"میں تمہارا منتظر تھا۔" انھوں نے ٹیک لگا کے کہا۔ "مسئلہ ہے رالعہ کا۔"

میں ان کے رویے سے اندازہ تو کر ہی چکا تھا کہ وہ رالعہ کے بارے میں بات کریں گے۔ "کوئی... نیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تو نیا نہیں۔ ایک معمولی سی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔" وہ ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ نفسیاتی اسباب کی تشخیص مشکل کام ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ اور مشینی آلات اس میں کام نہیں آتے۔ اب تم خود جانتے ہو کہ کل رات رالعہ کی پروگریس بہت اچھی تھی۔ میری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ تم نے بڑی ذہانت کے ساتھ اس کو ہینڈل کیا۔ وہ بہت خوش تھی اور ظاہر ہے اس کو نارمل دیکھ کر میں خوش تھا مگر تمہارے چلے جانے کے بعد رات کو ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا اس نے چلانا شروع کیا..."

"ڈاکٹر صاحب۔ میں نروس ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"اوہ یس۔ وہ سو رہی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے ابلتے پانی کو کافی پر ڈالا اور مگ میں چمچہ ہلانے لگے۔ "اس کی چیخ و پکار سن کر میں سب سے پہلے بھاگا کیونکہ میں جاگ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی تھی اور نیچے آ چکی تھی۔ میں نے اسے پکڑ لیا کیونکہ وہ باہر جانا چاہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے خود کو چھڑا لیا مگر دوسری بار میں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ مسلسل تمہیں آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ انکل مجھے جانے دیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔ میں نے کہا کچھ بتاؤ تو سہی کہ کہاں جانا ہے۔ اس پر ہسٹریا کا سخت دورہ پڑا تھا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا کہ سکندر زخمی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ مچلتی رہی اور خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی رہی مگر سب سے غنیمت بات یہ تھی کہ وہ مسلسل تمہارے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوش میں آؤ رالعہ۔ سکندر بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ چلاتی رہی کہ آپ نہیں جانتے۔ آپ کو نہیں معلوم۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ لال رنگ کی فاکس ویگن تباہ ہو گئی ہے۔"

میں کچھ دیر پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ "یہ رات کتنے بجے کی بات ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"وقت... میرا خیال ہے ڈیڑھ یا دو بجے کی بات ہوگی۔" ڈاکٹر لطیف نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا۔

"پھر تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔" میں نے بے خیالی میں مگ پکڑ لیا۔

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر لطیف نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کل رات تقریباً اسی وقت میں ایک حادثے کا شکار ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں تو بچ گیا لیکن گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ رالعہ نے خواب دیکھا تھا یا... کچھ اور بات تھی۔ آپ ڈاکٹر بھی ہیں اور ماہرِ نفسیات بھی۔ خود سمجھ سکتے ہیں۔"

"ہاں۔ اس جذباتی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "ای ایس پی۔ جذبات کی ہم آہنگی۔ خیالات کی فریکوئنسی کا ایک ہو جانا۔ ٹیلی پیتھی۔ مگر میڈیکل سائنس اس کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میرے اپنے پیشہ ورانہ تجربے میں یہ کوئی پہلا کیس نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر کا واسطہ کبھی نہ کبھی ایسے حالات سے پڑتا ہے اور عام لوگوں کے مشاہدے میں ایسے واقعات آتے رہتے ہیں جن کی منطقی توضیح ممکن نہیں۔ میں اس چکر میں پڑتا بھی نہیں کیونکہ میرا فیلڈ سائیکولوجی ہے پیرا سائیکلوجی نہیں۔ رالعہ کی ذہنی کیفیت نے وقتی طور پر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ ردِ عمل کا ردِ عمل تو نہیں۔ یہ بھی ایک چکر ہوتا ہے۔ اب تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ میری سمجھ میں آ رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر رالعہ کے ذہن پر خوشگوار اثر ہوگا۔ وہ پھر نارمل ہو جائے گی۔"

"کیا ابھی وہ نارمل نہیں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں۔ صبح تک میں نے اس کو بہت اسٹرانگ انجکشن دے کر سلائے رکھا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "عموماً چھ سے آٹھ گھنٹے تک سکون آور دواؤں کا اثر رہتا ہے لیکن ذہن زیادہ ڈسٹرب ہو تو تین چار گھنٹے میں ہی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے دوبارہ انجکشن دیے۔ دوپہر کے بعد اس کو ہوش آنے لگا تو میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ شام کو اس نے کچھ کھایا اور مجھ سے بات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے بارے میں ہی پوچھتی رہی کہ سکندر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زیادہ زخمی ہوا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ سکندر کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور وہ بالکل خیریت سے ہے مگر اس نے میری ایک نہیں مانی۔ کہنے لگی کہ انکل مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کریں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ اس کی گاڑی حادثے میں ختم ہو گئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتا دیں کہ سکندر کون سے اسپتال میں ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے اسے قائل کرنا چاہا لیکن وہ بضد رہی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اس کو اسپتال لے جانا نہیں چاہتا۔ رفتہ رفتہ اس کی کیفیت میں پھر جنون کے آثار عیاں ہونے لگے۔ وہ رونے لگی کہ سب نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہے۔ میرا ہمدرد کوئی نہیں۔ کوئی نہیں بتاتا کہ سکندر زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ مر گیا ہے تب بھی مجھے بتا دو تاکہ مجھے قرار آ جائے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یا میں بھی مر جاؤں۔ زندہ ہے تو مجھے ایک بار اس کی صورت دکھا دو۔ اسے میری ضرورت ہے۔ میں اسے بچالوں گی۔ بس ایک پاگل پن کا دورہ تھا جس میں ایک بے بنیاد خیال نے یقین کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شام تک اس کا رونا دھونا زیادہ ہوگیا اور تم بھی نہیں آئے تو وہ چلانے لگی کہ دیکھا۔ سکندر ٹھیک ہوتا تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وعدہ کر کے نہ آئے۔ بس میاں۔ جب اس کی حالت تمھارے نہ آنے سے بگڑنے لگی تو میں نے پھر وہی کیا جو میں کرسکتا تھا۔ میں نے اس کو زبردستی انجکشن دے دیا اور بے ہوش کر دیا۔"

"سارا قصور میرا ہے لیکن میں کیا کرتا۔ میں خود پھنس گیا تھا۔" میں نے خالی مگ کو سنک میں رکھ دیا۔

"میں نے کوشش کی تھی کہ غالب کے ذریعے تم سے رابطہ قائم کروں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "سات بجے تک تو وہ اخبار کے دفتر پہنچا نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے پتا چلا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے آکر چلا گیا۔"

"کیا اب میں اس سے مل سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر مقصد دیکھنا ہے تو جاؤ دیکھ لو۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "لیکن بات کرنا چاہتے ہو تو ابھی مشکل ہے۔ وہ صبح تک سوتی رہے گی کیونکہ تمھارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں نے اس کو دوسرا انجکشن دیا تھا۔ یہ نیند نہیں ہے جس سے اس کو جگایا جاسکے۔ اگر اس نے آنکھیں کھولیں تب بھی اس کا ذہن تو بیدار نہیں ہوگا۔ تم صبح نو بجے آجاؤ تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں رابعہ کو ذہنی و جسمانی طور پر اس ملاقات کے لیے تیار رکھوں اور وہ تم سے بات کرتے ہوئے اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ یہ بہت ضروری ہے سکندر کہ وہ ایک حقیقت کو عقل و شعور کے ساتھ تسلیم کرے کہ تم زندہ اور بالکل صحیح سلامت ہو اور اسے یقین آئے کہ جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ خواب تھا اور گزشتہ دن کے واقعات اسی خواب کا حصہ تھے۔ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہوگی تو تمھیں سامنے پاکر بھی سمجھتی رہے گی کہ آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری صحت اور سلامتی کا یقین رابعہ کی موجودہ ذہنی کیفیت کو ختم کرسکتا ہے۔ اس یقین کے بغیر شاید... دوائیں اور علاج، میری تسلی اور ہمدردی کے الفاظ اور ماحول کی موافقت۔ سب بے کار ہوں گے۔ وہ تم کو چھو کر تمھارے مادّی وجود کو تسلیم کرے گی تو اس کے ذہن میں بیٹھا ہوا خوف خود بخود دور ہو جائے گا۔ اس خوف سے رابعہ کو صرف تم نجات دلا سکتے ہو۔ صرف تم سکندر۔"

"میں صبح نو بجے آجاؤں گا ڈاکٹر انکل۔" میں نے کہا۔ "اس وقت آپ کو جو زحمت ہوئی..."

"اوہ شٹ اپ۔ میں ایسی فضول رسمی گفتگو سے الرجک ہوں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم نے اگر بہت اچھا کیا۔ رابعہ کا پرابلم ہے جس کو ہم دونوں مل کر حل کرسکتے ہیں۔ مجھے بھی تمھاری مدد چاہیے جو کام تم کرو گے وہ کوئی دوا نہیں کرے گی اور کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکے گا خواہ وہ رابعہ کا کچھ بھی ہو۔ میرا مطلب ہے اگر اس کا بھائی ہوتا یا والدین ہوتے۔ تو ان سب کی نیک خواہشات اور دعائیں۔ محبت اور شفقت وہ کرشمہ نہیں دکھا سکتے تھے جو تم نے اس سے ملاقات کے بعد دکھایا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹوں میں تم اس کو شفا کی منزل کے بہت قریب لے آئے تھے۔ تمھارا طریقہ مجھے پسند آیا تھا۔ بہت سائنٹفک اور عقلی و عملی طریقے سے تم نے اس کو سوچ کی راہوں پر ڈالا تھا اور آہستہ آہستہ سوچ کو یادوں سے منسلک کر دیا تھا۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو مگر تم نے ایک ڈاکٹر کی طرح سوچا۔ ایک چاہنے والے جذباتی نوجوان کی طرح نہیں۔ میں خاصے یقین کے ساتھ دعوے کرسکتا ہوں کہ کل وہ تم کو اپنی نظر سے دیکھ لے گی اور عقل سے پہچان لے گی تو پھر اس مقام پر آجائے گی جہاں تم اسے کل شام چھوڑ گئے تھے اور پھر آگے سفر کرے گی۔ بہت جلد تمھارے اور اس کے درمیان وقت کا خلاء باقی نہیں رہے گا اور وہ اسی طرح تمھارے ساتھ ہوگی جیسے پہلے تھی۔"

"مجھے بھی اس کا یقین ہے ڈاکٹر انکل۔ لیکن آپ نے جو کچھ رابعہ کے لیے کیا اس کے بغیر شاید رابعہ مجھے کبھی نہ ملتی۔ اگر ملتی تو اجنبی ہو کے۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ رہتی اور اس کے بغیر میں کیسے زندہ رہتا۔ آپ کے احسان کا بدلہ میرے شکریے کے الفاظ نہیں ہوسکتے۔"

"کسی بھی ڈاکٹر کے لیے شکریے کے الفاظ میں خوشی نہیں، اس کی کامیابی ہی اسے خوشی دیتی ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "وہ کسی ایک مریض کو زندگی اور صحت کی خوشی دیتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں خدا نے ایک چھوٹی سی نیکی ضرور لکھ دی ہوگی۔ یہ نیکی ایک صدقۂ جاریہ کی طرح عاقبت تک ساتھ دیتی ہے۔ جب رابعہ ٹھیک ہو جائے گی اور میں تم دونوں کو خوش اور شاد و آباد دیکھوں گا تو یہ ایک دائمی مسرت ہوگی جو مجھے حاصل رہے گی۔ تمھاری زندگی کی ہر خوشی تمھاری کامیابی۔ تمھارے بچوں کی خوش حالی۔ جو کچھ بھی میں دیکھوں گا اس میں یہ خیال شامل ہوگا کہ خدا نے مجھے رابعہ کو صحت دینے کی توفیق عطا نہ کی ہوتی تو یہ سب کہاں ہوتا۔ ایسی نہ جانے کتنی خوشیاں ہی میری زندگی کا وہ اندوختہ ہیں جس پر میں فخر کرسکتا ہوں۔ یہ مال و دولت تو اسمگلر اور چور ڈاکو بھی کما لیتے ہیں لیکن وہ سب انھیں نہیں ملتا جو مجھے ملا۔ خیر۔ اب تم جاؤ ورنہ میں بولتا رہوں گا اور صبح ہو جائے گی۔" وہ ہنسے اور انھوں نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مجھے موش کی چیک پوسٹ سے بے خوف و خطر گزارنے کے لیے وہ گیٹ تک میرے ساتھ بھی رہے۔

واپسی پر سواری کا ملنا مشکل ہوگا' یہ بات مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی معلوم تھی چنانچہ میں نے انتظار کیے بغیر مارچ شروع کیا۔ "چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔" مجھے ایک بہت پرانا فلمی گانا یاد آیا جو میں اور محسن ایسے ہی حوصلہ آزما مواقع پر گاتے تھے۔ عاشقِ صادق کی واپسی۔ ناکام و نامراد۔ دیدارِ یار تک نصیب نہ ہوا اور خیر سے بدھو گھر کو آئے مگر بھائی عشق میں تو یہی ہوتا ہے۔ جوتیاں چٹخانے میں مجنوں کا ریکارڈ قائم ہے۔ جو صحرا میں نہ جانے کتنا پھرا۔ یہ کم غنیمت ہے کہ اس عہد کے عشق میں صحرا کے بجائے تارکول کی پختہ سڑک ہے۔ وہ خارِ مغیلاں اور نہ آبلہ پا ہونے کی آزمائش۔ زیادہ سے زیادہ سڑک پر بھونکنے والے کتے ہیں مگر کتوں سے کیا ڈرنا۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چل چل رے نوجوان۔ چھ سات میل ہی تو جانا ہے۔

میں خوش اور پُرامید تھا چنانچہ میرے ذہن کے اوٹ پٹانگ خیالات میں بھی مایوسی اور ملال نہیں تھا اور ڈاکٹر انکل سے ملنے کے بعد مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ واپسی پر محسن یا ٹیڈی نے کھلی کھڑکی سے داخل ہوتے پکڑ لیا تو انھیں کیا جواب دوں گا۔ میں ان کو دندان شکن جواب دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ابھی میں ایک میل بھی نہیں چلا تھا کہ مجھے مسافت کے طویل ہونے کا احساس کچھ شرمندہ کرنے لگا۔ پہلی حماقت تو میں نے گھر سے نکل کے کی تھی مگر اس سے کچھ فائدہ ہوگیا۔ یہ دوسری حماقت تھی کہ میں واپس چل پڑا۔ اگر ڈاکٹر لطیف سے کہہ دیتا کہ صبح تک ٹھہر جاتا ہوں تو کیا وہ انکار کرتے۔ وہ کہتے کہ میاں اپنا گھر ہے۔ جگہ کی کون سی کمی ہے۔ اب تو گھر پہنچتے پہنچتے مرغا اذانیں دینے گے اور ٹانگیں یوں ہو جائیں گی کہ بقول مرزا غالب سے چلتے ہیں بعدِ مرگ بھی میرے کفن میں پاؤں۔ اس کے بعد محسن کی ڈانٹ ڈپٹ۔ ناشتا اور پھر کوئے یار کی جانب مراجعت۔ تکلّف میں تکلیف کے سوا کیا ہے۔

ایک جیپ میرے پیچھے سے نمودار ہوئی تو میں نے پلٹ کر دیکھا اور سڑک سے ذرا ہٹ کر چلنے لگا۔ جیپ میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ رات کو گشت کرنے والی پولیس سوال جواب کرے گی کہ جاتے ہو کس طرف کو، کہاں کا خیال ہے اور ان کی فضول بک بک کا ایک انجام تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے جائیں اور دوسرا یہ کہ میں ان کی فیس ادا کر کے شرافت کی سند حاصل کرلوں۔ وہ اپنے راستے جائیں اور میں اپنی راہ پکڑوں۔ یہ بڑی افسوس ناک بات تھی کہ سواری پچاس روپے خرچ کر کے بھی نہیں مل سکتی تھی مگر سفر ختم ہونے تک تین چار جگہ آوارہ گردی کے الزام سے بچنے میں ڈیڑھ دو سو روپے خرچ ہوسکتے تھے۔ راہِ عاشقی میں فرہاد یا مجنوں کو کسی کانسٹیبل نے بہر حال نہیں پکڑا تھا اور انھیں کسی کو رشوت نہیں دینا پڑی تھی۔

جیپ رکے ایک پھول والا افسر میری طرف بڑھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو اس وقت؟" اس کے لہجے میں تھانیداری کا رعب یا اکھڑپن تو فطری تھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ اردو صاف نہیں بول سکتا۔ اس کی زبان کچھ اینٹھی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے کوئی انگریز روانی سے اردو بولے یا مدراس کا رہنے والا فرنچ میں بات کرے۔

"بالکل۔ تمھیں اس کا قانونی اختیار حاصل ہے آفیسر۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کانونٹ زدہ نہیں ہے کوئی اینگلو انڈین ہے۔ "تم ڈاکٹر لطیف کو یقیناً جانتے ہوگے؟"

"کون ڈاکٹر لطیف؟" وہ یکلخت محتاط اور شائستہ ہوگیا۔

"وہ... جو نیچے رہتے ہیں؟"

"بالکل وہی۔" میں نے پچاس روپے بچ جانے کے خیال سے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے بڑی خوشی ہوئی..."

"شٹ اپ۔ تم ڈاکٹر لطیف نہیں ہو۔ میں ان کو پہچانتا ہوں۔" اس نے غرا کے کہا۔ "دھوکے باز..."

"پلیز آفیسر۔ میں نے ڈاکٹر لطیف ہونے کا دعوے نہیں کیا۔" میں نے بھی لہجہ سخت کرلیا۔ "میں ان کے گھر سے آرہا ہوں۔"

"کون ہو تم ان کے؟ مریض؟" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔ "وہ تو پاگلوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیا تم فرار ہوئے ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی کو دیکھنے گیا تھا اور جسے میں دیکھنے گیا تھا وہ پاگل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تمھارا اپنا گھر کہاں ہے؟ ڈاکٹر لطیف کو چھوڑو۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ "نام کیا ہے تمھارا؟ اپنی شناخت کرا سکتے ہو یا میں لے جاؤں...؟"

"ضرور لے جاؤ۔ ڈاکٹر لطیف کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ مجھے شناخت کر کے تمھیں مطمئن کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں کہ آدھی رات کو انھیں جگاؤں۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ تم کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔ کسی شریف آدمی کے لیے خود کو شریف ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "تم اپنا نام تک نہیں بتا رہے ہو۔" اب اس کے لہجے میں دھمکی بہت واضح تھی اور جیپ میں سے ایک رائفل بردار کانسٹیبل بھی اتر کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

افسر کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے کر میں نے اپنے لیے مشکل پیدا کر لی ہے۔ ڈاکٹر لطیف مجھے صرف اسی صورت میں پہچانتے جب میں اپنا نام سکندر بخت بتاتا اور اصل نام بتاتا تو اس بات کا امکان تھا کہ اے ایس آئی جو مجھے صورت سے نہیں پہچان سکا تھا، نام سے فوراً پہچان جاتے۔ پھر وہ مجھے ڈاکٹر لطیف کے پاس کبھی نہ لے جاتا۔ اتنے بڑے کارنامے کو عطیۂ قدرت جانتا اور مجھے زندہ یا مردہ افسرانِ بالا کی خدمت میں پیش کر کے سرخ رُو ہوتا۔ ترقی اور تعریفی سند پاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا۔ اصل نام بتانے میں بہت خطرہ تھا چنانچہ میں نے ظاہری سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا: "آئی ایم سوری... میں سلیم جورت ہوں۔"

"تم۔ کرسچین ہو؟" اس کے لہجے میں رونما ہونے والی تبدیلی نے مجھے حوصلہ دیا۔ "کیا کرتے ہو؟"

"مشن ہائی اسکول میں سائنس پڑھاتا ہوں۔ ایم ایس سی بی ای ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بھی ہوں۔"

"کون سے مشن اسکول میں؟" وہ بولا۔ "یہاں لاہور میں؟"

"نہیں۔ راولپنڈی کے مشن اسکول میں۔" میں نے کہا۔ "راجہ بازار کے پاس فوارہ چوک کے قریب ہے۔"

"وہ مجھے معلوم ہے۔" اس کی دلچسپی اور ماتحت کانسٹیبل کی بیزاری بڑھ گئی۔ کانسٹیبل انگریزی میں ہونے والی گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف تھا کہ اچانک ملنے والا افسر کا یار ہے یا معاملہ کچھ اور ہے۔ "کب سے ہو تم وہاں۔ بہت سینئر ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔ تقریباً سات سال سے ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے پہلے میرے والد تھے۔"

"سات سال پہلے میں نے مشن اسکول راولپنڈی سے ہی میٹرک کیا تھا۔ مجھے تمہاری صورت دیکھی ہوئی نہیں لگتی۔" وہ بولا۔

میری ساری محنت جو میں نے اس اینگلو انڈین کا ہم مذہب بن کے رعایت حاصل کرنے کے لیے کی تھی، ضائع ہونے لگی۔ میں نے جھوٹ کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی جدوجہد میں کمی نہیں آنے دی۔ "وہاں اور بھی ٹیچر تھے اور اس وقت میں نیا تھا۔" میں نے کہا۔

"جو کچھ تم نے بتایا ہے اس کا کوئی ثبوت دے سکتے ہو؟" وہ بولا۔ "یہاں کس کے پاس ٹھہرے ہو؟"

میں نے ایک ایسے علاقے کا نام لیا جہاں بہت سے معزز کرسچین رہتے تھے اور اپنا ایک بھائی ایجاد کیا جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرار تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا شک بڑھ رہا ہے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا۔ غالباً اس نے تاڑ لیا کہ میں خود کو کرسچین ظاہر کر کے اسے بے وقوف بنا رہا ہوں اور اپنی جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے دوسرے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ پھر تیسرا جھوٹ بولنا پڑا۔ آہستہ آہستہ جھوٹ کا یہ جال میرے لیے وبال بننے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خود اپنے جال میں گرفتار ہونے والا ہوں۔ کسی نہ کسی مرحلے پر میرا ایک جھوٹ ہر جھوٹ کا راز فاش کر دے گا۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں سو پچاس کا نذرانہ دے کر نکل جاتا لیکن خود کردہ را علاجے نیست۔ اے ایس آئی اسے قبول کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔

"تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ بولا۔ "تم مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔"

"تم میرے ساتھ چل کے میرے بھائی سے پوچھ سکتے ہو۔" میں نے کہا اور ذہنی طور پر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

"میں اس علاقے میں گشت پر ہوں۔ تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "لیکن تم اپنے بھائی کو تھانے بلوا سکتے ہو۔ اس کے گھر میں فون تو ہوگا؟"

"نہیں۔ فون تھا۔ زیادہ بل آنے کے بعد کٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "بہت افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے اسکول کے ایک ٹیچر..."

"شٹ اپ۔" اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "تم وہاں ٹیچر نہیں ہو۔ اگر ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہیڈ ماسٹر کون ہے وہاں اب سات سال پہلے کون تھا؟ دوسرے سب ٹیچرز کے نام بتاؤ جو تمہارے ساتھ تھے۔"

"اس ریوالور کے سامنے تو مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں آئے گا انسپکٹر۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ابھی تک وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا لیکن مجھے اس کا نام دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم ایک اسٹریٹ لائٹ سے کافی فاصلے پر تھے اور قریب کے کھمبے پر کوئی بلب نہیں تھا۔ تھوڑی بہت روشنی صرف میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ خود روشنی کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ نام کا چھوٹا سا بیج اس کی جرسی پر لگا ہوا تھا۔ نیلے پلاسٹک کی آدھے انچ سے بھی کم چوڑی اور تین انچ لمبی پٹی پر انگریزی کے سفید حروف بھی اندھیرے میں تھے۔ اس نے ریوالور ہلا کے مجھے جیپ کی طرف بڑھنے کا اشارا کیا۔ میں نے صورت پر مظلومیت، دکھ اور بے بسی، احساسِ ذلت اور برہمی کے جذبات طاری کیے اور آہستہ سے ایک قدم جیپ کی طرف بڑھایا۔ دوسرے لمحے میں نے پیچھے کی طرف ٹانگ گھمائی اور میرے جوتے کی ایڑی سب انسپکٹر کی کلائی پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل کو کھینچ لیا اور اس کی گردن پکڑ کے جھٹکا دیا۔ وہ قلابازی کھا کے آگے گیا اور اس کی رائفل وہیں گر گئی۔ میں نے غوطہ مار کے رائفل اٹھائی اور ڈنڈے کی طرح گھمائی۔ اس کا بٹ سب انسپکٹر کے شانے سے ذرا نیچے لگا۔ اگر وار اس کے سر پر پڑتا تو شاید اس کی کھوپڑی چٹخ جاتی۔ وہ بھی ریوالور سے محروم ہو چکا تھا مگر میں نے نہیں دیکھا تھا کہ میری کک سے اچھلنے والا ریوالور کدھر گیا تھا۔ رائفل کا بٹ پڑتے ہی وہ نیچے گرا اور اس نے چلا کر جیپ میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو گالی دی۔ "شوٹ ہم۔ باسٹرڈ۔ گولی مار دو اس... کو۔" اس کی دوسری گالی میرے لیے تھی۔

پہلا کانسٹیبل اتنی دیر میں پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی بے وقوفی کی۔ اس نے اپنے افسر کا حکم سنا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ حکم کسے دیا گیا ہے۔ وہ خود رائفل کے بغیر مجھے کیسے شوٹ کرتا۔ بدحواسی میں وہ میرے سامنے آ گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ ڈرائیور بالکل مطمئن گاڑی کے انجن کو اسٹارٹ رکھے بیٹھا تھا اور اسے بالکل امید نہ تھی کہ انگریزی بولنے والوں میں اچانک خوف ناک جنگ چھڑ جائے گی۔ اس نے رائفل نکالنے میں کچھ دیر ضرور کی مگر وہ بدحواس نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر بالکل محفوظ تھا اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ وہ کیسے جان سکتا تھا کہ اس کا اپنا ساتھی گولی کے راستے میں آ جائے گا۔ گولی مجھ پر حملہ کرنے والے کانسٹیبل کو لگی۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل کے دھماکے سے اور کانسٹیبل کی چیخ سے رات کا سکون درہم برہم ہو گیا۔

صورت حال غیر متوقع طور پر انتہائی پرخطر اور پریشان کن ہو گئی تھی۔ میرے لیے مقابلے سے تیز راہِ فرار ہو جانا ضروری تھا لیکن ایک خطرہ تو ڈرائیور کی طرف سے تھا کہ وہ رائفل کی دوسری گولی مجھے ضرور مار دے گا۔ میری وجہ سے اس کا ایک ساتھی قتل ہو چکا تھا اور یہ بات بھی اسے مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ دوسرا خطرہ سب انسپکٹر کی طرف سے تھا۔ اس نے ضرور دیکھا ہوگا کہ ریوالور کس سمت میں گیا تھا۔ وہ ریوالور تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے کبھی فرار نہ ہونے دے گا۔ کانسٹیبل گولی لگنے کے بعد گر گیا تھا مگر ایسے لیٹ گئی اٹھ رہا تھا کہ میں اس پر جا گرا۔ میرا گرنا میرے کام آیا۔ ڈرائیور نے اپنی رائفل سے جو دوسری گولی چلائی تھی وہ میرے سر کے اوپر سے گزر کے نہ جانے کدھر گئی۔ پھر میں نے سب انسپکٹر کو اٹھا لیا اور ڈھال بنا لیا۔ اس کے دونوں بازو کمر کے پیچھے لاک کر کے میں نے اسے سامنے رکھا اور چلا کر کہا: "چلاؤ... چلاؤ گولی... مار دو اپنے اس کتے کو بھی۔"

ڈرائیور نے اتنی دیر میں نشانہ لے لیا تھا مگر یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ نشانہ کون بنے گا۔ سب انسپکٹر نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اُسے دھکیلتا ہوا آگے لے گیا۔ بے چارا ڈرائیور جیپ سے باہر کھڑا ہوا اپنے افسر کی بے بسی کا نظارہ کرتا رہ گیا اور خود بھی بے بس ہو گیا۔ پولیس میں ریوالور صرف افسروں کو ملتے تھے چنانچہ گشت کرنے والی پارٹی کے باقی دو ارکان کے پاس وہی گوروں کے وقت کی رائفلیں تھیں۔ نیچے اترنے والے کانسٹیبل کی رائفل میدانِ کارزار میں اُس کے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ کرنے والے کانسٹیبل نے اپنی رائفل پیچھے کہیں رکھی ہوگی۔ ضرورت پڑتے ہی وہ بھی جنگ میں کود گیا تھا لیکن اس کی بہادری نے اپنی ہی شکست کا سامان کیا تھا۔ ایک خالی ہاتھ شخص تین مسلح افراد پر غالب آ چکا تھا اور یہ ان سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

"رائفل پھینک کر دور ہٹ جاؤ۔" میں نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ "ورنہ تمہارے افسر..."

"اس بدمعاش کی بات مانی تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔" سب انسپکٹر نے چلا کر کہا۔ "شوٹ کر دو اسے بے وقوف..."

رائفل لے کر جیپ کے ساتھ کھڑے ہوئے ڈرائیور کی عقل خبط ہو گئی۔ وہ بھی پولیس کی وردی میں تھا اور اتنے کم فاصلے سے یقیناً تیسرا فائر کرتا تو اپنے ایک افسر کے قتل کا مجرم ہوتا لیکن افسر حکم دے رہا تھا کہ گولی چلاؤ۔ افسر خودکشی کرنا چاہتا تھا یا پاگل ہو چکا تھا لیکن وہ پاگل نہیں تھا چنانچہ اس نے رائفل کی ہلاکت خیزی کا تیسرا تجربہ نہیں کیا۔ اُسی وقت سب انسپکٹر نے ثابت کیا کہ اُس کا حکم غلط نہیں تھا۔ یکلخت میں نے خود کو فضا میں بلند ہوتے محسوس کیا۔ پھر میں سخت زمین پر گرا۔ ایک پل میں مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ سب انسپکٹر بھی جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ جانتا ہے اور اس نے میرے ہاتھوں گرفتاری پر بے بسی کا مظاہرہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ مناسب موقعے کے انتظار میں تھا۔

"اِدھر لاؤ رائفل سور کے بچے۔" میں نے سب انسپکٹر کی آواز سنی اور ایک قلابازی کھا کے اٹھا۔ تیسری گولی جو سب انسپکٹر نے چلائی تھی اُس جگہ زمین میں گھس گئی جہاں ایک سیکنڈ پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے دونوں دشمنوں کو مساوی فاصلے پر دیکھا اور کانسٹیبل کا انتخاب کیا۔ پھر میں ایک جھٹکے سے اوپر اُٹھا اور میری فلائنگ کک نے کانسٹیبل کو سب انسپکٹر پر گرا دیا۔ حیران ہونے کی باری اب سب انسپکٹر کی تھی کیونکہ جو وار میں نے کیا تھا وہ کوئی ماہرِ فن ہی کر سکتا تھا۔ اپنی طرف سے اُس نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواب میں نہلے پہ دہلا ملے گا۔ یہ ہم سب کی فطری کمزوری ہوتی ہے کہ ہم خود کو سیر سمجھتے ہیں تو یہ توقع نہیں رکھتے کہ سوا سیر سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پالا پڑ جائے گا۔ اس ایک لمحے میں جب ماتحت اور افسر ایک ساتھ گرے تھے۔ افسر کو یقین آ گیا ہو گا کہ میں کوئی بہت ہی عیار اور مکار مجرم ہوں جس نے پہلے اپنی شستہ انگریزی سے اور اپنے جھوٹ سے کام نکالنا چاہا تھا لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو میں بے خوف و خطر تین مسلح پولیس والوں سے بھڑ گیا۔ شاید لاہور میں اس کا واسطہ ایسے کسی بدمعاش سے نہیں پڑا ہو گا جو اتنا مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو۔ اتنا اچھا اداکار بھی اور جوڈو کراٹے کا ماہر بھی۔

کانسٹیبل تو سینے پر پڑنے والی کک کے بعد اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کے دفاع پانے کا بالکل امکان نہیں تھا اور وہ اتنا کمزور بھی نظر نہیں آتا تھا کہ ایک کک سے بے ہوش ہو جائے۔ غالباً اس نے دانش مندی اسی میں جانی کہ چپ چاپ لیٹ جائے اور خود کو مزید پٹائی سے بھی بچائے، ایک اور قتل کے الزام سے بھی اور افسر کی حکم عدولی کی سزا سے بھی۔ افسر کو میں نے اٹھتے ہی جا لیا مگر وہ بہت پھرتیلا تھا۔ اس نے غوطہ مار کر میرا وار خالی کر دیا اور میں اس کے اوپر سے گزر کر گرا تو وہ بڑی پھرتی سے میرے اوپر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا وہ بڑا مہلک وار تھا جسے دشمن کو یقینی طور پر ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام نمائشی مقابلوں میں یا معمولی لڑائی جھگڑوں میں اس کا استعمال کوئی نہیں کرتا۔ جوڈو اور کراٹے کا فن بنیادی طور پر دفاعی کھیل ہے۔ چنانچہ اس میں جارحانہ نیت کو غیر اخلاقی تصور کیا جاتا ہے اور نقصان پہنچانے والے داؤ پیچ استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے مگر جہاں معاملہ زندگی یا موت کا ہو وہاں اخلاقیات کا سبق بے معنی ہو جاتا ہے۔ سب انسپکٹر بھی جو کچھ کر رہا تھا موجودہ حالات میں جائز تھا۔ میں نے فوراً اپنا دفاع کیا اور اس طرح اچھل کر کروٹ لی کہ دوسرے لمحے میں سب انسپکٹر نیچے تھا اور میں اوپر۔ مقابلے کو زیادہ دیر تک جاری رکھنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ادھر ادھر کی کوٹھیوں میں فائرنگ کے تین دھماکوں سے ہلچل مچ گئی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ذرا سی دیر میں وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ دو طرف سے چوکیداروں نے یا گھر کے ملازموں نے شور مچا رکھا تھا لیکن وہ قریب نہیں آ رہے تھے۔ جنگ میں پولیس ایک فریق تھی اور وہ ریفری بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔ ایک گھر سے کسی نے چلا کے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ دوسری طرف سے کسی نے کہا کہ یار پولیس کو بلاؤ۔ پھر نہ جانے کون زندہ دل تھا جو اس صورت حال سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا کہ ہاں یار، مزید پولیس کو بلاؤ، یہ پولیس تو کم ہے۔

میں نے بڑی عجلت میں اے ایس آئی کو اٹھا کے جیپ میں ڈالا اور جیپ میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ اسے گیئر میں ڈالتے ہی میں نے ایکسیلریٹر دبا دیا۔ جیپ ایک دم بھاگی۔ اسی وقت نہ جانے کدھر سے ریوالور کی ایک گولی آئی اور جیپ کے پیچھے لگے ہوئے دس لیٹر پٹرول کے جیری کین میں لگی۔ رات کی خاموشی میں فائر کی آواز سے میں نے اندازہ کر لیا کہ گولی اعشاریہ چار پانچ کے سروس ریوالور سے چلائی گئی تھی جو ملٹری آفیسر کے پاس ہو سکتا تھا، یا پھر پولیس اور رینجرز وغیرہ کے پاس۔ ان میں سے کسی نے مجھے فرار ہوتے دیکھا تھا اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اسے جزوی طور پر کامیابی ہوئی۔ گولی ٹائر یا پیٹرول ٹینک میں لگتی تو میں اتر کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ جیری کین میں سوراخ ہوتے ہی پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی اور جیپ کے پچھلے حصے میں شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ بہنے والا پٹرول جیپ کے کینوس پر بھی گرا تھا اور سڑک پر بھی پھیلتا جا رہا تھا لیکن اس کے خالی ہونے تک پوری جیپ کا آگ کی لپیٹ میں آ جانا یقینی تھا مگر جیری کین اچانک پھٹ گیا۔ دھماکا کسی دستی بم کی طرح تھا۔ میں نے جیپ کو ایک دم پورا ایکسیلریٹر دے کر آگے بڑھا دیا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے سے میں نے پلٹ کر دیکھا تو جیری کین کے جلتے ہوئے ٹکڑے فضا سے زمین کی جانب پرواز کرتے نظر آئے۔ کچھ چراغ سے سڑک پر بھی روشن تھے لیکن جیپ کے پیچھے اب کینوس کا تھوڑا سا حصہ جلتا رہ گیا تھا۔ جیری کین کی آگ جیپ کی تیز رفتاری کے باعث پیچھے رہ گئی تھی اور جہاں پہلے جیری کین تھا وہاں اس کا ایک ٹکڑا کلیمپ میں اٹکا رہ گیا تھا۔

جیپ کو روک کر میں نیچے اترا۔ اگر میرے پاس خنجر ہوتا تو میں پیچھے والے حصے کا کینوس کاٹ دیتا۔ لیکن اب مجھے وہ سب ہک کھولنے پڑے جن سے جیپ کا اوپر والا حصہ بندھا ہوا تھا۔ کینوس کے ٹاپ والی جیپ میں شفاف پلاسٹک کی کھڑکیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ کینوس کے مقابلے میں پلاسٹک پر آگ نے فوراً اثر کیا اور باقی دو سائڈ پر بھی آگ پھیل گئی۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ آگ ابھی پیٹرول لائن اور پیٹرول ٹینک سے بہت دور تھی لیکن اندیشہ تھا کہ جلتا ہوا کینوس اگر سیٹوں پر گرا تو [illegible] یقیناً تباہ ہو جائے گی۔ میں نے کچھ ہک کھولے کچھ کھینچ کر اور جھٹکا دے کر توڑے اور باقی کینوس کو ان سوراخوں

میں ہاتھ ڈال کے پھاڑا جو کھڑکیوں کی جگہ نمودار ہو گئے تھے۔ وہاں جلا ہوا پلاسٹک اب بھی اتنا گرم تھا کہ میری ہتھیلیوں سے چپک گیا مگر میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے کینوس کی فولڈنگ باڈی کو جیپ سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کینوس کو سڑک پر ڈال کر میں نے پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میں گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ فائرنگ سے بچ گیا تھا۔ سب انسپکٹر کے جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سے بچ گیا تھا اور آخری وقت میں آگ لگا دینے والی گولی کی تباہ کاری سے بھی بچ گیا تھا۔ یہ سب بمشکل سے پندرہ منٹ میں ہو گیا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے میں بہت اچھے موڈ میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں ایک جیپ لے کر فرار ہو رہا تھا۔ جیپ میں ایک اے ایس آئی پڑا ہوا تھا۔ اس کے باقی دو ساتھیوں میں سے ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہو گا۔ دوسرے کے بارے میں مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اپنے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی اس کے جسم میں کہاں لگی تھی۔ ان دونوں کی رائفلیں بھی وہیں پڑی رہ گئی تھیں اور جائے واردات کے قریب ہی اے ایس آئی کے ریوالور کا مل جانا بھی یقینی تھا۔ صبح ہونے سے قبل ہی وہاں مزید پولیس پہنچ جائے گی اور اس سنگین واردات کی تفتیش شروع ہو گی جس میں بدمعاش ایک پولیس والے کو مجروح یا مقتول کر گئے تھے، ایک کو بے ہوش چھوڑ گئے تھے اور ان کے افسر کو جیپ سمیت اغوا کر کے لے گئے تھے۔

کھلی جیپ کو میں نے دو میل آگے ایک اسکول کے احاطے میں روکا۔ اسکول اجڑا پڑا تھا اور سارے کلاس روم تاریک تھے۔ اس گیٹ پر کوئی چوکیدار نہ تھا جس سے میں جیپ کو اندر لے گیا تھا۔ اندر داخل ہونے سے قبل ہی میں نے ہیڈ لائٹس آف کر دی تھیں اور انجن بھی بند کر دیا تھا۔ جیپ اپنی رفتار میں خاموشی سے اندر گئی۔ میں نے اسے موڑ کر دیوار کے متوازی کھڑا کر دیا۔ جہاں ایک طرف قد آدم جھاڑی پھیلی ہوئی تھی۔ اب میں نے زیادہ اطمینان کے ساتھ جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے ڈیش بورڈ کے خانے میں کاغذات تھے۔ سائڈ کی پاکٹ سے مجھے ایک ٹارچ ملی۔ میں نے ٹارچ کو روشن کیا اور پیچھے بے ہوش پڑے ہوئے اے ایس آئی کے چہرے پر روشنی ڈالی۔ پھر روشنی کا مختصر سا دائرہ آگے بڑھایا اور ایک لمحے کے لیے میری نظر بھی منجمد ہو گئی۔ جرسی پر لگی ہوئی نام کی تختی کے حروف سے "پرویز وکٹر" کا نام بہت واضح پڑھا جاتا تھا۔

میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے رات کے اندھیرے کو گھورنے لگا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ پرویز وکٹر کا نام پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ لاہور کی پولیس میں آخر کتنے اینگلو انڈین سب انسپکٹر ہوں گے۔ مشکل سے دو چار۔ قدرت نے مجھے حادثاتی طور پر اپنے ایک ایسے دشمن کے روبرو کر دیا تھا۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ سادھو رام کے لبوں سے یہ نام اگلوانے کے لیے مجھے اس پر سخت تشدد کرنا پڑا تھا لیکن اس سے حاصل ہونے والی معلومات نے ہمارے لیے وہ راستے کھول دیے تھے جو دلربا، کرنل جگن ناتھ اور سیوک رام کے بعد سادھو رام کی موت پر بند ہو گئے تھے۔ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ ہو گیا تھا اور دشمن کے جتنے ایجنٹ اس اڈے سے منسوب تھے، مارے جا چکے تھے یہاں تک کہ سادھو رام کی بیوی بھی نہ رہی تھی۔ ایسے وقت میں سادھو رام نے پرویز وکٹر، اس کے بھائی اور اس کی بہن سونیا وکٹر کے نام بتا کے ہماری جدوجہد کو نئی سمت عطا کر دی تھی۔ اب پرویز وکٹر کسی جستجو کے بغیر ہی مجھے مل گیا تھا اور میں بجا طور پر کہہ سکتا تھا کہ تقدیر مجھے اس سے ملوانے کے لیے سوتے سے اٹھا کے لائی تھی۔ رابعہ کا شوق دیدار تو بہانہ بن گیا۔ اسے دیکھنا تو نصیب نہ ہوا۔ نصیب نے راہ چلتے نیا گل کھلا دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں پرویز وکٹر کا کیا کروں۔ کوئی دوسرا سب انسپکٹر ہوتا تو میں اسی جگہ جیپ چھوڑ کر بھاگ جاتا لیکن پرویز وکٹر کا معاملہ مختلف تھا۔ ہم نے ابھی تک کوئی لائحہ عمل طے نہیں کیا تھا کہ پرویز وکٹر اور اس کی نرس سسٹر سونیا کا سراغ لگانے کے بعد ہم کیا کریں گے۔ اب اچانک فیصلے کا وقت آ گیا اور میرا ذہن الجھن کا شکار ہو گیا۔ میں اسے شہلا کے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ دوسری جگہ چن ماہی والا گھر تھا جس کی چابیاں ابھی تک ہمارے پاس تھیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اور محسن اس کو اسی ایم آر ایس کے تھانے میں لے جائیں جہاں سادھو رام سے تفتیش کی گئی تھی اور پرویز وکٹر سے بھی پولیس کے انداز میں سب کچھ پوچھ لیں مگر میرا دل اس سے مطمئن نہیں تھا۔ تشدد کے سامنے سادھو رام نہ ٹھہر سکا تھا مگر یہ ممکن تھا کہ پرویز وکٹر مر کے بھی کچھ نہ بتائے۔ اگر وہ کچھ بتائے بغیر مر گیا تو ہمیں فائدے کے بجائے نقصان ہو گا۔ پولیس تو یہی کہے گی کہ چور ڈاکو اے ایس آئی پرویز وکٹر کو مقابلے کے بعد اٹھا کے لے گئے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو پرویز وکٹر کے اغوا کا مطلب کچھ اور نکالیں گے۔ وہ یہی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ سائیں پاپڑ والے کا اڈا تباہ کرنے والوں نے ہی پرویز وکٹر کو اٹھایا ہے اور اب وہ اس سے مزید معلومات

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حاصل کر یں گے اور ظاہر ہے اس کے بعد اگلا وار کریں گے۔ نہیں دشمن اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ وہ فوراً حفاظتی تدابیر اختیار کریں گے۔ وہ ٹھکانے بدل دیں گے جو پرویز وکٹر کے علم میں ہوں گے کہ بفرض ... وہ کچھ بتانے پر مجبور ہو جائے تب بھی نقصان نہ ہو اور پرویز وکٹر کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے والوں کو مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سونیا کو غائب کر دیں، ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر۔ پرویز وکٹر کے دوسرے بھائی کو بھی ختم کر دیں اور اُس ایمبولینس کو بھی جسے وہ چلاتا تھا۔ دشمن کے ایجنٹ تو فقط مہرے ہوتے ہیں، ایک چال غلط ہو جائے تو مہرے پٹ جاتے ہیں۔ ان کے مارے جانے سے اوپر والوں کو فرق نہیں پڑتا، جن کے ہاتھ مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ نئے مہرے منتخب کر لیتے ہیں۔ راستے بدل دیتے ہیں اور پہلے کے سب سراغ مٹا دیتے ہیں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ دشمن ہوشیار ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پرویز وکٹر کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ہم خاموشی سے اس کا تعاقب کریں اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب پرویز وکٹر کو کچھ نہ ہو۔ وہ یہی سمجھے کہ اس کا واسطہ کسی خطرناک مجرم سے پڑ گیا تھا۔ اُس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا تھا اور میرا موجودہ حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اس واردات میں میرا نام آنے کا بہت کم امکان تھا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پرویز وکٹر کو اسی جگہ چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے؟ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہیے اور پھر اس سے معذرت کر کے اُسے گھر چھوڑ آنا چاہیے اور اس بہانے پرویز وکٹر کے گھر اور اس کی بہن سونیا کو دیکھ لینا چاہیے؟ نہیں، پرویز وکٹر ہوش میں آنے کے بعد مجھے معاف نہیں کرے گا۔ بات صرف مار پیٹ کی نہیں رہی تھی۔ فائرنگ سے ایک کانسٹیبل زخمی ضرور ہوا تھا۔ میں نے فرائض کی انجام دہی میں مداخلت کی تھی۔ سرکاری اہلکاروں کو مارا تھا اور اُن کی جیپ پر قبضہ کیا تھا۔ اُن سے اسلحہ چھینا تھا۔ میرے جرائم ناقابلِ معافی تھے۔ میں نے جھوٹ بول کر خود کو کرسچین اور مشن ہائی اسکول کا ٹیچر ظاہر کیا تھا۔ اپنے ایک بھائی کو انجینئرنگ یونیورسٹی کا لیکچرار بتایا تھا۔ ان سب معاملات کی تحقیق و تفتیش کے بغیر وہ مجھے کہاں چھوڑے گا۔

فیصلہ کرنے کی کوشش میں میرا ذہن اُلجھتا جا رہا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سارے معاملے کو ایم آر ایس کے دیگر ارکان سے صلاح مشورے پر اُٹھا رکھوں۔ یہ فیصلہ سب سے بہتر فیصلہ تھا جس نے میرے ذہن کو کچھ ہلکا کر دیا۔ ان حالات میں وہی لوگ صحیح انداز سے سوچ سکتے تھے جو اس واردات میں ملوث نہیں تھے۔ میرا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے جیپ کو پھر اسٹارٹ کرنے سے پہلے پرویز وکٹر کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ بے ہوش تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ وہ مکر کر رہا ہے۔ اس جیسے چالاک شخص سے کچھ بعید نہ تھا کہ بے خبری میں مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دے۔ ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو میں اُسے اٹھنے نہ دیتا لیکن ڈرائیونگ کرتے ہوئے میری توجہ بٹ جاتی۔ میں آگے اپنے راستے پر نظر رکھنے کی کوشش بھی کرتا اور پیچھے قیدی پر بھی تو پرویز وکٹر فائدہ اٹھا لیتا۔ میں نے اسے ہلا جلا کے دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر جیب سے سگریٹ نکالی۔ سگریٹ جلاتے وقت بھی میں محتاط تھا۔ ایک کش لے کر میں نے جلتی ہوئی تیلی بجھائی اور باہر پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن ایک دم پلٹ کر اس کا دہکتا ہوا سرا پرویز وکٹر کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ ایک دم حرکت میں آیا اور اُس کا ہاتھ بے اختیار ناک پر گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ڈراما نہیں چلا تو اُٹھ کر پیچھے سے میرے گلے میں بازو ڈالنے کی کوشش کی۔ سگریٹ پھینک کر میں نیچے جھک گیا۔ اس کا ہاتھ میرے شانے پر لگا اور میں نے اُس کی گالی سنی۔ میں نے پیچھے گھوم کر اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ اس کے سر میں جیپ کی باڈی کے فریم سے خاصی چوٹ آئی ہوگی۔ کیوں کہ وہ پھر اُٹھنے کی کوشش میں ناکام رہا۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر جیپ کی سیٹ کے فریم پر مارا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تو میں نے بال چھوڑ دیے۔ سر جیپ کے فرش پر گرا لیکن وہ ساکت رہا۔

دس منٹ بعد میں نے جیپ کو شہلا کے گھر کے دروازے پر روکا تو اندر سے کلاک کے تین گھنٹے سنائی دیے۔ میں اُسی کھڑکی سے اندر گیا۔ جس سے نکل کے فرار ہوا تھا۔ اندھیرے میں مجھے ایک جگنو سا چمکتا نظر آیا۔ یہ مرزا غالب تھے۔ جو میرے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔

"تم... تم اندر کیسے آئے؟" میں نے خفت سے سر کھجا کے کہا۔

"جیسے تم باہر گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "کہو ملاقات ہوئی؟"

"ہاں، اس کے سوا بہت سے ملے۔ ایک میرے ساتھ بھی آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم کو ادھر قدم رنجہ نہ فرمانے کی سختی سے تاکید کی گئی تھی۔"

"سختی سے تاکید تو بہت سی باتوں کی سب کو کی گئی ہے، مثلاً نماز پڑھنے کی اور ممنوعہ لٹریچر نہ پڑھنے کی۔" غالب نے اپنے دفاع میں نیا فلسفہ پیش کیا۔ "جب کوئی اور کسی کی نہیں سنتا تو ہم کیوں سنیں۔ بس ہم نے قدم رنجہ فرما دیا۔"

"یہ کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے۔ شرفاء کا سونا حرام ہے۔" ٹیڈی نے لحاف سے منہ نکال کے کہا۔ "یہ سالا صحافی پھر آمرا یہاں۔"

"یار شرفاء، ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔ واپسی پر ایک مہمان ساتھ ہو لیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔ تم ذرا فوراً محسن خان شیروانی کو خواب گاہ سے برآمد کرو کہ ایم آر ایس کا ہنگامی اجلاس ہے مگر ناز کو سونے دو۔"

واجبی سے ہنگامے کے بعد ہنگامی اجلاس شروع ہوا۔ میں نے ٹیلی گرام کے الفاظ میں اپنے جرائم کی تفصیل پیش کی جو سب کے سو جانے کے بعد مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ کیوں کہ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔

"تقدیر کے گھوڑے! آخر کیا تکلیف تھی کہ سوتے سوتے تو جھک مارنے نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"تکلیف تو پرانی ہے دوستو! تم جانتے ہو سب۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "یہ بھی تو دیکھو کہ میں کیا چیز اٹھا لایا ہوں۔"

"اور اب اُسے گلی میں ڈال رکھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "تاکہ لوگ اُسے دیکھ لیں اور وہ ہم لوگوں کو اور ہمارے ٹھکانے کو دیکھ لے۔"

"اس کو میں اندر لے آتا ہوں۔ ابھی تو اس کے اندر اور باہر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔"

میں نے اور محسن نے پرویز وکٹر کو بڑی پھرتی سے کھڑکی کے راستے اندر ڈالا۔ پھر اس کے ہاتھ پیر باندھے۔ منہ بند کیا اور آخر میں آنکھوں پر بھی پٹی باندھ کر باتھ روم میں ڈال آئے۔

"یہ جیپ کس کی ہے؟" مرزا غالب نے کہا۔

"سرکار کی اور کس کی۔" میں نے کہا۔ "کاغذات تو نہیں دیکھے میں نے مگر..."

"مگر کیا۔ تم نے نمبر بھی نہیں دیکھا۔" مرزا غالب نے منہ پر مکا مارا۔ "بلکہ جیپ تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوتی تو سمجھ لیتے کہ ابھی تک سرکار نے ہماری پولیس کو جو جدید ترین گاڑیاں دی ہیں وہ سن آف دی ملٹری ماڈل جیپ ہیں۔ ان کی نمبر پلیٹ پر ویسٹ پاکستان پولیس لکھا ہوا ہے۔ یہ نئی جیپ ہے۔ پرائیویٹ نمبر ہے اس کا۔ جاؤ اور کاغذات نکال کے لاؤ۔ اور میاں محسن، اپنی جورو سے کہو کہ شرفاء کے لیے شرافت سے اٹھ کے کافی بنائے۔"

"شرافت کی اولاد۔ تیرے باپ کی نوکر نہیں ہے وہ۔" ٹیڈی نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "خبردار جو اُسے جگایا۔"

"مگر میں تو جاگ رہی ہوں۔" شہلا نے دروازے سے جھانک کر کہا۔ "کافی بن رہی ہے بھائی جان۔" جب میں کاغذات لینے جا رہا تھا تو بھائی جان یعنی خواجہ نیک محمد پر سب ہنس رہے تھے۔ چند منٹ بعد میں واپس آیا تو ٹیڈی اور غالب ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ وہ بالکل بچوں کی طرح لڑتے تھے، ایک منٹ کے بعد وہ لڑائی کی وجہ بھی بھول جاتے تھے۔

"یہ تو اپنے پرویز وکٹر صاحب کی جیپ ہے جناب عالی۔" میں نے کاغذات کو روشنی میں دیکھ کر کہا۔

"تو اس میں پرویز وکٹر کے گھر کا پتا بھی ہوگا جناب عالی۔" محسن نے کہا۔ پتا واقعی تھا اور سب نے باری باری دیکھا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ پتا درست ہو یا رہائشی پتا ہو۔" غالب نے آخری کش کے بعد سگریٹ باہر پھینک دی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، ابھی اس میں دو سوٹوں کا دم تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اچھا تو باہر جاؤ اور دو سوٹے لگا لو۔" غالب نے کہا۔ "عادت تو پڑی ہوئی ہے ٹوٹے چن کر پینے کی۔"

"اگر تو نے پہلے ہی کاغذات دیکھ لیے ہوتے تو اُسے یہاں لانے کے بجائے اس پتے پر لے جاتا۔" محسن نے مجھ سے کہا۔ "معلوم ہو جاتا کہ پتا اصلی ہے یا نقلی۔"

"میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ کام کسی اور کو کرنا ہوگا۔ مجھے سونیا وکٹر نہ دیکھے اور اس کا دوسرا بھائی بھی نہ دیکھے تو اچھا ہے ورنہ تینوں نے میری صورت دیکھ لی تو سمجھ جائیں گے کہ جس نے مار پیٹ کی تھی، وہی مجرم اتنی دیدہ دلیری سے گھر تک آ گیا تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "خرابی کے اسباب تو آپ پہلے ہی بہت کر آئے ہیں۔ آخر تمھیں ڈاکٹر لطیف کا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی خواہ مخواہ پریشان ہوں گے اب۔"

"وہ... بس غلطی ہو گئی... بلکہ غلطی بن گئی۔" میں نے کہا۔ "مگر انھیں پریشانی کیوں ہوگی۔ وہ صاف انکار کر دیں گے۔"

"یار، عقل سے کام لو۔ پرویز وکٹر صرف نام سے تصدیق نہیں کرے گا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "نام پر تو اُسے پہلے ہی غلط ہونے کا شک تھا۔ وہ حلیہ بتائے گا کہ اس قسم کے ایک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شخص نے آپ کا نام لیا تھا۔ وہ آپ کو کیسے جانتا ہے اور ڈاکٹر لطیف بتا دیں گے کہ وہ رابعہ کو دیکھنے آیا تھا۔ نام اگر نہ بتایا تب بھی کہیں گے کہ ایک خاتون مریض سے ملنے والا تھا۔ پرویز وکٹر پہلے کچھ نہیں کہے گا کہ وہ کیوں پوچھ رہا تھا۔ بعد میں سب بتائے گا اور . . . ہو سکتا ہے رابعہ سے ملے۔"

"رابعہ سے . . . ڈاکٹر لطیف اس کی اجازت نہیں دیں گے۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"اس وقت نہ دیں۔ بعد میں وہ کورٹ سے آرڈر لے آئے گا کہ رابعہ سے اس ملزم کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کورٹ کے احکامات کو نہیں ٹال سکتے۔ پرویز وکٹر کے لیے یہ بہت سنگین معاملہ ہوگا۔ خدانخواستہ وہ کانسٹیبل مر گیا تو قتل کا کیس ضرور بنے گا اس میں رابعہ کو شامل تفتیش کرنا ضروری ہو جائے گا۔"

"یہ تو بڑی خرابی ہوگی۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ "وہ رابعہ کو تنگ کرے گا۔ رابعہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"ہاں۔ لیکن اس کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "ڈاکٹر لطیف کی رائے کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے اور رابعہ کا کیس میڈیکل بورڈ کی رائے کے لیے بھیجا جا سکتا ہے جو حتمی فیصلہ کرے گا کہ کیا واقعی اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ سوچو ذرا اس کے نتائج کتنے غلط نکل سکتے ہیں۔ استغاثہ اصرار کر سکتا ہے کہ مقدمے کی اس اہم ترین گواہ کو میو اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جائے جہاں شفایاب ہونے تک اسے زیرِ نگرانی رکھا جا سکے یعنی وہ پولیس کے پہرے میں رہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ڈاکٹر لطیف کے کمرے سے اس کو فرار کا موقع مل جائے گا۔ کہاں ڈاکٹر لطیف کے گھر کا ماحول اور کہاں پولیس کے ساتھ نفسیاتی وارڈ کی فضا۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اسے ابھی لے آتا ہوں۔"

"بیٹھو۔ ایک حماقت کے بعد دوسری حماقت کرو گے تو ہمارے لیے بھی کچھ کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑو گے۔" غالب نے مجھے ہاتھ کھینچ کر پھر بٹھا دیا۔ "وہاں اب شہلا کو جانے دو۔ وہ ڈاکٹر لطیف کو سمجھا دے گی کہ تمہارے ساتھ واپسی پر پولیس کا جھگڑا ہوا تھا اور تم نے حوالے کے طور پر ان کا نام لیا تھا مگر اب کوئی پوچھے تو وہ انکار کر دیں۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ میرا نام تو دروازے کی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا ہے۔ ہر شخص جو ادھر سے گزرتا ہے دیکھ سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ رابعہ کے حق میں بہتری کی خاطر وہ جھوٹ بولنا قبول کر لیں گے۔"

"لیکن انھوں نے صبح نو بجے بلایا تھا مجھے اور میرا جانا بے حد ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"تم فی الحال اُدھر نہیں جا سکتے۔ جاؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔" غالب نے کہا۔ "پرویز وکٹر سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ڈاکٹر لطیف کی بات پر بھی اعتبار نہ کرے اور باہر سادہ کپڑوں میں پولیس آنے جانے والوں کو دیکھتی رہے۔"

"یار خدا کے لیے یہ بحث ابھی چھوڑو۔ پہلے پرویز وکٹر کو ہیلا سے لے جاؤ۔" محسن بولا۔ "صبح ہونے والی ہے۔"

"چلو میں اور تم چلتے ہیں۔" غالب نے محسن سے کہا۔ "اس پتے پر سونیا وکٹر یا اس کا بھائی ملے تو اچھا ہے۔ میں کہوں گا کہ ہم رات کی ڈیوٹی کر کے لوٹ رہے تھے۔ یہ جیپ کھڑی دیکھی۔ اس میں یہ آدمی پڑا تھا۔ آدھا اندر، آدھا باہر۔ ہم اسے یہاں لے آئے کیوں کہ کاغذات میں یہی پتا تھا۔"

"وہ پوچھیں گے کہ تھانے میں کیوں نہیں لے گئے تھے؟" محسن بولا۔

"سیدھی صاف بات کہ ہم نیکی کر کے مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔" غالب بولا۔ "یہ آپ کا آدمی ہے تو اسے سنبھالو اور جو آپ کا دل چاہے کرو۔ ہم جاتے ہیں۔ تھانے کچہری سے ہمیں معاف رکھو۔"

"تمھارے ساتھ میں چلتا ہوں۔" ٹیڈی بولا۔ "محسن کو شہلا کے ساتھ جانے دو۔ یہ بھی صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔"

غالب اور ٹیڈی اتفاقِ رائے سے پرویز وکٹر کو اٹھا کر لے گئے۔ صبح چار بجے ان کی جیپ گلی سے نکل چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ آدھے پونے گھنٹے میں وہ پرویز وکٹر کا پتا تلاش کر لیں گے۔ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ کہیں پرویز وکٹر کا بھائی اور سونیا انھیں زبردستی نہ روک لیں مگر مجھے غالب کی عقل اور معاملہ فہمی پر بھی بھروسا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کے اپنے ساتھ ٹیڈی کو بھی نکال لائے گا۔ انھیں پرویز وکٹر کو گھر والوں کے حوالے کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پیر بھی کھول لینے تھے اور منہ پر بندھی ہوئی پٹی بھی کھولنا تھی۔ خدا کرے کہ راستے میں پرویز وکٹر کو ہوش نہ آئے ورنہ غالب اور ٹیڈی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ پرویز وکٹر سخت مشتعل ہوگا اور آسانی سے مطمئن نہیں ہوگا تاہم غالب کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ گر تھانے بھی جانا پڑا تو غالب کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل نہ ہوگا کہ آدھی رات کے بعد تک وہ اخبار کے دفتر میں تھا اور ٹیڈی اس کے ساتھ تھا۔

"اگر ڈاکٹر لطیف نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا سکندر؟" محسن نے تشویش سے پوچھا۔

"بہت برا ہوگا۔ رابعہ پھنس جائے گی اور اسے نکالنا بھی آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میرے سارے پرانے کیس نکل آئیں گے . . ."

"مگر اسے نکالنا بھی تو نقصان دہ ہوگا۔" محسن بولا۔ "وہ اسی گھر میں رہے گی تو ٹھیک ہوگی۔"

"ڈاکٹر لطیف نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے زندہ سلامت دیکھے گی تو ٹھیک ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اب صبح نو بجے میں نہ گیا تو بہت زیادہ خرابی نہ ہو جائے محسن۔ وہ رابعہ کو ذہنی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے تیار کریں گے۔ میں نہ پہنچا تو وہ سمجھے گی کہ ڈاکٹر لطیف بھی جھوٹ بول رہے تھے۔ ایسے کیس میں مریض کا ڈاکٹر پر سے اعتماد اُٹھ جائے تو سارا علاج بے مصرف ہو جاتا ہے۔ مجھے جانا چاہیے محسن اور میں جاؤں گا۔"

"سکندر، تیری عقل پر جذبات غالب آ رہے ہیں۔ وہاں جانے سے بہتر ہے کہ تو سیدھا تھانے جا کر خود کو قانون کے حوالے کر دے، کم از کم پولیس کے سر تو تیری گرفتاری کا سہرا نہ بندھے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "کیا تو اندازہ نہیں کر سکتا کہ تیری گرفتاری سے کتنے لوگوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اس بار وہ تجھے چالان، ضمانت اور سماعت پر پیشی کے انتظار میں قید رکھنے کا رسک نہیں لیں گے۔ میں شرط لگا کے . . . میرا مطلب ہے کہ مجھے ایک فی صد بھی شبہ نہیں کہ وہ تجھے مار دیں گے، خود پولیس کے ہاتھوں مروا دیں گے۔ ایسے جھوٹے پولیس مقابلوں میں خطرناک مجرم اور ڈاکو اکثر مارے جاتے ہیں۔ پولیس اپنی فائلیں بند کر دیتی ہے اور عدالت میں زیرِ سماعت مقدمات ختم کرتی ہے ثبوت، شہادت، جرح اور اپیل کے چکر ختم کرتی ہے۔ تیرے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ کہا جائے گا کہ تو نے پولیس پر فائر کر کے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تیرے کسی ساتھی نے تجھے ایک ریوالور پہنچا دیا تھا۔ سب شکاری یہی چاہتے ہیں کہ ایک بار تو زیرِ دام آ جائے تو سارے جھگڑے جو تیرے دم سے ہیں، ختم کر دیے جائیں گے۔ تو خود سوچ۔ اس سے کس کس کا بھلا ہوگا۔ نقصان ہوگا تو صرف ایم آر ایس کا۔ شکاری تو تیری زندگی کی قیمت دس لاکھ تک لگا سکتے ہیں اور دس لاکھ ایک آدمی کو قتل کرنے کا اتنا زیادہ معاوضہ ہے کہ کوئی بھی اس کام کے لیے تیار ہو سکتا ہے خواہ بعد میں پھانسی ہو جائے۔ نقصان ہوگا ہمارا۔ کیا ہماری دوستی کی قیمت دس لاکھ ہے؟ رابعہ کی قیمت دس لاکھ ہے؟ ایم آر ایس کا مشن دس لاکھ میں ختم کیا جا سکتا ہے؟ مگر دس لاکھ یا دس کروڑ میں بھی شکاری تجھے شکار کرنے میں کامیاب رہے تو مرنے والا صرف سکندر بخت نہیں ہوگا۔ پھر رابعہ بھی مر جائے گی۔ محسن اور شہلا بھی مر جائیں گے۔ غالب اور نیک محمد بھی جی کے کیا کریں گے۔ یہ شکست ہم یوں قبول نہیں کر سکتے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ تو ابتدا میں دلاور سے سودا کر لیتا۔"

میں نے دیکھا تو شہلا دروازے کی دہلیز سے لگی رو رہی تھی۔

"خدا کے لیے بس کرو، چُپ ہو جاؤ۔" وہ چلائی۔

"اگر صبح نو بجے میں رابعہ سے ملنے نہ پہنچا محسن، تو اُسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ دیوانگی کی سرحد عبور کر کے اتنی دُور نکل جائے گی جہاں سے میرے لیے اس کو واپس لانا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔"

"میں ایک بات کہوں سکندر۔" محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد کہا۔ "فرض کر ایسا وقت آیا کہ تجھے رابعہ کی محبت اور اپنے فرض میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا، تو تیرا فیصلہ کیا ہوگا؟ تو رابعہ کو چھوڑے گا یا اس مشن کو جس کا مقصد وطن کی سرزمین کو غداروں اور اس کی آبرو کا سودا کرنے والوں سے پاک کرنا ہے۔ اس مشن میں ہم سب ایک طرف ہیں۔ ہم صرف تیری وجہ سے اپنے مشن کو ختم نہیں کریں گے جب تک یہ وزیر خان کے قتل کا انتقام لینے کا مسئلہ تھا، یہ تیرا ذاتی مسئلہ تھا لیکن اب یہ کسی کا بھی ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سب اس مشن میں برابر کے شریک ہیں اور کوئی بھی مشن محض ایک فرد کی کمی سے ختم نہیں ہوتا۔ مشن کسی فرد کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک جذبہ ہوتا ہے۔ مقصد ہوتا ہے اور تحریک ہوتی ہے۔ افراد اُسے ایک مشعل کی طرح لے کر چلتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ کٹ کر گرتا ہے تو اس مشعل کو روشن رکھنے والے دوسرے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کل میں یا تو۔ نیک محمد یا غالب نہ رہیں۔ لیکن ہماری جگہ کوئی ضرور لے گا۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مگر ہماری جگہ خالی نہیں ہوگی۔ اس مشن کو اسی جذبے اور لگن کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے والے کبھی کم نہ ہوں گے۔"

میں پتھر کے بُت کی طرح بیٹھا ہوا دیوار کو دیکھتا رہا۔ محسن نے یکلخت سچ کو یوں میرے رُو برُو کر دیا تھا کہ میں اس سے نظر چرا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ ہی نہ تھا کہ آزمائش کا دوراہا اس سفر کے کسی بھی مرحلے میں کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ جب مجھے یا خود محسن کو ایک راستے کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ ایک وہ راستہ جو اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی خوشیوں کی بقا کا راستہ ہوگا، ایک اپنے لیے مرنے جینے کا راستہ۔ خود غرض زندگی کا راستہ، جس میں دل اتنا تنگ ہو جائے کہ وہ کسی اور کے لیے اپنی ایک سانس بھی وقف کرنا منظور نہ کرے۔ نہ دوستی کے نام پر، نہ انسانیت کے نام پر، نہ رشتوں کے نام پر اور نہ اعلیٰ و ارفع مقاصد کے نام پر۔ دوسرا راستہ قربانی کا راستہ ہوگا۔ جس پر چلنے کے لیے اپنی ذات کو فراموش کرنا پڑے گا۔ اپنی خوشیوں کو قربان کرنا ہوگا اور اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ یہ ادائے فرض کا راستہ ہوگا۔ حب الوطنی، انسانیت کی آبرو، صداقت کی روشنی، رشتوں کی بقا سب کچھ دوسرے راستے سے منسوب ہوگا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اگر... اگر یہی انتخاب تجھے کرنا پڑا محسن..." میں نے ہچر کے لہجے میں کہا۔

"میں تو بہت پہلے طے کر چکا ہوں۔" محسن بولا۔ "مجھے اب کسی فیصلے کا مرحلہ در پیش نہیں۔ فیصلہ تو میں نے اسی دن کر لیا تھا جب میں ولایت سے تیرے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ میرے والدین اور میری بہن سب میری خوشیوں سے اپنی اُمیدوں کا دامن باندھے میرا انتظار کرتے رہے تھے مگر میں تو لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ نگری نگری پھرا، مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ انتظار کرنے والے انتظار کرتے کرتے رخصت ہو گئے۔ میں واپس پہنچ کے بھی ان سے اتنا ہی دور رہا، جتنا ولایت میں تھا۔ میں نے تیرا ساتھ دیا تھا۔ میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں اپنے گھر میں سارے غموں سے محفوظ رہتا۔ والدین کی محبت اور شفقت پاتا۔ ان کے ارمان پورے کرتا۔ وہ میری شادی بڑی دھوم دھام سے کرتے۔ مرنے سے پہلے میرے لیے کسی اعلیٰ ملازمت کا بندوبست کر جاتے یا مجھے بزنس لائن پر لگا جاتے۔ میں کسی بیوروکریٹ یا بزنس مین کی طرح بے فکری اور عیاشی کی زندگی گزارتا اور بس۔ کبھی یاد کر لیتا کہ ہاں ایک یار تھا اپنا سکندر۔ نہ تجھے کوئی گلہ ہوتا مجھ سے، نہ مجھے اپنی خود غرضی پر شرمندگی ہوتی۔ مگر سکندر! اس وقت میں نے اپنا گھر، اپنے رشتے اور اپنا مستقبل سب قربان کر دیا تھا تو آج مجھے کون سی آزمائش میں مشکل ہو گی۔ میں بہت پختہ ہو چکا ہوں۔ اب مجھے انتخاب کرنا پڑا تو شاید میں سوچوں گا بھی نہیں۔ میں وہی راہ اختیار کروں گا جو پہلے کی تھی۔ میں پھر اپنے رشتے اور اپنا گھر، اپنا مستقبل اور اپنی خوشیاں سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تو آج اس آزمائش سے دوچار ہے۔ اس سے پہلے تُو نے صرف دولت کو چھوڑا ہے۔ آج شاید تجھے جذبات کے رشتوں کو چھوڑنا پڑے۔ رابعہ کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے مستقبل کے خوابوں کو اور خوشیوں کو چھوڑنا پڑے۔"

"میں سب چھوڑ دوں گا محسن۔" میں نے اچانک کہا۔ "میری آنکھیں شاید بند تھیں۔ تُو نے یہ اچھا کیا کہ میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے آئینہ دکھا دیا۔ مجھے اس میں اپنی صورت دیکھ کر شرم آنے لگی ہے۔ میں بہت نیچے گر کر سوچ رہا تھا۔ حیوانی سطح پر جہاں ایک مرد کے لیے صرف ایک عورت اہم رہ جاتی ہے اور اس کا حصول۔ کیا میں اندھا ہو گیا تھا کہ میں نے تیرے نقشِ قدم بھی نہیں دیکھے، حالانکہ یہ ساری مسافت تُو نے میرے ساتھ اور میرے سامنے طے کی تھی۔ آخر میرا راستہ جدا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے انھی نقوشِ قدم پر چلنا ہے جو تُو نے بنائے ہیں۔ میں رابعہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ چاہے گا تو ایک دن رابعہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اور مجھے وہ سب مل جائے گا جس کی آج مجھے آرزو ہے مگر اس آرزو پر میں اپنے مشن سے روگردانی کروں تو مجھ پر لعنت۔ میں ایسا سوچ کر بھی شرمندہ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ وقت آتا تو سکندر بخت وہی کرتا جو تم نے کیا۔ میں سکندر بخت کو جانتا ہوں۔" محسن بولا۔ "بس میں نے تیرا راستہ صاف کیا ہے، جس پر جذباتی اُلجھنوں کی وجہ سے تذبذب اور شکوک کے کانٹے پھیل گئے تھے۔ خدا ہم سب کو ساتھ رکھے اور ہماری اُمیدوں کے چراغ نہ بجھنے دے لیکن کوئی اکیلا رہ جائے اور اندھیرے میں گھر جائے تب بھی اُسے اپنے مشن کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں شہلا، محسن اور میں اپنے اپنے خیالوں اور اندیشوں اور اُمیدوں کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ یہ وقفہ بڑے کرب اور عذاب کا تھا جس میں ہم سب نے سچ کے زہر کی تلخی کو آبِ حیات سمجھ کر قبول کیا۔ یہ دل شکستگی کا وقفہ تھا جس میں عقل نے سارے آبگینے توڑ ڈالے۔ میں نے رابعہ کا تصور کرنا چاہا اور نہ کر سکا۔ سارے عکس مٹ گئے تھے اور گڈمڈ ہونے لگے تھے پھر اس کے سارے روپ بکھر گئے اور میں نے اُسے ایک دل شکن روپ میں دیکھا۔ وہ ایک پاگل خانے میں بند تھی۔ وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ "اگر اس دن تم آ جاتے سکندر بخت!" میرے کانوں میں ڈاکٹر لطیف کی آواز آئی۔ "تو آج یہ یہاں نہ ہوتی۔ اس حال میں نہ ہوتی۔" میں نے رابعہ کو ملتجی نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھے لینے ضرور آؤ گے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔" میں بھی تو کل تک شریکِ سفر تھی۔ آج میری مجبوری کو تم بھی نہیں سمجھو گے تو پھر کون سمجھے گا۔ سفر جاری رہتا ہے۔ سفر کو جاری رہنا چاہیے۔ جو تھک کے بیٹھ گیا اُسے منزل سے کیا... میں کیسے رک سکتا ہوں رابعہ۔

دروازہ کھلا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی نمودار ہوا۔ "تم لوگ ابھی بیٹھے ہو؟ اُسی طرح جیسے ہم چھوڑ گئے تھے۔ ہم تو اپنا کام کر آئے۔" ٹیڈی نے مسرت سے اعلان کیا۔ "سونیا سے بھی مل آئے۔"

"اس نے کچھ خاطر مدارت نہیں کی؟" محسن نے کہا۔ "جان بخشی کیسے ہوئی؟"

"اپنے خواجہ صاحب تو سونیا کو دیکھتے ہی سب بھول گئے تھے کہ کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔" غالب نے کہا۔ "پھر اُس کا دوسرا بھائی نکل آیا سلیم وکٹر۔ بہن تو رونے دھونے لگی۔ وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا تھا خبیث۔ ہم نے مختصراً وہی کہا جو سوچ کر گئے تھے۔ وہ ہمیں روکنے پر بڑا آمادہ تھا۔ مجھے اتفاق سے موقع مل گیا۔ اُسے دھکا دیا، باہر سے کُنڈی لگائی اور جُوتیاں بغل میں دبا کے بھاگے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"گویا سلیم وکٹر ہی وہ شخص ہے جو ایک طرف دلاور سے رابطہ رکھتا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس سے مال لیتا تھا اور اپنی نرس بہن سونیا کے ساتھ ایمبولینس میں ڈال کر سادھورام کو پہنچاتا تھا۔"

"ہاں اور پھر یہی سلیم وکٹر سادھورام سے پیسہ وصول کرنے جاتا تھا اور رقم دلاور کو پہنچاتا تھا۔" غالب نے کہا۔ "دوسرا بھائی پرویز وکٹر، پولیس میں ہونے کی وجہ سے براہِ راست سراج ڈی ایس پی سے رابطہ رکھتا تھا۔ وہ مال کو لاہور سے کرماں والی تک پہنچانے میں مدد کرتا ہوگا۔ ممکن ہے ایمبولینس کے ساتھ جیپ میں چلتا ہو تاکہ راستے میں کسی جگہ ایمبولینس کو روکنے کی ہمت کوئی نہ کرے۔ آگے بارڈر کراس کرانے میں ڈی ایس پی سراج ساتھ دیتا تھا۔"

"وکٹر فیملی کو اس کاروبار میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔" میں نے کہا۔ "ان سے ہمیں دونوں طرف کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں، بشرطیکہ ہمارا ایک جاسوس ان کے درمیان ہو۔" غالب نے کہا۔ "بظاہر جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کسی کو بھی ان پر شک نہیں ہوگا کہ وہ کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہیں۔ محلے والے ہمیں کچھ بھی نہیں بتا سکیں گے۔ سب یہی کہیں گے کہ تینوں بہت شریف اور بے ضرر لوگ ہیں۔ بہن کسی اسپتال میں نرس ہے۔ ہر روز نرس کی وردی پہن کر نکلتی ہو گی تو سب دیکھتے ہوں گے۔ ممکن ہے ایمبولینس اُسے لانے لے جانے کے لیے آتی ہو۔ محلے میں انھوں نے بہت اچھی گڈوِل بنا رکھی ہو گی۔ نرس کا پیشہ بہت معتبر اور محترم شمار ہوتا ہے۔ اگر دوسرا بھائی ایمبولینس ڈرائیور ہے تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ محنت کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے۔ تیسرا پولیس میں اے ایس آئی ہے۔ وہ اگر بدنام ہوا تو یہ کون سی انوکھی بات ہو گی۔ سارا محکمہ ایک جیسی شہرت رکھتا ہے۔ اس میں اچھے بھی بُرے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم اے ایس آئی پرویز وکٹر کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ایماندار اور فرض شناس مشہور ہوگا۔ پاس پڑوس کے لوگوں کی رائے اہمیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے آدھے اس کی شرافت کے قائل ہوں اور باقی آدھے اسے بھی ڈھونگ سمجھتے ہوں۔ ان کا رہن سہن اچھا ہوا تو اسے پولیس مین بھائی کی آمدنی سے منسوب کیا جاتا ہوگا۔ ایک نرس اور ڈرائیور کی آمدنی ہی کیا ہے۔ لیکن افسرانِ بالا اور پرویز وکٹر کے ساتھیوں سے پوچھا جائے تو وہ اس نوجوان اے ایس آئی کے بارے میں انھی خیالات کا اظہار کریں گے جیسے خیالات سابق اے ایس آئی اکرم شیخ کے بارے میں پائے جاتے تھے۔ زیادہ تر تو گالیاں ہی دیتے ہوں گے کہ سالا نہ خود کھاتا ہے اور نہ ہمیں کھانے دیتا ہے۔"

"پرویز وکٹر کو کیا ضرورت ہے رشوت کی۔" محسن بولا۔ "دوسرے راستے سے اس کی آمدنی کی کوئی حد نہیں۔ اس آمدنی کے مقابلے میں رشوت کی کمائی تو ایسے ہے جیسے ندی کے سامنے نالا۔ ایمان داری اور فرض شناسی کی شہرت تو ایک ڈھال ہے جو اسے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ انکل رضوی جیسے افسرانِ بالا اس کی بہت عزت اور قدر کرتے ہوں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ اتنی آمدنی کے باوجود وہ موہنی روڈ کے اس پرانے اور چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتے ہیں۔ کیا یہ بھی ایک ڈھونگ ہے؟" غالب نے کہا۔ "وہ دُہری زندگی گزار رہے ہیں۔ دیکھنے میں فرشتے، کرتوتوں میں شیطان۔ بظاہر میں غریب اور درحقیقت دولت مند۔ وہ شام کو پائے جاتے ہوں گے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جہاں اُن کے محلے کا کوئی آدمی انھیں دیکھ ہی نہیں سکتا۔"

"دوستو! وہ اندر سے کیا ہیں اور باہر سے کیا ہیں۔ اس پر بحث اور قیاس آرائی کا کیا فائدہ۔" غالب نے کہا۔ "ہمیں تو اصلیت معلوم کرنی ہے اور اس کا وہی ایک طریقہ ہے کہ ہم ان پر چوبیس گھنٹے نگاہ رکھیں۔ ان کے روز و شب کا ہر لمحہ ہماری نظر میں ہو، ہم ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنیں تاکہ ہمیں ان کے پروگرام کا قبل از وقت پتا چل سکے۔"

"یہ ناممکن ہے، وہ اپنے سائے سے بھی محتاط ہوں گے۔" محسن بولا۔ "اور کسی نے ایک دن بھی اُن کا تعاقب کیا تو انھیں معلوم ہو جائے گا۔"

"تعاقب سے مسئلہ حل بھی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ کوئی اندر ان کے ساتھ ہوگا تو کام بنے گا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تک انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ دستک دے کر کہوں گا کہ حضرات و خواتین۔ کیا آپ مجھ بے گھر کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دینا پسند کریں گے۔ یقین کیجیے میں شریف آدمی ہوں جیسا کہ میں آپ کو نظر آتا ہوں۔"

"اُن کے گھر میں کسی کا رہنا عملاً ناممکن ہے۔" غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپنے خطرناک کاروبار کی وجہ سے وہ کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ اُن کے گھر میں گھسنا تو درکنار، ان سے تعلقات بڑھانا بھی آسان نہیں ہوگا۔"

"جو کچھ میرے ذہن میں ہے وہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور یہ تو کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مشکل قرار دیا جائے یا ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا جائے۔ مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اس کے لیے جتنی لگن اور محنت درکار ہے، اتنی ہی عقل اور ذہانت سے کام لینے کی بھی شرط ہے مزید یہ کہ دشمنوں کے درمیان رہنا اور محفوظ رہنا حوصلے کی بات ہے اور عقل کے گھوڑے ہر طرف دوڑانے کے بعد

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

انھوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا؟ رابعہ کا یقین پختہ ہو جائے گا کہ سب اُس سے جھوٹ بولتے رہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سکندر اس دنیا میں ہوتا تو وعدہ کر کے نہ پہنچتا۔ اس کی راہ میں ندیاں اور پہاڑ، سمندروں کے طوفان اور زلزلے حائل ہوتے تب بھی وہ آتا۔ میرا نہ پہنچنا رابعہ کے لیے سب سے بڑا ثبوت بن جائے گا کہ وہ یقین کے فریب کا شکار نہیں ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے ابھی تک جو اُمید کی کرن روشن رکھی تھی وہ گم ہو جائے گی اور رابعہ ایک بار پھر اس اندھے خلا میں گر جائے گی جہاں سے اس کے لیے تنہائی کا جہنم شروع ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے واپسی کسی کے اعجازِ مسیحائی اور دستِ امکاں میں نہ ہوگی۔ کتنی کوشش اور خواہش کے ساتھ میں اُسے ایک بار خود فراموشی کی آخری سرحد سے واپس لے آیا تھا۔ اس سرحد کے پار دیوانگی کا صحرائے بے کنار تھا جس میں کسی یاد کا سایہ بھی نہ تھا اور محرومیوں کی کڑی دھوپ تھی۔ کتنی اُمید تھی مجھے کہ بہت جلد میں اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو وقت کی ایک ہی زنجیر سے منسلک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ رابعہ تو اس اندھے کی طرح تھی۔ جسے میں نے انسانوں کی دوڑتی بھاگتی، کچل دینے والی، مار دینے والی مشینی سواریوں کے ہجوم سے نکال کر سڑک پار کرانے کا عزم کیا تھا مگر اب سڑک کے درمیان میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا کہ وہ راہ گم کردہ جدھر چاہے جائے۔ حالات کی اس مجبوری کے سامنے میں بھی بے بس تھا۔ رابعہ کو مجھ سے ایسے اندازِ تغافل کی اُمید نہ ہوگی لیکن حالات نے میرے لیے ایک کے سوا سارے راستے بند کر دیے تھے۔ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں محبت کو بھول جاؤں اور اپنا فرض یاد رکھوں۔

"تم کو بہت دُکھ ہے سکندر کہ تم رابعہ کو لا سکتے تھے مگر نہ لا سکے۔" نازو نے کہا۔

میں نے چونک کر نازو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پیر سمیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اپنے پیر کے ناخن تراش رہی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر نہیں تھیں لیکن اس کے دل میں میرا خیال تھا۔ مجھے دکھی دیکھ کر وہ دکھی تھی۔ "ہاں... نہیں... اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"اُسے میں تمھارے لیے لے آؤں گی۔" وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولی۔ "تم اپنے دل کو دکھی مت کرو۔"

اس کی بات نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی وہ جان پر کھیل کر رابعہ کو بچا لائی تھی۔ اُسے اغوا کر کے کرماں والی لے جانے والے بہت طاقت ور اور خطرناک مرد تھے۔ اگر وہ چاہتی تو اکیلی فرار ہو کر آ سکتی تھی، اس پر کوئی الزام نہ آتا۔ کوئی بھی اُسے محبت کی رقابت میں خود غرض ہو جانے کا مجرم قرار نہ دیتا۔ لیکن اُس نے رابعہ کو فراموش نہیں کیا۔ اس پاگل لڑکی کی محبت بالکل بے غرض تھی۔ اُسے مجھ سے محبت تھی مگر یہ بالکل بے طلب اور یک طرفہ محبت تھی۔ اُسے بالکل پروا نہیں تھی کہ محبت کے جواب میں اُس کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ملتی۔ وہ رابعہ سے بالکل حسد نہیں کرتی تھی اور میں نے دنیا میں اتنی بے لوث محبت کو صرف اُن کے دل میں دیکھا تھا جو خدا کو، سچائی کو اور ظاہر کی حقیقت کو پانے کے لیے اپنے وجود کو یوں فراموش کر دیتے تھے کہ بے وجود ہو جاتے تھے۔ اُن کی ذات کی خواہشات بے وجود ہو جاتی تھیں اور ان کے ساتھ دوسروں کا رویّہ۔ دُکھ سُکھ، رنج و راحت اپنا جسم اور جذبات بے معنی ہو جاتے تھے لیکن نازو ایک جوان عورت تھی جس کا دل طوفانی خواہشات کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی عمر کی لڑکیاں دل کے ہاتھوں اس حد تک مجبور ہو جاتی تھیں کہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتی تھیں مگر یہ دنیا سے نرالی لڑکی تھی، جس کے پاگل پن کے انداز میں بھی ضبطِ نفس تھا، ڈسپلن تھا اور خود اختیاری تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مانگنے سے سب کچھ نہیں ملتا مگر آرزو تو جرم نہیں، خواب تو جرم نہیں اور آزارِ محرومی کی خلش تو جرم نہیں۔ اس کی محبت یہ تھی کہ وہ محبت کرنے کا مجھے حق دے۔ مجھے اپنی خواہشات کا اسیر نہ کرے بلکہ میری خوشی کو اپنی سب خوشیوں پر مقدّم رکھے اور اس کی خوشی یہی تھی کہ مجھے کوئی دُکھ نہ ہو۔ نہ وہ اپنے اس لازوال اور ناقابلِ تسخیر جذبۂ عشق کو دنیا سے چھپاتی تھی اور نہ اس سے مغلوب ہوتی تھی۔ اُس نے بہت پہلے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ مجھے حاصل نہیں کر سکتی اور میں رابعہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، چنانچہ اب اُس نے کسی عام عورت کی طرح میرے اور رابعہ کے درمیان حائل ہونے کی، رابعہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کی، خود کو الگ کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے اپنی خوشیوں کو میرے لیے وقف کر دیا تھا، جسم و جان کی ساری توانائیوں کے ساتھ۔ میں ایک ضدی بچّے کی طرح تھا جو اَڑ گیا ہو کہ وہ ایک کھلونے کے سوا دنیا کی کوئی چیز قبول نہیں کرے گا۔ اگر وہ مٹی کا کھلونا ہے تب بھی اُس کو وہی کھلونا چاہیے۔ اس کے سامنے کوئی آسمان کے تارے بھی ڈال دے، چاندنی کے ٹکڑے پھیلا دے اور قوسِ قزح کی کرنیں بکھیر دے تب بھی وہ خوش نہ ہو۔ اب نازو نے رابعہ کو میری خوشی جان لیا تھا تو اُسے سنبھال کے رکھنا اور اُسے بالآخر میرے حوالے کرنے کو اس نے اپنا فرض جان لیا تھا۔

لیکن اِس کے ساتھ ہی وہ عقل و ہوش سے بے گانہ نہیں ہوئی تھی اور اُس نے تارک الدنیا ہو کے رہبانیت اختیار نہیں کی تھی۔ اُسے زندگی کے تقاضوں کا احساس تھا اور خود کو ان خوشیوں سے محروم رکھنا نہیں چاہتی تھی جو قدرت نے عطا کی تھیں۔ اس نے اپنے آس پاس بسنے والوں سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں چنانچہ وہ غالب کی چاہت کو اُس کی آنکھوں میں پڑھ سکتی تھی اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سُن سکتی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے وہ اپنے لیے استاد ڈینڈی کے برادرانہ جذبات کے خلوص کو سمجھ سکتی تھی۔

اور اس معاملے میں نازو کا رویّہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُس نے کبھی غالب کی دل شکنی نہیں کی تھی اور اس کے ڈھکے چھپے اظہارِ عشق کا بُرا بھی نہیں مانا تھا۔ کسی حد تک اُس نے غالب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ زبان سے کچھ کہے بغیر اُس نے غالب کو سمجھا دیا تھا کہ ایک محبت میری رُوح کی ہے جو سکندر کے لیے وقف ہے لیکن تم چاہو تو نازو سے محبت کر سکتے ہو۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ غالب میرا خیال چھوڑ دو کیوں کہ میں سکندر کی ہو چکی ہوں اور اب کسی کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ اُس کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو بالکل جُدا تھے اور ان میں کوئی کش مکش نہیں تھی۔ میں پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ وہ غالب کی محبت کا جواب نفرت سے نہیں دے گی۔ اگر اس سے شادی کر سکے گا تو بہت اچھی بیوی بھی ثابت ہوگی جسے اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچّوں کے لیے جان بھی دینا پڑے تو دریغ نہ کرے۔ وہ غالب سے وفادار رہے گی اور اُسے اتنی ہی محبت دے گی جتنی کوئی بھی شوہر پرست بیوی دے سکتی ہے لیکن اُس کے دل میں جہاں میری محبت کا چراغ روشن ہے وہ گوشہ صرف میرے خیال سے آباد رہے گا۔ غالب یا کوئی اور چاہے کہ اس خیال کی روشنی کو بُجھا دے تو یہ ناممکن ہوگا۔

"کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟" نازو نے اچانک کہا۔

میں چونک پڑا۔ "کچھ نہیں... کوئی ایسی بات نہیں۔"

میں نے کہا: "محسن اور شہلا کو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں... دو گھنٹے ہونے کو ہیں۔" نازو نے کہا۔ "تم لوگوں نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تمھارے بارے میں...؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "اپنے فیصلے تم خود کرتی ہو بی بی۔ کس کی مجال ہے جو دخل دے سکے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "تم کوئی کام لینا چاہتے تھے مجھ سے۔"

"کام تو ہے... لیکن نازو... میں پھر کہتا ہوں کہ گھر لوٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "والدین کے گھر کے باہر پناہ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔"

"میں کس سے پناہ مانگ رہی ہوں؟" وہ خفا ہو کے بولی۔ "اور کیا یہاں میں تم سب کی پناہ میں نہیں ہوں۔ میں بہت مطمئن ہوں۔"

"مگر تمھارے ماں باپ اور تمھارا بھائی... وہ مطمئن نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہوں گے کہ تم صرف ان کی رسوائی کا سبب بن رہی ہو۔ انھیں دُکھ دے رہی ہو۔ تمھاری عمر کی لڑکیاں..."

"میری عمر کی لڑکیاں تو غلط راستے پر بھی نکل جاتی ہیں۔" وہ تند لہجے میں بولی۔ "مجھے یہ اعتماد تو ہے کہ میں نے غلط قدم ابھی تک نہیں اٹھایا۔ میرا کردار بے داغ ہے اور میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں خود کو اتنا ہی محفوظ سمجھتی ہوں جتنا اپنے گھر میں تھی، اور یہ سب تو نیت کے کھیل ہیں ورنہ سخت پردہ دار کہلانے والی لڑکیاں کیا نہیں کرتیں۔ کہاں نہیں جاتیں۔ ان کے اپنے خاندان میں اُنھیں کزن مل جاتے ہیں ورنہ محلّوں میں کوٹھوں کی دیواریں پھلانگنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ وہ اسکول اور کالج جانے کے لیے کتابیں لے کر اور برقعے اوڑھ کر نکلتی ہیں تو شالامار اور مقبرۂ جہانگیر پہنچتی ہیں کیا تم یہ سب نہیں جانتے؟ کون نہیں جانتا۔ کچھ لوگ اپنا بھرم رکھتے ہیں اور اسے پردہ کہتے ہیں۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، سب کے سامنے کر رہی ہوں اور غلط نہیں کر رہی ہوں۔ عزت و ذلّت اور رسوائی یا نیک نامی کی سند دینے والے اکثر وہی ہیں جو چوری چھپے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ غیبت کرتے ہیں۔ امانت میں خیانت کرتے ہیں، حقوقِ ہمسائگی اور حقوق العباد کی پروا نہیں کرتے۔ جہاں ڈر نہ ہو وہاں غیر قانونی کام سے بھی نہیں جھجکتے۔ کتنے ہیں ایسے جن کو موقع ملے اور پھر بھی وہ رشوت نہ لیں، سفارش قبول نہ کریں، کسی لالچ یا دباؤ میں نہ آئیں۔ پورے لاہور میں ہے کوئی ایسا جو رات کو ویران سڑک پر ٹریفک سگنل کی لائٹ سُرخ دیکھے اور رک جائے۔ وہ سب کسی نہ کسی طور مجرم ہیں جو دوسروں پر فردِ جرم عائد کرتے ہیں۔ میں اُن سے نہیں ڈرتی۔ ایک دن میرے والدین کو اور میرے بھائی کو یقین آ جائے گا کہ میں نے بغاوت نہیں کی تھی، وہی کیا تھا جسے جائز اور سچ مانا تھا۔ ہمت نہ ہو تو آدمی نتائج کی سوچ کے ڈر جاتا ہے۔ میں نتائج کی پروا نہیں کرتی کیوں کہ میں جانتی ہوں، نتائج غلط نہیں ہو سکتے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ معاشرتی اقدار کے پیمانے سے اس کے خیالات یقیناً سرکش اور باغیانہ تھے مگر اس بات سے انکار ناممکن تھا کہ وہ سچ کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اس کی بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ "تم اپنے گھر سے بالکل قطع تعلق کر لو گی۔"

"اس حد تک کہ میں اپنے گھر میں نہیں رہوں گی، میں اُن سے رابطہ رکھوں گی۔" وہ بولی۔ "تاکہ انھیں یقین رہے کہ میں زندہ ہوں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ خود تمھارے بغیر صرف اس یقین پر زندہ رہ سکیں گے کہ تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ نہیں سوچیں گے۔ کہ تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو۔ لڑکی تو ایک پل کے لیے نظر سے اوجھل ہو تو ماں باپ دس اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔"

"ایک تو میرے ماں باپ جانتے ہیں کہ میں کس قسم کی لڑکی ہوں۔" وہ بولی۔ "پھر وہ دوسری قسم کے ماں باپ ہیں۔ ماں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیوں کہ وہ صرف ماں ہے لیکن میرے والد اور میرے بھائی مجھ سے مختلف نہیں ہیں۔ اُنھیں مجھ پر اعتماد ہے۔"

"اور مجھ پر۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"اعتماد تو تم پر بھی ہے۔" نازو نے کہا۔ "وہ تمھارے جرائم کی نوعیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ انھیں بالکل شک نہیں کہ تم ایک مضبوط کردار کے مالک اور شریف آدمی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ تم نے کیا وہ غلط تھا۔ ان کے لیے ہر غیر قانونی کام غلط ہے، خواہ وہ شریف آدمی کرے یا بدمعاش۔ تاہم انھیں میری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا کہ میں غلط لوگوں کے درمیان ہوں۔ میرا بھائی اور میرا باپ مل کر میری ماں کو بھی سمجھا لیں گے کہ میرے لیے دعا کرے اور میری بحفاظت واپسی کا انتظار کرے۔"

"ٹھیک ہے نازو۔ میرا کام تمھیں سمجھانا تھا لیکن تم خود سمجھ دار ہو۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کوشش کریں گے کہ تمھیں ایک دن پھر والدین کے گھر پہنچا دیں، بالکل سلامتی اور حفاظت کے ساتھ۔ اسی حالت میں جیسے تم گھر سے نکلی تھیں۔ ہم اس بارِ امانت کو اٹھا لیں گے۔ حالانکہ اس سے ہماری ذمّے داریوں میں اضافہ ہوگا مگر ہم سب جانتے ہیں کہ کسی رشتے کی عدم موجودگی میں سب سے مضبوط رشتہ انسانیت کا ہوتا ہے جس نے ہمیں ایک خاندان بنا دیا ہے اور دُکھ سُکھ میں ساتھ دینے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔"

"حوصلہ تم میرا بھی آزما چکے ہو۔ یہ بتاؤ میں کس طرح تمھارے کام آسکتی ہوں؟" وہ بولی۔

"بتاؤں گا۔ سب کے سامنے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وہ کام ایسا ہے جو بہت مشکل اور خطرناک ہے۔ جب میں نے اس کام کے بارے میں سوچا تھا تو مجھے خیال آیا تھا کہ تمھارے سوا یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے لیکن فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ سب کا متفق ہونا ضروری ہے تاکہ کل کو خدانخواستہ۔۔۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔۔۔ تو الزام صرف مجھ پر نہ آئے۔"

"میں تمھیں کبھی الزام نہیں دوں گی۔" وہ بولی۔ "مجھے بتانے میں کیا حرج ہے۔"

"نہیں بات سب کے سامنے ہوگی۔" میں نے کہا۔ "وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں باہر جا کر ڈاکٹر لطیف کے گھر فون کروں۔ آخر اتنی دیر کیوں کی انھوں نے۔" نازو نے سر ہلایا اور میں باہر نکل گیا۔

ایک دکان پر میں نے پبلک ٹیلی فون کی تختی لگی دیکھی۔ وہ ایک جنرل اسٹور تھا جس پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ کئی بار چلّانے کے بعد میں دکان کے مالک پر واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ مجھے آٹے دال کا بھاؤ نہیں معلوم کرنا بلکہ فون کرنا ہے۔ اُس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اس کی اجازت دی اور میں نے یادداشت کی مدد سے ڈاکٹر لطیف کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی چار مرتبہ بجی، پھر اُن کی بیگم نے ریسیور اٹھا لیا۔

"آنٹی، میں سکندر بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ محسن۔۔۔ اور شہلا آپ کی طرف آئے تھے؟"

"یہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ میں نے نہیں دیکھا۔" وہ بولیں۔ "تم خود کیوں نہیں آئے آخر۔۔۔؟"

"تھی کچھ ایسی مجبوری کہ مجھے اپنی جگہ محسن اور اس کی بیوی کو بھیجنا پڑا۔" میں نے کہا۔

"تم بھی کمال کرتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب بہت ناراض تھے۔" وہ بولیں۔ "کہ اس لڑکے نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ اگر وہ آ نہیں سکتا تھا تو اُس نے آنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔ اب رابعہ پر اس کا غلط اثر ہوا تو کون ذمّے دار ہوگا۔"

"کیا وہ موجود ہیں؟ میں خود انھیں بتا دیتا ہوں کہ میں کیوں نہیں آسکا۔" میں نے کہا۔

"اُن کے کلینک میں کوئی بیٹھا ہے۔ وہ چلا جائے تو میں بات کروں۔" انھوں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے محسن بھی وہاں ہی بیٹھا ہو۔"

"آپ فون انھیں دے دیں۔" میں نے کہا۔ "کلینک میں بھی تو فون ہوگا۔"

"ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ میرا خیال ہے چوہدری دلاور کے سامنے وہ بات نہیں کریں گے۔"

"چوہدری دلاور؟" میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "کون چوہدری دلاور؟ وہ ایم ڈبلیو ڈی والا؟"

لائن یکلخت کٹ گئی۔ میں ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا جس میں اب لائن کے بزی ہونے کی ٹون آرہی تھی۔ پھر دکان دار نے ریسیور مجھ سے لے لیا اور ایک خاتون کے لیے نمبر ملانے لگا۔

یکلخت

کسی نامعلوم خطرے کے احساس نے میری پریشانی کو تشویش میں بدل دیا۔ ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے بہت کچھ بتا دیا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ چھپا لیا تھا اور میرے ذہن کو اَن گنت پُر خطر اور زہریلے خیالوں کے سرسراتے، کلبلاتے اور پھنکارتے سانپوں سے بھرے جنگل میں بھٹکتا چھوڑ دیا تھا۔ ان میں ایک سوال اژدہے کی طرح سر اُٹھاتا تھا اور مجھے ڈراتا تھا۔ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیا کام؟ اس کا ایک منطقی جواب کوئی بھی دے سکتا تھا کہ ڈاکٹر کے گھر کے دروازے تو سب ہی کے لیے کُھلے رہتے ہیں۔ اگر وہاں رابعہ جا سکتی ہے تو چوہدری دلاور کیوں نہیں جا سکتا۔ لیکن ڈاکٹر لطیف ایک نیورو فزیشن تھے جو ہر مرض کا علاج نہیں کرتے تھے۔ وہ نفسیاتی امراض کے معالج تھے اور میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ چوہدری دلاور کوئی نفسیاتی یا ذہنی مریض ہوگا۔ جب سے میرا اور اس کا رابطہ ہوا تھا میں نے اس کی شخصیت کے مختلف روپ دیکھے تھے۔ ابتداً میں وہ میرے والد کا ایک پارٹنر بن کے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایک شفیق سرپرست کا رویّہ اختیار کیا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا تھا کہ وہی میرے باپ کا قاتل ہے اور میں نے اسے اپنے دشمن کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ میں نے اس کی فراخدلی دیکھی تھی جب اس نے مجھے کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی اور میرے سامنے دو متبادل راستے رکھے تھے۔ میں یکمشت رقم لوں اور بھول جاؤں کہ میں ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے بانی مقتول وزیر خان کا جائز قانونی وارث ہوں۔ دوسرا یہ کہ بہت معقول معاوضے پر اس کاروبار میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے شریک رہوں۔ اپنے ضمیر کا ماہانہ معاوضہ طے کر لوں اور اس کے مذموم کاروبار میں ایک ایجنٹ بن کے دولت مندی کے اس کبھی خشک نہ ہونے والے سرچشمے کو رواں دواں رکھوں۔ میں نے دونوں راستے اختیار نہیں کیے تھے اور اصولوں کی جنگ میں کود گیا تھا۔ پھر میں نے دلاور کو ایک شکاری کے روپ میں دیکھا تھا اور اس کے ذہن کی عیاری، معاملہ فہمی، دور اندیشی، حالات کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئے بغیر پُرسکون رہنے کی صلاحیت اور شاطرانہ فطانت کا اعتراف کیا تھا۔ اس کا پیشہ اخلاقی اور قانونی اعتبار سے مجرمانہ تھا لیکن اس کاروبار کے تمام داؤ پیچ اور جوڑ توڑ، خطرات سے نمٹنے کے طریقے، راستوں کی رکاوٹوں کو صاف کرنے کے گُر، خود کو محفوظ رکھتے ہوئے نیچے سے اوپر تک تمام دشمنوں سے مقابلے کا حوصلہ اور ابتدا سے انتہا تک تمام مرحلوں سے بخیر و عافیت گزر جانے کی صلاحیت۔ یہ سب چوہدری دلاور کے دماغ کا ہی کام تھا۔ اس راستے کو غلط کہا جا سکتا تھا جس پر وہ چل رہا تھا مگر اس کے قدم کسی تذبذب کے بغیر آگے بڑھتے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ذہنی طور پر وہ شکوک و شبہات اور اندیشوں کے جال میں گرفتار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ بالکل واضح رہتی تھی۔ اس کا یقین و اعتماد اور اس کی قوتِ فیصلہ و قوتِ عمل سب قابلِ رشک تھے تو صرف اس لیے کہ اس کو خدا نے بہترین دماغ عطا کیا تھا۔ یہ اس کی بدبختی تھی کہ اس دماغ کی توانائی کا رُخ اس نے تخریب کی جانب موڑ دیا۔ چوہدری دلاور کبھی وہ ذہنی یا نفسیاتی مریض نہیں ہو سکتا تھا جو ڈاکٹر لطیف سے رجوع کرنے پر مجبور رہو۔ اس کے شعور میں کوئی اُلجھن اور کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ دنیا کے تین ہزار مذاہب پر راسخ اعتقاد رکھنے والے دل اور دماغ کی یکسوئی کے ساتھ اپنے عقائد کو مصائب سے نجات اور روح کے سکون کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یقین میں صرف جذبات کی نہیں عقل کی بھی تائید شامل ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک مذہب کا ماننے والا یہ کہے کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور نظریات کو ماننے والے نفسیاتی مریض ہیں تو یہ غلط ہوگا۔ ذہن ایک مجرم بھی ہو سکتا ہے اور سراغرساں بھی۔ دنیا میں تعمیری قوت اور تخریبی عناصر کے درمیان ازل سے جو برابر کی جنگ چل رہی ہے وہ ابد تک جاری رہے گی۔

گھر میں داخل ہونے سے قبل مجھے ایک فضول سا خیال یہ بھی آیا کہ کیا ڈاکٹر لطیف اور دلاور کے درمیان کوئی کاروباری تعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس کاروبار میں قانون کے محافظ اس کے ساتھ تھے۔ جعلی پیر اس کے ساتھ تھے جن کی روحانی قوت کے سامنے سادہ دل مرید سر جھکا دیتے تھے۔ سابق نواب خسرو جمشید کا ولی عہد ان کے ساتھ تھا تو پھر ایک ڈاکٹر بھی اس کا ساتھی بن سکتا ہے مگر اس خیال پر مجھے خود ہی شرم آئی۔ بے شک میں نے انسانیت کش ڈاکٹر بھی دیکھے تھے جو پیسے کی خاطر اپنے پیشے کی آبرو بیچتے تھے مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی اور ڈاکٹر لطیف تو ان لوگوں میں سے تھے جو انسان کے روپ میں فرشتہ ہوتے ہیں۔ [illegible] اپنا ایمان بیچتے ہیں تو شیطان ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف کو [illegible] نیل کے چوہدری دلاور نہ خرید سکتے ہیں۔ نہ اپنی طاقت سے سرنگوں کر سکتے ہیں اور نہ اپنے مقصد سے ہٹا سکتے ہیں۔ وہ مقصد ہے دُکھی انسانوں کے جسم و جاں کی شفا اور ان کی روح کے ناسوروں کے لیے دوا کرنا۔ انھوں نے اپنا تمام وقت، ساری توانائی، سب صلاحیت اور خدا کی دی ہوئی استطاعت کے ساتھ اپنے آپ کو بھی اسی مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ انھیں مال و زر سے کیا۔ نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے ہے۔ کہاں دلاور کا پیشہ کہاں ڈاکٹر لطیف کا پیشہ۔ چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک! معلوم نہیں ان کے بارے میں اتنا گھٹیا خیال میرے ذہن میں آیا کیوں)۔ شاید اس لیے کہ سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے۔ مجھے تو رسّی بھی پھانسی کا پھندا نظر آتی تھی۔ میں سانپ اور رسّی دونوں سے ڈرنے لگا تھا۔ حسبِ عادت غالب سویا ہوا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی میری متفکر صورت اور پریشان حالی نے استاد ٹیڈی اور نازو کو مضطرب کر دیا۔ "کیا ہوا سکندر بادشاہ۔ کیا خبر لائے ہو؟" ٹیڈی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ "شکل پر ابھی سے بارہ بج گئے ہیں۔"

"خبر اچھی نہیں ہے استاد۔" میں نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ "محسن اور شہلا تو وہاں پہنچے ہی نہیں۔"

"کہاں؟ ڈاکٹر لطیف کے گھر؟"

"ہاں۔ گئے تو وہیں تھے۔" نازو نے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آئی بات۔"

"اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ چوہدری دلاور اس وقت ڈاکٹر لطیف کے گھر میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" استاد ٹیڈی یوں اچھلا جیسے میں نے اس کے سر پر پٹاخہ پھوڑ دیا ہو۔ "چوہدری دلاور۔ کیا کہہ رہے ہو سکندر بادشاہ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ ڈاکٹر لطیف کے کلینک میں موجود ہے اور محسن یا شہلا کی کوئی خبر نہیں کہ وہ اندر ہیں یا نہیں ہیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" نازو نے کہا۔

"میں نے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "خود ڈاکٹر لطیف کی بیگم نے مجھے یہ بات بتائی ہے۔"

"وہ جانتی ہیں دلاور کو؟" ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں۔ ان کی بات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ میں کیسے پوچھ سکتا تھا کہ دلاور وہاں کیوں آیا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ "اس کے ہزاروں اسباب ہو سکتے ہیں۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ چوہدری دلاور خود اپنے کیس میں طبی مشورے کے لیے گیا ہو گا۔ نہ وہ پہلے نفسیاتی مریض تھا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ اس کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ اسے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے سلسلے میں مشورہ لینا ہو۔" نازو نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں دلاور کی بیوی کے اعصاب مسلسل دباؤ اور کشیدگی کے باعث جواب دے گئے ہوں۔ وہ میرے خیال کے مطابق ایک عام قسم کی گھریلو عورت ہے۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "ورنہ وہ کہیں تو دلاور کے ساتھ نظر آتی اور دلاور کی معرکہ آرائی میں برابر کی شریک ہوتی مگر اس کا تو نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ ہم نے شاید صرف ایک بار اسے دیکھا ہے۔ جب ہم ایک لاش کا تحفہ لے کر دلاور کے گھر گئے تھے۔"

"تمھارا خیال درست ہو سکتا ہے۔" نازو نے اس کی تائید کی۔ "دلاور کتنا بھی پُر سکون رہتا ہو اور باہر کے معاملات کو گھر سے دور رکھنے کی بھی کوشش کرتا ہو مگر یہ ناممکن ہے کہ اس قسم کے حالات سے گھر کی فضا متاثر نہ ہو۔ بیوی جاہل ہو یا بہت پڑھی لکھی، اپنے شوہر کی صورت دیکھ کر اس کی ذہنی پریشانی اور اس کے مسائل کا اندازہ کرنے کی قدرتی اور فطری صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ عرصہ شوہر اپنی اداکاری سے سب خیریت ہے کا ڈراما چلا سکتے ہیں مگر پھر چھوٹی چھوٹی باتیں سب راز کھولنے لگتی ہیں۔"

"ایسے بول رہی ہے جیسے تجھے بڑا تجربہ ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"واہ۔ تجربہ ہی سب کچھ ہے کیا۔ مشاہدہ کچھ نہیں۔" نازو نے ٹیڈی کے طنز کا فوراً موثر جواب دیا۔ "آدمی بہت کچھ سنتا ہے۔ پڑھتا ہے۔"

"آدمی کی بات اور ہے۔ تو ابھی عورت بھی نہیں، لڑکی ہے۔"

"مجھے صرف لڑکی سمجھنے والے غلط فہمی میں مارے جاتے ہیں۔" نازو نے غرور آمیز برہمی سے کہا۔ "کیا میں نے غلط کہا تھا سکندر؟"

"اسے کیا معلوم۔ اس کی ابھی تک ایک بھی بیوی نہیں۔"

"اچھا شہلا آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" نازو نے چڑ کر کہا۔ اسے چڑانا ہی استاد ٹیڈی کا مقصد تھا۔

"وہ اپنے میاں کے ساتھ بھاگ گئی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ناک کٹوا دی ہماری۔"

ایسے سنگین حالات میں بھی یہ بات سُن کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ شکل سیدھی ہوئی۔" ٹیڈی بولا۔ "پریشانی اپنی جگہ مگر رونے سے کیا ہو گا۔ عقل بھی کام نہیں کرے گی۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا استاد۔" میں نے کہا۔ "اس وقت عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"محسن اور شہلا کی واپسی کا انتظار۔" ٹیڈی بولا۔

"انتظار آخر کب تک۔ ڈھائی گھنٹے میں وہ دو بار جا کے آ سکتے تھے۔ چھ سات میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے آدھا گھنٹا۔" میں نے کہا۔

"بشرطیکہ باہر نکلتے ہی سواری مل جائے۔ وہ پیدل تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مطمئن اور پُرسکون رکھنے کے لیے اس قسم کے دلائل کا سہارا لے رہا ہے۔ اس کی یہ مخلصانہ کوشش میرے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے تھی مگر بے سود تھی۔ ہر لمحہ میرے اندیشوں کو یقین میں بدل رہا تھا اور محسن کی واپسی میں جتنی دیر ہو رہی تھی اتنا ہی میرا یہ احساس شدّت اختیار کر رہا تھا کہ مجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ اپنے لیے۔ رابعہ کے لیے۔ محسن اور شہلا کے لیے۔ مگر کیا، اس کیا کا ابھی تک میرے ذہن میں کوئی جواب نہ تھا۔

"آخر ہم کب تک صرف سوچتے رہیں گے!" میں نے کہا۔ "کہ یہ ہوا ہو گا اور وہ ہوا ہو گا۔ خود ہم کچھ نہیں کریں گے؟"

"کریں گے کیوں نہیں سکندر بادشاہ۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "قسم مولا علی کی ہم سے جو بھی بن پڑا کریں گے۔"

"مگر کب... سوچو ذرا استاد کہ تین گھنٹے ہونے کو ہیں۔"

"ابھی ہوئے تو نہیں ہیں۔" استاد ٹیڈی نے نازو کی طرف دیکھا۔ "بس تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد تین گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔"

"مجھے بتاؤ کہ تین گھنٹے بعد ہم کیا کریں گے؟" میں نے طنز اور مایوسی کے ساتھ کہا۔ "بھنگیوں کی توپ لے کر طبلِ جنگ بجاتے ہوئے کوچ کریں گے اور کشتوں کے پشتے لگا دیں گے؟"

"تین گھنٹے بعد میں جاؤں گی۔ صرف میں۔" نازو نے یکلخت کہا۔ "مجھے کوئی وہاں نہیں پہچانتا۔ جو میرا راستہ روکے گا، میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ محسن اور شہلا اندر ملے تو انھیں بھی نکال لاؤں گی ورنہ رابعہ کو اٹھا لاؤں گی۔ وہ اچھی ہے یا بُری، رہے گی یہاں۔"

"تم نے تو فرض کر لیا ہے کہ تمھارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہو گا اور ہوا تو خالی ہاتھ ہو گا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری دلاور تو سوتے وقت بھی مسلح رہتا ہے اور خواب میں بھی اسلحہ ساتھ لے کر پھرتا ہے۔ تم اس کی ہڈی پسلی کیا ایک کرو گی، وہ تمھاری پسلیوں کے اندر دل کو چھلنی کر دے گا۔"

"تم نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ چوہدری دلاور کا ڈاکٹر لطیف کے گھر جانا ہمارے معاملات سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔" نازو نے خفگی سے کہا۔

"امکانات کو نظر انداز مت کرو نازو۔" میں نے کہا۔ "ذرا سوچو کہ رابعہ کتنے دن سے وہاں ہے۔ ڈاکٹر لطیف کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں اور ان کے حلقۂ احباب میں، مریضوں میں، ملنے جلنے والوں میں نہ جانے کتنے وکیل بھی ہوں گے۔ سب وکیل رابعہ کو پہچانتے ہیں۔ سو فیصد نہ سہی۔ تو نوّے فیصد ہوں گے۔ وہ بھی بہت شہرت یافتہ وکیل تھی۔ اس کی وجہِ شہرت کا ایک سبب تو یہی تھا کہ خواتین وکلاء کی تعداد محدود ہے۔ گنتی کی چند عورتیں پریکٹس کرتی تھیں اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ خواتین تو دو چار ہی تھیں۔ پھر رابعہ کی ذہانت اور اس کی وہ صورت جو ایک بار دیکھنے والا آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ بعد کے واقعات نے اسے مزید شہرت دی۔ اب اگر کسی وکیل نے اسے ڈاکٹر لطیف کے گھر میں دیکھ لیا ہو گا تو فوراً پہچان لیا ہو گا اور ایک وکیل سے یہ بات بار ایسوسی ایشن کے تمام ارکان تک پہنچ سکتی ہے۔ چوہدری دلاور کے بھی وکیل ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ... چوہدری دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے گیا ہو گا؟" استاد ٹیڈی نے تشویش سے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو ڈاکٹر لطیف خواہ مخواہ مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "دلاور ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"میرا اندازہ ہے کہ دلاور وہاں رابعہ کی وجہ سے نہیں گیا۔" نازو نے سوچ کر کہا۔ "وہ بہت چالاک اور عیار آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ رابعہ اس گھر میں موجود ہے تو وہ اپنے شکاری باہر بٹھا دیتا۔ اس یقین کے ساتھ کہ جہاں رابعہ ہو گی وہاں تم ضرور جاؤ گے۔ یہ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے کہ منہ اٹھا کے اندر گھس جائے اور رابعہ کو یا ڈاکٹر لطیف کو ڈرانے دھمکانے لگے کہ سکندر کا پتا بتاؤ۔"

نازو کی بات اتنی مدلل تھی کہ میں فوراً قائل ہو گیا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر بھی ایک بے نام سی بے کلی اور خلش باقی رہی جس کا علاج کوئی نہ تھا۔ نازو نے اور ٹیڈی نے سوچے سمجھے بغیر تین گھنٹے گزر جانے کے بعد کچھ نہ کچھ کرنے کا اعلان تو کر دیا تھا جس میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ یہ خود ان پر واضح نہیں تھا کہ اسی وقت سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا گیا تو زیرو آور پر کیا ہو گا۔ پندرہ منٹ کے بعد دس منٹ۔ پانچ منٹ۔ چار... تین۔ دو۔ ایک۔ پھر سیکنڈ۔ ساٹھ پچاس... دس... نو آٹھ سات... چھ... پانچ چار۔ تین دو۔ ایک۔ زیرو۔ زیرو کے بعد؟ زیرو کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف زیرو ہوتا ہے۔ زیرو لامحدود ہے۔ خلا کی طرح۔ حیات بعد از موت کی طرح... دشتِ امکاں کی طرح...

ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور بیک وقت ہم سب اُچھل پڑے جو اپنے اپنے خیالات کے ڈراؤنے جنگل میں الگ الگ بھٹک رہے تھے۔ میں نے ٹیڈی کو دوسرے کمرے میں روپوش ہونے کا اور نازو کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ احتیاط کے ان تقاضوں پر عمل کرنا اب ہماری عادت سی ہو گئی تھی۔ خدانخواستہ اندر آنے والا کوئی اجنبی یا شکاری ہوتا تو ہمیں بالکل تیار پاتا۔ سامنے میں آتا اور مجھے ٹیڈی کا تحفظ حاصل ہوتا جو سامنے نہیں تھا۔ نازو ایک طرح کی کمانڈو فورس تھی جو ہنگامی صورتِ حالات میں غیر متوقع طور پر حملہ کرنے کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اہل تھی اور یقینی ناکامی کو کامیابی میں بدل سکتی تھی۔ اس وقت ہم سب محسن اور شہلا کی واپسی کے انتظار میں تھے لیکن ایک غلط بات یہ ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کے گھر میں چوہدری دلاور پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ رابعہ کا پتا چلا سکتا تھا مگر یہ بھی عین ممکن تھا کہ اسے محسن اور شہلا نظر آجائیں اور وہ ان کا خاموشی سے پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچے۔ یا ان پر کسی طرح اپنے شکاری کتوں کی مدد سے قابو پالے اور انھیں زبردستی یہاں تک لے آئے۔ محسن اور شہلا سے دباؤ کے سامنے آسانی سے سر جھکانے کی مجھے توقع نہیں تھی لیکن شادی کا بندھن ان کے درمیان ایک ایسی کمزوری بن گیا تھا جس سے شکاری فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ خدانخواستہ یہ میرے ساتھ ہوتا کہ مجھے محسن کی جان خطرے میں نظر آتی تو میں شہلا کے سہاگ کو بچانے کے لیے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتا۔ باقی سب کا بھی یہی تھا کہ محسن اور شہلا کی ازدواجی زندگی جس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا سب کو عزیز تھی۔ خود محسن یا شہلا کو اس کمزوری سے مبرا کیسے سمجھا جا سکتا تھا جو میاں بیوی تھے۔ بیوی کو بچانے کے لیے محسن اور شوہر کی زندگی کے لیے شہلا اگر ہمیں گرفتار کرانے کی شرط بھی منظور کر لیتے تو ہم شکوہ نہ کرتے۔ ہر آدمی بالآخر خود اپنی ہی کسی کمزوری کے جال میں گرفتار ہوتا ہے اور اس کی کمزوری ایک ناگزیر مجبوری بن جاتی ہے۔

رات بھر جاگنے والا غالب اب سو رہا تھا۔ میں نے اسے سونے دیا اور دروازے کے قریب کھڑا دوسری دستک کا منتظر رہا اور باہر کھڑے ہوئے محسن اور شہلا یہ بات جانتے تھے چنانچہ محسن نے اپنی آواز میں کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تب میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں میاں بیوی شاید باہمی صلاح مشورے سے طے کر آئے تھے کہ انھیں بہت زیادہ مایوس اور پریشان نہیں دکھائی دینا چاہیے چنانچہ اندر آتے ہی محسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"سکندرِ اعظم کیوں رو رہا ہے؟" محسن بولا۔ "اور کیسے رو رہا ہے؟"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر محسن کی طرف دیکھا۔

"تم دونوں ڈاکٹر لطیف کے گھر نہیں گئے۔ پھر واپسی میں اتنی دیر کیوں کی؟"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" محسن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وہاں چوہدری دلاور پہنچا ہوا تھا نا؟" میں نے کہا۔

"تجھے کیسے معلوم؟" محسن نے اسی لہجے میں کہا۔

"فون کیا تھا میں نے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بیگم لطیف سے بات ہوئی تھی۔"

"وہ یار... بڑی عجیب سی بات ہو گئی۔" محسن کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "سچی بات ہے کہ پہلے تو میں گھبرا گیا تھا کہ اس وقت چوہدری دلاور کا یہاں کیا کام؟"

"تو نے کیا اسے باہر ہی دیکھ لیا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس وقت میں اور شہلا اندر پہنچ چکے تھے۔" محسن بولا۔ "بس قسمت اچھی تھی کہ ڈاکٹر لطیف کو صبح صبح ایئرپورٹ جانا پڑا کسی دوست کو چھوڑنے کے لیے۔ وہ اس وقت تک لوٹ کر نہیں آئے تھے لیکن کہہ گئے تھے کہ سکندر آئے تو اسے روک لینا اور رابعہ سے ملوا دینا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ رابعہ سے کہہ چلے تھے کہ میں آؤں گا۔" میں نے سخت دل شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یار... انھیں صبح ساڑھے چھ بجے ہی جانا پڑ گیا۔ اس وقت ٹیکسی ملتی نہیں چنانچہ دوست نے انھیں فون کر دیا اور وہ گاڑی لے کر نکل گئے۔ رابعہ جاگ رہی تھی۔ اس نے باتیں شروع کر دیں اور ڈاکٹر لطیف نے اس کا مورال اپ کرنے کے لیے بتا دیا کہ سکندر نو بجے تمھیں لینے آئے گا۔ بے وقوف لڑکی پھر تو مانو گی کہ اسے کچھ نہیں ہوا۔ وہ سب تمھارے دماغ کا فتور تھا۔ یہ باتیں مجھے بیگم لطیف نے بتائیں۔"

"اور... رابعہ پر کیا اثر ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ اچھا اثر ہوا تھا۔" محسن بولا۔ "یوں لگتا تھا جیسے وہ سوتے سوتے اچانک بیدار ہو گئی ہو۔ نہ جانے کیوں اس نے ڈاکٹر لطیف کی بات کو جھوٹ نہیں کہا۔ جیسے کہ وہ پہلے کہتی تھی اور ان کی تردید بھی نہیں کی۔ وہ کچھ مضطرب اور بے چین نظر آنے لگی اور ڈاکٹر لطیف کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ آٹھ بجے بیگم لطیف نے اسے دیکھا... تو وہ بالکل تیار تھی۔ میک اپ وغیرہ سے فارغ ہو گئی تھی اور اس نے وہی"

"محسن...!" شہلا نے اسے گھور کے تنبیہ کی۔

"اس نے وہی ساڑی باندھی تھی۔ نیلی۔ جس پر زرد پھول ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... مجھے بہت افسوس ہے یار...!" محسن نے کہا۔ "اسے یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔"

"مایوسی تو پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا۔ نہ جانے یہ مایوسی کیا گل کھلائے۔" میں نے زخمی دل کی تڑپ کو الفاظ دے کر کہا۔ "کون جانے وہ پھر کتنی دور نکل جائے۔ اتنے قریب آکے...!"

"قسمت اچھی تھی کہ جس رخ پر میں بیٹھا تھا اس کے بالکل سامنے بہت بڑی کھڑکی تھی۔" محسن بولا۔ "پٹ بند تھے مگر پردے ہٹے ہوئے تھے اور میں شیشے سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اچانک ایک گاڑی کو اندر آتے دیکھ لیا اور ونڈ اسکرین کے پیچھے مجھے چوہدری دلاور کی صورت نظر آگئی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو میں منجمد ہو گیا تھا اور میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس کا آنا کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ہے اور ہم محصور ہو چکے ہیں۔ پھر میں نے بیگم لطیف سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اور انھوں نے سر گھما کے گاڑی کو دیکھا تو لاعلمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر لطیف کے سب مریضوں سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ یہ چوہدری دلاور ہے جو ایک بہت خطرناک آدمی ہے۔ میری حالت کے تغیر نے ان کو پہلے ہی حیران کر رکھا تھا۔ میری بات نے انھیں مزید حیران کیا۔ میں نے کہا کہ زیادہ لمبی بات کا وقت نہیں۔ یہ رابعہ کا ایک خاندانی دشمن ہے۔ اس کے والد کی موت۔ پھر والدہ کی موت اور اس کے گھر کی تباہی میں بہت حد تک اسی شخص کا ہاتھ تھا چنانچہ آپ اسے رابعہ کی یہاں موجودگی کا بالکل پتا نہ چلنے دیں اور نہ ہمارے یہاں آنے کا۔ ورنہ وہ چالاک آدمی ہے۔ یہ نتیجہ اخذ نہ کر لے کہ ہم رابعہ کی وجہ سے ہی یہاں آتے ہیں۔ نوکر نے دلاور کو ڈرائنگ روم میں نہیں بلایا بلکہ کلینک میں پہنچا دیا۔"

"اس وقت رابعہ کہاں تھی؟" میں نے کہا۔

"رابعہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور تیرا انتظار کر رہی تھی۔" محسن نے کہا۔

"تجھے اس سے مل لینا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا تھا کہ وہ تجھے اور شہلا کو پہچان جاتی اور اگر تم میرے نہ آنے کی وجہ بتاتے تو مان بھی جاتی۔"

"میں نے یہی کیا تھا یار۔" محسن بولا۔

"مگر میں نے کہا تھا۔ خود تمھاری عقل میں نہیں آئی تھی یہ بات۔" شہلا بولی۔

"اچھا بابا۔ اب روایتی بیویوں کی طرح ہر جگہ شوہر کو احمق اور خود کو عقلِ کل ثابت کرتی پھرو۔" محسن نے بھنا کے کہا۔ "جب ہم ایک ساتھ اور ایک ہی مشن پر گئے تھے تو یہ ٹیم ورک تھا۔ ایک بات کا کریڈٹ میں لوں اور دوسری کا تم تو کیا فائدہ دونوں کا۔"

"تم بھی شوہروں کی طرح زبردستی اپنی مت منواؤ۔ عقل کی ایک بات میں نے کی تھی تو مان لو کہ بیویاں بھی بالکل ناقص العقل نہیں ہوتیں۔" شہلا بولی۔

"مجھے بتاؤ کہ رابعہ سے مل کے کیا ہوا؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"رابعہ سے ملنا اچھا ہوا۔" محسن بولا۔ "وہ پہلے تو کشمکش میں پڑ گئی۔ کہنے... دونوں سے ملاقات ہو چکی ہے لیکن یاد نہیں آتا کہ کہاں۔ میں نے کہا کہ سکندر کے ساتھ اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ کہنے لگی کہ سکندر آنے ہی والا ہے۔ عجیب سی اجنبیت تھی ہمارے لیے مگر تمھارا نام لیتے ہوئے اس کا لہجہ اور اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔"

"میں تو اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کے سارے جذبات کی روشنی اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔" شہلا نے کہا۔

"اسی وقت میں نے بتایا کہ سکندر نہیں آسکے گا اور میرے الفاظ کا ردِعمل اتنا شدید ہوا کہ میں تو ڈر گیا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کی صورت ایک دم بجھ گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے لائٹ کے ساتھ ہی ٹی وی کا زندہ متحرک تصویروں والا اور روشن اسکرین بے جان اور تاریک ہو جائے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ موقع ملتے ہی سکندر آئے گا مگر اس نے نہیں مانی۔ وہ اسی طرح سر ہلاتی رہی کہ نہیں۔ سب مجھے بے وقوف بنانے آتے ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ اب کیسے آسکتا ہے۔"

"کوشش میں نے بھی کی تھی کہ اسے تمھارے بخیر و عافیت ہونے کا یقین دلا سکوں لیکن اس کے ذہن کے سارے دروازے جو صبح سے تمھارے انتظار میں کھلے ہوئے تھے یکلخت بند ہو گئے تھے۔" شہلا نے کہا۔

فیض کی ایک نظم صدائے بازگشت بن گئی۔

ڈھل گئی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

مگر میں آؤں گا۔ ایک دن ان بے خواب پلکوں کی چلمن اٹھا کے میں تمھاری آنکھوں میں جھانک کر کہوں گا کہ دیکھو رابعہ، میں وہی سکندر ہوں۔ میں تمھارا بھولا ہوا خواب ہوں۔ یادوں کا نقشِ رہگزر ہوں۔ میں اس وقت کا حصہ ہوں جو تمھارا اور میرا تھا اور کسی جگنو کی طرح تمھاری مٹھی سے نکل کر اڑ گیا تھا۔ میں ان گنت فروزاں لمحوں کے جگنو سمیٹ کر تمھاری مانگ میں افشاں کے ستارے سجانے لوٹ آیا ہوں اور تب تم دیکھو گی کہ میری آنکھوں میں تمھاری تصویر ہے اور مجھے پہچانو گی اور کون ہو سکتا ہے جو تمھاری تصویر نگاہوں میں سجائے ہجر کی صدیوں کا سفر کرے اور اس نقش کو مٹنے نہ دے مگر میرے آنے تک انتظار کرنا۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو مگر ان کواڑوں کے پیچھے امید اور انتظار کا سورج روشن رکھو۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم میری بات نہیں سن رہے تھے۔" محسن نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں...!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں... میں سب سن رہا تھا۔"

محسن نے میرے جھوٹ کو معاف کرتے ہوئے سچ مان لیا۔ "میں نے رابعہ سے کہا کہ اس وقت چوہدری دلاور یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ تم خود ہی سوچو کہ سکندر کیسے آتا۔ چوہدری دلاور کے نام پر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگی تھی لیکن پھر وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ تم سمجھتے ہو میں پاگل ہوں۔ یہاں چوہدری دلاور کا کیا کام! میں نے کہا کہ تم چاہو تو دیکھ لو۔ نیچے اس کی گاڑی کھڑی ہے یا نہیں۔ اس نے نیچے جھانکا اور بولی کہ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ اس کی گاڑی نہیں ہے۔"

"تو کیا وہ گاڑی دلاور کی نہیں تھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی اسی کی تھی۔" محسن بولا۔ "مگر وہ پہلے والی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے اتنے عرصے میں گاڑی بدل لی ہے۔ میں نے بھی براہِ راست اس کو ونڈ اسکرین کے پیچھے دیکھ لیا تھا ورنہ گاڑی دیکھ کر تو میں بھی کچھ نہ سمجھتا۔ یہ میری بھول تھی یا بدقسمتی۔ دلاور نے گاڑی نہ بدلی ہوتی تو شاید رابعہ کے حق میں اچھا ہوتا اس کے ذہن میں پرانی گاڑی تھی اور اسے یقیناً یاد تھا کہ چوہدری دلاور تمھارا دشمن تھا کیوں دشمن تھا' یہ بات ممکن ہے اسے پوری تفصیل کے ساتھ یاد نہ ہو۔ رابعہ کے ذہن میں پرانی گاڑی کا تصوّر تھا۔ نئی گاڑی دیکھتے ہی اس کا میری بات پر سے اعتبار بالکل اُٹھ گیا۔ وہ ایک دم بگڑ گئی اور چلّانے لگی۔ مجھ پر اور شہلا پر خفا ہونے لگی کہ تم دونوں جھوٹے اور دھوکے باز ہو۔ سازشی ہو اور پتا نہیں کون ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں تمھیں نہیں جانتی۔ میری اور شہلا کی سب منّت سماجت رائگاں گئی۔ اس نے ہماری ایک نہیں سنی۔ اس وقت یہ ہو سکتا تھا کہ میں رابعہ کو نیچے لے جاتا اور کسی طرح اس کو موقع فراہم کرتا کہ وہ دلاور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے مگر ایک تو گاڑی والی بات غلط ہو گئی۔ پھر اس کی آواز پر بیگم لطیف آگئیں۔ انھوں نے پریشان ہو کر ہم دونوں کو کمرے سے باہر بلا لیا۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں رابعہ پر ہسٹریا کا شدید دورہ نہ پڑ جائے۔ ڈاکٹر لطیف بھی آنے ہی والے تھے۔ ان کا موڈ ایک دم بگڑ جاتا کہ سکندر کیوں نہیں آیا اور رابعہ سے ہم نے کیا کہہ دیا ہے کہ ان کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ہم رابعہ کو چھوڑ کر پھر نیچے ڈرائنگ روم میں آگئے اور بیگم لطیف نے کسی طرح رابعہ کو خاموش کر لیا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا محسن۔ بہت ہی بُرا ہوا۔" میں نے کہا۔

"بُرا تو ہوا لیکن سب بُرا نہیں ہوا۔" محسن بولا۔ "کچھ اچھا بھی ہوا۔"

"اس میں کون سا پہلو نکلتا ہے اچھائی کا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ایک بات ہمارے خلاف گئی تو ایک حق میں بھی رہی۔" محسن نے کہا۔ "ہم نیچے آکر بیٹھے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی اور مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ میں نے صرف ہیلو ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے کوئی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ "میں سب انسپکٹر ... بول رہا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر لطیف سے بات کرنا ہے۔"

میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ "بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور ذرا نرمی سے اور آہستہ بات کرو۔ میں بہرا نہیں ہوں۔"

اس لہجے اور رویے نے اسے احساس دلایا کہ وہ کسی عام آدمی سے نہیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے مخاطب ہے۔ "آئی ایم سوری ڈاکٹر۔ کل رات آپ کے گھر کے قریب کچھ بدمعاشوں نے مجھے مارا۔ میں گشت پر تھا دو سپاہیوں کے ساتھ کہ مجھے ایک مشتبہ شخص نظر آیا۔ میں نے اسے روکا۔ پہلے تو اس نے آپ کا نام لیا۔"

"خود اس نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"غالباً... سلیم جوزف۔" وہ بولا۔ "اس نے کہا تھا کہ آپ اسے جانتے ہیں اور وہ اپنے کسی عزیز کو دیکھنے گیا تھا جو آپ کے گھر میں زیرِ علاج ہے۔"

"میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور انسپکٹر! یہ میرا گھر ہے' اسپتال نہیں۔ یہاں میں کسی کو زیرِ علاج نہیں رکھتا۔"

"لیکن اس نے آپ کا نام لیا تھا سر۔ آخر کیوں؟" وہ بولا۔

"اگر اس سڑک سے گزرنے والے ڈاکو میرا نام دیکھ جائیں اور بعد میں کہیں کہ ہم ڈاکٹر لطیف کے بھائی ہیں تو کیا اس سے وہ ڈاکو میرے بھائی بند ہو جائیں گے انسپکٹر۔ تم کو عقل سے کام لینا چاہیے۔ یہاں عموماً دروازوں پر نیم پلیٹ نظر آتی ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں سر۔" وہ بولا۔ "مجھے معلوم تھا وہ جھوٹا آدمی ہے کیونکہ بعد میں بھی اس نے اپنے بارے میں بہت غلط بیانی کی تھی۔ سوری فار ... ٹربل۔" اس نے فون بند کر دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت خطرناک مرحلہ حسنِ اتفاق سے دو منٹ میں بڑی آسانی سے گزر گیا تھا۔ اس وقت بیگم لطیف اگر موجود ہوتیں یا خود ڈاکٹر لطیف ہوتے تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ ہمارے لیے ان کو سمجھانا بھی مشکل ہوتا اور اُنھیں جھوٹ بولنے پر راضی کرنا بھی۔ میں یہی سوچ کر پریشان تھا کہ ڈاکٹر لطیف نہ مانتے تو کیا ہوگا۔ وہ کرنا خدا کا کچھ ایسا ہوا کہ فون ریسیو بھی کیا تو کس نے؟ خود میں نے۔ جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا مگر بعض اوقات تقدیر بڑے عجیب انتظامات کرتی ہے اور ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک سیکنڈ کے وقت کا فرق نہیں پڑتا۔ جتنی دیر میں بیگم لطیف اوپر سے آئیں' ڈاکٹر لطیف لوٹ آئے اور گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ پہلے ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں ہم کو دیکھ کر مایوس ہوئے۔ ہم نے بتا دیا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر سکندر نہیں آیا۔

"ناگزیر وجوہ؟" وہ ایک دم بگڑ گئے۔ "کیا آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا قیامت آگئی تھی۔ اتنا سمجھا دیا تھا اس گدھے کو میں نے کہ تمھارا آنا بے حد ضروری ہے۔ نہیں آسکتا تھا تو بتا دیتا۔ میں رابعہ کو تیار نہ کرتا۔ اس سے بات ہی نہ کرتا کہ سکندر نو بجے آئے گا۔ پہلے وہ ایک فریب خیالی کا شکار تھی۔ اب اسے یقین ہو گا کہ جھوٹ ہم سب بولتے تھے۔ ہم اس کے لیے بالکل قابلِ اعتبار نہیں رہے کیونکہ ہم اس کے سچ کی نفی کرتے تھے اور ایک حقیقت کو جھٹلاتے تھے کہ سکندر بخیر و عافیت اور زندہ سلامت ہے۔ اب تو خود سکندر کے لیے سامنے آکر اپنے وجود کو حقیقی ثابت کرنا مشکل ہو گا۔ وہ سمجھے گی کہ پہلے بھی اس کی نظر کو دھوکا ہوا تھا اور وہ نظر کے فریب میں آگئی تھی۔ دوسری بار اس کا ذہن پوری مزاحمت کرے گا۔ ناگزیر وجوہ۔ مائی فٹ! رات کے دو بجے تک وہ یہاں تھا۔ بے وقوف آدمی یہاں رُک جاتا۔ خواہ مخواہ گیا۔ اب پیغام بھیج دیا کہ وہ تشریف نہیں لا سکتے۔ چند گھنٹوں میں ان کے لیے ناگزیر وجوہ پیدا ہو گئیں۔" وہ اتنے برہم تھے کہ درمیان میں بول کر انھیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرنا ہی بے سود تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو میں نے آہستہ سے کہا کہ رات کو واپس جاتے ہوئے سکندر کو ایک معمولی سا حادثہ پیش آگیا تھا۔ اس کا ردِ عمل دیکھنے والا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کا سارا غصّہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگے۔

"ایکسیڈنٹ! کس چیز سے... اور وہ ہے کہاں؟" انھوں نے کہا۔

"اسپتال میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے ایک جیپ ٹکر مار کے نکل گئی تھی۔ وہ اس کا نمبر وغیرہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ وہ کنارے پر تھا چنانچہ اس کا مونڈھا جیپ کی سائڈ سے لگا اور وہ گر گیا۔ دو چار دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ فریکچر یا کوئی گہرا زخم نہیں ہے۔"

انھوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ سب بدقسمتی کی بات ہے۔ دو چار دن بعد اس کے آنے سے رابعہ کو کیا فائدہ ہو گا۔ وہ نقصان تو ہو گیا۔ اب نہ جانے کب تک رابعہ اس خود فراموشی کی کیفیت کا شکار رہے گی۔ میں تو بہت خوش اور پراُمید تھا اس کی پیش رفت دیکھ کر۔ لیکن وہ آخری سیڑھی سے پھسل کر پھر نیچے گر جائے گی۔ معلوم نہیں دوبارہ اوپر دیکھے گی بھی یا نہیں۔ پھر اپنے آپ کو پانے کی خواہش بھی باقی رہے گی یا نہیں۔"

"یہ سب قدرت کے کھیل ہیں ڈاکٹر لطیف۔" میں نے کہا۔ "ہم سب اپنی طرف سے اچھا کرتے ہیں مگر بُرا ہو جاتا ہے۔ اب رات کو سکندر یہاں آنے کی حماقت نہ کرتا تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس کے آنے پر خوش تھے اور آپ کا خیال تھا کہ اس نے ٹھیک کیا۔ آیندہ بھی ہم سب اور آپ مل کر رابعہ کے لیے کوشش کرتے رہیں گے۔ اُمید کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"ہاں... اب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہی اُمید تو آدمی کے لیے زندہ رہنے کی جدوجہد کا سبب بنتی ہے۔" وہ بولے۔ "اللہ مالک ہے رابعہ کا بھی۔ جو اس کے مقدر میں ہے وہ تو اسی کو بھگتنا ہے۔" وہ جانے والے تھے کہ میں نے اُنھیں روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ کے کلینک میں ایک شخص بیٹھا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ چوہدری دلاور۔ کیا بات ہے؟" وہ رُک کر بولے۔

"آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" میں نے کہا۔ جو ایک احمقانہ سوال تھا۔

"اسے تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میرا مطلب تھا کہ کیا وہ آپ کا مریض ہے؟"

"نہیں۔ اس کی بیوی کچھ عرصے سے میرے پاس زیرِ علاج ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "بیماری وہی ہے۔ ذہنی اور اعصابی کشیدگی۔ صحیح سبب وہ بتاتا نہیں۔ غلط بیانی کرتا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس طرح میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وکیل اور ڈاکٹر کو حقائق کا علم ہونا چاہیے۔ ورنہ کیس بگڑ جاتا ہے۔ دوائیں اس وقت تک بے اثر رہیں گی جب تک بیماری کے اسباب دور نہیں ہوں گے۔ بھئی ایک سیدھی سی بات ہے۔ تمھارا گلا اگر کھٹائی کھانے سے خراب ہے تو پہلے گھر سے یہ اچار چٹنی وغیرہ ہٹاؤ۔ کھٹائی کھانا چھوڑو۔ مگر یہ عجیب آدمی ہے۔ کہنے لگا کہ اسباب تو میں دور نہیں کر سکتا۔ اسے دور بھیج دیتا ہوں۔ جہاں اسباب نہ ہوں۔ اب دیکھتا ہوں کہ کیا بتانے آیا ہے۔"

اس وقت تک بیگم لطیف نیچے آگئی تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ دلاور کے بارے میں خود کچھ نہ کہوں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے بیگم لطیف سے کہہ دیا تھا..." شہلا بولی۔

"ہاں ہاں۔ میں سن رہا تھا" محسن بولا "اور اسی لیے میں نے آگے بات نہیں کی۔ اجازت لی اور چل پڑا۔"

"فی الحال رابعہ کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے" میں نے ایک تلخ حقیقت کو دل پر پتھر رکھ کے تسلیم کیا "اور صرف رابعہ ہی ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" استاد ٹیڈی نے فوراً کہا۔

"تمہارے مقدر میں صرف دُکھ ہیں۔ محبت کی بات تم کیوں کرتے ہو" محسن نے کہا۔

یہ استاد ٹیڈی کی دُکھتی رگ تھی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔

"تمہارے آنے سے پہلے میں اور نازو ایک بات کر رہے تھے جس کا تعلق ایم آر ایس کے اگلے مشن سے ہے" میں نے کہا "اس میں نازو کا مرکزی کردار ہے۔"

"ایک فلسفیانہ نکتہ ذہن میں آیا ہے" محسن نے کہا "کہ آدمی کی تمام جدّ و جہد میں مرکزی کردار پیٹ کا ہے جو اس وقت خالی ہے۔"

"اور پیٹ کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"تم پھر بولے۔ تمہارے پاس ہے دماغ!" محسن نے کہا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں" استاد ٹیڈی ایک دم اُٹھا "پہلے تمہارا سر توڑ کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔ ذرا ہتھوڑی لانا میری بہن۔"

"خبردار زوجہ محترمہ۔ آپ کو ہمارے سرِ عزیز کی قسم جو آپ نے اس کو توڑنے کا بندوبست کیا" محسن نے کہا۔

"میں جاتی ہوں کھانے کا انتظام کرنے" شہلا ہنسنے لگی۔ "ورنہ تم دونوں ایک دوسرے کو کھا جاؤ گے۔"

"میں مسلمان ہوں۔ لحمِ خنزیر نہیں کھاتا" ٹیڈی نے فوراً وار کیا۔

"سنا تم نے... کیا کہا گیا ہے تمہارے سرتاج کو" محسن چلّایا "اسی وقت عاق کر دو اس بھائی کو ورنہ سوچ لو تم کیا کہلاؤ گی۔"

محسن اور نازو نے نامعقولیت کی اس محفل سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ سالے بہنوئی کی جنگ جس طرح شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم بھی ہوگئی اور وقت گزارنے کے لیے انھوں نے ایک عجیب کھیل شروع کیا جس میں رشتوں کے الٹ پھیر کو سمجھ کے صحیح جواب نکالنا پڑتا تھا۔

"اب فرض کرو کہ تمہاری ممیا ساس کے پوتے سے میری سمدھن کے نواسے کا نکاح ہو جاتا ہے" محسن نے کہا "تو تم میرے کیا ہوئے؟"

"نہ تمہاری سمدھن ہے نہ میری ممیا ساس۔ دوسرا سوال کرو۔"

"سوال ہے فرض کرنے کا" محسن بولا "میں نے فرض کیا تھا کہ تمہارے پاس عقل ہے۔ بھلا پوتے کا نواسے سے نکاح ہو سکتا ہے، بے عقل شخص۔ دونوں مذکر ہوں گے تو میرا تمہارا رشتہ ہی ختم رہے گا جو اب ہے۔" غالب کھانے کے وقت بھی سوتا رہا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنی تجویز پیش کی۔

"میرا خیال ہے کہ نازو کو وکٹر فیملی کے گھر میں پہنچا دیا جائے" میں نے کہا "یہ کام نازو بہت اچھی طرح کر سکتی ہے۔"

"بلّی کے گلے میں گھنٹا کون کون باندھے گا" محسن بولا "ان کو اندر چھوڑنے کون جائے گا اور جو جائے گا وہ واپس کیسے آئے گا؟"

"وہ خود اسے باہر پھینک دیں گے" ٹیڈی بولا "اسٹریچر پر آ جائے گا۔"

"یارو، یہ مذاق کی بات نہیں ہے" میں نے کہا "میں نے سب سوچ لیا ہے کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ نازو اس گھر کے اندر ایک ملازمہ بن کے رہ سکتی ہے۔ خود اندر پہنچ سکتی ہے۔ یہ بہت سخت۔ خطرناک اور مشکل کام ہے مگر میں نازو پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔ کرنے کو یہ کام شہلا بھی کر سکتی تھی لیکن وہ ایک کام نہیں کر سکتی۔ وہ خالی ہاتھ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی۔"

"اور جو میری گھر والی کر سکتی ہے وہ نازو نہیں کر سکتی" محسن نے کہا "خادمہ کو کھانا پکانا پڑتا ہے۔ جھاڑو دینا پڑتی ہے اور برتن مانجھنے پڑتے ہیں۔"

"خواہ مخواہ میرے خلاف غلط پروپیگنڈا مت کرو" نازو نے کہا "تم سے کس نے کہا ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتی؟"

"میں نے تو بی بی تمھیں جب بھی دیکھا قتلِ عام کرتے دیکھا۔ اسے اٹھایا، اسے پٹخا۔ اس کی ٹانگ توڑی، اس کی بتیسی باہر کی" محسن بولا "اب اس وقت جو ما حضر تناول فرمایا ہے سب حرام خوروں نے۔ مثلاً یہ جو زردہ تھا.."

"وہ تو نازو نے ہی پکایا تھا" شہلا بولی "ورنہ اتنی جلدی کا سب کیسے ہوتا؟"

"کیا؟ یعنی کہ... خیر..." محسن نے گڑبڑا کے کہا "آپ کچھ فرما رہے تھے؟"

"جی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ نازو اس گھر میں خادمہ کی حیثیت سے داخل ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی" میں نے ہنسی پر قابو پا کے... "یہ کام ایک اچھی ایکٹریس کے لیے مشکل نہیں اور نازو غالباً..."

"غالباً... تمہارا مطلب ہے غالب کی وہ... خیر آگے کہو" محسن نے کہا۔

"پہلے میں تمہاری گرامر ٹھیک کر دوں" نازو جھینپ کر اٹھی۔ محسن ذرا ہونے کے لیے اٹھا پھر دونوں بیٹھ گئے۔

"نازو بہترین ایکٹریس ہے۔ جب میں فلم بناؤں گا تو اسے ہیروئن لوں گا اور غالب کو ہیرو" محسن نے کہا "مگر برادرانِ اسلام سوال یہ ہے کہ ایک اچھی خادمہ کو جو اچھی اداکارہ بھی ہے، وکٹر فیملی قبول کرے گی؟ انھیں ضرورت ہے خادمہ کی؟"

"ضرورت تو سب کو ہوتی ہے۔ اس کی شدت کا احساس دلایا جا سکتا ہے" میں نے کہا "اور اگر ملازمت کی امیدوار اپنی مظلومیت کا رونا روئے۔ ہاتھ پیر جوڑے اور منت سماجت کرے کہ لاوارث ہوں۔ رہنے کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ بس رہنے کو جگہ دے دو اور دو وقت کی روٹی۔ تو بعض اوقات آدمی کا دل پسیج جاتا ہے۔"

"ان کے دل ایسے نہیں ہو سکتے" ٹیڈی بولا "وہ سنگدل لوگ ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں کہ آسانی سے اعتبار نہیں کر سکتے۔"

"مشکل مرحلہ یہی ہے۔ اندر داخل ہونے کا" میں نے کہا "اور انھیں اعتبار پر مجبور کرنے کا۔ فرض کرو نازو پر انھیں رحم آ جاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ ایک نوکرانی مل رہی ہے۔"

"اور وہ بھی اتنی خوبصورت" شہلا بولی۔

"اونہوں۔ اس کا تو حلیہ بگاڑنا پڑے گا" میں نے شرماتی ہوئی نازو کو دیکھا "اس رنگ روپ پر بدصورتی کا پردہ ڈالنا پڑے گا۔ یہ بھی محنت طلب کام ہے مگر ناممکن نہیں کہ ہم نازو کو ایک سیاہ فام، بدصورت اور عمر رسیدہ عورت بنا دیں۔ پھر یہ وکٹر برادران کی بُری نظر سے تو محفوظ ہو جائے گی۔ آج کل گھریلو ملازم ملتے ہیں تو لوگ انھیں گھر میں جگہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ مردوں کے لیے تو ویسے ہی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ گھروں میں بہو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ لڑکے بھی ملتے ہیں تو گھروں سے بھاگے ہوئے اور اُٹھائی گیرے قسم کے۔ جوان عورت کو عموماً گھر والیاں نہیں رکھتیں"

"کہ کہیں صورتِ حال الٹی نہ ہو جائے" محسن بولا "سب شوہر میری طرح شریف اور نیک نفس تو نہیں ہوتے نا۔ بعد میں پتا چلے کہ اب خادمہ کو مالکن کا اور مالکن کو خادمہ کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ تختہ اُلٹ گیا ہے۔"

"چنانچہ ادھیڑ عمر کی عورتیں سب سے موزوں خادمہ ثابت ہوتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں" میں نے کہا "زیادہ بوڑھی سے بھی لوگ ڈرتے ہیں کہ دس روگ ساتھ لائیں گی اور دو دن خدمت کریں گی تو چار دن کرائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں نازو کی کامیابی کے چانس ففٹی ففٹی ہیں۔ کوشش کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ فرض کرو نازو کسی طرح ان کی گھریلو خادمہ بن گئی۔ تو دو چار دن آزمائش کے ہوں گے۔ وہ لوگ اس پر چوبیس گھنٹے نظر رکھیں گے۔ صبح سے رات تک اور رات سے صبح تک۔ کام بہت سخت ہے نازو تمھیں دن بھر محنت کرنا ہوگی۔ پہننے کو میلے کچیلے کپڑے ہوں گے اور سونے کو کسی کوٹھری میں جھلنگا چارپائی یا فرش پر بستر۔ کر لو گی یہ سب؟"

"تم جانتے ہو کہ میں اس سے کہیں زیادہ قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر چکی ہوں" نازو نے کہا۔

"اگر تم نے انھیں مطمئن کر دیا" میں نے کہا "تو میرا خیال ہے کہ تمہارا کام ایک مہینے میں ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ دو چار دن یا ایک ہفتے بعد جب انھیں تمہارے بے ضرر ہونے کا یقین آ جائے گا تو تمھیں کچھ آزادی مل جائے گی۔ میرا مطلب ہے ان کی نگرانی کچھ کم ہو جائے گی۔ اس عرصے میں تم گھر کے اندر آنے جانے والوں کا جائزہ لو گی۔ ہر گوشے کو دیکھو گی۔ بظاہر بالکل بے نیاز نظر آؤ گی مگر تمہارے کان بھی کھلے رہیں گے اور تمہاری آنکھیں بھی سب کچھ دیکھتی رہیں گی۔ تم خود کو بالکل جاہل ظاہر کرو گی۔ تمھیں اپنے لیے ایک بیک گراؤنڈ بھی بنانا ہوگا کہ تم پہلے کہاں تھیں اور اس حال تک کیسے پہنچیں۔ تمہاری کہانی ہم سب مل کر تیار کریں گے۔ اس میں کوئی سُقم نہیں ہوگا اور کوئی بات ناقابلِ یقین نہیں ہوگی اور اس کی تصدیق بھی کوئی بھی آسانی سے نہیں کر سکے گا۔ یہ کہانی تم کو انتہائی ستم رسیدہ اور مردم گزیدہ عورت ثابت کرے گی جس کے باپ نے، شوہر نے، یہاں تک کہ بیٹوں نے اس کا استحصال کیا اور اسے دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ ایسی زندہ کہانیاں بھی ملتی ہیں جن سے ہم راستے کاٹ کے اور نظر بچا کے گزر جاتے ہیں۔ ہر دستِ طلب دراز کرنے والے محتاج و گدا کو پیشہ ور بھک منگا کہہ کر حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ سرِ راہ گزر پڑے ہوئے معذور یا بیمار پر طنز و استہزا کا جملہ پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں کہ مانگنے والے بھی کیسے کیسے ڈرامے رچاتے ہیں۔ بے شک اکثریت خیرات کی مستحق نہیں ہوتی مگر سو میں سے پانچ نہ سہی تو ایک کی کہانی وقت کی بے وفائی۔ عاقبت نااندیشی۔ اپنوں کے کرم اور غیروں کے ستم کی منہ بولتی داستانِ عبرت ہوتی ہے جسے سننے کی نہ کسی کو ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے تو" محسن نے کہا "فلمی دنیا میں تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے وقت میں فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ منہ مانگے معاوضے لیتے تھے اور دولت کو ہاتھ کے میل سے زیادہ بے وقعت جانتے تھے۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ وہ کاسۂ گدائی لیے پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا نہ تھا۔ رئیس زادے فقیر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوئے۔ عیاشی طبع کے باعث صنعتکار دیوالیہ ہو گئے۔ لوگ آخری دمڑی تک جوئے میں ہار گئے یا پھر لالچی اولاد نے ان کا سب کچھ چھین لیا۔ دنیا میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"ہاں... مگر نازو کو یقین دلانا ہے کہ ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور وکٹر فیملی کو ایسی دردناک کہانی سنانی ہے جو پتھر کو بھی پگھلا دے۔ اس کے علاوہ نازو کا میک اپ بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ہم بھی اسے نہ پہچان سکیں۔"

"میک اپ کرتے کرتے میں بھی اب اتنا ماہر ہو گیا ہوں کہ تیرا میک اپ کر دوں تو تجھے آدمی بنا دوں۔" محسن بولا۔

"اچھا فرض کرو، یہ سب ہو گیا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یعنی نازو صحیح میک اپ میں ایک بہت رقت انگیز کہانی سنا کے وکٹر فیملی کے گھر کی خادمہ بننے میں کامیاب رہی تو کیا ہو گا؟"

"ایک ہفتہ تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "نازو اپنی پوزیشن مستحکم کرے گی۔ اس کے بعد بھی ہم اس سے رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ وہ خود جب بھی مناسب سمجھے گی اور جیسے بھی چاہے گی ہم سے رابطہ قائم کرے گی اور ظاہر ہے نازو یہ کام اس وقت کرے گی جب اس کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ یہ سب سے اہم پہلو ہے۔ پہلے اپنے قدم مضبوطی سے جمانا اور تمام شکوک و شبہات دور کرنا۔ جلدی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ جتنی نازو کی پوزیشن اچھی ہو گی، وہ اتنی ہی آزادی اور بے خوفی سے کام کر سکے گی۔ وہ لوگ ایک بار مطمئن ہو جائیں گے تو اس پر عائد بہت سی پابندیاں نرم کر دیں گے مثلاً یہ کہ گھر کے کس حصے میں جانا ہے، کس طرف نہیں جانا ہے۔ کس کے سامنے اور کس وقت آنا ہے اور کب نہیں آنا ہے۔ نازو کے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی شرط ہے۔ پھر وہ خود بے پروا ہو جائیں گے۔ یہ ایک فطری چیز ہے کہ ہم پہلے بہت محتاط رہتے ہیں لیکن مطمئن ہونے کے بعد ہمارا ذہن ایزی ہو جاتا ہے۔ اس سنتری کی طرح جو مسلسل نگرانی پر مامور ہو اور جب اسے بالآخر بتایا جائے کہ اب وہ آرام کر سکتا ہے تو وہ بیٹھے اور سو جائے۔ ان سب کا دوسرا ردِعمل بے فکری کا ہو گا۔ وہ ایک مظلوم اور لاوارث بڑھیا کو یکسر نظر انداز کر دیں گے اور ان کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آئے گا کہ یہ بڑھیا آفت کی پڑیا ثابت ہو سکتی ہے چنانچہ اس کے سامنے کھل کر بات نہیں کرنا چاہیے یا اسے باورچی خانے تک نقل و حرکت کی اجازت دینا چاہیے اور بس۔"

"میں نے ایک انگریزی ناول پڑھا تھا۔" محسن بولا۔ "اس میں ہوٹلوں کے ویٹرز نے ایک خفیہ بین الاقوامی تنظیم بنا رکھی تھی اور وہ ملکوں کے راز ادھر سے ادھر کرتے تھے۔ جن ہوٹلوں میں وہ کام کرتے تھے وہاں ہر ملک کے سربراہ، وزرا اور سفیر، تجارتی اور فوجی وفد سب ہی آتے تھے۔ کانفرنس کرتے تھے اور یہ بیرے آزاد تھے کہ ان کی ساری گفتگو سن سکیں۔ انھیں بار بار کمروں میں بلایا جاتا تھا۔ وہ کانفرنس ہال میں موجود رہتے تھے لیکن کوئی ان کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا کہ یہ تو ویٹرز ہیں۔ ہوٹل کے ادنیٰ ترین ملازم۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چنانچہ غیر محتاط قسم کے لوگ اسی ذہنی رویے کے باعث وہ باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو بقول کسے۔ دیواروں کے کان بھی سن لیں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔"

"رائٹ۔ نازو اسی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گی۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ہم اسے سب کچھ فراہم کر دیں گے۔ اسلحہ۔ ریموٹ مائک جس سے ہم اپنے ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر پیغام وصول کر سکیں۔ کوئی فون نمبر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ کوڈ میں خفیہ پیغام رسانی کا طریقہ بھی وضع ہو سکتا ہے۔ نازو سب کچھ لکھ کر ڈاک سے بھی بھیج سکتی ہے۔ اندر کے حالات کا اندازہ اندر پہنچنے کے بعد ہو گا اور سارے فیصلے نازو کو خود کرنے ہوں گے۔ اپنے رسک پر۔"

"اور سکندر بادشاہ! اگر انھوں نے اس کو پہچان لیا۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "اس کا میک اپ اتار دیا اور اصلیت معلوم کر لی پھر؟"

کچھ دیر کے لیے ہم سب خاموش ہو گئے۔ استاد ٹیڈی کی "پھر" کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک جواب کے سوا جو انگریزی میں مشہور ہے۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ نازو پکڑی گئی اور اس کی رہائی کی کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوئی تو اس کی مدد کون کر سکے گا سوائے خدا کے۔ وہ اعترافِ جرم پر بھی مجبور کر دی جائے گی اور اگلوانے والے اس سے سب اگلوا لیں گے۔ ہمیں معلوم تک نہ ہو گا کہ پہلے ہفتے میں اس پر کیا بیتی۔ میری نظر میں بہت سے لرزہ خیز مناظر آئے۔ شاید اس وقت جب نازو کو شکاری دشمنوں کے حصار میں پہنچا کے ہم مطمئن ہوں گے کہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا اور رات کو چین سے سو رہے ہوں گے، نازو کسی غیر انسانی تشدد کا عذاب جھیل رہی ہو گی۔ زندگی کا عذاب بھگت رہی ہو گی اور بے بس ہو گی۔ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بے ضمیر شیطان کیا نہیں کر سکتے۔ عزت آبرو کی بات تو الگ رہی موت بھی بہت آسان ہے۔ موت سے پہلے کا عذاب جھیلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ خود میں نے سادھو رام سے کس طرح ہر بات پوچھی تھی۔ راوی کے ٹھنڈے پانی میں پہنچ کے تو اس کے مردہ جسم کو بھی بہت قرار ملا ہو گا۔

"اب چپ کیوں ہو گئے؟" استاد ٹیڈی کی آواز آئی۔

"میں اس لیے چپ ہوں استاد کہ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا اور اگر کوئی جواب ہے تو نازو کو معلوم ہے۔ ہم سب

خود کو بچائیں گے، نازو کو نہیں بچا سکیں گے۔ اس حقیقت کا اعتراف آج اور ابھی سب کے سامنے کر لینا چاہیے۔ نازو اس مشن میں تنہا ہو گی۔ سب سے ساتھ اس کی تقدیر ہو گی۔ یا پھر اس کی ذہانت اور جرأت۔ دو سمجھ لینا چاہیے کہ اندر جانا شاید آسان ہو۔ وہ خود دروازے کھول دیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بند کر دیں۔ واپسی اپنے اختیار کی بات ہی نہ رہے۔"

"ایسی صورت میں کیا تم نازو کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی قرارداد پاس نہیں کر رہے ہو؟" استاد ٹیڈی نے ناراض ہو کے کہا۔

"یہ قرارداد نہیں ہے، چیلنج ہے۔" میں نے کہا۔ "نازو پر کسی قسم کا دباؤ نہیں۔ اگر کوئی اسے مجبور کرے یا اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے تو مجرم۔ وہ اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہے۔ زندگی میں ایسے مشکل مقام سب کے لیے آتے ہیں جب یہ جوا کھیلنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس وقت جب ڈاکٹر کسی مریض کے لواحقین کو بتا دیتے ہیں کہ آپریشن کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات برابر ہیں اور کسی کو یہ فیصلہ ضرور کرنا پڑتا ہے کہ آپریشن ضروری ہے ورنہ یہ ففٹی ففٹی کا چانس بھی نہیں رہے گا۔ فیصلہ کرنے والا باپ بھی ہو سکتا ہے اور بیٹا بھی مگر کیا ڈاکٹر اس فیصلے میں اس کی مدد کر سکتا ہے؟ نازو انکار کر دے تو یہ اس کا حق ہے۔"

"اس کا یہ حق میں استعمال کرتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "وہ نہیں جائے گی۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔" نازو نے قطعی لہجے میں کہا۔ "تم بھائی بن کے سوچ رہے ہو۔ یہاں سب نے رشتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ محسن نے بھی اور سکندر نے بھی۔ اس معاملے میں تمھاری بھی نہیں چلے گی بھیا۔"

"نازو! یہ خودکشی بھی ہو سکتی ہے۔" ٹیڈی نے مایوسی سے کہا۔

"خودکشی بھی بعض اوقات ناگزیر ہوتی ہے۔ وہ موت یقیناً حرام ہے جو کسی ذاتی مسئلے سے فرار کی خاطر خودکشی سے ملے مگر اس موت کو کیا کہتے ہیں جو سپاہی کو محاذ پر نصیب ہوتی ہے۔ اس محاذ پر جہاں سے زندہ واپسی کے ایک فیصد امکانات بھی نہیں ہوتے اور جانے والے جانتے ہیں کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ کیا وہ شہادت کی ابدی زندگی نہیں سمجھی جاتی۔ فرق صرف مقصد کا ہے۔ جنگِ عظیم دوم میں جاپانی فوجوں کے پاس "سوئی سائڈ بٹالین" تھی جس کے دستے آگے بڑھ کر موت کو گلے لگاتے تھے مگر دشمن کا راستہ روک دیتے تھے۔ یہ خودکشی کرنے والے دستے ان جیالوں پر مشتمل ہوتے تھے جو دستی بم لے کر ٹینک کے سامنے لیٹ جاتے اور لوہے کے اس ہاتھی کی پیش قدمی روک کر اپنی جان دیتے ہوئے یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ان کا گوشت، خون، ہڈیاں سب پس کر مٹی میں مل جاتے تھے۔ نہ ان کا مزار بنتا تھا نہ مدفن، نہ انھیں بہادری کے بے مثال کارنامے پر میڈل پس از مرگ دیا جاتا تھا اور نہ ان کے لیے کوئی قومی دن منایا جاتا تھا۔ غالباً ایسے ہی وہ بھی تھے جو اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کودے تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بحری جہاز "پرنس آف ویلز" کی چمنی لے اندر اتر گئے تھے۔ اس جہاز کو تباہ کرنے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک آدمی نے اس فولادی قلعے کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ہزار یا ایک لاکھ آدمی اپنی ساری طاقت صرف کر کے اس جہاز کو یوں توڑ سکتے تھے جیسے ایک انگلی سے ماچس کی تیلی ٹوٹ جاتی ہے۔ کیا وہ خودکشی تھی؟ خودکشی کو جاپانی اپنے پرانے عقیدے کے مطابق کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ اسے "ہاراکاری" کہا جاتا ہے۔ ہم اپنے عقیدے کی کسوٹی پر "ہاراکاری" کو حرام موت کہہ سکتے ہیں لیکن جو کچھ "سوئی سائڈ بٹالین" نے کیا وہ جرأت کے اعلیٰ ترین کارنامے تھے۔ ان کی طرح کوئی ہم میں سے جان دے تو شہید کا مرتبہ پاتا ہے اور بہادری کے اعلیٰ ترین اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ پھر میرا وہاں جانا خودکشی کیسے ہوا؟ میں جان کو ایک ہتھیلی پر لیے پھرتی ہوں۔ دل کو دوسری ہتھیلی پر۔ یہ دونوں چیزیں بے مصرف سہی مگر کسی کے کام آ جائیں تو مجھے زندگی سے اور کچھ نہیں لینا۔"

میں بہت دیر تک دم بخود بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا دنیا میں نازو جیسی دوسری لڑکی کہیں ہو گی؟ حسن و نزاکت میں یکتا۔ حوصلے اور جرأت میں بے مثل۔ ذہانت اور جذبوں کی صداقت میں کھری۔ اتنا وہ پہلے کبھی نہیں بولی تھی۔ آج اس نے سب کو بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس کی سوچ کا انداز اتنا مثبت تھا کہ منفی رجحانات رکھنے والے معاشرے کی تمام اقدار کی نفی کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ لڑکی یہاں کیوں پیدا ہو گئی۔ اسے فلسطین میں ہونا چاہیے تھا اور ہر اس دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا جب حق و صداقت اور انصاف کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ اس کے حقیقت شناس ذہن کے دلائل چٹانوں سے زیادہ مضبوط تھے جو گہرے سمندروں میں قدم جمائے کھڑی ہوں اور کوہ شکن لہروں اور قیامت خیز طوفانوں پر خندہ زن ہوں۔

"میں نے اپنی بات کہہ دی نازو۔" میں نے ہی خاموشی کے اس سکوت کو توڑا جس میں ذہنی طور پر ہم سب ایک ہی طرح نازو کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ "تم نے اپنے عزم کا اظہار کر دیا لیکن پھر بھی کل تک سوچ لو۔"

"کل... کل کس نے دیکھی ہے؟" وہ مسکرائی۔ "پھر آج کا کام کل پر کیوں چھوڑیں۔ میں اس سوچ کی قائل ہی نہیں جو ارادوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو متزلزل کرنے لگے۔ دیمک کی طرح حوصلے کو چاٹنے لگے اور اندیشوں کا جال پھیلا گئے۔ میں نے ایک بار سوچ لیا اور فیصلہ کر لیا تو دوسری بار کیا سوچنا۔ کیا تم نے پہلے بھی مجھے اسی نظریۂ حیات پر عمل کرتے نہیں دیکھا۔ میں پچھتانے اور افسوس کرنے کی قائل ہی نہیں رہی۔ فیصلہ کر لیا تو کر لیا۔ غلط ہوا تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا۔ کتنی بار جائے گی؟"

استاد ٹیڈی نے بڑی عقیدت اور شفقت کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "مجھے تجھ پر کتنا فخر ہے نازو۔ خدا نے سب کچھ دے کر ایک بہن دی اور تلافی کر دی۔ کاش اتنی ہی جرأت اور بے خوفی مجھ میں بھی ہوتی۔ افسوس کہ تو اپنے بھائی پر فخر نہیں کر سکتی۔ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ صرف زبانی باتوں سے بہادری کی ڈینگ مارنے والا۔ مولا علی کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے والا گناہگار۔ جس کے اتنے بڑے وجود میں چیونٹی کے دل کے برابر ہمت نہیں۔ جو موت سے ڈرتا ہے۔"

"میں بھی سخت شرمندہ ہوں نازو" میں نے یکلخت سنجیدہ ہو جانے والی صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے آواز میں مصنوعی رقت پیدا کی۔ "میں بھی موت سے نہیں ڈرتا، توپ سے نہیں ڈرتا۔ یہاں تک کہ بھوت سے نہیں ڈرتا مگر میں موش سے ڈرتا ہوں۔ جانتی ہو موش کیا ہوتا ہے؟"

نازو کو سب کے ساتھ ہنسی آئی۔ "تم چوہے سے ڈرتے ہو؟"

"مجھے پتا تھا تم یہی سمجھو گی۔" میں نے رونی شکل بنا کے کہا۔ "وہ چوہا نہیں ڈاکٹر لطیف کا کتا ہے۔ گدھے کے سائز کا۔ جب وہ بھونکتا ہے تو بھونچال آ جاتا ہے میرے پیٹ میں۔ کاٹے گا تو پتا نہیں کیا ہوگا۔"

ایک دم سب کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ سب ضرورت سے زیادہ جذباتی اور سیریس ہو رہے تھے اور میں یہ کامیڈی پیش نہ کرتا تو فضا بہت دیر تک بوجھل اور ناقابلِ برداشت حد تک افسردہ رہتی۔

"ابھی سب فیصلے کر لو۔" نازو نے پھر سب کو متوجہ کیا۔ "میرا اپنا خیال ہے کہ دیر سے کچھ حاصل نہیں۔ مجھے فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔ مسٹر میک اَپ مین! تم اپنا کام کتنی دیر میں ختم کر سکتے ہو؟"

"کون سا کام؟" محسن بولا۔ "تمہاری صورت بگاڑنے کا؟ وہ میں غالب سے اجازت بلکہ باقاعدہ این او سی لیے بغیر نہیں کر سکتا۔" یہ اس کی بدقسمتی کہ وہ اپنا محلِ وقوع بھول گیا۔ وہ نازو کے بہت قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے خود کو قلابازی کھا کے اڑتا ہوا پایا۔ نازو نے اتنی پھرتی سے اسے اٹھایا تھا کہ خود میں حیران رہ گیا۔ یہ اس کے دبلے پتلے جسم کے لوچ کا کمال تھا کہ وہ خود کمان ہو جاتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں خم... محسن نے ہائے کے ساتھ تقریباً شملا کے سامنے لینڈ کیا۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی مگر اس نے دیدے گھما لیے اور

"الوداع اے حور۔ اب تجھ سے جنت میں ملیں گے۔" بولا۔ "میرا بدلہ ضرور لینا کسی سے بھی لے لینا۔"

"اٹھ کے بیٹھو سیدھے۔" شملا نے اسے ڈانٹا مگر ہنسی بھی آئی۔ محسن اس کے اور میرے درمیان بیٹھ گیا اور پھر گھورنے لگا جو اس تماشے پر بہت خوش تھا۔

"سالے۔ نازو سے کس کو رستگاری ہے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے۔" محسن نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا۔" نازو

"جواب اس کا یہ ہے اے قاتل حسینہ کہ میں فقط حکم کا منتظر ہوں۔ اجازت ہو تو شام تک تجھے پری سے چڑیل بنا دوں کہ غالب تک ڈر کے چیخ مارے اور ایسا بھاگے کہ پھر ہاتھ نہ آئے۔" محسن بولا۔

"بس تو میں آج ہی رات کو نکل جاؤں گی۔" نازو نے فیصلہ کیا۔

"آج رات؟" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "نازو تم بہت جلدی کر رہی ہو۔"

"دیر کی گنجائش کہاں ہے بھیا۔" نازو بولی۔ "ہم فرصت اور اطمینان کے لیے وقت نکالیں گے تو اتنی دیر میں اسلحے کی کوئی کھیپ نکل جائے گی۔ ایک کھیپ کتنے گھر تباہ کرے گی کتنے خاندانوں اور رشتوں کا وجود مٹائے گی، تخریب کاروں کو کتنی جانوں کا نذرانہ لینے کی طاقت دے گی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلوں گا۔" ٹیڈی نے

"تمہارا وہاں کیا کام؟" نازو نے اور میں نے تقریباً ایک ساتھ کہا۔

"وہی جو تیرا کام ہے لڑکی۔" ٹیڈی بولا۔

"وہ کام تم نہیں کر سکتے۔" نازو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تجھے بھی اس گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" ٹیڈی اڑ گیا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے بھی ملازم رکھ لیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نازو کا چانس بھی خراب کرو گے استاد اور وہ فوراً کھٹک جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے بے فکر رہو۔" نازو بولی۔ "میں جان لینا بھی جانتی ہوں اور جان دینا بھی... میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ تم کو یہاں بہت سے دوسرے کام ہوں گے۔"

"اچھا میں ہر روز تیری خبر لینے آؤں گا۔" ٹیڈی نے بادلِ ناخواستہ کہا اور گردن جھکا لی۔

"خبر تو وہ تمہاری ایسی لیں گے کہ تم خود خبر بن جاؤ گے۔" محسن نے کہا۔

"یار محسن، مجھے ایک خیال آیا ہے ٹیڈی کی بات پر۔" میں نے کہا۔ "جس سے ہم نازو کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ اگر اپنے استاد ٹیڈی بھی اس گھر کے قریب چیک پوسٹ قائم کر لیں۔"

"کیسی چیک پوسٹ؟" محسن بولا۔ "وہاں کوئی گھر...؟"

"گھر نہیں... گھر میں رہ کے ہر وقت دروازے پر نگاہ نہیں رکھی جا سکتی مگر فرض کرو کوئی دکان ہو۔ ریڑھی ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے استاد۔ اگر تم وہاں مونگ پھلی کی ریڑھی لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ بہت آسان کام ہے۔ منافع اپنی جگہ اور بہانہ معقول۔ تم سب آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ان کی تصویریں تک اتار سکتے ہو۔ گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر سکتے ہو۔ اور بعد میں نازو کے اور تمہارے درمیان کوئی مواصلاتی رابطہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ تم درمیانی رابطہ بن سکتے ہو۔ رات بارہ بجے تک وہاں پیٹرومیکس لیمپ لے کر کھڑے رہنا کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس پر کوئی شک کر سکے۔ دن میں بھی اگر نازو کو موقع ملے گا تو تم وہیں موجود ہو گے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد تم ہمیں دن بھر کی رپورٹ دے سکتے ہو۔"

"یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔ مان گئے سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے خوش ہو کے کہا۔

"سارا دن کھڑا رہنا پڑے گا اور رات بارہ بجے تک سردی میں مونگ پھلی بیچنا ہوگی۔ ٹانگیں ٹیڑھی ہو جائیں گی۔" محسن نے اس کا حوصلہ کم کرنے کی کوشش کی۔ "آواز لگاتے لگاتے آواز بیٹھ جائے گی۔"

"یہ ایک مہینے کا مشن ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ۔" میں نے کہا۔ "اس عرصے میں ہمیں جو کچھ معلوم ہونا ہے معلوم ہو جائے گا۔ اگر نہ ہوا تو پھر وہاں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"میری شکل مونگ پھلی بیچنے والے کی طرح بنا دو محسن بھائی۔" ٹیڈی بولا۔

"تمہاری شکل پہلے ہی مونگ پھلی جیسی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ذرا مجھے ایک سریلی صدا لگا کے تو دکھاؤ کہ مونگ پھلی بیچو گے کیسے؟ ٹریلر پیش کرو۔"

ٹیڈی نے کھنکار کے گلا صاف کیا اور ایک ہاتھ کان پر رکھا۔ پہلی صدا نہایت بے سُری نکلی۔ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ دوسری کوشش اس سے بھی بدتر رہی۔ ٹیڈی کا منہ لال ہو گیا تھا۔

"تم مونگ پھلی تک نہیں بیچ سکتے سالے۔" محسن بولا۔

"میں تمہیں بیچ سکتا ہوں مونگ پھلی کی جگہ۔" ٹیڈی نے بھنا کے کہا۔ "اس کے لیے گانا ضروری نہیں۔ مونگ پھلی والے ہاتھ میں گھنٹی رکھتے ہیں۔"

"تم گلے میں گھنٹی باندھ لینا۔ بیل کی طرح سر ہلاتے رہنا اور یہ ڈڈو جیسی آواز نکالتے رہنا۔" محسن بولا۔ "تماشا دیکھنے والے جمع ہو جائیں گے تو دو چار مونگ پھلی بھی لے لیں گے۔"

ان کی جنگ بڑی مشکل سے ختم ہوئی۔ اصولی طور پر سب نے میری دونوں تجاویز سے اتفاق کر لیا تھا۔ اب تفصیلات طے ہونا باقی تھیں اور ہمیں بعد کا لائحہ عمل طے کرنا تھا مگر اس کے لیے بہت وقت تھا۔ شام ہونے لگی تھی جب محسن نے لات مار کے غالب کو اٹھایا۔ پھر محسن ضرورت کا کچھ سامان لینے چلا گیا اور میں نے غالب کے پوری طرح جاگنے کے بعد اسے اپنی تمام گفتگو کا خلاصہ سنایا اور صبح سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات بتا دیے۔ وہ شام کے پانچ بجے لنچ کرتے ہوئے گھوڑے کی طرح سر ہلاتا رہا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ کئی بار مجھے شک ہوا کہ وہ اب بھی سو رہا ہے اور میری بات سن ہی نہیں رہا ہے مگر وہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ بعد میں میرے ساتھ کافی پیتے ہوئے بہت سے مفید مشورے دیے جو سب غیر سنجیدگی سے دیے گئے تھے چنانچہ احمقانہ تھے۔ شام سات بجے وہ اپنے اخبار کے دفتر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نازو کے مشن اور استاد ٹیڈی کے رول پر غور کر رہا ہے اور اس کا ذہن خاموشی سے اس منصوبے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کر رہا ہے۔ غالب کی یہی خوبی تھی۔ وہ کبھی اندازہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ کسی کمپیوٹر کی طرح چپ چاپ جمع تفریق ضرب تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس وقت بولتا تھا جب وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ جاتا تھا اور پھر سب کو لاجواب کر دیتا تھا۔ وہ بہت سطحی نظر آنے والا شخص بہت گہرائی رکھتا تھا اور اسے سادہ لوح سمجھنے والے اس کی عیاری سے مار کھا جاتے تھے جیسے نازو کو کمزور اور لڑکی سمجھنے والے اس سے مار کھا جاتے تھے۔

مجھے اطمینان اس بات کا تھا کہ غالب نے ہمارے کسی خیال کو مسترد نہیں کیا اور ہمارے منصوبے سے اتفاق کیا — اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بہتر تجاویز پیش کر دے اور زیادہ مؤثر لائحہ عمل مرتب کرنے میں مدد دے یا خود بھی عملی طور پر شرکت کا راستہ نکال لے۔ وہ کام کرتے ہوئے بھی سوچتا رہے گا اور غیر شعوری طور پر منصوبے کا ہر پہلو سے جائزہ لیتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ایک مشکل تھی کہ وہ شب بیدار لوگوں میں سے تھا۔ رات کو جاگتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا اور دن کو اسے ضرورت کے تحت سونا پڑتا تھا چنانچہ وہ دن میں ہمارے ساتھ ہر روز جانے سے قاصر تھا۔ اس کا ایک فائدہ بھی تھا کہ رات کے وقت ہم کہیں بھی ہوں اس سے رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ اسے پیغام دے سکتے تھے اور اس سے مدد بھی مانگ سکتے تھے۔ یہ اپنا غریب وطن پاکستان تھا جہاں ہر فرد اور ہر گھر کو ٹیلی فون جیسی بنیادی سہولت حاصل کرنے کے لیے بھی دس دس سال انتظار میں گزارنے پڑتے تھے چنانچہ اب تک ہم نے جتنے گھر لیے تھے اور جتنے ٹھکانے بدلے تھے سب ٹیلی فون سے محروم تھے ورنہ رابطہ رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ پھر یہاں پبلک کال آفس کی آسانی بھی بڑے شہروں میں محدود پیمانے پر حاصل تھی۔ پی سی او کچھ دکانوں میں تھے اور ان سے اسی وقت فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا جب دکان کھلی ہوئی ہو۔ کہاں وہ لندن کا شہر جہاں ٹیکسی میں بھی فون دستیاب تھا اور گھر میں تو اتنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا جتنا پانی کا نل یا بجلی کی لائن۔۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ ہم اپنے درمیان غیر قانونی مواصلاتی رابطہ قائم کریں یعنی وہی وائرلیس مائکروفون رکھیں جن سے ہماری آواز ریڈیو کے ایف ایم بینڈ پر سُنی جا سکے اور ہم تین چار افراد ایک ہی فریکوئنسی پر پیغام دے سکیں یا فریکوئنسی الگ الگ ہو تو ہم سب کے علم میں ہو مگر اور کسی کو معلوم نہ ہو۔

اس طریقے میں بہت سی خرابیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ رابطے کے لیے دوطرفہ نظام ضروری تھا۔ ہر شخص کے پاس بیٹری کے سیل سے چلنے والا ایف ایم بینڈ کا ریڈیو ہو اور مائکروفون ہو۔ چھوٹے سے چھوٹا ریڈیو بھی سگریٹ کے پیکٹ سے بڑا تھا اور اس میں استعمال ہونے والے دو پین ٹارچ سیل چار دن سے زیادہ ساتھ نہیں دیتے تھے۔ مسلسل استعمال کی صورت میں شاید دو ہی دن میں جواب دے جاتے اور وقفے وقفے سے مختصر وقت کے لیے استعمال کیا جائے تب بھی ان کی لائف ایک ہفتے سے زائد نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر ہفتے نئے سیل ڈالنے کا مسئلہ جو ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ملتے۔ یہی صورتِ حال ریموٹ مائکروفون کی تھی۔ ان دونوں چیزوں کو ساتھ رکھنا' اس طرح کہ کسی کو پتا نہ چلے' عملاً ناممکن تھا۔ یہ چیزیں نظر میں آ سکتی تھیں اور تلاشی میں فوراً برآمد کی جا سکتی تھیں۔ یہاں وہ بٹن کی جگہ استعمال ہونے والے طاقت ور مائکروفون کہیں دستیاب نہ تھے جو انگریزی جاسوسی ناولوں میں مجرم اور پرائیویٹ سراغرساں سب بے باکانہ استعمال کرتے تھے اور آلۂ سماعت جیسے ٹرانسمیٹر بھی نایاب تھے جن کی آواز سو پچاس میل کے دائرے میں سُنی جاتی ہو اور جو دھوپ سے چارج ہونے والی یا جوہری قوت والی بیٹری سے مسلسل استعمال کے قابل رہتے ہوں۔ اگر ہم مقامی مارکیٹ سے ایف ایم اور ریڈیو یا واکی ٹاکی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے کی رینج زیادہ سے زیادہ پچاس کلو میٹر ہوتی تھی گویا پینتیس میل کم تھی۔ اس سے شہر کے اندر رہتے ہوئے رابطہ رکھا جا سکتا پینتیس میل سے زیادہ دور نکل جانے کے بعد رابطے کی کوئی نہ تھی۔

ہمارے لیے حالات کی عدم موافقت ہی سب سے مشکل تھی۔ پرائیویٹ سراغرساں کا تصور یہاں جاسوسی اور کی کہانیوں میں بھی غیر حقیقی لگتا تھا۔ پولیس کا تصور یکسر مختلف نہ وہ برطانوی پولیس کی طرح عوام کے دوست اور مددگار تھے اور نہ امریکن پولیس کی طرح مستعد اور فرض شناس۔ حقیقتاً کہ بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں پولیس کا کردار وہی تھا جو ازروئے ہونا چاہیے۔ یہاں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی کا امیج بہت خراب تھا۔ پبلک ان کو اپنا دشمن اور ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ جو اگر مستعد تھے تو صرف رشوت لینے اور فرض کی ادائیگی سے اتنا بھی واسطہ نہیں رکھتے تھے جتنا کی آمدنی سے۔ ان کے لیے اصل آمدنی کے ذرائع ہی اصل بنے ہوئے تھے جن میں شریف لوگوں کو بے وجہ تنگ کرنا یا کرنا اور معاوضے لے کر چھوڑنا۔ چوروں ڈاکوؤں سے اشتراک جوئے اور نشے کے اڈوں کی سرپرستی۔ غنڈوں بدمعاشوں کے ذریعے بھتہ وصول کرنا اور ایسے ہی رفاہِ عامہ کے کام شامل تھے۔ بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر اس کا کیا علاج کہ رسوا ایک سے تھے۔

خود پبلک کی صورتِ حال مختلف نہ تھی۔ قانون کا احترام اگر کوئی کرتا تھا تو سزا کے خوف سے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ جہاں دیکھنے والا کوئی نہ ہو وہاں سب موقع سے فائدہ اٹھا لیتے تھے اور بیشتر صورتوں میں رشوت کو برا وہی کہتے تھے جن کو رشوت کہیں سے نہیں ملتی تھی۔ ایسے با لوگ عنقا ہوتے جا رہے تھے جو مایا جال میں گرفتار نہ ہوں اور سامنے ہو مگر وہ خوفِ خدا کے باعث نہ لیں۔ لوگ اپنی اور قانونی ذمے داریوں سے بھاگتے تھے۔ پڑوس کے گھر میں پڑ جائے تو اپنے گھر میں تالا ڈال کے بھاگ جاتے تھے تاکہ سکیں کہ وہ تو واردات کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ سڑک حادثہ ہو جائے تو نظر بچا کے فرار ہو جاتے تھے کہ گواہی نہ دینی پڑے۔ رشتوں ناتوں اور ذات برادری کے چکروں میں وہ کرتے تھے جو درست ہو بلکہ ذاتی مفادات اور مصلحت کے

کو پیش رکھتے تھے۔

ایسے حالات میں ہم چند افراد کا اتحاد اور ایک گروہ کی حیثیت سے دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف صف آرا ہونا بہت بڑی بات تھی۔ یہ کوئی پی ایل او یا بلیک ستمبر جیسی تنظیم نہیں تھی جس کے وسائل لامحدود ہوں اور جس کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد لامحدود ہو۔ یا جسے عالمی سطح پر سیاسی حمایت بھی حاصل ہو۔ یہ تو کچھ سرپھرے سرفروش اور سرخ رُو افراد تھے جن کو اعتماد تھا خدا کی ذات پر اور اس کی مدد پر۔ جو تکیہ کرتے تھے اپنے نامِ عمل کی قوت اور نیت کے خلوص پر اور کام لیتے تھے اپنے زورِ بازو سے۔ بقول علامہ اقبال۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ہم تو اپنے وسائل بھی خود پیدا کرتے تھے اور اپنے راستے بھی خود نکالتے تھے اور انجام کی پروا کبھی نہیں کرتے تھے۔ یہی ہماری اب تک کی کامیابیوں کا راز تھا۔

رات کو نازو کے جانے کا معاملہ صبح پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ محسن کو میک اپ کا سامان لے کر واپس آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگلے دن استاد ٹیڈی پہلے اپنا مورچہ قائم کرے اور نازو بعد میں پہنچے۔ استاد ٹیڈی کو اگلے دن بہت سی شاپنگ کرنا تھی۔ ایک عدد ریڑھی خریدنا تھی۔ اس پر ڈھیر کرنے کے لیے مونگ پھلیاں۔ مونگ پھلیاں بھوننے کا چولھا کڑچھا' ریت اور متعلقہ سامان۔ ترازو اور باٹ۔ لفافے اور پٹرومیکس لیمپ۔ ان چیزوں کی خریداری تو مشکل نہ تھی مگر اس میں کم سے کم دو گھنٹے صرف ہونے یقینی تھے چنانچہ نازو کی روانگی صبح بھی مشکل نظر آتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ جا سکتی تھی اور محسن کے پاس اس کا میک اَپ کرنے کے لیے بہت وقت تھا۔ میں نے رات کو ٹیڈی کے ساتھ جا کر اس گھر کا اور گلی کا جائزہ لیا جہاں وکٹر فیملی کا قیام تھا۔ وہ عام قسم کے بہت سے گھروں سے ملا ہوا ایک گھر تھا جس کا ایک ہی دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اِدھر اُدھر کرائے کا مکان تلاش کرنے کے بہانے ہم بہت پھرے مگر وہاں کوئی مکان تھا بھی نہیں۔ میں نے ٹیڈی کی ریڑھی کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا اور ہم لوگ رات دس بجے تک لوٹ آئے۔ خلافِ توقع ہم نے غالب کو موجود پایا۔ شہلا اسے کسی بات پر چھیڑ رہی تھی لیکن وہ ٹال رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہماری واپسی کے انتظار میں مبتلا تھا۔ اسے ہم سے کچھ کہنا تھا چنانچہ وہ کوئی بہانہ کر کے جلد لوٹ آیا تھا لیکن ہم گھر سے غائب تھے۔ نازو کی موجودگی میں وہ اتنا نروس نہیں ہوتا تھا اور ہم سب کے چھیڑنے پر ڈھیٹ بن جاتا تھا لیکن اس وقت وہ کوفت کا شکار تھا۔

"آج کیا پھر ایڈیٹر سے باکسنگ ہو گئی؟" میں نے کہا۔ "اس وقت تمھارا یہاں نظر آنا چہ معنی دارد؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صحافی ایک امن پسند قوم ہیں۔"

"مگر تم صحافی نہیں، کسی صحافی کی بھٹکی ہوئی بدروح ہو۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔

"ہاں۔۔ اور مجھے بھٹکانے والے تم سب ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "اب میں صحافی بہت کم رہ گیا ہوں۔ تقریباً تیس فیصد۔ باقی تیس فیصد جیمز بونڈ قسم کی چیز بن گیا ہوں۔"

"اور باقی چالیس فیصد کا کیا حساب ہے؟" میں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ دل کا حساب ہے۔" غالب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ میرے دل میں ہے اور میں خود نہیں سمجھتا تو تمھیں کیا سمجھاؤں۔ یہ بتاؤ' تشریف آوری کہاں سے ہو رہی ہے؟"

"میں اور استاد اس مشن پر گئے تھے جسے فوجی اصطلاح میں ریکونی سینس کہا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ہم دشمن کے علاقے کا جائزہ لینے گئے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اور وہ دولھا میاں؟"

"وہ نہیں آیا ابھی تک؟" میں نے کہا۔ "بہت بوفر ہو گیا ہے شادی کے بعد سے۔ شہلا نے ڈھیل بہت دے رکھی ہے لیکن اس سوال کا جواب تو بیچ میں ہی رہ گیا۔ تم کیسے بھاگ آئے؟"

"بس یار۔ چھٹی کر دی میں نے اخبار کی۔" غالب نے کہا۔

"کیا مطلب؟ استعفا دے دیا؟" میں نے کہا۔

"یا انھوں نے لات مار کے نکال دیا؟" استاد ٹیڈی بولا۔

"ایک مہینے کے لیے کچھ بھی سمجھ لو۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو مانگی تھی چھٹی کہ شادی ہے۔"

"شادی؟ کس کی شادی؟" نازو بولی اور ہنسنے لگی۔

"میری۔" غالب نے اسے غور سے دیکھ کر کہا اور نازو کی ہنسی کافور ہو گئی۔ "اور معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ ایڈیٹر نے بہت شور مچایا کہ اخبار کیا میرا باپ نکالے گا۔ میں نے کہا کہ اخبار گیا بھاڑ میں۔ کیا تمھارے اخبار کی خاطر میں کنوارا مر جاؤں تو اس نے ایک فائل نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ یہ دیکھو جب ستمبر ۶۵ء کی جنگ چل رہی تھی تو تم نے ایک مہینے کی چھٹی کی تھی۔ یہ دوسری شادی تم نے کی دو سال بعد نومبر ۶۷ء میں۔ تیسری درخواست میں پھر شادی کے بہانے تم ایک ماہ غیر حاضر رہے۔ جولائی ۶۸ء میں۔ اور اب دو سال بھی نہیں ہوئے۔۔ کہ پھر شادی۔ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے الو بناتے ہو۔ میں نے کہا آپ کو خدا نے جو بنا دیا سو بنا دیا میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے لیکن آپ کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ از روئے شرع مجھے چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اپنا یہ شرعی حق حاصل کرنے کے لیے تمہارے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ کہنے لگا اچھا میں خود جا کر دیکھوں گا کہ اسٹاک میں تین بیویاں ہیں یا نہیں اور چوتھی کو اس تباہی سے بچانے کے لیے راست اقدام کروں گا۔ میں نے کہا کہ چوتھی سے آپ ضرور ملیں۔ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ ہاضمہ درست ہو جائے گا۔ چال ٹھیک ہو جائے گی اور عقل و نظر کا فتور بھی دور ہو جائے گا مگر پہلے والی تین سے آپ نہیں مل سکتے۔ پہلی تو عقد سے پہلے ٹمبکٹو بھاگ گئی تھی۔ دوسری کو میں عقد کے بعد ہنولولو میں چھوڑ کر بھاگ آیا۔ تیسری بارات راستہ بھٹک گئی تھی اور غلط جگہ پہنچی جہاں کوئی عرس شریف ہو رہا تھا۔ جب دُلھن کے گھر پہنچے تو اس کا نکاح قاضی سے ہو چکا تھا۔"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ نازو پہلے تو شرم سے لال ہو گئی تھی کیونکہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے مگر۔۔۔۔ پھر وہ بھی سمجھ گئی اور اس کے لیے ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ غالب بالکل سنجیدہ رہا۔

"تم لوگ بلا وجہ خبطی مشہور نہیں ہوتے۔" ٹیڈی بولا۔

"ہم جینئس لوگ ہوتے ہیں۔ جن کو آدھا پاگل سمجھنے والے پورے پاگل ہوتے ہیں۔"

"مگر ایک مہینے کی چھٹی کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔ "تم وہیں رہو تو اچھا ہے۔ سب کے لیے رابطے کی ایک جگہ ہے۔"

"تم ذرا میرے ساتھ چلو۔" غالب بولا۔ "مجھے تم سے ایک۔۔۔ نہیں، دو باتیں کرنا ہیں۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو یہاں سب کے سامنے نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور محسن اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جو اس نے نیچے رکھ دیا اور حیرانی سے غالب کو دیکھنے لگا۔

"ایک بات کی جا سکتی ہے سب کے سامنے۔" غالب سوچ کے بولا۔ "لیکن دوسری بات۔۔۔ بہتر ہو گا کہ تم سنو۔ اس کا تعلق سب سے نہیں ہے۔"

محسن کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ کر پھونک ماری اور سب کی صورت دیکھ کر بیٹھ گیا۔ "کوئی گمبھیر مسئلہ ہے؟" وہ بولا۔

"ایک مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔" غالب بولا۔ "جس کی وجہ سے مجھے فوراً آنا پڑا۔ اور یہ فیصلہ بھی کرنا پڑا کہ فی الحال میں آفس نہ جاؤں۔"

"کوئی خطرے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج جب میں آفس پہنچا تو مجھے اپنی میز پر ایک لفافہ ملا۔ اس پر صرف میرا نام تھا۔" غالب بولا۔ "کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ لفافہ وہاں کس نے پہنچایا۔ وہ ڈیسک نیچے ہے جہاں پبلک اپنے مراسلے، بیانات، اعلانات اور پریس ریلیز وغیرہ جاتی ہے۔ سب وہاں ڈھیر ہوتے رہتے ہیں اور پھر متعلقہ شعبوں تک پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں زیادہ تر فضول ردی ہوتی ہے۔ نام کی تنظیموں کے بیانات اور ذاتی قسم کے خطوط، بے مقصد اعلانات۔ انھی میں یہ لفافہ بھی ہو گا۔ ڈیسک پر بیٹھنے والے کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون لایا تھا۔ میرے نام ذاتی قسم کے خط بھی آتے ہی رہتے ہیں مثلاً تقریبات کے دعوت نامے ہوتے ہیں جو ایسے ہی سادے لفافوں پر نام لکھ کر پہنچا دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس لفافے کو دیکھ کر میں نہ حیران ہوا تھا نہ پریشان لیکن میں نے اسے کھول کر پڑھا تو مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ممکن ہے پندرہ سولہ طبق ہوں۔ مجھے گننے کا ہوش نہیں تھا۔"

"اور وہ ہوش رُبا خط کس کا تھا۔ اور اب کہاں ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔

"خط میرے پاس ہے۔" غالب نے کہا۔ "اور چوہدری دلاور کی طرف سے آیا ہے۔"

یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر تو کسی کے ذہن نے اس سنگین حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا اور اسے بھی غالب کی ظرافت کا نمونہ سمجھا۔ پھر غالب کی صورت دیکھ کر آہستہ آہستہ سب پر عیاں ہونے لگا کہ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ اس نے جیب میں سے ایک لمبا سا لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "تم اس تحریر کو پہچان سکتے ہو؟" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر یہ دلاور کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تو اس نے تحریر کو بدل کے لکھا ہے۔ یہ کوئی خط شناس ہی بتا سکتا ہے۔"

"خط نکالو، خط کہاں ہے؟" محسن نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "لفافے پر تو تمہارے نام کے سوا کوئی خطرناک بات نہیں۔"

"پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ خط لے کر تم سیدھے ادھر آ گئے تھے؟" میں نے کہا۔ "ایڈیٹر کو بتا کے آئے تھے کہ کہاں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے شادی کی درخواست خط پڑھ لینے کے بعد ہی دی تھی۔" غالب بولا۔ "جھگڑا تو ہوا مگر میں طے کر چکا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں جا رہا ہوں اپنے گھر اور خبردار جو تم بارات میں آئے۔ وہ بے وقوفوں کی طرح بیٹھا رہ گیا۔ دراصل اس سے پہلے بھی جب میں نے چھٹی لی تو بات مذاق میں ٹل گئی۔ اخبار کے دفتر میں کام زیادہ ہوتا ہے اور عملہ کم۔ باری باری سب لوگ ہفتے کے مختلف دنوں میں ایک چھٹی کر کے کام چلاتے ہیں۔ کوئی

دو دن بھی نہ آئے تو شیڈول بگڑ جاتا ہے۔ ایک ہفتے کی رُخصت بھی مشکل ہوتی ہے کیونکہ کام دوسروں پر پڑ جاتا ہے۔ ایک مہینے کی چھٹی صرف شادی کے لیے ملتی ہے چنانچہ سب یہی لکھ دیتے ہیں اور اخبار کا جو مالک ہے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر سب جانتا تھا اور اتفاق سے ایک "سب ایڈیٹر" پہلے ہی چھٹی پر تھا چنانچہ اس نے گڑبڑ ڈالی اور مجھے جھگڑا کر کے نکلنا پڑا۔ آفس میں تو میرا اپنا پتا لکھا ہوا ہے جہاں مدت سے کسی کا آنا نہیں ہوا ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سب باہر مل لیتے ہیں اور اپنا گھر بار ایسا تھا بھی کہاں کہ کسی کی میزبانی کریں یا کوئی وہاں مہمان ہو۔ اب ہو سکتا ہے کہ کل پرسوں ایڈیٹر خود اُدھر دوڑ لگائے مجھے کسی صورت واپس لے جانے کے لیے۔"

"تمہارے پاس تو فلیٹ تھا۔" میں نے کہا۔ "مقبرہ ٹائپ۔"

"ہاں۔ اب وہاں کوئی اور دفن ہو گا۔" غالب بولا۔ "جو بے سروسامانی تھی اس سے لینڈ لارڈ کو کرائے کا عشرِ عشیر بھی وصول نہیں ہوا ہو گا۔"

"وہی۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط؟" محسن بولا۔

"نہیں۔ ایک میلا پاجامہ۔ ایک پتلون۔ دو قمیصیں، پرانی چپل اور چارپائی مع فقیرانہ بستر کے۔" غالب بولا۔ "کرایہ تو میں نے چھ مہینے پہلے بھی نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد سے لاپتا ہوں۔ وہ تالا توڑ کے قبضہ لے چکا ہو گا۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ نے خط لے کر آفس سے سیدھے ادھر تشریف لانے کی حماقت کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"ویسے تو حماقت آدمی شوقیہ کرتا ہے۔" غالب بولا۔ "مگر اس وقت حماقت مجھے بہت مہنگی پڑتی۔ میں نیچے والی منزل پر گیا۔ وہاں ایک سب ایڈیٹر کا کمرہ ہے۔ وہ رازدار قسم کا آدمی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ باہر بہت خطرناک قسم کے سود خور بندوقیں اور توپیں لیے کھڑے ہیں۔ میں نہ سود دے سکتا ہوں نہ اصل چنانچہ وہ مجھے لے جائیں گے اور معلوم نہیں کس طرح سود وصول کریں گے۔۔۔ بہرحال۔۔۔ وہ کوئی اخلاقی طرزِ عمل اختیار نہیں کریں گے اس لیے میں پچھلی طرف سے نکل کر فرار ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے دروازہ بند کر کے میری حالت پر افسوس کیا اور پوچھا کہ آخر میں نے ایسی حماقت کیوں کی۔ سود خوروں سے قرضہ لینا آسان ہے مگر ان سے جان چھڑانا مشکل۔ میں نے اسے ایک دردناک کہانی سنائی کہ کیا کرتا۔ بہن کی ڈولی اُٹھانا تھی۔ خاصے فلمی ڈائلاگ تھے۔ نتیجہ یہ کہ اس نے میری مدد کی۔ دفتر میں رسی تو کوئی نہیں تھی مگر ٹیلی فون کے پرانے تار ایک جگہ پڑے تھے۔ وہ سب سے لمبا ٹکڑا لے آیا اور میں نے اس ٹکڑے کو کھڑکی کے باہر والے ہینڈل سے باندھ دیا۔ ٹیلی فون کا دُہرا تار بہت سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ گانٹھ کھل جائے گی چنانچہ اس مددگار نے بھی ایک سرا تھامے رکھا اور میں پھسلتا ہوا نیچے اتر گیا۔ رات کا وقت تھا اس لیے دیکھا کسی نے نہیں۔ پیچھے جو احاطہ ہے اس میں کاغذ کی کترن کے انبار پڑے رہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً رُوئی کی گانٹھوں کی طرح باندھ کر اور دبا دبا کے ٹرک پر لادے جاتے ہیں۔ ان کترنوں کو خریدنے والا اخبار کے ایڈیٹر سے بہت زیادہ مالدار ہے۔"

"مختصر بات کرو۔ دلاور کے خط میں کیا لکھا ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔" غالب نے مجھے تسلی دی۔ "ساری پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ خط میرے پاس کیوں آیا؟ میں تو آج بال بال بچ گیا۔ یقیناً صدر دروازے پر چوہدری دلاور کا کوئی شکاری کتا کھڑا ہوا ہو گا اس وقت بھی۔ اس نے مجھے اندر جاتے دیکھا ہو گا اور یہ اطمینان بھی کر لیا ہو گا کہ عمارت میں داخل ہونے اور باہر آنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ پیچھے سے نکلنے میں بھی ان کاغذ کی کترنوں نے بچا لیا ورنہ میں دل کی طرح ٹوٹ جاتا۔ ہزار ٹکڑے ہوتے کہ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر میں گرا اس انبار پر جو رُوئی کے پہاڑ کی طرح تھا۔"

"کیا تار چھوٹ گیا تھا؟" نازو نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کے سوال کیا۔

"اس کا اندازہ تو مجھے لٹک جانے کے بعد ہوا۔" غالب بولا۔ "تار تھا کوئی بیس فٹ لمبا۔ چوتھی منزل تھی اڑتالیس فٹ بلند۔ بس اچانک میں نے ہاتھ نیچے بڑھا کے تار کو گرفت میں لینا چاہا تو مٹھی میں رات کا اندھیرا آیا اور میں نے چوبیس فٹ بغیر پیرا شوٹ کے پرواز کی۔ کمزور دل کا ہوتا تو نیچے لینڈ کرتا صرف یہ فانی جسم۔ روح وہیں سے اوپر چلی جاتی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں دیوار پر گروں گا، فرش پر یا اس فولادی بازوؤں والی مشین پر جو کاغذ کی کترنوں کو پریس کر کے گانٹھوں کی شکل میں باندھتی ہے۔"

"غالب بھائی۔" شہلا نے اچانک کہا۔ "اس وقت جب آپ گر رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں آپ کو کس کا خیال آیا تھا؟ سچ بتائیے گا۔"

غالب نے سانس روک کر نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے پیر کے ایک ناخن کو کھرچ رہی تھی اور خاموشی کے اس مختصر ترین وقفے میں غالب کا جواب سب نے سنا اور سمجھا، دیکھا اور جانا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکرایا۔ "جیسے عدالت فیصلہ محفوظ رکھتی ہے، ایسے ہی میں جواب محفوظ رکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "زندگی میں پہلی بار میں نے موت کو اتنے قریب پایا تھا مگر نیچے گرتے ہی میں نرم کاغذوں کے ڈھیر میں دھنس گیا تو میں بہت دیر تک آنکھیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بند کیے پڑا رہا۔ اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ چوکیدار وہاں ہوتا ہی نہیں۔ پھر میں نے کہا تھینک یو گاڈ۔ پہلی زندگی ہی کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ یہ دوسری زندگی مجھ گناہگار پر تیری خاص عنایت ہے کیونکہ اب مجھے جینے کی ضرورت کا احساس پہلے سے زیادہ ہو رہا تھا جب آدمی صرف اپنے لیے جیے یا بے مقصد جیے تو اس کے جینے یا نہ جینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ غالب نے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو اسے کہنا تھا۔ کچھ کیے بغیر ناز و پیر واضح کر دیا تھا کہ اپنی پہلی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے تمہارا خیال آیا تھا اور اب دوسری زندگی کی مجھے اس لیے ضرورت تھی کہ میں تمہارے لیے جی سکوں اور تمھیں مقصد بنا سکوں۔ کسی نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ غالب نے دلاور کا خط نکالا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

”اس خط کے ذریعے میں سکندر بخت کو ایک پیش کش کرتا ہوں جس کے ساتھ میرے تمام اختلافات کی بنیاد ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس تھا۔ وہ اس کا قانونی وارث ہے اور میں اس کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے یہ کارخانہ اور اس کے تمام اثاثے اس کی ملکیت میں دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ تمام قانونی کارروائی میں سکندر بخت کا ذاتی طور پر حاضر رہنا ضروری نہیں ہوگا۔ اس کے کسی بھی قانونی اٹارنی کو قبضہ دیا جاسکتا ہے۔“

”دلاور نے ایک ٹیلی فون نمبر بھی دیا ہے۔“ غالب نے پڑھنا چھوڑ کے کہا۔ ”اس نمبر پر اس سے مزید بات کی جاسکتی ہے۔“

”کیا خط میں صرف اتنا ہی تھا؟“ محسن بولا۔

”نہیں۔ یہ پہلا پوائنٹ تھا۔“ غالب بولا۔ ”تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”خیال تو سب کا ایک ہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ چوہدری دلاور کی ایک احمقانہ چال ہے۔ شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اب مسئلہ حق وراثت حاصل کرنے یا انتقام لینے کا نہیں رہا۔ یہ ایک طرح کی رشوت ہے۔“

”رائٹ۔ یہ رشوت ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”ہمیں اپنے اصل مقصد سے ہٹانے کے لیے اور ایم آر ایس کے مشن کو ختم کرنے کی سازش ہے۔“

”دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں اب اسلحہ سازی ختم کر دی گئی ہوگی۔ خطرے کے پیش نظر اسلحہ ساز مشینیں اور آلات کسی دوسری جگہ منتقل کر دیے گئے ہوں گے۔ دلاور کا خصوصی عملہ بھی نکل گیا ہوگا اور اب شاید پھر وہاں صرف زرعی مشینری کے پرزے بننے لگے ہوں گے جو ... کے زمانے میں بنتے تھے۔ ان کے منافع کی چوہدری دلاور کو ... نہیں رہی۔ اسے کافی وقت ملا ہے۔ اس عرصے میں اپنے نا... کاروبار سے اس کی آمدنی میں بے حساب اضافہ ہوا۔ اس کے ... میں زرعی مشینری کے پرزوں کا منافع کیا حیثیت رکھتا ہے۔ ا... منافع کو برقرار رکھنے اور کاروبار کو پھیلانے کے لیے اس نے ... محفوظ جگہ منتخب کر لی جہاں مکمل رازداری کے ساتھ زیادہ پیدا... ممکن ہو۔ زیادہ آرڈر پورے کیے جائیں اور اس وقت سے فا... اٹھاتے ہوئے تجوریاں بھر لی جائیں۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی... کا رجحان بڑھ رہا ہے اور وہاں تخریب کار زیادہ سرگرم عمل ہو ... ہیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والے انڈین ایجنٹ بھی زیادہ ... ہیں۔ انھوں نے اپنا جال زیادہ منظم طریقے پر پھیلا دیا ہوگا اور ... ہے وہی اب چوہدری دلاور کے مشیر ہوں جنھوں نے اسے سمجھا... ہو کہ لعنت بھیجو اس جھگڑے پر جو ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس ... وجہ سے شروع ہوا۔ اپنی آرڈیننس فیکٹری کسی نئی اور خفیہ جگہ ... قائم کرو۔ بہتر مشینری لگاؤ اور زیادہ مال فراہم کرو۔ یہ پرانا کارخانہ ا... شرپسند سکندر بخت کے حوالے کرو۔ ان کے نقطۂ نظر سے تو ... شرپسند ہی ہوا نا۔ تاکہ دنیا دیکھ لے کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ چوہدری دلاور کی پوزیشن کلیئر ہو جائے اور اسے کوئی خطرہ نہ رہے۔ بلکہ اس کی شرافت کی دھاک بیٹھ جائے۔“

”میں اس خیال سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔“ محسن بولا۔

”میں بھی۔ کیونکہ آگے جو کچھ ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے!“ غالب نے کہا۔ ”ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر دو۔

”سکندر کے والد کو کاروبار سے بے دخل کرنے کا ذمے دار میر شرافت علی تھا تاہم اس سے جتنی ذہنی اذیت سکندر بخت کو ملی اور جتنا مالی نقصان ہوا میں اس کی تلافی کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اور یہ سکندر بخت پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کتنا ہرجانہ طلب کرتا ہے۔ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر یہ رقم میں اسے اپنے حساب سے دینے کو تیار ہوں۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میر شرافت علی کو قتل کرنے والا استاد پیڈرو تھا جس نے یہ قتل میرے ایما پر نہیں ڈی سلوا کے کہنے پر کیا تھا۔ ڈی سلوا اب دنیا میں موجود نہیں ورنہ اس کی تصدیق کرتا لیکن استاد پیڈرو کو سکندر بخت کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور وہ چاہے تو اس سے وزیر خان کے قتل کا انتقام خود لے سکتا ہے۔

استاد پیڈرو ہی یہ بھی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کو اب کہاں دفن کیا گیا ہے۔ سکندر بخت کو اس کے بعد مجھ سے کوئی گلہ نہیں رہنا چاہیے۔“

”یکلخت اتنی نیکی!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ساری غلطیوں کا اعتراف کرنا اور تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے پر رضامندی۔ کیا واقعی دلاور کی فطرت میں یہ انقلاب آگیا ہے؟“

”یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔“ محسن نے کہا۔ ”بہت سے لوگ زندگی کے کسی مرحلے میں یا کسی حادثے کے باعث اچانک گمراہی کے راستے سے ہٹ کر صراطِ مستقیم پر آگئے۔ متقی اور پرہیزگار بن گئے اور گناہ کی زندگی چھوڑ دی۔ لیکن چوہدری دلاور شیطان ہے۔ شیطان ڈھونگ تو رچا سکتا ہے مگر تائب نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں۔ یہ بھی ڈراما ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ شروع سے ڈرامائی انداز میں ہر بات کہنے کا عادی رہا ہے۔ اس مرتبہ ڈرامے کی پیش کش کا انداز مختلف ہے۔ ظاہر یہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے اور پیڈرو کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ کاروباری مقابلت یا پیڈرو کی سرکشی کے باعث وہ پیڈرو کا دشمن ہو گیا ہے اور اب اسے میرے ہاتھوں ختم کرانا چاہتا ہے۔ دلاور کو یقین ہوگا کہ ہم اس کا یہی مطلب نکالیں گے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہوگی۔“

”اس کا مقصد بھی وہی ہے۔ تجھے اصل مقصد سے ہٹانا۔“ محسن نے کہا۔ ”اور ذاتی انتقام کے چکر میں ڈالنا۔ تو ایم آر ایس کے مشن کو بھول کر استاد پیڈرو کے پیچھے پڑ جائے اور اس سے پہلے تو وزیر خان کے موجودہ مدفن کے بارے میں معلوم کرے اور پھر اسے قتل کرنے کی سوچے۔ اس چکر میں پیڈرو تو ہاتھ آئے گا نہیں۔ تو پیڈرو کے ہاتھ پڑ جائے گا۔“

”وزیر خان کے لیے ایک مدفن کیا اور دوسرا کیا۔“ میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ”زمین کی مٹی سب ایک ہے اور ایک ہی طرح آدمی کو کھاتی ہے۔ مجھے خدا نے موقع دیا کہ ایک بار اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کے اس کی مغفرت کے لیے دعا کر سکوں۔ وہ میں نے کر لی۔ اب پھر خدا نے توفیق دی تو اس کی دوسری ابدی آرام گاہ تک بھی جا پہنچوں گا۔ اس کے ظلم کے حساب اور اس کی سزا کو میں نے خدا پر چھوڑا کہ وہ چاہے تو اسی دنیا کے نظام انصاف کو حرکت میں لائے اور اسے عبرتناک انجام سے دوچار کرے اور چاہے تو یوم حساب پر اس کا فیصلہ کرے۔ میرا مقصد اب اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ ایک جذباتی دور تھا جس میں ذاتی انتقام کی خواہش نے مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔ اب میں نے صبر کر لیا ہے اور دنیا کے تجربات نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے مثلاً یہ کہ میرے غم میرے مصائب و مسائل اور میری زندگی کے دکھ ہی سب سے زیادہ نہیں۔ ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے۔ واقعات مختلف ہیں لیکن مظلوم ہم سب ہیں۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ پہلے میں ایک شخص کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا اور وہ تھا وزیر خان کا قاتل۔ اب میں اپنے وطن کی خاطر جہاد میں شریک ہوں۔ دو افراد شرط لگا کے تاش کھیلتے ہیں۔ ایک شخص قومی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا ہے۔ دونوں کے معیار کا نہیں، مقصد اور جذبے کا فرق بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک کا مقصد ذاتی فتح اور جیت ہے۔ دوسرے کے لیے پورے ملک کی نمائندگی کا اعزاز ہے اور وطن کی عزت کا سوال ہے۔“

”اس بیان سے ہم سب کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔“ محسن نے سر ہلا کے کہا۔ ”کیوں استاد؟“

”مجھے اپنے ساتھ مت شامل کرو۔“ ٹیڈی نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں تو اس خبیث استاد پیڈرو کو کبھی معاف نہ کرتا۔ چوہدری دلاور سے کہو کہ پہلے اسے ہمارے حوالے کرے پھر آگے بات کریں گے۔“

”استاد۔ یہ سب دھوکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک مقصد کے تحت استاد پیڈرو کو قاتل بنا کے پیش کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے اصل قاتل وہ نہ ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ دلاور کے ذہن میں کیا ہے مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے کہ پیڈرو کو آسانی سے تمہارے حوالے کر دے۔ وہ پیڈرو کو اس کیچوے کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے جسے کھانے کے لیے آنے والی مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے۔ تم اس جال کو نہیں دیکھ رہے ہو مگر جال ہے۔ تمھیں اس کی طرف لانے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ورنہ تصدیق کرنا ہو تو یہ خط عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کو بھیج دو۔ وہ دلاور سے ملے اور پوچھے کہ کیا یہ خط اسی نے لکھا ہے اور یہ بات دو گواہوں کی موجودگی میں پوچھے۔ وہ صاف انکار کر دے گا۔ یہ اس کی ہینڈ رائٹنگ تک نہیں ہوگی۔“

”اب آخری پیراگراف۔“ غالب نے کہا۔

”اگر تمام معاملات کا تصفیہ ہو جاتا ہے تو اس بات کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ سکندر بخت کے خلاف مقدمات ختم ہو جائیں۔ ابھی تک اس کے خلاف شرافت علی کے قتل کا مقدمہ سب سے سنگین تھا مگر شیدے اور عبدل کے مرنے کے بعد اس مقدمے میں جان نہیں رہی۔ بے شک اس کے خلاف پولیس نے قتل کے اور بھی مقدمات بنا رکھے ہیں مگر ان کا عینی گواہ کوئی نہیں اور صفائی کے گواہ فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ سکندر کے خلاف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گاڑیاں چھیننے پر جو ڈکیتی کے مقدمات درج ہیں وہ کمزور ثابت ہوں گے کیونکہ سکندر ایک تعلیم یافتہ اور باحیثیت آدمی ہے اور نفسیاتی مریض بھی نہیں ہے۔ ان وارداتوں کے عینی گواہ بھی نہیں اور ہوتے تو منحرف ہو جاتے۔ تاہم قانون کے اس عمل سے گزرنے کے لیے سکندر کو خود عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا اور خود کو قانون کے سپرد کرنا ہوگا کیونکہ اس کی ضمانت غیر حاضری کے باعث منسوخ ہو چکی ہے۔ نئے سرے سے ضمانت ہونے تک یا پھر مقدمات کا فیصلہ ہونے تک اسے جیل میں رہنا ہوگا۔ اسے جیل کے اندر بی کلاس اور اضافی مراعات ملیں گی اور اس بات کی ضمانت میں دے سکتا ہوں کہ وہ بہت جلد باعزت طور پر رہا ہو جائے گا۔"

"الّو کا پٹھا۔" میں نے کہا۔ "سمجھتا ہے میں مرعوب ہو جاؤں گا کہ دلاور مقدمات قائم کرا سکتا ہے تو ختم کرانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ میں ایک بار جیل گیا تو وہاں سے میری لاش ہی باہر نکلے گی۔"

"کیا واقعی وہ ہمیں اتنا کم عقل سمجھتا ہے؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"اور کیا اسے معلوم نہیں کہ ہمارے پاس ایک وکیل تو ہر وقت ہے۔ دوسرا عبدالودود منظر ہے۔ اگر ہم ذاتی عقل سے محروم ہوتے تب بھی ان سے ضرور مشورہ کرتے۔" میں نے کہا۔

"اور اسے یہ معاملات طے کرنے ہی تھے تو غالب کو خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" محسن بولا۔ "عبدالودود منظر سے ملتا اور سارے مقدمات ختم کرانے کی بات کر لیتا۔ یہ کوئی اور چکر ہے سکندر، جسے ہم ابھی تک سمجھ نہیں سکے۔"

"چکر کچھ بھی ہو۔" غالب بولا۔ "باعثِ تشویش یہ بات ہے کہ اسے میرے اور تمہارے تعلق کا علم ہے۔ وہ میرے ذریعے تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آج میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی مگر کل وہ پھر کوشش کر سکتا ہے۔"

"یہ تمہارے لیے خطرناک ہوگا اور ہمارے لیے نقصان دہ۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم تمہارے تعلقات سے اور تمہاری پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم آزادانہ گھومتے ہو اور کوئی آسانی سے تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ تم ہمیں وہ معلومات فراہم کر سکتے ہو جو ہم خود حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ تم ایک اخبار میں ہو۔ اگر اخبار چھوڑ دو گے تو تمہاری یہ پوزیشن نہیں رہے گی۔"

"اسی لیے میں نے فی الحال ایک مہینے کی چھٹی لی ہے اور چھپ کر بھاگ آیا ہوں تاکہ وہ کسی طرح بھی یہاں نہ پہنچ سکیں۔"

غالب نے کہا۔ "یہاں آتے ہوئے میں موت جھالی کے گھر گیا تھا۔ وہی میک اپ مین۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ خود نازو کا میک اپ کرے گا۔" غالب نے کہا۔ "دو ہزار لے گا۔"

"کیا ضرورت تھی اس کی۔ میں بھی یہ کام کر لیتا ہوں۔" محسن

"کام کرنے اور مہارت سے کام کرنے میں فرق ہے۔" غالب بولا۔ "جہاں ہم نازو کو بھیج رہے ہیں وہاں حفاظتی اقدامات میں ایک فیصد فرق کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔ دس ہزار میں یہ رسک نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بھی میک اپ کرے گا۔"

"تمہارا؟" میں اور محسن ایک ساتھ بولے۔ پھر میں نے کہا۔ "تم کیا بنو گے؟"

"یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ بچپن میں بھی بہت سے لوگ مجھ سے کرتے تھے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے میں بیشتر بچوں کی طرح کہتا تھا کہ پائلٹ۔ جہاز اڑانے کے خیال میں سب بچوں کے لیے سنسنی خیزی کا سب سامان ہے۔ میرا باپ کہتا تھا کہ بیٹا بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا۔ ماں کی خواہش تھی کہ میں بڑا آدمی بنوں۔ بڑے آدمی کا اس کے ذہن میں کوئی تصور واضح نہیں تھا۔ غالباً وہ سب مشہور لوگوں کو بڑا آدمی سمجھتی تھی خواہ وہ مولانا محمد علی جوہر ہوں یا گرو ونی۔ میں کیا بنا؟ یہ سب کے سامنے ہے۔"

"تم بے وقوف بنے دنیا کے ہاتھوں۔" ٹیڈی نے کہا۔

"اور دل کے ہاتھوں۔" محسن نے اضافہ کیا۔

"چنانچہ اب میں مونگ پھلی بیچنے والا بنوں گا۔" غالب نے اعلان کیا۔ "جو کام استاد ٹیڈی کے سپرد کیا جا رہا تھا، وہ میں کروں گا۔"

"کیوں؟ تم سمجھتے ہو میں وہ کام نہیں کر سکتا؟" استاد ٹیڈی نے بھڑک کر کہا۔ "یہ فیصلہ تم نے اکیلے کیسے کر لیا؟"

"اس لیے کہ اکیلا میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کام کے لیے قطعی نااہل ہو بلکہ کسی بھی کام کے لیے نااہل ترین شخص ہو۔" غالب نے اشتعال انگیزی کی پوری کوشش کی۔ "تم کو ہم نے استاد کہہ کے سر چڑھا دیا ہے ورنہ تم کو ابھی سو سال میری شاگردی میں جوتیاں سیدھی کرنا سیکھنا چاہیے۔"

"اور تم... تم کیا ہو۔" ٹیڈی آپے سے باہر ہو گیا۔ "افلاطون بنے پھرتے ہو۔ مرزا غالب کا نام بدنام کرتے ہو۔ خبریں بنانے کا نہیں تم کو قبریں بنانے کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔" وہ غالب کی طرف لپکا۔

غالب ایک دم ہنس پڑا اور اس نے ٹیڈی کو گلے لگا لیا۔

"یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ ہم تو مذاق کر کے دل خوش کرتے ہیں اپنا ورنہ ہم کیا اور تمہاری... میرا مطلب ہے ہماری اوقات کیا۔ بات یہ ہے کہ ہمیں تمہاری جان بہت عزیز ہے اس لیے یہ خطرہ میں اپنے سر لیتا ہوں۔ مریں تو ہم مریں۔"

"ضرور مرو۔" ٹیڈی نے خود کو چھڑا لیا۔ "مگر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔"

"اچھا تو آرام سے بیٹھ کے میری بات سنو۔" غالب نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ..."

"اصل بات تو میں سمجھتا ہوں برخوردار۔ تم بچے ہو ابھی ہمارے سامنے۔" محسن نے غیر موجود داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "ہم بھی جوانی میں گزرے ہیں اسی دور سے۔ صحرا کی خاک چھاننا، جوئے شیر لانا یا مونگ پھلی بیچنا سب ایک ہی سلسلہ ہے۔ تجھے وہاں بیٹھ کے جوتے بھی گانٹھنے پڑتے تو گانٹھتا۔"

"بھئی، ہم تو جا رہے ہیں۔ نیند آ رہی ہے۔" نازو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم لوگ باتیں زیادہ کرتے ہو فیصلے کم کرتے ہو۔ صبح بتا دینا مجھے۔"

"تم کو جو بتانا تھا وہ بتا دیا۔" محسن بدستور شرارت پر آمادہ رہا۔ "اب تمہیں خوابِ ناز مبارک۔ جاگتے رہیں اُلّو۔ تم بھی جاؤ زوجہ۔ ایسے اونگھنے سے کیا فائدہ۔" اس نے شہلا کو ہلا کے کہا۔

وہ دونوں احتجاجاً واک آؤٹ کر گئیں۔

"اب ٹھیک ہے۔" غالب بولا۔ "کھل کے بات ہو سکتی ہے یارو، بات یہ ہے کہ میں ایک تیر سے دو بلکہ تین چار شکار کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی مشکل تو یہ تھی ٹیڈی کے لیے کہ وہاں گلی کے دوسرے موڑ پر ایک پرانا مونگ پھلی والا ہے جو شاید کسی تھانیدار کا سالا ہے کہ کسی کو گلی میں مونگ پھلی نہیں بیچنے دیتا۔ اس کی اجارہ داری کئی سال سے قائم ہے۔ میں نے اوپر بات کی اور کہا کہ ایس ایس پی رضوی صاحب کا ایک آدمی دوسری طرف مونگ پھلی کی ریڑھی لگائے گا۔ اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور بھتا نہ مانگے۔ اب رضوی صاحب سے بھلا کون تصدیق کر سکتا ہے کہ آدمی ان کا ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے دفتر سے ایک دوست کو فون کیا تھا۔ دوست کیا، ایک ایسا شخص ہے جسے میں نے جیل جانے سے بچا لیا تھا۔ ایک ڈی ایس پی اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ اس نے ڈی ایس پی کو چھ مہینے کا بل بھیج دیا تھا۔ ان کے گھر سے کبھی ٹی وی، کبھی ٹیپ ریکارڈر اور کبھی فریج آ جاتا تھا مرمت کے لیے۔ اس کی اب بھی ہال روڈ پر دکان ہے۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ جاسوسی کے لیے کچھ آلات چاہئیں۔ واکی ٹاکی۔ چھوٹے سے چھوٹے مائکروفون۔ پاکٹ ریسیور... اس نے کہا سب مل جائے گا۔ یہاں نہ ملا تو کراچی سے لازماً ملے گا۔ وہاں اس کے بھائی کی وکٹوریہ روڈ پر دکان ہے۔"

"جب میرا پلان سنتے ہوئے تم سوچ میں گم تھے تو میں سمجھ گیا تھا کہ تمہارا ذہن مصروفِ عمل ہو چکا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "دو تین گھنٹے میں کافی کام کر لیا تم نے۔"

"اخبار والے ہیں بھیا۔ بال کی کھال نکال سکتے ہیں اور کھال کے جوتے بنا سکتے ہیں اور جوتے چٹخاتے عمر گزار دیتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ایک ہاکر نے مجھے مونگ پھلی والے کے بارے میں بتایا۔ شک تو مجھے تھا کہ گڑبڑ ہوگی۔ پولیس کو بھتا دیے بغیر اور غنڈہ ٹیکس دیے بغیر کوئی ریڑھی تک نہیں لگا سکتا۔ اسٹیشن پر قلی بھی ٹھیکیدار کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کام میں ہماری ضروریات کیا ہوں گی چنانچہ میں نے فون پر ہی ہال روڈ والے دوست سے بات کی۔ واپسی میں موسلے جی کو پکڑا۔ اس بار وہ اکڑ گیا تھا مگر میں نے نقد سودا کیا۔ میں نے ریڑھی پر صبح کے وقت اخبار فروشی کا بندوبست بھی کیا ہے۔ رات بارہ بجے میں آ جاؤں گا۔ صبح چھ بجے سے ٹیڈی وہاں اخبار بیچے گا، شام چھ بجے تک۔ اس میں کسی کو بُرا نہیں ماننا چاہیے، اگر شام چھ سے رات کے بارہ بجے تک ہم بھی اس کے قریب رہیں۔ وہ کوئی بات ہم سے کرے اور ہم اس سے کہہ لیں۔ یہاں تو ایک چنڈال چوکڑی ہے جو بات کا بتنگڑ بناتی ہے۔ وہ باتیں صیغۂ راز میں رہیں گی اور اس پر کچھ تو اثر ہوگا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے عشق نے ایم اے پاس کامیاب صحافی کو مونگ پھلی بیچنے پر مجبور کر دیا۔"

"میں تو سمجھ گیا تھا بیٹے۔" محسن نے دانت نکال کے کہا۔ "کیا ماڈرن الیکٹرونک عشق ہے جس میں وائرلیس پر حالِ دلِ زار کہا جائے۔"

"کل نازو کامیاب رہی تو اُمید ہے کہ کامیابی کے نئے راستے کھل جائیں گے مگر ایک ہفتہ ہمیں بھی ملے گا۔" میں نے کہا۔ "اس ایک ہفتے میں اور کچھ کام بھی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنا سب نقد سرمایہ ایک جگہ کر لیں۔ جن ماہی کے گھر سے انڈین کرنسی لے آئیں۔ استاد ٹیڈی کا سونا بیچ دیں۔ دس ہزار تو صبح موسلے جی لے گا۔ الیکٹرونک مواصلاتی رابطے کا ساز و سامان بھی سستا نہیں ملے گا۔ شاید پھر کوئی گاڑی بھی لینی پڑے، اس کے علاوہ اسلحے کی پوزیشن کا صحیح اندازہ کرنا ہے۔"

رات کے ایک بجے ہم بھی سو گئے۔ اس وقت تک ہم نے اتفاقِ رائے سے چوہدری دلاور کے خط کو نظر انداز کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ اس چال کی ناکامی کے بعد وہ کیا قدم اٹھاتا ہے۔ غالب نے غائب ہو کے بہت عقلمندی کی تھی ورنہ ہمارا یہ ٹھکانا بھی شکاری تاڑ جاتے اور اس مرتبہ وہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عجلت میں کوئی کام نہ کرتے۔ ہمیں اس وقت پتا چلتا جب ایک دھماکا "ایم آر ایس" کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا۔

صبح میں خلافِ معمول دیر تک سوتا رہ گیا۔ ٹیڈی تو سونے کے معاملے میں تھا ہی بدنام۔ اٹھایا نہ جاتا تو دوپہر تک نہ اٹھتا۔ اکیلا محسن بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گھڑی میں صبح کے آٹھ بجے تھے۔

"عیش کر لو بھائی۔ جب تک مقدر میں ہے۔" محسن سرد آہ بھر کے بولا۔ "ہم بھی کبھی آٹھ بجے سو کر اٹھتے تھے۔"

"اب کون روکتا ہے تجھے۔ نام بتا مجھے اس کا۔" میں نے کہا۔

"نام اس کا کچھ بھی ہو۔ شہلا، رابعہ یا نازو۔" محسن بولا۔ "لیکن کہلاتی وہ بیوی ہے۔ عجیب مشکل ہے کہ شادی نہ کرو تو رونا اور شادی کر لو تو مزید رونا۔"

"اس وقت رونے کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔" میں نے کہا اور سگریٹ جلالی۔ محسن نے چوری چوری باہر دیکھا اور ایک سگریٹ مانگی۔

"دیکھ نا یار۔ کل سگریٹ کی پوری ڈبیا چرمر کر کے باہر پھینک دی کہتی ہے کہ خبردار جو آئندہ منہ سے دھواں نکلا۔" محسن نے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا کہ نیک بخت، دھواں کہیں سے تو نکلے گا۔ ناک منہ سے نہ نکلا تو دل سے اٹھے گا۔ رات کو ہم سوئے تھے تہجد کے وقت۔ صبح فجر کے لیے اٹھا دیا کہ نماز پڑھو۔ نماز تو پڑھ لی میں نے مگر اس کے بعد بیڈ ٹی مانگی تو جواب ملا کہ بری عادت ہے۔ بس اب ناشتا کرو گے تو چائے ملے گی۔ اگر خالی پیٹ کچھ پینا ہے تو دودھ پیو یا جوس پی لو۔ ہم صبح دم بلیک کافی پینے والے دودھ پئیں گے۔ ناشتا ملے گا سب کے ساتھ۔ روؤں نہیں تو کیا کروں۔"

"غالب اٹھ گیا ہو تو بس منگوا لے ناشتا۔ اور دیکھ اتنا زن مرید مت بن۔" میں نے کہا۔ "بیوی کو ذرا دبا کے رکھ۔ ناشتے پر ڈانٹنا بلاوجہ۔ چائے ٹھنڈی کیوں ہے۔ انڈا ہاف فرائی کیوں ہے۔ شوہروں کے پاس رعب جھاڑنے کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔ اس نے سگریٹ پینے کو منع کیا ہے۔ تو بیڑی شروع کر دے۔ بیڑی سے منع کرے تو حقہ۔ اپنے ساتھ لے کر پھر حقے کو۔ حقے پر پابندی ہو تو دھمکی دے کہ اب آخر کیا پیوں۔ شراب، چرس یا گانجا ... ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اچھی صلاح دے رہے ہیں سکندر بھائی۔" شہلا نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ اس نے محسن کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔

"تم فکر مت کرو۔" محسن نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو کرے گا شادی۔ میں بھی اسے الٹی صلاح دوں گا۔ خدا کے لیے اب تو ناشتا لا دو، مردے تک اٹھ گئے ہیں۔" اس نے ٹیڈی کی طرف دیکھا جو اٹھ بیٹھا تھا۔

"غالب بھائی بھی آ جائیں۔" شہلا مسکرائی۔

"اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ دوپہر تک بھی نہ آئے۔" محسن بولا "مجھ سے کہہ گیا تھا۔"

غالب دس بجے آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ میک اپ موسلے بھائی بھی تھا۔ وہ ٹیکسی میں سو رہا تھا اور غالب نے دروازہ کھلوانے کے بعد اسے بیدار کیا تو وہ سخت حیران ہوا۔

"ہم سو گیا تھا؟" وہ سر کھجا کے مشکوک لہجے میں بولا۔

"کیا رات بھر جاگتے رہے تھے؟" غالب نے کہا اور لے اندر لے آیا۔

"نیند ایسے نہیں آتا۔ گولی کھاتا تو سوتا۔" موسلے بھائی نے باری باری ہم سب کی صورتوں کا جائزہ لیا۔ نازو اور شہلا کے چہرے اس نے پہلی بار دیکھے تھے مگر مجھے دیکھ کر وہ پہچان گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے مصافحے پر مجبور کیا۔

"رات کو تم نے بھول سے دو گولیاں کھالی ہوں گی۔" غالب نے کہا۔

"ہم دو ہی کھاتا ہے بابا... مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے پھر دو گولی کھالیا ہو۔ بھول ہو جاتا ہے۔" وہ بولا۔ اس کی آواز میں غنودگی تھی اور آنکھیں بوجھل تھیں۔ وہ ہمیں مجرموں کے ایک ناپسندیدہ گروہ کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا جو صورت بدل بدل کے حقیقی زندگی میں ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔ بلیک کافی کی ایک پیالی پی کر وہ مستعد ہو گیا۔

"اب تم اپنا کام شروع کر دو۔" غالب نے کہا۔ "کام میں تم کو بتا چکا ہوں۔ کام اچھا ہو گا تو ہزار زیادہ دوں گا۔ فرق ہوا تو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ بلکہ جو تمھاری جیب میں ہے وہ بھی لے لوں گا۔"

"پیسہ پہلے۔ کام بعد میں۔" موسلے بھائی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

میں نے اسے دس ہزار نقد دیے جو اس نے حفاظت کے ساتھ اندر کی جیب میں رکھ لیے۔ محسن نے وہ سوٹ کیس اس کے سامنے رکھ دیا جو وہ گزشتہ رات لے کر آیا تھا۔ موسلے بھائی نے اسے کھول کر دیکھا اور تمام اسباب کا بغور جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کے سر ہلایا مگر جب محسن نے نازو کو ہاتھ پکڑ کے آگے کیا تو وہ حیران ہوا۔

"اس لڑکی کو چڑیل بنا دو۔" محسن نے کہا۔

"اللہ ہم کو معافی دے۔ ہم اچھا صورت کو بگاڑتا! ٹی وی پر

ہم صورت کو خوبصورت بناتا مگر تم ہم سے یہ گناہ کراتا۔"

"زیادہ باتیں مت کرو۔" غالب نے خفگی سے کہا۔ "گناہ ثواب کے فلسفے کو ہم زیادہ سمجھتے ہیں۔ گناہ تم نے جیب میں رکھ لیا ہے۔ ثواب تم کو اپنے کام سے ملے گا۔ کتنا وقت لگے گا اس کام میں؟"

"تین گھنٹا۔" موسلے بھائی نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اچھا تم اپنا کام کرو۔" غالب نے کہا۔ "میں آتا ہوں دو گھنٹے میں۔"

محسن کو وہیں چھوڑ کر غالب نے مجھے اور ٹیڈی کو ساتھ لیا اور ہم اسی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے۔ ہمارا نقد سرمایہ اب تیس ہزار سے بھی کم رہ گیا تھا۔ اس میں سے پانچ ہزار دے کر ہم نے ٹیڈی کو راستے میں اتار دیا۔ اسے ایک ریڑھی خرید نا تھی اور مونگ پھلی بیچنے کا سارا ہی سامان لینا تھا۔ پھر اس سامان کو اپنے اڈے تک پہنچانا تھا اور اس کام کے لیے ٹیڈی کے پاس پورا دن تھا۔ غالب نے اسے بتا دیا تھا کہ شام تک وہ پہنچ جائے گا۔ ٹیکسی کو ہم نے بیڈن روڈ کے پاس چھوڑ دیا اور بیڈن روڈ سے پیدل گزرے۔ راستے میں وہ آفس بھی آیا جس کے باہر "میرو نیر اینڈ کمپنی" کا سائن بورڈ اب تک اسی طرح موجود تھا لیکن اوپر جانے والے زینے کی گرل میں تالا پڑا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آفس میں اب کوئی نہیں۔ شاید وہ سب رخصت کر دیے گئے تھے جو پہلے کاروبار کے دفتری امور کو سنبھالتے تھے۔ زرعی مشینری کے پرزوں کے آرڈر لیتے تھے۔ سپلائی کرتے تھے اور امپورٹ ایکسپورٹ کی کاغذی کارروائی کا حساب رکھتے تھے۔ اس فیکٹری میں انسانوں کا پیٹ بھرنے والی مشینوں کو رواں رکھنے والے پرزوں کے بجائے سینوں میں گولیاں اتارنے والا اسلحہ بننے لگا اور زندگی کے بجائے موت کا سامنا ہونے لگا تو کسی دفتر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آرڈر دینے والے اور لینے والے براہِ راست بات کرتے تھے اور گفتگو تک کا نہ ریکارڈ چھوڑتے تھے اور نہ گواہ۔ ان کا لین دین سب ناجائز اور غیر قانونی تھا۔ اس میں حساب کتاب بھی ان کا اپنا تھا۔ اس کے داؤ پیچ، کیش بک اور لیجر سب وہ خود تھے۔ انھیں امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس کی ضرورت نہیں تھی کہ سرکاری اداروں سے خط و کتابت کریں اور سیلز ٹیکس یا انکم ٹیکس ادا کرنے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ فائلوں کا اور عملے کا وجود بے مصرف ہو گیا تھا اور حسابِ دوستاں دردل کی طرح اب حسابِ دشمناں دردل کے اصولوں پر عمل ہو رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب پہلی بار میں نے اس دفتر میں قدم رکھا تھا اور میری ملاقات ڈی سلوا سے ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک گردشِ حالات نے کیا رنگ دکھائے تھے۔ ڈی سلوا رزقِ خاک ہو چکا تھا اور میں اس ادارے کا مالک ہونے کے باوجود یہاں سے گزرتے ہوئے بھی خوف زدہ تھا کہ پہچان نہ لیا جاؤں۔ زیر خان کے پرانے وفادار اور نمک خوار جو اس کے لیے ایک خاندان کی طرح تھے، بکھر گئے تھے۔ غالب سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے جذبات و احساسات کیا ہوں گے۔ وہ خود بھی وقت کی انھی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا ہو گا جن کا شکار سب ہوئے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ وقت گھات میں بیٹھا ہوا بے رحم اور اندھا شکاری ہے جو بے خبری میں وار کرتا ہے اور سارے خوابوں کے طلسم توڑ دیتا ہے۔ امیدوں کے نقش مٹا دیتا ہے اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور شہنشاہ کو گدا اور غلام کو سلطنت کا مالک بنا دیتا ہے۔

ہم اپنے خیالات میں محو دائیں طرف مڑ گئے پھر صوبہ خان ٹیلرز کی دکان کے سامنے سے گھوم کر بیڈن روڈ پر داخل ہوئے۔ شروع کے حصے میں وہ دکان بھی نہیں تھی جہاں سے ایک بار میں نے کلاک میکنیزم والے ٹرانسسٹر ریڈیو لیے تھے جو درحقیقت ٹائم بم تھے۔ معلوم نہیں وہ شخص کیا ہوا! اپنے ہی کسی ٹائم بم کے دھوکا دینے سے مارا گیا۔ دھوکا بم نہیں دیتا، ٹائم دیتا ہے۔ وقت پر گرفت کا دعویٰ غلط ہو جاتا ہے اور تیس منٹ کا وقت انتیس منٹ میں گزر جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کو متحرک رکھنے والی گراریاں تیز چلنے لگتی ہیں تو تیس منٹ کا سفر پچیس منٹ میں پورا کر لیتی ہیں اور پانچ منٹ کے وقت کو خطرے کی حدود سے دور پہنچنے کے لیے بہت کافی سمجھنے والے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تیس منٹ پورے ہوتے ہی فرشتۂ اجل وقت کو روک لیتا ہے کیونکہ اس کے حساب سے وقت پورا نہیں ہوتا اور جب ٹائم بم لگانے والوں کو یقین آ جاتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہے تو وہ اسے چیک کرنے آتے ہیں اور یہی ان کے لیے زندگی کا آخری لمحہ ہوتا ہے جب ہاتھ لگاتے ہی بم پھٹ جاتا ہے کیونکہ فرشتۂ اجل کے ہاتھوں میں رکا ہوا وقت آزاد ہو جاتا ہے۔

غالب کے ساتھ میں ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہوا تو میرے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ وہ دکان ہر قسم کے بجلی کے سامان سے بھری ہوئی اور بہت سجی ہوئی تھی۔ نئے سیلز مین ہماری طرف بڑھے لیکن غالب ہاتھ ہلا کے سیدھا گزر گیا۔ آخری حصے میں ایک شیشے کا دروازہ تھا جس کے وسط میں سرخ رنگ سے "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا۔ اندر مختصر سے کیبن نما کمرے میں ایک میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر ایک نوجوان آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے غالب کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ہم اس کے مقابل کی دیوار کے ساتھ لگے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ خاطر تواضع کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ باغی ذہن رکھنے والا نوجوان' غالب کی مدد کے باعث ایک ڈی ایس پی کے عتاب سے بچ گیا تھا مگر اس کی روش تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ پولیس ہی نہیں دوسرے حرام کھانے والوں سے تو میں دُگنی اجرت وصول کرتا ہوں۔ مفت کام کرنا ہوگا یا رعایت دینا ہوگی تو کسی غریب یا مستحق آدمی کو دوں گا یا کسی دوست کا کام ہوگا تو کروں گا۔ پھر ان بدمعاشوں سے کمی پوری کروں گا۔ غالب نے اسے یقین دلایا کہ اس ملک میں رہ کر بھی اس کے خیالات نہ بدلے تو انشاء اللہ ایک دن اس کا کاروبار بھی چوپٹ ہو جائے گا اور وہ خود بھی اپنی اصولی اور نظریاتی جنگ کے باعث عزت نہیں پائے گا بلکہ بستہ 'ب' کے مجرمان میں شامل کیا جائے گا۔ غالب کہاں کہاں اس کی مدد کرے گا۔ اس نقار خانے میں جہاں بدمعاشی کا نقارہ بج رہا ہے' کون سنتا ہے صدائے درویش۔

پھر غالب نے مطلب کی بات کی کیونکہ اس نوجوان کے خیالات کو بدلنا مشکل تھا۔ بالآخر وقت اسے صحیح سبق پڑھا دے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا اور پھر دنیا میں کامیاب رہے گا۔ اس نے ہمارے مطالبات پر غور کیا اور ضرورت کی نوعیت کو سمجھنے کے بعد کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"بات یہ ہے غالب صاحب کہ ملنے کو دنیا کے بازار میں سب کچھ ملتا ہے مگر آپ آ گئے ہیں میری دکان پر۔" وہ بولا "میں کوئی ناجائز چیز نہ رکھتا ہوں نہ بیچتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو "سوری" کہہ کے بھی رخصت نہیں کر سکتا کیونکہ آپ ایک ضرورت لے کر میرے پاس آئے ہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟" غالب بولا۔

"میں نے انکار نہیں کیا۔" وہ بولا "مجھے یہ سب سامان منگوا کے دینا پڑے گا۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہاں کون کیا بیچ رہا ہے اور کس دام بیچ رہا ہے۔"

"چلو تم ان کا پتا بتا دو۔" غالب نے کہا۔

"وہ آپ کو اتنی آسانی سے یہ چیزیں نہیں دیں گے۔" وہ بولا۔ "جتنی آسانی سے پرچون کی دکان سے دال مل جاتی ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ آپ کون ہیں۔ پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی یا ملٹری انٹیلی جنس والے۔ یہ چیزیں بہت خطرناک مقاصد میں استعمال ہوتی ہیں۔ کسی کا راز لینے کے لیے۔ اب راز کسی فرد یا خاندان کا ہو تو اسے بلیک میل کیا جا سکتا ہے اور حکومت کا ہو تو اس سے وطن فروش قسم کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"ایک اور استعمال کے امکانات پر غور کرو۔" غالب نے کہا۔ "کہ اس سے وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا پتا چلایا جا... ہے اور ان کی نگرانی کی جا سکتی ہے۔ انھیں ارتکاب جرم ... وقت یا معقول ثبوت اور شہادت جمع کر لینے کے بعد گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"آئی سی۔" اس نے مجھے پہلی بار غور سے دیکھا کیونکہ اب ... میں خاموش ہی رہا تھا اور عملاً اس موضوع پر صرف غالب ... کی تھی۔ "آپ لوگوں کا مقصد یہی ہوگا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا ... آپ لوگ کسی طرح بھی غیر اخلاقی یا غیر قانونی کام کر سکتے ہیں۔"

"کیوں فرض نہیں کر سکتے۔ صرف ہماری شریفانہ صورت ... کر؟" غالب بولا۔

"نہیں۔ ہر شخص کی ایک چھٹی حس ایسے ہی موقع پر اس ... صحیح رہنمائی کرتی ہے اور اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تمھاری مرضی۔ تم حواسِ خمسہ پر بھروسا کر دیا چھٹی حس پر۔ کام ہونا چاہیے۔ کاروبار میں لگی لپٹی نہیں رکھنی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "صاف بات کرو۔"

"جی۔ اور صاف بات یہ ہے کہ میں آپ کو سب کچھ لا ... ہوں۔ دوسروں سے لے کر آؤں گا۔" وہ بولا۔ "آپ یہیں تشریف رکھیے۔ اگر آپ گئے تو وہ بہت چکر دیں گے۔ کبھی ایک جگہ بلا ... گے کبھی دوسری جگہ۔ آج کل پرسوں پر ٹالیں گے اور اس عرصے ... آپ کے بے ضرر ہونے کی تصدیق بھی کر لیں گے اور آپ کی ... کا اندازہ بھی۔ قیمت وہ ضرورت کی وصول کرتے ہیں' چیز کی نہیں۔ میں ان کے لیے بے ضرر ہوں۔ ابھی مال لے آؤں گا اور زیادہ پیسے بھی نہیں دوں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر چیز وہ مجھے قیمت خرید پر یا معمولی منافع پر دے دیں گے۔ جی نہیں۔ اسمگلر اتنے خطرات مول لے کر جو چیز لاتا ہے وہ معمولی منافع کمانے کے لیے نہیں لاتا۔"

"قیمت کوئی مسئلہ نہیں۔" غالب نے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہم یہاں تشریف رکھتے ہیں۔" اس نے مجھ سے لے کر اس کے سامنے بیس ہزار رکھ دیے۔

"اب ایسا بھی نہیں۔" وہ بیس ہزار اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی میں احتیاطاً زیادہ لے جا رہا ہوں۔ کچھ لوگ زیادہ خبیث ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں بھی لحاظ کے قائل نہیں ہوتے۔ بعض اوقات پوری مارکیٹ میں ایک ہی پیس ہو تو وہ چڑھ جاتا ہے آسمان پر۔ جو قیمت مانگے دینا پڑتی ہے۔"

ہم نے اسے ایک سیلزمین کے ساتھ باہر جاتے دیکھا لیکن اندر شیشے کے دروازے کے پیچھے بیٹھ کر ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ کے ہر بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے مذبح خانے میں بھینس کسی دوسری بھینس سے پوچھے کہ یہاں چھری کا کوئی ڈر تو نہیں۔" غالب بولا۔

"تمھارا مطلب ہے یہاں دیواروں کے واقعی کان ہوں گے؟" میں نے کہا "جو سب سن کر ریکارڈ کر لیں گے اور تمھارا دوست بعد میں سب جان لے گا؟"

"کیا یہ ناممکن ہے؟" غالب بولا "وہ آدمی تو ایسا نہیں ہے۔ اسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اتنا اہتمام کرنے کی۔ تم کہو کیا کسنا ہے۔ وہ کم سے کم ہماری باتیں سن کے ہمیں بلیک میل نہیں کرے گا اور افشائے راز بھی نہیں کرے گا۔"

"تمھارا کیا خیال ہے' وہ خط لکھنے والا احمق تھا؟" میں نے کہا "اس کی جگہ تم ہوتے۔" غالب سوچ کر بولا "تو یہ خط لکھنے کے بعد کیا اُمید رکھتے۔ فرض کر لو کہ تمھاری جگہ وہ ہوتا۔"

"میں کوئی اُمید نہ رکھتا۔" میں نے کہا۔

"میں رات کو اسی مسئلے پر غور فرماتا رہا۔" غالب نے کہا۔ "وہ پورا خط ایک جال ہے۔ مگر اس میں ایک سچائی چھپی ہوئی ہے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم نے کچھ نتائج اخذ کیے تھے۔ لکھنے والے کو یقین تھا کہ تمھارا ذہن اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچے گا اور یہی نتائج اخذ کرے گا۔ تم نے بہت کچھ فرض کر لیا ہے مثلاً یہ کہ فیکٹری تمھارے حوالے کرنے کی وجہ کیا ہے۔ تمھارے خیال میں وجہ یہ ہے کہ دلاور نے اسلحہ سازی کہیں اور شروع کر دی ہے۔ دلاور جانتا تھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد تم یہی سمجھو گے اور پھر تصدیق کرو گے۔ اگر تصدیق کے لیے خود جاؤ گے تو وہ تمھارے استقبال کے لیے موجود ہوگا اور تمھیں اپنے اندازوں کے غلط ہونے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ سب کچھ وہاں بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا پہلے تھا۔"

"کیا تمھارا خیال غلط نہیں ہو سکتا؟" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہر بات' ہر خیال اور نظریہ دونوں پہلو رکھتا ہے۔" غالب بولا "وہ تجربات کی کسوٹی پر اور مشاہدے کے بعد درست ثابت ہو جائے گا یا غلط ہوگا' اس حقیقت کو میں نے کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اسلحہ سازی اب کسی دوسرے محفوظ اور خفیہ مقام پر ہو رہی ہے تو کیا ہوگا؟ ہم ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کی طرف سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم یا تمھارا کوئی قانونی اتھارٹی اس کا قبضہ لینے جائے۔ جاتا تو جھک مار کے لوٹ آتا۔ دلاور کہتا کہ میاں ہوش کے ناخن لو۔ مقدمہ عدالت میں ہے۔ میں ایسا خط لکھنے کی حماقت اور جسارت کر سکتا ہوں؟ چنانچہ وہی ہوتا کہ ہم اپنے خیال پر قائم رہتے اور ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس ہماری نظرِ کرم سے محفوظ ہو جاتا۔ ہم بے وقوف اس نئے مقام کی جستجو میں لگ جاتے جہاں دلاور نے اسلحہ سازی کی مشینری منتقل کی ہوگی اور اس سراب کے پیچھے اپنا وقت بھی ضائع کرتے اور توانائی بھی۔"

"تم نے مجھے الجھا دیا ہے مرزا غالب کے بھتیجے۔" میں نے کہا۔

"کیونکہ تمھارے دونوں خیال منطقی اور قائل کرنے والے ہیں۔ سچ یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی مگر سچ دو نہیں ہو سکتے۔"

"سچ ایک ہے اور اس کو دریافت کرنا پڑے گا۔" غالب نے کہا۔ "دلاور کے خط نے ہمارے سامنے ایک چیلنج رکھ دیا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہم اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔" میں نے کہا "ہم خود جا کے دیکھ لیں گے کہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس میں اب کیا ہو رہا ہے۔"

اسی وقت دکان کا مالک لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک ڈبا تھا۔ "کچھ تو مل گیا۔" وہ اندر آ کے بولا "کچھ میرا آدمی لے کر آئے گا۔" اس نے ڈبا میز پر رکھا اور فون گھمانے لگا۔ اس نے چھ جگہ فون کیا اور پھر آرام سے بیٹھ کر ڈبا کھولنے لگا۔ پہلی چیز جو اس نے برآمد کی وہ دیکھنے میں مختصر ترین آلۂ سماعت کی طرح تھی۔ ایک دھاگے جیسے باریک تار کے ساتھ ایک سرے پر ننھا سا سفید موتی لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف دو انچ چوڑا اور تین انچ لمبا سفید رنگ کا پلاسٹک پیس تھا جس کی موٹائی چار یا پانچ ملی میٹر سے زیادہ نہیں تھی۔

"یہ وہ چیز ہے جس سے بہرے اور اونچا سننے والے عام لوگوں کی طرح سن سکتے ہیں۔" وہ بولا اور اس نے ہر طرف سے بند ڈبیا پر ایک ننھے سے ابھار کو دبا دیا۔ ابھار کے نیچے سرخ روشنی جھلملانے لگی "اب یہ آن ہو گیا ہے۔ جس کا دل چاہے اسے ٹیسٹ کر لے۔ یہ آلۂ سماعت کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

غالب نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی۔ "غالباً یہ چیز اس فہرست میں شامل نہیں تھی۔ اس کی ضرورت تو شاید اسی سال کی عمر میں پڑے گی۔"

وہ مسکرایا۔ "یہ آپ کی مطلوبہ چیز ہے مگر بہت محفوظ۔ اب آپ غور سے دیکھیے۔ میں اس ننھے سے بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آف ہو گئی؟ مگر اب پھر غور فرمایئے۔ میں اسی بٹن کو پھر دباتا ہوں۔ لائٹ آ گئی۔ یہ اب بھی آلۂ سماعت ہے مگر یہ دیکھیے میں نے اسی بٹن کو ایک بار پھر دبایا۔ لائٹ آف نہیں ہوئی بلکہ کچھ تیز ہو گئی ہے۔ اب یہ ایک واکی ٹاکی ہے۔ کان میں لگا ہوا مائک بہت زیادہ حساس اور پاورفل ہے اور تین فٹ کے دائرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی سرگوشی بھی کیچ کر لیتا ہے۔ یہ باریک تار اس کا انٹینا ہے اور یہ نیچے کا دوسرا حصہ ٹرانسمیٹر، جسے جیب میں ڈالا جاسکتا ہے یہاں تک کہ بالوں میں چھپایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ بال لمبے اور بڑے ہوں۔ بالوں میں سے نکل کے یہ دھاگے جیسا تار کان تک پہنچ جائے گا۔ اس کی آواز سو میٹر دور دوسرے یونٹ میں سنی جاسکتی ہے دونوں کی فریکوئنسی ایک ہے لیکن "پری سیٹ" ہے یعنی آپ چاہیں تو اسے بدل نہیں سکتے۔" اس نے ڈبے میں سے دوسرا ویسا ہی آلۂ سماعت نکال کے ہمیں دکھایا اور اپنی نگاہ شیشے کے دروازے کے باہر رکھی

"یہ خاصی کار آمد چیز ہے۔" غالب نے کہا۔

"اب آپ اس کا طریقۂ استعمال سمجھ لیں۔" وہ بولا۔ "اس بٹن کو پھر دبانے سے یہ نظام آف ہو گیا۔ لائٹ بجھ گئی ہے۔ اسے دوبارہ آن کرنے کے لیے یہی عمل دہرانا پڑے گا۔ پہلی بار میں آلۂ سماعت آن۔ دوسری بار میں آف۔ تیسری بار میں پھر آلۂ سماعت آن۔ چوتھی بار دبانے سے لائٹ زیادہ تیز ہو گی مگر لائٹ ہر جگہ نہیں دیکھی جاسکتی۔ فرض کریں، یہ آپ نے بالوں میں چھپا رکھا ہے۔ آپ اپنا سر کھجانے کے بہانے اسے آن یا آف کر سکتے ہیں۔ واکی ٹاکی بنانے کے لیے اس بٹن کو چار مرتبہ دبایئے۔ پانچویں دفعہ میں آف۔ خدانخواستہ یہ کسی کے علم میں آجائے تو اسے خاک بھی پتا نہیں چلے گا۔ ایک بار میں یہ آن ہو گا تو صرف آلۂ سماعت ہو گا۔ وہ اسے آف کر کے دیکھ لے۔ دوبارہ آن کرے گا تب بھی یہ آلۂ سماعت ہی ہو گا۔ شک کی بات ہی نہیں۔ چوتھی بار میں یہ سو گز دور تک پیغام رسانی کا ذریعہ ہے جب یہ چار مرتبہ دبایا جائے گا تو سو گز کے دائرے میں دوسرا یونٹ کان میں سگنل دے گا۔ دوسرا شخص اپنے یونٹ کے بٹن کو چار مرتبہ دبا کے بات کر سکے گا اور سن بھی سکے گا۔ کان میں لگا ہوا موتی کنڈنسر مائک بھی ہے اور ہیڈ فون بھی۔"

میں اس چیز کی افادیت کا قائل ہو گیا۔ جب اس نے بڑے بالوں کی بات کی تھی تو قدرتی طور پر میرے ذہن میں نازو کا خیال آیا تھا مگر ابھی یہ محض ایک خیال تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے ضرور استعمال کرے گی۔ آغاز ہی سے اس کا ایک الیکٹرونک آلے کے ساتھ جانا شبہات کو جنم دے سکتا تھا۔ ہمارے مقابل بے وقوف لوگ نہیں تھے جو گرد و پیش سے بے خبر ہوں۔ شاید ہم سے پہلے وہ جانتے ہوں گے کہ بازار میں کیا کچھ دستیاب ہے اور استعمال بھی کر چکے ہوں گے۔ یہ کوئی نادر ایجاد یا دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد چیز نہیں تھی۔ اس کی قیمت سن کر غالب بھی متاثر ہوا۔ باہمی رابطے کی یہ جوڑی آٹھ ہزار میں ملی تھی اور اس کی افادیت سو میٹر تک محدود تھی۔ اس کے بعد مجھے دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ سگریٹ کے پیکٹ سے جڑا واکی ٹاکی تھا اور اس سے ایک فٹ لمبا انٹینا کھینچ کر باہر نکالا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے دو پیس چار ہزار میں [illegible] ایف ایم ٹرانسمیٹر ریسیور تھے جو بیٹری سیل سے چلتے تھے اور ان کی رینج ایک کلومیٹر تھی۔ ظاہر ہے یہ چھپا کے استعمال کرنے کی چیز تھی اور ان کا طریقۂ استعمال ہم جانتے تھے۔

"اس کی رینج انٹینا بڑھانے سے تین کلومیٹر تک ہو جاتی ہے۔" غالب کے دوست نے کہا۔ "مثلاً گھروں کے اوپر لگے ہوئے [illegible] یا ٹی وی کے ایریل سے مدد لی جائے تو تین کلومیٹر تک آواز پہنچ [illegible] تین کلومیٹر کے فاصلے سے سگنل ریسیو کرنا ممکن ہے۔ اس کا [illegible] مسلسل استعمال کیا جائے تو پانچ گھنٹے کام دے گا۔"

"اس پر مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "اس دوسرے یونٹ [illegible] اندر بھی تو سیل ہو گا۔ آلۂ سماعت ٹائپ۔۔۔"

"ہاں۔ اس میں مائکرو سلیکون سیل ہے۔" وہ بولا۔ "یہ چیز [illegible] اتنی عام تو نہیں ہے مگر مل جاتی ہے تلاش کرنے سے۔ ڈیڑھ [illegible] سو کا ایک سیل ملے گا جو کافی چلے گا۔ استعمال پر منحصر ہے۔ ایک سو اسی منٹ کی لائف ہے اس کی چنانچہ آپ حساب رکھیں کر [illegible] منٹ استعمال ہوا۔ ٹارچ لائٹ سیل آہستہ آہستہ کمزور پڑتا ہے [illegible] سگنل بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ سلیکون سیل ایک دم جواب دے جائے گا۔ دراصل اس یونٹ کو کم سے کم ایک خاص مقدار میں کرنٹ چاہیے اس کا لیول گرے گا تو فنکشن ختم ہو جائے گا۔ آپ ان دونوں چیزوں کو ٹیسٹ کریں گے؟"

"نہیں۔ آپ کا کہا کافی ہے۔" غالب نے کہا اور اس کے دکان دار دوست نے دو چھوٹے اور دو بڑے واکی ٹاکی پھر ڈبے میں بند کر دیے۔ وہ صابن کی بارہ ٹکیوں والا ڈبا تھا جس کو کھولنے سے صابن کی مخصوص مہک آتی تھی۔ اس میں سب چیزیں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر رکھی گئی تھیں۔ ہمیں گھر سے نکلے ہوئے سوا گھنٹا ہو گیا تھا۔ غالب نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسی وقت دکان کا وہ سیلزمین بھی آگیا جو مالک کے ساتھ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور اس نے چمڑے کی جیکٹ کے اندر سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کے میز پر رکھ دیا۔ "دو ہزار اور دینے ہیں۔" وہ بولا۔

"کم نہیں کیے اس یہودی نے؟" دکان کا مالک بولا۔

"کہہ رہا تھا بارہ کے دس لے رہا ہوں اور کیا کم کروں۔"

"غالب صاحب، میرا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔" دکان دار نے کچھ خفت سے کہا۔ "لیکن ساری بات ضرورت کی ہے اور مال شاذ و نادر ہے اتفاق سے چنانچہ سب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دو چار ہفتے میں اس سے آدھی قیمت دینا پڑتی۔ اسے دو ہزار اور دے دیں۔"

سیلزمین دو ہزار لے کر چلا گیا تو اس نے "تھری کیسل" برانڈ سگریٹ کا پیکٹ کھولا۔ اندر سے ایک کلائی کی گھڑی نکلی اور ایک عجیب سی چیز جس کی لمبائی دو انچ تھی۔ چوڑائی آدھے انچ سے کچھ زیادہ اور موٹائی وہی چار یا پانچ ملی میٹر۔ اس کے دونوں کنارے گول تھے۔ ایک سطح بالکل صاف اور چکنی تھی۔ دوسری طرف انگلی کے ناخن کے برابر کھلے حصے پر جالی تھی۔ جالی کا اور اس چیز کا رنگ چمکدار سیاہ تھا۔

"یہ بہت نایاب۔۔۔ اور خطرناک چیزیں ہیں۔" دکان دار بولا۔ "یہ کلائی کی گھڑی نہیں ایف ایم مائکرو فون ہے۔ گھڑی کی چابی یوں تو وقت بتانے والی سوئیوں کے لیے ہے، اس کو تھوڑا سا باہر کھینچ لیں تو وقت ملایا جاسکتا ہے۔ ہر گھڑی میں ایسے ہی ہوتا ہے لیکن اب دیکھیے۔ میں منٹ کی سوئی کو ایک پورا چکر دیتا ہوں۔ وقت ایک گھنٹا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے واپس لاتا ہوں۔ وقت پھر وہی ہو گیا۔ اب چابی کو تھوڑا سا اور باہر کھینچ لیں۔ سیکنڈ کی سوئی رک گئی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آپ کی گھڑی کا مائکرو فون کام کرنے لگا ہے۔ سوئی کو گھمائیں گے تو فریکوئنسی بدلے گی۔ جیسے ریڈیو کی سوئی سے بدلتی ہے۔ اس ریموٹ مائکرو فون میں یہ فائدہ ہے کہ آپ کو ایک ہی فریکوئنسی پر پیغام دینے کی مجبوری نہیں۔ آپ جب چاہیں فریکوئنسی بدل لیں۔ اٹھاسی میگا ہرٹز سے ایک سو آٹھ میگا ہرٹز کے درمیان کہیں بھی رکھ لیں۔ اس کی رینج بہت زیادہ ہے میرا مطلب ہے، اس کے سائز کے مقابلے میں۔ کسی گاڑی کے ریڈیو کا انٹینا پورا اونچا کر لیا جائے تو ریڈیو ٹیون کرنے سے اس مائکرو فون کا سگنل کسی جگہ بالکل صاف سنائی دے گا۔ تقریباً ایک میل کے دائرے میں۔ ایک کلومیٹر کچھ کم ہوتا ہے ایک میل سے۔ انٹینا کم سے کم تین فٹ اونچا ہونا چاہیے گاڑی کے ریڈیو کا۔ چھت کے اوپر ہو گا تو آواز زیادہ صاف ہو گی مگر رینج وہی رہے گی۔ اس کلائی کی گھڑی کی سب سے بڑی خوبی اس کا سیل ہے جو تھرمو الیکٹرک سیل ہے۔ جیسے کوئلے یا تیل کو جلا کے بجلی پیدا کرتے ہیں، اسی طرح اس سیل میں جسم کی حرارت سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ گھڑی ہاتھ پر بندھی رہے تو اس کی پشت حرارت جذب کرتی ہے اور سیل اس حرارت کو کرنٹ میں تبدیل کرتا ہے۔ سیل کی لائف مقرر نہیں۔ نہ چلے تو دو دن نہ چلے اور ٹھیک کام کرتا رہے تو دو سال گزر دے۔ طریقۂ استعمال سمجھ لیا ہے آپ نے۔ ایک بار پھر دیکھ لیں۔"

"ہم اتنے کوڑھ مغز نہیں ہیں۔" غالب مسکرایا۔ "ایک بار میں بات سمجھ بھی لیتے ہیں اور سمجھا بھی دیتے ہیں۔ یہ واقعی بہت قابلِ قدر اور کار آمد چیز ہے۔"

"ہے بھی تو آٹھ ہزار کی جناب۔" غالب کا دوست خوش ہو کے بولا۔ "یہ جو کالی سی چیز ہے یہ سیدھا سادا مائکرو فون ہے۔ اس کی فریکوئنسی پری سیٹ ہے۔ یعنی آپ بدل نہیں سکتے۔ اسے آپ ایک الیکٹرونک کان سمجھ لیں۔ یہ مقناطیسی ہے اور کسی بھی لوہے کی سطح پر چپک جاتا ہے۔ آس پاس کچھ بھی ہو یہ ہر آواز کو نشر کرتا رہتا ہے اور اس کی آواز بھی ایف ایم بینڈ ریڈیو پر سنی جاسکتی ہے مگر وہی سو میٹر کے دائرے میں۔ اسے ارتھ ہونا چاہیے۔ ارتھ ہوتے ہی یہ خود بخود آن ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ اسے گاڑی کی باڈی سے لگا دیں تو یہ کام شروع کر دے گا۔ الگ کریں گے تو آف ہو جائے گا۔ گھر کے اندر پانی کے نلکے سے چپکا دیں۔ کسی کیل سے لگا دیں جو دیوار میں پیوست ہو۔ لکڑی میں نہ لگی ہوئی ہو۔"

"زبردست! مان گئے تمھیں دوست۔" غالب نے جذباتی ہو کے کہا۔ "تم نے میری جو مدد کی ہے، وہ درحقیقت ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تم کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ مگر اس وقت تم نے اپنے وطن اور ملک کے کچھ دشمنوں کے عزائم ناکام بنانے کے مقدس فرض کو پورا کر دیا ہے۔ جس حد تک تم کر سکتے تھے۔"

"میں نے تو آپ کی مدد کی تھی۔ اگر یہ میرے وطن کی خدمت ہے تو غالب صاحب، آپ یہ پیسہ لے جائیے۔" وہ بولا۔ "میں سپاہی نہیں ہوں لیکن اس وطن کی خاطر لڑنے والوں کے لیے کچھ کر سکوں تو میری خوش قسمتی۔"

"پیسہ غیر اہم ہے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ ہے تو سب ہے۔ تم نے وقت پر ایک مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد کی، یہی تمھارا جہاد ہے۔" غالب نے اٹھتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ "ایک دن میں خود تمھیں یہ بتلانے آؤں گا کہ تم نے جو کچھ کیا تھا وہ بیس ہزار کیا، بیس لاکھ یا بیس کروڑ سے زیادہ قابلِ قدر تھا۔"

"مجھے امید ہے، اس دن یہ بھی آپ کے ساتھ آئیں گے۔" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا۔ "آج تو یہ بالکل نہیں بولے۔"

"امید ہے، تم بھی راز کو راز رکھتے ہوئے چپ رہو گے۔ کسی سے ہمارے آنے کی بات نہیں کرو گے۔" غالب بولا۔ "تمھارا وہ سیلزمین قابلِ اعتبار ہے؟"

"وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔" وہ بولا۔ "اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں، آپ بھروسا رکھیں اور پھر ضرورت پڑے تو مجھے کسی بھی وقت یاد کر لیں۔ میں اپنا کارڈ دیتا ہوں۔ گھر یا دکان پر کسی جگہ فون کر دیں۔"

ہم کارڈ لے کر دکان سے نکل آئے۔ ہم نے دو گھنٹے میں واپس پہنچنے کو کہا تھا اور دو گھنٹے ہو گئے تھے۔

"تیرے دوست نے تو کمال کر دیا یار۔" میں نے کہا۔ "میں واقعی خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے لگا ہوں جس نے دنیا فتح کر لی ہو۔"

"وہ تم کو ملٹری کا کوئی کرنل جنرل سمجھتا رہا۔" غالب ہنسا۔ "اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اسی لیے تمھارے بارے میں اس نے زیادہ تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ یہ جانتا ہے کہ کمانڈو ونگ کے آپریشن کتنے ٹاپ سیکرٹ ہوتے ہیں۔"

"مجھے اس کی حُب الوطنی، دوست داری اور اصول پرستی بھی پسند آئی۔" میں نے کہا۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ اسی جگہ سے ایک رکشا والے نے کسی قسم کی شرائط عائد کیے بغیر ہمیں بٹھالیا اور بیس منٹ بعد ہم گھر میں داخل ہوئے تو ہمارا استقبال چالیس سال سے زائد عمر کی ایک بدصورت بڑھیا نے کیا جس کے چہرے پر عمرِ رفتہ کی تحریر جھرّیوں کی شکل میں نظر آتی تھی۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی غالب آنے لگی تھی اور یہ بال خشک، اُلجھے ہوئے اور کھُردرے تھے۔ اس کے میلے اور بدوضع دانتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پان بہت کھاتی ہے اور پھر دنداسہ بہت استعمال کرتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا اور سوسی کے پُرانے میلے شلوار قمیص کے ساتھ پھٹے ہوئے دوپٹے سے اس کی غربت عیاں تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ بہت نحیف و لاغر تھی۔ میں اور غالب کچھ دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔ ہمارے لیے نازو کی اس ہیئت کذائی پر ہنسنا بھی مشکل تھا اور رونا بھی۔

"بہت صدمہ پہنچا ہے دل کو؟" شہلا نے غالب کو چھیڑا۔

"صدمہ تو مجھے بھی پہنچا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا صورت تھی، جسے کیا کر دیا مگر صدمے سے زیادہ مجھے اس ہمت پر رشک آتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"ابھی تو کچھ نہیں کیا میں نے۔" نازو ہنسی۔ "اتنی تعریف مت کرو کہ مجھے غرور ہو جائے۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی بھی نقصان پہنچاتی ہے۔"

"اس میں کوئی مبالغے کی بات نہیں نازو۔" محسن نے کہا۔ "میری بیوی سے پوچھو۔ ایمانداری سے بتائے کہ یہ کام وہ کر سکتی تھی۔"

"میں جھوٹ کیوں بولوں۔" شہلا نے کہا۔ "میں واقعی اتنی ہمت نہیں رکھتی۔ لیکن رابعہ باجی شاید..."

"نہیں... وہ بھی سیدھی دشمن کے قلعے میں داخل نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔ "خود میں اسے نہ جانے دیتا۔ نازو کی طرح وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔"

"بابا تم لوگ اپنا مسخری چھوڑو۔" موسلے جی نے کہا جس کی طرف ہم نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اس نے تین گھنٹے کہے تھے مگر اپنا کام دو گھنٹے میں ختم کر لیا تھا چنانچہ آدھے گھنٹے سے وہ ہمارے انتظار میں۔ شہلا کے بیان کے مطابق ایک پیکٹ سگریٹ کا، دو گلاس پانی اور تین کپ چائے پی چکا تھا۔

"چھوڑ دی۔ بالکل چھوڑ دی آج سے۔" غالب نے کہا۔ "اپنا بُوتھا پیشِ خدمت ہے۔ اس کو بگاڑ کے اپنے جیسا بنا دیجیے۔" وہ موسلے بھائی کے سامنے دھرنا مار کے بیٹھ گیا۔ موسلے جی ایک فنکار تھا مگر اس کے فن کی قدر نہیں تھی یا دنیا کو اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی موٹر مکینک کی چنانچہ وہ عمر کے اس حصے میں فرسٹریشن کا شکار تھا۔ اسے ٹی وی سے لگا بندھا معاوضہ ملتا تھا جو زندگی کی جائز ضروریات کی کفالت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ناجائز اور منہ زور خواہشات کی تکمیل کے لیے اس نے ناجائز راستے اختیار کر لیے تھے لیکن اس سے موسلے جی کے اندر چھپا ہوا فنکار شرمسار رہتا تھا اور خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ ہم سب اس کے ہاتھوں کی ہنرمندی کو مصروفِ عمل دیکھتے رہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے غالب کا چہرہ بدل دیا۔ غالب پر اسے اتنی محنت نہیں کرنا پڑی جتنی نازو پر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ آدھے گھنٹے میں فارغ ہو گیا۔

"ابھی تم میرے کو چھوڑ کر آؤ۔" وہ بولا۔

"تم ٹیکسی میں آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ٹیکسی لو اور چلے جاؤ..."

"نہیں یار۔ ہم اتنے بے مروّت نہیں ہیں۔" غالب نے کہا۔ "لاؤ بھئی شہلا، موسلے بھائی کے لیے گرما گرم دودھ مَلائی والی چائے لاؤ۔ اور ہمارے لیے بھی۔" اس نے موسلے جی سے نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری اور یہ اشارہ شہلا نے بھی دیکھ کر مخالفت کا ارادہ ترک کر دیا ورنہ یہ چائے کا کوئی وقت نہیں تھا۔

"استاد، تم ذرا جا کے موسلے بھائی کے لیے ایک فرسٹ کلاس ٹیکسی لاؤ۔" غالب نے کہا۔ "جتنی دیر میں ٹیکسی آئے گی یہ چائے پی لیں گے اور اگر وہ فوراً آ جائے تو اس سے دو چار منٹ انتظار کا کہنا۔" ٹیڈی نے میری نظر کا اشارہ نہ دیکھا ہوتا تو وہ غالب کے اس تحکمانہ انداز پر احتجاج ضرور کرتا مگر اس نے دیکھا کہ یہ چکر کچھ اور ہے تو وہ خاموشی سے چلا گیا۔ شہلا نے چائے پانچ منٹ میں حاضر کر دی۔ پانی پہلے سے اُبل رہا تھا چنانچہ اسے دیر نہیں لگی۔

"یار یہ کیا حرام خوری ہے۔" غالب نے ایک کپ کو اندر سے ملاحظہ فرما کے کہا۔ "کپ کو ٹھیک طرح صاف تو کر نا تھا۔" پھر وہ اسی طرح کپ کو اندر لے گیا اور گرم پانی سے دھو کے لایا۔ سب سے پہلے اس نے موسلے جی کو چائے بنا کے دی۔ پھر اطمینان سے بلکہ کاہلی سے سلو موشن میں ہم سب کو چائے بنا کے دینے لگا۔

استاد ٹیڈی ہمارے چائے ختم کرنے تک ٹیکسی لے کر نہیں لوٹا تھا۔ شاید اسے ٹیکسی دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں نہ جانے کیوں رکشا تعداد میں بڑھتے جا رہے تھے اور ٹیکسیاں کم ہو رہی تھیں۔ موسلے بھائی اب واپس جانے کے لیے بے چین تھا کیونکہ اس کے ٹی وی اسٹیشن جانے کا وقت ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جھلاتے ہوئے استاد ٹیڈی نے واپس آ کے اعلان کیا کہ شاہی سواری آگئی ہے مگر موسلے جی اس وقت تک سو چکا تھا۔

"موسلے بھائی! اے موسلے بھائی۔" غالب نے اس کو ہلاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "تم ادھر سونے کو آیا تھا کیا؟ تم کو نہیں معلوم کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" مگر اس پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔

"آتے ہوئے بھی تم ٹیکسی میں سو گیا تھا۔"

"اس کو کیوں ڈانٹتے ہو۔ حرکت تو یہ تمھاری ہے۔" میں نے کہا۔

"توبہ توبہ ———" غالب دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "میں نے تو بس خواب آور گولیاں ملائی تھیں اس کی چائے میں۔ سو یا یہ خود ہے۔ اگر نہ سوتا تو مجھے اس کو ناک آؤٹ کرنا پڑتا مگر گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کا گناہ میں نہیں کرتا۔"

"شک تو مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تصدیق اب ہو گئی۔"

"چلو اب یہ مال ڈھونے میں میری مدد کرو۔" غالب بولا۔ "میں اس کو گھر کے دروازے تک تو چھوڑ آؤں۔ پہلے آنکھ کھلی تھی تو موسلے بھائی نے خود کو یہاں پایا تھا۔ اب آنکھ کھلے گی تو واپس وہیں ہو گا جہاں سے چلا تھا۔"

"سمجھے گا کہ خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سُنا افسانہ تھا۔"

"اس کو سمجھنا پڑے گا۔" غالب بولا۔ "ورنہ میں اس کو سمجھا دوں گا۔ یہ ضروری تھا کہ موسلے بھائی کو اس گھر کے راستے کا علم نہ ہو۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ کل شراب کے لیے پیسے نہ ہوں تو پھر آ جائے۔ اب کہاں جائے گا۔"

"تمھارے دفتر بھی تو پہنچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں میں اس کو پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔" غالب بولا۔ "شہر میں یہ ہمیں تلاش کر نہیں سکتا اور اتفاق سے مل جانے کا رسک ایک فی ہزار بھی نہیں۔ اتنا رسک تو ہم شوقیہ بھی لیتے ہیں۔" باہر سے ٹیکسی والے نے ہارن دیا اور ہڑبڑ مچایا تو میں اور غالب سوئے ہوئے موسلے جی کو اُٹھا کر لے گئے اور ٹیکسی میں پیچھے کی سیٹ پر لٹا دیا۔

"اتنی دیر کیا اسے قتل کرنے میں لگی؟" ڈرائیور نے موسلے بھائی کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "یہ بندہ ہے کہ لاش؟"

"بندہ ہے مگر سویا ہوا۔" غالب نے کہا۔ "بیمار تھا اس لیے ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دیا ہے۔" وہ آگے بیٹھ گیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

"سچ کہا تھا غالب نے۔" میں نے کہا۔ "وہ تیس فیصد صحافی، تیس فیصد جیمز بونڈ ایجنٹ زیرو زیرو سیون اور چالیس فیصد مجنوں ہو گیا ہے۔ صحافی تو برائے نام ہی رہ گیا نا۔"

اندر آنے کے بعد میں نے الیکٹرونک نوادرات کی نمائش کی جسے خواتین نے بھی دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے طریقۂ استعمال اچھی طرح سمجھانے کے بعد کلائی کی گھڑی نازو کے ہاتھ پر کہنی سے بھی اوپر باندھ دی۔ وہ بہت ہی نازک سی لڑکی تھی چنانچہ اس کا بازو میری کلائی کے برابر یا کچھ زیادہ تھا۔ جب اس نے آستین اوپر کی تو کہنی تک سیاہی مائل گندمی رنگ کے ختم ہوتے ہی جلد کا سنہرا رنگ شروع ہو گیا جو یوں لگتا تھا جیسے سائے کے ساتھ ہی دھوپ کی روشن لکیر۔ سایہ محدود تھا اور آگے سب دھوپ تھی۔ اس کے چہرے اور گردن کے نیچے تک اور پیروں پر ٹخنے سے اوپر تک سائے کی عملداری تھی جسے دیکھ کر کوئی اجنبی، دھوپ کے اجالے کا تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا۔

"ہر بار اس کو استعمال کرنے کے لیے تمھیں آستین چڑھانا ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید گھڑی کھولنا بھی پڑے۔ مگر یہ احتیاط بہتر ہے۔ ان کو تمھارے ہاتھ پر کلائی کی گھڑی نظر نہ آئے۔"

"میں اسے آن کیوں نہ رکھوں؟" نازو بولی۔

"چوبیس گھنٹے آن رکھو گی؟" میں نے کہا۔ "اس کی بیٹری ایک دن بھی ساتھ نہیں دے گی۔ اسے تو ضرورت کے وقت استعمال کرنا ہے۔ کم سے کم الفاظ میں پیغام دینا ہے اور بس۔"

"کس کے لیے پیغام دینا ہے؟" محسن نے کہا۔

"تمھارے لیے اب کسی کا پیغام نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تم چپ رہو۔ لمبی گفتگو کرو گی تو یہ اندیشہ بھی رہے گا کہ کوئی سُن نہ لے۔"

"ہائے اللہ۔ کسی نے سُن لیا تو؟ کوئی آگیا تو؟" محسن نے لڑکیوں کی طرح کہا اور ایک دم دور بھاگ گیا۔ "تم اسے کیا سمجھا رہے ہو۔ لمبی گفتگو کرے گا وہ۔ چھ سے بارہ والا۔ دیوانِ غالب اور کلیاتِ میر سُنائے گا اور صبح تک بیٹری خلاص۔"

"تم بولنے دو اسے۔" میں نے نازو سے کہا۔ "تم اپنا کام سمجھتی ہو اور حالات کے مطابق خود احتیاط برت سکتی ہو۔ یہ دوسرا مقناطیسی مائک ہے۔ اسے بھی موقع دیکھ کر استعمال کرنا۔ اگر تم نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو ممکن ہے تمھیں کہیں آنے جانے پر کوئی نہ ٹوکے۔ باہر کا کام ہم پر چھوڑ دو۔ ہم تمھاری نگرانی اور حفاظت بھی کریں گے اور تمھارے ہر پیغام کو ریسیو بھی کریں گے۔"

غالب ایک گھنٹے میں لوٹ آیا تو ہم سب نے کھانا کھایا جو ایک رسمی کارروائی تھی۔ کھانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ سب کے دل پر خوف کا ایک بوجھ سا تھا کہ سوچا تو ہم نے بھابی نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مگر ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ نازو میک اپ اور اچھی اداکاری کے باوجود پکڑی جائے۔ وہ اتنے محتاط ہوں کہ کسی اجنبی کو اندر گھسنے ہی نہ دیں۔ یا بعد میں کسی موقع پر نازو کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ سارے خطرات نازو کے لیے تھے جسے ہم سب مل کر خطرے کی بھٹی میں جھونک رہے تھے۔ جانتے بوجھتے دشمنوں کے حصار کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہو سکتا تھا' اس کا تصور کرتے ہوئے بھی دل کانپتا تھا اور ہم خود کو مجرم محسوس کرتے ہوئے نظریں چار نہیں کر پاتے تھے۔ دو بار میں نے نازو سے کہا کہ ابھی وقت ہے اور وہ چاہے تو قدم آگے بڑھانے سے پہلے رک جائے۔ یہی بات دو بار محسن اور غالب دُہراتے رہے مگر وہ سب کا مذاق اڑاتی رہی اور سب پر ہنستی رہی کہ ڈرنا مجھے چاہیے مگر خوف سے تم سب کا بُرا حال ہے۔

شام کے چھ بجے میں نے اور غالب نے نازو کو ساتھ لیا اور ہم نے ایک خطرناک ترین مشن کے لیے روانگی اختیار کی۔ شہلا رونے کے قریب تھی مگر محسن نے اسے اندر سے جاکر ڈانٹا ڈپٹا تو وہ چپ کھڑی رہی۔ ہم نے جانتے بوجھتے تانگے میں سفر کیا۔ آدھے راستے میں مجھے خیال آیا کہ ہم نے سب کچھ لے لیا مگر ایف ایم بینڈ کا ریڈیو نہیں لیا۔ اس کے بغیر نازو کے ارسال کردہ پیغامات سنے ہی نہیں جا سکتے تھے۔

"یہ ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی گھوڑا لینے جائے تو نعلیں لے کر لوٹ آئے اور گھوڑا بھول آئے۔" غالب نے کہا۔

نازو ہنس پڑی۔ زبردستی۔

"گھوڑا اب لے لیتے ہیں۔ خریدتے ہوئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہیں جی، راہ میں گھوڑا خریدو گے؟" تانگے والا ایک دم چونکا۔ "خیر سے کیسا گھوڑا چاہیے۔ جنگی جان والا۔ جیسا یہ گھوڑا ہے۔ ایسا ہی لینا ہے تو آپ یہ لے لو۔ میں دوسرا پکڑ لوں گا۔"

"کہاں سے پکڑ لو گے؟ چڑیا گھر میں تو گھوڑا ہے نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس کے علاوہ ہم جس گھوڑے کی بات کر رہے تھے وہ بیٹری سیل سے چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ کھلونا لینا ہے۔" تانگے والے نے دانت نکال کے کہا۔

ایف ایم بینڈ والا ریڈیو کہیں نہ تھا۔ سب میں وہی میڈیم ویو یا شارٹ ویو بینڈ تھے جو عام گھروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ بجوراً مجھے کار ریڈیو لینا پڑا۔ یہ پھر وہی گھوڑے کے بغیر نعلیں لینے والی بات تھی۔ کار نہیں تھی مگر کار ریڈیو تھا۔ اس کے لیے کار بیٹری کی ضرورت تھی۔ وہ بھی ہم نے راستے ہی میں خریدی ور تانگے والے کو مطمئن کیا کہ اسے ڈبل راستے کا ڈبل کرایہ ضرور ادا کیا جائے گا۔ سب سے پہلے غالب اتر گیا۔ اس جگہ جہاں سے چند قدم کے فاصلے پر مونگ پھلی کی ریڑھی تھی۔ پھر نازو نے بھی وہیں اترنے کا فیصلہ کیا اور میں نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے اس کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔ "بیسٹ آف لک۔" میں نے کہا۔ نازو نے مسکرا کے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنایا اور تانگا آگے چل پڑا۔

یکلخت میرے دل کو اداسی نے اور مایوسی نے جکڑ لیا۔ میں نے تانگے والے کو بیس روپے دیے اور خود اتر کے چند قدم واپس گیا۔ نازو کو اب بھی واپس بلایا جا سکتا تھا۔ ابھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کل جب نقصان ہو جائے گا تو الزام صرف مجھ پر آئے گا جس نے یہ اسکیم پیش کی تھی۔ جس نے اوّل تا آخر اس کے ہر مرحلے میں نازو کی جان کو داؤ پر لگائے رکھا تھا اور اب وہ میری خواہش پر موت کے مشن پر گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے چلا کے واپس بلاؤں۔ مگر آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ نازو بہت آگے جا چکی تھی۔ اس کی بحفاظت واپسی کے لیے اب صرف دعا کی جا سکتی تھی۔ غالب کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ نازو کو بھی ریوالور فراہم کیا جا سکتا تھا۔ وہ خالی ہاتھ بھی مقابلہ کر سکتی تھی مگر جہاں وہ گئی تھی اور جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑنے والا تھا وہ بہت بے رحم' بے ضمیر اور خطرناک تھے۔ ان سے نازو کو صرف خدا کی ذات ہی محفوظ رکھ سکتی تھی۔

گلی کے موڑ پر غالب نے مونگ پھلی کی ریڑھی پر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ میں نے آلۂ سماعت کو کان میں لگا لیا۔ ایسا ہی دوسرا یونٹ غالب کے پاس تھا جو سو میٹر سے کم فاصلے پر تھا چنانچہ ہم آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے غالب سے پہلے رابطہ قائم کیا۔

"ابھی کچھ نہیں ہوا۔" غالب کی آواز میرے کان میں گونجی۔ "وہ دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔"

"میں سخت پشیمانی اور احساسِ جرم میں مبتلا ہوں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب کی کیفیت ایک سی ہے۔ میں نے تو دل کو پہلے ہی قائل کر لیا ہے کہ اب نازو سے اس دنیا میں ملاقات کی فقط اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ اگر وہ اور میں بہت خوش قسمت رہے تو پھر ملیں گے ورنہ اس کی یاد میرے ساتھ ہو گی۔ دمِ آخر تک۔"

"ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟" میں نے تقریباً رو کر کہا۔ "تم بھی تو رابعہ کو کھو چکے ہو۔ پھر پالو گے تو تمھاری قسمت کی خوبی اور خدا کی مہربانی۔" غالب بولا۔ "میں اور تم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔"

"خدا کے لیے بتاؤ نازو کیا کر رہی ہے؟"

"کسی نے دروازہ کھولا ہے۔ ایک عورت ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو اس سے کچھ کہہ رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"مونگ پھلی دینا ایک پاؤ۔" کسی کی آواز آئی۔ "فٹافٹ۔"

"ابھی لو سرکار۔" غالب نے اچانک آجانے والے گاہک سے کہا اور اس غلط وقت پر گاہک کا آنا مجھے سخت گراں گزرا۔ اپنے سوال کے جواب پر مجھے بالکل ہنسی نہیں آئی۔ میں غالب کو مونگ پھلی دیتے دیکھتا رہا۔

"اب... نازو ہاتھ جوڑ رہی ہے۔" غالب بولا۔ "عورت نے ایک بار دروازہ بند کر دیا تھا مگر وہ کھڑی رہی تھی... وہ اس عورت کے پاؤں پڑ رہی ہے۔ میرا خیال ہے اداکاری اچھی ہے۔ عورت رُک کر نازو کی بات سننے پر مجبور ہو گئی ہے۔ یہ وکٹر براوران کی بہن سونیا تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی کتنی عمر ہے؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ مگر ظاہر ہے نرس جوان ہی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"نرس کے بوڑھی ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔" غالب بولا۔ "یہ کچھ عمر رسیدہ عورت ہے۔ ہاں۔ اب ایک جوان عورت بھی آگئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں گفتگو نہیں سن سکتا حالانکہ نازو کی گھڑی کا ٹرانسمیٹر آن ہو گا۔ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ ورنہ دن میں ہی ریڈیو اور بیٹری بھی خرید لیتے تو اب تک ریڑھی پر فٹ ہو جاتے... خیر... لو بھائی سکندر۔ دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ نازو اندر پہنچ گئی ہے۔"

آدمی نے چاند پر قدم رکھ دیا ہے۔ یہ خبر ابھی نئی تھی۔ غالب کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے وہ نازو کے ایک دوسری دنیا میں پہنچ جانے کا اعلان کر رہا ہے۔ چاند کی اجنبی دنیا کے پُراسرار سفر پر روانہ ہونے والوں کو اپنی روانگی کے بعد واپسی کا کتنا یقین تھا؟ سائنس کی تمام تحقیق اور نتائج کی قبل از وقت معلومات پر دسترس کے باوجود وہ اس ایک لمحے پر مکمل اختیار کی ضمانت نہیں رکھتے تھے جو فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔ کہیں آنکھ سے اوجھل رہ جانے والی ایک مشینی غلطی یا کمپیوٹر کے برق رفتار ذہن سے سرزد ہو جانے والی حساب کی فروگزاشت اسی لمحے کے وجود کو تسلیم کراتی تھی۔ کروڑوں چھوٹے بڑے کل پُرزوں کے سرکٹ میں رونما ہو جانے والی خرابی لاکھوں سائنس دانوں اور انجینئروں کی آنکھ نہیں دیکھ پاتی۔ کون جانے نازو کو اس سفر پر روانہ کرنے سے قبل احتیاط اور انتظام کے سارے تقاضے پورے کرنے کے باوجود ہم سے کس مرحلے میں کون سی کوتاہی سرزد ہو گئی ہو جو اب اس کے لیے واپسی کو ناممکن بنا دے مگر اب ہم اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ وہ اس سیارے پر اتر چکی تھی جہاں ایک وحشی' درندہ صفت اور انسان دشمن مخلوق کی حکومت قائم تھی اور وہ اپنی حدودِ مملکت میں کسی کی داخل اندازی کو ناقابلِ معافی جرم تصور کرتی تھی۔

آدھا گھنٹا مکمل خاموشی میں گزر گیا جس میں ہر دس سیکنڈ بعد میں غالب سے ایک ہی بات پوچھتا تھا۔ "کوئی خبر؟" اور غالب ایک ہی جواب دیتا تھا۔ "کچھ نہیں۔" انتظار کی کوفت آہستہ آہستہ جھنجلاہٹ میں بدلنے لگی تھی۔ اعصابی کشیدگی کا شکار غالب بھی تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا یا پھر کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے یہی کہتا رہا کہ ہم نازو کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ پھر پریشان ہونے سے کیا حاصل۔ میں دُہرے عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک طرف رابعہ تھی جس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جب مجھے موقع ملا تھا تو میں نے گنوا دیا تھا۔ ایک مجبوری نے میرے قدم پکڑ لیے تھے اور اب مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔

جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہیں ایک میڈیکل اسٹور تھا اور مالک کسی کو فون کر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب اس نے ریسیور رکھا تو میں دکان میں داخل ہو گیا۔ وہ عجیب آدم بیزار شخص تھا لیکن میں نے کہا کہ مجھے ایک ڈاکٹر کو فون کرنا ہے اور ایک مریض کی خیریت دریافت کرنی ہے تو وہ مان گیا۔ ریسیور خود ڈاکٹر لطیف نے اٹھایا۔

"ڈاکٹر لطیف۔" میں نے کہا۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"سکندر... ہاں بھئی۔" انھوں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کیا حال ہے؟"

"حال تو مجھے رابعہ کا معلوم کرنا تھا۔" میں نے کہا۔

"ٹیلی فون پر؟ کیا تم اس وقت بھی نہیں آسکتے؟"

"میں کیوں نہیں آسکا تھا' اس کی وجہ تو آپ کو معلوم ہو گئی ہو گی۔" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "مجبوری ایسی تھی۔"

"مجبور ہم سب ہیں۔ مختار کوئی نہیں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "مگر کبھی دوسروں کی مجبوری پر اپنی مجبوری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ خواہ اس سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ چھوٹی چھوٹی مجبوریوں کے عذر..."

"وہ چھوٹی مجبوری نہیں تھی انکل۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس سے کتنی بڑی خرابی پیدا ہو گی۔" ڈاکٹر لطیف نے برہمی سے کہا۔ "تم کو تو ابھی اس کا اندازہ بھی نہیں ہے؟"

"خدانخواستہ... رابعہ کو... وہ ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "کیا میں آجاؤں۔؟"

"بہتر ہوگا کہ تم آجاؤ۔ فون پر میں کیا بتاؤں۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"آپ بتادیں۔ میں سب کچھ سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ جائے تب بھی میں یہ صدمہ جھیل کے جی لوں گا۔"

"مرنے والے کے لیے صبر آجاتا ہے۔ اس دنیا میں بچھڑ جانے والے پر آدمی رو کر نہیں بیٹھ سکتا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس کی واپسی کی آس تڑپاتی رہتی ہے۔"

"واپسی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ آج تمھارے نہ آنے کا ردِ عمل بہت شدید ہوا تھا۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "اس نے میری ایک نہیں مانی۔ یہی کہتی رہی کہ تم سب جھوٹ بولتے ہو اور مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ وہ سارا دن روتی رہی۔ اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا شام کو وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔"

"کیا! کمرے میں نہیں تھی؟" میں نے چلا کر کہا۔ "پھر کہاں تھی؟"

"کہیں بھی نہیں تھی۔ تمھاری آنٹی نے مجھے بتایا کہ رابعہ نے ان سے کچھ کہا تھا۔ یہی کہ سکندر ضرور کسی اسپتال میں زخمی پڑا ہوا ہے۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا۔ میں خود اسپتالوں میں دیکھوں گی۔ ایمرجنسی میں یا پھر آرتھو پیڈک میں۔ معلوم نہیں۔ وہ کس حال میں ہوگا۔ میں یہاں آرام سے بیٹھی ہوں اور کوئی مجھے بتاتا بھی نہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ اسپتال میں جا سکتی ہے؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "او مائی گاڈ۔ وہ کہاں کہاں جائے گی۔ کس طرح جائے گی؛ اس پاگل پن میں پیدل پھرے گی۔"

"وہ تو خالی ہاتھ نکل گئی ہے۔ اس کا پرس تک یہیں پڑا ہوا ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔

"ڈاکٹر لطیف! کیا آپ نہیں سمجھتے کہ وہ... وہ ذہنی طور پر معذور ہے اور کوئی بھی اس کی معذوری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "وہ غلط افراد کے ہاتھوں میں جا سکتی ہے۔ کوئی بھی اس سے کہہ دے کہ چلو میں تم کو بتاتا ہوں سکندر کہاں ہے تو وہ اس کے ساتھ ہو لے گی۔"

"میں یہ سب تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اس وقت جذباتی ہو کر یہ بھول رہے ہو کہ میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اور میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے کہ رابعہ کی ذہنی کیفیت کیا ہے اور اس کیفیت میں اس کا رویہ اور ردِ عمل کیا ہو سکتا ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ صرف ٹیلی فون پر چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں... آپ نے کچھ کیا ہے ابھی تک؟ یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"غالباً دو سے تین گھنٹے ہوئے ہیں اس کو نکلے ہوئے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا۔ "تین گھنٹے پہلے وہ موجود تھی۔ اب دو گھنٹے سے غائب ہے۔ میں نے فون کیے ہیں۔ اسپتالوں میں ڈاکٹر مجھے جانتے ہیں لیکن میں سب کو یہ بات نہیں بتا سکتا۔ ایمرجنسی اور آرتھوپیڈک وارڈ تو ہر اسپتال میں ہوتے ہیں کیا معلوم وہ کہاں پہنچے گی لیکن میں نے میو اسپتال۔ گنگا رام ہوسپٹل۔ البرٹ وکٹر اور گلاب سنگھ جیوٹ دیوی اسپتال کے علاوہ کچھ مشہور اور بڑے پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی بات کی ہے۔ یہ کہا ہے کہ کوئی عورت سکندر نام کے کسی شخص کو پوچھتی ہوئی آئے تو اسے روک لیا جائے۔ اگر تم آسکتے ہو تو آجاؤ۔ ہم چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

"میں آتا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دکان دار کو... پیسے دیے اور باہر آگیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ رابعہ اس وقت کس سڑک پر اور کس سمت میں رواں ہوگی۔

وہ ہر ایک سے پوچھتی پھرے گی کہ تم نے سکندر کو تو نہیں دیکھا؛ تم نہیں جانتے میرے سکندر کو؟ غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی۔ دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری۔ کہیں نہ کہیں رابعہ کو پہچان لیا جائے گا۔ کوئی اس سے پوچھ بیٹھے گا کہ تم وہی رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہو نا؛ وہ اقرار کرے گی۔ اور تم اس سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہو نا؛ وہ پھر اقرار کرے گی کہ ہاں میں اسی سکندر بخت کو تلاش کر رہی ہوں جو میرا محبوب ہے۔ میری تمنا ہے اور جستجو ہے لیکن دنیا کسی رابعہ کے محبوب سکندر کو نہیں جانتی۔ ایک مفرور اور مطلوب مجرم سکندر بخت کو جانتی ہے۔ ایمرجنسی وارڈ میں ہر جگہ پولیس ضرور موجود ہوتی ہے۔ وہ اس نام کو بھولے نہیں ہوں گے یہ ایک لاکھ روپے کے نوٹ کا نام ہے۔ یہ سکندر بخت کو گرفتار کرانے والے کا انعام ہے۔ میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ کسی اسپتال میں رابعہ کو تلاش کرتا پھروں گا۔ وہ مجھے دوسرے اسپتال میں پوچھتی پھرے گی۔ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال۔ پیدل۔ جسمانی تھکن کے احساس سے بے نیاز۔ بھوک پیاس سے بے پروا۔ رات کے اندھیرے سے بے خوف۔ اندھیرے میں گھومنے والے بھوکے ہوسناک بھیڑیوں کے وجود سے بے خبر۔ اس شہر کی سڑکوں پر وہ رات بھر چلتی رہے گی اور میں رات بھر اس کی تلاش میں سرگرداں رہوں گا مگر کہیں کسی راستے پر میرا اس کو یا اس کا مجھے دیکھ لینا مشکل ہوگا۔ عملاً ناممکن۔ اس کا چانس ایک لاکھ کے مقابلے میں ایک کا بھی نہیں۔ خصوصاً اندھیری سڑکوں پر۔ اور کون جانے اس شب کی سحر ہونے تک کون کہاں پہنچے۔ وہ اور میں الگ الگ پکڑے جائیں اور شکاری ہمیں ایک دوسرے سے بہت دور، کبھی نہ ملنے کے لیے پسِ دیوارِ زنداں پہنچا دیں۔ مگر اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ رابعہ کے علاوہ میں سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ انجام کچھ بھی ہو، مجھے اس کو تلاش کرنا ہوگا۔

"غالب" میں نے اپنی جگہ پہنچ کے وائرلیس پر کہا۔ "میں حال ابھی۔"

"یار، وہ نازو کا پہلا پیغام ملا ہے ابھی ابھی..."

"غالب! رابعہ پاگل پن میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکل گئی ہے اور اسپتالوں میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"نازو نے مجھے بتایا ہے کہ..."

"اگر وہ بھٹکتی رہی تو مشکل میں گرفتار ہو جائے گی۔" میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اسے تلاش کرنے۔"

"تم بھی پاگل ہو گئے ہو کیا؟" غالب نے برہمی سے کہا۔ "رابعہ ہی سب کچھ نہیں ہے، نازو بھی ہے۔"

"میرے لیے رابعہ ہی سب کچھ ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "اس کے بغیر میں خود بھی کچھ نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔"

"ایم آر ایس کا یہ مشن تمھارے ذہن کی پیداوار تھا۔" غالب نے مشتعل ہو کے کہا۔ "اب تم یہ سننے کے روادار بھی نہیں کہ نازو نے کیا کہا ہے۔ اس کو تم نے ہی بھیجا تھا اس جہنم میں..." وہ بولتا رہا مگر میں نے نہیں سنا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر میں نے ایک رکشے کو سواریاں اتارتے دیکھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر رکشا پکڑنے کے لیے سڑک عبور کرنے لگا۔ بائیں طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ گاڑی کے پہیے جام ہو گئے اور پھر سڑک سے رگڑ کھا کے چیختے ہوئے، گاڑی کے بھاری وجود کو اپنی ہی قوت میں گھسیٹتے ہوئے اور اپنے پیچھے ایک سیاہ لکیر چھوڑتے ہوئے بڑھتے گئے۔ میں نے گاڑی کی چندھیا دینے والی روشنی کو یوں دیکھا جیسے شکار ہونے والا کمزور جانور شکاری چیتے کی انگارا آنکھوں کو روبرو دیکھتا ہے اور مفلوج ہو جاتا ہے۔ گاڑی نے ٹکر مارنے کے بعد مجھے اوپر اچھال دیا۔ میں فضا میں تھوڑا سا بلند ہوا۔ درد کی شدید لہر نے میری ٹانگیں بے کار کر دی تھیں چنانچہ میں نیچے آیا تو پیروں پر نہ اتر سکا۔ میں تارکول کی پکی سڑک پر پتھر کی طرح گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اپنی کم ہوتی ہوئی رفتار کے باوجود وہی گاڑی کچھ اور آگے آ کے میرے جسم پر سے گزرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اَن گنت روشنیاں دیکھیں۔ ستاروں کی روشنی۔ سڑک پر رواں دواں گاڑیوں کی روشنی۔ بجلی کے کھمبوں کی روشنی۔ پھر روشنی کے دائرے سے بن گئے اور گھومنے لگے۔ مدھم پڑنے لگے۔ میرے کانوں نے آوازوں کا شور سنا جو رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔

آنکھ کھلی۔ تھوڑی سی کھلیں تو میرے سامنے روشنی میں سائے سے تیرنے لگے۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں میرے کان سے ٹکرائیں۔ میں نے پلکیں جھپکا کے دیکھا۔ سائے واضح ہو گئے۔ وہ سب انسانی ہیولے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے اور الفاظ کہیں کہیں سے سنائی دینے لگے تھے۔

"کس طرح... دیکھیے... دماغ پر چوٹ... عارضی اثرات۔"

"خطرے کی بات..."

"نہیں... دماغ کے اندر جھلی میں... جھٹکا لگتا ہے تو دماغ ہل جاتا ہے... اور اس سے بے ہوشی... وقتی اثر... بالکل وقتی۔ آٹھ سے بارہ گھنٹے میں ہوش آنا چاہیے۔"

"اور نہ آیا تو؟" اب میں نے بالکل واضح طور پر ایک عورت کی آواز سنی۔

"خدا پر بھروسا رکھیں۔ آخر ہم ڈاکٹر ہیں۔ کچھ علم اور کچھ تجربہ رکھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ پہلا کیس نہیں ہے۔"

"کیا کسی طرح بھی ذہن متاثر ہوگا؟" وہی عورت بولی۔

"ابھی تو آثار نہیں ہیں۔" مرد نے کہا۔ "سب ریسپانس نارمل ہیں۔"

"میرا مطلب تھا یادداشت۔" عورت نے کہا۔

"اس کا پتا تو ہوش میں آنے کے بعد چلے گا۔" وہ یقیناً کوئی ڈاکٹر تھا۔

اتنی دیر میں میری آنکھیں بھی سایوں کو شناخت کرنے لگی تھیں۔ اجالے کے رُخ مجھے رابعہ کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے سر گھمایا اور دوسری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر پلٹ کر جا رہا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور غائب ہو گیا۔ بند کمرے کی تنہائی میں میرے ساتھ صرف رابعہ رہ گئی۔ میں نے اس کمرے کو، اپنے بستر کو اور لائٹس کو دیکھا۔ میری ناک نے دواؤں کی مخصوص بو کو محسوس کیا اور ایک دم مجھے یاد آگیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اب میں کسی اسپتال میں تھا مگر رابعہ؟ کیا اس کار سے ایکسیڈنٹ کے بعد رابعہ مجھے یہاں لائی تھی؟

"رابعہ!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"سکندر!" رابعہ نے فرطِ مسرت سے چیخ ماری اور بیڈ پر بیٹھ کر میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ "خدا کا شکر ہے۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کے رونے لگی۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کو جلانے لگے۔ "یہ خدا کا احسان ہے مجھ پر... اس نے دعا سن لی میری... تم نے مجھے پہچان لیا۔"

"رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ "میں تو نہیں رو رہا تھا۔ جب تم میرے ساتھ تھیں اور میں تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ تم تو مجھے چھوڑ گئی تھیں۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں خود ہی آگئی۔ انھوں نے مجھے روک رکھا تھا۔ قید کر رکھا تھا اور وہ مجھ سے جھوٹ بولتے تھے۔" رابعہ نے روتے روتے کہا۔ "وہ مجھے آنے دیتے تو میں بہت پہلے تم کو تلاش کر لیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم زخمی ہو۔ کسی حادثے کا شکار ہوئے ہو لیکن ڈاکٹر لطیف مجھ سے غلط بیانی کرتے رہے۔ کہتے رہے کہ تم کو کچھ بھی نہیں ہوا... میرا دل جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وعدہ کرنے کے باوجود تم کیوں نہیں آئے تھے۔"

"لیکن تم... تم یہاں کیسے آگئیں؟" میں نے کہا۔ "یہاں مجھے کون لے کر آیا تھا؟"

"یہ سب تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں تم کو تلاش کرتی پھر رہی تھی ہر اسپتال میں... اور یہاں پہنچی تو میں نے تمھیں پا لیا۔ میری محبت نے مجھے یہ راستہ دکھایا اور یہاں لے آئی۔ اب تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں ہوں۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"اور تم... تم ٹھیک ہو؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ محبت کی معجزہ نمائی تھی جس نے وقت کے ہر لمحے کا اور سارے راستوں کا تعین کیا تھا۔ اسی محبت نے سب سے پہلے رابعہ کو خبر دی تھی کہ سکندر کی گاڑی ایک حادثے میں تباہ ہوئی ہے۔ اسے رات کے دو بجے جگا کے یہ خبر سنائی تھی۔ اگر اس رات ڈاکٹر لطیف نے رابعہ کا راستہ نہ روکا ہوتا تو شاید وہ ٹھیک اس جگہ پہنچ جاتی جہاں میں تھا۔ محبت کا یہ قطب نما جذبۂ دل کی قوت پر راہنمائی کرتا تھا۔ اس نے بالآخر رابعہ کو رہائی دلائی اور اسے وہاں پہنچا دیا جہاں میں سچ مچ ایک حادثے کا شکار ہو کے اسپتال کے بستر پہ لیٹا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ خود غالب کو اس حادثے کی خبر نہیں تھی جو مجھ سے سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھا لیکن اس وقت قدرت نے راستوں کو وقت کے لمحوں سے لانے کا نیا اہتمام کیا۔ اس نے مجھے فون کرنے بھیجا اور یوں مجھے نیم دیوانگی کی کیفیت میں حادثے سے دوچار کیا۔ ٹھیک وقت پر پسِ پردہ رہنے والے تقدیر کے ہاتھ نے مجھے اس اسپتال میں پہنچایا اور عین اسی وقت رابعہ کی تلاش اور اس کی قیدِ تنہائی اور دیوانگی سے تمام ہوئی۔ اس نے مجھے زخمی پایا اور یکلخت اس کے دماغ نے دل کی بات مان لی۔ یہ تسلیم کر لیا کہ سچ وہی تھا جو دل کہتا تھا۔ وہ حقیقت تھی اس کا تصور نہیں تھا اور فریبِ خیال نہیں تھا جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل اور دماغ کے درمیان جاری رہنے والی کشمکش باقی نہ رہی۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں واقعی زخمی ہوں لیکن میری حالت تشویشناک نہیں ہے۔ میں شدید زخمی نہیں ہوں۔

اسپتال کے کسی ڈاکٹر نے یقیناً اسے میرے ساتھ ہی دیکھا ہوگا۔ اسی لمحے وہ رابعہ کو میری حالت کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"میں نے بتایا نا، مجھے بھلا کیا ہوا تھا جو تمھیں میرے بارے میں اتنی تشویش ہے؟"

"یہ اسپتال کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

"البرٹ وکٹر اسپتال۔" وہ بولی۔ "اس سے پہلے میں میو اسپتال میں دیکھ چکی تھی اور گنگا رام اسپتال ہو آئی تھی۔"

"تم میرا نام پوچھتی پھر رہی تھیں؟" میں نے پریشان ہو کے کہا۔ مجھے ڈاکٹر لطیف کی بات یاد آگئی تھی کہ انھوں نے سب اسپتالوں کو میرا نام لے کر کچھ پوچھنے والی عورت کو روکنے کی ہدایت کر دی ہے۔ ان میں البرٹ وکٹر اسپتال بھی شامل تھا۔

"کیا میں اتنی احمق ہوں؟" رابعہ نے مسکرا کے کہا۔ "میں خود تمھیں دیکھتی پھر رہی تھی۔"

"تم واقعی احمق ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ان دو اسپتالوں میں کتنے وارڈ ہیں۔ کتنا پھرنا پڑا ہوگا تمھیں۔"

"زیادہ نہیں۔ میو اسپتال میں ایمرجنسی اور ہڈیوں کے وارڈ دیکھے کیونکہ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے حادثے میں تمھاری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کسی نے روکا نہیں تمھیں؟" میں نے کہا۔

"روکتا کیوں؟" وہ حیران ہو کے بولی۔ "ملاقات کا وقت تھا سب ہی آ جا رہے تھے۔"

"اور یہ سب فاصلہ تم نے پیدل ہی طے کیا؟"

"ہاں... مگر یہ فاصلہ ہی کتنا ہے۔" وہ بولی۔ "میں ڈاکٹر لطیف کے گھر سے نکلتے ہوئے اپنا پرس لینا بھول گئی تھی۔"

یہ فاصلہ کم نہیں تھا۔ رابعہ نے میلوں کی مسافت طے کی تھی لیکن اسے احساس نہیں ہوا تھا۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ اس حادثے کو بہانہ بنا کے قدرت نے اسے پھر مجھ سے ملا دیا ورنہ میں بھی وہی سمجھ رہا تھا جو دنیا کا خیال تھا کہ اب شاید وہ لوٹ کر نہ آسکے۔

"رابعہ! میں یہاں لیٹا نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "کیا کسی نے بھی یہاں میرا نام نہیں پوچھا۔ یہ تو پرائیویٹ کمرہ ہے۔"

"ہاں تم کو وہی گاڑی والا لایا تھا۔ جس کی کار سے تمھاری ٹکر ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ تم دیوانہ وار سڑک پار کرنے کے لیے بھاگے تھے۔" رابعہ نے کہا۔ "نیک دل آدمی تھا۔ پانچ ہزار یہاں بھی جمع کرا گیا تھا۔ اور تمھارے تکیے کے نیچے بھی دس ہزار چھوڑ گیا۔ اس نے تمھارا نام فرخ لکھوایا تھا۔"

میں نے تکیہ اٹھا کے دیکھا۔ اس کے نیچے واقعی دس ہزار موجود تھے۔ وہ آدمی نیک تھا یا نہیں، پیسے والا ضرور تھا اور پیسے کا صحیح استعمال بھی جانتا تھا۔ اس نے خود کو پولیس کیس سے بچانے کے لیے پیسہ فراخدلی سے استعمال کیا تھا۔ شاید اس نے کہا ہوگا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے جس کو سڑک پر کوئی شخص گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا۔

"آخر وہ تھا کون؟" میں نے کہا۔ "اور پھر گیا کہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔ جب میں نے تمھیں دیکھا تو میں رک گئی اور ڈاکٹر مجھ سے ہی بات کرتا رہا۔" رابعہ نے کہا۔ "کوئی پولیس آفیسر تھا۔ رضوی..."

میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ رضوی؟ ایس ایس پی رضوی؟ کیا انھوں نے مجھے پہچانا نہیں تھا؟ کیا رابعہ کو یاد نہیں کہ رضوی نام کا پولیس افسر کون ہوگا؟

"رابعہ! سوچ کے بتاؤ وہ ایس ایس پی تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے انکل ضامن رضوی تو نہیں تھے؟" رابعہ مسکرائی۔ "یہ تو تمھارے سوچنے کی بات ہے۔ وہ ہوتے تو کیا تمھیں یوں چھوڑ جاتے اور ان کے پاس شاید بنک میں پندرہ ہزار ہوں گے تو اپنی تنخواہ میں سے بچائے ہوئے ہوں گے۔ وہ پندرہ ہزار جیب میں نہیں لیے پھرتے۔ ان کے پاس حرام کی کمائی نہیں ہوتی کہ اس طرح پھینک کر بھاگ جاتے۔"

"کیا تم نے اس پولیس افسر کو دیکھا تھا؟"

"نہیں... وہ اسی وقت گیا تھا جب میں پہنچی تھی۔" وہ بولی۔ "میرے آنے سے چند ہی منٹ پہلے۔ لیکن جو کچھ مجھے ڈاکٹر نے بتایا، اس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ انسپکٹر کے عہدے کا کوئی افسر تھا اور اس نے حادثے کی ذمے داری سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔"

"وہ مجھے ٹکر مار کے بھاگ بھی سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی کہ وہ رکنے پر مجبور ہوا۔" رابعہ بولی۔ "وہاں ٹریفک زیادہ ہوگا۔ مجمع لگ گیا ہوگا۔ وہ ہوشیار آدمی تھا اور خود پولیس میں تھا اس لیے پریشان نہیں ہوا۔ فوراً تمھیں اپنی گاڑی میں ڈال کے چل پڑا۔ لوگ اس کی شرافت اور احساسِ ذمے داری سے متاثر ہوئے ہوں گے اور مطمئن ہو کے منتشر ہو گئے ہوں گے یا ممکن ہے اس کے ساتھ بھی دو زیادہ جوشیلے اور ہر معاملے میں آگے رہنے والے ہمدرد قسم کے لوگ بیٹھ گئے ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "وہ اپنی چالاکی اور حاضر دماغی سے بچ گیا لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی بدحواسی کی وجہ سے میں بچ گیا۔ یہاں آکے اس نے بڑی مستعدی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ فوراً ایمرجنسی وارڈ میں ایمرجنسی پھیلا دی ہوگی کہ سب کو چھوڑ دو... پہلے اس زخمی کو دیکھو۔ ساتھ آنے والے بعد متاثر ہوئے ہوں گے اور جب وہ پندرہ ہزار دے کر اور مجھے داخل کرا کے گیا ہوگا تو شاید اس پولیس انسپکٹر کی نیت پر شک کرنے والے شرمندہ اور مطمئن ہو کے پہلے ہی جا چکے ہوں گے۔"

"تم چاہو تو ڈاکٹر سے بات کر لو۔" رابعہ نے ایک نوجوان کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ نوجوان صرف اسٹیتھیسکوپ کی وجہ سے ڈاکٹر نظر آتا تھا، ورنہ حلیے سے وہ نئی نسل کا نمائندہ تھا۔

"ہیلو!" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ "لُکنگ فائن۔"

"خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب... آئی فیل فٹ۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ میں تم کو فٹ قرار دے کر ڈسچارج کر دوں تو یہ مشکل ہے۔ تم ٹھیک نہیں... بلکہ بہتر ہو... اس حد تک کہ ہوش میں آگئے ہو لیکن تم کو کم سے کم مزید دو دن یہاں رہنا ہوگا۔"

"کسی وجہ کے بغیر...؟"

"وجہ کو ہم سمجھتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہوش کا یہ وقفہ عارضی بھی ہو سکتا ہے۔ تم کو انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہے۔ میں ذاتی طور پہ پہلے بھی مطمئن تھا کہ بے ہوشی کا اثر عارضی ہے لیکن اولڈ مین مجھ سے متفق نہیں تھا۔"

"کون اولڈ مین؟" میں نے کہا۔

"ہمارے سینئر ڈاکٹر۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر آف نیورو سرجری جن کے پاس دس ڈگریاں ہیں مگر سب آؤٹ آف ڈیٹ۔"

"کیا ڈگری بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہے فیشن کی طرح؟"

"آف کورس... علم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تحقیق مسلسل جاری ہے اور دنیا بھر کے دوا ساز ادارے ریسرچ پر زیادہ سے زیادہ رقم صرف کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پرانے نظریات بدل گئے ہیں۔ بعض نظریات الٹ گئے ہیں۔ میں اسپرین کی مثال دیتا ہوں۔ پہلے کہا گیا کہ اس سے دل پہ برا اثر پڑتا ہے۔ اب ثابت ہوا ہے کہ اسپرین دل کے دورے سے بچاتی ہے۔ یہ سب ریسرچ کا نتیجہ ہے مگر یہ پرانی ڈگریاں رکھنے والے محض نام کے دام وصول کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی فیس لے کر اور بڑے بڑے عہدے سنبھال کر مطمئن ہیں۔ یہ طب اور میڈیسن میں نئے رجحانات سے ناواقف ہیں اور نئی معلومات سے استفادہ کرنے کے لیے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ ایک ڈاکٹر کی معلومات بالکل وقت کے ساتھ رہنی چاہئیں۔ اسے نئی دواؤں کے بارے میں، نئے امراض کے بارے میں اور امراض کے نئے اسباب کے بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ پڑھنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے پیسہ کما رہے ہیں۔ دو گھنٹے ایک پرائیویٹ کلینک میں تو دو گھنٹے دوسرے میں۔ ہر جگہ ڈگریوں سے متاثر ہونے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

والے مریض منتظر ملتے ہیں۔ لوگوں کے یقین کا یہ حال ہے کہ وہ دس دس دن بعد کی ڈیٹ لینا قبول کرتے ہیں مگر ہم جیسے نوجوان ڈاکٹروں سے مشورہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اُن کے خیال میں ہم ناتجربہ کار، غیر ذمے دار اور احمق ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ آج کے دَور کی مکمل معلومات رکھتے ہیں۔ ہم میں زیادہ انرجی ہے اور زیادہ جذبہ ہے۔ ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ ہم ان بوڑھے ڈاکٹروں کی بھی سنتے ہیں اور ان کے تجربے کو نظرانداز نہیں کرتے مگر اپنے جدید ترین ذخیرۂ معلومات سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جو ان بوڑھوں کے پاس نہیں ہے۔"

"تم ان سینیئر ڈاکٹروں سے بہت خفا ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں ہی نہیں... یہ ہم سب نئی نسل کے ڈاکٹروں کا المیہ ہے۔" نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ سینیئر ہمیں اپرنٹس سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ابھی زیرِتعلیم ہیں اور ہماری ڈگری بھی بوگس ہے۔ انھوں نے اپنے ناموں سے اور ڈگریوں کی قطار سے ایک امیج بنا رکھا ہے اور اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سینیئر ڈاکٹر ایک سے ہوتے ہیں۔ کچھ یقیناً اپنی نالج کو اپٹوڈیٹ رکھنے کے لیے وہ سب لٹریچر پڑھتے ہوں گے جو دواساز کمپنیوں کی معرفت ان تک پہنچتا رہتا ہے اور جس سے نئے نظریات و رجحانات اور نئی دواؤں کے بارے میں مفصل معلومات مل جاتی ہیں۔ مگر اکثریت اس کی زحمت نہیں کرتی۔ کیا ضرورت ہے انھیں جبکہ عزت، شہرت اور دولت اس کے بغیر ہی حاصل ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ ان میں سے کچھ بڈھے طوطے پرانا پڑھا ہوا بھی بھول گئے ہوں گے اور ان کے پاس تجربہ ہی تجربہ ہے۔ علم نہیں ہے یا ہے تو اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ آج ان کا پھر امتحان لیا جائے تو یہ فیل ہو جائیں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "کیا یہ مبالغہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اگر تم بُرا نہ مانو۔ اور آپ بھی خاتون... تو میں ایک سگریٹ پی لوں۔"

"ضرور پیئیں۔" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "بلکہ اجازت ہے تو مجھے بھی دیں۔"

"اجازت ہوتی تو نہیں ہسپتالوں میں۔" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں... قواعد و ضوابط... ریڈٹیپ۔" وہ سگریٹ کیس نکال کے بولا۔ "ٹھیک ہے بھئی آپریشن تھیٹر میں پابندی ہونی چاہیے۔ جنرل وارڈ میں ٹھیک ہے کہ دوسرے بھی ہوتے ہیں وہاں جو اس کی بُو سے الرجک ہوں۔ اسٹور میں یا آفس میں بھی پابندی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ایک پرائیویٹ کمرہ ہے۔ یہاں ڈاکٹر اور مریض دونوں سگریٹ پیتے ہیں تو کسی کو نقصان نہیں ہو سکتا۔ دُھواں اس کمرے میں رہے گا اور اس کھڑکی سے باہر نکل جائے گا۔ ہاں تمھاری صحت کے لیے سگریٹ یا اس کا دُھواں مُضر ہوتا تو میں خود تمھیں یہ حرکت نہ کرنے دیتا۔" اُس نے بیک وقت دو سگریٹ جلائے اور ایک کش لگانے کے بعد ایک سگریٹ مجھے تھما دیا۔ مجھے وہ نوجوان اور بےتکلف ڈاکٹر اچھا لگا۔

"دراصل میں بہت تھک گیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس لیے ذرا رک گیا ہوں۔ اولڈ مین صرف ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس کا صرف یہ کام ہے کہ دن میں دو چکر لگائے اور دیکھے کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں، ڈاکٹر ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں یا نہیں، نرسیں دوڑی بھاگی پھر رہی ہیں یا نہیں؟ کہیں وہ آپس میں زیادہ رومانٹک تو نہیں ہو رہے ہیں۔"

اب رابعہ کو بھی ہنسی آئی۔ "کیا اُن کا رومانٹک ہونا جرم ہے؟"

"ان کا رومانٹک ہونا سخت جرم ہے۔ اُن کو ہر وقت ڈاکٹر اور نرس رہنا چاہیے۔ یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ مرد و عورت ہیں۔" ڈاکٹر نے اسی لہجے میں کہا۔ "قواعد و ضوابط یہاں بھی ظالم سماج سے کم نہیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک ڈاکٹر کسی نرس کو پسند کرتا ہے یا نرس کسی ڈاکٹر کو چاہتی ہے تو وہ ایک اچھی ٹیم بنتے ہیں۔ اس نرس کو کسی ایسے ڈاکٹر کے ساتھ لگا دو جس کی صورت سے وہ چڑتی ہو اور ڈاکٹر کو اس نرس کے ساتھ نتھی کر دو جس کو دیکھ کر اُسے وحشت ہوتی ہو۔ تو کیا وہ ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں گے؟ نو سر... وہ زبردستی ڈیوٹی تو دیں گے مگر انتہائی بددلی کے ساتھ۔ ایک دوسرے کو چاہنے والے نرس اور ڈاکٹر ایک تشفی کے ساتھ کو ایک خوشگوار ساتھ سمجھتے ہوئے کوشش کریں گے کہ ان کا ساتھ قائم رہے۔ چنانچہ وہ مستعد رہیں گے اور کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ یہاں ایسا ہوا ہے کہ کسی ڈاکٹر نے کسی ایک نرس کے ساتھ شفقت پر اصرار کیا اور دو چار مرتبہ ایسا ہوا تو بن جائے گا افسانہ اور اولڈ مین کے کانوں تک بات پہنچے گی تو وہ فوراً فلمی ہدایت کار کی طرح کہے گا... کٹ... اور رومانٹک سین وہیں ختم۔ اگلے دن ایک بیزار ٹیم بنا دی جائے گی۔ ایک دوسرے سے بیزار، مریضوں سے بیزار... قواعد و ضوابط سے بیزار۔ یو سی مسٹر فرخ۔ یہ پورا معاشرہ ایک انقلاب مانگتا ہے۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ علامہ اقبال کے کہنے کے مطابق۔"

میں ہی نہیں، ڈاکٹر کی گفتگو سے رابعہ بھی متاثر ہوئی تھی اور معلوم نہیں کیا بات تھی کہ وہ میرے کمرے میں دم لینے رکا تھا اور اس نے اتنی بےتکلفی سے اظہارِ خیال کیا تھا جیسے ہم پرانے شناسا ہیں اور ہم خیال ہیں۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ ورنہ عموماً لوگ ڈاکٹر یا وکیل اور گورکن وغیرہ سے مل کر خوش نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "میں کوشش کرتا ہوں کہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان قریبی اور ذاتی تعلق پیدا کروں۔ عموماً ان کے درمیان فاصلہ رہتا ہے۔ مریض خود کو بےبس اور ڈاکٹر کے رحم و کرم پر سمجھتا ہے اور ڈاکٹر کے لیے وہ ایک نمبر ہوتا ہے۔ وہ مریض کو نام سے نہیں، بیڈ نمبر سے پکارتے ہیں۔ چھ نمبر کی کیا پوزیشن ہے۔ دس نمبر کو ڈرپ لگا دو۔ بارہ نمبر کے ساتھ کون ہے اس سے کہو خون کا بندوبست کرے۔ یہ نمبر دی رہتے ہیں۔ اس پر مریض بدلتے رہتے ہیں۔ سال میں دس بیس یا چالیس پچاس بار چھ نمبر آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ اس سے مریض کو بھی احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اس کے مقابلے میں ایک بہت بڑی اور عظیم طاقت ہے جس کی خوشنودی میں شفا بھی ہے اور زندگی بھی۔ جو ہمارے بنیادی عقائد کے خلاف بھی ہے مگر اس سے مریض اور ڈاکٹر میں دوستانہ اعتماد کی فضا پیدا ہو ہی نہیں سکتی اور مریض کھل کر بات نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مریض پریشانی میں بہت سی فضول باتیں بھی کرتا ہے مگر بعض اوقات اس کی باتوں سے ہی ڈاکٹر بہت کچھ سمجھ لیتا ہے۔ میں اسی لیے زیادہ بولتا ہوں۔ اولڈ مین بہت ریزرو رہتا ہے اور مجھے سنجیدہ رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔"

"آپ نے ابھی تک خود کو متعارف نہیں کرایا۔" رابعہ بولی۔

"اور یہ جو میں اتنی دیر سے بول رہا ہوں۔ کیا یہ تعارف نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کا مطلب غالباً نام سے ہے۔ تو میرا نام ڈاکٹر فرخ ہے۔"

"فرخ؟" میں نے چونک کر رابعہ کی طرف دیکھا۔

"چونکیے نہیں۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کے شوہر کا نام بھی فرخ ہے۔ مگر دنیا فلمی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔"

رابعہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا مگر یہاں ڈاکٹر کی بات سننے والا میرے سوا کوئی نہ تھا چنانچہ وہ چپ رہی۔

"اس پر مجھے یاد آیا۔" میں نے کہا۔ "کہ اسپتال والوں کو میرا نام کس نے بتایا تھا؟"

"اس نے جو تمھیں داخل کرانے آیا تھا۔" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا... رضوی۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کس سے معلوم ہوا ہے؟" وہ بولا۔

"ان سے۔" میں نے رابعہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ان سے!" وہ ہنسا۔ "یہ بھی خوب ہے... ہمارے یہاں میاں بیوی کتنے تکلف سے کام لیتے ہیں۔ بیویاں بھی نام لینے کے بجائے کہتی ہیں ان کا یہ خیال ہے یا وہ یہ کہہ رہے تھے۔ ارے بھائی کہو کہ بیوی سے معلوم ہوا ہے۔ بیوی کو بیوی کہنا کون سا غیراخلاقی فعل ہے یا گناہ ہے... خواہ مخواہ کا ایک کمپلیکس ہے۔"

"آل رائٹ... میری بیوی نے بتایا تھا مجھے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"میں نے بھی سُنا تھا۔" رابعہ نے جلدی سے کہا۔

"مگر میں نے اُسے دیکھا تھا۔" ڈاکٹر اطمینان سے بولا۔ "وہ ایک عیار اور جھوٹا آدمی تھا... مجھے اس کے انسپکٹر ہونے پر بھی شک تھا۔"

"کیوں؟" میں اس انکشاف پر حیران ہوا۔ "کیا وہ وردی میں نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اُس نے کہا کہ میں انسپکٹر رضوی ہوں اور یہ میرا بھائی ہے فرخ رضوی۔" ڈاکٹر بولا۔ "کوئی اسے گاڑی سے ٹکر مار کے بھاگ گیا تھا... اُسے فوراً دیکھیں۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ تھا تمھارا..." میں نے کہا۔ "اسی بدمعاش نے تو ٹکر ماری تھی مجھے۔ پھر خود ہی یہاں لایا اور چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

ڈاکٹر نے اقرار میں سر ہلایا اور سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ پھر کھڑکی کی طرف لپکا۔ "مائی گڈنس، ابھی باہر سے اولڈ مین گزر رہا ہوتا تو دھماکا ہوتا۔ اگر سگریٹ اس کے سامنے بھی جا گرتی۔ وہ بارود کا بنا ہوا ہے۔"

رابعہ اس کی بات پر ہنسی۔ "آپ اسے اولڈ مین کہتے ہیں۔ وہ آپ کو کس نام سے پکارتا ہے۔"

"ینگ فول۔" ڈاکٹر فرخ نے پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بات کر رہا تھا اس انسپکٹر کی جو جعلی تھا۔ جب وہ تم کو لے کر آیا تو میں ڈیوٹی پر تھا۔ ہم مریض کو اٹینڈ کرتے ہیں۔ اسے لے کر آنے والے کے بارے میں تفتیش نہیں کرتے۔ یہ کام پولیس کرتی ہے۔ غالباً اسی لیے وہ فوراً انسپکٹر بن گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پُراعتماد آدمی تھا۔ اس نے بغیر مانگے پانچ ہزار جمع کرا دیے۔"

"دس ہزار وہ میرے پاس بھی چھوڑ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"باسٹرڈ! رشوت دے کر نکل گیا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تاہم میں نے اُسے دیکھا تھا۔"

"تم اس کا کچھ حلیہ وغیرہ بتا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ ڈارک براؤن سوٹ میں تھا۔ تیس پینتیس سال عمر ہو گی۔ قد درمیانہ اور جسم قدرے بھاری۔" ڈاکٹر بولا۔ "یہ بہت عام حلیہ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی شخصیت کا کوئی بہت نمایاں پہلو نہیں تھا۔"

"کیا کسی نے اس کی گاڑی نہیں دیکھی؟"

"مشکل ہے..." اس نے کہا۔ "گاڑیاں تو سب پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرتے ہیں۔ یہاں وارڈ کے سامنے وہ ایک منٹ کے لیے رکا ہو گا۔ صرف اتنی دیر جتنی دیر میں تم کو اتارا جا سکے۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا تو سامنے نہیں آیا... وہی آگے آگے تھا تمام معاملات میں اور ضرورت سے زیادہ شور کر رہا تھا۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "خود

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو اصلی انسپکٹر ثابت کرنے کے لیے... میری اس سے جھڑپ بھی ہوئی تھی، بکطرفہ۔ میں نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ یہ اسپتال ہے تھانہ نہیں... اگر تم ڈی ایس پی کیا ڈی آئی جی ہو تب بھی اپنی آواز سے مجھ پر رعب مت جھاڑو اور عملے کو ہراساں مت کرو، ورنہ میں ایک منٹ میں تم کو باہر پھینک دوں گا... بقلم خود۔"

"بقلم خود؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا تم ایسا کر سکتے تھے؟"

"میں ایک بار ایسا کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "بعد میں وہ انسپکٹر معطل ہو گیا تھا... یو سی... میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہمیشہ میرے دوست ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ میرا رویہ اُن کے ساتھ دوستانہ رہتا ہے۔ ڈونٹ مائینڈ اٹ لیڈی۔ نرسوں کے ساتھ یہ رویہ کچھ عاشقانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں مگر صرف پیشہ ورانہ... ان سب نے میرے حق میں گواہی دی کہ انسپکٹر نے مجھے گالیاں دی تھیں اور تھپڑ مارا تھا۔ جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

"پھر کیا ہوا تھا؟" رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

"وہی... اس نے مجھے ترڑی دی۔ میں نے کہا کہ اُٹھا کے باہر پھینک دوں گا... وہ تھا ڈھائی من کا۔ کہنے لگا کہ ہمت ہے تو پھینک کر دکھاؤ۔ میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر جا کے گرا اور لڑھک کر نیچے جا لیٹا۔ میری ٹیم کے ارکان اُسے اسٹریچر پر ڈال کے اُٹھا لائے اور وارڈ میں لے گئے۔" وہ بولا۔

"تم دیکھنے میں تو نارزن نہیں لگتے۔" میں نے کہا اور بے ساختہ ہنسا۔

"دیکھنے میں تو میں ڈاکٹر بھی نہیں لگتا۔" وہ بولا۔ "میں پہلوان بننا چاہتا تھا لیکن اکھاڑوں میں کشتی کم تھی بدمعاشی زیادہ... پھر میں نے باکسر بننے کی کوشش کی اور اس کا ثبوت میری ناک ہے۔" اس نے ربر کی محسوس ہونے والی ناک کو دونوں طرف موڑ کر کہا۔ "مجھے بچپن سے خواہش تھی کہ کسی سے مار نہ کھاؤں لیکن میں ذرا کمزور تھا چنانچہ سب سے پٹتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جسمانی طاقت کو کارآمد بنانے کے ہر فن میں ٹانگ اڑائی لیکن بالآخر وہی جوڈو کراٹے کا فن کام آیا جس میں میرا جسمانی طور پر بہت صحت مند ہونا ضروری نہیں تھا۔ بس پھرتی کی ضرورت تھی۔ چار سال تک یعنی ایم بی بی ایس کے آخری چار سالوں میں سخت پڑھائی کے ساتھ میں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بھی سخت محنت کی۔ حالانکہ اس زمانے میں محنت سے زیادہ وقت نکالنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ یہاں پر بلیک بیلٹ وغیرہ تو ایسے ہی مل جاتی ہے۔ بس میں خود مطمئن ہو گیا کہ اب مجھ سے زیادہ صحت مند چار آدمی مل کے بھی میری پٹائی نہیں کر سکتے۔ میرے بچپن کا کمپلیکس کام آ گیا۔ احساسِ کمتری میں مبتلا افراد اکثر کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے دنیا کو حیران کر دیتے ہیں... یہی میں نے بھی کیا۔"

"یو آر اے ونڈرفل مین۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے اُس جعلی انسپکٹر کا نام بھی رضوی نہیں ہو گا۔"

ڈاکٹر فرخ ہنسا۔ "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارا نام بھی فرخ نہیں سکندر بخت ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا اور نیچے کا نیچے۔ میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا اور میں نے ڈاکٹر فرخ کی طرف دیکھا جو اتنا بڑا دھماکا کر کے بھی اُسی طرح پُرسکون بیٹھا تھا۔ خود رابعہ کا رنگ اُڑ گیا تھا اور وہ ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

"یہ... یہ کس نے بتایا تمھیں؟" میں نے بالآخر خود کو سنبھالا۔

"ڈاکٹر لطیف نے۔ وہ ایک زمانے میں میرے استاد تھے اور میں آج بھی اُن کا احترام کرتا ہوں۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم دونوں پریشان کیوں ہو گئے؟"

"پریشان... نہیں... اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ میں خود تمھیں بتانے والا تھا کہ..."

"غلط۔ تم چاہتے تھے کہ تمھارا اصلی نام کسی کو معلوم نہ ہو۔" ڈاکٹر فرخ نے کہا۔ "تم فرخ بنے ہوئے تھے اور فرخ ہی رہنا چاہتے تھے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے ایک واجبی سی کوشش کی۔

"مائی ڈیئر سر! تم تو بے ہوش تھے۔" وہ بولا۔ "لیکن تمھاری وائف تو ہوش میں تھی۔ اس نے ایک بار بھی تردید نہیں کی کہ میرے شوہر کا نام غلط لکھ دیا گیا ہے۔ اور اتنی دیر سے تم باتیں کر رہے ہو۔ تم نے بھی نہیں کہا کہ تمھارا نام فرخ نہیں ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے اپنا نام فرخ بتایا تھا۔ صرف تمھارا ردِعمل دیکھنے کے لیے۔ تم چونکے تھے اور میرے کہنے پر تم نے اسے ایک فلمی اتفاق مان لیا تھا۔ یعنی تسلیم کر لیا تھا کہ تمھارا نام بھی فرخ ہے۔ اس سے تصدیق ہو گئی تھی کہ تم اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہو... آخر کیوں؟"

"تم بہت چالاک آدمی ہو ڈاکٹر۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"اس دنیا میں بے وقوف آدمی کے لیے جگہ نہیں رہی اب۔" وہ بولا۔ "چالاک لوگ کامیاب ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے والے اصول پرست، وضعدار اور ضمیر شناس۔ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی پر عمل کرنے والے احمق مانے جاتے ہیں اور ہر جگہ ناکام رہتے ہیں۔ امید ہے میری صاف گوئی کا تم بُرا نہیں مانو گے... میں منافقت کا قائل نہیں... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو بہت سیدھا سادا... بے ضرر اور شریف آدمی ہوں۔"

"میں کسی حد تک اسی فلسفے کی افادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں انکار نہیں کروں گا کہ میں اپنی شناخت چھپا رہا تھا... کیوں چھپا رہا تھا؟ اس کے اسباب پرائیویٹ ہیں۔"

"پولیس پرائیویٹ اسباب کی دلیل نہیں مانتی۔"

"کیا مطلب! پولیس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کے کہا۔

"حادثہ پولیس کیس ہوتا ہے لیکن ابھی تک اس کی رپورٹ پولیس کو نہیں دی گئی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمھاری بیوی نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس جعلی انسپکٹر کے خلاف رپورٹ کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ تمھارا فرض نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"تھا۔ مگر مجھے اندازہ ہوا کہ خود ڈاکٹر لطیف یہ نہیں چاہتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے مجھ سے تمھارے متعلق نہیں پوچھا تھا اور نہ کچھ کہا تھا۔ اُن کا فون آیا تھا کہ کیا رابعہ قاری نام کی کوئی عورت کسی سکندر بخت کو پوچھتی اسپتال پہنچی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ رابعہ قاری کون ہے؟ وہی ایڈووکیٹ؟ تو ڈاکٹر لطیف نے کہا کہ ہاں، اگر وہ آئے تو اس کو روک لینا۔ شی اِز ناٹ نارمل۔ لیکن مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش ہے۔ میں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ اس فون کے آنے کے پندرہ منٹ بعد تم کو لایا گیا۔ اور تمھیں لانے والا تمھارا نام فرخ لکھوا کے بھاگ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد تمھاری بیوی پہنچی۔ اور حسبِ توقع اس نے پوچھا کہ یہاں کوئی سکندر بخت تو نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ رابعہ قاری ایڈووکیٹ ہیں؟ انھوں نے تسلیم کیا تو میں ان کو مختلف وارڈز میں لے گیا۔ تمھارے کمرے میں پہنچتے ہی ان کے ردِ عمل سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ نارمل نہیں ہیں۔ ان کو شاید یاد بھی نہ ہو۔ انھوں نے میری موجودگی کی پروا کیے بغیر چیخ ماری تھی اور تمھارا نام لیا تھا۔ اور ان کا رویہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک محبت کرنے والی بیوی کا ہونا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر لطیف کو اطلاع دے دی کہ رابعہ یہاں ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ اور وہ سکندر بخت کے پاس ہے۔ ایک گھنٹے بعد وہ آ پہنچے تھے اور انھوں نے سامنے آئے بغیر رابعہ کا کیس ڈسکس کیا تھا۔"

"صرف رابعہ کا؟" میں نے کہا اور رابعہ کی طرف دیکھا۔

"صرف رابعہ کا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے کہا کہ رابعہ کو یہاں رہنے دو جب تک سکندر یہاں ہے۔ اس سے فائدہ ہوا ہے۔ شی اِز نارمل ناؤ۔ پھر وہ چلے گئے تھے۔"

"جانے سے پہلے انھوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ رابعہ میری بیوی نہیں ہے؟" میں نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"بیوی نہیں ہے؟" ڈاکٹر نے بوکھلا کے کہا۔ "اوہ نو... پھر کون ہے؟ خیر میرا یہ سوال بھی غلط ہے... بیوی نہ سہی... ان کا ایک جذباتی تعلق ہے آپ سے جو بہت گہرا ہے۔ اور واضح ہے۔ تم نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر جب کسی مریض سے دوستانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تو اس سے باتوں باتوں میں وہ سب معلوم کر سکتا ہے جو براہِ راست تفتیش سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ مریض ایک دم محتاط ہو جاتا ہے اور کچھوے کی طرح اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بہرحال تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"خطرہ... خطرہ کیوں محسوس کروں گا میں؟" میں نے کہا لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ اس بہت ذہین ڈاکٹر سے حقیقت نہیں چھپائی جا سکتی اور اگر میں نے دفاعی کھیل نہ کھیلا تو وہ میرا سارا کھیل چوپٹ کر دے گا۔

"وہی آدمی اپنی شناخت چھپاتا ہے جسے اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں خطرہ محسوس ہو۔" ڈاکٹر بولا۔ "تم کہتے ہو کہ اس کے پرائیویٹ اسباب ہیں... میں مان لیتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ میں ڈاکٹر ہوں سراغرساں نہیں ہوں ورنہ اسباب بھی معلوم کر لیتا... مس رابعہ! آپ ابھی تو یہیں ہیں کیونکہ یہ دو دن یہاں ہیں۔ ہو سکتا ہے کل صبح ڈاکٹر لطیف آئیں۔ میری باتوں سے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں مسٹر سکندر بخت۔ میں وہ آدمی ہوں کہ اگر تم مجھ پر بھروسا کرنا چاہو تو فائدے میں رہو گے۔ تم اگر کسی کو قتل کر آئے ہو یا جیل سے بھاگے ہو تب بھی مجھے بے خوف ہو کے بتا سکتے ہو۔ کم سے کم میری زبان سے ایک لفظ کسی اور تک نہیں پہنچے گا۔ میرے لیے ہر مریض پہلے ایک آدمی ہے۔ پھر مریض اور اس کے بعد وہ کچھ بھی ہو۔ وِش یو بیسٹ آف لک۔" وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر..." میں نے کہا۔ "جانے سے پہلے اپنا اصل نام بھی بتاؤ۔"

"اِٹ اِز ڈاکٹر حکیم۔" وہ مسکرایا۔ "ویری فنی نیم فار اے ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر اور حکیم۔" میں نے اس کے چلے جانے کے بہت دیر بعد کہا۔ "کیا یہ آدمی بھی اپنے نام کی طرح عجیب نہیں تھا؟"

"مجھے وہ عجیب نہیں خطرناک لگا۔" رابعہ نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ بہت کچھ جانتا ہے۔"

"اس نے کہا ہے کہ وہ قابلِ اعتماد بھی ہے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"ہم اس طرح ہر ایک کے کہنے پر اعتماد کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔"

"رابعہ! کیا تمھیں یاد ہے کہ تم ڈاکٹر لطیف کے گھر میں کیوں تھیں؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم اور غالب وہاں آتے تھے، تم بتاؤ؟"

"اچھا اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟" میں نے کہا۔

"کب کیا ہوا تھا؟"

"جب میں تم سے ملا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا...؟" میں نے کہا۔ "دلاور نے جو کچھ کیا۔ تم کو محسن اور شعلہ... استاد ٹیڈی یاد ہیں؟"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" رابعہ نے پریشانی سے کہا۔ "کل

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تم پوچھو گے کہ میرا نام بتاؤ... یہ پوچھو گے کہ مجھے اپنا نام یاد ہے۔ اپنے والدین کا نام یاد ہے؟"

میں یہ سوال بہت پہلے کرنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر حکیم کی موجودگی میں مجھے صرف رابعہ کے رویئے پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس سے میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وہ نارمل ہو گئی ہے۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ اس کی یادداشت بھی بحال ہو چکی ہے۔ میرے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے کے بعد اس کا مجھ سے ملنا اس کی شفا کا بہانہ بن گیا تھا... یہ سب تقدیر کے کھیل تھے۔ قدرت نے اسے جس طرح پہلے ملایا تھا اسی طرح پھر ملا دیا تھا، ورنہ وہ مجھے کھو بیٹھی تھی اور میں اس سے مایوس تھا۔ میرا حادثے میں زخمی ہونا بھی اچھا ہی ہوا۔ نہ میں زخمی ہو کے یہاں پہنچتا نہ رابعہ کو نظر آتا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں مجھے تلاش کرتی پھرتی اور بالآخر نہ جانے کہاں پہنچتی۔

مجھے اس وقت یہ خیال بھی آیا کہ میں رابعہ سے ان واقعات کے بارے میں سوال کروں جن کے نتیجے میں اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی مگر میں نے اس تلخ حقیقت کے حوالے سے گریز کیا۔ پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد۔ میں ڈرا کہ کہیں اس بات کے ذکر سے رابعہ کے ذہن پر خود فراموشی یا پاگل پن کے اس دورے کا اثر پھر نہ ہو جائے۔

"دیکھو رابعہ! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ابھی تک کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہاں دو دن نہیں رک سکتا۔ میں ایک انتہائی اہم کام کو ادھورا چھوڑ آیا تھا... مجھے یہاں سے جانا ہے... ابھی اور اسی وقت۔"

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔" وہ سہم کر بولی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"ضرور چلو لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلیں گے کیسے؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر حکیم بہت چالاک آدمی ہے۔ اسے دھوکا دینا بہت مشکل ہوگا۔"

"تم ہی کچھ سوچو۔" رابعہ نے کہا۔

"ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں اسے رازدار بنا لوں۔ وہ آدمی اچھا ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عقل کہتی ہے کہ اتنی جلدی کسی پر بھروسا کر لینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ اچھی طرح جانے اور پرکھے بغیر ہمیں کسی کو بھی دوست اور مددگار نہیں بنانا چاہیے۔ دوسرا طریقہ مشکل اور خطرناک تو ہے مگر..."

"مگر کیا؟" رابعہ نے مجھے سوچ میں دیکھ کر کہا۔

"سوچتا ہوں کہ وہ بیچ میں جوڈو کراٹے کا ماہر ہوا اور مجھ پر بھاری پڑا تو کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم اسے زبردستی مغلوب کرنے کی سوچ رہے ہو؟" رابعہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "اسپتال میں مار دھاڑ کرو گے؟"

"اگر اور کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی تو پھر یہی ایک راستہ رہ جائے گا۔" میں نے کہا۔ "میرا یہاں رکنا ناممکن ہے۔ اب تک میری عدم موجودگی سے نہ جانے کتنا نقصان ہو چکا ہوگا۔ غالب تو پہلے ہی مشتعل تھا کہ میں نازو کو مصیبت میں پھنسا کے جا رہا ہوں۔"

"نازو مصیبت میں ہے... تمہاری وجہ سے؟" رابعہ بولی۔

"ہاں، میری وجہ سے۔ وہ میری ہی تجویز تھی جس پر عمل کیا تھا اس نے۔" میں نے کہا۔ "محسن اور شہلا الگ پریشان ہوں گے کہ میں کچھ بتلائے بغیر اور مشن کو ایسے نازک مرحلے میں چھوڑ کے کہاں غائب ہو گیا۔"

"یہ تم کس مشن کی بات کر رہے ہو؟" رابعہ پریشان ہو کر بولی۔

"دیکھو رابعہ! بہت سی باتیں ہیں جو میں تم کو یہاں اور اس وقت نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "جب تم گھر چلو گی تو محسن بتا دے گا۔ یا اس کی بیوی سے اپنی غیر حاضری کے سارے واقعات سن لینا۔"

"سکندر، تم مجھے پاگل کر دو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "میں کب غیر حاضر تھی اور یہ محسن کی بیوی کون ہے؟"

"میری بات غور سے سنو۔" میں نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ "تم کو آخری بات کیا یاد ہے؟"

"مجھے؟... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے اور شہلا کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے..." وہ بولی۔

"ہاں... اور تم کو وہاں سے نازو نے نکالا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی مجھے یاد ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کیا نازو نے مجھے ڈاکٹر لطیف کے گھر پہنچا دیا تھا؟" رابعہ نے کہا۔

"ابھی تم یہی سمجھ لو کہ تب سے تم ڈاکٹر لطیف کے گھر میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "اور تمہاری یادداشت کھو گئی تھی۔"

"میری یادداشت کھو گئی تھی؟" وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

"ہاں۔ اس حد تک کہ تم مجھے بھی پہچاننے سے قاصر تھیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ غیر حاضری ذہنی تھی۔ تم ہمارے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات سے بے خبر ہو۔ ان کا خلاصہ بھی پیش کرنا چاہوں تو گھنٹوں لگ جائیں گے۔ اب تم ٹھیک ہو تو تمہیں درمیانی مدت میں اپنے ساتھ ہونے والی کوئی بات یاد نہیں۔ تمہارا علاج ڈاکٹر لطیف کر رہے تھے۔ جب تم وہاں زیر علاج تھیں تو محسن کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

"انکل شیروانی کا؟" رابعہ کی صورت پر افسردگی چھا گئی۔

"ہاں۔ اور جب محسن گیا تو شہلا سے شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔" میں نے کہا۔ "شہلا کو وہاں چھوڑنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم انکل شیروانی کی وصیت یہی تھی۔ سوئم کے بعد فوزیہ کے گھر سے شہلا کی رخصتی ہوئی اور وہ دونوں اچانک میاں بیوی کی حیثیت سے آ پہنچے۔ ہم تو خود بھی دم بخود رہ گئے تھے۔"

"اور مجھے یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ شہلا اب محسن کی بیوی بن گئی ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟" رابعہ نے اشتیاق اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

"ہم انہی کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اور استاد ٹیڈی اور مرزا غالب۔ ہم سب نے ایک پلان بنایا تھا۔ ملاور اینڈ کمپنی کے خلاف۔ اور نازو کو آگے رکھا تھا۔ غالب اس کے ساتھ تھا اور میں غالب کے ساتھ لیکن اس کے بعد اچانک میرے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور میں غالب کو بتائے بغیر یہاں آ پڑا۔ میری مدد کے بغیر غالب بھی نازو کی مدد نہیں کر سکتا اور ہمارے پورے مشن کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے۔ ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ لیکن بارہ گھنٹے بھی بہت ہوتے ہیں... خدانخواستہ... خدانخواستہ نازو کو کچھ ہوا تو میں تمام عمر خود اپنی نظر میں مجرم ہو جاؤں گا۔ میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں اس کے احسانات کے بوجھ تلے پہلے ہی اتنا دبا ہوا ہوں کہ ایک بار نہیں تین بار جنم لوں تو اس کا قرض ادا کر سکوں گا۔ اس ایک زندگی میں تو یہ قرض اتر نہیں سکتا۔"

"لوگ سات جنم کی بات تو محاورتاً کرتے ہیں۔ یہ تین جنم کی کیا بات ہوئی؟" رابعہ بولی۔

"اس کا، دو بار میری زندگی کو اپنی جان کی بازی لگا کے بچانے کا قرض ہے۔" میں نے کہا۔ "دونوں مرتبہ وہ زخمی ہوئی اور مر بھی سکتی تھی۔ تیسری بار وہ جان پر کھیل کر تمہیں بچا لائی۔ تم بھی میری زندگی ہو۔ اس لیے نازو کے احسانات کا قرض اتارنے کے لیے مجھے کم سے کم تین بار مر کے جینا ہوگا۔ پھر بھی شاید سود رہ جائے کیونکہ وہ جذبہ میں کہاں سے لاؤں گا جس نے نازو کو اپنے ہی بھائی کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ہم پہلے سے نکل جائیں۔ میں تم کو شہلا کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہاں تم اطمینان سے سارے واقعات اور پورے مشن کی تفصیلات سن لینا... اور وہیں یہ بھی بتا دینا کہ نازو تم کو کس طرح نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر لطیف کون ہیں؟... میرا مطلب ہے میں وہاں کیوں تھی؟ کیا وہ نازو کو جانتے تھے؟" رابعہ نے کہا۔

"نہیں۔ وہ غالب کے والد کے دوست تھے... بہت زبردست آدمی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں تمہیں رکھا جا سکتا۔ خصوصاً اس حال میں کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اب انہوں نے ڈاکٹر حکیم سے کہا ہے کہ رابعہ کو کہیں نہ جانے دیا جائے تو یہ ڈاکٹر تمہیں نکلنے دے گا اور نہ مجھے۔" میں نے کہا۔ "مجھے وہ کم سے کم دو دن اور یہاں رکھنے پر مصر ہے۔ ویسے بھی وہ کچھ تجسس میں مبتلا ہو گیا ہے کہ میں نے اپنی شناخت بدلنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے باہر پہرا بٹھا رکھا ہوگا؟"

"پہرا بٹھانا تو مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے اس نے چوکیدار کو ہدایت کر رکھی ہو۔ تم ذرا باہر کا ایک راؤنڈ لگاؤ... یہ دیکھو کہ فرار کے کتنے راستے ہیں۔ خود باہر جانے کی کوشش کرو۔"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا اور دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تو میں اس کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے کھڑکی تک جا کے دیکھا۔ اس میں فلائی پروف جالی تھی۔ میں نے جالی پر ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اُسے ایک چھری سے بھی کاٹا جا سکتا تھا اور مُکا مار کے پھاڑا بھی جا سکتا تھا مگر کھڑکی کے بالکل سامنے ایک گارڈن لائٹ تھی۔ اس کے نیچے بنچ پر دو مریض بیٹھے تھے۔ مختصر سے لان میں ایسی چھ بنچیں تین طرف لگی ہوئی تھیں اور اُن سب پر مریض کھلی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سردی کا زمانہ گزر چکا تھا اور شام بڑی خوشگوار ہوتی تھی۔ لان کے دوسرے کنارے پر ایک کیمسٹ کی دکان تھی اور اس طرف سے کھڑکی توڑ کے نکلنا رات کے بارہ بجے سے پہلے ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں شور مچانے یا راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو ناک آؤٹ کرتا جاؤں اور باہر نکلتے ہی کسی رکشا کو پکڑ لوں۔ میں رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا مگر اس کے بعد رابعہ بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ وہ اپنے محسن ڈاکٹر لطیف کے سامنے بھی نہ جا پاتی۔ ڈاکٹر حکیم ان کو پوری رپورٹ دے دیتا کہ وہ کس طرح سکندر کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔

دروازہ کھلا تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ رابعہ لوٹ آئی تھی۔ اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "پکڑ لیا کسی نے؟"

"ہاں... اسے اتفاق کہو یا کچھ اور... کوریڈور میں ہی سامنے سے ڈاکٹر حکیم آ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ خیریت؟ کدھر کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ ایسے ہی کمرے میں گھبرا گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا کہ چلیے کچھ دیر باغ میں ٹہلتے ہیں۔ میں بھی فارغ ہوں اس وقت۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ دس منٹ تک زبردستی اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ عجیب آدمی ہے وہ بھی۔ یہاں کتنا بول رہا تھا۔ اب بالکل چپ۔ دو بار بولا تو یہ کہ مس رابعہ کچھ بات کیجیے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تنگ آ کے میں نے کہا کہ کیا موسم پر بات کروں۔ اور لوٹ آئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اتفاق ایک بار ہو سکتا ہے۔ دو بار ہو سکتا ہے مگر بار بار نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ "پھر جاؤ... اور اگر وہ دوبارہ ملے تو اس کو جھاڑ دینا۔ کہہ دینا کہ میں تنہائی چاہتی ہوں۔ آپ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ لڑکیوں کے پاس شمع حسن کے پروانوں کی حوصلہ شکنی کے بہت بہانے ہوتے ہیں۔"

"اسے مت شامل کرو میرے پروانوں میں۔" رابعہ نے خفگی سے کہا۔

"ایک شمع روشن ہو تو پروانے کتنے آ جاتے ہیں مرنے والے۔ انھیں کوئی روک سکتا ہے بھلا؟" میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے کہا اور وہ ناراضگی میں باہر نکل گئی۔

آدھے گھنٹے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر حکیم کا سامنے سے نمودار ہو جانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ دوسری مرتبہ بھی وہ رابعہ کو بالکل اسی جگہ ملا اور پھر رابعہ کے ساتھ ہو گیا۔ رابعہ نے اسے پہلے شرافت سے کہا کہ وہ کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہے مگر اس نے کہا کہ یہ عمر اکیلی رہنے کی نہیں ہوتی اور آپ جیسی خاتون کو کیا ضرورت ہے اکیلی رہنے کی۔ رابعہ نے اُسے بے تکلفی سے باز رہنے کے لیے زیادہ سخت الفاظ میں کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا کہ مس رابعہ... میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تنہائی آپ کی ذہنی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ تنہائی میں ذہن کو خیالات پریشان کرتے ہیں اور آدمی ڈپریشن کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں کہ مجھے ڈاکٹر لطیف نے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے، میں کسی صورت آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے مجبور کرنے پر رابعہ تیسری بار نکلی اور چند قدم چل کے لوٹ آئی۔ اس نے ڈاکٹر حکیم کو کسی جن کی طرح نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔

"یہ معاملہ بے حد مشکوک ہو گیا ہے۔" میں نے رابعہ کی رونی صورت دیکھ کر کہا۔ "آخر اُسے کیسے علم ہو جاتا ہے کہ تم کمرے سے نکلی ہو... اور حد یہ ہے کہ وہ ملتا بھی اسی جگہ ہے۔ کیا وہ دروازے پر نظر رکھے کھڑا رہتا ہے کہ اُدھر سے تم چلے اور ہم اِدھر سے... اور ملاقات پھر اسی جگہ۔"

"کیسے دیکھتا رہتا ہے؟" رابعہ نے چڑ کے کہا۔ "کہاں سے دیکھتا رہتا ہے۔ سامنے تو سیدھا کوریڈور ہے اور اس کے دونوں جانب مریضوں کے کمرے ہیں۔ آخر میں وہ لاؤنج سا ہے جہاں رات کی ڈیوٹی پر مامور اسٹاف موجود رہتا ہے۔ ایک ٹیبل نرس کی ہے جس پر دو نرسیں اس وقت بھی بیٹھی ہوں گی۔ ایک ذینچ ہے جس پر دو آیا ٹائپ عورتیں بیٹھی ہیں اور ایک طرف ڈاکٹر کا کمرہ ہے۔"

"کس ڈاکٹر کا؟" میں نے کہا۔

"جس کی بھی ڈیوٹی ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "اس کا دروازہ کھلا ہے اور وہاں دوسرا ڈاکٹر موجود ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہے۔ اگر دروازے سے باہر نکل کے دیکھو تو تمھیں بائیں جانب بالو سامنے دیکھنے سے نرس کی ٹیبل بھی نظر آئے گی اور لیڈی ڈاکٹر بھی۔ دائیں طرف بھی ایک کمرہ ہے جو غالباً اسٹور ہے۔ دوائیں وغیرہ ہیں اور سامانِ ضرورت ہے۔ بائیں جانب باہر جانے کا راستہ ہے۔"

"اور ڈاکٹر حکیم کس طرف سے آتا ہے؟"

"دائیں جانب سے۔ جدھر اسٹور ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "کیا وہ اسٹور میں صرف ہماری نگرانی کے لیے موجود ہے؟ ایک ڈاکٹر اگر بلاوجہ اسٹور میں رہے گا تو کتنی دیر۔ کیا وہ ہماری چوکیداری پر مامور ہے؟ ہم قیدی ہیں؟ فرض کرو میں زبردستی باہر جانا چاہوں تو کیا وہ روک سکتا ہے مجھے؟"

"میرا خیال ہے ایک ڈاکٹر کے اختیارات کو اسپتال میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بھی آسانی سے تم پر قابو پالے گا اور پھر کسی ایسی جگہ رکھ دے گا جہاں میں بھی نہ جا سکوں گا۔ یہاں کمرے بہت ہیں اور میں ہر کمرے میں جھانک کر کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے سکندر کہ اس کو معلوم کیسے ہوتا ہے؟"

"یہی ہے غور طلب مسئلہ۔" میں نے کہا۔ "کیا تم چوتھی بار..."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رابعہ نے برہمی سے کہا۔ "میرا جھگڑا ہو جائے گا اس سے... ہنگامہ کر دوں گی میں۔"

"نہیں نہیں... ایسے نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "جوش سے نہیں، ہوش سے کام لو... اور مجھے ذرا سوچنے دو۔"

میں نے کمرے کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ کسی دیوار کے کان نہیں تھے۔ پلاسٹر اور رنگ و روغن پرانا تھا۔ اگر اس کے نیچے کوئی خفیہ مائکروفون ہوتا تو مجھے بال برابر لکیر دیکھ کے بھی اندازہ ہو جاتا کہ کسی نے مہارت سے کچھ چھپایا ہے۔ مگر دو دن پہلے بھی کون میرے یہاں آنے کی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ میرا یہاں آنا ایک حادثے کا نتیجہ تھا چنانچہ اس قسم کے انتظامات نہ پہلے سے کیے جا سکتے تھے اور نہ میری موجودگی میں ممکن تھے۔ میں نے لائٹس کو دیکھا۔ پنکھے پر غور کیا جس کے درمیان میں ایک گول چمکیلا سا دائرہ ہوتا ہے اُسے دبا کر کھولا جا سکتا ہے۔ تاکہ پنکھے میں گریس ڈالی جا سکے۔ میں نے اس کو انگلی سے بجایا اور پھر کھول کر دیکھا۔ اس کے نیچے تازہ بھری ہوئی گریس تھی۔ میں نے بستر کے نیچے اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں میں دیکھا۔ کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے دروازے کا خیال آیا۔ میں نے اس کے ہینڈل کو گھمایا اور رابعہ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھتے ہوئے باہر جھانکا اور سر فوراً اندر کر لیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

"کیا وہ پھر سامنے آ گیا تھا؟" میں نے کہا اور رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور ڈاکٹر کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اندر نہیں آیا۔ وہ دروازے کے قریب تک آیا اور پھر لوٹ گیا۔ میں نے مکمل خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ سنی اور رابعہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آخر اس کے یوں آنے اور چلے جانے کا مقصد؟ وہ کون ہے؟ کس کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے؟ کسی سوال کا یقینی جواب نہیں تھا مگر مجھے اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بے بس و لاچار نہیں لیٹے رہنا تھا۔

میں نے گھٹنوں پر جھک کر ڈور لاک کا معائنہ کیا اور بڑی آسانی سے میں نے وہ باریک سا تار دریافت کر لیا جو دروازے کے گول گھومنے والے ہینڈل کے قفل سے نکل کر دروازے کی ایک جھری کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا مگر اس پر وہی پینٹ کر دیا گیا تھا جو دروازے پر تھا، چنانچہ بہت غور سے دیکھے بغیر اس تار پر کسی کی نظر پڑنے کا بالکل امکان نہیں تھا۔ میں نے تار کے اوپر انگلی پھیری اور میری انگلی پر کریم کلر کی لکیر سی بن گئی۔ باقی دروازے کا رنگ خشک تھا مگر تار پر نیا رنگ تھا۔ میں نے اُسے سونگھا۔ اس میں پینٹ یا اینمل کی بُو نہیں تھی۔ یہ خشک پاؤڈر کلر تھا جو بڑی صفائی سے تار کے اوپر پھیلا دیا گیا تھا۔ میں نے رابعہ کو تار کی طرف متوجہ کیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور واضح کیا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ میں نے انگلی سے زمین پر لکھا۔ "باتیں کرو۔"

"میں اب نہیں جاؤں گی۔" رابعہ نے زور سے کہا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں آخر۔ اِدھر میں باہر نکلتی ہوں اُدھر وہ آ پہنچتا ہے۔"

"اچھا اسی سے کہہ دو کہ مجھے کیا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ پیش بندی آخر کس لیے ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "تم سگریٹ، چائے کافی سب منگوا سکتے ہو۔"

"لیکن تم جانتی ہو... وہ چیز تمھارے سوا کوئی نہیں لا سکتا۔"

"پھر اس ڈاکٹر کو بلا کر کہہ دو۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ لا دے گا۔"

"ڈاکٹر مجھے اسپتال میں شراب لا کے دے گا؟ تمھارا دماغ خراب ہے۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ کی... مگر یہ سب ضروری تھا۔

"کل جو ملی تھی... سب پی گئے۔ اب میں کیسے باہر جاؤں۔ بس میں سو رہی ہوں۔" رابعہ نے کہا۔ "تم بھی سو جاؤ۔"

"اچھا بھئی، تمھاری مرضی۔" میں نے کہا اور لائٹ آف کر دی۔

"دو دن کی قید اور ہے... کاٹ لیں گے..." لیکن اس تمام عرصے میں جو کچھ میں کرتا رہا وہ سب رابعہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ میں نے میز پر سے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس کی دھار کو آہستہ سے تار پر پھیر دیا۔ پتلا سا تار دو حصوں میں تقسیم ہو گیا مگر اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد ہم نے پندرہ منٹ خاموشی میں گزارے۔ ایک بار پھر کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا عین دروازے تک آیا۔ چند سیکنڈ رکا اور مطمئن ہو کے لوٹ گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔

"اب تیار ہو جاؤ۔" میں نے رابعہ سے سرگوشی میں کہا۔ "ہماری آواز اب کوئی نہیں سُن رہا ہے۔"

"پھر بھی وہ ہمیں سامنے سے گزرتا دیکھے گا۔"

"اس کا باپ بھی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا اور چھری سے کھڑکی کی فلائی پروف جالی کاٹ دی۔ اگر دروازے میں نصب مائکروفون کام کر رہا ہوتا تو یہ آواز بھی یقیناً ڈاکٹر حکیم کے کان سن لیتے۔ اب باہر پارک میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اوائل مارچ کی خنکی کے باعث سب لیٹے اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور کھڑکیاں بند کر چکے تھے۔ صرف کیمسٹ کی دکان کھلی ہوئی تھی لیکن وہ بھی کہیں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلے رابعہ کو باہر اتارا۔ پھر بستر کی چادر اپنے جسم پر اس طرح لپیٹ لی کہ میرا اسپتال کا لباس تقریباً چھپ گیا۔

"اب تم اطمینان سے باہر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور کسی رکشا کو روکو۔ جب رکشا گیٹ پر آ جائے تو اندر آ کے مجھے اپنی صورت دکھا دینا۔ میں گیٹ پر نظر رکھوں گا۔ تم واپس جا کے رکشا میں بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا۔ رکشا والے سے کہنا کہ مرتنگ جانا ہے۔"

رابعہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ گیٹ سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ اسپتال کے کپڑوں میں نہیں تھی چنانچہ چوکیدار نے اسے نہیں روکا۔ وہ عملے کی رکن بھی ہو سکتی تھی اور کسی پرائیویٹ وارڈ کے مریض کے ساتھ رہنے والی گھر کی کوئی عورت بھی۔ میں اس اندھیرے کمرے میں کھڑکی بند کیے شیشوں کے پیچھے کھڑا گیٹ کو دیکھتا رہا۔ رابعہ دس منٹ بعد اندر آئی اور اس نے کیمسٹ کی دکان سے کچھ خریدا۔ پھر وہ واپس چلی گئی... میں کھڑکی سے باہر اترا اور گیٹ کی سمت بڑھا۔ چوکیدار نے چادر کے نیچے سے اسپتال کے دھاری والے کپڑے کا پاجامہ پہچان لیا۔

"کون ہو تم... لے بھائی صاحب... رک جاؤ۔" وہ میری طرف بڑھا اور میں رک گیا۔ چوکیدار میرے قریب آ گیا۔ "اپنی صورت تو دکھاؤ۔" وہ بولا۔ صورت کے ساتھ ہی میں نے اُسے ایک معمولی سے داؤ کا تماشا بھی دکھایا۔ اس کی گردن پر اور کنپٹی پر میرے دو ہاتھ لگے۔ وہ لان پر گر گیا۔ میں گیٹ کی طرف بھاگا۔ کیمسٹ چلانے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لگا: پکڑو... پکڑو۔"

اس کی آواز پر اسپتال کے اندر شاید کوئی متوجہ ہوا ہو تو ہوا ہو۔ باہر جہاں رکشا میں رابعہ میری منتظر تھی اس کی آواز انجن کے شور میں دب گئی۔ وہی رکشا کا شور جس سے ہمیشہ میرے اعصاب متاثر ہونے لگتے تھے، اس وقت میرے لیے باعثِ سکون ثابت ہوا۔ میرے پہنچتے ہی رکشا چل پڑا اور اس وقت میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے گیٹ لائٹ کی روشنی میں ڈاکٹر حکیم کا چہرہ نظر آیا۔ وہ رکشا کے پیچھے بھاگا۔ "اے رکشا۔" اس نے چیخ کر کہا مگر رکشا والا اپنی دھن میں چلتا گیا۔ اُسے کیسے شک ہو سکتا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اگر رکشا خالی ہوتا تو اس آواز پر ضرور رک جاتا۔ ڈاکٹر کی یہ حرکت مجھے مضحکہ خیز لگی۔ وہ رکشا کے پیچھے خود کیسے دوڑ سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ پلٹ کر دیکھا تو اس کا ہاتھ جیب سے باہر آ چکا تھا میرے ایک ہاتھ نے رابعہ کو گردن سے پکڑ کے جھکا دیا۔ میں خود بھی جھک گیا تھا جب فائر کی آواز آئی۔ اگر اس کا نشانہ صحیح ہوتا تو گولی رکشا والے کو بھی لگ سکتی تھی جس کا سر پیچھے بیٹھنے والی سواریوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اب یا تو اس کا نشانہ حد سے زیادہ درست تھا کہ نہ میں نشانہ بنا اور نہ رابعہ بنی اور گولی سیدھی گزر گئی۔ اگر اس نے رکشا روکنے کے لیے ڈرائیور کے سر کا نشانہ لیا تھا تو اسے قسمت نے بچایا۔ رکشا متحرک تھا اور اس کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ سڑک ناہموار تھی۔ چنانچہ جھٹکوں سے ہم بھی اُچھل رہے تھے۔ غالباً یہی سب عوامل تھے جو ہمارے اور رکشا والے کے بچ جانے کا سبب بنے۔ ڈاکٹر نے تین فائر کیے تھے مگر ہر فائر کے بعد دوسرا فائر ہونے تک درمیانی فاصلہ پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ جب رکشا نے موڑ کاٹا تو میں نے اپنے محفوظ ہونے کا یقین کیا اور اطمینان کا سانس لے کر سر اٹھایا۔ رکشا والا اس سارے خونی ڈرامے سے بالکل بے خبر تھا اور اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ گولیاں اس پر چلائی جا رہی ہیں۔ اُسے تو اچانک گولی لگ جاتی تو پتا چلتا کہ بغیر کسی وجہ کے موت نے اُسے آ لیا ہے۔

"یہ تو ہم بُرے پھنسے تھے۔" میں نے رابعہ سے کہا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ ڈاکٹر جو اتنے دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا اور ہمارا اعتماد حاصل کر چکا تھا، ہمارا دشمن تھا۔" رابعہ بولی۔

"میں بھی اس سے متاثر ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے اُسے رازدار اور مددگار نہیں بنایا۔" رابعہ بولی۔

"بس خدا نے بچا لیا۔ میں جلدی میں فیصلہ کر لیتا کہ اس سے مدد لینی چاہیے تو ساری باتیں آگے پہنچ جاتیں۔ وہ بہت چالاک تھا اور بہت خطرناک بھی۔"

"تمہارے خیال میں وہ چوہدری دلاور کا ایجنٹ تھا؟"

"مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کوئی حفاظتی انتظام نہیں کر سکتا جو اس نے کیا۔ وہ کسی کمرے میں بیٹھا ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ ہر آواز اس تک پہنچ رہی تھی۔ تم جب دروازہ کھولتی تھیں اسے معلوم ہو جاتا تھا۔ اگر میں کھڑکی کھولتا تو یہ آواز بھی اس تک پہنچتی اور وہ فوراً آ جاتا۔ باتوں باتوں میں وہ ہم پر واضح کر چکا تھا کہ اسے جوڈو کراٹے میں مہارت حاصل ہے۔ مجھے تو اس کے ڈاکٹر ہونے پر بھی شک ہے۔"

"اسے اپنی ناکامی پر جھنجلاہٹ بھی ہوگی اور پریشانی بھی۔ ہم اس کی ساری چالاکی اور مستعدی کے باوجود صاف نکل گئے۔" رابعہ نے کہا۔ "اسے خبر ہو جاتی تو وہ گاڑی لے کر ہمارے تعاقب میں آتا۔"

"ہاں۔ وہ کیمسٹ کے ہنگامے پر باہر نکلا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کیمسٹ نے بھی اس لیے شور مچایا کہ وہ چوکیدار کو ناک آؤٹ ہوتے دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے باہر نکل کے کیمسٹ سے پوچھا ہوگا کہ بات کیا ہے اور جتنی دیر میں صورتِ حال اس پر واضح ہوتی ہم دور آ گئے تھے۔ اگر اس وقت وہ گاڑی کی طرف لپکتا تو اسے رکشا نظر تک نہ آتا۔ مگر اس سے زیادہ اطمینان کی بات تو یہ ہے کہ میں نے تم سے کمرے میں بہت سی باتیں کی تھیں پر نہیں بتایا تھا کہ نازو کہاں ہے اور اس کا مشن کیا ہے۔ میں نے شہلا اور محسن کی شادی کا ذکر تو کیا تھا مگر ان کے گھر کا پتا نہیں بتایا تھا۔ اس تمام گفتگو کو ریکارڈ کیا گیا ہوگا تب بھی اس سے کچھ پتا نہیں چلے گا۔"

"چوہدری دلاور تو بہت برافروختہ ہوگا۔"

"ہاں۔ اس مرتبہ انتظام بہت پکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب ناکامی کی ساری ذمے داری ڈاکٹر حکیم پر جائے گی۔ حالانکہ قصور اس کا نہیں ہے۔ وہ تو پوری طرح مستعد تھا۔ ہر آہٹ پر نکل آتا تھا مگر رکشا کدھر جا رہا ہے؟"

"مزنگ اکھیا سی۔ مزنگ وّل جا ریا اے۔" رکشا والے نے کہا۔

"مزنگ؟ او نئیں یار۔" میں نے کہا۔ "مزنگ جا کے کی لینا اے۔ میرا کیہڑا ماما رہندا اے اوتھے۔ میں نے جانا اے داتا دربار۔ پہلاں اوتھے حاضری دے کے گھر جاواں گا۔"

رکشا والے نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں نے رابعہ کو گھور کے دیکھا جیسے ساری غلطی اس کی ہے۔ داتا صاحب کے نام پر وہ بول نہ سکا ورنہ کہیں اور جانا ہوتا تو وہ احتجاج کرتا۔ میں نے

رکشا کو داتا صاحب کے دربار والی گلی میں چھوڑا اور مزار پر فاتحہ خوانی کرنے گیا۔ آج میں ایک نئے شکاری کے جال میں پھنس گیا تھا اور بال بال بچا تھا۔ جب ہم پھر سڑک پر آئے تو میں بہت اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ دوسرے رکشا نے ہمیں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچا دیا۔ گھر پہنچنے تک میرے دل کی بے قراری میرے اعصاب کو شکست دینے لگی تھی۔ ایک معمولی سے حادثے نے مجھے کہاں پہنچا دیا تھا۔ میری عدم موجودگی نے نازو کو کہاں پہنچا دیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے کچھ بتائے بغیر غائب ہو جانے سے باقی سب کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ میرے ساتھ پیش آنے والا حادثہ عقل کے ہاتھ سے جذبات کا دامن چھوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ رابعہ کے گھر سے نکل جانے کی خبر نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا اور میں نہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل رہا تھا اور نہ کچھ دیکھنے سننے کے۔ لیکن اسی جذباتی دیوانگی کا نام زندگی تھا۔ اس دیوانگی کے مختلف انداز تھے۔ رابعہ سے عشق اس کا ایک نام تھا۔ ورنہ ہم سب جو کچھ کرتے تھے جس طرح جیتے تھے اور جیسے مرنے کا سامان کرتے تھے اس میں سب کچھ ہی دیوانگی سمجھا جا سکتا تھا۔

رکشا رک گیا تو میرے خیالات کی رو بھی رک گئی، اور میں یوں گھر کی طرف بڑھا جیسے گھر سے فرار ہو جانے والا ناخلف بیٹا دُنیا کے دھکے کھا کر شرمسار اور خوفزدہ دوبارہ گھر آتا ہے... دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ فرطِ جذبات سے اس کی حالت بھی غیر تھی اور یہی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچ کر قوتِ برداشت سے بڑھ جاتی تو ہسٹریا کا دورہ بن جاتی۔ جذباتی دباؤ سے وہ بھی شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا تھی۔

دروازہ شہلا نے کھولا۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر اندھیرے سے رابعہ اس کے سامنے آئی اور شہلا نے ایک چیخ ماری۔

"رابعہ باجی۔" وہ ایک دم رابعہ سے لپٹ گئی۔ اس کی چیخ نے گھر کے اندر محسن کو بوکھلا دیا۔ وہ نہ جانے کیا گرا کے یا خود کسی چیز پر گر کے دوڑا اور لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا۔

"کیا ہوا؟ قیامت آ گئی کیا؟" وہ شہلا کو ڈانٹ رہا تھا۔ مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ لنگڑانا بھی بھول گیا۔

"آ گئے ہو خیر سے گھر کو لوٹ کے بدھو میاں۔" محسن نے ناخلف اولاد کے سخت گیر باپ کی طرح کہا۔

"اکیلا نہیں آیا... کچھ لے کر بھی آیا ہوں۔" میں نے شہلا کی طرف اشارہ کیا جو رابعہ سے گلے لگ کر رو رہی تھی اور رابعہ اسے بالکل بڑی بہن کی طرح تسلی دے رہی تھی۔ چمکار رہی تھی۔ محسن نے پہلے رابعہ کو اور پھر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلائی کیونکہ اس کی نظروں کا سوال میں نے سمجھ لیا تھا اس نے پوچھا تھا کہ کیا رابعہ نارمل ہو گئی ہے؟ اس کی یادداشت بحال ہو گئی ہے؟

"یہ بچھڑے ہوئے اندر جا کے بھی رو دھو سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"یار محسن!" میں نے کہا۔ "میں تو بعد میں بتاؤں گا کہ کہاں گیا تھا اور اس وقت کہاں سے آ رہا ہوں پہلے تو بتا کہ نازو کا کیا حال ہے؟"

محسن نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ "اللہ اس کی مغفرت کرے، اچھی خاصی لڑکی تھی مگر تجھے کیا۔ بیوہ تو ہوا غالب۔"

"تو ایسے نہیں بتائے گا۔" میں نے کہا اور محسن اندر کی طرف دوڑا۔ رابعہ اور شہلا روتے روتے ہنس پڑیں۔

"شروع ہو گئی دھما چوکڑی اور خرمستی۔" شہلا نے کہا۔

میں نے محسن کو ٹانگ اڑا کے گرایا اور اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ "میں تین تک گنوں گا۔"

"کیوں! آگے گنتی نہیں آتی کیا؟" محسن بولا۔ "اتنے کم وقت میں بھلا میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ نازو خیریت سے ہے۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ "اس کی طرف سے کوئی پیغام ملا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ غالب کا رابطہ قائم ہے۔" محسن بولا۔ "آج صبح سے شام چھ بجے تک ٹیڈی نے ڈیوٹی دی تھی۔ چھ سے بارہ پھر غالب گیا تھا۔ آتا ہی ہوگا۔ بہت مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں نازو سے۔"

"وہ لڑکی بھی کمال ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"تجھے تعریف کرنا ہے تو رابعہ کی کر۔" محسن نے مجھے ڈانٹا۔ "خود میں اب شہلا کے سوا کسی کی تعریف نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا بیچارا۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے بیوی سے کہ کوئی تم سا حسین نہیں زمانے میں۔"

"میں تو ایک سچ بولنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "کہ کچھ کھانے کو نہ ملا تو میں فوت ہو جاؤں گا۔ گناہ تیرے سر کیونکہ میں تیرا مہمان ہوں۔"

"کنیز۔" محسن نے تالی بجا کے کہا۔ "دو مہمانوں کے لیے شاہی دسترخوان بچھایا جائے۔ چولہے پر دس تولے دال مسور ہمراہ ایک گیلن پانی کے اچھی طرح جوش دے کر ایک ماشہ گھی کے ہمراہ رکھی جائے اور اگر بھوسی ٹکڑے والا گزشتہ ہفتے کی روٹیاں نہ لے گیا ہو تو وہ بھی معزز مہمانوں کے لیے حاضر کی جائیں۔" وہ دونوں نہایت زور شور سے باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ موضوع تھا شادی سے پہلے اور شادی کے بعد۔ مجبوراً محسن کو چلّانا پڑا۔

"لیڈیز! آپ کچن میں جا کے ایک دوسرے کا دماغ چاٹیں، یہاں بے حد اہم مردانہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"سُن لیا سن لیا۔" شہلا نے بھی چلّا کے کہا۔ "ابھی فرصت نہیں ہے ہمیں۔ ہم بھی بے حد مصروف ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تو ہم کیا تمھارا سر کھائیں جس میں مغز تک نہیں۔" محسن نے چلّا کر کہا۔

"جوتے کھالو۔ کچن میں جا کے پکا لو یا بازار سے جا کے لے آؤ۔" شہلا نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا۔ "ابھی تنور کھلے ہوں گے۔"

"دیکھا تو نے ان بیسویں صدی کی بیویوں کا رویّہ۔" محسن نے خفّت سے کہا۔ "اس سے تو اچھا ہوتا کہ میں کسی تنور والے کی بیٹی سے شادی کر لیتا۔ اس وقت سسرِ محترم گرماگرم روٹیاں خود لگا کے دیتے۔"

"چل یار جانے دے۔ تیرے مقدر میں شوہر پن کے یہی بے عزتی لکھی تھی۔" میں نے کہا۔ "ان کو باتیں کرنے دے۔ ہم بازار سے لے آتے ہیں۔"

ہم نکلے ہی تھے کہ ہمیں سامنے سے ٹیڈی اور غالب آتے دکھائی دیے۔ ہمارے سامنے آ کے دونوں یوں رُک گئے جیسے متحارب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوتی ہیں۔

"آ گئے تم مجنوں کے جانشیں۔ ملی وہ لیلیٰ یا محض جھک ماری۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"دونوں کام کیے۔ جھک بھی ماری ہم نے اور لیلیٰ کو بھی لے آئے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔

"کیا مطلب؟ رابعہ کو لے آئے؟" ٹیڈی نے بے یقینی سے کہا۔

"یقین نہیں تو گھر میں جا کے دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہمارے ساتھ چلو۔ ہم ما حضر تناول فرمانے جا رہے ہیں۔"

"مجھے میری بیوی نے مع مہمان کے گھر سے نکال دیا ہے دوستو۔ میں جا رہا ہوں کہیں سے نان نفقے کا بندوبست کرنے۔" محسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔ کہیں بیٹھ کے دعوتِ ولیمہ کھا لو میری۔"

"اور وہ گھر میں انتظار کریں گی ہمارا۔" میں نے کہا۔

"بیویوں کا کام انتظار کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "خود جب باتیں کرتے کرتے تھک جائیں گی تو پکا لیں گی اور کھا لیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ ہم بھی کہیں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم واپس چل پڑے۔ میں نے مختصر الفاظ میں وہ سب واقعات سنائے جو کسی کے علم میں نہ تھے۔ میرے حادثے میں زخمی ہونے سے اسپتال پہنچنے اور وہاں سے فرار ہونے تک جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا تھا وہ میں نے سب بتا دیا اور چلتے چلتے ہم ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ ہم ایک نسبتاً صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر میں نے دیا۔ پھر غالب نے مجھے نازو کے بارے میں رپورٹ دی۔

"اس کو ڈاکٹر فیملی نے مجبور ہو کے گھر میں جگہ دے دی... بھائی بہن تو بالکل تیار نہیں تھے مگر اسی گھر میں ان کی ماں بھی رہتی ہے جسے اپنی اولاد کے اصل کرتوت معلوم نہیں۔" غالب نے کہا۔

"اس روز رات کو... اس کا پہلا پیغام کیا تھا؟" محسن نے پوچھا۔

"بہت مختصر۔ اس نے مورس کوڈ میں 'او کے' کہا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اندر پہنچنے کے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد ملنے والے پیغام نے میری ساری تشویش دور کر دی تھی۔ اس وقت مجھے تم سے زیادہ تم پر غصہ تھا کہ سب چھوڑ چھاڑ کے چل پڑے۔ نازو کی طرف سے اطمینان ہوا تو میں مونگ پھلی کی ریڑھی چھوڑ کے وہاں تک گیا جہاں تم کھڑے ہوئے تھے مگر تم غائب تھے۔ میں لوٹ آیا، تمھیں ایک سو ایک گالیاں دے کر۔"

"گالیوں کی کوئی بات نہیں۔ دوست دیں تو دعا کی طرح لگتی ہیں، دشمن دیں تو پتھر کی طرح۔" میں نے کہا۔ "مونگ پھلی کا بزنس کیسا رہا؟"

"بہت فائدہ مند... ایک بوری پر کوئی دو سو بچے... بوری دو دن میں ختم ہو گئی۔" غالب بولا۔ "صحافت سے تو اچھا ہے۔"

"اس کے بعد نازو سے رابطہ قائم ہوا؟" میں نے کہا۔ "کوئی کام کی بات معلوم ہوئی ڈاکٹر فیملی کے بارے میں؟"

"ہاں۔ اندر داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر برادران کو مطمئن کرنا اصل مسئلہ تھا۔" غالب بولا۔ "نازو نے رات کے گیارہ بج کے چالیس منٹ پر دوسرا پیغام دیا۔ یہ کہا کہ ابھی جانا مت۔ وہ نہ کہتی تب بھی میں ٹھیک بارہ بجے دکان نہ بڑھاتا۔ میں شرمانے ہوئے اعتراف کرتا ہوں کہ میں سخت مضطرب اور بے چین تھا۔"

"ماشاءاللہ سے بہت شرمیلا بچہ ہے۔" محسن نے اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تم ہوتے میری جگہ تو تمھارے لیے بھی بہت مشکل ہو جاتا نازو کو اس طرح چھوڑ کے جانا۔" غالب نے کہا۔ "پہلا دن... بلکہ پہلی رات تھی۔ ایک ڈر سا تھا کہ کہیں بعد میں کوئی غیر متوقع بات نہ ہو جائے۔ خیر میں ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کرتا رہا اور یہ آدھا گھنٹا اتنا لمبا ہو گیا..."

"طولِ شبِ فراق کی طرح۔" محسن نے کہا۔ "مختصر بات کرو۔"

ویٹر نے ہمارے درمیان ڈنر سجانا شروع کیا۔ میں نے اس سے ہر اچھی چیز لے آنے کو کہا تھا۔ اس کے نزدیک مرغی سے زیادہ اعلیٰ و ارفع خوراک نہیں تھی چنانچہ ہر چیز میں مرغی تھی۔ چاول میں مرغی مگر اسے چکن بریانی کہنا مشکل تھا۔ قورمے میں مرغی جسے مرغ قورمہ قرار دیا گیا تھا۔

"جی تو نصف شب کے بعد آپ کے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہوئے؟" میں نے کہا۔ "آپ مختصر کر کے سنا سکتے ہیں۔"

"اس نے ساڑھے بارہ بجے سگنل دیا۔ گویا میرے کان میں ایک ڈرک سرگوشی کی۔" غالب بولا۔ "میں نے فوراً اپنے یونٹ کو آن کر لیا۔ اس نے کہا کہ پہلا مرحلہ تو سر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر فیملی کو ایک خادمہ کی ضرورت تھی۔ وہ سب دن بھر باہر رہتے ہیں اور بعض اوقات رات کو بھی گھر نہیں آتے، ماں گٹھیا کی مریض ہے۔ اسی مجبوری نے نازو کا گھر کے اندر قیام آسان بنا دیا۔ ڈاکٹر برادران اور ان کی بہن تو مخالف تھے کہ کسی اجنبی کو گھر میں جگہ دی جائے مگر نازو کی آہ و زاری نے ان کی ماں کو متاثر کر لیا تھا۔ نازو کا کہنا ہے کہ اسے خود اپنی اداکاری پر حیرت ہوئی تھی۔ سلیم ڈاکٹر اور یوسف ڈاکٹر کو مطمئن کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ پوچھتے رہے کہ پہلے کہاں تھیں اور اب کیا گھر گھر سوال کرتی پھر رہی ہو۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے۔ نازو نے سارے سوالات کے ایسے جواب دیے کہ وہ مطمئن ہوئے یا نہیں مگر اُن کی ماں پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مظلوم عورت کو گھر میں جگہ دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ لڑکے اس بات پر تو راضی ہو گئے کہ ایک خادمہ کی حیثیت سے وہ دن بھر گھر میں رہے کام کاج اور ان کی ماں کی خدمت کرے لیکن رات کو اپنے گھر جائے۔ نازو نے شور مچایا کہ گھر ہوتا اور گھر والا ہوتا تو میں آتی ہی کیوں۔ قصہ مختصر، ماں کی وجہ سے وہ مجبور ہو گئے اور نازو کو کچن کے ساتھ ایک اسٹور خالی کر کے اپنا بستر بچھانے کی اجازت دے دی گئی... اور یار اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب اسی کا حوصلہ تھا۔ اسٹور میں موش کی پوری فیملی تھی۔"

"کون موش؟ وہ ڈاکٹر لطیف کا خونی دربان۔"

"ہاں۔ اس کے بھائی بند اسٹور میں آباد تھے۔ جسے دیکھ کر تمھاری گھگی بندھ جاتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اسے عموماً واپسی پر پتلون بدلتے پایا گیا۔" محسن نے کہا۔

"میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تم دونوں کی زوجگان کو کمرے میں ایک چوہا نظر آ جائے تو وہ چیخ ماریں گی اور بیہوش ہو جائیں گی۔"

"چوہے اور چھپکلی کو دیکھ کر چیخ مارنا خواتین کا پیدائشی حق ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "اور بیہوش ہونا ان کی ایک ادا۔"

"خیر تو اپنی بہادر جورو کی داستانِ شجاعت جاری رکھو۔ چوہے سے کیا، وہ تو تجھ سے بھی نہیں ڈرتی۔" محسن نے کہا۔

"اُلٹا یہ اس سے چوہے کی طرح ڈرتا ہے۔" ٹیڈی نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں... چوہا ہوں میں..." غالب نے بھنا کے کہا۔ "اُلّو کا پٹھا تو نہیں ہوں... یک ٹک لگا رکھی ہے اپنی۔"

"معاف کرنا یار، سچ سے تمھاری دل شکنی ہوئی۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"اس نے پہلی رات تو جیسے تیسے کاٹ دی۔" غالب کچھ دیر بعد بولا۔ "دوسرے دن اس نے چوہوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا اور چھ چوہے تو میدانِ جنگ میں کام آئے۔ باقی بھاگ گئے... پہلی رات اس نے مفصل رپورٹ دی۔"

محسن پھر ہنس پڑا۔ "کیا ستم ہے۔ ہجر و فراق کے مارے ہوئے الم نصیب ایسے نہ ہوں گے۔ اُدھر محبوب کو چوہے نہیں سونے دیتے۔ اِدھر شاعر مونگ پھلی بیچ رہا ہے۔ کتنا غیر شاعرانہ تصوّر ہے عشق کا۔"

"اور کتنا غیر فلمی منظر ہے۔" میں نے کہا۔ "کسی کامیڈی فلم میں بھی ایسا آئیڈیا پیش نہیں کیا گیا۔"

"زندگی ایک ٹریجڈی ہے۔" غالب نے متانت سے کہا۔ "اس کا اُردو شاعری اور فلموں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ خیر تو اس رات مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فیملی عیش کر رہی ہے۔ ان کا گھر دیکھنے میں باہر سے جتنا غریبانہ نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی شاہانہ ہے۔ دولت کی فراوانی کے آثار اندر قدم رکھتے ہی نظر آ جاتے ہیں۔ بیڈ روم ایئر کنڈیشنڈ ہیں۔ اور تیسرا بڑا کمرہ ڈرائنگ روم ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ وہ بھی ہے۔ لیکن نازو نے بتایا کہ محلے والے تو اُن سے ملتے جلتے نہیں۔ ان کو بُرا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ محلے میں ایسے ہیں جو اُن کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ وہ کرسچن ہیں اس لیے نہیں، اس لیے کہ وہ بھنگی تھے اور مشہور ہے کہ ان کی ماں اسی شہر لاہور کی گلیوں میں جھاڑو دیتی پھرتی تھی۔"

"میرے خیال میں وہ زیادہ قابلِ عزت کام تھا۔" میں نے کہا۔ "محنت کیسی بھی ہو اور کسی بھی پیشے میں ہو بُری نہیں سمجھی جا سکتی۔"

"ہاں۔ اس کے مقابلے میں جو اولاد کر رہی ہے وہ انتہائی مذموم اور قابلِ نفرت ہے۔" محسن بولا۔ "مگر دنیا کی نظر میں فتور ہے۔"

"دنیا کی عقل میں بھی فتور ہے۔ بہت سے حرام کی کمائی سے دولت مند ہو جانے والے معزز ہیں اور ہر ہاتھ انھیں سلام کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ راج مزدور اور بڑھئی، مزدور اور بس ڈرائیور... ویٹر اور چوکیدار سب گھٹیا کام کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔ پیسہ عزت کا معیار بن گیا ہے۔"

"جو اس وقت صرف میرے پاس ہے۔ اس لیے تم سب مجھے سرکار کہہ کے مخاطب کرو۔" میں نے جیب سے دس ہزار کی گڈی نکالی جو میں اسپتال سے فرار ہوتے وقت تکیے کے نیچے سے نکال لایا تھا۔ "تم سب سوالی ہو اس وقت۔" میں نے کھانے کا بل ادا کر دیا جو صرف ساٹھ روپے بنا تھا۔ کسی فرسٹ کلاس ہوٹل میں یہ بل ایک سو ساٹھ سے بھی زیادہ ہوتا۔

"نازو کا خیال ہے کہ وہ ڈرائنگ روم ہی وہ جگہ ہے جہاں ان وطن فروشوں کی ملاقاتیں اور اجلاس ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مقناطیسی مائکروفون کل وہیں نصب کر دیا جائے گا۔"

"کل کیوں؟" میں نے کہا۔

" اس لیے کہ کل ایک اجلاس متوقع ہے۔" غالب نے کہا۔

" اس کے آگے میں سناؤں گا۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیونکہ باقی باتیں اس نے مجھ سے دن میں کی تھیں۔ آج دن میں۔ صبح آٹھ بجے وہ مائکرو بس آئی تھی۔ اس کا نمبر میں نے نوٹ کر لیا تھا۔ سوا آٹھ بجے سونیا البرٹ وکٹر اسپتال چلی گئی۔

" کیا وہ واقعی وہاں کام کرتی ہے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

" اس میں کوئی شک نہیں۔ وہاں وہ نرس ہے اور بہت نیک نام ہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ فارغ وقت میں وہ کیا کرتی ہے۔" غالب نے کہا۔

" فاکس ویگن کی اس مائکرو بس کو سونیا کا ایک بھائی چلاتا ہے اور وہ بھی البرٹ وکٹر اسپتال میں ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

" میرا ایک نظریہ درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ " مگر میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے تم اپنی بات بتاؤ۔"

" دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ معلوم نہیں وہ صبح منہ اندھیرے ہی ویگن لینے نکل گیا تھا یا رات کو ڈیوٹی پر تھا۔" ٹیڈی نے کہا۔ " اگر اس نے رات بھر ڈیوٹی دی ہوتی تو اسے صبح اسٹاف کو لینے نہ بھیجا جاتا۔ یا تو وہ مائکرو بس کسی دوسری جگہ کھڑی رہتی ہے یا سلیم وکٹر ذرا پہلے نکل جاتا ہے۔ سونیا تیسرے پہر لوٹ آئی تھی۔ اس کا انسپکٹر بھائی بھی صبح گیا تھا اور تیسرے پہر تک وہ بھی آگیا تھا۔ ان دونوں کے آنے تک نازو کو بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ مثلاً اس نے ایک اہم بات یہ معلوم کی کہ گھر میں ایک تہ خانہ ہے جس کا راستہ ڈرائنگ روم سے نیچے جاتا ہے۔ بظاہر وہ بند دروازہ باتھ روم کا لگتا ہے جو ڈرائنگ روم سے اٹیچ ہے۔ مگر اس دروازے کو مقفل رکھا جاتا ہے۔"

" نازو نے اتنی جلدی کیسے معلوم کر لیا؟"

" وہ ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی کہ پولیس انسپکٹر آگیا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بائیں جانب ایک گوشے میں نازو بھی موجود ہے۔ وہ حصہ کچھ تاریک بھی تھا۔ ساری وال لائٹس جلائی جائیں تو ظاہر ہے بہت روشن ہو جاتا ہے مگر دن میں دروازے کھڑکیاں بند رہتے ہیں اور پردے پڑے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ادھر کوئی جاتا ہی نہیں۔ نازو نے انسپکٹر کو اندر آتے دیکھا تو وہ ایک صوفے کے پیچھے دبک گئی۔ انسپکٹر سیدھا گیا اور دروازے کو چابی لگا کے کھولا۔ نازو نے چند سیکنڈ بعد قریب جا کے سُنا تو اس کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ جو کم ہوتی گئی۔ نازو نے دروازہ کھول کر نہیں دیکھا کہ کوئی الارم وغیرہ نہ ہو۔ مگر اس نے اندازہ کر لیا کہ وہ نیچے اتر گیا ہے۔ حالانکہ دروازہ کھلا تھا تو اسے باتھ روم ہی نظر آیا تھا۔ انسپکٹر صاحب کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ ڈرائنگ روم سے نکل آئی اور مصروف ہو گئی۔ تاہم اس نے دو بار سونیا کی اور اس کے بھائی کی گفتگو سنی۔ وہ اکیلے تھے اور کسی سے وائرلیس پر مخاطب تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کل رات کچھ لوگ آئیں گے۔"

" وہ کون لوگ ہوں گے؟" میں نے کہا۔

" اس کا اندازہ نازو نہیں کر سکی۔" غالب نے کہا۔ " ان کی ہم سے جتنی گفتگو ہوئی۔ یعنی مجھ سے اور اپنے استاد سے، وہ کچھ ٹیلی پرنٹر کے پیغامات تھے۔ وقفے وقفے سے دس منٹ اسے جب بھی ملے، اس نے رابطہ قائم کر لیا۔ کسی نے اس پولیس انسپکٹر پرویز وکٹر کو فون کیا تھا۔ اس کی گفتگو میں چند نام واضح طور پر لیے گئے۔ مثلاً جگن ناتھ، سیوک رام کے اور اس معاملے میں غالباً کوئی اختلاف رائے تھا یا وہ اپنی اور ان کی حکمتِ عملی کے غلط نتائج پر غور کر رہے تھے کہ بات لمبی ہو گئی اور انسپکٹر پرویز وکٹر کی آواز غیر ارادی طور پر بلند ہو گئی۔ نازو بہت قریب نہیں جا سکتی تھی۔ انسپکٹر آہستہ بول رہا تھا لیکن غصّے میں آ جاتا تو احتیاط کے تقاضے بھول جاتا تھا۔ اس وقت نازو نے آپ سب لوگوں سے زیادہ عقل مند ہونے کا ثبوت دیا۔"

" اگر تم اس کے مجنوں ہو تو تمھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک ناقص العقل عورت کو ہم سب سے افضل قرار دو۔" محسن نے احتجاج کیا۔ " میں سب مردوں کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں۔"

" میں اپنی بات پر قائم ہوں۔" غالب اڑ گیا۔ " نہیں مانتے تو مت مانو۔ میں بھی اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک اپنی بات نہیں منوا لوں گا۔"

" تم کہو کہ وہ آپ سب سے زیادہ خوب صورت ہے تو ہم مان لیں گے۔ یہ بھی مان لیں گے کہ وہ مار دھاڑ میں ہم سے زیادہ نڈر ہے۔" محسن نے مصالحت کا ایک فارمولا پیش کیا۔

" اونھوں — وہ تم سب سے زیادہ عقل مند ہے۔" غالب نے کہا۔

" اچھا بابا — ہم سے ہی نہیں تم سے بھی۔ سارے جہان سے زیادہ عقل مند ہے وہ افلاطون کی بچی۔" محسن نے جھنجلا کر کہا۔ " آگے بکو۔"

" اس نے مجھے پیغام دیا کہ میں اپنے ایف ایم بینڈ کے ریڈیو کو ٹیون کر کے اُن کی گفتگو سُن لوں۔" غالب نے فاتحانہ انداز میں دانت نکال کر کہا۔ " وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ وائرلیس سیٹ ایسا ہی ہے جیسا ہمارے پاس واکی ٹاکی ہے۔ یہ رینج کم زیادہ ہو سکتی ہے مگر ہوگا تو وہی ایف ایم بینڈ۔ سوئی کو اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنے سے کہیں نہ کہیں ان کی آواز پکڑ لی جا سکتی ہے۔ میں نے یہی کیا اور ایک جگہ اُن کی آواز صاف سُن لی۔ دوسری طرف سے معلوم نہیں کون بات کر رہا تھا اور ان کے درمیان جھگڑا یہ تھا کہ سیوک رام اور جگن ناتھ کے ٹولے کو کس کی غلطی نے ختم کیا۔ سائیں بابا پڑ والے کے لڈّی اور کرپان والی کا سُراغ کس کی غلطی سے ملا؟ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔"

" اُن کی گفتگو میں چوہدری دلاور کا نام نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

" نہیں۔ نہ اُس کا، نہ اُستاد پیڈرو یا نواب خسرو جمشید کا۔" غالب نے کہا۔ " لیکن سراج کا نام آیا تھا۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ سراج کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ وہ بہت خفا تھا کہ وعدے کے مطابق مال کیوں نہیں پہنچا۔ جب میں نے اسے بتلایا کہ یہاں معاملہ چوپٹ ہو گیا ہے تو اس کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ راز کیسے فاش ہو گیا؟ کیا سراغ رساں اداروں کو مخبری ہو گئی؟ پرویز وکٹر نے جواب میں جو کچھ کہا، وہ اہم ہے۔ اس نے کہا کہ ثبوت تو کوئی نہیں لیکن میں نے جب ایم ڈی سے بات کی تو وہ بھی میرا ہم خیال ثابت ہوا کہ یہ سکندرِ اعظم کی فوج کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ دُنیا فتح کر لیں گے۔ اس گفتگو میں ایم ڈی کا لفظ کس کے لیے استعمال ہوا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ ایم ڈی کا مطلب ہوتا ہے مینجنگ ڈائریکٹر۔ یہ چوہدری دلاور کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بہرحال ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ یہ کسی اور کا نام بھی ہو سکتا ہے لیکن سکندرِ اعظم کی فوج کا حوالہ بالکل واضح ہے۔ اس بارے میں شک کی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ہماری بات کر رہے تھے اور انھیں یقین ہے کہ اس تباہ کاری کے ذمّے دار ہم ہیں۔ ایم آر ایس والے۔"

" کیا انھیں بھی یہ نام معلوم ہے؟" میں نے کہا۔

" غالباً نہیں۔ ورنہ وہ ایم آر ایس ہی کہتے۔ وہ ہمارا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کر رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ " جیسے ہم کوئی ناقابلِ فہم، ناممکن اور بعید از امکان و قیاس کام کر رہے ہیں اور ہمارے عزائم شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ خیالی اور ناقابلِ عمل ہیں۔ ان کی گفتگو دس منٹ تک میں نے سُنی۔ بات کل پر ختم ہوئی۔ پرویز وکٹر نے کہا کہ اچھا اب جو طے کرنا ہے کل رات کر لیں گے۔ تم وقت پر پہنچ جانا۔ اس نے کہا کہ میری فکر مت کرو۔ بادان آر سنگھ سے کہنا کہ دیر نہ کرے اور آرڈیپ کو سمجھا دینا کہ اس نے اُلٹی سیدھی بات کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ ایم ڈی وہ نہیں ہے۔"

" آرڈیپ — یہ بھلا کیا نام ہوا؟" میں نے کہا۔

" اور بادان آر سنگھ؟" غالب مسکرایا۔ " ظاہر ہے یہ نام نہیں تھے، کوڈ تھے۔ کل میں ان ناموں پر غور کر رہا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ خیر ناموں سے ہمیں کیا۔ یہ تو معلوم ہو گیا نا کہ ڈاکٹر نیملی کے گھر میں اُن کی میٹنگ ہے۔"

" ہمارے پاس بارہ ٹائم بم ہیں۔" محسن نے کہا۔

غالب نے اور میں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ " ابھی اُن کے استعمال کا وقت نہیں آیا۔ کل رات کی میٹنگ میں کون آتا ہے ایک تو یہ دیکھنا ہے اور میٹنگ کے بعد اگر الگ الگ اُن کا تعاقب کیا جا سکے تو یہ بھی کرنا ہے۔ نازو نے ڈرائنگ روم میں وہ مقناطیسی مائکروفون صحیح جگہ پر لگا دیا تو مونگ پھلی کی ریڑھی پر ہم پوری میٹنگ کی رُوداد سُن سکیں گے۔ ممکن ہوا تو ریکارڈ بھی کر لیں گے تاکہ بعد میں ایم آر ایس کی میٹنگ میں اس پر ڈسکس کیا جا سکے۔"

" دوسری اہم بات ہے تہ خانے کی دریافت۔" غالب بولا۔ " اگر میٹنگ تہ خانے میں ہوئی تو ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ نازو وہاں نہیں پہنچ سکتی کہ اپنا مقناطیسی مائکروفون نصب کر آئے۔"

" اُسے چانس مل بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ " فرض کرو کہ وہ چائے لے کر جاتی ہے۔"

" وہ اتنے غیر محتاط نہیں ہوں گے۔" غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ " اگر چائے کی ضرورت محسوس ہو گی تو نازو سے بنوائیں گے اور خود لے جائیں گے۔ وہ اِس خفیہ جگہ تک نازو کو کبھی نہیں پہنچنے دیں گے۔ مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ تہ خانہ ایک گودام ہے اور وہاں سے وہ مائکرو بس بھر کے لے جاتے تھے۔ وہاں شاید میٹنگ کی جگہ نہ ہو۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کے دروازے بند کرنے کے بعد خود کو محفوظ سمجھیں گے۔ وہ کسی خفیہ مائکروفون کی موجودگی کا شبہ کیسے کر سکتے ہیں اور انھیں شک ہو تب بھی اسے تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا۔"

" اور کچھ چاہیے صاحب؟" ویٹر نے ہم سے یوں پُوچھا جیسے یہ میز خالی کرنے کا نوٹس ہو۔ یہ کارروائی قطعی غیر ضروری تھی کیونکہ دوسری بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔

" ہاں دوست — چاہیے تو بہت کچھ۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ " تاج و تخت۔ حکومت و اقتدار۔ مگر فی الحال تم ہمارے لیے صرف چائے لے آؤ۔ باقی پھر کبھی سہی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بیرے کی صورت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اُس نے فرض کیا ہوگا کہ غالب نشے میں ہے چنانچہ وہ جھینپ کر مسکرایا اور لوٹ گیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ نازو کو کسی کٹھن آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔" میں نے کہا۔ "یہ مرحلہ جو بہت مشکل نظر آتا تھا، خلافِ توقع بہت آسان ثابت ہوا۔"

"مجھے تو یقین تھا کہ ہم اتفاقِ رائے سے نازو کو عذاب کے جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ وہ حد سے زیادہ چالاک اور بے رحم لوگ ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اس پر اعتبار کہاں کریں گے اور گھر میں تو ہرگز نہیں گھسنے دیں گے۔ مگر یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ بڑے مجرم بہت احتیاط کرتے ہیں۔ ہر طرح سے مکمل منصوبہ بندی کرتے ہیں اور حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن کوئی بہت چھوٹی سی غلطی کر جاتے ہیں جس کا خود انھیں بھی پتا نہیں چلتا یا احساس نہیں ہوتا اور اس چھوٹی سی غلطی کا بہت بڑا خمیازہ ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے تو پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اس کی ماں کی مدد تائیدِ ایزدی ثابت ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ وہ گٹھیا کی مریض ہے۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔ اس نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ گھر بیٹھے ایک قابلِ اعتماد خادمہ مل گئی۔ ورنہ آج کل بھروسے کے قابل نوکر کہاں ملتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے تینوں بھائی بس چپ ہو گئے لیکن سب سے بڑی کامیابی کی وجہ خود نازو کی اداکاری ہے۔ اس نے اپنے مظلوم، بے سہارا اور بے ضرر ہونے کا یقین دلا دیا۔"

"پرویز وکٹر پولیس میں ہے۔ اس کی لائن ایس پی سراج سے ملی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن دوسری طرف سونیا اور سلیم وکٹر کا کردار زیادہ اہم ہے۔ غالباً سلیم وکٹر ہی نے ڈاکٹر حکیم بن کے ہمیں ٹریپ کر لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر حکیم؟" ٹیڈی اور غالب نے کہا۔ میں نے ان کو پھر بتایا کہ میں اور رابعہ کس طرح فرار ہوئے تھے۔

"سوال یہ ہے کہ اس ڈاکٹر حکیم کو یہ سب کچھ کرنے کے لیے کس نے کہا ہوگا؟" غالب بولا۔

"اُس نے تو ظاہر کیا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ میرا نام فرخ نہیں، سکندر بخت ہے اور میں اپنی شناخت کو کسی نہ کسی وجہ سے چھپانے پر مجبور ہوں۔"

"لیکن وہ سب کچھ جانتا تھا۔" غالب بولا۔ "تمہیں محصور رکھنے کے لیے کسی اسپتال میں یہ انتظام کر لینا آسان نہیں تھا۔"

"وہ ڈاکٹر نہیں تھا۔ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں لیکن وہ کوئی بہت ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کی باتوں نے مجھے اور رابعہ دونوں کو متاثر کیا تھا۔ لیکن یہ اس شکاری کا جال تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اعتماد میں مارے جائیں۔ اس پر بھروسا کرتے ہوئے فرار ہونے کی کوشش نہ کریں اور خود کو محفوظ سمجھیں۔ وہ تو قسمت تھی کہ مجھے اس کے ہر وقت باخبر رہنے کا راز معلوم ہو گیا اور وہ دھوکے میں مارا گیا۔ ورنہ خود سوچو کہ ایک ڈاکٹر کیا اپنے ہاتھ میں ریوالور لے کر پھرتا ہے؟"

"سوال یہ ہے کہ کسی نے اُسے چیک کیوں نہیں کیا؟"

"اسپتال سب کے لیے کھلا رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں اُس کی تیمار داری کرنے والے۔ اُن کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آنے والے۔ وقت بے وقت پہنچنے والے مریض۔ اِن سب کو چیک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بڑے اسپتالوں میں تو ایک شفٹ کا عملہ دوسری شفٹ کے عملے سے بے خبر رہتا ہے۔ کتنے ڈاکٹر ہیں اور کتنی نرسیں۔ یہ سب کسی کو یاد نہیں رہتا۔ اگر عملے میں کوئی نیا ڈاکٹر شامل ہو جائے تو فوراً سب کو معلوم نہیں ہو جاتا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اس وقت میں یا محسن ایک گاؤن قسم کا سفید کوٹ پہن لیں اور ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ لے کر کسی بھی اسپتال میں پہنچ جائیں تو کوئی ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔ سب ایک جیسے حلیے میں اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ کسی کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ کوئی جعلی ڈاکٹر یا نرس بھی اُن کے درمیان موجود ہے۔ ہم آپریشن تھیٹر کے اندر تک ہو آئیں گے اور کوئی سوال نہیں کرے گا کہ تم کون ہو۔ اس کے لیے تھوڑا سا اعتماد چاہیے اور ایک معقول قسم کی شخصیت۔ یہی سلیم وکٹر نے کیا۔ رابعہ بھی سب ڈاکٹروں کو نہیں جانتی۔ مختلف وقت پر مختلف ڈاکٹر آتے رہے۔ اُس نے مان لیا کہ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔ نہ ہوتا تو کیس کے بارے میں کیسے جانتا اور اندر آتا ہی کیوں۔ اُس نے اولڈ مین کا تذکرہ ایسے کیا کہ میں بھی شک نہ کر سکا۔ شک تو ایک بیج کی طرح ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک بار پھوٹ جائے تو پھر بڑھتا ہی جاتا ہے مگر دماغ میں بیج ہی نہ ہو تو شک کا پودا کیسے سر اٹھائے گا۔ آخری کام اس نے یہ کیا کہ ڈاکٹر لطیف کا حوالہ دے دیا۔ اور یہی وہ کڑی ہے جس سے دوسری کڑی ملتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ڈاکٹر لطیف بھی.....؟" غالب بولا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ایسی احمقانہ بات کر کے تم یہ کیوں ثابت کر رہے ہو کہ تم غلطی سے صحافت کے پیشے میں چلے آئے ورنہ تم تھے مونگ پھلی بیچنے کے قابل۔" میں نے کہا۔ "رابعہ جب ڈاکٹر لطیف کے گھر میں تھی تو دلاور وہاں اپنی بیوی کے نفسیاتی کیس کے سلسلے میں مشورہ کرنے گیا تھا۔"

"کیا وہ پاگل ہو گئی ہے؟" ٹیڈی بولا۔

"نفسیاتی کیس تھوڑے بہت سب ہوتے ہیں۔ ہم بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو اعصابی دباؤ یا پریشانی کے باعث نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوتے ہیں، وہ دوسرے درجے کے مریض سمجھے جا سکتے ہیں۔ پاگل پن کے تو کئی درجے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دلاور وہاں جاتا تھا اور شاید کسی موقع پر اس کی نظر رابعہ پر پڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہو تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے رابعہ سے بات کی ہو اور میرے متعلق پوچھا ہو مگر اس زمانے میں رابعہ کو خود اپنی خبر نہ تھی۔ وہ دلاور کو میرے بارے میں کیا بتاتی۔ دلاور نے اسے ایکٹنگ سمجھا ہوگا تو شاید ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہوگا اور اُسے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہوگی کہ رابعہ کو تو کچھ بھی یاد نہیں۔ تاہم اس نے رابعہ پر نظر رکھی اور ایک دن اسے اچانک معلوم ہوا کہ رابعہ گھر سے نکل گئی ہے اور ڈاکٹر لطیف نے ہر اسپتال میں فون کیا ہے۔ دلاور نے بھی تمام اسپتالوں سے پوچھا اور بہت جلد رابعہ کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسے اپنی محنت کا انعام توقع سے زیادہ ملا، یعنی رابعہ کے ساتھ میں بھی مل گیا۔ اس نے فوراً سلیم وکٹر کو میری حفاظت پر مامور کر دیا اور اُس کو حفاظتی انتظامات کی ہر سہولت فراہم کر دی۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی اور خود سامنے کیوں نہیں آیا؟" محسن بولا۔

"تمہیں اُس کا وہ خط یاد نہیں، جو غالب کی معرفت ملا تھا۔ اس میں دلاور نے مذاکرات کی پیشکش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے مہلت ملتی تو وہ اب کیا کرتا۔ میں بے ہوش تھا اور ایسی حالت میں نہ مجھے پولیس لے جا سکتی تھی اور نہ دلاور مجھ سے بات کر سکتا تھا۔ ہوش میں آتے ہی ایک گھنٹے کے اندر اندر میں فرار ہو گیا۔ اگر اتنی دیر میں اس جعلی ڈاکٹر سلیم وکٹر نے دلاور کو مطلع کیا ہوگا تو دلاور نے کہا ہوگا کہ جلدی کی کوئی بات نہیں۔ صبح دیکھیں گے اور تم اس پر نظر رکھو۔"

"اب وہ دلاور کو کیا جواب دے گا کہ اس نے کیا نظر رکھی تھی۔" محسن ہنس کر بولا۔

"تو کیا جواب دے گا گھر جا کے اپنی جورو کو کہ آدھی رات کو منہ اٹھا کے کہاں نکل گیا تھا؟" میں نے کہا۔ "ہم تو ہیں آزاد لوگ۔"

"آزاد نہیں، گمراہ لوگ۔ میں کہہ دوں گا یہی لوگ مجھے بہکا کے بلکہ ہائی جیک کر کے لے گئے تھے۔" محسن بولا۔ "اور رہتے دار تو وہ خود ہے نافرمان۔ اس نے کھانا پکانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ خود ہی کہا تھا کہ بازار سے لے آؤ۔"

"پھر بھی اب چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کافی سزا مل چکی اُسے۔ وہ دونوں پریشان ہوں گی۔"

"خاک پریشان ہوں گی۔ انھیں باتوں میں ہوش ہی کہاں ہوگا کہ کتنی دیر سے شوہر غائب ہے۔" غالب بولا۔

واپسی پر ہم نے اگلے دن کا پروگرام مرتب کیا۔ اس کارروائی میں ہم سب کو شریک رہنا تھا۔ غالب اپنی مونگ پھلی کی ریڑھی پر وکٹر نیلی کے گھر میں ہونے والی کارروائی سُنے گا اور آگے نشر کرے گا۔ سو میٹر کے فاصلے پہ دونوں جانب میں اور ٹیڈی اُس کی ٹاک کے لیے موجود رہیں گے۔ گلی میں جانے والی ہر گاڑی کا رنگ، ماڈل اور نمبر وغیرہ سب ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ غالب اپنی ریڑھی پر ٹیپ ریکارڈر کا اضافی بندوبست رکھے گا۔ تاکہ وکٹر نیلی کے گھر میں جو گفتگو ہو، اس کا ہر لفظ سُنا جا سکے۔ ہم سب مسلح ہوں گے اور ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حالات کے لیے تیار ہو کے جائیں گے۔ میں اور محسن اپنے پرانے طریق کار کے مطابق دو گاڑیاں حاصل کریں گے۔ گاڑی خریدنے، بیچنے اور بدلنے میں رسک تھا۔ اتفاقِ رائے سے ہم نے طے کیا کہ اپنی ضرورت کے لیے ہم گاڑی کسی سے بھی لے لیں گے۔ اور شرافت سے ایک بار استعمال کرنے کے بعد مالک کو پہنچا دیں گے۔ اسے سمجھا دیں گے کہ وہ پولیس کے چکر سے بچے اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے گاڑی بالکل اسی حالت میں کہیں مل جائے گی۔ نہ سمجھا تو خود پولیس سے چھڑاتا پھرے گا لیکن اس طرح ہمیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ گاڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی اور ہم کسی بھی گاڑی کی وجہ سے پہچانے نہیں جائیں گے۔

رات کا ایک بجنے والا تھا جب ہم نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آنے پر میں نے دروازے کو زیادہ قوت سے بجانا چاہا تو دروازہ اندر ہو گیا۔ میں نے حیران ہو کے اُسے پیچھے دھکیلا۔

"یہ کیا۔ دروازہ اس وقت سے کھلا پڑا تھا؟" محسن بولا۔

"اپنی باتوں میں اتنا بھی ہوش نہیں کہ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔" میں نے کہا اور اندر سب سے پہلے داخل ہوا۔ باقی سب مجھ سے صرف ایک قدم پیچھے تھے لیکن گھر کے اندر غیر معمولی خاموشی کا احساس ہم سب کو ایک ساتھ ہوا۔

"کیا سو گئی ہیں دونوں؟" غالب نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم کتنی دیر میں واپس آ گئے ہیں، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اور میری بیوی تو..... اپنی قسم کی ہے۔ اس کے صبح تک سونے کا کوئی امکان نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ صبح تک تشویش میں مبتلا جاگتی اور ڈرتی رہتی۔"

"میں عموماً بارہ بجے کے بعد ہی چلتا تھا ــــ اور تقریباً اسی وقت گھر پہنچتا تھا تو ہم سب اسی وقت کھانا کھاتے تھے۔" غالب بولا۔ گڑبڑ کا احساس سب کو ہو رہا تھا لیکن دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

"شہلا.....!" سب سے پہلے محسن نے آواز دی۔

"رابعہ.....!" میں نے بھی اتنی اونچی آواز میں کہا کہ وہ گھر کے کسی بھی کمرے میں ہوتی تو سن لیتی۔ پھر ایک ساتھ ہم نے تینوں کمروں میں اور باتھ روم میں دیکھا۔ وہ دونوں کہیں بھی نہیں تھیں۔

"میں اوپر دیکھتا ہوں۔" استاد ٹیڈی نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

"چھت پہ! اس وقت چھت پہ کیا کام ان کا؟" غالب بولا لیکن اتنی دیر میں ٹیڈی اوپر پہنچ چکا تھا۔

"اوپر بھی نہیں ہیں وہ۔" ٹیڈی گھبرا کے واپس بھاگا تو زینے سے گرتے گرتے بچا۔ ہم سب خوف اور پریشانی میں اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ شکوک و شبہات کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ اپنی مرضی سے اتنی رات گئے کہیں جانے والی نہیں تھیں۔ انھیں کوئی لے گیا تھا۔ غالب بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ ٹیڈی دیوار سے ٹیک لگا کر دوسری دیوار کو گھورنے لگا۔ میں نے اس جگہ کو دیکھا، جہاں وہ بیٹھی تھیں۔ یوں جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی سگی بہنیں۔ دلوں کی ایک جیسی بے قراری اور محبت کی ایک جیسی تڑپ کے ساتھ جذبوں کی ساری خوبصورتی ان کی حسین صورتوں پہ یوں جھلک رہی تھی جیسے شفاف سطحِ آب پہ چاندنی۔ اب وہ جگہ سنسان پڑی تھی۔

"ان کو اغوا کر لیا گیا سکندر۔" محسن نے بہت دیر بعد کھوکھلے لہجے میں کہا۔ کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا اور تھا تو اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ وہ بے رحم حقیقت تھی جو خود اپنا وجود تسلیم کراتی تھی۔ کسی کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انھیں دلاور اینڈ کمپنی کے شکاری اٹھا لے گئے تھے۔ ایک بار تو رابعہ کو نازو اپنی جان پہ کھیل کے نکال لائی تھی مگر نازو وہ بجلی تھی جو طوفان سے ٹکرا سکتی تھی۔ وہ چنگاری تھی جو شعلوں سے الجھ سکتی تھی اور وہ موجِ نسیم تھی جو بادِ سموم کو پلٹ سکتی تھی۔ کیا اب رابعہ بھی شہلا کے لیے کچھ کر سکے گی؟ نازو پہلے دشمنوں کے حصار میں تھی اور کسی دشواری کے بغیر اس نے حصار کو عبور کر لیا تھا۔ مجھے اب اس کی کامیابی بھی

ایک جنگی چال نظر آنے لگی۔ دشمن نے اسے بھی کامیابی کا[...] دیا تھا۔ وہ ہمیں اس کامیابی پہ خوش ہوتا دیکھنے کے لیے بے[...] ہماری شکست پہ خندہ زنی کے لیے۔

"وہ یہاں تک کیسے پہنچ گئے یار۔" غالب نے کہا[...] سب چونک پڑے۔ "وہ بہت چالاک شکاری ہیں۔ ہم دیدۂ[...] سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے[...] سے یہاں تک ہمارا پیچھا کیا ہو گا۔"

"کیا تم نے..... دیکھا تھا؟" غالب بولا۔

"ہاں..... دیکھا تو تھا..... اور ہم براہِ راست آئے ہی[...] تھے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے رکشا والے سے مزنگ چلنے کو کہا تھا[...] میں پروگرام بدل دیا تھا۔ داتا دربار میں رکے تھے اور وہاں سے[...] رکشا میں یہاں تک آئے تھے..... کہیں بھی مجھے اپنے تعاقب[...] کوئی نظر نہیں آیا تھا۔"

"وہ اتنے بے وقوف تو نہیں ہیں کہ پیچھے آتے تو اس طرح[...] کہ پتا چل جائے۔" استاد ٹیڈی نے برہمی سے کہا۔ "بڑا تیر مارا تھا[...] نے اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔ وہ سب دیکھ رہے[...] سب جانتے تھے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور مجرم کی طرح سب کی طرف دیکھا۔ "میں نے وہی کیا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میری جگہ تم[...] تم میں سے کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا..... یہ ناممکن تھا کہ میں[...] پڑا رہتا اور کچھ نہ کرتا۔"

"تمھیں کوئی الزام نہیں دے رہا ہے۔" غالب نے کہا۔

"ظاہر ہے اُن کا کوئی آدمی باہر بھی موجود تھا۔ کسی گاڑی یا موٹر سائیکل پہ جس نے رکشا کا نمبر دیکھ لیا..... اور پھر بہت فاصلے سے تعاقب کیا۔ غالباً اس نے داتا دربار پہنچ کر رکشا والے سے پوچھ لیا ہو گا کہ ہم کدھر گئے اور اس نے بتا دیا ہو گا۔ ہم نے اس کا کام آسان کر دیا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم ایک رکشا چھوڑ کے فوراً دوسرا رکشا لے[...] تو شاید وہ تعاقب جاری نہ رکھ پاتا۔ مگر ہم ایسا کرتے تو رکشا والا شک میں پڑ جاتا۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟" محسن بولا۔

"میرا دل تو نہیں مانتا۔ میں امکان کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اصل بات کچھ اور ہو گی ــــ یا تو اُن کو پہلے سے ہمارے ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ کسی وجہ سے خاموش تھے۔"

"وجہ کچھ نہیں۔ وہ تینوں کو ایک ساتھ پکڑنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے۔" غالب نے کہا۔ "اب تک وہ نازو کا میک اپ بھی اتار چکے ہوں گے اور اس کے سب پیغام رسانی کے خفیہ آلات ضبط کر چکے ہوں گے۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" استاد ٹیڈی نے کہا اور ہم سب نے اس کو یوں دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کا سوال احمقانہ تھا۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"یہ مذاق ہمیں بہت مہنگا پڑا۔" محسن نے کہا۔

"کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم باہر نہ گئے ہوتے تو وہ ہمیں بھی ساتھ ہی لے جاتے؟" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ ہمیں لے جانا چاہتے تو ہماری واپسی کا انتظار کر سکتے تھے۔ ہم اسی طرح پکڑے جاتے جیسے چوہے دان میں چوہا گرفتار ہوتا ہے۔ وہ ہمیں ہینڈز اپ کراتے اور ریوڑ کی طرح ہانک کر لے جاتے۔"

"کہاں لے جاتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں ــــ یہ سوچنے کی بات ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرا خیال کہتا ہے کہ وہیں جہاں نازو ہے۔ وہ شہلا اور رابعہ کو بھی وہیں لے گئے ہوں گے۔"

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا اور ٹیڈی نے فقط تائید میں سر ہلایا۔

"اگر سب یہی سمجھتے ہیں..... تو پھر دیر کیسی؟" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے ہم اس اسلحہ خانے پہ حملہ کر دیں اور اپنے یرغمالی چھڑا کے لے آئیں؟" محسن بولا۔ "مر جائیں یا مار آئیں؟"

"کیا ہم ایسا نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"یہ سراسر خودکشی ہو گی۔ ہمیں اُن کے پیغام کا انتظار کرنا ہو گا۔ وہ ہم سے کوئی سودا کریں گے۔ کوئی بات منوائیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم سب یوں اچھل پڑے جیسے کوئی بغیر بتائے اندر آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ دستک بیرونی دروازے پر ہوئی تھی۔ ٹیڈی قریب تھا چنانچہ وہ سب سے پہلے دروازے تک جا پہنچا۔ ہم سب جو اس کے ساتھ بیٹھے تھے، رک گئے۔

"ٹھہر جاؤ اُستاد۔" میں نے چلا کے کہا اور جیب سے ریوالور نکال کے دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ "تم سب ہٹ جاؤ پیچھے۔" مگر اتنی دیر میں ٹیڈی نیچے جھکا۔ میں نے اُسے نیچے سے کچھ اُٹھاتے دیکھا۔

"یہ..... یہ کوئی کاغذ ہے۔" ٹیڈی چلایا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں نے ٹیڈی کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھین لیا۔

"وہ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا گیا ہے۔" ٹیڈی نے مشتعل ہو کے ایک ایسی گالی دی جو وہ بھول چکا تھا۔ غالب اور محسن میرے قریب ہو کے اس کاغذ کی تحریر کو پڑھنے لگے۔ اس پر لکھا تھا۔

"سکندر!

میں نے تمھیں پہلے بھی پیغام بھیجا تھا۔ آخر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟

دلاور"

"بس۔ صرف ایک سطر۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔

"جو کچھ اسے لکھنا تھا وہ پہلے ہی لکھ کر بھیج چکا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب تو اس نے صرف یہ کہا ہے کہ تم بات کرنے پر مجبور ہو۔ اب تم انکار نہیں کرو گے ــــ اور اس نے ٹھیک کہا ہے میں جاؤں گا۔"

"سکندر بادشاہ ــــ کہاں جاؤ گے تم؟" ٹیڈی نے خوف زدہ ہو کے کہا۔

"اس نے ایک ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بتا دے گا کہ مجھے کہاں خود کو پیش کرنا ہے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے۔" ٹیڈی بولا۔

"اس نے تو مجھے بلایا تھا۔" میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ مرضی ہے اس کی کہ وہ میرے ساتھ کسی اور کو آنے کی اجازت دے یا نہ دے۔"

"تم..... تم شاید واپس نہ آ سکو ــــ" محسن بولا۔

"ہاں..... لیکن وہ تینوں آ جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "وہ ہم میں سے کسی کو بھی بلاتے تو وہ جاتا۔ کیا تم انکار کر سکتے تھے محسن؟ اور تم غالب؟ کیا یہ ممکن تھا کہ تم نہ جاتے ــــ تم استاد؟" اُن میں سے کسی نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔ اُن میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ پھر اُن کا فیصلہ مختلف کیسے ہو سکتا تھا۔

"عجلت میں فیصلہ مت کرو۔" غالب نے کہا۔ "اس وقت کسی کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہمیں صبح تک سوچ سمجھ کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہو گا۔ ہونے والی بات تو ہو چکی لیکن کیا یہ ہماری شکست ہو گئی؟ جنگ ختم ہو گئی، صرف اتنی سی بات پہ کہ وہ دو لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔"

"یہ اتنی سی بات ہے غالب کے بچے؟" استاد ٹیڈی چلایا۔

"سنو دوستو! وہ سب ہماری محبت تھیں۔ مگر کیا ہماری محبت ہماری کمزوری ثابت ہو گی؟" غالب نے کہا۔ "وہ ہمارا حوصلہ تھیں مگر کیا اُن کے بغیر ہمارا عزم کچھ نہیں۔ ہمارا مشن آخر کیا تھا؟ سب کا نقصان، سب کے اندیشے ــــ اور سب کے خطرات برابر ہیں۔ کیا اس نقصان پر ہم اپنے مشن کو قربان کر دیں گے ــــ ہمارا مشن ایک عورت کا حصول تھا؟ صرف اس کے ساتھ گزاری جانے والی ازدواجی زندگی کی خوشیاں ہمارا مقصدِ حیات تھیں؟ تو ہم نے اتنا وقت کیوں ضائع کیا؟ ہم یہاں تک کیوں آئے؟"

اس کی بات نے ہم سب کو پھر احساس دلا دیا کہ وقتی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

صدمے نے ہم سب کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ اب سونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ یہ سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا کہ وہ رابعہ، شہلا، یا نازو کے ساتھ کیا کر سکتے تھے اور کیا کریں گے۔ پیغام نے ہماری سوچ کو بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ اب یہ توقع تھی کہ وہ میرا یا میرے جواب کا انتظار کریں گے اور اگر میں نے انکار نہ کیا تو ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ بے شک اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ انھیں ہمارے سامنے یا ہمیں ان کے سامنے لے جا کر ہر بات منوا سکتے تھے یا اگلوا سکتے تھے مگر آج کی رات ہم آزاد تھے۔ وہ ہمیں جان بوجھ کر چھوڑ گئے تھے کہ ہم صبح تک کوئی فیصلہ کر سکیں۔

"تم لوگ ڈرائنگ روم میں چلو۔" محسن نے کہا۔ "میں سب کے لیے کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

"میں دروازے کو چیک کر لوں۔" میں نے کہا۔ "کہیں دروازے تک آ کے پیغام چھوڑنے اور ہمیں قید کر جانے والا وہی آلات یہاں نصب نہ کر گیا ہو جو ہم نے وکٹر فیملی کے گھر میں پہنچائے تھے۔ ہماری جوتی اور ہمارا ہی سر والا کیس نہ ہو۔"

"لیکن ..... دروازہ تو باہر سے بند ہے۔" ٹیڈی نے کچھ تاخیر سے کہا، کیونکہ وہ بھی اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس وقت تک وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر چکا تھا۔ میں بھی بھولا ہوا تھا کہ دروازہ نہیں کھولا جا سکتا مگر مجھے اس وقت بڑی حیرانی ہوئی جب دروازہ کھل گیا۔ میں نے کسی کے فرار ہوتے قدموں کی صدا پر بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور باہر آ گیا۔ فرار ہونے والے کو میں نے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دیکھا۔ وہ سرتاپا سیاہ لباس میں تھا اور آخری کونے کی اسٹریٹ لائٹ کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تب بھی میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کے چہرے پر بھی چادر کا پلّو تھا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ میں نے ریوالور اٹھایا اور نیچے کر لیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہ حرکت میں تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ نشانہ خطا جائے۔ محلّہ تو سارا جاگ اٹھتا مگر میرے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگانے کا سوچا مگر پھر خود ہی اس ارادے کو ترک کر دیا۔ اسے پچاس گز آگے ہونے کا فائدہ حاصل تھا اور وہ تھا بھی بہت تیز رفتار۔ ذرا سی دیر میں وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ پھر کسی جیپ کا انجن غُرّایا۔ اور جیپ کی ایک جھلک مجھے اس وقت دکھائی دی جب جیپ گلی کے سامنے سڑک پر سے گزری۔ گلی کے آخری حصّے کے بعد سڑک پر کوئی اسے واپس لے جانے کے لیے تیار کھڑا ہوا تھا۔

"کچھ ملا؟" غالب نے میرے قریب آ کے کہا۔ "یہ ٹیڈی تو کہہ رہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے؟"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا تھا؟" ٹیڈی نے بیزار ہو کے کہا۔

"جھوٹ نہیں تھا تو کیا سچ تھا؟" غالب نے بھی بیزاری میں کہا۔ "سکندر کے پاس جادو تو نہیں ہے کہ اس نے خود باہر سے لگی ہوئی کنڈی کھول لی۔"

"کوئی باہر موجود تھا۔" میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے سب کو مطلع کیا۔ "جس نے کنڈی لگائی تھی، وہ دروازے سے لگا کھڑا رہا اور ہماری گفتگو سنتا رہا تھا۔"

"تم قیاس آرائی کر رہے ہو....."

"نہیں ——— جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ بھاگا۔" میں نے کہا۔ "میں نے خود اسے بھاگتے دیکھا ——— ایک جیپ اسے لے گئی ہے۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا اسے؟ کون تھا وہ؟" محسن بولا۔

"گولی کیوں نہیں مار دی اسے ———" ٹیڈی نے کہا۔

"یار! اس نے کالی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بہت دور نکل گیا تھا وہ۔" میں نے کہا۔ "گولی تو مار دیتا مگر اس کے بعد کیا ہوتا، لوگ باہر نکل آتے کہ یہ کیا تھا ——— اسے گولی لگتی یا نہ لگتی ہم [illegible] میں پولیس کا چکر پڑ جاتا۔"

ایک بات پر ہم سب کا اتفاقِ رائے تھا کہ یہ جگہ اب چوہدری دلاور کی نظروں سے محفوظ نہیں اور تحفظ کا احساس محض ہماری خوش فہمی تھی۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ اس شہر کے کسی گوشے میں ہمارے لیے مستقل پناہ نہیں۔ دلاور ہزار آنکھوں والا ہزار پا ہے جو ہر جگہ دیکھ سکتا ہے اور ہر جگہ پہنچ سکتا ہے اور اس سے کہیں مفر نہیں۔ آئندہ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ یہ مسئلہ خارج از بحث تھا اور زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا، جہاں سینگ سمائیں ——— جہاں تقدیر لے جائے۔

یہ غالب تھا جس نے ایک سوال پھر اٹھایا کہ وہ شہلا اور رابعہ کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ غالباً وہیں جہاں نازو ہے۔ ہم سب نے کہا ——— یہ ہم پہلے بھی کہہ چکے تھے۔

"وہ انھیں کسی دوسری جگہ بھی لے جا سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہاں ——— انتخاب رابعہ یا شہلا کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟" غالب بولا۔ "کیا وہ انھیں اپنے گھر لے جائیں گے ——— نہیں ——— وہاں ان کی اپنی فیملی ہو گی۔ وہ جو کچھ باہر کرتے ہیں، اس کا تعلق ان کی فیملی سے نہیں ہوتا اور اس کا اثر ان کے گھر پر نہیں پڑتا۔"

"ان کے پاس جگہ کی کمی نہیں۔ ان کے وسائل محدود نہیں اور ان کے سارے خفیہ ٹھکانے ہمارے علم میں نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "میں نے بھی ان کے گھر اور خاندان کی بات کی تھی جو ان کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لیکن کیا ہمارے گھر اور خاندان ان کی بدمعاشی اور جارحیت سے محفوظ ہیں؟ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ وہ رابعہ اور نازو کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ہمارے ساتھ ایک محاذ پر آ گئے تھیں۔ آج انھوں نے ہمارے گھر میں گھس کر کارروائی کی ہے۔ وہ محسن کی بیوی کو اٹھا لے گئے ہیں۔ محسن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دلاور کی بیوی کو اٹھا لائے۔"

میں نے غالب کے استدلال پر محسن کی طرف دیکھا۔ پھر محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نظر کا سوال ایک ہی تھا۔ کیا غالب ٹھیک نہیں کہتا؟ ——— جنگ میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری دونوں فریق کرتے ہیں یا پھر کوئی بھی نہیں کرتا۔ پہل کرنے والے ہم نہیں تھے مگر ہمارے لیے ایسی ہی جوابی کارروائی کا جواز یقیناً پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ بھی سوچو سکندرِ اعظم کہ رشتوں کی آبرو کا پیمانہ صرف نکاح نامہ نہیں ہوتا، جو محسن کے پاس ہے اور تمھارے پاس یا میرے پاس نہیں ہے۔ رابعہ تمھاری بیوی نہیں۔ نازو میری کچھ نہیں مگر کیا وہ ہماری عزّت نہیں ہیں؟ ——— ہم ان کی عزّت کے اتنے ہی رکھوالے ہیں، جتنا دلاور اپنی بیوی کی عزّت کا رکھوالا ہے۔ یہاں قانون اور اخلاق میں ذمّے داری کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔" غالب نے کہا۔

"میں تمھارے خیال سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اختلاف محسن بھی نہیں کر سکتا۔" غالب نے کہا۔ "اگر ہم اپنے عقیدے کو دیکھیں تو اس میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت یا جان کے بدلے جان لینے کا تصوّر ہے۔ ہمیں یہ حکم نہیں کہ کوئی تمھارے ایک گال پہ طمانچہ مارے تو تم دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ جہاں تک ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تعلق ہے تو سوال قانونی رشتے کا نہیں.......... ایک دشمن ہم سے وہ چیز چھین کر لے گیا جو ہمیں بہت عزیز تھی۔ ہماری آنکھ اور ہمارے دانت سے بھی زیادہ اور وہ ہمارا دشمن تھا۔ اس سے ہماری جنگ ہے ——— کھلی جنگ۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں دلاور نے ہی مجبور کیا ہے کہ ہم اسی کے سکّوں میں اس کو ادائیگی کریں۔" محسن بولا۔

"اب یہ ہمارا مفروضہ ہے کہ وہ رابعہ اور شہلا کو بھی نازو کے ساتھ قید کر کے لے گئے ہوں گے۔ اس مفروضے کی بنیاد کوئی نہیں۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وکٹر فیملی کے اسلحہ خانے پر حملہ کر کے سب کو چھڑا لانا بھی ناممکن ہے۔ لیکن ایک کام ہم کر سکتے ہیں۔ سو فی صد یقین کے ساتھ جس میں ناکامی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم نے چوہدری دلاور کا گھر دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے دشمنوں میں سے ہم نے ایس پی سراج کا گھر دیکھا ہے۔ سکندر کو چوہدری حشمت کا گھر معلوم ہے جو پولیس میں انسپکٹر یا سب انسپکٹر ہے۔ ڈی سلوا جس کوٹھی میں تھا وہ اب خالی پڑی ہو گی۔ لیکن وہ بھی ایک ٹارگٹ ہے۔ کیا یہ چار ٹارگٹ کافی نہیں؟"

"ٹارگٹ کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس بارہ ٹائم بم ہیں۔" غالب نے کہا۔ "ہم ان میں سے چار استعمال کر سکتے ہیں ——— ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بم کے پھٹنے سے شاید شکاری خوف زدہ نہ ہوں۔ دوسرا دھماکا ان کے حوصلے پست کر دے گا۔ تیسرے دھماکے سے پہلے اگر چوہدری دلاور کو بتا دیا جائے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لے، ورنہ نہ اس کا گھر رہے گا نہ خاندان۔ تو مجھے امید ہے ہم اس سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

غالب کی تجویز نے ہم سب کو دم بخود کر دیا۔ یہ خطرناک جنگ کی ابتدا تھی مگر جنگ تو ہوتی ہی خطرناک ہے۔ اس حکمتِ عملی سے دلاور کو ایک فیصلہ کُن جنگ میں شکست ہو سکتی تھی۔ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے تھے اور ہم ثابت کر سکتے تھے کہ "ایم آر ایس" ایک نام ہی نہیں، ایک طاقت بھی ہے۔ ایک ایسی طاقت جس سے ٹکرانا آسان نہیں رہا۔ اگر یہ پلان کامیاب رہا تو شکاری پہلی بار ہماری قوت کے مظاہرے سے خوف زدہ ہوں گے۔ انھیں یقین کرنا پڑے گا کہ ہم بھی شکاری ہیں، جو ان کو اسی طرح شکار کر سکتے ہیں جیسے اب تک وہ سب کو شکار کرتے رہے ——— ان کو جو بے گناہ مارے گئے ——— جو ہمارے مقابلے کے لیے خریدے گئے اور جان گنوا بیٹھے۔ سائیں پاپڑ والے سے سیوک رام اور وکٹر فیملی تک سب اسی ہوسِ زر کے شکار تھے۔ چوہدری دلاور نے اپنے پیسے سے ڈی سلوا کو، استاد پیڈرو اور خسرو جمشید کو، ڈی ایس پی سراج کو اور ان سب کو شکار کیا جو ضمیر کو قابلِ فروخت سمجھتے ہیں۔ اس کی عیاری اور سفاکی نے وزیر خان کو اور میر شرافت علی کو شکار کیا۔ رابعہ، اس کی ماں اور دوسرے ان گنت لوگ اس کی بربریت کا شکار ہوئے۔ لیکن خود دلاور سے اوپر عالمی سیاست کے شکاری تھے جو اسی پیسے کی قوت سے سرحدیں بدل رہے تھے۔ دلوں میں تفرقے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پیدا کر رہے تھے۔ گھر اور بستیاں اُجاڑ رہے تھے اور اسلحہ خرید کر ان انسانوں کے ہاتھوں میں تھما رہے تھے جو قاتل نہیں تھے مگر ان کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ عصبیت کا شکار ہو کے اپنے ہم وطنوں کا شکار کر رہے تھے۔ خون کی ہولی کھیل رہے تھے اور انسانیت کی قدروں کو پامال کر رہے تھے شکاری سب تھے اور شکار بھی سب تھے۔۔۔ نیچے سے اوپر تک مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک چلانے والوں سے لے کر اس تحریک کی نشو ونما کرنے والوں تک۔۔۔

"اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو؟" غالب نے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

"ابھی صبح ہونے میں دیر ہے کم سے کم چار گھنٹے ہیں جس میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ ٹائم بم کبھی کسی نے دیکھے؟ مطلب یہ کہ ان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اگر انھیں استعمال کرنا ہو تو کیسے کیا جائے گا؟"

"اب تک کوشش تو نہیں کی۔ مگر ٹائم بم کا میکینزم کوئی کمپیوٹر کا سرکٹ نہیں ہوتا۔" محسن بولا۔ "کلاک ورک ہوتا ہے۔ ابھی سمجھ لیتے ہیں۔" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹائم بم تھا جو اس نے ٹیڈی کی طرف اچھال دیا۔

"لو اُستاد پکڑو۔ کیچ۔۔۔" محسن نے کہا۔ استاد ٹیڈی کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور اس کی حالت خندق میں بیٹھے ہوئے شخص سے بدتر ہو گئی جس کے سر پہ بم آ گیا ہو۔ نہ وہ اٹھ کر بھاگ سکتا تھا اور نہ بچ سکتا تھا۔ کیچ وہ خاک کرتا۔ اس نے نہایت مضحکہ خیز انداز میں اِدھر اُدھر ہاتھ چلائے جیسے ناک پر بیٹھنے والی مکھی کو اُڑا کر بھگا رہا ہو اور پھر آخری وقت میں لڑھک گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی مضحکہ خیز آوازیں سُن سُن کر ہم سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ہماری ہنسی اس وقت قابو سے باہر ہو گئی جب ٹائم بیس کے برابر بم اُس کی گود میں گرا اور اس نے زور سے کلمہ پڑھا جیسے بم پھٹ گیا تو اُسے اس کی مہلت بھی نہ ملے گی۔

جب کچھ بھی نہ ہوا اور اُس نے ہمیں ہنستے دیکھا تو وہ ایک دم اٹھا۔۔۔ "تیری تو ایسی کی تیسی۔" وہ محسن کے پیچھے دوڑا۔ "سالے استاد۔۔۔ کیا گناہ ہے آخر میرا۔ کیچ خود تم نے نہیں کیا اور مارتے ہو مجھے۔" محسن نے چھلانگ مار کر اپنی جان بچائی۔

"لو۔۔۔ بیچارے پر بم پھینک دیا اور کہتا ہے میرا گناہ کیا ہے۔" غالب بولا۔

"بم پھٹ جاتا تو بیچارا دُنیا سے کنوارا جاتا۔" میں نے کہا۔

"بڑی خود غرضی کی بات ہے کہ خود تو شادی کر لی او ٹیڈی پر بم گرا دیا۔"

اُستاد ٹیڈی کا خوف پہلے شدید اشتعال میں تبد گیا تھا۔ ہماری ہنسی نے غصّے کو خجالت میں بدل دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ "یار ایسا جان لیوا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بولا

"ابے کوڑھ مغز۔۔۔ عقل کے دشمن۔" محسن نے کہا۔ "بم والا ہوتا تو یہ دوسرے آرام سے بیٹھے رہتے۔۔۔ اور میں پھینکتا۔ قسم خدا کی میرے لیے تو ڈوب مرنے کا مقام ہے سالا اتنا احمق ہے۔"

"اُستاد۔۔۔ بم میں ایک تو ہوتا ہے فیوز۔" غالب نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ "جب تک فیوز نہ لگایا جائے بم اتنا ہی رہتا ہے۔ جیسا کوئی کھلونا۔۔۔ اس کے علاوہ یہ تو خاص سسٹم اُس میں ٹائم سیٹ کرنا ضروری ہے۔ جیسے الارم ٹائم سیٹ کیے بغیر نہیں بجتا۔ ایسے ہی یہ ٹائم بم بھی سیٹ کیے ہوئے ٹائم پھٹتا ہے۔" اتنی دیر میں محسن نے ٹائم بم کو اکٹ پلٹ کر سے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار غالب سے کیا اور غالب نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر انھوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے کہا کہ میں اپنی ناقص عقل کو اس دام سے دُور رکھ کے خوش ہوں۔ اللہ آپ دونوں کی مغفرت کرے۔ اگر سمجھنے میں کوئی غلطی ہو جائے۔۔۔ تجربے کی گنجائش تھی چنانچہ انھوں نے بم کو ایک طرف رکھ دیا اور آدھے گھنٹے میں ہم نے اپنا پلان بنا لیا۔

اس کا پہلا مرحلہ دو ٹیموں کی تشکیل سے شروع ہوا۔ ٹیم میں میرے ساتھ غالب رہا۔ دوسری ٹیم میں سالے بہنوئی کو شامل کیا گیا۔ اس تنبیہ کے ساتھ کہ وہ بم ایک دوسرے کو نہ لگا پروگرام کے مُطابق انھیں ڈی سلوا کی خالی کوٹھی میں پہلا بم رکھنا اور اس کا وقت اتفاقِ رائے سے دس بجے رکھا گیا تھا۔ چونکہ ٹائم بم میں زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ آخری بم کا وقت دو بجے ہو۔ دُوسرا بم بھی انھی ایس پی سراج کے گھر میں لگانا تھا اور اس کا وقت گیارہ بجے کا تھا۔ باقی دو بم میرے اور غالب کے پاس تھے۔ تیسرے کے لیے بارہ بجے کا وقت اور حشمت خان کا گھر منتخب کیا گیا اور آخری بم چوہدری دلاور کے گھر کے لیے تھا۔ دلاور کو دو گھنٹے مہلت دی گئی تھی تاکہ وہ فیصلہ بھی کر سکے اور اس پر عمل در آمد کے انتظامات ہماری مرضی کے مطابق ممکن ہوں۔

اس وقت رات کے یا صبح کے تین بجے تھے۔ اندھیرے کو دیکھتے ہوئے اسے رات ہی سمجھا جا سکتا تھا مگر اصولاً یہ

دن کی صبح کا آغاز تھا اور اس آغاز کو بھی تین گھنٹے بیت چکے تھے۔۔۔ حشمت خان کا گھر ایک سمت میں تھا تو دلاور کا دوسری سمت میں اور ہم واپس پہنچتے تو ایک تکون کے تین اضلاع کی مسافت طے کرتے۔۔۔ مجموعی فاصلہ پندرہ میل سے کم نہ ہوتا۔ چنانچہ پہلا مسئلہ ٹرانسپورٹ کا تھا۔ محسن اور ٹیڈی کی ٹیم پر بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ انھیں ذرائع نقل و حمل خود تلاش کرنے ہیں یا پیدا کرنے ہیں۔ ہم دو فرلانگ تک پیدل چلتے رہے لیکن اتنی دیر میں ہمارے قریب سے ایک چوکیدار سائیکل پہ گزر رہا۔ ایک کُتا چار ٹانگوں پر اور ایک پولیس مین دو ٹانگوں پر گزرے اور دُودھ لے جانے والا ایک ریڑھا گزرا۔ جس میں دو ٹانگوں والا جانور چار ٹانگوں والے کو نہار منہ گالیاں دے رہا تھا۔ ہماری مایوسی اور دل شکستگی کو مرزا غالب نے حُسنِ تدبیر سے نئی اُمید اور تازہ حوصلہ دے کر جدّ وجہد کے جوش اور ولولے میں بدل دیا تھا۔ ہم محسوس کرنے لگے تھے کہ ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی ہے۔

اچانک غالب نے مجھے کہنی ماری اور سڑک پر گر گیا۔ میں نے پیچھے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹ دیکھ لی تھی۔ میں نے سڑک کے درمیان میں آ کے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ قریب آ کے کار رُک گئی۔ ان کے لیے رُکنے کے بنا چارہ بھی نہ تھا کیونکہ غالب آدھی سڑک پر لمبا پڑا ہوا تھا۔ باقی راستہ میں نے روک رکھا تھا۔ عورت اور مرد دونوں جوان تھے لیکن عورت خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"میں نے۔۔۔ تم سے کہا تھا۔۔۔" وہ بولی۔ "گاڑی مت روکو۔"

"شٹ اپ۔" مرد نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "کیا بات ہے؟"

"یہ میرا ساتھی۔۔۔ چلتے چلتے لیٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "غالباً اس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی۔۔۔ اگر آپ اسے اسپتال۔۔۔"

"اُف۔۔۔ بھئی ہم ایئر پورٹ جا رہے ہیں۔" مرد بولا۔ "میرا سالا آ رہا ہے۔ اسپتال گئے تو دیر ہو جائے گی۔ ہم ایئر پورٹ پہنچیں گے اور وہ گھر پہنچ جائے گا۔"

"وہ گھر پہنچ تو جائے گا صاحب۔۔۔ یہ تو اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا۔" میں نے کہا۔ مرد مجبور ہو گیا اور اس نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پلک جھپکتے میں مُردہ زندہ ہو گیا اور ہم دونوں تقریباً ایک ساتھ پچھلی سیٹ پہ قابض ہو گئے۔ مرد کا ہاتھ گلوو کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے ریوالور نکال لیا۔ عورت نے ایک چیخ ماری۔

"واٹ اِز دِس۔۔۔ تم ڈرلما کر رہے تھے؟" مرد بولا۔

"یس۔۔۔ ہم ایسے ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔ "اور خواہش یہی رکھتے ہیں کہ انجام ٹریجک نہ ہو۔ سب لوگ آخر میں ہنسی خوشی اپنے اپنے گھر جائیں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔"

"یہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے۔" غالب نے کہا۔ "جہاں ہم جانا چاہتے ہیں وہاں پہنچا دو۔ اس کے بعد گڈ بائی اینڈ گڈ لک۔۔۔ ہمیں صرف لفٹ چاہیے۔"

"جو تم خوشی سے کبھی نہ دیتے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر ہمیں اس وقت ٹرانسپورٹ ملنے کی امید ہوتی تو ہم تمھارا راستہ کبھی نہ روکتے۔"

بیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے ہمیں مغل پورہ روڈ پر گھاس منڈی کے پاس اتار دیا۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔۔۔ عورت نے ایک بار پھر مرد کو یاد دلانا چاہا تھا کہ وہ احمق ہے اور اگر اس نے گاڑی نہ روکنے کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔ مرد نے پھر اس کو شٹ اپ کہا تھا اور وہ شٹ اپ ہو گئی تھی۔

"تھینک یو۔۔۔ اور بہت معذرت۔" میں نے اترنے کے بعد کہا۔ "آدمی کبھی کبھی مجبوری میں وہ کام کرتا ہے جو اسے نہیں کرنے چاہئیں۔ مثلاً شادی۔"

"اگر تم ڈاکا ڈالنے جا رہے ہو تو خدا کے لیے میری گاڑی کا نمبر بھول جاؤ۔" مرد بولا اور گاڑی نکال لے گیا۔ عورت اُس وقت بھی دم بخود بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے صرف لفٹ لی ہے۔ اس کی جان نہیں لی ہے۔ زیورات نہیں لیے۔۔۔ ہینڈ بیگ نہیں لیا۔

آگے کا راستہ ایک تنگ سی سڑک سے گزرتا تھا، جو ایک فرلانگ کے بعد دو حصّوں میں بٹ جاتی تھی۔ ایک گلی نما سڑک تھوڑا سا دائیں طرف گھومتی تھی تو دوسری تھوڑا بائیں طرف۔ یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور میں نے اُلٹے ہاتھ کی طرف مڑنے کا فیصلہ کیا۔ بہت جلد میں نے اس جگہ کو شناخت کر لیا جہاں ایک رات میں رابعہ کو سخت ترین عذاب کی قید سے نجات دلا کے پہنچا تھا تو مجھے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ کیونکہ میرے جسم پر نام کو بھی لباس نہیں تھا۔ وہ گھڑ سوار پولیس تھی جو مجھے اپنے ساتھ تھانے لے گئی تھی۔ جہاں سے انکل ایس ایس پی رضوی کو فون کرتے ہی مجھے وی آئی پی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اسی رات میں نے حشمت خان کا گھر دریافت کیا تھا۔ بات بہت پُرانی تھی اور میں کچھ بھول رہا تھا۔ اگر ہم چلتے تو کسی سے بھی پتا پوچھ سکتے تھے۔ مگر ایک تو اُس وقت پتا بتلانے والا دُور دُور تک کوئی نہیں تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور ہوتا تو بھی حشمت خان کا پتا پوچھ کے ہم اپنی حیثیت مشتبہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر پروگرام پر عمل کرتے ہوئے ہم بارہ بجے حشمت خان کے گھر کو اُڑاتے تو ایک چشم دید گواہ سامنے آجاتا اور بتاتا کہ ہاں..... رات کے نہیں.... صبح کے ساڑھے تین چار بجے تھے جب دو اس قسم کے آدمی حشمت خان کا پتا پوچھتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ رُک کر میں نے تھوڑا سا غور کیا اور ذہن کے نہاں خانوں میں رکھی ہوئی یادوں کی کتاب پر سے وقت کی گرد جھاڑی۔ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک تصویر اُبھری تو غالب نے مجھے ہلایا۔

"یہ کیا گلی کے بیچ میں گیان دھیان شروع کر دیا۔ ابھی آجائے گا کوئی چوکیدار تو گلے پڑ جائے گا۔" غالب نے کہا۔

"گیان یہ حاصل ہوا ہے ہمیں مُورکھ، کہ جہاں ہم پہنچ چکے ہیں وہی ہماری منزل ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنے سامنے دیکھ..... وہ جو سُرخ رنگ کی کھڑکیوں کی قطار ہے، وہی حشمت خان کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے میری انگلی کے اشارے پر دیکھا۔ "یہ تیسرا گھر؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ہم نے تصدیق کے لیے قریب جا کے دیکھا۔ دروازے پر لکڑی کی میلی سی تختی پر "حشمت خان" اے ایس آئی لکھا تھا۔ اس کے دونوں جانب دو منزلہ مکان تھے۔ ایک نظر میں ہمیں یہ اندازہ ہو گیا کہ ہمارا کام کتنا مشکل ہو گیا ہے۔

"دونوں طرف سے چھت پر اترنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" غالب نے کہا۔

"شاید پیچھے کی طرف کوئی ایسا گھر ہو جس کی چھت بالکل حشمت خان کے گھر کی چھت سے ملتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا کیا فائدہ کہ پہلے ہم ایک چھت پر چڑھنے کا خطرہ مول لیں اور پھر دوسری پر اتریں۔" غالب نے کہا۔ "براہِ راست اسی پر نہ چڑھ جائیں۔"

"کیسے چڑھ جائیں بندر کے بچے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو اُڑنا بھی نہیں آتا اور خدا نے تمھیں عقل دی ہوتی تو ایک سیڑھی یا رسّی لے آتے۔"

"میلی کو پٹر ہوتا تو سب سے اچھا رہتا۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "تم اِدھر آؤ۔ ذرا دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔ میں تمھارے سرِ عزیز پہ قدم رکھ کے اُوپر والے چھجے تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے چھت کی منڈیر تک پھر یہی طریقہ کام آئے گا۔"

مجھے اندازہ تو تھا کہ کھڑکی کے اُوپر والا چھجا کافی مضبوط ہے اور زیادہ اُونچا بھی نہیں ہے۔ زمین سے اُس کی بلندی آٹھ فٹ کے قریب تھی۔ لیکن غالب روشن دان کے چھجے کی بات کر رہا تھا جو بارہ فٹ اُوپر تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں میں پیر رکھا اور میرے کندھے پر چڑھ گیا لیکن چھجا ابھی ایک فٹ دُور تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اٹھائے۔

"دونوں ہتھیلیوں پر ایک ایک پیر رکھو۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو اور اُوپر اٹھاتا ہوں۔"

غالب نے سر ہلایا اور میرے ہاتھوں پر چڑھ گیا۔ اس کا وزن میری توقع سے زیادہ ثابت ہُوا۔ لیکن میں نے جسم کی ساری توانائی صَرف کر کے ہاتھوں کو اُوپر کیا۔ آہستہ آہستہ غالب اُوپر اٹھا۔ "شاباش ٹارزن، تھوڑا سا اور..... بس تھوڑا سا اور..... " ایک دم میرے ہاتھوں پر سے وزن غائب ہو گیا۔ میں نے لمبی سانس کھینچی اور غالب کو روشن دان کے چھجے پر پیر جما کے چھت کی منڈیر کو پکڑتے دیکھا۔ روشن دان کا چھجا لکڑی کا تھا اور اس پر زیادہ وزن نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے ہاتھ سے کیا اشارہ کیا اور چھت پر اُتر کے غائب ہو گیا۔ میں گلی میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ اِتنی دیر میں نہ گلی سے کوئی چوکیدار گزرا تھا نہ کوئی دُوسرا شخص۔ لیکن کوئی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سامنے والے گھر کے دروازے میں نزدیک ہو گیا، جو دونوں دیواروں کے درمیان کچھ گہرائی میں تھا۔

غالب شاید یہ چاہتا تھا کہ میں گلی کی نگرانی کروں۔ اتنا کام وہ اکیلا کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے اُوپر جانے اور ایک ساتھ گھر میں اترنے سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ کام ایک ہی آدمی کا تھا۔ میں اُس الماری جیسے خلا میں دروازے سے چپک کر سانس روکے کھڑا ہوا تھا کہ نہ جانے کدھر سے ایک کُتا نمودار ہو گیا۔ اس نے قریب آ کے مجھے سُونگھنا شروع کر دیا۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے لگی۔ کُتا میرے بُوٹ چاٹنے لگا۔ دُنیا کی آفات میں اگر مجھے کسی چیز سے خوف آتا ہے تو وہ کُتا ہے، جس پر بطرس نے انتہائی حقیقت پسندانہ مضمون لکھا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس خطرناک چیز سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور اس سے ٹل جانے کو کہا لیکن وہ بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب آدمی خوف زدہ ہوتا ہے تو اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے اور اس کے بدن کا رُواں رُواں کھڑا ہونے کا سبب وہ ایڈرنالین ہوتی ہے۔ جو ایسے وقت میں خود بخود خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور کُتے اُس کی بُو سے الرجک ہوتے ہیں چنانچہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ کُتا اُس پر غُرّاتا ہے جو اس کے قریب سے ڈرتا ہُوا گزرے یا خوف کے باعث رُک کر کانپنے لگے ۔۔۔۔ لیکن جو بے خوفی سے گزر جائے، کُتا اس کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا، اور اس سے ڈرتا بھی ہے۔ اس بات کے سچ ہونے کا ثبوت مجھے پھر ملا۔ کُتے نے غُرّانا شروع کیا اور اس کے عزائم جارحانہ ہو گئے۔ میرے لیے کچھ کرنا ضروری ہو گیا۔ میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ چیخ نہیں مار سکتا تھا، یہاں تک کہ اُسے شُو شُو کر کے دھتکار تک نہیں سکتا تھا..... میں نے وہ کیا جس کی مجھے خود سے بالکل اُمید نہ تھی۔ میرا ایک پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور بُوٹ کی ٹھوکر کُتے کے سَر پہ لگی۔ وہ چلّاتا ہوا بھاگا..... میں نے اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ نئی مصیبت نازل ہو گئی ۔۔۔ اگر وہ کُتے کا بچہ نہ آتا تو میں دبکا کھڑا رہتا اور چوکیدار سیدھا گزر جاتا مگر کُتے پر ہونے والے تشدد اور اس کی فریاد و فغاں نے چوکیدار کو ہوشیار کر دیا..... وہ ایک دم لٹھ لے کر سامنے آگیا۔

"کون....؟" اُس نے چلّا کر پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اُسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی اور وہ میری گرفت میں بے بس ہو گیا۔ میری جگہ غالب ہوتا تو اس سے نہ نمٹ پاتا کیونکہ وہ صحت مند اور جوان عمر کا پٹھان تھا۔ اُسے خاموش رکھنے کے لیے میں نے اس کے کان کے پیچھے کہنی ماری۔ وہ بے سُدھ ہو کے میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے وہیں لٹا دیا اور بے چینی سے غالب کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ سب سے زیادہ خوف مجھے حشمت خان کے گھر میں کسی کے جاگ اٹھنے کا تھا۔ غالب مسلح تھا اور خدانخواستہ حشمت خان مقابلے پر آجاتا اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چور کو خود پکڑنے کی کوشش کرتا یا اس پر گولی چلاتا تو خود مارا جاتا۔ یہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے تو یہ طے کیا تھا کہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹا پہلے حشمت خان کے گھر فون کر کے گھر والوں کو نکل جانے کو کہیں گے۔ انھیں صاف بتا دیں گے کہ گھر میں بم رکھا ہوا ہے جو ٹھیک آدھے گھنٹے بعد پھٹ جائے گا۔ بم کو تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ بم ایسی جگہ ہے جہاں سے خود بم ڈسپوزل اسکواڈ والے بھی اسے برآمد نہیں کر سکتے۔

غالب بیس منٹ بعد نمودار ہوا اور اس نے اُوپر سے ہی ہاتھ ہلایا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ اوپر جانے کی نسبت نیچے اترنے کا عمل بہت آسان تھا۔ غالب منڈیر سے لٹکا تو اس کے پاؤں کھڑکی کے چھجے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ لٹک کر گلی میں پہنچ گیا اور ہم کوئی بات کیے بغیر چل دیے۔

"سب ٹھیک ہو گیا نا۔" میں نے گلی سے نکل جانے کے بعد کہا۔

"اوپر کپڑے سکھانے والی الگنی تھی۔" غالب بولا۔ "میں نے رسّی کھول لی اور بم کو اس میں باندھ کر آتش دان کی چمنی سے نیچے پہنچا دیا۔"

"یہ نہ ہو کہ بم نیچے آتش دان میں رکھا ہوا نظر آجائے۔"

"میں نے اُسے آٹھ فٹ نیچے اتارا تھا۔" غالب بولا۔ "اور رسّی کو چمنی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ بم دیوار کے بیچ میں ہے۔"

"چمنی میں سے دھواں نیچے نہ گرا ہو۔"

"یار، کچھ نہیں ہوا....." غالب نے جھلّا کے کہا۔ "بے وقوف نظر ضرور آتا ہوں میں، لیکن ہوں نہیں..... آتش دان میں آگ کبھی نہیں جلائی گئی۔ پُرانے مکانوں میں بنائے ضرور جاتے تھے۔ اب نمائشی رہ گئے ہیں ۔۔۔ گھروں میں بجلی اور گیس کے ہیٹر استعمال ہوتے ہیں۔"

"نیچے ایک کُتے کی وجہ سے چوکیدار آگیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اُسے مجبوراً ناک آؤٹ کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آجائے گا۔"

"اب درپیش ہے اصل مرحلہ۔" غالب نے کہا۔ "شیر کے کچھار میں بلکہ شیر کے منہ میں بم رکھنا ہے۔"

"چار بج رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پانچ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے تک ہمیں وہاں سے نکل جانا ہو گا۔"

سڑک پر پہنچنے کے بعد پھر ٹرانسپورٹ کا مسئلہ پیدا ہوا مگر تقدیر مدد پر آمادہ نظر آتی تھی..... نہ جانے کیسے ایک رکشا نمودار ہو گیا اور ہمارے اشارے پر رُک بھی گیا۔ ہم نے عرضِ مدّعا کیا۔

"دھندا کرنے نہیں نکلا ہوں میاں جی ۔۔۔" وہ بولا۔ "اپنے پڑوسی کو اسپتال لے گیا تھا..... اس کی بیوی کو۔"

"چلو کچھ دھندا بھی کر لو۔" میں نے کہا۔ "جو مانگو گے دیں گے۔ آج بڑا مُبارک دن ہے تمھارے لیے..... ثواب تو کما ہی چکے ہماری مدد کر دو گے تو ثواب کے ساتھ پچاس روپے بھی کماؤ گے۔ سارا خرچ نکل آئے گا۔"

"واپسی میں اپنی گھر والی کے لیے حلوہ پُوری لیتے جانا۔" غالب نے اُسے آمادہ پاکے بیٹھتے ہوئے کہا۔ پچاس روپے سے اِنکار کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ رکشا نکالنے کے بعد رات تو خراب ہو ہی چکی تھی... مگر نیکی واقعی کام آئی تھی۔ ہم نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ پھر کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا پڑی۔ رکشا والے کو بھی اس کی نیکی نے بچا لیا تھا۔ اُس نے حقوقِ ہمسائیگی کا خیال کیا تھا خدا نے ہمارے وسیلے سے اُس کو انعام پہنچا دیا۔ ورنہ یہی رکشا والا دن میں ملتا تو شاید اتنی آسانی سے نہ مانتا اور ہم بزورِ بازو منواتے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس نے راستے میں ہمیں بتایا کہ اس کا پڑوسی ایک کلرک ہے جس کو ہر سالانہ انکریمنٹ کے ساتھ ایک بچے کا خرچ بڑھانے کا شوق ہے۔ پچیس روپے ماہانہ میں بھلا ایک بچہ پلتا ہے۔ مہنگائی الگ بڑھتی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ کلرک دن بدن زیادہ غریب ہوتا جا رہا ہے۔ بعد میں اُس نے انکشاف کیا کہ وہ خود بھی کلرک تھا تو یہی مسئلہ تھا۔ اب اللہ کا فضل ہے — سب کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ محنت کرنے سے مل جاتا ہے۔ بگی بندھی تنخواہ کا مسئلہ نہیں ہے۔

ہم اس فلاسفر رکشا والے کی گفتگو سے متاثر ہوئے جو ابھی کلرکی اور کثرتِ اولاد کے مُعاشرتی اسباب پر مزید اظہارِ خیال کرتا، اگر ہماری منزل نہ آ جاتی — وہ پچاس کا نوٹ لے کر اور ہاتھ ملا کے رخصت ہوا تو ہم نے دلاور کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ اس کوٹھی کا نقشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ عقبی حصّے میں ایک دروازہ تھا جس سے داخل ہو کے ہم نے لان میں طاقو کی لاش دفن کی تھی۔ کسی دشواری کے بغیر ہم اسی راستے سے گزر کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے ایک کونے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے چوکیدار دروازے پر مستعد کھڑا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی لیکن اُس کی پتلون کی سائڈ پر ہولسٹر میں ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"تم اپنا کام کرو۔" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار پر نظر رکھتا ہوں۔"

"یہاں تو سارے کھڑکی دروازے بند ہیں۔" غالب نے کہا۔

"دوسری طرف جاؤ۔ شاید کچن میں کوئی نہ ہو۔" میں نے کہا۔ غالب نے سر ہلایا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا... چند منٹ میں وہ پھر آ گیا۔

"کچن کے دروازے بھی بند ہیں۔ مجھے شیشہ توڑنا پڑے گا، کسی کھڑکی کا۔" غالب نے کہا۔

"پھر تو سامنے سے جاؤ۔ ڈرائنگ روم ہی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں چوکیدار کو اِدھر بلاتا ہوں۔"

غالب دُوسری بار غائب ہو گیا۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور سامنے والی دیوار پر مارا۔ چوکیدار ایک دم چونکا اور آواز کی سمت میں آیا۔ ریوالور اُس نے فوراً نکال لیا تھا۔ میں دیوار کے موڑ پر دیوار کے ساتھ سانس روکے کھڑا رہا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے سے گزرا، میں نے اس کو پیچھے سے دبوچا اور سر پر ریوالور کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا۔ وہ دلاور کا چوکیدار تھا اور گلی کے چوکیدار کی طرح نہیں تھا۔ اُسے ذرا بھی مُہلت ملتی تو وہ مقابلہ کرتا اور میں اُسے قابو نہ کر پاتا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ سابق کمانڈو ہو۔ میں نے تو اُسے اپنی صُورت تک نہیں دیکھنے دی تھی۔ چوکیدار کی طرف سے مطمئن ہو کے میں سامنے والے حصّے کی جانب گیا۔ غالب مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے باہر ٹھہر کر اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا تاکہ خُدانخواستہ اندر کوئی گڑبڑ ہو جائے، دلاور نے اندرونِ خانہ بھی الارم سسٹم لگا رکھا ہو یا کسی آہٹ پر وہ جاگ جائے تو غالب پکڑا نہ جا سکے اور میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔

غالب ایک کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھ لیا اور جب اس کے پٹ کو دھکیلا تو کھڑکی بھی کھل گئی — غالب اندر نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نڈر اور جری آدمی تھا جو صُورت سے چُغد نظر آتا تھا۔ مگر یہ اسی کی ذہانت کا کمال تھا کہ ہم ایک مؤثر جوابی کارروائی کا منصوبہ بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ اب وہ دشمن کے قلعے میں انتہائی بے خوفی سے گھس گیا تھا اور اکیلا ہی ساری کارروائی کر رہا تھا۔ مجھے بالکل شبہ نہیں تھا کہ دلاور اپنے تکیے کے نیچے بھرا ہوا ریوالور رکھ کر سوتا ہوگا — اگر وہ جاگ اٹھتا اور کسی کو گھر کے اندر دیکھ لیتا تو سوال کیے بغیر گولی مار دیتا۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ چور یا ڈاکو بھی آئیں تو انھیں مار کے گاڑ دیتا۔ اور پولیس کو ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کی خاطر بھی رپورٹ نہ دیتا۔ خود غالب بھی کم نہ تھا۔ وہ دیکھتا کہ دلاور کا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھ رہا ہے تو وہ اس ہاتھ کو ہی اُڑا دیتا۔

اُسے اندر گئے ہُوئے دس منٹ ہو گئے تھے۔ میں کچھ بے چین ہونے لگا تھا۔ اچانک گھر کے اندر سے سائرن کی آواز سُنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی غالب دوڑتا ہوا نمودار ہوا — اندر سے کسی نے چلّا کر کہا۔ "کون ہے —؟" یہ دلاور کی آواز تھی — "چوکیدار.... چوکیدار...!"

غالب نے باہر چھلانگ لگائی۔ ہم ایک ساتھ بھاگے۔ یک لخت باہر کوٹھی کے اُوپر ہر طرف رات کو دن کر دینے والی سرچ لائٹس جل اٹھیں۔ اندر سے کسی نے ایک فائر کیا مگر ہم اس وقت تک عقبی دیوار پھاند چکے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اور کوئی سوال کیے بغیر ہم بے تحاشا بھاگے — دلاور کی کوٹھی پر تو جیسے قیامت آ گئی تھی.... سائرن اب بند ہو گیا تھا۔ مگر دلاور کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ چوکیدار کو گالیاں دے رہا تھا اور گھر کے دوسرے نوکروں کو حکم دے رہا تھا کہ ہر طرف دیکھیں اور جو نظر آئے اُسے بلا تامّل گولی سے اُڑا دیں۔

جب ہم مڑ کے تو دلاور کی کوٹھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

"یہ.... یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے پھُولی ہوئی سانس کو قابو میں لا کے کہا۔

"کچھ نہیں یار — میں نے سوچا کہ چوری کا کیس بنا دُوں۔" غالب نے سر کھجا کے ہانپتے ہوئے کہا۔

"گویا تم نے تجوری کو ہاتھ لگایا تھا؟"

"ہاں — ہے تو تمھارے باپ کا مال.... آنکھیں کیوں دکھاتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "کچھ مال ہاتھ لگ جاتا تو اچھا تھا۔"

"اور تمھیں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگ جاتا تو مزید اچھا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "تجوری کیا کھلی پڑی تھی؟"

"نہیں.... میں نمبر ملا رہا تھا۔" غالب بولا۔ "یہ فن میں نے ایک ماہر نقب زن سے سیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کان تیز ہونے چاہئیں — اندر کی گراریاں صحیح نمبر پر کلک کرتی ہیں۔ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ اس کی تجوری کے قفل کا نمبر کیا ہے؟ مرڈر — تین سو دو — مگر اس کے علاوہ بھی کوئی چکر تھا کہ تجوری کا دروازہ کھلتے ہی سائرن چلّانے لگا۔"

"یہ بتاؤ، جس کام کے لیے گئے تھے، اس کا کیا بنا؟"

"وہ تو میں نے دو منٹ میں کر لیا تھا۔" غالب بولا۔ "اندر ایک بڑا سا گملا ہے۔ اس میں اِن ڈور پلانٹ ہے۔ میں نے بم کو گملے کے پیچھے کونے میں رکھ دیا ہے — وہاں کسی کو نظر آنے کا سوال ہی نہیں۔"

صبح کے سوا پانچ بجے تھے۔ آدھا میل چلنے کے بعد ہم ایک رکشا پکڑنے میں کامیاب ہو گئے اور طے شدہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی گھر پہنچے تو ہمارا خیال تھا کہ محسن اور ٹیڈی ابھی نہیں لوٹے ہوں گے مگر وہ کافی پی رہے تھے۔ ہم نے ایک دُوسرے کو اپنی اپنی کامیابی کی رُوداد سُنائی اور مبارک باد دی۔ اس میں سات بج گئے۔ محسن نے ناشتا تیار کیا، جو میں نے زبردستی کھایا تاکہ کسی کو میری پریشانی کا احساس نہ ہو — حقیقت یہ ہے کہ میں بہت بڑا جوا کھیلنے جا رہا تھا۔ میرے مقابل دلاور جیسا شکاری تھا، جو آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالتا تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ہماری چال کا کوئی توڑ نکال لے اور ہم خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں۔ ناکامی کی سزا صرف میرے لیے ہی نہیں تھی۔ مجھ سے زیادہ رابعہ اور شہلا کے لیے ہو سکتی تھی۔ ٹیڈی میرے ساتھ ہی نکلا اور میں نے سب کی گڈ لک کے ساتھ سب کو گڈ بائی کہا۔

ٹیڈی نے اپنی ریڑھی پر پڑا ہوا اخبارات کا بنڈل پھیلا کر

اطمینان سے اپنا مواصلاتی رابطہ بحال کیا — پندرہ منٹ بعد اس نے مجھے دو انگلیوں سے 'وی' کا نشان بنا کے سگنل دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ نازو خیریت سے ہے اور شہلا اور رابعہ کو یہاں نہیں لایا گیا۔ یہ میرے لیے خاصی اطمینان بخش خبر تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے میں شاہدرہ جانے کے لیے رکشا میں بیٹھ گیا — ساڑھے آٹھ بجے میں اطمینان کے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے دروازے پر اُترا۔ فیکٹری میں کام شروع ہو چکا تھا مگر دلاور ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اس کے اتنی جلدی آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، مگر میں اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گیٹ کیپر نے مجھے نہیں پہچانا — وہ کوئی نیا آدمی تھا۔

"کیا کام ہے آپ کو چوہدری صاحب سے؟" وہ بولا۔

"کام کے بچّے۔" میں نے غُرّا کے کہا۔ "جو کام مجھے چوہدری صاحب سے ہوگا، وہ میں تمھیں بتاؤں گا۔ میں اُن کے آفس میں بیٹھوں گا اور اُن کے گھر فون کروں گا کہ میں پہنچ گیا ہوں۔"

"یس.... یس سر۔" وہ گھبرا گیا اور اس نے چوکیدار سے کہا کہ میرے لیے دروازہ کھول دے — وہ مجھے چوہدری دلاور کے کمرے تک لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے جھڑک دیا اور کہا کہ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں پی اے کے ساتھ بھی یہی رویّہ برقرار رکھا، اور اُس کا فون اپنی طرف کر لیا۔ پھر میں نے وہ نمبر ملایا جو مجھے دلاور کی طرف سے ملا تھا — بیس سیکنڈ بعد کسی نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو..... میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے چوہدری دلاور کا پیغام ملا تھا۔ میں اُن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کے پی اے نے پلک جھپکتے میں دراز سے ریوالور نکال لیا۔

"اِسے توپ کے دہانے کا رُخ اپنی طرف کر لو۔" میں نے اس سے پہلے اپنا ریوالور نکال لیا۔ پی اے کا ہاتھ رک گیا۔ موٹاپے کے باعث وہ میری طرح پھرتیلا نہیں تھا۔

"کہاں سے بول رہے ہیں آپ؟" ٹیلی فون پر دوسری جانب سے کسی کی زنانہ آواز میں سوال کیا گیا۔

"اپنے مُنہ سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ تمھاری آواز کو کیا ہو گیا ہے چوہدری دلاور۔ صرف آواز زنانہ ہوئی ہے یا خصلت..."

"جس ٹیلی فون پر آپ بات کر رہے ہیں، وہ کہاں ہے؟" سوال اس بار سوچ سمجھ کے کیا گیا تھا۔

"ایک میز پر۔" میں نے کہا۔ "مگر دلاور... یہ تمھاری جنس بدلنے کا واقعہ کب پیش آیا؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کمال کرتے ہیں آپ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں چوہدری صاحب کی سیکریٹری ہوں۔ آپ کا پیغام پہنچا دوں گی لیکن آپ سے ملنے کے لیے وہ کہاں تشریف لائیں۔"

"کچھ لانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "بس خود اپنے آفس آجائیں جہاں میں پہلے سے موجود ہوں اور اگر ان کے پی اے نے اتنی دیر میں مجھے مقتول نہ بنایا تو میں انھیں منتظر ملوں گا۔ ورنہ پھر عرصۂ محشر میں ملیں گے۔" فون بند ہوگیا۔ میں نے دانت نکال کے پی اے کی طرف دیکھا۔ "اب تم شوق سے مجھے گولی ماردو۔" میں نے کہا اور ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا۔ پی اے خون آشام نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر الجھن کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ وہ حیران اور پریشان تھا کہ جو شخص ایک مفرور مجرم، قاتل اور دہشت گرد قسم کی چیز تھا اور چوہدری دلاور کا دشمن نمبر ون تھا، وہ اتنے سکون و اعتماد کے ساتھ اپنے پیروں سے چل کر یہاں کیسے آپہنچا اور چوہدری دلاور نے اسے طلب کیا تھا تو ظاہر ہے قتل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ پھر دو متحارب دشمنوں کے درمیان اس ملاقات کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ کیا وہ دونوں سیز فائر کے مذاکرات میز پر آنے سامنے بیٹھ کر کریں گے؟ اور کیا اس کا یہ مطلب بھی نکالا جاسکتا ہے کہ چوہدری دلاور نے مجھے برابر کا حریف مان لیا ہے؟ یہ تسلیم کرلیا ہے کہ جنگ یکطرفہ نہیں اور نقصانات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے رویّے میں لچک پیدا کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں؟ یہ ایسا ہی تھا جیسے برسرِ اقتدار حکومت کسی باغی گوریلا لیڈر کے سامنے اتنی بے بس ہو جائے کہ اسے ہر قسم کے تحفظات فراہم کرکے بات چیت کے لیے مدعو کرے۔

"ایسے کب تک گھورتے رہو گے مجھے؟" میں نے کہا۔ "میں واقعی زندہ سکندر بخت ہوں، اس کی روح نہیں ہوں۔ شاید تمھیں حیرت ہے کہ میں کیسے زندہ ہوں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ تم اب تک کیوں زندہ ہو۔" پی اے نے کہا۔

"جب چور، ڈاکو، اسمگلر اور وطن فروش زندہ ہیں، شیطان صفت انسان زندہ ہیں۔ خوشامدی چمچے اور الّو کے پٹھے زندہ ہیں۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہاں تک کہ سُور کے بچّے اور کتے کے پِلّے زندہ ہیں تو پھر میں کیسے مرسکتا ہوں... فانوس بن کے جس کی حفاظت ہَوا کرے۔ وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خدا کرے۔ کیسا شعر ہے؟"

وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ سارے استعارے میں نے کس کے لیے استعمال کیے ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پی اے نے ریسیور اٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہاں بھئی، اپنے سکندر صاحب۔ اچھا کیا تم نے کہ ہماری بات مان لی۔" چوہدری دلاور کی آواز آئی۔ "مگر یار یہ تم دفتر کیوں چلے گئے؟"

"جہنم میں شاید میری اور تمھاری ملاقات نہ ہوتی..."

وہ ہنسا۔ "ابھی تک مسخری کی عادت نہیں گئی تمھاری۔ میں تم سے ملنے کے لیے آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں۔ مگر ایک بار تو بتاؤ۔ کیا تمھیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ فرض کرو اس سے پہلے ہی پولیس آپہنچے؟"

"چوہدری صاحب! کیا دشمن کو کمزور سمجھنے والے کو عقلمند مانا جاسکتا ہے؟"

"نہیں، کمزور آدمی بھلا دشمنی کا حوصلہ کہاں رکھتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر کیا تم نے مجھے کمزور اور احمق سمجھا تھا کہ یہ سوال کیا؟" میں نے کہا۔ "خطرہ تو ایک احساس کا نام ہے۔ آدمی سڑک پر چلتے ہوئے ڈرے کہ کہیں وہ حادثے کا شکار نہ ہوجائے۔ بند کمرے میں ڈرے کہ کہیں چھت اس پر نہ آگرے۔ موت سے ڈرے۔ موت کا ایک دن معیّن ہے۔ اور اس کے بارے میں نہ تم جانتے ہو نہ میں کہ آج کا دن کس کی موت کے لیے معیّن ہے۔ خطرہ تو تمھارے لیے بھی ہے اور ہر طرف ہے۔ مگر تم اس کے احساس سے دُور رہنا چاہتے ہو۔ یقین نہیں کرنا چاہتے کہ میری طرح تم بھی غیر محفوظ ہو۔ مگر کیا حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت بدل جاتی ہے یا اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ میرا مطلب ہے ڈرا رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تمھیں سمجھا رہا ہوں کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے ملنے آسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تمھارے لہجے اور تمھاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اپنی حفاظت کا انتظام پہلے سے کرکے آئے ہو۔"

"کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" میں نے کہا۔ جواب میں وہ صرف ہنسا اور اس نے فون بند کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھ سے بالواسطہ رابطے کے لیے کسی اور کا فون نمبر استعمال کیا تھا۔ اگر میں خود ہی نہ بتاتا کہ میں سکندر بخت ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں کون ہوں اور غلط نام بتاتا تو دوسرا سوال یہ ہوتا کہ مجھے کس سے بات کرنا ہے۔ وہ فون نمبر کسی ایسے شخص کا ہوگا جس کی ظاہری حیثیت عام لوگوں کی نظر میں بہت معتبر اور شبہے سے بالاتر ہوگی لیکن وہ درمیان کا آدمی ہوگا۔ اس طویل زنجیر کی ایک کڑی جس کا ایک سرا دلاور تھا تو دوسرا مشرقی پاکستان کا کوئی دہشت پسند ٹولہ جو علیٰحدگی کے جذبات کو ہوا دینے کے لیے صوبے کے طول و عرض میں تخریب کاری میں مصروف تھا۔ مجھ سے کسی عورت نے بات کی تھی جس کا لب و لہجہ ہرگز سیکریٹری والا نہیں تھا۔ وہ کسی کی بیوی یا گھر کی کوئی عورت تھی۔ اگر وہ بھی صفِ مجرماں میں شامل نہیں تھی تو اس کو اتنا ہی بتایا گیا ہوگا کہ سکندر بخت نام کا کوئی شخص کبھی چوہدری دلاور سے بات کرنا چاہے تو دلاور کو فلاں نمبر پہ پیغام دے دیا جائے۔ درمیان میں نمبروں کا سلسلہ دراز بھی ہوسکتا تھا لیکن یہ احتیاط اتنی زیادہ اہم اور ضروری نہیں تھی۔ نمبر مجھے یاد تھا اور میں کسی بھی وقت معلوم کرسکتا تھا کہ یہ کس کے گھر کا نمبر ہے۔

"چوہدری صاحب تم سے ملنے آرہے ہیں؟" پی اے نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "یا تم مجھے یکطرفہ ڈائیلاگ سُنا کے بے وقوف بنارہے تھے؟"

"اللہ نے تم کو دلاور کا پی اے بنادیا۔ تم کو بے وقوف بنا کے وقت ضائع کون کرے گا؟" میں نے کہا اور ریوالور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔"

"کتنا؟ اپنے برابر یا اپنے باس کے برابر؟" میں نے کہا۔

"میری بات مت کرو۔ تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔" پی اے نے کہا۔ وہ دلاور ہی کا ہم عمر لیکن نسبتاً عیار نظر آنے والا آدمی تھا جس سے میری بارہا ملاقات ہوچکی تھی مگر ہم نے کبھی اس طرح گفتگو نہیں کی تھی مگر اب ظاہر یہ ہوتا تھا کہ اس کو بھی میرے تمام معاملات اور حالات کا علم ہوچکا ہے۔

"تم کو کچھ کہنا ہے تو بلا تمہید کہہ ڈالو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔" وہ بولا۔ "ٹھیک ہے میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ بننا چاہتا تھا مگر بن نہیں سکا۔ اب بننا بھی چاہوں تو بن نہیں سکتا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں مطمئن ہوں اور دنیا کی پروا نہیں کرتا کیونکہ مجھے دوسروں سے بھی زیادہ مختلف نہیں لگتے مجھے پیسے کی ضرورت تھی اور پیسہ مجھے ضرورت سے زیادہ ہی مل رہا ہے۔"

"تمھارے نامۂ اعمال میں تو اندراج کی جگہ نہیں بچی ہوگی۔ اصل مع سود تمھارا زادِ آخرت دلاور کے بنک بیلنس سے زیادہ ہے یا کم؟" میں نے کہا۔

"یہ پیسہ میرے کام نہیں آرہا ہے۔ اس سے میرے بیوی بچّوں کو معاشرے میں عزت ملی ہے۔ آسائش کی زندگی ملی ہے۔ وہ خاصے بڑے گھر میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک کار ہے اور ہم بیمار ہوں تو بہترین علاج کرسکتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ یہ پیسہ صرف پی اے کی تنخواہ نہیں ہونا۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ میرا سیٹھ بہت سخی اور فراخدل ہے اور میری خدمات کا بہت صلہ دیتا ہے۔ اتنا کہ کہیں اور مل ہی نہیں سکتا۔ میرے کام کچھ نہیں آتا۔ میں دل کا مریض ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر سے دل بڑھ گیا ہے اور یہ مرض قابلِ علاج نہیں۔ ذیابیطس کے ساتھ مل کر یہ مرض جان لیوا ہو جاتا ہے۔ میں کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ نہ نمکین نہ میٹھا۔ اس عمر میں لباس بھی کیا پہنوں۔ یار دوست کبھی تھے نہیں۔ سگریٹ، شراب حرام ہی نہیں ممنوع ہیں۔ چنانچہ پیسہ دوسروں کی ضرورت ہے جسے میں پورا کرنے پر مجبور ہوں۔ اس پیسے نے میرے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنانے اور بیٹی کو عزت سے رخصت کرنے میں میری مدد کی۔ دوسرے بیٹے کو ریڈیو شاپ قائم کرنے میں مدد دی۔ میں اس پیسے کے بغیر کچھ نہ ہوتا۔ میری اولاد اپنے پیروں پر اس طرح نہ کھڑی ہوتی۔ چنانچہ میں اس پیسے کی خاطر سارے گناہ اپنے کھاتے میں ڈال رہا ہوں اور ساری خوشیاں ان کو دے رہا ہوں۔ وہ گنہگار نہیں ہیں کیونکہ وہ اس پیسے کو جائز اور حق حلال کی کمائی سمجھ کے خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تو وہ میری دل سے کبھی عزت نہ کرتے۔ میں گناہ سمجھ کے پیسہ کماتا ہوں اور جہنمی ہوں لیکن جس سے پیسہ ملتا ہے اس کا وفادار بھی ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن تم میرے مالک کے دشمن ہو۔ اس لیے تم مجھ سے بھی نفرت کرتے ہو۔ یہ نفرت میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔ مگر تم نے کبھی انسانوں کی مجبوری کو محسوس نہیں کیا۔ تم یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ نیکی کے راستے سے آدمی جب چاہے بدی کے راستے پر چلنے لگے مگر جس راستے پر میں ہوں اُسے چھوڑنا میرے لیے ناممکن ہے۔ آج میں تم کو یہ سب اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تم مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔"

"لیکن تم میرے دوست بھی نہیں ہوسکتے۔" میں نے اس بھاری بھرکم اور مجبور و معذور شخص کو افسوس سے دیکھا۔

"دوست کیسے ہوسکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اگر ابھی چوہدری صاحب آکے مجھے حکم دیں کہ تمھیں شوٹ کردوں تو میں ان کا حکم مانوں گا۔"

"تم نے تو ان کا حکم ملنے سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ کوشش ضرور کی تھی۔" میں نے طنز سے کہا۔

"میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً اسے دیکھ کر جو مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتا ہو۔ میرا یہ ردِّ عمل فطری تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ مجھے حکم تھا کہ تم کبھی اندر نظر آؤ تو تمھیں گولی ماردوں۔"

"پھر تم نے ماری کیوں نہیں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "اب ماردو۔"

"تمھاری بات سننے کے بعد یہ ضروری نہیں رہا۔" وہ بولا۔ "تم جوان آدمی ہو، پڑھے لکھے ہو۔ بے شک دلاور نے تم سے تمھارا حق چھینا مگر بازوؤں میں دم ہو تو آدمی نئی دنیا آباد کرلیتا ہے۔ تم یہاں موت کو گلے لگانے کیوں آگئے ہو؟"

"تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں بھاگ جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم ہر طرف سے محصور ہو۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟" وہ بولا۔ "آج میں پہلی بار غداری کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ غالباً یہ کمزوری اس بات کا اشارہ ہے کہ میرا وقت قریب ہے اور قدرت مجھے نیکی کمانے کا ایک موقع دینا چاہتی ہے۔ سُنا ہے بعض اوقات نامۂ اعمال کی ایک نیکی سارے گناہوں کی سیاہی دھو ڈالتی ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمہارے بارے میں سب کو ایک جیسے احکامات ملے ہوئے ہیں۔ اب تم جانا بھی چاہو تو جا نہیں سکو گے۔"

"پھر تم یہ مشورہ دے ہی کیوں رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم جانا چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "مجھے ہینڈز اَپ کراؤ۔ میرا ریوالور لے لو۔" اس نے ریوالور نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ "پھر مجھے دھکیلتے ہوئے ڈھال بنا کے آگے لے جاؤ۔ میں سب کو منع کر دوں گا کہ گولی نہ چلائیں۔ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔ سڑک تک مجھے ایسے ہی لے جاؤ۔ پھر ناک آؤٹ کرو اور بھاگ جاؤ۔ آگے اللہ بیلی۔"

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا! مجھے اس بے بس آدمی پر ترس آیا، جو اب عمر کی آخری منزل پر پہنچ کے عذابِ آخرت کے خوف کا شکار ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو بہت دیر سے ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی پُرامید تھا کہ ایک نیکی کما لے گا تو اس کا عذاب شاید کم ہو جائے گا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس کو یہ موقع فراہم کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ بہت بدبخت تھا وہ شخص جس نے بہت کمایا اور سب گنوا دیا۔

"میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہوا۔" میں نے کہا۔ "مگر میں یہاں دلاور سے خود ملنے آیا ہوں۔ اپنی مرضی سے اور اپنے پیروں پر چل کر اور اپنے تمام معاملات اور مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے۔ تم نے کہا ہے کہ آگے اللہ بیلی۔ آگے پیچھے ہر جگہ اللہ بیلی نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا؟ تم بالکل فکر مت کرو۔ اس نے مجھے عقل کی طاقت ضرور دی ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ دلاور چاہے گا بھی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس نے مایوسی اور دُکھ سے سر ہلایا۔ "تم نوجوان ٹھوکر کھائے بنا سنبھلتے ہی نہیں۔ دوسروں سے کچھ نہیں سیکھتے جو ٹھوکریں کھا چکے ہیں۔"

"اپنے تجربات کے بغیر اپنی زندگی ایسی ہی ہے جیسے چابی کے کھلونے کی زندگی۔" میں نے کہا۔ "میں دوسروں کی عقل کی چابی سے نہیں، اپنی مرضی سے چلنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ مجھ میں اور کھلونے میں کچھ فرق رہے۔"

"تمہاری مرضی۔ مگر یوں نہ بیٹھو میرے سامنے۔" وہ بولا۔ "کم سے کم ریوالور نکال لو۔ دلاور آتا ہی ہو گا۔"

میں نے اس کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا، حالانکہ اس وقت میری نگاہ کو ایک تصویر نے متوجہ کر لیا تھا۔ یہ تصویر ڈاکٹر حکیم کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خبر تھی کہ البرٹ وکٹر اسپتال کا ایک ملازم کل اُس وقت ایک تیز رفتار گاڑی کی ٹکر سے شدید زخمی ہو کے انتقال کر گیا جب وہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے جا رہا تھا۔ متوفی کے بارے میں اسپتال کے ذرائع نے بتایا کہ وہ جعلی اسناد پیش کر کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بیز ڈاکٹر اس پر اپنے شک کا اظہار کر چکے تھے۔ اس کو ملازم ہوئے ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا اور اسپتال میں اس کے لواحقین اور اس کے رہائشی پتے کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ لاش کو پولیس نے معدوم کے بعد میو اسپتال پہنچا دیا تھا لیکن رات گئے تک اس کا کوئی وارث اسپتال نہیں پہنچا تھا۔ پولیس نامعلوم گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا۔ تصویر اسی شخص کی تھی جس سے میں اور رابعہ اسپتال میں ملے تھے، جو انتہائی پُراسرار طریقے پر سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا اور جس نے اپنی ناکامی پر مشتعل ہو کے ہم پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا اور اس بات کا خیال بھی نہیں رکھا تھا کہ اسپتال کے کسی ڈاکٹر کا مسلح ہو کے آنا اور یوں فائرنگ کرنا ہی اس کی حیثیت کو مشتبہ بنا دیتا ہے۔ بلاشبہ اس کو ناکامی کی سزا دی گئی تھی اور سزا دینے والے بھی وہی شکاری تھے جن کے جال کو ہم نے کاٹ دیا تھا۔

لیکن زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ خبر میں حادثے کا وقت دوپہر کے قریب بتایا گیا تھا۔ دوپہر کے بعد تو لاش مردہ خانے پہنچ چکی تھی مگر ہم نے اس شخص کو رات کے وقت زندہ دیکھا تھا۔ پھر کیا اس کی روح مردہ خانے سے اُٹھ کر وہ فرض پورا کرنے آ گئی تھی جو زندگی میں پورا نہ ہوا تھا۔ نہ مجھے اپنی عقل اور بصارت پر شبہ تھا اور نہ رابعہ انکار کر سکتی تھی کہ تصویر اسی شخص کی نہیں ہے۔

دن میں مرنے والا رات کو ہمیں زندہ نظر آیا تو یقیناً اس خبر میں کوئی گھپلا تھا۔

پہلی بات تو میں نے یہ دریافت کی کہ خبر کسی اسٹاف رپورٹر نے نہیں دی تھی بلکہ پریس ریلیز تھی۔ ایک حادثے کے بارے میں اخباری نمائندوں کا ذریعۂ اطلاعات تھانہ ہوتا ہے یا اسپتال اور خبر اسٹاف رپورٹر کے حوالے سے شائع کی جاتی ہے۔ حادثہ بڑا ہو مثلاً ریل یا بس کا تو خبر رساں ایجنسی کا حوالہ ہوتا ہے مگر کوئی اسپتال کسی مرنے والے کے بارے میں پریس ریلیز جاری نہیں کرتا۔ حادثات میں زخمی ہونے والے میو اسپتال ہی جا کے مرتے ہیں مگر اُن کی موت پر میو اسپتال کی جانب سے کوئی پریس ریلیز نہیں جاری ہوتی کہ فلاں فلاں مقام سے حادثے کے اتنے زخمی لائے گئے تھے اور ان میں سے اتنے جانبر نہ ہو سکے۔ یہ خبر ان کی طرف سے دی گئی تھی اور دلاور نے اپنے خصوصی ذرائع استعمال کر کے شائع کروا دی تھی۔

"میں ایک اور فون کر لوں؟" میں نے کہا اور پی اے کی مرضی کے مطابق ریوالور کو انتہائی جارحانہ انداز میں اس کی جانب رکھا۔

"کر لو۔ مگر خیال رکھنا کہ دلاور آتا ہی ہو گا۔" وہ بولا۔

میں نے سر ہلایا اور ڈائریکٹری سے البرٹ وکٹر اسپتال کا نمبر تلاش کر کے ملایا۔

"ہیلو" کسی نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔

"مجھے اس خبر کے بارے میں..."

"ارے بابا... ہم تو صبح سے دس بار بتا چکے ہیں کہ خبر غلط ہے۔ کوئی ڈاکٹر حکیم وکیم ہمارا ملازم نہیں تھا۔" بیزار شخص چلانے لگا۔ "او ہم نے یہ پریس ریلیز دی ہے۔ اب سارا دن سارا شہر ہم سے پوچھتا رہے گا۔ ہم کیا کریں..."

"آپ اس کی تردید جاری کر دیں۔" میں نے اس کی بیزاری کو جائز تسلیم کرتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔

"کر دیا بابا کر دیا۔ مگر وہ تو کل چھپے گی... آج کیا ہو گا۔ فون پر جواب دے دے کر ہم تو پاگل ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

"پاگل ہوں آپ کے دشمن... آپ ریسیور نیچے رکھ دیں۔"

"پھر اسپتال فون کرنے والے ضرور تنہ پاگل ہو جائیں گے۔" وہ میرے ہمدردانہ لہجے سے متاثر ہوا تھا۔

"پھر آپ صبر جمیل سے کام لیں۔ کوئی سکون بخش دوا کھائیں یا پھر چھٹی کر کے گھر چلے جائیں۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ دی — پی اے مجھے غور سے دیکھتا رہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ بولا۔

"بات تو ابھی میری سمجھ میں نہیں آئی... تمہیں کیا سمجھاؤں۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "مردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے تصویر پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ شخص دوپہر کو فوت ہوا۔ شام سے پہلے اُٹھ کھڑا ہوا اور مردہ خانے سے فرار ہو گیا۔"

"چوہدری دلاور سے میں نے اکثر سُنا ہے کہ تم جوکر ہو۔" پی اے بولا۔

خبر میں ایک گھپلا اور بھی تھا۔ میرا زخمی ہو کے البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا بھی حادثہ تھا۔ مجھے وہاں پہنچانے والا ایک پولیس افسر تھا۔ حادثے کے کیس تو میو اسپتال جاتے ہیں۔ پھر وہ مجھے البرٹ وکٹر اسپتال کیوں لے گیا تھا؟ غالباً قانونی الجھن سے بچنے کے لیے۔ میری چوٹیں معمولی نوعیت کی تھیں۔ اُس نے اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ساز باز کی یا پھر کوئی دوسری کہانی بیان کی۔ کوئی ایسی کہانی جس پر یقین کرتے ہوئے البرٹ اسپتال والے مجھے داخل کر لیں۔ پندرہ ہزار وہ میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ شاید دس پندرہ کسی کے ہاتھ پر بھی رکھ دیے ہوں۔ البرٹ وکٹر بڑا نیک نام اسپتال تھا مگر ایک گندی مچھلی کس تالاب میں نہیں ہوتی۔ اچھے لوگوں کے درمیان کوئی پیسے کا لالچی بھی بیٹھا ہے جو اس نیک نامی پر بٹا لگاتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوتا۔

آخری ناقابلِ فہم بات یہ تھی کہ میرا البرٹ وکٹر اسپتال پہنچنا اگر اتفاق تھا تو یہ جعلی ڈاکٹر حکیم وہاں کیسے پہنچ گیا۔ کیا وہ شخص جس کی گاڑی کو میں نے ٹکر ماری تھی اور جس نے خود کو پولیس انسپکٹر رضوی ظاہر کیا تھا، وہ بھی ایک شکاری تھا یا اُسی نے دلاور کو مطلع کیا تھا کہ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ سکندر رضا کارانہ طور پر میری گاڑی کے سامنے آ مرا اور میں نے اس کو فلاں جگہ جمع کرا دیا ہے۔ آگے آپ سنبھال لیں۔ دلاور فوراً حرکت میں آ گیا اور اس نے ایک قابلِ اعتماد آدمی کو حفاظتی انتظامات کے ساتھ اسپتال میں پہنچا دیا مگر وہ آدمی اعتماد کے معیار پر پورا نہیں اترا چنانچہ عالمِ بالا کو ارسال کر دیا گیا اور اس کی وفات تو رات کو ہوئی مگر حادثے میں دوپہر کا وقت بتا دیا گیا۔ دلاور نے جلدی میں غلطی یہ کی کہ پریس ریلیز کو اسپتال سے منسوب کر دیا، ورنہ اس جعلی ڈاکٹر حکیم کو ناکامی اور نااہلی پر گاڑی سے مروانے کے بعد یہ بہتر ہوتا کہ اس کی لاش پولیس کے حوالے کر دی جاتی اور دلاور اپنے ذاتی تعلقات اور پیسے کی مدد سے پولیس کی خدمات حاصل کرتا۔ وہ حادثے کا بہت اچھا انتظام کر لیتے۔ مثلاً جائے واردات کو بدل دیتے۔ یہ کہتے کہ متوفی ریلوے لائن پر جا لیٹا تھا چنانچہ تیز گام کے نیچے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ پولیس اس کی لاش کو ناقابلِ شناخت بنا سکتی تھی۔ لاوارث قرار دے کر مردہ خانے میں پھنکوا سکتی تھی۔ میڈیکل کے طالب علموں کو تجربات کے لیے مرنے بھیجنے والا ٹھیکیدار بھی کچھ کما لیتا اور متوفی کے اجزائے ترکیبی منتشر ہو جاتے۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب۔ موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا۔

مگر پلان کے نقائص ظاہر کرتے تھے کہ یہ سب کچھ دلاور نے نہیں کیا ہو گا۔ کسی نے اُسے بہت گھبراہٹ میں ٹھکانے لگایا اور پھر اپنی عقل پر بھروسا کرتے ہوئے خبر دینے کی غلطی کی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ دلاور کی طرف سے غلطی کرنے والے کو بھی انعام ملے گا۔ خبر نے ایک اور وضاحت بھی کر دی تھی کہ مجھے اسپتال میں نظر بند ہی کیوں رکھا گیا تھا۔ اگر میرے محافظ اور نگراں خود شکاری تھے تو انہوں نے مجھے شکار کیوں نہیں کیا۔ صرف اسیر رکھنا کیوں کافی سمجھا۔ دراصل دلاور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ پہلی بار اس کی دعوت کو میں نے چال سمجھ کے مسترد کر دیا تھا۔ دوسری بار وہ مجھے اس اسپتال سے لے جانا چاہتا تھا اور میرے ہوش میں آنے کا منتظر تھا مگر اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ مجبوراً اس نے وہ چال چلی جس میں کامیابی یقینی تھی۔ شہلا اور رابعہ کو یرغمال بنا کے وہ مجھے بلانے میں کامیاب رہا تھا۔

میں نے میو اسپتال فون کرنے کا سوچا اور اپنے ارادے کو ملتوی کر دیا۔ ان کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ یہاں کسی ڈاکٹر حکیم کی لاش نہیں لائی گئی جو کسی کار کے حادثے میں زخمی ہوا ہو۔ میں پولیس سے پوچھتا تو وہ سب سے زیادہ لاعلم بن جاتے۔ اخبار والوں سے پتا کرتا تو پریس ریلیز کا مسودہ ہی نہ ملتا یہ نہ معلوم ہوتا کہ پریس ریلیز کون

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دے گیا تھا خبر کس نے کاتب تک پہنچائی اور اشاعت میں شامل ہوگئی۔ اخبار کے دفتر میں رات کے وقت کاتبوں کی ایک ٹیم سر اُٹھائے بغیر کام کرتی ہے اور کتابت کے لیے ان میں خبریں برابر تقسیم ہوتی رہتی ہیں۔ بعد میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون سی خبر کس نے دی تھی اور کس کاتب کو دی تھی۔

خبر میں میری دلچسپی ایک قدرتی بات تھی لیکن اس کے بعد میں ذہنی طور پر خبر کا تجزیہ کرنے لگا اور پی اے کی طرف سے غافل ہوگیا۔ ریوالور میری گرفت میں ضرور تھا مگر اپنی حفاظت کے لیے نہیں۔ پی اے چاہتا تھا کہ میں اس پوز میں بیٹھوں۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی وقت مجھ سے ہتھیار رکھوا لیتا لیکن اس کی باتیں سننے کے بعد میں نے مان لیا تھا کہ وہ میرا دشمن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ گھومنے والی کرسی پر اطمینان سے سر پیچھے لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف توجہ کی تب بھی وہ اسی طرح خاموش تھا اور بے حس و حرکت نگاہیں چھت پر لگائے بیٹھا تھا لیکن اچانک مجھے اس کی حالت پہلے سے مختلف لگی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت نظر آئیں۔ میں ایک دم اٹھا اور میز کا چکر لگا کے اس کے پاس پہنچا۔

"شفاعت صاحب!" میں نے کہا۔ اور اس کا شانہ ہلایا۔

وہ تھوڑا سا ہلا اور بائیں طرف جھک گیا۔ میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ مر چکا تھا۔ پانچ دس منٹ پہلے وہ زندہ تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے سوچ بچار میں کتنا وقت صرف کر دیا تھا لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس وقفے میں کوئی بھی نہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور نہ کھڑکی میں نظر آیا تھا۔ اس کی موت کے طبعی ہونے میں شبہ نہ ہونے کے باوجود میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوگئی۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ابھی چند منٹ پہلے اس نے اپنی گنہگار زندگی پر میرے سامنے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو جانا چاہیے۔ کیا یہ سب قدرت کا انتظام تھا؟ فرشتۂ اجل کی روانگی سے پہلے گناہ گار اور خطاکار آدمی پر اپنا غفور الرحیم ہونا ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک شخص کو چند منٹ دیے کہ وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرلے! مگر اسے یہ ثابت کرنے کی کیا ضرورت جسے ثبوت درکار ہی نہیں۔ پھر کیا یہ اتفاق تھا کہ اعترافِ جرم و ندامت کے فوراً بعد دل نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

میں ابھی حیرت اور خوف، دکھ اور بے یقینی کے احساس سے دم بخود کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فوراً کسی کو آواز دے کر بلانا چاہیے یا دروازہ بند کرکے بھاگ جانا چاہیے کیونکہ یہ حادثہ میرے خلاف ایک جرم بھی بنایا جاسکتا تھا کہ اسی وقت مجھے اپنے سامنے کھلے دروازے میں چوہدری دلاور نظر آیا۔

وہ اطمینان سے چلتا ہوا میری طرف دوستانہ انداز میں مصافحے کے لیے آیا۔

"لو بھئی اپنے سکندر صاحب! ہم نے بلوا ہی لیا آپ کو۔" دلاور نے خوشدلی سے کہا۔ بلوا لیا کہہ کے اس نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ "ورنہ تم تو کبھی نہ آتے۔ مگر دیکھو کہ تم کتنے مجبور ہو کر آئے۔ یہ کچھ ویسی ہی ملاقات تھی جیسی دوسری جنگِ عظیم کے بعد شہنشاہ ہیرو ہیٹو اور اتحادی فوجوں کے سپریم کمانڈر کے درمیان ہوئی تھی۔ چڑھتے سورج کی سرزمین کا وہ شہنشاہ جس کی طرف رعایا نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتی تھی نظر جھکا کے اعترافِ شکست کی دستاویز پر دستخط کرنے آیا تھا۔ نہ آنا اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

"یہ... یہ اسے کیا ہوا؟" چوہدری دلاور نے میری خاموشی اور میری صورت کے تاثرات کو دیکھ کر کہا۔

"اسے اللہ نے بلوا لیا۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی میری طرح مجبور ہوگیا تھا غالباً۔"

"اچھا... گویا یہ مرگیا۔" چوہدری دلاور نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا ردِعمل اتنا سرسری تھا کہ میرا پارہ چڑھنے لگا۔ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے ذکر کسی آدمی کا نہیں پالتو کتے کا تھا۔ کتا پالنے والے بھی اس سے اتنے مانوس ہوتے ہیں کہ اس کے مرنے پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

"چند منٹ پہلے تک یہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ میری اور تمہاری طرح۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اور یہ تمہارا پی اے تھا۔ تم ایسے بات کر رہے ہو جیسے...."

"ارے بھئی تم کیوں خفا ہو۔" دلاور بولا۔ "موت سے کس کو رستگاری ہے۔ یہی شعر ہے نا۔ ہم کچھ اُن پڑھ بندے ہیں۔ غلط شعر پڑھیں تو آپ اس پر بھی خفا ہو جاؤ۔ اب مرنا تو سب کو ہے جی۔ بندہ بشر کیا اور جانور کیا۔ درخت اور یہ سب دنیا کا دھندا کاٹھ کباڑ، سب ختم ہو جانا ہے۔"

"تمہارے نزدیک اس آدمی میں اور کاٹھ کباڑ میں کوئی فرق نہیں؟ اور کیا یہ اب یہاں ایسے ہی پڑا رہے گا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اٹھوا دیتے ہیں اسے۔" دلاور نے بے نیازی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! زندہ انسانوں کی تو کوئی اہمیت ہے نہیں آپ کے نزدیک۔ مرنے والے کا بھی لحاظ نہیں؟ آخر یہ نمک خوار تھا آپ کا۔ اس کے وارثوں کو اطلاع دینا۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہونا، یہ سب آپ کی اخلاقی ذمے داری ہے۔"

"ہاں یار ہے۔ میری اخلاقی ذمے داری کے لیے تم کیوں پریشان ہو آخر۔ یہ تمہارا نمک خوار تو نہیں تھا۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "سب کچھ ہو جائے گا۔ میں بھی پہنچ جاؤں گا نماز کے وقت۔ یہ کام دوسروں کو کرنے دو۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم اتنی دیر

بہ اپنے کام کی بات کر لیں۔ آخر تم اس سے ملنے تو نہیں آئے تھے"

"کمال ہے چوہدری صاحب!" میں نے بادلِ ناخواستہ اور سخت خراب موڈ میں دلاور کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ آخر کیسے مرگیا۔ صرف میں تھا اس کے پاس۔"

"مجھے معلوم ہے۔" دلاور نے دروازہ کھول کے اسی بے حسی کے ساتھ کہا۔ "پوچھنا کیا اپنے سکندر صاحب۔ بندے کا دل دغا دے گیا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا دل حد سے بڑھ گیا تھا مگر شاید تم نہ سمجھو۔"

"کیوں؟ کیا دل نہیں ہے میرے پاس؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

"یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" دلاور نے بیٹھتے ہوئے مجھے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "دل تو ہے تمہارے پاس مگر جوان ہے اور تم اس سے کام بھی کہاں لیتے ہو۔ دماغ سے ہی سارے کام نکالتے ہو۔ کبھی کبھی زندگی اور موت کا توازن ایک بال پر قائم ہوتا ہے۔ ریت کے ایک ذرے پر چٹان رکی رہتی ہے۔ ہم نے دسویں جماعت کے جغرافیے میں پڑھا تھا کہ میلوں لمبے گلیشیر جو سال میں چند انچ سرکتے ہیں آواز کی لہروں سے۔ اونچا بولنے یا ایک چھینک مارنے سے پھسل جاتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ یہ بندہ بھی بس ایسے ہی زندگی کے دھاگے سے لٹکا ہوا تھا۔ دھاگا مکڑی کے جالے کی طرح ہوگیا تھا کہ ایک سانس میں ٹوٹ جائے۔"

"تم یہ فلسفہ مجھے کیا سمجھانے کے لیے بول رہے ہو؟" میں نے اسے غور سے دیکھا کیونکہ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی جو کچھ کہتی محسوس ہوتی تھی۔

"یہی کہ مجھے اس کی اچانک موت کا سبب معلوم ہے۔" چوہدری دلاور نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "تم دیکھو گے؟"

"اب دیکھنے کو کیا رہا ہے۔" میں چونکا۔

"وہی اس بندے کی موت کا سبب۔" چوہدری دلاور بولا اور اس کا ایک ہاتھ جیب میں گیا۔ میرا ردِعمل فوری اور فطری تھا۔ میں اس بات سے اور کیا مطلب نکالتا کہ وہ مجھے موت کا سبب بتانا نہیں دکھانا چاہتا ہے۔ ریوالور ایک دم میرے ہاتھ میں آگیا لیکن اس کا دلاور پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا یوں جیسے میرے ہاتھ میں اصلی نہیں نقلی ریوالور ہو۔ اس شخص کی اداکارانہ صلاحیت کا میں ہمیشہ سے معترف تھا۔ وہ اپنے ردِعمل کو بھی کنٹرول کرلیتا تھا۔ اپنی صورت سے وہ خوف یا پریشانی اور گھبراہٹ کا کبھی اظہار نہیں ہونے دیتا تھا اور اپنے لہجے سے یا صرف مسکراہٹ سے وہ بات کہہ جاتا تھا جو زبان نہیں کہتی تھی۔ اس نے جیب میں سے ایک سفید کاغذ نکالا جس کو چار مرتبہ تہ کیا گیا تھا۔ پورا کھل جانے پر وہ دو فل اسکیپ سائز کی شیٹ بن گیا جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے میرے سامنے پھیلا دیا۔ میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس پر مارکر سے موٹے واضح حروف میں صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ "غدار کے لیے سزائے موت۔"

وہ سارا فلسفہ جو دلاور نے بگھارا تھا ایک دم میری سمجھ میں آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا پی اے کس طرح اچانک آواز نکالے بغیر مرگیا تھا۔ اسے کسی نے گولی نہیں ماری تھی۔ زہر نہیں دیا تھا اور کسی نے اس کا گلا نہیں گھونٹا تھا مگر اس کی موت طبعی نہیں تھی۔ یہ قتل تھا جو دلاور نے کیا تھا۔ اس نے میری اور اپنے پی اے کی تمام گفتگو سن لی تھی یا اس کا کچھ حصہ سن لیا تھا جس سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ پی اے نمک حرام ہوگیا ہے۔ اس کا شاطر ذہن عملی زندگی میں کئی مرتبہ ڈرامے کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرامائی تاثر سے ذہن کو مرعوب کرنے کا ماہر ہے اور خود میرے ساتھ اس نے کئی ایسے ڈرامے کیے تھے جن کا نقش میرے ذہن پر قائم تھا۔ وہ سیدھی سی صاف بات کو بھرپور انداز میں یوں پیش کرتا تھا جیسے ایک کامیاب ہدایت کار کسی کہانی کے خیال کو ڈرامے کی صورت میں اسٹیج پر پیش کرتا ہے اور اپنی پیش کش کے کمال سے ناظرین کو ہنسانے رلانے اور ان کے جذبات کا رُخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔ جب اس نے کہا تھا کہ ریت کے ایک ذرے پر چٹان رُکی رہتی ہے تو وہ اپنے پی اے کی بات کر رہا تھا جس کا ناتواں دل خفیف سا صدمہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے قتل کا الزام اپنے سر لیے بغیر اسے مار دیا۔ نہ جانے کس وقت وہ ذرا سی دیر کے لیے کھلے دروازے کے سامنے آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں یہی تحریر تھی جسے شفاعت پی اے نے پڑھا اور وہ ایک دم سمجھ گیا کہ دلاور نے اس کی تمام گفتگو سن لی ہے۔ دہشت کا صدمہ اس کے دل کو لے بیٹھا۔ وہ سزائے موت کا فیصلہ دیکھ کر مرگیا۔ غالب نے تو ایک شاعرانہ بات کی تھی کہ مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب۔ مگر یہاں میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی میری نظروں کے سامنے ایک انسان کو ایک سطر سے قتل کیا گیا تھا۔ کیا چند حروف پر مشتمل ایک سطر کو آلۂ قتل سمجھا جا سکتا ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اسے قتل قرار دے سکتا تھا! کوئی ہوشمند آدمی میری بات مان سکتا تھا کہ دلاور قاتل ہے۔ وہ غضب کا فنکاری تھا۔ اس کی نظر اس کی عقل سے زیادہ تیز تھی۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ صرف ریت کا وہ ذرہ ہٹا دیا تھا جس پر چٹان رکی ہوئی تھی اور اب وہ مجھے موت کا سبب دکھا رہا تھا۔ کسی خوف یا شرمندگی کے بغیر۔ اُسے بالکل ڈر نہیں تھا کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔ میں کہتا تو وہ کاغذ کی شیٹ میرے حوالے کر دیتا کہ لو جہاں چاہو لے جاؤ۔ پولیس کے پاس جاؤ یا اخبار والوں کے پاس یا اسے چوک میں چسپاں کر دو اور چاہو تو اس کے نیچے یہ بھی لکھ دو کہ اس جملے سے چوہدری دلاور نے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اپنے پی اے کو قتل کر دیا۔ یکلخت میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا مگر ایک بار پھر دلاور نے اپنے ٹھنڈے دماغ سے مجھے شکست دی۔ اس نے میری صورت سے میرے ردِ عمل کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں اس وقت جب میں ریوالور نکال چکا تھا اور طے کر چکا تھا کہ اب اس حرامزادے کو قتل کر کے ہی دم لوں گا اس نے میرے ہاتھ پر پیپر ویٹ کھینچ مارا۔

اس کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ میری کلائی پر سخت چوٹ آئی اور ریوالور پھینک کر میں نے اپنا ہاتھ جھٹکا جس میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔ دلاور نے ایک فون نمبر گھمایا۔

"ریوالور اٹھا کے جیب میں رکھ لو۔" وہ آہستہ سے بولا اور پھر فون پر مخاطب ہوا۔ "دیکھو بھئی! یہ شفاعت بے چارے کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی... نہیں... اب کیا فائدہ ڈاکٹر ایمبولنس کا... ہاں... وہ تو میں نے باہر نکل کے دیکھ لیا... نہ جانے کتنی دیر سے مرا پڑا تھا... ہاں... تم نیکرٹری میں چھٹی کرا دو۔ سب اس کے جنازے میں شریک ہوں گے۔ اور دیکھو میت کے ساتھ تم خود جانا... تدفین کا وقت شام تک رکھنا تاکہ میں بھی پہنچ جاؤں۔ میری طرف سے تعزیت کرنا... ہاں بھئی صدمے کی بات تو ہے۔ یہ دیکھو کہ اس کے واجبات کتنے تھے... خیر جتنے بھی ہوں تم سب ملا کے ایک لاکھ کر لو... ہاں... باقی میری طرف سے ڈال دینا مگر یہ ایک لاکھ مرحوم کے خاندان کو آج ہی دینے ہیں۔ میں خود آؤں گا تو دے دوں گا... اور سنو بھئی... یہاں ایک مہمان بیٹھے ہیں میرے ورنہ میں ابھی یہ سارا کام خود کراتا۔ بہت اہم اپائنٹمنٹ ہے جو کینسل نہیں ہو سکتی۔ تم ذرا کافی وغیرہ کے لیے کسی سے کہہ دو... ہاں... شفاعت بے چارہ خود کر لیتا تھا سب کچھ..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے جذبات کی آتش فشانی پر قابو پا لیا۔ آدمی اپنے دوستوں سے ہی نہیں دشمنوں سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ دشمن اس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو ایک طرح سے اُسے موقع فراہم کرتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے نجات پا لے۔ دلاور کی بات ایک طعنہ بن گئی تھی کہ میں دل سے کہاں دماغ سے ہی سارے کام لیتا ہوں۔ کم سے کم ایسا سمجھتا ضرور ہوں مگر کیا واقعی ایسا ہے؟ ابھی ابھی میرے دماغ پر دل اس طرح غالب آ گیا تھا کہ میں اندھا ہو گیا تھا۔ اندھا نہ ہوتا تو ضرور دیکھ لیتا کہ دلاور کو قتل کر کے میں خود کس راستے سے زندہ باہر جاتا اور پھر ان سب کے مشن کا کیا بنتا جنھوں نے عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ رابعہ اور شہلا کا کیا ہوتا؟

میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور پی اے کی موت کو بھول گیا۔ دلاور ایک سفاک اور شیطان صفت آدمی تھا اور جذباتی بے حسی کا یہ مظاہرہ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ مجھے مقصد سے کام رکھنا چاہیے۔

"میں تمہارا مہمان نہیں ہوں دلاور۔" میں نے کہا۔ "... سے آتا تو ضرور ایسا سمجھتا لیکن جیسا کہ تم نے کہا کہ تم نے مجھے ... ہے۔"

"یعنی تم کافی کیا پانی تک نہیں پیو گے میرے ہاتھ ..." دلاور ہنسا۔ "تمہاری مرضی بھئی... ہم تو اتنی وضعداری کے پابند نہیں ہیں۔ تم مجھے اٹھوا لیتے تب بھی تمہارے پاس جا کر میں سب سے پہلے کافی مانگتا۔"

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں؟" میں نے ... "کہاں رکھا ہے تم نے انھیں؟"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔ مجھے معلوم تو نہیں لیکن تمہاری یقین دہانی کے لیے کہہ سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیا وہ نازو کے ساتھ ہیں؟" میں نے کہا۔

"نازو؟ یہ کون ہے اپنے سکندر صاحب...؟" دلاور ...

"وہی لڑکی تو نہیں جو بڑی مار دھاڑ کرتی ہے۔ اس سب انسپکٹر کی بہن... کیا نام ہے اس کا... ہاں... اکرام شیخ، بیچارے کو بہن کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔"

"میرا سوال اکرام شیخ کے بارے میں نہیں تھا۔" میں نے ...

"وہ تمہارا گہرا دوست تھا... اور اپنے سکندر صاحب ... میں ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔" دلاور بولا۔ "دوست کی عزت ... عزت ...!"

"تم جیسے ... شیطان کے مُنہ سے عزت کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔" میں نے بھڑک کر کہا۔ "اس کی ہی نہیں... ہر پرائی بہن کی عزت میری عزت ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "مگر دنیا ... اس لیے بکواس کرتی ہے... میں بھی کہتا ہوں کہ تم سے ... چھوڑو... بس جو بھی ہوا اس سے کسی کا بھلا نہیں ہوا... اگر ... ہوا تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن ماں باپ تو کسی کو مُنہ دکھانے کے نہیں رہے۔ اب یہ بھی ایسی بات ہے سکندر جو تم ... میں ... بعد سمجھتے۔ بشرطیکہ تمہاری بھی جوان بیٹی ہوتی مگر کچھ سمجھنے ... زندگی کے سارے تجربات سے گزرنے کی مہلت سب کو نہیں ..."

"اگر تم سمجھتے ہو کہ اس دھمکی سے میں..."

"دھمکی کوئی نہیں۔" دلاور نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ "یہ سب فضول باتیں ہیں۔ تم کچھ کرو گے تو مجھے بتا کے نہیں کرو گے ورنہ میں بھی کرتا رہا ہوں۔ تم نے نازو کے بارے میں سوال کیا تو ... اس کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ تمہیں بتا دیا۔"

"وہ خود کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

دلاور نے دونوں ہاتھ پھیلا کے لاعلمی کا اظہار کیا۔ "اگر تم کو نہیں معلوم تو پھر میں کیسے بتاؤں۔ بھائی نہیں جانتا... ماں باپ نہیں جانتے... پولیس نہیں جانتی اور تم نہیں جانتے... تو پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

ایک شخص کافی لے کر اندر آیا۔ "وہ... سر... پولیس کو اطلاع دی ہے جی آپ نے؟"

"اس کی ضرورت نہیں... تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے..." دلاور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "لاش اُٹھا لی ہے؟"

"یس سر جی... چوکیدار کی چارپائی پہ لٹا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا... پھر تم اس کی جگہ بیٹھو۔" دلاور نے کہا۔ "اور اس بات کا خیال رکھو کہ اندر کوئی نہ آنے پائے... ٹیلی فون کال بھی نہیں..."

"جی سر جی..." کافی لانے والے نے کہا۔ ایک نظر مجھے دیکھا اور لوٹ گیا۔ میں دلاور کی کسی بات کو جھوٹ یا سچ کیسے سمجھتا جب کہ وہ حد درجہ عیار شخص اس بات پر قادر تھا کہ سچ کو جھوٹ بنا دے اور جھوٹ کو سچ... نازو کے متعلق اس کے اظہارِ لاعلمی سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا اور نازو کے گھر والوں کی حالت کے متعلق اس کے بیان پر اعتبار کرنا بھی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو دلاور..." میں نے اس کی کافی قبول کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پہلے دعوت نامے کو میں نے مسترد کر دیا تھا۔ تمہاری پیشکش اگر سنجیدہ اور مخلصانہ ہوتی تب بھی میں تم سے ملنے نہ آتا۔ مجھے تم سے کوئی سودا منظور ہی نہیں، خواہ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہو۔ میں اس فائدے پر لعنت بھیج سکتا ہوں جو تم سے حاصل ہو۔ اس کے مقابلے میں جان کا زیاں بھی قبول ہو گا مجھے..."

"واہ اپنے سکندر صاحب!" دلاور مسکرایا۔ "بڑی تیاری سے آئے ہو۔ اچھا بول رہے ہو... پڑھے لکھے بندے ہو نا... ڈائیلاگ مجھے پسند آئے۔"

"اب یا تو بتا دو کہ مجھے کیوں بلایا تھا یا مجھے جانے دو۔" میں نے اُسے گالی دینے کی خواہش کو اور غصے کی شدید لہر کو دبا کے کہا۔

"میں نے تو اپنے خط میں سب لکھ دیا تھا۔" وہ بولا۔ "کوئی نئی بات نہیں ہے۔" اور اطمینان سے کافی پینے لگا۔ اس کا کنٹرول اپنی حرکات و سکنات پر اور چہرے کے تاثرات پر ہی نہیں لہجے اور آواز پر بھی حیرت انگیز تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ آدمی نہیں مشین ہے۔ کوئی آٹومیٹک نظام اس کی ساری شخصیت کو ایک خاص تاثر کی سطح پر رکھتا ہے۔ جیسے تھرمو اسٹیٹ بجلی کی استری اور اوون یا واٹر ہیٹر کے درجہ حرارت کو نہ کم ہونے دیتا ہے اور نہ زیادہ بلکہ وہیں رکھتا ہے جہاں اسے سیٹ کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ اپنے ہر ردِ عمل کو ضرورت کے مطابق سیٹ کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر نہ وہ مشتعل ہو گا نہ مایوس۔ نہ حیران ہو گا نہ پریشان۔ اس کی آواز بھی ایک ہی لیول پر رہے گی۔ نہ اوپر جائے گی نہ نیچی ہو گی۔ لہجے میں بھی جذبات کو قطعی دخل نہ ہو گا اور اس کا چہرہ بند ٹی وی اسکرین کی طرح کوئی عکس پیش نہیں کرے گا۔ بالکل بلینک رہے گا۔ شاید اسمگلر دلاور کی شخصیت اس سے بہت مختلف ہو گی۔ وہ اپنے ردِ عمل کے نظام کو دوسرے لیول پہ لے آتا ہو گا۔ بے رحم سفاک اور غصہ ور... طوفانی مزاج والا چیخنے دہاڑنے والا۔

"میں چاہتا تھا کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔" وہ پھر بولا تو میں چونکا۔

"جھگڑا تو ایسے ختم نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ اب میرے اور تمہارے درمیان نہیں، یہ جنگ غیر ذاتی ہونے کے بعد حق و باطل کی قوتوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہ نیکی، بدی... جائز و ناجائز... دوست اور دشمن کی شناخت کی جنگ ہے۔ ہم دشمنوں کو پہچان گئے ہیں اور اب ایک طرف وطن پرست ہیں تو دوسری طرف وطن فروش۔ میں ان کا نمائندہ نہیں ہوں کہ تم سے صلح کے مذاکرات کر سکوں۔ جھگڑا تو تمہارے ناپاک وجود کے ساتھ ہی ختم ہو گا، ورنہ نہیں ہو گا۔ لیکن یہ سب میں نے مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے نہیں کہا۔

"پھر کیسے ختم ہو سکتا ہے؟" دلاور نے اسی سپاٹ آواز میں کہا مگر یہی وہ بات تھی جس کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے زبردستی بلایا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے؟" میں نے بھی گول مول بات کی۔

"جانتا تو ہوں؟" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم کو وزیر خان پر ہونے والے ظلم کی شکایت ہے۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ تم کو یقین دلا دیا گیا ہے کہ اصل مجرم میں ہوں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے وزیر خان کی مدد نہیں کی۔ تمہیں حالات سے بے خبر رکھا اور... مدد کی تو میر شرافت علی کی، جس نے سب کچھ کیا۔ پلان اسی کا تھا۔ عمل کرنے کے جرم میں ایک شریک میں بھی تھا۔ لیکن اس وقت تک پلان میں وزیر خان کو یکسر خارج کر دینا شامل نہیں تھا۔ میر شرافت علی نے مجھے قائل کیا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ وزیر خان کو وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ حد درجہ اصول پرست اور ضدی آدمی ہے۔ میں نے نہ تائید کی اور نہ تردید... پھر جو کچھ کیا اس نے کیا۔ میں خاموش رہا جو ایک طرح سے حمایت تھی۔ ظاہر ہے کہ میں کھل کر مخالفت کرتا تو وہ ایسا نہ کرتا۔ مگر میں وزیر خان سے ناواقف تھا۔ اور میر شرافت علی نے جو بھی کیا اس کے نتیجے کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً وہ خود بھی اندازوں کی غلطی کا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نسکار ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ تم نوجوان ہو۔ ہر نوجوان کی طرح دولت مند بننے کی آرزو رکھتے ہو۔ چار سال ولایت میں رہنے کے بعد تمھارے خیالات کی پرواز بلند ہوگی۔ تم اصول پرستی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑو گے اور عام نوجوانوں کی طرح نو عیش وہ آؤٹ کیش... کے اصول پر عمل کرتے ہو گے۔ اگر تم نے تھوڑی بہت مزاحمت کی تو حالات کی سختی بہت جلد تمھیں راہِ راست پر لے آئے گی۔ خیر... ایسا نہیں ہوا اور میری رضامندی کے بغیر اس نے وزیر خان کو قتل کرا دیا... اگر وہ مجھ سے براہِ راست کہتا کہ اس نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس پر فوراً عمل بھی کرا رہا ہے تو میں اس کی ضرور مخالفت کرتا۔"

"یہ سب مجھے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں صرف سن رہا ہوں۔ اس پر یقین نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب مجھے کچھ کرنا ہوگا تو اپنی تفتیش کے نتائج کو سامنے رکھ کے کروں گا۔ میرے نظامِ انصاف کا تمھارے خیالات اور اس فضول بکواس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"سیدھی صاف بات ہے سکندر کہ تم انتقام صرف مجھ سے لینا چاہو تو یہ ناممکن ہے۔" دلاور نے کہا۔ "میں نے اپنی حد تک اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ مت نکالنا کہ میں تلوار تمھارے ہاتھ میں دے کر سر جھکا رہا ہوں... کہ اُڑا دو میری گردن... نہیں... مجھے اپنی گردن بچانا آتی ہے۔ ایک تو خود اپنی نظر میں ساری سزا کا مستحق اکیلا میں ہوں۔ دوسرے یہ کہ ایک نہیں دس قتل کر کے بھی کوئی بہ رضا و رغبت پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھتا۔ تمھارے دو مسئلے تھے۔ ایک حقِ وراثت کا اور دوسرا اپنے باپ کے قاتل کو سزائے موت دینے کا۔ میں اس شخص کو تمھارے حوالے کر سکتا ہوں جس کے ہاتھ براہِ راست وزیر خان کے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔"

"تمھاری مراد استاد پیڈرو سے ہے تو جس دن وہ میری گرفت میں آئے گا اس دن حقیقت کا اعتراف خود اس کی زبان کرے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پھر حقیقت وہ نہ رہے جو تم بیان کر رہے ہو بلکہ اس کے برعکس ثابت ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "تم اور استاد پیڈرو میری نظر میں ایک ہی جیسے مجرم ہو۔"

"استاد پیڈرو تم کو یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اس نے تمھارے والد کو کہاں دفن کیا تھا۔" دلاور نے یوں کہا جیسے میری بات اس نے سُنی ہی نہیں۔

"وہ بتلائے یا نہ بتائے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے یا وزیر خان کو کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مٹی خود آدمی کو بلاتی ہے۔ خدا کی مرضی ہوگی کہ وہ اپنے موجودہ مدفن سے صورِ اسرافیل پر اُٹھے۔ مٹی تو مٹی میں مل گئی۔ اسے اب نہ لوحِ مزار کی ضرورت ہے نہ میرا ارادہ اس کے لیے کوئی عالیشان مقبرہ تعمیر کرنے کا ہے۔ اس کی نشانی میں خود ہوں۔"

اگر اسے کوئی مایوسی ہوئی تھی تو اس کا اظہار دلاور نے صورت سے نہیں ہونے دیا۔ "تم نہیں جانتے اپنے سکندر صاحب کہ آج تم صرف میری وجہ سے زندہ ہو۔"

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "کیا تم خدائی کے دعویدار ہو چوہدری دلاور؟ زندگی اور موت پر اپنے اختیار کا دعویٰ تو اور نمرود نے بھی کیا تھا۔"

"میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا تمھیں۔" پہلی بار دلاور کے لہجے میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ آئی۔ "الفاظ کو توڑ مروڑ کے تمھیں کیا فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ استاد پیڈرو کی لگام میرے ہاتھ میں نہ ہوتی تو وہ کب کا تمھیں ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ تمھارے قتل پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہی ہوگا۔ یہ اس کی پرانی خواہش ہے مگر اُس کو میں نے ہمیشہ روکا۔ اُسے روکنے کے لیے صرف الفاظ کافی نہ ہوتے۔ میں نے اُسے ہمیشہ واضح دھمکی دی کہ جس دن اس نے تم کو قتل کرنے کی حماقت کی وہ اس کی زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تم ابھی تک زندہ بھی ہو۔"

"میں اس لیے زندہ ہوں چوہدری صاحب کہ خدا کی یہی مرضی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم دیکھنا چاہتے ہو کہ پیڈرو کس حد تک تمھارے خون کا پیاسا ہے؟" دلاور نے کہا۔ "میں اسے یہاں بلا کے صرف اشارہ کر دوں... خیر چھوڑو... میں نے تم کو یہاں دشمنی بڑھانے یا لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں بلایا۔"

"جب تم اتنے طاقتور ہو تو صلح کے مذاکرات کیوں کرنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ نقصان مجھے بھی ہو رہا ہے۔" دلاور نے کہا۔ "یہ میرے اندازوں کی غلطی تھی جس کے باعث ایک معمولی سا معاملہ اتنا لمبا تنازعہ بنا۔ بے شک اُس وقت تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جب یہاں پہنچے تھے۔ لیکن اس کے بعد تم کو حالات موافق ملے۔ تم اکیلے تھے اور مرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ میں بیوی بچوں والا تمھاری طرح جنون کا شکار نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا کاروبار ہی نہیں، میرا گھر بھی اس جنگ سے متاثر ہوا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمھاری بیوی کے اعصاب پر بُرا اثر پڑا ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے چوہدری دلاور کہ گھر کے اندر تم اچھے شوہر ثابت ہوئے ہو۔ تمھارے رویے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہو۔ یا اس کی اعصابی کمزوری کا یہ مرض موروثی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا..."

"ہاں، اسباب تو رابعہ کے پاگل پن کے بھی وہی ہو سکتے ہیں مگر تمھارے ساتھ صرف رابعہ ہے۔ میرے ساتھ بچے بھی ہیں۔ ان کو ایک ماں کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ تم نے فوزیہ کو رابعہ پر قربان کر دیا۔ اب رابعہ نہ ہو تب بھی تم جی لو گے۔ بالآخر کوئی متبادل تلاش کر لو گے۔ میں بھی دوسری بیوی تو لا سکتا ہوں لیکن وہ بچوں کی ماں نہیں ہوگی... اور ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے تم سے تمھاری شرائط پر سودا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں مرحوم وزیر خان کی تمام جائداد منقولہ اور غیر منقولہ کہتے ہیں شاید اسے تمھیں منتقل کرنے کو تیار ہوں۔"

"اس میں ایک چیز اور شامل کر لو۔ وزیر خان کی زندگی۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ..." دلاور نے ایک ہاتھ کے اشارے سے میری بات کو فضول سمجھتے ہوئے ٹال دیا۔ "تم حسابات آڈٹ کرا کے وہ سب منافع بھی لے سکتے ہو جو وزیر خان کو نہیں ملا۔"

"لیکن اس کو تو سب منافع ملتا رہا تھا۔ آخری وقت تک۔" میں نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔ "اس کے دستخط موجود ہیں۔ تمام حسابات وکیش بُک لیجر اور دوسری سب دستاویزات پر۔"

"ہاں۔ مگر اس کے باوجود وہ رقم میں تمھارے حوالے کر دوں گا۔ تم میرے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے ایک قانونی مالک بن جاؤ گے۔ تمام معاملات میں میرا اور تمھارا برابر کا دخل ہوگا۔ مطلب یہ کہ تم سلیپنگ پارٹنر نہیں کہلاؤ گے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ معاملات میں اپنے قانونی مشیر اور اٹارنی ایڈووکیٹ عبدالودود منظر پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔

دلاور نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تمھارے لیگل اٹارنی سے معاملات طے کرنے ہوتے تو میں تمھیں کیوں بلاتا۔"

"لیکن اس میں کوئی بات غیر قانونی نہیں۔ منظر کو مکمل اختیارات حاصل ہیں کہ وہ میری طرف سے جو چاہے کرے۔" میں نے کہا۔

"یہ قانونی اختیارات کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "میں تحفظ کی ضمانت چاہتا ہوں۔ ورنہ مجھ سے بڑا احمق کوئی نہیں ہوگا کہ تمھیں وارث تسلیم کرتے ہوئے سب کچھ تو عبدالودود منظر صاحب کے سپرد کر دوں اور تم بدستور میرے خلاف گوریلا جنگ جاری رکھو۔ تمھیں تو وہ سب مل جائے جو تمھارے باپ کا تھا مگر مجھے سکون نہ ملے۔"

"یہ تحفظ تمھیں کیسے حاصل ہو سکتا ہے چوہدری جی؟" میں نے کہا۔

"اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔" دلاور نے کہا۔ "ہر کیس میں تمھاری ضمانت کرانے کی ذمے داری میری... ثبوت شہادت پیش نہ کرنے کی ذمے داری میری۔ گواہوں کو منحرف کرنے کی ذمے داری میری۔ تم کسی سزا کے بغیر چھوٹ جاؤ گے لیکن قانونی کارروائی ضابطے کے مطابق ہوتی ہے۔ تمام مقدمات کا فیصلہ ہونے میں کم سے کم سال لگے گا۔ یہ عرصہ تم جیل میں نہیں گزارو گے مگر پابندِ ضمانت رہ کر گزارو گے اور چونکہ ضامن میں بنوں گا، اس لیے میری حفاظت میں گزارو گے تاکہ تمھارے کسی غلط فیصلے سے میری دی ہوئی ضمانت ضبط نہ ہو۔"

میں نے دل ہی دل میں دلاور کے منصوبے کی خوب صورتی کو سراہا۔ اگر وہ نیک نیتی کے ساتھ ویسا ہی کرتا جیسا وعدہ کر رہا تھا تب بھی ایک سال کے لیے میں اپنے مقصد سے کٹ جاتا۔ دلاور کے محافظ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے اور ضمانت پر رہائی بھی نظربندی ہوتی۔ میں کسی کوٹھی میں رہتا تو محافظ باہر پہرا دیتے۔ گاڑی میں نکلتا تو محافظ ساتھ ہوتے یا پیچھا کرتے۔ ایک سال میں تو میرا مشن چوپٹ ہو جاتا اور اسی ایک سال میں دلاور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سارا پلان اوپر سے دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے جو دلاور کے بھی آقا تھے۔ جو اس سے اسلحہ خرید رہے تھے اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے آگے مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں تک پہنچا رہے تھے۔ نقصان دلاور کو نہیں اُن کو ہو رہا تھا اور وہ ہر قیمت پر میری رخنہ اندازی کو ختم کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی دلاور پر دباؤ ڈالا ہوگا کہ اپنا جھگڑا ختم کرو تاکہ ہمارا راستہ صاف ہو۔ جو دینا دلانا ہے ہم سے لو اور اس کو ذاتی نہیں سیاسی مسئلہ سمجھ کے بات کرو۔

"بے شک تم ضمانت پر رہائی کے عرصے میں نقل و حرکت کے لیے آزاد ہو گے اور جسے چاہو گے ساتھ رکھ سکو گے۔ تمھاری عزت اتنی ہی ہوگی جتنی میری ہے۔ تم ایک پارٹنر کی حیثیت سے آفس میں بیٹھ کر کام کرو گے اور فیصلے کرو گے۔ رابعہ بھی اگر اپنی لیگل فرم کے معاملات ٹھیک کرنا چاہے تو اپنی گڈوِل بحال کر سکتی ہے اور ظاہر ہے اس نئے شادی شدہ جوڑے کو... محسن اور شہلا کو ازدواجی زندگی کا یہ پہلا سال... جو ہنی مون سمجھا جا سکتا ہے... سکون کے ساتھ گزارنے کے وہ مواقع ملیں گے جو اب حاصل نہیں۔"

"تمھاری باتیں دلچسپ ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ اور کیا ہوگا؟"

"اور یہ ہوگا... کہ غالب پہلے کی طرح ایک صحافی بن کے کام کرتا رہے گا۔ ایک بار تو وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا تھا مگر وہ کب تک مفرور رہ سکتا ہے۔ نازو اپنے گھر لوٹ جائے گی۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ صحافی اس میں خاصی دلچسپی لے رہا ہے۔ تم سب نے جوڑے اچھے بنائے ہیں۔ پھر اس احمق کو ابھی تک لاوارث کیوں چھوڑ رکھا ہے جو خواہ مخواہ تمھارا دُم چھلا بنا ہوا ہے؟ استاد ٹیڈی کو... خیر یہ مذاق کی بات تھی۔ اصل بات تھی میری پیشکش کی۔"

"چوہدری صاحب! آپ کی ہر پیشکش کے پیچھے آپ کی ضمانت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کو دخل ہے؟" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردوں تو باقی سب آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ میری ضمانت پر رہائی۔ ثبوتِ شہادت میں ردّ و بدل اور گواہوں کا منحرف ہونا۔ اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ تم یہ سب ضرور کرو گے۔ اگر میں نے خود کو گرفتاری کے لیے قانون کے حوالے کردیا اور تم اطمینان سے بیٹھے گئے تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گا۔ کس طرح تم کو مجبور کروں گا کہ تم مجھ سے کیے ہوئے وعدے پورے کرو۔ تم تو کہہ رہے ہو کہ میری زبان پر اعتبار کرتے ہوئے تختۂ دار تک پہنچنے کا چیک دے دو۔ میرے بارے میں تمہارے خیالات کا یہ تضاد کیسا ہے۔ ایک طرف تم مجھے برابر کا حریف مانتے ہو۔ یہ کہتے ہو کہ میرے بارے میں تمہارے اندازے غلط ہوئے اور اب تمہیں بھی نقصان ہو رہا ہے۔ دوسری طرف تم مجھ سے اس قسم کی حماقت کی توقع رکھتے ہو؟"

"یہ حماقت نہیں سکندر! تمہاری مجبوری ہے۔" دلاور بولا۔ "تم کو میری زبان پر اعتبار کرنا ہی ہوگا اور کوئی صورت نہیں ہے اس مسئلے کو حل کرنے کی۔ تم کو یہ فیصلہ آج اور ابھی کرنا ہے۔"

"یعنی ایک جانی دشمن سے زندگی کی ضمانت قبول کرنے کا۔ بھیڑیا اگر خرگوش کو ضمانت دے۔ بھیڑیا اگر بھیڑ کو محافظت کا یقین دلائے تو کیا یہ عملی طور پر ممکن ہے؟" میں نے کہا۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے اپنے سکندر صاحب! مجھے نہیں۔" دلاور بولا۔

"اور اگر میں کہوں کہ ایسا احمقانہ فیصلہ کرنے کے لیے تمہارا مجھ کو بلانا ہی سب سے بڑی حماقت تھی؟"

"تم جو چاہو کہو۔ مگر یہ حماقت بھی تم کو ہی مہنگی پڑے گی۔ فیصلہ کیے بغیر تم کیسے جاؤ گے۔" دلاور مسکرایا اور اس کی صورت کا تاثر تھوڑا سا بدلا۔ "تم بھول رہے ہو کہ رابعہ اور شہلا میرے پاس ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ محفوظ ہیں... اگر یہ بات سچ نہیں ہوتی تو پھر باقی باتیں کیسے سچ ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ محفوظ ہیں۔ تمہارے فیصلے کی ضمانت پر۔" دلاور نے کہا۔

"میں تمہاری ہر پیش کش مسترد کرتا ہوں... یہی ہے میرا فیصلہ۔" میں نے کہا۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو۔" چوہدری دلاور نے کہا اور اس کی صورت پر خشونت، بے رحمی اور سختی کے جذبات کا تھوڑا سا تاریک سایہ پھیل گیا۔

"ایسا تم سمجھتے ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "تمہارے اندازے پہلے بھی غلط ہو چکے ہیں۔ دوبارہ سوچنے کا میں قائل ہی نہیں۔"

"تم اپنے ساتھ ایک ریوالور لائے ہو۔" دلاور آگے جھک کر بولا۔ "ابھی تم نے مجھے میرا ریوالور استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور بہت خوش ہوئے تھے... تم سمجھے تھے میں ڈر گیا... ہے نا یہی بات؟"

"میں ایسا نہیں سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بالکل محفوظ ہو اور میں غیر محفوظ ہوں۔ اس عالم میں ریوالور نکالنے کی حماقت نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے کہ میں نشانہ لوں شاید ہر طرف سے دس بندوقوں کی نالیں نکل آئیں گی... آنے سے پہلے میں نے ایک پرانی کہاوت کو ذہن میں رکھا تھا کہ اپنی مرضی سے ہوتا ہے مگر واپسی دوسرے کی مرضی کی بات رہتی ہے۔"

"تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔" دلاور بولا مگر اس کے لہجے نے مجھ پر واضح کر دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

"میرا کام اتنا آسان ہوتا تو میں ضرور چلا جاتا۔ تم کو بیدار کر کے ڈھال بناتا اور ظاہر ہے پھر میرا راستہ کوئی نہ روکتا۔" میں نے کہا اور اپنی جیب سے اچانک ریوالور نکال کے میز پر ڈال دیا۔

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا جس میں دلاور کی نگاہیں مجھے گھورتی رہیں اور میں ظاہری بے نیازی سے مسکرانے کی کوشش کرتا رہا تاکہ دلاور میرے اطمینان سے میری بے خوفی کا قائل ہو جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوف زدہ میں بھی تھا۔ ایک طرف سے میں نے اور ایم آر ایس کی کابینہ نے جو پلان بنایا تھا اس میں کوئی سقم نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ دھوکا تو سب کو ہوتا ہے۔ بافاتل سے لے کر ترقیاتی منصوبے بنانے والوں تک سب سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد ناکامی کا امکان نہیں چھوڑا مگر عمل درآمد کا وقت آتا ہے تو بہت سے ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی نظر میں نہ تھے اور جو منصوبے کو چوپٹ کر دیتے ہیں۔ میرے سامنے بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ شخص تھا جو اپنے حیرت انگیز شیطانی ذہن سے انہونی کو ہونی کر دکھا دیتا تھا۔ اسے ہمارے حالات کی خبر رہتی تو لہٰ ما شے تک نازو کے متعلق اس کا اظہارِ لاعلمی اس کی چال بھی ہو سکتا تھا۔ میں اس بات کو خارج از امکان نہیں سمجھتا تھا کہ اسے ہمارے دھماکا خیز پروگرام کی خبر بھی مل چکی ہو اور وہ اچانک قہقہہ مار کر چاروں ٹائم بم میرے سامنے رکھ دے کہ اپنے سکندر صاحب! کیا خیال ہے۔ تاہم میں اسے سُپرمین تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھا اور قبل از وقت مایوسی کو گناہ سمجھتا تھا۔

"آخر تم کیا سوچ کے یہاں آگئے تھے؟" دلاور نے بالآخر کہا۔ "یہ کہ میں تم سے وہی بات کروں گا جو میں نے خط میں لکھی تھی۔ تم نے مان لی تو بہت اچھا، ورنہ تمہیں کافی پلا کے ہاتھ ملاؤں گا اور کہوں گا تھینک یو..."

"جو تمہیں نہ جانتا ہو دلاور! وہ یہ سوچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم تو اتنے عرصے میں کھل کر میرے سامنے آگئے ہو۔ جب آدمی کسی آدم خور شیر کی کچھار میں جاتا ہے تو اظہارِ خیر سگالی کے لیے نہیں جاتا۔ میں نے اپنا فیصلہ تم کو بتا دیا۔ اب ایک فیصلہ تم کو کرنا ہے اور اس فیصلے کے لیے میں تم کو آدھا گھنٹا دوں گا۔ اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ بلکہ پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"دس بجے کیا ہوگا... قیامت آجائے گی؟" دلاور نے طنز سے کہا۔

"تمہیں اپنے سابق دستِ راست ڈی سلوا کے گھر کا فون نمبر یاد ہے؟" میں نے کہا۔ "یا تم مرتے ہی دوستوں کو اسی طرح بھلا دیتے ہو جیسے طوائف کنگال عاشقوں کو فراموش کر دیتی ہے۔"

"کیا اس فون نمبر پر ڈی سلوا کی روح مجھے میرے سوال کا جواب دے گی؟" دلاور نے کہا۔

"اس کی کوٹھی میں آج کل کون رہتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اس کا جانشین؟" میں نے کہا۔ "اس سے میری ملاقات تو ہو چکی ہے لیکن اس وقت مجھے نام یاد نہیں آرہا ہے۔ دس بجے اسے تم سے وفاداری کا وہ انعام ملے گا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ دیکھنے میں بے حد شریف اور مہذب آدمی تھا۔ چنانچہ ڈی سلوا سے زیادہ خطرناک تھا۔ ڈی سلوا اپنے رویے سے صاف بتا دیتا تھا کہ میں بدمعاش ہوں۔ مجھ سے بچ کر رہنا۔ اس نئے منیجر کی بدمعاشی پر شرافت اور تہذیب کا پردہ تھا۔"

"اسے بیچ میں کیوں لا رہے ہو؟" دلاور نے میری بات کاٹ دی مگر وہ اپنی تشویش کو نہ چھپا سکا۔

"اسے میں نہیں! آپ نے چوہدری دلاور صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ بیچ میں لائے ہیں۔ اس کو میں نے تو جنرل منیجر مقرر نہیں کیا تھا۔ اگر تم صرف پانچ منٹ پہلے بھی بتا دو گے یعنی نو بج کر پچپن منٹ تک کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں تو اس کے گھر میں جو بھی ہوگا، باہر نکل کے اپنی جان بچا لے گا۔ گھر بہرحال تباہ ہو جائے گا۔"

"ویری گڈ! تمہارا پائلٹ ٹھیک دس بجے اس گھر پر ایٹم بم گرانے کے لیے ٹیک آف کر جائے گا۔" دلاور نے طنز آمیز تمسخر کے ساتھ کہا۔

"آدمی کسی ٹائم بم سے مرے یا ایٹم بم سے، اس کے لیے موت تو زندگی سے محرومی کا نام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ بے گناہ مارے جائیں مگر اس کا فیصلہ بھی تمہیں کرنا ہے۔ اس کوٹھی میں ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو ٹھیک دس بجے پھٹ جائے گا۔ ویسے تو یہ خبر تمہیں ذرا دیر سے ملے گی لیکن میری وزارتِ اطلاعات نے تمہاری سہولت کے لیے خبر فوراً پہنچانے کا معقول انتظام کیا ہے۔ ٹھیک پونے دس بجے تمہیں ایک فون کال موصول ہوگی۔ تم کو ایک ٹیلی فون نمبر بتلایا جائے گا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ اس کوٹھی کے آگے پیچھے یا دائیں بائیں کون لوگ رہتے ہیں اور ان کا فون نمبر کیا ہے؟"

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ شریف لوگوں کا اپنے ہمسایوں سے تعلق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹیلی فون نمبر تمہیں بتا دیا جائے گا دس بج کر پانچ منٹ پر تم فون کر لینا۔ آس پاس رہنے والے تم کو یقیناً یہ خوش خبری دے سکیں گے کہ اس کوٹھی میں کیا ہوا۔"

دلاور نے ایک دم ٹیلی فون اٹھا لیا۔ اس نے انکوائری کا نمبر ڈائل کیا اور منتظر رہا کہ کوئی جواب دے مگر ٹیلی فون والے کسی پر اتنے مہربان ہوں کہ فوراً جواب دے دیں تو اسے اتفاق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی اتفاق دلاور کے ساتھ ہوا۔ اسے آدھا منٹ بھی انتظار نہیں کرنا پڑا ہوگا مگر وہ آپریٹر پر برس پڑا۔ "سوتے رہتے ہو تم لوگ... آدھے گھنٹے سے ریسیور پکڑے بیٹھا ہوں کہ کوئی بولے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے فوراً بم ڈسپوزل اسکواڈ کا نمبر بتاؤ... ایک بم پھٹنے والا ہے... پھٹ گیا تو میں... اچھا۔" اس نے ایک کاغذ پر نمبر لکھا اور لائن کاٹ دی۔ پھر وہ بم ڈسپوزل والوں کا نمبر گھمانے لگا۔

میں نے مایوسی اور افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ "اتنا وقت اب کہاں رہا ہے چوہدری دلاور صاحب! ان کو پہنچنے میں بھی پندرہ منٹ تو لگ جائیں گے۔ اور بم ایسی جگہ رکھا ہوا ہے کہ انھیں تلاش کرنے کے لیے پورا دن چاہیے۔"

"ہیلو! دیکھو میں ایم ڈبلیو ڈی کیلیکس کا مالک بول رہا ہوں۔ چوہدری دلاور... ایک پتا لکھو اور فوراً پہنچو۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس کوٹھی میں ٹائم بم فٹ کر دیا ہے جو دس بجے پھٹ جائے گا... کیا؟... پہلے کیسے بتاتا پاگل کے بچے جبکہ خود مجھے یہ بات ابھی ایک منٹ پہلے معلوم ہوئی ہے۔" اس نے ریسیور کو دھڑ سے دے مارا۔

"اچھا ہوا کہ آپ نے مختصر بات کی۔" میں نے کہا۔ "بم ڈسپوزل والے عقل مند تو ہوتے ہیں کہ مقررہ وقت تک بم نہ تلاش کر سکیں تو اپنی جان بچانے کا بندوبست ضرور کر لیتے ہیں مگر تم ان کو خبردار کر دیتے تو اچھا تھا۔"

"اپنا اچھا بُرا میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" وہ غرّایا جس سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ تھوڑا بہت پریشان ضرور ہے۔ اس نے میری بات کو جھوٹ سمجھ کے نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"کاش ایسا ہوتا چوہدری دلاور۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔ "تمہارے اس فون میں اسپیکر سسٹم تو ہے۔ ذرا بٹن دبا دو کہ کال آئے تو گفتگو میں بھی سن سکوں؟" میری بات ختم ہونے سے قبل ہی گھنٹی بجی اور دلاور نے ایک دم ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور ایک بٹن دبا دیا۔

"ہیلو!" چوہدری دلاور نے دور سے ہی ریسیور اٹھائے بغیر کہا۔

"اپنے چوہدری دلاور صاحب؟" میں نے غالب کی آواز سنی۔ "ایک فون نمبر لکھ لیں۔ جہنم رسید ہونے سے قبل تمہارا نائب، شیطان ڈی سلوا جس کوٹھی میں رہتا تھا، یہ اس کوٹھی کے مقابل سڑک کے پار والے جنرل اسٹور کا نمبر ہے۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"تم... کون ہو تم؟" دلاور نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"میں فرشتۂ اجل کا نمائندۂ خصوصی۔" غالب نے قہقہہ مارا۔ "ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر اس اسٹور سے آپ کو فون پر کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔"

دلاور نے کاغذ کے پیڈ پر نمبر لکھا۔ "تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح ہراساں ہو جاؤں گا تو تم غلطی پر ہو۔"

"اللہ اس کی غلطی معاف کرے جو غلطی پر ہو۔" غالب بولا۔ "ایک بات کا خیال رکھنا اپنے چوہدری دلاور صاحب۔ آپ کے پاس ہمارا ایک مہمان بیٹھا ہے۔ اس کو ایک ڈبل چائے، ڈبل ملائی والی پلانا نہ بھولیں اور خود تقویتِ قلب کے لیے خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا چھ ماشہ..."

دلاور نے اُسے ایک گالی دی جو ناقابلِ اشاعت ہے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ اس نے ایک اور نمبر ملایا۔

"سنو! میں دلاور بول رہا ہوں۔" اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "وہاں کوئی آیا ہے۔ فائر بریگیڈ والے یا سرکاری گاڑی میں..."

"نہیں چوہدری صاحب! ابھی تو میں اور چھوٹو ہی ہیں... آپ بالکل فکر مت کریں... ہم کسی کو اندر نہیں گھسنے دیں گے۔"

"فکر کے بچے۔ فوراً باہر نکل جاؤ۔" دلاور نے کہا۔ "اندر کسی نے بم رکھ دیا ہے۔"

"بم۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب؟ ہم نے تو کسی کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔

"اس وقت تم مرے پڑے تھے۔ اور دوبارہ مر جاؤ گے اگر میری بات نہ مانی۔" دلاور نے ریسیور کو دوسری بار غصے میں کریڈل پر مارا۔ اسے نروس دیکھ کر مجھے زندگی میں پہلی بار دلی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

"ایک تو چھوٹو ہے وہاں؟" میں نے ہمدردانہ لہجہ بنا کے کہا۔ "دوسرا کون ہے۔ جو دس منٹ بعد نہیں ہوگا۔ موٹو یا ملبوہ؟"

"اپنی بکواس بند کرو..." دلاور نے دہاڑ کر کہا۔

"تم بتا دو کہ رابعہ اور شہلا کہاں ہیں تو میں بتا سکتا ہوں کہ بم کہاں ہے۔" میں نے کہا۔ "چھوٹو، موٹو یا ملبو میں سے کوئی بھی اس کا فیوز نکال سکتا ہے۔"

میری بات جھوٹ تھی۔ وہاں بم فٹ کرنے والے تو ٹیڈی اور محسن تھے۔ میں نے حشمت خان اور دلاور کے گھر میں بم رکھا تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہاں بم رکھنے کے لیے میں غالب کے ساتھ گیا تھا۔ بم خود غالب نے رکھا تھا اور میں نے کسی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ اس نے بم کہاں رکھا ہے۔ غالب نے یہ ضرور بتا دیا تھا کہ ایک جگہ بم کو اس نے چمنی میں لٹکا دیا ہے اور

دوسری جگہ ایک گملے کے پیچھے رکھا ہے لیکن کون سی چیز اور کس گملے کے پیچھے، یہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

دلاور بڑے شش و پنج میں مبتلا تھا اور اس کے اضطراب میں میرے اعتماد سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ریوالور میرے سامنے میز پر میرے ہاتھ کی دسترس میں تھا اور اس سے پہلے کہ دلاور کوئی غلط حرکت کرتا، میں ریوالور اُٹھا سکتا تھا۔ وہ فضا جس میں ہم کچھ دیر پہلے گفتگو کر رہے تھے ایک دم بدل گئی تھی۔ پہلے وہ اپنی بالادستی کے احساس سے مطمئن اور پُراعتماد تھا اور میں انتظامات کے خیال سے۔ میرے آدھے گھنٹے کے نوٹس کے ساتھ گویا اعلانِ جنگ ہوگیا تھا اور اب ہم متحارب فوجوں کے کمانڈروں کی طرح آمنے سامنے موجود اپنے حریف کی قوت کا صحیح اندازہ لگانے، اس کی جنگی حکمتِ عملی کا جائزہ لینے اور دونوں طرح کے نتائج پر غور کرنے میں مصروف تھے۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے پر گولی چلانے میں پہل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر گولی ایک طرف سے چلائی گئی تو دوسری جانب سے بھی فوراً جواب آئے گا۔ اتنے کم فاصلے سے کسی کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ یہ حرکت صریح خودکشی کے مترادف تھی۔

دلاور کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی آدھے گھنٹے کی مہلت والی کھوکھلی دھمکی اور اس کے بعد آنے والی فون کال کو ڈرامے کا حصہ سمجھتا مگر یہ بھی سوچتا کہ خدانخواستہ دھمکی ٹھیک آدھے گھنٹے بعد صحیح ہوگئی تو کیا ہوگا؟ وقت اس کی قوتِ فیصلہ کو مفلوج کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بم ڈسپوزل والوں کے پاس پہنچنے اور بم کو تلاش کر کے ناکارہ بنانے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اب دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ میری دی ہوئی مہلت تمام ہو رہی تھی اور وہ میری صورت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن میری صورت سے وہ جھوٹ سچ کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہی چیز اس کو جھنجلاہٹ اور کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

دوسری طرف میں پورے اعتماد کے باوجود دل کے ایک گوشے سے اس خوف کو نہیں نکال سکتا تھا کہ ہمارے انتظامات میں کوئی خامی عین وقت پر ہماری ناکامی نہ بن جائے۔ یہ تو سارا کھیل ہی وقت کا تھا۔ اگر ٹائم بم کا کلاک ٹھیک نہ ہوا۔ اسے سیٹ کرتے ہوئے محسن کچھ بھول گیا ہو جس سے مشینی نظام ہی نہ ہوا ہو۔ خراب تو ہر گھڑی ہو سکتی ہے۔ کلاک کی مشینری کو تیل وغیرہ دینا پڑ جاتا ہے۔ اندر گرد بھی چلی جاتی ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دلاور کے ساتھ میں بھی اُچھل پڑا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اعصابی کشیدگی کا شکار میں ہی نہیں دلاور بھی ہے۔ اس شخص کو میں نے کبھی پریشان ہوتے ہوتے نہ دیکھا تھا۔ آج اس کی ساری اداکاری دھری رہ گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں ناکام تھا۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھالیا۔

"بہت افسوس ہے اپنے چوہدری صاحب۔" اس بار آواز محسن کی تھی جو دلاور کے لہجے کی بہتر طور پر نقل اتار رہا تھا۔ "فیصلے میں بہت دیر کی آپ نے... شاید آپ نے فیصلے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی..."

"کون ہو تم شوہر کے بچے..." دلاور کے منہ سے گالیاں یوں نکلیں جیسے پریشر ککر سے بھاپ نکلتی ہے۔

"فرشتۂ اجل کا نمائندۂ خصوصی۔" محسن ہنسا۔ "اگر تمہاری قوتِ فیصلہ یہی رہی تو آج دوپہر تک تم مجھے دیکھو گے... زندگی میں پہلی اور آخری بار۔ لیکن اس سے پہلے گیارہ بجے تمہارا ایک اور خانہ خراب ہوگا۔ ہمارے مہمان کی زندگی کا مالک ویسے تو خدا ہے مگر ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ تمہارے شر سے محفوظ رہے۔"

"میں ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔" دلاور چلایا۔

"دھمکی تو بے وقوف دیتے ہیں دلاور۔" محسن بولا۔ "تم سکندر بخت کو ہاتھ لگا کے دیکھو۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ وہ تمہارے دفتر میں اتنا ہی محفوظ ہے جتنا اپنے گھر میں تھا۔ اب تم اس کی حفاظت کرو گے۔ اس کی بحفاظت واپسی پر بہت کچھ منحصر ہے۔ وقت ہوگیا ہے۔ وقت کا پہلا سبق تم کو یہ ہے کہ جو کچھ سکندر بخت نے کہا تھا غلط نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی جو کچھ وہ کہے گا وہی ہوگا۔ وہ بڑا پہنچا ہوا شخص ہے۔" فون کی لائن کٹ گئی اور دلاور نے بڑی عجلت میں وہ نمبر ملایا جو اُسے غالب نے دیا تھا اور اس کے سامنے کاغذ کے پیڈ پر لکھا ہوا تھا۔

"تم تو واقعی نام کے دلاور نکلے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "آج تو دلاوری کا بھرم رکھنا بھی تمہارے لیے مشکل ہو رہا ہے... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میں تمہیں مزید آدھے گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔"

"بھونکو مت کتے..." دلاور نے چیخ کر کہا۔

دروازہ ایک دم کھلا۔ "آپ... آپ نے آواز دی سر..."

"گیٹ آؤٹ..." دلاور نے اندر آنے والے کو ایک زبردست گالی دی۔ "میں نے کیا کہا تھا... اندر کیسے آئے تم..."

"سوری... سوری سر..." اندر آنے والا بڑی گھبراہٹ میں فرار ہوا مگر جاتے جاتے وہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے بارے میں بہت کچھ سن گیا۔

"ہاں جی؟" ٹیلی فون کے ریسیور اور اسپیکر میں کسی نے کہا۔ پس منظر میں ریکارڈنگ کی آواز کے ساتھ مختلف لوگوں کی باتیں کرنے کا شور بھی سنائی دیا۔ دلاور نے نظر گھڑی پر رکھی اور نمبر دہرایا۔

"ہاں جی... یہی نمبر ہے۔" جواب ملا۔ "بات کرو فٹافٹ..."

"بھئی یہ تمہارے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر کیا ہوا ہے؟" دلاور نے آواز کو سخت جدوجہد کے بعد نارمل رکھا۔ "ایک کوٹھی ہے...؟"

"بس جی مت پوچھو کیا ہوا ہے..." آواز آئی۔ "اور کوٹھی ہے کہاں جی۔ تھی... اب تو مٹی دھول ہے اور دھواں ہے... آپ کون ہو؟"

"میں... ڈی ایس پی..."

"تو ڈی ایس پی صاحب! آپ مہربانی کرو۔" جواب دینے والا سخت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ "کسی کو بھیجو اِدھر... ایسا بم مارا ہے جی کسی نے کہ بیت کچھ اُڑا کے رکھ دیا ہے... اوئے پجامے، دیکھ کوئی گاہک دوڑ نہ جائے پیسے دیے بغیر... معاف کرنا جی، بڑی افراتفری ہے۔ میں تو خود بھی نیچے گر گیا تھا۔ سارے شیشے ٹوٹ گئے۔ گلاس برتن نیچے پڑے ہیں۔ کچھ گاہک بھی پڑے ہیں مگر انہیں ہوا کچھ نہیں ہے۔ ڈر کی وجہ سے میزوں کے نیچے گھس گئے ہیں۔ اوئے پجامے... بند کر ایہہ گانا بجانا... ایتھے قیامت آ گئی اے تے ایہہ پیا گانے سُن دا اے..."

دلاور نے ریسیور کو نیچے رکھا اور چند سیکنڈ تک اس کی نظریں خلا میں معلق رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے میری طرف دیکھا۔ "تم کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی سکندر۔" اس نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔

"صرف تیس منٹ اور ہیں تمہارے پاس دلاور۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس وقت کو دھمکیوں میں ضائع مت کرو... ایسا نہ ہو کہ تمہارے لیے دوسری اطلاع زیادہ اندوہناک ہو۔ میں صرف رابعہ اور شہلا کا پتا ہی تو پوچھ رہا ہوں۔"

"اب وہ تم کو اگلے جہان میں ملیں گی۔" دلاور نے کہا اور میں نے اس کی صورت کو دیکھا جو غیظ و غضب سے مسخ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور نتھنے پھول گئے تھے۔ گال اندر دب جانے سے جبڑے کچھ نمایاں ہوگئے تھے اور اس کی کنپٹی پر ایک رگ پھڑک رہی تھی۔

"تم ان کو قتل کرانے سے زیادہ کیا کر سکتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے تو اس وقت بھی یقین نہیں کہ وہ زندہ ہوں گی۔ یہاں آنے سے قبل ہی میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ شاید اس دنیا میں ہماری پھر ملاقات نہیں ہوگی۔"

"تم موت کو کھیل سمجھتے ہو نا... اس لیے کہ موت ابھی تم نے دیکھی نہیں۔" دلاور نے زہریلے سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔

"یہ تو سارا کھیل ہی موت کا تھا دلاور! مگر ہم جانتے تھے کہ موت صرف ایک بار آتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بات

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تم نہیں جانتے وہ بہت جلد جان لوگے۔ ٹھیک گیارہ بجے تم پھر کسی کو فون کرو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فرشتۂ اجل کا نمائندہ خصوصی غلط نہیں کہتا تھا۔ شاید آج ہی تم اُسے دیکھو...“

”اس سے پہلے تم بہت کچھ دیکھو گے سکندر۔“ دلاور نے کہا اور فون اٹھالیا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا لیکن فون کے اسپیکر کو بند کر دیا تاکہ میں ان کی گفتگو نہ سن سکوں۔

”گاڑی باہر لاؤ ؟“ وہ بولا...: ہاں ... پانچ منٹ میں... چھ منٹ ہوئے تو میں تمہاری کھال کے جوتے بنوا کے تمہاری ماں کو بھیج دوں گا۔“ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ ”اور سنو... رابعہ اور شہلا...“

یہ آخری بات اس نے مجھے چونکانے اور میری توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ اسے جو حکم دینا تھا وہ دے چکا تھا۔ رابعہ اور شہلا کا نام سنتے ہی میں نے بے اختیار دلاور کی طرف دیکھا اور اس ایک لمحے میں اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہو گیا۔ دلاور نے ریسیور میرے منہ پہ کھینچ مارا۔ فون اگر میز کے ایک کونے پہ ہوتا تو شاید بل کھائے ہوئے اسپرنگ جیسے تار کی قوت اُسے آگے بڑھنے سے روک لیتی مگر فون دلاور کے بالکل سامنے اور میز کے وسط میں تھا۔ میز کی تین فٹ سے کچھ کم چوڑائی ہم دونوں کے درمیان حائل تھی اور کریڈل سے الگ ہونے کے بعد ریسیور دونوں طرف برابر فاصلے پہ چار فٹ تک تو جا ہی سکتا تھا۔ یہ دلاور کی زبردست چال تھی کہ اس نے میرے ذہن میں غفلت کے ایک لمحے کو پیدا کیا اور جب وہ لمحہ اسے حاصل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر اور مجھے کوئی موقع دیے بغیر میرے دفاع کی صلاحیت ختم کر دی۔ ریسیور کسی پتھر کی طرح میرے منہ پہ لگا اور میں سنبھل نہ سکا۔ میرا سر ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا۔ دلاور نے ریسیور پھینکتے ہی جست لگائی تھی۔ میرا ہاتھ میز کی خالی سطح پر پڑا۔ ریوالور اس وقت تک دلاور کے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔ اس درد کو بھول کر جو میری ناک اور جبڑے کی ہڈی میں یوں اٹھا تھا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو، میں کرسی سے لڑھک گیا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولی میرے پیچھے کی دیوار سے ٹکرا کے نیچے گری یا اس میں پیوست ہو گئی... یہ میں نے نہیں دیکھا۔

”باہر آجاؤ سکندرِ اعظم۔“ میں نے دلاور کی آواز سنی جو میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ”تم اتنے پھرتیلے نہیں ہو کہ گولی کو ڈاج کر سکو اور نہ میرا نشانہ اتنا کچا ہے۔ میں نے گولی تم پر چلائی ہی نہیں تھی۔“ وہ کمینگی سے ہنسا اور نیچے جھکا۔ میں نے اس کے ریوالور کو میز کی سطح کے نیچے، اپنے سر سے دو فٹ دُور دیکھا۔ ”اٹھو!“ اس نے ریوالور ہلا کے مجھے حقارت سے حکم دیا۔ ”گولی تو میں تم کو یہاں بھی مار سکتا ہوں مگر اتنی آسان موت تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔“

میں آہستہ آہستہ اٹھا اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ میری ناک سے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور درد کی ٹیس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ چوٹ میرے لبوں کے کنارے پر بھی لگی تھی، اوپر والا لب کٹ گیا تھا اور کسی مسوڑھے سے رِستا ہوا نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔ دلاور نے ریسیور کو اٹھا کے پھر کریڈل پہ اپنے سامنے رکھ دیا تھا اور اب میری طرف دیکھ کے یوں مسکرا رہا تھا کہ یہ مسکراہٹ کسی گالی سے زیادہ اشتعال انگیز لگتی تھی۔

”تم نے تیس منٹ میں سے پانچ منٹ ضائع کر دیے۔“ میں نے ناک کے خون کو آستین سے صاف کیا۔ ”اس وقت تم جب چاہو مجھے گولی مار سکتے ہو مگر خود کو اس تباہی سے نہیں بچا سکتے جو تمہارے اور تمہارے خاندان کا نصیب ہو جائے گی تمہارے غلط فیصلے کے باعث۔“

”صرف اپنی فکر کرو...!“ اس نے مجھے ایک گندی گالی دی۔

”اس جنگ میں عورتوں کو گھسیٹنے میں تم نے پہل کی تھی۔ رابعہ اور اس کی ماں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کی سزا یہ تھی کہ تم نے میرے ایک دوست کی بیوی کو اغوا کر لیا۔ وہ میرے محسن کی بیوی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہاری ایک بیوی جو تمہارے بچوں کی ماں ہے اور جو تمہاری عزت بھی ہے... کرنا چاہیے کہ گیارہ بجے...!“

”گیارہ بجے کچھ نہیں ہو گا۔“ وہ دیوانوں کی طرح چلایا... پہ حملہ آور ہوا۔ اس کی دیوانگی مجھے ایک ایسی ... مسرت دے رہی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آج وہ بہت کمزور پڑ گیا تھا۔ اس کا سارا اعتماد، اطمینان اور غرور اب اعترافِ شکست میں ڈھل رہا تھا۔ اداکاری سے خود کو ... کرنے کا، زبان سے خود کو ناقابلِ تسخیر ظاہر کرنے کا اور عیاری میں خود کو شیطان سے زیادہ فطین تسلیم کرانے کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس کا سیلف کنٹرول ختم ہو رہا تھا۔ مجھ پہ حملہ کرنا اس کی ذہنی ابتری کی دلیل تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اس کو خالی ہاتھوں سے لمبا لٹا سکتا ہوں۔ اسے شاید عام آدمی کی طرح ڈھنگ سے مکا مارنا بھی نہیں آتا تھا اور میں نے بیک ... لینے کی کوشش بھی نہیں کی تھی مگر جو ٹھوکر اس نے میری ... کسی سند یافتہ کراٹیکا سے کم نہ تھی۔

میں نے سر جھکایا اور نیچے سے اس کے پیٹ میں ... وہ اوپر اچھلا تو میں نے گھٹنا اٹھایا اور پھر دایاں ہاتھ گردن پر ... کے اسے الٹ دیا۔ یہی ہاتھ میں زیادہ قوت سے مارتا تو گردن کی ہڈی کسی دیا سلائی کی طرح ٹوٹ جاتی لیکن میں ... دیتا تو خود بھی مارا جاتا اور میرا مشن ادھورا رہ جاتا۔ بہت کچھ رہ جاتا جن میں میرے اور رابعہ کے خواب بھی شامل تھے۔ دلاور کے چیخنے پر تین طرف سے تین مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں مشین گن تھی۔ چوتھا جو سب سے پہلے اندر آیا تھا، پیڈرو تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا ہنٹر تھا۔ وہ بالکل فلمی ولن کی طرح پیر پھیلائے اور ہاتھ کمر پہ رکھے کھڑا تھا۔

”اس حرامزادے کے ہاتھ باندھ دو۔“ پیڈرو نے کہا۔ اندر آنے والے تین افراد میں سے دو نے مشین گن رکھ دی لیکن تیسرا کچھ دس فٹ کے فاصلے پر مشین گن کا رخ میرے سینے کی جانب کیے اور ایک انگلی ٹریگر پہ رکھ کے کھڑا رہا۔ وہ مجھے صورت سے ذہنی طور پر پسماندہ اور کچھ جنونی لگتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو کسی کے حکم یا اشارے کے بغیر بھی گولی چلا سکتا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر میرے جسم کو چھلنی کر سکتا تھا اور میرے بدن کے ہر سوراخ سے ابلنے والے لہو کے دھارے کو دیکھ کر خوشی سے قہقہے لگا سکتا تھا۔ دیوانے کو اپنے کسی فعل کے منطقی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے کیوں کر رہا ہے۔ سب اس کی ذہنی رو پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو سرِ بازار اپنے کپڑے پھاڑ کر اتار پھینکے یا کسی دور سے قریب سے گزرنے والے کے گریبان پہ ہاتھ ڈال دے۔ ایسے دیوانے کے ہاتھ میں مشین گن دیکھ کر میرا خوفزدہ ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا اور اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ طریقے پہ مسکرایا۔

دلاور فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے ہسٹریا کے دورے سے بے قابو ہو جانے والی عورت کو ہوش میں لانے کے لیے ایک تھپڑ کافی ہوتا ہے، ایسے ہی میرے ہاتھوں زیر زبر ہونے کے بعد دلاور کی عقل ٹھکانے آگئی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ میرے سامنے اپنی جذباتی کمزوری کا تماشا کر کے اس نے اپنا امیج خراب کر لیا ہے۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور پرانے دلاور کی شخصیت کا نقاب پھر اوڑھنے کی فکر میں تھا جو میرے ہاتھوں نے ذرا دیر کے لیے اتار دی تھی۔

وہ دونوں ایک رسی لے کر لوٹے جو مشین گن پیچھے رکھ گئے تھے۔ میں نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ پیچھے کر دیے۔

”میں تم کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا دلاور!“ میں نے بڑی تکلیف سے کہا۔ میری ناک سے رِسنے والا خون بند ہو گیا تھا مگر اندر جمنے والے خون کے باعث میرے لیے ناک سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں رسی لانے والے بڑے انہماک سے میرے ہاتھوں کے گرد رسی لپیٹنے میں مصروف تھے۔ ”ایک ثبوت ... سے کم نہیں۔ اس کے باوجود تم سمجھتے ہو کہ گیارہ بجے کچھ نہیں ... ذرا گھڑی کی طرف دیکھو۔“

دلاور نے گھڑی کی طرف نہیں دیکھا۔ پیڈرو نے بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن وہ شخص جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے، میری چال میں آگیا۔ وال کلاک اس کے پیچھے تھا۔ اس کی گردن بے اختیار گھوم گئی۔ میں نے دایاں پیر ایک دم پیچھے کی جانب اٹھایا۔ میرے ہاتھ باندھنے والوں میں سے ایک بلبلا کے دہرا ہوا۔ میں نے غوطہ مارا اور مشین گن والے کے پیروں میں جا پڑا۔ اس نے خطرے کا احساس ہوتے ہی ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ مشین گن کا ایک راؤنڈ ختم ہو گیا۔ میرے جوتے کی ایڑی کا شکار ہونے والا سیدھا ہوا ہی تھا کہ کئی گولیاں اس کے جسم سے گزر گئیں۔ دوسرا جو بدستور میرے ہاتھوں کے گرد رسی لپیٹ رہا تھا، میرے ساتھ کھنچا چلا آیا۔ میں تو فرش پہ اوندھا ہو گیا مگر وہ مزاحمت کے باعث سیدھا رہا اور مجھے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش میں مارا گیا۔ ان دونوں کے حلق سے ایک جیسی بھیانک چیخ نکلی۔ رسی سے آزاد ہوتے ہی میرے ہاتھوں نے مشین گن والے کی پنڈلیوں کو عین ٹخنے کے اوپر سے گرفت میں لے لیا جہاں ان کی موٹائی کم سے کم تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ اس پل کی طرح گرا جس کو سہارا دینے والے ستون ڈائنامائیٹ کے دھماکے سے غائب ہو جائیں۔ پیڈرو اور دلاور صورتِ حالات کی اس غیر متوقع تبدیلی کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ مشین گن کے فائر کی آواز سے وہ غیر شعوری طور پہ پیچھے ہٹے اور مجھ سے چند قدم دُور ہو گئے۔ مشین گن والا نیچے گرا تو اس کا سر سیمنٹ کے فرش پر لگا اور ضرب کی شدت نے اسے بے سُدھ کر دیا۔

میرا ہاتھ ایک دم اس مشین گن کی طرف بڑھا جس کے راؤنڈ نے دو افراد کو ایک سیکنڈ میں موت سے ہمکنار کر دیا تھا لیکن اس میں اب کوئی راؤنڈ نہیں تھا۔ اسے دوبارہ لوڈ کرنے کے لیے اضافی راؤنڈ کہاں سے آتے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اپنے پیچھے رکھی ہوئی دو میں سے ایک مشین گن اُٹھانے کا نہیں سوچا۔ اسی وقت میں نے پیڈرو کو جست لگا کے اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ میں نے خالی مشین گن کو ڈنڈے کی طرح گھمایا۔ اس کا بٹ پیڈرو کی پنڈلی پہ بالکل سامنے پڑا۔ ہڈی پر لگنے والی ضرب کی شدت دُہرے تصادم کے باعث دگنی ہو گئی۔ ایک طرف سے وہ آگے بڑھ رہا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی رفتار کیا ہو گی مگر دوسری طرف سے گن کا بٹ کم سے کم دس گنا رفتار سے آیا۔ نتیجے میں وہ چیخ مار کے منہ کے بل گرا اور میں خالی مشین گن پھینک کر ایک دم اٹھا۔

دلاور نے دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ مسلح افواج کے دو ارکان خاک و خون میں غلطاں پڑے تھے۔ تیسرے کو دن میں تارے نظر آگئے تھے یا اُسے زمین آسمان ابھی تک گھومتے محسوس ہو رہے تھے کہ وہ فرش پہ بیٹھا سر کو زور زور سے جھٹک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا تھا۔ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بھی زمین بوس ہو گیا تو چوہدری دلاور کو اپنی حفاظت کے لیے خود کچھ کرنے کا خیال آیا۔ مگر اس خیال کے آنے اور میرے مشین گن تک پہنچنے میں سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کا فرق رہ گیا جس کی وجہ سے مشین گن پر پہلے میں گرا۔ پھر دلاور میرے اوپر گرا اور میں نے ایک کروٹ لے کر اسے دور پھینک دیا۔ سیدھا کھڑا ہوتے ہی میں نے دوسری مشین گن پر ایک پاؤں رکھ دیا اور اپنے ہاتھ کی مشین گن کا رخ دلاور کی جانب کر دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ دلاور کے پیچھے کچھ تماشائی بھی ہیں جو فائرنگ، شور ہنگامے اور چیخ پکار پر کام چھوڑ کر دوڑے تھے۔ مشین گن کا رخ اپنی جانب دیکھ کر وہ پھر بھاگے۔

"رک جاؤ سب۔" میں نے چیخ کر کہا۔ وہ سب یوں رک گئے جیسے بجلی سے چلنے والے کھلونے لائٹ جاتے ہی ساکت رہ جائیں۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی مگر میری ذہنی و جسمانی صلاحیت آزمائش کے مرحلے سے گزر کر دو چند ہو گئی تھی۔ "دلاور... گیٹ بند کرا دو... نہ کوئی باہر جائے گا نہ اندر آئے گا اور نہ فون کرے گا۔ کم اِن، حکم دو ان اُلو کے پٹھوں کو ورنہ اس مشین گن کا راؤنڈ میں ان پر چلا دوں گا۔ دوسری مشین گن پھر بھی میرے پاس ہو گی۔"

"جاؤ!" دلاور نے زخمی شیر کی طرح دہاڑ کر کہا۔ "سنا نہیں تم نے کہ کیا کرنا ہے... اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"نہیں۔ یہ سب جو کمرے میں آ چکے ہیں یہیں رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم فون پر حکم دو گے۔ یہ سب یرغمالی ہیں۔ تمہاری یا کسی اور کی دلاوری کی قیمت یہ اپنی جان دے کر ادا کریں گے۔ کوئی سالا خود کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور حد سے زیادہ نمک خوار ثابت نہ کرے ورنہ ان سب کی موت کا ذمے دار وہی ہو گا۔ اندر کی خبر باہر نہیں جائے گی۔ اشارے کنایے یا کوڈ میں۔ کوئی پرچی لکھ کر یا کسی آنے والے فون کے جواب میں غلط بات کہی گئی تو میں ان سب کو بھون دوں گا۔ ان کی بیویاں یتیم اور بچے بیوہ... میرا مطلب ہے... خیر مطلب تم سب لوگ سمجھ گئے ہو۔"

دلاور آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس نے فون اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک مشین گن ہاتھ میں سنبھالے اور دوسری کو پیر سے گھسیٹتا میں میز تک پہنچا۔ دلاور نے دو ہی نمبر ڈائل کیے تھے کہ میں نے ایک ہاتھ مارا اور فون دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

"میں نے فون استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "انٹرکام استعمال کرو... باہر کی دنیا سے تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔"

چوہدری دلاور کی صورت بگڑ گئی۔ اس کی یہ چال بھی ناکام رہی تھی۔ وہ میرے سامنے فون کرتا اور وہی دہراتا جو میں نے کہا تھا مگر سننے والا شاید ایس پی سراج ہوتا۔ نواب خسرو جمشید ہوتا یا اس کا کوئی مددگار ہوتا جو فوراً سمجھ جاتا کہ معاملہ گڑبڑ ہے ... نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کیا نمبر ڈائل کر رہا ہے اور یہ نمبر باہر یا اندر کا۔

"چوکیدار سے کہو باہر تالا ڈال دے۔" میں نے کہا ... آئے اسے یہی کہے کہ فیکٹری بند کر دی گئی ہے۔ سب لوگ ... کے جنازے میں گئے ہیں... ٹیلی فون ایکسچینج کے آپریٹر ... یہاں آ جائے۔" دلاور نے انٹرکام کا بٹن دبائے رکھا اور ... زبان سے نکلنے والا ہر لفظ ایک حکم بن کے جاری ہوتا گیا۔

"گھڑی کی طرف دیکھو چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اگر تم ... سے جاتے تو میں کیسے ثابت کرتا کہ گیارہ بجے مری ... نے کہا تھا۔ اب دس بجکر چالیس منٹ ہوئے ہیں۔ ٹھیک پونے گیارہ بجے تم کو فرشتۂ اجل کے نمائندۂ خصوصی کی ٹیلی فون ... آئے گی جو میں ریسیو کروں گا... لیکن سنو گے تم بھی... تم"

کمرے میں موجود سات افراد نے حیرانی سے ایک ... کی طرف دیکھا۔ فرشتۂ اجل کے روپ میں تو خود میں ان کے سامنے موجود تھا، پھر یہ نمائندۂ خصوصی کون ہو گا جو ٹیلی فون ... گا؟ ایسا کبھی دیکھا نہ سنا کہ حضرت عزرائیل نے کسی کی جان ... کرنے سے پہلے اسے فون پر مطلع کیا ہو کہ حضرت میں حاضر ...

"ایک قدم پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ لگ جاؤ۔" ... کہا۔ "اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" ان سب نے بڑی فرمانبرداری سے تعمیل کی۔ سوائے پیڈرو کے جو وہیں بیٹھا رہا اور کراہتا ...

کال ٹھیک پونے گیارہ بجے آئی۔ میں نے بٹن دبا ... فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ "ہاں بھئی کس سے بات کرو گے ... نے اپنی زبان میں کہا۔

"یہاں دلاور کون ہے؟" غالب کی آواز آئی۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "سب بزدل ہیں ... کی طرح دبکے کھڑے ہیں۔ ان میں اپنے چوہدری صاحب ... ہیں جو مشین گن کے سامنے بید مجنوں کی طرح کانپ رہے ہیں۔"

غالب یقیناً سمجھ گیا ہو گا کہ دال میں کچھ کالا ہے ... کالا تھا مگر اب پھر سفید ہے ورنہ دلاور مشین گن کی زد میں ... آ گیا؟

"اپنے چوہدری صاحب! آپ بم ڈسپوزل اسکواڈ ... ایک ٹیلی فون اور کریں۔" غالب بولا۔ "ان سے کہیں کہ ... سراج کے گھر میں کسی نے ٹائم بم رکھ دیا ہے جو ٹھیک گیارہ ... پھٹ جائے گا..."

"سراج... سراج کے گھر میں..." دلاور ہکلایا۔

"یہ تو واقعی مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اس کی ... کانپ رہی ہے۔" غالب نے قہقہہ مارا۔ "اس سے کہو کہ اپنا ...

یہ مرزا پھویار کھ لے یا حاجی لق لق..."

"وہ... اس گھر میں... اس کی بوڑھی ماں بھی رہتی ہے۔ تم اس کو بھی نہیں بخشو گے۔" دلاور نے اس بے عزتی پر خون کے گھونٹ پی کر کہا۔

"جب بم ہیروشیما پر گرا تھا تو اس نے کسی کی ماں بہن کا خیال نہیں کیا تھا۔ بم رشتوں کو نہیں پہچانتا۔ شریف اور بدمعاش میں فرق نہیں دیکھتا۔ امن کے حامی بھی جنگ میں کام آتے ہیں۔ چوہدری دلاور... رابعہ کی ماں کا... یا سکندر کے باپ کا کس نے لحاظ کیا تھا؟ اور بھی بہت سے نام یاد ہوں گے تم کو جو اتنے ہی بے گناہ تھے جتنی ایس پی سراج کی ماں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اس بار تو شاید بم ڈسپوزل اسکواڈ والے تمہاری بات سنیں گے ہی نہیں۔ تم کتنی بار کہاں کہاں دوڑاؤ گے ان کو اور ہر جگہ وہ دس منٹ میں پہنچ بھی نہیں سکتے۔ ایک بم کا سراغ لگانے کے لیے بھی تو وقت چاہیے۔"

"میں... میں اس کے... سراج کے گھر فون کر دوں؟"

"تمہارا باپ ہے وہ سُور کا بچہ...؟" میں نے گرج کر کہا۔ "اور جب ایک بار میں نے کہہ دیا ہے کہ نہ کوئی فون کال جائے گی اور نہ آئے گی... آئے گی تو میں ریسیو کروں گا۔"

"ایک فون کال کی اجازت دے دینا ان کو یار۔" غالب نے کہا۔ "یہ ایس پی سراج کی کوٹھی سے متصل دوسری کوٹھی کا فون نمبر ہے۔ گیارہ بجکر پانچ منٹ پر... یعنی اب سے دس منٹ بعد... ان کو دوسری خوش خبری ملے گی... نمبر لکھو..."

میں نے دلاور کو اشارہ کیا۔ اس نے مجبوراً نمبر لکھا۔ پھر لائن کٹ گئی۔ دلاور کی حالت کا تغیر اب قابلِ دید تھا۔

"سنو! میں بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔" وہ لبوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "علیحدگی میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں۔ تم نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے سچ مچ دلاور بننے کی کوشش کی اور اپنا ایک ساتھی گنوا دیا۔ اس کی ماں کے خونِ ناحق کے ذمے دار بھی تم ہو... تم نے پھر فیصلے میں دیر کی۔ ثبوت دیا کہ تم کتنے احمق ہو کہ دشمن کو کمزور سمجھتے ہو۔ میں نے تم کو آتے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ صرف تم اپنے دفاع سے غافل تھے۔"

"میں تم کو... بتا دوں گا... کہ وہ کہاں ہیں۔" وہ بولا۔

"بتا دینا۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "گیارہ بجکر پانچ منٹ کے بعد تمہیں آدھے گھنٹے کی مہلت ملے گی۔ بلکہ پچیس منٹ کی۔ اگر تم نے ساڑھے گیارہ بجے تک ان کا صحیح پتا ٹھکانا بتا دیا اور ہمارے پاس اتنا وقت ہوا کہ ہم ان کو بحفاظت نکال سکیں تو ہم تمہیں بھی بتا دیں گے کہ بم کہاں ہے... اگر تمہیں وقت ملا تو تم بھی وہی کر سکو گے جو ہم کریں گے۔ تم اپنے یار ایس پی اور اس کی ماں کے لیے تو کچھ نہیں کر سکے۔ مگر اس کے بعد جس کی باری ہے، شاید اسے بچا سکو۔ یہ سب تمہارے تعاون پر منحصر ہے۔ یاد رکھو ہم اس وقت تک کچھ نہیں بتائیں گے جب تک ہمیں یقین نہیں آ جائے گا کہ اب وہ بھی محفوظ ہیں اور ہم بھی۔ تیسرا نشانہ کون ہے، یہ میں ابھی نہیں بتا رہا ہوں مگر یہ چوتھا نشانہ تمہارا اپنا گھر ہو گا۔ تمہارے اپنے بیوی بچے تمہاری وجہ سے مریں گے۔"

دلاور اب میری ہر بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی مضبوط شخصیت سومنات کے بت کی طرح بکھر چکی تھی اور وہ پٹے ہوئے مہرے کی طرح انہی کی نظروں کے سامنے ذلت و رسوائی برداشت کر رہا تھا جو اس کے نام کی دہشت سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ یہ شکست وقتی تھی مگر مکمل تھی۔ وقتی اس لیے کہ تمام وطن فروشوں کا اور ان کے اڈوں کا پتا چلنے تک دلاور کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

"چلو دلاور! اپنے یار سراج کی خیریت معلوم کر لو۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں گیارہ بجکر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

"نمبر تم ملا دو..." دلاور نے ٹوٹے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"انٹرکام پر کسی سے کہو کہ ایک فون نکال کر یہاں لے آئے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے پی اے کی لائن بھی یہی ہے۔ اسے کہو اپنا فون پلگ سے نکال کر یہاں لگا دے۔"

وہ شخص جو کافی لے کر آیا تھا اور جسے حکم دیا گیا تھا کہ مرحوم پی اے کی جگہ جا بیٹھے اس وقت دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جاؤ لیکن اپنی زندگی کو وفاداری کے غیر معمولی مظاہرے سے خطرے میں مت ڈالنا۔" میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب تمہیں تو پی اے بنا دیں گے مگر یہ جو باقی چھ بے گناہ کھڑے ہیں ان کی جان لے کر ایک عہدہ حاصل کرنا تم کو بہت مہنگا پڑے گا۔"

"یہ سب میرے ساتھی ہیں سر۔" وہ مسکینی سے بولا۔

"اس کے علاوہ... وہ شاخ ہی نہ رہے جس پہ آشیانہ تھا۔" میں نے کہا۔ "تو فکرِ آشیاں بندی سے کیا حاصل۔ ان کے ساتھ چوہدری صاحب بھی گئے تو تم کس کے پی اے بنو گے۔"

غالباً یہ دوسرا نکتہ اسے قائل کرنے میں زیادہ اہم کردار ادا کر گیا اور وہ چند منٹ میں فون کو پلگ سے نکال لایا۔ ٹیلیفون کی لائن بجلی کے تاروں کی طرح فٹ کی گئی تھی۔ جیسا کہ عموماً دفاتر اور بڑے اداروں میں ہوتا ہے۔ اور ایک بورڈ میں ٹیلی فون لائن کے تین کنکشن تھے۔ اس نے صحیح ساکٹ میں پلگ لگایا اور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بے حد سعادت مندی سے پھر اسی صف میں جا کھڑا ہوا جہاں دوسرے چھ افراد زندگی سے بیزار کھڑے تھے۔ وہ تماشا دیکھنے آئے تھے اور خود تماشا بن گئے تھے۔

دلاور نے جس بے دلی کے ساتھ نمبر ڈائل کیا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ یقین تو اُسے پہلے ہی آ چکا ہے اور اب دوسری بڑی خبر کی تصدیق سے احساس کے عذاب میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس دوسرے فون کے ساتھ ایمپلی فائڈ اسپیکر نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ٹیلی فون کو بلاوجہ چھاپنے مارا تھا۔ میں دلاور کو چھاپنے مار کے فون استعمال کرنے سے روک سکتا تھا۔ اس ٹیلی فون کے ٹوٹ جانے کا نقصان یہ ہوا کہ میں دلاور کی گفتگو یکطرفہ ہی سن سکا۔

"کون۔ دیکھیں جی میں دلاور بول رہا ہوں۔" چوہدری دلاور نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کے ساتھ والی کوٹھی میں ایک ایس پی صاحب رہتے ہیں۔ جی؟ ہاں جی... جی... پوری کوٹھی تباہ ہو گئی... کوئی زندہ بچا؟ آپ کو معلوم ہے ایس پی صاحب کی والدہ اندر تھیں۔ اور خود ایس پی صاحب... نہیں معلوم..." اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"اب بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کے یہاں چلا آیا تھا تو تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب میں اکیلا نہیں ہوں دلاور... اور کمزور بھی نہیں ہوں۔ میں اسی وزیر خان کا بیٹا ہوں جس کو تم نے بے بسی اور ذلت کی موت مار دیا اور اپنے شکاری کتے پیچھے لگا کے مجھے انگلستان سے یہاں بلوا لیا۔ آج میں ایک طاقت ہوں دلاور... میرا نام انصاف کی طاقت ہے۔ تم اپنی دولت اور بدمعاشی کی طاقت کے غرور میں انصاف کی بات کرنے والوں کو کیا سمجھتے تھے؟ خیالی دنیا میں رہنے والے احمق... مگر یہی احمق آج تم سے تسلیم کرا چکے ہیں کہ انصاف ایک سچائی ہے جسے ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کی دھوپ کو کالا کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ انصاف آج بھی ملتا ہے اور اگر ملتا نہیں تو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کا تصور کرو جب تمہاری جگہ میں اسی طرح خوف اور دہشت میں مبتلا... ڈرا ہوا اور سہما ہوا کھڑا تھا۔ تمہاری طاقت اور دبدبے کے ڈرامے سے مرعوب اور خود کو تمہارے رحم و کرم پر سمجھنے والا آج صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ انگریزی محاورے کے مطابق میزیں اُلٹ گئی ہیں۔ اب تم میرے جوتوں میں کھڑے ہو۔ یہ بھی انگریزی محاورہ ہے۔ اس کا اندازہ تم کو ہو چکا تھا اسی لیے تم مجھے انصاف کی خیرات دینا چاہتے تھے مگر قانونی حق دینے کی بات کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات تم نے بہت دیر سے کی۔ اپنے فیصلوں کی طرح۔ اب مجھے تم سے کچھ مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔"

ایک تو طرئیں نے ان سب کو دیکھا جو کفر...
نہیں تھکے تھے لیکن ہاتھ اوپر رکھنا ان کے لیے مشکل ثابت... سب سے زیادہ ابتر حالت پیڈرو کی تھی۔ پنڈلی کے ٹوٹ... سے وہ شدید تکلیف میں تھا اور کھڑا تک نہیں ہو سکتا تھا... ساری باتیں اس نے بھی سُنی تھیں اور دلاور کی طرح وہ بھی... ہی اندر اپنی بے بسی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنی عقل... رہا تھا کہ اس نے تین افراد کی طاقت پر جو مشین گنوں سے... بہت زیادہ بھروسا کر لیا۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا۔ ایک... تین مشین گنوں کے سامنے کتنا بے بس ہوتا ہے اس کا ان کو... اندازہ تھا۔ وہ کس طرح فرض کر لیتے کہ تقدیریں دھوکا دے... ورنہ وہ اپنی جیب میں ایک ایک ریوالور تو ضرور لاتے۔

"استاد پیڈرو!" میں نے تفریحِ طبع کے لیے تھوڑا سا... ضروری سمجھا۔ "بہت بے ادب ہو گئے ہو تم۔ تمہارے آقا... نعمت، تمہارے اُن داتا اور باس کھڑے ہیں۔ اور تم بیٹھے... کھڑے ہو جاؤ۔"

"میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" وہ بولا۔ معذ... کو سمجھتے ہوئے یا دلاور کے اشارے پر اس نے کتے کی طرح... اور غرانا بند کر رکھا تھا اور شرافت سے بات کر رہا تھا۔ اس... لہجہ بھی مجھے اجنبی لگا۔

"کون سی ٹانگ؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ٹانگ۔" اس نے خون کے گھونٹ پی کر بائیں... کی طرف اشارہ کیا۔

"غلطی تمہاری تھی... تمہیں کیا ضرورت تھی ٹانگ اڑا... کی۔" میں نے محاورے کا عملی استعمال کیا۔ "خیر کوئی بات نہیں... اور احترام کرنے والے تو ایک ٹانگ پر کھڑے رہتے ہیں... کھڑے ہو جاؤ۔"

پیڈرو مجھے یوں دیکھتا رہا کہ اس کی آنکھوں کے پیچھے... ہوئی خون کی پیاس کو میں نے محسوس کیا۔ جیسے راکھ میں دبی ہوئی... چنگاری کی حرارت محسوس کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ اسی طرح بیٹھا...

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں... پھر تمہیں پنکھے سے اسی طرح لٹکا دوں جیسے قصائی ذبح کیے ہوئے... بکرے کی کھال اتارنے کے لیے اس کی ٹانگیں توڑ کر کام کرتے... میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا تو ہوگا یہ منظر... یہ رسی دیکھو جو تم نے... منگوائی تھی... میرے ہاتھوں کے لیے... اب میرے ہاتھوں... کمال دیکھنا۔ دس منٹ اُلٹے لٹکو گے تو تمہارے حلق سے آواز... بھی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح نکلیں گی۔"

دیوار کے ساتھ ساتھ قطار میں کھڑے ہوئے سات افر... میں سے ایک بے اختیار ہنس پڑا۔ اب انھیں اپنی طرف...

بے قدری ہو گئی تھی۔ میں نے ان کو کئی بار بے گناہ کہا تھا، چنانچہ اب نہیں یہ ڈر نہیں رہا تھا کہ میں ان کو بھی انتقام کی خاطر مار سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ بیٹھنے والا وہی تھا جس کی مشین گن سے اس کے دو ساتھی ہلاک ہوئے تھے اور جس سے میں نے پہلی مشین گن چھینی تھی۔ وہ واقعی ذہنی طور پر پسماندہ تھا۔ اُسے پاگل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آدمی جب انتہائی احمق ہونے کی حد سے بھی آگے نکل جائے اور جسمانی عمر کے مقابلے میں اس کے دماغ کی عمر پیچھے رہ جائے تو یہی ہوتا ہے۔ پیڈرو نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم سب لوگ بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مگر ایک شرط ہے جب میں اشارہ کروں تو تم لوگ تالیاں بجاؤ گے۔"

وہ سب بیٹھ گئے اور میں آگے بڑھا۔

"تالیاں۔" میں نے پیڈرو کے قریب پہنچ کر مشین گن اٹھائی۔ بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مجبوراً تالیاں بجانے لگے۔ دلاور اب بھی میری زد میں تھا۔

"جب میں مشین گن سے استاد پیڈرو کی ٹانگ پر ضرب لگاؤں گا تو پھر تالیاں۔" میں نے کہا۔ "پیڈرو چلائے تو پھر تالیاں..."

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی ایک ٹانگ زمین پر تھی اور دوسری ہوا میں معلق تھی۔

"تالیاں۔" میں نے کہا۔ "استاد پیڈرو اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے... بلکہ پیر پر کھڑے ہو گئے۔"

دلاور اور پیڈرو کے ماتحت اور ملازم۔ ان کے اشاروں کے غلام اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے پھر تالیاں بجانے لگے۔ چشمِ فلک نے یہ تماشا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"ویری گڈ۔ ذرا ایک قدم آگے آ جاؤ استاد۔" میں نے کہا۔ "سہارا ہمیشہ انسانوں کا لینا چاہیے۔ دیواروں کا نہیں... شاباش... بچپن میں تم نے بھی ایک ٹانگ پر وہ کھیل تو کھیلا ہوگا... لنگڑی پالا۔"

استاد پیڈرو ایک ٹانگ پر اُچھل کر آگے آیا تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ گرا تو اس کی وہ ٹانگ اس کے جسم کے وزن کے نیچے آ گئی۔ وہ بُری طرح بلبلایا۔

"عورتوں کی طرح ڈھکوسلے مت کرو۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کھڑے ہو جاؤ فوراً۔"

"میں کھڑا نہیں ہو سکتا سُور کے بچے... کتے..." پیڈرو کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "مار دے گولی مجھے... تیری..." اس نے مجھے مزید غلیظ ترین گالیاں دیں۔ عام حالات میں ایسی گالیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ میں یہی سمجھتا کہ گندے منہ سے گندگی نکل رہی ہے تو قصور منہ کا نہیں۔ اُس منہ سے پھول کیسے جھڑ سکتے ہیں۔

گٹر میں پھول کیسے مہک سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں نے آگے بڑھ کے پیڈرو کے منہ پر کک ماری۔ وہ لڑھک گیا۔ میں نے اس کو ٹھوکریں مار مار کے بے حال کر دیا۔ کئی ٹھوکریں اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لگیں اور اس کی چیخوں نے تماشا دیکھنے والوں کا رنگ فق کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیڈرو کی حالتِ زار دیکھتے رہے بالآخر پیڈرو کی آواز بند ہو گئی اور وہ بے حس ہو گیا۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ اب اُسے ٹھوکریں مارنا کسی پتھر کو ٹھوکر مارنے کی طرح بے مقصد تھا۔

"تالیاں ایک بار پھر..." میں نے کہا اور یہ محسوس کیا کہ پیڈرو کو مارتے وقت میں دشمنی اور انتقام کے بے رحم جذبات سے کس حد تک مغلوب ہو چکا تھا۔ شاید میرے لاشعور میں دبا ہوا ایک خیال میرے شعور پر غالب آ گیا تھا کہ یہی میرے باپ کا قاتل ہے۔ بہت بے دلی سے چند افراد نے تالیاں بجا کے ظاہر کیا کہ وہ حکم عدولی نہیں کر رہے ہیں۔

"چوہدری دلاور..." میں نے کہا۔ "سوا گیارہ بجے ہیں... کیا تم ان دونوں کو ساڑھے گیارہ بجے تک یہاں بلوا سکتے ہو؟"

"یہاں؟" دلاور چونکا۔ "میں تم کو وہاں پہنچا دوں..."

"جو میں کہوں گا، وہ ہوگا..." میں نے کہا۔ "تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔"

"لیکن صرف پندرہ منٹ میں۔" وہ بولا۔ "کم سے کم آدھا گھنٹہ تو دو۔" پیڈرو ایک بار کراہا۔ وہ ہوش میں آنے لگا تھا۔

"میں تم کو پون گھنٹا دے سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کے بعد یہ ممکن نہیں رہے گا کہ تم تیسرے بم کو نہ پھٹنے دو۔"

"تیسرا بم... وہ کہاں ہے...؟" دلاور کے حلق میں آواز پھنس گئی۔

"یہ تمہیں ٹیلی فون پر بتایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "جب رابعہ اور شہلا یہاں آ جائیں گی اور ہم سب بحفاظت نکل جائیں گے تو تمہیں یہ بتا دیا جائے گا کہ تیسرا بم کہاں ہے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن اس کے لیے مجھے ایک فون کرنا ہوگا۔" دلاور بولا۔

"کرو لیکن ذرا سوچ سمجھ کے... چوتھا بم تمہارے گھر کے اندر ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور نے ایک نمبر ڈائل کیا جو میں نے ذہن میں نوٹ کر لیا۔

"جمشید! ان دونوں کو یہاں بھجوا دو۔" دلاور نے مختصراً کہا۔ "کم سے کم وقت میں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ دلاور کسی کا نام لیے بغیر بھی یہ حکم دے سکتا تھا مگر وہ حواس باختہ تھا۔ اس نے خود ہی مجھے نواب خسرو جمشید کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا مگر اسے احساس نہ ہوا۔ اس نمبر سے خسرو جمشید کا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ اسی وقت پیڈرو کراہتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تمھارے کہنے کے مطابق رابعہ اور شہلا کو یہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ ہی صرف ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اس وقت کو ضائع کرنا ٹھیک نہیں چوہدری جی... اپنے استاد پیڈرو کو ایک کاغذ قلم فراہم کیجیے۔"

دلاور نے میز پر سے پیڈ اور بال پوائنٹ پین اٹھایا اور آہستہ آہستہ پیڈرو کی طرف بڑھا۔ پیڈرو کے قریب جا کر وہ تھوڑا سا جھکا اور اس ایک لمحے میں جب دلاور میرے اور پیڈرو کے درمیان حائل تھا، پیڈرو کا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جیب سے ریوالور نکال کے مجھ پر فائر جھونک دیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ میرا تو خیال یہ تھا کہ دلاور اور پیڈرو اپنے ساتھ کوئی ریوالور نہیں لائے تھے۔ دلاور تو ریوالور اپنی دراز میں رکھتا تھا مگر پیڈرو کا ریوالور عادت کے مطابق اس کے پاس تھا۔

میرا خیال ہے کہ پیڈرو نے گھبراہٹ اور عجلت میں نشانہ لیا تھا۔ اسی لیے گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دلاور ایک دم گر گیا۔ اس نے مجھے پیڈرو کے مقابل نہیں کیا تھا۔ پیڈرو کو میرے سامنے چھوڑ دیا تھا اور اپنی جان بچائی تھی۔ یہ اس نے اچھا ہی کیا کیونکہ جواب میں ایک لمحے کا توقف کیے بغیر میں نے مشین گن کا برسٹ مارا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گولی پیڈرو کو نہ لگے۔ کوئی گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر دُور جا گرا۔ پیڈرو تکلیف سے چلایا۔ اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔ دلاور نے اور کمرے میں موجود دوسرے لوگوں نے خوف و دہشت سے گولیوں کے ان نشانات کو دیکھا جو پیڈرو کے پیچھے والی دیوار پر نمودار ہو گئے تھے۔ یہ سوراخ اس کے جسم میں بھی ہو سکتے تھے مگر وہ بال بال بچ گیا تھا۔

"اب قلم اٹھاؤ اور لکھو۔" میں نے تیسری مشین گن اٹھا کے کہا۔

"کیا لکھوں؟ اور کیسے لکھوں۔" پیڈرو نے اپنا خون آلود ہاتھ اٹھایا اور میں نے دیکھا کہ گولی سے اس کی درمیان والی انگلی اُڑ گئی تھی۔ زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔

"یہ لو..." میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کے دلاور کی طرف پھینک دیا۔ "اس کو پٹی باندھ دو۔ اس کے بعد تم منشی کے فرائض سنبھال لو... یعنی جو کچھ پیڈرو بتائے وہ لکھتے جاؤ۔ تم نے کہا تھا کہ میرے والد کا اصل قاتل پیڈرو ہے اور پیڈرو ہی بتا سکتا ہے کہ وزیر خان کا مدفن اب کہاں ہے؟"

پیڈرو نے چونک کر سر اٹھایا۔ "یہ تم نے کہا تھا؟" اس نے ہر میں بجھے ہوئے لہجے اور خونخوار نظروں کے ساتھ دلاور سے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف۔" دلاور نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ دلاور کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "... عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود ابھی تک تم اسے سمجھے نہیں ... نے مجھ سے ایک سودا کرنا چاہا اور سودے میں تم بھی شامل ... تمھیں میرے حوالے کیا جا رہا تھا کہ میں تم سے وزیر خان اور ... کے قتل کا انتقام لے لوں اور تم سے یہ بھی معلوم کروں کہ وزیر ... کو اس کی قبر سے نکال کر تم نے کہاں دفن کیا تھا۔"

پیڈرو نے دوسرے ہاتھ سے دلاور کو دھکا دیا ... "... سچ ہے؟ تم مجھے قربانی کے بکرے کی طرح بیچ رہے تھے..." ... نے ایک گالی دی۔

"ڈراما مت کرو تم دونوں۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں ... دونوں مل کر کیا ناٹک کرتے رہے ہو۔ جو کچھ دلاور نے کہا ... تمھیں معلوم تھا۔ تم دونوں نے ہی مل کر اس ون ایکٹ ... مکالمے تیار کیے ہوں گے اور منظر نامہ لکھا ہو گا۔ اب جو میں ... ہوں وہ لکھو۔ سب سے پہلے یہ لکھو کہ تم نے وزیر خان اور شرافت ... کو کیسے قتل کیا تھا۔"

"وزیر خان کو میں نے قتل نہیں کیا تھا۔" پیڈرو چلایا ...

"گویا میر شرافت علی کو تم نے قتل کیا تھا؟" میں نے کہا۔ "... مجھے بتاؤ کہ یہ قتل تم نے کیسے کیا تھا؟... دلاور لکھتا جائے گا ..."

"اس سے کیا فائدہ ہو گا تمھیں؟" پیڈرو بولا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "عدالت میں اس کی کوئی قانونی ... نہیں ہو گی اور ویسے بھی عدالت میں میرا حاضر ہونا ناممکن ... ہے۔ اس کے بعد یہ لکھو کہ وزیر خان کو تم نے کہاں دفن کیا ... غلط بیانی کے ذمے دار..."

پیڈرو نے اس ہاتھ کو دیکھا جس پر دلاور نے بڑی صفائی ... و مہارت سے پٹی لپیٹی تھی مگر اس کے باوجود خون رِس رہا ... اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے ... ہوئی ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔

"تم مجھے گولی مار سکتے ہو مگر مجھ سے یہ تحریر نہیں لکھوا سکتے ..." وہ بولا۔

"میں تم سے سب کچھ کرا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس کا ... تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور تم کرو گے ایک دن۔ ابھی وقت ... کم ہے اس لیے میں اصرار نہیں کر رہا۔ تم کو جانا تو میرے ساتھ ہی ... ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو کمرے میں موجود ہر شخص تقریباً اچھل ... پڑا۔ میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹا اور میں نے ریسیور اٹھا لیا ...

"ہیلو..." میں نے کہا۔

"سکندر..." محسن کی آواز آئی۔ "کچھ بات بنی؟"

"تم تیار رہو۔" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ یہ سب ... شدہ کوڈ تھے۔ میری بات کا مطلب یہ تھا کہ وہ فوراً روانہ ... ہو جائیں اور ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے باہر کسی گاڑی میں میرا انتظار کریں۔ گاڑی ان کے پاس نہیں تھی۔ ان کو حاصل کرنا تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی صورت میں پونے بارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ اب حشمت خان کے گھر کو بھی دھماکے سے اُڑنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ہم نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ غالب اور محسن کس وقت فون کریں گے اور کامیابی یا ناکامی کی صورت میں ان کا لائحہ عمل کیا ہو گا۔ نیڈی اس وقت مونگ پھلی اور اخبار بیچنے کی ڈیوٹی پر تھا اور مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ نازو خیریت سے ہے۔ اس کا راز فاش نہیں ہوا اور وہاں سب کچھ پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ یہ بات دلاور نہیں جانتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ دھماکے سے قبل سراج کی ماں کو خود غالب اور محسن نے اس گھر سے نکال لیا ہو گا۔ خواہ انھیں بڑی بی کو زبردستی اُٹھا کے لے جانا پڑا ہو۔ ہم اپنی جنگ میں عورتوں بچوں کو نشانہ بنانا اخلاقی بزدلی سمجھتے تھے اور اگر وقت آ جاتا تو دلاور کے بیوی بچوں کو بھی خود دلاور کی زبانی گھر میں بم کی موجودگی کی اطلاع مل جاتی۔ حشمت خان کے بیوی بچوں کو بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انھیں دس منٹ پہلے بھی گھر سے نکالا جا سکتا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر بجی۔ یہ فون غیر متوقع تھا۔ فیکٹری کے اندر پانچ لائنوں کا ایکسچینج تھا جو بند کر دیا گیا تھا مگر دلاور کے پاس ایک ڈائریکٹ لائن تھی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر ریسیور اُٹھا کے کہا۔ "ہیلو!"

"بھئی آج یہ کیا ہو رہا ہے؟" میرے کانوں نے ایک جانی پہچانی آواز بہت عرصے کے بعد سُنی۔ "یہ نامعقول چوکیدار ہمیں روکتا ہے کہتا ہے فیکٹری میں چھٹی ہے۔ اور اس کی خود سری دیکھو۔ ہماری نہیں مانتا کہ ابھی ہمیں چوہدری صاحب نے خود فون کر کے بلایا تھا۔"

"نواب خسرو جمشید۔" میں نے کہا اور ریسیور دلاور کو تھما دیا۔

"ہاں۔ کیا بات ہے جمشید؟" دلاور نے کہا۔ "ہاں ہاں... میں سمجھ گیا مگر تم نہیں سمجھے۔ تم ذرا فون چوکیدار کو دو... ہیلو دت..." پھر چند سیکنڈ کا وقفہ آیا جس کے بعد دلاور نے چوکیدار کو حکم دیا کہ وہ نواب خسرو جمشید کو اندر آنے دے۔ دونوں خواتین کے ساتھ۔ ان آخری الفاظ کا مجھ پر الیکٹرک شاک کی طرح اثر ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میری نظر دروازے پر جم گئی۔

دو منٹ بعد ایک گاڑی اندر آئی۔ اس کے چاروں دروازے بیک وقت کھلے اور بند ہوئے پھر میں نے رابعہ اور شہلا کو دیکھا۔ وہ سب سے آگے کمرے میں آئی تھیں۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر ان کے قدم رُکے مگر سب سے زیادہ خسرو جمشید کو صدمہ پہنچا۔ وہ اپنی پرانی وضع میں تھا۔ سیاہ شیروانی۔ اونچے کلف لگے شملے والی دستار اور گھیر والی سفید شلوار۔ اس کی مونچھیں بھی پہلے کی طرح گھنی اور لمبی تھیں اور صحت مند کلین شیو، چہرے کا رنگ بھی سرخ و سفید تھا۔ اس کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ رابعہ اور شہلا کی صورت سے پریشانی عیاں تھی جو ایک قدرتی بات تھی اور وہ کچھ تھکی ہوئی بھی لگتی تھیں مگر اس کے علاوہ مجھے ان کی ظاہری حالت میں کوئی بات تشویشناک نہیں لگی۔

"تم دونوں اِدھر آ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور آپ نواب صاحب قبلہ... اِدھر تشریف لے آئیے۔ اس صف میں بیٹھ جائیے۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار۔"

نواب خسرو جمشید کے ذہن نے بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان کا سپرمین باس دلاور اور استاد کہلانے والا پیڈرو مشین گن کے سامنے بے بس ہیں تو وہ کیا کر سکتے ہیں جو محض نواب ہیں۔ وہ وہیں بیٹھ گیا جہاں دیوار کے ساتھ پہلا آدمی ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم اصلی ہو یا نقلی؟" میں نے کہا۔

"ہم اصلی بھی ہیں اور نقلی بھی۔" خسرو جمشید بولا۔ "جس کی شناخت ہو وہ پہچان لے۔"

میں نے رابعہ اور شہلا کی طرف دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

انھوں نے ایک ساتھ اقرار میں سر ہلایا۔

"تمھارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی کسی نے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ بس ہمیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔" رابعہ نے کہا... وہ یقیناً مجھ سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہو گی مگر یہاں اس کا موقع نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔ "اب تم سب انسپکٹر حشمت خان کو فون کر دو۔ بم اس کے گھر کے ایک کمرے کی چھت میں معلق ہے۔ اسے نکالنے اور ناکارہ بنانے کا وقت نہیں ہے، اس لیے گھر والے فوراً باہر نکل جائیں۔"

"حشمت خان!" چوہدری دلاور کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "وہ تو خود بھی گھر پر ہو گا۔" وہ فون کی طرف لپکا۔

"گویا تم کو اس کی ڈیوٹی کا شیڈول بھی معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور نے بڑی گھبراہٹ میں نمبر ملایا۔ "حشمت! میں دلاور بول رہا ہوں۔ سنو اسی وقت گھر سے نکل جاؤ... پاگل کے بچے تمھارے گھر میں ایک ٹائم بم رکھا ہوا ہے جو سات منٹ بعد پھٹ جائے گا... تمھارے باپ سکندر بخت نے رکھا ہے۔ سراج کے گھر میں پھٹ چکا ہے اور اس سے پہلے گلوب سینما والی کوٹھی میں۔ ہاں ہاں میں تصدیق کر چکا ہوں... دیر کرو گے تو مارے جاؤ گے..."

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت تک نواب خسرو جمشید کی صورت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر بارہ بج چکے تھے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے دلاور سے کہا۔ "تمہارے بیوی بچّوں کی سلامتی کا دار و مدار تمہارے رویے پر ہے۔ اگر ہمارا راستہ نہ روکا گیا اور کسی نے ہمارا پیچھا نہ کیا تو ہم دس منٹ بعد تم کو بتا دیں گے کہ ہم کہاں ہے۔ تم کو بہت وقت ملے گا ہم کو ناکارہ بنانے کے لیے لیکن ہمیں شک ہوا کہ تم نے کوئی چکّر چلایا ہے تو ہم فون نہیں کریں گے۔ ایک گھنٹے بعد تم دنیا میں اکیلے رہ جاؤ گے۔۔۔ ہم نواب خسرو جمشید کی گاڑی میں جائیں گے۔۔ رابعہ تم استاد پیڈرو کا ریوالور اٹھا لو۔" میں نے ایک کرتے کی طرف اشارہ کیا "اور شہلا کے ساتھ جا کے گاڑی میں بیٹھو۔ تم ڈرائیور کے پیچھے رہو گی اس کے سر کا نشانہ لے کر بیٹھو گی۔ شہلا درمیان میں ہوگی۔۔ پھر میں اور آگے دوسری سیٹ پر پیڈرو ہوگا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" پیڈرو چلّایا۔ اس کی آواز میں احتجاج تھا فریاد تھی کہ مجھے دشمنوں کے حوالے مت کرو۔۔ خوف تھا اور بے بسی تھی۔

"تم سے کسی نے پوچھا نہیں ہے کہ چلو گے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں رابعہ نے ریوالور اٹھایا اور شہلا کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"دلاور! تم چُپ کھڑے ہو۔" پیڈرو نے چیخ کر کہا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ دلاور دوسری طرف دیکھتا رہا۔

"سُور کے بچّے۔۔۔ حرام زادے۔۔۔ یہی صلہ ہے میری نیکی کا۔ جو میں نے تیرے ساتھ کی۔۔۔" پیڈرو پھر چلّایا۔

"نیکی!" میں نے قہقہہ مارا۔ "اوّل تو وہ نیکی نہیں تھی۔ کسی چور ڈاکو کی مدد نیکی نہیں کہلاتی۔ اس کے علاوہ یہ تو تمہاری بے وقوفی تھی کہ تم نے نیکی کر کے کچھ کیا تو کس کے لیے۔۔۔ سانپ کو دودھ پلاؤ گے تو کیا وہ ڈسنا چھوڑ دے گا۔ اور اسے صلہ دینا ہو تب بھی اس وقت وہ خود مجبور ہے۔ وہ تمہیں جواب تک تو دے نہیں سکتا۔"

"نہیں۔۔۔ تم مجھے نہیں لے جاسکتے۔۔۔ دلاور۔۔۔ مجھے بھی تو نے چھوڑ دیا؟ ان سب کی طرح جو۔۔۔ تیرے زر خرید تھے۔" پیڈرو اب پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے چکرا دیا۔ کیا واقعی یہ ڈراما نہیں تھا؟۔۔۔ دلاور سچ مچ اپنے دستِ راست سے محرومی کے فیصلے کو قبول کر چکا تھا۔ کیا دلاور کو ڈر نہیں کہ وہ ہماری تحویل میں ہوگا تو سارے راز کھول دے گا۔

"تم اگر نہ جانا چاہو تو تمہیں کون لے جاسکتا ہے۔" دلاور نے اچانک بے حد پُرسکون اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"کیا؟۔۔۔ تو بھی۔۔۔ تو چاہتا ہے کہ میں۔۔۔؟ دلاور، میں ایسا نہیں کرسکتا۔" انتہائے خوف سے پیڈرو کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"بزدل! کیا تم نے سوچا نہیں تھا کہ یہ وقت بھی آسکتا ہے" دلاور نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "تم سے پہلے بھی لوگوں پر سارے راستے بند ہو گئے تھے تو انھوں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم ان معمولی حیثیت کے لوگوں کو کم ہمت ہونے کا ثبوت دو گے۔ یہ تمہاری لاش لے جائیں تم کو کیسے لے جاسکتے ہیں۔"

"نہیں۔" پیڈرو پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ان کے ساتھ مل کر انھیں وہ سب بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہے۔ ان سے اپنی جان کا سودا کرلوں گا۔ میں خودکشی نہیں کروں گا دلاور۔۔" دلاور کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

یکلخت ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ دلاور بے بس تھا۔ پیڈرو کو نہ جانے دیتا مگر وہ جانتا تھا کہ پیڈرو جو آج تک ہمت کی آزمائش سے کامراں گزرا تھا۔ زندگی اور موت کے سے بے خوف گزرا تھا اور وفاداری کے ہر امتحان سے کامیاب تھا آج بھی اس کی توقعات پر پورا اترے گا اور اتنی ہی آسانی سے جان سے گزر جائے گا مگر عین وقت پر دلاور کے سامنے پیڈرو کی شخصیت کا وہ روپ سامنے آگیا جو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ یقیناً اس کے دانتوں کے کسی خلا میں کوئی زہر قاتل تھا جس کو دلاور نے آخری راستہ قرار دیا تھا۔ اس نے پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا اور اب تمہیں مر جانا چاہیے۔ اس سے پہلے اگر پیڈرو کے لیے جان کے طلب گار مرحلے آئے تھے تو اس میں زندگی کے بھی پچاس فیصد امکانات تھے۔ تھے تو چالیس فیصد تھے یا تیس فیصد تھے مگر آج یہ امکانات گھٹ کر صفر فیصد رہ گئے تھے تو پیڈرو کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے ساتھ جانا جلاد کے ساتھ پھانسی کے تختے کی طرف جانے سے بھی بدتر ہے۔

"اٹھو پیڈرو!" میں نے کہا۔ "شاید تم مجھے دلاور سے زیادہ فراخدل پاؤ۔۔ شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔ تمہارے پاس مجھے دینے کے لیے کوئی ایسی چیز ہو جس کے بدلے تم مجھ سے زندگی کا سودا کرسکو۔"

پیڈرو نے دیوار کا سہارا لیا اور کھڑا ہوگیا۔ میں ایک دم پلٹ گیا اور اُلٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے چلتا گیا۔ اس وقت تک رابعہ اور شہلا گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھیں اور نواب خسرو جمشید کا ہم شکل ڈرائیور جو خود نواب بھی ہوسکتا تھا بالکل منجمد بیٹھا نظر آرہا تھا۔ یقیناً اس کے سر کے پیچھے رابعہ کا ریوالور تھا۔

"شاباش۔۔۔ آگے آؤ۔۔" میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ پیڈرو ایک ٹانگ پر اُچھلتا کراہتا آگے بڑھا۔ وہ اس وقت ایک خوفناک پاگل نظر آرہا تھا۔ دروازے تک پہنچ کے اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔

"لعنت تم پر۔۔۔ تم سب پر۔۔۔" پیڈرو چلّایا اور میں پیچھے ہٹتے ہٹتے گاڑی کے دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر وہ ہوا جس کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا۔ پیڈرو ایک دم کمرے کے اندر گرا اور دیوار کی اوٹ میں ہوگیا۔ کسی نے دروازے کو دھڑ سے بند کر دیا۔ میرے ہاتھ نے مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔ دروازے میں سوراخ ہی سوراخ ہو گئے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ اندر رہ جانے والے جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ سب دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں خالی ہاتھ دشمنوں کے قلعے میں کھڑا رہ گیا ہوں۔ کسی طرف سے آنے والی کوئی بھی گولی میرے جسم میں اتر سکتی تھی۔ یہ بات دشمن بھی جانتے تھے کہ مشین گن کی ہلاکت خیزی ختم ہوئی۔ اب جو کچھ تھا وہ ریوالور تھا جو رابعہ کے ہاتھ میں تھا مگر ریوالور تو دلاور کی دراز میں بھی تھا۔ اس کے پی اے کی دراز میں بھی ہوگا۔ نہ جانے کس کس کے پاس ہوگا۔ یہ تو وہ اسلحہ خانہ تھا جہاں سب کچھ بن رہا تھا اور ہزاروں میل دور پہنچانے کے لیے ذخیرہ کیا جارہا تھا۔ اس اسلحے سے بھرے ہوئے قلعے میں ایک ریوالور ایسے ہی تھا جیسے ریوالور کے مقابلے میں غلیل۔ میں ایک دم دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔۔۔ میں نے دلاور کو چلّاتے سُنا۔

"چلو۔۔ گاڑی چلاؤ۔" میں نے چلّا کر کہا۔

نواب خسرو جمشید کے نقشِ ثانی نے سر گھمایا اور مسکرا کے مجھے دیکھا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی۔" رابعہ نے پیچھے سے ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ "ایک۔۔۔ دو۔۔" مگر میرے ہاتھ اس سے پہلے ہی حرکت میں آچکے تھے۔ میں نے نواب خسرو جمشید یا اس کے بھیس والے ڈرائیور کے سر پر مشین گن کا دستا مارا۔۔۔ وہ گرنے لگا تو میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ باہر لڑھک گیا۔ اس کمرے میں جہاں دلاور، پیڈرو اور دو کے سات افراد بند تھے، نہ جانے کیا کارروائی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی دیر میں دلاور نے گیٹ کیپر کو فون یقیناً کر دیا ہوگا کہ دروازہ نہ کھولے۔ مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے فون دوبارہ لگوا کے روانگی سے قبل ناقابلِ استعمال نہیں بنایا تھا۔ اب دلاور فیکٹری کے اندر اور باہر ہر جگہ سب کو ہمارا راستہ روکنے کے احکامات جاری کر رہا ہوگا۔ پولیس کو بتا رہا ہوگا کہ مطلوبہ مجرم کہاں ہیں۔ غصے اور انتقام کی آگ اسے جلا رہی ہوگی۔ پولیس کے پہنچنے کی مجھے فکر نہیں تھی۔ ان کو قریب ترین پولیس اسٹیشن سے سو گز دور بھی جانا ہو تو وہ آدھا گھنٹا ضرور لیتے ہیں مگر اندر کے دشمنوں کا ہوشیار ہو جانا اور ہمارا ان کے نرغے میں آجانا انتہائی سنگین صورتِ حال پیدا کرسکتا تھا۔

پہلا فائر کسی نے اس وقت کیا جب میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کو نصف دائرے میں یوٹرن دیا تو ایک منڈیر سی آگئی جس کے بعد پھولوں کی ایک فٹ چوڑی اور آخر تک پھیلی ہوئی کیاری تھی۔ گاڑی اس سے ٹکرا کے اُچھلی اور منڈیر کو توڑتی ہوئی پھولوں پر سے گزر گئی۔ اگر یہ نواب خسرو جمشید کی مرسیڈیز نہ ہوتی تو شاید اس رکاوٹ کو عبور نہ کرپاتی۔ کیاری کی کچّی زمین بہت نرم تھی لیکن طاقتور انجن کی قوت نے پہیوں کو دھنسنے نہیں دیا۔ پھر بیک وقت دو فائر ہوئے جن میں سے ایک سامنے والے حصّے میں بونٹ پر لگا۔ میں نے اپنے سامنے چھوٹے چھوٹے گملے دیکھے۔ مرسیڈیز ان کو چُورا کرتی گزری تو لان آگیا۔ جس میں مالی نے پانی دے رکھا تھا۔ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی تو گاڑی گھوم گئی مگر پھر ایک جست میں لان کو عبور کر گئی۔

رابعہ نے پیچھے سے فائر کیا اور میں نے ایک بیرک سے دوڑ کر باہر آنے والے پہلے شخص کو گرتے دیکھا۔ رابعہ کا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا مگر اس شخص کی قضا آچکی تھی کہ گولی خود اس کی طرف چلی گئی۔ دوسرا شخص بائیں جانب سے مشین گن کے ساتھ نمودار ہوا۔ رابعہ نے پھر فائر کیا مگر اس سے قبل ہی میں نے گاڑی کا رُخ سیدھا اس کی جانب کر دیا تھا۔ اس نے دس گز کے فاصلے سے مرسیڈیز کو یوں دیکھا جیسے کھُلے میدان میں آدمی سر پر آجانے والے بمبار طیارے کو دیکھتا ہے۔ مرسیڈیز کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ مشین گن پھینک کر بھاگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھے رہ گئے ۔۔۔ پھر کسی خون آشام درندے کی طرح مرسیڈیز نے اُسے روند دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے۔ پیچھے سے رابعہ اور شہلا مسلسل چیخ رہی تھیں مگر میں اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ فیکٹری کے گیٹ کو بھی میں نے اس وقت دیکھا جب درمیانی فاصلہ پچاس گز بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے سر کو جھکا کے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ دوسرے لمحے ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں نے خود کو اوپر اُٹھتا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے آتا محسوس کیا۔ گاڑی دروازے کو توڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ دونوں فولادی گیٹ اکھڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک مرسیڈیز کے پچھلے حصّے پر گرا۔ میرے کانوں نے مشین گن کے مسلسل فائر سُنے لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ گاڑی میرے قابو میں آچکی تھی اور ابھی تک رواں تھی۔ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں زندہ تھا۔ رابعہ اور شہلا زندہ تھیں اور ہم ہر لمحہ موت سے دُور ہوتے جارہے تھے۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بین روڈ تک کا راستہ شاید دو سو گز تھا لیکن اس وقت یہ فاصلہ زندگی کی سرحد کا سفر بن گیا جو حدِ افق سے بھی دُور لگتی تھی نہ مجھے اپنا ہوش تھا۔ نہ یہ خیال تھا کہ رابعہ اور شہلا کس حال میں ہیں۔ گاڑی کو میں کیا دیکھتا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔

"سکندر!" رابعہ نے ایک دم میرا کندھا ہلا کے اور میرے کان میں چیخ کر کہا۔ "گاڑی روکو۔۔ وہ دیکھو محسن اور غالب دوسری گاڑی لیے کھڑے ہیں۔"

"سکندر بھائی۔" شہلا چلّائی۔ "اس گاڑی سے دھواں اٹھ رہا ہے۔"

میں نے جسم کی تمام قوت بریک دبانے میں صرف کر دی۔ گاڑی کے پہیّے جام ہو گئے۔ نیم پختہ سڑک پر ٹائر زبردست رگڑ کے ساتھ بڑھتے گئے۔ پھر جیسے زلزلہ گزر گیا۔ کائنات جو تہ و بالا ہو رہی تھی ساکت ہو گئی۔ سمندروں کا طوفانی مد و جزر ختم ہو گیا اور شورِ قیامت تھم گیا۔ میں نے محسن اور غالب کو دوڑ کر آتے دیکھا... میں اپنا سر اسٹیرنگ پر رکھے سوچ رہا تھا کہ میں کتنا تھک گیا ہوں۔ مجھ میں حرکت کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور محسن نے مجھے کھینچ لیا۔ وہ مجھے کندھے پر ڈال کے دوڑنے لگا۔ چند سیکنڈ میں اس نے مجھے کندھے پر سے اتار کے سیدھا دوسری گاڑی کے کھلے دروازے میں پھینکا۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی چل پڑی تو میں نے دیکھا کہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر رابعہ اور شہلا بھی ہیں۔ وہ دونوں زخمی تھیں اور بے ہوش تھیں۔ میں خود بھی ہوش میں نہیں تھا مگر دھماکا ہوا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مرسیڈیز کی جگہ ایک الاؤ بھڑک رہا تھا۔ اس میں پٹرول ٹینک کے پھٹتے ہی آگ لگ گئی تھی۔ میرے کانوں میں ابھی تک مشین گن کے فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس آدمی کی چیخ گونج رہی تھی جسے میں نے روند ڈالا تھا۔ مرسیڈیز اس کے لہو، گوشت اور ہڈیوں کو پیستی ہوئی اور سڑک پر پھیلاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں وہ دھماکا سُن رہا تھا، جو بند فولادی گیٹ کے ٹوٹنے سے ہوا تھا۔ وہ سب پیچھے رہ گیا تھا مگر ہنوز میرے تصور کے ساتھ تھا۔ میرے خیال میں زندہ تھا۔ ایک آسیب بن گیا تھا۔ گاڑی سیدھی جا رہی تھی۔ دوسری بہت سی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی۔ اسے محسن چلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں زندگی کے یقین کی طرف لوٹنے لگا۔ پھر ہوش میں آنے لگا اور بالآخر سب کچھ دیکھنے، سننے اور سمجھنے لگا۔

"یہ... یہ دونوں زخمی ہیں۔" میں نے غالب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا جو اگلی سیٹ پر مطمئن بیٹھا تھا۔

"اور خود تم کیا ہو۔ ذرا آئینے میں دیکھو۔" غالب نے بیک ویو مرر کا رخ میرے مقابل کر دیا۔ میں اپنا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس پر خون ہی خون تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک کسی زخم کی تکلیف مجھے محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی اب اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں غالب؟" میں نے کہا۔

"ہم وہاں جاتے ہیں جہاں تقدیر ہمیں لے جاتی ہے۔ پھر ایک گھر لیا ہے بے گھر ہونے کو۔" غالب نے کہا۔

"تم بہت وقت پر پہنچے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ اور رابعہ اور شہلا کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر خراشیں تو بالکل ویسی ہی جیسے میرے چہرے پر تھیں۔ یہ گاڑی کے ریزہ ریزہ ہو جانے والے شیشے سے آئی تھیں اور اگر میں نے سر نہ جھکایا ہوتا تو شاید اندھا ہو جاتا۔

"تم نے بہت دیر کی۔" غالب بولا۔ "ہم تو مایوس ہو کر کچھ کرنے والے تھے۔ تخت یا تختہ۔"

"کم سے کم فون پر تو بتا دینا تھا کہ تمھیں مدد کی ضرورت ہے۔" محسن بولا۔

"محسن!" میں نے اچانک چلّا کے کہا۔ "فون... ہمیں دلاور کو فون کرنا ہے۔ صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"تو نے اسے بتایا نہیں؟" محسن نے ایک دم پلٹ کر کہا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور محسن نے گاڑی کو ایک پٹرول پمپ پر موڑ لیا۔ جتنی دیر میں اس کا ٹینک فل ہوا محسن کیشئر کے پاس جا کے لوٹ آیا۔ اس نے رقم ادا کی اور گاڑی نکال لے گیا کیونکہ پٹرول ڈالنے والا پیچھے کی سیٹ پر پڑے ہوئے اور زخمی پڑی ہوئی دو عورتوں کو اور ایک مرد کو انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بات ہو گئی؟" میں نے کہا اور محسن نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"میں نے دلاور کے گھر اور دفتر دونوں جگہ فون کر دیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "وہ خود تو ملا نہیں۔ شاید راستے میں ہوگا۔ اس کی بیوی کو بتا دیا۔"

"اس نے یقین بھی کیا؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"کیا ہی ہوگا۔ وہ ایک دم چیخنے چلّانے لگی تھی۔" محسن بولا۔

"وہ اعصابی مریض ہے۔ پاگل نہ ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔ "دلاور کے بچے مارے جائیں گے اگر اس نے کچھ نہ کیا۔"

"خطرہ ہو تو جانور بھی بچّوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیتا ہے۔ وہ پاگل ہے تو کیا... ایک ماں بھی ہے۔" محسن نے کہا مگر اس کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ خدا کرے دلاور وقت سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اس کی بیوی ہی ٹیلی فون پر ملنے والے پیغام کے بارے میں بتا دے۔

"ایس پی سراج اور حشمت خان کے گھر میں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"دھماکا۔" غالب بولا۔ "صرف حشمت خان کے مارے جانے کی اطلاع ہے۔ باقی سب بچ گئے۔ گھر تباہ ہو گئے۔"

"اس پٹرول پمپ والے نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا؟" محسن نے اچانک کہا۔ گاڑی جو مال روڈ پر دوڑ رہی تھی موڑ کاٹ کے ایک کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ وہ خاصی پرانی اور ویران کوٹھی تھی۔ "تم سب نکلو۔" محسن نے کہا۔ "تم اور غالب دونوں..... لڑکیوں کو اٹھا کے اندر لے جاؤ۔ میں گاڑی کو کہیں چھوڑ کے آتا ہوں۔"

غالب آگے سے اترا اور میں پیچھے سے ایک طرف... دوسری طرف۔ ہم نے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے۔ رابعہ کو غالب نے کھینچ لیا اور شہلا کو میں نے۔ پھر ہم نے لات مار کے دروازے بند کیے اور محسن گاڑی کو ریورس گیئر میں لے گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ فورڈ کار تھی۔ چھ سلنڈر والی ساٹھ کے ماڈل کی زیفر... کسی سے چھینی ہوئی۔

"میاں کھڑے کیوں ہو... اندر چلو۔" غالب بولا۔ "اپنا ہی گھر سمجھو اسے۔"

"اپنا گھر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایسے کہہ رہے ہو جیسے تمھارے باپ کا گھر ہو۔ آگے چلو۔"

"ہاں... یہ میرے باپ کا ہی گھر ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہاں میں پیدا ہوا تھا۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اس کا مالک میرا باپ تھا۔"

اس حالت میں بھی غالب کی بات نے میرے ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ مجھے وہ سب یاد آ گیا جو ڈاکٹر لطیف نے بتایا تھا۔ غالب ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ "تم... تم نے تو یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔" میں نے کہا اور شہلا کو ایک پرانے بیڈ پر لٹا دیا جس پر صاف اور نئی چادر تھی۔ غالب نے رابعہ کو اسی بیڈ پر شہلا کے ساتھ لٹا دیا۔

"ہاں۔ میں نے بن باس لے لیا تھا۔ مہاتما بدھ کی طرح۔ میں اپنے محل سے نکل گیا تھا۔" غالب اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "گھر ہو یا محل... سب دیواروں کے حصار ہوتے ہیں۔ دیواریں تو جیل کی بھی ہوتی ہیں۔ فرق صرف تعلق کا ہے۔ پیار کرنے والی دیواریں نہ ہوں تو اس کو گھر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان دیواروں کو مجھ سے اور مجھے ان دیواروں سے کوئی پیار تھا ہی نہیں تو میں ان کے درمیان کیسے رہتا۔"

"پھر اب اس زنداں میں کیوں لوٹ آئے ہو...؟" میں نے طنز سے کہا۔

"اب یہ گھر ہے۔ پیار ہے یہاں۔" غالب نے کہا۔ "تم اور رابعہ، محسن اور شہلا... ہم سب پیار ہو۔ پیار تم سے ہے اور تم پیار سے ہو۔"

"اور نازو... وہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میں ہوں۔" غالب ہنسا۔ "مجھے تم جو چاہو سمجھو۔ محسن آ جائے تو کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔"

"کیا ان کی حالت زیادہ تشویشناک ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہوش میں تو یہ آ جائیں گی۔" غالب بولا۔ "مگر ان کو کچھ سکون آور ادویات کی اور کچھ مرہم پٹی کی ضرورت تو ہوگی۔"

"تم وہاں سے سب سامان نکال لائے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ صرف اپنی جان سلامت لے آئے ہیں۔" غالب بولا۔ "یہ بھی کیا کم غنیمت ہے؟ ہم وہاں کیسے رہ سکتے تھے۔ نقد رقم اب ختم ہو رہی ہے۔"

"ویسے تو میرے پاس دس ہزار ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر اپنے استاد ڈیڈی کا مدفون خزانہ بھی تو محفوظ پڑا ہے۔"

"ہاں ساب کسی دن نکال کے لانا ہی پڑے گا۔" غالب بولا۔ اسی وقت باہر ایک رکشا آ کے رکا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو محسن ایک ڈاکٹر کے ساتھ اتر کے اندر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر بہت عجیب چیز تھا۔ اور اپنے مضحکہ خیز لباس سے کسی سرکس کا جوکر لگتا تھا۔ محسن نے بعد میں بتایا کہ وہ تیس سال تک ایک سرکاری اسپتال میں کمپاؤنڈر رہا اور اب نجی پریکٹس کرتا ہے۔ اس نے ڈریسنگ بڑی مہارت سے کی اور دونوں لڑکیوں کو دو دو انجکشن بھی لگائے۔ ایک "ٹی ایس" کا اور دوسرا سکون آور۔ یہی سلوک وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا، مگر میں نے کہا کہ سکون آور انجکشن وہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھے۔ اس نے محسن سے دو سو روپے لیے اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ اس نے زخموں کی نوعیت اور ان کے اسباب کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ سو روپے محض زبان بند رکھنے کے لیے تھے اور میرے خیال میں رازداری کی یہ فیس بہت کم تھی۔ مستند ڈاکٹر ہوتا تو یہی کام ہزار لے کر بھی نہ کرتا۔

اُجڑی ہوئی کوٹھی کے صرف دو کمرے قابلِ رہائش بنائے گئے تھے۔ اس حد تک کہ بستر جھاڑ کر بچھا دیے گئے تھے ورنہ فرش پر برسوں کی دھول اسی طرح موجود تھی۔ چھت میں پرندوں کے گھونسلے قائم تھے اور دیواروں کے گوشوں میں مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ دوسرے کمروں میں کیا تھا، یہ دیکھنے کی ابھی نہ ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ ان دو کمروں کے علاوہ کچن اور باتھ روم کو بھی استعمال کے قابل بنا لیا گیا تھا مگر مردانہ ہاتھوں کے لیے صفائی کا عمل مشکل کام تھا۔ پوری کوٹھی کی جھاڑ پونچھ اور صفائی رابعہ اور شہلا کے لیے بھی مہینہ بھر کی مشقت تھی۔ محسن نے اسی کچن میں چائے بنائی اور ثابت کیا کہ چولہا اب بھی جلتا ہے۔ تاہم پانی کی موٹر کے بارے میں اس نے افسوس سے مجھے مطلع کیا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

کہ جام ہوگئی ہے اور جو پانی اوپر والے ٹینک میں تھا، وہ برسوں میں بخارات بن کے اُڑ گیا ہے۔ جو انڈر گراؤنڈ ٹینک میں ہے، وہ گندہ ہے اور ٹینک کی صفائی کیے بغیر اس کو بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم باہر باغ کے ایک نل سے براہِ راست کارپوریشن کا تازہ اور صحت بخش پانی حاصل ہوتا ہے۔ ٹونٹی جام ہو چکی تھی مگر اسے پلاس کی مدد سے کھول لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عقبی حصے میں ایک ہینڈ پمپ بھی تھا جس کا واشر سوکھ چکا تھا۔ غالباً تیل دینے کے بعد وہ بھی پانی اُگلنے لگا۔

"ہم ابھی تو سامنے کے حصے سے داخل ہونے پر مجبور تھے مگر آئندہ ہماری آمد و رفت عقبی حصے سے ہوگی۔" محسن نے کہا۔ "کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ کئی سال تک غیر آباد رہنے والی کوٹھی میں کوئی آگیا ہے۔"

"کوٹی کا کیا مطلب ہے؟" غالب نے ڈانٹ کر کہا۔ "صاحب خانہ تشریف لے آئے ہیں۔ ہم کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے، کوٹھی والے ہیں۔"

"ہم نے اندر کے دو کمروں کا انتخاب کیا ہے۔" محسن نے اس کی بات سُنے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "بیرونی کمروں کے کھڑکی دروازے بند رہیں گے۔ آج ہم ایسا انتظام بھی کر لیں گے کہ رات کو لائٹ جلے تو روشنی باہر نہ جائے۔ جب تک نازو کا مشن مکمل نہیں ہو جاتا، ہم اسی طرح چھُپ کر رہیں گے۔ حتی الامکان دن میں باہر نکلنے سے گریز کریں گے اور ناگزیر ہوا تو پیچھے سے جائیں گے۔"

"میری ایک بہت اچھی تجویز کو محسن نے ویٹو کر دیا۔ صرف اس لیے کہ وہ میرے ذہن میں آئی تھی۔" غالب نے شکایت کی۔ "میرا مشورہ تھا کہ ہم خانہ بدوش یا فقیروں کا کنبہ بن جائیں اور یوں رہیں جیسے ویران کوٹھیوں میں ناجائز قابضین رہتے ہیں۔"

"اور اس تجویز کو محسن نے مسترد کر دیا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں اس کے ویٹو کو ویٹو کرتا ہوں۔ یہ تو چھُپ کر رہنے اور آزاد رہتے ہوئے پھرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کا قبیلہ بن سکتے ہیں کیونکہ ہم واقعی بے گھر لوگ ہیں۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے محسن اور غالب کو دلاور سے ملاقات کا احوال سنایا۔ رابعہ اور شہلا سوتی رہیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو غالب نے ناشتے کو دُہرایا یعنی سلائس، آملیٹ اور چائے پیش کی۔ پیٹ بھرنے کے لیے سب غنیمت تھا کیونکہ اس وقت کوئی بھی باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر میں نے نازو کی خیریت معلوم کی۔

"نازو اپنی ڈیوٹی پر ہے۔" محسن بولا۔ "اور مونگ پھلی والا اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے۔"

"آج رات وہاں جو خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے اس سے بہت کچھ معلوم ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "ہم سب آس پاس ہوں گے اور اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے۔ یہ بھی دیکھیں گے کہ کون کون آتا ہے اور..."

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ قدموں کی آہٹ پر میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے تین آدمی نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ انھوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔

تینوں نے پہلے نو واردوں کو اور پھر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان حالات میں سب سے پہلے یہ خیال آنا ایک فطری امر تھا کہ یہ تینوں بھی شکاری ہیں جو ہماری تلاش میں تھے یا کسی طرح ہمارا سراغ لگا کے یہاں تک آ پہنچے تھے۔ لیکن یہ خیال ایک بے بنیاد اندیشے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ کسی نے ہمارا پیچھا کیا ہوتا تو ہمارے ساتھ ہی یہاں قدم رنجہ فرماتا۔ رونمائی کے لیے اتنی دیر انتظار نہ کرتا۔ میں یہ بھی خاصے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ فیکٹری سے دلاور یا اس کے کسی پالتو کتے کا ہماری بو سونگھتے ہوئے یہاں تک آنا محال بلکہ ناممکن تھا۔ ہم جس گاڑی میں فیکٹری کا گیٹ توڑ کے نکلے تھے وہ نواب خسرو جمشید کی تھی مگر وہ گاڑی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔ باقی سفر ہم نے دوسری گاڑی میں جلیبی سے زیادہ سیدھے راستے پر کیا تھا اور محسن اس گاڑی کو بھی بہت دور چھوڑ آیا تھا چنانچہ اس دعوے میں مبالغہ نہ تھا کہ اب کوئی کتا ہماری بو بھی نہیں پا سکتا تھا۔

"وہ... محسن... کیا یہ تیرے سسرالی رشتے دار ہیں؟" غالب نے سب سے پہلے محسن کو ٹھوکا دیا۔

"پتا نہیں یار..." محسن چونکا۔ "ہو بھی سکتے ہیں۔ نئی نئی شادی ہے نا... ابھی سب کو نہیں پہچانتا میں۔"

"ایک کی صورت میرے پرنانا کے سلسلے سے ملتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مرحوم نے ایسی ہی بندوق سے خودکشی فرمائی تھی۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" ان میں سے ایک نے گرج کے کہا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

غالب نے ایک سرد آہ بھری۔ "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟"

"یہ خود کون ہیں یار؟" محسن بولا۔ "بالکل اصلی ڈاکو لگتے ہیں۔"

"حالانکہ یہ سب میک اپ کا کمال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "غالباً کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔"

"ہم اصلی ڈاکو ہیں۔" دوسرا نقاب پوش چلّایا۔ میرے الزام سے اس کی انا سخت مجروح ہوئی تھی۔

"میرے پرنانا کا سالا بھی اصلی ڈاکو تھا۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "ایسی ہی بندوق لے کر دن دن کرتا پھرتا تھا... انیسویں صدی میں بھی رائفل چلتی تھی۔"

"اگر تم لوگ ڈاکو ہو تو یہ توپ کیوں اٹھائے پھرتے ہو؟" محسن نے کہا۔ "ریوالور رکھ لو... ایسا..." اس نے بڑی پھرتی سے اپنا ریوالور نکال کے سامنے کر دیا۔

"یا ایسا۔" فوراً غالب نے اور میں نے بھی ایک آواز ہو کے کہا اور اپنے ریوالور نکال کے دکھائے۔ ہمارے غیر سنجیدہ رویے نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ بلاشبہ وہ حلیے سے ڈاکو ہی لگتے تھے۔ عام آدمی کی انھیں دیکھ کر گھگی بندھ جاتی مگر ہم بہت بڑے ڈاکوؤں سے لڑ رہے تھے اور اس لڑائی میں جدید ترین اسلحہ یہاں تک کہ دستی بم اور ٹائم بم تک استعمال کر رہے تھے۔ وہ ڈاکو تھے ملک کی آزادی اور سلامتی پر ڈاکا ڈالنے والے۔ عدل و انصاف کے مقدس ایوانوں پر ڈاکا ڈالنے والے۔ انسانیت اور شرافت کی آبرو پر ڈاکا ڈالنے والے اور انسانوں کی زندگی کے حق، محبت کے رشتوں اور ماؤں بہنوں کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والے۔ ان کے مقابلے میں یہ ڈاکو طفلِ مکتب بھی نہیں تھے جو صرف مال و زر چھینتے تھے۔ ان کی یہ ازکار رفتہ رائفلیں بھی پولیس کے ناتواں ہاتھوں سے چھینی ہوئی لگتی تھیں۔

"گولی چلانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" محسن نے انھیں سمجھایا۔ "تم بھی تین ہو اور ہم بھی تین۔"

"لیکن ہمارا چوتھا ساتھی آنے والا ہے۔" غالب نے کہا۔

"اور اگر تمھارا کوئی چوتھا ساتھی نہیں ہے تو سمجھ لو کہ تم گھاٹے میں ہو کیونکہ ہمارا چوتھا ساتھی تم کو باہر سے ہی ہینڈز اَپ کرا دے گا۔" میں نے کہا۔

"تم تینوں اس کے نشانے کی زد میں ہو گے مگر وہ خود تمھارے سامنے نہیں ہوگا کہ تم اسے نشانہ بنا سکو۔" محسن نے کہا۔

"اس لیے بہتر ہوگا کہ تم یہ رائفلیں رکھ دو اور آرام سے بیٹھ کر بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" غالب نے کہا۔

"یہاں کیوں آئے ہو اور زندہ واپس جانا کیوں نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔

ڈاکوؤں کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ہمارے پُرسکون انداز اور اعتماد نے ان کے جارحانہ عزائم کو پہلے ہی شکست دے دی تھی۔ جب ہم نے مسلسل بولنا شروع کیا اور ان کو جواب کی مُہلت دیے بغیر قوالوں کی طرح یکے بعد دیگرے بول سے بول ملانے لگے تو ان کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں اور مقابلہ عام لوگوں سے نہیں ہے۔ پنجابی فلموں نے تو پبلک کے دل میں ڈاکوؤں کی وحشت بٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہم شریف آدمی ہوتے تو اخلاقاً ہی اصلی ڈاکو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتے یا بے ہوش ہو جاتے مگر ہمارا ردِ عمل الٹا ہوا تھا کہ ہم نے زیادہ بے خوفی سے زیادہ مہلک ہتھیار نکال لیے تھے۔ تاہم انھیں بھی اپنے ڈاکو ہونے کی لاج رکھنا تھی۔

"ہم ان کھلونوں سے نہیں ڈرتے۔" ان میں سے ایک نے گرج کر کہا۔ لیکن یہ گرج بھی انہی بادلوں کی تھی جو برستے نہیں۔

"اوئے موت سا ڈے لئی کھیڈ اے۔" دوسرے نے بالکل فلمی ولن کی طرح دہاڑ کر کہا مگر یہ دہاڑ بھی چڑیا گھر کے شیر کی دہاڑ تھی جو زکام میں مبتلا ہو۔

"ٹھہر وا اوئے! پہلے انیاں وی دی سن لئی اے۔" تیسرے نے نسبتاً پُرسکون لہجے میں حکم دیا اور اپنے زیادہ سمجھدار ہونے کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے باقی دو جوشیلے ساتھیوں کی آبرو بھی رکھ لی۔ باقی دو نے تھوڑا سا احتجاج کیا مگر پھر اپنے سردار کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے رائفلیں رکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ بہادری، مصلحت اندیشی اور سرداری کا ڈراما خاصا کامیاب رہا۔ ہم نے بھی اخلاق اور مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریوالور واپس جیب میں ڈال لیے۔

"اب بتاؤ تم کون ہو؟" سرداری کا عہدہ سنبھالنے والے نے کہا۔

"ہم یہاں رہتے ہیں۔" غالب نے بے حد اختصار سے کام لیا۔

"جھوٹ مت بولو۔" سردار نے کہا۔ "یہاں ہم رہتے ہیں۔"

"ایک نیام میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی گھر کی چھت کے نیچے ہم بھی رہیں اور تم بھی رہو۔" میں نے کہا۔

"ہم نے تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" ایک ماتحت ڈاکو نے کہا۔

"ہم نے بھی تمھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو۔" دوسرے نائب ڈاکو نے مشتعل ہو کے کہا۔ "تمھارے باپ کا گھر ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ ہاں تو؟" غالب نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے بھی باپ کا گھر ہے۔" سردار نے تنگ آ کے کہا۔

"کیا؟ تم تینوں ایک ہی شخص کو باپ مان رہے ہو؟" غالب نے انھیں مزید مشتعل کرنے کے لیے کہا۔ "میرے باپ نے تو ایک ہی شادی کی تھی لیکن مجھے کیا اگر اس کے تعلقات دوسری عورتوں سے بھی تھے۔"

"اوئے... زبان سنبھال کے..." اس مرتبہ سردار کا خون جوش میں آگیا۔ حملہ ان کی والدہ کے کردار پر ہو رہا تھا۔ غالب نے زبان سے نکل جانے والی بات کے مفہوم کو بدل دیا تھا۔

سردار کا اُٹھنا ہی اس کے لیٹنے کا سبب بنا۔ جب تک وہ رائفل لے کر میرے سامنے کھڑے تھے میں نے اپنے جارحانہ عزائم کو خوف کی معصوم اداکاری سے چھپا رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرف سے بھی گولی چلے۔ خصوصاً ہمارے نو وارد مہمانوں کی رائفل سے وہ دھماکا ہو جو ہر طرف سُنا جائے اور آس پاس رہنے والے یہ دیکھنے آ جائیں کہ اس ویران اور آسیب زدہ کوٹھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں کسی بھوت کا قتل ہوا ہے یا کوئی پُراسرار واردات ہوئی ہے۔ اس طرح ہماری یہاں موجودگی کا راز فاش ہو جاتا۔ سردار نے تو محض اداکاری سے یہ ظاہر کرنا چاہا تھا کہ گالی سُننا اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہے ابھی وہ رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا کے کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اُسے جا لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ پُھرتیلا نہیں تھا لیکن میں تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا۔ جب وہ بیٹھ گئے تھے تو مجھے مہلت ملنے کا یقین ہو گیا تھا۔

میری لات پڑتے ہی سردار اُچھل کر پیچھے گیا۔ میں نے اُسے نیچے سے اٹھا کے پوری قوت سے دیوار پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دیوار کے ساتھ سرکتا ہوا زمین پر بیٹھ کر جھومنے لگا۔ میرے حرکت میں آتے ہی غالب اور محسن نے بھی ریوالور دوبارہ نکال لیے تھے اور باقی دونوں ڈاکو اُٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ان تینوں کی رائفلیں لے کر دیوار کے سہارے ایک کونے میں کھڑی کر دیں۔

"کب سے قابض ہو تم لوگ اس گھر پر؟" میں نے ان کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔ "تمھیں معلوم ہے یہ کس کا گھر ہے؟"

"یہ مجسٹریٹ صاحب ہیں۔" محسن نے باادب لہجے میں میری طرف اشارہ کیا۔ "کوٹھی ان کے دوست کی ہے۔" اس نے غالب کی طرف دیکھا۔

"چار سال سے میں لندن میں تھا۔" غالب نے آگے آ کے کہا۔ "تم نے کیا سمجھا تھا کہ یہ لاوارث زمین ہے؟ اور لاوارث ہو تب بھی یہ حق کس نے دیا ہے تم کو کہ اس کے وارث بن بیٹھو۔"

ان تینوں کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ اپنے ڈاکو ہونے کا پہلے ہی اعتراف کر چکے تھے۔ ان کا دوسرا جرم غاصبانہ قبضہ بن گیا۔ نہ جانے کب سے وہ اس ویران کوٹھی میں اپنا اڈا جمائے بیٹھے تھے اور کئی سال سے بند پڑی ہوئی کوٹھی کی طرف سے بہت مطمئن تھے کہ اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہاں نہ کبھی پولیس آئے گی اور نہ کوئی حقِ ملکیت کا دعویدار آئے گا۔ اگر کوئی دور کے رشتے سے حقِ وراثت رکھنے والا زندہ ہوتا تو اب تک لاکھوں کی اس جائداد کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ بے شک کوٹھی کھنڈر ہو رہی تھی اور اس کا ساز و سامان غارت ہو چکا تھا مگر صرف یہ زمین ہی کئی لاکھ مالیت کی تھی جس پر کوئی بھی سرمایہ کاری کرتا تو عالی شان عمارت کھڑی کر سکتا تھا۔ پرانے آثار کو مٹا کے اس کی جگہ کوئی کمرشل کمپلیکس یا کئی منزلہ رہائشی اسکیم بنا سکتا تھا۔

"صاحب! غلطی ہو گئی ہم سے۔" سب سے پہلے سردار نے ہاتھ جوڑ کے عاجزی و انکساری کا ڈراما شروع کیا۔

"ہر غلطی کی سزا تو بھگتنا ہی پڑتی ہے۔" میں نے بالکل کسی مجسٹریٹ کی طرح کہا۔ "قانون کسی کو معاف نہیں کرتا۔"

"جناب ہمیں معلوم نہیں تھا۔" اب دوسرے نے بھی اپنی غلطی ڈاکو والی اداکاری کو خیرباد کہا اور منت سماجت پر اتر آیا۔

"کیا معلوم نہیں تھا؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ بات تو بچہ بھی جانتا ہے کہ پرائی چیز پرائی ہوتی ہے۔ کیا ایسے کوئی بھی کسی کے گھر میں منہ اُٹھا کے گھس سکتا ہے؟ اور اس پر یہ دیدہ دلیری ہمیں دھمکا رہے تھے۔ یہ سینہ زوری کہ اس کو اپنے باپ کا گھر ... رہے تھے۔ حالانکہ یہ اس کے والد کا مکان ہے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر تھے اور ہوائی حادثے میں میاں بیوی دونوں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ باہر زیرِ تعلیم تھا اس لیے گھر نہیں آ سکا تو اس کا مطلب ہوا کہ گھر اس کا نہیں رہا؟"

"گھر تو مالک کا ہی ہوتا ہے سرکار۔" ڈاکوؤں کے سردار نے گڑگڑا کے کہا۔ "ہم سے بڑی بھول ہوئی۔"

"کیوں بھئی! کیا خیال ہے؟" میں نے بڑی متانت سے غالب کی طرف دیکھا۔ "چھوڑ دیں ان کو؟"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" غالب نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "دیکھ تو لوں کہ گھر میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ چور تو گھر کا سارا سامان بھی بیچ کر کھا گئے ہوں گے۔" محسن نے تائید کی۔ "فی الحال تو ان کو پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ وہ خود سب اُگلوا لیں گے کہ یہاں سے کیا کچھ نکالا تھا۔"

انھوں نے قسمیں کھانا شروع کر دیں کہ اس ایک کمرے کے سوا انھوں نے کسی دوسرے کمرے میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ یہاں بھی وہ ہفتے میں یا دس دن میں ایک بار آتے تھے... سب ایک ساتھ بول رہے تھے اور ہاتھ پیر جوڑ رہے تھے۔ ان کا شور جاری ہی تھا کہ رابعہ نمودار ہوئی اور اس نے ڈرامے کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ اب بہت پُرسکون تھی۔ سکون بخش دوا کا اثر قبل از وقت ختم ہو گیا تھا چنانچہ وہ کچھ غنودگی کی کیفیت کا شکار تھی اور اس کی آنکھیں اب بھی سوئی سوئی لگتی تھیں۔

"آپ ہماری سفارش کریں بیگم صاحبہ۔" ڈاکوؤں کے سردار نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے عورت کے دل کی نرمی اور فطری رحمدلی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ "آئندہ ادھر کا رخ کریں تو ہماری توبہ..."

"آئندہ کی آئندہ دیکھی جائے گی۔" محسن نے کہا۔ "ابھی تو پچھلا حساب دو کہ کہاں کہاں ہاتھ مارتے رہے۔ کتنی وارداتیں کی ہیں اب تک... قتل کتنے کیے ہیں۔" پھر وہ رابعہ کو ان کے بارے میں بتاتا رہا۔

"میرا خیال ہے میں ساتھ والی کوٹھی سے فون کر کے پولیس کو بلوا لیتا ہوں۔" غالب نے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہرو... مجھے یہ چور اُچکے لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکو اتنے بزدل نہیں ہوتے۔ بہت سے ڈاکو میرے سامنے

سے جا چکے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی نہ اتنا احمق تھا نہ اتنا بودا۔ یہ پولیس کی مار کیا برداشت کریں گے۔"

"مجھے بھی یہ ڈاکو نظر نہیں آتے۔" رابعہ نے کہا۔ اس کی بات نے مجھے حیران کیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی میرے خیال کی تائید کرے اور یہ ڈاکو ہونے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود کو معمولی قسم کی وارداتوں کا مجرم تسلیم کریں۔ میں جانتے بوجھتے اپنی کوتاہ بینی اور کم عقلی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ وہ سچ مچ کے ڈاکو تھے لیکن ہم اُن کو پولیس کے حوالے کرنے کے چکر میں نہیں پڑ سکتے تھے۔ ان سے پہلے تو پولیس ہمیں دھر لیتی۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اتنے خوفزدہ ہو کر فرار ہوں کہ دوبارہ ادھر کا رُخ کرنے کا نہ سوچیں۔

"صورت پر مت جائیے۔" میں نے رابعہ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "یہ آپ کو دیکھ کر مسکین بن رہے ہیں۔ آپ جا کر دیکھیے، اگر خانساماں آ گیا ہو تو کافی بنوائیے۔"

"خانساماں ذرا دیر سے آئے گا۔" محسن بولا۔ "میں اپنی وائف سے کہتا ہوں۔" وہ رابعہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔

ڈاکوؤں کے دل میں اب ذرا بھی شک و شبہ نہ رہا کہ گھر کے اصل مالک اپنی فیملی کے ساتھ لوٹ آئے ہیں اور ان کی بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ مالک کا ایک دوست مجسٹریٹ ہے۔ دوسرے نہ جانے کیا ہوں گے۔ پولیس کے نام سے ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ گرفتاری کے بعد ان کا پولیس کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا اور اگر انھیں سارے جرائم کی سزا ملی تو ان کی زندگی کے کتنے سال جیل میں کٹ جائیں گے۔ ان کے بارے میں میرا ایک اندازہ کسی حد تک درست تھا کہ وہ بہت خطرناک قسم کے ڈاکو نہیں تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ گروہ بھی نہیں تھا۔ غالباً انھوں نے حال ہی میں یہ دھندا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ چوری چکاری کی وارداتیں کرتے رہے ہوں گے۔ آپس میں مل گئے تو رائفلیں لے کر گھومنے لگے اور خود کو ڈاکو کہنے لگے۔ ان میں بڑی واردات کا حوصلہ نہیں تھا تو قتل وہ کیا کرتے۔ تاہم میرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اصولاً انھیں قانون کے مطابق سزا ملنا چاہیے تھی لیکن ہم قانون کی نظر میں ان سے بڑے مجرم تھے۔ اپنے حالات کے باعث ہم ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جس کے وہ مستحق تھے۔

"وہ ٹیلی فون والا آیا تھا۔" محسن نے دوسرے کمرے سے نمودار ہو کے کہا۔ "اس نے کہا ہے کہ دو ہزار دیں تو کل ہی فون بحال ہو جائے گا۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔ رابعہ اس کے ساتھ پھر آ گئی۔

"اتنے برسوں کے بعد بحالی کا کیا سوال... وہ نئی لائن دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو... میں کل ایس پی ضامن رضوی سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ وہ ٹیلی فون کے محکمے کے کسی اعلیٰ افسر سے کہہ دیں گے تو کام ہو جائے گا۔ رشوت مانگنے آئے کوئی تو اُسے گردن سے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

"ضامن رضوی تو اب ایس ایس پی ہیں۔" محسن بولا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے ذہن کی سوچ کو سمجھ لیا تھا اور اب ہماری ساری گفتگو بے مقصد ہونے کے باوجود ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے تھی۔ ڈاکوؤں نے ایس ایس پی کا نام سُنا اور سہم کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شامتِ اعمال ان کو کہاں لے آئی تھی۔

"بھئی ختم کریں یہ سلسلہ۔" رابعہ نے سچ مچ کی بیگم صاحبہ کے ناز نخرے کے ساتھ کہا۔ "کیا آتے ہی عدالت لگا لی۔ ہمارے لیے تو پہلے ہی کم مسائل نہیں ہیں۔ اتنے عرصے بعد گھر آئے ہیں تو یہ نئی مصیبت۔"

"یہ کوئی مصیبت نہیں۔ میں ان کو پولیس لاک اپ بھجوا دیتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تو اب پولیس بھی آئے گی؟" رابعہ نے تنک کر کہا۔ "میں کہتی ہوں دفع کریں انھیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں، یہ مجرم ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہوں گے... لیکن کیا سب کو پکڑنے کے ذمے دار آپ ہی رہ گئے ہیں۔ ابھی سارا گھر ٹھیک کرنا ہے۔ فرنیچر آنے والا ہے۔ ہزار کام چھوڑ کے آپ اس کام میں لگ گئے۔" رابعہ نے کہا۔

"اچھا آپ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ ان بدبختوں کا قصور قابلِ معافی ہے یا نہیں۔"

رابعہ اندر چلی گئی تو میں نے ان کے سردار کو اشارہ کیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں اپنے تمام کرتوت اُگل دو۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ اب تک کیا ہے سب سچ سچ بتا دو۔ پھر میں سوچوں گا کہ کیا تم کو شرافت سے زندگی گزارنے اور اپنی اصلاح کا ایک موقع دیا جائے یا نہیں۔"

"آپ ہمارے مائی باپ ہیں حضور۔" سردار نے ہاتھ جوڑ کے کہنا شروع کیا۔ "بس ایک بار ہمیں معاف کر دیں۔ ہم قسم کھا لیں گے آپ کے سامنے... آئندہ چوری ڈاکا سب چھوڑ دیں گے... محنت مزدوری کریں گے اور پھر کبھی برائی کی طرف نہیں آئیں گے۔"

ڈاکوؤں کے اس خود ساختہ سردار نے مجھے دنیا کا سب سے احمق مجسٹریٹ مان لیا تھا۔ اسی یقین کے باعث وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انھیں راہِ راست پر چلنے کا موقع فراہم کیا گیا تو وہ واقعی شرافت کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ یہ عملاً ناممکن تھا... وہ جس راستے پر چل رہے تھے اس میں واپسی ممکن ہوتی تو وہ بہت پہلے لوٹ گئے ہوتے۔ اب تو وہ بہت آگے جا چکے تھے۔ اتنا آگے کہ وہ وقت ان کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا جب ان کے قدم غلط راستے پر اُٹھے تھے۔ میں اُن کو چھوڑنے پر مجبور تھا مگر میں اپنا بھرم رکھنا چاہتا تھا اور اس ڈرامے کو حقیقی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ میں انھیں آسانی سے نہ جانے دوں اور بالآخر انھیں "فرار" ہونے دوں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اندر ایک اسٹور روم ایسا تھا جس کو باہر سے مقفل کیا جا سکتا تھا مگر اس کی کھڑکی کے تمام شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اس کے باہر کی طرف نہ لوہے کی سلاخیں تھیں اور نہ گرل تھی چنانچہ دونوں پٹوں کو ملا کر ان پر تختے ٹھونک دیے گئے تھے اور کیلیں جڑ دی گئی تھیں۔ کیلوں کو بھی زنگ لگ گیا تھا اور کوئی بھی معمولی سی کوشش سے اور تھوڑا سا زور لگا کے تختوں کو نکال سکتا تھا اور پٹ کھول سکتا تھا۔

"ان میں سے ایک کو اندر لاؤ۔" میں نے اندر جاتے ہوئے محسن کو حکم دیا۔ "باقی دو کو باندھ کر رکھو۔"

"باندھنے کے لیے تو کچھ نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں انھیں ہلنے نہیں دوں گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "کوئی ہلنے کی کوشش بھی کرے تو بلا تامل گولی مار دینا۔" میں نے کہا۔ "اچھا ایسا کرو، ایک کو اندر لے آؤ اور دو کو مرغا بنا دو... اس سردار کی اولاد کو پہلے لاؤ۔"

"چل بھئی۔" غالب نے اس تھانیدار کی طرح کہا جو ملزم کو حوالات سے نکال کر ڈرائینگ روم کی سیر کرانے کے موڈ میں ہو۔ "تو چل مجسٹریٹ صاحب کے ساتھ۔ اور تم دونوں کیا دیکھ رہے ہو کان پکڑ لو۔"

دونوں ڈاکوؤں نے احساسِ ذلت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یوں جیسے کہہ رہے ہوں کہ حضرت پہلے آپ۔

"بن جاؤ مرغا۔" میں نے گرج کر کہا۔ "کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں سب کو گولی مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا مجھ سے۔"

وہ دونوں بڑی پھرتی سے اٹھے اور مرغا بن گئے۔ میں نے اسٹور کی ایک پرانی گرد سے اٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور سردار صاحب کو طلب کیا۔ محسن نے اسے یوں پیش کیا جیسے وہ ایس ایچ او کا کمرہ ہو۔

"تو خود کو ڈاکوؤں کا سردار کہتے ہو تم؟" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "اس کونے میں کان پکڑ لو اور پھر بتاؤ اپنے کارنامے۔"

"مرغے کی اولاد۔" محسن نے اس کے ایک جھانپڑ مارا۔ "سنا نہیں مجسٹریٹ صاحب نے کیا حکم دیا ہے۔" ڈاکو کو میرے ہاتھ میں ریوالور صاف نظر آ رہا تھا اور وہ میرے خالی ہاتھوں سے بھی خلعت پٹ چکا تھا چنانچہ اس نے بخش دیے جانے کی امید میں یہ ذلت بھی قبول کر لی اور مرغا بن گیا۔

"یہ بتاؤ کہ کب سے چوری ڈاکے شروع کیے تھے؟" میں نے کہا۔ "زیادہ لمبی بات مت کرنا اور کوئی دردناک اسٹوری مت سنانا کہ تم کو حالات نے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا۔ تم زمانے کے ستائے ہوئے ہو اور جو کچھ کر رہے ہو وہ ایک انتقامی ردِ عمل ہے۔ ایسی بکواس پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا۔ ہر آدمی اپنے ہر فعل میں خود مختار ہے۔ وہ نہ چاہے تو کوئی اسے مجرم نہیں بنا سکتا۔ سیدھی طرح یہ بتاؤ کہ پہلی

چوری کب کی تھی۔ کہاں کہاں واردات کر چکے ہو۔ کس کس کے ساتھ رہے ہو اور اس لائن میں آنے کے بعد کسی بے گناہ کو مارا ہے؟"

اس نے ایک بے سر و پا داستان شروع کی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اب تک اس نے معمولی نوعیت کی چوریاں کی ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کو بھی لوٹا ہے۔ گھروں میں گھس کے نقدی اور زیور بھی لوٹے ہیں لیکن کسی کی جان کبھی نہیں لی۔ کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کسی غریب آدمی سے کچھ نہیں چھینا۔ اس کا نشانہ حرام کا مال جمع کرنے والے ہی رہے ہیں۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ اس طرح وہ اپنی مجرمانہ زندگی کو ایک اخلاقی جواز بھی فراہم کر رہا تھا اور اپنے جرائم کی سنگینی کو کم کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے آدھے گھنٹے تک اس کی سنی۔ پھر اسے باہر نکال دیا۔

"اب اسے لے جاؤ۔ اس کا منہ بند رکھنا۔" میں نے کہا۔ "اس کے دوسرے بہادر ساتھی کو لے آؤ... اس سے بھی جھوٹ سچ پوچھ لیں۔" میں نے دیکھا کہ میری بات پر ڈاکو کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کا جھوٹ پکڑ لیا جائے گا۔ ایک ہی واردات میں ملوث ملزمان سے الگ الگ بیانات لے کر تضاد بیانی یا حقائق کے فرق کا پتا چلانا آسان ہو جاتا ہے۔ محسن ریوالور اس کی کمر سے لگا کے اسے دھکیلتا ہوا لے گیا۔ اس کی جگہ دوسرا مرغا آ گیا۔ حسبِ توقع اس کا بیان مختلف واقعات پر مبنی تھا۔ تیسرے کی باری آئی تو اس نے کچھ اور کہانی سنائی۔

میں نے انھیں ایک ساتھ طلب کیا اور صف بستہ کر دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے رعایت حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔" میں نے ان کے مقابل کھڑے ہو کے کہا۔ "تم سب نے جھوٹ بولا... اگر سچ ہوتا تو سب ایک ہی بات کہتے۔"

وہ خود بھی جانتے تھے کہ انھوں نے غلط بیانی کی تھی اور تین افراد کے الگ الگ بیان دینے سے ان کے سچ کا راز فاش ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے تو جو ایک کہتا تھا دوسرا اس کی تائید کر دیتا تھا۔

"اب میں تمھیں پولیس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم سب کے بیانات میں نے ٹیپ کر لیے تھے... احتیاطاً... پولیس وہ ٹیپ بجا کر سن لے گی تو تمھیں بجائے گی اور پھر وہ جانیں اور تم جانو... میرا نام تو اس کیس میں آئے گا نہیں۔ میں پولیس کو ہدایت کر دوں گا کہ دوسرے سب معاملات میں تمھارا چالان الگ الگ پیش کرے۔ اگر وہ ضروری سمجھیں گے تو تمھیں ہیروئن یا ناجائز اسلحے کے کیس میں بھی لے آئیں گے۔ اسلحہ تمھارے پاس ہے۔ ہیروئن اُن کے پاس ہوتی ہے۔"

"پولیس پر بہت اعتماد ہے تمھیں؟" ڈاکوؤں کے سردار نے مایوس ہو جانے کے بعد بہتر یہی سمجھا کہ اب وہ اپنی جراتِ رندانہ

کا مظاہرہ کرے۔ "مجسٹریٹ صاحب، وہ تو ہمارے بیلنگ پارٹنرز ہیں۔"

"سیلنگ پارٹنرز؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "ویری گڈ! اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو۔ سمجھتے ہو کہ اس اصطلاح کا مطلب کیا ہے؟"

"ہاں۔ جو کچھ نہ کرے مگر حصہ پورا وصول کرے۔" سردار نے اپنے ساتھیوں کی طرف فخر سے دیکھا۔ "یہ دونوں ان پڑھ ہیں مگر میں گریجویٹ ہوں، اسی لیے سردار ہوں ان کا۔"

"ماشاء اللہ! تعلیم سے خوب فائدہ اٹھایا تم نے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم ان دونوں سے زیادہ سخت سزا کے مستحق ہو جس نے زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود یہ راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اس پر چلایا۔ میں پولیس سے تمھارے ساتھ امتیازی سلوک کو کہوں گا۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ سب حصے دار ہیں۔ ہم ان سے مل بانٹ کر کھائے بغیر کچھ نہیں کرتے۔" وہ بولا۔ "تم جو چاہو کہو مگر وہ ہمیں حوالات میں بڑے آرام سے رکھیں گے۔ ہماری خاطر تواضع مہمانوں کی طرح کریں گے۔ اور ہماری ضمانت بھی کرائیں گے۔"

"ضمانت کے لیے تم کو میرے ہی سامنے لایا جائے گا نا۔" میں نے کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ تمھارا ضامن کون بنتا ہے۔ خود ضامن کو ایک ضامن کی ضرورت پڑ جائے گی۔ تم بھول رہے ہو کہ میں عام آدمی نہیں ہوں، ایک مجسٹریٹ ہوں۔ اگر میں تفتیش سے مطمئن نہ ہوا تو تھانے کے پورے عملے کا ٹرانسفر کرا دوں گا۔ اچھا ہوا کہ میں نے رحم کھا کے تم کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کی۔ تم راہِ راست پر آنے والے نہیں تھے۔ جاؤ بھئی، پولیس کو فون کر دو۔" میں نے محسن کی طرف دیکھ کر کہا، جو ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا۔

وہ پلٹا ہی تھا کہ ان تینوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا...

"سیدھے ہو جاؤ۔" محسن نے چلا کر کہا۔ "ورنہ شوٹ کر دوں گا۔"

"نہیں۔ گولی مت ضائع کرو۔" میں نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ کر کہا۔ "پہلے میں ان کو سمجھا دوں کہ مجسٹریٹ کی مار پولیس سے کتنی زیادہ سخت ہوتی ہے۔"

دس منٹ بعد وہ تینوں لیٹے پڑے ہوئے تھے اور اس قابل نہیں رہے تھے کہ پیروں پر کھڑے بھی رہ سکیں۔ سردار کا دایاں ہاتھ کلائی پر سے ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرے کے دو دانت کم ہو گئے تھے اور وہ قمیص کے دامن سے خون صاف کرتے ہوئے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ تیسرے کی شاید ایک پسلی ٹوٹ گئی تھی کہ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ اس کی صورت پر کرب نمایاں ہو جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ میں نے تینوں کو ایک ساتھ بہت بُری طرح رگیدا تھا۔ انھیں اٹھا اٹھا کے دیوار پر مارا تھا۔ دھوبی پٹخا دیا تھا۔ ٹھوکریں ماری تھیں اور

لاتیں مار مار کے ان کے چہرے بگاڑ دیے تھے۔ وہ انتہائی دہشت زدہ ہو گئے تھے اور شاید پچھتا رہے تھے کہ انھوں نے سچ نہ بول کر رہائی کا موقع گنوا دیا۔

"پولیس کے آنے تک اسے ہی اپنی جیل سمجھو۔" میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر میں اور محسن دروازے سے کان لگا کے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے کچھ دیر کراہنے اور ہائے ہائے کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ غالباً بات ایک دوسرے کو الزام دینے سے شروع ہوئی تھی کہ بہت جلد تلخ کلامی کی نوبت آ گئی مگر سردار جی نے انھیں ٹھنڈا کیا۔

"احمقو... الو کے پٹھو... خدا نے ایک موقع دیا ہے نکلنے کا تو اسے آپس میں لڑ کر گنوا رہے ہو۔" وہ بولا۔ "اس کھڑکی سے راستہ بناؤ اور نکل جاؤ۔"

"اور باہر نکلتے ہی انھوں نے گولی مار دی تو؟" ایک کراہ کے بولا۔

"یہ جُوا تو کھیلنا ہی پڑے گا۔ کچھ نہ کیا تو ذرا سی دیر میں پولیس آ جائے گی اور سب کو لے جائے گی۔" سردار نے کہا۔ "اور اس بار اگلا پچھلا سارا حساب برابر کرے گی۔ ہائے رب جی... کلائی توڑ دی ظالم نے۔"

"پولیس تو پہلے بھی لے جاتی رہی ہے ہیں۔"

"پہلے کی بات بھول جاؤ۔" سردار بولا۔ "وہ خرگوش اور ہرن تھے جن کا ہم شکار کرتے رہے۔ اس بار شیر کی کچھار میں پھنس گئے ہیں اور شیر بھی آدم خور۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں... ہائے..." تیسرا بولا۔ "کہ سو دن چور کے تو ایک کوتوال کا... یا میرے مولا... لگتا ہے پسلی حلق میں اتر گئی ہے۔"

"وہ کوتوال بھی بڑا خبیث ہے۔" سردار نے کہا۔

"بڑے مردم شناس لوگ ہیں۔" محسن نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "کیسی صحیح رائے دی ہے تیرے بارے میں۔"

"وہ مونچھوں والا گیدڑ تو ریوالور سے کر شیر ہو رہا تھا۔" دوسرا بولا۔

"سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے خوش ہو کے محسن کے کان میں کہا۔ "تیری ذات پر بھی بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔"

ہم نے تختے اکھاڑنے اور لکڑیوں کے ٹوٹنے کی دبی دبی آوازیں سن کر درز میں سے جھانکا۔ وہ کھڑکی کھولنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ زور آزمائی صرف وہ کر سکتا تھا جس کے دانت ٹوٹے تھے۔ ٹوٹی ہوئی کلائی اور شکستہ پسلی والے صرف اللہ کو یاد کر رہے تھے۔

"ہمارے بنک کا کیا ہو گا استاد... ہائے..." ٹوٹی پسلی والا بولا۔

"بھاڑ میں گیا بنک۔" سردار نے کہا۔ "یہاں سے نکل گئے تو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سارے نیک ہمارے ہیں۔"

"کسے معلوم تھا کہ سال بھر میں جتنا جمع کیا تھا سب یہیں رہ جائے گا۔" دوسرے نے دردناک لہجے میں کہا۔

"ایک لاکھ کم تو نہیں ہوتے استاد۔" کھڑکی سے کشتی لڑانے والے نے مُنہ دبا کے کبوتر کی طرح غرغوں کی۔

"اچھا تو جاؤ کھود کے نکال لو۔" استاد نے برہمی سے کہا۔ "اپنے اُسی ملامے مجسٹریٹ سے کہنا کہ جناب دوسرے کمرے میں ہم نے چوری کا مال گاڑ رکھا ہے۔ اجازت ہو تو لے جائیں۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لاکھ کی لاٹری نکلنے پر ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

"پاگل دے پتر... وہ مجسٹریٹ تو ہمیں ایسا اندر کرائے گا کہ شاید باہر آنے ہی نہیں دے گا۔" سردار نے کہا۔ "تینوں رائفلیں بھی تو لے لی ہیں اس نے اور وہ سب پولیس کی ہیں۔"

"ہم نے ان کا کرایہ دیا تھا۔ ہمیشہ دیتے آئے ہیں۔"

"مگر کیا پولیس والے مانیں گے؟" سردار خفا ہو کے بولا... "جب بات ان پر آئے گی تو وہ ہم کو پکڑ لیں گے کہ ہم نے یہ اسلحہ مال خانے سے چوری کیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں خدا کا شکر ادا کرو کہ یہ بے وقوفی ہو گئی ان سے کہ انھوں نے کھڑکی کی طرف دھیان نہیں دیا اور یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ کھڑکی میں سلاخیں نہیں ہیں۔ لعنت بھیجو سب پر اور نکلنے کی کرو۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ دوبارہ ہماری پرچھائیں بھی دیکھی تو چھوڑیں گے نہیں۔ اس بار مرغا بنایا تھا۔ اگلی بار مرغی بنائیں گے اور پھر کہیں گے کہ انڈا بھی دو... ورنہ ماریں گے۔"

"مگر استاد جی ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ کے بچے... یہاں سے بچ کر نکل گئے تو ایسے کئی لاکھ بنانے کا موقع ملے گا۔" سردار نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "بھول جا اس نقصان کو... فائدہ دیکھ کہ جیل جانے سے بچ گئے۔ ایک بڑا ہاتھ ماریں گے اگلی بار تو لاکھ پورے کرلیں گے۔"

جب وہ کھڑکی کھول کے اپنی دانست میں کامیابی سے فرار ہو گئے تو میں نے دروازہ کھول کر کھڑکی سے جھانکا وہ تینوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے گرتے پڑتے بدحواسی کے عالم میں پیچھے دیکھتے بھاگے جا رہے تھے۔ میرا ڈراما کامیاب رہا تھا۔ اب ان کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ ہمارے لیے اسی گھر میں کسی جگہ ایک لاکھ روپے مدفون بھی چھوڑ گئے تھے مگر اس کے باوجود مجھے افسوس ہو رہا تھا۔

"کاش ہم ان کو پولیس کے حوالے کر سکتے۔" محسن نے کہا۔

"کاش صرف اتنا ہی کر سکتا میں کہ انھیں سامنے کھڑا کر کے گولی مار دیتا، اور ان کی لاشیں یہاں گاڑ دیتا۔" میں نے کہا۔ "اس سزا کے مستحق تو تھے یہ لوگ۔"

"ہاں۔ ہم نے ایسے خطرناک مجرموں کو مزید جرائم کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔" محسن بولا۔ "مجرم ہم بھی ہو گئے۔ قانوناً بھی اور اخلاقاً بھی۔"

"یہ آئندہ جو کچھ کریں گے اس کا گناہ ہمارے سر بھی آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہماری خود غرضی تھی یا مجبوری کہ ہم نے انھیں نکل جانے دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ آئندہ بھی چوریاں کریں گے اور ڈاکے ڈالیں گے۔ ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں تھی۔"

"بس اتنا احساسِ پشیمانی بہت ہے۔" غالب نے آکے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "خدا تو جانتا ہے نیتوں کا حال۔ ہم مجبور تھے تو یہ ہمارے ذاتی مفاد کی مجبوری نہیں تھی۔ ہم ایک عظیم تر مقصد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یہ فرد اور معاشرے کی پرانی بحث ہے کہ کیا اجتماعی فائدے کی خاطر فرد کے حقوق کو قربان کر دینا چاہیے۔ فرد بھی اہم ہے کیونکہ افراد کے ملنے سے ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے مگر بعض اوقات انتخاب میں آزمائش کا مرحلہ آجاتا ہے۔ ایک ہی وقت میں تم اپنے وقت اور اپنی توانائی کو کہاں کہاں صرف کر سکتے ہو۔"

"یہ فلسفہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتا۔" محسن بولا۔ "اور میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کچھ بھی کرے اس کے غلط یا صحیح ہونے کا جواز بھی خود پیدا کر لیتا ہے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "فرض کرو تمھارے پاس دس منٹ ہوں اور تمھیں معلوم ہو جائے کہ دشمن نے دو جگہ ٹائم بم فٹ کر رکھے ہیں، ایک تمھارے دوست کے گھر میں جو پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے اور دوسرا کسی پُل یا پاور ہاؤس... اسکول یا اسپتال میں۔ اگر تم اپنے دوست کو خبردار کرنے گئے تو دوسرا بم پھٹ جائے گا جس سے اجتماعی نقصان ہو گا۔ وہاں پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ تم کدھر جاؤ گے؟ کسے بچاؤ گے... اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اپنے دوست کے گھر کو بچا سکتے تھے تم نے ان کو مر جانے دیا تو یہ صحیح فیصلہ ہو گا۔"

"اس مثال کا موجودہ حالات سے کیا تعلق؟" محسن بولا۔

"تم بڑے دشمن سے نمٹ رہے ہو۔ جو معاشرے کے نہیں ملک کی تباہی کے درپے ہے۔" غالب بولا۔ "یہ چور ڈاکو ایک محدود دائرے میں غیر قانونی سرگرمیوں سے چند افراد کو نقصان پہنچائیں گے۔ اگر تم ان کو سزا دینے یا دلوانے کے چکر میں پڑ جاتے تو دلاور اینڈ کمپنی کا کچھ نہ کر پاتے۔ وہ اس ملک کے عوام کو ان کی آزادی کو اور ان کی حُبّ الوطنی کو بیچ رہے ہیں۔ وہ بڑے ڈاکو ہیں۔ تم نے ایک منطقی طور پر درست فیصلہ کیا۔ چلو اب اندر چلو۔"

غالب نے بڑے غیر جذباتی انداز میں ہمارے اس فعل کو ایک

اخلاقی سند عطا کر دی تھی۔ اس طرح سوچنے پر خود ہماری نظر میں ہمارا جرم کوئی جرم نہیں رہا۔ اندر اب شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی ظاہری حالت پُرسکون تھی مگر وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ہم دلاور اینڈ کمپنی کے جال کو توڑ کر یہاں تک بحفاظت پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ میں نے انھیں مختصراً وہ سب بتا دیا جو میں نے کیا تھا۔ ہمارا منصوبہ کامیاب رہا تھا اور ہم نے بیک وقت دو کارنامے سرانجام دیے تھے۔ ایک طرف دشمن پر اپنی بھرپور قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ دوسری طرف انھیں اتنا مجبور اور بے بس کر دیا تھا کہ وہ شہلا اور رابعہ کو گزند نہیں پہنچا سکے تھے۔ دلاور کی یہ شکست انتہائی سبق آموز تھی۔ رابعہ اور شہلا کو اٹھاتے وقت اس کے ذہن میں صرف ہماری کمزوری کا خیال تھا اور اپنی شہ زوری کا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ رابعہ اور شہلا کی وجہ سے ہم کو دست وابستہ اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا اور اس کی ہر شرط کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وقتی کامیابی نے اسے بہت بڑی ناکامی سے دوچار کر دیا تھا۔ ڈی سلوا جس کوٹھی میں رہتا تھا وہاں اب بھی اس کا کوئی آدمی رہتا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ ان کے ایک ٹھکانے کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ وہاں رہنے والے بھی اگر مارے گئے تھے تو مجھے ان کی موت کا ملال نہیں تھا لیکن وہ اڈا بہرحال تباہ ہو گیا تھا۔ خود کو فرعون سمجھنے والے ایس پی کی کوٹھی کو بم سے اڑا دینا بھی ایسا کارنامہ تھا جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ جتنا دلاور اس تباہی و بربادی پر دل شکستہ و مشتعل تھا، اتنا ہی سراج بھی غصّے سے پاگل ہو رہا ہو گا۔ اصلی یا نقلی نواب خسرو جمشید کی ذلت بھی ان کے لیے بہت بڑی سزا تھی اور حشمت خان اگر مارا گیا تھا تو گویا ایک شیطان کم ہو گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ حشمت خان کے گھر سے عورتیں اور بچے نکل گئے تھے اور ایس پی سراج کی ماں کو نکال لیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کے ہم دشمن کے قلعے سے یوں نکل آئے تھے کہ وہ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے تھے۔ نہ جانے کتنے عرصے تک مسلسل کوشش کے بعد وہ ہمارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ ہم پھر روپوش ہو گئے۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ دلاور نے ڈاکٹر لطیف کے گھر میں رابعہ کو دیکھنے کے بعد ہی ہمارے پیچھے اپنے شکاری کتے لگا دیے تھے۔

رابعہ اور شہلا نے ہمیں بتایا کہ ان کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ "تم دونوں تو کھانا لینے نکلے تھے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں، مگر پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔" محسن نے اعتراف کیا۔

"اور تمھیں بالکل خیال نہیں آیا کہ گھر پر بیویاں بھوکی بیٹھی ہیں۔" شہلا نے خفگی سے کہا۔

"بیویاں؟" محسن نے میری طرف دیکھا۔ "یار کیا یہ جمع کا صیغہ درست ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چوری چھپے کسی اور سے بھی نکاح کر لیا ہے تو بتا دے۔ شہلا کو تو پتا چل گیا ہے۔"

"میری اکلوتی بیوی جانتی ہے کہ میں دوسری بار یہ حماقت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔" محسن بولا۔

"پھر کیا میرا حوالہ دیا ہے تیری اکلوتی بیوی نے؟" میں نے سر کھجایا۔

"پتا نہیں۔ یہاں جو دو عورتیں ہیں ان میں ایک تو یقیناً بیوی ہے جس کا شوہر میں ہوں۔" محسن نے غور سے رابعہ کو دیکھا جس کا رنگ لال ہو رہا تھا۔

"دیکھا تم نے باجی۔" شہلا نے ہنسی کو خفگی میں چھپائے رکھا۔ "کیسی بات پکڑتے ہیں اور پھر شروع کر دیتے ہیں اپنی بیت بازی۔"

"ایک گھنٹے تک تم لوگ نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہونا شروع ہو گئی تھی۔" رابعہ نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دے۔ "دستک ہوئی تو ہم نے یہی سمجھا کہ خیر سے بدّھو گھر کو آئے۔"

"اس وقت کسی اور کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔"

"گاہک اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔" محسن نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"گاہک سے کیا مطلب؟" شہلا نے آنکھیں نکالیں۔

"تمھاری اور ہماری جان کے گاہک ایک ہی ہیں۔" محسن نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ "اور وہی موت کے نامہ بر بھی ہیں۔"

"اتفاق سے میں کمرے میں تھی۔ شہلا نے دروازہ کھولا اور انھوں نے اندر آتے ہی اسے دبوچ لیا۔" رابعہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے اندر سے ہی پوچھا کہ کون ہے اور شہلا کا جواب نہیں ملا تو خود دیکھنے گئی۔ وہ اندر آکے زینے کی طرف لپک کر کھڑے ہو گئے تھے۔"

"انھوں نے تمھیں بھی دبوچ لیا۔ شاباش ہے تم دونوں کو۔" غالب نے کہا۔ "نہ ہوئی وہ شیر کی بچی ورنہ اکیلی دونوں کو دبوچ لیتی۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو زبان کے علاوہ ہاتھ پیر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔"

"گویا زبان درازی کے ساتھ دست درازی بھی آنا چاہیے معزز خواتین کو۔" محسن نے تائید کی۔ "اب نازو آئے تو اس کی شاگردی قبول کر لو۔"

"سوچ لو۔ سب سے زیادہ خطرہ بھی اُسے ہی لاحق رہے گا جو سب سے قریب ہو گا۔" شہلا ہنسی۔

"توبہ کرو توبہ۔" محسن کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "کس کو ڈرا رہی ہو نیک بخت... اپنے مجازی خدا کو..."

"سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں برادرِ عزیز۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔ "برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب تم لوگ باتیں ہی کرتے رہو گے۔" رابعہ نے کہا۔ "شام ہو رہی ہے۔ تم کو نازو اور ٹیڈی کی طرف جانا ہے۔"

"کمر باندھے ہوئے چلنے کو یہاں سب یار بیٹھے ہیں۔" غالب بولا۔ "کیوں یارو؟"

"بیٹھے کیا ہیں کھڑے ہیں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر بقولِ شاعر تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے۔"

"مطلب یہ کہ ٹھکانا تو وہ بھی تھا جہاں سے تم پتا ٹھکانا بتائے بغیر نکل گئی تھیں۔" محسن بولا۔ "ہر بار ایک بیوی کے لیے ایک جنگِ عظیم نہیں چھیڑی جا سکتی۔"

"اس سے تو آسان ہے کہ آدمی وہ کرے...." میں نے تائید کی۔

"عقدِ ثانی؟" غالب نے کہا۔

"نہیں یار... صبرِ جمیل۔" محسن بولا۔ "تم دونوں کو تو فکر ہے ہی نہیں... رات حوالات میں گزرے یا فٹ پاتھ پر... تم کیا جانو طولِ شبِ فراق کو۔"

"اچھا اچھا... اب جاؤ۔" شہلا نے کچھ شرما کے اور ڈانٹ کے کہا۔ "ہم اب یہیں ملیں گے۔"

"یہ لو میرا نعم البدل۔ میرا مطلب ہے میری عدم موجودگی میں یہ توپ تمہاری محافظ ہوگی۔" محسن نے ریوالور شہلا کو تھما دیا۔ "بس گولا چلاتے وقت دیکھ لینا کہ سامنے کون ہے۔ میں تو پہلے ہی مر چکا ہوں... تم پر۔"

"تم بھی یہ اضافی اسلحہ رکھ لو۔" میں نے اپنا ریوالور رابعہ کے حوالے کیا۔ "اگر تیرِ مژگاں اور خنجرِ ابرو ناکافی ہوں تو یہ داغ دینا، مگر یہ خیال تم بھی رکھنا کہ نشانہ کسی کا دل ہے۔ باقی وہی جو محسن نے کہا۔" وہ دونوں واک آؤٹ کر گئیں۔

ہم نے اپنے اسلحہ خانے سے دو نسبتاً جدید ریوالور نکالے۔ ان میں سے ایک پر سائلینسر بھی تھا۔ آج کی رات قتل و خونریزی کا امکان تو نہیں تھا لیکن احتیاط کے تقاضے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ فرنیچر کے سوا پرانے گھر کا تقریباً سب سامان یہاں منتقل کرلیا گیا تھا۔ اسلحہ خانے میں جو کچھ تھا دوسروں سے چھینا ہوا تھا اور آج تک ہر مشکل وقت میں ہمارے کام آیا تھا۔ ریوالور نسبتاً آسان حاصل رہے تھے ورنہ ہمارے ملکی قوانین کے تحت لائسنس بھی بڑی سفارشوں سے حاصل ہوتا تھا اور اس کے بعد اگر ریوالور ملتا تھا تو اس کی ایک ایک گولی کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ اب تک کی معرکہ آرائی میں سب سے اہم کردار وہ چار ٹائم بم ادا کر گئے تھے جو ہماری خواہش اور منصوبہ بندی کے مطابق ایک ایک گھنٹے کے فرق سے پھٹ گئے تھے۔ چوتھا بم پھٹنے سے پہلے شکاری چوکڑی بھول گئے تھے۔ سب سے بڑے شکاری نے یقین کرلیا تھا کہ چوتھے بم پر اس کے خاندان کی زندگی اور ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور وہ ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا سودا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو ہم نے خواتین کو سختی سے تلقین کی کہ وہ دروازے بند کر کے قلعہ بند ہو جائیں اور ہمارے لیے بھی اس وقت دروازے کھولیں جب ان کو یقین آجائے کہ ہم ہی آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی ہمیں یہاں تک لانے والا نہیں ہے۔

"ہدایت نمبر ایک۔" محسن نے کہا۔ "اسے تم حکم سمجھو۔ اپنے مجازی خدا کا۔ ریوالور کو میرے خیال کی طرح دل سے جدا نہ کرنا۔"

"ہدایت نمبر دو...." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولنا ہی پڑ جائے تو اس طرح مت کھولنا جیسے پہلے کھولا تھا۔ شہلا دروازے تک کسی محفوظ مقام پر چھپ کر دیکھتی رہتا اور ریوالور تیار رکھنا۔ اس میں سات گولیاں ہیں اور تم کو سات خون معاف ہیں۔ ایک بس شہلا کا نشانہ مت لینا۔"

"اگر بھوت اور جنات یا خبیث ارواح تم کو اسی طرح نکالنا چاہیں جیسے ہم نے ان تین ڈاکوؤں کو نکالا تھا تو چیخ مار کے بے ہوش ہو جانا۔ یہ کام تو خواتین کے لیے مشکل نہیں ہوتا مگر بھوت اور ارواحِ خبیثہ کے لیے لخلخہ لانا مشکل ہو جائے گا۔" غالب بولا۔ "وہ لخلخہ لینے جائیں گے تو انشا اللہ لوٹ کر نہیں آئیں گے... یہ ہدایت نمبر تین ہے۔"

"بھوتوں سے پہلے آپ لوگ جو آجائیں گے۔" رابعہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ان کی صورت دیکھتے ہی بھاگ گئے ہوں گے۔" شہلا کی آواز پیچھے سے سنائی دی۔ ہم تینوں اپنے بدلے ہوئے حلیوں کے باعث اصلی صورت میں تو نہیں تھے لیکن مقامِ افسوس یہ تھا کہ جتنی محنت موسیٰ بھائی نے ہمارا حلیہ بدلنے میں کی تھی وہ رائیگاں گئی تھی۔ کم سے کم میری موجودہ صورت کو شکاری دیکھ چکے تھے۔ رات کا اندھیرا جو آہستہ آہستہ شام پر غالب آرہا تھا ہمیں تھوڑا سا تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ وقت ہوتا تو ہم ایک بار پھر چہرہ بدل لیتے کیونکہ وہ جگہ بھی شکارگاہ تھی جہاں نازو انتہائی جرأت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اکیلی پہنچ گئی تھی۔ اس جگہ سے بہت قریب ٹیڈی ایک خطرناک مشن کی نگرانی کر رہا تھا۔

"میاں سکندرِ اعظم۔" غالب نے کچھ دور آجانے کے بعد کہا۔ "ہم کوئی بے وقوفی تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"بے وقوفی تو ہم اکثر کرتے ہیں۔ وضاحت فرمایئے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمارے ساتھ... آگے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے... والی بات نہ ہو جائے...." غالب بولا۔ "وہاں پہنچیں اور معلوم ہو کہ شکاری پہلے سے استقبال کے لیے موجود ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا تو ٹیڈی گرفتار ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"اور نازو کو بھی مہلت نہ ملتی۔"

"یہ مہلت بھی تو ایک چال ہو سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا یہ ناممکن ہے کہ انھوں نے نازو کو بھی شناخت کرلیا ہو۔ جانتے بوجھتے اس کو گھر میں گھسنے دیا ہو۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔"

"ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا مرزا جی... مگر..."

"مگر کیا۔ تم نے فرض کرلیا تھا کہ شکاری ڈاکٹر لطیف کے گھر میں رابعہ کو دیکھ کے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔" غالب بولا۔ "کیا ثبوت ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا؟"

"تمہاری ناقص عقل کیا کہتی ہے آخر؟" محسن نے کہا۔

"کیا یہ بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے نازو کو پہچان کے اس پر نظر رکھی ہو۔" غالب نے کہا۔ "اس طرح کہ خود نازو کو خبر نہ ہو۔ انھوں نے اس کے پھیلائے ہوئے جال کا ہر پھندا دیکھ لیا مگر خاموش رہے۔ میں اور ٹیڈی صبح شام ڈیوٹی بدلتے رہے اور بزعم خود بڑی کامیابی سے اپنی سراغ رسانی کا اڈا چلاتے رہے۔ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے ہمارے اڈے تک آپہنچے۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "پھر اب کیا کریں... یہیں سے واپس لوٹ جائیں؟ نازو اور ٹیڈی کو چھوڑ دیں؟"

"یہ کون اُلو کا پٹھا کہہ رہا ہے۔" غالب نے چڑ کے کہا۔ "خود کو بہت زیادہ عقلمند سمجھنے والا جھک مارتا ہے۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور کتنا چالاک اور عیار آدمی ہے۔"

"ہماری صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔" محسن بولا۔

"سکندر تو چوہدری دلاور سے مل آیا ہے۔ اور اس کا چہرہ دلاور بھول نہیں سکتا۔" غالب نے کہا۔ "ہماری شکل کا بھی بھروسا نہیں۔ وہ سب کی اصلیت جان چکے ہوں... کہ یا جوج ماجوج اور منکر نکیر تو ساتھ ساتھ ہی ملیں گے جہاں بھی ملیں گے۔ میرا مطلب تھا کہ ہمیں الگ الگ رہنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ مونگ پھلی... ریڑھی اور حلوا حقیقین کو ایک ہی بار سمیٹ کر اندر لے جائیں اور نازو کے سامنے پیش کردیں کہ لیجیے خاتون... یہی ہیں نا وہ جو خود کو شکاری کہتے اور سمجھتے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ریڑھی سے دُور رہیں گے۔" محسن بولا۔

"لیکن ٹیڈی کو اپنی تشریف آوری کی اطلاع دے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ جب تک اس کی طرف سے آل کلیئر کا سگنل نہیں ملے گا ہم قریب نہیں جائیں گے۔"

ٹیڈی اپنی جگہ موجود تھا۔ یہ ہم نے دُور سے ہی دیکھ لیا۔ ہم نے تین مختلف سمتوں میں پوزیشن سنبھالی۔ میں گلی کے دوسرے کنارے پر رہا۔ غالب اور محسن میں سے ایک کو میرے ساتھ رہنا تھا۔ محسن نے میرا ساتھ دینا پسند کیا۔ گلی کے اس کنارے پر ایک کیفے فٹ پاتھ تھا۔ چائے والے نے چولھا اور دوسرے آلات و اسباب چائے سازی اپنے اطراف میں پھیلا رکھے تھے اور فٹ پاتھ کو بلاک کرنے کے لیے یوں بند کیا تھا کہ چوڑائی کے رُخ دونوں جانب دو لکڑی کے تختوں کی بنچیں لگا دی تھیں۔ فٹ پاتھ پر آنے والوں کو سڑک سے نیچے اتر کے چائے خانے کی حدود سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ کوئی بھی راہگیر فٹ پاتھ پر چلنے کا قانونی حق ان سب سے طلب نہیں کرسکتا تھا جو بنچوں پر اکڑوں یا آلتی پالتی مار کے بیٹھتے تھے اور چائے نوش کرتے تھے۔ گپ لگاتے تھے اور کیفے سرِ راہ کی رونق بڑھاتے تھے۔ محسن نے بھی اسی چائے خانے سے رجوع کیا اور جم کر بیٹھ گیا۔ وہاں ایک کپ چائے پینے والا اگر دو گھنٹے بھی بیٹھا رہے تو کیفے کے مالک ذرا معترض نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت صرف دو ہی افراد تشریف فرما تھے وہاں چنانچہ محسن شریکِ محفل ہو گیا اور نہ جانے کس فضول مسئلے پر بحث میں الجھ گیا۔ اس کی نظر مجھ پر رہی۔

میں نے ٹیڈی کو وائرلیس پر سگنل دیا تو فوراً اس کی طرف سے جواب آیا۔ "آگئے ہو اپنے سکندر بادشاہ۔" وہ بولا۔ "مجھے تو سخت تشویش لاحق ہو رہی تھی۔"

"کیوں استاد! ڈر کس کا تھا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"ڈر تو قسم مولا علی کی کسی کا نہیں..." وہ بولا۔ "سب سے اکیلا بھی نمٹ لیتا میں۔"

"سب کون؟" میں نے کہا۔

"ارے وہی سب بدمعاش۔ دلاور آخر میں پہنچا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "اس سے پہلے ایک گاڑی میں دو آدمی آئے تھے مگر میں انھیں دیکھ نہیں سکا۔ انھوں نے پردے ڈال رکھے تھے پچھلی سیٹ پر۔"

"نازو کی طرف سے کوئی اطلاع ملی؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "تم بتاؤ شہلا اور رابعہ کی کوئی خبر..."

"ہم انھیں لے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خراش تک نہیں آئی دونوں کو۔ تفصیلات اس وقت نہیں بتا سکتا۔"

"شکر ہے میرے رب کا۔" ٹیڈی بولا۔ "تشویش اسی بات کی تھی کہ سارا دن گزر گیا تھا اور تمہاری طرف سے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ سارے دن میں آدھا خون تو خشک ہو گیا ہوگا میرا۔"

"باقی آدھا خشک مت ہونے دینا استاد۔" میں نے کہا۔ "ہم سب تمہاری حفاظت کر رہے ہیں۔"

"وہ مرزا غالب کا بھتیجا کہاں ہے؟ اس نے چارج نہیں لیا مجھ سے۔"

"وہ تمہارے بہت قریب کہیں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "میں گلی کے دوسرے کنارے پر تمہارے بہنوئی کے ساتھ مورچہ بند ہوں۔ ہم سب مسلح ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو دونوں طرف سے راستے بند کردیں گے۔ خدانخواستہ انھوں نے نازو کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تو پھر کھلی جنگ ہوگی۔"

"نازو کا آخری پیغام مغرب سے ذرا دیر پہلے ملا تھا۔" ٹیڈی بولا۔ "اس نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ دُور رہے گی۔ اس نے وہ متفقاً

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مائکروفون صحیح جگہ پرفٹ کردیا ہے جہاں ان سب کے جمع ہونے کی امید ہے۔ ان کی سب گفتگو براہِ راست سنائی دے گی۔ تم بھی سنو گے نا؟"

"تم نے ٹیپ ریکارڈر بھی سیٹ کرلیا ہے نا؟"

"ہاں۔ لیکن ابھی تک تو بالکل خاموشی ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"وہ تینوں بہن بھائی گھر میں ہیں؟"

"ہاں۔ پرویز وکٹر اور اس کی بہن موجود ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "اب وہ تین نہیں، دو رہ گئے ہیں۔"

"میں بھول گیا تھا کہ سلیم وکٹر مارا جا چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے خبر دیکھی ہو گی۔"

"دیکھی تھی... تصویر بھی دیکھی تھی۔ کیا۔ اسپتال میں وہی ڈاکٹر بنا ہوا تھا اور اسی نے تم پر فائر کیے تھے؟" ٹیڈی بولا۔

"ہاں استاد۔ دلاور نے اسے ایک بہت اہم فرض دار سونپی تھی اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ رابعہ اور میں اسپتال سے نہ نکل سکیں اس کے لیے بہت اچھا انتظام کر دیا گیا تھا۔ مگر وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کی سزا یہی ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے... یہ حادثہ نہیں تھا... قتل تھا؟"

"ہمارے ساتھ اتنا عرصہ ہو گیا تمھیں استاد مگر تم ابھی تک بہت سیدھے ہو کہ ان لوگوں کو نہیں سمجھے۔" میں نے کہا۔ "یہ انسانوں کو استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لیے نقصان ہو جانے تو یہ آدمی کی ایک بھی غلطی کو معاف نہیں کرتے۔"

"حالانکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔" استاد ٹیڈی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"غلطی مشین سے بھی ہو جاتی ہے۔ روبوٹ اور کمپیوٹر سے بھی ہو سکتی ہے تو آدمی کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا سلیم وکٹر کی لاش گھر آئی تھی؟"

"نہیں... میں نے صبح خبر پڑھی..."

"تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا ہو گا۔ خبر کسی نے براہِ راست اخبارات کو دی تھی۔" میں نے کہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"جرائم اور حادثات کی خبریں عموماً تھانوں سے جمع کی جاتی ہیں یا پھر عدالتوں سے۔" میں نے کہا۔ "حادثات کی خبریں اسپتالوں سے ملتی ہیں یا پھر اتفاق سے کوئی رپورٹر جائے حادثہ پر موجود ہو تو خود دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ شہر کے کسی حصے میں حادثہ آٹھ نو بجے بھی پیش آئے تو اخبار والوں کو اگلے دن ہی پتا چلتا ہے اور خبر اس سے اگلے دن آتی ہے۔ نہ کوئی تھانہ کسی اخبار والے کو اطلاع دیتا ہے، نہ اسپتال... مگر یہ خبر اسپتال سے منسوب کی گئی تھی۔ اسپتال والوں نے اسے جھوٹ قرار دیا۔ میں نے معلوم کیا تھا۔"

"اس کی لاش تو گھر بھی نہیں پہنچی۔ میں سارا دن منتظر رہا۔ سونیا کو پرویز وکٹر دن کے ایک بجے گھر لے آیا تھا۔ وہ بہت دور رہی تھی۔ لیکن اس ایمبولینس سے لاش کوئی نہیں آتاری گئی۔" ٹیڈی نے کہا۔ "کیا انھوں نے لاش کو غائب کر دیا ہو گا؟"

"ابھی کچھ دیر میں حقیقت سامنے آ جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میرے دو نظریات ہیں۔ ایک یہ کہ حادثہ ہوا ہی نہیں۔ سلیم وکٹر کو گولی مار کے کہیں گاڑ دیا گیا۔ لیکن اس کے امکانات کم ہیں۔ پرویز وکٹر اور سونیا کو اپنا دشمن نہیں بنائیں گے۔ انھیں اس فیملی کی خدمات کی ضرورت ہے۔ یہ بھائی بہن ملک و قوم اور دوسروں کے لیے جیسے بھی ہوں، آپس میں کوئی بیر نہیں رکھتے اگر ان کے درمیان محبت نہ ہوتی تو اس عمر کو پہنچنے تک وہ الگ ہو جاتے اور اس کام کو یوں مل کر نہ کرتے۔ ان کے مزاجِ طبیعت اور عادات میں فرق ہوتا تو یہ اتفاق کیسے ہوتا ان میں... یہ تو ایسا کام ہے کہ ایک کی سوچ بھی مختلف ہوتی تو وہ باقی دو کو بھی کچھ نہ کرنے دیتا۔ لیکن یہ تینوں ایک ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہو گی۔ اگر وہ سلیم وکٹر کو قتل کریں گے تو باقی دو باغی ہو جائیں گے۔ یہ سوچیں گے کہ کل یہی ہمارے ساتھ نہ ہو۔ مشتعل ہونے کے بعد وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کو سب معلوم ہے اور جسے سب معلوم ہو اس سے ڈرنا پڑتا ہے۔ یہی ان تین بہن بھائیوں کی طاقت ہے کہ کسی ایک کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اب یا تو دلاور اینڈ کمپنی سب کو ختم کرے اور سب کو برداشت کرے۔ سب کو ختم کیا تو کام رُک جائے گا۔ یہ پرانے بھروسے کے قابل اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ فوراً ایسے لوگ نہیں مل سکتے جو ان تینوں کی جگہ لے لیں۔"

"تمھاری باتیں اپنے پلے نہیں پڑیں سکندر بادشاہ۔ تم ایک طرف کہتے ہو کہ سلیم وکٹر کو اس کی غلطی کی وجہ سے قتل کر دیا گیا۔ دوسری طرف اپنے کہنے کی تردید کرتے ہو۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "سیدھی بات کرو۔"

"بات ٹیڑھی ہے کیونکہ یہ لوگ ٹیڑھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور دھوکا دینے کے ماہر ہیں۔ انھوں نے خبر دے کر ہمیں مطلع کیا ہے کہ سلیم وکٹر کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اسپتال میں بوگس ڈاکٹر بن کے پہنچا تھا۔ اسپتال والوں کی جان چھوٹ گئی اور وہ بھی مطمئن ہو گئے کہ چلو خس کم جہاں پاک۔ لیکن حقیقت اس کے بر عکس ثابت ہو گی۔ سلیم وکٹر سو فیصد زندہ ہو گا۔ بس اسے منظر سے ہٹا دیا گیا ہے کیونکہ وہ بہت نمایاں ہو گیا تھا... یہ آوازیں..."

"ہاں... میں بھی سن رہا ہوں۔" استاد ٹیڈی بولا۔ "شاید وہ لوگ میٹنگ کے لیے آ گئے ہیں... اب کچھ مت بولنا کیونکہ میں ٹیپ ریکارڈر کو آن کر رہا ہوں۔"

میرے کانوں میں بیک وقت بہت سے لوگوں کے بولنے کی آواز آنے لگی تھی۔ یوں جیسے کرکٹ میچ کی کمنٹری کے پس منظر میں لوگوں کا شور... آہستہ آہستہ آوازیں بلند اور صاف ہونے لگیں۔ پھر کوئی دروازہ کھلا اور یکلخت میرے لیے آوازوں نے ایک واضح شکل اختیار کر لی۔ سب سے نمایاں آواز نازو کی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ بڑی مظلومیت کے ساتھ زیادہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آواز بدلی تھی مگر میں اسے لہجے سے شناخت کر سکتا تھا۔ "میں ایک غریب لاوارث عورت ہوں۔"

"چپ کھڑی رہ ادھر۔" یہ آواز دلاور کی تھی۔ "کس نے بھیجا تھا یہاں تجھے... بول..."

"میں تو خود ہی آ گئی تھی جی۔" نازو نے روتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی نے رحم کھا کے رکھ لیا مجھے۔"

طمانچے کی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ "خود ہی آ گئی تھی۔" دلاور نے اس کے الفاظ دہرا کے کہا۔ "بکواس کرتی ہے اُلو کی پٹھی۔"

نازو نے سخت واویلا کیا۔ "ہائے ہائے میں مر گئی... ارے ظالمو... غریب بڑھیا پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ ارے کوئی تمھارے جیسا جوان بیٹا ہوتا میرا تو تم سے نمٹ لیتا... گالیاں دیتے ہو مجھے۔ اللہ کے عذاب سے ڈرو۔"

"اداکارہ اچھی ہے بڑھیا۔" اس بار خسرو جمشید کی آواز میں نے پہچان لی۔

"دیکھ مائی... جھوٹ نہیں چلے گا۔" دلاور نے بدلے ہوئے یا کچھ نرمی سے کہا۔ "تو نہیں جانتی ہم کون ہیں۔"

"کیا ضرورت ہے مجھے جاننے کی۔" نازو نے دھاڑیں مار مارے رونا شروع کیا۔ "میں تو اس گھر کی نوکرانی ہوں۔ گھر سمجھ کے رہتی تھی اس گھر کو بھی... تم کہاں سے آ گئے... خدا غارت کرے نصیں۔ بس میں جا رہی ہوں جی... عزت سے ملازمت کی روٹی ملتی تھی... کسی نے کبھی کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ چھوٹی بی بی ا بڑی بی بی... سب نے بڑا اچھا سلوک کیا میرے ساتھ... مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اس گھر کے مہمان اتنے کمینے ہوں گے... اچھے مہمان ہیں یہ کہ گھر کے نوکروں کو مارتے ہیں اور مالک چپ رہتے ہیں۔"

"ادھر کہاں جا رہی ہے؟" دلاور کے چمچے پیڈرو نے گرج کر کہا۔

"جا رہی ہوں جہاں مقدر لے جائے۔ یہاں اب نہیں رہ سکتی میں۔" نازو نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "ہٹ جا میرے راستے سے کمینے۔"

نازو کے ایک اور جھاپڑ مارا گیا اور غالباً پیڈرو نے مارا ہو گا۔ نازو نے ایک دل گداز چیخ ماری۔ "ارے کوئی بچاؤ... یہ مُشٹنڈے مار ڈالیں گے مجھے... کسی کو رحم نہیں آتا ایک عورت پر... خدا نے بے آسرا کر دیا مجھے... ورنہ میرے بھی دو جوان بیٹے تھے۔"

"پھر کہاں گئے وہ؟" پیڈرو تلخی سے ہنسا۔ "ماں کو چھوڑ کر بھاگ کر ہی گئے ہوں گے۔"

"اللہ نے اٹھا لیا انھیں۔" نازو نے روتے دھوتے کہا۔ "چھوٹا تو لڑکے پیچھے آ گیا۔ بڑا جنگ سے نہیں لوٹا... بالکل اس کے جیسا تھا۔ یہی صورت شکل یہی قد کاٹھ... ایسی ہی آواز بھی تھی اس کی۔ سچ بتا تو وہی تو نہیں ہے؟"

"تیرا دماغ خراب ہے بڑھیا۔" دلاور نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ نازو نے اس کو جذباتی کمزوری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی جرأت اور بے باکی کا میں پہلے ہی قائل تھا۔ ذہانت اور اداکاری کی صلاحیت کا معترف تھا۔ جوڈو کراٹے میں اس کی مہارت کو تسلیم کرتا تھا جس سے فائدہ اٹھا کے اس نے بڑے بڑے شہ زور مردوں کو چت کیا تھا۔ اس کے حسن بے مثال کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا۔ اس ہمہ صفت اور مجموعۂ حسن و خوبی کی شخصیت پر میں پوری ایک کتاب رقم کرتا تو الفاظ کم پڑتے۔ اگر میں مصور ہوتا تو مجھے رنگ ناکافی ہوتے جو اس پیکرِ جمال کے عکس کو اتار سکیں اور میں شاعر ہوتا تو اس کے وجود کی رعنائی پر نہ جانے کتنے دیوان لکھ دیتا... محبت ایک الگ جذبہ تھا جس کا مرکز صرف رابعہ کی ذات تھی اور میرے خیال کی دنیا اسی کے تصور سے آباد رہتی تھی مگر نازو کے بارے میں میرے حقیقی جذبات یہی تھے کہ شاید اس حسین لڑکی کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے ایک بار تخلیق کر کے شاہکار کی طرح بنایا اور پھر بے شکل کر دیا۔ شاہکار تو ایک ہی بار تخلیق ہوتے ہیں۔ اگر محبت کرنا اپنے اختیار کی بات ہوتی تو میں ہزار بار اس سے محبت کرتا۔

اس وقت وہ انتہائی ہمت اور حاضر دماغی کے ساتھ بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی اور دلاور کو اپنے بیٹے کی طرح بنا کے اس نے زبردست چال چلی تھی۔ دلاور کا لہجہ کمزور پڑ گیا تھا۔ مضبوط سے مضبوط نظر آنے والے مرد کے گرد بھی ایک جذباتی فصیل موجود رہتی ہے جو کہیں نہ کہیں سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ نازو نے اس کمزور حصے کا پتا چلانے کے لیے اندھیرے میں ایک پتھر پھینکا تھا اور جہاں یہ پتھر لگا تھا وہاں سے گونج آئی تھی جو ٹھوس حصار کے پیچھے خلا کا پتا دیتی تھی۔

"میں کتنے سالوں سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہو گا۔" نازو نے دیوانوں کی طرح کہا۔ "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے... ہے تو مجھے پہچانتا کیوں نہیں ہے آخر؟"

"لاحول ولا قوۃ... ارے اماں مجھے معاف کر۔" دلاور نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں تیرا بیٹا نہیں ہوں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو... وہ تو بڑا رحمدل تھا کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔" نازو نے اسی لہجے میں کہا۔ "کسی کا دل نہیں دکھایا تھا اس نے۔ سب کی عزت کرتا جاتا تھا... ہر بوڑھی عورت اس کی ماں تھی جب وہ گیا تھا تو میں نے کہا تھا کہ بہادر... یہ اس کا نام تھا۔ بہادر تو نام کا بہادر نہیں ہے۔ بہادری کمزور پر ہاتھ اٹھانے میں نہیں ہے۔ خبردار جو کسی عورت پر کسی بچے پر... بوڑھے یا بیمار پر ہاتھ اٹھایا۔"

"بند کر اپنی بکواس۔" پیڈرو نے پھر اس کے ہاتھ مارا۔ "بھونکتی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جا رہی ہے کتیا کی طرح ۔" نازو مار کھا کے بھی مشتعل نہیں ہو رہی تھی۔
"پیڈرو۔" دلاور نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔" یہ ایسے ہی بتا دے گی۔ مار مت اسے۔"
" استاد! یہ بہت مکار لگتی ہے مجھے۔" پیڈرو نے کہا۔
" پیڈرو... یہ کئی دن سے ہمارے گھر میں ہے۔" یہ آواز سن کے میں چونک پڑا کیونکہ یہ سلیم وکٹر کی آواز تھی۔ وہ سلیم وکٹر جو البرٹ وکٹر اسپتال میں مجھ سے "ڈاکٹر حکیم بن" کے ملا تھا اور اخباری اطلاع کے مطابق حادثے میں ہلاک ہو چکا تھا۔
" ہم نے اس پر مسلسل نظر رکھی ہے۔" پرویز وکٹر بولا۔" ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔"
" تم دونوں ہر وقت گھر میں نہیں رہتے۔" پیڈرو نے برہمی سے کہا۔
" میں نے سارا دن گھر میں رہ کے بھی دیکھا ہے۔" یہ آواز سونیا کی تھی۔
" ہم نے اپنی ماں کو بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ کوئی مشتبہ حرکت کرتی نظر آئے تو ہمیں بتانا۔" سلیم وکٹر بولا۔" اس عرصے میں نہ یہ کہیں گئی اور نہ کوئی اس سے ملنے کے لیے آیا۔"
" تم سب بلا وجہ اس کی طرف داری کر رہے ہو۔" پیڈرو بولا۔
" مجھے صرف دس منٹ دو۔ میں اسے الٹا لٹکا کے سارا سچ اگلوا لیتا ہوں۔"
" میرا بھی خیال ہے کہ اس کا یہ ظاہری روپ میک اپ کا نتیجہ ہے اور اصل چہرہ مختلف ہوگا۔" نواب خسرو جمشید کی آواز پہلی بار آئی۔
" میک اپ کیا میں کھال اتار کے دیکھ لوں گا۔" پیڈرو نے غالباً نازو پر ہاتھ ڈالا تھا کہ اس نے چیخ ماری۔
" پیڈرو!" اس مرتبہ دلاور کے لہجے میں برہمی نمایاں تھی۔
" کیا کہا تھا ابھی میں نے... خبردار جو اسے پھر ہاتھ لگایا۔"
میں یہ سب کچھ ایک ریڈیو ڈرامے کی طرح سن رہا تھا جس میں مرکزی کردار ادا کرنے والوں کے ڈائیلاگ مکمل اور واضح صوتی اثرات کے ساتھ سنائی دیتے تھے۔ میں اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا جہاں حقیقی زندگی کا یہ پُر جوش ڈراما کھیلا جا رہا تھا لیکن چشم تصور سے میں خود کو اسی جگہ محسوس کر سکتا تھا۔ سارے کردار میرے دیکھے بھالے تھے اور میں ان کی صورت کے ہر تاثر کو اور ان کی تمام حرکات و سکنات کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک بالکل غیر متوقع صورت حال تھی۔ ہم میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس وقت جب نازو کی پوزیشن وکٹر فیملی کے گھر میں محفوظ ہو چکی ہے، اس کے خلاف نئے سرے سے انکوائری شروع ہو جائے گی لیکن ایسا ہونا عین ممکن تھا۔ نازو کو اس گھر کے اندر جگہ دلوانے میں تینوں بہن بھائیوں سے زیادہ ان کی بوڑھی ماں کی خواہش اور ضرورت کا دخل تھا۔ دلاور، پیڈرو اور خسرو جمشید مختلف لوگ تھے۔ زیادہ خطرناک اور شک کرنے والے۔ وہ سفاک اور بے رحم شکاری نازو کو یوں گھیر چکے تھے جیسے معصوم ہرنی کو خونی بھیڑیوں کا غول سمت سے نرغے میں کر لے۔
کسی نے دروازے پر دستک دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ کسی حد تک اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوں۔
" کون ہے؟" پیڈرو نے کہا۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دلاور کی بات سے کتنا مشتعل ہوا ہے۔
" تمہارا باپ۔" جواب ملا۔ آواز بند دروازے کے پیچھے سے آئی تھی لیکن میں نے پہچان لی۔ یہ ایس پی سراج تھا۔ دروازہ نہ جانے کس نے کھولا۔
" میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ میرے باپ کی بات نہ کیا کرو۔" پیڈرو نے سخت برہمی سے کہا۔
" آئندہ تم بھی اس لہجے میں بات کرنے کی بھول مت کرنا۔" ایس پی سراج نے خطرناک آواز بنا کے کہا۔
" گلا چھوڑو میرا..." پیڈرو کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔
" سراج! یہ کیا کر رہے ہو تم۔" دلاور نے کہا۔" چھوڑو اسے۔"
" اس دو ٹکے کے بدمعاش کو سمجھا دو کہ یہ اپنی اوقات نہ بھولے اور یہ نہ بھولے کہ میں ایس پی ہوں۔" سراج نے کہا۔" اگر کسی نے تم کو اس کا باپ کہلانا قبول نہیں کیا تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔"
" لیکن تمہیں بھی وہ بات نہیں کرنا چاہیے جو میں برداشت نہیں کر سکتا۔" پیڈرو نے پھنکارتے ہوئے کہا۔
" کانے کو کانا کہو تو وہ بھی برداشت نہیں کرتا جس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہوں وہ نوٹس ہی نہیں لیتا۔" سراج بولا۔" یہ تمہاری ایک آنکھ کا قصور ہے... میرا نہیں..."
" بہت ہو گئی سراج۔" دلاور نے غرا کے کہا۔" تم نے آتے ہی فساد پھیلا دیا۔ یہاں تم ایس پی نہیں ہو... یہ بات بھی سمجھ لو تم بھی ہم میں سے ایک ہو۔ ہم تمہیں سیلوٹ نہیں کر سکتے... نہ تم ہمارے افسر ہو اور نہ یہ تھانہ ہے۔"
" چلو بات ختم ہوئی۔" نواب خسرو جمشید سب سے کم بولنے والا آدمی تھا۔ اس نے بر وقت مداخلت کی۔
" یہ عورت کون ہے؟" سراج نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا اور میں نے تصور کیا کہ وہ مظلوم بن کر روتی ہوئی اور کانپتی ہوئی نازو کو نظر سے گھور رہا ہوگا۔
" یہ اس گھر کی نئی ملازمہ ہے..." پیڈرو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔" خود کو لاوارث اور مظلوم کہتی ہے۔ اس سے زیادہ اپنا اتا پتا کچھ نہیں بتا سکتی کہ اس کے دو بیٹے تھے جو مر گئے اور اب اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"
" اس طرح کسی بھی اجنبی پر اعتبار کر لینا حماقت ہے۔" سراج بولا۔" یہی میں نے بھی کہا تھا۔" پیڈرو بولا۔" مگر سلیم کے گھر میں سب اس کو بھروسے کے قابل سمجھتے ہیں۔ سب مطمئن ہیں کہ یہ بے ضرر ہے۔ بلکہ ہمارے چوہدری صاحب کو اس مکار عورت نے اپنی اداکاری سے موم کر لیا ہے۔"
" یہ میں کیا سن رہا ہوں دلاور... کیا تم کسی تفتیش کے بغیر ہی مطمئن ہو جاؤ گے؟" سراج بولا۔
" آخر کیا تفتیش کرو گے تم؟" دلاور نے کہا۔ جھنجلاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ دوسرے چاہتے ہیں، وہ اسے منظور نہیں مگر وہ سب کو روکنے سے بھی قاصر تھا۔
" ایس پی صاحب! میں کہتا ہوں کیا یہ اداکاری نہیں ہو سکتی؟ اس کا رونا دھونا اور مکر کرنا۔" پیڈرو کا حوصلہ بڑھ گیا۔" کیا اس کی صورت پر میک اپ کا جھوٹا نقاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمارے چوہدری صاحب کا دل بہت نرم ہے نا۔ اس بات سے پگھل گیا ہے کہ اس کے ایک بیٹے کو بس نے کچل دیا تھا اور دوسرا بالکل ہمارے چوہدری صاحب جیسا تھا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔" انہی کی شکل و صورت رکھنے والا۔ آواز بھی ایسی ہی تھی اس کی۔ اور کمال یہ ہے کہ اس کا نام بہادر تھا۔ دلاور اور بہادر میں کیا فرق ہے۔ وہ جنگ میں لاپتا ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھ لیا کہ تم وہی تو نہیں ہو اور یہ چوہدری صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے۔"
ذرا سی دیر میں صورت حال بدل گئی تھی۔ جب سراج آیا تھا تو اس نے پیڈرو کا گلا دبوچ لیا تھا اور اسے دلاور نے چھڑایا تھا۔ دو منٹ بعد وہ سراج کی حمایت میں اور دلاور کی مخالفت میں بول رہا تھا۔ دلاور یقیناً اندر ہی اندر کھول رہا ہوگا کہ پیڈرو اس وقت صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔
" فضول بات مت کرو۔" دلاور نے غرا کے کہا۔" میں جذبات سے نہیں عقل سے سوچنے والا آدمی ہوں۔"
" پھر تم تفتیش کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟"
" تفتیش کرو مگر دیکھو کہ یہ ایک بوڑھی اور کمزور عورت ہے۔" دلاور نے کمزور سا دفاع کیا۔" جسمانی تشدد سے کیا فائدہ؟"
سراج نے قہقہہ مارا۔" تمہارا مطلب ہے کہ ہم سوال کریں۔ یہ جواب دے اور ہم مان لیں۔ کیا اس طرح کوئی سچ بولتا ہے؟"
" اصل بات وہی ہے سراج۔" نواب خسرو جمشید نے کہا۔" اس عورت نے دلاور سے پوچھا تھا کہ تم میرے گمشدہ بیٹے تو نہیں ہو؟ اب یہ اتفاق ہے یا اس عورت کی چالاکی کہ اس نے جو نام بتایا وہ دلاور نہیں تھا، بہادر تھا... اور دلاور کے ایک بھائی کا نام بہادر تھا جو بچپن میں ہی گم ہو گیا تھا۔"
اس بات نے جتنا مجھے حیران کیا تھا اتنا ہی دوسروں کو بھی کیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا۔ پھر سراج کی آواز آئی۔
" کیا یہ ٹھیک ہے اپنے چوہدری دلاور صاحب؟"
" یہ ٹھیک ہے۔" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
" تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں۔" سراج بولا۔
" یہ میری پرائیویٹ لائف ہے۔ تم سے میرا صرف کاروباری رشتہ ہے۔" دلاور ایک دم بھڑک گیا۔" ضروری نہیں کہ میں اپنے خاندانی معاملات اور خاندانی تاریخ پر بھی تم سے بات کروں۔"
" یہ تم نے ہی خسرو جمشید کو بتایا ہوگا؟"
" میں دلاور کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔" خسرو جمشید نے اطمینان سے کہا۔" اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس کی ماں بھی..."
" جمشید!" دلاور نے دہاڑ کر کہا۔" بند کرو اپنی بکواس۔"
" میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایک سبب بتا رہا ہوں تمہارے مذبذب کا اور تمہاری نفسیاتی کمزوری کا۔" خسرو جمشید نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔" کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس صدمے سے تمہاری ماں کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اگر میرے ساتھ ہوتا تو شاید میرا ردِ عمل بھی مختلف نہ ہوتا..."
" میں... میں مانتا ہوں کہ اس صدمے نے میری ماں کی جان تک لے لی تھی اور اس کے بعد میں دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ ایک سال کے وقفے سے میرا بھائی گیا اور پھر میری ماں گئی۔" دلاور نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔" اور بالآخر باپ بھی گیا۔ کیونکہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی... وہ میرا باپ نہیں رہا تھا۔ آخر میں میرا گھر بھی گیا کیونکہ وہ میرا گھر نہیں رہا تھا... بس جمشید... خود میں نے سب بتا دیا ہے کہ تم میری ذات کو بے نقاب کرنے کا اعزاز حاصل نہ کر سکو۔ کوئی دھماکا کرنے کی سنسنی خیز خوشی نہ ملے تمہیں۔ تم مجھے جذباتی طور پر بلیک میل نہ کر سکو۔ کوئی گندہ انڈا آج تک مجھے بلیک میل نہیں کر سکا۔ جس نے یہ کوشش کی وہ زندہ نہ رہا۔" اس کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی چلی گئی تھی۔
" آئی ایم سوری دلاور... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"
" میں تمہیں بھی سمجھتا ہوں اور تمہارے مطلب کو بھی..." دلاور نے اس کی بات کاٹ دی۔" تم نے سمجھا تھا دلاور کمزور پڑ گیا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ذلیل کرو دلاور کو اس بہانے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا جمشید... تم اس عورت کے ساتھ جو چاہو کرو... ایس پی صاحب آگئے ہیں اب تو... یہ تفتیش کے ماہر ہیں... اگر میری ماں ہوتی... میری اصلی ماں... تب بھی میں یہ اذیت جھیل جاتا لیکن ڈرو اس وقت سے جمشید... تم پیڈرو... اور تم سراج... جب وقت ہماری جگہ بدل دے گا۔ تم خود کو وہاں پاؤ گے جہاں اس وقت میں ہوں اور میں تمہاری جگہ لوں گا۔ تم بھی آدمی ہو۔ پتھر کی دیوار یا بجلی کے کھمبے نہیں ہو۔ تمہاری جذباتی کمزوری کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تو ظاہر ہوگی۔" وہ یکلخت چپ ہو گیا۔
میرا خون خشک ہونے لگا۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رکھتے ہی میں نے ایک رات تھانے میں سراج کے ہاتھوں جو ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی اس کے تصور سے آج بھی میری روح کانپتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوف کے بچھو کا ڈنک میرے دل میں اتر گیا ہے اور تکلیف سے میرا وجود مفلوج ہونے لگا ہے۔ کیا وہ سب کچھ نازو کے ساتھ ہوگا؟ سراج اپنے اسی غیر انسانی طریقے پر نازو سے تفتیش کرے گا اور... نہیں... اس سے آگے سوچنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا ذہن سوچ کے اس خلا سے ایک جست میں آگے نکل جاتا تھا اور قطعی فیصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ اگر سراج نے نازو پر تشدد کے شیطانی اور ننگِ انسانیت طریقے آزمائے تو میں انتظار نہیں کروں گا۔ میں غالب اور محسن اور ٹیڈی کے ساتھ اندر پہنچ جاؤں گا۔ پھر جو ہو سو ہو۔ غنیمت تھا کہ یہ ساری گفتگو ابھی ٹیڈی سن رہا تھا یا میں۔ غالب اور محسن کو گفتگو کا ٹیپ بعد میں سننا تھا۔

"یار سکندر بادشاہ..." استاد ٹیڈی کی آواز آئی "قسم مولا علی کی اگر ان لوگوں نے..."

"بالکل ٹھیک ہے استاد... میں بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا۔" میں نے کہا۔

"کیا فیصلہ کر چکے تھے؟" میری بات نے ٹیڈی کو حیران کیا۔

"جو تم کر چکے ہو۔ ہم وکٹر فیملی کے گھر پر دھاوا بول دیں گے اور نازو کو نکال لائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے پاس صرف ریوالور ہیں... مگر کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی مجھے مہلت نہ ملی۔

"میرا خیال ہے کہ فضول اختلافات اور بے مقصد باتوں میں ہم نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔" سراج نے کہا۔ "تم سب کو معلوم ہوگا کہ آج کسی نے میرے گھر کو بم سے اڑا دیا۔ خدا کا شکر ہے میری ماں بچ گئی۔"

"حشمت خان بھی مارا گیا۔" دلاور بولا۔ "اور گلوب سینما والا گھر بھی تباہ ہو گیا۔"

"لیکن تمہارا گھر بچ گیا۔" سراج نے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا۔

"میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔" دلاور نے احتجاج کیا۔ "میں نے جو قدم بھی اٹھایا تھا اس میں تم سب کا مشورہ شامل تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پیڈرو نے بھی دیکھا۔ خسرو جمشید نے بھی دیکھا۔ کیا میری جگہ یہ لوگ کچھ کر سکتے تھے؟"

"تم یہ سب کچھ کس کے سامنے کہہ رہے ہو؟" پیڈرو بولا۔ "اس عورت کے سامنے جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے کہ یہ دوست ہے یا دشمن۔"

"یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔" ایس پی نے کہا۔ "سلیم تم گھر میں سے ایک رسی لاؤ۔ تھوڑا سا تیل اور پسی ہوئی لال مرچیں اور پیڈرو تم اس کے کپڑے اتار دو۔" نازو نے ایک چیخ ماری۔

"میں زخمی ہوں۔" پیڈرو بولا۔

"اچھا پرویز... یہ کام تم کر سکتے ہو۔" سراج نے خباثت سے کہا۔ "جب رسی آ جائے تو اس کو الٹا لٹکا دو۔ پیر باندھ کر، دونوں ہاتھ بھی پیچھے کمر کی طرف کر کے باندھ دو اور منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔"

"ماں جی... ماں جی، مجھے بچاؤ۔" نازو نے چیخنا شروع کیا۔ "مجھے ان شیطانوں سے بچاؤ۔"

"بس... حوصلہ جواب دے گیا ابھی سے۔" سراج شیطانی انداز پر ہنسا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" سراج نے غرا کے کہا۔

"دروازہ کھولو... یہ کیا ہو رہا ہے اندر؟" کسی عورت نے دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ نازو نے اور زور سے چلانا شروع کیا۔

"سلیم... اپنی ماں سے کہو واپس چلی جائے۔" سراج نے کہا۔

"دروازہ کھولو نہیں تو میں دروازہ توڑ دوں گی۔" سلیم کی ماں کی آواز آئی جو دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ دبی دبی محسوس ہوتی تھی۔ "کھولو دروازہ نہیں تو میں سارا محلہ اکٹھا کر لوں گی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس عورت کی مداخلت نے نازو کو بچا لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے مجبوراً کنڈی کھولی۔

"آخر کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اسی عورت کی آواز اب بلند ہوئی۔ "کیوں چیخ رہی تھی نوراں؟"

"ماں جی...... مجھے بچا لو... مجھے نکال لو یہاں سے۔" نازو نے چلانا شروع کیا۔ "یہ ظالم شیطان مجھے بے عزت کرنا چاہتے تھے..."

"کیا... کیا تم سب پاگل ہو گئے ہو؟" بوڑھی عورت چلائی۔ "تم بھی سلیم... اور تم پرویز... یہ بوڑھی عورت ہے۔"

"تم کو کچھ معلوم نہیں ممی۔" سلیم بولا۔ "تم اندر جاؤ۔"

"لیکن نوراں کو یہیں چھوڑ جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"اپنا ہاتھ پیچھے کر کمینے... کون ہے تو میرے گھر میں مجھ پر حکم چلانے والا اور نوراں پر ہاتھ ڈالنے والا۔" وہ چلا کے بولی۔

"ممی... اندر جاؤ ورنہ..." پرویز نے زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"ورنہ کیا؟... بول... مجھے بھی بے عزت کرے گا..." وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "بے غیرت... بے حیا... کون ہیں یہ تیرے یار... میں نے کبھی نہیں پوچھا کہ تم لوگ اندر گھس کے اور دروازہ بند کر کے کیا کرتے ہو۔ مگر آج تم میرے گھر کا نمک کھانے والی غریب، بے سہارا اور مظلوم عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟ خداوند یسوع مسیح کی قسم... میں اپنی جان دے دوں گی ایسا اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی... رو مت نوراں..."

میرے ساتھ... میں دیکھتی ہوں میرا راستہ کون روکتا ہے..."

اس کے چند منٹ بعد دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا..." دلاور نے بہت دیر بعد کہا۔ "اچھا نہیں ہوا۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔"

"ہم اس عورت سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" سراج نے کہا۔

"یہ خیال تم کو بہت دیر سے آیا ایس پی صاحب۔" دلاور نے طنز سے کہا۔ "جب ساری خرابی ہو چکی۔ تم لوگ یہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ تمہیں پولیس افسری کا رعب دن کے چوبیس گھنٹے ہر جگہ اور ہر شخص پر جھاڑنا ہے خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔"

یہیں سے ان کے درمیان ایک گرما گرم بحث کا آغاز ہوا۔ دلاور اور ایس پی سب سے زیادہ طاقتور لوگ تھے۔ ثانوی حیثیت پیڈرو اور خسرو جمشید کی تھی۔ حیثیت کا یہ تعین کسی چارٹر یا بائی لاز کے تحت نہیں ہوا تھا بلحاظ اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ کوئی بڑا ہو گیا تھا اور حکم دینے لگا تھا تو دوسرے اس کا حکم ماننے لگے تھے۔ دلاور سب سے زیادہ دولت مند، عیار اور ذہین، بااثر اور سفاک تھا۔ اس نے سرغنہ کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس کے کاروبار سے سب کا کاروبار چلتا تھا اور اس نے ناجائز کاروبار کو ایک جائز تحفظ رکھنے والا نام دے رکھا تھا۔ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس نہ ہوتا تو شاید مٹی سے سونا بنانے کا یہ کاروبار شروع ہی نہ ہوتا۔ سراج اس کاروبار کا محافظ تھا اور اپنے تمام قانونی اختیارات کے ساتھ اس غیر قانونی دھندے کو چلانے والوں پر آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خود کو دلاور سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دولت کی اس گاڑی کا ڈرائیور تھا تو دوسرا گارڈ... پیڈرو خود کو انجن سمجھتا تھا جو گاڑی کو کھینچتا تھا اور یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی مگر یہ بھی جانتا تھا کہ انجن خود نہیں چلتا۔ وہ ہر وقت ڈرائیور کے ہاتھوں کے کنٹرول میں رہتا ہے۔ وہ اسے جہاں چاہے روک دے اور اگر چاہے تو پٹری سے بھی اتار دے... چنانچہ اہم ہونے کے باوجود اپنا غیر اہم ہونا اسے بہت کھلتا تھا۔ خسرو جمشید نے آج مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ دلاور کے کاروبار میں برابر کا شریک معلوم ہوتا تھا اور غالباً یہ برابری اس کاروبار میں سرمائے کی برابری کے باعث تھی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ چوہدری دلاور اور خسرو جمشید بہت پرانے ساتھی ہیں۔ وہ بچپن کے دوست یا کلاس فیلو وغیرہ ہوتے تو نواب خسرو جمشید اس کا حوالہ ضرور دیتا۔ لیکن اس نے صرف بتایا تھا کہ وہ دلاور کو بہت پہلے سے جانتا ہے۔ کیا وہ پہلے بھی کسی غیر قانونی کاروبار میں شریک رہے تھے؟ میں نے سوچا۔ کسی وجہ سے ان کو وہ دھندا ختم کرنا پڑا لیکن دلاور نے نیا دھندا شروع کیا تو خسرو جمشید پھر شامل ہو گیا۔ وہ زبردستی بھی شامل ہو سکتا تھا کیونکہ وہ دلاور کے بہت سے پرانے معاملات سے واقف تھا، جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ دلاور کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھا چنانچہ دلاور نے اسے بھی ایک ورکنگ پارٹنر بنا لیا تھا تاہم کنٹرول بدستور دلاور کے ہاتھ میں تھا اور خسرو جمشید بھی اپنی حیثیت کو دلاور سے کمتر تسلیم کر کے خوش نہیں تھا۔ وکٹر فیملی چار بڑوں کے بعد آتی تھی۔ وہ محض کارکن تھے لیکن عام کارکن نہیں تھے۔ ڈی سلوا اور گاما بھی جو مارے جا چکے تھے، وہ بھی ایسے ہی کارکن تھے جو بہت اہم اور قابلِ اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں تھے جو خریدے جا سکتے تھے۔ ختم کیے جا سکتے تھے۔ بدلے جا سکتے تھے اور ضائع ہو جائیں تو بھلائے جا سکتے تھے۔ اہمیت کے اعتبار سے اس شکاری ٹولے میں سب سے اوپر دلاور تھا... پھر سراج... اس کے بعد خسرو جمشید اور آخر میں استاد پیڈرو... وکٹر فیملی کے تین افراد اس کے بعد تھے۔

آج وہ سب بے حد مشتعل تھے۔ رابعہ اور شہلا کو یرغمال رکھ کر مجھے بلانے کی اسکیم ان سب نے مل کر بنائی تھی اور اس کا مقصد میرے عزائم کا اندازہ کرنا اور مجھے منہ مانگی قیمت دے کر راہ سے گمراہ کرنا تھا مگر یہ کوشش ناکام رہی تھی اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا تک نہ ہوگا کہ میں یوں بے خوف و خطر ان کے ناقابلِ شکست حصار میں داخل ہو جاؤں گا اور پھر اتنی آسانی سے دندناتا ہوا نکل جاؤں گا۔ ان کی ساری طاقت مجھے نہ روک سکے گی اور ان کی فتح ایسی ذلت آمیز شکست میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ سب ایک دوسرے کو الزام دیتے تھے حالانکہ نقصان کے ذمے دار سب ایک جیسے تھے۔ دلاور پر سب کی برہمی یوں تھی کہ اس کا گھر بچ گیا تھا۔ اس نے پانچ منٹ پہلے بم کو ڈھونڈ نکالا تھا اور گھر سے دور ایک کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ اس کے پھٹنے سے ایک ٹیلی فون کا کھمبا گر گیا تھا اور ایک گھر کی بیرونی دیوار کا کچھ حصہ، لیکن کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ بم وہاں کس نے رکھا تھا اور کیوں رکھا تھا۔ سراج کی کوٹھی کا نصف حصہ تو کھنڈر بن گیا تھا۔ باقی نصف میں بھی دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اس کے کہنے کے مطابق سامان کے ساتھ ہونے والے نقصان کی مالیت چار لاکھ سے اوپر تھی۔ ڈی سلوا کی کوٹھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی تھی۔ ڈی سلوا کا کوئی وارث ہوتا تو اس کا مالک بنتا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں وہ اکیلا تھا۔ اس کوٹھی میں دو ملازم مارے گئے تھے۔ کسی کو ان کی زندگی کے ضائع ہونے پر رنج نہیں تھا۔ گفتگو کے دوران میں انھوں نے بار بار مال کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کیا تاہم یہ واضح نہ ہو سکا کہ وہ مال کیا تھا۔ اگر وہاں بھی اسلحے کا گودام ہوتا تو ایک ٹائم بم سے چین ری ایکشن شروع ہو جاتا یعنی ایک سے دوسرا بم پھٹتا گولا بارود میں آگ لگتی اور وہ دھماکا ارد گرد کے سارے علاقے کو ہلا دیتا۔ پاس پڑوس کے گھر اور دکانیں تباہ کر دیتا اور وہ صرف ایک دھماکا نہ ہوتا۔ دھماکوں کا سلسلہ ہوتا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

حشمت خاں موجود ہی نہ تھا کہ اپنے نقصان کو روتا۔ کسی نے اس کا تذکرہ کیا بھی تو سرسری انداز میں۔ اتفاق رائے سے انھوں نے سراج کے نقصان کو سب سے زیادہ اور ذاتی تسلیم کیا اور اسے تسلی دی کہ چار پانچ لاکھ کا ازالہ بہت جلد کر دیا جائے گا۔ فی الحال وہ کسی کمالے کے مکان میں منتقل ہو جائے یا دوسرا مکان خرید لے۔

"مکان تو میں خرید لوں گا۔" سراج نے کہا۔ "لیکن میرے محکمے میں اور پبلک کے سامنے میری پوزیشن بہت خراب ہوگی۔ کل سارے اخباروں میں آ جائے گا کہ ایس پی کے گھر میں بم کا دھماکا۔"

"یہ تو حشمت خان کے بارے میں بھی آئے گا۔"

"حشمت خاں گیا جہنم میں۔ اسے اب خدا کے سوا کس کو منہ دکھانا ہے۔" سراج عالم اشتعال میں بولا۔

"خدا کو منہ دکھانے کے قابل وہ پہلے ہی نہیں تھا۔" خسرو جمشید بولا۔

"تم ان اخبار والوں کو نہیں جانتے۔" سراج بولا۔ "یہ بال کی کھال نکالتے ہیں اور کڑی سے کڑی ملاتے ہیں۔ مفروضات پر سنسنی خیز سرخیاں لگاتے ہیں اور نام کماتے ہیں۔ یہ معلوم کر لیں گے کہ میری پوسٹنگ کہاں ہے اور پھر کوئی تجسیث ایسا شوشہ چھوڑے گا کہ خود تو گرفت میں آئے گا نہیں مگر پبلک پر واضح کر دے گا کہ یہ بارڈر پر اسمگلنگ کرنے والوں کی کارروائی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے یہ سودے بازی میں اختلاف پر رنجش کا نتیجہ ہو۔ وہ اس کو حشمت خان کے گھر کی تباہی سے اور حشمت خان کی ہلاکت سے ملائیں گے اور پھر کوئی اسٹوری بنالیں گے کہ وہ انسپکٹر پولیس اور میں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مل کر کوئی غلط کام کرتے تھے اور غلط کام کا انجام تو غلط ہونا ہی تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"جھوٹ لکھنے پر تم ان کے خلاف کارروائی کر سکتے ہو؟" پیڈرو بولا۔

"عدالتی کارروائی کیا آسان کام ہے؟" سراج تلخی سے بولا۔ "اور پھر ان اخبار والوں کے خلاف... یہ تو لکھ دیتے ہیں۔ مبیّنہ طور پر... یا پھر... کہا جاتا ہے... اب کس نے کہا اور انھوں نے کس سے سنا۔ معتبر ذرائع کیا تھے... یہ سب گول مول ہوتا ہے... ان کے جھوٹ کو کبھی جھوٹ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ الٹا آدمی دلدل میں اتر جاتا ہے۔ وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر آ جاتے ہیں۔ سب مل کر محاذ قائم کر لیں تو افسرانِ بالا تک پریشان ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کو سچ مان کے جان چھڑائی جائے۔ جس کے خلاف طوفان کھڑا کیا گیا ہے اسے ٹرانسفر یا وقتی طور پر معطل کر دیا جائے۔ بیان دے دیا جائے کہ تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ اس طرح معاملہ دب جاتا ہے اور چند دن میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن پریشانی تو ہوتی ہے نا۔"

"تم اپنا دوسرا گھر خفیہ رکھنا۔" خسرو جمشید نے مشورہ دیا۔

"مجھے تو اندیشہ ہے کہ اب ہم کچھ بھی خفیہ نہیں رکھ سکیں گے۔" سراج نے کہا۔ "آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کرماں والی کے اڈے کو ہم نے کتنا محفوظ سمجھ رکھا تھا۔ وہ کیسے تباہ ہو گیا۔ سیوک رام اور کرنل جگن ناتھ سب کیسے مارے گئے؟"

"میں سمجھتا ہوں، وہ بھی ایسی ہی غلطی تھی۔" خسرو جمشید بولا۔ "اس وقت رابعہ نام کی اس ایڈووکیٹ کو اور اس لڑکی نازلی کو اغوا کیا گیا تھا۔"

"کون نازلی... وہ انسپکٹر شیخ کی بہن؟" سراج بولا۔

"ہاں۔ اب تو خیر وہ استعفا دے کر غائب ہو گیا ہے۔" خسرو جمشید نے کہا۔ "مگر سکندر بخت کا وہ انتقامی ردِ عمل بھی ایک اقدام کا نتیجہ تھا۔ بہتر ہوگا اگر ہم عورتوں کو بیچ میں نہ لائیں۔ وہ رابعہ کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے اور اس کی خاطر ساری دنیا کو تباہ کر سکتا ہے۔ خواہ دنیا کے ساتھ وہ خود بھی تباہ ہو جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" پیڈرو بولا۔ "آج وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں گھس آیا تھا جہاں سے وہ واپسی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر دیکھو وہ کتنی تباہی پھیلا کے دونوں لڑکیوں کو لے گیا۔"

"یہ ٹائم بم تو ویسے ہی ہیں... بلکہ وہی ہیں..."

"ہاں۔ اس نے سائیں پاپڑ والے کے مزار سے پورا باکس اٹھا لیا ہوگا اور باکس میں بارہ بم تھے۔" دلاور نے کہا۔ "آٹھ بم ابھی اس کے پاس ہونے چاہئیں۔"

"ضرور ہوں گے۔ شاید اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا۔" پیڈرو بولا۔ "جو اس نے کرماں والی کے اڈے سے اٹھایا ہوگا۔"

"اگر ہم نے رابعہ کو اغوا نہ کیا ہوتا تو وہ سیوک رام تک نہ پہنچتا۔ سیوک رام کے ذریعے ہی اسے کرماں والی کا ٹھکانہ پتا چلا۔ اس نے سب تباہ کر دیا۔" پیڈرو نے کہا۔ "گاما ماچھی بھی اسی بار مارا گیا تھا۔"

"سیوک رام اور جگن ناتھ کو اس نے دشمن کا ایجنٹ کہہ کے مار دیا اور ان کے سلحے کے ذخیرے کو بھی تباہ کر دیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے ہم پر بھی شبہ ہے؟" سراج نے کہا۔ "اور اس کے ساتھی یہ جانتے ہیں کہ سیوک رام اور جگن ناتھ کو اسلحہ کون فراہم کرتا ہے؟"

"میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" دلاور بولا۔ "ممکن ہے سیوک رام نے اسے بتا دیا ہو۔ تشدد سے ہی انھوں نے کرماں والی کا پتا معلوم کیا ہوگا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے صرف رابعہ کے بارے میں پوچھا ہو کہ وہ کہاں ہے اور سیوک رام اسے وہاں لے جانے پر مجبور ہو گیا ہو۔ سیوک رام اپنی بیوی کو ختم کر گیا تھا۔ وہ کچھ نہ بتا سکے۔ ایسے شخص سے یہ امید کم ہی ہے کہ اس نے ہمارے بارے میں کچھ اگلا ہو۔ اس کو یہ ڈر بھی ہوگا کہ راز افشا ہونے کے بعد وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ مگر سیوک رام کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس کی لاش مل جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ وہ تشدد سے ہلاک ہوا تھا یا اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھاگ گیا ہو۔" سراج بولا۔

"ہاں۔ اس کا امکان زیادہ ہے۔" دلاور نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ جب وہ سکندر کے ہتھے چڑھا تو سکندر نے اس سے صرف رابعہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ رابعہ کے بارے میں بتانے پر مجبور ہو گیا اور سکندر کو سائیں پاپڑ والے کے مزار تک لے گیا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ وہاں پہنچنے کے بعد سکندر کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ جانے سے پہلے اس نے جان بچا کے نکل جانے کا انتظام کر لیا۔ بیوی کو ساتھ لے کر فرار ہونا مشکل ہوتا۔ اسے وہ ہمیشہ کی نیند سلا گیا اور جب سکندر کو رابعہ ملی تو درمیان میں کسی وقت سیوک رام کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ سرحد پار چلا گیا ہوگا۔ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے تہ خانہ وغیرہ بعد میں دیکھا ہوگا مگر اس وقت تک سیوک رام نکل گیا تھا چنانچہ اسے ہمارے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔"

"میں تمھارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا دلاور۔ میرا خیال ہے کہ سیوک رام نے سب بتا دیا ہوگا۔ وہ انہی کے ہاتھوں مارا گیا اور انھوں نے لاش کہیں پھینک دی۔" سراج بولا۔

"اگر اس کو اتنا معلوم ہوتا تو کیا وہ یہاں نہ پہنچ جاتا؟" دلاور نے کہا۔ "مجھ سے گفتگو کے دوران میں بھی اس کی باتوں سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ اسے اسلحے کے کاروبار کی نوعیت معلوم ہے۔ بے شک وہ بہت ذہین اور چالاک ایکٹر ہے۔ مجھ سے تو وہ منشیات کی بات ہی کرتا رہا۔"

"گویا اب تک اسے علم نہیں کہ ہم منشیات فروش نہیں ہیں۔" نواب خسرو جمشید نے کہا۔ "یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی دلاور۔"

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ اداکاری کو سمجھ نہ سکوں۔" دلاور نے کہا۔ "اور میں نے اپنی عقل کے مطابق اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ تمھارا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم نے اسپتال میں اس کا رویہ دیکھا تھا؟ وہ صرف رابعہ کے لیے متفکر تھا اور رابعہ کو لے کر نکل گیا۔ ہمارے سب حفاظتی انتظامات بہت خفیہ تھے۔ اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ دروازے کے سینڈل میں مائیکروفون چھپایا گیا ہے؟"

"کیا تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو؟" سلیم نے برہمی سے کہا۔

"چور کی طرح داڑھی کے تنکے پر ہاتھ مت ڈالو۔" دلاور بولا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس نے اپنی ذہانت سے سب معلوم کیا اور تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا... ڈاکٹر جیفری کے گھر میں آخر کیا ہوا تھا۔ وہ صرف رابعہ کی خاطر جاتا تھا۔ اس عشق نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ رابعہ کا مسئلہ ہو تو وہ خود کو بھول جاتا ہے۔ ابھی تک وہ جہاں بھی ہتھیلی پر سر رکھ کے گیا ہے، رابعہ کے لیے گیا ہے۔ اگر اس کو شبہ ہوتا کہ اس کارخانے میں اسلحہ بن رہا ہے تو وہ چار ٹائم بم لگا کے کارخانہ اڑا چکا ہوتا۔ اس نے ابھی تک براہِ راست کارخانے پر حملہ نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ اگر وہ جانتا ہے کہ اسلحے کی ترسیل اسی جگہ سے ہوتی ہے تو اس جگہ کو وہ کیوں چھوڑے ہوئے ہے؟ اِدھر اُدھر کیوں جھک مارتا پھر رہا ہے۔"

"تمھاری اس بات میں وزن ہے۔" سراج نے کہا۔

ان کی بات خاصی اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھی۔ وہ ابھی تک ہمارے عزائم کا صحیح اندازہ نہیں کر پائے تھے اور ہمارے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ ہمیں اپنی تباہی کا ذمے دار نہ سمجھیں۔ ان کی عقل میں یہ نہ آئے کہ ہم اُن کے ملک دشمن ساتھیوں سے اور ان کے ناجائز کاروبار کی اصل نوعیت سے واقف ہو چکے ہیں۔ ہم نے ابھی تک انھیں اپنے بارے میں غلط تاثر دینے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ دلاور اینڈ کمپنی کا خیال اب بھی یہی تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کا دشمن ہوں۔ اس کو زبوں حالی اور کسمپرسی کے عالم میں زندہ درگور رکھنے والوں کا دشمن ہوں۔ اس کی تمام عمر کی محنت کی کمائی پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کا دشمن ہوں اور ان سب کا دشمن ہوں جنھوں نے مجھے مصائب کی دلدل میں گرفتار کر کے بلیک میل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور مجھے میرے حق سے محروم رکھنے کے لیے اپنے ترکش کا ہر تیر آزمایا۔ ان کے یقین کے مطابق میں جو کچھ کر رہا تھا اپنے ذاتی دشمنوں کے علاوہ منشیات کے اسمگلروں کے خلاف تھا۔

ان کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ وہ اسلحے کے ذخائر کی تباہی اور اپنے ایجنٹوں کی موت پر سخت تشویش میں مبتلا ہیں کہ یہ خفیہ پولیس کی کارروائی تھی یا ملٹری انٹیلی جنس کی۔ دلاور نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ ملک میں پی ایل او کی طرز پر کوئی ایسا سرفروشوں کا گروہ برسرِ پیکار نہ ہو جسے اپنے ذرائع سے وطن کی سرزمین پر غداروں کی موجودگی کا پتا چل گیا ہو مگر دلاور کے خیال کو اکثریت نے مسترد کر دیا۔ سب نے یہی کہا کہ یہاں کسی زیرِ زمین مزاحمتی گروپ، گوریلا تنظیم یا جانبازوں کی تنظیم کے اس حد تک فعال ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ابھی تک اس قوم میں اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم کے اصولوں پر عمل کرنے کی صلاحیت صرف تقریروں تک محدود ہے یا ان زرّیں اقوال کا تذکرہ صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں یہ ناممکن ہے کہ کوئی تنظیم بنے جو پی ایل او کی طرح قوت رکھتی ہو، مؤثر ہو اور باعمل ہو۔ وہ فرمودۂ اقبال سے بے خبر تھے کہ۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ ایم آر ایس کے نام سے سرفروشوں کی ایک بہت چھوٹی سی تنظیم وجود میں آ چکی تھی مگر چھوٹی ہونے کے باوجود اس تنظیم کے پاس یقینِ محکم اور اتحاد کی وہ طاقت تھی کہ اس کے عزائم بہت بڑے تھے اور ان کے حوصلے ہمالہ کی بلند ترین چوٹی سے بھی بلند تر اور ناقابل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شکست تھے۔ انھیں کہاں علم تھا کہ ستاروں پر کمند ڈالنے والے جوانوں کے ساتھ اس سرزمین پر رابعہ اور نازو جیسی مادرِ وطن کی قابلِ فخر بیٹیاں بھی ہیں جو اپنے جسم کے ہر قطرۂ خون سے اس مٹی کے ہر ذرّے کو سرخرو کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

بس کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ میں نے دُور سے محسن کو اشارہ کیا اور وہ چائے کے چنڈو خانے کی محفل سے اُٹھ گیا۔ معلوم نہیں اس نے حاضرین و ناظرینِ باتمکین سے کس اختلافی مسئلے پر اشتعال انگیز بحث شروع کر رکھی تھی کہ وہ آیا تو لال پیلا ہو رہا تھا۔

"اچھا ہوا کہ تو نے بلا لیا۔" وہ بولا۔ "ورنہ ایک آدھ میرے ہاتھوں جہنمی ہو جاتا یا وہ سب مل کر میرا آملیٹ بنا دیتے۔"

"جھگڑا کس بات کا تھا؟" میں نے کہا۔

"ارے یار! میں یوگنڈا کا ذکر کر رہا تھا کہ وہاں کے گینڈے صورت میں شتر مرغ سے ملتے ہیں کہ ایک شخص کہنے لگا تم بکتے ہو۔ میں سات سال افریقہ میں رہ چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم بکتے ہو۔ تم نے شتر مرغ تو کیا مرغ تک نہیں دیکھا ہوگا۔ ذرا بتاؤ، دنیا میں کتنی قسم کے مرغے ہوتے ہیں۔ وہ ایسا خبیث تھا کہ واقعی قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ہر قسم کے مرغوں کی اقسام گنانے لگا۔ میں نے کہا، سب سے اچھا کون سا ہوتا ہے۔ بس یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے کوئی مشکل سا نام لیا اور میں نے کہا غلط۔ سب سے اچھا ہوتا ہے فلاں ہوٹل کا مرغ مسلّم... بس اسی بات پر ہاتھا ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

"ہاتھا؟ یا ہاتھا پائی...؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں... صرف ہاتھا... پائی میں پاٹے چلانے پڑتے۔" وہ بولا۔

"اچھا اب تم یہاں میری جگہ لو۔" میں نے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں اور چائے خانے کی رونق بڑھانے جا رہا ہوں۔"

ولاور اینڈ کمپنی کی گفتگو لمبی ہوتی گئی اور بیچ میں ایسے بہت سے مرحلے آئے جب ذرا سی بات پر اختلافِ رائے سے نوبت تلخ کلامی تک اور گالی گلوچ تک پہنچی مگر پھر کسی نہ کسی نے جوش کو چھوڑ کر ہوش سے کام لیا اور بات کو اس حد تک نہیں بگڑنے دیا جہاں بات بنائے نہ بنتی۔ وہ سب ایک ایسے کاروبار میں شریک تھے جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی تو تھا ہی خود ان کے لیے ندامت اور احساسِ جرم کی خلش کو جگائے رکھتا تھا۔ وہ اس کا اعتراف اپنے آپ سے بھی نہیں کرتے تھے مگر ان کے مادی وجود کے اندر احساس کی ایک کرن زندہ تھی جس پر تاریکی غالب آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ آدمی کا ضمیر تھا جو کبھی کسی قاتل کے ہاتھوں نہیں مرتا۔ جو بے وجود ہونے کے باوجود سخت جان ہوتا ہے اور سسک سسک کر بھی زندہ رہتا ہے۔ یہ لاشعور کی گہرائیوں میں دفن رہنے والا خیال ان کو اندر ہی اندر کچوکے دیتا رہتا ہے کہ وہ دوست نہیں ہیں شریکِ جرم ہیں اور دنیا کے سامنے ظاہر ہے وہ معزز اور معتبر مگر یہاں ایک دوسرے کے سامنے سب مجرم ہیں۔ ان کے درمیان خلوص اعتماد کی فضا میں پروان چڑھنے والا رشتہ تھا ہی نہیں ... شکوک اور عدم اعتماد کے ساتھ مجبوری کا تعلق تھا۔ ان حالات ... خانہ ہی ایک مناسب ٹھکانا لگتا تھا۔

چائے خانے کے مالک نے کئی بار مجھ سے مختلف ... پر تبادلۂ خیال کی بے سود کوشش کی۔ وہ نیلو کی نئی فلم کے رقص کی ... سے سیلاب یا زلزلے کی تباہ کاری تک ہر مسئلے پر مفید معلومات ... کر سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یا نہیں ... ہے، سب قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اس جگہ آنے جانے ... عام لوگ تھے جو ایک کپ چائے پیتے تھے تو دل کے بہلانے کو ... باتیں کرتے تھے۔ یہ تنہائی کے احساس کو مٹانے ... اور وقت گزارنے کا سستا نسخہ تھا۔ کچھ وہاں ... آنے والے لوگ تھے جو اُسے اپنا اڈا سمجھتے تھے۔ اڈا اگر اعلیٰ ... تو کلب کہلاتا ہے یا کافی ہاؤس۔ کبھی کبھار کے آنے والوں کو ... اس روڈ سائڈ کلب میں اجنبی سمجھ کے نظر انداز نہیں کیا جاتا تو ... سب بہت جلد بے تکلف ہو جاتے تھے اور پھر جس کا جو ... چاہے کہے۔ سب کی سُنے اور اپنی سنائے۔

لیکن میں یہاں گیان دھیان میں مگن سادھو یا جبلی اللہ ... طرح چُپ بیٹھا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ میرے سر کے بالوں ... ایک خفیہ ریسیور چھپا ہوا ہے جس میں سے نکلنے والا مکڑی کے جالے ... جیسا باریک تار میرے کان میں گھس گیا ہے اور میں سو گز دور ... گھر کے بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک ... لفظ صاف سُن رہا ہوں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جو آوازیں میں سُن ... ہوں وہ اس ملک اور اس قوم کے محبِ وطن افراد کے لیے کیا ... اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر یہ آوازیں سب سن سکتے تو شاید اس گا... جلا کے راکھ کر دیتے اور وطن فروشوں کے اس ٹولے کی تِکا بوٹی ... مگر جو کچھ ہم کرنا چاہتے تھے وہ اشتعال انگیزی کی کارروائی نہیں ... ہمیں سب سن کر تمام معلومات کی مدد سے ایک مؤثر لائحہ عمل ... کرنا تھا تاکہ ہم ہر گوشے میں چھپے ہوئے وطن کے ہر دشمن کا ... کر سکیں۔

"میری سوہنی سرکار۔" چائے خانے کا مالک بالآخر میری ... پُراسرار محویت اور خاموشی سے تنگ آگیا۔ "آپ چائے کی پیالی ... پیالی پیٹ میں ڈالتے جا رہے ہو۔"

"اس پیٹ کے دوزخ میں آدمی تمام عمر ایندھن ڈالتا رہتا ہے لیکن اس کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔

چائے والا بے حد متاثر ہوا۔ "آپ تو مجھے پہنچے ہوئے ... ہو جی!"

"تجھے کیا معلوم کون کہاں پہنچا ہوا ہے۔" میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ "کوئی شیخوپورہ بھی نہیں پہنچا... کوئی ولایت پہنچا۔"

"سبحان اللہ میری سوہنی سرکار۔" فرطِ عقیدت سے اس کا ... بُرا حال ہو گیا۔ "جو ولایت کے مرتبے تک پہنچے، ولی ہوئے۔ آپ کو بھی ولایت حاصل ہے ہو؟"

"ہم ولایت تک پہنچ کے لوٹ آئے۔" میں نے قلندرانہ شان سے کہا۔ سارا فرق اس لفظ کے مطلب کا تھا کہ میں کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ چُپ ہو جائے۔

"آپ ہم پر بھی نظرِ کرم کریں تو ہم خود اس فٹ پاتھ سے اُٹھ جائیں۔" وہ میرے سامنے ایک اور چائے کا کپ رکھ کے بولا... "ورنہ کسی روز کارپوریشن والے ایسا اٹھائیں گے کہ پھر بیٹھنے نہ دیں گے۔ دعا کریں کہ یہاں سے اُٹھ کے کسی ہوٹل میں کاروبار جمائیں۔"

"اللہ تجھے اُٹھائے بچّہ۔" میں نے کہا۔ "تیرے کاروبار کو متحد کرے۔"

"آمین۔" وہ سمجھے بغیر بڑی عقیدت سے بولا۔ "ایک بات بتائیں۔"

"چُپ۔" میں نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "ہم کچھ سُن رہے ہیں۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "کیا سُن رہے ہو میری سوہنی سرکار؟ ادھر تو بس شور ہی شور ہے۔"

"ہم جو کچھ سُن سکتے ہیں وہ کوئی نہیں سن سکتا بدبخت..." میں نے کہا جو بالکل غلط نہیں تھا۔ چائے والا خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا۔

دلاور اینڈ کمپنی والے اب اپنے نئے انتظامات پر بحث کر رہے تھے۔ سائیں پاپڑ والے کی جعلی درگاہ اور کرماں والی کے اڈے کا خاتمہ ہو گیا تھا اور وہ سب لوگ بھی مارے جا چکے تھے جو اس نیٹ ورک سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس سے نہ تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے عزائم کو شکست ہوئی تھی اور نہ ان کے غدار دوستوں کا ... نقصان ثابت ہوا تھا۔ انھوں نے دوسرے افراد اور دوسرے ٹھکانے تلاش کر لیے تھے۔ اگر ہم سیوک رام اور جگن ناتھ کے علاوہ ان کے دوسرے ... غداروں کو جہنم رسید نہ کرتے تب بھی یہ ایسا کاروبار نہیں تھا ... جو غیر معینہ مدت تک ایک ہی جگہ چلتا رہے اور انہی لوگوں کے ... کنٹرول میں رہے۔ شکوک سے بچنے کے لیے بھی لوگ اور ٹھکانے ادھر سے ادھر کرتے رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جو کچھ میں سُن رہا تھا وہ استاد ٹیڈی کے پاس ریکارڈ بھی ہو رہا تھا۔ اس کے پاس وافر مقدار میں کیسٹ تھے لیکن میں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک مشینی نظام تھا جو اصلاتی ... معمولی سے نقص سے ختم ہو سکتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر میں فنی ... خرابی پیدا ہو سکتی تھی چنانچہ میرے لیے گفتگو کے ہر لفظ کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ عین اس وقت جب ان کی میٹنگ کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا اور وہ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھے، میں نے ایک کار کو گلی کے آخری حصّے سے کچھ دُور رُکتے دیکھا۔ یہ ایک مرسیڈیز تھی اور تقریباً ویسی ہی تھی جیسی خسرو جمشید کے پاس تھی اور جسے ہم ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس سے نکلنے کی کوشش میں تباہ کر چکے تھے۔ اس کا رنگ اور ماڈل سب کچھ وہی تھا مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کا رجسٹریشن نمبر تھا۔ خسرو جمشید کی جل کر کوئلہ ہو جانے والی مرسیڈیز کا نمبر ہی ایسا تھا کہ آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا تھا اور اس دوسری کار پر مجھے پھر وہی نمبر نظر آ رہا تھا۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مردہ جسے سپردِ خاک کر دیا گیا ہو پھر سرِ راہ انہی کپڑوں میں نظر آ جائے جو وہ عموماً اپنی زندگی میں پہنتا تھا۔

ابھی میں اس مردے کے زندہ ہونے پر حیران ہی تھا کہ میں نے سڑک کے کنارے لگے ہوئے، بجلی کے کھمبے کی روشنی کو براہِ راست ڈرائیور پر پڑتے دیکھا اور چائے کا آٹھواں کپ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے رہ گیا۔ میں ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ لو چائے کے پیسے..." میں نے دس کا نوٹ نکال کے کہا۔

"توبہ جی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔ "آپ تو بس میرے حق میں دعا کریں۔"

"دعا کس چیز کے لیے؟"

"اللہ ایک بیٹا دے اس سال۔" وہ بولا۔ "چھ سال میں گھر والی نے چھ لڑکیاں پیدا کر دی ہیں۔"

"لڑکیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں بچّہ۔" میں نے کہا۔

"مجھے بڑھاپے کا ایک سہارا بھی چاہیے میری سوہنی سرکار۔"

"ہم اولادِ نرینہ کے لیے دعا نہیں دیتے۔" میں نے کہا۔ "اولاد جوان ہو کے نافرمان اور سرکش ہو تو باپ کی سفید داڑھی پکڑتی ہے اور اس کا مُنہ کالا کرتی ہے۔ ساری بددعائیں پھر ہم پر آتی ہیں۔"

"اچھا تو خوشحالی کی دعا دیں۔" وہ بولا۔

"کتنی خوشحالی چاہیے؟" میں نے کہا۔ "لکھ پتی بننے کی دعا چاہیے تو فیس ہزار روپے۔ کروڑ پتی بننے کی دعا دس ہزار میں۔"

"فیس؟ اوئے بدمعاش... فراڈیے..." اس نے میرے ہاتھ سے دس کا نوٹ چھین لیا اور چھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ "چل کھسک اِدھر سے... بڑا پہنچا ہوا بنتا تھا... یہ نہ ہو تھانے پہنچ جائے۔"

"ہم وہاں بھی پہنچ چکے ہیں بچّہ۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ "اب اللہ تجھے بھی پہنچائے۔ اور تجھے مزید چھ بیٹیاں دے۔" پھر میں نے وہاں سے دوڑ لگائی۔ وہ اُٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ اس کا ارادہ مجھ پر ایک کفگیر مارنے کا تھا مگر ہاتھ کچھ غلط گھوم گیا اور نشانہ ایک "تابت بنا"۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھر وہ آپس میں اُلجھ گئے۔ چائے والا معافیاں مانگ رہا تھا اور گاہک مجروح کلائی کو ملتے ہوئے بیٹھ چکا تھا۔

کار کے قریب پہنچنے کے بعد میں نے خود کو ایک سائڈ پر رکھا تاکہ ڈرائیور مجھے بیک ویو مرر میں نہ دیکھ سکے۔ نیچے بیٹھ کر میں نے ماچس کی ایک تیلی سے ٹیوب کا والو دبا دیا۔ ہوا بڑی آواز کے ساتھ نکلی اور ڈرائیور ایک دم اچھل پڑا۔ وہ کسی نامعقول کی شرارت اور دیدہ دلیری پر مشتعل تھا، جو ڈرائیور کی موجودگی میں ٹائر کو فلیٹ کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ ایک دروازے سے باہر آیا اور میں دوسری طرف سے گھوم کر سامنے چلا گیا۔ نواب خسرو جمشید کے ہم شکل شوفر نے زیرِ لب ایک گالی دی۔ "کون تھا؟" وہ پچھلی سائڈ کے بائیں ہاتھ والے ٹائر کو دیکھ کر بولا۔ اس نے لات مار کر ہوا کا پریشر دیکھا جو بالکل ٹھیک تھا۔ ذرا سی ہوا کم ہونے سے پریشر میں کیا فرق پڑ سکتا تھا مگر ہوا نکلنے کی آواز اس نے خود سُنی تھی جو پیچھے سے آئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے پر اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا جس پر وہ شک کر سکتا۔ اس نے آواز کو اپنا وہم سمجھا اور پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں اتنی دیر میں سر جھکائے پیچھے کی طرف لوٹ آیا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے پھر تیلی کی مدد سے ٹیوب کے والو کو دبایا۔ اس مرتبہ آواز پہلے سے بھی زیادہ دیر تک سنائی دی۔

نواب خسرو جمشید کا ہم شکل شوفر دوسری بار بڑے یقین کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لے کر باہر آیا۔ میں دبک کر کار کے نیچے گھس گیا اور کسی آواز کے بغیر سرکتا ہوا دوسری طرف جا نکلا۔ وہ پیچھے آیا اور کچھ دیر سیدھا کھڑا رہا۔ پھر میں نے نیچے سے ہی اس کے قدموں کو آگے بڑھتا دیکھا۔ اس نے کار کے گرد ایک چکر پورا کیا اور کسی کو نہ پا کے حیران ہوا۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے سر جھکایا اور نیچے جھانکنا چاہا۔ میرے ہاتھوں نے صحیح وقت پر اس کی گردن دبوچ لی۔ اپنی اونچے شملے والی پگڑی اس نے پہلے ہی اتار کے ایک ہاتھ میں تھام لی تھی ورنہ اتنا جھکنے سے وہ زمین پر گرتی۔ اس طرح وہ ایک ہاتھ کو استعمال کرنے کے قابل نہ رہا۔ میرے سامنے اس کے بال آئے۔ میں نے اسے ایک ہاتھ سے بال پکڑ کے کھینچا تو وہ نیچے گرا اور اس کا سر سائڈ سے ٹکرایا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ سے اس کی گردن دبا کے اسے کار کے نیچے کھینچ لیا۔ ریوالور وہ استعمال کر ہی نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کا سر اوپر اٹھا کے کار کے فرش پر مارا۔ اس سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی خالی ڈرم پر لات مارے۔ دوسری بار بھی میں نے ایسا ہی کیا اور وہ آواز نکالے بغیر بے سُدھ ہو گیا۔

میں نے چند منٹ تک انتظار کیا کہ اگر اِدھر اُدھر سے کسی نے دیکھا ہو گا تو آ جائے گا اور پھر اس سے بھی نمٹنا ہو گا مگر یہ ساری کارروائی ایک منٹ میں ختم ہو گئی تھی۔ کسی نے ڈرائیور کو کار کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہو گا تو اسے کوئی بات غیر معمولی نظر نہ آئی ہو گی۔

اس نے دوسرے لمحے میں ڈرائیور کو غیر موجود پایا ہو گا تو فوراً ... ہو گا کہ وہ اندر جا بیٹھا ہے۔ کار کے نیچے تیس سیکنڈ میں ... والی جنگ بالکل یکطرفہ رہی۔ اسے مزاحمت کا موقع ہی ... میں نے اُسے ناک آؤٹ کر دیا۔

اگلا مرحلہ زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ جب میں ... ہوئے نواب خسرو جمشید کے نقشِ ثانی کو بے لباس کیا ... قدرت میں آ گیا۔ مرسیڈیز جیسی عالی شان کار کے نیچے ایک ... ایسا بھی آیا جب ایک حمام والا محاورہ درست ثابت ... پھر میں نے وہ خلعتِ فاخرہ زیبِ تن فرمائی جو دوسرے ... جسم پر تھی مگر اب نہیں تھی۔ میں نے اپنا لباس اسے پہنانا ... نہیں سمجھا۔

باہر طلوع ہونے کے بعد میں نے اپنی دستار بندی ... وہ پگڑی جس پر میں نے ہاتھ ڈالا تھا نیچے سے اٹھا کے ... اپنے سر پر جمائی۔ فرق اب صرف مونچھوں کا تھا لیکن ... میں کا تھا۔ خود میں نے حلیہ بدلنے کے لیے اپنی مونچھوں ... پر کافی وقت صرف کیا تھا مگر اس نقلی نواب کی مونچھیں ... آدھا انچ کے قریب زیادہ باہر نکلی ہوئی تھیں اور کچھ نوکیلی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں صورت کے فرق کا فوراً ... مشکل تھا اور میں اب ایک ادھکلی میں سر سے جیتا تھا چنانچہ ... سے ڈرنا بے کار تھا۔

موقع پاتے ہی میں نے ڈکی کھول کر نقلی نواب کو نیچے لٹا لا اور ڈکی میں ڈال دیا۔ زیادہ ڈر مجھے اصلی نواب خسرو جمشید کی طرف سے تھا۔ ان کی میٹنگ ختم ہو رہی تھی اور وہ کسی بھی ... ہو سکتا تھا۔ ان دونوں نے ایک جیسی شکل و شباہت سے ... چلا رکھا تھا، وہ بالآخر آج ختم ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اصل خسرو جمشید اعلیٰ سطحی اجلاس میں یہ نفسِ نفیس شریک تھا ... کی ہدایات کے مطابق شوفر ٹھیک وقت پر ... لیے گاڑی لے کر حاضر ہو گیا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے ... تھوڑا سا آگے بڑھا کر لیمپ پوسٹ سے دور اندھیرے میں ... پھر نیچے اتر کے ڈکی میں پڑے ہوئے نقلی نواب کو تاروں ... تار ڈکی میں پڑے ہوئے تھے۔ محسن دُور سے سب کچھ دیکھ رہا ... وہ آہستہ آہستہ قریب آ گیا۔

"یہ کیا کر رہا ہے تو؟" وہ بولا۔ "یہ ہمارے پروگرام میں ... نہیں تھا۔"

"پروگرام میں تو ہمارے بہت کچھ شامل نہیں تھا۔" میں ... کسی عظیم فلسفی کی طرح کہا۔ "مثلاً میرا اسماۃ رابعہ وکیلن سے عشق کر ... تیرا شعلا سے عقد فرمانا۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ... یہی منظور تھا، منظورِ نظر کہ میں نواب بنوں اور تو حسد کرے ... لگ رہا ہوں میں؟"

"ایسا کہ نواب خسرو جمشید تیری نظر اتاریں گے۔" محسن جل کر بولا۔ "ممکن ہے نظر کے ساتھ کھال بھی اتار لیں۔ اور بھُس بھرنے کے لیے ہمیں ارسال کر دیں۔"

"بھُس مت بھرنا۔" میں نے وصیت کے انداز میں رقت طاری کر کے کہا۔ "میری کھال کے طبلے بنوا لینا۔ اور رابعہ کو دے دینا اور اگر وہ بھی عاشقی کی روایات پر عمل کرتے ہوئے میرا ساتھ دینے کے لیے دنیا سے عالمِ بالا کی سمت کوچ کر جائے تو ہر سال شہیدانِ الفت کا عرس کرنا۔ لنگر اور قوالی والا۔ قوالی میں سنگت کے لیے یہی طبلے رکھنا اور قوال خود گانا۔"

"دلاور چوہدری قوال اور ہمنوا زیادہ بہتر قوالی کریں گے۔" محسن بولا۔ "طبلہ سراج بجائے گا۔ اس نے ایک رات تھانے میں تجھے بھی طبلے کی طرح بہت اچھا بجایا تھا۔"

"مذاق کی بات چھوڑ... وہ آنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج میں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ پانی ڈکی میں ہے۔ بالکل اصل حالت میں... جیسا دنیا میں آیا تھا... اور دودھ آنے والا ہے۔ یہ میرے کپڑے لے جا۔" میں نے بنڈل اسے تھما دیا۔

"یہ لے جا کر تیری نشانی کے طور پر رابعہ کو دے دوں؟" محسن نے سمجھ لیا کہ وہ میرا ارادہ بدل نہیں سکے گا۔

"ہاں... میری آخری نشانی۔"

"اور اسٹوری کیا سناؤں؟" محسن بولا۔ "کہ کپڑوں کے اندر کا والی کدھر گیا۔"

"کوئی اچھی سی دل پر اثر کرنے والی اسٹوری سنا دینا۔ مثلاً یہ کہ مرحوم چڑیا گھر کے شیر کو دیکھ رہے تھے۔ شیر نے کہا کہ ایسے کیا دیکھتا ہے اندر آ پھر میں تجھے دیکھوں۔ مرحوم جذباتی ہو کے اندر چلے گئے۔ اب شیر کے اندر ہیں اور ہضم ہو رہے ہیں۔ کپڑے شیر کو فٹ نہیں تھے اس لیے بچ گئے۔ بہت امپریس ہو گی۔"

"میں دوڑ کر یہ کپڑے غالب کو دے آتا ہوں۔" محسن بولا۔ "اسے بتا دوں کہ ہم ذرا گھومنے جا رہے ہیں اور کچھ دیر سے آئیں گے۔ میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

"بے وقوفی مت کر... بیوی کو بیوہ میں تبدیل مت کر۔"

"بکواس مت کر۔" وہ بولا۔ "میں آتا ہوں... میرے آنے تک جانا نہیں۔"

اس کے جانے اور آنے میں دس منٹ صرف ہونے یقینی تھے۔ ادھر جو آوازیں میرے کان سن رہے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ کام کی ساری باتیں میں نے سُن لی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ ٹیپ پر ریکارڈ بھی ہو گئی ہیں۔ یہ سب سُن کر میں ان کے بارے میں سمجھ چکا تھا جو انتہائی خطرناک تھے۔ اگر ان کے عزائم پورے کامیاب ہو جاتے تو یہ ملک دو ٹکڑے ہو جاتا اور ملک میں ایسی خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی جس میں لاکھوں محبانِ وطن کا پاک لہو بے آبرو ہو کے مٹی میں مل جاتا۔ ان غداروں کو سزائے موت دینے کے لیے یہی جرم کافی تھا کہ انھوں نے ایسا سوچا مگر ابھی ہمیں ان کے پورے منصوبے کو طشت از بام کرنا تھا اور ان کے ہر شریکِ جرم تک پہنچنا تھا۔ ابھی سے انھیں مار کے ہم راستوں کا سراغ گم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

رخصت ہونے والوں میں سب سے پہلے ایس پی سراج گیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ گلی کے دوسرے حصے سے نکل گیا۔ ورنہ اس طرف سے جاتا تو میں اُسے ضرور دیکھتا۔ اس کے جانے کے بعد پیڈرو نے دلاور اور جمشید کے سامنے اسے گالیاں دیں کہ بڑا ایس پی بنا پھرتا ہے۔ کسی دن یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پیڈرو اور سراج کے درمیان کبھی نہیں بنی اور وہ ساتھ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہیں۔ ساتھ دینے کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ ایک دوسرے کو کتے کی موت مار دیتے۔ دلاور نے پھر اُسے سمجھایا کہ وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ ایس پی اور ڈی آئی جی کے عہدے کی بات نہیں۔ پولیس میں ایسے بہت ہی کم ہوتے ہیں جو پیسے کے لالچ میں اندھے ہو جائیں۔ فرائض اور ذمے داریوں کو بھول جائیں اور دشمنوں کا آلۂ کار بننا تک قبول کر لیں۔ اسے ناراض کرنا کاروبار کے راستے بند کرنے کے مترادف ہو گا۔ پھر دوسرا آدمی ملے نہ ملے جو اسی طرح سارے راستے کھلے رکھے۔ خسرو جمشید نے اس کی تائید کی اور پیڈرو کو جذباتی نہ ہونے کی تلقین کی۔

دلاور اور خسرو جمشید ایک ساتھ نکلے اور مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے الوداعی کلمات سے کیا۔ پھر پیڈرو نے روانگی اختیار کی اور چلتے چلتے سونیا سے نہ جانے کیا کہا کہ اس نے برہمی سے کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اور پیڈرو قہقہہ مار کے ہنسا۔ سونیا کی برہمی مجھے ایک ادائے محبوبی لگی۔ معلوم نہیں اُن کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی لیکن یہ بات عجیب سی تھی یا مجھے عجیب لگی کہ اس گھر میں سونیا کے دونوں بھائی بھی موجود تھے اور پیڈرو نے ان کے سامنے کوئی قابلِ اعتراض بات کی تھی۔ ممکن ہے وہ سامنے نہ ہوں۔ میں نے سوچا۔ میں صرف آوازیں سُن رہا ہوں۔ کچھ دیکھ نہیں رہا ہوں۔ پیڈرو بھی چلا گیا اور میں نے قدرے تشویش میں مبتلا ہو کے محسن کو تلاش کیا جو دس منٹ میں آسانی سے واپس لوٹ کر آ سکتا تھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ نواب خسرو جمشید کسی بھی لمحے گلی کے نکڑ سے نمودار ہو سکتا تھا اور اب محسن کے لیے اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ وہ ڈکی میں چھپ سکے۔

غالباً آخری چند سیکنڈ باقی تھے جب میں نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ذہن میں آنے والا یہ فوری خیال بالکل آوازِ غیب کی طرح تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا کہ سکندر! تم نے سوچے سمجھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بغیر بہت عجلت میں فیصلہ کیا تھا۔ ابھی وقت تمھاری گرفت میں ہے... بدل دو اس فیصلے کو... یہ نہ ہو اتنی بڑی کامیابی تمھارے غلط فیصلے سے ناکامی میں بدل جائے اور قصور وار صرف تم کہلاؤ کیونکہ تم نے کسی کو بتلائے بغیر اور کسی سے مشورہ کیے بغیر وہ کیا جو تمھارے دماغ میں آیا۔ یہ شاید وہ آواز تھی جس کو میں اپنی چھٹی حس سے تعبیر کرسکتا تھا۔ یہ تائید ایزدی تھی۔ وہ قوت تھی جس کا نادیدہ ہاتھ ہمیشہ مجھے تحفظ فراہم کرتا آیا تھا اور جس نے مجھے سوچ کے صحیح راستے پر گامزن رکھا تھا۔

میں نے چابی گھمائی اور گاڑی کو ایک دم گیئر میں ڈال دیا۔ کسی چیتے کی طرح طاقتور اور خوب صورت مرسیڈیز نے ایک جست لی اور اس کی رفتار سات سیکنڈ میں ساٹھ میل پر پہنچ گئی۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کے پیچھے دیکھا کیونکہ بیک ویو مرر میں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خسرو جمشید ابھی تک سڑک پر نہیں پہنچا تھا۔ اب میں اس سے کئی گز دور تھا چنانچہ وہ آ بھی جاتا تو اتنے فاصلے پر جانے والی کار کو پہچان نہ پاتا۔ اس کی نظر گلی اور سڑک کے سنگم پر ادھر اُدھر گئی ہوگی کہ شوفر نے کار کہاں کھڑی کی ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں آنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ صرف دس سیکنڈ پہلے وہ کار یہاں موجود تھی مگر اب نہیں ہے۔

خود کو محفوظ پاکے میں نے رفتار کم کی اور اب میرے دماغ کی منفی سوچ نے مجھے اندیشوں اور خطرات کے امکانات کا تناسب سمجھانا شروع کیا۔ اگر محسن آجاتا اور ڈکی میں لیٹ جاتا تو کیا ہوتا۔ وہ میری کوئی مدد نہ کرپاتا۔ سب سے پہلے تو یہ ہوسکتا تھا کہ خسرو جمشید اصل اور نقل کے فرق کو پہلی نظر میں تاڑ جاتا۔ اس کے شوفر کی اور میری مونچھوں میں تو اتنا فرق نہیں تھا مگر ہمارے چہرے بالکل مختلف تھے۔ اگر خسرو جمشید اندھیرے میں صورت پر غور نہ بھی کرتا تو جیسے ہی وہ اندر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولتا اور اندر چھت کی لائٹ جلتی وہ میری صورت دیکھ لیتا۔ اس کی نگاہ کے دھوکا کھانے کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے اسے کبھی چشمہ لگاتے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کرنا غلط تھا کہ اس کی نظر کمزور ہوگی۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو سب سے خطرناک مرحلہ آتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ چلو۔ اور میں احمقوں کی طرح سوچتا کہ کہاں چلوں۔

یہ سب سے بڑی غلطی میرا راز فاش کردیتی۔ اصلی شوفر تو جانتا تھا کہ خسرو جمشید کو کہاں لے جانا ہے۔ میں اس سے تو پوچھ نہیں سکتا تھا کہ نواب صاحب کہاں تشریف لے جائیے گا۔ پھر کس سے پوچھتا میں؟ میں نے ناک آؤٹ ہو جانے والے شوفر سے نواب جمشید کے گھر کا پتا معلوم کرلیا ہوتا تو کام شاید چل جاتا۔ اس کے بعد بھی مجھے وقت ملا تھا۔ جیب میں گلوز کمپارٹمنٹ میں کاغذات دیکھ سکتا تھا۔ رجسٹریشن بک میں کوئی نام اور پتا ضرور مل جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ کیے بغیر میں نے شوفر کی جگہ سنبھال لی تھی اور

بال بال بچ گیا تھا، ورنہ پیچھے بیٹھنے والا خسرو جمشید میری گ ریوالور رکھ دیتا اور کہتا کہ بہروپیے! کون ہو تم... اور نواب شہ کہاں ہیں جو اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے گاڑی کو دوسری مرتبہ دائیں طرف موڑا اور شکر ادا کیا کہ جلد بازی میں ایک بے وقوفی کرنے سے بچ گیا ہ اینڈ کمپنی کو معلوم ہو جاتا کہ جس وقت اُن کا انتہائی خفیہ اجلاس ہو رہا تھا اس وقت ایم آر ایس کے جاسوس باہر پھیلائے ان کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو گرفتار کر رہے ان کا یہ شک یقین میں بدل جاتا کہ ہمیں ان کے اصل کارو ان کے مذموم عزائم کا اچھی طرح علم ہے۔ اب تک ان کے ٹھکانے اور ایجنٹ ہمارے ہی ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے اپنا سارا پروگرام بدل دیتے، سارے اڈے تبدیل کر دیتے اور سب منسوخ کر دیتے جو انھوں نے وکٹر فیصل کے گھر میں میٹ طے کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور سے ان کے سراغ دیکھنا اتنا ہی ناممکن ہو جاتا جتنا ہوا کے جانے والے جھونکے کا تعاقب کرنا۔

ظاہر ہے اس کے بعد اگر خسرو جمشید مجھے ختم نہ کرتا تو پھر اصلی اور نقلی دونوں نوابوں کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا۔ میں ان کو قید رکھتا یا ان کی لاشیں تک غائب کر دیتا، ہر صورت میں پُراسرار گمشدگی سے شکاری ایک ہی نتیجہ اخذ کرتے کہ عین اس کے پالیسی ساز اجلاس کے بعد ایک اہم شریک جلسہ کا اس طرح غائب ہونا خطرے کا سائرن ہے۔ ان کو کسی نے اغوا کیا ہوگا اور پھر ان کے جسم سے جاں کو قطرہ قطرہ کشید کرنے والوں نے ان کے دماغ سے بھی وہ سب معلومات حاصل کرلی ہوں گی اہم تحقیق و تفتیش کے تو ایک سو ایک طریقے ایسے ہیں جن کا آدمی کو یوں بولنے پر مجبور کر دیتا ہے جیسے چابی والے گراموفون ریکارڈ کو سوئی کی چبھن آواز نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر اپنے منصوبے کو از سر نو مرتب کرتے اور سب کچھ بدل ڈالتے۔

یہ مسئلہ اب بھی تھا کہ اس شوفر نواب کا کیا کیا جائے جو کی ڈکی میں بند تھا لیکن زیادہ سنگین نہیں۔ اسے سب کے سامنے کر بہتر طریقے پر حل کیا جاسکتا تھا۔ میں اس عالی شان کار کو تنگ گلی سے گزار کر گولڈن مونگ پھلی اینڈ نیوز پیپر ایجنسی کی طرف لے گیا جہاں اب مرزا غالب مونگ پھلی بیچ رہے تھے۔ یہ کوئی عام کار نہیں تھی جو کسی کو متوجہ نہ کرتی۔ اس کو چوری کر کے آسان تھا، رکھنا عملاً ناممکن تھا۔ آدمی کسی کی مرغی تو چرا کر ہضم بھی کرسکتا ہے چڑیا گھر کا ہاتھی نہیں چرا سکتا اور چرا کر تو چھپا کے نہیں رکھ سکتا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد پولیس کو اس کار کی چوری کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے گا وہ آسانی سے کسی بھی سڑک پر اس گاڑی کو دیکھیں گے تو پہچان

جائیں گے کیونکہ ایسی کاریں لاہور میں دو درجن سے زائد نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے کار کو دو گھروں کے درمیان خالی پڑے ہوئے پلاٹ پر کھڑا کیا ہی تھا کہ میرے کانوں میں پھر آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈرائیونگ کرتا ہوا سو میٹر کی رینج سے دور ہو گیا تھا۔ اب میں پھر مونگ پھلی کے اسٹیشن سے قریب تھا چنانچہ میرے ریسیور نے کام شروع کر دیا تھا۔

"سب تمھارا قصور ہے ممی..." پرویز یا سلیم وکٹر میں سے کسی نے کہا۔ ان دونوں بھائیوں کی آوازیں بھی ایک تھیں جیسے ان کے کرتوت ایک تھے۔

"آخر کیا ضرورت تھی تم کو..."

"تُو تھانیدار ہے کیا۔" ان کی ماں نے چیخ کر کہا۔ "کہ مجھ سے اس لہجے میں سوال کر رہا ہے... ارے یہ گھر میرا ہے... تیرے ان شہدے دوستوں کا نہیں۔ آخر کیا سمجھ کے اس نے ایسی حرکت کی تھی... میں اس کا مُنہ نوچ لیتی۔"

"اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔"

"اور کیا ہوتی ہے غلط حرکت؟" وہ اسی لہجے میں بولی۔ "وہ اس مظلوم عورت کو مارتا؟ کپڑوں کے ساتھ عزت اتار لیتا؟ کھال کھینچ لیتا تب یہ زیادتی کہلاتی؟ میں کہتی ہوں تم کو شرم نہیں آئی اس وقت جب وہ ہمارے گھر کا نمک کھانے والی ایک غریب عورت پر ظلم ہو رہا تھا، تم کیوں نہیں بولے... کیوں منع نہیں کیا اس کمینے کو..."

"تم ان باتوں کو نہیں جانتیں ممی۔" سونیا نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ "اس سے پوچھنا ضروری تھا۔"

"کیا پوچھنا ضروری تھا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ بے چاری کتنی ستم رسیدہ تھی۔" ان کی ماں بولی۔

"ہم نے یہ اسی کے مُنہ سے سُنا تھا۔" سونیا کا بھائی بولا۔

"تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی؟" ماں نے چمک کر کہا۔

"ممی! کیا ثبوت ہے کہ سچ ہی بول رہی تھی وہ؟" سلیم بولا۔

"سچ کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی احمق۔ کتنے دن سے تھی وہ اس گھر میں۔ صبح سے شام تک جو کچھ کرتی تھی سب کے سامنے کرتی تھی۔ سب کی خدمت کی اس نے... میرے تو پاؤں دباتے، میری دوا کا اور خوراک کا خیال رکھا۔ جو تم سب نہیں کرسکے تھے وہ اس نے کیا..."

"ہم نوکر نہیں تھے۔" پرویز نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ہاں! تم میری اپنی اولاد تھے... تم کو کرنی چاہیے تھی میری خدمت مگر تم تو میرا دو دن کا آرام نہ دیکھ سکے۔" ان کی ماں نے رونا شروع کیا۔ "ارے بے وقوفو... میں نے اُسے اچھی طرح پرکھ لیا تھا... جانتے بوجھتے میں نے زیور کھلا چھوڑا۔ اِدھر اُدھر رکھ دیا مگر اس نے ہر چیز اٹھا کے مجھے لادی۔ میں نے ہزاروں روپے... دس ہزار کی پوری گڈی دروازے کے پاس گرا دی۔ یوں

جیسے تم سے باہر جاتے ہوئے گر گئی ہو۔ وہ چاہتی تو رکھ لیتی لیکن اس نے کبھی ایک پیسہ اِدھر سے اُدھر نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ چور تو نہیں ہے۔ وہ زمانے کی ستائی ہوئی عورت تھی، جسے تم نے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا۔ خدا معلوم اب کہاں گئی ہوگی۔ اس کی بددعا نہ لگ جائے ہمارے گھر کو۔"

یہ میرے لیے نئی اور بڑی اچھی اطلاع تھی کہ نازو موقع پاتے ہی اس گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا مشن اس کی ہمت اور ذہانت کے باعث بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس نے وہ سب کچھ کرلیا جس کے لیے ہم نے... میں نے... اسے ایک ایسے جہنم میں دھکیل دیا تھا جہاں زہریلے ناگ اور ڈنک مارنے والے بچھو سے زیادہ ہلاکت آفریں انسان رہتے تھے اور جہاں سے اس کی واپسی قطعی غیر یقینی تھی۔ ایک بار پھر میں نے تسلیم کیا کہ صرف نازو ہی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتی تھی۔ دعوے تو سب ہی کرلیتے ہیں کہ وہ آسمان پر تیر مار سکتے ہیں مگر وقت آتا ہے تو ان سے کمان بھی نہیں اٹھائی جاتی۔ میں خود اپنے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی کام میرے سپرد کیا جاتا تو میں سارے خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنی آسانی سے تیار ہو جاتا اور اگر جانا پڑتا تو ہر مرحلہ اتنی خوبی سے سر کرنے کے بعد اتنی صفائی سے نکل بھی آتا۔ یہ نازو کی اداکاری کا کمال تھا کہ ماں اپنی اولاد کو احمق اور بے وقوف کہہ رہی تھی۔ نازو کو ایک ستم رسیدہ اور مظلوم عورت تسلیم کرچکی تھی۔ اس کے دکھ پر دُکھی تھی۔ اس کی خدمت گزاری، وفا شعاری اور ایمانداری کے گُن گا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر برہم تھی۔ نازو نے کمال کیا تھا کہ کسی کو اپنے بارے میں شک میں مبتلا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک وقت کچھ دیر پہلے ایسا آگیا تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ مار دھاڑ کیے بغیر وہ نکل نہ سکے گی اور میں یہ بھی طے کرچکا تھا کہ ایم آر ایس کی پوری قوت کے ساتھ اس کو نکال لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ بلاشبہ نازو کسی کے ہاتھ آنے سے پہلے ایک دو کے ہاتھ پیر توڑنے کی پوری طرح اہل تھی مگر وہاں دو سے زیادہ افراد تھے جو مسلح بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم نازو کی مدد کو پہنچتے کوئی بھی شکاری صرف ایک گولی چلا کے نازو کا اور اس کے مشن کا خاتمہ کر دیتا۔ نازو نے ثابت کر دیا کہ وہ آسانی سے جذبات کی تندی کا شکار ہو جانے والی لڑکی نہیں ہے۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے جوابی کارروائی سے گریز کیا اور جب موقع پایا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یوں نکل گئی جیسے چھلنی سے پانی نکل جاتا ہے۔

میں نے وائرلیس کا بٹن دبا کے مرزا غالب سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لہک لہک کر گا رہے تھے۔ "کھاؤ جو میری مونگ پھلی... کھِل جائے تمھارے دل کی کلی۔ خوشبو سے مہکے گلی گلی۔ بادام سے اور پستے سے بھلی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"بس مرزا بس... شاعری کو مبالغے نے ڈبویا..." میں نے کہا۔ "تم کو یہ مونگ پھلی ڈبو دے گی۔"

"تم کیا شاہِ جنات کے ساتھ ڈوب مرے تھے بھوت کے بچے؟" مرزا غالب نے خفگی سے کہا۔ محسن اور اس کا سالا دونوں جھک مارتے پھر رہے تھے۔"

"ویری گڈ۔ وہ اسی قابل ہیں کہ جھک ماریں۔" میں نے کہا۔ "اور کیا مارس گے وہ... تم نے سنا کہ نازو بھاگ گئی۔"

"پرانی خبر ہے... مگر دالمنح ہو کر بے سر ساتھ نہیں بھاگی... ٹیڈی کے ساتھ بھاگی ہے۔" غالب نے کہا۔ غالب کی قدر تو اس کے مرنے کے بعد ہوگی۔"

"تمہارے کیس میں مرنے کے بعد بھی مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ محسن خاں کہاں پائے جاتے ہیں؟"

"تمہاری تلاش میں گلی گلی بھٹک رہا ہے... ابھی آجائے گا رپورٹ دینے کہ ابھی تک سکندر کے نہ فنگر پرنٹ ملے ہیں نہ فٹ پرنٹ۔" غالب بولا۔

"یار وہ ایک چیز اٹھالی میں نے سڑک پر سے... بس ایسے ہی دل چاہا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر آپ بھول رہے کچھ۔" غالب بولا "آپ نے ایک نہیں دو چیزیں اٹھائی ہیں۔ ایک نواب کا چربہ اور دوسری نواب کی کار۔ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ قبض ہو جاتا اگر شرافت سے لوٹ آتے؟"

"یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہت سے کام سوچنے سے نہیں ہوتے مثلاً نکاح کے وقت فوراً کہنا پڑتا ہے کہ قبول کیا۔ سوچنے بیٹھ جائے آدمی تو قاضی سے کہے کہ آپ بتائیے پہلے آپ نے قبول کیا؟" میں نے کہا۔ "محسن آئے تو اس سے کہو کہ گھر جائے۔ تم بھی خیر سے سدھارو۔ میں وہ تحفۂ درویش لے کر حاضر ہوتا ہوں... اس کا کیا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر کریں گے۔"

"میں ابھی نہیں جاسکتا۔ آج تو سیل ہو رہی۔ ٹیڈی چیلنج دے گیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "میں بارہ بجے ہی دکان بڑھاؤں گا۔"

"یہ بتاؤ، وہ سب ٹھیک ریکارڈ ہو گیا ہ؟"

"ہو گیا ہوگا... جب سنیں گے تو پتا چلے گا۔" غالب نے کہا اور بیوپاری شروع کی۔ "کھاؤ جو میری مونگ پھلی...!" غالباً اس کے گاہک آرہے تھے۔ میں نے سیٹ آٹ کرنے سے پہلے قافیہ ملا کے کہا۔ "بھون منگے موت ملی۔" اور گاڑی کو واپس لے گیا... میری آخری بات صرف غالب کے کانوں نے سنی ہوگی مگر وہ فی البدیہہ کچھ عرض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ان دنوں مونگ پھلی بیچنے کا مقابلہ زوروں پر تھا اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کی ٹھنی ہوئی تھی۔ گزشتہ دن ہی ان کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

وہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں نے سیدھا گھر کا رُخ کیا۔

میں اس کار کو کم سے کم وقت اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ ... کو اپنے پاس رکھنا ضروری تھا۔ وہ ہمیں بہت سی مفید معلو... فراہم کرسکتا تھا۔ اس کے انجام کے بارے میں مجھے کوئی شبہ ... ہم اسے واپس کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بہتر ... تھا کہ وہ غائب ہو جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے گدھے کے ... سینگ غائب ہوئے ہوں گے۔ گدھا تھا اصل نواب اور ... کے سینگ تھے یہ ہمشکل شوفر صاحب جو ڈبل کا رول بڑ... سے ادا کرتے آئے تھے مگر دنیا سے سنگل ہی جانے والے تھے۔

کار اتنی شاندار تھی کہ مجھے خسرو جمشید پر رشک آیا ... اس سے حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ جائز دولت کی خرید تھی یا نا... کی مگر شاہانہ سفر کے تمام تکلفات سے مزین ایسی کار کی ملکیت ... آدمی فخر کرے تو جائز... شاید کسی دن خدا مجھے بھی اس قابل ... میں نے سوچا۔ اگر وہ سب جو میرا حق تھا، مجھے مل جاتا اور ... دشواری کے بغیر رابعہ قاری جیسی کامیاب ایڈووکیٹ سے شادی ... میں کامیاب ہو جاتا تو ہم ایسی دو کاریں رکھ سکتے تھے۔ اے ... آرزو کہ خاک شدہ!!... ابھی تو عشق بھی آشفتہ سر ہے اور ... ہے سودائے خام... نہ جانے کب تک اس گردشِ قام ... درمیان... بے ساماں... ہم ہی ہوں گے بے نشاں... سا... گے اپنی ہی تنہائیوں کے کارواں... اپنے اپنے نوحہ خواں۔

معلوم نہیں کیسے میرا ذہن ایسے وقت میں بھٹک گیا ... مجھے انتہائی مستعد رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس ٹریفک پولیس کے سارجنٹ کو اس وقت دیکھا جب وہ مجھے ... کے لیے سامنے آچکا تھا۔ اس کی ساڑھے سات ہارس پاور ... ٹرائمف موٹر سائیکل نہ جانے کہاں سے میرے پیچھے لگی تھی ... وہ آگے آگے چلتے ہوئے ایک ہاتھ سے مجھے رُکنے کا اشارہ ... تھا۔ قدرتی طور پر جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا ... خسرو جمشید نے چوری ہونے والی مرسیڈیز کا ماڈل رنگ اور ... مشتہر کرا دیا تھا اور پولیس نے اپنے وائرلیس کے نظام پر سب ... اطلاع دے دی تھی کہ اس قسم کی کار پر نظر رکھی جائے۔ یہ سارجنٹ ... میری شامتِ اعمال بن کے کہیں کھڑا تھا کہ ادھر اعلان نشر ہوا ... میں اس کے سامنے سے گزرا۔

اب نجات کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں ... کے بجائے رفتار بڑھاؤں اور بھاگ جاؤں مگر اس کے پاس ا... خطرناک قسم کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ میرا تعاقب کر کے بھی مجھے ... پکڑ سکتا تھا۔ یہ کار نہ ہر تنگ گلی سے گزاری جا سکتی تھی اور نہ ... موڑی جا سکتی تھی۔ اس کے برخلاف موٹر سائیکل شکاری کتے کی ... تھی جو برق رفتاری کے ساتھ جست لگائے۔ ایک دم ملٹے ... گھوم کر سامنے آجائے اور فرار کے راستے ہی نہ چھوڑے۔ دو... طریقہ یہ تھا کہ میں اسے ٹکر مار کے بھاگ جاؤں۔ یہ بھی مشکل تھا ...

سارجنٹ مسلح تھا۔ وہ گرتے گرتے بھی کار کا ٹائر برسٹ کر سکتا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنے اعتماد کا مظاہرہ کروں اور اگر مقابلہ ہو تو آتشیں اسلحے کا نہ ہو۔ خالی ہاتھوں کی طاقت کا ہو۔

"یس؟" میں نے کار روک کے سر نکالا۔

"نیچے اترو، یس کے بچے۔" وہ موٹر سائیکل ایک کنارے پر ٹکا کے بولا۔

"میں یس کا بچہ ہوں تو تم کون ہو؟" میں نے نیچے اتر کے کہا۔ "نو کے بچے؟"

"بکواس بند کرو..." وہ ریوالور نکال کے بولا۔ "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "یہ تمہارے باپ کی گاڑی ہے۔"

اتنی اشتعال انگیزی کو برداشت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس نے ریوالور اٹھایا اور دستہ میرے سر پر مارنا چاہا۔ لیکن اس کا ہاتھ نیچے بھی نہیں آیا تھا کہ میرا ہاتھ اٹھا اور ضرب اتنی شدید ہوگئی کہ ریوالور اچھل کے نیچے گرا اس کے ہاتھ کی ہڈی کلائی کے اوپر سے ٹوٹ گئی۔ میں نے کم سے کم وقت میں وہاں سے نکل جانے کے لیے اس کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے ہاتھوں نے اس کو اپنی طرف کھینچا اور جب وہ تیزی سے آگے آیا تو میں نکل گیا۔ اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ گاڑی سے ٹکرایا۔ کوئی دوسری کار ہوتی تو اس کی چادر اندر دب جاتی لیکن مرسیڈیز کی باڈی بہت مضبوط تھی۔ سارجنٹ کے حلق سے ایک بار "حق" کی آواز نکلی۔ پھر وہ وہیں گر گیا۔ میں نے اُسے اٹھا کے گاڑی کے اندر ڈال دیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دو منٹ میں سنسان سڑک پر سے ایک گاڑی بھی نہیں گزری اور کسی نے بھی مجھے نہیں دیکھا، ورنہ اس واردات کا چشم دید گواہ بن جاتا۔

میرے ذہن نے تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ سارجنٹ یقیناً گاڑی دیکھ کر میرے پیچھے آیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ یہ چوری کی ہے ورنہ اتنی عظیم الشان کار کے مالک سے تو ایس پی کو بھی ایسے لہجے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ میں اپنے ٹھکانے سے اب بھی دو میل دور تھا۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے ایک بار پھر حلیہ بدلنے کے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں خود بھی گاڑی کے اندر گیا اور اندر ہی رہتے ہوئے میں نے نقلی نواب کا لباس بھی بدل ڈالا۔ سارجنٹ کی وردی میرے جسم پر فٹ آئی۔ وردی کے ساتھ ہی اس کے تمام کاغذات اور اس کی جیب میں بھری ہوئی حرام کی دولت بھی میری تحویل میں آگئی۔ سارجنٹ کی موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی اور ابھی تک میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کو وہیں چھوڑوں گا یا ساتھ لے جاؤں گا۔ میں نے سارجنٹ کے بارے میں بھی طے نہیں کیا تھا کہ اسے کہاں غائب کروں گا۔ اس نے تو محض شامتِ اعمال کے باعث میرا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی اور جو کچھ اس نے کیا وہ اس کا فرض تھا۔ نہ وہ مجھے پہچان پایا تھا اور نہ میرا ارادہ اسے اس سے زیادہ سزا دینے کا تھا جتنی وہ پا چکا تھا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب میں نے اسے بھی ڈکی میں ڈال کر کچھ دُور لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ سارجنٹ کو موٹر سائیکل سے ایک ڈیڑھ میل دور بالکل مختلف سمت میں کسی جگہ سڑک کے کنارے ڈال دوں گا جہاں سے کوئی اسے اٹھالے گا، ورنہ وہ خود ہی ہوش میں آنے کے بعد چل پڑے گا۔ خسرو جمشید کے شوفر کی وردی اسے پہنانے کا خیال مجھے ضرور آیا تھا لیکن اس طرح دو الگ الگ وارداتوں کا سلسلہ آپس میں مل جاتا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ سارجنٹ کو بھی ڈکی میں ڈال دوں۔ پھر ایک جگہ اسے چھوڑوں اور گاڑی کو دوسری جگہ۔ کہیں سے ایک اور گاڑی لاؤں۔ نقلی نواب کو اس گاڑی میں شفٹ کروں اور گھر پہنچ جانے کے بعد دوسری گاڑی کو بھی دور کھڑا کر آؤں۔

ڈکی کھول کر دیکھنے پر مجھے نواب خسرو جمشید کے شوفر کی گردن کچھ عجیب طرح سے مڑی ہوئی اور اکڑی ہوئی دکھائی دی۔ زندگی میں تو خسرو جمشید کی گردن اکڑی ہی رہتی تھی مگر بے ہوشی کی کیفیت میں یہ پوزیشن ذرا مشکل لگتی تھی۔ میں نے اُسے ہاتھ لگا کے دیکھا تو اس کا جسم بھی اکڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد تصدیق کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مر چکا تھا اور اسے مرے ہوئے بھی کافی دیر ہوگئی تھی۔ غالباً وہ اسی وقت مر گیا تھا جب میں نے اُسے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کا اتنی جلدی مر جانا میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر وہ سر کی کسی اندرونی چوٹ سے مرتا تو فوراً نہ مرتا۔ ایک شبہ دور کرنے کے لیے میں نے ڈکی میں سر ڈال کے اس کا مُنہ سونگھا۔ اس کے مُنہ سے کڑوے باداموں جیسی بُو آرہی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ گزشتہ روز بھی ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ ولاور نے پیڈرو سے کہا تھا کہ گرفتار ہو کے ہمارے ساتھ جانے سے بہتر ہے کہ وہ قیدِ حیات سے نجات پالے مگر اس کو ہمت نہ پڑی تھی۔ خسرو جمشید کا یہ وفادار شوفر جو اس کے ڈبل کا رول بڑی کامیابی سے کرتا تھا، پیڈرو سے زیادہ بہادر ثابت ہوا۔ اس نے وہی کیا جو ایسے حالات میں کرنا تھا۔ ولاو راینڈ کمپنی کے ہر معتمدِ خاص کو اس کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اس نے دانتوں کے کسی خلا میں چھپے ہوئے دنیا کے خطرناک ترین زہر سائنائڈ سے بھرے کیپسول کو توڑ دیا تھا اور چند سیکنڈ کے اندر اندر مر گیا تھا۔ غالباً ڈکی کے اندر پہنچتے ہی اُسے ہوش آگیا تھا مگر ہوش آتے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ قید میں ہے اور اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ وہ پُرانا آدمی تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کو قید کرنے والے کون ہیں اور اس کے ساتھ کیا سلوک کر سکتے ہیں۔ اس نے فوراً فیصلہ کیا اور اس پر عملدرآمد میں بھی دیر نہیں لگائی۔

اس صورتِ حالات نے مجھے اپنا پروگرام بدلنے پر مجبور کر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دیا۔ مجھے اپنی کوشش کے رائیگاں جانے اور وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہونے لگا۔ محسن اور غالب تو اب مجھے بخشیں گے نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ آخر اس ایڈونچر کی کیا ضرورت تھی۔ نقلی نواب کے مرنے سے میرا یہ کارنامہ واقعی بے مصرف ایڈونچر ہو گیا تھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ خواہ مخواہ گاڑی چوری کی۔ نقلی نواب کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لیا اور مزید خرابی کہ ایک ٹریفک سارجنٹ کو مار کے گاڑی میں ڈال لیا۔ یک نہ شُد دو شُد۔ اب دوسرا مسئلہ سارجنٹ کی گاڑی کا بھی پیدا ہو گیا تھا۔

سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے سارجنٹ کو کھینچ کر باہر نکالا اور سڑک سے دُور لے گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے، چنانچہ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ کسی نے مجھے یہ کارروائی کرتے نہیں دیکھا۔ میں واپس آ کے گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو بھگا لے گیا۔ تقریباً ایک میل سیدھا جانے میں میرے پانچ منٹ صرف ہوئے۔ میری نظر کسی مناسب مقام کی جستجو میں تھی۔ اچانک مجھے سڑک کے کنارے ایک گیراج سا نظر آیا۔ گیراج لکڑی کا مختصر سا کیبن تھا جس کے سامنے تین چار پرانی اور زنگ خوردہ کاروں کے ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی کو ان کے درمیان میں فٹ کیا۔ نقلی نواب کے کپڑے ڈکی میں ڈالے اور پٹرول ٹینک کھولا۔ ڈکی میں ایک پائپ نہ ہوتا تو پٹرول نکالنا خاصا مشکل ہو جاتا مگر کاروں والے عموماً چھوٹا سا پائپ کا ٹکڑا اس لیے رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر تھوڑا بہت پٹرول نکالا جا سکے۔ کاربوریٹر کی صفائی کا مسئلہ ہو یا بریک لائن دھونے کا، تھوڑا بہت پٹرول میکینک بھی کھینچ کر نکال لیتے ہیں۔ میں نے پائپ کا ایک سرا ٹینک میں ڈالا اور دوسرے سرے کو منہ سے لگا کے پٹرول کو سانس کے ساتھ کھینچا۔ تھوڑا سا پٹرول میرے منہ میں گیا۔ میں نے فوراً نلکی کو نیچے کر دیا اور پٹرول خسرو جمشید کے شوفر کے کپڑوں پر گرنے لگا۔ میں نے منہ کے پٹرول کو باہر تھوکا مگر پھر بھی میرا حلق کڑوا رہا اور پٹرول سے میرے ہونٹ کے کنارے جلنے لگے۔ میری زبان سُن ہو گئی اور اس کی بُو سے مجھے متلی سی ہونے لگی۔ جب کپڑے پٹرول میں اچھی طرح تر ہو گئے تو میں نے ڈکی بند کی اور کپڑے گاڑی کی اگلی اور پچھلی سیٹوں پر پھیلا کے لائٹر سے آگ دکھا دی۔ شعلے بھڑکتے ہی میں وہاں سے بھاگا۔

سڑک پر دس منٹ پیدل چلنے کے بعد مجھے اپنے پیچھے سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا اجالا محسوس ہوا۔ میں نے گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کیا اور پھر سڑک کے بیچ میں آ کے اُسے روک لیا۔ گاڑی کو ایک عورت چلا رہی تھی۔ وہ بُری طرح نروس ہو گئی۔ اگر آخری وقت میں چھلانگ لگا کے میں ایک طرف نہ ہو جاتا تو کار یقیناً مجھے کچل دیتی۔

"کیا... کیا بات ہے؟" عورت نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا۔

"کیا تم نشے میں ڈرائیونگ کر رہی تھیں؟" میں نے [illegible] سارجنٹ کے لہجے میں سوال کیا۔ "لائسنس ہے تمھارے پاس؟"

"سب کچھ ہے۔" وہ چلّائی۔ "لیکن اس وقت مجھے جانے دو... مجھے میو اسپتال پہنچنا ہے... میری بیٹی کی حالت خراب ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔ "آپ اُدھر ہی جا رہی ہیں۔ مجھے آگے ڈراپ کر دیں۔"

عورت نے سر ہلایا اور دروازہ کھول دیا۔ "بیٹھو..." بولی اور ابھی میں بیٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے گاڑی چلا دی۔

"کیا ہوا ہے آپ کی بیٹی کو خاتون؟" میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔

"اس کو... کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔" وہ دُکھ اور مایوسی سے بولی۔ "آج ایک سال ہونے کو آیا۔ اس کے گردے ناکارہ ہو چکے تھے۔ وہ مشین کے سہارے زندہ تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ ڈائیلیسس ہوتی تھی مگر اب وہ بھی ممکن نہیں۔ ایک گردہ مل جاتا تو ڈاکٹر کوشش کر سکتے تھے لیکن ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ اب اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس سے زیادہ میں اس کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔" وہ چالیس پینتالیس سال کی عورت تھی مگر کچھ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی اور کچھ اس نے خود کو سنبھال کے رکھا تھا چنانچہ وہ تیس برس کی نظر آتی تھی۔ اس کا لباس فیشن ایبل تھا اور اس کے انداز و اطوار میں بھی اچھے بیک گراؤنڈ کی جھلک ملتی تھی۔ وہ بہت ہمت والی بھی تھی کہ اتنی رات کو اکیلی گاڑی لے کر چل پڑی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے ساتھ کوئی مرد کیوں نہیں۔

"آپ اکیلی جا رہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اکیلی ہی ہوں... ایک بیٹی تھی... جب وہ مر جائے گی تو میں بھی مر جاؤں گی... صرف اسی کے لیے زندہ تھی میں۔ ایک امید تھی کہ شاید میری کوشش اور دعائیں اسے بچا لیں۔ اپنے لیے جی کر مجھے کیا کرنا تھا... میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔" اس نے سیٹ کی سائڈ پر رکھا ہوا ریوالور اُٹھا کے مجھے دکھایا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ اگر چاہتی تو ریوالور دکھا کے رُکے بغیر نکل جاتی مگر اس نے میرے لیے گاڑی روک لی تھی۔

"آپ... یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے کہا۔ "اتنی مایوس ہیں آپ... کہ خودکشی کی سوچتی ہیں... یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا کرنا غلط ہے... اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔"

"کوئی مجھے زندہ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔

"میں کر سکتا ہوں۔" میں نے اچانک کہا۔ "آپ کا مسئلہ صرف ایک گردے کا ہے نا... میں یہ مسئلہ حل کر دوں گا۔"

"میں اب تک کچھ نہیں کر سکی... تو تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے بہت سے ساتھی ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کا ایک گردہ آپ کی بیٹی کے لیے موزوں ثابت ہو۔ آپ نے خود..."

"میرا اپنا گردہ میچ کر گیا تھا۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے بولی۔ "مگر قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں بدل سکتا... جس دن آپریشن ہونا تھا اس دن بجلی فیل ہو گئی۔ اسپتال والوں نے اپنا جنریٹر چلایا۔ وہ خراب ہو گیا... گردہ ضائع ہو گیا۔"

"گاڑی یہاں روک لیں۔" میں نے موٹر سائیکل کو دیکھ کر کہا۔ "اور مجھے بتائیں کہ آپ سے پھر کہاں اور کیسے رابطہ قائم کروں؟"

"کیا پولیس میں اتنے ہمدرد اور نیک دل لوگ ہوتے ہیں؟" وہ میری وردی کو دیکھ کر بے یقینی سے بولی۔

"اچھے بُرے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی محکمے، کسی شہر یا صوبے اور کسی ملک سے نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "بہتر ہوگا اگر آپ اس وقت میرے ساتھ چلیں۔ سب سے پہلے میں ہوں۔ پھر میرے گھر کے لوگ ہیں۔ کسی نہ کسی کا گردہ ضرور میچ کرے گا۔ نہیں کرے گا تو ہم اپنے دوستوں سے رابطہ قائم کریں گے۔ ہمارے دوست بھی ایسے ہی ہیں جیسے ہم ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو۔ اگر کوئی میرا بھی دوست ہوتا تو میری مدد کر سکتا تھا۔" وہ اب تک نہیں روئی تھی مگر ہمدردی کے دو بول سنتے ہی رونے لگی۔

"کم آن... خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اُسے تسلی دی۔

"بہت مشکل ہے اب۔" وہ بولی۔ "اگر میرا شوہر زندہ ہوتا... تو کیا ایسا ہو سکتا تھا... اس کے مرتے ہی سب ساتھ چھوڑ گئے۔"

"کون تھا آپ کا شوہر؟" میں نے کہا۔ "کب انتقال ہوا ان کا؟"

"انتقال ہوئے کئی سال ہو گئے۔" وہ بولی۔ "وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا... کم سے کم اس دنیا کی نظر میں... تم نے بھی شاید اس کا نام سنا ہو گا... بہرام دادا کے نام سے مشہور تھا وہ..."

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ بہرام دادا کا ذکر استاد نیلو نے کیا تھا مگر میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ آدھی رات کو اتفاق سے ایک سنسان سڑک پر ملنے والی یہ عورت بہرام دادا کی بیوہ ہو سکتی ہے۔ میں پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اطمینان سے اس کا ریوالور اٹھا لیا۔

"میں بہرام دادا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو..."

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔" وہ بولی۔ "اسے پولیس سے زیادہ کون جانتا تھا۔ تم ہی تو اس کے قاتل تھے۔ میں پہچانتی ہوں تمھیں..." اس نے یکلخت جھپٹ کر ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ حیرت کا ایک لمحہ تھا جس نے مجھے اس کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ میں یہ امید بھی نہیں رکھتا تھا کہ اس جیسی دُبلی پتلی، مغموم اور مضمحل عورت ایک توانا مرد کے ہاتھوں سے ریوالور چھیننے کی کوشش بھی کر سکتی ہے مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب ریوالور کی نال کا رُخ میری طرف تھا۔ مجھے وہ اپنے شوہر کا قاتل سمجھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں انتقام کی پیاس کے ساتھ خون اُتر آیا تھا۔

"دماغ خراب ہے تمھارا۔" میں نے پلک جھپکتے میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا مگر پھر بھی مجھے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ گولی میرے بائیں شانے کے گوشت کو اُدھیڑتی ہوئی بند کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اگر اس وقت جب اُس نے ریوالور اٹھایا تھا، میں نے دیکھ لیا ہوتا کہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے تو یہ نوبت نہ آتی۔ سیفٹی کیچ سے گولی کے اتفاقیہ چل جانے کا خطرہ بھی باقی نہ رہتا۔ میں نے سیدھے ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کے جھٹکا دیا تو ریوالور نیچے گر گیا۔

"ہاں، ہاں میں پاگل ہوں۔" اُس نے ہسٹریائی میں چلّانا شروع کیا۔ "پہلے تم نے میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے زندہ درگور کیا..."

"ہوش میں آؤ... میں نے اُسے قتل نہیں کیا تھا۔" میں نے اُسے جھنجوڑا۔

"تم نہ سہی... وہ تم جیسا ہی تھا۔ پولیس کی وردی نے اور اس کے ریوالور نے یہ اختیار دے دیا تھا اسے کہ وہ جسے چاہے قانون کے نام پر اپنی گولی کا نشانہ بنا دے۔" وہ دیوانہ وار چیخنے لگی۔ "آج تم آ گئے ہو میرے ہمدرد بن کے... جھوٹے... فریبی... دغاباز... کیا بچا ہے اب میرے پاس جو مجھ سے چھینو گے۔" اُس نے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ مجھ سے لڑنا جاری رکھا۔ اپنی کلائی کو میری گرفت سے چھڑانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی بل کھاتی رہی۔ اس نے میرے ہاتھ پر دانت جما کے کاٹنا چاہا اور دوسرے ہاتھ سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی۔ مجبوراً مجھے اس کے ایک تھپڑ رسید کرنا پڑا۔ میں نے زیادہ قوت صرف نہیں کی تھی مگر ایک محدود سی جگہ میں ہونے والی کشمکش سے نقصان زیادہ ہوا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ پر لگا۔ وہ آخری بار چلّائی اور بے ہوش ہو گئی۔ میں نے اُسے دوسری سیٹ پر کر دیا اسی وقت ایک کار سامنے سے نمودار ہو گئی اور عین میرے قریب آ کے ٹھہر گئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہ..." کار میں سے اترنے والے باکسر ٹائپ شخص نے بڑے خطرناک ارادے سے ہماری کار کا دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے باہر گھسیٹتا میں خود باہر آ گیا۔

"تمھارے خیال میں یہاں کیا ہو رہا تھا؟ کسی فلم کی شوٹنگ؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"کیوں چیخ رہی تھی یہ عورت... بولو۔" وہ غرّایا۔ قد میں وہ مجھ سے چار انچ زیادہ ہی تھا اور اُسے یقیناً اپنی قوتِ بازو پر بہت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ناز تھا۔

"دیکھو مسٹر! میں تمھیں شرافت سے جانے کے لیے دس سیکنڈ دیتا ہوں۔"

"شرافت کی ایسی تیسی۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "تم جیسے شریفوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں... اس وردی سے بھی نہیں ڈرتا میں... تم جیسے دس سارجنٹ میرے باپ کو سیلیوٹ کرتے ہیں۔ یوں۔"

"مگر ان دس میں تم نے مجھے شامل سمجھ رکھا ہے تو یہ تمھاری بھول ہے۔" میں نے کہا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تم کو بھی گرفتار کرلوں گا۔"

"مجھے گرفتار کرو گے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کس جرم میں؟"

"فرائض کی ادائیگی سے روکنا جرم ہے۔ میٹر ریڈر سے پولیس انسپکٹر تک سب سرکاری ملازم ہیں تمھارے باپ کے نہیں۔" میں نے کہا۔

"اور وردی پہن کر اکیلی عورت پر دست درازی کرنا تمھارے سرکاری فرائض میں شامل ہے؟" اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

میں اس سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا تو اس کے متعدد اسباب تھے۔ میں نقلی سارجنٹ تھا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اصلی سارجنٹ کی موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اصلی سارجنٹ کسی بھی لمحے ہوش میں آجاتا تو بہت سنگین مسائل پیدا کردیتا۔ وردی نہ سہی اس کے جسم پر بنیان اور انڈرویر بہر حال تھے چنانچہ وہ سڑک تک پہنچتا تو مجھے فوراً شناخت کرلیتا اور مجھ پر ایک درجن مقدمات قائم ہو جاتے۔ ایک مرسیڈیز کی چوری... سارجنٹ پر قاتلانہ حملہ۔ اس کی وردی پہن کر دھوکا دینا۔ گاڑی کو آگ لگا کے تباہ کرنا (اس میں سے جلی ہوئی لاش برآمد ہونے کے بعد) ایک قتل... چوری اور قتل کے جرائم کو چھپانے کی کوشش۔ ایک عورت پر بدنیتی کے ساتھ دست درازی اور ایک "شریف شہری" سے مارپیٹ جو عورت کی مدد کرنا چاہتا تھا... وغیرہ وغیرہ... یہ کون دیکھتا کہ میں نے ایک مصیبت سے نجات پانے کے لیے دوسری مصیبت مول لی تھی۔ سلسلہ نہ جانے کہاں تک دراز ہوتا۔

میری وجہ سے اس عورت کو بھی اسپتال پہنچنے میں دیر ہورہی تھی جس کی بیٹی کی حالت نازک تھی۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر مدد کا جذبہ اس کے حق میں برائی کا سبب بن رہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے شک تھا کہ دخل درمعقولات کرنے والا جوان ہوش میں نہیں ہے۔ وہ کچھ پیے ہوئے تھا اور اگر میں اپنی جان چھڑا کے نکل جاتا تو معلوم نہیں وہ بہرام دادا کی بیوہ کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا، وہ پریشانی کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھی۔ اب اس کے لیے یک نہ شد دو شد والا مسئلہ ہوگیا تھا۔ پہلے میں نے اس سے زبردستی لفٹ لی تھی اور ابھی وہ مجھ سے گلو خلاصی میں ہی کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور بدمعاش نے فساد کھڑا کر دیا۔

ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے فوری مؤثر جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک مُکا پوری قوت سے اس کے مُنہ پر مارا۔ وہ اس حد تک ہوش میں ضرور تھا کہ اس نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور مُکا اس کے شانے پر لگا۔ ضرب شدید نہیں تھی مگر وہ ایک دم پیچھے گر گیا اور چلانے لگا۔ بچاؤ... میں نے ایک پیر سے اس پہ دباؤ ڈالا۔

"بھونکنا بند کرو کتے... اور بھاگ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ اس طرح چیخنے لگا جیسے روڈ رولر کے نیچے آگیا ہو مگر مُنہ میں۔ یہ سب نشے کا اثر تھا۔ نشہ ہرن ہوا تھا تو بہادری کے جوہر دکھانے کا جذبہ بھی خلاص ہوگیا تھا اور اس نے مظلوم بن کر سارے زمانے کو مدد کے لیے اکٹھا کرنے کا پروگرام بنالیا تھا۔

"مرڈر... ارے کوئی دوڑو... مدد کرو..." اس نے لاؤڈ اسپیکر کی طرح آواز نکالی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے شور سے سونے والے تو کیا مردے تک جاگ جائیں گے۔ ابھی میں اسے چھوڑ کر فرار ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ بہرام دادا کی بیوہ کار لے کر وہاں سے نکل گئی۔ نہ جانے کس وقت اُسے ہوش آگیا تھا اور اس نے موقع پاتے ہی پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آکے چابی گھما دی۔ انجن کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے گاڑی بڑھا دی۔ میں بے ساختہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں اس کار کو چھو بھی نہ سکا اور بے بسی سے اس کی ٹیل لائٹ اندھیرے میں ڈوبتے دیکھتا رہا۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ میں نیک نیتی رکھنے کے باوجود اس عورت کے کام نہ آسکا جو استاد ٹیڈی کی طرح ایک بہت بڑے محسن کی بیوہ تھی اور مصیبت میں تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا غالب محسن یا ٹیڈی کا شملا، نازو یا رابعہ میں سے ایک کا گروہ اس کی بیٹی کی جان بچاسکے گا۔ میں عبدالودود سے کہہ سکتا تھا اور وہ اپنی وکیل برادری تک یہ اپیل پہنچا سکتا تھا۔ مرزا غالب کے اپنے روابط تھے۔ وہ صحافی برادری کے ذریعے بات کو عوام و خواص کے ہر حلقے تک پہنچا سکتا تھا اور اتنے بڑے پیمانے پر کوشش کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہونے لازمی تھے۔ غالباً بہرام دادا کی بیوہ کو نہ کسی نے مشورہ دیا تھا اور نہ خود اسے خیال آیا تھا کہ وہ اخبارات میں اپیل شائع کرائے۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو۔" میرے پیچھے وہ خبیث قہقہہ لگا کے ہنسا جو ایک منٹ پہلے زمین پر گرا ہوا واویلا کر رہا تھا۔ "وہ گئی... پھُرّ سے... اُڑ گئی۔"

بالکل غیرارادی طور پر میرے مُنہ سے گالی نکلی۔ "ابھی نکالتا ہوں تیری ساری ایکٹنگ..." میں نے اُسے دبوچ کر ایک جھٹکے سے اوپر اُٹھالیا۔ وہ پھر چلانے لگا۔ "مرڈر... ہیلپ..." مگر میں نے پروا نہیں کی۔ میں نے اُسے پنکھے کی طرح گھمایا اور نیچے پھینک دیا۔

میں نے دوسری طرف دیکھا ہی نہیں جدھر سے سارجنٹ بنیان اور انڈرویر میں دوڑتا چلا آرہا تھا۔

"ٹھہرو... کون بدمعاش ہے... تمھاری تو..." وہ کسی آتش فشاں کی طرح گالیوں کا لاوا اُگل رہا تھا۔ اس نے وردی دیکھ کر مجھے یقیناً شناخت کرلیا تھا۔ اس کا ریوالور تو میں نے چھین لیا تھا مگر یہ دیکھ کر میری سٹی گم ہوگئی کہ وہ دوسرا ریوالور لہراتا آرہا تھا اور سخت قاتل موڈ میں تھا۔

میں ایک دم بھاگا اور اس جوان کی گاڑی میں جا بیٹھا جو زمین پر ایسے تڑپ رہا تھا جیسے آخری وقت قریب ہو۔ اس نے ہیرو بننے کے چکر میں گاڑی کا گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا اور انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں دیر نہیں لگی۔ میری نیت کا اندازہ بے وردی سارجنٹ نے بھی کرلیا تھا۔ اس نے نشانہ لیے بغیر فائر کیا۔ گولی کار کی باڈی پر نہ جانے کہاں لگی۔ میں نے صرف فائر کی آواز سُنی اور پھر ٹین کی چادر سے گولی کے ٹکرانے کی آواز۔ میرے کانوں نے کار کے مالک کی فریاد و فغاں بھی سُنی۔ وہ عالم نزع کو بھول کر اور تڑپنا چھوڑ کر میرے پیچھے دوڑا تھا۔ "اوئے... اوئے میری گاڑی... اوئے تیری..."

مگر میں اتنی دیر میں کار کے ایکسیلریٹر کو فرش سے لگا چکا تھا۔ گاڑی ایسی تھی کہ اس نے زیادتی پر احتجاج کرتے ہوئے ایک چھلانگ لگائی اور ہوا ہوگئی۔ دوسرا فائر مس ہوگیا مگر تیسرا پیچھے والی ونڈ اسکرین پر لگا۔ اس کا شیشہ بکھر گیا اور شیشے کے ذرات اندر تک آئے۔

سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل سے دُور تھا۔ اُسے فوراً پلٹ کر سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے اور موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں دو تین منٹ تو لگ جاتے۔ اس کے بعد بھی وہ میرا پیچھا کرتا تو اس مضحکہ خیز حلیے میں موٹر سائیکل کو کہاں تک دوڑاتا... مجھے اس کے غصے اور بے بسی دونوں کا احساس تھا۔ احتیاطاً میں نے سیدھی سڑک پکڑنے کے بجائے دوسری متوازی سڑکوں پر دائیں بائیں کئی موڑ کاٹے اور جب یہ محسوس کیا کہ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو میں نے کار کو ایک کوٹھی کے دروازے پر روک لیا۔ اب میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ نقلی نواب جمشید کو ہائی جیک کرنے سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے ناکامی کے اسباب پیدا ہوتے گئے تھے اور اب مجھے شدت سے احساس ہورہا تھا کہ میرے لواحقین کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ میں نقلی خسرو جمشید بن کے اسی گاڑی میں چلا گیا تھا۔ پھر میں اصلی خسرو جمشید کے گھر پہنچا، تھانے یا عدم آباد؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ صرف قیاس آرائی کرسکتے تھے۔ تاہم میری یہ مہم جوئی بالکل بے مصرف نہیں رہی تھی۔ ایک تو مجھ پر یہ راز منکشف ہوا تھا کہ اصلی نواب خسرو جمشید کون ہے۔ نقل باقی نہ رہی تھی چنانچہ آئندہ کسی کنفیوژن کا امکان نہ تھا۔ دوسری اہم بات بہرام دادا کی بیوہ سے ملاقات تھی۔ میں اس کی گاڑی کا نمبر نہیں نوٹ کرسکا تھا۔ اس کا نام اور پتا نہیں پوچھ سکا تھا لیکن اس سے ہسپتال میں دوبارہ ملا جاسکتا تھا۔ وہاں مجھے اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا جس کے دونوں گردے ناکارہ ہوچکے تھے اور جو مشین کے سہارے زندگی کے آخری ایام ایک موہوم سی امید کے سہارے کاٹ رہی تھی کہ شاید قدرت اُسے زندہ رکھنا چاہے تو کسی دردمند یا ضرورت مند کو بھیج دے جو ایک انسانی زندگی بچانے کا ثواب کمانے کے لیے اپنے ایک گردے سے محرومی قبول کرلے یا مالی مشکلات سے نجات پانے کے لیے اپنا ایک گردہ فروخت کردے۔ پچاس ہزار یا ایک لاکھ میں زندگی کا یہ سودا کرلے۔ اس میں بھی کوئی معیوب یا غیر اخلاقی بات نہیں ہوگی۔ جو شخص گردہ بیچتا ہے وہ اپنا ضمیر تو نہیں بیچتا۔ باہمی رضامندی سے دو حاجت مند زندہ رہنے کے مواقع حاصل کرتے ہیں اور یہ معاہدہ دو خاندانوں کی خوشیوں کا ضامن ہوتا ہے۔

ابھی میں نے ایک فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کیا ہوگا کہ پیچھے سے ایک موٹر سائیکل سوار آیا۔ میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو وہ خود ہی رک گیا۔ وہ ایئرپورٹ سیکیورٹی کا آدمی تھا اور نصف شب کے بعد کی ڈیوٹی ختم کرکے لوٹا تھا۔ اُس نے وردی کے فرق کے باوجود مجھے بھی اپنا ہم پیشہ سمجھا اور گھر تک لفٹ دینے کے بعد ہاتھ ملا کے رخصت ہوا۔ عمداً میں ایک ایسی کوٹھی کے سامنے رک گیا تھا جہاں صرف پورچ میں روشنی تھی اور گیٹ کھلا پڑا تھا۔ میں چند قدم اندر تک گیا اور پھر لوٹ آیا۔ مرزا غالب کا آبائی گھر تقریباً سو قدم کے فاصلے پر اس سے متصل اور متوازی چلنے والی سڑک پر تھا۔

باہر سے کوٹھی کی ویرانی سال ہا سال پُرانی لگتی تھی اور ایک نظر ڈال کے گزر جانے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ برسوں بعد بالآخر بوسیدہ دیواروں والے اس کھنڈر نے اپنے وارث کو بلالیا ہے۔ میں جھاڑ جھنکاڑ والے میدان سے گزرا جو کبھی لان ہوگا۔ اس کے سرسبز تختوں کے گرد رنگین پھولوں کا حاشیہ ہوگا اور اس کی ہریالی نگاہوں کو تازگی بخشتی ہوگی۔ اب وہاں خشک نوکیلی گھاس تھی۔ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور خودرو پودوں کے درمیان گرگٹ کی نسل کے زمین میں رہنے والے جانوروں نے بل بنا رکھے تھے... برآمدے کے عقبی حصے کے ایک دروازے کے سوا باقی سب دروازے اور کھڑکیاں جن کا رُخ سامنے کی طرف تھا حسبِ سابق بند پڑے تھے۔

میں گھوم کر پیچھے گیا تو مجھے ایک کھڑکی کے پردوں سے چھن کر نکلنے والا اجالا گرد آلود شیشوں پر نظر آیا۔ اندر وہ سب تھے۔ میں کان دروازے سے لگا کر ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا مگر ابھی میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جھکا ہی تھا کہ کسی نے بہت جما کے لات رسید کی اور میں دروازے سے گزر کے سیدھا ان کے درمیان پہنچا۔ محسن باہر میرے انتظار میں تھا اور اس نے تو مجھے اندر آتا دیکھ لیا تھا مگر میں اُسے نہ دیکھ پایا تھا چنانچہ وہ دبے پاؤں میرے پیچھے آگیا تھا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ میرے قدم اکھڑ گئے۔ کچھ پھرتی مرزا غالب نے بھی دکھائی اور میں تیر کی طرح اندر گیا تو انھوں نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ نتیجہ یہ کہ میں منہ کے بل وہیں گرا جہاں وہ سب میرے آس پاس حلقہ سا بنائے بیٹھے تھے۔

"السلامُ علیکم حضرات و خواتین!" میں نے اُٹھنے کے بعد چوٹیں سہلاتے ہوئے خفت سے دانت نکال کے کہا۔ "میں کچھ جلدی تو نہیں آگیا؟"

"جی نہیں..." محسن نے اندر آنے کے بعد کہا۔ "یہی وقت دیا تھا آپ نے... جلدی تو ہم آگئے تھے... گدھے تو ہم ہیں۔"

"دریں چہ شک۔" میں نے کہا۔ "ابھی جو دولتی آپ نے جھاڑی اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ... تم نے ہم سب کو تفتیش میں مبتلا کر دیا تھا۔" استاد ٹیڈی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تفتیش نہیں، ابو جہل کے چچے... تشویش..." مرزا غالب نے کہا۔ محسن بھی نہیں ہنسا تھا مگر رابعہ، شہلا اور نازو کے ہنسنے سے ان کے غصّے کا ڈراما فلاپ ہو گیا۔ ٹیڈی نے جواب میں غالب کو مرزا جاہل کہا۔

"کیا مصیبت ہے یار۔" محسن نے جھلّا کر کہا۔ "کیا طے کیا تھا ابھی کہ سب سیریس رہیں گے... کچھ سزا دیں گے اسے... میں نے تو لات ماردی... ایک ایک ہاتھ تمھیں بھی مارنا تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے آپ سب کے دلی جذبات کا۔" میں نے کہا۔ "کچھ ایسے ہی جذبات میرے بھی ہیں لیکن پہلے آپ لوگ میری دُکھ بھری کہانی سن لیں... اگر سب آٹھ آٹھ آنسو نہ رونے لگیں تو میرا ذمہ۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ میں اتنی دیر تک جھک نہیں مارتا رہا۔"

"اتنی دیر تک پھر آپ کیا مارتے رہے مسٹر تیس مار خاں؟" محسن بولا۔

"بھئی ایک تو ہم نے نقلی نواب مارا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "پھر ایک عدد ٹریفک سارجنٹ کو تھوڑا سا مارا... اتنا کہ وہ اپنا سر نہ اُٹھا سکے۔ ایک نامعلوم شخص کو بلا وجہ مارا۔ اس کا دل چاہتا تھا پٹنے کو۔ ہمیں اس کی کار بھی چھیننا پڑی۔ اس سے پہلے ہم ایک بہت اعلیٰ قسم کی کار پھونک چکے تھے۔ پھر ایک نیک دل خاتون سے ہم نے زبردستی لفٹ لی۔ اس پہ یاد آیا کہ ہم نے خاتون کے ایک جھانپڑ بھی مارا تھا۔"

"نیک دل خاتون کی عمر۔ رنگ روپ، ناک نقشہ؟" محسن بولا۔ "یہ سوال مس رابعہ کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔"

"اہم بات یہ ہے کہ نیک دل خاتون ہمارے ایک کی بیوہ تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کو اس کا ایک قرض چکانا"

"ویری گڈ... اور جھانپڑ گویا... اس قرض کی پہلی قسط طور پہ مارا تھا آپ نے۔" غالب بولا۔

"مرزا جی! اپنی زرد صحافت مت چلاؤ یہاں... ابھی نے میرا پورا بیان سُنا نہیں اور ایک سنسنی خیز سرخی لگا دی۔" کہا۔ "جو کچھ میں نے فرمایا ہے اس کی تفصیلات بہت جلد پیش گی پہلے میری اچھی طرح خاطر تواضع کی جائے... ویسے نہیں جیسے آپ لوگ چاہتے ہیں... بلکہ جیسے میں چاہتا ہوں... کیسے سنگدل لوگ ہیں یہاں کہ اسے مارتے ہیں جو پہلے ہی مر رہا کسی پر... یہ نہیں پوچھتے کہ کیا چاہتے ہو اور کیسے چاہتے ہو۔"

"سیدھی طرح بتاؤ کیا چاہیے۔" رابعہ نے مصنوعی غصّہ مجھے ڈانٹا کیونکہ شہلا کھی کھی کرنے لگی تھی۔

"ایک روٹی کا سوال ہے مائی۔" میں نے فقیر کی طرح صدا لگائی۔ "دو وقت کا بھوکا ہوں... اللہ تیرے دل کی مراد پوری کرے... تیرا سہاگ سلامت رکھے... میرے چھوٹے چھوٹے یتیم بہن بھائی ہیں۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور ایک ہاتھ محسن کے سر پہ رکھا اور دوسرا غالب کے سر پہ۔

"بابا جی!" محسن نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ تینوں میں سے جس کو چاہیں بہن بنا لیں۔ بس مجھے بھائی نہ بنائیں بہنوئی کو بھائی کہنا گناہ ہے۔"

"چلو باجی! یہ لوگ تو شروع ہو گئے۔" شہلا نے کہا اور رابعہ کے ساتھ کچن کی طرف چلی گئی۔ وہاں صرف نازو رہ گئی جو ابھی تک اپنے اسی میک اپ میں تھی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک بدشکل اور خستہ حال بڑھیا بنی ہوئی۔

"خدا کے لیے اب تو حلیہ بدل لو اپنا۔" میں نے کہا۔ "میرا نہیں تو غالب کے دل کا ہی کچھ خیال کرو۔"

"ہاں، کتنے پاپڑ بیلے ہیں اس نے۔" محسن نے تائید کی۔

"نہیں... کتنی مونگ پھلیاں بیچی ہیں اس نے۔" میں نے

"مونگ پھلیاں تو میں نے زیادہ بیچی ہیں۔" ٹیڈی بولا۔

"غلط، تم کیا مجھ سے اچھے سیلز مین ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہاں... میری آواز میں تاثیر تھی۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "لوگ اس پہ کھنچے چلے آتے تھے۔" میری اس بات کا تو جواب ہی کہ مونگ پھلی سونے کی ڈلی۔"

"یہ چوری ہے..." مرزا غالب نے کہا۔ "یہ محکمہ زراعت کا نعرہ ہے جو ہر قصبے دیہات کی دیوار پہ لکھا نظر آتا ہے۔ شرم آنی چاہیے تمھیں۔"

"چور تم بھی ہو... ایک شعر نہیں پورا شاعر چُرا لیا تم نے"

ٹیڈی نے مشتعل ہو کے کہا۔ "مرزا غالب کو قیامت کے دن کیسے منہ دکھاؤ گے۔"

"شاعری میری اپنی تھی۔" مرزا غالب نے میز پہ مُکا مارا۔ "اور مونگ پھلی کی شان میں ایسا قصیدہ لکھ کر تو دکھائے کوئی... یہی میری کامیابی کا راز تھا... میری سیل ہمیشہ زیادہ رہی۔"

"دو سیر مونگ پھلیاں تم خود چر جاتے تھے۔ اس کو سیل میں شامل کرتے ہو..." ٹیڈی نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"تم بھی اس سے زیادہ اپنی پی آر بڑھانے کے لیے بانٹ دیتے تھے۔" مرزا غالب نے چلّا کر کہا۔ "اور تم بارہ گھنٹے دُکانداری کرتے تھے۔"

"صبح سے دوپہر تک لوگ اخبار خریدتے ہیں۔ مونگ پھلی نہیں۔ تم کو سینما کے دو شو ملتے تھے۔" ٹیڈی نے بھی چلّا کے کہا۔ "لوگ رات کو ہی مونگ پھلی کھاتے ہیں... کبھی شفٹ بدل کے دیکھتے۔"

"دیکھ لیتے۔ شام کے دونوں شو خالی جاتے۔" مرزا غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "لوگ تو تمھاری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ وہ سینما بھی چھوڑ دیتے۔"

"ہاں! اور بس تمھارا گانا سن کے لوٹ جاتے۔" ٹیڈی نے جل بھن کے کہا۔ "بالکل زہرہ بائی انبالے والی کی طرح گاتے تھے۔ کھائے جو میری مونگ پھلی۔" اس نے مضحکہ خیز زنانہ آواز بنا کے نقل اتاری۔ میں اور محسن تو اس مونگ پھلی کی پہلی جنگ سے بہت خوش تھے اور لطف اندوز بھی ہو رہے تھے مگر رابعہ اور شہلا کے اندر آتے ہی امن بحال ہو گیا۔ انھوں نے نازو سے کہا کہ وہ تصفیہ کرا دے اور نازو اٹھی ہی تھی کہ غالب اور ٹیڈی نے ہاتھ ملا لیا۔

"بخدا سیلز مین تو آپ ہیں... میں تو آپ کی خاکِ پا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں دوست اب مجھے شرمندہ مت کرو... تم نے بہت زیادہ مونگ پھلی بیچی۔" ٹیڈی بولا۔ "تم استاد میں شاگرد۔"

"نہیں تم استاد میں شاگرد۔" غالب بولا۔

"اُونہوں... تم..." ٹیڈی نے اصرار کیا اور نازو جو اب تک دُور ایک چارپائی پہ لیٹی ہوئی تھی اُٹھ کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔

"اب کوئی نام لے مونگ پھلی کا۔" نازو نے کہا۔ "کسی کا لحاظ نہیں کروں گی میں۔" غالب اور ٹیڈی نے ڈھٹائی سے ہنسنا شروع کیا۔

"یار، وہ کس محسن کی بیوہ کا ذکر تھا۔" محسن بولا۔ "ہمارا کون محسن فوت ہوا ہے؟"

"اس کے انتقال کو زمانہ ہوا۔" میں نے کہا اور کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ "احسان اس نے استاد ٹیڈی پر کیا تھا لیکن ہم سب دوست ہیں تو اس احسان کا قرض بھی ہم سب پہ ہے۔ خدا نے ہمیں موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اب یہ قرض اتار دیں۔"

میں نے نقلی خسرو جمشید کے اغوا سے بات شروع کی اور مختصراً اپنی اور بہرام دادا کی بیوہ سے ملاقات تک سب کچھ بتا دیا۔ میری توقع کے مطابق استاد ٹیڈی پر سب سے زیادہ اثر ہوا۔

"تمھیں یقین ہے کہ وہ عورت جھوٹ نہیں بول رہی تھی؟" وہ بولا۔

"نہیں استاد! جھوٹ بول کے اُسے کیا ملتا۔"

"مگر اپنے سکندر بادشاہ... جہاں تک مجھے معلوم ہے۔" ٹیڈی نے بے چینی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "بہرام دادا کی بیوی ہی کوئی نہیں تھی... تم بیٹی کی بات کرتے ہو۔"

"بہرام دادا سے تمھاری ملاقات کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ اس نے تمھاری مدد کی تھی... تم کو اپنا رازدار نہیں بنایا تھا۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے وہ کسی کو بھی اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہ بتاتا ہو... ان کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی کے سامنے ان کا ذکر تک نہ کرتا ہو۔"

"اگر یہ سچ ہے تو ہمیں فوراً اس سے ملنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اس عورت کی مدد کرنا چاہیے۔"

"زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ نہ جانے خدا نے یہ نیکی کی توفیق کس کے مقدر میں لکھی ہو۔ کس کا ایک گردہ میچ کر جائے اور اس کی بیٹی کی زندگی بچا لے۔"

"کیا ایک گردے کے ساتھ آدمی بالکل صحت مند رہتا ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اور زندہ رہتا ہے؟"

"ہاں استاد... یہ قدرت کا حیرت انگیز نظام ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک آنکھ مل جائے تو اندھا دنیا کو اسی طرح دیکھ سکتا ہے جیسے دو آنکھوں والے، اسی طرح ایک گردے اور ایک پھیپھڑے کے ساتھ آدمی بالکل نارمل رہتا ہے۔"

"پھر تو سب سے پہلے میں اپنا گردہ دوں گا..." ٹیڈی بولا... "یہ میرا حق ہے کہ اپنا قرض سب سے پہلے میں ادا کروں۔"

"تمھارے جذبات قابلِ قدر ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مسئلہ جذباتی نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس کا ہے۔ کسی بھی شخص کے کوئی بھی گردہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پہلے بہت سے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ عموماً ماں باپ یا بھائی بہن کے گردے موزوں ثابت ہوتے ہیں اور جسم انھیں قبول کر لیتا ہے لیکن غیروں کے گردے بھی میچ کر جاتے ہیں۔"

"تم عجیب آدمی ہو کہ اس کا نام پتا نہیں پوچھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ وہ ایک دم بھاگ گئی۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب تو ہم صبح ہی میو اسپتال جا کے معلوم کریں گے۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں اپنے اخبار کے دفتر اور دوسرے صحافی دوستوں سے کہوں گا۔ وہ ایک گھنٹے میں پتا چلا لیں گے اور اگر بدقسمتی سے ہم میں سے کوئی بھی اس ثواب کا اہل نہ ہوا تو پھر پبلک سے اپیل بھی وہی لوگ شائع کرا دیں گے۔"

"ہم منہ مانگا معاوضہ ادا کریں گے۔" ٹیڈی بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ وہ پندرہ سیر سونا ابھی تک محفوظ رہا... شاید اسی دن کے لیے..."

"مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس عورت کے مالی حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں... ورنہ یہ کام وہ خود بھی کر سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "اخبار میں اشتہار دے کر کسی کو معقول معاوضے کی پیشکش کرتی۔"

"مگر تم نے کہا ہے کہ وہ گاڑی میں تھی۔ خود چلا رہی تھی..." محسن بولا۔

"ہاں، گاڑی تو چلا رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گاڑی اسی کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ گاڑی کوئی بہت زیادہ قیمت کی نہیں تھی... معمولی سی پرانی گاڑی تھی۔"

"ایک گردہ جسے ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔" غالب نے تلخی سے کہا۔ "وہ ایک گاڑی سے زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ اہمیت گاڑی کو ملتی ہے۔"

"جب تک زندگی کی گاڑی چلتی رہے ہم یہی رویّہ رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر ایک دن اچانک ہم پر عیاں ہوتا ہے کہ جسم کی مشینری کا ایک معمولی سا پرزہ بھی کتنا گراں قیمت ہے۔ بعض اوقات کروڑوں، اربوں روپے میں زندگی کی چند سانسوں کے لیے یہ سامان مستعار بھی نہیں ملتا۔"

"میرا خیال ہے میں ابھی چلا جاؤں۔" ٹیڈی اچانک بولا۔

"ابھی جا کے کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔ "کوئی تمھیں وارڈ میں نہیں جانے دے گا اور تم سارے اسپتال میں بھٹکتے پھرو گے اور اسی میں صبح ہو جائے گی۔ یہی کام غالب صبح آسانی سے کر لے گا۔"

"لیکن صبح تک... اُسے کچھ ہو نہ جائے۔" ٹیڈی بولا۔

"خدا پر بھروسا رکھو۔" میں نے کہا۔ "اُس نے ہی ایسے اسباب پیدا کیے کہ میں بہرام دادا کی بیوہ سے ملا اور اس کے حالات سے واقفیت ہوئی۔ ظاہر ہے اس میں خدا کی مرضی اور مصلحت شامل تھی۔ وہ ہمیں اتنی مہلت بھی دے گا کہ ہم ایک نیکی کما سکیں۔ میرا دل کہتا ہے اگر خدا کو یہ منظور نہ ہوتا کہ وہ لڑکی زندہ رہے تو یہ اتفاقیہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔ یہ کوئی ایسا مرض نہیں جو مہلت ہی نہ دے۔ اس میں مریض کی ظاہری حالت کئی بار اتنی بگڑ جاتی ہے کہ زندگی کی امید نہیں رہتی مگر وہ پھر سنبھل جاتا ہے۔"

"اس کے علاوہ..." غالب بولا۔ "سارے ٹیسٹ صبح ہی ہوتے ہیں... اس وقت ہم سب جا کے کہیں کہ ہمارا گردہ لے لو تب بھی ڈاکٹروں کا جواب یہی ہو گا کہ صبح آئیے۔ یہ بہت مشکل اور پیچیدہ قسم کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ سارے ٹیسٹ ہو جانے کے بعد ہی ڈاکٹر کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہیں۔ گردہ دینے والے کو ایک مقررہ تاریخ پر طلب کرتے ہیں اور پھر آپریشن وغیرہ ہوتے ہیں۔"

ٹیڈی خاموش ہو گیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس اطلاع نے جذباتی طور پر اسے کتنا مضطرب کر دیا ہے۔

"تم یہ بتاؤ استاد کہ وہ سب ریکارڈ ہو گیا؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"ہاں، کیا تم سن نہیں رہے تھے؟" غالب بولا۔

"میں نے اور تم نے تو سن لیا تھا۔" میں نے کہا۔ "باقی سب نے تو کچھ نہیں سنا۔"

"نازو کا یہ کارنامہ ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے..." محسن بولا۔ "ٹیپ تو میں نے نہیں سُنے مگر ٹیڈی نے جو کچھ بتایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی کے عزائم کتنے خطرناک ہیں..."

"لیکن اب خدا کی مدد شاملِ حال رہی تو ہم ان کے عزائم خاک میں ملا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نازو کی بے مثال ہمت کے باعث ہی ہمارے لیے یہ معلومات حاصل کرنا ممکن ہوا... ورنہ ہم سب اندھیرے میں رہتے اور دشمن کے ایجنٹ اپنا کام کرتے رہتے۔ زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ نازو محفوظ رہی... اسے کچھ ہو جاتا تو..."

"مجھے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی یقین نے میری حفاظت کی۔" نازو بولی۔

"ایک وقت ایسا آیا تھا جب تمھارے یقین کو شکست ہو سکتی تھی۔ اس وقت جب ایس پی سراج تمھاری اصلیت جاننے کے لیے پولیس کے مخصوص حربے استعمال کرنے پر تُل گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس وقت میں گھبرا جاتی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔"

"تمھاری اداکاری بہت لاجواب تھی۔" میں نے کہا۔

"سراج کسی اداکاری سے متاثر ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ تو خدا نے کسی کی سُن لی اور وکٹر کی ماں آ گئی۔" نازو بولی۔

"کس کی سن لی؟" شہلا بولی۔ "میری اور رابعہ کی سُنی ہو گی۔"

"ممکن ہے غالب کی سُنی ہو۔" میں نے کہا۔ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے... مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک میں بھی ایک خطرناک فیصلہ کر چکا تھا۔"

"تم نے کیا فیصلہ کیا تھا استاد؟" نازو مسکرائی۔

"بس سرِدھڑ کی بازی لگانے کا۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شیطان تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کرتے اور ہم سب سن کے بھی کچھ نہ کرتے۔"

"قسم مولا علی کی... سوچا میں نے بھی یہی تھا۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "اگر وہ کمینہ پیڈو اپنے باپ سراج کے حکم پر عمل کرتا تو اس کے بیلے میں اندر گھس جاتا... اس کے بعد تخت یا تختہ۔"

"تم نے اکیلے ہی چڑھائی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا استاد؟" میں نے کہا۔

"ہاں! پہلے تو مجھے اتنا تاؤ آ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا دروازہ توڑ کے اندر گھس جاؤں اور سالوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔" ٹیڈی بولا۔

"کافی رفعتیں لے جاتی پڑتیں تمھیں۔" غالب نے کہا۔ "اور استاد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کمینے تم کو انہی اینٹوں سے انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ چُن دیتے۔"

"اسی لیے میں نے برداشت سے کام لیا۔" استاد ٹیڈی سادگی سے بولا۔ "میں نے سوچا کہ سب کے ساتھ حملہ کرنا چاہیے۔ بس اسی وقت اُن کی اماں نے معاملات کو بگڑنے سے بچا لیا۔"

"اُس وقت بڑھیا کا آنا واقعی تائیدِ ایزدی ثابت ہوا۔" نازو نے ٹیڈی کی بات پر مسکرا کر کہا۔ "ورنہ معلوم نہیں کیا ہوتا... کوئی قریب آنے کی ہمت کرتا تو مارا جاتا۔ اس کے بعد اگر ریوالور میرے ہاتھ لگ جاتا تو شاید بچ کر نکل آنے کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔ میں سب کو شوٹ تو کر نہیں سکتی تھی۔ اگر دلاور یا سراج میں سے کوئی پکڑا جاتا تو اسے ڈھال بنا کے نکلنے کی کوشش کامیاب ہو سکتی تھی۔"

"یہ کامیابی بھی ناکامی ہی ہوتی۔ ہمارا راز فاش ہو جاتا اور تمھاری محنت رائیگاں جاتی۔" میں نے کہا۔ "خیر جو ہوا اچھا ہوا... اب تو آگے کی سوچنا چاہیے۔"

"آگے کی صبح سوچیں گے۔" محسن نے منہ پھاڑ کے جماہی لی۔ "معلوم ہے رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کل مونگ پھلی بیچنے نہیں جانا ہے۔" اُستاد ٹیڈی نے کہا۔ "نیند تو مجھے بھی آ رہی تھی پہلے... لیکن اب بہرام دادا کی بیوہ کے خیال سے پریشانی ہو رہی ہے۔"

"تمھاری پریشانی سے اس کی پریشانی دُور نہیں ہو گی۔" محسن نے اُسے سمجھایا۔ "ہم سب کو عملی طور پر جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کریں گے مگر اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ہماری عدم موجودگی میں رابعہ اور شہلا نے بہت کام کیا تھا۔ انھوں نے تیسرا کمرہ بھی جھاڑ پونچھ کے رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔ اس کو پہلے گیسٹ بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ صفائی کے باوجود ویرانا وقت اس کمرے کی فضا میں موجود تھا۔ کئی سال پرانے بیڈ کو جھاڑنے سے گرد ہٹ گئی تھی لیکن اس کا اُڑا ہوا رنگ اور داغ دھبے باقی تھے۔ یہی حال پردوں کا تھا جو لٹکے لٹکے بوسیدہ ہو گئے تھے۔ فرش پر سے تنکے اور دوسرا کوڑا کرکٹ ہٹا دیا گیا تھا لیکن قالین پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ اُسے اٹھا کر باہر لے جائے بغیر صاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دیواروں پر جہاں تک رابعہ یا شہلا کا ہاتھ پہنچتا تھا، وہاں تک جھاڑو سے مکڑی کے جالے وغیرہ ہٹا دیے گئے تھے مگر اوپر کے گوشوں میں اور چھت کے ساتھ ساتھ اب بھی جالے دکھائی دیتے تھے۔ اگر بجلی کی روشنی ہوتی تو شاید اس ماحول کا آسیب کچھ کم محسوس ہوتا لیکن موم بتی کی مدھم روشنی سے ویرانی کا تاثر ختم نہیں ہوتا تھا۔ یہ گیسٹ بیڈ روم شہلا اور محسن کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسرا کمرہ کھانے کا کمرہ تھا۔ اس کی بہت قدیم وضع کی میز کرسیاں ہٹانے کے بعد اتنی جگہ نکل آئی تھی کہ میں، غالب اور ٹیڈی فرش پر دراز ہو جائیں۔ ہم نے تکیوں کی جگہ وہ کشن استعمال کیے جو ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"بالکل ایسا لگتا ہے جیسے یہاں بھی قالین ہے..." میں نے کہا۔

"یہ قالین ہی ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا۔" غالب نے کہا۔ "جس پر آپ لیٹے ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے سر کھجایا۔ "اس کا رنگ کیسا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں۔" غالب نے خفت سے کہا۔ "مٹی کئی سال سے پڑ رہی ہے۔"

"ہاں، اب مٹی زیادہ ہے قالین کم۔" میں نے کہا۔ "پہلے مٹی اس قالین پر پڑتی رہی۔ اب ہم مٹی میں پڑے ہیں۔ تم مُصر ہو کہ ہم قالین پر لیٹے ہوئے ہیں... چلو مان لیتے ہیں۔"

"ایک ویکیوم کلینر سے سارے قالین صاف ہو جائیں گے..." غالب نے کہا۔ "جب گرد ہٹے گی تو پھر دیکھنا قالین کا اصلی رنگ۔"

"خدا کا شکر ہے چوہے نہیں ہیں۔" ٹیڈی بولا۔ "ورنہ یہیے سونا مشکل ہو جاتا... ابے تیری..." وہ ایک دم چلّایا اور اُچھل کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ ٹیڈی کی بات ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک موٹا تازہ چوہا دروازے سے اندر آ گیا۔

"سالا کہیں چھُپ کر انتظار ہی کر رہا تھا۔" ٹیڈی نے کہا اور اس پر جوتا پھینکا۔ اس کے بعد بڑی بھگدڑ مچی۔ چوہا ڈرائنگ روم میں چلا گیا جہاں رابعہ اور نازو آمنے سامنے کے بڑے صوفوں پر دراز تھیں۔ انھوں نے چیخ ماری اور صوفے پر کھڑی ہو گئیں۔ میں، غالب اور ٹیڈی چوہے کے پیچھے لگ گئے۔ ہم نے باری باری نشانہ لے کر جوتوں کے میزائل چلائے مگر چوہا ہر بار بچ گیا۔ وہ کبھی ایک صوفے کے پیچھے چلا جاتا تھا کبھی دوسرے کے پیچھے۔ چنانچہ کبھی نازو چیخ مار کے دوسرے صوفے پر رابعہ کے ساتھ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جا کھڑی ہوتی تھی تو کبھی رابعہ اور وہ ایک ساتھ تیسرے صوفے پر چھلانگ مارتی تھیں۔ ہماری ہنسی سے ان کو مزید خفّت کا سامنا تھا۔ ان دونوں کی جرأت مندی اور بے خوفی اچھے خاصے مردوں کو شرمندہ کردیتی تھی۔ رابعہ نے دشمنوں کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا تھا۔ اسے قید میں شدید ترین جسمانی اذیت دی گئی تھی اور ابھی گزشتہ دنوں وہ گولیوں کی بوچھار میں میرے ساتھ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس سے باہر نکلی تھی اور اس گاڑی سے وہ جوابی فائرنگ کرتی رہی تھی۔ دوسری نازو تھی۔ مجسّم قیامت... مار دھاڑ سے بھرپور اور قتل و خونریزی کو کھیل سمجھنے والی جو تن تنہا دشمن کے قلعے میں داخل ہوگئی تھی اور بحفاظت لوٹ آئی تھی۔ یہاں ایک چوہا دیکھ کر دونوں حواس باختہ تھیں اور یہی سب سے بڑا لطیفہ تھا۔

ہمارے شور اور قہقہوں نے محسن کو بھی بیڈ روم سے کھینچ نکالا۔ اس کی زوجہ پہلے تو آنکھیں ملتی اندر آگئی پھر اُسے ہنگامے کا سبب نظر آگیا۔ اس نے بھی ایک دلخراش چیخ ماری اور اس صوفے پر چڑھ گئی جہاں دو بہادر خواتین پہلے ہی لرزہ براندام تھیں۔ محسن ہمارے ساتھ شکار میں لگ گیا اور چوہا جس کے لیے فرار کے سارے راستے بند کردیے گئے تھے، بالآخر محسن خان کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ چند جوتے کھانے اور مسلسل دوڑنے سے وہ نیم جان پہلے ہی ہو رہا تھا۔ محسن خان نے ایک بانس اُٹھا رکھا تھا جس پر جھاڑو اس طرح باندھی گئی تھی جیسے رائفل پر سنگین لگائی جاتی ہے۔ اس سے دن میں جالے صاف کیے گئے تھے۔ اب محسن نے طویل فاصلے پر مار کرنے والے اس ہتھیار سے چوہے پر وار کیے اور اسے مار دیا۔

اس کے بعد مزید ہڑبونگ مچی کیونکہ ابھی خواتین نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ محسن نے چوہے کو دم سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"یار سکندر! تو نے غور کیا۔ اس میں اور میرے سالے میں کوئی فرق نہیں ہے، دیکھنے میں ویسا ہی ہٹا کٹا الّو کا پٹھا مگر اتنا ڈرپوک۔" وہ بولا۔

"اتفاق دیکھو کہ نظر بھی ٹیڈی کو آیا تھا۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"آیا ہوگا بڑے بھائی سے ملنے۔" محسن بولا۔ "وہ بھی مارا جائے گا کسی دن اسی طرح میرے ہاتھوں... سالا چوہا۔"

"محسن... یہ کیا بدتمیزی ہے۔" شہلا چلّائی کیونکہ ٹیڈی کسی پریشر ککر کی طرح پھٹنے والا تھا۔

"یہ بدتمیزی نہیں چوہا ہے... یہ لو...!" اس نے چوہے کو شہلا کی طرف اچھال دیا۔ وہ چیخ مار کے بھاگی۔

"یہ چوہا نہیں چھچھوندر ہے۔" اب اُسے غالب نے اُٹھالیا اور اس کو ناک کے قریب لا کے سونگھا۔

"کیا اس کے سر میں چنبیلی کا تیل ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی دیکھ رہا تھا... ذرا تم دیکھنا..." اس نے چوہا نازو کی طرف پھینکا۔

نازو ایک صوفے سے دوسرے پہ کود گئی۔ "میں بتاؤں گی تم کو..." وہ چلّا کے بولی۔ اب چوہا میرے قریب آگیا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا تو رابعہ کی حالت غیر ہوگئی۔ میں آگے بڑھا۔

"دیکھو سکندر... خبردار... باہر لے جاؤ اسے۔" وہ ہٹتے ہوئے چلّائی۔ "دُور کرو... دفع کرو اسے۔"

"کیوں... اچھا بھلا آدھا سیر گوشت ہے۔" میں نے کہا۔ "پلاؤ پکے گا زبردست... یا قورمہ... موش مسلّم کھایا ہے کبھی؟"

اب پوزیشن یہ تھی کہ جیسے ہی میں آگے بڑھتا تھا خواتین باہر دوسری جانب دوڑ جاتی تھیں۔ ان کا احتجاج اور ان کی زبانی فغاں سب کو بے حد محظوظ کر رہی تھی اور ہم سب کے ہنستے ہنستے آنسو نکل آئے تھے۔ جب ٹیڈی نے وہ بلیے ڈنڈے جھاڑو مار کے چوہا نیچے گرایا اور اُٹھا کے باہر پھینکا تو یہ تماشا ختم ہوا۔ ہم پھر لیٹے تو بہت دیر تک ہماری ہنسی نہیں تھمی۔ کافی دیر بعد جب ہم نے پھر سونے کا موڈ بنایا تو رابعہ اور نازو رونی صورت بنائے دروازے میں نمودار ہوئیں۔

"اب کیا ہوگیا... کیا وہ میرا سالا آگیا؟" غالب اُٹھ بیٹھا۔

"نہیں یار... میرا سالا ہوگا..." میں نے کہا۔

"ہم بات نہیں کرتے تم سے۔" رابعہ نے کہا۔

"دونوں ایک جیسے بدتمیز ہو..." نازو بولی۔ "بھائی نیک محمد ذرا تم اِدھر آؤ۔"

"آہا ہا... بھائی نیک محمد۔" غالب نے نقل اتاری۔ "کیا شرافت اور شائستگی آگئی ہے لہجے میں۔"

"ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے بھی نقل اتاری۔ "بھائی نیک محمد آپ اِدھر ہمارے کمرے میں سو جائیں... یہی بات ہے نا...؟"

بات یہی تھی چنانچہ ان دونوں کو مزید شرمندگی اُٹھانا پڑتی لیکن ٹیڈی نے انھیں بچا لیا اور خود ہی ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ بھی ہم سے جان چھڑانا چاہتا تھا اور اسے موقع مل رہا تھا کہ ایک شریف اور بہادر بھائی کا رول ادا کرے۔ ہم بہت دیر تک اُسے ہوٹ کرتے رہے مگر وہ دوسرے کمرے میں جا کر صوفوں کے درمیان خالی جگہ پر لیٹ گیا تھا۔ رابعہ اور نازو اس کے دائیں بائیں صوفے کے اوپر تھیں اور وہ نیچے قالین پر تھا۔ ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ استاد ٹیڈی کا شور و غوغا سنائی دیا۔ میں اور غالب فوراً اُٹھ بیٹھے۔

"خدا خیر کرے اب کوئی بھوت آگیا ہے کیا..." غالب بولا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے... ان کا قبیلہ آباد ہے یہاں..." میں نے کہا۔

"یار اِدھر آؤ..." ٹیڈی نے کہا۔ اس کے بلانے سے پہلے ہی ہم کھڑے ہو چکے تھے۔ دوسرے کمرے میں عجیب منظر تھا۔ رابعہ اور نازو تو سکون سے سوئی پڑی تھیں جو خاصی حیرت کی بات تھی۔ اتنے ہنگامے سے اتنی خوفزدہ ہونے کے بعد وہ کتنی جلدی مطمئن ہوگئی تھیں کہ اب ڈر کی کوئی بات نہیں رہی کیونکہ ان کے درمیان ایک محافظ موجود ہے۔ خوف کا احساس بھی نفسیاتی تھا اور تحفظ کا بھی... استاد ٹیڈی قالین کے اوپر ایسے ہاتھ مار رہے تھے جیسے عینک لگانے والا عینک تلاش کر رہا ہو۔

"مرزا جی! تم کو کچھ یاد ہے؟" ٹیڈی نے کہا۔ "اس کونے میں کیا تھا؟"

"اس کونے میں...؟" غالب نے ایک صوفے کے آخری حصے کے نیچے دیکھا۔

"ہاں... ابھی سوتے میں میرا پیر اِدھر گیا تو ایسا لگا جیسے فرش ہلا ہو..." ٹیڈی نے کہا۔ "تم بھی دیکھو، قالین کے نیچے تختہ ہے۔"

"ہُوں... ہے تو سہی..." میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر تختے کے اُبھرے ہوئے کنارے تلاش کیے۔

"یہاں ایک تجوری رکھی ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "لیکن لکڑی کا تختہ کہاں سے آگیا۔ تجوری تو گن میٹل کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر بم بھی اثر نہ کرتا۔ اس کی سطح فرش کے برابر تھی۔ یکے بعد دیگرے تین چابیاں لگا کے اُسے کھولا جا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار ڈیڈی نے اُسے میری موجودگی میں کھولا تھا۔ انھوں نے قالین ہٹایا تو مجھے اس کونے میں ٹائل والے موزیک ڈیزائن کی جگہ ایک سیاہ مربع دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے اگر کبھی وہاں سے قالین ہٹایا گیا تھا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا... پورا فرش ایک جیسا ہی تھا۔ میری حیرانی دیکھ کر ڈیڈی نے دو فٹ لمبا اور چوڑا کینوس کا ٹکڑا اس سیاہ سطح پر پھیلا دیا اور سارا فرش پھر ایک جیسا ہوگیا۔ اس کینوس کے ٹکڑے پر وہی ڈیزائن اسی رنگ میں پینٹ کیا گیا تھا اور اس کے نیچے کوئی چپکنے والی چیز تھی۔ قالین ہٹانے پر بھی ایک نظر میں کوئی بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ ایک کونے میں ٹائل نہیں ہیں۔ دوبارہ کینوس ہٹانے کے بعد انھوں نے تالی سے ایک چابی لی اور مجھے دکھائی تو اس پر مجھے سات کا ہندسہ نظر آیا۔ انھوں نے چابی کو درمیان میں رکھ کے ذرا سا دبایا تو ایک جگہ چابی فٹ ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کار کے ڈور لاک کی چابی اپنی جگہ بناتی ہے۔ اس چابی نے سوراخ تلاش کر لیا تھا اور اندر گھس گئی تھی۔ اسے ایک بار گھمانے کے بعد ڈیڈی نے دوسری چابی لی۔ اس پر آٹھ نمبر لکھا ہوا تھا۔ دوسری چابی کو انھوں نے بالکل دائیں جانب رکھا اور اسی طرح دبایا تو وہ بھی لگ گئی۔ اسے گھمانے سے پہلے والی چابی نکل آئی۔ ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ جب تک دوسری چابی نہیں لگائی جائے گی پہلی چابی اندر پھنسی رہے گی۔ یہی دوسری چابی کے ساتھ ہوا۔ اسے نکالنے کے لیے تیسری چابی بائیں جانب لگانا پڑتی تھی اور تیسری چابی پر چھ کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔"

"سات سو چھیاسی۔" میں نے کہا۔ "گویا بسم اللہ۔"

"ہاں... بسم اللہ کے اعداد پورے ہوتے ہی ہموار سطح پر ایک ہینڈل سا اُبھر آیا۔ اسے ڈیڈی نے ایک بار سیدھے ہاتھ کی طرف گھمایا اور پھر اُلٹے ہاتھ کی طرف۔ اس سے تیسری چابی نکل آئی اور تجوری کا دروازہ اندر کی طرف کھل گیا... وہ بہت بھاری دروازہ تھا۔ بعد میں ڈیڈی نے مجھ سے کہا کہ اسے اوپر کھینچ کر بند کردوں تو میں اسے ہلا بھی نہ سکا لیکن اتنا وزنی دروازہ کھلتے ہوئے نیچے گرا نہیں تھا بلکہ آہستہ آہستہ نیچے گیا تھا۔ اندر نہ جانے اسپرنگ اور لیور کا کیا مشینی نظام تھا جو اسے سنبھالے رکھتا تھا۔"

"ایسی نادرِ روزگار تجوری تمھارے ڈیڈی نے کہاں سے بنوائی تھی؟"

"وہ لندن کی کسی سیکیورٹی فرم کے مالک کو جانتے تھے۔ اسے برٹش گورنمنٹ نے ریزرو بینک آف انڈیا کے اسٹرانگ روم کے قفل کا انتظام بدلنے کے لیے دہلی بلایا تھا۔ معلوم نہیں کون اُسے دہلی کی جامع مسجد لے گیا اور وہاں اس نے سیڑھیوں پر بیٹھ کے بارہ مسالے والی گھسیٹے خاں کی حلیم کھالی۔ اس بارودی حلیم نے نازک مزاج انگریز کے پیٹ کا وہی حشر کیا جو نادر شاہ نے دلّی کا کیا تھا۔ اس کا علاج میرے ڈیڈی نے کیا جو اس زمانے میں وہاں تھے۔ بعد میں وہ لندن گئے تو اسی کے مہمان ہوئے۔ وہ انھیں ہر ایک سے ملواتا تھا تو یہ واقعہ ضرور سناتا تھا کہ دہلی میں اس نے گن پاؤڈر والا حلوا کھالیا تھا تو اس ڈاکٹر نے مجھے پھٹنے نہیں دیا تھا۔ وہ گلہ بھی کرتا تھا کہ انڈین پولیس سخت حرامخور ہے۔ انھوں نے وہ آتش گیر حلوا بیچنے والے کو پکڑا تو تھا مگر پھر چھوڑ دیا کہ حلوے میں ذرا نمک کم تھا اور کوئی خطرناک بات نہیں تھی۔"

مجھے اور غالب کو اس بیان پر بڑی ہنسی آئی۔ مرچ بالکل نہ کھانے والے انگریز کے لیے تو وہ تیز سرخ مرچوں والا دھواں دھار حلیم واقعی بارود سے کم آگ لگانے والا نہ تھا۔ پولیس نے انگریز حاکم کا حال پتلا دیکھ کر مجبوراً حلیم فروش کو پکڑا ہوگا اور اس کی حلیم کی دیگ نوش فرمانے کے بعد چھوڑ دیا ہوگا۔ ظاہر ہے اسی سے ان کو نمک کی کمی کا پتا چلا تھا۔

"یہ تجوری کسی جوہری نے بنوائی تھی؟" غالب بولا۔ "اس جوہری کو ڈاکو اٹھا کے لے گئے اور اس کی بیوی سے سہاگ کی اتنی قیمت طلب کی کہ آدھی دکان خالی ہوگئی۔ میاں چھوٹ کر آیا تو اطلاع ملی کہ بیٹے کو قبائلی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کی مہم پر گیا تھا اور اسے رزمک کی چھاؤنی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے رپورٹ کیے دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔ باقی آدھی دکان اس عورت نے اپنی مامتا پر قربان کی۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ خود ہی بچی تھی اور جوہری اسے تجوری میں رکھ کے کیا کرتا۔ وہ تجوری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہ لے جاسکا اور بنانے والے نے اسے میرے والد کو گفٹ کر دیا۔ ڈیڈی بہت پریشان ہوئے کہ اس تحفے کا کیا کریں، انکار کریں تو بدتہذیب کہلائیں اور قبول کریں تو اسے سوٹ کیس میں ڈال کر کیسے لے جائیں۔ وہ ایک سوٹ کیس میں سامانِ سفر ڈال کے پھرنے کے عادی تھے۔ میزبان ان کی پریشانی کو بھانپ گیا اور انھیں تسلی دی کہ یہ تحفہ ان کے دروازے تک پہنچانا اور اسے نصب کرانا بھی اسی کی اخلاقی وضع داری ہے۔ بعد میں یہ تجوری واقعی کام آئی۔"

"کیا ڈیڈی تم کو رکھتے تھے اس میں؟" میں نے کہا۔

"نہیں! وہ کچھ بہت قیمتی ہیرے جواہرات اور خاندانی قسم کے زیورات میری والدہ کو مل گئے..." غالب بولا۔

"کہاں سے مل گئے... سڑک پر پڑے ہوئے..." ٹیڈی بولا۔

"وہ تم ملے تھے اپنے باپ کو..." غالب نے کہا۔" واضح ہو کہ میری نانی کسی والیٔ ریاست کی چھٹی یا ساتویں بیگم تھیں... اور روایات شاہد ہیں کہ حسن و جمال میں ثانی نہیں رکھتی تھیں لیکن یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ حضور نواب کی نگاہِ انتخاب کی کسوٹی پر کیسے پوری اترتیں۔ وہ تو عقد ہی اسی سے فرماتے تھے جو چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہو۔ نانی مرحومہ میں جو خوبی سب سے بڑھ کر تھی وہ ان کی سیاسی ذہانت تھی۔ انھوں نے محل میں قدم رنجہ فرماتے ہی دو کام کیے۔ ایک تو نواب صاحب کی عقل کو گھاس چرنے کے لیے بھیج دیا اور بقول کسے، نواب صاحب پر اُلّو کی لکڑی پھیر دی۔ وہ حکم کے غلام ہوگئے کہ نانی نے کہا کہ کان پکڑلو تو وہ مرغا ہی نہیں بنے، اذانیں بھی دینے لگے۔ انھوں نے کہا ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر میرے لیے شعر کہو تو انھوں نے پوری مثنوی زہرِ عشق پڑھ ڈالی۔ اس مرحلے پر نانی جی نے دوسرا کارنامہ سرانجام دیا اور اپنی ہر سوکن کی چھٹی کردی۔ نواب صاحب نے سب کا اجلاسِ عام طلب کیا۔ جیسا کہ حقے داروں کا ہوتا ہے۔ وہ بیگمات نواب صاحب کی شیر ہوا بڑ رہی تھیں اور اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نواب صاحب نے کہا کہ میں آپ ساتوں کو مجموعی طور پر اکیس بار طلاق دیتا ہوں۔ بحساب تین طلاق فی کس۔ نانا جان کی رحلت کے بعد ایک دن خود نانی کو بھی فوت ہونا پڑا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بعد مرنے کے جو گھر سے سامان نکلا اس میں سیر سوا سیر موتی، کوئی ڈیڑھ پاؤ ہیرے۔ ڈھائی چھٹانک زمرد، الماس اور نیلم، اور ساڑھے سات سیر سونے اور چاندی کے ظروف کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہائے یہ مفلسی کی موت! یہ سب کاٹھ کباڑ میری والدہ کو زبردستی تھمایا گیا کہ تم ہی ان کی واحد وارث ہو۔ چاندی کے برتن ان کے چہلم سے قبل ہی چوری ہوگئے تھے۔ سونا انھوں نے بیچ کر رقم بنک میں ڈال دی اور پھر اسی سے

یہ کوٹھی تعمیر ہوئی۔ ہیرے جواہرات تھے، جو اس تجوری میں رہتے تھے۔ میرے والد بڑے قلندر تھے۔ دنیاوی مال و زر، شہرت اور عزت کی نہ انھیں کمی تھی اور نہ پروا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ان ہیرے جواہرات کو محفوظ کیے بیٹھے تھے اور کبھی کبھی ان کو دیکھ کر خوش ہو لیتے تھے۔ اس کے سوا ان پتھروں کا مصرف بھی کیا تھا؟

"ممکن ہے تمھاری والدہ کو اپنی والدہ کی نشانیاں عزیز ہوں۔"

"مشکل ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ سونا بھی پڑا رہتا۔" غالب بولا۔ "وہ سب زیور نہیں تھا۔ سونے کا ایک پیالہ تھا جس سے وہ پانی پیتی تھیں... نانی جان۔ ایک وضو کا لوٹا تھا۔ ثواب تو کوثر کے وضو کا ہی ملتا ہوگا مگر خوشی زیادہ ملتی ہوگی۔ اللہ انھیں اس غرور اور اسراف پر معاف کرے۔ سونے کی ایک رحل تھی جس پر قرآن رکھ کر وہ تلاوت کرتی تھیں۔ قرآن بھی ایک نادر نسخہ تھا جس کے حروف طلائی تھے۔ قرآن گھر میں رہ گیا تھا۔ باقی سب اماں نے بیچ دیا تھا۔ انھیں چاندی کے برتنوں کے چوری ہونے کا بھی صدمہ نہیں تھا۔ قصہ مختصر وہ ہیرے جواہرات، زمرد، الماس اور نیلم اسی تجوری میں بند تھے اور میری آخری اطلاعات کے مطابق بیچے نہیں گئے تھے۔ میرے والدین پر ایسا وقت آنے کا کوئی امکان نہ تھا جب وہ ضرورت کے لیے ان کو فروخت کرتے۔ بعد میں جیسا کہ تم جانتے ہو، وہ ہوائی حادثے میں مارے گئے اور میں ناخلف لوٹ کر گھر نہیں آیا۔"

"کمال ہے! ان کی مالیت تو کئی لاکھ بنتی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"لاکھ نہیں۔ کروڑ کا لفظ استعمال کرو۔" غالب بولا۔

"اور اس کے باوجود تم نے ان کی خبر نہیں لی؟" ٹیڈی بولا۔

"میرے لیے سب پتھر تھے۔ میں خود پتھر ہوچکا تھا۔ یہ دیواریں پتھر کی تھیں اور اس میں سارے جذبے پتھر تھے۔ میرا احساس پتھر تھا۔ دنیا کے لوگوں کی نظریں پتھر ہوگئی تھیں۔ ان چمکیلے لال، نیلے، سبز پتھروں میں میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی خیال آیا بھی تو اس گھر کی ویرانی کا... آج تم نے پوچھا تو سب یاد آیا... ورنہ شاید اب بھی میں بھولا ہی رہتا۔" غالب نے کہا۔ "میرا خیال ہے، اب یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"قالین ہٹا کے دیکھتے ہیں۔" ٹیڈی نے کہا۔

قالین بڑی دشواری سے ہٹایا گیا۔ اس کا کونا اسی صوفے کے نیچے دبا ہوا تھا جس پر رابعہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف سے اُٹھانے کی کوشش کی۔ رابعہ کا اپنا وزن ہوتا تو میں محسوس بھی نہ کرتا مگر وکٹورین طرز کا صوفہ نہ جانے کس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ غالب نے اور میں نے اسے مل کر زمین سے تین انچ اوپر اُٹھایا تو ٹیڈی نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر قالین کھینچ لیا۔ ہم نے صوفہ آہستہ سے پھر نیچے رکھ دیا۔ رابعہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ قالین کے ہٹتے ہی تین فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا لکڑی کا تختہ سامنے آگیا۔ اسے فرش کے خلا پر ایسے ہی رکھ دیا گیا تھا۔ خلا تجوری کے نکال لینے سے پیدا ہوا تھا۔

"بڑی فراغت سے کام کیا چوروں نے۔" غالب تلخی سے ہنسا۔ "جس تحفے کو وصول کرنے کے بعد والدِ ماجد پریشان ہوگئے تھے کہ اسے اٹھا کر کیسے لے جاؤں، حالانکہ وہ جائز اور قانونی طور پر اسے لا سکتے تھے اور اتنی استطاعت بھی رکھتے تھے کہ ہوائی جہاز سے لانا چاہیں تو لے آئیں، خواہ کرایہ اتنا بن جائے کہ پھر اصل مالک یعنی جوہری والا کیس ہو جائے، اسے چور اطمینان سے نکال لے گئے۔"

"اور وہ کیا کرتے! بسم اللہ کی چابی ان کے پاس تھی نہیں۔ نہ ہتھوڑی نہ ہتھوڑا۔ نہ تیشۂ فرہاد اور نہ کھل جا سم سم کا جادو... تجوری کو کھولنا یا توڑنا ناممکن تھا۔ بم بھی اگر ایٹم بم ہوتا تو کام کرتا مگر پھر ہیرے جواہرات اور وہ خود بھی مشتِ غبار رہ جاتے۔ انھوں نے آسان کام کیا کہ تجوری کو فرش سے نکال لیا۔ پھر کہیں ویلڈنگ ٹارچ سے اسے کاٹ دیا ہوگا۔ ممکن ہے تجوری بھی بیچ دی ہو۔ دس ہزار میں بھی سستی تھی۔" غالب بولا۔

"پھر اب یہ دیکھو کہ تختہ رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔" میں نے کہا۔

خالی جگہ دو فٹ سے کچھ زیادہ لمبی اور چوڑی تھی۔ گہرائی تین فٹ کے قریب تھی۔ تجوری کے چاروں طرف سے اور نیچے سے سارا سیمنٹ توڑے بغیر تجوری نہیں نکالی جاسکتی تھی لیکن جو گڑھا ہمیں نظر آرہا تھا اس کے کنارے ہموار تھے اور فرش سیدھا تھا۔

"اسے بعد میں دوبارہ بنایا گیا ہے۔" غالب نے جھک کر اس کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"اندر کچھ ہے۔" ٹیڈی نے کنارے سے سر لگا کے گڑھے کے نسبتاً تاریک حصے میں دیکھا اور اندر اترنے لگا۔

"دیکھنا استاد! چکر نہ ہو اس میں کوئی۔" میں نے کہا۔

"کیسا چکر؟" ٹیڈی نے اپنا پاؤں باہر کھینچ لیا۔

"کوئی شیطانی چکر۔ تم اترو اور غائب ہو جاؤ... نیچے دو سو فٹ گہرا کنواں ہو۔" میں نے کہا۔ "یا ڈاکوؤں کا خزانہ ہو اور اس پر سیاہ ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔"

ٹیڈی سمجھ گیا کہ میں اسے ڈرانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔ پھر بھی وہ محتاط رہا۔ "یہ تو کوئی صندوق ہے۔" وہ ٹین کی آواز سن کر بولا۔ مزید تصدیق کے لیے اس نے سیاہ ٹین کی چادر پر پاؤں مارے۔

"استاد! کیا غضب کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "اپنے مال کی حفاظت کے خیال سے کوئی غافل نہیں ہوتا۔ کوئی بم نہ ہو اس میں جو لاتیں مارنے سے پھٹ جائے اور تمھارے ساتھ ہماری عاقبت بھی خراب ہو۔"

"بار سکندر بادشاہ، کیسی دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو! ہمارے ساتھ تمھاری عاقبت خراب ہو رہی ہے؟" ٹیڈی بُرا مان کے بولا۔

"جو تم کر رہے ہو یہ خودکشی ہے... یا ہو سکتی ہے۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔ "اس کو حرام موت ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کیا عاقبت سنور جائے گی۔ خیر تم اللہ کا نام لے کر نکالو اس پنڈورا کے باکس کو۔"

"کس کا صندوق ہے یہ؟" ٹیڈی نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تم کو کسی کا نام لکھا ہوا نظر آرہا ہے اس پر؟"

"یہ غالب کی نانی کا نام تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ خود پنڈورا کا باکس تھیں جسے نواب صاحب غلطی سے کھول بیٹھے تھے... اب سمجھے؟"

ٹیڈی کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ہماری اس قسم کی گفتگو سمجھ نہیں پاتا تھا اور جھینپ کر چُپ ہو جانے میں ہی بہتری سمجھتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور ٹین کا وہ صندوق نکال لیا جو زیادہ پرانا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر چمکدار کالا اینمل تھا جو گرد پڑنے سے کچھ دھندلا گیا تھا اور اسی لیے فوراً نظر نہیں آیا تھا۔ اس میں معمولی سا قفل تھا جسے ٹیڈی نے ہاتھوں کے زور سے توڑنے کی ناکام کوشش کی۔

"اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔" غالب نے کہا۔ "ہاں، یہاں شور ہوگا تو ان کے خوابِ ناز میں خلل پڑے گا۔" غالب ہنسا۔ "اللہ یہ عورت ذات بھی... ایک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا... اب کیسی غافل سو رہی ہیں۔"

"بس یہ احساس ہے کہ ہمارے استاد ٹیڈی عرف ٹارزن آف لاہور ان کے درمیان ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"چنانچہ اب چوہا تو خیر آ ہی نہیں سکتا۔ چور ڈاکو اور بھوت بھی دور رہیں گے۔" غالب بولا۔

"کچھ سوچ کے ہی بھروسا کیا ہوگا انھوں نے مجھ پر!" ٹیڈی بولا۔

"معاملہ جذبات کا ہو تو خواتین سوچنے سے قاصر رہتی ہیں استاد اور ثبوت دیکھنا ہو تو ابھی انھیں جگا کے بتا دو کہ میں جا رہا ہوں... مجال ہے جو یہ پھر سو سکیں۔ ویسے تو تم جا ہی رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

ایک پیچ کس نے سریے کی مدد سے تالا کھٹ سے ٹوٹ کر کھل گیا۔ میں نے ڈھکنا اُٹھایا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس میں صرف فائلیں تھیں اور کاغذات تھے۔ نہ جانے کیوں میں یہ توقع رکھتا تھا کہ باکس میں سے ہیرے جواہرات نہ سہی، مالِ غنیمت ضرور برآمد ہوگا۔ کچھ ایسی ہی مایوسی کی کیفیت غالب اور ٹیڈی کی صورت سے عیاں تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ بدمعاش جو یہاں غاصبانہ طور پر قابض تھے۔" غالب بولا۔
"وہ چور ڈاکو تھے۔ انھوں نے کہا بھی تھا کہ ان کا مال یہاں دفن ہے۔"
"یہ تو وہ مال نہیں ہوسکتا۔" میں نے سرہلایا۔ "جس کی وہ بات کررہے تھے... مگر یہ کاغذات کیسے ہیں؟"

غالب نے ایک فائل اُٹھا کے گرد جھاڑی اور اس کے چند صفحے پلٹے۔ پھر اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے باقی صفحات پر سرسری نگاہ ڈالی۔ "یہ تو کوٹھی کی ملکیت وغیرہ کے کاغذات ہیں۔ سیل ڈیڈ... لیز، میوٹیشن۔"

میں نے دوسری فائل اٹھائی۔ "اس میں پراپرٹی ٹیکس کے بل ہیں۔ کارپوریشن کے واجبات کی ادائیگی کی رسیدیں ہیں۔ اور یہ کئی سال کے بل ہیں جو ادا نہیں ہوئے۔ کسی نے سب چُن کر اکٹھے کر دیے ہیں۔"

غالب نے تیسری فائل اُٹھالی۔ "یہ ڈیڈی کے انکم ٹیکس کا حساب ہے۔" ٹیڈی نے ایک بڑا سا لفافہ اُٹھایا اور اُلٹ دیا۔ اس میں چیک بکس تھیں۔ سب جزوی طور پر استعمال شدہ... مختلف بنکوں کی مختلف برانچوں کے یہ اکاؤنٹ غالب کے والد یا والدہ کے نام پر تھے۔ پھر دو چیک بکس غالب کے نام کی برآمد ہوئیں۔

"معلوم نہیں کس اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہے؟" وہ بولا۔
"جتنا بھی ہو... مگر ان کاغذات سے تمھیں اپنا قانونی حقِ وراثت حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔" میں نے کہا۔
"قانونی حقِ وراثت!" غالب نے تلخی سے کہا۔ "تمھیں مل گیا؟"
"میری بات چھوڑو... تمھارے حق پر ڈاکا ڈالنے والا کوئی میر شرافت علی یا چوہدری دلاور نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں سب ملے گا۔"
"کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک۔" وہ بولا۔
"کیا تصور میں تم نازو سے مخاطب ہو؟" میں نے کہا۔
ٹیڈی نے اُچھل کر کہا۔ "یار سکندر بادشاہ۔" اور میں نے بھی باکس میں دیکھا۔ کاغذات ختم ہوگئے تھے اور نیچے سے اچانک وہ دولت نکل آئی تھی جس کی امید اور جس کا خیال بھی دل سے محو ہو چکا تھا۔ مایوسی خلافِ توقع ہوئی تھی لیکن اس کے بعد یکلخت خیال کے حقیقت میں ڈھل جانے سے جتنی حیرانی ہوئی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔ صندوق کے نچلے حصے میں نوٹوں کی گڈیاں تہ در تہ جمی ہوئی تھیں اور یہ سب ملے جلے پرانے نوٹ تھے۔
"کیا یہ ایک لاکھ کی رقم ہے؟" غالب نے نوٹوں کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔
"ایسے اندازہ نہیں ہوسکتا، گن لیتے ہیں۔" استاد ٹیڈی نے کہا۔ "یہ کون سا قارون کا خزانہ ہے۔"
"تم نے کبھی غور کیا۔" میں نے کہا۔ "ہم سب پیسے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے جارہے ہیں حالانکہ ہم سب پیسے کو اپنا مقصدِ حیات نہیں سمجھتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے پیسے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا کہ یہ آئے گا اور کہاں سے آئے گا۔ نہ ہم اس کو طاقت کا ذریعہ سمجھتے تھے نہ شرافت کا معیار... میرا باپ ایک صنعت کار تھا اور میں لندن میں تھا تو میری سب ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ مجھے یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ واپسی پر کیا ہوگا۔ یہ سب تو گویا پہلے سے طے شدہ تھا کہ میں اسی کاروبار کو سنبھالوں گا اور ترقی دوں گا۔ میں نے کبھی حساب نہیں لگایا تھا کہ میرے اثاثے کتنے ہوں گے اور میں کتنا کماؤں گا۔ کما کے کہاں لگاؤں گا۔ کہاں خرچ کروں گا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور شانِ استغنا تھی۔ کہ پیسہ ہمارا مزید آتا رہے گا۔ سب ضروریات اب تک پوری ہوئی ہیں تو آئندہ بھی ہوں گی۔ ضروریات کا بھی کوئی محدود تصور نہ تھا۔ نہ ایک سے دو اور دو سے چار کارخانے بنانے کا کوئی منصوبہ تھا اور نہ یہ احساس کہ کل اگر یہ کارخانہ بھی نہ رہا تو کیا ہوگا۔ بُرائی فطرت میں ہی نہ تھی۔ چنانچہ عیش و عشرت کے بارے میں تو سوچتے نہیں تھے۔ ایسے بھی نہ تھے کہ دنیا میں نام منظور رہے تو نیکی کے اسباب بنا۔ پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا کے مقولے پر عمل کرتے۔ یہ میرے لیے اپنا کوئی وجود ہی نہ رکھتا تھا۔ بس میں تھا... میری ذات اور اس کی مصروفیات۔ محسن کے لیے بھی مستقبل محفوظ تھا وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔"

"خود میں نے عملاً پیسے کو ہاتھ کا مَیل سمجھا۔" غالب بولا۔ "تم دیکھ لو کہ وہ ہیرے جواہرات نہ جانے کتنے لاکھ کے تھے جو میرے تھے مگر اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کون لے گیا۔ مانی ہیرے جواہرات کے خزانوں کی خاطر قتل و خونریزی ہوتی ہے۔ اسمگلنگ کا جال پھیلایا جاتا ہے۔ اس پر فلمیں بنتی ہیں اور ہزاروں کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ وہ ہیرے جواہرات کسی غریب آدمی کو سڑک پر پڑے مل جاتے تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ یا اسے پولیس مار ڈالتی کہ کس کا خزانہ لوٹا تھا مگر وہ نہ بتا پاتا۔ مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ میرے باپ کے اور میرے اکاؤنٹ میں کتنا پیسہ ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ اس جگہ کی قیمت کتنے لاکھ ہے جس پر ہم فقیروں کی طرح ڈیرا ڈالے پڑے ہیں۔ میرا مشن صحافت تھا۔ پیسہ کبھی بھی مشن نہ تھا مگر اب دیکھو کہ صرف ایک لاکھ..."

"ایک لاکھ چوالیس ہزار۔" استاد ٹیڈی نے تصحیح کی جو نوٹ گن کر فارغ ہوگئے تھے۔ "ایک لاکھ چوالیس ہزار کی میرے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہ ہوتی اگر میں اپنے باپ کے کاروبار کو سنبھالتا میں بھی ستار ہوتا مگر بہت بڑا۔ میں اس کے کاروبار کو بہت ترقی دیتا اور مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا بنا لیتا۔ مگر دیکھو کہ پندرہ سیر سونا میں کس دن کے لیے اٹھائے پھر رہا تھا... میرا اپنا کیا تھا؟"

"خود رابعہ کتنی مطمئن اور خوشحال تھی۔ اس کا مشن بھی پیسہ نہیں تھا۔ وہ ترقی کرتی۔ مزید شہرت پاتی۔ اس کی فرم کی آمدنی لاکھوں میں تھی اور اس کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی دن وہ ہائی کورٹ کی جج بن جاتی مگر آج اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

"اور حالات کی ستم ظریفی دیکھو کہ ہمارے مقابل وہ ہیں جن کا دھرم ایمان سب پیسہ ہے۔" غالب بولا۔ "جو صرف پیسے کو مقصدِ حیات جانتے ہیں خواہ وہ جائز ذرائع سے آتا ہو یا ناجائز طریقے سے... جو پیسے کی خاطر خود کو، اپنی عزتِ نفس کو، اپنے ضمیر کو اور اپنے وطن کو سب کو بیچ دیتے ہیں۔ کیا تضاد ہے یہ بھی۔ ایک طرف ہم جیسے ہیں جو بہت دولت مند گھروں میں پیدا ہوئے۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر۔ اور ہم طبعاً بھی قلندر تھے کہ پیسے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے ورنہ وہ بھی ہیں جو لاکھ سے کروڑ بنا لیں تو کروڑ سے ارب اور ارب سے کھرب بنانے کی فکر کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔"

"ہمارا واسطہ پڑ رہا ہے ان چوروں سے۔ ڈاکوؤں سے۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ غریب اور احساسِ محرومی کے مارے ہوئے تھے۔ ان کے لیے سب کچھ پیسہ تھا جس کی خاطر انھوں نے مذہب، اخلاق اور قانون کے دائروں سے نکل کر سب کے حقوق غصب کیے... مجرم کہلائے اور معاشرے کا ناسور قرار پائے لیکن ان کو پیسہ ملا تو عزت نہ ملی۔ پیسے کو خرچ کرنے کی آزادی نہ ملی۔ جن کے یہ ایک لاکھ چوالیس ہزار ہیں ان کی حیثیت ہمارے مقابلے میں کیا ہے؟ مگر ہم بھی ان سے مختلف نہیں... چوری کا مال چُراتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے مال پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ چھوٹے چور سے بڑے چور تک سب کی دشمنی کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ جو کام ہم کر رہے ہیں وہ کتنا بڑا ہے مگر کیا ہمیں کوئی قومی ہیرو مانتا ہے۔ ہمیں کوئی بہادری یا حُبّ الوطنی کا میڈل ملے گا؟"

"اتنا اداس اور قنوطی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" غالب نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا۔ "کامیابی کی جو لگن... شوق کی جو انتہا... عزم و ہمت کا کبھی ختم نہ ہونے والا جذبہ اور رفاقت کا جو اعتماد ہمیں حاصل ہے وہ کس کو ملتا ہے۔"
"نیکی کرنے کی توفیق بھی خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "ہر ایک کے نصیب میں یہ خوشی نہیں ہوتی۔"
"بڑا نام کمانے کے لیے تو سب ہی جدّوجہد کرتے ہیں... بڑا کام کر دکھانے اور نیک مقصد میں کامیابی کی خوشی کو ہی اپنا انعام سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔"
"یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ ہم سب مل کر ڈاکوؤں کا ایک گروہ بنا لیتے یا اسمگلروں کا۔" غالب نے کہا۔

"اور کچھ بھی نہ کرتے تو دلاور کے ساتھی بن جاتے۔ اس کی دشمنی میں تو سب نے نقصان اُٹھایا۔ فائدہ دیکھتے تو اس کی ہر پیشکش سے دولت حاصل کر سکتے تھے۔" ٹیڈی بولا۔ "یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ابھی تک وہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنے ارادے سے ایک انچ نہیں ہلا سکے۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "ابھی تک کسی کی استقامت میں سرِمُو فرق نہیں آیا ہے۔ اتنی سختی جھیلنے اور اتنے مصائب برداشت کرنے کے باوجود سب کا حوصلہ پہلے سے زیادہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کتنے لوگ ہیں جو آرام و آسائش... بلکہ عیش و عشرت کی زندگی کو چھوڑ کے اس راہ پُرخطر کے عذاب و اذیت کو قبول کر سکے۔ ہماری جگہ دلاور اینڈ کمپنی کا کوئی بھی آدمی ہوتا تو اس کا ایمان سلامت نہ رہتا۔ وہ سب قابلِ فروخت ہیں۔ میں شرط لگا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیس لاکھ ہوتے تو ہم پیڈرو کو خرید سکتے تھے۔ وہ دلاور سے وفاداری پر لعنت بھیج کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کو قتل کر دیتا۔ بیس لاکھ میں خسرو جمشید بھی الگ ہو جاتا... رہ جاتا سراج... وہ بیس لاکھ میں سب کو بند کرا دیتا یا ختم کرا دیتا اور اپنی ایس پی کی نوکری سے بھی فائدہ اٹھاتا رہتا... ان سب کو احساس ہے کہ وہ ایک جرم میں شریک ہیں... کسی نیک کام میں نہیں۔ یہ بات وہ سب سمجھتے ہوں گے کہ کوئی کسی وقت بھی خود کو بچانے کے لیے دوسروں کی گردن پھنسا سکتا ہے۔ وہاں سب اپنی ذات کا تحفظ اور اپنا فائدہ پہلے دیکھتے ہیں۔"

"اگر ہماری سوچ بھی ایسی ہی ہوتی تو سب سے پہلے تم الگ ہو جاتے کیونکہ سب سے زیادہ فائدہ تمھارا ہی تھا۔" غالب بولا۔ "پچاس لاکھ کی آفر اب کتنی بڑھ چکی ہے۔ وہ تمھارا کاروبار تک تمھارے حوالے کرنے کو تیار ہے۔ تمھارے اور مرحوم وزیر خان کے سارے نقصانات کی تلافی کرنے کی بات کرتا ہے۔ تم اُن کی مانتے تو رابعہ کے ساتھ لندن میں سکونت اختیار کر لیتے اور انہی کے کاروبار کو چلاتے رہتے۔ محسن کو کیا پڑی تھی۔ ماں باپ اور بھائی بہن کا ساتھ چھوڑ کے تمھارے ساتھ خوار ہونے کی۔"

میں نے کہا۔ "یہی تو فرق ہے جو بالآخر ان کی شکست کا سبب بنے گا۔ ہم سب خود کو نہیں ایک دوسرے کو بچا رہے ہیں۔ ان سب کو بچا رہے ہیں جو اس سرزمین پر جان اور مال اور عزت آبرو کے تحفظ کے ساتھ رہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے درمیان ہی وہ غدار ہیں جو پیسے کے لیے ان کے یقین کو فروخت کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں۔ اُن کو صرف اپنی جان پیاری ہے۔ ایم آر ایس کے اتحاد کا مقصد ان کے اتحاد کے مقصد سے اتنا ہی دُور ہے جتنا آسمان اس زمین سے ——— اگر ہم اپنی اپنی دنیا میں والدین کے بنائے ہوئے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پر کامیابی اور خوشحالی کا سفر جاری رکھتے تو پھر ایک دوسرے سے کیسے ملتے اور ایم آر ایس کا وجود کہاں ہوتا۔"

"آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے شیخ چلی کی طرح صرف خیالی پرواز نہیں کی... ہوا میں تیر نہیں چلائے۔" غالب نے کہا۔ "صرف سوچا ہی نہیں، عمل بھی کیا ہے۔ ہمارے کریڈٹ پر بہت سی فتوحات ہیں۔ ہم نے دشمنوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ان کے عزائم کو پہنچایا ہے۔ ان کے مقاصد کو ناکام بنانے کے لیے پیش قدمی کی ہے اور ان کے حوصلوں کو پست کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب تو انھیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے مقابل بھی ایک قوت ہے جو اُن کی راہ میں دیوار بن گئی ہے اور یہ دیوار گرائی نہیں جا سکتی۔ ہر نیا دن اس کی مضبوطی میں اضافہ ..رہا ہے اور ایک دن آئے گا جب یہ دیوار ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بلند اور ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔"

اس سے ٹکرانے والے خود پاش پاش ہو جائیں گے..."

غا..ب بولا۔

"پھر ہم خود ایک دوسرے کو بہادری کا تمغہ دیں گے۔"

..ی بولا۔ "کیوں سکندر بادشاہ؟"

"ایک میڈل تو ابھی لو..." محسن نے دروازہ کھول کے کوئی چیز پھینکتے ہوئے کہا۔ "بک بک لگا رکھی ہے کب سے!"

اس نے جو چپل پھینکی تھی وہ میری کمر پر پڑی۔ "آہ... کیسا چھپ کر پیٹھ پر وار کیا ہے۔" میں نے واویلا کیا مگر محسن اندر غائب ہو چکا تھا۔

"شرفاء کی عزت اب باہر بھی محفوظ نہیں رہی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ٹیڈی نے قہقہہ مارا۔

"شرفاء کے بچے! ساری رات نیند حرام کی۔" محسن نے پھر دروازہ کھول کے دوسری چپل ماری جو نشانہ چوک جانے سے ٹیڈی کو لگی۔

"یہ سالا بہت دانت نکال رہا ہے۔" محسن کی آواز آئی۔ ٹیڈی کی ہنسی رک گئی۔ اس نے مشتعل ہو کے اپنی چپل کو محسن کی طرف فائر کیا مگر محسن پھر دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

"صبر کرو استاد۔" غالب قہقہہ مار کے بولا۔ "مقدر میں یہی تھا کہ بہن کا رشتہ بھی دو اور پھر جوتے بھی کھاؤ۔"

"او بدبخت! فقیروں کو مت مار... مارنا ہے تو کسی کا حق مار۔" میں نے کہا۔

"نہیں تو باہر آ... پھر دیکھ فقیر کیا کرتے ہیں۔" ٹیڈی نے چلا کے کہا۔

"ایسی کی تیسی فقیروں کی۔" محسن نے اندر ہی سے جواب دیا۔ "ہم کسی بادشاہ سے نہیں ڈرتے... خواہ سکندرِ اعظم آ جائے۔"

وہ اپنے قلعہ بند ہونے کا فائدہ اُٹھا رہا تھا مگر شامتِ اعمال اس وقت شہلا باہر آ گئی کیونکہ صبح ہونے لگی تھی۔ میں اور ٹیڈی ایک ساتھ اُٹھ کر دوڑے۔ محسن فوراً چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ چارپائی کے نیچے ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ محسن اکیلا ہم دونوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش میں چارپائی اُلٹ دی مگر پکڑا گیا۔ ہم باہر نکلے تو رابعہ دروازے میں کھڑی غالب سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا کوئی چوہا اور نکل آیا ہے؟" خوفزدہ نازو اس کے پیچھے تھی۔

"ہاں! یہ چوہا ابھی ابھی پلنگ کے نیچے سے نکالا ہے۔" میں نے کہا اور محسن کو بیچ میں پھینک دیا۔

"بہت شکریہ آپ حضرات کا۔" محسن نے اُٹھ کر بیٹھے ہوئے دانت نکال کے کہا۔ "یہاں تک اُٹھا کر لانے کی زحمت کی۔" پھر اس کی نظر نوٹوں کے ڈھیر پر گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہاتھ کا میل۔" میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "غالب کے ہاتھ کا... مجھے رشوت میں دے رہا تھا۔"

"تم لوگ کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دے سکتے۔" شہلا بولی۔

"ہم سیدھے سادے لوگ ہمیشہ سیدھی بات کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی غلط بیانی نہیں شہلا بی بی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب غالب کا ہے۔"

"تجھے کیوں رشوت میں دے رہا تھا؟" محسن نے دلچسپی سے کہا۔

"کہتا تھا کہ میرا ایک کام کرا دو... سفارش کی کہتا تھا..." میں نے نازو کی طرف دیکھا۔

"اچھا...؟ کام کیا تھا؟" محسن نے بھی نازو کو دیکھا۔ اس کا رنگ لال ہونے لگا۔

"بہت مشکل کام تھا یار... جان جوکھوں کا۔"

"میں سمجھ گیا... کہتا ہو گا کہ میری طرف سے اظہارِ محبت کرا دو۔" محسن نے سر ہلایا۔ "اسے سمجھاؤ کہ یہ خیال چھوڑ دے۔ ایٹمی میزائل کا ڈنڈے سے کیا عشق... ڈنڈا بھی تھانیدار کا نہیں... بے چارہ مولا بخش۔"

"مولا بخش تمام عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"اور اسے ہمیشہ پاؤں کی جوتی سمجھے گا۔" محسن نے کہا۔

"اس کے لیے ایک محل بنائے گا سپنوں کا۔"

"اور اسے محل میں اپنی ادنیٰ کنیز بنا کے رکھے گا۔" محسن بولا۔

جب ہم سب نے ہنسنا شروع کیا تو وہ سب واک آؤٹ کر چکی تھیں۔

"بس ایک دفعہ ان کی زبان چل پڑے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔" کچن سے رابعہ کی آواز آئی۔ "بدنام ہم ہیں۔"

"فوراً پٹری سے اتر جاتے ہیں۔" شہلا نے خفگی سے تائید کی۔

جب ناشتا شروع ہوا تو ہم نے اپنی شب بیداری کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ غالب کی بات اور ہمارے انکشافات نے خاصی سنسنی پھیلائی۔

"کیا وہ چور اپنا مال لینے کے لیے واپس آئیں گے؟" محسن بولا۔

میں نے کہا۔ "اگر تجوری بھی انھوں نے نکالی ہو گی تو انھیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی کیا پروا۔"

غالب نے کہا۔ "مجھے وہ ایسے نہیں لگتے تھے کہ تجوری کا پتا چلا لیں اور اُٹھا لے جائیں۔ اس کو کھود کر نکالنا بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا اُسے یہاں سے کہیں منتقل کرنا اور پھر کسی سے کھلوانا... عام ویلڈنگ کرنے والے اسے نہیں کاٹ سکتے تھے۔ وہ گن میٹل کی بنی ہوئی تھی۔"

"تمھارا مطلب ہے تجوری پہلے ہی کوئی لے گیا تھا! زیادہ بڑا اور ہنرمند چور؟"

غالب بولا۔ "ہاں، اور ممکن ہے یہ کام کسی گھر کے بھیدی نے کیا ہو۔"

"کیا مطلب؟" ٹیڈی نے کہا

غالب نے کہا۔ "میرے والد اپنے دوست احباب پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ ان کے سب دوست پرانے اور قابلِ اعتماد تھے۔ ڈاکٹر لطیف اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ سب کو تجوری کے متعلق بتاتے تھے۔"

"مگر ڈاکٹر لطیف جیسے لوگ تو یہ کام کرنے سے رہے۔"

"نہ جانے کس کس کو یہ بات معلوم تھی۔" غالب نے کہا۔ "ان کے انتقال کے بعد میں تو آیا نہیں۔ معلوم نہیں کس نے موقع سے فائدہ اُٹھا لیا۔"

"تمھیں کیوں یقین ہے کہ یہ کام اپنوں کا ہو گا؟" میں نے کہا

"یہ کام وہی کر سکتا تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ یہاں آ کے رہ سکتا ہو۔" غالب بولا۔ "جسے دوسرے سب لوگ جانتے پہچانتے ہوں اور گھر کا محافظ سمجھتے ہوں۔ کوئی اجنبی تجوری نکالتا تو سب دیکھتے۔ اُسے لوڈ کرنے کے لیے کرین منگوانا پڑا ہو گا اور اسے ٹرک میں لے جایا گیا ہو گا۔ ورنہ دس بیس مزدوروں نے یہ کام کیا ہو گا۔ ظاہر ہے یہ رات کی خاموشی میں ہونے والا ایسا کام نہیں تھا کہ آس پاس والوں کو خبر تک نہ ہوئی ہو۔ میں ایک مفروضے کی بنیاد بناتا ہوں کہ جب میرے والدین کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو سب تعزیت کرنے والے یہاں پہنچے۔ ہمارے کچھ رشتے دار بھی تھے جن کو میرے والدین مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غریب تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے والد معمولی ڈاکٹر تھے اور وہ سب دولت مند شمار ہوتے تھے۔ میرے والد نے سخت حالات کا مقابلہ کیا تھا اور اُس وقت سب رشتے دار غیر بنے رہے تھے۔ بعد میں میرے والد کی کامیابی کا دور شروع ہوا تو وہ سب دوڑے۔"

"اپنی اپنی نااہل، بدتمیز اور بدصورت لڑکیوں کے رشتے لے کر۔" محسن بولا۔

"بالکل یہی ہوا۔" غالب بولا۔ "مگر میرے والد نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ ایک متوسط گھرانے میں... اپنے ایک میٹرک کے زمانے کے کلاس فیلو کی لڑکی سے جو ہیڈ کلرک تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ لو میرج تھی۔"

"ایک اچھی روایت قائم کی تھی انھوں نے... اسے قائم رکھو۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد انھوں نے یعنی ٹھکرائے ہوئے رشتے ... نے ہمارے خاندان کے خلاف قوت اد... میرے والد نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور معاشرتی مقاطعہ کرنے والوں سے الگ ہو کے اپنے مخلص دوستوں کے رشتوں کو استوار کر لیا۔ ان کو کسی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔" غالب نے کہا۔ "میرا قیاس یہ ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو میری عدم موجودگی میں کوئی خون کے رشتے کا دعویدار آ پہنچا ہو گا۔ ایک دو تو فرسٹ کزن تھے۔ چچازاد یا ماموں زاد قسم کے۔ اصولاً وہ میرے بھی چاچے، مامے تھے۔ کسی چاچے مامے نے فوراً میزبانی کے فرائض سنبھال لیے اور گھر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ سوگ ختم ہو گیا اور کوئی آنے جانے والا نہ رہا... میرا انتظار بھی نہ رہا۔ تو اس نے صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کی سوچی۔ ممکن ہے وہ سال چھ ماہ یہاں رہا ہو۔"

"تم نے ڈاکٹر لطیف سے پوچھا ہو گا؟"

"میں نے پوچھا تھا۔" غالب نے کہا۔ "اور ان کے جواب پر ہی میرے قیاس کی بنیاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہاں! کوئی تھا تو سہی جو سب سے مل کر آنسو بہا رہا تھا۔ سب اُسی کو تسلی دیتے تھے اور اُسی سے تعزیت کرتے تھے۔ اندر باہر سب انتظام اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ سوئم پر بھی وہی منتظم تھا اور چہلم پر بھی... خود ڈاکٹر لطیف کو اس کا نام یاد نہیں تھا۔ جو حلیہ انھوں نے بتایا، وہ کسی بھی ادھیڑ عمر کے آدمی کا ہو سکتا تھا لیکن وہ نام بتا دیتے تب بھی میں کیا سمجھتا۔ میں آج بھی کسی کو نہیں پہچان سکتا۔ نہ ان کو میری خبر ہے نہ مجھے ان کی۔ مطلب یہ کہ یوں مرحوم کا نام لیوا بن کے کوئی یہاں مقیم رہا اور جب اِدھر اُدھر کے لوگوں نے اسی کو وارث تسلیم کر لیا اور اس کی موجودگی کے عادی ہو گئے تو اس نے اپنا کام بے خوف و خطر کیا۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی روکے گا۔ میرے نہ ہونے سے وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیا کہ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ دیا۔ یہ ..."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گھر کا ساز و سامان... بس وہی ایک چیز لے گیا جو قصرِ بکنگھم سے زیادہ قیمت کی تھی۔ ممکن ہے اب وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ کسی عالی شان محل میں رہتا ہو اور اس کا شمار صنعت کاروں میں ہو۔"

"ایک اور چوہدری دلاور۔" میں نے کہا۔" اس کو بھی ڈائری میں لکھ لو۔ ہمیں ایک دن اس تجوری چور کو بھی پکڑنا ہے۔ ہم اسے تلاش کریں گے مگر بعد میں..."

"کیا تم نے میری قیاس آرائی کو اتنا درست تسلیم کر لیا ہے؟" غالب ہنسنے لگا۔" ہو سکتا ہے اس افسانے میں حقیقت کا ایک فیصد بھی نہ ہو۔"

"یہ فیصد کا فرق ہی افسانے کو حقیقت سے جدا کرتا ہے۔" محسن بولا۔" اور مجھے یہ فرق دکھائی نہیں دیتا... بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تجوری چور تو فی الحال محفوظ ہیں مگر ہم خود کو ان چوروں سے محفوظ تصور نہیں کر سکتے جن کا مال ہمارے قبضے میں آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔" وہ اپنا مال لینے تو آئیں گے۔"

"اور ایسے وقت میں آئیں گے، جب ہم موجود نہ ہوں گے۔" غالب نے کہا۔" صرف محترم خواتین ہوں گی۔"

"اور اب وہ تیر و تفنگ اور بم بارود نہیں لائیں گے۔ اپنے ساتھ نصف درجن حسن پرست چوہے لے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"اوئی اللہ... چھ چوہے...!" محسن نے زنانہ آواز بنا کے چیخ ماری۔ رابعہ اور نازو کا خفت سے بُرا حال ہو گیا کیونکہ ہم سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو رہا تھا۔

"چھ چوہے اور چھ چھپکلیاں۔" غالب بولا۔" یہ اسلحہ خواتین کی ایک فوج کو شکست دینے کے لیے کافی ہے۔" مگر ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ نازو بجلی کی طرح اٹھی۔ دوسرے لمحے میں مرزا غالب اُڑتے نظر آئے۔ ٹیڈی نے بچنے کی بڑی کوشش کی مگر غالب اس کے اوپر گرا۔ وہ دونوں بھی اُلجھ گئے۔ میں اور محسن فوراً دُور ہو گئے تھے، چنانچہ بچے بھی ویسے ہی بیٹھ گئی۔ باری اب خواتین کے جیتنے کی تھی۔

"کیا ہوا بھئی! بڑے بڑے سورما چت پڑے ہیں۔" رابعہ بولی۔

"اور بڑے بڑے سکندر بھاگ رہے ہیں۔" شہلا بولی۔" چھپ رہے ہیں۔"

"بالکل چوہوں کی طرح۔" رابعہ نے کہا۔

"اور ایک چھپکلی جیسی لڑکی کے سامنے نہیں آ رہے ہیں۔" شہلا بولی۔

جب امن و امان بحال ہوا تو سنگین مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ رقم کے بارے میں طے کیا گیا کہ اسے فوری ضرورت پر خرچ کرنا مناسب ہو گا۔ چوہدری دلاور اینڈ کمپنی کا پروگرام بھی معلوم ہو چکا تھا مگر اس کا پہلا مرحلہ تین دن بعد آنا تھا۔ یہاں سے ہم پھر ان کے پیچھے لگ سکتے تھے۔ ٹیپ سننے کے بعد سب کے لیے نئی حکمتِ عملی کا نقشہ سامنے آ گیا تھا اور سب ہی سمجھ رہے تھے کہ اب ہمارا پروگرام کیا ہو گا۔ ان تین دنوں میں ہمیں بھی بہت سے کام نمٹانے تھے۔

"سب سے پہلے تو بہرام دادا کی بیٹی کے لیے کچھ کرنا ہے۔" ٹیڈی نے کہا۔" ہم کو اب تک اسپتال پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"میں اور تم اسپتال جائیں گے۔" میں نے کہا۔" اس کے لیے ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف مجھے پولیس تلاش کر رہی ہو گی۔"

"تم اس سارجنٹ کی وردی کو تو اتار دو۔" رابعہ نے کہا۔" خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے کہ ابھی کسی کا چالان کر دو گے۔"

"ایک دن چالان تو تمہارا ہو گا بی بی۔" میں نے کہا۔" بغیر وردی کے بھی کریں گے ہم... مگر تمہاری خواہش کے احترام میں یہ لباس بدل دیتے ہیں حالانکہ بہت جچ رہا تھا یہ لباس ہم پر۔"

"تقریباً ایسی ہی وہ وسٹر کی وردی تھی۔" رابعہ نے کہا۔

"اس میں آدمی خود کو زیادہ بااختیار محسوس کرتا ہے۔" میں نے کہا۔" مگر اس لباس میں باہر جانے کا مطلب ہے... ٹریفک پولیس کو پیچھے لگانا... میں اتنا احمق نہیں ہوں آپ لوگوں کی اطلاع کے لیے..."

"ہماری رائے کسی اطلاع سے نہیں بدل سکتی۔" محسن بولا۔" آپ نے کل جو حماقتوں کا ورلڈ شو پیش کیا..."

"یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج بہرام دادا کی بیوہ کے لیے کچھ کرنے کے قابل ہوں گے۔" میں نے احتجاج کیا۔" اگر اسے حماقت کہا جائے تو اس میں بھی خدا کی مصلحت تھی۔"

"اس کا اثر دلاور اینڈ کمپنی کے پلان پر بھی پڑ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔" کل ہی نازو وہاں سے غائب ہوئی... کل ہی شمروز جمشید ثانی مارا گیا۔"

"ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" محسن بضد رہا۔" وہ کوئی رسک بہرحال نہیں لیں گے۔"

"رسک ہم بھی نہیں لیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم اسپتال جا کے رسک لے رہے ہو۔" غالب بولا۔" تم کو کم از کم چوبیس گھنٹے سڑک پر نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"لیکن بہرام دادا کی بیوہ کو صرف میں پہچانتا ہوں۔"

"اسے پہچاننا ضروری نہیں۔" غالب نے کہا۔" اگر اس کی بیٹی مل جائے گی تو ان کا پتا بھی مل جائے گا۔ اسپتال میں ہمیشہ پولیس موجود رہتی ہے۔ اور تم ایک بار میو اسپتال میں خاصی ہنگامہ آرائی کر چکے ہو۔"

"ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو جاؤں گا۔" ٹیڈی بولا۔

"تم بھی مت جاؤ..." غالب نے کہا۔" یہ کام صرف شہلا کو کرنے دو۔"

"اکیلی شہلا کو؟" رابعہ نے کہا۔

"اکیلی کا کیا مطلب... اسے کیا وہاں توپ چلانی ہے؟" غالب بولا۔" اور نازو کا مشن تو خیر ایسا تھا کہ یہ بی بی دکین اور تم کچھ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔"

"یہ تسلیم کرتے شرم آتی ہے کہ تم بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔" رابعہ بولی۔

"ہاں ہاں، میں اور شہلا کا میاں... ہم دونوں صرف مار کھا سکتے ہیں۔ کسی کو خالی ہاتھوں سے مار نہیں سکتے... تمہارے سکندرِ اعظم کی طرح۔" غالب نے بھنا کر کہا۔" عقل کی بات کوئی سنتا نہیں... فوراً کاٹ شروع ہو جاتی ہے۔ شہلا سب سے کم مشہور اور مطلوب ہے۔ اسے رابعہ اور نازو کی طرح کسی سے خطرہ نہیں۔ یہ جائے برقع اوڑھ کر اور اطمینان سے پھرے۔ ہر وارڈ میں کسی سے بھی بات کرے۔ اسے کوئی نہیں پہچانتا۔ یہ اس لڑکی سے کوئی بھی رشتہ جوڑ سکتی ہے۔ بہرام دادا کی رشتے کی کچھ بن جائے اور سیدھی اس لڑکی سے جا کے بات کرے۔ خاموشی سے اس کو یا اس کی ماں کو سمجھا دے کہ وہ کس کی طرف سے آئی ہے۔ وہ میرا حوالہ دے یا استاد ٹیڈی کا مگر انھیں قائل کر لے کہ وہ رازداری سے کام لیں... ہماری اصلیت جاننے کے چکر میں نہ پڑیں اور خدا نے چاہا تو ہم سب کچھ ٹھیک کر لیں گے۔ ایک بار رابطہ قائم ہو گیا تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

غالب کی بات بہت معقول تھی چنانچہ اس سے اتفاق نہ کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ شہلا نے اُسی وقت روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ مسئلہ ایک برقعے کے حصول کا بھی تھا مگر شہلا نے کہا کہ وہ انارکلی سے خرید لے گی اور امید ہے دوپہر کے کھانے کے وقت تک لوٹ آئے گی۔ ٹیڈی کچھ مضطرب اور مایوس تھا کہ اسے بہرام دادا کی فیملی کے لیے کچھ کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے لیکن ہم نے اسے تسلی دی کہ پہلا کام تو اس لڑکی کو بچانے کا ہے۔ اس کے بعد ساری زندگی پڑی ہے۔ ٹیڈی جس طرح چاہے اپنے احسان کا قرض مع سود ادا کر دے۔"

"وہ سونا تو اب نکال ہی لینا چاہیے۔" ٹیڈی نے کہا۔

"ابھی سے کیوں نکال لیں۔ جب ضرورت پڑے گی نکال لیں گے۔" میں نے کہا۔" وہاں وہ سونا بہت محفوظ ہے۔"

میں اور محسن سڑک تک شہلا کے ساتھ گئے اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کے لوٹ آئے۔ ہم نے اسے دس ہزار روپے دے دیے تھے کہ اگر اسپتال میں بہرام دادا کی بیٹی ضرورت مند ہو تو اُسے دے آئے۔ واپسی پر ہم نے اخبارات خریدے۔ ان میں گزشتہ دنوں کی دہشت گردی کے خلاف بہت سے بیانات اور اداریے تھے جن میں سارا غم و غصہ انتظامیہ پر اتارا گیا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ بیانات چھپوائے گئے ہیں کیونکہ ہماری تمام کارروائی کا نشانہ دلاور کے علاوہ پولیس کے دو افسر بنے تھے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر حشمت خان تو مارا گیا تھا لیکن ایس پی سراج کا گھر تباہ ہوا تھا۔ تازہ خبریں ایک نامعلوم شخص کے قتل اور ایک ٹریفک سارجنٹ پر قاتلانہ حملے کی تھیں۔ نامعلوم شخص کے متعلق بتایا گیا تھا کہ اس کی لاش ایک جلی ہوئی گاڑی سے دریافت ہوئی تھی اور ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی۔ اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ گاڑی کس کی تھی اور کہاں سے ملی تھی۔ اس گیراج کا بھی کوئی حوالہ نہیں تھا جہاں میں نے مرسیڈیز کو چھوڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دو زیرِ مرمت کاریں بھی ضرور تباہ ہوئی ہوں گی مگر خبر میں اس کا تذکرہ نہیں تھا۔ پولیس شاید اس گیراج کے مالک کو پکڑ کر لے گئی ہو گی یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ مرسیڈیز وہاں کیسے پہنچی... کیسے اس میں آگ لگی؟ اسے وہاں چھوڑ کر جانے والے کون تھے اور اس نے کچھ نہیں دیکھا تو کیوں نہیں دیکھا؟ باقی دو گاڑیوں کے مالکوں نے بھی اپنے اپنے نقصان کے لیے اسی کو ذمے دار ٹھہرایا ہو گا اور پولیس نے کاروں کے مالکوں کو مطمئن کرنے کے لیے گیراج والے کو اٹھا لیا ہو گا۔ اس کی واجبی سی مرمت کی ہو گی اور پھر اسے معاف کر دیا ہو گا۔ معاف کرنے کا نذرانہ لے کر۔ پولیس کو بھی معلوم ہو گا کہ وہ مجرم نہیں ہے اور اگر سچ مچ تفتیش کرنی پڑی تو وہ کبھی کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے لیکن خبر میں یہ سب نہیں تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے بھی واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق پیش کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق حملہ آور دو تھے۔ ان میں سے ایک گاڑی لے کر بھاگ گیا اور دوسرا پکڑا گیا۔ اس نے دوسری کار کے مالک کو پکڑ لیا تھا جو وہاں موجود ہونے کا قصور وار تھا... وہ نشے میں تھا اور اس کا یہ جرم کافی تھا۔ پولیس نے اس سے سارے نقصانات کی تلافی کر لی ہو گی۔ سارجنٹ نے اپنی عزت بچا لی تھی اور یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ فرار ہونے والا مجرم اس کی وردی اتروا کے بھاگ گیا تھا۔ دوبارہ اس وردی میں نمودار ہوا تھا اور پھر بھاگ گیا تھا۔ اس قسم کی کارکردگی پر اسے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ جو پکڑا گیا تھا بہرحال پیسے والا تھا۔ نئی وردی بنوانے کے لیے پیسے دے گیا ہو گا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہم واپس پہنچے تو غالب اور نازو مختلف کمروں میں پھر رہے تھے۔ غالب اپنے بچپن سے فرار ہونے تک کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کر رہا تھا اور نازو بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی۔ چنانچہ غالب نے عمرِ رفتہ کی کتاب کا ہر ورق اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

"میرا خیال ہے غالب بالآخر نازو کو امپریس کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔" محسن نے ان دونوں کے انہماک کو دیکھ کر کہا۔

"تم سب ہر ایک جیسے شکاری ہو۔" رابعہ نے کہا۔ "لفظوں کے جال بُنتے ہو۔ سبز باغ اور سنہرے خواب دکھاتے ہو۔ عورت بچ کر کہاں جاسکتی ہے۔"

"یہ عورت تو اپنے گھر جاسکتی ہے۔" محسن بولا۔ "اس کا اپنا گھر ہے۔"

"کون سا گھر؟ عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے۔" رابعہ بے خیالی میں بولی۔

"یہ زنانہ فلسفہ مت جھاڑو، ہمیں اداس کرنے کے لیے کہ اسے تو ایک دن بابل کا انگنا چھوڑ کے آنا پڑتا ہے۔" محسن بولا۔ "ہم سب ہی اسی طرح اپنے اپنے دل میں حسرتِ تعمیر لیے پھر رہے ہیں۔ میرا کون سا گھر ہے؟ استاد ٹیڈی کا گھر کہاں ہے ہمباپ کا گھر نہ اسے ملا نہ سکندر کو۔ لیکن اسے تم نے خرید لیا۔ اُس ویرانے میں اور اس ویرانے میں کیا فرق ہے؟ بقولِ شاعر۔ آباد کرتے آخر ویرانے آدمی ہیں۔ جب سکندر دوارع ہو کے تمہارے گھر جائے گا... تو کیا وہ اس کا گھر نہیں کہلائے گا کیونکہ مالک تو تم ہو۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" رابعہ نے شرمندگی سے کہا۔

اندر سے غالب کا ایک نعرہ سنائی دیا۔ نازو ہنستی ہوئی برآمد ہوئی اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ "چلو باجی کچھ دوپہر کے کھانے کا کرلیں۔" وہ بولی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ غالب رونی شکل بنائے لنگڑاتا ہوا نمودار ہوا تو وہ پھر ہنسی۔ میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"یار مرزا... خیریت تو ہے نا...؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"خاک خیریت ہے۔" مرزا فرش پر آکتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ "الّو کی پٹھّی کے ہاتھ پیر ہی قابو میں نہیں ہیں۔"

"تمھاری بھی تو زبان قابو میں نہیں ہے دوست۔"

"او یار تو زبان کا جواب زبان سے دے۔" مرزا غالب نے غصّے سے کہا۔ آخر کون سی بڑی بات کہہ دی تھی میں نے۔ یہی کہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب تمھارے رُخِ روشن کی چاندنی سے میرے گھر میں اجالا ہوگا۔ میرے دل میں پھول کھلیں گے۔"

"ڈائیلاگ تو اچھا تھا۔" میں نے سر ہلا کے کہا۔

"خاصی رومانٹک اور جذباتی بات تھی۔" محسن نے میری تائید کی۔

"بس اسی پر اُٹھا کے پھینک دیا۔" غالب نے نقشِ فریادی بن کے کہا۔

"تم چھوڑو مرزا... یہ عشق تمھارے بس کا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لنگڑے لُولے ہو جاؤ گے شادی ہونے تک۔ دُولھا بن کے پہ جاتا اچھا نہیں لگتا۔"

"اور وھیل چیئر پر بیٹھ کر کیسا لگتا ہے؟" محسن بولا۔

"یہی تو مجبوری ہے دوستو۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔ "اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔"

"سوچ لو ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں کیا ہوگا۔" محسن ... "جب تم اس کے حکم کے غلام بنو گے، سارا دن فٹ بال کھیلے سے..."

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" غالب بولا۔ اس نے آج پہلی بار اظہارِ عشق کیا تھا۔ اعترافِ جرم کیا تھا اور سزا کا طلبگار تھا۔ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔

"یار یہ نازو کیا اب ایسے ہی پھرے گی؟" غالب بولا۔ "... بنی ہوئی۔"

"یہ پوچھو کہ چاند بدلی سے کب باہر آئے گا۔" میں نے کہا۔ "تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب موسلے بھائی آئے گا۔ وہی ... کو پھر پری بنائے گا۔"

"اور موسلے بھائی کب آئے گا؟" محسن بولا۔ "جب ہم ... لائیں گے۔"

"اور تم اُسے کب لاؤ گے؟" غالب نے کہا۔

"ہم اُسے جب چاہیں گے اُٹھا لائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اب تو اُٹھا کے ہی لانا پڑے گا... اپنی خوشی سے وہ ... بھی نہیں آیا تھا......" غالب بولا۔ "صورت دیکھتے ہی ... جائے گا۔"

"ہمیں ایک خانہ بدوش قبیلہ بن کے سفر کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر کیا ضرورت ہے نازو کا میک اپ اتارنے کی۔ ہم سب کو ایسا ہی بن جانا چاہیے۔"

"ہمیں خانہ بدوشوں کے دیگر اسباب کی ضرورت بھی ہوگی۔ چار گدھے اور کم سے کم دو خیمے۔ سفر میں کھانا پکانے کا سامان، بہت برتن اور زمین پر بچھا کے سونے کے لیے کچھ بستر وغیرہ۔" محسن بولا۔ "اس کے علاوہ صورت خانہ بدوشوں جیسی بنا لینے کے بعد ویسا ہی لباس بھی درکار ہوگا۔ یہ سب کہاں سے آئے گا؟"

"بازار میں کیا نہیں ملتا... ابھی تو کھانے میں دیر ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم چلتے ہیں اور سب خرید لاتے ہیں۔ شام تک حلیہ بدل جائے تو اچھا ہے۔ پھر یہ طے کریں گے کہ کس کو کیا کرنا ہے، کدھر جانا ہے۔"

"اب ہم سب ایک ہی قافلے کی صورت میں نہیں ... سکتے۔" غالب نے بھی بالآخر اپنے لب کھولے۔ "دو حصّوں میں تقسیم ہو جانا ... بنے گا۔ ایک ٹیم دوسری ٹیم سے رابطہ ضرور رکھے گی۔ لیکن دونوں ... الگ رہیں گے۔"

"یہاں کون ٹھہرے گا؟" ٹیڈی سوتے سوتے اُٹھ بیٹھا۔

"کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں کوئی کام نہیں ہوگا۔"

"کام تو ہے لیکن تم اسے کام نہیں سمجھتے۔" ٹیڈی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "بہرام دادا کی بیٹی کا کیا بنے گا؟"

"اس کے لیے ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا، جانے سے پہلے ہی کرلیں گے۔ اس کے بعد آپریشن کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ آپریشن کی کامیابی کے لیے ہم دعا کے سوا کیا کرسکتے ہیں۔ دعا کے لیے ہمارا یہاں موجود ہونا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہم ان عورتوں کو بھی ساتھ رکھیں گے؟"

"ظاہر ہے! یہاں کس کا میکہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کی مدد کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے۔ ایک ٹیم میں نازو ہوگی تو دوسری میں رابعہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ میں اور نازو الگ ہوں۔ خالی ہاتھوں سے لڑنا پڑے تو دونوں ٹیموں میں مقابلے کی صلاحیت برابر ہو۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اور رابعہ... میں اور نازو..." غالب نے خوش ہو کے کہا۔ "خوب گزرے گی..."

"مجبوری ہے ورنہ تمھاری جان کی بازی نہ لگاتے۔" میں نے کہا۔ "اسے لڑنے بھڑنے کا موقع نہ ملا تو وہ ساری مشقِ ستم تمھاری جانِ ناتواں پر کرے گی اور وہاں تمھیں بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔"

"ارے تو کون کافر بچنا چاہتا ہے۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی۔" غالب بولا۔

"بس تو پھر کیا غم ہوگا۔" محسن بولا۔ "شوق سے مرو۔"

"ان میاں بیوی کا کیا ہوگا۔ کیا ہم ظالم سماج کی طرح ان کو جدا کردیں گے؟" غالب بولا۔

"میرا خیال ہے شہلا ہمارے ساتھ نہیں جاسکتی۔" میں نے کہا اور محسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں جاسکتی۔"

"مگر کیوں نہیں جاسکتی۔" ٹیڈی نے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گے بیٹے! ابھی بچے ہو۔" محسن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "وہ امید سے ہے۔" اُس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا۔

"اچھا؟" غالب اور ٹیڈی ایک ساتھ اُچھلے۔ "تو یہ بات ہمیں بتایا تک نہیں۔" غالب نے محسن کے ایک مُکا رسید کیا۔ "مبارک ہو بھئی۔"

"یہ تو اتنی تازہ خبر ہے کہ آج کے اخبار میں بھی نہیں۔" محسن بولا۔ "مجھے بھی کل رات کو ہی اطلاع ملی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ کسی کو معلوم نہیں۔"

"سکندر کو کیا فرشتے بتا گئے؟" غالب بولا۔

"تار نے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید تھی۔"

"تم بھی امید سے تھے؟" غالب بولا۔

"ہاں بھئی! ایک اندازہ تھا کہ جب محسن نے شادی کی ہے تو پھر وہ سب کچھ تو ہوگا جو شادی کے بعد ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دنیا امید پر قائم ہے۔"

"پھر تو واقعی شہلا نہیں جاسکتی۔ اور ظاہر ہے پھر بچے کا باپ بھی نہیں جاسکتا۔" غالب نے کہا۔

"باپ ضرور جائے گا۔ کسی کا باپ نہیں روک سکتا اسے۔" محسن بولا۔

"لیکن یہاں بھی تو کسی کو شہلا کی خبرگیری کے لیے رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"ہم اسے کسی کے پاس چھوڑ سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مثلاً منظر کے گھر میں۔ اس کی بیوی بہت تجربہ کار ہے۔"

"فائن! اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہوسکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "تو اب دونوں ٹیموں کی تشکیل ہوگئی۔ میرے اور رابعہ کے ساتھ استاد ٹیڈی۔ غالب اور نازو کے ساتھ محسن۔ اس سے بہتر ٹیم نہیں بن سکتی۔ غالب اور نازو کی جوڑی تو اچھی ہے..."

"اتنی ہی اچھی ہے جتنی تمھاری اور رابعہ کی جوڑی۔" محسن بولا۔

"ہاں اتنی ہی اچھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ضروری ہے کہ دونوں کے ساتھ ظالم سماج کا نمائندہ موجود رہے۔ ویسے تو ماشاءاللہ سب ہوش مند، فرض شناس اور باضمیر ہیں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ نازو کے اور میرے الگ الگ رہنے کے اسباب وہ نہ ہوتے جو میں نے بیان کیے تو میں خود تجویز کرتا کہ رابعہ اور غالب ایک ساتھ ہوں۔"

"یہ انتخاب بہتر کارکردگی کا ضامن ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "کام میں دل لگے اور دل کی تقویت کا سامان ساتھ ہو تو کام بھی کام نہیں رہتا۔ ایک رومانٹک ایڈونچر بن جاتا ہے۔"

لیکن نازو اور غالب کے ساتھ ٹیڈی کو رکھا گیا تو یہ ایڈونچر بھی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے گا۔ نازو اور غالب میں تو نا چھیڑ ملے خوباں سے چلی جائے اسد۔ والا معاملہ ہے مگر ٹیڈی اور غالب بھی لڑیں گے اور تینوں آپس میں اُلجھنے والے ہوں گے تو سلجھائے گا کون۔ میں اور رابعہ امن پسند لوگ ہیں۔"

"ٹھنڈے خون والے جانور مثلاً مگرمچھ اور اگرمچھ۔" غالب نے کہا۔

"تمھارے ساتھ محسن ہی ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم استاد ٹیڈی کے اچھے پارٹنر ہوں گے۔"

ہم دونوں ٹیموں کے فرائض اور تقسیمِ کار کی بحث میں ایسے اُلجھے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ شہلا نے اس سے پہلے ہی لوٹ آنے کو کہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ وہ جائے اور اسپتال کو ہاتھ لگا کے لوٹ آئے۔ رابعہ اور نازو نے لنچ کا اعلان کیا تو دو بج چکے تھے۔ شہلا کا انتظار بے سود تھا۔ محسن نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ وہ چار بجے سے پہلے نہیں آ سکتی چنانچہ ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مینو دیکھ کر ہم سب کو حیرانی ہوئی۔ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں دو لڑکیوں نے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ قورمے کے ساتھ آلو کے کٹلٹ تھے۔ بریانی تھی۔ سلاد، اچار اور کھیر دیکھ کر مجھ پر رقت طاری ہونے لگی۔ یہ انتہائی گھریلو قسم کا مینو تھا جو دربدری میں نہ جانے کب سے خواب و خیال تھا۔ عام طور پہ بازار کا کھانا چلتا تھا۔ تنوری روٹیاں اور وہی آلو قیمہ، آلو گوشت۔

"بیٹھے کیوں ہو... کیا صرف دیکھ کر پیٹ بھر جائے گا؟" رابعہ ہنسی۔

"کچھ یقین نہیں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب کیسے کر لیا تم لوگوں نے؟"

"ہم کیا نہیں کر سکتے۔" نازو نے غالب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب تک تو ہاتھ پیر چلاتے اور توڑتے ہی دیکھا تھا..." غالب بولا۔ "یہ معلوم نہیں تھا کہ ہانڈی میں چمچہ بھی چلا لیتی ہو۔"

"اور یہ خاتون ایڈووکیٹ! انھیں قانونی دفعات کے حوالوں کے علاوہ کھانے پکانے میں بھی شُد بُد ہے۔" میں نے کہا۔ "غالباً قورمہ انھوں نے بنایا ہوگا۔"

"غلط... قورمہ نازو نے تیار کیا ہے۔" رابعہ مسکرائی...

"میں نے بریانی پکائی... خوب اندازہ ہے آپ کا۔"

"پھر کٹلٹ نازو نے بنائے ہوں گے۔" غالب نے کہا۔ "میرے کٹلٹ بناتی رہتی ہیں نا۔"

"یہ بھی غلط۔" رابعہ پھر ہنسی۔ "نازو نے کھیر بنائی ہے۔"

"کھیر پکائی جتن سے اور خرمہ دیا جلا۔" میں نے کہا۔

"آیا کتا کھا گیا۔" محسن نے غالب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تو بیٹھا ڈھول بجا۔" میں نے امیر خسرو کا دوہا مکمل کرتے ہوئے نازو کو مخاطب کیا۔ "ڈھول بجنی ڈھول جاتی، ڈھول سپاہیا۔"

"ڈھول تو یہ ساری عمر بجائیں گی۔" محسن بولا۔ "کھانا کھا لیجیے پھر نہ جانے سفر میں ریت پھانکنا پڑے اور گھاس چرنا پڑے۔" میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ٹیڈی اور غالب مجھ سے پہلے ہی ٹوٹ پڑے تھے اور خواتین کی ایک نہیں سن رہے تھے جو صبر کی تلقین میں وقت ضائع کر رہی تھیں۔ بالکل گھر گرہستی والی بی بیوں کی طرح انھوں نے حلیں کھدیہ... خود کھانے سے انکا... شہلا کا انتظار کریں گے۔

غالب اور ٹیڈی نے اتنا کھا لیا تھا کہ انھیں کھینچ کر اٹھانا پڑا... وہ اٹھے، بمشکل سے بستر تک پہنچے اور لیٹ گئے۔

"اب تو سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔" استاد ٹیڈی کی...

"غالباً معدے میں جگہ نہیں رہی تو کھانا پھیپھڑوں کی... گیا۔ دل و جگر میں سما گیا۔" غالب نے کہا۔

"یہ تمھارا آخری طعام تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"اب لیٹ کر کلمہ پڑھتے رہو۔" محسن بولا۔ "ہم جا رہے ہیں... ہماری واپسی تک فوت مت ہونا۔"

ان دونوں پہ غنودگی طاری تھی۔ میں اور محسن گھر سے نکلے تو وہ خراٹے لے رہے تھے۔ نہایت مضحکہ خیز طریقے سے... لگتا تھا کہ غالب ایک مصرع پڑھتا ہے اور ٹیڈی خراٹوں کا دوسرا مصرع پڑھ کے جواب دیتا ہے۔ ہم دونوں نے جیب میں پانچ ہزار روپے رکھ لیے تھے۔ باقی ایک لاکھ چوبیس ہزار کی رقم... نے سیوفین میں اچھی طرح لپیٹ کر انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں ڈال دی تھی جس میں پانی اوپر تک بھرا ہوا تھا لیکن نہ جانے... پرانا تھا۔ ہم نے اتفاقِ رائے سے موسیٰ بھائی کی خدمات حاصل کرنے کو غیر ضروری قرار دیا۔ خانہ بدوش صحرائی قبیلے کے افراد کا بھیس بدلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا جو ہم خود نہ کر سکتے۔

چوک رنگ محل کی ایک دکان تک پہنچنے کے لیے... نے راہ چلتے لوگوں سے اور کچھ دکانداروں سے رہنمائی حاصل کی۔ رنگ محل کی اس دکان کے ماتھے پہ بڑا جاندار سائن بورڈ آویزاں تھا۔ "حشر تھیٹر سپلائی کمپنی" کا نام اسٹیج ڈرامے کے اس عظیم مصنف اور فنکار کے نام سے منسوب تھا جسے دنیا آغا حشر کے نام سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ تاہم سائن بورڈ پہ مصوری کے سارے نمونے ویسے ہی تھے جیسے عموماً ٹرک اور بس کی باڈی پر نظر آتے ہیں۔ ایک طرف خوفناک مونچھوں والا پہلوان ٹائپ شخص مغل بادشاہوں کی وضع قطع بنائے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ نے کندھے پر گرز کو تھام رکھا تھا تو دوسرے ہاتھ سے وہ مغلِ اعظم کی طرح گلاب کا پھول سونگھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کسی شہنشاہِ ہند کا تصور نہ آیا جو اتنا بے ڈھنگا ہو اور بہ یک وقت گرز اور پھول اٹھا کے تصویر بنواتا ہو۔ دوسری طرف نور جہاں یا ملکہ ممتاز محل قسم کی جہاں... خاتون تھیں۔ لباسِ شاہانہ میں بے لباسی کا اشتہار۔ ملکہ عالیہ کی ایک آنکھ چھوٹی تھی اور دوسری بڑی۔ کسی نے شرارت میں ان کے لبوں پہ مارکر سے دو سیاہ لکیریں بنا دی تھیں جو باقاعدہ تراشی ہوئی مونچھیں نظر آتی تھیں۔

مالک دکان آغا حشر کا قدرداں ہی نہیں بہروپ کار تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بات کرنا سب ڈرامائی تھا۔ اس نے ہماری فرمائش میں اپنا مشورہ شامل کیا اور بہت تفصیل سے سمجھایا کہ صحیح... نظر آنے کے لیے ہمیں کس قسم کا حلیہ بنانا ہوگا۔ اس کے پاس... پرانی البم تھی جس میں مختلف اسٹیج ڈراموں کے فوٹوگراف تھے۔ ...نے متعدد ڈراموں کے بارے میں بتایا کہ وہ کس میں کیا بنا تھا۔

...نے ہیرو، ولن، ہیرو کے باپ، ہیروئن کے باپ اور کامیڈین یہاں تک کہ ایمرجنسی میں زنانہ رول تک کیے تھے۔ اور بقولِ خود ہر کردار میں اپنی اداکاری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ بُرا ہو بائیسکوپ کا جس نے تھیٹر کا بیڑا غرق کیا۔ اس نے ہمیں خانہ بدوش قبیلے کے مرد اور عورت کے بھیس میں بہت سی تصویریں دکھانے کے بعد اپنی مرضی سے سامان نکالا اور مفصل ہدایات کے ساتھ ہمارے حوالے کیا۔ اس کی فضول بکواس ہم نے مروت اور اخلاق میں سُنی... وہ ایک دل شکستہ آرٹسٹ تھا جس کے لاکھوں قدرداں ختم ہو چکے تھے اور بامِ شہرت سے گمنامی کے اندھیرے میں گم ہو جانے والے کو اب کوئی پوچھنے بھی نہیں آتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ جب وہ کسی کو اپنے زریں دور کے متعلق کچھ بتاتا تھا تو کم ظرف اور بدتمیز لونڈے ہنستے تھے۔ کالجوں میں ڈرامیٹک کلب بنا کے پھکڑپن کا مظاہرہ کرنے والے یہ لونڈے خود کو ڈراما آرٹسٹ کہتے تھے اور اُسے بہت افسوس تھا کہ یہی لوگ بعد میں ٹی وی ڈراموں کے لیے منتخب ہو جاتے تھے۔ فن کہیں نہیں مگر فنکار سب ہیں۔ اس نے زمانے کے چلن پر آخری تبصرہ کیا۔

ہم ایک خاصا بڑا بنڈل لے کر اور اس ماضی کے عظیم فنکار سے مصافحے کی سعادت حاصل کر کے دکان سے رخصت ہوئے تو کچھ افسردہ تھے۔ زمانے کی قدرناشناسی کا نظارہ بہت عبرتناک تھا۔ وہ بھی زمانہ ہوگا، جب ہزاروں افراد اس عظیم فنکار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے، اس سے ایک بار ہاتھ ملانے کے لیے اور اس سے ملاقات کے لیے دن رات آگے پیچھے پھرتے ہوں گے۔ ایکٹرسوں سے لے کر تماش بینوں تک ہر طبقے کی ایک سے ایک حسین لڑکی اس پر فریفتہ ہوگی اور اس کے قرب کی خواہش میں بے قرار مگر وقت ساتھ چھوڑ گیا تو سب ساتھ چھوڑ گئے۔ اب ثقافت کے نام لیوا بھی اس سے کترا کے گزر جاتے ہیں۔ شاید وہ ہر ایک کو اسی طرح اپنے ماضی کی داستان سنا کے دل کا غبار نکالتا ہوگا اور بتاتا ہوگا کہ یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ... گزرنے کی روش تو یہ ہے کہ جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔ ان فنکاروں کو تو آثارِ قدیمہ والے بھی اپنی تحویل میں نہیں لیتے۔

"اس آدمی نے مجھے شرمندہ کیا۔" محسن بولا۔ "موسیٰ بھائی تھا ایک نمبر کا بدمعاش۔ ہم بھی اس سے بدمعاشی کے دھندوں میں دلیتے تھے اور پیسہ اس کے منہ پر مارتے تھے۔ یہ فنکار تھا۔ اس نے ہمیں فن شناس سمجھا اور فن کے اسرار و رموز سمجھاتا رہا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم اس کے پیشے سے دُور کا تعلق بھی نہیں رکھتے اور اسے دھوکا دے رہے ہیں تو اسے کتنا دکھ ہوتا۔"

"دکھ تو آدمی کا مقدر ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اسے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے فن کی بے قدری دیکھ کر تو وہ اس پیشے کو خیرباد کیوں نہیں کہہ دیتا؟ اصل بات یہ ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔

وہ جانتا ہے کہ سب میک اپ سے بھیس بدلنے والے ڈراما آرٹسٹ نہیں ہوتے۔"

"پھر اُس نے ہم سے یہ سب باتیں کر کے کیا پایا؟"

"کچھ نہیں... تم بھول رہے ہو کہ وہ ایکٹر تھا۔ ایکٹر ہمیشہ ایکٹر رہتا ہے خواہ اسے اسٹیج اور اسکرین کی دنیا بھول جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ اچھی طرح سمجھتا ہوگا کہ اب میک اپ سے کوئی بھیس بدل سکتا ہے تو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے، روپوش ہونے کے لیے۔ چور ڈاکو اور جرائم پیشہ لوگ زیادہ ہیں۔ اسٹیج آرٹسٹ بہت کم۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا کہ ہم کس ڈراما سوسائٹی یا کس کالج کے ڈرامیٹک کلب سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً پرانے کلب اپنا سامان رکھتے ہیں اور ہماری طرح اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اس نے تو ڈرامے کا نام تک نہیں پوچھا۔ ہم سچ مچ اسٹیج ڈراما کرنے والے ہوتے تو کیا اسے مدعو نہ کرتے؟ مگر وہ پرانے وقتوں کے کچھ نہ جاننے والے اور کچھ نہ سمجھنے والے سادہ لوح بوڑھے کا کردار ادا کرتا رہا اور بلاشبہ اس نے اپنی اداکاری سے مجھے متاثر کر لیا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کے پاس ڈاکو جائیں اور صاف کہیں کہ وہ کس مقصد کے لیے بھیس بدلنا چاہتے ہیں تو وہ بہرا بن جائے گا۔ یہ ظاہر کرے گا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اشاروں میں بات کرے گا اور جو وہ مانگیں گے دے دے گا۔"

"اس کا فائدہ؟"

"وہ محفوظ رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جو لوگ دھوکا دہی کے لیے اس سے بھیس بدلنے کا سامان لے جاتے ہیں انھیں وہ ایک مظلوم اور قابلِ رحم شخص لگتا ہے۔ کبھی کوئی پکڑا جاتا ہوگا تو اس کا نام نہیں لیتا ہوگا کہ خواہ مخواہ پولیس اس بڈھے کو بھی گھسیٹے گی۔ بفرضِ محال اس کو پولیس اعانتِ جرم میں دھر لے تو وہ ایک مخبوط الحواس اور دل شکستہ بوڑھے کی اداکاری سے اپنی مظلومیت کا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہے گا اور چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ بھی موسیٰ بھائی ہے لیکن بے خطر۔"

"میں نہیں مانتا کہ یہ اداکاری تھی۔" محسن بولا۔

"دیکھ یار! اس نے پیسہ کتنا لیا ہم سے۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ سامان سات ہزار کا ہے؟ ڈراما آرٹسٹ ہوتے تو یہ ان سے سات سو مانگتا اور اگر سات ہزار مانگتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے دے دیتے۔ چھ عدد نقلی وِگ، داڑھی مونچھیں، اور چھوٹا موٹا دوسرا سامان۔ یہ تین چار سو کا ہوگا۔ سات سو کے بجائے اس نے ہم سے سات ہزار وصول کر لیے۔ ایک پیسہ کم نہ کرنے کا مطلب بالکل صاف تھا کہ میاں یہ سامان کی نہیں، ضرورت کی قیمت ہے۔ معلوم نہیں تم کیا کرو گے۔ مجھے اپنا رسک بھی تو کور کرنا ہے۔ ممکن ہے تم ڈاکا ڈالو، لاکھوں لوٹ لو۔ پھر سات ہزار مجھے کیوں نہیں دیتے؟"

"ہم چھوڑ کے بھی تو جا سکتے تھے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"مشکل تھا۔ اسے ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دکان کتنی مشکل سے تلاش کی تھی ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مشکل انہی کو پیش آتی ہے جن کا ڈرامے سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ہم سات ہزار دے سکتے ہیں۔ ایسی دکانیں گلی گلی تو ہیں نہیں۔ ہم کہاں جاتے۔ اور جانے لگتے تو وہ ایک شوشہ چھوڑ دیتا کہ میاں ہوشیار رہنا۔ لوگ پہلے پولیس کو بلا کے تصدیق بھی کر لیتے ہیں کہ یہ ڈراما کہاں ہو رہا ہے۔ مجھے تم لوگ ڈراما آرٹسٹ تو لگتے نہیں۔"

"میں قائل ہونے لگا ہوں تیری بات سے۔" محسن بولا۔ "اس کا یہ بھی مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بڈھے کو پیسے سے غرض ہے۔ اس کے بعد اسٹیج پر ڈراما کرو یا دنیا کے ساتھ۔ اس کی کوئی ذمے داری نہیں۔"

"ظاہر ہے! سات ہزار کی اس نے کون سی رسید دی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور سامان سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم نے اس سے لیا تھا۔" محسن بولا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ ہم بھی ایک مستقل مزور تمند ہیں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"

"اب وہ سامان چاہیے جو کسی دکان پر نہیں ملتا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کچھ گدھے چاہئیں۔"

"ان کی کیا کمی! ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"وہ ایک کہاں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "غالباً کسی کمہار یا دھوبی سے پوچھنا پڑے گا۔ معلوم نہیں آجکل کیا بھاؤ چل رہا ہے۔"

محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کیا دلچسپ تجربہ ہے یہ بھی۔ کبھی سوچ سکتے تھے ہم کہ ایک دن گدھے خریدنے پڑیں گے۔۔۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آدمی کبھی نہیں خریدتا۔ مثلاً کشکول ہم فقیروں کے ہاتھ میں دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر کوئی پوچھے کہ یہ کہاں بنتے ہیں اور کہاں ملتے ہیں تو جتنے خیرات دینے والے ہیں ان میں سے ایک بھی نہ بتا سکے۔"

"میرا خیال ہے کہ شہر سے باہر چلتے ہیں۔ ملتان روڈ کی طرف۔ میں نے اکثر خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھے ہیں وہاں۔" میں نے کہا۔ "گدھے کیا ان سے خانہ بدوشی کا تمام اسباب مل جائے گا۔"

ایک ٹیکسی نے ہمیں ملتان روڈ پہنچا دیا۔ ڈرائیور نے دو بار پلٹ کر پوچھا کہ ہمیں ملتان روڈ پر کہاں جانا ہے اور ہر بار ہم نے وہی جواب دیا کہ سیدھے چلتے جاؤ۔

"اوجی ملتان جانا ہے تے صاف دسو نا۔" وہ چڑ کر بولا۔ "میں نئیں جا سکدا۔۔۔ کوئی بس پھڑ لو۔"

"ایہہ وی ٹھیک اے۔" میں نے کہا۔ "اسی بس پھڑ لینے آں۔"

ٹیکسی والے نے اس جواب کا مزید برا منایا اور وہیں ٹیکسی کھڑی کر دی۔ ہم نے بہت شرافت سے کرایہ بمطابق میٹر ادا کیا اور وہ ہمیں ویران سڑک پر چھوڑ کے واپس ہو گیا۔ وہ طے نہیں کر سکا کہ ہم بیوقوف ہیں یا بہت چالاک۔ جب ٹیکسی نظر سے اوجھل ہو گئی تو [اس نے] ایک طرف اشارہ کیا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر چند خیمے [نظر آ رہے] تھے۔ ایک اونٹ اپنی بلندی کے باعث صاف پہچانا جا [رہا تھا۔] اس کے دامن میں چرنے والے گدھے بھی ہو سکتے تھے [اور] گھوڑے بھی۔ باقی چوپائے بھیڑ بکریاں تھے یا خانہ بدوشوں [کے] بیوی بچے۔

تقریباً آدھے میل کا فاصلہ ہم نے ہل چلی ہوئی زمین [اور] کھیتوں کی منڈیر پر طے کیا۔ گرد اور دھوپ نے ہمارے رنگ روپ کو خاصا متاثر کیا اور جب ہم خیموں تک پہنچے تو فرق [ہمارے] لباس کا رہ گیا تھا۔ حلیے سے تو من تو شدم تو من شدی والا معاملہ [تھا۔] وہاں کل سات خیمے تھے اور اتنے ہی گدھے کے سائز کے گھوڑے جو نہایت کاہلی سے کھڑے تھے۔ چار جوانی میں بوڑھی ہو جانے [والی] عورتیں میلے کچیلے ڈھیلے ڈھالے مگر رنگ برنگے کپڑے پہنے [زمین] پر پاؤں پسارے ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں تلاش کر رہی تھیں۔ یہ ان کی ہابی سمجھی جا سکتی تھی۔ بچے بھی زمین کی تپش [اور] سے بے نیاز لوٹیں لگانے میں مصروف تھے۔ بھیڑ بکریاں [دوڑ رہے] تھے اور ان کے ساتھ مل کر زمین کو کھاد فراہم کر رہے تھے۔ ایک [کتے] نے بھونکنا شروع کیا تو انھیں کسی اجنبی کی موجودگی نے خبردار [کیا۔] سب سے پہلے بچے آئے اور انھوں نے انتہائی پیشہ ورانہ انداز [میں] کورس شروع کیا۔ "ایک چار آنے دے بابو۔۔۔ بھوک لگی ہے۔" وہ ہمارے پیچھے چلنے لگے اور مختلف درد بھری اپیلیں کرتے رہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ ماں اندھی ہے۔ باپ [معذور] ہے۔ اگر ہمارے پاس اتنی ہی چونیاں ہوتیں جتنے بچے تھے تو ہم [اس] کورس کو بند کر سکتے تھے۔ ایک روپے کا نوٹ دیتے تو وہ آپس [میں] چھینا جھپٹی میں پھاڑ دیتے اور لٹنے تو ایک کے نوٹ بھی ہر [ایک کے پاس] نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے ان کو جھڑکا لیکن وہ بالکل متاثر نہ ہوئے۔

پھر کسی خیمے سے ایک پتلا سا بانس نما شخص نکلا جس [کی] مونچھیں اسٹیل وول کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ اس کے لمبے لمبے [بال] کندھوں تک پہنچتے تھے اور تقریباً سفید تھے۔ وہ صرف دھوتی باندھے ہوئے تھا اور ننگے پاؤں نکلا تھا لیکن اس کے گلے میں [ڈھیروں] جیولری تھی۔ نیلے پیلے لال رنگ کے موتیوں کی مالائیں۔ کانوں [میں] پیتل کی بالیاں اور ہاتھ میں کونڈی والا موٹا ڈنڈا جو بھنگ گھوٹنے کے کام آتا ہو گا لیکن اس سے وہ ہمارا سر توڑنا چاہتا تو توڑ سکتا تھا۔ ہم اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کیا یہ قبیلے کا سردار ہو گا؟" محسن نے سوچ کر کہا۔

"سخی داتا کچھ دینے آیا ہے۔" وہ شخص آسمان کی طرف [منہ] اٹھا کے بولا۔ اس کی آواز کی گھن گرج نے مجھے متاثر کیا۔

"یہ تو یار فقیروں کا ڈیرا ہے۔" محسن بولا۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔ یہ خانہ بدوش فقیر ہوں گے۔" میں نے کہا۔

[پھر] گلا صاف کر کے اس بڈھے کو مخاطب کیا۔ "بابا! ہم کچھ دینے [بھی آئے] ہیں اور لینے بھی۔"

"فقیر دعا دے گا بچہ! اللہ تجھے زمین پر حاکم بنائے گا۔"

"حاکم کا کیا مطلب؟ سی ایس ایس؟" محسن بولا۔ "ڈپٹی کمشنر وغیرہ۔۔۔"

"یار کام کی بات کرنے دو۔" میں نے کہا۔ "بابا! ہمیں کچھ گدھے چاہئیں۔۔۔ جیسے یہ ہیں۔"

بڈھے کا موڈ آف ہو گیا۔ "مذاق کرتے ہو ہم سے۔" وہ گرج کر بولا۔ "شہر میں کم ہیں گدھے؟"

"صحیح کہا آپ نے۔۔۔ بہت گدھے ہیں مگر ہم یہ خریدنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔ "یہ سب۔۔۔ مطلب یہ کہ آپ کی بستی۔۔۔"

بڈھے نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ غالباً میں صحیح الفاظ میں عرض مدعا نہیں کر سکا تھا۔ محسن نے بروقت میری مدد کی۔

"بابا جی! آپ کے یہ دو خیمے بہت پرانے ہو گئے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہم چاہتے تھے کہ ان کی جگہ آپ کو نئے دلوا دیں۔"

"اللہ اجر دے گا آپ کو۔" بڈھا ایک دم خوش ہو گیا۔

"اب ہمارے پاس اتنا وقت تو ہے نہیں کہ ہم نئے خیمے [خرید] دیں اور پھر ان کو بدلیں۔" محسن بولا۔ "یہ بتاؤ نئے خیمے کتنے میں آتے ہیں؟"

"دو خیمے۔۔۔ چھ سو۔۔۔ سات۔۔۔ نہیں آٹھ سو۔" لالچ نے اس کے لیے فوری فیصلہ کرنا مشکل بنا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ یہ لو آٹھ سو۔" محسن نے جیب میں سے نوٹ نکالے۔ "یہ خیمے اکھاڑ کے ہمارے حوالے کرو۔"

بڈھا پھر پریشان ہو گیا۔ وہ کبھی خیموں کی طرف دیکھتا تھا تو کبھی نوٹوں کی طرف۔ "ابھی؟۔۔۔ دیکھو بابو۔۔۔ ایک تو میں اپنا خیمہ [دے] سکتا ہوں اسی وقت۔۔۔ دوسرا۔۔۔ وہ۔۔۔ پیچھے والا۔۔۔ وہ میری بڑی بہن کا ہے۔۔۔ باقی مرد دھندے پر گئے ہوئے ہیں۔۔۔ شام کو۔۔۔ بلکہ رات کو آئیں گے۔۔۔ اور پتا نہیں سودا کریں گے [یا] نہیں۔۔۔"

میں سمجھ گیا۔ بڈھا اپنا اور اپنی بہن کا فائدہ چاہتا تھا۔ "اچھی [بات] ہمارے لیے یہ تھی کہ وہ دونوں خیمے جو بڈھا بیچنے پر آمادہ تھا۔ [زیادہ] خستہ تھے مگر باقی سب کے مقابلے میں نئے ہی لگتے تھے۔ میں نے محسن کو آنکھ ماری اور اس نے نوٹ بڈھے کو تھما دیے جس نے ان کو بڑے ندیدے پن سے دھوتی میں اڑس لیا۔ پھر وہ [دوسری] طرف منہ کر کے گلا پھاڑنے لگا۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس کی بات کا اثر ہم نے فوراً دیکھا۔ تقریباً ہر [خیمے] سے ایک عورت نے نکل کر چلانا شروع کیا۔ بڈھے نے جواب میں بہت کچھ کہا جو غیر شریفانہ اور خواتین سے گفتگو [کا] اشتعال انگیز طریقہ تھا مگر خواتین ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں۔ ان کو بڈھے کی گالیوں پر نہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ اس نے کمینے پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے دونوں خیمے بیچ دیے۔ انھوں نے بڈھے کو تقریباً ہم وزن گالیاں دیں اور پھر مایوس ہو کر اندر چلی گئیں۔ فروخت ہو جانے والے دونوں خیموں کو اکھاڑنے کا کام فوراً شروع ہو گیا۔ ان کی بستی میں ایسا سنسنی خیز واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا چنانچہ بچے بھی دم بخود تھے۔

"اب ایک سودا اور کرنا ہے۔" محسن نے کھنکار کے کہا۔

"بولو، بولو۔۔۔ اور کیا چاہیے۔۔۔ یہ مٹکے۔۔۔ یہ مالا۔۔۔ چمٹا ہے اور کشکول ہے۔" بڈھا بولا۔

"نہیں! یہ سب آپ کو مبارک ہو۔۔۔ یہ گدھے۔۔۔"

"یہ گھوڑے ہیں بابو۔۔۔" اس نے تصحیح کی۔

"اچھا! اتنے پورٹیبل۔۔۔ میرا مطلب ہے بالکل گھوڑے کا خلاصہ لگتے ہیں۔" محسن نے ایک کامیاب شوروم کے مالک کی طرح کہا جو کسی کی پرانی گاڑی لیتے وقت اس میں صرف خامیوں کا شمار کرتا ہے اور مالک شرمندہ ہوتا ہے کہ اب تک جس چیز کو وہ فخر سے گاڑی سمجھ کے استعمال کرتا رہا وہ تو گدھا گاڑی سے بھی زیادہ گئی گزری چیز تھی۔

"خیر یہ گھوڑے ہیں تو گھوڑے سہی۔۔۔ چار تول دو۔" محسن بولا۔ نوٹ محسن کے ہاتھ میں تھے۔ چنانچہ بڈھا دانت پیس کر گالی نہ دے سکا اور دانت نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ "یہ چار سو کا ایک ہو گا۔"

"چلو اس کا بھی سودا ہوا۔" محسن نے سولہ نوٹ گنے۔ بڈھے کی طرف بڑھائے اور پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "یہ ریڑھا بھی تمہارا ہے؟"

"ہاں جی۔۔۔ لینا ہے؟ آٹھ سو ہوں گے۔" بڈھے نے نوٹوں کی طرف پھر ہاتھ بڑھایا۔

"یہ ہو گئے چوبیس۔۔۔ ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "کچھ کپڑے۔۔۔ جیسے ان عورتوں نے پہن رکھے ہیں۔"

"یہ۔۔۔ یہ کپڑے۔۔۔" بڈھا بھونچکا رہ گیا۔ "پھر یہ کیا پہنیں گی؟"

"ان کو تم نئے کپڑے لا کر دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہم تھیٹر والے لوگ ہیں۔ ہمیں ایک فلم کے لیے یہ سب سامان درکار ہے۔ ہمارے پاس یہ تین ہزار روپے ہیں۔ ہمیں خانہ بدوشوں کی زندگی دکھانے کے لیے یہ سامان چاہیے۔"

"فلم کے لیے۔۔۔" بڈھا بولا۔ "ایک بار پہلے بھی فلم والے آئے تھے اور ہم سب کو لے گئے تھے۔ سب کو دس دس روپے ملے تھے۔"

"ہم بھی لے جائیں گے اور پچاس پچاس دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی۔۔۔ سب مل جائے گا آپ کو۔" وہ بولا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "آدھا گھنٹا ہم انتظار کر لیں گے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تقریباً پون گھنٹے میں وہ سب سامان ریڑھے پر لاد دیا گیا جو ہم نے مانگا تھا۔ اگر ہن بڑھے نے ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہم ریڑھے کو ڈرائیو کر کے نہیں لے جا سکتے تھے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ تین فاضل گھوڑے بھی ساتھ ہوں۔ اس نے دو گھوڑوں کو بڑی مہارت سے آگے جوتا اور دو کو پیچھے باندھ دیا۔ ہم سامان کے اوپر بیٹھے اور وہ شہر کی مختلف سڑکوں سے گزار کے شام پانچ بجے تک ہمیں گھر کے قریب پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ خیریت گزری کہ راستے میں کوئی حادثہ نہیں ہوا اور کوئی ٹریفک سارجنٹ ملا بھی تو متوجہ نہیں ہوا۔ ہماری جیب میں تو اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اس سے گلوخلاصی کی فیس ادا کر سکتے۔ ابھی ہم اپنے گھر سے آدھا میل کے فاصلے پر تھے کہ مجھے ایک کھلا میدان سا نظر آیا۔ میں نے اس جگہ کو مناسب سمجھتے ہوئے گھوڑا گاڑی روک لی۔ ڈرائیور سے کہا کہ ہماری فلم کا سیٹ اسی جگہ لگایا جائے گا۔ وہ اگر چاہے تو ایک ہفتے بعد اپنے قبیلے کو لے کر صبح نو بجے تک یہاں پہنچ جائے۔ اس نے اپنی فقیرانہ بولی اب ترک کر دی تھی اور ہم سے عام فہم زبان میں اور سیدھے صاف لہجے میں بات کر رہا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میں نے دو گھوڑوں کی باگ ڈور سنبھالنے کی کوشش کی اور اس تجربے میں ناکام رہا۔ وہ اشاروں کی زبان سمجھنے والے جانور تھے اور میرے اشارے ان کو کنفیوز کر رہے تھے چنانچہ ایک چلتا تھا تو دوسرا رک جاتا تھا۔ ایک دائیں طرف جانے کے لیے مڑنے لگتا تو دوسرا بائیں سمت چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح گاڑی نہیں چل سکتی تھی چنانچہ میں نے اتر کے ان دونوں کی لگام تھامی اور آگے آگے پیدل چلنا شروع کیا۔ محسن پیچھے رہا اور باقی دو گھوڑوں کو ہنکاتا رہا۔ چھ بجے ہم اس خانہ بدوشی کے جملہ اسباب کے ساتھ کوٹھی کے ویران احاطے میں داخل ہوئے تو مجھے بہرام دادا کی بیوی کی گاڑی نظر آئی۔ "یہ کون آ گیا سکندر؟" محسن نے گھبرا کے کہا۔

"فکر کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو ان گھوڑوں کو یہاں باندھ دے۔ ان کے چرنے کو گھاس کافی ہے۔ ریڑھا پیچھے کی طرف لے جانا۔ سامان اسی پر رہے۔"

"یہ سب تو کر لوں گا، میں..."

"بہرام دادا کی بیوی آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید شہلا کو چھوڑنے اور ہمارا ٹھکانا دیکھنے آئی ہو گی۔"

اندر پہنچنے کے بعد میں نے بہرام دادا کی بیوہ کو ایک پرانی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے سامنے بیڈ پر رابعہ اور نازو چپ بیٹھی تھیں۔ غالب اور ٹیڈی کچھ فاصلے پر متفکر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ عورت چونکی۔ اس نے ابھی تک لباس ... نہیں تھا مگر میرے جسم پر سارجنٹ کی وردی نہیں تھی۔

میں نے اسے سلام کیا اور اس کی بیٹی کی خیریت پوچھی۔

"وہ ویسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "کل رات تمھارے ... کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔"

"شہلا پولیس کی تحویل میں ہے۔" غالب نے کہا۔

"پولیس کی تحویل میں؟" میں نے اور محسن نے بیک ...

"بے چاری لڑکی۔" بہرام دادا کی بیوہ نے افسوس سے کہا۔ "آئی تو تھی جولی کی جان بچانے کے مشن پر... میری بیٹی ... جولیٹ مگر ہم جولی کہتے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ اسے ... کر لیا گیا۔"

"لیکن کس جرم میں؟" میں نے کہا۔ "کیسے گرفتار کر لیا؟"

"جرم اس نے تو کوئی نہیں کیا تھا؟" غالب بولا۔ "... ہمارے ساتھ تھی... مجرموں کی ساتھی تھی۔"

محسن ابھی تک اس غیر متوقع صدمے سے گم ...

"یہ پولیس کو کیسے معلوم ہوا...؟"

"غلطی میری بھی تھی۔" جولی کی ماں سر جھکا کے بولی۔ "... مجھے معاف کرے۔ لیکن تم نے مجھے رات کو روکا نہ ہوتا ... میں تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ تم کون ... تم تو ایک سارجنٹ کی وردی پہن کر میری گاڑی کے سا... آ گئے تھے اور تم نے مجھے بتایا ہی نہیں تھا کہ تم..." وہ چپ ...

"تم نے ... موقع ہی کب دیا تھا... کیا ضرورت تھی ... فرار ہونے کی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"دیکھو! وہ میری غلطی نہیں تھی۔ میں بہت پریشان تھی ... وہاں تم نے اس شرابی سے مار پیٹ شروع کر دی تھی۔" وہ بو... "میں اس جھگڑے میں نہیں پڑ سکتی تھی۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو ... تھی۔ میں نروس بریک ڈاؤن کا بہت جلد شکار ہو جاتی ہوں ... جولی کی بیماری نے میرا حوصلہ چھین لیا ہے اور میری قوت برداشت ختم کر دی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پولیس والا مجھے تھانے لے ... گا اور وہاں جو سوال جواب ہوں گے ان کا مجھے اندازہ تھا ... وہ مجھے بلاوجہ بٹھائے رکھتے... ذلیل کرتے اور پھر پیسہ ما... جو آجکل ویسے ہی میرے پاس نہیں ہے۔ جو تھا وہ پہلے ہی ... بیماری میں لگ گیا اور میرے پاس زیادہ وہ تھا بھی نہیں۔ جولی ... باپ جتنا چھوڑ کر مرا تھا اس میں سے ہم کئی سال سے خرچ کرتے آ... تھے۔ اس میں تو قارون کا خزانہ بھی پورا نہ ہوتا۔ کمانے والا کوئی ... تھا۔ میں سروس کر سکتی تھی۔ پڑھا سکتی تھی۔ اسٹینوگرافر بننے کے ... میں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھی تھی اور اسپیڈ بھی بنالی تھی ... لیکن میں کیا کروں کہ ہر جگہ بہرام دادا کا حوالہ میری راہ میں حائل ہو ... تھا۔ مجھے نوکری اس لیے نہیں ملتی تھی کہ میں ایک بدنام شخص ... بیوی رہی تھی۔ میں خود بدنام نہیں تھی۔ کوئی بھی مجھ سے نہیں پو... تھا کہ تم کس کی بیٹی ہو۔ میری شرافت کی بہرام دادا قسم کھاتا تھا ...

... سے شادی کر کے گویا میں نے خاندانی شرافت بیچ دی تھی۔ سب ... اس نے ... ذہن کر لیتے تھے کہ میرے یار آشنا وہی ڈاکو بدمعاش ہوں گے جو ... جرم دلوا کے ساتھ تھے اور یہ ساتھی اب بھی آتے جاتے رہیں ... گئے تو بڑی خرابی ہو گی۔ کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ وہ ساتھی اگر ساتھ ... نبھانے تو میں یہ چار جگہ سو کی نوکری کیوں ڈھونڈتی پھرتی... خیر ... معاف کرنا میں کیا کہنا چاہتی تھی اور کدھر نکل گئی۔"

"تم اب فکر مت کرو۔" استاد ٹیڈی نے اچانک انتہائی جذباتی لہجے میں یوں کہا کہ ہم بھی چونک پڑے۔ "تمھاری مشکلات کے دن پورے ہو گئے۔ اب تمھیں کسی بات کی پریشانی نہیں ہو گی۔ ... سب تمھارے ساتھ ہیں۔"

"ہاں! ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا ... نے چاہا تو جولی بھی ٹھیک ہو جائے گی اور دوسرے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ ... تم یہ بتاؤ کہ شہلا تک پولیس کیسے پہنچ گئی؟"

"... میں وہی بتانے والی تھی۔" جولی کی ماں بولی۔ "تم جس شرابی سے الجھ پڑے تھے..."

"وہ شرابی مجھ سے الجھا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہی مطلب تھا میرا۔" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس نے میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اور میں سمجھتی ہوں ... یوں۔ اس نے مجھے کوئی بدقماش عورت سمجھا ہو گا۔ میرا حلیہ بھی تو ... ایسا ہی رہتا ہے لیکن یہ لباس تو میں شروع سے پہنتی آئی ہوں ... کرسچین ہوں اور اسکرٹ بچپن سے پہنا میں نے۔ بال میں نے ہمیشہ کٹوائے۔ بہرام دادا نے تو کبھی نہیں ٹوکا مجھے۔ اب تو ... میک اپ نہیں کرتی، پہلے کرتی تھی۔ اس نے کبھی نہیں کہا ... کیتھی۔ کیتھرین میرا نام ہے مگر سب کیتھی کہتے ہیں۔ اس نے ... کسی بات پر مجبور نہیں کیا۔ مجھے ہی وار لے گریٹ مین۔ دنیا ... کے لیے وہ مس فٹ تھا۔ اسے کسی نے نہیں سمجھا اور اسی لیے ... سیدھے راستے سے ہٹ گیا، باغی ہو گیا۔ اس نے مجھ سے محبت ... کی اور شادی کی۔ میرے باپ کی دولت کو لات مار دی مگر مجھ ... سے نہیں کہا کہ اپنا مذہب بھی چھوڑ دو۔ میں نے اسے بتا دیا تھا ... کہ میں کٹر رومن کیتھولک ہوں۔ اس نے کہا کہ کیا فرق پڑتا ... ہے۔ ہم تو بس میاں بیوی ہیں۔ تمھارا اور ہمارا خدا تو وہی رہے گا اور ... حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ ان کو آسمان ... پر اٹھا لیا گیا۔ گھر میں ہمارا اپنا اپنا مذہب دوسرے کے لیے کوئی ... پریشانی تو پیدا نہیں کر سکتا۔ کوئی مذہب پریشانی پیدا کرنے اور ... نفرت پھیلانے یا نفاق سکھانے کے لیے آیا ہی نہیں۔ ہمارا گھر تو ... ایسا ہے اور مسائل بھی وہی ہیں جو کسی بھی گھر کے مسائل ہو سکتے ... ہیں۔ ... واقف ہو۔ اپنے فرائض کو سمجھتی ہو تو کافی ہے ... وفادار اور بااخلاق ہونا چاہیے۔ یہ ہر مذہب کی تعلیم ہے۔ ... اتوار کو چرچ چلی جانا۔ میں بدبخت جمعے کو بھی مسجد

نہیں جاتا تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم میرے ساتھ عید کر لینا اور میں تمھارے ساتھ کرسمس میں شریک رہوں گا۔ آئی ایم سوری۔ میں پھر بھول گئی کہ تم نے کیا پوچھا تھا۔ میں اس آدمی کی بات کر رہی تھی جب مجھے غلط قسم کی عورت سمجھ کے روکا تھا۔ غلط آدمی وہ خود تھا۔ اس نے سمجھا ہو گا کہ مجھے پولیس نے آوارہ گردی میں دھر لیا ہے۔ یا شاید خود یہ پولیس والا... خیر... اسے مایوسی ہوئی اور اس نے مار کھائی۔ نمبر اس نے بہرحال دیکھ لیا تھا اور جب دوسرا آدمی جو انڈر ویر پہنے دوڑتا ہوا آیا تھا اور جس کے متعلق مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اصلی پولیس سارجنٹ تھا۔ تم نے اسے مار کے اس کی وردی کیوں چھینی تھی؟"

"اس سوال کا جواب میں پھر کبھی دوں گا۔" میں نے کہا۔

"خیر وہ اصلی سارجنٹ تو وہیں رہ گیا تھا اور تم اس شرابی کی گاڑی لے کر بھاگ گئے تھے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اسی سے ساری گڑبڑ پھیلی۔ وہ ایک اسمگلر کا لڑکا تھا۔ باپ سے زیادہ بدکردار لیکن بااثر۔ اس وقت تو وہ پولیس کے ساتھ چلا گیا مگر آدھے گھنٹے میں باپ آ پہنچا۔ یہ باتیں مجھے اسپتال میں آج معلوم ہوئیں۔ وہ بیٹے کو لے گیا اور پولیس کو اس کی گاڑی چوری ہونے کی رپورٹ لکھنا پڑی۔ اخبار میں جو خبر ہے وہ فضول اور نامکمل ہے۔ اس میں نہ کسی کا نام ہے اور نہ کار کی چوری کا ذکر۔ یہ سب پولیس والوں کی چال تھی۔ انھوں نے میری کار کا نمبر لے کر معلوم کر لیا گاڑی کس کی ہے اور پھر میرے گھر پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ تم میرے ساتھی ہو۔ تم میرے ساتھ کار میں بیٹھے تھے اور میری خاطر تم نے ایک شخص کو مارا بھی تھا چنانچہ میں ان کو تمھارے بارے میں بتا سکوں گی۔ صبح گیارہ بجے وہ اسپتال آ پہنچے۔ میں جانتی تھی کہ انکار کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ میری نہیں مانیں گے کہ میں تمھیں نہیں جانتی اور تم سے چند منٹ پہلے ہی ملی تھی۔ تمھارا نام تک نہیں جانتی اور تم کو پہچانتی بھی نہیں۔ وہ یقیناً مجھے تھانے لے جا کر اقرار کرانے کے وہ سب طریقے آزماتے جن سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ معاملہ بہت سنگین تھا۔ ان کے ایک افسر کی سخت بے عزتی ہوئی تھی۔ تم نے اسے مارا اور اس کے کپڑے اتار کے اسے اندھیری جھاڑیوں میں پھینک گئے۔ پھر آئے اور اس کی نظروں کے سامنے دوسری واردات کر کے بھاگ گئے۔ اس کی ایک گولی نہیں لگی تمھیں۔ وہ اپنی ناکامی پر سخت مشتعل تھا۔ اگر وہ مجھے تفتیش کے لیے لے جاتے تو اپنی ناکامی کا سارا غصہ مجھ پر اتارتے۔ اور خواہ وہ مجھے مار مار کے ختم کر دیتے مگر مجھ سے تمھارا نام پتا معلوم کرنے میں ناکام رہتے۔ جو بات مجھے معلوم ہی نہیں تھی وہ میں ان کو کیسے بتاتی۔ میرا سچ ہی میری جان لے لیتا۔ یہ سب سوچ کے میں نے اسپتال کے ایک ... بات کی۔ وہ بہت نیک دل آدمی ہے۔ نیک دل آدمی سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا اور اپنے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مسلمان ہے اور اگر تنگ نظر ہوتا تو شروع سے میرے ساتھ بے غرض ہمدردانہ رویہ نہ رکھتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کی مدد نے مجھے بہت سہارا دیا۔ اس نے میری ساری بات سُنی اور سمجھی۔ یہ میری بیوقوفی ہے یا کمزوری کہ جب کوئی مجھ سے ہمدردی کرتا ہے تو میں ایسا دُکھڑا رونے بیٹھ جاتی ہوں۔ مسلسل صدمات اور آزمائشوں نے مجھے کمزور کر دیا ہے۔ زیادہ لوگ تو دکھوں کے زخم دینے والے ملتے ہیں۔ اسی لیے ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کوئی میرے غم کو سمجھتا ہے تو میں اپنا ہر دکھ اور ہر زخم اسے دکھانے لگتی ہوں۔ اس ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ ایک پولیس والا مجھے اپنے ساتھ تھانے لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بتا دیا کہ میرے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا اور اب مجھے کیا ڈر ہے۔ اس نے میری بات سمجھ لی اور پولیس والے کو وارڈ سے نکال دیا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ سارجنٹ خود آ پہنچا۔ وہ دو پولیس والوں کے ساتھ مجھے وارڈ میں گھس کے اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کے لے جانے کی نیت رکھتا تھا مگر وارڈ میں اس کو میرے بجائے ڈاکٹر سے بات کرنا پڑی۔ ڈاکٹر نے مجھے وارڈ میں ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک پولیس نہ چلی جائے میں باہر نہ آؤں ورنہ صورتِ حال بگڑ جائے گی۔ وہ زبردستی پر اتر آیا تو تمہیں گھسیٹ کر لے جائے گا۔ مجھ سے مارپیٹ ہو گی اور معاملہ اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاکٹر ہڑتال کر دیں گے۔ اخبارات طوفان کھڑا کر دیں گے لیکن اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں اس کمرے میں بیٹھی سنتی رہی۔ تھانیدار بہت گرم ہوا مگر ڈاکٹر نے تحمل سے بات کی اور کہا کہ جولی کی ماں کل دوپہر کے بعد آئی تھی اور پوری رات یہاں رہی کیونکہ اس کی بیٹی جولی کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ ہم نے اُسے فون کر کے بلوایا تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا اور جانتا تھا کہ ڈاکٹر مجھے بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ جب اس نے شور کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ تھانیدار صاحب یہ وارڈ ہے۔ یہاں آہستہ بات کرو ورنہ یہاں سے نکل جاؤ۔ اس نے ڈاکٹر کو بھی دھمکی دی کہ تم مجرم کو چھپا رہے ہو اور یہ بھی جرم ہے۔ ڈاکٹر نے سینئر ڈاکٹر کو طلب کر لیا اور ذرا سی دیر میں علاقہ ایس پی کا فون آ گیا۔ انسپکٹر کو واپس جانا پڑا۔ ایک ڈاکٹر اور ایک سینئر سرجن کو خود ایس پی جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا تاہم انسپکٹر اپنے یقین کی وجہ سے ٹلا نہیں۔ اس نے ساتھ آنے والوں کو وارڈ کے دونوں جانب باہر کھڑا کر دیا کہ وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھیں۔ کیتھرین باہر نکلے تو اس کا تعاقب کریں اور کوئی جولی سے ملنے آئے تو اس سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں وہ اپنی کامیابی کے بارے میں بہت پُرامید تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا تھا کہ وہ بدمعاش بھی تیرے شوہر کا یار کوئی ڈاکو تھا جو اب تیرا یار ہے۔ تو اسے چھپا رہی ہے اور یہ ڈاکٹر تجھے بچا رہا

ہے مگر میں کسی کے روکے رُکنے والا نہیں ہوں۔ ... ہی دم لوں گا۔ ابھی وہ وہیں موجود تھا کہ شہلا آ گئی اور ... یا جولی کو پہچانتی نہیں تھی اس لیے وہ لوگوں سے پوچھتی پھرتی تھی۔ اس کی اطلاع فوراً انسپکٹر کو مل گئی۔ ایک ... نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک عورت جولی کی خیریت ... آئی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ نہ اسے جولی کا نام معلوم ... نہ اس کا بیڈ نمبر اور وارڈ۔ وہ عورت برقعے میں ہے ... وضع کا ہے مگر عورت جوان خوب صورت اور فیشن ... وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت تمہاری ... اور تم نے خود آنے کے بجائے اسے بھیجا ہے تاکہ تشویش ... ہو تو پتا چل جائے۔ وہ وارڈ کے باہر مستعد کھڑا رہا اور جیسے ہی شہلا نکلی اس نے آگے بڑھ کے راستہ روک لیا۔ شہلا ایک ... اندر بیٹھی رہی تھی اور میں نے بھی اس سے بات کی تھی ... نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔ تم سب کے متعلق...“

”ہمارے متعلق کیا بتایا اس نے؟“ محسن بولا۔

”کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔“ کیتھرین بولی۔ ”اس نے ... کہ رات کو انسپکٹر کی وردی میں میرا بھائی تھا اور اس نے جو کیا تھا مجبوری میں کیا تھا۔ مجبوری کی نوعیت اس نے نہیں بتائی ... نے یہ بھی کہا کہ میرے تین بھائی ہیں اور میں شادی شدہ ہوں ... نے یہ بھی بتایا کہ دو بھائیوں کی بہت جلد شادی ہو جائے ... ان کی نسبت طے پا چکی ہے لیکن میں نے نام پوچھے تو کہنے لگی کسی کا بھی نام بتانے سے انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ ماں باپ کون ہیں اور شوہر کیا کرتا ہے ... لگی کہ آنٹی! بس آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ اور کچھ نہ پوچھیں، کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ ہم خود آپ سے رابطہ رکھیں گے۔ اس لیے آپ کا پتا درکار ہے۔ میں نے اسے پتا بتا دیا مگر اس کی باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ اس کا رویہ بے حد پُراسرار تھا ... کوئی انسان نیک کام کرنا چاہے تو اسے اتنی رازداری برتنا ... نہیں ہوتی۔ بے شک کچھ لوگ گمنام رہ کے نیکی کرتے ہیں ... اپنی تشہیر سے گریز کرتے ہیں لیکن کسی نہ کسی کو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ وہ مجھے تو سب کچھ بتا سکتی تھی اور کہہ سکتی تھی ... ہم لوگ پبلسٹی نہیں چاہتے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ خوفزدہ ... اپنی شناخت نہ کرانے کا مقصد وہ نہیں ہے جو میں سمجھ رہی ... وہ اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ کل تمہارا ... بھی عجیب تھا اور تمہارے بارے میں معلوم ہونے والی باتیں ... مزید شک میں ڈال رہی تھیں۔ تاہم میں نے شہلا سے ... کی۔ خدا نے اسے رحمت کا فرشتہ بنا کے بھیجا تھا کہ ... کی جان بچ جائے۔ اب وہ کچھ بھی ہوں۔ اس کے بھائی ... ڈاکو ہوں تو مجھے کیا۔ اتنی بڑی نیکی کے بعد تو ان سب ...

... ضرور قبول کرے گا۔ دنیا کا قاعدہ مختلف ہے۔ ... ایک بہت بڑی نیکی سے بھی ایک بہت چھوٹے جرم ... معافی نہیں ملتی جب تک کہ قانون اسے بری نہ کرے۔ میں ... مزدوری جیسے مظاہرے سے گریز کیا نہیں رحمت کا ... روند کر نہ چلا جائے اور پھر میں تمام عمر جولی کی قبر پر ... رہوں کہ میں نے نیکی کے جذبے کا خون اپنے شک سے ... جولی مر گئی۔ بہرام دادا کی بیوی نے اچھائی برائی سب دیکھی ... اس کو معلوم تھا کہ سب اچھے نظر آنے والے اچھے نہیں ... اور جن کو بُرا سمجھا جاتا ہے وہ بعض اوقات اچھوں سے ... ہوتے ہیں۔ عذاب اور ثواب، نیکی اور بدی اس دنیا کا ... نہیں، خدا کا حساب ہے جسے صرف وہی جانتا ہے۔ میں ... مطمئن اور اتنی خوش تھی کہ جب شہلا چلی گئی تو میں رو پڑی ... میں نے جولی سے کہا کہ ہم بہت خوش نصیب ہیں بیٹی کہ ... اپنی دعا خدا نے قبول کر لی اور ہماری مایوسی کو امیدیں بدل ... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے شہلا کے گرفتار ہونے کا ... پتا چلا۔ وہ اچانک پولیس کے ہاتھ پڑنے سے گھبرا گئی تھی اور ... اپنے جو جواب دیے اس سے انسپکٹر کا شک بھی یقین میں ... بدل گیا۔ وہ شہلا کو اپنے تھانے لے گیا۔ میں بہت پریشان ہوئی کہ ... اس کے بھائیوں کو کیسے اطلاع دوں اور اسے کیسے بچاؤں ... اس کے بغیر میری امید کا چراغ بھی روشن نہیں رہ سکتا تھا... میں ... ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے کہا کہ کیتھرین! میں نے ہمیشہ ... تمہاری مدد کی ہے کیونکہ تم مصیبت زدہ ہو لیکن وہ عورت ... تم خود جانتی تک نہیں ہو اور جو پولیس کے خیال میں کسی ... ایک مجرموں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے، اُسے میں کس طرح ... بچا سکتا ہوں اور میں بچانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ ... اس نے کہا کہ وہ مجرموں کے کسی گروہ کی عورت نہیں تو وہ بولا کہ ... بے گناہ ہو گی تو خود ہی چھوٹ جائے گی۔ مایوس ہو کے میں نے اپنے ... شوہر کے کچھ پرانے دوستوں سے رابطہ قائم کیا جو وکیل تھے اور جب ... تک بہرام دادا زندہ رہا وہ اس کے مقدمات کی پیروی کے لیے ... بھاری فیس وصول کرتے رہے تھے۔ ان سب پر میں اعتماد ... کر سکتی تھی کیونکہ میں ان کی فطرت سے واقف تھی۔ بعد ... میں مجھے ان کی خدمات کی ضرورت پڑی تھی نہ ان کو مجھ سے ... کسی کی۔ کاروباری تعلق تھا نا۔ پھر بھی میں نے کوشش ... کی۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی حد تک کامیاب رہی۔ ایک ... تجربہ کار بہت سینئر وکیل نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے ... جانے کو تیار ہے۔ وہ مجھے اسپتال سے اپنے ساتھ لے گیا اور اس ... وقت تک تھانے والے بھی شرافت سے بات کرتے رہے ...

”تم کتنی دیر بعد تھانے پہنچی تھیں؟“ میں نے کہا۔

”تقریباً ایک گھنٹے بعد۔ وہ لوگ شہلا کو ڈرا دھمکا رہے تھے کہ وہ اس شخص کا نام بتائے جس نے اُسے بھیجا تھا اور جو گزشتہ رات ٹریفک سارجنٹ کی وردی اتار کے خود پہنے پھر رہا تھا۔“ کیتھرین نے کہا۔ ”لیکن شہلا کی رٹ وہی تھی کہ نہ اسے کسی نے بھیجا ہے اور نہ وہ کسی ایسے شخص کو جانتی ہے۔ اس کے پاس دو باتوں کا جواب البتہ نہیں تھا۔ ایک یہ کہ جس لڑکی کو وہ نہ جانتی تھی، نہ پہچانتی تھی اس سے ملنے کیوں گئی تھی؟ دوسری یہ کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ شہلا کی یہ بات ماننے پر تیار نہ تھے کہ نہ اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے اور نہ گھر، چنانچہ وہ اسے سخت دہشت زدہ کر رہے تھے کہ انھیں سب اگلوانا آتا ہے اور ان کے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ وہ صرف پانچ منٹ میں سب بک دے گی۔“

”کیا انھوں نے شہلا کو مارا تھا؟“ محسن خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایک آدھ تھپڑ تو مارا ہی تھا۔ نشان اس کے گالوں پر نظر آ رہے تھے اور وہ رو بھی رہی تھی۔“ کیتھرین بولی۔ ”لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایس ایچ او کے کمرے میں تھی جہاں وہ ٹریفک سارجنٹ بھی موجود تھا۔ اور بہت گندی گالیاں بک رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اسے بتلاؤں گا کہ اس کے خصم نے تو صرف میری وردی اتاری تھی، میں عزت کیسے اتارتا ہوں اور کھال کیسے اتارتا ہوں۔ اگر ہم نہ پہنچتے تو وہ سب کچھ کرتے۔ ان کی اس قسم کی تفتیش آدھی رات کے بعد شروع ہوتی ہے۔ شہلا کے ساتھ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا اس کا کوئی والی وارث بھی تھانے نہیں پہنچا تھا اور وہ ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بن سکتی تھی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ پہلی بار تھانے جا کے تو مرد بھی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور وہاں ایک سے ایک سفاک دل والا قانون کا نام لے کر سب کچھ کرنے کا مجاز ہے۔ اس وقت بھی شہلا کے سامنے ایک کونے میں انھوں نے کسی چور کے کپڑے اتار کے اسے لٹا رکھا تھا۔ اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر دو کانسٹیبل قسم کے قصائی اس کو دبائے بیٹھے تھے اور تیسرا چمڑے کی پٹی سے اس کو بُری طرح مار رہا تھا مگر وہ نہ چیخ سکتا تھا اور نہ ان کے چنگل سے رہائی پا سکتا تھا۔ وہ ہر وار پر وہیں کرب سے بل کھاتا تھا...“

”شٹ اپ...“ محسن چلایا۔ ”مت سناؤ یہ سب مجھے اور یہ بتاؤ کہ تم نے وہاں جا کے کیا کیا؟“

”تم اس کے شوہر ہو نا۔“ کیتھرین بولی۔ ”آئی ایم سوری۔ لیکن بات یہ ہے کہ میں پہلے، جب میرا شوہر زندہ تھا، تھانے جاتی ہی رہتی تھی۔ مار بھی بہت کھائی تھی میں نے اس لیے اب میں ڈرتی نہیں۔ پھر وہ وکیل تھا میرے ساتھ۔ اس کو دیکھتے ہی سب سیدھے ہو گئے۔ اس چور کو اندر لے گئے اور تھانیدار نے مجھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دیکھ کر بڑا سا منہ تو بنایا مگر کچھ بولا نہیں۔ وکیل نے کہا کہ اس لڑکی کو اسپتال سے کس جرم میں گرفتار کر کے لائے ہو۔ تھانیدار نے کہا کہ اس کا ایک خطرناک گروہ سے تعلق ثابت ہوتا ہے اور ہم ابھی کچھ بتانے کے پابند نہیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیں گے اور اس کا ریمانڈ لے لیں گے۔ وکیل نے سمجھداری سے کام لیا اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے چند منٹ شہلا سے اکیلے میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو ممکن ہے اس سے فائدہ ہو۔ اس وقت تک شہلا نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ تھانیدار ہنسنے لگا اور بولا کہ اچھا تو شہلا ہے اس کا نام۔ آپ اس کے شوہر کا نام بھی بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیں کہ اس کے بھائی کون ہیں اور گھر کہاں ہے۔ وکیل نے کہا کہ سب بتا دیا جائے گا لیکن پہلے اسے شہلا سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ تھانیدار اس چکر میں آ گیا کہ شاید اب وہ اصل مجرم تک یعنی تم تک پہنچ سکے گا۔ میں نے موقع پاتے ہی شہلا سے تم لوگوں کا پتا پوچھا۔ وہ بہت پریشان تھی کہ کیا کرے۔ بہرحال میں نے اس کو تسلی دی اور اس وکیل نے بھی کہا کہ تم میری بیٹی کی طرح ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہو۔ اس شہر میں تم کسی کو تو جانتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے مل لوں۔ اس نے پہلے ایک ایس پی کا نام لیا...“

”ایس ایس پی... ضامن رضوی؟“ محسن نے چونک کر کہا۔

”ہاں، وکیل ان کو فون کرتے گیا مگر وہ نہ آفس میں ملے نہ گھر پر — تاہم اس نے پیغام دے دیا۔“ کیتھرین بولی۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ محسن بولا۔ ”کیسی بے وقوف لڑکی ہے۔“

”اس نے ٹھیک کیا۔“ غالب بولا۔ ”وہ اسی طرح محفوظ رہے گی۔“

”لیکن ہم تو محفوظ نہیں رہیں گے۔“ محسن بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے شہلا ان کو ہمارا پتا بتا دے گی۔“ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گی۔“ میں نے کہا۔ ”فائدہ صرف یہ ہو گا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر پائے گا۔“

”ایس ایس پی صاحب اس کی رہائی کے احکامات بھی صادر نہیں فرما دیں گے۔“ محسن نے تلخی سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے وہ شہلا کو زیرِ حراست رکھنے کے احکامات دیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر حراست میں رہ کے بھی شہلا محفوظ ہو گی۔“

”یہ تمہارا خیال ہے جسمانی تشدد وہ چاہے نہ کریں تفتیش کے نفسیاتی دباؤ والے طریقوں کا استعمال ضرور کریں گے۔“ محسن بولا۔

”تم لوگ میری بات تو سن لو... کی عدم موجودگی میں مجھے پھر موقع ملا۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو! تم میرے ... امید بن کے آئی تھیں، کیا اب میں ناامید ہو جاؤں؟

یہاں سے واپس چلی جاؤں اور جولی کو یہ بتا دوں کہ جو ... سکتے تھے وہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ کتنی مایوس ہو گی... بولی کہ میں صرف آپ کو بتا سکتی ہوں۔ اس وکیل پر ... کر سکتی۔ یہ لوگ قانون پرستی کے چکر میں پڑ گئے تو ہم کہیں ... رہیں گے۔ میں نے کہا کہ خداوند یسوع مسیح کی قسم... کیتھرین ... کوئی کاٹ سکتا ہے مگر اس زبان سے وہ بات نہیں ... کو میں راز رکھنا چاہوں۔ پھر شہلا نے مجھے یہ پتا سمجھایا اور ... وقت ضائع کیے بغیر یہاں آ گئی۔“

”وہ وکیل کہاں گیا؟“ میں نے کہا۔

”وہ اپنے آفس چلا گیا۔“ کیتھرین بولی۔ ”میں نے اس سے ... کہ کل اگر ضمانت داخل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو میں اسے ... کر دوں گی کہ وہ عدالت میں آ جائے۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ اگر ... ٹھیک کہتی ہے اور ایس ایس پی ضامن رضوی واقعی اس ... انکل ہیں تو پولیس کا باپ بھی اس کو باعزت طور پر چھوڑ ...“

”تم نے اسے اور کچھ تو نہیں بتایا؟“

”میں بہرام دادا کی بیوی ہوں۔“ وہ بڑے فخر اور غرور سے ... ”میں اس کے قابل نہ ہوتی تو وہ مجھ سے شادی نہ کرتا اور اس ... میں اپنے قابل نہ سمجھتی تو اس پر تھوک دیتی۔ لیکن میں نے ... باپ کی دولت پر تھوک دیا۔ وہ مر گیا... مٹی ہو گیا مگر میں ... کی وفادار ہوں۔ میں شادی کر سکتی تھی۔ مجھ سے شادی کے خواہش ... بھی بہت تھے آئی واز ویری بیوٹی فل۔“

”آج بھی آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔“ محسن بولا۔

”شٹ اپ بوائے... تم آج مذاق کر سکتے ہو مجھ سے ...“

”اوہ نو! میں مذاق نہیں کر رہا تھا آنٹی۔“ محسن خفگی سے بولا۔

”اس وقت جو لوگ میرے آگے پیچھے پھرتے تھے ... سب کو میں نے دھتکار دیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”پھر وہ میرے ... بن گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں زندگی کی آخری سانس تک بہرام دادا کی رہوں گی۔ وہ نہ سہی اس کی چھوڑی ہوئی نشانیاں ... اس کی یادیں تو ہیں۔ وہ سب گدھ تھے۔ لالچی اور ... کو یقین تھا کہ بہرام دادا کے پاس کروڑوں ہوں گے۔ نقد ... سونا چاندی، ہیرے جواہرات۔ اس نے عمر بھر میں جتنا کمایا ... وہ سب ہو گا۔ شاید اس سے زیادہ ہی ہو گا۔ وہ سب ... تھا۔ کچھ لوگ سردار بننے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ان ... ہونے لوئی دوسرا سردار بن ہی نہیں سکتا۔ وہ میر کا حصہ ... خرین محاورے کے مطابق۔ اور کیوں نہ رکھتا۔ وہ تھا بھی ... میں اس کو فرشتہ ثابت نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ وہ میرا شوہر ... تفصیل ہے وہ ڈاکو تھا مگر وہ خود کو ڈاکو مانتا تھا۔ ... ڈالتا تھا۔ دن دہاڑے لوٹتا تھا اور ان کو جو درحقیقت ...

... ڈاکو تھے مگر سفید پوش تھے۔ اسمگلر کسٹم کے بدعنوان افسر اور رشوت ... والے۔ ذخیرہ اندوز اور ٹھیکیدار جو ریت کی دیواریں کھڑی ... تھے اور سیمنٹ کے ٹینڈر دُگنے دام پر بھرتے تھے۔ ... عزت دار اور اعلیٰ عہدوں والے... جو کہیں صدارت ... تھے کہیں مہمانِ خصوصی ہوتے تھے۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا ... ان کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی جس میں سے وہ عطیات ... دیتے ہیں۔ ان کی چمکتی دمکتی کاروں کا ماڈل ہر سال کیسے بدلتا ہے۔ ... کی کتنی کوٹھیاں ہیں۔ کتنے ناموں سے کتنے اکاؤنٹ ہیں اور ... ان میں کتنا پیسہ ہے۔ اور کیا ان کی ساری عمر کی تنخواہ کا ٹوٹل ان ... کی ایک کوٹھی کی قیمت خرید کے برابر بھی ہوتا ہے؟ وہ سب ... بھی ڈاکو تھے۔ بزدل۔ قانون کے ڈر سے تھر تھر کانپنے والے۔ ... اینٹی کرپشن کے چھاپوں سے خوفزدہ رہنے والے۔ سات پردوں ... میں چھپ کر سرکار کے خزانے پر یا پبلک کی جیب پر ڈاکا ... ڈالنے والے۔ بہرام دادا ان سے زیادہ بڑا آدمی تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ اس میں منافقت نہیں تھی۔ اس نے لوٹ ... میں بہت مال کمایا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے سب ... میں برابر بانٹا۔ اور جو اپنا حصہ بنا اس میں سے بہت کم بچایا۔ وہ ... مال بچا بھی کہاں ہے۔ وہ رابن ہڈ مشہور نہیں ہوا مگر وہ تھا رابن ... ہڈ ہی۔ تم کیا جانو۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی مدد سے کتنی غریب لڑکیوں کو جہیز ملا۔ کتنی بیواؤں کو سر چھپانے کے لیے ایک ... چھت کا سایہ ملا۔ کتنے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے ہوئے۔ ... کمال تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اسے نہیں جانتے جن کے لیے اس ... نے سب کچھ کیا۔ وہ کہتا تھا کیتھی! ہمارے مذہب کی یہی تعلیم ... ہے کہ دو تو یوں دو کہ ایک ہاتھ دے مگر دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ... ہو۔ وہ بہت زیادہ نہیں جیا۔ صرف چوالیس سال اس کی عمر تھی جب وہ مر گیا تھا مگر کچھ لوگ سو سال جی کے بھی کچھ نہیں کرتے۔ ... پیدا ہوتے ہیں بڑے ہو کر اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کو پیدا ... کرتے ہیں اور خود ختم ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کوئی داستان ... نہیں چھوڑتے۔ کوئی ایسا کام نہیں کرتے کہ انہیں زمانہ یاد کرے۔ ... ٹیپو سلطان کی بات کہتا تھا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے ... شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اور اس نے یہ ثابت کر دکھایا۔ ... اس کے دشمن اسے نہ مار سکے۔ ایک دوست نے اس سے ... وفا نہ کی اور اس نے دے دی۔ خیر میں تم کو اس کی سوانح حیات ... سنا کے تمہارا وقت برباد نہیں کروں گی۔“

”ہم اس بہادر انسان کے بارے میں تم سے سب باتیں ... سنیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ ہم نے وقت کا بہترین استعمال کیا۔“ ... کہا۔ ”بڑے انسانوں کی زندگی کے تجربات چھوٹے انسانوں ... کے راستوں کو روشنی دیتے ہیں۔ تم اس روشنی کو ہمارے لیے بھی ... بچا کے رکھو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہو گی لیکن اس وقت شہلا

کو بھی ہماری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی جولی کو۔“

”یو آر رائٹ بوائے۔ تم اب کیا کرو گے؟“ وہ بولی۔

”ہم اب کیا کریں گے؟“ محسن نے زیرِ لب کہا۔ یہ کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا، جو الفاظ میں ڈھل گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ لبوں تک آ گئی تھی۔

”ہم پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے۔“ میں نے کہا۔ یہ بھی جواب نہیں تھا محض اظہارِ حقیقت تھا۔ ”اب تک انکل ضامن رضوی وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔“

”انکل... وہ تمہارے بھی انکل ہیں؟“ کیتھرین نے حیران ہو کے کہا۔ ”پھر کس کا ڈر ہے ینگ مین؟“ اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوار کے پیچھے کیا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کے سیٹ کیے ہوئے بال ہلکے براؤن رنگ کے تھے اور اس کے شانوں تک پہنچتے تھے۔ وہ کسی حد تک دُبلی پتلی اور اسمارٹ عورت تھی۔ اچھا میک اپ مین اسے بیس سال کی حسین و جمیل لڑکی بنا سکتا تھا۔ جسم سے زیادہ اس کا حوصلہ جوان تھا۔ تھکن یا اداسی کا اظہار ہوتا تھا تو صرف اس کی آنکھوں سے۔ ان کا رنگ بھی براؤن تھا مگر وہ کچھ خلا میں دیکھتی ہوئی اور کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔

”وہ ہم سب کے انکل ہیں لیکن... میں اُن کو بُرا نہیں کہہ سکتا۔ وہ مثالی قسم کے انسان ہیں۔ اصول پرست اور فرض شناس۔ وہ ادائے فرض پر جذبات کے سارے رشتے قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور ہم سب اسی لیے ان کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔“

”کیوں! واٹ ہیو یو ڈن؟“ وہ بولی۔ ”کیوں ڈرتے ہو تم لوگ؟“

”یہ بھی بہت لمبی کہانی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب فرصت ہو گی تو ہم پہلے تم سے بہرام دادا کی زندگی کی کہانی سنیں گے اور پھر تمہیں اپنی کہانی سنائیں گے۔ ابھی صرف اتنا سمجھ لو کہ ان کی نظر میں اور قانون کی نظر میں ہم مجرم ہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے کہ مجرم کون ہے۔ حالات کی شہادت اور اتفاقات و حادثات نے ہمیں مجرم بنا دیا ہے۔ شہلا کو مجرموں کے ایک گروہ کا ساتھی سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ خود مجرم نہیں ہے۔ تم یہ بات بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو۔ مجرم بہرام دادا تھا مگر سزا تم کو اور جولی کو آج تک مل رہی ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا نا... پھر ایسا کیوں ہے؟ مگر ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور آج کل بھی ہو رہا ہے۔“

”تو شہلا کے بھائی نہیں ہو تم؟“

”بھائی ہونے کا مطلب اگر یہ ہو کہ ہم سب نے ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لیا یا ہمارا باپ ایک ہی تھا تو جواب ہو گا نہیں۔ مطلب اگر رشتے کی جذباتی گہرائی ہے اور اس کا تقدس

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے تو شہلا ہم تینوں کی بہن ہے۔" میں نے غالب اور ٹیڈی کے کندھوں پر دونوں ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اور ہم سب بھی آپس میں بھائی ہیں۔ صرف سکھ کے ساتھی نہیں۔ دُکھ بھی برابر بانٹ رہے ہیں، اسی لیے سب مجرم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک خاندان ہے۔ الزام بھی ہم سب لیتے ہیں۔ انعام بھی ہم سب پاتے ہیں۔ گھر ہوگا تو سب کا گھر ہوگا۔ ورنہ ہم سب بے گھر ہیں۔"

"میں یقین نہیں کرسکتی کہ رشتے اتنے پائیدار اور حقیقی بھی ہوسکتے ہیں۔" وہ رشک سے ہم سب کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں شہلا کی نہیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ انکل کی فوج ہمیں محصور کرلے اور راستے بند ہو جائیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ شہلا اتنی کمزور ثابت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"وہ اتنی کمزور نہیں تھی۔" محسن بولا۔ "جب تک وہ صرف میری بیوی تھی۔ اب وہ ایک ماں بن رہی ہے۔ اس کی سوچ بدل سکتی ہے۔"

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اگر انکل رضوی نہ پہنچے اور پولیس نے اس پر تشدد کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو نہیں، اپنے بچے کو بچائے گی۔ ماتا کا جذبہ تو عورت کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتا ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ شہلا اپنی ممتا پر ہم سب کو، ہمارے مستقبل کو اور ہمارے مشن کو قربان نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "وہ مرجائے گی۔"

"مگر اسے مرنا نہیں چاہیے۔" رابعہ چلائی۔ "ہم اتنا بڑا گناہ نہیں کرسکتے سکندر! اس سے تو بہتر ہے کہ ہم خود کو پولیس کے حوالے کردیں۔"

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟" محسن بولا۔ "وہ نہیں مرے گی۔ اور یہ سب ہم پہلے ہی طے کرچکے ہیں کہ ایک فرد ایک مشن نہیں ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی... میں تم... سکندر یا شہلا... کسی کی خاطر بھی خودکشی نہیں کی جاسکتی۔"

"تم سب کیا کہہ رہے ہو! واٹ مشن؟" کیتھرین نے کہا۔

"کیا تم کو ہر بات بتانی ضروری ہے؟" محسن سخت لہجے میں بولا۔ "تم یہاں موجود ہو... یہ کافی ہے۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم سے چوبیس گھنٹے پہلے صورت آشنائی تک نہیں تھی۔ تمہارے کریڈٹ پر بہرام دادا کا قرض ہے ورنہ..."

"اس نے کبھی کسی پر قرض نہیں چھوڑا تھا۔" کیتھرین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور چھوڑا تھا تو میں معاف کرتی ہوں۔ لو آزادی۔"

"ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق اس سے نہیں ہم کررہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "ہمیں اپنا فیصلہ خود کرنے دو۔"

"تم سب کیا خاک فیصلہ کروگے۔" غالب بولا۔ "میں کہتا ہوں پولیس اسٹیشن یا اخبار کے کسی بااثر آدمی کے کچھ نہیں ہونے دیں گے اور شہلا آجائے گی۔"

"اس کے پیچھے پولیس بھی آجائے گی۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ ہم ایسا بندوبست کریں گے کہ ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہو لیکن پولیس کو کچھ نہ ملے، ہم ان کو ڈاج کرسکتی ہے ورنہ ہم خود شہلا کو پولیس سے چھین لیں۔" غالب بولا۔ "آپ اب گھر جائیں۔ اپنے ساتھ استاد ٹیڈی کو بھی لے جائیں۔ یہ اصل نام نہیں ہے اس کا... ماں باپ نے نیک رکھا تھا۔ دنیا نے استاد ٹیڈی ہی کردیا۔ آپ اس پر اتنا ہی اعتماد کرسکتی ہیں جتنا بہرام دادا پر کرسکتی تھیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو... یو ایڈیٹ..."

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں خاتون..." غالب بولا۔ "آپ اپنا بیٹا سمجھ لیں۔ بیٹے بعض اوقات توقعات پر پورے نہ اترتے۔ اسی لیے میں نے بہرام دادا کی مثال دی تھی۔ صرف اعتماد کی بات ہوگی تو آپ دیکھیں گی کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ہم میں سے کوئی آپ کے اشارے پر جان نہیں دے گا... یہ دے گا۔"

"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم لوگ... میں کیوں کسی کی جان لوں گی۔" کیتھرین بولی۔ "بہرحال میں اس کو ساتھ لے جاتی ہوں۔"

"یہ آپ کا گھر دیکھ لے گا۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو ہم میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہوگا... بشرطیکہ آپ خود کو تنہا یا غیر محفوظ سمجھتی ہوں..."

"غیر محفوظ۔" کیتھرین تلخی سے ہنسی۔ "میرا خدا میرا محافظ ہے جس دن وہ ہاتھ کھینچ لے گا اس دن میں خود بھی اپنی حفاظت نہیں کرسکوں گی۔ میرے شوہر نے مجھے زندہ رہنا سکھا دیا تھا۔ یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ہمارے لیے زندگی فنا و بقا کی ایک مسلسل جنگ ہے۔ جنگ میں سب جیتنا چاہتے ہیں۔ ہارنے والا میدان سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی دوسروں سے جینے کا حق چھین کر بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔ میں نے اس ریوالور سے چھ آدمی مارے ہیں اب تک..." اس نے پلک جھپکتے میں بلاؤز سے ایک زنانہ آٹومیٹک ریوالور نکال لیا۔ یہ وہ ریوالور نہیں تھا جو میں نے کار میں دیکھا تھا۔

اس کے ریوالور نے کسی کو خوفزدہ نہیں کیا تھا۔ وہ جب ملے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ریوالور واپس رکھ لیا۔ "میں اس وقت تک کسی کو نہیں مارتی جب تک خود میری زندگی یا میری عزت خطرے میں نہ پڑے۔ اپنے شوہر کو خود کو اور ایک بار جولی کو بچانے کے لیے میں نے گھر کو... یہاں بھی دشمنوں کو گولی ماردی جو بہت آگے آگئے تھے اور جنہیں واپسی کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ آج بھی یہ نہیں بتا سکتی ہوں... اور ایک بات بتاؤں... میں نے ایک بھی دو گولیاں ضائع نہیں کی ہیں۔ صرف ایک گولی سے ان کی پیشانی میں یہاں سوراخ کیا تھا۔" اس نے اپنی پیشانی کے وسط میں پستول کی نال سے چھو کر کہا۔ "اس سر کے سوراخ سے ان کے شیطانی ارادے ان کی ناپاک روح کے ساتھ نکل گئے۔ تم ان کی لاشیں نکال کے دیکھنا چاہو تو میں بتاسکتی ہوں کہ وہ کہاں ہیں گی۔ ان کے ڈھانچے دیکھنا۔ سب کے سروں میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی سوراخ ملے گا۔"

"ہم بہت امپریس ہوئے۔" غالب بولا۔ "اب آپ جائیں اور کل تک اس ڈاکٹر کے ساتھ مل کر کوئی ایسا بندوبست کریں کہ ہم سب کے سارے ٹیسٹ ہو جائیں۔ باری باری... اور جب ایک کے بارے میں قطعی رپورٹ مل جائے کہ وہ جولی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تو دوسرے کو لے جائیں۔ یا وہ ڈاکٹر انتظام کرسکے تو ایک ہی دن میں سب کے ٹیسٹ مختلف ہسپتالوں میں کرلیے جائیں۔ شرط صرف ایک ہے۔ مکمل رازداری اور سب کی بحفاظت واپسی... خدانخواستہ سب ناکام رہے تو پھر دوسرا بندوبست ہم کریں گے۔ اس ہفتے کے آخر تک جولی کا گردہ بدل دیا جائے گا اور ایک کامیاب آپریشن کے بعد وہ صحت مند زندگی کی طرف لوٹے گی۔"

"کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے تو ایک جملے میں بات ختم کردی۔ اس ایک مسئلے کے ساتھ دس دوسرے مسئلے ہیں۔"

"ہم سب کی طرف سے یقین رکھیے کہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔" میں نے کہا۔ "زمین پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے وہ ہمارے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ ایک بار نہیں دو بار بھی گردوں کی ضرورت پڑے گی تو ہم حاصل کرلیں گے۔ یہاں کے ڈاکٹر علاج نہ کرسکے تو ہم جولی کو امریکا تک بھیج دیں گے۔"

"تم کیا سمجھ رہے ہو... میں... کیا ہے میرے پاس..."

"ہمارے پاس کیا ہے؟ صرف اپنا یقین۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اب کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بالکل کچھ نہیں... صرف دعا کرنا ہے کیونکہ ماں آپ ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو سب سے زیادہ اعجاز مسیحائی رکھتی ہے لیکن کرۂ ارض پر صرف ایک جگہ ملتی ہے... آپ کے دل میں..."

"گاڈ بلیس یو... گاڈ بلیس آل آف یو۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے سینے پر ایک انگلی سے صلیب بنائی۔ "میں سب کچھ خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں... خدا پر اور تم پر چھوڑتی ہوں..." وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ٹیڈی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد اس کی گاڑی کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔

"میں باہر کسی پبلک کال آفس سے بات کروں گا۔" غالب بولا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

پبلک کال آفس کی تلاش میں ہمیں ایک میل اور جانا پڑا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں ٹیلی فون کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ مالک اتنے قریب بیٹھا تھا کہ ہماری گفتگو سن سکتا تھا۔ غالب نے نہ جانے کس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو... یار میں غالب ہوں... ہاں... ارے نہیں بھائی! مرتے ہیں غیرت مند لوگ... ہم بہت ڈھیٹ چیز ہیں... یار اسی دنیا سے بول رہا ہوں... دیکھو ایک کام ہے... ٹاپ سیکرٹ... تمہارے اور میرے درمیان رہے گی بات۔ ایک نمبر لکھو... ہاں... ایس ایچ او سے بات کرو... ایک لڑکی ہے شہلا... بکواس نہیں کرو، ورنہ فون پر مکا ماروں گا... وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ بہن کی طرح ہے میرے لیے... اسے پولیس نے میو ہسپتال سے اٹھالیا ہے۔ ہاں آج... وجہ کوئی نہیں۔ بس اٹھا لیا... ذرا ان کو ایک ڈوز دے دو... کہہ دو کہ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے... اور اگر اس نے ایف آئی آر کاٹ دی ہو تو معلوم نا دفعہ کیا لگائی ہے... وہ سالے کچھ بھی لگا سکتے ہیں... یار میں نہیں جاسکتا اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں... نہیں میں فون بھی نہیں کرسکتا۔ میں دس منٹ بعد پھر تم سے ہی پوچھوں گا۔ ... اور دیکھو... مرزا غالب نے کوئی فون نہیں کیا تمہیں... یہ بات اچھی طرح بٹھالو اپنی کھوپڑی میں، ورنہ میں آج رات ہی تمہاری کھوپڑی اتار کے لے آؤں گا..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا اور فون بند کردیا۔

ہم نے وہیں بیٹھ کے ایک کپ چائے کا پیا اور اس دوران میں کیتھرین اور اس کے شوہر کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ شوہر کے بارے میں بات کرتی تھی تو بے حد جذباتی ہوجاتی تھی وہ کسی شریف آدمی کی بیوی نہیں تھی لیکن اس کی محبت سو فیصد وہی تھی جو مشرق کی کوئی بھی شوہر پرست بیوی کرتی ہے۔ شاید اس سے زیادہ ہی تھی۔ اس میں آج بھی کمی نہیں تھی جبکہ بہرام دادا صرف ایک نام رہ گیا تھا۔ اس کی شدت اور وارفتگی کا انداز وہی تھا۔ مصائب نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا لیکن وہ بڑی حوصلہ مندی سے مقابلہ کررہی تھی۔ اس کے کردار کی مضبوطی اور اس کی بے خوفی قابلِ تعریف تھی۔ بے شک حالات کے دباؤ نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت بولتی تھی۔ بولتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتی تھی اور گھوم پھر کر اپنے شوہر کے ذکر پر آجاتی تھی لیکن وہ اکیلی عورت جینے کا اپنا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

انداز رکھتی تھی۔

دس منٹ سے پہلے ہی غالب نے دوبارہ اپنے دوست کو فون کیا: "ہاں... کیا ہوا... خود ایس ایس پی صاحب موجود ہیں وہاں... نہیں یار... تو کیوں ڈرتا ہے۔ ابے صحافی ہے تو، گھسیارا نہیں... اگر تم نے فون کر کے کسی ڈاکو کے یا قاتل کے بارے میں بھی پوچھا ہوتا تو یہ کوئی جرم نہ ہوتا... ہاں... ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں... اچھا... ہاں... ٹھیک ہے دوست... ہم بات کر لیتے ہیں... تھینک یو نہیں کہوں گا میں... سالے تم ہمارے کام نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا۔ تمھاری برادری سے خارج تو نہیں ہو گئے ہم... سمجھ لو ایک انڈر گراؤنڈ صحافتی مشن پر ہوں میں۔ جب باہر آؤں گا تو ایسی اسٹوری کے ساتھ جو ایٹمی دھماکا کرے گی۔ نیچے سے اوپر تک سب کو ہلا دے گی... دیکھ لینا بھائی... تم بھی یہاں ہو اور ہم بھی ہیں... سب سامنے آجائے گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا ایس ایس پی صاحب براہِ راست مذاکرات پر بضد ہیں؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اس صورتِ حال سے...؟"

"معلوم نہیں وہ کیا چاہتے ہیں۔" غالب بولا۔ "بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ صرف پولیس افسر ہی نہیں، شریف النفس آدمی بھی ہیں۔ اس بچارے کے پیچھے پڑ گئے تھے؟ مجھے معلوم ہے تم کس کے کہنے پر فون کر رہے ہو۔ تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو اور اس کا نام مجھے کبھی نہیں بتاؤ گے لیکن تم اُسے ایک پیغام دے سکتے ہو تو ضرور دو کہ مجھ سے بات کریں۔" ہم یہ گفتگو کاؤنٹر سے ذرا ہٹ کر کر رہے تھے۔

"اس میں کوئی چال تو نہیں ہو سکتی؟" میں نے کہا۔

"چال کیا ہو گی۔" غالب بولا۔ "تمھارا خیال ہے کہ وہ کال کو ٹریس کر لیں گے تو برادرِ عزیزم... یہ ولایت نہیں ہے۔ ابھی تو ان کو یہ بھی علم نہیں کہ میں نے کہاں سے فون کیا تھا، ورنہ وہ ایکسچینج سے کہہ دیتے... یہاں ایک نہیں دس ایکسچینج ہیں... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دوبارہ کال کریں تو وہ کسی انجینئر سے کہیں اور وہ اپنے طور پر کسی طرح اس فون نمبر کا پتا چلا لے جہاں سے ہم بات کر رہے تھے۔ پر بڑا لمبا عمل ہے۔ انکل رضوی کو تھانے میں ایک فون پر ہم سے گفتگو جاری رکھنی ہو گی اور اس وقفے میں دوسرے فون سے کال ٹریس کرنے کی کارروائی کی جائے۔ دوسرا فون تھانے میں تو ہو گا نہیں۔ یہاں ابھی تک ایک تھانے کو ایک سے زیادہ فون دینے کا رواج نہیں بلکہ زیادہ تر تھانے بغیر فون کے ہیں۔ دوسرا فون قریب ہوا تو شاید کوئی معلوم کر آسکے کہ فلاں نمبر سے بات ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون کا عملہ بھی کوئی اتنا مستعد اور فرض شناس تو ہوتا نہیں کہ ایک منٹ میں بتا دے۔ پانچ دس منٹ کسی کو آتے جاتے میں لگ جائیں گے۔ پھر اگر پولیس کو فوراً روانہ کیا گیا تو انھیں یہاں [illegible] کے لیے آدھا گھنٹا چاہیے۔ برطانیہ، امریکا میں تو قریب [illegible] کار پیغام ملنے کے بعد تین منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ سالے... ہم اطمینان سے آدھا گھنٹا گفتگو کر کے جا سکتے ہیں۔"

"بہتر ہو گا کہ اب ہم دوسری جگہ سے بات کریں۔"

"نہیں! وقت ضائع ہو گا۔" غالب بولا۔ "میں کرتا ہوں بات۔"

غالب نے دوبارہ کاؤنٹر پر جا کے فون گھمایا تو مالک [illegible] نہیں تھا۔ اس کے کچن میں کوئی خانہ جنگی کی واردات ہو گئی [illegible] جس میں ہاتھ پیر یا سر کم ٹوٹتے تھے، برتن اتنے شہید ہوئے [illegible] آواز آئی تھی کہ لگتا تھا فی الحال معزز گاہکوں کو سلور کے گلاس میں چائے پیش کی جا سکے گی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" غالب نے اعتماد سے کہا۔ اور چند سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد بولا "السلام علیکم سر... میں غالب بول رہا ہوں۔ جی... ایک منٹ" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "پوچھ رہے ہیں کہ سکندر بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہے؟"

میں نے ریسیور لے لیا۔ "السلام علیکم انکل!" میں نے کہا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی سر ہی کہو گے۔" ضامن رضوی صاحب کی آواز میں طنز تھا اور کچھ دبا دبا دکھ بھی تھا۔ "کیا حال ہے؟"

"آپ کو معلوم ہو گا انکل... بس جی رہے ہیں... بلکہ [illegible] جینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آنٹی ٹھیک ہیں؟"

"ہاں... ٹھیک ہیں سب۔" وہ بولے۔ "رابعہ کیسی ہے؟"

"اگر میں کہوں گا کہ آپ کی دعا سے اچھی ہے تو آپ سمجھیں گے میں طعنہ دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس نے شادی کر لی ہے محسن سے۔" انکل رضوی بولے۔ "شیروانی زندہ ہوتا تو میں گلہ کرتا۔ فوزیہ سے پوچھوں گا کہ کیا بچپن سے اب تک انکل کہنے میں کوئی [illegible] لاحق تھی کہ اِدھر باپ مرا اُدھر نہ کوئی انکل رہا نہ کوئی رشتے کا [illegible] خیر یہ بتاؤ تم نے بھی رابعہ سے...؟"

"نہیں انکل... محسن اور شہلا کو... بلکہ انکل شیروانی کو دفن [illegible] نہیں ملا... ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کی دعائیں شامل نہ ہوتیں [illegible] میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... رابعہ کو آپ رخصت کریں گے"

"ابے پاگل ہوا ہے۔" غالب میرے کان میں بولا۔ "یہ بات [illegible] رہے ہیں۔ ایس ایس پی صاحب ایسے نہیں ہیں کہ تھانے میں بیٹھ کر تجھ سے اس قسم کی پرائیویٹ گفتگو کریں۔ تیرے جذبات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ..."

"یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے مان لیتا ہوں۔" انکل رضوی نے دکھی لہجے میں کہا۔ "ورنہ آثار تو ایسے نہیں ہیں کہ سب کچھ بھر دیا [illegible]

ہو جائے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی پانچ منٹ میں پھر فون کرتا ہوں آپ کو... کچھ تسلی سی ہو رہی ہے۔" میں نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ غالب کی بات نے مجھے قائل کر لیا تھا۔ [illegible] اس وقت آفیشل ڈیوٹی پر تھے لیکن ان کی گفتگو سراسر آن آفیشل تھی جو ان کے کردار کے خلاف اَمر تھا کیا ان کے لہجے میں دکھی ہونے کا احساس بھی ان کی اداکاری تھا؟ میں نے باہر نکل کے سوچا۔ نہ جانے کیوں میرے دل نے یہ بات نہیں مانی کہ وہ مجھے دکھی ہونے کا تاثر صرف دھوکا دینے کے لیے دے رہے تھے۔ وہ واقعی دکھی تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ ان کا دکھ ظاہر نہ ہو۔ خدا نے غالباً ان کو دو دل دیے تھے۔ ایک بے حد شریف آدمی کا جو ہمارے حالات سے پریشان تھا۔ دوسرا ایک ذمے دار پولیس افسر کا جو کسی رشتے کو قانون سے زیادہ اہم تسلیم نہیں کرتا تھا اور اس وقت یہ دونوں دل باہم مصروفِ پیکار تھے۔ بے شک پولیس افسر کا دل غالب تھا مگر انکل رضوی کا مظلوم دل بھی دبے دبے لہجے میں [illegible] تھا۔

اتفاق سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک خالی رکشا گزرتا نظر آگیا اور میں نے چلا کے اُسے روک لیا۔ ہم نے مخالف سمت میں دو میل کا فاصلہ دس منٹ میں طے کیا۔ پھر مجھے ایک پرائیویٹ کلینک نظر آیا۔ میں نے رکشا کو روک لیا اور غالب کے ساتھ اندر ہو گیا۔ ریسپشن پر ایک اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی تھی۔ وہاں ہمیں دو فون نظر آئے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا: "صرف ڈاکٹرز کے لیے" اور دوسرے کے سامنے "وزیٹرس اور مریضوں کے لیے" کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے کسی تذبذب کے بغیر دوسرا فون اٹھا لیا۔ لڑکی نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا مگر پھر کسی کال کو اٹینڈ کرنے لگی۔

"مجھے ایس ایس پی صاحب سے بات کرنی ہے۔" میں نے نمبر ملا کے کہا۔

"آپ کا نام؟" اس اکھڑ لہجے میں مجھے ڈانٹنے والا ایس ایچ او [illegible] ہو سکتا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب کو معلوم ہے۔" میں نے بھی اسے [illegible]

"ہاں جی سکندر! مسئلہ شہلا کا ہے۔" انھوں نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمھاری وجہ سے یہ بے قصور پکڑی گئی۔"

"آپ لوگ تو عموماً بے قصور انسانوں کو پکڑتے رہتے ہیں۔ [illegible] میرا مراد ہے آپ کے محکمے کے تھانیداری رکھنے والے لوگ" میں نے کہا۔

"میں تم سے پولیس کے محکمے کی خرابیوں اور ان کی اصلاح [illegible] پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔" وہ بولے۔ "مختصر بات کرو [illegible] چاہتے ہو یا نہیں۔" غالب کا تجزیہ بالکل درست تھا... اب وہ صرف ایس ایس پی رہ گئے تھے کیونکہ ان کی چال ناکام ہو گئی تھی۔ گفتگو اسی طرح چلتی رہتی تو وہ آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک "گپ شپ" کرتے رہتے۔ میں ان کے مہربان اور دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کے باتوں میں الجھ جاتا۔ پھر مطلب کی بات بھی اتنی لمبی ہو جاتی کہ کال ٹریس کرنے کی سست رفتار کارروائی بھی مکمل ہو جاتی اور ہم وہیں دھر لیے جاتے۔ اب وہ سمجھ گئے تھے کہ میں اس جگہ سے کھسک گیا ہوں جہاں پہلے تھا۔

"شہلا کو آپ کسی جرم کے بغیر قید میں رکھنا چاہیں تو میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں سر۔" میں نے طنز سے کہا۔ "آپ کا حکم تو قانون سے بڑھ کر ہے۔"

"میں معمول کی قانونی کارروائی میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

"وہ تو آپ کر چکے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی... "پولیس نے ایک عورت کو ہسپتال کے وارڈ میں گھس کر پکڑا۔ ہسپتال کا سارا عملہ اور وارڈ کے سب مریض گواہ ہیں کہ اس عورت نے کوئی جرم نہیں کیا تھا... کیا آپ نے اس غیر قانونی کام کرنے والے سے باز پرس کی؟ اس سے پوچھا کہ اس عورت کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے...؟"

"ایسا ہوتا ہے... مجرموں کے گروہ کا ایک آدمی بھی ہاتھ آجائے تو ہم اس سے گروہ کا سراغ لگانے میں مدد لیتے ہیں..."

"کیا آپ بھی اس طریقۂ تفتیش کے قائل ہیں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کہ ڈاکو ہاتھ نہ آئیں تو اس کے بیوی بچوں کو اٹھا لو، ماں باپ کو اٹھا لو۔"

"میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

"کیا شہلا کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپورٹ درج ہے؟" میں نے کہا۔ "کبھی کوئی ایسا ثبوت یا گواہ ملا ہے جس سے پتا چلا ہو کہ وہ کسی واردات میں شریک تھی یا اس نے مجرموں کی مدد کی تھی؟ میں سمجھتا ہوں وہ اتنی ہی بے قصور ہے جتنی... آپ سمجھ لیں کہ شیروانی صاحب کی بیٹی اور محسن کی بہن فوزیہ... جو سیالکوٹ میں ہے۔ پکڑنا چاہیں تو آپ اسے بھی پکڑ لیں کہ محسن کی بہن ہے اور اس سے محسن کا پتا پوچھا جا سکتا ہے مگر کسی مجرم سے رشتہ کوئی جرم تو نہیں ہوتا ایس پی صاحب... باقی آپ کی مرضی ہے۔ اس کے خلاف کسی بھی جرم میں ایف آئی آر کاٹ دیں۔ اسے تو پھنسانے کے ہزار بہانے ہوں گے آپ کے ضابطۂ فوجداری میں۔"

"شٹ اپ! تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔"

"مگر آپ کے یہ ماتحت ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ نہیں جانتے کہ شہلا اس تمام عرصے میں کہاں رہی تھی۔ وہ اسلام آباد میں تھی۔ انکل شیروانی کی بیگم اور خود انکل شیروانی کی زندگی کے آخری لمحات میں اسی نے دن رات ایک کر کے تیمارداری کی تھی... اور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ان کی موت کے بعد وہ فوزیہ کے پاس سیالکوٹ چلی گئی تھی۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔"

"تم نے اسے اپنا آلۂ کار بنایا تھا" انکل رضوی نے کہا۔

"کیا یہ ثابت ہو گیا ہے... شہلا نے اس کا اعتراف کر لیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اور اگر ہم نے آلۂ کار بنایا تھا تو کس جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے؟ یقیناً پولیس کی کارکردگی قابلِ تعریف ہے کہ ابھی مجرموں کے ایک گروہ نے جس کا انھیں نام و نشان تک معلوم نہیں، کوئی واردات کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ایک لڑکی کو کسی خاص مقصد سے ایک بسترِ مرگ پر لیٹی ہوئی لڑکی کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے موقعے پر پہنچ کر لڑکی کو پکڑ لیا اور یوں قبل از وقت کارروائی سے مجرموں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا... ونڈرفل۔"

"مجھے یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں کہ میں شہلا کو رہا کرنے کا حکم دے دوں۔" انھوں نے کہا۔ "ایس ایچ او کا خیال ہے کہ اس لڑکی سے تمھارا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اخفائے جرم بھی تو جرم ہوتا ہے۔"

"آپ شوق سے اس کو حراست میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک تو یہ بات نہ بھولیں کہ وہ خود مجرم نہیں ہے۔ اس کا شوہر آپ کی تعریف میں تو مجرم ہوگا ورنہ وہ بھی مجرم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ انکل شیرازی کی بہو ہے اور مرتے وقت تک ان کی صرف یہی خواہش تھی کہ شہلا سکھی رہے۔ تیسری بات یہ کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس پر ذہنی یا جسمانی تشدد کیا گیا تو ہو سکتا ہے..."

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں اس کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ تفتیش میرے سامنے ہو یا میں خود کروں۔ اس کو ریمانڈ پر تھانے میں یا جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہ بھیجا جائے۔ تم جانتے ہو وہاں کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ نازلی کو واپس کر دو۔ اُسے کہو اپنے گھر جائے۔ اس کے والدین کی حالت بہت خراب ہے اور اس کا بھائی پاگل ہو رہا ہے۔ وہ میرے گھر میں بھی آزاد نہیں ہوگی۔"

"میں یہ پیغام اُسے دے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ اس شرط کو قبول بھی کر لے گی۔ وہ خود پاگل لڑکی ہے جو ہم پاگلوں کے ساتھ ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے مگر اس نے ہماری کبھی نہیں مانی۔ اگر وہ لوٹ کر نہ گئی تو..."

"تو میں لوٹ جاؤں گا۔" وہ بولے۔ "میں شہلا کے معاملے میں بالکل دخل نہیں دوں گا۔ مجھے اپنا دل پتھر کرنا پڑے گا۔ ایک ایس ایس پی شہر کے ہر تھانے کے کیس میں دخل نہیں دیتا۔ میں نے نازو کی فیملی کے خیال سے ایک پیش کش کی تھی۔ اگر اسے شہلا کا خیال ہوگا تو وہ اتنا ضرور کرے گی... یہ کوئی بہت مشکل یا ناممکن بات نہیں۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہتی ہے تو پھر مجھے بھی اپنے ضمیر پر جبر کرنا پڑے گا۔ یہ نہ قانون کے خلاف ہوگا نہ میرے ضمیر کے خلاف۔ ایک جذباتی الجھن ہوگی مگر اس کی کوئی بات نہیں... گھلے گی تو شہلا۔" انھوں نے ایک دم لائن کاٹ دی۔ آخر میں کہتے ہوئے وہ بے حد مشتعل تھے اور میں تصور کر سکتا تھا کہ کتنا غصہ تھا۔ میری باتوں نے انھیں مشکل میں ڈال دیا تھا اور یک طرفہ فیصلہ کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

"یہ آپ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟" کسی نے پیچھے آ کے کہا اور میں چونک کر پلٹا۔

"کیا یہ غیر مہذب اور غیر شائستہ گفتگو تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ فون صرف مریضوں کے لیے اور انھیں دیکھنے کے لیے آنے والوں کی خاطر لگایا گیا ہے۔" وہ بولا۔ صورت اور حلیے سے وہ ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ شاید وہ مالک یا منیجر تھا۔

"ہم کسی مریض کو دیکھ لیتے ہیں۔" غالب بولا۔ "اس کے بعد فون کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جائے گا۔ ویسے میں ایک صحافی ہوں۔" اس نے اپنا پریس کا کارڈ نکالا۔ "میں نے ایمرجنسی میں فون استعمال کر لیا تو کوئی جرم نہیں کیا اور کیا ہے تو تم مجھے گرفتار کرا دو۔ یہ ایک وکیل ہیں جو ایک ایس ایس پی سے بات کر رہے تھے۔"

"اور ہم اس فون کو زحمت نہ دیتے اگر آس پاس کوئی پبلک کال آفس مل جاتا۔" میں نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "معلوم نہیں لوکل کال کے کتنے یونٹ چارج ہوں گے۔"

"ایک لوکل کال اگر آدھا گھنٹا جاری رہے یا سارا دن چلتی رہے تب بھی پچاس پیسے ہی بنتے ہیں۔" غالب نے دس کا نوٹ اٹھا لیا اور کاؤنٹر پر ایک اٹھنی رکھ دی۔ اعتراض کرنے والا بے بسی سے ہمیں باہر جاتا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے ہم پر رعب جھاڑنے کی بلاوجہ کوشش کی تھی۔ پریس کارڈ اور وکیل کا نام سن کر وہ خود مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھنی اٹھا کے ہمارے پیچھے پھینکی جو فرش پر کھن سے گری مگر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی اسمارٹ لڑکی کے ہنسنے کی آواز جو چاندی کے سکوں کی جھنکار کی طرح تو نہیں تھی مگر یہ لگتا تھا جیسے بہت سی اٹھنیاں فرش پر بکھر گئی ہوں۔

"اب کیا ہوگا؟ ایس ایس پی صاحب نے تو شرط عائد کر دی ہے مگر دوسری طرف نازو ہے۔" میں نے کہا۔

"نازو واپس چلی جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"وہ کبھی نہیں جائے گی۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں اس کی فطرت کو۔"

"تم اس کی فطرت کو جانتے ہو۔ میں نازو کو جانتا ہوں۔ لگا لو شرط۔"

شرط تو ہم نے نہیں لگائی لیکن لگائی ہوتی تو غالب جیت جاتا۔ نازو نے رابعہ کے ساتھ ہماری پوری بات بڑے سکون سے سنی اور میں اس کی صورت کے تاثرات کو غور سے دیکھتا رہا۔ غالب نے اُسے وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا۔ رابعہ کی شکل رونے والی ہو گئی مگر نازو مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی۔

"پھر میں چلتی ہوں۔" وہ بولی۔ "شہلا کی آزادی کے لیے شرط یہی ہے تو مجھے منظور ہے۔"

خاموشی کا ایک اُداس اور بوجھل لمحہ آیا۔ نازو کو یوں بھی واپس جانا ہی چاہیے تھا۔ اس کے والدین کی حالت ابتر تھی اور بھائی اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں یہ سب ہمارے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ ہم نہیں سوچ سکتے تھے کہ وہ یوں اچانک ہمارا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ ہماری قوت تھی، ہمارا سہارا تھی۔ آہستہ آہستہ سب کی ضرورت بن چکی تھی۔ اس کے بغیر ہم سب جیسے ادھورے رہ جاتے تھے۔ ہمارے بلان، ہمارے حوصلے اور ہماری امیدیں۔ سب میں وہ برابر کی شریک تھی۔ ایم آر ایس کا مشن اس کی شرکت کے بغیر لاحاصل محسوس ہوتا تھا۔ بے شک وہ ایک لڑکی تھی اور ہم سب اکثر کہتے تھے، دوسروں کو قائل کرنے کے لیے دلیل دیتے تھے کہ مشن میں کسی ایک فرد کی عدم موجودگی سے پیش قدمی نہیں رک سکتی مگر آج وقت آیا تھا تو سب کو مایوسی کے احساس اور ناامیدی کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

"تم مجبور نہیں ہو۔" محسن نے بہت دیر بعد کہا۔ "شہلا کی وجہ سے خود کو پابند مت سمجھو۔ وہ آ جائے گی۔ اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوگا اور وہ... پولیس والے اسے کیسے رکھ سکتے ہیں... منظر اس کی ضمانت کرا لے گا۔"

"اسے تھانے میں ایک رات بھی نہیں رہنا چاہیے۔" نازو بولی۔ "اچھا ہے اگر اسے انکل رضوی لے جائیں۔ وہاں اس کی دیکھ بھال بھی ہوگی۔ اور وہ محفوظ بھی رہے گی۔"

"میرا مطلب تھا کہ تم کو اپنے والدین کی وجہ سے جانا چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہم تو پہلے بھی کہتے تھے کہ تمھارا گھر لوٹ جانا بہتر ہوگا۔ اب اکرام شیخ بھی تو ایک ہی بھائی ہے تمھارا، اس نے تمھاری وجہ سے نوکری چھوڑی اور یقیناً اُسے بھی بہت صدمہ ہے۔"

محسن کی بات بے ربط تھی۔ وہ خواہ مخواہ دلائل دے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کشمکش تھی جس نے اس کی سوچ کو الجھا دیا تھا۔ وہ شہلا کی طرف سے بالکل بے فکر نہیں ہو سکتا تھا، چاہے وہ رضوی صاحب کے گھر میں رہے۔ شہلا کے لیے وہ بھی نظربندی تھی۔ اور ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ پھر کب اس سے ملاقات ہوگی۔ ہوگی یا نہیں ہوگی۔ وہ تو ہمارے ساتھ ہی جا رہی تھی۔ ہم نے سوچا تو تھا کہ اس کا نہ جانا بہتر ہوگا مگر اس بات کا یقین کسی کو نہیں تھا کہ وہ مانے گی۔ وہ صاف کہہ دیتی کہ اب جو بھی ہوگا وہ سب کے ساتھ ہوگا۔ میں اکیلی پیچھے رہ کے اپنے وسوسوں کے آسیب میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ اکیلی انتظار کاٹوں گی۔ کب تک؟ جب تک تم سب واپس نہ آ جاؤ۔ کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ تم کس دن، کس وقت واپس آؤ گے... کون سی فلائٹ سے؟ کس ٹرین سے؟

"تم سب لوگ اتنے مایوس کیوں ہو... رونی شکل کیوں بنائی ہے تم لوگوں نے؟" نازو ہنسی۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس سفر کے کسی مرحلے میں ہمارا ساتھ چھوٹ جاتا؟ ابھی تو میں لوٹ کر گھر جا رہی ہوں۔ کیا یہ بالکل بعید از امکان تھا کہ مجھے کسی دشمن کے ریوالور کی ایک گولی ختم کر دیتی اور تم کو میرا نشان تک نہ ملتا؟ یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس سے مشن ختم ہو جائے گا۔ تم تو کہتے تھے کہ آخری آدمی بھی لڑے گا۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک..."

"وہ مختلف بات ہوتی..." میں نے بمشکل تمام کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرا ارادہ کمزور پڑ جاتا۔ میں ویسے ہی ڈر جاتی اور تمھارا ساتھ چھوڑ جاتی؟" نازو بولی۔ "اس وقت واپس چلی جاتی جب تم مجھے واپس جانے کے لیے مجبور کرتے تھے؟ یہ تو بہت اچھا ہے کہ میں ایک ساتھ دو کام کر رہی ہوں، اپنے گھر واپس جا رہی ہوں اور شہلا کو بھی ایک گھر میں پہنچا رہی ہوں۔ تم لوگ جاؤ... تمھیں اور ہمسفر ملیں گے۔ تمھارا ساتھ دینے والے بہت ہوں گے۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بالآخر تم گھر جا رہی ہو... اپنے ماں باپ کے پاس۔" میں نے کہا۔ "ہم سب بے گھر لوگ تھے۔ کسی کے بھی ماں باپ نہیں تھے۔ ہم اگر واپس نہ بھی آئے تو کسی کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم واپس آؤ گے... کامیاب آؤ گے۔ اور اس وقت شہلا تمھارا انتظار اکیلی نہیں کرے گی..." نازو ہنسی۔ وہ اپنی اعصابی کشیدگی اور جذباتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے زبردستی ہنس رہی تھی۔

"معلوم نہیں ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ ممکن ہے وہ اس قیدِ تنہائی میں گھٹ گھٹ کر اور ہمارے لیے پریشانی میں روتے روتے حوصلہ ہار جائے اور ہم واپس نہ آ سکیں۔ جانا تو ہمارے اختیار کی بات ہے، واپس آنا تقدیر کی یاوری کے بغیر ممکن نہیں۔" محسن بولا۔ "ہو سکتا ہے وہ بیوہ اور اس کا بچہ یتیم رہ جائیں۔"

"تو پاگل ہو رہا ہے محسن!" میں نے برہمی سے کہا۔ "اتنا ہی خیال ہے بیوی بچے کا تو جا... تو بھی انکل رضوی کے پاؤں پکڑ لے... تجھے بھی معافی اور پناہ مل جائے گی۔"

محسن نے سر کو جھٹکا۔ "معاف کرنا یار... پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اب جارہی ہوں... ہو سکے تو جب بھی موقع ملے مجھے فون کر دینا۔" نازو بولی۔

"تمہارے والدین فون کٹوا دیں گے۔" غالب بولا۔

"خط ڈال دینا... بس خیریت کا..." نازو نے براہِ راست غالب سے کہا۔

"صرف خیریت کی اطلاع کو میں خط نہیں سمجھتا۔" غالب بولا۔ "میں سادہ پوسٹ کارڈ پر اپنے آٹوگراف ارسال کرتا رہوں گا۔ مضمون تم خود لکھ لینا کہ میں یہاں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

"اچھا بابا جو تمہارا دل چاہے لکھ دینا۔" نازو نے کہا۔

غالب کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ "جو دل چاہے... مگر دل کی بات تم تک کوئی پہنچنے دے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ جیسے ہی تم واپس پہنچو گی، والدین خدا کا شکر بجا لائیں گے جس نے ان کی عزت آبرو رکھی۔ اب تک تو وہ کسی بہانے تمہاری عدم موجودگی پر جھوٹ کا پردہ ڈالتے رہے ہوں گے۔"

"ہاں! انھوں نے سب سے کہا ہوگا کہ میں خالہ کے پاس کراچی میں ہوں۔"

"مگر اب وہ تمہارے ساتھ جَٹ منگنی پَٹ بیاہ کی بات کریں گے اور تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔" غالب بولا۔ "شادی کی زنجیر سے باندھ کر کسی کے حوالے کریں گے کہ چاند سی تو اب تیرے حوالے۔"

"پاگل ہوئے ہو۔ زبردستی کون کسی کو میرے سر منڈھ سکتا ہے۔ میں نہیں ڈرتی کسی زنجیر سے اور زنجیر تو میں یوں توڑ سکتی ہوں۔" وہ چٹکی بجا کے بولی۔

"پھر بھی کب تک..."

"جب تک تم واپس نہیں آجاؤ گے... میرا مطلب ہے تم سب..." وہ بولی۔

"دوسروں کی بات نہیں کرتا۔ میں ضرور آؤں گا... وعدہ۔" غالب نے کہا۔

نازو کے چہرے پر حیا کا رنگ گُل کھلانے لگا۔ 'وعدہ' اس نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سب سے ہاتھ ملایا۔ جب اس نے رابعہ سے ہاتھ ملایا تو رابعہ رونے لگی۔ اس نے نازو کو گلے لگا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ نازو مسکراتی رہی؛ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ روئے گی نہیں۔ غالب سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے چند سیکنڈ کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اور میں نے دیکھا کہ غالب نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا، تھوڑا سا اٹھایا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس چند سیکنڈ کے وقفے میں ان کے درمیان سارے قول و قرار ہو گئے۔ غالب نے وہ سب کہہ دیا جو وہ [illegible] خاموشی میں کہہ سکتا تھا۔ اور نازو نے شاید پہلی بار اسے

مایوس نہیں کیا۔ جواب نازو کی آنکھوں نے دیا اور اس کا عکس غالب کی صورت پر نظر آیا۔ پھر وہ دروازے سے نکل گئی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ہم سب وہیں کھڑے رہے، چپ چاپ اور سوگوار اور دل شکستہ۔ اس گھر کی ویرانی میں جیسے [illegible] کی اُداس شام اُتر آئی۔

پھر باہر کوئی کار آکے رُکی۔ ہم سب چونکے۔

میں نے کہا۔ "یہ تو کیتھرین آنٹی کی کار معلوم ہوتی ہے... [illegible] واپس یہاں آگئی!"

"سب لوگ اندر۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور [illegible] دروازے کے ساتھ پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔ غالب، رابعہ اور [illegible] ساتھ والے کمرے میں غائب ہو گئے۔ مجھے ایک خیال [illegible] کر دیا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حمایت نے جولی کی ماں کو بچا لیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ باہر پولیس اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کرنے پر آ جائے۔ وہ کینہ پرور لوگ بہرام دادا کا نام بھولے نہیں تھے۔ اور اس کی بیوہ آج پھر انہیں چوٹ دے گئی تھی۔ ایک اکیلی عورت کے خلاف جھوٹے الزامات کا سلسلہ دراز کیے بیٹھے تھے۔ اس پر بدکاری کا الزام عائد کرنے کے لیے نام نہاد شرفا کی طرف سے درخواست حاصل کر سکتے تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اس کے گھر میں اب بھی جرائم پیشہ افراد کا آنا جانا ہے۔ وہ جوئے کا اڈا چلاتی ہے۔ کبھی اسمگلروں کی آلۂ کار ہے... وغیرہ وغیرہ۔ بے بنیاد ثبوت اور جھوٹے گواہوں کی بنیاد پر اُن کے لیے شریف آدمی کا جینا اجیرن کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ بے گناہی تو عدالت میں سو بار پیشی کے بعد ایک مرتبہ ثابت ہوتی ہے۔ اس سے قبل جھوٹے مقدمات درج کرنے سے پولیس کو روکنے کے لیے کوئی قانون کام نہیں آتا۔

لیکن استاد ٹیڈی اندر آیا تو ہمارے اندیشے مٹ گئے۔ اس کے ساتھ کیتھرین بھی آئی تھی۔ اندر آنے کے بعد ٹیڈی نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر [illegible] سامنے آگیا۔

"میں تو ڈر گیا تھا کہ [illegible] اسب کہاں چلے گئے!"

"ہم بھی ڈر گئے تھے کہ تم [illegible] چھوڑنے گئے تھے تو انھیں اپنے ساتھ واپس کیوں لے آئے۔" رابعہ نے اندر سے آکے کہا۔

"کیا آپ اس کو چھوڑنے آئی ہیں؟" محسن بولا۔ "اسے سڑک پر چھوڑ دینا تھا۔ یہ سیدھا اپنے تھان پر آجاتا۔"

"میں... میں آج رات یہاں رہوں گی..." کیتھرین [illegible] تم لوگ ڈونٹ مائنڈ... مجھے ڈر تھا کہ کہیں رات کو پریشان کرنے نہ آجائے کوئی..."

"ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔" میں نے کہا۔

"ویسے میں پولیس سے کبھی نہیں ڈرتی... پچھلے چند سال سے انھوں نے مجھے پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا۔" کیتھرین بیٹھ گئی۔ "لیکن اس وقت میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ میں خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں نہیں پڑ سکتی۔"

"یہ بھی آپ کا گھر ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن..."

"لیکن کیا؟ فکر مت کرو... میں تم پر زیادہ عرصہ بار نہیں بنوں گی۔" وہ بولی۔

"آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔" میں نے ذرا وضاحت کی۔ "[illegible] اس گھر میں ہمارا قیام چند دن سے زیادہ نہیں۔ پھر ہمیں جانا ہے۔ ہم جولی کے لیے کچھ کیے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"ابھی میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔" کیتھرین نے کہا۔ "اس نے کہا ہے کہ کل تم سب کے ٹیسٹ ہو سکتے ہیں۔ کیا واقعی تم لوگ میری جولی کے لیے یہ سب کرو گے... ایک اجنبی کے لیے... میں کیسے شکریہ ادا کروں تمہارا۔"

"اس کی ابھی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "الفاظ صرف شرمندہ کرتے ہیں۔ کبھی وقت پڑا تو ہم بھی ضرورت مند بن کے کہیں گے کہ آنٹی! اب تم ہماری مدد کرو... ممکن ہے ایسے ہی تم بھی کسی اجنبی کے لیے کچھ کر سکو۔"

"مجھے اس لڑکے نے بتایا ہے کہ یہ میرے شوہر کو جانتا تھا اور یہ کہ اس کے پاس اس کی کوئی امانت پڑی ہے۔" وہ بولی۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب آپ اسی سے باقی تفصیلات بھی سُن لیں۔ اتنی دیر میں ہمیں کچھ کام کرنے ہیں۔"

رابعہ ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ میں، محسن اور غالب باہر آگئے۔ ہم نے خانہ بدوشی کے پروگرام پر تفصیل سے بحث کی۔ ابھی تک ہمارے پلان میں کہیں خامی نہیں تھی۔ ڈلاور اینڈ کمپنی کے پروگرام کے مطابق اسلحے کی اگلی کھیپ کے چار دن بعد روانگی طے تھی۔ انھیں یہ اسلحہ بیل گاڑیوں پر بھوسے کے ڈھیر میں چھپا کے لے جانا تھا۔ بھوسے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں عموماً رات کو سڑکوں پر رواں نظر آتی ہیں جن پر بھوسا یوں باندھ کر لادا جاتا ہے کہ بیل گاڑی کے اوپر دس فٹ تک اور اس کی حدود سے دائیں اور بائیں جانب پانچ پانچ فٹ تک بھوسے کا پہاڑ سا بن جاتا ہے مگر بھوسے کا وزن نہیں ہوتا چنانچہ بیل اسے آسانی سے کھینچتے رہتے ہیں۔ سڑک پر دور سے بسوں اور گاڑیوں کی ہیڈلائٹ پڑتی ہے تو بھوسے کی سنہری چمک سے پوری سڑک پر کوئی روشن دیوار سی دکھائی دیتی ہے لیکن اوور ٹیک کرنے والی گاڑیاں تھوڑی سی جگہ میں سے گزر جاتی ہیں۔ بیل گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک لالٹین جھولتی رہتی ہے اور بھوسے [illegible] گاڑی والا سوتا نظر آتا ہے۔ تجربہ کار بیل بالکل [illegible] پر نان اسٹاپ سفر کرتے ہیں۔

اس ڈھیر کے اندر یقیناً خاصی مقدار میں اسلحہ چھپانے کی گنجائش تھی اور چھ بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ اتنا ہی اسلحہ لے جا سکتا تھا جتنا ایک ٹرک میں لے جانا ممکن ہوتا ہے مگر بھوسے کی گاڑیوں پر کسی کو شک ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کو چلانے والے بھی دیہاتی نظر آتے ہوں تو انھیں اسلحے کا اسمگلر، غدار یا دشمن کا ایجنٹ کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم ان کے پہلے پڑاؤ تک ان سے پہلے پہنچ سکتے تھے اور سڑک کے کچھ فاصلے پر اپنے خیمے گاڑ کے انتظار [illegible]۔ ہم عقبی حصے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رابعہ آئی اور ہمیں بھی چائے کے کپ تھما کے لوٹ گئی۔ "کیا استاد ٹیڈی کی فلم ابھی چل رہی ہے؟" میں نے کہا۔

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ابھی تو انٹرول ہوا ہے۔"

"اس نے ابھی تک نازو کے بارے میں سوال نہیں کیا؟"

"کیا تھا..." رابعہ بولی۔ "میں نے بتا دیا... رونے کے قریب ہو گیا تھا۔"

"اس سے کہنا کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ بتائے۔" محسن بولا۔ "ہم خود رات کو ایک ساتھ بیٹھیں گے تو بات ہو جائے گی۔"

"تم لوگ یہاں بیٹھے ہو! جا کے پتا کیوں نہیں کرتے کہ نازو اپنے گھر پہنچی یا نہیں۔ اور انکل رضوی بھی شہلا کو لے گئے یا نہیں؟" رابعہ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ "میں اب رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہوں۔"

"ہم بھی جاتے ہیں چائے پی کر۔" میں نے کہا۔ "ویسے انکل رضوی وعدہ کر کے مکرنے والے نہیں ہیں۔ شہلا کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ آنٹی اس کا خیال رکھ سکتی ہیں۔ اس کی مدد بھی کر سکتی ہیں۔"

"کیسی مدد؟"

"یہی! اگر وہ ہم سے بات کرنا چاہے۔ ہم فون کریں کبھی تو وہ بات کرا دیں۔ اس کو خط یا پیغام ارسال کریں تو انکل رضوی کا سنسر دھرا رہ جائے اور خط کا جواب بھی آجائے۔" میں نے کہا۔ "وہ عورت ہیں بہرحال۔"

ہم تینوں میں سے غالب اور محسن ٹیلی فون کرنے گئے۔ میں نے گھر پر ٹھہر جانا مناسب سمجھا۔ ٹیڈی ابھی تک باتوں میں مصروف تھا۔ میں رابعہ کے پاس کچن میں جا بیٹھا۔ وہ موم بتی کی مدھم روشنی میں گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ "...کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں! خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں میں نے۔" وہ بولی۔

"ایک [illegible] کہ زوجہ محترمہ سخت بھوک لگی ہے۔ تم گرما گرم پراٹھے اتارو۔ میں یہیں بیٹھ کے کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا زنانہ رومانی ناولوں میں ہوتا ہے۔" رابعہ مسکرائی۔ "اس وقت تم کہو گے کہ چلو آج چائنیز میں چلتے ہیں... یا حکم دو گے کہ ویٹر... خانساماں سے کہو آج ہم ناشتے میں پراٹھے کھائیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈائننگ ٹیبل پر اخبار پڑھتے پڑھتے تم دو چار نوالے کھا کے کافی پی لو گے اور اُٹھ جاؤ گے۔"

"یہ تو بڑا عبرتناک نقشہ کھینچ کے رکھ دیا تم نے۔" میں نے کہا: "بے شک اگر میں سکندر بدبخت نہ ہوتا صرف سکندر بخت ہوتا تو آج صنعت کاروں کی صف میں شامل ہوتا۔ جو دن رات کاروباری مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں اور پراٹھے نہیں کھا سکتے کیونکہ ہضم نہیں کر سکتے اور ان کا کلسٹرول بڑھ جاتا ہے۔ خیر... کیا یہ ممکن ہے کہ کل جو نہیں ہو سکتا وہ ابھی ہو جائے؟"

"یہ ہو سکتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"ابھی وہ سب آجائیں گے، میرے سالے۔" میں نے کہا: "کتے کی طرح ان کی ناک خوشبو سونگھ لے گی۔"

"اور آتے ہی میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ پراٹھے پکا پکا کے کھلا رہی ہو۔" رابعہ ہنسی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے تو ٹیڈی وارد ہوا۔ اُس نے آتے ہی نعرہ لگایا: "آہا ہا... پراٹھے!" اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کیتھرین دروازے میں کھڑی مسکراتی رہی۔ میں اور ٹیڈی چھینا جھپٹی کرتے رہے اور اتنے گرم پراٹھے کھاتے رہے کہ دونوں کے منہ جل گئے۔ ابھی ہمارا مقابلہ جاری ہی تھا کہ محسن اور غالب آگئے۔

"ارے یار دیکھو ذرا بدمعاشی۔" محسن چلایا۔ "ہمیں کیسے بہانہ کر کے گھر سے نکال دیا اور یہاں ہو رہی ہے دعوت؟"

"کس کی دعوت؟" غالب بولا۔ "میاں یہ تو عشق ہے کھلا عشق اور حد ہے بے شرمی کی۔"

"یہ طفیلی تو میاں مجنوں کی وجہ سے کھا رہا ہے۔ ورنہ اسے کون پوچھتا۔" محسن نے کہا۔ "یار اپنی بھی گھر والی تھی... سو فیصد شرعی..."

"صبر کر یار! آجائے گی وہ... سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھی ہے۔" غالب نے کہا: "اپنی بھی کسی دن نکل آئے گی ظالم سماج کی دیواریں گرا کے۔"

"مگر یہ تو ظالم سماج کے سامنے پراٹھے کھاتے جا رہے ہیں..."

"بک بک بند کرو۔ یہاں بیٹھو اور کھانا شروع کر دو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں نے منع کر دیا رابعہ کو تو سوکھی روٹی ملے گی۔"

"ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر۔ تو وہ ہے غلامی کے حلوے سے بہتر۔" غالب بولا۔ "مگر میں غلام ابن غلام غلام..." وہ محسن کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

"تم لوگ کیا خبر لینے گئے تھے۔ کیا خبر لائے؟" میں نے کہا۔

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" غالب بولا۔ "نازو اپنے گھر میں ہے۔ اس کے باپ نے کم اور بھائی نے ہمیں زیادہ گالیاں دیں۔ مگر میں گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔"

"شہلا کو انکل رضوی اسی وقت لے گئے تھے۔"
"جب وہ تھانے گئے تھے تو اسی ارادے سے گئے تھے... ہوشیار آدمی ہیں۔ تم سے ایک سودا بھی کر لیا۔ اگر نازو نہ ملتی تب بھی وہ شہلا کو بہر حال لے جاتے۔"

"کیا ان کی بیگم نے بتایا ہے یہ سب کچھ؟"

"اور کیا انکل بتاتے۔" محسن بولا۔ "میں نے شہلا سے بھی بات کی تھی۔"

"وہ رو رہی تھی؟"

"رو تو میں بھی رہا تھا۔" محسن نے معصومیت سے کہا "مگر..."

"رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے۔" غالب نے لقمہ دیا۔

"ہاں! آنٹی نے بہت تسلی دی اور کہا کہ دن میں جب ایس ایس پی صاحب دفتر میں ہوتے ہیں تو میں فون کر لوں۔ میں نے کہا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کے دیواریں پھاند جاؤں اور آجاؤں تو؟ وہ ہنسنے لگیں اور بولیں کہ دیوار پر اب خاردار تار ہیں... بہت اونچے۔ اندر دو خونخوار قسم کے کتے بھی پال لیے گئے ہیں۔ تاروں سے کپڑے پھٹ جائیں گے۔ کتوں سے تم خود پھٹ جاؤں گا، اس لیے ایسا نہ کرنا۔"

کھانے کے بعد ہم سب بیٹھے تو ایک بار پھر ہماری روانگی کے پلان کی بات شروع ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے ساتھ الگ بیٹھ کے اسے اپنی سرگزشت کا خلاصہ سنایا۔ وہ دم بخود بیٹھی رہی۔ محسن اور غالب کا تعارف ختم ہوتے ہوتے ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر میں نے اُسے رابعہ، شہلا اور نازو کے متعلق بتایا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم سب اتنے باہمت اور اتنے مخلص... اتنے اچھے دوست ہو۔" کیتھرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "آج مجھے اپنا شوہر یاد آرہا ہے۔ وہ ہوتا تو تمہارے لیے کوئی پرابلم نہ ہوتی۔ کچھ نہ کچھ میں بھی کر لوں گی۔ میرے بھی وسیع رابطے تھے۔ میں بہرام دادا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ہر راز میں شریک تھی۔"

"پ... آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟"
"ساتھ نہ گئی تب بھی ساتھ دوں گی... تم نہیں جانتے، میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ "وقت بتائے گا کہ میں اب بھی وہ ہوں جو بہرام دادا کی نصف بہتر تھی۔"

ابھی اس کی بات جاری تھی کہ باہر سے آہٹ سنائی دی۔ پھر ایک رائفل کی نال شیشہ توڑ کے اندر آئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُدھر سے بھی دو نالیں ہم سب کا نشانہ لیے ہوئے تھیں۔

ہم سب ایک ہی وقت میں ایک ہی چھت کے نیچے جمع تھے اور کوئی دشمن ایسے وقت میں آپہنچا تھا جب ہم اپنے دفاع کی طرف سے غافل تھے۔ ہم سب نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے سوال کیا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں مگر جو میری ذہنی کیفیت تھی وہی سب کی تھی۔ یقین کے ساتھ میں بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ کون سے شکاری ہیں۔ دلاور پنہ کمپنی کے شکاری جو صفِ دشمناں میں سب سے اوّل تھے۔ پولیس یا وہ چور جو ہم سے پہلے اس گھر پر قابض تھے اور بڑی دیدہ دلیری سے اسے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر یہاں مالِ غنیمت لاتے تھے چھپاتے تھے اور جمع رکھتے تھے۔

ایک قدرتی ردِ عمل یہ ہوا تھا کہ ہم سب نے ریوالور نکال لیے تھے مگر ہمارے مقابل صرف دیواریں تھیں اور ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے جو ہمیں گھیر چکے تھے اور اپنا نشانہ بنائے منتظر تھے کہ ہم خود ہی اپنی اس کمزور پوزیشن کو سمجھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیں۔ یہ سب لوٹا ہوا اور چھینا ہوا اسلحہ تھا۔

میں نے ایک نظر سب کا جائزہ لیا اور اچانک امید کی ایک کرن نے مجھے مایوسی کے گھپ اندھیرے سے نکال لیا۔ مجھے غالب نظر نہ آیا۔ عین اسی وقت جب ان نادیدہ حملہ آوروں کی بندوقوں نے سر نکالا تھا یا چند لمحے قبل وہ دوسرے کمرے میں غائب ہو چکا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا کہ اب اسے لوٹ کر نہ آنے دیا جائے اور اس خطرے سے خبردار کر دیا جائے جس میں ہم گرفتار ہو چکے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" محسن نے پُراعتماد اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"معلوم ہو جائے گا۔" باہر سے جواب آیا۔ آواز اجنبی تھی اور بے حسی کا آئینہ دار تھا۔ "بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ یہ ہتھیار پھینک دو اور سب پلٹ کر دیوار کی طرف منہ کر لو۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو سر سے اوپر اُٹھا کے دیوار پر رکھو اور ایسے ہی کھڑے رہو۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اتنے بزدل اور کم ہمت ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا: "ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ تم اگر مرد ہو تو سامنے آؤ۔"

میری بات کا کوئی مقصد نہ تھا، سوائے غالب کو خبردار کرنے کے۔ ایسے وقت میں کسی کو اپنی جرأت مندی سے متاثر کرنا یا اسے دعوتِ مبارزت دینا ایک مضحکہ خیز حرکت ہی تھی چنانچہ سب نے مجھے حیرانی سے دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس طرح شور مچانے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

"اپنی بکواس بند کرو۔" اسی آواز نے کہا۔ "ہم یہاں تم سے مقابلہ کرنے نہیں آئے ہیں۔ اپنی مردانگی اپنے پاس رکھو اور وہی کرو جو کہا جائے۔"

"ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔" یہ دوسری آواز کسی اُجڈ اور گنوار شخص کی تھی: "بڑی بہادری..." اس نے ایک فحش بات کی۔

"تم چپ رہو۔" پہلے شخص نے اپنے ساتھی سے اتنی ہی بے حسی کے ساتھ کہا: "کیا تمہیں بتایا نہیں گیا تھا کہ فضول بات کوئی نہیں ہو گی اور تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" دوسرا شخص کتے کی طرح آہستہ سے غرّایا۔

"میں تم کو دس سیکنڈ دوں گا کہ اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔ اِدھر دروازے کی طرف۔" پہلا شخص جو روبوٹ کی طرح بولتا تھا اور اس گروہ کی قیادت کا دعویدار تھا، مجھے زیادہ خطرناک لگا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا مشینی لہجہ بھی مصنوعی لگا۔ وہ آواز بدل کے بات کر رہا تھا۔ اب وہ گنتی شمار کر رہا تھا اور میرے کان ہر سیکنڈ کے گزرنے کی آواز سُن رہے تھے۔ جب وہ سات پر پہنچا تو میں نے ریوالور نیچے کر کے دروازے کی طرف اچھال دیا۔ محسن اور استاد ٹیڈی مجھ سے پہلے ہی جھک کر سیدھے ہو چکے تھے۔

"تمہارا ایک ساتھی کم ہے۔" گروپ لیڈر نے کہا۔

"کون کم ہے؟" میں نے بیک وقت محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھ کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

"تم خود جانتے ہو کہ کون کم ہے۔ اسے کہو کہ سامنے آجائے ورنہ اندر آنے کے بعد ہم سب سے پہلے اس کی ساری چالاکی نکال دیں گے۔"

"اگر کوئی ملے تو تم کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی تم کو ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" محسن نے سر ہلایا۔

"اچھا اب ان عورتوں سے کہو کہ یہ بھی وہی کریں جو تم نے کیا۔" گروپ لیڈر بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ یہ بھی مسلح ہیں۔"

"یہ... یہ کیا ہو رہا ہے۔" جولی کی ماں نے اچانک ہسٹریا سے مغلوب لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں لکنت تھی اور وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"ہمت سے کام لو... پلیز..." میں نے کہا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ محض خوف کا ڈراما کر رہی ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ صرف بندوق کی نال کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائے۔ اس کی عمر کا بڑا حصہ بہرام دادا کے شانہ بہ شانہ دادِ شجاعت دیتے گزرا تھا۔ وہ تسلیم کر چکی تھی کہ کس طرح وہ چھ افراد کو گولی کا نشانہ بنا چکی ہے جو اسے کمزور عورت سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ میری بات ختم ہونے سے قبل ہی تھوڑا سا ہلی اور پھر بے جان لاش کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

"یہ عورت دل کی مریض ہے۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں... اسے مر جانے دو۔" باہر سے جواب ملا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہوسکتا ہے کہ یہ مکر کر رہی ہو... تم یہ بتاؤ کہ چوتھی عورت کہاں ہے؟"

"چوتھی عورت؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔ اس کی بات سے پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں سکتا ورنہ وہ نام لے کر پوچھتا کہ فلاں کدھر ہے۔"

"ہاں! یہاں چار مرد اور چار عورتیں ہوں گی۔" وہ بولا۔ "ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔" رابعہ اور شہلا نے بھی ایک ایک ریوالور آگے کھسکا دیا۔

"بتانے والوں کو غلط فہمی..."

"ایک عورت اور ایک مرد اگر دوسرے کمرے میں ہیں تو اُن سے کہو کہ سامنے آجائیں ورنہ ان کا حشر بُرا ہوگا۔" وہ بولا۔

"تم ان کا کیا حشر بُرا کرو گے۔" محسن نے اچانک قہقہہ مارا۔ "وہ میاں بیوی باہر گئے ہوئے ہیں۔ تم محسن اور شہلا کو پوچھ رہے ہو، نا؟"

میں ایک بار پھر محسن کے اور اپنے خیالات کی یکسانیت اور سوچ کی ہم آہنگی کا قائل ہوا۔ کچھ لوگ اسے ذہن کی اس برقی رو کی فریکوئنسی کا ایک ہونا کہتے ہیں جو انسان کی کھوپڑی میں دماغ کے فعل کو متحرک کرتی ہے۔ محسن نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ہمیں محصور کرنے والے صرف ہماری تعداد سے واقف ہیں۔ وہ کسی کو صورت سے شناخت نہیں کر سکتے۔

"شہلا امید سے ہے۔ محسن اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کس ڈاکٹر کے پاس؟" وہ بولا۔

"غالباً ڈاکٹر لطیف کے پاس۔" میں نے روانی سے کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محسن نے وہاں جانے کا خطرہ مول نہ لیا ہو... شہر میں سیکڑوں ڈاکٹر ہیں جو اس کو نہیں پہچانتے۔"

"وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا مگر یوں کہ باہر والے بھی سن لیں۔

"تم سب مل کر ایک جھوٹ کو سچ بنا رہے ہو۔" باہر والا بولا۔ "ہم نے صبح سے اپنے آدمی یہاں لگا رکھے تھے۔ انھوں نے کسی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

وہ خود کو احمق ثابت کر رہا تھا۔ صبح کے بجائے وہ دوپہر کہتا تب بھی غلط ہوتا لیکن وہ کہہ سکتا تھا کہ ہم بہت دیر سے دیکھ رہے تھے۔ میرا حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا۔ ایک احمق آدمی زیادہ خطرناک دشمن ثابت نہیں ہوسکتا اور اپنی حماقت کے باعث اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خود ہی کوئی ایسی غلطی کرے گا جس سے ہم فائدہ اُٹھالیں گے۔

"اچھا وہ اندر ہیں تو آ کے انھیں بھی پکڑ لو۔" ٹیڈی نے جھنجلا کے کہا۔

"اپنا مُنہ دیوار کی طرف کرو اور ہاتھ اٹھا کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس نے حکم دیا۔ ہم چند لمحے تذبذب کی کیفیت کا اظہار کرتے جب اس نے پھر دس سیکنڈ کی وارننگ دی اور گننا شروع کیا ہم پلٹے اور مردہ قدموں سے چلتے ہوئے دیوار سے جا لگے رویے سے بے بسی، مایوسی اور اشتعال کا اظہار ہو رہا تھا صرف جولی کی ماں فرش پر بے حس و حرکت پڑی رہ گئی۔ مکمل کا مختصر وقفہ بھی اس حالت میں بہت طویل محسوس ہوا۔ میرے کانوں نے بھاری قدموں کی آہٹ سنی۔

"ان سب کی تلاشی لو۔" گروپ لیڈر بولا۔ "اس بات کا خیال رکھنا کہ سکندر بخت جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ اگر اس نے قابو کر لیا..... تو میں تمھیں بچا نہیں سکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ میں اس کو گولی مار دوں گا۔ گولی تم کو بھی لگ جائے تو میں ذمہ دار نہیں۔"

"بس بس! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" وہی اجڈ شخص بھنّا کے بولا۔

"پھر کتنے بے وقوف ہو؟" محسن نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔ جواب میں اس کی گالی کے ساتھ ہی محسن کو تھپڑ مارنے کی آواز سنائی دی۔ محسن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

"اپنا کام کر..." گروپ لیڈر نے بھی اس کو ایک گالی دے کر کہا لیکن گالی دیتے وقت بھی اس کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ وہ اسی مشینی لہجے میں بولتا رہا۔ "اسی لیے سب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی اور کو ساتھ لے جاؤں۔ تجھ میں برداشت نہیں ہے۔"

میں اپنی باری کا منتظر رہا اور تلاشی لینے والے کو مشتعل کرنے کا کوئی موثر طریقہ سوچتا رہا۔ اگر کسی طرح اس کو مجبور کیا جاسکتا کہ وہ غصے میں بے قابو ہو جائے اور اپنا کام کرنے کے بجائے مجھ سے الجھ جائے۔ اچانک میرے کانوں نے ٹیڈی کے کراہنے کی آواز سنی۔ سر گھما کے دیکھنے پر مجھے ٹیڈی نیچے گرا ہوا نظر آیا۔ دو افراد اُسے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں نے شہلا اور رابعہ کا دہشت سے سفید پڑ جانے والا چہرہ دیکھا اور یہ بھی کہ ہمارے پیچھے دو افراد مشین گن لیے بہت مستعد کھڑے ہیں۔ ان سب نے سر سے پیر تک سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ سیاہ پتلونوں کے پائنچے انھوں نے سیاہ بوٹوں کی سیاہ جرابوں کے اندر کر لیے تھے۔ اوپر سب نے ایک جیسی کالی قمیص پہن لی تھی اور اپنی صورت کو چھپانے کے لیے انھوں نے نائلون کی کالی جرابیں الٹی کر کے سر کی طرف سے چڑھائی تھیں۔ بڑے سائز کی جراب میں پھیل جانے کی بہت گنجائش ہوتی ہے اس کے باوجود پیر کی جراب کو سر پر چڑھانے کے لیے انھیں جراب کے ساتھ زبردستی کرنا پڑی ہوگی۔ اس طرح جراب گردن تک آگئی تھی اور بہت زیادہ کھنچ جانے سے جھلی کی طرح ہوگئی تھی چنانچہ وہ اس کے اندر سے دیکھ سکتے تھے مگر باہر سے ان سب کے چہرے مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ ان کے ناک کان اس جھلی میں سے ابھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے لیکن گردن سے اوپر ان کے سر اور چہرے ایک جیسے لگتے تھے۔ قدرے لمبوترے اور اوپر سے گول۔ سپاٹ اور بے شناخت۔ سب کے سروں پر وسط میں ایک چھوٹا سا گنبد نما ابھار بھی تھا۔ یہ جراب کا آخری حصہ تھا جو پورا پھیلا نہیں تھا اور سر کی ہموار سطح کے ساتھ چپک کر برابر نہیں ہوا تھا۔ اس قسم کے نقاب میرے لیے نئے نہیں تھے۔ میں نے لندن میں قیام کے عرصے میں سر منڈے گوروں کو اسی کم خرچ آسان حاصل نقاب سے صورت چھپا کر ایشیائی اور افریقی باشندوں پر حملہ کرتے اور فرار ہوتے دیکھا تھا۔ کوئی ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ جھلی جیسے نقاب میں ان کے بالوں کے انداز، ان کی رنگت اور صورت کے خدوخال سب چھپ جاتے تھے۔ یہی طریقہ وہاں ڈکیتی کی چند وارداتوں میں بھی استعمال ہوا تھا مگر وہ جہاں اور تھا۔ وہاں کی پولیس اس روپوشی کے باوجود اکثر مجرموں کو ڈھونڈ نکالتی تھی۔

ٹیڈی کو تلاشی لینے والے نے ناک آؤٹ کیا تھا۔ اس کو انھوں نے تھوڑا سا پیچھے لے جا کر ڈال دیا اور محسن کی تلاشی لینے لگے۔ اس بار میں انھیں دیکھتا رہا۔ ایک نے اوپر سے نیچے تک محسن کے کپڑوں پر ہاتھ مارا۔ اور ٹخنوں تک لباس کو یوں ٹٹولا کہ کہیں کوئی سگریٹ لائٹر بھی ہوتا تو اس کے ہاتھ محسوس کر لیتے۔ دوسرے نے محسن کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا اور محسن کوئی آواز کیے بغیر لڑکھڑا کے نیچے گر گیا۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہوا ہے۔ مارنے والے نے بڑی قوت کے ساتھ وار کیا تھا۔ تاہم وہ صرف ضرب کی شدت کو کافی سمجھتا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ صحیح جگہ پر خفیف سی ضرب کا اثر بھی وہی ہوتا ہے جو غلط جگہ پر شدید ضرب کا بلکہ بعض اوقات سخت ترین ضرب سے بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔

جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے دفاع میں کامیابی کے لیے جو کچھ کرنا تھا اس کا انحصار میرے صحیح ذہنی اور جسمانی ردِعمل پر تھا۔ تلاشی کا عمل پورا ہوا تو میں سر پر چوٹ کھانے کے لیے تیار تھا۔ اگر میں گردن اکڑا لیتا تو چوٹ زیادہ سخت پڑتی اور میں خود کو بچانے کے لیے سر جھکاتا تو وہ ایک کی جگہ دو مرتبہ وار کرتا۔ اور دوسری بار جھنجلاہٹ میں زیادہ طاقت سے مارتا۔ میں نے ضرب کو سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ جھیلنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ذرا دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور دیوار میرے سامنے لہرا کے غائب ہوگئی۔ میں نے کھڑے رہنے کی ناکام کوشش کی۔ زمین تو میرے قدموں کے نیچے سے جیسے غائب ہو چکی تھی۔ میں گرتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا۔

نیم بے ہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا لیکن اس نے مجھے کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی میں مختلف آوازیں سن کر ان کا مطلب سمجھنے کے قابل تھا۔

"کیا سب کا ڈھیر لگاتے جاؤ گے؟" روبوٹ بولا۔ "جاؤ پہلے ان کو ٹرک میں ڈال دو۔"

"باہر سے ان دونوں کو بھی بلا لو۔"

"نہیں... ایک ٹرک میں ہے۔ ایک کا باہر رہنا بھی ضروری ہے۔ کہیں وہ دونوں میاں بیوی نہ آجائیں۔"

"ایک کو ایک اٹھا کے ٹرک تک نہیں لے جاسکتا..."

"تو دونوں مل کے لے جاؤ۔"

"پھر تم یہاں اکیلے رہ جاؤ گے!"

"میری فکر مت کرو۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ میں دو عورتوں سے نہیں نمٹ سکتا۔" روبوٹ نے کہا۔ "آخر تم بار بار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ یہاں تم میرے حکم کی تعمیل کے لیے آئے ہو۔ مجھ سے بحث کے لیے نہیں۔ لیڈر میں ہوں۔"

"لیڈر... اونہہ..." تمسخر اور حقارت آمیز لہجہ اور مجبوری۔

میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھنا چاہا لیکن میں غلط رُخ پر گرا تھا۔ میں دونوں آنکھیں کھول کر دیکھتا تب بھی مجھے اپنے مقابل دیوار ہی نظر آتی۔ پیچھے دیکھنے کے لیے میرا سر کو گھمانا ضروری تھا لیکن میں ذرا بھی حرکت کرتا تو وہ ہوشیار ہو جاتے۔ چنانچہ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ ایک وقت ایسا آیا جب میرے اندازے کے مطابق کمرے میں صرف روبوٹ تھا۔ باقی دونوں محسن کو اٹھا کے باہر لے گئے تھے۔ آخر کیتھرین اس موقع سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتی؟ میں نے سوچا۔ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔ وہ اس ایک آدمی کو شوٹ کر سکتی ہے۔ غالب کیوں دبکا ہوا ہے! اس وقت وہ بھی روبوٹ سے ہتھیار رکھوا لے تو باقی دو کو بھی اندر لوٹ کر آتے ہی ہینڈز اپ کرایا جاسکتا — یہ وقت گزر جائے گا تو وہ غالب کو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ وہ چھلاوا تو ہے نہیں کہ نظر سے اوجھل ہو جائے۔ غالب اور کیتھرین نے پھر بھی ہمیں کیا اور دوسرے چکر میں وہ ٹیڈی کو لے گئے۔ پانچ منٹ میں وہ پھر آئے۔ ان میں سے ایک نے میرے دونوں ہاتھوں کے نیچے مجھے بغل میں ہاتھ دے کر اٹھایا۔ دوسرے نے ٹانگوں کو پکڑ کے۔

ٹرک عام قسم کا مال بردار ٹرک نہیں تھا۔ یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک تھا جس کے پیچھے لمبا سا ٹریلر تھا۔ اس کے اوپر فولادی چادروں سے بنا ہوا بیس فٹ لمبا دس فٹ چوڑا اور دس فٹ اونچا باکس کنٹینر رکھا ہوا تھا۔ یہ اسٹینڈرڈ سائز کے کنٹینر ایسے ساز و سامان کی نقل و حرکت میں استعمال ہوتے ہیں جس کے بارش یا دھوپ میں خراب ہونے کا اندیشہ ہو اور جس کو زیادہ حفاظت کے ساتھ پہنچانا مقصود ہو۔ بیرونِ ملک سے اس قسم کے کنٹینر بحری جہازوں پر کرین سے اُٹھا کے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جاتے ہیں اور مال بردار جہاز جب بندرگاہ پر پہنچتے ہیں تو انھیں کرین جہاز پر سے اُٹھا کے اسی طرح ٹرک کے ٹریلر پر رکھ دیتی ہے جو اُن کو سڑک کے راستے اندرونِ ملک پہنچا دیتے ہیں بظاہر ہے یہ باکس انتہائی مضبوط ہوتے ہیں اور اس طرح مقفل کیے جا سکتے ہیں کہ کسی بھی جگہ کوئی انھیں آسانی سے نہ کھول سکے۔

دیو ہیکل باکس کی سائڈ کا ایک دروازہ نیچے گرا ہوا تھا اس دروازے کو بند کرنا مقصود ہو تو اوپر اٹھا کے برابر کر دیتے ہیں اور ایک انچ موٹی لوہے کی سلاخ کو کھسکا کر کئی سوراخوں میں سے گزارنے کے بعد تین چار جگہ ایسے قفل سے روک دیتے ہیں کہ باکس تقریباً سیل ہو جاتا ہے۔ تالے بھی عام تالے نہیں ہوتے۔ ان سب کو توڑے بغیر سلاخ ایک سوت نہیں ہلتی اور جب تک پوری سلاخ دروازے کے سامنے سے نہ ہٹ جائے پٹ نیچے نہیں گرتا۔ مجھے بھی اس کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا گیا۔ کچھ کرنے کی خواہش کو میں نے بڑی مشکل سے دبا رکھا تھا۔ صرف اس امید میں کہ غالب اور کیتھرین کے ذہن میں جو بھی پروگرام ہے وہ میری جلد بازی کے باعث ڈسٹرب نہ ہو۔

فرش پر گرنے سے مجھے چوٹ تو آئی مگر میں برداشت کر گیا اور جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اس کمرے سے بڑے باکس کے اندر بھی کوئی شکاری ضرور ہوگا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے تو اتنے کم اندیش اور غیر محتاط کیسے ہو سکتے تھے کہ پہلے سب کو گرفتار کریں اور پھر نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں۔ میں سر اٹھا کے محسن یا ٹیڈی کو آواز دینا چاہتا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ بھی میری طرح بے ہوش بنے تو نہیں پڑے ہیں مگر میں اسی نادیدہ محافظ کے ڈر سے نہیں بولا جو میرے خیال کے مطابق اندر موجود تھا۔ غالباً یہی احتیاط محسن اور ٹیڈی بھی کر رہے تھے۔ اب تک جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے مطابق کم سے کم سات شکاری اس مہم کے لیے بھیجے گئے تھے۔ چار اندر آئے تھے۔ ایک ٹرک ڈرائیور اور ایک وہ جو باہر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کنٹینر کے اندر والا ملا کے سات۔ ان کی تعداد زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ معلوم ہو دشمن کے قلعے کو سر کرنے کے لیے فوج کشی مطلوب تھی۔

پہلا فائر ہوا تو میں اچھل پڑا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑے بے ہنگم طریقے پر چلایا اور میں نے آواز پہچان لی۔ یہ وہی اُجڈ اور اکھڑ شخص تھا جسے گروپ لیڈر یعنی مشینی لہجے میں بات کرنے والا روبوٹ بار بار فہمائش کرتا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا اور دوسرے شخص نے چیخ کے کہا۔ "میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی رابعہ کے چلانے کی آواز نے مجھے احتیاط کے سب تقاضے نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا۔

"محسن... ٹیڈی..." میں نے سر اٹھا کے کہا۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں میرے سر کے اوپر دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ اس فولادی ہال میں فائر کی آواز نے بڑی گونج پیدا کی۔ گولیاں ایک تاریک گوشے سے چلائی گئی تھیں جہاں میرے اندازے کے مطابق کوئی ریوالور لیے دبکا کھڑا تھا۔ میں نے سر کو ایک لمحے کے لیے نیچے کیا اور دوسرے لمحے بجلی کی طرح اٹھتے ہوئے باہر کود گیا۔ اندر کھڑا ہوا محافظ اس ایک لمحے میں تھوڑا سا مطمئن اور غافل ہو گیا تھا کہ میں اتنی جلدی دوبارہ سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کروں گا۔

میں زمین پر گرا اور ایک دم پلٹ کر ٹرک کے بھاری بھرکم اور بڑے بڑے پہیوں کے درمیان کی جگہ میں گھس گیا۔ میرا محافظ شاید دوڑ کر دروازے تک آیا تھا۔ جتنا وقت مجھے باہر گرنے میں لگا تھا اتنا ہی اسے پھر مجھے زد پر لینے میں صرف ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی میں نے پلٹا کھایا یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ ایک سیکنڈ کے سوویں یا ہزارویں حصے کے فرق نے مجھے نشانہ بننے سے بچا لیا اور گولیاں وہاں زمین میں پیوست ہو گئیں جہاں میں گرا تھا۔ میرے کانوں میں رابعہ کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے اپنے خالی ہاتھ ہونے کا افسوس ہوا، ورنہ وہ دونوں بدمعاش جو رابعہ کو ڈھال بنائے لا رہے تھے میرے سامنے تھے۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ اس ٹرک کے نیچے بھی میں محفوظ ہوں اور جیسے ہی اندر سے فائرنگ کرنے والا بتائے گا کہ ایک قیدی نکل کر ٹرک کے نیچے چھپ گیا ہے، باقی شکاری مجھے ہر طرف سے فائرنگ کر کے مار ڈالیں گے یا بہ آسانی نکال لیں گے۔ میرے پاس ایک ریوالور ہوتا تو میں اس محفوظ مورچے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رابعہ اور شہلا کے زخمی ہونے کا خیال کرتا تو ان پر گولی نہ چلاتا مگر اس ٹرک کے اگلے ٹائر برسٹ کر دیتا یا ڈیزل ٹینک میں سوراخ کر دیتا اور ان کے فرار کو ناممکن کر دیتا۔ ٹرک کے ٹائر اتنے بھاری اور موٹے تھے کہ عام کیل سے ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ میرے پاس خنجر بھی ہوتا تو بے کار تھا۔ ہر پہیے میں ڈبل ٹائر ہونے کے باعث ایک دو ٹائروں کے فلیٹ ہونے سے فرق بھی نہ پڑتا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ آزاد رہ کر میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اور آزادی کے لیے مقابلے کا امکان نہیں تھا، فرار کے راستے ابھی کھلے ہوئے تھے۔

میں ٹرک کے عقبی حصے کے نیچے سے نکلنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ ٹرک کے اندر سے محافظ نے چلا کے کہا۔ "ایک سُور کا بچہ بھاگ گیا۔"

"کیسے بھاگ گیا...؟" باہر سے کوئی گالی دے کر اور چیخ کر بولا۔ "تو کیا سو گیا تھا۔ بے ہوش آدمی پر نظر نہیں رکھ سکا۔"

"وہ بے ہوش نہیں تھا... تم دونوں اُلو کے پٹھے اور بے وقوف ہو جو ایسا سمجھتے تھے۔" وہ اوپر سے بولا۔ "دیکھو اسے، وہ نیچے گھسا تھا۔"

تُو نے پاؤں میں مہندی لگا رکھی تھی۔" نیچے سے دوسرے نے اُسے زیادہ گندی گالی دے کر کہا۔

"میں نیچے اُترتا تو تیرے یہ دونوں باپ بھی بھاگ جاتے۔" اوپر والے نے گالی کا جواب گالی سے دیا۔ "ان دونوں کو اندر ڈالو اور اسے نکالو۔"

رابعہ کی خاموشی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی بے ہوش ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے۔ چند سیکنڈ کے اس وقفے میں جو ٹرک کے فولادی ڈھانچے کی پناہ میں گزرا، مجھے یہ بھی سوجھی تھی کہ میں کسی بھی قریب آنے والے کو ٹانگ پکڑ کے اندر گھسیٹ لوں اور اس سے ریوالور چھین لوں مگر اس میں کامیابی کے امکانات بہت کم اور خطرات بہت زیادہ تھے۔ یہ ضروری تھا کہ آنے والا اتنا قریب آ جائے کہ میرے دونوں ہاتھوں کی دسترس میں ہو۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ میرے ہاتھ اس کے ٹخنوں سے اوپر کے حصوں کو صحیح طرح گرفت میں لے سکیں اور آخری بات یہ ضروری تھی کہ میں اسے اتنی قوت کے ساتھ جھٹکا دے سکوں کہ وہ سر کے بل گرے اور سیدھا اندر کھنچا چلا آئے۔ ٹرک کے نیچے میری نقل و حرکت کی صلاحیت بہت محدود تھی۔ ہر طرف کیل کانٹے تھے اور میں سیدھا بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایسی حالت میں میری کوشش کا انجام ناکامی ہوتا تو بعد کے نتائج زیادہ بھیانک نکلتے چنانچہ میں نے زیادہ سے زیادہ دُور جانے کا فیصلہ ٹھیک ہی کیا تھا۔

ابھی غالب اندر تھا اور ایک شکاری بھی باہر نہیں آیا تھا جو غالباً وہی روبوٹ گروپ لیڈر تھا۔ ابھی تک انھوں نے ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی تھی اور صرف مشینی لہجے میں بولنے والا ہی آواز بدل کے بات نہیں کر رہا تھا، باقی سب بھی اصل آواز میں گفتگو نہیں کر رہے تھے۔ انھیں اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے مفصل اور واضح ہدایات دی گئی تھیں جن پر وہ پوری طرح عمل پیرا تھے مگر اُن کے طرزِ عمل نے بہت سے راز کھول دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اجنبی تھے اور ہم میں سے کسی کو پہچانتے نہیں تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا تھا کہ وہ نئے شکاری تھے یا انھیں اس مہم پر بھیجنے والوں نے ایسے افراد کا انتخاب کیا تھا جو پیشہ ور بدمعاش نہیں تھے۔ مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پکڑے جائیں تو پولیس کے پاس ان کا کوئی ریکارڈ نہ ہو اور وہ کسی کا نام نہ بتا سکیں۔ نہ دلاور اینڈ کمپنی کے کسی رکن کا اور نہ ہمارا... انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ہمیں کس لیے اٹھوایا جا رہا تھا۔ اس بار شکاری محتاط تھے۔ ان میں سے کوئی شہر کے کسی نئے بدمعاش کے پاس پہنچا ہوگا اور اس کے سامنے ایک لاکھ روپے رکھے ہوں گے کہ سوال جواب کوئی نہیں۔ فلاں جگہ اتنے لوگ ہیں۔ انھیں جیسے چاہو اُٹھا لاؤ اور فلاں جگہ پہنچا دو۔ پہنچا دو گے تو دو لاکھ یا تین لاکھ اور ملیں گے۔ نہ لا سکے اور پکڑے گئے تو تمھاری قسمت۔ تم سے ایک لاکھ کوئی واپس نہیں مانگے گا لیکن بچانے کے لیے بھی کوئی سامنے نہیں آئے گا۔ تم خود بتاتے رہنا کہ تم نے جو کچھ کرنے کا سوچا تھا اس کا مقصد کیا تھا۔ پولیس کے سامنے ذمے دار ہمیں ٹھہرانا بے کار ہوگا کیونکہ تم ہمارا نام پتا ٹھکانا کچھ جانتے ہی نہیں اور پولیس یہ عذر قبول نہیں کرتی کہ تم کوئی جرم کسی کے کہنے پر کر رہے تھے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب مجرم فرضی نام لیں۔ اس نئے بدمعاش کے لیے ایک لاکھ بہت تھے اور یہ اس کے لیے خود کو بڑا بدمعاش ثابت کرنے کا چیلنج تھا۔ حقیقی معنوں میں بڑا بدمعاش بننے کے کیریئر کے آغاز کا پہلا سنہرا موقع... ایک لاکھ کا جُوا... ہار گئے تو وہی جیل جو اس کیریئر کی ٹریننگ اکیڈمی ہے اور چھوٹے بدمعاش کو بڑا بدمعاش بننے کے لیے وہاں سے پاس آؤٹ کرنا ہی پڑتا ہے۔ نہ پکڑے گئے تو مزید تین لاکھ۔ کیریئر کا پہلا بڑا منافع بخش ٹھیکہ جس سے گڈوِل قائم ہو گی اور مستقبل میں شہرت اور کامیابی کے نئے راستے کھل جائیں گے۔ اس نئے بدمعاش نے چانس سے فائدہ اٹھانے کے لیے یارانِ کہن سے مشاورت کی اور چند حوصلہ مند ساتھیوں کو گروپ بنانے اور اسے گروپ لیڈر تسلیم کرنے کی ضرورت اور افادیت کا قائل کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں ابھی ڈسپلن کا فقدان تھا اور پرانے تجربہ کار لوگوں کی طرح منصوبہ بندی کرنے اور سکون کے ساتھ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت کی کمی تھی۔

یہ سب وہ خیالات تھے جو اُن حملہ آوروں کے آنے کے بعد سے اب تک کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں آئے تھے۔ اس تمام عرصے میں جب میں مصروفِ عمل تھا، میرا ذہن اپنے طور پر حقائق کو جمع کرنے اور نتائج اخذ کرنے میں مصروف تھا۔ ٹرک کے نیچے سے نکلتے وقت بھی میں نے مجموعی صورتِ حال کو فراموش نہیں کیا تھا اور احتیاط ہر لمحہ مجھے ملحوظ رہی تھی چنانچہ آگے سے نکلنے کے بجائے میں نے پیچھے کا راستہ منتخب کیا تھا۔ آگے میری معلومات کے مطابق ایک ڈرائیور موجود تھا اور میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسلح نہیں ہوگا۔ اگر میں سامنے سے نکلتا تو کیتھرین کی گاڑی سامنے تھی اور میں ایک جست میں اس گاڑی کے پیچھے پہنچ جاتا لیکن یہ ناممکن تھا کہ میں اس گاڑی کو اسٹارٹ کر کے نکل جاتا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ گاڑی تباہ ہو جاتی جس کی طرف ابھی ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔

میں پیچھے والے دونوں ٹائروں کے بیچ میں سے نکلا تو اندر سے رابعہ کو لانے والے ٹرک کے دونوں طرف نیچے جھکے ریوالور نکالے ایک ہی بات کو بار بار دُہرا رہے تھے۔ "تم چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ خیریت چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ۔" ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ گالیاں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہے تھے۔ رالیہ کو غالباً وہ اندر پھینک چکے تھے۔ میں پیچھے بھی زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ بالآخر ان میں سے کوئی چکر لگاتا ہوا پیچھے بھی آ سکتا تھا۔ وہ فائر کرنے سے گریز کر رہے تھے کیونکہ انھیں گولی کے کسی ٹائر میں لگ جانے کا ڈر تھا۔ نقصان زیادہ بھی ہو سکتا تھا اگر گولی سے ڈیزل یا آئل ٹینک میں سوراخ ہو جاتا، بریک لائن یا فیول لائن کٹ جاتی۔

اچانک میری نظر نے لوہے کی اس سیڑھی کو دیکھا جو ٹرک کی باڈی کے پچھلے حصے کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ اس ٹریلر میں اوپر سامان نہیں رکھا جاتا کیونکہ اوپر کی سطح بالکل ہموار تھی اور اس کے کناروں پر کسی قسم کی روک بھی نہیں تھی۔ سیڑھی لگانے کا بظاہر کوئی مقصد نہیں تھا سوائے اس کے کہ کبھی کبھار اوپر سے صفائی مقصود ہو تو چڑھا جا سکے۔ میں نے سیڑھی کو اپنی ہنگامی ضرورت کے لیے تائیدِ ایزدی جانا اور اوپر چڑھ گیا۔ کنٹینر کی چھت زمین سے پندرہ فٹ تو یقیناً اونچی تھی۔ اس کے اوپر چھ فٹ کا آدمی کھڑا رہ کے کیسے چھپا رہ سکتا تھا چنانچہ میں بالکل وسط میں لیٹ گیا اور سرکتا ہوا آگے بڑھا۔

"وہ نیچے نہیں ہے...." کسی نے چلا کے کہا۔

"اور کہاں جا سکتا ہے۔ نیچے ہی ہوگا... آنکھیں کھول کے دیکھو۔"

"تیری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں... جب وہ بھاگا تھا..." دوسرے نے مشتعل ہو کے گالی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ کسی اور طرف نکل گیا اور تجھے پتا نہیں چلا... ابھی اپنے باپ کو جواب دینا۔"

"کیا شور ہے یہ؟" مشینی لہجے والا روبوٹ اندر سے برآمد ہوتے ہوئے بولا۔ "کون نکل گیا؟" باقی نے اس کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس محافظ کی غفلت نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا تھا وہ زیادہ قصوروار سمجھا جا رہا تھا حالانکہ جس طرح میں جان ہتھیلی پر رکھ کے کودا تھا اس کو میری بے وقوفی یا خوش قسمتی کچھ بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ اس محافظ کی جگہ کوئی دوسرا یا خود گروپ لیڈر بھی ہوتا تو صورتِ حال مختلف نہ ہوتی۔ اب الزام کے جواب میں الزام لگا کے وہ سب خود کو بچانے میں لگے ہوئے تھے اور مجھے بھولے ہوئے تھے۔ میں نے آہٹ کیے بغیر آگے کھسک کر کنارے سے سر نکالا اور پیچھے جھانکا۔ گروپ لیڈر ان سب کو ایک جیسی گالیاں دے رہا تھا۔ ایک معمولی سے حادثے نے ان کو بدحواس اور پریشان کر رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر غالب اور کیتھرین کا کیا بنا۔ وہ ابھی تک باہر نہیں آئے تھے۔

ان کا ایک ساتھی غالباً مارا جا چکا تھا۔ اس کی چیخ سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور گولی یا غالب چلا سکتا تھا یا پھر کیتھرین چلا سکتی تھی۔ دوسری گولی کا نشانہ آخر کون بنا تھا؟ دل کے وسوسے کہتے تھے کہ انھی دونوں میں سے ایک اپنی جرأت مندی کا خمیازہ بھگتا۔ دوسرا فائر بھی انھوں نے کیا ہوگا اور دشمن اس کا نشانہ ہوتا تو مجھے ایک آدمی کم نظر آتا یا زخمی ضرور دکھائی دیتا۔ اگر وہ دونوں اندر تھے تو کیا ان میں سے ایک مر چکا تھا۔ کون مر چکا تھا؟ کیتھرین نے اچانک اٹھ کر ایک کو نشانہ بنا لیا تھا اور دوسرے کا نشانہ بن گئی تھی۔ یا غالب ایک کو مار کے باہر آنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ پہلی صورت زیادہ امکانی تھی... کیونکہ کیتھرین اتنی دیر تک ساکت و صامت نہیں پڑی رہ سکتی تھی۔ اس سے امید بھی بندھتی تھی کہ غالب محفوظ ہے اور شاید ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے سامنے آنے سے گریز کر رہا ہے۔ وہ عین وقت پر نمودار ہو کے ان کے پروگرام کا ملبہ کر دے گا لیکن اس سے ناامیدی کا جو احساس پیدا ہوتا تھا، وہ زیادہ دل شکن اور دل آزار تھا۔ کیتھرین کو مرنا نہیں چاہیے۔ اگر وہ مر گئی تو پھر جولی بھی مر جائے گی۔ ایسے وقت میں جب زندگی سے مایوس جولی کے لیے جینے کے اسباب پیدا ہو گئے تھے اور دستِ غیب نے اس کے لیے حیاتِ نو کے فرمان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی، جولی کا بے سہارا ہو جانا ہی اس کی موت تھا... نہیں... قدرت اس کے ساتھ اتنا سنگین مذاق نہیں کر سکتی۔

"تم سب گدھے ہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ "وہ بھوت یا چھلاوا نہیں تھا آدمی تھا۔ اب اس بحث سے کیا فائدہ کہ وہ کس کی غلطی سے نکلا۔ وہ یہیں ہوگا۔ تلاش کرو اسے... دوسری گاڑی میں دیکھو۔ اس گھاس میں دیکھو۔ یہ گدھے گھوڑے کیسے کھڑے ہیں یہاں... ریڑھا کیوں موجود ہے؟"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" آگے سے آواز آئی اور میں نے پہلی بار ڈرائیور کی موجودگی کا یقین کیا ورنہ اب تک وہ ایک مفروضہ تھا۔

"تم کچھ مت کرو... ہاتھ پہ ہاتھ رکھے تماشا دیکھتے رہو۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے رہو۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی نروس ہونے لگا تھا اور اس کا مصنوعی سیلف کنٹرول ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"خود تم نے ہی کہا تھا کہ تمھارا کام بالکل تیار رہنا ہے تاکہ روانگی میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ ہو۔" ڈرائیور خفگی سے بولا۔

"اچھا اس ٹرک کو آگے بڑھا دو۔ وہ نیچے ہوگا تو مرے گا یا نکلے گا۔"

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ میں کس طرح ان بدمعاشوں کی بدمعاشی ختم کروں۔ وہ مسلح تھے اور تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ پھیلے ہوئے تھے۔ اگر وہ ایک ہی جگہ ہوتے تو میں اوپر سے چھلانگ لگا دیتا۔ ایک کو گرتے گرتے گرا دیتا اور باقی کو سنبھلنے سے پہلے بے دست و پا کر دیتا۔ چند سیکنڈ کی جنگ میں کود کر دشمن کی قوت کو ختم کرنے کا خطرہ بھی مول

لیا جا سکتا تھا لیکن اسی صورت میں کہ کامیابی کے امکانات واضح نظر آتے ہوں۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں نے سوچا کہ اب مجھے اوپر ہی قیام کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر یہ ٹریلر کہاں جاتا ہے۔ جو بات ابھی تک میری عقل میں نہ آ سکی تھی وہ یہی تھی کہ آخر کس عقل مند نے ان لوگوں کو یہ ٹرک استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کی رفتار ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔ اسے تنگ راستوں اور تمام سڑکوں پر سے نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ چند سڑکیں ہیوی ٹریفک کے لیے ممنوعہ علاقہ تھیں۔ کچھ ایسے پل بھی تھے جن پر سے ایک مخصوص سائز اور وزن سے زیادہ کی گاڑیاں گزارنا منع تھا۔ اس چلتے پھرتے پہاڑ کو چھپانا مشکل تھا لیکن اس کا سراغ لگانا اور تعاقب کرنا بہت آسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی عام تیز رفتار ٹرک یا ویگن ہوتی تو زیادہ کارآمد ثابت ہوتی۔ یہ صرف آٹھ افراد کی منتقلی کا مسئلہ تھا۔ اس میں دو کاریں بھی استعمال کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ کنٹینر کس لیے جس میں سینٹرل جیل کے سارے قیدی ایک ہی پھیرے میں منتقل کیے جا سکتے تھے۔

ٹرک آگے بڑھا تو میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور میری نگاہ نے ایک ربر کی نلکی دیکھی جو کنٹینر کی سپاٹ چھت میں ایک روشندان ٹائپ سوراخ میں سے اندر چلی گئی تھی۔ یہ روشندان اس قسم کا تھا کہ چھت پر پڑنے والی بارش یا دھوپ کا اندر گزر نہ تھا لیکن ہوا کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔ اس قسم کے روشندان اور بھی تھے اور ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ کبھی اس ہال جیسے کنٹینر میں مویشی لے جانے پڑیں تو انھیں تازہ ہوا ملتی رہے۔ یا بفرضِ محال اندر انسان ہوں تو زندہ رہیں۔

میں نے نلکی کو کھینچنا چاہا مگر وہ چھت کی سطح کے نیچے کہیں مضبوطی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا سرا مجھے ٹریلر کے آگے ٹرک کو چلانے والے حصے میں ڈرائیور کیبن کے اوپر تک جاتا نظر آیا۔ کیبن کے اوپر مختصر سا جنگلا لگا ہوا تھا۔ اور اس پر دوسرے فاضل ٹائر کے علاوہ بھی کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ نلکی وہیں لپیٹے ہوئے ایک سلنڈر سے ملتی تھی۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے کسی بھی ٹرک، بس یا ویگن پر اس قسم کا کوئی نظام پہلے نہیں دیکھا تھا اور اس کی ضرورت بھی مشکوک تھی۔ ہر فاضل نظر آنے والا پرزہ بھی اگر گاڑی کے لیے ضروری ہو تو وہ ایسی جگہ نصب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آگ بجھانے والا آلہ بھی نہیں تھا جو ہمیشہ اندر ڈرائیور کی دسترس میں رکھا جاتا ہے۔

سلنڈر کا رنگ بھی زرد اور سرخ تھا اور اس پر سفید دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے قریب سے دیکھا تو اس پر مجھے سفیدی کے نیچے بھی سیاہی کی جھلک نظر آئی۔ اس پر خطرے کا نشان تھا۔ جس کو سفید پینٹ کے نیچے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی مگر ایک کاسۂ سر کے ساتھ دو ہڈیاں کراس کی صورت میں نظر آ جاتی تھیں۔ قدرتی طور پر مجھے خیال آیا کہ اس میں پہلے کوئی زہریلی گیس تھی۔ مگر زہریلی گیس کے سلنڈر کو کسی دوسری بے ضرر گیس کے لیے استعمال کرنے کی وجہ کوئی نہیں ہو سکتی اور ایسی کون سی گیس ہے جو کسی گاڑی میں یوں رکھی جائے۔ اس میں اب بھی وہی زہریلی گیس ہوگی۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اس کا مقصد یہی ہوگا کہ کسی بھی وقت زہریلی گیس کے سلنڈر کو کھولا جائے تو گیس فولادی کنٹینر میں داخل ہونے لگے۔ کوئی بھی گیس جو ہوا سے بھاری ہوگی، وہ نلکی کے راستے نیچے اتر جائے گی اور سانس لینے والوں کے پھیپھڑوں میں پہنچ جائے گی اور وہ کنٹینر ایک گیس چیمبر بن جائے گا۔ کسی قسم کی مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور زہریلی گیس سونگھنے والے بے ہوش ہو جائیں گے یا مر جائیں گے۔

اس تصور نے ہی مجھے لرزا دیا کہ میرا اور میرے ساتھ پوری ایم آر ایس کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک بات قبل از وقت دریافت کر لی تھی۔ اب اس موت کے سامان کو غیر مؤثر بنانا ضروری تھا۔ پہلے میں نے نلکی کو کھینچ کر سلنڈر سے جدا کرنے کا سوچا لیکن اس طرح تو جو بھی سلنڈر کا والو کھولنے آتا اسے فوراً معلوم ہو جاتا کہ ٹیوب الگ ہے اور وہ اسے پھر جوڑ دیتا۔ میں نے آہٹ کیے بغیر اوپر کے سامان میں کوئی ایسی چیز تلاش کی جس سے ربر کی نلکی کاٹی جا سکے لیکن وہاں ایسی کوئی بھی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہونے لگا تھا کہ مجھے جنگلے کا کنارا دکھائی دیا۔ ربر پائپ کو اس کے اوپر رگڑنے سے کام بننے کی امید تھی۔ میں نے پائپ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے جنگلے پر دبایا اور اس طرح رگڑا کہ کیبن میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو حرکت کا ارتعاش بھی محسوس نہ ہو۔ کند نظر آنے والا کنارہ خلافِ توقع بہت جلد پائپ کو ادھیڑنے میں کامیاب رہا۔ پائپ کا ربر بھی نرم تھا۔ دو منٹ میں ربر اتنا کٹ گیا کہ میں نے دونوں طرف سے اسے انگلیوں میں دبا کے کھینچا اور پائپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے ان کو وہیں ساتھ ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اوپر آ کے سلنڈر کی چابی گھمانے والا ایک نظر میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ گیس لائن درمیان میں سے منقطع ہے۔ گیس فضا میں منتشر ہو جائے گی اور انھیں اس وقت پتا چلے گا جب سلنڈر خالی ہو چکا ہوگا۔

دریں اثنا وہ مجھے ہر طرف تلاش کرنے والے ناکامی کا اعتراف کر چکے تھے۔ تاہم روبوٹ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میں پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔

"اندر باہر سب جگہ تم لوگ موجود تھے۔" وہ بولا۔ "تم نے صرف اس کو باہر چھلانگ لگاتے اور ٹرک کے نیچے گھستے دیکھا تھا۔ نیچے سے وہ نکلا نہیں تو پھر کہاں گیا؟"

"اوپر۔" ایک بے وقوف نظر آنے والے نے اچانک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وہ بات کہہ دی کہ وہ سب چونکے۔ میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو وہ سب مجھے دیکھ لیتے جن کے سر خود بخود اوپر اٹھ گئے تھے۔

"یہ ٹھیک ہے... اوپر دیکھو۔" روبوٹ بولا۔ "باقی سب ذرا ہٹ کر گھیرا ڈال لو۔"

اس کی بات نے مجھے نروس کر دیا۔ اب میرے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی پوزیشن تھی۔ تین میں سے دو ٹریلر کے ایک جانب کھڑے ہو گئے۔ روبوٹ دوسری طرف رہا۔ اور چوتھے نے نیچے سے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے ایک کنارے پر ہو کے ادھر دیکھا جہاں سے ایک مسلح شخص نمودار ہونے والا تھا۔ دوسری نظر نیچے ڈالی جہاں روبوٹ ٹریلر سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر قدم جمائے کھڑا تھا اور پھر جسم کو تول کر جست لگا دی۔

گروپ لیڈر کی نگاہ اوپر ہوتی تو شاید وہ ہٹ جاتا مگر وہ اپنے اوپر جانے والے ساتھی کی طرف متوجہ تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اتنا وقت بھی نہ رہا تھا کہ وہ سنبھل پاتا یا ریوالور کام میں لاتا۔ میں اس کے ساتھ ہی گرا۔ اس نے چلا کر کسی کو آواز دی اور مجھے دھکیلنا چاہا مگر موت کے روبرو میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے اسی مشینی لہجے میں بولنے والے کو زمین بوس کرنے اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے میں تیس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔ اس کی آواز نے سب سے پہلے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا مگر وہ خاصی بلندی پر کیبن میں فٹ تھا۔ یہی پوزیشن اس شخص کی تھی جو اب کنٹینر کی چھت پر نظر ڈال رہا تھا اور سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ اوپر ہوتا تو مجھے براہ راست نشانہ بنا لیتا۔ اسے اور ڈرائیور کو نیچے اترنے میں کچھ وقت لگا اتنا ہی وقت دوسری طرف کھڑے ہوئے دو افراد کو گھوم کر آنے میں لگا۔ مگر یہی مختصر ترین مہلت میرے لیے زندگی کی ضمانت بن گئی۔ میں پھر ٹرک کے نیچے گھس گیا۔ جہاں سے پہلا فائر میں نے ڈرائیور پر کیا۔

ڈرائیور اپنی جگہ پر گھوم گیا۔ گولی نے اس کے سینے پر زخم کھول دیا تھا۔ وہ منہ پھاڑ کے چلایا اور نیچے گر گیا لیکن اس کے بعد مجھے مہلت نہ ملی۔ باقی تین نے ٹائروں کے پیچھے رہتے ہوئے اپنے ریوالوروں کا رخ میری طرف کر دیا۔

"باہر نکل آؤ۔ اپنا ریوالور وہیں چھوڑ دو۔" روبوٹ نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تم کو شوٹ نہیں کر سکتا، ورنہ اب تک اس ریوالور کی ہر گولی تمہارے جسم میں اتر گئی ہوتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارے ہاتھوں مرنا قبول کر لوں گا مگر تم کو نہیں ماروں گا۔"

میں نے مقابلہ بے سود سمجھا۔ کھلی جگہ پر میں ان تینوں سے نمٹ سکتا تھا مگر یہاں مقابلہ آتشیں اسلحے کا تھا اور میں تین طرف سے گھرا ہوا تھا۔ میری مایوسی کی دوسری وجہ غالب اور کیتھرین کا خیال تھا۔ ابھی تک مجھے امید تھی کہ غالب کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا لیکن آہستہ آہستہ میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس قابل ہی نہیں۔ وہ زخمی پڑا ہے اور شکاری جانتے ہیں کہ وہ خود ہی مر جائے گا۔ شاید اب تک مر چکا ہوگا۔ پھر کیتھرین رہ جاتی تھی۔ وہ بھی بہت کچھ کر سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی بے ہوشی ڈرامہ ہے مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بہادری کی ساری داستانیں، جرأت مندی اور بے خوفی کے سارے دعوے اور عزم و حوصلے میں بہرام دادا جیسے مرد سے کم نہ ہونے کی باتیں وقت آنے پر جھوٹی ہو گئی تھیں۔ تھی وہ عام عورت بلکہ عام عورت کے مقابلے میں زیادہ کمزور۔ رابعہ نے حواس برقرار رکھے تھے لیکن وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید بعد میں اس سے بھی ریوالور لے لیا گیا ہوگا اور اس کی بے ہوشی کو ابدی نیند میں بدل دیا گیا ہوگا۔ اب میرا ذہن قائل ہو رہا تھا کہ پہلا فائر غالب نے کیا اور اس اُجڈ آدمی کو ختم کر دیا جو سب سے زیادہ جارحانہ رویہ رکھتا تھا۔ پھر کسی نے جواب میں گولی چلائی اور غالب کو مار دیا۔ فائر دو ہی ہوئے تھے۔ ایک سے دشمنوں کے ایک ساتھی کا مارا جانا ثابت ہوتا تھا۔ دوسرے فائر سے غالب اور کیتھرین میں سے ایک مارا گیا تھا تو یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ ایک گولی چلا کے دشمنوں نے بے ہوش پڑی ہوئی کیتھرین کو ختم کیا تھا اور غالب ابھی تک چھپا بیٹھا تھا۔ میرے ذہن میں ایک جگہ ایسی تھی جہاں غالب چھپ سکتا تھا۔ دوسرے کمرے میں قالین کے نیچے ایک گوشے کا فرش دیکھنے میں برابر لگتا تھا لیکن وہاں تختے کو ہٹانے سے وہ خلا نمودار ہو جاتا تھا جس میں سے غالب کے باپ کی تجوری نکال لی گئی تھی۔ غالب اگر اس خالی جگہ میں بیٹھ کر تختہ برابر کر لیتا تو اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ ایسا آدمی تو تھا نہیں کہ جان بچانے کے لیے وہاں چھپا ہو۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک ضرور نکل آتا۔ اس کے لیے دشمنوں کو اندر سے ہی نشانہ بنانے کے بہترین مواقع تھے۔

یہ وہ حوصلہ شکن خیالات تھے جن کی وجہ سے میں وقتی طور پر اپنی شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ کرائے کے لوگ ہیں اور انھوں نے مجھے بھی قتل کر دیا تو باقی لوگوں کو یہ بہر حال لے جائیں گے اور اپنے آقاؤں کے سامنے بیان داغ دیں گے کہ ان میں سے دو بڑے سورما بنتے تھے چنانچہ مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ باقی حاضر ہیں۔ ان کا اپنا بھی ایک آدمی کم ہوگا تو کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کہ مقابلہ واقعی ہوا تھا۔ میں "ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت" کے اصول پر بھی یقین رکھتا تھا اور یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اسیری میں غالب اور ٹیڈی کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔ ایک اور ایک گیارہ تو مزید ایک ملانے سے ایک سو گیارہ۔

میں شرافت سے باہر نکلا اور اس فولادی قید خانے میں چڑھ گیا جس میں محسن اور ٹیڈی کے ساتھ صرف رابعہ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ شہلا کا گرفتار ہو جانا ایک بہت نیک فال ثابت ہوا۔ اس سے وہ خود انکل ضامن رضوی کے گھر میں محفوظ ہو گئی اور اسی کی وجہ سے نازو بھی بچ گئی۔ شہلا نہ پکڑی جاتی تو اس وقت قیدیوں میں تین حضرات کے ساتھ تین خواتین بھی ہوتیں۔ شہلا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مار دھاڑ اور اٹھا پٹخ برداشت کر سکتی۔ اسے بھی ٹریلر میں رابعہ کی طرح پھینکا جاتا تو خطرناک ہوتا اور اسے ناقابل تلافی نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں ہمارے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کو کبھی معلوم بھی نہ ہوگا کہ ہم پہ کیا بیتی اور نہ جانے کب تک وہ ہمارا انتظار کریں گی۔ کوئی پیغام ملے۔ کوئی واپسی کی نوید ہو۔ کہیں سے خیریت کی اطلاع آئے۔ وہ کب تک آس لگائے بیٹھی رہیں گی؟ آس بڑی سخت جان چیز ہے کہ مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹیں، نا امیدی کا کوہ گراں آ پڑے اور سخت ترین آزمائش کی چکی پیس ڈالے مگر آس ٹوٹتی نہیں، مرتی نہیں... دم آخر تک امید کی ایک کرن ساتھ رہتی ہے کہ پھر کوئی آیا دل زار۔

"اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" روبوٹ نے کہا۔ "جاؤ اس بڑھیا کو بھی لے آؤ۔ دیکھتے نہیں فائرنگ کی آواز دوسروں نے بھی سن لی ہے۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا تو ہم یہیں دھر لیے جائیں گے۔"

"گاڑی اب کون چلائے گا؟" ایک ماتحت نے کہا جو کافی خوف زدہ محسوس ہوتا تھا۔

"گاڑی کوئی بھی چلا سکتا ہے۔ ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" دوسرے نے زیادہ پریشانی سے کہا۔

"ظاہر ہے ان کو ہم چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" گروپ لیڈر بولا۔ "دونوں کو یہیں ڈال دو۔"

ان کی گفتگو نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اگر وہ کیتھرین کو لا رہے تھے تو شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ غالب مارا گیا اور اس خیال نے ہی میرے دل میں خنجر اتار دیا۔ وہ مرد قلندر... یاروں کا یار... باضمیر اور اصول پرست انسان اور اپنی ذات سے بے پروا اور بے نیاز۔ راہ و رسم عاشقی میں وضعدار اور دولت دل کو دولت جہاں کے مقابل ہیچ سمجھنے والا۔ لاکھوں کروڑوں کی وراثت ترک کر کے آزادی کی جلاوطنی اختیار کرنے والا۔ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔ اور جب گھر لوٹا تو بس پل بھر آرام کیا اور عدم کی راہ لی۔ اس کے دکھ کا سارا درد میری آنکھوں میں اتر آیا۔ آنسو بن کے ٹپکا اور پھر بھی دل میں رہا۔

یکے بعد دیگرے دو خون آلود لاشیں اندر آئیں۔ ان میں سے ایک کے سینے سے اور دوسرے کے سر سے لہو اب بھی ٹپک رہا تھا۔ اب میرے سامنے پانچ بے حس و حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں زندہ اور مردہ کی تفریق صرف میں کر سکتا تھا جو گھٹنوں پر سر رکھے بے بسی سے سب کچھ دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔ ایک لاش محسن پر یوں گری تھی کہ اس کا آدھا اوپر کا دھڑ محسن کی ٹانگوں پر تھا چنانچہ اس کے سینے سے نکلنے والا خون محسن کو بھی تر کرنے لگا تھا۔ دوسری لاش رابعہ کے پاس گری تھی اور اس کا خون رابعہ کے دامن تک پہنچ رہا تھا۔ وہ سب آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ دوست اور دشمن سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

جب کیتھرین کو اندر پھینکا گیا تو وہ بھی محسن کے اوپر والی لاش پر گری۔ محسن ایک مردہ اور ایک زندہ جسم کے بار سے دب گیا۔ مردہ جسم دشمن کا تھا اور زندہ دشمن کا نہیں تھا لیکن یہ سب میرے اپنے احساس کی تفریق تھی۔ وہ خود ان سب خیالوں سے بیگانہ تھے۔ امید اب بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ ایک امید یہ تھی کہ شاید پاس پڑوس کے لوگوں میں سے کوئی فون کر چکا ہو اور پولیس آ جائے۔ بے شک پولیس بھی ہماری دوست نہیں تھی اور ہم ایک کی قید سے رہائی پاتے تو دوسرے کی قید میں پہنچ جاتے لیکن ترجیح کے اعتبار سے دیکھا جاتا تو پولیس کی قید آسان اور بہتر تھی۔ پولیس کے جال سے نکلنے کی امید کی جا سکتی تھی مگر ان سے نہیں جو ہمیں لے جا رہے تھے۔ ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید اب بھی غالب آ جائے... مگر غالب کہاں کہ آ جائے یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے۔

دروازہ دھڑ سے بند ہوا تو کنٹینر کے اندر اندھیرا چھا گیا جس میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انھوں نے باہر سے لوہے کی سلاخ کو بولٹ کیا اور تالے ڈال دیے۔ میں آوازیں سنتا رہا اور تصور کی مدد سے سب دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد ٹرک کا انجن گرجا اور ٹریلر آہستہ سے آگے بڑھا۔ باہر سے آنے والی دوسری آوازیں معدوم ہو گئیں۔

"سکندر..." میں نے کیتھرین کی آواز سنی۔

میں اچھل پڑا۔ "تم... آنٹی کیتھرین... تم ٹھیک ہو؟"

"او ویس... مجھے کچھ نہیں ہوا۔" وہ آہستہ سے بولی اور میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کیا۔ "یو او کے؟"

"ہاں۔ مجھے شرم آتی ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ میں ٹھیک ہوں مگر میں تمہاری طرف سے بہت متفکر تھا" میں نے کہا۔

"میں بے ہوش نہیں تھی۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ موقع ملے... مگر کیا کروں... وہ میرے سر پر کھڑے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے مار دیتے اور میرا ریوالور چھین لیتے۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" ریوالور اب بھی تمہارے پاس ہے؟" میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سنے کہا۔

"ہاں... انھوں نے اسی وجہ سے مجھے نظرانداز کیا... اور اہمیت نہیں دی کہ عورت ہے اور اتنی بزدل عورت کے پاس کیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"ان کا ایک آدمی تو مارا گیا تھا۔" میں نے کہا۔" جس کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔ اسے تم نے نہیں مارا تھا تو غالب نے ... ہوگیا۔"

" غالب؟ کیا وہ یہاں نہیں ہے؟" کیتھرین حیران ہوکے بولی۔

" نہیں... وہ اندر ہی تھا۔ دوسرے کمرے میں چھپ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

" مجھے نہیں معلوم۔" کیتھرین نے کہا۔

" تم نے دو فائر تو سُنے ہوں گے؟" میں نے کہا۔

" ہاں... سُنے تھے۔" کیتھرین بولی۔

" کس نے چلائی تھیں وہ گولیاں؟" میں نے کہا۔

" مجھے کیا معلوم... میں نے دیکھا نہیں... صرف سُنا تھا۔ میں نے باہر سے بھی فائرنگ کی آواز سُنی تھی۔" وہ بولی۔" کیا تم فائرنگ نہیں کر رہے تھے؟"

" میں نے بھی فائرنگ کی تھی... لیکن اندر نہیں... آخر ان کے آدمی کو کسی نے تو مارا ہوگا۔ محسن اور ٹیڈی تو پہلے ہی ناک آؤٹ ہوگئے تھے... اس کے بعد کسی نے جواب میں گولی چلائی تھی۔" میں نے کہا۔

" میں کیا بتاؤں... اصل بات وہی ہے کہ میں نے کچھ دیکھا نہیں تھا۔"

" بہرحال... مجھے یقین ہے کہ غالب مارا جاچکا ہے۔" میں نے کہا۔

" اوہ نو..." اس نے اندھیرے میں اپنے سینے پر انگلی سے صلیب بنائی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے لگی تھیں۔

"تم وہ ریوالور مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

" نہیں... میرے پاس شاید بچ جائے۔" وہ بولی۔

" میری تلاشی لی جاچکی ہے... تمھاری اب لی جائے گی۔" میں نے کہا۔

" کہاں لی جائے گی؟" وہ ریوالور مجھے دے کر بولی۔

" جہاں بھی ہمیں لے جایا جائے گا۔" میں نے کہا۔" ابھی تو ہم سفر میں ہیں۔ دیکھو یہ ٹرک کب اور کہاں رُکتا ہے؟"

" یہ کون لوگ ہیں سکندر؟ دلاور کے شکاری؟" وہ بولی۔

" غالباً! یقین کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔" مگر اور کون ہوسکتا ہے... خدا کا شکر ہے نازو اور شہلا بچ گئیں... لیکن آنٹی... اب جولی کا کیا ہوگا؟"

" کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ وہ مر جائے گی۔" وہ کھوئے لہجے میں بولی۔

" ایسا مت کہو... اُس کو زندہ رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

" بہت کچھ ہونا چاہیے ینگ مین... لیکن وہ سب نہیں ہوتا۔" کیتھرین نے کہا۔" میں کوئی فلاسفر نہیں ہوں مگر زندگی کے تجربات کا فلسفہ میں نے پڑھا ہے۔ میری زندگی ہوائی جہاز کا آرام دہ شاہانہ سفر نہیں تھی جس میں انسان ہوا پر تیرتا جاتا ہے۔ آنکھیں بند کرکے کوئی خواب دیکھتا ہے یا آنکھیں کھول کر اوپر کے آسمان اور نیچے بادلوں کے خوب صورت رنگ دیکھتا ہے اور منزل آجاتی ہے۔ نہیں... یہ سمندروں کا سفر تھا۔ طوفانی لہروں، غضب ناک ہواؤں اور خطرناک چٹانوں کے ساتھ جاری رہنے والی جدوجہد کا سفر۔ میں نے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی میں بارہا دستِ اجل کو رگِ جاں سے بھی قریب تر پایا اور پھر میرے محافظ خدا کے ہاتھ نے مجھے بچالیا۔ جولی بھی ایسی ہی جدوجہد کررہی ہے وہ بچانے والا ہاتھ اس کے ساتھ بھی ہے۔ اب میں سمجھنے لگی ہوں کہ ایسی حالت میں وہ آج تک کیوں زندہ رہی۔ خدا کو اسے زندہ رکھنا منظور تھا۔ ایک وقت تھا جب میں اس کی موت کے خیال سے بہت ڈرتی تھی۔ سوچتی تھی کہ وہ مرگئی تو میں بھی مرجاؤں گی۔ اس کا غم اور اس کی تکلیف میرے لیے بہت عذاب تھے مگر آہستہ آہستہ میں نے یہ عذاب برداشت کرنا سیکھا۔ میں سمجھتی تھی کہ جولی کو میرے سہارے کی ضرورت ہے۔ میری موجودگی اور میرا قرب اسے حوصلہ دیتا ہے۔ میری باتوں سے اس کو امید ملتی ہے۔ پھر میں نے جینے کی خوش مطلق اور پُرامید نظر آنے کی جدوجہد شروع کی تاکہ میں جولی کے لیے وہ سب کچھ کرسکوں جو میں کرنا چاہتی تھی اور کرسکتی تھی۔ میں نے ایک حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ میری کوشش اور ڈاکٹروں کی جدوجہد جولی کو زندہ رکھنے کی ایک خواہش کا نام ہے۔ ورنہ خدا کو نامنظور ہو تو میرے چاہنے اور ڈاکٹروں کے چاہنے سے کیا ہوگا... کچھ بھی نہیں۔ اور اگر اس کی زندگی باقی ہوگی تو خود بخود سب ٹھیک ہوجائے گا۔ دوا اثر کرے گی، جسم ساتھ دے گا اور کوئی معجزہ بھی رونما ہوجائے گا۔ معجزہ کیا ہے۔ کوئی بھی ایسی بات جو آدمی کے وہم و گمان میں نہ آسکتی ہو۔ جب تم لوگ ملے تو میں نے فوراً اسے ایک معجزہ تسلیم کرلیا۔ میں ہر امید کو سہارا بنالیتی ہوں۔ امید غلط ہو جائے تو دل سخت ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی بہت پہلے جولی کی طرف سے دل کو پتھر کرچکی ہوں کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ میں ہر روز کہتی تھی کہ وہ آج مرجائے گی۔ پھر وہ دن گزر جاتا تھا لیکن میرے لیے ہر آنے والا دن پُرامید ہوجاتا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر اس حقیقت سے سمجھوتا کرلیا ہے کہ جولی کا مرجانا غیر متوقع نہیں اس کا زندہ رہنا غیر متوقع ہوگا۔ وہ پھر مجھے مل گئی تو یہ خداوند یسوع مسیح کی مجھ گنہگار پر خصوصی عنایت ہوگی۔" وہ یکلخت چُپ ہوگئی۔

" انکل ضامن رضوی بہت اچھے آدمی ہیں۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔" اگر شہلا انھیں جولی کے بارے میں بتائے گی تو وہ ضرور کچھ کریں گے۔ اس کے علاوہ نازو بھی ہے۔ غالب نے بھی اپنے کچھ ہم پیشہ دوستوں سے کہا تھا۔ تمھارے لیے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"کیا تم نوٹ کررہے ہو کہ ہم کدھر جارہے ہیں؟" وہ بولی۔

" میں نے کوشش کی تھی۔ پہلے دائیں طرف... پھر دائیں طرف... اس کے بعد بائیں جانب... پھر دائیں طرف... اب دائیں بائیں سب خلط ملط ہوگیا ہے۔ کچھ یاد نہیں... اس کے علاوہ صرف موڑ سے کیا پتا چلتا ہے۔ ایک سڑک پر دائیں جانب دس جگہ موڑ آسکتے ہیں۔"

" میں نے ایک ایسی ہی صورتِ حال کسی فلم میں دیکھی تھی۔" وہ کہنے لگی۔" ہیرو گھڑی دیکھتا رہتا ہے کہ کتنے منٹ بعد موڑ کس طرف آیا تھا۔ اس نے رفتار کا اندازہ کرلیا۔"

" میرے دماغ میں کوئی اسپیڈو میٹر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" مزید یہ کہ میں ہیرو نہیں ہوں اور یہ فلم نہیں ہے۔"

"تم بہت افسردہ اور دل شکستہ ہو..."

" میں غالب کی موت کے خیال سے افسردہ ہوں۔" میں نے کہا۔" جان تو میرے چکر میں نہ جانے کس کس نے دی۔ سب میرے خیر خواہ تھے اور اسی لیے جان سے بھی گئے لیکن ایسا بے غرض دوست اُن میں کوئی نہ تھا۔ وہ شاید کبھی اپنے لیے جیا ہی نہیں۔ اس کی زندگی ایک مشن رہی۔ صحافت کا پیشہ بھی اس نے اپنے مشن کی خاطر اختیار کیا تھا۔ اس نے کس مقصد کے لیے جان دی، کون جان سکے گا۔ اسے کوئی تمغہ کوئی میڈل اور کوئی ایوارڈ کبھی نہیں دیا جائے گا۔ ان ہزاروں گمنام مجاہدوں کی طرح جو وطن کی آبرو پر قربان ہوگئے۔ اس کو تو رونے والا بھی کوئی نہیں۔"

کیتھرین خاموش رہی۔ میں بھی چُپ رہا۔ ٹرک ایک ہی رفتار سے چلتا رہا۔ اس کی مسلسل گھوں گھوں ایک نوحۂ ماتم بن گئی اور چشمِ تصوّر سے میں نے وہ گھر دیکھا جہاں غالب اکیلا رہ گیا تھا۔ جو اس گھر کا وارث تھا مگر پولیس شاید اسے لاوارث قرار دے دے گی۔ اس کی موت کے قصّے عاریہ بندوبست بھی کریں گے کہ مرنے والے کی شناخت نہ ہو اور ایک صحافی کی موت کا چرچا ہی نہ ہو۔

ٹرک کی رفتار کم ہونے لگی تو میں نے کیتھرین سے کہا۔" غالباً ہولٹ اسٹاپ آرہا ہے۔"

" ہولٹ اسٹاپ... کیا اس کے بعد بھی سفر جاری رہے گا! تم کو کیا معلوم۔" وہ بولی۔

" ہم اس باکس میں تو نہیں رہیں گے نا۔" میں نے کہا۔" یہاں سے کہیں منتقل کیے جائیں گے۔" میں نے کہا۔" یا یہ ٹریلر بھی آگے جائے گا اور ہم بھی۔ ایسے ٹریلر کراچی تک یا بیرونِ ملک سامان لے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں پر لوڈ کردیے جاتے ہیں۔"

" سمندر پار... اوہ نو... میں جولی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔"

" تم نے ابھی کہا تھا کہ بہت کچھ ہونا چاہیے مگر وہ سب ہوتا نہیں۔" میں نے کہا۔" تم نے سفر کی بات کی تھی تو میں نے بھی بتادیا کہ سفرِ زندگی کی آخری منزل تک جاری رہتا ہے۔"

ٹرک رُک گیا اور کیتھرین فوراً اسی طرح لیٹ گئی جیسے پہلے لیٹی ہوئی تھی۔ باتوں میں مجھے بھی اس سلنڈر کا خیال نہیں رہا تھا جس کے پائپ کو میں نے کاٹ دیا تھا۔ کیا انھوں نے گیس کھولی ہوگی؟ میرے اندازے کے مطابق ہم نے بیس منٹ سے آدھے گھنٹے کے درمیان سفر کیا تھا۔ اگر انھیں استعمال نہ کرنا ہوتا تو وہ زہریلی گیس کو اندر پہنچانے کا اہتمام ہی کیوں کرتے۔ اس کے بعد کب موقع آئے گا اور ممکن ہے وہ زہریلی گیس صرف اس لیے ہو کہ ہم سب بے ہوش ہوجائیں۔ ٹرک کو بڑی سڑکوں پر سے گزرنا تھا۔ اگر ہم ہوش میں رہتے تو اندر سے چادر بجا کے راہ چلتے لوگوں کو متوجہ کرلیتے۔ یہ بات میرے دل کو لگی کہ وہ صرف ہمیں خاموش رکھنا چاہتے تھے۔ مارنا مقصود ہوتا تو وہیں مار دیتے، زندہ یہاں کیوں لاتے۔ میں نے باہر سے راڈ کے ہلائے جانے اور ہُک میں سے نکالنے کی آواز سُنی۔ اس کا شور کنٹینر کے اندر بہت زیادہ سنائی دیا اور میں نے بھی لیٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

میرا فیصلہ کسی یقین کی بنیاد پر نہ تھا لیکن سوچنے اور کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اگر میں نے غلط کیا تھا تو غلطی کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ غلط یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں ہوش میں بیٹھا ہوا ملتا اور ایک غلطی مجھے بہرحال کرنا تھی۔ ملاس کے وقت کچھ تو مانگنا ہی پڑتا ہے۔

دروازہ بڑی آواز کے ساتھ گرا اور میں نے آنکھیں کھول کر پھر بند کرلیں۔ باہر اندھیرا تھا اور کنٹینر کے اندر باہر سے ٹیوب لائٹس اور بلبوں کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ میرے کان آوازیں سننے کے لیے مستعد تھے لیکن ابھی تک وہی آوازیں تھیں جو میں نے اس معرکہ آرائی میں سُنی تھیں اور اُن کے قدموں کی چاپ تھی۔ پھر خاموشی کا مختصر وقفہ آیا۔ یکلخت سب چُپ ہوگئے تھے۔ دو منٹ بعد کوئی اندر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی آئے۔ میں نے اپنی پوزیشن ایسی رکھی تھی کہ میں سر یا گردن گھمائے بغیر ایک آنکھ کھول کر بھی آنے جانے والوں کو دیکھ سکوں چنانچہ میں نے چوہدری دلاور کو سب سے پہلے دیکھا۔ اس کے پیچھے وہی چار افراد تھے جو ہمیں لے کر آئے تھے۔ مشینی لہجے میں بولنے والا گروپ لیڈر، دلاور کے ساتھ ساتھ ٹارچ لے کر چل رہا تھا۔

" آخر باقی لوگ کہاں ہیں؟" دلاور کی آواز میں ناگواری تھی۔

" یہی ہیں سب جو مجھے ملے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے کیا بتایا تھا تمھیں؟" دلاور بولا۔

"آپ نے تو سات کہے تھے چوہدری صاحب۔ چار مرد اور تین عورتیں مگر..."

"مگر تم لائے ہو تین مردوں اور دو عورتوں کو... یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ باقی دو کہاں ہیں؟" دلاور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہاں جتنے تھے سب کو میں لے آیا ہوں۔ کسی کو چھوڑ کر آنے میں کیا ملنا تھا مجھے۔" گروپ لیڈر نے کہا۔ "میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ سب کو زندہ لے آؤں۔"

"مگر دو مارے گئے...؟"

"میرے دو آدمی مارے گئے۔ اس لیے کہ میں ان کو روکتا رہا۔" وہ اونچے مشینی لہجے سے دوسرا دلاور لگتا تھا اور بعض اوقات گمان گزرتا تھا کہ وہ دلاور کی نقل اتار رہا ہے مگر یہ اس کا اپنا انداز نہ ہوتا تو دلاور کے سامنے وہ اصل لہجے میں بات کرتا۔ یہ بات دلاور بھی جانتا ہوگا چنانچہ وہ لہجے کا بُرا نہیں منا رہا تھا۔

"مجھے ان کے مرنے کا یقیناً افسوس ہے لیکن تم نے معاہدہ پورا نہیں کیا۔" دلاور بولا۔ "تم کو سات آدمی لانے تھے۔"

"وہاں پانچ ہی آدمی تھے تو میں کیا کرتا چوہدری صاحب!"

"تمھارا مطلب ہے میں نے تم کو غلط اطلاع دی تھی۔" دلاور کا موڈ آف ہونے لگا۔ "جھوٹ بولا تھا تم سے؟"

"میں نے ایسا کب کہا ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہاں سات ہی ہوں گے۔ چار مرد اور تین عورتیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ایک مرد اور ایک عورت کہیں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ان کا نام محسن اور شہلا تھا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کہا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر لطیف کے پاس مگر عورت کہنے لگی کہ نہیں وہ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے ہوں گے..."

"دیکھو لڑکے... کیا نام ہے تمھارا... پتنگا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرا نام پروانہ ہے... استاد پروانہ۔" گروپ لیڈر نے مشتعل ہو کے کہا کیونکہ اس کے کسی ساتھی نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں بھئی پروانہ... وہ ایک ہی چیز ہوتی ہے پتنگا اور پروانہ۔" دلاور نے اسی لہجے میں کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمھارا اصل نام کیا ہے۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھاری اصلیت کیا ہے۔ اور کس کے استاد ہو لیکن تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام کیا ہے۔ بعض اوقات نام سے کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ کچھ لوگ نام کی پبلسٹی سے استاد بنتے ہیں اور پبلسٹی وہ خود کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گمنام رہتے ہیں مگر وہ استادوں کے استاد ہوتے ہیں۔ یقیناً اس شہر میں تمھارے نام کا ڈنکا گلی گلی بج رہا ہوگا اور میرا نام بہت کم لوگوں نے سُنا ہوگا۔ لیکن تم اپنی غلط فہمی دور کر لو تو اچھا ہے کہ تم میرے مقابلے ہو..."

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کیوں بگڑ رہے ہیں!" پروانہ بولا۔

"جب میں نے تم کو بلایا تھا مسٹر پروانہ۔" دلاور نے اپنے مخصوص کاٹ رکھنے والے سرد سفاک لہجے میں کہا۔ "تو میں نے تمھارے آبا و اجداد کا شجرۂ نسب تک معلوم کر لیا تھا۔ میں بتا رہا ہوں کہ تمھارا باپ کون تھا۔ تمھارا گھر کہاں ہے۔ تم کس کس کے ساتھ رہتے ہو۔ گھر میں کتنے بھائی بہن ہیں۔ کتنی بہنوں کی شادی ہوئی ہے اور کس کے ساتھ۔ کتنی شادی کے قابل ہیں۔ پھر یہ کہ باہر تم نے کیا کارنامے سرانجام دیے اور کس کس کے شاگرد رہے۔ استادی کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے۔"

"آپ کو مجھے مرعوب کر کے کیا فائدہ ہوگا۔" پروانہ نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یا مجھے میرے ساتھیوں کے سامنے بے عزت کر کے کیا ملے گا؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔"

"استادِ محترم! آپ کے والد پرانے شاہ عالمی کے ایک تنور پر کام کرتے تھے۔" دلاور بولا۔ "سات سال روٹیاں لگاتے رہے اور پھر ایک دن خود تنور میں گر گئے۔ کہا گیا کہ ان کو گرمی سے چکر آ گیا تھا مگر یہ دوسرا چکر تھا۔ بعد میں تم پیدا ہوئے۔ جب تنور کے مالک نے تمھاری ماں سے شادی کر لی۔ تمھاری ایک بہن کامونکے منڈی کے ایک ڈرائیور کی بیوی ہے۔ دو گھر میں بیٹھی جوان ہو رہی ہیں۔"

"بکواس بند کرو اپنی..." پروانہ چیخ کر بولا۔

"میاں پروانہ صاحب! جامے سے باہر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" دلاور نے ہنس کر کہا جس کے سامنے استاد پروانہ واقعی طفلِ مکتب تھا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں جانتا تو میں بتا رہا تھا کہ مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ اگر غلط کہا ہو تو کہو۔ تمھارے یہ ساتھی تمھاری پرائیویٹ لائف کے بارے میں کچھ اور سمجھتے تھے۔ مثلاً یہ کہ تم مہاراجہ پٹیالہ کی اولاد ہو۔ تو اپنا ریکارڈ درست کر لیں۔ اب تمھارا استادی شاگردی کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ تم مختلف لوگوں کے ساتھ رہے ہو۔ چار مرتبہ جیل میں۔ وہاں سے نکلے تو ماشاءاللہ خاصی ترقی کی۔ ایک زمانے میں تم استاد پیڈرو کے لونڈے تھے۔ تم کو یاد ہے؟" جس انداز سے اُس نے استاد پروانہ کو پیڈرو کا لونڈا کہا تھا وہ انتہائی تحقیر و تذلیل کا انداز تھا اور ممکن تھا کہ پروانہ کسی اور جگہ چوہدری دلاور پر حملہ کر دیتا مگر یہاں وہ خود کو مجبور سمجھتا تھا۔

"استاد پیڈرو کی..." پروانہ نے اپنے غصے کا رُخ پیڈرو کی طرف موڑ دیا اور اُسے ایک بہت بڑی گالی دی۔

"ابھی تم ان سے ملو گے تو یہ بات ان سے خود ہی کہہ دینا۔ میرے منہ سے اچھی نہیں لگے گی۔" دلاور ہنسا۔ "استاد پیڈرو نے ہی تمھارا انتخاب کیا تھا اور تمھارا تاریخ جغرافیہ بتایا تھا۔ تم کو یہ بتانا ضروری ہے کہ استاد پیڈرو میرا ایک کتا ہے۔ میرے اشارے پر چلنے والا، دُم ہلانے والا۔ بھونکنے والا اور کاٹنے والا... اور اپنے بہت سے کتے پال رکھے ہیں میں نے جن کے سامنے تم ایک پلّے ہو۔ اس لیے اپنی ہوشیاری اپنے پاس رکھو۔"

دلاور زبردست ڈرامے باز تھا اور مکالموں کی ادائیگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ میرا اس سے بار بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ چنانچہ میں جانتا تھا کہ وہ صرف زبان سے ہی نہیں اپنی شخصیت سے اور بعض اوقات ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے کس طرح اپنے حریف پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ذہن کو گمراہ یا مفلوج کر دیتا ہے یا سوچ کے غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور پھر اپنے مقصد میں کامیابی کے امکانات کو یقینی بنا لیتا ہے۔ استاد پروانہ کیا چیز تھا کہ متاثر نہ ہوتا۔

"میں نے کون سی غلط بات کہی ہے چوہدری صاحب!" پروانہ بولا۔ لیکن اب اس کا لہجہ جارحانہ نہیں معذرت خواہانہ ہو گیا تھا۔

"کون سی بات صحیح کی ہے تم نے؟" دلاور نے ایک دم گرج کے کہا۔ "پروانے کی اولاد، میں خاک کر دوں گا تمھیں... کن سے میاں بیوی کی بات کر رہے تھے تم؟"

"میں نے نام بتایا ہے اُن کا... محسن اور شہلا۔"

"اُلو کے پٹھے... یہ ہے تمھارا والدِ ثانی محسن۔" دلاور نے کہا۔ "اس کی بیوی کہاں ہے؟ اور یہ تم کسے اُٹھا لائے ہو، اپنی ماں کو... کون ہے یہ عورت؟"

"چوہدری صاحب! میں کسی کو پہچانتا نہیں تھا اور آپ نے مجھے نہ کسی کا فوٹو دکھایا تھا اور نہ نام بتایا تھا۔" پروانہ نے احتجاج کیا۔

"میں ہر بات تم کو نہیں بتا سکتا تھا... اس لیے کہ تم احمق ہو... اصل افراد میں سے تین کم ہیں۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ ایک تو وہی عورت ہے جو محسن کی بیوی ہے... شہلا۔" دلاور نے کہا۔

"نام تو میں نے ٹھیک ہی بتایا تھا آپ کو... اور یہ مجھے انہی سے معلوم ہوا تھا۔" پروانہ بولا۔

"کیا ضرورت تھی کسی سے اس کا نام یا کام پوچھنے کی؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ فضول باتیں بالکل نہ کرنا... جتنے آدمی جا ہو لے جاؤ مگر سب کی زبان کو لگام دے کے رکھو اور اُن سے کہو کہ اپنا کام کریں۔ یہ کام کیا ہے تم نے؟ سات میں سے چار کو لائے ہو۔ باقی تین کو چھوڑ آئے ہو یا اپنے پیچھے لگا لائے ہو۔"

"ہمارے پیچھے کوئی نہیں آیا۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ تمھارا واسطہ تم جیسے نام کے استادوں سے نہیں تھا۔ یہ آدمی نہیں بھوت ہیں۔ تمھیں کیا، مجھے نظر نہیں آتے مگر آ جاتے ہیں سر پر۔ جو رہ گئے ہیں وہ نہ میرا پیچھا چھوڑیں گے اور نہ تمھارا۔ میری تو کوئی بات نہیں۔ مجھے اُن سے نمٹنا آتا ہے۔ تم اپنی خیر مناؤ۔" دلاور نے کہا اور اس کی رائے سن کر میں خوش ہوا۔ اُس نے ہمیں جن بھوت کہا تھا۔ کیڑے مکوڑے نہیں کہا تھا۔ شیخی نہیں بگھاری تھی کہ وہ ہمیں حشرات الارض کی طرح مسل دے گا۔ یہ تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ دلاور جیسے شخص سے اتنی عزت و احترام حاصل کرنا ایک دن کا کام نہیں تھا۔ اس کی رائے بدلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ جان اور مال کا بڑا زیاں ہوا تھا اور پُرخطر آزمائش کے ہزار جان لیوا مرحلے سر کرنے پڑے تھے۔

"آپ ہماری فکر مت کریں جی۔ ہم بھی دیکھ لیں گے وہ کتنے بڑے جن بھوت ہیں۔ بڑے بڑے عمل سیکھے ہیں ہم نے بھی جن اتارنے کے۔" پروانہ ابھی چھوٹا بدمعاش بلکہ شہدا تھا چنانچہ اس کی اکڑفوں زیادہ تھی۔ انگریزی محاورے کے مطابق خالی برتن زیادہ شور کرتے ہیں۔ ایسا ہی پروانہ کر رہا تھا تو یہ اس کا قصور نہیں تھا۔ "آپ ہمیں فارغ کر دیں۔"

"تم فارغ ہوئے... جاؤ۔" دلاور چیخ کے بولا۔

"جائیں... میرا مطلب ہے جانا تو ہے۔" پروانہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"تم شاید معاوضے کے انتظار میں ہو؟ برخوردار... مجھے یہ سمجھاؤ کہ میں تم کو کام کا معاوضہ دوں یا کام بگاڑنے پر تم سے جرمانہ وصول کروں۔ سات میں سے تم چار بندے لائے ہو... یہ پانچواں میری طرف سے تحفہ رکھ لو... یہ میرے کام کی نہیں۔" دلاور نے یقیناً کیتھرین کی طرف اشارہ کیا ہوگا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے پچاس ہزار فی کس کہا تھا..." پروانہ نے غصے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے ضبط سے کام لیا۔ "چار آدمی تو آئے نا... ان کے دو لاکھ نکالیں... اور یہ جو دو مر گئے..."

"اللہ ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔" دلاور نے کہا۔ "تجہیز و تکفین کے لیے کچھ چاہیے تو لے لو۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں چوہدری صاحب... میرے دو آدمی جان سے گئے۔" پروانہ مشتعل ہونے لگا۔

"یہ تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی مارا گیا یا پکڑا گیا تو رسک صرف تمھارا ہے۔" دلاور نے بے رخی سے کہا۔ "تم آٹھ نہیں آٹھ سو کی نفری لے کر جاتے۔ ان میں سے صرف تم بچ کر آتے تب بھی مجھے کیا... جو یہ کام کرتے ہیں وہ مرتے بھی ہیں۔ مرنے سے ڈرتے تو ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھتے۔ باہر نہ نکلتے... بہرحال میں انہی کی وجہ سے دو لاکھ دوں گا... لیکن تمھیں نہیں دوں گا۔ ان کے گھر والوں کو ایک ایک لاکھ پہنچ جائیں گے،

بیٹوں کی جوانی کی قیمت۔"

"دو لاکھ میں لوں گا چوہدری صاحب... چار آدمی میں لایا ہوں۔" پروانہ چیخ کر بولا۔ "معاہدہ میں نے کیا تھا۔"

"تمہارا معاہدہ ابھی پورا نہیں ہوا استاد... باقی دو آدمی بھی لے آؤ اور یہ فالتو مال لے جاؤ۔" دلاور نیم سنجیدگی سے بولا۔ "معاہدے میں جو وقت دیا گیا تھا وہ ایک گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔"

"مجھے نام پتا بتاؤ وہ کون لوگ ہیں۔" پروانہ اب آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"ہاں... نام نوٹ کرو...۔" دلاور بولا۔ "ایک ہے مرزا غالب' وہ صحافی ہے اور اس کا پتا کوئی نہیں۔ وہ جس اخبار میں تھا وہاں سے اس کو برطرف کیا جا چکا ہے۔ تاہم وہ گھر اسی کا تھا جہاں تم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا باپ بہت مشہور ڈاکٹر تھا جو یہ کوٹھی اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ دوسرا نام ہے شہلا کا جو تمہیں ملے گی ایس ایس پی ضامن رضوی کے گھر میں۔ میری تازہ ترین اطلاعات یہی ہیں... تمہارے لیے ایس ایس پی کے گھر میں گھس کر اسے اٹھالانا کیا مشکل ہے۔ آخر ایسے ہی تو استاد پروانہ نہیں کہلاتے۔ تیسرا نام ہے ایک لڑکی نازلی کا جو نازو کہلاتی ہے... ایک سابق سب انسپکٹر پولیس اکرام شیخ کی بہن ہے، اس کا باپ ریٹائرڈ سول جج تھا۔ لڑکی تم سب کو دو منٹ میں لنگڑا، لولا، اپاہج اور معذور کر سکتی ہے۔ اس کے سامنے بھول کر بھی خالی ہاتھ جانے کی غلطی مت کرنا، ورنہ سب کے جیسس تک ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ تمام عمر کوئی چیز صحیح کام نہیں کرے گی... نہ بریک، نہ گیئر، نہ کلچ۔"

"یہ تم اب بتا رہے ہو مجھے... تمھاری...۔" پروانہ نے غضبناک لہجے میں ایک گالی دے کر کہا۔ "پیسہ ہضم کرنا چاہتے ہو ہمارا... بے ایمان کتے... میں تم کو چھوڑوں گا نہیں... سور کے بچے...۔"

"اوئے پروانے...۔" [illegible] باہر سے استاد پیڈرو کی آواز آئی۔ "چل باہر... بہت دیر ہو رہا ہے... اور تم سب بھی آجاؤ... میں تم سب کو انعام دیتا ہوں۔ ایسا کہ دوسرے یاد رکھیں گے۔"

"دوسرے... دوسرے کون؟" پروانہ ہکلایا۔

"تمہیں رونے والے... اور کون...۔" پیڈرو ہنسا۔ "اور وہ جو کل تمہارے جنازے میں شریک ہوں گے۔"

اس کے بعد بہت ہنگامہ ہوا۔ بیک وقت گالی گلوچ کا شور اٹھا اور مار پیٹ بھی ہوئی مگر ایک گولی نے سب ختم کر دیا۔ میں نے بالکل غیر ارادی طور پر آنکھ کھول کے دیکھا تو استاد پروانہ تڑپ رہا تھا۔ وہ جتنا بڑا بدمعاش بن سکتا تھا بن چکا تھا۔ اپنی دانست میں استاد مگر درحقیقت ایک غلط راستے پر چل نوجوان جس نے بڑے بدمعاش دیکھے ہی نہیں تھے۔

وہ اونٹ جس نے پہاڑ نہ دیکھا ہو اردگرد کی مخلوق کو دیکھ کر یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی نہیں۔ دلاور نے اس سے ایک کام لیا تھا۔ معلوم نہیں کتنا پیسہ دکھایا تھا اور پروانہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی قیمت ہے۔ دلاور نے اس سے پہلے نہ جانے کس کس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح استعمال کیا جیسے وہ کاغذ کے نوٹ یا ریوالور کی گولی استعمال کرتا تھا۔ دونوں صرف ہونے والی چیزوں کی طرح پروانے جیسے لوگ بھی اس کے لیے قابلِ صرف اشیا سے زیادہ اہم نہیں تھے۔

پروانے کے انجام نے باقی سب کو گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑنے، زمین پر ناک رگڑ رگڑ کر رحم کی بھیک مانگنے اور زندگی کی خیرات کے لیے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا تھا مگر زندگی کا یہ عملی سبق انھوں نے بہت دیر سے سیکھا تھا۔ شیر کی خوش آشامی کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی آدم خور شیر کے سامنے چلا جائے تو اسے یہ تجربہ بہت مہنگا اور بہت بے مصرف محسوس ہوتا ہے مگر اس وقت جب وہ شیر کی جان لیوا گرفت میں آجاتا ہے اور کسی کو نہیں بتا سکتا کہ یہ تجربہ کیسا رہا۔ چوہدری دلاور نے کچھ سرپھروں کو پیسے کے جال میں گرفتار کر کے موت کے مشن پر روانہ کیا تھا اور جو مر گئے تھے وہ اچھے رہے تھے کہ رسوا نہ ہوئے۔ مجبور نہ ہوئے اور انھوں نے صرف موت کا عذاب جھیلا۔ موت ان کا بھی مقدر ہوئی جو زخم کر آئے اور خود کو کامیاب و کامران جان کر فتح مندی کی جھوٹی تسلی دیتے رہے۔ وہ خود اپنی نظر میں رسوا ہوئے اور ذلت کا عذاب انھوں نے اضافی جھیلا۔ پشیمانی اور بے بسی کے احساس اور اپنی احمقانہ جدوجہد کے رائیگاں جانے کا صدمہ الگ برداشت کیا اور پھر پہنچے وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ ان جیسے پہلے بھی یوں ہی مرے کہ ان کو رونے والے بھی پچھتاتے رہے کہ کاش وہ ہم سب کی طرح جیتا تو مزید جی لیتا۔

جب یہ شور و فغاں ختم ہوا۔ جلاد انھیں لے گئے جن کو سزائے موت دی گئی تھی اور وہاں تین زندہ اور تین مردہ مرد اور دو عورتیں پڑی رہ گئیں تو دلاور نے کہا۔ "ان سب لاشوں کا... اور باقی سب کا بھی انتظام تم خود کرو گے۔"

پیڈرو نے کہا۔ "وہ میں کر لوں گا۔ مگر باقی کا کیا بنے گا؟"

"ان کا بعد میں سوچیں گے۔" دلاور بولا۔ "ان سب کو اندر لے آؤ۔"

مجھے اسی طرح پڑے پڑے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہونے والا تھا۔ مجھے کیتھرین کے بارے میں تو علم تھا کہ وہ میری طرح سب سن رہی ہے اور شاید دیکھ بھی رہی ہو مگر رابعہ کی طرف سے میں پریشان تھا کہ کہیں ہوش میں آ کے کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔ پلنے ذہنی انتشار اور اعصابی بحران سے نکلے۔

[illegible] ہوا تھا۔ محسن اور ٹیڈی کے بارے میں مجھے تشک تھا کہ وہ [illegible] دیر تک بے ہوش نہیں رہ سکتے۔ غالباً وہ بھی مکر کر رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد مجھے اٹھا لیا گیا۔ مجھے اٹھانے والا [illegible] شخص تھا جس نے مجھے کندھے پر ڈال لیا۔ میرا سر اور [illegible] پیچھے تھے اور ٹانگیں آگے تھیں۔ اس وقت بھی میں ایسی [illegible] میں تھا کہ اس شخص کو ختم کر دوں لیکن میں پروانے کا [illegible] دیکھ چکا تھا۔ اس کے ساتھی بھی پیڈرو جلاد کے سپرد [illegible] گئے تھے اور وہ مسلح ہونے کے باوجود دم نہ مار سکے تھے [illegible] کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب خود کو دشمن کے قلعے میں بے بس [illegible] کرتے تھے ورنہ ان کی جنگ باہر ہوتی تو وہ بھی مرنے [illegible] پر اتر آتے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میرا کوئی بہادری کا [illegible] قبل از وقت خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس سے بہتر [illegible] میں انتظار کروں اور دیکھوں کہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے [illegible] گودام قسم کا شیڈ نظر آیا۔ شبہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ جگہ [illegible] میں واقع ایم ڈبلیو ڈی کیپلیکس ہو سکتی ہے۔ دلاور کی موجودگی [illegible] حکمرانی کے انداز سے اس شبہے کو تقویت ملی تھی۔ جو شخص مجھے [illegible] کر لے جا رہا تھا، وہ بھی اپنی ڈانگری، سے کوئی ورکر ہی لگتا [illegible] اور قد و قامت سے قابلِ رشک صحت کا مالک نظر آتا تھا۔ [illegible] نے مجھے بیرک کی لمبائی کے رخ والی دیوار سے متصل کمرے [illegible] پہنچا دیا۔ اس مختصر مسافت کو طے کرتے ہوئے مجھے بیرک [illegible] ایک سائڈ کا تفصیلی جائزہ لینے کا موقع ملا۔ بیرک کی مجموعی [illegible] اور چوڑائی اتنی تھی کہ اس میں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ اس [illegible] دو ہیوی ڈیوٹی ٹرالر کھڑے کیے جا سکتے تھے۔ چھت [illegible] بھی ٹریلر کی اونچائی سے دگنی ضرور تھی۔ بیرک میں چاروں طرف [illegible] ٹیوب لائٹس نصب تھیں اور درمیان میں چھت سے آویزاں [illegible] لائٹس کی دوہری قطار تھی۔ ٹرک کے سوا مجھے بیرک میں اور [illegible] نظر نہ آیا۔ سوائے چند لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں کے جو [illegible] دیوار کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا وہ کچھ آفس قسم کا تھا۔ مجھے [illegible] قالین پر ڈال دیا گیا۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہا اور میں [illegible] آنکھیں کھولنے کی حماقت بھی نہیں کی۔ یہاں تیز روشنی تھی [illegible] یقین تھا کہ یہاں دلاور ضرور ہو گا۔ اس کی پوری کابینہ بھی [illegible] ہو سکتی تھی۔ وہ سب ہمیں بغور ملاحظہ فرما رہے ہوں گے۔ [illegible] تصدیق فوراً ہی ہو گئی۔

"یہ سب لوگ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں؟" دلاور نے کہا۔ "کیا گیس کھولی تھی؟" پیڈرو بولا۔

"گیس کا اثر ہی ہو گا۔" کسی نے جواب دیا۔

"گیس کا اثر بھی اتنی دیر میں ختم ہو جانا چاہیے۔" دلاور نے کہا۔ "خیر تم ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

"فون کروں جی؟"

"خود جاؤ گاڑی لے کر۔" دلاور نے بدمزگی سے کہا مگر یہ سب اس خبیث کی اداکاری تھی۔ اچانک اس نے میری گردن پر جلتی ہوئی سگریٹ لگا دی۔ میں اچھل پڑا اور قدرتی طور پر میرا ہاتھ گردن کی طرف گیا۔ یہ جسم کا طبعی ردِ عمل یا ریفلکس ایکشن تھا۔ اس نے مجھے تاثر یہ دیا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش تسلیم کر چکا ہے اور ڈاکٹر کو بلانے کی بات کرتے کرتے وہ دبے پاؤں میرے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میری بے ہوشی کو ٹیسٹ کرنے کے لیے ٹھیک چال چلی تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔

"معاف کرنا اپنے سکندر صاحب۔" وہ مسکرایا۔ "ہم ہیں تو آپ کے مقابلے میں ان پڑھ اور بے وقوف لیکن تھوڑا سا زندگی کا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ وہ بھی آپ کی جوتیوں کے طفیل... آپ کی خدمت کر کے...۔"

"تمہیں تو اب بولنا بھی آ گیا ہے۔" میں نے خفت کو چھپا کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی کہاں جی... ابھی تو صرف گنتے آئے ہیں۔" وہ ذومعنی الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ "ہم بولیں گے تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے مجھ سے بات کرتے کرتے اچانک جھک کر وہی سگریٹ محسن کے کان کی لو سے چھوا دی۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ اس نے کان پر ہاتھ مارا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ چلا کے بولا اور پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے میری طرف اور دلاور کی طرف دیکھا اور ٹیڈی کو ہلانے لگا۔ "اٹھو بھئی اپنے خواجہ صاحب۔"

"ورنہ یوں اٹھائے جاؤ گے جیسے مردے اٹھائے جاتے ہیں۔" دلاور بولا۔

ایک ایک کر کے سب کھڑے ہو گئے جو ابھی تک اپنی بے ہوشی کو ایک دوسرے سے بھی چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں رابعہ بھی تھی۔ وہ خوفزدہ ضرور تھی مگر ہسٹریا کا شکار نہیں تھی۔ سب ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے پیچھے سپاٹ دیوار تھی جو تقریباً پندرہ فٹ لمبی تھی۔ اس کمرے کی چوڑائی دس فٹ ہو گی۔ اس کی چھت کے نیچے پلائی ووڈ کی چھت تھی جو مشکل سے آٹھ فٹ اونچی تھی۔ ایئرکنڈیشنر کی مؤثر کارکردگی برقرار رکھنے کے لیے دیواروں پر بھی پلائی ووڈ کی تہ بڑی خوب صورتی سے لگائی گئی تھی اور اس پر بہت عمدہ وارنش تھا۔ دیواروں پر چھت سے فرش تک پہنچنے والے پردے تھے چنانچہ کسی دیوار میں کوئی کھڑکی تھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے مقابل ایک میز تھی جس کے پیچھے ایک گھومنے والی کرسی رکھی ہوئی تھی۔

دلاور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ہاتھ [illegible]

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کھڑا ہوا بڑی عیاری سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کمرے کے دونوں گوشوں میں دو آدمی مشین گن لیے کھڑے تھے۔ تیسرا ہمارے قریب دروازے میں موجود تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کے مقابلے میں میرا ریوالور کس حد تک کارآمد ہوگا۔

"ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے سکندر۔" دلاور نے کہا۔

"ہاں۔ ظلم اور ناانصافی بھی ایک انتہا کو پہنچ کے خود اپنی سزا بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے... یا تم کہہ سکتے ہو کہ تقدیر نے۔" وہ میری بات کو سُنی اَن سُنی کر گیا۔ "تم کو متعدد مواقع فراہم کیے، جب تم اپنی یہ احمقانہ جنگ ختم کر سکتے تھے۔ تم اسے احمقانہ تسلیم نہیں کرو گے۔ یہ میرا خیال ہے اور تم اس سے اتفاق کرو یا نہ کرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس کو معرکۂ حق و باطل کہو، اصولوں کی جنگ کہو یا وطن کے لیے جہاد... حقیقت وہی رہتی ہے کہ تم نے کچھ پایا نہیں۔ جو کچھ تمھارا تھا وہ بھی تم نے ٹھکرا دیا اور اس کے علاوہ دوسروں کا بھی بہت نقصان کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تم لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتے ہو چنانچہ تم کو کچھ لوگوں کی اس حد تک حمایت حاصل رہی کہ وہ تمھارے لیے ہر قسم کی قربانی دیتے رہے۔ جوانی میں جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں، سیلاب کے دھارے کی طرح۔ اس کا جدھر رُخ موڑ دیا جائے ادھر بہنے لگتا ہے۔ دو چار لڑکے اور دو چار لڑکیاں... یہ ہے تمھاری کُل طاقت جس کو تم نے ایم آر ایس کا مضحکہ خیز نام دے رکھا ہے۔"

"تمھاری انٹیلی جنس سروس کی فراہم کردہ معلومات قابلِ تعریف ہیں۔" میں نے کہا۔

"ڈھول کا پول تو کھل ہی جاتا ہے ایک دن۔" دلاور نے گھوم کر جاتے ہوئے اور کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ عرصہ مجھے دھوکے میں مبتلا رکھا اور یہ ظاہر کرنے میں کامیاب بھی رہے کہ میرے کاروبار کی اصل حقیقت کا تمھیں علم نہیں ہے۔ میری حد تک یہ دھوکا چل سکتا تھا لیکن سائیں بابڑے والے کے مزار اور موضع کرماں والی پہنچ کے تم حد سے بڑھ گئے۔ کیا تم اب بھی انکار کرو گے کہ تم نے اس جگہ کو تباہ کیا؟"

"نہیں..." میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "یہ کوئی قابلِ شرم بات نہیں، کوئی اخلاقی یا قانونی جرم نہیں اور کوئی گناہ نہیں کہ میں اس کا اعتراف تم جیسے شیطان کے سامنے کرتے ہوئے ڈروں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمھارے اس فریب کے اڈّے کو میں نے ختم کیا تھا۔ انہی چند سرپھرے سرفروشوں کی مدد سے جو ایم آر ایس کے نام کو مضحکہ خیز تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے مشن کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اپنی زندگی سے بھی زیادہ۔"

"ویری گڈ... اپنے سکندرِ اعظم صاحب۔" دلاور نے طنزیہ اور تمسخر والے انداز میں تین بار تالی بجا کے کہا۔ "افسوس ہے کہ یہ

"ڈائیلاگ حب الوطنی پر بنی ہوئی کسی فلم میں اداکار محمد علی نے نہیں کیے ورنہ لوگ بہت تالیاں پیٹتے۔ خصوصاً صف اوّل کے لوگ۔ سیوک رام اور اس کی بیوی کو اور کرنل جگن ناتھ کو تم نے قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ اور ہمیں اس کارنامے پر فخر ہے۔" میں نے کہا۔ باقی سب اس لیے چپ کھڑے رہے کہ ان کے جذبات کی ترجمانی میں کر رہا تھا۔

"کیا تم سمجھتے تھے کہ چند افراد ایک حکومت کی مشینری کو تباہ کر سکتے ہیں؟ تم اتنے کم عقل تو نہیں تھے۔ تم سب..." وہ بولا۔ "بس مجھ سے دشمنی میں اپنے ساتھ میرا نقصان کرکے خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ تم نے سمجھ لیا کہ ایک ملک سے جو آبادی اور فوجی قوت کے اعتبار سے اس ملک سے پانچ گنا بڑا ہے تم پانچ آدمی اور ڈھائی عورتیں ٹکر لے سکتے ہو، سوچو ذرا یہ کیسی شیخ چلّی کی کہانی ہے۔ انڈین آرمی... کمانڈوز اور ملٹری انٹیلی جنس کے وسائل، ان کی تنظیم... طاقت اور وسعت کا چند افراد کا کیا مقابلہ جن کے پاس اپنا پستول تک نہ ہو۔ جو راہ چلتے لوگوں سے کاریں چھین کر کام چلاتے ہوں اور اِدھر اُدھر سے ریوالور چھین کر اسلحہ حاصل کرتے ہوں... یہ چور اُچکّوں کی غیر مسلح فوج کہاں اور انڈین آرمی کہاں۔"

"چوہدری دلاور! تاریخ کا سبق کچھ اور بھی ہے۔" میں نے تنگ آ کے کہا۔ "یہ دنیا صرف طاقت رکھنے والوں نے نہیں بنائی ہے۔ آج جو کچھ ہے تعلیم اور تہذیب کی ترقی۔ علم کی روشنی اور سائنس کا ارتقا... یہ سب ان کی بدولت ہے جو جسمانی طور پر بہت کمزور لوگ تھے۔ وہ نہ جنرل تھے، نہ پہلوان اور نہ باکسر... نہ جوڈو کراٹے کے ماہر اور نہ سُپر مین۔ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے والے کتنے زیادہ اور کتنے طاقتور تھے۔ امام حسینؓ کے مقابل یزید کا کتنا بڑا لشکر تھا مگر کیا وہ جیت گئے اور آج فتح مند کون ہے؟ سقراط کو زہر کا پیالہ دینے والے اور گلیلو پر کفر کے فتوے صادر کرنے والے کیوں کامران نہ ہوئے۔ اس لیے کہ عیسیٰؑ یا محمدؐ۔ سقراط، حسینؓ یا گلیلو کسی فرد کا نہیں، ایک سچائی کا نام تھا اور سچائی ناقابلِ شکست رہتی ہے، خواہ سچ بولنے والے کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ عرب کے ریگزاروں سے اُٹھنے والی ایک آواز آج دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ایک ارب انسانوں کی آواز ہے۔ اس آواز کو دبانے والے ہزار یا دس ہزار تھے۔ ایک لاکھ تھے۔ ان کو بھی بہت گھمنڈ تھا اپنی طاقت کا۔"

"تمھارے ساتھ یہی ایک خرابی ہے۔" دلاور کا موڈ آف ہو گیا۔ "کہ تم سے آج کی بات کی جائے تو تم گزرے ہوئے کل کی تاریخ پڑھانے لگتے ہو یا آنے والے کل سے ڈرانے لگتے ہو۔ میں دنیا کی بات کرتا ہوں تو تم آخرت کی۔ میں تم کو بتانا چاہتا

ہے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سب باتیں دیر سے معلوم ہوئیں، ورنہ میں خود تم کو تھوڑا تھوڑا کر کے قتل آہستہ آہستہ مارتا۔ نہ جانے کیوں پہلے میں تم کو ڈھیل دیتا رہا۔ تمھارے باپ کے ساتھ تھوڑی سی زیادتی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے میں نے تمھاری جوانی پر رحم کھایا۔ کسی حد تک تمھارے نقصانات کی تلافی کی کوشش بھی کی تو تمھارے جذبات کے آتش فشاں کو سرد کرنے کی بھی۔ اس کا خمیازہ میرے ساتھ دوسروں نے بھی بھگتا۔ تم نے کرماں والی کے اڈّے سے بارہ ٹائم بم چوری کر لیے۔"

"چوری نہیں کیے... چھینے..." میں نے کہا۔

"ان میں سے چار کو تم نے مجھ پر اور میرے دوستوں پر استعمال کیا۔" وہ بولا۔

"تم کو ہماری شرافت کا قائل ہو جانا چاہیے کہ ہم نے اس ملک میں ایس پی سراج کی والدہ کو، حشمت خان کی فیملی کو اور تمھارے گھر کو بخش دیا کیونکہ ہم جنگ میں عورتوں، بچّوں کو مارنے کے قائل نہیں تھے۔ تم نے جو کچھ رابعہ اور شہلا کے ساتھ کیا اس کا ذکر کرتے تمھیں شرم آتی ہے؟"

"ٹھیک ہے... تم فرشتے ہو اور میں شیطان ہوں۔" وہ بولا۔ "تم نے اس ملک کے قانون کے تحت ہی اتنے جرائم کیے ہیں کہ تم کو دس دس بار پھانسی ہو سکتی ہے مگر اب تمھاری سزا کا اختیار انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو اس ملک کے قانون کے پابند نہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم سب کو زندہ سلامت ان کے حوالے کر دوں۔ وہ تم سے سیوک رام اور کرنل جگن ناتھ کے علاوہ اپنے کے دوسرے ساتھیوں کے خون کا حساب لیں گے اور یہ بھی پوچھیں گے کہ تمھارے ساتھی اور مددگار کون ہیں۔ وہ دیکھیں گے تمھارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ تم نے میری انٹیلی جنس سروس کی فراہم کردہ معلومات کی تعریف کی تھی۔ یہ سب میں نے نہیں، انھوں نے خود معلوم کیا اور مجھے بتایا۔ کیا یہی وہ بڑھیا تھی جو ورکر فیملی کے گھر میں بھیس بدل کے ملازم رہی تھی؟" اس نے کیتھرین کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔" میں نے کہا مگر اسی وقت کیتھرین نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ دلاور مسکرایا۔ "بیک وقت ہاں اور نہیں؟ خیر جھوٹ سچ کا پتا وہ خود چلا لیں گے۔ میں تو تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمھارا سارا ڈراما انھوں نے بہت دلچسپی سے دیکھا... سب تمھارے استاد ٹیڈی وہاں مونگ پھلی بیچتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ جانباز صحافی تھا جو ابھی غائب ہے مگر کب تک غائب رہے گا۔"

یہ غالب کے غائب ہونے کی بُری خبر نہیں تھی، اس کے ہونے کی خوشخبری تھی۔ میرا دل ایک دم خوشی سے لبریز ہو

گیا اور میں نے ان آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا جو میری دلی مسرت کا سرچشمہ بن کے آنکھوں سے رواں ہونے پر بضد تھے۔ اس وقت میرے رونے کو میری خوشی کی انتہا کون مانتا۔ اسے میری بزدلی اور کم ہمتی سے تعبیر کیا جاتا۔

"انھوں نے بعد میں سب کچھ دریافت کر لیا۔" دلاور بتاتا رہا۔ "ان کے پاس سگنل ڈیٹیکٹر تھے۔ تمھارے ٹرانسمیٹر کی ڈائریکشن سے انھوں نے تمھارا سراغ لگایا۔ پھر ورکر فیملی کے گھر میں سے سب کچھ برآمد کر لیا۔ بس یہ بڑھیا وہاں سے نکل گئی تھی... وہ ایک سسٹم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا تجربہ اسی فیلڈ میں ہے۔ غالب بھی آتا ہی ہوگا۔ شہلا کو انھوں نے چھوڑ دیا ہے کیونکہ عملاً وہ تم لوگوں کی تخریبی سرگرمیوں میں تمھارے ساتھ نہیں رہی تھی۔ اور وہ ہے بھی بالکل بے ضرر لڑکی... نازو بھی ماں باپ کے گھر میں محفوظ رہے گی۔ اس کے بھائی نے یقین دلا دیا ہے کہ اسے گھر میں زنجیروں سے باندھ کے رکھنا پڑا تو رکھا جائے گا... باقی سب لوگوں کو بہت جلد آگے روانہ کر دیا جائے گا۔"

دلاور کی باتوں نے مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔ وہ جھوٹ بولنے اور اُسے سچ بنا کے پیش کرنے کا ماہر تھا لیکن اس وقت جو کچھ اس نے کہا غلط نہیں لگتا تھا۔ وہ خود کچھ پریشان سا تھا۔ غالباً اس کو اپنا کارندہ بنانے والوں نے اس کی نااہلی کے باعث ہونے والے نقصانات پر اظہارِ تشویش کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فوری طور پر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو اس کا کاروبار ہی نہیں، خود اس کا وجود اور اس کے خاندان کا اور ساتھیوں کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ ہمیں گرفتار کر کے دشمنوں کے حوالے کرنے سے وہ محفوظ ہو سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیں آپ کے مجرم، اب آپ ان کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔

دلاور کے اشارے پر ہم سب کو باری باری باہر لے جایا گیا۔ کمرے کے مخالف کونوں میں دونوں مسلح افراد مشین گن لیے موجود رہے اور ان کی نظر ایک پل کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی تھی بلکہ میں نے تو ان کو پلک جھپکاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل منجمد اور بے حد مستعد تھے۔ مشین گن کی موت اگلنے والی نال کا رُخ ایک ہی جگہ رہا تھا اور ان کی انگلی کو ٹرائیگر پر دیکھ کر دہشت اس لیے محسوس ہوتی تھی کہ کہیں وہ اس اعصابی کشیدگی کے باعث غیر ارادی طور پر دباؤ نہ بڑھا دیں اور اس سے پہلے کہ ان کو غلطی کا احساس ہو، ہم میں سے کسی کا جسم چھلنی بن جائے۔ ان کو واضح حکم تھا کہ کوئی بھی خطرے کی بات دیکھیں یا ہم سے کوئی خطرہ محسوس کریں تو فائر کھول دیں۔ ان کے عزائم کا اظہار ان کے چہروں کی بے حسی اور ان کی آنکھوں کی سفّاک چمک سے ہوتا تھا...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی مجھے انسان سے زیادہ مشینی روبوٹ لگے جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دلاور کے اختیار میں تھی۔ دلاور ایک اشارہ کرتا اور وہ حرکت میں آجاتے۔ مشین گن رکھ دیتے۔ بیٹھ جاتے۔ لیٹ جاتے یا کھڑے ہو کر پھر مشین گن اٹھا لیتے اور یہ دیکھے بغیر کہ سامنے دیوار ہے یا ان ہی جیسے آدمی قطار میں کھڑے ہیں، وہ گولیوں کی بوچھار کر دیتے۔ یہی سب کچھ سمجھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی بہادر بننے کی بالکل بے وقوفی نہیں کی۔

جب میری باری آئی تو میں نے کسی بہادر جنگی قیدی کی طرح مارچ شروع کیا۔ ایک شخص میرے پیچھے تھا اور دو کچھ فاصلے سے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ویسے تو وہاں ہر آدمی دشمنِ جاں تھا اور مجھے قاتل موڈ میں نظر آتا تھا لیکن اس بار محافظوں کے انداز میں ملٹری ڈسپلن کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ حملہ کرنے والے یقیناً احمقوں کا ایک گروہ تھے جو اپنی تعداد اور طاقت کے بل پر ہمیں گرفتار تو کر لائے تھے لیکن بہت بڑی قیمت دے کر۔ ان میں نظم و ضبط کا فقدان تھا اور وہ کسی منصوبے کی پیش بندی کیے بغیر آپہنچے تھے۔ خود دلاور احتیاط پسند اور ہوشیار آدمی تھا مگر وہ بھی کام لیتا تھا، پریڈ نہیں کراتا تھا۔ یہ تجربہ اس اعتبار سے جدا تھا کہ دلاور ان پر حکم نہیں چلا رہا تھا۔ وہ دلاور کے سامنے اس کے غلاموں کی طرح باادب، باملاحظہ ہوشیار نہیں کھڑے تھے اور بظاہر صرف ادائے فرض میں مصروف تھے۔ انھیں کسی سے سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیا کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ ان کو حکم تھا کہ جو لوگ وہاں لائے جائیں، انھیں کہیں نہ جانے دیں۔ حتی الامکان زندہ اور اسیر رکھیں۔ یہ ناممکن ہو جائے تو شوٹ کر دیں لیکن فرار نہ ہونے دیں۔ ورنہ یہ ان کا جرم سمجھا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ جو کمرے میں موجود تھے وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ اب بھی خاموش تھے اور ایک تو مشین گن کے ساتھ میرے ہر قدم کو شمار کرتا پیچھے آرہا تھا لیکن دائیں بائیں چلنے والے فرشتے خالی ہاتھ تھے۔ ان کے ساتھ چند قدم چل کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی دلاور کے آدمی نہیں تھے۔ وہ پیشہ ور قسم کے کمانڈوز تھے جو خالی ہاتھوں سے لڑنے کا فن جانتے تھے۔ مجھے ان کے ہاتھوں کی ساخت اور مخصوص حرکات سے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے سیدھا بھاگنے کی کوشش کی تو وہ جوڈو کراٹے کا کون سا داؤ آزمائیں گے۔ کسی ایک پر حملہ کیا تو کیا کریں گے، قلابازی کھائی تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا اور پیچھے والے محافظ پر حملہ کر کے اس سے مشین [illegible] کوشش کی تو وہ میری کوشش کو کیسے ناکام بنائیں گے۔ میں خود بھی اس فن کو.....

... چنانچہ اپنے ذہن سے سوچنے کے باوجود میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ انھیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ قیدیوں میں [illegible] مرد اور ایک عورت مومن ہیں۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی...

دوبارہ بیرک سے گزرتے ہوئے میں شک میں [illegible] یہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا حصہ ہے یا کوئی اور [illegible] میں نے اس فیکٹری کو پوری طرح نہیں دیکھا تھا جس کی بنیاد [illegible] والد نے رکھی تھی، جس کو میرے والد نے ورکشاپ سے [illegible] بنانے میں دن رات ایک کر دیے تھے اور جو قانونی طور پر [illegible] بھی ملکیت تھی۔ اس کا کچھ حصہ میں نے بہت پہلے دیکھا تھا [illegible] یہ ہو سکتا تھا کہ اندر سے عمارت میں تبدیلی کر دی گئی ہو لیکن میرے کانوں میں باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی [illegible] جی ٹی روڈ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور اس سڑک پر چوبیس گھنٹے ٹریفک رواں رہتی تھی جس کا شور صاف سنائی دیتا [illegible] باہر کا سناٹا مجھے بہت اجنبی لگتا تھا۔

چلتے چلتے میں نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ہر [illegible] باکس کو غور سے دیکھا۔ یہ سب پانچ فٹ اونچے اور چوڑے باکس تھے جو بڑی صفائی سے موٹے تختے جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ [illegible] کہیں نظر نہ آتا تھا اور ان کے کناروں پر اینگل آئرن تھا جس سے کناروں کے ٹوٹنے یا جدا ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ [illegible] طرح رندہ پھیرنے کے بعد لکڑی پالش کی گئی تھی جو اور چمک رہی تھی [illegible] یہ باکس کس طرف سے کھلتے تھے، یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

دائیں جانب چلنے والا اچانک رک گیا۔ دوسری طرف والے نے ہاتھ اٹھا کے میرے سامنے ایک بیریئر سا بنا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔ میں رک گیا۔ دائیں طرف چلنے والے نے ایک باکس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اسے آنکھیں نکال کے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے آخر تمھارا؟"

اس نے ہاتھ سے زیادہ واضح اشارہ دیا کہ مجھے اندر داخل ہو جانا چاہیے۔

"میں اس... دڑبے میں گھس جاؤں؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مرغا ہوں... اور تم رہ سکتے ہو اس میں..." لیکن میری بات کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں حرکت میں آگئے۔ ان کو اندازہ تھا کہ بہ رضا و رغبت اور ہنسی خوشی کوئی بھی ایسے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اندر تھا۔ میرا سر سامنے والے تختے سے ٹکرایا اور اندر گونج سی پیدا ہوئی۔ میرے سنبھل کر اٹھنے سے پہلے وہ تختہ برابر ہو گیا جو ایک طرف پڑا تھا لیکن میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے تختہ برابر کیا۔ اس کے کناروں پر اینگل آئرن رکھے اور اس میں پیچ کسنے لگے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ باکس تھا ہمارے لیے [illegible] تھے اور ایم آر ایس کے باقی معزز ارکان انہی ڈبوں میں بند [illegible] جن کے پاس سے میں گزر کے آیا تھا۔ سب ڈبوں کی ساخت [illegible] تھی کہ اس کی ایک سائڈ کا کھلا حصہ قبضوں کی مدد سے [illegible] تھا اور یہ حصہ کھولنے پر نیچے گر کر فرش سے مل جاتا تھا۔ دوبارہ اٹھا کر بند کرنے کے لیے پانچ فٹ لمبا اینگل آئرن کام آتا [illegible] کے باقی تین کناروں پر اینگل آئرن پہلے سے نصب [illegible] اور شاید ہر کنارے کو ملانے والا اینگل آئرن دوسرے کنارے [illegible] اینگل آئرن کے ساتھ ویلڈ کر دیا گیا تھا۔ صرف اوپر کی ایک [illegible] ایسی تھی جس کا اینگل آئرن پیچ کھولنے سے جدا ہو جاتا [illegible] تو وہ سائڈ دروازے کی طرح کھل جاتی تھی۔

یہ بڑا مضبوط اور تکلیف دہ انتظام تھا۔ میرے ساتھ [illegible] نے والے تو گونگے بہرے بن گئے تھے۔ ان کو ضرور بات کرنے [illegible] ممانعت ہوگی تاکہ میں لہجے سے یہ اندازہ بھی نہ کر سکوں کہ وہ کس علاقے اور کس خطے کے رہنے والے ہیں۔ وہ پاکستانی بہرحال نہیں تھے اور میں ان کو مدراس، حیدرآباد دکن یا جنوبی ہندوستان کے علاقے کا رہنے والا فرض کر سکتا تھا۔ وہ اپنی تربیت اور ہدایات [illegible] اصولوں پر سختی سے عمل کر رہے تھے۔ ایک منٹ میں انھوں [illegible] اینگل آئرن میں اسکریو ٹائٹ کر دیے اور مجھے سیل بند کر دیا۔ [illegible] سکریو ڈرائیور اور اسکریو ان کے پاس جیب میں تھے یا ڈبے [illegible] پاس ہی کہیں موجود تھے، یہ میں نہ دیکھ سکا تھا۔

پانچ فٹ کی چوڑائی اور اونچائی ایسی تھی کہ میں نہ سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ پیر پھیلا کے لیٹ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اگر اس پنجرے میں مجھے دس پندرہ دن رکھا گیا تو میری کیا حالت ہو جائے گی۔ قید میں سب سے زیادہ اذیت ناک احساس تنہائی کا ہوتا ہے چنانچہ نظربندی بھی صرف اس لیے [illegible] بن جاتی ہے کہ آدمی کا مونس دیواروں کے سوا کوئی نہیں رہتا۔ [illegible] چلنے پھرنے اور کھانے پینے کی آزادی ہوتی ہے اور بعض اوقات لوگوں کو اپنے ہی گھر میں بھی نظربند کیا جاتا ہے مگر اس وقت اپنا گھر بھی بیگانہ لگتا ہے جب گھر کے دروازے خود صاحبِ خانہ کو باہر نہ جانے دیں اور اس کو ساری دنیا سے الگ کر دیں۔ [illegible] آدمی اپنے آپ سے باتیں کرے تو دیوانہ نظر آتا ہے اور کہلاتا ہے۔ مسلسل خاموشی اعصاب کو شکست دینے لگتی ہے اور نظربندی فی الحقیقت زباں بندی بھی بن جاتی ہے۔

یہاں قید تنہائی کے علاوہ بھی بہت سے عذاب تھے۔ [illegible] اندھیرا تھا۔ نقل و حرکت کی جگہ انتہائی محدود تھی اور سب سے [illegible] اپنے جانور ہونے کا احساس تھا۔ اشرف المخلوقات کو اس [illegible] میں ڈال دیا گیا تھا جس میں شاید گدھا بھی نہ سماتا۔ تاہم [illegible] اپنی مرضی کا زنداں نہیں منتخب کر سکتے اور وہاں پسندیدہ [illegible] کا تقاضا بھی نہیں کر سکتے۔ کسی عالمی انسانی منشور میں اسیروں کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ انگریز تو کہتے ہیں کہ خیرات مانگنے والے بھی اختیار کا حق نہیں رکھتے۔ انھیں وہی قبول کرنا پڑتا ہے جو خیرات دینے والے دیں۔

خود کو اس فلسفے سے قائل کرنے کے بعد میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ میری جیب میں سے سگریٹ تک نکال لی گئی تھی لیکن سگریٹ ہوتی تو اس ڈبے کی پچیس مکعب فٹ ہوا کو دھوئیں سے آلودہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ میں نے اندر کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور کونوں میں انگلی پھیر کے دیکھا، مجھے کوئی درز یا سوراخ محسوس نہیں ہوا۔ تاہم باکس ایئر ٹائٹ نہیں تھا اور مجھے امید تھی کہ جتنی آکسیجن میں خرچ کروں گا اتنی باہر سے آتی رہے گی اور جو کاربن ڈائی آکسائڈ [illegible] باہر نکلتی رہے گی۔ کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا سے تو غالباً ہلکی ہوتی ہے، میں نے سوچا۔

پرائمری اسکول کے زمانے سے میں یہ پڑھتا چلا آرہا تھا کہ تمام جانداروں کو جن میں پودے بھی شامل ہیں، زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا کے علاوہ دھوپ، پانی اور خوراک کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اگر میں سکندر بخت نہیں ٹماٹر کا پودا ہوتا تب بھی ان چار چیزوں کے بغیر مر جاتا اور ابھی تک میں یہ دریافت کر پایا تھا کہ تازہ ہوا تو حسبِ ضرورت ملتی رہے گی۔ دھوپ کا گزر بعید از قیاس تھا مگر خوراک اور پانی کی فراہمی بھی مشکوک تھی۔ اللہ پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے تو باکس میں بند سکندر بخت کے لیے بھی کچھ کرے گا۔ خود سکندر بخت کیا کرے گا اگر اسے اپنے موجودہ بیڈروم کو ہی باتھ روم کے طور پر استعمال کرنا پڑا؟

میرے پاس کیتھرین کی حاضر دماغی کے باعث ایک ریوالور محفوظ رہ گیا تھا۔ دشمن، چور ڈاکو یا قاتل خواہ کتنی ہی باریک بینی سے کام لیتے ہوئے احتیاط اور حفظِ ماتقدم کے سارے تقاضے پورے کریں مگر کہیں نہ کہیں غیرارادی طور پر بھول چوک کر جاتے ہیں۔ حد سے زیادہ مستعد ذہن ننانوے فیصد درست چلتا ہے مگر ایک فیصد خطا بھی نہ کرے تو آدمی خطا کا پتلا کیسے کہلائے۔ ہمارے مقتول شکاری بھی کیتھرین کی بے ہوشی کے ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے چنانچہ ان کے ذہن میں صرف کیتھرین کی بزدلی کا احساس رہ گیا تھا اور یہ خیال محو ہو گیا تھا کہ ان کو اس حد درجہ کمزور عورت کی تلاشی لینے کی رسمی کارروائی تو کرنا ہی چاہیے۔ اس کے بعد وہ ریوالور میں نے لے کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا مگر اب میں حیران تھا کہ اس عقل مندی کا کیا کروں۔ ریوالور میرے لیے اتنا ہی بے کار تھا جتنا خالی ہاتھوں سے لڑنے کا فن... میں ان دیواروں کو شوٹ نہیں کر سکتا تھا جو ہر طرف پانچ فٹ کے بعد سامنے آجاتی تھیں۔ اس محدود وسعت میں بہت سے کام ناممکن تھے۔ میں چہل قدمی نہیں فرما سکتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

زیادہ سے زیادہ رکوع کی حالت میں دو قدم جا سکتا تھا۔ سیدھا کھڑا ہو کے انگڑائی نہیں لے سکتا تھا اور ڈنڈ تو نہیں پیل سکتا تھا مگر بہت سے ایسے طریقے بھی تھے جن سے میں ہاتھوں پیروں کو حرکت دے کر ان کی کارکردگی کا معیار برقرار رکھ سکتا تھا۔ میرے لیے بیٹھ کر گردن اور کمر کی ورزش کرنا بھی ممکن تھا۔

یہ سب خیالات قبل از وقت تھے۔ ابھی میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے اس ڈبّے میں کتنا عرصہ رہنا ہوگا۔ رکھنے والے مجھے اسی حالت میں ایک سال بھی رکھتے تو مجھے کوئی معجزہ ہی بچاتا۔ وہ مجھے چند گھنٹوں کے بعد تفتیش کے لیے زیادہ دیر پُر عذاب جگہ طلب کر لیتے یا کچھ پوچھے بغیر عالمِ بالا کو ارسال کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ان کی مرضی۔ میں نے اطمینان سے بیٹھ کر صورتِ حال میں امید کا پہلو تلاش کرنا شروع کیا۔ ریوالور میرا بہت بڑا سہارا تھا۔ فرض کرو ایسا ہو جائے کہ کوئی شخص مجھے دانہ پانی ڈالنے آئے اور میں اس کو دبوچ لوں۔ میں نے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ اگر کوئی آئے گا تو اکیلا نہیں آئے گا۔ باہر دوسرا قاتل موجود رہے گا کہ اِدھر میں ڈبّے سے گردن نکالوں اُدھر وہ میرا قصہ پاک کرے۔ ایک قفل ہوتا یا ایک کُنڈی ہوتی تو میں گولی سے اُڑا دیتا لیکن پانچ فٹ لمبے اینگل آئرن کا ایک گولی سے کیا بگڑے گا جو کئی جگہ سے اسکریو لگا کے جوڑا گیا ہو۔ اور گولی چلاتے ہی سب بھاگے چلے آئیں گے۔ ڈبّے سے باہر نکلنے کے بعد کون سی آزادی مل جائے گی۔ آگے کئی بند دروازے ہوں گے اور راستہ روکنے والے محافظ ہوں گے۔ چنانچہ سکندر بادشاہ! تم کو دوسروں کے مقابلے میں اس ریوالور کے باعث صرف ایک فائدہ ہو سکتا ہے کہ تم قید کی سختی نہ جھیل سکو تو خودکشی کر کے حرام کی موت مر جاؤ۔

لاحول ولاقوۃ! میں نے کہا۔ ایسے مایوس کُن خیالات کا آخر کیا مطلب ہے؟ مجھے کچھ تو شرم آنا چاہیے۔ میرے ساتھ محسن بھی بند ہے اور وہ زیادہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہوگا کیونکہ اس کو بیوی یاد آ رہی ہوگی اور اس بچّے کا خیال ہوگا جس کا باپ شاید اسے کبھی نہ دیکھ سکے۔ میرے ساتھ رابعہ ہے اور کیتھرین ہے۔ ڈاکٹر فل وومن۔ اس کی بیٹی بسترِ مرگ پر ہے مگر وہ زندگی سے مایوس نہیں ہے اور اس کا خدا کے اعجازِ مسیحائی پر اعتقاد کم نہیں ہوا ہے۔ مزید یہ کہ مردہ بھی زندہ ہو گیا ہے یعنی مرزا غالب جن کو میں مرحوم سمجھ کے رو بھی چکا تھا بفضلِ خدا ابھی تک دشمن کے ہاتھ نہیں لگے ہیں۔ وہ الّو کا پٹھا آخر کہاں گیا اور چھپ کر کیا کرتا رہا۔ ہمارے آنے کے بعد نکلا ہوگا تو اس کا فائدہ؟ پھر بھی اللہ سے دعا ہے کہ اس کو عقل اور ہمت دے کہ وہ ایم آر آئی ایس کے منشور پر عمل کرتے ہوئے جہاد جاری رکھے۔ ہمارا سراغ لگائے پھر ہمیں ایسے نکال لے جائے جیسے اسمگلر کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ممنوعہ سامان نکال لے جاتے ہیں۔ افسوس یہ کہ نازو نے میکے جانے کے لیے بہت غلط وقت انتخاب کیا۔ اس نے کیا انتخاب کیا شہلا کی مجبوری نے مروا دیا۔ وہ باہر ہوتی تو اس سے امید رکھی جا سکتی تھی کہ وہ دشمنوں کے [illegible] کھٹے کر دے یا توڑ دے۔

کسی نے دروازہ کھولنے کا عمل شروع کیا اور میں نے اپنا ریوالور تیار کر لیا مگر جیب سے نکالا نہیں۔ پانچ منٹ میں بولٹ کھل گئے اور دروازہ ہٹا تو مجھے منکر نکیر میں سے ایک نظر آیا۔ ان دونوں کا ابھی تک مجھے نام تو معلوم تھا نہیں جو مجھے اس ڈبّے تک لانے اور اندر پہنچانے کے ذمے دار تھے۔ وہ پھر سامنے آئے تو مجھے منکر نکیر کا ہی خیال آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ میں ایک تابوت میں تھا۔ دوسرا باہر کھڑا رہا۔ تو ذرا چھوٹا تھا "تشنۂ مضراب سے ساز" کی عملی تفسیر بنا ہوا۔ وہ مار دھاڑ کے لیے کچھ بے چین نظر آتا تھا اور میری بے عملی سے مایوس تھا۔

"السلام علیکم حضرت!" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "کیا لے آئے؟" گیٹ کھولنے والے نے ایک کاغذ میں لپٹا ہوا بنڈل اندر رکھا۔ پھر موم کاغذ کا بنا ہوا پانی کا گلاس بھی احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھا۔

"دیکھیے! صبح ناشتے میں دو انڈے ہاف فرائی... ایک کافی... توس دو عدد براؤن کیے ہوئے..." میں نے کہا مگر وہ گیٹ اوپر اٹھا چکا تھا اور اس کے نٹ بولٹ کس رہا تھا۔ "عجیب بداخلاقی کا دور ہے" میں نے کہا۔ "یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں" میں نے ذرا [illegible] پر غور فرماتے ہوئے مرزا غالب کی زبان میں شکوہ کیا۔ ابھی مجھے بھوک نہیں تھی مگر میں نے سب کچھ پیٹ میں انڈیل لیا اس خیال سے کہ کہیں مجھے بھوک ہڑتال پر سمجھ کے وہ اس من و سلویٰ کو بھی نہ لے جائیں۔ پانی میں نے نہیں پیا کیونکہ پھر ساتھ پانی کے جسم سے اخراج کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

میری عقل ابھی تک کام کر رہی تھی چنانچہ میں نے جارحیت سے گریز کیا تھا۔ ایک امید قائم تھی کہ شاید قدرت کوئی ایسا موقع فراہم کر دے جب ایک ریوالور سے جنگ کا پانسا پلٹتے دیر نہ لگے۔ مارنے کو میں منکر نکیرین کو ٹھنڈا کر سکتا تھا مگر باہر مشین گن والے بھی تھے جو [illegible] کی طرح قتل و خونریزی کے لیے بہانہ چاہتے تھے۔ ابھی تک ہم میں سے کسی نے یہ بہانہ پیدا نہیں کیا تھا چنانچہ ہم سب بقیدِ حیات اور اپنے اپنے ڈربوں میں بخیر و عافیت موجود تھے۔

جب کرنے کو کچھ نہیں، سوچنا بے کار ہے۔ نہ کوئی سننے والا نہ کہنے والا تو وقت کاٹنے کے لیے سو جانا ہی بہتر ہے۔ میں نے [illegible] سونے سے جسم کی توانائی بحال ہوتی ہے اور ذہن آرام پانے کے بعد بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں تختے کے فرش پر پاؤں [illegible] سے سمیٹ کر لیٹا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی دراز قامتی میرے لیے کبھی باعثِ پریشانی یا پشیمانی نہ تھی۔ میں اس قد و قامت پر ناز کرتا تھا مگر آج مجھے خیال آیا کہ پستہ قد بھی کبھی کبھی فائدے میں رہتے ہیں۔ اگر میں پانچ فٹ قد کا ہوتا تو [illegible] کے سوتا اور باکس کے اندر مزے سے ٹہلتا۔

مجھے معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا اور سو چکا تھا یا ابھی سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے کانوں نے دستک سُنی اور میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ یہ دستک میرے ڈربے کے صدر دروازے پر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آواز مجھے اپنے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ کھٹ کھٹ... کھٹا کھٹ... کھٹا کھٹ... کھٹا کھٹا کٹ کٹ... میں وقتی خوشی سے اُچھل پڑا۔ یہ مورس کوڈ کا سگنل تھا۔ ایک پرانی یاد نے پھر دل کا دریچہ کھولا۔ میں نے غور سے سُنا۔ از کجا می آید ایں آوازِ دوست!

آوازِ دوست پڑوس میں سے سنائی دے رہی تھی جیسے میرے پنجرے کے ساتھ ہی محسن خاں دوسرے پنجرے میں قیام پذیر تھے۔ معلوم نہیں اس نے کیسے جانا کہ میں اس کا ہمسایہ ہوں۔ غالباً اس نے قسمت آزمائی کی لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ میں نے اس کے پیغام کو صاف سمجھ لیا۔ اس نے صرف میرا نام لیا تھا۔ سکندر... میں نے فوراً پیچھے کی دیوار پر انگلی بجا کے جواب دیا... یس...

مورس کوڈ ایک عظیم ایجاد ہے۔ اسے ٹیلیگراف آفس میں تار دینے والے نہیں سمجھتے۔ شاید تار ارسال کرنے والے بھی اسے مسلسل استعمال کرنے سے اتنے بیزار ہو جاتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا پسند کرتے ہیں یا یوں ہی شغلاً دو چار ہاتھ اِدھر اُدھر مار کے ڈیوٹی پوری کرتے ہیں۔ تار نہ پہنچنے یا غلط پہنچنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ ورنہ نقطوں اور لکیروں کی یہ زبان ایک عالمی زبان ہے جسے اہلِ زبان بھی استعمال کر سکتے ہیں اور بے زبان بھی... ہنگامی حالات میں اس سے پیغام ارسال کرنے کے لیے کسی بھی سطح کو کسی بھی چیز سے بجا کے کام چلایا جا سکتا ہے۔ محسن نے نقطے کے لیے انگلی آہستہ سے ماری تھی اور لکیر کے لیے ذرا زور سے اور دبا کے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ کسی ٹرانسمیٹر، واکی ٹاکی، لفافے یا کبوتر کے بغیر ہمارے درمیان مواصلاتی رابطہ قائم ہو گیا۔

"کیا حال ہے... شیر لوہے کے جال میں ہے؟" محسن بولا۔

"بس خواہش کر رہا تھا کہ میرا قد چار فٹ گیارہ انچ ہوتا۔" میں نے کہا۔

"ہم یہاں کب تک رہیں گے آخر؟"

"یہ تو بابا آدم کو بھی علم نہ تھا کہ وہ جنت میں کتنا عرصہ رہ سکے۔" میں نے کہا۔

"تو نے ضرور غور و خوض فرمایا ہوگا۔ کافی فرصت تھی... کہ ہمارا انجام کیا ہوگا۔"

"میں کچھ استراحت فرماتا رہا۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے غور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ نے یہ احمقانہ سوال بھی غور فرمائے بغیر کیا ہے۔"

"یار مختصر بات کر... انگلیاں تھک جائیں گی۔" محسن بولا۔

"یار میرے پاس ایک ریوالور ہے۔" میں نے کہا۔

"تو سیریس نہیں ہے اُلّو کے پٹھے۔"

"کیا میں ایک گولی چلا کے ثبوت پیش کروں؟" میں نے کہا۔ "اپنا سر سامنے رکھ اس تختے کے درمیان میں۔ ریوالور مجھے آنٹی نے دیا ہے۔"

"کیتھرین نے؟"

"ہاں... وہ تلاشی سے بچ گئی تھی۔"

"معلوم نہیں یہ اچھی بات ہے یا بے کار بات ہے۔" محسن بولا۔ "اس کے استعمال کی نوبت آئے گی یا نہیں۔"

"رابعہ اور کیتھرین کا کیا حال ہے؟"

"معلوم نہیں... ان کو جو بنگلا الاٹ کیا گیا ہے وہ دُور ہے۔ میرے دوسرے پڑوسی خواجہ صاحب ہیں۔"

"وہ زندہ تو ہیں؟"

"ہاں۔ میں نے پہلے ادھر پیغام دے دیا تھا۔ اس نے جواب میں چلا کے کہا کہ کون ہے بھائی... اندر آ جاؤ..." محسن بولا۔ "پھر میں نے دوسری طرف کوشش کی۔"

"تجھ پر کیا وحی نازل ہوئی تھی کہ دوسرے بنگلوں میں کون ہے؟"

"جب مجھے یہاں ٹھہرایا گیا تھا تو ظاہر ہے اس فائیو اسٹار ہوٹل کے باقی کمرے دوسرے مہمانوں کے لیے بُک تھے۔" محسن بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ہمیں رکھنے کے لیے اتنا تکلف کیوں کیا گیا۔" میں نے کہا۔ "باکس بنوانے ضروری نہیں تھے۔ ہمیں ایک ہی کمرے میں بھی بند کیا جا سکتا تھا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ باکس ہمارے لیے نہیں بنے۔ اس میں سامان جاتا ہے۔" محسن نے جواب دیا۔ "ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ سب کے تختوں پر ایک ہی پتا لکھا ہوا تھا۔"

"کیا لکھا ہوا تھا؟"

"نام تو میں... یاد نہیں رکھ سکا..." محسن نے جواب دیا۔ "بہت مشکل اور لمبا نام تھا۔ کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ قسم کا... پتا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔"

"پھر تو تو نے دیکھا اور میں نے نہیں دیکھا... ایک ہی بات ہے۔"

"نہیں یار... ملک کا نام مجھے یاد ہے... بلکہ شہر بھی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن بولا۔" اس پر تو شرک کا نام۔ٹیلیکس نمبر۔کیبل ایڈریس اور فون وغیرہ سب ہی لکھا گیا تھا۔اسٹینسل سے حروف پینٹ کیے گئے تھے۔وہ سب میں کیسے یاد رکھتا۔شہر کا نام تھا" ایلڈومیٹ سٹی۔"

"کیا... ایلڈومیٹ ؟" میں نے کہا۔" تو نے ٹھیک سے دیکھا تھا۔"

" ہاں یار... یہی نام تھا... اے ایل ڈی او ایم اے ٹی۔"

" یہ کیسے ہوسکتا ہے...؟"

" مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ ایک دوا کا نام ہے۔" محسن نے کہا۔

" ہاں۔ اور یہ بلڈ پریشر کی دوا ہے۔بہت عام۔" میں نے کہا۔

" اور اسی لیے مجھے یہ نام یاد رہ گیا۔" محسن نے جواب دیا۔" کہ خود میرے والد یہ دوا استعمال کرتے تھے۔"

" ملک کا نام کیا تھا ؟"

" یہ مت کہنا کہ میری عقل گھاس کھا گئی ہے۔یا میری دور کی نظر خلاص ہوگئی ہے۔" محسن بولا۔" ملک کا نام تھا... دس بی دانیا..."

" دس بی دانیا ؟" میں ہکا بکا رہ گیا۔

" ہاں دس بی دانیا۔" محسن بولا

" اس کا مطلب تو ہے... خدا حافظ..."

" میں نے اور تو نے فلم پردیسی ایک ساتھ دیکھی تھی۔" محسن بولا۔" لندن میں بھی کچھ دن یہ لفظ چلا تھا۔"

" یہ روسی زبان کا لفظ ہے۔" میں اب محسن کی بات سمجھنے لگا تھا۔" فلم میں ایک گانا تھا۔پھر ملیں گے جانے والے یار دس بی دانیا۔"

" ہاں۔ اچھا گانا تھا مگر وہ دوسرا گانا زیادہ اچھا تھا۔نادریم تنا دے رے نا۔" محسن بولا۔" لتا کی آواز میں۔"

" لاحول ولا قوۃ... موسیقی ہمارا موضوع نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" تیری بات سے تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پتا بھی بوگس ہوگا۔ٹیلیکس نمبر... کیبل ایڈریس... فون نمبر... سب غلط ہوگا۔"

" اتفاق سے میں آپ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔"

" اور یہ سب مال جاتا کہاں ہوگا ؟" میں نے کہا۔

" جہاں اسے نہیں جانا چاہیے۔" محسن بولا۔" لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں سے کراچی جاتا ہوگا۔ وہاں بندرگاہ سے کسی بحری جہاز پر لادا جاتا ہوگا۔ اب جیسا کہ تو جانتا ہے۔ بندرگاہ تو پورا شہر ہوتا ہے جس کا سر پیر نہیں ہوتا۔ ہر روز نہ جانے کتنے مال بردار جہاز آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنی گودیاں ہیں اور کتنے گودام۔ سیکڑوں ایسے اور اس سے چھوٹے بڑے باکس اور کنٹینرز۔"

" ہاں... کنٹینرز۔" محسن بولا۔" جس میں ہم لائے گئے تھے۔"

"ان کنٹینرز میں کتنے باکس آسکتے ہیں ؟" میں نے کہا۔

" سولہ... ایسے ہی باکس..." محسن نے ہونہار طالب علم کی طرح فوراً جواب دیا۔" وہاں اس قسم کے کنٹینرز بھی روزانہ اتارے چڑھائے جاتے ہیں۔ہزاروں مزدور اور بندرگاہ کے عملے کے ہزاروں افراد دن رات یہ کام کرتے ہیں۔کون غور کرتا ہے کہ کس پیٹی، پارسل، باکس یا کنٹینرز پر کیا پتا لکھا ہوا ہے۔ مال جانا ہے تو چلا جائے گا۔ چڑھانے والے خود بحری جہاز پر لوڈ کر آئیں گے۔ کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ اور ان کے ایجنٹ۔سب مل کے کسی بھی چیز کو جہاز تک پہنچا سکتے ہیں یا بندرگاہ سے نکال سکتے ہیں اور جہاں تک مجھے یقین ہے سب لوگ دنیا کے تمام ممالک اور تمام شہروں کے نام نہیں جانتے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کے رکن کتنے ممالک ہیں اور ان سب ممالک کی بندرگاہوں کے نام کیا ہیں۔"

" نہیں... یہ جواب تو کمپیوٹر بھی نہیں دے سکتا ہے کیونکہ آئے دن کوئی پنڈدادن خان جتنا ملک خود مختاری حاصل کرلیتا ہے اور چند جزائر پر مشتمل مملکت بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

" رائٹ... اسی کم علمی کو دنیا کا زیادہ علم رکھنے والوں نے استعمال کیا۔" محسن بولا۔" عام مزدور تو پڑھ بھی نہیں سکتا۔اس کو بندرگاہ کے اندر کوئی ایجنٹ کہے گا کہ یہ فلاں جہاز کا مال ہے ایجنٹ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً دشمن کا ایجنٹ... جہاز بھی انہی کا ہوگا۔"

" یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔"

" ہاں۔ مگر کرنے والے کر رہے ہیں۔" محسن بولا۔" خطرے سے کھیلنے کا ہی معاوضہ پا رہے ہیں۔ اول تو وہ اپنے مال کے سوا کسی کے مال پر نظر ڈالتے نہیں۔ سب اپنا مال پہچانتے ہیں اور اسی کو تلاش کرتے ہیں۔ کوئی دیکھے تو سوچتا نہیں کہ یہ شہر اور یہ ملک کہاں ہوں گے۔ ٹانگانیکا... ہونولولو... وغیرہ وغیرہ یہ بھی تو شہر ہی ہیں۔"

" تیری نظر... تحقیق اور استدلال سے ہم مرعوب اور خوش ہوئے۔"

" صرف خوش ہونے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم فوت بھی تو ہوسکتے ہیں۔"

" اگر فوت نہ ہوئے تو یہ معلومات کارآمد ہوں گی۔" میں نے کہا۔

" فوت تو ہونا پڑے گا۔"

" یار ہوسکتا ہے غالب دھاوا بول دے۔" میں نے کہا۔

"... ہے۔"

"... تو باتیں تصدیق طلب ہیں۔" محسن بولا۔" ممکن ہے وہ بھی آئے ہوں اور ہماری طرح آرام کر رہے ہوں... اس کے علاوہ غالب صرف بول سکتا ہے، دھاوا نہیں بول سکتا۔"

"اس کو فلمی ہیرو کی طرح چانس ملنا چاہیے... دیکھنا وہ پنتوں کے پنتے لگاتا ہے۔"

" مجھے کیتھرین کا بہت افسوس ہے۔اس کے لیے دہرا عذاب ہے۔"

" ایک امید یہ بھی ہے کہ شاید اسے چھوڑ دیا جائے۔" میں نے کہا۔

" یہ لوگ بے گناہ کو بخش دینا ضروری نہیں سمجھتے۔"

" کیا تجھے اپنی زوجہ یاد آرہی ہے ؟" میں نے کہا۔

" ہاں۔ اور مجھے ہچکیاں بھی آرہی ہیں۔ یقیناً وہ مجھے یاد کر رہی ہے۔"

" مجھے بھی رابعہ یاد آرہی ہے۔ممکن ہے اب اسے ہچکیاں آنے لگی ہوں۔" میں نے کہا۔

" میری انگلیوں کی پوریں درد کرنے لگی ہیں... اس لیے وقفہ۔"

" یار یہ باتھ روم کی ضرورت ناگزیر ہوتی جارہی ہے۔"

ابھی ہمارے مواصلاتی رابطے کو منقطع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے رابعہ کے چلانے کی آواز سنی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

" کہاں لے جارہے ہو تم مجھے... بتاتے کیوں نہیں۔" اس کی بات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا اور رابعہ کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوگئی۔ اس کے چلانے کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ ہم کہیں آس پاس موجود ہوں تو خبردار ہوجائیں۔ ہمیں یہاں قید کرنے والے ایک ایک کرکے لائے تھے چنانچہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ صرف محسن نے عقل کے گھوڑے دوڑا کر مجھ سے رابطہ قائم کرلیا تھا اور یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ دوسری طرف استاد ٹیڈی ہے۔ میں نے استاد ٹیڈی کی آواز بھی سنی۔

"بے غیرت... بزدل انسانو... عورتوں پر ظلم کو بہادری سمجھتے ہو۔" اس کے مشتعل ہونے اور ایسی باتیں کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا مگر اس کے دلی جذبات عقل کے تابع نہیں تھے۔ وہ اپنے غصے اور بے بسی کا اظہار اسی طرح کرسکتا تھا۔ میں اور محسن چپ بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے ہم کیا کہتے... نہیں جانتا تھا نہ محسن کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور رابعہ کے ساتھ بھی کیا ہوسکتا ہے۔ ہم جنگی قیدی تھے اور افراد یا اقوام کے اخلاقی معاہدے یا جینوا کنونشن کے اصول ہمیشہ کاغذی پیرہن رکھتے ہیں۔ ان پر حقیقی عمل درآمد وہ بھی نہیں کرتے جو حقوق انسانیت کے عالمی منشور بناتے ہیں۔ ہم جن لوگوں کے رحم و کرم پر تھے وہ ہمارے بارے میں ایسی بہت سی معلومات حاصل کر چکے تھے جو ہمارے خیال کے مطابق صرف ہم تک محدود تھیں لیکن ابھی ان کو اور بھی بہت کچھ پوچھنا تھا۔ پوچھ گچھ کے پرانے طریقے مجھ پر آزمائے جاچکے تھے اور رابعہ کے لیے بھی نئے نہ تھے۔ پہلے ایک وکیل کی حیثیت سے اس نے پولیس کے طریق کار کا مشاہدہ کیا تھا اور بعد میں میرے ساتھ رہ کے وہ تشدد کا عملی مفہوم بھی سمجھ چکی تھی۔ مورس کوڈ کی ٹک ٹک کے بغیر زبانِ خامشی میں محسن مجھ سے ہمکلام رہا۔

" یار... یہ تو بہت برا ہوا..."

" ہم نے اچھا چاہا ہی کب تھا... اچھائی برائی سب ہمارے اور ان کے اندازِ نظر کا فرق ہے۔"

" اب وہ رابعہ پر تشدد کریں گے۔"

" ہم ان کو نہیں روک سکتے... پھر یہ سوچنے سے کیا حاصل... رابعہ کے ساتھ اس کا اور ہمارا خدا ہے۔"

اسی وقت کیتھرین نے شور مچانا شروع کیا۔" واٹ از دس... چھوڑ دو مجھے... تم اس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے... کیوں چلا رہی تھی وہ... دیکھو... اس کی جگہ مجھے مارنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں... مگر اس کو جانے دو... اس پر ظلم مت کرو۔"

بے وقوف عورت... کس سے سودا کرنا چاہتی ہے اور کیا مانگ رہی ہے۔ میں نے سوچا۔ پتھر کی دیواروں پر اثر ہوسکتا ہے لیکن ان کے کانوں پر نہیں۔ اس کی جگہ رابعہ ہوتی تو وہ بھی شور مچاتی کہ مجھے مار ڈالو مگر اس عورت کو کچھ مت کہو... اس کی لڑکی بہت بیمار ہے... وہ مر جائے گی۔

باہر سے کسی نے پھر باکس کو کھولنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد مجھے منکر نکیر نظر آئے۔ ایک نے مجھے انگوٹھے سے باہر آنے کا سگنل دیا۔ میں جھک کر رکوع کی حالت میں باہر نکلا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میں نے پھر انہی لوگوں کو دیکھا جو دلاور کے ساتھ آفس میں مشین گن لیے کھڑے تھے۔ میں نے محسن اور ٹیڈی کو بھی دیکھا جو اپنے اپنے پنجروں سے جانوروں کی طرح نکل آئے تھے اور اپنے احساسِ خودداری کو بلند رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ آپس میں کوئی بات کیے بغیر ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔ جتنی ضروری باتیں تھیں وہ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنی بے نیازی کا انداز برقرار رکھا جاسکتا تھا۔ ٹیڈی ڈربے میں شور مچا رہا تھا۔ اب خوفزدہ ہو کے خاموش ہوگیا تھا۔

اس بار ہمیں بیرک سے باہر لے جایا گیا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ جگہ شاہدرہ میں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے اندر نہیں تھی۔ وہ تنہا بیرک صنعتی علاقے میں کھڑی تھی۔ اس کے گرد و نواح میں دوسری فیکٹریاں تھیں اور دور دور تک ایسی بہت سی عمارتیں اور کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کوٹ لکھپت کا علاقہ لگتا تھا۔ ہر کارخانے میں رات کی شفٹ میں کام نہیں ہو رہا تھا چنانچہ تاریکی میں ویرانی کا تاثر گہرا ہوگیا تھا۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی اور دوسرا لائٹ ویٹ ٹرک تھا۔ ہم تینوں کو ٹرک میں سوار ہونے کا حکم دیا گیا اور آمنے سامنے لگی ہوئی دو بینچوں پر ہم یوں بیٹھے کہ آخری حصے میں بیرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مقابل محسن تھا۔ محسن کے ساتھ استاد ٹیڈی اور پھر وہ گوریلا جو مشین گن پر سے انگلی نہیں ہٹاتا تھا۔ دوسرا گن مین میرے ساتھ تھا اور اس کی مشین گن کا رُخ مخالف سمت میں محسن اور ٹیڈی کی طرف تھا۔ وہ دونوں شروع میں رہے جن کے بارے میں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں۔ ہمارے بیٹھ جانے کے بعد بھی ٹرک نہ ہلا۔ پھر ایک وردی والا شخص نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں تھرمس تھا۔ اس نے تھرمس میں سے کافی انڈیلی اور کپ میری طرف بڑھایا۔ "یہ پی لو۔"

"یکلخت تم لوگوں اتنے مہربان اور مہمان نواز ہوگئے ہو؟" میں نے کہا۔ "اس میں کیا راز ہے؟"

"پی لو ورنہ پچھتاؤ گے... لمبا سفر ہے۔" وہ بولا اور اس نے دوسرا مگ بھر کے محسن کو دیا۔ تیسرا ٹیڈی کو دینے کے بعد اس نے چوتھا اپنے لیے بھرا اور بولا۔ "تم کو شک ہے کہ اس میں زہر ہوگا۔ پھر وہ ہنسا۔" اگر تمہیں مارنا ہی مقصود ہوتا تو یہاں تک کیوں لاتے۔"

وہ باہر کھڑا رہا اور کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ اس نے کافی کے ساتھ دو گولیاں بھی نگل لیں اور ہم سے بھی پوچھا کہ کسی کو اسپرین کی ضرورت تو نہیں ہے۔ مجھے ضرورت تھی۔ میرے بعد محسن نے بھی مانگ لی۔ ہمارا شک اب دُور ہو چکا تھا۔ کافی کی مہک ویسے بھی بہت پُرکشش تھی۔ ہم نے مگ خالی کردیے تو اسی شخص نے ہمیں سگریٹ دیے۔ وہ انہی لوگوں کا ساتھی تھا اور جو کچھ کررہا تھا اپنی مرضی سے نہیں کررہا تھا مگر وہ بداخلاق یا بدزبان نہیں تھا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں سے میں نے اپنے اور محسن کے لیے دو سگریٹ نکالے اور اس کو پیکٹ واپس کرتے ہوئے ماچس طلب کی۔ اس نے ماچس دیتے ہوئے کہا کہ پیکٹ رکھ لو۔

"تھینک یو۔" محسن بولا۔ "تم نے کوئی نیکی تو کی... کون ہو تم؟"

"میں حکم کا غلام ہوں۔" وہ ہنسا اور خالی مگ لے گیا۔

"اب چلنا ہے کہ نہیں؟" آگے سے کسی نے پوچھا اور ٹرک ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ایک دفعہ۔ دو دفعہ۔ تین دفعہ... میں نے اور محسن نے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں استاد۔" محسن نے اچانک ٹیڈی سے کہا۔ "ابھی تم دیکھنا یہ کیا زبردست مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شاندار دعوت ہوگی... پلاؤ... قورمہ..."

"کیوں۔ سسرال جارہے ہیں کیا تمہارے؟" ٹیڈی جل کے بولا۔

"اونہوں۔ جب کسی کی سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کا وقت آجائے تو اسے پسند اور خواہش کے مطابق کھانا دیا جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"آخری طعام۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سر کچھ زیادہ ہل گیا تھا۔ میں نے بہت کم حرکت دی تھی لیکن سر ڈھلک کر کافی آگے آگیا تھا اور پھر اسے واپس لانے کے لیے مجھے تھوڑا سا زور لگانا پڑا تھا۔ یہ بڑی عجیب کیفیت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری پرانی گردن پر بہت بڑا بوجھ رکھ دیا گیا تھا جسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہورہا تھا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ سگریٹ کو گھور رہا تھا۔

"اس سگریٹ میں... کچھ تھا سکندر۔" وہ بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو میرا سر پھر ڈھلنے لگا۔ "... کافی...

"کافی تو اس نے بھی پی تھی۔" محسن بولا۔

"اُس نے دو گالیاں بھی... کھالی تھیں..." میں نے کہا۔ "اس پر اثر نہیں ہوا... وہ اسپرین نہیں ہوگی... اسپرین... اس نے صرف ہمیں دی۔" میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ٹرک ڈرائیور آگے انجن کے ساتھ کچھ کررہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ جانتے بوجھتے دیر کررہا تھا۔ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ جس راستے سے ہمیں لے جایا جائے وہ ہم یاد رکھیں۔ ایک مقصد یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہم شور کرنے کے قابل نہ رہیں۔ چند منٹ کے اندر اندر میں نے اس صورتِ حال کو قبول کرلیا۔ ٹیڈی سو گیا تھا اور محسن اونگھ رہا تھا۔ جب ٹرک اسٹارٹ ہوا تو میں ایک جھٹکے سے نیچے گر گیا۔

دوبارہ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک تہ خانے میں پایا۔ اس کی دیواروں کے بالکل اوپر والے حصے میں چھت کے قریب دو روشندان تھے جن میں سے آسمان دکھائی دیتا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم زمین کی سطح سے کتنا نیچے ہیں۔ جیسے جیسے حواس بحال ہوئے، میں گرد و پیش کا جائزہ بہتر طور پر لینے کے قابل ہوگیا۔ یہ سیمنٹ کے پلاستر کے رنگ والا خاصا بڑا کمرہ تھا۔ تقریباً اٹھارہ فٹ لمبا اور پندرہ فٹ چوڑا۔ میں اس کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے قریب ہی محسن اور ٹیڈی پڑے تھے۔ کمرے کی چھت سے ایک بلب معلق تھا مگر اس کی روشنی کو دیواریں جذب کررہی تھیں۔ اس کی صرف ایک ہی دیوار میں دروازہ تھا اور یہ دیوار ہم سے بہت دُور تھی۔ ہم اس دروازے تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم سب کا بایاں ہاتھ ایک زنجیر سے منسلک تھا اور زنجیر دیوار میں پیوست تھی۔ میں نے محسن کو آوازیں دیں۔ وہ ہوں... ہاں کرکے اور کروٹ لے کر پھر سو گیا۔ ٹیڈی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں ابھی سوچ رہا تھا کہ آخر اس قید خانے میں منتقلی کا مقصد کیا ہے اور یہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ شاید پہلا مقصد تو یہی ہوگا کہ جب تک ان کے منصوبے کے مطابق مال کی ... نہ نکل جائے ہمیں نکلنے ہی نہ دیا جائے۔ وکٹر فیملی کے ... ہونے والی میٹنگ میں جو کچھ طے ہوا تھا ہمیں معلوم ... تھا اور یہ بات وہ جان گئے تھے۔ اب یا تو وہ اپنا پروگرام ... جو زیادہ مشکل کام تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے ... ان کے سارے ایجنٹ مال کو وصول کرنے اور آگے پہنچانے ... انتظامات کرچکے ہوں گے۔ یہ سب انتظامات درہم برہم ہو ... اور سب کچھ نئے سرے سے کرنے میں تاخیر کا پہلو آجاتا۔ ... نے آسان یہی سمجھا کہ ہمیں روک لیا جائے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر میں چونکا۔ آہستہ آہستہ پولیس کی ... دی میں ملبوس دو افراد میرے قریب آئے۔ ان میں سے ... کو میں پہچانتا تھا۔ وہ ایس پی سراج تھا۔ دوسرا کوئی نیا ... پکٹر تھا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ ہمارے ساتھ کیا ... ہونے والا ہے۔ سراج میرے قریب آکے رُک گیا۔ پھر ... نے مجھے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔

"دیکھو اپنی حالت کو سکندرِ اعظم۔" وہ خباثت سے بولا۔ "تم ایک چوہے سے زیادہ بے بس اور قابلِ رحم ہو۔ ایک بار ... میرے جال سے نکل گئے تھے اور جتنا عرصہ بچتے رہے یہ سمجھتے ... کہ تم ناقابلِ تسخیر ہو۔ تقدیر تم کو ڈھیل دیتی گئی اور تم اسے ... اپنا کمال سمجھتے رہے۔ یہ سمجھتے رہے کہ تم بہت ذہین اور بہت ... جرأت مند ہو۔ بیک وقت افلاطون بھی ہو اور ٹارزن بھی۔ تمہارے ... کارنامے سُن سُن کر میرا خون کھولتا تھا۔ اس خیال سے کہ یہ سب ... کچھ میری وجہ سے ہوا۔ اسے میری بے وقوفی کہہ لو یا کمزوری... ... جب تم میری مٹھی میں تھے تو میں نے تم کو نکل جانے دیا۔ ... کاش مجھے علم ہوتا کہ تم بعد میں اتنا اُچھلو گے۔ اتنا اتراؤ گے ... اور اتنی خرابی کا باعث بنو گے۔ اتنا نقصان کرو گے... تو اسی ... رات ہی میں تمہاری لاش کے ٹکڑے شہر کے دس کوڑے خانوں ... میں پھنکوا دیتا... کون... پکڑ سکتا تھا مجھے... بہت ہوتا تو تھوڑی ... سی تحقیقات ہوتی اور بس... اتنی خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ میں نے ... تم کو قتل نہیں کیا تھا۔"

"مجھے قتل کرنا اس رات تمہارے اختیار کی بات تھی... ... بے ضمیر غدار اور بے غیرت شیطان۔" میں نے کہا۔ "اور نہ آج ... بھی..."

وہ غصّے سے پاگل ہوگیا۔ اس نے چیخ کر مجھے ایک سے ... بڑھ کر غلیظ گالی دی اور اس کے ماتحت انسپکٹر نے اس کو نہ روکا ہوتا ... تو اس پاگل پن میں وہ مجھے لاتوں سے مار مار کے ختم کردیتا۔ "میں ... تیری زبان کاٹ لوں گا کتے کی اولاد... تیرا یہ سر توڑ کے وہ سب ... کچھ نکال لوں گا۔ تیری ہڈیاں کتوں کے سامنے ڈال دوں گا... ... تیرا دماغ سے ساری سرکشی... ساری خوش فہمی اور ساری مردانگی ... نکلوا لوں گا جیسے..." اس نے منہ سے مغلظات اگلتے ہوئے کہا۔

"سر... پلیز سر۔" ماتحت انسپکٹر نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے ایک طرف کھینچ لیا۔ "یہ آپ کیا کررہے ہیں... ہوش میں آئیں سر..."

"چھوڑ دو مجھے سندر..." وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلّایا۔ "میں اس... کو بتاتا ہوں... اس کی تو..."

"نہیں سر! ہم اور آپ مشکل میں پڑ جائیں گے..." انسپکٹر نے کہا جو اپنے نام سے ہندو ہی لگتا تھا۔ ایک اور وطن فروش۔ اس مٹی سے اُگنے والی فصل سے پیٹ بھرنے والا۔ اس زمین کے اوپر کی ہوا سے وہ آکسیجن کھینچنے والا جو اس کے جسم کے ہر خلیے اور خون کے ہر قطرے تک پہنچتی تھی۔ اور اسی زمین کے آسمان سے دھوپ لینے والا۔ اس زمین پر بسنے والوں سے رشتوں کے سہارے پاکر زندگی کے مشکل مرحلوں سے گزرنے والا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر سوچا اور تھوکا۔ میرے تھوک میں میرا لہو تھا جس کا نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہوتا تھا۔ اب یہ انسپکٹر سندر۔ احسان فراموش اور کمینہ۔ دشمن کا ففتھ کالم تھا۔ اندرہ کے دوستی کا فریب دینے والا اور دشمن کے ساتھ مل کر پیٹھ میں خنجر گھونپنے والا۔ اس ملک نے ان دونوں کو کیا نہیں دیا؟ بچپن سے جوانی تک زندہ رہنے کے لیے سازگار حالات... تعلیم... ترقی کے مواقع۔ ملازمت۔ قانون کے مقدّس نام کی حفاظت کے لیے یہ وردی۔ یہ عہدہ۔ لوگوں کے جان و مال اور عزت آبرو کے تحفظ کی ذمے داری اور ان دونوں نے ان تمام مراعات کا کیا بدلہ دیا۔ ان احسانات کے بدلے میں اسی ملک کے ساتھ کیا کیا؟ ایک ہندو تھا اور اس کا جرم قانونی طور پر مسلمان کے جرم سے کم سنگین نہ تھا مگر مسلمان میری نظر میں زیادہ بڑا مجرم تھا جس نے خدا اور رسولؐ کے ماننے والوں کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ اس نے وہی کیا جو ایک کافر کرسکتا تھا لیکن مسلمانوں جیسا نام رکھ کر۔ ان کے ہم مذہب کی حیثیت سے وہ دُہرا مجرم تھا۔ اس کو اسلام کے نام پر حاصل ہونے والے ایک ملک کی حفاظت ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی کرنا تھی اور ایک پولیس افسر کی حیثیت سے بھی۔

یہ سب خیالات میرے ذہن میں اس مختصر وقفے میں آئے جو میں نے ایس پی سراج کی وحشیانہ مار پیٹ کے بعد سنبھلنے میں صرف کیا۔ ٹھوکروں سے میری کھال متعدد مقامات پر سے پھٹ گئی تھی اور میری پسلیوں پر پڑنے والی ہر ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے لیے سانس لینا بھی آسان نہ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری پسلیاں ٹوٹ کر اندر گھس گئی ہیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور میرا اوپر والا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی میری طرح بے بس تھے۔ چنانچہ وہ مجھے عقل سے کام لینے کی تلقین کرنے کے سوا میرے لیے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ براہ راست

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سراج کے عتاب کا نشانہ نہیں بنے تھے چنانچہ محفوظ رہے تھے۔

ٹیڈی نے کہا۔ "سکندر بادشاہ... چپ رہو... کیا فائدہ بولنے سے..."

محسن بولا۔ "یار! چھوڑ ایسی باتیں... ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے..."

انسپکٹر سندر نے بھی سراج کے غصّے کی آگ کو دبا دیا تھا۔ سراج نے مجھے آستین سے خون صاف کرتے دیکھا۔ "تم آئندہ بھی کچھ نہیں کر سکو گے..."

"اور تُو غلام ابنِ غلام۔" میں نے حقارت کے زہر سے بجھے لہجے میں کہا۔ "شیطان کے غلام۔ ہوسِ زر کے غلام۔ وطن دشمنوں کے غلام۔ تُو خود کیا کر سکتا ہے؟ تجھ میں ہمّت ہے، اپنے آقاؤں کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی؟ کتّا اپنی مرضی سے دُم تو ہلا سکتا ہے۔ تُو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ بدبخت ہے، وہ ماں جس نے تجھے جنا۔ تیری ماں کے پیروں کے نیچے بھی جنّت تھی۔ ہر ماں کے پیروں کے نیچے وہی جنّت ملتی ہے۔ یہ وطن جو ہم سب کی جنّت ہے۔ اس کی مٹّی کو تُو نے بیچ دیا تو ماں کے پیروں کے نیچے ملنے والی جنّت کو بیچ دیا۔"

معلوم نہیں کیوں سراج کا اشتعال ذرا سی دیر کے لیے ایک کرب بن کے اس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ اس کے اندر سے اذیت کی ایک لہر یوں اٹھی جیسے دل کے دورے کی پہلی جان لیوا، وجود کو کاٹ دینے والی، احساس کے زخموں میں کرچیاں بن کے پھیل جانے والی اور درد کی انتہا تک پہنچ کے ٹوٹ جانے والی تڑپ۔ پل بھر کے لیے ایس پی کے قالب میں دفن اور پولیس کی وردی کے کفن میں لپٹی ہوئی اس آدمی کی بے جان اور بے حس لاش میں حرکت پیدا ہوئی جو کسی ماں کا بیٹا تھا۔ یکلخت اس نے محسوس کیا کہ وہ خود اپنے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے باعثِ رسوائی ہے اور اس کے چہرے پر انفعال کا سایہ اس طرح آیا اور گزر گیا جیسے پیاسے سوکھے، سپاٹ صحرا پر سے ابرِ رواں کا سایہ گزر جائے۔

لیکن اس ایک لمحے نے سراج کے آتش فشاں سے اُبلنے والے لاوے کو روک دیا۔ وہ انسپکٹر سندر سے مخاطب ہوا۔

"سندر داس... میں... باہر ہوں..." وہ پلٹ کے بولا۔ "تم کو اس سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔" اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس تماش بین کی طرح جس کو جوان بیٹے نے کسی طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ لیا ہو۔ دروازے تک جا کے وہ لوٹا اور اندر جھانک کر بولا۔ "میں ایک سگریٹ پی رہا ہوں۔ اندر میری طبیعت کچھ گھبرا رہی تھی۔" یہ بات کہتے ہوئے اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔

"آپ فکر نہ کریں سر۔" سندر داس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو پھر مجھے بتانا..." وہ بولا اور دروازے سے غائب ہو گیا۔

میرا وار کارگر رہا تھا۔ میں نے اس کے ضمیر پر نشتر چلا دیا تھا۔ یہ ضمیر پہلے ایک ناسور ہو گا مگر اب سرطان کا آزار دکھنے والا تھا۔ ناقابلِ علاج اور قاتل۔ اس نے سب کو مار دیا تھا۔ اس سراج کو جو ایک بہادر ماں کا بیٹا تھا۔ وہ نیک دل ماں اس بیٹے پر فخر کرتی تھی اور اس کی راستی کی قائل تھی۔ اس کی فرض شناسی کی قائل تھی اور اس کی محبت کی قائل تھی۔ وہ آج کے اس ایس پی سراج کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی جسے ہم جانتے تھے یا دلاور اور کرنل جگن ناتھ جیسے شکاری جانتے تھے۔ اگر اس ماں کو اپنے بیٹے کا یہ اصل چہرہ دیکھنا پڑتا تو وہ ایک آہ کر کے اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ مگر دل شکستگی کا اگلا لمحہ اس کے لیے دکھ، ندامت اور احساسِ جرم سے نجات کا لمحہ بن جاتا۔ وہ مر جاتی اور شاید یومِ حشر اسے اپنا بیٹا بھی تسلیم نہ کرتی۔ ضمیر کے اس سرطان نے پولیس کے اس افسر کو مار دیا تھا جس نے سروس کا آغاز کرتے ہوئے فرض کی ادائیگی کے لیے جان تک دینے کا حلف اٹھایا ہو گا۔ ضمیر کے سرطان نے ایک آدمی کو مار دیا تھا جو برائی کو برائی سمجھتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ میں نے اس ضمیر کے سرطان میں زہر کا انجکشن گھونپ دیا تھا۔ وہ مجھ سے کیسے نظر ملا کے بات کرتا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" سندر داس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ "غدّار... پہلے تم نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ تم کو اس ملک کے رہنے والوں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے عزت سے جینے کا حق دیا تھا... یہاں تک کہ تم کو اسی وطن کے قانون کا رکھوالا بنانا تک منظور کر لیا تھا۔"

"فار گاڈ سیک! میری بات سنو۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ ٹھیک ہے میں ہندو ہوں۔ کافر ہوں اور ملحد ہوں۔ مگر میں غدّار اور وطن فروش نہیں ہوں۔ تم مانو یا نہ مانو اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ سارا زمانہ میری وفاداری پر شک کرتا ہے کیونکہ میں ہندو ہوں۔ رام اور رحیم کا یہ فرق مذہبی عقائد کا فرق ہے۔ تم نماز پڑھتے ہو، میں پوجا کرتا ہوں۔ اس کا میرے فرض سے کیا تعلق۔ یہاں تو کرپشن بھی ہیں اور تم دیکھ لو، تمہارے ہم مذہب سراج جیسے بھی۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ پھر میں نے کہا۔ "یہ بھی انٹیلی جنس والوں کا حربہ ہے۔ ہمدرد بن کے جانا اور اعتماد حاصل کر کے..."

"...تک پہنچا دینا۔"

"تم پھر وقت ضائع کر رہے ہو۔" وہ پریشانی سے بولا۔ "وہ اندر آ جائے گا تو میں بات بھی نہیں کر سکوں گا۔ میں اس بحث نہیں کر سکتا۔ دلائل نہیں دے سکتا اور ثبوت نہیں... کہ میں بھی اتنا ہی پاکستانی ہوں جتنے تم ہو۔ تم پڑھے لکھے... خیال آدمی ہو۔ محض اس لیے مجھ سے نفرت مت کرو کہ... نام سندر داس ہے۔ ایک نہ ایک دن تم قائل ہو جاؤ گے... میں غدّار تھا اور نہ کسی غدّار کا ساتھی۔ میں بڑی مشکل سے... کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس کا اعتماد حاصل... کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ اب بھی وہ... سو فیصد قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا مگر وہ مجبور ہے۔ مجھے اس... ساتھ ضامن رضوی صاحب نے رکھا ہے۔"

مجھے اب بھی اس پر یقین نہیں آیا۔ "تم ضامن رضوی کا... استعمال کر رہے ہو۔"

"او کے... میں بتا چکا ہوں کہ یقین کرنا نہ کرنا تمہارا کام..." سندر داس کا موڈ آف ہو گیا۔ "تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو یا فرض... سکتے ہو لیکن میری ایک درخواست ہے کہ سراج کے سامنے... گفتگو کا حوالہ بالکل مت دینا، ورنہ میرا کام خراب ہو جائے گا۔"

"کیا کام... کیا تم اور وہ ایک ہی کام نہیں کرتے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بظاہر ہمارا ایک ہی کام ہے۔" سندر داس بولا۔ "ہم... پولیس میں ہیں اور ہمارے فرائض کی نوعیت مختلف نہیں۔... ایک بات تمہاری معلومات میں اضافے کے لیے۔ ایس پی... کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف... گمنام شکایات موصول ہوئی تھیں۔ محکمہ جاتی قوانین و ضوابط... مطابق گمنام خطوط پر ایکشن نہیں لیا جاتا لیکن اس کی بھی ایک... ہے۔ جب کچھ شکایات مع ثبوت آئیں تو ایس ایس پی... رضوی نے مجھے اس کے ساتھ پوسٹ کر دیا۔"

"کیا وہ جانتا ہے کہ تم کو اس کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہے؟"

"غالباً نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" سندر داس... "وہ ہر وقت اور ہر جگہ مجھے ساتھ نہیں رکھتا۔ اس... یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے شک ہو گیا ہے۔ یہ بھی ہو... ہے کہ پولیس میں یہ بات دوسرے لوگ بھی جانتے ہوں۔... اس کا امکان کم ہے۔ کیونکہ تمام شکایات خاتی طور پر ضامن... صاحب کے نام ان کے گھر کے پتے پر ارسال کی گئی تھیں... انھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان شکایات کا علم کسی کو بھی... مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ شکایت بھیجنے... نے کسی دوسرے اعلیٰ پولیس افسر کو بھی خطوط لکھے ہوں۔... لکھنے والا ایک ہی شخص ہے۔"

"اور اس کی شکایات کی نوعیت کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" سندر داس نے سر ہلایا۔ "رضوی صاحب نے مجھے تفصیل سے آگاہ نہیں کیا۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ میں ایس پی سراج کے ساتھ ڈیوٹی دوں۔ اس کی کوئی بات مشکوک یا مشتبہ نظر آئے تو اس کی رپورٹ ذاتی طور پر صرف رضوی صاحب کو دوں اور کسی کو بھی معلوم نہ ہونے دوں کہ سراج کے خلاف شکایات ملی ہیں۔"

"پھر تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"انھوں نے تمہارا ذکر کیا تھا۔" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

"کس حوالے سے؟" میں نے کہا۔

"میں بتا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔ "مگر جب میری پوسٹنگ کا پتا میرے ایک پرانے ساتھی کو چلا تو اس نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میں تمہارا خاص طور پر خیال رکھوں۔"

میں اس پُراسرار انکشافات کرنے والے انسپکٹر سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر مشکل وہی تھی کہ نہ اس کے لیے وقت تھا اور نہ یہ جگہ ایسی تھی کہ میں مفصل گفتگو کر سکتا۔ میں جرح کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ پولیس کی وردی میں ایک بااختیار افسر تھا اور میں ایک قیدی۔ معلوم نہیں ضامن رضوی صاحب نے اس سے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔ صرف میرے بارے میں کہا تھا یا رابعہ، محسن اور شہلا کے بارے میں بھی کہا تھا۔ ان کے لیے ہم سب مجرم بھی تھے اور دوسرے رشتے سے ان کے مرحوم دوستوں کی نشانی بھی۔ وہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے ہم سب کو مجرم سمجھنے اور ہماری گرفتاری کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے پر مجبور تھے لیکن یہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ اس میں کوئی خوشی محسوس کرتے ہوں گے یا ان کے دل میں ہمارے لیے نیک اور ہمدردانہ جذبات نہیں رہے ہوں گے۔ ایک انسان کی حیثیت سے وہ یقیناً ہمارے لیے اداس ہوتے ہوں گے کہ ہم سے پہلا سا تعلق نہ رہا اور وقت نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ انسپکٹر سندر داس سے انھوں نے میرا ذکر کس طرح کیا تھا؟ کیا وہ جانتے تھے کہ میرا اور سراج کا آمنا سامنا ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ ان کو یقیناً معلوم ہو گا۔ پھر انھوں نے کیا کہا ہو گا؟ یہ کہ سکندر بخت یا محسن میں سے کوئی نظر آئے تو ان کی حفاظت کرنا؟ یا انھیں گرفتار کر لینا؟ نہیں... اگر وہ گرفتاری کی بات کہتے تو سندر داس مجھ سے بات ہی کیوں کرتا۔ مجھے گرفتار کر لیتا اور سیدھا رضوی صاحب کے سامنے لے جا کر پیش کر دیتا۔ پھر جو کچھ پوچھنا ہوتا وہ خود پوچھ لیتے۔ یا ان کو اطلاع کر دیتا کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھی مل گئے ہیں۔ باقی سب ان پر چھوڑ دیتا کہ وہ گرفتاری کا بندوبست کرتے ہیں یا خود آتے ہیں۔ سندر داس نے دوستانہ رویّہ رکھا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیکن اس تاثر کے فریب میں آنے کا انجام غلط بھی ہو سکتا تھا۔

" وہ کون دوست تھا تمھارا ؟" میں نے محسن کی آواز سُنی۔
" جس نے ہمارا خاص خیال رکھنے کو کہا تھا۔"

" ہمارا ؟" سندرداس نے اُسے گھور کر دیکھا۔" تم کون ہو؟ میں تم کو نہیں جانتا۔ کیا تم بھی اس کے ساتھ ہو ؟"

" نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔" تم یہ سوال میری طرف سے سمجھ لو۔"

" مجھ سے اکرام شیخ نے کہا تھا۔" وہ بولا۔" وہ پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ بڑا اچھا اور نیک نام افسر تھا مگر ایسے افسروں کا چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی استعفا دے گیا۔ اکرام شیخ نے بھی ایک ہی نام لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سکندر بخت کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ اس نے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔"

" کیا تم اس کو اطلاع دے چکے ہو ؟" میں نے کہا۔

" ابھی تو نہیں۔ لیکن بتا دوں گا۔" سندرداس بولا۔

" کیا تم نے ایس پی سراج کے بارے میں کوئی رپورٹ بھیجی ہے ؟"

" ہاں لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔" خاص بات مجھے معلوم ہی نہیں ہوئی۔ میں ایک انسپکٹر ہوں اور وہ ایس پی ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے انسپکٹر اس کے ماتحت ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے ساتھ رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ویسے تو ہم سب بارڈر ایریا کی نگرانی کرتے ہیں لیکن بارڈر بہت طویل ہے اور ہم سب ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ دن رات ڈیوٹی بدلتی ہے تو کوئی کسی طرف جاتا ہے کوئی کسی طرف۔ سراج کی مرضی ہوتی ہے کہ جسے چاہے اپنی جیپ میں ساتھ لے جائے۔ مجھے وہ کبھی نہیں لے جاتا بلکہ ہمیشہ اس کا اُلٹ ہوتا ہے۔ یعنی وہ مشرق کی طرف جاتا ہے تو میری ڈیوٹی مغرب میں ہوتی ہے۔ کئی میل دُور۔ وہ رات کو جاتا ہے تو میں دن میں بھیج دیا جاتا ہوں۔ اور وہ دن میں جائے تو میری ڈیوٹی رات کو لگ جاتی ہے۔"

" اچھا سندرداس ! دیکھو تم کو ہم سے بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔" اور تم سراج کی نقل و حرکت اور اس کی مشتبہ سرگرمیوں کے بارے میں ایس پی ضامن رضوی صاحب کو مستقل رپورٹیں بھیج سکتے ہو۔ ایسی رپورٹیں جو ناقابلِ یقین مگر درست ہوں گی۔ اور اگر تم اس مشن پہ کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے میں کامیاب رہے تو تمھارا ڈی ایس پی بن جانا یقینی ہے۔ عین ممکن ہے تم کو خصوصی ترقی دے کر ایس پی بنا دیا جائے۔ ہم وہ سب جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔"

" ہم کون ؟" وہ محسن اور ٹیڈی کی طرف دیکھ کے بولا۔

" تم کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔" میرے کچھ ساتھی بھی ہیں جو میری وجہ سے مشکل میں گرفتار ہیں۔ ہم سب پہ یہ آفت کیوں آئی۔ اس کا جواب بھی تمھاری رپورٹوں سے ملے گا لیکن یہ سب ہم اس وقت بتائیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم ڈراما نہیں کر رہے ہو۔"

" ڈراما ؟ کیسا ڈراما ؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

" ہمارے ساتھ ہونے کا۔" میں نے کہا۔" میں نہیں مانتا کہ تم سندرداس ہو۔ خدا بخش ہو یا پیٹر جون۔ میں آنکھ بند کر کے نہیں مان سکتا کہ تم پولیس انسپکٹر ہو اور یہ وردی اصلی ہے۔ ضامن رضوی اور اکرام شیخ کے حوالے تو سراج بھی دے سکتا ہے اور کچھ اس سے بھی بڑے شکاری۔"

" شکاری ... تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔" سندرداس ناراض ہو کے بولا۔

" ناراض ہونے کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔" سچ کبھی چھپا نہیں رہتا اور جھوٹ بھی ایک نہ ایک دن کھل جاتا ہے۔ جس دن مجھے یقین آ گیا کہ تم نے سب سچ کہا تھا اس دن تم میرے دوست بن جاؤ گے۔ ابھی تم بھی شکاری ہو اور یہ سمجھو کہ میں بھی شکاری ہوں۔ ہم ایک ہی شکارگاہ میں ہیں۔ ایک دوسرے سے اوجھل مگر ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں۔ ہم ایک دوسرے کو شکار کرنے کے لیے جال بچھاتے پھر رہے ہیں اور دوسروں کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ابھی فیصلہ ہونا ہے کہ کون شکاری تھا اور کون شکار۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا یا تقدیر کرے گی۔"

" مختصر بات کرو ... وہ آنے والا ہو گا۔" سندرداس نے بے چینی سے باہر کی طرف دیکھا اور پھر کلائی کی گھڑی کو۔

" میں تمھارا دوست بن کے تمھارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں گا مگر یہ سب اس وقت ہو گا جب تم ثابت کر دو گے کہ تم میرے دشمن نہیں ہو۔ غداروں میں سے ایک نہیں ہو اور خود بھی شکاری نہیں ہو۔ ابھی تو مجھے تم سے صرف ایک بات کہنا تھی ... تم میرے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں دو گے۔ نہ اپنے ایس پی کو ... نہ اکرام شیخ کو ... یہی پہلا ثبوت ہو گا۔"

سندرداس نے نفی میں سر ہلایا۔" میں ایسا نہیں کر سکتا ... جب میں تم سے مل چکا تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی ... سراج جانتا ہے ..."

" سراج کبھی ضامن رضوی کو نہیں بتائے گا کہ میں یہاں ہوں اور تم نے ضامن رضوی کو رپورٹ دی کہ سکندر بخت مل گیا ہے تو ان کے آنے سے پہلے ہی تمھاری رپورٹ غلط ہو جائے گی۔ خود تمھیں پتا نہیں ہو گا کہ میں کہاں ہوں تو تم ان کو کیا بتاؤ گے۔ تم دس جگہ مجھے دیکھو گے تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ تمھاری رپورٹ غلط ہو گی اور بالآخر تم ناقابلِ اعتبار ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

" اب جو بھی ہو۔" سندرداس بولا۔" اکرام شیخ کو تو میں نے خط بھیج ہی دیا ہے۔ ایک آدمی لاہور جا رہا تھا۔ وہ ذاتی طور پہ لے گیا۔"

افسوس سندرداس ! تقدیر نے ہم دونوں سے ایک اچھا ... چھین لیا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔" اب نہ تم کچھ کر سکو ... ہم ... اکرام شیخ یہ بات ایس ایس پی ضامن رضوی کو بتا ... اور ..."

دروازے کو لات مار کے ایس پی سراج اندر آیا۔" بہت ... مل گیا تم کو سندر ... کچھ معلوم ہوا۔" وہ اب پہلے کی طرح ... نہ تھا۔

" کچھ معلوم نہیں ہوا سر۔" سندرداس نے کہا۔" اس کی تو ... ی کارٹ ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔"

" اور اس کے ساتھیوں سے پوچھا ؟" وہ میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔" ... کے بچے بھی تیس مار خاں اور رُستم خاں ہیں۔ رستم خاں کے ... ہیں سب۔" اُس نے حسبِ ضرورت گالیاں فٹ کر کے ہر ... ہمارے لیے شایانِ شان بنایا۔

سندرداس نے افسوس زدہ اور شکایتی انداز میں میری طرف ... اس نے محسن کو اپنا ساتھی نہ بتا کے پہلا جھوٹ بولا تھا۔ اعتماد ... بنیادیں پختہ ہونے سے پہلے ہی ہلانے کا الزام وہ مجھے دے ... تھا۔ میں اسے نہیں کیونکہ ابھی تک مجھے اس کے کسی جھوٹ ... جھوٹ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

" کسی سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی سر۔" سندرداس ...

" تم کو صرف ایک بات پوچھنی تھی سندر۔" سراج نے ... اس سے کہا اور مجھے معلوم تھا کہ تم نہیں پوچھ سکو گے۔ تم گپ شپ ... رہے ہو۔"

" جی ؟ یہ گپ شپ نہیں تھی۔" سندرداس چوکنا ہو گیا۔ ... کے ذہن میں یہ شک پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ کہیں ... چھپ کر تو اس کی باتیں نہیں سُنتا رہا تھا۔ اس نے اپنی ... بند نہیں ہونے دی تھی مگر ایسے مقامات پہ کسی خفیہ مائکروفون ... موجودگی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

" اور اتنی دیر تم کیا جھک مارتے رہے۔ تم ایک نالائق اور ... نکمّے ہو۔" سراج نے برہم ہو کے کہا۔" معلوم نہیں کس اُلّو ... نے تمھاری سفارش کی تھی کہ تمھیں ..."

" میں پہلے بھی تردید کر چکا ہوں کہ میں کسی کی سفارش سے ... بھرتی نہیں ہوا تھا۔" سندر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ... آپ نالائق اور احمق سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی رائے ہے سر۔ ... تردید نہیں کروں گا لیکن آپ جب بھی مجھے سفارشی ... کے تو میں تردید ضرور کروں گا۔ یہ میرے لیے زیادہ ناقابلِ ... گالی ہو گی۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں میرٹ پر سلیکٹ ... ہوا ..."

" ... میرٹ پر ... تم اپنے اقلیتی کوٹے پر آئے ہو گے۔"

سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔" مجھے تمھاری یہ خودسری اور بحث کی عادت بالکل پسند نہیں ہے اور میں اسے " اَن ڈسپلن" سمجھتا ہوں۔ تم کو مجھ سے اچھی رپورٹ لینا ہے تو خود کو اچھا ثابت کرنا ہو گا انسپکٹر ..."

" یس سر ! میں خوشامد کر کے آپ کو مجبور نہیں کروں گا کہ میرے بارے میں جھوٹی رپورٹ دیں۔" سندرداس نے مؤدّبانہ لہجے میں کہا مگر یہ سراج کی بات کے جواب میں ایک اور طنزیہ اور معنی خیز بیان تھا۔

" مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا پوچھتے رہے ؟" سراج نے جھنجلا کے کہا۔" تم نے ابھی کہا تھا کہ کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اور کیا کام کی باتیں معلوم کرنا تھیں تم کو ؟ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تم کو یہاں اکیلا چھوڑنا میری غلطی تھی اور تم بھروسے کے قابل نہیں ہو۔"

" یہ میری بدقسمتی ہے سر ..." سندرداس نے جذبات سے عاری اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ان کے یہ اختلافات اور باہمی کشیدگی کو ظاہر کرنے والا رویّہ ثابت کرتا تھا کہ سندرداس نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی مگر میرا فریب خوردہ ذہن اتنی جلدی اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے ایک شک کی خلش اس وقت بھی ہوشیار کر رہی تھی کہ کہیں یہ گفتگو بھی ڈرامے کے ریہرسل کیے ہوئے ڈائیلاگ پر مشتمل نہ ہو۔ میں جانتا تھا کہ ولاور کتنا بڑا ڈراما آرٹسٹ ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک ڈراما تھی۔ وہ خود بہترین اداکار تھا اور کسی بھی صورتِ حال کو ناقابلِ یقین حد تک ڈرامائی بنا سکتا تھا۔ پھر اس ڈرامائی صورتِ حال کو حقیقت میں ڈھال سکتا تھا اور اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کو خود اسی نے یہ ڈائیلاگ رٹائے ہوں تاکہ سراج اور انسپکٹر سندرداس کی چپقلش کھل کر سامنے آ جائے اور میں انسپکٹر سندرداس پر یقین کرتے ہوئے اسے رازداری کا اہل سمجھ لوں۔ میرا ذہن شک کی بیماری میں مبتلا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ میں بقول مرزا غالب " ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں" اس بیماری سے شفا میں چاہتا بھی نہیں تھا۔ ہر بات پر شک کرنے سے میری احتیاط پسندی کی عادت راسخ ہوتی جا رہی تھی۔ ہر بات کو سُن کر اور ہر چہرے کو دیکھ کر اعتبار کر لینے کی عادت مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے سراج کی اور سندرداس کی رنجش آمیز گفتگو سے کچھ غلط امیدیں وابستہ کرنے سے گریز کیا۔

سراج کی ایک اور لات پڑی تو میں بے اختیار چلّایا کیونکہ ضرب میرے پیٹ میں آئی تھی۔ میں وہیں پیٹ پکڑ کے لوٹنے لگا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے جگر یا گردے اس چوٹ سے متاثر ہوئے ہیں۔ سراج نے میرے ایک اور لات ماری۔" مر جاؤ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

...کل کے مرتے آج مر جاؤ۔" وہ گالی دے کر بولا۔" میری جوتی کو بھی پروا نہیں۔"

"سر... پلیز خیال رکھیں..." سندر بولا۔

"شٹ اپ۔" سراج نے دہاڑ کر کہا۔" تنگ آ چکا ہوں میں تم سے... تم خود کو کیا سمجھتے ہو آخر... میرے افسر ہو تم یا میرے باپ ہو؟ خبردار جو آئندہ مجھے ٹوکا..."

"میں آپ کی بھلائی کے لیے..."

"نہیں چاہیے مجھے تمھاری بھلائی۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔" اپنی بھلائی کو اپنے پاس رکھو... اور یہ کبھی مت بھولو کہ میں تم سے بہت بڑا افسر ہوں۔ میں تم کو خوش رکھنے کا پابند نہیں ہوں... میری نوکری... میرا مستقبل تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے... لیکن میں تمھارا بیڑا غرق کر سکتا ہوں۔ میری رپورٹ تمھارے کیریئر کو تباہ کر دے گی۔ نوکری کے... روٹی کے اور زندگی کے لالے پڑ جائیں گے تم کو۔"

"آپ مجھے لکھ کر حکم دیں کہ میں سروس کے قابل نہیں تو میں ابھی اپنا استعفا لکھ کر آپ کو دے دوں گا۔" سندر داس نے سرکشی سے کہا۔" لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھے نوکری سے نکلوا دیں گے تو یہ آپ کی بھول ہے سر... بھگوان مجھے بھی بچانے والے ہیں... میں آپ کا ذاتی ملازم نہیں ہوں اور یہ وردی وہ نہیں ہے جیسی آپ نے اپنے شوفر کو بنوا کے دی ہوگی۔ یہ سرکاری وردی ہے سر... آپ دیکھیں گے کہ میری نوکری رہے گی۔ مجھے کھانے کو روٹی بھی ملتی رہے گی۔ اور موت سے پہلے میری زندگی کی حفاظت بھگوان کریں گے۔"

سراج غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ شاید اس کے کسی ماتحت نے کبھی یوں کھل کر اس سے بات نہ کی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا لیکن نہ جانے اس نے سندر داس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور رُک گیا۔ کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور اسے خوں آشام نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر وہ میری طرف پلٹ گیا۔

"سکندرِ اعظم کے نطفے... میں صرف ایک بار پوچھوں گا اس کے بعد بھی جواب نہ ملا تو میں دوسرے طریقے اختیار کروں گا جن سے تم اچھی طرح واقف ہو۔" وہ طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولا۔ "سیدھی طرح بتا دو کہ نازو کہاں ہے؟"

"میری آخری اطلاعات کے مطابق نازو اپنے گھر میں تھی۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد کہاں گئی؟" ... نے مجھے گھما کے لات ماری...

میں لڑھک گیا۔" ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب نے کہا تھا کہ نازو کو گھر بھیج دیا جائے تو شہلا کو وہ اپنے گھر لے جائیں گے۔ اور ان کا پیغام ملنے کے بعد ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ شہلا کو پولیس اسٹیشن سے اپنے گھر لے گئے تھے اور ہم نے نازو کے گھر سے پوچھا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے۔"

"اتنی دیر سے تم یہی کہے جا رہے ہو۔" سندر نے اچانک ... دیا۔" ارے بھائی! یہ سب تو ہمیں پہلے سے معلوم ہے۔ ... کہ بعد میں وہ کہاں گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اس انکشاف پر ... حیرت کو چھپا لیا۔

"پھر وہی 'مجھے نہیں معلوم'۔" سندر نے آگے بڑھ کر ... گلا دبوچ لیا اور میرے منہ پر کئی زوردار تھپڑ رسید کیے۔" تم کو سب معلوم ہے۔ تمھاری ہدایت پر وہ واپس گئی تھی مگر تم نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ جب شہلا کو ایس ایس پی صاحب ... تو تم گھر سے مار پیٹ کر کے نکل آنا۔ کہاں بلایا تھا تم نے اُسے؟"

سندر داس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ جو ہم میں سے کسی کے علم میں نہیں تھا۔ نازو کا پھر نکل جانا اس کی فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ وہ قید میں رہنے والی لڑکی تھی ہی نہیں۔ ماں باپ اور بھائی اُسے زنجیروں سے باندھ کر رکھنے کی بات کر سکتے تھے۔ اور شاید وقتی طور پر اسے باندھ بھی سکتے تھے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ہمیشہ بند کمروں میں اور مقفل دروازوں کے پیچھے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ جس لڑکی کو رشتوں کی پروا ہی نہ ہو اس کی راہ میں کون حائل ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھی کہ وہ جتنی آسانی سے جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی، اتنی ہی آسانی سے وہ واپس آنے کا فیصلہ بھی کر چکی ہو گی۔ اس کا مقصد شہلا کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اس نے ایس ایس پی صاحب کی عائد کردہ شرط قبول کر لی تھی اور ایک بار شرط پوری بھی کر دی تھی۔ اس نے یہ شرط قبول نہیں کی تھی کہ اس کے بعد وہ تمام عمر گھر سے نہیں نکلے گی۔ نہ رضوی صاحب نے یہ ضمانت طلب کی تھی کہ بعد میں بھی نازو کو گھر میں ہی رہنا ہوگا ورنہ جس دن وہ دوبارہ نکلی اسی دن شہلا کو پھر پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے... شہلا کو پولیس کے پاس کبھی نہ چھوڑتے۔ خواہ نازو واپس جاتی یا نہ جاتی۔ سوال یہ تھا کہ نازو والدین کے گھر سے کب نکلی اور نکل کے کدھر گئی؟

"بولو... تم نے اس سے کہاں آنے کو کہا تھا؟" سندر نے میری گردن کو جھنجوڑا۔

"میں نے اُسے کہیں بھی آنے کو نہیں کہا تھا۔" میں نے ... کے کہا۔" وہ آتی تو وہیں آتی جہاں سے ہمیں پکڑا گیا تھا۔"

"تمھارا ایک اور ساتھی بھی تھا۔ صحافی مرزا غالب۔" ... نے میری گردن چھوڑ دی۔" وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر میں مر گیا تھا۔" میں نے ... کسی کی گرہ ... گھنٹے ...

"یہ جھوٹ ہے۔" سراج نے میرے سر پر مُکا مارا۔" وہ اندر نہیں تھا۔ وہ اندر ہوتا تو جل کے مر جاتا اور ہمیں اس کی جلی ہوئی لاش ملتی۔ یا وہ جان بچانے کے لیے باہر نکلتا تو ہمارے ہاتھ لگتا..."

"پھر وہ غائب ہو گیا ہوگا... بھوت بن کے۔" میں نے سخت تکلیف کے باوجود کہا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی کہ غالب نہ صرف یہ کہ بچ گیا تھا بلکہ وہ کسی کے ہاتھ بھی نہیں آیا تھا۔ ہم سب کے لیے یہ بھی ایک خبر تھی کہ بعد میں اس کوٹھی کو آگ لگا دی گئی تھی۔ وہ غالب کے باپ کا گھر تھا۔ جو غالب کی وجہ سے جل کے خاک ہوا۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

"مجھے معلوم تھا کہ یہ حرامزادہ آسانی سے نہیں بتائے گا..." سراج اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کو بتانا تو پڑے گا۔" سندر نے کہا۔" اچھا ہوتا اگر تم ہمیں بتا دیتے اور زیادہ سختی سے بچ جاتے۔"

"کیا تم کو معلوم ہے سکندر کہ اس وقت رابعہ اور وہ عورت جو اپنا نام کیتھرین بتاتی ہے۔" سراج بولا۔" کہاں ہیں؟"

"وہ ایسے ہی خصوصی رہائشی انتظامات اور تم لوگوں کی مہمان نوازی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں... اس وقت وہ آرام سے ہیں۔" سراج نے کہا۔" ان دونوں کو ایک بیڈ دے دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ باتھ بھی ہے۔ انھیں کھانا بھی اچھا دیا گیا تھا لیکن انھوں نے کھایا نہیں... خیر... کب تک نہیں کھائیں گی۔ جب ہم ان کو تمھارے متعلق بتائیں گے کہ تم بہت آرام سے ہو۔ تو وہ کھا لیں گی۔ مگر اس کے بعد وہ آرام سے نہیں رہیں گی۔" وہ کمینگی سے ہنسا۔" یہ سب کچھ باری باری ہوگا۔ ابھی تم آرام سے نہیں ہو۔ اور آج یا کل رات وہ اپنی آنکھوں سے تفتیش ہوتے دیکھیں گی——جیسے آپریشن تھیٹر کے باہر سے کوئی اپنے کسی عزیز کا انتہائی جان لیوا اور تکلیف دہ آپریشن ہوتا دیکھے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کوئی ماں اپنے بیٹے یا بہن اپنے بھائی کے جسم پر نشتر چلتے... اس کا خون بہتے اور اس کے کھلے پیٹ سینے یا سر کو نہیں دیکھ سکتی اور جہاں معاملہ محبوب کا ہو..." اس نے ایک شیطانی قہقہہ مارا۔" تو بھلا کون لڑکی اپنے محبوب کی اذیت برداشت کر سکتی ہے۔ فرض کرو کہ تم اُلٹے لٹکے ہوئے ہو۔ لہولہان ہو اور تڑپ رہے ہو... بالکل بے لباس۔"

... نے مضبوط لہجے میں کہا۔" میں تو خیر ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں مگر تم دیکھو گے کہ رابعہ تمھاری توقع سے زیادہ قوتِ برداشت رکھتی ہے... تمھیں مایوسی ہوگی۔"

"چلو پھر کیا ہوا۔" سراج بولا۔" یہ تو پہلا مرحلہ ہوگا مگر اس کے بعد بساط اُلٹ جائے گی... نہیں... شاید میں غلط محاورہ استعمال کر گیا۔"

"محاورہ غلط نہیں تھا۔ تمھارے منہ سے سچ نکل گیا۔" میں نے کہا۔" خدا نے چاہا تو واقعی بساط اُلٹ جائے گی۔"

"یہ لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔" سراج بولا۔" اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد نقشہ بدل جائے گا۔ جو تماشا تھے وہ تماشائی ہوں گے۔ اور جو تماشائی تھے وہ تماشا ہوں گے۔ تمھاری قوتِ برداشت کتنی ہے؟"

"تم کو اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو ہے... تم کو پہلی بار ہوگا۔" وہ بولا۔" میں نے تمھاری پاکستان تشریف آوری پر تمھارا خیر مقدم کیا تھا۔ اس رات تمھاری قوتِ برداشت دیکھ لی تھی میں نے۔ یہ مسئلہ ذرا زیادہ ہی سنگین ہے۔ کیا تم اپنی جگہ رابعہ کو تصور کر سکتے ہو۔ اسی حالت میں جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا۔ سر کے بل معلق۔ اس طرح تم نے پہلے کبھی اسے نہ دیکھا ہوگا۔ جیسے وہاں ہم سب دیکھیں گے اور یہ تو گننے کی بات ہی نہیں کہ جتنا ایک مرد کے ساتھ ہو سکتا ہے اس کا دس گنا ایک عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کا جسم... ایک خوب صورت جوان عورت کا نازک جسم، اذیت میں کس طرح رقص کرتا ہے۔ کیسے بل کھا کے تڑپتا ہے اور کتنے دلچسپ تجربات کی آماجگاہ بنتا ہے، اس پر تم غور کرو تو تمھیں نازو اور مرزا غالب کے بارے میں بتا دینا بہت آسان لگے گا۔"

وہ حرامزادہ میرے جذبات پر گندے الفاظ کے گھناؤنے نشتر چلا رہا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی اذیت دے کر میرے اعصاب کو شکست دینا چاہتا تھا لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس دباؤ کو برداشت کروں گا۔ وہ بولتا رہا۔ اس نے بے شرمی اور بے حیائی کی انتہا کر دی۔ وہ حد درجہ فحش زبان میں بتاتا رہا کہ رابعہ کے ساتھ کیا ہوگا۔ محسن کی حالت بھی غیر تھی اور ان باتوں پر اس نے بھی کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تو یہ اس کی ہوشمندی تھی۔ اس شیطان کو جواب میں گالیاں دینا یا اس پر چیخنا چلانا بے سود تھا۔ ٹیڈی نسبتاً کم ہمت آدمی تھا۔ اس نے سراج کو برابر کی گالیاں دیں۔ اس کی ماں اور بہن کو بیچ میں گھسیٹ لایا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود چلاتا رہا کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا تو یہ کر دوں گا اور وہ کر دوں گا۔ سراج کے لیے اس کا یہ ردِ عمل کچھ تسکین کا باعث بنا کیونکہ ہم نے اسے مایوس کیا تھا۔ وہ زیادہ مزے لے کر نت نئی شیطانی باتیں کرتا رہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا کہ شہلا اس کے ہاتھ نہ لگی ورنہ زیادہ مزہ آتا۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ ایک ہی جگہ ڈبل پروگرام چلتا۔ جس کا جدھر دل چاہے دیکھے۔

بالآخر وہ دفع ہوا اور ہم سب کچھ دیر زمین پر سر رکھے پڑے رہے۔ اگر ہمیں سو سو دُرّے مارے جاتے تو وہ ہماری حالت نہ ہوتی جو اس کی باتوں سے ہوئی تھی۔ بے حیائی کی یہ باتیں ہم نے سُن تو لی تھیں مگر اب ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک دوسرے سے نظر ملا سکیں۔ ہم سب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور ڈر رہے تھے۔ اگر سچ مچ ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ اور خود کو سمجھا رہے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ٹیڈی رو رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ گالیاں دینے اور چیخنے چلانے کے بعد وہ اپنی بے بسی کے احساس سے مار کھا گیا تھا۔ حقیقت نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا تھا کہ جو سب کچھ کر سکتے ہیں وہ آج آزاد ہیں اور طاقتور ہیں اور ہم صرف امید کا سہارا لے سکتے ہیں۔ خود کو فریب دینے کے لیے اور ناقابلِ تصور حالات کا حقیقی روپ دیکھنے کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے... دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سراج نے کہا تھا۔

"استاد..." بالآخر میں نے سر اٹھا کے کہا۔ "تم تو بہت بزدل نکلے یار۔"

"قسم مولا علی کی سکندر بادشاہ۔" وہ روتے روتے بولا۔ "اس کتے کی زبان تک میرے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ورنہ میں اس کا حلق تک چیر کے رکھ دیتا۔ میں تو اتنا مجبور تھا کہ خود اپنے کان نہیں بند کر سکتا تھا۔ جن میں وہ حرامزادہ اتنی گندگی ڈال گیا۔"

"گندے الفاظ جس منہ سے نکلتے ہیں وہ منہ گندا ہوتا ہے یہ بات تو مجھے بچپن میں بتائی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "سُننے والے پر گندگی نہیں آتی۔"

"کیا واقعی نازو پھر اپنے گھر سے نکل گئی؟" محسن اچانک بولا۔

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور جب وہ گئی تھی تو... تجھے یاد ہے، وہ فوراً چل پڑی تھی... اس نے کسی قسم کے تذبذب کا اظہار نہیں کیا تھا... بالکل سوچا نہیں تھا۔"

"ہاں... غالباً وہ طے کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔" محسن بولا۔ "اسے جانا تھا اور جانے کی شرط پوری کرتے ہی پھر آ جانا تھا۔"

"لیکن وہ آئی بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ میرے لیے بھی پریشانی کی بات ہے۔" محسن بولا۔ "اسے تو معلوم تھا کہ ہم وہیں ہیں۔ وہ کسی اور جگہ نہیں جا سکتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا آخر؟"

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا... حادثہ..."

"اونہوں۔ حادثہ پیش آتا تو بالآخر اس کے والدین کو اور انکل رضوی کو خبر مل جاتی۔ ان کو بھی معلوم ہو جاتا۔" محسن بولا۔ "ان لوگوں نے پہلے سارے اسپتال چھان مارے ہوں گے میرا مطلب ہے نازو کو تلاش کرنے والوں نے۔"

"کیا یہ سندر داس... واقعی اکرام شیخ کا دوست ہوگا؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ ابھی تک میں طے نہیں کر سکا کہ وہ کس حد تک سچ بول رہا تھا۔" محسن نے کہا۔ "میرا دماغ ستر فیصد ووٹ اس کے حق میں دیتا ہے تو دل تیس فیصد خلاف بھی ہے۔"

"غالباً یہی تناسب میرا ہے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انکل رضوی نے اسے صرف میرے بارے میں بتایا؟ تیرے اور شہلا کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟"

"یہ ہے ذرا عجیب سی بات۔" محسن بولا۔ "کہ وہ مجھے اور ٹیڈی کو نہیں پہچان سکا۔"

"حالانکہ اس نے غالب اور نازو کی بات کی تھی۔" میں نے کہا۔ "اُس کو یہ نام معلوم تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باقی سب کے نام وہ نہ جانتا ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ صرف نام جانتا ہے۔ پہچانتا کسی کو نہیں۔" محسن بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ سراج تو اُسے دُور دُور رکھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی راہ میں کہیں حائل نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ اس کو تفتیش کے لیے اپنے ساتھ کیوں لایا؟" محسن نے ایک منطقی سوال کیا۔ "وہ اپنے کسی قابلِ اعتماد انسپکٹر کو بھی تو لا سکتا تھا۔ جس سے افشائے راز کا بالکل ڈر نہ ہوتا۔"

"اس کی باتوں نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آخر انکل رضوی نے میرے بارے میں اس سے کیا بات کی تھی؟ میری باتیں بتائی ہوں گی کہ یہ سکندر ایک مفرور مجرم ہے اور بہت خطرناک ہے۔ اگر تم کو نظر آئے تو فوراً گرفتار کر لینا یا گولی مار دینا۔ اور اگر کچھ نہ کر سکو تو مجھے اطلاع دینا۔ میں سارا انتظام کر دوں گا... نہیں محسن! انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی... انھوں نے کہا ہے کہ تم سکندر بخت کی حفاظت کرو گے کیونکہ وہ سراج کے ہاتھ پڑ سکتا ہے۔ سندر داس کو سراج کے خلاف شکایت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ حقیقت کیا ہے یہ تو انکل رضوی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سندر داس کو ثبوت حاصل کرنے ہیں تاکہ وہ سراج پر ہاتھ ڈال سکے۔ غالباً انھی شکایات کے باعث انکل رضوی کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہم کس چکر میں ہیں اور کس کے خلاف لڑ رہے ہیں، جو بات ہم نے ان کو نہیں بتائی تھی وہ کسی نے انھیں خطوط میں بتا دی۔ کچھ باتیں انھیں پہلے سے معلوم تھیں۔ انکل رضوی نے دو اور دو کو جوڑ کر جواب نکالا تو چار آیا۔ غالباً اب وہ ہمارے مشن کو سمجھتے ہیں اور اس مشن کو راز رکھنا چاہتے ہیں۔ خود کو ملوث کیے بغیر بالواسطہ طور پر وہ ہماری حفاظت کے انتظامات بھی کر رہے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں رہے۔" محسن بولا۔ "جب وہ شہلا کو لے گئے تھے تو مجھے شک ہوا تھا کہ یہ مہربانی بے سبب نہیں۔"

"وہ بے حد ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے تسلیم کر لیا ہوگا کہ قانون کے دائرے میں رہ کے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مجبور تھے یہ راستہ اختیار کرنے پر۔ قانون کی تمام قوت ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے دلاور اینڈ کمپنی کا کیا بگاڑ لیا؟ آج تک ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس پر چھاپا تو مار نہیں سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دلاور اینڈ کمپنی سے تصادم کا کوئی فائدہ نہیں۔ الٹا ہوگا یہ کہ یہ سب لوگ جن کے ہاتھ بہت لمبے اور خزانے بہت بھرے ہوئے ہیں، انکل کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔ ان کی پوسٹنگ کسی دوسرے شہر میں کرا دیں گے۔ اتنی دور جہاں بیٹھ کے وہ کچھ نہ کر سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ترقی دے کر ہیڈ آفس میں بٹھا دیا جائے۔ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے۔ جو اختیارات ایک شہر کا ایس ایس پی رکھتا ہے وہ ہیڈ کوارٹر کا ڈی آئی جی بھی نہیں رکھتا۔ پھر وہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتے تھے اور نہ ہماری مدد کے لیے کسی سندر داس کو بھیج سکتے تھے۔"

"تیرا خیال دل کو لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "انکل رضوی کو اب حقیقی صورتِ حال کا پتا چل گیا ہے۔ انھوں نے ہمارے سارے چھوٹے موٹے جرائم کو اسی لیے نظر انداز کر دیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہم نے شوقیہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک مقصد کے حصول کی خاطر کیا تھا۔ وہ مقصد بہت بڑا ہے اور دشمن سے جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میدانِ جنگ میں سپاہی اپنی بندوق کا بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ دشمنوں کا قتلِ عام کرتا ہے مگر اسے پھر بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ وہ ایک پوری پلٹن کا صفایا کر دے، دشمنوں کا ایک مورچا اڑا دے یا پھر کسی بستی کو تباہ کر دے جہاں دشمن کا اسلحہ خانہ ہو۔ تو اس سے باز پرس نہیں ہوتی۔ اسے تمغہ ملتا ہے۔ یہ بہادری اور جرأت کے کارنامے کہلاتے ہیں۔ انکل رضوی نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہم ایک بہت خطرناک دشمن کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور یہ ایسا دشمن ہے جس سے وہ نہیں لڑ سکتے۔ فوج نہیں لڑ سکتی۔ پولیس نہیں لڑ سکتی اور عوام نہیں لڑ سکتے۔ یہ سب کی نظروں سے دور پس پردہ لڑی جانے والی جنگ ہے۔ اگر انھوں نے ہمارے بارے میں ملنے والی ساری خبروں پر غور کیا ہوگا تو اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ہم جس پاگل پن میں مبتلا ہیں وہ عقل کی ایسی بات ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ انھوں نے اخبارات کی خبروں کو دیکھا ہوگا۔ گامے ماچھی کے تباہ ہو جانے والے اڈے کے بارے میں تفتیشی رپورٹ دیکھی ہوگی۔ پھر انھیں کرماں والی اور سائیں پارے والے کے اسلحہ خانے، وہاں سے حاصل ہونے والے ہیلی کوپٹر کے ٹکڑے۔ اسلحے کے نمونے اور ماہرین کی رپورٹ ملی ہوگی۔ انھیں حشمت خان، سراج اور ڈی سلوا کی پرانی کوٹھیوں میں پھٹنے والے ٹائم بموں کی تفصیلی رپورٹ مل گئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ حشمت خان کو وہ نہ جانتے ہوں مگر سراج کے خلاف تو پہلے ہی ان کو شکایات مل رہی تھیں۔ وہ ڈی سلوا کے نام سے بھی واقف تھے اور اس کوٹھی میں بھی اسلحہ تھا..."

"یار یہ سراج کے خلاف شکایات کون ارسال کرتا رہا؟"

"اسی کا کوئی دشمن۔" میں نے کہا۔

"ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔" محسن بولا۔ "ایسا ساتھی جو مالِ حرام کی غلط تقسیم یا کسی کے غلط رویے کے باعث ان کے خلاف ہو گیا ہو۔"

"یا جس کو بالآخر ضمیر کی خلش نے مجبور کر دیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں... یہ بھی ایک امکان ہے۔" محسن بولا۔

"سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی نے اچانک کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کس بات پر... یہ کیا ہے خواجہ صاحب؟"

"وہ خط میں نے ڈالے تھے۔" ٹیڈی نے کہا۔ "تم سے پوچھے بغیر..."

اگر اس تہ خانے میں بم پھٹ جاتا تو ہم اتنے حیران نہ ہوتے جتنے ٹیڈی کے لبوں سے نکلنے والے ایک جملے سے ہوئے۔ کچھ دیر ہم دم بخود بیٹھے ٹیڈی کو دیکھتے رہے۔

"تم نے! تم نے ایس ایس پی ضامن رضوی کو خطوط ارسال کیے تھے؟" میں نے بہت دیر بعد کہا۔

"ہاں، سکندر بادشاہ۔" ٹیڈی سر جھکا کے بولا۔ "میں بہت بے وقوف ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں جس دن مجھے یہ خیال آیا اس دن کے بعد مجھ پر آسیب ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی خیال رہنے لگا کہ مجھے تمھارے انکل رضوی کو سارے حالات سے باخبر رکھنا چاہیے۔ وہ کب تک یقین نہ کریں گے۔ بالآخر ان کو سوچنا پڑے گا۔ وہ بڑے افسر ہیں۔ تفتیش کریں گے تو سچ سامنے آ جائے گا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بے وقوف اور بزدل نظر آنے والے استاد ٹیڈی نے ایک ایسا کام کیا تھا جو ہم افلاطون نہ کر سکے تھے۔ اس کی بے وقوفی یہ تھی کہ وہ اب بھی شرمندہ تھا جبکہ اس کی وجہ سے ہماری پوزیشن صاف ہو گئی تھی۔ انکل رضوی کا ہم پر اعتماد بحال ہو گیا تھا اور ان کی نظر سچ کو دیکھنے لگی تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں نے تم سے اس لیے تذکرہ نہیں کیا تھا۔" وہ اب بھی اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ "کہ تم مجھے روک دو گے۔ اور نہ جانے میرے اندر کون سی آواز تھی جو کہتی تھی کہ نیک محمد... یہ نیکی کر... یہ نیکی ہے۔ ایسا ضرور کر... پھر میں نے تم سب سے چھپ چھپ کے خط لکھنے شروع کیے... میں وہ سب لکھتا گیا جو میرے نزدیک سچ تھا۔ جو کچھ ہم نے کیا تھا، جو ہمیں معلوم تھا۔ میں نے کسی کا نام نہیں لکھا مگر واقعات سب لکھ دیے وہ سب لکھ دیا جو ہم جانتے تھے۔ اور پھر یہ خطوط مختلف مقامات سے پوسٹ کرتا رہا۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ میں نے خطوں میں بھی لکھ دیا تھا۔ اور اسی لیے میں نے سارے خط ان کے گھر کے پتے پر بھیجے تھے۔"

میرے کان ٹیڈی کی آواز سن رہے تھے۔ یہ آوازِ غیب تھی جس نے ٹیڈی سے کہا تھا کہ اٹھا قلم اور لکھ... اس سچّی آواز کی طرح جس نے ایک اُمّی رسولؐ سے کہا تھا کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ اور اب وہ آواز مجھ سے مخاطب تھی کہ دیکھو! تم صراطِ مستقیم پر تھے۔ اس لیے ہم نے تمہاری حفاظت کی اور تم کو ہدایت دی، عقل دی اور بصیرت دی کہ تم اپنے نفع نقصان کو سمجھ لو۔ اور تم کو روشنی دی اور رفاقت دی۔ حوصلہ دیا اور وہ سب کچھ دیا جو تم نے چاہا۔ تمہارے مانگنے سے پہلے تم کو دیا۔ تم کو دنیا نے معتوب جانا۔ تمہارے نام پر ہر تقصیر لکھی اور تم کو سارے رشتوں سے محروم کیا مگر کیا ہم نے تمہارے لیے دلوں میں محبت کم کی؟ ہم نے تم کو زیادہ مخلص اور سچے رشتے دیے اور وہ محبت دی جو ہم اپنے خاص بندوں کو دیا کرتے ہیں (پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے)

میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری ساری طاقت تو ہے میرے معبود... میں نے عاجزی سے اعتراف کیا... یہ سب سچ تھا۔ استاد ٹیڈی نے سچ کو سب پر افشا کر دیا تھا۔ انکل رضوی کو قائل کر لیا تھا اور ان کو پھر ہمارا معاون و مددگار بنا دیا تھا۔ سندرداس کی باتوں کا ثبوت مل گیا تھا کہ اسے ضامن رضوی نے بھیجا تھا اور اکرام شیخ نے اسے بطورِ خاص میرا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ سب تائیدِ ایزدی تھی کہ اس نے ایک غیر مسلم کو ذریعہ بنایا اور اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک اور ثبوت فراہم کیا حالانکہ اس قادرِ مطلق کے اختیار میں سب کچھ ہونے کا یقین، ایمان ہے اور اس پر کوئی شک کرنے والا نہیں۔

"... اور میں نے یہ اس لیے کیا کہ میری ہینڈ رائٹنگ رضوی صاحب بالکل نہیں پہچان سکتے۔ میں وہ خط سیاہی اور کاغذ بدل کے لکھتا تھا۔ اور کبھی ایک جگہ سے ڈالتا تھا تو کبھی دوسری جگہ سے۔" ٹیڈی کا اعترافِ جرم جاری تھا۔

استاد! تم کس بات پر شرمندہ ہو؟" میں نے کہا۔ "شرمندہ تو میں ہوں کہ کچھ کر نہیں سکتا، ورنہ اس وقت اُٹھ کر تمھارا منہ چوم لیتا اور تمہارے ہاتھوں کو بوسہ دیتا۔ تم نے تو وہ کام کیا ہے جو سکندر سے نہ ہوا۔ یہ سب تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہم میں ایک بہت بڑی اور خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی اب ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ ناز نے چاہا تو ان کی تائید بھی حاصل ہو گی۔ وہ پولیس کو ہمارے تعاقب سے ہٹا سکتے ہیں۔ ہمارے کیس داخلِ دفتر کرا سکتے ہیں۔ عدالتی کیس تو وہی ایک ہے۔ میر شرافت علی کے قتل کا... اور اس میں اب جان کہاں رہی ہے۔ قاتل نے مرتے وقت اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ جس دن بھی ہم عدالت میں پیش ہوں گے سماعت کی رسمی کارروائی کے بعد باعزت طور پر بری ہو جائیں گے۔"

"تم نے بہت بڑا کام کیا ہے استاد... تم واقعی استاد ہو۔" محسن نے کہا۔ "مجھے شہلا کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ اکرام شیخ بھی سندرداس کے پیچھے پیچھے ہو گا۔ انکل رضوی نے اُسے ضرور سمجھا دیا ہو گا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ مستعفی ہو چکا ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دے سکتا ہے۔"

"تو نے بالکل ٹھیک کہا۔" میں نے مسرت سے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ نازو نے اپنی پوزیشن کلیئر کر دی ہو۔ اکرام شیخ بھی بہت ذہین آدمی ہے۔ اس نے اور انکل رضوی نے مل کر نازو کے والدین کو قائل کر لیا ہو گا کہ وہ نازو کی طرف سے بے فکر رہیں... نہ وہ غلط قسم کی لڑکی ہے اور نہ غلط راستے پر چل رہی ہے۔ جو کچھ وہ کر رہی ہے وہی اس کو کرنا چاہیے۔"

"تو... کہنا کیا چاہتا ہے کہ نازو اس بار سب کی رضامندی سے فرار ہوئی ہے اور یہ فرار نہیں ہے۔" محسن بولا۔

"اگر میرے مفروضات غلط نہ ہوئے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نازو اس بار اپنے بھائی کے ساتھ نکلی ہو۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا اعتراض ہو گا۔"

"مگر وہ نکل کر جائے گی کہاں؟" محسن نے پرانا سوال دُہرایا۔ "وہ گھر جہاں ہم تھے جل کے خاک ہوا۔ غالب نہ جانے کدھر گیا۔ انھیں معلوم نہیں کہ ہم کدھر گئے۔ دلاور اینڈ کمپنی نے تو اپنا سارا پلان بدل دیا۔ وہ ہم تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں نہ جانے کہاں لے جائیں گے۔ تلاش کرنے والے بھٹکتے رہ جائیں گے مگر کبھی ہمارا سراغ نہ پائیں گے۔"

"انسپکٹر سندرداس ان کو بتا چکا ہے۔"

"صرف یہ کہ ہم کہاں ہیں۔ کل کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ سراج اسے ہمارے ساتھ نہیں رکھے گا۔" محسن نے کہا۔

"سندرداس نے بتایا تو ہے کہ اکرام شیخ کو مطلع کر کے سندرداس نے کسی کو خط دے کے بھیجا تھا۔ کسی کے ہاتھ بھیجا جانے والا لیٹر اب تک پہنچ چکا ہو گا۔ خط ڈاک سے جاتا تو دیر ہو سکتی تھی۔ خط گم بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر سکندر... اگر ایسا ہوا کہ نازو اور اکرام شیخ ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہوں... جیسا کہ تیرا خیال ہے۔ تو وہ خط لے جانے والا خط کسے دے گا؟" محسن بولا۔ "یہ بڑی عجیب اور افسوسناک صورتِ حال ہو گی کہ اِدھر ہمارے موجودہ پتے کی اطلاع لے جانے والا نامہ بر وہاں جائے، اُدھر پتا چلے کہ مکتوب الیہ تو گھر سے نکل کے نہ جانے کدھر گئے۔ گھر والے کیا بتائیں گے کہ اکرام شیخ کہاں گیا۔ اکرام شیخ اپنی بہن نازو کے ساتھ پہنچے گا اس گھر میں جہاں نازو ہمیں بخیر و عافیت چھوڑ کر گئی تھی۔ وہاں اسے ایک پرانی حویلی کا جلا ہوا ڈھانچہ ملے گا... لوگ شاید بتا دیں کہ آگ لگی تھی تو دو لاشیں شاید ملی تھیں مگر اور نہ کوئی زندہ نکلا نہ مردہ۔ شاید اندر ہی جل کے راکھ ہو گئے یا ملبے میں دب کر کوئلہ ہو گئے۔ پھر نازو اور اس کا سابق سب انسپکٹر بھائی کیا کریں گے۔ وہ کس سے پوچھیں گے غالب کا پتا... میرا اور تیرا پتا۔"

"لیکن... جب انھیں کسی کا پتا نہ ملا تو وہ کہاں جائیں گے؟ ظاہر ہے واپس گھر..." میں نے کہا۔ "اور گھر پہنچنے پر انھیں سندرداس کا مکتوب مل جائے گا۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ وہ لوٹ کر گھر گئے۔" محسن بولا۔ "وہ دونوں قدم آگے بڑھا کے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ اکرام شیخ کو جانتا ہی ہے تو... اگر اب اس کو احساس ہو گا کہ اس نے غلطی کی تھی۔ تو تلافی کے لیے وہ سر دھڑ کی بازی لگا دے گا اور ہمارا سراغ لگانے چل پڑے گا۔ اس کی رہنمائی کرے گی نازو... وہ بھی ضدی اور جنونی لڑکی ہے۔ عجیب فلمی اتفاقات اور حادثات سے بھرپور کیس ہے۔" محسن نے ایک سرد آہ بھری۔ "بس دعا کرو وہ خط اُسے مل جائے۔"

"صرف خط کا ملنا ہی کافی نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خط پڑھ کے فوراً روانہ ہو جائیں۔ اور ہمارے یہاں سے ہٹائے جانے سے قبل آ جائیں۔ اگر وہ دیر سے آئے تو یہاں کون ملے گا۔ ممکن ہے سندرداس ملے مگر وہ بھی کیا بتائے گا کہ اسیرانِ خستہ جاں کو شکاری کدھر لے گئے۔"

"سندرداس ہمارے انکل رضوی کو بھی تو مطلع کرے گا..." ملک نے کہا۔ "اور ان کو یہ بھی بتائے گا کہ اس نے سکندر کو کہاں اور کس حال میں دیکھا تھا۔ پھر وہ سراج سے پوچھیں گے۔ سراج کو بتانا پڑے گا۔"

"ایسا ہو سکتا تھا لیکن یار میں نے تو خود ہی سندرداس کو تیرے سامنے منع کر دیا تھا کہ انکل رضوی کو کچھ نہ لکھے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"یہ تو نے بہت غلط کیا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا اس وقت کہ سندرداس واقعی سچ بول رہا ہے۔ میں اس پر کیسے اعتبار کر لیتا ایک دم۔" میں نے کہا۔

"اب کہہ دیں گے اس سے کہ ایس ایس پی صاحب کو سب لکھ دے۔ وہ سب باتیں جو ہم سے ہوئیں۔ ہمارے بارے میں۔ سراج کے بارے میں۔" محسن بولا۔

"اگر موقع ملا تو کہہ دیں گے۔ مگر اس کے بعد بھی کون سی ضمانت ہے کہ انکل رضوی فوراً ایکشن لیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ سراج سے پوچھ ضرور سکتے ہیں لیکن سراج انکار کر دے تو اس طرح نہیں پوچھ سکتے جیسے سراج ہم سے پوچھے گا۔ ایس ایس پی صاحب سراج کو الٹا لٹکا کے تھرڈ ڈگری کے طریقے سے اعتراف نہیں کرا سکتے کہ اس نے ہمیں کہاں چھپایا ہے۔ کہاں بھیجا ہے یا کس کے ہاتھ بیچا ہے۔ قتل کیا ہے تو کہاں گاڑا ہے۔ وغیرہ وغیرہ... زیادہ سے زیادہ کسی ایس پی کو معطل کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی کسی سنگین جرم کا ثبوت ملنے پر۔ صرف ایک انسپکٹر کا کہہ دینا کافی نہیں ہو گا۔ سراج صاف مکر جائے گا کہ کبھی وہ دوبارہ سکندر بخت سے ملا ہے۔ وہ انسپکٹر پر دشمنی کی نیت سے جھوٹ بولنے کا الزام عائد کر سکتا ہے۔ نہ ثبوت نہ گواہ۔ ایک الزام ماتحت نے افسر پر لگایا۔ دوسرا افسر نے ماتحت پر۔ وزن کس کے الزام میں ہو گا۔ ظاہر ہے افسر کی افسری چلے گی اور مارا جائے گا سندرداس۔"

"تو بہت حوصلہ شکن باتیں کر رہا ہے۔" محسن بولا۔ "تو نو ملی ہو رہا ہے۔"

"میں حقیقت کو خواب کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "خواہش اگر جنون بن جائے تو آدمی پاگل کہلاتا ہے۔ سراب کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔"

دروازہ کھلا تو ہم خاموش ہو گئے۔ ایک ساتھ چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو وہی مشین گن والے تھے جو ہمیں اس بیرک کے آفس میں دلاور کے ساتھ ملے تھے۔ باقی دو وہی خاموش رہ کر خالی ہاتھوں سے لڑنے والے تھے جو ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اور جنھوں نے ہمیں پنجروں میں بند کیا تھا۔ ان کے پیچھے ایس پی سراج آیا۔

"تم لوگوں نے کوئی فیصلہ کیا؟" وہ میرے سامنے کمر پر ہاتھ رکھ کر اور پیر پھیلا کے کھڑا ہو گیا۔ بالکل فلمی ولن کی طرح۔

"فیصلہ تم کو کرنا ہے۔ تم نے بہت بڑے دعوے کیے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "نازو اور غالب کہاں ہیں؟"

"ہمارا جواب اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم نہیں جانتے۔" میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہا: "اگر ہمیں معلوم ہوتا تب بھی نہ بتاتے۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج بولا: "ان سب کو اوپر لے آؤ۔"

دونوں خالی ہاتھ آنے والوں نے اپنی اپنی جیب سے رومال سے بڑے کپڑے نکالے۔ ایک نے میرے پیچھے آکے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ دوسرے نے محسن کے پیچھے بیٹھ کر یہی عمل شروع کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ چند منٹ کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ انہی میں سے کسی نے مجھے جھٹکا دے کر پیروں پر کھڑا کیا اور پھر آگے دھکیلا۔ میں لڑکھڑا کے گرتے گرتے بچا۔ مجھے ہانکنے والے اسی طرح دھکے دے کر مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کرتے گئے۔ تہ خانے کی سیڑھیوں پر میں دو مرتبہ منہ کے بل گرا۔ میں نے ٹیڈی کی آواز سنی۔ وہ ان سب کو گالیاں دے رہا تھا۔

"خدا تم سب کو اندھا کرے۔ تمھاری آنکھوں میں کیڑے پڑیں۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے روک لی۔ بات مذاق کی نہیں تھی لیکن مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء یا اس کے بعد ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب انگریز افواج غالب آچکی تھیں اور ہندوستانی چونکہ متحد نہ تھے اس لیے شکست کھا گئے تھے۔ بطور لطیفے کے یہی بات سنائی جاتی تھی کہ اس زمانے میں بڑی بوڑھیاں انگریزوں کو بددعائیں اور کوسنے دیتی تھیں تو کہتی تھیں کہ اللہ کرے موئے فرنگیوں کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ ٹیڈی بھی کچھ کرنے سے قاصر تھا تو بددعا پر اکتفا کر رہا تھا۔

میں سراج کے حکم کی تعمیل میں دائیں بائیں مڑتا گیا۔ ظاہر ہے یہ حکم صرف میرے لیے نہیں تھا۔ محسن اور ٹیڈی بھی اس کا حکم مانتے جا رہے تھے اور ہم سب ایک ساتھ کسی نامعلوم مقام کی جانب رواں تھے۔ مجھے اپنے اندیشے درست ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اب کوئی آیا بھی تو یہاں کون ملے گا۔ نہ نازو اور نہ غالب۔ نہ ایس آئی اکرام شیخ اور نہ ایس ایس پی ضامن رضوی ہم وہاں پہنچ سکیں گے جہاں ہمیں اب لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی ہماری منزل کہاں تھی۔ یہ خود ہم نہیں جانتے تھے۔ شاید سراج اور سندر داس بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمیں کس کے حوالے کرنا ہے اور کہاں پہنچانا ہے۔ سفر کے کتنے مرحلے ہیں اور کتنے ہمسفر ہیں۔ ہم شکاری تھے۔ یہ دعویٰ باطل ہوا۔ دلاور اور سراج بھی شکاری تھے۔ وہ کسی حد تک کامیاب ہوئے انھوں نے ہمیں جن کے حوالے کیا وہ سب سے بڑے شکاری تھے۔ یہ ثابت ہو گیا۔

دو ہاتھوں نے مجھے ایک دم اٹھایا اور اچھال دیا۔ میں کسی ٹرک یا بس کے فرش پر گرا۔ میرے ساتھ ہی محسن اور ٹیڈی بھی اندر آئے۔ میں نے سندر داس کی آواز سنی: "اب کیا حکم ہے سر؟"

"تم اب ڈیوٹی پر جاؤ۔" سراج نے کہا۔

"لیکن کل رات کی شفٹ میں ڈیوٹی دے چکا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"ہم یہاں روٹین اور شیڈول کو فالو نہیں کر سکتے۔ بارڈر کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔" سراج نے گرج کر کہا: "ایک آدمی بیمار ہے تو اس کی جگہ کیا میں ڈیوٹی دوں۔ دِس از این آرڈر... تم کو ڈبل ڈیوٹی دینا ہے۔ یہ کوئی ناانصافی یا ظلم نہیں ہے۔ تمھاری جگہ بھی لوگ ڈیوٹی دے چکے ہیں۔"

"یس سر!" سندر داس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"او کے... تم جا سکتے ہو... اور یاد رکھو کہ آج رات پھر تم کو اپنے معمول کے مطابق شفٹ کرنا ہے۔" سراج بولا۔

"آئی نو سر!" سندر نے کہا: "ڈیوٹی از ڈیوٹی... آرڈر از آرڈر..."

ٹرک دس منٹ بعد روانہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹا چلتا رہا۔ میں ادھر اُدھر کی آوازوں سے بالکل اندازہ نہ کر سکا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہچکولے یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم پختہ سڑک پر نہیں تھے۔ وہ کچی سڑک بھی نہیں تھی۔ ناہموار زمین تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد ٹرک رُکا تو ہمیں اتار لیا گیا۔ ہم مختلف راستوں سے گزارے گئے۔ پھر ہمیں رُکنے کا حکم دیا گیا اور کسی نے میری آنکھوں پر سے پٹی اتار لی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ محسن اور ٹیڈی میرے ساتھ نہیں ہیں۔ جہاں میں کھڑا ہوا تھا وہ پندرہ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا کمرہ تھا جس میں کراس بار اور چھت سے آویزاں لوہے کے حلقے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ورزش کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹا سا جمنازیم لگتا تھا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ عقوبت خانہ ہے جہاں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ نازو کہاں ہے اور غالب کہاں ہے۔ لیکن اس بار پوچھنے کا انداز مختلف ہوگا۔

اس بات کا یقین مجھے رابعہ کو دیکھ کر بھی آیا جو شیشے کے ایک بند دروازے کے پیچھے کرسی پر بندھی بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے لیے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پھر دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا ہو گیا اور اس مختصر سے کمرے میں سرچ لائٹ روشن ہو گئی۔ اب رابعہ وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی جو میرے ساتھ ہونے والا تھا۔ لیکن میں اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اچانک ایک اسپیکر آن ہو گیا اور میں نے رابعہ کے چیخنے کی آواز سنی۔ "رابعہ!" میں چلایا: "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں سکندر!" اس نے چلا کے کہا: "دیکھو ان کو بتا دو کہ نازو کہاں ہے۔"

یہ بڑا بے رحم انتظام تھا۔ ہم ایک دوسرے کی فریاد و فغاں سب سن بھی سکتے تھے۔

رابعہ کی آواز نے میری ذہنی اذیت میں اضافہ کیا۔ ایک طرف جسمانی عذاب کا خیال باعثِ اذیت تھا دوسری طرف رابعہ کی موجودگی کا احساس۔ ایسے میں رابعہ کا یہ کہنا میں نازو کے بارے میں کچھ نہ چھپاؤں اور سب بتا دوں میرے لیے حیرانی اور دکھ کی بات تھی۔ حیرانی مجھے یوں تھی کہ مجھے نازو کے متعلق کیا معلوم تھا جو رابعہ جانتی تھی اور سب جانتے تھے۔ میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا جو میں کچھ چھپاتا اور ان حالات میں کچھ چھپانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر میں سچ بولتا تو صرف یہی کہتا کہ نازو گھر گئی تھی لیکن وہاں سے نکل کے کہاں گئی؟ یہ کسی کو نہیں معلوم اور غالب اس کھنڈر کی آگ میں جل کر بھی نہیں مرا اور وہاں ملا بھی نہیں تو خدا کے سوا کون جانتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔ تو یہ جواب انھیں ہرگز مطمئن نہ کرتا۔ چنانچہ یہ تو طے تھا اور میں نے ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے تیار بھی کر لیا تھا کہ وہ جسمانی تشدد کا کوئی بھی طریقہ جس حد تک آزمانا چاہیں گے ضرور آزمائیں گے۔ وہ مجھ سے ایک واضح جواب کی امید رکھتے تھے کہ فلاں فلاں جگہ جا کے دیکھو۔ یا فلاں دن فلاں وقت پر نازو اور غالب فلاں جگہ آئیں گے مگر میرا یہ جھوٹ بھی آسانی سے نہ چلتا۔ وقتی طور پر میری جان عذاب سے بچ جاتی مگر پھر یہی سب کچھ رابعہ کے یا محسن کے ساتھ ہوتا اور اگر وہ بھی جھوٹ بولتے کہ غالب اور نازو کہاں اور کس وقت مل سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے اور میرے جھوٹ میں فرق ہوتا اور ہمارے سچ کی قلعی کھل جاتی۔ دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ہم نے تشدد کی اذیت سے بچنے اور مہلت حاصل کرنے کی فضول سی کوشش کی تھی۔

دکھ مجھے رابعہ کی اس بات پر ہوا کہ اس نے ایک غلط بات کی تھی۔ اگر مجھے نازو کے بارے میں علم ہوتا کہ وہ کہاں ہوگی تب بھی کیا میں اُسے پکڑوا دیتا۔ میں پوری کوشش کرتا کہ آخری سانس تک مجھ پر جو گزرتی ہے گزر جائے لیکن میری زبان میرے ارادوں کی شکست کا اعتراف نہ کرے۔ غالب اور نازو میں میرے لیے اس اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا کہ دونوں میرے ساتھی تھے اور خیر و شر کی اس جنگ میں میرے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ انھیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا اور دشمنوں کے ہاتھ ان تک نہ پہنچنے دینا میرا ہی نہیں ہم سب کا مشترکہ مقصد تھا جو اس وقت قید میں تھے۔ پھر رابعہ نے یہ کیوں کہا کہ نازو کے بارے میں بتا دو؟ کیا وہ ایک حسد سے مغلوب ہو جانے والی عورت ہو گئی تھی یا جذبات کی یک طرفہ یلغار میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جانے والی۔ جواب ایک ہی تھا۔ آرزو کی پکار بن گئی تھی کہ چاہے دنیا رہے نہ رہے وہ رہے جو میری محبت کی زندگی ہے۔ کیا محبت اسی خود غرضی کو کہتے ہیں؟

سرچ لائٹ چھت کے ایک گوشے میں نصب تھی اور اس کی روشنی ٹارچ کی روشنی کی طرح ایک لکیر کی صورت میں اندھیرے سے گزر کر فرش تک محدود سے دائرے میں پڑ رہی تھی اور جہاں وہ دائرہ تھا وہیں فرش پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی عام استعمال کی کرسی نہیں تھی۔ یہ فولادی کرسی سیاہ رنگ کی تھی اور اس ماحول میں بالکل الیکٹرک چیئر کی طرح لگ رہی تھی جو امریکا اور یورپ میں سزائے موت دینے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ وہ چمڑے کے تسمے تھے جو کرسی کے بازوؤں پر اور پشت پر نظر آ رہے تھے اور جن سے کرسی پر بیٹھنے والے کو یوں کسا جا سکتا تھا کہ وہ جنبش تک نہ کر پائے۔ الیکٹرک چیئر پر بٹھائے جانے والوں کو بھی برقی رو چھوڑنے سے پہلے اسی طرح باندھا جاتا تھا۔ کرسی کے فولادی پائے سیمنٹ کے فرش میں نصب تھے۔ چنانچہ کرسی کو ہلانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔

مجھے سزائے موت نہیں ہوئی تھی۔ یہ میرے لیے موت سے بدتر عقوبت کا اہتمام تھا اور ایذا رسانی کے ذریعے اعترافِ جرم کرانے یا زبان کھلوانے کے اس طریقے کو ساری دنیا میں سب سے آسان اور مؤثر سمجھ کے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اس کٹھن مرحلے کو جھیل جاتا تھا وہ گویا جہنم کے دوسرے زیادہ اذیتناک طبقے کے لیے کوالیفائی کر لیتا تھا۔ جہنم کے اگر سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا عذاب شدید تر ہے تو دنیا میں انسانوں نے بھی عقوبت کے درجے بنا رکھے ہیں اور جو قوتِ برداشت کے ایک مرحلے سے گزر جاتا ہے وہ اذیت اور تشدد کے سخت ترین مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کسی نہ کسی مرحلے میں ہر شخص شکست قبول کر لیتا ہے۔ اگر کوئی فتح مند گزرتا ہے تو وہ بالآخر جان سے گزر جاتا ہے۔ سراغ رسانی اور تفتیشی اداروں کے ماہرین نے آدمی کے ذہن کے ہر نہاں خانے سے سچ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے فن کو ایک ناقابلِ تصور حد تک بھیانک اور لرزہ خیز عمل بنا دیا ہے۔ اب تشدد کرنے والی مشینوں کے استعمال کو وہ بھی جائز سمجھتے ہیں جو آزادی، ضمیر اور اخلاقی اقدار اور مہذب معاشرے کی بات کرتے ہیں۔ جو انجمن انسدادِ بے رحمی حیوانات بناتے ہیں مگر حیوانِ ناطق اور اشرف المخلوقات کے ساتھ انسانیت سوز مظالم کو اپنی سیاست میں روا رکھتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ سب سے پہلے مجھے ہی اس کرسی پر باندھ کر یوں بٹھا دیا جائے گا کہ وہ سرچ لائٹ براہِ راست میری آنکھوں پر پڑتی رہے اور جب اس روشنی کا عذاب میری آنکھوں کے لیے اور میرے اعصاب کے لیے برداشت سے باہر ہونے لگے گا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوگا۔ جن لوگوں نے روشنی کو صرف چاندنی، ٹیوب لائٹ اور مرکری لیمپ، فانوسوں اور دلکش ڈیزائن والی وال لائٹس، نیون سائن، جلتے بجھتے آرائشی بلبوں، نگینوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

روشنی کے فواروں، کینڈل لائٹ ڈنر اور خواب گاہوں میں دیکھا ہے، ان کے لیے روشنی صرف خوب صورتی ہے۔ اندھیروں کو مٹا دینے والی قوت ہے اور نائٹ لائف کے ہنگامۂ نا و نوش اور جشن طرب کو جاری رکھنے کی ضمانت ہے مگر جو پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقۂ تفتیش سے گزرے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی روشنی کتنی سفاک اور بے رحم حقیقت ہے۔ عام آدمی کو اگر براہِ راست آنکھوں پر پڑنے والی دس ہزار واٹ لائٹ کی بیم میں بٹھا دیا جائے تو پہلے اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگا۔ پھر وہ پاگل ہونے لگے گا۔ پھر چیختا چلاتا اس اذیت کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جائے گا یا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے گا۔ یہ کتنا بہت آسان ہے کہ آنکھیں بند کرنے کے بعد روشنی نہیں رہتی مگر یہ اتنی کمزور روشنی نہیں ہوتی۔ یہ بند آنکھوں کے پپوٹوں کو چیرتی ہوئی اندر اتر جاتی ہے اور اس کی چبھن آنکھوں میں پیوست ہونے والی سوئیوں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

جس دروازے سے مجھے اندر لایا گیا تھا وہ ایک بار پھر کھلا اور وہ دونوں پھر نمودار ہوئے جو زبان رکھتے تھے مگر گونگے تھے۔ ان کے تیور ہر وقت جارحانہ رہتے تھے اور وہ اتنے جو گنے نظر آتے تھے جیسے ان کے مقابل آدمی نہیں آدم خور شیر ہو۔ ان کی صورت کے نقوش میں بھی عجیب آدم بیزار بے حسی اور دلآزار سختی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان کو ایک ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ بھی کرتا تو وہ دونوں مجھے دو ہاتھ مار کے لٹا دیتے۔ قد میں وہ مجھ سے کم تھے لیکن ان کے جسم فولادی اور تباہ کن قوت سے بھرے ہوئے لگتے تھے۔

ان میں سے ایک نے انگلی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کوئی مشکل اور ناقابلِ فہم اشارہ نہیں تھا مگر میں کھڑا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب وہ زبان سے کیا حکم دیتا ہے مگر ان کے منہ میں تو جیسے زبان تھی ہی نہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کا واسطہ لاتوں کے بھوت سے ہے جنہیں باتوں کی ضرورت نہیں۔ دوسرے نے مجھے بڑی پھرتی سے گھوم کر لات ماری اور میں ایک دم آگے گیا تو دوسرے نے سنبھال لیا اور کرسی پر گرا دیا۔ مشینی انداز میں انھوں نے میرے ہاتھوں کو کرسی کے بازوؤں پر کس دیا۔ پیروں کو نیچے کرسی کے پایوں سے باندھ دیا اور ایک بیلٹ درمیان سے میرے پیٹ پر سے گزار کے پیچھے ہُک کر دیا۔ ریوالور اب بھی میری جیب میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں مناسب موقع کے انتظار میں، میں نے کچھ کرنے کے سارے مواقع ضائع تو نہیں کر دیے ہیں۔

جب میرے سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھ کے ایک بیلٹ میری پیشانی پر کسی گئی تو میں تقریباً منجمد ہو گیا۔ سرچ لائٹ ابھی میری آنکھوں پر نہیں پڑ رہی تھی۔ مجھے باندھ کر بے بس کر دینے والے اپنا کام کر کے رخصت ہوئے تو سرچ لائٹ نے اس کا زاویہ بدلا اور اچانک میرے سامنے سورج آ گیا۔ اس خیرہ کن روشنی کے سوا میری نگاہ سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ مجھے اس کی چندھیا دینے والی روشنی کے ساتھ ہی تپش بھی محسوس ہوئی جو میرے وجود میں ہر مسام کے راستے اتر رہی تھی لیکن میں اپنے سر کو ایک سُوت اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتا تھا کہ اس روشنی کی یلغار سے بچ سکوں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دیکھا مگر اس سے روشنی کی شدت میں برائے نام کمی آئی۔ میری پلکوں پر اس روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا اور اس کا دباؤ آنکھوں میں درد بن کے پھیلنے لگا۔ وقت گزرنے لگا۔

رابعہ کی آواز اب میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں ایک کمرے کی تنہائی میں اس روشنی میں یوں قید تھا جیسے وہ روشنی اپنا ایک مادی وجود رکھتی ہے۔ وہ روشنی میرے گرد ایک چمکیلے اور ٹھوس مادے کی طرح جمع ہو کے جم گئی تھی اور اس میں میرا جسم اس طرح نظر آتا تھا جیسے شفاف شیشے کے پیپر ویٹ میں رنگین پھول مقید دکھائی دیتے ہیں۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے آواز دی۔ میرا مقصد اپنی تنہائی کے احساس کو شکست دینا تھا۔ "رابعہ... حوصلہ مت ہارنا... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میری بات کا جواب دیواروں کی خاموشی نے بھی نہیں دیا۔ مجھ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ میرے اور رابعہ کے درمیان رابطہ ہے لیکن کنٹرول ان کا ہے۔ ان کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہیں دکھائیں اور جو چاہیں سنائیں۔ رابعہ کو میری حالت دکھائیں اور مجھے اس کی آہ و بُکا سنائیں۔ وقت ایک بار گراں بن گیا تھا۔

"رابعہ..." میں پھر چلایا۔ "مجھے اور تم کو ایک ہی بار مرنا ہے لیکن مرنے سے پہلے یہ شرمندگی نہ ہو کہ ہم ہار گئے۔ ہم دوستی کے نام کو رسوا کر گئے۔"

خاموشی... سناٹا... اکیلے پن کا آسیب اور اذیت۔ "تم سُن رہی ہو نا... جب ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تو یہ ہم سے کیا پوچھیں گے۔" میں نے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ وقت مجھے شکست دینے لگا۔

"جواب دو مجھے رابعہ۔" سکوت کا ایک وقفہ۔

"رابعہ... میں تم سے محبت کرتا ہوں... تم جانتی ہو... سارا زمانہ جانتا ہے اور ساری خدائی جانتی ہے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "زندگی کی آخری سانس تک... دل کی آخری دھڑکن تک میں یہ اقرار کرتا رہوں گا۔"

نہ جانے کون میرے تصور میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ اس کی بے آواز ہنسی میرا تمسخر اڑا رہی تھی۔ یہ وقت تھا یا میری تقدیر تھی جو مجھ پر خندہ زن تھی۔ "تمہارے اعصاب جواب دے رہے ہیں سکندر بخت... تم پاگل ہو رہے ہو۔"

"یہ روشنی بجھا دو... ہٹا دو اس روشنی کو میرے سامنے سے۔" میں نے چیخ کر کہا اور خود کو آزاد کرنے کی بے سود کوشش کرنے لگا۔ "سنو... تم جو بھی ہو... دلاور... سُور کے بچے... کمینے... یہ لائٹ آف کرتے نہیں تو میں تجھے قتل کر دوں گا... پیڈرو... استاد کی اولاد... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا... خسرو جمشید... نواب کے نطفے... تیری تو..."

روشنی پسے ہوئے شیشے کی طرح میری آنکھوں کو کھرچ رہی تھی۔ درد بن کے میرے دماغ کو مفلوج کر رہی تھی اور میرے جسم میں آگ بھر رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح زور لگا رہا تھا اور دیوانہ وار جدوجہد کر رہا تھا لیکن اس روشنی سے مفر نہ تھا۔ میں اس روشنی میں ایسے پھنس گیا تھا جیسے گاڑھے سیمنٹ میں تنگا پھنس جائے اور وقت کے ساتھ ساتھ سیمنٹ سخت ہوتا جائے تو تنگے کے پر بھی ٹوٹ کر منجمد ہونے لگیں۔ میں چیخ رہا تھا اور چوہدری دلاور سمیت ان سب کو گالیاں دے رہا تھا جو میری اس حالت کا تماشا کہیں چھپ کر دیکھ رہے تھے یا میرے قریب ہی خاموش کھڑے تھے۔ بالآخر بے ہوشی مجھ پر سکون کا وقفہ بن کے نازل ہوئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں پسینے میں تر تھا۔ وقت کا احساس تو پہلے ہی فنا ہو گیا تھا۔ اب مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ باہر کی دنیا میں دن ہے یا رات اور میں بے ہوشی سے پھر ہوش کی دنیا میں کتنی دیر کے بعد لوٹا ہوں۔ مجھے سخت نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ میری سانس بھی تیز تھی۔ تاہم وہ روشنی خاموش تھی جس نے مجھے بے بس کر رکھ دیا تھا۔

"تم کچھ سوچ رہے ہو سکندر بخت۔" ایک اجنبی آواز نے اس اندھی خاموشی کو چیر دیا۔ میں اچھل پڑا... صرف محاورتاً ورنہ اُچھلنا تو در کنار میں اپنی جگہ پر ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

"کیا تم سوچ رہے ہو کہ تعاون کرنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔" آواز نے کہا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا مگر اس کا لہجہ بالکل صاف نہیں تھا۔ میں خاصے اعتماد سے انگریزی کے مرہٹی گجراتی، بنگالی اور پنجابی یا مدراسی لہجے کو شناخت کر سکتا ہوں۔ مجھے مخاطب کرنے والا جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ تامل، تیلگو یا ملیالم بولنے والوں کے خطے کا تلفظ سب سے جدا ہے۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تم کو صرف جواب دینے ہیں۔ سوال ہم کریں گے۔" وہ بولا۔ "تم جواب میں کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کے غلط یا صحیح ہونے کا پتا ہم خود چلا لیں گے۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہم ترتیب وار سوالات کریں گے۔" یہ دوسری آواز تھی۔ غالباً کوئی بنگالی۔

"سکندر بخت، تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"مجھے بچپن میں کبیر خان بھی کہتے تھے میرے والدین اور دوست۔"

"تم اپنا والد کسے سمجھتے ہو؟"

"صرف وزیر خان کو۔"

"مگر تمھیں معلوم ہے کہ وزیر خان نے صرف تمھاری پرورش کی تھی، ورنہ تم جنوبی ہندوستان کی ایک ریاست کے ولی عہد ہو۔"

"میں اس فضول بات کو نہیں مانتا... پیدائش کے وقت میں نے جس ماں کی گود میں آنکھ کھولی وہ وزیر خان کی بیوی تھی۔ اور جس شخص نے میرے کان میں اذان دی وہ وزیر خان تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔" مدراسی بولا۔

"اگر تم چاہو تو آج بھی اپنی ریاست میں لوٹ کر جا سکتے ہو۔" بنگالی نے کہا۔

"ہندوستان میں اب کون سی ریاست رہ گئی ہے۔"

"مگر ریاستوں کے انضمام کے وقت جو کچھ حکمرانوں کو ملا وہ تمھیں مل سکتا ہے۔" بنگالی نے کہا۔

"مجھے اس کی قطعی آرزو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ویری ویل... کیا تم وزیر خان کے وارث کی حیثیت سے اس کے کاروبار اور اثاثوں کو اپنی تحویل میں لینا پسند کرو گے؟" مدراسی بولا۔

"میں اس رشوت کو پہلے ہی ٹھکرا چکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"مگر اسی حق وراثت کے لیے تم نے اپنے والد کے پارٹنر میر شرافت علی کو قتل کر دیا تھا۔"

"وہ ایک جھوٹا الزام تھا۔ مجھے اس قتل میں ملوث کیا گیا تھا۔"

"لیکن ابھی تک کسی عدالت نے تمھیں بے گناہ قرار نہیں دیا۔" بنگالی بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔"

"صرف تمھارا جاننا کافی نہیں سکندر بخت... یہ قانونی معاملہ ہے۔" مدراسی نے کہا۔

"تم اپنے والد کا قاتل کسے سمجھتے ہو؟" بنگالی بولا۔

"کئی افراد کو... بہت سے لوگوں نے مل کر ان کے خلاف سازش کی تھی۔"

"میر شرافت علی کو تم نے قتل نہیں کیا تو پھر کس نے کیا تھا؟" مدراسی بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اس کے دل میں خنجر اتارنے والا ہاتھ استاد ٹیڈو کا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں خنجر تھمانے والا چوہدری دلاور تھا۔" میں نے کہا

"تم نے ان دونوں سے قتل کا انتقام لینے کا ارادہ کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"میرا انصاف خدا کرے گا۔" میں نے کہا جو ایک گول مول جواب تھا۔

"تم پرویز خان کے قتل کے اسباب کب واضح ہوئے تھے اور تمھارے خیال میں یہ اسباب کیا تھے؟" بنگالی نے پوچھا۔

"چوہدری دلاور کے ٹولے کا ناجائز کاروبار۔" میں نے کہا۔

"تم اس ناجائز کاروبار کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"وہ اسلحہ بناتا اور اسمگل کرتا ہے۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"اور یہ اسلحہ کہاں جاتا ہے؟"

"مشرقی بنگال کے تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کو۔" یہ سب ایسے حقائق تھے جن کا اعتراف نہ کرنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"گویا تم ہی سائیں پاپڑ والے کی خانقاہ کو تباہ کرنے کے ذمے دار ہو؟"

"وہ خانقاہ نہیں... تمھارا اسلحہ خانہ تھا۔" میں نے کہا۔

"تم سیوک رام... کرماں والی اور کرنل جگن ناتھ کے قتل کا اعتراف کرتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"ہاں، وہ جاسوس اور غدار تھے اور اپنی زمین پر مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں ایسے لوگوں کے ناپاک وجود کو ختم کر دوں۔ مجھے موقع ملے تو میں تم کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے بہت سے اسلحے پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔" بنگالی نے کہا۔

"ہاں... ہمیں اس کی ضرورت تھی۔"

"ہم کون؟ تمھارے ساتھی؟" بنگالی نے کہا۔

"کیا تم ان ساتھیوں کے نام گنوا سکتے ہو؟" مدراسی نے کہا۔

"تم سب کے نام جانتے ہو۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔"

"میں سوال دہراتا ہوں۔ کیا تم ان کے نام گنوا سکتے ہو؟"

"میں اپنی زبان سے کسی کا نام نہیں لوں گا۔"

مدراسی نے ایک ایک کر کے سب نام لیے۔ "تم سب نے تنظیم آزادیٔ فلسطین، آئرش لبریشن آرمی کی طرز پر ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی۔ یہ ایک مضحکہ خیز حرکت تھی۔"

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔"

"اگر تم کو آزاد کر دیا جائے تو کیا تم کوئی سمجھوتا قبول کرو گے؟"

"اور اگر قبول کرو گے تو اس کی شرائط کیا ہوں گی؟"

"تم نے ابھی ہماری تنظیم کو مضحکہ خیز قرار دیا تھا۔ اب اسی کے ایک نمائندے سے مصالحت کی پیش کش میں تم اتنے سنجیدہ ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ تم اور رابعہ لندن چلے جاؤ... محسن اور شہلا بھی تمھارے ساتھ رہیں تو کوئی ہرج نہیں۔ تم کو رہائش اور معقول ملازمت کے ساتھ برطانوی شہریت مل جائے گی۔" بنگالی نے کہا، "پھر باقی سب لوگ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جائیں گے استاد ٹیڈی، غالب اور نازو۔"

"میں ان شرائط کو مسترد کرتا ہوں۔"

"تمھیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔" مدراسی بولا۔

"ہم سب کو باری باری رضامند کر لیں گے۔" بنگالی نے کہا۔

"پرویز وکرم کے گھر سے تمھیں کیا معلومات حاصل ہوئی تھیں؟ تم نے ایک بڑھیا کو وہاں جاسوسی کے لیے بھیجا تھا... وہ بڑھیا کون تھی؟" مدراسی نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا وہ رابعہ تھی؟" مدراسی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"وہ شہلا تھی۔" میں نے یہ سوچ کر کہا کہ سب سے زیادہ محفوظ وہی تھی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمیں نازو کو وکرم فیملی کے گھر میں بھیج کر معلوم ہوا تھا۔ اس معلومات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ اپنا پلان بدل چکے تھے اور میرے سچ بولنے سے وہ یقین کر سکتے تھے کہ جاسوس بن کے اندر پہنچنے والی عورت شہلا ہی تھی، نازو نہیں تھی۔

"نہیں، وہ رابعہ بھی نہیں تھی اور شہلا بھی نہیں تھی... تم جھوٹ بول رہے ہو۔" مدراسی بولا۔

"یہ تمھاری مرضی ہے کہ جسے چاہو جھوٹ مانو اور جسے چاہو سچ۔"

"تمھاری اس نام نہاد دہشت گرد تنظیم کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ یہ تنظیم کب سے قائم ہے؟" مدراسی بولا۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے اس کا نام کب ایم آر ایس رکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اغراض و مقاصد تمھیں معلوم ہیں۔"

"ایم آر ایس سے پہلے یہ تنظیم کیا تھی؟"

"وطن کے ناموس کی خاطر اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے والے چند دوست جو سرزمینِ پاکستان سے غداروں اور وطن فروشوں کا خاتمہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔

"اور اب اس کی قوّت کیا ہے؟"

"وہی اتحاد، یقین محکم اور تنظیم کے اصول۔ خلوصِ نیت۔ خدا پر بھروسا اور سرفروشی کا جذبہ۔" میں نے کہا۔

"اس جملے میں صرف خوب صورت الفاظ ہیں... میں مادّی قوّت کی بات کر رہا تھا۔" مدراسی نے کہا۔ "تمھاری اس تنظیم کے حروف، ایم آر ایس، سے کیا بنتا ہے۔"

اگر میں سچ بولتا تو یہ جواب نہایت مضحکہ خیز ہوتا کیونکہ ایم آر

ایس میرے سے کوئی تنظیم ہی نہ تھی۔ یہ تو درحقیقت ہمارے ایک جذبے کا نام تھا۔ ایک عہد اور ایک مشن کا نام تھا جس میں سب برابر کے شریک تھے مگر مذاق میں ہم نے محسن، رابعہ اور سکندر کے ناموں کے ابتدائی حروف لے کر ایک نام گھڑ لیا تھا جو پی ایل او کی طرح بہت بھاری بھرکم اور متاثر کرنے والا لگتا تھا۔ اس کے ابتدائی ارکان ہم تھے۔ سب سے پہلے شکاری مجھے گھیر کر لائے تھے۔ محسن میرے ساتھ تھا اور پہلی مدد رابعہ نے کی تھی۔ اس کے بعد ہمارا ساتھ دینے والے استاد ٹیڈی... شہلا... نازو اور غالب کسی طرح بھی ہم سے کم اہم نہ تھے مگر وہ نام زبان پر ایسا چڑھا تھا کہ ہم اپنی اجتماعی قوّت کو ایم آر ایس کہنے لگے تھے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے عظیم موجد اور سائنسداں رانجن کو جب اپنی دریافت کردہ پُراسرار شعاعوں کا کوئی نام نہ سوجھا تو اس نے انھیں ایکس رے کہنا شروع کر دیا جو آج تک ایسے ہی چل رہا ہے۔ اب ایک سنگین صورتِ حال میں اس سوال کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔

مدراسی نے کہا "کیا تم نے سوال نہیں سنا؟"

میں نے کہا "ایم آر ایس کا مطلب ہوتا ہے۔ مدر لینڈ ریفارم سوسائٹی۔"

مدراسی نے کہا "ریفارم؟ گویا تم جو کچھ کر رہے ہو یہ اصلاح ہے؟"

"ہاں سادہ اردو میں تم اسے تنظیم اصلاحِ وطن کہہ سکتے ہو۔"

مدراسی بولا "تم نے اصلاح کا کون سا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "اصلاح کے لیے ہی سب کچھ ہے۔ سب سے پہلے دشمنوں کی اصلاح۔ ان کے دماغ کی اصلاح۔ نیّت کی اصلاح پھر وطن پرستوں کی نگاہ کی اصلاح جو دشمنوں کو نہیں پہچانتی۔ ان کے جذبۂ ایمان و اتحاد کی اصلاح۔"

"ایم آر ایس کا صدر دفتر کہاں ہے؟" مدراسی نے میری دلیل سے قائل ہو کے کہا۔

میں نے کہا "جہاں ہم سب ہوں وہی صدر دفتر ہے۔"

"ہم سب سے تمھاری مراد ہائی کمان سے ہے؟" مدراسی بولا۔

میں نے کہا "ہائی کمان؟"

مدراسی بولا "ہاں... تم اور محسن... غالب اور ٹیڈی... رابعہ، شہلا اور نازو۔ یہ سات افراد ایم آر ایس کو کنٹرول کرتے تھے؟"

"تھے کا کیا مطلب؟"

مدراسی بولا "مطلب یہ کہ اب تم سات نہیں رہے اور تم خود اب کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ایم آر ایس کو کیسے کنٹرول کرو گے جبکہ تم خود ہمارے کنٹرول میں ہو۔"

میں نے کہا "ایم آر ایس افراد کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک قوّت کا... ایک جذبے کا اور ایک تحریک کا نام ہے۔ اس میں ہم سات کیا ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اس میں ملک کے سات کروڑ عوام شامل ہیں۔"

"سوائے ہم غداروں کے۔" بنگالی بہت دیر بعد غصے سے بولا۔ "تم یہی کہو گے۔"

"تم سچ کو خود قبول نہیں کر رہے ہو۔ سچ تم پر غالب ہے اور تم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو۔" میں نے کہا۔

"سات کروڑ عوام میں سے تمھارے ساتھ عملاً کتنے لوگ شامل تھے۔" مدراسی نے کہا۔ "جو تمھاری تخریبی کارروائیوں میں تمھارا ساتھ دیتے تھے۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟"

"سات کروڑ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ایم آر ایس کی باقاعدہ رکنیت حاصل کرنے والے کتنے ہیں؟ ان کے صوبائی ڈویژن اور ڈسٹرکٹ... اور شہر کی سطح پر کون سربراہ ہیں؟ کس کس شہر میں تمھارے دفاتر ہیں اور کہاں واقع ہیں۔ ان کے اجلاس کب ہوتے ہیں۔ انھیں کون بریف کرتا ہے تربیت کون دیتا ہے؟"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کو ابھی ایک سوالنامہ دیا جائے گا۔" مدراسی متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"اور اس میں یہی سوالات ہوں گے...؟"

"اس میں اور بھی بہت کچھ پوچھا جائے گا... نام پتے... سب کی کارگزاری... یہ کہ کس کے پاس کتنا اسلحہ ہے اور کس قسم کا اسلحہ ہے یہ اسلحہ کس طرح حاصل کیا گیا۔ کس کس نے ایم آر ایس کو سرمایہ فراہم کیا... کیا تمھاری تنظیم کو غیر سرکاری طور پر حکومت کی فوجی یا نیم فوجی تنظیموں کا تعاون حاصل ہے اور یہ کہ مشرقی بنگال اور بھارت میں تمھارے کتنے تربیت یافتہ ایجنٹ کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں ان سب کے نام اور ٹھکانے..."

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔ "تنظیم میں وہی سات آٹھ افراد شامل ہیں جن کو تم نے خود ہائی کمان سمجھ لیا ہے۔ بے شک ہمیں بہت سے دوسرے لوگوں کا تعاون بھی حاصل رہا اور اکثر غیر متعلقہ افراد نے ہماری مدد کی ہے... مگر وہ ایم آر ایس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم اس بے سروپا بات پر یقین کر لیں گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔" مدراسی نے کہا۔ "ایم آر ایس ایک تنظیم ہے اور تمھارے اپنے کہنے کے مطابق یہ صوبائی یا مقامی تنظیم نہیں ہے۔ ایک قومی تنظیم ہے جسے ملک کی سات کروڑ آبادی کا تعاون حاصل ہے۔ غالباً تمھاری مراد مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں اپنے حامیوں سے ہوگی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بنگالی ہنسنے لگا۔ "تم سمجھتا ہے ادھر سب تمھارا ساتھی لوگ ہے؟ تم سب پاکستان کا آبادی میں سات کروڑ کو اپنے ساتھ مانتا... تم بے وقوف ہے۔ ادھر سب ایسا بات بولتا۔ امارا بنگلہ دیش میں سب تمھارا دشمن ہے۔" بنگالی نے نہ جانے کیوں انگریزی بولتے بولتے اردو کی ٹانگ توڑنا شروع کر دی۔ اس غدار کی زبان سے یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ علیٰحدگی پسندی کے رجحانات رکھنے والے ایسی ہی باتیں کر رہے تھے اور ان کے سستے جذباتی نعرے مشرقی پاکستان کے سیدھے سادے مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جنھوں نے تقسیم کے وقت مسلمانوں کے علیٰحدہ وطن کی خاطر خون کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ آج یہ کیسے ممکن تھا کہ وہی مسلمان اپنے مغربی حصے کے بھائیوں سے الگ وطن کا مطالبہ کرنے لگتے۔ انھیں غلط اعداد و شمار سے... سیاسی چالبازیوں سے اور بے بنیاد مگر مسلسل پروپیگنڈے سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ سنہرے ریشے کی سرزمین کی تمام آمدنی کو مغربی حصے کی خوشحالی پر صرف کیا جا رہا ہے اور ان کے حصے میں بھوک اور سیلاب کی تباہ کاری۔ فاقہ کشی اور بے روزگاری کے سوا کچھ نہیں آ رہا ہے۔

چھ نکاتی پروگرام کو ایک منظم سازش کے تحت بنگال کے عوام کا نعرہ بنایا جا رہا تھا حالانکہ ان سچے پاکستانیوں کے دل سے وہی پاکستان زندہ باد کی صدا نکلتی تھی مگر یہ عالمی سیاست کے شعبدہ گروں کا کمال تھا کہ وہ اسی آواز کو بدل کے نکال رہے تھے۔

"میں مکرجی... آئی مین یہ جو کچھ انھوں نے کہا۔" مدراسی نے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والے نام پر خفت سے کہا۔ "سوال یہ نہیں کہ پاکستان کے دونوں حصوں کی مجموعی آبادی میں سے سات کروڑ تمھارے ساتھ ہیں یا آٹھ کروڑ۔ میرا مقصد تھا کہ تم پہلے مغربی پاکستان کے بارے میں بتاؤ۔ یہاں تمھاری تنظیم کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پشاور سے کراچی تک تمھارے کتنے ایجنٹ ہیں؟"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے کہا۔ "اس تنظیم میں جو کچھ ہیں ہم ہیں اور کوئی نہیں۔"

"جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ہم ایسی مضحکہ خیز بات پر یقین نہیں کر سکتے، ایم آر ایس صرف سات ارکان پر مشتمل ہے۔" مدراسی بولا۔ جو اپنے لہجے اور اعتماد کے باعث تفتیشی ٹیم کا سربراہ لگتا تھا "چار مرد اور تین عورتیں مل کر کوئی دہشت گرد تنظیم نہیں بنتے۔ تمھاری پُشت پناہی یقیناً کسی کا سرمایہ کر رہا ہو گا۔ کوئی سیاسی جماعت تمھارے پیچھے ہو گی جو تم کو اسلحہ اور وسائل فراہم کرتی ہو گی تمھاری عملی مدد کرنے والے ہر جگہ ہوں گے جو سامنے آئے بغیر تمھارے لیے بہت کچھ کرتے ہوں گے۔ ہم نے دنیا بھر کی دہشت پسند تنظیموں کی نظریاتی اساس... طریق کار اور کارکردگی۔ نیچے سے اوپر تک کے تنظیمی ڈھانچے کی ساخت... عوامی سطح پر اس کے فعال ہونے کے اسباب اور عالمی سطح پر ان کے روابط کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مجھے پہلے یہاں تمھاری تنظیم کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ بھارت میں اور مشرقی بنگال میں تمھاری پوزیشن کیا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مدراسی کی سوچ غلط نہیں لیکن ہمارے معاملے میں وہ ایم آر ایس کا موازنہ پی ایل او کے تنظیمی ڈھانچے، روابط اور وسائل سے کر رہا تھا تو اس کے اسباب تھے۔ یہاں ہم نے انھیں بہت نقصان پہنچایا تھا جو غداروں سے مل کر ملک کے دو ٹکڑے کرنے کی سازش میں شریک ہو گئے تھے اور پیسے کی خاطر بک گئے تھے۔ مشرقی بنگال میں بھی حب الوطن عناصر کے ہاتھوں علیٰحدگی پسندوں کو اور ان کے حامیوں کو برابر نقصان ہو رہا تھا۔ چنانچہ مدراسی نے فرض کر لیا تھا کہ ہمارا ان سے رابطہ ہے اور ہم ملک گیر سطح پر منظم ہو کے مزاحمت کی تحریک چلا رہے ہیں۔

"ابھی میں تم کو ایک سوال نامہ دوں گا۔" مدراسی نے کہا۔ "تمھارے پاس پوری رات ہو گی۔ ایسا ہی سوال نامہ تمھارے تمام ساتھیوں کو الگ الگ دیا جائے گا۔ اس سوالنامے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ساٹھ سوال ہیں جن کے جواب بہت مختصر ہیں۔ ہاں یا نہیں۔ دوسرے حصے میں تمھیں سوچ کر وہ سب لکھنا ہو گا جو تم جانتے ہو۔"

"دیکھو... تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو..."

"آج کی رات سوچو اور آرام کرو۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا۔ "کل صبح دس بجے تک تم جوابات تحریر کر دو گے۔"

"میرے پاس نہ کچھ بتانے کو ہے اور نہ لکھنے کو۔" میں نے چلا کر کہا مگر وہ اسپیکر بند ہو گیا تھا جس کے ذریعے میں ان کی آواز سُن رہا تھا۔ کمرے میں ایک مدھم سی روشنی کچھ تیز ہوئی اور پھر وہی دونوں اندر آ گئے جنھوں نے مجھے کرسی کے ساتھ باندھا تھا۔ انھوں نے مجھے کھولا اور کھڑا کر دیا۔ میں تھوڑا سا لڑکھڑایا کیونکہ اتنی دیر تک بندھے رہنے کے بعد میرے ہاتھوں اور پیروں کے رگ پٹھے اکڑ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے دھکیلا تو میں چل پڑا۔ بے اختیار میری نگاہ اس شیشے کے دروازے کے پیچھے گئی جہاں میں نے رابعہ کو دیکھا تھا۔ تھوڑی سی روشنی وہاں پہنچ رہی تھی لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میرے دونوں محافظ مجھے اس عذاب گاہ سے نکال کے ایک خواب گاہ میں لے گئے۔

خواب گاہ سات فٹ لمبے چوڑے اور اونچے کمرے یا کوٹھری کا نام تھا جس کی چاروں دیواریں ایک جیسی سپاٹ اور مضبوط تھیں۔ دیواروں پر رسماً چونے کی کوچی پھیر دی گئی تھی تاکہ پلستر کا سیاہ رنگ ...ے روشن ہو جائے۔ اوپر چھت بھی ایک دیوار ہی محسوس ...وتی تھی جو میرے اور آزادی کے درمیان حائل تھی۔ جو میری زمین کو ...سمان سے جدا کرتی تھی اور مجھے محبوس ہونے کا احساس دلاتی ...تھی۔ میرا ذہن اُسے چھت نہیں مانتا تھا۔ گھروں کی چھت بہت ...بلند اور بہت مہربان ہوتی ہے۔ آدمی گھر کی دیواروں کو چھو سکتا ...ہے مگر چھت کو آسمان کے نیچے ایک اور سائبان کی پناہ کے طور ...پر دیکھ سکتا ہے یا محسوس کر سکتا ہے۔ اس چھت کو میں اپنے ...ہاتھوں سے چھو سکتا تھا اور اس کی سختی کو اور بے رحمی کو محسوس ...کر سکتا تھا۔ دیواروں کے اوپر والے ایک جوڑ پر ٹیوب لائٹ کی ...تیز روشنی تھی جس کے تار پیچھے والے روشندان سے گزر کے ...باہر جا رہے تھے۔ روشندان کی لمبائی دو فٹ اور چوڑائی آٹھ انچ ...کے قریب تھی۔ ٹیوب لائٹ اس کی چوڑائی کو دو حصوں میں تقسیم ...کرتی تھی اور لمبائی کے رُخ پورے روشندان پر پھیلی ہوئی تھی۔ ...دو فٹ کی ٹیوب لائٹ کا اُجالا اس کمرے کے لیے کافی تھا۔

روشندان میں کوئی سلاخ یا جالی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ٹیوب لائٹ کی رکاوٹ ضرور تھی، اگر میں اسے توڑ دیتا تب بھی آٹھ ...انچ کی چوڑائی سے نہیں گزر سکتا تھا۔ روشندان سے ہی مجھے اندازہ ہوا ...دیواریں چھ انچ موٹی ہیں۔ میرے پاس ایک کیل بھی ہوتی تو میں ...چنائی سے ایک اینٹ الگ کر دیتا اور رات بھر میں دیوار کے ...شگاف سے نکل جاتا لیکن میرا سارا اثاثہ ایک ریوالور تھا جسے میں ...باہر نکالنے سے گریز کرتا آیا تھا اور منتظر تھا کہ اس کے استعمال کا مناسب ...وقت آئے۔ شاید وہ وقت کبھی نہیں آئے گا اور جب آئے گا ...تو ریوالور مجھ سے چھینا جا چکا ہو گا۔ میں نے مایوسی کی کیفیت میں ...سوچا۔ فرش پر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ بستر صاف اور آرام دہ تھا۔ ...اس کے تکیے پر ایک قلم اور ایک کاپی رکھی ہوئی تھی — کاپی ...تیس صفحات والی تھی جو شاید چار آنے میں ملتی تھی۔ اسے کھول کر ...دیکھے بغیر میں نے جان لیا کہ یہی وہ سوالنامہ ہے جس کے جواب ...مجھے صبح دس بجے تک تحریر کرنے ہوں گے۔ اگر میں نے جوابات ...نہ دیے تو کیا ہو گا؟ غلط جوابات دیے تو کیا ہو گا اور بفرض محال ...سب کے صحیح جوابات لکھ دیے تو کیا ہو گا؟ یہ اضافی سوالات ...میرے ذہن میں تھے مگر ان کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔

بستر پر بیٹھ کے میں نے چشم تصوّر سے رابعہ کو اور پھر محسن ...کو دیکھا جو شاید ایسے ہی ڈربوں میں بستر پر بیٹھے سوالنامے کو ...گھور رہے ہوں گے اور ان کا خون کھول رہا ہو گا لیکن بے بس ...آدمی کا خون کھولتا ہے تو جلتا ہے۔ وہ بھی اسی مشکل کا شکار ہوں ...گے کہ کیا کریں۔ قلم توڑ دیں۔ سوالنامے کو پھاڑ دیں یا جوابات پر ...غور کریں۔ جو سوالات میرے ذہن میں تھے وہی ان کے ...ذہن میں انتشار پیدا کر رہے ہوں گے۔ آزمائش کے مرحلے سب ...کے لیے ایک سے تھے۔

اچانک دروازے کے قفل نے باہر سے کسی کے آنے کی خبر دی۔ پھر درِ زنداں کھُلا اور ایس پی سراج اندر آ گیا۔ اس کے لبوں پر وہی کمینے پن کی مسکراہٹ تھی جو اس کی فطرت کی خباثت کو ظاہر کرتی تھی۔ پیچھے ایک ملازم ٹائپ آدمی تھا جس نے ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ ٹرے میں میرے لیے کھانا لایا گیا تھا۔ اس کے اشارے پر ملازم نے ٹرے نیچے رکھ دی۔

"اسے لے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی میں کسی دشمن کا نمک نہیں کھا سکتا۔"

سراج نے قہقہہ مارا۔ "وہ کیا فرما گئے ہیں اپنے علامہ صاحب کہ اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی... مائی ڈیئر طائر لاہوتی، جو مل رہا ہے کھا لو۔ کیا معلوم ... آخری طعام ہو۔ پیٹ خالی ہے تو دماغ بھی خالی رہتا ہے اور تم کو دماغ کا بہت استعمال کرنا ہے۔"

میں نے ٹرے پر نظر ڈالی۔ اس میں روٹی کے ساتھ چاول تھے۔ بھُنا ہوا گوشت تھا اور تھوڑا سا حلوا تھا۔ میں نے سراج کے سامنے ایک ڈینگ تو ماری تھی مگر حقیقت کو جھٹلانا ناممکن تھا۔ بھوک آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے یا اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بھوک نے آدم کو جنّت سے نکلوایا۔ بھوک نے معاشی جدّوجہد کو جنم دیا۔ غلامی بھی معاشی جدّوجہد ہے۔ عصمت فروشی بھی اور چوری ڈکیتی بھی۔ بھوک نے ہی انسان کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ اس میں اور ایک حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ آخر میں کب تک نہیں کھاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ فاقہ کشی کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے تو کبھی شوقیہ بھی بھوک ہڑتال نہیں کی تھی۔ ذہن اب میرے جذبات پر عقل کا دباؤ ڈال رہا تھا اور وہ دلائل دے رہا تھا جن کی نفی نہیں کی جا سکتی تھی۔ نہ جانے اس قید میں کب تک رہنا پڑے۔ جسم بھی اذیّت اسی وقت برداشت کر سکتا ہے جب اس میں قوّت ہو۔ سختی جھیلنے اور مظالم برداشت کرنے کے لیے مجھے توانائی چاہیے۔ ناتوانی میں تو حوصلہ بھی جواب دے جاتا ہے۔ پھر دشمن کے نمک کا کیا سوال نمک حرام تو یہ شیطانی ٹولہ تھا۔ میں اپنے وطن کی مٹی سے اُگنے والی گندم کی روٹی پر حق رکھتا ہوں۔ اسے میں خود کیوں اپنے لیے شجرِ ممنوعہ بناؤں۔ یہ سب کچھ حرام ہونا چاہیے ان کے لیے جو وطن فروش ہیں۔ ان کو واقعی حق نہیں پہنچتا کہ اس وطن کی کسی بھی نعمت کو اپنا کہیں۔

"دُرومت۔" سراج طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اس میں زہر نہیں ہے۔"

"اگر تمھارے بس کی بات ہوتی تو تم مجھے صرف زہر ہی کھانے کو دیتے۔" میں نے کہا۔ "میں بے بس ہوں، تم بھی بے بس ہو کہ مجھے مار نہیں سکتے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"مار دینا تو بہت آسان کام ہے۔ مارنا اور مرنے نہ دینا، یہ ذرا مشکل پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "میں تمھیں مار دیتا تو تمھاری جان دنیا کے سارے بکھیڑوں سے چھوٹ جاتی۔ یہ مختلف لوگ ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑیں گے۔ تم نے یہ سوالنامہ دیکھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔"

"کیسا کام؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"میں ڈنر کے بعد سو جاتا ہوں۔ تم یہ سوالنامہ پڑھ کے مناسب جوابات لکھ دو۔" میں نے کہا۔ "سوالات مرتّب کرنے میں تم نے ضرور مدد کی ہوگی۔ زیادہ تر معلومات ایسی ہوں گی کہ تم میری جگہ جواب دے سکتے ہو۔"

"ماشاءاللہ طبیعت کی ظرافت ابھی باقی ہے۔" وہ بولا۔ "ابھی کچھ ہوا نہیں نا۔ کل رات مزاج پوچھیں گے اور دیکھیں گے، زبان سے پھول جھڑتے ہیں یا کانٹے۔ ٹرے میں یہ تھرماس کافی کا ہے۔ سگریٹ میں ابھی بھجواتا ہوں، جو شخص برتن اُٹھانے آئے گا وہی سگریٹ بھی لائے گا۔ اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو دروازہ بجا دینا۔ باہر دو مسلّح محافظ تمھاری خدمت کے لیے ہی کھڑے کیے گئے ہیں۔"

"کیا میں انھیں قتل کر کے فرار ہو جاؤں؟" میں نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لو۔" سراج جاتے جاتے بولا۔ "تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی کوشش ضرور کرتا۔ دوسرا راستہ روشندان کا بھی ہے۔ تم سمٹ کر بلی کے برابر ہو جاؤ تو اِدھر سے نکل سکتے ہو۔"

جب وہ چلا گیا تو مجھے یہ جان کے بہت افسوس ہوا اور بہت شرم آئی کہ میں کھانے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ جیسے نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے، ایسے ہی بھوک شاید قبر میں بھی لگتی ہوگی۔ آدمی بہت کمزور، بے بس اور مجبور ہے۔ خطا کا پُتلا ہے اور وہ ہے، پانی کا بُلبلا وغیرہ۔ اس قسم کے دلائل ختم ہونے سے پہلے کھانا ختم ہو گیا اور میں نے کافی کا تھرماس خالی کرتے ہوئے ریوالور استعمال کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ ملازم برتن اٹھانے کے لیے اندر آئے تو میں اسے زد پر رکھ لوں اور کہوں کہ راستہ چھوڑ دو ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا... نہیں..... وہ کہے گا کہ مار دو۔ ایک ملازم کی جان بے قیمت ہوتی ہے اور ایک آقا کی مرضی پر دس غلام قربان کرنے کی روایت پرانی ہے۔ تجویز نمبر دو... کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس ملازم کی ٹھکائی لگاؤں اور جب وہ واویلا کرے تو خود بھی اس کے ساتھ شور مچاؤں۔ فوراً کوئی مسلّح محافظ مشین گن کے ساتھ اندر آجائے اور میں اسے گولی مار کے اس کی مشین گن پر قبضہ کر لوں... تو... وہ اکیلا نہیں آئے گا۔ ایک اندر آئے گا تو دوسرا پیچھے موجود رہے گا اور وہ دونوں بہرحال اتنے احمق نہیں ہوں گے کہ مجھے مشین گن پر اتنی آسانی سے قبضہ کرنے دیں۔ انھیں یہ بتا دیا گیا ہوگا کہ یہ کیا کر سکتے ہیں اور انھیں ہر مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے واضح ہدایات دے دی گئی ہوں گی۔

ملازم اندر آیا اور ٹرے اُٹھانے لگا تو میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا تم سگریٹ لانا بھول گئے ہو؟"

اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس نکال کے مجھے پکڑا دی۔

"یہ کیا؟ گولڈ لیف؟" میں نے کہا۔ "میں تھری کاسل پیتا ہوں۔" ملازم نے میری فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنو، کیا تم مجھے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہو؟" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میں تم کو پانچ روپے انعام دوں گا۔"

ملازم نے بدحواسی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"چلو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم باہر کھڑے ہوئے دونوں محافظوں کو گولی مار سکتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ریوالور میں فراہم کردوں گا۔"

ملازم نے پھر ٹرے کو اٹھانا چاہا جس کو میں نے پکڑ رکھا تھا۔

"اچھا میرے ماموں کو پیغام تو پہنچا سکتے ہو کہ میں یہاں قید ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ مال روڈ سے جھنگیوں کی توپ لے کر آجائے گا اور ایک گولا چلائے گا تو سب کو بدروح بنا دے گا۔ وہ بہت بہادر ہے... دلاور سے بھی زیادہ..."

باہر سے ایک محافظ نے میری توقع کے مطابق اندر جھانک کر یہ دیکھا کہ برتن اٹھانے والا اتنی دیر سے کیا کر رہا ہے۔

میں نے ملازم کے ایک جھانپڑ مارا۔ "اتنی دیر سے میں اکیلا ہی بولتا جا رہا ہوں... مُنہ میں زبان نہیں ہے یا ماں نے بولنا نہیں سکھایا؟"

ملازم چِلّانے لگا۔ "ہائے مر گیا جی... اللہ میری توبہ۔" اور میں نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔ ایک بار پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی۔ مشین گن والا محافظ اندر آگیا۔ اس کے بالکل پیچھے دو قدم سے دوسرے محافظ نے بھی اپنی مشین گن کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ملازم ٹرے اٹھا کے بھاگا۔

"سب سالے گونگے ہیں یہاں۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ جلالی۔ دونوں محافظ لوٹ گئے اور دروازہ باہر سے مقفّل ہو گیا۔

تو گویا فرار ہونے کے امکانات صفر فیصد۔ میں نے اس تجربے سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں سوچا... کہیں سے غیبی امداد پہنچنے کے امکانات صفر فیصد... بہادری سے مقابلہ کر کے نکل جانے کے امکانات صفر فیصد... مجموعہ صفر فیصد... ان حالات میں سوالنامے کا مطالعہ کرنے کے سوا کیا

سکتا تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس کے پہلے حصّے کے سوالات چھ صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ دوسرے حصّے کے دس سوالات ساتویں صفحے پر درج تھے اور باقی پچیس صفحات چھوڑ دیے گئے تھے کہ میں جتنا زورِ قلم صرف کرنا چاہوں کرلوں۔ بہت لائق طالب علم تھا اور سالانہ امتحانات میں پرچا حل کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صفحات کالے کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ جہاں دوسرے ایک امتحانی کاپی سے کام چلا لیتے تھے، وہاں میں دو یا تین کاپیاں بھرتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا کہ دوسروں سے دوگنا یا تین گنا قابل ہوں مگر مجھ سے زیادہ لائق لڑکے ایک امتحانی کاپی بھر کے زیادہ نمبر لے جاتے تھے۔

آج پھر ایک امتحان درپیش تھا۔ کاش، مجھے معلوم ہو سکتا کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ ان کا ذہنی ردِّعمل کیا ہے۔ اگر میں ان سے مشورہ کر سکتا تو ہم مشترک لائحہ عمل اختیار کر سکتے تھے لیکن دشمن نے یہی تو چال چلی تھی۔ ہمارے جوابات سے جھوٹ سچ الگ ہو جائے گا۔ ویسے مجھے پوری امید تھی کہ ممن اور رابعہ بھی وہی کریں گے جو میں کروں گا... میں کیا کروں گا۔ یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا۔ کیتھرین بیچاری کی معلومات تو نہ ہونے کے برابر تھیں اور اس کے لیے سوالنامہ شاید عبرانی زبان میں ہوتا تب بھی اتنا ہی ناقابلِ فہم ہوتا۔ وہ اردو بول لیتی تھی مگر لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی۔

حصّہ اوّل کے سوالات تاریخ کا حصّہ تھے اور میرے لندن میں قیام کے زمانے سے شروع ہوتے تھے۔ لندن میں مجھے وزیر خان کے خطوط ملتے تھے؟ کیا خطوط میں اس نے دلاور کا ذکر کیا تھا؟ کبھی بتایا تھا کہ دلاور کون ہے؟ پیڈرو کون ہے اور امیر شرافت علی کون ہے؟ اس نے کاروبار سے اپنی علیحدگی کا ذکر کیا تھا؟ کبھی یہ بتایا تھا کہ اس کے کاروبار پر غاصبانہ قبضہ ہو چکا ہے؟ کبھی یہ لکھا تھا کہ اب وہاں ناجائز کاروبار ہوتا ہے؟ پھر سوالات پاکستان میں قیام کے بعد کے حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ سب کچھ پوچھا گیا تھا جو ہم کر چکے تھے۔ ان کے جواب ہاں یا نہیں میں دیے جا سکتے تھے۔

دوسرے حصّے کے سوالات زیادہ مشکل تھے اور کچھ یوں تھے کہ...

1 :۔ ایم آر ایس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

2 :۔ ایم آر ایس کے ارکان کی مجموعی تعداد کیا ہے؟ ان میں کتنے عہدیدار ہیں اور ان کے فرائض کیا ہیں؟ کس صوبے میں کتنی شاخیں ہیں؟ بڑے بڑے شہروں میں ان کے ٹھکانے کہاں ہیں اور ان کو ہدایات کون جاری کرتا ہے؟

3 :۔ ایم آر ایس کی عسکری قوّت کیا ہے؟ اسے کتنے سابقہ فوجیوں کا اور کمانڈوز کا تعاون حاصل ہے؟ انھیں خدمات کا کیا معاوضہ دیا جاتا ہے اور یہ لوگ کیا خدمت سرانجام دیتے ہیں؟

4 :۔ ایم آر ایس کے مالی وسائل کیا ہیں؟ مجموعی اثاثے کتنے ہیں اور کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔

5 :۔ ایم آر ایس کے پاس اسلحہ کتنا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟

6 :۔ ایم آر ایس کا رابطہ ملک کی کس سیاسی جماعت سے ہے اور کس کس جماعت نے ایم آر ایس کو حمایت کی پیش کش کی ہے؟

7 :۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ایم آر ایس کو کس سُپر پاور کی پشت پناہی حاصل ہے؟

8 :۔ ایم آر ایس نے اب تک تخریب کاری کی کتنی وارداتیں کی ہیں اور ان میں کتنا مالی یا جانی نقصان کیا ہے یا اٹھایا ہے؟

9 :۔ بھارت اور مشرقی بنگال کے کن افراد... تنظیموں... سیاسی جماعتوں یا اداروں سے ایم آر ایس کو سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر تعاون حاصل ہے؟

10 :۔ کیا ایم آر ایس اپنی تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ روکنے اور ملکی معاملات سے خود کو علیحدہ رکھنے کے سوال پر مذاکرات کے حق میں ہے یا مصالحت کا کوئی فارمولا پیش کر سکتی ہے؟

یہ سوالات پڑھ کے میری عجیب حالت ہوئی۔ ایک طرف میرے اندر غصّے کا آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا۔ یہ حرامزادے ہمیں تخریب کار کہتے تھے۔ ہماری مجاہدانہ سرگرمیوں کو اپنی وطن دشمن حرکتوں کی طرح پیسے کی ہوس کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ملک میں انتشار پھیلانے والے پیسہ اور اسلحہ دیتے ہیں۔ ہم امریکا یا روس کے ایجنٹ ہیں۔ آخری سوال کا مفہوم بھی واضح تھا کہ بتاؤ کتنا پیسہ چاہیے۔ کس ملک کی شہریت اور عیش و عشرت کے کیا لوازمات درکار ہیں۔ مذاکرات... مصالحت کا فارمولا... اُلو کے پٹھے... شیطان کے چیلے۔ خود تو بِک چکے، اب مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔ غصّے کے ساتھ مجھے ہنسی بھی آگئی کہ وہ خوف اور دہشت کے باعث رائی کو پہاڑ کی شکل میں دیکھ رہے تھے۔ ہم گنتی کے چند افراد... خالی ہاتھ... بے آسرا اور پریشان حال... ہمارا موازنہ وہ بہت بڑے پیمانے پر ملکی اور بین الاقوامی سطح کی تنظیموں سے کر رہے تھے۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ گنگو تیلی ہم تھے مگر ان کی نظر اور عقل ہمیں راجا بھوج سمجھ رہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا، جیسے محاذِ جنگ پر کوئی کسی کے ہاتھ میں لوٹا بھی دیکھے تو بم سمجھ کے دور بھاگ جائے... سارا اثر ایک نفسیاتی فضا کا ہوتا ہے۔ کُتّے سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد... ان کو ہماری سرگرمیوں نے ایم آر ایس فوبیا میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ سب سوالات ان کے ذہن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں بیٹھے ہوئے اندیشوں کی پیداوار تھے اور اُن کے تصور کا فریب تھے لیکن میرے لیے تشویش کی بات ... جواب کیا ہوں گے۔ جہاں سوال ہی غلط ہوں' وہاں جوابات کے درست ہونے کا کیا سوال... ہم کیسے بتائیں گے کہ ہمارا کس سیاسی جماعت سے رابطہ ہے۔ ہم کس سیاست داں کے آلۂ کار ہیں اور کس کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ روس اور امریکا میں سے کون ہمیں شہ دے رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو ایک خالص ذاتی سطح کی جدّوجہد ہے جس سے نہ کسی کا مفاد وابستہ ہے اور نہ غرض۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ کہاں کی مدد اور کیسی مدد۔ ابھی تک تو کوئی ایم آر ایس کا نام تک نہیں جانتا۔ کیا دے گا' کوئی ہمیں اور کیوں دے گا۔ ابھی تک نہ اثاثے ہیں نہ وسائل۔ ملا خاک بھی نہیں۔ جو اپنا تھا وہ بھی گنوا دیا ہے اور ایک جان ہے سو وہ بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

مگر کیا یہ سب کچھ وہ مانیں گے جنھوں نے سوال نامہ مرتّب کیا ہے۔ وہ تو کہیں گے کہ جواب دو... مفصّل جواب دو۔ اعداد و شمار دو... نام پتے دو... اور ہمارے انکار سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے سوالنامہ رکھ دیا اور ایک سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتے لگا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کس مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل... وہ ہر صورت میں تشدّد کریں گے اور تشدّد کی ہر صورت میرے تصور میں تھی خصوصاً وہ سب جو رابعہ کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اس کو غیر شریفانہ۔ غیر اخلاقی یا غیر انسانی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دشمن سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں' اس کے لیے دشمنی کا جواز رکھتے ہیں۔

کونے میں ایک سرسراہٹ کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کونے میں فرش کے ساتھ ایک انچ سے کچھ زیادہ قطر کا سوراخ تھا جس میں لوہے کا پائپ فٹ تھا۔ اگر رات کے وقت میں دروازہ بجا کے سنتری کے سامنے اسکول کے بچوں کی طرح ایک انگلی کھڑی کرتا تو وہ مجھے اس سوراخ سے رجوع کرنے کو کہتا۔ سرسراہٹ سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی چوہا اندر آنے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن اسی وقت ایک تنکا اندر آیا۔ تنکے کے آخر میں کاغذ کی ایک گولی چسپاں تھی۔ میں لپک کے گیا اور تنکے کو اندر کھینچ لیا۔ یہ تنکا نہیں' لوہے کا تار تھا۔ کسی سائیکل کی پرانی اسپوک۔ اس پر جو کاغذ کی گولی تھی' اسے میں نے احتیاط سے کھولا۔ اس پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ "مجھے بتاؤ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ سندر۔"

"سندر!" میں نے زمین پر لیٹ کر نالی کے سوراخ میں سرگوشی کی۔ "تم میری آواز سُن سکتے ہو۔"

"ہاں..." سندر کی آواز لوہے کے پائپ میں سے براہِ راست میرے کان میں پہنچی۔ "ذرا آہستہ بات کرنا۔"

"کیا تم ہمیں یہاں سے نکال نہیں سکتے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... پہرا بہت سخت ہے۔ میں اکیلا سب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں تو ڈیوٹی سے بھاگ کر آیا ہوں۔" سندر داس بولا۔ "سراج نے مجھے دو میل دُور مخالف سمت میں بھیج دیا تھا۔"

"کیا ہم بارڈر پر ہیں؟" میں نے کہا۔

"تم بارڈر کے قریب ہو۔" وہ بولا۔ "کھیم کرن کا قصبہ یہاں سے نزدیک ہے۔ تقریباً سات میل کے فاصلے پر۔"

"تو کیا اب ہمیں بارڈر کے پار اسمگل کیا جائے گا؟"

"ہاں... تم کو انڈین انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا گیا ہے لیکن وہ تم کو زمینی راستے سے نہیں لے جائیں گے۔" سندر داس بولا۔

"پھر کیا ہوائی جہاز سے لے جائیں گے؟"

"مجھے اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ تم کو سمندر کے راستے مال بردار جہاز میں لے جایا جائے گا۔" سندر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پہلے ہمیں کراچی لے جایا جائے گا؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اور غالباً انھی صندوقوں میں۔" سندر نے کہا۔

"آئی سی!" میں نے کہا۔ مجھے محسن کی بات یاد آگئی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ صندوقوں پر 'ایلڈ ویسٹ سٹی' اور ملک کا نام 'دبئی دانیا' لکھا ہوا تھا جو ایک مہمل اور گمراہ کُن بات تھی۔ "سندر! کیا تم یہ بات کسی ایسے شخص کو بتا سکتے ہو جو ہماری مدد کر سکے۔ مثلاً اکرام شیخ کو یا ایس پی ضامن رضوی کو... یا غالب کو اور نازو کو... اگر وہ پہلے سے کراچی میں موجود ہوں تو شاید کچھ کر سکیں۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

"اگر انھیں اس جگہ کی بابت صحیح معلوم ہو جائے اور تم ان کو لوکیشن بتا سکو کہ ہم کہاں ہیں تو بتا دینا۔" میں نے کہا۔

"میں... کوشش کروں گا۔" وہ بولا۔ "دراصل یہاں سے میرا جانا تو ناممکن ہے۔ ڈاک کا نظام بھی نہیں ہے۔ لاہور یہاں سے بائیس میل دُور ہے لیکن جہاں ہم پڑے ہیں' وہ غیر آباد علاقہ ہے کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ملتی۔ میں خود موٹر سائیکل لے کر جاؤں تو تین چار گھنٹے سے پہلے نہیں آ سکتا اور میری غیر حاضری کا سراج کو فوراً علم ہو جائے گا۔ ادھر سے کوئی بس گزرتی بھی نہیں کہ میں خط دے دوں۔ لاہور سے ہمارا رابطہ وائرلیس پر ہے لیکن وائرلیس بھی سراج کے پاس ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا۔"

"اچھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ تو ہمارے دوستوں کو صرف یہ بتانا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ ورنہ وہ پریشان رہیں گے۔ اگر معلوم ہو سکے تو مجھے ان کے بارے میں مطلع کرنا۔ خصوصاً غالب اور نازو کے بارے میں۔ اور ہاں... اگر ایس پی ضامن رضوی صاحب سے بات ہو تو ان سے یہ پوچھنا کہ کیتھرین کی لڑکی جولی کا کیا ہوا۔ اس کے گرگے بدلے لینے والے تھے۔ اگر یہ آپریشن اب تک نہ ہوا ہو تو ایس پی صاحب سے کہنا کہ اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ کام ضرور کرا دیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ شہلا انھیں یاد دلاتی رہے گی... اور غالب نے بھی کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہوگا۔ اس نے اپنے اخبار نویس ساتھیوں کے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ بس جولی کی خیریت معلوم ہو جائے۔"

"میں... کوشش کروں گا۔" سندر نے اسی لہجے میں کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر وہ انکار سے بھی گریز کر رہا تھا اور دعوے سے بھی۔ پھر بھی اس کے الفاظ مجھے امید کی روشنی دیتے تھے اور اس سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ میرا رابطہ ساری دنیا سے بحال ہو گیا ہے۔ ابھی تک دنیا کو خبر نہ تھی کہ رابعہ اور محسن' ہیڈی اور کیتھرین کہاں ہیں لیکن اب انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں ہیں۔ کوئی ضرور کچھ کرے گا۔

"مجھے اب ڈیوٹی پر واپس پہنچنا ہے۔"

"اچھا سندر۔" میں نے کہا۔ "تم پھر کب آؤ گے؟"

"میں کیا بتاؤں... جب بھی موقع ملا... یہ بہت خطرناک کام ہے اور میرے لیے بہت زیادہ رِسکی ہے۔" وہ بولا۔

"تم ایس پی صاحب کو اپنی رپورٹ کیسے بھیجتے ہو آخر؟"

"ایسے ہی... جب بھی موقع مل جائے یا کوئی وسیلہ ہاتھ آ جائے۔" وہ بولا۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ رابعہ اور محسن کدھر ہیں؟"

"ہاں... لیکن میں ادھر نہیں جا سکتا۔ ادھر روشنی ہے اور میں محافظوں کی نظر میں آ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "آخری کمرہ کیتھرین کا ہے' وہاں جا سکتا ہوں۔"

"تم مجھے کوئی ایسی چیز لا کر نہیں دے سکتے جس سے میں دیوار توڑ سکوں۔" میں نے کہا۔ "کوئی چھینی یا ہتھوڑی... چاقو..."

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔ "اگر تم رات بھر کوشش کر کے دیوار کی چند اینٹیں نکالنے میں کامیاب رہے اور محافظوں کو بھی پتا نہ چلا... تو باہر آ کے کہاں جاؤ گے... کیسے جاؤ گے؟"

"آخر تم بھی تو یہاں پہنچے ہو۔"

"مجھے گارڈ پہچانتا ہے۔ اس نے کوئی سوال کیے بغیر میرے لیے دروازہ کھول دیا تھا اور میں نیچے اتر آیا تھا۔" وہ بولا۔ "اگر میں خاموشی سے لوٹ گیا تو کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں اندر آیا تھا... گارڈ بلاوجہ کسی سے میرا ذکر نہیں کرے گا۔ مگر تم گیٹ تک بھی نہ پہنچ پاؤ گے۔"

"اور اگر تم گیٹ تک نہ پہنچ پائے؟" میں نے کہا۔

"تو کل سویرے صبح میری پیشی سراج کے سامنے ہوگی اور مجھے اس جرم کی سزا ملے گی۔ ممکن ہے میری پیٹی اتر جائے۔ یا مجھے معطّل کر دیا جائے... لائن حاضر کر دیا جائے۔ یا میرے خلاف انضباطی کارروائی ہو تو میری تنزلی ہو جائے۔ میرے کندھے پر دو ہی اسٹار رہ جائیں۔" سندر داس بولا۔

"گیٹ کتنی دُور ہے؟"

"سو گز کے فاصلے پر۔" وہ بولا۔ "یہ جگہ زیرِ زمین ہے۔ سو گز لمبی سرنگ ایک کمرے میں کھلتی ہے۔ باہر سے صرف یہی ایک کمرہ نظر آتا ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے 'سب اسٹیشن واپڈا' اس کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ ہے جس میں کرنٹ رہتا ہے۔ تاروں کی بلندی دس فٹ ہے اور ان کو عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ دروازے پر مسلح محافظ کھڑا رہتا ہے جو واپڈا کا ملازم نظر آتا ہے اور اس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ وہ تم کو دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ اس کے علاوہ تم اکیلے نکل بھی گئے تو تمھارے دوسرے ساتھیوں کا کیا ہوگا۔ ان کی تو شامت آ جائے گی۔ تم سب ایک ساتھ تو فرار ہو نہیں سکتے... میرا مشورہ ہے کہ ایسی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے زیادہ مایوس ہو کے کہا۔ "چلو تم ایک کام تو کرو... میں ایک ریوالور باہر پھینک رہا ہوں۔"

"ریوالور... تمھارے پاس...؟"

"ہاں... تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا کہ ریوالور میرے پاس کہاں سے آیا۔ میرا خیال ہے کہ ریوالور کیتھرین کے پاس ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں نے اس سے لیا تھا کہ کام آئے گا... مگر اب مجھے ڈر ہے کہ میرے پاس سے برآمد ہو جائے گا۔ اس کے پاس محفوظ رہنے کا چانس زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن ریوالور کیسے پھینکو گے؟"

"روشندان میں سے۔" میں نے کہا۔ "بیچ میں ٹیوب لائٹ ہے لیکن میرا ہاتھ نیچے کے خلاء تک پہنچ جاتا ہے۔"

"پھینک دو... میں کیچ کر لوں گا۔" وہ بولا۔

میں فرش سے اٹھا ہی تھا کہ دروازہ ایک دم کھلا۔

"لاؤ... پستول مجھے دے دو۔" سراج نے اندر آتے ہی ہاتھ پھیلا دیا اور آہستہ آہستہ میرے قریب آنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کے ٹرائیگر پر رکھی ہوئی انگلی ذرا سے دباؤ کی منتظر تھی۔ میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ ابھی تو میں نے اپنا ریوالور باہر پھینکنے کے لیے نکالا تک نہ تھا کہ وہ آ پہنچا۔ وہ یقیناً کہیں دُور بیٹھا ہوا ہماری ساری گفتگو سُن رہا تھا۔ میں اور سندر بہت اونچی آواز میں نہیں بول رہے تھے مگر کہیں چھپا ہوا کوئی مائیکروفون اتنا حسّاس تھا کہ ہماری سرگوشی بھی کیچ کر رہا تھا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں لیکن ان کے کان کہیں نہ کہیں ضرور تھے۔

"کم آن..." سراج نے کہا۔ "معلوم نہیں' اب تک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بے وقوفی سے یہ ریوالور تمہارے پاس رہا... میں معلوم کرلوں گا... لیکن تم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہو تو اچھا ہے۔ ریوالور کیا تمہارے پاس توپ بھی ہوتی تو بے کار تھی۔"

میں نے اندر اُڑسا ہوا ریوالور نکالا اور سراج کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اس کے بالکل پیچھے آنے والا گونگا کمانڈو انتہائی جارحانہ انداز میں آگے بڑھنے لگا تھا۔" یہ لو... خودکشی میں کام آئے گا۔"

" اس حرامزادے سُندر سے تو میں نمٹ لوں گا۔" سراج نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔" دھوبی کا کتا... نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

" تم اپنی بات کررہے ہو تو میں اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

" مسٹر جوکر... بہتر ہوگا اگر تم آرام سے سو جاؤ یا ان سوالات پر غور کرو جن کا تمہیں جواب دینا ہے۔ کتنا وقت ضائع کردیا ہے تم نے۔" سراج ناگواری سے بولا اور پلٹ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا وہیں کھڑا رہا ـــــ وہ چند منٹ کے لیے باہر گیا اور پھر لوٹ آیا۔

" تم سندر سے ملنا یقیناً پسند کرو گے۔" وہ خباثت سے مسکرایا۔ اس کے اشارے پر گونگے کمانڈو نے مجھے ہاتھ پکڑ کے گھما دیا اور دروازے کی جانب روانہ کردیا۔ دروازے کے باہر اس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ بالکل مشینی انداز میں وہ میرے دائیں بائیں ہوگئے لیکن اس وقت مجھے ان کا نہیں سندر کا خیال تھا۔ کیا سراج کے کتوں نے اُسے پکڑ لیا ہوگا۔ بے چارہ نیکی کرنے آیا تھا بدی گلے پڑ گئی۔ اپنی وفاداری اور حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی اور بالآخر ہندو ہونے کے باوجود یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ وہ کسی بھی مسلمان سے کم پاکستانی نہیں۔ اس نے ضامن رضوی جیسے افسر کا اعتماد حاصل کرلیا تھا تو یہ اس کی کامیابی کی سند تھی۔ سراج اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ معطل ہوگا۔ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ رضوی صاحب بعد میں اُسے بچا لیں گے۔ وہ بتا دے گا کہ اس نے یہ رسک کیوں لیا تھا مگر اسے دوبارہ سراج کے ساتھ پوسٹ کرنا مشکل ہوجائے گا۔ سراج پہلے ہی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور سندر نے اس کو بہت معقول جواز فراہم کردیا تھا کہ وہ اسے انتہائی خراب رپورٹ کے ساتھ واپس کردے۔ سندر انکار نہیں کرسکے گا کہ وہ ڈیوٹی چھوڑ کے مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے دو گھنٹے تک بارڈر کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس نے کسی اسمگلر سے بھتا لے کر وعدہ کیا تھا کہ جب اس کا مال گزرے گا تو ٹوکنے والا کوئی نہیں ہوگا؟ سندر پر سارے الزامات عائد کیے جاسکیں گے اور وہ کسی کا جواب نہ دے سکے گا۔

میں ایک سرنگ نما راہداری میں چل رہا تھا۔ چھت میرے سر سے آتنی ہی اونچائی پر تھی جتنی کمرے کی چھت تھی۔ یہ زیرِ زمین عمارت تھی۔ اس کی دیواروں اور چھتوں کو اونچا رکھنے کے لیے زیادہ گہرائی تک کھدائی کرنا مشکل کام تھا چنانچہ سات فٹ کی بلندی کافی سمجھی گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ نیچے حبس نہیں تھا اور گرمی نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں سے ایگزاسٹ فین کے ذریعے ہوا باہر کھینچی جارہی تھی اور دوسری طرف سے تازہ ہوا اندر پہنچ رہی تھی۔ راہداری کے دونوں طرف دروازے تھے۔ سراج نے ایک دروازے کو دھکیلا اور اس کے پیچھے میں بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ رالعبہ کو دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر گھٹنے سمیٹے اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی کمرہ تھا جیسا مجھے دیا گیا تھا۔ محسن اور ٹیڈی دائیں جانب کی دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ مجھے بھی اس صف میں شامل کردیا گیا۔

" کیا بات ہے؟ کہاں ہے وہ...؟" اس نے ایک گالی دے کر کہا۔

" وہ... دوسرے کمرے میں..." اندر آجانے والا ایک شخص بولا۔

" کیا تم نے اُسے مار دیا ہے؟" سراج نے کہا۔

" نہیں... زندہ ہے... مگر مرنے والا ہے..."

" تو میرا مُنہ کیا دیکھ رہے ہو... اُسے مرنے سے پہلے لاؤ۔" سراج نے گرج کر کہا۔ دو آدمی باہر نکل گئے۔ میں نے رالعبہ کی طرف دیکھا اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور نظریں دیوار پر منجمد ہوگئی تھیں۔

سراج کے حکم پر باہر جانے والے چند منٹ میں لوٹ کر آئے تو انھوں نے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں پکڑ کے سندرداس کو اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بے ہوش تھا اس کا سر نیچے لٹکا ہوا پیچھے کی طرف جھول رہا تھا اور اس کے کپڑے خون سے تر تھے۔ خون اس کے جسم سے مسلسل بہہ رہا تھا اور فرش پر گرتا جارہا تھا۔ انھوں نے سندرداس کو کمرے کے فرش پر ایسے پھینک دیا جیسے وہ مرچکا ہو اور اس کے لیے درد کے احساس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ بے شک ہوش سے بیگانگی نے اسے جسمانی اذیت کے احساس سے بھی بے نیاز کردیا تھا لیکن ہم بہرحال احساس رکھتے تھے۔ ہم تو مُردوں کو بھی اتنے احترام اور شائستگی کے ساتھ اُٹھاتے ہیں کہ ان کو خفیف سا جھٹکا بھی نہ لگے۔ زخمی اور قریب مرگ کے ساتھ اس قسم کا رویہ دشمن سپاہی کے ساتھ میدانِ جنگ میں بھی کوئی روا نہیں رکھ سکتا۔ سندرداس کی تکلیف کا آزار ہم سب نے اپنے دل میں محسوس کیا۔

سندرداس کو تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک زخم سینے پر تھا دوسرا پیٹ سے ذرا نیچے اور تیسرا بائیں ران پر۔ خون تینوں جگہ

بہہ بہہ کر فرش کو داغدار کرتا جارہا تھا اور میں اس شخص کو دیکھ کر احساسِ جرم و ندامت کا شکار تھا۔ جس نے ہماری خاطر چوری چھپے دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور دشمنوں کے علاقے سے گزرنے کا خطرہ مول لے کر خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنا چاہا تھا جو رضوی صاحب نے اس پر کیا تھا۔

" تم لوگ جذبات میں اندھے ہوجاتے ہو۔" سراج نے ...نا شروع کیا۔" فائر کھول دیا سوچے سمجھے بغیر۔ ایک گولی کافی تھی۔ میں اس کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مُنہ سے سُنتا ... تھا کہ اس نے کیا کہا تھا اور کیا سُنا تھا۔ میں اس سے سب ... لیتا۔ اس کا یہ جرم ہی کافی تھا کہ یہ بارڈر پر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ... آیا تھا۔ اب میں کس سے معلوم کروں کہ یہ کیوں آیا تھا۔ یہ لوگ ... ہیں گے؟" اس نے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

" جب تم نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ہے تو پھر ... کس بات کا۔" میں نے کہا۔" سندر تمہیں وہی بتاتا... جو ... نہ بتا سکے گا۔"

" تم اپنی بکواس بند رکھو۔" سراج دہاڑا۔" مجھے معلوم ہے ... ون تھا۔ یہ تمہارے انکل ایس ایس پی کا ایجنٹ تھا۔ میری ... پر مامور کیا گیا تھا۔ تمہارا ہمدرد تھا اور تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔"

" شیطانوں کے درمیان بھی انسان ہوتے ہیں جن کا مذہب ... انسانیت ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔" اور تم جیسے لوگ جو ... کو خدا مانتے ہیں ان سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ تم کو اب ... الزام کا ڈر ہے جو تم پر آئے گا۔ رضوی صاحب یہی سمجھیں ... کہ تم نے جان بوجھ کے اسے مروا دیا۔ تم اس سے جان چھڑانا ... تے تھے۔"

" لیکن اسے میں نے تو نہیں مارا۔" سراج نفرت اور حقارت سے مسکرایا۔" یہ بارڈر پر ڈیوٹی دیتے ہوئے اسمگلروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ یہ کوئی غیر معمولی واردات نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ... افسوس مجھے یہ ہے کہ سندر داس کی موت بہادر اور فرض ... آدمی کی موت کہلائے گی۔ میں اسے زندہ گرفتار کرتا تو ... مجرمانہ غفلت، اسمگلروں سے سازباز، رشوت لے کر ان ... کھلا رکھنے اور جرم میں برابر کا شریک ہونے کے الزامات ... کرتا... ثابت کرتا اور اسے جیل پہنچاتا۔"

سندرداس کے بے حس و حرکت جسم میں اچانک حرکت ... اس نے آنکھیں کھول کے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی ... مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں دوسروں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا ... گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا سر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

" پا... پا... پانی..." اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" ... تم مرنے والے کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دو گے؟"

میں نے پلٹ کر سراج کی طرف دیکھا۔

" کاش میرے اختیار میں ہوتا کہ میں اس کے لیے موت کے عذاب کو زیادہ سخت اور لمبا کرسکتا۔" سراج نے قہقہہ لگایا۔ ایک سفاک شیطانی قہقہہ... جو انسانیت کا نوحہ تھا اور ضمیر کی بے حسی کا آئینہ دار تھا۔

رالعبہ ایک دم اُٹھی۔ اس کے کھانے کے برتن ابھی تک اُٹھائے نہیں گئے تھے کیونکہ اس نے کھانے کو چھوا بھی نہیں تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھا ہوا پانی کا گلاس اُٹھایا اور سندر کے پاس گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی۔ ایک طرف سے میں نے سندر کو سہارا دے کر اوپر اُٹھایا اور دوسری جانب سے رالعبہ نے گلاس کو اس کے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔ میں ذرا سی دیر کے لیے سراج کی طرف سے غافل ہوگیا کیونکہ سندر مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔" میں... میں نے کہا... کہا تھا... کہ کوشش..."

اسی وقت سراج نے آگے بڑھ کر گلاس کو کِک ماری۔ گلاس رالعبہ کے ہاتھ سے نکل کر اُڑتا ہوا گیا اور چھت سے ٹکرا کے پاش پاش ہوگیا۔ رالعبہ نے ایک چیخ ماری۔ کیونکہ چوٹ اس کی کلائی پر بھی آئی تھی۔ پھر وہ وحشیانہ دیوانگی کے ساتھ اُٹھی اور سراج پر حملہ آور ہوئی۔

" ذلیل... شیطان... کتے..." اس نے پاگل پن کی بھری ہوئی قوت کے ساتھ سراج کا مُنہ نوچ لیا۔ سراج کے لیے اتنا شدید ردِعمل بالکل غیر متوقع ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا رالعبہ کے ہاتھوں نے جو کسی خونخوار شیرنی کے پنجوں سے زیادہ بے رحم ہوگئے تھے سراج کے چہرے پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ چُھپانا چاہا اور ایک بار رالعبہ کو دھکیلا مگر وہ پھر اس سے یوں ٹکرائی جیسے کسی اسپرنگ کی طاقت نے اُسے کھینچ لیا ہو۔ سراج کی گردن کا گوشت اُدھڑ گیا۔ میں نے اس کی جلد پر خون کی سُرخ لکیروں کو نمایاں ہوتے دیکھا۔

" چھوڑ مجھے پاگل کتیا..." اس نے چیخ کر گالی دی اور اپنا گھٹنا اُٹھا کے رالعبہ کے پیٹ میں مارا۔ رالعبہ بلبلا کے دُہری ہوئی تو اس نے دوسرا گھٹنا اس کے مُنہ پر مارا اور وہ دُور جا گری۔ محسن اور ٹیڈی مجھ سے پہلے آگے بڑھے تھے لیکن ان کی راہ میں وہ دونوں گونگے کمانڈوز حائل ہوگئے تھے جو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔ انھوں نے بڑی پُھرتی سے دونوں کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور وہیں دبوچ کر اتنا بے بس کردیا تھا کہ وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہے تھے۔ میری آنکھوں نے ایک سیکنڈ میں دونوں طرف دیکھ لیا تھا۔ رالعبہ کو حملہ کرتے بھی اور محسن کے ساتھ ٹیڈی کو پسپا ہوتے بھی۔ دوسرے سیکنڈ میں میرے دماغ کا فیوز اُڑ گیا۔ میرے وجود میں غصہ یوں بھر گیا جیسے پریشر ککر میں بھاپ اتنی بھر جائے کہ سارے حفاظتی نظام کی موجودگی بھی اُسے پھٹنے سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہ بچا سکے۔ میں نے ایک جست میں سراج کو جالیا۔ اس نے رابعہ کو دُور پھینکا ہی تھا کہ میں نے اُسے اُٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ وہ نیچے گرا تو میں اس کے اوپر گرا۔ میں نے مشین گن کے برسٹ کی آواز سُنی اور رابعہ کی چیخ بھی لیکن اس وقت میں جنون کی اس منزل سے آگے تھا جہاں عقل کی رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ میں سراج کو اسی شیشے کے گلاس کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا جس کو سراج نے ٹھوکر مار کے گرا دیا تھا۔ میں اس کو قتل کر دیتا اور خود سراج نے بھی میری آنکھوں میں اپنی موت دیکھ لی تھی۔ مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میرے تابڑتوڑ مکوں نے اس کا حُلیہ بگاڑ دیا تھا۔ میں نے اُسے آٹے کی طرح گوندھ ڈالا تھا اور یوں رگڑ ڈالا تھا جیسے سِل پر مسالے کو بٹے سے پیسا جاتا ہے۔ مجھے ایک منٹ اور ملتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ، بوٹی بوٹی الگ کر دیتا اور ان سب کے سامنے سراج ایس پی کے بجائے ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں، خون اور گوشت کا کراہیت انگیز، قابلِ نفرت اور بے ہنگم ڈھیر پڑا رہ جاتا۔

اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے کھینچ لیا۔ میں نے مداخلت کرنے والوں سے بھی لڑنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک قلابازی کھا کے دُور جا گرا لیکن دوسرے نے مجھے مفلوج کر دیا۔ اس کے بجلی کی طرح چلنے والے ہاتھ میرے بازوؤں پر یوں پڑے کہ ہڈی ٹوٹنے سے رہ گئی مگر میرے بازو بے جان ہو گئے۔ اس نے گھوم کر لات ماری جو میری ران پر پڑی اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح گرا۔ دوسرا اتنی دیر میں مجھے سنبھالنے آگیا اور اس نے مجھے دونوں ہاتھوں میں گھما کے نیچے دے مارا... میں پھر اُٹھا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اجالا گڈمڈ ہو رہا تھا اور میرے پیروں کے نیچے زمین جھولا بن گئی تھی۔ ان دونوں نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

میں نے سر کو جھٹک کر دیکھا اور منظر میری نظروں کے سامنے صاف ہونے لگا۔ ٹیڈی اور محسن کو ایک مشین گن نے روک رکھا تھا۔ دوسرا مشین گن والا دروازے میں جما کھڑا تھا اور اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ اگر اندر والے ایک ایک کر کے ختم ہو جاتے تو آخر میں وہ ایک برسٹ مار کے ہمیں بھی ختم کر دیتا لیکن اس سے پہلے وہ ہمارے لیے فرار کا راستہ کھلا نہ چھوڑتا۔ اس ملازم نے جو میرے لیے کھانا لایا تھا، سراج کو سہارا دے کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ سراج زخمی تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اتنی مہلت ملنے کے باوجود اس کی ناپاک زندگی کا خاتمہ نہیں کیا۔ میں اس کو مکے تھپڑ مارتا رہا اور پھینکتا پٹختا رہا۔ وجہ وہی تھی کہ میں ٹھنڈے دماغ کے ساتھ نہیں لڑ رہا تھا، ورنہ میں صرف ایک ہاتھ مارتا اور اس کی گردن توڑ دیتا۔ وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا اور اگرچہ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی مگر وہ زندگی میں تھا۔ شاید اس کی ہڈیاں بھی ڈھیٹ تھیں کہ ٹوٹی نہیں تھیں اور وہ سیدھا کھڑا رہنے کے قابل تھا۔ سندر مر گیا تھا لیکن کوئی اس کی طالبِ انصاف لاش کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب کی نگاہ سراج پر تھی جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی اور وہ ریوالور نکال کر اس کی ساری گولیاں میرے جسم میں اتار دینے کی نیت کے ساتھ آگے آ رہا تھا۔ اس کی بہت بے عزتی ہوئی تھی۔ اس کی حاکمیت کا غرور ایک عورت نے توڑ دیا تھا۔ پھر اس کی افسری کی فرعونیت کو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی اور اس جرم کی وہ مجھے زیادہ سے زیادہ سزا دینا چاہتا تھا۔ مجھے دونوں گونگے کمانڈوز نے یوں جکڑ لیا تھا کہ میں جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔

وہ مجھ سے دو قدم دُور تھا جب دروازے میں کھڑے ہوئے محافظ نے اُسے مخاطب کیا۔ "ریوالور جیب میں رکھ لو ایس پی صاحب۔" میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کی آواز میں نے پہلے بھی سُنی تھی۔ یہ وہی مدراسی تھا جو مجھ سے تفتیش کرتا رہا تھا۔ اس کی سپاٹ آواز میں سختی نہیں تھی لیکن تحکمانہ بے حسی کا ایسا انداز تھا جس نے سراج کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

"میں اس کو قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔" سراج نے زخم خوردہ سانپ کی طرح پھنکار کے کہا۔ "اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"یو وِل ڈو نو سچ تھنگ۔" مدراسی نے اسی جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "ریوالور کا استعمال کرنے کی تمھیں اجازت نہیں۔"

"اجازت۔" سراج پھٹ پڑا۔ "تم اجازت کی بات کرتے ہو مجھ سے... کون ہو آخر تم... میرے افسر یا میرے باپ... تم بھول رہے ہو کہ تم کہاں کھڑے ہو۔"

"میرا کام تم کو خبردار کرنا تھا۔" مدراسی نے بھی انگریزی میں کہا۔ "میں وہ نہیں ہونے دوں گا جو تم چاہتے ہو۔ ایٹ اِز آرڈر... میں پھر دُہراتا ہوں... ریوالور جیب میں رکھ لو۔"

سراج کے پندار پر یہ ایک اور تازیانہ تھا۔ اس نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے مدراسی کو زیرِ لب گالی دی مگر وہ برف یا پتھر کا آدمی تھا جو کسی طرح بھی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا تھا نہ وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ نہ ادائے فرض کے معاملے میں اس لکیر سے ایک سُوت اِدھر اُدھر ہوتا تھا، جو اوپر والوں نے اس کے مشن کا راستہ قرار دی تھی۔

"تم... کتے کے کمینے پلّے۔" سراج نے شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا تھپڑ میرے مُنہ پر پڑی آواز کے ساتھ پڑا۔

میں اب ہوش میں تھا۔ میرا گال تھپڑ کی ضرب سے جلنے لگا تھا مگر میں مسکراتا رہا۔

"میں تم کو ایسی سزا دوں گا... تم کو بھی اور تمھاری اس ... بھی... کہ تمھاری ساری بہادری بھاپ بن کے نکل جائے" ... نے میرے مُنہ پر دوسرا تھپڑ مارا۔ اس نے ایک بار ... شروع کی کہ وہ میرے سامنے رابعہ کا کیا حشر کرے ... رابعہ کی نظروں کے سامنے میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس کے ساتھ وہ میرے پیٹ میں گھونسے مارتا گیا۔ میں ان گونگے ... کے شکنجے میں تھا اور ان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ... کرانے میں میری ساری مہارت دھری رہ گئی تھی۔ ہر ضرب ... میرے پیٹ کے اندر درد کا بگولا سا اُٹھتا تھا اور میں کرب سے ... جھک کر کراہتا تھا۔ اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی... ... ظاہر تھا کہ سراج کے لیے گولی چلانے کے سوا مجھ پر ... ستم کی اجازت لینا ضروری نہیں تھا۔ وہ مجھے ہر طرح ... کرنے... میرے ساتھ ہر غیر انسانی سلوک کرنے... میری ... اُدھیڑنے اور مجھے زیادہ سے زیادہ ذہنی و جسمانی اذیت ... دینے کے لیے آزاد تھا۔ شرط صرف ایک تھی کہ میری جان ... نہ لے اور یہی سب سے سخت شرط تھی۔ میرے لیے بھی اور ... رابعہ کے لیے بھی۔ مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے میری ... سب سے بڑی کمزوری رابعہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آہستہ ... اس تلخ حقیقت کا زہر قبول کر لیا تھا کہ ہم سب کچھ نہیں ... کر سکتے۔ ہماری آنکھوں کو وہ سب دیکھنا ہوگا جس کا تصور ہی ... کو آزار میں مبتلا کرتا ہے۔ ہمارے کانوں کو گندے الفاظ ... رشتوں کی آبرو لوٹے جانے کا مکروہ شور سُننا ہوگا اور ہمارے ... دل کو وہ سب برداشت کرنا ہوگا جو پتھر کا سینہ شق کر دے۔

"تم مجھ سے معافی مانگ لو گے تو بڑی اذیت اور ... ذلت سے بچ جاؤ گے سکندر۔" سراج نے میرے بال پکڑ ... کر میرا سر اُٹھایا۔

اس وقت میں نے وہی کیا جو میرا بہترین جواب ہو سکتا ... تھا۔ میں نے اس کے مُنہ پر تھوک دیا اور مسکرانے لگا لیکن ... میری اس حرکت نے سراج کو پاگل کر دیا۔ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ ... اس نے میرے کپڑے پھاڑ دیے اور ان کا تار تار میرے جسم ... سے جدا کر دیا۔ رابعہ نے ایک چیخ ماری لیکن اس کا کسی پر اثر ... نہ ہوا۔ کمرے میں موجود ہر شخص جیسے اندھا گونگا اور بہرا ہو گیا ... سوائے سراج کے جس کی زبان سے اس کے وجود کی ساری ... غلاظت گالیاں بن کے بہہ رہی تھی۔ ٹیڈی اور محسن نے نظر ... جھکا لی تھی اور رابعہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ سراج نے میری بیلٹ کھینچ لی تھی۔ شڑاپ کی آواز کے ساتھ ... چمڑے کی بیلٹ میرے جسم پر پڑی۔ شدید تکلیف کے ... باوجود میں نے مسکرانا جاری رکھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک ہوش رہے گا میں مسکراتا رہوں گا۔ یہ مسکراہٹ اس کی گالیوں سے زیادہ تذلیل کرنے والی تھی۔ میں اگر اسے برابر کا جواب دیتا تب بھی وہ اتنا مشتعل نہ ہوتا، جتنا میری اس مسکراہٹ نے کیا۔ یہ مسکراہٹ اسی روشنی کی طرح بے رحم تھی جس کو بجھانا میرے اختیار میں نہ تھا اور جس کا عذاب میری برداشت سے باہر تھا۔ وہ مجھے تو قتل نہیں کر سکتا تھا لیکن اب وہ میری اس طعنہ دیتی ہوئی تمسخر اڑاتی ہوئی، چیلنج دیتی ہوئی، تحقیر کرتی ہوئی، اس کی بزدلی اور میری جرأت، اس کی بے بسی اور میری ہمت، اس کی کامیابی میں ناکامی اور میری سرفرازی کا اعلان کرتی ہوئی مسکراہٹ کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں بیلٹ کو لہرا کر پوری قوت سے میرے جسم پر مارتے رہے کسی نے اسے نہیں روکا۔ ہر بار جب بیلٹ کسی کوڑے کی طرح میرے بدن پر لگتی تھی تو میری کھال پر ایک نیلگوں سیاہ لکیر سی بنا جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ لکیریں گہری اور جنگل کی اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرح ہوتی جا رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھال کے پھٹنے سے خون رسنے لگا تھا لیکن ابھی تک میں ہوش و حواس کے ساتھ اپنے لبوں کی مسکراہٹ کو برقرار رکھنے میں کامیاب تھا۔ اس دیے کی طرح جسے کوئی راہ گم کردہ مسافر طوفان سے بچائے رکھنے کے لیے جسم و جان کی ساری توانائی صرف کر دے۔ رابعہ تو اسی وقت بے ہوش ہو گئی تھی، جب میرے جسم پر چمڑے کی بیلٹ کا پہلا نقش ابھرا تھا۔ ٹیڈی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور بُری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر آیت الکرسی تھی جو وہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یا اپنے دل کی تقویت کے لیے۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ محسن خلا میں دیکھ رہا تھا اور بالکل بُت بنا کھڑا تھا۔ اس کی پلکیں تک نہیں جھپکتی محسوس ہوتی تھیں۔

بالآخر میں کامران ہوا۔ خدا نے مجھے اتنا حوصلہ دیا۔ اتنی استقامت دی اور اتنی قوتِ برداشت دی کہ میں شدید ترین اذیت کو جھیل گیا۔ میرے جسم کو انگاروں کی زبان چاٹ رہی تھی اور ہر آتشیں زخم میں کانٹے اُگ آئے تھے لیکن میں نے دانتوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھا تھا اور میرے لبوں پر سراج کے لیے ایک ناقابلِ برداشت گالی بن جانے والی مسکراہٹ زندہ تھی۔ یہ مسکراہٹ اس وقت تک رہی جب تک میں ہوش میں رہا۔ پھر اچانک احساس فنا ہو گیا اور میرا وجود گھُپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ درد حد سے گزرا تو دوا ہو گیا۔

میں نے دوبارہ آنکھ کھولی تو اپنے کمرے میں تھا۔ ایک شخص جو ڈاکٹر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا، میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"زخم مندمل ہونے میں دو ہفتے تو لگیں گے۔" وہ بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

" دو ہفتے... نہیں ڈاکٹر... زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔"
یہ آواز سراج کی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا... اور خوف زدہ تھا۔
میں نے آنکھیں پھر بند کرلیں۔
" میں علاج کرسکتا ہوں... جادو نہیں کرسکتا..." ڈاکٹر نے کہا۔" تاہم خطرے کی اس وقت بھی کوئی بات نہیں۔ میں نے اینٹی بائیوٹک انجکشن دیے ہیں اس لیے کوئی پیچیدگی پیدا ہی نہیں ہوگی۔ مرہم اور پاؤڈر لگاتے رہو۔"
" لیکن اس کو جانا تھا۔"
" جانے... چلنے پھرنے سے کس نے روکا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔" تھوڑی سی جسمانی توانائی بحال ہوجائے تو یہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوگا۔"
" کل سے چوبیس گھنٹے ہوچکے ہیں۔" سراج بولا۔
" چوبیس گھنٹے میں یہی ہوسکتا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔" گلوکوز کی دو بوتلیں اور دے دی جائیں گی۔"
" کیا تم کسی کو زبردستی ڈرپ لگا سکتے ہو ڈاکٹر؟" میں نے اچانک کہا۔
ڈاکٹر چونک پڑا۔" تم... تم ٹھیک ہو... ویری فائن..."
" تم زبردستی مرہم تھوپ سکتے ہو؟ پاؤڈر چھڑک سکتے ہو؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔" میں تمھارے علاج معالجے پر لعنت بھیجتا ہوں... کوئی میرے قریب تو آکے دیکھے۔"
" کیا تم اچھا ہونا نہیں چاہتے؟" ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔
" اچھا ہوجاؤں آخر کس لیے... دوبارہ کھال ادھڑوانے کے لیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔" نہیں... میں چاہتا ہوں کہ سراج مجھے اسی حالت میں پیش کرنے پر مجبور ہو... اُسے جواب دہی کرنا پڑے کہ یہ سب کیوں ہوا۔ ایک ایس پی کو بھی اندازہ ہو کہ بااختیار ہونے کے باوجود وہ اپنے آقاؤں کا زرخرید غلام ہے اور کتنا بے اختیار ہے۔"
" ہم تمھیں انجکشن دے کر سیڈیشن میں رکھ سکتے ہیں... مطلب یہ کہ سلائے رکھ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔" تم کوئی پرابلم نہیں بنوگے اور ہم گلوکوز دیتے رہیں گے۔"
" تم اگر واقعی ڈاکٹر ہو تو مجھے دکھ ہے کہ تم نے بھی اپنے پیشے کے تقدس کو ان بے ضمیر شیطانوں کے ہاتھ بیچ دیا۔" میں نے کہا۔
" میں کون سا غلط کام کررہا ہوں؟" ڈاکٹر نے عیاری سے کہا۔" اگر میں کسی کی جان لوں تو یہ غلط ہوگا۔ میں تمھاری صحت کی بحالی کے لیے کوشش کررہا ہوں تو یہی میرا اور ہر ڈاکٹر کا پیشہ ہے... اور فرض ہے۔ اگر کسی مریض کا رویّہ عدم تعاون کا ہو، کوئی ہسٹریا، جنون یا پاگل پن میں اپنا اور ہمارا دشمن ہوجائے تو ہم اور کیا کرسکتے ہیں۔ ہم اسے زنجیروں سے نہیں جکڑتے بس سُلا دیتے ہیں۔ اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ حرکت بھی [illegible]
" تم فکر مت کرو ڈاکٹر..." سراج نے ڈاکٹر کے کندھے پر تھپکی دی۔" میں مسٹر سکندر بخت کی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ یہ وہی کریں گے جو ہم چاہیں گے۔ اگر یہ کتے کی دم کی طرح سیدھے نہیں ہوں گے تو ہم انھیں سیدھا کرنے کے لیے ایک چیز استعمال کریں گے جس کا نام ہے رابعہ..."
میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ سراج ہنسا اور ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ کاش اس مشکل وقت میں مَیں رابعہ کی یاد ہوتی، خود رابعہ نہ ہوتی۔ میں نے سوچا۔ میں اکیلا تو اس کے تصور کے ساتھ زندگی کی ہر سختی جھیل جاتا۔ جلی کے طلب گار ہر مرحلے سے گزر جاتا... لیکن اب میں کیا کروں۔
تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں اپنی ہی سوچوں سے نڈھال تھا ایک شخص کمرے میں آگیا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرا ہی ہم عمر تھا یا مجھ سے پانچ سات سال بڑا تھا مگر اچھی صحت کے باعث کم عمر لگتا تھا۔ وہ صورت سے تعلیم یافتہ اور مہذب نظر آتا تھا اور اُسے ہینڈسم کہا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں وہ سختی نہیں تھی جو یہاں سب کی صورتوں پہ محسوس ہوتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے اردگرد خونی بھیڑیے جمع ہوں۔ اس نو وارد کی شخصیت میں ایک متاثر کن والی دلکشی تھی۔ اس کے گھنے چمکیلے سیاہ بال۔ نازک سنہرے فریم کی عینک۔ تازہ کلین شیو چہرہ اور اس کی دوستانہ مسکراہٹ اس تاثر میں خوشگوار اضافہ کرتے تھے۔ وہ کریم کلر کے بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ کے ساتھ اعلیٰ درجے کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔
اس نے قریب آکے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
" ہیلو مسٹر سکندر بخت... کیا حال ہے؟"
میں نے ہاتھ نہ بڑھانے کا سوچا اور پھر اپنی جانب بداخلاقی کی ابتدا کو درست نہ سمجھتے ہوئے ہاتھ ملالیا۔" میری حالت کے بارے میں مجھ سے بہتر دوسرے جانتے ہیں۔ جو اس کے ذمے دار ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟"
وہ ابھی کھڑا ہوا تھا۔ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھنے کے لیے مشکل بھی تھا اور شاید اس نے مناسب بھی نہیں سمجھا۔
" ویل... اگر تم چاہو تو مجھے اپنا دوست سمجھ سکتے ہو۔" اس نے ہاتھ پیچھے باندھ کر کہا۔
" دوست، ایک ایسے شخص کو جسے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو اور وہ بھی اپنے بدترین دشمنوں کے درمیان۔"
اس نے سر ہلایا۔" میں غلط لفظ استعمال کرگیا۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ میں ایک ایسا شخص ہوں... جو تمھارے کام آسکتا ہے۔ تمھاری بہتری کے لیے کچھ کرسکتا ہے۔"
مثلاً یہ کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو باعزّت طور پر نکال کے کہیں بھی پہنچا سکتے ہو۔" میں نے طنز سے کہا۔
باہر کھڑا ہوا محافظ اس کے لیے ایک اسٹول رکھنے آیا اور واپس چلا گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ لبوں میں دو سگریٹیں دبا کے سلگائیں اور ان میں سے ایک میرے لبوں سے لگا دی۔ یہ اعتماد پیدا کرنے کا اور دوستانہ فضا پیدا کرنے کا ایک اچھا طریقہ تھا۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ ماہرِ نفسیات ہوگا۔ تفتیشی اداروں میں ایسے افراد مؤثر کردار ادا کرتے ہیں جہاں پولیس کے مروّجہ طریقے ناکام ہوں۔ جرم کرنے والے یا زیرِ تفتیش افراد بہت ذہین، ہوشیار اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہوں تو جسمانی تشدد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر ان کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا اور انھیں ذہنی طور پر مطیع کرنا ضروری ہوجاتا ہے اور یہ کام وہی کرسکتے ہیں جو انسانوں کو اس طرح سمجھتے ہوں جیسے بیس پچیس سال کا عملی تجربہ رکھنے والا ماہر مکینک موٹر کے ہر کل پرزے کو سمجھتا ہے۔
" مسٹر سکندر بخت!" وہ خاموشی کے طویل وقفے کے بعد بولا۔" تم جب سے پاکستان آئے ہو..."
" میں خود آیا نہیں، لایا گیا تھا۔" میں نے کہا۔
اس نے سر ہلایا۔" تب سے تم اپنی مشکلات میں مسلسل اضافہ کررہے ہو اور تمھارا یہ طرزِ عمل ہر روز زیادہ سے زیادہ انتقامی ہوتا جارہا ہے۔ انتقام لینا انسان اور حیوان کی قدرِ مشترک ہے۔ تم اپنے آپ کو انتقام کا نشانہ بنا رہے ہو اور خود کو اذیت دینا یہ منفی رجحان..."
" میں اس فضول بکواس سے تمھاری قابلیت کا تعین، تمھاری اہلیت کا اندازہ کررہا ہوں۔" میں نے کہا۔" سیدھی طرح بات کیوں نہیں کرتے کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"
اس کی مسکراہٹ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے پھیکا پڑا۔" آل رائٹ... کل تمھیں ایک سوالنامہ دیا گیا تھا... کیا تم نے اسے دیکھا؟"
" میں نے اُسے پڑھ لیا۔" میں نے کہا۔
" اور پھر کیا فیصلہ کیا؟" وہ بولا۔
" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے ساتھیوں نے کیا فیصلہ کیا؟" میں نے کہا۔
" پہلے اپنا اندازہ بتاؤ، انھوں نے کیا کہا ہوگا؟" وہ نرمی سے بولا۔
" میرا اندازہ ہے کہ انھوں نے سوالنامے کو پھاڑ پھینکا ہوگا۔"
وہ معنی خیز طریقے پر مسکرایا۔" آئی ایم سوری... میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔ وہ ذہنی ہم آہنگی ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ تم ایک دوسرے کی مانند ریڈنگ کرسکو۔ دراصل یہ انڈر اسٹینڈنگ پرانے دوستوں میں طویل رفاقت کے بعد یا گہری جذباتی وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ دوستی اور وابستگی بے غرض ہو۔ بقائے باہمی کے لیے ہو اور اس کا مقصد مسرّت کا حصول ہو۔ تمھاری ان ساتھیوں کے ساتھ وابستگی ایک مشن کے لیے ہے۔ گویا کاروباری ہے۔"
میں نے دلچسپی سے اُسے دیکھا... الّو کا پٹھا... ماہرِ نفسیات کی دم۔ حالات کا پتا نہیں اور آگیا تحلیلِ نفسی کے لیے۔ کتابی علم بگھارنے۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ اس کے نظریات کی بنیاد وہی معلومات تھیں جو اسے فراہم کی گئی تھیں۔ اسے صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ایم آر ایس کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دہشت گردوں کا ایک ٹولہ تھا اور جیسے ہمارے دشمن صرف پیسے کی خاطر سب کچھ کررہے تھے ایسے ہی شاید ہم نے بھی پیسے کے عوض اپنی جان کو گروی رکھ دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم کرائے کے گوریلے ہیں۔
تاہم میں نے اس کی تھیوری کو مسترد نہیں کیا اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کتنا سطحی علم اور کتنی نامکمل معلومات رکھتا ہے۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میرے ذہن میں جھانکنے کی خواہش لے کر آنے والے کی آنکھوں پر غلط نمبر کی عینک ہی لگی رہے تاکہ وہ غلط دیکھے اور غلط سمجھے۔ میں اس کو صحیح معلومات فراہم کردیتا اور اس کا زاویۂ نگاہ درست کردیتا تو گویا اس کی مدد کرتا۔
" تمھارے اندازے کے برعکس انھوں نے سوالنامے کے جوابات تحریر کردیے ہیں۔" وہ میری مایوسی سے مطمئن ہوکے بولا۔
" اچھا۔" میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔" پھر تو مجھے بھی ان کی توقعات کو غلط ثابت کرنا چاہیے۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ میں جواب لکھ دوں گا چنانچہ انھوں نے بھی لکھ دیے۔ ایسی کی تیسی ان سب کی۔" میں نے سرہانے رکھی ہوئی کاپی اُٹھا کے پُرزہ پُرزہ کردی۔
وہ میری اس حرکت پر بالکل حیران یا مشتعل نہیں ہوا بلکہ ایسے بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" کوئی کام دو طرح سے کیا جاسکتا ہے۔ خوش اسلوبی سے اور کسی خرابی یا دشواری کے بغیر... وہی کام اپنے لیے مشکلات پیدا کرکے اور بڑی خرابی کے بعد کرنے والے کو عقلمند نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ لوگ جو تم کو یہاں لائے ہیں تمھارے دشمن ہیں۔ ان سے رحم یا رعایت کی توقع خود فریبی ہوگی لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی اس پوزیشن کو تسلیم کرتے ہوئے مزاحمت چھوڑ دو اور وہ سب بتادو، جو تم سے پوچھا جارہا ہے تو تم بہت سے عذابوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ مجھے تم کو یقین دلانے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ تم ان سے تعاون کروگے تو وہ دوبارہ نہیں ہوگا... جو گزشتہ شب ہوا۔"
" یقین دہانی کرانے والا کون ہے؟" میں نے کہا۔
" وہ ذمے دار لوگ ہیں۔ انھوں نے سراج کو بھی سرزنش

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کی ہے۔ وہ ذرا اُجڈ اور بارودی مزاج رکھنے والا آدمی ہے۔ اس کے خلاف پہلے بھی بے رحمی کی شکایات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ نارمل نہیں ہے تو اس کی وجہ ہے، یہ اس کے بچپن کے حالات کی سختی... احساسِ محرومی اور کمتری کا ردِعمل ہے۔ یوسی اس کا باپ نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے اس کے باپ کا نام نہیں تھا۔"

"بغیر نام کے تو کوئی شخص نہیں ہوتا... یہ کہو کہ اس کے اصل باپ کا نام اس کی دستاویزات میں کہیں ولدیت کو ظاہر نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" اس نے انگلی اٹھا کے تعریفی انداز میں کہا۔ "اس کی ماں کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ جس شخص نے اس سے شادی کی وہ اس کو بدچلن سمجھتا تھا جبکہ وہ خود بدچلن تھا۔ اس نے شادی کے بعد اپنی بیوی کو گناہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے بچے کے ساتھ اس کے گھر سے فرار ہو گئی۔ بعد میں بھی وہ زمانے کے ہاتھوں میں بہت خوار ہوئی۔ یہ سب سراج کے ذہن میں اس کے لاشعور میں ہے۔ وہ سارا زہر جو اس کی ماں نے پیا، نفرت کا زہر تھا۔ یہ زہر اس کے خون میں بھی شامل ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ دنیا کو ان سارے مظالم کی سزا دے کر ایک تسکین حاصل کرتا ہے جو دنیا نے اس پر کیے تھے۔ ایک سینئر اور ذمے دار افسر میں زیادہ تحمل، بُردباری اور قوتِ برداشت ہونا چاہیے۔ مثلاً کل اسے اتنا مشتعل ہونے اور ایسی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی جگہ دوسرا ایس پی ہوتا تو سندر کو گرفتار کر لیتا مگر تم سے کچھ نہ کہتا۔ ظاہر ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ یہ مار پیٹ بے مقصد تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تم کو تھوڑی سی مہلت آرام سے سوچنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس نے اشتعال میں کام خراب کر دیا۔ اس پر تو لازم تھا کہ تم نے اس پر تھوکا تھا تب بھی برداشت سے کام لیتا اور رومال سے منہ صاف کر لیتا... خیر... یہ سب میں نے اس لیے بتایا کہ تم سراج کی مجبوری کو سمجھ سکو اور یہ بھی سمجھ لو کہ آئندہ وہ تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔"

میں حیران تھا کہ وہ سراج کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ اس نے وہ سب دیکھا یا سنا ہے جو گزشتہ شب ہوا لیکن وہ ہمارے بارے میں معلومات نہیں رکھتا کہ میں اور محسن بچپن سے یک جان دو قالب ہیں اور رابعہ کا مجھ سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے ہوتا ہے۔ کیا وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہا تھا اور جانتے بوجھتے ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا؟

"میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہیں آزادی دلا سکوں لیکن میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا کر دوں۔ یہاں تمہارا قیام عارضی ہے۔ میں اور چند دوسرے لوگ ہم ذمے داری کو قبول کر چکے ہیں کہ تمہارے بارے میں اور ... کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کریں۔ سب ... معلومات غلط ہیں یا صحیح۔ اس کی تصدیق ہم نہیں کریں گے۔ جو کچھ ... گے ہم درست تسلیم کرتے ہوئے ریکارڈ میں شامل کر لیں گے ... آگے وہ جانیں جن کا یہ کام ہے۔ ہم تمہارے مکمل بائیوڈاٹا ... یہ سب انفارمیشن آگے پاس کر دیں گے اور تمہیں بھی ... حوالے کر دیں گے۔ ہم صرف عارضی طور پر تمہارے کسٹوڈین ہیں ... ذاتی سطح پر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم وہ کر رہے ہو جسے تم صحیح سمجھتے ہو۔ ہم وہ کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ فرق صرف پوزیشن کا ہے۔ اس وقت تم ... ہو اور قید کرنے والے ہم ہیں۔ کل یہ پوزیشن اُلٹ بھی سکتی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ تم ہمارے لیے مشکل پیدا مت کرو۔ سوالنامے کے جواب میں کچھ بھی لکھ دو۔ جھوٹ سچ ... سے کیا۔ ہم تو کہیں گے کہ جناب یہ ہیں آپ کے قیدی اور ... انفارمیشن جو ان سے ملی ہے۔ اس کے بعد ہمارا کام ختم۔"

اس وقت تک مجھے یقین آ چکا تھا کہ جسے میں ماہر ... سمجھا تھا وہ ایک بہت عیار اور خطرناک آدمی ہے۔ وہ خود کو ... کچھ ظاہر کر رہا تھا، درحقیقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ میرا ... اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ دوسرا اندازہ میں نے یہ لگایا کہ وہ اس انٹیلی جنس کی ٹیم کا سربراہ ہو گا جو ہماری گرفتاری اور ایم آر ایس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خصوصی طور پر تشکیل دی گئی ہو گی۔ اس ٹیم میں جاسوس اور سراغرساں، تفتیش کے ماہر ... اور پیشہ ور قاتل سب شامل تھے لیکن اس کی نگرانی کرنے والا انٹیلی جنس کا بہت اچھی شہرت اور بہترین ریکارڈ رکھنے والا کوئی بہت اعلیٰ افسر ہو گا۔ کرنل جگن ناتھ سے بھی اوپر کے رینک کا کوئی بریگیڈیئر یا میجر جنرل۔ اعزازی عہدے والا یا سولین نظر آنے والا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا کام ہمیں معلومات کے ساتھ دوسروں کے حوالے کرنے کا ہے۔ یہ دوسرے کون ہیں؟ مشرقی بنگال میں بغاوت کی منظم سازش کرنے والے یا ان کے مددگار بھارتی؟ دوسرے الفاظ میں وہ خود کو ایک پاکستانی ... کر رہا تھا۔ سراج اور دلاور کا ساتھی بتا رہا تھا جبکہ وہ خود ہی دوسری طرف کا آدمی تھا۔ جو ہمیں لے جانے کے لیے آیا تھا جو سراج اور دلاور کا بھی باس تھا۔ ان سے کام لیتا تھا اور ان غداروں کو وطن فروشی کے راستے دکھاتا تھا۔ طریقے بتاتا تھا اور اس کے معاوضے طے کراتا تھا۔ وہ مشرقی بنگال میں ہونے والے ڈرامے میں برابر کا شریک تھا مگر اس نے مغربی پاکستان کے ... کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ اس جیسے نہ جانے کتنے ... محاذ پر مختلف جگہ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری کر رہے تھے۔

... میں خود مختار تھے۔

... میری بات کو سمجھو اور مانو۔" اس نے اندر کی جیب میں ... اور ویسی ہی دوسری تہائی نکالی جیسی میں پھاڑ چکا تھا۔ ... عدہ کرتا ہوں کہ تم آرام سے رہو گے۔ سفر میں ... ہر سہولت ... ہے گی اور تمہارے ساتھیوں کو بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ... کو اکٹھا کر دیا جائے کیونکہ باقی سب تو جوابات دے ہی ... تم بھی جوابات لکھ دو تو تمہاری یہ قیدِ تنہائی ختم ہو جائے ... سب کو ایک کوٹھی میں شفٹ کر دیا جائے گا جہاں تم ... ملنے ملانے کے لیے آزاد رہو گے۔ اندر ہی گھوم پھر سکو ... باہر کی دنیا سے تمہارا رابطہ ممکن نہ ہو گا کہ ان حالات میں ... کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ ایک میڈیکل اسپیشلسٹ ... دیکھنے آتا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ ایک ہفتے ... بالکل فٹ ہو جاؤ گے۔ اس وقت بھی تم چل پھر سکتے ہو ... اٹھ بیٹھ سکتے ہو۔ تم کچھ بھی منگوا سکتے ہو۔"

"... مثلاً دستی بم... دور مار توپ... ایٹم بم..."

وہ ہنسا۔ "میں نے سنا تھا کہ تمہارا سینس آف ہیومر سخت حالات میں بھی ختم نہیں ہوتا... خیر... کیا اب میں امید ... کروں کہ تم یہ سوالنامہ بھر دو گے؟ یہ سمجھ لو کہ جتنی جلدی یہ ... کر لو گے اتنی ہی جلدی یہاں سے نکل کے پُرتکلف رہائش گاہ ... منتقل ہو جاؤ گے اور اپنے ساتھیوں سے جا ملو گے۔ کوشش ... کہ تمہارے جوابات درست ہوں کیونکہ باقی سب کے جوابات ... سے موازنہ ہو گا اور بہت زیادہ فرق ہوا تو..." وہ بات ادھوری ... چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرے باقی ساتھی کیسے ہیں؟" میں نے بے اختیار ہو کے پوچھ لیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ اس کا جو بھی جواب دے گا، وہ غلط ہو گا۔

"ٹھیک ہیں... رابعہ اور کیتھرین کو ہم نے ایک جگہ کر ... ان کو کچھ ... سہولیات حاصل ہیں... عورت ہونے کی وجہ ..." وہ بولا۔ "کیا تم رابعہ سے ملنا چاہو گے؟"

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں اٹھ بیٹھا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

"میں کوشش کر سکتا ہوں کہ تم چند منٹ کے لیے مل ... بے شک کوئی تمہارے قریب موجود ہو گا۔ کسی پرائیویسی ... کی امید مت رکھنا۔" وہ بولا۔ "اس کے علاوہ... تمہاری گفتگو ... ہونا چاہیے... ذاتی باتیں... یہ بہت غلط ہو گا اگر تم نے ... دوسرے سے پوچھا ... نے کیا لکھا اور کیوں لکھا... اور ... کے ساتھ کیا ہوا۔ تم کوئی پلان نہیں بناؤ گے اور ایک ... دوسرے کو کسی قسم کی ہدایات نہیں دو گے۔ کیا ان شرائط کو ... پورا کرتے ہوئے تم کو ملنا قبول ہو گا؟"

میں نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں صرف اسے دیکھوں گا... صرف تسلی دوں گا۔ اس کے آنسو پونچھ دوں گا۔ دیٹس از آل... لیکن تم کہو گے تو میں یہ بھی نہیں کروں گا۔ بالکل نہیں بولوں گا... تم ایک بار اسے لانے کا وعدہ کرو تو میں سب وعدے کر سکتا ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا... اندر ہی اندر میں اس شخص کے دوغلے پن... اس کی اداکاری... اس کی پُرفریب باتوں اور اس کے شاطر ذہن کی بدمعاشی پر کھول رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ میرے اور رابعہ کے جذباتی تعلق سے بے خبر ہے۔ اس نے ہماری وابستگی کو کاروباری قرار دیا تھا۔ اب وہ رابعہ کو میری جذباتی کمزوری بنا کے استعمال کر رہا تھا۔ وہ پہلے مبہم اور غیر واضح الفاظ میں دوسروں کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اب وہ کھل کر "ہم" پر آ گیا تھا۔

دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری جسمانی اذیت بہت کم ہو چکی تھی۔ یہ درد کے احساس کو مٹانے والی کسی زود اثر دوا کا اثر تھا۔ میرے زخموں پر بھی کوئی ایسا ہی مرہم لگایا گیا تھا۔ زخم بالکل سطحی تھے چنانچہ کسی علاج کے بغیر بھی ٹھیک ہو جاتے۔ اینٹی بایوٹک انجکشن کے بعد انفیکشن کا خطرہ بھی نہیں رہا تھا۔

دروازے کے باہر کسی محافظ کو نہ پا کے مجھے تعجب ہوا لیکن بہت جلد میں نے سمجھ لیا کہ یہ دوسری چال ہے۔ شکاری وہی ہیں مگر جال وہ نہیں ہے۔ اب انھوں نے دام ہمرنگِ زمیں پھیلایا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن جیسے ہی میں نے غلط قدم اٹھایا، میں نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ میں واپس آ گیا۔ دل کو رابعہ کے آنے کا سُن کر ضبط و سکون کا یارا ہی نہ رہا تھا اور صبر و قرار ساتھ چھوڑ گئے تھے... وہ آئے گی... کیا وہ آئے گی...؟ نہیں... وہ مجھے امید کا فریب دے گیا ہے۔ رابعہ کے خیال میں الجھا گیا ہے۔ وہ ابھی کچھ دیر میں آ کے کہے گا کہ سوری بھئی سکندر بخت... وہ کہتے ہیں کہ پہلے تم سوالنامے کے جوابات دے دو تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم ایک ساتھ اس کمرے میں بھی رہو۔

میں نے اسٹول کو روشندان کے قریب کیا اور باہر جھانکا۔ میرے سامنے مشکل سے پانچ فٹ کے فاصلے پر دوسری دیوار تھی اور ایک ایسا ہی روشندان تھا اس میں بھی ٹیوب لائٹ لمبائی کے رُخ فٹ تھی لیکن میں ٹیوب لائٹ کو پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی عجیب بات مجھے یہ لگی کہ اس میں چوک کی طرف سے دو تین تین تار نکلے ہوئے تھے۔ اس میں سے دو تو واضح طور پر بجلی کے تار تھے لیکن تیسرا نسبتاً پتلا تار تھا۔ تقریباً ویسا ہی جیسا کہ ہینڈ سیٹ اور ٹیلی فون کے درمیان ہوتا ہے۔ یا جو ڈیک اور اسپیکر کے درمیان نظر آتا ہے۔ آواز کی لہروں کو برقی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مقناطیسی لہروں کی صورت میں اِدھر سے اُدھر آنے جانے کی راہ فراہم کرنے والا۔ میں نے فوراً اپنے روشندان کی ٹیوب لائٹ کے پیچھے ہاتھ مار کے دیکھا۔ اس میں بھی تین تار تھے۔۔۔ دو آپس میں بل کھا کے لپٹے ہوئے تار بجلی کے تھے۔ تیسرا پتلا اور چکنی سطح والا نرم تار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس چکنی سطح کے نیچے دو الگ الگ تار ہیں اور ٹیوب لائٹ کے اندر ہی کسی جگہ ایک مائکروفون فٹ ہے۔

ٹیوب لائٹ کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہوتی۔ چوک۔ اسٹارٹر اور ٹیوب۔۔۔ اس کے یہی تین اجزاء ہیں۔ چوتھی چیز وہ ٹین کا فریم ہوتی ہے جس میں ٹیوب فٹ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ہے تو اس کا تعلق ٹیوب لائٹ سے نہیں۔ میں نے ہاتھ گھماتے ہوئے سوچا اور بہت جلد اس چیز کو دریافت کرلیا۔ یہ بھی ایک اسٹارٹر تھا۔ ایک ٹیوب لائٹ میں دو اسٹارٹر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ دوسرا اسٹارٹر دیکھنے میں اسٹارٹر لگتا ہے لیکن اس کے اندر مائکروفون ہے۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد میں نے دونوں کی ساخت پر غور کیا۔ فرق بہت نمایاں تھا۔ ایک اسٹارٹر کے اوپر والے حصے میں بہت باریک جالی سی تھی۔ اسٹارٹر نکال لینے سے جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ روشن رہتی ہے۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب اُسے بجھایا جائے۔ بغیر اسٹارٹر کے ٹیوب پھر روشن نہیں ہوگی۔

میں نے اطمینان سے دونوں کی جگہ بدل دی۔ اسٹارٹر کی جگہ مائکروفون لگاتے وقت معمولی سا اسپارک ہوا اور تار جلنے کی مخصوص بُو آئی۔ دو سو بیس وولٹ پر مائکروفون کا جل جانا قدرتی بات تھی لیکن میں نے مائکروفون کی جگہ اسٹارٹر لگایا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ گزشتہ روز اسی مائکروفون کے ذریعے وہ سب گفتگو سراغ رساں نے سُن لی تھی جو میرے اور رسندر کے درمیان ہوئی تھی۔ وقتی طور پر میں نے اس نظام کو ناکارہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ خوش فہمی نہیں تھی کہ انھیں پتا نہیں چلے گا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ حرکت میں نے کی ہوگی مگر اب مجھے رابعہ سے بات کرنے کا موقع ملا تو ہماری گفتگو کوئی نہ سن پائے گا۔ ایک نظر دیکھنے سے وہ فرق محسوس نہ کر پائیں گے اور جتنی دیر میں وہ چیکنگ کر کے دیکھیں گے کہ خرابی کہاں ہے، اتنی دیر میں رابعہ سے بہت سی باتیں ہو جائیں گی۔

یہ کارروائی دو منٹ سے بھی کم وقت میں مکمل ہوگئی تھی۔ باہر کوئی نہ تھا لیکن یہ خطرہ بہرحال تھا کہ کوئی اچانک آ جائے۔ میں اترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے رابعہ کی آواز سُنی۔۔۔ اور گرتے گرتے بچا۔

"سکندر۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ خوفزدہ سرگوشی میں بولی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے نیچے اترتے ہی اسٹول کھینچ کر روشندان سے دُور کر دیا۔ "بیٹھو اور سناؤ کیا حال کیا ہے۔ بہت قیامت ڈھا رہی ہو اس وقت۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔"

"سکندر، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ میں اس کے بالوں کی خوشبو کو سونگھ سکتا تھا اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے موتیوں کو چُن سکتا تھا۔

"رونے سے کیا یہ سب نہیں ہوگا؟" میں نے کہا۔ "صبر اور امید رکھو، خدا نے سندرداس کو ایک وسیلہ بنا کے بھیجا تھا، وہ بہتری کی کوئی اور صورت بھی پیدا کرے گا۔ لیکن ذہنی طور پر تیار رہو کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کہیں بھی جنیوا کنونشن کے معاہدے کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔ نازیوں نے جو کچھ جرمنی کے کسی کیمپ میں کیا تھا، وہ دوسروں نے بھی اپنے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں کیا ہے اور یہی ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے سکندر۔۔۔ یہ بہت بے رحم اور شیطان لوگ ہیں۔۔۔ میں کیا بتاؤں کہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"وقت کم ہے اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں، وہ سُن لو۔ اے ایس پی ضامن رضوی اب ہمارے ساتھ ہیں۔ انسپکٹر سندرداس کو انھوں نے ہی سراغ کے پیچھے لگایا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ بے چارہ تو مارا گیا۔" رابعہ کا چہرہ پھر آنسوؤں میں ڈوبا۔

"ہاں، لیکن اس نے مرنے سے پہلے اکرام شیخ کو کوئی خط بھیج دیا تھا کسی کے ہاتھ۔۔۔" میں نے کہا۔

رابعہ کا چہرہ پھر امید سے روشن ہوگیا۔ "سچ؟"

"ہاں۔۔۔ اور خبر یہ بھی ہے کہ اکرام شیخ اور نازو ایک ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے غالب بھی ان کے ساتھ ہو۔"

"کیا یہ بات سب کو معلوم ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن موقع ملے تو بتا دینا۔۔۔ کہ ناامید نہ ہوں۔ بے شک ان کو خط ملنے اور ہمارا پتا معلوم کرنے۔۔۔ یہاں تک پہنچنے اور کچھ کرنے میں وقت لگے گا اور یہ ہو سکتا ہے کہ اتنی دیر میں ہم کہیں اور پہنچ جائیں۔۔۔ پھر بھی یہ ناممکن تو نہیں کہ وہ ہمارا سراغ لگالیں۔ وہ تینوں ماشاءاللہ بہت ہوشیار ہیں۔ اب مجھے باہر گڑبڑ لگتی ہے۔ جلدی سے یہ بتاؤ کہ تم نے سوالنامے کے جوابات لکھے ہیں یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ سب نے لکھ دیے ہیں۔"

"یہ جھوٹ انھوں نے مجھ سے بھی بولا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ کمینہ پن ہوا ہے۔" کسی نے باہر کی طرف سے روشندان میں نمودار ہو کے کہا۔ مجھے اس کی غصے سے چمکتی آنکھیں نظر آئیں۔

"کیا ہوا بھائی۔۔۔ خدانخواستہ تمھاری ہمشیرہ محترمہ۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔ ایک لفظ آگے کہا تو۔۔۔" اس الیکٹریشن نے کہا جو مائکروفون اور اسٹارٹر کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ چکا تھا اور اب اپنی جیب میں سے دوسرا مائکروفون نکال کے صحیح جگہ لگا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ ارشاد فرماتا دروازے سے ایک محافظ نمودار ہوا اور تقریباً ہم سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس طرح کیوں گھور رہے ہو سالے صاحب؟" میں نے کہا۔ "غلط حرکت تم کرنے پر آمادہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان آ گئے ہو۔ چلو ڈیڑھ انچ پیچھے ہٹو۔"

محافظ مجھے اسی طرح گھورتا رہا لیکن رابعہ میری بات پر مسکرائی۔

"ہاں تو زوجۂ محترمہ۔۔۔" میں نے کہا۔ "عرض میں یہ کر رہا تھا کہ ہم اپنے پروگرام کے مطابق نومولود۔۔۔"

"یہ کیا ہے جی۔۔۔ آپ سوالنامے کی بات کر رہے تھے؟" رابعہ نے مجھے ڈانٹا۔ "اعمال نامے کی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یاد آیا۔۔۔ تو طے ہم نے یہ کیا ہے کہ اس سوالنامے کے مفصل جواب دیں اور سب کچھ سچ لکھ دیں۔ صاف بتا دیں کہ جب امریکی سفیر نے ہمیں طلب کیا تھا اور ایک کروڑ ڈالر دیے تھے۔۔۔ خیر یہ سب تو تم نے بھی لکھا ہی ہوگا۔"

"تم نے رعایت کا غلط استعمال کیا مسٹر سکندر بخت۔" وہی شخص مجھے دروازے میں نظر آیا جو رابعہ کو لانے کا وعدہ کر کے گیا تھا۔

"میں بالکل نجی باتیں کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر اس پر بھی تم کو اعتراض ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ وقتِ ملاقات ختم ہونے تک میں رابعہ کو دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کروں گا۔ وہ بھی بُری نظر سے نہیں۔"

"اس لڑکی کو لے جاؤ۔" وہ مجھ پر دھیان دیے بغیر بولا۔ محافظ فوراً حرکت میں آیا اور اس نے رابعہ کو بازو سے پکڑ کے کھینچ لیا۔

"خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ "اب میدانِ حشر میں ہی ملیں گے۔۔۔ پریشان مت ہونا۔۔۔ میں خود تلاش کر لوں گا تمھیں۔۔۔"

دروازے میں کھڑا ہوا شخص اندر آ گیا۔ "یہ حیرت کی بات ہے کہ تم ان حالات میں بھی ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئے۔"

"سب کی طرح میں بھی روتا ہوا دنیا میں آیا تھا۔" میں نے فلسفی کی طرح کہا۔ "ہنسنے کی یہ مہلت بہت غنیمت ہے، پھر آگے پھر رونا ہے۔"

اس نے پھر سر ہلایا اور اسٹول اٹھا کے نکل گیا۔ وہ سر ہلا کے بہت کچھ کہہ جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ انکار بھی نہیں ہوتا تھا اور اقرار بھی نہیں۔ اس کا مطلب کچھ نہیں ہوتا تھا اور کچھ بھی نکالا جا سکتا تھا۔ وہ حد درجہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ بالکل برف کا بنا ہوا۔ جذبات سے عاری اور ظاہر سے باطن کی خبر نہ دینے والا۔ انٹیلی جنس سروس میں وہ اسی لیے کامیاب تھا کہ وہ گرگٹ تھا۔ اس کی شخصیت کے رنگ بدلتے رہتے تھے اور وہ ہر جگہ وقت کی ضرورت کے سانچے میں ڈھل سکتا تھا۔ اس کا اصل روپ کیموفلاج ہو جاتا تھا اور کبھی نظر نہیں آتا تھا۔

میں تھک گیا تھا اور میرے زخموں کی ٹیسیں پھر بیدار ہو رہی تھیں۔ مسکن اور دردکش دوا کا عارضی اثر کم ہونے لگا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ گیا اور سوالنامے کو بہ آوازِ بلند پڑھنے لگا۔ پھر میں بہت دیر لیٹا رہا اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہا۔ انسپکٹر سندر مر گیا تھا اور مجھے اس بہادر، شریف اور محبِ وطن انسان کی موت کا بہت دُکھ تھا۔ مرتے مرتے وہ ہمارے لیے ناامیدی کے اندھیرے میں امید کا ایک چراغ روشن کر گیا تھا۔ شاید اس کا پیغام اکرام شیخ تک پہنچ جائے۔ پھر شاید اکرام شیخ یہاں تک پہنچ جائے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی کی سپاہ یہاں تک پہنچ جائے اور دشمن کے اس زیرِ زمین قلعے کو فتح کر لے۔ ہم نیچے بیٹھے گولیاں اور گولے چلنے کی آوازیں سُن سُن کے خوش ہوتے رہیں یہاں تک کہ انکل رضوی کے ساتھ نازو۔۔۔ غالب اور اکرام شیخ نمودار ہوں اور انکل کہیں۔۔۔

"تم پہلے سے بہت بہتر ہو۔" ڈاکٹر نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ "میں تم کو کچھ گولیاں دے جاتا ہوں۔"

"تھری ناٹ تھری کی؟" میں نے کہا۔ "اس کے لیے رائفل بھی تو چاہیے۔"

"گڈ جوک۔۔۔ ویری گڈ جوک۔" ڈاکٹر نے ایسی بُری شکل بنا کے کہا کہ مجھے اپنا بچپن یاد آیا جب ملیریا کے علاج کے لیے کونین مکسچر پلایا جاتا تھا۔

"یہ گولیاں درد اور تکلیف میں چھ گھنٹے آرام دیتی ہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "کھانا کھا کے یہ دو گولیاں کھا لینا۔ اس سے نیند آ جائے گی۔"

"میں ان کا عادی ہوں۔۔۔ چار سے کم نہیں کھاتا۔" میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے آٹھ گولیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"ان میں سے چار رات کے کھانے کے بعد۔" وہ بولا۔ "سب اکٹھی کھا کے مرنے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ تم مرو گے نہیں۔۔۔ ذرا لمبے سو جاؤ گے۔" پھر اُس نے مجھے ایک انٹی بایوٹک انجکشن لگایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کو حیرت کے ساتھ خوشی بھی تھی کہ میری صحت یابی کی رفتار اتنی تیز ہے۔ میں نے ساری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خواب آور گولیاں اپنے بستر کے نیچے رکھ دیں اور سوالوں کے جواب لکھنے لگا۔ درمیان میں وہی ملازم میرے لیے لنچ لے کر آیا اور میں نے اس سے انتہائی اُوٹ پٹانگ اور پریشان کُن سوالات کیے۔ دوپہر سو کر گزارنے کے بعد میں شام کو اٹھا تو میں نے پھر کاپی کے صفحے بھرنے شروع کیے۔ حصّہ اوّل کے جوابات میں نے یوں دیے کہ جہاں مجھے ہاں لکھنا تھا وہاں نہیں لکھا اور جہاں جواب نہیں تھا وہاں میں نے ہاں لکھا۔

حصّہ دوم کے جوابات زیادہ دلچسپ تھے۔ میں نے ایک کے بعد ایک صفحہ بھرنا شروع کیا۔ رات تک میں نے دس صفحات پُر کر دیے تھے۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں لیٹ گیا اور نہ جانے کب تک سگریٹ پھونکتا رہا۔ میزبان بہت مہربان تھا اور میری ہر فرمائش پوری ہو رہی تھی۔ سگریٹ کے علاوہ مجھے ہر بار طلب کرنے پر کافی بھی ملی۔ رات کو میں وقفے وقفے سے سوتا جاگتا رہا۔ جب نیند آتی تھی تو میرے لاشعور کا خوف مجھے خواب میں ڈراؤنے مناظر دکھاتا تھا۔ سراج کی ہر دھمکی کا نقش زندہ ہو جاتا تھا اور میں اُٹھ بیٹھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہ کمرہ نہیں میری قبر ہے اور صورِ اسرافیل کی صدا سے پہلے میں اس قبر سے نہ نکل سکوں گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نے کاپی کے باقی صفحے بھی پُر کر دیے۔ یہ سب بالکل بے معنی باتیں تھیں۔ مثلاً میں نے لکھا تھا کہ ایم آر ایس کی تنظیم کے اغراض و مقاصد بہت وسیع ہیں۔ دنیا کی تمام بدصورت لڑکیوں کے لیے عاشقانِ صادق فراہم کرنا اور ان کی شادی ایسے لڑکوں سے کرنا جو چندے آفتاب چندے ماہتاب قسم کی حوریں چراغ لے کر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ شالیمار باغ کو اسی طرح کے ٹوٹ پر منتقل کرنا۔ یہ معلوم کرنا کہ پہلے انڈا پیدا ہوا تھا یا مرغی... باقی سوالوں کے جواب میں کچھ یوں لکھا تھا کہ ایم آر ایس ملک گیر بلکہ بین الاقوامی تنظیم ہے۔ ہر صوبے میں اس کی شاخ کا سربراہ گورنر ہوتا ہے اور ڈویژن کا کمشنر۔ ان کا اجلاس ہر چودھویں رات کو چاند نکلنے کے بعد زیرِ زمین ہوتا ہے۔ ممبران کی کل تعداد اتنی ہی ہے جتنی پولیس کی نفری۔ بیرونی امداد کا یہ حال ہے کہ ایک بار امریکی سفیر نے طلب کیا تھا اور ایک کروڑ ڈالر دیے تھے کہ جاؤ کشمیر خرید لو مگر واپسی میں جیب کٹ گئی۔ روسی سفیر کو میں نے دو درجن ایٹم بم... تین درجن میزائل۔ چار درجن سُپر سانک طیارے اور پانچ درجن جدید ترین ٹینک کے علاوہ بھی بہت کچھ فراہم کرنے کا حکم دیا تھا اور امید ہے کہ وہ سارا سامان بہت جلد ڈلیور کر دے گا۔ سیاسی پارٹی جس نے ایم آر ایس سے رابطہ قائم کیا تھا ٹی پارٹی کہلاتی ہے... وغیرہ وغیرہ... ہر سوال کے جواب میں ایک کہانی تھی، جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔

صبح دس بجے وہ پھر آیا جو خود کو میرا خیر خواہ کہتا تھا۔

میری حالت بہت بہتر تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سا جادو اثر مرہم تھا جو میرے جسم پر ملا گیا تھا تو بدن کا درد غائب ہو گیا تھا۔ صرف داغ رہ گئے تھے۔ دراصل وہ زخم جلد کی خراشوں سے زیادہ نہ تھے اور اگرچہ نیل بہت نمایاں نظر آتے تھے لیکن تکلیف نہیں رہے تھے۔ درد مٹانے والی دوائیں کھانے اور صرف آرام کرنے سے میری جسمانی حالت تقریباً نارمل ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔

"اگر وہ خبر سنانا بے حد ضروری ہے اور تم سنائے بغیر رہ نہیں سکتے تو میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں نے اتنی بُری دیکھی ہے اور اتنی بُری خبریں سُنی ہیں کہ میرا دل پتھر ہو گیا ہے۔"

"تمہارے ساتھ جو عورت پکڑی گئی تھی۔" وہ بولا۔ "تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مصیبت زدہ بیوہ ہے... اتفاقیہ تم سے ملی تھی۔"

"تم کیتھرین کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں" اس نے بتایا کہ تم لوگوں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کی ایک بیٹی میو اسپتال میں داخل تھی اور اسے ایک گردے کی ضرورت تھی۔ تم سب نے مل کر کوشش کی اور اس کا انتظام ہو گیا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا صحافی دوست... کیا نام ہے اس کا؟"

"مرزا غالب۔"

"کہاں ہے وہ آج کل؟" وہ بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے بتا سکتے ہو... ورنہ یہ بہت سفاک اور بے درد لوگ ہیں۔ تم سے نہیں پوچھ سکے مگر کسی نہ کسی سے معلوم کر لیں گے۔" وہ بولا۔ "ضروری نہیں کہ سب کی قوتِ برداشت اتنی ہی ہو۔"

"تم خود کو بہت شریف اور رحمدل ثابت کر رہے ہو۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم ہمارے ہی خواہ ہو... تم بھی یہ نہیں سمجھتے کہ جو بات کسی کو معلوم ہی نہ ہو وہ اسے بدترین عذاب دے کر بھی نہیں پوچھی جا سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ تشدد کے جدید طریقوں کے مقابلے میں انسان کی قوتِ برداشت واقعی کچھ نہیں لیکن ایسی صورت میں نتیجہ کیا تشدد کرنے والوں کی محنت رائگاں جاتی ہے۔ اپنا وقت اور توانائی کسی کو ذہنی و جسمانی اذیت دینے میں صرف کرنے اور بعض اوقات جان لے کر بھی کچھ نہ پانے کے بعد لوگ سچ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے... مگر یہ میرے اور تمہارے جیسے نہیں ہوتے کہ ان کو کسی احساسِ پشیمانی سے پریشانی ہو یا ضمیر کی خلش سے۔" وہ ٹہلتے ہوئے بولا۔ "آدمی مر جائے تو ان کو اتنا صدمہ بھی نہیں ہوتا جتنا کارپوریشن کے اس ملازم کو جو لاوارث آوارہ کُتّے مارتا پھرتا ہے۔ یہ آدمی کو بھی کُتّے کی طرح پھینکتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ اور دوسرے کے ساتھ..."

"میں ایسی باتوں سے دہشت زدہ نہیں ہوتا۔" میں نے دانت پیس کے کہا۔ "تم مجھے وہ بُری خبر سنانا نہیں چاہتے تو نہ سناؤ... یہ مت سمجھنا کہ میں سخت سسپنس کا شکار ہوں۔"

"سوری" میں دوسری باتوں میں اُلجھ گیا۔" وہ بولا۔ "تمہارے صحافی دوست کی اپیل پر دوسرے اخبارات میں کام کرنے والوں نے بھی اپیل کی اور پبلک میں سے بہت سے لوگ آئے لیکن اتفاق سے شہلا کا گردہ میچ کر گیا اور وہ بضد تھی کہ جولی کے لیے کسی اور کا گردہ نہ لیا جائے۔ ڈاکٹروں نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ اس حالت میں وہ رسک نہ لے۔ وہ ماں بننے والی ہے لیکن وہ مانی... اور..."

میرا دل ڈوبنے لگا۔ "کیا... کیا شہلا کو کچھ ہو گیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "شہلا کو نہیں..."

"تو کیا... اس کے بچّے کو..." میں نے اُٹھ کے اس کا گریبان تھام لیا۔ "بتاتے کیوں نہیں؟"

اس نے خود کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا رہا۔ "ابھی ابھی تم نے کہا تھا کہ تم ہر بُری خبر سُن سکتے ہو گویا تم خود کو فریب دے رہے تھے۔"

میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ایک گہری سانس لی اور بستر پر گر پڑا۔

"شہلا کے بچّے کو بھی کچھ نہیں ہوا۔" اس نے اپنے کپڑوں کی شکنوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "بس شہلا کی قربانی... یا اس کے جذبۂ ایثار سے جولی کو فائدہ نہیں ہوا... وہ مر گئی۔"

"اوہ مائی گاڈ..." میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"جولی کی کنڈیشن ایسی نہیں رہی تھی کہ اتنا بڑا آپریشن کیا جاتا۔" اس نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن ڈاکٹرز کے پاس متبادل نہیں تھا۔ وہ رسک نہ لیتے تب بھی جولی مر جاتی۔ اس کا ففٹی ففٹی چانس بہر حال تھا اور انھوں نے گردہ بدلنے کا فیصلہ کیا تھا تو زندگی کے ففٹی پرسنٹ چانس پر۔ لیکن قضا و قدر کا فیصلہ دوسرے ففٹی پرسنٹ چانس کے لیے ہو چکا تھا۔ اسے کوئی بچا نہیں سکتا تھا۔"

"کیا یہ بات اس کی ماں کو بتا دی گئی ہے... تم سب شیطان ہو... اسے تو تم سب سے پہلے بتانے گئے ہو گے۔" میں نے کہا۔

"دشمن سے رعایت کی امید مت رکھو۔" وہ بولا۔ "میں نے تم کو کل سمجھایا تھا۔ میں خود شاید یہ نہ کرتا مگر ہوا یہی... اب وہ تمہارے سامنے ایک شرط رکھیں گے۔ تم سب کے سامنے۔"

"کیسی شرط؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"یہی کہ... اگر تم غالب اور نازو کے بارے میں بتا دو اور ان کے سارے سوالات کے صحیح جوابات دے دو تو کیتھرین کو اسپتال بھیجا جا سکتا ہے۔"

"کیا؟" میں نے چلّا کے کہا۔ "کیتھرین..."

"ہاں۔ اس خبر کا اس پر غیر متوقع اثر ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئی اور ابھی تک بے ہوش ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کو اسپتال پہنچا دیا جائے تو وہ بچ جائے گی۔"

"ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں ایسی ہزاروں نیکیاں درج ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "بہتر ہوگا اگر کیتھرین کے قتل کی نیکی بھی کما لیں۔"

"اس کی موت ایک صدمے کا نتیجہ..."

"نہیں... اس کی موت جانتے بوجھتے طبّی امداد کی فراہمی کو روکنے کا نتیجہ ہو گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی کی خوراک روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ ہوا روک دی جائے تو وہ بھی مر جائے گا۔ قانون اسے طبعی موت نہیں سمجھتا۔ پھر مریض کی دوا روک دی جائے اور اس کا علاج روک دیا جائے تو کیا یہ قتل نہیں ہے؟ مجھے الفاظ کے چکّر میں مت ڈالو۔ نیت کا حال خدا بہتر جانتا ہے لیکن بندے بھی اندھے نہیں ہیں۔"

وہ خاموشی سے ٹہلتا رہا۔ "تم کو شہلا کی زیادہ فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ جولی کے مرنے کے بعد کیتھرین کا زندہ رہنا بے مقصد تھا۔"

"اس کا فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو۔ وہ کسی عظیم تر مقصد کے لیے بھی زندہ رہ سکتی تھی۔" میں نے کہا۔ "موت تو زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس کو ماں باپ بھی تسلیم کرتے ہیں خواہ ان کا سب سے بڑا... ہونہار اور کماؤ بیٹا مر جائے۔ انھیں دوسرے بچّوں کے لیے زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ مر جائیں تو آدمی بہن بھائی اور بیوی بچّوں کی خاطر زندہ رہتا ہے۔"

"لیکن کیتھرین کا تو کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔"

"رشتے جذبات سے ہوتے ہیں اور جذباتی وابستگی کے لیے خونی رشتے ہی نہیں ہوتے۔ خلوص اور محبت کے رشتے بھی ہوتے ہیں۔ خیر یہ بات تم نہیں سمجھو گے... یہ بتاؤ شہلا کا کیا ذکر تھا؟" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا۔ "میں نے بتایا نا کہ اس نے ڈاکٹروں کی مرضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خود کو پیش کیا... ایک جذباتی... حرکت۔"

"تم اسے حماقت کہنا چاہتے تھے نا؟" میں نے تلخی سے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"نیک دل رضا کار بہت تھے۔ ان کی پیشکش بھی انسانیت کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ شہلا کے پاس تو تعلق کی ایک وجہ تھی۔ یہ اجنبی لوگ تھے جن کا جولی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اپنوں کے لیے تو سبھی کچھ کرتے ہیں۔ کمال ان کا ہے جو غیروں کے لیے کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جو کچھ ہوا دیر سے ہوا۔ یہ چھ مہینے پہلے ہوتا تو جولی بھی بچ جاتی اور شہلا کے لیے یہ ایثار کوئی خطرہ پیدا نہ کرتا... اب اس کی اپنی زندگی خطرے میں ہے۔"

"خطرہ کس حد تک ہے؟" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "اطلاع صرف اتنی تھی کہ شہلا کی حالت بھی ٹھیک نہیں اور اس کو کسی پرائیویٹ اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا گیا ہے۔ ایس ایس پی صاحب کا پیسہ اور اثر و رسوخ اسے بچا لے گا۔"

اس نے آخری جملے میں جو طنز کیا تھا اسے میں نے نظرانداز کر دیا کیونکہ یہ وقت ضامن رضوی صاحب کے کردار کے دفاع کرنے کا نہیں تھا۔ "یقیناً تم نے محسن کو اذیت دینے کے لیے یہ خبر ضرور سنائی ہوگی اور بہت مبالغہ آرائی کے ساتھ... میں دلاور کو جانتا ہوں... اس نے ایسا نقشہ کھینچا ہوگا کہ شہلا تو بسترِ مرگ پر ہے اور ہر سانس کے ساتھ تمہارا نام لے رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے صاف کہا ہے کہ اس کی زندگی کی امید صرف ایک صورت میں ہے کہ محسن کو فوراً بلا لیا جائے۔ تم جا سکتے ہو اگر غالب اور نازو کا پتا بتا دو۔ ان کے ملتے ہی تم کو اسپتال پہنچا دیا جائے گا۔ تمہاری بیوی اور تمہارا بچہ دونوں بچ سکتے ہیں۔"

"کم سے کم میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"تم اور وہ کیا الگ ہو؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ دلاور کے ڈرامے بھی میں نے دیکھے ہیں اور یہ ڈراما بھی دیکھ رہا ہوں جو تم کر رہے ہو لیکن میں ایسی باتوں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں اور میں محسن کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کے سامنے فرض اور محبت کی آزمائش کے لیے یہ دردناک فلمی سچویشن رکھو گے تو وہ بھی متاثر نہیں ہوگا۔ وہ کہے گا کہ شہلا کو اگر خدا بچانا چاہے گا تو بچا لے گا۔ اسے منظور نہیں ہوگا تو میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ موت ہمارے لیے کوئی حوصلہ آزما یا حوصلہ شکن چیز نہیں جس کا خوف ہمارے ارادے بدل دے۔ ہماری عقل کو مفلوج کر دے یا ہمیں اطاعت پر مجبور کر دے۔ جس کو مرنا ہے وہ اپنے وقت پر مرے گا اور ویسے ہی مرے گا جیسے دستِ قدرت نے اس کے لیے مرنا لکھا ہے۔ اس تحریر کو نہ ہم بدل سکتے ہیں نہ کوئی اور بدل سکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی مر سکتا ہے لیکن تمہاری کوشش سے نہیں، خدا کے حکم سے... اور خدا کے حکم کے سامنے ہم ہر وقت راضی برضا ہیں۔"

"اچھا بول لیتے ہو تم... مجھ سے دلاور نے کہا تھا۔"

"اور میں نے کہا تھا کہ وہ سب بولنے والے ہی نہیں، زبان سے نکلنے والے ہر لفظ پر عمل کرنے والے بھی ہیں... تم سب کے کردار میں سختی بھی ہے اور لچک بھی... جیسے کہ کسی فولادی سپرنگ میں ہوتی ہے۔ وہ مڑتی جاتی ہے اور ایک جگہ پہنچ کے لوٹ جاتی ہے۔ اسے موڑنے والا دوسرا نہیں کر سکتا... خیر... تم ابھی تک میری پوزیشن کو نہیں سمجھے۔ اتنے کم وقت میں سمجھ بھی نہیں سکتے میری۔ کچھ مجبوریاں ہیں لیکن میں کچھ اختیارات بھی رکھتا ہوں۔"

"محدود اور مشروط اختیارات۔" میں نے کہا۔ "مثلاً مجھ سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی وعدہ کر سکتے ہو۔ یہ کہ محسن کو شہلا کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ کیتھرین کو اسپتال منتقل کر دیا جائے گا۔ یا یہ کہ سب کو چھوڑ دیا جائے گا۔ ظاہر ہے ان وعدوں کی ضمانت کوئی نہیں۔ تم دس جھوٹ بول سکتے ہو اور زیادہ مہارت سے بول سکتے ہو...!"

"تم نے وہ سوالنامہ بھرا؟" اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔

"ہاں... باقی سب نے مجبوری کے سامنے سر جھکا دیا تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا اور کاپی اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کاپی کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور اس کے چہرے پر کامیابی کی طمانیت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کاپی بند کر کے اس نے سر ہلایا۔ جو اور بہت کچھ کہنے کے مترادف تھا... تھینک یو... ختم ہوگئی ساری اکڑفوں؟ یہ تو ہونا ہی تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ میں اس کے جانے کے بعد اس خیال سے ہنس بھی نہ سکا کہ جوابات پڑھنے کے بعد اس کی حالت کیا ہوگی جب اس پر واضح ہوگا کہ وہ صرف بے وقوف بنا ہے اور میرے ساتھ مغز ماری کی ہے تو اس نے جھک ماری ہے۔

مجھے جولی کی موت کا سخت صدمہ تھا۔ کتنی امیدوں کے ساتھ ہم نے اس کارِ خیر کے لیے مل کر جدوجہد کی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم سب کی مشترکہ کوشش جولی کو موت کے منہ سے کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئے گی۔ یہ کوئی ناممکن کام بھی نہیں تھا۔ بس اس کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ قدرت نے جولی کو جتنی فرصتِ عمر دی تھی وہ تمام ہو رہی ہے جس کے بعد ساری دنیا کے ماہر ترین سرجن کوئی معجزہ مسیحائی نہیں دکھا سکتے۔

مجھے شہلا کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔ اس نے بے وقوفی ضرور کی تھی مگر اس بے وقوفی پر اس کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بھی وہی عشق تھا جو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا

کسی سود و زیاں کا خیال کیے بغیر۔ اپنی ذات سے بے نیاز... میں کوئی مفتی نہیں تھا اور دین کا بہت کم علم رکھتا تھا میری نظر میں شہید کا کوئی مقام تھا تو بہت بلند تھا۔ شہید وہ ہو جو کسی نیک مقصد کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے جان دے تو شہلا مرنے کے بعد شہادت کا مقصد حاصل کر لیتی لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر جولی بھی زندہ رہتی اور شہلا ایک طویل عمر تک اس خوشی کی دولت سے سرفراز رہتی جو اسے ایک زندگی بچا کے حاصل ہوئی تھی۔ ایسا نہ ہو سکا تھا تو اب ہم سب کی خوشی کے لیے شہلا کا زندہ رہنا اور اس کے بچے کا وقتِ مقررہ پر جنم لینا ضروری تھا۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب میرے اور ڈیڈی کے درمیان جنگ ہوئی تھی کہ چچا کی حیثیت سے پہلا حق میرا ہوگا یا ماموں کی حیثیت سے اس کا۔ اب کسی کو کچھ نہ ملے گا؟ سوائے رنج و احساسِ زیاں، اور پشیمانی و پریشانی کے؟ کیا خدا ہم سب کی دعائیں مسترد کر دے گا۔ دل سے نکلنے والی دعائیں اثر ہوتا ہے تو پھر یہ دعائیں کیسے قبول نہ ہوں گی جو دل کی گہرائی سے خلوص اور صدق کے ساتھ نکلی ہیں۔ میرا حوصلہ انتہائی پست ہو گیا تھا۔ یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بے بسی کی انتہا اور کیا ہوگی کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں۔ ایسی جگہ میں جہاں تائیدِ غیبی کے بغیر کسی کی رسائی ممکن ہی نہیں۔ جولی مرگئی ہے۔ شہلا انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے۔ غالب اور نازو کا پتا نہیں۔ کیتھرین کو بیٹی کی موت نے ہوش سے بیگانگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہمارا ایک مددگار سکندر تھا جو مارا جا چکا ہے اور ہم اب غیر ملکی ایجنٹوں کی تحویل میں ہیں جو ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ ہر طرف سے ناامیدی کی یلغار ہے۔ امید ایک تنکا اس سیلابِ یاس میں کیسے سہارا دے سکے گا۔

میرے جوابات کا ردِعمل بہت جلد ظاہر ہوا... آدھے گھنٹے سے کم وقت میں وہ پھر آ گیا۔

"تمہارے جوابات بہت پُرلطف تھے۔" وہ بولا۔ "ہم سب ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔" لیکن یہ بات کہتے ہوئے اس کے لیے چہرے کے ناگوار اثرات اور لہجے کی تلخی کو چھپانا مشکل ہو گیا۔

"اور اب شاید میرا بُرا حال ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ فکرمندی سے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ... تم اتنے... عاقبت نااندیش ہو... تم سوچ سکتے ہو... ذہین ہو اور حالات تمہارے سامنے ہیں... خیر... مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہاری مدد نہ کر سکا۔"

اس کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ دونوں اندر آ گئے جن کا نام معلوم نہ ہونے کے باعث میں انہیں گونگے کمانڈوز کہتا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے مجھے چلنے کا اشارہ دیا۔ میں چل پڑا۔ وہ میرے دائیں بائیں اس طرح چلنے لگے کہ ان کی آنکھیں، ان کے ہاتھ اور ان کا ذہن پوری طرح چوکس تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اس زیرِ زمین قید خانے سے نکل کے فرار ہو سکوں مگر وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ تیار رہیں اور اگر میرا ایک قدم بھی غلط پڑے تو دماغ درست کر دیں۔ ایک بار پھر مجھے اسی جمنازیم میں لایا گیا جہاں میں نے ایک رات کا عذاب مسکراتے ہوئے جھیل لیا تھا مگر اب مجھ میں مسکرانے کا حوصلہ نہ تھا۔

اس بار مجھے فولادی کرسی میں جکڑ کر نہیں بٹھایا گیا۔ کمرے میں تین کرسیاں پڑی تھیں جن میں سے مجھے بیچ والی کرسی ملی۔ تقریباً میرے ساتھ ہی سراج اندر آیا۔ اس کی وہی زہر آلود، پُرخباثت شیطانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چپکی تھی جو اس کا ٹریڈ مارک بن گئی تھی لیکن وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دوسری جانب وہ آ گیا جو میرے ہمدرد اور بہی خواہ کا رول ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

"تم نے تو ہماری تفریح کا بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔" سراج نے کچھ دیر بعد کہا۔ "سوالوں کے جواب میں لطائف لکھ مارے۔ اب کچھ تفریح کا بندوبست ہماری طرف سے ہوا ہے۔"

"ہم تم کو ایک فلم دکھا رہے ہیں۔" دوسرا شخص بولا۔ "یہ فلم ہم رابعہ کو بھی دکھا چکے ہیں۔"

سراج ہنسا۔ "اور یقین کرو" اس نے بڑا انجوائے کیا۔ "تم بھی کرو گے۔"

میں خاموشی سے ایک شخص کو فلم کی نمائش کا انتظام کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر ایک آہنی بار سے پردہ لٹکایا اور اسے کھول دیا۔ یہ چار ضرب چھ فٹ کا پردہ سفید کینوس یا ڈزین کے کپڑے کا بنا ہوا تھا اور ایک ڈنڈے پر لپٹا ہوا تھا۔ پھر وہ پیچھے گیا اور اس نے اپنے پروجیکٹر کو ہمارے سروں سے تھوڑا سا اوپر رکھنے کے لیے پہلے ایک سنٹر ٹیبل رکھی اور اس کے اوپر ویسی ہی کرسی رکھی جیسی میرے بیٹھنے کے کام آ رہی تھی۔ اس کرسی پر اپنا پروجیکٹر رکھنے کے بعد اس نے پلگ کو پچھلی دیوار میں لگایا اور لائٹ کو پردے پر فوکس کرنے کے لیے میز کو آگے پیچھے گھسیٹتا رہا۔ بالآخر ایک سلائیڈ پردے پر نمودار ہوا جسے آپریٹر نے بالکل ٹھیک فاصلے پر فوکس کیا تھا چنانچہ عکس بہت واضح تھا۔ میرے ذہن کو ایک الیکٹرک شاک لگا کیونکہ سلائیڈ میں ایک عورت کو دکھایا گیا تھا۔

اور یہ عورت رابعہ تھی، اسے لباس کے بغیر دیکھ کر مجھے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اسے انتہائی بے شرمی سے مسکراتا دیکھ کے ہوا۔ وہ نہایت بے باکی سے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی چنانچہ مجھے اپنی طرف دیکھتی محسوس ہوتی تھی اور میرے لیے اس سے آنکھیں چار کرنا مشکل تھا۔ یہ عکس غائب ہو گیا اور اس کی جگہ دی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عورت دوسرے زیادہ شرمناک پوز میں نمودار ہوئی۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ رابعہ ہو سکتی ہے مگر اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی۔۔۔۔۔ رابعہ دشمن کے قبضے میں تھی اور اس کے جسم کو پوشاک یا لباس سے محروم رکھنا اور اسے جبر سے کسی بھی ننگِ انسانیت فعل پر مجبور کرنا ان لوگوں کے اختیار میں تھا۔ ناقابلِ یقین وہ جذبات تھے جو رابعہ کی صورت پر عیاں تھے۔ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ رابعہ اس طرح مسکراتے ہوئے۔ اتنی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور اتنی خوشی سے ایسی تصاویر اتروا سکتی ہے۔ اس کے چہرے سے جبر کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا اور اگرچہ یہ ساکت تصاویر تھیں لیکن میں فرض کر سکتا تھا کہ آگے فلم میں بھی مرکزی کردار رابعہ کا ہی ہو گا۔ میرا دماغ خالی ہو رہا تھا اور میں گم صم بیٹھا تھا۔ آخر یہ سب کیسے ہوا۔ اگر وہ خوابیدہ ہوتی تو میں سمجھتا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتیں تو میں سمجھتا کہ اسے [illegible] یہ سین وہ تو پوری طرح ہوش و حواس میں تھی۔ میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ آخر یہ کیسے ممکن ہوا۔

میں نے ابتدائی دو تین تصاویر کے بعد کچھ نہیں دیکھا۔ میری نظریں اسکرین پر رہیں اور اس پر عکس بدلتے رہے مگر میں سوچتا رہا۔

جواب تلاش کیے بغیر میرے دماغ کا پُرسکون ہونا مشکل تھا۔ یہ جواب بہت جلد مل گیا۔ غالباً رابعہ کو شراب پلا دی گئی تھی یا اسی قسم کی کوئی نشہ آور چیز دے دی گئی تھی جس سے وہ نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھی تھی۔ یا اسے ہپناٹائز کیا گیا تھا اور اس کے ذہن کو ناکارہ بنانے کے بعد اس طرح اپنے قابو میں کر لیا گیا تھا کہ وہ ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی تھی۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ مسکراؤ۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ کہنا نہیں مانوں گی تو ہم سکندر کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے۔ اس کے لاشعور میں ایک خوف تھا جس نے اُسے مجبور کیا ہو گا۔۔۔ یہ وضاحت منطقی ضرور تھی مگر پھر بھی اطمینان بخش نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک نوکِ خار تھی جو مسلسل باعثِ آزار تھی اور مجھے احساس دلاتی تھی کہ یہ توضیح غلط ہے۔ یہ اصل بات نہیں ہے۔ میں نے ایک جواز بنا لیا ہے۔ ایک سبب ایجاد کر لیا ہے۔ صرف خود کو مطمئن کرنے کے لیے رابعہ کے رویے کو قابلِ فہم بنا لیا ہے۔

"تم کو تصویریں پسند آئیں؟" سراج نے میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"ان تصویروں سے تم کس کو بلیک میل کرو گے؟" میں نے کہا۔ "مجھے یا رابعہ کو اور ہمارے تمام دوست احباب کو بالکل فرق نہیں پڑے گا اگر تم اس البم کو شائع کرا کے سارے شہر میں مفت بانٹ دو۔"

"یہ تو کچھ نہیں۔" سراج نے قہقہہ مار کے کہا۔ "ہر فلم سے پہلے سینما ہال میں سلائیڈ دکھائے جاتے ہیں نا۔۔۔ اس کے بعد فلم شروع ہوتی ہے۔"

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ خبیث گونگا [illegible] اپنے ہاتھوں کو بڑے جارحانہ انداز میں بازوؤں پر رکھے [illegible] کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تین قاتل موجود تھے جن کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ دو کے پاس ریوالور تھے اور تیسرے کے پاس مشین گن تھی۔

"پریشان ہونے کی بات نہیں۔" میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا ہوا شخص آہستہ سے بولا۔ "اس فلم کا رابعہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اس پیشگی اطلاع کا شکریہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب اپنا یہ کھیل بند کرو کہ تم میرے بہی خواہ اور ہمدرد ہو یا دوسروں کے مقابلے میں کوئی شریف اور مہذب آدمی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم زیادہ نمک حرام ہو۔"

اسی وقت فلم شروع ہو گئی۔ معلوم نہیں وہ کون لڑکی تھی۔ منظر اسی جگہ کا تھا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی فرش پر گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ سراج نے کمنٹری کرتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکی ایک کالج میں لیکچرار ہے اور اس نے ہمارے لیے کام کیا تھا لیکن بعد میں جب اس کے پاس کافی پیسہ جمع ہو گیا تو یہ غائب ہو گئی۔ ہم نے اسے تلاش کر لیا۔ اسے دوبارہ کام پر لگا دیا گیا اور پھر چھ مہینے تک یہ ٹھیک رہی۔ پھر اس کی آنکھ کسی کیپٹن میجر سے لڑ گئی اور اس پر حب الوطنی کا دورہ پڑا۔ اس کے ضمیر میں فرض شناسی کے جراثیم داخل ہو گئے اور اس نے اپنے یار سے مل کر ایسا چکر چلایا کہ ہمارے بہت سے آدمی پکڑے گئے۔ کئی جگہ کامیاب چھاپے پڑنے سے لاکھوں کا نقصان ہوا اور وہ راستے بند ہو گئے جن پر ہمارا مال جاتا تھا۔ نئے راستے اور نئے آدمی تلاش کرنے میں بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ پھر اس نے سارے جرائم کا اعتراف کر لیا۔

یہ فلم اس لڑکی سے اعترافِ جرم حاصل کرنے کی لرزہ خیز کہانی تھی۔ اس پر روایتی طریقے کے مطابق تشدد کیا گیا تھا۔ اس کے نازک جسم پر کوڑے برسائے گئے تھے اور جلتے ہوئے سگریٹ لگائے گئے تھے۔ اس کی لرزہ خیز چیخوں کی آواز پروجیکٹر سے منسلک اسپیکرز پر مسلسل سنائی دیتی رہی۔ ان کو کسی ماہر کیمرہ مین کی خدمات بھی حاصل ہوں گی ورنہ یہ منظر اتنی بے رحم تفصیلات کے ساتھ دکھایا نہ جا سکتا۔ میری آنکھیں اس اجنبی لڑکی پر ہونے والے ظلم کو دیکھ رہی تھیں مگر میرے تصور میں رابعہ تھی۔ وہ چند ساکت عکس تھے جو میں نے فلم سے پہلے دیکھے تھے۔ اگر شکاری یہ چاہتے تھے کہ اس فلم کو دیکھتے ہوئے میں چشمِ تصور سے اس بدبخت اور مظلوم لڑکی کی جگہ رابعہ کو دیکھوں تو وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے تھے۔

میں نے دل کو کئی طرح سے قائل کیا۔ میں نے فرض کیا کہ یہ سب حقیقت نہیں ہے، یہ لڑکی کوئی پیشہ ور ایکسٹرا گرل یا کوئی معمولی سی اداکارہ ہو گی جسے بھاری معاوضہ دے کر اس قسم کی شوٹنگ کے لیے رضامند کر لیا گیا ہو گا۔ اگر کوئی لڑکی تن کی عریانی قبول کرے تو باقی کام ہدایت کار اور کیمرہ مین کر لیتے ہیں۔ کس سین کو کس زاویے سے لیا جائے۔ کس طرح پیش کیا جائے کہ اس کا تاثر حقیقی اور زیادہ دل گداز لگے اور کس طرح کیمرے کی آنکھ سے منظر کو یوں فلمایا جائے کہ دیکھنے والے کو سب اپنے سامنے ہوتا ہوا محسوس ہو۔ بلاشبہ غیر ملکی [illegible] عام رہتے ہیں اور وہاں ایکٹرز بھی پیسہ لے کر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر اب مغرب کی ہر مہذب بے راہ روی ہمارے معاشرے میں بھی سرایت کرنے لگی ہے اور پیسہ تو سب کچھ بن ہی گیا ہے۔ کیا عورت کی شرم و حیا اور کیا اس کی آبرو۔

اس خیال نے مجھے قائل کر لیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ صرف ایک فلم ہے۔ یہ اداکارہ یا فاحشہ آج بھی کہیں موجود ہو گی اور اس کے بعد بھی نہ جانے کتنی فلموں میں بے حیائی کے مظاہرے کر چکی ہو گی۔ یہ اداکاری ہرگز نہیں تھی۔ اداکاری کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے۔ اس لڑکی پر جو تشدد کیا جا رہا تھا وہ غیر حقیقی تھا اور وہ اس طرح چیخ چلا رہی تھی اور یوں تڑپ رہی تھی جیسے سچ مچ اس کے لیے یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہ چیخ و پکار بھی صوتی تاثرات دینے والوں کا کارنامہ تھی جن کے پاس ہر قسم کی آوازیں بھرنے کے لیے ریکارڈ ہوتے ہیں۔

ان سب دلائل کے باوجود میرے ذہن سے وہ نقش نہ مٹتا تھا جو رابعہ کی ناقابلِ بیان حد تک شرمناک تصاویر دیکھ کر قائم ہوا تھا اور میرے لیے یہ اذیت انتہائی باعثِ ملال بھی تھی۔ نہ جانے اس قسم کی تصویر کشی کے لیے ان بے رحموں نے رابعہ پر کیا مشقِ ستم کی ہو گی۔ شاید خود اسے بھی یہ تصاویر دکھائی گئی ہوں اور اس وقت وہ ہوش میں ہو گی تو اس کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ محسن اور ڈیڈی نے بھی رابعہ کو اس حال میں دیکھا ہو گا۔ اُف میرے خدا۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ذلت اور رسوائی کے احساس سے نجات پانے کے لیے رابعہ خودکشی کر لے۔ ہر لڑکی اگر حساس ہو گی اپنی یہ نمائش دیکھنے کے لیے اور دیکھنے والوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے لیے زندہ رہنا پسند نہیں کرے گی۔ محسن اور ڈیڈی نے سمجھ لیا ہو گا کہ رابعہ کو مجبور کیا گیا ہو گا اور مجبور کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ خدا کے لیے حوصلہ مت ہارنا رابعہ۔۔۔ تم ہم سب کی نظروں میں فرشتوں کی طرح معصوم رہو گی۔ یہ سب تو جنگ میں ہوتا ہی ہے۔ دشمن کوئی رعایت نہیں کرتا اور کسی ظلم کو غیر اخلاقی، غیر انسانی یا ناجائز نہیں سمجھتا۔

اچانک فلم کا منظر بدل گیا۔ آخری سین وہ تھا جب بے ہوش ہو جانے والی لڑکی کو دو آدمی اٹھا کر لے گئے تھے۔ یہ دونوں اس وقت میرے دائیں بائیں تیار کھڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں میرا یقین متزلزل ہونے لگا کہ یہ فلم تھی جس کے سارے مناظر غیر حقیقی تھے۔ جس طرح وہ لڑکی لے جائی گئی تھی، وہ منظر حقیقی تھا۔ اتنی اچھی اداکاری اس لڑکی نے کیسے کی؟ اگر وہ واقعی ایسی اداکاری کر سکتی تو یقیناً فلمی دنیا میں صفِ اوّل کی اداکارہ شمار ہوتی کیونکہ جہاں تک ظاہری حسن و شباب کا تعلق تھا وہ بہت سی نامور اداکاراؤں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر تھی پھر اس کے چہرے پر پیشہ ور، خصوصاً اس قسم کے رسوائی کردار کرنے والی 'اداکارہ' والی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر وہ پیسے کی خاطر اس قسم کی فلمیں بنوانے والی ہوتی تو اس کی صورت پر پھٹکار برستی اور اس کے انداز و اطوار میں اس کے سارے گناہ آلود ماضی کی جھلک ہوتی لیکن وہ تو عام سی لڑکی تھی۔

ایک اور بات یہ تھی کہ اس لڑکی سے جتنے سوال جواب کیے جا رہے تھے وہ بھی میں نے سُنے تھے۔ سوال کرنے والے سامنے نہیں تھے مگر ان کی آواز کو میں نے شناخت کر لیا تھا۔ ایک آواز استاد پیڈرو کی تھی اور دوسری ایس پی سراج کی۔ میرا دل لرزنے اور کانپنے لگا۔ اگلے منظر میں وہ لڑکی اس کمرے میں تھی جس میں مجھے رکھا گیا تھا اور شاید وہ سب کمرے ایک جیسے تھے جن میں ہم سب اسیر تھے۔ اس کے ساتھ بھی دونوں گونگے کمانڈوز تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس فلم میں بھی ان کا کردار خاموش تھا۔ وہ ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ وہ تعمیلِ حکم کرتے تھے یا کراتے تھے۔ کمرے میں لڑکی کے ساتھ وہی دونوں موجود تھے اور معلوم نہیں کیا کرنے والے تھے کہ لڑکی حد درجہ سہمی ہوئی تھی۔ اب مجھے یقین آنے لگا کہ یہ اداکاری نہیں۔ وہ لڑکی کوئی ایکٹرس نہیں تھی۔ جو کچھ اس پر بیتی تھی حقیقت تھی اور میں اس ظلم کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

سراج کے کمرے میں آتے ہی لڑکی نے چیخ ماری۔ سراج کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا۔ جب کیمرے نے سامنے سے فوکس کیا تو مجھے پتا چلا کہ یہ ڈبا ایک چوبے دان تھا۔ اس کا سامنے کا کھل جانے والا حصہ تاروں کی جالی کا بنا ہوا تھا۔ کیمرے نے اس کو بہت قریب سے [illegible] تو مجھے اس میں چھوٹے چھوٹے چوہے اُچھلتے اور انتہائی اضطراب کے عالم میں جالی سے سر ٹکراتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہو گا۔ اس کا مجھے تجربہ نہیں تھا لیکن میں نے [illegible] تھا کہ پولیس کے پاس یہ بھی تشدد کا ایک مؤثر اور کامیاب طریقہ ہے اور اس طریقے کو استعمال کرنے کے بعد عام طور پر سچ کو چھپانے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ یہ سب چوہے بھوکے رکھے گئے تھے اور گوشت خور تھے۔ عورت تو خیر [illegible] چوہا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یا کاکروچ دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو جاتی ہے۔ مرد بھی ان چوہوں کی آدم خوری اور خوں آشامی سے پناہ مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب غالب کے آبائی گھر میں ایک چوہے کے آجانے سے نازو جیسی بہادر لڑکی اور رابعہ جیسی باہمت لڑکی کا کیا حال ہوا تھا۔

ان دونوں گونگے کمانڈوز نے لڑکی کو بے بس کر دیا اور سراج نے اپنے شیطانی قہقہوں کے ساتھ اسے چوہوں سے ڈرانا شروع کیا۔

گونگے کمانڈوز نے لڑکی کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ بُری طرح اچھلنے لگی۔ چوہے اس کے سارے جسم پر دوڑ رہے تھے مگر ان کے لیے باہر نکلنے کے سارے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ وہ جسم سے چپکے ہوئے کپڑوں کے اندر قید تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ پاگلوں کی طرح دانتوں سے رسّی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے دانت صرف آستینوں کی گرہ تک پہنچے لیکن وہ انھیں بھی نہ کھول سکی۔ قمیص کے نچلے حصّے اور شلوار کے پائنچوں تک اس کے دانتوں کی رسائی ہی نہ تھی۔ اس نے فرش پر جھک کر دُہرا ہو کے اِدھر سے اُدھر تڑپ کر گرتے ہوئے قلابازی کھا کے لوٹتے ہوئے ان موذی اور وحشی چوہوں سے نجات پانے کی بے سود کوشش جاری رکھی۔ سراج مسلسل ایک ہی سوال دُہرا رہا تھا اور لڑکی کچھ نہیں سُن رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے حلق سے "خدا کے لیے... رسول ﷺ کے لیے... مجھے نہیں معلوم... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے چھوڑ دو..." کے جملے نکلتے تھے۔ پھر وہ ایسے چیخ مارتی تھی جیسے اسے ذبح کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی ماں کو آوازیں دے رہی تھی۔ خدا کو پکار رہی تھی۔ ان سب کی منّت سماجت کر رہی تھی لیکن اُس کی آواز بہری دیواروں سے ٹکرا کے رُک رہی تھی۔

"بند کرو... بند کرو یہ سب۔" میں نے اچانک چیخ کر کہا اور کسی دیوانے کی طرح میرے ذہن میں یہ سب کچھ تباہ و برباد کر دینے کا خیال آیا۔ پروجیکٹر، سینما کا پردہ۔ میرے ارد گرد موجود درندے۔ جلّاد صفت شکاری۔ یہ عقوبت گاہ۔

میں ان سب کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ پہلے سے ہوشیار تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ فلم کا اثر کیا ہو گا۔ مضبوط سے مضبوط اعصاب والے کے لیے بھی یہ سب دیکھنا ناممکن تھا۔ میرے اُٹھنے سے پہلے دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے پھر بٹھا دیا۔ سراج میرے دائیں جانب تھا۔ اس نے اپنی کرسی کو کچھ دور کر لیا۔ بائیں طرف بیٹھا ہوا شخص بھی آگے کھسک گیا۔ اور وہ دونوں گونگے کمانڈوز میرے دائیں بائیں آ گئے۔ انھوں نے مجھے ایک دم اٹھایا اور گھسیٹ کر اس کرسی تک لے گئے جو لوہے کی بنی ہوئی تھی اور سیمنٹ کے فرش میں نصب تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر چلائے اور ان کو لاتیں مارنے میں کامیاب بھی ہوا مگر وہ پروفیشنل لوگ تھے۔ مجھ سے بہت زیادہ تنومند تھے اور مار کھانا بھی جانتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بندوق کا ایک کُندا مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیتے۔ خود گونگے کمانڈوز کے لیے میری مزاحمت کو ختم کرنا مشکل نہ تھا مگر وہ مجھے فلم دکھانے کے لیے ہوش میں رکھنا چاہتے تھے۔

مجھے اس فولادی کرسی پر چمڑے کی پیٹیوں سے باندھ دیا گیا تو سراج اور اس کا دوسرا ساتھی اپنی کرسی پھر میرے قریب لے آئے۔ سینما کا اسکرین نئے زاویے پر لٹکا یا گیا اور اسی مناسبت سے پروجیکٹر کو شفٹ کیا گیا۔ میں نے ان کو بہت گالیاں دیں اور قتل کر کے ٹکڑے کتّوں کو ڈالنے کی دھمکیاں دیں۔ وہ صرف مسکراتے رہے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بالآخر میری قوتِ برداشت ختم ہو جائے گی اور میرے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ ابتدا میں رابعہ کی تصاویر دکھانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جب میں فلم دیکھوں تو مجھے اس اجنبی لڑکی کی جگہ رابعہ دکھائی دے۔

"ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔" سراج بولا۔ "ابھی تو آدھی فلم ہوئی ہے... باقی آدھی بھی دیکھو۔"

"میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔" میں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن اسی وقت میرے جسم کو سچ مچ کا الیکٹرک شاک لگا۔ میں تڑپ کر اچھلا مگر اپنے بندھنوں میں کسمسا کے رہ گیا۔ میرے لب خشک ہو گئے اور سارے جسم پر پسینہ آ گیا۔ میرا دل چلتے چلتے رُکا اور پھر چلنے لگا لیکن اب اس کی دھڑکن بہت تیز تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل میرے سینے کے زنداں کی دیواریں توڑ دے گا۔ یہ کرسی واقعی الیکٹرک چیئر تھی۔ انھوں نے اس میں ذرا سی دیر کے لیے کرنٹ چھوڑا تھا اور بند کر دیا تھا۔

"پانی... پانی..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

سراج نے قہقہہ لگایا۔ "فلم کے بعد پانی ملے گا... فلم نہیں دیکھو گے تو صرف الیکٹرک شاک ملیں گے۔"

"میں... میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا..." میں نے کہا۔

بجلی ایک بار پھر چمکی اور اس بار یہ چمک مجھے اندھیرے میں چمکنے والی آسمانی بجلی کی طرح لگی۔ میرے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے اور اندھیرے آ جانے کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا اور اس میں سے آگ نکلنے لگی۔ پسینہ اب پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور میرے حلق میں کانٹے بھر گئے تھے۔ اب میں چیخ بھی نہیں سکتا تھا اور پانی بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔

"فلم دیکھو۔" سراج نے مجھے حکم دیا۔

"اگر تم پوری فلم خاموشی سے نہیں دیکھو گے تو ہم رابعہ کو بھی لے آئیں گے اور باقی فلم وہ بھی تمھارے ساتھ بیٹھ کر دیکھے گی۔" دوسرا شخص بولا جس کا مجھے ابھی تک نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ میرے خیال میں اس مشن کا سربراہ تھا جس کا مقصد ہمیں گرفتار کر کے لانا اور ہم سے تمام معلومات حاصل کرنا تھا۔

"ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ تمھارے پپوٹے کاٹ دیں... تم پلک ہی نہ جھپکا سکو گے تو آنکھیں کیسے بند کرو گے۔ تمھاری آنکھیں ساری زندگی کھلی رہیں گی۔ مرنے کے بعد بھی کھلی رہیں گی...... اور تم جانتے ہو اگر پلک ایک منٹ بھی نہ جھپکے تو آنکھ پر کیا گزرتی ہے۔"

میں لمبے لمبے سانس لینے لگا اور فلم دیکھنے لگا۔ فلم کے باقی مناظر شرافت اور انسانیت کی لاش کی بے حرمتی کے مناظر تھے۔

مجموعی طور پر اس فلم کی لمبائی کیا تھی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ میرے لیے وہ وقفہ صدیوں کے عذاب پر محیط تھا۔ اس الیکٹرک کرسی پر دو مرتبہ معمولی جھٹکے کھانے سے میری جو حالت ہوئی تھی اس کے بعد مجھ میں آنکھیں بند کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ میں نے تشدد کے واقعات کا تذکرہ کتابوں اور رسالوں میں پڑھا تھا۔ مجرموں کے ناخن کھینچنے، دانت توڑنے اور پپوٹے کاٹنے کے واقعات نازیوں سے بھی منسوب تھے۔ دہشت پسندوں اور تفتیش کرنے والوں سے بھی یہ سب میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا اور رابعہ کے ساتھ بھی۔

فلم کے آخری منظر میں لڑکی مر گئی تو میں نے یوں محسوس کیا، جیسے میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ خدا نے بالآخر اس کو عذاب سے نجات دی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا، یہ سب بیان کرنا بھی ناممکن ہے اور اس کا ذکر سننا بھی۔ مگر میں نے تو یہ سب دیکھا تھا اور خوف میری روح کے اندر تک سما گیا تھا کہ یہی سب کچھ رابعہ کے ساتھ ہو گا اور میں دیکھوں گا۔ دیکھنے پر مجبور کر دیا جاؤں گا۔ میری عقل اور میرے جذبات۔ میرا دل اور دماغ سب ایک ہی بات کہنے لگے تھے۔ چھوڑ دو سکندر بخت! یہ سب بکھ چھوڑ دو جو تم کرتے رہے ہو۔ صرف رابعہ کو بچا لو۔ بھول جاؤ ایم آر ایس کو۔ اپنے مشن کو... دلاور کو... اپنے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کو... اس وطن کو بیچنے والے بہت طاقتور ہیں۔ تم نے دیکھا کہ انھوں نے رابعہ کے ساتھ کیا کیا۔ رابعہ کے ساتھ؟ نہیں... ابھی رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ ہوا کیسے نہیں۔ کیا تم نے اس کی تصاویر نہیں دیکھیں... وہ دیکھو... اس لڑکی کی لاش کو ایک ٹرک میں ڈالا جا رہا ہے... ٹرک اب روانہ ہو گیا ہے۔ اس جگہ کو تم پہچانتے ہو نا... یہ لاہور کی ایک سڑک ہے سایہ مال کا حصّہ... دیکھو انھوں نے لڑکی کی آبرو سوختہ... شکستہ اور زخم خوردہ لاش کو سڑک پر پھینک دیا ہے... اور اب دیکھو... وہ ٹرک واپس آ رہا ہے۔ ٹرک اس لاش کے اوپر سے گزر گیا ہے... ہاہاہا... ٹرک دوبارہ ریورس گیئر میں آیا... ہاہاہا... پھر لاش کے اوپر سے گزرا۔ اب اسے کون پہچانے گا۔ یہ کس کی بیٹی تھی۔ کس کی بہن تھی۔ کس سے پیار کرتی تھی۔ کون تھا جس نے اسے خوابوں میں بسا رکھا تھا۔ یہ کس گھر کے آنگن کو اپنے وجود کی مہکار دینا چاہتی تھی۔ کس گلشن میں پھول کھلا سکتی تھی۔ اب یہ ایک لاوارث ناقابلِ شناخت لاش ہے۔ حشرات الارض کا رزق... اس کے لیے کوئی مدفن نہیں... کوئی لوحِ مزار نہیں... کوئی اشکبار آنکھ نہیں۔ اس کی روح تاابد زمین اور آسمان کے درمیان چلّاتی رہے گی۔ ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دارو گیر!! ہاہاہا... روزِ مکافات... ہاہاہا...

قہقہے سراج کے تھے مگر ایک وقت آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہنس رہا ہوں۔ اسی طرح قہقہے لگا رہا ہوں۔

"لے جاؤ اسے... اور وہیں ڈال دو۔" سراج بولا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔" دوسرا شخص بولا۔ "اس کے دماغ پر یہ اثر عارضی ہو گا... آدمی مستقل مزاج ہے۔"

وہ دونوں مجھے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں راستے میں ان کو ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ ہنستا رہا اور روتا رہا۔ انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر پھینک دیا۔ میں فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ان سب مکروہ آوازوں کا شور... اس لڑکی کی جگر خراش چیخیں، سراج کی بھیانک ہنسی... سب ختم ہو گئے۔ ذہن سے سارے بے آبرو نقش محو ہو گئے۔ مجھے احساس سے پناہ مل گئی۔ جب میں پھر ہوش میں آیا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں اسی زنداں کے اندھیرے میں تھا اور تنہا تھا۔ میرے قریب اسٹول پر وہی شخص بیٹھا تھا جس کو میں نے سوالنامے کے جوابات پیش کیے تھے۔ کاپی اس کے ہاتھ میں تھی۔ "ہیلو۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ "میں تمھارے جوابات دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کاپی کے صفحات پلٹتا رہا۔

"دیکھو... مجھے یہ بتا دو کہ تم کون ہو؟" میں نے لجاجت سے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے میرا نام..." وہ بے نیازی سے بولا۔ "نام سے کیا فرق پڑے گا تم کو... فرض کرو میرا نام ایکس ہے۔ یہ نام جاسوسی ناولوں اور کہانیوں میں بہت مقبول ہے۔ تم مجھے مسٹر ایکس کہہ سکتے ہو۔"

"مسٹر ایکس... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "اگر میں کچھ بتا سکتا تو ضرور بتا دیتا۔ ایم آر ایس ویسی تنظیم نہیں ہے جیسی پی ایل او... یا پھر آئی ایل آر۔ اس میں صرف ہم لوگ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ کچھ سوالات کے میں نے عمداً غلط جواب دیے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ لو دوسری کاپی۔ شام تک اس میں صحیح جوابات لکھ دو... جس حد تک لکھ سکتے ہو۔ ورنہ کل ایک اور فلم کی شوٹنگ ہوگی۔ فلم ویسی ہی ہوگی جیسی تم نے کل دیکھی تھی مگر اس کی ہیروئن رابعہ ہوگی۔"

"تم نے یہ دھمکی کل ہی مجھے فلم دکھا کے دے دی تھی۔" میں نے سوالنامہ لیتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کاش وہ مجبوریاں میری اپنی ہوتیں..."

"جو کسی طرح بھی مجبور نہیں وہ ایک خدا کی ذات ہے۔" وہ بولا۔

"تم خدا کی بات کیوں کرتے ہو۔ تم اس کے وجود کے قائل ہوتے تو تمہارے دل میں اس کا خوف بھی ہوتا... جو کچھ تم کرتے ہو یا کر سکتے ہو اس پہ تو شاید خود شیطان بھی شرمسار ہو۔"

"ہر شخص اپنے اعمال کی سزا اگر خود کاٹتا ہے تو کوئی انوکھی یا غلط بات نہیں۔" وہ بولا۔ "مگر جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا... یا ہو سکتا ہے اس میں رابعہ کی کوئی خطا نہیں۔ اس کے ذمے دار تم ہو... تم اسے بچا بھی سکتے ہو... نہ بچانا چاہو تو ایک بار پھر اس سوالنامے کو غلط بھر کے دیکھو۔"

"میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یقین کرو سچ اتنا ہی ہے جتنا تم پہلے سے جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو میرے جوابات مطمئن نہیں کریں گے۔ تم یہ سمجھتے رہو گے کہ میں حقائق کو چھپا رہا ہوں۔ کسی دوسرے شہر میں یا ملک میں ہماری کوئی شاخ نہیں۔ ہمارا کوئی حمایتی تک نہیں۔ تم تصدیق کر سکتے ہو کہ کسی بھی سیاسی جماعت نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ کوئی ہمیں جانتا ہی نہیں تو رابطہ کیسے قائم کرے گا۔"

"میرا خیال ہے ایسے جوابات سے بات نہیں بنے گی۔" وہ بولا۔

"تو پھر یہ لے جاؤ۔" میں نے سوالنامہ اسے واپس کر دیا۔ "ویسے بھی میں تم کو کسی وعدے کا پابند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ میرے پاس اپنے سچ کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچ اگر ایکس رے میں ظاہر ہو سکتا یا کسی لیبارٹری ٹیسٹ سے معلوم کیا جا سکتا تو ہم سب کے لیے کوئی پریشانی کی بات ہی نہ ہوتی مگر اب بات یقین کی ہے۔ ہم سے تم لاکھ بار پوچھو۔ کسی بھی طرح پوچھو... جواب وہی رہے گا۔"

"یہ مسئلہ تو ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "اور افسوس کی بات میرے لیے یہ ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔"

"دشمن کی کون مدد کرتا ہے۔ آخر تم میرے دشمن ہو اور میں تمہارا دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا کہ تمہاری کسی بھی ضمانت کی کوئی حیثیت ہے۔ تم اگر کہو کہ سکندر بخت یہ لو خنجر اور اپنا گلا کاٹ لو۔ اس کے بعد باقی سب کو چھوڑ دیا جائے گا... تو یہ حرام موت ہوگی۔ میرے جان دینے کے بعد بھی تم باقی سب کے ساتھ وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔ مجھ سے کیے ہوئے وعدے اور میری قربانی کا کو خیال تک نہیں آئے گا۔ تم کہو گے کہ وہ تو بے وقوف تھا کہ ہم نے کہا اور اس نے مان لیا۔ خس کم جہاں پاک۔ اور بات صرف میری نہیں۔ تم کسی کے سامنے بھی یہ شرط رکھو گے تو وہ دوسروں کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو جائے گا۔ جسے تم بے وقوفی سمجھ سکتے ہو وہ ہم سب کے لیے خلوص اور وفاداری کے جذبات کا نام ہے۔"

"میں ایسی کوئی شرط عائد نہیں کر رہا ہوں۔"

"ہاں... تمہاری شرط اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "تم سچ جاننا چاہتے ہو اور ہمارے سچ کو سچ نہیں مان سکتے پھر ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔"

"گویا تم نے آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی بھی سوال کا جواب نہیں دو گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے فیصلے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جواب دوں یا نہ دوں، تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔ تم ہمیں جیسے جی چاہے مار ڈالو۔ تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کرو... بے آبرو کر کے مارو... ہمارے جسم سے قطرہ قطرہ خون کشید کر دو یا ہمیں پرزہ پرزہ کرو... جو ہم نہیں جانتے وہ کیسے بتا سکتے ہیں۔ تم تو ہماری لاشیں ٹٹولتے ہوئے بھی پشیمان نہیں ہو گے۔ دعا کا کیا سوال ہمیں گالی ہی دو گے کہ حرام زادے ضدی تھے۔ جان دے دی مگر بتایا کچھ نہیں۔ ہمارا وقت بھی برباد کیا اور توانائی بھی ضائع کی۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پھر سر ہلایا مگر اس سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ قائل ہو گیا ہے یا کچھ اور فیصلہ کر چکا ہے۔ جب وہ دروازے کے قریب تھا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے کہا۔ "تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ کیتھرین کی حالت اب کیسی ہے؟"

"کوئی خاص فرق نہیں... ڈاکٹر نے کہا تھا کہ مینٹل شاک کی یہ کیفیت عارضی ہوگی تو چوبیس گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔ چوبیس گھنٹے تو گزر گئے۔ اب یہ ہے کہ اسے کسی نیورو سرجری کے وارڈ میں کسی ماہر کی زیر نگرانی رکھا جائے تو وہ ہوش میں آ سکتی ہے مگر وقت کا تعین مشکل ہے۔ ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں... مہینہ بھر بھی۔"

"اور اگر وہ اسی طرح پڑی رہی تو...؟"

اس نے فقط کندھے ہلا کے لاعلمی کا اور مایوسی کا اظہار کیا۔ "یہ تو پھر جو خدا کی مرضی۔ جب تک زندگی ہوگی جیے گی اسی طرح..." وہ پھر جانے کو تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔

"شہلا کی کوئی خبر ہے...؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا سوال احمقانہ تھا۔ بھلا انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ شہلا کی خیریت معلوم کرتے پھریں۔ اُن کی بلا سے کل کی مرتی آج مر جائے۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہا۔ میری عقل تجھ سے مدد اور رہنمائی مانگتی ہے میرے پروردگار۔ میں نے دل کی آواز میں کہا۔ میں کیا کروں۔ اگر اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت ممکن نہیں تو ہمارے لیے موت کو آسان کر دے۔ شہلا اور محسن کے لیے۔ کیتھرین کے لیے۔ میرے اور رابعہ کے لیے۔ ہمیں موت سے پہلے کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

میں نے وہ سارا دن یوں گزارا جیسے سزائے موت پانے والا قیدی زندگی کا آخری دن بسر کرتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح اندر مختصر سے دائرے میں چلتا رہا یہاں تک کہ میری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ڈاکٹر دو بار آیا اور مجھے چیک کر کے چلا گیا۔ اس نے مجھے فٹ قرار دیا۔ میں نے اس کو بہت گالیاں دیں... اسے قصاب، جلاد اور شیطان کہا۔ میرا ذہنی توازن پھر بگڑنے لگا تھا۔ میں دروازہ کوٹتا رہا اور رابعہ اور محسن کو آوازیں دیتا رہا۔ پھر دلاور اور سراج کو گالیاں دیتا رہا۔ ان کی منت سماجت کرتا رہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری آواز کسی کے کانوں تک پہنچ رہی ہے تب بھی بے اثر ہے۔

میں نے سارا دن کھانا نہیں کھایا اور جو کھانا آیا تھا وہ ملازم کے منہ پر پھینک دیا۔ رات آئی تو مجھے ان گولیوں کا خیال آیا جو میں نے ڈاکٹر سے لی تھیں۔ وہ آٹھ گولیاں میرے بستر کے نیچے موجود تھیں۔ میں نے آٹھوں گولیاں ہتھیلی پر رکھیں اور چبا کے کھا گیا۔ ان کا ذائقہ بہت خراب تھا مگر میں نے مزے لے لے کر سب کو حلق سے اتار لیا۔ اور نیند، بے ہوشی یا موت کا انتظار کرنے لگا۔

میری آنکھیں نیم غنودگی سے بوجھل ہو رہی تھیں جب میں نے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ یوں چلا رہی تھی جیسے وحشی اور بھوکے بھیڑیے ہر طرف سے اس کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اس پر یلغار کر رہے ہوں۔ "خدا کے لیے... چھوڑ دو مجھے... مجھے جانے دو... سکندر... مجھے بچاؤ... سکندر... سکندر..." وہ اسی طرح چیخ رہی تھی جیسے وہ لڑکی جسے میں نے ایک فلم میں بڑی بے آبروئی اور بڑے عذاب کے ساتھ مرتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ بات بھی یاد تھی کہ یہ سب کچھ رابعہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آواز رابعہ کی ہے۔ میں نے نیم خوابیدہ ذہن کو بیدار کیا اور غور سے سننے کی کوشش کی۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ رابعہ تھی... رابعہ نہ ہوتی تو مجھے کیوں پکارتی۔ لیکن اس وقت تک میرے حواس پہ نیند غالب آنے لگی تھی۔

دوسری بار میں نے پھر وہی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی فریاد سنی۔ یہ رابعہ کے سوا کسی کی آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"یا اللہ... اللہ میری توبہ..." وہ شدید تکلیف میں دہشت سے چیخ رہی تھی۔ "چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو... خدا کے لیے..."

"رابعہ..." میں نے دیوانہ وار چلا کے کہا اور بند دروازے پہ مُکّے مارنے لگا، پوری قوت کے ساتھ۔ جیسے اپنے خالی ہاتھوں کی قوت سے میں دروازے کو توڑ ڈالوں گا۔

"اللہ... اُف اللہ... آہ... قسم خدا کی... قسم رسول ﷺ کی... مجھے نہیں معلوم..." اس کی مسلسل چیخوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ "ارے ظالمو... مجھے مار ڈالو... میرا گلا کاٹ دو... گولی مار دو مجھے... لیکن مجھے ایسا عذاب مت دو... یا خدا... ہائے میں کیا کروں... کدھر جاؤں... سکندر... مجھے بچاؤ سکندر... سکندر... سکندر..."

"رابعہ..." میں نے دروازے پر پاگلوں کی طرح یلغار کی۔ "رابعہ... میں آ رہا ہوں... میں ان سب کا خون پی جاؤں گا... دلاور... سراج... رابعہ کو چھوڑ دو... اسے کچھ نہیں معلوم... اسے عذاب مت دو..." میں نے دروازے پر لاتیں اور مکّے برسانا جاری رکھا۔ میرے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ میرا دماغ رابعہ کی مدد کی پکار سے مفلوج ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ان پتھر کی دیواروں سے گزر کے رابعہ تک پہنچ سکوں لیکن میں چلا چلا کے کہہ رہا تھا کہ میں آ رہا ہوں اور مسلسل اس بند دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ تھا کہ رابعہ اس تہ خانے میں کدھر ہے۔ کتنے بند دروازے اور کتنی سنگ و خشت کی دیواریں میرے اور اس کے درمیان حائل ہیں۔ میں تو اس کے جسم پر گزرنے والا سارا عذاب جھیل رہا تھا۔ اس کی ہر صدا پر میرے دل میں درد کا آتشیں نشتر پیوست ہو جاتا تھا اور ایک ناقابلِ برداشت کرب بن کے میرے وجود کو پگھلنے لگتا تھا۔ میرے احساس کو سُن کرنے لگتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور اس کی ہر چیخ ایک تڑپ تھی۔ میری آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں کہ وہ بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں ہے جو اس کے بدن پر اپنے سفاک پنجوں اور اپنے خونی دانتوں کی درندگی آزما رہے تھے۔ اس کے زخمی لہولہان جسم پر اپنے شیطانی ہاتھوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے حیوانیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اسے ہوس پرست، سفاک اور خون آشام جانور بھنبھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف سے نوچ رہے تھے۔ کاٹ رہے تھے اس کے گرد جمع ہو کے دہشت اور بربریت کا ننگا رقص کر رہے تھے۔ عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی عصمت اور عفت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور معصومیت کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ اور وہ چلّا رہی تھی۔ خدا کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ مجھے بُلا رہی تھی۔ موت مانگ رہی تھی۔

میں نے چیخ چیخ کر دلاور کو اور سراج کو ایک سے ایک گندی گالی دی اور اپنا سر دروازے سے ٹکرانے لگا۔ رالعبہ کی آواز میرے دل کو یوں پارہ پارہ کر رہی تھی کہ ہر قطرۂ خوں درد و کرب کا سمندر بن کے اُبلنے لگا تھا لیکن پھر بھی وہ دُکھ بھری، بے بس پکارتی ہوئی آواز کئی ہزار نوکیلے دندانوں والی آری کی طرح میرے جگر کو کاٹتی جا رہی تھی۔

بالآخر دروازہ کسی نے باہر سے کھولا۔ میں ایک وحشی قوّت کے ساتھ باہر نکلا اور اس جال میں اُلجھ گیا جو شکاری پہلے سے پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ نائلون کی مضبوط ڈوریوں سے بنا ہوا جال تھا جو عین درِ زنداں کے مقابل رکھا گیا تھا کہ میں اپنے پاگل پن میں نکلوں تو مجھے قابو کرنے کے لیے کسی کو ایک انگلی بھی نہ ہلانا پڑے۔ وہ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر سکتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو بھی میرے سامنے آئے گا مارا جائے گا خواہ اس کے ہاتھ میں مشین گن ہی کیوں نہ ہو۔

جال ایک دم میرے گرد لپٹ گیا۔ میں نے ہر طرف ہاتھ پیر چلائے اور اس جال کی ڈوریوں کو ہاتھوں سے توڑنے کی اور دانتوں سے کاٹنے کی دیوانہ وار کوشش کی مگر میری ساری جدوجہد تلوار سے ہوا کو کاٹنے یا سمندر کے ٹکڑے کرنے کی احمقانہ کوشش کے سوا کچھ نہ تھی۔ جال سمٹتا گیا اور میں چیختے چیختے سچ مچ پاگل ہو گیا۔ میں اس وقت اپنی حالت دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میرے حلق سے بے ربط اور بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں کبھی رالعبہ کو پکارتا تھا کبھی دلاور اور سراج کو، پیڈرو کو اور خسرو جمشید کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ میں نے ان سب کی ماں بہن کو ایک کر دیا تھا۔ میں انھیں مضحکہ خیز دھمکیاں دے رہا تھا اور جال میں یوں تڑپ رہا تھا جیسے جنگل میں پکڑا جانے والا خونخوار چیتا۔ مجھے پیش کرنے والے وہی دونوں خاموش رہنے والے تھے جو صرف حکم کے غلام تھے اور اسی طرح کام کرتے تھے جیسے مشینی نظام والا روبوٹ کسی آپریٹر کے اشارے پر چلتا ہے۔ ان کے ذاتی جذبات و احساسات کا سرے سے وجود نہ تھا۔ وہ بے پناہ قوت کے مالک تھے اور جسمانی اعتبار سے دیوزاد تھے۔ ان کو خصوصی تربیت کے ذریعے ہر صورتِ حال سے نمٹنا سکھا دیا گیا تھا چنانچہ وہ خالی ہاتھوں سے لڑ سکتے تھے۔ یا قتل کر سکتے تھے۔ ابھی تک انھوں نے اسلحہ استعمال نہیں کیا تھا مگر میرا بہت پہلے سے خیال تھا کہ وہ ریوالور سے اسٹین گن تک سب کچھ چلاتے ہوں گے اور ممکن ہے ہر قسم کی گاڑی ڈرائیو کر سکتے ہوں اور جہاز اڑا سکتے ہوں۔ وہ محض اعلیٰ تربیت یافتہ اور ہر کام کی

صلاحیت رکھنے والے ملازم تھے جن کو اطاعت گزاری اور وفاداری کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔

وہ مجھے جال میں گرفتار کر کے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں نے خود کو پھر اسی ممنازیم جیسے عقوبت خانے میں پایا۔ میرا خیال تھا کہ رالعبہ اسی عذاب گاہ میں ہوگی مگر وہاں صرف دلاور تھا جو بڑے طنزیہ اور معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میں ابھی تک جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو زخمی کر لیا تھا، اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور اپنے بال نوچ ڈالے تھے۔ میرے بازوؤں سے، میرے ماتھے سے اور چہرے سے رسنے والے خون کی لکیریں میری حالت کو مزید مضحکہ خیز بنا رہی تھیں۔ مجھے اب رالعبہ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ بے ہوش پڑی ہوگی۔ شاید وہ مر گئی ہوگی۔ میں نے سہم کر سوچا۔

سراج اندر آیا اور دلاور کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ دونوں میری دیوانگی اور میری بے چارگی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میری سعیِ رائیگاں پر خندہ زن تھے۔ وہ اپنی فاتح قوت کے غرور کا مقابلہ میری شکست کی ذلّت سے اور میری مجبوری سے کر رہے تھے۔

"بھئی سراج صاحب! یہ اپنے سکندرِ اعظم ہیں۔ ایم آر ایس کے چیئرمین۔" دلاور نے اپنے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

سراج نے قہقہہ مارا۔ "چوہے دان کے اندر چوہا۔"

"ایسا تو مت کہو یار... یہ ماشاءاللہ سے بڑے جیالے اور سُورما ہیں۔" دلاور بولا۔ "جوڈو کراٹے جانتے ہیں۔ میرے تمھارے جیسے دس کو چیت کر سکتے ہیں۔ دیوار کو یوں گرا سکتے ہیں۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

سراج نے آگے بڑھ کر میرے بال پکڑ لیے۔ "یہ تو بہت پتلی ڈوریاں ہیں۔ دیواریں گرا سکتے ہو تو ان کو کیوں نہیں توڑ سکتے... تم تو نر شیر ہو اور یہ جال تو خرگوش پکڑنے کے کام آتا ہے۔"

"سراج... ایس پی صاحب... خدا کے لیے۔" میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"اب خدا یاد آیا۔" سراج نے میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اتنی قوت سے جھٹکے دیے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کیا یہ خدا کا حکم تھا کہ ایم آر ایس بناؤ۔"

"اور اپنے سکندر صاحب! یہ تو بڑی بزدلی دکھا رہے ہو۔ آپ جیسے عزت والے کبھی ہم جیسے کمینوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں؟" دلاور نے طنز سے کہا اور پیچھے ہاتھ باندھ کے ٹہلنے لگا۔ "آپ تو خیر سے مجاہد ہو۔ جان و مال اور عزت و آبرو سب قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو... وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ

صاحب نے کہ مر گئے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی۔ شعر و شاعری کی بات ہے، اس لیے صحیح یاد نہیں مگر کچھ ایسا ہی ہے اس میں، آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

"سراج! تمھیں اپنی ماں کی قسم۔" میں نے کہا۔ "رالعبہ کو چھوڑ دو۔"

سراج نے میرے سر پہ لات ماری۔ "اچھا سلوک کیا تھا تم نے میری ماں کے ساتھ۔ اس نے ایک رات تم کو مہمان رکھا اور پھر تم نے اسی کے گھر کو بم سے اُڑا دیا۔"

"لیکن اس کو تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم نے اُسے نکال لیا تھا۔"

"کیا اس سے تمھارے جرم کی سنگینی کم ہو جاتی ہے؟" سراج نے دوسری لات میرے بازو پر ماری۔ "تم کسی عورت کو گھر سے نکال کے گھر کو آگ لگا دو۔ بم سے تباہ کر دو... اور پھر کہو کہ عورت کی زندگی تو بچا لی۔ یہ پوچھو اس عورت سے کہ اس کے دل پر کیا گزری۔ اس کے دل میں تمھارے لیے شکر گزاری کے جذبات ہیں یا نفرت کے؟ وہ گھر میرے باپ کا تھا۔ میری ماں کے شوہر کا۔ اس گھر میں جو کچھ تھا اس سے میری ماں کی تمام زندگی منسوب تھی۔ اس کی یادوں کا سارا خزانہ لوٹ لیا تھا تم نے... اس کو بے گھر کر دیا تھا۔"

"جانے دو سراج۔" دلاور بولا۔ "ان سے ناتجربہ کاری اور جوانی کے جوش میں بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔ ہمارا تو نقصان کیا سو کیا اپنا بھی خوب بیڑا غرق کیا انھوں نے... واہ بھئی، واہ اپنے سکندر صاحب... پڑھ لکھ کے بھی آپ ہم سے زیادہ بے وقوف رہے۔ کیا بہادری ہے کہ دشمن کے سر پہ ڈنڈا مارا تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی۔"

"میں تم کو آخری موقع دے رہا ہوں۔" سراج نے سو فیصد ایس پی کے لہجے میں کہا۔ "بہت لحاظ کر لیا میں نے۔ اس کمینے سندر نے تم کو بہت گمراہ کیا۔ تم یہ سمجھنے لگے کہ بس اب تمھارے حمایتی اور مددگار پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے حقارت سے ایک گندی گالی دی۔ "یہاں اُن کے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے۔ نہ تمھارے وہ انکل رضوی ایس ایس پی بہادر... نہ وہ ایس آئی اکرام... بے غیرت شخص۔ اس کی بہن فاحشہ ہے۔ راتوں کو گھر سے باہر رہتی ہے۔ جوان مردوں کے ساتھ جہاں چاہتی ہے راتیں گزارتی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا۔ دنیا نہیں جانتی کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں ہو۔ صرف آوارہ مزاج، مغرب زدہ اخلاقی اقدار کے ماننے والے... مادر پدر آزاد لڑکے اور لڑکیاں وہاں بھی مشترکہ خاندان بنا کے رہتے ہیں۔ شادی کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ معاشرتی، خلقی اور مذہبی زنجیروں کو توڑ کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے انفرادی آزادی حاصل کر لی۔ ان کے لیے خاندان کچھ نہیں اور خاندانی ذمے داریاں بھی کچھ نہیں۔"

"تم بکتے ہو۔" میرا خون کھنچ کر سر میں آ گیا۔

"نہیں... میں جانتا ہوں، تم نے چار سال لندن میں گزار کے یہی سیکھا اور اب وہی سب کچھ یہاں کر رہے ہو۔" سراج نے کہا۔ "تم سب جوائنٹ فیملی سسٹم پر رہتے ہو...... کیسا نکاح اور کیسی شرعی قیود۔ تم حیوانی سطح پر رشتے قائم کرتے ہو..... میں جانتا ہوں کہ یورپ میں بھی یہ انتہائی گرے ہوئے، معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے، بے ضمیر اور بے کردار افراد کا شیوہ ہے۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ وہاں ننگوں کے کلب بھی ہیں اور ان کے ممبر لباس کو انسان کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لباسِ فطرت تو برہنگی ہے۔ خدا آدمی کو دنیا میں جس طرح بھیجتا ہے اسے ویسے ہی رہنا چاہیے۔ تمام ذی روح رہتے ہیں۔ انسان بھی جانور ہے۔ اگر تعلق رکھتا ہے تو کیا ہوا۔ تم نے بھی شاید یہاں خود ایم آر ایس کے نام پر وہی کلب بنا رکھا ہے اور یہ جو ڈھونگ رچایا ہے تم نے کہ تم محبِ وطن ہو، یہ سب اپنے کرتوتوں کا پردہ ہے۔ رالعبہ تمھاری ہی نہیں محسن، غالب اور ٹیڈی کی بھی...."

"سُور کے بچّے...... خبیث..... کتّے۔" میں نے غصّے میں پاگل ہو کے چیخنا شروع کیا۔ "ایک بار مجھے چھوڑ کے دیکھ... پھر میں تجھے بتاؤں کہ ماں اور بہن میں کیا فرق ہوتا ہے۔ بیوی، محبوبہ اور داشتہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے، مگر تم نے سب کو ایک کر دیا ہے۔" سراج نے کمینگی سے کہا۔ "تم سب کے سامنے مُنہ پر کسی کو بہن کہتے ہو کسی کو بھابی۔ مگر ہیں وہ سب تمھارے لیے صرف عورتیں...."

میں اسے چیخ چیخ کر گندی گالیاں دینے لگا۔ دلاور مسکراتا رہا، میں جال میں پھنسا ہوا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھے مگر بالکل محفوظ تھے۔ پھر میری آواز بیٹھ گئی۔ میرے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا اور سراج پھر بولنے لگا۔ اس نے نازو، شہلا اور رالعبہ کے بارے میں اور زیادہ غلیظ باتیں شروع کر دیں۔ میں تھک گیا تھا۔ اگر میرے اعصاب پہلے کی طرح مضبوط ہوتے تو میرا ردِّ عمل یہ نہ ہوتا۔ میں ساری بکواس سُن کر بھی پُرسکون رہتا اور سمجھتا کہ کُتّا بھونک رہا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ بھونکنا کُتّے کی فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ کبھی کبھی وہ کاٹ لے تب بھی کوئی ایسی بات نہیں مگر اس وقت میں اپنے آپ پر قابو رکھنے میں ناکام تھا۔ ذرا سی بات سے میرے اعصاب کے تار جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ جب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ سراج کی ہرزہ سرائی کا مقصد صرف مجھے ذہنی اذیت پہنچانا اور میرے اعصاب کو زیادہ کمزور کرنا ہے تاکہ میری مزاحمت کی قوت کم سے کم ہو جائے تو میں خاموش پڑا سب سنتا رہا۔ کیا یہ لوگ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کر رہے ہوں گے؟ رالعبہ پر ہونے والے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تشدد کو تو میں نے دل کی آنکھ سے دیکھا تھا اور خود بھی جھیلا تھا مگر مجھے محسن اور ٹیڈی یا کیتھرین کی کوئی خبر نہ تھی۔ کیا ان پر بھی ایسے ہی جسم اور ذہن کو شکست دینے والے حربے آزمائے گئے ہوں گے؟ جواب اثبات میں آیا۔ یہ لوگ کسی کو بھی رعایت دینے والے نہیں تھے۔ مایوسی کی انتہا کو پہنچنے کے بعد میں بے حد قنوطی ہو گیا تھا۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی تھی کہ اس مصیبت سے ہمیں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ میں بتا سکتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ پوچھ رہے تھے۔ میرے پاس اگر سونے کا ایک سکہ تھا جسے میں چھپا سکتا تھا تو وہ مجھ سے سونے کی کان کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے جو میرے فرشتے بھی نہیں بتا سکتے تھے۔ میں ان کی ہر شرط قبول کرنے کو تیار تھا۔ میں ایم آر ایس سے دستبرداری قبول کر سکتا تھا۔ اپنے مشن سے تائب ہونے پر تیار ہو سکتا تھا۔ انھوں نے ذہنی اور جسمانی طور پر مجھے ہی نہیں میرے حوصلے کو بھی ختم کر دیا تھا۔ مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میری ساری جدّوجہد بے مقصد اور احمقانہ تھی۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا۔ کوئی پتھر یا فولاد کا مجسمہ نہیں تھا کہ مجھ پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا اور میں سُپرمین نہیں تھا کہ ساری عمر ہر قسم کا تشدد جھیلتا رہتا اور پھر بھی اپنی بات پر اُڑا رہتا۔ یہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا لیکن انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا کہ ہم کچھ کر سکتے اور پہلے جو ہوا اس کو بھول کر ندامت کا اظہار کرتے اور آئندہ کے لیے وہ راستہ اختیار کر لیتے جو ہمیں دکھایا جاتا۔ دشمنوں سے نجات مشروط تھی اور ان کی شرائط کو ناممکنات میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ فلموں، قصے کہانیوں اور تصورات کی دنیا میں ہیرو ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ وہ تنہا سارے دشمنوں کو زیر کر دیتا ہے۔ سماجی اور معاشرتی اقدار کو، یہاں تک کہ قانون کو شکست دے سکتا ہے۔ فوجوں سے لڑ جاتا ہے اور سب پر غالب آتا ہے۔ عملی زندگی میں ایک آدمی کا بدمعاشوں۔ اسمگلروں۔ پولیس یا مسلح افراد کی طاقت سے مقابلے کا سوال ہی نہیں۔ وہ مارا جاتا ہے اور کبھی ہیرو نہیں بن سکتا۔ چنانچہ معاشرے میں بُرائی بڑھتی جا رہی ہے۔ زبردست کی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ لاقانونیت کا رجحان پھیل رہا ہے اور اصول پرستی، فرض شناسی اور قانون یا حق کی باتیں کرنے والے احمقوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا تھا۔ اس جال کے اندر میں واقعی خود کو چوہے سے زیادہ حقیر، کمزور اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ جب میں نے خاموشی پر غور کیا تو سر اٹھا کے دیکھا۔ کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے جال میں باندھ کر لانے والے شکاری تک رخصت ہو چکے تھے۔ میں جال سمیت ادھر سے اُدھر لڑھکنے کے لیے آزاد تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس ہال کے سارے دروازے بند تھے۔ اوپر ایک لائٹ جل رہی تھی اور یہ وہی بے رحم لائٹ تھی جو تیز ہو جاتی تھی تو آنکھوں میں زبردستی گھستی تھی۔ اسے کسی ریگولیٹر سے تیز یا مدھم کیا جاتا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے سر گھما کے دیکھا، شکاری اب محسن کو دوسرے جال میں گرفتار کر لائے تھے۔ انھوں نے محسن کو گھسیٹ کر میرے قریب ڈال دیا اور لوٹ گئے۔ محسن کے گرد بھی جال یوں لپٹا ہوا تھا کہ وہ ایک گٹھڑی بن گیا تھا۔

"محسن!" میں نے بمشکل تمام کہا۔ "تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں..." وہ کراہ کے بولا۔ "انھوں نے مجھے مرنے نہیں دیا۔"

"ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ ہم حالات کی موافقت یا اتفاق سے بچتے رہے تھے اور جو کچھ ہم نے کیا تھا اس سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم ان کو ختم کر دیں گے۔"

"حالانکہ ایسا سوچنا بھی بے وقوفی تھا۔ یہ ایک طاقت ہیں۔ ان کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ ہے، وسائل ہیں اور فوجی قوت ہے۔" محسن بولا۔

"اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔" میں نے کہا۔ "یہ بتا کہ ہم ان کی غلط فہمی کیسے رفع کریں؟ کیسے یقین دلائیں ان کو کہ ہم ہی ایم آر ایس ہیں۔ ہم کوئی قومی یا عالمی دہشت گرد یا حریت پسند تنظیم نہیں ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی سیاسی حمایت حاصل نہیں ہے۔ ہماری پُشت پر کوئی سُپر پاور نہیں ہے۔"

"اس کا یقین تو انھیں ہمارے مر جانے کے بعد بھی نہیں آئے گا۔" محسن بولا۔ "لیکن موت ابھی کہاں۔"

"کیا انھوں نے تجھے... بہت تشدّد کیا تجھ پر؟"

"تجھ پر تشدد نہیں ہوا کیا؟" محسن نے کہا۔ "میں اور تو اور ہم سب ان کے لیے برابر ہیں۔ سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہو رہا ہے۔ اس میں شک کی کون سی بات ہے۔"

میں محسن کی حالت دیکھ سکتا تھا۔ جال کے اندر سے بھی اس کے پھٹے کپڑے... چوٹوں کے نشانات... بدن کے نیل اور لہو کے داغ دکھائی دیتے تھے۔

"محسن... انھوں نے رابعہ کو..." میں نے کہا۔

"دل کو پتھر کر لے سکندر... رابعہ سب سے زیادہ عذاب جھیلے گی کیونکہ وہ عورت ہے اور ہم سب کی کمزوری ہے۔ جذبات کے رشتے سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں... انہی سے آدمی کا استحصال ہوتا ہے۔" محسن بولا۔

"کیا تجھ کو معلوم ہے کہ... کہ شہلا...؟"

"ہاں، شہلا مر گئی۔" محسن نے سکوت سے کہا۔

"مر گئی...؟"

"ہاں... کیا تجھے نہیں معلوم؟" محسن تلخی سے بولا۔

"مجھے صرف آسا بتا یا تھا... کہ اس نے ایک گردہ جولی کے لیے دینے کی غلطی کی تھی۔" میں نے بمشکل تمام کہا۔

"غلطی؟ غلطی کیسی... اس نے تو بہت اچھا کیا کہ اپنے بے مقصد... آسان اور ثواب کی موت قبول کی۔" محسن ہنسنے لگا۔ میری طرح اس کا ذہنی توازن بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔

"اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..."

"اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ ایک دن وہ بھی یہاں پہنچتی... آج نہ سہی تو کل... ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد..." محسن بولا۔ "یا اس وقت جب اس کے وجود سے جنم لینے والے بچے کے دنیا میں وارد ہونے کے دن قریب ہوتے۔ ابھی تو وہ وقت بہت دور تھا... وہ یہ سب عذاب کیسے برداشت کرتی سکندر... اور وہ بچہ... اس نے تو کوئی قصور نہیں کیا تھا مگر اس کو بھی سزا ملتی... اب وہ ماں کے ساتھ مر گیا... اچھا ہوا... میں نے اس کی صورت صرف تصور میں دیکھی... وہ میری گود میں نہیں کھیلا... اسے بھول جانا آسان ہو گا... شہلا نے بھی صرف خواب دیکھے تھے۔ ابھی اس کی مامتا کے سوتے نہیں پھوٹے تھے۔ وہ اسے اپنی کوکھ میں چھپا کے ان بے رحم درندوں کی دسترس سے دور چلی گئی۔ زمین میں چھُپ گئی... اس نے بہت اچھا کیا سکندر۔ بے شک وہ جولی کی جان نہ بچا سکی... لیکن اس نے نیت کا ثواب حاصل کر لیا... نیکی کمالی... اس کی بخشش ہو گئی۔ وہ تو اس معصوم کے طفیل بھی بخشی جاتی جس کو اس نے اپنے وجود میں سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ زندگی خدا کی امانت تھی اور شہلا نے باعزت طور پر اسی کو لوٹا دی... یہاں بے عزت ہو کے مرنے سے اسے کیا ملتا۔" وہ اب زار و قطار رو رہا تھا۔ میں رحم کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اطلاع کہ شہلا بھی مر گئی میرے دل کے زخم پر تازہ دہکتے انگارے کی طرح تھی جس کی اذیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"میری شہلا مجھے چھوڑ گئی سکندر۔ وہ میرے بچے کی ماں نہ بن سکی۔" محسن نے روتے ہوئے کہا۔ "اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا۔ نہ اپنے لیے، نہ تیرے لیے، نہ ایم آر ایس کے لیے۔"

مایوسی... مایوسی... مایوسی... ہر سمت ناامیدی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا... زندگی کی مجبوریاں... زندہ رہنے کا عذاب۔ نجات کا سراب۔

"کیا جولی بھی مر گئی ہے محسن؟"

"ہاں۔ مجھے کیتھرین نے بتایا تھا۔" محسن بولا۔

"اور کیتھرین پھر بھی زندہ ہے۔"

"میں اور تو بھی زندہ ہیں۔" محسن نے کہا۔ "زندہ نہ رہنا بھی ہمارے بس میں نہیں تو پھر کیا کریں... کیسے مریں؟"

"کیا ہم ایک دوسرے کے جال کی ڈوریاں نہیں کھول سکتے؟"

"معلوم نہیں۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟" محسن بولا۔ "وہ ہمیں پھر باندھ جائیں گے۔"

"ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کوشش کی ضرورت کیا ہے۔ جال کاٹ دیا تب بھی یہاں سے نکل تو نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔

میں نے محسن کی بات نہ مانتے ہوئے لڑھکنا شروع کیا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میرے مجبور کرنے پر محسن نے ہر طرف سے میرے جال کو دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر میں نے اُسے چاروں طرف سے دیکھا تب مجھے یقین آیا کہ اس جال کے کسی پھندے کو کاٹنا یا کھولنا ممکن نہیں۔ اس کا کوئی کنارا نہیں تھا۔ کسی جگہ ڈور کا کونا نہیں تھا اور سب پھندے ایک سے کسے ہوئے لگتے تھے۔ ڈوری کو دانت سے کاٹنے کی کوشش میں میرے دانت درد کرنے لگے مگر ڈوری پر اثر نہ ہوا۔

"آخر ایسے کب تک چلے گا محسن؟" میں نے کہا۔ "کب تک یہاں رکھیں گے یہ لوگ ہمیں؟"

"یہی سوال میں تجھ سے کرتا ہوں۔ مجھے تو جواب نہیں معلوم۔ تجھے معلوم ہے تو بتا دے۔" محسن بولا۔

سراج اور دلاور ایک بار پھر اندر آئے۔

"ہاں بھئی! اپنے سکندر بخت صاحب! خوب گپ شپ رہی پھر یاروں میں؟" دلاور نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔

"آج شہلا کی تدفین ہے... اور جولی کی بھی۔" سراج نے خباثت سے مسکرا کے کہا۔ "ہم نے ایک آدمی بھیجا تو ہے کہ فلم بنا لے یا کم سے کم تصویریں لے آئے۔"

"ایک فلم آپ نے ضرور دیکھی ہو گی یہاں... اپنے سکندر صاحب! ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے۔" دلاور نے لبوں پر زبان پھیر کے آنکھ ماری۔ "وہاں ولایت میں آپ نے مووی کی بہت فلمیں دیکھی ہوں گی مگر کیا وہ ایسی تھیں؟"

"اور وہ فلم تجربہ حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔" سراج نے کہا۔ "تجربہ ہی آدمی کے کام آتا ہے۔ اب جو فلم ہم آج بنائیں گے ابھی تھوڑی دیر میں... وہ بہت بہتر ہو گی... ہر لحاظ سے۔"

"اور آپ یہ سمجھ لیں جنابِ عالی۔" دلاور نے کہا۔ "کہ جہاں اس وقت ہم ہیں، یہ اسٹوڈیو ہے... اپنے سراج صاحب بڑے اچھے ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے سارا انتظام کیا ہے۔ لائٹ مین۔ کیمرا مین... ایکٹر جو ہر سین میں الگ ہوں گے۔"

"ایک ہی ہیروئن کے ساتھ۔" سراج نے قہقہہ مارا۔

"ہم کوشش کریں گے کہ انجام ویسا نہ ہو۔" دلاور مسکرایا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ جو لڑکی تھی، وہ ہماری ناتجربہ کاری کے باعث مر گئی تھی۔ ان شاء اللہ اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ اور ہیروئن خود اپنی فلم کا ہر شاٹ دیکھے گی۔ اس کی کاپیاں سارے پاکستان میں نمائش کے لیے بھیجی جائیں گی۔ خاص طور پر تمھارے ایس ایس پی صاحب کو۔"

"نازو کے گھر والوں کو۔" سراج بولا۔ "اور وہ جو محسن کی بہن ہے نا... تمھاری پرانی داشتہ... اس کے شوہر کو۔"

ایک بار پھر میرے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں چلانے لگا اور انھیں گالیاں بکنے لگا۔ "تم سب کتے ہو... شیطان ہو... رابعہ کے ساتھ تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو... وہ تم کو کچھ نہیں بتا سکے گی... اس کو کچھ معلوم ہی نہیں۔"

"تم تو جانتے ہو... شوٹنگ کے دوران میں جب مناسب سمجھو بتا دینا... ورنہ فلم تو پوری بنے گی۔" سراج بولا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ دو افراد بڑے بڑے کیمروں کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے، یہ فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والے کیمرے تھے جو تختوں پر نصب اسٹینڈ کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ تختوں کے نیچے بال رولر تھے۔ چنانچہ انھیں کسی بھی سمت میں گھمایا اور چلایا جا سکتا تھا۔ پھر دو آدمی بھاری بھرکم سرچ لائٹس اٹھا کے لائے۔ انھوں نے لوہے کے اسٹینڈ والی لائٹس کو آمنے سامنے رکھ دیا اور ان کے پلگ لگا کے روشنی کے سیلاب کا رُخ متعین کرنے لگے۔ کیمروں نے بھی ایک پلیٹ فارم کو فوکس کیا جو لکڑی کا بنا ہوا تھا اور زمین سے ایک فٹ اونچا ... لمبائی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ پلیٹ فارم کمرے کے دوسرے کنارے پر اور ہم سے پندرہ فٹ دور تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ... جیسا کمرہ پہلے اتنا بڑا نہیں تھا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ درمیان کی دیوار ہٹا لی گئی ہے۔ یہ دیوار لوہے کی سمٹ جانے والی گرل تھی جس کے سامنے پہلے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دو حصوں کے ایک ہو جانے سے کمرے کی مجموعی لمبائی چوبیس پچیس فٹ ہو گئی تھی مگر چوڑائی اتنی ہی رہی تھی۔ جو کچھ وہاں ہونے والا تھا اس کا تصور کرنے سے ہی میرا جسم سرد پڑنے لگتا تھا اور میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

"محسن!" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے۔ تو ڈر رہا ہے؟"

"ہاں یار... یہ لوگ ... نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے... یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ ان سے کہہ ایسا نہ کریں... جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لیں۔"

"یہ میرا کہنا ماننے والے لوگ نہیں ہیں... ورنہ رابعہ کی جگہ ہی نہیں تیری جگہ بھی میں خود کو پیش کر دیتا۔" محسن دکھی لہجے میں ... نیلی اور کیتھرین کی جگہ بھی میں خود پر سارا ظلم برداشت ... یہاں سودا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ سودا وہ کر سکتے ہیں جو کچھ دے سکتے ہوں۔ ہمارے پاس کیا ہے دینے کو؟"

"ہاں، جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں... وہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اچانک رابعہ کی آواز پھر سنائی دی۔ "چھوڑ دو... خدا کے لیے... مجھے معاف کر دو... اللہ... یا اللہ... اللہ... ہائے... ہائے میں مر گئی... سکندر..."

"میرے کانوں میں سیسہ ڈال دے محسن..." میں نے اپنے ہاتھوں کی دونوں انگلیاں کانوں میں ٹھونس کر کہا مگر رابعہ کے چیخنے کی آواز اسی طرح سنائی دیتی رہی۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا محسن۔"

"کاش میں بھی ہو جاؤں۔" محسن بولا۔ "دیوانگی میں احساس کا یہ عذاب تو نہیں ہوگا۔ میں خود بھی پاگل ہو جانا چاہتا ہوں تاکہ دکھ سکھ، دوسروں کے رنج و غم سب سے نجات مل جائے۔ کوئی فکر نہ رہے۔ کوئی خیال پریشان نہ کرے۔ نہ آج کی پروا ہو نہ کل کی... نہ زندگی کا حصار ہو نہ موت کی تمنائے لاحاصل۔"

"میں بہت بے غیرت ہوں محسن۔" میں نے کہا۔ "مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کاش مرنا میرے اختیار کی بات ہوتی۔ میں سانس روک لیتا اور پھر نہ لیتا۔ میں اپنے دل کی دھڑکن کو روک لیتا۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ ابھی تک میرا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا جب میں نے سُنا کہ شہلا مر گئی ہے... میرا بچہ مر گیا ہے میرا اور اس کے سارے خواب مٹی میں مل گئے ہیں تو صدمے سے میری حرکتِ قلب بند کیوں نہیں ہوئی۔ آخر وہ بھی تو ہوتے ہیں جو بہت معمولی سے جذباتی دباؤ پر ہارٹ فیل ہونے سے مر جاتے ہیں۔" محسن پھر رونے لگا۔ اس کے اعصاب بھی جواب دے چکے تھے۔ وقت ہمیں کہاں لے آیا تھا کہ ہماری ساری شوخی اور ظرافت کافور ہو گئی تھی۔ عزم و حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ امید کے آسرے باقی نہ رہے تھے۔ خود پر آنے والے دن پر سے اور دنیا کی ہر چیز پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ہم اب زندگی کی نہیں موت کی بات کرتے تھے۔ تقدیر ہمیں دیارِ غیر سے... سات سمندر پار ولایت سے اپنے وطن لائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش اور ابتلا کا دور شروع ہوا تھا۔ عارضی اور وقتی کامیابیوں کے فریب نے ہمیں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور انجام یہ ہوا تھا کہ اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد ہم موت سے بدتر عذاب جھیل رہے تھے اور ایک بہت پُراذیت دنیاوی جہنم میں جھونک دیے گئے تھے۔

وہ دونوں گونگے کمانڈوز پھر نمودار ہوئے اور انھوں نے مجھے اور محسن کو گھسیٹ کر کمرے کی دوسری دیوار سے لگا دیا۔ دیوار کے نچلے حصے میں وہ دو کنڈے پہلے ہی لگا چکے تھے۔ انھوں نے جال کو اس کنڈے میں یوں پھنسا دیا کہ ہمارے لیے نہ کھڑا رہنا ممکن رہا نہ بیٹھنا۔ ہم نیچے ہوتے تو ہمارے پیر زمین پر ٹک جاتے تھے لیکن باقی دھڑ اوپر رہتا تھا۔ کھڑے ہونے کی جال میں گنجائش نہ تھی۔ بینک سے منسلک ہو جانے کے بعد ہمارے لیے دائیں بائیں گھومنا بھی ممکن نہ رہا۔ معلوم نہیں اب ان کے شیطانی دماغ میں کیا تھا۔ وہ صرف ہمیں دہشت زدہ کر رہے تھے یا سچ مچ کوئی بھیانک کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔

جب وہ رابعہ کو گھسیٹتے ہوئے اندر لائے تو میرے جسم کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ وہ چوبیس فٹ دُور مخالف دیوار کے ایک در سے آئے تھے۔ رابعہ ان کے ہاتھوں کی گرفت میں مچل رہی تھی اور ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو اس نے اسیری کے وقت پہن رکھا تھا۔ اس کو اندر لانے والے بھی وہی دونوں گونگے کمانڈوز تھے اور ان کی فولادی گرفت میں رابعہ اسی طرح تھی جیسے باز کے پنجوں میں ایک ناتواں فاختہ۔ رابعہ اب چلا نہیں رہی تھی کیونکہ اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ دو انچ چوڑے میڈیکل ٹیپ نے اس کے ہونٹوں کو ملا کے بند کر دیا تھا۔

"سُنو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "خُدا کے غضب سے ڈرو۔ اس عورت کو مار ڈالو مگر اس پر یہ ظلم مت کرو۔"

"... بند کر لے سکندر۔" محسن نے مشورہ دیا۔ جو ... حالات میں سب سے اچھا مشورہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ... ختم ہیا۔ میری ... تصور ... جو زیادہ لرزہ خیز تھا۔ میں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ رابعہ اب اسٹیج کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ سراج اور دلاور اس پلیٹ فارم کے دائیں اور بائیں جانب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ سراج کے اشارے پر باری باری دونوں سرچ لائٹس آن ہوئیں... دو کیمرا مین اور دو لائٹ مین اسی وقت آ گئے تھے جب میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے فرض کیے بیٹھا تھا کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں رہی۔

سب سے آخر میں پیڈرو آیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن میں اتنی دور سے الفاظ کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ پھر پیڈرو نے ایک قہقہہ لگایا اور نیچے جھکا۔ اس نے ایک انتہائی شرمناک حرکت کی اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔ رابعہ نے لاتیں چلائیں، تب مجھے پتا چلا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر رسیوں سے باندھ دیے گئے ہیں۔ چاروں رسیوں کے کنارے پلیٹ فارم کے چاروں کونوں پر بندھے ہوئے تھے چنانچہ وہ حرکت تو کر سکتی تھی مگر اس شکنجے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ پیڈرو کے ہاتھ میں سُلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ وہ نیچے جھکا اور اس نے وہ سگریٹ رابعہ کے جسم پر رکھ دی۔ وہ بُری طرح تڑپی۔ پھر میں چلایا۔ میں پیڈرو کو گالیاں دینے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ میری طرف بالکل متوجہ نہیں ہوا۔

سراج آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم مجھے وہ سب بتا سکتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا... معلوم ہوتا تو اب ضرور بتا دیتا۔" میں نے دہاڑیں مار مار کے روتے ہوئے کہا۔ "تم کو اللہ رسول کا واسطہ... رابعہ کو چھوڑ دو... اس کے ساتھ ایسا مت کرو۔"

"یہ سب تو تمھاری ضد کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ہمیں بہرحال معلوم کرنا ہے کہ پاکستان بھر میں تمھارے ایجنٹ کہاں ہیں۔ کون ہیں اور کیا پلان رکھتے ہیں۔" سراج بولا۔ اس پر میرے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی لوٹ گیا۔

ایک گھنٹے بعد جو شاید ایک پورے دن سے بھی زیادہ طویل عذاب رکھتا تھا، قدرت نے میری مدد کی۔ میں پاگل ہو گیا۔ لیکن پاگل ہونے سے پہلے میں نے رابعہ کے ساتھ وہ سب کچھ ہوتے دیکھا جو اس سے پہلے ایک فلم میں کسی نامعلوم لڑکی کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ فلم تھی، یہ حقیقت... وہ لڑکی مظلوم ضرور تھی مگر اس کے ساتھ میری کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور لڑکی ہوگی۔ یہاں میرے سامنے رابعہ تھی۔ ایک کلی سے زیادہ معصوم اور پھول سے زیادہ نازک۔ اس کے آس پاس وہ انسان تھے جن سے شیطان شرمائے۔ ان کی سفاکی سے درندے پناہ مانگتے اور حیوان توبہ کرتے۔ ان میں سب سے نمایاں کردار پیڈرو کا تھا لیکن اس کا ساتھ دونوں گونگے کمانڈوز نے بھی دیا —— انھوں نے مجھ پر ایک ظلم یہ بھی کیا تھا کہ رابعہ کے ہونٹوں کو آزاد کر دیا تھا۔ اس کی دل کو خون کر دینے والی چیخوں سے میرے لیے کہیں مفر نہ تھا۔ جو کچھ رابعہ کے ساتھ ہوا وہ... پولیس بدترین اخلاقی مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کرتی —— سراج نے ہدایات دیں اور باقی لوگوں نے جس طرح رابعہ کے جسم کو نوچا کھسوٹا .... جلایا کاٹا اور بربریت کا نشانہ بنایا اس کا الفاظ میں بیان ممکن ہی نہیں... سراج کئی بار میرے پاس یہ پوچھنے کے لیے آیا کہ اب میرا کیا خیال ہے۔ میں اس وقت تک پاگل ہو چکا تھا۔ میں جال سمیت اُچھل رہا تھا اور چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ میرے لبوں سے کف جاری تھا اور میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں میں نے اس سے کیا کہا۔ میں رو پا پیٹا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اسے سب کے واسطے دیے۔ دھمکیاں اور گالیاں دیں مگر وہ سب پتھر کے آدمی تھے۔ رابعہ ان کے جور و ستم کی انتہا سے گزر کے بار ہا بے ہوش ہوئی۔ انھوں نے اس کے خوب صورت بال جلا دیے اور میں نے بالوں کے جلنے سے اٹھنے والی بُو کو اپنے حواس پر یلغار کرتے محسوس کیا۔ ... میں ہنسنے لگا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"محسن! یہ سب تُو نہیں دیکھ رہا ہوگا؟" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ پتا نہیں، مجھے کیا نظر آرہا تھا۔ عجیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں رابعہ کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ وہ یہاں ہے ہی نہیں... وہ تو انکل رضوی کے گھر میں ہے۔"

"یہ رابعہ نہیں ہے سکندر۔" محسن نے کہا۔ وہ بھی پاگل ہو چکا تھا۔ میں نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ رابعہ پھر چلّانے لگی۔ مگر اب وہ مر رہی تھی۔ اس کی آواز میں نزع کا کرب آگیا تھا۔

اس وقت مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ محسن نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور چیختے چیختے ایک وقت ایسا آیا تھا جب میرے حلق سے آواز نکلنا بھی بند ہوگئی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ میں آزاد ہوتا تو کچھ نہ کچھ ضرور کر بیٹھتا۔ میں انھیں قتل نہ کر پاتا تو خود کو نقصان پہنچاتا۔ میرے ہاتھ میں کوئی چیز آجاتی میں اپنی جان لینے کے لیے استعمال کرتا اور کچھ بھی نہ ملتا تو دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاتا۔ جب مجھے ایک دہشت انگیز اور انسانیت سوز مظالم کی فلم دکھائی گئی تھی تو میں نے سوچا بھی تھا کہ یہ سب رابعہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ ایک خیال تھا۔ خیال سے حقیقت تک یقین کے ہزار مرحلے تھے اور میں نے پہلے ہی مرحلے میں اپنے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ دلیل میرے کام آئی تھی کہ فلم کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سب کیمرا ورک تھا اور کسی پیشہ ور اداکارہ یا فاحشہ کی خدمات مُنہ مانگی قیمت دے کر حاصل کرنے کے بعد یہ شوٹنگ کی گئی تھی چنانچہ رابعہ کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے جینے کے لیے مادّی سہاروں کے ساتھ ذہنی اور روحانی اطمینان اور اعتماد کے سہاروں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ہر روز سڑکوں پر پیش آنے والے بدترین حادثات کی دردناک تفصیلات پڑھ کے اور تصویریں دیکھ کے بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوتا اور یہ نہیں مانتا کہ وہ خود بھی ایسی ہی خبر بن سکتا ہے... اگر یہ خوف غالب آجائے تو وہ پاگل ہو جائے۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دے۔ زینے پر اترنا چڑھنا چھوڑ دے کہ اس پر سے بھی پیر پھسل جائے تو گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ بجلی کی چیزوں کو ہاتھ نہ لگائے کہ برقی جھٹکے سے بہت لوگ مرتے ہیں لیکن جینے کی خواہش آدمی کو اس خوف سے دور رکھتی ہے اور اس کے یقین کو متزلزل نہیں ہونے دیتی کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ میں نے مان لیا تھا کہ رابعہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا اور یہ لوگ صرف مجھے ڈرا رہے ہیں لیکن وہ خیال جس پر میں یقین کرتے ہوئے ڈرتا تھا، سچ بن کے سامنے آیا تو خوف اور صدمے کی شدت نے میرے ذہن کو پھر تحفظ فراہم [illegible] میں ہوش سے بیگانہ ہوگیا اور احساس کے عذاب سے بچنے

کے لیے میں اس خیال کی پناہ میں چلا گیا کہ وہ رابعہ نہیں تھی۔

جب وہ رابعہ کی لاش اُٹھا کے لے جا رہے تھے تو میں زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ سراج اور دلاور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آکے رُک گئے۔

"کیا یہ سچ مچ پاگل ہوگیا ہے؟" سراج نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" دلاور بولا۔

"میں پاگل ہوں؟" میں نے قہقہہ مارا۔ "پاگل تم دونوں ہو... مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔ کیا میں سمجھتا نہیں کہ یہ سب ڈراما تھا۔"

"یہ ڈراما نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ "تمھاری ضد کی وجہ سے رابعہ کو..."

"وہ رابعہ نہیں تھی..." میں نے ایک گالی دے کر کہا۔ "میں اندھا نہیں ہوں کہ رابعہ کو بھی نہ پہچان سکوں۔"

"پھر وہ کون تھی... اپنے سکندر صاحب۔" دلاور مُسکرایا۔

"وہ تیری ماں تھی اُلّو کے پٹھے۔" میں نے ہنس کر کہا... "پوچھ لو محسن سے... کیوں محسن... وہ سراج کی ماں تھی نا؟"

"تو ٹھیک کہتا ہے سکندر... وہ رابعہ نہیں تھی۔" [illegible] نے میری تائید کی۔

"وہ بے وقوف لڑکی مر گئی بالآخر۔" سراج نے کہا۔ "کیا ملا اس کو ضد سے؟"

"کیا تم اس کی لاش دیکھو گے؟" دلاور بولا۔

"لاش..." میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ میرے قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ "میں تمھاری لاش دیکھنا پسند کروں گا... میں اپنی لاش دیکھنا پسند کروں گا... اپنے چوہدری صاحب... میں مر گیا ہوں... رابعہ کو بتا دینا... اس سے کہنا کہ میری لاش کو نیلا کفن دے۔ گہرا نیلا جس پر زرد پھول ہوں۔ اس کی ایک ساری ہے ایسی ہی... اسی میں لپیٹ دینا مجھے۔ رابعہ، شہلا اور روحی سے کہنا کہ میرے لیے تاج محل بنوائیں۔ شہلا کے بچے کا نام سکندر بخت رکھنا۔"

میں نے محسن کو دھاڑیں مار مار کے روتے سُنا اور اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ "تجھے کیا ہوا شیروانی کے نیچے... اچکن کی اولاد... تیرے کون سے بیوی بچے مر گئے ہیں جو تو رو رہا ہے۔"

میں اسی طرح شور کرتا رہا اور جال کے اندر پاگل جانور کی طرح اچھلتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ دلاور اور سراج چلے گئے۔ محسن چلّا چلّا کے مجھ سے کچھ کہتا رہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سُنی۔ پھر وہی دونوں گونگے کماندو نمودار ہوئے اور مجھے لے گئے۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں لے جا کر آزاد کیا، میں مقید پاگل کتے کی طرح لپکا اور ان دونوں سے چمٹ گیا۔ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ ایک نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ میں پھر اُٹھا اور ان سے یوں لڑنے لگا

جیسے وہ میرے جانی دشمن ہیں اور میں نے ان کو نہ مارا تو وہ مجھے [illegible]دیں گے۔ میرے ہاتھ پیر بجلی کی طرح چل رہے تھے اور دیوانگی نے مجھے غیر معمولی قوت عطا کر دی تھی۔ میں نے ایک کو اتنی پھرتی اور مہارت سے فلائنگ کِک ماری کہ وہ دیوار سے ٹکرایا اور کچھ دیر کے لیے بے سُدھ ہوگیا مگر اتنی دیر میں دوسرا مجھ پر [illegible] پڑا۔ اس نے مجھے اُٹھنے ہی نہ دیا اور بال پکڑ کے میرا سر فرش پر [illegible]نے لگا۔ میں نے چیختے چلّاتے ہوئے اس سے مقابلہ جاری رکھا اور اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ میرا وجود مکمل تاریکی میں نہیں ڈوب گیا۔

مجھے معلوم نہیں بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ درمیان میں ہوش کے مختصر وقفے یوں آتے رہے جیسے صحرا کے بے کنار کے [illegible] سفر میں نخلستان۔ میرے کانوں نے کچھ آوازیں سُنی جو [illegible] نہیں تھیں اور اندھیرے میں سایوں کی طرح لرزتے ہوئے [illegible] [illegible] میں مِلے لیکن میرا ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ پھر ایک رات میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ سرتاپا سفید لباس میں تھی جو بالکل کفن کی طرح تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اس نے اپنا [illegible] میرے ہاتھ میں دے دیا جو برف کی طرح سرد تھا۔

"یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے، سکندر؟" وہ بولی۔

"مجھے کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو قبر کی تنگی کا [illegible] بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی قبر بہت کشادہ محسوس ہوتی ہے۔"

"یہ تمھاری قبر نہیں ہے۔"

"اچھا! تو کیا یہ تمھاری قبر ہے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "انھوں نے مجھے بھی تمھارے ساتھ ہی دفن کر دیا ہوگا۔ عاشقی کی روایات کچھ ایسی ہی ہیں۔ غالباً لیلیٰ مجنوں کا مدفن بھی ایک تھا اور [illegible] جولیٹ کا بھی۔"

"خلا کے بیچ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ تمھارا کمرہ ہے۔" وہ [illegible]۔

"قبر بھی ایک کمرہ ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"سکندر! تم زندہ ہو۔ میں بھی زندہ ہوں۔" رابعہ نے مجھ پر جُھک کر کہا۔

"یہ حیات بعد از موت ہے۔ ہماری دوسری ابدی زندگی۔" [illegible] نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں سکندر! یہ وہی دنیا ہے۔" رابعہ کی آنکھوں سے [illegible] قطرۂ اشک میری پیشانی پر ٹپکا۔

"کون سی دنیا... وہ جس میں میرے باپ کے قاتل تھے؟ [illegible] اور سراج تھے، وطن دشمن اور انسانیت فروش شیطان۔ [illegible] اور تمھاری خوشیوں کے دشمن۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں... وہی دنیا..."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں ہم نہیں مل سکتے [illegible] تمھارے بغیر میں اس دنیا میں کیسے رہ سکتا تھا۔ اب کوئی ڈر نہیں..."

"سکندر! میں زندہ ہوں... تم نے غلط دیکھا تھا۔ وہ سب تمھاری نظر کا دھوکا تھا۔" رابعہ نے کہا۔

"دھوکے میں نے بہت کھائے تھے رابعہ... لیکن اب ہم وہاں ہیں جہاں کوئی ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ میں مر چکی ہوں؟" رابعہ نے کہا۔ "دیکھو... اچھی طرح دیکھو میں زندہ ہوں... وہ میں نہیں تھی... جسے تم نے مرتے دیکھا تھا... وہ سب ڈراما تھا... شوٹنگ تھی... جیسے فلموں کے مناظر کی شوٹنگ ہوتی ہے... دیکھنے والوں کو سب بالکل حقیقی لگتا ہے... محسن نے تم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی... وہ سب سمجھ گیا تھا کہ جس لڑکی... پر ... ظلم کیا گیا تھا... وہ میں نہیں تھی... وہ ایک ایکٹریس تھی... میری اور اس کی صورت میں تھوڑی سی مشابہت ہے... باقی مشابہت میک اپ سے پیدا کی گئی تھی۔ اسے میرے کپڑے پہنا دیے گئے تھے... تم بہت دُور سے دیکھ رہے تھے اور تمھارا دماغ کام نہیں کر رہا تھا... تم نے سمجھ لیا کہ وہ میں ہی ہوں... یہ سب تم کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا... وہ ایکٹریس بھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا... وہ سب کیمرا ٹرک تھی... وہ چیخوں کی آواز بھی اس کی نہیں تھی... میری بھی نہیں تھی۔ وہ ریکارڈ تھا۔ ٹیپ کی ہوئی آوازیں تم کو سنوائی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ نہ کسی قسم کی زیادتی ہوئی نہ اس پر تشدد ہوا، نہ ملہیٹ کی گئی لیکن ایسا تو فلموں میں دکھایا ہی جاتا ہے۔ یہ کون سی غیر معمولی یا مشکل بات ہے۔ اس شوٹنگ کا بندوبست دلاور نے کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ وہ ایسے ڈرامے پہلے بھی کرتا رہا ہے... یہ اسی کے شیطانی ذہن کی سازش تھی۔ اس ایکٹریس کو خراش تک نہیں آئی۔ وہ کوئی ایکٹریس بھی نہیں، شاہی محلے کی ایک طوائف کی بیٹی ہے۔ ایسی ہی گندی فلموں میں کام کرتی ہے اور اس کو ذرا شرم نہیں آتی۔ میں نے بعد میں اس کی اور دلاور کی ساری گفتگو سُنی تھی۔ اُسے پچاس ہزار روپے دیے گئے تھے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا... جہاں میرا کمرہ ہے، اس کے پیچھے ہی وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور مجھے ان کی گفتگو روشندان سے سنائی دے رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ فلم بنانے والوں کا مقصد کیا ہے۔ اس کے خیال میں مقصد مختلف کیسے ہو سکتا تھا۔ پہلے بھی اس نے ایسی ہی فلموں کے لیے کام کیا تھا۔ دلاور اس کی اداکاری کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ وہ کون تھا جو درمیان میں چلّا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا... دلاور نے اُسے بتایا کہ فلم کی سچویشن ہی ایسی ہے۔ ایسی فلموں میں کہانی تو برائے نام ہوتی ہے۔ دلاور نے کہا کہ فلم میں یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کی نظروں [illegible] ہوا تھا جو لڑکی کو چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا۔ چنانچہ اس کا یہ رول بالکل حسبِ حال تھا۔ اس کی چیخ پکار، گالی گلوچ اور احتجاج ایک فطری امر تھا... وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ دراصل وہ تم کو نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس کے سامنے دو سرچ لائٹس تھیں اور تم روشنی کے پیچھے بہت دُور تھے۔ وہ سمجھتی رہی کہ جیسے اس کی آوازیں اصلی نہیں بلکہ پہلے سے ٹیپ کی ہوئی تھیں اور وہ ان آوازوں کے مطابق تاثرات دے رہی تھی، ایسے ہی تمھلا ہنگامہ بھی صوتی اثرات کا نتیجہ تھا... اب آیا تمھاری سمجھ میں؟ مجھے چھُو کر ہاتھ لگا کے دیکھ لو... میں زندہ ہوں اور حقیقی رابعہ ہوں... مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے... تم بھی بالکل ٹھیک ہو اور میں تمھارے پاس ہوں۔"

بے شک اس کی باتوں کو میرے ذہن نے قبول کیا تھا اور میں کچھ پُرسکون ہو کے سنتا رہا تھا لیکن بے یقینی کے اثرات باقی تھے۔ میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے میرے دماغ کے اندر مکمل تاریکی تھی مگر اب نامعلوم سمت سے روشنی اندر آرہی ہے۔ یہ روشنی بہت کم تھی۔ میں واضح طور پر کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں خود کو اندھے خلا کی قید میں محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں خود کو دیکھ سکتا تھا اور ہر طرف تجسس کی نظر ڈال سکتا تھا اور اب وقت اور مقام کا تعین کرنا چاہتا تھا... میں کون ہوں؟ زندہ یا مُردہ... اور کہاں ہوں؟ عالمِ خاک و باد میں یا عالمِ ارواح میں... رابعہ کی کچھ باتیں میری سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ نہیں۔ جیسے دسویں جماعت تک سائنس پڑھنے والے طالب علم کو زمین کی کشش اور اس کے دائرے سے نکلنے والے راکٹ کی رفتار کا اصول تو سمجھ میں آئے مگر خلا میں اس کے مدار اور حرکت کے سائنسی فارمولے اور ایرو ناٹکس کی فنی اصطلاحات محض کنفیوژن پیدا کریں۔ میں اُسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہی جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر وہی دونوں نمودار ہوئے۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا: "آ گئے... ملک الموت..." میں نے انگلی اُٹھا کے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔" رابعہ کھڑی ہو گئی۔

"یہ جہنم کے فرشتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تم کو نہیں آنے دیں گے۔"

"نہیں سکندر! یہ میرے اور تمھارے جیسے انسان ہیں..." رابعہ نے کہا۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ ایک وقت تھا جب رابعہ کا ذہنی توازن برقرار نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں مر چکا ہوں اور میں نے سخت کوشش کے بعد اس کو قائل کیا تھا کہ یہ غلط ہے۔ فریبِ خیال ہے اور حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں... اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔ رابعہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں زندہ ہوں اور وہ بھی زندہ ہے مگر میرا ذہن اس خیال سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ ہم دونوں مر چکے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد بھی میرا ذہن بے سروپا خیالات کی یلغار میں رہا۔ یہ سب بے ربط خیالات تھے۔ بے سمت بھٹکنے والے اور کسی وجہ کے بغیر آنے جانے والے۔ میرے دماغ میں ساری عمرِ گزشتہ کی یادیں وقت اور مقام کی ترتیب سے محفوظ تھیں۔ بالکل کسی ماڈرن سُپر اسٹور میں قاعدے اور سلیقے سے رکھے ہوئے سامان کی طرح... ایک زلزلے نے سب کچھ تہ و بالا کر دیا تھا۔ سب خلط ملط ہو گیا تھا۔ ترتیب بگڑ گئی تھی اور اب ایک ڈھیر تھا جس میں ہاتھ مارنے سے کبھی کچھ مل جاتا تھا، کبھی کچھ لیکن یہ مشکل تھا کہ ضرورت کی کوئی چیز تلاش کی جائے تو آسانی سے ہاتھ سیدھا وہیں جائے جہاں وہ چیز موجود ہو۔ مجھے تمام واقعات، چہرے اور مقام اس طرح یاد آتے تھے جیسے سینما اسکرین پر ایک سلائیڈ آئے اور دوسری جائے لیکن ایک اشتہار کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مجھے بہت سے لوگ یاد آئے جو مر چکے تھے اور انہی کے ساتھ جولی یاد آئی۔ شہلا یاد آئی اور آخر میں رابعہ... مگر رابعہ کہتی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ شہلا بھی زندہ ہو؟ جولی بھی زندہ ہو؟ میں سوچنے لگا۔ میرے ذہن کا خلا کبھی کباڑی کی دکان بن کے بھر جاتا تھا تو کبھی ایسے رہ جاتا تھا جیسے لوٹی ہوئی دکان... مجھے اتنا ہوش ضرور تھا کہ کچھ لوگ میرے سامنے بار بار آتے ہیں۔ ان میں سے دو میرے لیے کھانا لائے تھے۔ ایک ڈاکٹر تھا جو صبح شام آتا تھا۔ دو بار میں نے اس پر حملہ کیا مگر اس کے ساتھ آنے والوں نے مجھے بے بس کر دیا اور وہ مجھے انجکشن لگا کے چلا گیا۔

پھر ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے محسن دکھائی دیا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ "محسن! یار! یہ کیا چکر ہے؟"

محسن کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "کیا چکر ہے؟"

"یہ خواب ہے یا حقیقت؟" میں نے کہا۔

"تو مجھے خواب میں نہیں دیکھ رہا ہے۔" محسن بولا۔

"عجیب بات ہے... رابعہ کو بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوا"

"وہ بھی خواب نہیں تھا۔ وہ خود تیرے پاس آئی تھی اور یہ ٹھیک ہے کہ اُسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" محسن بولا۔ "اور کیا کہتی تھی وہ؟"

میں نے سوچ سوچ کر یادداشت کی مدد سے وہ سب بتایا جو مجھ سے رابعہ نے کہا تھا۔ محسن مسکراتا رہا۔ پھر اس نے بھی وہی کہا جو رابعہ نے بتایا تھا۔

"تو صحیح کہ [illegible] ہے؟" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "وہ سب ڈھونگ تھا... دلاور کا ڈراما تھا... فلم کی شوٹنگ تھی۔"

"ہاں یار... وہ شاید تجھے فلم بھی دکھاتے۔" محسن نے خوش ہو کے کہا۔ "مگر وہ شوٹنگ انھیں مہنگی پڑی... تیرا دماغ اُلٹ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس کا اثر زیادہ دیر نہیں رہا۔ انھوں نے رابعہ کو بھی اسی لیے بھیجا تھا اور مجھے بھی اسی لیے لایا گیا ہے کہ ہم لوگ تجھے یقین دلا سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں کہ رابعہ پر کوئی تشدد نہیں ہوا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی۔ وہ ہم سے مدد لینے پر مجبور تھے۔ یہ دلاور اور سراج کا آئیڈیا تھا۔ وہ عینک والا جو سب کا چیف ہے یا مشن کا نگراں ہے، اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک فلم دکھانا کافی ہے۔ اس نے بادلِ ناخواستہ ایک ایسے منظر کی شوٹنگ کی اجازت دی تھی جس میں کسی کو رابعہ بنا کے پیش کیا جائے۔ جب وہ ایک عورت کو لے آئے جو رابعہ کی ہم شکل تھی اور یہ مشکل رول کرنے پر تیار تھی تو اس نے بھی یہ تجربہ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ بعد میں وہ دلاور اور سراج پر بہت بگڑا کہ انھوں نے انتہا پسندی سے کام لیا اور اگر سکندر کا ذہنی توازن ٹھیک نہ ہوا تو ان کے حق میں بھی ٹھیک نہ ہوگا... وہ کہتے تھے کہ ایک سکندر کے نہ ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تفتیش دوسروں سے بھی کی جا سکتی ہے... مگر وہ کہتا تھا کہ مجھے آگے بھی جواب دینا ہے۔"

"یہ سب باتیں تو نے کیسے سُن لیں؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ نہیں سُنا۔" محسن بولا۔ "رابعہ کو جس کمرے میں رکھا گیا ہے اس کا روشندان باہر کی طرف دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ وہاں ان کا آفس ہے یا وہ کمرہ اس عینک والے کا ہے۔ اس کا نام کسی کو بھی نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ وہ انڈین [illegible]ی انٹیلی جنس کا کوئی اعلیٰ افسر ہے۔"

"میں نے اس سے نام پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اسے مسٹر [illegible] سمجھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسا کہ عموماً چیف کا نام ہوتا ہے۔"

"وہی مسٹر ایکس اس بات کا ذمّے دار ہے کہ ہمیں بحفاظت [illegible]لت سے لے جائے اور اعلیٰ حکام کے سپرد کر دے۔ کچھ معلومات [illegible]ں حاصل کرنا ضروری تھیں۔" محسن نے کہا۔ "تاکہ وہ تصدیق کر لیں [illegible] ہم میں سے کوئی ان کے حربوں سے زیر نہیں ہوا۔"

"اب ان کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ سمجھتے ہیں کہ [illegible] اس سے زیادہ کچھ معلوم ہی نہیں یا ہم کچھ بتا نہیں رہے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ اب ہمارے متعلق ان کی رائے کیا [illegible]" محسن نے کہا۔ "یہ سب کچھ مجھے رابعہ سے معلوم ہوا ہے۔ وہ روشندان سے کان لگا کے باتیں سُنتی رہتی تھی۔ اگر دوسری طرف [illegible]س نہیں تو پھر مسٹر ایکس کا کمرہ ہے۔"

جیسے شیطان کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا نام لیا اور وہ حاضر، ایسے ہی مسٹر ایکس اندر آ گیا۔ وہ سوٹ میں تھا۔ کریم کلر کے سوٹ کے نیچے اس نے ڈارک براؤن شرٹ پہن رکھی تھی اور کریم کلر کی ٹائی بڑی نفاست سے باندھ رکھی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے بہ یک وقت مجھے اور محسن کو مخاطب کیا اور مسکرایا۔ میں اپنے اسی بستر پر تھا جو فرش پر بچھا رہتا تھا اور محسن اسی پر میرے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ مسٹر ایکس کے بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی اور وہ نیچے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اوّل تو یہ اس کی شان کے خلاف تھا کہ ایک دشمن، مجرم کے ساتھ فرش نشیں ہو۔ دوسرے اس کو اپنے سوٹ کی استری کے خراب ہونے کا ڈر تھا۔

"میں... افسوس کا اظہار کرنے آیا تھا۔" اس نے عادت کے مطابق کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔

"کس بات پر؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہوا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "اس میں میری مرضی بہرحال شامل نہیں تھی۔"

"تمھاری مرضی کیا تھی؟" محسن نے طنز سے کہا۔

"کچھ نہیں... سوری... میں صرف حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اور اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے پیچھے سائے کی طرح ایک محافظ نمودار ہو گیا تھا، جو اب دروازے سے ذرا آگے مشین گن تانے کھڑا تھا اور اپنے جارحانہ انداز سے ہر لمحہ دھمکی دیتا معلوم ہوتا تھا کہ خبردار جو مجھے غافل سمجھتے ہوئے کوئی غلط حرکت کی۔ خود مسٹر ایکس بھی اپنی حفاظت کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔ اس وقت بھی میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی پتلون کی ایک جیب میں سروس ریوالور ہے جو حجم میں بڑا ہونے کی وجہ سے کوٹ کے اوپر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

میں نے محسن کے یوں انگلی چبھوئی کہ وہ نہ دیکھ سکے۔ "میں کچھ کرنے والا ہوں۔" میں نے آہستہ سے فرانسیسی میں کہا۔

مسٹر ایکس چونکا۔ "تم نے کچھ کہا مجھ سے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تم کتے کے بچے ہو۔"

وہ متاثر نہیں ہوا اور مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تم نے کچھ اور کہا تھا، فرانسیسی میں۔"

"تم فرنچ جانتے ہو؟" میں نے مجرمانہ اعتراف بے اختیار کر لیا۔

"فرنچ تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔" وہ بولا۔ "تم کوئی اور زبان بول کے دیکھو مثلاً روسی، بنگالی، عربی، پشتو، جرمن یا ڈچ۔"

"گویا سات زبانیں جانتے ہو تم... انگریزی سمیت۔" محسن نے تعریفی انداز میں کہا۔ "مادری زبان الگ۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم نے کہا تھا... میں... چاہتا ہوں..." وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"میں مرنا چاہتا ہوں... یہی کہا تھا میں نے۔" میں نے کہا۔

خلافِ توقع وہ مطمئن ہو گیا اور اس کے اطمینان سے مجھے اطمینان حاصل ہوا کیونکہ جو میں نے کہا تھا، وہ محسن نے سُن اور سمجھ لیا تھا۔

"... تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب میری مرضی کے خلاف ہوا۔" وہ پھر ٹہلنے لگا۔ محسن میرے سرہانے بائیں جانب بیٹھا تھا...... وہ دائیں طرف مختصر سی جگہ میں ہاتھ پیچھے باندھے ایک دیوار تک جاتا تھا، پھر پلٹ کر دوسری دیوار تک۔ اس طرح ایک راؤنڈ میں دو مواقع ایسے آتے تھے، جب وہ میرے اور مشین گن کے درمیان آجاتا تھا۔

"تمھارا دل رکھنے کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم ہمارے سچ پر اعتبار نہ کرو تو تمھاری مرضی اور جھوٹ کو سچ منوانا چاہو تو تمھیں اختیار ہے۔"

"میں پولیس کا طریقۂ کار اختیار کرنے کو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ جیسے گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے ہانکنا..." وہ بولا۔ "ہر آدمی ایک الگ یونٹ ہے... اپنی ذات کے خول میں بند۔ اس کی شخصیت اور مزاج یا طبیعت... ذہنی ردِعمل کا نام ہے اور... ذہنی ردِعمل میں بہت کچھ آجاتا ہے۔ فرق کے ہزاروں اسباب نکلتے ہیں... سب کو ڈنڈے سے تسخیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور کچھ بہرحال ناقابلِ تسخیر رہتے ہیں۔ میں ان کے اصرار سے مجبور ہو گیا تھا... میں یہ بتانے آیا تھا کہ شاید تم سے یہ میری آخری ملاقات ہو... آرڈر آگئے ہیں کہ تمھیں بھیج دیا جائے۔ میں نے اعتراف کر لیا ہے کہ میں تم سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام رہا۔"

"تمھاری اس ناکامی کو تمھاری نااہلی نہیں سمجھا جائے گا؟" محسن بولا۔ وہ مسٹرایکس کو باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا، کیونکہ اس نے میری نیت کو سمجھ لیا تھا اور وہ دیکھ بھی رہا تھا کہ میں موقع تلاش کر رہا ہوں۔

"اوہ نو... میرے وسائل بہت محدود تھے۔" وہ بولا... "اگلے مرحلے میں جو لوگ تم سے پوچھ گچھ کریں گے، وہ ایکسپرٹ لوگ ہوں گے۔ تفتیش کا فن ایک سائنس ہے اور وہ سائنس داں ہیں... بہت سائنٹیفک طریقے پر کام کرنے والے لوگ...؟ یقیناً نتائج حاصل کرتے ہیں۔ ان کی ایک لیبارٹری ہوتی ہے اور وہاں آدمی کو اسی طرح ٹیسٹ کیا جاتا ہے جیسے... تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ میڈیکل سائنس کی ریسرچ میں سفید چوہے بہت استعمال ہوتے ہیں... گنی پگ... وہاں تمھارے دماغ کے ایک ایک نیچے اور ہر خیال کا تجزیہ کرنے والی جدید ترین مشینیں ہیں۔ تم کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ، وہ تمھارے ذہن کو پڑھ لیں گے۔ بہت سی دوائیں ہیں جو آدمی کے دماغ پر براہِ راست اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس کو بزدل یا بہادر بنا سکتی ہیں۔ اس کی مزاحمت یا سرکشی کو ختم کر سکتی ہیں اور اسے مکمل طور پر مطیع و فرماں بردار کر سکتی ہیں... اس کے ردِعمل اور ہر ذہنی کیفیت کا تجزیہ..."

میرا خیال ہے کہ وہ ایک عام انسانی کمزوری کا شکار ہوا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم کسی کے سامنے کوئی انوکھی یا حیرت انگیز بات کرتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ سُننے والا ہمارے انکشافات سے حیران بھی ہے اور دلچسپی بھی رکھتا ہے تو ہم زیادہ گہرائی میں جا کے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ اسے اپنی معلومات سے امپریس کرتے ہیں۔ یہی مسٹرایکس کے ساتھ ہوا۔ وہ ہمیں یہ باتیں بتانے میں ضرورت سے زیادہ ہی منہمک ہو گیا۔

میں اپنی جسمانی استعداد کا اندازہ کر رہا تھا۔ مسٹرایکس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ کمانڈوز کے ایک مشن کا لیڈر تھا تو ظاہر ہے اپنی صلاحیت کے اعتبار سے خود کو بہت پہلے اس کا اہل ثابت کر چکا تھا۔ اس کا اپنی ذات پر یہ اعتماد اسی اہلیت کی بنیاد پر تھا۔ چنانچہ میرے لیے ناکامی اور کامیابی کے امکانات کو برابر سمجھنا بھی مشکل تھا۔ زیادہ امکان میری ناکامی کا تھا مگر جس شخص کے پاس ہارنے کو کچھ نہ ہو، وہ جوا کھیل سکتا ہے۔ جسے موت یقینی اور ذریعۂ نجات محسوس ہوتی ہو اس کے لیے مرنے سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ان لوگوں کے لیے میری زندگی زیادہ اہم ہے۔ مارنا چاہتے تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا لیکن یہ حکم کی تعمیل کرنے والے لوگ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھے۔ ابھی تک تفتیش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا اور 'گنی پگ'، یعنی ہم کو اب لیبارٹری میں سائنسدانوں کے حوالے کرنا ضروری تھا۔ ابھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ مسٹرایکس نے روایتی طریقے پر تفتیش کی تھی چنانچہ مشن ناکام نہیں سمجھا جا سکتا مگر ہم مارے جاتے تو مشن کہاں رہتا۔ مسٹرایکس کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی کہ وہ ہماری حفاظت کیوں نہیں کر سکا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صرف ہم ہی سے بنیادی نوعیت کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیا وہ ہماری اہمیت کو نہیں سمجھتا تھا؟

مسٹرایکس ہماری جسمانی اور ذہنی صحت کا ذمے دار تھا

اور اس نے ابھی تک اپنی ذمے داری پوری کرنے میں کسی قسم کی نادانی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ایک مرحلے پر دلاور اور سراج کے اصرار کے سامنے جھک جانا اس کی غلطی تھی۔ میری حالت یقیناً ایسی ہو گئی تھی کہ میں جسمانی طور پر زندہ رہتا لیکن میری ذہنی موت واقع ہو جاتی۔ میرا دماغ ان سائنسدانوں کے لیے بیکار ہو جاتا جو اپنے سائنٹیفک طریقوں سے ہر خلیے کے ہر خیال کو پڑھنا چاہتے تھے اور مسٹرایکس کو اس کوتاہی اور غیر ذمے دارانہ رویّے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑتی۔ اس کے شاندار سروس ریکارڈ پر سیاہی پھر جاتی۔

ان سب عوامل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ایک فائدہ یہ حاصل تھا کہ مسٹرایکس کے نزدیک میں سو فیصد فٹ نہیں تھا۔ اس کو ملنے والی رپورٹس کے مطابق میں ذہنی اذیت سے بریک ڈاؤن کا شکار تھا۔ سادہ الفاظ میں یہ کہ میں عارضی طور پر پاگل ہو چکا تھا۔ اصل صورت اب اس کے برعکس تھی۔ پہلے رابعہ کا ملنا مجھے دیوانگی سے ہوش کی دنیا میں لانے کا سبب بنا تھا اور وہ جذباتی وجوہ کی بنا پر پچاس فیصد سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔ اس سے ملاقات کے بعد میں کچھ بے یقینی کا شکار ضرور رہا تھا مگر میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہو گئی تھی۔ محسن نے اس بے یقینی کی کیفیت کو بھی ختم کر دیا تو میرا ذہن پھر جدّوجہد کے لیے مستعد ہو گیا۔ عام حالات میں میری ذہنی اور جسمانی صحت کی بحالی کا یہ عمل اتنا تیز نہ ہوتا۔ گھر میں یا اسپتال میں لیٹا ہوا مریض اس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک معالج اور تیمار دار نہ چاہیں اور وہ خود ضرورت محسوس نہ کرے لیکن صحرا کے سفر میں کسی آبلہ پا کے لیے بھوک پیاس یا تھکن کے علاوہ بخار میں بھی ریت پر لیٹ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ گر پڑے تب بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کی ہمت کا فاضل ذخیرہ جو قدرت نے ہر ذی روح کے جسم میں ہنگامی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے رکھا ہے اسے جدّوجہد جاری رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مسٹرایکس ابھی اپنے تفتیش کرنے والے سائنسدانوں کی مہارت اور ان کی استعداد کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں مصروف تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ بے حرکت پڑے رہ کر سب کچھ جھیلنے سے بہتر ہے کہ میں جان کی بازی لگا دوں۔ مر گیا تو سمجھ لوں گا کہ موت ایسے ہی لکھی تھی اور فرشتۂ اجل کو بھی حکم تھا کہ سکندر بخت کی روح فلاں جگہ فلاں وقت قبض کرے۔ بچ گیا اور ناکام رہا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی کہ مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا یا کسی فولادی پنجرے میں بند کر دیا جائے گا۔

میں نے بہت ناپ تول کر کے جست لگائی۔ میں نے ہر لمحے کو شمار کیا۔ مسٹرایکس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی۔ اس کا ایک ایک قدم گِنا اور بالآخر میرے دماغ کے کمپیوٹر نے اس لمحے کا اعلان کر دیا جب مجھے کچھ کرنا تھا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ مسٹرایکس بات کرتے کرتے ایک سیکنڈ سے بھی بہت کم وقت کے لیے رُکا۔

وہی لمحہ تھا جب مسٹرایکس نے مجھے مشین گن سے تحفّظ فراہم کیا۔ میں بگولے کی طرح اٹھا۔ ایک لات مار کے میں نے محسن کو فرش پر گرا دیا اور اپنی قوت میں اُڑتا ہوا گیا۔ مسٹرایکس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کی نظر اپنی طرف ہونے سے پہلے میں اس سے ٹکرا چکا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف گیا تھا لیکن ریوالور نکالنے کے لیے نہیں۔ وہ غالباً سگریٹ نکالنا چاہتا تھا۔ میرے چھ فٹ قد اور ایک سو ساٹھ پونڈ وزن نے مسٹرایکس کے قدم اکھاڑ دیے۔ میں نے محسن کی طرف نہیں دیکھا اور مشین گن کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں نے صرف ایک شکاری کو زیر کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی۔

گرنے کے بعد مسٹرایکس نے صورتِ حال کو سمجھ لیا اور وہ فوراً پوری طرح متحرک اور فعال ہو گیا۔ اس نے دونوں پیروں کو فرش پر جما کے مجھے ایک جھٹکے سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن میں عملی تجربہ رکھنے کے باعث اس جھٹکے کے لیے تیار تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میں نے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھایا اور اسے اپنے اوپر سے گزار کے دوبارہ نیچے دے مارا۔ پھر میں نے اس کے شانے پر کھڑی ہتھیلی سے ضرب لگائی اور وہ ذرا سی دیر کے لیے مفلوج ہو گیا۔

اسی وقت میں نے مشین گن کے برسٹ کی آواز سُنی مگر میں نے اپنی توجہ میں کمی نہیں آنے دی۔ کوئی گولی مجھے لگتی تو خود پتا چل جاتا۔ اگر محسن اس کا شکار ہوا تو یہ اس کا مقدر، میں اُسے بچا نہیں سکتا تھا۔ بس میرے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ محسن بھی محفوظ ہے ورنہ میں اس کی آواز ضرور سنتا۔

مسٹرایکس کے لیے سوٹ ایک جال بن گیا۔ وہ جوڈو کراٹے کا ایکسپرٹ ہوگا مگر اس لباس میں مسٹرایکس کی حرکت بڑی محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ مجھے قید رکھنے والوں نے علاج کی غرض سے مجھے ایک دھاری دار سوتی پاجامہ اور ویسی ہی شرٹ ٹائپ قمیص دے دی تھی۔ عموماً اسپتالوں کے مریض اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ یہ لباس مجھے نقل و حرکت کی پوری آزادی عطا کرتا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

...ایکس کا دایاں بازو مفلوج ہوتے ہی میں نے بڑی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کا ریوالور نکالنے میں کامیاب ہوگیا مگر میں اسے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ مسٹر ایکس نے دوسرے ہاتھ کی کہنی میرے سینے پر ماری۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ تاہم میں نے اس لمحے پر اپنی گرفت برقرار رکھی جو فیصلہ کن تھا۔ اس کے بعد کوئی دوسرا موقع عطا کرنے والا لمحہ نہیں تھا چنانچہ میں اس لمحے کو گنوا ہی نہیں سکتا تھا۔

مشین گن والا ایک برسٹ مار کے الگ ہوگیا تھا۔ میں نے اوپر نیچے ہوتے ہوئے دیکھا تھا کہ محسن بھی اس سے ٹکرا گیا ہے۔ بعد میں غالباً اس نے مشین گن کا بٹ مار کے محسن کو ناک آؤٹ کردیا تھا جو اب فرش پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ مشین گن کا برسٹ بھی اس نے بڑی احتیاط سے مجھے اور مسٹر ایکس کو بچاتے ہوئے مارا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ تمام گولیاں دیوار میں پیوست ہوئی ہیں۔ اب وہ میری اور مسٹر ایکس کی جدوجہد دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

مسٹر ایکس نے مجھے اپنے سے جدا کر کے اٹھتے ہوئے اپنے گھٹنے سے وار کیا اور مجھے دیوار کی طرف اچھالا۔ وہ ابھی اُٹھا ہی تھا کہ میں نے پیر دیوار پر مارے اور اسپرنگ کی طرح اس کی طرف آیا۔ سر کے بل گیا اور پلٹ کر دونوں پیر پوری قوت سے اس کے مُنہ پر جما دیے۔ وہ نیچے گرا تو اس کا سر بڑی آواز کے ساتھ فرش پر لگا۔ اسی وقت مشین گن نے پھر گولیاں اُگلیں اور میں نے اپنے کانوں میں سائیں سائیں ہوتی محسوس کی۔ گولیاں یقیناً میرے اوپر سے میرے کانوں کو چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ سنتری نے چلا کے مجھ سے کچھ کہا اور یہی غلطی کی۔ وہ مجھے فائرنگ سے دہشت زدہ نہیں کرسکا تھا اب اس نے خود آگے بڑھ کے مجھے بھی محسن کی طرح ناک آؤٹ کرنا چاہا۔ وہ مسٹر ایکس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میری اور اس کی جنگ میں کوئی فریق حاوی نہیں ہے لیکن یہ کسی بھی لمحے ہوسکتا تھا کہ میں مسٹر ایکس پر غالب آجاؤں یا میرے ہاتھ میں ریوالور آجائے۔ اُس نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ قریب آ کے موقع دیکھے اور پھر میرے سر پر مشین گن کا بٹ مارے۔

لیکن اسے خبر نہ تھی کہ محسن جو وقتی طور پر بے ہوش ہوا تھا، ہوش میں آچکا ہے۔ اسے بھی تھیبی قوت نے جھنجوڑا ہوگا کہ اٹھ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے۔ یہ بے ہوش رہنے کا وقت نہیں ہے اور لاشعور کی دستک نے محسن کو بہت جلد بیدار کردیا تھا۔ جیسے ہی سنتری آگے بڑھا وہ اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور سنتری مُنہ کے بل گرا تو مشین گن چھوٹ کر میرے اور مسٹر ایکس کے قریب آئی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائے تھے اور میرے اندازے کے مطابق مشین گن میرے مقابلے میں مسٹر ایکس کے زیادہ قریب تھی لیکن ہوا یہ کہ فرش پر اوندھا گرنے والے محافظ نے بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچنا چاہا مگر اسے محسن نے کھینچ لیا اور یوں مشین گن مسٹر ایکس کی دسترس سے چند انچ دور چلی گئی اور میرے ہاتھ میں آگئی۔

پوری طرح اپنی مضبوط گرفت میں لیے بغیر میں نے مشین گن کو گھمایا۔ اس کا بٹ مسٹر ایکس کے مُنہ پر لگا اور اس نے بلبلا کے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کے سامنے والے دانتوں کو غائب پایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا لیکن وہ اسی بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ اس نے اچانک ریوالور اُٹھا لیا جو اس کے نیچے آگیا تھا۔ اتنے قریب سے وہ فائر نہیں کرسکتا تھا اس نے ریوالور محافظ کی طرف پھینک دیا۔

"پکڑو اسے... شوٹ ہم... یو ایڈیٹ..." وہ چلایا۔

اسی وقت میں نے مشین گن کا بٹ مسٹر ایکس کے سر پر مارا۔ جب ریوالور کے فائر کی آواز آئی تو میں بے اختیار فرش پر گرا۔ میرے کانوں نے ایک چیخ بھی سُنی لیکن یہ محسن کی چیخ نہیں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریوالور محسن کے ہاتھ میں تھا اور محافظ، جو کچھ دیر پہلے مشین گن لیے کھڑا تھا۔ خود کو بے حد محفوظ اور دوسروں کو اپنی انگلی کے اشارے کا نشانہ سمجھے ہوئے تھا فرش پر عجیب طرح سے لوٹ رہا تھا۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا اور تقریباً ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن پر تھے اور خون اس کی انگلیوں سے پھوٹ رہا تھا۔ محسن کی چلائی ہوئی گولی اس کے نرخرے میں سے گزر گئی تھی۔ وہ اب بہت بھیانک آوازیں بھی نکال رہا تھا اور چند لمحوں کا مہمان تھا۔

اس جنگ کی خبر مشین گن کے پہلے ہی راؤنڈ نے سب کو پہنچا دی تھی لیکن نہ جانے کس وقت محسن نے دروازہ اندر سے بند کردیا تھا۔ اب باہر جمع ہونے والے دروازے کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ میں سراج کے دہاڑنے اور ادبی آواز میں گالیاں بکنے کا شور بھی سن رہا تھا۔ مسٹر ایکس لمبا لیٹا ہوا تھا اور اس کے سانس لینے کی رفتار بہت کم تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی بے ہوش ہے۔

مشین گن اٹھاتے ہی میں نے محسن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے محافظ کے جسم پر سے اتارا ہوا راؤنڈ میری طرف اچھال دیا۔

"دروازے کے ساتھ... اِدھر سے۔" میں نے محسن کو اشارہ کیا اور محسن میری راہ سے ہٹ گیا۔ باہر سے ٹکریں مارنے والے دروازے کی مضبوطی پر برہم تھے۔ انھوں نے خود ہی اسے مضبوط بنایا تھا لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ جو اسیر ہو وہ اُسے نہ کھول سکے۔ اب خود صیاد کے لیے اسیر تک رسائی مشکل ہوگئی تھی۔ یقیناً ان کو اس غلطی کا احساس بھی ہوا ہوگا جو انھوں نے دروازے کے اندر کُنڈی لگا کے کی تھی لیکن یہ ہماری عادت ہے کہ ہم دروازے کو اندر اور باہر سے ایک جیسا محفوظ بناتے ہیں۔ لوہے کی موٹی سی سلاخ کو محسن نے ایک ہاتھ مار کے کھسکا دیا تھا اور سلاخ دو آہنی کُنڈوں سے گزر گئی تھی۔

باہر سراج مسلسل چیخ رہا تھا "مارا گیا نا آخر افلاطون کی اولاد... ہم کو اُلّو کا پٹھا سمجھتا تھا۔" اس نے مسٹر ایکس کے لیے ایک زبردست گالی کے ساتھ کہا "ہم بھی چھوٹے بچے کے ایس پی نہیں بنے... بہت عرصہ..." اس نے خود اپنی ذات کے لیے خاصے نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ "اور اندر وہ کُتّے کا بچہ... مشین گن لیے کھڑا کیا کر رہا تھا... اب لایا ہے کلھاڑی۔" اس نے کسی کو گالی دی۔

میں نے مشین گن سے نشانہ لے کر ایک برسٹ مارا... دروازے میں کئی سوراخ ہوگئے اور باہر دو تین افراد ایک ساتھ چیخنے لگے۔ میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ کُنڈی کھول دے۔ اس کا یہی بہترین موقع تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا میں باہر کی طرف لپکا۔ پہلے برسٹ نے تین آدمی گرا دیے تھے جو دروازہ توڑنے کے لیے اپنے جسم سے دھکا لگا رہے تھے۔ ان میں وہ دونوں گونگے کمانڈوز بھی شامل تھے جو آج تک فرشتۂ اجل کی طرح مسلط رہے تھے۔ ان کو مرتا دیکھ کے مجھے ایک وحشیانہ سی خوشی ہوئی۔ باقی سب ایک دم پیچھے ہٹے تھے۔ خود سراج بھاگ رہا تھا کہ میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کردیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا مگر وہ منجمد ہوگیا۔

"تم اسی طرح اسی جگہ کھڑے رہوگے۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "محسن باہر جائے گا... صرف محسن..."

"مگر وہ کیسے... کیسے باہر جائے گا۔" سراج نے کہا۔ "راستے میں..."

"وہ اپنے ساتھ مسٹر ایکس کو لے جائے گا۔" میں نے کہا۔ "راستہ خود مسٹر ایکس بتائیں گے۔ ان کے حکم سے سارے محافظ راستہ چھوڑیں گے... اور سارے بند دروازے کھلیں گے... باقی سب سے کہو کہ غائب ہو جائیں۔ تم اکیلے اس راہداری میں کھڑے رہوگے۔ اگر کوئی تمھاری مدد کے لیے آئے گا تو خود بھی جان سے جائے گا اور تمھیں بھی مروائے گا۔"

"تم اپنی زندگی سے کھیل رہے ہو۔" سراج نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔ "یا تم چاہتے ہو کہ میں وہی گنتی والا کھیل شروع کروں... دس تک گنوں اور اس کے بعد بھی تم..."

"آل رائٹ... سب لوگ اندر جاؤ۔" اس نے بادل ناخواستہ حکم دیا اور وہ چاروں اِدھر اُدھر کے کمروں میں گم ہوگئے جو راہداری میں سراج کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے مشین گن سے سراج کو اشارہ کیا۔

"اب تم اندر آجاؤ... آگے آؤ... اور آگے..." میں نے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ میں اسے نظر میں رکھنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دروازے سے گزرے تو میرے بہت نزدیک ہو۔ سراج تعمیل پر مجبور تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے تک آیا۔ اس وقت تک میں چند قدم پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس کے گزرنے کے لیے دروازہ خالی تھا۔

"یہ تو مر گیا ہے۔" سراج نے نیچے پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اس کے مرنے سے تم یتیم نہیں ہوئے۔" میں نے کہا۔ "دوسرا باپ مل جائے گا تمھیں... تم اپنی فکر کرو۔"

اگر سراج کا مقصد میری توجہ ہٹانا تھا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ یہ ایک بچکانہ حرکت تھی۔ کوئی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی اس طرح دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اپنا مُنہ دیوار کی طرف کرلے اور ہاتھوں کو سر کے اوپر رکھ کے کھڑا ہو جائے۔ تھانے میں ایک معمولی سپاہی کسی بھی چور اُچکے یا جیب کترے کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے اور صفِ مجرماں میں ان شرفا کو بھی شامل کردیا جاتا ہے جو آوارہ گردی یا مشتبہ انداز میں پھرنے کے الزام میں پکڑ کر لائے جاتے ہیں۔ پولیس کی کچھ دفعات کا معاشی خوشحالی سے براہِ راست تعلق ہے۔ اندیشہ نقصِ امن کی دفعہ کسی بھی دو افراد یا دو گروہوں پر لگائی جاسکتی ہے جو بہ آوازِ بلند بات کر رہے ہوں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہاں خون خرابا ہونے ہی والا تھا۔ کوئی تفریح کی غرض سے ٹہل رہا ہے یا کسی کا پتا تلاش کر رہا ہے تو اس پر آوارہ گردی کا لیبل آسانی سے لگ جاتا ہے... اور مشتبہ نظر آنا تو دیکھنے والے کی نظر پر ہے۔ جیسے حُسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے ایسے ہی کسی سو فیصد شریف اور امن پسند معزز شہری کو پولیس کی نظر مشتبہ یا آوارہ گرد کی حیثیت سے دیکھتی ہے تو صرف اس لیے کہ یہی لوگ رہائی کا مُنہ مانگا معاوضہ ادا کر کے جاتے ہیں۔ جانے سے پہلے ان کو تھانے کے رعب اور دبدبے کا احساس دلانے کے لیے چند چھتر مارے جاتے ہیں یا لاتیں مُکّے تو اس کی ضرورت اور اہمیت بھی تھانے والے ہی جانتے ہیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مگر آج معمولی کانسٹیبل نہیں ایک ایس پی کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا تھا جو عام حالات میں ہمارے ساتھ ہوتا۔ مجھے وہ سب یاد تھا جو سراج نے روزِ اول میرے ساتھ کیا تھا اور اب کیا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں انگریزی محاورے کے مطابق... اس کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کروں۔ ایک بار اسے بھی بتاؤں کہ بات صرف وقت کی ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ کل وہ اوپر تھا۔ آج نیچے آ کے دیکھے اور سمجھے کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔ زبان سے میں کیسے بتا سکتا تھا کہ مجھ پر کیا بیتی تھی۔ جو جسمانی اور ذہنی اذیت میں جھیل چکا تھا اس کو بیان کرنے کے لیے دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ ناکافی تھے اور اسے ضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے عمرِ مختصر بھی ناکافی تھی لیکن صرف ایک رات کا عملی سبق اس بے ضمیر شیطان کی آنکھیں کھول سکتا تھا۔

"مجھے افسوس رہے گا سراج کہ تم میرے ہاتھ آئے تو ایسے وقت میں جب میں تم سے اپنا حساب برابر نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے اور دلاور نے بڑے زبردست شیطانی ڈرامے کیے۔ تم خود کو بہت اچھا ڈائریکٹر پروڈیوسر سمجھتے ہو گے۔ میں تمھاری خوش فہمی دور کر دیتا کہ تم سے بڑے ہدایت کار اور ڈراما باز تو ہم ہیں... میں تو ہر عذاب اور ہر اذیت جھیل گیا۔ اور کیا تم دعویٰ کر سکتے ہو کہ قوتِ برداشت میں سکندر بخت تم سے زیادہ نہیں؟ اس کا پتا چل جاتا۔ اور کسی دن ضرور پتا چلے گا جب معاملہ الٹا ہو گا۔ اب تک ہم تماشا تھے اور تم تماشا کرنے والے بھی اور تماشائی بھی... کسی دن تم تماشا بنو گے... تمھارے لیے وہ ایک دلچسپ تجربہ ہو گا اور سبق بھی جو تم کبھی نہ بھولو گے۔"

"آج تمھیں روکنے والا کون ہے؟" سراج نے زہرخند کے ساتھ کہا۔

"وقت۔" میں نے کہا۔ "ابھی اتنی ہی مہلت ہے کہ میں دوسرے زیادہ اہم کام ختم کروں۔ تاہم میرا وعدہ ہے کہ ایک رات تم بھی ایم آر ایس کے تھانے میں گزارو گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک رات میں نے تمھارے تھانے میں گزاری تھی اور سراج ایک فلم کی شوٹنگ میں بھی کروں گا جسے تم میری طرح دیکھو گے۔ مجھے تو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو گا... مگر میں نے تم کو بتا دیا ہے۔ اب تم انتظار کا عذاب بھی جھیلو۔ خوف کے آسیب سے بھی ڈرتے رہو۔ حادثے میں مر جانا آسان ہوتا ہے۔ سزائے موت پانے والے قیدی کے لیے پھانسی کے دن تک جینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سارا ذہنی اور جسمانی عذاب اور اذیت جو مجھے ملی، تم بھی پاؤ گے مگر خوف اور انتظار کا کرب تمھیں اضافی ملے گا۔ اسے تم اپنے اعمال کا سود سمجھ لو جو حرام ہوتا ہے لیکن حرام کھانے والوں کو حرام کاری کرنے والوں کو اور تم جیسے حرامزادوں کے لیے جائز ہے... محسن... ایس پی صاحب کو ننگا کر دے اور ان کے کپڑے اتار دے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سراج پھٹ پڑا۔

"اس وقت ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں۔ تم اتنے کم عقل تو نہیں ہو کہ صورتِ حال کو سمجھ نہ سکو۔"

"میں... اس کا بدلہ لوں گا۔" سراج نے دانت پیس کر کہا۔

محسن نے اس کے ایک چھانپڑ دیا۔ سراج کا منہ دیوار سے لگا اور اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا ہے۔

"بدلہ تم کو نہیں ہم کو لینا ہے۔" محسن نے کہا۔ "تم تو سب کچھ کر چکے۔ جوابی کارروائی ہمیں کرنا ہے۔ یہ باری کا کھیل ہے اور تمھاری باری گزر گئی۔" اس نے سراج کی جامہ تلاشی جاری رکھی اور اس کی جیب میں سے ریوالور کے علاوہ شناختی کارڈ۔ نقد رقم جو بعد میں نو ہزار سات سو پچاس بنی۔ اور کچھ کاغذات بھی نکال لیے۔

"اب تم اپنے کپڑے شرافت سے میرے حوالے کرو گے یا میں زبردستی کروں؟" محسن نے کہا۔

شدتِ اشتعال کے عالم میں سراج نے اپنی بشرٹ اور پتلون اتار کے زمین پر دے ماری۔ "تم نے اسے اترواکے بہت بڑا جرم کیا ہے۔"

محسن نے اس کے ایک لات ماری۔ "کیا یہ جرم اس وردی کو پہن کر اسمگلنگ کرنے سے بھی بڑا ہے؟ غداری اور وطن فروشی سے بھی زیادہ سنگین ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ تم اس لباس کے کبھی اہل نہ تھے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے جسم پر تو وہ چار خانے والی وردی ہونا چاہیے جو سی کلاس کے قیدیوں کو ملتی ہے... یہ لباس تو وطن کے قانون کی بالادستی رکھنے والوں اور ملک کو اندر اور باہر کے دشمنوں سے بچانے والوں کو دیا جاتا ہے۔"

"اب اُلٹے لیٹ جاؤ۔" محسن نے حکم دیا۔

احساسِ ذلت سے سراج کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اس کی نظر بار بار دروازے کی طرف جاتی تھی۔ شاید اسے امید تھی کہ کمرے سے باہر دوسرے لوگ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے مگر ابھی تک ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا الٹا لیٹ گیا۔ میری نظر دروازے سے باہر بھی دیکھ رہی تھی اور میں بے ہوش پڑے ہوئے مسٹر ایکس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔

سکتا تھا کہ وہ چالاک اور عیار آدمی مکر کر رہا ہو اور آنکھیں بند کیے ہماری ساری باتیں سن رہا ہو اور موقع کی جستجو میں ہو، وہ پھر صورتِ حال کو قابو میں کر سکے۔ میں نے اس کو دو بار ٹھوکریں مار کے دیکھا اور اس کی جیب میں سے سگریٹ لی۔ اسی کے لائٹر سے جلائی اور پھر اس کے جسم سے لگا کے مگر وہ غیر متحرک رہا۔ اس وقت جب میں یہ کارروائی کر رہا تھا مجھے احساس ہوا تھا کہ اس کا سانس رکا ہوا ہے... مجھے ہوا کہ سراج کی بات درست ہی نہ ثابت ہو جائے۔ دس منٹ بعد میں نے پھر دیکھا تو مجھے پھر سانس رکی ہوئی لگی اور میرا یقین میں بدلنے لگا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ دو منٹ تک سانس روکے رکھنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن منٹ بہت ہوتے ہیں۔ اگر میں نبض دیکھتا تو مجھے مشین گن چھوڑنا پڑتی۔ مشین گن اگر ایک ہاتھ میں ہو تو بے کار ہے۔ اسے چلانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے تھامنا پڑتا ہے۔ میں نے نبض دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ کہیں میں دیکھنے بیٹھوں اور مُردہ زندہ ہو جائے۔ جب محسن اپنی کارروائی میں مصروف تھا، تب بھی میری نظر مسلسل مسٹر ایکس کا جائزہ لیتی رہی تھی اور میں یہ ماننے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مسٹر ایکس نے خودکشی کر لی ہے یا وہ کسی ضربِ کاری سے ہلاک ہو گیا ہے۔ ایجنٹ اپنے دانتوں کے خلا میں پوٹاشیم سائنائڈ جیسا کوئی زہر رکھتے ہیں اور جہاں فرار کے سب راستے بند ہوں، وہاں زہر کی مدد سے اپنا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ وہ دشمن کی قید میں جا کے تفتیش کا عذاب جھیلنے سے بچ جاتے ہیں اور اس اندیشے سے کہ کہیں وہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے سارے راز افشا نہ کر دیں۔ دانتوں کے خلا میں چھپے ہوئے اس زہر کے کیپسول کو ایک خاص طریقے سے دانتوں کے بیچ میں لا کر چبانا کافی ہوتا ہے۔ چند لمحوں میں زہر اپنا کام کر جاتا ہے اور ہر حکومت کے جاسوس جو مشن پر دشمن کے علاقے میں بھیجے جاتے ہیں، ان پر واضح کر دیا جاتا ہے کہ گرفتاری کی صورت میں انھیں اپنی مدد آپ کرنا ہے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ جاسوس کا دوست کوئی نہیں ہوتا، نہ اپنے نہ پرائے۔ پرائے تو خیر دشمن ہوتے ہیں مگر اپنے بھی پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں چنانچہ وہ جان آسانی سے دینا پسند کرتے ہیں۔

جب تڑتڑ کی آواز آئی تو میں چونکا۔ اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی کہ محسن نے سراج کے ساتھ بہت خوب سلوک کیا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کے سراج کی دھلائی شروع کر دی تھی لیکن سراج اب خاموش تھا۔

"افسوس کہ میرے پاس وہ تیرہ نمبر کا روایتی چھتر نہیں جو تھانوں میں شرفا کی عزت افزائی کے لیے رکھا جاتا ہے۔ میرے جوتے کا نمبر دس ہے۔" محسن نے کہا۔

"محسن! وقت ضائع مت کر۔" میں نے کہا۔ "یار زندہ، صحبت باقی۔ ہم یہ کام تسلی سے اور دل جمعی سے کریں گے۔"

"میں نے تو افتتاح کیا ہے۔" محسن بولا۔ "دس جوتے صرف آغاز کے طور پر مارے ہیں... باقی اقساط آئندہ۔"

"اِدھر آ کے دیکھ، یہ دشمن کتا مر گیا ہے... مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

محسن نے سراج کو چھوڑ کے جوتا پہنا اور میرے پاس لیٹے ہوئے مسٹر ایکس کا معائنہ کرنے لگا۔

"یہ تو واقعی مر چکا ہے۔" محسن نے بھی سانس پر غور کیا۔

میں نے اشارے سے نبض اور دل کی دھڑکن دیکھنے کو کہا۔ محسن نے اس کی کلائی تھامی اور جانتے بوجھتے غلط جگہ پر انگلی رکھ کے نبض دیکھنے لگا۔ یہ ضروری نہیں کہ نبض کے چلنے کا پتا صرف انگوٹھے کے نیچے کلائی پر انگلی رکھ کر ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو نبض کی جگہ متحرک نظر آتی ہے۔ بے شک یہ حرکت بہت خفیف ہوتی ہے مگر جلد پر ایک جگہ پھڑکتی دکھائی دیتی ہے۔ اور محسن نے اسی کو دیکھ کے مجھے آنکھ ماری جس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ مسٹر ایکس فوت نہیں ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ وقفے وقفے سے سانس لیتا رہا تھا اور میں نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یوگا کا ماہر ہو جن کے بارے میں ناقابلِ یقین باتیں مشہور تھیں کہ وہ سانس کو مسلسل گھنٹوں روکے رکھتے ہیں۔ یوگی ایسے بھی ہیں جو قبروں میں دفن رہ کے اگلے دن زندہ برآمد ہوتے ہیں۔ کم عقل اور اندھی عقیدت رکھنے والے تو ہفتوں اور مہینوں کا ذکر کرتے ہیں کہ فلاں یوگی بابا چھ مہینے بعد قبر سے نکلے۔ مگر وہ سب مبالغہ اور بکواس ہوتی ہے۔ تاہم طویل وقفے کے لیے سانس روکنے کی مشق یوگا میں شامل ہے۔

"نبض بھی رکی ہوئی ہے۔" محسن نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے بھی افسوس سے کہا۔ "یہ آدمی کام کا تھا۔ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔"

"اچھا ہوتا اگر یہ زندہ رہتا۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ساری گفتگو مسٹر ایکس کو سنانے کے لیے تھی تاکہ اسے ہمارے بے وقوف بننے کا یقین آ جائے۔ "خیر اب آگے کی سوچ... ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے کیا کرنا ہے؟"

"ہمیں تو باہر نکلنے کے راستے بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"راستے تو مل جائیں گے لیکن پہلے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو ساتھ لینا ہے۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں قید ہیں۔ ہمیں ہر کمرے میں جا کے دیکھنا ہوگا۔ باہر والے کوریڈور میں دونوں طرف آٹھ دروازے ہیں۔ چار ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ نواں دروازہ بالکل سامنے ہے جو شاید باہر جانے کے لیے ہوگا۔ باہر کیا ہے؟ یہ باہر جا کے دیکھیں گے پہلے تو ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا مرحلہ ہے۔ نہ معلوم کس کمرے میں سے کوئی توپ چلا دے پھر رابعہ کیتھرین اور ٹیڈی کو نکال کر ساتھ لے جانا بھی آسان نہیں ہوگا۔ سراج ہمارے قبضے میں ہے تو ہمارے بھی تین آدمی ان کے پاس ہیں۔ ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"معلوم نہیں یہاں کُل کتنے آدمی تھے۔" محسن بولا۔

"تین مارے گئے... دو یہاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور اور پیڈرو بھی یہیں تھے۔ اب کسی کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھتے ہیں۔"

"ہر کمرے کے سامنے سے گزرنے کا اور ہر کمرے کے اندر جانے کا خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔" محسن بولا۔

"تو ایس پی صاحب کی وردی پہن لے۔" میں نے آہستہ سے محسن کے کان میں کہا۔

محسن نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ لوگ پہچانتے ہیں اور دھوکا نہیں کھائیں گے کہ تو سراج ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔ "مگر ہم باہر نکل گئے تو اس وردی سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔"

محسن نے میری بات مان لی اور اپنے کپڑے اتار کے ایس پی سراج کی پوری وردی چڑھا لی۔ سراج خونی نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ میں نے محسن کو دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ محسن نے مسٹر ایکس اور سراج کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر کا سوال واضح تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہم ان دونوں خطرناک دشمنوں کو اسی جگہ ایسے ہی چھوڑ جائیں گے۔ میں نے سر ہلایا اور اسے پھر دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ ایک ساتھ دروازے سے نکلے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے وہیں کھڑے رہ کر باری باری دونوں پیروں پر اچھلنا شروع کیا۔ محسن نے میری تقلید کی۔ زمین پر ہمارے پیروں کے پڑنے سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے ہم دونوں بھاگ رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اس آواز کو کم کیا۔ یہ تاثر دینے کے لیے کہ ہم دُور چلے گئے ہیں۔ پھر ہم دروازے کے دونوں جانب پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔

ہماری اس حرکت کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ سب سے پہلے تو کمرے کے اندر سے سراج نے گالی دینے کی اور چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ پھر ہم نے مسٹر ایکس کی آواز سُنی۔ وہ سراج کو ڈانٹ رہا تھا کہ اس طرح شور نہ کرے۔ ہم ان کے منتظر تھے کہ کوریڈور کے تین دروازے کھلے اور ان میں سے تین آدمی نکلے۔ دو کے ہاتھ میں ریوالور تھے اور تیسرے نے مشین گن اٹھا رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، میں نے مشین گن کا راؤنڈ چلا دیا اور وہ تینوں وہیں گر گئے۔ مارے جانے والے بھی یہی سمجھے تھے کہ ہم راہداری میں دوڑتے ہوئے دروازے کی طرف گئے ہیں اور وہ ہمیں پیچھے سے شوٹ کر دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اندازے کی غلطی ان کی موت کا سبب بن گئی۔

میں نے محسن کو واپس کمرے کے اندر کھینچ لیا کیونکہ اب مزید مسلح افراد کا باہر نکل آنا یقینی تھا۔ اندر سراج اور مسٹر ایکس ایک ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بُری طرح چونکے۔ فائرنگ کی آواز سے انھوں نے بھی فرض کر لیا تھا کہ ہم فرار ہوتے ہوئے مارے گئے۔

"مُردہ زندہ ہو گیا۔" میں نے مسٹر ایکس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا تم بھی اسی شان سے باہر جانا پسند کرو گے؟" محسن بولا۔

"مجھے کوئی کمپلیکس نہیں ہے۔" مسٹر ایکس نے متانت سے کہا۔ "تم میرے کپڑے پہننا چاہتے ہو تو لے لو۔ کپڑوں کا میری شخصیت سے یا میری عزت اور ذلت سے کوئی تعلق نہیں۔ کپڑے ہوں یا نہ ہوں، میں وہی رہوں گا... جو میں ہوں۔ میں ان کی پروا بھی نہیں کرتا جو میرا تماشا دیکھیں گے اور مجھ پر ہنسیں گے کیونکہ وہ دشمن ہیں۔"

اس کی باتوں نے سراج کے دل کو یقیناً تسلی دی ہوگی۔ وہ بولا۔ "یہ ایسی ہی بات ہے جیسے تم میری وردی پہن کے ایس پی نہیں ہوئے۔ اور چوروں نے میری وردی اتار لی تو میرا عہدہ ختم نہیں ہوا۔ میں اب بھی ایس پی ہوں اور ایسی وردیاں مجھے بہت ملیں گی۔"

مشین گن کے راؤنڈ ختم ہو گئے تھے لیکن اب ہمارے ہاتھ میں دو ریوالور آ گئے تھے۔ ایک سراج کا اور دوسرا مسٹر ایکس کا۔ میں نے مشین گن کو ناکارہ بنا کے پھینک دیا۔

"چلیے جناب ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور مسٹر ایکس۔"

اس نے مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔ "تم مجھے شوٹ کر سکتے ہو مگر مجھے تعمیلِ حکم پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی پُراعتماد مسکراہٹ اور اس کے لہجے پر غور کیا تو مجھے یقین آنے لگا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اُسے ناک آؤٹ کر دوں۔ ایسی صورت میں اُسے اٹھا کے

جانا پڑتا۔ میں اُسے دھکے دے کر باہر لے جانے کی کوشش کرتا ...مزاحمت کرتا اور اگر باہر چلا بھی جاتا تو وہ نہ کرتا جو ہم چاہتے ... وہ کسی کو حکم نہ دیتا کہ ہماری مدد کریں۔ اپنی جان بچانے کے ...ی کو تعمیلِ حکم پر مجبور نہ کرتا۔ وہ بالکل مختلف آدمی تھا۔ سراج ...دلاور جیسے لوگوں سے الگ۔ وہ جان کی بازی لگانے آیا تھا ...سے جان کی پروا نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ الٹا سب سے ...کہ ہماری بات نہ مانیں اور مقابلہ کریں۔ ایسے آدمی سے کچھ بھی ...ناعملاً ناممکن تھا اور یہاں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ...س سے زبردستی کچھ اگلواتے۔

اگر میں تذبذب سے کام لیتا تو اس سے میری کمزوری ظاہر ...۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ "مسٹر ایکس! دس سیکنڈ میں تم ...فیصلے پر نظرِ ثانی کر سکتے ہو۔ ہمیں باہر نکالنے میں مدد کرو گے یا ...ت قبول کرو گے۔"

"فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اور میں کبھی دو فیصلے نہیں کرتا۔" وہ ...۔ "اگر میں زندگی کو اتنا اہم سمجھتا تو اس مشن کی کمان سنبھالنے ...فیصلہ نہ کرتا اور میرا یہی کردار ان کی نظر میں بھی تھا جنھوں نے ...یہ اہم ذمے داری سونپی تھی۔ تمہارے نقطۂ نظر سے میں دشمن ...۔ کافر ہوں یا جہنمی ہوں۔ غدار اور شیطان ہوں لیکن سرحد ...کے اس پار میں بھارت کا جیالا سپوت ہوں۔ میں محبِ وطن ...۔ غازی ہوں اور مر جانے کے بعد سورگ باشی کہلاؤں گا۔ اعلیٰ ...یا اعزاز کا مستحق سمجھا جاؤں گا۔ شکست قبول کر لینے اور زندہ ...بنے کے لیے دشمن سے رحم کی بھیک مانگنے یا اس سے سمجھوتا ...کرنے کی صورت میں میرے لیے کچھ نہیں۔ میں اِدھر دشمن تو ...غدار۔ اِدھر کافر تو اُدھر بے دین۔ اِدھر جہنّم تو اُدھر نرگ کا ...۔ ذلت اور رسوائی دونوں طرف... میں تمہارے ہاتھوں ...نے کو ترجیح دوں گا۔"

"آل رائٹ۔ میں تمھیں وعدے کے مطابق دس سیکنڈ ...دے رہا ہوں جس میں تم سوچ سکتے ہو کہ یہ ڈراما بہتر ہے یا حقیقت ...۔" میں نے کہا اور ایک ایک سیکنڈ کو گن کر شمار کرنے ...ہوئے دس سیکنڈ گزر گئے اور اس شخص کے اطمینان اور اعتماد ...میں کمی نہیں آئی۔ جب میں نے اس کے سر میں گولی ماری تب بھی ...مسکرا رہا تھا لیکن اس کی اچانک موت نے سراج پر ...دہشت طاری کر دی۔

"اب تمھاری باری ہے۔" میں نے ریوالور کا رُخ بدلا۔ "تم کیا ...؟"

"میں... میں... تم کیا چاہتے ہو؟" سراج نے ہکلا کے کہا۔

"اب تم آزادی سے سارے فیصلے کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "یہی ایک شخص تھا جو تم پر حکم چلاتا تھا۔ تمھارے لیے ہم سب کو زندہ سلامت یہاں سے نکالنا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"اتنا آسان بھی نہیں... لیکن میں کوشش کر سکتا ہوں۔" سراج نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمھارا مطلب ہے چوہدری دلاور یا پیڈرو تمھاری راہ میں حائل ہو سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا تم وعدہ کر سکتے ہو کہ اس کے بعد مجھے مارو گے نہیں؟" اس نے مسٹر ایکس کی لاش پر نظر ڈالی۔

"اگر تم ہمارے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو تو وعدہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

سراج کی پوزیشن بہت عجیب ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ہم نے مسٹر ایکس کے ساتھ کیا کیا۔ لیکن وہ مسٹر ایکس کی طرح بہادر نہیں تھا۔ مسٹر ایکس اب اپنوں کے لیے غدار نہیں رہا تھا لیکن سراج بدستور غدار تھا اور مرنے کے بعد بھی رہتا۔ وہ مرنے سے ڈرتا تھا۔ ہم سے زندگی کی ضمانت مانگنا ایک ایسی ہی احمقانہ حرکت تھی جو اس سے موت کے خوف میں سرزد ہوئی۔ جب جنگ جاری ہو تو دشمن سے وعدہ لینا اور پھر وعدے پر قائم رہنے کی امید رکھنا دونوں بے وقوفی کی دلیل ہیں۔

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا... لیکن اس طرح نہیں۔" وہ بولا۔

"تم محسن کے کپڑے پہن سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

انتہائی مجبوری کے عالم میں اس نے محسن کے اتارے ہوئے کپڑے پہنے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو خود اپنی نظر سے گر گیا تھا۔ اس کی بہادری کے دعوے موت کو سامنے پا کے نقش بر آب ثابت ہو گئے تھے۔ وہ بہت ہینو کتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا اور ظلم کرتا تھا مگر اس وقت جب فریقِ ثانی بے بس اور انتہائی مجبور ہوتا تھا۔ اس وقت جب وہ خود کو محفوظ سمجھتا تھا اور بااختیار سمجھتا تھا۔ صورتِ حال کے پلٹتے ہی اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی۔

باہر آتے ہی اس کی نگاہ نے دروازے پر پڑی ہوئی تینوں لاشوں کو دیکھا۔ پھر آگے تین مختلف دروازوں پر اسے تین اور آدمی پڑے نظر آئے اور اس کی صورت پر مایوسی اور ناامیدی کا تاریک سایہ اور گہرا ہو گیا۔

"میں تمھارے ساتھ ایک قدم پیچھے ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے ایک دروازے پر دستک دو... جو اندر ہو اُسے باہر آنے کا حکم دو اور پھر خود ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"اندر اب کون ہوگا۔" وہ تلخی سے بولا اور آگے چلتا گیا۔

میں نے پہلے دروازے پر گرے ہوئے محافظ کی اسٹین گن اٹھا لی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اسے اُٹھانے کا خیال سراج کے دل میں بھی آیا تھا مگر اس نے مجھے ایک قدم پیچھے پایا تو اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسٹین گن لوڈ تھی چنانچہ میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔ محسن ہمارے ساتھ نہیں نکلا تھا، وہ اسی کمرے کے دروازے میں ریوالور لیے کھڑا رہا تھا جس میں مسٹر ایکس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک دُہرا حفاظتی انتظام تھا۔ میں سراج کے پیچھے لگا ہوا تھا اور محسن نسبتاً محفوظ مقام سے میری حفاظت کر رہا تھا۔ سراج نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھُل گیا۔

" اندر کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

" تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔" میں دیکھوں گا... اور یہ مت بھولنا کہ تم دوسرے ریوالور کی زد میں ہو۔" میں نے محسن کی جانب اشارہ کیا۔

کمرے میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ یہ ویسا ہی کمرہ تھا جیسے کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ تاہم یہ رابعہ کا کمرہ نہیں تھا... وہ دائیں جانب تھا۔ چنانچہ یہ محسن یا ٹیڈی میں سے کسی ایک کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ اندر کی فضا خود بتاتی تھی کہ یہاں بھی کوئی اسیر تھا۔ کھانے کے برتن جن میں تھوڑا بہت کھایا ہوا کھانا موجود تھا۔ چائے کا کپ، ایک خالی گلاس اور فرش پہ بچھے ہوئے بستر کی شکن آلود چادر۔

" تم آگے چلو۔" میں نے باہر آ کے کہا۔ دوسری جانب وہ کمرہ تھا جس میں رابعہ کو رکھا گیا تھا مگر وہ بھی خالی تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے سراج کے لبوں پہ ایک ایسی مسکراہٹ نظر آئی جو میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ میں نے اس مسکراہٹ سے مشتعل ہو کے اس پر حملہ کر دیا۔

" کہاں گئے یہ لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کے بَٹ سے سراج کے شانوں پر اور اس کی پسلیوں پر وار کیے۔

" میں... میں تو تمہارے ساتھ تھا..." وہ نیچے گر گیا اور بُری طرح کراہنے لگا۔

" کیا انھیں دلاور اور بیڈرو لے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

" مجھے نہیں معلوم۔" وہ دُہرا ہو کے بولا۔

" معلوم ہے... تم کو سب معلوم ہے۔" میں نے کہا اور اس کو پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ وہ ہر ٹھوکر پر لڑھکتا گیا اور ہائے ہائے کرتا گیا۔

" خدا کی قسم... میں... مجھے معلوم نہیں..."

" اب خدا کی قسم کھاتے ہو۔" میں ہنسا اور لاتیں ماریں۔ " کتے... جب میں خدا کا نام لیتا تھا تو کیا کہتا تھا... میری کسی قسم پہ اعتبار کیا تھا؟ اپنے الفاظ یاد کر..." میں نے اُسے ایک گالی دی۔

محسن نے بھی سب سُنا تھا۔ وہ میرے قریب آ کے بولا۔ "اس کو مارنے سے کیا ملے گا سکندر... اندر سارے کمرے دیکھ لیتے ہیں۔ ممکن ہے وہ باقی سب کو لے کر نکل گئے ہوں۔"

میں نے محسن کے ساتھ مل کر دوسرے کمروں میں جھانکا۔ سارے کمرے خالی تھے۔ رابعہ، کیتھرین اور استاد ٹیڈی کا کہیں پتہ نہ تھا، غالباً حالات کا رُخ بدلتا دیکھ کے دلاور اور پیڈرو نے وہاں رُکنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور فوراً وہاں سے نکل گئے۔ انھوں نے محسوس کیا ہو گا کہ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جُزوی شکست مکمل شکست بن جائے۔ ہم سب کو چھُڑا لیں اور ان کو قید کر لیں۔ ہماری دسترس سے باہر کسی نامعلوم مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اپنا دباؤ برقرار رکھ سکتے تھے کیونکہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی ان کے قبضے میں تھے۔ اپنے ان ساتھیوں کی سلامتی کو داؤ پہ لگا کے ہم کچھ نہیں کر سکتے... یہ بات شکاری اچھی طرح سمجھتے تھے۔

" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا تو یہ آدمی کس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔" میں نے کہا۔

" یہ غالباً سراج اور مسٹر ایکس کو نکال کر لانے کے لیے پیچھے چھوڑ دیے گئے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ " تو یہاں ٹھہر... میں دیکھتا ہوں کہ اس آخری دروازے کے پیچھے کیا ہے۔"

" ایسے مت جا سکندر..." محسن نے کہا۔ " کیا معلوم دروازے کے پیچھے وہ نیا جال بچھائے بیٹھے ہوں اور تو سیدھا ان کے ہاتھوں میں پہنچ جائے... یا موت کے مُنہ میں پہنچ جائے۔"

مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ " تو ٹھیک کہتا ہے... ہو سکتا ہے کہ وہ دروازے کو ٹریپ کر گئے ہوں... اس کے ساتھ کوئی بم وغیرہ لگا گئے ہوں... کہ اِدھر ہم دروازہ کھولیں اُدھر دھماکا ہو اور سب ختم..." میں نے کہا۔

" ایس پی صاحب کو ضرور معلوم ہو گا۔" محسن نے سراج کی طرف دیکھا جو اَب اُٹھ بیٹھا تھا مگر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

" مجھے... مجھے نہیں معلوم..." وہ چلّانے لگا۔

" چلاّ مت۔" محسن نے اس کے سر پر لات ماری۔ "اس دروازے سے ہم گزرتے تو ہلاک ہو جاتے۔ ایسا انتظام مشکل نہیں تھا مگر کیا ایسا انتظام کرنے والوں کو تمہارا خیال نہیں ہو گا؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس میں سے ہم نہ گزرتے۔ تم اور مسٹر ایکس

...تے۔ ہمیں قتل کرنے کے بعد یا پھر قیدی بنانے کے بعد۔ کیا ...ہی مارے جاتے؟ نہیں، ایس پی صاحب... شکاری جانتے ...گے کہ ایس پی صاحب، کو بچ کر نکلنا آتا ہے۔"

" دروازے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف قفل ہے۔" سراج ...اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے کراہ کر کہا۔

پہلے مجھے صرف شبہ تھا اور میرے ذہن میں یہ خیال احتیاط ...ہی میں انتہا پسندی کے باعث آیا تھا لیکن سراج کے رویّے ...خیال کو یقین بنانے میں مدد دی۔ میں نے کہا۔ " اچھا یہ قفل ہے ...اسے کھولو۔"

" میں... میں کیسے کھولوں..." سراج بولا۔ " میرے پاس ...ن سی چابی ہے۔"

میں نے کہا۔ " اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔ ...ن پی صاحب کہتے ہیں کہ میں تالا کیسے کھولوں... ساری عمر ...روں، ڈاکوؤں کے ساتھ رہے۔ ان سے تالے کھولنے کے گُر ...سیکھتے رہے اور ان کی بند زبانیں کھلواتے رہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ ...ن کے سامنے پتھر بولتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے کیا وہ ہماری ...انوں پر پڑے ہوئے قفل کھولنے کے لیے کیا۔ اب کہتے ہیں ...وازے کا قفل بغیر چابی کے کیسے کھولوں؟" میں نے بڑی پھرتی ...سے آگے بڑھ کے اسے لات ماری۔ وہ دروازے سے ٹکرایا اور ...کچھ دیر لمبا لیٹا رہا۔

" چابی اس کے ہاتھ میں دے محسن۔" میں نے دو مُردہ پڑے ...ہوئے محافظوں میں سے ایک کا ریوالور سراج کی طرف پھینکا... ...توڑ دو اس تالے کو ایس پی بہادر... لیکن اپنا اور ریوالور کا رُخ ...دوسری طرف رکھنا... مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ تم پلٹ کر دیکھنا ...چاہتے ہو تو میں تم کو چھلنی کر دوں گا۔"

سراج اُٹھا تو اس کا رنگ زرد تھا۔ " تم خود... خود بھی تو یہ ...کام کر سکتے ہو..."

" وقت مت ضائع کرو... ہم یہ کام تمھیں سونپ رہے ہیں۔" ...محسن بولا۔

سراج نے ریوالور اُٹھایا۔ میری ہدایت کے مطابق اس نے ریوالور اُٹھاتے وقت بھی اپنا چہرہ دروازے کی طرف رکھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ وہ چند سیکنڈ تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے جھک کر ریوالور فرش پر رکھ دیا۔

" میں... میرا خیال ہے... کہ تم ٹھیک کہتے ہو..." وہ ...مُنہ سے بولا۔

" ہم کبھی غلط نہیں کہتے تھے۔ اس کا اعتراف ایک دن تم ...بھی کرو گے۔" میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ بروقت ذہن میں آ جانے والے ایک خیال نے ہمیں بچا لیا تھا تو اسے ہم اپنی ذہانت اور عقلمندی بھی کہہ سکتے تھے اور خوش قسمتی بھی لیکن یہ آوازِ غیب تھی اور تائیدِ ایزدی کے سوا اسے کچھ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

" گویا تم مان رہے ہو کہ دروازے کے قفل میں موت کا جال ہے؟ تم پہلے بھی یہ جانتے تھے مگر خاموش رہے۔ تم کو یقیناً بہت مایوسی ہوئی ہو گی۔ تمہاری ساری امیدیں اس ڈیتھ ٹریپ سے وابستہ ہوں گی۔" محسن بولا۔

ایس پی آگے بڑھا۔ اس نے ڈور لاک کو اُلٹا گھمایا اور چند سیکنڈ خاموش رہا۔ " دلاور... میں سراج ہوں... تم سُن رہے ہو نا؟"

" کیا بات ہے اپنے ایس پی صاحب۔" مخصوص لہجے میں دلاور کی آواز سنائی دی۔ کسی بہت چھوٹے سے اسپیکر میں سے نکلنے والی آواز اصل آواز سے بہت مختلف تھی مگر انداز اور لہجہ دلاور کا تھا۔ ہمیشہ کی طرح پُرسکون۔ جذبات سے عاری ٹھہرا ہوا... ویسے ہی طنز اور تمسخر کا انداز لیے ہوئے۔

" میں باہر آنا چاہتا ہوں۔" سراج نے کہا۔

" اچھا؟ اندر بہت گرمی ہے کیا؟" دلاور بولا۔

" فضول باتیں مت کرو..."

" لو جی آپ ہم پہ ناراض ہو... ہم تو آپ کے بھلے کی کہتے ہیں۔ کیا کرو گے آخر باہر آ کے... باہر وہی کمینی دنیا ہے جس نے آج تک تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اب دوسری دنیا میں ملیں گے اپنے سراج صاحب، کیونکہ یہاں سے تو ہم جا رہے ہیں۔" دلاور بولا۔

" کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کے؟" سراج نروس ہو گیا۔

" اب تمہاری اور ہماری منزل جدا ہے۔ پھر تم کو بتانے سے کیا فائدہ کہ ہم کس راستے پہ جا رہے ہیں۔" دلاور ہنسا۔

" میرے احسانات کا اور میری دوستی کا یہ بدلہ دے رہے ہو مجھے... تم ایسا نہیں کر سکتے دلاور..." سراج نے برہمی سے کہا۔

" کیوں نہیں کر سکتے بھئی؟" دلاور بولا۔ " کیا تم ہمیں روک سکتے ہو؟ اور یہ دوستی اور احسان کی بات تم پہلے بھی کرتے تھے۔ میں نے کتنی بار سمجھایا تھا تم کو کہ ہم سب ایک کاروبار کر رہے ہیں... وہ کاروبار بھی شرافت کا نہیں تھا۔ نقد سودا تھا جس میں نہ کوئی دوستی کا سوال تھا نہ کسی کے احسان کا۔ نہ نیکی کا نہ مروّت کا... تمہارے بعد یہی کام کوئی اور کرے گا۔ ضرورت مند دنیا کے بازار میں بہت ہیں جو تمہاری طرح برائے فروخت ہیں۔ اپنے ضمیر، شرافت، فرض اور انسانیت کے ساتھ... جیسے مکان برائے فروخت ہو تو تمام آسائشوں کے ساتھ زیادہ قیمت ملتی ہے ایسے ہی آدمی کی خدمات کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کتنا اچھا کر سکتا ہے کون زیادہ سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر سکتا ہے۔ تم بھی بُرے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نہیں نقصے مگر اب ہمیں ایک ڈی آئی جی مل رہا ہے... اسی معاوضے پر..."

"دلاور... کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سراج نے اچانک خود کو سنبھال لیا۔ "وہ لوگ تہ خانے میں اُتر گئے ہیں۔"

"تہ خانے میں اُتر گئے ہیں! کیسے؟" دلاور کے لہجے میں تشویش آگئی۔ "ضرور تم نے اُنھیں راستہ بتایا ہوگا نمک حرام۔"

"گالی مت دو... میری جگہ تم ہوتے... تو تم بھی بتاتے۔" سراج نے کہا۔

"اتنی سی دیر میں بول گئے ایس پی بہادر۔" دلاور نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "شاید انھوں نے صرف گولی مارنے کی دھمکی دی ہوگی اور تمہارا دم نکل گیا ہوگا۔ آخر وہ بھی تو تھا جس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جان دے سکتا ہے مگر حکم کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔ اور اُس نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔"

"ٹھیک ہے... میں اتنا بہادر نہیں ہوں۔" سراج نے خفت سے کہا۔ "کیا تم اس کی جگہ ہوتے تو اتنی آسانی سے موت قبول کر لیتے؟ کہنا بہت آسان ہے چوہدری دلاور مگر مرنا بہت مشکل کام ہے... یہ جو تم نے کروڑوں کمائے ہیں کس کے لیے ہیں؟ اتنا خطرہ اور اتنی بدنامی مول لے کر آدمی دولت جمع کرتا ہے، زندگی کا لطف اُٹھانے کے لیے... اس لیے نہیں کہ ایک گولی کھائے اور مر جائے... عیش کریں وہ جنھوں نے انگلی تک نہ ہلائی ہو... جن کو گھر بیٹھے قارون کا خزانہ مل جائے... نہیں دلاور... میں ابھی مرنا پسند نہیں کروں گا... جب دولت ہاتھ میں ہو تو دنیا زیادہ... بہت زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔"

"اپنے ایس پی صاحب!" دلاور ہنسا۔ "کیا موت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اپنے اختیار کی بات ہے؟ مثلاً تم اس وقت جینا تو چاہتے ہو لیکن کیا اپنی مرضی سے جی سکتے ہو؟ وہ راستے تو سب بند ہیں جو زندگی کی طرف جاتے ہیں۔"

"ایسا مت سوچو دلاور... جب کوئی راستہ نہ ہو تب بھی بنانے والے راستہ بنا لیتے ہیں۔" سراج نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "میں ابھی زندہ ہوں... میرے جیتے جی یہ دغا بازی نہیں چلے گی۔ ایسی کی تیسی تمہارے اس ڈی آئی جی کی اور تمہاری... تمہارے سارے راستے تو میری نظر میں ہیں، کیا وہ ڈی آئی جی تمھیں میری نظر سے چھپا سکتا ہے؟ خود چھپ کے رہ سکتا ہے؟ یہ میں ہی تھا جس کے ساتھ تم نے ہر راستے پر خود کو محفوظ سمجھا اور دونوں ہاتھوں سے مال سمیٹا۔" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" دلاور بولا۔

"ہاں ہاں... کھلی دھمکی دے رہا ہوں... مجھے یہاں چھوڑ کے جاؤ اور پھر دیکھو کہ میں کیا کرتا ہوں... تمہاری سات پشتوں کو عبرت حاصل ہوگی... تم نے کیا آسان سمجھ لیا ہے... سراج سے پیچھا چھڑانا... میں تو موت کا فرشتہ ہوں... جب [illegible] آخری سانس قبض نہیں کرلوں گا چھوڑوں گا نہیں... [illegible] دیکھو مجھے۔" سراج نے اُسے ایک زبردست گالی دی۔

"ٹھیک ہے اپنے ایس پی صاحب... پھر ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کون کس کی جان قبض کرتا ہے۔" دلاور نے کہا۔

ان کی یہ لڑائی ایک نیا تجربہ تھی۔ اگر سچ مچ ان کے درمیان کاروباری رقابت کی خلیج آگئی تھی اور دلاور اینڈ کمپنی نے سراج کو سرطان زدہ عضو کی طرح کاٹ کے الگ کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو اس صورت حالات سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ معلوم نہیں دلاور نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ ممکن ہے سراج سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں یا وہ ان کی توقعات پر پورا نہ اُترا ہو۔ دلاور جیسے لوگ اپنی مرضی سے راستوں کے پہریدار خریدتے ہیں اور پھر بے خوف ہو کے سفر کرتے ہیں۔ وہ ہر محافظ کی جیب میں مال ڈالتے جاتے ہیں لیکن اسی طرح جیسے کوئی کتے کو ہڈی ڈالتا ہے۔ ہڈی ڈالنے والا کتے سے وفاداری کی توقع تو رکھتا ہی ہے، اُسے اپنی اوقات بھی یاد دلاتا رہتا ہے۔ یہ بتاتا رہتا ہے کہ وہ ہڈی پر پلنے والا کتا ہے اور کتے کو کتا ہی رہنا چاہیے۔ ایس پی سراج شاید کتا بن کے رہنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ وہ ایک خود سر، بدمزاج اور مغرور آدمی تھا۔ وہ خود کو دلاور اینڈ کمپنی میں اوپر والوں کے برابر سمجھتا ہوگا۔ شاید اسی لیے انھوں نے سراج کو ہٹا کے دوسرے آدمی کو لانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھیں سراج سے پیچھا چھڑانے کا بہترین موقع ہاتھ آیا تھا، وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتے۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سراج پر سندر لال کی نگرانی کا علم دوسروں کو بھی ہو گیا ہو۔ سراج اب مشتبہ افراد میں شامل تھا اور اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ ایسے پولیس افسر کا تعاون حاصل کرنے والے بھی خود کو سو فیصد محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جیسا کہ وہ اب تک سمجھتے آئے تھے۔ سراج کی پوزیشن وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ اس سے پہلے کہ سراج کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی انھوں نے سراج کا متبادل تلاش کر لیا۔ ایک ایسا آدمی ڈھونڈ لیا جو برائے فروخت تھا اور زیادہ کارآمد تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انھیں پیسے کی طاقت بھی حاصل تھی۔ معلوم نہیں وہ کون ڈی آئی جی تھا جس نے ہوسِ زر میں ان لوگوں کا کتا بننا منظور کر لیا تھا۔ دولت کی خاطر اپنے عہدے کی آبرو اور وطن کی عزت کا سودا کر لیا تھا۔ یہ افسوس کی بات ضرور تھی مگر اچنبھے کی نہیں۔ میر جعفر اور صادق ہماری تاریخ کے ہر دور میں رہے۔ ان کے نام بدل گئے مگر ان سب کا کردار ایک ہی رہا۔ کچھ لوگ آج ہمارے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے لیکن بہت سے چہرے ابھی ہمارے سامنے نہیں آئے تھے۔

سراج اب گالیاں بک رہا تھا کیونکہ دلاور نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا تھا۔ وہ مائکروفون یقیناً ڈور لاک میں تھا اور وہ اسپیکر بھی جس کے ذریعے دلاور اور سراج کی دو طرفہ گفتگو جاری تھی۔ ہم یہ تو سمجھ رہے تھے کہ دلاور اور سراج کے درمیان ٹھن گئی ہے مگر ابھی تک یہ اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ دلاور کہاں سے بات کر رہا تھا۔ وہ اسی عمارت کے کسی حصے میں تھا یا کسی دوسری جگہ سے بول رہا تھا۔ نہ جانے وہ جگہ کتنی دُور تھی۔ بظاہر وہ سراج کو ہمارے ساتھ زیرِ زمین تہ خانوں میں مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے اور اگر ان تہ خانوں سے باہر جانے کا راستہ ہوتا تو دلاور یہ نہ پوچھتا کہ کیا اپنی مرضی سے جی سکتے ہو اور یہ چیلنج نہ دیتا کہ دیکھیں اب کون کس کی جان قبض کرتا ہے۔ ان کی گفتگو سے ہی ہم پر تہ خانوں کی موجودگی کا راز افشا ہوا تھا۔ ان تہ خانوں میں کیا تھا؟ یہ ابھی ہم نہیں جانتے تھے۔

"اب تم کیا کرو گے سراج؟" میں نے کہا۔ "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

"میں سب کی ہوا نکال دوں گا۔" سراج نے پلٹ کر کہا۔ "میری دشمنی ان کو بہت مہنگی پڑے گی... بہت مہنگی..."

"ہاں... بشرطیکہ تم دشمنی کرنے کے لیے ان کی دنیا میں پہنچ سکے۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو تم ہمارے ساتھ ہو۔"

"اور تمہاری پوزیشن دھوبی کے کتے سے بھی بدتر ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ دوست تمہارے رہے نہ دشمن... تمہارے لیے اندر اور باہر صرف موت ہے اور وہ بھی عزت کی موت نہیں۔"

"دیکھو... یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے دشمن ہو... میں نے تم سے رعایت نہیں کی... تم کو جس حد تک ذلیل کر سکتا تھا، کیا... تمہارے عذاب کو سخت سے سخت بنایا اور... مجھے اختیار ہوتا تو میں تم کو کتے کی موت مارتا۔" سراج نے کہا۔ "اگر تم کو موقع ملے تو تم بھی کمی نہیں کرو گے۔"

"یہ وعدہ تو ہم کر چکے ہیں۔"

"ہاں، مگر تمہاری اور میری مجبوری ایک ہی ہے۔" سراج بولا۔ "اور وہ ہے جینے کی مجبوری... دوستی اور دشمنی کے رشتے سب زندگی سے مشروط ہیں۔ زندہ رہو گے تو اپنا وعدہ پورا کرو گے۔ باہر نکل گئے تو کوئی تیر مارو گے۔ نہ نکلے تو یہیں مر جاؤ گے۔ میں تم کو باہر نکال کے لے جا سکتا ہوں۔"

"کس شرط پر؟" میں نے کہا۔

"شرط یہی ہے کہ باہر نکلنے کے بعد تم مجھے ایک موقع دو گے۔" سراج بولا۔ "میں تم کو جینے کا ایک موقع دوں گا۔ اس کے بدلے میں تم مجھے جینے کا ایک موقع دو گے۔ ہم اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ ہم دوست نہیں ہوں گے... دشمن ہی رہیں گے مگر دشمنی اس کے بعد شروع ہوگی۔ ہمارے راستے وہی ہیں اور منزل وہی ہے۔ منزل تک پہنچنے کا مقصد الگ ہے۔ ہم انہی راستوں پر پھر ملیں گے۔ تب تک کے لیے تم کو میری اور مجھ کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں تم کو باہر پہنچا دوں گا۔ بس تم وعدہ کرو کہ تم میری پیٹھ میں گولی نہیں مارو گے... مجھے جانے دو گے... یہ وعدہ میں کسی دشمن سے نہیں، وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے چاہتا ہوں۔"

"جب میں نے تمہاری ماں کا نام لے کر تمہاری منت کی تھی تو تم نے کیا جواب دیا تھا؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ پہلے ہوا میں اس سے انکار نہیں کر رہا ہوں... اور نہ تم سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں اور نہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ وقت ضائع مت کرو... مرنا ہے تو آسان راستہ اختیار کرو... پہلے مجھے گولی مارو اور پھر خود کو مار لو... ایسے بھوکے پیاسے تڑپ تڑپ کر مرنے سے کیا فائدہ... یہاں کوئی نہیں آئے گا... کم سے کم ایک ہفتے تک... تم ان ویران کمروں میں چیختے پھرو... دیواروں سے سر ٹکراؤ یا دروازے سے۔ باہر نکلنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو مجھ سے اپنے باپ کے خون کی قسم کھا کے وعدہ کرو کہ میں نے تمھیں باہر نکال لیا تو تم یہ مشین گن مجھ پر نہیں چلاؤ گے اور مجھے قید کر کے بھی نہیں لے جاؤ گے... تم مجھے اتنی مہلت دو گے کہ میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں... کم سے کم ایک گھنٹے تک تم میرے پیچھے نہیں آؤ گے۔ تم اگر مخالف سمت میں جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اب زیادہ بے خوفی سے اور زیادہ اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میں اپنے والد مرحوم وزیر خان کے خونِ ناحق کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس تہ خانے سے نکلنے پر تم کو زندہ رہنے کا ایک موقع دوں گا۔ ایک مجبوری کے تحت میں تم سے اشتراک کر رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہم دشمن نہیں رہے... میرے باپ کو قتل کرنے والوں میں تم بھی ہو... یہ میری اور تمہاری ذاتی دشمنی ہے۔ میں اپنا انتقام خدا پر بھی چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم کو وطن دشمنی کے جرم پر معاف نہیں کر سکتا۔"

"اچھا...؟" وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"تم ذاتی عداوت کے جذبات کو بھول سکتے ہو؟ کیسے...؟"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں اس کے جواب میں تم کو ایک مشہور واقعہ سناؤں گا۔" میں نے کہا۔ "جو شاید تم نے سُنا ہو۔ ایک یہودی کو حضرت علیؓ نے میدانِ جنگ میں زیر کر لیا۔ جب آپ خنجر سے اس کے سر کو تن سے جُدا کرنے والے تھے تو اس نے آپؓ کے مُنہ پر تھوک دیا۔ آپؓ نے خنجر کے وار کو روک لیا اور اُسے بخش دیا۔ یہ فرماتے ہوئے کہ پہلے میرے اور تیرے درمیان راہِ خدا میں جنگ تھی۔ اب میں نے تجھے قتل کیا تو سمجھا جائے گا کہ میں نے ذاتی توہین کا بدلہ لیا... تو ایس پی سراج صاحب... خدا اور اس کے رسولﷺ نے عفو و درگزر کو سب سے بہتر انتقام قرار دیا ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب میں جذبات کی رو میں بہہ کر ان سب کا خون پی جانا چاہتا تھا جو میرے باپ کے قاتل تھے، اس کے قتل میں شریک تھے یا اس کے ذمہ دار تھے۔ اب یہ جنگ وہی ہے جو حق و باطل کی جنگ سمجھی جا سکتی ہے۔ تم میرے وطن... میرے عقیدے۔ میرے کروڑوں ہم وطن مسلمانوں کی نظریاتی اساس کے دشمن ہو تو میں تمہارا دشمن ہوں اور تم میرے نزدیک واجب القتل ہو۔"

"اور اگر... اگر میں تائب ہونا چاہوں... ؟" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

"تم... تم تائب ہو کے کیا کرو گے اب ؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کیوں... کیا توبہ کے دروازے بند بھی ہوتے ہیں؟" وہ بولا۔

"نہیں... مجھے... مجھے نہیں معلوم... کہ تمہاری نیت کیا ہے... اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو... یا کرنا چاہتے ہو اس کے پس منظر میں کیا ہے۔ یاد رکھو مرتے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اگر تم خوف اور مجبوری میں توبہ کرنے کی سوچ رہے ہو تو بے کار ہے... لیکن فیصلہ کرنے والا میں نہیں، وقت ہے۔ یہاں اس موضوع پر بات کرنے کا کیا فائدہ... ہم تمہاری کسی بات پر اعتبار کرنے والے نہیں۔ آئندہ جو کچھ ہو گا، وہ دُور کی بات ہے۔ ابھی تو ہمارے درمیان ایک وقتی معاہدہ ہوا ہے۔ تم ہمیں باہر لے چلو... ہم تم کو جانے دیں گے۔ آئندہ کبھی سامنے آئیں گے تو دوست ہوں گے یا دشمن، اس کی بات کرنا ابھی بے کار ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور واپس چل پڑا۔ میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر بھی ایک پُرامید مسکراہٹ تھی۔ کیا ایسا ہو گا کہ سراج تائب ہو جائے گا۔ آدمی ٹھوکر کھا کے ہی سنبھلتا ہے۔ اور صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اُسے بھولا بھی نہیں کہتے۔ دیر سے ہی سہی، اگر اب بھی اسے احساس ہو جائے کہ جس راستے پر وہ چل رہا تھا، وہ غلط تھا تو بلاشبہ وہ آئندہ زندگی کے لیے صراطِ مستقیم کا انتخاب کر سکتا ہے۔ وہ سابقہ غلطیوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ معافی مانگ سکتا ہے۔ باقی عمر نیکیاں کما کے وہ گناہ اور ثواب کے حساب کو برابر کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب تک وہ فرض سے بے گانہ تھا۔ وہ اپنے فرض کو پہچان لے تو ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چور اگر پرہیزگار ہو جائے اور کوتوال بن جائے تو سب چور پکڑے جاتے ہیں کیونکہ وہ سب کو پہچانتا ہے اور سب کے ٹھکانے جانتا ہے۔ ایک ایس پی اگر راتوں رات انتقامی ردِعمل کا شکار ہو جائے تو ہمیں وہ سب معلومات فراہم کر سکتا ہے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہوں، وہ اندر کے سب لوگوں کو پہچانتا تھا۔ سب خفیہ راستوں سے واقف تھا۔ انسان سے دغا کی امید نہ تھی جن کا وہ سب سے بڑا معاون تھا۔ اب وہ ان کی دشمنی مول لینے کی پوزیشن میں تھا۔ اس نے بہت دولت کما لی تھی مگر اتنی دولت کمانے کے بعد اس پر واضح ہوا تھا کہ وہ دھوبی کا کتا ہے۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اسے مزید دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایماندار اور فرض شناس بن کے اپنی ذات پر آنے والے شک کے سائے سے بھی بچ سکتا تھا۔ افسرانِ بالا کی نظر میں نیک نام ہو سکتا تھا۔ یہ ثابت کر سکتا تھا کہ اس کے خلاف الزامات بے بنیاد تھے۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان بھی حاصل کر سکتا تھا۔ میرے خیال میں سراج کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں تھا اور اگر وہ سچ مچ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا تو میں اس کے سارے قصور معاف کر سکتا تھا۔ وہ سب زیادتیاں بھول سکتا تھا جو اس نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے جو کچھ میں سوچ رہا تھا، شاید وہی محسن بھی سوچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حالات بھی ایک بہت بڑے انقلاب کی علامت تھی۔ دلاور اینڈ کمپنی نے سراج کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اس کے مرنے سے پہلے کسی اور کو سراج کی جگہ دے دی تھی تو یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ مگر دشمن اگر ایسی غلطیاں نہ کرے تو ثابت کیسے ہو کہ اس کا مالک دھولا، راہبر اور رہنما، مشیر و معاون شیطان تھا۔

سراج آخری کمرے کے دروازے سے گزر گیا۔ اس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ آگے راہداری بند تھی اور مجھے اپنے سامنے ایک سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔

"کیا تم اس دیوار کو توڑ سکتے ہو؟" سراج نے کہا۔ "یہ کوئی بہت مضبوط دیوار نہیں ہے۔ ایک اینٹ کی کھڑی چُنائی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کے پیچھے ایک کچی پہاڑی ہے۔ ریت کنکر پتھر کی دیوار ہے۔" وہ بولا۔ "اس سے یہ دیوار ملی ہوئی ہے مگر بیچ میں تھوڑا بہت خلا ضرور ہو گا۔ یہ عمارت کا آخری حصہ ہے۔ باقی عمارت آر سی سی چھت کے نیچے ہے اور اس کے اوپر مٹی ہے اور جھاڑیاں ہیں۔ باہر سے یہ عمارت نظر نہیں آتی لیکن میں نے نقشہ دیکھا تھا تو اس دیوار سے ملی ہوئی پہاڑی تھی۔ اگر تم دیوار کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکالو تو اینٹوں کے ساتھ ہی ریت اور کنکر اندر گریں گے۔ ایک شگاف ہو جائے تو مزید اینٹیں نکالنا مشکل نہیں ہو گا۔ تین بائی تین کا راستہ بنانے کے بعد اوپر کی جانب سے زمین کھودنا پڑے گی۔ بُھربُھری مٹی ہے۔ خود ہی شگاف سے اندر گرتی جائے گی۔ میرا خیال ہے تین چار فٹ کھدائی کے بعد ہم باہر ہوں گے۔"

"اور اگر اوپر بیس پچیس یا تیس چالیس فٹ تک پہاڑی ہوئی۔ بُھربُھری کنکر پتھر والی مٹی نہ ہوئی۔ کوئی چٹان آ گئی تو؟" میں نے کہا۔

"بلندی کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ اس کنارے پر پہاڑی کی اونچائی زیادہ نہیں ہے کیونکہ یہ پہاڑی کا کنارا ہے۔ درمیان میں سے اس کی اونچائی چالیس پچاس فٹ ہو گی مگر یہاں نہیں... تاہم میرا اندازہ ہے کہ پانچ فٹ سے زیادہ مٹی نہیں ہو گی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بیچ میں چٹان ہو گی یا نہیں کیونکہ میں نے پہاڑی کو صرف اوپر سے دیکھا تھا۔" سراج نے کہا۔

"کیوں دیکھا تھا؟" محسن نے کہا۔ "تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں ایک دن اسی طرح قید ہو جانے کا ڈر تھا۔"

"میں نے اور دلاور نے اس زیرِ زمین عمارت کا ہر طرف سے جائزہ لیا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ کوئی اندر پہنچ سکتا ہے تو کس طرف سے۔ اور اندر سے باہر نکلنا چاہے تو کیسے نکلے گا۔ اس وقت دلاور نے تھوڑی سی تشویش کا اظہار کیا تھا کہ ادھر سے دیوار کا اوپر والا کنارا پہاڑی کے نیچے آ گیا ہے اور پہاڑی کچی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ادھر تھوڑا سا سیمنٹ اور کنکریٹ بچھا دینا چاہیے۔ مگر بعد میں اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور دلاور بھی بھول گیا۔" سراج نے کہا۔

"ٹھیک ہے... ہم کوشش ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہمارے پاس کھودنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اس عمارت میں سب کچھ ہو گا سکندر۔" محسن بولا۔ "وہ یہاں رہتے تھے۔ ہم سب نے وہ جگہ بھی دیکھی ہے۔"

"وہ... اس کا راستہ ادھر سے نہیں ہے۔" سراج نے بیچ میں بات شروع کر دی۔ "باہر والا دروازہ کُھل سکتا تو ہم آگے جب کے اوپر پہنچ سکتے تھے۔ وہاں سب مل سکتا تھا مگر دروازے کو کھولا نہیں جا سکتا اور یہ سب کمرے خالی ہیں۔"

"چلو ہم اسٹین گن کا استعمال کریں گے۔" میں نے کہا۔ "کام کی بندوق گرو گے۔ تم میرے کندھوں پر چڑھ کے اوپر والے حصے کی اینٹیں نکالو گے۔ تمہارے پاس خالی اسٹین گن ہو گی۔ بھری ہوئی اسٹین گن لے کر محسن کھڑا رہے گا۔ پھر میری جگہ تم لو گے اور محسن تمہارے کندھوں پر چڑھ کے باقی کام کرے گا۔ بھری ہوئی اسٹین گن میرے ہاتھ میں رہے گی۔"

"اپنے اطمینان کے لیے تم کچھ بھی کرو... مجھے اعتراض نہیں لیکن دیر مت کرو۔" سراج بولا۔ "ایسا نہ ہو، وہ لوگ نکل جائیں۔"

"کہاں؟ وہ نکل کے کہاں جائیں گے؟" میں نے کہا۔

"ایسے کیا بتاؤں۔ ان کے کئی ٹھکانے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم نے تہ خانوں کا ذکر بھی کیا تھا۔" محسن بولا۔

"تہ خانوں کے چکر میں پڑو گے تو وہ تمہارے ساتھیوں سمیت غائب ہو جائیں گے اور پھر تم کو نہ جانے کب تک بھٹکنا پڑے گا۔" وہ بولا۔

"تم یہ تو بتا سکتے ہو کہ ان تہ خانوں میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اسلحہ ہے۔" وہ بولا۔ "فیصلہ کر لو کہ تہ خانے دیکھو گے یا باہر نکل کے دلاور کا راستہ روکو گے۔"

"کیا ہم ان کا راستہ روک سکتے ہیں؟" محسن بولا۔ "میرا خیال ہے کہ براہِ راست مقابلہ مشکل ہو گا۔ اور شاید سودمند بھی نہ ہو۔ ہم ان کے تعاقب میں بھی جا سکتے ہیں... تمہیں تو اُن کے سارے ٹھکانے معلوم ہیں۔"

"لیکن... میں تم کو ہر ٹھکانے تک کیسے لے جا سکتا ہوں۔ باہر نکلنے کے بعد میرے اور تمہارے راستے الگ ہوں گے۔" سراج نے کہا۔

"میرا اور تمہارا راستہ ایک ہی ہو گا ایس پی صاحب... تم خود مجھے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے... تم جانتے ہو، وہ کہاں جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"تم... تم نے ابھی وعدہ کیا تھا۔" سراج نے خوف اور مایوسی کے ساتھ کہا۔ "کیا تمہاری کوئی بھی قسم اعتبار کے قابل نہیں۔"

"قسم میں نے نہیں کھائی تھی سراج... سکندر اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔" محسن بولا۔ "وہ تمہارے پیچھے نہیں جائے گا لیکن میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا اور کوئی قسم نہیں کھائی۔"

سراج کو احساس ہوا کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہے۔ سراج سے غیر ارادی طور پر ایک چُوک ہو گئی تھی۔ اس نے میرے وعدے کو ایک اجتماعی وعدہ سمجھ لیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے قسم کھائی ہے تو اس کا پابند محسن بھی ہو گا۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا کہ محسن سے بھی حلف اٹھوائے۔ باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہو چکا تھا اور وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا لیکن باہر جانے کے بعد قسم کا پابند صرف میں تھا۔ میں نے اپنے باپ کے خونِ ناحق کی قسم کھائی تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ محسن یا میرا کوئی ساتھی بھی سراج کے تعاقب میں نہیں جائے گا۔

"محسن ٹھیک کہہ رہا ہے سراج! یاد کرو تمہارے الفاظ کیا تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں وزیر خان کے بیٹے سکندر بخت سے وعدہ چاہتا ہوں اور وعدہ صرف میں نے کیا تھا۔ میں نے ایک بار بھی ہم کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ میری قسم کا پابند محسن نہیں ہے۔"

تم دھوکے سے ابتدا کر رہے ہو۔" سراج بگڑ گیا۔

"اوّل تو یہ دھوکا ہے نہیں۔ یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد یہ مان لیا جائے کہ تم سے دھوکا ہوا تو اس میں بھی کوئی بُری بات نہیں کیونکہ جنگ میں سب جائز ہے۔ تم خود ہمیں دھوکا دیتے آئے ہو۔ تم حکومت کو دھوکا دے رہے ہو۔ اس ملک کے رہنے والوں کو دھوکا دے رہے ہو اور ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔ جو سب کو دھوکے دے رہا ہو اس کے ساتھ دھوکا کیوں نہ کیا جائے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔"

"میں۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہاری مدد کروں گا۔۔۔ تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"مجھے اس پر اعتبار نہیں تھا۔ تمہارا ایسا کہنا بھی دھوکا ہو سکتا تھا" محسن نے کہا۔ اور اسی لیے میں طے کر چکا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے قسم کھانے کو کہا تو میں انکار کر دوں گا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تم ہمارا ساتھ دینے کی کیوں سوچ رہے تھے؟ اس لیے کہ اب تک تم جن کا ساتھ دیتے آئے تھے انھوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم ان کے پاس جاؤ گے تو وہ تم کو دھتکار دیں گے۔ ان سے دشمنی کرو گے تو کس برتے پر۔۔۔ تم ان کی طاقت کو جانتے ہو۔۔۔ وہ تمہیں عہدے سے ہٹوا سکتے ہیں۔ گرفتار کروا سکتے ہیں یہاں تک کہ مروا سکتے ہیں۔ تم ہمارا ساتھ دینے پر اس لیے تیار ہوئے تھے کہ اب تم نے انھیں اپنا دشمن مان لیا ہے اور ان کے خلاف تم کو ہماری مدد کی ضرورت تھی۔ تم ذاتی انتقام کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہم تو پہلے ہی ان کو نیست و نابود کرنے پر کمربستہ ہیں۔ یہی تمہاری خواہش بھی ہے۔ چنانچہ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف نیکی کما کے افسرانِ بالا کا یہ شبہ دُور کر دو کہ تم ملک دشمن عناصر سے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف دغا دینے والوں کو عبرت ناک سبق دو۔۔۔ یہ ثابت ہو جائے کہ تم تو بہت ہی ایماندار اور فرض شناس افسر ہو اور تمہاری نشاندہی پر ملک دشمن افراد کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ جو مالِ حرام تم نے اب تک کما لیا ہے وہ کوئی نہ دیکھے اور تم نیک نامی بھی کما لو۔"

میں حیرت سے محسن کو دیکھتا رہا۔ اس نے سراج کی نیت کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور اس نے وہی سمجھا تھا جو میں نے سمجھا تھا۔ اس نے سراج کو آئینہ دکھا دیا تھا اور سراج میں ہمت نہ تھی کہ نظر اُٹھا سکے۔ اس نے پھر مزید بحث نہیں کی اور خاموشی سے ہمارے ساتھ تعاون کرنے لگا۔ اس کے بیان کے مطابق ہمیں دیوار کے اوپر والے حصّے کی اینٹیں نکال کر راستہ بنانے میں کچھ زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ باہر اندر کی طرف گرنے والی بھربھری مٹی ایک ڈھیر کی شکل میں کمرے میں جمع ہو گئی تھی۔

"ہم پہلے تہ خانے دیکھیں گے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ یوں سمجھو کہ میں تہ خانہ دیکھوں گا۔" محسن کچھ دیر بعد بولا۔ "سکندر باہر جائے گا اور باہر ہی ہمارا انتظار کرے گا۔"

"نہیں، میں بھی تہ خانے میں ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنی قسم کے مطابق میں نے باہر نکلنے کے بعد سراج کے پیچھے نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ یہ وعدہ اندر کے لیے نہیں تھا۔ پہلے ہم تہ خانے دیکھ آئیں۔ پھر باہر جانے کے بارے میں سوچیں گے۔"

سراج کو اگر اپنی زندگی سے اتنا پیار نہ ہوتا تو وہ اتنا بزدل نہ ہوتا اور اتنی آسانی سے ہماری بات نہ مانتا۔ تیر اس کی کمان سے نکل چکا تھا مگر زندہ رہنے کی مجبوری اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ واپس چل پڑا۔

"میں کچھ بھول گیا۔" سراج نے اچانک ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا۔

"کیا بھول گئے؟" میں نے کہا۔

"وہی۔۔۔ تہ خانے کا راستہ۔۔۔" سراج نے کہا۔ "دراصل میں ایک ہی بار نیچے گیا تھا۔۔۔ اور اس وقت دلاور آگے تھا۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔"

"کیا دلاور نے دھیان دینے سے منع کر دیا تھا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "تم ہو صحیح نمک خوار۔ مطیع و فرماں بردار، حکم کے غلام۔ تم نے کہا کہ اچھا جی مائی باپ، اگر آپ نہیں چاہتے تو ہم دھیان نہیں دیتے۔"

"میں۔۔۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" سراج نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا۔۔۔ وہ اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"خوب، آپ کسی اور کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "غالباً اپنی محبوبہ یا منگیتر کے بارے میں کہ آپ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد وہ کس کے پاس جائے گی۔ بہتر ہو گا اگر آپ پھر ہی سوچیں۔"

"تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔" سراج نے کہا۔ "تہ خانے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ اس کا راستہ تلاش کرنا پڑے گا اور پھر نیچے جانے آنے میں مزید وقت لگے گا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ اتنی دیر میں کوئی اوپر آ کے وہ راستہ دیکھ لے۔۔۔ جو ہم نے بنایا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ سراج ہمیں تہ خانے میں لے جانے سے گریز کر رہا ہے۔ اس نے پہلے راستہ بھول جانے کا بہانہ کیا۔ پھر تاخیر کے نتائج سے ڈرایا۔ سراج کو اس تھپڑ کی بالکل توقع نہ تھی جو میں نے ایک دم اس کے مُنہ پہ اُلٹے ہاتھ سے رسید کیا۔

"یہ حرکت دوبارہ مت کرنا سراج۔" میں نے کہا۔ "انتخاب اس وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تہ خانے کا راستہ ہم تم سے ہی پوچھ لیں گے اور مرتے دم تک تم انکار پر قائم رہے تو خود دریافت کر لیں گے۔"

"ہمیں اب کوئی جلدی نہیں ہے۔" محسن نے تائید میں سر ہلایا۔ سراج کا ایک ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس نے آستین سے لب صاف کیے۔ "تم یہ بھی نہیں سوچتے کہ اتنی دیر میں وہ بہت دُور نکل جائیں گے۔۔۔ رابعہ کے ساتھ۔۔۔"

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ وہ رابعہ کو کہاں لے گئے ہیں اور تم ہی ہماری رہنمائی اس ٹھکانے تک بھی کرو گے۔ فی الحال خیریت چاہتے ہو تو تہ خانے کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔ "رابعہ کا اللہ مالک ہے؟"

"میں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔" سراج نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اس ذخیرے کو تباہ کر دو گے۔۔۔ اور وہ اس کا ذمّے دار مجھے سمجھیں گے۔۔۔ اور اس کی سزا بہت سخت دیں گے۔"

"کیا تم پاگل ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تم کو ہمارے ساتھ مرنے کے لیے چھوڑ گئے۔۔۔۔۔ وہ تم کو مردہ سمجھ کے بھول چکے ہیں۔ تم اب ان کے ساتھ نہیں ہو۔۔۔ تمہاری جگہ کسی اور کو دے دی گئی ہے۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو گی؟"

"کیا تم نہیں جانتے کہ سزائے موت بہت کم سزا ہوتی ہے۔ یہ سزا صرف ایک آدمی کو ملتی ہے اور موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جب اُسے سخت ترین سزا دینی ہو تو مرنے نہیں دیا جاتا۔ مجھے بتاؤ، کیا ایسا وقت نہیں آیا تھا جب تم نے موت کی آرزو کی تھی۔ اس لیے کہ موت اس عذاب کے مقابلے میں بہت کم تھی جو تم جھیل رہے تھے؟ موت تمہاری نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی نے اگر سراج کو الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو یہ واقعی ان کی مہربانی تھی کہ وہ سراج کے لیے سزائے موت کا انتظام کر کے چلے گئے تھے۔ سراج کا وجود ان کے لیے بے مصرف ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس کی وجہ سے نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس نقصان سے بچنے کے لیے انھوں نے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔ اگر اس کی بے وقوفی یا غداری کا ثبوت مل جاتا یا یہ بھی پتا چل جاتا کہ سراج نے جانتے بوجھتے ان کو نقصان پہنچانے والوں کا ساتھ دیا تھا تو یقیناً اس کی سزا زیادہ سخت ہوتی۔ اس کی موت زیادہ سخت ہوتی۔ مرتا تو آدمی ایک ہی بار ہے مگر اس کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیت کو طول دیا جا سکتا ہے۔ اسے تھوڑا تھوڑا کر کے قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے یا ایک سال تک موت کے کرب میں معلق رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس عرصے میں وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی غلطی کی سزا وہ بھی پا رہے ہیں جن سے وہ محبت کرتا تھا۔ جن کے لیے وہ نوکِ خار کی چُبھن بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"میں سمجھ گیا سراج۔۔۔" میں نے کہا۔ "لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی چوروں کا ساتھ دیتا ہے تو اُسے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ پکڑا گیا تو خواہ اُسے پہلی واردات کے مالِ غنیمت میں سے پھوٹی کوڑی نہ ملے، اسے ان سب کے برابر سزا ملے گی جو پہلے سے وارداتیں کر رہے تھے مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ پکڑے نہیں گئے تھے۔ پہلی بار ساتھ دینے والا بدقسمت بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ تمام سابقہ جرائم کی سزا پائے اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔۔۔ قتل کرنے والا اگر خنجر اُٹھانے سے پہلے یا گولی چلانے سے پہلے اس شخص کے بارے میں سوچ لے جو موت کے اندھے کنوئیں میں پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا اکیلا تڑپ رہا ہو اور فرشتۂ اجل کے سوا اس کی مدد کوئی نہ کر سکتا ہو۔۔۔ تو شاید وہ ہاتھ روک لے۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اور اسی لیے آئے دن ورثا، بیوی بچے اور بوڑھے ماں باپ۔۔۔ آخری ملاقات کے لیے لائے جاتے ہیں اور پھر صبح دم طلوعِ آفتاب سے قبل اس کی لاش لینے جیل کے دروازے پہ جمع ہوتے ہیں۔۔۔ تم نے وہ سب کچھ دیکھا جو میرے اور محسن کے ساتھ ہوا۔ مگر اس وقت تم کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہی سب کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تمہیں یہ ڈر ہوتا تو کیا تم وہ سب کرتے جو تم نے کیا تھا۔"

"اب تم بھی ان کے لیے دشمن ہو۔۔۔ تمہاری پوزیشن ابھی تک وہ نہیں جو ہماری ہے۔۔۔ لیکن ہو جائے گی۔۔۔ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔" محسن نے کہا۔ "ہم نے تو اپنا عذاب کاٹ لیا۔ یہ ہمارے لیے غیر متوقع تھا اس لیے ہم ڈرے نہیں تھے۔ یہی عذاب تم کو درپیش ہے اور تم اس لیے خوفزدہ ہو کہ تم نے ہمیں عذاب میں دیکھا ہے۔"

"یوں سمجھو کہ تم نے ایک شخص کو پھانسی پاتے دیکھا تھا اور اس وقت تم جیلر تھے یا جلاد تھے۔" میں نے کہا۔ "اب اس نادیدہ ہستی کی قوت نے جو انسانوں کی تقدیر کے فیصلے لکھتی ہے، خود تم کو تختۂ دار پر لا کھڑا کیا ہے۔ مگر کیا تم نوشتۂ تقدیر کو بدل سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم لوگ... تم لوگ مجھے بچا سکتے ہو۔" وہ یکلخت ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔ "مجھے تہ خانے تک جانے پر مجبور نہ کرو۔ مجھے معاف کردو۔ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا، میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف ہاتھ جوڑنے سے کسی غلطی کی تلافی نہیں ہوتی... تم تو قانون کو سمجھتے ہو... اس پر عمل کراتے ہو۔ اگر تم کسی چور کو یا ڈاکو اور قاتل کو ارتکاب جرم کے وقت گرفتار کرلو تو کیا اس کو ہاتھ جوڑنے پر معاف کردو گے؟ جسے تم اپنی غلطی کہہ رہے ہو وہ غلطی نہیں تھی سنگین ترین جرم تھا۔ غداری سے بڑا جرم ملک کے قانون کے تحت اور کیا ہوگا ایس پی صاحب؟"

"تاہم تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔" محسن بولا۔ "قانون میں ایک شق وعدہ معاف گواہ کے لیے خصوصی رعایت کی ہوتی ہے۔ وہ باقی مجرموں کے خلاف ٹھوس شہادت دے اور انھیں کیفر کردار تک پہنچانے میں قانون کا معاون ہو تو اس کی سزا بہت کم یا بالکل ختم بھی ہوجاتی ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ ملک کا قانون ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ کیونکہ اس قانون کے ہاتھ مضبوط کرنے والے نہی تھے مگر تم نے قانون کے ہاتھ کاٹ دیے تھے۔ اب قانون ہم ہیں۔ قانون وہ ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم خود مدعی ہیں، خود منصف اور خود سزا پر عمل درآمد کرنے والے۔ اب یہ پی پی سی یا ضابطۂ فوجداری پاکستان کی کسی دفعہ کے تحت چلایا جانے والا مقدمہ نہیں ہوگا۔ یہ ایم آر ایس کے وضع کردہ قانون انصاف کے مطابق چلے گا اور تم یہ کرسکتے ہو کہ وعدہ معاف گواہ کی طرح اصل مجرموں کے خلاف ایم آر ایس کی عدالت میں بیان دو، گواہی دو اور ثبوت پیش کردو۔"

میں نے تعریفی نظروں سے محسن کی طرف دیکھا۔ اس نے بہت واضح الفاظ میں سراج کے سامنے ایک متبادل راستہ رکھ دیا تھا۔ سراج خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کا ذہن کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محفوظ وہ کسی طرح بھی نہیں۔ اگر اس نے ہماری بات نہ مانی تو ہم اسے بخشنے والے نہیں۔ اگر اس نے ہمارا ساتھ دیا تو دلاور اینڈ کمپنی اسے بخشنے والی نہیں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ وہ نہ آگے جاسکتا تھا نہ پیچھے۔

"تم جانتے ہو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر تم نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔" محسن بولا۔

سراج نے آہستہ سے سر ہلایا اور آگے بڑھا۔ بظاہر وہاں ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے ہم کچھ اندازہ کرسکتے۔ محسن نے بتایا تھا کہ رابعہ کے کمرے میں جو روشندان ہے اس کے ساتھ ہی مسٹر ایکس کا کمرہ ہے یا کوئی آفس ہے جہاں ہونے والی گفتگو رابعہ کو سنائی دیتی تھی۔ اب سراج اسی کمرے میں کھڑا ہوا تھا اور روشندان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے دیوار کو کھرچنا شروع کیا۔ دیوار کا رنگ اکھڑنے لگا۔ سراج نے عین روشندان کے نیچے سے رنگ اتارنا شروع کیا اور رنگ کے بڑے بڑے نیلے اور چتے ٹکڑے نیچے گرنے لگے۔ اس رنگ کے نیچے بھی مختلف رنگ نہیں تھا مگر رنگ کی اوپر والی تہ پھیکی پڑگئی تھی چنانچہ نیچے سے نمایاں ہونے والا رنگ نیا اور گہرا محسوس ہوتا تھا۔

سراج نے تین فٹ کی چوڑائی اور چھ فٹ کی لمبائی کا رنگ اتار دیا۔ اب یہ مستطیل ٹکڑا باقی دیواروں سے الگ نظر آنے لگا۔ اگر ہم خوردبین یا محدّب عدسہ لے کر اس عمارت کی ایک ایک دیوار کو دیکھتے پھرتے تب بھی ہمیں اس جگہ کا پتا نہ چلتا۔ اس کمرے میں رہ کر بھی ہم کبھی اندازہ نہیں کرسکتے تھے کہ ایک دیوار کسی بھی طرح دوسری دیوار سے مختلف ہے۔ اوپر کا رنگ بالکل ہموار اور ایک جیسا تھا۔ دلاور اینڈ کمپنی کی چالاکی پر میری عقل دنگ رہ گئی۔ اگر وہ اپنا ایک مہرہ نہ گنواتے تو شاید اس محاذ پر ان کو بازی مات نہ ہوتی۔

"یہ ہے نیچے جانے کا راستہ۔" سراج نے کہا۔ اس کی آواز اور لہجے میں شکست اور مایوسی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ "میں نے تمہارے لیے یہ راستہ کھول دیا ہے مگر اپنے لیے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔"

"اس کا احساس تمہیں آج ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "واپسی کے راستے تو تم نے بہت پہلے بند کردیے تھے۔ آج تو اچانک تمہارے سامنے دیوار آگئی ہے۔"

"اس دیوار کے پیچھے ایک کمرہ ہے۔" وہ بولا۔ "پہلے یہاں ایک دروازہ تھا۔ پھر اس کی جگہ دو انچ موٹی دیوار اٹھادی گئی اور اس پر رنگ کردیا گیا... اسے تم لات مار کے گرا سکتے ہو۔ چنائی کچی ہے۔"

لات کے بجائے میں نے اس پر اسٹین گن کا دستہ مارا۔ اس کی بہت سی پتلی پتلی اینٹوں کے دوسری جانب گرتے ہی دیوار میں خاصا بڑا شگاف پیدا ہوگیا۔ پھر محسن نے اوپر والا حصہ بھی گرادیا۔ مجھے اب اپنے مقابل وہ کمرہ نظر آرہا تھا جس میں وہ سب جمع ہوتے تھے۔ اس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک میز تھی جس کے گرد چھ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ میز کھانے کے لیے بھی استعمال ہوسکتی تھی اور گول میز کانفرنس کے لیے بھی۔ اور دونوں مقاصد کے لیے استعمال بھی ہوتی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی الماری رکھی ہوئی تھی اور اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ الماری میں کچھ کراکری تھی اور چائے وغیرہ بنانے کا سامان تھا۔ اسی الماری کے قریب کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا تھا جس پر سیاہ ہوجانے والی المونیم کی پتیلی رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے گوشے میں چھوٹا سا فریج تھا۔

پہلے میں دیوار کے ملبے پر سے گزرا اور دوسری جانب ریوالور لے کر کھڑا ہوگیا۔ پھر سراج اندر آیا اور آخر میں محسن۔ میں نے زیادہ تفصیل سے کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سوائے ایک بات کے، ایک بیڈ کے سرہانے میز پر مختلف رنگ کے چند تار لٹک رہے تھے۔ یہاں ان کا مواصلاتی نظام تھا جس سے وہ ہماری گفتگو سنتے تھے۔ شاید ریکارڈ بھی کرتے تھے۔ ہم سے بات کرتے تھے اور باہر والوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ جاتے وقت وہ سارے آلات وغیرہ لے گئے تھے اور منقطع تار چھوڑ گئے تھے۔ کمرے کی اونچائی اتنی ہی تھی جتنی ہمارے کمروں کی تھی۔ لیکن یہ کمرہ رقبے میں دُگنا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ رابعہ کو یہاں ہونے والی گفتگو کیوں سنائی دیتی تھی۔ دو انچ کی کچی دیوار آوازوں کو مؤثر طور پر نہیں روک سکتی تھی مگر یہ خامی دلاور اینڈ کمپنی کے علم میں نہیں تھی۔

"اس کمرے میں مجھے کوئی دوسرا دروازہ نظر نہیں آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"دروازہ اس الماری کے پیچھے ہے۔" سراج نے کہا۔

"محسن کے ساتھ مل کے اسے ہٹاؤ۔" میں نے کہا۔ "بلکہ بہتر ہوگا اگر تم اکیلے ہی کوشش کرو۔"

"ہاں الماری زیادہ بھاری تو نہیں لگتی۔" محسن نے کہا۔ "پہلے برتن نکال کے نیچے رکھ دوگے تو کام زیادہ آسان ہوجائے گا۔"

سراج نے بڑی مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم اب بھی شک کرتے ہو کہ میں دھوکا کرسکتا ہوں۔"

"میں سانپ اور بچھو پر بھروسا کرنے کا رسک لینے کو عقلمندی نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "خواہ وہ میری قید میں ہی کیوں نہ ہو۔"

سراج نے غصّے میں برتن نکال کے باہر پھینک دیے۔ کپ اور پیالے اور پلیٹیں فرش پر گر کے ٹوٹ گئے۔ چمچے بکھر گئے۔ چائے کی پتی اور چینی کی شیشیاں پاش پاش ہوگئیں۔ پھر سراج نے خالی الماری کو دھکا دیا اور لکڑی کی الماری بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ مجھے اس آواز سے فرش کے نیچے خلا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ الماری کی جگہ اب ایک دروازہ نمودار ہوگیا تھا۔

"اب اگر تم کہو گے کہ اس کا قفل بھی کھول دو تو میں نہیں کھول سکوں گا۔" سراج نے اپنی ذلت کے احساس کو دبانے کے لیے تھوڑی سی خفگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے ایک دم ریوالور اٹھا کے فائر کیا۔ آواز زیادہ نہیں تھی مگر اس کمرے کی محدود جگہ میں زیادہ سنائی دی۔ سراج بُری طرح چونکا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گولی اس کے سامنے سے گزری تھی۔ میں نے تالے کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی سراج کے پیٹ سے چند انچ دُور رہ گئی تھی۔

میں نے دوسرا فائر کیا تو تالے کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے۔

"اب دروازہ کھل جائے گا... آگے چلو..." محسن نے کہا۔

سراج پلٹا اور اس نے دروازے کو لات ماری۔ دونوں پٹ اندر کی طرف کھلے اور میں نے اپنے سامنے ایک تاریک خلا دیکھا۔

"نیچے روشنی کا کیا بندوبست ہے؟" میں نے کہا۔

"اور اسی سوال سے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عمارت میں بجلی کہاں سے آتی ہے؟" محسن نے کہا۔

"بجلی واپڈا والے فراہم کرتے ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ان کا اپنا انتظام بھی ہے۔ نیچے جنریٹر ہے جو بجلی کے جاتے ہی ٹرپ ہو جاتا ہے۔ یعنی خود چل پڑتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ... ویسے میں ٹرپ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" میں نے کہا اور محسن سے مخاطب ہوا۔ "انسپکٹر رستدر نے مجھے بتایا تھا کہ اوپر صرف ایک کمرہ ہے جس پر واپڈا سب اسٹیشن کا بورڈ لگا ہوا ہے اور آس پاس خاردار تاریں ہیں۔ خود واپڈا والوں کو اپنے اس سب اسٹیشن کا پتا نہیں ہوگا۔"

سراج نے دروازے سے نیچے قدم رکھا اور کوئی سوئچ دبایا۔ اس سے اندر روشنی پھیل گئی۔ سراج کے پیچھے چلتے ہوئے ہم نیچے اترنے لگے۔ کُل بارہ زینے تھے اور ہر زینہ شاید آٹھ انچ بلند تھا چنانچہ تہ خانہ آٹھ فٹ کی گہرائی میں تھا۔ زینہ ختم ہوتے ہی مجھے ایک نیم تاریک ہال نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہال پوری اوپر والی عمارت کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی بھی پچاس فٹ تھی اور چوڑائی بھی پچاس فٹ... یہ صحیح پیمائش نہیں تھی۔ مجھے چھت کے نیچے تو سیمنٹ اور کنکریٹ کے ستون دکھائی دے رہے تھے۔ انہی ستونوں نے اوپر کے سارے اسٹرکچر کا وزن سنبھال رکھا تھا۔ ہر قطار میں تین پلر تھے اور ایسی تین قطاروں کے ہر پلر کے درمیان کا فاصلہ دونوں جانب سے بارہ فٹ کے قریب لگتا تھا چنانچہ ہال اتنا ہی لمبا اور چوڑا ہوسکتا تھا۔

جنریٹر نیچے والے دروازے کے قریب ہی نصب تھا۔ وہیں اوپر مجھے ایک سوئچ بورڈ نظر آیا۔ میں نے اس کے بٹن دبائے تو ہال کے ہر ستون پر نصب بلب روشن ہوتا گیا۔ ہال کی دیواروں پر سیمنٹ کے پلاسٹر کا رنگ تھا مگر ہر ستون پر دو سو واٹ کا بلب سرچ لائٹ کی صورت میں یوں لگایا گیا تھا کہ سب کی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

روشنی مختلف سمت میں جاتی تھی اور ہال کے ہر گوشے کو روشن کر دیتی تھی۔ اس روشنی میں مجھے نیچے سے اوپر تک ویسے ہی باکس نظر آنے جیسے ہم نے گاما ماچھی کے اڈّے پر اور پھر سائیں پاپڑ والے کے مزار کے پیچھے دیکھے تھے۔ انھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تک ہم نے جو اسلحہ پکڑا تھا اور تباہ کیا تھا وہ ایک ہی جیسا تھا۔ کچھ غیر ملکی ساخت کا مگر بیشتر ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کا تیار کیا ہوا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دلاور اینڈ کمپنی اور اس جیسے وطن کے غداروں کی فیکٹریوں کا بنا ہوا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اب ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس میں پھر زرعی مشینری کے پُرزے بن رہے ہوں کیونکہ اس کا نام پریس، پبلک اور پولیس سب کے لیے ناآشنا نہیں رہا تھا۔ وہ اسلحہ ساز مشینری کسی دوسری جگہ لے گئے ہوں گے۔ اس خیال کا اظہار محسن پہلے بھی کر چکا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ صرف ایک نہیں، تخریب کاری کی کئی فیکٹریاں چل رہی ہوں۔

محسن کی نظر بھی لکڑی کے تابوت نما صندوقوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید وہ بھی سوچ رہا تھا کہ ان میں کتنے دستی بم ہوں گے۔ کتنے ٹائم بم اور کتنی مشین گنیں۔ کتنے ریوالور اور کتنے کارتوس۔ ڈائنا مائیٹ اور بارودی سرنگیں۔ یہ سب تباہ کن اسباب کتنے لوگوں کی جان لیتا۔ کتنے بے گناہوں کا خون بہاتا۔ کتنے بچوں کو یتیم کرتا۔ کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا۔ اس سے کتنے پُل اُڑائے جاتے۔ کتنے بجلی گھر تباہ کیے جاتے اور کتنی سرکاری تنصیبات کو نقصان پہنچایا جاتا۔

سب سے پہلے وہ آواز میں نے سُنی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت کے فرق سے محسن نے چونک کر اوپر دیکھا اور میں نے سراج کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلتی محسوس کی۔

"کیا یہ ہیلی کاپٹر یہاں آرہا ہے؟" میں نے اسٹین گن کا رخ سراج کی طرف کرلیا۔

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح مسکراتا رہا اور اس کی یہ مسکراہٹ مجھے اپنا تمسخر اُڑاتی محسوس ہوئی۔

"کون آیا ہے اس ہیلی کاپٹر میں؟" میں نے چیخ کر کہا اور اسٹین گن کا دستہ گھما کے سراج کے سر پہ مارا۔ وہ اُچھل کے ایک طرف ہوگیا مگر اپنے کندھے کو ضرب سے نہ بچا سکا۔

"اس میں تمھارا باپ آیا ہے... وزیر خان... سیدھا جہنم سے۔" سراج نے تکلیف کے باوجود مسکرانا جاری رکھا۔ "... اور وہ تم کو ساتھ ہی لے کر جائے گا اپنے بہادر سپوت کو۔"

"وہ صرف مجھے نہیں، تمھیں بھی لے جائے گا سراج۔" میں نے کہا۔ اس کی اشتعال انگیز باتوں پر یہ جواب بہت ناکافی تھا مگر میرا ذہن فوری طور پر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ اب میں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ سراج کے اس رویّے کا مطلب کیا ہے اور محسن نے بھی۔ ہیلی کاپٹر میں یقیناً وہ آئے تھے جو ہمارے دشمن تھے۔ سراج کے ساتھی تھے۔ اس اسلحے کے خریدار آئے تھے یا اس ذخیرے کو منتقل کرنے والے۔

"ہمیں کچھ کرنا ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔

"وقت بہت کم ہے... ہم یہ سارا ذخیرہ تباہ نہیں کرسکیں گے۔" محسن بولا۔

"کیوں محسن! ان صندوقوں میں دیکھو... ان میں ٹائم بم بھی ہوں گے... ہمیں پندرہ منٹ تو ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ میں ایک یا دو ٹائم بم فٹ کیے جاسکتے ہیں۔" محسن نے مایوسی سے کہا۔ "ان میں فیوز لگانا... ٹائم سیٹ کرنا اور انھیں صحیح جگہ پر رکھنا۔"

"چل دو ہی سہی... کچھ تو ہوگا..." میں نے کہا۔

"دو ٹائم بم سارے اسلحے کے ذخیرے کو نہیں اُڑا سکتے... مگر یہ اسٹرکچر بھی آر سی سی کا ہے۔ ایک دو پلر گر جائیں گے... یا چھت کا کونا ٹوٹ جائے گا۔" محسن بولا۔

"تم اب کچھ نہیں کرسکتے... صرف مر سکتے ہو... مجھے بھی مار سکتے ہو مگر خود کو کسی طرح نہیں بچا سکتے۔" سراج نے وہی شیطانی قہقہہ مارا۔ میں ایک دم اس پر ٹوٹ پڑا۔ محسن نے جلدی جلدی باکس کھول کر دیکھنے شروع کیے۔

"کتے... تیرا منہ پہلے بند کردوں..." میں نے اس پر پے در پے وار کیے۔ وہ سر پر پڑنے والی پہلی چوٹ پر ہی چکرا کے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

"دیکھو محسن! میں اس کمینے کو گھسیٹ کر اوپر لے جاتا ہوں اور اس راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز اب بہت صاف سنائی دے رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ ہمارے سر پر پہنچ چکا ہے۔

"نہیں سکندر... باہر مت جانا۔" محسن چلایا۔ "ہوسکے تو ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرنا۔ وہ سامنے والے دروازے سے اندر آئیں گے... جس کو ٹریپ کیا گیا تھا۔"

"نہیں محسن! ادھر سے اندر آنے کے بعد نیچے پہنچنے کا واحد راستہ یہ دیوار تھی۔" میں نے سراج کو اٹھا لیا اور کندھے پہ ڈال لیا۔ "اس تہ خانے تک آنے کا دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ تو اس دروازے پر ایک ٹائم بم لگا دے۔ وقتی طور پر ان کی پیش رفت رک جائے گی۔ تجھے وقت مل جائے گا۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں ہیلی کاپٹر کو نہیں اترنے دوں گا۔"

میں سراج کے وزن کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا... یہ کام

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آسان نہیں تھا چنانچہ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سیڑھیاں صرف بارہ تھیں۔ کمرے سے گزر کے میں راہداری میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ ہیلی کاپٹر کا شور اب بہت بلند ہوگیا تھا۔ میں نے سراج کو مٹی اور پتھر کے اس ڈھیر پر پھینک دیا جو دیوار سے ملی ہوئی کچی پہاڑی کھود کر راستہ بناتے ہوئے اندر گرنے سے جمع ہوگیا تھا۔ پھر میں اس ڈھیر پر چڑھا۔ بھربھری مٹی پر قدم جما کے اوپر جاتے ہوئے کئی بار میرا پیر پھسلا اور میرے کپڑے پھٹنے کے علاوہ میرے بازوؤں پر خراشیں آئیں مگر چند فٹ کی وہ بلندی میں نے ایک جنونی کیفیت میں طے کرلی۔ نیچے محسن کیا کرسکتا ہے اور کیا کرے گا؟ یہ میں نے اس پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے سامنے وہ تھا جو مجھے کرنا تھا۔

ایک بات میرے ذہن نے قبول کرلی تھی کہ اس صورتِ حال میں ہمارا بچ نکلنا ناممکن نہیں تو محال ہوگا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ہم سراج کو وہیں چھوڑتے تو اپنی جان بچا کے اس راستے سے فرار ہوجاتے جس کا ابھی دشمن کو علم نہیں تھا لیکن ہم یوں نکل جاتے تو یہ جرم محاذِ جنگ پر مورچا چھوڑ کر فرار ہوجانے کے جرم سے بھی زیادہ سنگین ہوتا۔ دشمن وہ سب اسلحہ لے جاتا جو وہاں موجود تھا اور اس اسلحے سے جتنی تباہی ہوتی۔ جتنی انسانی جانوں کا زیاں ہوتا اور وطن فروشوں کے مذموم مقاصد کی تکمیل کا جتنا سامان ہوتا اس کے ذمّے دار صرف ہم ہوتے۔ ہم اتنا بڑا جرم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسا سوچنے سے پہلے جان دینا ہمارے لیے بہت آسان ہوتا۔

میں نے اوپر ایک پتھر کی اوٹ سے سر نکال کے دیکھا تو مجھے ہیلی کاپٹر مشکل سے پچاس گز دُور اور فضا میں چالیس پچاس فٹ کی بلندی پر نظر آیا۔ اس کی بلندی آہستہ آہستہ کم ہورہی تھی اور ہیلی کاپٹر تقریباً اسی جگہ اتر رہا تھا جہاں اسلحہ خانے کی چھت تھی۔ کچھ دیکھنے یا سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایکدم سامنے آکے پوزیشن لی اور اسٹین گن کا رُخ اوپر ہیلی کاپٹر کی طرف رکھتے ہوئے پورا راؤنڈ خالی کردیا۔ یہ چند سیکنڈ کا کام تھا۔ پھر میں نے غوطہ مارا اور اس کچی مٹی کی ڈھلوان پر گر گیا جو کسی سرنگ کی طرح اندر آتی تھی۔ میں پھسلتا لڑھکتا سراج کے اوپر گرا۔

باہر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں اُٹھ کے پھر باہر کی جانب لپکا۔ میرا دل کامیابی کی خوشی سے دیوانہ ہورہا تھا۔ ہیلی کاپٹر یقیناً گر گیا تھا۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی تباہی کس حد تک مکمل رہی۔ جو نظارہ میں نے باہر نکل کے دیکھا اس نے میرے جسم کے رونگٹے رونگٹے میں مسرت کی سنسنی بھر دی۔ ہیلی کاپٹر ایک آگ کا الاؤ بن گیا تھا۔ اس کے بہت سے چھوٹے ٹکڑے دُور تک پھیلے ہوئے جل رہے تھے۔

ایک بڑے الاؤ کے گرد یہ چھوٹے چھوٹے الاؤ میرے لیے خوشی کا چراغاں تھے۔ ابھی تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہیلی کاپٹر کے عملے اور دوسرے افراد کی تعداد کیا تھی اور ان میں سے کتنے مر گئے۔ پہلے میری فائرنگ اور پھر ہیلی کاپٹر کے گرنے سے کسی کا زندہ بچ جانا مشکل ہی نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آگ اب خشک گھاس اور جھاڑیوں تک پھیل چکی ہے۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا لیکن نہ مجھے کسی کے چیخنے چلانے یا کراہنے کی آواز سنائی دی اور نہ کوئی حرکت کرتا دکھائی دیا۔ پھر اچانک وہ بُو میری ناک تک پہنچی جو دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور کراہیت انگیز بُو سمجھی جاسکتی ہے۔ اس بُو میں اور سیخ پر کبابوں کے بھونے جانے کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں ہوتا مگر جہاں آدمی خود جانتا ہو کہ بُو انسانی گوشت کے جلنے کی ہے وہاں احساس کا ردِّعمل قطعی مختلف اور شدید ہوتا ہے۔ معلوم نہیں وہ اس بُو کو کیسے گوارا کرلیتے ہیں جو اپنے عقیدے کے مطابق مرنے والے کو خود جلاتے ہیں اور اس کے جل کر راکھ ہونے تک تماشائی بنے کھڑے رہتے ہیں۔ شاید وہ اس کے عادی ہوتے ہیں۔ انسان کے ذہن کی تربیت جس نہج پر ہو وہی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ آدم خور قبائل کے درمیان پرورش پانے والے بچّے کے لیے مردے کے گوشت کو بھون کر کھا جانا کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہوگا خواہ مرنے والا اس کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے متلی سی محسوس کی۔ میں نے خالی اسٹین گن کو وہیں پھینکا اور پھر نیچے بھاگا۔ سراج ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں اس کے اوپر سے عجیب لگا گیا۔ دوڑتا ہوا راہداری سے اور پھر کمرے سے گزرا۔ نیچے پہنچا تو محسن نے ہال کے آخری حصّے سے چلّا کے مجھے مبارکباد دی۔

"تُو اب ماہر شکاری ہوگیا ہے کوّے مارنا چھوڑ کے ہیلی کاپٹر گرانے لگا ہے۔" وہ بولا اور تاروں سے کسی چیز کا کنکشن ملانے میں مصروف رہا۔

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دھماکے سے۔" محسن نے دو تاروں کو دانت سے کاٹ کے چھیلا۔

"وہ تو میرے گرنے سے بھی ہوسکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب ایک دھماکا میں کروں گا۔ دیکھتے ہیں کس کا دھماکا بڑا رہا۔" محسن نے کہا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا پہلے۔" پھر میں نے دو باکس درمیان میں رکھے اور ان دونوں میں ایک ایک ٹائم بم فکس کردیا۔" وہ اچانک تار چھوڑ کے دوڑا۔

"کیا دونوں بم پھٹنے والے ہیں؟" میں نے اس کی بدحواسی کو سمجھ کے کہا۔

"خیال نہ آتا تو دو منٹ میں ہم دونوں اللہ کو پیارے ہوجاتے۔" محسن نے ایک باکس کھول کے کچھ کیا اور پھر دوسرے باکس کی طرف لپکا جو دوسرے ستون کے قریب تھا۔

"یہ تو مرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ اللہ کو پیارے ہوتے یا اللہ کے نزدیک معتوب ہوتے۔" میں نے کہا۔ "اصولاً یہ ہماری اجتماعی خودکشی کا کیس بن جاتا اور خودکشی حرام موت ہوتی ہے۔"

"اللہ نے ہی حرام موت سے بچایا۔" محسن بولا۔

"تُو بھی عجیب چیز ہے۔ دو منٹ باقی رہ گئے تھے اور آپ کتنے اطمینان سے تار چھیلنے میں اور مبارکباد دینے میں مصروف تھے۔"

"وہ... دراصل یار... تیرے آنے سے پہلے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب زندہ بچ کے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔" محسن بولا۔ "ذہن میں وہی خیال تھا۔"

"یہ تار کہاں سے ملے تجھے؟" میں نے کہا۔

"یہیں سے۔" اس نے اِدھراُدھر ہاتھ گھما کے کہا۔ "دیکھتا نہیں، اب تو تین، صرف دو لائٹیں جل رہی ہیں۔"

"تو نے ان کے تار کاٹ لیے؟"

"کاٹنے کو کیا تھا۔ بس کھینچ کر توڑ لیے۔" محسن بولا اور چھیلے ہوئے تار کو ایک ڈائنامائیٹ سے جوڑنے لگا۔

"تجھے کرنٹ نہیں لگا؟ تو شاک پروف مخلوق ہے کیا؟" میں نے کہا۔

"حاضرین میں سب سے احمق مخلوق۔" محسن بولا۔ "تو نے سائنس پڑھی ہوتی تو ایسا سوال نہ کرتا۔ اگر ایک وقت میں ایک ننگے تار کو بھی پکڑ لیا جائے اور آدمی کہیں سے ارتھ نہ ہو تو کرنٹ کیوں لگے گا۔ میں لکڑی کے صندوق پر چڑھ کے تار کھینچتا رہا۔ ایک وقت میں ایک تار کھینچا تاکہ تار شارٹ ہونے سے فیوز نہ اُڑ جائے۔"

"اور اب کیا سائنسی کارنامہ سرانجام دے رہا ہے تو؟"

"میں نے کچھ ایسا بندوبست کیا ہے۔" محسن نے ایک اور تار کے ٹکڑے کو دانت سے کاٹا۔ "کہ جب ہم باہر جائیں تو وہ تار جو میں نے چار صندوقوں کو جوڑنے کے لیے استعمال کیے ہیں... یہ دیکھ... پہلا باکس پہلے ستون کے پاس ہے۔ اس میں ڈائنامائیٹ ہیں۔ دوسرے میں بارودی سرنگیں ہیں جو زمین کے نیچے دبائی جاتی ہیں اور کوئی ان پر سے مرسیڈیز میں گزرے یا دو ٹانگوں پر، دھماکے سے اُڑتا ہے اور سیدھا اوپر پہنچتا ہے... اللہ میاں کے پاس۔ اس تیسرے باکس میں دستی بم ہیں۔ ان تینوں کے درمیان برقی تاروں کا سلسلہ ہے۔ اور یہ تار میں نے اس جنریٹر سے ملائے ہیں۔"

"گویا اسے اڑانا ہو تو پہلے جنریٹر چلانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور جنریٹر نہ چلا تو کچھ نہیں ہوگا۔ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔"

"دیکھ میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں مگر پلاؤ زردے قورمے کی بات نہیں سُن سکتا۔" محسن بولا۔ "تجھے معلوم ہے کب سے فاقہ چل رہا ہے۔ سوائے جوتوں لاتوں اور کوڑوں کے کچھ نہیں کھایا۔ سوئیٹ ڈش میں گالیاں ملی ہیں۔ تیری باتوں سے میرے پیٹ میں وہ چوہے پھر دوڑنے لگے ہیں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر بے ہوش ہوگئے تھے۔"

"تیرا کتنا کام باقی ہے اب؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے فریج میں کچھ کھانے کو مل جائے۔ چائے کے برتن تو اس سالے ایس پی نے سب غصّے میں توڑ ڈالے ورنہ میں اس سے خانساماں کا کام بھی لیتا۔"

"وہ ہے کہاں؟" محسن نے جھک کر تاروں کو تیسرے باکس میں کسی چیز سے ملایا۔

"باہر کوڑے کے ڈھیر پر مردہ کتّے کی طرح پڑا ہے۔"

"بہت بڑا شیطان ہے یہ بھی۔ کیسے کیسے رنگ بدلے اس گرگٹ کی اولاد نے۔ پہلے تائب ہونے کی بات کی۔ پھر خوف زدہ کرنا چاہا۔ اور آخر میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہی آگیا اپنی اصلیت پر۔" محسن بولا۔

"یار محسن! کیا اُسے معلوم تھا کہ ہیلی کاپٹر آنے والا ہے؟" میں نے کہا۔

"یقیناً معلوم تھا... وہ وقت پورا کررہا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر تو یار، وہ بھی ڈراما تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب گفتگو جو دلاور کے اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ غالباً دلاور کو معلوم ہوگیا تھا کہ ہم غالب آگئے ہیں۔ انھوں نے جو بات کی اس کا اصل مطلب کچھ اور نکلتا ہوگا۔"

"اصل مطلب ہم سراج میں سے ... بلکہ نچوڑ لیں گے۔" محسن بولا۔

"ٹائم بم میں اب کتنا وقت رکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"پندرہ منٹ آگے بڑھا دیا ہے۔" محسن بولا۔ "تو وقت باتوں میں مت گزار۔ جا کے دیکھ اگر فریج میں کچھ پڑا ہے تو لے آ۔"

میں پھر اوپر گیا۔ فریج میں ٹھنڈا پانی تھا اور ڈبل روٹی کے کچھ پیس تھے۔ کچھ انڈے تھے اور مکھن تھا جو جما ہوا تھا۔ میں یہ اسباب جھولی میں ڈال کے اور پانی کی بوتل لے کر اوپر گیا۔ ہم نے چار چار پیس یوں کھائے کہ دانتوں سے مکھن کاٹتے تھے اور پھر سلائس... اس کے بعد ایک گھونٹ پانی پیتے تھے۔

"کافی بہت اچھی ہے۔" محسن نے پانی کا گھونٹ پی کر کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"جی... امپورٹڈ تھی۔ اور میں نے بڑی محنت سے بنائی تھی" میں نے کہا۔

"انڈے بھی تو وائی کے تھے آپ نے۔" محسن بولا۔

"جی... وو ہاف فرائی... وو ہاف بوائل۔" میں نے اس کی خدمت میں چار سالم انڈے پیش کیے۔ "نوش فرمائیے۔"

"ایسا نہ ہو کہ میں انڈا توڑ کے منہ میں ڈالوں اور کوئی چوزہ حلق سے اتر جائے لیکن شاید خالص اور کچی حالت میں چوزہ بھی پروٹین فراہم کرے گا۔ ویسے ہر انڈا مستقبل کا چوزہ ہے ہر انڈے سے مرغ اور مرغیوں کے ایک خاندان کا شجرۂ نسب شروع ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ شجرۂ نسب کھا جاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"بلکہ پی جاتے ہیں۔" میں نے کچا انڈا توڑ کے حلق میں انڈیل لیا۔ اس وقت مسئلہ ذائقے کا نہیں توانائی کا تھا۔ یہ مکھن اور انڈے ہمارے جسم کی گاڑی کے لیے آئندہ بارہ گھنٹے کا ایندھن تھے۔

"تو نے ایس پی صاحب کی سگرٹیں بھی چرائی تھیں۔" محسن بولا۔ "وہ ہوش میں آتے ہی تجھے گرفتار کر لیں گے۔"

"یہ سب مال غنیمت ہے جو مسلمانوں پر حلال ہے اور مجاہدین میں برابر تقسیم ہوتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "مگر یار... بارود خانے میں سگریٹ جلا لوں۔"

"جلا لے یار... کیا ہوگا... زیادہ سے زیادہ مرنا۔" محسن بولا۔

میں نے نیچے بیٹھ کے اور جھک کر زمین سے لگتے ہوئے دو سگریٹ منہ میں دبائے اور ماچس کی ایک تیلی سے جلائے۔ ان میں سے ایک میں نے محسن کو دیا۔ "کش لیتے وقت خیال رکھیے گا کہ یہ آپ کی آخری سانس ثابت نہ ہو۔ آپ بارود کے ڈھیر پر تشریف فرما ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا کام ختم ہوگیا۔" محسن نیچے اتر آیا۔ "اب اپنی سائنسی مہارت اور اعلیٰ کارکردگی پہ ایک تقریباً اپنی تعریف میں کرتا ہوں۔" وہ کش لے کر بولا۔ اور دروازے کی طرف چلنے لگا۔ "جیسا کہ تجھے معلوم ہے، یہ انکشاف ایس پی صاحب نے فرمایا تھا... کہ جیسے ہی بجلی جائے جنریٹر ٹرپ ہو جاتا ہے یعنی خود بخود چل پڑتا ہے۔"

"وضاحت کا شکریہ۔ ویسے میں ٹرپ ہونے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔" یہ وہی الفاظ تھے جو محسن نے سراج سے کہے تھے۔

"جب ہم باہر جائیں گے تو بجلی چلی جائے گی۔" محسن اوپر آ کے بولا۔ "اور جنریٹر ٹرپ ہو جائے گا۔"

"بجلی کو آپ کیسے بھیجیں گے؟" میں نے کہا۔

"اُف... ابوجہل..." محسن نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "بچپن سے دیکھتا آیا ہے کہ کوئی چیز شارٹ ہو تو فیوز اُڑ جاتا ہے۔ فیوز کا اُڑنا اور بجلی کا بند ہونا ایک ہی بات ہے۔"

"آدمی کا اُڑنا اور آدمی کا بند ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔" میں نے بلاوجہ اُس کو چڑانے کے لیے کہا مگر محسن نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ سُنی تھی تو اُس کا جواب دینا فضول سمجھا تھا۔ وہ زیادہ اہم کام میں مصروف تھا۔ اُس نے سب سے آخری بلب کو نکالا۔ اس پر ایک چونی رکھی اور بلب کو پھر فٹ کر دیا۔ یہی حرکت اس نے باہر آ کے کی۔ وہ بلب اس راہداری کا آخری بلب تھا اور تقریباً ملبے پر پڑے ہوئے سراج کے سر پر تھا۔ چونکہ چھت ہر جگہ وہی آٹھ فٹ اونچی تھی اس لیے ہاتھ اٹھا کے بلب نکالنا اور فٹ کرنا مشکل کام نہیں تھا۔

"یہ چونیاں کہاں سے ملیں تجھے؟" میں نے کہا۔

"ان کی جیبوں سے کچھ ریزگاری نکالی تھی میں نے۔" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا جو اب اکڑ چکی تھیں۔ ان کا جو خون فرش پر بہا تھا وہ بھی جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ "اللہ مجھے مُردوں کی جیب کاٹنے پر معاف کرے۔ ویسے میں نے ایک روپیہ ان کی جیب میں رکھ دیا تھا۔ ایک کا نوٹ۔"

"پھر تو کوئی گناہ نہیں ہوا غالباً۔ مُردے سے ریزگاری لینا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم اگر چاہیں تو ان کی جیب سے سب کچھ نکال سکتے ہیں لیکن یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ یہ تو شاید ہمارا نام تک نہ جانتے ہوں۔ یہ فقط دشمن کے آلۂ کار تھے۔ ان کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔" میں نے کہا۔

"سراج کی جیب سے نکلی ہوئی رقم کافی ہے۔" محسن بولا۔ "مگر اس کی جیب سے جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں وہ زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں۔ مجھے سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔"

"کیا تھا اس میں؟" میں نے کہا۔

"ایک تصویر بتاں ایک حسینوں کے خطوط۔" محسن بولا۔

"اُف بدبخت، بدذوق۔ سارے صیغے جمع کے استعمال کر ڈالے... شاعری کی روح کو سخت تکلیف ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تکلیف تجھے ہو رہی ہے... کیا تو شاعری کی روح ہے؟" محسن بولا۔ "اس میں سب کچھ واحد تھا۔ ایک تصویر... ایک خط... ایک پتا... وہ لڑکی سراج کی منگیتر ہے۔ جتنی خوب صورت لڑکی ہے اتنا ہی خوب صورت نام ہے۔ عزالنسیم... تحریر اس سے زیادہ خوب صورت ہے... معلوم نہیں ایسی لڑکی ایسے کمینے آدمی کے پلّے کیوں باندھی جا رہی ہے۔"

"کمینہ اور شیطان وہ ہمارے نقطۂ نظر سے ہے۔" میں نے کہا۔ "لڑکی کے والدین تو اکڑتے پھرتے ہوں گے کہ ہونے والا داماد ایس پی ہے... بات بات پر سب کو بند کرا دینے کی دھمکی دیتے

ہوں گے۔"

"تو غلط سمت میں غور کرنے نکل گیا۔" محسن بولا۔ "یہ لڑکی ہمارے کام آسکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"جیسے رابعہ ان کے کام آئی۔" محسن نے کسی تذبذب کے بغیر کہا۔

میں کچھ دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ "غزالہ نسیم... کیا ہم اسے اُٹھا کے لائیں گے؟ اس پر تشدد کریں گے؟"

"اگر سراج نے ہمیں مجبور کیا... تو یہ بھی ہوگا۔ جنگ تو جنگ ہے۔ اس کی لپیٹ میں سب آجاتے ہیں۔ جولی اور شہلا کا قصور کیا تھا کہ وہ اس جنگ کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔" محسن یکلخت اداس ہوگیا اور اس کے لہجے میں نفرت کا اور انتقام کی آرزو کا زہر اُتر آیا۔ مجھے اپنی بات یاد آئی۔ میں نے بھی سراج سے کہا تھا کہ تم کو تمہارے ہی سکوں میں ادائیگی کی جائے گی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا... لیکن کیا ایسا ضروری ہوگا۔ خدا کرے کہ نہ ہو... شاید ہم غزالہ نسیم نام کی اس معصوم اور بے گناہ لڑکی کے ساتھ وہ سب کچھ نہ کرسکیں جو سراج اور دلاور کرنے کے اہل ہیں۔ ہم کتنے بھی گر جائیں، انسان سے شیطان نہیں بن سکتے اور دلاور یا سراج جیسے کتنے بھی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ ہوں ان کے لیے انسانیت کے معیار کو چھونا مشکل ہے۔

ہم اب سراج کو اُٹھا کے باہر لے جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک آواز نے ہم دونوں کو چوکنا کردیا۔

"پھر؟ دوسرا ہیلی کاپٹر۔" محسن بولا۔

میں نے ایک دم سراج کو اُٹھالیا۔ "اسلحہ بھی تو بہت تھا۔ ایک ہی ہیلی کاپٹر میں کیسے جاسکتا تھا۔"

"تو باہر نکل۔" محسن نے کہا۔ "میں آتا ہوں... جتنا دُور جا سکے چلے جانا... اور میری فکر مت کرنا۔"

"تو کیا کرنا چاہتا ہے؟ میرے ساتھ کیوں نہیں نکلتا؟" میں نے چلّا کر کہا۔

"پاگل مت بن۔" محسن بولا۔ "مجھے یہ سوئچ آن کرنا ہے جس سے اوپر والا بلب روشن ہوگا۔ اس کے اوپر چھتری رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ تار شارٹ ہوجائیں۔ اندر والے بلب پر تو یہ بندوبست اس لیے کیا تھا کہ یہاں سوئچ خراب ہو یا کسی وجہ سے تار شارٹ نہ ہوں تو میں اندر جا کے لائٹ جلاسکوں۔ اسپارک ہوتے ہی مین فیوز اُڑ جائے گا اور بجلی بند ہوتے ہی نیچے جنریٹر اسٹارٹ ہوگا۔ میں نے جنریٹر کی لائن کے کنکشن کو تینوں صندوقوں میں ڈائنا مائٹ سے جوڑ دیا ہے۔ جنریٹر کے اسٹارٹ ہوتے ہی ہر باکس سے بجلی کا شعلہ اُٹھے گا جو ڈائنامائیٹ کو اُڑا دے گا۔ باقی سب چین ری ایکشن ہوگا۔ یعنی ایک ڈائنا مائٹ کے پھٹنے سے دوسرے بھی پھٹ جائیں گے۔ بارودی سرنگ اور دستی بموں میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ صرف ٹائم بم والے باکس میں دھماکا ایک وقت پر ہوگا۔ تقریباً اب سے پندرہ منٹ بعد۔ باہر میں نے دو ٹائم بم اس گیٹ پر لگائے ہیں جو ہال کے آخر میں ہے۔ تو نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سیدھا تہ خانے میں پہنچنے کا راستہ ہے اور گیٹ کی لمبائی چوڑائی دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ اس راستے سے چھوٹی گاڑیاں سیدھی اندر لائی جاتی ہوں گی۔ شاید یہ کوئی سلوپ ہوگا۔ کوئی آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے والا راستہ جو ایک فرلانگ یا سو گز دُور سے شروع ہو کے تہ خانے پر ختم ہوتا ہوگا۔ ٹائم بم گیٹ کو اتنا نقصان ضرور پہنچا دیں گے کہ فولادی گیٹ ٹوٹ کر راستہ روک دے یا ٹیڑھا ہوجائے تو کھلنے کے قابل نہ رہے۔"

"ویری گڈ... مگر اب تیرا رکنا کیوں ضروری ہے۔ بٹن دبا کے نکلنے کی فکر کر۔" میں نے کہا۔

"ابھی نہیں۔" محسن بولا۔ "تو سراج کے ساتھ بھاگ جا۔ میں اس وقت بٹن دباؤں گا جب ہیلی کاپٹر اُتر جائے گا۔ یہ پوری عمارت گر جائے گی اور ملبے کے ڈھیر میں ہیلی کاپٹر کے پرزے بھی دفن ہوجائیں گے۔"

"تو خود بھی تو غیر محفوظ ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔

"اللہ مالک ہے۔ میں بٹن دباتے ہی اسی راستے سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔" محسن نے کہا۔ "دھماکا تو بٹن دباتے ہی ہوجائے گا اس لیے ممکن ہے یہ چھت بھی بیٹھ جائے اور... یہ راستہ بند ہوجائے۔ مگر تو جا... خدا نے چاہا تو ہم پھر ملیں گے۔" وہ ہنسا۔ "اس دنیا میں نہیں تو اُس دنیا میں... ویسے بھی اب جینے کی تمنا مر چکی ہے۔ شہلا کے ساتھ میں..."

یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے..."

"جا سکندر... نکل جا... ہیلی کاپٹر اُتر رہا ہے۔" محسن نے کہا اور بلب روشن کرنے والے سوئچ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

میں سراج کو لے کر بیس پچیس قدم ہی بھاگا تھا کہ دھماکا ہو۔ دھماکے نے میرے قدم اکھاڑ دیے اور میں منہ کے بل گرا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

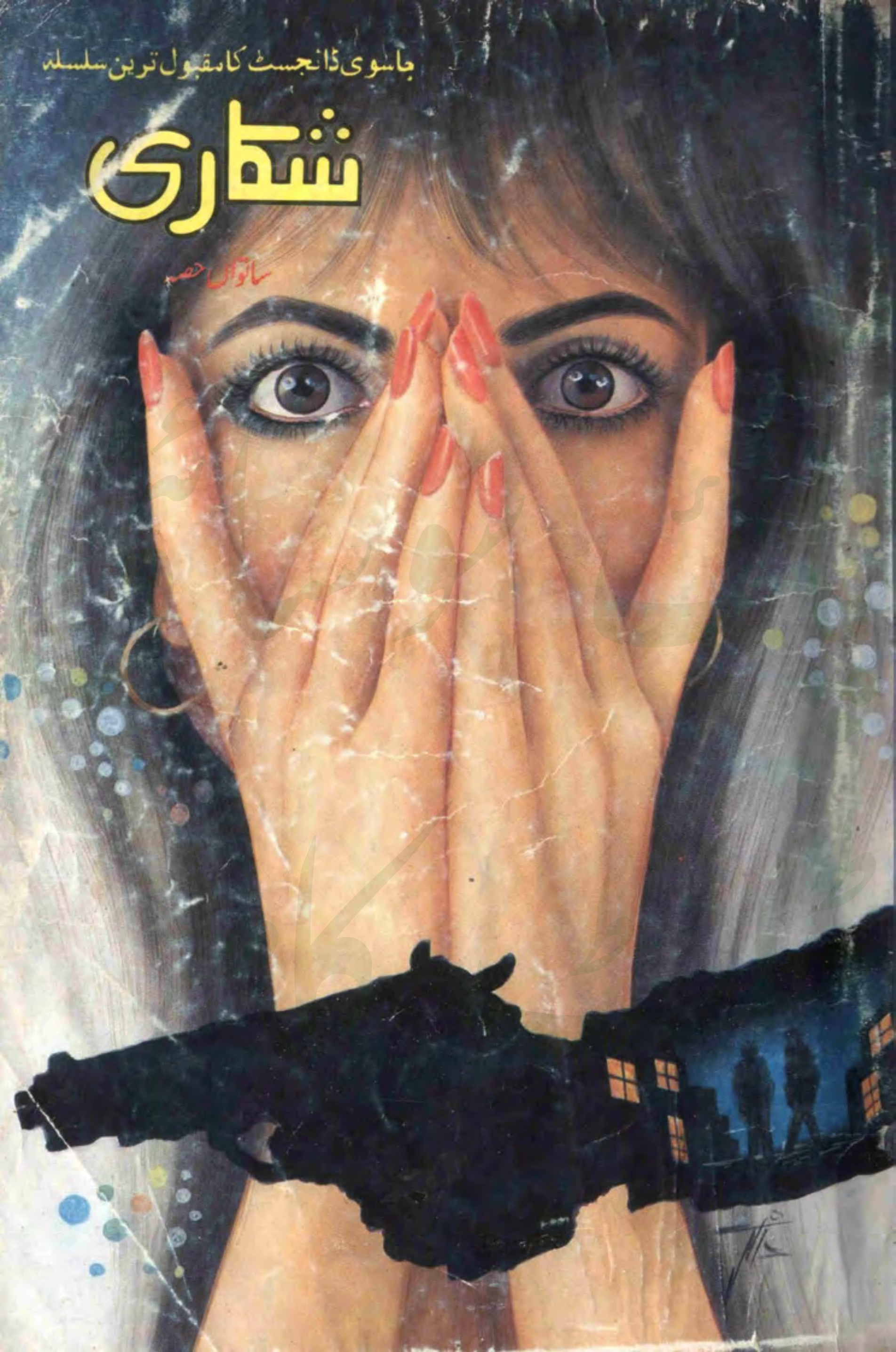
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
ساتواں حصہ

پسندیدہ رسائل و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد شہید روڈ ... پوری
... روڈ ...

شکاری

معاشرے کے اُن ناسوروں کی روداد جو گوشت و پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن سلگتی راتیں۔ آس و یاس، خوف و ہراس۔ شیریں خواب تلخ حقیقتیں

زندہ کرداروں پر مشتمل جاسوسی ڈائجسٹ کا منفرد سلسلہ

نئی سوچ - نیا رنگ - نیا لہجہ - نیا ڈھنگ

احمد اقبال کے شرربار و شبنم فشاں قلم سے

وہ ایک دھماکا نہیں تھا بلکہ ایک کے بعد ایک ہونے والے کئی دھماکے تھے جو درمیانی وقفہ انتہائی مختصر ہونے کے باعث ایک طویل گونج دار دھماکے کی طرح سنائی دیے تھے۔ اس کی وجہ مجھ پر واضح تھی۔ پہلے دھماکے تین الیکٹرک اسپارک سے ہوئے تھے جب محسن نے بٹن دبا کے باہر کی لائٹ جلائی ہوگی تو بلب نہیں جلا ہوگا۔ اس پر رکھی ہوئی چوتی نے فیوز اڑا دیا ہوگا۔ فیوز کے اڑتے ہی جنریٹر اسٹارٹ ہوا ہوگا اور اس سے ملے ہوئے تاروں سے ان تین تابوتوں میں بجلی کا شعلہ لپکا ہوگا جن میں ڈائنامائیٹ، بارودی سرنگیں اور ٹائم بم بھرے ہوئے تھے۔ اس تمام بارودی ڈھیر کے اڑتے ہی عمارت کا ڈھانچہ بھی ایک دھماکے سے گرا ہوگا۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر بھی اتر چکا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی، محاورے کے مطابق.... اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکلی، ہیلی کاپٹر بھی ملبے میں دفن ہوا اور اسی دھماکے میں اس کی موت کا دھماکا بھی شامل ہو گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ دونوں ٹائم بم جو محسن نے نیچے والے فولادی گیٹ میں نصب کیے تھے، صحیح وقت پر پھٹے تھے یا نہیں۔ پندرہ منٹ تو ہو گئے تھے چنانچہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اس دھماکے میں شریک ہوں لیکن ان کے نہ پھٹنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کنکریٹ کے اس زمیں دوز اسٹرکچر کے گرتے ہی وہ فولادی گیٹ بھی گر گیا ہوگا اور نہیں گرا ہوگا تو اس کے شکستہ ڈھانچے کی لاش ملبے میں دفن ہو گئی۔ کبھی اس ملبے کو کھودا گیا تو اس میں سے ایک ہیلی کاپٹر کا ڈھانچہ بھی برآمد ہوگا اور دیکھنے والے حیران ہوں گے یا برہم ہوں گے تو صرف ایک دشمن ملک کی کارروائی پر۔ ان کی اس جسارت پر کہ انھوں نے اپنا ہیلی کاپٹر یہاں بھیج دیا۔ یہ علاقہ عین سرحد پر تھا مگر پھر بھی یہ سرحدی حدود کی خلاف ورزی تھی۔ دیکھنے والے اسلحے کے اس ذخیرے پر بھی تحقیق کریں گے جو ملبے سے نکلے گا اور پھر ایک رپورٹ مرتب کی جائے گی جو حکومت کی مشنری کے اعلیٰ ماہرین کے جائزے پر مشتمل ہوگی۔

اس رپورٹ میں یقیناً بڑی باریک بینی سے کام لیا جائے گا اور ہیلی کاپٹر کے اجزا کے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کو یکجا کر کے بتایا جائے گا کہ ہیلی کاپٹر کتنا بڑا تھا، کس ساخت اور ماڈل کا تھا اور اس میں کتنے افراد تھے۔ اس کے کریش ہو جانے کے بعد کیا ہوا۔ عملے پر کیا بیتی اور باقی افراد کس طرح ہلاک ہوئے۔ سچے اندازے کتنے ڈائنامائیٹ تھے، کتنے ٹائم بم اور کتنی بارودی سرنگیں۔ ان سب کی مجموعی تباہ کن قوت کیا تھی اور اس نے اسٹرکچر کو کتنا نقصان پہنچایا۔ (یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسٹرکچر کی مضبوطی کا کیا معیار تھا۔ بی ایس ایس کے مطابق اس میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سیمنٹ اور کنکریٹ کی قوت۔ کتنے ہزار راؤنڈ فی منٹ برسانے والی (؟) رائفلوں، مشین گنوں اور ریوالوروں کی تعداد بتائی جائے گی۔ تباہ شدہ ٹینک اتنے اور صحیح حالت میں ملنے والے اتنے۔ پھر ساخت وغیرہ کا ذکر ہو گا۔ ان کے راؤنڈ شمار کیے جائیں گے۔ لاشیں گنی جائیں گی اور ہر لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ہو گی۔

لیکن اس مفصل رپورٹ میں کہیں ایک سطر بھی اُن کے بارے میں نہیں ہو گی جو اسی چھت کے نیچے اپنی ذات کے جہنم میں روز و شب کے ہر لمحے کا عذاب جھیلتے رہے۔ جو تہی دست اور بے آسرا اور بے نوا تھے اور اُن کی ساری طاقت ان کا عزم تھا۔ ان کا خلوص تھا اور ان کا ناقابلِ تسخیر جذبہ تھا۔ وطن کی پاسبانی کا جذبہ، وفا کی راہ میں نذرانۂ جاں کو بہت کم سمجھنے کا جذبہ۔ غداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا جذبہ۔ پوچھنے والے اُن سے پوچھتے تھے کہ تمھارے ساتھ کون سی سپر پاور ہے؟ کون سی سیاسی جماعت ہے؟ تمھاری عسکری قوت کیا ہے؟ اور وہ مردانِ حق... سر فروش اور جنونی لوگوں کا ٹولہ ایسی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا چنانچہ اُن کے جسم پر ستم کا ہر تیر آزمایا گیا اور تشدد کا ہر سامان استعمال کیا گیا۔ ان کو ذہنی اذیت کے ناقابلِ تصور عذاب میں زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس رپورٹ میں کہیں نہیں لکھا جائے گا کہ وہاں ایک عقوبت خانہ بھی تھا۔ کوئی ان لاشوں کو شمار کرتے وقت یہ نہیں لکھے گا کہ ان میں سے کس نے کیا ظلم کیا تھا۔ ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ درج نہیں ہو گا کہ دو گورنگے کمانڈوز کس قسم کے ننگِ انسانیت اور ظالمانہ احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور کراتے تھے۔ مجھ پر اور محسن اور رابعہ پر جو بیتی، اس کی کسی کو خبر نہیں ہو گی۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہ ماہرین اس فلم کو دیکھ سکتے اور اس فلمی سین کی شوٹنگ دیکھ سکتے جو میں نے دیکھی تھی اور وہ بھی اُنھی حالات میں دیکھتے جن سے میں گزرا تھا۔ پھر اُن کی رپورٹ مکمل ہوتی۔ اس میں صرف اعداد و شمار نہ ہوتے۔ حقائق کی وہ تصویریں ہوتیں جسے دیکھنے والی ہر آنکھ سے خون کے آنسو ٹپکتے۔

ستم تو یہ تھا کہ اگر ان رپورٹ مرتب کرنے والوں کو ہماری موجودگی کا ثبوت مل جائے گا تو وہ لکھیں گے کہ یہاں کچھ مفرور مجرم بھی روپوش تھے۔ ان میں سکندر بخت بھی تھا جو متعدد مقدمات میں پولیس کو مطلوب تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم جس وطن کی خاطر جان کی بازی لگائے ہوئے تھے اسی وطن کے قانون نے ہمیں مجرم بنا رکھا تھا۔ ہماری قربانی۔ ہماری مشکلات اور ہماری جدوجہد کی کوئی قدر کرنے والا نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ ہم کتنا بڑا کام کر رہے تھے اور کتنی مضحکہ خیز بے سر و سامانی کے ساتھ۔ خیر۔ کبھی تاریخ لکھی گئی تو شاید اس کا ایک سنہرا باب ہمارے نام سے منسوب ہو۔ ہر چند کہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ تاریخ سب سے زیادہ مظلوم ہے کہ اسے لکھنے والوں نے اپنے مفادات کے تحت مرتب کیا یا اپنے جذباتی نقطۂ نظر سے سمجھ کے لکھا۔

یہ سب خیالات ان چند منٹوں میں میرے ذہن سے گزرے جو میں نے منہ کے بل مٹی میں پڑے ہوئے گزارے۔ اتنا سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی متعدد بار کی پڑھی ہوئی کتاب دیکھے تو صرف ایک خیال کی طرح کتاب کا موضوع ذہن میں آ جائے یا کسی مشہور فلم کا نام سنے تو اسے پوری فلم کی کہانی یاد آ جائے اور اس فلم کی ہر نمایاں بات یاد آ جائے۔ خیالات پرانے تھے اور یہ میری سوچ میں جمع ہو جانے والی گرد تھی۔ جو نیچے بیٹھ گئی تھی مگر ایک پتھر پڑنے سے یہ مٹی اڑی تو یہ ایک بگولا بن گیا۔ بالآخر ہم اس جہنم سے نکل آئے تھے اور ہم نے اس جہنم کو نیست و نابود بھی کر دیا تھا مگر ابھی نہ جانے ایسے کتنے جہنم ہمارے انتظار میں تھے اور ہماری راہ میں تھے۔

صبح ہونے والی تھی۔ میں اٹھا تو میں نے آنکھوں سے اور چہرے سے گرد صاف کی اور پھر گرد اور دھوئیں کے اس بادل کو دیکھا جو بہت بلند ہو چکا تھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک سیٹیاں سی بج رہی تھیں اور مجھے زمین اپنے قدموں کے نیچے ابھی تک لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ جس دھماکے نے دور ہونے کے باوجود مجھے اچھال دیا تھا، اس نے محسن کا کیا حال کیا ہو گا؟ یہ سوچتے ہوئے بھی میں ڈرتا تھا۔ ابھی تک اس کا کہیں پتا نہ تھا مگر میں خود کو قائل کر رہا تھا کہ وہ نکل آئے گا۔ اسے اتنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ میری نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں اور میرے کانوں میں محسن کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے بات مذاق میں کی تھی۔ اس دنیا میں نہ سہی اگلے جہان میں ملیں گے۔ مگر بعض اوقات زبان سے مذاق میں نکلنے والی بات، تقدیر کا بے رحم مذاق بن جاتی ہے۔ اور وہ تو زندہ رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہیں۔ وہ اتنا کم ہمت نہیں ہے۔ اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ شہلا کے مر جانے کے بعد جینے کی تمنا کسے ہے! مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔

"محسن۔" میں نے آواز میں اپنے جذبات کی ساری فریاد کو شامل کر کے اسے پکارا۔ اتنی قوت سے کہ وہ زیرِ زمین بھی ہوتا تو میری آواز سن لیتا۔ میں نے گلے کی ساری طاقت کے ساتھ اسے آواز دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دیوانگی کا جواب کون دے گا۔ ویرانے میں میری صدائیں گم ہو جائیں گی، جیسے صحرا کی پیاسی ریت میں بارش کا ایک قطرہ۔ چنانچہ جواب میرے بہت قریب سے آیا تو میں یوں اچھل پڑا جیسے کسی لعنت دوسرا دھماکا میرے پیچھے ہو گیا ہو۔

"اتنا کیوں چلّا رہا ہے بھائی؟" محسن نے کہا اور میں ایک دم پلٹا۔

"یہ... یہ تو... تو ٹھیک ہے نا؟" میں اس کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ گیا۔

"ابے بھوت... کیوں چمٹ گیا مجھ سے...؟" محسن ہنسنے لگا۔ "کیا تو جانتا نہیں کہ میں... میں نہیں ہوں۔ میں محسن کا بھوت ہوں... محسن تو مارا گیا۔"

"میں سخت پریشان ہو گیا تھا یار۔" میں نے محسن کو چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا۔"

محسن نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "ابے ایسے مرنے والے ہوتے، تو بہت پہلے مر جاتے... بہت ڈھیٹ چیز ہیں ہم..."

"یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے محسن۔" میں نے کہا۔ "ذرا تو خود سوچ کہ جس حال میں ہم یہاں تھے۔ ابھی دو دن کیا، دو گھنٹے پہلے بھی ہم اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینے کا خیال بھی دل میں لاتے؟"

"مصیبت پہلے بھی آئی تھی۔" محسن بولا۔ "اور مصیبت سے ہم نکلے بھی تھے لیکن اب کے نظر آتے تھے کچھ آثار جدا۔ امید تک ساتھ چھوڑ گئی تھی۔"

"چل اب یہاں سے نکلنے کی فکر کر۔" میں نے کہا۔ "تو زخمی ہے۔"

محسن ہنسا۔ "اتنا زخمی تو تو بھی ہے۔ یہ تو خراشیں آئی ہیں۔ جب میں بٹن دبا کے بھاگا تو یار پتا نہیں کیا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے بم کے ساتھ ہی میں بھی اُڑ گیا ہوں۔ کسی جن کے نظر نہ آنے والے بہت طاقتور ہاتھ نے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیا۔"

"میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن میں دور تھا۔" میں نے کہا۔

"میں تو بس زندگی تھی کہ بچ گیا۔" محسن بولا۔ "اگر میرا رخ اس دیوار کے شگاف کی طرف نہ ہوتا تو میں چھت سے ٹکراتا یا دیوار سے اور میرا سر پھٹ جاتا۔ میرا رخ باہر کی جانب تھا۔ چنانچہ میں اس شگاف سے باہر جا پڑا۔ اسی سے یہ خراشیں آئی ہیں۔ کنکر پتھر لگے تھے۔ سخت چٹان ہوتی تو شاید زیادہ چوٹ آتی۔ جیسے ہی میں باہر گرا، وہ دیوار منہدم ہو گئی اور شگاف بند ہو گیا۔ میں وہیں رک گیا ورنہ پھسلتا ہوا واپس جاتا اور اندر ہی دفن ہو جاتا۔ مجھے تو اٹھنے کا ہوش بھی نہیں تھا اور کافی دیر تک مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ اتنی مٹی تھی کہ میری ناک حلق اور آنکھوں میں بھر گئی اور مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ پھر بارود کی بو بھی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ دھواں نہیں تھا۔ دھواں بعد میں اٹھا، جب میں خود اٹھ چکا تھا۔ ہوش آنے سے پہلے تو مجھے خیال آیا تھا کہ دنیا سے اٹھ چکا مگر جب زندہ ہونے کا یقین آیا تو میں اٹھ کے بھاگا۔ دل پر ایک دہشت سوار تھی کہ ابھی دوسرا دھماکا ہوا تو نہ جانے کدھر جا کے گروں گا۔ اپنی حالت کا جائزہ بھی میں نے بعد میں لیا۔ ایس پی صاحب خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں۔ ابھی سو کے نہیں اٹھے۔" میں نے پلٹ کر کہا اور اس طرف اشارہ کیا جہاں سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "اُدھر لیٹے ہوئے ہیں۔"

محسن کی صورت پر بارہ بج گئے۔ "کہاں؟"

نظر میری بھی اس خالی جگہ پر ٹھہر گئی تھی جہاں ابھی چند منٹ پہلے سراج بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ "مردود۔ وہ بھاگ گیا محسن۔" میں نے کہا۔ "مکر کیے پڑا تھا۔ اسے موقع مل گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "جائے گا کہاں۔ ہمارے سامنے سے تو گزرا نہیں۔ گیا ہو گا تو ادھر ہی گیا ہو گا۔ تو تھوڑا سا دائیں طرف جا۔ میں اِدھر بائیں طرف رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ بہت دور نہیں جا سکتا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ چیتے کی طرح دوڑ سکے۔ ایک میل کے اندر ہی ہو گا ابھی۔"

"زیادہ دور مت جانا۔" محسن نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ ہم ہی بچھڑ جائیں اور باقی وقت ایک دوسرے کو ہی تلاش کرتے رہیں۔"

ہم دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ ہم دونوں کے پاس اب دو دو ریوالور تھے۔ جو ہم نے سراج سے، ہسٹر ایکیں سے اور دو محافظوں سے حاصل کیے تھے۔ ایک ایک ہم نے ہاتھ میں رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلتے گئے۔ میری نظر زمین پر تھی کہ کہیں کوئی نقشِ قدم یا سراج کے گزرنے کی کوئی نشانی دکھائی دے تو ہم اپنی سمت کا تعین کر سکیں مگر وہاں جھاڑیاں تھیں اور بھربھری زمین تھی جس میں نصف سے زیادہ کنکروں کی آمیزش تھی۔ اس پر نقشِ پا کا ثبت ہونا مشکل تھا۔ سورج

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

نکل آنے کے بعد راستہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

"شیطان سے زیادہ مکار آدمی ہے یہ سراج بھی۔" محسن بولا۔

"ہاں۔۔۔ خبیث نے کس طرح مجھے قسم دے کر پابند کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو اچھا ہوا کہ خود اس نے اپنی طرف سے بدعہدی کی اور اب میں قسم نباہنے کا پابند نہیں رہا۔"

"ورنہ کیا تو سچ مچ اس کو جانے دیتا؟"

"ہاں۔۔۔ قسم تو قسم ہی ہوتی ہے یار۔۔۔ آدمی دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے لیکن اپنے ضمیر کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے۔۔۔ ابے یہ جنگ ہے کوئی امن کا زمانہ نہیں ہے.... کم سے کم ہمارے لیے۔۔۔ جنگ چل رہی ہو تو یہ سارے ادب آداب۔۔۔ اصول اور شرافت کے قاعدے ضابطے نہیں چلتے۔"

"میں مانتا ہوں۔۔۔" میں نے کہا۔ "مگر اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ سراج کو اپنی طرف سے ایک موقع ضرور دوں گا۔۔۔ ممکن ہے باہر آ کے میرا بھی خیال بدل جاتا۔۔۔ لیکن سب سے بڑی عقل مندی کا ثبوت تو سُنعیا تھا۔۔۔ تو قسم سے بچ گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم نے جو ملا، پیٹ میں ڈال لیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ورنہ اس وقت چلنے کی طاقت بھی نہ ہوتی۔"

"سراج کا ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "ورنہ ہم کدھر جائیں گے۔۔۔ ان سب کا سراغ سراج ہی سے مل سکتا ہے۔"

میری مراد رابعہ کیتھرین اور شیلڈی سے تھی اور محسن نے یہ بات سمجھ لی۔۔۔ اس نے سر ہلایا اور اچانک اس کی صورت پر دکھ کا تاریک سایہ پھیل گیا۔ میں نے اس کے وجود کو ڈسنے والے خیال کے کرب کو دیکھا۔۔۔ ایک لمحے کی کسک محسن کی آنکھوں تک آئی مگر اس نے درد کو اشک نہیں بننے دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شہلا کی یاد تھی۔۔۔ جو اس کی محبوبہ تھی۔۔۔ اس کی بیوی تھی اور اس کے ہونے والے بچے کی ماں تھی۔ اس بچے کی جس نے محسن کے خیالوں میں ہی زندگی پائی اور حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ میں محسن سے تسلی اور ہمدردی کے الفاظ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے الفاظ ہی نہیں سوجھے۔۔۔ میں سوچتا رہا کہ محسن سے کیا کہوں۔ کہنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ الفاظ ہیں تو وہ بس الفاظ ہیں۔۔۔ الفاظ کیا کر سکتے ہیں۔۔۔ کون سا دکھ دور کر سکتے ہیں۔ کس نقصان کی تلافی کر سکتے ہیں۔۔۔ کس درد کا درماں بن سکتے ہیں۔۔۔ کیسے زخم بھر سکتے ہیں۔۔۔ یہ سب تو خدا کرے گا اور وقت کرے گا جو سب سے بڑا مسیحا ہے۔ چنانچہ میں چپ رہا۔۔۔ کچھ بھی نہ بول سکا۔۔۔ پھر میں نے دیکھا تو محسن مسکرا رہا تھا۔

"اب یہاں سے میں تھوڑا سا دائیں طرف جاتا ہوں۔" محسن نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن ہر طرف وہی قدِ آدم جھاڑیاں تھیں اور جنگل تھا جو اب گھنا ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ اس زرخیز مٹی والے علاقے میں نیم ریگستانی علاقے کا وجود میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ لیکن وہ بہت چھوٹا سا قطعہ زمین تھا۔ اب جہاں سے ہم گزر رہے تھے، وہاں سونا اگلنے والی مٹی تھی۔ ہر طرف سبزہ اُگ رہا تھا اور بقولِ غالب ؎ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی۔۔۔ بن گیا سطحِ آب پر کائی۔ شیشم دریک اور پیپل کے درخت زیادہ نظر آنے لگے تھے۔ جس سے فضا میں صبحِ بہار کی لطافت اور خوشبو آ گئی تھی۔۔۔ درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے اب تلاشِ رزق کے لیے پر تول رہے تھے اور ان کی چہکار ہر سمت سے سنائی دیتی تھی۔۔۔ آبادی کے نشان ہنوز مفقود تھے ورنہ مجھے زمین پر پگڈنڈیاں نظر آ جاتیں۔ پگڈنڈی قرب و جوار میں انسانی آبادی کی علامت ہوتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ عین اسی جگہ سے لوگ گزرتے ہیں۔ اکا دکا آدمی ہل چلانے والے۔۔۔ بازار جانے والے۔۔۔ کھیتوں میں محنت کرنے والوں کے لیے کھانا لے جانے والی جفاکش بیویاں۔۔۔ کنوؤں سے پانی بھر کر لانے والی مٹیاریں۔۔۔ نہ جانے کتنی صدیوں تک آدمی کے قدم زمین کو ایک ہی جگہ سے روندتے جاتے ہیں اور تب آہستہ آہستہ ناہموار کچی زمین پر ایک راستے کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں۔ شہر میں محکمۂ تعمیرات والے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ نقشے بنواتے ہیں۔ سروے ہوتا ہے۔ ٹینڈر طلب کیے جاتے ہیں اور مجموعی اخراجات کا حساب لگایا جاتا ہے کہ اس میں سے کتنا سڑک کی تعمیر پر صرف ہوگا اور کتنا کس کس کی جیب میں جائے گا۔۔۔ اسے منافع۔ نذرانہ۔۔۔ کمیشن یا رشوت، کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے جو سڑک بنانے والے مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔۔۔ گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ بس آدمی چلتے جاتے ہیں۔ ان کے پیر مخصوص قدموں کے نشان دیکھ کر ایک ہی راستے پر اٹھتے رہتے ہیں۔۔۔ باپ کے بعد بیٹا۔۔۔ پھر اس کی اولاد۔۔۔ سب اس پر چلتے ہیں اور یہ انسانی قدم خود بخود ایک سڑک بنا دیتے ہیں۔ کسی سروے۔۔۔ بلیو پرنٹ اور ٹینڈر کے بغیر۔۔۔ اور پھر یہ راستے شاہراہوں کی طرح گاؤں کو گاؤں سے اور گھر کو گھر سے ملاتے ہیں اور بھی مسافروں کو بھٹکنے نہیں دیتے مگر یہاں مجھے ایسے آثار بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"حیرت کی بات ہے محسن، کہ اتنا بڑا دھماکا کسی نے نہیں سنا۔" میں نے کہا۔

"سنا ہوگا تو آنے والوں کو وقت لگے گا۔" محسن بولا۔ "کون جانے یہاں سے آبادی کتنے کوس پر ہے۔۔۔ میرا خیال ہے ادھر ہو گی۔۔۔ مخالف سمت میں۔۔۔ جدھر سے ہم آئے ہیں۔۔۔ دھماکا یقیناً تین چار میل تک تو ضرور سنا گیا ہوگا۔"

"صبح صبح کا وقت تھا۔۔۔ آٹھ دس میل تک آواز پہنچی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میں اس طرف پینتالیس ڈگری پر جاتا ہوں۔۔۔ تو دوسری طرف پینتالیس ڈگری کے زاویے پر تلاش کر۔" محسن نے کہا۔ "لیکن منہ اٹھا کے چلتے نہیں جانا ہے۔۔۔ ایک میل کے بعد پھر پینتالیس درجے مڑ کر چلنا شروع کریں گے تو ایک جگہ مل جائیں گے۔۔۔ تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر۔"

"یہ حساب کا فارمولا ہے بھائی۔۔۔ غلط نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "میں نکل جاؤں کالا شاہ کاکو کی طرف اور تو جا پہنچے، چیچو کی ملیاں...."

آہستہ آہستہ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ میں نے محسن کے غائب ہونے سے پہلے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے وی کا نشان بنایا۔۔۔ وی فار وکٹری۔۔۔ اس نے جواب میں مجھے مٹھی بند کر کے مکا دکھایا جو اتحاد کی علامت تھا اور طاقت کا مظہر تھا۔۔۔ یہ مکا پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم مرحوم لیاقت علی خان نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا تھا اور تب سے بہت شہرت حاصل کر گیا تھا۔۔۔ مجھے اس وقت محسن کا یہ اشارہ بہت حوصلہ افزا لگا۔ یہ اتفاق میں برکت ہے کا سمبل تھا۔ مل کر رہو اور متحد رہو تو یہی سب سے بڑی قوت ہے۔

محسن درختوں میں غائب ہو گیا تو میں نے زیادہ انہماک کے ساتھ زمین کے آثار پر غور کرنا شروع کیا۔ ہمارے ملک کے ریگستانی اور پہاڑی علاقوں میں جہاں عام طور پر جغرافیائی حالات کسی سراغ کو باقی نہیں رہنے دیتے۔ تجربہ کار کھوجی قدموں کے نشان دیکھ لیتے ہیں یا وہ نشانیاں تلاش کر لیتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص کدھر گیا ہے۔۔۔ ان کی آنکھیں انتہائی باریک بیں اور تیز ہوتی ہیں کہ گھاس کی ایک پتی بھی مڑی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی دکھائی دے تو وہ چوکتے نہیں اور بیشتر صورتوں میں ان کی تلاش کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر بار وہ کسی مجرم کو ہی تلاش کریں۔ بعض اوقات کوئی مفرور گھوڑا یا منحرف ہو جانے والا اونٹ بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے تو وہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔۔۔ ان کی نظر صرف سُموں کے نشان ہی نہیں دیکھتی۔۔۔ جانور نے جہاں گھاس پر منہ مارا ہو یا درختوں سے پتے توڑے ہوں، یہ کھوجی اسے بھی نوٹ کر لیتے ہیں۔ اس وقت میرے ساتھ ایسا ہی کوئی کھوجی ہوتا تو مجھے سیدھا سراج کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا۔

تاہم میں سراغ رسانی کے فن میں اپنی نااہلی کے خیال سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے زمین کا مشاہدہ جاری رکھا۔ ایک جگہ مجھے پگڈنڈی دکھائی دی، جو دائیں سے بائیں جا رہی تھی مگر میں نے اس پر چلنے کا خیال چھوڑ دیا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے محسن کی ہدایات کے مطابق ناک کی سیدھ میں اور پینتالیس ڈگری پر چلنا تھا اور میں پگڈنڈی پر ہو لیتا تو محسن سے نہ مل پاتا۔ دوسری وجہ میرا ذاتی خیال تھی کہ سراج چالاک آدمی ہے۔۔۔ وہ عام اور آسان راستے سے دور رہے گا۔ وہ دشوار گزار راستہ اختیار کرے گا، جہاں کسی سے ملنے کا امکان کم سے کم ہو۔

ایک جگہ میرے قدم خود بخود رک گئے اور میں ارشمیدس کی طرح "پالیا.... پالیا...." چلاتے چلاتے رک گیا۔۔۔ گھاس پر خون تھا۔۔۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس داغ کو غور سے دیکھا تو مجھے مایوسی ہوئی۔۔۔ یہ بہت پرانا خون تھا جو خشک ہو چکا تھا۔ کچھ آگے جا کے مجھے یہی خون پھر نظر آیا۔ چوتھی جگہ یہ خون گھاس پر پپڑی بن کے منجمد ہو گیا تھا اور میں نے اس پپڑی کو اٹھایا تو یہ سرخ رنگ کا پاپڑ ٹوٹ گیا۔ میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ خون آدمی کا ہے یا جانور کا مگر اتنا میں وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ خون بہت پرانا تھا۔۔۔ وہیں میری ناک نے تعفن بھی محسوس کیا اور کچھ آگے جانے پر میں نے ایک لاش دیکھی۔۔۔ مگر وہ لاش کتے کے سائز کے کسی جانور کی تھی۔ وہ لومڑی بھی ہو سکتی تھی اور گیدڑ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ اسی کا خون تھا۔ جانور اب ہڈیوں کا پنجر رہ گیا تھا۔ اس کا سارا گوشت حشرات الارض اور مردار خور جانور کھا چکے تھے۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔" میں نے زور سے کہا اور ناک پر رومال رکھ لیا۔

"باہر کس پر لاحول بھیجتا ہے۔۔۔" میرے پیچھے سے کسی نے خوفناک آواز میں کہا۔ "شیطان تو تیرے اندر ہے۔۔۔ بھوت کے بچے۔۔۔"

میں اچھل پڑا۔۔۔ بے اختیار میرا ہاتھ ریوالور پر گیا۔۔۔ لیکن وہ کوئی ملنگ تھا... پچاس ساٹھ سال کا یا اس سے بھی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

زیادہ عمر کا ــــ اس کی صحت اب بھی اچھی تھی۔ اس نے عجیب مضحکہ خیز حلیہ بنا رکھا تھا ــــ ملنگ سے زیادہ وہ جوکر لگتا تھا ــــ اس کی دھوتی پہلے ضرور نارنجی رہی ہوگی مگر اب اس پہ داغ ہی داغ تھے ــــ گرد و غبار اور میل نے دھوتی کو ہزار رنگ دے دیے تھے۔ مزید یہ کہ کثرتِ استعمال سے دھوتی ائیر کنڈیشنڈ ہوگئی تھی اور اس میں ہر طرف تازہ ہوا کے آنے اور جانے کے لیے چھوٹے بڑے متعدد سوراخ ہو چکے تھے ــــ دھوتی پہ اس نے بے حد میلا کچیلا پھٹا ہوا اور لال رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ بقول ضمیر جعفری یہ لنڈا کا کوٹ تھا تو ــــ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ ــــ گورے کے بعد اس کو ہمارے وطن کے کسی غریب کالے نے پہنا تھا اور جب اس کے لیے بھی بے مصرف ہو گیا تو شاید اس نے کسی کو خیرات کر دیا تھا ــــ اب یہ ملنگ اسے بڑی شان سے پہنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پہ جو فلیٹ ہیٹ تھا، اسے ملنگ نے کھینچ کھینچ کر کانوں تک بڑھا دیا تھا اور اس کے درمیانی حصے میں ملنگ کا سر کسی گیند کی طرح نظر آتا تھا۔ باقی چیزوں کی طرح یہ فلیٹ ہیٹ بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا جس کے نیچے سے ملنگ کے لمبے مگر الجھے ہوئے سفید بال نکلے ہوئے تھے ــــ سر کے بال اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں یوں مل گئے تھے... کہ من تو شدم تو من شدی کا منظر تھا ــــ پتا نہیں چلتا تھا کہ داڑھی کہاں ختم ہوئی اور جٹائیں کہاں شروع ہوئیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت موٹا ڈنڈا تھا جسے اصطلاحاً "گھوٹنا" کہا جاتا ہے اور جو کونڈی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے ..... اکیلی .... کونڈی بھنگ نہیں گھوٹ سکتی جو ہمارے ملنگوں کا فیورٹ ڈرنک ہے۔ ملنگ نے گلے میں چھوٹے بڑے رنگین منکوں کی جو مالائیں پہن رکھی تھیں، اُن کا وزن دو سیر تو ضرور ہو گا ــــ یہ فریبی ملنگ ــــ مجذوب اور سیر یا تو نیم پاگل ہوتے ہیں اور کمزور عقیدے کے لوگ ان کی بے سرو پا باتوں سے اپنی اپنی عقل اور ضرورت کے مطابق مفہوم اخذ کر کے انھیں معرفت کی باتیں سمجھ لیتے ہیں ــــ یا یہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسا حلیہ بناتے ہیں کہ عام آدمی دیکھ کر مرعوب تو نہیں ہوتا، کچھ خوف زدہ ہو جاتا ہے ــــ یہی خوف ان کے دل میں عقیدت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ ملنگ اپنے گلے میں ایک بے ضرر سانپ ڈال لیتا تو نہ جانے کتنے لوگ اس کے پیر چھوتے۔

"کیا کہا ــــ؟" میں نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ "میں بھوت کا بچہ ہوں ــــ کارٹون کی اولاد؟"

ملنگ کی گھگی بندھ گئی۔ "ارے ــــ ارے بابا... غلطی ہوگئی فقیروں سے ــــ جانے دے ہمیں نامراد ــــ اور تو بھی نامراد جا ــــ اس دُنیا سے جا، یا یہاں سے جا..."

"میں جاؤں ــــ؟" میں نے گرج کے کہا۔ "پہلے میں تجھے تو بھیج دوں نامراد کے بچے ــــ بیٹھ ــــ چل بیٹھ نیچے۔"

"ہم تو ہیں مٹی کے کیڑے ــــ مٹی ہمارا اوڑھنا بچھونا ہے ہم مٹی میں مل جائیں گے ــــ" وہ بھد سے نیچے بیٹھ گیا۔ "مگر تو مٹی میں سونا کھوج رہا ہے ــــ تیرے من میں لوہ مایا ہے ــــ تیری نظر خزانے تلاش کر رہی ہے۔"

"اپنا ریکارڈ بند کرو ملنگ مہاراج، ورنہ مارتے مارتے پلنگ بنا دوں گا...."

"کیا بنا دے گا ــــ پلنگ.... یعنی چارپائی ــــ نادان، ہم پہلے ہی چرپائے ہیں ــــ" وہ بولا۔

"میں پتنگ بنانے کی بات کر رہا تھا ــــ" میں نے کہا۔ "ویسا ہی ہلکا پھلکا کر کے اڑا دوں گا ــــ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم اپنے سوہنے محبوب کو تلاش کر رہے ہیں، بھوت کے بچے۔"

"پھر.... پھر بھوت کا بچہ کہا۔" میں نے اس کے ایک تھپڑ رسید کرنا چاہا مگر وہ بڑی پھرتی سے لیٹ گیا۔

"سیدھی طرح جواب دے.... بدمعاش ــــ کون ہے تو؟"

"فقیر پہ ہاتھ اٹھائے گا تو اللہ تجھے اٹھائے گا بھوت کے بچے۔" ملنگ نے اٹھ کر کہا ــــ "ابھی موقع ہے... جو مانگنا ہے مانگ لے۔"

"میں ایک سوال کا جواب مانگ رہا ہوں۔" میں نے تنگ آ کر اسے بھوت کا بچہ کہنے پر معاف کر دیا۔ "تم نے کسی آدمی کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے۔"

"کیا تو آدمی نہیں ہے ــــ ہمیں پتا تھا تو مان جائے گا کہ تو بھوت کا بچہ ہے۔" اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا ــــ میں نے اس کے ایک لات رسید کی ــــ وہ گرا اور پھر اٹھ کے بیٹھ گیا ــــ لات اس کے صحیح نہیں پڑی تھی۔

"میرے علاوہ کسی اور کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اپنا فلیٹ ہیٹ جھاڑ کر سر پہ رکھا اور کھینچ کر کھوپڑی پہ فٹ کر لیا۔ "ہم نے تو بہت کچھ گزرتے دیکھا ہے وقت کو ــــ بادشاہوں کے جاہ و جلال کو ــــ فرنگی کے دورِ استبداد کو ــــ دل پہ قیامت کو ــــ شاہِ جنات کو ــــ"

میں اس کے منہ سے یہ الفاظ سُن کے چونکا۔ اچانک اس نے عالمانہ قسم کی گفتگو شروع کر دی تھی ــــ کسی جاہل آدمی کے لیے یہ مجذوب کی بڑ ہو سکتی تھی مگر میرے لیے یہ بہت بامعنی اور کسی حد تک شاعرانہ گفتگو تھی۔

"ہم تو تجھے بھی گزرتا دیکھیں گے۔ بھوت کے بچے۔" وہ بولتا گیا۔

میں نے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ "سچ بتاؤ، تم کون ہو؟ مجھے تو تم دشمن کے ایجنٹ لگتے ہو۔"

"ارے بابا ــــ کیوں ہماری اکلوتی داڑھی کا دشمن ہوا ہے۔ چھوڑ اسے ــــ پکڑنا ہے تو کچھ اور پکڑ لے ــــ یہ عصا پکڑ لے، ہمارا ہاتھ پکڑ لے۔" وہ شور مچانے لگا۔

"میں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک حقیقت معلوم نہیں کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "تو اس اڈے کے آس پاس گھوم رہا تھا ــــ تیرا یہ بھیس فقیروں والا ہے مگر تو فقیر نہیں ہے۔"

"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب.... تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں ــــ سمجھا بھوت کے بچے۔" اس نے اپنی اصل آواز میں کہا اور میں نے غالب کی آواز پہچانی تو انتہائے حیرت سے منجمد ہو گیا۔

"ارے بھائی! اب تو داڑھی چھوڑ دو ہماری امپورٹڈ داڑھی کا ناس کر دیا جھٹکوں سے ــــ" غالب بولا۔

"غالب ــــ مرزا غالب۔" میں نے چیخ کر کہا ــــ پھر میں اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے دھائیں دھائیں مکے مارے اور میں نے اسے ــــ محبت اور خوشی میں ہم ایک دوسرے کو جتنی گالیاں دے سکتے تھے، دے چکے تو میں نے آنکھوں میں خود بخود آ جانے والے آنسو صاف کیے۔

"تو زندہ ہے ــــ مجھے پتا تھا، تو نہیں مر سکتا بھوت کے بچے!" میں نے مرزا غالب سے کہا۔ "تو غائب ہو گیا تھا بھوت کے بچے ــــ مگر تو یہاں کیسے پہنچا؟"

"جیسے تو پہنچا ــــ" غالب نے اپنے گندے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ نکالی اور وہیں بیٹھ گیا۔ "آدمی کو اس کی تقدیر کہیں بھی لے جا سکتی ہے ــــ کوئے یار سے، سوئے دار تک۔"

"وہ تو ہے ــــ مگر یہ جگہ کیسے معلوم ہوئی تجھے ــــ تو اکیلا آیا ہے ــــ باقی سب کہاں ہیں؟ نازو کیسی ہے؟" میں نے ایک سانس میں کہا۔

"چھری تلے دم لے ــــ" غالب نے دو سگریٹیں جلائیں اور ایک مجھے دے دی۔ "یہاں تو میں اکیلا ہی پہنچا ہوں ــــ ایک حضرت ہیں انسپکٹر شنڈے داس...."

"ہیں نہیں یار.... تھے ــــ" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا اُس کا پیغام مل گیا تھا؟"

"اس پیغام کے بغیر تمھارا پتا ٹھکانا کیسے ملتا؟" غالب نے کہا۔

"پھر تم نے اتنی دیر کیوں کی؟" میں نے کہا۔

"دیر کہاں کی میرے عزیز ــــ تمھارے بارے میں اطلاع ملی تھی نازو کو ــــ بلکہ اس کے برادرِ کلاں مسمی اکرام شیخ کو.. وہ پہنچے سیدھے ایس ایس پی صاحب کے پاس ــــ واضح ہو کہ خدا نے ان کے دل میں نیکی ڈالی اور ان کو صراطِ مستقیم پہ چلنے کی توفیق عطا کی۔ انھوں نے حقائق کو سمجھا اور اکرام شیخ کو نہ جانے کیا مشورہ دیا کہ وہ اپنی ہمشیرہ صاحبہ... محترمہ نانلی بیگم صاحبہ...."

"نازو کافی ہے ــــ تو اپنی محبوبہ کا نام لے رہا ہے، نانی مرحوم کا نہیں ــــ" میں نے کہا۔

"بجا ارشاد ــــ اکرام شیخ نے نازو سے مشورہ کیا اور ظاہر ہے وہ تو ہے شاہِ جنات کی بیٹی ــــ" غالب بولا۔

"مگر تو کہاں مل گیا اسے؟" میں نے کہا۔ "تیرے بارے میں تو عام اطلاع یہ تھی کہ اپنے آبائی گھر میں مدفون ہے ــــ"

"یہ اطلاع خود میں نے دی تھی ــــ" غالب بولا۔ "اور سب سے پہلے نازو کو دی تھی ــــ تمھارے نکلتے ہی میں بھی رفوچکر ہو گیا تھا۔ بال بال بچا ورنہ وہیں جل مرتا ــــ میں نے اندازہ لگایا کہ ان حالات میں میرا مرحوم نہ ہونا ایک معجزہ ہی تھا۔ میں اندر دبکا ہوا تھا کہ مناسب وقت پہ دخل در معقولات کروں گا اور دشمنوں کو تہس نہس کر دوں گا مگر اسی میں وقت نکل گیا۔ مجھے سخت ملال تھا کہ تم لوگ کیا سمجھتے ہو گے ــــ باہر نکل کے دیکھا تو تم میں سے کسی کا پتا نہ تھا ــــ پھر میں کیا کرتا ــــ میں عبدالودود منظر کے گھر چلا گیا۔ اس کے ایک درجن پورے ہو گئے۔"

"ایک درجن کیا پورے ہو گئے؟" میں نے کہا۔

"بچے اور کیا...." غالب نے کش لے کر جواب دیا۔ "دس تو پہلے ہی تھے۔ اس بار ــــ بقول منظر کے ــــ بیوی نے ایڈوانس بکنگ کر رکھی تھی۔ آئندہ سال کی چھٹی مانگی ہے اس نے۔ خیر اس کے یتیم خانے میں میرے لیے بھی جگہ نکل آئی ــــ وہاں سے میں نے پہلے تو اُن کو فون کیا ــــ" اس نے شرمانے کی بھونڈی اداکاری کی۔

"اچھا ــــ اور انھوں نے کیا کہا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"انھوں نے کہا.... مگر تجھے کیوں بتاؤں کہ میں نے کیا نہیں کہا اور اس نے کیا نہیں کہا ــــ یہ ہماری پرائیویٹ باتیں ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غالب بولا۔ "آخر میں اُس نے کہا کہ جہاں ہو، وہیں رہو۔"

"مطلب یہ کہ اپنی اوقات میں رہو ــــ خبردار، جو آگے بڑھے یا بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔" میں نے کہا۔

"ایسی غلطی میں کر سکتا ہوں؟ مجھے اپنی ہڈیاں عزیز ہیں۔" غالب نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا کہ منظر کے گھر میں رہو۔ تم لوگ یعنی اغوا شدہ حضرات و خواتین کو موقع ملا تو تم کسی نہ کسی جگہ سے رابطہ ضرور قائم کرو گے اور ایسی جگہ انکل رضوی کا گھر تھا' نازو کا گھر یا پھر عبدالودود منظر کا گھر۔ اُسے یقین تھا کہ تم خود فون نہ کر سکے تو کسی کو نمبر دے دو گے ــــ یہ ضروری ہے کہ ہم پیغام موصول کرنے کے لیے موجود ہوں۔ فون تو نہیں ملا لیکن انسپکٹر سندرداس کا ایک خط ضرور مل گیا جس میں خاصی مفید معلومات تھیں اور اس خط نے ہماری بڑی رہنمائی کی۔ وہ کیسے مارا گیا یار ـــ؟"

"یہ بڑی لمبی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "فرصت میں بتاؤں گا۔ یہ سمجھ لے کہ اسے سراج نے گولی مار دی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

غالب کچھ دیر چُپ رہا۔ "تھا تو وہ کافر ـــ مگر اس کے لیے مغفرت کی دُعا جائز ہوگی، آگے جو اُس غفور الرحیم کی مرضی۔"

"تُو نے بتایا نہیں کہ نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی تھے، اب کراچی میں ہیں۔" غالب نے کہا۔

"کراچی میں؟ کراچی کیا لینے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمہیں لینے۔" غالب نے کہا۔ "پتا یہ چلا تھا کہ تم کو کسی کارگو شپ پر مال کے ساتھ کہیں بھیجا جائے گا، تم ایکسپورٹ آئیٹم ہو۔"

"وہاں ہزاروں جہاز، لاکھوں ٹن مال اُتارتے چڑھاتے ہیں۔ وہ کیا سارے جہازوں کی جامہ تلاشی لیں گے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، سُندرداس نے لکھا تھا کہ جو کریٹ وہاں پہنچیں گے اُن پر نام پتا غلط ہے۔" غالب بولا۔ "بڑی احمقانہ حرکت تھی یہ دلاور اینڈ کمپنی کی ــ کریٹ پر شہر کا نام تھا 'ایلڈ وِمیٹ سٹی'۔"

"اور ملک کا نام تھا دِس بی دا انیا۔ رائٹ؟" میں نے کہا۔

"رائٹ، وہ دونوں یہی دیکھیں گے۔" غالب نے کہا۔ "میں نے تو اس بت طنّاز کے بھائی سے کہا تھا کہ میری نظر بہت تیز ہے، میں اور نازو چلے جاتے ہیں کراچی اور قسم بھی کھائی تھی کہ ہم صرف کریٹ دیکھیں گے لیکن وہ اڑ گیا کہ نظر ہی نہیں تم خود بھی بہت تیز ہو اور میری بہن تم سے بھی تیز ہے۔ میں تمہاری سلامتی اسی میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں الگ ارسال کر دوں تاکہ تم سالم رہو ــ بس لمبے یار جانی۔" غالب نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "یہ فقیر اِدھر آ گیا، صحرا کی خاک چھاننے۔"

"تُو نے کمال کا میک اپ کیا اور خوب آواز بنائی یار ـــ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "تُو کب سے موجود ہے یہاں...؟"

"میں رات کو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا گرد و نواح کے کچھ دیہاتیوں نے مجھے بتایا تھا کہ ادھر ایک پہاڑی سی ہے، وہاں کبھی کبھی جہاز اُترتے ہیں، بس میں سمجھ گیا کہ یہی ہے میری منزلِ مقصود، ورنہ یہاں کوئی ائر پورٹ تو ہے نہیں۔ رات بھر میں اِدھر اُدھر سے جائزہ لیتا رہا مگر مجھے سوائے ایک کمرے کے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس کے باہر ایک نیلے رنگ کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہُوا تھا، جس پر لکھا ہُوا تھا 'واپڈا' اور کچھ بھی نہیں، یہ کوئی گرڈ اسٹیشن تو تھا نہیں، بس ایک کمرا تھا۔ میں نے غور کیا کہ کیا یہ سب اسٹیشن ہو سکتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا دوست؟" میں نے سر کھجا کے کہا۔

"نادان دوست! سب اسٹیشن وہاں بنائے جاتے ہیں، جہاں لوڈ زیادہ ہو۔" غالب بولا۔ "ڈسٹری بیوشن ڈپو سمجھ لے بجلی کا، وہاں سے ہائی وولٹیج کے تار نکلتے ہیں اور صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے باہر عموماً لال رنگ کی ایک پلیٹ لگا دی جاتی ہے اس پر ہمیشہ مجھے وہی ایک تصویر نظر آتی ہے، تیرے جدِ امجد کے سر کی پلائے کی۔ نیچے لکھا ہوتا ہے خطرہ گیارہ ہزار وولٹ یا تینتیس ہزار وولٹ، لیکن اس کمرے میں پول سے بجلی کے دو معمولی تار جا رہے تھے۔ مزید یہ کہ سب اسٹیشن اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوتا۔"

"مرزا غالب! کاش واپڈا والے اپنا محکمہ تجھے بخش دیں آخر اتنی موٹی باتیں ان کی عقل میں کیوں نہیں آئیں؟" میں نے کہا۔

"آئی ہوں گی تو چلی گئی ہوں گی۔" غالب بولا۔ "جب ہاتھ میں نوٹ آجاتے ہیں تو آدمی صرف نوٹ دیکھتا ہے۔ ملک اور قوم کا مفاد نہیں دیکھتا، یہ نہیں دیکھتا کہ دال میں کیا کالا ہے اور کیوں کالا ہے۔ جب میں نے تصدیق کر لی کہ یہ سب اسٹیشن نہیں اور جو سنتری باہر کھڑا ہُوا ہے، وہ بھی واپڈا کا ملازم نہیں...."

"یہ تصدیق کیسے ہوئی؟"

"میں نے سنتری کے پاس جا کر پوچھا تھا کہ بابا! کیا واپڈا میں نوکری ملے گی؟" غالب بولا۔ "وہ کہنے لگا کہ دفع ہو جاؤ، ورنہ گولی مار دوں گا۔ اس سے تصدیق ہو گئی، سچ مچ واپڈا کا ملازم ہوتا تو اتنا بُرا نہ مانتا' رشوت مانگتا یا دُعا۔ میں نے کہا 'بچہ' ہم تیری نوکری تو نہیں لے رہے ہیں، گولی مارنا ہے تو واپڈا کو مار اور خلقِ خدا کی دُعا لے۔ وہ ذرا مشتعل ہُوا اور آگے بڑھا تو میں نے اُلٹ دیا اور ٹھنڈا کر دیا۔"

"کیسے؟ خالی ہاتھوں سے ... نازو کی شاگردی کر لی ہے کیا؟"

"آہ! ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کر، وہ جفا کار حسینہ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کرلے تو میں تین بار ایجاب و قبول کروں۔ سنتری کو میں نے طمانچے سے ٹھنڈا کیا۔" غالب نے کوٹ میں ہاتھ ڈالا اور بغل میں سے سائیلنسر والا پستول برآمد کیا۔ "وہ دھوکے میں مارا گیا، اُسے کیسے خیال آسکتا تھا کہ آج کل کے ملنگ بھی گدڑی میں طمانچے رکھتے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا اندر جانے کی کہ فائرنگ کی آواز آئی اور میں دُور بھاگ گیا۔ وہ مشین گن کے فائر تھے۔ دُور سے ہی میں نے تین گاڑیاں روانہ ہوتے دیکھیں۔"

"کتنی دُور سے؟ نمبر وغیرہ دیکھا؟"

"نہیں، میں قریب ہوتا تب بھی نمبر نہ دیکھ سکتا اور دیکھ لیتا تو کیا فرق پڑتا، وہ اصلی نمبر تو نہیں ہوں گے نا۔ تینوں گاڑیاں ایک ہی سمت گئی تھیں، میں پیچھے دوڑتا تو کیسے دوڑتا۔ رات کا وقت تھا، اندھیرے میں ویسے بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم میں اسی طرف گیا تھا اور اب واپس آرہا تھا کہ یہ دھماکا سُنا۔" غالب بولا۔

"وہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی کو لے گئے یار۔" میں نے کہا۔ "سراج کو ہم نے قابو میں کر لیا تھا۔"

"وہ دھماکا تم نے کیا تھا، کیا تھا یہاں؟"

"وہی جو سامیں پاپڑ والے کے اڈّے پر تھا۔" میں نے کہا۔ "افسوس یہ ہے کہ خبیث سراج بھاگ گیا۔ بس چند سیکنڈ کے لیے نظر چُوکی تھی کہ وہ نکل گیا سُوّر کا بچہ مکر کیے بے ہوش پڑا تھا۔ میں اور محسن اُسے ہی تلاش کرنے نکلے تھے۔"

"محسن؟ کہاں ہے محسن؟" غالب ایک دم اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"وہ مجھے کوس رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اُس نے مجھے سخت ہدایات دی تھیں کہ میں پینتالیس ڈگری پر ایک میل چلوں پھر بائیں جانب اُسی زاویے پر اتنا ہی سفر کروں تو جہاں سے ہم چلے تھے' وہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر پھر مل جائیں گے۔ وہ تو پہنچ چکا ہوگا۔"

"مشکل ہے، تم دونوں کی فطرت ایک ہے۔ جب تم صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے اور گپ لگانے بیٹھ گئے تو وہ بھی کہیں بھٹک گیا ہو گا۔" غالب نے کہا۔ "چلو اب ہم دونوں اُسے تلاش کرتے ہیں' اندازاً سمت بتاؤ۔"

میں نے اندازے سے سمت کا تعین کیا اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ سُورج اب کافی بُلند ہو گیا تھا۔ میں نے اور غالب نے پہلے اُسے بُلند آواز سے پُکارنے کا سوچا اور پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں محسن سے پہلے، ہماری پُکار سراج کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور وہ جواب گولی سے نہ دے۔ ہم نے اُسے غیر مسلح کر دیا تھا مگر اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ باہر بھی کہیں توپ چھپا رکھی ہو۔ دَن سے گولا داغ دے۔ گولا نہ سہی' سیر بھر کا پتھر کھینچ مارے۔ اُس کے جنگل میں پائے جانے کے خاصے امکانات تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہماری نظر سے چُھپنے کے لیے درخت پر چڑھ جائے اور پتّوں میں چُھپ کر بیٹھ جائے۔ اُوپر سے سیر بھر کا پتھر وہ سیدھا ہمارے سر پر مار سکتا تھا اور ہمارے دل کی طرح ہمارے سر بھی بہت نازک تھے۔

تقریباً پون گھنٹے تک ہم اندازے غلط کرتے رہے اور اِدھر سے اُدھر بھٹکتے رہے لیکن محسن کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب بھی میرے ذہن میں سمت کا تھوڑا سا حساب تھا کیونکہ سورج ابھی تک مشرق میں ہی تھا۔ کنفیوژن سے بچنے کے لیے میں نے ایک کھجور کے درخت کو نشانی بنا لیا تھا، جو صُبح ٹھیک اسی سمت میں تھا، جدھر سے سورج طلوع ہُوا تھا اور یہ درخت اپنی قسم کا ایک ہی درخت تھا۔

"میاں سکندرِ اعظم! مجھے تو یہ دشتِ طلسمات لگتا ہے۔" مرزا غالب نے بالآخر کہا۔ "آخر محسن ابھی تک نظر کیوں نہیں آیا۔ ذرا میری طرف دیکھنا، کیا میں نظر آرہا ہُوں؟"

"بالکل صاف، پوری داڑھی کی جھاڑی سمیت...!"

"خدا کا شکر ہے، تم بھی نظر آرہے ہو مجھے، ہم ابھی تک گُم نہیں ہوئے ہیں۔" غالب بولا۔ "غالباً اس لیے کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں پھر رہے ہیں مگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ بہت سفر کیا۔"

"ناک کی سیدھ میں چلنے والا سیدھے راستے سے نہیں بھٹک سکتا۔"

"تیری ناک ٹیڑھی ہے میرے ہمسفر... میرے راہنما۔" غالب نے کہا۔ "معلوم نہیں کس کی ضربِ کلیم سے ہوئی مگر اسی کی وجہ سے ہم جھک مار رہے ہیں اور ہنوز وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔"

"غلط۔ وہ جگہ کم سے کم دس قدم دُور ہے۔" میں نے اشارہ کر کے بتایا مگر اس کے ساتھ ہی میری آواز بند ہو گئی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے غالب کو روک لیا۔

"غور سے سُنو مرزا جی!" میں نے لبوں پر اُنگلی رکھ کے سرگوشی کی۔

غالب نے سر ہلایا۔ "سُنا، میں نے بھی سُنا۔"

"کیا سُنا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"جو تُو نے نہیں سُنا، میرے دل نے اُسے پُکارا تھا۔" غالب بولا۔

"کاش میں آپ کے جھانپڑ رسید کر سکتا۔ جھانپڑ کی آواز آپ صاف سُنتے۔" میں نے کہا اور غالب کو ہاتھ سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ ہم دونوں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے پھر میں نے درخت پر غور کیا اور مجھے درخت کے تنے سے ملی ہوئی شاخوں تک پہنچنا آسان نظر آیا۔ میں نے غالب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اُوپر چڑھ گیا۔ زمین سے تقریباً بارہ چودہ فٹ اُوپر جا کے دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہیں آیا تو مجھے فریبِ سماعت کا یقین آنے لگا۔ غالب نیچے کھڑا مجھے گھور رہا تھا کیونکہ اُس کے کانوں نے واقعی کچھ نہیں سُنا تھا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے اور میں نے اشاروں کی زبان

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اُسے صبر کرنے کو کہا۔ اس وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا تھا اور اگر میں نیچے اُترتا تو شاید وہی لطیفہ غالب مجھے شرمندہ کرنے کے لیے سُناتا۔ کسی پاگل خانے میں ایک پاگل بہت دیر سے زمین پر پڑا دیوار سے کان لگائے کچھ سُن رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آتے جاتے کئی بار دیکھا اور بالآخر پاگل کے قریب بیٹھ کر خود بھی کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا مگر اُسے کچھ بھی سُنائی نہیں دیا تو اُس نے پاگل سے کہا کہ کیا بات ہے میاں، مجھے تو کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ پاگل نے ڈاکٹر کو افسوس ناک اور قابلِ رحم نظروں سے دیکھ کر کہا کہ پاگل کے بچے! جب پانچ گھنٹے سے مجھے کچھ سُنائی نہیں دیا تو تجھے پانچ منٹ میں کیا سُنائی دے گا، چل بھاگ یہاں سے۔

ابھی مجھے یہ لطیفہ یاد آیا ہی تھا کہ فریبِ سماعت کا شُبہ دُور ہو گیا۔ میں نے دائیں جانب سے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ دبے پاؤں آ رہا تھا۔ میں نے نظر جما کے دیکھا اور ایک دم سراج میرے سامنے آ گیا۔ بے ہوش محسن اُس کے کندھے پر لٹک رہا تھا اور سراج ہاتھ میں محسن کا ریوالور لیے اِدھر ہی آ رہا تھا۔

"غالب!" میں نے شاخ سے بندر کی طرح نیچے لٹک کر کہا۔ "شکاری آ گیا۔ اس کمینے نے محسن کو شکار کیا ہے۔ اسے اِدھر متوجہ کرا اور پیڑ کے نیچے لے آ، مگر آواز مت نکالنا، اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں پھر اُوپر پہنچ گیا۔ میں اُوپر سے غالب کو خاموش سگنل دیتا رہا۔ سراج بہت محتاط تھا لیکن وہ بہت تھکا ہُوا بھی تھا۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا آتا تھا، رُک کر ہانپتا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ غالباً اُسے بھی راستے کی جستجو تھی یا کسی آبادی کی تلاش تھی۔ ٹھیک وقت پر غالب نے اپنے موٹے منکوں کی مالا کو ہاتھ میں لے کر ہلانا شروع کیا۔ منکے کڑکڑائے اور سراج ٹھٹک گیا۔

"کون ہے؟" سراج نے پھُولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا مگر غالب درخت کی اوٹ میں چھُپ گیا تھا۔ سراج چند سیکنڈ بہت چوکنا کھڑا رہا پھر اُس کی صُورت پر حیرانی کے آثار نمودار ہوئے کیونکہ اس جنگل میں یہ آواز اسے عجیب لگی تھی۔ تجسس اُسے درخت کے نیچے لے آیا۔ اُس نے محسن کو نیچے ڈال دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ریٹل اسنیک!" اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ سوال بالکل ٹھیک تھا۔ اس قسم کی آواز جنگل میں ایک سانپ کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے، جس کی ٹھریاں کرکڑاتی ہیں لیکن وہ سانپ ہمارے جنگلوں میں نہیں پایا جاتا۔

ریوالور اُس کے ہاتھ میں ہی تھا جب میں اُس پر بم کی طرح گرا۔ قدرتی طور پر میں نے گرتے ہوئے ریوالور کا خیال رکھا اور میرا ایک ہاتھ اُس کی کلائی پر یوں لگا کہ ریوالور دُور جا گرا۔ سراج میرے وزن کے نیچے دب گیا۔ میں نے اُس کی گردن دبوچ لی۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کُتّے کی موت مار دوں۔" میں نے اُس کے مُنہ پر طمانچے مارتے ہوئے کہا۔ ہر طمانچے پر اُس کا مُنہ کبھی دائیں طرف پھر جاتا تھا، کبھی بائیں طرف اور میری انگلیوں کے نشان اُس کے گالوں پر بن جاتے تھے۔ وہ ہر طمانچے پر کراہتا تھا۔

"دل کی بات مان لے بچّہ۔" غالب نے سامنے آ کے اپنی موٹے منکوں والی مالا بجانا شروع کی۔ "مگر یہ کُتّا تو نہیں ہے، یہ تو کُتّے کا بچہ ہے۔" اُس نے سراج کا ریوالور اُٹھا لیا۔

میں نے سراج کو چھوڑ دیا۔ "تُو سمجھا ہو گا کہ چکما دے کر نکل گیا لیکن تقدیر ساتھ چھوڑ دے تو سارے راستے ایک ہی طرف لے جاتے ہیں۔"

"اور ہاتھ میں توپ بھی ہو تو اُس کا گولا پلٹ کے لگتا ہے بچّہ۔" غالب نے ریوالور کو لہرا کے کہا۔ "یہ دیکھ، اب اس کا رُخ کدھر ہو گیا ہے۔"

اب سراج سمجھ گیا تھا کہ وہ ریٹل اسنیک کون تھا۔ وہ غالب کو گھُور رہا تھا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر جسے میری نگاہ نہ پہچان سکی تھی اُسے سراج کیسے پہچان سکتا تھا۔ میں محسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ غالباً سراج نے اُسے بے خبری میں وار کر کے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی اور اُس کے گال تھپکے لیکن محسن کی آنکھیں بند رہیں۔ اس وقت اندر ہی اندر میں غصّے کی بھڑکی ہوئی آگ میں جل رہا تھا لیکن بہت مجبور تھا۔ میں سراج کو مارتا تو وہ مر جاتا، جو معلومات ہمیں اُس سے حاصل ہو سکتی تھیں، کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہی کی مدد سے ہم رابعہ، کیتھرین اور ٹیلڈی تک پہنچ سکتے تھے چنانچہ سراج کا زندہ رہنا بے حد ضروری تھا۔

"یار، کچھ سمت کا اندازہ ہے؟" میں نے غالب سے کہا۔ "تم نے تو اس علاقے کا سروے کیا تھا، کوئی آبادی ہے قریب میں؟"

"قریب تو نہیں، چار پانچ میل چلنا پڑے گا۔" غالب بولا۔ "پہلے ہم آبادی تک جانے والے راستے تک پہنچ جائیں، وہاں سے ٹیکسی مل جائے تو اس بارِ گناہ کو اُٹھا کے چلنے سے بچ جائیں گے۔" اُس نے سراج کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹیکسی؟ گھاس کھا گیا ہے کیا؟"

"مقامی آبادی آمد و رفت اور نقل و حمل کے لیے بیل گاڑی سے استفادہ کرتی ہے۔ شہر میں یہی کام ٹیکسی سے لیا جاتا ہے۔ پس بیل گاڑی لوکل ٹیکسی ہے۔" غالب بولا۔ "ممکن ہے سُپر ڈیلکس سروس ریڑھا یا تانگا بھی مل جائے مگر کیا ہم پبلک میں جا سکتے ہیں؟"

"محسن کی حالت ٹھیک نہیں ہے، ہمیں جانا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "تو اُسے اُٹھا لے اور آگے چل، میں ایس۔ پی صاحب کو مارچ کراتا ہوں۔" اور نیچے جھُک کر سراج کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ایس۔ پی صاحب کا مُنہ بند کر دے۔" میں نے کہا۔ "اور ہاتھ پیر باندھ دے، جو قمیص انھوں نے پہن رکھی ہے، وہ محسن کی ہے، اسی کو پھاڑ کے استعمال کر۔"

سراج اب تقدیر سے بھی مایوس ہو چکا تھا، جس نے اُسے دوبارہ ہم جیسے دشمنوں کی قید میں پہنچا دیا۔ اُس نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ غالب نے قمیص کا کچھ حصّہ اُس کے مُنہ میں ٹھونس دیا اور باقی سے اُس کے ہاتھ کمر کے پیچھے کَس کر باندھ دیے پھر غالب نے محسن کو کندھے پر ڈالا اور میں نے سراج کو دھکیل کر روانہ کر دیا۔ میرے ہاتھ میں اُسی کی پتلون سے نکالی ہوئی چمڑے کی بیلٹ تھی۔

تقریباً دو میل کا یہ راستہ بہت کٹھن ثابت ہُوا۔ غالب نے اور میں نے باری باری محسن کو اُٹھایا۔ یہ عام حالات میں بھی مشکل کام تھا کیونکہ محسن کا وزن بھی میرے برابر ہی یعنی ایک سو ساٹھ پونڈ تھا۔ اب تو مدّت سے ہم نے وزن نہیں کرایا تھا۔ جب تک ہم لندن میں تھے تو ایک دوسرے کو موٹا اور گول گپّا کہتے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے ہمارا وزن بڑھنے لگتا تھا اور وزن کو حد میں رکھنے کے لیے ہم اکٹھے دوڑ لگاتے تھے اور ورزش کرتے تھے پھر کبھی ایسا زمانہ آتا تھا کہ ورزش چھُٹ جاتی تھی اور خوب پارٹیاں ہوتی تھیں۔ آئس کریم اور کیک کھانے کے مقابلے شروع ہو جاتے تھے تو وزن پھر بڑھنے لگتا تھا۔ یہاں آئس کریم، کیک کے مقابلے تو تھے نہیں۔ دلاور اینڈ کمپنی سے مقابلہ تھا اور ورزش سے زیادہ دوڑ دھوپ تھی چنانچہ پہلے کے مقابلے میں دونوں کا وزن کم ہُوا تھا پھر بھی یہ وزن اتنا کم نہیں تھا کہ ہمیں نقش فریادی سمجھا جاتا۔

جنگل کے ناہموار راستے پر محسن کو اُٹھا کے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرتے کرتے ہم ہانپنے لگے تھے۔ غالب اور میں ڈیوٹی بدل رہے تھے۔ ایک محسن کو لے کر چلتا تھا اور دوسرا سراج کو جنگی قیدی کی طرح دھکیلتا۔ اُسے حسبِ توفیق ذلیل کرتا اور وہ خاموش احتجاج کرتا یا پلٹ کر دیکھتا تو بیلٹ سے اُس کی کھال اُدھیڑتا۔ اس کام میں ہمارے لیے ایک انتقامی تسکین کا سامان تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ دس پندرہ منٹ کے لیے رُکے اور ایک سگریٹ پی۔ اس کے سوا پینے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

"آہا! کتنا لُطف ہے اس تصوّر میں کہ جب یہ سفر ختم ہو گا تو ہمیں گرما گرم کافی ملے گی، سینڈوچ ہوں گے، کلب سینڈوچ۔" غالب نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ "اور تھری کاسل کے سگریٹ ہوں گے۔"

"اور ہمارے لیے ایک چمکتی دمکتی مرسیڈیز تیار کھڑی ہو گی۔"

میں نے بھی اُس کے تصوّر میں ساتھ دیا۔ "ایئرکنڈیشنڈ اور ہوا بھی ترسنے والی۔"

"جس کی پچھلی نشست پر رابعہ اور نازو بیٹھی ہوں گی۔" غالب بولا۔ "رابعہ نے گہرے آسمانی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی ہو گی، جس پر زرد پھُول یوں کھِلے ہوں گے جیسے آسمان پر ستارے۔" میں نے کہا۔

"اور نازو نے سرہاتے سفید ریشم کی شلوار قمیص پہن رکھی ہو گی اور اُس کے گلابی چہرے کے گرد سفید شیفون کے دوپٹے کا ہالہ ہو گا اور اُس نے بالوں میں موتیے کے پھُول لگا رکھے ہوں گے اور اُس کے لبوں پر دھوپ سے اُجلی مسکراہٹ ہو گی اور وہ حیا سے نظریں جھُکا کے اور مُسکرا کے کہے گی۔۔۔"

"اُلّو کے پٹھے! اُٹھ اور آگے چل۔" میں نے کہا۔

"بس، ذرا سی جھُوٹی خوشی بھی نہیں دیکھی گئی۔ اچھے دوست ہو۔" غالب نے آنکھیں کھول کے سرد آہ بھری۔ "بڑا مزہ آ رہا تھا۔"

"مزہ تو آئے گا ابھی۔" میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سراج ہم دونوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کاش تم بھی تصوّر میں کوئی ایسا ہی حسین خواب دیکھ سکتے۔" میں نے سراج کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ "مگر تمھارے تصوّر میں تو وہی بھُوکے بھیڑیے آتے ہوں گے۔ دلاور اور پیڈرو۔۔۔ تمھارے غیر ملکی آقا۔ تم تو بس بند قلیں اور ہم ہی دیکھتے ہو گے، یا پھانسی کا پھندا، ذلّت کی موت، بے آبروئی اور رسوائی۔"

"ایسا مت کہہ یار، یہ بھی غزالہ نسیم کو یاد کر رہا ہو گا۔" غالب بولا۔

سراج ایک دم تڑپ کر پلٹا۔ اُس کی نظروں میں دُکھ کے ساتھ خوف تھا۔

"پریشان کیوں ہو ایس۔ پی صاحب۔" میں نے اُس کے ایک بیلٹ رسید کی۔ "اُسے بھی تم سے بہت جلد ملوانے کے لیے لائیں گے۔"

سراج نے پھر پلٹ کر دیکھا اور میں نے ایک اور بیلٹ ماری۔ اُس کی پیٹھ پر کئی نیل نظر آنے لگے تھے۔

"تم کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک وعدہ کیا تھا، تم کو تمھارے ہی سِکّے میں ادائیگی کا۔" میں نے کہا۔ "اب وقت آ گیا ہے۔ بہت جلد تم وہ سب دیکھو گے، جو ہم نے دیکھا کیونکہ تم نے دکھایا تھا اور ہم وہی کریں گے جو ہم نے تم سے سیکھا۔ مثلاً ایک فلم تم نے دکھائی تھی اور پھر ایک فلم کی شوٹنگ کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے تو معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکی رابعہ نہیں تھی مگر ہم تم کو کیمرا ٹرک سے پریشان نہیں کریں گے۔ ہماری فلم میں اصلی ہیروین ہو گی، مس غزالہ نسیم، تم بہت قریب سے سب دیکھو گے، جو میں نے دیکھا تھا۔"

سراج نے پھر سر گھُمایا اور پھر بیلٹ شڑاپ سے اُس کی کمر پر لگی۔ "وقت بڑا بے رحم اُستاد ہے سراج۔" میں نے کہا۔ "یہ طوائف سے بھی زیادہ بے وفا ہے اور تم سے زیادہ دغا باز۔ دیکھو اس نے کس طرح تمھارا ساتھ چھوڑ دیا۔ آج وقت ہمارے ساتھ ہے۔ اب تاریخ اپنے آپ کو دُہرائے گی، واقعات وہی ہوں گے بس تمھاری جگہ ہم ہوں گے اور ہماری جگہ تم کو لینا پڑے گی۔ جب وقت ہمارا نہیں تھا، تو انتخاب ہمارے ہاتھ میں نہیں تھا، آج انتخاب تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"اپنے سکندر بخت صاحب!" غالب نے دلاور کا لہجہ بنا کے کہا۔ "یہ تو ہم شاید کسی آبادی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ میرے کانوں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں گھنٹیاں سی بج رہی ہیں اور یہ نانڈو کی آواز نہیں، بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی لگتی ہے۔"

غالب کے بعد مَیں نے بھی یہ موسیقی سُنی اور اس کے ساتھ ہی مجھے بیل گاڑی کی چرخ چوں سُنائی دی پھر بیل گاڑی کے پائلٹ نے اپنے بیلوں سے خطاب کیا، جو چند بے معنی الفاظ پر اور کچھ پیار بھری گالیوں پر مشتمل تھا۔

"آ آ ہا... آ دو... ٹخ ٹخ... اوئے سُور دے چرخے، تینوں بے جان بو چڑا... چل چل... او تیری تے..."

"مرزا غالب!" مَیں نے محسن کو نیچے رکھ کے کہا "مَیں جاتا ہوں اس ٹیکسی میں اور گاؤں سے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔"

"اور ہم... ہم یہاں سُوکھتے رہیں۔" غالب نے کہا۔

"مجبوری ہے مرزا۔" مَیں نے کہا "تم اس خلعتِ فاخرہ میں گئے تو گاؤں میں مجمع لگ جائے گا۔ مرد و زن تم سے تعویذ کے اور دُعاؤں کے طالب ہوں گے۔ وہ تمھاری قدم بوسی کے خواہش مند تمھارا جلوس نکال دیں گے۔ بہت زیادہ عقیدت کا مظاہرہ کیا تو ممکن ہے تمھارا مزار شریف بنا دیں تاکہ تمھاری ذاتِ بابرکات کے فیوض اسی آبادی تک محدود رہیں اور ہمیشہ رہیں۔ سراج کو بھی تم ہی اسیر رکھ سکتے ہو۔"

"آخر محسن کو لے جانے میں کیا ہرج ہے؟"

"اس کی وردی تو دیکھو دوست، یہ ایس۔ پی ہے۔ اوّل تو ایس پی بے ہوش نہیں ہوتا اور ہو تب بھی بیل گاڑی میں بہرحال سفر نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا "میرے ذہن میں ایک بہت شاندار پلان ہے، بس تم ایک گھنٹا انتظار کر لو، اس کے بعد دیکھنا۔"

"اگر آنکھیں اس وقت تک دیکھنے کے قابل رہیں؟" غالب بولا۔

مَیں درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور بیل گاڑی کے پیچھے دوڑا، جو اتنی دیر میں سو گز آگے جا چُکی تھی۔ یہ کچّا راستہ اسی قسم کی سواریوں کے لیے تھا۔ مجھے زمین پر ٹائروں کے جو نشانات نظر آئے، وہ سائیکلوں کے ٹائر تھے۔ اس سے بڑی ٹائروں والی گاڑی شاید اِدھر سے کبھی نہیں گزری تھی، ورنہ کیچڑ کے خشک ہو جانے کے بعد جو جو نقوش قائم رہ گئے تھے، اُن میں موٹر سائیکل کے ٹائروں کے پرنٹ تو نظر آتے۔ راستہ مشکل سے چھ فٹ چوڑا تھا اور اس کے دوسری طرف کھیت تھے۔

"بھیّا... اے بھوا...!" میں نے دوڑتے ہوئے ہانک لگائی۔

گاڑی والا بھونچکّا رہ گیا۔ وہ جس راستے سے گزر کے آیا تھا، اُس پر ابھی چند منٹ پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اچانک نمودار ہُوا تھا، بالکل اس طرح، جیسے آسمان سے ٹپکا ہُوں یا زمین سے اُگا ہُوں۔ مزید ستم یہ کہ میں تپلون والا شہری بابو تھا۔ گاڑی بان بیس بائیس سال کا لڑکا تھا۔

"قبلۂ محترم! اگر بارِ خاطر نہ ہو تو اس بندۂ حقیر، فقیر، پُر تقصیر کو قریب ترین آبادی تک رسائی حاصل کرنے کے کارِ خیر میں..." مَیں نے کہا۔

وہ خوفزدہ ہو کے میری صُورت دیکھنے لگا۔

"اُردو نہیں سمجھتے؟" میں نے انگریزی میں کہا "مجھے گاؤں تک پہنچا دو، جہاں تم جا رہے ہو۔"

گاڑی والے نے سر ہلایا "مینوں تے سمجھ نئیں لگدی۔"

"اچھا اچھا، پہلاں دسناں سی یار کہ پنجابی دے سوا ہور کجھ نئیں آوندا۔" مَیں چھلانگ مار کے بیل گاڑی میں بیٹھ گیا "ہُن چل۔ مینوں وی لے چل نال دے، بائو سوہنی گڈی والیا۔"

وہ ہنس پڑا "تم فلموں میں کام کرتے ہو؟"

"اب کروں گا۔" میں نے کہا "تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو۔ میں راستہ بھُول گیا تھا، رات بھر بھُوت میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ اس جنگل میں شیر کم ہیں بھُوت زیادہ ہیں۔"

"شیر؟" گاڑی والا ہنسنے لگا "شیر کدھر سے آ گیا؟"

"پتا نہیں، غیر ملکی ہو گا۔" میں نے کہا "ٹورسٹ شیر یا ممکن ہے علی ہو۔ ایک ہی فیملی ہے دونوں کی، خیر یہ بتاؤ گاؤں کتنی دُور ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"گاؤں تو وہ سامنے ہے۔" لڑکا بولا "وہ مسجد کا مینار نظر نہیں آرہا ہے؟ نام ہے چور لوالہ۔"

"کیا یہ بورلوالہ کا بھائی ہے؟" مَیں نے کہا۔ لڑکا پھر ہنسنے لگا۔ وہ سادہ لوح اور اچھا آدمی تھا۔ اُس نے مجھے بہت مفید معلومات فراہم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ گاؤں میں ڈھائی تین سو گھر تھے۔ ایک ڈاک خانہ بھی تھا اور پولیس چوکی بھی۔ پٹواری اور نمبردار کے بارے میں اُس کی رائے اتنی ہی خراب تھی جتنی پولیس چوکی کے تھانے دار کے بارے میں۔ گاؤں میں بجلی بھی تھی اور ایک تصویروں والا ڈبا پہلے چوپال میں لگایا گیا تھا پھر نمبردار اپنے گھر لے گیا اور اب اُس کی بیٹھک میں صرف خاص خاص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ ان میں اسکول ماسٹر بھی شامل ہے، جو دس سال سے بچّوں کو پڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ بچّوں کے والدین تعلیم کے مقابلے میں دوسرے مسائل کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، مثلاً بھیڑ بکریاں چرانا، گائے بھینسوں کی دیکھ بھال، کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بہرحال چوتھی پاس تھا۔

مجھے اُس نے گاؤں کی مال روڈ پر اُتار دیا۔ وہ مُصر تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور اُس کے چاچے کو سمجھاؤں کہ وہ اُسے اعلیٰ تعلیم کے لیے قصور بھیج دے، جہاں وہ پانچویں کلاس سے شروع کرے گا تو صرف پانچ سال میں میٹرک کر لے گا۔

"تمھارے گھر تو میں بعد میں آؤں گا۔" میں نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ تمھارے چاچے سے کیوں بات کرنا ضروری ہے، باپ سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ باپ تو ہے ہی نہیں۔" وہ بولا "اس کے مرنے کے بعد چھوٹے بھائی نے رواج کے مطابق گھر کی عزت پر چادر ڈالی تھی۔"

"معاف کرنا دوست، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" مَیں نے کہا۔

"بہو کو ہم گھر کی عزت کہتے ہیں ناجی۔ گھر والا مر جائے تو اسی گھر کا دوسرا مرد اسے بیوی بنا لیتا ہے، عزت باہر نہیں جاتی۔" وہ بولا "میرے باپ کے چھوٹے بھائی نے بھابی سے شادی کر لی تھی، یعنی میری ماں سے۔ اب ماں تو تیار ہے کہ مجھے قصور بھیج دیا جائے، مامے کے پاس۔"

"تو تمھارے چاچے کو کیا اعتراض ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ میری شادی کرنا چاہتا ہے۔" وہ بولا "اُس کی پہلی بیوی بڑی ہے..." اُس نے اپنی چھوٹی سوتیلی والدہ کے لیے ایک ایسا لفظ استعمال کیا، جو اُس نے کئی بار اپنے ایک بیل کے لیے استعمال کیا تھا۔ "وہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ باندھنا چاہتی ہے۔"

"کیا وہ تم کو پسند نہیں؟" مَیں نے کہا۔

"آپ دیکھا اُس کو، پسند آ گئے تو لے جانا۔ گاؤں میں سب اُس کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔" وہ بولا "اور جناب سچ بات تو یہ ہے کہ وہ سارے گاؤں کی بیوی بھی بن چُکی ہے۔ میں اُس سے بیاہ کر دوں، قتل کر کے پھانسی نہ چڑھ جاؤں۔"

"اچھا اچھا، مَیں تمھارے چاچے کو سمجھا دوں گا اور وہ نہ سمجھا تو اس کا دماغ درست کر دوں گا۔" مَیں نے کہا "ایک دو دن میں یہاں ایس پی صاحب دورے پر آنے والے ہیں۔"

"ایس پی؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پولیس کا سب سے بڑا افسر۔" مَیں نے کہا۔

"تھانیدار سے بھی بڑا؟" وہ بولا۔

"ہاں، تھانیدار تو اُس کے گھر میں جھاڑو دیتے ہیں اور برتن دھوتے ہیں۔" میں نے کہا "وہ سارے تھانیداروں کا تھانیدار ہوتا ہے۔"

"بس جی تو آپ چاچے کو دس چھتر لگوا دیں۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "وہ افسر آپ کی مانتا ہے؟"

"دوست ہے میرا، مانے گا کیوں نہیں۔" میں نے کہا "لیکن یار، تم بھی میرا ایک کام کرو۔ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تھانے میں کون کون ہے؟"

"تھانے میں؟" وہ بولا "ایک تو وہ کانا حوالدار ہے فتح خان، اُس کے ساتھ دو سپاہی ہیں۔ ایک تو کُوما ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے قیوم؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، کمہار کا لڑکا اور دوسرا شہر سے آیا ہے سونا خاں، ان کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ روز ککڑ کھاتے ہیں، پانچ سیر دودھ ہر روز نے جانا پڑتا ہے اُن کے لیے، جسے چاہتے ہیں پکڑ کے لے جاتے ہیں اور گنجا کر کے واپس بھیج دیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"گنجا کر کے! کیا اُن میں کوئی نائی بھی ہے؟" مَیں نے کہا۔

"ہاں جی، وہ سونا خاں نائی کا بیٹا ہے، وہی اُسترا پھیرتا ہے۔ کل بالو ترکھان کو پکڑ کے لے گئے تھے۔ اُس نے نمبردار کی بیٹھک کے لیے جو منجی بنائی تھی اُس کی لکڑی سے بُرادہ جھڑنے لگا تھا۔ آج وہ آئے گا، سو چھتر کھا کے اور سر منڈوا کے... نمبردار نے سو چھتر مارنے کے لیے کہا تھا۔"

"اچھا! یہ سب تو ہوتا آیا ہے عزیزم اور ہوتا رہے گا۔ اکیلا چنا بھاڑ کو نہیں پھوڑ سکتا۔ ہر گاؤں اور شہر کے تھانے میں پولیس کے ہاتھوں غریب اور لاوارث مگر بے گناہ لوگوں کی ٹُھکائی ہوتی رہے گی اور ظالم نمبردار قسم کے لوگ ان کو سو چھتر بھی پڑواتے رہیں گے اور سو پیاز بھی کھلاتے رہیں گے مگر تمھارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں پولیس کی اصلاح کے لیے نہیں آیا، ان سے اب اللہ ہی سمجھے، تم میرا ایک کام کرو، سیدھے تھانے جاؤ۔"

"تھانے جاؤں؟" لڑکے نے خوفزدہ ہو کے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کے سر پر تازہ کٹی ہوئی لان کی گھاس جیسے بال اُگ رہے تھے۔ غالباً اُسے تھانے سے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

"فکر مت کرو، دوبارہ تمھاری ٹنڈ کوئی نہیں کرے گا۔" مَیں نے کہا "تم اُس کانے حوالدار سے کہنا کہ مجھے ایس۔ پی صاحب کا پی اے ملا تھا۔ کیا کہو گے؟"

"ایس۔ پی صاحب کا پی۔ اے ملا تھا۔" وہ بولا۔

"شاباش۔ اور کہنا کہ وہ کسی ملزم کی تلاش میں اِدھر آئے ہیں اور ہو سکتا ہے تھانے میں بھی پہنچ جائیں۔" مَیں نے کہا "پر یہ مت بتانا کہ پی۔ اے صاحب بیل گاڑی میں آئے تھے میرے ساتھ، کہنا کہ سڑک پر ملے تھے۔"

"اچھا جی۔ میں کہہ دوں گا کہ سڑک پر ملے تھے۔" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" مَیں نے کہا "اگر تم سے ملنا ہو تو...؟"

"فضلو... میرے چاچا کا نام ہے ہاشو... وہ خود کو حشمت اللہ کہنے لگا ہے اب..." وہ خوش ہو کے بولا۔

مَیں نے اُسے دس کا ایک نوٹ دیا "یہ اپنا انعام رکھو اور دیکھو، جو کام میں نے کہا ہے، وہ ویسے ہی ہونا چاہیے، بھُولنا مت، میں ایس پی کا پی۔ اے ہُوں۔"

"ایس پی کا پی اے۔" اس نے دس کا نوٹ دھوتی میں اُڑس کر کہا۔

گاؤں کی مال روڈ پر چار یا پانچ دُکانیں بالکل اُسی معیار کی تھیں جیسی کہ ہونی چاہئیں۔ وہ سب سپر اسٹور اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھے یعنی وہاں ہر چیز ملتی تھی، مثلاً انسانوں کی خوراک بھی اور مویشیوں کی بھی۔ بھینس باندھنے کی زنجیر بھی اور سگریٹ بھی، تاہم گاؤں اس سے بڑا تھا جتنا مجھے مسٹر فضلو نے بتایا تھا۔ اس میں گھروں کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ضرور ہو گی۔ میں نے ایک چائے خانہ بھی دریافت کیا۔ وہاں وہی اُبلتا ہُوا گاڑھا شیرہ تھا جس میں دُودھ وافر تھا اور چائے کی پتّی رسماً ڈالی گئی تھی تاہم اُسے پی کر بھی میں اتنا ہی خوش ہُوا جتنا لاہور میں شیزان کی چائے پی کر ہوتا پھر میں سوچنے لگا کہ اس مشروب کو غالب اور محسن

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تک کیسے لے جاؤں کہ یہ ٹھنڈا نہ ہو مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ ابھی میں چائے پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ میں نے پولیس فورس کو دیکھا۔ اُن میں کانا حوالدار بھی شامل تھا۔ دونوں ماتحت ایک نوجوان کی گردن میں رسّی ڈالے اُسے بیل کی طرح کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ نوجوان کے گھنے بال دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ بہت جلد وہ ان بالوں سے محروم ہونے والا تھا۔ حوالدار جسے مقامی تھانیدار کے مکمل اختیارات حاصل تھے اور جو تھانیدار کہلاتا بھی تھا، ایک ڈنڈا لیے پیچھے چل رہا تھا اور وقتاً فوقتاً وہ مجرم کے ایک ڈنڈا رسید کرتا تھا اور ایک ایسی گالی دیتا تھا، جو میں نے پہلے نہیں سنی تھی۔ سب سے پیچھے ایک شخص ریڑھی دھکیلتا آ رہا تھا۔ ریڑھی پر کھلونے، پلاسٹک کا سامان اور نہ جانے کیا کچھ تھا مگر اسی میں مجھے ایک الارم کلاک، ایک جوڑی نئے جوتے، ایک تھرماس اور ایک سلائی مشین بھی نظر آئے۔ میں اُن کے پیچھے چل پڑا۔ باقی لوگوں میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے اس شخص سے کہا، جو ریڑھی لے جا رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے ملزم کی طرف اشارہ کیا۔

"چور ہے جی۔" ریڑھی دھکیلنے والے نے مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھ کر کہا۔ اگر میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوتا اور پتلون میں نہ ہوتا تو وہ مجھے جھڑک دیتا۔ "یہ سب چوری کا مال ہے۔"

"یہ تھرماس بھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی، پتا نہیں کس کس کے گھر سے اُٹھاتا رہا۔ گلی میں پھر کے کھلونے بیچتا تھا اور جہاں داؤ لگتا تھا وہاں سے کچھ غائب کر لیتا تھا۔"

کانا تھانیدار اور اُس کے ماتحت شاید بیس قدم آگے تھے۔ اُنھوں نے یہ گفتگو نہیں سنی، ورنہ وہ مجھ سے دخل در معقولات کا سبب ضرور پوچھتے۔

"تم کون ہو، چور کے ساتھی؟" میں نے کہا۔

"لعنت بھیجو جی ایسے کام پر۔" وہ بولا۔ "میں تھانے کا چوکیدار ہوں اور تھانیدار صاحب کا خاص آدمی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "پھر تو تم میرا ایک کام کر سکتے ہو۔ یہ لو سو روپے، خاموشی سے جیب میں رکھ لو۔"

تھانیدار کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی نے سو کا نوٹ ایسے غائب کیا جیسے شعبدہ باز لوہے کا گولا غائب کرتے ہیں۔ "کیا کام ہے؟"

"یہ تھرماس تمہارے لیے بے کار ہے۔" میں نے کہا۔ "چوری کے مال میں اسے مت شامل کرو۔"

اُس نے ریڑھی پر سے تھرماس اُٹھایا اور مجھے پکڑا دیا۔ "یہ لو جی مگر اب کھسک لو، تھانیدار صاحب نے دیکھ لیا تو سو چھتر ماریں گے۔"

میں فوراً واپس ہو گیا۔ بیس روپے کا تھرماس اس وقت سو میں بھی مہنگا نہیں تھا۔ میں نے اُس میں چائے بھروائی، بسکٹ لیے اور گاؤں کا ایک چکر کاٹ کے واپس ہوا۔ میں نے گاؤں کا ڈاک خانہ دیکھا، جہاں فردِ واحد ایک کرسی پر حقّہ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ میں نے ایک دھوتی بھی خریدی لیکن ایک کُرتا مجھے نہ مل سکا۔ جب میں دوسری طرف سے واپس آ رہا تھا تو مجھے پھر فضلو ملا۔ وہ تھانے جا رہا تھا۔ اُس نے میری فرمائش پر پھر دُہرایا کہ اُسے کیا کہنا ہے۔ اس کے باوجود مجھے ڈر رہا کہ کہیں وہ اُلٹا نہ کہہ دے کہ مجھے پی۔ اے صاحب کے ایس پی ملے تھے۔ گاؤں کے دوسری طرف مجھے ایک جلا ہوا گھر بھی نظر آیا، جو [illegible] پڑا تھا۔ (اس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پٹواری کی شکایت پر تھانیدار کے حکم سے اسے آگ لگا دی گئی تھی۔)

جب میں پھر غالب اور محسن کے پاس پہنچا تو دو گھنٹے کے انتظار نے اُن کی حالت خراب کر دی تھی۔

"معاف کرنا یار، کچھ دیر ہو گئی مجھے۔" میں نے کہا۔

غالب ایک درخت کے نیچے سبز گھاس پر محسن کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے میری طرف ایک آنکھ کھول کے دیکھا۔ "اب معافی مت مانگ، دُعائے مغفرت مانگ، ہم سب فوت ہو چکے ہیں۔"

محسن آنکھیں کھول کے مسکرایا تو میری آدھی کوفت اور تھکن دُور ہو گئی ـــــ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیا حال ہے اب تیرا؟"

"ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "سر میں بہت سخت درد ہے۔"

"فکر مت کر، میں گرما گرم چائے لایا ہوں۔ اسپرین کی گولیاں بھی مل گئیں لیکن یہ تھرماس نہ ملتا تو کچھ نہ ہوتا۔" میں نے کہا۔

غالب اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "گاؤں والے بھی اب ماڈرن ہو گئے ہیں۔ چائے، تھرماس اور اسپرین... نصف صدی قبل کسی گاؤں کے رہنے والے ان الفاظ کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ کیا نام ہے اس گاؤں کا...؟"

"چوریوالہ!" میں نے کہا۔ "بروزن بوریوالہ... وہ کہاں ہے سابق ایس پی؟"

"اُدھر، حوالات میں۔" غالب نے بڑے اشتیاق سے تھرماس کھولا، بسکٹ کے ڈبے کھولے اور پہلے محسن کو چائے دی۔ میں نے دوسری طرف جا کے دیکھا تو غالب نے سراج کو درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اُس نے اپنی تمام رنگین منکوں والی مالائیں اُس کے گرد لپیٹ رکھی تھیں۔

"میں فارغ تھا، سوچا تھوڑی سی نیند کر لی جائے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ڈر تھا کہ ایس پی صاحب چوری نہ ہو جائیں۔ جب محسن ہوش میں آ گیا تو میں نے سراج کو باندھ دیا۔ کتنی خوبصورتی سے باندھا ہے؟"

"کافی طاقت صرف ہوئی تیری۔" میں نے کہا۔ "بہت اچھا سجایا ہے قربانی کے اس بکرے کو، اُوپر نیچے تک لال، نیلے، پیلے موتیوں کی لڑیاں نظر کو بہت بھلی لگتی ہیں۔ تم لوگ کھا پی لو تو اسے بھی کچھ ڈال دینا

ورنہ مر جائے گا۔"

"کیا موضع چوریوالہ بہت دُور ہے؟" غالب بولا۔

"نہیں، میں تو خواہ مخواہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔" میں نے کہا۔ "واپسی پر پیدل آنے میں پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔"

"لیکن ہم سب پیدل نہیں جا سکتے۔" غالب بولا۔

"مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے پلان کے مطابق ہمارے لیے اس وقت گاؤں میں داخل ہونا مناسب نہیں۔ ہم رات کو اندھیرا پھیلنے کے بعد جائیں گے۔ میں سارے راستے اور ٹھکانے دیکھ آیا ہوں۔"

"مگر رات تک یہاں کیا کریں گے؟" غالب نے احتجاج کیا۔

"آرام۔" میں نے کہا۔ "یہ جگہ راستے سے بہت ہٹ کر ہے۔ اُوپر پیڑوں کا سایہ ہے، نیچے سبزہ، رات تک ہم سب کی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔"

"مگر اس وقت جانے میں کیا قباحت ہے؟" غالب نے میری ہر دلیل کو مسترد کر دیا۔

"بے وقوف آدمی، اپنا حلیہ دیکھ۔ سراج کی وردی محسن نے پہن رکھی ہے۔ کوئی ایس پی گاؤں میں اس طرح پہنچتا ہے؟ پھر سراج کو ہم ایسے نہیں لے جا سکتے، اسے چھپا کے لے جانا پڑے گا۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "اور تم نے تو ابھی میرا پلان بھی نہیں سُنا۔"

"اچھا سُن لیتے ہیں۔" غالب نے محسن سے کپ لے لیا۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ تھرماس کا ایک ہی مگ تھا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی اُس کی زبان جل گئی اور صورت ایسی ہو گئی جیسے غلطی سے وہ ٹنکچر آیوڈین پی گیا ہو۔ "یہ چائے ہے؟"

"ہاں یہ چائے ہے۔" میں نے آستین چڑھا کے کہا۔ "تیرا تو باپ بھی مانے گا بھوت کے نیچے... اگر یہ چائے نہیں ہے تو پھر کافی ہے۔"

محسن آنکھیں بند کیے اور ایک ہاتھ سر پہ رکھے لیٹا رہا اور میری بات سُنتا رہا۔ میں نے ان کو فضلو سے ملاقات سے لے کر کانے تھانیدار کے افسر بکارِ خاص سے چوری کا مال خریدنے تک کا احوال تفصیل سے سُنایا لیکن اپنی آواز اتنی کم رکھی کہ سراج کے کانوں تک نہ پہنچے پھر بھی بیچ بیچ میں کبھی غالب زور سے قہقہہ مارتا تھا تو کبھی میں۔ آہستہ آہستہ محسن کی حالت بھی بہتر ہونے لگی اور وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سراج کو چائے اور بسکٹ دینے کے بعد پھر اسی طرح باندھ دیا گیا اور ہم نے سر جوڑ کر اپنے پلان کو ڈسکس کیا۔ اُن دونوں نے ہاتھ ملا کے مجھے ایسا شاندار پلان بنانے پر مبارکباد دی اور بڑی فراخدلی سے اعتراف کیا کہ میں ایم آر ایس کی سربراہی کے لیے موزوں ترین شخص ہوں۔ غالب نے یہ بھی اعتراف کیا کہ یہ بات وہ اُوپری دل سے کہہ رہے ہیں اور اخلاقاً جھوٹ بول رہے ہیں۔

رات کا اندھیرا پھیلنے میں ابھی کم سے کم چھ گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے اتفاقِ رائے سے دو دو گھنٹے سراج کی نگرانی کرنے کی ڈیوٹی دینے کا فیصلہ کیا اور اس طرح چار چار گھنٹے سونے کی مہلت نکال لی۔

سورج تقریباً سات بجے غروب ہوا۔ ہم سب کئی دن کے تھکے ہوئے تھے اور ذہنی طور پر بھی اتنے ہی خستہ حال تھے جتنے جسمانی طور پر شکستہ حال تھے چنانچہ مجھے اور محسن کو نیند تو آئی مگر ٹوٹ ٹوٹ کر۔ وہ پُرسکون اور بے خواب نیند ان حالات میں یہاں کیسے آ سکتی تھی جبکہ ہر طرف خطرے کا آسیب مسلط تھا۔ ذہن میں ہر لحظہ رابعہ کی یاد تھی اور ان سب کا خیال تھا جن کی سلامتی ہمیں خود اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ دو بار میری پلک جھپکی تو یادوں کے بھیانک عفریت جو ماضی کا قصّہ بن گئے تھے، اپنی قبروں سے نکل آئے اور اُن کے مکروہ ڈھانچے مجھے خواب میں ڈرانے لگے۔ "ہم پھر آئیں گے سکندر بخت... ہم تمھارے تعاقب میں ہیں۔" وہ شیطانی قہقہے لگانے لگے۔ "لو، یہ فلم دیکھو، بڑی اچھی فلم ہے، اس میں رابعہ بھی ہے۔" دونوں بار میں گھبرا کے اُٹھ بیٹھا اور محسن میرے ساتھ اُٹھا، نیند میں وہ بھی پریشان ہو رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو تسلی دے کر پھر لیٹ گئے۔ نیند نہ سہی، جسم کے لیے آرام ضروری تھا۔ ہم نے سراج کو بھی باندھ کر پیڑ کے ساتھ کھڑا رکھنے کے بجائے زمین پر لمبا لٹا دیا تھا اور اُس کے جسم سے لپٹی ہوئی ایک مالا کو درخت سے باندھے رکھا تھا تاکہ وہ دُور نہ جا سکے۔ وہ بھی تھکن اور پٹائی سے بے حال تھا مگر ہمارے مقابلے میں وہ واقعی گھوڑے بیچ کر سویا۔ اُس کے خرّاٹے سُن کر مجھے تعجب ہوا تھا۔ محسن نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہوگا، مگر میں نے اُس کے کان میں کبوتر کا پَر گھما کے دیکھا، اُس نے حرکت بھی نہیں کی، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔ کھانے کے لیے دہی بسکٹ کے ڈبے تھے، جو ہم چر گئے تھے اور چائے بھی، جو دوپہر کو ہی ختم ہو گئی تھی۔ تاہم اس آرام کے وقفے نے ہماری جسمانی توانائی کو بحال کر دیا۔

سات بجے ہم نے سراج کو لات مار کے جگایا۔ "اُٹھ مردے! یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے، جس پر پیر پھیلا کے سو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تیرے لیے تو قبر کی دو گز جگہ بھی مشکل سے نکلے گی۔ تیری لاش کو کُتّے ہضم کریں گے۔" محسن بولا۔ "ذرا سوچ کہ صورِ اسرافیل پر شرفا تو اپنی قبروں سے اُٹھیں گے، تُو کہاں سے نکلے گا؟"

"بے حد غور طلب نکتہ ہے۔" غالب نے آخری سگریٹ جلاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "ممکن ہے ایسے بدبختوں کو عرصۂ محشر میں بھی قدم نہ رکھنے دیا جائے، سیدھا جہنّم کے سب سے غلیظ طبقے میں پہنچا دیا جائے۔"

"چلو یار، کُوچ کرو۔" میں نے کہا۔ "گاؤں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا گہرا ہو جائے گا، بھوک بھی لگ رہی ہے اب تو..."

ہم سب ایک ساتھ روانہ نہیں ہوئے، سراج کو ہم نے سب سے پیچھے رکھا اور اُس کے ساتھ غالب رہا۔ میں اور محسن آگے تھے۔ ہم راستہ صاف دیکھتے تھے تو اُنھیں اشارہ کرتے تھے اور وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہمارا ساتھ دینے لگتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمیں کوئی بھی گاؤں میں وارد ہوتا دیکھے۔ پورے بیس منٹ کا راستہ چالیس منٹ میں طے ہُوا اور ہم تقریباً آٹھ بجے اس جلے ہوئے مکان میں داخل ہوئے جس کے بام و در ابھی تک سیاہ تھے اور آدمی کے ہاتھوں آدمی کی خانہ بربادی پر نوحہ خوانی کر رہے تھے۔ اس کا ایک کمرا جلنے سے صاف تھا کیونکہ اس کی چھت نہیں گری تھی مگر وہاں بھی فرش پر مٹی اور گھاس کے علاوہ چھت میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی غلاظت کا بستر بچھا ہُوا تھا۔ کچھ حضرات و خواتین نے اُسے خلوت کی جگہ پا کے بطور بیت الخلا بھی استعمال کیا تھا اگر محبت کرنے والوں نے اسے ملنے کی جگہ بھی بنایا ہو تو تعجب نہیں کیونکہ یہ گھر گاؤں سے باہر تھا۔

"آخر پٹواری نے اس گھر کو کیوں آگ لگائی؟ کون بدقسمت تھا وہ، جسے یہ سزا ملی اور وہ اپنے گھر کی آگ میں جل مرا یا کہیں بے گھر پھر رہا ہے؟" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"ان سوالات کا یہ کوئی وقت نہیں،" میں نے اُسے ڈانٹا۔ "ڈیٹ شیٹ کے حساب سے جب انگلش کا پرچا ہو تو حساب کے سوال پوچھنے کا مقصد؟ بہرحال، ہم کل جواب دیں گے۔"

"کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔" غالب نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آگیا، اپنا گھر بھی ایسا ہی رو سیاہ ہے۔ اُسے دلاور نام کے ایک پٹواری کے حکم پر جلایا گیا تھا۔"

"گھر تو رابعہ کا بھی جلایا گیا تھا،" میں نے کہا۔ "مگر جلے دل جلو، ابھی اپنی گم گشتہ جنتوں کو یاد کر کے کیوں دل آزردہ ہوتے ہو، ہم ایک دن پھر لوٹ کر انہی جنتوں کو آباد کرنے جائیں گے، جہاں سے ہمیں شیطان نے نکلوایا۔ ابھی تو میں گاؤں جا رہا ہوں۔ موم بتی، سگریٹ، ماچس، کھانے پینے کا سامان لاتا ہوں اور چائے بنانے کا سامان بھی لاؤں گا۔ مرزا غالب، تم یہ قلندرانہ لباس اُتار دو اور یہ دھوتی باندھو، جو میں دن میں لایا تھا اور میرے ساتھ چلو۔ محسن، تُو ذرا ایس پی صاحب سے کمرے کی صفائی کروا لے۔"

غالب نے وہ لنگی باندھی اور اوپر صرف بنیان رہنے دیا۔ یہ وضع قطع مقامی لوگوں کے لیے زیادہ قابلِ قبول تھی۔ ہم نے گاؤں کی مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک کنواں دریافت کیا جو ہماری جائے قیام سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہم اس کے رہٹ کو بیل کی طرح چلا سکتے تھے اور تازہ پانی سے غسل فرما کے تازہ دم ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے ہمیں بہت خوش کیا۔ میں یہ بھی غور کرتا گیا کہ موضع چوریوالہ میں ٹیلی فون کی لائن تو نہیں ہے۔ ٹیلی فون کا کھمبا تک مجھے دکھائی نہ دیا۔ رات کے وقت بیشتر گھروں میں چراغ جل رہے تھے مگر گاؤں میں بجلی تھی چنانچہ کچھ گھروں میں بلب بھی روشن تھے۔ مال روڈ پر ایک قطار میں چھ سات بلب ٹمٹما رہے تھے۔ سردیاں گزر چکی تھیں چنانچہ دکانیں ابھی کھلی ہوئی تھیں اور چائے خانے کے باہر تو خاصی رونق تھی۔ چارپائیوں پر لوگ دھوتیاں سمیٹ کر اور حقے لے کر فراغت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اُدھر جانے سے گریز کیا۔ پہلی ہی دکان سے ہمیں چُورا چائے کے ایک ایک آنے والے پیکٹ ملے۔ لال شکر ملی جس کو دکاندار نے بہترین کھانڈ قرار دیا۔ ہم نے وہیں سے سگریٹ خریدے اور تھری کاسل کے نام پر دکاندار دنگ رہ گیا۔ اس کے خیال میں یہ ولایتی سگریٹ تھے یا پھر گوروں کے زمانے میں بنتے تھے۔ مقامی آبادی کا برانڈ تھا بگلا مارکہ سگریٹ یعنی کنگ اسٹارک۔ اعلیٰ ترین سگریٹ ولز کے سمجھے جاتے تھے، جس کا صرف ایک پیکٹ دستیاب تھا۔ باقی ہم کو وہی بگلا مارکہ لینے پڑے جسے غالب نے 'کھنگ اسٹروک' قرار دیا۔ کھنگ چونکہ پنجابی میں کھانسی کو کہتے ہیں اس لیے یہ نام بہت مناسب تھا۔ اس سگریٹ کا دھواں سینے میں جا کے گھونسے کی طرح لگتا تھا تو بے اختیار کھانسی آتی تھی۔ وہاں صابن بھی تھا مگر مسئلہ ایک برتن نے پیدا کیا۔ گاؤں میں صرف مٹی کے برتنوں کی دکان تھی اور چونکہ ہم نے کافی شاپنگ کی تھی، اس لیے نیک دل دکاندار نے ہمیں کمہار کا گھر بھی انگلی کے اشارے سے دکھا دیا۔ پھر اس نے ہم سے وہ سوال کیا جس کے انتظار میں ہم بہت دیر سے تھے:

"تم اس گاؤں کے تو نہیں لگتے۔" وہ بولا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"

"شہر سے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"شہر سے؟ قصور سے کہ لاہور سے؟" وہ بولا۔

"دونوں جگہ سے۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے چلے تھے، اب قصور سے آئے ہیں۔ دراصل ایس پی صاحب کے ساتھ خوار ہو رہے تھے۔"

"کس کے ساتھ؟" وہ چونکا۔

"پولیس کے بادشاہ کے ساتھ۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے ایک دھوکے باز کو پکڑنا تھا... وہ کبھی اِدھر بھاگ جاتا تھا، کبھی اُدھر... آج پھنس گیا۔"

"اچھا اچھا... وہ اپنا فضلو بھی کہتا پھر رہا تھا۔" دکان دار بولا۔ "کہ کوئی بہت بڑے پولیس کے افسر آنے والے ہیں۔ تھانیدار اُسے پکڑ کے نمبردار کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس نے سب کے سامنے کہا کہ اُسے کوئی ملا تھا۔ پتا نہیں کون۔ اس نے بتایا کہ تھانے والے ہوشیار رہیں... کانا... میرا مطلب ہے تھانیدار صاحب کی تو پتلون ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ جو منکر نکیر ہیں نا... ان کی حالت زیادہ خراب ہے۔ آج رات بھر تھانے کی صفائی ہوگی۔"

"اس اطلاع سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔" میں انہی کے ساتھ ہوں اور وہ گاؤں کے باہر موجود ہیں۔"

"گاؤں کے باہر؟" دکان دار اچھلا۔ "اتنے بڑے افسر اور گاؤں کے باہر... نمبردار کی حویلی کے ہوتے ہوئے..."

"چاچا... بس یہیں رُک جاؤ۔" میں نے کہا۔ "افسر کا حکم ہے کہ کسی کو خبر نہیں ہونا چاہیے... بہت سخت اور ایمان دار افسر ہے... کسی بھی نمبردار، تحصیلدار، تھانیدار کے گھر کی روٹی بھی نہیں کھاتا... مگر غریب آدمی کے گھر چلا جاتا ہے۔ تمھاری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلنا چاہیے کل تک ورنہ سمجھ لو کہ سب سے پہلے تم ہی پکڑے جاؤ گے... ابھی تک تمھارے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔"

"میں... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ..." وہ بولا۔ "آپ یہ پیسے بھی رکھیں... میں غریب اور بڈھا آدمی ہوں۔"

"چاچا... میں نے کہا نا کہ افسر سخت ہے۔ ایک پیسے کی رشوت نہیں لیتا، اس لیے قیمت تو تم کو لینا پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک رات کے لیے کچھ سامان دے دو۔"

"حکم کرو مائی باپ... کیا سامان چاہیے... گھر خالی کر دوں، آپ اِدھر آ جائیں... میں اپنے سُسر کے گھر..."

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "افسر اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہے اور تم کہتے ہو یہاں آ جاؤ... کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ ایک پتیلی لا دو... دو تین چائے کے پیالے۔"

بڈھے دکان دار کے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ اُسے اتنے بڑے افسر کی خدمت اور رازداری کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے سب چیزیں ہمیں لا دیں اور سارا سامان ایک پوٹلی میں باندھ دیا۔ میں نے اس کے اطمینان کے لیے سو کا نوٹ بطور زرِ ضمانت رکھوانا چاہا تو وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ میں نے نوٹ رکھ لیا۔ "بس اب آج رات کسی سے بات مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا کہ مسافر تھے۔"

"کسی سے کوئی شکایت ہو تو بتا دو۔" غالب نے کہا۔ "ہم صاحب سے سفارش کر سکتے ہیں۔"

"شکایت... شکایت تو ہے جی... پر کسی اور سے کیا کہیں جب اپنی ہی اولاد کمینی ہو۔" وہ بولا۔ "میرا جوان لڑکا ہے جی... تین بچوں کا باپ۔ ایک رنڈی کے پیچھے لگ کر برباد ہو رہا ہے۔"

"کون ہے وہ رنڈی؟" میں نے رعب سے کہا۔

"وہ جی... ہاشو کی سالی... کیا کہیں جناب کہ ماں کتنی شریف اور اس کی بیٹی کیسی بدمعاش... تیس سال کی ہو گئی اور ابھی تک کسی نے قبول نہیں کیا اسے... کرے گا بھی کون۔" وہ بولا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی عورت کا ذکر فضلو نے کیا تھا کہ اس کا چاچا ہاشو زبردستی اسے اپنی سالی کے ساتھ باندھنا چاہتا ہے، جو بقول فضلو کے سارے گاؤں کی جورو بن چکی ہے۔ اور فضلو اس سے شادی پر خودکشی کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ مسئلہ ایک نہیں تھا مگر اس کا حل ایک ہی ہو سکتا تھا۔

"فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "صبح سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھارا بیٹا اس رنڈی سے اس طرح الگ ہو جائے گا جیسے جوتی پاؤں سے الگ ہوتی ہے۔"

"یہ... یہ ہوئی نا بات جنابِ عالی... سارا کمال ہی جوتی کا ہے... بس اس کو چار چھتر پڑ جائیں کرارے۔" وہ بولا۔

"کسے... اس رنڈی کو...؟" میں نے کہا۔

"نہیں جی... میرے پتر کو..." وہ بولا۔ "اور چھتر پڑیں سب کے سامنے... اس کی بیوی بھی ہو... میری بہو کے سامنے... دل خوش ہو جائے سب کا۔"

"سب کا دل خوش کر دیں گے چاچا... السلام علیکم..." میں نے کہا۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو مرزا غالب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہاں ہر مرض کی دوا چھتر ہے۔ جمہوریت اور شخصی آزادی، انصاف اور قانون... انسانی نفسیات پر چھتر کاری کے منفی اثرات یہ سب یہاں کوئی نہیں جانتا... چور کا علاج چھتر... آوارہ پنے کا علاج چھتر... عشق کا علاج چھتر... جن بھوت کا علاج بھی چھتر۔ جو پٹواری... مولوی صاحب یا نمبردار کی نہ مانے اس کا علاج چھتر۔

ہماری عدم موجودگی میں محسن نے ایس پی سے جھاڑو دلوائی تھی۔ جھاڑو بھی سراج نے خود ہی درختوں سے پتلی پتلی شاخیں توڑ کے بنائی تھی اور پھر پتوں سے ہی رگڑ رگڑ کے فرش کو صاف کیا تھا۔ وہ دو بار محسن سے پٹا بھی تھا۔ ہم نے موم بتی روشن کی تو چھت پر چمگادڑوں نے احتجاجاً اُڑنا اور چیخنا شروع کیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں چکر لگا کے باہر نکل گئیں تو محسن نے سارا سامان دیکھا اور ہماری ساری روداد سُنی۔ اس عرصے میں غالب نے پتھروں کا چولھا بنوایا اور سراج کو باہر سے خشک لکڑیاں جمع کرنے لے گیا۔ اب ہم اپنی مرضی کے مطابق چائے تیار کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن میں نے تجویز پیش کی کہ پہلے ہمیں نہا لینا چاہیے۔

کنوئیں پر سراج کو بیل کی جگہ باندھ دیا گیا۔ اس کے مقدر میں خدا نے جتنی ذلت لکھی تھی وہ اس کو بہرحال اٹھانا تھی۔ یاری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

باری ہم نے بھی اس کے ساتھ زور لگایا اور ایک ایک کر کے نہاتے گئے۔ پانی بہت صاف اور ٹھنڈا تھا۔ لائف بوائے کا گاؤں میں ملنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ یہ یونیورسل قسم کا ہاتھ سوپ تھا جو شاید ماؤنٹ ایورسٹ پر بھی مل جاتا۔ اس سے نہا دھو کے پاک ہوتے ہی ہم نے خود کو ایک نئی دنیا کا نیا انسان محسوس کیا جس کے جسم میں نئی طاقت تھی اور جس کا عزم و حوصلہ نیا تھا۔ سراج کو ہم نے مُنہ بھی نہیں دھونے دیا کیونکہ صبح اس کو مفرور ملزم کی طرح پیش کرنے کے لیے اس کا حلیہ بھی خراب ہونا ضروری تھا۔ ہم نے چولھا جلا کے چائے بنائی اور بسکٹ کھاتے ہوئے مسلسل چائے پیتے رہے۔ دلنز کے سگریٹ برابر تقسیم کیے گئے۔ دسویں سگریٹ کو پہلے سلگایا گیا اور اس کے سُوٹے سب نے لیے۔ سراج کو بھی بسکٹ اور چائے دی گئی اور پھر باندھ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا گیا جس کی چھت نہیں تھی۔ اس کے مُنہ میں کپڑا نہیں ٹھونسا گیا تھا۔ یہاں اس کو شور مچانے کی اجازت تھی مگر وہ بالکل گم سُم پڑا رہا۔ اس سے بندھی ہوئی ایک ڈوری ہمارے ہاتھ میں رہی لیکن پھر بھی ہم نے اس پر نظر رکھی۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ مالا کی ڈوری کسی پتھر سے باندھ کے نکل جاتا اور ہم ساری رات ڈور تھامے اس یقین کے ساتھ بیٹھے رہتے کہ وہ موجود ہے۔

دس گیارہ بجے چاند نکلا تو ہم زمین پر ایک دوسرے کے متوازی لیٹے سگریٹیں پھونک رہے تھے کھانس رہے تھے او سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ سب کے ذہن میں رابعہ کیتھرین اور استاد ٹیڈی کا خیال تھا۔

اچانک محسن نے پوچھا "یار غالب! تو نے بھی شہلا کو روکا تھا؟"

غالب نے اسے سر گھما کے دیکھا "کس بات سے؟ میں نے اسے شادی کے وقت روکا تھا کہ کس کو قبول کر رہی ہے... میرا مطلب ہے روکتا اگر..."

" بکواس مت کر۔" محسن گرم ہو گیا "سیدھی طرح بتا..."

" کیا بات ہے یار... تو بہت سیریس ہو رہا ہے۔" غالب بولا۔

" میں نے جو پوچھا ہے وہ بتا... تو نے بھی منع کیا تھا اسے؟"

" کس بات سے یار... تو جانتا ہے وہ انکل رضوی کے گھر میں تھی۔" غالب بولا۔

" انھوں نے بھی اُسے روکا تھا... کہ جولی کے لیے گردے کا عطیہ نہ دے؟"

" تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟" غالب اُٹھ بیٹھا "شہلا نے کب عطیہ دیا تھا جولی کے لیے؟"

" پھر کس نے دیا تھا؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

" ایک حافظ جی تھے۔ اخبار میں اپیل چھپی تھی تو ان کی بیٹی آ گئی تھی اور لوگ بھی بہت آئے تھے مگر گردہ اسی حافظ جی کی بیٹی کا لگا۔ انھوں نے کسی طرح بھی ایک پیسہ نہیں لیا... نہ معاوضہ، نہ نذرانہ نہ تحفہ..." غالب بولا۔

" غالب... کیا کہہ رہا ہے تو..." میں نے اس لہجے میں کہا کہ غالب پریشان ہو کے بیٹھ گیا۔ اس نے میری اور محسن کی صورت پر برستی ہوئی وحشت کو دیکھا۔

" اس میں... ایسی کون سی انوکھی بات ہے یارو؟" وہ بولا۔

" پھر کیا ہوا تھا شہلا کو..." محسن نے چلّا کے کہا "اس کی طبیعت اچانک اتنی خراب کیسے ہو گئی تھی۔ کون جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے... زمانہ کہ تو..."

" یار میں کیوں جھوٹ بولوں گا... اس کی طبیعت... خراب تو خیر ہوئی تھی مگر اس میں بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں... انکل رضوی سے بہتر اس کا خیال رکھنے والا کون تھا... اور پھر آنٹی تجربے کار ہیں۔ باقاعدہ میڈیکل چیک اپ کے لیے وہ ایک گائنک اسپیشلسٹ کے پاس جاتی تھی... آنٹی کی کوئی کزن وغیرہ ہے۔"

" پھر وہ مر کیسے گئی... کیسے مر گئی وہ..." محسن نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے دیوانہ وار جھنجوڑنے لگا۔

غالب نے محسن کو دھکا دیا "سکندر... یہ پاگل ہو رہا ہے، پیچ پچ... کہتا ہے شہلا مر گئی... کیوں کرتا ہے یہ ایسی باتیں۔"

" تو... تو کیا... وہ زندہ ہے۔" میرے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکلی اور جو آواز نکلی وہ مجھے اپنی نہیں لگی۔

" تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو... تمھاری صورت بتاتی ہے کہ تم سیریس ہو... کیا کسی نے تم سے کہا تھا کہ وہ مر گئی ہے؟" غالب نے باری باری مجھے اور محسن کو دیکھا جو اب بُت کی طرح ساکت بیٹھے تھے "میں سمجھ گیا... یہ ان خبیث لوگوں نے کہا ہو گا۔ تم کو اذیت دینے کے لیے... ہے نا یہی بات..."

میں نے احمقانہ اور مجرمانہ ندامت سے سر ہلایا۔

" اُلو کے پٹھو... مجھ سے اب تک پوچھا بھی نہیں..." غالب چلّانے لگا "انھوں نے کہا اور تم نے مان لیا...؟ میں قابلِ اعتبار نہیں تھا تمھارے لیے؟"

" یار... وہ دراصل..." میں نے کہا۔

" کیا دراصل...... اصل بات یہ ہے کہ دونوں کے دماغ میں بھوسا بھرا ہے اور کچھ نہیں... سارے زمانے کی باتیں کر لیں۔ صبح سے رات ہو گئی... کہاں کہاں جھک مار آئے۔ شہلا کا نام تک نہیں آیا کسی کی زبان پر۔" غالب ہم پر بری طرح برسنے لگا۔

" ہم اس بُری خبر پر اعتبار کر چکے تھے۔" میں نے کہا "ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس موضوع کو چھیڑتا... میں محسن کے خیال سے چُپ تھا۔ محسن ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کتنا صبر کرنے والا دل رکھتا ہے۔"

" کیا وہ... وہ زندہ ہے غالب... دیکھ جھوٹ مت بولنا مجھ سے... میں نے دل کو پتھر کر لیا تھا۔ سینے پر صبر کی چٹان رکھ لی تھی۔ مجھے ایسے جھوٹ کی ضرورت نہیں ہے جو کوئی مجھے تسلی دینے کے لیے بولے۔" محسن نے غالب کا بازو تھام لیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

" محسن! وہ بالکل ٹھیک ہے میرے یار... شہلا بالکل ٹھیک ہے... تو بتا میں کس کی قسم کھاؤں۔" غالب نے اس کے چہرے پر پیار سے تھپکی دی۔

" تو نے... تو نے خود دیکھا تھا؟ کب دیکھا تھا؟" محسن بولا۔

" یہاں آنے سے، دو دن پہلے..." غالب بولا "دیکھا تو نہیں تھا... فون پر بات ہوئی تھی... اس وقت نازو بھی تھی وہاں... اور میں نے جب نمبر ملایا تھا تو ریسیور آنٹی نے اُٹھایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ کھانے کی چور ہے... تم ہی سمجھاؤ اسے، کل رات دودھ کا آدھا گلاس پیا آدھا واش بیسن میں ڈال دیا۔ صبح مجھے پتا چل گیا... یہ کیا احمقانہ حرکت ہے... میاں تو ہمارے بھی گھر سے دُور رہتے تھے۔ چوروں ڈاکوؤں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے مگر ہم اپنا خیال رکھتے تھے۔ اس طرح کھانا پینا چھوڑنے سے اپنی صحت تو خراب ہو گی۔ پھر بچّے کی صحت کیسے اچھی ہو گی۔ میں نے کہا تھا کہ آنٹی آپ مجھے کیا کہہ رہی ہیں۔ ایس ایس پی صاحب سے کہیں۔ دو ہاتھ لگائیں... تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔ میں نے بھی اُسے ڈانٹا تھا کہ کھاؤ... اتنا کھاؤ کہ ہیضہ ہو جائے۔ بھوک کے مرنے سے کھا کھا کے مرنا بہتر ہے۔"

محسن ایک دم ہاتھوں میں مُنہ چھپا کے رونے لگا۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا "مت رو محسن... وہ سب جھوٹ تھا... ڈراؤنا خواب تھا..."

" میری شہلا زندہ ہے سکندر... میرا بچّہ بھی زندہ ہے۔" محسن اب پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جسے اس نے اپنے ذہن سے فراموش کر دیا تھا اور تصوّر میں ایک بھولی بسری یاد بنا لیا تھا وہ پھر حقیقت بن کے اس کی دنیا میں آ گئی تھی۔ یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ اس کا پاگل ہو جانا بھی ممکن تھا۔ میں نے اُسے رونے دیا۔ یہ جانے بغیر کہ میں خود بھی رو رہا ہوں، صرف غالب تھا جو بے وقوفوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور بڑبڑا رہا تھا "لاحول ولا قوۃ... اچھا عشق ہے یہ... خوب محبت ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ مر گئی اور دل نے مان لیا... سب ڈراما ہے... سچا عشق ایسا نہیں ہوتا... کوئی لاکھ کہتا مگر دل نہ مانتا... یہ تو محبت کا دعویٰ کرنے والے کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے... کل کوئی کہہ دے گا کہ وہ بھاگ گئی کسی کے ساتھ... یا اس نے نکاح ختم کرانے کا کیس کر دیا ہے... مان لو گے؟"

" بس یار... اب اور شرمندہ مت کر..." میں نے کہا۔ "اسے مبارکباد دے کہ اس کی محبت اسے پھر مل گئی۔"

" ہونہہ... محبت..." غالب بولا "یہ کہہ کہ یقین پھر مل گیا۔ بہت کچّا اور بودا... ناقابلِ اعتبار یقین ہے یہ بھی... پھر اُٹھ جائے گا کسی کی بات پر۔"

" مرزا جی، انھوں نے بات ہی اس طرح کی تھی۔" میں نے کہا "تم ہوتے تو تم بھی مان جاتے۔ انھوں نے کہا کہ جولی کا آپریشن کامیاب نہیں ہو سکا۔"

" ایسی کی تیسی ایسا کہنے والوں کی... جولی بالکل ٹھیک ہے... بالکل صحت مند ہے اور اس کا آپریشن ایک سو ایک فیصد کامیاب تھا۔" غالب نے کہا "ڈاکٹر بھی اس کی صحت یابی کی رفتار پر حیران تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے ریکوَر کیا۔ ایک دو ہفتے میں وہ چلنے پھرنے لگے گی۔ یہ سب انکل رضوی نے خود اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ صبح شام اسے دیکھنے جاتے تھے۔ سارے ڈاکٹر اٹین شن رہتے تھے۔ نرس ہر وقت موجود... اسپیشل وارڈ میں تو پہلے ہی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور وہ تو ایسا کیس تھا کہ نہ جانے کتنے رضاکار تھے۔ سب بضد تھے کہ ہم سے گردہ لے لو۔ اسے دیکھنے کے لیے تو نہ جانے کتنے لوگ ہر روز آتے تھے... اسکولوں کے بچّے اپنے ساتھ گلدستے لاتے تھے۔ چرچ کی طرف سے الگ گلدستے پہنچتے تھے۔ ٹیلی فون تو سارا دن آتے تھے اخبارات میں اس کی تصاویر بھی چھپتی رہی تھیں۔ سب اپنے یار تھے جو برابر کام کر رہے تھے۔"

" آج مجھے بہت عرصے بعد... نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد... اتنی بڑی خوشی ملی ہے۔" میں نے کہا "اتنی بڑی کہ میرے دل میں اس کے لیے جگہ تنگ لگتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سرکاری کوارٹر رکھنے والے چپراسی کو قارون کا خزانہ مل جائے، جس کی کُنجیاں ہی سات اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔"

" اس کا مطلب تو یہ ہوا سکندر..." محسن نے بالآخر خود کو سنبھال کے اپنے آنسو خشک کیے "کہ کیتھرین بھی ٹھیک ہو گی۔ ہم سے تو انھوں نے کہا تھا کہ اسے بیٹی کے مرنے کی خبر دی گئی تھی تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کی حالت بہت تشویشناک بتائی تھی۔"

" کیتھرین کی بات اور ہے۔ بیٹی کی موت کی خبر سے اُسے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کچھ بھی ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرا دل اب بھی نہیں مانتا۔" محسن نے کہا۔

"آپ کا دل انتہائی فضول... کمزور اور جاہل ہے۔" غالب نے کہا۔ "اب اس پر اعتبار کیوں کرتے ہو۔"

"وہ ہمت والی عورت تھی یار۔" محسن بولا۔ "صدمہ تو ہوا ہوگا اُسے مگر اتنا نہیں۔ جب شہلا کی اور جولی کی بات غلط ہوگئی تو یہ بات بھی غلط ہوگی کہ وہ بے ہوش پڑی تھی... اگر وہ بے ہوش تھی۔ اور اس کی حالت اتنی ہی خراب تھی تو وہ جاتے وقت اُسے کیوں لے گئے؟"

"ماشا اللہ، بڑے منطقی دلائل سوجھ رہے ہیں اب۔" غالب نے طنز کیا۔

"ظاہر ہے یار... جب دماغ کو غلط لائن پر ڈال دیا گیا تھا تو سوچ کیسے صحیح رہتی۔" محسن نے کہا۔ "تو بہت بول رہا ہے بیٹے... وہاں ہماری جگہ ہوتا تو ہم پوچھتے... سارا ردیف قافیہ تنگ ہو جاتا۔"

"ہاں یار... اب ذرا فرصت ہے... بتاؤ تمھارے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا۔" غالب بولا۔ "ویسا ہی جیسا بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں... یا ویسا، جو اکثر بادشاہوں کے ساتھ نہیں کرتے؟"

"انھوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہم ان کے ساتھ کرتے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں ہوتے۔" میں نے کہا اور پھر غالب کو مختصراً وہ سب بتانے لگا جو ہم پر بیتی تھی۔ غالب نے درمیان میں کئی بار ان کو گالیاں دیں اور اُبلتا رہا کہ قسم فلاں کی۔ فلاں کے ساتھ یہ نہ کیا تو غالب نام نہیں۔

رات کے آخری پہر میں جب ہمارے سگریٹ بھی ختم ہو گئے اور ہماری باتیں بھی ختم ہوگئیں تو ہم نے سونے کی ناکام کوشش کی ہر صرف غالب اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ میں اور محسن صبح کا اجالا پھیلنے تک شہلا، رابعہ اور جولی کی باتیں کرتے رہے۔ محسن اب بہت خوش تھا۔ خود میں محسوس کرتا تھا کہ میری دنیا میں امید کا نیا تابناک سورج طلوع ہوا ہے جس نے مایوسی کے اندھیرے کو یوں دھو ڈالا ہے جیسے بارش گرد آلود آسمان کو دھو ڈالتی ہے۔

صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تو مجھے خیال آیا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے محسن سے کہا اور محسن نے اتفاق کیا۔ ہم دونوں کنوئیں تک گئے۔ محسن نے اپنی ایس پی کی میلی وردی اتاری اور میں نے رہٹ چلایا۔ اسی لائف بوائے صابن سے محسن نے وردی کو اچھی طرح دھو کے صاف کیا۔ اتنی دیر میں اجالا کافی پھیل گیا تھا چنانچہ ہم نے باری باری غسل کیا اور لوٹ آئے۔ جب ہم چائے بنانے کی تیاری کر رہے تھے تو غالب اٹھا۔ مجھے چولھا جلاتے اور محسن کو دُھلے ہوئے کپڑے پھیلاتے دیکھ کر وہ بہت ہنسا۔

"کیا وقت آگیا ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "جو سکندرِ اعظم بنے پھرتے تھے وہ چولھا پھونک رہے ہیں۔ تقدیر نے تن کے کپڑے تک اتروا لیے ہیں۔"

"یہ نہیں دیکھتا شاعر کی دُم کہ تقدیر نے ایس پی کی وردی بھی پہنا دی ہے۔" محسن نے شرما کے کہا۔

"مت سن اس کی شاعری۔" میں نے محسن سے کہا۔ "یہاں سب اپنے ہیں اور اپنوں میں شرم کیسی۔"

غالب اس کے بعد کنوئیں پر گیا اور میں نے غسل میں اس کی مدد کی۔ جب ہم واپس آئے تو محسن چائے بنا چکا تھا۔ ہم نے دہکتے ہوئے کوئلے اسی پتیلی میں ڈالے جس میں چائے بنائی گئی تھی اور ایس پی کی وردی کو فرش پر بچھا کے اور ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے پتیلی گھس کر استری کی۔ پتیلی کا پیندا اتنا گرم ہوگیا تھا کہ نتائج سو فیصد نہیں تو ستر فیصد ہماری توقع کے مطابق نکلے۔ دھلنے اور استری ہونے کے بعد وردی بالکل ایسی ہوگئی تھی کہ دورے پر جانے والے ایس پی کے شایانِ شان ہو۔ ایک میلی کچیلی اور شکن آلود وردی کا امپریشن اتنا اچھا نہ پڑتا۔ اس ایجاد شدہ، استری سے وردی خشک بھی ہوگئی تھی ورنہ ہمیں دھوپ کے نکلنے کا انتظار کرنا پڑتا اور اُسے دو تین گھنٹے تک پھیلائے رکھنا پڑتا۔ سراج کی جیب میں سے ایک کنگھی بھی نکلی تھی جو اس وقت کام آئی۔ میرے اور غالب کے کپڑے اتنے صاف نہیں تھے لیکن ہمارا کردار بھی اتنا اہم نہیں تھا۔ میں ایس پی صاحب کا پی اے تھا، اور غالب ان کا چپراسی۔

نو بجے کے قریب ہم اس جلے ہوئے گھر سے اپنے قیدی کو لے کر روانہ ہوئے۔ سراج اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں مگر وہ ہمیں روک نہیں سکتا تھا۔ ہم نے اس کا منہ پھر بند کر دیا تھا تاکہ وہ بول ہی نہ سکے۔ گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی ہمیں متعدد افراد نے دیکھا جو ہل لے کر کھیتوں کی طرف جا رہے تھے اور بڑے ادب سے سلام کیا۔ فضلو کی کارکردگی کا اندازہ میں نے گزشتہ شب ہی کر لیا تھا۔ اس نے ایس پی کی آمد کی خبر متعلقہ افراد تک پہنچا دی تھی اور اب تک غیر متعلقہ افراد کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس کا کتنا بڑا افسر گاؤں میں آنے والا ہے۔

پولیس چوکی تلاش کرنے میں ہمیں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ دو کمروں پر مشتمل پکی عمارت تھی جو انسپکشن کے لیے تیار تھی۔ کانے حوالدار نے راتوں رات اس پر سفیدی پھیری تھی۔ ظاہر ہے اس نے مقامی آبادی کو بیگار میں پکڑا ہوگا۔ باہر بھی چونے کی سفید لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور اندر بھی ہر چیز چمک رہی تھی۔ یہ کسی تھانے تک ہی محدود نہیں، ہر دفتر اور ادارے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی بڑا افسر یا وزیر معائنے کے لیے تشریف لاتا ہے تو تمام معاملات درست ملتے ہیں اور حالات مثالی ہو جاتے ہیں۔ عملہ مستعد، با اخلاق اور فرض شناس نظر آتا ہے۔ ہر کام قاعدے ضابطے کے مطابق۔ صفائی کا معیار بہترین۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عام دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اگر سارا سال کارکردگی کا ایسا ہی معیار رہے تو پبلک کو کسی سے شکایت نہ رہے اور خواہش کرنے کو کچھ نہ رہے مگر یہ ایک رسم ہے جو اسی طرح سب لوگ نباہتے رہیں۔

ہماری تشریف آوری کی خبر ہم سے بہت پہلے پہنچ گئی تھی۔ غالباً کانے تھانیدار نے گاؤں کے چاروں طرف اپنے مخبر کھڑے کر دیے تھے کہ ایس پی صاحب جدھر سے بھی نمودار ہوں اُسے دوڑ کر اطلاع دی جائے۔ وہ بہ نفسِ نفیس ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کی وردی سے جوتے تک سب بے داغ تھے اور اپنی ایک آنکھ پر اس نے سیاہ چشمے کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ اُس نے چلّا کر ہمیں سیلوٹ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں سپاہی اٹین شن ہوئے اور انھوں نے بھی ایڑیاں بجا کے سیلوٹ جھاڑا۔ یہ گویا گارڈ آف آنر تھا۔ کانا حوالدار بظاہر بہت پُر اعتماد نظر آ رہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وردی میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوں گی۔ کسی ایس پی کا ایک چھوٹے سے گاؤں کی پولیس چوکی پر اچانک چھاپا مارنا قیامت کے آنے سے کم نہیں ہوتا۔

محسن نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ سر ہلا کے سیلوٹ کا جواب دیا اور کہا۔ "دیکھو بھئی... ہم نے یہ خطرناک مجرم پکڑا ہے... یہ بہت بڑا دھوکے باز ہے... اور جعلساز ہے..."

"شکل سے ہی ایک نمبر فراڈ لگ رہا ہے جنابِ عالی۔" کانے حوالدار نے کہا اور اس کے ماتحت عملے نے تائید میں سر ہلایا۔

محسن اس کرسی پر بیٹھ گیا جو واحد میز کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ "اس کو حوالات میں ڈالو۔" اس نے دوسرے کمرے کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جو باقاعدہ حوالات تھا۔ اس میں لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا جس میں قفل بھی پڑا ہوا تھا۔

کانے حوالدار نے گرج کر اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔ "اوئے سونے... اس بدمعاش کو ڈک دے... تفتیش کرنا ہے جنابِ عالی؟"

اس کا مطلب واضح تھا۔ تفتیش کے نام پر پولیس صرف تشدد کرتی ہے۔ کانا حوالدار افسر کو خوش کرنے اور اپنی فرض شناسی ثابت کرنے کے لیے فوراً تیرہ نمبر چھتّر کا استعمال شروع کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی نہیں..." محسن نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اور اپنی کیپ اتار کے میز پر ڈال دی۔ "بس اس کا مُنہ بند رکھنا... مجھے شور اچھا نہیں لگتا۔"

سراج کا مُنہ تو پہلے ہی بند تھا۔ جب اسے نہایت ذلت کے ساتھ دھکّے دے کر حوالات میں پھینکا گیا تو مجھے دلی مسرّت حاصل ہوئی۔ وہ اس تھانے کا حاکم تھا مگر اس کے ماتحت اسی کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کر رہے تھے۔ اندر ہی اندر اس کا خون کھول رہا ہوگا لیکن وہ بے بس تھا۔

"بہت کمینہ ہے یہ..." محسن نے کہا۔ "نہ جانے کتنے لوگوں کو لوٹ چکا ہے۔ کہیں تحصیلدار بن کے جاتا ہے۔ کہیں نہر کے محکمے کا افسر بن جاتا ہے۔ ایک گاؤں کے لوگوں سے دس ہزار وصول کر لیے تھے کہ نہر کا پانی بند ہی نہیں ہوگا... آج کل ایس پی بنا پھر رہا تھا۔"

"ایس پی؟" کانا حوالدار اُچھلا۔ "اس کی یہ مجال..." وہ کسی مجبوری کے باعث جیم کی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ "زوتے مار مار کے..."

"بھئی، دیکھو..." محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ ہمارے ماتحت ہیں... ہمارے ساتھ خوار ہو رہے تھے... ارے بھئی، تم کھڑے کیوں ہو۔" محسن نے مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹھ جاؤ نا... تم بھی دروازے کے باہر بیٹھو... میری اجازت کے بغیر کسی کو اندر مت آنے دینا... اور مجمع مت لگانا..."

"جی سرکار..." غالب بولا اور باہر چلا گیا جہاں اس کو بھی تشریف رکھنے کے لیے ایک کرسی دی گئی۔ میں بھی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا جو میز کے دائیں جانب پڑی تھی۔ تیسری کرسی بائیں طرف تھی۔ سامنے کوئی کرسی نہیں رکھی گئی تھی۔ یہ سب کرسیاں کسی کے گھر سے منگوائی گئی تھیں کیونکہ اس قسم کا فرنیچر تو شہر کے تھانوں میں بھی نظر نہیں آتا... ایک بینچ کمرے کی دیوار کے ساتھ ڈال دی گئی تھی جو ملاقاتیوں کے لیے تھی۔ ان کو افسرِ اعلیٰ کے بہت قریب آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان یہ فرق بھی نہ رہے تو خطرناک قسم کی اسلامی مساوات آجاتی ہے اور جمہوریت آجاتی ہے جو حاکموں کو حاکم نہیں رہنے دیتی۔ چنانچہ جو نظام گوری چمڑی والے انگریز نے کالی رعایا کو خود سے دُور رکھنے کے لیے قائم کیا تھا، وہ اپنی قابلِ مذمت روایات کے ساتھ آزاد نوکر شاہی نے اپنا لیا تھا۔

"ہاں بھئی... کیسا چل رہا ہے یہاں کا نظام؟" محسن نے سر کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ آنکھیں ملیں اور کچھ اطمینان سے۔ بیٹھ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گیا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے۔

"نظام بہترین چل رہا ہے زناب... بہترین۔" کانسٹیبل حوالدار نے کہا۔ اور اپنے ایک نائب کو کچھ اشارہ کیا جو میں نے دیکھا۔ ماتحت فوراً دبے پاؤں نکل گیا۔

"وارداتوں کا کیا حال ہے؟" محسن نے کہا۔

"اللہ کی مہربانی سے سب ٹھیک ہے... چوری ڈکیتی کچھ نہیں... بس کبھی کبھی آپس کے چھوٹے موٹے زگڑے (جھگڑے) ہوزاتے ہیں... تو زناب عالی وہ میں زو تے... میرا مطلب ہے صلح صفائی کرا دیتا ہوں۔" حوالدار نے مفصّل رپورٹ دینا شروع کی۔ "زگڑے بھی وہی ہوتے ہیں۔ کسی کے ڈنگر کسی کے کھیت میں چلے گئے... آخر زانور ہے زناب عالی... گھروں میں لڑائی ہوزاتی ہے... جہاں دو برتن ہوتے ہیں وہ ٹکراتے ہیں تو بزتے ہیں... پرچے کاٹنے سے کیا فائدہ۔"

"یہاں گنجے بہت نظر آئے مجھے۔" محسن نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

حوالدار پر بجلی گر پڑی۔ "زی..." اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔

"گنجے... بہت سے لوگوں کی ٹنڈ نظر آئی مجھے..." محسن نے کہا۔

"وہ... دراصل... گرمی بہت پڑتی ہے تو زناب یہاں کے لوگ سر منڈوا دیتے ہیں تاکہ سر کو ٹھنڈی ہوا لگے مغز ٹھنڈا رہے۔"

"مجھے رپورٹ ملی تھی کہ ٹنڈ تم کراتے ہو۔" محسن نے اسی لہجے میں حوالدار کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

حوالدار پر اب آسمان ٹوٹ پڑا۔ "میں... یہ آپ کیا فرماتے ہیں، زناب عالی... میری کیا مزال... کسی نے زوٹی رپورٹ دی ہے... بہت سے کمینے لوگ میرے خلاف ہیں... میں انصاف سے کام لیتا ہوں اس لیے... میرا تو یہی فرض ہے... کسی میں فرق نہ رکھوں... یہاں پٹواری اور نمبوار... زمیندار... یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کا ساتھ دوں... وہ زس کو کہیں زوتے ماروں غریب مزارع۔"

"یہ تم سے نمبوار اور پٹواری کہتے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "یعنی مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی بے گناہ کو ان کے کہنے پر تھانے بلا کے جوتے مارے جائیں؟ میں ملنا چاہتا ہوں ان سے... اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ پولیس کے کام میں دخل دیتے ہیں۔ میرے ایک ماتحت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"یہ بات... یہ بات نہیں زناب عالی۔" حوالدار کی حالت اس وقت کے خیال سے غیر ہونے لگی جب ایس پی یہ بات نمبوار اور پٹواری کے سامنے کہے گا کہ تم میرے ماتحت سے غلط کام کراتے ہو۔ "آپ تو افسر ہیں... کبھی کبھی آتے ہیں... یہاں ہم دن رات ان کے ساتھ ہیں... ان کی نظر دیکھتے ہیں... وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔"

"ہاں... یہ تو ہے... دریا میں رہ کے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جاسکتا... لیکن میرے پاس کچھ درخواستیں آئی تھیں۔" محسن بولا۔

"کس کی زناب..." حوالدار کا رنگ پھر اڑ گیا۔

"میں بلاؤں گا ان سب کو آج۔" محسن نے کہا۔

"ایک تو سردہ فضل الرحمٰن عرف فضلو کا کیس ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی... مجھے یاد ہے... ایک عورت کے بارے میں بہت سی شکایات ملی تھیں۔ کوئی حشمت اللہ ہے یہاں۔ اس کی بیوی کی بہن ہے۔" محسن نے افسرانہ شانِ بے نیازی سے کہا۔

"وہ... گلابو..." حوالدار بولا۔ "بڑی حرافہ ہے... زی... مگر آپ کچھ کھا پی لیں پہلے۔"

"ہاں بھئی... چائے اگر مل جائے تو..." محسن نے دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کے کہا اور جیب میں سے دس کا نوٹ نکالا۔ "یہ ایک پیکٹ تھری کاسل کا۔"

"کس چیز کا زناب عالی؟" حوالدار دم بخود رہ گیا۔ یہ نام اس نے پہلی بار سنا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ افسر بسکٹوں کا پیکٹ مانگ رہا ہے یا بندوق کی گولیوں کا۔

"سگریٹ چاہئیں... میرے سگریٹ رات کو ختم ہو گئے تھے۔" محسن بولا۔

"تو حکم کریں زناب..." وہ ایک الماری کی طرف لپکا۔ اس میں سے کیپسٹن کے سگریٹوں کا پورا کارٹن نکالا جو اس نے یقیناً شہر سے بطورِ خاص منگوایا ہوگا یا کسی نمبردار قسم کی چیز نے تحفے میں بھیجا ہوگا۔

"تھانے میں سگریٹ؟" محسن نے ناگواری سے کہا۔

"وہ سر... آپ کے لیے نمبردار صاحب نے خاص طور پر بھیجے تھے... اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آج رات کا کھانا..."

"شٹ اپ..." محسن نے کہا۔ "یہ لو دس روپے... اس میں سے دس پیکٹ دے دو... بلکہ یہ دس روپے اور رکھو... کارٹن میرے حوالے کرو۔"

"زناب عالی... وہ پیسے نہیں لیں گے..." حوالدار نے مری مری آواز میں کہا۔

"مگر تم دو گے... ابھی اپنے پاس رکھو... جب میں انھیں بلاؤں تو میرے سامنے دینا۔ میں دیکھتا ہوں، وہ کیسے انکار کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور ہاں، شام کے کھانے کے لیے ان سے منع کر دو۔ میں کسی کے گھر دعوت میں نہیں جاتا۔ کوئی تحفہ قبول نہیں کرتا اور ہر چیز کی نقد قیمت ادا کرتا ہوں۔ جو افسر پہلے آئے ہوں گے، ان کی بات اور تھی۔ مجھے ان جیسا نہ سمجھا جائے۔ یہ بات ان سب کو معلوم ہوجانا چاہیے جو مجھ سے ملنے آئیں۔ اگر کسی نے مجھے کسی بھی بہانے کچھ پیش کیا... تو تم معطل..."

"زی... زی... زناب عالی..." حوالدار کا خون خشک ہونے لگا مگر خیریت گزری کہ اسی وقت چائے آگئی۔ حسبِ توقع چائے کے ساتھ بہت کچھ تھا۔ میں نے حوالدار کو آنکھ سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"جب افسر لوگ چائے پیتے ہیں تو کسی کی موجودگی پسند نہیں کرتے، تم ہمارے لیے چائے ناشتا یہیں لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا زناب... غلطی ہوگئی تھی مجھ سے۔" وہ اندر جانے لگا۔

"بے وقوف... ابھی نہیں... پہلے صاحب کو فارغ ہونے دو۔" میں نے کہا۔

میری اس کوشش کا فائدہ یہ ہوا کہ محسن نے اطمینان سے پیٹ بھر کے کھایا۔ دیہات کے خالص مکھن کا بھرا ہوا ڈونگا تھا۔ پراٹھے تھے، حلوا تھا۔ اُبلے ہوئے انڈے تھے اور چائے تھی۔ ڈراما صحیح پیش کرنے کے لیے ہمیں آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ مگر اس کے بعد کھانے کا سامان باہر آیا تو میں نے اور غالب نے سب کے سامنے ڈٹ کر کھایا۔ ہم ماتحت اور 'نچلے' لوگ تھے چنانچہ ہمارا اپنے افسر کی طرح ہونا ضروری نہیں تھا۔ ہمیں افسرِ اعلیٰ کی طرف سے ایک ایک پیکٹ سگریٹ کا بھی مرحمت فرمایا گیا۔ ہم نے سگریٹ بھی باہر پی۔ افسر کے سامنے یہ حرکت بھی گستاخی سمجھی جاتی۔

اصل ڈراما ایک گھنٹے کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت تک گاؤں میں پولیس کے افسرِ اعلیٰ کی آمد کی خبر پھیل چکی تھی اور کچھ لوگ تھانے کے آس پاس بھی پہنچے تھے مگر ان کو کانسٹیبل حوالدار نے دبکا لگا کے بھگا دیا۔ اُسے اندیشہ تھا کہ یہ شرپسند اس کا کیریر خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان میں بیشتر گنجے تھے اور سر پر چیلنج دینے کے انداز میں ہاتھ پھیر رہے تھے۔ گاؤں کے وی آئی پی بھی شرفِ نیاز حاصل کرنے کا پیغام ارسال کر چکے تھے لیکن ان کو انتظار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"حوالدار..." محسن نے ناشتے کے بعد ایک دم اپنا رویہ بدلا اور ایس پی بن گیا۔ "اس لڑکے فضل الرحمٰن کو حاضر کرو۔"

حوالدار نے کہا۔ "زی زناب۔" اور سونا خان کو سمن دے کر روانہ کردیا۔

"کل یہاں کوئی چور پکڑا گیا تھا؟" محسن نے کہا۔

"چور... نہیں... کوئی چور نہیں پکڑا گیا یہاں تو۔"

"بکومت۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "کوئی پلاسٹک کے کھلونے بیچنے والا تھا... گلیوں میں پھرتا تھا اور چوریاں کرتا تھا۔"

"وہ... زی ہاں... مگر وہ بے قصور تھا۔"

"چنانچہ تم نے چھوڑ دیا۔ تفتیش بھی ایک دن میں مکمل ہوگئی، چالان بھی نہیں کاٹا، تم نے لیکن فیصلہ کر دیا۔ کیا تم نے یہاں عدالت کے اختیارات بھی سنبھال رکھے ہیں... بولو... جواب دو۔"

"زناب... زنابِ عالی... اس کے پاس..." حوالدار کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"اس کے بارے میں چشم دید گواہوں کا بیان کچھ اور ہے۔" محسن نے کہا۔

"کون... چشم دید گواہ... کیا بیان ہے سر...؟"

"یہ کہ تم نے اس کے گلے میں رسّی باندھ رکھی تھی اور اُسے بیل کی طرح گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے۔" محسن نے کہا۔ "اس کی ریڑھی پر مالِ مسروقہ تھا جس میں ایک سلائی مشین... ایک گھڑی اور ایک تھرماس تھے۔"

"یہ... یہ غلط ہے زنابِ عالی۔" حوالدار نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

محسن نے میز پر ہاتھ مارا۔ "پی اے..." اُس نے مجھے آواز دی۔ "اندر آؤ۔"

میں اندر جا کے اٹین شن ہوگیا۔

"تم نے کل ایک چور کو حوالدار کی تحویل میں دیکھا تھا، حوالدار کو بتاؤ کہ اس کے پاس کیا تھا۔" محسن نے کہا۔

میں نے وہی بتایا جو حقیقت پر مبنی تھا۔ سو روپے... میں تھرماس کی خرید و فروخت کا معاملہ حوالدار کے علم میں بھی نہیں تھا، تاہم وہ کسی الزام کی نفی کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی۔

"حوالدار... تمھاری خاموشی اقرارِ جرم کے مترادف ہے۔" محسن نے سخت لہجے میں کہا۔ "یا تو تم نے کسی بے گناہ کو پکڑا تھا یا پھر وہ چور تھا تو تم نے رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا۔ مالِ مسروقہ کو ضبط کر کے بیچا۔ دونوں جرم بہت سنگین ہیں... نہ تم کو مال ضبط کرنے کا اختیار تھا اور نہ بیچنے کا۔ تم کو مشیر نامہ بنانا چاہیے تھا۔ وہ چور کہاں ہے۔ اگر وہ بھاگ گیا ہے تو میں تم کو معطل کرسکتا ہوں۔ ابھی... اسی وقت..."

"زنابِ عالی۔" حوالدار نے ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانا شروع کیا۔ "غلطی ہوگئی... پہلی بار سمجھ کے معاف کردیں... وہ لڑکا ایک

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

غریب مزارع کا ہے... باپ بہت شریف اور فرماں بردار تھا۔ اسے بھی گمراہ کیا۔"

"گویا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے باپ کو مزارع کی حیثیت سے کام نہیں کرنے دیا۔ بڑھاپے میں ذلت اُٹھانے سے روک دیا اور خود بھی غلامی قبول نہیں کی... آزادی سے روزی کمانے کا سوچا... کس کا مزارع تھا وہ؟" محسن بولا۔

"نمبردار صاحب کا۔" حوالدار بولا۔

"ٹھیک ہے... جب نمبردار آئے تو اس لڑکے کو بھی میرے سامنے پیش کرنا، اس کی رپورٹ کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"وہ... وہ تو زناب... انھی کے احاطے میں کھڑی ہوئی تھی... کل ہی اُسے آگ لگا دی گئی تھی۔" حوالدار بولا۔

"اوہ مائی گاڈ... یہاں تو لاقانونیت کا راج ہے۔ غنڈہ گردی ہے اور تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔" محسن نے برہمی سے کہا۔

"سر... وہ فضلو آگیا ہے۔" ایک سپاہی نے سیلیوٹ مار کے کہا۔

"ٹھیک ہے... اُسے اندر بھیج دو... باقی سب باہر جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "تم ٹھہرو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

فضلو ڈرتا ہوا اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا حوصلہ بحال ہوا۔ وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"بہلیں سب معلوم ہو گیا فضلو۔" محسن نے کہا۔ "تمھارا وہ چاچا... کیا نام ہے اس کا؟"

"حشمت اللہ عرف ہاشو سر۔" میں نے مستعد پی اے کی طرح کہا۔

"ہاں... وہ بھی آیا ہے؟" محسن نے پوچھا۔

فضلو نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آیا ہے سر... مگر اس نے راستے میں مجھے دو تھپڑ مارے اور کہا کہ ایس پی تو چلا جائے گا۔ دیکھ بعد میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں میں... اور ٹنڈ کرانے کی دھمکی دی ہے۔"

"اُسے بلاؤ اندر۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار کو بھی بلاؤ۔"

حشمت اللہ عرف ہاشو صورت سے کمینہ نظر آنے والا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ غالباً اسے حوالدار نے بریف کر دیا تھا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر اندر آیا اور ایک دم شروع ہو گیا۔ "مائی باپ... یہ لڑکا فضلو تو سارے گاؤں کے لیے مصیبت ہے... ہم سب پریشان ہیں اس سے... ایک نمبر کا جھوٹا ہے..."

محسن اُٹھ کر ٹہلتا ہوا اس کے قریب گیا تو وہ کانپنے لگا اور اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ محسن کا زنّاٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو وہ نیچے گر گیا۔ میں نے فضلو کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ میں نے اُسے آنکھ بھی ماری کہ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ہاشو نے اب محسن کے پیر پکڑ لیے تھے مگر اس کا اشارہ بھی حوالدار نے کیا تھا۔

"سیدھا کھڑا کرو اسے حوالدار۔" محسن نے گرج کر کہا۔

حوالدار نے اُسے سر کے بال پکڑ کے کھینچا اور اٹین شن کر دیا۔

"ہاشو! میں تم کو اسی جگہ پھانسی دے دوں تو مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں... گولی مار سکتا ہوں میں تم کو۔" محسن نے اچانک ریوالور نکالا اور پھر رکھ لیا۔ "تم ایک نمبر کے جھوٹے اور ناقابلِ اعتبار آدمی ہو۔ میں لمبی بات نہیں کرتا... میرا حکم سُن لو... اور حوالدار... میں ایک ہفتے بعد کسی کو بھیجوں گا... یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میرے احکامات پر عمل ہوا یا نہیں۔"

"بالکل... بالکل ہو گا زناب عالی... کیسے نہیں ہو گا۔" حوالدار پر کپکپی طاری تھی لیکن وہ اپنی خودی کو رعایا کے سامنے بلند رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"فضلو کو کل ہی پڑھنے کے لیے قصور بھیج دو۔" محسن نے کہا۔

"سُنا کہ نہیں۔" حوالدار نے ہاشو کی گدی پہ ایک زبردست جھانپڑا مارا۔

"کل کیوں مائی باپ... آج ہی بھیج دوں گا۔" ہاشو چلانے لگا۔

"اپنی آواز بند رکھو۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تم اس کی شادی کی بالکل فکر نہیں کرو گے۔ وہ جہاں چاہے گا اور جب چاہے گا اپنی مرضی کے مطابق شادی کرے گا۔ کوئی زبردستی نہیں چلے گی۔ میں نے اس کو اپنا پتا اور اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیا ہے کہ کوئی اُسے پریشان کرے تو مجھ سے شکایت کرے پھر میں ایک ایک کی کھال میں بھس بھر دوں گا۔"

"جیسا حکم مائی باپ..." ہاشو لرزتے ہوئے بولا۔

"تم نے یہاں آتے ہوئے اُسے مارا تھا۔" محسن نے کہا۔ "معافی مانگو اس سے۔"

ہاشو کی سانس رُک گئی اور آنکھیں پتھرانے لگیں۔ افسر سے مار کھانا اتنی بڑی ذلت نہیں تھی جتنی کہ چھوٹے سے معافی مانگنا۔ محسن نے اس کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے دوسرا تھپڑ رسید کیا... اور اپنا حکم دُہرایا۔

"مجھے... مجھے معاف... کر دے... فضلو..." ہاشو نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"فضلو نہیں... بیٹا کہو... آئندہ ہمیشہ اسے بیٹا کہو گے پھر کبھی تمھارے غلط رویّے کی شکایت ملی تو شہر منگوا لوں گا۔" محسن نے کہا۔

"معاف کر دے مجھے بیٹا۔" ہاشو بولا۔

"اب دفع ہو جاؤ..." محسن نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد محسن نے فضلو سے ہاتھ ملایا اور اُسے پانچ سو روپے دیے۔

"یہ تمھاری تعلیمی ضروریات کے لیے... جاؤ..." محسن نے کہا۔ فضلو کی آنکھوں میں جذبۂ احسان مندی سے آنسو آنے لگے تھے۔

"اللہ آپ کو ترقی دے... عزت دے سر..." وہ بولا اور باہر نکل گیا۔

اگلا کیس بھی خاصا دلچسپ تماشا رہا۔ پہلے اس بڑے دکاندار کے بیٹے کو طلب کیا گیا جو گلابو کے چکر میں پڑ کر بیوی بچوں کو بھول رہا تھا۔ وہ تیس سال کا کلین شیو اور لمبی لمبی مونچھوں والا جوان تھا اور گاؤں میں یقیناً بدمعاشی سے سر اٹھا کے چلتا ہو گا۔ یہاں بھی وہ کچھ اکڑ میں تھا کیونکہ ابھی تک اس کو اپنے خلاف الزامات کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔

"کیسے یاد فرمایا ہمیں حضور نے۔" وہ بولا۔ اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

محسن نے اُسے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نظر جما کے دیکھا۔ "حوالدار... اسے سیدھا کھڑا ہونا سکھاؤ۔" اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

حوالدار اب اپنی عزت و نوکری بچانے کے لیے ایس پی صاحب کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک مُکا مارا۔ "ہاتھ پیچھے کر سور دے پتّر... ایسے کھڑا ہے جیسے تو ہمارا افسر ہے... ابھی ساری بدمعاشی بھی نکل جائے گی... بڑے بڑوں کی پھونک نکل جاتی ہے یہاں..."

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا... اُس نے ظاہر کیا کہ مُکّے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ایسے مُکّوں کی پروا بھی نہیں کرتا۔

"اچھا تو یہ بدمعاش ہے؟" محسن نے کہا۔ "حوالدار... یہاں کوئی باربر ہے... میرا مطلب ہے حجام... نائی..."

"ہے زناب عالی... آپ نے شیو بنوانا ہے؟"

"نہیں... اس بدمعاش کی ٹنڈ کراؤ پہلے۔" محسن بولا۔ حوالدار کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ افسر نے وہی کیا تھا جو وہ خود کرتا تھا۔ اُسے یقین آنے لگا تھا کہ اب اس کا لوگوں کی ٹنڈ کرانے کا جُرم سنگین شمار نہیں ہو گا۔ ملزم نے کچھ شور مچایا کہ اس کا جرم بتایا جائے مگر اس کی کسی نے نہیں سُنی... حوالدار نے اُسے بزورِ بازو مرغا بنایا۔ خود چھتّر لے کر اس کے سر پہ کھڑا رہا اور اس کے ماتحت سونا خان نے بقلم خود ملزم کو مونڈ دیا۔ اس کام میں وہ خاصا تجربہ رکھتا تھا اور حوالدار صاحب کے حکم پر شاید گاؤں کی نصف باغی آبادی کے سر صاف کر چکا تھا۔ گھنے لمبے بالوں کے نیچے سے کدّو جیسا سر نکال لینے کے بعد سونا خان نے صفائی کے خیال سے ایک ایک بال چُنا اور فرش پہ کپڑا مارا۔

"اس کی مونچھیں کیوں چھوڑ دیں؟" محسن نے کہا۔

ملزم کی ساری اکڑ فوں ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑنا اور گڑگڑانا شروع کیا لیکن اس کی ایک نہ سُنی گئی۔ سونا خان نے اس کی پلی ہوئی مونچھیں ایک منٹ میں غائب کر دیں۔ سر مُنڈوانے کے مقابلے میں کسی جوان کے لیے مونچھیں مُنڈوانا بہت زیادہ بے عزتی اور بے غیرتی کے مظاہرے کی بات تھی۔ شاید اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا مُنہ کالا کیا جائے گا اور پھر اسے شاہی سواری پر یعنی کمہار کے گدھے پر دُم کی جانب مُنہ کر کے بٹھایا جائے گا اور گاؤں کی گلیوں میں پھرایا جائے گا۔

"ہاں بھئی... اب بتاؤ تم کیا کرتے ہو... بدمعاشی کے علاوہ؟" محسن نے ایک اور سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

"حضور، ہم شریف آدمی ہیں... غلط کہا ہے کسی نے..."

"تمھاری بیوی ہے... بچے ہیں؟" محسن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہیں حضورِ والا... چار بچے ہیں..."

"اور اس کے باوجود بدمعاشی کرتے ہو؟" محسن نے کڑک کر کہا۔ "کیا لگتی ہے گلابو تمھاری... کیوں ملتے ہو اس سے..."

"میں... خدا کی قسم حضور... میں کسی گلابو کو نہیں جانتا... یہ جھوٹا الزام ہے مجھ پہ..." وہ چلّانے لگا۔

"چلّاؤ مت۔" محسن نے میز پر مُکا مارا۔ "حوالدار... گلابو کو بلاؤ... ہاشو کی سالی کو۔"

اس دوسرے جملے سے حوالدار پر اور گلابو کے عاشق پہ واضح ہوا کہ ایس پی صاحب سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ ایک آدمی اسی وقت گلابو کو لانے کے لیے بھیج دیا گیا۔

"گلابو کے آنے تک تم اُدھر کان پکڑو۔" محسن نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ایک شادی شدہ شخص کو راہِ راست پہ لانے اور ایک فاحشہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے مؤثر کارروائی ضروری تھی۔ حوالدار نے اُسے گردن سے دبوچا اور کونے میں پھینک دیا جہاں وہ رضاکارانہ طور پر مُرغا بن گیا۔

"حوالدار... اس گاؤں کی مشرقی سمت میں آخری مکان کس کا ہے؟" محسن نے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آگ لگ گئی تھی۔"

"آگ... زی ہاں زناب... صحیح فرمایا آپ نے... اس میں آگ ہی لگی تھی۔" حوالدار نے سنبھل کے کہا۔

"کیسے لگی تھی؟ کس کے حکم سے...؟"

"یس زناب عالی... بزلی گری آسمان سے۔" حوالدار نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اللہ کے حکم سے۔"

"اور وہ جو اس میں رہتے تھے... وہ کون تھے... اب کہاں ہیں؟"

"وہ... ایک بڈھا تھا زناب... نب بزلی گری تو... وہ گھر میں نہیں تھا۔" حوالدار نے کہا۔ "اس لیے بچ گیا... بڑا مغرور ہو گیا تھا کیونکہ اس کا ایک بیٹا دبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے وہ باپ کو بہت پیسہ بھیج رہا تھا... اس نے پکا مکان بنالیا تھا!"

"جو ایک گستاخی تھی۔ پٹواری کا مزارع اور پکا مکان بنا کے رہنے لگے؟ یہ تو صاف بغاوت کرنے والی بات ہے۔ کل تک جوتیاں اٹھانے والے اور جوتیاں سیدھی کرنے والے برابری کا دعویٰ کرتے ہیں... سر اٹھا کے چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی کہتے ہیں کہ خدا کے آگے سر جھکاؤ... کسی اور کے آگے نہیں۔ رزق دینے والا خدا ہے... زمیندار نہیں... یہی جرم تھا نا اس کا؟ جس کی سزا اسے یہ دی گئی کہ اس کا گھر جلوا دیا گیا؟" محسن کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ "تم نے کیا کیا؟"

"میں... میں... میں..." حوالدار ہکلانے لگا۔

"کیا بکرے کی طرح میں میں کر رہے ہو... میں پوچھتا ہوں تم نے پرچہ کاٹا پٹواری کے خلاف؟" محسن نے میز پہ ہاتھ مارا۔

حوالدار اچھل پڑا... "تو جی کاٹ دیتا... زناب عالی کوئی تو مدعی ہونا چاہیے... وہ سامنے ہی نہیں آیا... شکایت لکھوانے آتا تو میں ضرور لکھتا۔"

"اب کہاں ہے وہ...؟" محسن نے کہا۔

"اپنے بیٹے کے پاس..." حوالدار بولا۔

"گویا ان ظالموں کے ڈر سے جلاوطن ہو گیا؟ اپنا گھر اور گاؤں چھوڑ گیا... اور تم انصاف کے ٹھیکیدار بن کے دیکھتے رہے؟" محسن نے گرجتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر سے رپورٹ ملی ورنہ میں دیکھتا حوالدار کہ وہ پٹواری اس مکان کو نئے سرے سے تعمیر کراتا۔ اپنے خرچ سے بنواتا اور تم کو میں اس مکان کا چوکیدار بنا دیتا کہ اس کی ایک اینٹ بھی نکلی تو تم پولیس سے نکالے جاؤ گے... مگر اب خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئے ہو۔ مدعی ہی کوئی نہیں اس کیس میں تو انصاف کیسے دلایا جائے۔"

تھانے پر ایسی افتاد کبھی نہ پڑی ہو گی۔ افسر پہلے بھی گزرے ہوں گے تو دعوتیں کھا کے یا زمینداروں کی میزبانی کا لطف اٹھا کے، نذرانے لے کر اور شکار کھیل کر رخصت ہوئے ہوں گے۔ یہاں تو آج تھانے میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کیس آج ہی نمٹا دیے جائیں گے۔ جس پر بھی ظلم ہوا ہے اس کی داد رسی ہو گی اور ظالم کا وہیں فیصلہ ہو گا... اتنا بڑا افسر تھا۔ اس کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی۔ ایک حوالدار اگر سزا دینے کا اختیار رکھتا تھا تو اس افسر کے اختیارات کی انتہا کوئی نہیں ہو سکتی۔ دونوں سپاہی بار بار گاؤں دوڑتے تھے اور کسی فریادی کو لے آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک سارے گاؤں میں تہلکہ مچ گیا ہو گا کہ ایک زبردست فرض شناس انصاف پرور حاکم آیا ہے جو کسی کی نہیں سنتا اور ایک پیسہ نہیں لیتا۔ نمبردار کے گھر کی روٹی تک کھانے سے انکار کر دیا۔ بچہ سقہ کو ایک دن کی بادشاہت ملی تھی تو اس نے چمڑے کے سکے چلا دیے تھے۔ ہم بھی چمڑے کے سکے چلا رہے تھے۔ جو بہت عرصہ نہ چلیں گے۔ کچھ دن چرچا رہے گا کہ ایک صحیح پولیس افسر آیا تھا۔ لوگ اس کے انعام و اکرام اور اس کے انصاف اور اس کے فیصلوں کو یاد رکھیں گے اور دعائیں دیں گے۔ کچھ عرصے بعد سب وہی ہو گا۔ صدیوں کے ظلم اور بدعنوانی، اختیارات سے تجاوز اور قانون کے غلط استعمال کی روایات کی بنیادیں بہت گہری تھیں، انھیں ایک دن میں نہیں بدلا جا سکتا تھا مگر خود میں بہت لطف لے رہا تھا کہ ایک دن کے لیے ہی سہی، ہم نے نمونہ تو پیش کیا کہ پولیس کو کیا ہونا چاہیے۔ قانون تو کمزور کی حفاظت کے لیے بنا تھا لیکن پھر پیسے نے قانون کو بھی خرید لیا اور جو طاقتور تھے وہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔ غریب کا دشمن قانون بھی ہو گیا۔ اب سوائے یوم حشر کے انصاف پر اعتقاد رکھنے کے سوا وہ کرے بھی تو کیا کرے۔

ایک سپاہی نے گلابو کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے یقین آیا کہ عورت کو صرف مجبوری طوائف نہیں بناتی۔ اس الزام میں بھی سو فیصد صداقت نہیں ہے کہ اسے مرد طوائف بناتا ہے۔ کبھی کبھی وہ شوقیہ بھی طوائف بنتی ہے۔ شہر کی طوائف کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا تھا۔ دیہات کی طوائف کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ واقعی اٹھائیس تیس سال کی عورت تھی۔ قدرے فربہی کی طرف مائل۔ اس کے رخساروں پر صحت مندی کی چمک تھی اور اس نے کپڑے بھی ریشمی پہن رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کا سرمہ پلکوں کے سائے سے باہر تک پھیلا ہوا تھا اور اس نے چہرے کے داغوں کو چھپانے کے لیے پاؤڈر کو کریم میں ملا کے یوں لیپ رکھا تھا جیسے دیہاتی دیوار کو کیچڑ سے لیپ پوت کے برابر کرتے ہیں۔ جب وہ میرے پاس آئی تو اس کے وجود سے بہت تیز اور گھٹیا سینٹ کی مہک آئی۔ یہ سب فحش نہیں تھا۔ فحش اس کی مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ خود اشتہار دیتی تھی کہ وہ عورت نہیں طوائف ہے۔ برائے فروخت ہے۔

"بڑے صاحب نے بلایا ہے مجھے۔" وہ پازیب چھنکا کے بولا۔

"ہاں" مگر تیرے نخرے دیکھنے کے لیے نہیں۔" میں نے اس کے پیچھے پر برہمی سے کہا۔ "یہاں ٹھہر ابھی۔ میں پہلے اطلاع کر دوں۔"

لیکن وہ بڑی بے باک عورت تھی۔ وہ ہنسی اور میرے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔ وہ مجھے بالکل لفٹ دینے پر تیار نہیں تھی اور اسے یقیناً یہ خوش فہمی تھی کہ اسے بڑے افسر کی دل بستگی کا سامان فراہم کرنا ہے۔ اندر قدم رکھتے ہی اس نے اپنے ایک پرستار کو صاف ستھرے سر کے ساتھ کونے میں مرغا بنا دیکھا تو وہ ٹھٹکی۔

"سلام صاحب جی۔" گلابو نے ایک ادا سے مسکرا کے کہا اور کرسی پہ بیٹھنے کی نیت سے آگے بڑھی۔ "کیا حکم ہے ہمارے لیے؟"

"الو کی پٹھی۔" میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "کھڑی ہو جا یہاں۔" گلابو کا رنگ اڑ گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ "یہ گلابو ہے سر۔" میں نے کہا۔ "اسے روکا تھا میں نے مگر یہ پیچھے چلی آئی... بہت بدتمیز عورت ہے۔"

محسن نے سر ہلایا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ افسری کی اداکاری میں واقعی کمال دکھا رہا تھا۔ اس کی نظر گلابو پر جمی رہی۔

"گھر والا کہاں ہے تیرا؟ وہ ساتھ کیوں نہ آیا؟" محسن نے کہا۔

"جی... گھر والا؟" گلابو نے گھبرا کے کہا۔ "شادی نہیں ہوئی۔"

"تو باپ کو ساتھ لانا تھا۔ بھائی کو ساتھ لانا تھا۔" محسن نے کہا۔

"میرا کوئی نہیں سرکار۔"

"رہتی کہاں ہے؟ کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"اپنا گھر ہے سرکار... باپ کا چھوڑا ہوا... اسی میں رہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"کرتی کیا ہے؟ کھاتی کہاں سے ہے؟"

"بس سرکار... دال دلیہ مل جاتا ہے... آپ کی دعا سے۔" وہ مسکرائی۔

"میری دعا سے یا ان الو کے پٹھوں سے۔" محسن نے گرج کر کہا اور کونے میں مرغا بنے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا لگتا ہے یہ تیرا؟"

"کچھ... ک... کچھ نہیں... کچھ نہیں سرکار۔" وہ کانپنے لگی۔

"پھر کیوں بلاتی ہے اسے؟ کیوں ملتی ہے اس سے؟" محسن نے کہا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس کی بیوی ہے... بچے ہیں... ان کا حق تو مار لیتی ہے فاحشہ... گاؤں تیری وجہ سے بدنام ہے۔"

"قسم آپ کی سرکار... میں نہیں بلاتی اسے... یہ خود میرے پیچھے پڑا ہوا ہے... جان نہیں چھوڑتا میری۔" وہ رونے لگی۔ "اس کے بیوی بچوں کا تو مجھے بھی خیال ہے۔"

"اچھا... سچ کہہ رہی ہے؟" محسن نے نرمی سے کہا۔ "حوالدار... اس کے باپ کو اور اس کی بیوی کو حاضر کرو۔" انھیں بھی شاید گلابو کے ساتھ ہی بلایا گیا تھا مگر وہ بعد میں پہنچے تھے اور باہر کھڑے ہوئے تھے۔ اس دکاندار نے اندر آ کے مجھے پہچانا اور بڑے ادب سے مجھے بھی سلام کیا۔ پھر اس کی نظر اپنے فرزندِ ارجمند پر گئی جو ایک کونے میں بانگ دے رہے تھے۔ ان کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"بیٹھو چاچا۔" میں نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی بہو کو بھی بٹھاؤ... اور صاحب کو بتاؤ، کیا شکایت ہے تمھیں گلابو سے؟"

بڈھا تو خاموش رہا۔ مرغے کی بیوی نے رونا پیٹنا اور دہائی دینا شروع کیا۔ اس نے گلابو کو اپنی زنانہ لغت میں گالیاں دیں اور کوسا۔ اپنے اکلوتے شوہر نامدار کو برا بھلا کہا اور درخواست کی کہ اس کا دماغ درست فرمایا جائے۔ محسن سب کچھ فسانۂ التفات کے ساتھ سنتا رہا۔

"دماغ درست ہو جائے گا۔ فکر مت کرو... آج کے بعد یہ گلابو کا نام بھی لے تو حوالدار کو بتانا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار..."

"یس زناب عالی۔"

"چھتر ہے تمھارے پاس؟" محسن نے کہا۔

"کیا چیز سر... کون سا چھتر..." حوالدار ایکدم انجان بن گیا۔

"تیرہ نمبر کا چھتر... دماغ کیسے درست کرتے ہو آخر تم... حوالدار ہو گئے، ابھی تک چھتر کا مطلب پوچھتے ہو۔" محسن نے کہا۔ اس کے بعد حوالدار کے لیے گنجائش نہ رہی کہ وہ اصلی تے وڈا چھتر پیش کرے۔

"اس مرغے کو الٹا لٹا دو۔" محسن نے حکم دیا۔ حوالدار نے تعمیل کی، مرغے نے بہت واویلا مچایا اور بہت ہاتھ جوڑے۔ ابھی تک اس کا خیال تھا کہ چھتر سروس خود حوالدار کرے گا۔

"اس عورت... کیا نام ہے اس کا... گلابو۔" محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "یہ چھتر اسی کو دو... اور اس سے کہو کہ یہ واقعی اسے نہیں بلاتی بلکہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ تو اس کے گن کر چالیس چھتر لگائے۔"

مرغا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "ایہہ نئیں ہو سکدا... عورت ذات مینوں جتی مارے... نئیں سرکار... تسی چالیس نئیں، مینوں سو چھتر مار لو..."

"بکواس بند کرو اس کی حوالدار۔" محسن نے آواز بلند کیے بغیر کہا۔

"چل ادئے تیری..." حوالدار نے پھر اسے لٹانا چاہا مگر اس نے حوالدار کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کے لیے یہ انتہائی ذلت کی بات تھی کہ ایک عورت جو طوائف تھی... بدنام تھی اور کوئی عزت نہ رکھتی تھی، اسے جوتی سے مارے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اس کے باپ کے سامنے اور اس کی بیوی کے سامنے۔ عورت تو مرد کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکتی۔ مرد زیادہ سے زیادہ یہ حق بڑی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بہن کو اور ماں کو دیتا ہے کہ وہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ دے اور ایک آدھ تھپڑ بھی غصے میں مار دے۔ لیکن بیوی تو خود پاؤں کی جوتی ہے۔ گاؤں میں تو مرد حاکم ہے اور عورت کا درجہ کنیز کا بھی نہیں۔

"میں لے نئیں ہون دیاں گا وڈیا تھانیدارا۔" مرغے نے عین فلمی ولن کی طرح بڑک ماری... وہ مقابلے پر آمادہ تھا اور بلاشبہ اتنا تنومند تھا کہ میرے سوا جملہ حاضرین کو فرداً فرداً پیٹ سکتا تھا۔ خود حوالدار اس کے جارحانہ عزائم کو دیکھتے ہوئے ڈر گیا تھا اور جب اس نے وڈے تے اصلی تھانیدار کو للکار دیا تو حوالدار کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ شخص مرنے مارنے پر آمادہ تھا اور حوالدار کو اندازہ نہیں تھا کہ اس صورتِ حال سے ایس پی کیسے نمٹے گا۔ اگر وہ حوالدار کو حکم دیتا کہ اس بدمعاش کو پکڑ لو تو حوالدار یقیناً مار کھاتا۔ اس کا اندازہ محسن نے بھی کر لیا تھا چنانچہ اس نے ریوالور نکال کر میری طرف دیکھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اُلٹے لیٹ جاؤ۔" محسن نے کہا۔

"اوئے توں گولی مار دے مینوں۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ اس کے باپ نے اور بیوی نے چلانا شروع کیا کہ اس بے وقوف کا قصور معاف کر دیا جائے۔ گلابو لرزنے لگی۔

"سب پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "بیچ میں کوئی نہ آئے۔" پھر میں آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ مرغا سنبھلتا، میں نے اسے اُٹھایا اور گھما کے نیچے دے مارا۔ وہ تڑپ کر اُٹھا۔ میں نے اُسے مسلسل ٹھوکریں ماریں اور وہ کئی بار دیوار سے لگا۔ ذرا سی دیر میں اُسے اپنی طاقت کے بے مصرف ہونے کا اندازہ ہو گیا۔ میں نے اُسے دو منٹ میں اُلٹا لٹا دیا اور ایسے دبا لیا کہ وہ حرکت تک نہیں کر سکتا تھا۔

"چلو... اپنا کام کرو..." محسن نے گلابو کو یوں اشارہ کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ گلابو ہاتھ جوڑنے لگی۔

"ایسا مت کریں سرکار... کسی اور کو حکم دیں..."

"اگر تو نے حکم نہ مانا تو اس کی جگہ لینا پڑے گی۔" محسن نے سگریٹ جلاتے ہوئے دھواں اوپر چھوڑا۔ "بول، تیار ہے؟"

گلابو کے لیے حوالدار سے چھتر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ گلابو کے اس پرستار کو بالکل اندازہ نہ ہوا کہ یہ سب اس کے باپ کی فرمائش پر ہو رہا ہے مگر افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ خود بڈھے دکاندار نے یہ بات سنجیدگی سے نہیں کی تھی۔ اُسے یہ بات کرتے وقت بالکل امید نہیں تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اب وہ پشیمان بھی تھا اور پریشان بھی۔ خود اس کی بہو جو کچھ دیر پہلے رو رو کر گلابو کو کوس رہی تھی اور اپنے مجازی خدا کے دماغ کی اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھی اب دم بخود بیٹھی تھی۔ تھانے کا وہی ماحول تھا جو

شاید پھانسی گھر میں مجرم کو زبردستی تختۂ دار تک پہنچاتے وقت نظر آتا ہو گا۔ گلابو ابھی تک ششش و پنج میں تھی۔ حوالدار نے اُسے دھکا دیا۔

"اب بھول زرا سارا نخرا... کنجریا... تیرے سارے یار آئیں گے ابھی تو..."

مجھے یہ دھمکی پسند آئی۔ اس میں گلابو کے لیے معاشی اور سماجی بحران اور مستقبل کے بارے میں شدید خطرات کی دھمکی تھی۔ بلاشبہ اگر وہ اپنے سارے پرستاروں کی ناچوشی کرتی تو پھر گاؤں میں کیسے رہتی۔ گلابو کا دم خشک ہو گیا اس نے نیچے پڑے ہوئے شخص کے ایک چھتر مارا۔

"ایسے نہیں... زان لگا ذرا... زتنا مال کھایا ہے اس کا اتنا ہی زور لگا کے مار۔" حوالدار نے کہا۔ نتیجہ یہ کہ باقی انتالیس چھتر گلابو نے ایمانداری سے پوری قوت صرف کر کے مارے اور اس کے پرستار نے ہر چھتر پر اُسے غلیظ گالیاں دیں۔ جب یہ سزا پوری ہو گئی تو میں نے اُسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

"ابھی تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔" محسن نے کہا۔ "حوالدار! اسے بند کرو حوالات میں۔ رات کو سارے گاؤں کو جمع کرو۔ تماشا پھر ہو گا۔ اب چھتر اس کی بیوی مارے گی۔"

وہ ایک دم زمین پر گر گیا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں... میری توبہ ہمیشہ کے لیے توبہ۔ میں اس کنجری کا نام بھی لوں تو میری کھال کھینچ لینا۔ مجھے اور ذلیل مت کرو۔ ابھی کسی نے نہیں دیکھا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ اگر سب کو معلوم ہوا..."

"اچھا... نہیں معلوم ہو گا۔" محسن نے نرمی اور رحمدلی کا مظاہرہ کیا۔ "اُٹھو اور سیدھے کھڑے ہو کے اپنے باپ سے کہو وہ تمہاری ضمانت دے۔ یہ کہ تم آئندہ کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔ بیوی بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرو گے اور یہ بدمعاشی بھی چھوڑ دو گے۔ چھوٹے سے گاؤں میں بدمعاشی بہت آسان ہوتی ہے مگر تم نے انجام دیکھا اپنا... یہ میرا آخری دورہ نہیں ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ کسی بھی دن آ جاؤں گا۔ ایک ہفتے یا ایک مہینے بعد... اور مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا رنگ نہیں بدلا۔ تو پھر دیکھنا میں تم کو کیسے بھٹی چڑھاتا ہوں۔ رنگ پکا ہو تو اسے کاٹنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔"

جب اس نے باپ کے سر پہ ہاتھ رکھ کے وعدہ کر لیا اور باپ بھی اس کی نیک چلنی کا ضامن بن گیا تو اُسے جانے کی اجازت دے دی گئی اور ان سب کو جو وہاں موجود تھے، سمجھا دیا گیا کہ اس کمرے میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر وہ باہر کسی سے نہیں کریں گے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی اور سارے گاؤں کو اطلاع مل

چکی تھی کہ تھانے میں کتنا انصاف ہو رہا ہے۔ باہر مجمع لگ رہا تھا اور علاقے کے کچھ معزز لوگ بھی باہر غالب کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں پٹواری بھی تھا اور نمبردار بھی مگر غالب نے ان کو روک رکھا تھا کہ بڑے صاحب ایک کیس سے نمٹ لیں تو وہ جا سکتے ہیں۔ جب گلابو کا پرستار اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ نکل گیا تو گلابو بھی جانے لگی۔ محسن نے اُسے روک لیا۔

"تم وہاں بینچ پر بیٹھو۔" محسن نے کہا۔ "نمبردار صاحب اور پٹواری کو اندر آنے دو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور میں چق ہٹا کر باہر گیا اور ان دونوں کو لے آیا۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص آیا... وہ اسکول ماسٹر تھا۔ پھر ڈاک بابو نے بھی اجازت چاہی۔ میں نے سب کو آنے دیا۔ محسن نے ان سب سے اُٹھ کر ہاتھ ملایا اور سب کو تشریف رکھنے کے لیے کہا۔ ڈاک بابو اور ماسٹر کو جگہ نہ ہونے کے باعث مجبوراً گلابو کے ساتھ بینچ پر بیٹھنا پڑا۔ میں کھڑا رہا۔ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد، خوشامد اور چاپلوسی کے بعد اور افسر کا موڈ دیکھنے کے بعد نمبردار نے محسن کو دعوت دی۔

"آپ سے پہلے بھی دو بار افسر آئے۔ ہمیشہ غریب خانے کو عزت بخشی۔" وہ بولا۔ "آپ کیا ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتے؟"

"نمبردار صاحب... یہ میرا اصول ہے کہ ڈیوٹی پر نہ میں کسی کے گھر میں قیام کرتا ہوں اور نہ کسی کی دعوت قبول کرتا ہوں۔" محسن بولا۔ "پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔"

"جناب! ہم افسر سمجھ کے نہیں... مہمان سمجھ کے درخواست کر رہے ہیں، یہ شہر نہیں ہے کہ کوئی آئے، کوئی جائے کسی کو غرض نہیں۔ یہاں ہر آنے والا گاؤں کا مہمان ہے۔" نمبردار نے اپنی لچھے دار باتیں جاری رکھیں۔ میرا دل چاہا اس سے پوچھوں کہ گزشتہ ایک سال میں کتنے اجنبی گاؤں سے گزرے اور ان میں سے کتنوں کی دعوت اس کی حویلی میں ہوئی۔ مہمان نوازی کی وہ تابندہ روایات اب داستانِ پارینہ ہو گئی ہیں۔ اب تو مسجدیں بھی مقفل رہتی ہیں جہاں پہلے مسافر بلاامتیاز ٹھہر جاتے تھے اور ہر گھر سے ان کے لیے کھانا بھی آ جاتا تھا۔

"جب میں مہمان بن کے آؤں گا تو سیدھا آپ کے دروازے پر دستک دوں گا کیونکہ سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ آپ نے ہی سب سے پہلے کہا ہے۔" محسن بولا۔ "فی الحال میں آپ لوگوں سے ایک مسئلے کو حل کرنے میں مدد چاہتا ہوں۔ آپ لوگ اس علاقے کے بااثر اور معزز لوگ ہیں۔ آپ سب چاہیں تو یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔"

"آپ حکم دیں جناب۔" پٹواری بولا۔ "مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے۔" محسن نے بینچ پر بیٹھی ہوئی گلابو کی طرف اشارہ کیا۔

سب کی نظر ایک ساتھ گلابو پر گئی۔ پھر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک ایس پی ان سب کو آزمائش میں ڈال دے گا۔ وہ سب نظریں چُراتے رہے۔

"جہاں تک مجھے موصول ہونے والی شکایات سے پتا چلا ہے۔" محسن نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔ "یہ عورت آپ لوگوں کے گاؤں کو بدنام کر رہی ہے؟"

"یہ تو ہے جناب... اسے گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔" نمبردار کھنکارا۔

"نہیں نمبردار صاحب۔ پھر یہ دوسرے گاؤں میں چلی جائے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ ہر گاؤں کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ کیا کبھی آپ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے دروازے کی غلاظت اٹھا کے اپنے پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیں۔ کیا حکم ہے ہمارے دین کا ہمسائے کے حقوق کے بارے میں؟ پڑوسی کا گاؤں بھی تو ہمسایہ گاؤں ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال ایک عورت کے مستقبل کا بھی ہے۔ مجھے اس فلسفے پر تقریر نہیں کرنا ہے کہ عورت کو طوائف کون بناتا ہے۔ میں صرف ایک سوال کروں گا کہ کیا آدمی کو موقع ملے تو اسے نیکی نہیں کرنا چاہیے؟ بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھانا ہو تو کیا اس کا ہاتھ نہیں تھامنا چاہیے... گرے ہوئے کو اُٹھانا نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں کے گاؤں میں کوئی ہے جو اس عورت کو اپنی ذمے داری سمجھ کے قبول کر سکے؟"

طویل خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ محسن اپنے سوال کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ گلابو پلک جھپکائے بغیر محسن کو دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی نہ سُنا تھا نہ دیکھا تھا۔ شاید ان میں سے کسی نے بھی سنا اور دیکھا نہیں تھا کہ پولیس ایسی بھی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ پولیس معاشرے کی اخلاقی ذمے داریاں بھی سمجھ سکتی ہے اور سمجھا سکتی ہے۔ مسائل کو حل بھی کر سکتی ہے۔ اب تک تو پولیس صرف مسائل پیدا کرتی آئی تھی۔ دن بدن پولیس کی وجہ سے لوگوں کے مسائل میں اضافہ ہو رہا تھا مگر یہ عجیب افسر تھا کہ حقوقِ ہمسائیگی کی بات کرتا تھا۔ سماجی ذمے داریوں کی بات کرتا تھا۔ طوائف کے مستقبل کی بات کرتا تھا۔

"ایک شخص ہے تو سہی۔" بالآخر اس خاموشی کو ماسٹر کی آواز نے توڑا۔

"کون ماسٹر صاحب؟" ڈاک بابو نے کہا۔

"وہی میراثی... جو اس سے کئی بار شادی کو کہہ چکا ہے۔" ماسٹر نے کہا۔

"بے شک... وہ شادی کر لے گا۔" نمبردار نے تائید کی۔

"شادی تو کر لے گا... نبھائے گا بھی؟" محسن نے کہا۔ "ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں سنبھال لے گا؟ اخلاق و کردار کیسا ہے اس کا؟"

"اب اس کے اخلاق و کردار کو کیا دیکھنا جناب۔" پٹواری بولا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ کون سی شریف زادی ہے؟"

"یہی تو اصل بات ہے پٹواری صاحب۔" محسن نے اُسے ٹوک دیا۔ "ہر شخص اس عورت کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس کا دل بڑا ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں وسعت ہونا چاہیے... کہ وہ اس عورت کے ماضی کو فراموش کر دے۔ کبھی اس کا طعنہ نہ دے اور اُسے شریف زادی سمجھتے ہوئے قبول کرے۔ غلطی سب کرتے ہیں مگر کیا غلطی کو معاف بھی سب کر سکتے ہیں؟ سچے دل سے؟ دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں... نیک نیتی کے ساتھ۔"

"وہ... اچھا آدمی ہے جناب۔" ماسٹر بولا۔ "اس سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے... مگر وہ میراثی ہے... اور اس کا رنگ کالا ہے۔ اس لیے یہ عورت اُسے ٹھکراتی رہی۔ وہ اب گانے بجانے کا کام نہیں کرتا۔ اس کے باپ دادا میراثی تھے اس لیے وہ بھی میراثی کہلاتا ہے۔"

"باپ دادا کے میراثی ہونے سے کسی کی میراث ذلت نہیں ہو سکتی اور شرافت بھی کسی کو ورثے میں نہیں ملتی۔ اسلام نے تو گورے کو کالے کے اور عربی کو عجمی کے برابر رکھا تھا۔ حضورؐ کا آخری خطبہ کیا تھا۔ انھوں نے رنگ، نسل اور ذات کی بنیاد پر فضیلت کے دعوے کو مسترد کر دیا تھا۔" محسن بولا۔ "یہ ایک جاہل عورت ہے۔ آپ لوگ اس کو سمجھا سکتے ہیں کہ سب سے بڑی دولت تو محبت ہے... یہ نہ ہو کہ وقت گزر جائے تو وہ بھی اسے نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے جو آج دل میں محبت رکھتا ہے۔ اس سے کہو کہ اس میراثی سے شادی کر لے۔"

"میں... میں کروں گی سرکار... میں ضرور کروں گی۔" گلابو ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا ہسٹریا اشکوں کا سیلاب بن گیا۔ "میں جاہل ہی نہیں اندھی بھی تھی۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس کی بیوی بن کے ایسے ہی رہوں گی جیسے سب بیویاں رہتی ہیں۔ کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔ یہ سب لوگ دیکھیں گے کہ میں بھی عورت ہوں۔"

"ویری گڈ!" محسن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ "آپ سب نے سُنا یہ تائب ہو رہی ہے۔"

"جزاک اللہ... آپ تو جنتی ہیں ایس پی صاحب۔" نمبردار بولا۔

"میں بہت گنہگار ہوں نمبردار صاحب... توبہ کرتا ہوں ہر وقت خدا سے۔" محسن نے کہا۔ "اب آپ لوگ آج رات اس کی شادی کا بندوبست کریں۔ دعوت وہیں ہوگی اور ہم سب شریک ہوں گے۔ میری طرف سے یہ رکھیے۔" اس نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے اور میز پر ڈال دیے۔ "شادی کے انتظام کے لیے۔"

"انتظام ہو جائے گا سرکار۔" نمبردار نے احتجاج کیا۔

"پھر بھی... یہ میری طرف سے... دولہا دلہن کے لیے۔" محسن نے کہا۔ "رکھ لیں ورنہ میں نہیں آؤں گا۔" نمبردار نے بادلِ ناخواستہ رقم اُٹھالی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کتنے سرشار تھے۔ ان کی نظر میں اس پولیس افسر کے لیے حقیقی عزت اور عقیدت کے جذبات تھے... یہ انتہائی جذباتی منظر تھا۔

اچانک گلابو اُٹھی اور دوڑتی ہوئی محسن کی طرف بڑھی۔ اس نے نیچے گر کر محسن کے قدم پکڑنا چاہے۔ محسن نے اُسے اُٹھا لیا۔ "جاؤ میری بہن... خدا تمھیں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق دے اور تمہارا گھر آباد رکھے۔"

"آپ فرشتہ ہیں... فرشتہ ہیں سرکار..." وہ بولی اور ہچکیاں لینے لگی۔ معززین دم بخود کھڑے رہے۔ ایک ایس پی ایک طوائف کو بہن کہہ رہا تھا۔ اس کا گھر آباد کر رہا تھا۔ اُسے دعا دے رہا تھا۔ دھمکی نہیں... وہ رشوت بھی نہیں لے رہا تھا۔ اپنی جیب سے شادی کا خرچ دے رہا تھا۔ اس نے نمبردار کی ذاتی دعوت مسترد کر دی تھی مگر ایک میراثی اور ایک طوائف کی تقریبِ خانہ آبادی کی دعوت میں آنے پر تیار تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ کیا آئندہ کبھی ایسا ہوگا؟ ہوگا تو کب ہوگا؟ جس دن ہوگا کیا اس دن یہی دنیا جنت نہیں کہلائے گی؟

جب سارے لوگ نکل گئے تو محسن نے پٹواری کو روک لیا۔ "آپ سے کچھ مشورہ کرنا تھا مجھے۔" محسن نے اخلاق کے ساتھ کہا۔

"ہم تو غلام ہیں سرکار کے۔" پٹواری پھر بیٹھ گیا۔

"پٹواری صاحب!" محسن نے کہا۔ "اس گاؤں کے باہر ایک جلا ہوا گھر ہے۔"

پٹواری کا رنگ فق ہو گیا۔ "ہاں جی ہے... بالکل ہے۔"

"کس کا گھر تھا وہ؟" محسن نے میز پر انگلیوں سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے بہت شرافت سے کہا۔

"تھا جی ایک بدبخت کا۔" پٹواری سرد آہ بھر کے بولا۔ "اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ آسمان سے بجلی گری۔"

"وہ بجلی آپ تو نہیں تھے؟" محسن بولا۔ "اللہ نے خدانخواستہ آپ کو قہر بنا کے تو نازل نہیں کر رکھا ہے یہاں۔"

"مجھے... نہیں سرکار... میں تو سب کا خادم ہوں... سب کی بھلائی کے لیے دن رات کوشش کرتا ہوں۔" پٹواری نے جھوٹ کو نباہنے کی کوشش کی۔

"پھر کہاں گیا وہ شخص، جس کے گھر کو بجلی نے جلا کے خاک کر دیا؟"

"اس نے کہاں بچنا تھا جی۔" پٹواری بولا۔ "کچھ نہیں بچا گھر میں۔"

"پٹواری صاحب!" محسن نے یکلخت لہجہ بدل دیا۔ "اس کے لڑکے نے مجھے براہِ راست باہر سے خط بھیجا تھا۔ باپ تو ان پڑھ تھا اس لیے کچھ نہ لکھ سکا مگر لڑکے نے سب واقعات لکھے تھے۔

شرم آنا چاہیے آپ کو پٹواری صاحب۔ اگلی بار میرے آنے سے پہلے اس گھر کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا پہلے تھا۔ بہت مال کھینچا ہے آپ نے۔ مجھے سب معلوم ہے... اس میں سے تھوڑا سا لگا لیجیے۔"

"لیکن... حضور... میرا کیا قصور... میرے خلاف کوئی شکایت کسی نے نہیں لکھائی... کوئی پرچا نہیں کاٹا گیا..."

"اچھا... تو آپ قانون چھانٹ رہے ہیں... اپنے ہوشیار ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔" محسن کھڑا ہو گیا۔ "بہت بہتر۔ ایف آئی آر بھی درج ہو جائے گی... حوالدار..."

"جی... جی... جنابِ عالی..." حوالدار چونک پڑا۔

"مجھے شکایت ملی ہے کہ گاؤں سے کچھ لوگ ناجائز اسلحہ سرحد پار بھیجتے ہیں اور ان کی مدد گاؤں کا پٹواری کرتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "بعد میں خانہ تلاشی کے وارنٹ آئیں گے تو اسلحہ بھی برآمد ہو جائے گا۔ فی الحال میں پٹواری صاحب کو ساتھ لے جاؤں گا۔ ان کا کیس سی آئی اے کے سپرد کیا جائے گا۔"

پٹواری چلانے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... سرکار یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

"اور جو کچھ تم نے کیا تھا وہ کیا تھا؟ وہ ظلم نہیں تھا؟" محسن نے گرج کے کہا۔ "بک بک کرنے کی ضرورت نہیں میرے سامنے۔ کل گاؤں میں کھلی کچہری ہوگی۔ اس میں بھی تمھارے خلاف سب کی شکایات سُنی جائیں گی۔"

"سرکار... مجھے معاف کر دیں... میری توبہ... میں نیا مکان کھڑا کر دوں گا۔" پٹواری گڑگڑانے لگا۔

"ایک مہینے میں۔" محسن نے کہا۔ "میں درمیان میں بھی چکر لگا کے دیکھ سکتا ہوں کہ کتنا کام ہوا۔ میں نہ آ سکا تو کوئی تمھاری خبر لینے ضرور آئے گا... جاؤ دیکھو... نمبردار صاحب چلے گئے؟"

"ابھی باہر موجود ہیں جنابِ عالی... پٹواری صاحب کا انتظار فرما رہے ہیں۔" حوالدار نے کہا۔

"اچھا تو انھیں ایک منٹ کے لیے اندر بھیج دو۔" محسن بولا۔

"حکم بندہ پرور۔" نمبردار نے اندر آ کے کہا۔

"نمبردار صاحب! کل ایک غریب آدمی کو غلطی سے پکڑ لیا گیا کہ وہ چور ہے۔" محسن بولا۔ "ساری غلطی اس حوالدار کی ہے۔ اسے میں نے سرزنش کر دی ہے۔ وہ شخص ریڑھی پر پلاسٹک کے کھلونے بیچتا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا۔ اور پھر رات کو اس کی ریڑھی کو آگ لگا دی۔ آپ کی حویلی کے احاطے میں لے جا کر۔"

"میری حویلی کے احاطے میں؟" نمبردار نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"جی ہاں... ظاہر ہے آپ کو بدنام کرنے کے لیے۔" محسن نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ "یہ میری طرف سے اس کو دے دیں۔ ممکن ہے وہ مجھ سے قبول نہ کرے... اور اُسے ریڑھی لگانے دیں۔ میں اُسے آپ کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں۔ حوالدار! اگر تم نے پھر ایسی زیادتی کی تو جیل میں سڑا دوں گا۔"

"جیسا آپ کا حکم بندہ پرور۔" نمبردار پھر کھنکارا۔ "لیکن یہ رقم تو اپنے پاس رکھیے... زیادہ شرمندہ نہ کریں... تھوڑی سی نیکی ہم بھی کما لیں۔"

محسن نے ہاتھ ملایا اور ان کو رخصت کر دیا۔ اس نے کسی ماہر سیاست داں کی طرح ہر چال چلی تھی۔ ہر شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا جس کا وہ مستحق تھا۔ اسی لہجے میں بات کی تھی جیسے ضروری تھی اور تمام معاملات کو انتہائی خوش اسلوبی سے نمٹا دیا تھا۔ وہ ایس پی تو نہیں تھا مگر اس سے بہتر ایس پی کی مثال نہیں دی جا سکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر شعوری طور پر وہ ایس ایس پی انکل ضامن رضوی کے انداز میں سارے معاملات طے کر رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بھی کسی حد تک انکل رضوی کے جیسا تھا۔ اور یہ ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ ذہنی طور پر وہ رضوی صاحب سے متاثر تھا اور خود میں بھی۔ ہمارے لیے وہ ایک مثالی انسان اور مثالی قسم کے پولیس افسر تھے۔ یہ حالات ہوتے تو شاید ان کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ وہ جعلی ایس پی ہے۔ گاؤں کے رہنے والے کیا جانیں کہ ان کے علاقے کا ایس پی کون ہے۔ ایس پی بدلتے رہتے ہیں اور نمبردار کے کہنے کے مطابق صرف دو بار ایس پی یہاں آئے تھے۔ اگلی بار کون کس وقت آئے گا، یہ کہنا غیر یقینی تھا۔

ایس پی کی آمد کا شوشہ پہلے سے چھوڑنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ تھانیدار کے اختیارات رکھنے والا کانا حوالدار اپنے عملے سمیت ہمارے شاہانہ استقبال کے لیے تیار تھا۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ تصدیق کر سکتا۔ تھانے میں کیا گاؤں میں بھی ٹیلی فون نہیں تھا۔ اگر وہ دس میل جاتا اور کہیں سے ٹیلی فون کر کے معلوم کرتا تو اُسے کچھ معلوم نہ ہوتا۔ اوّل تو شہر کی لائن ہی نہ ملتی۔ پھر پولیس ہیڈکوارٹر میں وہ کس سے پوچھتا کہ کون سا ایس پی اچانک آ رہا ہے۔ ایس پی اچانک کہیں بھی چھاپا مارنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اتنی ہمت تو کسی ایک یا دو پھول والے باقاعدہ تھانیدار کو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایس پی کا نام پوچھ سکے اور اس سے شناختی کارڈ طلب کر سکے۔ پھر جتنے کیس محسن نے صبح سے سہ پہر تک نمٹائے، ان سے بھی ثابت ہوا کہ وہ ایس پی ہے جسے ہر بات کا علم ہے۔ جتنی شکایات اسے ملی تھیں ان سب پر اس نے ایکشن لیا۔ کہیں بہت سخت تو کہیں معمولی۔ مگر اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک حاکم کو رعایا کے حال سے کتنا باخبر ہونا چاہیے۔ کتنا عادل ہونا چاہیے اور کتنا مہربان ہونا چاہیے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہاں بھئی حوالدار... اور کوئی کیس ہے؟" محسن بولا۔

حوالدار کی صبح سے پریڈ ہو رہی تھی اور اتنی سخت ڈیوٹی شاید اس نے کسی افسر کے ساتھ نہیں کی تھی۔ وہ اور اس کے ماتحت مسلسل گاؤں میں دوڑ لگا رہے تھے اور اٹین شن کھڑے تھے۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی تک افسر نے کھانے کا نام ہی نہیں لیا تھا تو وہ کیسے بولتا۔ ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم نے دس بجے کے قریب جو اعلیٰ مکھن اور دیسی گھی کے پراٹھے کھائے تھے، وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوئے تھے۔ ہم شہری لوگ تھے۔ چیزوں کو دیکھ بھال کے، چھان پھٹک کے مقررہ مقدار میں اور ایک وقت پر کھانے والے۔ یہ خالص غذا محنت کرنے والوں کو راس آتی تھی، جو ہل چلا کے اُسے آسانی سے ہضم بھی کر لیتے تھے۔

"اور تو کوئی کیس نہیں سرجی۔" حوالدار بولا۔

"تم نے کھانا کھا لیا ہے؟" محسن نے بے نیازی سے کہا۔

"نہیں جنابِ عالی... میرا خیال ہے کہ آپ بھی کھا لیں۔"

"نہیں... تم کھا لو۔" محسن بولا۔ "اور یہ بتاؤ یہاں کوئی تنور ہے جہاں سے روٹی سالن مل سکے۔"

حوالدار نے افسوس کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی۔ "سب کے اپنے اپنے گھروں میں تنور ہیں۔"

"اچھا چلو... ایک چکر گاؤں کا لگاتے ہیں۔" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہیں چائے پی لیں گے... چائے تو ملتی ہے نا۔"

حوالدار کا منہ لٹک گیا۔ پہلے وہ بھی افسروں کے ساتھ عیش کرتا ہوگا۔ ان کے لیے پلاؤ زردہ اور بھنے ہوئے مرغ آتے ہوں گے تو حوالدار بھی دعوت میں شریک رہتا ہوگا۔ اس افسر نے صبح سے بھوکا کھڑا کر رکھا تھا اور اب خالی پیٹ گاؤں میں گھمانے پر مُصر تھا۔ لیکن حوالدار انکار کیسے کرتا۔ اس نے اپنی سپاہ کو اٹین شن کیا اور ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ تھانے کے باہر اب بھی پندرہ بیس افراد جمع تھے۔ ان سب نے محسن کو ڈرتے ڈرتے سلام کیا۔ محسن ان کے پاس چند منٹ کے لیے رکا اور رسماً پوچھا کہ کسی کو پولیس سے کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ ان میں مجھے چار گنجے نظر آ رہے تھے۔ دو تازہ اور دو پرانے لیکن وہ بولے نہیں۔ غالباً ہمارے پیچھے سے حوالدار نے اُن کو آنکھیں دکھا کے خاموش کر دیا تھا۔

گاؤں میں واقعی اس پولیس افسر کے انصاف اور رعایا پروری کے قصے پھیل چکے تھے اور لوگ ہر جگہ ہمیں انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس احترام میں خوف بالکل نظر نہ آیا۔ کچھ بزرگ قسم کے لوگوں نے آگے بڑھ کے محسن سے ہاتھ بھی ملایا اور اسے طویل عمر کی، ترقی کی اور صحت کی دعائیں دی۔ یہ سچے دل سے نکلنے والی دعائیں تھیں۔ دعا دینے والے نہیں جانتے تھے کہ وہ ایس پی اصلی ہے یا نقلی۔ انھوں نے تو انصاف اور سچائی کا ایک روپ دیکھا تھا۔ مظلوموں کے حق میں اُٹھنے والی ایک آواز سنی تھی۔ حق بات کو تسلیم کرنے والے کو دیکھا تھا۔ اور یہ سب انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ اپنے جذبات کے اظہار میں برحق تھے۔ ہم پھر رہے تھے، جیسے واقعی ہم اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔ میرا دل بار بار کہتا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔ یہ پانچ سو گھروں کی چھوٹی سی آبادی ہماری حکومت ہوتی۔ ہم اسی کو ایک یوٹوپیا بنا سکتے۔ وہ مثالی فلاحی ریاست جس کا تصور اسلام نے پیش کیا تھا اور جس کی ایک مثال حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں نظر آئی تھی۔ جب گلی میں ایک کتا بھی بھوکا سوتا تو خلیفہ خود کو مجرم سمجھتا تھا۔ جب خلیفہ اور غلام باری باری اونٹ پر سواری کرتے تھے۔ شہنشاہوں کے سفیر طاقت اور دبدبے میں خود کے ہمسر خلیفہ کو اپنی عبا میں ٹانکے لگاتے ہوئے پاتے تھے۔ جو رعایا کے سامنے ہر فعل کے لیے جوابدہ تھا مگر جس کی سخت گیری اور گرفت سے وہ سب تھر تھر کانپتے تھے جن کے دل پاک نہ تھے یا جن کی نیّت میں فتور تھا۔ ہماری یہ ایک دن کی بادشاہت خود ہمیں یاد رہے گی اور لوگ بھی یاد رکھیں گے۔

اچانک ایک ضعیف اور کمر خمیدہ شخص نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس کی عمر ستر سال سے زائد ضرور ہوگی۔ "السّلام علیکم بیٹیا۔" اس نے محسن سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "میں گاؤں کی مسجد کا پیش امام ہوں۔"

محسن کے بعد ہم سب نے اس سے مصافحہ کیا۔ "تم ہی وہ ایس پی ہو نا... جس کو سارا گاؤں دعائیں دے رہا ہے... میرا لڑکا بھی پولیس میں تھا۔"

"اچھا مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔ "اب کہاں ہے؟"

"سوہنے رب کے پاس۔" وہ انگلی اوپر اُٹھا کے بولا۔ "اُس کی رضا یہی تھی۔ ورنہ وہ بھی آج ایس پی ہوتا... بالکل تمھارے جیسا گبرو جوان تھا۔"

"کیا نام تھا اس کا مولانا صاحب؟" محسن نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"کرم علی... ایس آئی کرم علی۔" پیش امام نے کہا۔ "دس سال ہو گئے اب تو... اللہ نے صبر دیا۔ ایک ہی اولاد تھی میری۔"

"مجھے بہت افسوس ہے... کیسے انتقال ہوا تھا اس کا؟" محسن نے کہا۔

"ڈاکو آ گئے تھے گاؤں میں۔" پیش امام نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ اکیلا نکل گیا... میں نے روکا کہ بیٹیا اکیلا مت جا... وہ بولا کہ بابا... اکیلا کہاں۔ میرا رب میرے ساتھ ہے... یہ اس کی ڈیوٹی نہیں تھی، وہ تو چھٹی آیا ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال ہوا تھا شادی کو... پُتّر ایس پی... اُدھر اس کا جنازہ اُٹھا۔ اُدھر اس کے بیٹیا ہوا... اب دس سال کا ہے میرا پوتا... اس کو پولیس میں بھرتی کرانا ہے۔"

"ضرور کرائیے... لیکن ابھی تو وہ چھوٹا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں پُتّر... جب بڑا ہو جائے گا تب۔" وہ بولا۔ "میں نے تو اسی دن اپنی بہو سے کہا تھا کہ نیک بخت... رو مت... اللہ نے امتحان لیا ہے ہمارے صبر کا... بیٹیا لیا ہے تو پوتا دیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر تھا تو یہ اس سے بھی بڑا افسر بنے گا... باپ سے آگے جائے گا۔"

"ضرور جائے گا مولانا صاحب... اگر آپ کی دعائیں شامل حال رہیں اور خدا نے چاہا تو وہ ایس پی کیا آئی جی بنے گا۔" محسن نے اس جذباتی بوڑھے کو تسلی دی۔ اس کی بات نے ہم سب کو افسردہ کر دیا تھا جب ہم نے اجازت مانگی تو وہ اَڑ گیا۔

"میں اتنی دیر سے آخر کس لیے کھڑا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "میں تو خود آتا مگر میں ایک سب انسپکٹر کا باپ ہوں... جو شہید ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا کہ تم کو ملے کر میرے پاس آنا چاہیے... اور دیکھو تم آ گئے۔ اب میرے گھر سے کچھ کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ چائے لسّی پیو، پھر جاؤ۔" اُس نے ہمیں حکم دیتے ہوئے کہا۔ پیش امام کچھ عمر کے باعث اور کچھ اپنی زندگی کے اس المناک حادثے کی وجہ سے تھوڑا سا خبطی ہو گیا تھا۔

"چائے لسّی تو ہم نہیں پئیں گے مولانا صاحب۔" محسن نے کہا۔

"پیو گے کیسے نہیں..." وہ گرم ہونے لگا۔

"میرا مطلب تھا کہ ہمیں بھوک لگی ہے۔ روٹی مل جائے گی...؟" محسن نے کہا۔

"اوئے پُتّر ایس پی... روٹی کیوں نہیں ملے گی۔ گھر میں روٹی نہیں ملے گی تو پھر کہاں ملے گی۔" وہ محسن کو بازو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ میں نے حوالدار کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔

"یہ بڈھا تو پاگل ہے جنابِ۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جب سے اس کا بیٹیا مرا ہے..."

"تم کو شرم نہیں آتی۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "جس کے پیچھے نماز پڑھتے ہو اسے پاگل کہتے ہو... ساری زندگی جھک مارتے رہے تم حوالدار رہے۔ اس کا بیٹیا دس سال پہلے ایس آئی تھا... اور وہ شہید بیٹیا تھا۔"

"غلطی ہو گئی سرجی۔" حوالدار نے حلق کی تلخی کو تھوک سے نگل لیا کیونکہ محسن نے بھی اُسے خوں آشام نظروں سے گھورا تھا۔

پیش امام کا کچا گھر مسجد سے متصل دو نیم تاریک کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میں ہم کو بٹھایا گیا۔ فرش پہ پھوڑی (چٹائی) پڑی ہوئی تھی ہم نے ہاتھ دھو کر بسم اللہ پڑھی اور کھانے لگے۔ اندر سے پیش امام کی بہو گرم گرم روٹیاں ارسال کرتی رہی۔ اس کے ساتھ گڑ تھا۔ دیسی گھی تھا اور پیاز تھی۔ حوالدار کے حلق میں نوالہ پھنس رہا تھا اور اس کو دن بھر کے فاقے کے بعد سوکھی روٹی اور پیاز کھانا پڑ رہی تھی۔ اس کی مجبوری قابلِ دید تھی۔ افسر کو وہ دل ہی دل میں ہزار گالیاں دے رہا ہوگا کہ کیسے کیسے کمینے لوگ ایس پی ہو گئے ہیں جن میں کوئی بات افسروں والی ہے ہی نہیں۔ مگر وہ سب کا ساتھ بھی دے رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ ماحول کی جذباتی فضا کا اثر تھا۔ یا چلنے سے ہمیں بھوک لگی تھی کہ ہم نے اس کھانے میں جتنا مزہ پایا، وہ آج بھی یاد ہے۔

ہمارے واپس ہونے تک پورے گاؤں کے ہر فرد کی زبان پر یہ بات تھی کہ ایس پی نے پیش امام کے گھر میں زمین پہ بیٹھ کے سوکھی روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھائی۔ اسی شہرت کا نتیجہ تھا کہ رات کو ہم گلابو اور میراثی کے نکاح کی تقریب میں پہنچے تو وہاں گاؤں کا بچہ بچہ موجود تھا۔ عورتیں محسن کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ آدمی نہیں، فرشتہ ہے جو ابھی پر لگا کے اڑ جائے گا۔ ہر شخص اس سے ہاتھ ملانے کا مشتاق تھا کیونکہ ان کے دلوں سے ڈر نکل گیا تھا اور اس کی جگہ عزت و احترام کے جذبات نے لے لی تھی۔ وہ محسن سے ہاتھ ملا کے بھی خوشی محسوس کرتے تھے۔ جتنی دعائیں محسن نے اس ایک دن میں لیں، اتنی شاید ہم سب نے ساری عمر میں اکٹھی نہیں لی ہوں گی۔ شادی کی دعوت کا سارا انتظام نمبردار نے کیا تھا۔

پٹواری اور دوسرے معززین بھی اب اپنے نمبر بنانے میں پیش پیش تھے اور غالباً یہ گاؤں کی تاریخی شادی تھی۔ عام حالات میں یہ معززین کسی میراثی اور ایک بدنام عورت کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آنے والے کو بھی بے عزت کر کے بھگا دیتے۔ شادی میں ایک بار پھر حاکم و محکوم کی تفریق رکھی گئی تھی۔ ایس پی کے لیے اور معززین کے لیے الگ بیٹھنے کا انتظام ہو رہا تھا مگر میں نے خاموشی سے نمبردار کو سمجھا دیا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ایس پی عام لوگوں میں بیٹھ جائے گا تو اُسے مایوسی ہوگی۔

ہم رات آٹھ بجے لوٹ آئے۔ مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شادی کامیاب رہے گی۔ اس کی ذمے داری گاؤں کے بڑوں نے لی تھی اور خود گلابو نے جو وعدہ کیا تھا، وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کے دل کا سچ خود الفاظ میں ڈھل کے زبان تک آ گیا تھا اور گلابو کا لہجہ اس کی نیت کی صداقت کا گواہ ہو گیا تھا۔ میراثی بہت خوش تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے خدا بیک وقت اتنی بہت سی خوشیاں عطا کر دے گا۔ اسے اپنی محبت مل جائے گی۔ شادی کے انتظامات خود بخود ہو جائیں گے۔ اس کی شادی میں نمبردار، پٹواری اور گاؤں والے ہی نہیں، ایک ایس پی بہ نفسِ نفیس شریک ہوگا جو اسے سلامی میں پانچ سو روپے دے جائے گا۔

"آج تو تم نے کمال کر دیا محسن۔" میں نے واپسی میں فرانسیسی بولنا شروع کی۔ "تیری جگہ میں اس منصب کو اتنی خوش اسلوبی سے نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نبلا سکتا تھا۔"

"معلوم نہیں کیوں، اس دھوکا دہی اور جعلسازی میں بھی مجھے سچی خوشی مل رہی ہے۔" محسن نے بھی فرانسیسی میں جواب دیا۔ "اس وردی کے بغیر میں ایک دن میں اتنی نیکی نہیں کما سکتا تھا۔"

"چلو، ہمارا مقصد تو پورا ہوا۔ جب ہم چلے جائیں گے تو سب یاد کریں گے... کچھ دن سب ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا۔

"ہم کسی طرح انکل رضوی سے کہیں گے کہ وہ بعد میں اپنے کسی ماتحت کو ایک دن کے لیے بھیج دیں۔" محسن بولا۔ "جو تصدیق کر جائے کہ فضلو کو تعلیم کے لیے بھیجا گیا یا نہیں۔ گلابو کا چلن کیسا ہے۔ اس کا سابقہ پرستار راہِ راست پر ہے یا نہیں۔ پٹواری نے اس گھر کو پھر بنا لیا ہے یا نہیں جسے اس نے آگ لگوائی تھی اور نمبردار نے اس نوجوان کو ریڑھی لگا دی ہے یا نہیں۔"

"میرا بھی خیال ہے کہ یہ بندوبست مشکل نہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ لوگ بعد میں تصدیق تو نہیں کریں گے... ہمارے متعلق۔" محسن بولا۔

"اگر ہم سب کو لوٹ کر لے جاتے۔ فراڈ کرتے۔ زبردستی نذرانے لیتے اور رشوت سے جیبیں بھرتے تو شاید یہ لوگ معلوم کرتے کہ وہ ڈاکو تو نہیں تھے۔" میں نے کہا۔ "اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم کچھ نہ دے کر ہی جا رہے ہیں... لے کر جا رہے ہیں تو صرف دعائیں۔"

"اب اصل کام رات کا ہے۔ جس کے لیے ہم نے تھانہ حاصل کیا تھا اور تھانیداری قائم کی تھی۔" محسن نے کہا۔

"ہاں... اب سراج سے تفتیش کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے حالات خود بخود سازگار ہو گئے ہیں۔"

حوالدار ہماری گفتگو سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اگر انگریزی ہوتی تو وہ ایک آدھ لفظ یا جملہ ضرور سمجھ لیتا۔ مگر یہ زبان تو اس کے لیے خیالی زبان تھی۔ وہ پریشان بھی تھا کہ کہیں یہ گفتگو اس کے خلاف تو نہیں ہے۔ ایس پی نے سارے گاؤں کے کیس نمٹا دیے تھے۔ مگر اس کا کیس باقی تھا۔ وہ خود جانتا تھا کہ اس نے کتنے غلط کام کیے ہیں چنانچہ اس کے دل کا چور اسے ڈرا رہا تھا کہ یہ افسر بہت باخبر ہے۔ اسے لوگوں کے ذاتی معاملات تک کا علم ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے اپنے عملے کے کرتوتوں کی خبر نہ ہو۔

تھانے پہنچنے کے بعد محسن نے کہا۔ "بھئی حوالدار... تم بہت تھک گئے ہو گے۔ اس لیے اب تم آرام کرو۔"

"اور... آپ... زنابِ عالی؟" حوالدار نے سکھ کا سانس لیا۔

"مجھے تو ابھی اس بدمعاش سے تفتیش کرنا ہے۔" محسن نے کرسی پر گر کے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ تھانے کے باہر چارپائیاں ڈال لو۔"

"ہماری مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی سرکار؟" حوالدار بولا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں پڑے گی۔" محسن بولا۔ "پڑے گی تو بلا لیں گے۔ تم آج اندر سے چارپائیاں نکال کے باہر لے جاؤ۔"

"چارپائی کی کوئی بات نہیں زنابِ عالی۔" وہ بولا۔ "آپ کو بھی آرام کرنا ہو گا اس لیے میں نے بستر لگوا دیے ہیں۔"

"پھر... تم لوگ کیا کرو گے؟" محسن بولا۔

"ہم بھی منگوا لیں گے کچھ گاؤں سے۔" حوالدار بولا۔ پھر اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ گارڈ آف آنر پیش کیا اور رخصت ہو گیا۔ تخلیہ ہوتے ہی سارے دن کی اداکاری کی تھکان اتارنے کے لیے ہم نے آدھا گھنٹا لمبے لیٹ کر سگریٹیں پیتے اور سارے دن کے واقعات پر ہنستے گزارا۔ پھر ہم حوالات میں پہنچے جہاں سراج گٹھڑی بنا پڑا ہوا تھا۔ محسن نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔

"اب تم گلا پھاڑ کے چلا سکتے ہو اور مدد کے لیے پکار سکتے ہو۔ باہر تمہارے اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ وہ تفتیش کے شور میں زیادہ سکون سے سوتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اگر ان کو معلوم ہو جاتا... کہ تم دھوکے باز ہو۔" سراج نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہم تم سے بڑے دھوکے باز تو نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم نے دھوکا دیا تو ایک چھوٹے سے گاؤں کو۔ تم تو پورے ملک کو اور ملک کے عوام کو دھوکا دے رہے ہو۔"

"اور انہیں معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا۔" محسن بولا۔

سراج ہنسا۔ "معلوم ہو سکتا تھا۔ میں ان کو بتا سکتا تھا۔"

"افسوس یہ کہ تمہیں کوئی موقع نہیں ملا۔" غالب نے کہا۔

"تم لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور پھر میرا۔" سراج نے اسی لہجے میں کہا۔ "کہ اس وقت تم میری جگہ حوالات میں بندھے ہوئے نہیں پڑے ہو۔ تم سارا دن بادشاہت کرتے رہے اور نشۂ اقتدار میں بھول گئے کہ شامتِ اعمال تمہارے کتنے قریب آ گئی تھی۔ مجھے موقع ملا تھا جب میں یہ راز فاش کر سکتا تھا۔"

"کب موقع ملا تھا۔" میں نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"جب ایک احمق میرے لیے کھانا لایا تھا۔" سراج بولا۔ "اس نے تو میرے ہاتھ بھی کھول دیے تھے اور جب میں کھانا کھا رہا تھا تو وہ بندوق تانے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ میں چاہتا تو اسے سب بتا سکتا تھا۔ صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ ذرا ایس پی صاحب سے ان کا شناختی کارڈ تو مانگ لو۔ وہ نہ سہی... نمبردار تو تمہارا ماتحت نہیں تھا۔ وہ شک میں پڑ جاتا تو تم سے یہ مطالبہ ضرور کر بیٹھتا۔ جب میں کھانا کھا رہا تھا تو تمہارے دربار میں یہی معززین بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی ہم سے اتنی بڑی بھول ہو گئی تھی۔

"تم کو کھانا کس نے دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کس کی اجازت سے دیا گیا تھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم... تم تو مجھے بھول گئے تھے لیکن وہ نہیں بھولے تھے کہ ان کی تحویل میں ایک حوالاتی بھی ہے۔" سراج بولا۔

"پھر تم نے ان سے وہ کیوں نہیں کہا جو تم کہہ سکتے تھے۔" محسن بولا۔

"میں نے اس میں کوئی فائدہ نہیں دیکھا۔" سراج نے کہا۔ "تم جو کچھ کر رہے تھے، اچھا ہی کر رہے تھے۔ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ سب مجھے اچھا لگا اور میں نے دخل در معقولات نہیں کیا۔"

"لیکن تم جانتے تھے کہ... تمہیں نقصان ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کیا نقصان ہو گا؟" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ "جتنا نقصان ہونا تھا، ہو چکا۔ میں نوکری سے غیر حاضر ہوں۔ اور میرے دوبارہ حاضر ہونے کا امکان بھی نہیں۔ مجھے معطل کیا جا چکا ہو گا۔ یہ وردی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تم صرف میری جان لے سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہارے لیے جان دینا اتنا آسان بھی نہیں ہو گا جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" محسن بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم مجھے بدترین اذیت دینے کے لیے کتنے بے تاب ہو۔" سراج بولا۔ "تمہیں پہلی بار موقع ملا ہے۔"

"ہاں... جب تم کو پہلی بار موقع ملا تھا تو تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔ آج تم میرے مہمان ہو۔ ایک بالٹی میں نے رکھی ہوئی دیکھ لی تھی ورنہ میں خاص طور پر منگواتا۔"

"تم اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اگر صرف معلومات حاصل کرنے کی بات ہے تو میں ویسے ہی سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔ میں تم کو وہاں لے جا سکتا ہوں جہاں رابعہ، کیتھرین اور تمہارے دوست ٹیڈی مل سکتے ہیں۔"

"ہم اب تم پر اتنی آسانی سے اعتبار نہیں کریں گے سراج۔ ایک موقع تم کو پہلے بھی دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ موقع تقدیر نے دیا تھا۔ لیکن میں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ تقدیر بار بار موقعے فراہم نہیں کرتی۔ اور اب تو میرا اعتقاد نہ تقدیر پر رہا ہے نہ تدبیر پر... وقت ہی ساتھ چھوڑ گیا ہے ورنہ میں دوسری بار گرفتار کیوں ہوتا۔" سراج بولا۔

"یہ سب ہم نہیں جانتے۔ یہ تمہاری ریاکاری بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

"نہیں، ہم اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ ہم نہ تمہاری رہنمائی پر بھروسا کر سکتے ہیں اور نہ تمہاری نیک نیتی پر۔" میں نے کہا۔ "ہم تمہیں ساتھ رکھیں گے۔"

"تمہارے علاوہ مجھے کوئی ساتھ رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں ہو گا۔" وہ بولا۔ "تم جانتے ہو کہ دلاور بھی مجھے چھوڑ چکا ہے۔ مجھے ایک موقع اور دو... میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ پھر غلطی کروں تو جو سزا چاہے دینا۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ، کیتھرین اور ٹیڈی کو کہاں لے جایا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"انہیں کراچی لے جانے کا پروگرام تھا۔" وہ بولا۔

"کیسے؟ یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان کو کریٹ میں بند کر کے کراچی پہنچایا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ کریٹ کراچی تک کیسے جائیں گے۔"

"سڑک کے ذریعے۔ سامان لے جانے والے ٹریلرز میں۔" وہ بولا۔

"اور یہ ٹریلر کہاں سے روانہ ہوں گے؟" محسن بولا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔ "دلاور... یہ باتیں مجھے نہیں بتاتا تھا۔"

"مگر تم ہمیں بتاؤ گے۔" میں نے کہا۔

تھانے میں تفتیش کا سب اسباب مہیا تھا۔ پہلے ایک گھنٹے میں غالب نے اور میں نے تفتیش کی۔ ہمارا سوال ایک ہی تھا کہ ٹریلرز کہاں سے روانہ ہوں گے اور کب روانہ ہوں گے۔ میں نے اس کے جسم سے لباس الگ کر دیا اور غالب کی مدد سے اس کو کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر میں نے چمڑے کی بیلٹ اٹھا لی۔ اس کی آواز بند رکھنے کے لیے ہم نے اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا۔ بیلٹ کے ہر وار پر وہ بل کھاتا رہا اور تڑپتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے جسم پر نیل کے سانپ سے نمودار ہو گئے۔ جب میں تھک گیا تو میں نے اسے ایک موقع دیا۔ لیکن وہ ایک ہی بات پر اڑا رہا۔ مجھے نہیں معلوم... محسن نے اور غالب نے مزید ایک گھنٹا محنت کی مگر اس سے کچھ نہ اگلوا سکے۔ وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

بالآخر میں نے محسن سے کہا کہ وہ بالٹی اٹھا لائے۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کے مضبوطی سے باندھ دیا اور بالٹی اس کے سر پر الٹی کر کے رکھ دی۔ اس کا منہ گردن تک بالٹی میں غائب ہو گیا۔ محسن دوسرے کمرے سے باہر گیا اور درخت کی دو شاخیں توڑ لایا۔ ان کے پتے صاف کرنے کے بعد وہ ایک انچ سے زیادہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

موٹے اور تقریباً تین فٹ لمبے لچکدار ڈنڈے ہمارے ہاتھ میں رہ گئے۔ سراج کی آنکھیں بالٹی اوڑھانے سے پہلے دہشت سے باہر آرہی تھیں۔ جب بالٹی پر میں نے پہلا ڈنڈا مارا تو سراج کرب سے بل کھانے لگا۔ دوسری طرف سے محسن نے بالٹی پہ وار کیا۔ اس کی اذیت میں نے محسوس کی کیونکہ میں اس بھیانک تجربے سے گزر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا جنون بڑھنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے بالٹی پہ ڈنڈے مارنا شروع کیے۔

"سراج..." میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "کیسا لگتا ہے اندر؟۔ میں نے اپنا ایک وعدہ پورا کیا۔ یہ طریقۂ تفتیش میں نے تم سے ہی سیکھا تھا۔"

"سکندر!" محسن نے اچانک میرا ہاتھ روک لیا۔ "یہ آواز کیسی ہے؟"

میں نے کان لگا کے سُنا۔ یہ کوئی گاڑی تھی... غالباً جیپ... جو قریب آرہی تھی۔ ابھی تک تو میں نے اس گاؤں کے راستے پر موٹر کے ٹائر کا ایک بھی نشان نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ وقت کے تین بجے جیپ کہاں سے آگئی؟

باہر گھپ اندھیرا تھا لیکن میں دُور سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو روشنی کی دو متحرک اور متوازی لکیروں کی طرح آگے بڑھتا دیکھ سکتا تھا۔ ناہموار زمین کے ہچکولوں سے روشنی اُوپر نیچے ہوتی تھی تو اس کی زد میں آنے والے جنگل کے درختوں کا ساکت وجود کبھی تنے کی حد تک نظر آتا تھا تو کبھی سرسبز شاخوں میں اُجالا اندر تک پیوست ہو جاتا تھا۔ پتوں کے درمیان آشیانوں کی محفوظ خواب گاہوں میں پرندے یوں خوفزدہ ہو کے چلاتے تھے، جیسے صبح کے لمحہ شفق کے نرم اُجالے سے نکلنے والا سورج آج یک لخت آدھی رات کو سوا نیزے پہ آگیا ہے۔

"حوالدار۔" میں نے چلا کے کہا۔ وہ مجھ سے پچاس گز کے فاصلے پر منجمد کھڑا ہوا تھا۔

"زناب عالی۔" وہ اُچھلا اور پلٹ کر دوڑا۔

"کون آیا ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"کوئی زیپ میں آیا ہے زناب۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کہ کوئی زیپ میں آیا ہے مگر یہ کون ہے؟ یہاں کس کے پاس ہے جیپ؟"

"زیپ تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ مگر آپ تو زانتے ہیں کہ آذکل چور ڈاکو بھی گھوڑوں پر نہیں آتے۔" وہ بولا۔ "پچھلے سال زب ڈاکا پڑا تھا تو زناب، لینے نمبردار صاحب کی بیٹی کی شادی تھی۔ ... تینے مہمان تھے کہ اِدھر اُدھر کے پنڈ سے دو سو بندے اور زنانیاں حویلی میں اور باہر خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور

زناب، یہ عورتیں... اللہ ان کو عقل دے... خوب گہنے پہن کر آئی تھیں... شو مارنے کے لیے... ڈاکوؤں کو سب معلوم تھا۔ چوڑیاں اور کڑے... ہار بُندے... ناک کی لونگ تک نہیں چھوڑی انھوں نے... کئی سیر سونا لے گئے۔" جیپ اب گاؤں کی طرف جا چکی تھی۔

"اچھا... اور کسی نے... میرا مطلب ہے، اتنے لوگ تھے پھر بھی ڈاکو نکل گئے۔"

"مقابلہ تو کیا تھا زناب... گاؤں کے زیالوں نے۔" وہ بولا۔ "ایک ڈاکو زخمی ہوا تو اسے اس کے ہی ساتھی ٹھنڈا کر گئے۔ گاؤں کے دو زوان مر گئے... شادی کیا ہوئی تھی... سب کی بربادی ہو گئی۔"

"تمھارا مطلب ہے رخصتی نہیں ہو سکی؟" میں نے تازہ ہوا میں سانس لی۔

"لو زی... وہ سب کچھ تو ہوا... پر زناب، اپنا نمبردار تو برباد ہو گیا نا۔" حوالدار بولا۔ "سب اس کے مہمان تھے۔ اس نے سب کا نقصان پورا کیا... ایک مربع زمین بیچی۔ پورا سال سب نے مل کر نمبردار کا نقصان برابر کیا، تب اس غریب کو زمین واپس ملی۔"

"سب نے مل کر۔ تمھارا مطلب ہے گاؤں کے لوگوں نے؟" میں نے کہا۔ "ان کا کیا قصور تھا... اور کیا زمیندار کے پاس وہی ایک مربع زمین تھی؟"

"نہیں زناب عالی... تھی تو دس مربعے... مگر نقصان تو اس اکیلے کا ہوا تھا۔" حوالدار نے کہا۔ "اور مہمان تھے وہ پنڈ کے... سب نے مل کر یہ نقصان تو پورا کرنا ہی تھا۔"

"بہت خوب... مہمان پنڈ کے اور نقصان نمبردار کا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم دس مربعے والے کو غریب کہتے ہو؟ نو تو باقی تھے اس کے... کیا وہ کم تھے اس کو کہ گاؤں والوں کو سال بھر محکومی کا ٹیکس دے کر نقصان پورا کرنا پڑا... امیر کے خزانے سے مٹھی بھر اشرفیاں نکل جائیں تو رعیت اپنا پیٹ کاٹ کر دے... اور غریب کا گھر لُٹ جائے تو...؟"

"غریب کا گھر... اس میں کیا ہوتا ہے زناب عالی... زو کوئی لُوٹے؟" حوالدار میری جذباتی موشگافی پر دم بخود رہ گیا۔

"کیا آج بھی کوئی شادی ہے؟" میں نے لاجواب ہو کے کہا۔

"ابھی تو نہیں... ابھی دو ہفتے ہیں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "ڈاکو نہیں ہوں گے سرزی... کسی کے مہمان آئے ہوں گے۔ یا کوئی بیمار ہو گا تو شہر سے ڈاکٹر کو لایا ہو گا... آپ فکر مت کریں۔ بندہ اِدھر ڈیوٹی پر موزود ہے۔"

"اور دُوسری طرف؟" میں نے کہا۔

"اُدھر بھی گارڈ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔ تھانے کے تینوں جانب اس کے ماتحت عملے کا کوئی نہ کوئی فرد چارپائی ڈالے لیٹا ہوا

میں نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا اور اندر لوٹ گیا۔ جتنی دیر میں باہر کھڑا رہا تھا میں نے محسوس کیا تھا کہ اندر ہونے والا تفتیش کا شور جتنا بند کمرے میں سنائی دیتا تھا، اتنا باہر نہیں پہنچتا تھا۔

غالب نے غالباً اس تفتیش کے دوران اپنی موجودگی کو مزید ضروری نہیں سمجھا تھا اور وہ حوالات کے باہر پڑی ہوئی ایک لمبی میز پر دراز ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ محسن اکیلا ہی سراج کی فولادی ٹوپی کو بجا رہا تھا اور اس کام میں بڑے ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اندر سراج کی حالت کیا ہو گی۔ بات پُرانی تھی مگر اس کی اذیت کا احساس تازہ لگتا تھا۔ سراج کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی... وہ اب چیخ رہا تھا اور اُچھل رہا تھا... کرب سے بلبلا رہا تھا... خدا اور رسُولؐ کے واسطے دے رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو... میں... مر جاؤں گا... مجھے بخش دو... مجھے کچھ معلوم نہیں... خدا کی قسم...۔" الفاظ اس کے حلق سے کراہ بن کے نکل رہے تھے۔

میں نے اس کے سر سے بالٹی ہٹا دی۔ "کیوں بھئی اپنے ایس پی صاحب!" میں نے سراج کے لہجے اور آواز میں کہا۔ "کیسے ہیں مزاجِ عالی؟"

"سکندر... میں... میں نے بہت ظلم کیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ خود ایسے لرز رہا تھا جیسے اسے سخت جاڑا لگ رہا ہو... وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"ظلم نہیں بھئی... یہ تفتیش ہے... تمھارا ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھ پر تمھارا بہت قرض ہے... سب ایک رات میں تو ادا نہیں ہو گا۔ پھر بھی جتنا ممکن ہوا ضرور لوٹائیں گے۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔"

تفتیش کا یہ عمل یقیناً صبح تک جاری رہتا لیکن اچانک گاؤں کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں... پہلے ایک فائر ہوا اور کسی عورت نے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کیا... رات کی خاموشی کے باعث اس کے رونے پیٹنے کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ میں اور محسن ایک ساتھ اٹھے اور باہر آگئے۔

"غالباً یہ ڈاکو ہیں۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "مجھے ابھی حوالدار نے بتایا تھا کہ کبھی کبھار وہ ادھر بھی چکر لگانے آجاتے ہیں کسی خاص موقع پر، مثلاً کسی شادی پر، جب انھیں عورتوں کے زیورات ہاتھ لگتے ہیں۔"

"اگر یہ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا۔" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو روک نہیں سکتے اور نہ انھیں مار کے بھگا سکتے ہیں۔"

"ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "آپ سوچ لیں... ایک نے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر اس گاؤں میں جو عزت کمائی تھی، وہ خاک میں مل جائے گی۔"

"عزت کا خاک میں مل جانا بہتر ہے۔" محسن نے فرمایا۔ "خود ہمارے خاک میں ملنے سے۔"

"مگر یار... یہ گاؤں والوں پر بڑا ظلم ہے... ہم اتنے بے حس ہو جائیں کہ جانتے بُوجھتے کچھ نہ کریں۔" میں نے کہا۔ "ظلم ہم پر ہو یا ہمارے کسی ہم وطن پر... ہم اسے ایم آر ایس کے منشور میں شامل سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف ڈٹ جائیں۔"

"آپ ایم آر ایس کو پنگا تحریک بنا رہے ہیں سکندرِ اعظم صاحب!" محسن نے کہا۔ "ہمارا ایک مقصد اور ایک مشن ہے، اس سے ہٹ کر ہم نے ہر جگہ پنگا لینا شروع کیا تو حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔ سوائے وفاتِ حسرت آیات کے... بے شک، سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے مگر اس کی دوا ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس تو خود اپنے درد کی دوا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ کان اور آنکھیں بند کر لے۔" محسن بولا۔ "ظالم ہر جگہ ہیں اور شیطان بھی ہر جگہ ہیں... لیکن ہم خدائی فوجدار نہیں ہیں۔"

ایک فائر اور ہوا۔ "حوالدار۔" میں نے چلا کے کہا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ابھی چند منٹ پہلے وہ پوری طرح جاگ رہا تھا، چنانچہ اس کا فوراً مدہوشی کی اتنی گہری نیند میں گم ہو جانا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

"حوالدار مکر کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنی چیخ پکار ہو رہی ہے مگر کیسے مُردہ بنا پڑا ہے۔ سالے کو ڈر ہے کہ کہیں اسے گاؤں کی طرف جانے کا ... ..."

"یہ بہترین پالیسی ہے۔" محسن بولا۔ "ہر جگہ یہ لوگ ڈاکوؤں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کے پاس کوئی نہ کوئی عذرِ لنگ ہوتا ہے... ناکافی اسلحے کا... بہت کم نفری کا... ٹرانسپورٹ کی سہولت نہ ہونے کا یا پھر قطعی لاعلمی کا... یہ جانتے بُوجھتے انجان بن جاتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں سے ان کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ سب طے شدہ پروگرام کے مطابق اور اتفاقِ رائے سے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کب آئیں گے، کدھر سے آئیں گے... کس کے گھر جائیں گے اور کیا لے جائیں گے؟ یہ سب معلومات پولیس کے پاس پہلے سے ہوتی ہیں... صرف اس لیے کہ ڈاکو اُن کا حصہ دیتے وقت ڈنڈی نہ ماریں... میں ذرا حوالدار کو خوابِ خرگوش سے جگا دوں۔"

حوالدار بھی تان کے سو رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی خفیف سی حرکت چغلی کھاتی تھی کہ وہ جاگ بھی رہا ہے۔ ہماری باتیں بھی سن رہا ہے اور غالباً نیم وا آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"حوالدار۔" محسن نے قریب پہنچ کر اور کڑک کر کہا۔ پھر اس سے قبل کہ حوالدار ہڑبڑا کے اٹھنے کی اداکاری کرتا محسن نے اُس کی چارپائی الٹ دی۔

"وہ..... آہ... بسنوی۔" حوالدار بدحواسی کے عالم میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔

"گھوڑے بیچ کے سوتے ہو گدھے کے بچے۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" محسن نے گاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے جناب عالی۔" حوالدار نے معصومیت سے مظلوم لہجے میں کہا۔ اس کی بدقسمتی کہ اسی وقت مسلسل تین فائر ہوئے۔

"تمھارے باپ آئے ہیں غالباً۔" محسن نے کہا: "تمھاری آنکھیں تو کھل گئی ہیں لیکن کان شاید ابھی تک بند ہیں۔" اس کا ہاتھ گھوما اور ایک زناٹے دار تھپڑ حوالدار کے گال پر پڑا۔ اس کے کانوں میں یقیناً سائیں سائیں ہونے لگی ہو گی۔ وہ لڑکھڑا کے گرا اور پھر فوراً کھڑا ہو گیا۔ گالیاں تو اس نے افسرانِ اعلیٰ اور عوام و خواص سب سے ہی بہت کھائی ہوں گی مگر ایسا تھپڑ کھانے کا شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔ مشکل یہ تھی کہ افسر بہت بڑا تھا اور جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کے برعکس حوالدار کمزور ہی نہیں، بے ضمیر اور بزدل بھی تھا۔ چنانچہ اس میں خودی ایک فیصد بھی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ تھپڑ کھانے کا یہ ذلت آمیز واقعہ ایک پرائیویٹ واقعہ تھا یعنی کسی کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ گاؤں میں اب پھر خاموشی چھا گئی تھی یہ بھی عجیب بات تھی۔

"معاف کر دیں جناب۔ بندہ بشر ہوں۔ نیند آگئی تھی۔"

"بکومت۔ تم مکر کر رہے تھے، تاکہ تم کو جانا نہ پڑے۔" محسن نے ڈانٹ کر کہا: "جاؤ اور دوڑتے ہوئے آؤ۔ دیکھو گاؤں میں کیا ہو رہا ہے؟"

"جناب... میرے بیوی بچے ہیں... بچے تو یتیم خانے چلے جائیں گے۔ بیوی کون سے خانے میں جائے گی۔ ڈاکو شریف آدمی نہیں ہوتے ذرا لحاظ نہیں کرتے جناب عالی۔ میں بالکل مر جاؤں گا۔ مجھے خودکشی پر مجبور نہ کریں۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

ڈاکو غالباً اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ جسے لٹنا تھا وہ لٹ چکا تھا اور اب باقی لوگ اسے تسلی دے رہے تھے یا صبر کی تلقین کر رہے تھے۔ ممکن ہے کچھ بے وقوف اسے پولیس سے رجوع کرنے اور رپورٹ لکھوانے کا مشورہ بھی دے رہے ہوں۔

"تم کو کس اُلو کے پٹھے نے پولیس میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیا تھا؟" محسن نے افسرانہ غصے میں دہاڑ کر کہا۔ میری ایک نظر گاؤں کی طرف تھی تو دوسری تھانے کی طرف۔

"میری زوجہ نے جناب۔" وہ منمنانے لگا: "وہ چاہتی تھی کہ میں فٹافٹ مر جاؤں۔ کسی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو جاؤں۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ کبھی کہتی ہے بہادر بنو۔ کبھی کہتی ہے ٹریفک پولیس میں چلے جاؤ۔ ہر طرف گاڑیاں ہی گاڑیاں ہوں گی، خوب پیسہ ملے گا۔ کمینی ذات عورت کی۔ جانتی ہے کہ کوئی نہ کوئی گاڑی مجھ پر چڑھ جائے گی۔ رشوت مانگتی ہے یا... میری وفات...."

"آخر کیوں؟" مجھے اس کی بات اور حالت پر ہنسی آنے لگی۔

"بس جی۔ اس نے شادی سے پہلے ایک یار بنا لیا تھا۔" وہ بولا: "ایک لونڈا تھا..... نہ کام کا نہ کاج کا.... دشمن اناج کا۔ شہر جا کے فلمیں دیکھتا تھا۔ گاؤں میں آ کے عاشقی کی پریکٹس کرتا تھا۔ اس کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ باپ نے مجھ سے شادی کر دی۔ مگر وہ اسے بھولی نہیں ہے۔ چاہتی ہے کہ میں مروں تو اسے موقع ملے یار کے ساتھ جانے کا۔ ابھی تو ڈرتی ہے کہ میں اُسے قتل کر دوں گا۔"

"ایسی عورت کو تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" میں نے کہا۔

"چھوڑ دوں؟ خود اپنی مرضی سے.... یعنی جی اسے جانے دوں اپنے یار کے پاس؟" حوالدار دم بخود ہو گیا۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اس لیے جاری نہ رہ سکی کہ مجھے گاؤں کی جانب سے دو سائے لپکتے دکھائی دیے۔

"ایس پی صاحب.... دُہائی ہے سرکار۔" ایک نے چلا کر ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہماری مدد کریں مائی باپ۔" دوسرا بولا۔ قریب آ کر وہ اکٹھا نیچے گر گئے۔ یہ بالکل قدموں میں سر رکھنے کا انداز تھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" محسن نے پیچھے ہٹ کر کہا: "یہ کیا بے ہودگی ہے.... سیدھے کھڑے ہو کے بات کرو۔"

وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک جوان آدمی تھا اور دوسرا بوڑھا۔

"شرم نہیں آتی تم لوگوں کو... مسلمان ہو اور جانتے ہو کہ خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔" محسن نے انھیں ڈانٹنا شروع کیا۔ "جو کہنا ہے انسانوں کی طرح کہو۔ پیر پکڑنے یا ہاتھ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ مصیبت میں پولیس سے مدد مانگنا تمھارا حق ہے اور تمھاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"وہ... سر جی...." نوجوان نے خود کو سنبھال کے کہنا شروع کیا۔ "خرکار آگئے تھے گاؤں میں...."

"خرکار یا ڈاکو؟" میں نے کہا۔

"وہ ڈاکو نہیں تھے مائی باپ...." بڈھے نے کہا: "وہ کچھ لے کر نہیں گئے۔ کسی گھر کو نہیں لوٹا انھوں نے.... پانچ جوانوں کو پکڑ کر لاری میں ڈال لیا اور بھاگ گئے۔ ان کی مائیں تو پاگل ہو گئی ہیں۔ دو بے ہوش پڑی ہیں۔ دو کو باندھ کے ڈال دیا ہے۔" "اپنے کپڑے پھاڑ رہی تھیں۔"

"لیکن تمھیں کیسے معلوم کہ وہ خرکار تھے؟" محسن نے کہا۔

"اور کوئی پانچ جوان لڑکوں کا کیا کرے گا مائی باپ؟" بڈھے نے کہا: "بس اب وہ ان کو اپنے کسی بیگار کیمپ میں لے جائیں گے۔ کھانے کو کچھ نہیں دیں گے، ماریں گے اور جانوروں کی طرح کام لیں گے۔" وہ ایک دم دہاڑیں مار مار کے رونے لگا: "ان میں میرا بیٹا بھی ہے... اس کا چھوٹا بھائی...."

اب تو جوان نے بھی بھائی کو یاد کر کے رونا شروع کر دیا۔ اب تک وہ حوصلے سے کام لے رہے تھے یا پولیس افسر کے سامنے ضبط سے کام لینے پر مجبور تھے کہ کہیں وہ شور شرابے پر خفا نہ ہو جائیں۔

"دیکھو... عقل سے کام لو... حوصلہ رکھو۔" محسن نے کہا: "مجھے اطمینان سے ساری بات بتاؤ۔ خرکار اس طرح نہیں آتے۔ وہ ڈاکے مار کر جوان آدمی اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ تم نے دیکھا تھا ان کو...؟"

"دیکھا تھا مائی باپ۔" بڈھا سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"کتنے آدمی تھے وہ؟"

"صرف دو۔ مگر ان کے ہاتھوں میں پستول تھے مائی باپ۔ اور انھوں نے گولی سے ایک لڑکے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ وہ اُن کے قبضے سے نکل بھاگا تھا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی لیکن وہ پھر بھی بھاگ گیا۔ رات کا وقت تھا اس لیے نشانہ چوک گیا۔ اللہ نے زندگی بچالی۔ باقی پانچ کو انھوں نے لاری میں ڈال لیا۔ ان میں سے ایک لاری کا ڈرائیور تھا.... دوسرا پیچھے بیٹھا تھا اس نے لڑکوں سے کہا کہ خبردار جو کوئی ہلا۔ سب آرام سے پڑے رہو۔ کسی نے سر بھی اٹھایا تو گولی مار دوں گا۔" بڈھے نے بتایا۔

"اور تم سب دیکھتے رہے۔" محسن نے برہمی سے کہا: "خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ انھوں نے کس کس کو پکڑا.... اور کہاں سے؟"

"وہ جی ایک کو انھوں نے کھیتوں سے پکڑا۔ وہ پانی لگا رہا تھا۔" بڈھے نے بتانا شروع کیا: "اسے ساتھ لے کر وہ گاؤں میں آگئے۔ اسی لڑکے سے انھوں نے پوچھا کہ کس گھر میں کون جوان لڑکا ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ پھر انھوں نے ہر دروازے پر دستک دے کر ہر لڑکے کو نام لے کر بلایا اور باہر کھینچ لیا۔ دھکے دے کر ساتھ لے گئے اور لاری میں ڈال لیا۔"

"انھوں نے کچھ کہا نہیں.... کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟" محسن نے کنفیوز ہو کے پوچھا: "گھر والوں سے کوئی بات نہیں کی؟"

"انھوں نے یہ کہا تھا مائی باپ کہ فکر کی بات نہیں.... ہمیں چار پانچ جوان اور صحت مند لڑکے چاہئیں۔" بڈھا بولا: "شور مچانے اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکے صبح تک آجائیں گے۔ لیکن مائی باپ... وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ ماں باپ شور کیسے نہ مچاتے؟ انھوں نے دو بار فائر کی.... ڈرانے کے لیے۔ ایک لڑکا بہادر تھا سب جانتے ہیں اُسے کہ وہ ہاتھ سے سانپ کو پکڑ لیتا ہے اور پٹخ پٹخ کر مار دیتا ہے۔ ایک بار اس نے کلہاڑی سے بھیڑیے کی گردن الگ کر دی تھی جو اس پر حملہ کرنے والا تھا۔ وہ چلتی لاری سے کود گیا اور بھاگ کر آگیا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی لیکن اللہ نے ہڈی بچالی اور اسی لیے وہ دوڑتا رہا۔ چونکہ جنگل تھا اس لیے درختوں کی آڑ میں رہا ورنہ وہ اور گولیاں چلاتے۔ خرکاروں کو نکل جانے کی جلدی بھی تھی۔"

"بابا جی.... میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ خرکار نہیں تھے۔" میں نے کہا: "اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لڑکے صبح تک واپس آجائیں گے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ آجائیں گے۔ اصل بات کچھ اور ہے... تم ذرا ان کا حلیہ بتاؤ۔"

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا: "میں تو کچھ نہیں دیکھ سکا۔ انھوں نے دروازہ بجایا تو میرا بیٹا گیا تھا کنڈی کھولنے۔ وہ اسے گھسیٹ کر لے گئے... وہ چلایا تو میں دوڑا... مگر لاری نکل گئی تھی۔ میں نے اسے جگایا اور باہر گیا۔ اس وقت تک گاؤں کے چھ لڑکے اغوا ہو چکے تھے۔"

"وہ پولیس والے تو نہیں تھے...؟" محسن نے پوچھا۔

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا: "وردی تو کسی نے بھی نہیں پہن رکھی تھی۔"

"کسی دوسرے گاؤں کے دشمن بھی نہیں تھے؟"

"دشمن ہر ایک کا ہوتا ہے... مگر گاؤں کا دشمن گاؤں نہیں ہوتا۔" بڈھا بولا: "وہ چھ لڑکے ایک ہی خاندان کے بھی نہیں تھے... آپس میں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر ان کا کوئی دشمن نہیں۔ سب اچھے محنتی لڑکے تھے۔"

"گویا حلیہ کسی نے نہیں دیکھا؟"

"نہیں مائی باپ... انھوں نے چہروں پر رومال باندھے ہوئے تھے۔ ڈاکو ہوتے تو ڈھاٹے باندھ کر آتے۔" بڈھا بولا: "اور ڈاکو پتلونیں نہیں پہنتے۔"

"پتلونیں....؟" محسن چونک کر بولا۔

"ہاں مائی باپ.... اتنا میں نے ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ پتلونیں پہنے ہوئے تھے۔"

"اور اوپر... قمیص... ٹی شرٹ یا کوٹ...؟" محسن نے پوچھا۔

"کوٹ جیسی قمیص تھی جناب...." بڈھے نے کہا۔

"ایک کی ٹی شرٹ تھی سر جی۔" لڑکے نے کہا۔

"اچھا.... رنگ دیکھا تھا...؟"

"پتلونیں تو کالی لگتی تھیں۔" لڑکے نے کہا: "ٹی شرٹ تھی سفید

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور قمیص دھاریوں والی.... سفید کالی یا سفید نیلی۔“

”اچھا۔ تمھارے گاؤں کے لٹنے سارے لوگوں میں سے کسی نے لاری کا نمبر وغیرہ دیکھا؟“ محسن نے پوچھا۔ ”خیر چھوڑو۔ تم واپس جاؤ اور ان سب کو بُلا لو، جن کے گھروں سے لڑکے اٹھائے گئے ہیں۔ ماؤں کو مت بلانا۔ صرف ان کے باپ آ جائیں یا بھائی ــــ اور وہ سب جنھوں نے کچھ دیکھا تھا۔ اور اُس بہادر لڑکے کو ضرور بلانا جو اپنی جان بچا کے بھاگ آیا تھا۔“

”جیسا حکم مائی باپ۔“ بڈھا پھر رونے لگا۔ ”بس میرا بیٹا مجھے واپس دلوا دو ــــ اس کی ماں مر جائے گی.... سب کے بیٹے دلوا دو.... اللہ تم کو عزت دے گا ــــ غریبوں کی دُعائیں لوگے تو سُکھ پاؤگے۔“

”چلو بابا چلو ــــ ہم آتے ہیں۔“ محسن نے کہا۔ وہ دونوں پلٹ کر چل پڑے.... ہم انھیں اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔

”یہ کیا چکر ہے آخر۔“ محسن نے بے تکلفی سے کہا۔

”وہ.... سر.... “ میں نے کھنکار کر اسے حوالدار کی موجودگی کا احساس دلایا۔ ”ہم چل کے دیکھ لیتے ہیں.... حوالدار کو آگے بھیج دیتے ہیں۔“

”ہاں.... یہ ٹھیک ہے۔“ محسن محتاط ہو گیا۔ ”جاؤ حوالدار۔ تم نے میرے احکامات سن لیے ــــ اس بڈھے کے ساتھ گاؤں پہنچ کر میرے آنے سے پہلے.... “

”ذی ذناب عالی۔“ حوالدار پوری بات سُنے بغیر دوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ دونوں کانسٹیبل بھی ہمارے پیچھے ہی موجود ہیں۔ اس نئی واردات میں ان کا دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ خود میں پولیس چوکی کے دروازے سے کافی دُور آ گیا تھا.... اور جتنی دیر شامل تفتیش رہا تھا، اپنے قیدی کی طرف سے غافل رہا تھا.... سراج کا خیال آتے ہی میں اندر لپکا....

دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے 'کمرۂ حوالات' پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔ جہاں پہلے خستہ حال اور نیم جاں سراج لیٹا ہوا تھا، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا ــــ سراج اس موقع سے فائدہ اٹھا کے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اندر جا کے دیکھا ــــ وہ جاتے وقت محسن کے کپڑے بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کے پاس کپڑے پہننے کے لیے وقت نہیں تھا.... یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ تفتیش کرتے کرتے جیپ کی آواز سن کر باہر چلے گئے اور پھر دُوسرے مُعاملات میں اُلجھے تو اپنے قیدی کو بھول گئے۔ میں پلٹا کہ باہر جا کے محسن کو یہ افسوسناک اطلاع دوں مگر وہ میرے پیچھے موجود تھا۔

”نکل گیا وہ کمینہ؟“ محسن نے مایوسی اور صدمے کے ساتھ کہا۔

”ہاں یار.... میری بے وقوفی سے۔“ میں نے کہا۔ ”بس چند منٹ کے لیے میں اس کی طرف سے غافل ہوا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر دروازے پر تھی ــــ مگر جب وہ بڈھا چِلّاتا ہوا آیا تو.... “ میں نے پھر افسوس سے سر ہلا لیا۔

”غلطی ہم سب کی ہے۔“ محسن دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کسی ایک کی ذمے داری نہیں تھی ــــ میں تو اس کی حالت کی وجہ سے تھوڑا سا مطمئن تھا کہ اب بھاگ کر کہاں جائے گا۔“

”ہم نے دروازے کو مقفّل تک نہیں کیا اور باہر آ گئے۔“ میں نے سخت مایوسی کی کیفیت میں کہا۔ ”وہ خبیث مکر کرنے میں ماہر تھا۔ کیسا مرا پڑا تھا ــــ مگر پھر ایک دم کھڑا ہو گیا ہو گا ــــ اس نے جائزہ لیا ہو گا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ کپڑے اٹھا کے دبے پاؤں نکل گیا ــــ بڈھا اور اس کا لڑکا شور کر رہے تھے۔ ہماری توجہ ان کی طرف تھی.... پیچھے اندھیرا تھا ــــ اُسے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہو گا۔“

”ہم دونوں کی تو پیٹھ تھی ــــ مگر حوالدار نے بھی نہیں دیکھا؟“ محسن نے اچانک کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یار ــــ دروازہ اس کے بالکل سامنے تھا اور کھُلی آنکھوں کے ساتھ یہ ناممکن ہے کہ کوئی اس دروازے سے نکلنے والے کو نہ دیکھ پائے۔“

”اور پھر ایک ایسے شخص کو جو برہنہ ہو۔“

”تو نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ ننگا ہی نکل بھاگا ہو گا؟“ محسن بولا۔

”کپڑے اس کے لیے غیر اہم تھے محسن.... کپڑے نہ ہوتے تب بھی وہ بھاگ نکلتا ــــ یہاں سے نکل جانے کے بعد سب کچھ اس کے اختیار میں تھا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کپڑوں کا بندوبست بھی کر لیتا ــــ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایک سیکنڈ ضائع نہ کرتا۔ اس نے بھی یہی کیا ہو گا ــــ وہ کپڑے ہاتھ میں پکڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گیا ہو گا۔ یہاں سے نکل کے بھی اس نے کپڑے نہیں پہنے ہوں گے.... جب تک اسے یقین نہیں آ گیا ہو گا کہ وہ ہماری دسترس سے دور اور محفوظ ہو چکا ہے ــــ تاریکی اس کی بہترین پناہ گاہ تھی۔“

محسن نے قائل ہو کے سر ہلایا۔ ”لیکن یار کیا وہ جسمانی طور پر اس قابل ہے کہ زیادہ دیر تک اور زیادہ دُور تک بھاگ کے جا سکے؟“

”جب آدمی موت سے بھاگتا ہے تو اس کے جسم کی توانائی کا آخری تنکا بھی ایک شہتیر بن کے سہارا دیتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب اس کی تلاش میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ محسن بولا۔

”میں نے یہ نہیں کہا مگر یہ بتا کہ ہم کدھر جائیں ــــ ہم تو جنگل کے راستوں پر دن کے اُجالے میں کوئی سراغ تلاش نہیں کر پاتے

رات کے اندھیرے میں کیا دیکھیں گے ــــ وہ ایک آدمی ہے لیکن چار سمتوں میں تین سو ساٹھ راستے ایک ڈگری کے فرق سے بنتے ہیں۔ ایک ڈگری کا فرق ایک میل کے بعد کتنا پھیل جائے گا۔ اس کا تجھے بھی اندازہ ہو گا ــــ اس کے علاوہ ہم گاؤں کی طرف جا رہے ہیں.... ایس پی صاحب.... “ میں نے کہا۔

”یار، یہ غالب ہی جاگتا رہتا تو کیا تھا ــــ مُردہ بن کے لیٹ گیا۔“ محسن نے میز پر لمبے پڑے ہوئے غالب کی طرف دیکھا۔

”اسے تو اٹھا دو صور اسرافیل پھونک کے۔“ میں نے کہا اور زور سے میز کو ہلا کے غالب کے کان میں چیخ ماری۔ ”اٹھ مُردے، قیامت آ گئی۔“

غالب اچھل کے نیچے اترا۔ ”یار قیامت آئے گی تو آسمان تو نہیں گرے گا نا ــــ یہ آخر تم، لوگوں کے چین آرام کے دشمن کیوں ہو گئے ہو؟“

”ہم جا رہے ہیں ــــ گاؤں میں ایک واردات ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس سے بڑی واردات یہاں ہو گئی ہے ــــ سراج بھاگ گیا ہے۔“ محسن نے اسے اطلاع دی ــــ غالب نے بے وقوفوں کی طرح ہم دونوں کو دیکھا ــــ اس کو ہماری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم مذاق کے موڈ میں ہیں۔ ہم نے اسے مختصراً ساری بات بتائی ــــ پھر ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔

”میرا بھی شک حوالدار پر ہے۔“ محسن بولا۔

”ہاں.... میرا خیال ہے کہ سراج نے کسی طرح اسے پیغام دیا ہو گا کہ مجھے یہاں سے نکال سکو یا نکلنے میں میری مدد کر سکو تو منہ مانگا انعام دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے، لالچی حوالدار نے پانچ دس ہزار میں سودا کر لیا ہو کہ کوشش کروں گا۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا یار ــــ“ محسن بولا۔ ”کیا خبر سراج نے اسے اپنی اور ہماری اصلیت سے بھی آگاہ کر دیا ہو ــــ اور ساتھ ہی کہہ دیا ہو کہ وہ خاموش رہے، ورنہ ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا ــــ اگر سراج نکل گیا تو حوالدار کو انسپکٹر بنوانا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا؟“

”شاید اب نہ ہو۔“ میں نے کہا، ”وہ ڈیوٹی سے بغیر اطلاع دیے غائب ہونے کے جرم میں معطل کیا جا چکا ہو گا ــــ سُندر کی موت کے بعد اس کے خلاف شکوک بڑھ گئے ہوں گے اور ایس ایس پی ضامن رضوی پوری کوشش کریں گے کہ وہ معطل ہی نہیں گرفتار بھی ہو جائے۔“

”یہ مشکل ہو گا.... اپنے سکندر صاحب۔“ محسن چلتے چلتے بولا۔ ”وہ اپنی صفائی پیش کر دے گا کہ اسے ہم اٹھا کر لے گئے تھے۔“

”اور یہ ثابت کیسے کرے گا؟“

”کچھ اور ثابت کرے نہ کرے گا۔“ محسن بولا۔ ”کہ اُسے ڈاکو لے گئے تھے.... یا وہ اسمگلروں کے تعاقب میں نکل گیا تھا اور وہاں پھنس گیا تھا۔ اسے موقع ہی نہیں ملا کہ کسی کو اطلاع دے سکتا.... اس کے پاس ہزار بہانے ہوں گے اور خود اس کے ماتحت ہی اس کی جھوٹی کہانی کو سچ بتائیں گے تو وہ فوراً بحال بھی ہو جائے گا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ حوالدار سے محتاط رہنا ہو گا۔“

”صرف محتاط رہنے سے کیا ہو گا؟“ محسن بولا۔ ”اس سے پوچھنا پڑے گا کہ اس نے سراج کو فرار ہونے میں کس طرح مدد کی.... اور کیوں مدد دی؟“

گاؤں کا مجمع نمبردار کی حویلی کے دالان میں تھا۔ متاثرہ خاندانوں کے علاوہ گاؤں کے ہر گھر کا تقریباً ہر فرد وہاں موجود تھا.... بیک وقت سب بول رہے تھے۔ [illegible] نظر آتے تھے ــــ گریہ و زاری وہ کر رہے تھے جن کے بھائی یا بیٹے اٹھائے گئے تھے۔ گاؤں کی مقامی قیادت اس غم زدہ اور بپھرے ہوئے ہجوم کو خاموش کرنے میں ناکام رہی تھی ــــ زیادہ جوشیلے جوان کلہاڑیاں، ڈانگ سونٹے اور لٹھ لے کر ڈاکوؤں کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے مگر ذی ہوش لوگ ان کو روک رہے تھے ــــ اچھی بات یہ تھی کہ خواتین کو اندر نہیں آنے دیا گیا تھا۔ ان کی فریاد و فغاں پس منظر میں مسلسل جاری رہی لیکن وہ براہِ راست اس اجتماع کے سامنے اپنے ہسٹیریائی دیوانگی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہیں، ورنہ حاضرین کی قوتِ فیصلہ بھی بُری طرح متاثر ہوتی۔

”آیئے آیئے.... ایس پی صاحب۔“ نمبردار نے پریشانی سے سر پہ ہاتھ پھیر کے کہا۔ ”آپ بھی موجود ہیں ــــ اچھا ہوا جو یہ واقعہ آپ کے سامنے پیش آیا۔“

”یہ بہت اچھا ہوا۔“ کسی نے چلّا کے کہا۔

”اوئے پاگل دے پُتر.... میرا مطلب تھا کہ کوئی معتبر گواہ تو ہے۔“ نمبردار نے دخل در معقولات کرنے والے کو جھاڑا۔

”دیکھیے، میں چشم دید گواہ نہیں ہوں۔“ محسن نے فوراً وضاحت ضروری سمجھی۔ ”نہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا ہے اور نہ میری موجودگی ہی میں.... “

”اس کا مطلب ہے تم بھی کچھ نہیں کرو گے؟“ کسی نے کہا۔

”آخر ہونا پولیس والے.... “ دوسری آواز آئی۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔“ محسن نے گرج کر کہا۔ ”جو کچھ میں نے ایک دن میں کیا، وہ آپ لوگوں نے دیکھا تھا.... اس کے باوجود تم مجھے پولیس والا ہونے کی گالی دیتے ہو ــــ جب تک مجھے ساری بات معلوم نہیں ہو جاتی، میں کچھ نہیں کر سکتا اور ایسے تو مجھے کچھ پتا نہیں چلے گا ــــ کوئی لڑ رہا ہے ــــ کوئی گالیاں دے رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے تو کوئی صرف ہنگامہ کر رہا ہے ــــ میں حکم دیتا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوں کہ یہاں صرف وہ لوگ ہیں جن کا اغوا ہونے والوں سے قریبی تعلق ہے۔۔۔ پانچ جوان اغوا ہوئے ہیں ۔۔۔ ان پانچ گھروں کے مردوں کے سوا سب باہر نکل جائیں ۔۔۔ اپنے اپنے گھر جائیں اور مجھے کام کرنے دیں ۔۔۔ اور ہاں.... وہ لڑکا جوان بدمعاشوں کی قید سے فرار ہو کے آ گیا تھا.... پہلے وہ سامنے آ جائے۔"

مجمع خاموش تو پہلے ہی ہو گیا تھا.... اب لوگوں نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن نہ کسی نے جواب دیا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔

"تم لوگوں نے سُنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟" محسن نے دہاڑ کر کہا اور ایک دم ریوالور نکال کر ہوائی فائر کر دیا.... مجمع یوں منتشر ہوا جیسے جلسہ عام میں بم پھٹ جائے ۔۔۔ دو منٹ میں وہ سب حویلی کے دالان سے نکل گئے۔ اندر کوئی دس بارہ افراد رہ گئے۔

"جاہل لوگ.... میری ایک نہیں سنتے تھے۔" نمبردار نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ خود کو تعلیم یافتہ سمجھتا ہے۔

"وہ لڑکا کدھر ہے؟" محسن نے ایک کرسی پر تشریف فرما ہو کے کہا جو ملازم اندر سے اٹھا کے لایا تھا.... دوسری پر میں بیٹھ گیا.... نمبردار صاحب میری کرسی کے آس پاس تک کھڑے رہے۔

"وہ تو.... نہیں ہے۔" کسی نے کہا۔ "حکیم صاحب اس کی پٹی کر رہے تھے۔"

"اچھا.... اسے بعد میں لے آنا۔" محسن بولا۔ "پہلے تم آؤ.... تم بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا اور کیا سُنا؟"

"او جی.... سب نہ دکھائے کسے نوں جو میں نے دیکھا۔" ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پگڑی کے کونے سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔ "ایس طرح وی کدی ہوتا ہے ۔۔۔ اتنی زندگی لنگ گئی اے.... کدی نہیں سُنا کہ بندیاں نوں کوئی ایس طرح بھیڑ بکریوں وانگ لے جاندا اے.... ظلم....!"

"دیکھو ۔۔۔ تقریر مت کرو۔" محسن بولا۔ "یہ بتاؤ تم نے دروازے پر دستک دینے والے کو دیکھا تھا؟"

"ایس طرح سر.... جیسے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔" وہ اپنی اردو پنجابی کی ملی جُلی زبان بولتا رہا۔

"ایسے تو نہیں دیکھا ہو گا.... گاؤں کی گلیوں میں اندھیرا ہوتا ہے اور میں روشنی میں بیٹھا ہوں ۔۔۔" محسن نے کہا۔ "لیکن تم کو اپنی نظر پر اتنا بھروسا ہے تو مجھے اس کا حُلیہ ناک نقشہ سب بتاؤ۔"

مقرر کو محسن کے حوصلہ شکن رویے نے کچھ مایوس کیا۔ "وہ جی.... بندہ تھا میری طرح گبرو جوان.... واہ واہ قد.... چوڑی چھاتی۔"

"بے وقوف.... اس کا قد کتنا تھا.... موٹا تھا یا دُبلا پتلا.... سر پر بال تھے یا گنجا تھا.... بال تھے تو سیاہ تھے یا سفید۔" محسن نے برہمی سے کہا۔

"وہ سر.... قد میں کیسے ناپتا....؟" وہ سر کھجانے لگا۔

"اچھا ۔۔۔ اس کا اپنا رنگ کیسا تھا ۔۔۔ مونچھیں تھیں....؟ کپڑے کیسے پہن رکھے تھے؟" محسن نے اس پر جرح جاری رکھی ۔۔۔ وہ بڑھ چڑھ کے بے تکی بات کرنے یا لن ترانیاں مارنے کا عادی تھا.... وہ بھی اندھیرے اور افراتفری کے باعث زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکا تھا ۔۔۔ محسن نے اُسے جھاڑ کے ایک طرف کر دیا اور وہ خاصا افسردہ سا زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا ۔۔۔ دُوسرے گواہوں کے بیانات سے ہم نے جو نتائج اخذ کیے ان سے ظاہر ہوا کہ اغوا کرنے والے ایک اسٹیشن ویگن میں تھے۔ اسے دیہاتیوں نے بہت بڑی جیپ قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک نے سفید ٹی شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اور دُوسرے نے نیلی سفید دھاریوں والی قمیص اور نیلی پتلون.... دونوں نے منہ پر عام قسم کے رُومال اس طرح لپیٹے تھے کہ صرف ان کا آدھا چہرہ چھپ سکا تھا۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں لیکن صُورت کے نقوش اوجھل تھے ۔۔۔ ان دونوں کی عمر پر اتفاقِ رائے تھا کہ تیس پینتیس سال ہو گی۔ قد اور وزن کے تعین کے لیے حاضرین میں سے میرا انتخاب کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ وہ پانچ فٹ دس گیارہ انچ اور ایک سو پچاس ساٹھ پونڈ کے جوان آدمی تھے ۔۔۔ انھوں نے گاڑی کو گاؤں کے کنارے آبادی کے قریب لا کے کھڑا کیا اور قریب ترین گھروں سے چھ جوانوں کو اٹھانے کا فیصلہ کیا ۔۔۔ جو نوجوان کھیتوں میں پانی لگا کے لوٹ رہا تھا وہ سب سے پہلے اٹھا لیا گیا تھا اور اسی سے پوچھا گیا تھا کہ وہ اپنے جیسے پانچ جوانوں کے نام اور گھر بتائے ۔۔۔ اس نوجوان کی خاصی ٹھکائی ہوئی تھی کیونکہ وہ چلانے لگا تھا اور تعاون پر آمادہ نہ تھا۔

اس بیان بازی میں تقریباً ایک گھنٹا صرف ہو گیا۔ پھر وہ بہادر جوان آ پہنچا جو دشمنوں کے نرغے سے نکل بھاگا تھا اور گولی کھانے کا اعزاز بھی حاصل کر چکا تھا ۔۔۔ دو افراد اُسے یوں اٹھا کے لائے کہ ان دونوں نے ایک دُوسرے کے ہاتھ کلائی سے پکڑ لیے تھے.... اس طرح ایک جھولا سا بن گیا تھا اور یہ خاصا کارآمد اسٹریچر تھا.... اس جوان کے آتے ہی واہ واہ کی آوازیں بلند ہوئیں اور کسی نے اسے "شیر دا پُتر".... بھی کہا۔ اسے محسن کے سامنے زمین پر رکھ دیا گیا بلکہ پٹخ دیا گیا۔ محسن نے اسے تھپکی دی۔

"تم واقعی بہادر آدمی ہو ۔۔۔" محسن بولا۔

"جناب! مجھے پولیس میں رکھ لیں ۔۔۔" اس نے فوراً انعام کا مطالبہ کر دیا۔

"بہادر لوگ پولیس میں نہیں جاتے۔" محسن نے رک کر کہا۔

"پھر کہاں جاتے ہیں....؟" وہ بولا۔

"تم فوج میں جاؤ جوان ۔۔۔" محسن نے کسی قسم کے وعدے سے گریز کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "اب ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ وہ کون لوگ تھے.... ان کا ناک نقشہ.... لباس، حُلیہ سب تم نے اچھی طرح سے دیکھا ہو گا۔"

اس جوان نے بھی جو کچھ بتایا وہ مختلف نہیں تھا۔

"تم نے ان کی گفتگو بھی سنی ہو گی ۔۔۔" محسن نے کہا۔

"ہاں جی ۔۔۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بیٹھے بٹھائے مصیبت پڑ گئی ۔۔۔" وہ بولا۔

"کیسی مصیبت....؟" محسن بولا۔

"یہ تو پتا نہیں ۔۔۔" لڑکا بولا۔ "بس وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے.... ایک نے کہا کہ تم اندھے ہو کے گاڑی چلاتے ہو.... دُوسرے نے کہا کہ تم خود ڈرائیور بن جاؤ ۔۔۔ دونوں بہت غصے میں تھے لیکن انھوں نے لڑکوں سے کہا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں ۔۔۔ دو چار گھنٹے کا سارا کام ہے.... تم کو پیسے بھی ملیں گے.... صبح ہونے تک تم سب واپس گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"کام کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں بتایا ۔۔۔ کہ کیا کام ہو گا....؟"

"نہیں سر جی.... لڑکے بہت ڈرے ہوئے تھے۔" وہ بولا ۔۔۔ "انھوں نے سب کو اٹھا کر زبردستی گاڑی میں ڈالا تھا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ۔۔۔" محسن بولا۔ "تم سب جوان اور صحت مند لوگ ہو ۔۔۔ وہ کیا ٹارزن تھے کہ تم کو اٹھا اٹھا کے پھینکتے رہے اور جب گاڑی میں چھ جوان ہو گئے تھے تو کیا اُس کو بھی قابو نہیں کر سکتے تھے.... جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا؟"

"یہ دیکھیں جناب ۔۔۔" لڑکے نے اپنی زخمی ٹانگ محسن کے قریب کی۔

"لاتے کھوتے.... لت پیچھے کر۔" کسی نے اس کو بدتمیزی کے اس مظاہرے پر ڈانٹا کہ وہ ایک پولیس افسر کی طرف ٹانگ پھیلا رہا ہے۔

"تمھارا مطلب ہے کہ ریوالور تھا اُس کے پاس.... اس لیے تم سب کچھ نہ کر سکے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں جی.... اس نے کہا تھا کہ پستول میں چھ گولیاں ہیں.... کسی نے سُستی کی تو وہ سب کے سر میں سوراخ کر دے گا.... یہاں۔" جوان نے پیشانی کے وسط میں انگلی رکھ کے بتایا۔

"اللہ توبہ ۔۔۔" کسی نے خوف سے جھرجھری لے کر کہا۔

"تم مجھے سمجھدار لگتے ہو.... پھر تم نے جان کا خطرہ مول کیوں لیا؟" محسن بولا۔ "کیا تم کو ڈر نہیں تھا کہ وہ پیچھے سے تم کو گولی مار دے گا؟"

"ڈر تو تھا جناب.... مگر میں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔" وہ اپنے فرار ہونے کے کارنامے کی تفصیلات بتانے لگا۔ "وہ دروازے کے قریب تھا اور میں اس کے پیروں میں ۔۔۔ اس نے اُکڑوں بیٹھ میری کمر پر رکھا ہوا تھا ۔۔۔ ایک جگہ کھڑا تھا۔ جھٹکا لگا تو وہ کچھ آگے جھکا.... میں نے اس کی گردن پر مکا مار کے اسے نیچے گرا دیا اور خود اٹھ کے باہر کُود گیا ۔۔۔ اُسے بھی اٹھنے میں دیر لگی اور مجھے بھی.... اللہ کا شکر ہے، گرنے سے میری ٹانگ نہیں ٹوٹی تھی ورنہ میں وہیں پڑا رہتا ۔۔۔ اس وقت تو میں نے کچھ نہیں دیکھا.... گرا اور اٹھ کے بھاگا ۔۔۔ گاڑی کی رفتار زیادہ نہیں تھی ورنہ ہڈیاں تو ضرور ٹوٹ جاتیں اور وہ آدمی وہیں آ کے میرے سر میں یہاں سوراخ کر دیتا۔" اُس نے دوبارہ پیشانی کے بیچ میں انگلی رکھی۔

"تم نے بہت حاضر دماغی سے کام لیا۔" محسن نے کہا۔ "کیا تم پڑھنا لکھنا جانتے ہو؟"

"ہاں جی ۔۔۔ ساتویں جماعت تک مُریدکے میں چاچے سے پڑھا تھا وہ ماسٹر ہے وہاں ۔۔۔" وہ بولا۔

"گڈ.... پھر تو تم نے گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کیا ہو گا۔" محسن بولا۔

لڑکے نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس پر نمبر تھا ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر جی کہ جہاں نمبر لکھا ہوتا ہے، وہاں کچھ بھی نہیں تھا ۔۔۔ آگے تو میں نے دیکھا نہیں.... لیکن جب وہ مجھے اندر دھکیل رہا تھا.... وہ مندری والا.... تو میں نے...."

"مندری والا....!" میں نے اور محسن نے بیک وقت کہا۔ یہ ایک غیر شعوری ردِ عمل تھا.... بالکل ایسا ہی جیسے بجلی کا جھٹکا لگنے پر ہو سکتا ہے۔

"ان میں سے ایک جو کالا بھینسا تھا جناب.... اس کے دونوں کانوں میں پیتل کی مُندریاں تھیں.... چھوٹی چھوٹی اور گول....!" لڑکے نے وثوق سے کہا۔

"اور اس کے بال چھوٹے، سخت اور گھونگریالے تھے؟" محسن نے کہا۔

"سخت کا تو مجھے پتا نہیں سر جی.... میں نے ہاتھ لگا کے نہیں دیکھے تھے لیکن چھوٹے ضرور تھے.... اور گھونگریالے بھی تھے۔" لڑکا سر ہلا کے بولا۔

"پیچھے کی طرف بنے ہوئے؟" میں نے کہا۔

"ماتھا تنگ.... موٹے ہونٹ.... چوڑی ناک۔" محسن بولا۔

"صرف ماتھا نظر آتا تھا اس کا جناب۔" لڑکے نے بوکھلا کے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "ہونٹ اور ناک تو رُومال کے نیچے تھے۔"

"کیا آپ نے اس کو شناخت کر لیا ہے؟" نمبردار نے پُرامید لہجے میں کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"ابھی کوئی کمال نہیں ہوا....!" محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو.... لیکن اس حُلیے کا ایک ہی شخص میرے ذہن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یں آتا ہے۔"

استاد پیڈرو۔ میں نے دل ہی دل میں کہا.... ذرا سی بات نے حوالدار تک غیر اہم سمجھی گئی تھی... میرے خیالات میں طوفان برپا کر دیا تھا... اگر وہ پیڈرو ہی تھا تو اس کے ساتھ دوسرا کون تھا؟ وہ اس گاؤں تک کیسے آ پہنچے تھے۔ ان کو چھ جوان آدمی پکڑ کر لے جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ پولیس حیثیت کا حوالہ [illegible] تھے؟ ایک نے دوسرے کو اندھا ہو کے گاڑی چلانے کا الزام کیوں دیا تھا؟ کیا ان کی گاڑی اُلٹ گئی تھی؟ یا گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا تھا؟ وہ کون سی گاڑی تھی؟ اس گاڑی میں کیا تھا؟ کون تھا....؟ یکے بعد دیگرے ہزاروں سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے جیسے بند گٹر کا ڈھکنا کھولنے سے سیکڑوں کیڑے فرش پر رینگنے کے لیے نکل آئیں۔

"سڑک یہاں سے کتنی دور ہے؟" محسن نے پوچھا۔ لہجے سے وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندرونی طور پر وہ بھی بہت مضطرب تھا۔

"پکی سڑک ہو گی جناب کوئی تین چار میل...." نمبردار نے کہا۔

"اچھا.... میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ گاؤں میں کسی کے پاس کچھ ہے.... گاڑی یا موٹر سائیکل؟" محسن بولا۔

نمبردار نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری گاڑی ہے لیکن وہ میرے لڑکے کے پاس رہتی ہے اور وہ ہفتے میں تین دن آوارہ گردی کرتا ہے۔ کل ہی شہر گیا ہے اور اب آئے گا کل پرسوں تک..... باقی گاؤں میں دو سائیکلیں ہیں اور دو تانگے...."

"زناب عالی....!" حوالدار نے پہلی بار لب کھولے۔ "آپ بغیر گاڑی کے کیسے پہنچے تھے یہاں....؟"

اس کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔ اس سے شک کا اظہار بھی ہوتا تھا اور اس میں تمسخر کی جھلک بھی تھی۔ یہ ایک جملہ سب کے دلوں میں شکوک پیدا کر سکتا تھا.... ایس پی اور دوسرے اعلیٰ سرکاری افسر ہم سے پہلے بھی گاؤں میں آئے تھے۔ وہ سب شاندار کاروں میں بڑے طمطراق اور جاہ و جلال سے آئے ہوں گے۔ کاریں نہ سہی سرکاری جیپ میں ضرور پہنچے ہوں گے۔ یہ کیسا ایس پی تھا، جو پیدل آیا تھا؟ وہ ایک مجرم کو گرفتار کر کے لایا تھا مگر اس کے پاس سواری نہیں تھی۔

"تم جانتے ہو حوالدار...." محسن نے سنجیدہ.... بُردبار مگر ناگوار لہجے میں کہا۔ "کہ میں اس خطرناک مجرم کے تعاقب میں تھا۔ اسے جنگل سے پکڑ کے لایا تھا۔ دن رات مجھے اس کا تعاقب کرنا پڑا تھا.... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ گاڑی میں نے کہاں چھوڑی تھی۔" جب

محسن نے اس خطرناک مجرم کے فرار ہو جانے کا ذکر نہیں کیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ فی الحال میں بھی حوالدار سے اس موضوع پر بات کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا معلوم ہے اور کتنا معلوم ہے۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے نہ چلّانے لگے کہ یہ دونوں فراڈ ہیں.... یہ جعلی ایس پی ہے.... وہ اصلی ایس پی تھا جو ان کی قید سے نکل کے بھاگ گیا۔

غالباً حوالدار خود یہ بات نہیں جانتا تھا۔ یا پھر تذبذب کا شکار تھا کہ کس کو اصلی سمجھے اور کس کو نقلی۔ ثبوت سراج کے پاس بھی نہیں تھا کہ وہ اصلی ایس پی ہے ورنہ وہ گاؤں کے اس مجمع میں ہمیں بے نقاب کر دیتا۔ حوالدار شاید اسی لیے چپ تھا کہ کہیں نقلی ہی اصلی ثابت ہو گیا تو خود اس کا کیا بنے گا۔ ابھی تو سراج غائب ہو گیا تھا اور جب تک وہ دوبارہ وردی اور ثبوت کے ساتھ ہماری جعل سازی کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے پھر نہ آتا، حوالدار کے لیے محسن کو ہی اصلی ایس پی سمجھتے رہنے میں عافیت تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ شک کے ذرا سے اظہار سے نقصان ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اصلی ایس پی کو پکڑ کے لا سکتے ہیں اور چوکی میں ننگا کر کے جوتے مار سکتے ہیں، وہ ایک حوالدار کو بڑی آسانی سے گولی مار سکتے ہیں۔

تاہم یہ سب میرے ذہن کے اندیشے تھے جو بے بنیاد بھی ہو سکتے تھے اور درست بھی..... میں اب جلد از جلد اس گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا، جہاں خطرہ بڑھنے لگا تھا۔ یہاں سے بہت قریب پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی موجود تھے اور اسی علاقے میں سراج ہماری قید سے نکل کر فرار ہو گیا تھا۔ اس کا کسی قریبی تھانے پہنچ کر اپنی شناخت کرانا اور پھر پولیس کی مسلح نفری کے ساتھ دھاوا بول دینا بعید از امکان نہ تھا۔ میرا اور محسن کا فوراً اس جگہ پہنچنا ضروری تھا، جہاں پیڈرو اور اس کا کوئی ساتھی گاؤں کے پانچ جوانوں کو اپنی مدد کے لیے لے گئے تھے۔ میرے ذہن میں دو امکانات واضح ہو رہے تھے.... یا تو وہ اپنے اسلحہ لے جانے کے مشن پر کسی حادثے سے دوچار ہو گئے تھے۔ یا وہ ہمارے تینوں ساتھیوں رابعہ، استاد ٹیڈی اور کیتھرین کو منتقل کرتے ہوئے کسی مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ اس مصیبت کی نوعیت ابھی غیر یقینی تھی مگر اس خیال سے میرا دل دھڑکتا تھا کہ رابعہ مجھ سے تین چار میل دور ہو سکتی ہے، ممکن ہے وہ زخمی ہو۔ ممکن ہے وہ زندہ ہی نہ ہو.... لیکن ممکن یہ بھی ہے کہ وہ میرے تصور سے اپنی تنہائی کو آباد کیے ہر سانس کے ساتھ مجھے پکارتی ہو۔

اگر پیڈرو کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا تعلق اسلحے کی کسی کھیپ سے تھا تو بھی ہمارا وہاں پہنچ کے دشمن کے ذخیرے پر قبضہ کرنا یا اسے تباہ کر دینا ضروری تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ سائیکل پر ہم کسی مقامی گائیڈ کی مدد سے پندرہ بیس منٹ میں سڑک تک پہنچ سکتے تھے۔ یک لخت مجھے حوالدار کا خیال آیا۔ اسے یہاں سے اپنے ساتھ گائیڈ بنا کر لے جانے میں دو فائدے تھے۔ ایک تو یہ ڈر نہیں رہتا کہ ہمارے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ عوام و خواص کے سامنے مدلل تجزیہ کر کے انھیں قائل کرے گا کہ ہم دھوکے باز تھے اور محسن ایک نقلی خود ساختہ ایس پی تھا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہم راستے میں اس سے پوچھ سکتے تھے کہ وہ سراج کے فرار کی سازش میں کس حد تک شریک ہے۔

"پھر جناب نمبردار صاحب۔ آپ وہی سائیکلیں منگوا لیں۔" محسن نے کہا۔

"بالکل ٹھیک فرماتے ہیں ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "ایک سائیکل پر میں اس بہادر جوان کو لے جاؤں گا.... جوان کو پہچانتا ہے۔ کیوں جوان، ہمت ہے نا؟"

"بالکل ہے سر جی۔" جوان کھڑا ہو گیا اور تھوڑا سا لنگڑا کر چلنے کے بعد مسکرانے لگا.... اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پیدل بھی چل سکتا ہے۔

"دوسری سائیکل پر حوالدار میرے ساتھ جائے گا۔" محسن نے اچانک اعلان کر دیا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ ایک بار پھر میری اور اس کی سوچ کے دھارے مل گئے تھے اور اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو میری خواہش سے مطابقت رکھتا تھا۔

"میں.... لیکن زناب.... میں کیسے ناؤں.... اور کیوں ناؤں آپ کے ساتھ۔" حوالدار نے واضح طور پر باغیانہ لہجہ اختیار کر لیا جس سے میرے شکوک کو زیادہ تقویت ملی کہ وہ اصلیت سے واقف ہو چکا ہے۔

"کیوں۔ ؟ تم نے پوچھا ہے کیوں؟" محسن نے یوں گرج کے کہا کہ حوالدار سمیت بہت سے لوگ اچھل پڑے۔ "تم مجھ سے سوال کرتے ہو۔ میرے حکم کو کافی نہیں سمجھتے۔" محسن نے یک لخت ریوالور نکال لیا۔ "تم نافرمانی اور بغاوت کا مطلب سمجھتے ہو حوالدار۔ پولیس میں نافرمانی کو ہی بغاوت سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا میں تم کو یہاں سب کے سامنے دے سکتا ہوں۔"

حوالدار کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ زناب اور زناب عالی سے آگے کچھ نہ کہہ سکا لیکن اس کی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ مجبور نہ ہوتا اور بزدل نہ ہوتا تو ابھی بتا دیتا کہ مجرم کون ہے۔ نمبردار نے اور چند دوسرے لوگوں نے اس کو ڈانٹا اور محسن سے درخواست کی کہ اس نادان کی غلطی معاف کر دیں..... پھر سائیکلیں آ گئیں اور محسن نے حوالدار کو ریوالور ہی سے اشارہ کیا۔ گاؤں کے لوگ ایک مہربان ایس پی کو [illegible] خون آشام موڈ میں دیکھ کر حیران و پریشان کھڑے تھے۔ وہ شاید سوچ رہے تھے کہ کیا سچ مچ ایس پی ابھی تھانہ [illegible] حوالدار کو گولی مار کے ٹھنڈا کر دے گا۔ افسر تو افسر ہی ہوتا ہے.... اس کا ہاتھ کون پکڑے گا اور گولی کو کون روکے گا۔

پھر چشمِ فلک نے ایک دلچسپ کامیڈی سین دیکھا.... جو گاؤں کے لوگوں نے کبھی تصور میں بھی نہ دیکھا ہو گا کہ ایک حوالدار جسے گولی مار دینے کی دھمکی دے کر تعمیلِ حکم پر مجبور کیا گیا تھا، ایک ایس پی کو سائیکل کے آگے ڈنڈے پر بٹھا کے جنگل کی سمت روانہ ہو رہا ہے۔ دوسری سائیکل پر میں نے بہادر مگر زخمی گائیڈ کو بٹھایا اور یوں چار افراد پر مشتمل یہ مضحکہ خیز پولیس پارٹی ایسے خطرناک مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے روانہ ہوئی جو چھ جوان آدمی اٹھا کے لے گئے تھے۔ اُن کے پاس بہت بڑی جیپ تھی.... وہ سب ٹارزن کی اولاد تھے اور مسلح تھے چنانچہ گاؤں والوں کا ہماری کامیابی کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہونا جائز تھا۔ ہم کیسے اُن کا تعاقب کریں گے۔ کیسے اُن کا مقابلہ کریں گے اور کیسے اُن کو پکڑیں گے؟ یہ سوالات.... ہمارے وسائل کے پیشِ نظر ہماری پوزیشن کو افسوسناک حد تک ناقابلِ اعتبار بناتے تھے۔

لیکن ہم بنیادی طور پر ایم۔آر۔ایس کے ارکان تھے اور اب تک عملاً ثابت کر چکے تھے کہ 'مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'۔ اسے ایم۔آر۔ایس کا 'موٹو' یا نعرہ بھی سمجھا جا سکتا تھا.... وسائل کے بغیر صرف خدا پر اور خود پر بھروسا کرتے ہوئے آتشِ نمرود میں اس یقین کے ساتھ کود جانا کہ وہ گلزار بن جائے گی، ہمارا ایمان بالیقین تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم فوراً حوالدار کو اغوا کر کے اس جگہ سے نکال لے جانا چاہتے تھے جہاں ہماری پوزیشن خطرے میں تھی۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہم پیڈرو تک پہنچنے میں تاخیر کے بالکل متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

گاؤں کے لوگ منہ کھولے ہمیں اندھیرے جنگل میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ میرے ساتھ زخمی مجاہد تھا جو ہمارا گائیڈ بھی تھا۔ چنانچہ ہم آگے تھے.... عام حالات میں سائیکل پر ڈبل سواری جرم تھا اور چالان خود پولیس کرتی تھی مگر اب پولیس خود ہی ڈبل سواری کر رہی تھی۔ ضرورت اس کا سب سے بڑا جواز بن گئی تھی۔ راستہ بہت پُرپیچ تھا اور اندھیرے میں مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے پگڈنڈی پر رہنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ناہموار راستے پر سائیکل چلانے کی مشقت الگ تھی۔ یہ ڈر الگ تھا کہ میں کسی جھاڑی میں نہ گھس جاؤں.... کسی بھیڑیے سے نہ ٹکرا جاؤں یا کسی سانپ پر سے نہ گزر جاؤں۔ کھڈے میں سائیکل سمیت سجدہ ریز ہونے کے یا سائیکل کی ہوا نکل جانے کے امکانات بھی خاصے روشن تھے۔ اُدھر جنگل میں سے عجیب و غریب جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جنگل زیادہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گھنا نہیں تھا لیکن ہوا تیز تھی اور سائیں سائیں کرتی درختوں سے گزرتی تھی تو درخت جھومتے تھے اور پورا جنگل سنسنانے لگتا تھا۔

یہ ماحول جن، بھوت اور چڑیل قسم کی ارواح خبیثہ سے ملنے کے لیے بھی نہایت سازگار تھا اور میرے ذہن میں ایسے متعدد واقعات تھے کہ (دروغ برگردن راوی) اچانک کوئی سامنے آ گیا جس کے ہاتھوں میں اپنا ہی کٹا ہوا سر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ مزید غضب یہ ہوا کہ گائیڈ نے رہنمائی کے ساتھ ساتھ میری جنرل نالج بڑھانے کے لیے گاؤں کی سینہ بہ سینہ سنائی جانے والی تاریخ کے اوراق میں سے بھوتوں کے تذکرے نکال لیے۔ پیپل کے کسی پیڑ کے نیچے کوئی راہ گیر کسی چڑیل کا شکار ہوا..... اس کی لاش بعد میں بغیر کلیجی کے پائی گئی۔ نیم کا بھوت کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ آم کے پیڑ میں کس بھوت کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ دریک کے ٹھنڈ سے جو ڈھانچہ اکثر برآمد ہو کر ڈانس کرتا ہے... وہ کس کا ہے۔ یہ سب اسی بہادر جوان نے مجھے راستے میں بتایا۔ وہ گولی سے نہیں ڈرتا تھا تو بھوتوں سے کیوں ڈرتا۔ وہ یہی ثابت کرنا چاہتا تھا مگر میں اس کی بکواس کم سن رہا تھا..... پیچھے ہونے والی گفتگو پر میرے کان زیادہ لگے ہوئے تھے جو نقلی ایس پی اور اصلی حوالدار کے درمیان جاری تھی۔

حوالدار نے دو مرتبہ آواز بلند کی مگر نہ جانے محسن نے کس طرح دبائی..... ان کے درمیان اب بات چیت شرافت کے دائرے سے باہر ہونے لگی تھی اور مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا کہ موضوع سخن کیا ہے۔ محسن اس سے سراج کے فرار کی سازش کا اقرار کرانا چاہتا تھا..... حوالدار شاید محسن سے اس کے نقلی ایس پی ہونے کا اقرار کرانا چاہتا ہوگا مگر..... دنیا میں زبردست اپنی منوا لیتا ہے... کمزور مجبور ہوتا ہے کہ اصل کو نقل اور نقل کو اصل مانے ..... حوالدار کمزور فریق تھا کیونکہ وہ بزدل تھا۔ کمزور تھا اور خالی ہاتھ تھا۔

بالآخر ایک دھما کا ہوا۔ میں نے فوراً سائیکل سے پیر نیچے لٹکا کے بریک لگائے کیونکہ سائیکل کے اپنے بریک تھے ہی نہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے حاکم و محکوم دونوں جنگل کی زمین پر سائیکل کے قریب پڑے ہوئے نظر آئے۔ پھر حاکم یعنی ایس پی اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟ سائیکل پنکچر ہو گئی سر.....؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ حوالدار پنکچر ہو گیا ہے شاید۔" ایس پی نے کہا۔ "میں آگے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اس نے اچانک حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور بس گر گیا۔"

"وہ کریلا بابا کا بھوت... " گائیڈ بولا۔ "وہ یہی کرتا ہے... جی۔ اس جھنڈی کے اوپر رہتا ہے۔" اس نے بیری کے درخت کو نظر اٹھا کے دیکھا۔

"کریلا بابا۔ اس کا بھوت کیا کرتا ہے؟" محسن بولا۔

"جو رات کو یہاں سے گزرتا ہے اس کے حلق میں کریلے کا ست ڈال دیتا ہے اور جناب وہ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ آدمی اوق کرتا ہے اور بس....." وہ بولا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ حوالدار کس طرح فلیٹ ہوا ہوگا مگر میں نے کہا۔ "آخر یہ کریلا بابا کا بھوت ایسا کیوں کرتا ہے؟ میرا مطلب ہے زبردستی لوگوں کو کریلے کا ست کیوں پلاتا ہے؟"

"جب کوئی آپ کو رات کے وقت سوتے سے جگائے بلکہ آپ کے اوپر سے سائیکل چلاتا ہوا گزر جائے تو کیا آپ اسے شربت پلائیں گے؟" زخمی مجاہد بولا۔

"اوہ... تمہارا یہ کریلا بابا یعنی اس کا بھوت بیری کے نیچے سو رہا تھا اور حوالدار گستاخ اس کے اوپر سے گزرا تو اسے سزا دی گئی۔" میں نے سر ہلایا۔ "چلو ہم بال بال بچے۔ شاید بھوت کے بیڈ سے دور تھے....."

"تم لوگ چلو۔" محسن بولا۔ "میں آتا ہوں۔ اسے لے کر آتا ہوں۔" محسن نے کہا۔ "سڑک اب کتنی دور ہے؟"

"سڑک تو وہ رہی۔ سامنے۔" زخمی نوجوان نے کہا۔

"اچھا اچھا۔" محسن نے سر ہلایا۔ "بھئی لڑکے۔ تم واقعی بہت بہادر ہو کہ بھوت سے بھی نہیں ڈرتے... کیا تم واقعی پولیس میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟"

"یس سر جی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرو، کل پرسوں یا کسی بھی دن لاہور شہر چلے جاؤ اور ایس۔ ایس پی ضامن رضوی صاحب سے مل لو۔" محسن بولا۔ "نام یاد رہے گا؟"

"ایس ایس پی... ضامن رضوی۔" وہ حفظ کرنے کے انداز میں بولا۔

"ہاں۔ نام بھول گئے تو سب گڑبڑ ہو جائے گی۔" محسن بولا۔ "ان سے مل کر کہنا کہ مجھے کبیر خان نے بھیجا ہے۔ وہ تم کو بھرتی کر لیں گے۔"

"میرا نام کبیر خان ہے۔" میں نے کہا۔ "بتا دینا کہ وہ ایس پی مرزا کے ساتھ گاؤں آئے تھے تو بات ہوئی تھی۔ اب تم جاؤ۔"

"جاؤں؟" وہ حیران ہو کے بولا۔ "واپس جاؤں؟....."

"سر یہ کیسے جا سکتا ہے... زخمی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ۔ پھر تو ایسا کرو، اسے اپنی سائیکل دے دو۔" محسن نے سوچ کر کہا۔ "یہ زخمی ہے اس لیے ہمارے ساتھ اس کو آگے نہیں جانا چاہیے۔ کیوں جوان سائیکل چلا لو گے؟"

"میں تو پیدل بھی جا سکتا ہوں سر جی۔" جوان پھول گیا۔

"نہیں نہیں۔ سائیکل لے جاؤ۔" محسن بولا۔ "ہمارا کوئی بھروسا نہیں کہ مجرموں کے تعاقب میں کہاں تک جانا پڑے۔ صبح تک ہم واپس نہ آئیں تو یہ دوسری سائیکل بھی یہیں مل جائے گی۔"

نوجوان نے بڑی عقیدت سے ہاتھ ملا کے چوما۔ ایک بار پھر پوچھا کہ اسے پولیس میں نوکری مل جائے گی اور ہمارے یقین دلانے پر خوشی میں تیز تیز پیڈل مارتا ہوا واپس ہو گیا۔

"اب یہاں سے فوراً کھسک لو دوست۔" محسن بولا۔ "اس خبیث حوالدار نے سراج سے بات کی تھی۔ اس سے پوچھا تھا کہ میں تم کو فرار ہونے میں مدد دوں تو کتنے پیسے دو گے۔ اس نے وہی جواب دیا جس کا ڈر تھا یعنی حوالدار کو بتا دیا کہ اصل ایس پی وہ خود ہے مگر اسے ان بدمعاشوں نے پکڑ رکھا ہے۔ اس کا شناختی کارڈ اور وردی سب چھین لی ہے اس لیے وہ خود کو اصلی ایس پی ثابت نہیں کر سکتا اور بول بھی نہیں سکتا ورنہ یہ لوگ قتل کر دیں گے لیکن حوالدار نے اسے نکلنے کا موقع دیا تو وہ چند گھنٹوں میں واپس آئے گا اور ان دونوں کی ایسی تیسی کر دے گا۔ اس نے حوالدار کو اپنی طرف سے دس ہزار نقد انعام دینے کا وعدہ کیا تھا اور سرکار کی طرف سے پکا تھانیدار بنانے کا یقین دلایا تھا لیکن یہ بھی کہا تھا کہ وہ خاموش رہے ورنہ مارا جائے گا۔"

"حوالدار نے خود ہی سب قبول دیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بے وقوف آدمی ہے۔" محسن بولا۔ "خود ہی مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا تم نقلی ایس پی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ شک تمہیں کیوں ہوا ہے کہنے لگا کہ کیا تمہارا نام سراج ہے؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تو بولا کہ یہ عجیب بات ہے۔ وہ بھی خود کو ایس پی سراج کہتا ہے جو حوالات میں بند ہے۔ تم بھی خود کو ایس پی سراج کہتے ہو۔ وہ تم کو بدمعاش کہتا ہے تم اسے بدمعاش کہتے ہو۔ آخر میں کس پر اعتبار کروں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم نے سراج سے بات کی تھی۔ اور کی تھی تو کیوں کی تھی؟ اس پر وہ ذرا آئیں بائیں شائیں بکنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر ریوالور اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس سے کہا کہ سائیکل چلاتے رہو اور بولتے رہو۔ جیسے ہی مجھے شک ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو میں گولی چلا دوں گا۔ سچ تمہاری جان بچا سکتا ہے۔ میں تم کو سڑک پر پہنچ کے چھوڑ دوں گا اور تم دونوں واپس جا سکو گے ورنہ یہ سمجھ لو کہ اکیلا وہ لڑکا واپس جائے گا۔ تمہارے بارے میں یہ اطلاع لے کر کہ تم بدمعاشوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔"

"مگر بدمعاش ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"یہی حوالدار نے بھی پوچھا تھا۔" محسن ہنسا۔ "میں نے اس سے کہا کہ جب ہم تمہیں گولی مار سکتے ہیں تو کیا گولی مارنے کی معقول وجہ ایجاد نہیں کر سکتے۔ تمہارا گاؤں میں کون رشتے دار ہے۔ ہم اس لڑکے کو سو روپے دیں گے تو وہ گاؤں جا کے یہی بیان دے گا اور سب کہیں گے خس کم جہاں پاک۔ تم نے آدھے گاؤں کو گنجا کر دیا ہے۔ تمہاری موت سے وہ سب خوش ہوں گے جن کے سر پہ بال نہیں۔

پھر حوالدار نے سب بتا دیا اور میں نے اسے گولی تو خیر نہیں ماری، اس کی بات ختم ہوتے ہی سر پہ ریوالور مارا اور اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہی اوق کی آواز تھی جسے ہمارے گائیڈ نے کریلا بابا کے بھوت سے منسوب کر دیا تھا کہ اس نے حوالدار کو کریلے کا ست پلا دیا تھا۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا کیونکہ حوالدار کی نظریں بدلی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے گاؤں والوں کو بھی شک ہو کہ یہ کیسا ایس پی تھا۔ ادھر سراج کی خبر نہیں وہ کب دوسرے گاؤں سے پولیس کی نفری لے کر پہنچ جائے.... گاؤں والے سب بتا دیں گے... ہمارا گائیڈ اسے بھی ادھر لے آئے گا۔"

"چل تو سائیکل اٹھا۔" محسن بولا۔ "میں حوالدار کو اٹھاتا ہوں۔"

"یار..... اس مصیبت کو کہاں لے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "اور اس سے چھٹکارا کیسے پائیں گے؟ غالب کا کیا بنے گا؟ جو وہیں پھنسا ہوا ہے۔"

"یہ بعد میں سوچیں گے۔" محسن بولا۔ "ابھی تو سڑک تک چل کے دیکھتے ہیں کہ ہینڈد کیا کر رہا ہے.... اس کے ساتھ کون ہے اور وہ گاؤں سے مین پاور کیوں لے گئے تھے۔"

محسن نے حوالدار کو سائیکل کے ہینڈل پر ڈالا اور میں نے سائیکل سنبھالی۔ یہ بہت مشکل کام تھا مگر ہم کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مین روڈ نہیں تھی بلکہ کوئی ذیلی سڑک تھی جو قصور کو آنے والی سڑک سے کسی قصبے کو ملاتی ہوگی۔ سڑک پر ہو کا عالم تھا اور وہی سناٹا تھا جو جنگل میں تھا.... دائیں بائیں تاحد نظر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"ہمارے گائیڈ کا اندازہ غلط ہو گیا؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ ہمیں شارٹ کٹ سے لایا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ گاڑی ادھر ہی آئی تھی۔"

"یار سکندر... شارٹ کٹ کو گولی مار۔" محسن بولا۔ "یہ دیکھ کہ وہ اسٹیشن ویگن کس راستے سے گاؤں پہنچی تھی۔ ظاہر ہے اس راستے سے گاڑی نہیں جا سکتی جس پہ ہم سائیکل چلا کے آئے ہیں۔"

"ہاں... ادھر تو کریلا بابا کا بھوت بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "... تو اس لاش کو سنبھال کے بیٹھ.... میں اسے دیکھ کے آتا ہوں۔"

"صرف دیکھ کے مت آ۔" محسن بولا۔ "اس سڑک یا کچے راستے سے گاؤں جا اور غالب کو لے آ۔ تجھے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی اور تم دونوں آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا اور ایسا نہ ہو کسی بڑی مصیبت میں اکیلا گرفتار ہو جائے۔"

"تو اتنی دیر کیا کرے گا؟" میں نے سائیکل سے حوالدار کو نیچے گرا کر کہا۔

"میں اس کے ساتھ ایک طرف چھپا رہوں گا۔" محسن بولا۔ "اسی جگہ سڑک کے کنارے دائیں طرف یا بائیں طرف... جیپ تو آئے گا تو میں خود باہر نکل آؤں گا ــــ جگہ مت بھولنا۔"

میں نے سر ہلایا اور سائیکل لے کر سڑک پر ایک فرلانگ گیا۔ پھر واپس آ کے دوسری طرف ایک فرلانگ جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک مجھے سو گز چل کے نظر آ گئی۔ اس پر جیپ کے ٹائروں کے نشان تازہ تھے اور میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے دیکھا تو مجھے یہ نشانات سڑک پر بھی دکھائی دیے۔ جیپ سڑک پر آ کے ادھر ہی مڑ گئی تھی، جدھر میں جا رہا تھا ــــ اس کا مطلب یہ تھا کہ محسن پیچھے بالکل محفوظ تھا اور وہیں جانا تھا تو آگے جانا تھا۔ اپنی سراغ رسانی سے مجھے تھوڑی سی خوشی ہوئی ــــ اب ہماری سمت کا تعین ضروری ہو گیا تھا اور دیکھنا صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس راستے پر پیڈرو کتنا آگے ہے۔

اس کچی سڑک پر میں نے سائیکل کو جیٹ طیارے کی طرح دوڑایا ــــ میری طبیعت جولانی پر تھی ــــ بہت عرصے بعد مجھے سائیکل پر سواری کا موقع ملا تھا اور آدھی رات کو جنگل میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے سائیکل کو ہینڈل پر پیر رکھ کے چلایا۔ پھر ہاتھ چھوڑ کے نتیجہ یہ کہ میں ایک بار سائیکل سمیت بھد سے کچی سڑک پر گرا اور باقی راستہ شرافت سے طے کرنے پر مجبور ہوا ــــ زور سے سیٹی بجانے یا گلا پھاڑ کے گانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اس کے باوجود یہ پُرلطف ایڈونچر رہا اور جب اچانک پولیس چوکی آ گئی تو میں سمجھ گیا کہ اسٹیشن ویگن جب یہاں سے گزری تھی تو میں نے اس کی آواز سنی تھی لیکن میرے باہر آنے تک اس کی ہیڈ لائیٹس دُور نظر آنے لگی تھیں۔

دونوں کانسٹیبل فراغت سے لمبی تان کر سو رہے تھے... لیکن اب انھیں ادائے فرض میں کوتاہی پر سزا دینے کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ ان کا سونا میرے حق میں نیک فال تھا ــــ اور غالب خستہ حال یوں پریشان ٹہل رہا تھا جیسے جنگل کا بھیڑیا پہلا دن چڑیا گھر کے پنجرے میں گزارتا ہے۔

"لے آ گئے تم سکندرِ اعظم کے خالو ــــ" وہ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

"شور و غوغا غل غپاڑہ مت کر ــــ" میں نے کہا۔ "باہر مرسیڈیز کھڑی ہے جو بطورِ خاص تیرے لیے بھیجی گئی ہے۔"

"بس پانچ منٹ اور تو نہ آتا تو میں بھاگ جاتا۔" غالب باہر آ کے بولا اور مرسیڈیز پر سوار ہو گیا یعنی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔

"بھاگ کے آپ کہاں جاتے...؟ میرا مطلب ہے چار سمتوں میں سے کدھر کا انتخاب کرتے؟" میں نے کہا۔ "ازراہ عنایت آپ ڈرائیور کی سیٹ پر آ جائیے۔"

"یار مجھے ڈبل سواری چلانا نہیں آتی ــــ" غالب نے احتجاج کیا۔

"مجھے بھی نہیں آتی تھی... لیکن میں نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ بھی کوشش کریں... آپ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔"

"اچھی زبردستی ہے...!" غالب نے بادلِ ناخواستہ مجھے آگے جگہ دی اور پھر سائیکل پر چڑھ گیا... "چالان ہو گیا میرا پھر؟"

"چالان کون کرے گا ــــ پولیس سو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"انھیں میں نے سونے کی اجازت دی تھی۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔ "ورنہ وہ میرے اعصاب پر سوار رہتے... اور مجھے فرار نہ ہونے دیتے ــــ میرا ارادہ تھا کہ سراج کا سراغ لگانے نکل جاؤں۔"

"ویری گڈ ــــ آپ کچھ بتا سکتے ہیں مسٹر شرلاک ہومز آف پاکستان کہ سراغ کدھر ملتا؟" میں نے کہا۔

"شرلاک ہومز کا طریقۂ کار یاد کرو... وہ کہتا تھا کہ آپ خود کو مجرم تصور کریں۔" غالب نے کہا۔ "ایک بار اس نے خود کو گھوڑا فرض کر لیا تھا اور پھر وہاں جا پہنچا تھا جہاں گھوڑا گھاس کھا رہا تھا ــــ میں بھی فرض کرتا کہ میں ہی سراج ہوں ــــ اگر مجھے فرار ہونا مقصود ہو تو مجھے کدھر جانا چاہیے۔"

"اور آپ کدھر تشریف لے جاتے؟"

"ہم اب بھی اُدھر ہی تشریف لے جا رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "سراج کو جنگل میں بھٹکنے کا کوئی فائدہ نہ تھا ــــ اُلٹا اسے ڈر ہوتا کہ ہم اسے پکڑ لیں گے ــــ وہ اُدھر گیا ہوگا جدھر کسی کے ملنے کا امکان ہو ــــ جس سے وہ مدد لے سکے۔ اگر وہ گاؤں کی طرف جاتا تو اس کو پھر تم لوگ مل جاتے چنانچہ وہ آیا ہوگا سڑک کی طرف... کہ شاید کوئی آتا جاتا مل جائے جو اسے یہاں سے دُور لے جائے۔"

"اسے کیا معلوم تھا کہ سڑک کدھر ہے؟"

"وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "اس نے بھی جیپ کی آواز سنی ہوگی اور اندازہ کر لیا ہوگا کہ جیپ کس طرف سے آئی تھی۔"

میرے جسم میں خوف کی ایک سنسنی دوڑ گئی۔ "یار غالب! تو واقعی عقل مند ہو گیا ہے ہماری صحبت میں ــــ میں تیرا مذاق اُڑا رہا تھا ــــ سراج ادھر ہی آیا ہوگا اور یار... بس قسمت اچھی تھی کہ میں تجھے لینے پہنچ گیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ راستے میں چھپا کھڑا ہوتا اور میرے سر پر پتھر یا کسی شاخ کا بنایا ہوا ڈنڈا کھینچ مارتا... میں بڑی بے فکری سے سرکس کا تماشا دکھاتا آ رہا تھا ــــ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔"

"یہ تو ا ــــ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پھر تیرے ساتھ نہیں ہوا۔" غالب نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں مرزا ــــ اب وہ نکل گیا۔" میں نے کہا۔ "اور غالباً پیڈرو سے جا ملا۔"

سائیکل کا ہینڈل ڈگمگایا اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں سڑک پر گرے ــــ میرے لبوں سے پیڈرو کا نام سن کر مرزا غالب اتنے حیران ہوئے تھے کہ اچھل پڑے تھے... اور انھوں نے ہینڈل تک چھوڑ دیا تھا ــــ جب ہم پھر روانہ ہوئے تو میں نے ڈرائیونگ کی اور مرزا غالب کو مختصراً پیڈرو کے بارے میں بتایا کہ وہ نا یا وہی گاؤں سے چھ افراد کو لے گیا تھا... اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کیوں لے گیا تھا ــــ؟ اور کہاں لے گیا تھا ــــ؟

"عجیب چکر ہے یہ تو ــــ" مرزا غالب نے کہا۔ "وہ خبیث اس گاؤں میں کیسے آ پہنچا؟"

"گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس محاورے کے استعمال کی یہاں کیا تُک تھی؟" غالب نے کہا۔

"تمھارے سوال کی بھی کوئی تُک نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھائی... معلوم نہیں تقدیر کو آگے کیا منظور ہے ــــ کیسے وقت پر سراج ہاتھ سے نکل گیا... اور اب ہمیں دیکھو کہ ہم اُدھر ہی جا رہے ہیں ــــ جدھر سراج کے ساتھ پیڈرو بھی ہے گا... اور ان کا تیسرا ساتھی بھی، جس کا نام میں ابھی نہیں جانتا مگر وہ دلاور بھی ہو سکتا ہے اور نواب خسرو جمشید بھی ــــ میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ گاؤں سے پانچ جوانوں کو لے کر کدھر گئے تھے... ممکن ہے آگے وہ ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوں۔"

"اب تو دو گھنٹے ہونے کو ہیں...؟"

"ہاں... لیکن مجھے اُمید ہے کہ وہ ملیں گے ــــ اُن کا کام لمبا اور محنت طلب تھا ورنہ وہ گاؤں تک آنے اور مزدور لے جانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ وہ خود ہی کر لیتے۔" میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان کی کوئی اسلحے کی کھیپ سڑک پر بکھر گئی ہے ٹرک کا ٹائی راڈ کھل گیا یا ایکسل ٹوٹ گیا اور ٹرک اُلٹ گیا... یا مال بردار ٹرک بے قابو ہو کے سڑک سے نیچے اتر گیا... نشیب میں چلا گیا یا کسی ایکسیڈنٹ میں ان کا مال سڑک پر گر گیا ــــ وہ دو آدمی... ٹرک ڈرائیور سمیت تین۔

ان کے لیے اسلحے کے تابوت نما بکس اُٹھا اُٹھا کے ٹرک پر لادنا بہت مشکل تھا... اگر وہ خود یہ کام کرتے تو صبح ہو جاتی۔ وہ راتوں رات کام ختم کر کے راستہ صاف کر دینا چاہتے ہوں گے... اور اسی لیے وہ قسمتی گاؤں سے لیبر فورس لے گئے۔"

"تیری بات دل کو لگتی ہے عزیزم!" مرزا غالب نے کہا۔ "ہو گی کوئی ایسی ہی بات... جو اچھی بھی ہے اور بُری بھی ــــ اچھی یوں کہ ہمیں اُن کا سراغ ملا، جن کو ہم تلاش کر رہے تھے ــــ اور بُری یوں کہ جب ہم ان سے ملیں گے تو وہ مل کر ہمارا سراغ مٹا دیں گے... پیڈرو اور سراج جیسے دشمن اور ان کے دو ساتھی مل کر چار افراد ہوئے... ایک ٹرک اسلحے کا بھی ہے ان کے پاس اور ہم اس موقع پر ٹخ ٹخ کرتے نمودار ہوں گے تو وہ اتنے خوش ہوں گے کہ ایک آدمی بڑی دردمندی سے بم پھینک کر سلامی دیں گے ــــ اب کیا خیال ہے، وہ گیدڑ اور شہر والا محاورہ ہم پر صادق نہیں آتا؟"

"آتا ہے ــــ مگر ہم مجبور ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو راہ اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے... یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم مخالف سمت میں بھاگ جائیں ــــ اس ٹٹو... سوری... مرسیڈیز کے علاوہ ہمارے پاس تین ریوالور ہیں ــــ ہم اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ سڑک پر سیدھے چلتے جائیں گے۔ ہم چھپ چھپا کے سفر کریں گے مجھے امید ہے کہ ایک میل سے پہلے وہ ضرور ملیں گے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جا چکے ہوں۔" غالب نے کہا۔

"تب بھی ان کا سراغ تو ملے گا۔"

"سراغ کا ہم کیا کریں گے؟ چاٹیں گے؟" غالب بولا۔ "گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر۔"

"ہم لکیر کے فقیر ہیں... سانپ کی لکیر پر چل پڑیں گے۔" میں نے کہا۔ "تیری باتیں تو حوصلہ شکن ہیں مگر اس سے زیادہ حوصلہ افزا رابعہ کا خیال ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا کہ تو نے اتنی دیر سے اس کی بات نہیں کی ــــ تجھے تو صرف اسی کا خیال ہوگا۔" غالب نے کہا۔ "جیسے قیس پھرتا تھا صحرا میں لیلیٰ کے اونٹ کے پیچھے... تو روانہ ہو جا اپنی لیلیٰ کے پیچھے جو بارود کے ڈھیر پر یا اسلحے کے ساتھ کسی تابوت میں ٹرک پر رواں ہے ــــ ہم مارے جائیں گے تیرے اس عشق میں ــــ بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ میں سائیکل لے کر ٹرک کے پیچھے دوڑوں... آرام سے گاڑی پکڑ کے کراچی نہ چلا جاؤں"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جہاں وہ بندرگاہ پر سنگر انداز ہے ـــ ایچ ایم ایس نازو ـــ" نہ جانے اس کی یہ بکواس کتنی دیر جاری رہتی مگر اتنی دیر میں ہم سڑک پر اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں میں نے محسن کو چھوڑا تھا ـــ وہ ایک دم ہمارے سامنے آ گیا۔

"آ گئے تم لوگ .... میں سخت پریشان تھا۔" محسن نے گھبراہٹ میں کہا۔ "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ ـــ؟" میں نے محسن کی بدحواسی دیکھ کر کہا اور سائیکل کو ایک طرف پھینک دیا۔ "آرام اور حوصلے سے بات کرو۔"

"ادھر آ جاؤ یار ـــ" محسن نے سڑک کے دوسری جانب اشارہ کیا۔

"کیا وہ حوالدار بھی بھاگ گیا؟" میں نے قیاس آرائی کی۔

"وہ .... وہ تو مر گیا یار ـــ" محسن نے کہا۔ "سڑک کے اس طرف وہیں پڑا ہوا ہے ـــ جہاں پہلے تھا ـــ" وہ اب سڑک سے نیچے اتر گیا تھا۔

"کیسے مر گیا؟ تو نے مار دیا ـــ؟" میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے باندھ کے اُدھر گیا تھا۔" اس کے ہاتھ کا اشارہ اسی سمت کو ظاہر کرتا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔

"باندھا کیسے تھا؟" میں نے کہا۔

"اسی کے کپڑے پھاڑ کر ـــ" محسن بولا۔ "میں نے سوچا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے تم آؤ گے نہیں .... کیوں نہ میں اتنی دیر میں آگے تک جا کے دیکھ لوں .... اور میں اُدھر ہی چل پڑا جدھر تو گیا تھا۔ کچی سڑک مجھے سَو سَوا سَو گز چل کے نظر آ گئی تھی ـــ میں نے غور سے دیکھا تو جیپ کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ وہ اسٹیشن ویگن اسی سمت میں گئی تھی .... میں چلتا رہا۔ پھر اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سُنی ـــ میں فوراً چھُپ گیا۔ آواز دوبارہ سُنائی دی تو میں آگے بڑھا ـــ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کراہ رہا ہو .... اور معلوم ہے میں نے کیا دیکھا .... کون تھا وہ؟"

"یار! مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" میں نے چڑ کر کہا۔ "خواہ مخواہ سسپنس مت پیدا کرو۔"

"یار .... وہ کیتھرین تھی ـــ" محسن ایک دم رُک گیا۔ "وہ سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"

میں بھی ایک دم رُک گیا .... غالب بھی ایک دم رُک گیا۔ ہمارا سانس بھی رُک گیا۔ میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ غالب کی آواز بھی بند ہو گئی۔

"وہ .... وہ زندہ ہے۔" محسن نے ہمارے سکتے کی حالت دیکھ کر کہا۔

"مگر وہ کہاں ہے؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے سرگوشی کی۔

"اُدھر .... جھاڑیوں کے پیچھے ـــ" محسن بولا۔ "میں بہت ڈر گیا تھا .... اسے اٹھا کے واپس دَوڑا اور یہاں لے آیا .... وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"چل .... چل آگے چل ـــ" میں نے کہا۔

"اس حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔" محسن چلتے چلتے بولا۔

میں پھر رُکا تو غالب مجھ سے ٹکرا گیا۔ "سانپ؟"

"ہاں یار ـــ میں کیتھرین کو پہلے اُدھر ہی لے گیا تھا۔ وہاں جا کے دیکھا تو وہ اُلٹ پُلٹ ہو رہا تھا ـــ" محسن بولا۔ "مجھے کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی ـــ دیکھا تو اتنا لمبا کالا سانپ گھاس میں غائب ہو رہا تھا۔ چند منٹ میں وہ مر گیا .... معلوم نہیں وہ کون سا زہریلا سانپ تھا ـــ پھر میں اُدھر نہیں رُکا .... اس ڈر سے کہ گاؤں کی طرف سے کوئی نہ آ جائے ـــ وہ صبح اس کی لاش کو لے جائیں گے۔"

"خوب سزا دی اسے قدرت نے۔" میں نے کہا اور نیچے جھک کر کیتھرین کو دیکھنے لگا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کے سانس کے چلنے کی رفتار میں بھی بے قاعدگی تھی۔ اس کی نبض بھی سُست تھی۔ اس کی بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن اتنا نظر آتا تھا کہ وہ زخمی نہیں ہے۔

"اب تو شک کی کوئی بات نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "وہی اِدھر سے گزرے تھے اور شاید اب بھی کہیں قریب ہی موجود ہوں گے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کے جسم پر تشدد کے نشانات ہیں۔ میں نے غور کیا تھا ـــ پرانے نیل گہرے زخم بن گئے تھے لیکن اب وہ مندمل ہو چکے ہیں۔"

"کیتھرین کے مرنے کا اندیشہ تو نہیں ہے؟" غالب نے کہا۔

"اگر اسی جگہ اس طرح پڑی رہی تو یقیناً مر جائے گی۔" محسن بولا۔ "اسے فوراً طبّی امداد ملنا چاہیے۔"

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ملے گا .... اور جو قریب ترین ہے وہاں اب ہم لوٹ کر نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔

"صبح تک انتظار کرنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے .... ہو سکتا ہے کہ صبح کوئی ٹرانسپورٹ مل جائے۔" محسن نے کہا۔ "جو اسے لاہور پہنچا سکیں۔"

"میں اسے سائیکل پر ڈال کے نہ لے جاؤں؟" غالب نے کہا۔

"کیا فائدہ ـــ یہاں آرام سے لیٹی ہوئی ہے .... ایسا نہ ہو کہ راستے ہی میں مر جائے۔" میں نے کہا۔ "بظاہر مجھے کوئی تشویش کی بات نظر نہیں آتی۔"

"مجھے تشویش اس بات پر ہے کہ اسے یہاں کیوں پھینک دیا گیا تھا۔" محسن بولا۔ "وہ خبیث اسے ساتھ لائے تھے تو ساتھ رکھ سکتے تھے۔"

"میدانِ جنگ کی تاریخ میں ایسے حوالے ملتے ہیں کہ کہیں بہت زیادہ قیدی ہاتھ آ گئے اور ان کو اسیر رکھنا مسئلہ بن گیا کیونکہ جتنا راشن فوج کے لیے ضروری تھا وہ قیدی کھا جاتے تھے چنانچہ ایک حکم کے ذریعے بوڑھوں، کمزوروں یا بیماروں کو قتل کرا دیا گیا ـــ پھر چودہ اور سولہ سال کے لڑکوں کو .... صرف جوان اور تندرست باقی رہے جو غلامی کی مشقت جھیل سکتے تھے اور جن کو راشن پانی دے کر کام لیا جا سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے اس کمزور اور بیمار بڑھیا کو وہ بے مصرف سمجھ کر پھینک گئے ہوں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں ـــ بے کار بوجھ اٹھائے پھرنے سے کیا حاصل ....؟"

"مگر کیتھرین کے ذریعے وہ اپنا دباؤ برقرار رکھ سکتے تھے۔" غالب نے مجھ سے اختلاف کیا۔ "ان کے ہاتھ میں تین پتے تھے۔ رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین ـــ اور وہ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے سب کی زندگی اور آزادی یکساں اہمیت رکھتی ہے .... وہ ایک پتّا ضائع کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔"

محسن نے بھی اس کی تائید میں سر ہلایا۔ "غالباً کیتھرین موقع پا کے خود کسی گاڑی یا ٹرک میں سے کود گئی .... یہ بے ہوشی اسی کا نتیجہ ہے۔"

"کیا انھیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ ایک قیدی فرار ہو گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ممکن ہے معلوم ہوا ہو .... اور انھوں نے گاؤں سے پانچ آدمی اسی لیے حاصل کیے ہوں کہ مفرور قیدی کو تلاش کریں ....؟" غالب نے کہا۔

"پھر کیتھرین انھیں ملی کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "جب کہ وہ محسن کے بیان کے مطابق سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔"

"صحیح بات تو خود کیتھرین ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکے گی۔" غالب نے کہا۔ "لیکن میرے نزدیک محسن کی بات میں وزن ہے۔ کیتھرین نے اگر کسی تیز رفتار ٹرک میں سے چھلانگ ماری ہو گی تو وہ سڑک پر گرتے ہی جنگل میں غائب ہو گئی ہو گی۔ اس ڈر سے کہ شکاری اسے تلاش کرتے ہوئے ضرور آئیں گے ـــ کیتھرین آسانی سے اُن کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی .... یہ بھی کیتھرین ہوش میں آ کے بتلائے گی کہ اس کے ساتھ رابعہ اور ٹیڈی بھی تھے یا نہیں۔ اگر تھے تو انھیں لے جانے والے کون تھے اور کہاں لے جا رہے تھے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ کسی طرح کیتھرین اپنے بندھن توڑنے میں کامیاب ہو گئی اور موقع پاتے ہی ٹرک یا گاڑی سے باہر کود گئی۔ کچھ دیر جنگل میں رُوپوش رہی لیکن جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو وہ پھر سڑک پر آ گئی۔ وہ جنگل میں پڑی رہتی تو اسے کون دیکھتا ـــ مرنے کے بعد اس کی لاش کو بھی چیل کوّے اور جنگلی جانور کھا جاتے .... سڑک پر ایک امکان تو تھا کہ اسے کوئی اٹھا لے گا۔ اٹھانے والے خود شکاری ہوں گے تو اس کی بدقسمتی ـــ کسی اجنبی نے اٹھا لیا تو کہیں نہ کہیں ضرور لے جائے گا ـــ جہاں وہ محفوظ ہو گی۔"

مجھے غالب کی دلیل نے قائل کر لیا۔ "شاید اسی لیے وہ گاؤں کے پانچ چھ جوانوں کو لے گئے ہوں گے ـــ وہ خود جنگل میں کہاں کہاں جاتے .... اور جاتے تو یہ ڈر بھی ہوتا کہ راستہ بھول جائیں گے .... چنانچہ انھوں نے مقامی افراد کی خدمات حاصل کرنا بہتر سمجھا جو اس جنگل کے راستوں سے واقف ہوں ـــ کم سے کم چار وہ خود تھے .... چھ کے بجائے ان کو پانچ آدمی ملے مگر اس طرح وہ نو افراد ہو گئے۔ جن کے لیے جنگل کو چھاننا نسبتاً آسان تھا۔"

"یار! ان قیاس آرائیوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟" محسن نے کہا۔ "یا تو کیتھرین کے لیے کچھ کرو یا آگے چل کے انھیں دیکھو۔"

"تم کیتھرین کو کندھے پر ڈال کر لے جا سکتے ہو؟" غالب بولا۔

"کہاں؟ لاہور؟"

"نہیں ـــ اُدھر چلے جاؤ ـــ آبادی سڑک کے ایک طرف تھی تو دُوسری طرف بھی ہو گی .... صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ یہاں کھیت بھی ہیں .... کسان نظر آ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔

"میں اسی جگہ صبح کا انتظار کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو تم ذرا چھُپ کر رہو ـــ میں اور سکندر آگے جاتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"یار .... ایسے اکیلے اکیلے مَت جاؤ .... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی بچھڑ جائیں جیسے دوسرے بچھڑے ....۔" محسن بولا۔ "پہلے ماں باپ بچھڑے .... پھر دوست مہربان بچھڑے، جیسے انکل رضوی اور اکرم شیخ .... اس کے بعد نازو اور شہلا نے ساتھ چھوڑا .... رابعہ اور ٹیڈی بچھڑے۔"

"کیا ہو رہا ہے تجھے ـــ قنوطیت کا مرض یا نروس بریک ڈاؤن؟" میں نے کہا۔ "ملنا بچھڑنا تو زندگی کے کھیل ہیں .... خدا نے چاہا تو سب بچھڑے ہوئے ملیں گے ـــ انتظار کیے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

صبر کی سفر طے ہے ــــ وقت پہلے ایک سا نہیں رہا تو آگے کیوں ہو گا ــــ دن رات ہمیشہ ایسے نہیں ہوں گے... جہاں تک ماں باپ کا تعلق ہے تو انھیں خدا نے بُلا لیا ــــ اس کی مرضی۔ شہلا تو خیر سے اپنے ہی گھر میں ہے ــــ نازو بھی بھائی کے ساتھ ہمارے انتظار میں ہے ــــ کیتھرین واپس آ گئی ہے۔ رابعہ اور ٹیڈی کو بھی ہم لے آئیں گے ــــ ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو جو ہمارے حوصلے بھی کم کریں۔"

"خفا مت ہو یار ــــ بس میں ڈرنے لگا ہوں وقت سے۔"

محسن بولا "ہم چاروں کوشش تو کر سکتے ہیں ساتھ رہنے کی۔"

میں اسے کوئی جواب ضرور دیتا لیکن روشنی کا ایک کوندا سا لپکا اور... ہم سب اچھل پڑے۔

"یہ کیا تھا....؟" میں نے اٹھتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

"....میں تو سمجھا تھا... بجلی چمکی ہو گی ــــ مگر بادل دور دور تک نہیں" محسن بولا۔

غالب نے مشرق کی جانب اشارہ کیا ــــ درختوں کے اوپر روشنی کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو رہی تھی ــــ ہم سب ایک ساتھ سڑک کی جانب لپکے ــــ اتفاق رائے سے ہم سب کے ذہن نے ایک ہی بات سمجھ لی تھی ــــ روشنی کسی گاڑی کی تھی۔ پہلی بار وہ کوندا سا اس لیے نظر آیا تھا کہ گاڑی نے کوئی موڑ کاٹا تھا اور اس وقت سڑک بلندی پر تھی ــــ اب وہ گاڑی ہماری طرف آ رہی تھی اور اس کی ہیڈ لائیٹس نے درختوں کے اوپر اُجالا کر دیا تھا ــــ جھٹکوں سے گاڑی اوپر نیچے ہوتی تھی تو روشنی کم زیادہ ہوتی نظر آتی تھی۔

"ایسے بے وقوفوں کی طرح سڑک پہ دوڑنا مت شروع کر دینا" غالب نے کہا۔

"تم ادھر سڑک سے دس گز دور رہو" محسن بولا "میں دُوسری طرف اتنے ہی فاصلے پر رہتا ہوں ــــ آگے بڑھتے جاؤ۔ گاڑی ہمیں اس جگہ سے جتنا آگے ملے اچھا ہے۔"

"سکندر تم ہم دونوں کے پیچھے آؤ ــــ دونوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کور فراہم کرو" غالب نے کہا "کیا معلوم کس کی گاڑی ہے۔"

"اگر... اگر یہ وہی ہوئے ــــ شکاری ــــ" میں نے ڈرتے ہوئے کہا ــــ "تو ہم کیا کریں گے؟"

"ماریں گے یا مر جائیں گے" غالب نے جھنجلا کے کہا...

"تیسری صورت صرف یہ ہے کہ دم سادھ کے لیٹ جائیں اور گاڑی کو گزر جانے دیں۔"

محسن سڑک پار کر گیا تھا اور میں اس کے سائے کو درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھتا دیکھتا رہا ــــ غالب کے اور

میرے درمیان بھی اب دس گز سے زیادہ فاصلہ ہو گیا تھا ــــ وہ دونوں پوری احتیاط کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے لیکن راستہ بہت دشوار تھا ــــ گاڑی اب بہت قریب آ چکی تھی ــــ اس کی ہیڈ لائٹس صاف نظر نہیں آتی تھیں لیکن انجن کی آواز سُنائی دینے لگی تھی۔ یہ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی محسوس ہوتی تھی۔ غالباً آگے کوئی موڑ تھا... اچانک غالب کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے گرا ــــ اسی وقت میں نے گاڑی کی روشنی دیکھی۔

صرف ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک خاصا بڑا پتھر اٹھا لیا ــــ امکانات ہر صورت میں برابر تھے۔ یہ گاڑی وہی ہو سکتی تھی جس میں پیڈرو اپنے ساتھ کیتھرین کو لے کر کہیں جا رہا تھا اور اسے پھینکنے پر مجبور ہو گیا تھا یا وہ خود جان کی پروا نہ کرتے ہوئے گاڑی میں سے چھلانگ لگانے پر مجبور ہو گئی تھی ــــ اگر ٹیڈی اور رابعہ بھی اسی گاڑی میں تھے تو غالباً یہ گاڑی انھیں کسی محفوظ قید خانے میں چھوڑ کے واپس آ رہی تھی... ایسی صورت میں میرا سڑک کے کنارے کھڑا ہو کے گاڑی کو رُکنے کا اشارہ کرنا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ گاڑی میں شکاری نہ ہوں مگر ڈرائیور جنگل میں گاڑی روکنے کا خطرہ مول نہ لے.... گاڑی کے قریب آنے تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے ــــ اگر اس میں شکاری ہوں گے تو میں پلٹ کر جنگل میں فرار ہونے کی اور خود کو باقی ساتھیوں سے دُور لے جانے کی کوشش کروں گا.... شاید میں درختوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں یا کسی درخت پر چڑھ کے بچ جاؤں ــــ وہ گاڑی چھوڑ کر زیادہ دیر تک اور بہت اندر آ کے مجھے تلاش نہیں کریں گے ــــ اگر یہ کسی عام آدمی کی گاڑی ہو گی تو خود ہی رُک جائے گی۔

گاڑی بالکل میرے سامنے تھی جب میں نے وہ لاش دیکھی جس سے ٹھوکر کھا کے غالب گرا تھا لیکن اب اس کے بارے میں غالب سے بات کہنے کا وقت ہی نہیں تھا ــــ میں نے ہاتھ گھما کے پتھر پھینکا جو گاڑی کے بونٹ پہ بڑے زور سے لگا ــــ چند انچ کے فرق سے ونڈ اسکرین بچ گیا ورنہ شیشہ بالکل ریزہ ریزہ ہو کے بکھر جاتا۔ کچھ پتھر کی رفتار تھی جو ایک سمت میں جا رہا تھا ــــ گاڑی مخالف سمت سے آئی، چنانچہ پتھر دُگنی قوت کی رفتار سے لگا اور بونٹ پر ایک دھماکا ہوا ــــ یہ صبح کاذب سے پہلے کا وقت تھا ــــ اب ہوا بھی تھم چکی تھی اور جنگل آخر شب کے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس خاموشی میں یہ آواز مجھے کچھ زیادہ ہی اونچی لگی ــــ پلک جھپکتے میں گاڑی میرے سامنے آ گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا ــــ یہ دُودھ لانے لے جانے والا ٹرک تھا ــــ نئے ماڈل کا بیڈ فورڈ ٹرک

جس کے پچھلے حصّے پر دُودھ کے ڈرم تین منزلوں میں ایک کے اوپر ایک رکھے گئے تھے ــــ لوہے کے فریم پہ تختے لگا کے ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ڈرم اٹھائے بغیر کھسکا کے آگے پیچھے کیے جا سکتے تھے اور دو اضافی فلور بنانے سے ٹرک میں دُودھ لے جانے کی گنجائش تین گنا ہو گئی تھی۔

پتھر لگتے ہی گاڑی لہرائی اور کچھ بے قابو ہوئی مگر ڈرائیور نے اسے سنبھال لیا۔ اس سڑک پہ سے وہ ہر روز گزرتا ہو گا... اور بے فکر خالی راستے پر اسے کوئی بھی نہیں ملتا ہو گا ــــ بم کی طرح پھینکے جانے والے پتھر کے دھماکے سے اس کا بدحواس ہو جانا اور بوکھلا جانا برحق تھا ــــ ٹرک کو روکتے ہی وہ ایک زبردست گالی دے کر نیچے اُترا ــــ اسی وقت میں سڑک پر آ گیا۔

"توں ماریا سی وٹّا ــــ؟" وہ مشتعل ہو کے میری طرف بڑھا۔

"ہاں.... پتھر میں نے سڑک پر پھینکا تھا" میں نے بھی پنجابی میں ہی جواب دیا "تم کو کیا ضرورت تھی بیچ میں ٹرک لے کر آنے کی۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "توں.... توں پاگل تے نئیں؟"

"نہیں" میں نے کہا "چلو ناراضگی چھوڑ دو ــــ ایک پاؤ تازہ دُودھ تو دو۔"

اس نے مجھے ایک گالی اور دی اور آگے بڑھا "بیڑا غرق کر دیا گاڈی کا اور اوپر سے مذاق کرتا ہے۔"

میں نے اطمینان سے ریوالور نکال لیا "یہ مذاق نہیں ہے پہلوان۔"

اس کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ وہیں منجمد ہو گیا "کیا... کیا چاہیے تم کو.... میرے پاس.... یہ سوا سو روپے ہیں ــــ"

غالب میرے ساتھ ہی نکل آیا تھا.... دوسری طرف سے محسن پولیس کی وردی میں نمودار ہوا تو پہلوان کی حالت غیر ہو گئی۔

"معاف کرنا پہلوان" میں نے کہا "کہ تمھیں روکنے کے لیے ہم یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے.... ہم گولی مار کے ٹائر پھاڑتے تو شاید ٹرک الٹ جاتا۔"

"لیکن.... میری غلطی جناب ــــ" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

"گھبراؤ نہیں ــــ" محسن نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ــــ "یہاں کچھ قاتل اور ڈاکو آ گئے ہیں.... اور چند وارداتیں بھی ہوئی ہیں ــــ ہم صرف تفتیش کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔"

"کیسی وارداتیں؟ اور میرا کیا تعلق جناب....؟"

وہ ہکلانے لگا۔

"تم سے جو پوچھا جائے اس کا جواب دو" محسن نے ڈانٹ کر کہا "یہ بتاؤ، تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"اِدھر سات میل دُور موضع ڈالیاں خورد سے" وہ بولا۔ "میں روز اسی وقت دُودھ لے جاتا ہوں۔"

"اِس سات میل کے راستے پر تم نے کوئی گاڑی دیکھی؟" میں نے کہا۔

"گاڑی.... کیسی گاڑی جناب؟"

"کوئی ٹرک یا بس، ویگن.... کار یا جیپ....؟" میں نے کہا۔

"دیکھی تو ہے ــــ" وہ بولا "جب میں پکّی سڑک سے کچھ دُور تھا تو ایک گاڑی دوسری طرف جا رہی تھی ــــ" وہ بولا "اس کی بتیاں نظر آئی تھیں۔"

"اس سے تمھیں کچھ اندازہ نہیں ہوا؟" میں نے کہا "کہ گاڑی چھوٹی ہے یا بڑی.... کار اور ٹرک میں تو بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں جی ــــ کار تو خیر وہ نہیں تھی" وہ بولا "اس کی بتیاں اونچی ہی تھیں.... میرا خیال ہے کہ وہ لاری تھی ــــ پتہ نہیں ادھر تو اس وقت کوئی مسافروں والی لاری نہیں جاتی ــــ ہو سکتا ہے کسی کی جنج ہو یا.... رب خیر کرے... کسی کی میّت آئی ہو ــــ آگے بھی پنڈ ہیں...."

"تمھارا گاؤں ڈالیاں خورد سڑک سے کس طرف ہے؟"

"اِدھر سے جاتے ہوئے کھبے ہتھ پر" وہ بولا "دو میل کا کچا راستہ ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ وہ لاری تمھارے گاؤں میں نہیں گئی ہو گی؟"

"نہیں جناب.... ڈالیاں خورد جانے کا تو وہی ایک راستہ ہے جس پر میں آ رہا تھا" وہ بولا "وہ لاری یا تو سنگرالی گئی ہو گی یا پھر.... اس سے آگے فضل پور رہ گیا ہے.... یا جوگی ڈیرا ہے۔"

"اچھا... اِدھر آؤ میرے ساتھ...." میں نے کہا اور سڑک سے کوئی دس گز اندر وہاں لے گیا جہاں ایک لاش پڑی ہوئی تھی "یہ کون ہے؟"

گوالے کا رنگ لاش دیکھتے ہی فق ہو گیا تھا "یا رب جی خیر.... آج تو سویرے سویرے وخت پڑ گیا ہے ــــ بادشاہو میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ کون ہے....؟"

"تم اس علاقے کے رہنے والے ہو... لوگوں کو پہچانتے نہیں ہو....؟"

"قسم ہو مینوں رب کی تھانیدار صاحب.... میں نے اسے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پہلے نہیں دیکھا۔۔۔ میں تو اپنے سارے پنڈ کے ہر بندے کو نہیں پہچانتا۔۔۔ خیر یہ کس پنڈ کا تھا۔۔۔؟"

"تم دیکھ رہے ہو کہ اسے قتل کیا گیا ہے ۔۔۔ یہ دیکھو گولی کا نشان ۔۔۔ یہ ہے کوئی دیہاتی۔" میں نے کہا۔ "کیا سڑک پر آگے تم نے کسی کو فرار ہوتے دیکھا تھا۔۔۔؟ جھوٹ مت بولنا۔۔۔"

وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس نے سڑک پر کسی کو بھی نہیں دیکھا۔

"اچھا ۔۔۔ کہیں ایسی ہی کوئی لاش دیکھی؟"

"لاش!" وہ اچھل پڑا ۔۔۔ "توبہ توبہ۔۔۔ یہ بھی آپ نے دکھائی ہے ورنہ میں تو گاڑی چلاتے ہوئے سڑک پر نظر رکھتا ہوں۔۔۔ اور بھی کوئی مارا گیا ہے کہیں۔۔۔؟"

"ہاں بھئی۔۔۔۔ اندازہ ہے کہ اس واردات میں پانچ افراد کو قتل کیا گیا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ایک پولیس کا حوالدار بھی غائب ہے۔"

"چھ۔۔۔ چھ بندے۔۔۔ کوئی زمین کا جھگڑا تھا۔۔۔ یا زن کا۔۔۔"

"وہ ڈاکو ہیں ۔۔۔ جیل سے فرار ہوئے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اطلاع ملی تھی کہ ادھر آئے ہیں ۔۔۔ ہم نے ناکا بندی کی مگر وہ کم بخت ہماری گاڑی لے کر فرار ہو گئے ۔۔۔ خیر اب تم بڑے وقت پر آئے۔۔۔۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے ۔۔۔ چلو بھئی ۔۔۔" محسن نے مجھے بڑے رعب سے اشارہ کیا۔

"کیا۔۔۔ کیا میری گاڑی۔۔۔" گوالا پریشان ہو کے بولا۔ "مجھے یہ دودھ پہنچانا تھا جناب۔۔۔"

"دودھ کا بچہ۔" محسن نے گرج کر کہا۔ "تیرے نزدیک اس دودھ کی قیمت انسانوں کے خون سے زیادہ ہے؟ آگے وہ نہ جانے کتنے انسانوں کی جان لیں گے ۔۔۔ ان کو روکنا بہت ضروری ہے ۔۔۔ بھئی اسے سمجھاؤ۔"

"دیکھو پہلوان!" غالب نے دودھ والے کو ایک طرف لے جا کے سمجھانا شروع کیا۔ "یہ تو ایس پی صاحب بہت نیک دل اور شریف آدمی ہیں۔۔۔ ورنہ اتنے بڑے افسر کے سامنے زبان چلانے والوں کی زبان کاٹ دی جاتی ہے ۔۔۔ یہ گاڑی اب سرکاری ڈیوٹی کے لیے استعمال ہوگی۔ دوسرے افسر تو جسے چاہیں بیگار میں پکڑ لیتے ہیں مگر یہ ایس پی صاحب کسی کا نقصان نہیں کرتے اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے ۔۔۔ تمہارا دودھ ضائع ہوگا تو ۔۔۔ تم کو اس دودھ کی پوری قیمت مل جائے گی۔"

"پوری قیمت ملے گی ۔۔۔ پھر تو کوئی بات نہیں۔" گوالا نے کہا۔ "گاڑی حاضر ہے سرکار۔۔۔ مگر آپ کو اس طرح ہم مانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالا۔۔۔۔ یہ سراج کا مال تھا۔ "یہ سو روپے اس نقصان کے جو پتھر پھینکنے سے ہوا۔ دودھ کی مالیت بتاؤ۔"

"دودھ۔۔۔؟" وہ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولا۔ "ساڑھے تین۔۔۔ نہیں۔۔۔ چار سو۔۔۔ کچھ اوپر۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اصل لاگت تین سو ہوگی تو اس نے ساڑھے تین کہے۔۔۔۔ وہ اسے کم لگے تو اس نے چار سو کہے ۔۔۔ پھر سوچا کہ کچھ اور بھی مانگنے میں ہرج کیا ہے۔ لوڈنگ میں استعمال ہونے والے ٹرک پر ڈینٹ پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اس نے ایک پتھر لگنے کا جرمانہ سو روپے خوشی خوشی رکھ لیا ۔۔۔ اسے مزید خوش کرنے کے لیے میں نے دودھ کی قیمت کے بھی پانچ سو پیش کیے تو اس کا سارا گلہ شکوہ جاتا رہا۔

"اب ذرا دھیان سے میری بات سنو۔" غالب بولا۔ "تم ایک خطرناک سرکاری مہم میں شریک ہو۔۔۔ خطرہ سب کے لیے برابر ہے لیکن زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان بدمعاشوں کو پکڑ لیں گے ۔۔۔ تم کو کچھ نہیں کرنا ہے سوائے اپنا منہ بند رکھنے کے ۔۔۔ جو کچھ تم دیکھو گے اس کے متعلق نہ آج ہم سے کوئی سوال کرو گے اور نہ آج کے بعد کسی سے کچھ کہو گے۔۔۔ اگر تمہاری زبان بند نہ رہی تو معلوم ہے کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا جی ۔۔۔؟" گوالا ڈر گیا۔

"وہ قاتل تمہارے پیچھے لگ جائیں گے ۔۔۔" میں نے کہا۔ "جب بات ایک زبان سے نکلتی ہے تو دس کانوں تک پہنچتی ہے اور دس زبانوں سے نکلتی ہے تو سو کان سنتے ہیں ۔۔۔ ان خطرناک قاتلوں کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بھی پولیس کے ساتھ تھے اور وہ کسی دن رات کو تمہارے گھر آ جائیں گے۔"

"تمہاری بھیڑ بکریاں ۔۔۔ مرغیاں ۔۔۔ گائے بھینس اور بیوی بچے سب کاٹ کر رکھ جائیں گے۔" غالب نے اسے ڈرانے کے لیے کہا۔ "اور اگر وہ نہ پہنچے تو پولیس پہنچ جائے گی ۔۔۔ تم کو گرفتار کر لیا جائے گا کہ تم نے سرکاری راز کو راز نہیں رکھا۔"

"میری توبہ۔۔۔ میرے باپ کی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اچھا اب تم پیچھے بیٹھو گے۔" میں نے کہا۔ "جگہ ہے نا۔۔۔؟"

"جگہ بہت جناب ۔۔۔ ایک پورا تختہ درمیان میں خالی ہے۔ مجھے آگے سے بھی دودھ اٹھانا تھا۔" وہ بولا۔

اس کے بعد معاملات آسان ہو گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو پیچھے لے گیا۔۔۔ سو گز پیچھے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر میں جنگل میں گیا اور کیتھرین کو اٹھا لایا ۔۔۔ محسن اور غالب نے اسے خالی تختے پر لٹا دیا۔

گوالا جو ایک لاش دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا اسے دوسری لاش سمجھا مگر غالب نے اسے بتا دیا کہ اس عورت کو ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن پولیس کی مداخلت سے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور سڑک پر گرا کر بھاگ گئے۔

"اس بڑھی عورت کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟" گوالا حیران ہوا تو ٹھیک ہوا کیونکہ دیہاتوں اور شہروں سے عام طور پر جوان لڑکیاں ہی اٹھائی جاتی ہیں۔

"بھئی یہ مال دار عورت ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "ڈاکو اس کے بعد ان کے وارثوں سے پانچ دس لاکھ روپے مانگتے۔"

"اور وہ نہ دیتے تو۔۔۔؟"

"تو اسے قتل کر کے پھینک دیتے۔" میں نے کہا۔

اس نے دونوں گالوں کو ہاتھ لگایا۔ "یا رب جی توبہ! ایسی بڈھی عورت نوں قتل کر دیتے۔۔۔ کیسا زمانہ آگیا اے؟"

"اچھا اب تم نیچے آؤ۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم سے ایک بات کرنا ہے۔"

جنگل میں ایک جھاڑی کے پیچھے لے جا کر میں نے اس سے کہا۔ "اپنے یہ کپڑے مجھے دے دو۔"

"اور میں۔۔۔ میں خود کیا پہنوں؟" وہ پھر بھونچکا رہ گیا۔

"تم میرے کپڑے پہن لو بھئی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "دراصل اب ہم بھیس بدل کر ان کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ وہ ہمیں پہچان گئے ہیں ۔۔۔ ہمیں دیکھتے ہی گولیاں چلانے لگیں گے۔ میں آگے آگے ہوں اس لیے سب سے پہلے نظر آؤں گا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کو شک نہ ہو ۔۔۔ وہ یہ سمجھیں کہ دودھ لے جانے والی گاڑی ہے اور کوئی گوالا اسے چلا رہا ہے ۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ خود ایس پی صاحب اور دوسرے تھانے دار صاحب بھی پیچھے بیٹھیں گے چھپ کر۔۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ بھی تھانے دار ہیں۔۔۔۔ اور آپ بھی؟"

"ہاں پہلوان ۔۔۔ اتنے بڑے افسر کے ساتھ تو تھانے دار بس کو ہی ڈیوٹی دینا پڑتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے کپڑے تم کو کچھ ڈھیلے ہوں گے لیکن کوئی بات نہیں۔۔۔۔ گزارا کر لو ۔۔۔ جب کام ختم ہو جائے گا تو تم کو یہ کپڑے مل جائیں گے۔"

"اوجی! نہ لیں۔۔۔۔ کون سا ریشمی لاچا اور دو گھوڑا بوسکی کا کرتا ہے۔" وہ اپنی گاڑھے کی دھوتی اور قمیص اتارتے ہوئے بولا ۔۔۔ چند منٹ کے بعد ہم جھاڑیوں میں سے برآمد ہوئے تو دونوں کا روٹین لگ رہے تھے ۔۔۔ تاہم محسن نے انگوٹھا دکھا کے اشارے سے 'ویری گڈ' کہا۔۔۔ وہ اور غالب دودھ کا فراخدلانہ استعمال کر رہے تھے ۔۔۔ انھوں نے کیتھرین کے منہ پر ٹھنڈے دودھ کے چھینٹے مارے اور اب اسے ٹھنڈا دودھ پلانے کی کوشش کر رہے تھے ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار ہم نے دودھ کا پورا ٹرک خرید لیا تھا۔ جس میں شاید دس من دودھ ہوگا ۔۔۔ دودھ کے اسٹاک کو وہ اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ غسل کرنے کے لیے بھی استعمال کرنا چاہتے تو کافی ہوتا۔۔۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہالی وڈ کی کوئی اداکارہ اپنے حسن کی حفاظت کے لیے دودھ سے منہ دھوتی تھی اور غسل کرتی تھی ۔۔۔ مگر ہمارے پاس بیوٹی باتھ کے لیے فرصت نہیں تھی۔

غالب مند کر کے میرے ساتھ آگے بیٹھا ۔۔۔ سیٹ کافی چوڑی تھی چنانچہ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ لیٹ جائے تاکہ سامنے والے شیشے سے صرف میری شکل مبارک دکھائی دے۔ اس حلیے میں مجھے کوئی آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا ۔۔۔ میرے سر پر ایک بہت میلے اور بدبو دار کپڑے کی پگڑی سی تھی ۔۔۔ اسے پگڑی کہنا بھی غلط ہوگا ۔۔۔ یہ ایک گز لمبا چوڑا چار خانے والا رومال تھا جسے میں نے دہقانی لبادے کے رخ دونوں کونے ملا کے سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس سے میری پیشانی جزوی طور پر چھپ گئی تھی ۔۔۔ گاڑھے کا کرتا زیادہ میلا اور بدبودار تھا۔ اس میں سے دودھ، گھی، مکھن کے علاوہ جانور، کھل، سوڑی، گائے اور بھینس کے پسینے اور ان کے دوسرے خارج کردہ مواد کی خالص دیہاتی مہک اٹھ رہی تھی ۔۔۔ گوالے کو اپنے بدن کی بو کا اس میں کیا پتا چلتا ۔۔۔ یہی حال دھوتی کا تھا لیکن یہ لباس اس ٹرک سے میچ کرتا تھا ۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے پائلٹ کی وردی ہوائی جہاز سے میچ کرتی ہے۔

میں نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا اور اس کے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی تو فیول میٹر کی سوئی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ٹینک دو تہائی کے قریب بھرا ہوا ہے۔

"آج بریک فاسٹ میں خالص دودھ ملے گا؟" غالب لیٹے لیٹے بولا اور ہاتھ بڑھا کے گلو کمپارٹمنٹ کی تلاشی لینے لگا۔

"ابھی کچھ نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے اس علاقے سے نکل جائیں، پھر کہیں رک کر دیکھیں گے۔۔۔۔ لوگوں سے پوچھیں گے کہ وہ سب کدھر گئے ہیں۔۔۔۔ آگے بھی آبادی ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ اپنے پہلوان کا گاؤں ہے۔۔۔۔ ڈالیاں خورد۔۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور اس کے بعد چک فضل لید۔۔۔ سنگرالی۔۔۔" غالب نے کہا۔

"واللہ! اس خاکسار صحافی نے یہ نام پہلے نہیں سنے۔"

"اس لیے نہیں سنے کہ یہاں کسی اخبار کا کوئی نمائندہ نہیں پہنچا۔ اور جو کچھ یہاں ہوتا ہے اُسے خبر نہیں سمجھا جاتا۔۔۔ خواہ وہ قتل ہو یا ڈاکا ہو۔۔۔" میں نے کہا۔

"ایک لاش سے کیا اندازہ ہوتا ہے؟" غالب بولا۔ "انھوں نے سب کو مار دیا ہوگا؟"

"ان سے کچھ بعید نہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ انھی پانچ میں سے ایک تھا؟"

"اور کون ہو سکتا ہے؟" غالب بولا۔ "گولی کا نشانہ دیکھا تھا تم نے؟ عین پیشانی کے وسط میں تھا۔۔۔ اور انھوں نے یہی دھمکی دی تھی۔۔۔ ویسے بھی گاؤں دیہات میں قتل کے لیے ریوالور استعمال نہیں ہوتے۔۔۔ سوٹے، کلہاڑی، ڈانگ اور چھرے وغیرہ زیادہ معقول ہیں۔۔۔ وہ اعشاریہ بائیس بور کی گولی کا سوراخ تھا۔"

میں نے حیرانی سے غالب کو دیکھا۔ "تو ماہر آتشیں اسلحہ ہونے کا بھی دعویٰ رکھتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ کرائم رپورٹر۔۔۔ عام اخبار نویسوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ جانتے ہیں۔" غالب بولا۔ "سوراخ بہت چھوٹا تھا اور اسی لیے خون بھی کم نکلا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ریوالور ٹھیک اسی جگہ رکھ کر گولی چلائی گئی تھی اور اس سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مقتول کو سزائے موت دی گئی ہوگی۔ اس کو فرار ہوتے ہوئے گولی نہیں ماری گئی تھی۔۔۔ یا تو اسے ناک آؤٹ کیا گیا اور پھر شوٹ کیا گیا۔۔۔ یا وہ خود بے ہوش ہو گیا تھا۔۔۔ تھوڑا سا امکان اس بات کا بھی ہے کہ اسے سر پہ ریوالور رکھ کے دہشت زدہ کیا جانا مقصود تھا مگر غلطی سے گولی چل گئی۔۔۔ ممکن ہے اس نے کسی حکم کی تعمیل سے انکار کیا ہو۔ اس کی موت کے بعد باقی چار نے عبرت پکڑی ہوگی اور اپنی جان بچانے کے لیے ان سے پورا تعاون کیا ہوگا۔"

"کیا اس بات کا امکان ہے کہ باقی چاروں کو زندہ واپس جانے کا موقع دیا گیا ہو؟" میں نے ٹرک چلاتے ہوئے نظر سڑک پہ رکھی۔

"ہاں۔۔۔ امکان تو ہے۔" غالب نے کہا۔ "یہ سب قتل سے سب گریز کرتے ہیں۔"

"مگر وہ چاروں ایک قتل کے چشم دید گواہ ہو گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اور ان سے یہ ڈر ہے کہ وہ بعد میں سب کو شناخت نہ کر لیں۔۔۔ یہ بتا دیں کہ انھیں کہاں لے جایا گیا تھا اور کس کام کے لیے۔۔۔؟"

"وہ کیسے بتائیں گے؟" غالب بولا۔ "گاؤں والوں کو؟ پولیس چوکی کے انچارج صاحب کو تو سانپ نے ڈس لیا۔"

"سانپ نے سانپ کو ڈس لیا۔" میں نے تصحیح کی۔

"گاؤں والے لاشیں لے کر چلے جائیں گے۔۔۔ کسی دور کے قصبے سے اگلی تعفن اٹھانے دار آئے گا تو۔۔۔ بیان وغیرہ لے کر جائے گا۔ تفتیش کون کرتا ہے کہ مجرموں کو ڈھونڈے۔۔۔ بس کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔۔۔ بلادر اور پیڈرو جیسے ان گاؤں کے لونڈوں کی گواہی سے ڈرنے والے نہیں۔ انھوں نے اہمیت ہی نہیں دی ہوگی کہ کسی سے کہتے ہیں تو کہتے پھریں۔" غالب نے کہا۔ "البتہ سراج پہنچا تو گاؤں کی شامت آ جائے گی۔ ایک دن کی بادشاہت میں جو اچھے کام ہم نے کیے تھے، سب برباد ہو جائیں گے۔۔۔ پیڈرو اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کسے بولنے دے گا؟ وہ تو حوالدار کی موت کو بھی قتل کا کیس بنائے گا اور اس نوجوان کی لاش کو بھی ہمارے کھاتے میں ڈالے گا۔ ساری گواہیاں ہمارے خلاف لے گا اور تلاش کرے گا تو ہمارا۔ پیڈرو اور اس کے ساتھ آنے والوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

ہمارے اور پیچھے والے حصے کے درمیان کیبن کی دیوار حائل تھی اور ہماری بیک پر ایک شیشہ تھا جس میں سے ہم محسن اور کیتھرین کو دیکھ سکتے تھے لیکن درمیان میں دودھ کے ڈرم حائل تھے۔ صبح کے چار بج گئے تھے اور آسمان پر ستارۂ سحری پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔۔۔ کچھ دیر میں صبح کاذب کے آثار نمودار ہونے کو تھے۔۔۔ ہم جائے واردات سے پانچ میل دور آ گئے تھے۔۔۔ احتیاطاً میں نے لائٹس بجھا رکھی تھیں چنانچہ ٹرک کی رفتار بہت کم تھی۔۔۔ اس کے انجن کی آواز بھی کم تھی لیکن مجھے اتنا شور بھی بہت محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ اچانک پیچھے سے کسی نے شیشے کو انگلی سے بجایا۔۔۔ میں نے ٹرک کو ایک کنارے پر روک لیا اور اتر کر پیچھے گیا۔

"کیتھرین کو ہوش آ گیا ہے۔" محسن بولا۔

"ہیلو کیتھرین۔" میں نے ٹرک پر چڑھ کے خوش دلی سے کہا اور مسکرایا۔ "کیسی ہو؟"

"فائن۔۔۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "تم سب کو دیکھ کر میں پھر زندہ رہنے کی آرزو کرنے لگی ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ صرف آرزو سے کیا ہوتا ہے؟"

"تم زندہ رہو گی کیتھرین۔۔۔ ابھی سے مرنے کی باتیں کر کے ہمیں مت ڈراؤ۔۔۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کو تمھاری فکر ہے۔۔۔ جولی کو بھی۔"

"جولی۔۔۔!" اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ "اب تک اور کس کے لیے زندہ تھی میں۔۔۔ یو ایڈیٹ۔۔۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔۔۔ آرزو۔۔۔"

"واٹ آرزو۔۔۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکی ہے۔۔۔ تم لوگ ایسے جھوٹ کیوں بولتے ہو۔۔۔ کیا جھوٹ سہارا بنتے ہیں؟ زندگی دے سکتے ہیں۔۔۔؟ جھوٹ تو خود مر جاتے ہیں۔۔۔"

"کیتھرین میری ماننے کو تیار نہیں کہ جولی زندہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "کیتھرین۔۔۔ پلیز ہم پر یقین کرو۔"

"مجھے تمھارے جھوٹے یقین کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "میں سچ کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔۔۔ تمام عمر میں نے سچ کا زہر پیا ہے۔۔۔ امرت سمجھ کے نہیں۔۔۔ زہر سمجھتے ہوئے۔۔۔ حقیقت پر مصلحت کے پردے مت ڈالو۔۔۔ کب تک ڈالو گے یہ پردے آخر۔۔۔؟ میرے پاس تو اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ۔۔۔ تم جھوٹ پر مجھے زندہ رکھو اور سچ کو ٹالتے رہو۔۔۔ جب تک میں اس قابل نہ ہو جاؤں کہ تم جھوٹ کے پردے ہٹانے پر اور جھوٹ کا اعتراف کرنے پر۔۔۔ اور شرمندہ ہو کے یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ۔۔۔ کہ کیتھرین، وہ ضرورت تھی۔۔۔ اصل حقیقت یہ ہے۔۔۔ تو مجھے تم کو شرمندہ دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔۔۔ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو۔۔۔ جسٹ لیٹ می ڈائی۔۔۔ پلیز۔"

محسن نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ کود کر نیچے آ گیا۔ گلالا ہکا بکا بیٹھا ہوا سارا ڈراما دیکھ رہا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے دماغ میں کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں تھا۔۔۔ ہم نے اسے قاتلوں، ڈاکوؤں کے بارے میں ایک کہانی سنائی تھی۔۔۔ بطور ثبوت اس نے ایک لاش بھی دیکھی تھی۔ کیتھرین کے بارے میں اس کو یقین تھا کہ ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے لیکن جو ڈائیلاگ اس نے سنے تھے، وہ اغوا کی واردات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔۔۔ بس وہ پولیس کے معاملات میں دخل در معقولات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پولیس کا ساتھ دینے میں مالی فائدہ ہی ہوا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اس نے تعاون نہ کیا تو وہ گھاٹے میں رہے گا۔۔۔ پولیس کیا نہیں کر سکتی۔ اسے تھانے لے جا کے چھتر مار سکتی ہے۔۔۔ اس کا ٹرک ضبط کر سکتی ہے۔۔۔ اسے چوری کے شبے میں جب تک چاہے زیرِ تفتیش رکھ سکتی ہے، یہاں تک کہ اس کے قبضے سے چوری کا مال بھی برآمد کر سکتی ہے۔۔۔ اس کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ہم جعلی پولیس والے ہیں۔۔۔ چنانچہ وہ چھ سو پر قناعت کیے چپ بیٹھا تھا اور پنگا لینے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

"کیتھرین کو لاہور لے جانا بہت ضروری ہے۔" محسن نے ٹرک سے ذرا فاصلے پر جا کے کہا اور مجھے ایک سگریٹ پیش کی۔۔۔ پھر ماچس نکالی۔

"یہ سگریٹ کہاں سے آئی۔۔۔؟" میں نے سگریٹ کو جھپٹ لیا۔

"ذرا احتیاط سے۔" محسن بولا۔ "پہلوان کا تحفہ ہے۔۔۔ باری باری سوٹے لگائیں گے۔۔۔" اس نے ماچس سے سگریٹ جلائی جو مقبولِ عام کنگ اسٹارک برانڈ تھی۔۔۔

۔۔۔ اس کا تند و تلخ بارودی دھواں میرے خالی پیٹ میں گھونسے کی طرح لگا مگر جسے نشے کی لت ہو وہی طلب کی اذیت کو جانتا ہے اور نشہ ٹوٹنے کے اعصابی دباؤ کو محسوس کر سکتا ہے پھر نشے کے لیے جو بھی ملے وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، سب نعمت ہے۔

"کیتھرین کو لاہور لے جانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر ہم تو غالباً مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔" میں نے ایک طویل کش لینے کے بعد بہت پُرسکون ہو کے کہا۔

"جب تک وہ جولی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گی اُسے کسی کی بات کا یقین نہیں آئے گا۔" محسن بولا۔ "میں نے اُسے ساری صورتِ حال سمجھانے کے لیے بہت سر کھپایا مگر وہ اسے بھی جھوٹ سمجھتی ہے کہ شہلا زندہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ہمارے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک تشویش ناک ہے۔ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئی ہے اور اس کی قوتِ مدافعت بالکل ختم ہو چکی ہے، اس لیے بھی کہ وہ زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی اور اگر وہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو شاید خودکشی کر کے مر چکی ہوتی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ ہسٹیریائی انداز میں بہت چیخی چلائی اور اس نے ٹرک سے چھلانگ لگانے کی کوشش بھی کی، ہم نے اُسے دبوچ لیا۔"

"اچھا! مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ شیشے کے ادھر آواز نہیں جاتی۔" میں نے سگریٹ محسن کی طرف بڑھا دیا۔

"پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ اب بھی وہ اسی ٹرک میں ہے۔" محسن نے دھواں چھوڑ کے کہا۔ "جس میں سے وہ کود گئی تھی۔"

"وہ کسی ٹرک میں تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں، اس نے ہمیں پہچاننے کے بعد بتایا تھا۔" محسن بولا۔ "کہ ٹرک میں لکڑی کے باکس تھے، جو پیچھے کے حصے میں بہت اوپر تک لادے گئے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق کم سے کم سو۔"

"ویسے ہی تابوت۔۔۔؟"

"نہیں، کیتھرین کا کہنا ہے کہ باکس ڈھائی فٹ لمبے، دو فٹ چوڑے اور دو فٹ اونچے تھے۔" محسن بولا۔ "اس نے کہا کہ موقع ملے تو پیمائش کر لینا، ایک انچ کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ باہر کی طرف عام قسم کے وہ کریٹ تھے، جن میں پھل سیب، آلو بخارے، مالٹے وغیرہ پیک کیے جاتے ہیں، لیکن ان میں پھل نہیں آلو تھے یا انڈے۔۔۔!"

"یہ کیتھرین نے کیسے جانا؟"

"اس کی نظر، قوتِ مشاہدہ، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت حیرت انگیز

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے۔“ محسن نے کہا۔ ”اُس کا کہنا ہے کہ پھل ہوتے تو خوشبو نہ آتی جبا ہر کی طرف آلو کے یا انڈوں کے کریٹ اس لیے رکھے گئے ہوں گے کہ راستے میں کوئی سرپھرا مل جائے یا ضرورت مند تو اُسے مطمئن کیا جا سکے۔“

”ہاں، راستے میں یا تو فرض شناس اور سرپھرے پولیس افسر آتے ہیں یا پھر رشوت مانگنے والے، جن کو حصہ نہ پہنچا ہو۔“ میں نے اتفاق کیا۔

”درمیان میں چار فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی جگہ تھی، جس میں ان تینوں کو بے ہوش کر کے ڈال دیا گیا تھا۔ رابعہ کو، ٹیڈی کو اور کیتھرین کو۔“ محسن بولا۔ ”اس ڈھیر کے اُوپر خود پیڈرو ریوالور لیے بیٹھا ہوا تھا اور اُوپر سے نیچے جھانک کر پندرہ فٹ گہرے چوکور کنوئیں کی تہ تک دیکھ سکتا تھا۔“

”کیتھرین کو پہلے ہوش آ گیا...؟“

”نہیں، وہ اوّل تا آخر ہوش میں تھی۔“ محسن بولا۔ ”جب انھیں روانہ کیا جا رہا تھا تو پروگرام کے مطابق کچھ دیر ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا یا کوئی عطائی! یہ اُسے نہیں معلوم، وہ سب اس کو ڈاکٹر ہی کہتے تھے اور گالیاں بھی دیتے تھے۔ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا چنانچہ وہ چار بجے شام کے بجائے پانچ بجے پہنچا۔“

”کہاں پہنچا؟“ میں نے کہا۔ ”کیتھرین کو اندازہ ہے؟“

”نہیں، وہ گبرگ کے آخری حصّے میں واقع کسی کوٹھی کا تہ خانہ تھا، جہاں اُن کو رکھا گیا تھا۔“ محسن بولا۔ ”ڈاکٹر نے پہلے رابعہ کو انجکشن لگایا پھر ٹیڈی کو، اُنھوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے۔“ وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہُوا۔

”مَیں سمجھ گیا محسن۔“ مَیں نے کہا۔ ”وضاحت کی ضرورت نہیں کہ وہ کیوں مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔“

”جب کیتھرین کی باری آئی تو نہ جانے کیسے ڈاکٹر کے ہاتھ سے گر کے دوا کی شیشی ٹوٹ گئی۔“ محسن نے کہا اور سگریٹ کا آخری ٹوٹا مجھے دیا۔ ”دیر پہلے ہی ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کے پاس دوسری شیشی نہیں تھی۔ اُنھوں نے کیتھرین کو ڈرایا دھمکایا کہ خبردار جو راستے میں آواز بھی نکلی۔ ان دونوں کو بے ہوش رکھنا ضروری تھا مگر تمھارا زندہ رہنا بھی غیرضروری ہے۔ گردن کاٹ کے لاش باہر پھینک دیں گے۔ کیتھرین نے اداکاری سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ صددرجہ بزدل ہے اور ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتی۔ اس نے اپنا رویّہ ایسا ہی رکھا جس کا فائدہ اُسے یہ ہُوا کہ وہ بہت کچھ دیکھتی اور سُنتی رہی اور اس کی فراہم کردہ اطلاعات پر بھروسا کرتے ہوئے ہی مَیں کہہ رہا ہُوں کہ کیتھرین کو آگے لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ راستے میں کسی جگہ اُنھوں نے رابعہ، ٹیڈی اور کیتھرین کو ٹرک سے ایک جیپ اسٹیشن ویگن میں منتقل کر دیا تھا۔“

”اسٹیشن ویگن میں؟“ مَیں نے بے اختیار کہا۔

”ہاں، وہ اسی گاؤں میں ہمارے بہت قریب سے گزر گئے۔ ہم نے پولیس چوکی سے باہر آ کے دیکھا تھا تو ہمیں ہیڈ لائٹس دکھائی دی تھیں۔“ محسن نے کہا۔ ”اس میں وہ پیچھے پڑے ہوئے تھے...... رابعہ اور ٹیڈی تو واقعی بے ہوش تھے مگر کیتھرین دم سادھے پڑی رہی محفوظ رہے اور ہوش میں رہنے کا فائدہ بھی اُٹھا سکے۔“

”کاش! کسی طرح مجھے معلوم ہو جاتا۔“ مَیں نے حسرت سے کہا۔ ”کہ وہ میرے اتنے قریب آئی اور پھر اتنی دُور ہو گئی کہ میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔“

”معلوم ہو جاتا تو آپ کیا کرتے، دوڑ لگاتے جیپ کے پیچھے؟“ محسن نے کہا۔ ”آپ خود بھی چُوہے کی طرح پکڑے جاتے بھائی! جب قیدیوں کو ٹرک سے اسٹیشن ویگن میں منتقل کرنے کے لیے روکا گیا تھا تو ڈرائیور کی غلطی سے تھوڑا سا نشیب کی جانب ہو گیا اُلٹنے سے بال بال بچا تھا۔ کیتھرین نے اسٹیشن ویگن کے پیچھے والے شیشے سے، جو اُوپر اُٹھ جاتا ہے، یہ دیکھا کہ اسٹیشن ویگن سڑک پر ہی رُکی رہی کہ واپس جانے لگی تھی، اُسی وقت ڈرائیور نے پھر ٹرک چلا دیا اور وزن کے باوجود اُسے صحیح سالم سڑک پر لے آیا لیکن اُس کی بدقسمتی اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ ٹرک نشیب کی جانب جھکا اور اُلٹ گیا۔ پیڈرو تو سڑک پر آ گرا تھا لیکن ڈرائیور ہلاک ہو گیا۔ یہ سب کیتھرین نے اُن کی گفتگو سے اندازہ کیا۔ اسٹیشن ویگن کو دلاور چلا رہا تھا۔ اُس نے نیچے آ کر پیڈرو کو اُٹھایا اور وہ کچھ دیر دُور کھڑے سر ہلاتے رہے اور نیچے نشیب میں اُلٹ جانے والے ٹرک کو دیکھتے رہے۔ اُن کا سارا مال بکھر گیا تھا۔ دیر بعد دلاور اکیلا واپس آیا اور گولی کی طرح لاہور کی طرف چل پڑا۔ اُس نے دوسرے ٹرک کا اور ڈرائیور کا بندوبست کیا اور دو گھنٹے بعد پھر وہاں پہنچا، جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس وقت وہ بہت جلدی میں تھا اور بہت پریشان تھا۔ وہ اُتر کے پیڈرو کے پاس گیا اور کچھ دیر بعد پیڈرو اس کے ساتھ آ بیٹھا۔ دوسرا ٹرک سڑک کے کنارے رُک گیا تھا۔ اُس کا ڈرائیور بھی اسٹیشن ویگن میں آ گیا اور وہ دونوں گاؤں گئے، وہاں سے اُنھوں نے چھ لڑکے پکڑے۔ اُنھوں نے رابعہ، پیڈرو اور کیتھرین کو سیٹ پر ڈال دیا۔ کیتھرین تو حکم پر خود ہی چلی گئی۔ گاؤں سے جو چھ لڑکے پکڑے گئے اُن کے لیے جگہ بہت ناکافی تھی، چنانچہ پیچھے والا پانچواں دروازہ اُٹھا کے سب کو وہاں ٹھونسا گیا مگر پھر وہ دروازہ بند نہ ہو سکا۔ پیڈرو پچھلی سیٹ پیچھے کو سرکے اُن پر ریوالور تانے بیٹھا رہا اور انھیں گالیاں دیتا رہا اور دھمکیاں دیتا رہا کہ کسی نے ذرا بھی حرکت کی اور آواز بھی نکالی تو اُس کے سر میں سوراخ کر دیا جائے گا۔ جگہ کی کمی کے باعث اُس نے کیتھرین سے کہا وہ سب سے آگے والی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھے اور کیتھرین نے اپنا تابعداری کا بزدلانہ رویّہ برقرار رکھا۔ آگے وہ آرام سے بیٹھ کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں پیچھے کا منظر دیکھتی رہی۔ شیشہ کچھ ... تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک لڑکے نے چلتی گاڑی سے باہر چھلانگ ماردی۔ کیتھرین نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو پیڈرو اس کا نشانہ لے رہا تھا، غالباً وہ کیتھرین کی دُعا قبول ہونے کے باعث بچ گیا۔ وہ ایک بار اور پھر اُٹھ کے بھاگ گیا۔ جنگل اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ پیڈرو کا ...

اس کے پیچھے جانے کا تھا مگر دوسرے شخص نے کہا کہ وقت ضائع ہو گا۔ وہ لڑکا جنگل کے راستوں سے واقف ہے، اب ہاتھ نہیں آئے گا۔ پانچ لڑکے کافی ہیں، ان سب کو وہ اسی لیے لے گئے تھے کہ نیچے بکھرا ہُوا مال دوسرے ٹرک میں لوڈ کریں۔ وہ یقیناً بہت بھاری کریٹ ہوں گے اور سو کریٹ ہوئے تو ہر شخص کو بیس بیس کریٹ نیچے سے اُٹھا کے ٹرک تک لانے پڑے ہوں گے اور پھر ٹرک میں رکھنے پڑے ہوں گے۔ ممکن ہے ٹرک میں پیڈرو کریٹ جمانے پر مامور ہو۔ یہ سب کیتھرین کو نہیں معلوم، صرف اس کا اندازہ ہے۔“

”میرے اندازے کا کمال بھی تو دیکھ۔“ مَیں نے کہا۔ ”بالکل وہی ہُوا جو میں نے سوچا تھا۔“

”بس اب ولی ہونے کا دعویٰ کر دے۔“ محسن بولا۔ ”بہت لمبی بات کر دی مَیں نے۔ قصہ مختصر یوں کہ پیڈرو نے جب اسٹیشن ویگن کو ٹرک کے پاس لا کے روکا تو وہ اور ڈرائیور فوراً پیچھے لپکے کہ اپنی لیبر فورس کو اُتاریں اور دلاور سے کچھ کہنے لگے۔ اُسی وقت کیتھرین کو فرار کا موقع ملا۔ ڈرائیور کی سائیڈ کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ ٹرک سڑک کے بائیں جانب کھڑا ہُوا تھا۔ اسٹیشن ویگن بھی بائیں جانب روکی گئی تھی اور وہ لیفٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ کیتھرین اُتری اور خاموشی سے جنگل میں کھسک گئی۔ پہلے چند قدم بہت مشکل ثابت ہوئے۔ جبکہ اُسے یقین تھا کہ ابھی کوئی گولی کسی ریوالور سے نکلے گی مگر اس کی آواز بعد میں اس وقت سُنائی دے گی، جب کیتھرین مُنہ کے بل گر چکی ہو گی مگر قدرت اُس کی مدد کر رہی تھی۔ اُس کی باری آنے پر انجکشن کی شیشی کا ٹوٹ جانا بھی تائیدِ ایزدی کے سوا کیا تھا۔ پیڈرو اور دلاور جلدی میں تھے اور پریشان تھے کہ اُن کا دھیان کیتھرین کی طرف نہیں گیا۔ وہ سیدھی بھاگتی گئی۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو کے گر پڑی۔ اُسے نہیں معلوم کہ بعد میں پیڈرو اور دلاور نے پانچوں مدد کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اگر اُنھوں نے ایک کو مار دیا تھا تو شاید باقی کو بھی مار دیا ہو گا۔ راز کا راز رہنا اُن کے لیے زیادہ اہم تھا۔ گاؤں کے پانچ لونڈوں کا زندہ رہنا اتنا ضروری نہیں تھا۔“

”پھر کیتھرین سڑک تک کیسے پہنچی؟“ مَیں نے کہا۔

”بہت دیر بعد اُسے ہوش آیا تو اُس نے سوچا کہ کہیں جنگل ہی میں نہ مر جاؤں۔“ محسن بولا۔ ”وہ گرتی پڑتی سڑک تک لوٹ آئی لیکن اس جگہ سے کافی دُور جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اُس نے اسٹیشن ویگن کو واپس جاتے دیکھ لیا تھا، جس کا مطلب کیتھرین نے صحیح نکالا کہ ٹرک بھی لوڈ ہونے کے بعد روانہ ہو چکا تھا اور وہ شاید دو تین گھنٹے کے وقفے سے دوبارہ سڑک پر آئی تھی۔ وہاں کسی آتے جاتے کا انتظار کرتی رہی تھی اور بالآخر بے ہوش ہو گئی تھی۔“

”اب جلدی سے بتا دے کہ وہ ٹرک کہاں گیا اور اسٹیشن ویگن کدھر گئی؟“

”کیتھرین نے جو کچھ سُنا اس کے مطابق ٹرک تو سیدھا ڈپو گیا۔“ محسن نے کہا۔ ”ڈپو کے بارے میں ایک اشارہ یہ ملا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے قریب ہے یا اُس کے دامن میں ہے۔ اسٹیشن ویگن میں رابعہ اور ٹیڈی کو سڑک کے راستے کراچی لے جایا گیا ہے۔ کیتھرین کے فرار کا ان کو فوراً پتا چل گیا ہو گا اور دلاور نے پیڈرو کو ذمے دار ٹھہرایا ہو گا تو پیڈرو نے ڈرائیور کو۔ اُن کے پاس وقت نہیں تھا ورنہ وہ اُسے ضرور تلاش کرتے۔ اپنی حماقت پر بہت پچھتائے ہوں گے کہ بڑھیا کو کمزور، بے وقوف اور بُزدل سمجھ کر بے ضرر مان لیا اور اُس کی طرف سے غافل ہو گئے۔“

”سب لوگ ہمیں گھُور رہے ہیں۔“ مَیں نے کہا۔ ”خصوصاً مرزا غالب بہت خون آشام موڈ میں نظر آتے ہیں، اب بتا کرنا کیا ہے؟“

”مَیں نے کہا نا کہ ٹرک میں کیتھرین کو لاہور بھیج دیا جائے۔“

”اس کے ساتھ کون جائے گا؟“ مَیں نے کہا۔ ”غالب؟“

”ہاں، غالب اس کے لیے ضروری طبّی امداد کا انتظام کرے گا، اُسے اس کی بیٹی سے ملوائے گا۔“ محسن بولا۔ ”اور ہم دونوں آگے جائیں گے۔“

”نہیں، میں اور غالب آگے جائیں گے۔“ مَیں نے یکلخت اپنا فیصلہ بدلتے ہوئے کہا۔ ”کیتھرین کو تُو لے جا، جو غالب کر سکتا ہے، وہ تو بھی کر سکتا ہے، تیری مدد کرنے والا ہمارا وکیل دوست عبدالودود منظر بھی ہے، کیتھرین اور جُولی کو وہاں چھوڑ دینا اور پھر شہلا سے مل کے آنا۔“

”نہیں یار۔“ محسن نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا مگر مَیں دیکھ رہا تھا کہ شہلا سے ملاقات کے ذکر پر اُس کی صورت کے تاثرات کس طرح بدلے تھے۔

”بکواس مت کر خواہ مخواہ، کیا تیرا دل نہیں چاہتا اُسے دیکھنے کو؟“

”وہ تو چاہتا ہے۔“ محسن آہستہ سے بولا۔

”تو پھر جا، شہلا سے مل، اُسے سب بتا، ہو سکے تو رضوی صاحب سے بھی ملنا مگر احتیاط ضروری ہے، اُن کی فرض شناسی بہت خطرناک چیز ہے۔ وہ پہلے تجھے بند کر دیں گے اور پھر کہیں گے کہ اب سُناؤ بیٹے، خیریت سے تو ہو، کہاں رہے اتنے دن؟ بہت یاد آتی تھی تمھاری۔“

محسن ہنس پڑا۔ ”مَیں اُن سے نہیں ملوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ پھر مَیں واپس نہیں آ سکتا۔ ہاں آنٹی سے ضرور ملوں گا، شاید کہیں سے انکل رضوی کو فون کر لوں۔ نازو اور اکرام شیخ کے گھر بھی جاؤں گا۔ فوزیہ کو بھی ٹیلی فون ضرور کروں گا اور سب کو تسلّی، تشفّی دے کر لوٹ آؤں گا۔ تم لوگ کہاں ملو گے؟“

”کراچی میں۔“ مَیں نے کہا۔ ”نازو اور اکرام شیخ وہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ بندرگاہ کا علاقہ بہت وسیع ہے۔ ان کو تلاش کرنا آسان نہیں ہو گا مگر وہ خود بھی ہماری جستجو اور ہمارے انتظار میں ہوں گے۔ تم میں سے کوئی نہ کوئی ایک دوسرے کو دیکھ لے گا۔ دو چار دن دیس میں پھرنے میں کامیابی کا امکان ہے، مگر بھیس بدل کے مت پھرنا۔ میں اور غالب ابھی تو آگے جا رہے ہیں، کوشش کریں گے کہ ایک ہفتے بعد تم سے کراچی میں ہی ملاقات ہو، اگر ایک ہفتے میں نہ آ سکیں تو پندرہ دن انتظار کرنا۔ کراچی سے لاہور کال کی جا سکتی ہے۔ شہلا کو بتا دینا کہ تم لوگ کہاں ہو۔ ہم بھی کراچی پہنچنے کے بعد شہلا کو ہی فون کریں گے۔ وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمھارا پتا ٹھکانا بتا دے گی۔"

"ایسا نہ ہو فون رضوی صاحب سُن لیں۔"

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" مَیں نے کہا۔ "احتیاطاً یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے رضوی صاحب کے دفتر فون کیا جائے، وہ موجود ہوں تو گھر کال کی جائے۔"

"اب آپ دونوں بہ رضا و رغبت حاضر ہوتے ہیں یا مَیں پاپوشِ خاص کے ساتھ تشریف لاؤں۔" غالب نے چِلّا کے کہا۔ اس کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہو گیا تھا۔

ہم واپس گئے اور ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اب صبح کا اُجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ جب ہم اس مقام تک پہنچے، جہاں ہم نے سائیکل چھوڑی تھی تو ٹرک پھر رُکا۔ ہم نے تازہ دودھ پیٹ بھر کے پیا پھر محسن کو الوداع کہا۔ مرزا غالب ہمارے مذاکرات کی تفصیل جاننے کے لیے بہت بے چین تھے مگر مَیں نے انھیں صبرِ جمیل کی تلقین کی۔ غالب سمجھ گیا تھا کہ ٹرک کی واپسی اور محسن کا کیتھرین کے ساتھ جانا کوئی مقصد رکھتا ہے اور ہم جو اتنی دیر تک الگ کھڑے باتیں کرتے رہے تھے تو ایک دوسرے کو لطیفے نہیں سُنا رہے تھے۔ دودھ والا بالکل خاموش تھا۔ وہ عقل مند آدمی تھا۔ اُسے لاہور جانے کے فیصلے سے یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ اس کے چھ سو روپے کا منافع تو پہلے ہی محفوظ تھا۔ اب وہ خود کو بھی محفوظ سمجھنے لگا ہوگا اور اپنے ٹرک کو بھی، اور اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا ہوگا کہ یہ پُراسرار لوگ اُسے کسی جگہ قتل کر کے پھینک دیں گے اور ٹرک لے جائیں گے۔

"اجی مرزا صاحب، وہ تو رہ گئے۔" مَیں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"کون رہ گئے؟" غالب بولا۔

"میرے کپڑے اور کون؟" مَیں نے کہا۔ "وہ گوالا پہلوان لے گیا۔ اب مجھے اُسی ڈیری فارم کی بولی فارم میں باقی زندگی گزارنا پڑے گی۔"

"اس میں سے بہت صحت مند جانوروں کی خوشبو آ رہی ہے۔" مرزا نے سائیکل اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور چشمِ بد دور تم کیا کسی بیل سے کم ہو۔"

"ذرا مجھ سے کہہ کے دیکھ کہ آ بیل مجھے مار۔" مَیں نے کہا۔

"آ بیل، سائیکل پر بیٹھ۔" غالب نے کہا۔

ہم اس چرخِ چوں پیطرس کی مشہورِ زمانہ سائیکل کی کزن پر سفر شروع کرنے ہی والے تھے کہ مخالف سمت سے ایک کار نمودار ہوئی۔ غالب نے سائیکل پھر پھینک دی۔ سُورج نکل آیا تھا اور درختوں کے ابھی سائے لمبے تھے اور اندھیرے اُجالے کی کیفیت تھی لیکن سڑک پر دُھوپ تھی اور چمکتی دمکتی کار پر سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"لو مرزا، تھا جس کا انتظار وہ شہکار آ گیا۔" مَیں نے کہا۔ "اس سے پہلے تو لوٹ مانگتے ہیں۔۔۔"

"اور اس کے بعد ہمیشہ کی طرح اُس کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں، جو عرب کے ساتھ اونٹ نے کیا تھا۔" غالب بولا۔ "اونٹ خیمے کے اندر مالک باہر۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس میں تمھارے ماموں چوہدری دلاور ہوں"

غالب سڑک کے کنارے واویلا کرنے لگا۔ پیٹ پکڑ کے دُہرا ہونے لگا اور ہاتھ ہلانے لگا۔ اُس نے اپنے منکے اور سادھوؤں والے مُنیے کے لوازمات تو اُتار پھینکے تھے مگر اس کا لباس وہی جوگیا تھا کہ مَیں نے بھی گوالے پہلوان کا سُوٹ چڑھا رکھا تھا، چنانچہ ہم دونوں خالص دیہاتی نظر آتے تھے اور یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مہذب شہری ہم جیسے کسی بیمار کو بھی اپنی صاف سُتھری کار میں بٹھانا پسند نہ کرے، چنانچہ مَیں نے سڑک کے درمیان آ کے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور دُہائی دینے لگا۔ گاڑی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ ایک موٹی توند والے مغرور اور بدتمیز شخص نے باہر سر نکالا اور مجھے ایک گالی سے نوازا۔

"مرنے کی صلاح ہے، میاں جی؟ مجھے کیوں مصیبت میں ڈالتے ہو، مرو کسی ٹرک کے نیچے آ کے۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"ٹرک تو ابھی تک کوئی نہیں آیا۔" مَیں نے معصومیت سے کہا۔ "بہت دیر سے کھڑے ہیں اور مرنے کی صلاح تو یہ میرا سالا کر رہا ہے۔"

"تو پھر مجھے کیوں روکا ہے؟ قبرستان لے جانا ہے کیا تمھارے سالے کو؟"

"نہیں جی، وہ تو آپ کو مجھے اور ہم سب کو چار بندے مونڈھوں پر چُک کے لے جائیں گے۔" مَیں نے کہا۔ "آپ ہم کو آگے تک چھوڑ دو۔"

"آگے کہاں، آگے تو ساری دُنیا ہے؟" وہ بولا۔

"بس جی ڈالیاں سے آگے۔" مَیں نے کہا۔ گولے کی فراہم کردہ معلومات میرے کام آئیں۔ "سنگرالی۔۔۔"

"چلو بیٹھو۔" اُس نے بُرا سا مُنہ بنا کے پیچھے کا لاک کھول دیا۔ "مَیں بھی اتفاق سے سنگرالی ہی جا رہا ہُوں، قسمت اچھی ہے تمھاری۔۔۔ لیکن میری سیٹ مت خراب کر دینا۔"

مَیں اور غالب پیچھے بیٹھ گئے۔ اس نامعقول شخص کے رویّے پر مجھے بہت تاؤ آ رہا تھا اور مَیں اب اُسے تھوڑا سا شرمندہ کرنے کے مُوڈ میں تھا۔

"کیا آپ مُسلمان نہیں ہو جی؟" مَیں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس شخص نے مشتعل ہو کے میری طرف گردن گھمائی۔ "کیا مطلب ہے اس بات کا؟ میں تم کو سکھ نظر آتا ہُوں؟"

"وہ۔۔۔ دراصل آپ نے پہلے گالی دی تھی۔" میں نے کہا۔ "مسلمان تو ملتے ہی پہلے السلام علیکم کہتے ہیں۔ یہ گالی کس مذہب کا سلام ہے؟"

"بک بک کرو گے تو مَیں اُتار دوں گا یہیں۔" وہ شرمندہ ہونے کے باوجود ڈھیٹ بن کے بولا۔

"اب تو مشکل ہے۔" غالب نے کہا۔ "ہم بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے۔"

"ہاں، اب اُٹھائے تو بس اللہ ہی اُٹھائے۔" میں نے سر ہلایا۔

"اور دُعا ہے کہ آپ کو پہلے اُٹھائے۔" غالب بولا۔

"تم۔۔۔ مکّار۔۔۔ فریبی۔۔۔!" اُس نے گاڑی روک دی۔ "تم بیماری کا ڈھونگ رچا رہے تھے، نیچے اُترو۔"

"چلو پہلے تم اُترو۔" غالب نے دانت نکال کے کہا۔

"نہیں جی، پہلے آپ۔" مَیں نے کہا۔

"پہلے آپ۔" غالب بولا۔

"پہلے آپ۔"

"انھوں نے تم سے کہا ہے۔" غالب بولا۔

"نہیں، تم سے کہا ہے، پوچھ لو ان سے۔"

"لاحول ولا قوۃ، تم دونوں اُترو، دفع ہو جاؤ۔" وہ چِلّا کے بولا۔

"دونوں؟ اچھا پہلے تم اُترو اور پھر ہمیں اُتارو۔" مَیں نے کہا۔ "ایسے تو ہم اُترنے والے نہیں ہیں۔"

"یا پھر جو جس کو اُتار دے۔" غالب نے سر ہلایا۔

"تم دو ہو، اس لیے بدمعاشی دکھا رہے ہو؟"

"نہیں، ایک کا مقابلہ ایک سے۔" غالب نے کہا۔ "پہلے مجھے اُتارو ورنہ میں تم کو مَیں اُتار دوں گا"

"یا میرے ساتھ مقابلہ کرو۔" میں نے کہا۔

"مقابلہ؟ کیسا مقابلہ۔۔۔ تمھارے باپ کی گاڑی ہے کیا؟" اُس نے چیخ کر کہا۔

"بھائی جی! اس نے آپ کے باپ کا نام لیا ہے۔" غالب بولا۔ "اسے مار دو۔"

مَیں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے تمھارے باپ کو کہا ہے کاکا، تم مارو۔"

"مگر میرا باپ تو تمھارا بھی چاچا تھا۔"

"اور میرا باپ تمھارا تایا تھا۔"

"چلو پھر دونوں مل کے مارتے ہیں، پہلا مُکا تم مارو۔"

اُس نے ایک نظر ہم دونوں کی غیر سنجیدہ صُورت کو دیکھا۔ ہم اُسے مارنے کے مُوڈ میں بالکل نہیں تھے لیکن وہ اشتعال میں آپے سے باہر ہو کے ہم پر ہاتھ اُٹھانے کی غلطی کر بیٹھتا تو اُسے یہ غلطی مہنگی پڑتی۔ اُس نے ہم دونوں کی جسمانی صحت پر غور کیا اور راست اقدام کو ملتوی کر دیا۔

"سمجھ لوں گا تم سے بھی۔" اُس نے غصّے میں گاڑی آگے بڑھائی۔

"آپ تو مجھے بہت بڑے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہو۔" مَیں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میں نہر کے محکمے کا اوورسیئر ہُوں۔" وہ میرے خوشامدانہ لہجے سے متاثر ہو کے بولا۔

"بلے بلے۔۔۔ اوورسیئر۔" غالب نے کہا۔ "تنخواہ کتنی ہے تمھاری؟"

اوورسیئر نے پھر غصّے سے پلٹ کے کہا۔ "جاہل۔"

"یہ گاڑی کتنے کی ہوگی اوورسیئر صاحب!" مَیں نے کہا۔ "بالکل نئی ہے اور بہت بڑی ہے۔"

"بھائیا جی! سر بھی تو بڑی ہوگی۔" غالب بولا۔ "اس سے آمدنی بھی بڑی ہوگی، تنخواہ چھوٹی ہے تو کیا ہُوا۔"

"سچ ہے کاکا، تنخواہ تو یہ ریٹائر ہونے تک جوڑتے رہتے۔ تب بھی آدھی کار ہی خرید پاتے یا بغیر انجن کی کار خریدتے۔" مَیں نے کہا۔

"اور اسے ایک ہارس پاور سے چلاتے۔" غالب بولا۔ "وہ گھوڑا کار کہلاتی۔ جیسے گھوڑا گاڑی ہوتی ہے یا موٹر کار ہوتی ہے۔"

اب اس کی صُورت پر پہلی بار خوف کے آثار عیاں ہوئے۔ اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن وہ بیک ویو مرر میں ہماری صورتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ "تم دونوں بہروپیے ہو۔" وہ بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"بھائیا جی۔" غالب نے ایک دم چیخ ماری۔ "وہ دیکھو، ایک ٹرک نیچے پڑا ہُوا ہے۔ اُس کے ٹائر اُوپر لگے ہوئے ہیں۔"

"غالباً رات کو حادثہ ہُوا ہے۔" اوورسیئر نے نسبتاً نرم لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔ "مگر رات کو اِدھر ٹرک کیوں آیا تھا؟"

"بے زبان جانور ہے، راستہ بُھول گیا ہوگا۔" غالب بولا۔

اوورسیئر ہنسا۔ رویّے کی یہ تبدیلی ظاہر کرتی تھی کہ وہ پریشان ہے۔ حرام کی دولت سے ایسی چمکتی دمکتی گاڑیاں خرید کر پھرنے والے ہمیشہ دو قسم کے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ انسدادِ رشوت ستانی والوں سے (بشرطیکہ وہ خود بھی رشوت نہ لیتے ہوں) اور ڈاکوؤں سے جو صرف اس تاک میں پھرتے ہیں کہ 'مالِ حرام بود بجائے حرام رفت' کے مقولے کو سچ ثابت کریں۔ مگر ہم اُسے نہ پکڑنے والے لگتے تھے اور نہ لُوٹنے والے۔ "تم لوگ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔"

"ہاں جی، ہم اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں، جو ہم نے ابھی تک آپ کے ساتھ نہیں کیا۔" مَیں نے کہا۔

اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ "دیکھیں۔۔۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کیا۔ میں کچھ پریشان تھا۔"

"مقدر میں پریشانی اور پشیمانی ہو تو پیسہ بھی خوشی اور اطمینان نہیں دیتا۔" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "تم نے نہر کے پانی کو بیچ کر خوب مال کمایا، کسان خون پسینہ ایک کرتے رہے، تم نے ہمیشہ اس وقت نہر کا پانی روکا ہوگا جب اُنھیں فصل کے لیے پانی کی ضرورت ہوگی۔ نہر کی صفائی کے بہانے اور فصلوں کی تباہی کے ڈر سے جب ان غریب محنت کشوں نے، جن [illegible] اُگائی ہوئی گندم تمھارے اور تمھارے بچوں کا پیٹ بھرتی ہے، تم کو مُنہ [illegible] پیش کر دیا ہوگا تو نہر میں پانی آ گیا ہوگا۔ تم نے باری کے [illegible] جاگیرداروں کے لیے نہر کاٹ دی ہوگی اور اُن سے بھی انعام و اکرام وصول کیا ہوگا مگر اتنی دولت سے تم کو کیا ملا، پیڑھول جیسی توند۔۔۔ پکڑے جانے کا خوف، اولاد کے سامنے شرمندگی، بیوی کے سامنے شرمندگی، جن کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تمھاری تنخواہ کتنی ہے اور تم ہر ماہ کتنے لاتے ہو، تم نے اُن کے خون میں حرام رزق ملایا، اُنھیں بے غیرتی کے ساتھ عیاشی کرنا سکھایا، اب تم کو بلڈ پریشر یا ذیابیطس ہوگی کیونکہ تم مرغن غذاؤں سے پیٹ کا دوزخ بھرتے رہے۔ تمھارا کولیسٹرول لیول آسمان اونچا ہوگا کہ ہر وقت ہارٹ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

فیل ہونے کے خیال سے تمھارا دل لرزتا ہوگا مگر تمھاری اولاد منتظر ہو گی کہ تم مرو تو تمھاری لاکھوں کی جائداد اُنھیں ملے۔"

اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم سی۔آئی۔ڈی کے آدمی ہو۔"

"ہم صرف آدمی ہیں، اے بی سی ڈی نہیں ہیں۔" غالب بولا۔

"آپ لوگ یہاں کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟" وہ بولا۔ "یقیناً کوئی سنگین کیس ہوگا؟"

"سنگین کیس تو تم بھی ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تم کو اپنے اعمال کی سزا مل رہی ہے اور ملتی رہے گی۔ دُنیا میں الگ اور آخرت میں الگ، اس لیے ہم تمھارا نام بھی نہیں پوچھیں گے۔"

"ویسے نام پوچھے بغیر بھی تمھارا پتا معلوم کرنا ہمارے لیے مشکل نہیں کیونکہ کار کا نمبر ہم نے دیکھ لیا ہے۔" غالب بولا۔ "ممکن ہے یہ تمھاری بیوی کے نام پر ہو یا بیٹی کے نام پر لیکن پتا شاید تمھاری ہی کسی کوٹھی کا ہو گا۔ اُس کوٹھی کا جس میں تم رہتے ہو یا اُس کا جو تم نے کرائے پر اُٹھا رکھی ہے۔"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے مت ڈرو۔" میں نے کہا۔ "ڈرنا ہے تو اللہ سے ڈرو یا اپنے ضمیر سے ڈرو اور اپنے انجام سے ڈرو، ہمیں تو چند سوالوں کے جوابات سے غرض ہے۔"

"کیسے سوالات؟" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور اُس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے نائٹرو گلیسرین کی ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی۔ یہ صاف انجائنا کی علامت تھی۔ ہماری باتوں کی دہشت نے اُس کے دل پر جُرم کے احساس کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

"اس علاقے کے جغرافیے سے تم اچھی طرح واقف ہو؟"

اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "یہاں میرا تیسرا سال ہے۔"

"گڈ! پھر تو تم گاؤں، دیہات کے لوگوں سے بھی واقف ہو گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اس سڑک کے دونوں جانب کتنے گاؤں ہیں جہاں گاڑی جا سکتی ہے؟"

"ایسے دو ہی گاؤں ہیں۔" وہ بولا۔ "چک گوہراں اور سنگرالی، جو آخری گاؤں ہے۔ ٹالیاں خورد کو ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

"اچھا یہ سڑک کہاں تک جاتی ہے؟"

"سرحد پار تک۔" وہ بولا۔ "درمیان میں نہر آئے گی، اس کے بعد بھی کچھ علاقہ پاکستان کا ہے پھر درمیان میں وہ جگہ ہے جو کسی کی نہیں ہے"

"نو مین لینڈ۔" میں نے کہا۔

"یس... یس۔" وہ میری انگریزی سے نروس ہُوا۔ "اس کے بعد انڈین ٹیریٹری شروع ہو جاتی ہے۔"

"بارڈر پر پوزیشن کیا ہے؟" غالب نے کہا۔ "دونوں طرف فوج رہتی ہے یا دستے گشت کرتے ہیں؟"

"بھارت کی طرف انڈین بارڈر فورس کے دستے کبھی کبھار آ جاتے ہیں، ورنہ سرحد کھلی ہی رہتی ہے۔" وہ بولا۔ "میرا مطلب ہے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے، یہی حال اِدھر کا ہے۔ رینجرز پھرتے رہتے ہیں لیکن دونوں طرف کے گاؤں کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی اِدھر کے مویشی اُدھر چلے گئے تو دو چار آدمی لینے پہنچ گئے، کبھی اُن کو اناج کی ضرورت پڑ گئی تو وہ آ گئے۔"

"اور اُن کو روکنے والا کوئی نہیں؟"

"ایسا اکثر تو نہیں، بارڈر سیکیورٹی فورس والے بھی یہ بات سمجھتے ہیں اور رینجرز بھی۔" اوورسیئر نے کہا۔ "کبھی مُوڈ ہو تو واپس بھی کر دیتے ہیں لیکن درمیان میں ایسے بہت سے وقفے آتے ہیں جب سرحد کے پار بلا روک ٹوک آنا جانا مشکل نہیں ہوتا۔ کیا بارڈر پر کوئی خطرہ ہے؟"

"بارڈر پر ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"آپ لوگ کس مشن پر آئے ہیں آخر؟" وہ بولا۔

"مسٹر اوورسیئر!" میں نے سخت لہجے میں اچانک انگریزی شروع کر دی۔ "آپ نے آفیشل سیکریسی ایکٹ پڑھا ہے۔ سال میں دو بار سرکاری ملازم سے دستخط لیے جاتے ہیں کہ وہ اس ایکٹ کی دفعات سے واقف ہیں مگر یہ صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ شاذ و نادر ہی کسی نے اس ایکٹ کا مطالعہ کیا ہوگا مگر قانون میں ناواقفیت کا عذر قبول نہیں ہوتا۔ یہ طے شدہ ہے کہ اَن پڑھ دیہاتی بھی قتل کرے تو ضابطۂ فوجداری کی دفعہ تین سو دو سے ناواقفیت کا عذر پیش کر کے بچ نہیں سکتا۔ ہم ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہیں چنانچہ ہم تو کسی پر اپنی شناخت تک ظاہر نہیں کر سکتے۔ آپ چونکہ ایک ذمّے دار سرکاری ملازم ہیں، اس لیے آپ کو صرف اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ ہم ایک ٹاپ سیکرٹ مشن پر ہیں مگر آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے، یہ بھی نہیں کہ آپ ہم سے ملے تھے، رائٹ؟"

"یس... یس سر!" گالی دینے والا اب سر کہنے پر آ گیا تھا۔

"یہ کبھی نہ بھولیں کہ ہم کسی بھی وقت آپ کو اُٹھوا سکتے ہیں۔" غالب نے بھی رواں انگریزی میں کہا۔ "راستے سے یا گھر سے اور افشائے راز کی صورت میں آپ سے شاہی قلعے کے ٹارچر سیل میں وہ بھی پوچھا جا سکتا ہے جو آپ نہیں جانتے۔ آپ ہمیشہ کے لیے گم بھی ہو سکتے ہیں۔"

خوف سے اوورسیئر کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکلے گا۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔"

"آپ کی خاموشی ہی فی الحال بہترین خدمت ہے۔" میں نے کہا۔ "بس ہر وقت واپسی پر دیکھ لیا کیجیے، ممکن ہے ہم پھر آپ سے لفٹ مانگیں۔"

"میں عموماً شام کو پانچ بجے واپس جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں خیال رکھوں گا۔"

"کیا اس طرف کوئی پہاڑ ہے؟" میں نے کہا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک پہاڑی ہے مشکل سے دو سو فٹ اونچی، اگر آپ نہر کے کنارے پر چلتے جائیں تو سات میل کے بعد نہر دائیں طرف مُڑ جاتی ہے۔ پہاڑی اسی موڑ پر ہے۔ وہاں جنگل بھی خاصا گھنا ہے۔ رات کو بھیڑیے بھی پھرتے ہیں۔"

"گرد و نواح میں کوئی آبادی نہیں؟"

"نہیں، پہلے وہاں ایک چھوٹا سا دیہہ تھا، چک مولا داد۔" اوورسیئر نے کہا۔ "ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں وہاں گولے گرے، آدھے سے زیادہ گھر تباہ ہو گئے اور کافی لوگ مارے گئے پھر وہاں ایک چھوٹا سا آرڈیننس ڈپو قائم ہُوا تو پولیس نے وہ علاقہ خالی کرا لیا۔ آس پاس ایک میل کے رقبے میں بورڈ لگے ہوئے ہیں، جن پر لکھا ہے 'علاقۂ ممنوعہ' چنانچہ اُدھر کوئی نہیں جاتا۔"

"عین سرحد پر آرڈیننس ڈپو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"آپ تو ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔"

"معلوم ہے اسی لیے تو کہہ رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے بات بنائی۔ "میری معلومات کے مطابق یہاں ایسا کوئی سب ڈپو بھی نہیں۔"

"میرے علم میں بھی نہیں۔" غالب نے میری تائید کی۔

"کیا آپ نے کبھی یہاں ملٹری کی موومنٹ دیکھی ہے؟" میں نے کہا۔ "اگر کہیں آرڈیننس یا ایمونیشن سب ڈپو ہو تو لازماً وہاں ملٹری کے لوگ آئیں گے، جائیں گے، گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دیں گی۔"

اوورسیئر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی نوٹ نہیں کیا۔ نہر سامنے آگئی ہے اب مجھے بائیں طرف جانا ہے۔ سنگرالی تین میل دُور ہے۔"

"آپ کا آفس سنگرالی میں ہے؟"

"ہاں آفس کیا ہے ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرا ہے۔" وہ بولا۔

"ریسٹ ہاؤس محکمۂ انہار کا ہے؟"

"نہیں محکمۂ جنگلات کا۔" وہ بولا۔

"وہاں ٹیلی فون ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہے مگر بہت کم ٹھیک ملتا ہے۔" وہ بولا۔ "خراب ہو جائے تو مہینہ لگ جاتا ہے ٹھیک ہونے میں مگر ہم اپنا کام دوسری طرح چلاتے ہیں۔"

"دوسری طرح کیسے؟"

"ڈائریکٹ لائن سے۔" وہ بولا۔ "ہمارے پاس وہ پورٹیبل ٹیلی فون انسٹرومنٹ ہے، جو ٹی اینڈ ٹی کے لائن مین لیے پھرتے ہیں۔ ایک میل پیچھے جنکشن باکس ہے، وہاں سے پیر ملا کے بات کر لیتے ہیں، اب کیا کریں مجبوری ہیں... خلافِ قانون تو ہے لیکن آپ لوگوں کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ کبھی ایمرجنسی ہو تو بندہ خدمت کے لیے حاضر ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "آپ ہمیں اسی جگہ اتار دیں۔"

اُس نے گاڑی روک دی اور خود بھی نیچے اتر آیا۔ "امید ہے آپ لوگوں نے میری گستاخی کو معاف کر دیا ہوگا۔"

"فارگیٹ اِٹ۔" میں نے کہا۔

"بٹ ڈونٹ فارگیٹ دی آفیشل سیکریسی ایکٹ۔" غالب نے کہا اور اپنی جیب سے ریوالور نکال کر قمیص سے صاف کیا۔ اوورسیئر مجھ سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں واضح لرزش محسوس کی۔ جن کو اُس نے احمق دیہاتی سمجھا تھا، وہ انتہائی خطرناک قسم کے کمانڈوز تھے۔ یہ تجربہ شاید اُسے پہلی بار ہُوا تھا کہ دھوتی کرتے والے پینڈو، جو احمق نظر آتے تھے فرفر انگریزی بولنے لگے تھے اور اُن کے پاس سروس ریوالور بھی تھے۔ غالب کے پاس سراج کا ریوالور تھا جو فوج یا پولیس کو ہی ملتا ہے۔ اوورسیئر کو ہمارے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی تو وہ پوری طرح رفع ہو چکی تھی۔

اُس کی گاڑی نہر کے کنارے کنارے چلنے والی کچی سڑک پر دُھول اُڑاتی نظروں سے غائب ہو گئی تو ہم نہر سے ذرا فاصلے پر درختوں کے پیچھے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

"وہ ٹرک دلاور اینڈ کمپنی کا ہی ہو گا۔" غالب بولا۔

"اسے وہ لاوارث چھوڑ گئے۔"

"اور کیا کرتے اس کے لیے کرین منگواتے، ایسا کوئی کام دن میں ... " غالب بولا۔ "ممکن ہے آج رات اُٹھوا لیں۔"

"ٹرک اُن کے لیے اتنا اہم تو نہیں ہوگا، اگر وہ چاہتے تو اُسے آگ لگا کے جا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"تاکہ آگ پورے جنگل کو لپیٹ میں لے لیتی۔" غالب نے میری عقل پر اظہارِ افسوس کے لیے سر ہلایا۔

"اس آرڈیننس سب ڈپو کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ دلاور اینڈ کمپنی کا ٹرانزٹ ڈپو ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں مال آ ... کر دن ٹھہرتا ہے اور پھر سرحد پار چلا جاتا ہے۔"

"اور یہ ایک ٹرانزٹ ڈپو ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایسے اور بھی ہوں گے۔"

"یقیناً ہوں گے اور ایسے ہی مقامات پر ہوں گے، جو بارڈر سے نزدیک ہوں گے اور جہاں گرد و نواح میں آبادی نہیں ہو گی... یا ہو گی تو اسی طرح خالی کرا لی گئی ہو گی۔"

"کل رات جس ٹرک میں مال آیا تھا وہ راتوں رات ڈپو میں پہنچا دیا گیا ہو گا اور غالباً ابھی وہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "رات کو وہ لیٹ ہو گئے تھے پھر بھی وہ ساڑھے تین، چار بجے تک ڈپو پہنچ گئے ہوں گے۔ اگر اُن کو 'اَن لوڈ' کرنے میں دو تین گھنٹے لگے ہوں تو چھ سات بجے تک وہ تمام مال اپنے ڈپو میں پہنچا کے فارغ ہوئے ہوں گے۔ اب بجے ہیں ساڑھے سات اور میرا حساب کہتا ہے کہ آٹھ بجے تک ٹرک کو اِدھر سے واپس جانا چاہیے۔"

"رائٹ۔" غالب نے چٹکی بجائی۔ "کیا ہم کوئی ایسی پوزیشن لے کر بیٹھ سکتے ہیں، جہاں سے ہم ٹرک کو پہلے سے دیکھ سکیں اور اس کا نمبر بھی نوٹ کر سکیں۔"

"اس کے لیے بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔" غالب نے کہا۔ "نہر کے کنارے چلتے ہیں، اس حُلیے میں ہمیں کون قابلِ غور سمجھے گا؟"

"پینڈرو کی نظر ہمیں سات پردوں میں دیکھ سکتی ہے۔"

"بشرطیکہ اُسے سات پردوں میں چلے پوشیدہ ہونے کا شک ہو۔" میں نے کہا۔ "ابھی اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ اس جگہ ہم گھومتے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ہوئے مل جائیں گے۔ اتنی دُور افتادہ جگہ پر کوئی آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ پینڈو کو کیا معلوم کہ ہم کتنے مرحلوں سے گزر کے کس طرح ان کے سرحدی اڈے تک آئے ہیں۔ آتے جاتے وہ راستے پر ضرور نظر رکھتے ہوں گے۔ کل رات انہوں نے اپنے ایک ٹرک کے سوا سڑک پر کچھ نہیں دیکھا ہوگا۔"

ہم پھر نہر کے پُشتے والی سڑک پر چلنے لگے۔ نہر میں پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا، جو دیکھنے میں تھوڑا سا گدلا تھا۔ ایک جگہ ہم نے گاؤں کی عورتوں کو کپڑے دھوتے دیکھا۔ دوسری جگہ نہر میں چار بھینسیں اور ایک بچہ نہا رہا تھا۔ بچہ چودہ پندرہ سال کا تھا اور جیسے بھینسوں کو اپنی عریانی کا احساس نہیں تھا، ایسے ہی اس کو بھی نہیں تھا۔

"کاکا جی!" میں نے اُسے مخاطب کیا "یہ کیہڑے پنڈ دا رہن والا ایں توں؟"

اُس نے ہاتھ سے پیچھے اشارہ کیا "اوہ پراں ویکھو۔"

پیچھے دیکھنے پر ہمیں درختوں اور جھاڑیوں سے چند کچے گھر جھانکتے دکھائی دیے۔

"کیا ہمیں اس آبادی سے رجوع کرنا چاہیے؟" میں نے کہا "شاید کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"اوورسیئر نے تو کہا تھا کہ آس پاس آبادی کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔

"اُس نے کہا تھا کہ پہاڑی کے آس پاس ایک میل کا علاقہ ممنوعہ ہے اور ہم ابھی اس پہاڑی سے پانچ میل دُور ہیں۔" غالب بولا۔

"میں بھی اُردو بول سکتا ہوں۔" لڑکے نے پانی سے باہر آکے اپنی نیکر پہنتے ہوئے کہا "تم اس پہاڑی کی طرف جا رہے ہو، مرنے کے لیے؟"

"مرنے کے لیے کیوں؟" میں نے کہا۔

"جو بھی اِدھر گیا، وہ زندہ نہیں آیا۔" لڑکے نے انکشاف کیا اور ان سب کے نام گنوانے لگا، جو اپنی جان گنوا چکے تھے۔ اس میں لڑکے کا چاچا بھی شامل تھا۔

"کیا اس میں جن ہیں؟" میں نے کہا۔

لڑکا ہنس پڑا "جن پہاڑ وِلہاڑ پر نہیں رہتے، قبرستان میں یا پیپل کے درخت پر رہتے ہیں، تم کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"

"ہم واقعی ابوجہل ہیں۔" میں نے کہا "تم بتاؤ کہ تمہارے چاچے کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"اُسے شیر نے کھا لیا ہوگا۔" لڑکا بولا۔

"شیر نے؟" میں اور غالب بیک وقت بولے۔

"ہاں ہاں شیر نے، اب آدمی تو شیر کو کھا نہیں سکتا۔" وہ بولا "اور وہ تو ہے ہی آدم خور شیر۔"

"مگر دوست شیر اس علاقے میں کہاں سے آیا؟" میں نے کہا۔

"تم اس علاقے میں کہاں سے آگئے ہو؟" لڑکا بولا اور اس کی تیزی طراری نے مجھے تھوڑا سا حیران کیا۔ عقل سے بڑی چیز کے ساتھ غسل کرنے والا اتنا افلاطون ہوگا، یہ میرے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ شیر پاکستان میں کہیں بھی نہیں ہیں، چھانگا مانگا میں بھی نہیں ہیں۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

"اچھا تو پھر شیر سے ہی پوچھ لینا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔" لڑکے نے بحث ختم کر دی اور اپنی بھینسوں کو پانی سے نکالنے کے عمل میں مصروف ہوگیا۔

"یہ تو بتاتے جاؤ کہ تمہارے پنڈ میں کوئی دکان ہے؟" میں نے کہا "جہاں سے کوئی سگریٹ، چائے، روٹی شوٹی مل جائے۔"

"مامے دی ہٹی ہے۔" وہ بھینسوں کے پیچھے روانہ ہوگیا "سگرٹ مل جائے گی، چائے نہیں ملے گی، روٹی سب کے گھر پکتی ہے۔"

"سُنا آپ نے، روٹی مانگ کر کھائیے، یہ شہر نہیں ہے قبلہ۔" غالب نے کہا "آپ کسی کے بھی مہمان ہو سکتے ہیں۔ چائے کا فیشن ابھی یہاں نہیں پہنچا، پڑ لسی پی کر جان بنائیے۔"

"صبح جو خالص دودھ پیا تھا، وہ تو ہضم ہوگیا۔" میں نے کہا "آگے پانچ میل تک کھانے کو صرف دھول ہوگی اور پینے کو یہ نہر کا آمیزہ، جس میں حضرات اور خواتین غسل کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں، وہ سب کچھ جو بھینسیں کر سکتی ہیں۔"

ٹرک بہت دُور ایک گردباد کی طرح نمودار ہُوا، میں اور غالب ٹھٹک گئے۔

"اب کیا کریں؟ کسی درخت پر چڑھ جائیں؟" غالب نے کہا۔

"نہیں، پانی بہتر پناہ گاہ ہے، غسل بھی ہو جائے گا۔"

"ایک حمام میں سب..." غالب نے کہا اور دو منٹ میں ہم کپڑے کنارے پر رکھ کر نہر میں کود گئے۔ ٹرک کے آنے تک ہم نے واقعی غسل کیا اور اُس ٹھنڈے پانی نے جسم کو بڑی فرحت دی۔ میں اور غالب سر کو پانی کے نیچے غائب رکھنے کے مقابلے میں مصروف رہے۔ ٹرک ہم سے پچاس گز دُور تھا جب ہم نے ڈبکی لگائی اور نیچے ہی نیچے تیر کر دس گز پیچھے گئے۔ ہم نے اُس وقت سر نکالا جب ٹرک ہمارے سامنے سے گزر چکا تھا۔ میں نے اُس کے پیچھے لگی ہوئی کمرشل نمبر پلیٹ کو دیکھا۔ یہ نمبر بوگس بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے حفظ کر لیا۔ ٹرک کسی پرائیویٹ کمپنی کا تھا اور اُس پر بہت اعلیٰ مصوری کے نمونے تھے۔ ایک عورت بڑے ہیجان انگیز پوز میں ایک شیر کے مقابل کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی، شیر کی تین ٹانگیں تھیں، اور وہ عورت پر جست لگا رہا تھا۔ غالباً مصور چوتھی ٹانگ میں رنگ بھرنا بھول گیا تھا۔ درمیان میں ایک خوفناک مونچھوں اور مختصر ترین لنگوٹی والا پہلوان بہت بڑا گرز اٹھائے کھڑا سوچ رہا تھا کہ کسے متوجہ کرے، شیر کو یا عورت کو۔ پہلوان کے سر پر تاج تھا اور تاج پر لکھا ہُوا تھا "مرحوم والد صاحب حاجی قمر دین انبالے والے عرف بونگا پہلوان رستمِ انبالہ گولڈ میڈلسٹ۔"

یہی سب کچھ مرزا غالب نے بھی دیکھا اور نہر سے باہر نکلنے کے بعد مجھے بتایا۔ البتہ اس نے مجھ سے چند سیکنڈ پہلے سر نکالا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ٹرک 'گولڈن انبالہ گڈز فارورڈنگ ایجنسی گوجرانوالہ' کا ہے۔ ہمارے درمیان خاصا اتفاقِ رائے تھا کہ یہ ٹرک دلاور اینڈ کمپنی نے کرائے پر لیا تھا چنانچہ اس کا نمبر وغیرہ سب اصلی ہوگا۔ شاید وہ اس طرح خود کو شک اور مصیبت سے محفوظ رکھتے تھے، اگر ٹرک پکڑا جائے تو وہ صاف بچ جائیں لیکن اس طرح ہمارے

ہاتھ ایک اہم سُراغ لگ گیا تھا۔ یہ فرض کرنا تو محال تھا کہ اس ٹرک کمپنی کے مالک یا ڈرائیور کو مال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ مالک کی بے خبری کو تسلیم کیا جا سکتا تھا مگر ڈرائیور سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کیا مال لے کر جا رہا ہے۔ اُسے اندھیرے میں رکھ کے کوئی غلط کام نہیں ہو سکتا۔ جب کوئی پیاز کا آڑھتی کراچی پیاز لے جانا چاہے تو یہ نا ممکن ہے کہ ٹرک میں چرس بھر کے لے جائے۔ اس طرح تو ہمیشہ ڈرائیور ہی پکڑے جاتے ہیں، اصل مجرم یہ کہہ کے الگ ہو جائیں کہ جی ہم کیا جانیں اس نے راستے میں کیا کِیا، یہاں سے تو پیاز بھیجی گئی تھی، ملاحظہ ہو رسید۔

لیکن ڈرائیور کو بتا دیا جائے کہ پیاز کے بہانے چرس لے جانا ہے تو وہ خود ذمے دار ہوتا ہے اور چونکہ راستوں پر سے اُس کا روز گزر ہوتا ہے اس لیے جو ڈرائیور غلط کام کرتے ہیں، وہ غلط قسم کے راستے روکنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور ان کی فیس بھی جانتے ہیں۔ وہ اپنے کام کا معاوضہ الگ لیتے ہیں اور ظاہر ہے چرس لے جانے کا معاوضہ وہ نہیں ہوتا، جو پیاز لے جانے کا ہوتا ہے۔ پیاز ہر للو کلو ڈرائیور لے جا سکتا ہے، چرس لے جانے والے خاص لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی فیلڈ کے اسپیشلسٹ اور ٹرک تو ایک ہی چلاتے ہیں لیکن فائدے کی مناسبت سے اپنا معاوضہ دس گنا تک طلب کر سکتے ہیں پھر راستے کی رکاوٹیں دُور کرنے کا جو نذر نذرانہ ہو، وہ خریدار کے کھاتے میں۔ ایسی صورت میں مالک بے چارہ تو یہی سمجھتا رہتا ہے کہ ٹرک میں پیاز کراچی گئی ہے مگر ٹرک جا رہا ہوتا ہے کسی اور سمت میں کچھ اور لے کر۔

چنانچہ طے شدہ طور پر ڈرائیور ہیرا پھیری کے ہر کاروبار میں ایک فریق ہوتا ہے۔ ٹرک کا نمبر اور کمپنی کا نام ہمارے پاس تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت آسان تھا کہ فلاں دن اس ٹرک کو لے کر کون گیا تھا۔ وہ ڈرائیور بہت کچھ بتا سکتا تھا مگر گزشتہ رات اُس نے جو کچھ دیکھا اور سُنا سب اُس سے معلوم ہو سکتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ بھی بتانے کی پوزیشن میں تھا کیونکہ وہ دلاور کے نزدیک 'خاص آدمی' تھا، جس پر وہ بھروسا کرتا تھا اور یہ پہلی بار نہیں ہوگا کہ دلاور نے اس کی خدمات ایمرجنسی میں حاصل کی ہوں۔ ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا۔

اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد ہم اُس گاؤں میں گئے، جو نہر کے دائیں کنارے پر ایک ڈیڑھ فرلانگ دُور نظر آیا تھا۔ اُسے پنڈ کہنا کسی قصبے کو شہر کا درجہ دینے کے مترادف تھا، وہ شکل سے چک کے معیار پر پورا اُترتا تھا۔ آبادی میں شاید پچاس گھر ہوں گے یا اس سے بھی کم اور ان سب کی ضروریات مامے دی ہٹی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ ہر گاؤں کی طرح یہ بھی ڈیپارٹمنٹل اسٹور قسم کی چیز تھی، جہاں انسان اور مویشیوں کی ضروریات کا سامان ایک ہی جگہ ملتا تھا۔ انسانوں کے لیے دال چاول تو مویشیوں کے لیے کھل، سوڑی، انسانوں کے لیے کلہاڑی اور مویشیوں کے لیے زنجیر...

وہاں ہمیں پھر کنگ اسٹارک سگریٹ ملے۔ ایک بات نام کی مقبولیت کی تھی تو دوسری بات کم لاگت ہونے کی تھی کہ سارس برانڈ سگریٹ عوام

کے نچلے طبقے میں ہر جگہ پیے جاتے تھے، اس سے اُوپر قینچی یا پاسنگ شو کے سگریٹ تھے، جو نسبتاً خوشحال لوگ پیتے تھے۔ سب سے اُوپر گولڈ فلیک کا سُنہرا پیکٹ تھا یا تھری کاسل کا خوبصورت نقشین پیکٹ اور اُس زمانے میں وہی ایک سگریٹ تھا جو بیس کی چوڑی انٹرنیشنل پیکنگ میں دستیاب تھا۔ گاؤں کے لوگ بہرحال کنگ اسٹارک یا قینچی مارکہ سے آگے کچھ نہیں جانتے تھے۔ لائف بوائے کا صابن اور ایک آنے والی لپٹن کی چُورا چائے کی تھیلی بڑے شوق سے خریدتے تھے، جو دکانوں پر ہار کی طرح لٹکی دکھائی دیتی تھی۔

گاؤں والے اتنے ہی سادہ دل اور مہمان نواز تھے، جتنے عموماً ہوتے ہیں۔ ہمیں مقامی زمیندار نے مسافر جان کے روٹی کھلائی۔ وہ اس گاؤں کے واحد پکے مکان میں رہتا تھا، اگر ہم اس دیہاتی حلیے میں نہ آتے بلکہ پتلون میں آتے یا غلطی سے بھی آپس میں انگریزی بولنے لگتے تو ایکدم ڈی۔آئی۔جی ہو جاتے پھر دم ہمارے لیے ککڑ پکوایا جاتا اور حلوا۔ ہم بالکل نمایاں ہونا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ہم پڑوس کے گاؤں ٹوالیاں خورد کے باسی بن گئے، جن کو سنگرالی جانا تھا۔ اس طرح ہم ایک گھنٹے میں پھر اپنی راہ پر گامزن ہونے میں کامیاب رہے۔ پیٹ بھر گیا تھا اور اب ہم دو دن بھوکے رہ سکتے تھے۔ اس زندگی نے ہمیں فاقے جھیلنے کا عادی بنا دیا تھا۔ سگریٹ سے عیاشی کا کچھ سامان ہو گیا تھا۔ لسی سے چائے کی طلب پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے دل کو تسلی دے لی تھی کہ دُنیا میں کسی کو مانگنے سے سب کچھ نہیں ملتا۔

ہمارا راستہ بالکل سیدھا تھا۔ نہانے اور کھانے سے ہم تازہ دم ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے چار میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس تمام راستے پر ہمیں کوئی بھی نہیں ملا پھر وہ موڑ آیا جہاں سے نہر دائیں طرف جاتی تھی اور پہاڑی جو ابھی تک درختوں کے پیچھے اوجھل تھی، اچانک ہماری نظروں کے سامنے آگئی۔ وہیں ہم نے 'علاقہ ممنوعہ' کا پہلا سائن بورڈ دیکھا۔ راستہ اب بھی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور ہم چلتے جاتے تو پہاڑی تک پہنچ جاتے لیکن یہ احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہوتا۔ اگر یہ ایک اہم ڈپو تھا تو یقیناً یہاں حفاظتی انتظامات بھی خاصے سخت ہوں گے۔ محافظ ہر وقت راستے کی نگرانی کرتے ہوں گے اور دُوربین سے آس پاس کے سارے علاقے کو چھانتے رہتے ہوں گے۔

"اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہیں۔" غالب بولا "تو شکاری تاڑ جائیں گے کہ آگئے ایم آر ایس کے مجاہدین خودکشی فرمانے۔"

"شہید ہونے۔" میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔

"بات وہی ہے۔" غالب ہنسا "ایک ہمارا اندازِ بیان ہے، دوسرا اُن کا۔"

"یہاں کھڑے رہنا بھی تو کوئی دلچسپ اور مفید کام نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ابھی دوپہر ہے۔" غالب نے کہا "ہم وہاں رات کو جائیں گے۔ رات ہونے تک ہم قیلولہ فرما سکتے ہیں۔ آپ اپنی پسند کے خواب دیکھیں، مَیں اپنی پسند کے دیکھتا ہوں۔"

"بیڈ رُوم ایئر کنڈیشنڈ ہے نا؟" میں نے کہا۔

"بالکل ہے، فوم ربر کے گدّے، شنیل کے پلنگ پوش، ایرانی قالین اور مخملیں پردے۔" غالب نے کہا "مہکتی فضا اور پھر وہ خواب، جو سُنائے بھی نہیں جا سکتے، تشریف لائیے۔"

جنگل میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے درخت تھے چھوٹے درخت بیری کے تھے اور بڑے شیشم کے لیکن بہت گھنے نہیں تھے۔ زمین کی سطح کے ساتھ خود رُو گھاس تھی اور جنگلی پھولوں والے پودے تھے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ہمیں ایک ہموار قطعۂ زمین مل گیا جہاں لمبے نوکیلے پتّوں والی گھاس نہیں تھی بلکہ کچھ لان ٹائپ ہری گھاس تھی، جو زمین پر اُوپر نہیں اُٹھتی، سطح کے ساتھ ساتھ پھیلتی جاتی ہے اور جڑیں پکڑتی جاتی ہے۔ آس پاس بیس پچیس گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کی قدرتی فصیل تھی اور اُوپر صرف کھُلا آسمان تھا چنانچہ یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی پرندہ ہم پر کچھ ٹپکا دے۔ غالب نے جھک کر زمین کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ بیڈ رُوم میں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔

"اگر سوتے میں شیر کھا جائے یا ہاتھی اُوپر سے گزر جائے تو بُرا مت ماننا۔" غالب نے لمبا لیٹتے ہوئے کہا "روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں ایک مردم خور شیر ہے۔"

"نام اُس کا دلاور ہے۔" میں نے کہا "مگر وہ نام کا دلاور ہے۔"

"محسن تو پہنچ گیا ہوگا اپنی زوجہ کے پاس۔" غالب آسمان کو تکتے ہوئے بولا "میں اُن کے بچھڑ کر ملنے کے فلمی منظر کو چشمِ تصوّر سے دیکھ سکتا ہوں، شہلا اُسے دوبارہ ملے گی۔"

"مجھے اُس کی وہ کیفیت یاد ہے جب اُسے پتا چلا تھا کہ شہلا زندہ ہے۔" میں نے کہا "شہلا سے مل کے اس کا کیا حال ہوگا۔ شہلا نہیں سمجھے گی کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔"

"محسن لاہور گیا۔" غالب نے آنکھوں پر کہنی رکھ کے کہا "میں جاتا ہوں کراچی کی بندرگاہ، تُو کہاں جائے گا چیف؟"

"میں بھی وہاں پہنچ ہی جاؤں گا جہاں روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام۔" میں نے کہا "یہ خیال خود میرے خوابوں کی رہگذر ہوگا۔"

ہمیں اُن پرندوں کے شور نے بیدار کیا جو شام ہوتے ہی درختوں پر شب بسری کے لیے لوٹ آئے تھے اور آشیانوں کے گرد منڈلاتے ہوئے خوشی سے چلّا رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو غالب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ پرندے سارا دن فکرِ معاش میں رہتے ہیں۔" غالب بولا "اور اب گھر آئے ہیں تو معلوم ہے، بیوی بچوں سے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو آدمی شام کو دفتر یا کارخانے سے گھر آتے ہی کہتا ہے، ہیلو ڈارلنگ، بچّے کہاں ہو، ہم آ گئے۔" غالب بولا۔

"کسی دن ہم بھی کہیں گے۔" میں نے غالب کے کندھے پر تھپکی دی۔ "وہ دن ضرور آئے گا۔"

"اونہہ... کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔" غالب بولا۔ "یہ کنگ اسٹارک سگریٹ پیو اور خدا کا شکر بجا لاؤ کہ زندہ اُٹھے ہو۔"

"تجھ پر قنوطیت کا دَورہ پڑا ہے۔" میں نے کہا "کیا خواب میں نازو نے اچھا سلوک نہیں کیا؟"

"اچھا کیا اور بُرا کیا۔" وہ آہ بھر کے بولا "وہ ہمیشہ ایک ہی جیسا سلوک کرتی ہے، نظر سے نہیں گراتی، ہاتھوں سے گراتی ہے کبھی اِدھر کبھی اُدھر، سالا عاشق نہ ہُوا دالی بال ہو گیا، میلا پجامہ ہو گیا کہ دے دھوبی پٹخا... دے دھوبی پٹخا، مَیل کیا جان تک نکل جائے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "ہر ایک کے پیار کا انداز جُدا ہوتا ہے، دوست..."

ہم نے ایک بار پھر نہر میں ڈبکی لگائی اور سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ سفر اندھیرے جنگل کا سفر تھا مگر راستہ گم ہونے کا احتمال کم تھا کیونکہ ہمیں نہر کے متوازی چلنا تھا کسی دُشواری کے بغیر ہم نے وہ ایک میل کا فاصلہ پون گھنٹے میں طے کر لیا۔ ہم بہت محتاط تھے اور ہمارے کان ہر آہٹ پر لگے ہوتے تھے۔ ہم بات بھی کرتے تھے تو ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کے انداز میں۔

"یہ ایک پہاڑی ہے۔" غالب نے رُک کر کہا۔

"یہ صرف ایک پہاڑی ہے۔" میں نے کہا "اور کچھ نہیں۔"

"لیکن یہاں ایک آدم خور شیر ہونا چاہیے۔" غالب بولا "یہ علاقہ ممنوعہ ہے تو کیوں ہے؟"

"شیر کی افواہ بھی بے مقصد تو نہیں پھیلائی گئی۔" میں نے کہا "گاؤں کے اَن پڑھ لوگ علاقہ ممنوعہ کی اصطلاح نہیں سمجھتے۔ انھیں اس علاقے سے دُور رکھنے کے لیے شیر ایجاد کیا گیا۔ ایجاد اس لیے کہ ویسے تو مغربی پاکستان میں شیر سوائے چڑیا گھر کے کہیں دستیاب نہیں، مگر گاؤں والے یہ باتیں کیا جانیں۔"

"اور اس فرضی آدم خور شیر نے کئی زندہ انسانوں کو سچ مچ کھا لیا۔"

"ہاں، وہ احمق تھے یا غیر ضروری طور پر تجسّس پسند اور مہم جُو، وہ گئے ہوں گے شیر کی حقیقت دریافت کرنے یا کسی غلطی کے باعث پھرے دلدل سے بچ کے وہاں تک جا پہنچے ہوں گے، جہاں سے واپسی اُن کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ اُن کی ہڈیاں اور جسم کے بچے ہوئے ٹکڑے بعد میں ملے ہوں گے تو یہ افواہ پھیلانے میں کام آئے ہوں گے کہ انھیں شیر نے کھا لیا۔"

"مگر مجھے ابھی تک کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی۔" غالب بولا۔

"اس کے لیے زیادہ قریب جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا تو نہیں کہ ڈپو پہاڑی کے پیچھے ہو؟"

"ہم پتا کر لیں۔" میں نے کہا "ہم گھوم کے جاتے ہیں۔"

غالب کے مُنہ سے نکلی ہوئی بات ایک گھنٹے کے بعد سچ ہوئی۔ پہاڑی کے عقبی حصے میں ہم نے روشنی دیکھی، روشنی بہت مدھم تھی اور غالباً لالٹین کی روشنی تھی۔ گھُپ اندھیرے میں چمکنے والی یہ دُھندلی روشنی پہاڑی کے دامن میں کبھی نظر سے اوجھل ہو جاتی تھی اور کبھی پھر نظر آنے لگتی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہَوا سے شاخیں ہلتی تھیں تو ہماری آنکھوں کے اور روشنی کے بیچ میں آ جاتی تھیں۔ میں نے اور غالب نے آہستہ آہستہ کوئی آہٹ کیے بغیر بڑھنا شروع کیا۔ ریوالور اب ہمارے ہاتھ میں تھے، اور ہم ایک پلان کے مطابق پیش قدمی کر رہے تھے۔ پہلے میں چند قدم چلتا تھا اور غالب کسی درخت کی اوٹ میں ریوالور لیے کھڑا رہتا تھا کہ اچانک کوئی مجھے روک لے تو وہ میری مدد کرے۔ مدد یہی ہو سکتی تھی کہ وہ سامنے آنے والے کو شُوٹ کر دے اور ہم واپس بھاگ کھڑے ہوں۔ جنگل میں فائرنگ کے بعد اس غیر قانونی آرڈیننس ڈپو سے دُشمن کی سپاہ کا جدید ترین اسلحے کے ساتھ نکلنا اور ہماری تلاش میں ہمارے پیچھے دوڑنا یقینی تھا۔ باری باری ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے اور کوَر فراہم کرتے ہم نے مزید سو گز طے کیے۔ اب ہمیں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ لالٹین اُس دروازے کے اُوپر لٹکی ہوئی تھی، اُس کے بالکل پیچھے کوئی شخص مشین گن لیے کھڑا تھا۔ اُس کے پاس ایک دُوربین بھی تھی، جس سے وہ ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے سامنے کا سارا علاقہ دیکھتا تھا۔ یہ اندھیرے میں بھی صاف دکھانے والی دُوربین تھی۔ انفرا ریڈ شعاعوں کی مدد سے تصویریں اُتارنے والے کیمرے بھی اب کوئی جادوئی ایجاد نہیں رہے تھے لیکن اس قسم کے کیمرے اور ایسی دوربینیں بازار میں دستیاب نہیں تھیں۔ یہ سُراغ رسانی کے سرکاری اداروں کو بطورِ خاص فراہم کی جاتی تھیں۔ ہم نے دوربین کے سامنے آنے سے گریز کیا اور درختوں کی اوٹ سے دروازے کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد اندر سے ایک شخص نمودار ہُوا اور اُس نے پہلے سے کھڑے ہوئے شخص کی جگہ لے لی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے اور آگے گئے۔ آپس میں بات کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ مجھے ایک ڈر تو یہ تھا کہ یہاں درختوں پر خفیہ کیمرے اور مائیکروفون نہ ہوں اس سے بڑا اندیشہ زمینی شکنجوں کا تھا۔ اس علاقے کو مداخلت کرنے والوں سے محفوظ رکھنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ یہاں بارُودی سُرنگیں بچھا دی جائیں لیکن اس میں نقصان یہ تھا کہ جب بھی کوئی اس پر قدم رکھتا تو دھماکا ہوتا اور آس پاس دُور دُور تک سُنائی دیتا۔ دوسرے وہ شخص بھی بارُودی سُرنگ کے ساتھ ہی اُڑ جاتا، جو مداخلت کار تھا۔

چنانچہ میری عقل کہتی تھی کہ یہاں قدم قدم پر شکاری پھندے ہو سکتے ہیں، جال ہو سکتے ہیں اور شکنجے ہو سکتے ہیں، اُن کی ہزاروں اقسام ہیں، چُوہے دان کی طرز پر بنائے جانے والے بڑے شکنجے آدمی کے پیر کو اس طرح جکڑ سکتے ہیں کہ ہڈی ٹوٹ جائے۔ ایسے جال ہو سکتے ہیں جو اچانک اُوپر سے آ گریں اور آدمی اندر ہی بند ہو جائے یا ایسے گڑھے بھی ہو سکتے تھے، جن پر سرکنڈے رکھ کے گھاس پھوس پھیلا دی جائے اور ان پر کوئی قدم رکھے تو اندر گرے اور اندر گرنے والے کے لیے باہر نکلنا ناممکن ہو۔ گڑھے میں نوکیلے بانس گاڑے جا سکتے تھے جو آدمی کے بدن میں گھُس جائیں شکاری ہر قسم کے جانور کے لیے الگ پھندا یا شکنجہ رکھتے ہیں جنگل کے اندھیرے میں رات کے وقت یہ پھندے اور شکنجے نظر آ ہی نہیں سکتے تھے لیکن ہمارے قدم ایک بار غلط پڑ جاتے تو ہم گرفتار ہو جاتے اور شکاری فوراً آ پہنچتے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک حفاظتی بندوبست کیا تھا۔ میں نے ایک خشک ٹہنی اُٹھالی تھی جو ٹیڑھی میڑھی ضرور تھی لیکن چار فٹ لمبی اور خاصی مضبوط تھی۔ ہر قدم آگے بڑھانے سے پہلے میں زمین پر ٹہنی پھیرتا تھا کہ کوئی شکنجہ ہوگا تو ٹہنی کو پکڑے گا میرے پاؤں کو نہیں اور سرکنڈوں کی کھوکھلی چھت پر گھاس بچھی ہوئی ہو گی تو میں قدم رکھنے سے بچ جاؤں گا میری اس احتیاط کو غالب نے بھی پسند کیا مگر اُسے اپنے آس پاس کوئی ایسی شاخ نہیں ملی، اگر وہ کسی درخت سے چار فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی شاخ توڑتا تو اتنی آواز ہوتی کہ اب پچاس گز دُور نظر آنے والے محافظ اُسے بجلی کی کڑک کی طرح صاف سُنتے۔

مجھے اس حفاظتی انتظام نے پہلی بار اس وقت بچایا، جب میں نے ایک گڑھا دریافت کیا۔ گڑھے کو بہت ہوشیاری سے کیموفلاج کیا گیا تھا اور اس کی سطح جنگل کی عام سطح نظر آتی تھی۔ میں نے ڈنڈی ماری تو مجھے سرکنڈوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے غالب کو روک لیا۔ درخت کی اوٹ میں رہتے ہوئے ہم نے سرکنڈوں سے بنی ہوئی کچی چھت پر سے گھاس اور پتّے ہٹانے ... اس کا ایک کنارہ تلاش کر لیا۔ دس منٹ کی خاموش کوشش کے بعد مجھ پر انکشاف ہُوا کہ وہ کوئی گڑھا نہیں، ایک خندق ہے، جو تین فٹ چوڑی ہے اور ہمارے دائیں بائیں پھیلی ہوئی ہے۔ غالباً پہاڑی کے سامنے والے حصّے کے آس پاس، جہاں وہ دروازہ نظر آ رہا تھا، کوئی کسی سمت سے بھی آتا اس خندق میں ضرور گرتا۔ اس سے بچ کے نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ تین فٹ چوڑائی میں لمبے سے لمبے آدمی کا ایک قدم پڑنا یقینی تھا۔

غالب نے شاباش کے انداز میں میرے کندھے پر تھپکی دی اور میں کورنش بجا لایا۔ خندق کو عبور کرنے سے پہلے ہم نے پھر دروازے کو دیکھا۔ یہ دروازہ موٹے شہتیروں کو زمین میں گاڑ کے بنایا گیا تھا۔ ایک شہتیر اُوپر رکھا گیا تھا اور مجھے یہ کسی غار کا دروازہ لگتا تھا۔ اس دروازے کے پیچھے بالکل اندھیرا تھا۔ ابھی میں نے خندق پر سے گزرنے کے لیے جمپ لینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ جیسے دن نکل آیا۔ پہاڑی پر ایک ایسی سرچ لائٹ روشن ہو گئی جس کی طرف دیکھنا ناممکن تھا۔ میں اور غالب فوراً لیٹ گئے۔ سرچ لائٹ آہستہ آہستہ گھومتی ہوئی ہمارے اُوپر سے گزری۔ میرا دل زمین اور سینے کے درمیان اُچھلنے لگا۔ اس روشنی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے منعکس ہونے والے اُجالے میں اُلٹا لیٹنے سے مجھے خندق کی گہرائی نظر آگئی۔ اگر میں یا غالب اس میں اُتر جاتے تو چھ فٹ نیچے جاتے۔ بالکل نیچے سیمنٹ کا فرش تھا جس میں کانچ کے ٹکڑے اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے بعض گھروں کی بیرونی دیواروں اور کوٹھوں کی فصیلوں پر لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ اب اس کا اتنا رواج نہیں رہا تھا کیونکہ چور ڈاکو بہت ہوشیار ہو گئے تھے مگر ایک زمانے میں یہ حفاظتی انتظام خاصا مقبول تھا۔ خندق میں گرتے ہی ہمارا سارا جسم نوکیلے تیز دھار والے شیشوں کی جراحت سے کٹ جاتا اور ہم اس قابل نہ رہتے کہ اتنے زخموں سے بہنے والے لہو کو روک سکیں اور خندق سے نکل کے فرار ہو سکیں۔

سرچ لائٹ ایک راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد آف ہو گئی تو میں نے رُکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور غالب کے ساتھ خندق کے پار کود گیا۔ تین فٹ کا فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے آہستہ سے جست لی اور کسی آہٹ کے بغیر دوسری طرف پہنچ گئے لیکن اس وقت غالب کے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جسے سُن کر میرے دل کی دھڑکن رُک گئی۔ میں نے پہلے دروازے کی طرف دیکھا مگر سنتری نے یہ آواز نہیں سُنی تھی۔ پھر میں غالب کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ غالب کا ایک پاؤں شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ ٹخنے سے ذرا اُوپر یہ فولادی شکنجہ اُس کے پیر سے یوں چمٹ گیا تھا جیسے جونک کھال سے چمٹ جاتی ہے۔ غالب سخت تکلیف میں تھا اور یہ اُسی کا حوصلہ تھا کہ اُس نے مُنہ میں ہاتھ دے کر اپنی چیخ کو دبا لیا تھا۔ اس میں غالب نے اپنے ہی دانت اپنی ہتھیلی میں گاڑ دیے تھے لیکن اپنی آواز نہیں نکلنے دی تھی۔ میں نے جھک کر شکنجے کو دیکھا۔ یہ مضبوط لوہے کے اسپرنگ لاک والا شکنجہ تھا جسے صرف مخصوص چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ اس کا وزن بھی ڈیڑھ دو سیر سے کم نہیں تھا۔ غالب کا پیر سیدھا اُس پر پڑا تھا اور شکنجے نے مگرمچھ کے دانتوں کی طرح غالب کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔

میں نے آہستہ سے شکنجے کو ہلایا تو خوف اور صدمے سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ ٹخنے کے اُوپر سے غالب کی پنڈلی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دبایا اور اُسے حوصلہ نہ ہارنے کی تلقین کی۔ اب یہاں ایک لمحہ ضائع کرنا بھی بے سود تھا۔ میں نے غالب کو اُٹھایا تو شکنجہ بھی ساتھ آ گیا اور ٹوٹے ہوئے جوڑ کے ساتھ لٹکنے لگا۔ غالب درد کی شدت سے تڑپا اور میرے ہاتھوں سے نکل کے خندق میں گرتے گرتے بچا۔

"بس غالب... بس ایک منٹ... صرف ایک جھٹکا اور میری جان۔" میں نے کہا اور خندق عبور کر گیا۔ غالب دُہرا ہو گیا مگر اُس نے کمال ضبط سے کام لیا اور مُنہ میں ہاتھ دبائے رہا۔ میں نے اُسے چند قدم دُور لے جا کر ایک جھاڑی کے پیچھے لٹا دیا۔ شکنجے کو الگ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اب مجھے غالب کو اُٹھا کر پانچ میل واپس جانا تھا اور کوئی ایسا انتظام کرنا تھا کہ شکنجہ اُسے تکلیف نہ دے اور اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو نہ ہلائے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے گاڑھے کے پُرانے میلے کُرتے کے دامن کو نیچے سے پھاڑا اور ایک لمبی پٹی اُتار لی۔ اِدھر اُدھر تلاش کر کے مجھے کوئی ایسی مضبوط لکڑی نہ ملی جسے میں استعمال کر سکتا۔ مجبوراً میں نے اُسی لکڑی کو توڑا جسے میں ابھی تک پھندے اور شکنجے دریافت کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ یہ سوکھی لکڑی ایک انچ کے قریب موٹی تھی۔ اس سے ایک ایک فٹ لمبے دو ٹکڑے توڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر مجھے اس طرح پیدا ہونے والی آواز سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لکڑی کو گھٹنے کے نیچے دبا کے موڑا، لکڑی پٹ سے ٹوٹ گئی اور میرا دل ایک بار پھر زور سے دھڑک کے رُکنے لگا کیونکہ آواز کے ساتھ ہی سرچ لائٹ پھر روشن ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے رحم روشنی ہم تک پہنچتی، میں بھی غالب کے ساتھ ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ روشنی جھاڑی کے پتّوں کی جالی سے چھن کر گزر گئی۔

میں نے دونوں لکڑی کے ٹکڑوں کو پنڈلی کے متوازی رکھا اور اندازے سے سیدھا رکھتے ہوئے پٹی کو کس کر باندھنا شروع کیا۔ یہ ابتدائی امداد کا اصول تھا۔ طبی امداد نہیں تھی، تاہم اس سے غالب کی مشکل اور کام آسان ہونے کی توقع تھی۔ میں نے دامن کے نیچے سے ایک اور پٹی پھاڑی اور اُسے بھی دونوں لکڑیوں کے اُوپر لپیٹ دیا۔ میں دامن سے دو انچ چوڑائی کی پٹیاں اُتارتا گیا اور لکڑیوں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے ہاتھ سے ہلا کے دیکھا تو درمیان میں ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا جوڑ نہیں ملا۔ پھر میں نے کُرتا اُتار دیا اور اُس کے پچھلے حصے کو نیچے سے پھاڑنا شروع کیا۔ میں نے ایک کے بعد ایک چار انچ چوڑی پٹیاں پھاڑیں اور پھر ان سب پٹیوں کو بل دے کر ایک کر لیا۔ اب میرے پاس ایک خاصی مضبوط رسی تیار ہو گئی تھی، جو دو سیر کا وزن اُٹھا سکتی تھی۔ میں نے اُس رسی کو شکنجے کے ایک حلقے سے گزارا اور پھر اپنی گردن میں ڈال لیا۔

پھر میں نے غالب کو یوں اُٹھایا کہ شکنجہ بھی ساتھ ہی اُٹھ گیا اور اس کا سارا وزن میری گردن نے اُٹھایا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر شکنجے کی گرفت برقرار تھی لیکن اُس کا وزن کسی طرح بھی ٹانگ کے جوڑ پر نہیں پڑ رہا تھا۔ میں نے غالب کو اُٹھا کے چند قدم کا فاصلہ طے کیا تو اندازہ ہُوا کہ رات بھر میں پانچ میل کی مسافت طے کرنا کتنا مشکل کام ہوگا۔ مجھے خود کو اس محافظ کی دُوربین نظروں سے بھی محفوظ رکھنا تھا جو اندھیرے میں میری نقل و حرکت کو دیکھ سکتی تھیں۔ ایک درخت سے دوسرے درخت کی اوٹ میں جاتے ہوئے میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا تھا پھر ایک ایک قدم آگے کی زمین کو چھو کر اور ٹٹول کر اگلا قدم بڑھاتا تھا۔ غالب کا وزن کندھوں پر تھا اور پھندے کا وزن میرے گلے میں یوں جھول رہا تھا کہ جب حرکت کرتا تھا تو فولادی شکنجہ میرے سینے پر دھم دھم لگتا تھا۔

پچاس گز کا فاصلہ میں نے کتنی دیر میں طے کیا، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ ہر قدم پُل صراط کی مسافت کا ایک حصہ تھا جس میں فنا کا خوف ہر لمحے ہم رکاب تھا۔ میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ یہ جسمانی مشقت سے زیادہ ایک انجانے خوف کا احساس تھا جو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی سرد لہر دوڑا دیتا تھا کہیں اگلے قدم پر کوئی شکنجہ مجھے شکار نہ کر لے، میں کسی قاتل گڑھے میں نہ گر جاؤں۔ جنگل میں بھیڑیے اور گیدڑ چلا رہے تھے، جس سے رات کا سناٹا زیادہ دہشت ناک محسوس ہوتا تھا۔ غالب کا کراہنا اب کم ہو گیا تھا۔ میری ترکیب نے اُس کے پاؤں کو وقتی طور پر جوڑ کے ہلنے کی تکلیف سے نجات دلا دی تھی، جہاں شکنجے نے اپنے آہنی دانت گاڑ رکھے تھے، وہ جگہ شاید سُن ہو گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس قسم کی چوٹ کچھ دیر بعد زیادہ تکلیف دیتی ہے، جب پٹھے اکڑتے ہیں اور سوجن بڑھتی ہے۔

دو گھنٹے بعد بھی میں ممنوعہ علاقے میں ہی تھا اور میرا اپنا یہ حال تھا کہ مجھے پانچ میل کا فاصلہ پانچ سو میل کے سفر سے زیادہ کٹھن نظر آتا تھا لیکن میں نے اپنی مایوسی کا اظہار غالب پر نہیں ہونے دیا۔ میں اُسے برابر ضبط اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتا رہا اور اُس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔

"یار، یہ سب مصیبت میری وجہ سے پڑی تجھ پر۔" وہ بولا۔

"کیا چوٹ کا اثر تیرے دماغ پر بھی ہو گیا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تیری جگہ اس شکنجے میں میں بھی پھنس سکتا تھا۔"

"پھر بھی یار، مجھے شرم آ رہی ہے کہ تیرے لیے..."

"بکواس مت کر مرزا غالب کے کفش بردار۔" میں نے کہا۔ "ایسی غیریت کی باتیں اچھی نہیں لگتیں تیرے مُنہ سے۔ کیا میں اس طرح ٹانگ تڑوا بیٹھتا تو مجھے کوئی نہ اُٹھاتا؟ محسن یا استاد ٹیڈی... تو اور میں... ہم میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں ہوتا تو دوسرا کیا کرتا؟ بائی بائی اور خدا حافظ کہہ کے چلا جاتا! لعنت ہے تیری اس سوچ پر..."

"لعنت ہے میری اس ٹانگ پر۔"

"ایسا مت کہہ، یہ میرے نزدیک کفر کا کلمہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام عمر اس ٹانگ نے کہاں کہاں تیرا ساتھ دیا، تجھے کہاں کہاں لے گئی، تیرے وجود کے بوجھ کو اُٹھا کے پھرتی رہی۔ یہ جسم خدا کی تخلیق کا وہ شاہکار ہے جس کا ایک پُرزہ بھی بے مقصد اور فالتو نہیں۔ جو اس میں نقص نکالے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوگا۔ تیری یہ ٹانگ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی تیری ایک آنکھ، ہاتھ یا پیر کی ایک انگلی پر بھی لعنت نہیں بھیجی جا سکتی۔ دوست کون ہے جو عام حالات میں ہنسی خوشی کہے کہ لعنت میری اس ٹانگ پر اور اسے کٹوا کے پھینک دے۔"

"یار، واقعی میرا دماغ چل گیا ہے۔" غالب شرمندہ ہو کے بولا۔ "اب زیادہ مت بول، تیری سانس پھول رہی ہے۔ ہم کتنی دُور آ گئے ہیں؟"

"تقریباً علاقہ ممنوعہ سے باہر ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، کچھ دیر پہلے میں نے ایک بورڈ دیکھا تھا۔" غالب بولا۔

"اچھا، میں نے نہیں دیکھا۔"

"تو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے، میری نظر پیچھے سے دونوں جانب دیکھ سکتی ہے۔" غالب نے کہا۔ "تھوڑی دیر رُک کر دم لے لے، ابھی بہت دُور جانا ہے۔"

ہم نے وہاں آدھا گھنٹا آرام کیا۔ میں ایک درخت کے نیچے دراز ہوا تو مجھے اپنی سانس کی رفتار بحال کرنے میں دس منٹ لگے۔ زمین پر چیونٹے رینگ رہے تھے اور درخت کی چھال سے سیدھے میرے جسم پر اُتر رہے تھے۔ وہ بڑے خونی قسم کے چیونٹے تھے۔ ایک نے میری گردن پر کاٹا تو میں اُچھل پڑا۔ میں نے اُسے نوچ کے الگ کیا تو میری اُنگلیوں نے خون کی معمولی سی نمی کو محسوس کیا۔ پھر دوسرے نے میرے پیٹ پر کاٹا۔ میں نے اُٹھ کر اپنا کُرتا اُتارا اور جھاڑ کر پہنا۔ کُرتا اب آگے پیچھے سے ڈیڑھ دو فٹ کم ہو گیا تھا اور اس کی لمبائی کوٹ کے برابر رہ گئی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے اور نامکمل کُرتے میں یقیناً میں مضحکہ خیز ہو گیا تھا لیکن مجھے اپنی ہیئت کذائی کا احساس ہی نہ تھا۔

درخت سے ذرا ہٹ کے چیونٹے نہیں تھے۔ وہ ایک بل سے نکل کر سیدھے درخت پر جا رہے تھے یا درخت سے اُتر کے بل میں داخل ہو رہے تھے۔ میں اس جگہ سے دو گز دُور لیٹ گیا۔ میری نظر اُوپر تاروں بھرے آسمان تک گئی اور بے اختیار میرے لبوں سے ایک دُعا نکلی۔ خدایا مجھے آج کی رات دوستی کی لاج رکھنے کا حوصلہ دے اور نہ جانے کیسے مجھے ایک سرگوشی سی سُنائی دی۔ میں نے اپنی ہی دُعا کے الفاظ سُنے۔ یہ دو پہاڑوں کے درمیان سُنائی دینے والی صدائے بازگشت محسوس ہوتی تھی۔ یقیناً غالب نے کچھ نہیں سُنا تھا، ورنہ وہ چونکتا۔ یہ میرے دل کا واہمہ تھا یا میری دُعا کا سفر تھا، جو عرش تک پرواز کر گئی تھی۔ یہ ایک بے غرض دُعا تھی، مدد کی التجا تھی یا فریاد تھی۔ میرے دل کو اعتبار آنے لگا کہ خدا نے میری سُن لی ہے۔

ایک سگریٹ جلا کے میں نے غالب کو دی اور دوسری خود پھونکتا رہا۔ خالی پیکٹ کو میں نے بڑی حسرت سے دیکھا۔ یہ خُوئے بد بھی کبھی کبھی ایک نفسیاتی سہارا فراہم کرتی ہے۔ غالب بھی خاموش پڑا رہا۔ اسے نیچے رکھتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا تھا پھر بھی فولادی شکنجہ اس کے مُنہ پر لگ گیا تھا۔ دوبارہ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے اپنے کُرتے کو دونوں طرف سے کچھ اور چھوٹا کیا اور ایک رسی بٹ کے ایسا بندوبست کر لیا کہ شکنجہ میری گردن میں طوق بن کے پڑا رہے لیکن حرکت نہ کرے اور میرے سینے پر وار نہ کرے۔ میں نے اُسے اپنی کمر کے ساتھ بھی کس لیا اور پھر نئے عزم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

رات کا وہ سفر سنسنی خیز حالات کی وہ داستان ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صبح مرغے اذانیں دے چکے تھے، جب مجھے وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گھاؤں نظر آیا، جہاں سے ہم گزشتہ روز پیٹ بھر کے چلے تھے۔ ہم گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو مسجد سے آوازِ اذاں بلند ہوئی — گھر سے نکلنے والے پہلے نمازی نے ہمیں دیکھا اور ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ ایک دراز قد سفید ریش و لالاینک دل بوڑھا تھا۔

"ایہہ کی ہویا پُتّر؟" وہ بولا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے مجھے دیکھنے لگا "توں تے کل وی آیا سی۔ کی یا سی نا؟"

"آہو چاچاجی" میں نے کہا "ایہہ میرا دوست وی میرے نال سی، لیکن اے بلا نال نئیں سی، اے راتی چمٹ گئی اے۔"

ذرا سی دیر میں ہمارے گرد کئی نمازی اکٹھے ہو گئے۔ اُنھوں نے ہمیں وہیں بیٹھنے کو کہا اور مسجد کی طرف جاتے جاتے کہا "اللہ اپنا فضل کرے گا۔"

پندرہ بیس منٹ بعد وہ پھر آگئے اور گاؤں میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ وہ لوگ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا کہ اگر ہمیں چائے مل جائے اور غالب کو اسپرو...

اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "چائے؟"

دوسرے نے سر کھجایا "اسپرو؟" مگر تیسرے نے کہا کہ زمیندار بھی اتنا بُرا آدمی تو نہیں ہے کہ کسی کی مصیبت میں بھی مدد نہ کرے۔ اسے جگانے میں کوئی ہرج نہیں۔ اُنھوں نے مجھے میرے فرض سے سبکدوش کر دیا اور غالب کو خود اُٹھا کے چل پڑے میں اعتراف کرتا ہوں کہ اُنھوں نے جس اخلاق کا مظاہرہ کیا اُس سے غالب کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔

زمیندار وہی شخص تھا جس کا اس گاؤں میں واحد پکا مکان تھا اور جس نے گزشتہ روز ہمیں مسافر جان کر کھانا بھی کھلایا تھا۔ اُس نے مُنہ اندھیرے شور مچانے والوں کو اندر ہی سے کچھ کہا لیکن دروازہ کھول کر دیکھنے پر اُسے حقیقتِ حال کا علم ہوا تو وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ غالباً وہ گاؤں کا واحد گھر تھا، جہاں چائے پی جاتی تھی۔ کمال یہ ہوا کہ اس کے پاس سے اسپرو کا پورا خوانہ دریافت ہوا۔ ان کا کوئی بیٹا جو شہر میں رہتا تھا اکثر فضول ولایتی دوائیں لا تا رہتا تھا جو وہ ایک ڈبے میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ولایتی دوا کا دیسی امراض سے کیا تعلق اور ولایتی طریقۂ علاج ہمارے مزاج کے موافق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ڈبے میں ملٹی وٹامن بھی تھے جو بیٹا ان ماں کے لیے لایا تھا مگر وہ بھی استعمال نہیں ہوئے تھے کیونکہ نیم حکیم صاحب کا ارشاد تھا کہ ان کی تاثیر گرم ہے۔ اینٹی بایوٹک دوائیں تو بقول نیم حکیم صاحب "نری آگ ہیں آگ، اندر سے وجود کو جلا دیتی ہیں، جگر کو پھونک دیتی ہیں اور خون خشک کرتی ہیں۔"

ان سب کی ناپسندیدگی کے باوجود میں نے غالب کو ٹیرامائی سین کا ڈبل ڈوز دیا، اس کے ساتھ بی کمپلیکس دیے اور پھر اسپرو کی چار گولیاں اُس کے حلق سے اُتار دیں۔

میرے سادہ دل میزبانوں کو یقینِ کامل تھا کہ اتنی گرم دوائیں یکمشت کھانے کے بعد غالب جھلس کے مر جائے گا اور اس کے اندر جو آگ لگے گی وہ غالب کے اس معرصے کے مطابق ہو گی کہ عشرِ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا لیکن اُنھوں نے ہمیں ہماری تقدیر پر چھوڑ دیا اور خودکشی... بلکہ میری بہ عمد اقدامِ قتل کی اس کوشش پر احتجاج نہیں کیا۔ اصل کرشمہ چائے نے دکھایا۔ میرے سامنے مکھن اور جہازی سائز کی تنوری روٹیاں بھی رکھی گئیں جو میں میزبانوں کی خواہش کے دس فیصد کے برابر کھا لیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم جیسے جوانوں کو اس سے دس گنا تو کھانا ہی چاہیے پھر ہمیں تھینی مارکہ اعلیٰ سگریٹ ملے اور مجھے اس آدھے کُرتے کے بدلے صاحبِ خانہ نے پورا نیا سوٹ پیش کیا، جو شلوار قمیص پر مشتمل تھا اور بہت پُرانا تھا مگر نیت کے خلوص اور نیکی کے جذبے نے اس کی قدر و منزلت کسی بیش قیمت نئے سوٹ سے ہزار گنا زیادہ کر دی تھی۔

ساڑھے سات بجے ہمیں گاؤں کا واحد تانگا دستگرالی لے جانے کے لیے جوتا گیا۔ میں نے اُنھیں بتایا تھا کہ وہاں محکمۂ نہر کے اوورسیئر میرے عزیز ہیں اور وہ اپنی گاڑی میں ہمیں شہر لے جائیں گے۔ تانگے کا سفر کوئی آرام دہ سفر نہیں تھا، کچی سڑک پر ہچکولے بہت زیادہ لگتے تھے۔ اسپرین نہ ملتی تو غالب کے لیے درد کی اذیت یقیناً ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اب وقتی طور پر درد کچھ دب گیا تھا۔ اسپرین میں نے بھی کھائی تھی کیونکہ رات بھر جنگل میں سفر کیا تھا اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ سخت ترین حالات میں کیا جانے والا سفر تھا۔ تانگے میں بیٹھ کے مجھے بڑی راحت ملی اور مجھے پھر اپنی دُعا کا خیال آیا۔ دُعا قبول نہ ہوتی تو یہ سب کیسے ہوتا۔ چائے تو معمولی چیز تھی مگر کیا اس گاؤں میں اسپرین اور اینٹی بایوٹک دوا ملنے کا سوچا بھی جا سکتا تھا۔ اب میں بڑی فراغت سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور میرے جسم کو بہت آرام مل رہا تھا۔ ہم تقریباً موت کے مُنہ میں جا کے زندہ لوٹ آئے تھے۔

ساڑھے نو بجے تانگا اوورسیئر کے آفس کے سامنے رُکا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا پھر اُس نے غالب کو دیکھا اور دوبارہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ... یہ سب کیا ہے سر؟" وہ بولا۔

"بتا دوں گا اطمینان سے" میں نے کہا "آپ کی گاڑی کہاں ہے؟"

"اُدھر پیچھے کھڑی ہوئی ہے" وہ بولا۔

"تو اُسے یہاں لے آئیے، میں اپنے دوست کو اس میں منتقل کر دوں پھر میں ایک ٹیلی فون کروں گا پھر آپ ہمیں شہر لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یس... یس سر" وہ بے دلی سے بولا۔ اس کے لیے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہمارے پاس ریوالور ہیں جب تانگے والا ہم سے ہاتھ ملا کے اور پیسے لینے کی بات کا سخت بُرا مان کے چلا گیا اور میں نے غالب کو اوورسیئر کی کار کی پچھلی سیٹ پر منتقل کر دیا تو ٹیلی فون استعمال کرنے کا مرحلہ آیا۔ اوورسیئر مجھے اپنے ساتھ آفس میں لے گیا۔

"سر... یہ بہت غیر قانونی طریقہ ہے۔"

"کیوں؟ آپ کا فون پھر خراب ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ہفتے سے خراب ہے" وہ بولا اور اُس نے ایک میز کی مقفل دراز کھول کے وہ ٹیلی فون کا آلہ نکالا، جس سے کھمبے پر چڑھ کے لائن ملائی جا سکتی تھی "میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں، یہ سرکاری معاملہ ہے۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے، جو تم سے کچھ کہہ سکے" میں نے شیخی مارتے ہوئے کہا "یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ اس میں جائز اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں۔"

ہم ایک میل دُور پیدل گئے کیونکہ جہاں کنکشن بکس تھا وہاں گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔

اوورسیئر نے مجھے نہر کے کنارے سے ذرا فاصلے پر لگے ہوئے ٹیلی فون پول کے مقابل کھڑا کر دیا "اب آپ کہیں بھی بات کر لیں۔" وہ بولا "اُدھر چڑھ جائیں۔"

میں نے جنکشن باکس کو دیکھا جس میں سے چار پیئر مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ اوورسیئر نے مجھے بتایا کہ کون سی لائن کس کی ہے اور انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا کہ میں کس کے بل میں اضافہ کرتا ہوں۔

"آپ خود اس سہولت سے کیسے فائدہ اُٹھاتے ہیں؟" میں نے اوورسیئر کے حرام خوری پر پھیلنے پھولنے والے جسم پر نظر ڈالی۔

"وہ میں خود نہیں کرتا۔" وہ جھینپ کر بولا "میرا کوئی بیلدار بات کر لیتا ہے۔"

"آپ کی جگہ وہ کیسے بات کرتا ہے؟" میں نے کہا۔

"جو میں نیچے سے کہتا ہوں، وہ اُوپر بول دیتا ہے" اوورسیئر نے کہا "جو جواب ملتا ہے وہ مجھے سُنا دیتا ہے۔"

"لیکن افسرانِ بالا سے...؟"

"وہ میں خود کرتا ہوں۔" اوورسیئر نے اس جرح کو غیر ضروری اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے بُرا سا منہ بنایا "میرا ایک بیلدار ہے، وہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیتا ہے پھر دوسرا ہم دونوں کو اُٹھاتا ہے، وہ پورا ٹارزن ہے۔"

میں ہنسا اور اوورسیئر کو مزید شرمندہ کرنے کے لیے بندر کی طرح کھمبے پر چڑھ گیا۔ یہ غیر قانونی کام جو ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے لائن مین عموماً بڑے شوق سے کرتے ہیں، میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ پہلے میں نے باکس کے اندر... دل کے کنکشن کو سمجھا پھر دو مختلف مقامات پر تار چھو کر دیکھے اور ریسیور کو کندھے سے دبا کے کان پر لگائے رکھا۔ ایک جگہ ٹون آ گئی۔ اوورسیئر صاحب نے نیچے سے ایک پیچ کس پھینکا جو میں نے کیچ کر لیا مگر اس کوشش میں اوورسیئر صاحب پر گرتے گرتے بچا۔ باکس کے پیچ تھوڑے سے ڈھیلے کرنے کے بعد میں نے اپنے آلے کے کنکشن ملائے اور پیچ دوبارہ کس دیے۔

انکل رضوی کا نمبر مجھے یاد تھا۔ اکرم شیخ اور نازو کے علاوہ وحید تو روز منظر کا نمبر بھی یاد تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے کس سے بات کروں۔ نازو کے گھر فون کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا تھا۔ اُس کے ماں باپ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میں اُن کی بے نقط کے جواب میں ہکلانے کے سوا کچھ نہ کر پاؤں گا۔ ان کے نزدیک نازو کو باغی کرنے اور گھر سے بے گھر کرنے والا میں تھا۔ میری وجہ سے وہ نافرمان اور گستاخ ہوئی، گھر والوں سے بے تعلق ہوئی اور نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔ منظر کا گھر پر ملنا غیر یقینی تھا کیونکہ اب دس بجنے والے تھے اور وہ عموماً ساڑھے آٹھ بجے کورٹ چلا جاتا تھا۔ ان حالات میں لے دے کے بس انکل رضوی کے گھر کا نمبر ہی رہ جاتا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی تین بار بجی پھر کسی نے کہا "ہیلو...!" اور شہلا کی آواز سُن کر میرا دل مچلنے لگا کہ میں اس کے ساتھ کوئی شرارت کروں مگر نیچے اوورسیئر صاحب مُنہ اُٹھائے گوش بر آواز کھڑے تھے۔

"یہ ایس۔ ایس۔ پی ضامن رضوی صاحب کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"جی۔ آپ... آپ کون ہیں؟" شہلا کی آواز میں عجیب سی بے چینی اور بے یقینی تھی۔ اُس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی پھر اُس نے چیخ ماری۔

"سکندر بھائی۔"

"اُتو کی پٹھی" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ جذبات کے بریک فوراً فیل ہو جاتے ہیں۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے یوں کہا جیسے اب ایس۔ ایس۔ پی لائن پر ہو "کیا حال ہیں آپ کے، جی میں کرنل سکندر بخت بول رہا ہوں فرام ایم۔ آر۔ ایس۔ کیا ہمارے محسن صاحب پہنچ گئے؟"

"ہاں، وہ پہنچ گیا" شہلا نے یک لخت صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھ لیا اور اپنی آواز دبالی "مگر تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ایک کھمبے پر سے" میں نے کہا "میری ذہنی سطح اس وقت عام لوگوں سے پندرہ فٹ بلند ہے، تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہوں... بالکل ٹھیک ہوں" وہ پاگل لڑکی رونے لگی تھی "مجھے محسن نے سب بتا دیا ہے۔"

"اور جس کے ساتھ وہ گیا تھا؟"

"کیپٹن رین؟ وہ بھی ٹھیک ہے" شہلا بولی "کل تو بیٹی کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی، ہوش میں آئی تو روتی رہی، انکل کی بہت احسان مند تھی۔ دونوں یہیں ہیں، آج شاید اپنے گھر جائیں گی۔"

"اچھا وہ کیسا ہے؟"

"وہ کون؟" شہلا نے کنفیوز ہو کے کہا۔

"وہ جو آنے والا ہے" میں نے کہا "ٹیڈی کا بھانجا۔"

"بھائی جان" شہلا نے مصنوعی خفگی سے کہا اور اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"کس کا فون ہے؟" پس منظر میں انکل کی آواز سُنائی دی۔

"کسی کا نہیں... میری ایک سہیلی ہے" شہلا ہکلائی۔

"شہلا! فون ایس ایس پی صاحب کو دو" میں نے چلّا کے کہا، اور نیچے کھڑا ہوا اوورسیئر ایک لڑکی کا نام سُن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ بھونچکا رہ جانے کا ماہر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

تھا میں نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ دُور چلا جائے۔ وہ مُردہ قدموں سے دُور چلا گیا۔ یہ اُس کی بے عزتی تھی جسے وہ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

"ہیلو!" انکل رضوی کی آواز ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھی۔

"السلام علیکم انکل! میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" انھوں نے کہا۔

"کیا محسن نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، کچھ بے سروپا باتیں کی ہیں، صرف فون پر۔" وہ بولے۔

"وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ اُسے بند کر دیں گے۔"

"یہ تو ہے۔" انکل رضوی نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ اس کی باتوں کو اوٹ پٹانگ کیوں کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور کیا کہوں؟" وہ بولے۔ "یہ ٹھیک ہے کہ کچھ دھماکے ہوئے ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی ملا ہے کہ وہاں غیر ملکی اسلحہ تھا مگر اس کا دلاور وغیرہ سے تعلق ثابت نہیں ہوا۔"

"کیا آپ کو فوجی ماہرین نے یہ نہیں بتایا کہ جو پل کا پشتہ اب تک تباہ ہو چکے ہیں وہ کس ملک کے تھے اور..."

"اس معاملے پر میں تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ یہ ملکی سلامتی کا مسئلہ ہے اور ٹاپ سیکرٹ لیول پر ڈیل ہو رہا ہے۔" وہ بولے۔ "تم بھی اتنے احمق کیوں ہو گئے ہو کہ ٹیلی فون پر اس قسم کی گفتگو کر رہے ہو۔"

"آئی ایم سوری انکل۔" میں نے کہا۔ "میں مجبور ہوں، میں ایک گاؤں بلکہ ایک ویران کھیت کے ٹیلی فون پول پر چڑھا ہوا ہوں کیونکہ آس پاس کوئی فون دستیاب نہیں، میری بات یہاں کوئی نہیں سُن رہا ہے۔"

"مگر وہ لائن وہاں سے یہاں تک پھیلی ہوئی ہے بے وقوف راستے میں کوئی بھی ٹیپ کر سکتا ہے۔" انکل نے برہمی سے کہا۔

"پلیز آپ یہ رسک لے لیجیے کیونکہ یہ ایمرجنسی ہے اگر وقت گزر گیا تو بہت نقصان ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسی کون سی ایمرجنسی ہے؟" انھوں نے کہا۔

"میں آپ کو ایک پتا سمجھا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے کیونکہ شاید دوبارہ آپ سے رابطہ قائم نہ ہو۔ وہاں ایک ایمونیشن ڈپو ہے، اگر آپ نے آج ہی فوراً ایکشن نہ لیا تو وہ اسلحہ سرحد پار پہنچ جائے گا مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کس قسم کا اسلحہ ہے اور کتنا اسلحہ ہے لیکن کل رات بھی وہاں ایک ٹرک اَن لوڈ کیا گیا تھا اور اس ٹرک کو خود دلاور نے لوڈ کرایا تھا جس ٹرک میں وہ اسلحہ جا رہا تھا، وہ اُلٹ گیا پھر دلاور دوسرا ٹرک لے کر آیا اور اُس نے اپنی موجودگی میں سارا اسلحہ دوسرے ٹرک میں رکھوایا۔ آپ سُن رہے ہیں نا؟"

"میں ٹیپ بھی کر رہا ہوں۔" انکل رضوی نے کہا۔

"ضرور کیجیے۔" میں نے کہا۔ "اس ٹرک کے ساتھ استاد پیدا ہو گیا تھا جو دلاور کا دستِ راست ہے۔ انھوں نے ٹرک کو لوڈ کرانے کے لیے راستے کے ایک گاؤں سے پانچ لڑکے پکڑے تھے... بلکہ چھ... ایک جان بچا کے اور زخمی ہو کے نکل گیا، وہ آپ کے پاس آئے گا، اُسے پولیس میں بھرتی ہونے کا بہت شوق ہے، باقی پانچ غالباً قتل کر دیے گئے میں نے ایک کی لاش بھی دیکھ لی تھی۔ وہ ٹرک بھی راستے میں اُلٹا پڑا ہوا ہے آپ کو نظر آ جائے گا۔ دوسرے ٹرک کا نمبر نوٹ کریں۔ ٹرک گولڈن نہال گڈز فارورڈنگ ایجنسی گوجرانوالہ کی ملکیت ہے، معلوم کریں کہ کل رات اُسے کون ڈرائیور لے گیا تھا۔"

"میں معلوم کر لوں گا۔"

"اور انکل، وہ جگہ بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے آس پاس ایک تین فٹ چوڑی خندق ہے۔ اُن وطن دشمنوں نے اپنے مقاصد کے لیے اُسے ممنوعہ علاقہ بنا رکھا ہے، جگہ جگہ پھندے اور شکنجے لگا رکھے ہیں، غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے ہو سکتا ہے آس پاس بارودی سُرنگیں بھی ہوں۔ آپ کو اپنے ساتھ خاصی مسلح فورس لانا پڑے گی۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ معاملہ اعلیٰ فوجی حکام کے سپرد کر دیں، میں آپ کو دوبارہ فون نہیں کروں گا، آپ کی کامیابی کی خبر اخبار میں دیکھ لوں گا۔"

"ممکن ہے یہ خبر دبالی جائے، ملکی سلامتی اور مفادِ عامہ کے پیشِ نظر..."

"اگر آپ یہ آپریشن رات کے وقت کریں تو بہتر ہوگا۔"

"میرا کام مجھ پر چھوڑ دو، تمھارے مشوروں کے بغیر بھی میں کر لوں گا۔"

"سوری انکل۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "کیا کیپٹن نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا تھا۔"

"اس کے باوجود آپ کو شک ہے۔"

"گدھے، یہ کس نے کہا ہے کہ شک ہے۔" انکل رضوی بولے۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس سب سے دلاور کا تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا، ابھی اتنا ہی غنیمت ہے کہ آپ کو ہم پر اعتبار آیا کہ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن مجھے اس طریقۂ کار سے اختلاف ہے، جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے انکل کہ آپ کا قانون اور ضابطوں والا طریقۂ کار ہمارے کام نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ شاید کاغذی کارروائیوں میں ہی اُلجھے رہ جاتے اور نکلنے والے نکل جاتے۔ ہم نے تو بہت کچھ کر لیا۔"

"مجھے معلوم ہے زیادہ شیخی بگھارنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولے۔ میں ہنسا کیونکہ اب اُن کے لہجے میں واضح طور پر شفقت آ گئی تھی۔ وہ مجبور نہ ہوتے تو شاید کھُل کر اسی طرح ہمارا ساتھ دیتے جیسے اب اکرام شیخ دے رہا تھا کیونکہ اُس نے نوکری چھوڑ دی تھی۔ "کیا بدمعاش سراج واپس پہنچ گیا انکل؟"

"نہیں، اس کا کچھ پتا نہیں۔" وہ بولے۔ "اُسے ڈیوٹی سے غائب ہونے کے جرم میں معطل کر دیا گیا ہے۔"

"کیا اُس کا چارج کسی ڈی آئی جی نے سنبھالا ہے؟"

"نہیں، ابھی تو اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔" رضوی صاحب نے کہا۔ "بلکہ کسی ڈی۔ آئی۔ جی کے وہاں جانے کا کیا سوال، ایس پی بھی شاید کوئی نہیں ہے ابھی تو... کوئی ڈی۔ ایس۔ پی جائے گا، ایس پی کی جگہ کام کرے گا۔"

"اُس نے انسپکٹر سندر کو قتل کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"یہی تو خرابی ہے ساری، آپ ثبوت ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں، سچ کو کسی کی زبان سے سچ نہیں مانتے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟ محسن جھوٹ بول سکتا ہے؟"

"میں جس نظام یا انصاف کی جس مشینری کا پُرزہ ہوں، اُس میں ثبوت کے بغیر نہ سچ کو سچ تسلیم کیا جاتا ہے، نہ جھوٹ کو جھوٹ، میرا ذاتی عقیدہ یا یقین کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔" وہ بولے۔ "یہ بتاؤ کہ تم خود کہاں ہو؟"

اُن کے سوال سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ "میں ملتان روڈ کی طرف چوبیس میل پر ہوں، واپڈا کے ریسٹ ہاؤس کے قریب۔ آنٹی کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"انھیں میرا سلام کہیے۔" میں نے کہا۔ "وہ تو مجھ سے خفا نہیں ہیں؟"

"نہیں، تمھارے لیے دُعا کرتی رہتی ہیں۔"

"مجھے آپ کی دُعاؤں کی بھی ضرورت ہے انکل۔" میں نے کہا۔

"میری دُعائیں..." انھوں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "ابھی تک تو تمھارے کام آئی نہیں ہیں۔" اور فون بند کر دیا۔ اُنھوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ جہاں تک دُعا کا تعلق ہے تو وہ ہمارے لیے دُعا ضرور کرتے ہیں مگر کسی معاملے میں ہماری مدد کرنا اُن کے اختیار کی بات نہیں۔ میرے لیے یہ بھی بڑے اطمینان کی بات تھی کہ ان کی دُعائیں بھی میری خیر خواہی کے لیے وقف ہیں۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں پھر شہلا سے بات کروں، آنٹی سے بات کروں، کیپٹن اور مجولی سے بات کروں لیکن میں سارا دن کھمبے پر ٹنگا نہیں رہ سکتا تھا۔ شاید رضوی صاحب بھی لمبی گفتگو کو غیر محفوظ سمجھتے تھے میں اس وقت جب میری کھمبے کے گرد لپٹی ہوئی ٹانگیں جواب دینے والی تھیں نیچے اُترنے کے بجائے پھسلتا ہوا نیچے اُتر آیا اور اوورسیئر صاحب کو دیکھ کر مُسکرایا۔

"یہ ایس۔ ایس پی شہلا، کوئی خاتون ہیں؟" وہ بولا۔

"شہلا اُن کی بیٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "میری کلاس فیلو تھی۔"

وہ سخت مرعوب نظر آنے لگا۔ "کرنل صاحب! میں بہت غریب سا آدمی ہوں۔"

"اگر آپ غریب ہیں تو اللہ ہم سب کو غریب کرے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان کے بچے بچے کو غریب کرے۔"

"میرا مطلب تھا یہ نوکری کا معاملہ ہے۔"

"آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔ آپ آنچ کے قریب جائیں گے تو ضرور آئے گی اور مجھے لگتا ہے کہ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی، میں سمجھا نہیں؟" وہ بوکھلا کے بولا۔

"سمجھا کریں۔" میں نے کہا۔ "اوورسیئر جب ایسی شاندار گاڑی میں پھرتا ہے تو اس کا مطلب دیکھنے والے کیا لیتے ہیں! یہی کہ آپ آگ بھر رہے ہیں اپنے نامۂ اعمال میں، اپنی قبر میں، اپنی اولاد کے خون میں۔"

"نہیں... میں یہ سب چھوڑ دوں گا۔" وہ لرزتے ہوئے بولا۔

"چھوڑ دوں گا۔" میں نے قہقہہ مارا۔ "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی، عیش کیجیے، جب تک مقدر میں ہے، ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے، جب بُرا وقت آئے گا تو آپ خود محسوس کریں گے کہ آخری وقت کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی۔ چلیں، اب ہمیں شہر لے چلیں۔"

غالب گاڑی میں بیٹھا ہوا سخت بے چین تھا مگر اوورسیئر کے سامنے اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

"یار، معاف کرنا... وہ لمبے ایس۔ ایس۔ پی صاحب ذرا لمبی بات کرنے لگ گئے۔"

"ایس۔ ایس پی... ضامن رضوی سے بات کر رہے تھے آپ؟" وہ چونکا۔

"ہاں، میں نے اُن کو سب بتا دیا ہے، اب باقی کارروائی وہ خود کریں گے۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اوورسیئر نے کار اسٹارٹ کی۔ ایک بار پھر ہم پُرانے راستے سے گزرے۔ وہ ٹرک اب بھی اُلٹا پڑا ہوا تھا۔ شاید وہ لاش بھی وہیں پڑی ہوئی ہوگی۔ میں نے سوچا، اُس نوجوان کی یا اُن پانچوں کی لاشیں جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ کیوں مارے گئے۔ ایک حوالدار کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ کتنی سچ بات تھی کہ سانپ نے سانپ کو ڈس لیا تھا۔ میں اونگھنے لگا۔ گاڑی رُکنے لگی تو میں نے آنکھیں کھولیں اور اچانک میری نظر نے پولیس کو دیکھا جو ٹرک کے درمیان ہمارا راستہ روکے کھڑی تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اگر میرے ساتھ محسن ہوتا تو میں اطمینان سے فرانسیسی میں کچھ بھی کہہ سکتا تھا لیکن مرزا غالب مادری زبان کے علاوہ کوئی زبان جانتے تھے تو وہ حلقوں کی زبان تھی اور حلقوں کی بیلوری کا ایک ناقابلِ اعتبار نمونہ ہمارے ساتھ اوورسیئر کی شکل میں موجود تھا۔

"یہ تو معاملہ کچھ گڑبڑ نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا تو ایسا ہی ہے کہ یہ خیروانی صاحب کے قائم مقام حسن کی عنایتِ خسروانہ ہے۔" غالب نے دقیق اُردو میں کہا۔ اس کی مراد انکل رضوی سے تھی جو آجکل شہلا کے والد بنے ہوئے تھے۔

"اس محاصرے کو توڑ کر نکلنا ہے اوورسیئر صاحب۔" میں نے کہا۔

"کیا جی توڑ کر نکلنا ہے۔" اوورسیئر نے کار کی رفتار اب بہت کم کر دی تھی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کرنل صاحب۔"

"آپ دیکھتے رہیے کہ کیسے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سب کر لیں گے۔"

"لیکن... وہ پیچھے سے گولی ماردیں گے... بلکہ گولیاں..." اوورسیئر نے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔" مرزا غالب نے کہا۔ "موت کا ایک دن معیّن ہے۔"

"آپ... آپ کا مطلب ہے کہ... خواہ میں فوت ہو جاؤں... مگر گاڑی کو بھگا کر لے جاؤں... ان کے بیچ میں سے یوں گزار کے لے جاؤں جیسے ان کی گولی میرے جسم میں سے گزرے گی۔" اوورسیئر نے تقریباً رو کے کہا۔

"نہیں نہیں... آپ گاڑی روک لیں۔" میں نے کہا۔ "فوت ہوں آپ کے دشمن۔"

"یعنی وہ سب جو آپ کو رشوت دینے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔ گاڑی رُک گئی کیونکہ اب ہمارے بالکل سامنے سڑک کے وسط میں ایک پکا تین پھولوں والا تھانیدار اور ایک سب انسپکٹر اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے روڈ بلاک کرنے کے لیے دو ڈرم رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ تھے بھی بالکل ڈرم۔

"اب آپ ان سے کہیں گے کہ ہم محکمۂ انہار کے بیلدار ہیں۔" میں نے ریوالور نکال کے اوورسیئر کی گدّی پر رکھا اور ہٹا لیا۔

"یعنی آپ کے ماتحت... آپ ہمارا کچھ بھی نام بتائیں لیکن موت کو مت بھولیں۔" غالب نے اوورسیئر کو دوسرے ریوالور کی جھلک دکھا کے کہا۔

اوورسیئر نے صرف ایک بار تھوڑا سا سر گھمایا تھا۔ پھر شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ گدّی پر یہ دھات کا ٹھنڈا لمس صرف ریوالور کی نال کا ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اقرار میں سر نہ ہلاتا تو کیا کرتا۔

"پکا تھانیدار گاڑی کے دائیں طرف آ گیا۔ دو پھول والا بائیں طرف سے غالب کے قریب پہنچا۔ ان دونوں کی نخوت اور فرعونیت کے تکبر سے بگڑی ہوئی کروہ صورت دیکھ کر اور ان کے جثے پر غور کرنے سے یہ خیال آتا تھا کہ وہ بھائی نہیں تو کزن ہیں۔

"نیچے آ جاؤ۔" انسپکٹر نے بڑی تمکنت سے اوورسیئر کو حکم دیا۔

"نیچے کہاں... گاڑی کے نیچے؟" میں نے پیچھے سے کہا اور اوورسیئر کا کندھا دبا کے اُسے نیچے اترنے سے روک دیا۔ "تم خود کیوں نہیں آ جاتے گاڑی کے نیچے؟"

"بیکار کے نیچے کیسے آ سکتے ہیں۔" غالب نے مزید اشتعال انگیزی کی۔ "یہ ٹرک کے نیچے شاید آ جائیں۔"

اپنی افسری کی یہ بے عزتی دیکھ کر تھانیدار اس غبارے کی طرح اُچھلا اور پھٹ گیا جسے آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ اس نے عادت کے مطابق مجھے کچھ روایتی گالیاں دیں جو آدمی پولیس میں رہ کے سیکھتا ہے۔ "پہلے تو میاں جی تو نیچے آنا۔" اس نے غضبناک لہجے میں غرا کے پچھے والا دروازہ کھولا۔ "تجھے ہم اتارتے ہیں قبر میں۔"

تقریباً اسی وقت سب انسپکٹر نے اپنے افسرِ اعلیٰ کی تقلید کرتے ہوئے غالب کی عزت افزائی کی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول لیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ خود غالب کے ذہن میں بھی ایسی ہی اسکیم آئی ہوگی کہ وہ دونوں ہمارے جال میں پھنس گئے۔ انسپکٹر کا خوفناک مونچھوں والا بھاری بھرکم چہرہ میرے اوپر آیا اور اس کا ہاتھ مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھا تو میں جان بوجھ کے پیچھے ہوا اور سیٹ سے چپک گیا۔ میری پشت غالب کی پشت سے لگ گئی۔ میں نے پیچھے کی طرف زور لگانا شروع کیا جیسے میں تھانیدار کے خلاف جسمانی مزاحمت کر رہا ہوں۔ اس سے تھانیدار اور اس کے ماتحت کے غصّے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

"اوئے... تمھاری تو... اوئے باہر نکل کنجر دے پتّر... میں کہتا ہوں گولی ماردوں گا۔" تھانیدار نے سر اندر ڈال کے ہانپتے اور چیختے ہوئے کہا۔ اس وقت میں اوورسیئر کی حالت نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی کار کی عقبی سیٹ پر ہونے والی اس دھینگا مشتی اور پکڑ دھکڑ سے سخت بدحواس ہوگا۔ ایک طرف تھانیدار تھا تو دوسری طرف ملٹری انٹیلی جنس کا ایک کرنل۔ دونوں مسلح تھے اور دونوں اس کو مقتول کر سکتے تھے۔ یہ ہاتھیوں کی لڑائی تھی جس میں وہ ایک حقیر کیڑے کی طرح پس جانے کے اندیشے سے دوچار تھا۔

مشکل یہ تھی کہ دونوں طرف سے کار کے دروازے پورے کھول کے بھی تھانیداروں کا سیدھا اندر آنا ناممکن تھا۔ ان کی چوڑائی زیادہ تھی اور وہ کار میں اس طرح گھس سکتے تھے کہ ایک سائڈ استعمال کریں۔ یعنی اپنے موت کے گولے جیسے پیٹ کو سامنے رکھیں۔ پھر کمرے جتنی کمر کو تھوڑا سا خم دیں اور سیٹ پر گر جائیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تب بھی سیٹ پر کیسے گرتے جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے لیے بیٹھ جانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ کار کے دروازے میں نیچے دھڑ نیچے بدن، پھنسے ہوئے تھے۔ پیٹ سے نیچے کا حصّہ کار سے باہر تھا اور بے کار تھا۔ اندر تک ان کے ہاتھ پہنچے ہوئے تھے اور انھوں نے ہمیں دبوچ بھی لیا تھا لیکن ہمیں کھینچ کے باہر نکالنا ان کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔

"تو کیا ہمیں گولی مارے گا۔ توپ کے گولے کی اولاد۔" میں نے تھانیدار کی گردن میں بانہیں حمائل کر دیں۔ وہ اور پھنس گیا۔

"ہم تیرے مقابلے میں تو انگور ہیں تربوز کے بچّے۔" غالب نے کہا۔ "لیکن یہ انگور کھٹے ہیں۔"

"اوئے چھوڑ مجھے۔" تھانیدار نے سانڈ جیسی گردن کو اِدھر اُدھر ہلا کے میری بانہوں کے ہار سے نکلنا چاہا۔

سب سے بُرا حال اوورسیئر کا تھا۔ "جناب... اجی سُنیے... کرنل صاحب... تھانیدار صاحب... یا میرے مولا... کس مصیبت میں ڈال دیا تو نے مجھ غریب کو..." وہ مسلسل بول رہا تھا مگر اس کی سننے والا کوئی نہ تھا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ اب تماشا کافی ہو چکا۔ میں نے تھانیدار کے سر کو بالوں سے پکڑ کے... کیونکہ اس کی ٹوپی اس دھینگا مشتی میں پہلے ہی گر چکی تھی، کار کے دروازے اور کھڑکی کے درمیان کی جگہ پر مارا۔ اسی وقت غالب نے سب انسپکٹر کے سر پر مارنے کے لیے ریوالور اُٹھایا تو اس کا دستہ پیچھے میرے سر سے ٹکرایا۔

"ابے دیکھ کے... دیکھ کے... یہ اپنا سر ہے۔" میں نے کہا اور تھانیدار کے سر کو "ری باؤنڈ" میں دوبارہ اسی جگہ مارا۔ تھانیدار نے پہلے دردِ زہ میں مبتلا بھینس جیسی آواز نکالی۔ پھر سب انسپکٹر بھینسے کی طرح ڈکرایا اور وہ دونوں تقریباً باہم پر گر گئے۔ غالب کی ٹانگ میں شاید درد کم تھا کہ اس نے میرا ساتھ پورا دیا۔ افسران کے کمترین ماتحت ابھی تک جیپ میں تشریف فرما تھے کیونکہ انھیں اپنے افسران کے اختیارات اور خوفناک مجرموں سے نمٹنے کی اہلیت پر پورا اعتماد تھا۔ جب میں باہر نکلا تو وہ کچھ نہ کر سکے کیونکہ افسروں کے ریوالور اب میرے ہاتھ میں تھے۔ اُن کا مُنہ کھلا رہ گیا۔ انھوں نے ایک نظر افسرانِ اعلیٰ کی طرف دیکھا جن کا نچلا دھڑ کار کے دروازے سے باہر پڑا تھا اور باقی افسر اندر اوندھا ہو چکا تھا۔ پھر میرے ہاتھ میں تھامے ہوئے ریوالور کو دیکھا اور اوائے فرض پر لعنت بھیجتے ہوئے جان بچانا بہتر سمجھا۔ جان ہے تو جہان ہے۔

"نیچے اترو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"پہلے اپنے طنبورے نیچے پھینک دو۔" غالب نے ان کی دقیانوسی رائفلوں کی طرف اشارہ کیا جو انگریز کے دَور کی نشانیاں تھیں جن کو وہ ہر وقت سینے سے لگا کے رکھتے تھے مگر یہ جنگ کے لیے طنبورے سے زیادہ کار آمد نہیں تھیں۔ طنبورے بجانے تو جا سکتے ہیں مگر گولیاں نہ چلانے کے قابل تھیں اور نہ بجانے کے۔ غالب گاڑی میں سے ریوالور نکالے ان کو دیکھتا رہا۔

"جو... ہو ہو ہو... ہو حکم... عالی جاہ..." ایک کانسٹیبل نے کہا جو غالباً پیدائشی ہکلا تھا۔

"مذاق... اُڑا... تا... ڑاتے... ہو... میرا۔" غالب نے کہا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر اوپر فائر کر دیا۔

"میں... میں... میں... میری... کیا مجال... عالی... جاجاجا... جاہ۔" وہ جیپ سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس نے اپنی رائفل اپنے قدموں میں ڈال دی تھی۔ دوسرے کی خودی کچھ بلند تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اطمینان سے نیچے اترا۔ اپنی رائفل کو اس نے جیپ میں ہی چھوڑ دیا... اوورسیئر بھی ہمت کر کے کار سے نکل آیا۔

"یہ آپ نے کیا غضب کیا... کرنل صاحب..." وہ بولا۔ "میں غریب آدمی..."

"چُپ کرو... غریب کے لُطفے..." میں نے دہاڑ کر کہا۔ "دوبارہ خود کو غریب کہا تو بچے یتیم ہو جائیں گے۔"

"ہمارا راستہ کیوں روکا تھا؟" میں نے واحد ہوش مند کانسٹیبل سے کہا تھا۔

"اس لیے کہ تم جیل سے بھاگے ہو۔" وہ بولا۔

"ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" میں نے اور غالب نے ایک ساتھ کہا۔

"اور نہیں تو کیا ہم جیل سے بھاگے ہیں؟" کانسٹیبل نے ایک معقول سوال کیا۔

"مگر... کیا ہم جیل سے بھاگے ہوئے لگتے ہیں؟" غالب نے کہا۔ "حُلیے سے یا شکل سے... یا لباس سے..."

کانسٹیبل نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے حُلیہ، صورت اور لباس سب بدل لیا ہے۔"

"جیل سے کون فرار ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"اور کس جیل سے؟" غالب نے پوچھا۔

"ایک تو ڈاکو مولا داد عرف پاٹے خاں ہے۔" کانسٹیبل نے کہا۔ "دوسرا اس کا ساتھی اور دشمن ہے زبردست شاہ عرف گورا۔"

"اور کیا پاٹے خاں کالا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... مگر زبردست شاہ سورج مکھی ہے۔" کانسٹیبل بولا۔ "اس کے بال بھی سفید ہیں اور سارا جسم سفید ہے... برص کے مریض کی طرح... اس لیے وہ گورا ڈاکو مشہور ہو گیا... بالکل گوروں کی طرح لگتا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے انگریزوں کی طرح۔" غالب نے کہا۔ "کیا ہم دونوں میں سے کوئی ایسا لگتا ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم دونوں نے ٹھیک اپ کیا ہوا ہے۔" کانسٹیبل نے قطعی لہجے میں کہا۔ اسے قائل کرنا بہت مشکل تھا کہ ہم وہ مفرور ڈاکو نہیں ہیں۔

"ابھی تم نے کہا کہ ساتھی اور دشمن ... یہ کیا بات ہوئی؟"

"بظاہر وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔" کانسٹیبل بولا۔ "سب ہی جانتے ہیں۔ مگر جیل سے فرار ہونے میں انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔"

"تم مجھے کچھ پڑھے لکھے لگتے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں گریجویٹ ہوں۔" وہ بولا۔ "کوئی اعتراض ہے تمھیں؟"

"بالکل ہے ... بی اے پاس کیا تھا تم نے پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے جہاں بیشتر لوگ انگوٹھا ٹیک ہیں۔" غالب نے کہا۔ "پیٹھان پڑھے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بولا۔ "کماتے کھاتے تو اچھا ہیں... عیش تو کرتے ہیں۔ بی اے ایم اے کو کون پوچھتا ہے۔"

"افسوس نوجوان ..." میں نے کہا۔ "کیا تم حرام اور حلال ..."

"چلو چلو ... یہ فتوے مت دو۔" کانسٹیبل حقارت سے بولا۔ "بہت وعظ سنے ہیں میں نے... بچپن سے جوانی تک سب کی بہت سنی۔ سب منافق اور ریاکار تھے۔ جو زیادہ نصیحت کرتے تھے وہی زیادہ بدمعاش نکلے۔ خود تم کون سا حرام حلال کے فرق کو سمجھتے ہو۔ باقی سب بھی تمھاری طرح ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ڈاکو کہلانے لگے ہو اور وہ ڈاکو نہیں کہلاتے۔"

"بات یہ ہے عزیزم ..." میں نے متاثر ہو کے کہا۔ "ہم اس وقت تم سے معاشرتی یا معاشی مسائل پر بحث نہیں کر سکتے۔ تمھارے پاس بھی یقیناً ایک دردناک کہانی ہوگی کہ تم نے کس طرح ڈگری لے کر ملازمت کی تلاش میں دھکے کھائے اور کس طرح تمھارے وہ سنہرے خواب خاک میں مل گئے جو اس ڈگری سے وابستہ تھے۔ اس لیے کہ تمھارے پاس سفارش کا انجن نہیں تھا جو تمھاری زندگی کی گاڑی کو دھکیل کر منزل مراد تک پہنچا سکتا۔ چنانچہ ناامید ہو کے تم نے کوئے ملامت کا رخ کیا اور کانسٹیبل بن کے حرام کھانے پر کمر باندھ لی۔ دنیا لے لی اور عاقبت کو چھوڑ دیا۔"

"یہ ... یہ سب تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" کانسٹیبل نے آنکھیں جھپکا کے کہا۔

"تم ابھی بچے ہو ... اپنے برخوردار ہو۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ کہانیاں تو ایسی ہیں کہ ان پر کوئی فلمساز فلم نہیں بناتا... کوئی ادیب قلم نہیں اٹھاتا اور کوئی غور نہیں کرتا۔ کسی کو اس مسئلے اور اس سے جنم لینے والے دوسرے مسائل سے اس لیے دلچسپی نہیں رہی کہ مسئلے کا حل کوئی نہیں۔ چنانچہ اس پر نہ کابینہ کے اجلاس میں غور ہوتا ہے نہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں۔ پہلے معاشرے کے تین طبقے تھے۔

فریاد کرنے والے، فریاد سننے والے ... اور وہ جن کے خلاف فریاد کی جاتی تھی۔ اب دو رہ گئے ہیں۔ کیونکہ فریاد سننے والے بھی وہی ہو گئے جن کے خلاف فریاد کی جاتی ہے۔ یہ بھی حق فریادی کو حاصل نہیں کہ ملزم کو منصف ماننے سے انکار کرے یا منصف کو ملزم قرار دے۔"

"معاف کرنا دوست!" غالب بولا۔ "ہم ہی وہ بدبخت بیکار ڈاکو ہیں۔ پاٹے خاں یہ ہے اور گورا ڈاکو میں ہوں۔"

"ہم نے کسی پولیس والے کو آج تک دوست نہ کہا۔ نہ ہم ..." میں نے اس کانسٹیبل کو گلے لگا لیا۔ "تم پہلے شخص ہو جس نے پولیس میں رہ کے بھی سچ بولنا نہیں چھوڑا ... اور تمھارے حالات وہی ہیں جو ہمارے حالات تھے۔ فرق صرف کل اور آج کا ہے۔ ہم کل ڈاکو بنے تھے۔ تم آج بنے ہو لیکن ہو تم ہمارے ہم پیشہ... اچھی بات یہ ہے کہ تم خود کو قانون کا محافظ نہیں کہتے بلکہ ڈاکو تسلیم کرتے ہو۔"

"میں ذرا بزدل تھا اس لیے ڈاکو نہیں بن سکا۔" نوجوان کانسٹیبل ذرا شرمندہ ہو کے بولا۔ "یہ زیادہ ہمت کا کام ہے۔"

"ہاں، ہم پکڑے بھی جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم پکڑے نہیں جاتے بلکہ ہمیں پکڑتے ہو۔ ڈاکوؤں کو بھی لوٹتے ہو۔ اب یہ اپنے اوورسیئر صاحب ہیں جو خود کو غریب آدمی کہتے ہیں حالانکہ یہ کار ان کی ہے۔"

"قسم خدا کی خریدی ہے میں نے..." اوورسیئر نے شور مچایا۔

میں نے اس کے ایک جھانپڑ دیا۔ "کیسے خریدی؟ لاٹری نکلی یا پردادا کا گاڑا ہوا خزانہ مل گیا تھا۔ محنت کرنے والوں کے حق پر ڈاکا ڈال کے لی تھی یہ گاڑی۔"

"دیکھو بھائی۔" اوورسیئر نے ہاتھ جوڑ کے کانپنا شروع کیا۔ "یہ کوئی قصور ہے تو بتاؤ... میں نے تو تمھاری مدد کی تھی۔"

"ہاں... تو تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی..." کانسٹیبل نے اسے ایک اور جھانپڑ مارا۔ "تم زیر حراست ہو۔"

"اور ہم ... ہمیں اجازت ہے۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"اگر چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔" غالب نے کہا۔ "اس سرکاری وردی کو اتار پھینکو۔" وہ تمام گفتگو کار کی کھڑکی سے سر نکال کے کر رہا تھا۔

"نہیں سجنو! میں اتنا جی دار نہیں ہوں۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں یہی وردی پہن کے زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکتا ہوں۔ تم بھی تو نقاب پہنتے ہو۔ اسے میرا نقاب سمجھ لو... جاؤ بھاگ جاؤ اس سے پہلے کہ میرے افسر ہوش میں آئیں... مگر دیکھو... ایسے مت بھاگو۔ ہم دونوں کو لمبا لٹا جاؤ تاکہ ہم پر تو الزام نہ آئے ... اور ہاں جاتے وقت یہ جیپ لے جانا۔"

"دل تو نہیں چاہتا تم پر ہاتھ اٹھانے کو۔" میں نے کہا۔ "مگر مجبوری ہے۔"

"یہ تو بتاؤ کہ تم اوورسیئر صاحب کا کیا کرو گے۔" غالب نے کہا۔

"یہ فالتو ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے لیے اب ان کا کوئی مصرف نہیں رہا... کہو تو قتل کر دوں، کہو تو پولیس کے حوالے کر دوں؟"

"اوورسیئر صاحب سے پوچھ لو ان کی کیا مرضی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا بیان دیں گے یہ؟"

"میں وہی بیان دوں گا جو تم کہو گے۔" اوورسیئر اب ہکلانے لگا تھا۔ اس کا بلڈ پریشر یقیناً اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہو سکتا تھا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ بعد میں تم اور کچھ نہیں کہو گے؟"

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟" اوورسیئر بولا۔ اسے اب ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ ہم ہی پاٹے خان اور گورا ڈاکو ہیں جو بھیس بدل کے اسے مل گئے تھے۔ ایک کانسٹیبل کے سامنے ہم نے تسلیم کیا تھا کہ ہم بھی تعلیم یافتہ ہیں اور گردش حالات نے ہمیں ڈاکو بنا دیا ہے۔ عموماً لوگ چور ڈاکو ایسے ہی بنتے ہیں۔ شوقیہ کوئی اس پیشے میں قدم نہیں رکھتا اور ماں باپ جو ہمیشہ اولاد کو ڈاکٹر، انجینئر بنانے کی سوچتے ہیں کسی بھی بیٹے کو ڈاکو بنانے کی پلاننگ نہیں کرتے۔

"ضمانت کی فکر چھوڑ دو۔" میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "تمھارے وعدے کی ضمانت تمھاری جان ہے۔ اس جان کو تم کسی سیف ڈپازٹ والٹ میں رکھوا دو تب بھی ہم نکال کے ضائع کر دیں گے۔ اس کے علاوہ تمھاری بیوی بچے بھی تمھارے وعدے کے ضامن ہوں گے۔"

"بیوی بچے... ان کا میرے معاملات سے کیا تعلق؟"

"ابھی تو نہیں ہے لیکن تم نے وعدے کی خلاف ورزی کی تو کوئی نہ کوئی تعلق ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اس دنیا میں نہ رہے۔ یا وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے، بات تو ایک ہی ہے۔ لواحقین اور وارث صرف اثاثوں کے، کوٹھی، کار اور بینک بیلنس کے حقدار نہیں ہوتے۔ انھیں مرحوم کے قرضے بھی چکانا پڑتے ہیں۔ ان کے کیے کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔"

میرا مقصد صرف اپنی دھمکی میں اثر پیدا کرنا تھا، ورنہ ایسا نہ ہوا تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ ہم اپنے دشمنوں کے مظالم، ان کی درندگی اور سفاکی کا بدلہ ان کے خاندان والوں سے لیں۔ ان کی بیویوں کو سزا دیں یا معصوم بچوں کو۔

"اپنے بچوں کی زندگی کی قسم کھاؤ۔" غالب نے کہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمھارے بچے بھی ہیں یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "بچے ہی نہ ہوں تو ہزار بار قسم کھانے سے بھی کیا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"میرے چھ بچے ہیں۔" وہ بولا۔ "تین لڑکے، تین لڑکیاں۔ میں ان کی زندگی کی قسم کھاتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ نہیں... کہو کہ وہی بتاؤں گا جو مجھے بتایا جائے گا۔" غالب نے اسے ڈانٹا۔

"ہاں، ہاں۔ وہی کہوں گا، ہمیشہ وہی کہوں گا جو تم کہو گے۔"

"اچھا تو سنو۔" میں نے کہا۔ "تم سے ہماری ملاقات ابھی کچھ دیر پہلے اچانک ہوئی تھی جب ہم نے جنگل سے نکل کر سڑک پر تمھارا راستہ روک لیا تھا۔ ہم نے ریوالور دکھا کے تم کو مجبور کیا کہ تم ہمیں گاڑی میں بٹھا کے وہاں لے چلو جہاں ہم کہیں۔ تم انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تم کو خطرہ تھا کہ یہ دونوں شخص جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔ یہ تمھارا خون کر کے بھی گاڑی لے جائیں گے۔ ابھی تم مشکل سے ایک میل دور آئے تھے کہ تمھارا راستہ پولیس نے روک لیا۔ تب تمھیں معلوم ہوا کہ ہم تو جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو تھے۔ اس کے بعد تمھاری اور کانسٹیبل کی ایک ہی کہانی ہوگی کہ ڈاکوؤں نے پہلے افسروں کو قابو کیا، پھر تمھیں مارا اور جیپ لے کر فرار ہو گئے۔ چونکہ تم بے ہوش پڑے تھے اس لیے تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ دونوں ڈاکو کس طرف گئے... بیان سمجھ میں آ گیا؟"

"بالکل آ گیا۔ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔" اوورسیئر کانپتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیں، پاٹے خاں صاحب... میں ایک غریب..."

اس مرتبہ میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا، ہونٹ کٹ گیا اور خون قطرہ قطرہ اس کی سفید قمیص پر گرنے لگا۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پھر بھوں بھوں کر کے مضحکہ خیز طریقے پر رونے لگا۔

"چپ۔ کیا منحوس کتے کی آواز میں رو رہا ہے۔" غالب نے اسے ڈانٹا۔ وہ ایسے چپ ہو گیا، جیسے گراموفون ریکارڈ پر سے سوئی اٹھا لی جائے۔

"تم پھر بھول گئے تھے کہ تم غریب آدمی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"جلدی کرو سجنو!" کانسٹیبل بولا۔ "اس موٹے کی فکر مت کرو۔ اگر اس نے بک بک کی تو ہم اسے اندر کر دیں گے کہ یہ بھی ڈاکوؤں کا ساتھی ہے اور اس نے ڈاکوؤں کی مدد کی تھی۔ تم اب نکل جاؤ۔ ایک افسر کچھ ہل رہا ہے۔"

میں نے دیکھا تو سب انسپکٹر کی ٹانگیں ہل رہی تھیں۔ غالب نے پلٹ کے اس کے سر پر ایک وار کیا تو وہ پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے اوورسیئر کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ پہلے ہی نیم جاں تھا۔ وہ ایک بار گلا پھاڑ کے چلایا اور گھوم کے پیچھے گر گیا۔

"تم نے سجن کہا ہے۔" میں نے کانسٹیبل سے مخاطب ہو کے کہا۔ "تم پر وار کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے۔"

"اس طرح میں الزام سے بچ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "تمھارا اللہ بیلی۔"

میں نے اس کی پیشانی پر ریوالور کی نال ماری جس سے ایک لمبا زخم آیا۔ کھال ڈیڑھ دو انچ تک پھٹ گئی اور اس کی پیشانی خون

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے تر ہو گئی۔ زخم کی گہرائی زیادہ نہیں تھی مگر دیکھنے میں وہ اوور سیئر اور اپنے افسران سے زیادہ زخمی لگتا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے بھی یوں پھاڑ دیے کہ معلوم ہو اس نے سخت مقابلہ کیا تھا۔ اس عمل میں کچھ خراشیں بھی اس کے جسم پر آئیں۔

"تھینک یو۔" وہ بولا۔ "اب مجھے ترقی ضرور ملے گی کہ میں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔" اور اطمینان سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ پھر میں نے باقی کارروائی مکمل کی۔ میں نے اوور سیئر کی جیب خالی کی اور کاغذات کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے وہیں پھینک دیا۔ ہکلا کے جیپ سے گرنے والا کانسٹیبل ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی چنانچہ مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا کہ وہ گولی کی آواز سن کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تمہارا یہ ساتھی۔ کیا یہ واقعی بے ہوش ہے۔" میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

کانسٹیبل نے مجھے ایک آنکھ کھول کے دیکھا۔ "ہو گا۔۔۔ اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت بھی شاید مرگی نے ہی اچانک آلیا تھا۔"

مرگی بھی ہکلانے کی طرح ایک دماغی عارضہ ہے۔ میں نے اس کا علاج لوگوں کو جوتی سے کرتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں جوتی سنگھانے کا نسخہ سب سے پہلے کس حکیم افلاطون نے ایجاد کیا ہو گا مگر میں نے اس سے سچ مچ مرگی کا دورہ ختم ہوتے اور مریض کو ہوش میں آتے دیکھا تھا۔ میرے یورپی ساتھی جو لندن میں میرے کلاس فیلوز تھے، ہندوستانیوں کی جہالت اور اوہام پرستی کا بہت مذاق اڑاتے تھے۔ جوتی سنگھانے والی بات بھی ایک بار سخت نزاع کا سبب بن گئی تھی، جب ہم نے ایک جرمن لڑکی کو مرگی کا دورہ پڑتے ہی جوتی سنگھا دی تھی۔ میں اور محسن پٹتے پٹتے اس لیے بچ گئے تھے کہ لڑکی ہوش میں آگئی تھی۔ تاہم یہ معاملہ اوپر تک گیا تھا کیونکہ عام تاثر ہمارے حق میں نہیں تھا۔ کہا یہی گیا کہ لڑکی کو خود ہوش آیا تھا، ہم نے جوتی سنگھا کے گویا سخت بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا۔ اس مرتبہ تو معذرت اور وارننگ پر بات ٹل گئی لیکن دوسری بار اسی لڑکی کو دوبارہ دورہ پڑا تو ہم نے چیلنج کیا کہ اب یہ لڑکی خود ہوش میں نہیں آئے گی۔ انڈین طلبا جو ہمیشہ ہر معاملے میں ہماری مخالفت کرتے تھے، ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم نے پھر جوتی سنگھائی اور لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ دوسری بار ایک ڈاکٹر نے ہمارا انٹرویو لیا اور سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں یہ برین ٹیومر کی ایک بیماری تھی، جس کا واحد علاج آپریشن تھا بشرطیکہ ٹیومر ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کاٹ کے نکالا جا سکے اور جان کو خطرہ نہ ہو۔ اور آپٹک نرو کے کٹ جانے سے ناقابل علاج دائمی اندھے پن کا اندیشہ نہ ہو۔ ہم نے یعنی پاکستان ہندوستان کے طلبا نے متعدد غلط سلط تاریخی نام اور حوالے دے کر ثابت کیا کہ یہ طریقۂ علاج صدیوں

سے کارگر ہے اور اب تو جوتا ہر مرض کا علاج بن گیا ہے۔ آج بھی [illegible] بعد یہ بات یاد آئی تو میں ہنس پڑا۔

میں نے ایک تیلی ماچس کی جلائی۔ پھونک مار کے بجھائی اور فوراً مرگی سے بے ہوش ہو جانے والے کانسٹیبل کے کان کی لو پر لگا دی [illegible] ہلا تک نہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کی بے ہوشی ڈرامہ نہیں تھی اور وہ بے ہوش بنا ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا۔ اس [illegible] جیب میں سے نقد رقم سوا سو روپے نکلی اور ایک پیکٹ کیپسٹن سگریٹ کا برآمد ہوا۔ میں نے فوراً ایک سگریٹ کار سے جھانکتے والے [illegible] کو پیش کی اور ایک اپنے لیے نکال لی۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے غالب نے سب انسپکٹر کی جامہ تلاشی لی اور میں نے تھانیدار کی مجبوری [illegible] ملا پیران کے قبضے سے بائیس ہزار روپے کی خطیر رقم ملی جو ہم نے مال غنیمت اور حلال سمجھتے ہوئے رکھ لی۔ کاغذات وغیرہ ہمارے لیے بے مصرف تھے چنانچہ ہم نے وہیں پھینک دیے۔

غالب اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو ہلائے بغیر خاصا سرگرم رہا تھا لیکن اب اس کی صورت دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور جیپ میں [illegible] کر دیا۔ جیپ میں مجھے تھرماس اور ناشتے دان نظر آئے۔ یہ ناکا بندی کرنے والی پولیس پارٹی کا لنچ تھا اور چونکہ پارٹی میں دو افسر بھی تھے اس لیے تعین کیرئیر میں تر مال ملنا یقینی تھا۔ کھانے کو غیر ضروری سمجھتے [illegible] میں نے تھرماس کھولا تو اس میں سے گرم چائے کی دلنواز مہک آئی۔ یہ ڈبل کپ والا تھرماس تھا جس میں دودھ الگ تھا اور سیاہ قہوہ [illegible] میں صرف چینی ڈالی گئی تھی۔ میں نے دودھ کو پھینک دیا اور [illegible] کے غالب کو پیش کیا۔ میری جیب میں اسپرین بھی تھی اور دوسری [illegible] بھی۔ اینٹی بایوٹک کی پہلی خوراک کو چار گھنٹے گزر چکے تھے چنانچہ میں نے غالب کو دونوں دوائیں دے دیں۔

جلدی جلدی چائے کا ایک کپ حلق سے اتار کے میں [illegible] کی طرف گیا۔ یہ گرم چائے نہیں، انتہائی قوت بخش اور جادو اثر ٹانک تھا جس نے مجھے آدمی سے ٹارزن بنا دیا۔ میں نے دوسری سگریٹ سلگا کے ایس آئی کو گاڑی کے اندر کیا، پھر مجھے ایک اور خیال [illegible] میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔ اس کی وردی [illegible] میں میرے پانچ منٹ بھی صرف نہیں ہوئے۔ یہ وردی مجھے [illegible] سے بہت ڈھیلی تھی لیکن میں نے بیلٹ کو ٹائٹ کر لیا اور [illegible] اپنے انہی کپڑوں پر چڑھا لی جو میں نے پہن رکھے تھے، پھر میں [illegible] سب انسپکٹر کو اسی حالت میں کار کے اندر ڈال دیا جس حالت [illegible] وہ پیدا ہوا تھا۔ دفل انسپکٹر کے ساتھ بھی میں نے یہی سلوک کیا [illegible] ماتحت پر ڈال کے کار کو لاک کیا اور چابیاں اپنی جیب میں ڈال لیں [illegible] وردی میں نے غالب کو تھما دی۔

"میں اسے نہیں پہن سکتا۔" غالب نے اپنی ٹانگ کی طرف

اشارہ کیا۔

"بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے کہا اور نیچے سے وہ رائفل اٹھا کے جیپ میں ڈال دی جو مرگی زدہ کانسٹیبل کی ملکیت تھی۔

"میری رائفل مت لے جانا بچو۔" ہمارے مددگار نے کہا۔ "مجھ پر کیس بن جائے گا۔"

"ہم اتنے احسان فراموش نہیں ہیں دوست۔" میں نے کہا اور اس کی رائفل جیپ میں سے اٹھا کے اس کے قریب ڈال دی۔

"میرا خیال ہے کہ تم نکل جاؤ گے۔" وہ بولا۔ "تم بہت ہوشیار اور ذہین لوگ ہو مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھو۔" میں نے کہا۔

"یہ تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہو؟" وہ بولا۔ "مل کے کام کیوں نہیں کرتے۔ اپنی طاقت ایک دوسرے کے خلاف کیوں ضائع کرتے ہو۔ جیسے مل کر جیل سے نکلے ہو ایسے ہی مل کے باہر رہو۔ فائدہ تمہارا اپنا ہے۔"

"یہ سبق ہم نے سیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی تمہاری بات یاد رکھیں گے۔ نام کیا ہے تمہارا دوست؟"

"چھوڑو نام کو۔۔۔ ہمیں کونسا پھر ملنا ہے۔" وہ بولا۔ "اب جاؤ۔"

"آج تم نے ہماری مدد کی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ کل ہم تمہاری مدد کریں۔"

"تم میری کیا مدد کرو گے؟" وہ ہنسا۔ "خیر۔۔۔ میرا نام ہے خدا بخش ولد نور بخش۔"

"جب ہم کچھ کریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔ چابیاں ابھی تک اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور چند منٹ میں ہم ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے رواں تھے۔ خدا بخش کی طرف سے میں مطمئن تھا کہ کچھ دیر میں اس کا کوئی افسر ہوش میں آئے گا تو اسے بھی اٹھائے گا۔ افسروں کے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت بہتر ہو گی۔

"کیسا عجیب آدمی تھا یہ کانسٹیبل بھی۔ تم نے نام پوچھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، خدا بخش۔" میں نے کہا۔ "ہمارے حق میں تو فرشتۂ رحمت بن گیا، ورنہ وہ ایسا شخص تھا کہ آسانی سے ہار نہ مانتا۔ مرتے مارتے پر اتر آتا تو پریشانی میں مبتلا کر دیتا۔"

"غالباً ذہنی طور پر اسے ڈاکو پاٹے خاں اور گورے ڈاکو سے ہمدردی ہے۔" غالب بولا۔ "یا وہ ان سے متاثر ہے۔ ممکن ہے ان کے بھی حالات ویسے ہی ہوں جیسے ہمارے ہو گئے ہیں۔"

"ہاں، بات صرف زاویے کی ہے کہ کون کسے کس زاویے سے دیکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "قانون کی نظر میں ہم مجرم، قاتل اور ڈاکو ہیں۔ ہماری نظر میں ملا ورا اور نواب خسرو جیسے دولت مند اور معزز لوگ سب سے بڑے ڈاکو ہیں۔"

"صرف پولیس میں کیا۔۔ ٹھیکیدار بھی ڈاکو ہیں اور ٹھیکے دینے والے افسر بھی ڈاکو ہیں۔ بیشتر محکموں میں بیشتر لوگ اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں حاصل ہونے والے اختیارات کو ڈاکے ڈالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ زمیندار اور وڈیرے اپنے مزارعین اور ہاریوں کے حقوق پر یہاں تک کہ ان کی عزت پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ شریف آدمی کہیں ہے تو روپوش ہے۔ اپنی جان و مال اور آبرو بچانے کے لیے خاموش ہے اور پناہ کے سوا کچھ نہیں مانگتا۔"

"ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب کوئی کسی کے حق پر، مال پر، جان یا عزت پر، انصاف پر اور قانون پر ڈاکا نہیں ڈال سکے گا۔" غالب بولا۔ "ہم مایوس نہیں ہو سکتے۔ ہمارا مایوس ہونا ہی شکست کی پہلی علامت ہو گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ دن کب آئے گا۔" میں نے کہا۔ "میں اور تو۔۔۔ محسن اور ایم آر ایس کے سب خدائی فوجدار۔۔۔ ہم سب احمقوں کی جنت میں تو نہیں رہتے؟"

"نور چشم! ایم آر ایس میں صرف ہم ہی نہیں، دنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں۔ وہ سب جو ایک یوٹوپیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ کرۂ ارض پر انسانیت کی معراج مانگتے ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، کچھ عملاً، کچھ خاموشی سے۔ جو دعا دیتے ہیں وہ بھی تو کچھ کرتے ہی ہیں۔۔۔ ہمارے لیے مورل سپورٹ تو فراہم کرتے ہیں۔"

"اچھا مرزا صاحب۔۔۔ یہ فلسفہ چھوڑو۔۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ہم اسی طرح سیدھے چلتے جائیں۔ آگے دوسری پولیس پارٹی بھی مل سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "آگے ایک سڑک سیدھے ہاتھ کی طرف جاتی نظر آتی ہے، گاڑی ادھر موڑ لوں؟"

مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ لاہور ہمارے مشرق میں ہے یا مغرب میں اور شمال یا جنوب میں ہے تو کتنے فاصلے پر ہے۔ وہ سب سرحد کے قریب کا علاقہ تھا اور مجھے کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ نہر مشہور بی آر بی کینال ہو گی جہاں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ملک کے ایک جیالے سپوت نے بے مثل جرأت اور شجاعت کا ایک تاریخی کارنامہ سر انجام دیا تھا، جس کی یادگار بھی وہاں موجود ہے مگر مجھے ابھی تک نشانِ حیدر پانے والے اس شہید کو خراج تحسین پیش کرنے اور دعائے مغفرت مانگنے کے لیے اس یادگار پر حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سگرانی بھی ایک بے حد غیر معروف نام تھا اور دوسرے گاؤں بھی ایسے تھے کہ لاہور میں رہ کے میں نے کسی سے ان کے نام سنے تک نہ تھے چنانچہ مجھے اپنی صحیح جغرافیائی پوزیشن کا تعین کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، اگر ہم سیدھے چلتے جاتے تو کسی نہ کسی شاہراہ پر پہنچ جاتے لیکن سیدھا جانے میں یہ امکان بھی تھا کہ ہم تھانے پہنچ جائیں۔ ہر پولیس پارٹی میں تو کوئی گریجویٹ کانسٹیبل خدا بخش نہیں ملتا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جیپ کچے راستوں، جنگلوں اور پتھریلے ناہموار میدانوں یا پہاڑوں کے سفر میں اتنی ہی قابلِ اعتماد اور مفید سمجھی جاتی ہے جتنا صحرائی مسافتوں کے لیے وہ جانور جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ دائیں طرف مڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ جو دور سے ایک نقلی سڑک نظر آتی تھی، وہ ایک کچے راستے سے زیادہ کچھ نہیں اور آگے جا کے یہ راستہ بھی اتنا دشوار گزار ہو گیا کہ ہمارے پاس کار ہوتی تو اس کا وہی حشر ہوتا جو قالین پر نزاکت سے چلنے والی شہری رئیس زادی کا ہو اگر اسے ننگے پاؤں دھوپ میں پتھروں پر میلوں چلنا پڑے۔

"یار یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" غالب نے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ ہم آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے والی بات کو سچ کر دکھائیں۔ پولیس سے بچ رہے ہیں تو اس سے بھی بڑی مصیبت گلے پڑ جائے۔"

"اب تو میرے خیالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں، یہ راستہ کہاں تک ایسا ہی ہوگا۔"

"میں نے ٹائروں کے نشانات تو دیکھے ہیں۔" غالب بولا۔ "شاید جنگل سے لکڑی کاٹنے کا ٹھیکا لینے والوں کی گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ آگے کسی آبادی کا وجود تو مشکل نظر آتا ہے۔"

مجھے تو ڈر ہے کہ ہم گھوم پھر کے دوبارہ اسی نہر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "یا پھر اچانک سڑک ختم اور نہر میں ہمارا بیڑا غرق۔"

"جیپ میں نہر اور نہر میں جیپ۔" غالب نے کہا۔ "بہتر ہے کہ آپ واپس چلیں۔"

میں نے گاڑی کو تھوڑا سا موڑا۔ جیپ کے پہیے ایک جھاڑی کو کچلتے ہوئے گھومے اور جیپ کا رخ کچھ بدلا۔ میں نے جیپ کو ریورس میں ڈالا تو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ "شاید پیچھے کوئی گڑھا آ گیا۔" میں نے کہا۔

"گڑھا یا کنواں؟" غالب نے کہا۔

"موت کا کنواں۔" میں نے کہا۔ "اس میں بھی گاڑی چلا سکتا ہوں میں۔"

لیکن یہ دعویٰ فوراً غلط ہو گیا۔ میں نے گاڑی کو دوبارہ آگے بڑھانا چاہا تو انجن غرایا۔ گاڑی نے تھوڑا سا جھٹکا لیا اور آگے بڑھ کے پھر پیچھے آ گئی۔ میں نے دوبارہ کوشش کی اور زیادہ ریس دی۔ انجن گرجنے لگا اور پہیے تیزی سے گھومتے ہوئے شور کرنے لگے۔ پیچھے گرد کے ساتھ خشک پتے اڑے تو میں نے سمجھ لیا کہ پہیہ گڑھے میں زیادہ دھنس گیا ہے۔ اب اس کے آگے پیچھے کی سطح زیادہ بلند اور چکنی ہو گئی ہے۔ میں جتنی کوشش کرتا پہیہ اتنی ہی مٹی کھودتا اور پھنستا چلا جاتا۔ یہ قدرے پریشان کن صورتِ حال تھی۔ اس کا ایک علاج تو یہ تھا کہ دو چار آدمی پیچھے سے جیپ کو آگے دھکیلیں تو انجن کے ساتھ یہ اضافی قوت کام کر جائے لیکن یہاں دو چار آدمی کہاں تھے۔ میں اور غالب مل کر ڈیڑھ آدمی۔ غالب اگر دھکا لگانے کی ہمت کر لیتا، تب بھی میں اکیلا جیپ کو نہیں دھکیل سکتا تھا۔ یہ کام صرف جنگلوں کا باسی ٹارزن ہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ دوسرا عمل طریقہ یہ تھا کہ میں جیپ کو جیک پر اوپر اٹھاؤں اور نیچے گڑھے میں خشک ٹہنیاں، کنکر پتھر بھر دوں۔ گڑھے کے دونوں کناروں کو تھوڑا سا کھود کے برابر کر دوں اور گھاس پھوس ڈال دوں تاکہ ٹائروں کی گرفت مضبوط ہو تو جیپ ایک جھٹکے میں آگے بڑھ جائے۔

"اب اسے فرصت سے نکالیں گے۔" میں نے کہا۔ "فی الحال وقفہ برائے آرام، قیام و طعام۔"

"پکنک کے لیے اچھی جگہ ہے۔" غالب نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

"ہاں، لیکن شاید ہم دونوں کے سوا آج تک کسی کو یہاں پکنک پر آنے کی توفیق خدا نے نہیں دی۔" میں نے کہا۔

"آجکل سب اچھے کام ہم سے سرزد ہو رہے ہیں۔" غالب بولا۔ یہ مذاق کی بات تھی ورنہ وہ جگہ انتہائی بے ہودہ تھی۔ نیچے صرف مٹی تھی جس پر خطرناک قسم کے لال چیونٹوں کی افواج بے مقصد گشت کر رہی تھیں۔ آس پاس کی جھاڑیوں میں عجیب سے کانٹے دار پھل لگے ہوئے تھے جو مٹر کے دانے سے ذرا بڑے تھے مگر اس کی بیرونی سطح پر کانٹے ہی کانٹے تھے اور یہ کانٹے اتنے باریک تھے کہ کپڑوں میں پیوست ہو جاتے تھے۔ گھنے درخت کم تھے اور بہت اونچے نہ تھے۔ جہاں جیپ رکی تھی، وہاں کسی لومڑی یا گیدڑ کی نسل کا جانور فوت ہوا تھا یا شکار ہوا تھا۔ اس کا بچا کھچا پنجر ڈی کمپوز ہو کے سخت تعفن پھیلا رہا تھا۔

"یہاں تشریف رکھنا تو بہت مشکل ہے۔" غالب نے ناک پر رومال رکھ کے کہا۔ "آپ ذرا سیر و سیاحت کر کے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں جہاں خیمۂ شاہی نصب کیا جا سکے۔"

"مطلب یہ کہ کوئی پُرفضا مقام تلاش کروں جہاں رنگ رنگ کے مہکتے پھول ہوں اور چہکتے میٹھے سُروں میں گاتے رنگین پروں والے طیور ہوں، سبزہ زار ہو، آبشار ہو، لبِ جوئبار ہو، الغرض مٹیار ہو جس کی زلف مشکبار اور حسن طرحدار ہو۔"

"تختۂ دار ہو، سر پر تلوار ہو، آگے پیچھے تھانیدار ہو۔" غالب نے بھنا کے کہا۔ "اس جنگل میں آ کے آپ کو بھی شاعری کا روگ لگنا تھا۔"

میں تسلیم بجا لا کے ہر سمت میں چند قدم گیا اور بہت جلد ایک ایسی جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو قدرے آرام دہ تھی۔ وہاں چیونٹے اور کانٹے بھی وہاں نہیں تھے اور اس ہموار قطعۂ زمین پر کچھ گھاس بھی تھی۔ میں غالب کو گود میں اٹھا کے لایا۔ پھر جیپ سے باقی اشیائے خور و نوش لینے گیا۔ ٹفن کیریئر خاصا بڑا اور بہت وزنی تھا۔ پانی ایک جیری کین میں تھا جو عموماً جیپ کے پیچھے

رکھنے کے کام آتا ہے۔ پہلے میرا بھی خیال یہی تھا لیٹر اضافی پٹرول ہوگا مگر جب مجھے جیپ میں کھانے پینے کا سامان، سگریٹ ہر چیز ملی اور پانی نہیں ملا تو مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ اس میں پٹرول ہوگا، چلانے والے اس اہتمام سے روانہ ہونے والے پانی کیسے بھول گئے۔ پھر میں نے جیری کین کو کھول کر سونگھا تو پٹرول کی مہک نہیں آئی اور میں نے اُسے اتار لیا۔

جنگل میں ہم نے باقاعدہ دسترخوان بچھا کے کھانا شروع کیا۔ "بسم اللہ کیجیے مرزا نوشہ۔" میں نے کہا۔ "ماحضر تناول فرمائیے۔"

"بڑا اہتمام کر لیا آپ نے۔" غالب نے کہا۔ "واللہ آپ نے بڑا تکلف کیا۔"

"بس قبلہ! شرمندہ نہ کیجیے... غریب کے پاس یہی تھا۔" میں نے کہا اور قہقہہ مار کے ہنسا کیونکہ ٹفن کیریئر کے چار ڈبوں میں سے ایک میں نرگسی کوفتے تھے، دوسرے میں بُھنا ہوا مرغ۔ تیسرے میں پراٹھے تھے اور چوتھے میں حلوا۔

"واہ یار! آج پھر ثابت ہوا کہ کھانا وہی ہے جس کے مقدر کی مُہر ہر دانے پر ہو۔" میں نے کہا۔

"صبح ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوپہر کے لنچ کا مینو ایسا شاندار ہوگا۔" غالب نے کہا۔

"اور تھانیدار کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر تو صرف شامتِ اعمال کا خیال آیا تھا، اس دعوتِ بے مثال کا نہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ بڑے اہتمام سے کھانا لے کر چلے ہوں گے۔"

"ہاں، منگوایا ہوگا کسی حوالاتی کے گھر سے۔" میں نے کہا۔ "تھانوں میں یہی ہوتا ہے۔ سرکاری فنڈ جو حوالاتی کی خوراک کا انتظام کرنے کے لیے ملتا ہے، وہ الگ ہضم۔ گھر والے حوالات میں بند عزیزوں کے لیے جو بھیجتے ہیں، وہ بھی ہضم۔ روز مفت کا تر مال ملتا ہے۔ اسی لیے تو دونوں ڈرم بنے ہوئے تھے۔"

"کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔" غالب بولا۔ "نرگسی کوفتوں اور حلوے پراٹھے کی جگہ جوتے کھائے اور گالیاں کھائیں۔"

"تو نے مہمان کی یاد دلا دی مرزا۔" میں نے کہا۔ "ہمارے باقی ساتھی۔"

غالب کا ہاتھ رک گیا۔ "رابعہ اور ٹیڈی؟"

"معلوم نہیں، انھیں آج کھانے کو کیا ملا ہوگا۔" میں نے اداسی سے کہا۔ رابعہ کے خیال سے نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا تھا۔ مجھ سے اور نہیں کھایا گیا۔ غالب نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ ہم نے تھرماس سے چائے نکالی اور اپنے اپنے مگ سے پیتے ہوئے سگریٹ کے کش لیتے رہے۔ بہت دیر تک ہم اپنے اپنے خیالوں سے ہمکلام رہے۔

پھر غالب نے کہا۔ "اب چلنا چاہیے۔"

"تو یہ کپڑے بدل لے۔" میں نے چونک کر کہا۔ "اگر تو بھی وردی چڑھا لے تو ہم کچھ محفوظ ہو جائیں گے۔"

"میں بش شرٹ تو پہن لوں گا۔" غالب نے کہا۔ "پتلون کیسے پہنوں گا۔"

"دونوں ڈھیلے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں پہنانے میں تیری مدد کروں گا۔ تو ذرا ہمت سے کام لینا۔"

غالب نے سر ہلایا اور میں نے پہلے اسے سب انسپکٹر کی بش شرٹ پہنائی پھر پتلون۔ پتلون کا ایک حصہ آسانی سے چڑھ گیا۔ دوسری ٹانگ کو موڑنا بہت مشکل تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ پتلون کا پائنچہ ادھیڑ دیا اور اسے ٹانگ کے گرد رکھ کے لپیٹ دیا۔ اب یوں لگتا تھا کہ پتلون کے ایک پائنچے کو جراب کے اندر کر دیا گیا ہے۔ شرٹ صرف پیٹ پر سے ڈھیلی تھی۔ اسے پتلون کے اندر کرنے سے وردی زیادہ مضحکہ خیز نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس پولیس کی جیپ بھی تھی اور وردی بھی۔ تیز رفتاری میں ہم کسی چیک پوسٹ سے رکے بغیر گزر جاتے تو اس بات کا امکان تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا نہ کرتا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم کو فوراً کسی جائے واردات پر یا کسی مجرم کو پکڑنے کے لیے پہنچنے کی جلدی تھی۔

اگر اس وقت ہم روانہ ہو جاتے تو وہ سب نہ ہوتا جو بعد میں ہوا لیکن مجھ پر مرغن غذاؤں کا اثر ہو رہا تھا اور تھوڑے سے آرام کی مہلت ملی تھی تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ قیلولہ فرمانے کی تجویز میں نے ہی پیش کی اور غالب نے منظور کر لی۔ اس شرط پر کہ ہم گھوڑے بیچ کر نہیں سوئیں گے۔ اور صرف ایک گھنٹا آرام کریں گے لیکن وہاں ہمارے پاس کوئی الارم تو تھا نہیں کہ ہمیں ایک گھنٹے بعد بیدار کر دیتا۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں تو آنکھیں بند کرتے ہی سو گیا۔ یہ ایک پُرسکون نیند تھی چنانچہ بے خواب تھی۔

پھر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے لات ماری ہو۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "کون ہے بے!"

"تمہارا باپ۔ اُلو کے پٹھو۔" کسی نے خوفناک لہجے میں کہا۔

میں چونکا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ صحیح صورتِ حال کا اندازہ کرنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ غالب کو مجھ سے پہلے اٹھا دیا گیا تھا اور وہ ایک ٹانگ سیدھی کیے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں اٹھانے والے دو افراد تھے۔ جس نے مجھے لات ماری تھی، وہ میرے سر پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر پگڑی کے انداز میں بہت بڑا صافہ باندھ رکھا تھا جس کے ایک کونے سے اس نے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ یہ ڈاکوؤں کا روایتی حلیہ تھا۔ دوسرا شخص بھی اسی حلیے میں تھا مگر اس کے ہاتھ اور پیشانی دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں کون ہو سکتے ہیں۔ غالب کا کہا درست ہوا تھا۔ ہم آسمان سے گر کر سچ مچ کھجور میں اٹک گئے تھے، یہ وہی مفرور ڈاکو تھے۔

"اٹھ اوئے تھانیدار۔" اس ڈاکو نے مجھے دوسری لات رسید

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کی جسے پاٹے خاں سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ سورج مکھی نہیں تھا۔ دوسرے کے بالکل سفید ہاتھ اور سفید پیشانی ظاہر کرتے تھے کہ وہ گورا ڈاکو ہے۔ پاٹے خاں بالکل فلمی ولن کے انداز میں مجھ سے مخاطب تھا اور لہجے کو خوفناک دہشت ناک بنا کے بات کر رہا تھا۔ یہ اس کا قدرتی انداز نہیں تھا۔

میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "تم پاٹے خاں ہو...؟"

"آہو... پاٹے خاں میرا نام اے۔" وہ گرج کے بولا۔ "تینوں چنگی طرح معلوم اے فیر وی سوال کرنا ایں؟"

"مجھے حکم ہے کہ تم جہاں نظر آؤ تم کو گرفتار کروں۔" میں نے تفریحِ طبع کے لیے کہا۔

پاٹے خاں نے پھر ایک فلک شگاف فلمی قہقہہ لگایا۔ "اوئے کون اے تینوں حکم دین والا۔ میرے کول لیا اوہنوں۔ میں اوہنوں دساں گا گرفتاری دا مطلب۔" اس کے قہقہے کا ساتھ گورے ڈاکو نے دیا۔

"گویا تم گرفتار ہونے سے انکار کر رہے ہو؟" میں نے سوچ کر کہا۔

"یہ تو بڑی غلط بات ہے، پہلے تم جیل سے فرار ہوئے..."

وہ دونوں پھر ڈرامائی انداز میں ہنسے۔ "اوئے ساہنوں جیل دیاں دیواراں نئیں روک سکدیاں۔"

وہ دونوں میرا اور محسن کے ریوالور پہلے ہی اٹھا چکے تھے چنانچہ ان کو اطمینان اور اعتماد حاصل تھا کہ ہم نہتے اُن کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکوؤں کی رائے پولیس والوں کے بارے میں اچھی نہیں ہوتی اور وہ سب کو ایک جیسا حرام خور اور بزدل سمجھتے ہیں۔ وہ میرے اتنا قریب تھا کہ میں جب چاہتا اُسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچتا، اس کا ریوالور گراتا اور ایک ہی بار میں اُسے اٹھا کے گورے ڈاکو پر دے مارتا۔ اس طرح کہ وہ دونوں پھر اٹھ نہ پاتے لیکن میں نے جلدی نہیں کی۔

"اچھا چلو میں تم کو گرفتار نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے بدلے تم مجھے کیا دو گے؟" میں نے اب تھانیداروں کا انداز اختیار کر لیا اور ہماری باقی گفتگو ٹھیٹ پنجابی میں ایک دوسرے سے تعلق کی بنیاد پر ہوئی۔

"ابھی کیا ہے میرے پاس دینے کو؟" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "جو بھی تھا وہ اندر والوں کو دے دیا۔"

"اب جیل سے نکلے ہیں تو کچھ کریں گے۔" گورا ڈاکو بولا۔ "تمھارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔"

"بس ہماری نوکری کا خیال کرنا۔" میں نے لجاجت سے کہا۔

"اور کچھ ہمارا..."

"تمھارا خیال ہم نے کب نہیں رکھا۔" پاٹے خاں نے رو[...] کے لہجے میں کہا۔ "تم کو بھی اتنا ہی ملے گا جتنا دوسرے تھانیدار[وں] کو ملتا رہا ہے... مگر دیکھو... پاٹے خاں سے دغا کی تو تمھارا حشر وہی ہوگا جو پہلے والے تھانیدار کا ہوا تھا۔"

"پہلے والا تھانیدار کون تھا؟" میں نے سہم کر کہا۔

"وہی بدبخت افضل شاہ۔" پاٹے خاں بولا۔ "اس نے کہا[...] تھا کہ مال بھی ہضم کرے گا اور پاٹے خاں کو پھانسی بھی لگوا دے[گا]۔"

"اس نے میرے ساتھ بھی غداری کی۔ اسی کی مخبری سے [میں] گرفتار ہوا۔ میرے سب ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔" [گورا] ڈاکو غصے سے بولا۔

"آج اس کی اور اس کے سارے خاندان کی قبریں ایک جگہ بنی ہوئی ہیں۔" پاٹے خاں فخر سے بولا۔ "لیکن پاٹے خاں سزا پا کے بھی آزاد ہے اور آزاد رہے گا۔" اس نے اچانک پاٹل کا[...]

میں اچھل پڑا۔ "میں اس علاقے میں بالکل نیا ہوں، مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا بتایا گیا تھا کہ کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو پا[ٹے] خاں اور گورا ڈاکو فرار ہو گئے ہیں اور اسی جنگل میں چھپے ہوئے ہ[یں]۔ دو دن پہلے میں سنگ جانی اسٹیشن پر تھا۔ ٹیکسلا کے پاس ہے۔"

"کیا نام ہے تیرا تھانیدار؟" پاٹے خاں نے میرے شرلید لہجے اور تعاون کرنے کے انداز سے متاثر ہو کے کہا۔

اگر وہ جاہل نہ ہوتا تو وردی پر لکھا ہوا نام پڑھ لیتا اور سوال ہی نہ کرتا۔ میں نے اپنے سینے پر نظر ڈالی اور کہا۔ "نصیب[...] یہ میرا ماتحت آغا مبارک ہے۔ یہ ترلہ گنگ سے میرے ساتھ ہ[ی] ہے۔ ہمیں چارج لیتے ہی اِدھر بھیج دیا گیا، اس لیے تمھارے با[رے] میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اب ملاقات ہو[ئی] تو انشاء اللہ ہم بھی بتا دیں گے کہ ہم سجنوں کے سجن ہیں اور دشمن[وں] کے دشمن۔"

"یہی ہمارا بھی اصول ہے نصیب علی۔" پاٹے خاں نے [...]

"ہم سے بنا کے رکھے گا تو عیش کرے گا۔"

"تم بھی عیش کرو مگر اتنا خیال رکھو کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔ میری یہ وردی نہ اتر جائے۔" میں نے کہا۔

پاٹے خاں نے پھر قہقہہ مارا۔ "اوئے تیری وردی کون [اتار] سکتا ہے ہمارے ہوتے۔ افضل شاہ بھی ہمارا ساتھ دیتا تو قد[رت بھی] اس کا ساتھ دیتی۔"

"اب اس طرح کتنی دیر کھڑے رہو گے۔" میں نے کہا۔ "[...] جاؤ اور ہمیں اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"یہ کوئی چال تو نہیں ہے؟" وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

"پاٹے خاں! بیٹھنے اور گپ لگانے کے لیے وقت نہیں ہے۔" گورے ڈاکو نے اُسے تنبیہ کی۔ "تو جن کو نہیں جانتا، ان پر بھروسا کر رہا ہے۔"

"بھروسا کر رہا ہوں میں اپنی ہمت اور طاقت پر۔" پاٹے خاں نے مونچھوں کو بل دیا۔ "رب دی سوں۔ چال ہوگی تو یہ خود دیکھ لے گا، پوری چھ گولیاں ہیں میرے پستول میں۔"

"چھ گولیاں تو میرے پاس بھی ہیں۔"

"تو پھر ڈر کیسا۔ دس لاشیں پھلانگ کے جا سکتے ہیں ہم اور ان میں دو لاشیں ان کی بھی ہوں گی۔" پاٹے خاں بولا۔

"دس کیوں؟" میں نے کہا۔ "بارہ کیوں نہیں؟"

پاٹے خاں گلا پھاڑ کے ہنسا۔ "ایک ایک گولی ہم اپنے لیے رکھیں گے، اب ہم زندہ ہاتھ نہیں آئیں گے کہ وہ ہمیں پھانسی چڑھا دیں۔"

"کیا تم... تم دونوں کو سزائے موت ہو چکی ہے؟" میں نے کہا۔

"اب تک چودہ قتل کیے ہیں۔ ایک بار صرف حکم ہوا ہے پھانسی کا۔ پھانسی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی مگر ہے کوئی مائی کا لال جو پاٹے خاں کو لٹکا سکے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کے بولا۔ "یہ بتا آگے پیچھے کوئی اور پولیس پارٹی ہے؟"

"نہیں... سڑک پر بہت آگے ایک پارٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ یہاں نہیں آ سکتے، تم کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان سے کچھ دیر آرام کرو، ہم بھی تو بے فکر سو رہے تھے حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اسی جنگل میں ہو۔"

"تجھے ڈر نہیں تھا ہمارا؟" وہ کچھ قائل ہو کے بولا۔

"ڈر ہوتا تو میں سو سکتا تھا؟ مجھے پتا تھا کہ تم سوتے میں گولی نہیں مارو گے کیونکہ تم بہادر آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے ملنا بھی چاہتا تھا۔"

گورا ڈاکو زیادہ ذہین تھا۔ "پاٹے خاں! باتوں میں مت آ۔"

"اونئیں یار! میرا دل کہتا ہے یہ تھانیدار دل کا کھرا ہے۔" پاٹے خاں بولا۔

"میرے ساتھی کی تو ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ سکتے ہو، یہ بالکل بے ضرر ہے۔ میرا ریوالور تمھارے پاس ہے۔ آخر میں کس طرح یقین دلاؤں تمھیں کہ میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ سب مجھے اپنی جان بھی پیاری ہے اور بیوی بچوں کی زندگی بھی۔"

"لا جیب کی چابیاں ہمارے حوالے کر۔" گورے ڈاکو نے ہاتھ پھیلایا۔

میں نے چابیاں اس کی طرف اُچھال دیں۔ "اور کوئی خدمت؟ کہو تو یہ وردی بھی اتار کے دے دوں۔"

"اونئیں یار۔" پاٹے خاں نے ریوالور ہٹا کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے اعتبار ہے تجھ پر۔"

"تو پھر بیٹھو، کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا۔ "پراٹھے، تکڑے، حلوا۔"

"اچھا...؟ واہ بھئی واہ۔" وہ بولا اور فوراً بیٹھ گیا۔ غالباً وہ دونوں بھوکے تھے اور جیل سے فرار ہونے کے بعد اب تک انھوں نے کچھ نہیں کھایا تھا کہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ چار افراد کا کھانا تھا اور ہم نے اس کا ایک تہائی بھی نہیں کھایا تھا مگر انھوں نے ذرا سی دیر میں سب صاف کر دیا۔ میں غالب کو آنکھ مار کے اس ڈرامے میں شریک کر چکا تھا۔ ان دونوں کو ناک آؤٹ کر کے جیپ میں ڈالنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن میں پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس قماش کے ڈاکو ہیں اور ان کے جرائم کی تعداد کیا ہے۔

کھانے کے بعد انھوں نے ہم سے سگریٹ لے کر پیے اور لمبے لمبے سوٹے لگانے لگے۔ ریوالور انھوں نے اندر رکھ لیے تھے اور اب بہت مطمئن بیٹھے تھے۔ پاٹے خاں کی کیس ہسٹری زیادہ پرانی تھی۔ وہ شریف والدین کی خبیث اولاد تھا۔ آوارگی کے شوق میں گھر سے نکلا۔ جیب کتروں کی صحبت سے مستفید ہوا۔ پھر جیل گیا تو چوروں کے گروہ میں شامل ہوا۔ دوسری بار اور تیسری بار جیل جانے سے تجربہ حاصل ہوا تو چھوٹے چھوٹے ڈاکے ڈالنے لگا۔ کچھ دن قسمت نے ساتھ دیا۔ چند وارداتیں کامیاب رہیں اور اسے ایک بڑے ڈاکو نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس وقت تک وہ تین قتل کر چکا تھا۔ دو فرار ہوتے ہوئے اور ایک دشمنی میں مگر پکڑا نہیں گیا تھا۔ گروہ میں شامل ہو کے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ بڑے ڈاکے ڈالتے تھے اور ان کا مقابلہ کرنے کی حماقت کرنے والے مارے جاتے تھے۔ جب وہ آخری بار پکڑا گیا تو اپنے حساب سے قتل کی دس وارداتیں کر چکا تھا مگر پولیس کو وہ صرف ڈکیتی میں مطلوب تھا۔ اسے سات سال کی جیل ہوئی۔ وہ باہر نکلا تو پرانے ساتھی مارے جا چکے تھے۔ تین کو پھانسی ہو گئی تھی۔ چار پولیس مقابلوں میں ہلاک ہوئے تھے اور باقی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا گروہ بنایا اور دو سال تک اسی علاقے میں دہشت پھیلاتا رہا۔ بالآخر ایک فرض شناس اور ایماندار پولیس افسر اس کے پیچھے لگ گیا۔ ایک سب انسپکٹر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

افضل شاہ نے اس کی ہر پیشکش مسترد کردی۔ لاکھوں پر تھوک دیا اور جان کی بازی لگا کے اُسے گرفتار کرا دیا۔ پاٹے خاں کے ساتھیوں نے افضل شاہ کو قتل کردیا اور اس کے گھر کو آگ لگا دی۔ افضل شاہ کے بیوی بچے اندر ہی جل کے مر گئے۔ ڈاکوؤں نے باہر سے کُنڈیاں لگا دی تھیں اور جب وہ اندر سے مدد کے لیے چیخ رہے تھے تو وہ باہر ہوائی فائر کر رہے تھے تاکہ لوگ قریب نہ آئیں۔ افضل شاہ مر گیا مگر وہ پاٹے خاں کی ساری کامیابیوں کا طلسم توڑ گیا۔ وہ پاٹے خاں کے خلاف چار افراد کے قتل کا پکا کیس بنا چکا تھا جس میں ثبوت، گواہ سب پکے تھے۔ جب افضل شاہ قتل کردیا گیا اور اس کے خاندان کو اتنی بے رحمی سے جلا دیا گیا تو پولیس کا پورا محکمہ پاٹے خاں کو پھانسی لگوانے پر تُل گیا۔ اس کے خلاف مزید قتل کے مقدمات بنائے گئے۔ اسے متعدد ڈکیتی کی وارداتوں میں ملوث کرلیا گیا جو اس نے نہیں کی تھیں۔ کسی ڈاکو سے تھانیداروں کی ملی بھگت 'جیو اور جینے دو' بلکہ عیش کرو اور عیش کرنے دو کے اصول پر ہوتی ہے۔ مگر پاٹے خاں نے افضل شاہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس نے ہر تھانیدار کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ یہی اُن کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکو بہرحال ڈاکو ہیں، اُن کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تھانیدار اُن سے ڈرتے ہیں یا ان کے زرخرید غلام ہیں۔ ان کے درمیان کوئی بقائے باہمی کا سمجھوتا ہوتا ہے تو یہ تھانیداروں کی دی ہوئی رعایت ہے۔ کوئی تھانیدار یہ رعایت نہیں دیتا تو اسے قتل کرنا تمام تھانیدار برادری کی توہین ہے۔ کسی تھانیدار کی شرافت، اصول پرستی اور ایمانداری اس کا عیب سہی مگر جرم بہرحال نہیں ہے اور اگر جرم ہے تو کسی ڈاکو کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اس کو سزا دے۔ ایک غلط حرکت نے پاٹے خاں کو تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ پولیس نے اس کے خلاف درجنوں عینی شاہد عدالت میں لاکھڑے کیے۔ جب پاٹے خاں کو سزائے موت سنائی گئی تو اسے احساس ہوا کہ معاملہ کتنا سنگین ہوگیا ہے۔ اس نے جیل سے تھانیداروں کو پیغامات بھیجے کہ وہ تلافی کے لیے تیار ہے مگر بات نہ بنی۔ اس نے گورے ڈاکو سے مدد مانگی کہ میں اور تم حریف سہی مگر ایک مقتول تھانیدار کے لیے سب تھانیدار اس کی جان کے دشمن ہوگئے ہیں تو کیا ایک ڈاکو ساتھی کے لیے دوسرے ڈاکو مل کر کچھ نہیں کریں گے۔ گورے ڈاکو نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ اپیل کی سماعت کی تاریخ پر پاٹے خاں کو جیل سے عدالت لایا گیا تو گورے ڈاکو کی پلٹن نے حملہ کردیا۔

گورے ڈاکو کو علم نہ تھا کہ مخبری ہوچکی ہے۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ حملہ کیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ پاٹے خاں کو چھڑا لے جائے گا مگر اس روز پاٹے خاں کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ سخت مقابلے میں دو پولیس والے مارے گئے اور دو عام آدمی۔ گورے ڈاکو کے چار ساتھی ہلاک ہوئے اور پاٹے خاں کو چھڑانے کے لیے آنے والا گورا ڈاکو خود گرفتار ہوگیا۔ پاٹے خاں کی ہر اپیل مسترد ہوتی گئی۔ گورے ڈاکو کو سیشن کورٹ سے سزائے موت سنا دی گئی۔ تھانیدار برادری اس کے خلاف بھی متحد ہوگئی تھی۔ گورے ڈاکو نے کوٹ لکھپت جیل سے ایس او ایس ارسال کیے جو باہر بہت سے گروہوں تک پہنچے۔ انھوں نے طاقت کے استعمال سے گریز کیا کیونکہ کوٹ لکھپت جیل کو توڑ کے کسی سزائے موت پانے والے قیدی کو نکالنا عملاً ناممکن تھا۔ انھوں نے رشوت کا لمبا چکر چلایا۔ نیچے سے اوپر تک لاکھوں کی تھیلیاں پہنچا دیں اور بالآخر پاٹے خاں اور گورا ڈاکو کال کوٹھڑی سے 'فرار' ہونے میں کامیاب رہے۔ باقی رسک ان کا اپنا تھا۔ وہ اب سندھ کے جنگلات میں روپوش ہو جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سیکڑوں میل دور جانا ان کے لیے بے حد ضروری تھا کیونکہ یہاں پھانسی کا پھندا تقریباً ان کے گلے میں پڑ چکا تھا۔

پاٹے خاں یقیناً بے وقوف تھا کہ اس نے باہر نکلتے ہی پھر پولیس سے گٹھ جوڑ کا سوچا۔ یہ نہیں سوچا کہ اسی پولیس نے اسے کہاں پہنچا دیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ اس کا ردِعمل انتقامی نہیں ہوا ورنہ وہ باہر نکل کے ان سب کو قتل کرتا جو اس کے خلاف استعمال ہوئے یا اس کی جان کے دشمن بنے۔ غالباً دو سال کال کوٹھڑی میں گزارنے کے بعد اس کا حوصلہ ختم ہوچکا تھا۔ ایک تھانیدار کو قتل کرنے کی سزا بہت سخت ملی تھی۔ اس نے موت کو روبرو دیکھ لیا تھا۔ ایک ایسی تاریخ کے روپ میں جس کی صبح پھانسی کے اندھے کنوئیں میں ہوتی۔ وہ ڈر گیا تھا اور اب صرف فرار ہونا چاہتا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان دونوں ڈاکوؤں کا سارا کس بل نکل چکا تھا ورنہ وہ ہمیں جگانے کے بجائے گولی مار کے ہمیشہ کے لیے سلا دیتے۔ ان کی اداکاری کی وجہ یہی میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اب کسی کے لیے دہشت ناک نہیں رہے تھے چنانچہ وہ خوفناک لہجے سے ہی ڈرا سکتے تھے مگر اس شیر کی دہاڑ سے کون ڈرتا ہے جو چڑیا گھر کے پنجرے سے اس لیے نکالا گیا ہو کہ اسے دوسرے پنجرے میں منتقل کردیا جائے۔ وہ جنگل کے بادشاہ کی اداکاری کرے تب بھی لوگ مرعوب نہیں ہوں گے۔

پاٹے خاں نے ہم پر اعتبار کرکے رسک لیا تھا۔ شاید اس رسک میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ ہر تھانیدار افضل شاہ نہیں ہوتا اور

پہلے ہزاروں میں ایک ہوتا تھا تو اب شاید لاکھوں میں ایک ہوگا۔ پھر میری تعاون کی پیش کش اور میرے بزدلانہ رویے نے اس کو مزید اعتماد عطا کیا اور وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے رُک گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ گورا ڈاکو اس کے مقابلے میں بہت زیادہ محتاط ہے اور اس کا ایک ہاتھ مستقل اپنے ریوالور پر ہے۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا بھئی سجن نصیب علی... ابھی تو ہم چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

"تم میری جیپ لے جارہے ہو۔" میں نے مردہ آواز میں کہا۔ "میں کیا جواب دوں گا؟"

پاٹے خاں نے قہقہہ مارا۔ "اوئے جو دل کرے کہہ دینا... کہہ دینا کہ ڈاکو پاٹے خاں کے ساتھ پرانے ساتھی تھے۔ انھوں نے بے بس کردیا تھا۔"

"مگر ہم بے بس کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کم سے کم ہمیں باندھ کے ڈال جاؤ۔" غالب نے کہا۔

"مگر یہاں نہیں۔" میں نے کہا۔ "سڑک پر ڈال دینا تاکہ کوئی اُٹھا لے۔ میرا یہ ماتحت تو چل بھی نہیں سکتا۔"

"چل بھئی جیسے تو راضی۔" پاٹے خاں بولا۔ "اسے جیپ میں ڈال دے۔"

میں نے اطمینان سے غالب کو پیچھے والی سیٹ پر بٹھایا جہاں گورا ڈاکو پہلے سے براجمان تھا، اس نے اب اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "تم جیپ چلاؤ۔" گورے ڈاکو نے مجھے حکم دیا۔ "اور خیال رکھو کہ پیچھے سے بھی میں دل میں گولی اتار سکتا ہوں۔"

میں نخوت سے مسکرایا۔ "کیوں ڈراتے ہو گورے بادشاہ...؟"

مگر اسی وقت میرا پورا جسم بجلی کی طرح حرکت میں آگیا۔ میں نے دایاں ہاتھ گورے ڈاکو پر ڈال دیا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کے بازو پر وار کیا اور میں نے بازو کی ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز صاف سُنی مگر اس سے قبل ہی وہ پاٹے خاں پر گر چکا تھا جو جیپ میں سوار ہونے والا تھا۔ میں نے ان کو اُٹھنے کی بالکل مہلت نہ دی۔ میری ایک لات پاٹے خاں کے سر پر لگی اور اس کا سر جیپ کی سائڈ سے ٹکرایا۔ گورے ڈاکو کا ہاتھ لٹک کر جھولنے لگا تھا مگر اس نے فوراً ریوالور کو دوسرے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ میری دوسری کِک اس ہاتھ کی کلائی پر پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اُڑ گیا اور وہ بُری طرح چلانے اور پاٹے خاں کو گالیاں دینے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی کلائی کے ٹوٹ جانے سے ناکارہ ہوگیا تھا۔ پاٹے خاں مجھے گالیاں دیتا اُٹھا تو میں نے اسے فلائنگ کِک ماری۔ وہ دوبارہ جیپ سے ٹکرایا اور اُسے چکر آگئے۔ میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا اور سر سے اوپر اُٹھا کے نیچے دے مارا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور وہیں پڑا رہا۔ گورا ڈاکو اچانک بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے دوڑنے سے پہلے میں نے پاٹے خاں پر آخری وار کیا تاکہ وہ اُٹھے تو غالب کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس کی آنکھوں کی پُتلیاں چڑھ گئیں اور اس کا کراہنا بند ہوگیا۔

میں جیپ گورے ڈاکو کے پیچھے لپکا تو وہ تقریباً پچاس قدم آگے تھا۔ میں نے پاٹے خاں کا ریوالور اُٹھا لیا تھا چنانچہ میں نے اسے پیچھے سے چلّا کے وارننگ دی۔ "گورے کی اولاد... رک جاؤ... ورنہ میں شوٹ کردوں گا۔"

جواب میں ایک گولی آئی جو شاید میرے کان کو چھُوتی ہوئی گزری۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ اس حالت میں گورے ڈاکو کے نشانے کا خطا ہو جانا ہی ممکن تھا۔ شاید اس نے اپنے شکستہ بازو والے ہاتھ سے کام لیا تھا ورنہ جس ہاتھ کی کلائی ٹوٹی تھی، اس سے وہ ریوالور نہیں تھام سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹوٹے ہوئے بازو والے ہاتھ سے فائر کرنا بھی آسان نہ تھا مگر مجھے زیادہ افسوس اپنی بے وقوفی پر ہوا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ گورے ڈاکو کے پاس بھی دو ریوالور ہیں۔ ایک اس کا اپنا اور دوسرا وہ جو اس نے غالب سے چھینا تھا۔

میرا جوابی فائر ایک فطری ردِعمل تھا لیکن اس نے گورے ڈاکو کو محتاط کردیا۔ اس نے بے تحاشا اور اندھا دھند دوڑنا چھوڑ کے درختوں کی آڑ میں بھاگنا شروع کیا۔ میں نے اُسے نظر میں رکھتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی اور جانتے بوجھتے اسے موقع فراہم کیا کہ وہ مجھ پر گولی چلائے۔ اس کی چلائی ہوئی تیسری گولی میری ران سے رگڑ کھاتی ہوئی گزری اور مجھے آگ کی ایک لکیر کی جلن محسوس ہوئی۔ میں نے اس پر دوسرا فائر صرف اسے بدحواس کرنے کے لیے کیا۔ گورے ڈاکو نے پلٹ کر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلادیں۔ اب میرے حساب سے اس کے ریوالور میں ایک ہی گولی رہ گئی تھی اور مجھے ان کی وہ بات یاد تھی کہ ایک گولی وہ اپنے لیے بچا کے رکھیں گے کیونکہ وہ زندہ ہاتھ آنے اور پھانسی چڑھائے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔

تیسرا فائر میں نے نشانہ لے کر کیا، اس وقت تک میرے اور گورے ڈاکو کے درمیان فاصلہ کم ہو کے آدھا رہ گیا تھا۔ گولی گورے ڈاکو کی ٹانگ پر گھٹنے کے قریب لگی۔ وہ ایک دم مُنہ کے بل گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کی آخری گولی خود پر چلاتا، میں نے دوڑ کر ایک جست لگائی اور اس کے اوپر جا پڑا۔ اس نے بلبلا کے چیخ ماری۔ ریوالور نیچے گر گیا۔

"خدا کے لیے مجھے مرنے دو... اسی جگہ مر جانے دو..." وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "کل بھی تو مجھے پھانسی ہی ہونا ہے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہاں۔ مگر وہ انصاف کے عمل کی تکمیل ہوگی۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو خودکشی کر کے نہیں مرنے دوں گا۔"

"اچھا تو خود گولی مار دو مجھے۔" وہ چلّایا۔

"نہیں گورے بادشاہ! میں تمھارا قاتل کیوں بنوں۔" میں نے کہا۔ "تم کو قاعدے قانون کے مطابق پھانسی ہونا چاہیے... اور ضرور ہوگی۔"

میں اُسے گھسیٹتا ہوا لایا اور اٹھا کے جیپ میں پھینک دیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کے لیے یہ اذیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ آخری بار چیخا اور بے ہوش ہو گیا۔ غالب نے مسکرا کے مجھے دو انگلیوں سے وی کا نشان دکھایا۔ وی فار وکٹری۔ میں نے دوسرے ڈاکو پلٹے خاں کو بھی گورے ڈاکو پر ڈال دیا۔ اب گاڑی کا پہیہ گڑھے سے نکالنے کا مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے پہلے سے سوچی ہوئی ترکیب پر عمل کیا اور اس میں کامیاب رہا۔

"ان دونوں پر نظر رکھنا۔" میں نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی نہ مرنے پائے نہ بھاگنے پائے۔"

کھانے پینے کا سارا سامان وہیں پڑا رہ گیا اور میں نے جیپ کو واپسی کے راستے پر دوڑانا شروع کیا۔ دوبارہ سڑک تک پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگا۔ اب شام کا سورج ڈھل رہا تھا۔ سڑک بھی سنسان تھی اور ہمارا راستہ صاف تھا۔

"خدا اس وقت قارون کا خزانہ بھی عطا کرتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی دو ڈاکوؤں کو پا کے ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اب ہم بارگین کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہم کس سے بارگین کریں گے؟" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب سے؟"

"اور کس سے کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "چوبیس گھنٹے میں ہم دوسری بار قانون کی مدد کریں گے۔ انکل رضوی نے اب تک یقیناً اس ایمونیشن ڈپو پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ یہ مفرور ڈاکو ان کے حوالے کر کے ہم ثابت کر دیں گے...؟"

"ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکیں گے، کم سے کم انکل رضوی پر۔" میں نے کہا۔ "وہ بارگین کرنے والے آدمی ہی نہیں ہیں۔ اور بارگین ہم کیا کریں گے؟ کیا ان سے کہیں گے کہ ہم پر قائم مقدمات ختم کر دیے جائیں تو ہم دونوں ڈاکو اُن کے سپرد کریں گے؟ یہ ان کے اختیار کی بات ہی نہیں اور ہوتی تب بھی وہ نہ کرتے۔ وہ صاف کہیں گے کہ ٹھیک ہے قانون تمھاری خدمات کے اعتراف میں سزا کم کر سکتا ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کرو۔"

"ہمارا اتنا بڑا کارنامہ بلکہ اتنے بڑے کارنامے ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔"

"قانون نہ ہمارے احسان کو تسلیم کرے گا اور نہ ہمارے قرض کو مانے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ملک و قوم کے دشمنوں کے ایک اڈّے کی نشاندہی کی، جہاں سے کثیر مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔ جو سب وطن دشمن عناصر کو ملتا تو وطن پرستوں کے خلاف استعمال ہوتا۔ اس کارنامے پر ایک تمغہ۔ ہم نے دو خطرناک ڈاکو جیل سے فرار ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر پھر پکڑ لیے جن کو پولیس گرفتار نہ کر سکی تھی۔ اس پر دوسرا تمغہ۔ جو کچھ ہم نے اس سے پہلے کیا... اس پر پھانسی... قانون یہی ہے۔"

"پھر ان ڈاکوؤں کا کیا کرنا ہے۔ اگر ان کے بدلے کوئی سودا بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہم ایک پوائنٹ اور اسکور کریں گے۔" میں نے کہا۔ "نیکی کر دریا میں ڈال اور ڈرا اتارو۔ ایک دن آئے گا کہ دریا نیکیوں سے بھر جائے گا۔ اتنا بھر جائے گا کہ اسے اپنا رُخ بدلنا پڑے گا۔ وقت کا دریا ہمارے خلاف بہہ رہا ہے مگر ایک دن ہم اس کا رُخ موڑ لیں گے، کیسے موڑ لیں گے؟ یہ تم بھی جانتے ہو مرزا۔ ہم کو غدار، قاتل اور مجرم کہنے والے خود غدار، قاتل اور مجرم ٹھہریں گے اور اگر ہم ملک کو ان وطن فروشوں کے وجود سے پاک کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس کا سارا اعزاز بھی ہمیں جائے گا۔"

"دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔

"نہیں۔ یہ صرف خیال نہیں۔ ہم اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوششوں کا آغاز تو کر ہی چکے ہیں۔ ہماری اب تک کی کامیابیاں کم نہیں اور امید کا سفر تو ہر حال میں جاری رہتا ہے۔ ہمارے عزم اور حوصلے کے کارواں کا ہر قدم منزل کی طرف ہے اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، راستے خود صاف ہوتے جاتے ہیں۔ انکل رضوی ہی ایک قابلِ اعتماد گواہ ہیں جو تسلیم کریں گے اور کریں گے کہ ہم نے ہی دشمنوں کے ایک خفیہ اسلحہ خانے کا پتا دیا تھا۔"

"اور وہ جو اس سے پہلے ہم کئی ذخائر تباہ کر چکے ہیں؟"

"ان کا کریڈٹ وہ ہمیں دیتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ آن ریکارڈ کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس نے ان اڈّوں کی تباہی کو ہمیشہ کی طرح نامعلوم شرپسندوں کی تخریبی کارروائی قرار دیا ہوگا۔ اگر ان کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تو وہ کریڈٹ خود کو دیتے اور خوب ڈھول پیٹتے کہ پولیس نے بہت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخریبی عناصر کے مذموم عزائم کو بروقت ناکام کر دیا۔ اوپر والے کامیابی کا سہرا کسی منظورِ نظر کے سر باندھتے اور اسے ترقی دلوا دیتے۔ صرف انکل رضوی ہی ایسا کر سکتے ہیں کہ کھل کر ہمارا نام لیں اور یہ کہیں کہ اس اڈّے کا پتا سکندر بخت نے دیا تھا جو کہ مفرور مجرم ہے۔ وہ کسی کو بھی اس کامیابی کا سہرا خود اپنے سر نہیں باندھنے دیں گے اور یہ بات ریکارڈ پر رکھیں گے کہ ہم نے اور صرف ہم نے اس اڈّے کا پتا دیا تھا۔

ہم ان ڈاکوؤں کو بھی انکل رضوی کے حوالے کریں گے اور صرف وہی ہیں جو اس کامیابی کو ہم سے منسوب کریں گے۔ ان کی جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو راتوں رات طے کر لیا جاتا کہ اس کامیابی کا اعزاز کیسے دیا جائے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس کا اعزاز دو مفرور مجرموں کو دیا جاتا۔ بھلا یہ کبھی ہوا ہے کہ دو مطلوب مجرموں نے دو مفرور ڈاکو پکڑ کے پولیس کے حوالے کر دیے ہوں۔ یہی تو موقع ہوتا ہے پولیس کے لیے اپنی کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کا۔ مجرم پکڑے جاتے ہیں، اتفاق سے یا مخبری سے یا اپنی بدقسمتی کے باعث۔ پولیس فوراً نام کما لیتی ہے۔"

"رضوی صاحب کے محکمے والے ان سے ناخوش ہوں گے۔" غالب بولا۔

"وہ تو پہلے ہی ناخوش ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "تاہم یہ بات سب کو خود اپنے منہ پر طمانچہ مارنے کے مترادف لگے گی۔ یہ پولیس کے محکمے میں نہ کے پولیس کے نام کو بٹا لگانے سے کم تو نہیں ہے کہ جیل سے بھاگ جانے والے ڈاکوؤں کو پولیس کی چھاپا مار پارٹیاں اور ناکابندی کرنے والے نہ پکڑ سکیں اور خبر آ جائے کہ ان کو سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابھی تم دیکھو میں کیا ڈراما کرتا ہوں۔"

"ڈرامے سے فائدہ ہونے کی امید نہیں تو پھر اتنی محنت کس لیے؟"

"فائدہ ہوگا مرزا۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ فائدہ نہیں جو تم چاہتے ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مفرور مجرم اچانک تائب ہو کے نیکی کے کام شروع کر دیں تو ان کے سابقہ جرائم ختم ہو جائیں۔ مثلاً یہی دونوں ڈاکو اگر جیل سے نکل کر دیندار اور نیکوکار ہو جاتے۔ رفاہِ عامہ کے اور ثواب کے کام کرنے لگتے۔ اصلاحِ معاشرہ کے لیے بدمعاشوں اور بدکرداروں کو پکڑوانے لگتے۔ جرائم کو روکنے میں مدد کرتے تو اس سے ان کی سزائے موت کے فیصلے پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ یہ ثابت ہو جاتا کہ اب یہ فرشتے ہو گئے ہیں اور بدی سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں رہا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ یہی پوزیشن ہماری بھی ہے... لیکن..."

"لیکن کیا؟" غالب نے کچھ دیر انتظار کیا۔

"لیکن دوست! ایک بات ایسی ہے جو صرف ہم سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم سے مراد ہے ہم سب جو خود کو ایم آر ایس کہتے ہیں۔ اگر آج کے حالات کا تجزیہ کرو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ رضوی صاحب دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرے گا انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ انکل رضوی ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی نیک خواہشات اور دعائیں ہمارے ساتھ ہیں مگر ایس ایس پی رضوی کے لیے قانون کی بالادستی اہم ہے۔ ایس ایس پی کا انکل کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ انکل کو یقین ہے کہ ہم بے گناہ ہیں۔ ہمیں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پاکستان لایا گیا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ وزیر خان کو کس نے قتل کیا تھا، میر شرافت علی کو کس نے مارا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے پیچھے کس شکاری کا ہاتھ تھا مگر ان کے جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایس ایس پی کہتا ہے کہ ثبوت لاؤ۔ قانونی تقاضے پورے کرو۔ عدالتی کارروائی ہونے دو۔ پھر جو مجرم ہوگا، اسے سزا مل جائے گی۔ جو بے گناہ ہوگا، وہ رہا ہو جائے گا۔ وہ نظامِ انصاف کو بُرا نہیں سمجھتے مگر یہ جانتے ہیں کہ اس کو مفاد پرست کس طرح استعمال کر رہے ہیں اور اب اس نظام میں جتنی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، وہ کیا ہیں لیکن وہ اکیلے اس پورے نظام کو نہیں بدل سکتے۔ وہ اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود اسی نظام کا حصہ ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ احتجاج کرتے ہوئے پولیس کی نوکری چھوڑ سکتے ہیں۔ اس سے کُتوں کا بھلا ہوگا۔ پولیس کے بدعنوان اہلکار جو اُن کی وجہ سے مجبور تھے آزاد ہو جائیں گے۔ ان کی موجودگی سے اگر بدعنوانی کی غلاظت کے ڈھیر میں ایک فیصد کا اضافہ رُکا ہوا ہے تو یہ بھی بہت ہے۔ ان جیسے سو افسر ہوتے تو یہ کوڑے کا ڈھیر نظر ہی نہ آتا جس پر بہت سے عزت داروں کے ضمیر اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے اکثر نوزائیدہ معصوم بچوں کی لاشیں پڑی ملتی ہیں۔"

"کچھ لوگوں کو اب بھی یہ کوڑے کا ڈھیر نظر نہیں آتا۔" غالب بولا۔ "انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔"

"ایک دن وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوں گے مرزا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت جب انھیں احساس ہوگا کہ ان کے چاروں طرف غلاظت اور کوڑے کے ڈھیر اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ وہ خود اس گندگی میں ڈوب چکے ہیں اور کوڑے کے متعفن ڈھیر کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس طرح کیا ہم انکل رضوی کی مشکلات میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں؟"

"یہ خیال تو مجھے بھی آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے جیسے ہم اپنی بے گناہی اور مظلومیت ثابت کرتے جائیں گے، اتنا ہی انکل رضوی اور ایس ایس پی رضوی کی دو شخصیتوں کے درمیان نفاق بڑھے گا۔ ان کے دل اور دماغ کی جنگ میں شدت آتی جائے گی۔ ان کے لیے اپنے وجود کے دونوں برسرِ پیکار حصّوں کو یکجا اور متحد رکھنا دشوار ہوتا جائے گا۔ پولیس والا بھی گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہوتا ہے جو احساس رکھتا ہے۔ ایس ایس پی کب تک ثبوت کو ڈھال بنائے گا۔ سچائی بالآخر اس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گی۔ ایک وقت آ جاتا ہے جب سچ کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہتا اور اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"یار، یہ سامنے کوئی بڑی سڑک آ رہی ہے۔" غالب نے اچانک کہا۔

"ہاں، میں بھی دونوں طرف کی ٹریفک کو دیکھ رہا ہوں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اب ہمارے لیے خطرناک علاقہ شروع ہوگا۔" غالب نے کہا۔"اس جیپ میں ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔"

"اس میں ہمارے بچ کے نکل جانے کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔" میں نے کہا۔"اگر ہمیں روکے گی تو صرف پولیس۔ پبلک سے ہم کو خطرہ نہیں ہے۔"

"پولیس نے اب تک چوری ہو جانے والی جیپ کے نمبر وغیرہ کی تشہیر کردی ہوگی۔" غالب بولا۔"کیا خیال ہے، ان پولیس والوں نے سچ بولا ہوگا؟"

"افسران بالا کے سامنے تو سچ ہی بولا ہوگا۔ لیکن افسران بالا محکمہ کی بدنامی کے ڈر سے حقائق کو بدل کر پیش کریں گے۔" میں نے کہا۔"خبر یہی آئے گی کہ دونوں مفرور ڈاکوؤں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے پولیس پارٹی پر حملہ کیا اور ان کا اسلحہ اور جیپ بھی لے گئے۔"

"اور ڈاکوؤں کا حلیہ وہ کیا بتائیں گے؟ وہی جو ہمارا حلیہ تھا؟" غالب ہنس کر بولا۔"انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم میک اپ میں تھے اور ہم کو پاٹے خاں یا گورا ڈاکو نہیں سمجھا جاسکتا لیکن ان کو اپنی عزت تو بچانا ہے۔ گر یجویٹ کانسٹیبل خدا بخش کے بیان سے ان کا بیان مختلف نہیں ہوسکتا۔ خود اوورسیئر وہی کہے گا جو پولیس کہے گی حالانکہ وہ ہم سے ایک دن پہلے بھی مل چکا تھا اور وہ جانتا ہے کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔ اس نے ہمیں کسی میک اپ کے بغیر دیکھا تھا لیکن وہ اپنا حقیقت پر مبنی بیان دے کر مصیبت میں نہیں پھنس سکتا۔ وہ بھی کہے گا کہ پاٹے خاں اور گورا ڈاکو زبردستی اس کی کار میں بیٹھے۔ آگے پولیس نے راستہ روکا تو ان کے ساتھی آگئے اور وہ سب کچھ چھین کر لے گئے۔ اسلحہ، گاڑی اور وردیاں۔ پولیس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر وہ تعداد میں زیادہ تھے اور ان کے پاس خطرناک قسم کا جدید اسلحہ تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بے چارہ اوورسیئر خواہ مخواہ پھنس گیا۔"

"سب اعمال کی سزا ہے۔" میں نے کہا۔"سالا خود کو غریب آدمی کہنے سے باز نہیں آتا تھا۔ اب ساری عمر آئینہ دیکھے گا تو ٹوٹے ہوئے دانت کی جگہ نقلی دانت دیکھ کر یاد رکھے گا کہ اسے یہ سزا کیوں ملی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اس کی گاڑی کو بھی آگ لگا دیتا۔ اس نے کھیتوں کا پانی روک کر کتنے مجبور کاشت کاروں کے دل جلائے ہوں گے۔ اس نے محنت کشوں کے خون پسینے پر غنڈہ ٹیکس عائد کیا اور زبردستی وصول کیا ہوگا۔ ایسے آدمی کی کار کو آگ لگانے میں اتنا ہی ثواب ہے جتنا بدکار کو سنگسار کرنے میں۔"

غالب ہنسنے لگا۔"ایسے فتوے مت ایجاد کر۔ مذہب کے ٹھیکیدار بھی تیرے خلاف ہو جائیں گے۔"

"اس میں غلط کیا ہے۔ ایک حرام کھاتا ہے، ایک حرام کرتا ہے۔ حرام کھانے والا تو اپنی نسلوں کے خون میں رزقِ حرام شامل کر دیتا ہے، وہ اور زیادہ بڑا مجرم ہے۔" میں نے کہا۔"وہ چوری کا مال تھا، یہ سب جانتے ہیں لیکن ایسے چور محفوظ رہتے ہیں، ہم ان کو کیوں معاف کریں۔ اس کی ایک اور چیز بھی میرے پاس رہ گئی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" غالب نے کہا۔

میں نے اندر ہاتھ ڈالا اور وردی کے نیچے اپنے کپڑوں میں سے وہ ٹیلی فون کا آلہ نکالا جسے تاروں سے جوڑ کے میں نے اوورسیئر سے بات کی تھی۔ اوورسیئر کو میں نے دُور بھیج دیا تھا، کھمبے سے اترنے کے بعد میں نے اس آلے کو ہاتھ میں رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اُسے دے دوں گا۔"

"مگر پھر دل میں بے ایمانی آگئی۔" غالب بولا۔

"سچ فرمایا آپ نے۔" میں نے شرمندہ ہوئے بغیر کہا۔"وہ بھول گیا اور میں نے اسے قمیص کے اندر چھپالیا، کام کی چیز ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تو نے دُور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ایجاد ہمارے بہت کام آئے گی۔" غالب نے کہا۔"اسے سنبھال کے رکھ۔"

"سنبھال کے ہی رکھا ہوا ہے ورنہ اب تک برآمد نہ ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"میرا ایک مشورہ ہے، بالکل مفت۔" غالب نے کہا۔"دن ظاہر ہونے سے پہلے ہم شہر میں داخل نہ ہوں۔ ابھی دو گھنٹے میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ دن کے اجالے میں پولیس کی جیپ بھی دُور سے نظر آتی ہے اور نمبر بھی پڑھا جاتا ہے، رات کو سڑکوں پر پولیس کم ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ زیادہ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹریفک پولیس نہیں رہتی۔" غالب نے کہا۔"گشت کرنے والے آجاتے ہیں مگر وہ مٹر گشت کرتے ہیں۔ سیر تفریح۔ پکڑ دھکڑ، آوارہ گردی کی دھمکی میں شرفا سے نذرانے وصول کرنا۔ آوارہ گردوں کی جیبیں خالی کرنا۔ ائیرپورٹ سے آنے والے مسافروں کو لوٹنا۔ لوگوں کی گھڑیاں اور بٹوے جامہ تلاشی میں ضبط کرنا۔ ان کی نظر میں تو سب ہی مشتبہ ہوتے ہیں۔ جو پکڑا جائے اور خالی ہو تو دو چار ہاتھ کھائے، دس بیس گالیاں سا کرے تو ایک سو نو میں تھانے ارسال کیا جاتا ہے۔ جو شرافت سے جیب خالی کر دے، وہ گھر چلا جاتا ہے اور کسی سے شکایت نہیں کرتا سوائے اپنی تقدیر کے۔"

"میں قائل ہوا۔" میں نے کہا۔"رات تک کیا کریں؟"

"صبر۔" غالب نے کہا۔"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ہم نے جیپ کو شاہراہ سے ایک فرلانگ دُور روک لیا۔ وہاں ایک ریلوے کراسنگ تھی اور اس کے ساتھ ہی ریلوے کا کوارٹر تھا جو خالی پڑا ہوا تھا یا باہر سے ایسا ہی لگتا تھا۔ میں نے جیپ اس کے پیچھے کھڑا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ چار افراد جو فرش پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، ایک دم اُٹھ کے بھاگے اور دیواریں پھاند گئے۔ نیلی ڈانگری میں ریلوے کا ایک گینگ مین پکڑا گیا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

"یہ سب ہو رہا ہے جوا یہاں؟" میں نے گرج کے کہا اور تاش کے ان بے ترتیب پتوں کی طرف دیکھا جو بھاگتے وقت جواری پھینک گئے تھے۔ وہیں ان کی جیتی ہوئی اور ہاری ہوئی رقم بھی پڑی تھی۔ گینگ مین کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا۔

"جوا... نہیں حضور والا..." وہ ہکلانے لگا۔"یار دوست تھے۔"

میں نے اس کے ایک چھانپڑ مارا۔ وہ دیوار سے جالگا۔

"سرکار غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردیں۔" اس نے ایک دم میرے پاؤں پکڑ لیے۔

میں نے اُسے کالر پکڑ کے ایک جھٹکے سے اُٹھا لیا۔"اس لیے دیا تھا تم کو ریلوے نے کوارٹر کہ یہاں جوئے کا اڈا قائم کرلو۔"

گینگ مین لرزنے لگا۔"اڈا کیسا جناب۔ آپس میں تھوڑا بہت کھیل لیتے ہیں۔ دس بیس روپے سے زیادہ نہیں لگاتے۔ غریب لوگ ہیں سب۔"

"غریب جوا کھیل سکتا ہے؟" میں نے کہا۔"دس بیس روپے کی بازی کو جوا کہتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ جوا ہوتا ہے ریس کورس میں، سٹے میں اور وہاں جہاں لاکھوں لٹانے والے آتے ہیں۔ موتی جی کار لو میں۔"

"کہاں جی۔" گینگ مین بولا۔

"کہیں نہیں۔" میں نے کہا اور اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ واقعی جواری نہیں تھے، صرف وقت گزارنے اور کھیل میں تھوڑی سی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شرط لگا کے کھیلتے تھے۔

"میری جگہ کوئی اور پولیس افسر ہوتا تو تم کو پکا جواری قرار دے کر قید کر دیتا اور اس جگہ کو جوئے کا اڈا سمجھ لیتا۔" میں نے کہا۔"لیکن مجھے تم شکل سے کنگلے نظر آتے ہو۔ تم کو ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے، کیا بیوی بچے نہیں ہیں تمھارے...؟"

"ہیں جناب! مگر وہ یہاں نہیں، وطن میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔"آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے میری عزت اور نوکری بچالی۔"

"ایک مرتبہ تو تم بچ گئے۔" میں نے کہا۔"دوبارہ شاید تقدیر تمھارا ساتھ نہ دے۔ غریب جب جوا کھیلتا ہے تو صرف اپنی تقدیر کو داؤ پر لگا سکتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کا مستقبل یا تھوڑی بہت عزت داؤ پر لگا سکتا ہے اور ہارنے کو تمھارے پاس کیا ہے۔ تمھاری تقدیر اچھی ہوتی تو تم گینگ مین نہ ہوتے بے وقوف۔ اور ایسی تقدیر سے کریلا ہونے کے بعد تم جوا کھیلتے ہو؟"

"آئندہ میرے باپ کی بھی توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا۔

"باپ زندہ ہے تمھارا؟" میں نے اس کے ایک چھانپڑ اور مارا۔

"نہیں جناب۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔

"تو اس کی روح کو کیوں دُکھ دیتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ وعدہ اور یہ ہاتھ جوڑ کے توبہ کرنا، سب دکھاوا ہے، جان بچانے کے لیے۔ کل تم پھر جمع ہو جاؤ گے اور پھر یہی کرو گے اور شاید سمجھو گے کہ عجیب تھانیدار تھا۔ دو چھانپڑ مار کے چھوڑ گیا مگر بیٹا! میں روز آدمی بھیجوں گا میرے مخبر سادہ کپڑوں میں یہاں آکے تاش کھیلیں گے۔" میں نے کہا۔"یہ بتاؤ تمھاری ڈیوٹی کیا ہے؟"

"میں جناب، یہاں پھاٹک بند کرتا ہوں۔" وہ بولا۔"جب گاڑی آنے کا ٹائم ہو۔"

"ابھی کسی گاڑی کے آنے کا وقت ہے؟"

"نہیں جناب! دو گھنٹے بعد ایک گاڑی گزرے گی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو دیکھو، ہم یہاں دو گھنٹے ٹھہریں گے۔" میں نے کہا۔"باہر ہماری گاڑی میں دو ڈاکو ہیں جو آج ہی پکڑے گئے ہیں۔"

"کون... وہ پاٹے خاں اور گورا ڈاکو؟" وہ بولا۔

"ہاں... تم کیسے جانتے ہو؟"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں حضور۔" وہ بولا۔"اخبار میں تھا کہ یہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ آس پاس کے رہنے والے بہت ڈرے ہوئے تھے۔"

"اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔"ہم نے ان کو جنگل سے گرفتار کرلیا ہے۔"

"واہ واہ جناب! یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔"ان دونوں کی علاقے میں بڑی دہشت ہے۔ سب یہی کہتے تھے اب پھر پہلے کی طرح کسی کی جان و مال محفوظ نہیں رہیں گے۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا تھا جب وہ پکڑے گئے تھے۔ پاٹے خاں کو تو چار دن بعد پھانسی ہونے والی تھی۔"

"اب چار دن بعد تو شاید نہ ہو مگر خدا نے چاہا تو چار ہفتے بھی نہیں لگیں گے۔" میں نے کہا۔

"اللہ کرے جی... بڑے گھر لوٹے انھوں نے۔" وہ ایک دم اداس ہوگیا۔"میرا گھر بھی تباہ کیا اس خنزیر کے تخم پاٹے خان نے۔"

"تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"میری بیٹی کا سارا جہیز لوٹ کر لے گئے تھے۔" وہ رونے لگا۔"اس کا رشتہ ختم ہوگیا، پھر وہ مر گئی... اس نے خودکشی کرلی۔ اسی ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ گئی۔ ہائے او میری سوہنی دِھی... کیسا نصیب لائی تھی تو۔" وہ یکلخت دھاڑیں مارنے لگا۔

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔"صبر کرو بھائی... سزائے موت کی سزا گورے ڈاکو کو بھی سنائی جا چکی ہے اور اسے پھانسی ضرور ہوگی مگر ان کو کبھی کوئی نہیں پکڑے گا جو تمھاری بیٹی کے اصل قاتل ہیں۔ وہ شریف ڈاکو جو جہیز کے نام پر لڑکی والوں کو لوٹتے ہیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیا وہ جہیز کے بغیر تمھاری بیٹی کو نہیں لے جا سکتے تھے؟ وہ رشتہ ختم نہ کرتے تو تمھاری بیٹی خودکشی کیوں کرتی؟"

"وہ لے جاتے تو کون سا خوش رکھتے۔" وہ آنسو پونچھ کے بولا۔ "وہ ساری عمر طعنے سہتی... عذاب جھیلتی... جل جل کے مرنے سے پہلے بہت دکھ اٹھاتی اور وہ سارے دکھ ہم بھی اٹھاتے... اچھا ہوا ایک ہی بار مر گئی۔ ہم نے بھی صبر کر لیا مگر حضور... مجھے اس ڈاکو کی صورت تو دکھاؤ۔"

"میں اس کو اندر لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر شرط یہ ہے کہ تم خود پر قابو رکھو گے۔"

میں پہلے غالب کو اٹھا کے اندر لایا۔ پھر باری باری ان دونوں ڈاکوؤں کو۔ اب وہ دونوں ہوش میں تھے۔ پاٹے خاں کی حالت کچھ بہتر تھی مگر گورا ڈاکو اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ کمرے میں ایک ہی چارپائی تھی جس پر میں نے غالب کو لٹا دیا تھا۔ خود میرے بیٹھنے کے لیے گینگ مین نے ایک اسٹول فراہم کر دیا۔

"دیکھ تھانیدار۔" پاٹے خاں نے فرش سے سر اٹھا کے کہا۔ "ہم سے سودا کر لے..."

میرے جواب دینے سے پہلے ہی گینگ مین اس پر پل پڑا۔ اپنی بیٹی کے خون کا بدلہ لینے کی آرزو اس پر ایک جنون بن کے سوار ہو گئی اور وہ مجھ سے کیے ہوئے وعدے کو بھول گیا۔ "تو سودا کرے گا... کس کس سے سودا کرے گا... پہلے میری بیٹی کی زندگی کی قیمت دے... تیری تو..." اس نے ایک سے ایک گندی گالی دیتے ہوئے پاٹے خاں کو دیوانہ وار لاتیں ماریں۔ پاٹے خاں نے اسے ایک بار دھکیل دیا مگر وہ پھر اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ میں چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں گینگ مین اپنے دل میں جلنے والی آگ کو کچھ ٹھنڈا کر لے۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ وہ شخص جس کے خلاف اس کے وجود میں نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا، یوں بے بس اور لاچار اس کے سامنے لایا جائے گا۔ عام حالات میں پاٹے خاں پھر اس گینگ مین کے سامنے آتا تو وہ ہاتھ جوڑ کے اس کے سامنے گریہ وزاری کرتا اور پوچھتا کہ سب کچھ تو لے گئے ہو، اب کیا لینے آئے ہو مگر یہ صورتِ حال قدرت کے نظامِ انصاف نے پیدا کی تھی کہ وقت کی بساط الٹ گئی تھی۔ ظالم اب مظلوم تھا اور جو کل مظلوم تھا اس کو ظلم کا حساب برابر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے غالب کو مختصراً گینگ مین کے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہانی سنا دی۔ اس عرصے میں گینگ مین نے پاٹے خاں کو دھن کے رکھ دیا۔ اس نے پاٹے خاں کی دو پسلیاں ٹھڈے مار مار کے توڑ دیں اور اس کے سامنے والے دانت توڑ دیے۔ اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ اور کسی وحشی درندے کی طرح اس کے جسم کو ریزہ ریزہ کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ جوان آدمی نہیں تھا اور پاٹے خاں میں ابھی تھوڑی بہت مزاحمت کی قوت باقی تھی۔ پاٹے خاں خود کو... اور مار کھاتا رہا۔ گینگ مین ہانپنے لگا۔ چلاتے چلاتے اور گالیاں دیتے اس کا گلا بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو نام لے لے کر پکارتا رہا اور پاٹے خاں پر مسلسل حملے کرتا رہا۔ اگر وہ خالی ہاتھ نہ ہوتا تو یقیناً پاٹے خاں کو قتل کر دیتا۔ میں بھی یہ جانتا تھا کہ وہ اس جنونی کیفیت میں پاٹے خاں کو چیر پھاڑ کے رکھ سکتا ہے چنانچہ میں بہت چوکس ہو... دو مرتبہ گینگ مین نے پاٹے خاں کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن پاٹے خاں نے اسے دھکیل دیا۔ پھر اچانک گینگ مین نے ادھر ادھر دیکھا... ایک کونے کی طرف لپکا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کیا کرے گا... کے واپس آنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سبزی کاٹنے... چھری لے کر آیا تو اس نے مجھے اپنی راہ میں مزاحم پایا۔

"ہٹ جاؤ... ہٹ جاؤ تھانیدار صاحب... میں اس کتے کا خون پیوں گا۔" گینگ مین چلانے اور ہانپنے لگا۔ "اس کے خون سے ہی میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی... میں پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ آپ مجھے گرفتار کر لینا، بس مجھے اس کی بوٹیاں کرنے دو... میں اس کے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالوں گا۔"

میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی اور وہ چھڑانے کے لیے بل کھا رہا تھا۔ "بس بھائی... پاگل پن... مت بڑھو، تم پھانسی چڑھ جاؤ گے تو باقی سب کا کیا بنے گا... بیوی کا... اور دوسرے بچوں کا... خدا کی لاٹھی بے آواز ہے... دیکھا کہ کس طرح تمھارا گھر برباد کرنے والا تمھاری ٹھوکروں میں... اپنا بدلہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس نے سب کا حساب بے باق کر... بہت جلد یہ اپنی ٹوٹی ہوئی گردن کے ساتھ پھانسی گھاٹ کے... کنوئیں میں لٹکا ہوگا۔ اسے میں بھی گولی مار سکتا تھا مگر میں نے... وہیں پہنچانا ہے جہاں اجل اس کے انتظار میں ہے۔ یہ دست... سے بھاگنا چاہتا تھا۔ بھلا موت سے بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا..."

گینگ مین نے چھری گرا دی اور فرش پر دھپ سے بیٹھ... رونے لگا اور میں نے چھری اٹھا کے دور پھینک دی۔

"اس ڈاکو سے بھی تم نے کچھ کہا تھا جو جہیز کے نام پر تمھارے... گھر میں ڈاکا ڈالنے آیا تھا؟" میں نے کہا۔ "اس سے تم نے کچھ نہ... کہا ہوگا، الٹا تم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوں گے۔ اس کے... قدموں پر سر رکھ دیا ہوگا، یا اپنی پگڑی ڈال دی ہوگی۔ کہا ہوگا کہ... عزت اب تمھارے ہاتھ میں ہے۔ یہی کیا تھا نا؟ سب یہی کر... ہیں۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ شخص تو خود بے غیرت ہے جو غریب... آدمی کی بساط سے بڑھ کر جہیز کا مطالبہ کرتا ہے اور جہیز کے بغیر اس... کی بیٹی کو ایسے ٹھکرا دیتا ہے جیسے کوئی طوائف... ہے۔ دونوں کا فعل ایک ہی ہے مگر طوائف صرف عورت کہلاتی... تم پر لازم تھا کہ اس ڈاکو کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے۔ اس کے گ...

اتار کے اسے ٹھوکریں مارتے۔ اسے بھی اتنا ہی بے عزت کرتے جتنا اس نے تمھیں کیا۔ جس دن تمھاری بیٹی کا جنازہ اٹھا اسی دن اگر اس کے بیٹے کا جنازہ بھی اٹھتا تو فرق پڑتا۔ ان سب کو فرق پڑتا جن کی بیٹیوں کی باراتیں لوٹ گئیں یا رشتے ٹوٹ گئے۔ مگر تم اس کے ہاتھوں ذلیل ہوئے اور تم نے خود کو بھی ذلیل کیا۔ اس نے تو اپنے بیٹے کی بارات اتنی ہی دھوم دھام سے کہیں اور پہنچا دی ہوگی۔ تم نے اس ڈاکو کو مارا؟ یہ تو ڈاکو ہے، اس کی کوئی عزت نہیں مگر اس عزت دار ڈاکو کا تم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" غالب نے مجھے اونچی آواز میں ٹوکا۔ "تم اسے قتل پر اکسا رہے ہو۔ اگر اس نے اب برانگیختہ ہو کے اس لڑکے کا، اس کے باپ کا اور پھر لڑکے کی بیوی کا خون کر دیا تو سوچو کیا ہوگا۔ تین گھر تباہ ہوں گے۔ اس کا اپنا، اس لڑکے کا اور اس دوسری لڑکی کا جو بے قصور ہے۔"

مجھے ہوش آگیا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ انصاف تو اسی وقت ہونا چاہیے تھا جب ظلم ہوا تھا۔ اب بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں جی اب تو بہت دیر ہو گئی۔" گینگ مین نے کہا۔ "آخر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے جس کا گھر بعد میں آباد ہوا۔ سارا قصور اس لڑکے کے باپ کا تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ میری بیٹی کا چالیسواں اسی دن تھا جس دن اس کا سوئم تھا۔ کہتے ہیں، اسی بیٹے نے جائداد کے لیے باپ کو زہر دیا تھا مگر مشہور یہ ہوا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ سانپ تو وہ خود تھا پھر بیٹا سپنولیا کیسے نہ ہوتا۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟" غالب نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ "یہ تو ابھی تک بتایا ہی نہیں تم نے۔"

"غازی خاں۔" وہ بولا۔ "خدا آپ کو ترقی دے۔ آپ نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ جس دن اس کمینے کو پھانسی ہوگی، میں مٹھائی تقسیم کروں گا اور آپ کے نام پر بھی بانٹوں گا۔"

"نہ بھئی، ہمارا تو یہ فرض ہے۔ ہم یہ کام مٹھائی بانٹنے کے لیے نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "ہماری کسی سے بھی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔"

"میں اپنی بیوی کو آپ کے متعلق ضرور بتاؤں گا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ میں نے اسے کتنا مارا۔ اس کے منہ پر پیشاب کر دیا میں نے مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔ اب میرے دل کو بہت قرار آگیا ہے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔ اگر ٹائم ملے تو میرے غریب خانے پر آئیں۔" وہ بولتا گیا۔ "میری بیوی کی دعائیں بھی لیں۔ وہ غریب تو رو رو کے اندھی ہو چکی ہے، صرف دعا دے سکتی ہے۔"

"ہم... ہم ضرور آتے... مگر تمھارا گھر بھی تو معلوم نہیں ہمیں۔" میں نے کہا۔

"آپ واپسی آئیں، وہاں ریلوے کے کوارٹر ہیں۔" وہ بولا۔ "چھوٹے کوارٹر دیکھے ہوں گے آپ نے۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لیں کہ ڈیرہ غازی خاں کہاں ہے۔"

"ڈیرہ غازی خاں؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... میرا نام غازی خاں ہے نا۔ تو سب میرے گھر کو ڈیرہ غازی خاں کہتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر کہ مجھے جوا کھیلنے کے جرم میں نہیں پکڑا اور مجھے موقع دیا کہ میں کچھ تو بدلہ لے سکوں اپنی بیٹی کا۔"

"غازی خاں... تمھاری بیوی کیا بالکل اندھی ہو چکی ہے؟" غالب نے پھر بات کا رخ پلٹا کیونکہ غازی خاں گھوم پھر کے اپنے انتقام پر آجاتا تھا۔

"ہاں جی، ابھی تو بالکل اندھی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، بڑا آپریشن ہوگا۔" وہ بولا۔ "ڈھائی ہزار روپے لگیں گے۔ غریب کے پاس ڈھائی ہزار کہاں جناب۔ کافی ہے، جتنی دنیا دیکھ لی۔"

"لیکن سرکاری اسپتال بھی تو ہے۔" میں نے کہا۔

"وہاں بھی ہمیں کون پوچھتا ہے، کہتے ہیں، ریلوے اسپتال جاؤ۔ اور ریلوے اسپتال آپ خود جا کر دیکھ لیں۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "کیا فائدہ دھکے کھانے سے۔"

میں نے غالب سے مشورہ کیا۔ بات صرف ڈھائی ہزار کی تھی جس سے ایک بدنصیب عورت کی بینائی واپس آسکتی تھی۔ پاٹے خاں کی پھانسی سے اس کی بیٹی واپس نہیں مل سکتی تھی لیکن بیٹی کے ساتھ چلی جانے والی بیوی کی آنکھوں کی روشنی اس سے صرف ڈھائی ہزار روپے کی مسافت پر تھی مگر اس کی دسترس میں نہ تھی۔ اسے ڈھائی ہزار میل پیدل چل کے اس روشنی کو واپس لانا پڑتا تو وہ اپنی شریکِ حیات کے لیے سفر کی ہر صعوبت برداشت کر لیتا اور اسے آنکھوں کا نور لا دیتا مگر ڈھائی ہزار روپے لانا اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ ایسے کئی ڈھائی ہزار ہماری جیب میں پڑے ہوئے تھے اور یہ ڈاکوؤں کا مال تھا، ویسے ہی ڈاکوؤں کا جو ایک غریب گینگ مین کے گھر کی ساری خوشی، ساری روشنی اور ساری زندگی کی کمائی لوٹ کر لے گئے تھے۔

"غازی خاں۔" میں نے جیب میں سے گن کر تین ہزار نکالے۔ "یہ لو۔"

"یہ کیا ہے جناب؟" وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔

"تمھاری بیوی کے لیے آنکھوں کی روشنی۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب! ایسے کسی سے لینے ہوتے تو میں بھیک مانگ لیتا۔" غازی خاں نے کہا۔ "بہت سے ساتھیوں نے کہا تھا کہ چندہ کر لیتے ہیں۔ سب کو مجھ سے ہمدردی تھی کہ پہلے جہیز گیا۔ پھر رشتہ گیا۔ پھر بیٹی گئی۔ جب بیوی کی آنکھوں کی روشنی گئی تو ان کے سینے میں دل پانی ہو گئے۔ مگر میں نے کہا کہ یہ سب اس کی رضا ہے۔ تو میں راضی بہ رضا ہوں۔ میں نے کسی کی خیرات نہیں قبول کی۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"مگر یہ خیرات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "انہی ڈاکوؤں کے پاس سے برآمد ہونے والی رقم ہے، اس پر تمھارا بھی حق ہے۔ تمھاری بیٹی کی زندگی انمول تھی مگر جہیز کی مالیت کا تو اندازہ ہو گا تم کو۔"

"ہاں جی... تھا کوئی پانچ ہزار کا۔" وہ بولا۔

"کیا وہ پانچ ہزار تمھیں واپس ملے؟"

"نہیں جناب... جو گیا سو گیا۔ برآمد ہو جائے تب بھی کہاں ملتا ہے۔ سب آپ جیسے تو نہیں ہیں پولیس میں۔" وہ بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ تمھارا حق ہے۔" میں نے مزید دو ہزار شامل کر کے رقم اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ "اگر یہ رقم پولیس کے حساب میں چلی گئی تو تمھیں کیا ملے گا؟ وقت سے فائدہ اٹھاؤ، ابھی معاملہ میرے اختیار میں ہے۔"

میری دلیل نے اُسے کچھ قائل کیا تھا مگر وہ تذبذب کا شکار تھا۔ "آپ... آپ کیوں اتنے مہربان ہیں مجھ پر جناب... کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"ہمیں دعائیں چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "وہ دعائیں جو سچی ہوں اور دل سے نکلیں۔ ہم دُکھی دلوں کا درد مٹا کے ہی ایسی دعائیں پا سکتے ہیں جو قبول بھی ہوتی ہیں۔ ہم غرض مند ہیں غازی خاں، یہ رکھ لو۔"

"ایسے نہیں جناب... مجھے معلوم ہے کوئی پولیس افسر اپنی مرضی سے برآمد ہونے والا مال نہیں بانٹ سکتا۔" وہ بولا۔ "اگر یہ ڈاکو کا مال ہے تو آپ کا بھی مال ہے۔"

"کیا تم مجھے ڈاکو کہہ رہے ہو؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"نہیں سرکار... میری کیا مجال... میرا مطلب تھا کہ آپ بھی تو اس مال کو رکھ سکتے ہیں۔ آپ سے پوچھنے والا کون ہوگا۔" وہ بولا۔ "میں بھی سامان کا حقدار ہوں، اس کے بدلے مال کا نہیں۔"

"ایک ہی بات ہے غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ مال حکومت کے خزانے میں جائے گا تو میں تم کو ایک پیسہ نہ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ اسے وہ سب لوگ تقسیم کر لیں گے جن کے خزانے ایسے ہی مال سے بھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ کسی ضرورت مند کے کام کیوں نہ آئے۔ کسی حرام خور کے لیے یہ ڈھائی ہزار کچھ نہیں، وہ ایک دن میں اس سے زیادہ پیدا کر لیتا ہے مگر تم ساری عمر کوشش کرتے رہو گے تب بھی ڈھائی ہزار نہیں بچا سکو گے اور اگر تم پانچ دس سال میں ڈھائی ہزار جمع کرنے کے قابل ہو گئے تو اس وقت تک آپریشن چار چھ پانچ ہزار ہو جائیں گے۔ کون جانے آپریشن ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں خود دے رہا ہوں تم کو۔"

"جناب آپ بڑے آدمی ہیں، آپ کا دیا دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کے لیے عزت کا باعث ہو سکتا ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ "ہم غریب اور چھوٹے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کر دنیا میں رسوا ہوں... آخرت میں بھی... اور اپنی نظر میں بھی۔ کبھی پولیس کو دیکھا نہیں کہ اس نے کسی کو نیک نیتی سے کچھ دیا ہو۔ لیتے ضرور دیکھا ہے اور اسی لیے یقین نہیں آتا کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں۔ یہ نہ ہو نوٹوں پر نشان لگے ہوں بعد میں آپ ہی مجھے گرفتار کر لیں کہ... یہ جوئے کی رقم تھی۔ ابھی تو بھاگ گئے والے دس بیس روپے چھوڑ کے بھاگے ہیں۔ اس سے بھی آپ جرم تو بنا سکتے ہیں مگر میرے پاس سے تین ہزار برآمد ہوئے تو میں کیسے انکار کروں گا کہ میں جوئے کا اڈا نہیں چلا رہا تھا۔ آپ ہی مجھ سے سوال کریں گے کہ تمھارے پاس تو اندھی بیوی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے ڈھائی ہزار نہیں تھے پھر یہ تین ہزار کہاں سے آئے؟ ابھی تک آپ نے میرے ان ساتھیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جو چھاپا پڑتے دیکھ کر فرار ہو گئے مگر ہو سکتا ہے کہ تین ہزار برآمد کرنے کے بعد آپ رات کو مجھے تھانے لے جا کر پوچھیں، میں چاہے نام بتا دوں تو کہیں، باقی چار کے بھی بتاؤ۔"

میرے دل میں درد کی ایک لہر اُٹھی اور ٹوٹ گئی۔ میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے ہو گیا۔ میرا نیکی کرنے کا جذبہ شرمسار ہو گیا اور میرے لیے احساسِ جرم بن گیا۔ یہ ایسا المیہ تھا کہ انسانوں کو نیکی، شرافت اور انسانیت کے خلوص پر اعتبار نہ رہا تھا کوئی دوستی یا دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھائے تب بھی نظر آستین میں دشنۂ پنہاں دیکھتی ہے۔ شک اور خوف نے دلوں میں بدگمانیوں کا زہر بھر دیا ہے۔ ہر شخص، آدمی سے ڈرتا ہے کہ عوام گزیدہ ہے۔ یہ وردی جو قانون کی بالادستی کی علامت تھی، کتنی بدنام ہو کے رہ گئی ہے۔ اب کسی کو یقین نہیں آتا کہ اس وردی میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے دل درد سے خالی نہیں... جو انسانیت کی قدروں کو اتنا ہی محترم سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ آدمی جسے انسان ہونا میسر ہے۔ آدمی کے تجربات کا عکس اس کی زندگی کے آئینے میں نظر آتا ہے اور پولیس کے معاملے میں نچلے طبقے کے غریب اور لاچار لوگوں کی رائے ایک دن میں خراب نہیں ہوئی۔ یہ برسوں، شاید صدیوں کا المیہ ہے۔ اس وقت سے جب انگریز بہادر نے پولیس کو اپنی حاکمیت تسلیم کرانے کے لیے ڈنڈے اور رائفلیں دی تھیں اور کہا تھا کہ جاؤ، اپنے ہم وطنوں کو ذلیل اور شرافت کی زبان میں نہیں، جوتا کاری، لاٹھی چارج، ٹیئر گیس اور فائرنگ کی زبان میں بتاؤ کہ اقتدار کیا ہوتا ہے۔ آج تک جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوئے بائیس سال ہوئے، پولیس کے اور عوام کے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا ہے۔ لندن کی پولیس کی طرح عام آدمی کے دوست بننے کے لیے نہ انھوں نے کوشش کی اور نہ ضرورت محسوس کی۔ جب زمانہ ہی لاٹھی سے بھینس ہنکائے جانے والوں کا ہو تو پولیس لاٹھی سے بات کیوں نہ کرے۔ پبلک چلاتی رہے کہ لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی۔

"آپ ناراض تو نہیں ہو گئے سرکار۔" غازی خاں نے کہا۔ "آپ مالک ہیں۔ اقرار کو بھی ہمارا جرم بنا سکتے ہیں اور انکار کو بھی۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے غازی خاں کہ ہم بحث کر سکیں

اور تم کو قائل کر سکیں کہ کہیں بھی سارے شیطان اور سارے رحمان نہیں ہوتے۔ ہر جگہ ہر ادارے میں، ہر شہر اور ہر ملک میں اچھے بُرے لوگ ملتے ہیں۔" میں نے کہا اور رقم جیب میں رکھ لی۔

"تم کچھ چائے وغیرہ پلا سکتے ہو؟" غالب نے کہا۔ "یہاں کوئی بندوبست ہے؟"

"ہے سرکار! میں خود بھی بنا سکتا ہوں۔ اور آپ کہیں تو آگے سے بھی لا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "سڑک کے موڑ پر ہوٹل ہے۔"

"نہیں... تم خود بناؤ۔" میں نے کہا۔ پھر میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نروس طریقے پر اسٹوو جلا کر پانی اُبلنے کے لیے رکھا۔

"جتنی دیر میں یہ پانی اُبلتا ہے۔" میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کے کہا۔ "تم دوڑ کے سگریٹ لاؤ، اس ہوٹل پہ ملتے ہیں نا؟"

"میں لاتا ہوں جناب... آپ پیسے رکھیں اپنے پاس۔" وہ ایک دم اُٹھا۔

"ٹھہرو، یہ پیسے کیوں نہیں لے رہے ہو تم؟ کیا اس ہوٹل سے تم کو روز مفت سگریٹ ملتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"روز... نہیں... مگر آپ تو مہمان ہیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔

"مہمان۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اچھی عزت کی ہے تم نے مہمانوں کی اُن کے خلوص کو گالی دے کر۔"

"میں... میں نے... میں نے تو..." وہ ہکلانے لگا۔

"اگر تم ہماری نیک نیتی پر شک کر سکتے ہو کہ ہم وہ رقم تم کو پھنسانے کے لیے دے رہے تھے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ مہمان نوازی نہیں ہے۔ تم رشوت دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "اور کس کس کو روز دس روپے کے سگریٹ لا کے پلاتے ہو۔ ہم تو چائے کے بھی پیسے دیں گے۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔ "میری کیا مجال کہ رشوت دوں۔"

"اچھا چھوڑو۔ مہمان نوازی کا شوق ہے تو اپنے سگریٹ نکالو۔" غالب نے کہا۔ زمین پر تاش کے پتوں، نوٹوں اور سکوں کے درمیان 'فاکس اون' سگریٹوں کی لال ڈبیا پڑی ہوئی تھی جو بہت سستے قسم کے سگریٹ تھے۔ حیرت زدہ گیلک میں نے وہ ڈبیا اُٹھا کے غالب کو دی۔ پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں وہ خاموشی سے چائے بنا کے لایا اور ہم نے پی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب نادم ہے۔

"اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہی کہا اور غالب کو اُٹھا کے جیپ تک لے گیا۔ باہر رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ شام کے دُھندلکے پر غالب آنے لگا تھا۔ دونوں ڈاکوؤں کی حالت خراب تھی لیکن میں نے شہر کے علاقے میں رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے گیلک میں غازی خاں کے دیے ہوئے تار کے ٹکڑوں سے انھیں باندھا اور کپڑا ٹھونس کر ان کے مُنہ بند کر دیے۔

"کسی سے ہمارے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں..." میں نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھیوں کو بتا دینا کہ ہم ایسے ہی آ گئے تھے۔"

"جی سرکار..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اچھا غازی خاں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ... تمھاری مہمان نوازی کا شکریہ۔"

غازی خاں کو بالآخر اس کے دل نے قائل کر لیا تھا کہ ہم ویسے لوگ نہیں ہیں جیسے وہ سمجھا تھا اور اپنے شک کا اظہار کر کے اس نے ہمیں صدمہ پہنچایا ہے۔

"ایک... ایک عرض ہے سرکار۔" غازی خاں نے اس وقت کہا جب میں جیپ کو اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"کہو کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... میں رقم آپ سے ضرور لے لیتا۔ مجھے ضرورت بھی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر...؟"

"مگر کیا...؟"

"اتنی ہی نیکی کرنا چاہتے ہیں آپ... تو یہ رقم خود اسے دے دیں... جو ضرورت مند ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے ہاتھ میں... انہی ہاتھوں سے وہ آپ کو دعا دے گی۔"

"تمھارا مطلب ہے تمھاری بیوی کو... تمھارے گھر آ کے...؟" میں نے کہا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سر ہلایا۔ "ڈرتا تو میں ہوں جی۔ میں بڑا گنہگار ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں نے جو کبھی دیکھا نہ سُنا، اس پر کیسے اعتبار کروں۔ اب میرا دل تو کہتا ہے کہ آپ فرشتے ہیں انسان کے بھیس میں۔ مجھے یقین آ جائے گا، اگر آپ نے اس اندھی کے ہاتھوں میں روشنی دینے کے لیے میرے غریب خانے کی دہلیز بھی پار کر لی۔"

"اچھا... اگر تم امتحان لینا چاہتے ہو ہماری نیت کا تو ہم آئیں گے۔" میں نے گاڑی آگے بڑھا کے کہا۔ "ضرور آئیں گے۔"

"کب... کس وقت جناب؟" وہ جیپ کے پیچھے دوڑا۔

"کسی بھی دن... کسی بھی وقت۔" میں نے چلا کے کہا۔ "خدا حافظ غازی خاں۔"

"خدا حافظ سرکار۔" وہ رک گیا اور پیچھے رہ گیا۔

ہم نے غازی خاں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ یہ میں بھی جانتا تھا اور غالب بھی کہ جسے وہ امتحان سمجھا تھا، وہ ہمارے لیے کوئی امتحان نہیں۔ ہم کسی بھی وقت جا کے اس کی بیوی کو ایک نیکی کا نذرانہ دے آئیں گے۔ ان ہاتھوں کی دعا بھی آنے والے دنوں میں کہیں ہمیں امید کی روشنی دے گی، جب ہم مایوسی کے اندھیرے میں اندھوں کی طرح بھٹک رہے ہوں گے۔

"کیوں نہ میں پہلے انکل رضوی کو فون کر لوں...؟" میں نے کہا۔ "شہر میں یہ کام مشکل ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک سوچا تو نے۔" غالب نے کہا۔ "مجھے وہاں بھی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

خیال آیا تھا۔ غازی خاں کے کوارٹر کے پیچھے سے ٹیلی فون کی لائن گزر رہی تھی۔ اور وہاں کھمبا بھی تھا مگر پھر سب سنتے۔"

میں نے جیپ کو سڑک کے قریب سے موڑا اور کچّے راستے پر اتار لیا۔ اندھیرے میں ہیڈ لائٹس جلائے بغیر اس ناہموار راستے پر گاڑی چلانے کے لیے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنا پڑا۔ بڑے بڑے درخت تو صاف نظر آتے تھے اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں جیپ کے نیچے آ کے پس جاتی تھیں لیکن گڑھے اور پتھر دکھائی نہ دیتے تھے جھٹکوں سے میرا بُرا حال ہو گیا اور میں نے بڑی مشکل سے گاڑی کو قابو میں رکھا۔ اس کے ٹائر نئے اور بہت جاندار تھے ورنہ ایک بھی ٹائر برسٹ ہو جاتا تو جیپ الٹ جاتی۔ ابھی تک جیپ میں پچھتر فیصد لوگ لوٹے ہوئے تھے۔ پھر سو فیصد ہو جاتے۔

گاڑی کو میں نے ایک ٹیلی فون پول کے قریب روک لیا جو ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ میں روڈ تو کیا چھوٹی سڑک پر سے گزرنے والا بھی نہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور نہ جیپ کو۔ کھمبے سے جیپ اتنی دُور تھی کہ میری گفتگو دونوں ڈاکو نہیں سن سکتے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں کھمبے پر چڑھا اور اس اینگل آئرن پر بیٹھ گیا جو تاروں سے دو فٹ نیچے شاید اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ فٹ لمبا اینگل آئرن پر میری ایک ٹانگ کھمبے کے ایک طرف لٹکتی رہی اور دوسری ٹانگ دوسری طرف۔ دونوں ہاتھوں سے کام کرتے وقت میں نے ٹانگوں کو کھمبے کے گرد قینچی مار کے لپیٹ لیا۔

اس پول پر وہ کالا سا باکس نہیں تھا جس میں سے کنکشن لینا آسان ہوتا اور یہی سوچ کے میں جیپ کے ٹول باکس سے پلائر ساتھ لایا تھا۔ تار کی بیرونی تہ بہت سخت تھی۔ میں نے ماچس کی تیلی جلا کے اسے گرم کیا اور جب سیاہ پلاسٹک جلنے لگا تو پھونک مار کے بجھاتے ہی پلائر سے کاٹ دیا۔ دو تاروں کی انسولیشن ہٹا کے میں نے اپنے کپڑوں کے اندر سے ڈائریکٹ لائن والا ٹیلی فون انسٹرومنٹ نکالا اور اس کے دونوں تاروں کے کنارے لائن سے ملا دیے۔ جب ریسیور میں ٹون آئی تو مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے سر پر سے گزرنے والے چار تاروں میں سے دو صحیح تاروں کو منتخب کیا تھا۔

ریسیور آنٹی نے اُٹھا کے ہیلو کہا تو میں ان کی آواز پہچان گیا۔

"آنٹی! میں آپ کا نالائق' نامعقول' ناہنجار بھتیجا سکندر بخت ہوں مگر پلیز میرا نام مت لیجیے گا۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انھوں نے کہا: "اچھا۔"

میں نے کہا: "میں نے آج صبح بھی فون کیا تھا۔ شہلا سے بات ہوئی تھی۔ اُن سے بھی۔"

"اُن سے کن سے؟"

"بھئی وہی جو آپ کے وہ ہیں۔ ایس ایس پی صاحب"۔ میں نے ہنس کر کہا: "انھوں نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"شہلا نے بتایا تھا۔" وہ بولیں: "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"بہت بلندی پر سے۔" میں نے کہا: "زمین پر میں بہرحال نہیں ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" انھوں نے کچھ اور مطلب نکال کر خفگی سے کہا: "یہ کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے تم نے سب کو۔ اپنے آپ کو' مجھے اور اپنے انکل کو۔ وہ لاکھ ایس ایس پی سہی۔ تم کو کیا معلوم وہ تمھارے لیے... اور تمھاری وجہ سے کتنے پریشان رہتے ہیں... راتوں کو سو نہیں سکتے... اور شہلا کے لیے کیا یہ پریشانی اٹھانے کے دن ہیں... کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو شادی کرنے کی اگر وہ بیوی کو سنبھال نہیں سکتا تھا۔"

"آنٹی... آنٹی... پلیز..." میں نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ کتنی ناراض ہوں گی۔ بے شک میں نے آپ کو بہت دُکھ دیے ہیں لیکن کیا کہوں خود کو... سوائے اس کے کہ سکندر بخت بدبخت تھا۔ بدبخت ہی تو ہوتے ہیں وہ بیٹے جو ماؤں کا سکھ بھی چھین لیتے ہیں۔ ماں تو یاد نہیں۔ ایک آپ کی ذات میں ہی بے غرض محبت کا وہ روپ دیکھا تھا۔ زمانے کی طرح آپ بھی خفا ہیں مجھ سے... مجھے تو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"اب تک کس کام آئی ہیں میری دعائیں۔" انھوں نے روتے ہوئے کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ یہی بات مجھ سے انکل رضوی نے کہی تھی۔ بے چارے مجبور لوگ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ ایک طرف دنیا اور اس میں رہنے کی دشواریاں۔ دوسری طرف ہم اور ہمارے دُکھ۔

"آنٹی... آپ روئیں نہیں پلیز۔ میں کھمبے سے نیچے گر گیا تو میری بھی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ غالب تو ٹوٹی ٹانگ لیے پہلے ہی میرے ساتھ لنگڑاتا پھر رہا ہے۔ پھر کیا رہا ہے' مجھ پر سوار ہے یا جیپ پر..."

میں نے انھیں ہنسانا چاہا۔

"بک بک مت کرو۔ مجھے بتاؤ رابعہ کہاں ہے... وہ خبیث محسن بھی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔" انھوں نے کہا: "اچھا ہے تمھارے انکل گھر میں نہیں ہیں... میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔"

"آنٹی... فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"نہیں' فون ٹیپ نہیں ہو رہا ہے۔" وہ بولیں۔

"آپ کو نہیں معلوم۔ انکل نے صبح مجھے بتایا تھا کہ..."

"تم کو نہیں معلوم۔ انھوں نے تمھیں غلط بتایا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کے بولیں: "انھوں نے مجھ سے بہت پہلے کہا تھا کہ میں نے سب ہٹوا دیا ہے۔ جب سے شہلا آئی ہے یہاں۔ انھوں نے تمام انتظامات ختم کرا دیے ہیں۔ دروازے پر گارڈ بھی نہیں ہے۔ شوفر بھی نہیں رکھا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں! کیوں کیا ہے یہ سب اور شہلا سے کیا تعلق ان انتظامات کا۔"

"تم واقعی احمق ہو۔ بھئی! ان کا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم کبھی شہلا سے بات کرنا چاہو تو کر سکو۔ مجھ سے کہا تھا انھوں نے کہ کسی کا فون آئے تو شہلا سے کہنا کہ اطمینان سے بات کرے' اب کوئی نہیں سُنے گا۔ انھوں نے کسی کا نام تو نہیں لیا تھا مگر ظاہر ہے کسی سے مراد تم ہو یا محسن۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محسن اب شہلا کا شوہر بھی ہے اور شہلا یہاں کتنی مجبور ہو کے آئی ہے۔ وہ اس کو زیادہ سخت قیدِ تنہائی کی سزا سے بچانا چاہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے گارڈ بھی ہٹا دی۔"

"یعنی... اس لیے کہ محسن گھر تنے کے لیے آنا چاہے تو آسکے نہیں آنٹی... میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔

"تمھارا مطلب ہے یہ بھی ان کی چال ہے۔" آنٹی نے خفگی سے کہا: "تم اس پولیس افسر کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے جتنی اچھی طرح میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ محسن تین بار آ چکا ہے۔ بے شک وہ ان کی موجودگی میں اور ان کے سامنے نہیں آیا' اُسے آنا بھی نہیں چاہیے لیکن انھیں معلوم ہے۔"

"کیسے معلوم ہے؟" اطمینان کا احساس میرے وجود میں خوشی کی لہر بن گیا۔

"تم نے شہلا کو دیکھا ہوتا اس دن تو تم بھی بتا دیتے کہ محسن آیا تھا۔" انھوں نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا: "مگر تم مت آنا ابھی۔"

"کیتھرین اور جولیا کہاں ہیں؟" میں نے اپنی دلی مسرت کو دبا کے کہا: "مجھے بات کرنا تھی اُن سے۔"

"وہ گھر جانا چاہتی تھیں لیکن تمھارے انکل نے اجازت نہیں دی' ان کو وہی سوئٹ کوارٹر دے دیا ہے۔"

پرانی یادوں کی ایک فلم میرے ذہن میں چلنے لگی جس کا پرنٹ ابھی تک نیا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔ رابعہ کہاں ہے؟"

ان کی آواز نے مجھے تصورات کی دنیا سے واپس بُلا لیا: "یہی سوال اگر میں آپ سے کروں؟ آپ ہی کچھ بتائیے کہ وہ کہاں ہے؟"

"سکندر! خدا کے لیے ختم کرو اس خطرناک کھیل کو۔ واپس آ جاؤ۔"

"یعنی پہلے خود کو پولیس کے حوالے کر دوں؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا تمھیں' تمھارے انکل سب ٹھیک کر لیں گے۔ وہ تیار ہیں اس پر کہ ایک بار تم قانون کے دائرے میں آ جاؤ تو وہ سب کچھ کر لیں گے' وہ بھی جو انھوں نے آج تک نہیں کیا۔ انھوں نے شہلا سے کہا تھا کہ میں ان پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں اپنے سارے وسائل' سارا اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کو بچا لوں گا۔ خواہ اس کے بعد میرے لیے ملازمت بچانا مشکل ہو جائے' خواہ مجھے استعفا دینا پڑے۔"

"مجھے... بہت افسوس ہے آنٹی کہ اکیلا میں واپس نہیں آ سکتا۔ آئیں گے تو ہم سب آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"تمھیں معلوم ہے نازو کی ماں کا کیا حال ہے؟" وہ بولیں۔

"نہیں... اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ اس سے تو اور میرا دکھ بڑھے گا۔"

"اپنے دکھ تو تم نے خود بڑھائے ہیں۔ اور بڑھاتے چلے جا رہے ہو۔ جیسے محسن کی ماں مر گئی' پھر باپ مر گیا اور وہ آخری وقت میں بھی ان سے دور رہا۔ ایسے ہی نازو کی ماں بھی مر جائے گی۔" آنٹی نے کہا۔

"میرا باپ بھی ایسے ہی مر گیا تھا آنٹی۔" میں نے انھیں یاد دلایا۔ "اگر یہ نوشتۂ تقدیر ہے..."

"تقدیر کو الزام مت دو... نازو تو خیر لڑکی تھی۔ اس نے ماں باپ کو رُسوا کیا۔ وہ تمھاری ایم آر ایس کی خیالی دنیا میں رہتی تھی لیکن ماں باپ اسی دنیا میں سب کو مُنہ دکھانے پر مجبور تھے۔ کب تک چھپا سکتے تھے کہ جوان لڑکی گھر سے نکل گئی اور... دہشت پسندوں سے مل گئی۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہاں ایسا ہی مشہور کیا گیا تھا۔"

"کس نے مشہور کیا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"تم جانتے ہو پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہو۔" آنٹی نے کہا: "باپ کی جان تو دنیا کے دُکھوں سے چھوٹ گئی۔"

"کیا؟" میں نے چلّا کے کہا: "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"تمھیں نہیں معلوم... نازو کے باپ کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔" آنٹی نے کہا: "نازو نے نہیں بتایا تم کو؟ اُسے تو معلوم تھا۔"

"نہیں آنٹی!" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا: "اس نے جانتے بُوجھتے یہ بات ہم سب سے چھپائی ہوگی۔"

"اب اس کی ماں اپنے بھائی کے گھر پڑی ہوئی ہے کیونکہ بیٹی تو بیٹی اب تو بیٹے کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ نوکری چھوڑی' پھر گھر چھوڑ دیا اور بہن کے نقشِ قدم پر چل پڑا۔ اب بتاؤ کون کرے گا اس لڑکی سے شادی۔" انھوں نے بالکل زنانہ اندازِ فکر اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"غالب۔" میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا: "غالب کرے گا اس سے شادی۔"

"ہونہہ... جیسے تم نے رابعہ سے کر لی۔" آنٹی نے طنزیہ تلخ لہجے میں کہا: "اور شہلا نے کی تو اُسے کیا ملا... پہلے بھی اکیلی تھی... اب بھی بے گھر ہے۔"

"کیا آپ کا گھر اس کا گھر نہیں ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو' لڑکیوں کا گھر ان کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔" آنٹی نے کہا: "کتنا اچھا ہوتا اگر تم رابعہ سے شادی کر کے اپنا گھر بساتے۔ غالب بھی صحافی تھا اور اچھا لڑکا تھا۔ نازو کے والدین ہنسی خوشی اُسے قبول کرتے... تم سب کے گھر ہوتے... ملنا ملانا ہوتا... ہم بھی آتے۔"

"ہوگا آنٹی... سب ہوگا... ضرور ہوگا۔" میں نے انھیں تسلی دی: "اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"میں شعر و شاعری نہیں سمجھتی۔" انھوں نے چڑ کر کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ... اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور شادی کے سوا۔ پہلے ان سے نمٹ لیں... اس کے بعد کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد۔" میں نے مزید اشعار پڑھ کے انھیں چڑایا۔ "اب یہ بتائیں کہ صاحب بہادر کہاں ہیں آپ کے اور کب آئیں گے۔"

"وہ تو آ گئے ہیں۔ کمرے میں جھانک کر چلے گئے تھے۔" انھوں نے اطمینان سے کہا۔

"یا میرے مولا" میں نے گھبرا کے کہا۔ "آنٹی! وہ سب سن رہے ہوں گے۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا، مجھے بھی نہیں بتایا۔"

"وہ کچھ نہیں سن رہے ہیں، باتھ روم میں ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"مجھے ان سے ہی بات کرنا تھی، آپ تو خواہ مخواہ بیچ میں ٹپک گئیں..."

"سکندر! میں اتنے جوتے ماروں گی..."

"کب ماریں گی۔" مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "سچ بہت دن ہو گئے کسی کے پیار بھرے جوتے کھائے۔ قیمہ بھرے کریلے کھائے... آلو بھرے پراٹھے کھائے..."

"بک بک کرنے کی عادت نہیں گئی تمھاری... لو آ گئے تمھارے انکل۔"

"آپ فون دیں انھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھئی سکندر..." انکل نے کہا۔

"کیا ہوا آپ کے مشن کا؟" میں نے کہا۔ "السلام علیکم۔"

"کون سا مشن؟" وہ بولے۔ "وعلیکم السلام۔"

"وہی آرڈیننس ڈپو کا۔" میں نے کہا۔ "جس کی میں نے اطلاع دی تھی۔"

"وہ... وہ میں نے آرمی انٹیلی جنس کے سپرد کر دیا تھا۔ ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔" انھوں نے کہا۔

"آپ نے کیا کہا۔ کس کی اطلاع پر آپ کو معلوم ہوا تھا...؟"

"میں نے تحریری رپورٹ بعد میں بھیجی تھی، ابھی آفس سے ہی اُٹھ کے آ رہا ہوں۔ اس میں تمھاری ساری گفتگو لفظ بہ لفظ لکھ دی تھی۔" وہ بولے۔ "تاکہ میری ذمے داری پر کچھ نہ ہو۔ ٹیلی فون پر میری بات اسی وقت ہو گئی تھی۔ تم سے بات ہونے کے بعد... اور شام کو مجھے اُڑتی اُڑتی خبر ملی تھی کہ خاصا اسلحہ ملا ہے۔ پکڑے صرف چار آدمی گئے تھے لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔"

"یہ بات آن ریکارڈ ہے کہ ان کا پتا میں نے بتایا تھا۔"

"ظاہر ہے آن ریکارڈ ہی ہوگا۔" وہ بولے۔ "میری ساری رپورٹ میں تمھارا ہی حوالہ ہے... تمھارا کیا خیال تھا کہ کریڈٹ میں لوں گا۔"

"نہیں انکل! آپ ہی پر تو بھروسا تھا مجھے... تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "ایک بات تو بتایئے انکل۔"

"پوچھو۔"

"ہم نے اسلحے کے جس ذخیرے کی نشاندہی کی، اس کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کو داؤ پر لگانا پڑا تھا۔ اس جگہ شکنجے تھے اور سرنگیں تھیں اور ایک شکنجے میں پھنس کر غالب کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔" میں نے کہا۔ "ہم نے اپنی قانونی ذمے داری تو پوری کی لیکن ہم نے ایک بہت بڑی قومی خدمت بھی کی۔ ہمارا یہ کارنامہ جنگ کے محاذ پر دشمن کی کسی چوکی پر قبضے یا کسی مورچے کی تباہی سے کم نہیں اور ہم نے فوج میں رہ کے میدانِ کارزار میں ہمت و شجاعت کا ایسا مظاہرہ کیا ہوتا تو ہمیں ستارۂ جرأت ضرور ملتا... اب ہمیں کیا ملے گا؟"

"تم کیا توقع رکھتے ہو؟" رضوی صاحب نے تلخی سے کہا۔ "میں تم کو بہادری کا میڈل دے دوں؟ میڈل کیا میں دیتا ہوں اور اس کے علاوہ بہادری کے کسی بھی کارنامے کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں اور وہ سب ایک قاعدے ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ ستارۂ جرأت لینے والے قانون کی نظر میں مجرم نہیں ہوتے۔"

"کیا ایک مجرم... قاتل یا ڈاکو محبِ وطن نہیں ہو سکتا؟" میں نے بھی تلخی سے کہا۔ "اس کا پیشہ غلط ہے یا اس کو حالات نے مجرم بنا دیا ہے۔ تو کیا وہ وطن کے لیے کچھ کرنے کے جذبے سے بھی محروم ہو گیا ہے؟ چشم دید گواہ نہ سہی کیا یہ غلط ہے کہ ہم نے اور صرف ہم نے اس ایمونیشن ڈپو کا پتا چلایا اور آپ کو مطلع کیا...؟"

"یہ ٹھیک ہے، اس کا اعتراف میں نے اپنی رپورٹ میں کر دیا ہے۔ سنو، میرے خیال اور یقین کے مطابق سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم نام کے ایک شخص نے مجھے گمنام ٹیلی فون کیا اور یہ اطلاع دی، چونکہ میں مذکورہ شخص کی آواز پہچان سکتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اس لیے میں فوری کارروائی کی سفارش کرتا ہوں۔ حال ہی میں ہونے والے چند دھماکوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ملک دشمن عناصر تخریبی مقاصد کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہیں اور بیرونِ ملک سے بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ملک کے مشرقی بازو میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ثابت ہو چکا ہے کہ خفیہ ہاتھ اس ملک کے سیاسی حالات کو انتشار اور بدامنی پھیلانے اور علیحدگی پسند رجحانات کو ہوا دینے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور بعض غیر ملکی طاقتوں نے وطن دشمن عناصر کے گٹھ جوڑ سے تخریب کاروں کو اسلحے کی ترسیل کی ہے اگرچہ ابھی تک دشمن کے ہاتھوں [illegible] دینے اور مالی مفاد پر ملکی و قومی مفاد کو قربان کرنے والے [illegible] گرفتار کیے گئے ہیں لیکن اندیشہ ہے کہ ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے ففتھ کالم نے دشمنوں کو اڈے اور پناہ گاہیں فراہم کر رکھی ہیں اور دفاعی نقطۂ نظر سے اس ففتھ کالم کو ختم کرنا اشد ضروری ہے۔ عوام میں شامل ان لوگوں کا پتا وہی دے سکتے ہیں جن کے درمیان یہ غدار موجود ہوں۔ دریں حالات ایک گمنام ٹیلی فون کال کو نظر انداز کر دینے سے نقصان کا احتمال ہے

اور میں اپنی ذمے داری اور رسک پر فوری کارروائی کی پُرزور حمایت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم چند قانونی مقدمات میں مطلوب اور ایک مفرور مجرم ہے لیکن صرف اس بنا پر اس کی اطلاع پر کارروائی نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اگر اس کے باوجود یہ معاملہ قابلِ غور اور توجہ طلب نہیں سمجھا جاتا تو بعد میں ہونے والے نقصانات سے مجھے بری الذمہ سمجھا جائے گا اور سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم مجاز ہوگا کہ جانتے بوجھتے مجرمانہ غفلت اور نااہلی کے مرتکب افراد کے طرزِ عمل سے ہونے والے قومی نقصانات کے خلاف پریس اور پبلک میں آواز اُٹھا سکے یا ان پر بالواسطہ طور پر دشمنوں کی اور ان کے ایجنٹوں کی پشت پناہی کرنے کی فردِ جرم عائد کر سکے۔ سنا تم نے؟ یہ میری رپورٹ کا ایک حصہ ہے، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں لکھ سکتا تھا اور اگر میں یہ دھمکی نہ دیتا تو شاید تمھارا نام بھی کہیں نہ آتا... یا تو کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ گمنام کال پر ایکشن نہیں ہوتا۔ یا کریڈٹ دوسرے لے جاتے۔ وہ پہلے اپنے طور پر تصدیق کرتے اور پھر ایک رپورٹ داغ دیتے۔"

"تھینک یو انکل۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "آپ نے تو مجھے کریڈٹ دے دیا لیکن کیا اوپر والے بھی دیں گے؟"

"میں ان کے بارے میں کیا کہوں؟ اور کیسے کہوں؟" وہ بولے۔

"کیا... یہ بات اخبارات کو نہیں بتائی جا سکتی...؟"

"نو..." انھوں نے صاف کہا۔ "ابھی تو یہ ٹاپ سیکرٹ فیصلہ ہے لیکن عام معاملات میں بھی میں پیشگی اجازت کے بغیر پریس کانفرنس بلانے کا مجاز نہیں۔ سرکاری ملازمین کسی صورت بھی پریس سے رابطہ قائم کریں تو یہ ان ڈسپلن میں شمار ہوتا ہے۔"

"ہمارے خلاف ہر بات تو اخبارات میں خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا تھا..." میں نے کہا۔

"وہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔" انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ "تمھارے دشمنوں نے کیا تھا۔"

"آپ مانتے ہیں کہ میرے کچھ دشمن ہیں اور انہی کی وجہ سے میں ہر سازش کا شکار رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہی جو میرے دشمن ہیں، ملک کے بھی دشمن ہیں۔"

"سکندر! عقل سے کام لو۔ میرے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا کیونکہ میں کوئی سیاسی لیڈر یا کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہوں۔ ایک ذمے دار پوزیشن رکھنے والا سینئر پولیس آفیسر ہوں۔ میں اس لیے تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا کہ تم میرے سب سے عزیز دوست وزیر خان کے بیٹے ہو اور اس یقین پر کچھ نہیں کر سکتا کہ تم مظلوم ہو۔ قانون کا معاملہ دوسرا ہے۔ میں قانون کے معاملے میں کیوں اور کیسے نہیں کر سکتا۔ مجھے احکامات کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ میں تم کو سپورٹ نہیں کر سکتا۔ میری پوزیشن تو اس لیے اور بھی خراب ہے کہ تمھارے اور میرے ذاتی تعلق سے سب واقف ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک سب میری غیر جانبداری کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مجھ سے حسد کرنے والے بھی ہیں اور میرے بدخواہ بھی۔ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے ان کو موقع فراہم کر دیا تو وہ ضرور فائدہ اٹھائیں گے کہ ایس ایس پی رضوی اب غیر جانبدار نہیں رہا۔ اس نے مجرموں کو رعایت دی۔ مثلاً یہی دیکھو کہ شہلا کا میرے گھر میں موجود ہونا میرے خلاف جاتا ہے لیکن میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں کہ تمھارے کارناموں کی تشہیر کروں۔ میں تو تمھاری حمایت میں بول بھی نہیں سکتا۔"

"آپ سچ بھی نہیں بول سکتے؟"

"سچ بولنا اچھی بات ہے مگر سچ کو تسلیم کون کرے گا۔" وہ بولے۔ "مثلاً یہی رپورٹ کا معاملہ لو، اس میں تمھارا نام ڈالنے سے پہلے میں نے ایک افسرِ اعلیٰ سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ایک مجرم کا نام لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لکھ دو کہ ہمارے مخبروں کی مصدقہ اطلاع ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انھوں نے کہا کہ سچ کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ وہ سکندر بخت کی آواز تھی۔ ٹیلی فون پر آواز دھوکا بھی دے جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی سکندر بخت کی... آواز بنا کے دھوکا دے رہا ہو۔ یا اس کی آواز ملتی جلتی ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کہیں تو میں حلف نامہ داخل کر دوں۔ اس پر وہ ذرا نرم پڑے کہ بھئی اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ سکندر بخت کا نام ضرور لکھو مگر اس کو فائدہ کیا ہوگا۔ بہت سے ماتحت مستحق ہیں کہ انھیں ترقی ملے۔ یہ اُن کے لیے ایک اچھا موقع ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب، میں اپنی رپورٹ دے دوں گا اور اس کے بعد جو آپ کا دل چاہے وہ کیجیے۔ آج میری رپورٹ پر سخت ناگوار ردِعمل ہوا کہ یہ آپ نے کیا دھمکی دے دی ہے آخر میں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہی بحث چل رہی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا ہے کہ میں رپورٹ پر نظرِ ثانی کر لوں اور صبح پھر بات ہوگی۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ میری اور تمھاری ٹیلی فون کی گفتگو کو سند ماننے کے لیے تیار نہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ایمونیشن ڈپو کی اطلاع کا کریڈٹ ہماری اپنی کسی ایجنسی کو دیا جائے یا پھر آئی جی صاحب کے کسی منظورِ نظر کو۔"

"فرض کیجیے وہ اس بات پر اڑ گئے...؟"

"تم ہی بتاؤ تاکہ کسی ثبوت کی عدم موجودگی میں میرے پاس کیا دلیل ہے۔ میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں کہ مجھے سکندر بخت نے اطلاع دی تھی۔ اگر کل یہ کہا گیا کہ رضوی اپنے بھتیجے کے جرائم کی شدت کم کرنے کے لیے ایک سازگار ماحول بنا رہا ہے۔ اسے رعایت دلوانے کے لیے بیک گراؤنڈ بنا رہا ہے تو میں کیسے تردید کروں گا... کیا اسٹینڈ لوں گا۔"

"گویا آپ نے ابھی رپورٹ دی نہیں ہے؟" میں نے کہا۔ "او آپ کو ثبوت چاہیے... او کے انکل... رپورٹ کو صبح تک اپنے پاس رکھیے۔ صبح تک آپ کو دستاویزی ثبوت بھی مل جائے گا۔ آپ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔ آپ میرے اگلے ٹیلی فون کا انتظار کریں۔"

"دیکھو کوئی حماقت مت کرنا۔ میری اس گفتگو کا حوالہ بھی مت دینا کسی کے سامنے۔" انھوں نے کہا۔

"میں بے وقوف ضرور ہوں انکل لیکن اتنا بھی نہیں۔ آپ کی نیک نامی اور پوزیشن دونوں پر میری وجہ سے کبھی حرف نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتائیے ایس پی سراج کہاں ہے؟"

"اپنی ڈیوٹی پر۔" انکل رضوی نے کہا۔

"لیکن اُسے تو معطل کر دیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس نے براہِ راست ڈی آئی جی صاحب کو رپورٹ دی کہ میں کچھ اسمگلروں کے نرغے میں تھا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے ٹریپ ہو گیا تھا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "چنانچہ نہ کسی کو اطلاع دے سکا نہ واپس آسکا۔ ڈی آئی جی صاحب کے سامنے اس نے اپنی مہم جوئی کی کہانی بہت نمک مرچ لگا کے بیان کی ہوگی کہ وہ متاثر ہو گئے۔ اسی وقت معطلی کے احکامات واپس لے کر اسے ڈیوٹی پر جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "اچھا انکل فی الحال تو خدا حافظ۔ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

"سکندر! مجھے امید تو نہیں کہ تم میرا مشورہ مانو گے۔" وہ بولے۔ "مگر پھر بھی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس چکر سے نکل جاؤ۔ تم دلدل میں اتر گئے ہو اور گہرے دھنستے جا رہے ہو۔ تم ان سب سے نہیں نمٹ سکتے جن کو تم شکاری کہتے ہو۔ تمھارے پاس ان سے مقابلے کے لیے بہت کم قوت ہے۔ ہاں تم اب تک حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں قانون کی مدد کر سکتے ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں ہر طرح سے تمھاری مدد کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم کو زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل ہوگی۔ تمھارے خلاف کیس بہت کمزور ہیں لیکن تمھاری غیر حاضری نے ان کو سنگین بنا دیا ہے۔ تمھارے ساتھ رابعہ محسن اور ٹیڈی غالب اور دوسرے سب بھی شریکِ جرم بن گئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اکیلے ہی معرکہ آرائی کرتے رہے تو مارے جاؤ گے۔"

"اکیلے؟ ہم اکیلے کہاں ہیں انکل۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اتنے بہت سے نام لیے ہیں ابھی آپ نے۔ ان کے علاوہ کیا سارے محبِ وطن ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ آپ کی اور اَن گنت دوسرے لوگوں کی دعائیں ساتھ نہیں ہیں؟ خدا بھی تو معرکۂ حق و باطل میں ہمیشہ حق کے ساتھ ہے۔ مرنے سے کوئی بھی نہیں ڈرتا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں ہمارے لیے۔"

میں نیچے اترا اور جیپ کو واپس چلا کے سڑک تک لاتے ہوئے میں نے غالب کو وہ سب بتا دیا جو انکل رضوی نے کہا تھا اور جو میں نے ان سے کہا تھا۔ وہ حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ طلبی گفتگو کی تھی اور غالب سخت جھلایا ہوا تھا لیکن تفصیل سے میری بات سننے کے بعد وہ مطمئن اور خوش نظر آنے لگا۔

"چل یار! کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔" غالب بولا۔ "ایس ایس پی صاحب کی بدگمانی تو دور ہوئی۔"

"بدگمانی الگ چیز ہے مرزا۔" میں نے کہا۔ "قانون شکنی الگ۔ یہ میں تم کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ بدگمان نہیں رہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے ہمارے جرائم معاف کر دیے۔ ان کی تو بس وہی ایک بات ہے کہ خود کو قانون کے حوالے کر دو، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ان کا قانون سب ٹھیک کرنے والا ہوتا تو اب تک ٹھیک کر چکا ہوتا اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہی کیوں۔" غالب بولا۔ "مگر یار تو نے اتنی دیر میں بھی ادھوری بات کی۔ جو کہنا تھا وہ تو تو نے کہا ہی نہیں۔"

"ان کی بات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنا پلان بدل دوں اور پلان بدلنے سے پہلے تم سے مشورہ ضروری تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم اب سیدھے اپنے دوست کے گھر چل رہے ہیں۔"

"کس دوست کے گھر؟" غالب نے کہا۔

"عبدالودود منظر ایڈووکیٹ کے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کہیں مل کے بیٹھنا ہے اور بہت سے معاملات طے کرنا ہیں۔ مجھے وہی ایک جگہ محفوظ نظر آتی ہے۔"

دونوں ڈاکو ہوش میں تھے اور ہماری ساری گفتگو سن رہے تھے لیکن مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ انکل رضوی کی باتوں نے مجھے ایک مختلف لائحہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے جیپ لاہور کے مضافات سے گزرتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر ہم جانی پہچانی سڑکوں پر تھے اور رات کا اندھیرا ہمیں بچا رہا تھا ورنہ اب تک پولیس کی جیپ کہیں نہ کہیں روک لی گئی ہوتی۔ ہم کئی پولیس چوکیوں کے پاس سے گزرے۔ ہمیں راستے میں بہت سے پولیس والے چوک میں ڈیوٹی دیتے اور موٹر سائیکلوں پر آتے جاتے ملے مگر کسی نے جیپ پر توجہ نہیں دی۔ ایسی درجنوں جیپوں کو وہ ہر وقت دیکھتے رہتے تھے اور ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ سب کے نمبر چیک کریں۔ اتنا مستعد اور حاضر دماغ بھی کوئی نہ تھا کہ جیپ کو دیکھتے ہی شناخت کر لیتا۔ جیپ ان کے پاس سے گولی کی طرح گزر جاتی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ کم لائٹ میں پڑھی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ عبدالودود منظر کے گھر سے ایک فرلانگ دور میں نے جیپ روک لی اور غالب کو جیپ میں چھوڑ کر منظر کے گھر تک پیدل گیا۔

میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ منظر سخت مشتعل ہو کے باہر نکلا، وردی والے پولیس مین کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گیا۔

"کیا بات ہے، دروازہ توڑنا ہے؟" وہ خونخوار لہجے میں بولا۔ "عقل نہیں دی خدا نے مگر تھانیدار بنا دیا۔ یہ گھنٹی سالی کس لیے لگائی گئی ہے یہاں؟"

"گھنٹی... کدھر ہے گھنٹی۔" میں نے آواز کو تھوڑا سا بدل کے کہا۔ "یہ تو ایک بٹن ہے۔"

"اُف... ارے یار تم کس چڑیا گھر سے آئے ہو۔ اسی بٹن کو دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے۔" منظر نے چلّا کے کہا۔

"اچھا اچھا!" میں نے گھڑا سا سر ہلایا۔ "تو یہ لکھ کر لگا دو نا ادھر کہ اسے دبانے سے اندر گھنٹی بجے گی۔ ایسے کیا پتا چلتا ہے۔ بندہ بٹن دبائے اور لائٹ چلی جائے یا کرنٹ لگ جائے۔"

"اچھا دفع کرو گھنٹی کو بھی اور بٹن کو بھی... کام کیا ہے؟" منظر نے سر پکڑ کے کہا۔

"ہم... کام تو بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم بتاؤ کہ تم نے کیا کہا تھا ابھی؟ میں کس چڑیا گھر سے آیا ہوں؟ تھانے کو چڑیا گھر کہتے ہو؟ ابھی گھر سے تھانے جا کے پتا چلے گا چڑیا کے بچے۔"

منظر چونکا کیونکہ پولیس کا کوئی تھانیدار اس سے یوں بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میں نے اپنی آواز بھی رفتہ رفتہ بدل لی تھی اور آخری جملہ میری اصل آواز میں تھا۔

"ابے... ابے تو... بھوتنی کے۔" اس نے حسبِ عادت گلا پھاڑ کے کہا اور مجھ سے بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ اس عرصے میں وہ کچھ اور پھیل گیا تھا۔ خصوصاً اس کا پیٹ۔ میں اس پیٹ کی وسعت میں تقریباً دھنس گیا اور بڑی مشکل سے اسے دھکیل کر اندر پہنچا۔

"ابے تو زندہ ہے... قسم اللہ کی میں تو سب کر چکا تھا۔ سوئم چہلم وغیرہ۔" اس نے مجھے کندھے پکڑ کے زور زور سے ہلانا شروع کیا۔ "اچھا ہوا کہ برسی سے پہلے تو لوٹ آیا۔ اکیلا ہے؟"

"نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "اور بھی تین عدد ہیں..."

"تین عدد... ہاہاہا۔" وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا اور اس کی توند قہقہے سے متلاطم ہو گئی۔ "ابے کیا ڈگی پھینک دی میری گھر والی کی طرح؟ رابعہ سے شادی کب ہو گئی؟"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔" میں نے اس کے پیٹ میں مکّا ملا۔ "ایک ٹوٹی ٹانگ والا غالب ہے میرے ساتھ اور دو ڈاکو ہیں جو آج ہی کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے۔ انھیں پکڑ لیا ہم نے اور اِدھر لے آئے، تیرے گھر کی بھیڑ میں پتا نہیں چلے گا۔"

منظر کی ہنسی ایک دم بند ہو گئی۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "کیا کہا؟ دوبارہ کہنا؟ پتا نہیں میرے کان خراب ہیں یا تیرا دماغ آؤٹ ہے۔"

"دونوں ٹھیک ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا اپنی گاڑی لے کر میرے ساتھ چل، ان تینوں کو یہاں لانا ہے۔ آج رات ہم یہاں رہیں گے۔"

"او یار سکندر... ایمان سے گھر والی مجھے طلاق دے دے گی... کھڑے کھڑے نکال دے گی۔" منظر نے واویلا کیا۔ "میں بارہ بچوں کو لے کر کہاں جاؤں گا آدھی رات کے وقت۔ میرا تو میکہ بھی نہیں ہے۔"

میں اسے زبردستی گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ اپنے کرتے پاجامے میں گاڑی لے کر گیا اور جیپ کے پاس پہنچ کے جب اس نے غالب کو، اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو اور اس سے منسلک شکنجے کو دیکھا تو اس کی عقل خبط ہو گئی۔ جب میں نے دونوں ڈاکو اس کی گاڑی میں ڈالے تو منظر کی حالت دیکھنے والی تھی لیکن وہاں شور مچانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

"اب آپ جائیں۔" میں نے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"کہاں جاؤں... جہنم میں۔" منظر نے فریاد کرتے ہوئے کہا لیکن گاڑی لے کر چل پڑا۔ میں نے جیپ کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس پر جہاں جہاں بھی ہمارے فنگر پرنٹ ہو سکتے تھے، وہ جگہ میں نے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دی۔ پھر جیپ کو چلا کے دو میل دور لے گیا اور اُسے ایک خالی کوٹھی کے احاطے میں چھوڑ کے پھرتی سے باہر نکل آیا۔

کوٹھی کے باہر سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور آدھے گھنٹے بعد پھر منظر کے دروازے پر دستک دی۔ اس بار وہ سمجھ گیا کہ گھنٹی نہ بجانے والا کون ہوگا۔

غالب نے اُسے مختصراً بتا دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور ہمارے دونوں قیدی کس طرح ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ اس نے ایس ایس پی رضوی صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ چنانچہ منظر کچھ مطمئن تھا۔ اس نے غالب کو باہر ڈرائنگ روم سے ملحق اپنی اسٹڈی میں لٹا دیا تھا اور دونوں ڈاکوؤں کو بھی باندھ کر وہیں ڈال رکھا تھا، جب میں پہنچا تو وہ بدحواسی میں کمرے کے اندر چکر لگا رہا تھا۔

"یار یہ مصیبت یہاں کیوں لے آئے۔ خود کیا کم مصیبت ہو تم لوگ۔" وہ بولا۔ "کسی تھانے کے باہر پھینک آتے۔ کرنا کیا چاہتے ہو تم؟"

"پیارے دوست! ابھی سب پتا چل جائے گا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صبح ہونے سے پہلے ہی ڈاکو تو پولیس کی تحویل میں دے دیے جائیں گے لیکن یہ کام ایسے نہیں ہوگا۔"

"پھر کیسے ہوگا۔ کیا پولیس خود آئے گی یہاں؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ ہم پولیس کو بلوائیں گے کسی اور جگہ۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم ہمارا پروگرام سن لو، ہم پہلے تو یہ وردی اتاریں گے۔ اس کے نیچے ہمارے اپنے کپڑے ہیں، وہ بھی اتار دیں گے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ بھی اتار دو گے؟" ارے یار کچھ خیال کرو۔ میرا نہ سہی، میری بیوی کا... کہیں وہ اِدھر آگئی۔ یا میرے کرایہ دار بچوں میں سے کوئی آگیا تو..." وہ بولا۔ "بات تو کپڑے اتارے بغیر بھی کی جا سکتی ہے۔"

"اس کے بعد تم ہمیں کپڑے فراہم کرو گے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو گے۔ چائے ہم نہیں پئیں گے۔ ہمیں کافی چاہیے اور غالب کو ایک ڈاکٹر۔"

"ڈاکٹر تو آجائے گا لیکن اس شکنجے کا کیا ہوگا؟ وہ پوچھے گا کہ یہ پازیب کیوں پہن رکھی ہے۔" منظر بولا۔

"اپنے کسی یار دوست کو بلاؤ تاکہ وہ سوال نہ کرے اور کرے تو پھر تمہارے جواب پر اعتراض نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"بڑی مصیبت ہے، کبھی تو خیریت کا پیغام لے کر آیا کرو یار۔ یہ کیسی دوستی ہے کہ جب آتے ہو نئی آزمائش میں ڈال دیتے ہو۔" وہ بولا۔ "آخر شرفا کی طرح کیوں نہیں آسکتے تم لوگ؟"

"اس لیے کہ ہم شرفا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر سکتے ہیں، اس لیے بک بک مت کرو۔"

"اچھا، میں ابھی کہتا ہوں اپنی گھر والی کو؟" وہ بے بسی سے بولا اور اندر چلا گیا۔ منظر کی عادت مذاق میں ہر بات کو بڑھا کے کہنے کی تھی ورنہ اس کی بیوی بہت سعادت مند اور بالکل اللہ میاں کی گائے تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی اور اس کا ایک کام تو یہی تھا کہ وہ منظر کو زیادہ سے زیادہ صاحبِ اولاد کرے۔ وہ منظر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتی تھی اور اس سے قطعی سروکار نہیں رکھتی تھی کہ باہر وہ کیا کرتا ہے اور کس سے ملتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ شوہر کے سارے کلائنٹ ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔

"مرزا جی!" میں نے منظر کے جانے کے بعد کہا۔ "اس وقت نو بجنے والے ہیں۔ تمہارے اخبارات کی پوزیشن کیا ہوگی اس وقت؟"

"کیا مطلب... اشاعت کے اعتبار سے؟"

"مطلب یہ کہ ہم ایک پریس کانفرنس بلانا چاہیں .... ٹاپ سیکرٹ قسم کی اور ایک دھماکا کرنے والی اسٹوری دیں۔" میں نے کہا۔

"تو اس کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے؟"

"وقت کم ہے۔" غالب نے سوچ کے کہا۔ "کیا یہ اسلحے کے ذخیرے سے متعلق خبر دینا ہے؟"

"ہاں۔ اس کے سوا اب چارہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "تو اخبار والوں کو جانتا ہے، ان میں سے قابلِ اعتماد کون ہے؟ زیادہ نہیں دو چار بڑے بڑے اخباروں کے خاص نمائندے بلا لے۔ ہم اُن کو تفصیلات دیں گے۔ اپنی تصاویر فراہم کریں گے اور میں ایک تحریری بیان دوں گا۔ تو اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اور شکنجے کے ساتھ بطور گواہ پیش ہوگا۔ وہ اپنے ساتھ فوٹو گرافر لائیں تاکہ ہم صحیح دھماکا کر سکیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر خطرناک بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی پولیس والا آجائے یا اپنے چوہدری صاحب کو۔"

"رپورٹر چار نہ ہوں، دو ہوں مگر بھروسے کے ہوں۔ جہاں بلائیں، وہاں پہنچ جائیں۔" میں نے کہا۔ "پریس کانفرنس میں ایس پی صاحب بھی ہوں گے۔"

"انکل رضوی؟" غالب نے کہا۔ "نہیں یار، ان کی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ سمجھا یہ جائے گا کہ انھوں نے شہرت کے لیے سب ڈراما کیا ہے۔"

"ہم انھیں ہائی جیک کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ بھی ڈراما سمجھا جائے گا بلکہ کہیں گے کہ انھوں نے اپنی رپورٹ کو مستند بنانے کے لیے سکندر کے ساتھ مل کر سارا ناٹک کیا۔"

"چل، وہ نہ سہی لیکن پولیس کا ایک افسر موجود ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اسے میں لاؤں گا۔ تو اپنے رپورٹر دوستوں کو بلا لے۔ یہ خبر بہت بے حد ضروری ہے ورنہ کل تک اسلحے کے ڈپو پر چھاپا مارنے والے سارا کریڈٹ خود لے لیں گے۔ ہمارا نام تک نہیں آئے گا کہیں۔"

"اور ان ڈاکوؤں کا معاملہ...؟"

"وہ اتنا ارجنٹ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کل پر اٹھا رکھو۔ کل دوسری پریس کانفرنس میں ان کو پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ پہلے ایک کام سے تو نمٹ لیں جو زیادہ ضروری ہے۔"

فون اس میز پر رکھا ہوا تھا جس پر منظر کسی کیس کی فائلیں لے کر بیٹھا ہوا تھا پھر ہم نے اس کو ڈسٹرب کر دیا تھا اور وہ سب کچھ میز پر پھیلا ہوا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔ قانون کی موٹی موٹی کتابیں ایک طرف ڈھیر تھیں اور ٹیبل لیمپ دوسری طرف رکھا ہوا تھا۔ ٹیلی فون کے ساتھ بہت لمبا تار تھا چنانچہ میں نے اُسے اٹھایا اور غالب کی گود میں رکھ دیا۔ غالب کی ٹانگ اب سوج رہی تھی لیکن اسپرین کے اثر سے اس کے درد کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اسپرین بھی غیر موثر ہونے لگی تھی اور اب غالب کو باقاعدہ علاج، پلاسٹر اور دافع درد انجکشن کی ضرورت تھی لیکن ایک مجبوری کے تحت ہم صورتِ حالات کو جوں کا توں رکھنے پر مجبور تھے۔

غالب نے ایک نمبر ملایا۔ اس کے اپنے اخبار کے کرائم رپورٹر سے غالب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ جب غالب نے بتایا کہ وہ کون بول رہا ہے تو شاید اس نے چلانا شروع کیا۔ غالب نے اُسے روکا۔ "شور مت کرو نورِ چشم! گالیاں پھر کبھی دے لینا۔ ابھی جو میں کہہ رہا ہوں، وہ غور سے سُنو۔" غالب نے کہا۔ "اخبار کے لیے ایک بہت بڑی اور بہت سنسنی خیز خبر ہے۔ تم کسی فوٹو گرافر کو لے کر اسی وقت اخبار میں جگہ روک لو۔ نہیں یار... رک سکتی ہے جگہ۔ ہوا سی غیر اہم خبریں نکال دو، یہ ڈائنا مائیٹ ہوگا۔ یار میں کوئی گھسیا راتیں ہوں۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ خبر ڈائنا مائیٹ ہے تو ہے۔ تم کو مان لینا چاہیے۔ نہیں، ایڈیٹر سے کوئی بات مت کرو۔ پہلے تم آجاؤ یہاں۔"

"اس سے کہو قذافی اسٹیڈیم۔" میں نے کہا۔ "گیٹ نمبر ون۔"

"قذافی اسٹیڈیم آجاؤ۔" غالب نے ریسیور میں کہہ دیا۔ "دور ہے...؟"

"اچھا... اصلی ہال کے پیچھے۔" میں نے کہا۔ "رائٹرز گلڈ۔"

"رائٹرز گلڈ کی عمارت کے احاطے میں تو آسکتے ہو؟" غالب بولا۔ "اس سے قریب کون سی جگہ ہوگی... اور دیکھو... اپنے ساتھ کسی دوسرے اخبار والے کو بھی لا سکتے ہو۔ کسی دوسرے کرائم رپورٹر کو۔ نہیں یار، تمہاری ہی اسٹوری ہوگی۔ شیئر کر لینا... نہیں؟... اچھا چھوڑو، تم آجاؤ... ابھی نہیں، بس کوئی ایک گھنٹے میں... اچھا آدھے گھنٹے میں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ایک رپورٹر کبھی دوسرے کو ساتھ نہیں لائے گا۔ سب کسی بڑی اسٹوری کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں۔" غالب نے دوسرا نمبر ملایا اور پھر وہی بات کی۔ چند منٹ کی بحث کے بعد وہ دوسرے کرائم رپورٹر کو بھی قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تین جگہ بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔

منظر ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان لے آیا تھا۔ اس نے بھی غالب کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ "یہ تو کوئی لمبا ڈراما ہے۔" وہ بولا۔ "ڈاکٹر کا کیا بنا، منگوایا کہ نہیں۔" میں نے کھانے پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ غالب مجھ سے پہلے کھانا شروع کر چکا تھا۔ کھانے سے زیادہ اس وقت کافی کی طلب تھی جو ہم نے مدت سے نہیں پی تھی۔

"ڈاکٹر آتا ہوگا۔" منظر بولا۔ "مگر ایک ڈاکٹر سے کیا بنے گا۔ یہ تو اچھا خاصا ہڈیوں کا وارڈ بنے گا۔ تین مریض ٹوٹے پڑے ہیں۔"

"تم نے کسی کو فون تو کیا نہیں؟" میں نے کہا۔

"وائرلیس پر بات کی تھی۔" منظر بولا۔ "وہ دراصل میرے پڑوس میں جو نئے لوگ آئے ہیں نا... اُن میں ایک لڑکا ڈاکٹر ہے۔ اسے میں نے چھت پر سے آواز دی تھی۔ ابھی ابھی اسپتال سے پہنچا تھا۔"

"نئے لوگ ہیں۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اندر مت کرا دینا۔"

"کراؤں گا... مگر بعد میں اور خود کراؤں گا۔" منظر نے کہا۔ "یہ ہر وقت بے وقت نازل ہونے کا چکر بُرا ہے۔ پھر میں خود ملنے آجایا کروں گا تم لوگوں سے جیل میں۔"

گھنٹی بجی اور منظر چند منٹ میں ایک ہم جیسے نوجوان کو لے کر آگیا۔ میڈیکل بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اندر آتے ہی وہ ٹھٹکا۔

"آؤ... آؤ... ڈرو نہیں... یہی ہیں میرے مہمان بلائے جان۔" منظر نے کہا۔ "تقریباً میرے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ اسکول کالج میں میرے پیچھے لگے رہے ایک کلاس پیچھے۔ کبھی میں تو کبھی یہ۔ یہ ہیں سکندر بخت عرف سکندرِ اعظم ثانی۔ بلکہ لاثانی۔"

اس نے اصل نام بتایا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ ہمارے کچھ بھی نام بتا سکتا تھا۔ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔

"یہ ڈاکٹر شہریار ہیں... لندن پلٹ ... ایک خصوصیت تو تم دونوں میں مشترک ہے۔" منظر نے کہا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا۔

"یہ ہیں مرزا غالب، ثانی بلکہ لاثانی۔ یہاں جو بھی ہے، ثانی ہوتے کے باوجود لاثانی ہے۔" منظر بولا۔ "اصل ان کے آگے ماند ہے۔ یہ اپنے کارناموں کے آگے سکندرِ اعظم کی فتوحات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہ دوسرے اسد اللہ خاں غالب کو اپنا چربہ قرار دیتے ہیں۔"

غالب نے میری طرف معنی خیز سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ "آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بیٹھ کر کہا۔ "آپ نے تو یہ کہا تھا منظر بھائی کہ پچھتر فیصد مہمان ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔"

"ہاں... دو وہ اُدھر پڑے ہیں۔" منظر نے کہا اور تب ڈاکٹر نے دوسری جانب بندھے پڑے ہوئے دونوں کو دیکھا۔ "یہ دونوں ڈاکو ہیں۔ کوٹ لکھپت جیل سے فرار ہوئے تھے کہ ہمارے ان دوستوں نے گھیر لیا اور یہاں لے آئے۔ بس ثابت نہ لا سکے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ منظر ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو سب سچ بتاتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ہم جیسا تندرست و توانا شخص تھا، دلکش اور وجیہہ شخصیت کا مالک، وہ خوش لباس و خوش اخلاق تھا مگر ہم اُسے نہیں جانتے تھے اور منظر نے بھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ وہ نئے پڑوسی ہیں۔ اس پر منظر کا یہ اعتماد ہمارے نقطۂ نظر سے خطرناک ہو سکتا تھا۔ وکیلوں کی طرح ڈاکٹر بھی اپنے پیشے کی اخلاقیات پر عموماً سختی سے کاربند رہتے ہیں اور کوئی غیر قانونی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

"یہ... کیسے ہوا... میرا مطلب ہے کیا آپ شکاری ہیں؟" ڈاکٹر نے غالب کے شکنجے کو چھو کر دیکھا۔

"جی... یہی سمجھ لیں۔" غالب بولا۔ "اتفاق سے وہاں چلے گئے تھے جہاں ہم سے بڑے شکاری موجود تھے۔"

"یہ فرسٹ ایڈ کس نے فراہم کی ہے؟" وہ بولا۔

"میں نے... اس کے علاوہ میں اسپرین دیتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور چار چار گھنٹے سے یہ اینٹی بایوٹک۔" میں نے باقی ماندہ گولیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے میرا کام آدھا کر دیا۔" شہریار نے کہا۔ "اب مجھے صرف ہڈی جوڑنا ہے یہ لکڑیاں نہ باندھی گئی ہوتیں تو ذرا سے جوڑ خراب ہو جاتا اور... تکلیف بھی بہت زیادہ ہوتی۔ پیچک ہونے کا بھی ڈر نہیں رہا۔ لیکن... منظر بھائی! جب تک یہ شکنجہ نہیں ہٹے گا۔ میں پلاسٹر کیسے..."

"ابھی آپ میری ٹانگ کو اسی طرح رہنے دیں۔" غالب نے کہا۔ "اگر درد کم کرنے کے لیے کوئی زیادہ مؤثر دوا دے سکتے ہوں تو دے دیں..."

ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے غالب کو دیکھا۔ "ایسے اچھا لگت ہے آپ کو؟"

غالب مسکرایا۔ "مجھے اپنی یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کہیں پیش کرنا ہے اس شکنجے سمیت۔ دو تین گھنٹے کے بعد میں آپ کو زحمت دوں گا، فی الحال آپ ان دونوں کو دیکھ لیں۔"

"ان کو کیا ہوا ہے؟" شہریار نے آگے بڑھ کے کہا۔

"ایک کا دایاں بازو اور بائیں کلائی ٹوٹی ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسرے کی غالباً دو پسلیاں۔ ان پر اگر پلاسٹر چڑھانا ممکن ہو تو یہ کام کرلیں اور ہاں... انھیں کسی قسم کی دوا وغیرہ بھی نہیں دی گئی ہے۔"

"یہ تو بے ہوش ہیں۔ غالباً سخت تکلیف ہوگی ان کو۔" وہ بولا۔

"آپ اب جیسا مناسب سمجھیں کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان کو کل پولیس کے حوالے کریں گے۔ کل تک ان کو زندہ رکھیں۔"

"یہ زندہ رہیں گے۔" شہریار نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے ان کے ہاتھ پیر کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی دونوں ہیں نا، پاٹے خان اور گورا ڈاکو؟"

"جی، لیکن آپ کسی سے تذکرہ نہیں کریں گے...!"

"منظر بھائی نے مجھے بتا دیا ہے کہ میں جو کچھ دیکھوں گا یا سنوں گا اسے اپنی ذات تک محدود رکھوں گا۔" شہریار مسکرایا۔ "آپ لوگ بالکل مطمئن رہیں۔ اگر میں اعتماد کے قابل نہ ہوتا تو منظر بھائی مجھے نہ بلاتے اور میں خود بھی نہ آتا۔ کہہ دیتا کہ یہ میڈیکو لیگل کیس ہیں۔ میو اسپتال لے جاؤ۔" وہ جھک کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں پیروں کو احتیاط سے ہلا کے دیکھنے لگا۔

"ویسے تو ایکسرے کے بغیر مجھے پلاسٹر نہیں چڑھانا چاہیے اور بعد میں بھی ایکسرے لینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ سمپل فریکچر ہیں۔ امید ہے جوڑ ٹھیک بیٹھ جائے گا۔ پہلے میں ان کو مارفین دے دیتا ہوں۔"

"آپ ان کو کل تک سیڈیشن میں رکھیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ شور نہ مچائیں اور آؤٹ آف کنٹرول نہ ہوں۔"

"کل تک تو لازماً انھیں بے ہوش رکھنا ہوگا۔" وہ بولا۔ "اچھا پہلے میں آپ کو ایک انجکشن لگا دوں۔ اس سے درد کا احساس مٹ جائے گا۔ کم سے کم چھ گھنٹے کے لیے... مگر اس کے بعد..."

"چھ گھنٹے بعد میں خود کو آپ کے حوالے کر دوں گا۔" غالب نے کہا۔

میں نے منظر کو اشارہ کیا۔ "مجھے تیری گاڑی کی چابی چاہیے۔" میں نے منظر کے ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد کہا۔ "اور چند کیلیں... ایک ایک انچ لمبی ہوں کم سے کم۔"

"گاڑی تو خیر لے جاؤ... مگر نور چشم یہ کیلوں کا کیا چکر ہے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی اندر مت کرا دینا۔ پھر انا للہ... ابھی تو ہونا چاہیے۔"

ایک بار پھر میں نے غالب کو شکنجے سمیت اٹھایا اور منظر کی گاڑی میں منتقل کیا۔ کار کو وہاں تک لے گیا جہاں خالی کوٹھی کے ویران احاطے میں جیپ ابھی تک موجود تھی۔ غالب کو جیپ میں منتقل کرنے کے بعد کار کو سڑک کے کنارے ہی چھوڑا اور جیپ کو دوڑاتا ہوا اس سڑک تک لے گیا جو نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ بانسوں والی سڑک کے موڑ پر میں نے جیپ کو انکل رضوی کی کوٹھی سے کچھ دور روکا۔ نیچے اتر کے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے وہ کھمبا نظر آگیا جس میں سے ایک تار انکل رضوی کی کوٹھی تک جا رہا تھا۔ سڑک ویران تھی اور ٹیلی فون کا کھمبا ایک گھنے درخت کے پیچھے آگیا تھا چنانچہ میں کسی حد تک محفوظ تھا۔ مجھے صرف ایک طرف سے آنے والے ٹریفک کی روشنی میں دیکھا جا سکتا تھا لیکن یہ وقت ٹریفک کے دوسری طرف سے آنے کا تھا اور ویسے بھی اس سڑک پر سے گزرنے والی اکا دکا گاڑی کے کس ڈرائیور کو اتنی فرصت تھی کہ وہ کسی کو ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھا دیکھے تو گاڑی روک کر وجہ پوچھے عموماً ڈرائیور کی نظر اپنے سامنے سڑک پر ہیڈ لائٹ کی روشنی تک محدود رہتی ہے۔ جہاں جیپ کھڑی ہوئی تھی وہاں سے انکل رضوی کی کوٹھی کا گیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ کسی آتے جاتے سے ہمیں کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ پولیس کی جیپ کو کھڑا دیکھ کر رکتا لیکن اتفاق سے کوئی پولیس مین بھی گزرتا تو یہی سمجھتا کہ ایس پی صاحب کی اپنی جیپ ہے۔ خطرہ صرف اس صورت میں تھا کہ خود انکل رضوی کہیں باہر سے آئیں یا باہر جانے کے لیے نکلیں تو گاڑی کو دیکھ لیں لیکن یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہ تھا۔ میں نے غالب کو حوصلے سے کام لینے کی تلقین کی اور ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا کھمبے پر رہنا ضروری نہیں۔ تار درخت کے بیچ میں سے گزر رہے تھے چنانچہ میں نے ایک شاخ پر بسیرا کیا اور ہینڈ سیٹ سے کنکشن ملایا۔ ریسیور انکل کے کسی ملازم نے اٹھایا اور کچھ دیر بعد انکل کی آواز آئی۔ "رضوی..."

"انکل! میں نے کہا تھا نا کہ میں پھر رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کیا آپ اسی وقت قذافی اسٹیڈیم آسکتے ہیں؟"

"قذافی اسٹیڈیم...؟ وہاں کیا ہے؟" وہ حیران ہو کے بولے۔

"آپ اکیلے آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا۔

"میں خود کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں نے چند اخباری نمائندوں کو بھی بلایا ہے آپ سمجھ لیں کہ یہ ایک بجی پریس کانفرنس ہوگی۔ میں اپنا بیان دوں گا۔ ظاہر ہے جو کچھ میں کہوں گا اس کی ذمے داری آپ پر نہیں۔ میں ایک تحریری بیان بھی پریس کے حوالے کروں گا جس میں اس امونیشن ڈپو کے بارے میں وہ سب ہوگا جو میں جانتا ہوں یا غالب جانتا ہے۔ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو آپ بھی نہیں جانتے۔ میرا تحریری بیان میری اور غالب کی تصویر کے ساتھ صبح کے اخبارات میں شائع ہوگا۔ اس کا سو فیصد کریڈٹ ہم کو ملے گا اور میری گرفتاری کا سو فیصد کریڈٹ آپ کو۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ پریس کانفرنس وغیرہ..."

"جو کام آپ نہیں کر سکتے تھے وہ ہم آپ کی طرف سے کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور جو کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آپ کریں گے... اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو آپ اکیلے آئیں گے۔"

"آل رائٹ... میں آؤں گا۔" انھوں نے کہا۔ "مگر قذافی اسٹیڈیم بہت بڑا ہے... تم کہاں ملو گے؟"

"گیٹ نمبر ون پر۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

حسب توقع انکل رضوی نے فوراً کوئی نمبر ملانا شروع کیا۔ نمبر پولیس اسٹیشن کا تھا اور دوسری طرف سے ایس ایچ او نے بات کی۔

"ایس ایس پی صاحب، حکم جناب عالی۔" میں نے ایس ایچ او کی آواز سنی۔

"دیکھو بھئی... ایک گرفتاری کرنا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "ایک مجرم ہے سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم۔"

"یس سر... میں جانتا ہوں۔"

"اس نے مجھے فون کیا تھا کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "تمہارے پاس کتنی نفری ہے اس وقت؟"

"جی سر... آپ حکم کریں... سب ملا کے تین افسر ہیں... اور پانچ بندے..." ایس ایچ او بولا۔

"اچھا تو ایسا کرو کہ تم ایک افسر کو تھانے میں چھوڑ دو... اور اس کے ساتھ دو ماتحت رہنے دو۔" انکل نے کہا۔ "تم باقی لوگوں کے ساتھ فوراً قذافی اسٹیڈیم پہنچو... گیٹ نمبر ایک پر پوزیشن لو لیکن ذرا چھپ کے اور میرا انتظار کرو۔ میں بھی پہنچتا ہوں۔ سب کے پاس اسلحہ ہونا چاہیے۔"

"کیا میں آپ کو لینے آجاؤں سر؟" ایس ایچ او نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں... تم ڈائریکٹ پہنچو۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اور دیکھو کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم کس کام سے جا رہے ہو۔"

"آپ بالکل فکر ہی نہ کریں سر۔" ایس ایچ او نے کہا اور لائن کٹ گئی۔

مجھے انکل رضوی کی وعدہ خلافی پر افسوس ہوا۔ غالباً ان کے حوصلہ افزا رویے نے مجھے ان سے غلط امیدیں وابستہ کرنے پر مجبور کیا تھا ورنہ وہ ایس ایس پی پہلے تھے اور کسی کے انکل بعد میں... خصوصاً ایک مجرم کے... میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی تیار ہو کے پانچ منٹ میں بھی باہر آسکتے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک منٹ کے وقفے سے پھر ان کا نمبر ملایا۔ حسن اتفاق سے ریسیور خود شہلا نے اٹھایا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ نروس ہوگئی۔

"آپ نے انکل سے بات کی تھی؟" وہ بولی۔

"ہاں، ایک بار نہیں دو بار۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت تم کو ایک ضروری پیغام دینا تھا۔ کیا محسن تم سے ملنے آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"تم کو معلوم ہے کہ وہ آئے گا۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "جب وہ آئے تو اسے بتا دینا کہ ہم منظر کے گھر میں ہیں... خدا حافظ۔"

نیچے اترتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جیپ کو بالکل گیٹ تک لے گیا۔ رضوی صاحب نے واقعی دروازے پر سے گارڈ ہٹا دی تھی اور اندر ان کی جیپ کے پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائیو وے کے پیچھے مجھے سرونٹ کوارٹر کی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے کیتھرین اور جولی کا تصور کیا اور سوچا کہ آخر وہ یہاں کیوں رکی ہوئی ہیں؟ ان کا اپنا گھر ہے لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں بھی پولیس ان کی کب تک حفاظت کر سکتی ہے اور حفاظت سے پہلے پولیس نے کیتھرین سے تفتیش کی ہوگی۔ پوچھا ہوگا کہ وہ کہاں تھی اور کس کے ساتھ تھی؟ اس نے کچھ تو بتایا ہی ہوگا۔ غالباً انکل رضوی نے اسے مزید تفتیش کے لیے روک رکھا ہے۔

میں دیوار کے سائے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک گیا پھر میں نے جیب سے ماچس نکالی اور اس میں ایک کیل یوں گھونپ دی کہ وہ دوسری طرف نکل آئی۔ اسے میں نے جیپ کے اگلے ٹائر کے نیچے پھنسا کے یوں رکھا کہ کیل کا نوکیلا سرا اوپر کی جانب رہا۔ دوسری ماچس میں نے غالب سے لی تھی۔ اس میں دوسری کیل اسی طرح کھڑی کر کے میں نے دوسرے اگلے پہیے کے بالکل نیچے فٹ کی اور دوڑ کر باہر آگیا۔ اب ایک ماچس کے سلپ ہونے کے باوجود دوسری کیل سے ٹائر کا فلیٹ ہو جانا یقینی تھا ورنہ دونوں ٹائر بھی پنکچر ہو سکتے تھے مگر روانہ ہوتے وقت جیپ کی کم رفتار کے باعث یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ٹائر برسٹ ہوئے تو جیپ الٹ جائے گی میرے اندازے کے مطابق انکل رضوی کو اپنی کوٹھی سے باہر آکے سو گز دور جانے سے پہلے معلوم ہو جائے گا کہ ٹائر فلیٹ ہو گئے ہیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دونوں ماچسوں کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ ان کا چُورا منتشر ہو جائے گا مگر کیلیں ٹائروں میں پھنسی رہ جائیں گی۔ فوری طور پر انکل رضوی کو خیال بھی نہیں آئے گا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔

تقریباً سات منٹ بعد انکل رضوی کی آواز آئی۔ "کام ہے ایک۔"

"ابھی تو آئے تھے آپ۔" یہ آنٹی کی آواز تھی۔

"ارے بابا! یہ بڑی مشکل نوکری ہے۔ تم کہتی ہو بیوی کو شوہر کا غلام بے چارے شوہروں کو دیکھو کس کس کے غلام ہیں۔ پبلک کے۔ افسران کے اور یہاں تک کہ ماتحتوں کے۔" وہ ہنسنے لگے۔ "کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارا بھی بس ایک شوہر ہوتا اور اسے خوش رکھ کے فرضے داری ختم۔ ایک گھر ہوتا اسے سنبھال کے کام ختم۔"

"بہت آسان سمجھتے ہیں نا... کسی دن کر کے دیکھیں۔"

"ایک دن اس شہر کو سنبھال کے دیکھو۔" وہ بولے اور جیپ اسٹارٹ کی۔ "ایک تھانے کو سنبھال کے دیکھو۔ پھر پتا چلے گا، نیچے اوپر سب چور اُچکے بیٹھے ہیں۔"

"اچھا کب تک آئیں گے...؟" آنٹی نے کہا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ یہ سوال مت پوچھا کرو۔ کوئی فلم کا شو تو دیکھنے جا نہیں رہا ہوں کہ بتا دوں... کہ فلم اتنے بجے ختم ہو گی اور اتنے بجے تک میں آ جاؤں گا... آ جاؤں گا کام ختم ہوتے ہی۔ ویسے تم یہ یاد رکھا کرو کہ کسی بھی سپاہی یا پولیس مین کا گھر سے نکلنے کے بعد واپس آنا سو فیصد یقینی نہیں ہوتا۔"

"مت کریں ایسی باتیں۔ میں عاجز آ گئی ہوں...!"

"تم کو عادی ہو جانا چاہیے۔ اسی لیے میں ایسی باتیں کرتا ہوں۔ جاؤ سو جاؤ، خدا حافظ۔" انکل نے کہا۔

ان کی جیپ باہر نکلی اور ہیڈ لائٹس انھوں نے سڑک پر آ کے جلائیں۔ جیپ کا رُخ ادھر ہی تھا جدھر ہماری جیپ کا چنانچہ انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا۔ حسبِ توقع ان کی جیپ مشکل سے پچاس گز جا کے رک گئی۔ اسی وقت میں نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور ایک دم آگے بڑھا دی۔ انکل رضوی ابھی ٹائروں کو دیکھنے کے لیے اترے ہی تھے کہ میں نے بریک لگائے اور جمپ مار کے جیپ سے اتر گیا۔ انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"السلام علیکم انکل! کیا ہوا... دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "چلیے کوئی بات نہیں۔ گاڑی حاضر ہے۔"

"تم..." انکل رضوی نے سیدھا کھڑا ہو کے کہا۔ "تو یہ تمھاری حرکت ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "تاہم آپ کو زحمت نہیں ہو گی۔"

"مقصد کیا ہے اس حرکت کا؟" انھوں نے متانت سے کہا اور اپنا ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ ریوالور غالباً جیب میں تھا۔

میں نے سوچا کہ آپ کہاں تلاش کرتے پھریں گے ہمیں۔ کیوں نہ ہم خود آپ کو لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"اور اگر میں جانے سے انکار کر دوں؟" انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے خوفی سے کہا۔

"مجھے امید ہے آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے ایس ایچ او کو تو ذرا فی اسٹیڈیم جانے دیں... لوٹ آئے گا جھک مار کے۔"

"آئی سی! گویا تم نے میرا فون ٹیپ کیا تھا۔" وہ بولے۔ "ویری گڈ... مجرم اب پولیس افسروں کے فون سنتے ہیں۔ کیا دیدہ دلیری ہے۔"

"وقت کم ہے انکل۔" میں نے کہا۔ "اخباری نمائندے پہنچ گئے ہوں گے۔"

"شٹ اپ۔ میں تمھارے ساتھ جانے سے انکار کرتا ہوں۔" رضوی صاحب نے کہا۔

"آپ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہے ہیں۔" میں نے کہا اور ریوالور نکال لیا۔

"مجھے تمھاری سعادت مندی سے یہی امید تھی۔" انکل نے طنز سے کہا۔ "انکل بھی کہتے ہو مجھے اور..."

"میں تو کہتا ہوں۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ کب خود کو انکل سمجھتے ہیں۔ آپ تو صرف ایس ایس پی ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی اپنا بھتیجا نہیں سمجھا، ہمیشہ ملزم سکندر بخت ولد وزیر خان مرحوم کہا۔ میں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ اکیلے آئیں۔ آپ نے وعدہ کیا اور میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ میں مانتا ہوں کہ آپ بہت ہوشیار شکاری ہیں لیکن اناڑی ہم بھی نہیں رہے ایس ایس پی صاحب کہ آپ کے فریب میں آ جاتے۔ میں آپ کو ہر قیمت پر لے جاؤں گا۔"

"تم پر اغوا کا ایک اور کیس بن جائے گا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اور ایک سینئر پولیس افسر کے اغوا کو معمولی واردات نہیں سمجھا جائے گا۔"

"مجھے پروا نہیں... جہاں سیر وہاں سوا سیر۔" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا کام تو کرنا ہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میں پریس کے نمائندوں کے سامنے گرفتاری دوں گا۔"

"اور کیا تم واقعی گرفتاری دینا چاہتے تھے؟" انھوں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے تھے۔"

"آپ کا خیال درست ہے، مجھے آپ کی موجودگی میں پریس کے سامنے ایک بیان دینا تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کی گواہی کی ضرورت تھی مجھے لیکن آپ نے مجھے پریس سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہی اپنی مسلح نفری کی مدد سے گرفتار کرنا چاہا...!"

"میں نے وہی کیا جو میرے نزدیک جائز اور درست تھا۔"

"میں بھی وہی کر رہا ہوں جو میرے نزدیک جائز اور درست ہے۔ جائز اور درست کا مطلب آپ کے نزدیک کچھ اور ہے میرے نزدیک کچھ اور... اور شاید ہر شخص الفاظ کا مفہوم اپنے حالات کے

اندر کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "آج میرے لیے چوہدری دلاور بھی اتنا ہی خطرناک شکاری ہے جتنے آپ ہیں۔ قانون کے محافظ اور قانون شکن دونوں شکاری ہیں جو ہمارے تعاقب میں ہیں لیکن ہم نے اس شکارگاہ میں جینا سیکھ لیا ہے اور اب ہم آسان شکار نہیں رہے۔ کیا آپ زحمت کریں گے؟ وقت کم ہے۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

انکل رضوی اپنی جگہ پر منجمد کھڑے کچھ سوچتے رہے۔

"انکل! میں آپ پر ہاتھ اُٹھانا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "فرض اور محبت کی جنگ میں کوئی مشکل مقام آیا تو آپ نے فرض کو ترجیح دی اور کبھی نہیں پچھتائے۔ مجھے آزمائش میں مت ڈالیں کہ میں نے آپ کی عمر کا، رشتے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔"

انکل رضوی نے سر ہلایا اور جیپ کی طرف بڑھے۔ اس جنرل کی طرح باوقار انداز میں جو اپنے حریف جنرل کے ساتھ جنگی قیدی بن کے جا رہا ہو۔ جنگ میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے مگر ایک جنرل ہار کے بھی جنرل رہتا ہے۔ وہ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے ذرا سی دیر کے لیے رُکے اور انھوں نے جیپ کا نمبر غور سے دیکھا۔

"السلام علیکم انکل رضوی۔" غالب نے پچھلی سیٹ پر سے کہا۔

وہ چونکے۔ "وعلیکم السلام... گویا آپ بھی ہیں۔" وہ بولے اور جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "یہ جیپ کہاں سے ملی؟"

"یہ دوسری اسٹوری ہے۔" میں نے ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور جیپ کو اسٹارٹ کیا۔ میری گھڑی کے مطابق ہم کچھ لیٹ ہی ہو گئے تھے۔ اخباری نمائندوں سے پہلے ہمارا پہنچنا ضروری تھا لیکن آدھے گھنٹے کا وقت بہت کم تھا۔ میں نے جیپ کو ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑایا۔ سڑکیں اس وقت خالی تھیں اور مجھے بانسوں والی سڑک عبور کر کے مال تک جانے اور چیئرنگ کراس سے گھوم کر سیدھے ہاتھ پر اسمبلی بلڈنگ کے پیچھے پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگے۔ رائٹرز گلڈ کے دفتر کی پرانی عمارت بالکل سنسان پڑی تھی۔ برآمدے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا اور ایک شخص سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے ملباٹی کے رُخ ٹہلنگ کر رہا تھا۔ اس کا حلیہ اتنا ہی مضحکہ خیز تھا جتنا کہ پبلک ایک روایتی صحافی کا سمجھتی ہے۔ جیپ کو گیٹ سے اندر آتا دیکھ کے وہ رکا اور آگے آیا۔ جیپ کے قریب آ کے اس نے پہلے رضوی صاحب سے اور پھر غالب سے ہاتھ ملایا۔

"کتنی دیر ہوئی تم کو پہنچے ہوئے؟" غالب نے کہا۔

"میں ٹھیک وقت پر آ گیا تھا۔ تم دس منٹ لیٹ ہو۔" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "اتنا کام کارش تھا مگر سب ایسے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"یہاں کوئی اور تو نہیں ہے؟" میں نے جیپ سے اتر کے کہا۔

"ایک چوکیدار تھا۔ میں نے بہت کہا لیکن وہ کوئی کمرا کھولنے پر راضی نہیں ہوا۔" وہ بولا۔ "حالانکہ وہ مجھے جانتا ہے۔ خیر، میں نے پچھلی طرف چار پانچ کرسیاں ڈلوا دی ہیں۔"

"اور چوکیدار کہاں ہے؟" غالب نے کہا۔

"اسے میں نے کہا تھا کہ چائے کا بندوبست رکھنا، پریس کانفرنس ہے..."

میں غالب کو اُٹھا کے پیچھے کی طرف والے برآمدے میں لے گیا اور ایک کرسی پر یوں بٹھا دیا کہ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ دوسری کرسی پر شکنجے کے ساتھ رکھی رہی۔ غالب کے دوست نے اس کا بغور معائنہ کیا اور اپنے فوٹوگرافر کو کوسنے لگا۔ وہ اسی اخبار کا کرائم رپورٹر تھا جس میں غالب تھا چنانچہ دوسرے کرائم رپورٹر کے آنے تک وہ دوستانہ فضا میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ ایک کرسی پر انکل رضوی بیٹھے رہے اور ایک پر میں بیٹھا رہا۔ اس طرح پانچ کرسیاں بھر گئیں۔ اگلے دس منٹ میں پانچ افراد پہنچے۔ ہر اخبار کا ایک رپورٹر اور ایک فوٹوگرافر۔ وہ سب پیچھے بیٹھے۔ ان سب نے غالب سے شکوہ کیا کہ باقی لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے اور غالب نے وعدہ خلافی کی ہے لیکن غالب ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے سب کو خاموش کر دیا اور مطمئن بھی کہ یہ حالات کا تقاضا تھا۔

"ایسے رہنے دو حالات کے بچے۔" مرزا غالب کے اخبار سے آنے والے صحافی دوست نے سب سے زیادہ برہمی کا مظاہرہ کیا۔ "ہم تو جانتے ہیں تیرے ضمیر کو۔ میں تو چاہتا تھا کہ یہ میری 'ایکسکلیو سو' اسٹوری ہوتی۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔" دوسرے رپورٹر نے کہا۔

"کون نہیں چاہتا تھا یہ۔" تیسرے نے تائید کی۔

"مگر حق میرا زیادہ تھا...!"

"چُپ بے حق کے بچے۔" غالب نے کہا۔ "یہ کیا، اس سے بڑی بڑی خبریں جب ایجنسی سے ملتی ہیں تو سب کو ملتی ہیں۔ پریس ریلیز سب کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی خبر ہے۔"

غالب کا وہ دوست منہ پھُلا کے بیٹھ گیا۔ میں نے پریس کانفرنس کے آغاز میں کہا۔ "مجھے ایک بیان دینا ہے۔"

ان سب نے اپنے ٹیپ ریکارڈر آن کر لیے جو وہ ہر پریس کانفرنس میں ساتھ لیے پھرتے تھے۔ میں نے بہت سوچ سوچ کے ہر لفظ کہا۔ یہ بتایا کہ بہت عرصے سے کچھ لوگ یہاں سے مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں۔ اس میں وہ کاروباری افراد بھی شامل ہیں جن کا ضمیر صرف پیسہ ہے اور غیر ملکی ایجنٹ بھی۔ کسی کا نام لیے بغیر میں نے کہا کہ ہم نے کچھ افراد کا پتا چلایا ہے لیکن ہمارے پاس اُن کے خلاف کوئی ایسا ثبوت نہیں جس کی بنیاد پر ہم انھیں قوم کے سامنے بطور مجرم پیش کر سکیں لیکن ہم بہت جلد ثبوت، شہادت اور

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

گواہ سب حاصل کر لیں گے۔ اس کے بعد میں نے اسلحے کے متعدد ذخائر کی تباہی کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ میں نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے تباہ کیے تھے۔ ان میں سے چند نے بے صبری کا ثبوت دیتے ہوئے درمیان میں سوال کیے مگر انھیں میں نے خاموش کر دیا کہ ابھی میرا بیان مکمل نہیں ہوا۔ اپنی کارگزاری کی مفصل روداد پیش کرنے کے بعد میں نے تازہ ترین صورتِ حال سے انھیں آگاہ کیا اور بتایا کہ کس طرح میں نے ٹیلی فون پر ایس ایس پی صاحب کو ایک اسلحے کے ذخیرے کی نشاندہی کی تھی، مگر انھوں نے ایک گمنام کال پر ایکشن سے انکار کر دیا۔ مجبوراً مجھے اخباری نمائندوں کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں خود پولیس کے سامنے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہم کس طرح سنگرالی کے جنگلوں تک پہنچے اور وہاں ملک دشمنوں کے اس اڈے تک جانا کتنا دشوار ثابت ہوا۔ اس مہم میں غالب کی ٹانگ ایک شکنجے میں پھنسی اور ٹوٹ گئی۔ وہاں بارودی سرنگیں بھی تھیں لیکن خدا نے ہمیں محفوظ رکھا۔ میں نے خندق کا اور آس پاس کی دوسری رکاوٹوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کوئی تفصیل باقی نہ رہی۔

میرا بیان ختم ہوتے ہی وہ سب پھٹ پڑے لیکن میں نے ان سے کہا کہ وہ باری باری سوال کریں چونکہ میں ان سب کے نام نہیں جانتا تھا اس لیے یہ ساری گفتگو نام کے حوالے کے بغیر ہے جو رضوی صاحب سے ہوئی۔

سوال:۔ ایس ایس پی صاحب، کیا آپ نے ملزم سکندر بخت کے ٹیلی فون کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا تھا؟

جواب:۔ میں اس کا پابند نہیں تھا تاہم قومی سلامتی کے پیشِ نظر میں نے اعلیٰ حکام کو اطلاع دے دی تھی۔

سوال:۔ اور کیا اعلیٰ حکام نے اس پر کوئی کارروائی کی ہے؟

جواب:۔ ضرور کی ہو گی، اگر نہیں کی تو یہ میری ذمے داری نہیں۔

سوال:۔ کیا وہاں سے اسلحہ دستیاب ہوا ہے؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم۔

سوال:۔ کیا کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔ یا متوقع ہیں؟

جواب:۔ میں قبل از وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔

سوال:۔ کیا سکندر بخت کی فراہم کردہ معلومات آپ کے نزدیک معتبر ہیں؟

جواب:۔ میں نہیں سمجھتا کہ سکندر بخت کو ایسا جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ ہو گا۔

سوال:۔ گویا آپ اسے سچ مانتے ہیں؟

جواب:۔ سچ نہ مانتا تو اعلیٰ حکام کو کیوں خبردار کرتا۔

سوال:۔ کیا آپ کے اور ملزم سکندر بخت کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟

جواب:۔ نہیں۔

سوال:۔ کیا آپ ملزم سکندر بخت کو گرفتار کر چکے ہیں؟

جواب:۔ نہیں، ملزم سکندر بخت مجھے گرفتار کر کے لایا ہے۔

سوال:۔ کیا مطلب؟

جواب:۔ مطلب یہ کہ مجھے میری مرضی کے خلاف گھر سے اغوا کر کے لایا گیا ہے۔

سوال:۔ کیا اس پر آپ سکندر بخت کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے؟

جواب:۔ یقیناً۔ میں موقع ملتے ہی اغوا کی رپورٹ درج کراؤں گا۔ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے نہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کر سکتا ہوں اور نہ کوئی جواب دینے کا پابند ہوں لیکن میں اپنی پوزیشن کلیئر کر دینا پسند کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ ملزم سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وہ مجھے یہاں دھوکے سے اور گن پوائنٹ پر لے کر نہیں آیا۔ اس جرم میں آپ کا دوست اور ہم پیشہ صحافی مرزا غالب بھی برابر کا شریک ہے۔

سوال:۔ سکندر بخت نے اسلحے کے چند ذخائر کا حوالہ دیا ہے، مثلاً گامے ماچھی کا اڈا۔ سائیں پاپڑ والے کی جعلی خانقاہ جو موضع کرماں والا میں تھی اور ایک ذخیرہ جہاں دو ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر موضع کرماں والا میں بھی تباہ ہوا تھا۔ وہاں کسی اخباری نمائندے کو نہیں جانے دیا گیا تھا؟

جواب:۔ سیکیورٹی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ قومی مفاد میں نہ ہو تو ہر بات اخبار والوں کو نہیں بتائی جا سکتی۔

سوال:۔ کیا آپ سکندر بخت کے دعووں کی تائید کرتے ہیں کہ ان اڈوں کو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے تباہ کیا تھا؟

جواب:۔ میں کیسے تائید یا تردید کر سکتا ہوں، میں چشم دید گواہ تو نہیں تھا۔

سوال:۔ کیا یہ درست ہے کہ وہاں سے غیر ملکی اسلحہ برآمد ہوا تھا؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم۔

سوال:۔ کیا وہ ہیلی کاپٹر انڈین تھے جو تباہ ہوئے؟

جواب:۔ میں نہیں جانتا۔

سوال:۔ آپ جانتے نہیں یا بتانا مناسب نہیں سمجھتے؟

جواب:۔ مجھے علم ہوتا تب بھی میں نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ ان معاملات کا تعلق حکومت کی خارجہ پالیسی سے اور سیاست سے بھی ہو سکتا ہے جب کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ اس کے علاوہ اس قسم کے کیس پولیس ہینڈل نہیں کرتی۔ اس کے لیے اعلیٰ سطح پر کوئی ایجنسی کام کرتی ہے۔

سوال:۔ کیا آپ نے کوئی انڈین ایجنٹ پکڑا ہے؟ اس کا سراغ لگایا ہے؟

جواب:۔ میں نے… نہیں… یہ میرا کام ہی نہیں ہے۔

سوال:۔ کیا آپ کے پاس ایسے افراد کا ریکارڈ ہے جو ملک کی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہوں اور تخریبی عناصر سے ملے ہوئے ہوں۔

جواب:۔ ایسے لوگ کہاں اور کس ملک میں نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس بھی ایسے افراد کا ریکارڈ ہے۔

سوال:۔ پھر آپ نے ابھی تک ان کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟

جواب:۔ ہر کام قاعدے قانون کے مطابق ہوتا ہے، جب ہمارے پاس کسی غدار یا وطن فروش کے خلاف اتنا مواد جمع ہو جائے گا کہ ہم عدالت میں پیش کر کے اسے مجرم ثابت کر سکیں تو ہم ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کریں گے۔

سوال:۔ سکندر بخت نے چند افراد کا ذکر کیا ہے لیکن کسی کا نام نہیں لیا۔ کیا آپ ان افراد سے واقف ہیں؟

جواب:۔ مجھے نہیں معلوم کہ سکندر بخت نے کن افراد کا ذکر کیا ہے۔

سوال:۔ اگر وہ آپ کو نام بتا دے تو آپ کیا کریں گے؟

جواب:۔ تفتیش۔ صرف نام سن کے ہر شخص کو نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ مجرم سمجھا جا سکتا ہے۔

سوال:۔ اب تک پولیس اور دوسرے اداروں نے اسلحے کے کتنے ذخائر کا پتا چلایا ہے اور کتنے ملک دشمن افراد کے خلاف کارروائی کی ہے؟

جواب:۔ یہ بات بتانا عقل مندی نہیں ہو گی۔ اگر ہم تفصیلات ظاہر کر دیں گے تو ان کے ساتھی روپوش ہو جائیں گے، اپنے ٹھکانے بدل دیں گے یا طریقۂ کار بدل دیں گے۔ یہ کام رازداری سے چلتے رہتے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹ کے کیے بھی نہیں جا سکتے۔ اس کے علاوہ میرا کام ملکی قانون کے مطابق لاہور تک محدود ہے۔ مجھے ملکی اور قومی سطح پر ہونے والے کام میں دخل کا اختیار نہیں ہے۔

سوال:۔ آپ کے خیال میں سکندر بخت کے خلاف مقدمات کی تعداد کیا ہے؟

جواب:۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں۔

سوال:۔ کیا وہ سب مقدمات بہت سنگین ہیں؟

جواب:۔ اس کا فیصلہ تو عدالت کرتی ہے۔ میرے نزدیک کسی کو گالی دینا بھی ایک سنگین جرم ہے، گولی مارنا تو دور کی بات ہے۔

سوال:۔ کیا سکندر بخت نے کسی کو گولی ماری ہے؟

جواب:۔ میں نے تو ایسا نہیں کہا۔ ایک مثال دی تھی۔

سوال:۔ کیا اس مرحلے پر سکندر بخت کی ضمانت ممکن ہے؟

جواب:۔ یہ بھی عدالت کے اختیار کی بات ہے۔

سوال:۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھیوں نے ملک دشمن عناصر کے خلاف قابلِ قدر جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے اسلحے کے ذخائر تباہ کیے۔ دشمن کے ایجنٹوں کو ٹھکانے لگایا اور جان پر کھیل کے وطن دشمنوں کے عزائم کو ناکام کیا۔ تو کیا انھیں ملکی و قومی خدمات کے عوض قانون سے کوئی رعایت ملے گی؟

جواب:۔ آپ پڑھے لکھے ہو کے ایسا سوال کرتے ہیں۔ قانون میں رعایت یا ترمیم کیسے ممکن ہے اور اگر کسی کو مقدمات واپس لینے کا اختیار ہے تو وہ حکومت کو حاصل ہے۔ میں حکومت نہیں ہوں کہ ابھی سے کچھ بتا سکوں۔ نہ میں عدالتی معاملات پر تبصرہ کرنے کا مجاز ہوں۔

سوال:۔ آپ کا ذاتی خیال کیا ہے۔ سکندر بخت کے ساتھیوں کے دعوے درست ہیں؟

جواب:۔ میری ذاتی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

سوال:۔ لیکن ابھی تک کسی نے بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا… اور حکومت کی طرف سے کوئی بیان بھی جاری نہیں ہوا کہ اسلحے کے وہ ذخائر کس نے تباہ کیے تھے؟

جواب:۔ حکومت کو تردید یا تائید کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی کیونکہ یہ دعوے کبھی حکومت کے سامنے نہیں آئے۔

سوال:۔ سنگرالی کے ایمونیشن ڈپو کے متعلق سکندر بخت کے انکشافات پر حکومت یہ نہیں کہہ سکتی کہ اسے پہلے سے علم تھا۔ کیا اس طرح تصدیق نہیں ہو جاتی کہ درحقیقت سکندر بخت اور ان کے ساتھیوں نے ہی اب تک تمام پیش رفت کی ہے۔ اور بغل ہراں کے دعوے درست ہیں؟

جواب:۔ نو کمنٹ۔

سوال:۔ کیا ان حالات میں یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر بخت کے خلاف سارے مقدمات ایک سازش کا نتیجہ تھے جس کا مقصد ان کو جیل میں بند کرا کے اصل مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے روکنا تھا اور کیا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ ملک دشمن عناصر کی سکندر سے دشمنی میں پولیس بھی شامل تھی جس نے مقدمات بنائے؟

جواب:۔ فرض کرنے کو آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد میری باری آئی اور ان چاروں نے مجھ سے یہ سوالات کیے۔

سوال:۔ مسٹر سکندر بخت! آپ کے خلاف سب سے پہلے ایک قتل کا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ آپ پر الزام تھا کہ آپ نے اپنے والد کے ایک بزنس پارٹنر کو قتل کیا تھا؟

جواب:۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات میرے مقدمات کے بارے میں نہ ہوں۔

سوال:۔ پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے خلاف مقدمات قائم کرنے والے وہی لوگ تھے جو اب آپ کے خیال میں وطن دشمن عناصر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں یا ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں مثلاً جن کے خلاف وراثت کا مقدمہ تھا؟

جواب :۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔

سوال :۔ کیا یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ آپ کو جان بوجھ کے ایک سے زائد مقدمات میں اُلجھایا گیا تھا تاکہ آپ ان عناصر کو بے نقاب نہ کرسکیں؟

جواب :۔ جیسا۔ یس ایس پی صاحب نے کہا۔ آپ کچھ بھی فرض کر سکتے ہیں۔

سوال :۔ آخر آپ کھُل کر ان کے خلاف بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ ان سے ڈرتے ہیں؟

جواب :۔ جی ہاں۔ میں ان سے ڈرتا ہوں۔ میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی ڈرتے۔ نہ میں سپرمین ہوں نہ ٹارزن۔ نہ مجھے جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ ملی ہے اور نہ ہی کنگ فو وغیرہ جانتا ہوں۔ میرا مسئلہ ہے یہاں کا نظامِ انصاف جو قدم قدم پر ثبوت اور شہادت طلب کرتا ہے اور ثبوت کے بغیر تو شاید یہاں ولدیت کے خانے میں باپ کا نام تک غلط درج کر دیا جاتا ہے۔ پھر پولیس ہے جو انصاف کرنے والوں اور انصاف مانگنے والوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

سوال :۔ کیا آپ اس پورے نظام کو بدل سکتے ہیں جس کی ساری خرابیاں ہم سب جانتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر آپ کیا کریں گے؟

جواب :۔ وہی جو اب ہم کر رہے ہیں۔ صرف خود پہ اور خدا پہ بھروسا رکھتے ہوئے۔

سوال :۔ آپ نے متعدد بار جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور کہا ہے ہمارے ساتھی۔ آپ کے یہ ساتھی کون ہیں؟

جواب :۔ میں کسی کا نام بتا کے اسے کسی شکاری کے سامنے نہیں ڈالوں گا۔

سوال :۔ شکاری آپ کسے کہتے ہیں؟

جواب :۔ ان سب کو جو انصاف کے نام پر استحصال کرتے ہیں۔ کمزور سے حق چھینتے ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے کو آج کے حالات کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ قانون کو کمزور کا سہارا سمجھتے ہیں لیکن کمزور کے لیے جینے کے حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لاء نہیں جنگل لاء پر یقین رکھنے والے سب لوگ ہیں جو "سروائیول آف دی فٹسٹ" کے قائل ہیں۔ جو اصول، ایمان، اقدار و عقائد کی خرید و فروخت کو جواز عطا کرتے ہیں۔ اس تعریف کی روشنی میں آپ معاشرے کے ہر شکاری کو شناخت کر سکتے ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ خود شکاری نہیں ہیں؟

جواب :۔ ہم بھی شکاری ہیں۔ ہم معاشرے کے ہر شکاری کے شکاری...

سوال :۔ آپ کب تک اس طرح روپوش رہیں گے اور اپنے... میں اضافہ کرتے رہیں گے؟

جواب :۔ جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے... جب ہم کامیاب ہوں گے تو یہ معاشرہ ہمیں خوش آمدید کہے گا...

سوال :۔ کیا مرزا غالب بھی آپ کے ساتھی ہیں؟

جواب :۔ نہیں۔ یہ صحافی ہیں۔ بعض اوقات خبروں کی جستجو میں یہ... جیسے دُور افتادہ مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ خبروں کے شکاری ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ نے ان کو مدعو کیا تھا کہ یہ سنگرالی ڈیرے کو خود دیکھ لیں...

جواب :۔ جی۔ اور اس کے بعد ہی انھوں نے آج کی پریس کانفرنس کا انتظام کیا۔ یہ سب میں نہیں کر سکتا تھا۔

سوال :۔ آپ کو ایس ایس پی کو اغوا کر کے لانے کی کیا ضرورت تھی...

جواب :۔ میں انھیں اغوا کر کے نہیں لایا۔ انھی کی جیپ میں آیا ہوں اور جیپ باہر کھڑی ہے۔ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں... میں نے ان کو راستے میں دیکھا اور روک لیا۔ میں نے کہا، میں اپنی گرفتاری دے سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے پہلے پریس کے سامنے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے دیا جائے۔ میں نے ان سے جھوٹ بولا تھا کیونکہ میرا ارادہ ہرگز گرفتاری دینے کا نہیں تھا۔ میں ان کو صرف گواہ رکھنا چاہتا تھا۔

سوال :۔ لیکن انھوں نے کہا ہے کہ یہ آپ کے خلاف اغوا کی رپورٹ لکھوائیں گے؟

جواب :۔ یہ ایس ایس پی ہیں۔ میرے خلاف ڈاکے اور قتل کی رپورٹ بھی لکھوا سکتے ہیں۔ مگر یہ خود جانتے ہیں کہ جرم وہ ہوتا ہے جس کے چشم دید گواہ ہوں۔ جس کا ثبوت ہو۔ کوئی جرم بے مقصد بھی نہیں ہوتا۔ اغوا زبردستی ہوتا ہے جب کہ... جیپ خود چلا کے لائے ہیں اور آپ نے دیکھا بھی تھا کہ... ہی اتر کے اندر آئے تھے۔ نہ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور نہ یہ بے ہوش تھے۔

سوال :۔ آپ کے ایک اور ساتھی تھے مسٹر محسن شیروانی؟

جواب :۔ مجھے ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ ان کی بیوی البتہ ایس ایس پی صاحب کے گھر میں مقیم ہیں۔ میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بھی نہیں جانتیں... گئے یا ممکن ہے باہر ہوں۔ محسن کے والد اور ایس ایس پی صاحب کے تعلقات برادرانہ تھے میرے والد وزیر خان مرحوم کی طرح۔

سوال :۔ آپ کے ساتھ ایک خاتون ایڈووکیٹ مس رابعہ کا نام بھی آیا تھا...

جواب :۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کراچی میں ہیں اور پریکٹس...

سوال :۔ آپ کے بارے میں یہ بھی مشہور ہوا تھا کہ آپ نے ایک دہشت گرد تنظیم ایم آر ایس کے نام سے بنائی تھی؟

جواب :۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔

سوال :۔ مسٹر سکندر بخت! سوال یہ ہے کہ آخر آپ کے ساتھی کون ہیں؟

جواب :۔ آپ سب۔ تمام محبِ وطن پاکستانی۔ تمام انسانیت دوست لوگ، باضمیر انسان... پاکستان کے عوام۔ انصاف اور حق کے علمبردار۔ کیا اتنے ساتھی کم ہیں۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ میں اور کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

انھوں نے بہت شور کیا کہ وہ غالب سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں مگر غالب نے کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ سوالات کسی ترتیب سے نہیں کیے گئے تھے۔ درمیان میں کبھی کوئی بولتا تھا کبھی کوئی۔ ایک دو جگہ خود انکل رضوی نے احتجاج کیا مگر میں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ شاید انھوں نے جیپ والی بات کی تردید کی تھی لیکن میں اپنے جھوٹ پر اڑ گیا اور ان کا سچ نہ چل سکا۔ نتائج اور قیاس آرائیاں... تبصرے اور تجزیے کا سارا کام میں نے اخبار نویسوں پہ چھوڑ دیا تھا۔ میں ایم آر ایس کا نام لیے بغیر اپنے سارے کارناموں کی روداد پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں کامیاب رہا تھا۔ یہ دلاور اینڈ کمپنی کے خلاف باضابطہ اعلانِ جنگ تھا لیکن میں نے پھر بھی ان کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ ویسے تو یہ بہت پہلے ہی کھلی جنگ بن چکی تھی مگر اب تک پبلک کے سامنے ہم صرف مجرم اور مفرور ملزم بنے ہوئے تھے۔ یہ پبلسٹی کا زمانہ تھا۔ اپنی ڈفلی آپ بجا کے لگ لیڈر اور ہیرو بنتے تھے۔ یہی میں نے بھی کیا تھا۔ پبلک کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کر دیا تھا۔ پروپیگنڈا بڑی مؤثر چیز ہے جو رائے عامہ کو بہت جلد متاثر کرتا ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے سارے عیوب پہلے ہی سب کے سامنے آ چکے تھے اب ضروری تھا کہ ہمارے محاسن بھی سب کے سامنے آئیں۔ عوامی سپورٹ ایک نفسیاتی فتح سے کم نہیں ہوتی۔

اخباری نمائندے بڑی عجلت میں رخصت ہوئے۔ ان کو یہ خبر آخری کاپی جانے سے پہلے بنانا تھی اور وہ سب تصاویر سیٹ کرنا تھیں جو فوٹو گرافرز نے اپنے اپنے زاویے سے بنائی تھیں۔ فوٹو گرافر اپنا کام کر کے بہت پہلے جا چکے تھے کیوں کہ انھیں فلموں کی پروسیسنگ کرنا تھی اور رزلٹ دیکھنے تھے۔ اخباری نمائندوں کے جاتے ہی چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔

"اوجی میرے پیسے۔" وہ بولا۔

"پیسے۔۔۔ کس چیز کے پیسے؟" میں نے کہا۔

"اوجی... میں اوناں نو... میرا مطلب ہے اوناں نے آکھیا سی کہ... اور جناب جانے سے پہلے میں بنا کے پیش کیتی سی...۔" وہ

اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے رائزنگ گلڈز کے احاطے میں اپنی اتھارٹی استعمال کرتے ہوئے پریس کانفرنس کرنے کی اجازت دی، کرسیاں لگائیں اور خدمت کی تو اس کا حق خدمت تو ملنا ہی چاہیے۔ صحافی برادری ہمیشہ کی کنگال۔ دوسروں کی دعوت اُڑانے والے — کھایا پیا اور دوڑ گئے کہ اب ایس ایس پی جیسے کوتوالِ شہر کی موجودگی میں غریب چوکیدار کیا بولے گا اور بولے گا تو کوئی نہ کوئی "بل" ادا کر بھی دے گا...

ہر نجی قسم کی پریس کانفرنس بُلانے والوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ پریس کانفرنس کسی بہترین ہوٹل میں بلائیں جہاں کھانے پینے کا بہترین انتظام ہو اور اس بہانے ہی کچھ لوگ آجائیں تو ان کو تحفے تحائف پیش کیے جائیں تاکہ وہ آپ کا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر یہ تو خود صحافی لوگ تھے جیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ پاکستان جیسے ملک میں اسمگلر اور رشوت خور لوگ کے پاؤں دبانے والے اور ان کے جوتے اُٹھانے والے بھی صحت مند بینک بیلنس پر اکڑ کے چل سکتے ہیں لیکن صحافی ہنوز اپنے پیٹ پر اڑتا ہے اور جوتیاں چٹخاتا ہے۔ ساری عمر قلم گھستا ہے۔ دماغ کھپاتا ہے اور خون جلاتا ہے مگر اس سے آتا بھی فرق نہیں پڑتا جتنا فولادی شہتیر میں دیمک سے۔ اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں۔

میں نے چوکیدار کو دو سو روپے پیش کیے تو وہ خوش ہو گیا۔ غالباً اس نے مجھے ایس ایس پی صاحب کا ریڈر وغیرہ سمجھا ہوگا۔ ابھی تو خود ایس ایس پی صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی پولیس کا ہی پیسہ تھا جو ہم نے لٹایا۔

صحافیوں کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا ہوگا۔ انکل رضوی بہت مطمئن کھڑے ہوئے تھے "ہاں بھئی، اب کیا حکم ہے میرے لیے۔" انھوں نے کہا۔

"انکل، میں دل سے شرمندہ ہوں۔ ایک مجبوری تھی جس کے تحت میں نے ایسا کیا۔" میں نے کہا۔

"اور وہ مجبوری کیا تھی جس کے تحت تم نے پولیس سے یہ جیپ چھینی تھی۔" انھوں نے طنزاً کہا۔ "تمھارے پاس تو ہر غلط کام کا عذر ایک ہی ہے، ضرورت۔ حالات کا تقاضا۔ یا مجبوری۔ اس کے نام تم خود بدلتے ہو۔"

"کیا آپ یقین کریں گے کہ ہم نے یہ جیپ وو ڈاکوؤں سے چھینی تھی جو آپ کی پولیس کے سورماؤں کی وردیاں تک اتار چکے تھے اور ان کا اسلحہ بھی لے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" انکل نے کہا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں انکل۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ لاہور کی کوٹ لکھپت جیل سے دو ڈاکو نکل بھاگے تھے۔ پاٹے خاں اور گورا ڈاکو۔ ان میں سے ایک کے لیے سزائے موت پر عمل درآمد

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی تاریخ تک مقرر ہو چکی تھی اور دوسرے کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو اخبارات میں بھی آیا تھا۔ پولیس نے ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بندی کر رکھی ہے۔" وہ بولے۔ "اور متعدد مقامات پر چھاپے مارے ہیں۔"

"آپ بالکل پولیس کے سرکاری ہینڈ آؤٹ کی زبان بول رہے ہیں ورنہ کیا آج تک ناکا بندی سے کوئی فائدہ ہوا ہے۔ کہیں چھاپے مارنے سے کوئی مجرم ہاتھ آیا ہے۔ انھیں تو چھاپا پڑنے سے پہلے علم ہو جاتا ہے مگر وہ مطمئن بیٹھے رہتے ہیں۔ پولیس صرف کاغذی رپورٹ دیتی ہے کہ چھاپا ناکام رہا۔ یا سرے سے چھاپا مارنے ہی نہیں جاتی۔ آپ کی ایک ناکا بندی کرنے والی پارٹی کی ان ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ غالباً کہیں کھانا کھا کے قیلولہ کر رہے تھے کہ ڈاکو آ پہنچے۔ ڈاکوؤں نے ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ میں آپ کو مینو بھی بتاتا ہوں۔ نرگسی کوفتے۔ بھنا ہوا مرغ، پراٹھے اور حلوا۔ ظاہر ہے ایسی مرغن خوراک کھا کے تو نیند ہی آئے گی۔ پھر جنگل کی پُرسکون تازہ ہوا۔ جب وہ جاگے تو ڈاکو ان سے سب کچھ چھین چکے تھے۔ چلتے چلتے ڈاکو ان کو ایک اوور سیئر کی گاڑی میں ڈال گئے۔"

"کون اوورسیئر..." انکل نے حیرانی سے کہا۔

"محکمۂ انہار کا۔ سنگرالی سے چند میل کے فاصلے پر اس کا آفس ہے اور وہ ہر روز اسی سڑک پر سے آتا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم سنگرالی سے واپس آ رہے تھے کہ ہمیں وہ گاڑی نظر آئی جس میں اوورسیئر بھی پڑا ہوا تھا اور آپ کے دو تھانیدار بھی۔ ایک انسپکٹر اور دوسرا سب انسپکٹر۔"

"تمھیں ان کے عہدے کیسے معلوم ہوئے؟"

"ان کے کاغذات سے۔ ہم نے جامہ تلاشی لی تھی۔" میں نے کہا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون ہیں، ڈاکو ہمیں آگے آ کے ملے۔ وہ پولیس کی جیپ میں فرار ہو رہے تھے۔ ہم خود جنگل میں چھپتے چھپاتے آ رہے تھے کہ ہم نے جیپ کو گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ پولیس کی جیپ کو سڑک سے اتنا دور جنگل میں پا کے ہمیں تعجب ہوا۔ ڈاکو وہاں کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ شاید اپنے ساتھیوں کا۔ ہم پہنچ گئے۔ انھوں نے ریوالور نکال لیے اور شاید وہ ہمیں شوٹ بھی کر دیتے مگر ہم فوراً نیچے گر گئے اور رعنے دھونے لگے کہ ہم تو دیہاتی ہیں جو غلطی سے ادھر آ گئے۔ انھوں نے ہماری جاں بخشی کی غلطی کی اور مارے گئے۔"

"کیا مطلب؟ تم نے قتل کر دیا انھیں؟"

"نہیں انکل۔ میں نے انھیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے زندہ گرفتار کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ان میں اور ہم میں یہی ایک فرق تھا کہ وہ اسلحے کی طاقت پر لڑتے تھے۔ جب تک اسلحہ ان کے ہاتھ میں تھا، ہمارے لیے اپنی جان بچانا ضروری تھا۔ اس کے بعد ہم نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک کی کلائی ٹوٹی اور بازو ٹوٹا... دو پسلیاں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے پوچھا تھا کہ یہ جیپ کہاں سے ملی تو میں نے کہا تھا کہ یہ دوسری اسٹوری ہے۔ ابھی یہ اسٹوری صرف آپ کو معلوم ہے۔ صبح شاید اخبارات میں بھی آ جائے، دیکھیے آپ کی پولیس پارٹی کے حیالے کیا فرماتے ہیں۔ ان کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ اور ظاہر ہے وہ اوورسیئر سے بھی اپنے بیان کی تائید حاصل کریں گے۔"

"پھر وہ ڈاکو کہاں گئے؟" انکل رضوی نے بےیقینی سے کہا۔

"وہ کہاں جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس کے تھانے میں ہیں، جہاں سے کوئی مر کے ہی نکل سکتا ہے۔"

"کیا مطلب! ایم آر ایس کے تھانے سے؟"

"مطلب یہ کہ ہماری تحویل میں ہیں۔ کل پھر ایک ایسی ہی چھوٹی سی پریس کانفرنس ہو گی جس میں ہم خود ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے کریں گے۔" میں نے کہا۔ "اب تو اخبارات میں ہمارے کارنامے ہی شائع ہوں گے۔ ہم ہیرو بن کے دکھائیں گے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پریس تک ہماری رسائی ہے۔ ہم سچی کہانیوں کے ساتھ جھوٹی کہانیاں بھی لگائیں گے جو پبلک کی نظر میں ہمارا امیج بحال کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ہم لوگوں کو باور کرائیں گے کہ مجرم ہم نہیں، شکاری ہیں اور انھوں نے ایک سازش کے تحت ہمیں مجرم بنایا ہے۔ اس سازش میں پولیس ان کے ساتھ تھی چنانچہ وہ کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اب ہم حقائق کو بےنقاب کر رہے ہیں۔ پریس کانفرنس بھی اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکو خود حقیقت بیان کر سکیں اور بتا سکیں کہ جب ان کی پولیس سے ملاقات ہوئی تھی تو پولیس ناکا بندی کر رہی تھی یا..."

"تم نے انھیں کہاں رکھا ہے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"بہت محفوظ مقام پر۔ ان کا علاج بھی ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک ان کی ہڈیاں جوڑ کے پلاستر چڑھا دیا گیا ہو گا۔ انھوں نے ہمیں بہت بڑی رشوت بھی پیش کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں شوٹ کر دو یا خودکشی کرنے دو لیکن ہم نے صاف انکار کر دیا اور انھیں بتا دیا کہ وہ قانون کے سزا یافتہ مجرم ہیں اور انھیں عدالت کے احکامات کے مطابق سزا ملے گی۔"

"یہ سب تو تم نے اچھا کیا۔" انکل رضوی نے تشویش سے کہا۔ "لیکن ان کو اپنے پاس رکھ کے تم بہت بڑی حماقت کے مرتکب ہو رہے ہو، وہ بہت خطرناک ڈاکو ہیں۔"

"میں نے عرض کیا کہ ان کے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں۔"

"افوہ... بھئی وہ خود نہیں فرار ہوں گے۔ ان کے ساتھی آ جو انھیں چھڑا لے جائیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔" انکل رضوی نے خفگی سے کہا: "ان کے گروہ کا ہر رکن ڈاکو ہے اور باہر ایک نہیں دو گروہ ہیں۔"

"انھیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ سردار لوگ کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ خوش فہمی تم کو لے ڈوبے گی۔" انکل رضوی کی برہمی بڑھنے لگی: "ابھی وقت ہے کہ انھیں پولیس کے حوالے کر دو۔ پولیس انھیں ماتحت عدالت واپس جیل پہنچا دے گی۔ کسی دوسری جیل میں منتقل کر دے گی۔ پولیس ان کے گروہوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ان میں اتنی ہمت نہیں کہ حملہ کر کے انھیں چھڑا لے جائیں۔"

"آخر وہ کوٹ لکھپت جیل سے بھی نکلے ہی تھے۔"

"وہ کبھی نہ نکل پاتے، اگر ان کی مدد اندر سے نہ کی جاتی..." انکل رضوی نے کہا: "جیل کے عملے کو مجبور کر دیا گیا تھا۔"

"رشوت لینے پر؟" میں نے طنز سے کہا۔

"نہیں۔ باہر ان کے گروہوں نے جیل کے تین ملازمین کو اغوا کیا اور ان کے خاندانوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔" انکل رضوی نے کہا: "کچھ اور لوگوں کو بھی ایسی ہی دھمکی دی گئی تھی کہ پاٹے خاں کو پھانسی ہوئی تو ان سب کے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ دھمکی کے علاوہ رشوت بھی تھی، کچھ لوگ مجبور ہو گئے۔"

"ایسا تو ہر ڈاکو کا گروہ کر سکتا ہے۔ کیا آپ ان کی دھمکی میں آ کے ڈاکوؤں کو چھوڑتے جائیں گے؟"

"نہیں... ہم قانون کے فیصلے پر عمل درآمد کرائیں گے۔ ان ڈاکوؤں کے بھی خاندان ہیں۔ ہم ان کے تعاقب میں ہیں اور شاید کل تک سب کو برآمد کر لیں گے۔" انھوں نے کہا۔ "میں تم کو وہ بات بتا رہا ہوں جو صرف پولیس کے اعلیٰ حکام کو معلوم ہے۔ بےوقوفی مت کرو اور ان کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اعلان کر سکیں۔"

"اپنی کوششوں کی کامیابی کا؟" میں نے کہا۔

"نہیں، یہ اعلان کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔ اگر ان کے ساتھی جیل کے عملے کو اور ان کے متعلقین کو چھوڑ دیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ پاٹے خاں کی سزائے موت ملتوی کر دی جائے اور اسے خصوصی رعایت کے تحت عمر قید دینے کی سفارش کی جائے۔"

"کیا قانون میں اس کی گنجائش ہے؟"

"بالکل نہیں۔ جب صدر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی تو پھانسی ہونا یقینی ہے۔" انکل نے کہا۔ "مگر ڈاکو اتنے بڑے قانون داں نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ بیشک حکومت قانون بدل سکتی ہے لیکن اس کا ایک طریقۂ کار ہے۔ کسی سرکاری افسر یا وزیر کے حکم سے قانون نہیں تبدیل ہوتا اور حکومت بھی قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتی۔ عدالتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا سوال۔ سپریم کورٹ نے سزائے موت کا فیصلہ بحال رکھا ہو تو صدر بھی خصوصی حالات میں ہی رحم کی درخواست قبول کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ موت کے فیصلے کو عمر قید میں بدل دے مگر ہمارے اعلان سے وہ جھانسے میں آ جائیں گے۔ ہم خود ان ڈاکوؤں سے اپنے ساتھیوں کے نام اپیل کرائیں گے۔"

"یہ آپ کل بھی کر سکتے ہیں۔ ہمیں نیک نامی کا ایک اور پوائنٹ تو اسکور کرنے دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم پریس کے ذریعے ایک اور دھماکا کر لیں۔"

"اور اگر رات کو ان کے ساتھی حملہ کر کے تمھیں بھی مار گئے اور ان کو بھی چھڑا کر لے گئے پھر کیا ہو گا؟" انکل رضوی نے کہا۔ "یا انھوں نے دھماکے سے تم کو ہی اُڑا دیا پھر..."

"انکل! ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکتی..."

"ان کو خبر مل چکی ہو گی۔ ان کے مخبر اور ساتھی ہر جگہ ہیں۔ خود پولیس میں ایسے لوگ ہیں جو ڈاکوؤں سے بھتا لیتے ہیں۔ صرف اس بات کا کہ وہ ڈاکوؤں کو پولیس کی سرگرمیوں سے باخبر رکھیں۔ پولیس کے ہر آپریشن کا ان کو قبل از وقت کیسے علم ہو جاتا ہے۔ پولیس مشرق میں کوئی کارروائی کرنے جاتی ہے تو انھیں خبر مل جاتی ہے کہ مغرب میں میدان صاف ہے۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل ابھی تو نہ پولیس کو معلوم ہے نہ کسی تیسرے شخص کو۔ میرا مطلب ہے آپ کے سوا؟" میں نے کہا۔

"اور جہاں تم نے ان کو رکھا ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے تو دیکھا ہو گا؟"

پہلے میں نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر مجھے ایک دم اس ڈاکٹر کا خیال آ گیا جسے ہم نہیں جانتے تھے مگر اس نے ڈاکوؤں کو پہچان لیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ اگر وہ نکل گئے تو تم دُہرے مجرم بنو گے۔ تم پر اُلٹا یہ الزام آ جائے گا کہ تم نے انھیں پناہ دی اور فرار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ابھی اور اسی وقت ان کو پولیس کے حوالے کر دو۔ اگر تم کو پریس پبلسٹی کا اتنا ہی شوق تھا تو ابھی کیوں نہیں اعلان کر دیا۔ تم ان کو ساتھ لا سکتے تھے۔" انکل نے کہا۔

"یہ بہت مشکل ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں بہت چھپ چھپا کے آنا تھا اور آپ کو بھی لانا تھا۔ ہم ڈاکوؤں کو کیسے لاتے۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھے کہ آ سکتے اور اگر ہم یہاں لے آتے تو بات وہی ہوتی۔ آپ اکیلے تھے۔"

"میں پولیس کی پوری مسلح پلاٹون لا سکتا تھا۔"

"ایسی صورت میں ہم کہاں جاتے۔ ہماری پریس کانفرنس کیسے ہوتی؟" میں نے کہا۔ "اب آپ صبح تک انتظار کر لیں۔ چند گھنٹے کی بات ہی تو ہے۔ ہم آپ کو گھر پر ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

انکل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صبح تک انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ مجھے ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سربراہ مقرر کیا گیا ہے، میں ان کو ابھی گرفتار کروں گا۔"

"یہ تو آپ کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کہ آپ نے چھتیس گھنٹے میں انھیں پھر جیل کے اندر پہنچا دیا۔ تاہم اس کامیابی کو ہم آپ کے ساتھ شیئر کریں گے۔ ہم صبح آپ کو بتائیں گے کہ آپ کو کہاں آنا ہے۔"

"تم مجھے ابھی بتاؤ گے کہ مجھے کہاں جانا ہے۔" انکل رضوی نے ایک دم ریوالور نکال لیا جو انھوں نے قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ کا ریوالور جیپ میں رہ گیا۔"

"برخوردار! اس عہدے تک میں کسی کی سفارش سے یا رشوت دے کر نہیں پہنچا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "زندگی میں تم سے کہیں زیادہ چالاک اور عیار لوگ ملے ہیں۔ ایسے جو تم کو جیب میں ڈال کے لے جائیں اور بیچ کھائیں مگر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔"

"اگر... اگر یہ آپ کے پاس تھا تو... تو آپ نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟" میں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ کیوں آ گئے۔"

"تمھاری خواہش پوری کرنے کے لیے۔" وہ بولے۔ "میں خود اغوا ہو گیا اور اپنی مرضی سے میں نے اغوا ہونا قبول کیا۔ تمھیں اجازت دی کہ تم اغوا کا ڈراما کر لو اور مجھے پریس کے سامنے پیش کر سکو۔ تم کو سارا معاملہ پریس کے ذریعے پبلک تک پہنچانا تھا۔ میں خود پریس کانفرنس سے خطاب کر نہیں سکتا تھا۔ یہ موقع تمھاری وجہ سے مجھے ملا۔ میں نے خود کو مجبور ظاہر کیا اور پریس سے وہ سب کہہ دیا جو میں کہنا چاہتا تھا۔ اس سے تمھیں بھی فائدہ ہوا اور مجھے بھی۔"

"مجھے... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے بیان کی تردید میں جھوٹ بولا۔" میں نے کہا۔ "یہ کہا کہ آپ اپنی جیپ میں ہمیں بٹھا کے لائے تھے، اور اپنی مرضی سے آئے تھے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولے۔ "اس لیے کہ وہ جیپ میری نہیں تھی۔ میری جیپ تو تمھاری مہربانی سے گھر کے قریب ہی کھڑی ہوئی ہے اور اخبار والوں کو کیا پتا کہ یہ جیپ کس کی تھی مگر میرے محکمے کے لوگ تو جانتے ہیں کہ اس جیپ میں کون کہاں گیا تھا۔ میں نے اس جیپ کا نمبر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور تم سے پوچھا بھی تھا کہ یہ جیپ تمھیں کہاں سے ملی؟ مگر تم نے جواب گول کر دیا۔ میرا اس وقت تک یہ خیال تھا کہ ان ڈاکوؤں نے پولیس پارٹی پر حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیا ہوگا اور تمھیں جیپ لاوارث کھڑی ہوئی ملی ہوگی۔ چونکہ تم سنگرالی کے قریب اسلحے کے ایک ذخیرے کی اطلاع پہلے ہی دے چکے تھے اور یہ پولیس پارٹی اسی طرف گئی ہوئی تھی اس لیے مجھے یہ بات قرین قیاس لگی تھی۔"

"اب آپ دیکھیے گا کہ وہ پولیس پارٹی کیا کہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ڈاکو کیا کہتے ہیں۔ وہ ہمارے بیان کی تصدیق کریں گے۔"

"میں ان سب کو معطل کر دوں گا۔ بلکہ ان کے خلاف ... غفلت کے تحت مقدمات درج ہوں گے۔" انکل رضوی نے ... "پولیس پارٹی کے ساتھ دو جوان بھی تھے۔"

"جی ہاں... وہ بھی وہیں پڑے ہوئے تھے۔" میں نے ...

"ان کا اسلحہ... وردیاں... سب تمھارے پاس ہیں؟" ... رضوی نے کہا۔

"جی سان کے ریوالور اور رائفلیں تو ہیں... کاغذات نہیں ... جو وہیں بکھرے پڑے تھے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... وہ بھی میرے حوالے کر دو۔"

"آئی ایم سوری انکل... اس وقت یہ ناممکن ہے۔" میں نے ...

"تم اخباری نمائندوں کو پھر بلا سکتے ہو۔" انکل رضوی نے کہا۔ ...

"میں تم کو اتنی رعایت دے سکتا ہوں۔ وہ جہاں بھی ہیں وہیں ... والے آ سکتے ہیں اور تمھارا بیان وغیرہ سب لے سکتے ہیں۔"

"میں آپ کو ضرور دے جاتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اپنی وردی اور اپنے خصوصی اختیارات کے باوجود وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔"

"کیا وہ کسی کے گھر میں ہیں؟ تم فکر مت کرو۔"

"وہ ایک ایسی جگہ ہیں جہاں آپ زبردستی داخل ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ آپ خود معطل ہو جائیں۔ آپ کا یہ فعل قانون کی ... میں جرم بھی بن جائے اور کامیابی کا کریڈٹ ناکامی کا ڈریبٹ بن ... شمار ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ کسی وکیل کے گھر میں ہیں؟" انکل رضوی نے ...

میں ان کی ذہانت پر حیران رہ گیا۔ اور اپنی بے وقوفی پر ... پچھتایا کہ میں نے ان کو ایسا اشارہ دے دیا جو انھوں نے سمجھ لیا۔

"وہ عبدالودود منظر کے گھر میں ہیں؟" انھوں نے پھر کہا۔ "تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب میں اس پورے علاقے کا محاصرہ کرا لوں گا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ گرفتار ہو جائیں گے۔"

"اور ہم بھی؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"کیا تم توقع رکھتے ہو کہ میں تم کو یہاں سے کہیں اور جانے دوں گا؟" انکل نے کہا۔ "اس وقت جب ریوالور میری جیب میں تھا، میں نے تمھارے اصرار پر تم سے تعاون کیا تھا۔ اب ریوالور تمھاری جیب میں ہے اور تم مجھ سے تعاون پر مجبور ہو..."

میرا ذہن بہت دیر سے مصروف عمل تھا اور موقع کا منتظر تھا۔ میری مایوسی صرف اداکاری تھی۔ انکل رضوی کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ میں نے جھپٹ کر ان کے ریوالور پر ہاتھ مارا لیکن وہ پہلے سے تیار تھے۔ انھیں جتنا میں سمجھتا تھا، اس سے زیادہ ... مجھے سمجھتے تھے۔ میں اپنے ہی زور میں جیپ کے بونٹ پر گرا اور انکل رضوی نے ریوالور کا دستہ میرے سر پر مارا۔ میں بڑی مشکل سے اٹھ ...

اور کچھ دیر جیپ کا سہارا لے کر آنکھوں کے سامنے پھیل جانے والے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالب معذور ہو چکا تھا ورنہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ اس وقت ہم رائٹرز گلڈ کے احاطے میں تھے اور انکل رضوی نے ہم دونوں کو ایک ہی ریوالور سے بے بس کر لیا تھا۔

"چلو... بیٹھو جیپ میں..." میں نے انکل کی آواز سنی۔ "اور یاد رکھو کہ میں نے زندگی میں کبھی کسی مجرم کو رعایت نہیں دی۔ یہ نہ ہو کہ مجھے تم پر گولی چلانا پڑے۔"

میں لڑکھڑاتا ہوا جیپ میں بیٹھا۔ غالب نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "گاڑی تم چلاؤ گے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "میں پیچھے بیٹھوں گا۔ چند منٹ میں تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے سر کو جھٹکا اور اقرار میں سر ہلایا۔ چند منٹ کا وقفہ پانچ منٹ کا وقفہ بن گیا۔ اس کے بعد میں نے جیپ میں لگی ہوئی چابیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اپنا رخ میرے گھر کی طرف رکھنا۔" انکل رضوی نے کہا۔ "وہاں سے میں پولیس کی نفری طلب کر لوں گا، مجسٹریٹ کو بلا لوں گا تاکہ چھاپا مارنے میں قانونی دشواری کوئی نہ ہو... اور تم میرے لیے کوئی مشکل پیدا نہ کرو۔"

اپنے پیچھے میں نے ایک قہقہے کی آواز سنی۔ "چلو جی! اپنے ایس ایس پی صاحب۔ ہم آپ کی مشکل آسان کر دیتے ہیں... گولی مارو ڈاکوؤں کو... اب آپ سب اپنے مہمان ہو... کیسی رہی یہ ملاقات اپنے سکندر صاحب... ہیں جی؟"

مجھے یقین تھا کہ اس آواز کو انکل رضوی نے بھی پہچان لیا ہوگا۔ انداز اور لہجہ دلاور کا تھا لیکن آواز محسن کی تھی۔ اس وقت میں اپنی وقتی کامیابی کی خوشی کے خاک میں مل جانے کے خیال سے بہت دل گرفتہ اور ملول تھا۔ بہت عظیم الشان اور بہت غور و خوض، پلاننگ اور احتیاط کے ساتھ بنائے جانے والے بڑے بڑے منصوبے ایک بہت معمولی، ناقابل فہم اور قطعی ناقابل وضاحت غلطی سے کس طرح چوپٹ ہوتے ہیں یہ میں نے دیکھ اور بھگت لیا تھا۔ اس وقت میرے لیے امید کی روشنی تو صرف تائید غیبی سے ملنے والی کوئی رعایت یا مہلت تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ایک بار پھر پانسہ پلٹ دوں۔ اگر ایسا کوئی موقع آتا تو یہ میرے اور انکل رضوی کے درمیان فنا و بقا کی آخری جنگ بن سکتی تھی۔ وہ مجھے کسی رشتے سے کوئی رعایت نہ دیتے اور گولی مارنا ناگزیر ہو جاتا تو وہ دل پتھر کر کے مفرور مجرم سکندر بخت کو شوٹ کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ بالکل ایسا ہی میں بھی کرتا۔ میرے لیے ان کی فرض شناسی قابل احترام تھی اور ان کی اصول پرستی ان کے مضبوط مثالی کردار کی بے مثل صفت تھی لیکن موجودہ حالات میں

سوال یہ تھا کہ کیا اہم ہے۔ سب سے اہم میری آزادی اور زندگی تھی جو بھی مجھ سے میری آزادی چھیننے کی کوشش کرتا یا میری زندگی کی راہ میں مزاحم ہوتا وہ میرے نقطۂ نظر سے صرف دشمن تھا اور یہ حساب کا سیدھا سادہ سوال تھا کہ مرنا ہو تو کسے مرنا چاہیے۔ مجھے یا انکل رضوی کو؟ اور میرے فارمولے سے اس کا صرف ایک ہی جواب آتا تھا کہ مجھے ہر جذباتی رشتے کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک ایس ایس پی کو قتل کر دینا چاہیے۔ کسی بھی ایس ایس پی کی پوسٹ خالی نہیں رہتی۔ رضوی نام کا ایک شخص قتل ہوتا ہے تو اس سے ایک عورت بیوہ ہوتی ہے، دو بچے یتیم ہوتے ہیں اور ایک خاندان بدبختی کے اندھے غار میں گرتا ہے۔ میری موت سے ایم آئی ایس کی قوت کمزور پڑتی تھی اور ہمارا مشن ناکامی سے دوچار ہو سکتا تھا کیونکہ میری جگہ فوری طور پر دوسرا کوئی لینے والا نہیں تھا۔ یہ مشن ناکام ہو جاتا تو ہزاروں لاکھوں عورتیں اور بچے بیوہ اور یتیم ہوتے اور وہ دشمن کامیاب ہوتے جن کو رضوی صاحب کا قانون ابھی تک پہچانتا بھی نہیں تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ بغیر لڑے قانون کے سامنے ہتھیار ڈالنا بھی موت ہے۔ پھر میں آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر کے کیوں نہ مروں ... جان دینا یا جان لینا جنگ میں کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر فیصلے کا لمحہ آ جاتا تو صرف ایک زندہ گھر پہنچ سکتا تھا، رضوی صاحب یا میں۔

لیکن وہ فیصلہ کن اور آزمائش کا لمحہ آنے سے پہلے محسن آ گیا۔ اس وقت میں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ آخر محسن کو یہاں کس نے بھیجا۔ اس کا آنا کچھ نہیں تھا، صرف تائید ایزدی تھا اور اس قادر مطلق کے کسی فعل کو جواز کی ضرورت نہیں کہ اس نے یہ کیوں کیا اور کیسے کیا۔ اس کی ذات کے مددگار ہونے پر میرا یقین ہمیشہ غیر متزلزل رہا تھا۔ آج میں زندہ تھا اور میرا ساتھ دینے والے دوست وفادار تھے تو اس میں میرا کوئی کمال نہ تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ خوشی سے میرا دل بھر گیا اور میرا حوصلہ پہلے سے دوچند ہو گیا۔

انکل رضوی منجمد ہو گئے۔ "کیا تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو محسن؟"

"نہیں انکل! آپ کو دھوکا دینا آسان نہیں اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے آپ سے۔" محسن بولا۔

"تم لوگ اب بڑی روانی سے جھوٹ بولنے لگے ہو۔" رضوی صاحب نے طنز سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم کو اب کسی کا بھی خوف نہیں رہا۔"

"باقی باتیں ہم راستے میں بھی کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "کیا آپ یہ ریوالور..."

"نہیں... ایسے نہیں دوں گا۔" رضوی صاحب نے کہا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم چھین سکتے ہو تو چھین لو مگر اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ میرا نشانہ سکندر ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ تم ریوالور چھینو' سکندر کی جان لے لو۔"

انکل رضوی کا لہجہ بہت پُر یقین تھا اور وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں انکل۔" محسن نے بے بسی اور عاجزی سے کہا۔

"نہیں... نہ میں تمھاری بات سمجھ سکتا ہوں' نہ تم میری بات سمجھتے ہو۔ یہ اس لیے ناممکن ہے کہ تمھاری اور میری سوچ کی سمت بالکل مختلف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔ "اس لیے یہ کوشش بھی فضول ہوگی کہ ہم ایک دوسرے پر اپنے نظریات اور اپنے مقاصد مسلط کرنے کے لیے بحث کریں یا توقع کریں کہ ہم میں سے کوئی ایک صرف باتوں سے دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جس دن ایسا ہوگا' اس دن یا تو میں اپنی نوکری اور وردی چھوڑ کے تمھارے ساتھ چل پڑوں گا یا تم خود کو پولیس کی تحویل میں دے دو گے۔"

"آپ اس وقت وردی کی اور فرض کی مجبوری کی بات نہ کریں انکل کیونکہ ہم آپ کے لیے صرف مطلوب و مفرور مجرم ہی نہیں..."

"تم میرے لیے اور کچھ نہیں..."

"کیا آپ جذباتی رشتوں کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے"

محسن نے برہمی سے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا۔ ہر زندہ شخص احساس رکھتا ہے۔"

"میرے لیے پہلے اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے پھر جذباتی رشتوں کا اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔" انکل رضوی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں اس تمام عرصے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہ تھی کہ میری پھرتی اور چالاکی میرے کام آسکتی ہے اور میں انکل رضوی کو دھوکا دے کر ان سے ریوالور چھین سکتا ہوں یا اس ریوالور سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکتا ہوں لیکن محسن کی بحث نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بحث بے مقصد تھی مگر وہ اسے بلاوجہ طول نہیں دے رہا تھا' اگر وہ وقت ضائع کر رہا تھا تو اس کا بھی کوئی مقصد ضرور تھا جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ غالب خستہ حال اپنی شکستہ ٹانگ اور فولادی شکنجے کے باعث بے عمل اور غیر فعال ہو چکا تھا چنانچہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر لاتعلق پڑا ہوا تھا اور اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کہ خود کو تقدیر کے فیصلے پر چھوڑ دے۔

"انکل! آخر ہم آپ کے کزن ہیں۔" محسن نے لجاجت سے کہا۔ "میرے والد اور سکندر کے والد آپ کے کتنے عزیز دوست"

"وہ سب مجھے ہمیشہ عزیز رہیں گے۔ ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔" انکل رضوی نے کہا۔

"پھر ہم آپ کو عزیز کیوں نہیں ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تم بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہو... مگر عزیز ہو اس سے مجھے کچھ امیدیں ہوتی ہیں۔" انکل نے کہا۔ "بیٹا بھی اگر تمھاری ہی عمر کو پہنچ کر وہ سب کرنے لگے جو میرے کے مطابق غلط اور غیر قانونی ہو تو میں اس کو یہ رعایت نہیں سکتا کہ وہ قانون کو تماشا بنا لے اور جو چاہے کرتا پھرے سے خون کا رشتہ تسلیم کروں گا مگر وہ قتل کرے گا تو اسے تختہ دار بھی لے جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر صدمے سے مر جاؤں تو الگ بات ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل!" محسن نے ہار ماننے کے انداز میں "اگر آپ اتنے ہی مجبور ہیں تو ہم آپ کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھا"

محسن نے پیچھے سے اپنا ریوالور آگے بڑھایا اور رضوی کے سامنے کر دیا۔ رضوی صاحب نے بہت محتاط رہتے ہوئے بائیں ہاتھ سے ریوالور وصول کیا مگر دائیں ہاتھ کے اپنے ریوالور زاویہ وہی رکھا اور اپنی نظر کو وہیں مرتکز رکھا۔ وہ بھی سمجھتے تھے ہم چالاک لوگ ہیں اور پلک جھپکنے سے پہلے بازی الٹ دینے ماہر ہیں۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے پر تیار نہ تھے اور طے کر چکے تھے انھیں سکندر بخت کی لاش بھی لے جانا پڑی تو وہ کمزور نہیں پڑیں گے۔ ان کا عزم مجھے ان کی آنکھوں کی بے حسی سے اور ان کے کی بیگانگی میں نظر آ رہا تھا۔ خود محسن نے یہ بات سمجھ لی تھی چنانچہ نے جو کچھ کیا وہ انتہائی ذہانت کا مظاہرہ تھا۔

ابھی انکل رضوی نے محسن کا ریوالور ضبط کر لینے کے بعد کامیابی پر اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ایک گولی آئی اور ان ہاتھ سے ریوالور اڑا کر لے گئی۔ میں نے اس وقت بالکل نہیں کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی اور کہاں سے چلائی تھی۔ جیسے فیوز کسی بم کو فعال کر دیتا ہے ایسے ہی گولی کی آواز نے مجھے متحرک کر دیا۔ ہی ریوالور انکل رضوی کے ہاتھ سے نکلا' میں نے دوسرا ریوالور لیا لیکن ریوالور میرے ہاتھ میں نہیں آیا۔ انکل رضوی کے بائیں کی گرفت ابھی ریوالور پر بہت مضبوط تھی۔ محسن نے چلا کر کچھ جو میں نے نہیں سنا۔ اب میرے اور رضوی صاحب کے درمیان دست بہ دست لڑائی چل رہی تھی۔ میں نے ان کے ریوالور بائیں ہاتھ کو نیچے دبا رکھا تھا تاکہ گولی چلے تو نیچے جائے۔ ان کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ میں نے ریوالور لے کر دیکھا تو وہ

جھکنے جا رہے تھے۔

یہ کام غالب نے کیا تھا۔ اس نے جیپ کے پیچھے سے ان کے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو اتنی دیر میں وہاں مجمع لگ جاتا اور فائر کی آواز پر بھگدڑ مچ جاتی لیکن رات کے سناٹے میں اس سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چلا کے پوچھا "کون ہے؟" پھر پولیس کی سیٹی سنائی دی اور محسن ایک دم جیپ میں بیٹھ گیا۔

"چلو۔ فوراً انکل چلو یہاں سے۔" محسن نے کہا۔

"تم انکل رضوی کو سنبھالو۔" میں نے کہا۔ "میں بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔"

"غالباً گشت کرنے والی پولیس آ رہی ہے۔" غالب نے تشویش سے کہا۔

"انھیں میں روک لوں گا۔" محسن بولا اور نیچے اتر گیا۔

"کیسے روک لو گے؟" غالب نے کہا۔ "اور کیا عقل مندی ہے آدھی رات کو پولیس مقابلے میں؟"

پولیس آجاتی تو مقابلہ ناگزیر ہو جاتا مگر دو منٹ میں ہم نے سب ٹھیک کر لیا۔ غالب کے ساتھ انکل رضوی کو ڈال دیا گیا اور محسن نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ میں نے غالب کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا سا دیکھا جو لوہے کا پائپ ثابت ہوا۔ جیپ کا ٹول باکس پیچھے تھا اور جس وقت محسن اور انکل رضوی کے درمیان گفتگو چل رہی تھی' غالب اس ٹول باکس کو آواز کیے بغیر کھول کر اس میں کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا تھا جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکے۔ غالب نے بعد میں بتایا کہ ویسے تو ٹول باکس میں ایک ہتھوڑی بھی تھی لیکن وہ ڈرتا تھا کہ اس کی ضرب مہلک ثابت نہ ہو جائے۔ اس نے تو پائپ مارتے وقت بھی ایک بار خدا سے اس گناہ پر معافی مانگی تھی اور دعا کی تھی کہ اس کا وار ضرورت کے مطابق کارگر ہو۔ یہ بھی نہ ہو کہ انکل رضوی کا سر پھٹ جائے اور ان کی جان جائے اور وار اتنا ہلکا بھی نہ ہو کہ رائیگاں جائے۔ وہ کامیاب رہا۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتا تو محسن بھی طے کر چکا تھا کہ اپنے ریوالور کا دستہ مار کے انکل رضوی کو ناک آؤٹ کر دے گا۔ اس نے بڑی عقل مندی سے ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہنے والے انکل رضوی بھی اس سے دھوکا کھا گئے۔ محسن کا نشانہ کبھی قابل رشک نہ تھا۔ غالب اس فن میں سرفہرست تھا اور بلاشبہ اڑتی چڑیا کے پر گن کر کسی بھی پر کا بے خطا نشانہ لے سکتا تھا۔ دوسرا نمبر مجھے دیا جا سکتا تھا یا پھر کیتھرین کو۔ محسن میرے اندازے کے مطابق رالیو کے بعد پانچویں نمبر پر تھا لیکن ابھی اس نے گولی سے ہاتھ کے ریوالور کو اڑا دیا تھا مگر ہاتھ پر خراش نہ آنے دی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے مشکل سے چار فٹ کے فاصلے سے نشانہ لیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی رضوی صاحب کے ذہن کو ذرا سی دیر کے لیے غیر حاضر کرنا تھی۔ جیسے میں ان سے ایک ریوالور لے کر مطمئن ہو گیا تھا کہ انھیں غیر مسلح کر دیا ہے۔ ایسے ہی ان کے ذہن نے بھی تسلیم کر لیا تھا کہ محسن سارے ہتھیار ان کے حوالے کر چکا ہے۔ انھیں یقین دلانے میں محسن کی باتوں کو بھی دخل تھا۔ انکل رضوی سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ جذباتی ہو کے شکست قبول کر رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ محسن نے دوسرا ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے یہ تاثر دیا تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی اور رضوی صاحب بھی اسی چال سے مات کھا گئے تھے جو انھوں نے میرے خلاف چلی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ انکل رضوی نے اپنی طاقت کو ظاہر کرنے میں عمداً تاخیر سے کام لیا تھا اور دوسرا ریوالور فوراً نہیں نکالا تھا۔ شاید اسی کوتاہی نے ان کی کامیابی کا قلعہ مسمار کر دیا۔

جب ہم جائے واردات سے دور نکل آئے تو میں نے کہا۔ "کیا آپ خود اس راز پر سے پردہ اٹھانا پسند کریں گے کہ غیب سے آپ کا ظہور اچانک کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"ہم ہر جگہ ایسے ہی پہنچتے ہیں۔ کیونکہ ہم بہت پہنچے ہوئے صاحب کشف و کرامت ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اللہ کا حکم ہوا کہ جا اپنے مصیبت میں گرفتار دوستوں کو دشمن کے پنجے سے چھڑا۔ بس ہم آگئے۔"

"تجھے شہلا نے بتایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے شہلا کو بتایا تھا کہ تمھارا پروگرام کیا ہے؟" محسن بولا۔

"ہم نے اسے بتایا تھا کہ ہم منظر کے گھر میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں تو منظر کے گھر گیا ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "اور تم لوگوں نے منظر کو بھی اس جگہ کا پتا نہیں دیا تھا۔"

"اچھا بھائی! آپ کو ہم نے صاحب کشف و کرامات مانا۔" غالب نے کہا۔ "اب آپ بتا دیں کہ آپ فلمی ہیرو کی طرح کیسے صحیح وقت پر نازل ہو گئے؟"

"یہ فلمی اتفاق نہیں تھا دوستو۔" محسن نے ہنس کر کہا۔ "مجھے شہلا سے صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ تم منظر کے گھر پہنچے ہو۔ میں نے منظر کو فون کیا تو وہ چلانے لگا کہ کیا تم اور کیا تمھارے ہم زاد اور عم زاد۔ سب میرے اعمال کی سزا بن کے نازل ہوتے ہو۔ وہ اکیلے آتے تب بھی کم نہ تھا۔ اپنے ساتھ راہ میں ملنے والی ہر مصیبت بھی اٹھا لائے ہیں اور مزید مصیبتوں سے شوق فرمانے کہیں گئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں اور کس طرف تو منظر نے کہا کہ اب یہ تو خود ان کے فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ان کی نیت کیا ہے اور وہ گھر سے مشرق کا رخ کر کے نکلے ہیں تو مغرب کی سمت نہیں جائیں گے مگر میں نے غالب کو چلا چلا کر اخبار والوں سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس نے پہلے قذافی اسٹیڈیم کی بات کی تھی مگر بعد میں کہا تھا کہ رائٹرز

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گلڈ آباد.. منتظر کی بات سن کر میں نے سیدھا یہاں آجانا مناسب سمجھا۔ تم لوگ یہاں نہ ملتے تو میں قذافی اسٹیڈیم جاتا۔ یہاں بھی مجھے گھوم پھر کے دیکھنا پڑا تو تم لوگ پچھلے حصّے میں نظر آئے اور تمھارے ساتھ رضوی صاحب کو دیکھ کر میں چکر میں پڑ گیا۔ بالآخر میں نے طے کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر رضوی صاحب اپنی مرضی سے آئے ہیں تب مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ صرف تم سے معلوم کرنا ہے کہ یہ کیا ڈراما تھا۔ اور اگر تم ان کو اٹھا کر لائے ہو تو پھر مجھے کسی بھی ناپسندیدہ صورتِ حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"یہ شک تمھیں کیوں ہوا کہ ہم رضوی صاحب کو زبردستی لائے ہوں گے؟"

"اس لیے کہ میں نے شہلا سے پوچھا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ انکل رضوی کو سکندر بھائی نے فون پر کچھ کہا تھا اور وہ چھاپا مارنے کی نیت سے قذافی اسٹیڈیم گئے ہیں۔ یہ بات انھوں نے اپنی بیوی کو بتائی تھی تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آنٹی نے ہمیشہ اپنے شوہر کی ذمے داریوں کو نبھایا یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کس قسم کے شوہر ہیں اور کس قسم کے افسر ہیں۔ لیکن انکل چلے گئے تو وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھیں۔ شہلا کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ کیوں پریشان ہیں۔ انکل رضوی چوروں اور مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پہلے بھی وقت بے وقت چھاپے مارنے جاتے رہے تھے اور یہ آنٹی کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ پریشان ان کو یہ اندیشہ کر رہا تھا کہ انکل غالباً سکندر کو گرفتار کرنے گئے ہیں اور وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ سکندر اور نہ بے وقوف ہیں۔ آخر کیا ضرورت تھی ان کو ایس پی صاحب سے بات کرنے کی۔ اس بات سے شہلا کو بھی پریشانی لاحق ہوگئی۔ تاہم اس نے آنٹی کو تسلی دی اور سمجھایا کہ محسن اور سکندر اتنے بے وقوف بہرحال نہیں ہیں کہ خود پولیس کو کسی جگہ بلائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ وہ گرفتار ہونا چاہتے تو کیا گھر نہیں آسکتے تھے۔ میرے ذہن میں شہلا کی بات رہی کہ تم نے کسی خاص مقصد کے تحت انکل رضوی کو قذافی اسٹیڈیم بلایا ہے۔ جب منتظر سے بات ہوئی تو صورتِ حال کھل کر سامنے آگئی۔ تم پہلے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر کسی وجہ سے تم نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ ایس ایس پی صاحب تم کو گرفتار کرنے کی غرض سے چھاپا مارنے کے لیے قذافی اسٹیڈیم جانا چاہتے تھے مگر پہلے گئے رائٹرز گلڈ میں۔ اس سے اور کیا نتیجہ اخذ کر سکتا تھا میں؟ اس بات کا امکان کم تھا کہ وہ ہنسی خوشی تمھارے ساتھ آگئے ہوں۔ چنانچہ میں نے جیپ میں سے دوسرا ریوالور بھی نکال لیا جو اس کے گلوو کمپارٹمنٹ میں پڑا ہوا تھا۔ میں قریب آکے کچھ نہیں سن سکتا تھا لیکن دُور سے ایسا لگتا تھا کہ کچھ سوال جواب قسم کا پروگرام چل رہا ہے اور جو لوگ بیٹھے ہیں وہ اخباری نمائندے ہیں۔ یہ عجیب معمّا بن گیا میرے لیے۔ آخر تم کو کس نے پریس کے سامنے جانے پر مجبور کیا؟ رضوی صاحب نے یا کسی ہنگامی ضرورت نے۔ پہلی بات مشکل لگی تھی چنانچہ میں نے فرض کیا کہ تمھیں پریس کانفرنس بلانا پڑی۔ اور یہ کام ہمارے صحافی بھائی کی مدد سے ہوا۔ میں جیپ کے قریب موجود رہا اور جب تم کو آتے دیکھا تو جیپ کے پیچھے چھپ گیا۔ اگر سب ٹھیک ہوتا تو میں جیپ کے روانہ ہونے سے پہلے نمودار ہو کے کورنش بجا لاتا لیکن میرے اس خیال کی تائید بہت جلد ہوگئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور اس کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور جو تم نے دیکھا۔"

"تیری حاضر دماغی اور جرأت پر ہم تجھے ایم آر ایس کی طرف سے نوبل پرائز دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ میں بعد میں وصول کروں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ جانا کدھر ہے؟" محسن نے کہا۔ "انکل کو کہاں پہنچانا ہے؟"

"ان کے گھر اور کہاں۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں منتظر کے گھر پہنچنا ہے۔" میں نے کہا۔ "غالب کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"یہ شیر آخر چوہے دان میں کیسے جا گھسا؟" محسن بولا۔

"سب اس کی تقدیر کا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "دل لگایا اس سراپا ناز سے جس کا شیوہ ہی ڈھول دھپّا ہے۔ ٹانگ پھنا بیٹھا اس جنجال میں۔"

غالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اگر اسے وقت پر صحیح طبی امداد مل جاتی تو اب تک وہ خاصا سنبھل چکا ہوتا لیکن پہلے تو مسیحائی کے فرائض میں نے سر انجام دیے اور انہی دواؤں کے سہارے پر وقت گزار دیا جو دستیاب تھیں۔ جب ڈاکٹر ملا تو غالب نے پریس کانفرنس کے جہاد پر روانگی اختیار کی۔ نتیجہ یہ کہ اب درد کی شدت کے ساتھ وہ بخار میں تپ رہا تھا لیکن اپنی تکلیف کو خاموشی سے برداشت کر رہا تھا۔ اس کے لیے شکنجے سمیت ٹانگ اٹھا کے پھرنے اور بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں کتنی اذیت تھی۔ اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا مگر وہ تو ساری اذیت خود جھیل رہا تھا۔

منتظر کے دروازے پر جیپ رکی تو میں نے کہا۔ "انکل رضوی کو میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تو غالب کے ساتھ منتظر کے گھر میں میرا انتظار کر۔ صبح ہونے میں ابھی چار گھنٹے ہیں۔ میں انکل کو چھوڑ کر ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

"یار غالب بے ہوش ہو گیا ہے۔" محسن نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہاں ایک ڈاکٹر ہے۔" میں نے کہا۔ "اس سے کہنا کہ فوراً مرہم پٹی اور علاج شروع کر دے۔ ہمیں یہاں سے اندھیرے میں ہی نکل جانا ہوگا۔ یہ میں آکے بتاؤں گا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ یہاں ہمارے دو مہمان بھی ہیں۔ ان کی طرف سے بھی محتاط رہنا۔"

ہم آہستہ آہستہ تقریباً سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ منتظر کا دوست ڈاکٹر شہریار مجھے پولیس کی اس جیپ

میں دیکھا اور یہ دیکھے کہ اس جیپ میں کوئی اور بھی بے ہوش پڑا تھا۔ جیسے میں نے غالب کے ساتھ نہیں اتارا بلکہ اپنے ساتھ لے گی۔ وہ انکل رضوی کی صورت دیکھ لیتا تو بعد میں یہ ہو سکتا تھا کہ اخبار میں ان کی تصویر دیکھے اور شناخت کرے۔ وہ مجھ سے واپسی پر یہ سوال بھی کر سکتا تھا کہ پولیس کی اس جیپ میں میرے ساتھ کون تھا اور اسے میں کہاں چھوڑ آیا۔ وہ جیپ کہاں گئی؟ وہ منتظر کے تعلق سے پہلے ہی ایک غیر قانونی کام میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ پولیس کی جیپ اور میرا پولیس سے مشتبہ قسم کا تعلق دیکھتے ہی وہ گھبرا جاتا تو ہمارے لیے مسائل کھڑے کر دیتا۔

میں نے غالب کو آہستہ آہستہ جیپ سے اتارا اور منتظر کے گھر کے دروازے پر لٹا دیا۔ پھر میں جیپ لے کر روانہ ہو گیا جس کی پچھلی سیٹ پر اب صرف انکل رضوی لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ہوش میں آنے ہی والے ہوں گے اور جب وہ مجھے اکیلا پائیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ پیچھے سے مجھ پر حملہ کر دیں یا چلتی جیپ سے کود جائیں۔ میں ان کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قریب ترین جگہ غالب کا آبائی گھر تھا جس کا جلا ہوا کھنڈر مجھے رات کی تاریکی اور ویرانی میں زیادہ ہی پُرآسیب لگا۔ میں نے جیپ کو اس کے پچھلے حصّے میں روکا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے فریم نظر آئے۔ میں نے گاڑی اور ہیڈ لائٹس بند کرنے کے بعد انکل رضوی کو کندھے پر ڈالا اور ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں ایک رات رابعہ اور نازو سوئی تھیں۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ جلنے سے بچا ہوگا تو لوگ اٹھا لے گئے ہوں گے۔ دھماکے سے وہ کمرا مسمار ہو گیا تھا جس میں محسن اور شہلا نے رات گزاری تھی۔ میں نے یادوں کو اپنے تصور میں جاگتے اور تصویر کی صورت میں متحرک ہوتے دیکھا۔ یہاں کیا کچھ نہ ہوا تھا۔ رابعہ اور نازو کی وہ کیفیت مجھے یاد آئی جب ان کو ایک چوہے نے دہشت زدہ کر دیا تھا تو میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی جگہ سے ہمارے مصائب کا آغاز ہوا تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا تھا۔ غالب کے والدین نے اسے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا۔ بڑے فخر سے سجایا تھا اور بڑی امیدوں کے ساتھ یہ ورثہ غالب کے سپرد کرنے کا سوچا تھا۔ غالب یوں اس کا وارث ہوا کہ لاوارث ہوا۔ گھر بھی اور گھر کا رکھوالا بھی۔

انکل رضوی کے کراہنے کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دوسرے کمرے میں تھے اور میں نے انھیں مجبوراً فرشِ خاک پر لٹا دیا تھا۔ یہ میری احتیاط پسندی تھی جس نے مجھے محفوظ رکھا، ورنہ میں زخمی ضرور ہو جاتا۔ یہ ممکن تھا کہ میرا سر پھٹ جاتا اور جب ہوش آتا تو میں زنجیروں سے بندھا ہوا کسی پولیس لاک اپ میں ہوتا۔ انکل رضوی اندھیرے میں اسی طرح لیٹے ہوئے تھے مگر میں نے نوٹ کیا کہ ان کی پوزیشن کچھ بدل گئی ہے۔ میں نے ان کو فرش پر سیدھا رکھا تھا مگر اس وقت وہ کروٹ لیے پڑے تھے اور غالباً اسی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے میرے آنے کی امید تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کا ایک ہاتھ کچھ پھیلا ہوا ہے اور اس ہاتھ میں آدھی اینٹ ہے۔ بغیر پٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں سے آنے والی روشنی کافی تھی، ورنہ میں یہ سب نہ دیکھ پاتا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ایک دم دروازے میں نمودار نہیں ہوا۔ میں تھوڑا سا سائڈ میں رہا اور پھر جست لگا کے نکل گیا۔ وہ اینٹ بعد میں اس دروازے کے خلا سے گزری جو رضوی صاحب نے بڑی قوت کے ساتھ ہاتھ گھما کر پھینکی تھی۔ انھیں دوبارہ یہ موقع نہیں ملا۔ میں ان کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

"مجھے بہت افسوس ہے انکل..."

"شٹ اپ۔ افسوس تو اب مجھے ہونے لگا ہے کہ میں تمھارا انکل ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ بیٹا ہوتا تو عاق کر دیتا۔" انھوں نے برہمی سے کہا۔

"ایک دن آئے گا جب آپ اس نالائق بھتیجے پر فخر کریں گے۔"

"وہ دن آنے سے بہت پہلے میں تم کو مار دوں گا یا تم مجھے مار دو گے۔" ان کا غصہ قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ "میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی مجرم نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا۔ میری پوزیشن کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا تم پہنچا چکے ہو صرف اس لیے کہ تم سیدھی راہ پر ٹیڑھی چال چلنے کو ضروری سمجھتے ہو۔ تم اچھا کر رہے ہو مگر برے طریقے سے۔"

"میں اچھائی برائی کے معیار کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ سارا فرق آپ کی اور میری پوزیشن کا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے رویے نے بالآخر مجھے بھی اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ میں بھی رشتوں کو نظر انداز کروں، اسی طرح جیسے آپ کرتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ وہ سلوک کرتے آئے ہیں جو کسی بھی مجرم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کیا اس کے بعد مجھے یہ حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ عام مجرموں کی طرح پیش آؤں۔ آپ کے ساتھ وہی کروں جو کوئی بھی مجرم کسی بھی ایس ایس پی کے ساتھ کر سکتا ہے؟"

"تو کرو، کس نے روکا ہے تمھیں۔" وہ دہاڑ کر بولے۔

"کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا کہ میں آپ کی شفقت اور محبت اور آپ کے احسانات کو فراموش کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "مشکل تو یہ ہے کہ خود آپ بھی ثابت قدم نہیں۔ آپ کے وجود کے دونوں حصوں میں سے کوئی ایک مکمل طور پر غالب نہیں۔ آپ بیشتر وقت ایس ایس پی رہتے ہیں مگر تمام وقت نہیں۔ جب انکل رضوی بنتے ہیں تو شہلا کو گھر میں رکھتے ہیں۔ بوبی اور کیتھرین کے لیے انسانی ہمدردی؟

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور شرافت کے معیار بنا دیتے ہیں اور انھیں بھی صرف ہم سے تعلق کی بنا پر گھر میں مہمان بنا لیتے ہیں۔ جانتے بوجھتے محسن کو سہولت فراہم کرتے ہیں کہ وہ شہلا سے مل سکے اور اسے فون کر سکے۔ اپنے گھر سے گارڈ آپ نے کیوں ہٹالی تھی آخر... اپنے فون کو آبزرویشن پر کیوں نہیں رکھا آپ نے؟ ایس ایس پی تو کسی کو بھی رعایت نہیں دیتا۔"

وہ شکست خوردہ اور مضمحل سے بیٹھے رہے۔ "غالباً اب مجھے مستعفی ہو جانا چاہیے۔ میں کمزور پڑنے لگا ہوں۔ اپنے فرض کے ساتھ وفاداری میں پہلے کی طرح مستقل مزاج نہیں رہا۔ میں مفاہمت کرنے لگا ہوں اور میرے رویے میں لچک پیدا ہونے لگی ہے۔"

"آپ اس احساس کو ختم نہیں کر سکتے انکل کہ آپ صرف ایس ایس پی نہیں، ایک اچھے انسان بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ روبوٹ نہیں ہیں۔ آپ کے سینے میں ایک دل ہے، یہ دل حساس ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کو آپ نکال کر نہیں پھینک سکتے۔ اس سے آپ کی نیت کی خرابی ظاہر نہیں ہوتی۔ آپ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اصول پسندی اور فرض شناسی کے صبر آزما راستے پر گامزن رہتے ہیں مگر انسانی فطرت کی کمزوریاں اور خامیاں آپ کے ساتھ بھی ہیں۔ بےعیب تو بےشک صرف خدا کی ذات ہے۔ آپ جو کچھ کرتے ہیں، وہ آپ کی غلطی نہیں، مجبوری ہے۔"

"معلوم نہیں۔" وہ بےخیالی میں بولے۔ "مجھے بتاؤ، اب میرے لیے تم نے کیا سزا تجویز کی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہاں سے آپ گھر جائیں گے، اس کے بعد جو آپ مناسب سمجھیں وہ کریں۔" میں نے کہا۔ "میں آپ سے کوئی درخواست نہیں کروں گا۔ منظر کے گھر چھاپا نہ مارنا خود آپ کے حق میں بہتر ہے۔ ہم آپ کو وہاں نہیں ملیں گے۔"

"میرے لیے اتنی مشکلات مت پیدا کرو سکندر کہ میں حوصلہ ہار جاؤں۔ تم آخر کب تک فرار ہوتے رہو گے؟" انکل رضوی نے کہا۔

"یہ فرار نہیں ہے، جہاد ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صرف بےبس اور لاچار ہونا نہیں چاہتے۔ آپ کا قانون نہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتا ہے اور نہ اُن دشمنوں کو دیکھ سکتا ہے جو ہماری نظر میں ہیں، اس لیے ہم چھُپ کر لڑنے پر مجبور ہیں۔ فرار ہوتے ہیں مجرم، بزدل اور کسی سے ڈرنے والے۔"

"کیا تم اور کیا تمہارا جہاد۔ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑنے کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔" انھوں نے تلخی سے کہا۔ "خود کو بچا نہیں سکتے۔ ملک کو دشمنوں سے بچانے نکلے ہیں۔ چند لڑکیاں اور چند لڑکے۔"

میرا چہرہ سُرخ پڑنے لگا۔ "کیا آپ اب تک کی تمام جدّوجہد کو اور کامیابیوں کو خیالی سمجھتے ہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "آپ کے خیال میں یہ سب جھوٹ ہے۔ فلمی کہانی ہے... گامے شاہ کا اڈا۔ سائیں بابا مولے کی خانقاہ کا ٹھکانا۔ چوریوالہ کا زمین دوز ذخیرہ۔ یہ سب کیا آپ کے محکمے کی کارکردگی کے باعث تباہ ہوئے ہیں؟ جو کچھ ملا وہ کم ثبوت ہے۔ آپ کو تو وہاں سے ہیلی کاپٹروں کے ملبے اور غیر ملکی ایجنٹوں کی لاشیں تک ملی ہوں گی۔ کس کی کارروائی تھی وہ؟ اور اب کل تک آپ کو سنگرالی کے ایمونیشن ڈپو کے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔" میں اتنا مشتعل تھا کہ چلانے لگا تھا۔ یہ حقائق کی نفی کرنے کا رویہ ہی اتنا اشتعال انگیز تھا کہ میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مجھ سے کہتا کہ کہاں کا عشق کیسا عشق، رابو کی چاہت صرف ہوس ہے۔ یا کوئی الزام لگاتا کہ شہلا کو میں نے دُنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے بہن بنا رکھا ہے۔ کم سے کم انکل رضوی ایسا نہیں کہہ سکتے تھے۔

یکلخت مجھے ہوش آگیا۔ میں ان کی چال کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے مشتعل کر کے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لینا چاہتے تھے۔ غصّے کی حالت میں آدمی کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے تو وہ مغلوب بھی آسانی سے ہوتا ہے۔ اس وقت انکل رضوی مجھ سے جسمانی طور پر مقابلہ کر کے نہیں جیت سکتے تھے لیکن کوئی نفسیاتی کمزوری میری ہار کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ بات سمجھنے کے بعد میں مسکرانے لگا۔

"آئی ایم سوری انکل! مجھے آپ کو اسی جگہ چھوڑ کے جانا ہوگا۔"

"تمہیں روپوش ہونے کے لیے مہلت چاہیے؟" رضوی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں، کم سے کم چار گھنٹے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" وہ بولے۔ "میں چار گھنٹے سے پہلے کچھ نہیں کروں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ کو جاننے والا آپ کے وعدے پر کبھی اعتبار نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ احمق نہ ہو۔"

"تم افلاطون ہو... تم کیا کرو گے؟ مجھے یہاں ہاتھ پیر باندھ کے اور میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کے ڈال دو گے؟" انھوں نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ میں یہی کر سکتا ہوں۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر ان کی اپنی مجبوریاں ہیں تو میرے لیے میری مجبوریاں جدا ہیں۔ ان کو روکے رکھنے کے دوسرے طریقے بھی تھے، مثلاً یہ کہ میں ان کو کہیں مقفل کر دیتا یا خواب آور گولیاں دے کر سلا دیتا لیکن یہ طریقے میرے امکان میں نہ تھے۔

"میں... نہیں چاہتا... کہ تم ایسا کرو..." انکل رضوی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"چاہتا تو میں بھی نہیں انکل... مگر..."

"مگر یہ کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" وہ بولے۔ "اور دشمن پر بھروسا کرنا تم نے نہیں سیکھا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو

میں بھی ایسا ہی کرتا۔ لیکن اچھا ہے اگر تم اعتبار کی کوئی صورت نکال لو۔ تمہیں بھی وہ سب نہ کرنا پڑے جو تم نہیں چاہتے اور میں خود اپنی نظر میں بہتر رہوں تو اس ذلت آمیز سلوک سے بچ جاؤں جو تم کر سکتے ہو، کوئی بھی مجرم کر سکتا ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ تم ایسا کرو۔" انھوں نے دوبارہ ایک بات کہی۔

"اگر آپ کوئی ایسی صورت پیدا کر دیں تو یہ مجھ پر احسان ہوگا۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں قسم نہیں کھاتا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"دنیا کے معاملات میں خدا کی قسم کھانا بھی میرے مسلک کے خلاف ہے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"آپ... آپ اپنے ضمیر کی قسم کھا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں وہ کچھ سوچتے رہے۔ شاید ان کو توقع نہ تھی کہ میں ان کو ایک ایسی قسم کا پابند بھی کر سکتا ہوں جسے توڑ کر وہ صرف اپنی نظر میں مجرم ٹھہرتے ہیں۔ جسے توڑنے کے لیے وہ کوئی اخلاقی جواز تک فراہم نہیں کر سکتے۔ قسم توڑنے کی قانون میں کوئی سزا نہیں۔ عادتاً قسم کھانے والے دن میں دس بار خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کے بھی شرمسار نہیں ہوتے۔ مذہب نے قسم توڑنے کا کفارہ رکھا ہے اور انتہائی ناگزیر حالات میں قسم توڑنے کی اجازت دی ہے مثلاً اس وقت جب جھوٹی قسم کھانے سے اپنی یا کسی اور کی زندگی بچائی جا سکتی ہو۔ موجودہ صورتِ حال میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ شرعاً یہ غلط ہوتا کہ وہ خدا کی قسم کھا کے کچھ نہ کرنے کا وعدہ کرتے اور میرے جاتے ہی ایس ایس پی بن کے احکامات جاری کرنے لگتے۔ بلاشبہ جواز لانا کبھی مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سامنے یہ عذر رکھتے کہ قسم انھوں نے حالتِ جبر میں ایک قیدی کی حیثیت سے کھائی تھی مگر ایک قانون کے پابند اور با اختیار ایس ایس پی پر وہ قسم لاگو نہیں ہوتی۔ چنانچہ میرے خیال میں صرف ضمیر کو گواہ بنا کے ہی وہ ایسی قسم کھا سکتے تھے جسے توڑ کے نہ وہ مجرم بنتے تھے اور نہ گناہگار، مگر ان کا اپنا ضمیر انھیں معاف نہ کرے تو یہ معاملہ ان کے اندر کی عدالت کا تھا۔

"مجھے منظور ہے۔ میں اپنے ضمیر کی قسم کھا کے وعدہ کرتا ہوں کہ صبح کے پانچ بجے تک اسی جگہ خاموش بیٹھا رہوں گا۔" انکل رضوی نے بالآخر کہا۔

"ٹھیک ہے انکل! میں یہ جوا کھیلوں گا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ آج بھی انسان کا ضمیر زندہ ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔ "بات آدمی کی نہیں، انسان کی ہے اور ابھی تک آپ کے انسان ہونے پر میرا اعتقاد متزلزل نہیں ہوا حالانکہ آپ ایس ایس پی بھی ہیں۔"

"جس دن انسانیت کا ضمیر مر جائے گا، اس دن یہ دنیا ایک ایسی عذاب ناک جہنم ہوگی جس پر شیطان حکمراں ہوگا اور اس کی رعایا میں بھی صرف شیاطین ہوں گے۔" انکل رضوی نے کہا۔

"میں آپ کے الفاظ یاد رکھوں گا۔" میں نے ان سے مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت اس جواری کی طرح تھی جس نے آخری داؤ پر اپنا سب کچھ لگا دیا ہو اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ ایسا کر کے اُس نے اچھا کیا ہے یا بُرا۔ باہر آنے کے بعد بھی میں تذبذب اور بےیقینی کا شکار رہا۔ عقل نے کہا کہ رضوی صاحب بھی شکاری ہیں۔ وہ بھی اپنا ایک جال رکھتے ہیں۔ دھوکے فریب کے پھندے لگاتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ قانون کی محافظت کے فرائض کی انجام دہی میں ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔ ان کا واسطہ شریف لوگوں سے نہیں، اخلاقی مجرموں سے پڑتا ہے جو ضمیر کا مفہوم بھی نہیں سمجھتے۔ دل کہتا تھا کہ کسی انسان کا ضمیر دھوکے باز نہیں ہوتا۔ جب وہ مجرموں سے بات کرتے ہیں تو قانون کی زبان بولتے ہیں۔ ضمیر کو درمیان میں نہیں لاتے۔ انھوں نے آج ضمیر کی ضمانت دی ہے۔ اس ضمانت کو ضبط کرا کے وہ ضمیر کے قیدی ہو جائیں گے اور بےضمیر ہو کے جینا ان کو منظور نہ ہوگا۔

یہی کشمکش تھی جس نے دو بار میرے قدم روک لیے۔ میں نے سوچا کہ پلٹ کر جاؤں اور دیکھوں کہ کیا وہ اپنے وعدے پر قائم رہنے کی ہمت رکھتے ہیں اور اسی طرح وہاں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک جلے ہوئے کھنڈر کی درسگاہِ عبرت میں۔ لیکن میرا ضمیر آڑے آگیا۔ اس نے مجھے شرم دلائی کہ اعتماد کی بات کرتے ہو مگر خود پر اعتبار نہیں کرتے۔ انسان کی سرشت میں شامل نیکی کے وجود کو تسلیم نہیں کرو گے تو اپنا اعتبار بھی کھو دو گے۔ میں چلتا گیا۔ جیپ کے انجن کی آوازیں سناٹے میں یوں گونجتی رہیں جیسے وسوسوں اور اندیشوں کے جنگل میں بھٹکنے والی پُرآسیب پاگل ہوا۔

ایک بار پھر میں نے جیپ کو منظر کے گھر سے دُور اسی خالی پلاٹ پر کھڑا کیا جو دو گھروں کی دیواروں کے حصار میں تھا۔ وہاں سے چند منٹ کا فاصلہ پیدل طے کر کے میں نے منظر کے دروازے کو بجایا۔ اس مرتبہ دروازہ کھولنے کے لیے آنے والا محسن تھا۔

"کہاں چھوڑا انکل رضوی کو؟" وہ میرے پیچھے دروازہ بند کر کے بولا۔

"غالب کے خانۂ ویراں میں۔" میں نے کہا۔

"انھیں ہوش تو نہیں آیا تھا؟"

"نہیں..." میں نے مختصر ترین وقفے میں جھوٹ بولنے کا تہیّہ کر لیا۔

"ان کو باندھ کر ڈال آئے تھے، کہیں ایسا نہ ہو..."

"یار! میں عقل سے اتنا بھی پیدل نہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"غالب کیسا ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"جیسا پہلے تھا... بیہوش..." محسن نے میرے ساتھ ڈرائنگ روم کا فاصلہ طے کیا۔ "خطرے کی بات نہیں۔"

ڈاکٹر شہریار مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ غالب کو قالین پر لٹائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑی مہارت اور مستعدی کے ساتھ غالب کی ٹانگ پر پٹی لپیٹ رہے تھے۔

"سمپل فریکچر تھا۔" وہ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر بولا۔ "ایکسرے وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ دو ہفتے تک احتیاط ضروری ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے... دو ہفتے تک چلنا پھرنا بند۔" میں نے کہا۔

"مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اس ٹانگ پر زور نہیں پڑنا چاہیے۔ ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔" وہ بولا۔ "لوگ یہی غلطی کرتے ہیں کہ بیساکھی کے سہارے گھومنے پھرنے لگتے ہیں۔ پریکٹس ہوتی نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تو خود گر پڑتے ہیں اور زیادہ نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ سمپل فریکچر کو کمپاؤنڈ بنا لیتے ہیں۔ یا شفایابی کے عمل کو صفر کر دیتے ہیں۔ کبھی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں کسی آدمی یا کھمبے سے، موٹر سائیکل یا دیوار سے ٹکرانا بھی حادثہ ہے اور دہلیز سے ٹھوکر کھانا بھی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اور یہ بے ہوشی..."

"یہ ابھی دو تین گھنٹے میں ختم ہو جائے گی... جب درد ختم ہوگا۔" وہ پٹی لپیٹتے ہوئے بولا۔ "تاہم آرام ضروری ہے۔"

"آپ دوائیں وغیرہ لکھ دیں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ جہاں بھی رہے علاج جاری رہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ غالب یہاں نہیں رہے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "خود ان کے الفاظ ہیں۔ ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔"

"آپ تو خوش ذوق آدمی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "چکر آپ کے سامنے ہی ہے۔ اس فولادی شکنجے سے نجات دلوانے کی صورت بھی نکالیے۔"

"میں تو سرجن ہوں۔" وہ بولا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ٹانگ کاٹ کے شکنجہ الگ کر دوں۔ شکنجے کو کاٹنے کا کام لوہار کر سکتا ہے اور کوئی جادوگر مل جائے تو یہ کر سکتا ہے کہ نہ ٹانگ کاٹے اور نہ شکنجہ اور دونوں کو الگ کر دے۔"

"آپ دلچسپ آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہنستے کھیلتے اتنے مشکل کام کر سکتے ہیں۔"

"کیا ڈینٹر پینٹر کسی ٹوٹی پھوٹی کار کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے یا جذباتی ہوتا ہے کہ کیسی نئے ماڈل کی کتنی خوب صورت کار تھی جو تباہ ہو گئی۔ پریشان صرف کار کا مالک ہوتا ہے۔" ڈاکٹر شہریار نے کہا۔ "ڈینٹر تو اسے اپنی مہارت کے لیے ایک چیلنج سمجھتا ہے اور اسے پھر اصل حالت میں لا کے ویسی ہی دوسری کاروں میں شامل کر دیتا ہے۔ ہم بھی ڈینٹر پینٹر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس ٹوٹے پھوٹے آدمی لائے جاتے ہیں۔"

"اب کتنا وقت اور لگے گا؟" میں نے کہا۔

"تقریباً ایک گھنٹا۔" وہ بولا۔

میں نے دونوں ڈاکوؤں کو دیکھا۔ وہ سکون سے سو رہے تھے لیکن کبھی کبھی خواب میں ڈر کے کراہنے لگتے تھے۔ سکون آور خواب آور دوائیں بھی ان کے لاشعور سے پھانسی کے پھندے کا خوف دور کرنے میں ناکام رہی ہوں گی کہ وہ سہمے ہوئے لگتے تھے۔ موت کے ناگزیر ہاتھوں کی بے رحم گرفت سے نجات کا احساس تقدیر کا ایک مذاق بن گیا تھا اور وہ گھڑی کی سوئیوں کے دوبارہ پہنچنے سے قبل ہی پھر وہاں تھے جہاں سے چلے تھے۔ زندگی کا ایک فریب خیال سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ موت اٹل تھی اور موت کا راستہ روک چکی تھی۔ جینے کی امید ایسی ہی تھی جیسے صبح کاذب جھوٹی صبح۔ جو درحقیقت صبح نہیں ہوتی۔ اس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے اور صبح صادق کے ساتھ ہی جلاد آ پہنچتا ہے جو ایک اشارے سے سانس کی ڈوری توڑ دیتا ہے اور دائمی اندھیروں کے خلا میں معلق کر دیتا ہے۔

میں، محسن اور منظر ڈرائنگ روم میں آ پہنچے۔ غالباً منظر نے محسن کو بتا دیا تھا کہ ہم اپنے ساتھ کیا اضافی مصیبت اٹھا لائے ہیں مگر ابھی خود اسے تفصیلات کا علم نہ تھا۔ میں نے ان دونوں کو اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی قید سے رہائی، سنگرالی پہنچنے، غالب کے ایک شکنجے میں پھنسنے، پھر پولیس سے ملاقات اور ڈاکوؤں کے ہاتھ آنے تک کے واقعات سنا دیے۔ محسن اور منظر کو اپنی پریس کانفرنس کی روداد سنا کے میں نے گھڑی دیکھی۔ پون گھنٹا گزر گیا تھا۔

"معلوم نہیں تم لوگ کیا کر رہے ہو اور کیوں کر رہے ہو۔" منظر فریاد کناں لہجے میں کہا۔ "ارے بابا چھوڑو یہ سارے چکر۔ شادی کرو، ہر سال بچے بناؤ۔ پیسہ بناؤ، گھر بناؤ... نام بناؤ۔"

"نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔" میں نے کہا۔

"پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا۔" محسن نے میری تائید میں کہا۔

"وہ سب چیزیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا، جو تم بنانے اور ہمیں بنالے کا مشورہ دے رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ سالا پاگل جو تم کو مشورہ دے کیونکہ تم خود پاگل ہو۔" منظر نے جھلا کے کہا۔ "قسم خدا کی کسی دن تنگ آ گیا تو دوستی سے توبہ کر دوں گا۔"

"بارہ بچوں کا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔" محسن نے کہا۔

"سوائے تیرھواں بچہ پیدا کرنے کے۔" میں نے سر ہلایا۔ "تیرہ کا عدد منحوس ہوتا ہے دوست۔ انگریز تک اسے تسلیم کرتے ہیں چنانچہ کئی بہت مشہور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں تیرھویں منزل نہیں ہوتی۔"

"ہوتی کیا نہیں، وہ بناتے ہی نہیں۔" محسن بولا۔ "تم بھی تیرھویں کو گول کرو۔ اگلا بچہ چودھواں ہونا چاہیے... بیوی کو سمجھا دو۔"

وہ بھڑکا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کو روک لیا اور پھر صوفے پر گرا دیا۔ "ہم اب دو گھڑی کے مہمان ہیں، اب جائیں گے تو پھر نہ جانے کب آئیں گے۔"

"آہا۔ مگر یوں نہ آنا۔" منظر بولا۔ "رات کے وقت سے پہلے ساتھ رقیب کو لیے۔" میں نے کہا۔ "آئے بھی یہاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں۔"

"تم لوگ واقعی خبطی ہو۔ ادھر بم بارود، مار دھاڑ، قتل و غارت گری کو شغل سمجھتے ہو۔ ادھر شاعری کی جان نہیں چھوڑتے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے کہ سب چور ڈاکو قاتل اور تخریب کار دہشت گرد اور شرپسند کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے دیوانِ غالب سے فال نکالتے ہیں۔" منظر بولا۔

"ہم صبح کا تارہ ہیں۔" میں نے کہا۔ "روشنی ہونے سے پہلے ہی غائب ہو جائیں گے۔ مرزا غالب کو ہم نے ایک جگہ تین ہفتے آرام دینے کے لیے منتخب کر لی ہے اور وہ تمہارا یتیم خانہ بہر حال نہیں ہے۔ ان ڈاکوؤں کو ہم بہ قدم خود پولیس کی تحویل میں دیں گے۔ پہلے صبح کے اخبار میں پولیس کا بیان دیکھ لیں۔"

"قسمت کا لکھا کون جانتا ہے۔" منظر آہ بھر کے بولا۔ "ہو سکتا ہے صبح بیان سے پہلے تمہیں پولیس حوالات میں دیکھے۔"

"ہماری وصیت سن لو۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ نماز فجر یہاں ایس ایس پی رضوی صاحب کی آمد متوقع ہے عرفِ عام میں اسے چھاپا کہا جاتا ہے۔ ان کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ سکندر یا محسن نام کے کسی شخص کو تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھا اور غالب... غالب کون؟ اداکاری تم اچھی کر لیتے ہو۔ اسی لیے ایک کامیاب شوہر اور وکیل ہو۔ ممکن ہے وہ سرچ وارنٹ وغیرہ کے ساتھ دھاوا بولیں۔ اپنے سارے بیوی بچے ان کو دکھا دینا اگر بھی جو چاہیں دکھانا اور گھر امانت۔ ہم برآمد نہیں ہوں گے اور تم ایس ایس پی صاحب سے وہ سب کہہ سکو گے جو تمہیں نہیں کہنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ رشوت کھانا حرام ہے۔ پولیس راج ہے اور لاقانونیت ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری بات یہ کہ شہلا یہیں ہے۔ وہ تم سے وقتاً فوقتاً رابطہ قائم کرتی رہے گی۔ ہم اس سے براہِ راست بات نہیں کر سکتے۔ اس سسٹم میں تم ٹیلی فون ایکسچینج کا کام بھی کرو گے۔ اس کے پیغامات ہمیں دو گے اور ہمارے پیغامات اسے اسی طرح تمہارا اور اس کا بھلا۔ متعلقہ ایس آئی اکرام آج کل کراچی میں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تمہیں فون کریں۔ ان سے پتا لے لینا اور جب ہماری کال آئے تو ہمیں بتا دینا۔"

"بہت بہتر۔" منظر بولا۔ "آج سے وکالت کا پیشہ ترک کرتا ہوں اور ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض سنبھالتا ہوں۔ سارے مقدمات مع مؤکلوں کے بھاڑ میں جائیں۔ ان کے لیے پھر وقت ہی کہاں ہوگا۔"

"یار! اتنی بڑی جان لیے پھرتے ہو اور حوصلہ ذرا نہیں۔ ہم جیسے دو کے برابر ہو۔" محسن بولا۔

"اور وہ محاورہ درست مان لیا جائے کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ تو پھر تم گیارہ کے برابر ہو۔" میں نے کہا۔ "گویا تم منظر الیون ہو۔ ایک ٹیم ہو۔"

"میں کچھ نہیں، اُلو کا پٹھا ہوں، پاگل کا بچہ ہوں۔"

"یہ تو تمہارے بارہ لختِ جگر کہہ سکتے ہیں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تم کو اس انکسار کی کیا ضرورت ہے۔ صبح کا اخبار ضرور پڑھنا۔ آج بھی اور کل بھی۔ اور تم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ تمہارے دوستوں نے ایک قابلِ فخر کارنامہ سرانجام دیا ہے اور دنیا ان پر عش عش کر رہی ہے۔ جیل سے فرار ہونے والے دونوں مجرموں کو زندہ گرفتار کر کے ہم پولیس کے شکریے کا لک ملیں گے۔ اس کے بعد ہم چلے جائیں گے کراچی۔ یہاں کے معاملات تمہارے سپرد کر کے۔"

"کچھ تمہارے سپرد، کچھ رضوی صاحب کے، کچھ شہلا کے۔" محسن بولا۔ "مثلاً میرے بچے کی ماں تم نہیں بن سکتے۔ میرے وکیل تم ہی رہو گے۔"

"کیسا وکیل اور کہاں کا مقدمہ۔ بس تاریخوں پر تاریخ لینا ہی میرا کام رہ گیا ہے۔" منظر نے کہا۔ "عدالتیں بھی کب تک ڈھیل دیں گی۔"

"تمہارا یہ دوست ڈاکٹر شہریار، کس حد تک بھروسے کے قابل ہے۔ تم نے اُسے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اس پر اتنا ہی بھروسا کر سکتے ہو جتنا تمہیں مجھ پر ہے۔" منظر نے کہا۔ "جذباتی اور سر پھرا جوان ہے۔ میری بیوی کے لیے جان دے سکتا ہے۔"

میں اور محسن ہنس پڑے۔ "رقیب کو ابھی تک مقتول نہیں کیا تو نے؟"

"رقیب نہیں... وہ سالا ہے۔" منظر بولا۔ "یہ کچھ فلمی اسٹوری ہے۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی جسے شوہر نے قتل کر دیا تھا شادی کی رات۔ بعد میں قاتل کو پھانسی ہو گئی۔ اس صدمے نے ماں کو تقریباً پاگل کر دیا تھا۔ یہاں آئے تو عجیب نفسیاتی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کی ماں نے میری بیوی کو دیکھا تو اُسے دورہ پڑ گیا۔ شہریار نے بعد میں مجھے بتایا کہ میری گھر والی کی صورت ایک سو ایک فیصد اس کی بڑی بہن کی صورت ہے۔ اس نے کچھ مدد مانگی کہ میری بیوی تھوڑی سی توجہ دے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو اس کی ملی نارمل ہو جائے گی۔ عورتیں اس معاملے میں بڑی جذباتی اور رقیق القلب ہوتی ہیں۔ تین مہینے میں بڑی بی نے مجھے ریگو کرلانے کا درجہ دے دیا ہے اور اب ذہنی طور پر مطمئن ہیں کہ یہ بارہ بچوں کی ملی اسی کی بیٹی ہے۔ اتنے سارے نواسے نواسیاں مفت میں مل گئے اور یہ لڑکا شہریار بھی کہتا تو خود کو نارمل ہے مگر وہ بھی یا جی کے چکر میں ایسا پڑا کہ اب دونوں بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں اور بات وہی ہے کہ جورو کا بھائی اک طرف۔ بیوی اپنی محبت کو پہلے بارہ بچوں میں تقسیم کرتی تھی اور بچی کھچی محبت مجھے مل جاتی تھی۔ اب یہ ایک خدائی فوجدار مزید شامل ہو گیا ہے تو میرا نمبر لائن میں بہت پیچھے ہو گیا ہے۔ تاہم مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں خود کام میں اتنا الجھا رہتا ہوں کہ بیوی سے محبت خاک کروں اور بیوی تھی جب تھی۔ اب تو گھر کی ہری بھری کھیتی ہے۔ اچھا ہے اس کا بھائی ہی کچھ محبت کرے۔"

روانی میں منظر خوب بولتا تھا۔ اس کی بات نے ہمیں شہریار کی طرف سے بے فکر کر دیا۔ اسی وقت وہ ہمارے پاس آگیا۔

"میرا کام تو ختم ہوا۔" وہ بولا۔ "اب کچھ دیر سوتا ہوں۔ صبح پھر آ کے دیکھوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "ہم جا چکے ہوں گے۔"

ڈاکٹر شہریار نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ "اچھا۔ تو پھر میں دوائیں لکھ دیتا ہوں۔" اس نے ہمارے قریب بیٹھ کے ایک کاغذ پر چند سطریں گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہمیں منظر نے آپ سے متعارف کرا دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وقت ہوتا تو..."

"سارا مسئلہ ہی وقت کا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "وقت ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں ہوتا۔ خیر کبھی وقت ملے گا تو بیٹھ کے گپ شپ کریں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔" وہ اٹھا اور اپنے بیگ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کلاک نے ساڑھے تین بجے کا ایک گھنٹا بجایا۔ مجھے انکل رضوی کا خیال آیا۔ کیا وہ اب بھی اسی اندھیرے میں اپنے ضمیر سے کیے ہوئے وعدے کی آبرو نباہنے کے لیے اکیلے بیٹھے ہوں گے۔ اتنا بااختیار افسر کتنا بے اختیار ہو گیا۔ صرف اپنے اپنے آپ کو مقامِ انسانیت پر رکھنے کے لیے۔ انھوں نے رضاکارانہ طور پر چار گھنٹے ایک ایسی جیل میں گزار نا قبول کیے جس کی نہ دیواریں ہیں نہ سلاخوں والے مقفل دروازے نہ پہریدار ہیں اور نہ نگراں۔ اگر انھوں نے ضمیر کی زنجیر توڑ دی ہوتی تو اب تک یقیناً اپنی سپاہ کے ساتھ حملہ کر چکے ہوتے۔ ان سے بنیادی نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود میرے دل میں ان کے لیے احترام کا جذبہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا۔

"ہمارے پاس تقریباً ستائیس ہزار روپے نقد ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک گھر میں ہم نے پندرہ سیر سونا دفن کر رکھا ہے۔ امانت ہے لیکن جس کی وہ امانت ہے وہ خود ہم ایسے ایک ... ہمیں اس مدفون خزانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ رابعہ کے ... میں نقد رقم کتنی ہے؟"

"اب تو شاید... ایک لاکھ۔ یا کچھ کم ہوگی۔" منظر ...

"وہ رقم ہمیں مل سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... رابعہ کے دستخط کیے ہوئے دو چیک میرے پاس پڑے ہیں۔"

"کل یہ رقم نکلوا لو۔" میں نے کہا۔ "اس نے ایک ... خسرو جمشید کو بھی تھی؟"

"وہ رقم دوسرے اکاؤنٹ میں ہے۔ اس کا میرے ... کوئی چیک نہیں اور اچھا ہے کہ وہ چار لاکھ پڑے رہیں ... بولا۔ "کبھی تم لوٹ کر آئے اور اپنا گھر بسایا تو کام آئیں گے۔"

"ایک لاکھ میں تم سے کل لے لوں گا۔" میں نے ... ہم چلتے ہیں۔"

ڈاکو پاٹے خاں اور گورا ڈاکو بے ہوشی کی نیند میں تھا ... میں نے اور محسن نے جیپ میں ڈالا۔ جیپ میں پچھلا ... تھی کہ دو افراد کو لٹایا جا سکتا۔ چنانچہ وہ کچھ اوپر کچھ نیچے ... سنبھالا اور میں نے منظر کو خدا حافظ کہا۔ اس نے ہمارے ... سے مسائل حل کر دیے تھے۔ وہ شور ضرور مچاتا تھا ... کسی کام سے نہیں کرتا تھا۔ بزدل نظر آتا تھا مگر دلیر تھا کہ ... دوستوں کی مدد کرتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتا تھا اور بالکل بے پروا ... تھا کہ اس طرح خود اس کی پوزیشن قانون کی نظر میں خراب ہو ... فولادی شکنجے سے نجات پانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا ... ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے ایک ... مہلت کافی تھی۔

"دن کے اجالے میں اس جیپ کو لے کر پھرنا خطر... ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تو مجھے ڈیرہ غازی خان پہنچا کے ... سمیت روپوش ہو جا۔"

"جیپ کو کہاں لے جاؤں؟" محسن بولا۔

"یہ سوچنے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "رضوی صاحب ... تو صبح ہنگامی حالت کا اعلان کر دیں گے۔ وہ کوئی جگہ نہیں ... گے، جہاں ہمارے ملنے کا ذرا بھی امکان ہوگا۔"

"ہم اس پر کور ڈال کے اسے کہیں بھی کھڑا کر سکتے ہیں۔" ... میں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ "مگر کور کہاں ہے؟"

"بہت سی گاڑیوں پر کور ہوگا۔ جو کسی گیراج میں نہیں ... گی۔ ہر گھر میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔" محسن بولا۔ "گلی سڑک ... گیراج استعمال کرنے والے سب کار مالکان کہ کہ ... ڈال دیتے ہیں ..."

"مطلب یہ کہ ہم ایک کور چرا لیں گے؟"

"ہم کور کے نیچے سے کار بھی چرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں لوالیا ... کئی بار کر چکے ہیں؟" محسن نے کہا۔ "ایک کور چوری ہونے سے کار والا مر نہیں جائے گا۔ وہ دوسرا کور خرید لے گا۔ ایک کور اس کی طرف سے ایم آر ایس کو عطیہ برائے جنگ تحفظِ آزادی۔"

کور آسانی سے مل گیا اور آسانی سے اتار بھی لیا گیا۔ مسئلہ اب یہ تھا کہ جیپ کو کہاں کھڑا کیا جائے اور محسن اپنے دونوں کے ساتھ کہاں چھپ کر رہے۔ خود مجھے اس وقت غازی خان کے گھر پہنچنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے خود اس کی خواہش کے مطابق اکیلا جاؤں اور اسے بیوی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے تین ہزار روپے دوں۔ میرا غالب کو ساتھ لے جانا اور اس کی اندھی بیوی کی تیمارداری میں دینا ایک طرح کا سودا ہو جاتا۔ غازی خان مشکل میں پڑ جاتا۔ وہ تین ہزار لینے سے انکار کرتا اور غالب کی ذمے داری بھی بڑی خوشی سے قبول کرتا۔ تین ہفتے تک اس کی دیکھ بھال کرنے کے بعد وہ محسوس کرتا کہ اس نے کسی حد تک احسان کا بدلہ چکا دیا ہے مگر اسے یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہمارے تین ہزار دینے کا مقصد ہی اس کے گھر کو استعمال کرنا تھا۔ غالب کے پاؤں میں اٹکے ہوئے شکنجے کو دیکھ کر اس کے دل میں شک پیدا ہو سکتا تھا اور اگر اسے رازداری سے شکنجے کو کاٹنے کا انتظام بھی کرنا پڑتا تو وہ سمجھ جاتا کہ وہ کام غلط تھا۔ اتنا ہی غلط جتنا جیل سے فرار ہونے والے کی ہتھکڑی بیڑی کاٹنا۔ ہمارے تین ہزار روپے رشوت بن جاتے۔ میں ایک نیکی کو رشوت بنا کے خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اس کا حل مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو چار بج کے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی پینتالیس منٹ تک ہم ایس ایس پی ضامن رضوی صاحب سے محفوظ تھے۔ ابھی وہ گھر نہیں پہنچے ہوں گے تو ان کی بیگم بھی رات آنکھوں میں کاٹ رہی ہوں گی۔ شہلا بھی تشویش کے باعث جاگ رہی ہوگی۔ ان سے بات کرنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے جیپ کو روک لیا۔ سڑک تاحدِ نظر بالکل سنسان پڑی تھی اور ہم ایریا مال کے علاقے میں تھے۔ گشت کرنے والی پولیس کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے میں اندر کی سڑکوں کے راستے دالٹن کی طرف جا رہا تھا۔ ادھر ادھر نگاہ ڈالنے پر مجھے ٹیلی فون کے کئی کھمبے دکھائی دیے۔ سب سے محفوظ کھمبا وہ تھا جو ایک کوٹھی کی پشت اور ایک درخت کے درمیان آگیا تھا۔ میں نے جیپ میں سے اپنا پورٹیبل فون اٹھایا جو ایک حرام خور اور دوسری کی طرف سے ملنے والا بہترین تحفہ تھا۔ اس کی افادیت اب تک متعدد بار ثابت ہو چکی تھی۔

انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملتے ہی پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو۔" میں نے آنٹی کی آواز سنی۔

"آنٹی! صبح بخیر۔" میں نے کہا۔ "سکندر بخت عرض کر رہا ہوں زمین سے دس فٹ کی بلندی سے۔"

"تم آدمی ہو کہ بھوت؟" انھوں نے کہا۔ "خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو اور وقت بھی نہیں دیکھتے۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "بخوبی جانتا ہے کہ آپ کو دو فکریں لاحق ہیں۔ پہلی اپنے شوہرِ نامدار کی۔ وہ بالکل خیریت کے ساتھ صبح ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان گھر پہنچ جائیں گے۔"

"یہ تم کیسے جانتے ہو؟"

"آنٹی... میں دنیا کو ذرا بلندی سے دیکھ رہا ہوں۔ میری نظر میں وہ ہے جسے آپ کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔" میں نے کہا۔ "دوسری فکر آپ کو میری طرف سے ہے تو آپ اطمینان رکھیں۔ میں ابھی آپ سے بات کرنے کے بعد زمین پر خیریت کے ساتھ ایسے ہی اتر آؤں گا جیسے چاند پر قدم رکھنے کے بعد نیل آرمسٹرونگ واپس زمین پر اترا تھا۔ دونوں فکریں ختم... اب آپ بیگم مسماۃ شہلا زوجہ محسن حسن خان شیروانی کے حوالے کیجیے۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "جب تم ایسی بک بک کرتے ہو تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور میں اداس بھی ہو جاتی ہوں۔ تم ہمارے ساتھ ہوتے تو... خیر... بات کرو شہلا سے۔"

"بی بی شہلا! کیا حال ہے؟"

"اچھی ہوں بھائی جان!" وہ بولی۔

"اچھی؟ ارے تم بہت اچھی ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ اکیلی ہو؟"

"نہیں۔ آنٹی ہیں میرے ساتھ۔"

"اچھا تو میری بات دھیان سے خاموش رہ کے سنو۔" میں نے کہا۔ "تم میری بات سننے کے بعد جولی اور کیتھرین کے پاس جاؤ گی۔ ان سے کہنا کہ وہ اسی وقت گھر سے نکل آئیں۔ اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ ہمیں ان کی اشد ضرورت ہے۔ ہم باہر نہر کے کنارے کھڑے ملیں گے۔ وہ نہر کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اپنے ساتھ کچھ بھی لانے کی ضرورت نہیں۔ جولی کی صحت ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔" شہلا نے کہا۔

"پھر تو وہ پیدل چل سکتی ہے۔ وہ پندرہ بیس منٹ میں نہر تک پہنچ جائیں گی۔ اتنی دیر میں ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

"ہم کون؟"

"ارے بھائی میں اور تمھارا میاں... صاف پوچھو نا... میں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے کہا۔" اس نے بھی ایک پیغام دیا تھا مگر وہ اتنا رومانٹک ہے کہ مجھے شرم آتی ہے' وہ ساری باتیں دہراتے..."

"آپ بہت تنگ کرتے ہیں مجھے..."

"ارے سنو بابا... فون مت رکھ دینا۔" میں نے کہا۔ "جولی اور کیتھرین سے کہنا کہ ہوشیاری سے کام لیں۔ کل سے راستے بند ہو جائیں گے۔ شاید گھر پر دوبارہ گارڈ آ جائے گی اور فون بھی ٹیپ ہو گا۔ لیکن ہم تم سے بات کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کل ہم کراچی چلے جائیں۔ نازو اور اکرام شیخ کے پاس۔"

"بھائی جان! رابعہ باجی اور ٹیڈی بھائی کی کوئی خبر..."

"نہیں، ہم جا کے ان کی خبر لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو اطلاع دیں گے۔ یہاں تم منظر سے رابطہ رکھنا۔ تم کو ہمارے بارے میں معلوم ہوتا رہے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔"

میں نیچے اتر آیا اور پھر جیپ میں جا بیٹھا۔ میں نے محسن کو اپنی گفتگو کے متعلق بتایا۔ "میں نے پروگرام بدل دیا ہے۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" محسن بولا۔

"جولی اور کیتھرین کے ساتھ اب ہم ایک گھر کرائے پر حاصل کریں گے۔" میں نے کہا۔ "مکمل صحت یابی تک غالب اسی گھر میں ان کے ساتھ رہے گا۔ اگر ان تین ہفتوں یا ایک ماہ کے عرصے میں کسی کو واپس آنا پڑا تو یہ گھر اس کے لیے ایک ٹھکانا ہو گا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس عرصے میں رابعہ اور ٹیڈی کا سراغ مل جائے گا۔ پھر ہم سب اکٹھے ہو جائیں گے۔"

تقریباً پونے پانچ بجے جب ہم نہر کے بائیں کنارے پر ایک درخت کے پیچھے دبکے ہوئے کھڑے تھے' میں نے پہلے کیتھرین کو اور پھر جولی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کیتھرین اور اس کی بیٹی کی عمر میں دو اور ایک کی نسبت ضرور ہو گی۔ یعنی ماں کی عمر بیٹی کے مقابلے میں دگنی تھی لیکن یہ فرق زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے کیتھرین دبلی پتلی تھی' اس کے آفتابِ حسن کی ڈوبتی کرنوں میں وہی دلکشی کا رنگ تھا جو بیٹی کی جوانی کے طلوع ہوتے سورج کی شفق میں۔ دونوں کے نقوش میں حیرت انگیز مماثلت تھی چنانچہ انھیں پانچ سات سال کے فرق سے چھوٹی بڑی بہن سمجھا جا سکتا تھا۔ جولی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں تھی اور اپنی ماں سے چند قدم پیچھے چلتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ کیتھرین کی نگاہیں پُرتجسس انداز میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔

میں اچانک ان کے سامنے آ گیا۔ "ہیلو آنٹی کیتھرین... صبح بخیر..."

وہ چونک کر رکی۔ "اوہ میں... تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

میں ہنس پڑا۔ "آپ کسی سے ڈرنے والی نہیں ہیں..."

"ٹائم ٹائم کی بات ہے ڈیئر۔" وہ بولی۔ "جب میں اکیلی تو اور مجھے یقین تھا کہ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ آج میں مجھے یہ یقین نہ تھا کہ مجھے جولی کے لیے بھی زندہ رہنا پڑے گا۔ تب میں واقعی نہیں ڈرتی تھی۔"

"اور اب جولی نے آپ کو ڈرنا سکھا دیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ہوتا ہے سکندر... آدمی رشتوں کے ٹوٹنے سے اتنا نہیں محبت سے ڈرتا ہے جو وہ دوسروں سے کرتا ہے۔ یا دوسرے اس سے کرتے ہیں۔ خیر چھوڑو یہ بات۔ جولی سے ملو۔" کیتھرین نے کہا۔

جولی نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "میں تمھارے بارے میں سب جانتی ہوں۔ ممی جب سے واپس آئی ہیں' بہت تم لوگوں کی باتیں کرتی ہیں۔ میں تم سب سے اتنی اچھی طرح متعارف ہوں جیسے تمھارے ساتھ رہ چکی ہوں اور تم میں سے ایک ہوں۔"

وہ بڑی روانی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بھی وہی معصومیت تھی جو اس کے چہرے پر عمر کی ناتجربے کاری کی دلیل بن کر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حسن کے اعتبار سے کوہ قاف کی پری یا مس یونیورس نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ غیر جانبداری سے کام لیا جاتا تو نازو بہ لحاظِ حسن سب سے اوپر تھی۔ پھر رابعہ کا نمبر آتا تھا' اس کے بعد شہو تھی اور جولی ان سب سے کم حسین تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بدصورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بہت تیکھے تھے۔ اس کی ملاحت میں صباحت سے زیادہ رعنائی تھی اور ایک دلنواز جاذبیت تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے ایک طویل عرصہ بیماری میں زندگی کے لیے جدوجہد کرتے گزارا تھا۔ شفایابی کے باوجود اس کا جسم بیماری کے اثرات سے پوری طرح سنبھلا نہیں تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں تھی لیکن اس عمر میں جو صحت مندی شباب کے ساتھ آتی ہے' وہ دب گئی تھی۔ اس کا رنگ بھی اسی لیے کچھ بجھا بجھا سا لگتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی صحت میں بہتری آ جائے گی۔ اس کے رنگِ شباب میں شوخی اور چمک آ جائے گی۔ اس کے رخسار بھر جائیں گے تو گلابی ہوں گے اور مجموعی طور پر وہ نسوانی دلکشی میں کسی سے کم نہ رہے گی۔ ابھی صرف اس کا لہجہ شوخ اور جوان تھا۔ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بال شانوں پر دو چوٹیوں کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ اس سے وہ بالکل اسکول گرل لگتی تھی۔

"بہت دیکھ لیا میری بیٹی کو۔" کیتھرین نے کہا۔ "نظر مت لگا دینا۔"

میں چونک پڑا۔ "کبھی بھائیوں کی نظر بھی لگتی ہے بہنوں کو؟ دراصل اب تک نام ہی نام سنا تھا۔ آج دیکھا تو عجیب سا لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس نے موت کو شکست دی۔ دیکھنے میں تو بہت چھوٹی سی اور کمزور سی اسکول گرل لگتی ہے مجھے۔"

جولی ہنسنے لگی۔ "موت کو میں کیسے شکست دے سکتی تھی۔ میرے ساتھ آپ جیسے بھائی تھے۔ ان کی محبت تھی' ان کا خلوص تھا اور ان کی دعائیں تھیں۔"

"کیا تم اکیلے ہو؟" کیتھرین نے کہا۔

"نہیں، محسن آپ کا منتظر ہے۔" میں نے پیچھے اشارہ کیا۔

"کیسے بے وقوف آدمی ہو۔ یہاں کھڑے باتیں کیے جا رہے ہو۔ چلو یہاں سے اور مجھے بتاؤ کہ اس طرح رات کے وقت میں گھر سے بے گھر کیوں کیا۔" کیتھرین نے چلتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کا گھر تو نہیں تھا آنٹی۔" میں نے کہا۔

"میرا گھر تو اب کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"کیوں؟ آپ کا ایک گھر تھا تو..."

"تھا... جب گھر والا تھا تو واقعی گھر تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے اسے گھر سمجھا کیونکہ اس کی یاد بہر حال میرے ساتھ تھی۔" وہ بولی۔ "اب کچھ بھی نہیں ہے۔ جو بچا تھا' وہ ڈاکو لے گئے۔ صرف دیواریں چھوڑ گئے۔"

"کون ڈاکو...؟"

"وہی ڈاکو جو دن دہاڑے لوٹتے ہیں۔ کبھی قانون کے محافظ بن کے تو کبھی دوستی کا لبادہ اوڑھ کر۔" کیتھرین نے کہا۔ "شرافت کے ٹھیکیدار بن کر یا خدائی فوجدار بن کر۔ کچھ لوگوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہاں ایک فاحشہ رہتی ہے جو خود بھی پیشہ کرتی ہے اور اپنی بیٹی سے بھی پیشہ کراتی ہے۔ ان سب کا پیشہ ہی یہ ہے... عزتوں کو اچھالنا اور عزتوں سے کھیلنا۔ معلوم نہیں پہلے کون اندر گھسا۔ کس نے چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال کیا۔ پولیس نے یا اخلاق اور کردار کے ان خود ساختہ ٹھیکیداروں نے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون پہلے گھسا اور کون بعد میں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سب کچھ لے گئے۔ وہاں تھا بھی کیا۔ وہ امیر تو نہیں ہو گئے ہوں گے' بلکہ ان کو بہت مایوسی ہوئی ہو گی' جو اس یقین کے ساتھ آئے ہوں گے کہ بہرام دادا جیسے شخص نے گھر میں قارون کے خزانے چھپا رکھے ہوں گے۔ سارا مالِ غنیمت زر و جواہر کی شکل میں گاڑ رکھا ہو گا۔ اسے دنیا ڈاکو کہتی تھی۔" کیتھرین تلخی سے ہنسی۔ "زمانے کا اب یہی چلن ہے۔ ڈاکو کو ڈاکو کہنے کی ہمت کسی میں نہیں رہا مگر ڈاکو جسے ڈاکو کہیں' وہ ڈاکو ہو جاتا ہے۔ بنا دیا جاتا ہے' لو مشہور ہو جاتا ہے۔ ان کمینے چوروں نے میری عدم موجودگی میں گھر کا فرش کھود کے رکھ دیا۔ شاید وہ رات کو وہاں مدفون خزانے تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے دیواروں کو ادھیڑ دیا۔ سارا سامان تو وہ پہلے ہی لے گئے تھے۔ انھوں نے فرنیچر کو بھی توڑ پھوڑ کے دیکھا ہو گا کہ کس کھوکھلے خانے میں ہیرے ہیں اور کس خفیہ دراز میں موتی۔ آدمی کے لالچ کی تصویر دیکھنا ہو تو میرے گھر کی دیواروں پر دیکھو۔"

وہ یکلخت چپ ہو گئی کیونکہ محسن ایک زیر تعمیر کوٹھی کے احاطے سے جیپ لے کر نکل آیا تھا۔

ایک بار پھر تعارف کی رسم ادا ہوئی اور جولی نے اسی بے تکلفی سے محسن سے ہاتھ ملایا اور محسن سے ایسے ملی جیسے بھائیوں سے برسوں کی بچھڑی ہوئی کوئی بہن ملے۔ مجھے کیتھرین سے اظہارِ افسوس کا موقع بھی نہ ملا تھا مگر شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ الفاظ کھوکھلے بھی ہوتے ہیں۔ جو دکھ مجھے اس کے گھر کی تباہی کا حال سن کے ہوا تھا' وہ کھوکھلا نہیں تھا۔ آخر قدرت کیا چاہتی ہے۔ وہ سب بے گھر اور جلاوطن' لاوارث اور بے آسرا لوگوں کو ملوا رہی ہے۔ سب کے گھر اسی طرح تباہ کیے گئے۔ جلائے گئے۔ لوٹے گئے یا برباد ہوئے۔ ہر کہانی الگ تھی مگر انجام ایک تھا۔ میرا گھر جو وزیر خان نے بنایا' چوہدری دلاور اور شرافت علی جیسے لٹیروں نے چھینا۔ رابعہ کا گھر اندھی تخریب کاری گرگوں نے بم سے اڑا دیا۔ ٹیڈی ملا تو اس نے بتایا کہ کس طرح اس کا ہنستا بستا گھر متعصب' تنگ نظر اور جاہل... شیطان صفت انسانوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوا۔ غالب کے گھر کی بربادی کا قصہ پرانا بھی تھا اور نیا بھی۔ تازہ ترین واردات کیتھرین پر گزری تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ خدا ہم سب بے گھروں کو اکٹھا کر کے کیا دے گا۔ ہمارے حوصلے آزمانے کے بعد ہمارے صبر کا انعام؟ سب کے لیے ایک ایک نیا گھر۔ نئی خوشیوں کی ضمانت کے ساتھ۔ نئی امیدوں کی روشنی کے ساتھ۔

"مہاراج... گیان دھیان بس کرو۔" محسن نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ میں پھر چونک پڑا۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں بہت زیادہ سوچنے لگا ہوں۔ مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر ہونے کی بیماری سی ہو گئی ہے۔ گزشتہ چند دن میں بارہا ایسا ہوا تھا۔

"اب جیپ میں جگہ نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "اور پانچ بجنے والے ہیں۔"

"گویا خطرے کی گھڑی آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"خطرہ کیسا؟" جولی نے کہا۔

میں ہنسنے لگا۔ "خطرہ تو بس خطرہ ہوتا ہے بہن... ایسا ویسا کچھ نہیں۔ اور ہم تو خطرات کے سمندر میں جینے والی وہ مخلوق ہیں جس نے تحفظ کی زمین چھوڑ دی ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گی تو سمجھ جاؤ گی کہ خطرہ اب ہماری سرشت میں شامل ہو چکا ہے اور جیسے مچھلی بغیر پانی کے نہیں رہ سکتی' ایسے ہی شاید ہم خطرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

"پھر کیا یہیں فوت ہونے کا ارادہ ہے؟" محسن جھلا کے بولا۔

"خان صاحب! آپ اب وہی کریں جو ہم اس قسم کے حالات میں کرتے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے وسائل پیدا کرو۔ میں جاتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہول ایمبولینس لے کر۔"

"ایمبولینس! کہاں ہے ایمبولینس؟" جولی نے کہا۔

"اس جیپ میں تین زخمی اور بے ہوش ہیں۔ اسے ایمبولینس ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔ میں پھر محسن سے مخاطب ہو گیا۔ "جولی اور کیتھرین کے ساتھ تم خاصے معتبر نظر آؤ گے۔ کسی سے لفٹ لے لو۔ کچھ ہی دیر میں گاڑیاں چلنے لگیں گی۔ میں دونوں جنگی قیدیوں کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں پہنچتا ہوں۔"

"اب تو وہ آبائی گھر ہے، میری آپا کا۔" محسن بولا۔ "مگر عزیزم کیا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح تم نے احمقانہ سوال کیا عزیزم۔" میں نے کہا۔ "خطرے سے کون سا گھر خالی ہے۔ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کس سمت میں خطرہ نہیں ہے؟ وہ گھر میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں پچھلی طرف سے اندر جا کے جیپ کو پرانے گیراج میں بند کرنے کی کوشش کروں گا اور تمہارا انتظار کروں گا۔ ڈائریکٹ مت آنا۔"

"سیدھی راہ چلنا ہم بہت پہلے چھوڑ چکے۔ اب چال ہی ٹیڑھی ہو چکی ہے؟" محسن نے کہا۔ "آپ فوراً تشریف لے جائیں اب۔"

میں ویران پڑے ہوئے تاریک گھر میں گیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے نکل آیا۔ محسن اب کیتھرین اور جولی کے ساتھ نہر کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ میں ہاتھ ہلا کے گزر گیا۔ اپنے سامنے میں نے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو بہت دور سے ڈپ ہوتے دیکھا...

جواباً میں نے بھی ڈپر دبایا۔ چند منٹ کے بعد جب میں دو فرلانگ دور آ چکا تھا وہ گاڑی میرے قریب سے گزری۔ یہ ائرپورٹ کی جانب سے آنے والی ٹیکسی تھی۔ تیز رفتاری کے باعث میں دیکھ نہ سکا کہ ٹیکسی میں مسافر بھی تھے یا نہیں۔ اگلے تین میل کی مسافت طے کرتے ہوئے مجھے کوئی گاڑی نہیں ملی۔ میں نے آسمان کو دیکھا جس پر ستاروں کے کارواں کا سفر آخرِ شب کی منزل پر تھا۔ ستارۂ سحری کی تابندگی نے مجھے رابعہ کی یاد دلائی۔ دل میں بیتی ہوئی صبحوں کی کسک جاگ اٹھی۔ ایسی کتنی صبحوں کا درد میرے دامنِ خیال میں تھا۔ جب اس کی اور میری نظر نے ایک ساتھ صبح کے تارے سے امید کی روشنی لے کر اپنے خوابوں میں بھر لی تھی اور اس کی ہر کرن کے ساتھ افق تک سفر کیا تھا جہاں سے امید کی یہ مشعل نئے دن کی نقیب بن کر آنے والی سورج کی پہلی کرن نے لے لی تھی۔ اب وہ کہاں ہو گی؟ مایوسی اور ناامیدی میں اس کے لیے ہر لمحہ کتنا پُرعذاب گزرا ہو گا۔ خیالوں اور خوابوں کی بے وفائی نے اس کے ہر زخمِ تمنا پر کتنے انگارے رکھے ہوں گے۔

میں نے سر کو جھٹکا اور رابعہ کے خیال کو دل سے جدا کر دیا۔ اپنے اختیار میں کچھ نہیں تو پھر سوچ کے کانٹے چُن کر اپنی ہی راہوں پر ڈالنے سے کیا حاصل۔ یہ سفر جاری رہنا چاہیے خواہ اس کی ... کبھی ختم نہ ہونے والی وصل کی شب ہو یا دائمی فرقت کی شب ... جذبۂ عشق سلامت رہنا چاہیے۔ پھر غم کیسا۔ اس دنیا میں ... تو دوسری دنیا میں کون چوہدری دلاور ہو گا جو ملنے سے روک ...

افق پر صبحِ کاذب کے آثار ہویدا تھے کہ میں نے جیپ ... اپنے ماضی اور مستقبل کے گھر میں روکا۔ یہ احساس بہت ... کہ یہ پہلے میرا گھر تھا۔ پھر یہ میرا نہ رہا اور آج بھی ایک جذباتی ... سوا اس گھر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ بے شک اب ... حقِ ملکیت کا خیال امید دیتا تھا کہ ایک دن پھر یہ میرا گھر ہو گا ... اور رابعہ کا گھر۔ وزیر خان مرحوم نے اسے اپنے بیٹے اور بہو کے لیے ... چاہا تھا مگر اس کے خواب بھی ڈاکو لے گئے اور مرتے وقت ... دامنی کے دکھ کے ساتھ دنیا سے گیا۔ کاش کوئی اُسے بتا سکتا کہ ... خواب جو آج جھوٹے ہو گئے، اپنے دامن میں سچ کی تعبیر رکھتے ... اور یہاں بالآخر تمہارا بیٹا اور بہو اسی طرح آباد ہوں گے جیسے ... سوچا تھا۔ وہ جلاوطن خوشیوں کے ساتھ لوٹ کر ضرور آئیں گے ... مگر اُسے کون بتاتا۔ آدمی کا احساس، ماضی سے گزر کر حال کی سرحد ... پر رُک جاتا ہے۔ مستقبل ایک دیوار کے دوسری طرف رہتا ہے ... جس سے نظر کو گزرنا نہیں آتا۔

پچھلی طرف سے میں نے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے میں ہاتھ ... ڈالا اور انگلیوں کی مدد سے ٹٹول کر چٹخنی تلاش کی جو عرصہ دراز سے ... رہنے کے باعث چٹخنی جام ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کو تو ... سا ہلایا اور چٹخنی کو نیچے کھینچنے میں کامیاب ہوا۔ دروازہ کھلا تو ایک ... عجیب سی مہک نے میرا استقبال کیا۔ یہ برسہا برس تک ... تنہائی میں رہنے والی یادوں کی مہک تھی اور محبوس ہوا کی خوشبو ... تھی۔ خانہ ویرانی کی اداس کر دینے والی خوشبو تھی اور درد کی خوشبو ... جسے صرف میرا دل پہچانتا تھا۔ میں چند منٹ ساکت و صامت ... کھڑا ویران دیواروں میں مقید اندھیرے کو دیکھتا رہا جس ... پر پرچھائیاں سی متحرک محسوس ہوتی تھیں۔ میرے والد کے بہت ... روپ سامنے آئے اور اسی اندھیرے میں کھو گئے۔ میں نے ... بوڑھے ریٹائرڈ سیشن جج کا ایک زخمی سایہ بھی دیکھا جس نے ... اپنی عمر کے آخری دور میں یہاں وقت کی قید اسی طرح کاٹی تھی جیسے ... معزول اور جلاوطن شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر نے رنگون میں ... کی آواز آج میرے گھر کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ دو گز زمین ... نہ ملی کوئے یار میں۔ نہ وزیر خان کو، نہ اس بوڑھے جج کو۔

ایک بار پھر میں نے جھٹک کر آوارہ پھرنے والے ... اسیر کیا اور آگے بڑھا۔ دوسرے اور تیسرے کمرے میں گیا اور ... کر باہر آ گیا۔ ایک ایک کر کے میں نے تینوں زخمی اور بے ہوش ... اٹھایا اور اندر لے گیا۔ غالب کا بخار ٹوٹ چکا تھا اور جب ...

... اسے اٹھایا تو ایک ہاتھ سے مجھے وہ شکنجہ بھی تھامنا پڑا جو ڈاکٹر شہریار نے بہت اوپر ایک پٹی کے ساتھ باندھ دیا تھا تاکہ اس کی حرکت سے نیچے کا حصہ زیادہ متاثر نہ ہو۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ میں نے غالب کو باقی دو افراد سے الگ ایک کمرے میں لٹا دیا۔

"سکندر..." اس نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"میری جان غالب۔" میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔

"میں ابھی آتا ہوں۔"

"کیوں... کہاں جا رہے ہو تم... مجھے چھوڑ کر..."

"کہیں نہیں۔ تم کو چھوڑ کے میں کہاں جا سکتا ہوں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ اسی طرح لیٹے رہنا۔ میں دو منٹ میں آیا۔" میں نے کہا اور باہر آ گیا۔

پرانا گیراج عمارت کے دائیں جانب تھا اور اس کا گیٹ لکڑی کا تھا، پرانی وضع کے بھاری کواڑوں والا۔ اس زمانے میں یہ اسٹیل شٹر نہیں تھے جو اوپر سے نیچے کھینچ لیے جاتے ہیں۔ اس دروازے کو توڑنے یا دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کرنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اسے قفل کے بغیر دیکھ کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ اس میں تالا کون لگاتا اور کیوں لگاتا۔ زنگ خوردہ کنڈی سے کواڑ بند کر دینا کافی سمجھا گیا تھا کیونکہ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے باری باری دونوں کواڑ کھولے۔ قبضوں میں تیل نہ ہونے کے باعث صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ میں لوٹ کر جیپ تک آیا اور اسے ڈرائیو کر کے سیدھا گیراج میں لے گیا۔ اس کے ایک گوشے میں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا رہ گیا تھا جس میں ایک پرانا ناکارہ ٹائر بھی شامل تھا۔ جیپ کو میں نے کور سے ڈھانپ دیا تاکہ اس کی شناخت کا ایک فیصد امکان بھی نہ رہے۔ ویسے تو یہ بات ہی بعید از امکان لگتی تھی کہ کوئی اس خانۂ ویراں میں آ کے جھانکے گا۔

میں فارغ ہوا ہی تھا کہ سفید رنگ کی ایک ہل مین کار اندر آ گئی جسے محسن چلا رہا تھا۔ میں نے اُسے اشارہ دیا کہ پیچھے کی طرف جائے۔ جولی اور کیتھرین کچھ پریشان اور خوفزدہ تھیں، کیونکہ انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا کہ ہم راہ چلتے لوگوں سے کار کس طرح چھینتے ہیں۔ محسن نے انھیں خاصی تسلی دی تھی کہ ہم ایسا ضرورت سے مجبور ہو کے کرتے ہیں اور ہمیشہ کار اس کے مالک کو واپس مل جاتی ہے۔

"یہ وہ گھر ہے جہاں سے میں نے ہوش کا سفر شروع کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میرے والد کو اس گھر تک پہنچنے کے لیے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اپنا پورا خاندان قربان کرنا پڑا تھا اور نئے ملک کی سرحد عبور کرنے کے بعد بھی اٹھارہ سال تک جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ یہ میرے بچپن کا گھر ہے۔ میری جوانی اس گھر سے باہر گزری مگر اب اسے پھر رابعہ نے خرید لیا ہے۔"

"ہاؤ ونڈرفل..." کیتھرین نے مسرت سے کہا اور جولی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ جولی نے عجائبات کی ایک نئی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا۔ ہر قدم پر اس کے لیے ایک سنسنی خیز کہانی تھی۔ ایک حیرانی کا سامان تھا اور نیا تجربہ تھا۔

"غالب کو ہوش آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے میں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ دونوں ڈاکو دوسرے کمرے میں ہیں۔ سات ہزار روپے میں لے جا رہا ہوں، چالیس ہزار چھوڑ رہا ہوں۔"

"یہ چارج رپورٹ کیوں دے رہا ہے تو مجھے..." محسن نے کہا۔

"میں تقریباً دو گھنٹے میں واپس آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "گاڑی کو کہاں چھوڑوں؟"

محسن نے مجھے ایک ٹیلی فون نمبر دیا۔ "جہاں بھی چھوڑنا پڑے اس نمبر پر اطلاع کر دینا۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی ہے۔ بہت شریف مگر تھوڑا سا کریک تھا۔ کہتا تھا کہ یہ سب چھینا جھپٹی آخر کیوں ہے؟ کیسے شروع ہوئی۔ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا کہ قصوروار میں ہوں جس نے کار خریدی اور عام لوگوں سے الگ ہوا۔ جو پیدل چلنے والے لوگ تھے، ظاہر ہے وہ مجھ سے حسد کرنے لگے اور میرے خلاف ان کے جذبات کو احساسِ کمتری نے ہوا دی۔ پھر وہ میری تحلیلِ نفسی کرتا رہا کہ میرا منفی ردِعمل میری شخصیت پر کیوں غالب آ گیا اور مسلسل بولتا رہا۔ میں کیا بولتا۔ اسے میں نے اسی کی درخواست پر یونیورسٹی کے نئے کیمپس پہنچا دیا۔ کہہ رہا تھا گاڑی لے جاؤ مگر مجھے ایک ٹیکسی پہلے لا دو۔ کیونکہ میں اتنی دور پیدل نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا کہ چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "کار اس کی اور ڈراپ میں کر دیتا ہوں، ہے نا لطیفہ اس نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا، ورنہ کہتا کہ جناب! مجھے موقع دیجیے کہ میں آپ کو ڈراپ کروں اور گھر جاؤں۔ آخر کار اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا کہ گاڑی نو دس بجے تک پہنچا دینا اور بڑے مہذب طریقے سے یہ خواتین کو وِش کر کے چلا گیا۔ گڈ نائٹ دی لائیکن۔"

"خود باہر نہ جانا۔" میں نے کہا۔ "کیتھرین کو بھیج دینا کسی پاس پڑوس کے گھر میں۔ عورتوں کے لیے مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ کہہ سکتی ہیں کہ ہم نئے آئے ہیں۔ چائے ناشتا وغیرہ لا سکتی ہیں۔"

"اگر پڑوسی اتنے با اخلاق ہوئے تب۔ ورنہ ہم بازار سے منگوا لیں گے۔"

"میں دس بجے تک ضرور آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "امید ہے دوپہر کے بعد ہمیں کہیں نہ کہیں کوئی مکان مل جائے گا۔ ایک اور عارضی ٹھکانا جس کو ہم ضرورت کا تھوڑا بہت سامان خرید کر استعمال کریں گے۔ جولی اور کیتھرین وہاں گمنام رہ سکتی ہیں۔ انکل رضوی کے پاس ان کے خلاف کچھ نہیں کہ وہ انھیں تلاش کریں۔ وہ سمجھ لیں گے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ دونوں ہمارے ساتھ نکل گئی ہیں۔ غالب کے بالکل ٹھیک ہونے تک اس کا لاہور میں ہی رہنا ضروری ہے۔ میں اور تو کراچی چلیں گے؟"

"ضرور چلیں گے۔ ابھی تو آپ جائیں جہاں جانا ہے۔" محسن بولا۔ "صبح ہو گئی ہے۔ دن بہت مصروف گزرے گا۔ رات کو پھر پریس کانفرنس بلانا ہے۔"

"رات کو ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "مکان مل گیا تو ہم اُس گھر میں پریس کانفرنس منعقد کریں گے ... کو پولیس کے کسی سینئر آفیسر کی موجودگی میں پیش کریں گے اور ... مجھے یقین ہے کہ انکل رضوی نہیں آئیں گے۔"

والٹن تک پہنچنے میں چالیس منٹ صرف ہوئے۔ خبطی پروفیسر کی گاڑی بھی اس کے مزاج کی آئینہ دار تھی۔ کچھ گاڑی پرانی تھی اور کچھ بے توجہی کا شکار تھی چنانچہ اس کی رفتار تیس میل سے اوپر جاتی تو گاڑی کا سارا ڈھانچہ کپکپانے لگتا تھا۔ خرابی بال جوائنٹس یا ٹائی راڈ کی تھی جو معمولی خرابی تھی لیکن ہم تو کہتے ہیں کہ چلتی کا نام گاڑی۔ جب تک چلتی ہے چلاؤ اور اچانک بیٹھ جائے یا بٹھا دے تو الزام بھی گاڑی کو دو۔ اس ملک کا پروفیسر یا دانشور غریب شمار ہوتا ہے اور ایسی کار رکھ لے تو بہت غنیمت مگر دکھتا ہے تو روز روز کی مرمت کے خرچے پورے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نئی کار کے نئے ماڈل کو وہ صرف اشتہار میں دیکھ سکتا ہے۔

کسی سے کچھ پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔ چھوٹے لوگوں کے چھوٹے کوارٹرز مجھے دور سے ہی نظر آ گئے۔ یہ گلبرگ کا علاقہ نہ تھا جہاں آدمی ایک ہی بلاک میں کسی کوٹھی کے نمبر کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے اور کس نمی پڑوسد کہ ہمسایا کون ہے۔ کوارٹروں کے درمیان دیواریں مشترک تھیں اور فاصلے اتنے کم تھے کہ دل ملتے تھے چنانچہ سب پرانے لوگ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے تھے اور اجنبی کو ایک نظر میں تاڑ لیتے تھے۔ ایک جگہ میں نے حلوائی کی دکان پر دہی کے حصول کے لیے گھمسان کا رن پڑتے دیکھا۔ یہ لاہور کی صبح کا ایک دلچسپ نظارہ ہے۔ بچے بوڑھے ہر قسم کے ڈول برتن لیے اس جنگ میں شریک ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک جاری رہتی ہے۔ پھر دہی ختم ہو جاتا ہے ... برتن بجاتے تصویر یاس بنے لوٹتے ہیں اور حلوائی کونڈے دھو دُھلا کے سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتے ہیں۔

میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک خشخشی داڑھی والا رضاکارانہ طور پر قریب آ گیا۔ ... ہے او صاب۔" وہ لنگی سے ناک صاف کر کے بولا۔

"مجھے ڈیرہ غازی خان جانا ہے۔" میں نے کہا۔

رضاکار خوشدلی سے ہنسا۔ "اوہ ... تیسرا کوارٹر۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ "جتھے اوکھوتی کھلوتی اے۔ اُس دے نال اے ڈیرہ غازی خان۔"

"مہربانی چاچا جی۔" میں نے کہا اور گاڑی کو کوارٹروں کی تنگ قطاروں سے گزار کے غازی خان کے دروازے تک لے گیا۔ ... وقت وہ اپنی نیلی وردی پہن کے ڈیوٹی پر جانے کے لیے نکلا۔ پہلے کار کو اور پھر مجھے دیکھ کر خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ وہ سیدھا میری طرف لپکا۔

"تھانیدار صاحب! آپ نے غریب کو یاد رکھا۔" اس نے ... طریقہ پر ہاتھ ملا کے کہا۔ "بڑی مہربانی جناب کی۔ بڑی عزت دی ... مولا نے مجھے، سخی داتا خود غریب خانے تک آ گئے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو غازی خان۔" میں نے کہا۔ "مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

ارد گرد کے بہت سے لوگ غازی خان کے معزز مہمان کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ تھانیدار کا لفظ سن کے وہ چونکے۔ ... قریب رہنے والے ایک دوسرے کا شجرۂ نسب تک جانتے ہیں اور انھوں نے آج تک نہ سنا تھا کہ غازی خان کے عزیز و اقارب یا جاننے والوں میں کوئی کاروالا تھانیدار بھی ہے۔ میں فوراً غازی خان کے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے مختصر ترین صحن تھا جس میں ایک بکری بندھی ہوئی تھی اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ صحن کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف باقی دو خانے جن کے بغیر غریب خانہ مکمل نہیں ہوتا۔ کوٹھیوں میں یہ اٹیچ باتھ کہلاتے ہیں۔ پھر ایک برآمدہ تھا جس میں دونوں کوٹھڑی نما کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ہر کوٹھڑی آٹھ فٹ بائی دس فٹ سے زیادہ نہ تھی۔

"کون ہے غازی؟ تو گیا نہیں؟" اندر سے کسی نے پوچھا۔

"گیا تھا نیک بخت ... مگر راہ میں ایک فرشتہ مل گیا۔" غازی خان بولا۔

"کون فرشتہ؟"

"تجھے بتایا تھا نا میں نے کل۔ ایک تھانیدار آیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔" وہ فرطِ جذبات میں کھڑی ہو گئی۔ وہ چالیس سال کی عورت تھی۔ اگر اس کے مقدر میں خوشحالی کا سورج ہوتا تو اس عمر میں بھی شباب کی دھوپ نظر آتی مگر مفلسی اور سختیٔ حالات نے اس سے جوانی کو قبل از وقت چھین لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈاکوؤں نے اس کی بیٹی کو چھین لیا تھا۔ وہ ساٹھ سال کی لگتی تھی۔ اس کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جسم لاغر ہو گیا تھا۔ تاہم صورت کے نقوش میں عہدِ رفتہ کی دلکشی کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ "کیا وہ ... آ گیا ہے ... واقعی آ گیا ہے؟" وہ بولی۔

"ہاں ... یہ دیکھ ... میرے ساتھ کھڑے ہیں تھانیدار صاحب۔"

"سلام تھانیدار صاحب۔" وہ سفید لٹھے کا میلا دوپٹہ سر پہ رکھ کے اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر بولی۔ "غازی نے مجھ سے کہا تھا ... مگر میرا دل نہیں مانتا تھا ... میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے، بہلا رہا ہے مجھے ... ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

"یہ ... غازی خاں کدھر چلا گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔

غازی خاں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے نمودار ہوا۔ وہ کہیں سے ایک کرسی لینے گیا تھا۔ یہ کرسی اس نے کپڑے سے صاف کر کے میرے قریب رکھ دی۔ "تشریف رکھیں جناب۔"

"یہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں بھی تمھاری طرح ایک معمولی آدمی ہوں۔ ایسا ہی گھر تھا میرا بھی۔" میں نے اس کی تسلی کے لیے کہا لیکن پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اُٹھ بھئی بو گے ... مہمان کے لیے کچھ لسی پانی کا کر ..."

"غازی خاں! تکلف میں مت پڑو۔" میں نے کہا۔

"تکلف تو بڑے لوگ کرتے ہیں جناب۔" وہ بولا۔ "ہم غریبوں کے پاس تکلفات کے لیے کیا ہے۔"

"تو اُٹھ ... اب باتیں ہی کرتا جائے گا ... جا کے کوئی مٹھائی لا۔ صاحب جی ... آپ تو چائے ہی پیتے ہوں گے۔" وہ آگے بڑھی۔ "میں بناتی ہوں۔"

"دیکھیے ... میں چائے ضرور پی لوں گا ... مگر یہ مٹھائی وغیرہ بالکل نہیں کھا سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم بیٹھ جاؤ غازی خان۔"

غازی خان کا چہرہ اتر گیا۔ کیونکہ میرا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ "ہاں جناب! اس علاقے میں تو مٹھائی بھی گندی ملتی ہے۔ آپ کے لائق نہیں ہوتی۔"

"اُفوہ۔ تم سمجھتے کیوں نہیں، صبح صبح مٹھائی کون کھاتا ہے۔ تم کو بہت اصرار ہے تو میں ناشتا کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "صبح سے ابھی تک فرصت ہی نہیں ملی تھی۔"

"ناشتا کریں گے آپ!" غازی خان نے مسرت کے جوش میں کہا۔ "میں ابھی حلوہ پوری لے کر آتا ہوں۔" وہ اُٹھا اور ایک دم باہر دوڑ گیا۔ اس نے میری آواز پہ دھیان ہی نہیں دیا۔

"میں چائے بناتی ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے کہا اور ہاتھ آگے رکھتے ہوئے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ "آپ یہ مت سمجھنا کہ میں اندھی ہوں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے سب نظر آتا ہے۔ میرے ہاتھ دھوکا نہیں دیتے۔ مجھے معلوم ہے کون سی چیز کہاں ہے۔" وہ چولھا جلاتے، برتن میں پانی اُبلنے کے لیے رکھتے اور چائے کا سامان اٹھاتے ہوئے بولتی رہی۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے چائے کی پتی ... یہ ہے وہ ڈبا۔ اس کی جگہ مرچ مسالے کا ڈبا اُٹھاتے ہی مجھے پتا چل جاتا ہے۔ حالانکہ ڈبے سب ایک جیسے ہیں مگر سب سے بھاری مرچ ہوتی ہے۔ دھنیا ہلکا ہوتا ہے۔ چائے کی پتی سب سے ہلکی۔"

غالباً وہ خود کلامی کی عادی تھی۔ غازی خان نے بتایا بھی تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کا کچھ اثر اب تک باقی تھا کہ وہ اپنی تنہائی سے بچنے کے لیے خود کو مصروف رکھتی تھی اور خیالوں کو منتشر رکھنے کے لیے بولتی رہتی تھی۔ میں اُسے باورچی خانے میں نقل و حرکت کرتے دیکھتا رہا۔ اس کے پُراعتماد انداز سے ایک ناواقفِ حال شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بینائی سے محروم ہے مگر اپنے گھر کے ... اور اس کی ہر چیز کے ساتھ وہ لمس کی شناسائی کا پیرا نارشتہ رکھتی تھی۔ صرف اس گھر کے اندر وہ اندھی نہیں تھی۔ تصور کی مدد سے اور چھُو کر وہ بصارت کی کمی کے احساس پر قابو پا لیتی تھی۔ باقی دنیا اس کے لیے بے وجود ہو گئی تھی۔

حیرت کی بات ہے کہ وہاں چوراہتی والی، اُبلی ہوئی نصف دودھ کی سفید چائے پیتے ہوئے مجھے وہ لطف آیا جو شیزان کی چائے میں کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہاں چائے میں چاہ کی خوشبو شامل تھی اور خلوص کی سادگی کا رنگ شامل تھا اور سچے جذبوں کی مٹھاس شامل تھی۔ میں نے غازی خان کے اصرار کے بغیر پیٹ بھر کے کھایا اور ایک کے بعد چائے کا دوسرا کپ پیا۔ اس دوران میں غازی خان دست بستہ کھڑا رہا۔ میرے بہت مجبور کرنے کے باوجود وہ چارپائی پر نہیں بیٹھا۔ اس کی بیوی بھی پلنگ کی پٹی پر ٹکی مجھے پنکھا جھلتی رہی اور دعائیں دیتی رہی۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا افسانہ چھیڑے اور اس کی المناک موت کا ذکر کرے لیکن ایسا لگتا تھا کہ غازی خان نے اُسے منع کر دیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں بہت تازہ دم ہو گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ "غازی خان!" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ اپنا وعدہ پورا کروں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے صاب جی۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "مگر ہم پہ اتنا بڑا بوجھ مت ڈالو۔ ہم غریب اتنی بڑی نیکی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔"

"یہ آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ پر کوئی بوجھ نہیں۔ میں قرض نہیں دے رہا ہوں۔ خدا کے لیے انکار مت کریں۔ میں یہاں انکار سننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" میں نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کے الگ کیے۔ "اگر ان سے آپ کی آنکھوں کی روشنی واپس مل گئی تو میں سمجھوں گا کہ یہ خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے ایک نیکی کا ثواب کمانے کا موقع دیا ... یہ موقع وہ کسی اور کو بھی دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایک ہزار میری بیوی نے بھیجے ہیں۔ آپریشن کے بعد دوائیں وغیرہ آئیں گی۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"خدا تم دونوں کو وہ ساری خوشیاں دے، جو اس کے اختیار میں ہیں اور تمھیں کوئی غم نہ دے۔ تم وہ سب پالو جو تمھارے دل کی تمنا ہے۔ تمھارے نصیب میں کامیابیاں ہوں۔" غازی خان کی بیوی نے گلوگیر لہجے میں دعائیں دینا شروع کیں۔ اس نے اپنی سفید چادر کو دونوں ہاتھوں پر پھیلا لیا تھا اور اپنی بے نور آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی۔ چھت کے اوپر... آسمان سے پرے۔ عرش کی بلندیوں پر، وہ براہِ راست خدا کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی تھی، خاموش آنسو اس کے چہرے پر لکیریں بناتے گر رہے تھے۔ میں ایک دم اٹھا اور کچھ کہے بغیر باہر آگیا۔ غازی خان میرے پیچھے لپکا۔

"غازی خان، اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا۔" میں نے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو ترقی دے۔ آپ کا اقبال بلند کرے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔

"میں پھر آؤں گا۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ تم نے آپریشن کرالیا ہے یا نہیں۔ دیر مت کرنا۔ خدا نے چاہا تو تمھاری بیوی دوبارہ دیکھنے لگے گی۔ خدا حافظ۔" میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور وہاں سے بھاگ آیا۔ ان کی دعاؤں اور ممنونیت کے جذبات کے نیچے دب کر میری نیکی کے جذبے کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہمارے لیے چار ہزار روپے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ اس سے دس گنا رقم ہمارے پاس موجود تھی۔ ایسے سیکڑوں چار ہزار ہم نہ جانے کہاں کہاں پھینک چکے تھے۔ ہمارے پاس لاکھوں آتے تھے اور نکل جاتے تھے۔ ہم نے کروڑوں کے سودے ہوتے دیکھے تھے جن میں انسان اپنی شرافت، اپنا ضمیر اور اپنی نیکی سب بیچ دیتے تھے۔ دنیا ہر منٹ میں لاکھوں ڈالرز سگریٹ اور پیٹرول کے دھوئیں کی صورت میں اڑا رہی تھی۔ عورتیں کروڑوں ڈالرز کے ہیرے جواہرات کی خریداری کر رہی تھیں۔ لاکھوں ڈالرز کی پرفیومز کے تحائف وصول کر رہی تھیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں۔ مونٹی کارلو کے جوئے خانوں میں۔ پیرس کے عشرت کدوں میں۔ ٹوکیو کے نائٹ کلبوں میں ہر رات لاکھوں کروڑوں ڈالرز عیش اور عشرت کے اسباب پیدا کرنے میں صرف ہو رہے تھے۔ یہاں صرف چار ہزار روپے میں ایک اندھی عورت سچی، پاک اور قبول ہونے کی ضمانت رکھنے والی دعائیں دے رہی تھی۔ تین ہزار روپے میں آنکھوں کی روشنی پالینا اس کے لیے دولت مندوں کی دنیا کی سب سے مہنگی خوشی سے زیادہ انمول تھا۔ کیا وہ تین ہزار روپے میں اپنی آنکھوں کی روشنی دے سکتی ہے، جو تین ہزار ڈالر کے کمرے میں ایک رات بسر کرنے والی فاحشہ کی ایک مسکراہٹ پر تین ہزار ڈالر قربان کر دیتا ہے۔ ہمارے معیار، ہمارے نقطۂ نظر کے پیمانے، اخلاقی اقدار کے حوالے، پستی اور بلندی۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔

میں بے حد قنوطی اور جذباتی ہو رہا تھا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلبرگ ستھری کا راستا اختیار کیا۔ سرکاری دفاتر کے افسران اب ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لیے نکل رہے تھے اور کاروباری لوگ بھی چنانچہ اس رہائشی علاقے میں بھی مجھے بہت سی کاریں آتی جاتی دکھائی دیں۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں کو پھر سنسان ہو جانا تھا۔ گزرتے گزرتے میں نے ایک گیٹ پر 'ٹولیٹ' کا سائن دیکھا۔ گتے کا ایک چکور ٹکڑا گیٹ پر لٹکا ہوا تھا اور اس پر کسی بدخط نے ٹیڑھے ترچھے حروف بنائے تھے۔ جہاں کال بیل کا بٹن تھا وہیں ایک نیم پلیٹ پر 'ڈیوڈ براؤن' لکھا ہوا تھا۔

گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی ایک شخص گاؤن پہنے عینک ٹھیک کرتا نمودار ہوا۔ گاؤن کے نیچے اس نے دھاری دار پاجامہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دم سیاہ صاحب تھا۔ چھ فٹ لمبا اور سوکھا چہرہ۔ اس کا سر لمبوترا اور بالوں سے بے نیاز تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان کیا۔

"یس؟" اس نے برآمدے میں ہی رک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کیا میں مسٹر ڈیوڈ براؤن سے بات کرسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم اسی سے بات کر رہے ہو۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"گڈ... کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"اگر کوئی کام ہے تو آسکتے ہو ورنہ جاسکتے ہو۔" وہ بولا۔

اس کی بدتمیزی اور بدتہذیبی پر مجھے تاؤ آنے لگا تھا مگر بوڑھا اور سنکی سمجھتے ہوئے میں نے درگزر کیا۔ "اگر اس سائن کا وہی مطلب ہے جو میں سمجھا ہوں..."

"اس کے دو مطلب نہیں ہو سکتے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم کو مکان کرائے پر چاہیے... یس اور نو؟"

"یس..." میں نے کہا۔ وہ اندر لوٹ گیا اور میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں تھا۔ یا اس نے میرے یس کو نو تو نہیں سنا تھا مگر وہ دروازے کا لاک کھولنے کے لیے ہی اندر گیا تھا۔ اس کا الیکٹرک لاک اندر کا کوئی بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ ایسے لاک یورپ میں تو عام تھے مگر ابھی یہاں میں نے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ عموماً یہ بہت دولت کے مقناطیسی تالے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان سے کسی کو الیکٹرک شاک نہیں لگ سکتا تھا۔ ایسا حفاظتی انتظام یہ ظاہر کرتا تھا کہ صاحبِ خانہ خوف کے نفسیاتی مرض کا شکار رہے یا پھر واقعی اپنے دشمنوں کے خلاف مؤثر دفاعی نظام کو اہم سمجھتا ہے۔

اندر وہ اکیلا تھا اور ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑا ہوا تھا۔ جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ "تم نے مکان دیکھا؟"

"جی... کیا یہی مکان کرائے پر دینا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہاں تم کو اس کے علاوہ بھی کوئی مکان نظر آرہا ہے؟" وہ بولا۔

"میرا مطلب تھا کہ یہاں آپ رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جب کرائے دار آجائے گا تو میں اس کے ساتھ تو نہیں رہوں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"کیا میں اندر جا کے ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"تم کو سب کچھ دیکھنے کا حق حاصل ہے۔" وہ بولا۔ "کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔"

میں نے مکان کا جائزہ لیا۔ اس میں ہر چیز پرانی اور فرسودہ تھی جھلک مکان کی ہم عمر نظر آتی تھی اور اس قابل تھی کہ باہر پھینک دی جائے۔ ٹوٹا پھوٹا گھٹا کوڑ فرنیچر۔ گھسے ہوئے کارپٹ۔ رنگ اڑے ہوئے بد رنگ، بے رنگ دیواریں۔ بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے برتن۔ سب مل کر کسی کباڑ خانے کا نقشہ پیش کرتے تھے اور کباڑی وہ تھا جو ہر بات جارحانہ لہجے میں کرتا تھا۔ وہ دو ٹوک بات کرتا تھا اور لہجے کی شائستگی کو بھی غیر ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ مکان ہماری ضرورت کے لیے مناسب ہوگا۔

"مسٹر ڈیوڈ... اس کا ماہانہ کرایہ بتاؤ۔" میں نے اب اسی کا انداز اپنا لیا۔

"اس کا کرایہ ماہانہ نہیں، سالانہ ہوگا۔" وہ بولا۔ "دس ہزار روپے۔"

"ٹھیک ہے، کیا میں دس ہزار ادا کردوں؟" میں نے کہا۔

"پہلے تم کرایہ نامہ وغیرہ بھرو گے اور میرے بارے میں تفتیش کرو گے؟"

"میں خود دیکھ سکتا ہوں کہ تم غلط قسم کے آدمی نہیں ہو۔" وہ بولا۔ "میرا اطمینان کافی ہے۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔ "تم کب تک مکان خالی کرو گے؟"

"میں کسی کرائے دار کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ بولا۔ "ورنہ میں بہت پہلے چلا جاتا۔ اب مجھے دیکھنا ہوگا کہ مجھے کون سی فلائٹ پر کب سیٹ ملتی ہے۔ مجھے کینیڈا جانا ہے۔"

"یہاں کون ہوگا۔ کوئی آنارنی۔ بچہ"

"کوئی نہیں..." وہ بولا۔ "میرا ایک ہی بیٹا ہے جو کینیڈا میں سیٹل ہو چکا ہے... وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے تاکہ میرا دل چیر سکے۔ پرانا دل کچھ مرمت مانگتا ہے۔ چانس برابر ہے کہ ایک سال بعد میں تندرست ہو کے واپس آجاؤں اور اس صورت میں تم کو مکان خالی کرنا ہوگا... فوراً... میں مر بھی سکتا ہوں۔ آپریشن کے دوران... یا کسی اور عارضے میں مبتلا ہو کے۔ کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہوں۔ ایسی صورت میں میرا بیٹا آئے گا۔ مجھے نہیں معلوم کب... جب بھی اسے ضرورت محسوس ہوگی یا فرصت ملے گی۔ وہ مکان کو بیچے گا اور واپس چلا جائے گا۔ ابھی میں نے اس کی بات نہیں مانی ہمیشہ کے لیے کینیڈا چلا جاؤں۔ اگر میں زندہ رہوں گا تو اسی کالے لوگوں کے ملک میں جہاں کوئی مجھے میرے رنگ کے باعث نفرت سے نہیں دیکھتا۔ وہ گوری چمڑی پر احمقانہ غرور رکھنے والے میری نظر میں سفید کتے ہیں۔ جیسے ان کی نظر میں ہم سب کالے کتے ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں کسی کو نفرت اور حقارت کے ماحول میں رہنے سے کیا ملتا ہے؟ صرف پچھتاوا... میں نے زندگی میں بہت عزت کمائی۔ میں بے عزت ہو کے مرنے کے لیے تیار نہیں۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"آپ جو بھی ہیں۔ ایک قابلِ تعریف اور قابلِ تعظیم انسان ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں کرایہ کم نہیں کروں گا۔" وہ بولا۔ "خوشامد کے الفاظ ضائع مت کرو۔"

"میں آپ کو دو ہزار ایڈوانس اسی وقت دے سکتا ہوں، باقی شام تک۔ میں اپنی فیملی کو لانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر میں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ایڈوانس کی ضرورت نہیں مسٹر؟"

"جارج بیک!" میں نے کہا۔ "انشورنس بیوموٹر... میں کراچی سے صرف اسی لیے آیا تھا کہ اپنی فیملی کے لیے کوئی مستقل انتظام کر جاؤں۔ میں ہر وقت سفر میں رہنے والا آدمی ہوں۔"

اس کی صورت کے تاثرات میں میرا نام سن کے کوئی فرق نہیں پڑا۔ "اسے تم مستقل بھی کہہ سکتے ہو لیکن ایک وعدہ تم کو ابھی کرنا ہوگا کہ ایک سال گزر جانے کے بعد تم دوسرے سال کا کرایہ فوراً جمع کرا دو گے۔ میں تم کو بینک کا اکاؤنٹ نمبر دے جاؤں گا اور اس کے بعد کسی بھی وقت میرا بیٹا آئے تو تم اس کو پریشان نہیں کرو گے، جیسا کہ کرائے دار کرتے ہیں۔ اس کے پاس کم وقت ہوگا۔ وہ مکان کو بیچ کر جانا چاہے گا... مقدمے بازی..."

"میں دشمنی میں بھی کمینگی سے نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک کرائے کا سوال ہے تو میں دو سال کا بھی جمع کرانے کو تیار ہوں۔"

"نو... ابھی صرف ایک سال..."

"اس سامان کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب مجھے بہت عزیز ہے؟" وہ بولا۔ "اور اسے تم احتیاط سے ایک کمرے میں رکھ کے کمرا لاک کر سکتے ہو... اسٹور کافی بڑا ہے۔ میری موت کی خبر ملتے ہی بے شک سڑک پر پھینک دینا۔ لیکن واپس آنے کی صورت میں مجھے سب اسی طرح پھر سیٹ کرنا ہوگا جیسا تم اس وقت دیکھ رہے ہو۔"

"آپ کی عدم موجودگی میں کوئی آسکتا ہے؟ جو خواہ مخواہ آپ کا نام لے کر ہمیں پریشان کرے؟"

"کوئی نہیں۔ پچھلے ایک سال سے کوئی نہیں آیا تو اب کون

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کسے گا۔ رشتے دار کوئی نہیں۔ دوست کوئی نہیں۔ ایک خادمہ آتی ہے، اُسے میں نے نوٹس دے دیا ہے۔" وہ بولا۔

"آپ نوٹس واپس لے لیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"

پہلی بار اس کی صورت پر سختی کے آثار کچھ کم ہوئے۔ "تھینک یو مسٹر جارج بلیک... تم نے میری ایک خلش مٹا دی۔"

میں اس سے مصافحہ کر کے روانہ ہوا تو میرا دل غم کے نئے احساس سے بوجھل تھا۔ زندگی کتنے آئینے دکھاتی ہے۔ ہر آدمی کتنے زخم لیے پھرتا ہے۔ عمر کے طویل سفر میں سب کے ساتھ چلنے والا سب سے الگ ہو جاتا ہے۔ کہیں کسی کو راہ میں خوشی کے پھول ملتے ہیں اور وہ کانٹوں کی زبان سے ناآشنا رہتا ہے۔ دوسرا صرف کانٹوں پر چلتا ہے اور پھولوں کے رنگ یا مہکار سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا... میں... میرے ساتھی... غازی خان اور اس کی اندھی بیوی۔ ڈیوڈ براؤن جس سے میں نے جھوٹ بولنے کا گناہ کیا تھا۔ سب کے پاس اپنے اپنے غموں کا الگ حساب ہے۔ سب کو اپنا حساب خود چکانا ہے۔

کار اچانک لڑکھڑانے لگی۔ میں نے اُسے سڑک کے ایک کنارے پر روک لیا اور نیچے اتر کے دیکھا۔ اس کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔ میں نے ڈکی کھول کے دیکھا تو اس میں امتحانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں۔ کم سے کم ایک ہزار کاپیاں جو سب انٹر آرٹس، فائنل اپر کا امتحان دینے والے پرائیوٹ طلبا کی تھیں۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ کار کا کچھ نہیں مگر اس میں ایک ہزار طلبا کے ایک ہزار سال پڑے ہیں۔ کاپیاں گم ہو جائیں یا ضائع ہو جائیں تو سب کے ہزار سال ضائع ہوئے۔ ہر سال کا ہر دن قیمتی ہے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اور اس لمحے کی محنت کا کوئی مول نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بھی کمال کیا کہ کار کے ساتھ ایک ہزار بچوں کا مستقبل بھی محسن کے حوالے کر دیا۔ جب محسن نے انھیں گھر پہ ڈراپ کیا تھا تو ان پر لازم تھا کہ امتحانی کاپیاں تو اتروا لیتے۔ خدانخواستہ محسن نے گاڑی کسی جگہ ڈاکا ڈالنے کے لیے چھینی ہوتی تو یہ پرچے بھی پولیس کی تحویل میں جلتے یا محسن اُسے آگ لگاتا تو اُسے خبر بھی نہ ہوتی کہ اس نے ایک ہزار علم کے طالب جوانوں کی محنت اور امیدوں کو جلا کے خاک کر دیا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ٹائر فلیٹ ہوا تو میں نے ڈکی کھول لی۔ تاہم اس سے میرا مقصد پورا نہیں ہوا۔ گاڑی میں نہ جیک تھا اور نہ اسٹپنی وھیل۔ میں نے گاڑی کو لاک کیا اور چل پڑا۔ میں مسٹر ڈیوڈ کے مکان سے دو میل دور آ چکا تھا۔ مزید ایک میل چلنے کے بعد مجھے پبلک ٹیلیفون آفس نظر آیا اور میں نے پروفیسر کو رنگ کیا۔

"جناب، وہ آپ کی گاڑی..."

"ہاں بھئی... وہ تم ابھی تک لائے نہیں۔" انھوں نے میری بات سُنے بغیر خفا ہونا شروع کیا۔ "آدمی کو وعدہ پورا کرنا چاہیے"

"سر، وہ گاڑی رک گئی ہے۔ ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔"

"تو پھر کیا میں آ کے پنکچر لگاؤں...؟ حد ہے بھئی... وہ لڑکا"

"تم جوان آدمی ہو۔"

"جناب، اس کی ڈکی میں امتحانی کاپیاں ہیں۔"

"ہاں ہیں... یہ تو تمھاری سخت غلط حرکت تھی کہ تم لے گئے اور وہ کاپیاں بھی لے گئے... آخر یہ کیا تھا۔ تمھارے کسی عزیز یا خود تم نے تو امتحان نہیں دے رکھا ہے؟ میں بالکل فیل کر دوں گا رول نمبر بتا دو اپنا..."

مجھے اچانک ہنسی آئی۔ "جناب پروفیسر صاحب... یہ تو آپ کا کام تھا کہ کاپیوں کو یاد رکھتے۔ میں پڑھ لکھ کے عالم فاضل ہو چکا، میرے سب عزیز بھی۔ پنکچر لگانا مجھے نہیں آتا۔ جوان آدمی سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی گاڑی کی چابیاں گاڑی کے اندر ہیں اور گاڑی یہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ آیئے اور لے جایئے۔" میں نے ان کو پتا بتایا اور ان کے شورِ احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

میں ٹھیک دس بجے واپس پہنچا۔ اس وقت تک غالب پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ دونوں ڈاکو بھی ہوش میں تھے اور بُری طرح کراہ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاتا میری نظر اخبار پر گئی اور میں نے اُسے جھپٹ کر اٹھایا۔ اس میں ہماری پریس کانفرنس کا پورا احوال تھا اور ہماری تقاریر بھی شائع ہوئی تھیں۔ دوسری خبر سنگرالی ڈپو سے پکڑے جانے والے دو تخریب کاروں کی اور ان سے برآمد ہونے والے اسلحے کی تھی۔ ہمارے انٹرویو اور اس خبر کی ساتھ اشاعت نے واقعات کے تمام سلسلے ایک کر دیے تھے اور ہمارے دعوے سچ کر دیے تھے۔ میں نے برآمد ہونے والے اسلحے کی تصاویر دیکھنے کے بعد دونوں گرفتار ہونے والوں کو دیکھا۔ غالباً وہ صرف محافظ تھے۔ تاہم ان کو سی آئی اے کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ ابھی ہمارے انٹرویو پر کسی نے تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ آخری وقت میں لگایا گیا تھا۔ لیکن اسلحے کی برآمدگی پر اور اس کے ممکنہ نتائج پر بہت سے بیانات تھے جن میں علیحدگی پسندوں اور غداروں کی مذمت کی گئی تھی۔ ان کے عزائم پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور حکومت سے سخت اقدام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

"ہماری تصاویر دیکھ کر چوہدری ولاور اینڈ کمپنی کو دلی مسرت حاصل ہوگی۔" محسن نے کہا۔

"اب تو ہم اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایم آر ایس نے تمام دھماکوں کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔"

"کیا ہم نے ایسا کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے؟" محسن نے

"وہ جھوٹ اب نہیں چل سکتا تھا کہ ہم چوہدری ولاور سے ... رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یا اس کے کاروبار وراثت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ منشیات کی نوعیت کے بارے میں بے خبر ہیں۔ یہ کا اسمگلر ہے۔ ولاور اور اس کے تمام ساتھی شکاری جان چکے ہیں کہ ہم سے حقیقت پوشیدہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے خلاف تمام تخریبی کارروائی ہم نے کی۔ ہمارا ساتھ کس نے دیا؟"

"لیکن اس کا نتیجہ رابعہ اور ٹیڈی کے حق میں بُرا ہو سکتا ہے۔"

"وہ پہلے کب اچھے حالات میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو وہ ہماری طاقت کا مظاہرہ سمجھتے ہوئے محتاط ہو جائیں۔ دشمن کی قوت برابر تسلیم کر لینے والے صلح پر بھی مجبور ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے مذاکرات کی پیش کش کر سکتے ہیں۔ ابھی ہمیں ردِعمل کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"تو نے پولیس کا بیان دیکھا۔" محسن بولا۔ "ڈاکوؤں کے بارے میں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا اور پورے صفحے پر نظر دوڑائی۔

غالب مسکرایا۔ "آخری صفحے پہ دیکھو... خبر کو بہت غیر نمایاں رکھا گیا ہے۔"

میں نے صفحہ پلٹ کے دیکھا۔ اس میں تصویر صرف اس اودر سیئر کی تھی لیکن بیانات سب کے تھے اور ظاہر ہے اتفاقِ رائے کے بعد جاری کیے گئے تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر نے بتایا تھا کہ وہ دونوں مفرور ڈاکوؤں کو پکڑنے کی غرض سے گشت پہ تھے کہ اچانک جنگل میں سے دونوں ڈاکو ایک کار میں بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ انھوں نے محکمۂ انہار کے ایک اوور سیئر کو ریوالور دکھا کے قابو کر لیا تھا۔ پولیس پارٹی نے ان کا مقابلہ کیا اور مقابلے میں ایک کانسٹیبل خدا بخش نے ملزمان کی گرفتاری کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال اور شدید زخمی ہوا۔ ڈاکو جدید ترین اسلحے سے لیس تھے اور جنگل میں ان کے دیگر ساتھی بھی روپوش تھے جو مقابلے کے وقت سامنے آ گئے اور پولیس کا اسلحہ اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ اوور سیئر نے بھی یہی کہا تھا مگر اس نے زیادہ تفصیل سے بتایا تھا کہ اسے دونوں ڈاکوؤں نے سنگرالی سے واپسی کے راستے پہ کس طرح بیچ سڑک میں آ کے روکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جیل سے فرار ہونے والے ڈاکو ہیں چنانچہ اس نے دونوں کو کار میں بٹھا لیا مگر آگے جا کے انھوں نے ریوالور نکال لیے اور اسے مجبور کیا کہ وہ گاڑی سے اتر جائے۔ دریں اثنا پولیس پارٹی نمودار ہوئی اور ڈاکوؤں سے مقابلہ ہوا۔ ڈاکوؤں کے کچھ ساتھی بھی آ گئے جو مشین گن لیے ہوئے تھے۔ پولیس پارٹی نے بہت جانبازی سے مقابلہ کرتے ہوئے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی طاقت کے بل پر پولیس کا اسلحہ، وردیاں اور جیپ وغیرہ چھین کر فرار ہو گئے۔ وہ خود بھی ایک ڈاکو کی ضرب سے بے ہوش ہو گیا تھا اس لیے وہ نہیں جانتا کہ ڈاکو فرار ہو کے کس طرف گئے تھے۔

مجھے اس بیان پر بہت ہنسی آئی۔ پولیس نے اپنی عزت بچا لی تھی۔ اوور سیئر نے وہی کہا تھا جو ہم چاہتے تھے۔ وہ پولیس کے مقابلے میں ہم سے زیادہ خائف تھا اور خود پولیس کے لیے بھی ایسا ہی بیان دینا ضروری تھا۔ میں نے اس وقت کا تصور کیا جب خود ڈاکو اس بیان کی نفی کریں گے اور پریس کے سامنے اپنی گرفتاری کے متعلق بیان دیں گے۔ اس کے بعد پولیس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ پریس کس طرح ان کے لتّے لے گا اور محکمہ خود ان کے خلاف کیا کارروائی کرے گا۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکو دوسرے کمرے میں تھے چنانچہ ہماری گفتگو نہیں سُن سکتے تھے۔ میں نے محسن اور غالب کو بتایا کہ میں رہائش کا پورا انتظام کرا آیا ہوں اور ان کو مسٹر ڈیوڈ براؤن کے متعلق بتایا۔ پروفیسر کی کار کی بات نے سب کو محظوظ کیا۔ وہ سب لوگ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ محسن نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ کیتھرین کو کسی کے گھر بھیجے۔ اس میں اندیشہ تھا کہ کوئی بہت زیادہ ہمدرد بن کے ساتھ نہ آ جائے۔ وہ ریوالور غالب کو دے کر بازار گیا تھا اور چونکہ یہاں کا بازار اس کا دیکھا بھالا تھا اس لیے وہ پہلے تھرماس خریدنے گیا اور اس میں چائے بھروانے کے بعد واپسی میں ڈبل روٹیاں اور مکھن کے پیکٹ لے آیا۔

"اب یہاں ٹھہرنے کا فائدہ کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ "چل کے گھر آباد کرتے ہیں۔"

"ابھی تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم نے ہمیں وہاں سے... میرا مطلب ہے ایس ایس پی رضوی صاحب کے گھر سے کیوں نکالا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ بعد میں تمھارا نکلنا مشکل ہوگا۔" میں نے کہا۔ "تمھارے وہاں رہنے سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ ولاور اینڈ کمپنی تم کو پھر لے جاتی۔ اس بار تمھارے ساتھ تمھاری بیٹی بھی ہائی جیک ہوتی اور جتنی ہمت یا مستقل مزاجی کا مظاہرہ تم نے اکیلے کیا تھا، شاید جولی کی موجودگی میں ممکن ہی نہ رہتا... جولی تمھاری کمزوری بن جاتی اور تم دونوں کو بچانے کے لیے ہمیں کہیں نہ کہیں جھکنا پڑتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس تم کو جال بنا کے رکھے اور ہم کبھی نہ کبھی اس جال میں پھنس جائیں۔"

"کیا وہاں یہ سب نہیں ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور اگر تم احتیاط سے کام لو۔ میرا مطلب ہے ایسے علاقوں میں بہت زیادہ نہ گھومو پھرو جہاں کسی بھی شکاری کے ملنے کا امکان ہو..."

"شکاری کون؟" جولی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ کیتھرین نے اُسے گھورا۔

"وہ سب جو ہمارے تعاقب میں ہیں، شکاری ہیں۔" میں نے وضاحت کے لیے کہا کیونکہ جولی نے ہماری زبان سے یہ لفظ پہلے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں سُنا تھا: وہ شکاری ہیں جو تمہاری ماں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ پولیس بھی شکاری ہے۔ بہرام دادا کے پرانے دشمن بھی شکاری ہیں۔ ممکن ہے کچھ دوست بھی شکاری ہوں۔ جو تم سے بہرام دادا کی دولت کا پتا لگا کے اس پر قابض ہونے کی فکر میں ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ بین الاقوامی۔ سیاسی نوعیت کے شکاری ہیں۔"

"کیا تم شکاری نہیں ہو؟" جولی نے کہا۔

"ہاں، ہم ان کے شکاری ہیں جو ہمارے شکاری ہیں۔ اس طرح جو یہاں شکار ہے وہی شکاری بھی ہے۔ بات وقت، حالات اور موقع یا نقطۂ نظر کی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تمہاری عدم موجودگی میں خاصی بریفنگ کی ہے۔" غالب بولا۔

"تم نے اپنی ڈیڑھ ٹانگ کے حوالے سے کی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"میں نے جولی کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"چنانچہ میں نے سب بتا دیا ہے۔ ایم آر ایس کے وجود میں آنے کے اسباب اور اس کے اغراض و مقاصد۔ کامیابیاں اور ناکامیاں، عزائم اور ارادے۔" محسن بولا۔ "جولی تقریباً سب سے متعارف ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ عرصے بعد جب یہ بالکل صحت مند ہو جائے گی اور اس کی تھوڑی سی ذہنی تربیت بھی مکمل ہو گی، تو یہ بھی ماں سے پیچھے نہیں رہے گی۔"

"ابھی ہم اپنے جلوس میں زیادہ افراد کو شامل کریں گے تو زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی ہم ایک ٹیم ہیں، شہلا اور جولی اس ٹیم کے لیے باہر رہ کے بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ ویسے تو عبدالودود مستقل ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر شہریار۔ غالب کے صحافی دوست اور بہت سے دوسرے لوگ جنھوں نے اب تک ہماری مدد کی۔ سب ہی ایم آر ایس کے حامی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ آئندہ ہمیں زیادہ منظم ہو کے الگ الگ ٹیم کی صورت میں کام کرنا ہوگا۔ ابھی تک ہم اپنے ہی ملک میں تھے اور ہمیں آمد و رفت کے یا سرحد، پابندیوں کے مسائل درپیش نہیں تھے۔ راستہ آسان تھا اور پیسا اسلحہ بھی مل ہی جاتا تھا۔ ہم کو ان مجرموں کے پیچھے بھارت یا مشرقی پاکستان جانا پڑا تو حالات مختلف ہوں گے۔ فوج کی تنظیم کس طرح ہوتی ہے۔ ایک حصہ پیش قدمی کرتا ہے اور قبضہ برقرار رکھتا ہے۔ دوسرا مواصلاتی رابطہ فراہم کرتا ہے۔ ان کو تم انفنٹری اور سگنل کور کہہ سکتے ہو۔ تیسرا موٹر ٹرانسپورٹ کا ذمے دار ہوتا ہے۔ ای ایم ای۔ چوتھا راشن، کپڑے اور دیگر ضروریات کی فراہمی کرتا ہے۔ سپلائی کور۔ یہ سب ضروریات تو ہماری بھی ہیں مگر ہم نے ذمے داریوں کو تقسیم نہیں کیا ہے۔ آگے چل کر ہر فرد کو ایک ٹیم کی ذمے داری سنبھالنا ہوگی۔ اپنے کارکن منتخب کرنے ہوں گے اور ضروری ہوگا کہ وہ کارکن قابلِ اعتماد ہوں۔ ہر جگہ مقامی آبادی کی مدد کے بغیر گمنام رہ کے اپنی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے مگر ہر جگہ ایسے لوگ مل جاتے ہیں جن کو پیسے یا جذباتی ہمدردی کے نام پر اپنے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے مگر یہ ابھی دور کے مسائل ہیں۔"

"تاہم غور طلب ہیں۔" غالب نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"یہ خیال تو میرے ذہن میں بھی تھا کہ آگے چل کے جنگ شدت اختیار کرے گی تو ہمیں زیادہ منظم ہو کے لڑنا ہوگا۔ اور تنظیم بھی درکار ہوگی۔ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے آج کل کے مسائل سے نمٹ لیں۔"

ہم نے ایک ٹیکسی میں نقل مکانی کی۔ ٹیکسی کو لاہور چھاؤنی اسٹیشن پر چھوڑا اور آدھے گھنٹے بعد وہاں سے دو تانگوں میں ڈیو گلبرگ کے اس مکان میں پہنچے جس کا میں نے نمبر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن راستوں کو شناخت کرتا ہوا میں صحیح پتے تک بغیر بھٹکے پہنچ گیا۔ ڈیوڈ براؤن نے برآمدے میں آ کے مجھے دیکھا اور ہم گیراج کا لاک کھولنے کے لیے اندر گیا۔

میں نے کیتھرین کا تعارف کرایا۔ "یہ میری آنٹی ہیں۔ اور یہ ان کی بیٹی جولیا عرف جولی... میری کزن۔"

ڈیوڈ نے ان سے ہاتھ ملایا۔ "میں سمجھا تھا کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی ہوگی اور یہ تمہاری ساس... اور یہ تمہارا سالا۔"

چونکہ میں سب کو ڈیوڈ براؤن کے مسیحی ہونے کے بارے میں بتا چکا تھا اس لیے بُرا کسی نے نہیں مانا... کیتھرین مسکرائی اور جولی کے منہ در رخسار حیا سے لال ہو گئے۔

"یہ جولی کا بھائی ہے... ایڈورڈ... مگر یہ میرا سالا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ اور اپنی بات پر خود میرے دل نے مجھے وقت کا آئینہ دکھا کے شرمسار کیا۔ وہ وقت کتنی جلدی خواب و خیال ہو گیا تھا۔ جب فوزیہ سے میرا عشق ایک جنون تھا۔ اور اس وقت محسن واقعی میرا سالا تھا۔ اس کی بہن فوزیہ سے میری منگنی کئی سال باقی رہی تھی اور رابعہ کے ملنے تک فوزیہ کے لیے میرے جذبات نہیں بدلے تھے۔ میں محسن کو باقاعدہ سالا اعظم اور جورو کے بھائی جیسے خطابات سے نوازتا تھا اور سارا زمانہ فوزیہ سے میری دائمی رفاقت کے رشتے کو تسلیم کرتا تھا۔ پھر وقت بدلا اور آغازِ شباب کے ناپختہ جذبات کو شعور کی آندھی اڑا لے گئی۔ حالات کے ساتھ دل بدل گئے اور نگاہیں بدل گئیں۔ یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف کاتبِ تقدیر کے پاس ہوگا۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اور آج فوزیہ کا خیال مجھے نہ پریشان کرتا تھا، نہ پشیمان... وہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ ہم دونوں جو ابتدا میں احساسِ بے وفائی کے آزار سے... تلدو فرقت سے اور احساسِ جرم و ذلت سے دل فگار تھے، اب یہ محسوس کرتے تھے کہ شاید وہ عشق نہیں تھا، نادانی کی پسند تھی۔ پرانی وابستگی کے جذبات تھے یا ایک خیال کی گرفت تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ عملی زندگی کی حقیقت برعکس تھی۔ آج ہم نیک نیتی سے تسلیم کرتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے اور اگر ساتھ رہتے تو تباہ ہو جاتے مگر اس حقیقت کو تسلیم کرتے کہ وہ محبت نہیں تھی۔ رابعہ نے زندگی کے ایسے موڑ پر میری رفاقت قبول کی اور مجھ کو محبت کا مطلب سمجھایا، جب مجھے صرف محبت کی ضرورت تھی اور اب میں جانتا تھا کہ محبت کا کوئی دوسرا روپ نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح جیسے سچ ایک ہی ہوتا ہے۔

"جارج..." محسن نے چٹکی بجا کے کہا۔ "واپس آ جاؤ۔"

میں چونکا۔ "سوری... میں تھوڑا سا وہ ہوں۔ تصور پرست اور تخیل کی دنیا میں رہنے والا۔ کبھی کبھی حقائق کی دنیا سے بے سبب اپنی دنیا میں لوٹ جاتا ہوں۔"

"بے سبب کچھ نہیں ہوتا۔" ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ہم سب فرار چاہتے ہیں۔ اس دنیا کے سخت حالات سے لڑتے لڑتے اور مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے اعصاب، ہمارا ذہن اور جسم سب تھک جاتے ہیں۔ اس تھکن کا علاج خواب ہیں، چاہے ہم جاگتے ہوئے دیکھیں یا سوتے ہوئے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ نو... سختی، حالات اور مخالف قوت سے تم غلط مطلب نکال رہے ہو نوجوان..." ڈیوڈ براؤن نے کہا۔ "ایک فنکار کے لیے سازگار ماحول کا نہ ملنا۔ ایک موسیقار کے لیے ایک کمپوزیشن کا پرفیکٹ نہ ہونا۔ مصور کے لیے، اس کے شاہکار کے لیے ایسے خریداروں کا ملنا جو صرف دولت مند ہوں مگر تصویر کا اُلٹا سیدھا نہ سمجھتے ہوں۔ ادیب پر اظہارِ رائے کی پابندی۔ مفکر کی سوچ پر پہرے۔ حریت پسند کے لیے آزادی کی منزل کے حصول کی دشواریاں۔ یہ سب مخالف قوتیں ہیں جو اسے اعصابی و ذہنی شکست دیتی ہیں اور وہ فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے تو خواب دیکھتا ہے۔ ایک سپاہی کی مثال لو جس نے گولیوں کی بوچھار میں، برستے بم کے دھماکوں میں موت کے خونی رقص کو دیکھتے پورا ہفتہ گزارا ہو۔ اُسے خندق میں سکون کے چند لمحے بھی میسر آتے ہیں تو وہ کس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے خواب میں یا تصور میں؟ اپنا گھر، بیوی بچے، زمانۂ امن کی خوشیاں... یہ خواب اس کو سکون دیتے ہیں، ریلیکس کرتے ہیں۔"

"کیا آپ ماہرِ نفسیات تھے... ہیں مسٹر ڈیوڈ براؤن؟" میں نے کہا۔

"ماہرِ نفسیات؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" وہ طنز سے مسکرایا۔ "یہ زندگی کا علم ہے جو زندہ انسانوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے سے آتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے سے آتا ہے اور کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی کسی بھی علم میں خود کو ماہر کہے تو وہ احمق ہے کیونکہ علم ایک پھیلتا ہوا افق ہے۔ تم جتنا اوپر جاؤ گے، اتنا ہی وسیع نظر آئے گا۔ کیا یہ غلط نہیں ہوگا اگر زمین سے اوپر اُڑنے والا خود کو ماہرِ افلاک کہنے لگے۔ خیر چھوڑو یہ بحث... یہ کیا بات ہے کہ تم لوگ خالی ہاتھ ہو! میں نے کسی خانہ بدوش فیملی کو بھی اس حد تک بے سر و سامان نہیں دیکھا۔"

میں نے فوراً ایک غلطی کو چھپا لیا۔ "سامان بعد میں آتا رہے گا۔ ہم لوگ فوری طور پر نئی رہائش میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم چاہتے ہو میں ابھی داک آوٹ کر جاؤں؟"

"اوہ نو... آپ رہیں جب تک آپ کا دل چاہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کے ساتھ رہنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"تھینک یو۔ میرا خیال ہے کل میں کراچی چلا جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "کینیڈا کے لیے مناسب پرواز وہیں سے ملے گی۔"

میں نے بیس ہزار روپے نکالے۔ "یہ دو سال کا ایڈوانس رینٹ قبول کر لیں۔"

"میں نے کہا تھا کہ میں ایک سال سے زیادہ کا کرایہ نہیں لوں گا۔" وہ بگڑنے لگا۔ "مگر تم مصر ہو تو... ٹھیک ہے۔"

میں اور محسن لوٹ کر گئے تو ہمارے سامنے بہت سے کام تھے۔ سب سے پہلے تو ہمیں غالب کی ٹانگ کو شکنجے سے آزاد کرانے کا بندوبست کرنا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر شہریار کی مسیحائی سے اس کی حالت سنبھل گئی تھی مگر وہ شکنجہ بلائے جان بن کے چپٹا ہوا تھا، اور یہ غالب ہی کا حوصلہ تھا کہ اس فولادی کیکڑے کو برداشت کر رہا تھا۔

"یہ کام کون کرے گا؟" محسن نے پوچھا۔ "کوئی لوہار؟"

"ہاں، لوہا کاٹنا تو لوہار ہی کا پیشہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ویلڈر بھی کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم غالب کو ویلڈنگ پلانٹ پر لے جائیں۔"

"ویلڈنگ پلانٹ موبائل بھی ہوتے ہیں، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"ہاں... مگر بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اس کے لیے گاڑی چاہیے۔ ظاہر ہے رازداری کا معاوضہ الگ ہوگا۔ ہر شخص پر اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جسے بھی لے کر آئیں گے، وہ دس قسم کے سوال کرے گا۔ اس بات پر تو کبھی راضی نہ ہوگا کہ اُسے آنکھ پر پٹی باندھ کے لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ محاورہ غلط ہو چکا ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے؟" محسن بولا۔

میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہر عقل مندی کی بات کرنے کا ٹھیکا میرے پاس ہے۔" محسن بولا: "لوہا کاٹنے کی مخصوص آری ہر جگہ ملتی ہے۔ اس کے بلیڈ سخت ترین اسٹیل کے ہوتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"خاک معلوم ہے، کیا فائدہ اس معلومات کا جو وقت پر کام نہ دے۔" محسن بولا۔

"تم نے کون سا وقت پر بتا دیا۔" میں نے کہا۔ "تم اور غالب بھی یہ بات جانتے تھے، پھر کل کیوں نہیں خیال آیا۔ بس وجہ وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"ہاں یار، اس شکنجے کو کل ہی کاٹ کے الگ کیا جا سکتا تھا۔ وہ نرم لوہے کا بنا ہوا ہے۔" محسن بولا: "ہتھکڑی کاٹنا پھر بھی مشکل ہوتا ہے۔"

"اس آری سے ہتھکڑی بھی کاٹی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

ہارڈویئر کی ایک دکان سے ہم نے دو اسٹیل کٹر بلیڈ خریدے اور واپس پہنچتے ہی اس کام میں لگ گئے جو بہت پہلے ہو سکتا تھا۔ غالب نے ہمیں اس کوتاہ بینی پر شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی اور خود شرمندہ ہوا۔ ہم آدھے گھنٹے تک آری کو ایک ہی جگہ رگڑتے رہے۔ اس میں ایک آری ٹوٹی کیونکہ محسن نے زیادہ جوش و خروش دکھایا تھا۔ ایسی ہر آری ذرا سا موڑنے سے خشک لکڑی کی طرح پٹ سے دو ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ بالآخر ہماری محنت رنگ لائی۔ محسن نے ایک گالی دے کر اس شکنجے کو باہر پھینکا اور پھر اس انڈر گراؤنڈ ٹینک میں ڈال آیا جس میں برسوں کا پانی کاہی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔

دوسرے کمرے میں ڈاکو اب چلّانے لگے تھے۔ بھوک اور تکلیف سے ان کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ ان کو کہاں لا کے ڈال دیا گیا ہے۔ مگر ہم میں سے کسی نے ان کو جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی حالت اتنی ابتر تھی کہ وہ شام تک مر جاتے۔ پولیس سے چھینی ہوئی وردیاں اب بھی جیپ میں موجود تھیں۔ ہم نے منظر کے فراہم کیے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے اور ڈاکوؤں نے ہوش آنے سے پہلے ہمیں صرف وردی میں دیکھا تھا۔ اب یہ ضروری تھا کہ ہم اپنی تھانیداری کا بھرم قائم رکھیں اور ان کو شک نہ ہونے دیں کہ ہم پولیس والے نہیں ہیں۔

میں نے باہر جا کے گیراج کا دروازہ کھولا اور جیپ میں سے دونوں وردیاں نکال لایا۔ ایک انسپکٹر کی وردی تھی اور دوسری سب انسپکٹر کی۔ محسن نے خیال ظاہر کیا کہ اب غالب کو بھی کیتھرین اور جولیا کے پاس پہنچا دینا چاہیے۔ میں نے اتفاق کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ دوسرے ضروری کام بھی نمٹا آئے مثلاً کچھ فرنیچر اور گھر میں استعمال ہونے والے برتن خرید لے۔ کیتھرین اور جولی اپنے لیے کپڑے بعد میں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خرید سکتی تھیں لیکن ہمیں دو چار اپنے لیے

جوڑے درکار تھے جو ہماری ظاہری وضع قطع کو بدلنے میں معاون ہوں۔ وہ اپنے ساتھ اس مقصد کے لیے پندرہ ہزار روپے بھی لے گیا۔ میں نے اسے یہ بھی تاکید کی کہ وہ منظر سے رابطہ قائم کر سکے تو ایک لاکھ روپے بھی لے آئے جو اس نے رابطہ کر کے کاؤنٹر سے نکلوائے ہوں گے۔

جب وہ ٹیکسی کی تلاش میں نکل گیا تو میں نے غالب سے کہا: "آج پھر تم کو اپنے اخبار نویس ساتھیوں کو بلانا ہے۔"

"ہاں، میں سوچ رہا تھا کہ کیا پھر انہی کو بلاؤں۔" غالب بولا۔

"کسی اور کو بلانا مناسب نہ ہو شاید۔" میں نے کہا۔ "ان کو اشارہ دے چکے ہیں کہ ہمارے پاس جیل سے فرار ہونے والے ملزم کی اسٹوری بھی ہے۔ یہ اسٹوری بھی ان کو ملے گی تو وہ ہم سے پورا تعاون کریں گے۔ ظاہر ہے ان کی تو دھاک بیٹھ جائے گی۔"

"ہاں... لیکن دوسرے مایوسی کے ردّ عمل کا شکار ہو کر تو ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔" غالب نے کہا۔ "اور شکاری دوسرے بھی ہیں مگر سب سے خطرناک شکاری یہ صحافی ہوتے ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تمہارے طے کرنے کا مسئلہ ہے، تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ ایک بات اہم ہے کہ وہی آئے جو ہم... کے قابل ہو۔"

"کل میں نے انہی کا انتخاب کیا تھا جو میرے نزدیک قابلِ اعتماد تھے۔" وہ بولا۔ "آج کس پولیس افسر کی موجودگی میں بلانا ہوگا؟"

"سب سے اچھا تو یہی ہوتا کہ خود رضوی صاحب آتے جو اس کیس کی تفتیش بھی کر رہے ہیں۔" غالب نے کہا۔

"ہمارے بلانے سے وہ ہرگز نہیں آئیں گے۔ اور اگر آئیں گے تو یہ بات یقینی سمجھو کہ واپسی میں ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا: "وہ کوئی ایسا بندوبست کریں گے کہ ہمیں خاک بھی پتا نہیں چلے گا اور ہم محصور ہو جائیں گے۔"

"رپورٹر یہ کام کر سکتے ہیں۔" غالب نے کہا۔ "وہ پہلے رضوی صاحب سے بات کر لیں کہ مفرور ڈاکوؤں کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر گرفتار کرا سکتے ہیں۔ بہت فائدہ ان کو ضرور ہوگا۔ محکمہ اگر رزلٹ پر نظر رکھتا ہے تو پھر اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہاں اور کیسے پکڑے گئے اور کس کے ذریعے پکڑے گئے۔ بیشتر جرائم کا سراغ مخبر دیتے ہیں۔"

"مگر یہاں تو کان کو اُلٹی طرف سے پکڑنے والے بیٹھے ہیں جو سیدھی سی بات نہیں سمجھیں گے۔" میں نے کہا۔ "سوال یہ کریں گے کہ ڈاکوؤں کو اخبار والوں کے سامنے لانے والے خود مجرم تھے، وہ کیسے نکل گئے اور ایس ایس پی صاحب نے دو خطرناک ملزم خود نہیں پکڑے مگر خود اس کوتاہی کے مرتکب ہوئے کہ دو خطرناک ملزم اتنی دیدہ دلیری سے فرار ہو گئے۔"

"اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔" غالب نے کہا: "فرض کرو کہ ہم اخبار والوں کو پہلے بلا لیں۔ ان کے سامنے ڈاکو اپنا بیان دیں اور جو سوال جواب ہونا ہیں ہو جائیں۔ وہ تصویریں وغیرہ لیں اور چلے جائیں۔ پھر ہم انکل رضوی کو فون کریں اور بتائیں کہ وہ اپنی نفری لے کر جائیں اور فلاں جگہ سے ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیں۔ اس طرح گرفتاری کا کریڈٹ انھیں مل جائے گا مگر ہمیں گرفتار نہ کرنے کی کوتاہی کا الزام ان پر نہیں آئے گا۔"

"آئیڈیا۔" میں نے کہا: "مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارے وہ یار اس وقت کہاں ہوں گے۔ میرا خیال ہے گھروں پر لمبی تان کے سو رہے ہوں گے۔"

"ہاں۔ رات کی مخلوق ہیں نا..."

"تمھیں ان کے ٹھکانے معلوم ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اب بھی وہیں ہوں گے جہاں پہلے رہتے تھے۔"

"تو فون مت کرو۔ جاتے ہوئے ہر ایک کو گھر پر پیغام دے جاؤ کہ تیار رہیں۔ اور جب محسن آئے تو اس کے ساتھ وہ بھی آ جائیں۔" میں نے کہا۔

باہر ایک گاڑی کے رُکنے کی آواز پر میں سمجھ گیا کہ محسن ٹیکسی لے آیا ہے۔ میں نے اور محسن نے غالب کو ٹیکسی میں شفٹ کیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ مجھے امید تھی کہ راستے میں غالب خود محسن کو سارا پروگرام بتا دے گا۔

اب میں نے تھانیدار کی وردی پھر پہنی اور ریوالور ہاتھ میں لے کر ڈاکوؤں کے سامنے گیا۔ وہ واقعی سخت تکلیف میں تھے اور مجھے دیکھتے ہی گڑگڑا کے بلبلانے لگے۔

"بلّے خاں... اور گورے خاں۔" میں نے کہا: "تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں... تھانیدار..." پاتے خاں بولا۔ "آخر ہمیں یہاں کیوں رکھا گیا ہے؟"

"تمھاری گرفتاری کی خبر ابھی پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ آج ایک خصوصی ٹیم تم سے تفتیش کرے گی۔" میں نے کہا۔

"ہم کچھ نہیں بتائیں گے... بس پھانسی چڑھا دیں ہمیں۔" وہ چلّایا۔

"تم کو تقدیر نے ایک موقع فراہم کیا ہے۔" میں نے کہا: "تم اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو... سچ بول کر..."

"سچ بول کر۔" گورے ڈاکو نے تلخ لہجے میں کہا: "تو پاگل ہے تھانیدار... سچ ہی تو آدمی کو پھانسی لگواتا ہے۔"

"یہ ذرا مختلف صورت حال ہے۔" میں نے کہا: "تمھارے فرار کے بعد بہت سے ذمے دار لوگ معطل ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم سچ بتا دو کہ تم کس طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوئے، کس طرح دوبارہ پکڑے گئے تو مقدمے کی سماعت پھر شروع ہو گی اور اس میں نئے معاملات

اُٹھائے جا سکتے ہیں۔"

"مشکل ہے۔ اب کوئی ہمیں نہیں بچا سکتا۔"

"تمھارا کیس اخبارات میں دیا جا رہا ہے۔" میں نے کہا: "حکومت کے نوٹس میں بہت سی باتیں آ سکتی ہیں جو آج تک نہیں آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ تم نے اپنا سارا مقدمہ جھوٹ پر لڑا۔ اب سچ بول کے تم حالات کی دوسری تصویر پیش کر سکتے ہو۔ مثلاً تم تفصیل سے بتاؤ کہ تم ڈاکو کیسے بنے۔ کس نے تمھاری سرپرستی کی۔ کون کون پولیس افسر تم سے مال کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے خلاف جانے والی بات بھی کہہ دو... صاف بتا دو کہ پولیس والے کھاپی کے کہاں سو رہے تھے، ان کی جیپ کہاں کھڑی ہوئی تھی اور... تم نے ان کے ساتھ بیٹھ کے کیا کھایا۔"

وہ دونوں تعجب سے میری صورت دیکھنے لگے۔ "یہ بھی بتا دیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا: "ہماری فکر مت کرو... یہ کوئی بڑا الزام نہیں ہے۔"

"تم کہتے ہو گرفتاری کے بعد پھر مقدمہ چلے گا؟" پاٹے خاں بولا۔

"ظاہر ہے، نئے بیان کی روشنی میں سماعت دوبارہ ہو گی۔" میں نے کہا۔ وہ میرے جھانسے میں آ گئے تھے کیونکہ وہ قانون سے ناواقف تھے۔ انھیں امید کی ایک کرن درکار تھی جو میں نے انھیں فراہم کر دی۔

"ایک صورت اور بھی ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

وہ میری صورت دیکھنے لگے۔

"تم سلطانی گواہ بن جاؤ۔" میں نے کہا: "دونوں اپنے گروہ کے تمام جرائم کا اعتراف کر لو۔ سب کے پتے ٹھکانے بتا دو اور سب کو گرفتار کرا دو۔"

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" گورا ڈاکو نے کہا۔

"ہم... ہم اپنے ہی سنگی ساتھیوں کے ساتھ دغا کریں۔" پاٹے خاں بولا۔

"زندہ رہنا ہے تو پھر کچھ کرنا ہی ہو گا۔" میں نے کہا: "یہ تو زمانے کا دستور ہے۔ کوئی بھی دوسروں کی خاطر جان نہیں دیتا۔ وہ کون سے تمھارے جگری دوست تھے۔ ہم پیشہ تھے اور بس... ایک غلط کام کے لیے تم سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ تم عدالت کے سامنے تائب ہو سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ ہم آئندہ شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں... تمھارے سب ساتھی اندر ہو جائیں گے اور تم کو قانون کی مدد کرنے کی رعایت ملے گی۔"

"لیکن... وہ ہم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے... ہمارے ساتھی۔"

"وہ جیل میں ہوں گے۔ کچھ لٹک جائیں گے۔ کچھ عمر قید کاٹیں گے۔ باقی کو لمبی سزائیں ہوں گی۔ ان کے باہر آنے سے پہلے ہی تم روپوش ہو سکتے ہو۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ جہاں چاہو چلے جانا۔ لیکن پہلے سوچ لو کہ زندہ رہنا چاہتے ہو یا نہیں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہ سوال آہستہ آہستہ غیر ضروری ہوگیا تھا۔ ان کی آنکھیں جھوٹی امید کی روشنی دیکھنے لگی تھیں۔ جو شخص تختۂ دار کے اتنا قریب ہو، اس سے کیا پوچھنا کہ زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہو تو بتاؤ۔ اس وقت وہ زندگی کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ پلٹے خاں اور گورا ڈاکو بھی سوچنے لگے تھے کہ اس طرح زندگی مل سکتی ہے تو کیا ہے... یہ غداری ہو یا بے وفائی۔ بزدلی ہو یا نامردی، ایسے دس الزام لے کر بھی زندگی کا سودا کرنا مہنگا نہیں ہوگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا داؤ چل گیا ہے۔ اب وہ میری مرضی کے مطابق بیان دیں گے اور ادھر اخبار والوں کے ہاتھ ایک دلچسپ سنسنی خیز کہانی لگے گی، ادھر انکل رضوی کو موقع ملے گا کہ وہ دونوں ڈاکوؤں کے باقی گینگ کو بھی گھیر لیں... اور یہ ان کی بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی۔ میں نے انھیں تنہا چھوڑ دیا کہ وہ اچھی طرح سوچ لیں اور آپس میں مشورہ بھی کرلیں۔

اس کمرے کے باقی دروازے باہر سے مقفل تھے۔ کھڑکیاں قدرے غیر محفوظ تھیں مگر مجھے ان دونوں کی حالت ایسی نظر نہیں آتی تھی کہ وہ اٹھ کر کھڑکی کے راستے کود جائیں اور نکل جائیں۔ مجھ پر کچھ تھکن غالب تھی۔ وردی اتار کے اور اپنے کپڑے پہن کے میں دروازے کے قریب لیٹ گیا۔ سگریٹ ابھی آدھا ہی ختم ہوا تھا کہ مجھے نیند نے آلیا۔ پھر میں کسی گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر جاگا۔ میں ایک دم اٹھا اور ریوالور لے کر باہر آیا مگر آنے والے محسن کے ساتھ آئے تھے اور وہی اخباری رپورٹر تھے جنھوں نے گزشتہ رات ڈائنرز کلب کے آفس میں ہم سے ملاقات کی تھی۔ وہ بہت خوش تھے کیونکہ ان کی خبر نے بہت بڑا دھماکا کیا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے حیران اور پریشان تھے کہ یہ سب تفصیلات ان کو کیسے ملیں مگر قانوناً وہ کسی بھی اخبار نویس کو ذریعۂ اطلاع بتلانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں خبروں نے نیچے سے اوپر تک تہلکہ مچا دیا ہے اور آنے والے اخبارات میں مزید طوفان کھڑا ہوگا۔ مجموعی طور پر اخبارات کا رویہ ہمارے حق میں ہمدردانہ ہوگا۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ ہمیں آہستہ آہستہ ہیرو بنا دیا جائے۔ یہ ثابت کیا جائے کہ ہم سازش کا شکار ہوئے۔ سازش کرنے والے غدار اور ملک دشمن عناصر تھے جن کی مدد پولیس نے کی۔ اس کے بعد تحریک چلائی جائے کہ ہمارے خلاف مقدمات واپس لیے جائیں۔

یہ بڑی خوش آیند خبر تھی۔ میں نے ان کو بتایا کہ دونوں ڈاکو آمدہ ہیں اور حالات کا تقاضا ہے کہ میں ان کے سامنے نہ جاؤں۔ محسن بھی پولیس کی وردی میں رہے گا اور اخبار والے ان کا مفصل بیان لینے کے بعد جتنے سوالات کرنا چاہیں کرسکیں گے۔ غالب اپنا بیان دے چکا تھا۔ میں نے بھی وہی کہا جو غالب نے کہا تھا کہ یہ ڈاکو پولیس پارٹی سے ان کی جیپ، رائفلیں، ریوالور اور وردیاں لے کر فرار ہو رہے تھے کہ ہم سے مڈبھیڑ ہوگئی اور ہم نے انھیں پکڑ لیا۔

ان کا خیال تھا کہ ہم خالی ہاتھ ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم نے خود کو احمق قسم کے دیہاتیوں کے روپ میں پیش کیا اور ان کو قابو کرلیا۔ اس موقع پر میں نے بتایا کہ میں کراٹے اور مارشل آرٹس سے واقف ہوں اور خالی ہاتھوں سے ایسے لوگوں کو پکڑ سکتا ہوں۔ غالب کے دوستوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہماری بہادری کا یہ قصہ خوب بڑھا چڑھا کے لکھیں گے۔ بہت جلد یہ قصہ ایک سزا یافتہ اور مفرور مجرم کا نہیں، ایک حیالے نوجوان کا بن جائے گا جو ظلم اور استبداد کے خلاف نبرد آزما ہے اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ ملک دشمن عناصر کو نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ ان عناصر کے حامی بیوروکریٹ اور بے ضمیر انتظامیہ کے افراد میرے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ محبِ وطن نہیں ہیں اور بک چکے ہیں۔

ڈاکوؤں نے میری توقع کے مطابق بیان دیا۔ محسن دوبارہ وردی پہن کے اندر گیا اور اس نے کہا کہ وہ خصوصی تفتیشی ٹیم کا افسر ہے۔ اگر ڈاکو سچ بولیں گے تو وہ رپورٹ میں ان کے لیے رعایت کی سفارش بھی کرے گا اور اگر وہ چاہیں گے تو ان کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا اور یہ ممکن ہے کہ ان کی سزا معاف کر دی جائے۔ یہ سب جھوٹ آف دی ریکارڈ رہا۔ محسن نے رپورٹرز کو پہلے ہی بریف کر دیا تھا۔

گورے ڈاکو نے ایک گھنٹے میں بتایا کہ وہ کس طرح ڈاکو بنا، کیسے جیل سے فرار ہوا۔ اس نے کہاں کہاں واردات میں پولیس کی مدد لی یا ان کو شریک کیا۔ وہ کس کس کو بھتا دیتا رہا تھا۔ اور آخر میں اس نے اپنی گرفتاری کا احوال سنانا شروع کیا کہ انھوں نے جنگل میں پولیس کو دیکھا۔ دو تھانیدار تھے جو جیپ کے پاس سو رہے تھے۔ انھوں نے دعوت اڑائی تھی اور کھانے میں مرغ، نرگسی کوفتے اور حلوہ کھایا تھا۔ یہی سب کچھ انھوں نے بھی کھایا اور پولیس والوں کا اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کر دیا۔

محسن کے اشارے پر اس نے اپنا بیان ختم کر دیا۔ یہ طے تھا کہ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہیں۔ گورے ڈاکو نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب وہ جن پولیس والوں کی تحویل میں ہیں ان کی ہر بات ماننا لازم ہے کیونکہ وہی ان کو بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پولیس والے پہلے بھی ان کے مددگار رہے تھے چنانچہ یہ کوئی انوکھی اور حیران کن والی بات نہ تھی۔ ڈاکو سمجھتے تھے کہ اس مدد کی قیمت پولیس کو بعد میں ادا کرنا ہی ہوگی۔ پلٹے خاں کی سوانح حیات قدرے مختلف تھی اور اس میں پولیس کے دو سرکردہ بدعنوان افسران کے نام آتے تھے جو اس کے دوست اور دشمن رہے تھے لیکن وہ بنیادی بات دونوں کے بیان میں مشترک تھی۔ پولیس کا وہ غلام تھا۔ وہ سب پولیس افسر بھی موجود تھے اور ترقی بھی پا چکے تھے۔ جن کے نام انھوں نے لیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس بیان کی اشاعت کے بعد وہ ڈاکوؤں کی بات کو جھوٹ کا پلندا، بہتان تراشی اور اخبار والوں کی سازش قرار دیں گے۔ انھیں سچا تسلیم کیا جائے گا کیونکہ وہ حاکم اور با اختیار ہیں اور سچ بولنے والے مجرم اور بے بس ہیں۔ وہ کوئی ثبوت بھی نہیں رکھتے۔ اس پورے نظام میں سچائی صرف وہ ہے جو ثابت کی جاسکے۔ پلٹے خاں کو بھی اسی جگہ روک دیا گیا جہاں اس کے ساتھی گورے ڈاکو کو روکا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ وہ پولیس کے دو تھانیداروں سے جیپ اور سرکاری اسلحہ چھین کر انھیں بے بس کرنے کے بعد فرار ہوگئے تھے۔

اس کے آگے ہمارا بیان تھا کہ ہم نے ان ڈاکوؤں کو پولیس کی وردیوں میں پولیس کی جیپ چلاتے دیکھا اور شناخت کر لیا۔ ان کو روکا اور ناک آؤٹ کر کے یہاں لے آئے۔ ہمارے اس بیان کا ڈاکوؤں کو بالکل علم نہ تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ بعد میں بیان بدل سکتے۔ اخبار نویس سب سمجھ رہے تھے مگر ان کی دوستی غالب سے تھی۔ پولیس کے وہ بھی اتنے ہی دشمن تھے جتنی عام پبلک تھی۔ شاید اس سے زیادہ ہی کیونکہ وہ بہت سے ایسے معاملات کی خبر بھی رکھتے تھے جو اندر سے کچھ تھے اور باہر سے کچھ اور دکھائے جاتے تھے۔ انھوں نے میرے اور محسن کے مشورے سے ڈاکوؤں کے اور ہمارے بیانات کو ریکارڈ کیا۔ ڈاکوؤں کی تصاویر اتاریں۔ پھر جیپ کی تصویریں لیں۔ وردی اور اسلحے کو پھیلا کے تصاویر بنائیں۔ اس طرح کہ ہر وردی پر لکھا ہوا نام واضح رہے اور ریوالور اور رائفل کا سیریل نمبر نمایاں ہو۔ انھوں نے شناختی کارڈ وغیرہ کی تصویریں بھی اتاریں اور پھر ہم سے ہاتھ ملا کے اور ہمارا شکریہ ادا کر کے بھاگ گئے۔ انھیں شام تک بہت کام کرنا تھے۔ اب ہمارا وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔

میں نے اور محسن نے اس نمائش کو اسی طرح چھوڑا جس میں پولیس کی وردیاں، ان کا اسلحہ اور شناختی کارڈ وغیرہ کمرے کے فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ جیپ کو گیراج سے نکال کے باہر کھڑا کیا۔ اپنا پورٹیبل فون اٹھایا اور اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا کے نکل گئے۔ قریب ترین ٹیلی فون بوتھ پر پہنچ کے میں نے انکل رضوی کے آفس کا نمبر ملایا مگر آواز بدل کے بات کی۔ انھیں بتایا کہ جیل سے فرار ہونے والے دونوں ڈاکو کہاں گرفتار کیے جا سکتے ہیں۔

"تم کون ہو... سکندر...؟" انھوں نے کہا۔ "آواز بدل کے دھوکا دیتے ہو؟"

"سکندر؟ سکندر کون؟ ہم پورس ہیں۔" میں نے کہا اور فون منقطع کر کے آ گیا۔

"تو نے سب کام کر لیے تھے۔" میں نے محسن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "غالب نے راہ میں دو گھنٹے لگا دیے۔" محسن بولا۔ "اس کے لیے صحافی دوست عجیب و غریب گلی کوچوں میں رہتے ہیں۔"

"اور کیا صحافی گلبرگ میں رہیں گے۔ وہ بھی پاکستان کے صحافی؟"

"ہر گلی میں ٹیکسی نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے اتر کے پیدل جانا پڑتا تھا اور سونے والے کو جگا کے لانا پڑتا تھا۔" محسن نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اسباب خانہ داری بھی نہیں پہنچا؟"

"کچھ پہنچ گیا... کانے صاحب کی تسلی کے لیے۔" محسن بولا۔ "راستے میں ایک پرانے فرنیچر کی دکان اتفاق سے آگئی۔ میں نے جو نظر آیا وہ خرید لیا۔ چار پرانے بیڈ ملے۔ دو ڈبل دو سنگل... میز، کرسیاں... ایک الماری۔ بائیس سو روپے میں کام چل گیا اور لینڈ لارڈ کو شک نہیں ہوا۔ فرنیچر استعمال شدہ نہ ہوتا تو وہ مزید پوچھتا۔ ایک بیڈنگ اسٹور سے تکیے چادریں لے لیے تھے۔ بس برتن رہ گئے ہیں۔"

"اور وہ فرنیچر... کیا وہ بھی ٹیکسی میں ڈال لیا تھا؟"

"اسے پتا سمجھا دیا تھا۔" محسن بولا۔ "دکاندار نے کہا کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہمارے آدمی سارے شہر میں پھرتے ہیں۔ ہر پتا ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب تک پہنچ گیا ہوگا۔"

"کیوں نہ ہم باقی شاپنگ کر لیں؟" میں نے کہا۔ "ضروری برتن اور کپڑے خریدتے ہوئے چلیں... منظور ملا تھا؟"

"نہیں... وہ نہ چیمبر میں تھا اور نہ گھر میں۔" محسن بولا۔ "غالباً کورٹ سے روانہ ہونے میں دیر ہوئی تھی۔ اس وقت چیمبر میں ہوگا اور وہاں اس سے ملنا ٹھیک نہیں۔ رات کو گھر پہنچ جائیں گے۔"

میرا اور محسن کا یوں گھومتے پھرنا خطرناک تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ آج ہی اخبارات میں ہماری تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ ایسے ہی چلتے چلتے میں نے محسن کو تجویز پیش کی کہ اب ہمیں حلیہ بدل لینا چاہیے۔ آدھے شہر نے ہماری تصویر آج دیکھی ہوگی۔ باقی آدھا شہر کل دیکھ لے گا۔ یہ سب پبلک کے لیے بہت سنسنی خیز خبریں ہیں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری تو ایسا موضوع ہوگا جس پر گھر کی خواتین بھی اظہارِ خیال فرمائیں گی۔ محسن کو مجھ سے اتفاق تھا۔ اچانک ہم ایک ہیئر ڈریسر کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ اس نے شوکیس میں ہر طرح کی وگ سجا رکھی تھی۔ میں نے محسن کو متوجہ کیا۔ اندر بہت کم لوگ تھے۔ جو رش صبح شام کے اوقات میں نظر آتا ہے، وہ نہیں تھا۔ "ہیئر آرٹسٹ ہمارے سر پہ وگ لگا بھی سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ہیئر ڈریسر کی دکان بہت خطرناک جگہ ہوتی ہے۔" محسن بولا۔ "سب شیو کروانے والے مفت کے اخبارات پڑھتے ہیں اور پھر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ باربر ایک باخبر اور باشعور شخص ہوتا ہے جو سب کی سنتا ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تیرا مطلب ہے وہ ہمیں شناخت کرے گا؟"
"اس کا امکان ہے۔"
"ہم رسک لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔
محسن نے ٹھیک کہا تھا۔ چیف باربر نے کاؤنٹر پر ہی ہمیں شناخت کر لیا۔ ابھی اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ ہم دونوں نے آگے جھک کر ریوالور نکال لیے۔ اس کا منہ فوراً بند ہو گیا۔
"آج کے اخبارات پڑھنے کے بعد تم کو اتنا اندازہ تو کر ہی لینا چاہیے کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہم نے سیکڑوں تخریب کاروں کا صفایا کر دیا۔ ان کے اسلحہ خانے برباد کر دیے۔ ہیلی کاپٹر گرائے اور درجنوں ایجنٹ قتل کیے۔ تم کیا چیز ہو؟"
"ہم نہ چور ڈاکو ہیں، نہ قاتل ہیں، نہ مفرور مجرم۔" محسن نے کہا۔ "ہم اس ملک کے محبِ وطن شہری ہیں۔"
"بے... بے شک جنابِ عالی..." باربر نے بمشکل تمام کہا۔ "آج تو سارے لوگ یہی کہہ رہے ہیں... آپ... آپ لوگوں نے تو بڑا کام کیا ہے جی... وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے... کہ لوگ فخر کر رہے ہیں۔"
"اچھا؟" میں نے اس حوصلہ افزا اطلاع پر خوش ہو کے کہا۔ "کیا تم سچ بول رہے ہو؟ یا اپنی جان بچانے کے لیے..."
"لو جی... آپ کوئی دشمن ہیں ہمارے۔ اللہ آپ کو حوصلہ دے اور پولیس کو عقل دے۔" چیف باربر نے کہا۔ "ہم تو جی دل سے تعریف کرتے ہیں کہ آپ نے کمال کر دیا۔"
"کل تم کو ایک اور خبر ملے گی۔" میں نے کہا۔
"وہ کیا جی؟" چیف باربر سرگوشی میں بولا۔
"یہاں نہیں... اندر کوئی جگہ ہے تو ہمیں لے چلو۔ ہمیں تمھاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "بس ایک بات مت بھولنا۔ دھوکا دینے یا چالاک بننے والے کو ہم بھون دیتے ہیں۔ ہمارے لیے ہمارا مشن اہم ہے۔ ہم صرف تم کو ہی نہیں ان سب کو ٹھنڈا کر کے بھی نکل جائیں گے۔ اگر ضروری ہوا... کوئی ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے گا۔"
"خدانخواستہ... خدانخواستہ جی..." چیف باربر نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ "آپ حکم کریں عالی جاہ... اندر میرا گھر ہے... پچھلی طرف سے اندر چلیں۔ مجھ سے جو خدمت ہوگی بجا لاؤں گا۔"
سیلون کے آخری حصے میں ایک قدِ آدم شیشہ گھوم گیا اور اس کی جگہ دروازہ نمودار ہوا۔ ہم اس کے پیچھے ایک اور دروازے سے گزرے تو خود کو ایک کمرے میں پایا۔ ایک عورت جو تخت پر لیٹی کوئی فلمی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ وہ پٹ اٹھ کے بھاگی اور اندر غائب ہو گئی۔ ایک بچہ جو کرسی سے فرش پر کود رہا تھا آرام سے بیٹھ گیا۔

"اِدھر بیٹھو شہنشاہو!" چیف باربر نے کہا۔ "میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے خدمت کا موقع دیا... میرا دل کر رہا ہے کہ سب کو بتا دوں..."
"ایسی بے وقوفی ہرگز مت کرنا۔" میں نے کہا۔ "ہم زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ ہم تو چلے جائیں گے، تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ تم ہی نہیں تمھارے گھر والے بھی۔"
"سمجھ گیا... بالکل سمجھ گیا جی..." وہ بولا۔ "وہ کیا خبر ہے جو کل اخبار میں آئے گا۔"
میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گورا ڈاکو اور اس کے ساتھی جیل سے فرار ہوئے تھے۔ یہ خبر اس نے بھی پڑھی اور سنی تھی۔ انھوں نے پولیس کے ساتھ کیا سلوک کیا اور بالآخر ہمارے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچے۔ چیف باربر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے ہم سپرمین قسم کی چیز ہیں یا مریخ کی مخلوق ہیں جو اس کے گھر میں اتر آئی ہے۔ یہ اتنی ہوش رُبا خبر تھی کہ اس کے لیے ضبط سے کام لینا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ سارے زمانے کو چیخ چیخ کر بتانا چاہتا تھا کہ اسے کس کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے اور اسے کتنی سنسنی خیز خبر سارے شہر سے پہلے معلوم ہو چکی ہے۔ ہم نے اسے اب چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ پھٹ جائے گا۔ وہ رازداری سے ایک کو بتائے گا، وہ دوسرے کو۔ دوسرے سے تیسرے اور چوتھے تک بات پہنچے گی اور صبح کا اخبار آنے تک اس محلے کے کافی لوگ اس راز سے آشنا ہو جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک زبان سے دوسرے کان تک پہنچتے ہوئے خبر بدلتی جائے۔ ہر شخص زیبِ داستان کے لیے کچھ اضافہ کرے اور صبح اخبار میں حقیقت اتنی ہی آئے جتنی چیف باربر جانتا تھا۔
"تمھارا نام کیا ہے استاد جی؟" میں نے کہا۔
"امام دین ہیئر آرٹسٹ۔" وہ بولا۔ "لوگ پنڈت کہتے ہیں۔"
"پنڈت؟ یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔
"وہ جی... میں کچھ ستاروں کی چال وغیرہ کے حساب سے باتیں بتا دیتا تھا جو درست ہوتی تھیں۔" وہ خفت سے بولا۔ "شوق تھا۔"
"اور باتیں اتفاق سے درست ہوتی تھیں۔"
"وہ تو ہے جی... ہم شغل کرتے تھے۔ ہوتا تو وہی ہے جو رب کو منظور ہو اور بندہ بشر کیا جانے غیب کا حال۔" وہ ہنسا۔ "جی تُکا لگ جاتا تھا اور سچ ہو تو لوگ دوڑے آتے تھے کہ پنڈت تو نے ٹھیک بتایا تھا۔ غلط ہو تو کسی کو میرا خیال بھی نہیں آتا کہ میں نے کیا کہا تھا۔ کچھ لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ بڑا پنڈت پھرتا ہے۔ بس وہ پنڈت ایسا چلا کہ اب زیادہ لوگ پنڈت ہی کہتے ہیں... خلیفہ پنڈت۔"
"پھر تو ہم بھی پنڈت ہی کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ پنڈت کہ ہمارے بارے میں تمھارا ستاروں کا علم کیا کہتا ہے۔"
"کیوں شرمسار کرتے ہیں شہنشاہو۔ اللہ نے آپ کو اتنی مشہوری دی ہے اور اتنے بڑے بڑے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔ آپ تو اس کے خاص بندے ہو۔ اس کی حمایت حاصل ہے آپ کو۔" وہ بولا۔ "ہمارا علم کچھ نہیں ہے۔ بس تُکا لگ گیا تو واہ واہ۔"
"اچھا پنڈت! اب ہمارا مسئلہ سنو۔" میں نے کہا۔ "تمھاری طرح جانے کتنے لوگ اس شہر میں ہمیں پہچان سکتے ہیں۔ ابھی تک ہمیں اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ہم تو مزے سے گھوم رہے تھے۔ شاید کسی نے غور نہیں کیا لیکن ہم ایسے نہیں پھر سکتے۔ کل کے بعد تو بہت مشکل ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارا حلیہ بدل دو۔ ہم اندر آئے تھے وِگ لینے۔ تم ہمارے سر کے لیے ایسی وِگ لاؤ جو فٹ بیٹھے۔"
"فٹ تو جناب، میں خود کروں گا..." وہ دکان کی طرف لپکا۔
"مجھے اس صورتِ حال سے خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔
"میں بھی نہیں بتا سکتا کہ میرا حوصلہ کتنا بڑھ گیا ہے۔" محسن بولا۔ "اب ہمارے معاون اور مددگار بہت ہیں۔ ان کے مقابلے میں شکاری جتنے بھی ہوں کم ہیں۔"
"کل کے بعد اخبارات میں جو مہم شروع ہوگی، اس کا بہت فائدہ ہوگا۔ ہم کو پبلک کی سپورٹ مل جائے گی۔ ہمارے لیے پناہ دینے والوں کی کمی نہ رہے گی۔ ہمارے مددگار اس ملک کے سب محبِ وطن ہوں گے۔ ان میں بڑے بڑے دل والے ہیں جو ہر طرح سے ہمارا ساتھ دیں گے۔ دامے، درمے، سخنے۔"
"یہ ہمیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔"
"ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم صحیح وقت پر صحیح کام کر کے پبلک کے سامنے آئے ہیں۔ آئندہ دو چار دن میں ہمارا جو امیج بنے گا، وہ ہماری سب سے بڑی فتح ہوگا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے اس ملک کے عوام ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہم خود شناخت کرا کے بہت سے کام نکال سکیں گے۔"
"غالب سے کہنا ہے کہ وہ اپنے سب صحافی دوستوں کو اس مہم پر لگا دے۔" میں نے کہا۔ "پولیس نے اور دولا ورائیڈ ٹیکنی نے ہماری بہت عرصہ کردار کشی کی ہے۔ اب رائے عامہ کو ہمارے حق میں ہموار کرنے کے لیے ہمارے کارناموں کو خوب اچھالنا ضروری ہے۔"
اسی وقت پنڈت آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چار ڈبے تھے۔
"یہ ولایتی وِگ کا سیٹ ہے بادشاہو۔" اس نے ایک ڈبا کھول کے کہا۔ "یہاں تو شوقین مزاج استعمال کرتے ہیں۔ بڑے بڑے تم جانتے میرے گاہک ہیں اور فلم اسٹار جن کا میں نام بتا دوں تو حیران رہ جاؤ۔ ان کے ہیئر اسٹائل کی لونڈے کاپی کرتے ہیں مگر ان کو کیا معلوم کہ یہ سب شو شا ہے۔ اوپر تو نقلی بالوں کی اسٹائل ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بوڑھے گنجے اس سے جوان اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ آپ تو خیر سے خود بھی ہیرو ہو۔" اس نے ایک ایک ڈبا کھول کے دکھانا شروع کیا۔
"چیز تو لاجواب ہے استاد۔" میں نے کہا۔
"لاجواب کیوں نہ ہوگی جناب، اصلی فرانس کا مال ہے۔ سات سو میں پڑتی ہے اور ڈیڑھ ہزار میں آسانی سے نکل جاتی ہے۔ دو بھی مل جاتے ہیں۔"
"ہم سے کیا لو گے؟" میں نے کہا۔
"آپ سے؟ لو جی... میں نے قیمت اس لیے تو نہیں بتائی تھی۔" وہ بڑے دکھی لہجے میں بولا۔ "بے وقوف آدمی ہوں جی... اس لیے نادانی میں بات منہ سے نکل گئی۔"
"ہم مفت نہیں لیں گے۔" محسن نے کہا۔
"ایسا مت کہو سرکار! آپ کو نہیں، یہ نذرانہ میں اپنے وطن کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ دشمنوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو تو یہ میری طرف سے عطیہ، تحفہ، چندہ کچھ بھی سمجھ لو۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پینسٹھ کی جنگ میں اپنی ساری آمدنی میں نے والز فنڈ میں دی۔ میں نے کہا، پنڈت اس ملک میں سکھ چین سے بیٹھ کے سارا سال کھاتا رہا۔ صرف اپنے لیے کماتا رہا۔ اب ملک اپنا حق مانگتا ہے۔ اپنی کمائی میں سے اس کو بھی دے... دیکھو نا جی... ماں اپنے بچے کے لیے کیا نہیں کرتی۔ باپ کتنی محنت سے کماتا ہے اور اسے کھلا پلا کے اتنا بڑا کرتا ہے۔ پھر جوان بیٹا صرف اپنے لیے کمائے اور سب خود کھا جائے۔ ادھر ماں باپ نے کبھی نہ مانگا ہو مگر ان پر سخت دن آ جائیں تو کیا بیٹا ان کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ حلالی ہو تو ضرور کرتا ہے جی۔ بس جی میں نے کہا کہ آج تک اس ملک نے مجھے پالا ہے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں نے کمایا اور خرچ کیا اور اٹھارہ سال سے ملک نے کچھ نہیں مانگا تھا۔ اب اٹھارہ دن کی کمائی بھی اس کو نہ دوں؟ سال میں صرف ایک دن کی آمدنی بھی اس وطن کو پیش کروں جس میں مجھے عزت سے روزگار کے مواقع صرف اس لیے حاصل ہیں کہ میں اس ملک کا شہری ہوں۔ پھر جناب، میں نے سترہ دن کی جنگ میں ایک دن کی کمائی اپنے پاس نہیں رکھی۔ اللہ کے فضل سے بھوکا نہیں مرا۔ آج پھر وطن کچھ مانگتا ہے۔ اس وطن کا مجھ پر، ہم سب پر بڑا قرض ہے۔ اس کا سود بھی میں ادا نہیں کر سکتا۔"
"سود تو حرام ہے پنڈت۔" میں نے کہا۔ "مگر تمھارے جذبات بے حد قابلِ قدر ہیں۔ جب وقت آئے تو وطن کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا مگر ابھی نہیں۔ ہم اس وقت چندہ نہیں لیں گے۔ نذرانے اور عطیات مستحق لوگوں کو دینا۔"
"پتا نہیں جی مستحق کون ہوں گے۔" وہ مایوسی سے بولا۔ اور وہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وقت کب آئے گا۔"

اس نے ایک ایک وگ کو ہمارے سر پر سیٹ کیا۔ پہلی وگ ایسے بالوں کی تھی جیسے افریقی اقوام کے سروں پر نظر آتے ہیں۔ سخت، کھڑے ہوئے اور گھونگریالے ناقابلِ یقین حد تک گھنے اور بیا کے گھونسلے کی طرح نظر آنے والے۔ اس وگ کے ساتھ اگر ہم منہ پر سیاہی مل لیتے تو بالکل نیگرو نظر آتے۔ یہ وگ یقیناً بہت کارآمد تھی اور ہماری ظاہری صورت کو اتنا بدل سکتی تھی کہ ہم خود ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پاتے۔ اس وقت میرے ذہن میں پہلی بار خیال آیا کہ نام تو میں بدلتا ہی رہا ہوں اور کسی کو اپنا نام کچھ بھی بتایا جا سکتا ہے۔ صورت بھی میک اپ سے بارہا بدلی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی مشکل مرحلے میں مجھے نام کے ساتھ صورت، قومیت اور شہریت بھی بدلنا پڑے۔

اس وگ کے ساتھ میں سوڈانی مسلمان بن سکتا تھا۔ ویسٹ انڈیز میں جمیکا سے تعلق رکھنے والا امریکی سیاہ فام باشندہ بن سکتا تھا اور ان مخصوص خطوں سے سے آنے والے الگ شناخت رکھنے کے علاوہ ہندوستان، پاکستان سے ... ست سے نام کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

دوسری وگ سفید بالوں کی تھی اور میچنگ داڑھی مونچھوں کے ساتھ ہم بالکل بوڑھے نظر آتے۔ شخصیت میں ظاہری تبدیلی کے دیگر اسباب یعنی لباس، چشمہ، چھڑی یا آلۂ سماعت آسانی سے دستیاب تھے۔ اصل چیز بال ہیں جو نقلی ہوں تو پہچانے جاتے ہیں۔ مگر یہ وگ ایسی نہیں تھی۔ امام دین خلیفہ عرف پنڈت نے دونوں وگیں ہمارے سروں پر فٹ کرنے میں ایک گھنٹا صرف کیا اور ہمیں یہ سمجھایا کہ ضرورت پڑنے پر ہم اسے کس طرح ہٹا کے دوبارہ اسی طرح لگا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں اندر سے پنڈت کی گھر والی نے چائے کے ساتھ گرم پکوڑے، مٹھائی اور سموسے ارسال کیے۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ اور ہم نے ابھی تک ٹیکسی کو روک رکھا تھا۔ اس میں ہمارا سامان بھی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹیکسی والے سے سودا ہو گیا تھا کہ ہم اسے سو روپے گھنٹا دیں گے۔ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ اب تک اس حساب سے اس کے ڈھائی سو بن گئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ منظر کے گھر سے ہو کے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے اس کو چار سو ضرور دے دیں گے۔ عام حالات میں ٹیکسی والے کے لیے یہ دو دن کی کمائی تھی چنانچہ وہ مطمئن ہی نہیں، خوش بھی تھا۔

میں نے پہلا گرم پکوڑا منہ میں ڈالا ہی تھا کہ باہر دکان میں سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔

"کہاں ہیں وہ دونوں...؟" کسی نے چیخ کر کہا۔ یہ آواز اور لہجہ دونوں اجنبی تھے۔

"کون دونوں...؟" کسی ملازم نے چلا کے کہا۔

پھر یوں لگا جیسے کسی نے گالی کے ساتھ ایک تھپڑ مارا ہو۔ کرسی یا میز کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ہی شور بلند ہوا۔ دکان کے کاریگر بہ یک وقت چلا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کسی گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" پنڈت دم اٹھا۔

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے کھینچا: "ٹھہرو۔ یہ معاملہ اور لگتا ہے۔"

باہر ایک فائر ہوا اور کوئی چیخ مار کے بلبلایا۔

"دروازے پر نظر رکھو۔ اندر مت آنے دو کسی کو۔"

"اندر پردہ ہے... تم اندر نہیں جا سکتے۔" کوئی اور چلایا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" پہلا شخص دہاڑا۔

میرے اور محسن کے لیے اتنا سمجھ لینا کافی تھا۔ ہم نے ساتھ ریوالور نکال کے اُٹھے۔ "پنڈت... اندر جاؤ... بھاگو۔" میں نے اسے دھکیلا۔ "اپنے بیوی بچے کو لے کر نکل جاؤ۔"

"کہاں... کہاں سے... یہ کیا ہے...؟" پنڈت کا رنگ اُڑ گیا۔

"بعد میں بتائیں گے... تم کسی طرف سے بھی نکلو مگر نکلو۔" محسن بولا۔

"ادھر... ادھر تو کوئی راستہ نہیں۔" پنڈت ہکلایا۔

"چھت کا راستہ ہے... باہر کود جاؤ... کسی کے گھر میں جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں مت رکو ورنہ مارے جاؤ گے ہم کے ساتھ۔"

باہر ایک شور قیامت برپا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دکان میں زلزلہ آ گیا ہو۔ سامان اُٹھا اُٹھا کے پھینکنے کی آوازوں کے ساتھ پوری دکان کی دکان کے چاروں طرف لگے ہوئے شیشے ایک کے بعد ایک ٹوٹ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں لڑنے والوں کی آہ و بکا سن رہا تھا۔ معلوم نہیں پہلی گولی انھیں ڈرانے کے لیے ہوا میں چلائی گئی تھی یا کسی کو نشانہ بنایا گیا تھا لیکن شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ مزاحمت کرنے والوں کا حوصلہ اس سے کم نہیں ہوا اور حملہ آور ابھی تک پوری طرح غالب نہیں آئے ہیں۔ وہ یقیناً ہماری تلاش میں آئے تھے۔ انھوں نے نہ جانے کہاں سے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا اور جب ہمیں اس ہیئر ڈریسر کے سیلون میں داخل ہوتے دیکھا تو فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم محصور ہو چکے ہیں اور ہمیں اندر ہی گرفتار یا شوٹ کیا جا سکتا ہے۔ وہ دلاور کے کتے تھے، دشمن کے آلۂ کار تھے یا پولیس والے تھے۔ یہ ہم ان کے سامنے آئے بغیر نہیں جان سکتے تھے۔

پنڈت بھاگ گیا تھا۔ اندر سے ہم نے اس کی بیوی اور بچے کی چیخ پکار سنی تھی جو دکان میں ہونے والی توڑ پھوڑ، مار پیٹ، گالی گلوچ کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے۔

کیا ڈاکو آ گئے ہیں۔ دکان سے اندر آنے والا راستہ اگر واضح اور نمایاں ہوتا تو حملہ آوروں کو کسی سے کچھ نہ پوچھنا پڑتا اور وہ سب کو ہینڈز اَپ کراتے ہوئے اندر پہنچ جاتے لیکن انھیں اس آئینہ خانے کے اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جو دکان کی تین دیواروں پر پھیلا ہوا تھا اور ہم ان کی نظر کے سامنے اندر داخل ہو کے اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے آئینے میں عکس بن کے چھپ گئے ہوں۔ انھوں نے کاریگروں سے پوچھ گچھ کی لیکن نمک حلال کاریگر سمجھداری نہیں، بہادری بھی ثابت کرنے پر اُتر آئے۔ مقابلے پر ڈٹ گئے اور انھیں اندر کا راستہ نہیں بتایا۔ غالباً وہ سمجھ گئے تھے کہ انہی کاؤنٹرز کے شیشوں کے پیچھے کوئی خفیہ راستہ ہے جو اندر کسی گھر میں کھلتا ہے۔ اب وہ راستہ تلاش کرنے کے لیے کاریگروں سے لڑ رہے تھے اور شیشوں کو پاش پاش کر رہے تھے۔

ہم پھر بچ گئے تھے اور ہمیں بچاؤ کی مہلت بھی مل گئی تھی۔ پنڈت چھت کے زینے پر چڑھ گیا تھا اور روتی پیٹتی بیوی کو گھسیٹ کر اوپر لے گیا تھا۔ اوپر سے کسی ساتھ والے گھر کی چھت پر کودنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ یہ ایسا ہی محلہ تھا جس کی گلیوں کے سارے اونچے نیچے مکانوں کی دیواریں ملتی تھیں اور یہ ہو سکتا تھا کہ پنڈت کے گھر کی چھت کسی بھی ہمسائے کی چھت سے ایک منزل اونچی ہو یا نیچی ہو۔ اونچی چھت پر چڑھنا مشکل تھا مگر ایک منزل نیچی چھت پر یا کسی کے صحن میں دس بارہ فٹ کی بلندی سے کودنا ناممکن نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کودنے والے کی ٹانگ ٹوٹ جائے مگر ٹانگ پھر جوڑی جا سکتی تھی۔ یہاں ان کے ٹھہرنے میں جان سے جانے کا خطرہ تھا۔

میں اور محسن بہت محفوظ پوزیشن لے چکے تھے۔ ابھی تک کوئی اندر نہیں پہنچا تھا مگر کوئی آ جاتا تو اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دیکھتا، ہم اُسے شوٹ کر دیتے۔ ہم نے کمرے کی لائٹ بجھا دی تھی۔ اندھیرے کمرے میں ہم روشنی سے آنے والے کو دکھائی ہی نہ دیتے لیکن جو بھی کھلے دروازے میں نمودار ہوتا وہ پیچھے سے آنے والی دکان کی روشنی میں بہت نمایاں ہوتا اور ہم اُسے پہچان جاتے کہ وہ کس قسم کا دشمن ہے۔

لیکن باہر کا ہنگامہ اب بہت بڑھ گیا تھا۔ مار پیٹ اور توڑ پھوڑ کا شور ختم ہونے کے بعد لوگوں کے ہجوم کا شور زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دکان کے ہنگامے نے اور کاریگروں کی چیخ پکار نے راہ چلتے لوگوں کو روک لیا تھا جو دکان کے سامنے جمع تھے یا اندر آ چکے تھے۔

"یہ کون ہو سکتے ہیں محسن؟" میں نے کہا۔ "کیا ہم نکل کے دیکھیں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ اندر چھپ کر کھڑے رہنے میں خطرہ زیادہ ہے۔ وہ نکل جائیں گے۔" محسن بولا۔ "اور راستہ نہ ملا تو نہ جانے کتنے لوگوں کو مار جائیں گے۔ مجھے یہ خطرناک شکاری لگتے ہیں۔"

"ممکن ہے پولیس والے ہوں۔"

"پولیس اس طرح مقابلہ نہیں کرتی۔ طاقت اور نفری کے اعتبار سے زیادہ ہو تو کمزور کو مارتی ہے ورنہ دم دبا کے بھاگ جاتی ہے۔" محسن بولا۔

"خبردار جو کوئی آگے آیا۔" کوئی چیخ کر بولا۔ یہ اسی شخص کی آواز تھی جس نے سب سے پہلے ہمارے بارے میں پوچھا تھا۔

"دور ہٹ جاؤ... میں کہتا ہوں... پیچھے ہٹ جاؤ۔"

جواب میں ایک شور بلند ہوا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں ماں بہن کی گالیاں دے کر کہا کہ وہ ایسی تیسی کر دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مسلسل فائر ہوئے اور لوگ بھاگے۔ بھاگتے قدموں کی آواز یوں سنائی دی جیسے گائے بھینسوں کا ریوڑ فرار ہو رہا ہو۔ میں نے دروازے میں ایک جھری تلاش کی اور باہر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے بالکل سامنے ہیئر ڈریسنگ سیلون کا وہ دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ اس کے باہر ایک ہجوم تھا جو منتشر ہو رہا تھا۔ مجھے بیس بائیس افراد اِدھر اُدھر دوڑتے دکھائی دیے۔ ظاہر ہے، ان میں بیشتر فارغ قسم کے تماشین تھے جو دخل در معقولات کا بالکل ارادہ نہیں رکھتے تھے اور اب جان بچا کے بھاگ رہے تھے۔

میں نے محسن کو اشارہ کیا کہ آگے آئے اور دروازے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ دروازے کے قبضے چرچرائے مگر ابھی ہمارے سامنے ایک مختصر سا خلا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی دو فٹ تھی۔ اس کے بعد وہ گھومنے والا شیشہ تھا جو دکان میں سب شیشوں کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ اب سیاہ نہیں تھا۔ اس میں روشنی کی دو لکیریں افقی سمت میں متوازی نظر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ دوسری طرف کا شیشہ بھی شہید ہو گیا ہے اور ہم اس تختے کو دیکھ رہے ہیں جو آئینے کا فریم تھا۔ شاید حملہ آوروں نے سارے آئینے چکنا چور کر دیے تھے مگر پھر بھی نہ جان سکے تھے کہ کون سا فریم اندر جانے والے راستے کو چھپائے ہوئے ہے۔

ایک دم دروازے میں دو افراد نمودار ہوئے۔ میں صرف ان کی پشت دیکھ سکا لیکن میری نظر ایک شخص کے ہاتھ پر گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاہ رنگ کا گولا سا تھا۔ دوسرے لمحے میں دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول کے باہر آ گیا۔

"ہاتھ اوپر..." میں نے چیخ کے کہا۔

اس شخص نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔ اس کا دوسرا ساتھی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ سینے پر ہاتھ رکھے گھوما۔ جھکا اور وہیں گر کے پلٹنے کھانے لگا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اسے محسن نے شوٹ کیا ہے۔ محسن میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا تھا۔ ایک کو میں پہلے ہی نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اس نے دوسرے کو سنبھالا اور اسے بالکل مہلت نہ دی۔ اگر محسن ذرا بھی تذبذب کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مظاہرہ کرتا یا اُسے خبردار کرتا تو میں مارا جاتا۔
پہلے شخص نے ایک دم حرکت کی۔ اس نے غوطہ مارا اور ایک ہی حرکت میں دستی بم کی پن کو مُنہ سے نکال کے پیچھے اُچھال دیا۔ وہ خود باہر گرا اور میں نے محسن کے ساتھ زمین پر گرنے میں دیر نہیں لگائی۔ یہ دستی بم پن نکل جانے کے پانچ سیکنڈ بعد پھٹتا ہے۔ اس شخص نے پانچ سیکنڈ گزرنے کا انتظار نہیں کیا تھا اور پن نکالتے ہوئے دستی بم اُچھال دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے اور محسن کو گرنے کے بعد مقامی پوزیشن میں آنے کے لیے بھی دو تین سیکنڈ مل گئے۔ ہم نے ہتھیلیوں سے دونوں کان بند کیے۔ چہرہ دونوں بازوؤں میں یوں چھپایا کہ سر محفوظ رہے اور گردن دونوں ہاتھوں کے درمیان میں آجائے۔

دھماکا ہوا تو ذرا سی دیر کے لیے میرے کان سُن ہو گئے۔ میں نے دو سیکنڈ میں جان لیا کہ نہ میں براہِ راست ہٹ ہوا ہوں اور نہ ملبے کا ڈھیر مجھ پر گرا ہے۔ تیسرے سیکنڈ میں میری نظر محسن پر گئی۔ وہ سر اٹھا کے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک ساتھ اُٹھے تو ہمیں اپنے مقابل سیدھے ہاتھ کے گوشے میں دھواں، گرد و غبار اور شعلوں کے الاؤ کے درمیان سے گزرنے والا راستہ نظر آیا۔ دستی بم ایک کونے میں گرا تھا کیونکہ اسے نشانہ لیے بغیر بدحواسی میں پھینکا گیا تھا۔ اس لیے وہ کونا اور چھت کا ایک حصّہ مسمار ہو گیا تھا اور باہر جانے والا دروازہ تو بند ہو گیا تھا مگر کونے میں ایک نیا راستہ بن گیا تھا۔

اس وقت میں نہیں دیکھ سکا کہ دستی بم سے دکان میں کتنے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے یا ملبے میں دب گئے۔ دکان کے اندر کسی چیز کے سلامت رہنے کا سوال ہی نہ تھا چنانچہ ساری لائٹس ٹوٹ گئی تھیں اور اب اندر صرف شعلوں کی روشنی تھی جو ایک کونے سے پھیل رہے تھے اور اس دیوار کے ساتھ لمبائی کے رُخ بنے ہوئے لکڑی کے کاؤنٹر کو جلا رہے تھے۔ میزوں کے اور کرسیوں کے ٹکڑے اینٹوں کے ملبے میں بھی آگ پکڑ چکے تھے لیکن ابھی یہ آگ پوری دکان میں نہیں پھیلی تھی اور اسے کنٹرول کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ باہر والے نظم و ضبط اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے۔
مگر میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا اور ملبے کے ڈھیر کو پھلانگتا ہوا سیدھا اس شگاف کی طرف گیا جو کونے کی دیوار کے گرنے سے نمودار ہوا تھا۔ اس دھماکے نے ساتھ والی دکان کا وہ حصّہ بھی گرا دیا تھا جو پنڈت کی دکان سے ملا ہوا تھا۔ دھوئیں اور گرد و غبار میں راستہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اوپر سے مزید ملبہ نہ آگرے یا آگ میرے کپڑوں تک نہ پہنچ جائے لیکن میں نتائج سے بے پروا باہر نکلنے کی جدّوجہد کرتا رہا۔ اینٹوں کے ڈھیر پر دو بار لڑکھڑانے کے بعد فٹ پاتھ پر جست لگانے میں کامیاب ہوا۔ دکان کے سامنے دو افراد ... بدحواسی میں ہائے ہائے کر رہے تھے اور سڑک پر ایک افراتفری ...
"کدھر گیا وہ؟" میں نے چیخ کر ایک دوڑتے ہوئے ... سے پوچھا۔
"اُدھر... وہ سامنے۔" دوسرا شخص ایک کار کی طرف ... کر کے چلّایا۔
میں اُدھر ہی بھاگا لیکن میری راہ میں ایک ... ہو گئی۔ صرف ایک بار میری نظر کار کے ڈرائیور پر گئی۔ وہ ... صورت پڑھا لکھا آدمی تھا جو اس منظر سے خوفزدہ ہو گیا تھا ... راستہ ملتا تو وہ فوراً بھاگ جاتا مگر میں نے اس کو دروازہ ... کے آگے ہونے کو کہا تاکہ میں اس کی جگہ لے سکوں۔
"اُدھر... دوسری سیٹ پہ... آگے۔" میں نے ریوالور ... اشارہ کیا۔
"کیا؟" وہ چلّایا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"
"تمھاری..." میں نے ایک گندی گالی دی اور اسے ایک جھٹکے سے باہر کھینچ کر سڑک پر گرا دیا۔ میں نے دروازہ بند کیا ... ہی محسن کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ساتھ ساتھ تھا اور یہ ... آگے کھسکائی ہی تھی کہ وہ دوسرا دروازہ کھول کے جلدی ... میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ کُھلا دروازہ ایک شخص سے ٹکرایا اور ... جھٹکے سے دُور جا پڑا۔ پھر محسن نے دروازہ بند کر دیا۔ کار کا ... سڑک پر گرتے ہی اُٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔
"بدمعاش... میری کار... اسے پکڑو..." وہ چلّانے لگا۔ اس نے کھڑکی کے قریب آکے اسٹیئرنگ کو پکڑنے کی کوشش ... کیونکہ ابھی کار کی رفتار زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ... ریوالور مارا اور اس کی چیخ سُنی۔ وہ گر کے پیچھے رہ گیا۔ میری نظر ... کار پر تھی جس کی طرف ایک شخص نے اشارہ کیا تھا۔ وہ کار ... کی طرح نکلی اور ایک آدمی اُچھل کر الگ ہونے کی پوری کوشش ... کے باوجود خود کو نہ بچا سکا۔ وہ کار کے ایک پہیے کے نیچے ... گیا۔ میں نے اس کے آدھے دھڑ کو تکلیف سے اُچھلتے دیکھا ... ایک دم اُٹھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کے ... چیخ ماری اور پھر اتنے زور سے سڑک پر گرا کہ شاید اس کا سر پھٹ گیا ہو ... اس کے اوپر سے گزری اور ڈرائیور نے پھر اسپیڈ دی مگر گاڑی ... سامنے ایک ریڑھا آگیا۔ گاڑی نے گھوڑے کو ٹکر ماری۔ گھوڑا ... اور ہنہنا کے پلٹا۔ پیچھے گرا اور لاتیں چلانے لگا۔ غالباً گاڑی ... اس کی گردن توڑ دی تھی۔
لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے چنانچہ مجھے خود بخود راستہ ...
"وہ بدمعاش اس کار میں فرار ہو رہے ہیں۔" میں نے محسن سے کہا ... تو وہیں رہ گیا مگر اس میں بھی کم سے کم دو افراد ہیں۔ ایک ڈرائیور ... دوسرا دستی بم پھینکنے والا۔"
"وہ تو مارا گیا، جو دکان میں گرا تھا۔" محسن بولا۔ "اس کا ریوالور میں اٹھا لایا ہوں۔"
"میری نظر اس گاڑی پر تھی جو اب رفتار پکڑ چکی تھی۔" اس کی جیب میں سے اور کچھ ملا۔"
"نہیں... مگر یہ ریوالور آرمڈ مین ہے۔ فوجی ساخت کا۔" محسن بولا۔
"اس کا مطلب ہے یہ آج کل کی خبر کا ردِّ عمل ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ دشمن کے کمانڈوز ہوں گے۔ اپنا ریوالور تیار رکھنا۔ جیسے ہی وہ رینج میں آئیں..."
"تو فکر مت کر... میں تیار ہوں۔" محسن نے سر باہر نکال کے کہا۔
اگلی گاڑی کا فاصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ میں نے ٹریفک رولز اور احتیاط کے تقاضے نظر انداز کرتے ہوئے پیڈل دبا دیا۔ سیکنڈوں میں گولی کی رفتار حاصل کر لینے والی فاکس ویگن کا انجن غرّایا اور وہ چیتے کی طرح اپنے شکار کی طرف لپکی۔ گاڑی میکلوڈ روڈ سے سیدھی جا رہی تھی اور اِدھر اُدھر سے آنے والی ٹریفک درہم برہم ہو گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ ہم پاکستان میں تھے ورنہ اب تک نہ جانے کتنی ٹریفک پولیس کی گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ چکی ہوتیں۔ اور خود پبلک میں سے ذمّے دار افراد ہمارا تعاقب کرتے مگر یہاں عام لوگ جان بچا رہے تھے اور جہاں بھی کوئی ٹریفک پولیس کا نمائندہ چوک کے درمیان بیزاری کے عالم میں ہاتھ ہلا رہا تھا یا سڑک کے کنارے ہاتھ باندھے رونق میلہ دیکھ رہا تھا تو اس نے فقط سیٹی بجانے پر اکتفا کیا۔ ممکن ہے انھوں نے دونوں کار والوں کو خصوصی گالیوں سے بھی نوازا ہو لیکن ان کی روایتی کاہلی اور عدم دلچسپی کے باعث مجھے یقین کامل تھا کہ انھوں نے کسی کار کا نمبر نوٹ کرنے کی زحمت بھی فضول سمجھی ہوگی۔
تمام حادثات سے بچتا بچاتا بالآخر میں درمیانی فاصلے کو اتنا کم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ محسن فائر کر سکے مگر اس سے پہلے کہ وہ نشانہ لیتا اگلی کار سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے ہمارا نشانہ لیا۔ ہم ایک دم نیچے ہو گئے۔ گولی نہ جانے کدھر گئی۔ پھر محسن نے فائر کیا اور اگلی کار کا پیچھے والا شیشہ پاش پاش کر دیا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پھر ہم پر دوسرا فائر ہوا جو کار کے بونٹ پر لگا۔ میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ ہم بال بال بچے تھے۔ کیونکہ بونٹ کے نیچے پیٹرول ٹینک تھا۔ انجن پیچھے تھا اور گولی بونٹ پر ونڈ اسکرین کے قریب لگتی تو پیٹرول ٹانکی میں گھس جاتی۔ محسن نے دوسرا فائر کیا۔ گاڑی پھر لہرائی اور ایکدم بائیں جانب فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ایک کھمبے سے ٹکرائی اور رک گئی۔
میں اور محسن ایک ساتھ چھلانگ لگا کے اترے۔ ہم نے بھی فاکس ویگن کو سڑک پر ہی روک دیا تھا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑ دوڑ کر آ رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک بھی رک رہی تھی اور یہ بات یقینی تھی کہ چند منٹ میں ہمارے گرد مجمع لگ جائے گا۔
میں نے کار میں دو افراد کو دیکھا جو آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ڈیش بورڈ پر جھکے ہوئے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ گاڑی کا انجن بند تھا مگر ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔
"محسن... رُکنا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔
"گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھ۔" محسن نے پلک جھپکتے میں ڈرائیونگ کرنے والے کو پیچھے کی سیٹ پر الٹ دیا۔ میں نے اگنیشن کی میں لگی چابی کو گھمایا اور کار نے ایک جھٹکا لیا۔ محسن اب پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ میں نے کار کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ایک بار پھر چابی گھمائی۔ انجن اسٹارٹ ہوا تو محسن نے آس پاس جمع ہونے والوں سے چلّا کر ہٹنے کو کہا مگر لوگ راستے روکنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔
مجبوراً میں نے کار کو تھوڑا سا پیچھے لے کر موڑا اور پھر آگے بڑھا کے فٹ پاتھ پر دوڑا دیا۔ بہت سے لوگوں نے شور مچاتے ہوئے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی مگر میں نے خاصی رفتار پہ گاڑی کو فٹ پاتھ سے سڑک پر اتارا۔ گاڑی اچھلی اگر اس کے شاک آبزرور درست نہ ہوتے تو اس جھٹکے سے قینچی ٹوٹ سکتی تھی۔ ایکسل بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ دھماکا ہونے سے قبل ہی میں نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ چنانچہ کار کے سڑک پر گرتے ہی میں بھی اپنی سیٹ پہ اُچھلا اور میرا سر چھت سے لگا لیکن میں نے اسٹیئرنگ کو نہیں چھوڑا اور سیدھا رکھا۔ گاڑی میرے قابو میں رہی اور جیسے بدک جانے والے مُنہ زور گھوڑے کو بالآخر ماہر شہسوار ہی راہ پر لاتا ہے ایسے ہی میں اس طاقتور بی ایم ڈبلیو کو جائے واردات سے نکال لانے میں کامیاب رہا۔ بی ایم ڈبلیو کوئی عام گاڑی نہیں تھی۔ شاید لاہور میں گنتی کی چار چھ کاریں ایسی ہو سکتی تھیں۔ جرمنی کی یہ پاور فل کار عموماً ڈپلومیٹ یا غیر ملکی رکھتے ہیں جو اس کے اخراجات کا بار اُٹھا سکیں کیونکہ عام نہ ہونے کے باعث اس کے پُرزے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔
گاڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش اگر کسی نے کی تھی تو مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ رات کے وقت میرے پیچھے روشنیوں کی ایک قطار تھی اور اپنی تیز رفتاری کے باعث میں آگے جانے والی سب کاروں کو پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا مگر ابھی تک ایک بھی کار مجھ سے آگے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اس میں زیادہ کمال گاڑی کا تھا جس کی کارکردگی کو شاید مرسیڈیز ہی شکست دے سکتی تھی۔ باقی میری ڈرائیونگ تھی۔ چار سال باہر رہنے کے بعد مجھے انٹرنیشنل ہائی ویز پہ راکٹ کی رفتار سے گاڑی چلانے کی بہت مشق تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ میں فاکس ویگن کی چابیاں نکال لایا تھا، ورنہ اس چھوٹی سی گاڑی میں بھی کوئی بڑے دل والا بیٹھ کر ہمارے پیچھے چل پڑتا تو ہمیں اتنی آسانی سے نہ نکلنے دیتا۔ طے شدہ طور پر وہ دونوں جو اب بے سُدھ پڑے تھے اچھے ڈرائیور نہیں تھے اور غالباً بدحواس ہو گئے تھے کہ ہم نے انھیں آلیا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محسن نے ان دونوں کی اچھی طرح تلاشی لے لی تھی۔ ان کے پاس سے صرف ریوالور برآمد ہوئے تھے۔ یہ سب سوس ریوالور تھے جس کا سیریل نمبر مٹا دیا گیا تھا۔ ہر غیر ملکی جاسوس ایجنٹ کی طرح ان کی شناخت ناممکن تھی۔ اب وہ پکڑے گئے تھے تو ان سے کچھ اگلوانا بھی آسان نہ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ان کو کس ملک نے کس مقصد کے تحت بھیجا تھا مگر سرکاری سطح پر اس ملک کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور اگر ان ایجنٹوں کو کسی دشمن ملک سے منسوب کیا جاتا تو وہ ملک صاف تردید کر دیتا۔ جاسوس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ یہ بات ہمیشہ سچ تھی اور رہے گی۔ نہ پکڑے جائیں اور ملک کے لیے بہادری کا اور ذہانت اور حوصلے کا قابلِ رشک کارنامہ سرانجام دے آئیں تو حکومت کی طرف سے انعام بھی بڑا ملتا ہے مگر پکڑے جائیں تو اپنے ہی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی ان کو پہچانتا تک نہیں اور دشمن تو خیر دشمن ہوتا ہی ہے۔

"یار... اب ان کا کیا کریں؟" محسن نے کہا۔ "ہم ان کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"پھر کیا کریں... گولی مار دیں؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہ انھیں بھی سرکاری حکام کے حوالے کر دیں؟" محسن بولا۔

"سول حکام یا فوجی حکام؟"

"معاملہ تو فوجی نوعیت کا ہے اور صحیح تفتیش بھی ملٹری انٹیلی جنس والے کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "مگر سوال وہی ہوگا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا... ہم حوالے کرتے جائیں گے تو اپنا کیا حوالہ دیں گے؟"

میں نے گاڑی کو ایک طرف روک دیا۔ "اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں۔ پہلے گاڑی کی تلاشی لے لیں۔"

اب ہم پل پار کر کے فورٹریس اسٹیڈیم کے پاس پہنچ چکے تھے۔ آگے کینٹ کا علاقہ تھا۔ شک و شبہے سے بچنے کے لیے میں نے کار کا بونٹ اٹھا دیا تاکہ معلوم یہ ہو کہ ہم انجن میں کسی خرابی کے باعث رکے ہیں۔ ایکسیڈنٹ نے گاڑی کی سامنے والی خوشنما گرل توڑ دی تھی اور بمپر کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ اگر کار فٹ پاتھ سے نہ ٹکراتی اور براہ راست کھمبے کو ٹکر مارتی تو کھمبا گر جاتا اور گاڑی کو بھی زیادہ نقصان پہنچتا۔ فٹ پاتھ کی بلندی نے گاڑی کی فورس ختم کر دی تھی اور غالباً اسی کے جھٹکے سے ان دونوں کا سر ڈیش بورڈ پر لگا تھا۔ ڈرائیور کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس کی پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دوسرا بھی مردے کی طرح پڑا تھا مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ یہ ہو سکتا تھا وہ مکر کر رہا ہو۔

محسن نے کار کی ڈگی کھولی اور ایک دم بند کر دی۔ اس کی وہ سیٹی جو اظہارِ حیرت کا سگنل تھی، میں نے بھی سنی۔

"مسٹر سکندرِ اعظم..." وہ بولا۔ "ادھر تشریف لائیے۔"

میں نے ریوالور کا رخ اندر کی طرف رکھا اور گھوم کر گیا۔ چونکہ پیچھے والا شیشہ ہماری فائرنگ سے غائب ہو گیا تھا اس لیے وہ بدستور میری زد میں رہے۔ محسن نے ایک بار پھر ڈگی کھولی۔ یار میں نے بھی اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ اسلحہ دیکھا جو اس میں بھرا ہوا تھا۔ اس میں چار تو غیر ملکی ساخت کی مشین گنیں تھیں۔ ایک باکس میں ویسے ہی کالے رنگ کے دس بارہ دستی بم تھے جیسا ہیئر ڈریسر کی دکان میں پھینکا گیا تھا۔ بالکل ویسے ہی دو باکس میں مشین گن کے راؤنڈ تھے۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے یہ سامان اتار دیں۔" محسن نے کہا۔ "اگر اس کے ساتھ ہی پکڑے جائیں تو..."

"کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے۔" میں نے کہا۔ پھر ڈرائیونگ کے لیے بیٹھ گیا۔ گاڑی کو میں نے پل سے نیچے اترنے والی چھوٹی سی سڑک پر موڑا۔ یہ تیلی سی سڑک ... کے سامنے سے گزری۔ تھوڑا آگے جا کے بائیں طرف ریلوے لائن تھی۔ اسے عبور کرتے ہی ہم گلبرگ میں داخل ہو گئے۔ ... کا اسٹاپ کہلاتا تھا اور وہاں چار نمبر بس کا ٹرمینل تھا۔

"کیا اس کی نمبر پلیٹ بوگس ہوگی؟" محسن بولا۔ "... معلوم ہوتی ہے۔"

"دوسری صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ گاڑی چرائی گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ بڈھا ہمیں یہ سامان اندر لے جاتے نہ دیکھے۔" وہ بولا۔ "کہے گا کہ کیا یہی ہے وہ سامان جو آنے والا تھا۔"

"فرنیچر تو پہنچ چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کہہ دو کہ یہ ہماری ... کے امورِ خانہ داری کی چیزیں ہیں۔ ہم شاہین بچے ہیں تو وہ بھی..."

"مذاق مت کر یار... اتنا خطرناک اسلحہ اس بڈھے کی نظر سے چھپانا بے حد ضروری ہے، ورنہ وہ تو شور مچا دے گا۔ اول تو ہماری اپنی حالت ماشاءاللہ ہو رہی ہے۔ دھماکے سے جتنا گرد و غبار اڑا سب ہم پر گرا تھا اور پھر ہم ملبے پر گرے تھے۔ بالوں اور کپڑوں ... لگتا ہے کہ سیدھے میدانِ جنگ سے آ رہے ہیں۔ اوپر سے یہ گاڑی اور اس کی یہ حالت۔" میں نے کہا۔

"گاڑی دور روک لیں گے۔" محسن بولا۔ "سامان ... لے جائیں گے اور خواتین سے کہیں گے کہ چھپا کر رکھیں۔ اب تک انھوں نے بڈھے کا سارا کاٹھ کباڑ اسٹور میں رکھ دیا ہوگا اور وہ فرنیچر سیٹ کر دیا ہوگا جو میں نے خرید کر بھیجا تھا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔ "جو سامان ہم نے خریدا تھا وہ تو ٹیکسی میں ہی رہ گیا۔"

"اور ٹیکسی والا نہ جانے کدھر گیا۔ مجھے تو نظر آیا نہیں۔"

"وہ سب سے پہلے فرار ہوا ہوگا کہ کسی مصیبت میں نہ پھنس ..."

"... نے کہا۔ "اس کے ڈھائی تین سو روپے گئے۔"

"وہ دو ہزار سے زیادہ کا مال لے گیا۔ مجھے تو اس کا نمبر بھی یاد نہیں۔"

"نمبر تو میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ خیر جانے دو۔" میں نے کہا۔ "افسوس تو اس ہیئر ڈریسر پہ ہے۔ اس کا ... ہو گیا۔"

"اس کا ایک کاریگر بھی مارا گیا۔" محسن نے کہا۔

"اب پولیس کے چکر میں آ جائے گا۔ تفتیش ہوگی اور رہی سہی کسر پوری ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "ہم سے ہمدردی اسے بہت مہنگی پڑی۔"

"کیا وہ ہمارا نام لے گا؟" محسن بولا۔

"مجھے تو امید نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ محبِ وطن اور سچا پاکستانی ہے۔ اسے صدمہ اگر ہوگا تو اپنے ایک کاریگر کی موت کا یا پھر اس کا کہ وہ ہماری مدد نہ کر سکا۔ اگر اس نے عقل مندی سے کام لیا تو بیان مختصر رکھے گا کہ معلوم نہیں کون تھے جو اندر دستی بم پھینک کر فرار ہو گئے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ شاید اسی کے دشمن تھے۔ اگر وہ بڑی مصیبت سے بچنا چاہے گا تو ہمارے سامنے آنے کی بات خود بھی نہیں کرے گا اور کسی کاریگر کو بھی نہیں کرنے دے گا۔"

"ہم اس کا نقصان پورا کر دیں گے۔ وہ کام کا آدمی تھا۔"

"وہ کام کا آدمی ہے۔" میں نے ہے پر زور دے کر کہا۔ "آئندہ بھی انکار نہیں کرے گا۔ بس ہم احتیاط کریں گے کہ اس سے ملنے جائیں تو چوروں کی طرح جائیں۔"

میں نے گاڑی کو ایک موڑ پہ روک لیا۔ ڈیوڈ کا مکان موڑ کے بعد دوسرا تھا۔ میں اتر کے اکیلا گیا اور کال بیل بجائی تو جولی نے گیٹ کو اندر سے کھولا۔ گیٹ لائٹ کی روشنی میں اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

"بڈھا کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا اور اندر چلا گیا۔

"ڈنر کر رہا ہے۔" جولی ہنسی۔ "عجیب کارٹون ہے..."

مگر میں اس وقت کارٹون دیکھنے یا سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں اندر گیا تو مجھے کمرے میں فرنیچر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ جولی اور کیتھرین نے واقعی گھر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ فی الحال دو کمرے ٹھیک ہوئے تھے کیونکہ تیسرے کمرے میں ڈیوڈ موجود تھا۔ غالب ایک بیڈ پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

"غالب!" میں نے قریب جا کے کہا۔ "میں کچھ خطرناک سامان لا رہا ہوں، اسے چھپا کے رکھنا ہے۔"

"کیسا خطرناک سامان؟" غالب اٹھ بیٹھا۔

"ابھی دیکھ لینا۔ دو مہمان ہیں، انھیں کہیں چھوڑنے جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "واپسی پہ سب بتا دوں گا۔" میں نے ادھر ادھر سے چادریں کھینچ کے باہر کا رخ کیا۔ پہلی چادر میں ایک کریٹ پلیٹ کراتے ہوئے میرا سانس پھول گیا۔ یہ اتنا ہی بڑا اور ویسا ہی کریٹ تھا جیسے پھل پیک کرنے میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ہر کریٹ کا وزن بہت زیادہ تھا۔ دوسرے پھیرے میں دوسرا کریٹ رکھنے کے بعد میں واپس گیا تو میں نے محسن کو غائب پایا۔ پھر وہ کار کے دوسری جانب سے نکلا۔

"سالا ہوش میں آ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔ "ایک دم اچھل کے بھاگا تھا۔"

"پھر؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"پھر کیا... میں نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ سر پہ ہی مارا۔ اس نے ریوالور دکھایا۔" اور پھر اندر ڈال دیا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"پتا نہیں... ویسے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔" محسن بولا۔ "تو جلدی کر..."

میں نے چاروں مشین گنوں کو چادر میں لپیٹ کر اٹھایا اور ایک اکڑی ہوئی لاش کی طرح اندر لے گیا۔ دونوں کریٹ جولی اور کیتھرین نے بیڈ کے نیچے کر دیے تھے۔ کیتھرین پر کوئی اثر نہ تھا مگر جولی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے یہ سب پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اسپتال کے بستر پہ زندگی سے مایوس لیٹنے والی جولی نے یکلخت ہماری ہنگامہ خیز، خطرناک اور جنون پرور زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ یوں جیسے کوئی کسی مقبرے کی سوگوار خاموشی سے اچانک پاپ میوزک کے شور سے گونجتے ہوئے ڈانس ہال میں قدم رکھ دے۔ میں نے مشین گنوں کو بھی ایک بیڈ کے نیچے کھسکایا ہی تھا کہ ڈیوڈ آ گیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟" وہ کسی تمہید کے بغیر بولا۔ "کہ تم سب آ گئے ہو مگر تمھارا سامان ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ عموماً لوگ سامان پہلے روانہ کرتے ہیں اور خود بعد میں آتے ہیں۔"

"ہمارے پاس بہت زیادہ ساز و سامان پہلے بھی نہیں تھا۔" میں نے کہا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کچھ بھی رکھتے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ بات بھی میں نے نہیں پوچھی تھی کہ تم لوگ پہلے کہاں رہتے تھے اور وہ جگہ تم نے کیوں چھوڑ دی؟" وہ بولا۔ "تم کچھ پُراسرار قسم کا قبیلہ ہو۔"

"تمھاری یہ تفتیش میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "لوگ جو کرائے پر رہتے ہیں، وہ دربدر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مالک مکان سے لڑنا جھگڑنا کے رہنا ہمیں اچھا نہیں لگتا اور جب کرائے کے مکان مل جاتے ہوں تو پھر..."

"میں تمھیں اصل بات بتاتی ہوں مسٹر ڈیوڈ۔" کیتھرین نے میری بات کاٹ کے انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ "میں ایک بیوہ ہوں۔ میرے شوہر کے کچھ دشمنوں نے میرا گھر جلا دیا۔ اس میں جتنا سامان تھا وہ سب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی جل گیا۔ یہ میری لڑکی جولی چھ ماہ سے اسپتال میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے میری مدد کی اور میری بیٹی کو گردے کا عطیہ ملا۔ یہ جولی کی دوسری زندگی ہے۔ اسے اسپتال سے واپس اس گھر میں لے جانا مشکل تھا جہاں اب ایک کھنڈر کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔ اس موقعے پر ان دو نوجوانوں نے پھر میری مدد کی اور میرے لیے کرائے کا یہ گھر تلاش کیا جہاں میں سکون سے اپنی بیٹی کے ساتھ رہ سکوں اور مجھے کسی سے کوئی اندیشہ نہ ہو۔ تم تصدیق کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ میں تم کو اپنا پتا دیتی ہوں، اس مکان کا جو جلا دیا گیا، تم اسے دیکھ بھی سکتے ہو۔ تم اسپتال جا کے ڈاکٹروں سے مل کر جولی کے سارے کیس کی تفصیلات بھی حاصل کر سکتے ہو۔ اگر اس سچ میں ایک فیصد بھی جھوٹ ہو تو ہمارا سامان اُٹھا کے باہر پھینک دینا۔ ہم بے سہارا رہتے ہیں۔ رہن سہن پر، آپس کے تعلقات پر نہ تمھیں شک کرنا چاہیے اور نہ تشویش میں مبتلا ہونا چاہیے۔"

"میں اس سچ کو تسلیم کرتا ہوں۔" وہ متانت سے بولا۔ "بہت بہتر ہوتا اگر مجھے ابتدا ہی میں یہ سب بتا دیا جاتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"تھینک یو مسٹر ڈیوڈ۔" کیتھرین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمھارے یہ دونوں مددگار نوجوان تمھارے رشتے دار نہیں ہیں۔ اور غالباً کرسچین بھی نہیں ہیں۔" ڈیوڈ اسی طرح اپنے پرانے کالے سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہا جس پر اس نے مضحکہ خیز بو لگا رکھی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" کیتھرین نے کہا۔ "مگر کیا اس میں کوئی معیوب بات ہے اگر میں ان پر رشتے داروں سے زیادہ بھروسا کروں...؟"

"میں اعتماد کو بہت بڑی طاقت اور صفت تسلیم کرتا ہوں۔ انسان کے جذبات اور اس کی فطرت کا تعلق اس کے مذہبی عقائد سے ہونا بھی نہیں چاہیے ورنہ وہ خطرناک ہو جاتا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ مکان حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک بے ضرر سا جھوٹ بولا تھا۔" میں نے شرمندگی کے احساس کو مٹانے کے لیے کہا۔

"آئی ڈونٹ مائنڈ۔ یہ بے ضرر ہی نہیں، فائدہ پہنچانے والا جھوٹ تھا۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔ "اور خود کو فائدہ پہنچانے کے لیے تو سب ہی جھوٹ بولتے ہیں... جو گناہ ہے۔ مگر دوسروں کے فائدے کی خاطر جھوٹ کو بھی نیکی شمار کرنا چاہیے۔ میں نے دخل اندازی کی۔ اس کے لیے معذرت۔ دراصل یہ جھوٹ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس کو۔ اب میں مطمئن ہوں۔ تم لوگ اس کو اپنا گھر سمجھ کے رہو۔"

وہ واپس چلا گیا تو میں نے کیتھرین کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "تم نے سب کی عزت بچا لی۔"

"مجھے اس کا شک بُرا لگا تھا۔" کیتھرین نے کہا۔

"ایک بات اب بھی قابلِ غور ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے ہمارے اصل نام ابھی تک نہیں پوچھے۔"

"صبح پوچھے گا جب اُسے احساس ہو گا۔" جولی بولی۔

میں واپس نکل گیا۔ محسن میرے انتظار میں پریشان ہو رہا تھا۔

"اتنی دیر کر دی۔" وہ بولا۔ "میں نے کچھ اور مال برآمد کیا۔"

"کہاں سے؟" میں نے کہا۔

"سیٹوں کے نیچے سے۔" محسن بولا۔ "ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ کاروں میں مال سیٹوں کے نیچے بھی چھپایا جا سکتا ہے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے سے ڈائنا مائیٹ اسٹک اور اگلی دو سیٹوں کے نیچے سے چار ٹائم بم نکلے ہیں۔ ان کو بھی جلدی سے رکھ آ۔ پھر ہم چلتے ہیں۔"

پندرہ منٹ بعد ہم اس علاقے سے نکل گئے۔ اگلا مرحلہ قیدیوں سے نمٹنے کا تھا۔ کینٹ ایریا سے گزرتے ہوئے میں نے نمبر کے تار پر نگاہ رکھی۔ اس سارے علاقے میں آرمی آفیسرز کے بنگلے تھے۔ گاڑی کو ایک جگہ روک کے میں چند قدم واپس گیا اور ایک بنگلے میں داخل ہو گیا۔ یہ پرانی طرز کا بیرک نما بنگلا تھا۔ جس کے باہر میجر سلطان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی تو جو شخص باہر آیا وہ میجر سلطان بھی ہو سکتا تھا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے شائستگی سے انگریزی میں کہا۔ "مجھے ایک بہت ارجنٹ کال کرنا تھی۔ کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔"

"شیور۔" وہ ہاتھ بڑھا کے بولا۔ اور مجھے اس کمرے میں لے گیا جسے ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا۔ فون کرنا تو بہانہ تھا۔ میں نے نمبر ملا کے اُسے کہا کہ ایمبولینس فوراً بھیج دی جائے۔ میں ڈاکٹر شاہ بول رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ سوری رانگ نمبر اور فون رکھ دیا۔ مگر اتنی دیر میں میجر سلطان کے فون پر لکھا ہوا نمبر میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ اب میں اُسے باہر کسی بھی جگہ سے ٹیلی فون کر سکتا تھا۔

میجر سلطان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تھینک یو میجر۔" میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔

"ڈاکٹر شاہ۔" میجر سلطان نے مصافحے کے بعد میرا ہاتھ تھامے رکھا۔ "یہ تم نے کس اسپتال سے ایمبولینس طلب کی تھی؟"

سوال قطعی غیر متوقع تھا لیکن میں نے اپنے ردِعمل پر قابو پا لیا۔ "میرا اپنا پرائیویٹ کلینک ہے۔"

"اور اب یہ ایمبولینس کہاں آئے گی؟" میجر سلطان نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا لیکن بہت ہوشیاری سے میری راہ میں حائل ہو گیا۔ "میرا مطلب ہے تم نے جس سے بھی بات کی تھی، اُسے کوئی ایڈریس نہیں سمجھایا تھا۔"

"بات میں نے اپنے اسسٹنٹ سے کی تھی۔" میں نے کہا۔

"اور وہ جانتا ہے کہ اُسے ایمبولینس کہاں بھیجنی ہے۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ ضرورت پڑی تو میں فون کر دوں گا۔"

"آپ جس مریض کو دیکھنے آئے تھے وہ کہیں آس پاس ہی ہو گا۔ ڈاکٹر شاہ۔" میجر سلطان بولا۔ "اور اس کے گھر میں یا تو فون نہیں ہو گا یا وہ خراب ہو گا۔ ایم آئی رائٹ؟"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں شکوک کا رنگ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ "یہ اندازہ کرنا مشکل کام نہیں۔"

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مریض یا اس کے گھر والوں میں سے کسی نے خود فون کرنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کی اور ایک پرائیویٹ کلینک کے مالک ڈاکٹر سے کیوں کہا کہ وہ کسی بھی جگہ سے فون کر کے ایمبولینس منگوا لے۔ وہ یقیناً بہت بداخلاق اور بدتہذیب لوگ ہوں گے لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس علاقے میں تعلیم یافتہ اور رفتے دار قسم کے لوگ ہی رہتے ہیں۔" میجر سلطان نے کہا۔

"میں اس بحث اور جرح کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" میں نے بُرا مانتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

"مطلب تو میں بھی تمھارے آنے کا نہیں سمجھ سکا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "بلاشبہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ بہت اچھی انگریزی بول لیتے ہو۔ تمھاری شخصیت بھی متاثر کرتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم ڈاکٹر نہیں ہو کوئی دھوکے باز ہو۔" اس کا لہجہ حسبِ سابق سپاٹ رہا۔

"یہ خیال تمھیں کیوں آیا میجر سلطان؟" میں نے محتاط ہو کے کہا۔

"یہاں ایسی وارداتیں ہوئی ہیں کہ کوئی شخص جعلی پولیس افسر یا میٹر ریڈر بن کے گھر میں داخل ہوا اور گھر کے اندر کا نقشہ دیکھ گیا۔ بعد میں گھر کا صفایا ہو گیا۔" میجر سلطان نے کہا۔

"کیا میں صورت سے ایسا نظر آتا ہوں؟" میں نے غصّے سے کہا۔

"نہیں... صورت سے تم ایسے نہیں لگتے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ تم اسی شخصیت کے فریب سے لوٹتے ہو... ضروری نہیں کہ تم چور ڈاکو ہو۔ تم نوسرباز بھی ہو سکتے ہو۔ جو باتوں سے بے وقوف بناتے ہیں، کبھی رقم دُگنی کرنے تو کبھی زیورات کو دُگنا کرنے والے اب بھی شہروں میں آ جاتے ہیں۔ پلاٹ دلوانے والے، گاڑی دلوانے والے، غلموں میں چانس دلوانے والے، ہزار دھندے ہیں تم جیسے لوگوں کے۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ فون کرنے کے بہانے تم اندر آنا چاہتے تھے یا مجھ سے تعلق پیدا کرنے آئے تھے۔ ایم آئی رائٹ؟"

"نو... یو آر ایب سلیوٹلی رانگ... میرے پاس وقت ہوتا تو میں تمھارے شکوک دُور کر دیتا۔" میں نے کہا۔

"تمھارے پاس اتنا وقت ہے... اور نہیں ہے تو تم نکال لوگے۔ یہاں سے جانے سے پہلے مجھے مطمئن کر جاؤ... ورنہ تم جا نہیں سکو گے۔" اس نے ایک دم پتلون کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے بوکھلانے کی اداکاری کی اور سخت دہشت زدہ نظر آنے لگا۔

"اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں تمھیں شوٹ کر دوں گا اور پھر خود پولیس کو بلاؤں گا کہ تمھاری لاش اُٹھا کے لے جائے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میں تم کو نہیں جانتا۔ میرے سارے خاندان یا کسی دوست، واقف کار نے آج تک تمھاری صورت نہیں دیکھی مگر تم میرے گھر میں موجود ہو۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم چوری کی نیّت سے اندر گھسے تھے اور میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میرا تعلق فوج کے کس شعبے سے ہے؟"

"میں نے باہر صرف نام دیکھا تھا۔"

"خیر، میں بتاتا ہوں تمھیں۔ میں اے ایم سی میں ہوں۔ آرمی میڈیکل کور۔ اور اس کا مطلب تم سمجھ گئے ہو گے۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اس لیے اب تک تم خود کو ڈاکٹر پوز کر رہے تھے تو اب یہ احمقانہ کوشش چھوڑ کے مجھے سچ سچ بتا دو کہ آخر تم کون ہو؟"

میرے لیے بہت مشکل اور پریشان کن صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اور جھوٹ، چالاکی یا ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے جان بچا کے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ میرے لیے اب ایک راستہ یہی رہ گیا تھا کہ میں میجر سلطان کے ریوالور کو ایک غیر مؤثر قوت بنا دوں۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور سے نشانہ بھی لیتا، میں اُسے ناک آؤٹ کر سکتا تھا اور اس کے ریوالور پر بھی قبضہ کر سکتا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی مدد کی ضرورت تھی اور میں نے اُسے ایک کام کے لیے ہی منتخب کیا تھا مگر انتخاب کے طریقۂ کار میں خامی کے باعث معاملہ اُلٹا ہو گیا تھا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں ملٹری پولیس کو طلب کروں؟" میجر سلطان نے میری خاموشی پر مسکرا کے کہا۔ "وہ خود تم سے پوچھ لیں گے کہ تم ڈاکٹر ہو یا ذہنی مریض۔ مجرم درحقیقت ذہنی مریض ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے ایک طویل سرد آہ بھری۔ ہاتھوں اور کندھوں کی حرکت اور شکل و صورت کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا کہ میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور میں مقابلے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتا۔

"کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے شکست زدہ لہجے میں کہا۔

"نو..." میجر سلطان نے کہا۔ "تم میرے مہمان نہیں ہو۔"

"ایک سگریٹ تو..."

"نو... یہ سب وقت ضائع کرنے اور چکر دینے کے حربے ہیں۔" وہ بولا۔

"آل رائٹ... تم سوال کرو... میں جواب دوں گا۔"

"تم ڈاکٹر نہیں ہو؟" وہ بولا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"صرف ہاں یا نا میں جواب دو۔" وہ مشتعل ہو گیا۔

"میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم نے کہاں فون کیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا۔
"اس نمبر سے تم کو کچھ معلوم نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔
یہ فکر تم کو نہیں کرنی چاہیے... نمبر بتاؤ۔" وہ بولا۔
میں نے اُسے نمبر بتا دیا جو اس نے نوٹ کر لیا۔
"یہ بھی تمہارا کوئی لنک ہے... میں معلوم کروں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔" اور وہ تم کو شناخت کرے گا... جسے تم نے فون کیا تھا۔"
تم اس سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟"
"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔
"میں فون پر بات کروں گا... تم بھی سُنو گے... اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا اور یہ مت سمجھنا کہ فوج کا ڈاکٹر گولی نہیں چلا سکتا... میں توپ بھی چلا سکتا ہوں۔"
میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔
اس نے نمبر ملایا اور ایک بٹن دبا کے ہینڈ سیٹ رکھ دیا... آواز اب براہِ راست فون کے چھوٹے سے اسپیکر سے آ رہی تھی اور میں دوسری طرف کی گھنٹی سُن سکتا تھا۔ چوتھی رِنگ پر کسی نے ہیلو کہا۔
"کون بول رہا ہے؟" میجر سلطان نے کہا۔
"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" جواب دینے والی عورت نے کہا۔
"ابھی آپ کو ڈاکٹر شا نے فون کیا تھا؟"
"میں کسی ڈاکٹر شا کو نہیں جانتی۔" وہ تند لہجے میں بولی۔
"پھر اس نے تمہارا نمبر کیوں ملایا تھا؟"
"اگر تم ڈاکٹر شا کو جانتے ہو تو اُسی سے پوچھو۔"
"اگر آپ کے لیے وہ اجنبی تھا تو آپ نے اُسے کیا جواب دیا تھا؟"
"جو مجھے دینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا تھا کہ رانگ نمبر... مگر تم یہ سب پوچھنے والے کون ہو؟"
"پولیس۔"
"یہ ڈاکٹر ابراہیم سرور کا گھر ہے۔ دوبارہ سوچ سمجھ کے بات کرنا۔"
فون بند ہو گیا اور میں نے میجر سلطان کے ماتھے پر بل دیکھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خفا نظر آتا تھا۔
"کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے کہ میں بھی ڈاکٹر... تم بھی ڈاکٹر اور میں نے سوچے سمجھے بغیر جو نمبر ملایا تھا، وہ اتنے بڑے ڈاکٹر کا گھر..." میں نے کہا۔
"آئی سی... تم نے سوچے سمجھے بغیر نمبر ڈائل کیا تھا... گویا تمہارا مقصد صرف اندر آنا تھا۔" میجر سلطان بولا۔" میرا خیال ہے کہ مجھے تفتیش کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایم پی کو بلاتا ہوں۔"
"انگریزی میں کہتے ہیں کہ کودنے سے پہلے سوچ لو... کہ کہیں تم گڑھے میں تو نہیں کود رہے ہو؟" میں نے کہا۔" یا آسمان سے کود کے

بکھیر میں اٹکنے کے امکانات تو پیدا نہیں کر رہے ہو۔"
"شٹ اپ... میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔" تم صرف میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کی سوچ رہے ہو۔ تمہارا ذہن ون وے ٹریک پر ہے... ان مشکلات کو بھول رہے ہو جو تم خود اپنے لیے پیدا کرو گے۔"
"کیا مطلب ہے اس بکواس کا...؟"
"فرض کرو، ملٹری پولیس یا پولیس کے سامنے میں نے بکواس شروع کر دی؟" میں نے کہا۔
"وہ تمہارا دماغ درست کر دیں گے۔"
"مگر تمہارا معاملہ تو بہر حال بگڑ جائے گا۔ میرے صرف بیان سے۔" میں نے کہا۔" کیا یہ تمہاری مسز کی فوٹو ہے؟" میں نے ... کے ایک فریم کو اٹھا کے غور سے دیکھا۔
"میری بیوی کی تصویر وہیں رکھ دو... سؤر کے بچے۔" وہ چلا کے بولا۔
"تمہاری وائف بہت ینگ ہے اور بہت خوب صورت..." میں نے کہا۔" اور اگر میں نے بیان دے دیا کہ یہاں میں اس کے بلاوے پر آیا تھا... میں اس کا یار ہوں... شادی سے پہلے کا... وہ ایک آوارہ..."
حسبِ توقع میجر سلطان نے مجھے انگریزی میں ایک گندی گالی دی اور ریوالور اٹھا کے فائر کیا۔ اس کی عزت و ناموس پر یہ حملہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں اس کے ہاتھ پر نظر جمائے بیٹھا تھا اور میرے آخری لفظ کے ساتھ ہی اس کا ردِعمل دیکھتے ہی میں غوطہ مار کے صوفے سے فرش پر گر گیا لیکن گرتے گرتے میں نے تصویر کا فریم میجر سلطان پر پھینک مارا۔ فریم دھات کا بھاری تھا۔ میرا نشانہ بھی خطا ہوا۔ فریم ریوالور والے ہاتھ پر نہیں لگا۔ میجر سلطان کے مُنہ سے ٹکرایا تاہم اس سے میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میجر سلطان ایک کشن والے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جھٹکا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ اُٹھتا، میں نے اُسے دبوچ لیا۔
"تم نے یہ سب کچھ بلاوجہ کیا۔" میں نے میجر سلطان کی کلائی کو جھٹکا دے کر فرش پر مارا اور ریوالور لے لیا۔
"یُو باسٹرڈ۔" میجر نے زور لگا کے مجھے دُور پھینک دیا اور چلّانے لگا۔" نور جہان۔" مگر گولی کی آواز پر اس کا بیٹ مین پہلے ہی اندر آ چکا تھا۔ دوسری طرف سے اس کی بیوی آ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین تھی مگر اتنی معصوم صورت تھی کہ مجھے اپنے بے ہودہ الفاظ پر شرم آئی۔
"سب رُک جاؤ... اپنی اپنی جگہ..." میں نے ریوالور سنبھال کے کہا۔" ورنہ میجر صاحب کی جان جائے گی۔ میرا ارادہ ابھی تک کسی کو بھی نقصان پہنچانے کا نہیں ہے... بس میں یہاں سے

جاتا ہوں... میرا راستہ کوئی نہ روکے۔"
"خدا کے لیے تم جاؤ۔" میجر سلطان کی بیوی نے کانپتے ہوئے کہا۔" میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا راستہ کوئی نہیں روکے گا۔" وہ آگے بڑھ کے اپنے شوہر کے سامنے آ گئی۔
"میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔" میجر سلطان نے غرّا کے کہا۔
"پلیز... تم چپ رہو۔" میجر سلطان کی بیوی نے پلٹ کر کہا۔" میری خاطر۔"
"مجھے بہت افسوس... اور شرمندگی ہے خاتون۔" میں نے کہا۔" کہ میں نے آپ کے شوہر کے سامنے انتہائی نامناسب اور بے ہودہ الفاظ استعمال کیے... آپ کے لیے... میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" میں نے ریوالور کا میگزین خالی کر کے گولیاں جیب میں ڈال لیں۔
میجر سلطان نے پھر مجھے ایک گالی دی۔" میں اکیلا ہوتا تو دیکھتا۔"
"تم مت بولو۔" میجر سلطان کی بیوی نے چلّا کے کہا۔
"یہ آپ کا سروس ریوالور ہے۔" میں نے ریوالور نیچے ڈال دیا۔" اس لیے میں ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں... اس کی گمشدگی سے آپ کے لیے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ یہ گولیاں بھی میں باہر ڈال جاؤں گا۔ تاہم آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ میرے پاس ذاتی اسلحہ بھی ہے۔" میں نے جیب کے اندر سے اپنا ریوالور نکال کے دکھایا۔" اگر میرا مقصد آپ کو لوٹنا ہوتا تو میں فون کرنے کا احمقانہ ڈراما نہ کرتا میجر سلطان۔ بے شک میں ڈاکٹر نہیں ہوں لیکن میں چور ڈاکو یا نوسرباز بھی نہیں ہوں۔ میں اتنا ہی شریف آدمی ہوں جتنے آپ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں آپ سے ضرورت کے تحت ایک تعلق پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔ ابھی میں وضاحت نہیں کر سکتا مگر میجر... ایک دن آئے گا کہ تم مجھ سے تعلق پیدا کرنا چاہو گے اور اس تعلق کو اہم سمجھو گے۔ ہو سکتا ہے کل ہی تمہاری غلط فہمی رفع ہو جائے تو تم یہ سب بھول جاؤ۔ اور ہم پھر ملیں تو دوست ہوں۔"
"معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" میجر سلطان نے کہا۔ وہ کنفیوز ہو گیا تھا اور اب اس کے لہجے میں نفرت یا اشتعال کا جذبہ سرد پڑ رہا تھا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔" فی الحال شب بخیر... خدا حافظ مسز سلطان... پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں... اطمینان سے سو جائیے اور اس واقعے کو بھول جائیے۔"
میں اطمینان سے باہر نکلا تھا مگر مجھے میجر سلطان کی طرف سے اطمینان نہیں تھا چنانچہ میں ایک دیوار کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ مشکل سے دو منٹ کے بعد میجر باہر آیا۔ بیوی نے اس کی قمیص کی آستین پکڑ رکھی تھی۔
"گیا کدھر آخر وہ...؟"
"کہیں بھی گیا... تم چلو اندر..." میجر کی بیوی نے کہا۔
"آپ کہیں تو میں اس بدمعاش کو گلی سے پکڑ لاؤں؟" اس کے بیٹ مین نور خان نے کہا۔
"چلو تم بھی اندر... اب سورما بن رہے ہو۔" مسز سلطان نے اُسے جھاڑا۔" جب وقت تھا تو چوہے کی طرح دبک گئے تھے۔ کوئی ضرورت نہیں کسی کو اُس کے پیچھے جانے کی۔ اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ نقصان پہنچانے والا آدمی تھا بھی نہیں۔"
"یہی تو مجھے حیرانی ہے... کہ وہ آیا کیوں تھا..." میجر سلطان نے کہا۔" نہ کچھ لیا، نہ دیا... خواہ مخواہ ایک بوگس کال کی... بہت پُراسرار آدمی تھا۔"
"شکر کرو کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوا... تم نے تو گولی چلا دی تھی۔"
"تمہارا دماغ خراب ہے... معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟" میجر سلطان بگڑ کے بولا۔
"کچھ بھی کہا ہو... جاتے جاتے معافی تو مانگ گیا..."
"مارا جاتا میرے ہاتھوں تو یہ مذاق مہنگا پڑتا۔" میجر نے کہا اور بیوی کے ساتھ اندر لوٹ گیا۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے بنگلے سے باہر نکل آیا۔ بی ایم ڈبلیو وہیں کھڑی ہوئی تھی جہاں میں نے اُسے چھوڑا تھا۔ میں نے مخالف سمت میں سفر کیا اور تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد گھوم کر پیچھے والی اسٹریٹ پر ہو لیا۔ وہیں کونے پر مجھے ایک ٹیلی فون کا کھمبا دکھائی دیا اور میں اللہ کا نام لے کر اس پر چڑھ گیا۔ بنگلے سے نکلنے کے چند منٹ بعد میں پھر میجر سلطان کا نمبر ملا رہا تھا۔
"ہیلو..." میجر سلطان کی آواز آئی۔
"میجر سلطان۔" میں نے کہا۔" اب میں بتاؤں گا کہ میں کیوں آیا تھا۔"
"تم!" انتہائے حیرت سے میجر سلطان صرف ایک لفظ بول سکا۔
یس... میں..." میں نے کہا۔" فون بند مت کرنا... مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات کرنی ہے... میں صرف تمہارا فون نمبر نوٹ کرنے آیا تھا۔"
"مائی گڈنس... اور اب کس کے بنگلے میں گھسے ہو فون کرنے؟"
"یہ میں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔" میں ہر جگہ رسائی رکھتا ہوں۔"
"تم نے ریوالور کی گولیاں کہاں ڈالی ہیں؟"
"گیٹ پوسٹ کے اوپر..." میں نے کہا۔" اب میری بات سُن لو... جو تم کو مضحکہ خیز لگے گی مگر یہ قومی سلامتی سے تعلق رکھنے والا انتہائی اہم معاملہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ملک کا دفاع کرنے والوں میں ہو اس لیے تم اس معاملے سے اچھی طرح نمٹ لو گے۔"
"کیا تم پاگل ہو... یا مجھے پاگل سمجھتے ہو...؟"
"تمہارے گھر کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی ہے۔" میں نے اس کی بات کو اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔" جرمنی کی بی ایم ڈبلیو۔ اس کے اندر دو افراد ہیں۔ ان کو ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دو... یہ ہمارے ملک کے دشمن ہیں۔ کیا تم نے گزشتہ دن کے اخبارات میں سنگرالی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ دریافت ہونے کی تفصیل پڑھی تھی؟"

"آں... ہاں..." وہ چونکا۔ "پڑھی تھی۔"

"اس میں سائیں پاپڑ والے اور رحیوریوالہ کے ذخائر کا تذکرہ بھی تھا۔"

"تم... تم سکندر بخت... او مائی گاڈ..."

"تھینک یو میجر... کہ تم نے مجھے دیر سے سہی مگر شناخت کر لیا... امید ہے اب تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم براہِ راست بھی بات کر سکتے تھے... اپنا نام بتا کے۔"

"میں اعتماد کا خطرہ مول نہیں لیتا مگر اعتماد کرنا جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب تم باہر جا کے اُن دونوں کو قابو کرو اور دیکھو کہ وہ تفتیش میں کیا بتاتے ہیں۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور ان کے پیچھے بھی خطرناک لوگ ہیں اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ خود کو بھی مار سکتے ہیں... اور تم کو بھی... میں نہیں چاہتا کہ تمھاری خوب صورت بیوی اس عمر میں بیوہ ہو۔"

"ایک آوارہ اور بدکردار عورت۔" وہ ہنسا۔

"میں معافی مانگ چکا ہوں میجر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ سب تم کو مشتعل کرنے کے لیے ضروری تھا... تم مشتعل نہ ہوتے تو میں خود کو یا تمھیں نقصان پہنچائے بغیر وہاں سے کیسے نکلتا۔"

"اچھا سبق دیا ہے تم نے مجھے۔" وہ بولا۔ "آئندہ میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھوں گا۔"

"بہت مشکل ہے میجر سلطان... بلکہ ناممکن۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "کوئی بھی غیرت مند شوہر ایسی بے ہودہ بات پر وہی کرے گا جو تم نے کیا۔"

"تم بھی یہی کرتے؟"

بالکل... بشرطیکہ میری بیوی ہوتی اور تم اسی طرح میرے گھر میں گھس کے اس کے بارے میں یہی کہتے۔" میں نے کہا۔ "خیر اب میں لمبی بات نہیں کر سکتا کیونکہ میں سولی پر ٹنگا ہوا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی، پھر کبھی ملیں گے تو دوست بن کر ملیں گے۔ ابھی تو مجھے صرف ایک بات اور کہنی ہے۔ کل صبح کا اخبار دیکھو گے تو اس میں میکلوڈ روڈ پر ایک ہیئر ڈریسر کی دکان میں بم کے دھماکے اور کچھ تخریب کاروں کی دہشت انگیزی کا ذکر ملے گا۔ اس تمام ہنگامہ آرائی کے ذمے دار یہی دونوں ہیں جو کار میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسند عناصر کے مددگار ہیں اور بھارتی ایجنٹ بھی ہو سکتے ہیں۔ تمھاری ملٹری انٹیلی جنس ان سے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہے۔"

"مائی گاڈ... ہم ان کا سر توڑ کے اندر سے تمام ضروری اور اہم معلومات کا ذرّہ ذرّہ نکال سکتے ہیں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "لیکن مجھے یہ تو بتاؤ..."

"فی الحال اس سے زیادہ نہیں۔"

"کیا تم ڈرتے ہو کہ میں کال ٹریس کرا لوں گا؟"

میں ہنسا۔ "ابھی ہم ترقی کے اس دور سے بہت دور ہیں۔ شاید ایک گھنٹے تک وہاں کوئی نہ پہنچے جہاں سے میں بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے دوسرے کام بھی ہیں۔"

"گڈ لک سکندر بخت۔"

"تھینک یو میجر سلطان۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب اچھے لوگ مجھے اچھا سمجھنے لگے ہیں اور میرے اچھے کام کے لیے اپنی اچھی تمنا رکھتے ہیں۔ یہ مورال سپورٹ ملے تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"صرف مورال سپورٹ ہی تو کافی نہیں ہوتی۔"

"مگر جب کوئی کسی سے اصولی طور پر اتفاق کرتا ہے تو ہر طریقے سے اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ جتنی جس کی استطاعت ہو یا جتنی کسی میں ہمت ہو۔ یہ احساس ہی بہت بڑی طاقت ہے کہ اب میرے دشمن بھی صفِ دوستاں میں شامل ہونے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "خدا حافظ۔"

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

"میں کل تم کو پھر فون کروں گا۔ اگر موقع ملا۔" میں نے کہا اور لائن کاٹ کے کھمبے سے نیچے اتر آیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مجھے گھور رہا تھا۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ کا بہت موٹا آدمی تھا۔

"کون ہو تم... اوپر کیا کر رہے تھے؟" وہ بولا۔

"اوپر؟" میں نے سر اٹھا کے کھمبے کو دیکھا۔ "اوپر کہاں؟"

"اوپر کھمبے پر؟" وہ چلا کے بولا۔

"لیکن میں تو اب نیچے آ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں کہتا ہوں تم چڑھے کیوں تھے؟"

میں... بس ایسے ہی... ٹھنڈی ہوا کھانے..." میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی؟

"بکواس کرتے ہو میرے سامنے۔ میں نے دیکھا تھا کہ تم تار لگا کے لائن ملا کے فون کر رہے تھے... یہ جرم ہے۔" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"یہ کون سا جرم ہے؟ میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ لوگ کھمبوں پر چڑھ کے فون کرتے ہیں۔ میرے گھر میں فون ہوتا تو میں ایسا کیوں کرتا مگر مجبوری سب کراتی ہے جناب۔" میں نے کہا۔

"مجبوری کے بچے... میں ٹیلی فون کے محکمے کا ایس ڈی او ہوں۔ تم کھمبے کے لائن مین نہیں ہو۔ میں تمھیں پولیس کے حوالے کردوں گا۔" ایس ڈی او نے کہا۔

"او ایس ڈی صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں بھی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہوں مگر میری ڈیوٹی کی اسپیشل نیچر..."

"میں ایس ڈی او ہوں... او ایس ڈی نہیں..."

"چلیں یوں ہی سہی... میرا ایک بھائی بھی ڈی ایس او ہے۔ ڈسٹرکٹ سیلز آفیسر۔" میں نے کہا۔

اس نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ "میں ایس ڈی او ہوں۔ سب ڈویژنل آفیسر محکمۂ ٹیلی فون کا... تم خود کو زیرِ حراست سمجھو۔"

"اگر میں بھاگ جاؤں تو آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔

"میں... میں شور مچاؤں گا۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں آپ کی سننے والا کون ہے... گھر میں لوگ آرام سے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے... آپ کا گلا بیٹھ جائے گا۔"

اس نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ پیچھے گر پڑا لیکن فوراً اٹھا اور میرے پیچھے دوڑا۔ میں نے قہقہہ مارا اور خود بھی دوڑا۔ وہ مشکل سے پچاس گز دوڑ کے رک گیا۔ میں نے بہت فاصلے سے پلٹ کے ہاتھ ہلایا اور اسے خدا حافظ کہا۔ مجھے دنیا کے ان موٹے افراد پر افسوس ہوا جو اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ ان کی نظر کے سامنے سے کوئی قتل کر کے بھاگ جائے یا ان کی دولت اٹھا کے فرار ہو رہا ہو تو وہ شور مچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور پاگل کتا پیچھے لگ جائے تب بھی بچ کے نہیں جا سکتے۔ اس چھوٹے سے ایک ایکٹ کے پُرلطف ڈرامے نے میری ساری کوفت دور کر دی جو مجھے کچھ دیر پہلے کے معرکۂ دار و گیر سے اٹھانی پڑی تھی۔

میجر سلطان نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے تقریباً گرفتار کر لیا تھا چنانچہ مجھے امید تھی کہ اسی ذہانت سے کام لیتے ہوئے وہ دونوں قیدیوں کو پولیس یا ملٹری کے حوالے کر دے گا اور کرنے والے تفتیش بھی کر لیں گے۔ مسئلہ اس گاڑی کا تھا۔ اگر وہ سفارتی عملے کے کسی رکن کی ہوگی تو سفارت خانہ احتجاج کرے گا اور بات پھر کچھ ہو جائے گی۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عملے کے دو معزز ارکان شاپنگ کے لیے انارکلی گئے تھے اور چائے پی کر ایک ریسٹورنٹ سے نکل رہے تھے جب انھیں مسلح افراد اغوا کر کے لے گئے۔ متحارب سیاسی گروہ یا دوستانہ تعلقات نہ رکھنے والے ممالک ایک دوسرے پر کچھ بھی الزام لگا سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں افراد کی بازیابی کا مطالبہ کیا جائے مگر یہ سیاسی مسئلہ خود حکومت سیاسی طور پر حل کرے گی۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ میں ان کے دامِ اجل سے بچ کر نکل آیا اور اس مقابلے میں ہمارا فائدہ یہ ہوا کہ کچھ اسلحہ مل گیا جو وقتِ ضرورت کام آئے گا۔ مجھے صرف اس ہیئر ڈریسر کی دکان کی تباہی کا افسوس تھا جس نے بڑے وطن پرست جذبے کے ساتھ ہماری مدد کی تھی۔

خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ سارا ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس ہیئر ڈریسر کے نقصانات کی تلافی بعد میں کی جا سکتی تھی۔ اس نے میرے اور محسن کے لیے جو وِگیں نکالی تھیں وہ ہمارے پاس ہی رہ گئی تھیں۔ ایک تو اس نے فٹ کر کے بھی بتا دی تھی اور دوسری ہم دیکھ ہی رہے تھے کہ شکاری آ گئے تھے۔ محسن نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے وِگ وہاں نہیں چھوڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آگے چل کے جب اپنی صورت بدلنے کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ وِگیں بہت کارآمد ثابت ہوں گی۔

اس رات ہم نے ڈٹ کر سو جانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ ہمارا لینڈ لارڈ بہت کائیاں آدمی تھا اور ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہم نے غالب کو چپکے چپکے وہ سب بتا دیا جو ہمارے ساتھ پیش آیا تھا لیکن جولی اور کیتھرین کو صبح تک کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

صبح ہم سو کے بھی نہیں اٹھے تھے کہ ہمارے لینڈ لارڈ نے دستک دی۔ "تم لوگ ابھی تک سوئے پڑے ہو؟" وہ خفگی سے بولا۔

"یہی تو دن ہیں سونے کے۔" محسن بولا۔ "بڑھاپے میں نیند کہاں آتی ہے۔"

"نان سنس۔" وہ بولا۔ "جوانی ہوتی ہے کام کرنے کے لیے۔ یہ وقت سو کر گنوا دو گے تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے۔ اور کون کہتا ہے کہ بڑھاپے میں نیند نہیں آتی... لک ایٹ می... میں پورے آٹھ گھنٹے سوتا ہوں۔ نہ ایک منٹ کم نہ ایک منٹ زیادہ... آدمی کا جسم کلاک کی طرح کام کر سکتا ہے بشرطیکہ آدمی اس کو ایک ڈسپلن کا پابند بنائے۔ خیر میں یہ بتانے آیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔"

"کب؟" میں نے کہا۔

"آج ہی... میری سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم بعد میں شریفوں کی طرح رہو گے اور وہ سب نہیں کرو گے جو کرتے رہے ہو۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہم کیا کرتے رہے ہیں جناب؟"

"وہی جو تم کو نہیں کرنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "لیکن میں تمھارا باپ بھی نہیں ہوں اور دوست بھی نہیں ہوں۔ میں نہ حکم دے سکتا ہوں اور نہ مشورہ... تم جو چاہو کرو مگر میری پراپرٹی محفوظ رہنی چاہیے۔"

اس نے ہم سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے چکرا دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا تھا۔

"تم اس کی بات کا مطلب سمجھے؟" محسن بولا۔

"ہاں اور نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم میرے جواب کا مطلب سمجھے؟"

"نہیں اور ہاں۔" محسن نے کہا۔ "غالباً بڈھا سب جان گیا تھا۔"

"کیا جان گیا تھا؟"

"یہی کہ ہم کون ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اور کیا کر رہے ہیں۔" غالب نے اتفاق میں سر ہلایا۔

"اس نے ہمیں پہچان بھی لیا تھا۔" محسن بولا۔

"پھر اس نے ظاہر کیوں نہیں کیا؟"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"وہ جا رہا تھا۔ اُسے ہمارے معاملات میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "بقول شاعر۔ بُلبُل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا۔ اس کی بُلا سے بوم بسے یا ہما رہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے گیا۔" محسن بولا۔ "اور وہ جانتا تھا کہ اس کی واپسی نہیں ہوگی۔"

"یہ پراپرٹی کا خیال رکھنے والی بات بھی ایسے ہی تھی۔ نہ وہ خود واپس آئے گا نہ اس کا بیٹا مگر اس نے دس ہزار روپے کراکاؤنٹ میں صرف اس لیے ڈالے کہ قانونی طور پر ہم کرائے دار رہیں اور خود کو مالک نہ سمجھنے لگیں۔" غالب نے کہا۔

"تم نے کیسے فرض کر لیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا؟"

"بس اس کا رویّہ، اس کی عمر اور اس کے حالات دیکھ کر۔ اب کتنی عمر رہ گئی ہے اُس کی۔ اور بیٹا جو کینیڈا میں سکونت اختیار کر چکا ہے، واپس آ کے کیا کرے گا؟ یہ پرانی فرسودہ حال کوٹھی کون سا بڑا اثاثہ ہے جس کے لیے وہ لوٹ کر آنا ضروری سمجھے۔ یہاں ایسے بہت سے پرانے گھر ہیں جن کے مکین ہجرت یا ترکِ وطن کر گئے اور جلاوطن ہوئے۔ ان کے سب رشتے ٹوٹ گئے اور جذبات بدل گئے۔ گھر کھنڈر ہو گئے۔ میرا گھر ایک مثال ہے۔" غالب نے بتایا۔

"میرا گھر ۔۔۔۔ مثال ہے۔" میں نے کہا۔

"بڑھا پچھ نہ لینے کے باوجود بہت کچھ کہہ گیا۔ ایک امانت ہمارے سپرد کر گیا اور یہ بھی سمجھا گیا کہ اب اس کی حفاظت بھی ہمیں اپنی زندگی کی طرح کرنی چاہیے۔" محسن بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ہمارا طرفدار اور حامی تھا۔ ہم سے اور ہمارے مشن سے اصولی اتفاق رکھتا تھا لیکن کھل کر یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا کہ کہیں ہم پریشان اور خوفزدہ نہ ہوں۔" غالب نے کہا۔ "اس نے اپنے شکوک کا اظہار بھی نہیں کیا۔"

"یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ آہستہ آہستہ لوگ ہمارے کام اور ہمارے نام سے آشنا ہو رہے ہیں۔ یہ ماننے لگے ہیں کہ ہم مجرم نہیں ہیں، مجاہد ہیں۔ ہم ڈائریکٹ ایکشن لیتے ہیں تو غلط نہیں کرتے۔ لوگ اس پورے سماجی، معاشی اور اخلاقی نظام کی ہیرا پھیری سے عاجز ہیں جس میں کوئی قانون، اصول یا ضابطہ کام نہیں آتا۔"

"یا کام آتا ہے تو غلط کام کرنے کرانے میں۔" محسن نے کہا۔ "اگر کوئی صحیح کام کرنا چاہے۔۔۔ صحیح طریقے پر۔۔۔ تو بدعنوان لوگ انہی قواعد و ضوابط کی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں اور اچھا کام کرنے والے کو بُرا بنا دیتے ہیں۔"

"اخبارات نے ہمارا امیج درست کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "لوگ اصل چہرہ پہچان رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اس ہیڈ ڈریسر کے بعد میجر سلطان نے اور اب ہمارے لینڈ لارڈ نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم سے اور ہمارے مشن سے ہمدردی رکھنے والے ہر جگہ پیدا ہو گئے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایسا نہ ہوتا تو یہ سب لوگ ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔"

"وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ۔ ظلم کی کھیتی سدا پھلتی نہیں کاغذ کی سدا چلتی نہیں۔" غالب بولا۔ "بالآخر سچ سب کے سامنے آنے لگا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ سچ کے ساتھ ہو رہے ہیں۔"

"یہ بڑی خوش آئند تبدیلی ہے اور بہت حوصلہ افزا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اب بہت محفوظ ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ہمیں پناہ دینے والے، ہمارے مددگار اور حمایتی بن گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف یہاں تک محدود نہیں ہوگی۔ جب اخبارات میں ہمارے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی تو ہم کہیں بھی غیر معروف نہیں رہیں گے۔ پناہ گاہیں زیادہ ہوں گی تو شکاری بھی آسانی سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔"

"یہ جگہ بھی بہت محفوظ ہے۔" محسن نے کہا۔

"اور اسے محفوظ ہی رہنا چاہیے۔"

"ہاں۔ جب تک غالب بالکل صحتیاب نہیں ہوتا۔" محسن نے کہا۔

"اس کے بعد بھی کیتھرین اور جولی کو یہاں رہنا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ان کا اپنا کوئی گھر نہیں رہا۔ ہم فی الحال ان کو ساتھ نہیں رکھ سکتے۔"

محسن نے اتفاق کیا۔ "کیتھرین پر شاک کا اثر ہے اور جولی پر بھی طویل بیماری کا اثر ہے۔"

"وہ ناتجربہ کار بھی ہے۔" غالب نے کہا۔

"ناتجربہ کار شہلا اور رابعہ بھی تھیں۔" محسن نے کہا۔

"نازو کا نام بھی لو یارو۔۔۔ اس کے نام سے اس کا تصور وابستہ ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہاں دوست، رابعہ کے نام سے اس کا تصور وابستہ ہے۔ مگر میں جاتے بوجھتے نہ اس کی بات کرتا ہوں اور نہ اس کا نام لیتا ہوں۔ اس سے سوچ کے راستے کھل جاتے ہیں اور خیال اُڑانے لگتے ہیں۔ میں نے رابعہ کے لیے اپنے جذبات کو دل کے ایک سرد خانے میں ڈال دیا ہے تاکہ احساس کی اذیت میرے دماغ کو ماؤف نہ کرے اور میں وہ سب کچھ کر سکوں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید زندہ بھی نہ رہ پاتا۔ اب رابعہ پھر ملے گی تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی کے نہ ہونے کا یقین آ جائے اور وہ اچانک مل جائے۔ فی الحال اسی یقین کی ضرورت ہے کہ رابعہ مر چکی ہے اور میں اُسے بھول چکا ہوں۔"

"اگر تیرے یہی جذبات رہے تو بہت جلد تو پاگل ہو جائے گا۔ یہ جنون کے آثار ہیں۔" محسن بولا۔

"پاگل تو میں ہوں۔۔۔ تم بھی ہو۔۔۔ ورنہ ہمارے راستے اور ہماری منزلیں جُدا ہوتیں۔ ہم یہاں نہ ہوتے۔ بہت پیچھے رہ جاتے یا اتنا آگے چلے جاتے کہ خود اپنا سراغ نہ ملتا۔ جنون کی ایک منزل ماورائے طلب میں طلب سے بے نیازی ہے۔" میں نے کہا۔

غالب نے سر کھجایا۔ "یہ قنوطیت کا فلسفہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اخبارات کی رپورٹ دیکھنی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "اور اس کے بعد شہلا سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔"

"شہلا سے کس لیے؟" میں نے کہا۔

"ہر شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے جس قسم کا رابطہ قائم کرنا چاہے کرے۔" غالب نے فرمایا۔

"وہاں آنکل رضوی نے پھر ایمرجنسی نافذ کر دی ہوگی۔ ان کی پوزیشن بہت خراب ہوئی ہے۔"

"صرف ہماری ۔ بہ سبب۔" میں نے کہا۔

"اب بہتر ہے کہ اپنے بھائی منظر کے ذریعے مواصلاتی رابطہ قائم کیا جائے۔ اور اسی سے تازہ ترین صورتِ حال دریافت کی جائے۔" محسن بولا۔

"میں نے منظر سے کہا تھا کہ وہ رابعہ کے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ایک لاکھ روپے لا دے۔ سینتالیس ہزار کے لگ بھگ ہمارے پاس ہیں اور یہاں ہمارا کام بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں آج ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"نازو اور اس کے بھائی اکرام نے بھی کراچی میں کچھ تو کیا ہوگا۔"

"مگر حیرت ہے کہ انھوں نے یہاں کسی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کہیں وہ بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گئے ہوں۔" محسن نے کہا۔ "رابعہ اور ٹیڈی کی خبر لینے گئے تھے اور خود گم ہو گئے۔"

"ان کی طرف سے کوئی پیغام مل جاتا تو ہمارے لیے آسانی ہو جاتی۔ خیر ہم بھی ہمت ہارنے والے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے ۔۔۔ تجھے ڈھونڈھ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" غالب نے آہ بھر کے کہا۔

"اپنی ٹانگ ہر جگہ اڑانے کا نتیجہ دیکھ لیا۔" محسن بولا۔ "نہ صحافی رہے نہ شاعر۔ آدھے عاشق اور آدھے چنگیز بانو بنے۔"

جولی اور کیتھرین گھر کی صفائی اور سامان کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں مصروف تھیں۔ مالک مکان کے رخصت ہوتے ہی انھوں نے اس کا کاٹھ کباڑ ایک کمرے میں رکھ کے تالا ڈال دیا تھا اور اب عملاً وہ پورے مکان کی مالک تھیں۔ دوپہر تک وہ کچن کو اس قابل کر چکی تھیں کہ وہاں کھانا پکایا جا سکے۔ محسن اخبارات لینے گیا اور اس کے واپس آتے تک میں نے اپنے اسلحے کے ذخائر کا جائزہ لیا۔ یہ سب خطرناک قسم کا تباہ کن اسلحہ تھا اور اسے ہم پستول کی طرح جیب میں ڈال کے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے لیکن یہ ضروری تھا کہ ہم جہاں بھی ہوں، یہ اسلحہ ہماری دسترس میں رہے۔

محسن آیا تو اس کے پاس اُردو انگریزی کے چار اخبارات تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس نے گورے ڈاکو اور پاٹے خاں ڈاکو کی گرفتاری، ان کے بیانات اور تصاویر کے علاوہ ہمارے کارنامے کی پوری خبر دی تھی لیکن اس خبر کے ساتھ جو پہلے صفحے پر شہ سرخی کے علاوہ ذیلی سرخیوں میں کئی جگہ مختلف حوالوں سے لگائی گئی تھی ۔۔۔ ہماری کوئی تصویر نہیں تھی۔ خبروں کے درمیان باکس میں کچھ ہلکی پھلکی باتیں بھی تھیں مثلاً ایک باکس میں لکھا ہوا تھا کہ "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔" کھوتا ذو معنی لفظ بن گیا تھا کیونکہ آگے ذکر تھا کہ پولیس پارٹی حلوے پراٹھے، مرغ اور نرگسی کوفتے کھا کے سوئی تو جاگنے پر انھوں نے خود کو ڈاکوؤں کی تحویل میں پایا۔ ان کی وردی، ان کا اسلحہ، جیپ اور ان کی آزادی سب چھن چکی تھی اور ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے جانے والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس طرح "کھوتا" یعنی گدھا بھی سمجھا جا سکتا تھا اور اتنا کچھ کھو دینے والوں کے لیے عام مطلب میں بھی آتا تھا۔

یہ صحافتی حلقوں میں ہلچل مچا دینے والی خبر تھی اور دوسرے اخبارات کے لیے اتنی بڑی خصوصی خبر کا نہ ملنا سخت پریشانی اور خفت کی بات تھی۔ غالب کا دوست راتوں رات ملک کے سب سے ذہین اور ہوشیار رپورٹر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اگر یہ سب جھوٹ ہوتا تو معاملہ اُلٹا ہو جاتا مگر ایس ایس پی رضوی صاحب نے ڈاکوؤں کو عین اسی مقام سے اُٹھا لیا تھا جہاں انھیں رپورٹرز سے ملوایا گیا تھا۔

پولیس کے ایک ڈی آئی جی نے مشتعل ہو کے رات کو کچھ رپورٹرز کو طلب کیا جو ایک دن پہلے کی پریس کانفرنس میں شریک تھے اور ان سے پوچھنا چاہا تھا کہ ہم سے ان کا کیا رابطہ ہے لیکن ایک گھنٹے بعد انھیں اپنے احکامات واپس لینے پڑے۔ صحافیوں نے یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ان کو ہمارے متعلق کیا معلوم ہے۔ سب نے صاف کہا تھا کہ جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ اخبارات میں آ گیا ہے۔ سکندر بخت اور اس کے ساتھی خود فون کر کے بلاتے ہیں اور رازداری کا وعدہ کرنے کے بعد وہ خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ وہ پولیس کو مطلع کر کے نہیں جا سکتے اور بدعہدی کر کے اپنا اعتبار کھونا نہیں چاہتے۔

ڈی آئی جی صاحب کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ تمام صحافی جو غالب کو جانتے تھے ۔۔۔ ہمارے مشن کی نوعیت کو سمجھ چکے تھے، پنجے جھاڑ کے پولیس کے بدعنوان اہلکاروں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اب مجرم پولیس بن گئی تھی جس نے مجرموں کی پشت پناہی کی اور زرخرید غلاموں کی طرح اُن ۔۔۔ اردوں پر ہمارے خلاف ناکردہ جرائم کی فہرست کو طویل سے طویل تر کرنے میں لگے رہے۔ بقیہ ۔۔۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے ہماری بے گناہی کے حق میں ایک مہم شروع کر دی تھی۔

جس اخبار میں ڈاکوؤں کی گرفتاری کی خبر اور ان کے بیانات شائع ہوئے تھے اس نے تو پولیس کی نااہلی پر پورا اداریہ لکھ مارا تھا اور صاف مطالبہ کیا تھا کہ اصل مجرم پولیس ہے اور اس پورے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن تشکیل دیا جائے جو ابتدا سے تمام معاملات کا جائزہ لے۔ یہ دیکھے کہ اصل مجرم کس طرح قانون کے ہاتھوں سے محفوظ رہے۔ وہ کون پولیس افسر تھے جو ملک دشمنی کے کاروبار میں مددگار رہے اور دشمن کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے رہے۔ ہمارے خلاف تمام قانونی معاملات کی از سرِ نو تفتیش کی جائے اور ان کو سزا دی جائے جنھوں نے ہمارے خلاف سازش کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

یہ تمام صورتِ حالات بہت خوش آئند تھی۔ اس سے دلاور اینڈ کمپنی کے لیے مشکلات پیدا ہوئی تھیں۔ ہمارا راستہ صاف ہونے لگا تھا اور اب یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایم آر ایس کی تحریک کو اخبارات کی حمایت مل گئی ہے۔ اس طرح ہمیں رائے عامہ کی تائید حاصل ہونا یقینی تھا اور ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ محبِ وطن عوام کی اکثریت نے ایم آر ایس کو اسی طرح تسلیم کر لیا ہے جس طرح تنظیم آزادیٔ فلسطین کو دنیا کے حریت پسندوں نے تسلیم کر رکھا تھا۔ اب ہم زیادہ بے خوفی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتے تھے اور امید رکھ سکتے تھے کہ ملک دشمنوں کے خلاف مدد کرنے والے ہر جگہ ہمارا ساتھ دیں گے۔

پھر آخری صفحے کی ایک خبر نے مجھے متوجہ کیا۔ اپنے بارے میں اتنی بہت سی خبریں، تبصرے اور اداریے پڑھتے ہوئے ہم سب بہت خوش تھے اور اتنے منہمک تھے کہ دوسری خبروں پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ہم سب کے جذبات ایک جیسے تھے۔ سب یہ محسوس کرتے تھے کہ ہماری طاقت کئی ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ ہم اکیلے نہیں رہے۔ ہمارے وسائل لامحدود ہو گئے ہیں۔ وہ سب جو اس ملک سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی مٹی سے عہدِ وفا رکھتے ہیں اور اس کی سرحدوں کی محافظت کو ایمان جانتے ہیں نظریاتی طور پر مانتے ہیں اور عملی طور پر پہچانتے ہیں۔ وہ سب ایم آر ایس میں شامل ہو چکے ہیں۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی اور سخت ترین دورِ ابتلا کے بعد ہمارے صبر و استقامت کے عوض ملنے والا، منزل کا نشان دینے والا اور یقین عطا کرنے والا وہ انعام تھا جس نے ہمارے حوصلوں کو بھی کئی ہزار گنا بڑھا دیا تھا۔ ہم تین آدمی تین مختلف اخبار دیکھتے جاتے تھے۔ بار بار ایک دوسرے کو کسی خبر کا متن سناتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ بہ یک وقت سب بولنے لگتے تھے۔ ایسے یہ دیکھ اس میں کیا ہے۔ یار یہ سُن... اور یہ خبر... کوئی انگریزی کا اقتباس پڑھ رہا تو کوئی اردو کا۔ سب کا تبصرہ اور شور الگ تھا۔

"یہ خبریں انکل رضوی نے پڑھ لی ہوں گی۔" محسن بولا۔

"انھوں نے کیا شہلا اور منظر نے بھی دیکھ لی ہوں گی۔"

"کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ سارے شہر نے پڑھ لی ہوں گی اور شہر میں دلاور بھی ہے اور اس کے شکاری کتّے بھی ہیں۔"

"تم شہر کی بات کرتے ہو۔ ملک کے دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات میں بھی کچھ تو ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے۔ خبر ایسی ہی ہے... میرا مطلب ہے قومی اہمیت کی خبر ہے۔" غالب بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کراچی کے اخباروں میں بھی یہ سب ہوگا۔"

"یقیناً ہوگا... یہ اخبار بہ یک وقت کراچی اور لاہور سے شائع ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"راولپنڈی، پشاور اور لندن سے بھی شائع ہوتا ہے۔" محسن بولا۔ "اکرام اور نازو نے بھی یہ اخبار دیکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اخبار کے رپورٹر سے رابطہ قائم کریں۔ یا منظر کو فون کریں۔"

"وری گڈ۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اب کام آسان ہو گیا۔"

"آسان؟" غالب نے کہا۔ "کام مشکل ہو گیا ہے نورِ چشمو! اتنا شور مچ گیا ہے کہ دلاور اینڈ کمپنی بہت محتاط ہو جائے گی۔ وہ سارے راستے سارے رابطے بدل دیں گے۔ انڈر گراؤنڈ تو پہلے ہی تھے، اب اور گہرائی میں چلے جائیں گے۔ پہلے کچھ بے خوفی تھی کہ پولیس اپنی ہے اور پکڑے گا کون۔ اب پولیس والے بھی ناک اونچی رکھنے کے لیے کچھ کارروائی تو کریں گے ہی۔ رائے عامہ کے احتساب سے بچنے کے لیے... اعلیٰ سطح پر حکام بھی ان باتوں کا نوٹس لیں گے۔"

"تم بہت امید پرست ہو رہے ہو دوست۔" میں نے کہا۔ "یہاں صرف کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ کچھ بیانات آئیں گے اس قسم کے کہ ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کر دی جائے گی۔ غداروں کو سخت سزا دی جائے گی۔ حکومت تخریب کاری اور انتشار پھیلانے کی اجازت نہیں دے گی۔ ملک کی سالمیت کے خلاف کام کرنے والوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سکہ بند بیوروکریٹ اسی قسم کے بیانات ہمیشہ دیتے آئے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ دلاور اینڈ کمپنی کے ساتھ صرف حشمت خان اے ایس آئی۔ یا ایس پی سراج ہی نہیں، اس سے بہت اوپر کی سطح کے لوگ بھی ہوں گے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اوپر والے بدعنوان نہ ہوں تو نیچے والوں کو آسانی سے پکڑ سکتے ہیں اور اوپر والوں کا خوف ہو تو نیچے والے کیسے غلط کام کر سکتے ہیں مگر اوپر والے براہِ راست شریک نہیں ہوتے۔ وہ بالواسطہ طور پر شامل رہتے ہیں۔ ان کی آشیرباد نیچے والوں کو حاصل ہوتی ہے اور نیچے والوں سے آشیرباد کا معاوضہ انھیں حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعلیٰ سطح پر کرپشن نہ ہو تو سب درست ہو جائے۔ اب تم دیکھ لینا کہ چند دن میں اخباروں کو نوٹس مل جائیں گے۔ ان کے خلاف عدالتی کارروائی ہوگی یا ضابطے کے مطابق انھیں "مفادِ عامہ کے خلاف" خبریں چھاپنے پر پابند کر دیا جائے گا۔ کچھ دن میں ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہوگا۔"

"تم نے ٹھیک کہا دوست۔ یہاں یہی کچھ ہو رہا ہے ——— حق کی آواز ایک ہو تو اسے دبانے والی آوازوں کا شور غالب آ جاتا ہے اور خرابی بڑھ جاتی ہے کیونکہ خرابی کی نشان دہی کرنے والوں کا انجام خراب ہوتا ہے۔" مرزا غالب نے مایوسی سے کہا۔ "مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس خرابے خانے میں کوئی مجاہد ہی نہیں رہا۔ کچھ صحافی اب بھی ہیں جو قلم کی آبرو پر جان بھی دے سکتے ہیں۔ یہ محاورے کی بات نہیں۔ وہ عملاً ایسا کر سکتے ہیں۔ اوپر والے معاملہ کتنا بھی دبائیں۔ لوگوں میں بات پھیل گئی ہے اور کچھ نہ کچھ آئندہ بھی پھیلے گی۔"

"چوہدری دلاور اینڈ کمپنی والے اب زخم خوردہ سانپ سے زیادہ خطرناک ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم نے ان کو خطرات کی دلدل میں دھکیلنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دولت، اثر و رسوخ اور اوپر کے بدعنوان سہاروں کی طاقت سے ہر خطرے کا رُخ پھر ہماری طرف کر دیں گے۔ جیسے ماہر کھلاڑی اسکواش کی خطرناک ترین شاٹ کو اپنے حریف کی طرف لوٹا کر پوائنٹ حاصل کر لیتا ہے۔"

اسی گفتگو کے دوران میں آخری صفحے پر میری نظر نے ایک چھوٹی سی خبر دیکھ لی۔ اس کی سرخی بہت زیادہ نمایاں نہیں تھی لیکن میری نظر کو گرفتار کرنے والا صرف ایک نقطہ تھا... دلاور...

"مشہور صنعت کار چوہدری دلاور نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

ایک لمحے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ محسن اور غالب نے غیر سنجیدگی اور بے یقینی کے ساتھ میری صورت کو دیکھا۔

"کیا وہ پاکستان کا وزیرِ اعظم اور صدر بننے کا فیصلہ بھی تو دہی کر لیا گیا؟" غالب نے کہا۔

"تم لوگ اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں اسے بکواس سمجھ رہا ہوں۔" محسن نے کہا۔

"یہ خبر بھی اسی اخبار میں موجود ہے جس کی دوسری خبریں آپ اور ہم سب ابھی تک خوش ہو رہے تھے۔" میں نے کہا اور اخبار اٹھا کے پڑھنے لگا۔ "معلوم ہوا ہے کہ مشہور صنعت کار چوہدری دلاور عملی سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے گزشتہ شام شاہدرہ کے علاقے میں دلاور بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ابھی تک انھوں نے کسی سیاسی جماعت میں شمولیت کے امکانات پر غور نہیں کیا ہے لیکن وہ ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل پر اپنے ہم خیال احباب سے مشورہ کر رہے ہیں۔ چوہدری دلاور نے کہا کہ موجودہ حالات میں تعمیرِ وطن، خدمتِ انسانیت اور اصولِ اخلاق کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو آگے آئیں اور ملک و ملّت کی بے غرض خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔"

"الو کا پٹھا... حرام زادہ..." محسن کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور اس نے ایک سانس میں نصف درجن گالیاں دے ڈالیں۔ ان میں سے نصف کو انتہائی فحش قرار دیا جا سکتا تھا۔

"سنو... آگے سنو۔" میں نے محسن کو ہاتھ کے اشارے سے ٹھنڈا کیا۔ "تمھاری گالیوں سے چوہدری دلاور کی سیاسی بصیرت پر اور اس قوم کی بصارت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ محبِ وطن انسان دوست اور اخلاق پرست ہونے کی سند حاصل کر لے گا۔"

"یار تم آگے کی فکر میں پڑ گئے۔ اگلا جملہ پڑھو۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔

"آگے لکھا ہے... چوہدری دلاور نے ہمارے نمائندے کو یہ بھی بتایا کہ دلاور بلڈنگ کئی منزلہ عمارت ہوگی لیکن اس کے فرسٹ فلور پر ایک جدید طرز کا اسپتال ہوگا۔ اپنے والد مرحوم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس اسپتال کے بستر غریب اور مستحق مریضوں کو بلا معاوضہ فراہم کیے جائیں گے۔ سرکاری اسپتالوں کی زبوں حالی کے پیشِ نظر وہ محسوس کرتے ہیں کہ کم آمدنی والے طبقے کو علاج معالجے کی بہتر سہولت فراہم کرنا بے حد ضروری ہے لیکن یہ کام تنہا حکومت کے وسائل پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر صاحبِ ثروت لوگ اسی طرح فلاحی کاموں کے لیے آگے آئیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان بھی گنگا رام اسپتال، گلاب سنگھ جمعیت دیوی اسپتال، دیال سنگھ لائبریری جیسے ادارے نہ بنا سکیں۔ واضح ہو کہ دلاور بلڈنگ اسی جگہ تعمیر کی جائے گی جہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے نام سے زرعی مشینری کے پرزے بنانے کا کارخانہ قائم تھا۔"

"یہ اس کے باپ کی ملکیت تھا۔" محسن نے غصّے میں میز پر مکّا مارا۔ "یہ کیس تو عدالت میں ہے... وہ کون ہوتا ہے..."

"کون کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا، یہ سب فضول باتیں اخبار میں نہیں ہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس خبر میں صرف وہ ہے جو ہو رہا ہے... اور ضرور ہوگا... تیرے میرے یا عدالت کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سمجھ میں آئی بات؟"

"یار تم چپ نہیں رہ سکتے۔" غالب نے محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "پہلے خبر سن لو۔ پھر چلے جانا زمزمے کر اور داغ دینا۔"

"پوری خبر سننے سے پہلے میں پھٹ جاؤں گا۔ میرے اندر غصے کا ایٹمی دھواں بھر رہا ہے۔" محسن نے کہا۔

"بس چند سطریں اور سُن لے... پھر پھٹ جانا۔" میں نے کہا۔ "آخر میں لکھا ہے کہ ہمارے نمائندے کی رپورٹ کے مطابق عمارت کے نچلے حصے میں ایک شاپنگ سینٹر ہوگا جو شاہدرہ ٹاؤن کی رونق میں بھی اضافہ کرے گا اور علاقے کی ضروریات بھی پوری کرے گا۔ اسپتال

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں دوسو بیڈ ہوں گے۔ بعد میں یہ تعداد دُگنی کر دی جائے گی۔ دوسری منزل ڈاکٹروں کے بیٹھنے کے کمروں اور لیبارٹری وغیرہ پر مشتمل ہوگی۔ اس سے اوپر کی چار منزلیں چار بیڈ روم والے لگژری فلیٹوں کے لیے رکھی گئی ہیں۔ تقریب میں شہر کے معززین، رؤسا اور اعلیٰ حکام، تاجر اور صنعتکار شریک تھے جنھوں نے چوہدری دلاور کے جذبات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور انھیں نادار لوگوں کو جدید طبی سہولتوں کی فراہمی کے نیک ارادے پر مبارکباد دی۔ ہمارے نمائندے کے مطابق چوہدری دلاور اس اسپتال کو اپنے مرحوم دوست کی یاد میں "وزیر اسپتال" کا نام دینے کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔"

میرے وجود کے اندر غصے کا آتش فشاں کھولنے لگا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور کھڑا ہو گیا۔ میرا خون میرے جسم میں تیزاب بن گیا اور انتقام کی آگ مجھے یوں جھلسانے لگی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایم آر ایس کو بھی اور اس کے مشن کو بھی۔ اپنے سب عظیم مقاصد کو، ان سب نقصانات کو جو میں نے اٹھائے تھے اور میری خاطر میرے دوستوں نے برداشت کیے تھے۔ اپنی کامیابیوں کو۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو۔ یہاں تک کہ رشتوں کی حرمت کو اور رابعہ کی محبت کو۔ ایک آرزو تھی جس نے مجھے پوری طرح مغلوب کر لیا۔ یہ عقل و ہوش کی بات ہی نہ تھی۔ سودا لئے سر تھا جس نے مجھے پاگل کر دیا۔

"میں اس کتے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے یکلخت چیخ کر کہا۔ "وہ جہاں بھی ملے گا میں اسے مار ڈالوں گا۔"

اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روک سکتا، میں بیڈ کے نیچے گھس گیا جہاں مشین گن سے دستی بم تک ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا۔

"سکندر... پاگل مت بن..." محسن نے مجھے پکڑ لیا۔

"بس اب مجھے مت روک محسن۔ مجھے اسی پاگل پن کی ضرورت ہے۔" میں نے محسن کو ایک طرف پھینک دیا۔ "یہ عقل سے کام لینے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج تک وہ زندہ ہے۔"

"یہ سب کرنا تھا تو..." محسن پھر اُٹھ کے آگے آیا۔

"ہاں... مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے چلا کے کہا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی مشین گن نکال لی۔ "اب میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے کہیں نہ کہیں تو ملے گا۔ میں اس کو چھلنی کر دوں گا۔ بنائے وہ محبِ وطن اور انسان دوست اور اخلاق پرست سیاسی جماعت... اس سے پہلے میں..."

محسن نے مجھے پھر پکڑ لیا... وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "ایسا مت کر سکندر۔"

"نہیں محسن... اب ایسا ہی ہوگا... یہ کھیل ختم... زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور ایک ہی بار لی جا سکتی ہے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے ہیں۔ میرے باپ کو مار چکے ہیں۔ اب وہ میرے پیچھے ہیں اور میں بھاگتا جا رہا ہوں... ہم سب بھاگنے پر مجبور ہیں..." میں نے خود پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ غلط ہے... یہ غلط ہے سکندر... ہم اس سے ڈرتے نہیں ہیں۔" محسن نے مجھے چھوڑے بغیر کہا۔ "ہمارا مقصد مختلف ہے۔ ہم کو اس کی جان لینی ہوتی تو ہم بہت پہلے ایسا کر سکتے تھے۔"

"ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا محسن..." میں نے محسن کو پھر الگ کر کے ایک طرف دھکیل دیا۔ "جو کچھ ہم نے کیا غلط تھا۔ اس سے دلاور کا نہیں صرف ہمارا نقصان ہوا۔ آئندہ بھی صرف ہمارا نقصان ہوگا۔ ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے... کبھی اس کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ وہ ترقی کرتا رہے گا۔ اس کا کاروبار جاری رہے گا۔ وہ زیادہ دولت مند ہوتا جائے گا اور زیادہ عزت دار بھی... تو نے دیکھا... اس شہر کے معززین، رؤسا اور اعلیٰ حکام اس کے ساتھ ہیں... تاجر اور صنعت کار اس کے ساتھ ہیں۔ اُسے خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک نیک کام پر۔ وہ غریبوں، ناداروں کے لیے اسپتال بنا رہا ہے، اسی زمین پر جو میری ہے اور کبھی دلاور کی نہیں ہو سکتی مگر کیا قانون مجھے میرا حق دلا سکا۔ مجھے تو وہاں قبر کے لیے دو گز زمین تک نہیں ملے گی۔ وہاں اس وزیر خان کے نام پر ایک خیراتی اسپتال قائم ہو رہا ہے جو خود بھی خیراتی اسپتالوں کے چکر لگاتے ہوئے مر گیا تھا۔ اور یہ اسپتال کون قائم کر رہا ہے؟ اس کا قاتل۔ مگر وہ سب کے سامنے کہتا ہے کہ وہ وزیر خان کا دوست تھا اور کوئی اُسے جھٹلا نہیں سکتا... اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اب وہ سیاست کا ہتھیار اُٹھا رہا ہے۔"

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر جو کچھ تو کرنا چاہتا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے... تو اسے قتل کر دے گا... پھر کیا ہوگا؟ ہم سب کا کیا بنے گا؟ کیا ہم نے صرف اسی لیے تیرا ساتھ دیا تھا کہ بالآخر پھانسی گھر سے تیری لاش لینے جائیں... رابعہ کہاں جائے گی... کیا تو اُسے دلاور کے کتوں کے پاس چھوڑ دے گا؟ کہ وہ اس کی بوٹیاں نوچ کھائیں۔ اس کی ہڈیاں تک چبا لیں؟ ہم سب کی طرف دیکھ سکندر..."

میرا کانپتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ میں نے مشین گن کو لوڈ کر لیا تھا، جب محسن کی آواز میرے کانوں کے راستے میرے دل میں یوں اترنے لگی جیسے بھڑکتے انگاروں پر بارش کی پھوار اُترتی ہے۔

"ڈونٹ بی سلی مائی بوائے۔" کیتھرین یکلخت میرے سامنے آگئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میری طرف دیکھو۔" کیتھرین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں سب کچھ گنوا چکی ہوں... میرا شوہر تم سے زیادہ بہادر تھا... وہ ایک شیر تھا جسے مجبور پا کے بازاری کتوں نے مار دیا۔ مگر تم نے دیکھا کہ میں زندہ رہی اور پھر بھی دیکھا کہ جولی کو موت مجھ سے نہیں چھین سکی۔ اس لیے کہ جب میں مایوس تھی اور ہمت ہار چکی تھی تو خدا نے مجھے ایک بیٹا دے دیا۔ بہرام دادا کو ایک بیٹے کی بہت آرزو تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کبھی ایک بیٹا ہوگا تو میں اسے پروفیسر بناؤں گا۔ میں خود نہ پڑھ سکا مگر وہ سب کو پڑھائے گا۔ اس کے پڑھائے ہوئے پروفیسر ہوں گے، شاعر اور ادیب ہوں گے۔ ایک ڈاکو کا بیٹا علم کی روشنی دے گا۔ ان سب کو جو ڈاکو بن سکتے تھے مگر نہیں بنے۔ کاش وہ آج زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ خدا نے اُسے کیسا بیٹا دیا ہے... پلا پلایا جوان بیٹا... وہ تم پر اتنا ہی فخر کرتا جتنا میں تم پر کرتی ہوں... تم جو حق و صداقت کے علمبردار تھے۔ انصاف کی آواز تھے اور ظلم کے خلاف دیوار تھے۔ یکلخت تم نے قاتل بننے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے مائی سن؟"

مشین گن میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے زار و قطار روتی ہوئی کیتھرین کو عین اس وقت سنبھال لیا جب وہ گرنے ہی والی تھی۔ میں نے اُسے آہستہ سے اُٹھا کے بستر پر لِٹا دیا۔ "تم ہم سب کو چھوڑ کے مرنے جا رہے ہو؟"

"اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں آنٹی۔" محسن نے تلخی سے کہا۔ "یہ صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہے۔"

"کیا یہ ٹھیک ہے سکندر؟" کیتھرین نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم محسن کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے؟ جولی اور شملا کو بہن نہیں مانتے... صرف اس لیے کہ تمھارے اور ان سب کے درمیان خون کا رشتہ نہیں ہے؟"

"ایسا نہیں ہے آنٹی۔" میں نے ندامت سے کہا۔ "یہ رشتے تو خون کے رشتوں سے زیادہ پائدار ہیں... مگر..."

"مگر میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا... کسی کی پروا کیے بغیر۔" غالب نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اب تک چپ بیٹھا تھا۔

میں نیچے بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں کیا کروں آخر... میرے اعصاب بھی فولاد کے بنے ہوئے تو نہیں ہیں۔ کوئی ایسی بات سنتا ہوں تو مجھ پر پاگل پن سوار ہو جاتا ہے۔"

میں نے جولی کو دیکھا جو دروازے میں ساکت و صامت کھڑی ہوئی تھی اور اس کی خاموش آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے آئی اور اس نے فرش پر پڑی ہوئی مشین گن کو اٹھا کے دوبارہ کپڑے میں لپیٹ دیا اور بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔

"آئی... ایم سوری آنٹی۔" میں نے کیتھرین سے کہا۔ "میں سب کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔"

"سکندر... مائی سن... یہ تمھاری اپنی فیملی ہے۔" کیتھرین نے کہا۔ "اگر تمھاری اپنی ماں ہوتی تو کیا تم اس کی بات نہ مانتے۔ تمھارے بہن بھائی زندہ ہوتے تو تم ان کا خیال نہ کرتے... دیکھو خدا نے مجھے ہی نہیں، تمھیں بھی سب رشتے دے دیے ہیں اور تم کو ان کی قدر نہیں... اگر ہم ساتھ ہیں تو ایک خاندان ہیں ورنہ لاوارث ہیں۔ تم ان رشتوں کو مانتے ہو مگر پہچانتے نہیں؟ پہچان اصل چیز ہے۔"

"میں... شرمندہ ہوں..." میں نے کہا۔ "آئندہ میں سب کے ساتھ وہی کروں گا جو سب چاہیں گے... یہ بات ہی ایسی تھی کہ میں اشتعال میں آگیا۔ تم تو جانتی ہو آنٹی کہ میرے والد کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا۔ اس کے پاس لاکھوں کی دولت تھی مگر وہ زندگی کے آخری دنوں میں کس طرح عذاب جھیلتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کو سرکاری اسپتال کی دوا تک نصیب نہ ہوئی۔"

"وہ سب میں جانتی ہوں۔ خدا پر بھروسا رکھو... ایک دن انصاف کا ظہور آئے گا۔" کیتھرین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں۔" محسن نے اچانک کہا۔ "جا کے دیکھتے ہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

"کون سا معاملہ؟" غالب نے کہا۔ "دلاور کے سیاست میں حصہ لینے کا؟"

"نہیں... ذرا ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس تک جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کارخانے کی جگہ عمارت کھڑی کرنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوگیا اچانک۔" محسن نے کہا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

"میرا خیال ہے تم دونوں جھوٹ بول کے باہر جا رہے ہو۔" کیتھرین اُٹھ بیٹھی۔ "تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ کی قسم آنٹی... میں کچھ نہیں کروں گا... اور سکندر کو بھی نہیں کرنے دوں گا۔" محسن نے کہا۔ "بس وہاں تک جا کے لوٹ آئیں گے۔"

"آخر کیوں... کیا دیکھنا ہے وہاں جا کے...؟"

"یہی کہ کارخانہ قائم ہے یا عمارت کی بنیادیں کھودی جا رہی ہیں۔" محسن بولا اور مجھے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

"دیکھو احتیاط سے جانا۔" کیتھرین نے چلا کے کہا۔ "کسی مصیبت میں مت پڑ جانا۔"

باہر آنے کے بعد محسن نے کہا۔ "یہ خبر تو منظر نے بھی دیکھی ہوگی؟"

"ہاں... وہ تو اخبار کا کیڑا ہے۔"

"اس سے پوچھتے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔" محسن نے کہا۔

"میں پہلے جائے واردات کا معائنہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"یار کہیں یہ خبر جعلی نہ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صرف ہمیں متوجہ کرنے کے لیے نہ لگوائی گئی ہو۔" محسن نے کہا۔ "کوئی نیا جال نہ ہو کہ ہم وہاں جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔"

"کیا اخبار نویس اتنے غیر ذمے دار لوگ ہوتے ہیں؟"

"بیشتر نہیں ہوتے۔ چھاپنے سے پہلے خبر کی تصدیق کر لیتے ہیں لیکن محض نام نہاد صحافی سب کچھ کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیونکہ نہ ان کا کوئی ضمیر ہوتا ہے نہ اصول۔ ان کا مشن صحافت نہیں تجارت ہوتا ہے۔ اگر ان کا سودا ہو جائے تو وہ اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔"

"پھر بھی... اس خبر میں معززین، رؤسا اور تاجر و صنعت کار سب کی شرکت کا ذکر ہے۔" میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن نام کسی کا نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "کہ فلاں فلاں حضرات اور خواتین شریک تھے... یہ ایک بے معنی سا جملہ ہے۔ چار لوفر لپاڑیے اور چار بدمعاش خود کو معززین شمار کر سکتے ہیں۔ چار ریڑھی پر سبزی بیچنے والے ہوں اور چار ریوڑیاں بنانے والے تو تاجر اور صنعت کار ہو گئے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں سب ہی خود کو معزز قرار دیتے ہیں... دکاندار اپنے آپ کو تاجر کہتا ہے اور جس کی ایک کھڈی ہو وہ صنعت کا مالک کہلانا چاہتا ہے۔"

"اسی سے تو مجھے شک ہوتا ہے۔" محسن نے کہا۔

"ایک چال اور بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کل اس کی تردید آجائے گی۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہوتا رہتا ہے۔" محسن نے اتفاق کیا۔ "آج میں کسی ذریعے سے بیان چھپوا دوں کہ میں نے صرف لنگوٹ باندھ کے ننگے پاؤں اور خالی ہاتھ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تو بڑی سنسنی پھیلے گی۔ وقتی اور سستی شہرت حاصل ہوگی اور بے وقوف جو کہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتے ہیں، کہیں گے کہ بھئی واہ... ہے نا شیر دا پتر۔ تردید تو بعد میں کسی بھی وقت کی جا سکتی ہے۔"

"بیان چھپوانے میں کیا ہے۔ تو میری طرف سے چھپوا دے کہ میں درحقیقت فلم اسٹار زیبا کا پہلا شوہر ہوں۔ تو پریشانی ہوگی زیبا کے لیے... وہ خود تردید کرتی پھرے گی اور اس کے پرستار خنجر بکف مجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے مجھے یہ خبر جھوٹ لگتی ہے... آخر ایک ہی اخبار نے یہ خبر کیوں دی؟" محسن بولا۔

"ہاں... اس قسم کی تقریب میں تو سب اخباری نمائندے ہوتے۔"

"ہمارے دوست بھی ہمیں بتاتے کہ چوہدری دلاور کیا کر رہا ہے۔ یا کیا کرنے والا ہے... انھیں تو پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔" محسن نے کہا۔

"سچ کہا تو نے... ہماری پریس کانفرنس میں آنے والے سب ہی مشہور صحافی ہیں۔ وہ ہمارے اور دلاور کے تعلق کو بھی جانتے ہیں اور اس تعلق کے پس منظر کو بھی سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ضرور اس بات کا ذکر کرتے۔"

"پھر کیا خیال ہے... نہ جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... جال پھیلا کے ہمیں مدعو کیا گیا ہے تو ہمیں بھی ایسی بے مروّتی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، ورنہ دلاور کو مایوسی ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم اسے مایوس نہیں کریں گے۔ ہم اُسے یہ بتا تو ضرور جائیں گے کہ ہم آگئے ہیں لیکن گرفتار ہونے کے لیے نہیں۔" محسن بولا۔ "اس کے لیے ضروری ہے کہ چوہدری صاحب کو پتا نہ چلے کہ ہم کب آئے اور کب گئے؟"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "میرا بھی ان سے ملاقات کو دل چاہتا ہے۔"

"گزشتہ چند دن میں ہم بہت مصروف رہے ہیں۔" محسن نے کہا "اور انہی مصروفیات کے باعث مشہور بھی ہوئے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب ہمیں پہچاننے والے آسانی سے پہچان جاتے ہیں۔"

"اور پہچاننے والے اتنے زیادہ ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"یہ ہمارے مشن کی راہ میں رکاوٹ ہے۔" محسن بولا۔

"پہچاننے والوں میں سب دوست نہیں ہوں گے۔ زیادہ دوست ہوں گے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں ایک دشمن ہو یا ہزار میں ایک۔ جتنا فائدہ ننانوے یا نو سو ننانوے دوستوں کی حمایت سے ہوگا، وہ ایک دشمن کے ہاتھوں نقصان بن جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اب ہمیں پھر گمنام ہو جانا چاہیے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہمارے چہرے بدل جائیں۔" محسن نے کہا۔ "یہ بات یقینی ہے کہ شکاری ہیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ دشمنی اور نفرت کے سنئے زیادہ زہریلے اور خطرناک جذبے کے ساتھ۔"

"ویسے بھی ہمارے مشن کا اگلا مرحلہ شروع ہونے والا ہے جس میں ہمارے لیے خاموشی اور رازداری سے ہر قدم اٹھانا ضروری ہوگا۔ جو پبلسٹی ہم نے اب تک حاصل کی، وہ ہمارے کام آئے گی۔ جب ضرورت پڑے گی اور ہم محسوس کریں گے کہ ہمارے لیے اپنی شناخت ظاہر کر دینے میں کوئی خطرے کی بات نہیں تو ہم خود بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ورنہ کسی کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

اس مسئلے پر ہمارے درمیان مکمل اتفاق رائے تھا چنانچہ ہم نے گھر سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہم نے کیتھرین کو سامانِ ضرورت کی ایک فہرست دے کر بازار بھیجا۔ اس کے واپس آنے تک ہم نے ایک دوسرے کی صورت بدل لی۔ سامام دین عرف پنڈت ہیئر آرٹسٹ نے ہمیں وہ تحائف پیش کیے تھے جن کی افادیت مسلم تھی۔ ایک وِگ میں نے دوسری محسن نے اپنے سر پر سیٹ کی۔ یہ بہت اعلیٰ قسم کی وِگ تھی جس کو لگانا بھی مشکل کام نہ تھا۔ وِگ لگانے کے بعد ہمارے بالوں کی جگہ سر پر جو بال نظر آنے لگے وہ سخت، کھردرے اور مڑے ہوئے تھے۔ جیسے کہ افریقہ کے حبشی نسل سے تعلق رکھنے والی اقوام کے ہوتے ہیں یا ہمارے ملک میں مکران کے علاقے میں نظر آتے ہیں۔

ہم نے سیاہی مل کے چہرہ گردن اور ہاتھوں کی جلد کو بڑے بے ہنٹ سے کالا کیا تاکہ ہمارا سیاہ رنگ بالکل قدرتی لگے۔ جولی ہماری یہ مضحکہ خیز صورت دیکھ کر بہت ہنسی مگر اس نے ہماری مدد بھی کی۔ غالب ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے تبدیلی کے اس عمل کو دیکھتا رہا اور ہمیں اپنے مشوروں سے بھی نوازتا رہا۔

کیتھرین تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آئی۔ اُس نے بہت ہوشیاری سے تمام اسباب کا انتخاب کیا تھا۔ میرے لیے ایک تنگ موری والی پرانی پتلون تھی جس کا نیلا رنگ جگہ جگہ سے اُڑا ہوا تھا اور اس کے گھٹنوں پر چمڑے کے گول ٹکڑوں کے پیوند تھے۔ یہ زین کی پتلون تھی مگر زین اتنی موٹی تھی کہ کینوس کا گمان ہوتا تھا۔ محسن کی پتلون ٹوئیڈ کی قسم کے کپڑے کی تھی جس پر بڑے بڑے لال رنگ کے چار خانے بنے ہوئے تھے۔ میری قمیص زرد تھی اور اس پر سامنے کسی فٹ بال ایسوسی ایشن کا بہت بڑا مونوگرام چھپا ہوا تھا۔ محسن کے لیے وہ سُرخ رنگ کی بنیان نما جرسی لائی تھی جس پر ایک نیم عریاں عورت کے رقص کا پوز سفید رنگ میں اُبھرا ہوا لگتا تھا۔ اس کے اوپر پہننے کے لیے ہم دونوں کی جیکٹ تھی۔ میری سرخ رنگ کی اور محسن کی سیاہ رنگ کی۔ عام حالات میں ہم انھیں پہننے سے کچھ نہ پہننے کو ترجیح دیتے مگر اس وقت یہی لباس ہمیں سب کی نظر میں نمایاں بھی کر سکتا تھا اور سب کی نظر سے چھپا کے بھی رکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی ہمیں دیکھتا تو حیران ہوتا۔ مسکراتا یا ہنستا۔ ہمیں کارٹون سمجھتا یا غیر ملکی سیاح لیکن کسی کا ذہن سکندر بخت اور محسن کی طرف نہ جاتا۔ ظاہر کی یہ تبدیلی اتنی بڑی تھی کہ دلاور جیسے چالاک آدمی کے ذہن کو بھی گمراہ کر سکتی تھی۔ اس لباس اور سیاہ رنگ کے ساتھ ہم نے سفید فریم اور گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک لگا لی اور دو کیمرے لٹکائے جو کیتھرین خرید کے لائی تھی۔

"تم اب خود کو کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔" کیتھرین نے ہمیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "کسی کا باپ بھی تم کو نہیں پہچان سکتا۔"

"خود ان کا باپ ہوتا تو نہ پہچانتا۔" غالب نے کہا۔

"ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہم کیا ہیں۔" میں نے کہا۔

"تاکہ کسی موقع پر کنفیوژن نہ ہو۔" محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تم دونوں یہی کہہ سکتے ہو کہ تم یورپ کے کسی سرکس میں جوکر تھے۔" غالب نے کہا۔ "کرتب بھی دکھا سکتے ہو۔"

"کرتب تو ہم ہر وقت ہر جگہ دکھا سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم جوکر ہی کہلائیں۔ ہم کسی امریکی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر بھی بن سکتے ہیں۔ پروفیسر انگینہ ندطر۔ سطح سمندر کے نیچے آثارِ قدیمہ کی

علمِ ہپناٹزم پر ایک نئی کتاب

جسے

ایک ماہرِ ہپناٹزم نے تحریر کیا ہے

قیمت ۳۰ روپے۔ ڈاک خرچ ۱۶ روپے

اُردو زبان کی پہلی کتاب جس میں اس عمل کی حقیقی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

- ہپناٹزم کے بارے میں آج تک کی تمام تحقیقات کا نچوڑ
- جدید طریقے اور مشقیں
- ہپناٹزم کی مشقوں کے لیے مکمل لائحہ عمل اور پورا پروگرام
- بے شمار سوالات کے جواب
- ہپناٹزم کے موضوع پر ایک مکمل اور مستند کتاب جس میں مصنف کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں۔

ارتکازِ توجہ کے لیے سیاہ دائرہ اور مشقوں کو سمجھنے کے لیے حقیقی تصاویر۔

ملنے کا پتہ

مکتبۂ نفسیات پوسٹ بکس ۴۳۰۹ کراچی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تلاش کے ماہر۔ اور ڈاکٹر اوٹ ٹپانگ۔ انسانی اخلاق پر ہوا کے دباؤ اور جراثیم کش ادویات کے اثرات کا مطالعہ کرنے والے یہاں سے اس قسم کے لوگ آتے رہتے ہیں۔"

"کیوں ایسے مشکل مضمون تلاش کرتے ہو۔" غالب نے کہا۔ "سیدھے سیدھے غیر ملکی صحافی بن جاؤ۔ فرنچ تم دونوں کو آتی ہے۔ اس طرح تم ہر جگہ پہنچ سکو گے۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "یہ ڈیڑھ ٹانگ کا غالب بات پتے کی کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"غیر ملکی صحافیوں کے پاس ایکریڈیشن کارڈ ہوتے ہیں۔ یا اُن کے اداروں کے جاری کردہ پاس۔" محسن بولا۔

"اگر ہم اپنا اعتماد بحال رکھیں تو مجھے یقین ہے بیشتر لوگ چکر میں آجائیں گے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ہم کوشش کریں گے کہ جعلی شناختی دستاویزات بھی بنالیں۔"

"سنا ہے کراچی میں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔"

"ہاں... غیر ملکی پاسپورٹ مل جاتے ہیں مگر آسانی سے نہیں۔ ان کو زیادہ تفصیل سے کوئی چیک بھی نہیں کرتا۔" محسن بولا...

"شناختی کارڈ وغیرہ کا مسئلہ اتنا مشکل نہیں۔ فی الحال تو ہمیں صرف اپنے چوہدری صاحب کے پاس ہی جانا ہے۔ وہ کچھ نہیں پوچھے گا۔ اگر یہ خبر سچ ہوئی تو بہت خوش ہو کے انٹرویو دے گا۔"

"لیکن جھوٹ ہوئی تو فوراً شک میں مبتلا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ہم اس کے شک کا علاج ساتھ رکھیں گے۔" محسن نے کہا۔

ہم تیسرے پہر کے قریب نکلے۔ حُلیے سے ہم کتنے عجیب لگتے ہیں، اس کا اندازہ ہمیں سڑک پر آتے ہی ہو گیا۔ لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اور زیرِ لب مسکراتے تھے۔ ایک جگہ دو ریڑھی والوں نے بہ آوازِ بلند اظہارِ خیال بھی کیا۔

"اوئے... ایہہ مخلوق کتھوں لتھی اے؟"

دوسرا قہقہہ مار کے ہنسا۔ "پُچھ کے ویکھ... کیہڑے چڑیا گھر توں نسے ہوئے نے؟ باندر دے پُتر..."

"اک تے تیرا ماما لگدا اے..."

"دوجا تیرا پیو اے..." دوسرے نے فوراً جواب دیا۔

ان کو یقین تھا کہ ہم غیر ملکی ہیں چنانچہ وہ کچھ بھی کہیں ہم نہیں سمجھ سکتے اور ہم نے بھی خوشدلی سے دانت نکال کے یوں ہاتھ ہلائے جیسے ہم ان تعریفی کلمات سے بے حد خوش ہوئے ہوں۔ ہم نے ایک شخص سے جو کار میں بیٹھ رہا تھا، فرانسیسی میں پوچھا کہ اس کے اصل والد گدھے تھے یا خچر... اور وہ خود آدمی سے زیادہ ڈرم کیوں نظر آتا ہے۔

اُس نے مُسکرا کے ہم سے ہاتھ ملایا۔ "میں صرف انگریزی جانتا ہوں۔"

"انگلش؟" میں نے مسرت سے کہا اور اس کو گلے لگا لیا۔ "ہم بھی انگلش جانتے ہیں۔"

میری ٹوٹی پھوٹی انگریزی پر وہ ہنسا۔ "میں آپ لوگوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ آپ لوگ میرے ملک میں مہمان ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہم... صحافی..."

"صحافی... آپ لوگ صحافی ہیں؟" وہ دم بخود رہ گیا۔ "یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں؟"

میں نے اپنا سر کھجایا اور فرنچ میں کہا۔ "ہم جھک مارنے آئے ہیں۔"

اس نے مظلوم صورت بنا کے محسن کو دیکھا۔ "میں نہیں سمجھا۔"

پھر ہم نے بہت اچھی اداکاری اور بہت بُری انگریزی کی مدد سے واضح کیا کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ بالآخر وہ سمجھ گیا کہ ہم ایک اخبار کی خبر کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ہم نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا جس میں دلاور کے متعلق خبر تھی۔ خبر کے گرد ہم نے حاشیہ سا بنا دیا۔

اس نے ہمیں اپنی کار میں شاہدرہ پہنچا دیا اور ٹھیک اس جگہ اُتار دیا، جہاں ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس تھا۔ وہ اچھے پاکستانی میزبان کی حیثیت سے ہماری مدد کر کے بہت مطمئن تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ہمیں اپنا کارڈ بھی دیا، جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ انجینئر تھا۔ ہم جُھک کر ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر ہی رہے تھے کہ ہمارے قریب سے چوہدری دلاور کی گاڑی گزری۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دلاور نے غور سے ہم تینوں کو دیکھا۔ پھر اس کی گاڑی سڑک سے بائیں جانب فیکٹری کے گیٹ تک جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔

ہم دونوں نے گیٹ تک واک شروع کی۔ دلاور نے شاید ہم دونوں کو بیک ویو مرر میں دیکھ لیا یا اُسے ڈرائیور نے بتا دیا کہ وہ دونوں کالے غیر ملکی اِدھر آرہے ہیں۔ اس کی گاڑی گیٹ سے گزر کے اندر نہیں گئی۔ وہ باہر ہی اُتر گیا اور پلٹ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"یو... دلاور؟" میں نے قریب جا کے ہاتھ بڑھایا اور آواز بدل کے کہا۔ چوہدری دلاور نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہو آر یو؟" دلاور نے محسن سے بھی ہاتھ ملا کے کہا۔ اس کی صورت پر حیرانی کے ساتھ تجسّس، تمسخر، دلچسپی اور شکوک کے جذبات کا ملا جُلا عکس نظر آرہا تھا۔

"می... پیئر استنوف۔" میں نے کہا۔ "کارس پونڈنت ڈیلی لامدے دو، مارسیلز... ایت تریپولی... قاہرہ... کراچی۔"

"می... جان آرمت... رپورتر... لاموند... آنلی... ناؤ ایٹ بنکاک... فار ایسٹ ایڈیشن۔"

"آپ لوگ جرنلسٹ ہیں؟" دلاور نے سنجیدہ اور محتاط ہو کے کہا۔ جواب میں محسن نے فرفر بولنا شروع کیا۔ پھر میں نے چند جملے بولے جو سب فرنچ تھے۔ دلاور پریشان ہو گیا۔ اس نے کبھی ان اخبارات کا نام نہیں سنا ہوگا جن کے ہم نمائندے بن گئے تھے۔ دنیا کے کس حصے کے کس شہر کے کس زبان کے کتنے اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں اور اُن کے نمائندے کہاں کہاں ملتے ہیں یہ خود پاکستان کے بڑے صحافی بھی بعض اوقات نہیں جانتے۔

"میں یہ فرنچ نہیں سمجھتا۔" دلاور نے کہا۔ "کیا آپ لوگ بالکل انگریزی نہیں جانتے؟"

"می... گُڈ انگلش۔" میں نے کہا۔ عمداً میں نے ڈی اور ٹی کو انگریزی لہجے میں ادا نہیں کیا۔ کوئی فرانسیسی یا اطالوی ایسا نہیں کر سکتا۔

"می اسپیک انگلش۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ بولا۔

"انٹرویو۔" میں نے کہا۔

"یس... انٹرویو... تھینکس..." محسن نے سر ہلا کے کہا۔ "فوٹو گراف۔"

"مگر کیوں؟" وہ بولا۔ "خیر آپ لوگ اندر آئیں۔ یہاں بات کرنے کی کوئی جگہ نہیں... اور انٹرویو وغیرہ کی تو میں سوچوں گا لیکن میں اتنا بداخلاق بہرحال نہیں ہوں کہ آپ لوگوں کو کھڑا رکھوں۔ یہاں تک آئے ہیں تو میرے ساتھ بیٹھ کے ایک کپ چائے یا کافی ضرور پئیں۔"

"یہ کتے کا بچہ بڑی روانی سے انگریزی بولنے لگا ہے۔" میں نے محسن سے فرنچ میں کہا اور یوں دانت نکالنے لگا جیسے میں نے دلاور کی تعریف کی ہے۔

"بنا لیا ہوگا کسی میم کو والدہ۔" محسن نے کہا اور سر کو خم کر کے مسکرایا۔ دلاور نے اُسے شکریہ سمجھ کے قبول کیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا اور میرا ردِّعمل بہت شدید تھا مگر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آگے ہونے کی وجہ سے دلاور نے کچھ نہیں دیکھا۔

اندر جہاں پہلے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کے گودام، شیڈ اور پروڈکشن یونٹ تھے وہاں اب کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک بالکل بدلا ہوا منظر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ سراب کے سوا کچھ نہیں یا پھر میں غلط جگہ آگیا ہوں۔ جب یہاں عمارات تھیں تو یہی جگہ بہت بھری ہوئی اور پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ اب خالی میدان میں کہیں کہیں پرانے آثار ملبے کی صورت میں نظر آتے تھے۔ سامنے والے حصے کو کھودا جا رہا تھا اور بنیادوں کا پورا نقشہ دیکھ کر زیرِ تعمیر ہونے والی عمارت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

اخبار میں جو کچھ ہم نے پڑھا تھا، وہ غلط نہیں تھا اور اس ہنگامہ کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میرے اور محسن کے یقین کی بنیادیں تک مسمار ہو گئیں۔ وہاں دلاور بلڈنگ کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا اور یہ بات درست تھی تو پھر وزیر اسپتال کے قیام کی بات بھی درست تھی اور شاید یہ بھی غلط نہ تھا کہ اس تقریب میں معززین، رؤسا، تاجر اور صنعت کار واقعی شریک ہوئے تھے۔ ہم نے اُسے جھوٹ یعنی مذاق، ڈراما اور فریب سمجھ کے خود اپنے اندازوں کے کھوکھلے پن کو ثابت کر دیا تھا۔ دلاور نے ہمارے لیے کوئی جال نہیں پھیلایا تھا۔ اُس نے ہمیں متوجہ کرنے اور زیرِ دام لانے کے لیے یہ خبر کسی صحافی کو خرید کے نہیں لگوائی تھی۔ وہ بہت بڑا شکاری تھا اور اس نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ اس کی بہت بڑی چال تھی، وہ ہمارے خلاف سیاست کا جال بچھا رہا تھا۔ وہ اسلحے کی طاقت آزما چکا تھا۔ اب وہ سیاسی قوّت حاصل کر کے ہمیں دوسری طرف سے محصور کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم دلاور کو سیاسی غدّار یا ملک دشمن قرار دینے کے مشن میں کامیاب ہوں، وہ سیاست کے پلیٹ فارم سے اپنے لیے حُبّ الوطنی کی سند حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ انسانیت کا خادم اور اخلاقیات کا علمبردار بن کے مشہور ہونے کی طے کر چکا تھا تاکہ اس کے خلاف ہر سچ بھی مخالفانہ جھوٹ بن جائے۔ اور وہ کہہ سکے کہ اس کے سیاسی مخالفین اس کی کردار کُشی کے لیے جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور اس کی ذات کو بے بنیاد الزامات کا ہدف بنا کے اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ملک کی سیاست میں اپنے حریف کے خلاف جائز و ناجائز، اخلاقی و غیر اخلاقی مہم چلانا بھی کھیل کا ایک حصّہ ہے۔ اور کامیاب سیاستداں وہ ہے جو اپنے سیاسی مخالف کی کمزوری کو اپنی شہ زوری بنائے اور جب شہ زور ہو جائے تو اس کا سر زورِ بازو سے کچل دے۔ دلاور نے اگر ہمارے خلاف سیاسی داؤ پیچ آزمانے کا طے کیا تھا اور اپنی ساکھ کو سنبھالنے کے لیے سیاست کی بیساکھی استعمال کرنے کا سوچا تھا تو یہ اس کی فہم و فراست اور دُور اندیشی کا ثبوت تھا۔

محسن کے خیالات بھی مجھ سے مختلف نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک سے حالات میں ہم دونوں کی سوچ کے دھارے اور ہمارے ردِّعمل ایک سے ہو جاتے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی صورت پر اپنے جذبات کا عکس نظر آیا۔ میں نے پھر فرانسیسی میں کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"لاقانونیت کی کوئی حد بھی ہے یار۔" محسن نے کہا۔

دلاور نے پلٹ کے کہا۔ "دِس وے پلیز۔"

میں اور محسن اسی آفس میں داخل ہو گئے جس میں پہلے بھی بارہا آئے تھے۔ کبھی سر بکف، کبھی جاں بکف۔ کبھی چوری چھپے اور کبھی طبلِ جنگ بجاتے ہوئے۔ اور جیسے آئے تھے ویسے ہی گئے بھی تھے مگر آج سارا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دلاور کے آفس کا فرنیچر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہی تھا مگروہ پرانے لوگ بھی بدل چکے تھے جن کو ہم پہچانتے تھے۔ فیکٹری نہیں رہی تھی تو کارکن کیسے رہتے۔ باہر مزدور اور راج کام کر رہے تھے۔ اندر دلاور کے پرانے سیکرٹری کی جگہ ایک ہوشربا قسم کی سیکرٹری براجمان تھی۔

دلاور نے ہمیں اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

ہم نے فرنچ میں شکریہ ادا کیا۔ پھر گورا شاہی اردو میں شکریہ ادا کیا اور دلاور کو مسکراتے دیکھا۔

"مس عاشی... پلیز اندر آجائیں۔" دلاور نے کہا۔

میں نے اور محسن نے سر ہلا کے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ لڑکی اور اس کا نام دونوں اچھے تھے۔ اس کا اندر آنا بھی اچھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اچھی تھی۔

"عاشی... یہ دونوں آتو کے پٹھے کہتے ہیں کہ یہ فرانسیسی اور اطالوی اخباری نمائندے ہیں۔" دلاور نے اردو میں کہا۔

"کافی۔" میں نے احمقوں کی طرح مسکرا کے کہا۔ محسن نے میری تائید کی۔

"ان کے لیے کافی منگوانے کے بعد یہاں بیٹھو۔" دلاور نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ان سے تم کو ہی بات کرنی ہوگی۔ انگریزی تو یہ ایسے بولتے ہیں جیسے انگریز شوقیہ اردو بولتے ہیں۔"

میں خواہ مخواہ مسکراتا رہا لیکن میرے دل میں تشویش پیدا ہو چکی تھی کہ کیا یہ نازک اندام اور خوش خرام عاشی بھی فرنچ سمجھتی ہے۔ چند منٹ میں میرے اندیشے درست ہو گئے۔

"مس عاشی نے پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی میں ڈگری لی ہے اور یہ فرنچ اسی طرح بولتی ہیں جیسے مادری زبان ہو۔" دلاور نے مس عاشی کے جانے کے بعد کہا۔

"ویری گڈ... ویری گڈ..." میں نے سر ہلایا اور محسن سے مخاطب ہو کے کہا۔ "لے بیٹا۔ سیر کو سوا سیر مل گئی۔ ترکی تمام شد۔"

"یار! ابھی سے کیوں ڈرتا ہے۔ تو دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔" محسن نے فرنچ میں جواب دیا۔ "اس خبیث کی باتوں پر مت جا۔ جیسے بھی اگر فرنچ جانتی ہے یہ حسینہ تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اسے دنیا بھر کے چکروں کا پتا نہیں ہوگا۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔"

"میں ڈرا نہیں ہوں اس سے۔ اس خیال سے فکر مند ہوں کہ اس نے دلاور کے سوالات کا ترجمہ شروع کر دیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟ دلاور کائیاں آدمی ہے۔ جو سوال اس بھولی بھالی لڑکی کے دماغ میں نہیں آئے گا، وہ دلاور کے ذہن میں آسکتا ہے... وہ جرح کر سکتی ہے... دلاور کی طرف سے۔"

"دیکھی جائے گی... ابھی تک تو دلاور کو شک نہیں ہے۔ اسے ہم مطمئن کر دیں گے۔" محسن نے کہا۔ ہم نے گفتگو میں دلاور کا نام نہیں لیا تھا بلکہ اس لفظ کا فرانسیسی متبادل استعمال کیا تھا جس کے معنی بہادر کے ہوتے ہیں۔

مس عاشی پانچ منٹ کے لیے باہر گئی اور پھر لوٹ آئی تو دلاور کے داہنے ہاتھ کی جانب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہم دلاور کے مقابل تھے لیکن میز اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ ہمارے درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا اور شاید اتنے ہی فاصلے پر عاشی بھی تھی (میں نے فرض کیا کہ اس کا نام عائشہ ہوگا)

"عاشی... ان سے پوچھو کہ یہ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ میرا انٹرویو کیوں لینا چاہتے ہیں؟" دلاور نے کہا۔

عاشی نے اس کا ترجمہ کیا تو اپنی فرنچ میں مہارت کا پول کھول دیا۔ اس نے فرنچ میں ڈگری ضرور لی ہوگی مگر ہمارے کالجوں سے ڈگری لینے والے دس سال انگلش کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود انگریزی کا ایک آدھ جملہ ہی صحیح بولتے ہیں۔ مسلسل بات کرنی پڑے تو ان کی گرامر غلط اور ڈکشنری ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حال مس عاشی کا بھی تھا۔ وہ درسی کتب والی فرنچ کے جملے بنا بنا کے ادا کر رہی تھی۔ درسی کتب کی زبان اور بولی جانے والی زبان میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ فارسی میں شاعری کرنے والے ایران جا کے وہاں کی بولی نہیں سمجھتے۔

"مسٹر دلاور آپ کے جواب کے منتظر ہیں موسیو۔" عاشی نے...

"پیتر استوف... تم صرف پیتر کہہ سکتی ہو۔" میں نے مسکرا کے اور رک رک کے کہا۔ "کیا تم سوال دہراؤ گی... میں کچھ سمجھا نہیں۔"

میری بات نے عاشی کو نروس کر دیا۔ کیونکہ عمداً میں نے وہ فرنچ بولی تھی جو بے حد عوامی تھی۔ اور اس کی کتابی فرنچ سے بے حد مختلف تھی۔ تاہم اس نے زیادہ محتاط الفاظ میں سوال دہرایا۔ دوسری بار اس کی فرنچ زیادہ غلط ہو گئی۔

میں نے سر ہلایا اور محسن کی طرف دیکھا۔ "موسیو ژاں آرمت اس سوال کا بہتر جواب دے سکتے ہیں۔"

محسن نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔ جیب میں سے ایک سگریٹ نکالی جو خاصی ٹیڑھی اور کمر خمیدہ ہو گئی تھی۔ اسے میز پر لٹا کے اور گھما پھرا کے سیدھا کیا اور ماچس نکالی۔ یہ انداز بالکل نشے اور سگریٹ استعمال کرنے والوں کا تھا۔ دلاور نے ناگواری سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

"دراصل... ہم بین الاقوامی ادارۂ صحت کے مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے پراجیکٹ پر ایک سروے کر رہے ہیں اور جہاں عوام کے لیے طبی سہولتوں کا فقدان ہے، وہاں حکومت کے تعاون سے چلنے والے ہر ہیلتھ پراجیکٹ کی کامیابی کے تناسب کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ان سب کی رائے بھی جاننا چاہتے ہیں جو صحت کے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں اور عملاً کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کل ہم یہاں تھے اور ہمیں اپنے ایک ہم پیشہ ساتھی سے پریس کلب میں یہ انفارمیشن ملی تھی کہ آج کسی رفاہی اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب ہے اور یہ اسپتال ایک ایسا شخص تعمیر کر رہا ہے جو زرعی معیشت سے وابستہ تھا۔ زرعی مشینری کے پرزے بناتا تھا۔ قدرتی طور پر ہم یہ سمجھتے تھے کہ اسے دیہی آبادی کی ہیلتھ پرابلم سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہیے۔ مگر اس نے خیراتی اسپتال بنانے کے لیے ایک ایسے شہر کو منتخب کیا جہاں پہلے ہی سرکاری اور نجی اسپتال بہت ہیں اور..."

مس عاشی کی سٹی گم ہو گئی کیونکہ محسن نے رک رک کر انتہائی دقیق اور ناقابلِ فہم فرنچ میں بڑی ثقیل گفتگو کی تھی۔ شاید وہ مشکل سے اس کے نصف کا صحیح مطلب سمجھی ہوگی۔ تاہم اس نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک دیہاتی بھی اگر شہر کے کسی عالم کے پلّے پڑ جائے جو غالب کے لب و لہجے میں فارسی آمیز اردو بولتا ہو تب بھی دونوں ایک دوسرے کی بات تو سمجھ ہی لیتے ہیں۔ خواہ دیہاتی دکن یا بنگال کے کسی علاقے کی اردو بولے۔ عاشی نے محسن کی طویل تقریر ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لیا اور پھر جتنا اسے یاد رہا تھا اتنا دلاور کو بتا دیا۔

"یہ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے فری ہوسپٹل لاہور جیسے شہر میں قائم کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جبکہ دیہات کو اس کی ضرورت زیادہ تھی۔" عاشی نے کہا۔

"یہ اتنی دیر سے بھونک رہا تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی؟" دلاور حیران ہو کے بولا۔

"وہ... نہیں سر..." عاشی نے کہا۔ "یہ بتا رہا تھا کہ انھیں پریس کلب میں کسی نے کل شام کی تقریب کے متعلق بتایا تھا مگر یہ مصروفیت کے باعث آ نہیں سکے تھے۔ اور یہ کہ ان کا مقصد اقوام متحدہ کے لیے ایک رپورٹ بنانا ہے۔"

دلاور نے سر ہلایا۔ "ان سے کہو کہ بہت جلد ہی دیہات کے لیے بھی موبائل ہیلتھ یونٹس قائم کروں گا اور میرا ارادہ ہے کہ فی الحال دس گاڑیاں ہوں گی جو ہر طرح کے سازوسامان، اسٹاف اور ادویات کے ساتھ گاؤں گاؤں جائیں گی۔ ہر گاڑی روزانہ کم سے کم سو مریض دیکھے گی۔ اور ان گاڑیوں میں ہنگامی نوعیت کے معمولی آپریشن بھی ہوں گے۔ اوسطاً ایک گاڑی دن بھر میں دس دیہات کا دورہ کرے گی۔"

میں نے اس جواب پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اصل اطمینان کی بات یہ تھی کہ محسن کی بات نے دلاور کو قائل کر لیا تھا اور اس کے دماغ میں شک کے بیج کو پھوٹنے نہیں دیا تھا ورنہ جواب سے پہلے وہ ہم سے شناخت مانگتا۔ اب اس کو یقین آ چکا تھا کہ ہم وہی ہیں جو خود کو بتا رہے ہیں۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک انٹرویو کا ڈراما کیا۔ میں نے دلاور کی کچھ تصاویر بنائیں۔ ہم نے سو فیصد غیر ملکی صحافیوں والی اداکاری کی اور دلاور کو مسکراتا ہوا دیکھتے رہے۔

وہ اس خیال سے خوش تھا کہ مقامی اخبار کی بات اتنے کم وقت میں ایک بین الاقوامی خبر کی بنیاد بن گئی۔ اس نے شہر میں ہماری موجودگی کو اپنی خوش قسمتی کی علامت سمجھا ہوگا کہ ہم نے جیسے ہی اسپتال کی تقریب کا ذکر سنا ویسے ہی انٹرویو لینے پہنچ گئے، ورنہ کسی غیر ملکی اور بین الاقوامی سطح کے اخباروں کو متوجہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور ان کے نمائندوں کو انٹرویو کے لیے بلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"ہم کل شام تک اس انٹرویو کو ٹائپ کر لیں گے۔" میں نے عاشی کو مخاطب کیا۔ "اور قابلِ اشاعت مسودہ بنا کے مسٹر دلاور کے دستخط لینے کے لیے پھر آئیں گے۔"

عاشی نے ہماری بات اُسے سمجھا دی۔

"ان سے کہو کہ رات کو مصروف نہ ہوں تو ڈنر میرے ساتھ کریں۔" دلاور بولا۔

میں نے محسن کی طرف اور محسن نے میری طرف دیکھا۔ ہم کچھ دیر آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر میں نے سر ہلایا۔

"یہ ہمارے لیے مشکل ہوگا لیکن ہم مسٹر دلاور کے لیے مشکل بھی برداشت کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم ہر مشکل کا سامنا کریں گے۔"

"جیسے آج تک کرتے آئے ہیں۔" محسن بولا۔

"اور ان کو شکار کرنے تک یہ مشکلات کا سلسلہ جاری رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اللہ ہماری مشکل آسان کرے گا۔"

"ورنہ یا ہم نہیں یا پھر یہ نہیں..."

"جی؟" عاشی نے گھبرا کے پوچھا۔ یہ سب گفتگو ہم نے بہت تیز تیز لہجے میں آواز کو بنا کے اور بگاڑ کے اس طرح کی تھی کہ عاشی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا لیکن ہم ایسے ہنستے رہے تھے جیسے یہ کوئی بے تکلف دوستانہ مذاق کی بات ہے۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"ہم ایک شرط پر آنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کس شرط پر؟" دلاور نے عاشی سے ترجمہ سن کے کہا۔

"ہماری حسین میزبان بھی کھانے کی میز پر اسی طرح موجود ہوگی۔"

"بلکہ ہمارے دل کے زیادہ قریب رہے گی۔" محسن بولا۔

"اور طعام کے بعد جب نشۂ شراب بے اثر ثابت ہوگا..."

"تو اس کا نشۂ شباب ہمارے ساتھ جائے گا۔" محسن بولا۔

"اور صبح ہونے تک..."

عاشی کا چہرہ شرم اور غصے سے لال پڑ گیا۔ اس نے پنسل میز پر پٹخ دی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیا بات ہے عاشی؟" دلاور نے کہا۔

"یہ بدمعاش..." اُس نے بڑی خشکی سے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں... کچھ پتا تو چلے؟" دلاور بولا۔

"یہ... یہ کہہ رہے ہیں... کہ ڈنر میں..."

"میں سمجھ گیا... تم کو بھی بلا رہے ہوں گے۔" دلاور ہنسنے لگا۔

"نہیں سر... یہ بہت ذلیل... شیطان قسم کے لوگ ہیں... مجھ سے کہہ رہے ہیں... کہ اس کے بعد... اس کے بعد ان کے ساتھ جاؤں۔" وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پا کے بولی۔

"ارے ان کی تو عادت ہوتی ہے۔ لاہور کو بھی پیرس سمجھ لیا ہے تو ان کا قصور نہیں۔" دلاور نے کہا "یہ اپنے ماحول کے عادی ہیں۔"

"میں بالکل نہیں آؤں گی سر۔" عاشی نے خفگی سے کہا۔

"اچھا اچھا... مت آنا... میں ان کو ٹال دوں گا۔" دلاور نے کہا۔ "ابھی تو کہہ دو کہ آؤں گی... بعد میں کوئی بہانہ کر دینا... میرا مطلب ہے تمہاری طرف سے میں کر دوں گا۔"

میں اور محسن ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھتے رہے اور سر ہلا ہلا کے اظہارِ حیرت کرتے رہے کہ ہم نے تو کوئی معیوب بات نہیں کی پھر یہ خوب صورت لڑکی اتنی خفا کیوں ہو رہی ہے عاشی نے بادلِ ناخواستہ کہا کہ وہ آئے گی لیکن اسے پہلے گھر جانا ہوگا تاکہ وہ لباس بدل سکے۔

"چلو میں تم کو راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔" دلاور بولا۔

"تو کیا آپ یہاں سے سیدھے ہوٹل جائیں گے؟" عاشی نے کہا۔

"نہیں... سیدھا تو نہیں۔" دلاور بولا۔ "راستے میں ایک دو کام ہیں۔ پہلے وہ نمٹاؤں گا... انھیں ساتھ ہی رکھوں گا۔ اس وقت تک کھانے کا تو ٹائم نہیں ہوگا۔ میں چاہتا ہوں دو چار مقامی صحافیوں کو بھی بلوا لوں۔ صرف کافی کے لیے... تاکہ انھیں بھی انٹرویو کے بارے میں معلوم ہو جائے کل کچھ اور خبریں آ جائیں... اور مجھے بھی معلوم ہو جائے کہ ان کو میرے پاس کس نے بھیجا تھا؟ پریس کلب میں ان کی کس سے بات ہوئی تھی۔ ظاہر ہے صحافیوں کے جانے کے بعد ہی کھانا کھائیں گے... سوچ رہا ہوں نواب صاحب کو بھی بلوا لوں... نواب خسرو..."

"میرا تو خیال ہے کہ آپ ان صحافیوں کو بھی ڈنر میں شامل کر لیں۔" عاشی نے کہا۔ "ورنہ ان کو بعد میں پتا چلے گا کہ آپ نے انھیں کافی پر ٹال دیا تھا اور ان کو ڈنر دیا تھا تو وہ اپنی توہین محسوس کریں گے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" دلاور نے کہا۔ "جو اخباری نمائندے کل رات کی تقریب میں شریک تھے ان سب کو فون کر کے میری طرف سے دعوت دے دو۔"

"یس سر... میں انھیں نو بجے کا وقت دے دوں؟"

"نو بجے ٹھیک ہے۔" دلاور نے کہا اور ٹیلی فون اُٹھا لیا۔ اس نے پہلے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ میں نے اس کی انگلی کی حرکت کو بہت غور سے نوٹ کیا۔ ایٹ... سیون... فور... تھری... زیرو... نائن... اس نمبر کو میں نے ذہن نشین کر لیا۔

"دیکھو مجھے دیر ہو جائے گی۔" دلاور شاید اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ "تم شوفر کے ساتھ چلی جانا... ارے بابا مجھے معلوم ہے تمہاری بہن کو دیکھنے کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ مگر وہاں میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا... تمہارے ماں باپ دیکھیں گے اصل میں تو... پھر تم ہو... لاحول ولا قوۃ... بتایا نا کہ غیر ملکی صحافی ہیں میرے ساتھ... ڈنر ہے رات کو... ہاں اچانک پروگرام بنا ہے، وہ بھی اچانک آ گئے تھے... میں عاشی کو تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گا... ابھی کچھ دیر میں... وہ بھی اپنی بڑی بہن کے میاں کو پسند کر لے گی۔

یکلخت وہاں عاشی کی موجودگی کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ دلاور کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی۔ غالباً چھوٹی سے چھوٹی یا سب سے چھوٹی... ورنہ اس جیسی لڑکی کا دلاور کے ساتھ ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دلاور نے دوسرا فون نواب خسرو جمشید کو کیا۔ لیکن اس مرتبہ اس نے نمبر ڈائل نہیں کیا۔ اس کے ٹیلی فون کی میموری میں یہ نمبر پہلے سے موجود تھا چنانچہ اس نے صرف ایک نمبر کا بٹن دبایا اور کال ملنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے نواب خسرو جمشید کو تفصیل سے ہمارے متعلق بتایا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم اردو نہیں سمجھتے اس نے بڑے اطمینان سے گفتگو کی اور عادتاً ہمیں خاصی گالیوں سے نوازتا رہا۔

"اپنے نواب صاحب... یہ ٹھیک ہے کہ کسی پر بھی آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر لینا چاہیے... مگر یار ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اور پھر ان کے بارے میں دوسروں سے معلوم ہو ہی جائے گا۔ مجھے بہرحال اطمینان ہے کہ یہ صرف اخباری نمائندے ہیں۔" دلاور نے کہا۔ "بس تم آ جاؤ وہاں... یہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے... ہاں ٹیبل ریزرویشن میں کرا دوں گا۔"

صاف ظاہر تھا کہ نواب خسرو جمشید نے اپنے عدم اطمینان اور شکوک کا اظہار کر دیا تھا۔ دلاور نے اپنی طرف سے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے مگر اب یہ ہو سکتا تھا کہ دلاور کو بھی عدم تحفظ کا احساس پریشان کرنے لگے تو وہ ہم سے شناخت کرانے کو کہے۔ دستاویزی ثبوت مانگ بیٹھے یا اپنے طور پر تصدیق کرنا چاہے۔

ٹیلی فون رکھنے کے بعد دلاور کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا اٹھا اور اس نے ہم سے چلنے کو کہا۔ غالباً اس نے اپنے شکوک کو جھٹک دیا تھا یا مؤخر کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کو چند مقامی صحافیوں کے ساتھ ڈنر کرنا تھا اور وہاں ہمارا تعارف بھی ہونا تھا۔ اگر ہم جعلی صحافی ہوں گے تو پول کھل جائے گا۔ یہی سوچ کے اس نے خود کو قائل کر لیا ہوگا کہ فی الحال تشویش کا اظہار بھی بے سود ہوگا۔ اصل بات یہ تھی کہ دلاور کے دل اور دماغ پر ہمارے حلیے، لب و لہجے، فرانسیسی زبان میں بات چیت اور ہماری پُراعتماد اداکاری کا اثر بہت خوشگوار تھا، ورنہ وہ ایسا آدمی تھا کہ اپنی ولدیت کے بارے میں بھی شک کا شکار ہو جائے تو ماں کو نہ بخشے۔

میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال بالکل مختلف تھی اور بالکل غیر متوقع تھی جس کے لیے ہم تیار ہو کے نہیں آئے تھے مگر اب حالات کی موافقت سے میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ اس کے بارے میں محسن سے رائے لینے اور مشورہ کرنے کی راہ میں عاشی حائل تھی۔ ہم فرنچ بولتے تب بھی وہ دشمنِ جاں سمجھ لیتی۔

اس کا موقع ہمیں باہر آنے کے بعد ملا۔ ہم دلاور کی گاڑی کے قریب کھڑے ہو کے زیرِ تعمیر عمارت کا نقشہ دیکھنے لگے۔ دلاور ہمیں انگلش میں کچھ سمجھاتا رہا جو ہم نے نہیں سنا۔ بظاہر ہم اس کی طرف متوجہ تھے اور اسی کی بات پر تبصرہ کرتے جا رہے تھے لیکن درحقیقت ہم آپس میں کچھ اور ہی بات کر رہے تھے۔ دلاور کو عاشی کا انتظار تھا جو ٹیلی فون کر رہی تھی اور صحافیوں کو ڈنر پر مدعو کرنے کا پیغام پہنچا رہی تھی۔

"یہ فرسٹ فلور پورا اسپتال ہے... بلکہ سیکنڈ فلور بھی اسی کا حصہ ہے۔" دلاور نے کہا۔

"ویری گڈ..." میں نے کہا۔ "یار محسن... میں نے ایک بہت بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" پھر میں زور سے ہنسا۔

"اور اوپر والی منزل میں..." دلاور بولتا رہا۔

"میرا بھی ارادہ بدل گیا ہے۔" محسن نے دلاور کی طرف دیکھ کے تائید میں سر ہلایا۔ "یہ بہت خطرناک اقدام ہوگا۔"

"مگر یہ بہترین موقع ہے..." میں نے دلاور کی طرف دیکھ کے معالجہ لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟" دلاور بولا۔

"سوری... وات یو سے..." میں نے سر کھجایا اور پھر محسن سے مخاطب ہو گیا۔ "بس برخوردار... اب تخت یا تختہ... ہمیشہ کی طرح۔"

"ہاں..." محسن نے سر ہلایا۔ "اللہ مددگار ہے۔"

اسی وقت عاشی نمودار ہو گئی۔ وہ بیس بائیس سال کی لڑکی تھی جس کی صورت میں حیرت انگیز طور پر اداکارہ رانی کی مشابہت تھی معلوم نہیں وہ کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ دلاور کی سیکرٹری بنی تھی۔ میرے ذہن میں اس کے دو اسباب آتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ پروفیشنل ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ کسی اچھی فرم میں اچھی ملازمت حاصل کرنے میں یہ تجربہ اس کا معاون ہو سکتا تھا جو وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ کام کر کے کسی پریشانی کے بغیر حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری وجہ اس کی بڑی بہن یعنی دلاور کی بیوی ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ بیشتر بیویاں اپنے شوہروں کی آؤٹ ڈور مصروفیات کے بارے میں زنانہ قسم کا حسد اور شک رکھتی ہیں۔ خصوصاً ان شوہروں کے بارے میں جن کے آنے جانے کا کوئی وقت نہ ہو اور کام کی نوعیت کا پتا نہ چلتا ہو۔

عاشی آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دلاور اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر رہے۔ باہر اتنی دیر میں غروبِ آفتاب کے بعد کا اندھیرا گہرا ہو کے رات میں ڈھل رہا تھا۔ کچھ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں لیکن زیادہ تر گاڑیاں چھوٹی پارکنگ لائٹ جلا کے چل رہی تھیں۔

"کہاں جانا ہے سر؟" شوفر نے سڑک پر آ کے کہا۔

"پہلے بیگم صاحبہ کے گھر۔" دلاور نے مختصراً کہا۔

شوفر ایک خطرناک قسم کا شکاری کتا لگتا تھا اور دلاور جیسے آدمی کے لیے ایسے ہی شخص کا شوفر ہونا ضروری تھا جو وقتِ ضرورت اس کے باڈی گارڈ کے فرائض بھی پورے کر سکے۔ میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور لڑنے والا ہوگا جو خنجر سے مشین گن تک ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے کا اہل ہوگا۔ خالی ہاتھ بھی لڑ سکتا ہوگا۔ جان دینے یا جان لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا ہوگا اور دلاور کے اعتماد پر ہر طرح سے پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہوگا... یہ بھی یقین تھا کہ وہ مسلح ہوگا۔

"پاکستان... ویری بیوٹی فل کنٹری۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ویری بیوٹی فل۔" محسن نے سر ہلایا۔ "دی گریٹ۔"

عاشی نے ناگواری سے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ "تم لوگ لڑکیوں کے علاوہ بھی کچھ سوچتے ہو۔ تمہاری ساری فرانسیسی قوم عورت، شراب اور خوشبو کے پیچھے دیوانی ہے۔ معلوم نہیں تم لوگوں نے اتنی ترقی کیسے کر لی۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ اس لڑکی نے یہ بات بڑی بے ساختگی میں کہی تھی اور روانی میں وہ بالکل صحیح فرنچ بول گئی تھی۔

"تمہارا خیال ایک سو ایک فیصد درست ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم فرنچ نہیں ہیں۔ فرنچ قوم کے بارے میں تمہاری رائے سے ہمیں اتفاق ہے۔ وہ ایک حسن پرست اور خوش ذوق، خوش مزاج اور مہذب قوم ہے۔ انفرادی آزادی اور جمہوریت پر یقین رکھنے والی۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عملاً یقین رکھنے والی محض نظریاتی یقین نہیں ۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر سب لوگ دنیا میں صرف خوب صورتی کے پرستار بن جائیں تو بدصورتی کا وجود مٹ جائے" محسن نے کہا۔ "وہ ساری بدصورتی جو سماجی تفریق، معاشی عدم توازن۔ ہوس اقتدار۔ جنگ و جدل، تعصب اور تنگ نظری سے پیدا ہوتی ہے۔ جو آدمی کو نفرت سکھاتی ہے اور محبت کو مشروط کر دیتی ہے۔ حالانکہ محبت مشروط ہو ہی نہیں سکتی مگر کچھ لوگ محبت کو اور احساس کو۔ جذبات اور خیالات کو۔ نظریات کو اور انسانی رشتوں کی سرحدوں کو متعین کر دیتے ہیں اور آدمی کو رنگ و نسل، ملک و قوم اور مذہب و ملت۔ خاندان برادری کے خانوں کا اسیر بنا دیتے ہیں۔ یہ ساری تقسیم صرف نفرتوں کے رشتے اور حوالے دیتی ہے۔ اور سب کچھ لے لیتی ہے۔"

"تم... تم فلاسفر ہو۔" عاشی نے مرعوب ہو کے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں یہ لوگ؟" دلاور نے تجسس سے مجبور ہو کے کہا۔

"تعریف کر رہے ہیں اس ملک کی۔ اور لوگوں کی..." عاشی نے کہا۔

دلاور طنز سے ہنسا۔ "یہ بھی فیشن ہے۔ سیاسی اخلاق کا تقاضا ہے کہ روم میں وہی کہو جو روم سننا چاہتے ہیں۔ ان الو کے پٹھوں سے کہو کہ یہ سچ ہے تو یہاں رہ جائیں۔ چھوڑ دیں اپنا گھر شہر اور ملک۔"

عاشی نے یہ بات ہم تک پہنچا دی اور ہنسنے لگی۔

"اگر تم کہو تو میں اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھ کے ادائے عاشقی سے کہا۔ "سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟" عاشی کی ہنسی ایک حیا آمیز مسکراہٹ بن گئی۔

"مثلاً... مثلاً یہ دنیا چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم مسٹر دلاور کو بتا دو کہ ایک دن وہ خود بھی اسی ملک کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے جانیں گے اور پہچانیں گے۔"

"اور وہ وقت مری جان بہت دُور نہیں ہے۔" محسن نے کہا۔ "جب ہم بھی یہاں آباد ہوں گے۔ سارے رشتوں کے تحفظ کے ساتھ خوشی اور عافیت کے ساتھ اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو ہم یہ سب کچھ وراثت میں دیں گے۔ ثقافتی، تہذیبی اور..."

"کیا تمہارا یہ دوست ہر وقت ایسا ہی فلسفہ بولتا رہتا ہے" عاشی نے کہا۔

"ہمیشہ اور ہر وقت تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے ہی یہ اسے متاثر کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کا احساسِ کمتری ہے۔ آج تک تم جیسی لڑکی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔ کیا تم یہ نیک کام کر سکتی ہو؟ گھاس میں لا دوں گا۔"

بہت اچھا ہوا کہ اسی وقت عاشی کا گھر آگیا جو دلاور کا گھر بھی تھا جسے ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ عاشی اُتر کے اندر چلی گئی اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب ہم کھل کے بات کر سکتے تھے۔

"ہماری پوزیشن خاصی محفوظ ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ ... مسٹر بہادر کی سیکرٹری اور سالی۔ نواب صاحب اور بہادر کی بیوی ... یہ سب جانتے ہیں کہ ہم کہاں ڈنر کے لیے مدعو تھے۔"

"غالباً وہ پولیس افسر بھی جانتا ہے۔" محسن نے سر اُٹھا کر ... لیے بغیر کہا۔

"بہت سے لوگوں نے ہمیں مسٹر بہادر کے ساتھ انہی کی گاڑی میں روانہ ہوتے بھی دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

"ہاں... رات کے دس بجے تک مسٹر بہادر کا انتظار کیا جائے گا۔" محسن بولا۔ "اور دس بجنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔"

تین گھنٹے میں ہم لاہور سے سو میل دُور ہوں تو بڑا اچھا ہے۔ دلاور نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "آپ لوگ آپس میں کیا بول رہے ہیں؟"

میں اور محسن ایک ساتھ ہنسنے لگے۔ جیسے ہم اس بدتمیزی پر شرمندہ ہیں۔ اس کے بعد ہم نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں دلاور کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم کس کس ملک میں اپنا مطالعاتی دورہ مکمل کر کے آئے ہیں اور اب کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ ہم واپسی میں یا جب بھی موقع ملا اس کے زیرِ تعمیر اسپتال کو پھر دیکھنے آئیں گے اور اگر مدعو کیا گیا تو اس کی تقریبِ افتتاح میں بھی شریک ہوں گے۔

دلاور نے دو جگہ کار رکوائی تھی۔ ایک جگہ تو اس کے سسرال کے قریب ہی سہ منزلہ عمارت تھی۔ وہ چند منٹ کے لیے معذرت کر کے گیا اور ہمیں موقع فراہم کر گیا کہ ہم کھل کے بات کر سکیں۔ دس منٹ بعد وہ لوٹا تو کچھ پریشان سا تھا۔

"وہ لڑکی... کیا تھا اگر وہ ساتھ آجاتی۔" وہ بولا۔

"کون لڑکی؟" میں نے کہا۔ "تمہاری کوئی گرل فرینڈ؟"

"نہیں... میں عاشی کی بات کر رہا تھا۔" دلاور بولا۔

"او یس... شی ویری بیوٹی فل۔" میں نے کہا۔

"وہ آجاتی تو ہم زیادہ خوش ہوتے... وہ کیوں نہیں آئی؟" محسن نے سادگی سے کہا۔

دلاور نے ہمیں گالی دے کر کہا۔ "تم دونوں... کی وجہ سے" مگر یہ جملہ اس نے اُردو میں کہا تھا چنانچہ ہم انجان بنے رہے۔ "میرا مطلب ہے آج اتفاق سے اس کی بڑی بہن کی شادی کا مسئلہ طے ہو رہا ہے"

"کیا اس میں آپ کے لیے کوئی پریشانی اور افسوس کی بات ہے؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ تمہارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان مترجم کے فرائض انجام دینے والا کوئی نہیں۔ یہاں ایک شخص تھا جو کئی سال فرانس میں رہ چکا تھا۔ اب کئی سال سے کراچی کے فرانسیسی کلچرل سینٹر میں لینگوئج انسٹرکٹر ہے۔ مگر وہ ملا نہیں۔"

"کراچی میں... الائنس فرانس... فریئر ہال کے سامنے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ اتفاق سے لاہور آیا ہوا تھا۔" دلاور بولا۔ "مگر اس وقت وہ تو کسی فنکشن میں مدعو ہے... خیر... میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے کہ وہ آئے تو سیدھا ہوٹل آجائے۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمارے جھوٹ کا پردہ فوراً چاک نہیں ہونے دیا۔ کوئی بھی شخص جو فرانس میں رہا ہو اور اب فرانسیسی پڑھاتا ہو... وہ بھی سفارتی مشن کے زیرِ اہتمام چلنے والے ادارے میں۔ وہ فوراً ہماری فرنچ اور ہماری صحافت دونوں کا ملبہ کر دیتا اور چند سوالوں میں ہماری اصلیت جان لیتا۔ عاشی اگر ہمارے سامنے طفلِ مکتب تھی تو ہم اس ماہرِ زبان کے سامنے ساری فرنچ بھول جاتے۔

دوسری مرتبہ گاڑی پلازا سینما سے کچھ آگے نکل جانے کے بعد رکی... دلاور نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے خیالات میں گم تھا چنانچہ شوفر سے کہنا بھول گیا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اُترتے ہوئے بولا۔ "آپ لوگ بور نہ ہوں گے... دس پندرہ منٹ میں..."

"ہم وقت گزار لیں گے۔" میں نے کہا اور دلاور کو واپس پیدل جاتا دیکھتا رہا۔ وہ ایک باہر سے تاریک نظر آنے والی عمارت میں داخل ہو گیا۔

"کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس عمارت کو دیکھیں یا اس کا نمبر اور باہر لگی ہوئی نام کی تختی۔" محسن نے کہا۔

"اگر ہم دیکھ لیتے تو کیا فرق پڑتا... مطلب یہ کہ اسے ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں... ہم تو اجنبی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اسے احتیاط پسندی سمجھا جا سکتا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی۔"

"یہ کیوں نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ ہمارے بارے میں تھوڑے بہت شکوک کا ضرور شکار ہے۔" میں نے کہا۔

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔" محسن بولا۔ "میں نے اس خیال کو بالکل مسترد نہیں کیا ہے کہ وہ بے وقوف بن کے ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے... جیسا کہ اس کی عادت ہے... اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کے ہمارے خلاف ایک مضبوط جال بُن رہا ہے۔"

"میں بالکل تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ دیر بعد ہونا ہے وہ اگر کچھ دیر پہلے ہو جائے گا تو کیا۔ ہم نمٹ لیں گے۔"

"تم نے غور کیا۔ وہ کس عمارت میں داخل ہوا ہے؟"

"نہیں۔ یہاں سے کیا پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا تھا۔ بیک ویو مرر میں۔" محسن بولا۔ "بھوت بنگلے سے تیسرا یا چوتھا گیٹ ہے۔"

"بھوت بنگلا؟"

"ہاں... جسے کچھ لوگ جادو گھر بھی کہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"تیرا مطلب ہے فری میسن ہال؟" میں نے کہا۔

"ہاں... فری میسن ہال ایک پُراسرار عمارت سمجھی جاتی ہے۔"

"اس سے تیسرا یا چوتھا گیٹ دیکھا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھنے کی ضرورت نہیں... مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟"

"یہاں ایک مشہور ایمونیشن ڈیلر رہتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "جس کی مال پر ریگل کے قریب دکان ہے۔"

"آفرین ہے جوان... کیا دماغ اور کیا حافظہ پایا ہے!" میں نے چلا کے کہا اور محسن کی کمر پر مُکا مارا۔ ہم دونوں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کرتے ہوئے بے وجہ چلا رہے تھے اور ہنس رہے تھے تاکہ ڈرائیور یہ سمجھے کہ ہم محض دوستانہ گپ شپ یا بکواس کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد دلاور اندھیرے میں سے نمودار ہوا

"مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس طرح وہ اپنی حالت میں رونما ہونے والے تغیر کو نہ چھپا سکا۔ وہ بے حد پریشان تھا اور یہ پریشانی سے زیادہ تشویش تھی۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور رنگ اُڑا ہوا تھا۔ ہم نے ظاہری اخلاق سے کہا کہ دیر کی کوئی بات نہیں۔

"اب ہم سیدھے ہوٹل جائیں گے۔" وہ بولا۔ "اور کافی پئیں گے۔ میں نے کافی وقت لے لیا آپ لوگوں کا۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی رہوں۔"

چور میرے دل میں چھپا ہوا پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا تھا چنانچہ دلاور کی بات پر میں چونکا۔ کہیں وہ اس لیے تو ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا کہ ہم ابھی تک مشتبہ تھے۔ دلاور ایسا شخص تھا جو دل کے جذبات کا ہلکا سا عکس بھی صورت پر نہیں آنے دیتا تھا اور یکلخت ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے تماشا دیکھتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اچانک ہمیں سب کے درمیان کھڑا کر دے گا۔ خسرو جمشید... ایس پی سراج... مقامی صحافی اور پولیس والوں کے سامنے۔ وہ ایک قہقہہ مارے گا اور کہے گا کہ پیارے سکندر صاحب اور محسن صاحب، اتنا ڈراما کافی ہے۔ بس اب چھوڑیں یہ فرانسیسی۔ بڑی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مشکل زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں بتاؤ کیسی رہی ؟
لیکن گاڑی خاموشی سے بڑھتی گئی اور جب ہوٹل کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو مستعد دربان نے دلاور کو پہچان کے سلامی دی۔ اس کے انداز پذیرائی سے میں نے جان لیا کہ وہ دلاور کو ایک وی آئی پی کی حیثیت سے جانتا ہے اور شاید اس کی گاڑی کو بھی پہچانتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ گاڑی گھوم کر پیچھے کی طرف والی قطار میں جا کھڑی ہوئی کیونکہ سامنے والے حصے میں بالکل جگہ نہیں رہی تھی۔ یہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ ہوٹل میں شام سے گاڑیاں بھرنے لگی تھیں اور بعد میں آنے والوں کو پیچھے ہی جانا پڑتا تھا کچھ دیر بعد مزید گاڑیوں کا دلاور کی گاڑی کے پیچھے آنا یقینی تھا۔ ڈنر ٹائم تک دلاور کی کار تقریباً درمیان میں آچکی ہوگی۔
گاڑی کے رکتے ہی میں اور محسن یوں حرکت میں آئے جیسے ہم دونوں کو متحرک کرنے والا بجلی کا ایک ہی سوئچ ہو۔ محسن عین ڈرائیور کے پیچھے تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کے وار کیا۔ ریوالور کا دستہ ڈرائیور کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی قوت سے لگا کہ اس کے لیے ہوش بحال رکھنا ناممکن ہوگیا۔ محسن نے دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا تھا چنانچہ وہ آواز نکالے بغیر بے حس ہوگیا۔
تقریباً یہی دلاور کے ساتھ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شوفر نیچے اترے گا اور اس کے لیے دروازہ کھولے گا۔ میرے لیے ریوالور نکالنا ممکن نہیں تھا کیونکہ میں وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں دلاور اگلی سیٹ پر نہیں بیٹھا تھا جو عاشی کے اتر جانے کے بعد خالی ہوگئی تھی۔ محسن میری اوٹ میں تھا، چنانچہ اس نے ریوالور پہلے سے نکال کے سائڈ میں رکھ لیا تھا لیکن میں جیب میں ہاتھ ڈالتا تو دلاور کو شک ہو جاتا۔ میں نے محسن کے اٹھتے ہی دلاور کو کھینچ کے گرایا اور پھر اس کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی ماری۔ وہ مچلا اور میں نے دوسرا وار شانے سے ذرا اوپر گردن کے قریب کیا۔ دلاور کی مزاحمت ختم ہوگئی۔
یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہوگیا۔ باہر رنگا رنگ روشنیوں کا جھلمل اجالا تھا مگر ائیرکنڈیشنڈ کار کے بند شیشوں کے پیچھے اندھیرا تھا چنانچہ باہر سے کوئی بھی اندر کا منظر اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک کہ وہ بہت قریب نہ ہو۔
ان دونوں کو بے ہوش چھوڑ کے ہم دونوں بڑی مستعدی کے ساتھ مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ اگنیشن کی چابی اب محسن کے ہاتھ میں جھول رہی تھی، دور کھڑے ہوئے کچھ شوفروں نے ہمیں واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر گپ لگانے لگے۔ ہم دونوں نے بلاوجہ ایک قہقہہ لگا کے ہاتھ ملایا۔ ایک اور گاڑی دلاور کی گاڑی کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک اور کار آگئی... میں رک گیا۔ پہلی کار میں سے ایک جوڑا نکلا اور عورت بڑے نخرے کے ساتھ ساری سنبھالتی مرد کے ہاتھ کا سہارا لیے اندر چلی گئی، دوسری کار میں سے ایک نوجوان کو اترنے کی جلدی تھی۔
اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے سنسناکر اس کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے ریوالور کی ضرب عجلت میں زیادہ سخت پڑ گئی اور وہ پیچھے گرا تو میں نے اس کے سر سے خون پھوٹتے دیکھا۔ لیکن اب پچھتانے یا افسوس کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ درمیان میں ایک کار کے آجانے سے ہمارا کام کچھ مشکل ہوگیا تھا لیکن ہم ذرا بھی دیر کرتے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا اور ہمیں دو چار منٹ کی جو مہلت ملی تھی اس میں کوئی اور گاڑی آجاتی تب بھی کام خراب ہوتا۔
دو منٹ میں محسن نے دلاور کو دوسری گاڑی میں منتقل کیا اور میں نے دلاور کے شوفر کو۔ ان دونوں کو ہم نے پچھلی سیٹ پر ڈھیر کر دیا۔ تیسرے منٹ میں محسن بھی پیچھے بیٹھ گیا اور میں نے اس کے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون چہرے پر آگیا تھا لیکن بہت زیادہ نہیں تھا۔ چوتھے منٹ میں گاڑی روانہ ہوگئی۔ اس وقت ایک اور کار گھوم کے پارکنگ کے لیے آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس ہم پر پڑیں۔ میں نے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالا اور پیچھے سے آنے والی کار رک گئی۔ اس نے ہمیں نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔ تیز روشنی براہِ راست میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی چنانچہ میں صرف یہ دیکھ سکا کہ وہ ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ جب میں گھوم کے باہر جانے والے راستے پر آیا تو میں نے بلا ارادہ مرسیڈیز کی طرف دیکھا۔ یہ نواب خسرو جمشید کی کار تھی۔ وہ اپنے مخصوص سفید طرے والی دستار اور سیاہ شیروانی میں تھا اور پہلے سے ذرا بھی مختلف نہ لگتا تھا حالانکہ میں نے اسے بہت عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ پھر اس کار میں سے دوسرا نواب خسرو جمشید نکلا۔ میں بھونچکا رہ گیا، کیونکہ خسرو جمشید کی ایک کاربن کاپی کو ہم ٹھکانے لگا چکے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ بالکل اپنے جیسا ایک شوفر رکھتا تھا اور اکثر ہمیں دھوکا دیتا تھا۔ کبھی ہم اصل نواب خسرو جمشید کو اس کا شوفر سمجھ بیٹھے تھے تو کبھی شوفر کو نواب خسرو جمشید۔ یہ کھیل اس وقت ختم ہوا تھا، جب بالآخر شوفر ہمارے ہاتھوں مارا گیا اور نواب کی گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔
"اس خبیث نے ایک اور کاربن کاپی بنالی ؟" محسن نے کہا۔
"ہاں یار... بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہے یہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسے دوسرا ہمشکل کہاں سے ملا ؟"
"میک اپ ہوگا۔" محسن بولا۔ "مگر کنفیوژن بہر حال پیدا کرے گا۔ آخر یہ ایسا کیوں کرتا ہے ؟"
"اسی سے معلوم کریں گے کسی دن۔" میں نے کہا۔

"اس نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔" محسن بولا۔
"ہاں... مگر دلاور نہیں پہچان سکا تو وہ کیسے پہچانتا۔" میں نے کہا۔
"وہ دلاور کی گاڑی بھی دیکھ لے گا۔"
"...مگر اس سے کیا پتا چلے گا۔" میں نے کہا۔
"ہم بال بال بچ گئے۔" محسن بولا۔ "اگر وہ ایک منٹ پہلے وارد ہو جاتا تو دیکھ لیتا کہ ہم دلاور کی گاڑی کا مال دوسری گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔ اور ہمارے پیچھے لگ جاتا۔"
"یہ ہنڈا سوک بھلا مرسیڈیز کا کیا مقابلہ کرتی۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس نوجوان کے زخمی ہونے کا افسوس ہے۔ میں اسے زخمی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خدا کرے زخم معمولی ہو۔"
"نواب خسرو جمشید اندر جا کے زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا۔"
"آدھا گھنٹہ تو دیکھے گا۔ پھر معلوم کرے گا۔" میں نے کہا۔ "چوکیدار سے پوچھے گا۔ وہ کہے گا کہ میں نے خود انہیں اندر جاتے دیکھا تھا۔ گاڑی ان کا شوفر چلا رہا تھا لیکن میں نے کسی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"
"کیا ہماری کارروائی کو آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے دیکھا تھا ؟"
"مجھے نہیں معلوم..." میں نے کہا۔ "کچھ ڈرائیور تھے مگر وہ دور کھڑے ہوئے تھے۔"
"ابھی تفتیش اور حقائق کو سامنے آنے تک گھنٹا بھر تو لگے گا۔ پھر پولیس میں رپورٹ ہوگی اور تلاش کا آغاز ہوگا، دو تین گھنٹے بس... یا پھر صبح کے بعد۔" محسن بولا۔ "اس وقت تک ہمیں لاہور سے نکل جانا چاہیے... دلاور کو ساتھ لے کر..."
"یہ خطرناک ہوگا محسن۔" میں نے کہا۔ "ہمیں کم سے کم دو دن چپ کر گزار دینے چاہئیں۔ ہم دلاور کو قید میں رکھ سکتے ہیں اور اپنے میک اپ کے ساتھ نکل سکتے ہیں۔ جب حقیقی خطرے کا احتمال جاتا رہے اور تلاش کرنے والے زیادہ مستعد نہ رہیں۔"
"وہ مستعد رہیں گے۔ ایک تو معاملہ صنعت کار چوہدری دلاور کے اغوا کا ہے۔ دوسرے اغوا ایک بہت مشہور ہوٹل کے اندر سے ہوا ہے۔ تیسرے ایس پی سراج کا سارا دباؤ پیچھے ہوگا۔ کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھے، وہ سمجھ جائے گا کہ دلاور سے ملنے والے غیر ملکی صحافی کون تھے۔ اسے نواب خسرو جمشید یہ بھی بتا دے گا کہ اس نے دلاور پر شبہ کا اظہار کیا تھا اور اسے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔" محسن نے کہا۔ "وہ تو شاید یہ بھی بتا دے گا کہ اسے ہم کب اغوا کر کے لے گئے ہیں، وہ گاڑی کے متعلق بھی بتا دے گا کیونکہ اس نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ہمیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کار میں ہم لاہور سے نہیں نکل سکتے اور اس حلیے کو بدلے بغیر بھی نہیں جا سکتے۔ بہتر ہے کہ ہم اس گاڑی کو جلد از جلد چھوڑ دیں۔"
میں نے بحث کر کے محسن کو قائل کر لیا کہ موجودہ حالات میں ہمارا چند دن روپوش رہنا ہمارے ہی حق میں تحفظ کی ضمانت بن جائے گا اور ہم نے عجلت میں فرار اختیار کیا تو ممکن ہے شہر سے نکلنے نہ پانے تھے کہ گرفتار ہو جانے والی کیفیت ہو جائے۔
ہل مین کار کو ہم نے راستے میں روک دیا۔ کار سے اترتے وقت میں نے نوجوان کے زخم کا معائنہ کیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چوٹ سے اس کا سر نہیں پھٹا تھا صرف کھال پھٹی تھی، اور یہ سطحی زخم کسی صورت میں مہلک یا خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کراہنے لگا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ جب میں نے دلاور کو گاڑی میں سے اتارا تو محسن نے اس کے شوفر کو زمین پر لٹا رکھا تھا اور کسی ڈاکٹر کی طرح اس کا معائنہ کر رہا تھا۔
"کیا بات ہے ؟" میں نے کہا۔
"یار سکندر... یہ... یہ تو مر گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔
"مر گیا ؟ یہ تو بہت برا ہوا۔"
"ہاں... زیادہ سخت ہاتھ پڑ گیا تھا۔" محسن نے کہا۔
"ہاتھ کتنا بھی سخت کیوں نہ پڑے، جب تک چوٹ نازک اور خطرناک جگہ پر نہ لگے کوئی مرتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ لمبی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ تو بہت جلدی مر گیا۔"
"میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا یار۔"
"میرے سامنے کیوں صفائی پیش کر رہا ہے...؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ بات میں نہیں سمجھتا ؟ ان تینوں میں سے کوئی بھی مر سکتا تھا لیکن مرا وہی جس کی قضا آگئی تھی۔ یہ دنیا کا قانون نہیں ہے جس کے تحت تجھ پر قتل کی فردِ جرم عائد کی جا سکے۔ خدا نیت کو جانتا ہے اور اس کے نظامِ انصاف میں ضابطے کی پکڑ دھکڑ نہیں ہے۔ ویسے بھی مرنے والا کون سا نیک آدمی تھا۔ خس کم جہاں پاک۔"
"آدمی تو تھا... نیکی بدی کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "اگر وہ برا تھا، تب بھی یہ اختیار کسی اچھے آدمی کو نہ اخلاقاً حاصل ہے اور نہ قانوناً کہ وہ جسے برا سمجھے اسے قتل کر دے... بس اللہ ہی ہے جو مجھے اس نادانستہ قتل پر معاف کرے۔ میری اور اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔"
"مگر وہ دشمن کا آدمی تھا اور اگر اسے موقع ملتا یا حکم ملتا تو وہ تجھے قتل کرنے میں ایک لمحے کا توقف نہ کرتا۔" میں نے کہا۔
محسن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ اداس ہوگیا تھا اور وہ میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی مطمئن نہ ہوتا۔
"اب اس کا کیا کریں ؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اسے ساتھ لے جانے میں کوئی عقل مندی نہیں۔"

"پھر کیا یہیں چھوڑ دیں؟" محسن بولا۔

"گاڑی میں چھوڑا تو یہ نوجوان خواہ مخواہ چکر میں پڑ جائے گا۔" یہ خود تو اب کچھ بتانے سے رہا۔" محسن بولا۔ "اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ گاڑی میں گھر چلتے ہیں۔ وہاں تو اپنے ساتھ دلاور کو اتار لینا اور میں اس گاڑی کو..." وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

"کیوں نہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔"

"لیکن اس کا پتا..."

"میں دیکھ لیتا ہوں۔" محسن نے گلوز کمپارٹمنٹ کھول کے دیکھا۔ اس میں سے کاغذات نکال لے اور گاڑی کی مدھم سے روشنی میں غور سے دیکھے پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ جیب میں ڈرائیونگ لائسنس پر بھی وہی پتا تھا جو گاڑی کی رجسٹریشن بک پر تھا۔

ایک بار پھر میں نے دلاور کو گاڑی میں ڈالا۔ محسن نے ڈرائیور کی لاش کو سڑک سے ذرا فاصلے پر رکھا اور واپس آ کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے گاڑی کو اس گھر کے سامنے روکا جہاں اب ہمارا بسیرا تھا۔ میں دلاور کو اندر لے اور محسن گاڑی لے کر چلا گیا۔

غالب نے دلاور کو دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ "یہ کیا؟"

"یہ اپنے چوہدری صاحب۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔

"زندہ یا مردہ؟" غالب نے فرش پر پڑے ہوئے دلاور کو دیکھا۔

"ابھی تک تو زندہ ہیں۔" میں نے کہا۔ کیتھرین نے اُسے قریب آ کے دیکھا۔

"یہ... یہ تو وہی شیطان ہے؟" وہ نفرت سے بولی اور اس کا چہرہ ایک دورِ اذیت کی یاد سے دُکھ کی تصویر بن گیا۔

"ہاں... یہ وہی شیطان ہے جس نے ہمیشہ آدم و حوا کو جنت سے محروم کیا... ہر جگہ... ہر زمانے میں۔" میں نے کہا۔

"تم اسے کیوں اُٹھا لائے؟" غالب نے پریشانی سے کہا۔

"ایک موقع ملا تھا۔ ہم نے فائدہ اُٹھا لیا۔ اور آئندہ بھی اس کے فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اور محسن نے اتفاقِ رائے سے چوہدری صاحب کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کیا۔ فی الحال ہم ان کے بدلے رابعہ اور ٹیڈی کی رہائی کا مطالبہ کریں گے۔"

"کس سے؟" غالب نے طنز سے کہا۔ "لواحقین سے؟"

"لواحقین کیا دے سکتے ہیں۔ سوائے جان کی قیمت کے۔" میں نے کہا۔ "نواب خسرو جمشید کا فون نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایس پی سراج ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے نزدیک دلاور صرف ایک آدمی ہے۔ اس کی جگہ دوسرا آدمی لے سکتا ہے۔ شاید تم نے دونوں کی دلی خواہش پوری کر دی۔"

"کیسی خواہش؟"

"نمبر ون پوزیشن حاصل کرنے کی۔" غالب نے کہا۔ "... چاہیں گے کہ تم دلاور کو ختم کر دو... ان کے لیے رابعہ اور ٹیڈی کو چھوڑنا ویسے بھی مشکل ہوگا۔"

"کیوں مشکل ہوگا؟"

"اگر انھیں معلوم ہوگا کہ وہ کہاں ہیں تب ہی چھوڑیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ صرف دلاور جانتا ہو۔" غالب نے کہا۔

"ہم نے ایک چانس لیا ہے۔ اسے ہم ضائع نہیں کریں گے اور اگر جمشید یا سراج نے انکار کیا تو ان پر واضح کر دیں گے کہ ہم دلاور کو اُٹھا لائے ہیں تو کل ان کو بھی اُٹھا کر لا سکتے ہیں۔ ٹاپ کے آدمی کو سکۂ رائج الوقت کے طور پر استعمال کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم اسے سنبھالو... میں ایک فون پر بات کروں۔"

گھر کے عقبی حصے کی دیوار سے میں ٹیلی فون کے پول پر... اور اپنے پورٹیبل فون کے تار کنکشن باکس میں لگا دیے۔ پھر میں نے اس ہوٹل کا نمبر ملایا جہاں ہم ڈنر پر مدعو تھے۔

"یس سر..." ہوٹل کے ایکس چینج کی آپریٹر نے کہا۔

"ڈائننگ ہال میں ٹیبل نمبر سیون پر..."

"سوری سر۔ مسٹر دلاور ابھی پہنچے نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"پوری بات سننے سے پہلے بولنا بدتمیزی ہے۔" میں نے کہا۔

"سوری سر۔" وہ محتاط ہو کے بولی۔

"ٹیبل نمبر سیون پر نواب خسرو جمشید ہوں گے... یا ایس پی سراج صاحب ہوں گے... کسی کو بلا دو۔" میں نے کہا۔

"کیا نام بتاؤں سر؟"

"نام... وزیر خان... عالم آباد سے..." میں نے کہا۔

"پلیز ہولڈ کیجیے۔" وہ سمجھے بغیر بولی۔

تین چار منٹ میں کھمبے پر ٹنگا تاروں بھری رات کا نظارہ کرتا رہا اور یہ سوچ کر مسکراتا رہا کہ میرے پیغام سے وہاں کتنی سنسنی پھیلے گی۔ وہ دونوں فوراً سمجھ جائیں گے کہ پیغام دینے والا میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

"سکندر..." ریسیور میں سے سراج کی آواز آئی۔

"کون سکندر اور کون دارا... لاکھ دارا اور سکندر ہو گئے۔ تم کو کس سے بات کرنی تھی؟" میں نے کہا۔

"دلاور کہاں ہے؟" سراج تمسد ہاڑ کر کہا۔

"میری جیب میں۔" میں نے قہقہہ مار کے کہا۔ "انگریزی محاورہ..."

"... تمہارا باپ بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔"

"... بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہاری زندگی کے سکندر۔"

"... جلا دمت... یہ بتاؤ کہ دلاور کی موت میں کتنے دن باقی ہیں ... کہ تم عالم غیب ہو اس لیے بتا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جہاں تک ... مرضی کا سوال ہے تو ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ یہ تو ہم بہت ... پہلے بھی کر سکتے تھے۔ آج بھی کر سکتے تھے۔ ہمارا ارادہ ایک بارٹر ... ہے۔ مال کے بدلے مال کی بات کرنی ہے تو میری بات ... سنو آج سے ٹھیک چوتھے دن ہم کراچی میں ہوں گے۔ تم کبھی ... گئے ہو؟"

"... کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"... اس لیے کہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کہ تم کون ... ہوٹل میں ملو گے، جہاں میں تم سے بات کر سکوں۔"

"... کیسی بات؟"

"... ہم نے آج تک مقابلہ کیا ہے... سودا نہیں کیا۔" میں نے ... لیکن اب میں ایک آفر دے رہا ہوں۔ تم رابعہ اور خواجہ نیک محمد ... چھوڑ دو۔ ہم چوہدری دلاور کو چھوڑ دیں گے۔"

سراج ہنسا۔ "تم بارگین کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"... ہنسنے والوں کے لیے بھی ایک انگریزی مقولہ ہے۔" میں ... نے کہا: کہ دیکھو آخر کار کون کس پر ہنستا ہے۔ تم شاید کہنا چاہتے ہو ... دلاور کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر ایسا کہنے سے پہلے اپنی قیمت طے ... کرلو۔ اور اس ڈبل رول والے نواب سے بھی پوچھ لو کہ اس کی کیا ... قیمت ہے۔ اگر دلاور کے بدلے سودا نہ ہوا تو پھر تم دونوں میں سے ... ایک کے بدلے میں ہوگا۔ اور تمہارے بدلے نہ ہوا تو تمہارے ... کے بدلے ہوگا۔ مت بھولو کہ کچھ جذباتی رشتے تمہارے ... اتنے ہی اہم ہوں گے، جتنا میرے لیے رابعہ سے رشتہ ہے۔"

"... آل رائٹ۔" سراج کچھ دیر کے بعد بولا۔ "تم ہوٹل میٹروپول ... بات کر سکتے ہو۔"

"... کس سے؟"

"... مجھ سے یا جمشید سے۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"... ایک بات اپنی پولیس افسری میں مت بھولنا... تم فون کو ... ڈیشن پر رکھو یا خود ٹیلی فون میں گھس جاؤ۔ کال کبھی ٹریس نہیں ... ہو سکے گی کہ کہاں سے کی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "شوقیہ سراغ رسانی ... کا شوق ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں... ایک بات اور... دلاور ... کے گھر والوں کو تسلی دے دینا کہ وہ خیریت سے ہے اور کام سے ... گیا ہے۔ دو چار دن میں لوٹ آئے گا۔"

"... تم کو ان کی پریشانی کی بہت فکر ہے۔"

"... مجھے تو تمہاری ضعیف ماں کی بھی فکر ہے۔" میں نے کہا۔

"آج اگر دلاور کی بیوی پریشان ہوگی تو سوچو کل تمھاری ماں کا کیا حال ہوگا۔ کوئی احمقانہ کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے سوچ لینا۔"

وہ کچھ اور بھی کہتا مگر میں نے فون بند کر دیا اور عبدالودود منظر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ ریسیور اس کی بیوی نے اُٹھایا۔

"منظر کہاں ہے بھابی؟ میں سکندر بول رہا ہوں۔"

"ابھی ابھی تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔" وہ بولی۔ "باتھ روم میں ہیں۔"

"تھانے سے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... تمھارے انکل رضوی نے چھاپا مارا تھا۔" منظر کی بیوی نے تلخ طنز آمیز شکایتی لہجے میں کہا۔

"ہمیں برآمد کرنے کے لیے؟"

"ہاں... اور اس جرم میں ان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے کہ انھوں نے جیل سے فرار ہونے والے دو ڈاکوؤں کو پناہ دی۔"

"یہ اُن کو کس نے بتایا؟"

"ڈاکٹر شہریار نے۔" منظر کی بیوی بولی۔ "وہ بیان نہ دیتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"اُس نے ہمارے متعلق بھی بتا دیا ہوگا؟"

"ہاں۔"

"منظر کو بہت بھروسا تھا اُس پر۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"بعد میں وضاحت کرنے آیا تھا۔ میں نے بے عزت کر کے نکال دیا اور صاف کہہ دیا کہ آئندہ اِدھر کا رُخ نہ کرے۔" وہ بولی۔

"لو اُن سے بات کرو۔"

"میاں منظر۔" میں نے کہا۔ "سُنا ہے تھانے کا منظر دیکھ آئے ہو؟"

"تمھاری صورت دیکھنے کے بعد یہی سب دیکھنا ہے۔" وہ بولا۔

"مگر یار... میں نے تمھارے اس فرض شناس انکل کی ایسی تیسی نہ کر دی تو میرا نام بھی عبدالودود نہیں۔"

"مگر جو کیس درج کیا گیا ہے؟"

"کیس کی بھی ایسی تیسی۔" وہ بولا۔ "میں خود وکیل ہوں، خود اپنی ضمانت پر رہا ہو کے آیا ہوں۔ اب دیکھنا اُس سالے ڈاکٹر کی..." اُس نے ایک بہت گندی گالی دی۔ "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"زمین اور آسمان کے بیچ میں معلق ہوں۔" میں نے کہا۔ "فون صرف اس لیے کیا ہے کہ تم سے دلاور کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ تم نے اس کے متعلق شائع ہونے والی خبر دیکھی؟"

"ہاں... مجھے پتا چلا ہے کہ وہ تمھارے باپ کی جاگیر پر اپنے دوست کی یاد میں اسپتال بنا رہا ہے۔"

"لیکن یار... یہ سب کیسے ممکن ہوا؟" میں نے کہا۔ "وہ جائداد تو متنازعہ تھی۔ ابھی اس کی ملکیت کا تصفیہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اس میں کوئی گھپلا ہوا ہے۔" منظر نے کہا۔ "میں معلوم کرلوں گا اور ہائی کورٹ سے اسٹے آرڈر لے لوں گا۔"

"گھپلا کیا ہوسکتا ہے؟"

"بھئی یا تو یکطرفہ فیصلہ ہوا تیرے نہ آنے کی وجہ سے۔" منظر نے کہا۔ "یا تیری طرف سے کوئی حلف نامہ وغیرہ داخل کردیا گیا... کہ تُو اپنے دعوے سے دستبردار ہوتا ہے۔"

"میری طرف سے؟ بغیر میری مرضی کے؟"

"تیرے جعلی دستخط کیے جاسکتے ہیں۔" منظر نے کہا۔ "آخر وہ اسپتال بھی تو تیرے باپ کے نام پر تعمیر ہورہا ہے۔"

"مگر کیا عدالت میں کوئی وکیل شناخت نہیں کرتا؟"

"وکیل ہر قسم کے ہوتے ہیں۔" منظر نے کہا۔ "جعلی حلف نامہ داخل کرنے کے لیے جعلی سکندر بخت حاضر ہوا اور ایک جعلی وکیل نے اُسے شناخت کیا۔ عدالت نے کاغذات قبول کرلیے۔ اب اس جعلسازی کو چیلنج کرنا بہت بڑا اور لمبا کام ہے۔ مجھے جعلسازی، دھوکا دہی اور عدالت میں غلط بیانی کے پتا نہیں کتنے مقدمات درج کرانے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ میری بقیہ زندگی صرف تم لوگوں کے مقدمات کی پیروی کرتے گزرے گی۔ ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ باقی لوگوں کے لیے وقت ہی نہیں بچے گا۔"

"ہم فیس دیں گے تجھے۔" میں نے کہا۔ "آخر تو ہمارا اکلوتا وکیل ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے بخشو... جتنی فیس اب تک ملی ہے وہ سب میری جان کا عذاب ہے۔" منظر بولا۔ "مجھ سے فیس لے لو راہِ راست پر آنے کی۔"

"یار میں زیادہ لمبی بات نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔ "اتنا تھک گیا ہوں کہ کسی بھی لمحے عرش سے فرش پر ٹپک سکتا ہوں۔ یہ بتا کہ وہ رقم نکلوالی۔"

"کون سی رقم... جو تیری زوجہ کے حساب میں تھی؟" وہ بولا۔

"ہاں یار... اپنے حساب میں تو صرف دولتِ عشق ہے۔"

"نہیں... آج سارا دن تھانے میں گزرا۔ بار ایسوسی ایشن نے زبردست حمایت کی ورنہ ہتھکڑی پڑجاتی۔" وہ بولا۔

"اچھا اب ہم جارہے ہیں کراچی۔" میں نے کہا۔ "رقم ہمیں کل پرسوں تک مل جائے تو اچھا ہے کیونکہ ہم اپنے ساتھ ایک بہت اہم چیز بھی لے جارہے ہیں۔"

"کیا چیز لے جارہے ہو جشن... دل کی توپ؟"

"نہیں... اپنے چوہدری صاحب کو..." میں نے کہا اور فون کی لائن کاٹ کے نیچے اتر آیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو سچ مچ کھمبے سے نیچے گر پڑتا، منظر سے دوبارہ کسی وقت بھی بات کی جاسکتی تھی۔

میں نے محسن کو بھی واپس آتا دیکھ لیا تھا۔

"چھوڑ دیا اُسے اپنے گھر؟" میں نے کہا۔

"ہاں..." محسن بولا۔ "گاڑی کی آواز پر اس کی بیوی ... تھی۔ میں نے اُسے سمجھا دیا کہ اس کا شوہر معمولی طور پر زخمی ہے۔ اس کی کسی سے لڑائی ہوگئی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئے اس کو بھی سمجھا دینا کہ چُپ رہے اور اس کے سوا کوئی بیان نہ ... کسی سے کوئی بات نہ کرے اور یہ سمجھ لے کہ وہ آج گھر سے نکلا ... نہیں۔ کوئی پوچھے تو تمہارا بیان یہی ہونا چاہیے کہ وہ شام ... میں ہی تھا۔ اس کی بیوی بہت پریشان ہوئی مگر میں نے سمجھا ... کہ وہ تفصیل میں نہ جائے اور وہی کرے جو میں کہہ رہا ہوں ... ذکر بھی کسی سے نہ کرے، ورنہ وہ بہت بڑی مشکل میں پڑجائے ..."

"چل یہ تو نے اچھا کیا۔"

"میں نے شہلا کو بھی فون کیا تھا۔" محسن بولا۔

"بے وقوف۔ انکل رضوی کا فون ٹیپ ہورہا ہوگا۔"

"بس یار... میرا دل چاہ رہا تھا۔ مگر معلوم ہے اُس ... کیا بتایا؟ کراچی سے رابعہ کے متعلق ایک اطلاع ملی ہے۔"

میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے غور سے ... طرف دیکھا۔

سسپنس کیوں پیدا کررہا ہے ... کہا ... بتاتا کیوں نہیں ... خبر ہے؟"

"خبر اچھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "مگر میں سناتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

"اچھی خبر سنانے میں ڈر کس بات کا؟"

"سنا ہے وضعدار قسم کے لوگ خوشی سے بھی اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں۔" محسن بولا۔

"بھاڑ میں گئی وضعداری۔" میں نے جھنا کے کہا۔ "کیا ... تجھ سے سچ اگلوانے کے لیے مجھے تھرڈ ڈگری کا طریقہ ... کرنا پڑے گا۔ سو جوتے اور سو پیاز کھا کے بتائے گا؟"

"بجا ارشاد، دونوں چیزیں حاضر کی جائیں۔" محسن ... گیا مگر میں نے جوتا اُٹھایا ہی تھا کہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "یار ... بھی کیا بے صبری، بتاتا ہوں، ذرا دم تو لے لوں، جلد بازی ... نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عجلت کارِ شیطان است ..."

میں نے اُسے جوتا کھینچ کے مارا۔ "بزرگوں نے یہ ... کہا ہے کہ جوتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" اُس ... چھلانگ ماری تھی مگر جوتا اُس کی کمر میں لگا۔

... نے اُسے جالیا۔ ... میں نے اُس کے دونوں کان پکڑ کے مروڑنا ... اب بول۔" میں نے ... ورنہ بے کان کا رہ جائے گا۔" ... وہ چلانے لگا۔ "ابے یار... اُس نے ایک فون نمبر دیا تھا ... اور بس۔"

"صرف فون نمبر؟" میں نے اُس کے کان چھوڑ دیے۔

"ہاں، فون نمبر۔" محسن نے دونوں کان دبا دبا کے کہا۔ "... اس نمبر پر رات بارہ بجے سے صبح چار پانچ بجے تک کوئی ... ملے گا۔"

"کوئی کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے کہا۔ "ہر فون نمبر پر کوئی تو ملتا ہی ہے۔"

"افسوس نوجوان کہ عشق کے وٹامن کی کمی کے باعث ... دل اور دماغ کی کارکردگی متاثر ہوئی ہے۔" محسن بولا۔ "کوئی کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ رابعہ نہیں ملے گی تو اپنے استاد ڈیڈی ملیں گے... یا اکرام اور نازو میں سے کوئی ہوگا۔"

"کیا یہ وضاحت رابعہ نے کی تھی؟"

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر اُسے موقع ملتا تو ضرور ... دیتی مگر نہ جانے کیسے لائن کٹ گئی۔"

"لائن کیوں کٹ گئی؟"

"یار لائن آخر ہوتی کس لیے ہے؟" محسن نے کہا۔ "کوئی ... پوچھے کہ ٹرین لیٹ کیوں ہوگئی تو بھیا ٹرین ہوتی کس لیے ... ہے، طویل فاصلے کی کال کا بہت نازک رشتہ ہوتا ہے۔ ... سے لاہور تک کسی ٹیلی فون کے کھمبے پر کا کروچ چڑھ ... جائے یا تار پر مچھر بیٹھ جائے تو لائن کٹ جاتی ہے۔ پھول ... سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر... تو لائن..."

"یار پھر بک بک... میرا مطلب تھا کہیں لائن کسی نے ... منقطع تو نہیں کی؟" میں نے کہا۔ "رابعہ کو موقع ملا ہو فون کرنے کا ... اور ابھی بات پوری نہ ہوئی ہو کہ کسی نے دیکھ لیا ہو۔"

"نہیں، میں ایسی قنوطیت سے سوچتا ہوں تو صحیح نتائج ... برآمد نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا۔ "اگر یہ فرض کیا جائے کہ وہ کہیں ... بھی جہاں اُسے یہ موقع مل گیا تو متعدد سوالات پیدا ہوتے ... کہ اُسے قید میں رکھنے والے احمق کوتاہ بین ... اور ... اندیش تھے کہ انھوں نے وہیں ایک فون بھی رکھا، اس ... نمبر بھی درج کیا اور رابعہ کو اس فون تک رسائی حاصل کرنے ... ذرائع بھی فراہم کیا۔ مزید یہ کہ رابعہ نے وہ فون نمبر ہمیں پہنچایا ... اس یقین کے ساتھ کہ جب بھی ہمیں موقع ملے گا تو اس

نمبر پر بات کرنے سے فائدہ ہوگا۔ نقصان کا اندیشہ ہوتا تو وہ نمبر بتاتی ہی کیوں۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی اس نمبر تک پہنچنے کے لیے آزاد ہے۔ کم سے کم رابعہ ضرور آزاد ہے جس نے یہ کال کی۔"

"وہ آزاد ہے تو اُس نے اپنے بارے میں تفصیل سے کیوں نہیں بتایا، اپنا نیا ٹھکانا...؟"

"میں نے کہا نا کہ لائن کٹ گئی تھی، اس کے بعد شہلا نے بہت دیر تک انتظار کیا... یا تو رابعہ کو دوبارہ لائن نہیں ملی، کسی بھی خرابی کے باعث... یا پھر وہی ہوا کہ کوئی آگیا جس کے سامنے وہ بات نہیں کرسکتی تھی یا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلی قیاس آرائی کا زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ پندرہ بیس منٹ کے بعد شہلا نے اس نمبر کو ملانے کے لیے بہت کوشش کی۔ ایک بار لائن ملی تو ایکسچینج کی ٹون آنے لگی۔ اس کا مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ دوسری طرف سے رابعہ نے ریسیور اُٹھا رکھا تھا اور وہ شہلا یعنی انکل رضوی کے گھر کا نمبر ملانے میں مصروف تھی۔ شہلا نے عقلمندی تو کی تھی کہ لائن کٹتے ہی فوراً خود نمبر گھمانا شروع نہیں کیا۔ اُس نے ریسیور رکھ کے انتظار کیا اور رابعہ کو موقع دیا کہ وہ دوبارہ رنگ کرے مگر کبھی کبھی لائن ملنا محبوب کے ملنے سے بھی زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔ کہنا یہ ہے میری زوجہ مسماۃ شہلا محسن کا کہ وہ دس پندرہ منٹ تک ڈائل گھماتی رہی اور نمبر نہیں ملا تو انکل رضوی وارد ہوگئے اور پوچھنے لگے کہ کسے لوق کررہی ہو، کوئی ٹرنک کال ہے؟"

"اُن کا ایسا سمجھنا برحق تھا۔"

"ہاں، لوکل کال میں اتنی دیر نہیں لگتی اور پھر شہلا کچھ جذباتی ہوگئی تھی چنانچہ نمبر ڈائل کرنے میں اُس نے غیر ضروری جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ لوکل نمبر نہ ملے تو آدمی دو چار منٹ کے وقفے سے دوبارہ کوشش کرتا ہے۔ ٹرنک کال کے لیے مسلسل نمبر ملانا پڑتا ہے۔ چنانچہ انکل نے کہا کہ مجھے بتاؤ کون سا نمبر ہے، ابھی مل جائے گا۔ ان کو تو شہلا نے ٹال دیا کہ کوئی ایسی اہم اور ضروری بات نہیں مگر مجھے شک پڑتا ہے کہ انکل رضوی نے نمبر نوٹ کرلیا ہوگا۔" محسن نے کہا۔

"وہ کیسے؟ کیا شہلا نے نمبر کہیں لکھا تھا؟"

"نہیں، اب میری گھر والی اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوسکتی۔" محسن نے بُرا ماننے کے انداز میں کہا۔ "ایس ایس پی صاحب بہت ہوشیار ہیں۔ اسی فون لائن سے منسلک دوسرا ٹیلی فون ان کے کمرے میں بھی لگا ہوا ہے۔ ہر مرتبہ جب شہلا ڈائل گھماتی ہوگی تو گھنٹی رضوی صاحب کے کمرے میں بھی بجتی ہوگی۔ مثلاً اُس نے نمبر چھ ڈائل کیا تو انکل کے کمرے میں چھ بار گھنٹی بجے گی پھر آٹھ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کا ہندسہ ہوگا تو آٹھ بار اور مسلسل ٹن ٹن سن کے اُنھیں خیال آیا ہوگا کہ آخر یہ کون فون کر رہا ہے اور کیسے کر رہا ہے کہ نمبر نہیں ملتا۔ ذرا سا غور کرنے سے وہ نمبر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تھوڑی سی پریکٹس کی بات ہے جیسے کوئی مورس کوڈ سمجھتا ہے ایسے ہی جہاں فون ہو وہاں سے ڈائل رنگ شمار کر کے صحیح نمبر نوٹ کیا جا سکتا ہے یا تقریباً صحیح نمبر سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک نمبر اِدھر اُدھر ہو جائے تو یہ غلطی نمبر ملانے سے درست ہو جاتی ہے۔"

"اور اس کے باوجود تو دعویٰ رکھتا ہے کہ تیری گھر والی اتنی احمق نہیں ہے، وہ تجھ سے زیادہ احمق ہے اور تو اس سے زیادہ۔ بھلا کیا ضرورت تھی اُسے یہ رسک لینے کی، نمبر آؤٹ ہوگیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا، خاموشی سے نمبر نوٹ کرتی اور ہمیں بتا دیتی۔" میں نے کہا۔

"یار! آخر عورت ذات ہے، افلاطون یا سکندر بخت نہیں ہے اور خود سکندر بخت ہوتے تو میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ جذباتی حماقت فرماتے۔ سر کے بل کھڑے ہو کر رابعہ، رابعہ پکارنے لگتے یا فون میں گھس جاتے۔" محسن نے خفگی سے کہا۔ "اور میں صرف ایک امکان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ نمبر رضوی صاحب کے پاس پہنچ چکا ہے۔"

"چل بُرا مت مان، جو ہُوا اچھا ہُوا۔ بُرا ہُوا تب بھی اس میں بُرائی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اب ہم آج رات کوشش کریں گے۔"

"یہ آدھی رات کے بعد والا مسئلہ کچھ عجیب ہے۔" محسن نے کہا۔ "لائن چارجز تو شاید رات کے گیارہ بجے کے بعد ہی کم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لائن چارجز کی بات نہیں۔ غالباً یہ فون رات کے بعد دستیاب ہوتا ہے۔ کسی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں رات بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک کسی کی موجودگی کا امکان نہیں اور وہاں سے چوری چھپے بات ہو سکتی ہے۔"

"گویا ناجائز طور پر۔" محسن بولا۔

"غالباً یہ کسی آفس کا فون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام دفاتر رات کے وقت بند پڑے رہتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی عقل اور پیسہ استعمال کرے تو کسی کمپنی یا سرکاری دفتر کے چوکیدار کو رشوت دے سکتا ہے اور چوکیدار کوئی بھی کمرا کھول کے فون اُن کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ ایسا ہوتا بھی ہے۔ سرکاری دفتروں اور صنعتی اداروں کے لمبے چوڑے بل ہوتے ہیں۔ اس میں نجی کالوں کا پتا ہی نہیں چلتا۔ یار لوگ سرکار کے خرچے پر نصف شب کو بیویوں اور محبوباؤں سے فلمی محبت بھرے ڈائیلاگ بھی بول سکتے ہیں اور دُشمنوں کو دولن کی طرح گالیاں بھی دے سکتے ہیں۔"

"کیا آئیڈیا ہے۔" محسن بولا۔ "افسوس کہ ہم نے کبھی نہیں سوچا ورنہ سرکاری دفاتر اور لالچی چوکیدار کہاں نہیں... خیر آئندہ کے لیے یہ بھی ایک وسیلہ ہے۔"

"جو ہم آج رات ہی استعمال کر سکتے ہیں۔" میں نے...

"اور کریں گے۔" محسن جوش سے بولا۔ "رابطے کی... تو نکلی۔"

"ہاں، ورنہ کراچی تو انسانوں کا سمندر ہے اور... جانے بغیر کسی کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل کام ہوتا۔" میں نے کہا۔ اس خیال سے میں رابعہ کی آواز سُن سکوں گا میرے دل میں بے قراری... جب تک رابعہ کے اور میرے درمیان نااُمیدی کا... احساس کا فاصلہ تھا، میرے جذبات پر بھی جیسے بے حسی کی... سی جمی رہی تھی۔ میں دیدہ و دانستہ اس کے خیال سے گریز... اور اس کے تصوّر کی اذیت سے بچتا تھا۔ اب وہ پھر دل... میں درد جگا کے اُتری تھی تو اس طرح کہ اس کا عکس جمال... خیالوں میں بس گیا تھا اور اس کا نام ہر دھڑکن کی بازگشت... تھا۔ یہ برف پگھلتے ہی میرے عشق کا آتش فشاں دہکنے لگا تھا... راستوں کے تاریک سفر میں یک لخت اس کے آفتاب... اُجلی دُھوپ آگئی تھی چنانچہ میرے جذبات کی شدت... صورت سے بھی عیاں ہونے لگی تھی۔

محسن قہقہہ مار کے ہنسا۔ "شروع ہو گئی بیٹ میں... اس کے بعد آنے لگیں گے عشق کے گلاب۔"

"تم نے گولی ہی ایسی دی ہے۔" میں نے کہا۔ "خواہ... وہ نام یاد جو میں بھولنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔"

"پھر کیا کرتا، نہ بتاتا یہ بات ابھی؟"

"نازو کے حوالے سے بتا دیتا۔" میں نے کہا۔

"پھر اپنے مرزا غالب کا یہی حال ہوتا۔" محسن بولا۔ "... اب پہلے تو اپنے مہمان کی خبر لیں کہ وہ کس حال میں ہے؟"

"سرکس کا شیر لوہے کے جال میں ہے۔" میں نے کہا۔

دلاور ہوش میں آچکا تھا اور کیتھرین کی تحویل میں تھا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے عجیب منظر دکھائی دیا۔ دلاور... کرسی پر دیوار کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہُوا تھا۔ دلاور کے ہاتھ... کی پُشت کی طرف کر کے باندھے گئے تھے اور کرسی دیوار... لگی ہوئی تھی۔ دلاور کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ دراز... بدن پر جگہ جگہ زخموں کی خونی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ کیتھرین... ہاتھ میں نائلون کی دُہری بل دی ہوئی رسّی تھی جسے اس نے... بے دردی سے کوڑے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

کیتھرین کے بال بکھر گئے تھے اور اُس کی آنکھوں میں... وحشت تھی، وہ جس حد تک دلاور سے اپنی تذلیل کا انتقام لے سکتی تھی، اُس کے جسم پر تشدد کر کے لے چکی تھی پھر شاید وہ... تھک گئی تھی یا اُسے خیال آگیا تھا کہ دلاور کا زندہ رہنا... ضروری ہے۔ اب وہ ایک ہاتھ میں مگ اور دوسرے ہاتھ میں... نمک کا چمچہ لیے کھڑی تھی۔ میرے سامنے اُس نے مگ میں ایک چمچہ پانی لیا اور دلاور کے زخم پر ڈال دیا۔ دلاور کا جسم بے اختیار... اینٹھا مگر اس کی صورت پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ برقرار رہی۔

"اب بولو... یو ڈرٹی سوائن... کیسا ہے؟" کیتھرین نے کہا۔ "آئی وِش... کہ میرے پاس تیزاب ہوتا۔"

دلاور نے مجھے اور محسن کو دیکھا۔ "لو تمھارے مددگار آگئے، ان سے جو چاہو منگوا لو، تمھارے دل میں حسرت نہ رہے کوئی۔"

کیتھرین نے پورا مگ اُس پر پھینک دیا، وہ نمک ملا پانی تھا جو اس کے ہر زخم پر پھیل گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا مگر کیتھرین کی کوششوں کا مذاق اُڑانے کے لیے پھر مسکرانے لگا۔

"تم ایسا کرو، ایک مشین منگوا لو قیمہ بنانے کی یا گنّے کا رس نکالنے کی۔" دلاور نے کہا۔ "اُس میں مجھے ڈالو اور مشین چلا دو پھر گوشت کھا لو اور خون پی لو، اپنی بیٹی کو بھی پلا دو۔" یہ تھا کہنا۔

کیتھرین نے ایک جنونی ردِ عمل کے ساتھ دلاور پر حملہ کیا۔ اُس کے ناخن لمبے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ دلاور کا منہ نوچتی، دلاور نے اُس کے منہ پر تھوک دیا۔ "پاگل کُتیا۔" دلاور نے حقارت کے زہر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا اس طرح تُو وہ سب بھلا سکتی ہے جو تیرے ساتھ ہُوا تھا، جو میں نے دیکھا تھا؟"

کیتھرین ایک دم رُک گئی، اُس کا چہرہ احساس ذلت سے زرد پڑ گیا، اُس نے مجرم نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ دلاور نے... وہ بات کہہ دی تھی جو کیتھرین نے آج تک ہم سے چھپائی تھی۔ شاید وہ کسی عورت سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی، وہ منہ چھپا کے روتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

"تم واقعی دلاور ہو۔" میں نے آگے جا کے دلاور کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ "تم نے اور تمھارے شکاری کتوں نے ایک کمزور اور بے بس عورت کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا اس پر تمہیں شجاعت و مردانگی کا اعلیٰ اعزاز ملنا چاہیے۔ تم جسم کے زخموں کی اذیت پاشی کو بھی مسکرا کے جھیل گئے مگر اصل اذیت رُوح کے زخم دیتے ہیں جو تم نے نہیں کھائے اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکو گے جو احساس کے ناسور دیتے ہیں۔"

"آپ ڈائیلاگ اچھے بولتے ہو۔ اپنے سکندر صاحب! میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔" دلاور بولا۔

"ہم نے اب تک اچھا ہی کیا ہے۔ ہم بُرائی سے گریز کرتے رہے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ہمیں اپنی طبیعت پر جبر کر کے تمھاری سطح پر آنا پڑے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمھارے ساتھ بھی آج کچھ ایسی بات ہو جائے جسے تم کبھی نہ بھلا سکو۔"

"اور تمھیں افسوس ہو کہ تم نے وہ سب کیتھرین کے ساتھ کیوں کیا تھا، جس پر انسان نہیں شیطان بھی شرمائے مگر تم اس کا حوالہ فخر کے ساتھ دیتے ہو۔" محسن نے کہا۔ "وہی تمھارے ساتھ ہوگا!"

"میرا تم کیا بگاڑ سکتے ہو۔" دلاور نے اطمینان کی اداکاری کے ساتھ کہا۔ "اپنے سکندرِ اعظم صاحب! نہ اپنی جوان بیٹی ہے نہ بہن اور نہ کوئی معشوقہ، جیسی کہ تم لوگوں کے لیے مجبوری اور کمزوری بن جاتی ہے۔ ایک پُرانی بیوی ہے تو اُسے بے شک اُٹھا لاؤ، جیسے چاہو مار دو، نقصان ہوگا تو بچوں کا، انھیں دوسری ماں نہیں ملے گی، ہمارا کیا ہے، ہمیں دوسری تیسری چوتھی بیوی بھی مل سکتی ہے، اگر زندہ رہے۔"

"کیا تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو اتنے ہی سکون کے ساتھ برداشت کر سکو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کرلیں گے جی، آدمی کا دل پتھر ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔ "یہ جو آپ لوگ موم کا دل لیے پھرتے ہو، یہی عذاب دیتا ہے، یہی آدمی کا راستہ روکتا ہے اور اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ ہم وہ نہیں کر سکتے جو تم کر سکتے ہو۔" میں نے غصّے سے کہا۔ "مگر یہ سوچو کہ..."

"نہیں، یہ تو کبھی سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ دُشمن ہمارے ساتھ وہ سب نہیں کر سکتا جو ہم دُشمن کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے، ایک درندہ ہے، جب وہ باہر آجاتا ہے تو شرافت اور تہذیب کے سارے لباس تار تار کر دیتا ہے۔ میری اپنی زندگی ہر وقت تمھارے نشانے پر تھی، بالکل اسی طرح جیسے تمھیں قتل کر دینا یا کرا دینا ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے اختیار میں تھا۔ تم وہ فلسفہ بگھار سکتے ہو کہ موت کا ایک دن معیّن ہے اور اس سے پہلے کوئی کسی کو نہیں مار سکتا پھر بھی ہم حقائق کو تسلیم کرتے ہیں، اپنی حفاظت بھی کرتے ہیں اور احتیاط بھی کرتے ہیں۔ میں کبھی اس خیال سے غافل نہیں رہا کہ تم میرے بیوی بچوں کو میری کمزوری بنا سکتے ہو، ایک با... زیہے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گھر کے اندر تک پہنچ گئے تھے مگر ایسا تم انتقاماً نہیں کرو گے، یہ میرا اندازہ تھا۔ تم مجھ سے کچھ اُگلوانے کے لیے، کچھ منوانے کے لیے یا مجھ سے کوئی سودا کرنے کے لیے ایسا کرو گے۔" دلاور نے کہا۔
"میرے اندازے کم ہی غلط ہوتے ہیں اپنے سکندر صاحب۔"
میں اُس کی ذہانت کا پھر قائل ہُوا۔ "ہم نے تمھاری زندگی کا سودا کرنے کی بات کی تھی۔"
"کس سے؟ میرے بیوی بچّوں سے؟" دلاور مُسکرانے لگا۔
"نہیں، تمھارے یاروں سے۔" میں نے کہا۔
"یار کون ہے کسی کا، آدمی خود اپنا یار نہیں۔" وہ بولا۔
"آج بڑا فلسفہ بول رہے ہو۔" محسن نے کہا۔ "یاد نہیں تو وہ لوگ کیا ہیں، سراج اور جمشید؟"
"بس بزنس پارٹنر، بزنس نہیں تو پارٹنر بھی نہیں اور پارٹنر نہیں تو بزنس کی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تم سے کوئی سودا نہیں کریں گے، نیا پارٹنر تلاش کریں گے۔"
"کیا تمھاری بیوی بھی دوسرا شوہر تلاش کرے گی؟" محسن نے مشتعل ہو کے کہا۔
"میرے جیتے جی تو نہیں کرے گی، میرے بعد کرے تو پتا نہیں کسی اور کا دل آجائے اُس پر یا اُس کا دل کسی پر آجائے۔"
دلاور ہنسنے لگا۔
"اور تمھارے بچے؟" میں نے کہا۔
"وہ یتیم ہو جائیں گے، ہونے دو۔ دُنیا میں ہزاروں بچے ہر روز یتیم ہوتے ہیں، ان کے لیے بہت کچھ ہوگا جس سے ان کی زندگی آرام اور آسائش میں گزر جائے گی جیسے اب گزر رہی ہے۔ باپ اہم ضرور ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ اُس کا پیسہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔"
"صرف تم جیسا شخص ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔
دلاور ہنسا۔ "میرے کہنے کی بات نہیں اپنے سکندر صاحب، حقیقت تو ایسی ہی ہے کیا اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے اُس باپ کی جو مفلس اور محتاج ہو، معذور ہو اور ایک ایسا بوجھ ہو جسے اُٹھا کے چلنا بھی بدنامی کے سوا کچھ نہ دے۔ ایک بدکردار، عیاش باپ بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے اگر وہ دولت مند ہو۔ اس اُمید میں کہ وہ کبھی تو مرے گا مگر وہی باپ سب کچھ ختم کر کے مرنا چاہے تو کیا اولاد برداشت کرے گی؟ بے شک بچے مجھے مس کریں گے لیکن کتنے دن، اُن کی ساری زندگی پڑی ہے، اُن کے لیے جو بندوبست میں نے کیا ہے، وہ میری محبت کا بہترین نعم البدل ہوگا۔ ایک موازنہ کریں جی کہ باپ ہو اور پیسہ نہ ہو... یا پیسہ ہو مگر باپ نہ ہو، اولاد کے حق میں کون [illegible] صورتِ حال بہتر رہتی ہے؟"
"تم رشتوں کے بیوپاری لوگ ایسے فارمولوں کے گُر [illegible] سکتے ہو مگر ایسے آدمی کو انسان نہیں سمجھا جاسکتا جو ہر جذبہ [illegible] بدی، اچھائی بُرائی خیالات اور احساسات سب کو مال و زر کے [illegible] سے دیکھتا ہو۔ اپنی بیوی سے ہی پوچھ کے دیکھو۔ کیا وہ ایک [illegible] بیچ سکتی ہے۔ کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ میں وہ ایک بچے کا [illegible] گی کہ اُسے آدم خور قبائل کے حوالے کر دیا جائے یا اپنے سہاگ کی کیا قیمت لے گی؟"
دلاور ہنسنے لگا۔ "اپنے سکندر صاحب! جب بنگال [illegible] قحط پڑا تھا تو عورتوں نے اپنی مامتا کے اور اپنی عصمتوں [illegible] سودے ایک مُٹھی چاول اور ایک روٹی کے بدلے کیے [illegible] میری بیوی کے پاس جذباتی عیاشی کے وسائل ہیں، وہ وا[illegible] تمھاری توقعات پر پورا اُترے گی۔ قحطِ بنگال جیسے حالات [illegible] کا ردِّعمل کیا ہوتا، یہ تم تصوّر کرو گے تو تمھاری نظر میں آدمی [illegible] نہیں رہے گا، وہ اپنے شیخ سعدی نے بھی تو کہا ہے کچھ [illegible] میں ایسا قحط پڑا کہ لوگ عشق تک بھول گئے، وہ غلط [illegible] گئے ہیں کیا؟"
دلاور کو قائل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ یہ ہمارے مزاج، ہماری سوچ اور فطرت کا فرق تھا۔ شیطان کو بحث سے نیکی کے وجود کا قائل کون کر سکتا ہے۔ "یہ بحث چھوڑو، ہم تمھیں ایک موقع دیں گے، زندہ رہنے کا۔" محسن بولا۔
"کہ تم اپنی دُنیا میں لوٹ جاؤ، سیاسی پارٹی بناؤ، الیکشن لڑو اور اپنی ساری طاقت ہمارے خلاف استعمال کرو۔ وزیرما[illegible] کے نام پر اسپتال بناؤ جسے خود تم نے قتل کیا تھا۔ ان سب کے نام پر نیکی کمانے کا ڈراما کرو، جن کو تم نے اپنی بربریت سے [illegible] کیا اور اپنے شیطانی عزائم کی قربان گاہ پر مار ڈالا۔ ان سب بچوں کے لیے یتیم خانے کھولو جن کو تم نے یتیم کیا اور ان سب عورتوں کے لیے فلاحی ادارے بناؤ جو تمھاری وجہ سے بیو[illegible] قبول کرنے پر مجبور ہوئیں۔" میں نے کہا۔
"اتنی رحمدلی اور فیاضی کس لیے؟" دلاور طنز سے بو[illegible]
"ہم تمھیں قتل نہیں کریں گے، تم صرف ایک آدمی ہو۔" [illegible] نے کہا۔ "تمھیں مار کے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ تم جیسے سیکڑوں [illegible] جو ملک فروشی کے کاروبار میں تمھارے ساتھ ہو گئے ہیں [illegible] اور ان سب کو سزا دے گا اس ملک کا قانون۔ قدرت [illegible] نظامِ انصاف، اس ملک کے عوام کا اتحاد۔ ہم نے تم سے [illegible] [illegible] دشمنی کا بدلہ بھی خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم اور تمھارے [illegible] غداری ہمارے نہیں، اس قوم کے مجرم ہو، تم سب کی [illegible] سزا ہوگی جو تمھیں ضرور ملے گی۔ ابھی تو ہم تمھیں اس [illegible] تم کار لائے ہیں کہ تم سے ایک سودا کریں، تم واپس جا [illegible] ہو۔"
"سودا کیا ہے؟" دلاور بولا۔ "اور فائدہ کس کا ہے؟"
"فائدہ برابر کا نہ ہو تو سودا نہیں ہوتا۔" محسن نے کہا۔ "تمھاری [illegible] تمھارے بیوی بچوں کو لوٹائی جاسکتی ہے۔"
"بشرطیکہ رابعہ اور تمھارے استادِ محترم ٹیڈی کو تمھارے [illegible] کر دیا جائے۔" دلاور سمجھ گیا۔ وہ بہت کائیاں شخص تھا اور [illegible] کا دماغ مشین کی طرح سوچتا تھا۔ "یہی ہے نا یہی بات؟"
"نہیں، تمھارا اندازہ غلط ہو گیا۔" میں نے ہاں کہتے کہتے [illegible] ارادہ بدل دیا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا کہ میں نے [illegible] الفاظ بدل دیے۔ مجھے یک لخت خیال آگیا تھا کہ اب [illegible] دلاور سے براہِ راست سودا ممکن نہیں رہا۔ اب تک جتنی گفتگو [illegible] ہوئی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی وہ خود کو مجبور [illegible] سمجھتا۔ "میرا خیال ہے کہ رابعہ اور ٹیڈی کی رہائی صرف تمھارے [illegible] اختیار کی بات بھی نہیں۔" میں نے سوچ کے کہا۔
"پھر کیا چاہتے ہو؟" دلاور بولا۔
"ہمارے مطالبات معمولی ہیں جو خود تم پورے کر سکتے ہو۔" [illegible] نے کہا۔ "ایک تو تم کو ایم آر ایس کے مالی وسائل کی کمی کو پورا کرنا [illegible] ہے۔ تم نے میرے والد کا اور میرا بہت مال ہضم کیا ہے۔ ایک [illegible] پہلے پر تم مجھے کئی کروڑ کی رشوت بھی دے رہے تھے، اب [illegible] کا کچھ حصّہ اپنے دشمنوں کو دو۔ ان دشمنوں کو جو تمھیں [illegible] اپنے کاروبار کو۔ تمھارے کاروبار میں شریک غداروں کو [illegible] اُکھاڑنے کے درپے ہیں۔ تمھاری سزا یہی ہے کہ تم ان کے [illegible] ہاتھ مضبوط کرو جو تمھاری جڑیں کاٹ رہے ہیں۔"
دلاور نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "کتنا پیسہ چاہیے تمھیں؟"
"فی الحال دس لاکھ۔" میں نے کہا۔
"صرف دس لاکھ؟" دلاور نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں، آئندہ ضرورت پڑے گی تو پھر وصول کریں گے۔" [illegible] محسن نے کہا۔ "اس کے علاوہ ہمیں ایک پتا بھی چاہیے۔"
"کس کا پتا؟"
"ایس ایس پی سراج کی منگیتر کا۔" میں نے کہا۔
"کون سی منگیتر؟"
"چار شادیوں کا ایک مشروط مسئلہ تو ہے مگر چار جگہ منگنی تو سُنی نہیں۔" محسن بولا۔
"ہم اُس کی منگیتر کا نام جانتے ہیں اور اُس کی تصویر بھی دیکھ چکے ہیں۔"
"اچھا وہ... تو تم اُس سے ملنا چاہتے ہو؟" دلاور مُسکرانے لگا۔
"تمھیں کوئی اعتراض ہے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں، شوق سے ملو مگر اس کے لیے تمھیں سات سمندر پار جانا پڑے گا، وہ امریکا میں ہے، کس شہر اور ریاست میں، یہ شاید سراج کو بھی معلوم نہیں۔" دلاور بولا۔
"اس قسم کے جھوٹ سے معاملات بگڑ جائیں گے دلاور۔"
"نہیں، یہ سچ ہے۔" دلاور نے کہا۔ "اس لڑکی کے گھر والوں نے یک طرفہ طور پر نسبت ختم کر دی تھی۔ ان کے خیالات سراج کے بارے میں اچھے نہیں رہے تھے۔"
"کیا وہ شریف لوگ تھے؟" محسن نے طنز سے کہا۔
"ہاں، تمھارے معیارِ شرافت پر پورے اُترنے والے لوگ تھے چنانچہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی کا مستقبل سراج کے ساتھ غیر محفوظ ہوگا۔ اُنھوں نے منگنی توڑ دی اور لڑکی کا نکاح کسی کزن سے کر دیا جو امریکا سے چند دن کے لیے آیا ہُوا تھا۔ اس سے پہلے کہ سراج کو معلوم ہوتا، وہ واپس بھی چلا گیا اور جاتے ہوئے بیوی کو بھی لے گیا۔"
"اس بے عزّتی کا بدلہ نہیں لیا سراج نے؟" میں نے کہا۔
"سراج تو اُس کی تصویر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔" محسن بولا۔
"وہ سب کرنا پڑتا ہے۔" دلاور بولا۔ "لڑکی اکلوتی تھی اور والدین لکھ پتی تھے۔ اُن کا جی ٹی روڈ پر ہی کوئی کارخانہ تھا، انارکلی میں ایک کمرشل بلڈنگ تھی۔"
"گویا سونے کی چڑیا تھی، ہاتھ سے نکل گئی۔" میں نے کہا۔
"ہاں، ورنہ لڑکیاں تو بہت۔" دلاور بولا۔ "بعد میں بہت افسوس ناک واقعات پیش آئے۔ پہلے انارکلی کی اُس کمرشل بلڈنگ میں آگ لگ گئی پھر ایک رات اُن کے گھر میں ڈاکو گھس گئے، وہ صرف مال لے جاتے لیکن گھر والوں نے مزاحمت کی۔"
"اور مارے گئے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "شاید کسی دن وہ لڑکی اور اُس کا شوہر امریکا میں کسی کار کے حادثے میں ہلاک ہو جائیں گے۔ افسوس ناک واقعات کیسے پیش نہ آتے، اُن کی حرکت ہی افسوس ناک تھی۔ ایک ایس پی کو کیا سمجھا تھا اُنھوں نے؟"
"تم سراج کی منگیتر سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اغوا کرنے کے لیے...؟" دلاور بولا۔ "تاکہ اس کے بدلے میں رابعہ کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مانگ سکو۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سمجھا۔"

"مَیں تمھیں نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا۔" دلاور بولا۔ "لیکن اس طرح تمھیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سراج کو کیا معلوم کہ رابعہ کہاں ہے۔"

"وہ ہم معلوم کرلیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"اور کوئی مطالبہ؟"

"تم ایک بیان تحریر کروگے اور اُس پر دستخط کرکے ہمارے حوالے کروگے، یہ بیان اخبارات میں شائع ہوگا۔" مَیں نے کہا۔ "یہ تمھاری طرف سے اعلان ہوگا کہ مجوزہ وزیر اسپتال کا نام اب دلاور اسپتال ہوگا، تم چاہو تو اپنے باپ کا نام بھی لکھ سکتے ہو۔"

محسن کی آنکھوں میں اُلجھن تھی اور حیرانی بھی، وہ میرے مطالبات کو یقیناً احمقانہ سمجھ رہا ہوگا۔ دلاور کے اغوا کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا مگر مَیں بہت سوچ سمجھ کے بے وقوف بن رہا تھا۔ مَیں سمجھتا تھا کہ دلاور کے لیے اپنی زندگی کوئی مجبوری نہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کسی کے لیے بھی اتنی اہم نہیں ہوگی کہ ہم اُسے جان سے مارنے کی دھمکی دیں تو ہمارا ہر مطالبہ تسلیم کرلیا جائے۔ وہ خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رابعہ اور ٹیڈی کو اپنی رہائی کے بدلے میں رہا کرسکے، یہ فیصلہ دوسروں کے ہاتھ میں تھا چنانچہ مَیں ایسے حالات پیدا کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا جس میں وہ سرے مجبور ہوں، خود دلاور مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہوگا کہ مَیں نے اتنے معمولی مطالبات پیش کیے۔ دس لاکھ وہ دس پیسے کی خیرات سمجھ کے پھینک سکتا تھا۔

رہا اسپتال کا نام بدلنے کا اعلان تو اُس نے سمجھا ہوگا کہ مَیں جذباتی اشتعال سے مغلوب ہُوں، حالانکہ ایسے کسی بھی اعلان کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ بعد میں جب چاہتا اپنے بیان کی تردید کرسکتا تھا۔

"بس یا کچھ اور؟"

"ہم چیک قبول نہیں کریں گے۔" مَیں نے کہا۔

"تمھیں نقد مل جائے گا۔" دلاور نے کہا۔

"دس لاکھ بہت معمولی رقم ہے، اس رقم کو بچانے یا ہمیں پکڑوانے کے لیے کوئی جال پھیلاؤ گے تو جان سے جاؤ گے اور تمھارے اپنے فلسفے کے مطابق نقصان صرف تمھارا اپنا ہوگا۔" مَیں نے کہا۔

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟"

"پہلے تم ادائیگی کا طریقِ کار بتاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"طریقِ کار کچھ بھی نہیں، تم جاؤ اور میری بیوی سے رقم لے لو، ابھی اور اسی وقت۔" دلاور بولا۔

"اتنی نقد رقم وہ اپنے ساتھ رکھتی ہے اور آدھی رات کے وقت کسی کو بھی دے سکتی ہے؟" مَیں نے کہا۔

"وہ میری بیوی ہے۔" دلاور نے غرور سے کہا۔ "تم آزما چکے، اب اُسے بھی آزما کے دیکھو۔ میری تحریر تمھارے لیے دس لاکھ کا بیئرر چیک ثابت ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، تم چیک لکھو۔" مَیں نے کہا۔ "رقم نواب خسرو جمشید وصول کریں گے، ان کو تمھاری بیوی ضرور پہچانتی ہوگی، مجھے اس کا فون نمبر تو بتاؤ۔"

دلاور نے اقرار میں سر ہلایا اور خسرو جمشید کا فون نمبر بتایا۔

"اب یہ رقم نواب صاحب خود ایس پی سراج کے گھر اُس کی والدہ کو پہنچائیں گے۔" مَیں نے کہا۔ "ہم یہ رقم اُن سے لے لیں گے اور اگر درمیان میں کسی نے کوئی چکر چلایا تو ہم سراج کی ماں کو ساتھ لانے پر مجبور ہوں گے۔"

"تم واقعی بہت چالاک ہو۔ تم نے ایک زنجیر میں سب کو باندھا ہے۔" دلاور نے کہا۔ "مجھے تمھاری نیت پر شک ہے کہ درپردہ تم کوئی دوسرا کھیل کھیلنا چاہتے ہو مگر میں دس لاکھ ایسے جوئے میں ہار جانے کے لیے تیار ہُوں جس میں میری جیت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، لاؤ کاغذ اور قلم۔"

مَیں نے اُسے کاغذ اور قلم دیا اور جب وہ لکھ رہا تھا تو میں نے محسن سے فرانسیسی میں بات کی اور اُسے اپنا پلان بتا دیا۔ دلاور نے ایک تحریر نواب خسرو جمشید کے نام بھی دی، اس نے خاصی عقل مندی سے کام لیا اور صرف یہ لکھا کہ ایک ضروری کام کی وجہ سے وہ ہوٹل نہ پہنچ سکا اور باہر سے ہی ایک مہمان کے ساتھ چلا گیا۔ یقیناً ان کو کوفت اور تشویش ہوئی ہوگی لیکن معاملہ ایسا ہے کہ وہ زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وضاحت نہیں کرسکتا۔ اسے دس لاکھ روپے نقد درکار ہیں جو اس کی بیوی کے پاس ہیں مگر وہ صرف اُسی کو دے گی جس کو وہ اعتماد کے قابل سمجھتی ہے۔

چنانچہ وہ جائے اور رقم لے آئے اور پھر یہ رقم سراج کی والدہ کو پہنچا دے، ایک پارٹی یہ رقم سراج کی ماں سے لے جائے گی۔

دوسری تحریر اُس نے بیوی کے نام دی، اس میں بھی تقریباً وہی بات دُہرائی گئی تھی جو جمشید کے خط میں تھی اور کہا گیا تھا کہ وہ دس لاکھ ادا کردے مگر اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے اور فکر بھی نہ کرے، وہ بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔

"یہ لو۔" دلاور نے کہا۔ "آ گئے تمھارا کام، تم مجھے جہاں بھی لے جانا چاہو...."

"ہم تمھیں تکلیف نہیں دیں گے۔" مَیں نے کہا۔ "تم ہماری واپسی تک یہیں رہو گے۔"

"مجھے معلوم تھا۔" دلاور نے زندگی سے مایوس پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم صرف دس لاکھ میں میری جان بخشی کرنے والے نہیں ہو، تم سمجھتے ہو کہ بڑی چالاکی سے تم نے مجھے لُوٹ لیا۔ اپنے سکندر صاحب! میرے ہاتھ کا میل بھی دس لاکھ سے زیادہ کا ہے یہ رقم مَیں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ایک فضول چال پر ہار دی ہے کیونکہ میں ایک سفید چانس بھی ضرور لیتا ہُوں۔"

"بہت جلد تم کو اندازہ ہو جائے گا دلاور کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور تم نے دس لاکھ میں اپنی وہ زندگی بچالی ہے جو دوسروں کے لیے بے مصرف تھی۔ ہم تمھیں آزاد کردیں گے۔" مَیں نے کہا۔

دلاور کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"آ جائے گا۔" مَیں نے کہا۔ "اب ہم چلتے ہیں، تمھاری نگرانی وہی عورت کرے گی جسے تمھاری جان لینے میں کوئی عار نہیں، ہم اُسے سمجھا دیں گے کہ تمھیں جسم اور رُوح ایک ساتھ لے کر نہ نکلنے دے مگر اس کا نشانہ کتنا بے خطا ہے اس کا اندازہ تمھیں خود ہی ہو جائے گا۔"

"تم ایسے کہاں جاؤ گے؟"

"تمھارا مطلب ہے کہ ہم نواب خسرو جمشید تک کیسے رسائی حاصل کریں گے اور سراج کے گھر کیسے جائیں گے۔" محسن بولا۔ "اپنے دلاور صاحب! ہم اپنا کام خود کرسکتے ہیں۔"

غالب نے دوسرے کمرے میں رہتے ہوئے ہماری تمام گفتگو سُنی تھی لیکن دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ جب محسن پھر دلاور کے ہاتھ پیر باندھ رہا تھا تو مَیں نے غالب کے بیڈ کے نیچے سے مشین گن نکالی اور اُسے لوڈ کرنے لگا۔ اس وقت میری غالب سے مختصر سی بات ہوئی اور مَیں نے مناسب سمجھا کہ اُسے بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کردوں۔

"دلاور کو کیتھرین کی تحویل میں دے کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" غالب نے کہا۔ "اُس کے ہاتھ میں ریوالور ہوگا، یہ نہ ہو کہ اُس کے وجود میں بھری ہوئی نفرت کا سارا زہر گولیوں کی صورت میں دلاور کے جسم میں اُتر جائے۔"

"غالباً غالب نے ٹھیک کہا۔" محسن بولا۔ "یہ کام اسے کرنے دو۔"

"مگر کیا یہ لنگڑا اس کا اہل ہے؟"

"وہ گولی لنگڑی نہیں ہوگی جو اس کا راستہ روکنے جائے گی۔" غالب بولا۔

مَیں اور محسن باہر آئے تو رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ مَیں نے ایک چادر میں مشین گن لپیٹ لی تھی۔ اور ریوالور محسن کی جیب میں تھا۔ ہم ابھی تک اسی غیر ملکی صحافیوں والے حُلیے میں تھے۔ پروگرام کے مطابق مَیں نے ایک پول پر چڑھ کے اپنا فون لگایا اور پھر دلاور کے گھر کا نمبر ملایا۔ میرا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں دلاور اور خسرو جمشید مستقل طور پر کسی ایک گھر میں نہیں رہ سکتے۔ دو چار مہینے میں وہ ٹھکانا بدلتے ہوں گے تو ان کا ٹیلی فون نمبر بھی بدل جاتا ہوگا۔ یہ خیال مجھے دلاور کا نیا فون نمبر نوٹ کرکے آیا تھا جو اُس نے میرے سامنے ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" کسی بچے نے ریسیور اُٹھا کے کہا۔

"یہ چوہدری دلاور صاحب کا گھر ہے؟" مَیں نے کہا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں انکل۔" بچے نے کہا۔

"امّی تو ہوں گی۔" مَیں نے سوچ کر کہا۔

"وہ نانی کے گھر گئی ہیں، آپ کون ہیں؟"

"مَیں... تم نہیں جانتے، یہ بتاؤ کہ تمھارے گھر ایک انکل آتے ہیں جن کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں، کالی شیروانی اور سفید پگڑی باندھتے ہیں۔ کالے رنگ کی مرسڈیز میں آتے ہیں، بالکل اپنے جیسے ایک ڈرائیور کے ساتھ، اُن کا ڈرائیور بالکل اُنھی کی شکل کا ہے اور اُنھی کے جیسے کپڑے بھی پہنتا ہے۔"

"جی، وہ آتے تو ہیں... انکل جمشید... مگر وہ تو اکیلے آتے ہیں اور اپنی مرسڈیز خود چلاتے ہیں۔" بچے نے کہا۔

"اچھا، خیر یہ بتاؤ کہ اُن کے گھر کا فون نمبر کیا ہے؟"

"جی، وہ مَیں نہیں بتا سکتا۔ پاپا نے منع کیا ہے کہ..."

"ہاں بیٹا، غیروں کو کبھی کچھ نہیں بتانا چاہیے، مَیں تمھارے انکل جمشید کا باپ ہُوں۔" مَیں نے کہا۔

"اچھا، تو پھر آپ ٹھہریں، مَیں دیکھ کے بتاتا ہُوں۔" بچہ میری بات سے قائل ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد اُس نے نمبر بتا دیا۔ یہ نمبر دلاور کے دیے ہوئے نمبر سے مختلف نہیں تھا۔ مَیں نے بچے کا شکریہ ادا کیا اور ٹیلی فون انکوائری کا نمبر ملایا۔ رات کی ڈیوٹی دینے والی ایک آدم بیزار آپریٹر نے کہا۔ "ہیلو۔"

"دیکھیں مِس، مَیں ایئرپورٹ سے بول رہا ہُوں۔"

"ہاں جی، بولیں۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہم یہاں اور کس لیے بیٹھے ہیں سر۔" آپریٹر نے کہا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں ایک پتا گم کر بیٹھا ہوں، میرے پاس صرف فون نمبر ہی ہے۔"

"کس کا فون ہے؟"

"وہاں رہتے تو خسرو جمشید ہیں، نواب خسرو جمشید لیکن وہ کرائے دار ہیں۔ فون شاید لینڈ لارڈ کے نام پر ہوگا، آپ مجھے پتا بتا دیں تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"دیکھیں جی! ایسے نہیں بتلاتے ہم۔"

"کیوں، آپ کے پاس ترتیب وار نمبروں کی ڈائریکٹری ہوگی؟" میں نے کہا۔

"کون سے نمبروں کی؟"

"نیومیریکل ڈائریکٹری۔" میں نے کہا۔ "یہاں ہوتی تو میں دیکھ لیتا، اب میں کراچی سے لاہور پہنچا ہوں، اُنھوں نے لندن میں فون نمبر دیا تھا۔"

آپریٹر نے مجھے پتا بتا دیا، وہ زیادہ لمبی کہانی سُننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے وہیں سے خسرو جمشید کا نمبر ملایا۔ کسی لڑکی نے فون اُٹھایا۔

"یہ نواب خسرو جمشید کا گھر ہے؟" میں نے کہا۔

"سوری، رانگ نمبر۔" اُس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ دوسری بار پھر ایسا ہی ہوا۔ میں نیچے اُتر آیا۔

"معلوم نہیں کیا چکر ہے۔" میں نے کہا۔ "نمبر تو غلط نہیں لگتا لیکن وہاں کوئی لڑکی ہے جو یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ وہاں کوئی نواب خسرو جمشید رہتے ہیں۔"

"کہیں اُس کی سیکرٹری نہ ہو۔" محسن بولا۔

"کیا وہ ہر کال پر انکار کر دیتی ہے کہ رانگ نمبر، پھر بات کرنے والے کیسے بات کرتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بات کرنے والے پوچھتے نہیں ہوں گے... یا اُن کے درمیان کوئی کوڈ ورڈ چلتا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ کیا یہ اُلو کے پٹھے کا گھر ہے اور وہ پوچھتی ہوگی کہ آپ کون، تو جواب دیا جاتا ہوگا کہ میں اُلو ہوں... یا دوسرا اُلو کا پٹھا ہوں وغیرہ وغیرہ۔" محسن نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے عزیزم کہ نواب خسرو جمشید ایک فرضی نام ہو، اصل نام کچھ اور ہو اور تجھ سے بات کی ہو گھر کی کسی عورت نے۔"

"یس، یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ دلاور کے گھر کے ایک بچے نے بھی ایک انکشاف کیا ہے کہ خسرو جمشید جب وہاں جاتا ہے یعنی دلاور کے گھر تو گاڑی خود چلاتا ہے، اپنے ڈپلی کیٹ کو ساتھ نہیں رکھتا۔ کیا مطلب ہے آخر اس کا؟ وہ دوسرا شخص ہر جگہ نہیں جاتا، صرف خصوصی مواقع پر کیموفلاج کرتا ہے۔"

ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک رکشا... نے ہم پر بڑا احسان کیا کہ میٹر سے دس روپے زیادہ پر... کالونی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس عالیشان کوٹھیوں... ویران علاقے میں آدھی رات کے وقت ہم پر غور کرنے... کوئی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے ہمیں ایک چوکیدار ملا جو... کوٹھی کے دروازے پر کرسی ڈالے بیٹھا ہُوا تھا۔

"نواب... کدھر کا نواب ہے؟" سیدھے سادے... نے کہا۔

"ریاست چکر پور کا۔" محسن بولا۔

"تم نام کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "کالے رنگ کی مر... گاڑی، کالی شیروانی، لمبی مونچھیں کلف لگی ہوئی اور اونچا... پگڑی کا۔"

"اچھا اچھا... وہ اِدھر سے گزرتا ہے۔ تم اُدھر سے... جاؤ پھر پیچھے والا لین میں، سیدھے ہاتھ پر چوتھا کوٹھی اُس... ایک جڑواں بھائی بھی ہے۔" چوکیدار بولا۔

"بالکل ٹھیک۔" میں نے کہا۔ یہ سب سے بڑی تصدیق... ہم فوراً چل پڑے اور دس منٹ بعد کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ...

"کیا سیدھا اندر جانا مناسب ہوگا؟" میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی بالکل نئی مرسیڈیز کو دیکھ کر کہا۔ خسرو جمشید لوٹ کے گھر آچکا تھا۔

"مجھے یہاں کوئی حفاظتی انتظام نظر نہیں آتا۔" محسن بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خبط کی حد تک احتیاط پسند خسرو... نے اپنا دروازہ ہم جیسے لوگوں کے لیے کھُلا چھوڑ دیا ہو۔" میں... کہا۔ "نہ کوئی چوکیدار، نہ کال بیل۔"

"ممکن ہے کہ وہ ہر آنے والے کو اندر ہی دیکھ لیتا ہو... اُسے فوراً خبر مل جاتی ہو کہ کوئی دروازے سے گزر رہا ہے۔"

"تو ہم دروازے سے نہیں گزرتے۔" میں نے کہا۔ "دیوار پھاند جاتے ہیں۔"

"دیواریں پھاندنا شرفا کا قاعدہ نہیں عزیزم۔" محسن بولا۔

"شرفا اب بے قاعدہ ہو گئے ہیں شیروانی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ بقولِ شاعر، خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر۔ پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دیوار پر بھی نظر نہ آنے والی شعاعوں کا پہرا ہو۔"

"تیرا مطلب ہے انفرا ریڈ الارم؟"

"ہاں، ایسے برگلر الارم تو عام استعمال ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دروازے سے بھی نہیں گزرنا اور دیوار بھی نہیں پھاندنی...

...ایسی صورت میں ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم راکٹ کی طرح سیدھے خلا میں پرواز کر جائیں اور پھر اندر گریں۔" محسن بولا۔ "دوسرا راستہ زیرِ زمین سُرنگ بنا کے نکالا جا سکتا ہے مگر کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟"

"وقت نہیں تو کیا، عقل تو ہے۔" میں نے کہا۔

"اور ایجاد ضرورت کی بیٹی ہے۔" محسن بولا۔ "چلیے قبلہ، پہلے آپ..."

اُس نے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا تھا جسے میں غور سے دیکھ رہا تھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ درختوں پر چڑھنا بچپن میں میرا محبوب مشغلہ تھا مگر اس کے بعد بیس تیس سال تک درختوں کے نیچے سے گزر ہوتا رہا یا بُلندی تک پہنچنے کے لیے لفٹ استعمال کی لیکن کچھ عرصہ ٹیلی فون کے کھمبوں پر چڑھنے کی جو مشق کی تھی، وہ کام آئی۔ میں درخت پر بڑھا اور اس آخری شاخ تک گیا جو دیوار کے اُوپر سے گزر کے کوٹھی کے لان تک پہنچتی تھی۔ جب آخر میں پہنچا اور میرے وزن سے شاخ کے ٹوٹنے کا امکان پیدا ہونے لگا تو میں جُھول کر نیچے لٹک گیا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔

محسن میرے پیچھے تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ ماہرِ درخت پیما ثابت ہُوا۔ جب میں نے ممنوعہ علاقے میں لینڈ کیا تو وہ استقبالیہ انداز میں مُسکراتا ہُوا ملا۔ اُس نے مجھے خوش آمدید بھی کہا اور مجھ سے مصافحہ بھی کیا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ میں نے دائیں جانب سے اور محسن نے بائیں طرف سے کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگایا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دُشمن کے قلعے کا کون سا دروازہ اندر پہنچنے کے لیے سب سے موزوں رہے گا۔ ہم عقبی دیوار کے وسط میں ملے۔

"ایک روشن دان ہے ادھر۔" محسن نے سرگوشی میں کہا۔ "جو غالباً باتھ رُوم کا حصّہ ہے، اس میں پٹ نہیں ہے۔"

"تو جالی یا سلاخ ہوگی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، غالباً پٹ نکل گیا ہے، وہ گھومنے والا پٹ جس کو ڈوری کھینچ کے بند کرتے اور کھولتے ہیں۔" محسن بولا۔

میں نے محسن کے کندھوں پر سوار ہو کے روشن دان میں جھانکا، یہ باتھ رُوم ہی تھا جس میں لائٹ جل رہی تھی۔ عین روشن دان کے نیچے انگلش اسٹائل کا ڈبلیو سی لگا ہُوا تھا۔ میں نے بازوؤں کے زور پر خود کو اُٹھایا اور اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اندر کی جانب جُھکا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا میں سر کے بل اُتر سکتا ہوں، اگر میری جگہ سرکس میں کام کرنے والا کوئی بازی گر ہوتا جو فضا میں معلق جھُولوں سے پیروں کے سہارے لٹک جاتے ہیں تو میں بھی روشن دان کو پنجوں سے پکڑ سکتا تھا۔

لیکن میں نے سر کے بل ڈبلیو سی میں گرنے سے گریز کیا۔ میں واپس آیا اور دوبارہ یوں کیا کہ محسن نے چادر کا ایک کونا میری ایک ٹانگ میں ٹخنے سے ذرا اوپر گرہ دے کر مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ یہ وہی چادر تھی جس میں ابھی تک مشین گن لپٹی ہوئی تھی۔ روشن دان سے آدھا گزر جانے کے بعد مجھے محسن ہی باہر سے چادر کا دوسرا کونا تھام کے سنبھال سکتا تھا۔

"گانٹھ ذرا مضبوط رکھنا دوست، کہیں محاورے میں ترمیم نہ ہو جائے۔"

"ہم بہت سے محاورے بدل چکے ہیں۔" محسن بولا۔ "یہ کس کا حوالہ ہے؟"

"ایسا نہ ہو کہ پانچوں روشن دان میں اور سر ڈبلیو سی میں ہو۔" میں نے کہا۔ "یا روشن دان سے گرا فلش میں اٹکا۔"

"آؤں گا تو میں بھی ساتھ ہی۔" محسن بولا۔ "چڑھ جا بیٹا، رام بھلی کریں گے۔"

میں سانپ کی طرح اندر لٹکا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے رکھے۔ میرا سارا وزن ایک بندھی ہوئی ٹانگ پر آگیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ میرا پیر ٹخنے کے پاس سے نکل کر الگ ہو جائے

گا پھر وہی ہوگا، یعنی مَیں سر کے بل فلش میں گروں گا اور محسن باہر گرے گا مگر محسن آہستہ آہستہ ڈھیل چھوڑتا گیا اور مَیں نیچے پہنچ گیا۔ ڈبلیو سی فرش سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر تھا، اُس کے کناروں پر ہاتھ رکھتے ہی مَیں محفوظ ہوگیا۔

اندر اُترنے کے بعد مَیں نے چادر کا کونا کھول کر ایک جھٹکا دیا اور محسن نے دوسرے کونے پر مشین گن باندھ کے اوپر کی، مَیں نے اُسے اندر کھینچ لیا اور چادر کا کونا پھر باہر پہنچا دیا۔ دوسری بار محسن نے اُسے ہاتھوں سے پکڑا اور پیر دیوار پر رکھ کے اُوپر اُٹھا۔ جب وہ روشن دان کی بلندی تک پہنچ گیا تو اُس نے پہلے ایک ہاتھ سے روشندان کا کنارا تھاما اور پھر چادر کو چھوڑ دیا۔ مَیں نے چادر اندر کھینچ لی اور محسن کو سنبھال لیا جو روشن دان سے اندر لٹک آیا تھا۔

سب سے خطرناک مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا تھا۔ اس میں چند پُر تشویش لمحے ضرور آئے تھے مثلاً اس وقت جب مشین گن دیوار سے رگڑ کھاتی اُوپر آئی تھی تو معمولی سی آواز پیدا ہوئی تھی اور اس وقت جب مَیں نے ڈبلیو سی پر ہاتھوں سے اپنا وزن ڈالا تھا تو میرے پیر دیوار پر لگے تھے یا اس وقت جب محسن کا سر روشن دان کی چوکھٹ پر لگا تھا مگر ان خفیف سی آوازوں نے اندر کسی کو متوجّہ نہیں کیا تھا۔

چونکہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات ختم ہو چکی تھیں، اس لیے اندر مکمل خاموشی تھی۔ مَیں نے دروازے کے ہینڈل کو آہستہ سے گھُمایا اور دروازہ کھولا، جو منظر یک لخت میری نظروں کے سامنے آیا، اُس نے مجھے مبہوت کر دیا۔ یہ ایک بیڈ رُوم تھا۔ تقریباً اٹھارہ فٹ لمبا اور چوڑا۔ اس کے ایک حصّے میں جو دائیں جانب تھا، کوئی لڑکی بڑے انہماک کے ساتھ ایزل پر چڑھے ہوئے کینوس پر روغنی رنگوں سے ایک تصویر بنا رہی تھی۔ اگر وہ اپنے کام میں مگن نہ ہوتی تو وہ کھٹکا ضرور سُن لیتی جو باتھ رُوم کا دروازہ کھُلنے سے ہُوا تھا۔

میری طرف اُس کی پُشت تھی۔ پُشت کی جانب سے اُس کا نظارہ بہت نظر نواز تھا۔ اُس کی لمبی اور موٹی چوٹی کمر سے نیچے تک لٹکی ہوئی تھی۔ اُس کی کمر چُست قمیص میں مشکل سے دو بالشت لگتی تھی۔ وہ ساٹن کے سفید غرارے میں تھی چنانچہ قمیص مختصر تھی اور اس کے وجود کی ساری نزاکت اپنے تمام ہوشربا نشیب و فراز کے ساتھ عیاں تھی۔ دوپٹے کو اُس نے بیڈ کے کنارے پر ڈال دیا تھا کیونکہ اُسے یہاں اپنے سوا کسی کی نظر نہیں دیکھ رہی تھی۔

غرارہ ایک مشکل مگر خوبصورت لباس ہے۔ وضعداری کے حُسن کی علامت، نسوانیت کے حُسن سے منسوب، مشرق

کی تاریخ کے ایک جاوداں دوَر کی علامت۔ ایک ... ایک تہذیب کا ورثہ جس میں ادب آداب، تکلفات ... رکھاؤ کو بہت دخل تھا۔ اب لڑکیاں کبھی تنگ اور کبھی ... پائنچوں کی شلواریں پہنتی ہیں۔ بیل باٹم پاجامے پہنتی ہیں ... پتلون ہوتے ہیں یا ساریاں باندھتی ہیں۔ لباس میں غرارے ... دخل صرف تقریبات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

مصوّر کے بعد مَیں نے تصویر کو دیکھا جو میرے سامنے تھی۔ یہ کسی عورت کی تصویر تھی، ایک عمر رسیدہ عورت کی ... لباس اور زیورات سے، چہرے کے پُر متانت و بدبے ... اور آنکھوں کے پُر تحکّم، پُر غرور اور پُر اعتماد انداز سے رانی مہارانی یا ملکہ لگتی تھی۔ اُس کی صورت کے نقوش کو اُجاگر کرنے میں مصوّر نے کمالِ فن کا ثبوت دیا تھا۔ وہ لڑکی بلاشبہ ایک خداداد صلاحیت سے بھرپور فائدہ اُٹھانے پر قادر تھی مگر جس چیز نے مجھے حیران کیا، وہ تصویر کے چہرے سے آشنائی کا احساس تھا۔ میرے ذہن میں بہت سی صورتیں آئیں۔ ملکہ نور جہاں، ممتاز محل، چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، جھانسی کی رانی، زیب النسا مگر یہ تاریخ کے کسی حوالے سے ذہن میں آنے والی شخصیت نہیں تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں کسی کا نام نہیں آیا۔ بس ایک شناسائی کا تاثر قائم رہا۔ تھوڑے سے کھُلے دروازے سے مَیں اُس پیکرِ حُسن کے جمال آفریں ہاتھوں کو اپنی تخلیق سے زبانِ خاموشی میں محوِ کلام دیکھتا رہا، وہ اس تصویر سے کچھ پوچھ رہی تھی یا کچھ سُن رہی تھی۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو ربط باہمی رہتا ہے، وہ احساس اور خیال کا منفرد تجربہ ہوتا ہے جسے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میرے پیچھے محسن تھا جو تھوڑا سا ایڑیوں پر اُٹھ کے یہی دیکھ رہا تھا اور شاید یہی سوچ رہا تھا۔

ہمارے جذبات وقتی طور پر ہمارے فرض کی راہ میں حائل ہو گئے تھے۔ کبھی دلاور کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوتے یا کسی شکاری کی پناہ گاہ پر شب خون مارتے ہوئے ہم کسی احساسِ جرم و ندامت سے نہیں، اپنی فتح مندی اور قوت کے احساس سے سرشار رہے تھے مگر یہ ایک لڑکی، ایک خوبصورت نازک اندام لڑکی کی خواب گاہ تھی اور وہ لڑکی بم بارود سے قتل و خونریزی، تخریب کاری اور دہشت گردی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی، وہ فنکار تھی۔ رنگ آمیزی سے ہر نقشِ فطرت کو کینوس پر دوام عطا کرنے والی۔ اُس کی خلوت میں مشین گن کے ساتھ قدم رکھنا مجھے جرم سے کم نہ لگا۔

مَیں دبے پاؤں اُس کے پیچھے پہنچا اور عین اُس وقت جب اُس کا ہاتھ تصویر کو بُرش سے چھُونے کے لیے آگے بڑھا میرے ہاتھ نے پیچھے سے اس کو دبوچ لیا، وہ بُری طرح

کسمائی لیکن میرا ایک ہاتھ اُس کے مُنہ پر اتنی سختی سے جم گیا تھا کہ اُس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اُس کی کمر میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کے اُسے بے بس کر دیا پھر محسن ریوالور لے کر اُس کے سامنے آ گیا۔

"ہم چور ڈاکو نہیں ہیں" محسن نے نرم شائستہ لہجے میں آہستہ سے کہا "اور تمہیں نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن تمہیں ہم سے تعاون کرنا ہوگا"

"فی الحال صرف اس حد تک کہ تم خاموش رہو گی" مَیں نے کہا۔ لڑکی نے آہستہ سے سر کو اقرار میں جُنبش دی۔

"تم بہت اچھی مصوّرہ ہو" محسن نے کہا "لیکن ہم بڑے اچھے شکاری ہیں۔ کسی تم جیسی خوبصورت اور معصوم ہرنی کو مارنا ہمارا شیوہ نہیں، ہم سفّاک بھیڑیوں اور خونی درندوں کے شکاری ہیں"

"لیکن مجبوری بن جائے تو غزالِ خوش خرام کو بھی نشانہ بنانا پڑتا ہے" مَیں نے کہا "تم ایک فنکار بھی ہو۔ یقین کرو ہمیں بہت رنج ہوگا، اگر تم نے ہماری بات نہ مانی اور ہمیں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرنا پڑی ــــ" مَیں نے مزید کہا۔ اُس نے پھر رضامندی کا اظہار کیا اور مَیں نے اُس پر اپنی گرفت کو کچھ کم کیا۔ آہستہ آہستہ اُس کے مُنہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا لیکن پوری طرح چوکس رہتے ہوئے کہ وہ چیخ مارنے کا ارادہ بھی کرے تو اس کی آواز کو حلق میں ہی روک دوں۔ وہ میرے ہاتھوں میں اسی طرح لرز رہی تھی جیسے کبھی مَیں بچپن میں چڑیا کو پکڑ لیتا تھا تو اُس کا نرم گرم وجود میری مُٹھی میں کانپتا رہتا تھا۔

جب مَیں نے اُس کا رُخ اپنی طرف کیا تو یک لخت مجھ پر تصویر کی اور اُس کی صورت میں مشابہت کا انکشاف ہُوا۔ دونوں میں فرق صرف ماضی و حال کا تھا اور ماہ و سال کا تھا۔ غالباً وہ اپنی ماں کی تصویر بنا رہی تھی۔ ماں پیکرِ جلال تھی تو بیٹی پیکرِ جمال مگر اندازہ ہوتا تھا کہ جب وہ اپنے دَورِ شباب سے گزری ہوگی تو اسی حسنِ بے مثال کا نقشِ ثانی رہی ہوگی جو اَب ہمارے روبرو تھا۔

"ہم ... اپنا دوپٹہ اُٹھا لیں؟" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اور مَیں چونک پڑا۔ میرے دل میں کوئی بُرا خیال نہیں تھا اور نہ بُری نیت بُری تھی۔ حُسن تصویر کا ہو، مناظرِ فطرت کا یا عورت کا، دل پر اثر تو کرتا ہی ہے مگر وہ ایک جوان لڑکی تھی جس کی خواب گاہ میں نصف شب کو دو مسلح اور جوان مرد گھُس آئے تھے اور وہ دونوں اسے مسلسل گھُور بھی رہے تھے۔ اس کا دہشت زدہ ہونا فطری امر تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر سمیٹے کھڑی تھی۔

"آپ تشریف رکھیں" مَیں نے کہا "مَیں معافی چاہتا ہُوں اس بدتہذیبی کے مظاہرے پر"

اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور بڑی بڑی کالی آنکھوں میں خوف اُترا ہُوا تھا۔ ابھی تک اُسے یقین نہیں آیا تھا کہ اتنی مہذّب گفتگو کرنے کے باوجود ہم مہذّب ثابت بھی ہوں گے اور بالآخر اپنی مردانگی اور درندگی کا مظاہرہ نہیں کریں گے جس کے سامنے ایک تنہا اور کمزور عورت اتنی ہی بے بس اور مجبور ہوتی ہے جتنا کسی سیلاب کے سامنے ایک حقیر تنکا، وہ ڈرتے ڈرتے بیڈ کی طرف بڑھی لیکن اُس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی۔ اس کے ہاتھ نے شیفون کے دوپٹے کو کھینچ لیا تو اُسے تھوڑا سا اعتماد اور اطمینان حاصل ہُوا، وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی پھر اُس نے بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔

"ہم ... پانی پی لیں تھوڑا سا ...؟" وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولی۔

مَیں نے آگے بڑھ کے وہ شیشے کا گلاس اُٹھایا جس پر موتیوں کے کام والا سفید دھاگے سے بنا ہُوا کور پڑا تھا۔ مَیں نے وہ گلاس اُٹھا کے اُسے مؤدبانہ انداز میں پیش کیا اور مُسکرایا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کا تاثر مزید کم ہُوا اور تھوڑی سی حیرانی کے آثار نظر آنے لگے۔ اُس نے ایک نظر میری مشین گن کو دیکھا جو میرے ایک ہاتھ میں تھی اور پھر اُس گلاس کو جو مَیں اُسے پیش کر رہا تھا، اُس لڑکی نے اپنی معصومیت سے اور اپنی گفتگو کے معصوم انداز سے مجھے واقعی شرمسار کر دیا تھا۔ پانی کے دو گھونٹ لے کر اُس نے گلاس مجھے تھما دیا۔ جیسے مَیں اُس کا خادمِ خاص ہُوں۔

"شکریہ" وہ آہستہ سے بولی "آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں ہم سے؟"

"آپ سے صرف تعاون" مَیں نے گلاس رکھ کے کہا۔

"ہم سمجھے نہیں" وہ بولی۔

"دیکھیے، ہم نواب خسرو جمشید سے ملنے آئے ہیں" مَیں نے کہا "یہ انھی کا گھر ہے نا؟"

اُس نے چند سیکنڈ مجھے نظر جما کے دیکھا اور آہستہ سے نفی میں سر ہلایا "آپ ... کیا کہہ رہے ہیں، وہ تو نانا تھے ہمارے اور اُن کے انتقال کو بہت عرصہ ہُوا، وہ اپنے آبائی محل میں مدفون ہیں، ہم سچ کہہ رہے ہیں"

"یہ ... آپ کی والدہ ہیں؟" مَیں نے تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ ہماری نانی ہیں" وہ بولی "نواب بیگم خلد آشیانی"

"اچھا، یہاں ایک صاحب ہیں ... لمبے چوڑے ... چھ فٹ قد کے جو بالکل نوابی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتے ہیں" مَیں نے کہا "ہم اُن کی گاڑی کو پہچانتے ہیں، یہ جو باہر کھڑی ہے، یہ غالباً نئی لی ہے اُنھوں نے، اس سے قبل جو گاڑی اُن کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پاس تھی، وہ بھی ایسی ہی تھی۔"

"اُن کی لمبی لمبی مونچھیں ہیں۔" محسن نے غیر موجود مونچھوں کو بل دے کر کہا۔ "سر پر پگڑی باندھتے ہیں جس کا طرہ ایک ہاتھ اُوپر رہتا ہے، سیاہ شیروانی۔۔۔"

"ہم سمجھ گئے، آپ بھائی جان کی بات کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"آپ کے بھائی؟" میں نے کہا۔

"جی۔ ہمارے سب سے بڑے بھائی۔" وہ بولی۔

"کیا نام ہے اُن کا؟"

"مرشد رضا خاں، کیا آپ نہیں جانتے؟" وہ بولی۔

"جانتے تو آپ سے کیوں پوچھتے۔" محسن نے کہا۔

"عجیب بات ہے، آپ اُن کا نام نہیں جانتے لیکن نانا مرحوم کا نام جانتے ہیں، ان کا حلیہ بھی آپ نے درست بتایا گویا آپ انھیں دیکھ بھی چکے ہیں، آپ نے ان کے گھر کا بھی سُراغ لگا لیا اور۔۔۔ آخر ان سے کیا چاہتے ہیں آپ لوگ۔۔۔ ہمیں پریشانی اور وحشت ہونے لگی ہے کہیں آپ۔۔۔ نصیب دُشمناں۔۔۔؟"

"آپ بلا وجہ پریشان نہ ہوں، ہم بھی اُنھیں قتل کرنے نہیں آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "صرف ملاقات مقصود تھی۔"

"لیکن ان سے ملنے کوئی اس طرح نہیں آتا، آپ لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ بولی۔ "آپ کو ہماری قسم۔۔۔"

"خواہ مخواہ کی قسموں سے ہم پابند نہیں ہوتے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "یہ بتا دیجیے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ اپنی خواب گاہ میں ہوں گے۔" وہ پھر سہم گئی۔

"آپ ہمیں اُن کی خواب گاہ تک لے چلیں۔" میں نے کہا۔

"ہم! آپ کے ساتھ۔۔۔" اُس نے گھبرا کے کہا اور غالباً خشک حلق کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ "ہم نہیں جا سکتے، بالکل نہیں جا سکتے۔"

"آخر کیوں؟" میں نے اُس کی حیا سے لال ہوتی صورت دیکھ کر کہا۔

"ہم۔۔۔ یہ بھی نہیں بتا سکتے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔ "ہم آپ کو بھی روک سکتے تو ضرور کہتے کہ اس وقت وہاں نہ جائیے، صبح مل لیجیے گا مگر آپ لوگ ماننے والے کہاں ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے خاتون۔ ہم کو ابھی اور اسی وقت ملنا ہے، آپ اگر ڈرتی ہیں تو اسی کمرے میں ٹھہریے، ہمیں بتا دیجیے کہ اندر سان کا بیڈ رُوم کون سا ہے؟" میں نے کہا۔

"ویسے ہم خود بھی تلاش کر سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"آپ باہر جا کے دیکھیں گے تو راہداری ہے، اس پر بائیں طرف آخر میں ٹی وی لاؤنج ہے۔" وہ بولی۔ "لاؤنج کے دائیں طرف ان کی خواب گاہ ہے۔ آپ ہماری مان لیں، ابھی نہ جائیں۔"

میں نے مشین گن محسن کو دی۔ "جا کے نواب صاحب کو اُٹھا لاؤ۔"

لڑکی نے ایک مرتبہ پھر کچھ کہنا چاہا مگر محسن کو دروازے کی سمت بڑھتا دیکھ کے خاموش ہو گئی۔ اُس کی صورت سے بے بسی کے ساتھ پریشانی عیاں تھی۔

"آپ لوگ ویسے تو شریفانہ گفتگو کرتے ہیں۔۔۔ اور تعلیم یافتہ بھی لگتے ہیں۔" وہ بولی۔ "لیکن ہم کسی طرح بھی اس طرزِ عمل کو شریفانہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس طرح اسلحہ لے کر کسی کے گھر میں داخل ہونا جُرم ہی تو ہے، کیا چاہتے ہیں آخر آپ لوگ۔۔۔؟"

"آپ بڑی اچھی مصوّرہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ نانا جانی کے دُشمن تھے؟ اور اب اُن کا کوئی بدلہ بھائی جان سے لینے آئے ہیں؟" وہ بولی۔

"آپ نے کہا تھا کہ یہ آپ کے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ گویا ان سے چھوٹے بھی ہیں؟" ہم دونوں ایک دوسرے کے سوالات کو نظر انداز کرتے رہے۔

"جی، ان سے چھوٹے ارشد رضا ہیں۔۔۔ لندن میں۔۔۔ اُنھوں نے وہاں کسی انگریز لڑکی سے شادی کی ہے اور وہیں کے ہو گئے ہیں، اُن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" وہ بولی۔

"کیا آپ جانتی ہیں، میرا مطلب ہے کہ کیا آپ کے نانا واقعی نواب تھے؟"

"واقعی کا کیا مطلب؟" اُس کے لہجے میں خفگی اور دُکھ کا احساس نمایاں ہو گیا۔ "وہ صحیح نواب تھے۔ ریاست ہندوستان میں ضم ہو گئی تو یہاں چلے آئے۔"

"اور اب آپ کے یہ بھائی مرشد رضا خاں، یہ خود کو کہاں کا نواب سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا کرتے ہیں؟"

اس کا چہرہ میرے اندازِ گفتگو سے تاریک ہو گیا۔ "آپ کو ہم کیا بتائیں۔ آپ کے نزدیک تو نواب بھی ایسے ہی ہیں جیسے نانبائی یا قوال اور حکیم۔ خاندانی نجابت اور خاندانی پیشہ کیا ایک برابر ہوتے ہیں۔ نانا حکومت کرتے تھے، اپنی رعایا کے دلوں پر بھی۔ ان کے بعد حکومت نہیں رہی لیکن عزت تو ہے۔ کیا مرشد رضا خاں یہاں گھی فروخت کریں گے۔۔۔ یا مویشی پالیں گے؟"

میں اُسے حیرانی سے دیکھتا رہا، معلوم نہیں وہ کس تصوراتی دُنیا کی مخلوق تھی۔ "میرا مطلب تھا آمدنی کے ذرائع سے۔"

"یہ ہم کیا جانیں، ہمارا کام ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا سمجھا جاتا ہے، یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، ہم خود

تو اسے شان و شوکت نہیں کہہ سکتے لیکن اس طرزِ زندگی کے لیے آمدنی کا معمولی وسیلہ کافی نہیں ہو سکتا۔ کوئی ملازمت نہ وہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں، تجارت میں ہوتے تو ہم بتا دیتے۔"

"پھر آپ کے خیال میں یہ آمدنی کیسے ہوتی ہے؟ عقل کیا کہتی ہے آپ کی؟" میں نے اُس نادان لڑکی کو افسوس سے دیکھا۔

"سب کو جاگیر کے بدلے جاگیر ملی تھی جن کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے، اُنھوں نے بھی کلیم داخل کیے تھے پھر کیا نواب خسرو جمشید کے وارثوں کو حکومت نے کچھ نہ دیا ہوگا۔ وہ جاتے رہتے ہیں اپنی زمینوں کے انتظام و انصرام کے لیے۔"

"انتظام و انصرام۔۔۔ بہت خوب۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کبھی دلچسپی نہیں لی، کبھی نہیں پوچھا ان سے؟"

"ہمیں کیا ضرورت ہے، جب ہماری ہر ضرورت پوری ہوتی ہے، گھر میں خادم ہیں، آرام و آسائش کے اسباب ہیں، فرمائش کرتے ہی ہر چیز حاضر ہو جاتی ہے، ہم جو چاہتے ہیں خود ہی لے آتے ہیں۔ ہماری گاڑی الگ ہے، ہمارا شوفر الگ ہے اور ہماری دلچسپی کے اسباب الگ ہیں۔ ہم کو شوق ہے تصویریں بنانے کا، ریکارڈ جمع کرنے کا اور گانے کا۔" وہ بولی۔ "ہم باقاعدہ ریاض کرتے ہیں اور ہمیں موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے۔۔۔" اُس کی بات فائرنگ کی آواز میں ادھوری رہ گئی۔ یہ آواز اندر کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بڑی پُراذیت آواز میں چلّایا جیسے وہ نزع کے کرب کا شکار ہو پھر کوئی عورت چلّائی۔

"یا اللہ۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے چلّائی اور دروازے کی طرف دیوانہ وار دوڑی۔ "بھائی جان۔" میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بازو چھڑا کے نکل گئی۔ "آپ چھوڑ دیں ہمیں، آپ لوگ قاتل ہیں، خونی ہیں۔" وہ چیختی ہوئی راہداری میں آگے آگے بھاگنے لگی۔

"زیب النساء۔" نواب خسرو جمشید کی بارُعب آواز سنائی دی۔ "ہوش میں آئیے، ہم ٹھیک ہیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں۔" زیب النساء ایک دم اُس سے لپٹ گئی۔ "ہم سمجھے ان لوگوں نے۔۔۔"

"ہم نے کہا نا کہ ہم ٹھیک ہیں، آپ کا یہ رویّہ بالکل نامناسب ہے، نامحرموں کے سامنے۔" وہ شخص جسے ہم نواب خسرو جمشید کے نام سے جانتے تھے اور جو درحقیقت مرشد رضا خاں تھا، اس وقت بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ اُس کا لب و لہجہ تک بدل گیا تھا۔ جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ ٹی وی لاؤنج میں ہاتھ اُوپر کیے کھڑا تھا اور صرف انڈر ویئر میں تھا۔

"چلیے آپ اندر جائیے۔" جمشید نے چھوٹی بہن کو حکم دیا۔ شاید ایسا پہلے کبھی نہ ہُوا ہوگا کہ وہ صرف انڈر ویئر میں ہو اور بہن اس سے لپٹ جائے۔ زیب النساء نے اُسے چھوڑ دیا۔ پلٹی اور ڈرتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ٹی وی لاؤنج ایک وسیع برآمدہ سا تھا جس کی ایک دیوار کے برابر کھڑکی کے سارے پٹ شیشے کے تھے۔ اس شیشے کی دیوار کا نصف سے زیادہ حصّہ شنیل کے سُرخ بھاری پردوں کے پیچھے تھا، باقی نصف میں سے باہر کی رات نظر آتی تھی۔ اندھیری، سنسان، تاروں بھرے آسمان والی۔ لاؤنج کے وسط میں چھت سے فانوس معلق تھا جس کی روشنی نیچے بچھے ہوئے سُرخ اور نیلے حاشیوں والے کاشانی قالینوں پر پڑ رہی تھی۔ چند قدم پیچھے قالین پر ایک عورت بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ عورت کے جسم پر لباس برائے نام تھا اور وہ ایک گداز بدن والی جوان عورت تھی۔ اُس کے جسمانی خدوخال اور رنگ و رُوپ سب اُس کی زر خرید جوانی کا اشتہار دیتے تھے۔ عورت کے پیچھے دروازہ کھُلا ہُوا تھا اور میں نواب خسرو جمشید کے عشرت کدے کی مدھم روشنیوں میں ایک چھپر کھٹ دیکھ سکتا تھا جس کے گرد نفیس پردے تھے۔ یہ بالکل الف لیلوی انداز کی خوابگاہ کا منظر تھا اور اب میں زیب النساء کے انکار کا سبب سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں اس وقت اپنے بھائی کے بیڈ رُوم کی جانب جانے سے گریزاں تھی، وہ جانتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ماحول میں بھی وہ اپنی مصوّری کے ذوق اور اپنی نجابت پر معصوم غرور کے احساس کو زندہ رکھے ہوئے تھی اور تمام گمراہ کُن خیالوں اور پریشان کرنے والے سوالوں سے محفوظ اپنے کمرے میں اپنی تصوّراتی دُنیا آباد کیے زندہ تھی۔

نواب خسرو جمشید کے کسی جاں نثار محافظ نے محسن کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی اور مارا گیا تھا۔ اُس کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی دوسری طرف اُلٹی پڑی تھی۔ فائرنگ کی آواز پر بیدار ہو کر نکل آنے والے دو ملازم اپنے مالک و آقا کے ساتھ ہی ہاتھ اُٹھائے کھڑے ہوئے تھے اور ان کی خوفزدہ نظریں ہم دونوں سے رحم کی بھیک مانگتی محسوس ہوتی تھیں۔ نواب اس مضحکہ خیز پوز میں اُن کے سامنے کبھی نہ آیا تھا۔

"چلو تم لوگ بھی جاؤ۔" خسرو جمشید نے اپنے نمک خواروں کو حکم دیا۔

"کوئی کہیں نہیں جائے گا۔" محسن نے کہا۔ "اس وقت وہی ہوگا جو ہم کہیں گے۔ جمشید! تم کو مناسب کپڑے پہننے کے لیے پانچ منٹ ملیں گے پھر تم کو ہمارے ساتھ جانا ہے۔"

"تم دونوں اِدھر چلو، زیب النساء کے کمرے میں۔" میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے دونوں تھر تھر کانپتے ہوئے نوکروں کو ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا، وہ کہیں فون نہ کر دے کسی کو۔" محسن بولا۔

"فون نہیں ہے اس کے کمرے میں۔" میں نے کہا۔

"وہ باہر نہ نکل جائے۔" محسن بولا۔

"تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "میں ان کو کہیں دفن کرتا ہوں، اتنی دیر میں نواب صاحب تیار ہو جائیں گے۔"

جب میں دونوں نوکروں کے پیچھے چلتا ہوا دوبارہ زیب النسا کے کمرے میں پہنچا تو وہ فرش پر دو زانو بیٹھی چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے زار و قطار رو رہی تھی مگر اس کے رونے کی آواز بھی اتنی کم تھی کہ باہر نہیں سُنی جا سکتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اُس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور اشکبار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آپ جو چاہیں لے جائیں، ہم کچھ نہیں کہیں گے۔" اُس نے اپنے گلے سے نیکلس اُتارا اور پھر کانوں کے ٹاپس اُتارنے لگی جو سب ہیرے کے تھے۔ "ہم کسی کو کچھ بتائیں گے بھی نہیں، ہم قسم کھاتے ہیں مگر آپ بھائی جان کو چھوڑ دیجیے، انھیں مت ماریئے آپ کو ہمارے سر کی قسم۔"

سخت سنگین صورتِ حال کے باوجود میں اس قسم پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ "مس زیب النسا! اپنے آنسو مت گنوائیے اور قسمیں ضائع مت کیجیے، مجھے آپ سے کیا اور آپ کے سرِ عزیز سے کیا لینا، نہ ہی یہ سب کچھ لینے آیا ہوں جو آپ مجھے پیش کر رہی ہیں، گو آپ کا حُسن اس کا محتاج نہیں مگر یہ پھر پہن لیجیے، اپنے سب زیورات آپ کو مبارک ہوں۔ میں آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ میرا ارادہ آپ کے بھائی کی جان لینے کا بالکل نہیں ہے، نہ ہمیں ان کا مال چاہیے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ اُس نے بڑی نزاکت سے پلّو کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کر کے مجھے دیکھا۔ اُس کا نازک جسم اب بھی سسکیوں کی زد میں ہچکولے لے رہا تھا۔ "پھر کیا چاہیے آپ کو، کس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں آپ؟"

"ہم آپ کے بھائی جان کو ساتھ لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یا اللہ!" اُس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کے کہا۔ "کہاں؟"

"یہ ہم نہیں بتا سکتے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کیونکہ آپ بھی ساتھ ہی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"خدارا ایسا مت کیجیے، ہم مر جائیں گے، آپ کو قسم..."

"پھر وہی قسم۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "بس اب خاموشی سے وہی کیجیے جو ہم کہتے ہیں، یہ ہمارا وعدہ کہ نہ آپ کو کچھ ہو گا نہ آپ کے بھائی جان کو مگر اُن کو ذرا سمجھا دیجیے گا کہ ہم گولی مارنے میں دیر نہیں لگاتے، وہ بہادر نہ بنیں، ورنہ آپ دُنیا میں اکیلی رہ جائیں گی۔"

جتنی دیر میں خسرو جمشید پاجامہ کُرتہ اور شیروانی والے لباس میں تیار ہو کے پہنچا میں نے اس کے دونوں نمک خواروں کو باندھ کے باتھ رُوم میں بند کر دیا تھا، وہ بے حد فرماں بردار ثابت ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک نے دوسرے کو باندھا تھا، وہی چادر پھاڑ کے جو ہم ساتھ لائے تھے پھر دوسرے نے رضاکارانہ طور پر خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ انھوں نے مُنہ بھی خود ہی کھول دیے تھے کہ میں کپڑا ٹھونس دوں اور پھر خاموشی سے باتھ رُوم میں چلے گئے تھے۔ زیب النسا نے یہ سب پتھرائی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

"گھر میں کوئی اور تو نہیں ہے، جو بعد میں ہنگامہ کرے؟" میں نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے سارے کمروں میں جھانک لیا تھا۔"

"ہماری آپا اماں ہیں۔" زیب النسا نے سوچ کے کہا۔

خسرو جمشید نے اُسے گھُور کے دیکھا۔ "وہ ایک مجبور لاچار عورت ہے جو دُنیا میں زیب النسا کے سوا نہ کسی کو جانتی ہے اور نہ پہچانتی ہے۔"

"وہ اگر زیب النسا کو خطرہ لاحق دیکھے گی تو ضرور خطرے کا الارم بجائے گی۔" میں نے کہا۔

"اور زیب النسا کو غائب پائے گی تب بھی شور مچائے گی۔" محسن بولا۔ "کیوں نہ اُسے بھی...؟"

"نہیں، ایسا مت کیجیے۔ ہم اُنھیں بتا دیتے ہیں، ہم خود سمجھا دیتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں۔" وہ منت کرتے ہوئے بولی۔ "کیا کہیں کہ اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مگر وہ ہیں کہاں؟" میں نے کہا۔

"بس اب تہجد اور وظیفے میں معروف ہوں گی۔" زیب النسا نے کہا۔ "ہم وہیں جا کے اُن سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھائی جان کے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"کیا وہ دیکھنے کے لیے نہیں آئیں گی کہ یہ غلط تو نہیں؟"

"کیوں؟ جب ہم بتائیں گے تو وہ مانیں گی کیوں نہیں، وہ جانتی ہیں کہ ہم نے کبھی جھُوٹ نہیں بولا۔" زیب النسا نے کہا۔ "ہم انھیں بتا کے ابھی آتے ہیں۔"

محسن اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے روک دیا۔ اس لڑکی نے مجھے اپنی سادگی اور معصومیت سے قائل کر لیا تھا کہ وہ جھُوٹ بولنے کی اہل ہی نہیں اور یہ ایک ناقابلِ یقین تضاد تھا جو اس کوٹھی کے اندر حیرت کی انتہا پیدا کرتا تھا۔

اگر اس گھر کے اندر زمین میں سے کوئی شخص درخت کی طرح نکل آتا جس کے ہاتھ میں ایٹم بم ہوتا تب بھی میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ دھُوپ میں جھُلستی ریت کے صحرا میں میلوں تک پھیلی ویرانی میں چلنے والے کو کسی پیاس سے مر جانے والے مسافر کا ڈھانچا نظر آ جائے تو وہ اتنا حیران نہیں ہو گا جتنا ایک تازہ کھلے ہوئے گلاب کے پھُول کو دیکھ کر ہو گا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ زیب النسا تمھاری بہن ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم نے بھی اسی ماں کا دودھ پیا ہے جس کا زیب النسا نے۔" "مجھے اُمید تو نہیں کہ تم میری بات مانو گے لیکن ہو سکے تو اسے ساتھ نہ لے جاؤ۔ اس نے وہ دنیا نہیں دیکھی جس میں ہم شکاری ہیں، تم اور میں۔"

"اسے وہ دنیا دیکھ لینی چاہیے مرشد رضا خاں۔" میں نے کہا۔ "آج تک وہ تمھاری دُہری شخصیت سے بے خبر رہی۔ حالانکہ تم اور وہ ایک ہی چھت کے نیچے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہتر ہے کہ اب ہم یہ نقاب اُٹھا دیں۔ حقائق کتنے ہی بے رحم کیوں نہ ہوں ان کے وجود سے بے خبری کا مطلب یہ نہیں ہوتا..."

"سکندر بخت، وہ ہماری جنگ میں شریک نہیں..."

میں تلخی سے ہنسا۔ "نواب صاحب! بہت سے لوگ تھے جو اس جنگ میں فریق نہیں تھے۔ وزیر خان کے نام سے شروع کروں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ رابعہ کی ماں کب اس جنگ میں شریک تھی؟ آج تمھاری بہن کی باری آئی ہے تو تم ابھی سے پریشان ہو۔"

"وہ... وہ مر جائے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ اپنے چوہدری دلاور صاحب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ جب بم گرتا ہے تو کسی بے گناہ کو اور معصوم کو نہیں بخشتا۔ بچوں بوڑھوں اور عورتوں یا معذوروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔ کیا تم نے جولی کی ماں سیتھرین یا رابعہ کے ساتھ کوئی رعایت کی تھی؟" محسن نے اس کے مُنہ پر مکّا مارا۔ "تم نے ہمارے ساتھ ہمارے رشتوں کو بھی رسوا کیا۔ جسم کے ساتھ ہماری روح کو بھی زخم دیے۔ ہم سے جذباتی تعلق رکھنے والوں کو بھی کچل دیا اور پھر ہماری اذیت کا تماشا دیکھا بھی اور دکھایا بھی۔ کس نے کی تھی اس غیر انسانی کھیل کی ابتدا؟ تم نے دیکھا نواب زادے! آج تمھاری شہ رگ کس طرح دبی ہے۔ اب کوئی منت سماجت، کوئی التجا اور واسطہ کام نہیں آئے گا۔ قسم خدا کی اگر میری ماں قبر سے اُٹھ کر آئے اور تمھاری سفارش کرے تب بھی میں تم کو نہ بخشوں۔"

میں نے محسن کے کندھے پر تھپکی دی۔ "جذبات کو قابو میں رکھ۔ ان کے اور ہمارے درمیان ایک فرق تھا اور رہے گا۔ ہم چاہیں بھی تو ایک سطح پر نہیں آ سکتے۔ نہ یہ ہماری سطح تک پہنچ سکتے ہیں اور

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ہَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصوں میں مکمل

قیمت فی حصہ ۵۰/- روپے ● ڈاک خرچ فی حصہ ۱۶/- روپے

نہ ہم اتنے گر سکتے ہیں۔"

زیب النساء کے آجانے سے میری بات پوری نہ ہو سکی۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی لیکن اسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کا ہنر بھی آتا تھا۔

"گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟" میں نے خسرو جمشید سے کہا۔

خسرو جمشید نے خاموشی سے چابیاں ہمارے حوالے کر دیں۔

"باہر کے دروازے پر کوئی حفاظتی الارم وغیرہ ہے تو بند کر دو۔ ہم خاموشی سے نکل جانا چاہتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"جب تم لوگ اندر آئے تھے تو کیا...؟"

"ہم دروازے سے گزر کے نہیں آئے تھے۔" میں نے خسرو جمشید کی بات کاٹ دی۔ "ہم نے دیوار بھی نہیں پھاندی تھی۔"

"ہم آسمان سے ٹپکے تھے۔" محسن نے کہا۔

"اللہ! اب تو بتا دیجیے ہم کہاں جا رہے ہیں؟" زیب النساء نے کہا۔

"ہم آپ کے بھائی جان کے ایک دوست کے گھر جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شاید آپ نے کبھی ان کا نام سنا ہوگا۔ پولیس کے ایک بہت بڑے افسر ہیں ۔۔۔ ایس پی سراج۔"

ان الفاظ کا شدید ردِ عمل ہوا۔ زیب النساء بری طرح چونکی اور اس کا رنگ جو خوف سے زرد تھا یکلخت لال پڑ گیا۔ "وہاں۔ ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ بالکل نہیں جا سکتے۔ بھائی جان...!"

"آپ کے بھائی جان بھی ساتھ ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم آپ کو اپنی مرضی سے لے جا رہے ہیں۔ آپ کے بھائی جان کی اجازت سے نہیں۔"

"اللہ۔ اب ہم کیسے بتائیں۔" اس کا رنگ گلابی پڑ گیا۔ "آپ ہی بتایئے ان کو بھائی جان۔ ہم مر جائیں گے مگر وہاں نہیں جائیں گے۔"

"زیب النساء! ان سے ضد مت کیجیے۔ یہ ماننے والے لوگ نہیں ہیں اور یہ مجبوری ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہمیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا۔ "کیا آپ چاہتی ہیں کہ ہم آپ کو باندھ کر لے جائیں۔ آخر کیا ہے وہاں، کوئی کھا تو نہیں جائے گا آپ کو۔ ہم وہیں رک کر انتظار کریں گے۔ آپ کے بھائی جان ذرا سی دیر کے لیے جائیں گے اور واپس آجائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہم آپ کو واپس لے آئیں گے۔"

"دیکھیے۔ یہ بہت مشکل ہے۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔ "ہمارا وہاں جانا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔"

"یہ نامناسب والی کیا بات ہے... قبلہ نواب صاحب؟" میں نے زیب النساء کے ردِ عمل پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"وہ... دراصل میں نے اس کی نسبت سراج سے طے کر دی تھی اور ظاہر ہے کہ رخصتی سے قبل اس کا اپنے سسرال جانا نامناسب ہی سمجھا جائے گا۔" خسرو جمشید بولا۔

"ہمیں یہ اطلاع تو مل گئی تھی کہ سراج کے ساتھ پہلی نسبت کر کے کیوں ختم ہوئی۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ علم نہ تھا کہ اس سازش میں تم بھی برابر کے شریک تھے۔ خیر، تم اپنی بہن کو بھی اپنے کاروباری رشتوں کی مصلحت کی بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر چکے ہو تو ہم کون ہوتے ہیں منع کرنے والے۔"

"بھائی جان! یہ کس قسم کی باتیں سن رہے ہیں ہم؟" زیب النساء نے مجروح لہجے میں کہا۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔ آپ برداشت کیجیے۔" خسرو جمشید نے بہن کو تسلی دینے کے لیے کہا۔ "یہ ہمارے دوست نہیں ہیں۔"

"چلو باہر نکلو۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔" میں نے کہا۔ "جھوٹ سچ خود ہی زیب النساء کے سامنے آجائے گا۔ آپ بھی چلیے زیب النساء، ہم مجبور ہیں کہ آپ کو ساتھ رکھیں۔ شاید اس طرح آپ کو بہت کچھ معلوم ہو جائے جو آج تک آپ کی نظر نے نہیں دیکھا اور عقل نے نہیں جانا۔"

"معلوم نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھ پائے۔" وہ بولی اور بوجھل قدموں سے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ محسن نہ جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ ہمارے پورچ میں آتے ہی پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوب گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مین سوئچ آف کرنے گیا ہوگا۔ وہ چند منٹ میں نمودار ہوا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے ٹیلی فون کے دونوں تار بھی کاٹ دیے تھے۔ گیٹ پر کوئی الارم تھا تو اب بے کار ہو چکا تھا۔

خسرو جمشید کا غصے اور بے بسی سے برا حال تھا۔ "یہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو...!"

"ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم بیٹھو آگے گاڑی میں چلاؤں گا۔ تم صرف راستہ بتاؤ گے۔ سراج کی نئی کوٹھی میں نے نہیں دیکھی۔"

"اور آپ کے پیچھے میں رہوں گا۔ آپ کی ہمشیرہ کے ساتھ اور مشین گن کے ساتھ۔" محسن بولا۔

"تم نکل نہیں سکتے۔" جمشید نے کہا۔ "دلاور کے اغوا کی خبر پھیل چکی ہے۔ ہم سب کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔"

"ابھی تک تو مجھے یہ انتظامات نظر نہیں آئے۔" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن نواب صاحب! جب آپ ہمارے ساتھ ہیں تو کوئی ہمارا راستہ کیوں روکے گا۔ آپ کی حفاظت کرنے والے آپ کی جان کے دشمن تو نہیں ہو سکتے نا۔" میں نے کار کو اسٹارٹ کیا اور گیٹ سے باہر نکالنے ہی والا تھا کہ ایک پولیس جیپ نے میرا راستہ کاٹ دیا۔ اس میں سے ایک تھانیدار قسم کا افسر اترا۔

"ان سے کہیے کہ راستہ چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

جمشید نے تعمیل کی۔ اس نے سر نکال کر تھانیدار کو بلایا۔ "جیپ کو سامنے سے ہٹالو۔"

"ہمیں علم تھا سر جی کہ آتے جاتے آپ کا خیال رکھیں۔" وہ بولا۔

"ہاں ہاں۔" جمشید نے کہا۔ "تم لوگ یہاں ٹھہرو اور خیال رکھو گھر میں کوئی داخل نہ ہونے پائے۔"

"مطلب یہ سر جی کہ آپ کے ساتھ نہ چلیں؟"

"نہیں۔" جمشید نے مجبوراً کہا۔ "میں اپنی فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

جیپ سامنے سے ہٹ گئی۔ جمشید کی گردن پر سے وہ دباؤ بھی ہٹ گیا جو محسن نے ریوالور سے ڈال رکھا تھا۔ اعصاب شکن خاموشی کا ایک وقفہ ٹل گیا جس میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ ہم رکنے والے نہیں تھے۔ جمشید عقل سے کام نہ لیتا تو ہمیں پولیس کو راہ سے ہٹانے کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑتی۔ زیب النساء چپکے چپکے پچھلی سیٹ پر روتی رہی۔ محسن نے اسے تسلی دے کر چپ کرانے کی واجبی سی کوشش کی پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

"حالات بتاتے ہیں کہ سراج کے گھر پر ہمارا استقبال کرنے والے زیادہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "امید ہے وہاں بھی تم اسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرو گے۔ بصورتِ دیگر یہ سمجھ لو کہ ان سب کا خون تمہاری گردن پر ہوگا جو ہمارا راستہ روکنے آئیں گے۔ ہم بہر حال اندر پہنچ جائیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں قتلِ عام کرنا پڑے۔"

"تم اپنی بہن کے سسرال میں کسی خونریز معرکے سے گریز کرنا چاہتے ہو تو خاموشی سے وہی کرتے جاؤ جو ہم کہیں۔" محسن بولا۔ "اور یہی اپنے اس ہونے والے بہنوئی سے بھی کہنا۔ اس کی ماں کا بھی خیال رکھنا جو بیمار رہتی ہے۔ تمہارے یا سراج کے غلط رویے کے باعث ہم جوابی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس کے نتائج غلط نکلے تو قصوروار ہم کو مت سمجھنا۔"

خسرو جمشید نے یا مرشد رضا خاں نے، سہولت کی خاطر ہم اسے پرانے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے، ہماری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے امید تو ہوگی کہ دلاور کے بعد ہم اس کی طرف بھی آنے کی سوچ سکتے ہیں لیکن ایک تو کبھی ہمارا اس سے براہِ راست تصادم نہیں ہوا تھا۔ اس نے ہمارے خلاف کسی کارروائی میں براہِ راست اور ذاتی طور پر حصہ نہیں لیا تھا اور دلاور کے ایک پارٹنر کی حیثیت سے بھی وہ سب سے کم فعال تھا۔ دوسرے اس نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات بھی بہتر کر لیے تھے۔

اس کی نئی مرسیڈیز جیسی شاندار گاڑی میں نے کبھی نہیں چلائی تھی۔ وہ ایک زبردست قوت رکھنے والی مگر خاموش اور سبک خرام گاڑی تھی جس میں سو میل فی گھنٹا کی رفتار کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس میں سہولتوں اور آسائشوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مثلاً اس کی کھڑکیاں اور دروازے بٹن دبانے سے کھلتے اور لاک ہوتے تھے۔ خود کار ٹرانسمیشن اور پاور اسٹیئرنگ کے ساتھ شاید وہ کار ملک کی گنی چنی کاروں میں ہوگی۔

ایس پی سراج کے گھر تک کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ راستہ رات کو خالی ملنے والی سڑکوں پر دس منٹ میں طے ہو گیا۔

آخری موڑ کاٹنے سے پہلے میں نے گاڑی روک کے بند کی اور چابی لے کر اتر گیا۔

"اب آپ ڈرائیونگ کریں گے نواب صاحب۔" میں نے کہا اور گھوم کے دوسرے دروازے پر پہنچا۔ جب خسرو جمشید میری جگہ بیٹھ گیا اور میں اس کی جگہ تو میں نے چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

"یہاں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہوں گے۔" محسن نے کہا۔

"تمہارے لیے تو سراج نے چار اونگھتے ہوئے سپاہی اور ایک توند یل تھانیدار بھیج کے محض ضابطے [illegible] کی تھی۔" میں نے کہا۔ "مگر خود اپنے لیے اس نے گھر کے چاروں طرف مسلح حصار قائم کر رکھا ہوگا کیونکہ ایک تو وہ خود [illegible] ایس پی ہے۔ دوسرے وہی سب سے بڑا مجرم ہے چنانچہ وہ سب سے زیادہ خائف بھی ہوگا۔ دلاور ایک عام آدمی ہے اور اس کا جرم غداری ہے۔ سراج ایک سرکاری افسر ہے جس کا کام قانون کی حفاظت کرنا بھی ہے چنانچہ وہ دُہرا مجرم ہے۔"

"اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دلاور جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر سراج جیسے چور افسر ان کی پشت پناہی نہ کریں۔ آج اسے ڈر ہوگا تو اس نے قانون کے محافظ جمع کر لیے ہوں گے۔" محسن نے کہا۔ "تم خود ہی ان محافظوں سے بات کرو گے اور بات نہ بنے تو سراج کو تمام صورتِ حال سمجھا دو گے کہ تعاون میں خیریت ہے اور عدمِ تعاون کا نتیجہ تم سب کی توقع سے زیادہ برا نکل سکتا ہے۔"

گاڑی آگے بڑھی تو مجھے پولیس کی پہلی گاڑی ملی جو ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس میں مسلح پولیس مین دقیانوسی [illegible] رائفلیں لیے بیٹھے تھے اور آگے کوئی سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا جو وائرلیس کے ماؤتھ پیس میں کچھ بول رہا تھا۔ جیپ کے اوپر لہرانے والا اینٹینا ظاہر کرتا تھا کہ اس گاڑی کا وائرلیس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر یا تھانے سے رابطہ قائم ہے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا مگر ایک اتنی عظیم الشان مرسیڈیز کو روکنے کی ہمت ان میں نہ تھی جس کا مالک کوئی وزیر، اسمگلر یا صنعتکار بھی ہو سکتا تھا اور ڈپٹی کمشنر یا آئی جی قسم کا افسر بھی۔

دوسری گاڑی عین کوٹھی کے دروازے پر موجود تھی جس کے سامنے جمشید نے کار کو روکا۔ گیٹ بند تھا اور گیٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ ایک وردی والا دروازے پر نسبتاً جدید قسم کا اسلحہ لیے کھڑا تھا۔ دوسرے کو میں اندر جانے والے راستے پر پورچ کے قریب دیکھ سکتا تھا۔ باقی دو کوٹھی کے باہر دیوار کے آخری کناروں پر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہنگامی ضرورت کے تحت سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں جو اندر کے اور باہر کے علاقے کو روشن کر رہی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس روشنی میں کسی کا کوٹھی میں نظر آئے بغیر داخل ہونا ناممکن تھا۔

"سراج ہے؟" خسرو جمشید نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کے سنتری سے سوال کیا۔

"ایس پی صاحب۔ لیکن آپ نیچے اتریں۔" سنتری نے کہا۔

"میں نیچے اتروں؟"

"آپ بھی اور باقی سب لوگ بھی۔" سنتری نے کہا۔

"لیکن کس لیے؟" خسرو جمشید نے رعونت سے کہا۔

"تلاشی کے لیے۔" سنتری نے کہا۔ "گاڑی کی تلاشی بھی لی جائے گی۔ آرڈر ہے۔"

"تم جا کے سراج سے کہو...."

"میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میری یہاں ڈیوٹی ہے۔" سنتری نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"بکواس بند کرو۔ میں سراج کا دوست ہوں۔" جمشید کا پارہ چڑھ گیا۔

"صاحب کا آرڈر ہے کہ میرا باپ بھی آئے تو اسے اندر مت آنے دو۔ آپ نیچے آجائیں۔"

"اگر سراج آ کے کہے گا تو میں اتروں گا۔ ورنہ میں بیٹھا ہوں گاڑی میں اور ساری رات اسی جگہ دروازہ روکے بیٹھا رہوں گا۔ تم سے جو ہوتا ہے کر لو۔" خسرو جمشید نے کہا اور بٹن دبا کے سب شیشے اور دروازے لاک کر دیے۔

یہ صورت حال سنتری کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس نے کچھ احتجاجی شور کیا۔ شیشے بجائے اور دروازے کھولنے کی بے سود کوشش کی۔ پھر آواز دے کر کسی کو بلایا۔ دور کھڑی ہوئی گاڑی میں سے ڈی ایس پی کے عہدے کا ایک افسر سخت خونخوار موڈ میں برآمد ہوا۔ سنتری نے اسے صورت حال بتائی لیکن بند شیشوں کے پیچھے ہم صرف اس کے ہاتھوں اور ہونٹوں کی حرکت ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ڈی ایس پی نے سر ہلایا، چیلنج قبول کر لینے کے انداز میں۔ اور آگے آیا۔ اس نے جیب میں سے ریوالور نکالا اور شیشے کو آہستہ سے بجایا۔ وہ اپنے عہدے، غصے اور ارادے سے ہمیں ڈرا کے کام چلانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ کسی شاہانہ مرسیڈیز کا شیشہ توڑ دے اور اپنی مہینے بھر کی تنخواہ یہ نقصان پورا کرنے میں گنوائے۔

جمشید نے شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا۔ "میں تمہارے ماتحت کو بتا چکا ہوں کہ سراج کے آنے تک گاڑی اسی جگہ موجود رہے گی اور میں باہر نہیں آؤں گا۔"

"آپ اپنے خلاف شکوک بڑھا رہے ہیں۔" ڈی ایس پی بولا۔

"ایسی کی تیسی شکوک کی۔ تم دیکھ نہیں سکتے کہ میرے ساتھ [illegible] ہے۔ میں بتا بھی چکا ہوں کہ سراج میرا دوست اور بزنس پارٹنر ہے۔ اگر میرا نام سن کے بھی اس نے گیٹ تک آنے سے انکار کیا تو میں اتر آؤں گا۔ ورنہ وہ خود ہمیں اندر لے جائے گا۔" خسرو جمشید نے [illegible]

"کیا نام بتایا آپ نے؟"

"میں نے ابھی تک کسی کو نام نہیں بتایا۔ اس لیے کہ کسی نے پوچھا ہی نہیں۔"

"اچھا اب میں پوچھ رہا ہوں۔"

"نواب خسرو جمشید اور سراج سے کہنا کہ ان کی ہمشیرہ بھی ہمراہ آئی ہیں۔" جمشید بولا۔ "اور یہ ریوالور سوچ سمجھ کے نکالا کرو ڈی ایس پی صاحب۔ میرے محافظوں کے پاس اس سے بہتر اسلحہ ہے۔"

غالباً محسن نے اسے مشین گن اٹھا کے دکھائی کیونکہ ڈی ایس پی کی صورت پر بارہ بج گئے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر گیٹ کی طرف گیا۔ وہاں دیوار پر ایک فون اس طرح نصب تھا کہ آویزاں لگتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کے چند منٹ تک بات کی۔ پھر ریسیور رکھ کے ہمارے پاس آیا۔

"اب آپ بتائیں میں کیا کروں۔" ڈی ایس پی بولا۔ "وہ ماننے کو تیار نہیں کہ نواب خسرو جمشید اپنی بہن کے ساتھ آ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ کوئی شخص مشین گن لے کر آ سکتا ہے۔"

"اگر وہ نہیں مانتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"نواب صاحب! وہ مجھے گالیاں دیتے ہیں کہ تم بے وقوف اور گدھے ہو کہ کوئی کچھ بھی کہے، مان لیتے ہو۔ وہ خسرو جمشید نہیں، کوئی خطرناک آدمی ہے۔ اگر تم نے اسے نہ روکا تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔" ڈی ایس پی کا لہجہ انتہائی بے بسی کا تھا۔ "دیکھیے ضد نہ کیجیے۔ اچھا ایسا کیجیے، یہ گاڑی گیٹ سے اندر لے جائیے۔ اس طرح کہ آدھی اندر ہو اور آدھی باہر اور رفتار کم سے کم ہو۔"

"اس کا فائدہ؟"

"میں پھر بات کرتا ہوں۔" ڈی ایس پی بولا۔ "کہ وہ خود آپ کو دیکھ لیں۔ کلوز سرکٹ کیمرے سے۔"

"یہ ہو سکتا ہے۔" خسرو جمشید نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ "لیکن یہ سمجھ لیں کہ گاڑی کے سامنے خود میں رہوں گا۔"

ڈی ایس پی نے کہا۔ "گیٹ کھلنے کے بعد آپ کو رکنا ہو گا ورنہ گاڑی میرے اوپر سے گزار کے لے جانی ہو گی۔"

"میں گاڑی گندی کرنا نہیں چاہتا۔" جمشید نے کہا۔ "گیٹ کھولو۔"

ڈی ایس پی کا چہرہ بگڑ گیا مگر اس کے سامنے ایک نواب تھا جو شاید جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا کہ وہ ایس پی کا دوست [illegible]

وہ اتنا خود سر تھا کہ ایک ڈی ایس پی کو کچل کے گزر جانے سے دریغ نہ کرتا، اگر اسے اپنی قیمتی گاڑی پر خون کے چھینٹوں کے داغ پڑنے کا ڈر نہ ہوتا۔ ایک ڈی ایس پی کا خون کتنا قیمتی اور کتنا اہم ہوتا ہے، یہ بات وہ ایک عام آدمی کو بہت اچھی طرح سمجھا دیتا جو اس کے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع کرتا۔ اب وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور گیٹ سے گزر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

گاڑی تھوڑا سا کھسکی اور گیٹ کے درمیان میں جا کے رک گئی۔ ڈی ایس پی نے پھر فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا۔ اس کے ہینڈ سیٹ کا تار لمبا ضرور تھا مگر اتنا لمبا بھی نہیں تھا کہ دروازے میں دو گز اندر تک گھس جانے والی مرسیڈیز کے سامنے کھڑا رہ کے وہ سراج سے بات کر سکتا چنانچہ وہ بونٹ پر کہنیاں ٹکا کے بہت آگے جھک آیا تھا۔

"سر آپ خود دیکھ لیں۔"

"کیوں۔ خدا نے تمہیں آنکھیں نہیں دی ہیں کیا؟" سراج کی آواز گیٹ پر لگے ہوئے انٹر کام ٹائپ اسپیکر سے سنائی دی۔

"وہ میری نہیں مانتے سر! ان سے کہیں کہ وہ مانیٹر کیمرے کے سامنے آجائیں۔" ڈی ایس پی بولا۔

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی۔ "جمشید؟"

"ہاں۔" جمشید نے اس ریسیور کے ماؤتھ پیس میں کہا جو ڈی ایس پی نے سامنے کر دیا تھا۔ "کیا اب مجھے بھی تلاشی دینی ہو گی؟"

"دیکھو۔ برا ماننے کی بات نہیں۔ میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے ساتھ زیب النساء بھی ہے۔"

"بھئی ہے نا۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔" خسرو جمشید نے جھنجلا کے کہا۔

"اچھا میری بات کراؤ اس سے۔"

"وہ کرے گی تم سے بات؟" جمشید نے کہا۔

"یار جب آ سکتی ہے تو بات کیوں نہیں کر سکتی۔" سراج نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے نا۔ جب میں ساتھ ہوں تو تم کو ڈر کس بات کا ہے۔ تم میری آواز نہیں پہچانتے ایس پی صاحب۔"

"آواز... تو ٹھیک ہے لیکن یار... زیب النساء کی جگہ کوئی اور نہ ہو۔" سراج بولا۔ "میں ان دونوں بدمعاشوں کے چکر سے ڈرتا ہوں۔ وہ بھیس بدلنے کے ماہر ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میرے بھیس میں سکندر نہ ہو اور زیب النساء کے بھیس میں محسن۔" جمشید نے برہمی سے کہا۔

"محسن تو نہیں لیکن ایک شخص اور بھی ہے تمہارے ساتھ جس کے پاس مشین گن ہے۔ یہ کون ہے؟"

"میرا باڈی گارڈ۔"

"تمہارے پاس کوئی ایسا باڈی گارڈ پہلے تو نہیں تھا۔"

"پہلے تو تمہارے گیٹ پر بھی یہ ڈراما نہیں ہوتا تھا۔ تم نے تو سرکاری خرچ پر اپنی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ میں اپنے خرچ پر بھی نہیں کر سکتا؟" جمشید نے کہا۔

"کر سکتے ہو لیکن اسے لے کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"باڈی گارڈ ہر جگہ ساتھ رہتا ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تم ہمارے ساتھ تھے، اس وقت تک تم نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ گھر جاتے جاتے تم کو نیا باڈی گارڈ بھی مل گیا؟"

"سراج! میں ساری رات بک بک نہیں کر سکتا۔ تم کو گیٹ تک آنا ہی پڑے گا، آ کے دیکھ لو ایس پی صاحب...."

"میں رسک نہیں لوں گا لیکن دیکھنے کی بات ہے تو پلیز، ایسا کرو کہ گاڑی سے نکل کر گیٹ پوسٹ پر کھڑے ہو جاؤ، درمیان میں کسی بھی جگہ اور ہاں، زیب النساء کو بھی اترنے کی زحمت دو، یہ بد تہذیبی نہیں، ایک ضرورت ہے، میں بعد میں تم سے معافی مانگ سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

میرے اشارے پر جمشید نے دروازہ کھولا اور باہر اتر گیا۔ کہیں سے کسی کلوز سرکٹ ٹی وی نے گیٹ کو فوکس کر رکھا تھا تو سراج نے اندر اپنے ٹی وی پر اسے ضرور دیکھا ہو گا۔ پھر جمشید نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور زیب النساء کو تقریباً باہر گھسیٹ لیا کیونکہ وہ باہر نکلنے پر آمادہ نہ تھی۔

"بس بس... سوری یار جمشید، میں آ رہا ہوں۔" سراج کی آواز آئی۔ "یو بھی گاڑی کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔" یہ آخری جملہ اس نے اپنے ڈی ایس پی سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔

"یس سر۔" ڈی ایس پی نے کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔ اتنی دیر میں زیب النساء پھر بیٹھ چکی تھی۔

"آئی ایم ویری سوری سر۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"آپ کے دوست اب ایس پی نہیں سر! ایس ایس پی ہیں، آپ کو بھی مبارک ہو۔" ڈی ایس پی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ایس ایس پی؟" خسرو جمشید نے کہا۔

"یس سر! ان کو ضامن رضوی کی جگہ مقرر کیا گیا ہے۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی صاحب نے فون پر احکامات دیے ہیں۔"

ان الفاظ کا صدمہ کتنا شدید تھا، اس کا اندازہ میں نے محسن کی صورت اور محسن نے میری شکل دیکھ کر کیا۔ پھر خسرو جمشید نے ایک تمسخر اڑانے والی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ کہو، اب کیا خیال ہے۔ میاں بھتے کوتوال... اور تمہارے انکل تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دُکان اپنی بڑھا گئے۔ گاڑی آگے بڑھی تو میرے ذہن پر ایک ہی سوال کی بازگشت کے ہتھوڑے برس رہے تھے، کیا انھیں معطل کر دیا گیا ہوگا؟ ہماری وجہ سے۔ ہماری پریس کانفرنس، ہم سے تعلق، شہلا کو پناہ دینا، جولی اور کیتھرین کا فرار، دو مفرور ڈاکوؤں کے معاملے میں ان کی مجموعی کارکردگی، سراج اور اُس کی پُشت پناہی کرنے والے رشوت خور، لالچی ہاتھوں کی رسّہ کشی، انکل رضوی کی ناپسندیدہ فرض شناسی اور ایمانداری۔ ان سب عوامل نے بالآخر ان کو رسوا کیا، بے اختیار کیا اور شرمسار کیا۔

سراج نے پورچ میں آکے ہمارا استقبال کیا، اس کے لیے یقیناً زیب النساء کا آتنی رات گئے وہاں آنا ایک ناقابلِ یقین بات تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی ماں بھی باہر آگئی تھی۔ جیسے ہی خسرو جمشید ایک دروازے سے نکلا، دوسرے دروازے سے مَیں باہر آگیا پھر محسن اُترآیا اور سراج کا رنگ اُڑ گیا، اُس کا ہاتھ غیرارادی طور پر جیب کی طرف جاتے جاتے رُک گیا۔

"تو... یہ تم ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہاں، یہ ہم ہیں، تمھارے سامنے۔" مَیں نے کہا۔ "تمھارے گھر میں۔"

"مجھے ایک لمحے کے لیے خیال آیا تھا۔" سراج بولا۔

"تمھارے خیال کی... اور ایسے خیال کی کیا اہمیت ہے جس سے وقت گزر جانے کے بعد صرف پشیمانی ملے۔" مَیں نے کہا۔

"یہ کیا ہے سب؟" سراج کی ماں نے چلّا کے کہا۔ "زیبا! اندر چل بیٹی، ان کو نمٹنے دے اپنے کام سے۔"

"جائیے آپ۔" جمشید نے اپنی بہن سے کہا۔

آنسو زیب النساء کی آنکھوں سے نہ تھمتے تھے اور اس کے لیے قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سراج کی ماں آگے بڑھی۔

"آپ اِدھر سے آئیں ماں جی۔" محسن نے کہا۔ "پیچھے رہیے۔"

سراج ابھی تک بے حس و حرکت کھڑا ہُوا اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور غصّے سے اُس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا تھا۔ محسن نے اُسے زد پر لیا ہُوا تھا اور اگر وہ اس لمحے سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا، جب ماں اور زیب النساء درمیان میں حائل ہوں گی تو ایسا نہیں ہُوا تھا۔ سراج کی ماں پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی۔

"مَیں صدقے۔ روتی کیوں ہے بیٹی، ان لوگوں نے کچھ کہا ہے تجھ سے تو بتا۔" اُس نے زیب النساء کو تھام لیا اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ زیب النساء نے نفی میں گردن ہلا کے اس خیال کی تردید کر دی تھی کہ ہم نے اس کے ساتھ بدسلوکی یا کسی قسم کی زیادتی کی ہوگی۔ یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب زیب النساء اپنے کمرے کی خلوت میں اپنے خیالوں کے ساتھ تنہا تھی اور صرف اپنی مصوّری کے شوق میں کھوئی ہوئی تھی تو وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی اچانک دو مسلح افراد اس کے کمرے میں وارد ہو جائیں گے اور پھر اُسے رخصت ہو کے یوں سسرال جانا ہوگا کہ نہ کسی کے سر پہ سہرا ہوگا اور نہ وہ دُلھن بنے گی۔ اسے بارات کے ساتھ نہیں مسلح حملہ آوروں کے ساتھ خود چل کے دُلہا کے گھر میں اُترنا پڑے گا۔ اتنی بے بسی اور بے عزّتی کے ساتھ۔

"ہم نے تمھاری ماں کو اور اس کی بہو کو کچھ نہیں کہا ہے ایس ایس پی صاحب۔ صرف اس اُمید میں کہ وہ بھی کسی...... سے کچھ نہیں کہیں گی۔" مَیں نے کہا۔ "یا مَیں ٹیلی فون کی لائن کاٹ دوں؟"

"میری ماں تمھارے عزائم کی راہ میں حارج نہیں ہوگی، وہ تم کو بچانے کے لیے بھی نہیں آئے گی۔" سراج بولا۔

"اس کے ہم کیا لگتے ہیں، بس اسے سمجھا دینا کہ وہ تم کو بچانے بھی نہ آئے۔" محسن نے کہا۔ "ہم یہاں جان ہتھیلی پر رکھ کے پہنچے ہیں اور اس بارے میں کوئی شبہ تمھارے دل میں ہے تو نکال دو کہ تم اپنی چالاکی سے یا اپنے اختیارات اور وسائل سے کام لیتے ہوئے ہمیں گرفتار کرا دوگے یا ہمارا راستہ روک لوگے۔ ہم محاورے کے مطابق ہی نہیں، عملاً کشتیوں کے پُشتے لگا دیں گے۔"

"ان کو کیوں اغوا کر کے لائے ہو؟" سراج نے کہا۔

"ہم یہاں کھڑے رہ کر مذاکرات جاری نہیں رکھیں گے۔" مَیں نے کہا۔ "اندر چلو، وہیں جہاں تمھاری ماں اور تمھاری ہونے والی بیوی ہیں۔"

"اور اگر مَیں انکار کردوں...؟" سراج نے مشتعل ہو کے کہا۔

"تو تم یہاں سب کے سامنے مار کھاؤ گے؟" مَیں نے کہا۔ "تمھارے نچلے درجے کے ماتحت بھی دیکھیں گے کہ ایس ایس پی بنتے ہی تم کو مرغا بننا پڑا۔"

"یہ پروموشن تمھارے حق میں سخت نامبارک ثابت ہوگی۔" محسن بولا۔

"اوکے، اندر چلو، اگر اتنا ہی ضروری ہے۔" سراج نے اپنی شکست کو قبول کر لیا۔ "مگر ایک وضاحت میری بھی سن لو، مجھے تم اس طرح اغوا کر کے نہیں لے جا سکو گے جیسے تم دلاور کو لے گئے تھے یا اب جمشید کو اُٹھا لائے ہو۔"

"ہم تمھارے سامنے ہی جمشید کو بھی چھوڑ دیں گے۔"

مَیں نے کہا۔ "ہم جس مقصد کے تحت آئے ہیں، وہ مختلف ہے۔"

ایک بڑے کمرے میں سراج کی ماں، زیب النساء کو چُپ کرانے کی اور یہ پوچھنے کی کوشش میں مصروف تھی کہ ہم کون ہیں

...ے کیوں لائے ہیں مگر زیب النساء نے ابھی تک کچھ ...نہیں بتایا تھا۔

"...اب کیا ہے؟" سراج کی ماں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "...کیوں چلے آئے ہو؟ کیا مقصد ہے تمھارا؟"

"...ہمارے یہاں آنے کا مقصد جان کے آپ کیا کریں گی، ...ے کاروباری معاملات ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"...کاروباری معاملات یوں طے ہوتے ہیں! ہم بندوق کے ...اور اگر ہوتے ہیں تو جاؤ دوسرے کمرے میں۔" وہ گرم ...ہو کے بولی۔

"...کی مجبوریاں ہیں ایسی کہ ہم یہاں رہیں گے۔" مَیں نے ...آپ کے سامنے..."

"ایسی بدمعاشی پر تم کو شرم آنا چاہیے۔"

"ماں جی! آپ کے بیٹے کا تو سارا دھندا ہی ایسا ہے، ...سب ہے اس کا واسطہ اور تعلق بدمعاشوں سے ہی رہتا ہے۔" ...نے کہا۔ "شریف آدمی تو پولیس کے سائے سے بھی بھاگتا ...ے اور پولیس خود بھی کسی شریف طبقے سے تعلق نہیں رکھتی، ...چاہئے شرم کی تو بات ہی نہیں۔"

"ہم زیادہ دیر نہیں رُک سکتے۔" محسن نے کہا۔ "خسرو جمشید! ...اب تم جاؤ اور دلاور کے گھر سے دس لاکھ روپے لے آؤ۔"

مَیں نے خط نکال کے جمشید کو دیا۔ سراج نے اس کو ...پہلے سے دیکھا تو خط مَیں نے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "تم بھی ...پڑھ لو، ویسے اگر کسی کی بیوی کے نام خط ہو تو اسے پڑھنا نہیں ...چاہیے لیکن یہ پرائیویٹ بات نہیں ہے۔"

سراج نے خط لے لیا اور کھول کر پڑھا۔ محسن مشین گن ...لیے ایک کونے میں کھڑا رہا۔ وہیں ایک ٹیلی فون بھی رکھا ہُوا ...تھا، اس نے ایک ہاتھ مار کے اس کا کنکشن توڑ دیا۔ سراج کی ...ماں نے اب سمجھ لیا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہے چنانچہ وہ ...اپنی ہونے والی بہو کو سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور خاموش تھی۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے...؟"

"کوئی ضمانت نہیں۔" مَیں نے سراج کی بات کاٹ دی۔ "ضمانت طلب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"جاؤ جمشید۔" سراج نے کچھ دیر سوچ کے کہا۔

"تمھارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اگر ...دلاور کی بیوی کے پاس ہوگی تو دیر لگنی بھی نہیں چاہیے۔ ...اگر تم نے بے وقوفی کی اور اپنے ساتھ پولیس یا فوج کی پوری ...رجمنٹ لے آئے، تب بھی تم آسانی سے ہمیں گرفتار نہیں کرا ...سکو گے، ہم مر جائیں گے اور مرنے سے پہلے سب کو مار جائیں ...گے، مرنے والوں میں زیب النساء بھی شامل ہوگی۔"

"تم میں سے کون میرے ساتھ جائے گا؟" جمشید نے کہا۔

"کوئی بھی نہیں۔" مَیں نے کہا۔ "لیکن واپسی میں تم کو ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔ تم دلاور کی بیوی کو یا اُس کی بہن کو ساتھ لاؤ گے۔"

"یہ اس خط میں نہیں لکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"یہ ہم کہہ رہے ہیں، ہمیں ضامن بھی تو چاہیے۔" مَیں نے کہا۔ "اگر دلاور کو لانا ہے تو خود اس کی بیوی جا کے لا سکتی ہے، وہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگی تو ہم غیر محفوظ رہیں گے۔"

"مَیں کوشش کروں گا مگر وہ راضی نہ ہوئی تو؟"

"تم اُسے راضی کر سکتے ہو۔ عورت ذات کو چکر دینا تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی ہے۔" خسرو جمشید نے کہا۔

"تم زبردستی بھی تو کر سکتے ہو... یا دھمکی دینے سے آگے کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔" مَیں نے کہا۔ "مَیں نہیں مان سکتا کہ تم اتنے نااہل ہو کیونکہ جن کے تم ساتھی ہو، وہ تو اس ملک کے قانون کو، حکومت کو اور عوام کو چکّر دے رہے ہیں اور ان کے دشمنوں سے آزادی اور حب الوطنی کا سودا کر رہے ہیں۔ ملک کے اندر قتل و خونریزی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں مصروف ہیں لیکن معزز و معتبر بھی بنے ہوئے ہیں۔ تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والوں کے ساتھی ہو، ان چوروں کے ساتھ ہو جو کوتوال بنے پھرتے ہیں اور اب تو خیر سے اپنے چوہدری دلاور صاحب عوام کے محبوب رہنما بننے کا فیصلہ کر چکے ہیں بلکہ.... پریس کانفرنس میں اپنی خیر خواہی اور خدمتِ خلق کے جذبات کا اظہار بھی فرما چکے ہیں اور تم یہ ظاہر کر رہے ہو کہ بہت معصوم ہو۔ جاؤ خسرو جمشید عرف مرشد رضا، وقت ضائع مت کرو، جیسے بھی ہو، دس لاکھ کی رقم ایک ضامن کے ہمراہ لے آؤ۔ ہم صبح ہونے تک انتظار نہیں کریں گے۔ اس بات کا خیال رکھنا، تمھارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ پانچ دس منٹ کی رعایت مل جائے گی، اس سے زیادہ نہیں۔" مَیں نے دیکھا کہ زیب النساء میری بات پر دم بخود بیٹھی ہے۔

"دیر سے آؤ گے تو یہاں کوئی بھی نہیں ملے گا۔" محسن نے کہا۔

"ممکن ہے چند لاشیں ملیں۔" مَیں نے کہا۔ زیب النساء کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا۔

"مگر وہ ہماری لاشیں نہیں ہوں گی۔" محسن نے کہا۔

ہمارے لہجے اور اعتماد نے خسرو جمشید کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے چابی لی اور باہر نکل گیا۔ سراج اُس کے ساتھ جانے لگا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" مَیں نے اُسے دروازے میں ہی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

روک لیا۔

"میری اجازت اور میرے حکم کے بغیر محافظ اسے نہیں نکلنے دیں گے۔" وہ بولا۔

"تم اُن کو اندر رہ کے بھی تو احکامات دے سکتے ہو یا تم یہ بات بھول گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ... انتظام دوسرے کمرے میں ہے۔" سراج بولا۔

"میں اس نظام کی کارکردگی کا بذاتِ خود مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چلو۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو، میرے گھر میں مجھ پر حکم چلا رہے ہو۔" سراج نے چراغ پا ہو کے کہا۔

"میں تمہارے گھر میں تم پر بلڈوزر بھی چلا سکتا ہوں اُلو کے پٹھے۔" میں نے دہاڑ کر کہا اور سراج کے سر پر مُکا مارا۔ وہ جھٹکا کھا کے آگے جھکا اور نیچے گر گیا۔ اُس کی ماں نے اور زیب النساء نے ایک ساتھ چیخ ماری۔

"خدا کے لیے رحم کرو۔" سراج کی ماں چلائی۔ "تم کو جو کچھ چاہیے لے جاؤ، جو بھی اس گھر میں ہے۔"

سراج کھڑا ہو گیا۔ اپنی ماں اور منگیتر کے سامنے اُس کی سخت تذلیل ہوئی تھی۔ وہ پُرانا ایس پی تھا جو کڑوے کریلے سے کم نہیں ہوتا۔ اب وہ ایس ایس پی ہو کے گویا نیم چڑھ گیا تھا مگر یہاں وہ صرف دو افراد کے سامنے اپنی ساری کڑواہٹ کو خود ہی پینے پر مجبور تھا۔

"آپ دُور رہیں ماں جی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

"ڈاکو نہیں ہو تو پھر کون ہو نامرادو۔" سراج کی ماں نے رو کے کہا۔

"ہم علی بابا ہیں اور ہمارا واسطہ چالیس چوروں سے ہے۔ تمہارا یہ ایس پی بیٹا ایک چور ہے۔ دوسرا چور اس کا سالا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ کو شرم آنا چاہیے ہمارے بھائی کو چور کہتے ہوئے۔ کیا خاندانی شرفاء کی یہی عزت رہ گئی ہے؟" زیب النساء نے روتے ہوئے کہا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "تم ایک بے وقوف اور کم عقل لڑکی ہو، جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شرافت کسے کہتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں جیسے اندھا اپنی کالی دُنیا میں رہتا ہے۔ ایسے ہی تم اپنی تصویروں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو۔ تصویریں گونگی بہری ہوتی ہیں، سب کچھ دیکھتی ہیں، تب بھی خاموش رہتی ہیں اور اتنی مجبور ہوتی ہیں کہ کوئی بھی انھیں بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ ان کے خدوخال مسخ کر سکتا ہے اور انھیں تباہ کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تم بھی ایک تصویر ہو، خوبصورت مگر صرف نقشِ خیال جو کینوس کے رنگ میں قید ہو جائے۔ تم کو جیتے جاگتے [illegible] کی دُنیا دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا اجازت نہیں ملی مگر اب [illegible] آگیا ہے زیب النساء کہ تم دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھو [illegible] ابھی تمھیں کیا معلوم کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، کون شریف ہے اور کون ڈاکو۔"

"تم یہاں تقریر کرتے رہو گے۔" سراج نے کہا۔ "باہر [illegible] نے گاڑی کو روک رکھا ہوگا۔"

"محسن باقی تقریر کرے گا لیڈیز۔" میں نے کہا۔ "فصاحت و بلاغت میری زیادہ ہے مگر حقائق سے وہ بھی آپ کو آگاہ کر سکتا ہے۔"

"جی تو میں... میرا مطلب ہے میرے دوست کیا [illegible] رہے تھے؟" محسن نے فوراً بات یوں شروع کی جیسے کرکٹ میں ایک کمنٹری کرنے والے سے دوسرا مائیک لیتا ہے۔ "بات تھی علی بابا اور چالیس چوروں کی..."

میں اور سراج کمرے سے نکل گئے۔ سراج آگے تھا۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ بڑی چالاکی سے کھولا۔ بظاہر وہ اس بند دروازے کے سامنے سے سیدھا گزرنے والا تھا مگر اچانک اُس نے دروازے کو ٹکر ماری اور ایک دم اندر ہو کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ میں نے دروازے کو کندھے سے روک کر دھکیلا لیکن خود ایک دہلیز اور پٹ کے درمیان پھنس گیا۔ سراج نے کوشش کو ناکام ہوتا دیکھ کے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دروازے کو دبایا جیسے وہ مجھے بیچ میں ہی سینڈوچ کر دے گا مگر میں نے ریوالور والا ہاتھ اندر ڈال کے اُس کی کلائی پر وار کیا۔ میرا ایک پیر دروازے میں بُری طرح دبا ہوا تھا۔ ریوالور کا یوں استعمال کرنا ایک غلطی بن گیا۔ سراج کے ہاتھ پر چوٹ ضرور آئی تھی مگر اُس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازے کو چھوڑ کے میرے ریوالور والے ہاتھ کو قابو میں کر لیا۔ اُس نے اب میری کلائی کو دروازے کے کونے پر مارا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دروازے [illegible] ایک دم اندر گیا۔ میرے جسم کا سارا بوجھ دروازے پر تھا۔ سراج کے ہٹتے ہی دروازہ پیچھے ہوا تو میں خود کو نہ سنبھال سکا۔ تاہم اُس غلطی نے میری جان بچالی۔ کمرے میں ایک اسپیکر چلانے لگا "ہیلو، ہیلو سر۔"

سراج نے ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی گولی چلائی تھی لیکن میں جھک کر مُنہ کے بل فرش کی سمت جا رہا تھا چنانچہ گولی مجھے نہیں لگی اور شاید میرے سر سے اُوپر نکل گئی۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا اور ابھی سراج کی طرف پلٹا ہی تھا کہ

[illegible] کی آواز اور پھر دوسرا فائر ہونے کی آواز سُنی۔ یہ پہلے [illegible] فائر سے مختلف آواز تھی۔ "یہ کیا ہے سر؟" اسپیکر نے [illegible] "ہیلو۔"

"بس جی اب سیدھے کھڑے ہو جاویں آپ۔" کسی نے [illegible] میں نے دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک اے ایس آئی [illegible] ریوالور کا رُخ میری جانب کیے سکون سے کھڑا نظر آیا جو اپنے [illegible] خود سراج نے اپنے اشتعال کے جذبات پر قابو [illegible] رہا تھا۔ [illegible] پیچھے ہٹ گیا تھا ورنہ وہ چاہتا تو اتنی دیر میں [illegible] دوسری گولی میرے سر میں اُتار سکتا تھا۔ اسپیکر اب بھی پکار رہا تھا۔ "ہیلو... ہیلو۔"

"کیوں بے، یہ کیا دنگا کر رہا تھا؟" اے ایس آئی میری جانب بڑھا۔ میں نے ہاتھ اوپر اُٹھا لیے اور احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔ "بس ایسے ہی جی۔"

"اتنی ہمت تیری سالے، مسکرا رہا ہے۔" اے ایس آئی بولا۔ "ابے ہم نے خود تیس مُردے گاڑے ہیں مسکراتے ہوئے، ان کے ڈھانچے بھی مسکرا رہے ہوں گے۔"

"واہ واہ... پھر تو آپ تیس مار خاں ہیں۔" میں نے کہا۔

سراج نے بالکل آخری وقت میں اے ایس آئی کو خبردار کرنا چاہا کہ وہ میرے قریب نہ جائے مگر اُسے پھر بھی دیر ہو گئی۔ ایک سیکنڈ میں تیس مار خاں فضا میں کبوتر کی طرح اُڑتے ہوئے اور فرش پر نظر آئے۔ سراج نے فائر کیا، گولی اس راستے سے گزری جس پر اُڑتے ہوئے تیس مار خاں نیچے آ رہے تھے۔ اُن کی ایک ٹانگ کی گولی سے ملاقات ہوئی۔ تیس مار خاں [illegible] یوں ہی اُچھلے، چلائے پھر گرے تو دوسری بار چلائے۔ غالباً انہوں نے کلمہ پڑھا تھا۔

محسن اپنی مشین گن کے ساتھ اندر آ گیا۔ "بند کر دو یہ آتش بازی۔" اُس نے ایک نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر کہا۔ "سراج! [illegible] تین تک گنوں گا۔" لیکن گنتی شروع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ سراج نے خود ہی ریوالور نیچے گرا دیا۔ میں ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا اور اچانک میں نے اُسے ٹانگوں سے پکڑ کے اُٹھایا اور [illegible] اے ایس آئی تیس مار خاں پر پھینک دیا، وہ بُری طرح بلبلایا۔ پھر باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ سراج کے چہرے پر مُردنی کی جگہ بشاشت نے لے لی۔

محسن ایک دم بائیں جانب دوڑ کر اس پردے کے پیچھے [illegible] ہو گیا جو غالباً باتھ رُوم کے دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے فوراً سراج کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔

"یہ تمہارے رکھوالے کُتے ہیں۔" میں نے ریوالور کی نال کو [illegible] سے چھو کر کہا۔ "انھیں واپس کردو، اچھی طرح سمجھا کے۔"

ڈی ایس پی دروازے میں نمودار ہوا تو ہانپ رہا تھا۔ "خیریت تو ہے سر؟"

"تم سے کس نے کہا کہ خیریت نہیں ہے؟" سراج نے کہا۔ میں اس کے پیچھے لاتعلقی سے کھڑا مسکرا رہا۔

"میں نے فائرنگ کی آواز سُنی تھی۔" ڈی ایس پی نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔ "اور کوئی ریسیور پر جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔"

"پھر بھی تم کو ڈیوٹی چھوڑ کے اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔" سراج نے کہا۔

"سر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! میری ڈیوٹی ہے آپ کی حفاظت کرنا اور میں کوئی غیر معمولی بات دیکھوں یا سُنوں تو یہ میرا فرض ہے کہ میں معلوم کروں۔" ڈی ایس پی نے کہا، وہ کوئی احمق نہیں تھا کہ صورتِ حالات کا صورتوں سے اندازہ نہ کر سکتا۔ اس عہدے تک پہنچنے میں اس نے پندرہ بیس سال تک پولیس میں پاپڑ بیلے تھے۔ اُس نے تاڑ لیا تھا کہ انہونی ہو چکی ہے اور اس کا افسرِ اعلیٰ ٹریپ ہو گیا ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے مجبوری میں کہہ رہا ہے لیکن وہ اپنے شک کا اظہار کرتا تو خود بھی پھنس جاتا۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو؟" ڈی ایس پی نے سب انسپکٹر تیس مار خاں کو ڈانٹا۔ "سیٹ پر تمہارا باپ بیٹھے گا؟"

اُس نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا اور پھر خاموشی سے اس میز پر جا بیٹھا، جس پر ایک ٹی وی اور ایک ٹرانسمیٹر قسم کی چیز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بہت سے ڈائل تھے اور سوئچ تھے اور اس کی ایک سُرخ روشنی ظاہر کرتی تھی کہ یہ مواصلاتی رابطہ کام کر رہا ہے۔ اس ٹرانسمیٹر سے نکلنے والے مختلف تاروں میں سے ایک ٹیلی فون کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ دوسرا ایک ٹیپ ریکارڈر سے اور تیسرا باہر جا رہا تھا جو شاید ایریل تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کہا اور سُنا جاتا تھا ٹیلی فون پر یا براہِ راست، وہ سب ریکارڈ ہوتا تھا اور شاید نشر ہونے کے بعد کسی دوسری جگہ بھی پہنچتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر مجھے کوٹھی کا صدر دروازہ نظر آ رہا تھا اور نواب خسرو جمشید کی گاڑی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سراج نے اُسے آف کر دیا۔

"سر، وہ آپ کے دوست؟" ڈی ایس پی نے ٹی وی کی جانب اشارہ کیا۔ "ان کو جانے دیں؟"

"ہاں، جانے دو انھیں۔" سراج نے کہا۔ "اور کچھ دیر بعد وہ آئیں گے تو انھیں روکنا نہیں ہے، ممکن ہے اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہو۔"

"اور کون سر؟"

"خواتین ہو سکتی ہیں۔" سراج نے کہا۔ "تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ اپنی عقل سے کام لے کر کچھ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔"

"یس سر۔" ڈی ایس پی نے سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ماتحت ہو، میں حکم عدولی بالکل برداشت نہیں کرتا، اگر تم نے مجھ سے پوچھے بغیر کچھ کیا تو میں تم کو معطل کرا دوں گا۔" سراج بولا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا سر۔" ڈی ایس پی بولا۔

"کچھ نہیں کا مطلب سمجھتے ہو، کسی سے فون پر یا وائرلیس پر بات نہیں کرنا ہے، میں خود بات کروں گا، اگر کہیں سے پیغام آئے تو مجھے بتاؤ۔ کوئی کچھ بھی پوچھے تو تم جواب دینے سے پہلے مجھ سے پوچھو۔ رائٹ؟"

"رائٹ سر۔" ڈی ایس پی اندر آ کے پچھتا رہا تھا۔

"اگر تمہاری وجہ سے نقصان ہوا، یہ سمجھ لو کہ نقصان بہت سنگین ہو سکتا ہے اور ناقابلِ تلافی بھی۔" سراج بولا۔ "تو تم کچھ نہیں کر سکو گے۔"

"سیدھی صاف بات سنو۔" محسن اچانک پردے کے پیچھے سے نکل آیا۔ "تمہارے ایس ایس پی اور اس گھر کے تمام افراد کی زندگی اور موت کا انحصار تمہارے رویّے پر بھی ہے، یہ ہماری قید میں ہیں۔ باہر کی صورتِ حال کو ہوشیاری سے کنٹرول کرو تاکہ ان کی جان بچی رہے ورنہ ان کے ساتھ ہم ہی نہیں شاید تم بھی مارے جاؤ گے۔ باہر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں آ جائیں تب بھی ان سب کی جان بچانے کوئی اندر نہیں آ سکتا، آئے گا تو صرف لاشیں پائے گا۔"

"ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم چلے جائیں گے۔" میں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "تم ہمیں خیریت کے ساتھ نکل جانے دو گے تو یہاں بھی سب خیریت ہی رہے گی ورنہ . . ."

"یس . . . آپ بالکل فکر نہ کریں۔" ڈی ایس پی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "کیا اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جاؤ۔" میں نے کہا۔ "مواصلاتی رابطہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ شکوک پیدا ہوں گے۔ سب کو بتاتے رہو کہ سب ٹھیک ہے، بعد میں تم اپنی مجبوری کی وضاحت کر سکتے ہو، ایس ایس پی صاحب تمھیں بچائیں گے اور اگر تم نے ان کو مزید مشکلات میں مبتلا نہ کیا تو تمہارے بارے میں اچھی رپورٹ بھی دیں گے۔"

ڈی ایس پی واپس جانے لگا تو محسن نے کہا۔ "ڈی ایس پی، جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اور تم سے کہا گیا، وہ صرف تمہارے لیے تھا، باہر جو تمہارے ماتحت ہیں انھیں کچھ بتانا ضروری نہیں۔"

"آپ مجھ پر بھروسا کریں، میں ایسی کوئی بات نہیں ہونے دوں گا۔" وہ بولا۔

"تمہارا یہ ماتحت واقعی سمجھ دار ۔۔۔ ۔۔ بے وقوف بنا کے نکل جانا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ باہر جا کے اپنی خودمختاری سے ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھائے گا؟"

"تم اگر مطمئن نہیں ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" سراج بولا۔

"اب آپ بھی جائیں۔" میں نے محسن سے کہا۔ "آپ کا لیکچر ڈسٹرب ہوا، خواتین باقی لیکچر سننے کے لیے بے چینی سے منتظر ہوں گی، انھیں سب سمجھا دینا۔"

"خاک سمجھا دوں، عجیب کوڑھ مغز خواتین ہیں۔" محسن بولا۔

"جب آپ نے خواتین کہہ دیا تو کوڑھ مغز کہنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔

"مناسب وقت پر یہ بات خواتین تک پہنچا دی جائے گی۔ ان خواتین تک جو آپ کی رائے بدل سکتی ہیں۔" محسن بولا۔ "میرے لیکچر سے مستفید ہونے والی تو کچھ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ در اصل ایک ماں ہے، ایک منگیتر، ایک بہن ہے تو ایک بیوہ، ایک ساس ہے اور ایک بہو، ایک سیدھی سادی عورت ہے تو ایک ممتورہ۔"

"اُف! میں دو کو چھوڑ کے آیا تھا، یہ دس کیسے جمع کر لیں تُو نے؟" میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔ محسن ہنسا اور واپس چلا گیا۔

"ہاں بھئی!" میں نے ایس آئی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"آہ! قسم اللہ کی بڑا دکھ رہا ہے۔" وہ کراہ کے بولا۔

"تیس مسکراتے ہوئے مُردے گاڑے ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت بھی وہ مسکرا رہے ہوں گے، تمہاری حالت پر۔" میں نے کہا۔

"وہ تو میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔" وہ پان چباتے ہوئے بولا۔

"ہمت سے کام لو، خود تم کو اکتیسواں مسکراتا ہوا مُردہ بننا ہے۔ منکر نکیر کے سامنے بھی مسکراتے رہنا۔ صورِ اسرافیل سُن کے مسکراتے ہوئے اُٹھنا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ جو تم شیطانی جھاڑ جھنکاڑ لیے بیٹھے ہو، اس میں بھی کسی سے بات کرو تو مسکراتے ہوئے بات کرنا، کیسے بھلا؟ ذرا مسکرا کے دکھاؤ۔"

"ہیں جی؟" وہ بوکھلا گیا۔

میں نے اس کے ایک ہاتھ مارا، وہ کرسی سمیت لڑھک گیا اور بڑی مشکل سے اٹھا۔

"مسکراؤ۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ اس نے زبردستی بتیسی کی نمائش کی۔

"ہم اب یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے کہا، وہ کھانے کا کمرا تھا اور کھانے کی میز پر ہی ریڈیو، ٹیلی فون، وائرلیس اور کلوز سرکٹ ٹی وی کا تمام اسباب پھیلا ہوا تھا۔ دو کرسیاں لے کر ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔ سراج نے ہی نہیں اس کے سرپرستوں نے اب تسلیم کر لیا تھا کہ دشمن ان کے قلعے میں گھس آیا ہے اور اس کی طاقت کا مقابلہ کرنا جان گنوانے کے مترادف ہے۔ سراج یہ بھی سمجھتا تھا کہ اسلحہ نہ ہونے سے اسے فرق پڑتا ہے، مجھے نہیں۔ وہ ایک بزدل اور کم ہمت آدمی تھا۔ ہر لالچی اور خود غرض آدمی کے لیے جرأت اور بہادری، غیرت و حمیت اور اعلیٰ انسانی صفات کی پاسداری اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی اپنی زندگی، کیونکہ زندگی اس کے لیے ہوسِ زر اور بے لگام خواہشوں کا سرچشمہ رہتی ہے اور وہ کسی مقصد کے لیے جان دے کر گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا، وہ آتشِ نمرود میں کبھی نہیں کودتا۔

"کیا تم واقعی دس لاکھ لے کر چلے جاؤ گے؟" سراج نے کہا۔

"تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے؟" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تمہارے لیے دس لاکھ کی رقم کچھ نہیں، جب تم اس سے دس گنا یا سو گنا لے سکتے تھے تو تم نے نہیں لیے تھے۔" سراج بولا۔

"تمہارا دماغ ابھی تک صحیح خطوط پر سوچ رہا ہے، ہم دس لاکھ تمھیں بخش کے بھی جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "مگر بخشیں گے نہیں۔ تمہارے پاس حرام کا مال جمع کرنے کے ذرائع پہلے بھی کم نہ تھے، اب اور زیادہ ہو جائیں گے، تم ایس ایس پی جو ہو گئے ہو، ماننا پڑتا ہے کہ تمہارے پیچھے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ تم دلاور کی بیوی کو لے جاؤ گے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اُسے ہی نہیں، تمہاری منگیتر کو بھی . . ."

"وہ، ایسی لڑکی نہیں ہے، وہ مر جائے گی۔" سراج بولا۔

"مر جانے دو، تم سے شادی کر کے وہ موت سے بدتر عذاب تو نہیں جھیلے گی اور جیتے جی درگور تو نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، تم میری ماں کو بھی لے جاؤ گے؟"

"ہاں، یہ ماں، بہن یا بیوی کے سب رشتے جذبات کے رشتے ہیں اور تمہارا بھلا جذبات سے کیا رشتہ۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی تم پولیس والے ہو، رشتوں کی قدر و قیمت اور آبرو کو سمجھتے تو رابعہ اور کیتھرین کا لحاظ کرتے، تم کو اب ہم سے کسی رعایت کی توقع کیوں ہے؟" میں نے کہا۔ "بہت مجبور ہو کے ہم نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ وقت نے ہمیں سمجھا دیا ہے کہ جنگ میں رشتے اور جذبات ہی آدمی کی کمزوری بنتے ہیں۔ میں بہت پہلے خود کو قائل کر چکا ہوں کہ میری محبت رابعہ کو تحفظ فراہم نہیں کر سکی تھی، الٹا وہ رابعہ کے حق میں نقصان دہ بن گئی تھی۔ تم نے اسے مجھ پر غلبے کے لیے استعمال کیا، اس کے ساتھ وہ سب کیا جو شاید نازی سپاہیوں نے اپنے کیمپوں میں عورتوں کے ساتھ نہ کیا ہوگا۔ اس کو میں نے دیکھا، تم نے مجھے دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ تم ہی مجھے بے حس اور سفاک بنا رہے ہو، میرے ذہن کو بدل رہے ہو، خود اپنے خلاف . . . آج میں اتنا پتھر دل ہو گیا ہوں کہ وہ سب کر سکتا ہوں جو تم نے کیا تھا۔ تمہاری ماں یا زیب النساء اور دلاور کی بیوی، یہ سب وسیلے ہو گئے ہیں تم پر غلبہ پانے کے، میں احترامِ آدمیت کے احساس سے بیگانہ ہو گیا ہوں۔ تمہاری کوششوں کے طفیل اور آگے چل کے شاید شیطان بھی بن جاؤں۔ جو اذیت میں جھیل چکا تم وہ اب جھیلو گے۔"

"رابعہ ہماری قید میں نہیں ہے۔" وہ اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"پھر کیا ہوا، ضامن رضوی صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دو، وہاں سے محسن کی بیوی کو اُٹھا لو۔" میں نے کہا۔ "کیتھرین اور جولی کو تلاش کر لو، رابعہ کو پھر پکڑ لو۔"

"ہم آپس میں سمجھوتا بھی تو کر سکتے ہیں۔"

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اس کے چہرے پر مُکّے مارے، اسے کئی بار نیچے سے اٹھایا اور پھر گرا کے ٹھوکریں ماریں۔ سخت دہشت زدہ ایس آئی یہ سب دیکھتا رہا۔ اس کا بہت بڑا افسر بڑی بے بسی کے ساتھ پٹ رہا تھا۔

"آج، اب بات کرتے ہو سمجھوتے کی۔ جب خندہ تمہارے پلڑے میں آ گیا ہے تو کہتے ہو، اس کا کیا فائدہ۔ جنگ میں عورتوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ضرورت کا احساس تمھیں دیر سے ہوا۔" میں نے پھر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم جب بازی ہارنے لگو گے تو صلح کی بات بھی کرو گے، وہ وقت بھی آئے گا مگر اس سے پہلے تم کو وقت کئی سبق پڑھا جائے گا، یہ ہو سکتا تھا کہ ہم تمھیں گولی مار کے نکل جاتے۔ سابق ایس ایس پی تمھیں چارج دینے کے بجائے تمہارے جنازے کو کندھا دینے آتے مگر میں تم کو جینے کی سزا دینا چاہتا ہوں۔ یہ میں دلاور کو سمجھا چکا ہوں کہ اُسے، جمشید کو اور تمہارے سب حواریوں کو ہم جب چاہتے، کتّے کی موت مار دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ ہم پر تمہارے قتل کا الزام نہ آئے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ تم ہمارے انتقام کا نشانہ بنے اور وہ بڑے خطرناک مجرم تھے جنھوں نے تمھیں مار دیا۔ نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ایک دن تمہارا مقدمہ ایک وطن فروش اور غدار لٹیرے کی حیثیت سے قانون کی عدالت میں اور عوام کے سامنے جائے، تمہارے خلاف ہر ثبوت ہو، ہر شہادت ہو، ان سب کے خون کی جس کے داغ تمہارے دامن پر ہیں۔ ان سب کی جو تمہاری ہوسِ زر پر قربان ہوئے پھر ایک دن فیصلے کا آئے اور ایک دن فیصلے پر عمل درآمد کا۔"

"تم کتنی لاحاصل خواہشوں کے اسیر ہو۔" سراج نے تلخی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے کہا "تم کو آج تک کس خواب کی تعبیر ملی ہے جو تم اس دن کے لیے زندہ ہو اور رہو گے۔"

"یہی دلاور نے پوچھا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہاں، میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا، جب خدا نے مجھے ایک مشن سونپا ہے تو وہ مجھے اپنی جدّوجہد کا اتنا انعام ضرور دے گا کہ میں کامیابی کی خبر سُن سکوں اور تمہارے انجام کو دیکھ سکوں۔" میں نے کہا "تمہاری وہ سزا میرے ساتھ سارا زمانہ دیکھے جو تم کو اس دُنیا میں ملنی ہے، باقی رہ جائے گی عاقبت کی سزا تو اس کا حساب ہم بھی دیں گے، ہم بڑے گناہ گار ہیں لیکن مُجرم نہیں ہیں۔"

"آج اس وقت تم بڑا بول، بول سکتے ہو، ہر دعویٰ کر سکتے ہو، یہ بھی کہ زندگی اور موت پر تمہارا اختیار ہے۔ . . مگر یہ وقت گزر جائے گا اور بالآخر تم دیکھو گے کہ تمہارے لیے زمین کتنی تنگ ہو چکی ہے، تم خود کو ایک دلدل میں محصور پاؤ گے۔ سراج بولا۔

"کل کی بات کل کریں گے۔" میں نے کہا "وقت بتلائے گا کہ کون دلدل میں ہے اور کس نے کسے محصور کیا ہے۔"

یکلخت وائرلیس کا اسپیکر سیٹی سی بجا نے لگا "ہیلو اے ایس آئی تیس مار خاں۔" کسی نے کہا۔

"یس سر، بول رہا ہوں۔"

"ایس ایس پی صاحب کے بارے میں کیا رپورٹ ہے، کہاں گئے ہیں؟"

"کچھ نہیں معلوم سر، بتا کے نہیں گئے۔"

"گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا؟"

"نہیں سر۔"

"تم سب چوکس رہنا، وہ دونوں بدمعاش ابھی تک روپوش ہیں، سب تھانوں کو خبردار کر دیا گیا ہے، اُن کی اصل تصویریں بھی دے دی گئی ہیں، شہر کی ناکا بندی ہے، تم کوئی ایسی ویسی بات دیکھو تو فوراً رپورٹ کرو۔" "ابھی کچھ دیر پہلے شور کیسا تھا؟"

"کچھ دیر پہلے؟ نہیں سر۔"

"ہاں، میں نے خود سُنا تھا جیسے فائر کیا گیا ہو مگر اس کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔"

"فائرنگ کون کرے گا سر؟ باہر ڈی ایس پی صاحب مسلح گارڈ کے ساتھ موجود ہیں۔" اے ایس آئی بولا "لائن آپ کی طرف سے خراب تھی سر، میں کوشش کر رہا تھا مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔"

"چلو اب ٹھیک ہے، ڈی ایس پی صاحب کو سلام بولنا۔"

"یس سر۔" اے ایس آئی نے کہا۔

"کس کی کال تھی؟" میں نے کہا۔

"تھانے سے ایس ایچ او صاحب کی۔" وہ بولا۔

"تم کو سب ہی تیس مار خاں کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اس کو یہ بات ہر جگہ موقع محل دیکھے بغیر کہنے کی عادت ہو گی کہ وہ مُسکراتے ہوئے تیس مُردے دفن کر چکا ہے۔

اس کال کے علاوہ بھی درمیان میں متعدد فون آئے تھے خیر خواہی کے جذبات کا اظہار کرنے میں پہل کی کوشش کرنے والوں کو اس جواب سے مایوسی ہوتی تھی کہ ایس ایس پی صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں۔ سب خوشامدی چمچے سراج کو مبارک باد دینا چاہتے تھے، کچھ زیادہ چاپلوس تھے کہ خود حاضر ہوئے تھے اور دروازے سے لوٹا دیے گئے تھے۔ اندر اور باہر سراج کے محافظ بڑی ہوشیاری سے تمام صورتِ حال کو ہینڈل کر رہے تھے۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ دس منٹ اُوپر ہو گئے تو مجھے تشویش لاحق ہوئی مگر اسی وقت ٹی وی اسکرین روشن ہو گیا۔ میں نے جمشید کی مرسیڈیز دیکھی جو گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔

"تیس مار خاں، جاؤ انھیں یہاں لے آؤ۔" میں نے کہا۔

"آگے جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی جگہ دروازے میں کھڑے رہو، وہ اِدھر ہی آئیں گے۔"

تیس مار خاں نے تعمیل کی۔ جمشید پہلے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سُوٹ کیس تھا پھر عاشی اس سے چند قدم پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ غصے سے لال پڑ گیا۔

"تم... تم ہو یہاں؟" اُس نے پلٹ کر جمشید کی طرف دیکھا "آپ نے کیوں جھوٹ بولا تھا؟"

"وہ ضروری تھا۔" جمشید نے مختصراً کہا۔

"خوش آمدید اے نازنین گلبدن۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر کو بڑی عاشقانہ نیازمندی سے جُھکایا اور فرانسیسی میں کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ پھر ملیں گے۔"

"شٹ اپ۔" وہ اُردو میں بولی "تم ایک دھوکے باز ہو، جعلساز ہو، صحافی نہیں، مُجرم ہو۔"

"ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کے کہا "ہم کو غصے پر پیار آتا ہے۔ جو چاہو کہو، ہم گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔"

"عائشہ، ان کے مُنہ مت لگو۔" جمشید نے کہا "جاؤ اُدھر۔"

"پہلے میں اس سے پوچھنا چاہتی ہُوں کہ جیجا جی کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟"

"جیجا جی؟ کس کے جیجا جی، کیسے جیجا جی؟" میں نے کہا "ہم کیا کسی کے جیجا جی سے کم ہیں، ہم سے بھی پوچھ لو کہ ہم کیسے ہیں؟"

"بکو مت، میں تم کو کچھ بتانا چاہتی ہُوں تاکہ تمہاری

غلط فہمی دُور ہو جائے۔" وہ تیز لہجے میں بولی "چوہدری صاحب کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ ان کے اغوا سے تہلکہ مچ گیا ہے۔ میرے پاس اخباری نمائندے بھی آئے تھے میں نے انھیں سب بتا دیا کہ وہ کون تھے جو انھیں لے گئے تھے۔ کل اخبار میں تمہارا حُلیہ بھی شائع ہو گا۔ چوہدری صاحب کی بازیابی کے لیے پولیس کی خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے کیونکہ وزارتِ داخلہ کے حکّام تک دباؤ میں ہیں۔"

"تت تت تت۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا "بے چارے چوہدری صاحب ابھی کوچۂ سیاست میں نو وارد تھے، یقیناً ان کو کسی سیاسی حریف نے اُٹھوا لیا ہو گا، جس کو اندیشہ ہو گا کہ آئندہ انتخابات میں چوہدری صاحب اس سے صوبائی اسمبلی کی نشست چھین لیں گے۔"

"ان کا کوئی سیاسی حریف نہیں، سب نے مذمت کی ہے۔"

"ہاں ہاں، مذمت کیوں نہیں کی ہو گی، ایک ایسا فرشتہ سیرت آدمی دن دہاڑے اغوا کر لیا گیا اور قانون کے یہ محافظ کچھ نہ کر سکے۔" میں نے سراج کی طرف اشارہ کیا "مذمت کرنے والے بھی سیاستداں ہی ہوں گے۔ خود ساختہ عوامی لیڈر۔ دلاور سے زیادہ قوم کا درد دل میں رکھنے والے۔ بوگس رفاہی ادارے چلا کے نیک نامی کمانے والے۔ فلاحی تنظیموں کی آڑ میں بدمعاشی کرنے والے۔ چندے کھانے والے۔ دین کے نام پر دُنیا کی تجارت میں مصروف۔ چہروں پر منافقت اور جھوٹ کی نقاب ڈال کے فرشتہ بننے والے شیطان، سب دلاور کے لیے بیان دیں گے کہ وہ بھی فرشتہ تھا۔ ملک و ملّت کے لیے تن من دھن سب لٹانے کا عزم رکھتا تھا۔ غریبوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال قائم کرنے کا اعلان کر چُکا تھا، ہائے! حسرت ان غنچوں پہ ہے...!"

"سراج صاحب! یہ شخص اتنا بول رہا ہے اور آپ چُپ ہیں، یہ آپ کے گھر میں موجود ہے، آپ کے پاس اتنی پولیس کی نفری ہے اور پھر بھی آپ کچھ نہیں کر رہے ہیں؟" عائشہ نے چلّا کے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" سراج نے سخت لہجے میں کہا "جاؤ اُدھر دوسرے کمرے میں امّاں کے پاس... وہاں زیب النساء بھی ہے۔"

"لیکن جیجا جی کہاں ہیں؟" وہ ضدّی لڑکی اڑی رہی "باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، میں وعدہ کر کے آئی تھی...!"

"عائشہ، پاگل مت بنو۔" سراج نے اُسے پکڑ لیا ورنہ وہ شاید مجھ پر حملہ کر دیتی "یہ مسئلہ دلاور کی جان بچانے کا ہے اور اسی لیے اتنے مجبور ہو گئے ہیں۔"

"آپ چھوڑ دیں مجھے، میں خود نمٹ لوں گی۔" عائشہ نے زور لگاتے ہوئے کہا "ان کمینوں سے...۔"

سراج نے اُسے جھنجوڑا "تم مجھ سے زیادہ عقل مند نہیں ہو، یہ دس لاکھ روپے آخر کس لیے دے رہے ہیں ہم؟ دلاور کو خیریت سے واپس لانے کے، تم جاؤ اُدھر..."

"میں نہیں جاؤں گی۔" اُس نے چیخ کر کہا۔

سراج کا تھپڑ اُس کے گال پر یوں پڑا کہ وہ دُور جا گری۔ تھپّڑ کی ضرب سے زیادہ اس تذلیل کا صدمہ تھا کہ وہ فوراً اُٹھ بھی نہ سکی۔ وہیں ایک ہاتھ مضروب گال پر رکھے سراج کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر اچانک اُس کا ہسٹریا آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

"چلو اُٹھو۔" جمشید نے کہا اور اُس کا بازو پکڑ کے کھینچا "اسی لیے تم کو سمجھایا تھا کہ یہ معاملات ہم پر چھوڑ دو۔"

"کیا تم رقم گنو گے؟" سراج نے کہا۔

"نہیں، اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" میں نے کہا۔

جمشید نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" وہ بولا اور عاشی کو دروازے کی طرف کھینچ کے لے گیا۔ سراج نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"کیا خیال تھا؟" میں نے کہا اور جمشید کو روک دیا۔

"یہی کہ دس لاکھ کا گننا آسان نہیں ہوتا۔" جمشید بولا اور پھر عاشی سے مخاطب ہُوا "تم دفع کیوں نہیں ہوتیں؟"

سراج اور جمشید دونوں ہی عاشی کو جلد از جلد کمرے سے دُور بھیج دینا چاہتے تھے۔ یہ بات میرے دل میں شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔

"مس عائشہ! آپ ذرا اِدھر آئیں۔" میں نے کہا "وہ سُوٹ کیس تو آپ کی باجی کا ہے نا؟"

عائشہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ اُس نے اب اپنے آنسو خشک کر لیے تھے۔

"اس میں رقم آپ کے سامنے رکھی گئی تھی؟" میں نے کہا۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو، کھول کے دیکھ لو۔" جمشید نے کہا اور عائشہ کو دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ میں نے ایک جست لگائی اور عائشہ کو پھر دروازے سے اندر کھینچ لیا۔ میرے ریوالور کا رُخ اس عرصے میں سراج اور جمشید کی جانب ہی رہا تھا۔

"میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے عائشہ کو کلائی سے پکڑ کے اندر میز کی جانب پھینک دیا۔ وہ میز کے کنارے کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔

"مجھ سے یہی کہا تھا۔" عائشہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کس نے کہا تھا؟"

"باجی... ہاں باجی نے کہا تھا۔" وہ ہکلا کے بولی۔

"گویا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ اس میں دس لاکھ روپے ڈالے گئے ہیں یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"باجی جھوٹ کیوں بولیں گی؟"

"کیا وہ دس دس لاکھ کے نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس تیار رکھتی ہیں کہ اِدھر مجازی خدا کا حکم ہو اُدھر وہ رقم حاضر کر دیں؟" میں نے کہا۔

عاشی نے بے بسی سے سراج اور جمشید کی طرف سوالیہ نظریں اُٹھائیں، شاید یہ پوچھنے کے لیے کہ بتاؤ اب میں کیا کہوں؟

"چلو تم مجھے کھول کے رقم دکھا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ رقم کتنی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُوپر نوٹ ہوں اور نیچے برابر کیے ہوئے سادہ کاغذ۔ یہ بہت عام ٹرک ہے۔"

"میں... میں اسے نہیں کھول سکتی۔" عاشی نے کہا۔

"کیوں، سیدھا سادہ بریف کیس جیسا سُوٹ کیس ہے۔ قفل بھی نمبر والے نہیں ہیں کہ تم نمبر بھول جاؤ یا کہو کہ مجھے نمبر معلوم ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس چابی نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"نواب صاحب! کیا چابی آپ کے پاس ہے؟" میں نے کہا۔ "ہے تو عاشی کو دے دیں۔"

"چابی... وہ تو تمھارے پاس ہونا چاہیے۔" جمشید نے کہا مگر وہ اتنا اچھا ایکٹر نہیں تھا جتنا دلاور تھا۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ مجرم بن گیا۔

"چلو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "میں اعتبار کر لیتا ہوں کہ رقم پوری ہو گی مگر اب اس سُوٹ کیس کو اُٹھاؤ اور دوسرے کمرے میں چلو۔" میں نے کہا۔ "جہاں سب خواتین محسن کی جنرل نالج کے لیکچر سے مستفید ہو رہی ہیں۔"

عاشی نے سُوٹ کیس اُٹھا لیا۔ سراج اور جمشید کچھ دیر اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ میں نے اُنھیں ریوالور سے اشارہ کیا۔ وہ پھر بھی کھڑے رہے۔

"کیا بات ہے، تم جام کیوں ہو گئے ہو؟ تمھیں اسپیڈ لگاؤں؟" میں نے اُن کے پیچھے جا کے کہا، وہ بادلِ ناخواستہ آگے بڑھے۔

محسن دوسرے کمرے میں کسی کالج کے پروفیسر کی طرح پیریڈ لے رہا تھا اور غالباً سراج کی ماں اور ہونے والی بیوی کو وہ سب کچھ بتا چکا تھا جو انھیں معلوم نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے تمام حقائق کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کر کے پیش کیا ہو گا۔ زیب النساء اور سراج کی ماں یوں بیٹھی تھیں جیسے ان پر فالج گر گیا ہو، اگر انھوں نے محسن کی باتوں پر یقین نہ کیا ہوتا تو ان کے چہروں کا ردِ عمل مختلف ہوتا۔

"عاشی! یہ سُوٹ کیس ایس ایس پی صاحب کی والدہ کو دے دو۔" میں نے کہا۔ "سراج اور جمشید، تم دونوں دیوار کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ، تاکہ تم کچھ نہ دیکھ سکو۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" سراج نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کروں گا۔ تمھاری والدہ یہ سُوٹ کیس کھول کے مجھے دکھائیں گی کہ اس میں نوٹ ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ عائشہ نے سوٹ کیس رکھ دیا۔

"نہیں۔" سراج چلّایا کیونکہ اس کی ماں نے سُوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ ان کی انگلیوں کے ذرا سے دباؤ سے سُوٹ کیس کے ہُک الگ ہو جاتے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے انجان بن کے پوچھا۔ "تم کیوں چلّانے لگے؟"

"سُوٹ کیس مت کھولنا۔" سراج نے اپنی ماں سے کہا۔

"سُوٹ کیس کھلے گا بھی کیسے۔" میں نے کہا۔ "مس عاشی اور نواب صاحب دونوں میں سے کسی کے پاس چابی نہیں ہے۔"

"لیکن اسے کھول کے دیکھنا تو پڑے گا۔" محسن بولا۔ وہ بھی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ "ماں جی! آپ ایسا کریں کہ تالا توڑ دیں۔"

"نہیں... ماں... سُوٹ کیس ان کے حوالے کر دو، یہ خود ہی کھول لیں گے۔" سراج نے سخت لہجے میں کہا۔

"افسوس ایس ایس پی صاحب! آپ نے کوئی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس ایک موقع تھا، وہ آپ نے گنوا دیا۔ ہم نے بہت کچھ آپ سے ہی سیکھا تھا، اب بھی سیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ حماقت کیسے کر سکتے تھے کہ دس لاکھ کی رقم کے بدلے خودکشی کر لیتے، یہ تو مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ دلاور نے فوراً دس لاکھ دینا کیوں منظور کر لیا تھا۔ اپنی بیوی کو خط کیوں لکھ کر دے دیا تھا، وہ بھی آخر دلاور کی بیوی ہے۔ اُسے پہلے سے معلوم ہو گا کہ اس سُوٹ کیس میں کیا ہے۔ دلاور نے اُسے خط میں کوئی اشارہ دے دیا جو وہ جانتی تھی۔ تم نے فرض کر لیا کہ ہم خود ہی سُوٹ کیس کھول کے رقم دیکھنے کی بے وقوفی کریں گے۔ تم عاشی کو وہاں سے جلد از جلد نکالنا چاہتے تھے۔ تم تو جانتے تھے کہ سُوٹ کیس میں بم ہے، اس کو کھولتے ہی دھماکا ہو گا۔ تم فوراً غوطہ مار کے فرش پر لیٹ جاتے، مارے جاتے تو صرف ہم۔"

"دیکھو، مجھے... میری باجی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔" عاشی نے ایک دم چلّانا شروع کر دیا۔ "اُنھوں نے تو خط دیکھ کر رونا دھونا شروع کر دیا تھا کہ کون سے دس لاکھ، اس وقت دس لاکھ کہاں سے لاؤں۔ دلاور نے میرے پاس کوئی دس لاکھ نہیں رکھوائے۔ ایک منٹ میں تو بینک والے بھی دس لاکھ نہیں دیتے، نوٹس مانگتے ہیں۔"

"عاشی، فضول مت بولو۔" جمشید نے غرّا کے کہا۔

"اگر تم نے دوبارہ عاشی کو ٹوکا تو میں تمھیں خاموش رکھنے کے دوسرے کسی طریقے پر عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "جو تمھارے لیے زیادہ ناپسندیدہ ہو گا، آگے کہو مس عاشی۔"

"اس پر جمشید صاحب نے کہا کہ دس لاکھ ایک تجوری میں محفوظ پڑے ہیں۔" عائشہ نے مجبوراً بات جاری رکھی۔ "انھوں نے باجی کو ایک چابی دی اور کہا کہ یہ تجوری کی چابی ہے، اس میں ایک سُوٹ کیس ہے، اسے نکال لو۔ مگر... خبردار! اسے کھولنا نہیں، بس احتیاط سے جیسا رکھا ہے، ویسا ہی اُٹھا لاؤ۔ پھر باجی نے نہیں، میں نے سُوٹ کیس نکالا اور پھر ہم یہاں آ گئے۔"

"تمھیں یہاں لانے کے لیے جمشید نے کیا جھوٹ بولا تھا؟"

"انھوں نے کہا تھا کہ چوہدری صاحب نے سراج کے گھر بلایا ہے، مجھے نہیں معلوم کیوں مگر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی چنانچہ میں آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیا ہے؟"

"معلوم ہو جائے گا، آئندہ چند دن میں تمھیں بہت کچھ معلوم ہو گا مس عاشی۔" میں نے کہا۔ "یہ سُوٹ کیس اُٹھا لو محسن، ان دونوں کا خیال رکھنا، میں خواتین کو لے جا رہا ہوں۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" سراج نے چیخ کر کہا۔

"میں ایسا ہی کرنے کی نیّت سے آیا تھا ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔ "اور ایسا ہی ہو گا۔ خواتین ہمارے ساتھ جانے کے لیے ہی آئی ہیں۔ تم اور جمشید یہاں رہو گے، صبح تک دلاور بھی پہنچ جائے گا۔"

"تم... تم مجھے بھی لے جاؤ گے؟" سراج کی ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خیر، میں چلتی ہوں مگر اسے چھوڑ دو..." وہ زیب النساء کے سامنے آ گئی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "ایس ایس پی صاحب کی والدہ، نواب خسرو جمشید کی بہن اور دلاور کی سالی، ہم نے انھی کا انتخاب کیا تھا۔"

"آخر کیوں، کیا چاہتے ہو تم؟" سراج کی ماں رونے لگی۔

"ماں جی، آپ فکر مت کریں۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی کی جان کے دشمن نہیں ہیں، ہم ایک سودا کریں گے۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دیں کہ وہ جلد از جلد ہم سے معاملات طے کرے تاکہ آپ سب واپس آ جائیں۔ مزید دیر اور خرابی کے ذمّے دار ہم نہیں، یہ لوگ ہوں گے جن میں آپ کا فرزند بھی شامل ہے۔"

زیب النساء اچانک نیچے لڑھک گئی۔ جمشید آگے بڑھا ہی تھا کہ محسن نے اُسے مشین گن کا بٹ مار کے پیچھے کر دیا۔ جمشید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا مگر وہ بے بس تھا۔ "زیبا بے ہوش ہو گئی ہے۔" وہ بولا۔

"ہونے دو، ہم اسی حالت میں لے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تم ہمیں روک نہیں سکتے۔ دخل دو گے تو اچھا نہیں کرو گے، نہ اپنے لیے اور نہ ان کے لیے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا راستہ روکا نہیں جا سکتا۔"

"یہ... جو یہاں موجود ہیں، اپنی جان پر بھی کھیل جائیں گے، تم مجھے مجبور مت کرو۔" سراج نے کہا۔

"جتنے لوگ یہاں اس وقت موجود ہیں، اس سے زیادہ گولیاں ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر تم خون خرابا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی، چھوڑ دو اپنے کتّوں کو اور پھر دیکھو کہ ہم کیسے شکاری ہیں اور ہمارا نشانہ کیسا ہے۔"

"دیکھو سکندر، اگر تمھارا کوئی مطالبہ ہے تو مجھے بتاؤ، ان عورتوں سے تم کچھ نہیں مانگ سکتے۔" سراج نے کہا۔

"ہم ان کو اس وقت تک اپنے پاس رکھیں گے جب تک ہمارے ساتھی تمھارے پاس رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"اور اگر رابعہ کو پہنچا دیا جائے...؟"

"صرف رابعہ ہی نہیں، ایک اور دوست بھی ہے ہمارا۔" میں نے کہا۔ "وہ دونوں بخیر و عافیت پہنچ جائیں گے تو پھر دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے کیا مطلب؟" جمشید نے غصّے سے کہا۔

"دیکھنا یہ ہو گا کہ تمھاری اگلی چال کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اُمید ہے اس کے بعد تم ایک بات ضرور سمجھ جاؤ گے۔ اب تک تم نے کچھ فائدہ ضرور اُٹھا لیا۔ آئندہ ہم اخلاق اور شرافت کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیں گے، اس لیے تم کو بھی محتاط رہنا ہو گا۔ ہم اب جا رہے ہیں۔ ہمارا راستہ کھلا چھوڑ دو اور ہمیں نکل جانے دو۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم تمھیں فون کریں گے۔"

"صرف اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دیں گے اور اگر تم نے راستے بند کیے...." محسن بولا۔ "تو ہم یہ بریف کیس کھول دیں گے۔"

"گاڑی کے اندر ہی۔" میں نے سر ہلایا۔ "جس میں ہمارے ساتھ دوسرے بھی ہوں گے۔ تم انھیں بھی ہمارے ساتھ دوسری دُنیا میں بھیجنا چاہو تو تمھاری مرضی، وہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔"

"نواب صاحب کا دُہرا نقصان ہو گا۔" محسن ہنسا۔ "گاڑی سے زیادہ حسین بہن اور بہن سے زیادہ قیمتی نئی گاڑی نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہے گی۔ سراج کی ماں نہیں رہے گی اور اسے تیسری جگہ منگنی کرنا پڑے گی، دوسری منگیتر کو بھول کر۔۔۔ سب سے کم نقصان میں دلاور رہے گا جس کی صرف سالی جائے گی۔"

"سالی بھی آدھی گھر والی ہوتی ہے۔ چوہدری صاحب بڑے مہربان ہیں آج کل، ممکن ہے پوری گھر والی بنانے کا سوچ رہے ہوں۔ منگوائی تو تھی پُرانی بیوی کہ ضائع ہو جائے تو نئی کر لیں۔ چمکتی دمکتی، انگلش اور فرنچ بولنے والی جو سیاست کے کاروبار میں اچھی پی آر کے لیے ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

میری بات پر عاشی کا رنگ فق ہو گیا۔ اگر یہ جھوٹ ہوتا تو وہ مشتعل ہوتی مگر میں نے اس سچ کو پکڑ لیا تھا جو دل میں چور بن کے چھپا ہوا تھا۔ "تم گندے ذہن کے مالک ہو۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"ہاں، چوہدری صاحب ہیں بس صاف ستھرے ذہن کے مالک، ایک بہن کو دل میں رکھتے ہیں تو دوسری کو نظر میں۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے عقل مند کہتے ہیں۔ داشتہ آید بکار۔ فرنچ اور فارسی میں فرق ہے، تم نے یقیناً داشتہ کا مطلب غلط لیا ہو گا۔"

"ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ وہ دور اندیش ہیں۔۔۔" محسن بولا۔ "ایک بیمار عورت مر بھی تو سکتی ہے۔ فرشتۂ اجل ویسے بھی چوہدری صاحب کے دربر دست بستہ اُن کے اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ کم سے کم وہ خود ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ گھر کی مرغی دال برابر، بچوں کی خالہ ماں برابر۔"

میں نے اندازے اور قیاس کی بنیاد پر ایک بات کی تھی جو اتنی سچ تھی کہ عاشی کے چہرے پر فردِ جُرم کی تحریر بن گئی۔ اُسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا، وہ اس کی تردید کر سکتی تھی مگر سب کے سامنے یہ انکشاف ایسا ہی تھا جیسے کوئی بھرے بازار میں اس کے کپڑے اُتار دیتا۔ مجھے یقین آ گیا کہ دلاور نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا اور بہت جلد ہم اس کی موت کی خبر بھی سُن لیں گے، یہ موت بھی بالکل طبعی ہو گی جیسے اُس کی بیماری کو طبعی سمجھا جا رہا ہو گا اور کسی کو شک نہ ہو گا کہ وہ مسیحا نہیں قاتل ہے جو اس کو دوا دیتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا تھا اور اب پھر ہو رہا تھا۔ ہم نے قبل از وقت سب پر ایک راز افشا کر دیا تھا لیکن ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس سے کچھ نہیں ہو گا۔

"چل یار، ہمیں کیا ان کے گھریلو معاملات سے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اپنے مسائل بہت ہیں تو عاشی کو اور سراج کی ماں کو لے کر گاڑی تک چل۔ ایس ایس پی صاحب! آپ آگے چلیں، محسن آپ کے نقشِ قدم دیکھتا آئے گا اور موت بن کے پیچھے چلے گا، تمہارے محافظ بھی دُور ہوں گے، تمہاری آواز اُن تک دیر

سے پہنچے گی، گولی قریب سے آئے گی اور تیز رفتار ہو گی۔ سب کتّوں کو پٹا ڈال کے رکھنا۔"

سراج نے تعمیل کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ ہمارا پلان ناکام ہو چکا تھا اور ان دونوں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ سراج کی ماں اب بالکل چُپ تھی۔ شاید محسن کی باتیں سُن کے وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ اُسے جو سزا مل رہی ہے اپنے ہی بیٹے کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ عاشی اُس کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھی چنانچہ سر جھکائے سراج کی ماں کے ساتھ رہی۔ محسن ان کے پیچھے یوں کہ اُس نے پھر ایک بستر کی چادر کندھوں پر ڈال لی اور مشین گن کو اُس کے نیچے کر لیا تھا تاکہ باہر والے اسے

صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے کنٹرول میں تھی۔ باہر سارے فرض دار لوگ سمجھ چکے تھے کہ اندر کیا ڈراما ہو رہا ہے۔ ان سے کوتاہی ضرور ہوئی تھی مگر وہ کسی طرح بھی قصور وار نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ خود ایس ایس پی صاحب نے حکم دیا تھا کہ ان کو اندر آنے دیا جائے جن کو انھوں نے گیٹ پر روکا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ صرف تعمیلِ حکم کر رہے تھے۔ اگر وہ اپنی دانست پر کچھ کرتے تو ایس ایس پی صاحب یا ان کی فیملی کو نقصان ہوتا چنانچہ وہ تعاون کر رہے تھے۔ ابھی تک کوٹھی کے باہر کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی تھی۔

"چلیے نواب صاحب، اُٹھائیے اپنی ہمشیرہ کو۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ دیر زیب النساء کو دیکھتا رہا جو بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ "کیا یہ مناسب ہوتا اگر خود سراج اسے اُٹھا کے لے جاتا؟"

میں نے کہا۔ "معلوم نہیں تم ایسا کیوں کر رہے ہو جمشید! ایسی بہن کو کس کے حوالے کر رہے ہو؟" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ زیب النساء کو اُٹھانے لگا۔

"ہاں، سب ہی معاملات تمہارے ذاتی معاملات ہیں، تم بہنوں کو بھی کاروبار میں سرمایہ سمجھ کے لگا دیتے ہو، خواہ بعد میں سرمایہ ڈوب جائے، تمہارے لیے سب مالِ تجارت ہے۔" میں نے کہا اور جمشید کے پیچھے چلنے لگا۔ "لیکن میری مانو تو اسے زہر دے دو، کم گناہ ہو گا۔"

"تم اس لڑکی کے دماغ میں زہر بھر دو گے، اسے سراج کے خلاف کر دو گے۔" وہ آگے چلتے ہوئے بولا۔ "مگر اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گا، تم اس لڑکی کے لیے مشکلات پیدا کرو گے اور کچھ نہیں۔ شادی تو اسے کرنا ہی پڑے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی تمہارا فیصلہ قبول نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "یہ خودکشی کر لے گی یا گھر سے بھاگ

جمشید نے مجھے پلٹ کے دیکھا۔ "اپنی بہن کو میں جانتا ہوں۔"

"میں نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "کہ تم اسے بہن بھی سمجھتے ہو۔"

اس وقت تک ہم باہر گاڑی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ محسن نے عاشی کو آگے بٹھایا تھا اور خود عین اُس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ درمیان میں سراج کی ماں تھی اور دوسری طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جمشید نے بہن کو اس دروازے سے سراج کی ماں کی گود میں ڈال دیا۔

"یہ آپ کی ہی امانت تھی۔" جمشید نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"امانت ہی رہے گی، جب تک زندگی ہے۔" سراج کی ماں نے کہا۔

"آپ دونوں پیچھے ہٹ جائیں۔" میں نے کہا۔ "رخصتی کے منظر کو زیادہ دردناک نہ بنائیں اور خیال رکھیں کہ یہ دہشت ناک نہ بنے۔"

"سکندر!" جمشید نے کچھ کہنا چاہا اور پھر چُپ ہو گیا۔ شاید اُس نے الفاظ کے بے اثر رہنے کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے چابی محسن سے لی۔

"وہ سُوٹ کیس کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈکی میں۔" محسن نے کہا۔

"اس میں پورے دس لاکھ ہیں۔" جمشید بولا۔ "تم کھولو گے تو معلوم ہو جائے گا۔"

"ہم۔۔۔ ہم کیوں کھولیں گے۔" میں نے کہا۔ "شاید کسی دن خود تم ہی اسے کھولو گے۔"

"عاشی اسے کھول سکتی ہے۔" جمشید نے آخری وقت میں مجھے اس راز سے باخبر کر دینا بہتر سمجھا، وہ اپنی بہن کی طرف سے پریشان اور خوفزدہ تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ لاعلمی میں ہم زیب النساء سے یہ کام کرنے کو کہیں تو وہ ماری جائے۔

"اس اطلاع نے تمہاری بہن کو بچا لیا۔" میں نے کہا۔ "اور سراج کی ماں کو بھی۔"

گاڑی آگے بڑھی تو دروازہ سراج کے اشارے پر کھول دیا گیا۔ محسن پوری طرح چوکس تھا، اگر کوئی حرکت بھی کرتا تو اس کی مشین گن سے آگ اُگلنے لگتی۔

چند منٹ میں ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے۔ مجھے اطمینان ضرور تھا کہ جب تک ہمارے پاس تین یرغمالی ہیں، سراج بھی طاقت کے استعمال سے گریز کرے گا مگر پھر بھی میں اتنا مستعد تھا کہ ہر لحظہ میری نظر ویران سڑک پر رہی۔ میرے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ درخت کا سایہ بھی زمین پر حرکت کرتا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے اچانک ہر طرف اندھیرے میں

چھپ کر بیٹھے ہوئے مسلح افراد کو حملہ کرنے کا اشارہ مل گیا ہے اور وہ ہمارے سامنے صف در صف کھڑے ہو کے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار بنا دیں گے۔ سناٹے نے مجھے سرگوشیاں سی محسوس ہوتی تھیں اور میرے کان کسی دھماکے کے منتظر تھے جو سکوتِ شب کو پارہ پارہ کر دے اور ہماری پیش قدمی روک دے۔

ذہنی طور پر میں تیار تھا کہ میرے راستے میں سنگ و خشت کی دیوار بھی ہو گی تو میں گاڑی کو اس سے ٹکرا دوں گا یا دیوار سے گزر جاؤں گا یا اسی دیوار کے ملبے میں سب دفن ہو جائیں گے۔ ہمارے خلاف شہر کی انتظامی مشینری حرکت میں آ چکی تھی اور پولیس اس بار زیادہ پیشہ ورانہ تن دہی سے ہماری تلاش میں سرگرمِ عمل تھی کیونکہ معاملہ ان کے اپنے محکمے کے ایک انتظامی سربراہ کا تھا۔ ایس ایس پی قسم کا ہر نیا افسر جب چارج لیتا ہے تو پبلک کے سامنے پریس کے ذریعے بڑے اُمید افزا بیانات کا تاثر قائم کرتا ہے اور قانون کی سخت گیری، مساوات اور مستعدی کو مثالی بنانے کے دعوے کرتا ہے۔ اخبارات میں اس قسم کے بیانات آنے لگتے ہیں کہ قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ معاشرے کے ناسوروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ شرپسندوں سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ جرائم پیشہ افراد اور بدعنوانی کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے یہی بیانات بار بار پڑھنے والے عوام پھر بھی اُمیدیں باندھ لیتے ہیں کہ شاید کچھ ہو مگر ہوتا کچھ نہیں۔ خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں! اور جہاں سراج جیسے حاکم ہوں اور رضوی صاحب جیسے معتوب، میرے خیالات کی رو محسن نے توڑ دی۔ "کس خیال میں گُم ہے سکندرِ اعظم؟"

"کیوں، کیا ہُوا؟" میں نے کہا۔

"میں نے کچھ کہا تھا۔" محسن بولا۔

"وہ، دراصل یار میں انکل رضوی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا ظلم ہے، ان کے ساتھ اور ہمارے ساتھ۔ اس شہر کے لوگوں کے ساتھ کہ ایک ایمانداری اور فرض شناسی میں مثالی کردار رکھنے والے کی جگہ آیا بھی تو کون۔۔۔ سراج، جسے ان صفات سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔"

"گو وہاں نہیں یہ وہاں سے نکلے ہوئے تو ہیں۔ کعبے سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی۔" محسن بولا۔ "ہیں تو دونوں پولیس والے، ایک زمین ہے اور ایک آسمان تو یہ تضاد ہمارے قومی مزاج کا ہے۔ اچھا تو ذرا گاڑی روک لے۔"

میں نے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ "کیا بات ہے؟"

"میں عاشی کو اندھا کر دینا چاہیے۔" محسن بولا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"کیا؟" عافی نے سہم کر چیخ ماری "اندھا کرو گے مجھے!"

"وقتی طور پر" محسن بولا "آپ کی آنکھیں بند کریں گے، آپ ہی کے دوپٹے سے۔ زیب النساء تو ہوش میں ہی نہیں۔"

"میں تو واقعی پھر غیر محتاط ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

عاشی کی آنکھوں پر میں نے پٹی باندھی۔ اُس نے احتجاجی انداز میں اس کی اجازت دی۔ سراج کی ماں نے چُپ سادھ لی تھی اور خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بوڑھی عورت کی حالت پر مجھے افسوس ہوتا تھا جس نے ایک بیٹے کو سب ماؤں کی طرح بڑی نیک خواہشات اور تمنّاؤں کے ساتھ پال پوس کے بڑا کیا تھا اور کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ ایک وطن فروش اور غدار بنے مگر اب وہ اپنی تمام عمر کی محنت کے رائیگاں جانے کا دُکھ اُٹھا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی جس کی قدرت نے یہ سزا دی۔ وہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ خطرہ عاشی ثابت ہو سکتی تھی جو شاید دلاور کے مستقبل کی ہمسفر بننے کے لیے نیکی بدی کی تمیز کھو بیٹھی تھی۔ اس نے دلاور کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ساتھ ہر قدم کا تھا خواہ وہ غلط سمت میں اُٹھے۔ اس کا آغاز ہی غلط تھا۔ عاشی نے اپنی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کرنا منظور کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہُوا تھا۔ کیا عافی اور اس کی باجی کے درمیان پہلے سے جذباتی دوری تھی؟ آخر اسے کس چیز نے دلاور کی طرف کھینچا تھا۔ دلاور کی شخصیت اتنی پُرکشش ہرگز نہ تھی کہ عاشی جیسی لڑکی اس پر مرمٹتی مگر لڑکیوں کا کیا بھروسا، یہ میں کیسے جان سکتا ہُوں کہ عورت کی نظر کیا ہے۔ لیلٰے را باچشم مجنوں باید دید، تو پھر مجنوں کو بھی لیلیٰ کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ دوسری قابلِ قبول وجہ دلاور کی موت ہو سکتی تھی۔ دلاور کی بیوی بن کے ملنے والی شہرت اور عزّت ہو سکتی تھی جس کی طرف عاشی کو خود دلاور نے کھینچا ہو گا۔ لالچ دے کر بُلایا ہو گا اور ناپختہ شعور رکھنے والی اور بے مہار خواہشات رکھنے والی عاشی نے اسے اپنی کامیابی جانا ہو گا کہ اس نے ایک ہوشیار صنعت کار، کاروباری اور سیاسی طور پر سمجھ دار، بااختیار اور صاحبِ اعتبار شخص پر اتنی آسانی سے اقتدار حاصل کر لیا۔

گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوئی تو میرے دل میں عاشی سے نفرت کے جذبات میں شدّت آ چکی تھی۔ عورت کو عورت کا گھر اُجاڑتے، اسے شوہر کی ملکیت اور گرہستی کا مالک ہونے کی خوشی سے محروم کرتے اور احساسِ رسوائی و ذلّت دے کر زندگی سے متنفر کرتے دیکھا اور سُنا تھا مگر کیا عورت صرف عورت ہوتی ہے، بہن نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ ہر عورت عاشی نہیں ہوتی جیسے ہر مرد دلاور نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی منفی سوچ کو کنٹرول کیا۔

تاہم عاشی سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ بے وقوف لڑکی نہیں تھی اور محسن نے اس کی آنکھیں کھُلی چھوڑنے میں خطرہ محسوس کیا تھا تو یہ احتیاط پسندی کا تقاضا تھا۔ وہ راستہ نوٹ کر سکتی تھی۔ دلاور نے اُسے شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کرتے وقت کیا دیکھا تھا۔ صرف اس کا نو دمیدہ گلاب جیسا تازہ شباب اور حُسنِ خانہ خراب۔۔۔ یا اس کے ساتھ شمعِ محفل بن جانے کی وہ اضافی صلاحیت جو چراغِ خانہ قسم کی پہلی بیوی میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اُس سے پوچھوں اور پھر اُسے غیر ذاتی مسئلہ سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

صُبح کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے گاڑی کو اپنے گھر یا موجودہ ٹھکانے کے سامنے روکا۔ اندر کے ہر کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ باہر سے جالی کے شیشوں پر نظر آتی تھی مگر خاموشی مکمل تھی۔ میں نے ایک بار کار کا ہارن بجانے میں کوئی ہرج نہ سمجھا پھر نیچے اُتر کے گیٹ تک گیا اور کال بیل دبائی اور اس کے کھُلنے کا منتظر رہا جو اندر سے بٹن دباتے ہی گیٹ کے کھُلنے کی خبر دیتا۔ انتظار کے آدھے منٹ کا ہر سیکنڈ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ خطرے کی سرگوشی ایک پکار بننے لگی۔ میں نے اضطراب میں بار بار کال بیل بجائی۔

"کیا بات ہے؟" محسن نے کہا "کال بیل تو بج رہی ہے۔"

"ہاں، کیا سب سو گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔

میں گیٹ پر چڑھ کے اندر کُود گیا۔ کیتھرین اور جُولی بھی اگر سو جاتیں تو مسلسل کال بیل سُن کے اب تک جاگ جاتیں۔ غالب یا چوہدری دلاور کے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اندر یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھا اور دروازے پر لات ماری، دروازہ پہلے ہی کھُلا ہُوا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے اس کمرے کو خالی پایا جس میں غالب اپنی پلاستر میں لپٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ موجود تھا۔ ہم نے اسے ریوالور کے ساتھ بیڈ پر بیٹھا ہُوا چھوڑا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ وہ خود دلاور کی نگرانی کرے گا۔ دلاور صرف ایک ہی دروازے سے باہر آ سکتا تھا اور غالب کے ریوالور کا رُخ اسی دروازے کی سمت میں تھا۔

میرا دل کسی بہت منحوس خبر سے ڈرنے اور لرزنے لگا "غالب!" میں نے چلّا کے کہا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"اِدھر آ جا یار" غالب کی آواز آئی۔

میں دروازے کے وسط میں رُک گیا پھر میرے منظر کی ہولناکی پر ٹھہر گئی جو میرے سامنے آ گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں کیتھرین بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی، بالکل چت اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ دلاور بیٹھا ہُوا تھا لیکن وہ کُرسی سے نہیں بندھا ہُوا تھا۔ کُرسی کمرے میں ایک طرف گری ہوئی تھی اور وہ رسّی بھی وہیں پڑی تھی۔ دلاور کے دائیں بازو کی آستین کہنی سے کچھ اُوپر خون سے تر تھی اور وہ دوسرے ہاتھ سے زخم کو دبائے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ غالب اس کے بالکل سامنے والی دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر یوں بیٹھا تھا کہ اس کی پلاستر والی ٹانگ سیدھی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

"کیتھرین" میں نے چلّا کے کہا اور گھُٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اُٹھایا پھر اس کے سینے پر سر رکھ کے دل کی دھڑکن کو سُنا۔ یہ سب غیر ضروری تھا۔ اُسے پہلی نظر میں دیکھتے ہی مجھے یقین آ چکا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں پھر بھی چاہتا تھا کہ اپنے یقین کو خود ہی جھٹلا دوں۔ اس سچ کو جھوٹ کرنے کی خواہش نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں نبض اور دل کی دھڑکن دیکھوں۔ میں نے دلاور کی طرف دیکھا تو وہ مجھے گھُور رہا تھا۔

"ہاں، میں نے مارا ہے اسے" دلاور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے غالب کی طرف دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ شاید اس نے مجھے آواز دی تھی۔

"سکندر! پہلے میری بات سن لے" غالب نے چلّا کے کہا۔ میرے، دلاور کی جانب بڑھتے قدم اور اس کی گردن کو دبوچ کے سانس کا رشتہ توڑ دینے کی آرزو سے مغلوب ہاتھ رُک گئے۔

"وہ جُولی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم، وہ بھاگ گئی تھی" غالب نے کہا۔ "تو اکیلا ہے کیا؟ باقی لوگ کدھر ہیں؟"

"باہر گاڑی میں" میں نے کہا اور باہر کا گیٹ کھولنے والا بٹن دبایا۔

"کون کون ہے؟" غالب نے پوچھا۔

"ابھی سب سامنے آ جاتے ہیں" میں نے پھر باہر کا رُخ کیا۔ محسن میری واپسی میں دیر سے پریشان ہونے لگا تھا۔

"کیا ہُوا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "بس جو ہونا تھا ہو گیا" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "یہاں کیا بتاؤں!"

محسن میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ کوئی سنگین صورتِ حال درپیش ہے لیکن اُس نے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور خود بھی باہر آ گیا۔

"اندر چلو" میں نے عائشہ سے کہا "آپ بھی ماں جی۔"

"مجھے کیا معلوم کہ اندر کیا ہے اور باہر کیا" عائشہ نے کہا اور مجھے خیال آیا کہ اس کی تو آنکھوں پر پٹی ہے۔ میں ذہنی طور پر اتنا اپ سیٹ تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو رہا تھا۔ جب میں، عائشہ اور سراج کی ماں کو ہاتھ تھام کے اندر لے جا رہا تھا تو محسن تیزی سے آگے نکل گیا۔ پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی زیب النساء سے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ فرار ہو جائے گی۔ غالباً اندر جاتے ہی محسن پر اس اندوہناک خبر کی بجلی گری کہ کیتھرین مر گئی ہے اور جُولی پاگل پن میں گھر سے نکل گئی ہے۔ میں نے اس کے چیخنے چلّانے اور دیوانہ وار گالیاں بکنے کی آواز سُنی۔ گالیاں وہ دلاور کو دے رہا تھا اور شاید اُس پر ٹوٹ پڑا تھا کیونکہ غالب اُسے چلّا چلّا کے ہوش میں رہنے کو کہہ رہا تھا۔ جو گالیاں محسن نے دیں، وہ حد درجہ فحش تھیں اور اس کے ناقابلِ برداشت صدمے کا اور [illegible] کی کیفیت کا نتیجہ تھیں۔ میں نے عائشہ کے اور سراج کی ماں کے چہرے پر کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے دوچار ہونے کا خوف دیکھا۔

انھیں ایک طرف بٹھا کے میں محسن کی طرف گیا۔ اس نے دلاور کو دھُن کر رکھ دیا تھا۔ دلاور پھر اُسی طرح بیٹھا ہُوا تھا لیکن اس کے چہرے پر چوٹوں کے آثار تھے۔ اس کے لبوں سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گولی کے زخم کو دبا کے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کے زخم سے زیادہ خون بہہ کر پورے ہاتھ کو تر کر چکا تھا۔ محسن نے اس کے کپڑے بھی پھاڑے تھے اور اس کے سر کے بال پکڑ کے کھینچے تھے یا سر دیوار سے ٹکرایا تھا کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا اور اپنی جگہ بیٹھا ہُوا جھُول رہا تھا۔

"محسن، بس کر یار! اس کو مارنے سے کیتھرین تو واپس آنے سے رہی" میں نے کہا "ہمیں جُولی کی فکر کرنا ہے۔ اس کو تو واپس کرنا ہی ہے تاکہ رابعہ اور ٹیڈی کی واپسی کی صورت پیدا ہو۔ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے دوست، ہم دونوں کو۔۔۔"

"ہاں یار، بس صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں پاگل ہو جاتا۔" محسن نے کہا "اب تو ہم ہی ہیں۔ کیتھرین اور جُولی کے بغیر ہم یہ سب کیسے کریں گے۔"

"ہاں، سوچا تھا کہ تینوں عورتوں کو ان کی تحویل میں دے کر نکل جائیں گے" میں نے کہا۔

"اب ایک کام بڑھ گیا۔ کیتھرین کو سپُردِ خاک کرنے کا" غالب نے رنج سے کہا "خدا اس کے گناہ معاف کرے، ایک زندگی میں اس عورت نے بہت دُکھ اُٹھائے جو کئی زندگیوں کا بوجھ تھے۔"

"میں۔۔۔ میں اسے بھی لے آؤں" میں نے کہا "اور پھر گاڑی کو ٹھکانے لگا دوں، کسی نے دیکھ لیا تو۔۔" میرا جملہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نامکمل رہ گیا کیونکہ باہر کسی نے گاڑی کا دروازہ بند کیا تھا۔ پچھلی سیٹ کا ایک دروازہ میں کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر کھڑی ہوئی گاڑی کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ رات کو گشت کرنے والے چوکیداروں یا پولیس والوں نے ایک گاڑی کا کھلا دروازہ دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھا ہوگا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شکوک رفع کرنے کے لیے رُک گئے ہوں۔

پھر سارے بند دروازے دیکھ کر مجھے یہ خیال آنا لازمی تھا کہ پیچھے والا دروازہ کیسے بند ہو گیا۔ ہوا تھی بھی نہیں اور ہوا کیا آندھی سے بھی ایک مرسیڈیز کا بھاری بھرکم دروازہ بند ہونا مشکل تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے دروازے کو پھر کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا، وہ سیٹ اب خالی پڑی تھی، جس پر میں زیب النساء کو بے ہوش چھوڑ گیا تھا۔

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ میں اس بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح اور معصوم نظر آنے والی لڑکی سے ایسی چالاکی اور مکاری کی کیسے توقع رکھ سکتا تھا اور وہ مجھے اعتماد سے دھوکا دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ بے ہوشی کا مکر کیے پڑی رہی تھی اور موقع کی منتظر تھی جو ہم نے اپنی بے وقوفی سے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ اب تک ہمیں کسی پر اعتبار نہ کرنا آ جانا چاہیے تھا مگر ہم تھے کہ کہیں نہ کہیں فریبِ اعتبار میں مار کھا جاتے تھے۔

میں نے سڑک پر دُور دُور تک دیکھا لیکن ہر سو سناٹا تھا اور ہر شے ساکت تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ بہت دُور نہیں جا سکتی تھی۔ اگر وہ سڑک پر سیدھا بھی گئی تو نظر میں آ جاتی چنانچہ وہ چالاک لڑکی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ میں اب تک بے یقینی میں مُبتلا تھا، وہ سب اُس کی اداکاری تھی۔ یہ کیسے کیسے فنکار پڑے ہیں دُنیا میں۔ اب تک اداکاری میں پہلا نمبر دلاور کا تھا جو صورت کے تاثرات، آواز اور لب و لہجے پر حیرت انگیز قدرت رکھتا تھا اور کبھی معلوم نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ یا کیا کہہ رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے مگر یہ لڑکی، اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ مجھے بار بار اس کا سہما سہما انداز۔ خود کو "ہم" کہنا۔ ہائے اللہ اور واللہ کہنے کی معصوم ادا، اُس کا رو ناد ھونا، خاموش اظہارِ بے بسی، کیا وہ سب ڈراما تھا، تھی نا آخر جمشید کی بہن جو خود الیاس ڈراما صبا ہے کہ اپنی اصل شخصیت کو دُوسرے چہروں میں چھپا کے رکھتا ہے۔

میں دونوں جانب دیکھتا ہُوا اور ہر آواز پر کان رکھتا ہُوا پیچھے گیا، اگر وہ کسی درخت کی اوٹ میں یا کسی دیوار کے سائے میں [illegible] تی تو مجھے دکھائی دے جاتی۔ آدھے منٹ سے کم وقت میں وہ کتنی دُور جائے گی۔ میں نے سوچا، وہ کون سی سو میٹر دوڑ کی چیمپئن تھی اور پھر غرارے کے ساتھ وہ بھاگ بھی کیسے سکتی ہے۔ دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی تو میں پہنچ گیا تھا۔

میں پچاس قدم کے فاصلے سے واپس ہُوا اور گاڑی سے آگے نکل گیا۔ اُلّو کی پٹھی، غصّے اور جھنجلاہٹ میں میرے لبوں سے اُس کے لیے گالی ہی نکل سکتی تھی۔ ہاتھ آ جائے تو مار مار کے مگر وہ ہاتھ نہ آئی تو؟ ایسی چالاک لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے۔ اُس کے ذہین ہونے میں کوئی شک نہیں، وہ فوراً کسی کوٹھی میں گھس جائے گی۔ ایک تو عورت ذات پھر جوان لڑکی صورت سے شریف اور معصوم نظر آنے والی، اُس کی جگہ کوئی مرد منہ اُٹھا کے کسی بھی گھر میں گھس جائے تو مار کھائے مگر اسے کسی کا ڈر نہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اِدھر اُدھر کی کوٹھیوں کو دیکھا لیکن سب میں اندھیرا اور سکوت مکینوں کے محوِ خواب ہونے کا پتا دیتا تھا۔ وہ کسی بنگلے میں ہو گی، شاید وہ مجھے دیکھ رہی ہوگی اور منتظر ہو گی کہ میں لوٹ جاؤں تو وہ دستک دے اور گھر والے اُٹھ کر دروازہ کھولیں تو انہیں بتا دے کہ کس طرح بدمعاش ایک ایس ایس پی کے گھر سے تین عورتوں کو اُٹھا لائے ہیں اور اب وہ کہاں موجود ہیں، وہ فون کر دے گی اور آدھے گھنٹے میں یا اس سے بھی پہلے پولیس پہنچ جائے گی، وہ جس گھر سے فون کرے گی، وہاں رہنے والا خود پولیس کو صحیح پتا سمجھا دے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں ہمارا یہاں رُکنا خطرات کی دلدل میں اُتر کے ڈوبنے کے مترادف ہوگا۔ عین اس وقت جب ہم اپنی کامیابی کے یقین سے سرشار تھے، ایک اُلھڑ اور نادان نظر آنے والی لڑکی نے ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھالیا، اُس نے اپنے رویّے سے خود کو بے ضرر ثابت کرنے کی بہترین اداکاری کی اور ہمیں اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں، وہ مصوّر تھی۔ اس کی نظر تو بہت تیز ہوگی۔ چیزوں کے ظاہر اور باطن تک اُتر جانے والی اور احساس کے ہر رنگ سے آشنا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے طے کر لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ شور مچا کے اور لڑ کے وہ نہیں جیت سکتی تھی۔ [illegible]ے کمزور ہونے اور شکست خوردہ نظر آنے کا کھیل رچایا اور اپنی ہار کو بالآخر جیت میں بدل دیا۔

میں سخت پریشانی میں واپس ہُوا۔ اب یہ انتہائی ضروری ہو گیا تھا کہ ہم اس جگہ سے نکل جائیں۔ میں نے سب سے پہلے محسن کو خبردار کیا۔

"یار! وہ حرّافہ نکل گئی، زیب النساء۔" میں نے محسن کو باہر بُلا کے کہا۔

"نکل گئی، کیا مطلب؟" محسن بھونچکا رہ گیا۔ "بھاگ گئی؟"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

"ہاں بھاگ گئی، وہ بے ہوش نہیں تھی، مکر کیے پڑی تھی۔"

"اوہ مائی گاڈ! لیکن بھاگ کے کہاں جا سکتی ہے وہ؟" محسن بولا۔

"میں نے ادھر اُدھر دیکھ لیا... یا تو وہ کہیں چھپی ہوئی ہے یا کسی گھر میں گھس گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے ساری رات تلاش نہیں کر سکتے۔"

"ساری رات کیا، ہم ایک گھنٹا بھی یہاں محفوظ نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ کہیں سے فون کر کے ہمیں پھنسا دے گی اور ہم ایسے پھنس جائیں گے جیسے چوہے دن میں چوہے پھنس جاتے ہیں مگر کمال ہو گیا یار، وہ سب اس کی اداکاری تھی۔"

"بس یار، دھری رہ گئی ہماری سب افلاطونیت۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "لعنت ہماری مردانگی پر اور بہادری پر۔ بہت چالاک بنتے تھے، ریوالور اور مشین گن لے کر گئے تھے، کیسا جوتا مار کے گئی ہے منہ پر۔"

"ہم کتنے بڑے گدھے ثابت ہوئے۔" محسن بولا۔ "کہ اس ناگن کو بے ضرر سمجھ لیا۔ اب تو واقعی نکلو یہاں سے، ورنہ محصور ہو جائیں گے سب۔ میرا تو دل نہیں مانتا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی تھی۔ نہ سراج نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار کیا، نہ خسرو جمشید نے۔ میرا مطلب ہے اس کا رویہ دیکھ کر۔ وہ ایسی تو نہیں تھی جیسی بن گئی تھی۔"

"وہ کنفیوز تو ہوئے ہوں گے کہ وہ ایسے کیوں بول رہی ہے اور اس طرح کیوں وی آئی پی ہیو کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس خیال سے خاموش رہے ہوں گے کہ اس کا کوئی مقصد ہے اور شاید وہ کچھ کر جائے جو دوسرے نہیں کر سکیں گے۔ ان کو کیا ضرورت تھی زیب النساء کا راز فاش کرنے کی اور دیکھ لو، وہ اس لشکرِ جرار سے بڑی طاقت ثابت ہوئی جو ایس ایس پی کے قلعے کی حفاظت پر مامور تھا، کم سے کم اس نے خود کو بچا لیا۔"

غالب کو یہ صورتِ حال جان کے سخت تشویش لاحق ہونا لازمی تھی۔ "اب کیا کریں؟ نکل جائیں؟"

"بالکل نکل جائیں اس جگہ سے جتنی دور جا سکتے ہوں اور جتنی جلدی جا سکتے ہوں۔" میں نے کہا۔

"مگر یار، جُولی؟" غالب نے دکھ سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "وہ کہاں جائے گی، میرا مطلب ہے آئے گی تو؟"

"کیا معلوم آئے گی یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس وقت ہم خود کو بچائیں یا جُولی کی فکر کریں۔ تم نے اسے کدھر جاتا دیکھا تھا؟"

"میں نے تو بس کمرے سے فرار ہوتے دیکھا تھا جب دلاور نے اس کی ماں کو مارا تو وہ چلائی تھی۔ اس کی چیخ پر میں لپکا، دوسری طرف سے جُولی آئی مگر اتنی دیر میں سب ہو گیا تھا۔"

"کیسے، آخر دلاور آزاد کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، اُس نے کسی طرح رسیاں کھول لی تھیں مگر اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔" غالب بولا۔ "کیتھرین نے اُسے پانی پلانے ... تے سُنا، میں نے بھی سُنا تھا، جُولی سو گئی تھی، کیتھرین نے مجھ سے پوچھا کہ پانی دے دوں اور میں نے کہا کہ دے دو۔ مجھے کیسے خیال آ سکتا تھا، قصور وار تو میں ہی ہوں، میں نے فرض کر لیا کہ وہ بندھا ہوا ہے اور بھاگ کے جانے کی تو دلاور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرتا، میں اُسے ختم کر دیتا۔"

"کیا کیتھرین نے اُسے مشتعل کیا تھا؟"

"نہیں، اُس نے ضرور کہا تھا کہ کُتے، میں پانی نہیں تم کو کچھ اور پلاتی لیکن کیا کروں۔" غالب بولا۔ "ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دلاور نے اُسے پکڑ لیا، وہ چلائی اور میں اُٹھا۔ میرا اُٹھنا بھی تم جانتے ہو۔ ایک ٹانگ کے پلاستر کا بوجھ بھی تھا، پھر بھی میں نے دیر نہیں لگائی لیکن اتنی دیر میں دلاور اس کو مار چکا تھا۔ اس نے کیتھرین پر کرسی ماری تھی۔ کیتھرین کی گردن ٹوٹ گئی۔ دلاور کا ارادہ بھی اس کی جان لینے کا نہیں ہوگا، وہ تو شاید کیتھرین سے کوئی اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ یہاں سب مسلح ہیں اور اس کے اتنے قریب آنے کا خطرہ مول لینے والی عورت خالی ہاتھ نہیں ہو سکتی، وہ کیتھرین کے بہترین نشانے سے ضرور واقف ہوگا اور یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ بہرام داد کی شریکِ حیات تھی۔ کرسی کا ایک پایہ کیتھرین کی گردن پر پڑ گیا۔ دلاور کے ... تو کچھ نہیں لگا، اُس نے اپنی جان گنوا دی۔ وہ اپنے بدترین دُشمن کو پانی پلاتے ہوئے ماری گئی۔ کیا اسے شہادت کہیں گے یارو، وہ مسلمان نہیں تھی مگر یہ موت کچھ کم محترم بھی نہیں تھی۔"

"موت کے بعد اُسے محترم کہو یا نہ کہو، وہ ایک ناگزیر لمحے کے اٹل ہونے کا احساس رلانے ضرور آتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیتھرین مر گئی ہے تو شاید میں خود بھی دلاور کو مار دیتا۔ میں اس کے بازو کا نہیں اس کے خبیث دل کا اور شیطانی دماغ کا نشانہ لیتا، میں تو سمجھا کہ وہ بھاگنا چاہتا ہے اور کیتھرین کو مار رہا ہے۔ میں نے کیتھرین کو گرتے بھی دیکھا تھا مگر یہ نہیں سمجھا تھا کہ اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے۔ میں نے تو بس ایک گولی چلا کے دلاور کو بے بس کیا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ کیتھرین کا جسم بے جان پڑا ہے، میں اُسے بے ہوش سمجھتا رہا تھا۔" بالکل نامعلوم طریقے پر غالب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جب وہ خاموش ہوا تو سوگ کے ایک ماتمی لمحے نے ہمیں احساس دلایا کہ خود ہمارے دل کا درد آنکھوں سے اشک بن کے ٹپک رہا ہے۔

"جب جُولی آئی تو میں کیتھرین کو پکار رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کر اُسے ہلانے لگی اور اس کا سر یوں فرش پر ڈھلکنے لگا جیسے... جیسے دھڑ سے الگ ہو۔ جُولی نے ایک چیخ ماری پھر دہشت زدہ ہو کے اُٹھی اور پیچھے ہٹی۔ اس نے دلاور کی طرف بھی نہیں دیکھا، میری طرف بھی نہیں دیکھا۔ میری آواز بھی نہیں سُنی۔ میں نے اس کے دوڑنے کی آواز سُنی۔"

"کیا وہ چلا رہی تھی، دوڑتے ہوئے؟"

"نہیں، میں نے اس دروازے سے دیکھا، وہ گیٹ کھول کے نکلی اور اندھیرے میں کھو گئی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑ سکتا تو ضرور دوڑتا لیکن ایک تو مجھے دلاور کا خیال تھا، دوسرے میری ایک ٹانگ دوسری کا بوجھ بنی ہوئی تھی۔ میں چلاتا رہ گیا اور اس کے دُور جاتے قدموں کی آواز سُنتا رہ گیا۔ میں کیا بتاؤں، وہ کہاں گئی۔ میرا خیال ہے اس کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تھا۔ صدمے نے اُسے وقتی طور پر پاگل کر دیا تھا۔" غالب نے کہا۔

"غالب!" میں نے اچانک کہا۔ "میں... میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔"

"کہاں گئی ہوگی، انکل رضوی کے گھر؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، ایسی حالت میں وہ یا تو پولیس کے پاس پہنچ سکتی ہے یا ایک جگہ اور بھی ہے۔"

"اس کا پُرانا گھر؟" غالب نے کہا۔ "ہاں، وہ جُولی کے لیے ایک جذباتی پناہ گاہ ہے۔ ماں کی گود کی طرح، اس کا بچپن وہیں گزرا تھا اور اس گھر کے باہر وہ جہاں بھی رہی غیر محفوظ رہی تو شاید ٹھیک کہتا ہے، ہم دیکھ سکتے ہیں اُسے وہاں...؟"

"سامان رکھو، اس وقت خود ہمارے لیے اس سے بہتر پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم دس منٹ میں نکل جائیں۔"

"اور ان کو، قیدیوں کو؟" محسن نے کہا۔

"ظاہر ہے جہاں ہم وہیں ہمارے قیدی۔" میں نے کہا۔ سارا اسلحہ ڈِکی میں ڈالنے کے سوا ہم نے اس گھر سے کچھ نہیں لیا، دس منٹ پورے ہونے سے پہلے ہم نے عائشہ اور سراج کی ماں کو پھر گاڑی میں بٹھا دیا۔ ان کی آنکھوں پر سے ابھی تک پٹی اُتاری ہی نہیں گئی تھی کہ سفر پھر شروع ہو گیا۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" عائشہ نے کہا۔

"جہنم میں۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "تمھارے خصم کے پاس، سال وہ ... زیب النساء گئی ہے۔"

"زیبا، کیا وہ کہیں چلی گئی ہے؟" سراج کی ماں نے کہا۔

"ہاں، وہ دغا باز اور مکار لڑکی، وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گئی ہے۔" محسن بولا۔

سراج کی ماں مُسکرانے لگی پھر ہنسنے لگی۔ اُس کی ہنسی ہمارا تمسخر اُڑا رہی تھی اور میرے خون کی حدت بڑھا رہی تھی مگر میں نے ایک بوڑھی عورت کے منہ پر ہاتھ مارنے سے گریز کیا۔ "آخر ہے نا میرے سراج کی دُلہن۔ میں تو سمجھ گئی تھی کہ وہ شرارت کر رہی ہے تو ایسے ہی نہیں کر رہی ہے۔"

میں نے محسن کی طرف دیکھا۔ "ہمارا اندازہ درست تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں بے وقوف بنا رہی تھی۔"

"اور دوسرے سب جانتے تھے کہ ہم بے وقوف بن رہے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "اب دیر کیسی، سب تو آ گئے۔"

"یارو، ایسی بھی کیا بے مروتی۔" غالب بولا۔ "اسے بھول گئے۔"

"نہیں یار۔" میں نے سر جھکا کے افسردگی سے کہا۔ "بھول تو ہم کبھی نہیں سکتے مگر اس کی صرف یاد کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، اس کے بے جان وجود کے لیے گنجائش نہیں رہی۔"

"کیتھرین جانتی تھی اور خدا بھی جانتا ہے کہ ہم خود غرض اور کمینے نہیں۔" محسن بولا۔ "وہ سب بھی بچھڑ جانے والوں کے ساتھ جذبات کے اظہار میں اتنے مخلص نہیں ہوتے جو بڑی دھوم دھام سے سوئم اور چہلم پر پلاؤ، زردے کی دیگیں پکواتے ہیں۔ کیتھرین کے لیے احترام اور عزت کے جذبات جو ہم رکھتے ہیں، نمائشی نہیں ہیں۔ ہم اس کے ساتھ رہتے تو اس کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کرتے۔"

"لیکن رسمِ دُنیا کے مطابق اسے آخری تعظیم دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس سے فرق بھی نہیں پڑے گا، کیتھرین و... اگر ... میں ہم شریک نہ ہوئے۔ وہ ہمیں معاف کر دے گی، ہماری ... مجبوری کو سمجھتے ہوئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ مجبوریاں نہ ہوں تو ہم خود کو خدا سمجھنے لگیں۔" غالب بولا۔ اور جب میں کار میں بیٹھا تو اُس نے ایک آہ سرد بھری۔

"یار، موقع ملے تو اسے بھی لے آنا۔" غالب بولا۔ میں نے اسے پچھلی سیٹ پر ریوالور تھما کے بٹھا دیا، جہاں وہ پلاستر والی ٹانگ کو پھیلا کے بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ محسن مجھے راستہ بتانے کے بجائے خود ہی ڈرائیونگ کرے کیونکہ کیتھرین کا پُرانا گھر صرف اُسی نے دیکھا تھا۔ میں نے چابیاں اُسے دیں اور خود اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اسی وقت اچانک ہر سمت سے سائرن سُنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف سے پولیس نے ادھر آنے والے تمام راستوں پر یلغار کر دی ہو۔ دُور کی یہ آوازیں رات کی خاموشی میں بھر گئی تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"پولیس آہی گئی" محسن نے کہا۔ "زیب النساء نے کام دکھا دیا۔"

"تو ڈکی کھول" میں نے کہا۔ "اس میں سے ایک دستی بم تو نکال ہی لے، اگر وہ بہت نزدیک آ پہنچے تو ہم اُن کی پیش قدمی روک دیں گے۔"

محسن نے سر ہلایا اور پیچھے جا کے ڈکی کھولنے لگا۔

"اب تو کیتھرین کی لاش بھی پولیس ہی لے جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"جلدی کر محسن" میں نے کہا کیونکہ سائرن زیادہ قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔

"اندھیرے میں پتا نہیں چل رہا ہے یار" محسن نے کہا۔ "سب سامان ڈھیر ہوا پڑا ہے۔"

"عمر بھر کی نمازِ جنازہ پڑھائی غیروں نے۔ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔" غالب نے کہا۔ وہ کیتھرین کی موت پر ہم سب سے زیادہ دُکھی اور جذباتی ہو رہا تھا۔ سائرن کی آواز ہر لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب آگے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ صرف کیتھرین اس آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ اس کی لاوارث لاش اس جائے عبرت و سرائے فانی میں جسے ہم نے اپنا ٹھکانا سمجھا تھا، غبارِ کارواں کی طرح پیچھے رہ گئی تھی۔

محسن نے بڑی عجلت میں ڈکی بند کی۔ اسی وقت سامنے سے دو ہیڈ لیمپس کی روشنی نمودار ہوئی۔

"گاڑی کو ریورس میں لے۔" میں نے کہا۔

"اور اگر کوئی پیچھے سے بھی آ گیا۔" محسن بولا۔ لیکن اس نے گاڑی کو ریورس کر لیا۔ یہ کوئی عام قسم کی کار نہیں تھی، چنانچہ محسن کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔ طاقتور گاڑی ایک دم بے قابو ہو کے پیچھے گئی اور اس سے پہلے کہ محسن رُخ بدلتا یا بریک لگاتا، کار ٹیلیفون کے کھمبے سے ٹکرا گئی۔ مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا اور عاشی نے خوفزدہ ہو کے چیخ ماری۔ گاڑی کو تھوڑا بہت نقصان ضرور پہنچا ہوگا۔ اس کی ٹیل لائٹس تو ٹوٹ ہی گئی تھیں مگر ٹیلی فون کا کھمبا بھی اس ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور پیچھے کی طرف جھک کر جھولنے لگا۔ اسے تاروں نے مل کے سنبھال لیا تھا جو دونوں طرف سے کھمبے کی گرفت میں تھے۔

پلٹ کر دیکھنے پر مجھے ایک گلی سی دکھائی دی جو دراصل ایک خالی پلاٹ تھا۔ دو کوٹھیوں کے بیرونی احاطے کی دیواروں کے درمیان یہ پلاٹ جو شاید ایک کنال کا ہوگا بہت چھوٹا لگتا تھا۔ یہاں سب کوٹھیاں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ایک کے پیچھے دوسری تھی اور دونوں کی عقبی دیوار مشترک اور منطبق رہتی تھی، چنانچہ ایک قطار کی ساری کوٹھیوں کا رُخ مشرق کی جانب ہو تو اس کے پیچھے والی کوٹھیاں مغرب کو فیس کرتی تھیں۔ ہر سڑک ایسی دو کوٹھیوں کی قطار کے درمیان سے گزرتی تھی۔ میں نے جو خالی پلاٹ دیکھا تھا، اس کے پیچھے والا پلاٹ بھی خالی تھا۔ شاید اس کا مالک ایک ہی شخص تھا جو آگے پیچھے کے پلاٹوں پر تعمیر کرتا تو اسے دونوں جانب سڑک ملتی یا شاید وہ ایک خاندان کی ملکیت تھے جو الگ رہتے ہوئے بھی مشترک عقبی دیواروں میں دروازہ نکال کے دو گھروں کو ایک سمجھ سکتے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اس وقت انہی دو خالی پلاٹوں نے ہمیں ایک سڑک سے دوسری سڑک تک پہنچنے کا راستہ فراہم کیا۔ سائرن کی آواز اور ہیڈ لائٹس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس چند سیکنڈ میں ہم تک پہنچ جائے گی۔

"یہ راستہ بند کر دے۔" محسن نے کہا۔

میں خود اسی امکان پر غور کر رہا تھا۔ جھک کر زمین سے لگ جانے والے کھمبے نے جزوی طور پر ایک رکاوٹ [illegible] تھی، مگر جیسے ہم نکل آئے تھے، ایسے ہی ہمارا تعاقب کرنے والے بھی آ سکتے تھے۔ میری نظر نے صورتِ حال کے عملی پہلو کو سمجھ لیا۔ پھر میں نے دستی بم کی پن منہ سے کھینچ کے نکالی اور کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کے اسے پیچھے پھینک دیا۔

دھماکا عین اسی وقت ہوا جب پولیس کی گاڑی سامنے آ چکی تھی۔ پلاٹ کی چوڑائی شاید بیس گز یا کچھ کم ہوگی۔ دستی بم اس کے تقریباً وسط میں گرا۔ اس وقت تک ہم نصف فاصلہ طے کر چکے تھے یعنی ایک پلاٹ کی لمبائی سے آگے نکل کر دوسرے پلاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ دھماکے نے بیچ میں ایک گڑھا بنا دیا اور دونوں جانب کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ جیپ میں سوار افراد براہِ راست اس دھماکے سے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے لیکن ان کا معمولی طور پر زخمی ہو جانا ممکن تھا۔ دھماکا ہونے تک مرسیڈیز کچھ اور آگے چلی گئی تھی لیکن جیپ کا رُخ اسی طرف تھا جہاں دستی بم گرا تھا۔

اب بیس گز چوڑے راستے کے درمیان میں اتنا گہرا گڑھا تھا کہ جیپ اس میں سے نہیں گزر سکتی تھی اور گڑھے کے دونوں جانب دیواروں کے ملبے کا ڈھیر تھا۔ جیپ ان اینٹوں کے ڈھیر پر بھی نہیں چڑھ سکتی تھی۔ وہ اب واپس جا کے اور پھر کسی موڑ سے گھوم کر ہی آ سکتے تھے۔ دھماکے سے دھواں پھیلا ہوا تھا اور گرد و غبار کا بگولا سا اٹھا تھا جس نے ہمیں اسکرین فراہم کر دیا اور ہم پولیس کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی مگر وہ اندھا دھند چلائی جانے والی گولیاں ضائع ہوئیں۔

ہنگامی صورتِ حال میں تقسیمِ کار میں ڈسپلن قائم رکھنے سے افراتفری نہیں پھیلتی۔ محسن نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر رکھی تھی اور مقابلے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر میں اُسے ڈرائیونگ کے بارے میں ہدایات بھی دیتا یا وہ ڈرائیونگ کے ساتھ مجھے بھی مشورہ دیتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو ہم ایک دوسرے کو ڈسٹرب کرتے اور خود بھی ڈسٹرب ہوتے۔ ہمیں ایک دوسرے کی صلاحیت پر [illegible] اعتماد تھا جتنا خود اپنی ذات پر اور اس دُہرے اعتماد کی قوت ہمیشہ مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

جب میں نے محسن کو اطلاع دی کہ اب پولیس پیچھے نہیں ہے تو [illegible] واردات سے بہت دُور تھے۔ گاڑی اسی نوّے میل کی رفتار سے موڑ کاٹتی جا رہی تھی۔ کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ منزلِ مقصود کا علم تو محسن کو تھا مگر وہ سیدھا جانے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے فقط سر ہلایا اور اپنی نگاہ سامنے رکھی۔

"تم... تم لوگوں نے پولیس پر بم پھینک دیا۔" عاشی نے کہا۔

"ہاں... مجبوری تھی۔" میں نے کہا۔ "ہمارے پاس ایٹم بم نہیں تھا۔"

"خدا تم سے سمجھے۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "تم واقعی دہشت گرد اور تخریب کار ہو۔ بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے شیطان ہو۔"

"آپ نے سُنا، ایس پی کی والدہ نے کیا کہا؟" محسن بولا۔

"ایس پی نہیں گستاخ... ایس ایس پی صاحب۔" میں نے کہا۔

"ان کی رائے ہمارے بارے میں اچھی نہیں ہے۔"

"اچھی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ بیٹے نے ماں کو بریف کر رکھا ہے اور ہم ہیں بیٹے کے دُشمن۔" میں نے کہا۔ "ہم بتائیں گے کہ وہ دن کو رات اور رات کو دن سمجھ رہی ہیں تو ہم ہی جھوٹے ہوں گے۔"

"رہنے دو یہ باتیں۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "میں نے سچ کو دیکھا بھی ہے اور بھگت بھی رہی ہوں۔"

"فرض کریں، صرف ایک لمحے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "کہ کسی دن وقت نے آپ کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا۔ آپ پر اچانک انکشاف ہوا کہ آپ کا یقین تو ایک سراب تھا۔ آپ کے ساتھ سب سے بڑا جھوٹ تو خود آپ کا اپنا بیٹا بولتا رہا تھا اور سب سے زیادہ دُکھ دینے والا دھوکا بھی اُسی نے دیا تھا تو آپ کیا کریں گی؟"

"میں مر جاؤں گی، خدا نہ کرے کہ میں اُس دن کے لیے زندہ رہوں۔"

"آمین۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو ہر ماں کا وجود ایک شجرِ سایہ دار ہوتا ہے اور کوئی بھی کسی کی ماں کے لیے موت نہیں مانگتا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ بہت اچھا ہوگا، اگر آپ اس وقت سے ایک لمحہ پہلے تک ہی سُکھ، چین، خوشی اور صحت کے ساتھ جئیں جو انکشاف کا لمحہ ہو۔ زندگی کے ایک لمحے سے دستبردار ہو کے آپ بہت سے ناقابلِ برداشت عذاب رکھنے والے لمحوں کی چیرہ دستی سے بچ جائیں گی۔"

"اب تک پولیس نے کیتھرین کی لاش قبضے میں کر لی ہوگی۔" غالب نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"اب وہ اس سے کیا معلوم کریں گے، جب اُس کے جیتے جی نہ معلوم کر سکے۔" محسن نے کہا۔ "مجھے زیادہ فکر جولی کی ہے۔ کیا یہ نئی زندگی جولی کو اسی لیے ملی تھی۔ ہم نے کتنی جدوجہد کی تھی اُسے موت کے منہ سے واپس کھینچ لانے کی خاطر مگر اس کے بعد ہم نے اُسے کیا دیا؟"

گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور گھنے درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے ویرانے میں ٹھہر گئی۔ ہیڈ لائٹس نے پل بھر کے لیے ایک پرانی طرز کے [illegible] کو روشن کیا جس کے برآمدے میں محرابی دروازے تھے [illegible] میں صرف دیواروں کے خلا تھے جو بغیر چوکھٹ [illegible] ہوں اور دروازوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ میں نے نیچے اُتر کے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس آباد گھر تھے جن کے درمیان بہرام داد کا لاوارث رہ جانے والا گھر زمانے کی بے حسی پر نوحہ خواں تھا۔ میں مختصر سے قطعۂ زمین پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ سے گزرا جو کسی زمانے میں باغیچہ ہوگا۔

دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ باقی رہ جانے والے دیوار کے خالی ٹکڑے ان قبروں کی طرح لگے تھے جن میں سے کفن چوروں نے مُردے نکال پھینکے ہوں۔ بہرام داد کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ اس دریا دل ڈاکو نے اپنا سب کچھ بانٹ دیا تھا، ساتھیوں میں اور ضرورت مندوں میں مگر پھر بھی اس کی موت کے بعد مدفون خزانے ڈھونڈنے والوں نے جھوٹی اُمیدوں کی خاطر اُس کی بنیادیں تک کھود ڈالی تھیں اور جب کچھ نہیں ملا تھا تو بھاگتے چور کی لنگوٹی کے مصداق تنکا تنکا سمیٹ کے لے گئے تھے۔ میں نے اندر جا کے ایک دیا سلائی روشن کی۔ ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے تین تیلیاں جلائیں اور اچھی طرح دیکھ لیا کہ گرد آلود فرش اور پلاسٹر اُکھڑی دیواروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

دونوں عورتوں کو اندر کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ قریب ہی کے کسی اسٹریٹ لیمپ کی روشنی اس میں سے براہِ راست ایک کھڑکی کے خلا سے پہنچ رہی تھی۔ غالب ان کے مقابل دوسری دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تو میں نے اور محسن نے وہ سب سامان دوسرے کمرے میں لا کے رکھا جو ہم ساتھ لے آئے تھے۔ اس میں وہ سُوٹ کیس بھی تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس کی ہلاکت خیزی میں کوئی شبہ نہ تھا مگر اُسے عائشہ کھول سکتی تھی، اگر اس میں واقعی دس لاکھ روپے بھی تھے تو یہی ہمارا سب سے بڑا اثاثہ بھی تھا۔

ڈکی میں گاڑی کا کور بھی تھا جسے میں نے چادر کی جگہ استعمال کرنے کے لیے اُٹھا لیا۔ محسن کو گلوز کمپارٹمنٹ میں سے ایک ٹارچ ملی۔

"پہلے تو اس گاڑی سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اس کھنڈر میں اس کا وجود ہی شکوک پیدا کرتا ہے۔ کسی رات کے پہرے دار نے اگر دیکھ لی تو مال پوچھنے آ جائے گا۔" محسن بولا۔ "میں اسے کیا کروں؟ کہیں چھوڑ آؤں یا؟"

"کیا تیرے دل میں جمشید کے نقصان کا درد اُٹھ رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، بس ایسے ہی کسی خوبصورت چیز کو تباہ کرتے ہوئے خیال تو آتا ہے۔" محسن بولا۔

"یہ خوبصورتی فریبِ نظر ہے ورنہ یہ مال حرام کا ڈھیر ہے۔ سوچ لے ذرا کہ کس کس نے اپنے خون سے اس کی قیمت چکائی ہوگی۔ ان سب نے جو تخریب کاروں کے ہاتھوں میں جلنے والے اسلحے سے اپنے بھرے گھروں میں ہی زندہ دفن ہو گئے۔ خون اور گوشت کے لوتھڑے بن کے بکھر گئے اور بچے بھی تو بالکل ادھورے رہ گئے، بے گھر یا بے دھڑ، آنکھوں یا ٹانگوں کے بغیر، یتیمی یا بیوگی کے ساتھ۔ یہ بدبودار و متعفن لاشوں کی تجارت کا مال ہے۔"

"میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔" محسن بولا۔ "بس ابھی آتا ہوں۔"

"اتنی دُور لے جانا کہ ہماری طرف کی ہوا بھی وہاں نہ پہنچے۔" میں نے کہا۔ "اور خیال رکھنا اپنا بھی، صبح ہونے والی ہے۔"

محسن نکل گیا تو میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کے محفوظ ترین ٹیلی فون کا کھمبا تلاش کیا۔ اتفاق سے ٹیلی فون کی ایک لائن کھنڈر کی چھت کے پیچھے سے گزر رہی تھی۔ لائن کا دوسرا کنارہ پیچھے والے گھر تک گیا تھا۔ میں نے چھت پر چڑھ کے ٹیلی فون کے تار کو دانتوں سے چھیلنے کی کوشش کی مگر انسولیشن بہت سخت تھی۔ مجبوراً میں نے دیا سلائی سے پلاسٹک کو گرم کیا اور پھر دانتوں سے توڑا۔ دوسرے تار کو میں نے دو انچ کے فاصلے سے ننگا کیا اور پھر اپنے پورٹیبل فون کے دونوں کنارے جوڑ دیے۔ سراج کا نمبر ملانے میں خطرہ تھا۔ اس وقت کنکشن ایک فون نمبر سے ملا ہوا تھا اور سراج کے گھر میں ہر فون کال کو ٹیپ کرنے اور ٹریس کرنے کا پورا انتظام تھا۔ وہ آدھے پونے گھنٹے میں اس گھر تک آ پہنچتے جس کی یہ لائن تھی چنانچہ میں نے دلاور کی بیوی سے بات کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیلو؟" کسی مرد نے گھنٹی بجتے ہی ریسیور اٹھا لیا۔

"کیا میں مسز دلاور سے بات کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے کہا۔

"پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے صحیح نمبر ملایا ہے یا نہیں۔"

"میں اس کا والد بول رہا ہوں، دلاور کا فادر اِن لاء۔" وہ بولا۔

"کیا آپ کو داماد صاحب کی خیر و عافیت سے کوئی دلچسپی ہے؟" میں نے کہا۔

"تم... تم وہی بدمعاش ہو؟" اس کا غصہ کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح اُبل پڑا۔ "میں پوچھتا ہوں، عائشہ کہاں ہے؟"

"عائشہ خیریت سے اور بالکل محفوظ ہے لیکن آپ کو اس قسم کا اشتعال انگیز اور غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"کیا! اشتعال انگیزی میں نے کی ہے اور جو تم نے کیا... کیا وہ ذمے دارانہ فعل تھا۔" بڈھے نے چلانا شروع کیا۔

"دیکھیے، نہ میں آپ کو جانتا ہوں نہ آپ کو میرے بارے میں کچھ معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ آپ کی ایک بیٹی میری تحویل میں ہے۔ دلاور کو ہم نے چھوڑ دیا ہے۔"

"خدا کے لیے اسے بھی چھوڑ دو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہاری اور دلاور کی کیا دشمنی ہے مگر عائشہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی بہن کی کیا حالت ہے، اس کی بڑی بہن بہت بیمار ہے اور اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، وہ صدمے سے مر جائے گی، اس پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی بوڑھا ہوں اور دل کا مریض بھی۔ کہاں تک صدمے اُٹھاؤں۔ ایک جوان بیٹا تھا، اس کے بعد جینا تو نہیں چاہتا تھا مگر بیٹیوں نے مجبور کر دیا تھا، اب صرف عائشہ رہ گئی ہے، کسی کو معلوم ہو گیا تو اس کی بدنامی میرا بوجھ بن جائے گی۔" وہ منت سماجت کرنے لگا۔

"مجھے آپ سے یقیناً ہمدردی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک اجنبی کو بھی کسی کے حالات سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم... تم جیسے لوگ کسی کے ہمدرد نہیں ہوتے۔ تم کو کیا، کسی کی زندگی تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے، کوئی مرتا ہے تو مر جائے۔" وہ پھر برہم ہو گیا۔

"جو میں کہنا چاہتا ہوں، وہ آپ کے مفاد میں ہے۔ مجھے بتائیں کہ آپ سنیں گے یا میں فون بند کر دوں؟" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"پہلی اطلاع تو میں دے چکا، دلاور کے بارے میں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اُس کے کسی دوست نے فون کر کے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت بُری حالت میں ملا ہے۔" وہ بولا۔

"خدا کا شکر ادا کریں کہ وہ زندہ مل گیا۔" میں نے کہا۔ "دوسری بات مجھے اُس کی بیوی کے بارے میں کہنا تھی، صرف آپ سے۔ آپ کے سوا کسی اور کو کچھ معلوم ہُوا تو آپ کی بڑی بیٹی مر جائے گی۔"

"وہ... اُسے تو مرنا ہی ہے۔" اُس نے کہا۔

"ابھی سے آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے کہ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب تک ایک ہی ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا ہے جو دلاور کے لیے قابلِ اعتماد ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ان کا فیملی ڈاکٹر ہے۔"

"کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ کی بیٹی کو صرف ایک اسپیشلسٹ نے دیکھا ہے اور اس کے پاس بھی دلاور خود لے کر گیا تھا؟"

"اور کون لے جاتا، آخر وہ شوہر ہے اس کا۔" بڈھے نے بگڑ کر کہا۔

"کیا اس نے آپ سب کو اور اپنی بیوی کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ اس سے پوچھے بغیر کسی بھی ڈاکٹر سے بیماری کے بارے میں بات تک نہ کی جائے؟"

"ہاں، مگر تم... تم کیسے جانتے ہو یہ سب؟" وہ بولا۔ "اس نے میری بیٹی سے یہ بات کہی تھی اور مجھ سے..."

"ظاہر ہے آپ دونوں ہی ایسا کر سکتے تھے۔ کیا اس نے کوئی دھمکی بھی دی تھی؟ مثلاً یہ کہ کسی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو بُرا ہوگا، وہ طلاق دے دے گا؟"

"یہ... یہ تو نہیں، آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"پہلے میری بات کا جواب دیں۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے دھمکی دی تھی، کسی قسم کے نتائج کی؟" میں نے کہا۔

"دھمکی؟ نہیں... بس ایک بار ایسا ہُوا تھا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے پاس چلی گئی تھی، اُس کا میاں اسپیشلسٹ ہے، تو دلاور نے اُسے مارا تھا اور میرے پاس بھیج دیا تھا کہ... کہ یہ بہت خود سر ہو گئی ہے اور اپنے شوہر پر اعتماد نہ رکھنے والی بیوی کو اس کے گھر میں بھی نہیں رہنا چاہیے پھر کبھی ایسا نہیں کیا کسی نے۔" وہ بولا۔

"گویا اب علاج وہیں ہو رہا ہے، جہاں دلاور چاہتا ہے؟"

"ہاں، وہ بھی اچھا ڈاکٹر ہے، بہت بڑا اسپیشلسٹ ہے۔" وہ بولا۔

"پھر فائدہ کیوں نہیں ہو رہا ہے اُس کے علاج سے؟" میں نے کہا۔ "چچا میاں! ایک بات کہتا ہوں، ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ تمہارا اپنا انتخاب ہے کہ تم بیٹی کی زندگی اور اُس کے سہاگ میں سے کس کا انتخاب کرتے ہو۔"

"میں... میں کون ہوتا ہوں اور یہ کیا فضول بات ہے؟" وہ سخت پریشان ہو گیا۔ "تم مجھے دہشت سے مار ڈالو گے۔"

"غور سے سنیے میری بات۔ دلاور اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ بیماری کو بہانہ بنا چکا ہے۔ چونکہ وہ اُسے زندہ رکھنا نہیں چاہتا اس لیے یہ بیماری اُس کی جان لیے بغیر نہیں ٹلے گی۔"

"تم... تم اُس پر... الزام... لگا رہے ہو کہ وہ قتل کرنا چاہتا ہے اپنی بیوی کو... خبیث... مردود... لعنت ہو تم پر۔"

"میری بات ابھی ختم نہیں ہُوئی۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ جھوٹ ہو تو ابھی جو کچھ آپ نے کہا اس پر مجھ سے غائبانہ اظہارِ شرمندگی ضرور کرنا۔ کل اپنی بیٹی کو خاموشی سے کسی دوسرے اسپیشلسٹ کو دکھاؤ۔ دلاور کو کچھ معلوم نہ ہو۔ اس کے سارے ٹیسٹ کرا کے دیکھو۔ نتیجہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اسے کوئی مہلک مرض نہیں ہے اور علاج کے نام پر اس کے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے، اُسے دوا کے نام پر زہر دیا جا رہا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم، بھونکتے ہو تم کتے..."

"حقیقت کو تسلیم نہیں کرو گے تو بیٹی کو خود مٹی دو گے، یہ کوئی عمر نہیں ہے اس کے مرنے کی۔ اُس کے بچوں کو اس کی ضرورت ہے۔ تم دلاور کو صرف داماد کی حیثیت سے جانتے ہو۔ تمہارے سامنے وہ انتہائی شریف اور فرماں بردار بن کے آتا ہوگا مگر یہ ناممکن ہے کہ بیوی سے اس کی اصلیت پوشیدہ ہو۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کے سامنے ظاہر اور باطن کے فرق کو نہیں چھپا سکتا اور اگر چھپانے میں کامیاب ہوتا ہے تو یہ اس بیوی کی کم عقلی ہے یا بدنصیبی ہے کہ وہ آنکھیں بند رکھنا پسند کرتی ہے۔ اپنی بیٹی سے کہو کہ آنکھیں کھول کر دیکھے، اُسے موت کو سامنے دیکھ کر ڈرنا نہیں چاہیے۔ موت برحق ہے اور سب کو آنا ہے مگر اپنی زندگی کی حفاظت بھی ایک فرض ہے، اس وقت کچھ نہیں ہوگا جب دلاور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"لیکن ایسا... وہ ایسا کیوں کرے گا؟" بڈھا اب ہانپ رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کا دل کمزور ہے۔" میں نے کہا۔ "اور آپ کی یہ عمر بھی نہیں صدمے جھیلنے کی مگر میں کسی اور کو یہ سب نہیں بتا سکتا، آپ کا بیٹا زندہ ہوتا تو اُس سے کہتا لیکن اب تو آپ کو ہی سنبھلنا پڑے گا اور حوصلہ رکھنا ہوگا۔ دلاور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہ سب عائشہ کے لیے کر رہا ہے۔"

وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ اُس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی۔ میں سب سنتا رہا۔ بالآخر وہ تھک کے خاموش ہو گیا۔

"خدا کے لیے، السامت کہو... کہو کہ یہ بیہودہ مذاق کیا تھا تم نے... میری جان لینے کے لیے۔ مگر میں بے غیرت کہ سن کے بھی زندہ رہا۔"

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ سچ کا بوجھ آپ کو ہی اٹھانا ہے اور برداشت بھی کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "دلاور نے عائشہ سے شادی کرنے کا سوچا ہے، جب اس کی بیوی مر جائے گی۔"

"یہ ناممکن ہے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ چلانے لگا۔

"آپ کی مرضی کا اس سارے کھیل میں کوئی دخل نہیں ہے۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "عائشہ خود اُس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکی ہے، وہ اُس کے ساتھ سازش میں شریک ہے۔ تم کہو گے کہ بہن بھلا بہن کے قتل کی سازش میں کس طرح ساتھ دے سکتی ہے مگر چچا، زر اور زن کے خونی کھیل کو آج تک کسی نے سمجھا ہے؟ ایسا ہو رہا ہے، ایسا پہلے بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ دولت اور ہوس کا جال لے کر پھرنے والے شکاری آپ نے دیکھے کہاں ہیں۔ آپ سن رہے ہیں نا میری بات؟ آپ اس سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں، آپ اپنی بیٹی کی زندگی بچا سکتے ہیں، اُس کی زندگی آپ کے لیے نہیں، اُس کے بچوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ آپ کو اور کتنے دن جینا ہے۔ بچے تمام عمر ماں کے بغیر کیسے رہیں گے۔ اُسے کل ہی کسی اسپتال میں لے جائیے۔ ایک نہیں، دو اچھے ڈاکٹروں سے الگ الگ رائے لیجیے۔ بے شک، دلاور کو معلوم ہوگا تو وہ بہت برہم ہوگا، کوئی سخت قدم اٹھائے گا، دھمکی دے گا طلاق دینے کی اور ممکن ہے طلاق بھی دے دے لیکن یہ تو آپ کو سوچنا ہے۔ میں نے بتا دیا تھا کہ فیصلہ اور انتخاب آپ کا ہے۔ دلاور کو اس بیوی کی ضرورت نہیں رہی، عائشہ کو بہن کی ضرورت نہیں رہی۔ اُسے دلاور کی دولت کی خواہش نے سارے رشتوں کی تقدیس کا خون کرنے پر آمادہ کیا ہے مگر اس کے بچوں کو اپنی ماں کی ضرورت ہے۔ انھیں دولت سے زیادہ ماں کا پیار چاہیے، اس لیے دلاور سے مت ڈریں، وہ طلاق دیتا ہے تو اُسے ایسا کرنے دیں۔ وہ بالآخر یہی کرے گا اور ایسا نہ کر سکا تو پھر وہ کرے گا جو میں بتا چکا ہوں۔ وہ کسی نہ کسی طرح بیوی کو قتل کر دے گا۔ آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔ سُنا آپ نے؟ میری بات کو گرہ سے باندھ لیں، وہ مر جائے گی اگر آپ نے میری بات کو اہمیت نہ دی... ہیلو، آپ خاموش کیوں ہیں... ہیلو... ہیلو۔"

مجھے احساس ہوا کہ نہ جانے کتنی دیر سے میں اکیلا بول رہا ہوں اور تاروں سے گزر کے جانے والی میری آواز کو دوسری طرف کوئی بھی سننے والا نہیں ہے۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا تھا یا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید مر گیا تھا۔ اُس کا بوڑھا، بیمار دل اس صدمے کو نہ جھیل سکا تھا۔ میرے دل پر صدمے اور ملامت کے احساس کا بوجھ سا پڑ گیا، اس کے ساتھ ہی مجھے یہ افسوس بھی ہوا کہ میں نے غیر ضروری طور پر لمبی بات کی، اُسے قائل کرنے کے لیے یہ ضروری بھی تھا، ورنہ میں دو جملوں میں بات ختم کر دیتا کہ عائشہ سے شادی کے لیے تمھارا داماد اپنی بیوی کو قتل کر رہا ہے تو بات نہ بنتی۔ اس وقت یہی بات میرے ذہن میں آئی جو میں نے پہلے کی اور دوسری بات کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں دلاور کی بیوی کے ذریعے جو پیغام سراج تک پہنچانا چاہتا تھا وہ نہ دیا جا سکا۔

جب میں نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا تو میرے کانوں نے انگیج کی ٹون سنی اور چشمِ تصور سے بہت کچھ دیکھا۔ مثلاً یہ کہ عائشہ کا باپ وہیں گر کے مر گیا ہے، جہاں کھڑا وہ مجھ سے فون پر بات کر رہا تھا اور ریسیور نیچے جھول رہا ہے یا فون بھی نیچے جا پڑا ہے۔ میں انہی افسوسناک خیالوں کے جال میں اُلجھا ہوا نیچے اُتر آیا۔ خرم جمشید کے گھر فون کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہاں جو نوکر تھے وہ دست و پا بستہ رُودمز میں بند تھے، ایک محافظ مارا گیا تھا اور ایک مہمان شب اپنے حسن و شباب کے ساتھ جان کا نذرانہ دے کر دنیا سے جا چکی تھی۔ خود جمشید کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی تک سراج کے گھر میں اور اُسی کے ساتھ ہوگا۔

ایسی صورت میں سراج سے رابطے کے سوا چارہ نہ تھا اور اس کے لیے میں کسی کی پرائیویٹ لائن استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کچھ دور جانا پڑا اور بالآخر مجھے ایک جنکشن باکس مل گیا۔ کھمبے پر چڑھ کے چھپکلی کی طرح چمٹے رہنے، اسکریو ڈرائیور سے جوائنٹ کھولنے اور تار لگانے کی مجھے اتنی مشق ہو گئی تھی کہ اب میں اندھیرے میں بھی یہ کام دو یا تین منٹ میں کر لیتا تھا۔

نمبر ملتے ہی سراج کے گھر میں آپریٹر کی ڈیوٹی کرنے والے اے ایس آئی تیس مار خاں نے کہا۔ "ہیلو۔"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے اُسی کے لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے تو میاں، جو ہم سے مذاق کر رہا ہے؟" وہ بولا۔

"میں ایک مسکراتا ہوا مُردہ ہوں جسے تم دفن نہ کر سکے تھے اور میں اس وقت بھی مسکرا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمھارے ایس ایس پی سے بات کرنا ہے مجھے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سراج کی آواز آئی۔ "بولو۔"

"جان کی امان پاؤں تو آپ سے کچھ عرض کروں ایس ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "اب تو آپ خیر سے حاکمِ شہر ہیں۔"

"کیا محض فضول مسخرے پن کے لیے فون کیا تھا؟" وہ بولا۔

"مسخرہ پن اور آپ کے ساتھ! آپ تو خود سب سے بڑے مسخرے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کم سے کم اس وقت ضرور لگ رہے تھے جب میں آپ کی والدہ ماجدہ اور دلاور کے کبھی نہ ہونے والے سسر کی والدہ ماجدہ کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آپ کی منگیتر تو واقعی سونے پر سہاگا ہے۔"

"اگر ان دونوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا...."

"تو آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔ "توپ چلائیں گے تو اللہ مرا رسال کریں گے، آپ کے تو فرشتے بھی نہیں جانتے کہ ہم چار رستوں میں سے کس سمت میں ہیں یا ہوں گے۔"

"فرشتے تو پہنچ گئے تھے مگر قسمت نے تمھارا ساتھ دیا۔"

"تو آپ قسمت کو کوستے، اکثر آپ کا ہی ساتھ دیتی آئی ہے مگر قسمت آپ کی زر خرید بہرحال نہیں ہے اور نہ آپ کی ماتحت ہے۔ میں نے تم کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تعاقب کا اور ہمیں محصور کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہم تک تم صرف فرشتہ اجل کے ساتھ ہی پہنچ سکتے ہو، وہ آدمی کو ڈھونڈ نکالنے کا ماہر ہے مگر وہ آئے گا تو اس کے ساتھ ہم اکیلے نہیں جائیں گے، ہمارے مہمان بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ تم اگر چاہتے ہو کہ ان کو گزند نہ پہنچے تو سب سے پہلے اپنے شکاری کتوں کو روک لو، یہ میرا وعدہ ہے کہ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور ہم ان کی حفاظت کریں گے۔ عائشہ اور تمھاری والدہ کو ہم خود واپس پہنچانے آئیں گے مگر اس وقت جب رابعہ اور خواجہ نیک محمد کو ہم تک پہنچا دیا جائے گا۔"

"تم زیب النساء کی بات نہیں کر رہے ہو۔"

"اُس کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "باتوں ہی باتوں میں اس نے ہمیں گھن چکر بنا دیا۔ جیسی روح ویسے فرشتے... تمھاری اور اس کی جوڑی اچھی رہے گی حالانکہ پہلے میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ تو خود ایس ایس پی بننے کے لائق ہے کہ جن کو تم نہ پکڑ سکے تھے، انھیں زیب النساء نے تقریباً پکڑوا دیا تھا۔ ہم اس کے حسن، اُس کی ذہانت اور بے مثل اداکارانہ صلاحیت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔"

"مگر وہ اب ہے کہاں؟" سراج نے کہا۔

"کیا اس نے تمھیں فون نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا، خود اُس نے نہیں، بات کرنے والا کوئی اور تھا۔"

"کوئی اور کون؟" میں نے کہا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟" وہ دہاڑ کر بولا۔ "تم ہی آواز بدل کے بول رہے تھے، تم نے اس سے زبردستی جو کہلوایا اُس نے کہا۔ پھر تم نے ریسیور لے کے پتا سمجھایا، تم ہمارا مذاق اُڑانا چاہتے تھے، یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تم کتنے بہادر اور کتنے چالاک ہو، پولیس کو اپنا پتا ٹھکانا بتا سکتے ہو اور پھر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل سکتے ہو۔"

"سراج! تم نے ایک مثل سُنی ہے، چاہ کن را چاہ در پیش مگر فارسی تم کہاں سمجھو گے۔ یوں سمجھو کہ اُس نے ہمیں چکر دیا تھا، اب شاید وہ خود کسی چکر میں پڑ گئی ہے۔ کیا وہ وہاں موجود نہیں تھی، جہاں سے دلاور ملا؟"

"نہیں، کیا تم نے اُسے وہیں چھوڑ دیا تھا؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"سراج! میں تم کو ایس ایس پی سمجھ کے نہیں، زیب النساء کا منگیتر ہونے کی وجہ سے ایک بات بتا رہا ہوں، سچ نہ مانو تو تمھاری مرضی، وہ ہمیں بے وقوف بنا کے نکل گئی تھی اور اُسی کے فون پر تم نے پولیس بھیج دی ہوگی۔ فون پر کسی مرد نے بات کی تھی تو وہ ہم نہیں تھے، میرا اپنا خیال ہے کہ...."

"کیا خیال ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"مجھے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے، تم سے نہیں، اس خیال سے کہ شاید کسی نے اُس سے فون کال کے چارجز وصول کرنے...." میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ بھاگی تو مُنہ اُٹھا کے کسی بھی گھر میں گھس گئی، وہ کوئی آس پاس کا بنگلا ہی ہوگا کیونکہ اُسے غائب ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگے تھے۔" میں نے کہا۔ "کسی شریف اور مہذب نظر آنے والے مرد نے اُس کی مدد کی۔ تم نظر آنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟ ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ زیب النساء نے تم سے یا جمشید سے کیا کہا، اس کا مجھے اندازہ ہے مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس شریف اور مہذب نظر آنے والے شخص نے کہا کہ لاؤ میں پتا سمجھا دوں اور پتا سمجھانے کے بعد...."

"اوہ نو!" سراج نے پریشان ہو کے کہا۔

"یس سر! تمھاری وہ منگیتر بہت حسین اور انداز و اطوار میں حد درجہ سنسنی خیز ہے۔ ایسی لڑکی اگر آدھی رات کے بعد اچانک کسی مرد کی خلوت میں وارد ہو جائے تو تہذیب اور شرافت کا لبادہ اُتر سکتا ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو یقیناً واپس وہیں پہنچ جاتی جہاں پولیس پہنچی تھی۔ پولیس کے آنے تک وہ چھپی رہ سکتی تھی مگر پولیس کو دیکھ کر تو اُس کا سامنے آ جانا ضروری تھا۔"

"یہ... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ فون کرنے کے بعد اکیلی ہی گھر کی طرف چل پڑی ہو۔" سراج نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم کیوں خود کو دھوکا دینا چاہتے ہو، وہ اتنی بے وقوف لڑکی ہوتی تو میں مان لیتا مگر کیا وہ نہیں جانتی کہ اس کا گھر کتنی دور ہے، رات کتنی سنسان ہے اور وہ خود کتنی پرکشش ہے اور راستوں پر بھو کے بھیڑیے بھی گھومتے ہیں۔ نہیں، ایسا رسک لینے کی کیا ضرورت تھی جب کہ اُسے معلوم تھا کہ پولیس آ جائے گی تو اُسے بہ حفاظت اور آرام کے ساتھ گھر پہنچا دے گی اور پولیس اُس کی غلام ہے کیونکہ سیاں بھئے کوتوال"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو، تھینک یو۔"

"تمہارے مُنہ سے یہ لفظ بڑا عجیب لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہُوا تو میں اس علاقے . . . !" وہ چپ ہو گیا۔

"ہاں ہاں، کہو . . تم اس علاقے پر بلڈوزر چلوا دو گے۔ یہاں ایس ایس پی بہادر! وہاں جتنے ہیں سب بلڈوزر ہیں، اپنی طاقت کے زعم میں ہی کسی نے زیب النساء کو بلڈوز کر دیا۔ وہ جانتا ہوگا کہ بعد میں اس کے نام پتے کی نشاندہی ہو جائے گی مگر اسے ڈر نہیں ہوگا، وہ اُن لوگوں میں سے ہوگا، جن کا نام کوئی لے تو اُس کی زبان کاٹ دی جاتی ہے یا اُس پر تالے ڈال دیے جاتے ہیں اور ان کا پتا ' ہُوا ز ہُو ' میں ملتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود تم کبھی اس کے بنگلے پر سلام کرنے گئے ہو اور یہ بھی کہ وہ تمہارے ہی گروہ کا شکاری ہو، کوئی تم سے بڑا شکاری . . . خدانخواستہ تمہارے محکمے کے کوئی ڈی آئی جی وغیرہ تو اُدھر نہیں رہتے؟ ہر فرعونے را موسیٰ، کبھی سیر کو سوا سیر بھی ٹکر جاتا ہے ٹکر جانا تو سمجھتے ہو نا؟"

"شٹ اپ . . . یہ ضروری نہیں۔" وہ یکلخت ایس ایس پی بن گیا۔

"شٹ اپ کرنے سے پہلے میں تم سے دو باتیں کہوں گا۔" میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ جو قدم اُٹھاؤ سوچ سمجھ کے اُٹھانا، کہیں تمہاری غلطی کا خمیازہ تمہارے اپنے رشتوں پر اثر انداز نہ ہو، دوسری بات یہ کہ ہمارے اگلے پیغام کا انتظار کرنا جس میں ہم بتائیں گے کہ جنگی قیدیوں کا تبادلہ کیسے ممکن ہے۔ تم اس وقت تک یہ معلومات حاصل کر لینا کہ رابعہ اور خواجہ نیک محمد عرف اُستاد ٹیڈی کہاں ہیں اور تم اُنھیں لا سکتے ہو یا نہیں۔ دو نام اور نوٹ کر لو، ایک تمہارے اپنے محکمے کا سابق ڈبل ایس آئی ہے"

"ڈبل ایس آئی؟"

"ایس آئی، سیّد اکرام شیخ اور اُس کی ایک بہن ہے نازلی، اگر وہ نہ ملے تو تم کو ہماری عدالت میں حلف نامہ داخل کرنا ہوگا کہ وہ تمہاری تحویل میں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میری یہ گفتگو تمہارے علاوہ کتنے لوگ سُن رہے ہیں۔ اسے کہاں کہاں ٹیپ کیا جا رہا ہے اور اب تک کتنے لوگ میری کال کو ٹریس کرنے کے لیے لاحاصل کوشش کر رہے ہوں گے مگر اِٹ از جسٹ ناٹ پاسیبل، اس لیے انرجی ضائع مت کرو، وہ کام کرو جس سے تمہارا اور ہمارا مسئلہ جلد حل ہونے کے امکانات پیدا ہوں۔" میں نے تار الگ کر دیے۔

جب میں واپس اُس کھنڈر میں پہنچا تو غالب نے عائشہ اور سراج کی ماں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کار کے کور میں لپٹ لپٹا کے سو جائیں۔ اُنھوں نے آنکھوں پر سے پٹیاں بھی اُتار دی تھیں اور اب وہ بظاہر بالکل ساکت پڑی تھیں مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ واقعی سو گئی ہوں گی، ان حالات میں نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے دونوں؟" غالب نے برہمی سے کہا۔

"کون دونوں؟" میں نے بے وقوف بن کے کہا۔ "ہم دونوں تو یہاں موجود ہیں، غائب کہاں ہو گئے؟"

"یہ منکر نکیر کی طرح تم دونوں نے ہر جگہ ایک ساتھ جانے کا عہد کر لیا ہے کیا؟" غالب بولا۔

"منکر سطح زمین پر سفر کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں سطح زمین سے زیادہ بلندی پر تھا۔ یہ بڑا دل توڑنے والا الزام ہے کہ ہم ایک ساتھ تھے۔ ویسے آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ایک مشرق کو جائے تو دوسرا مغرب کو۔"

"یار تم کن چکروں میں پڑ گئے۔" غالب کا موڈ سخت خراب تھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے، کس نے پیش کیا تھا ایک آئیڈیا؟"

میں سخت شرمندہ ہُوا۔ "وہ . . . اُسے بھولا نہیں ہُوں میں۔"

"بھولے ہوئے ہو تم۔" غالب نے میری بات کاٹ دی۔ "تم نے کیتھرین کو بھی چھوڑ دیا۔"

"ہم بہت مجبور تھے۔ ڈکی میں بھی نہیں ڈال سکتے تھے اُسے اور میں نے تو کہا تھا کہ اُسے بھی لے آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "وقت ملتا تو لے بھی آتا۔"

"چلو اسے چھوڑو، جُولی کو پہلے تلاش کرنا چاہیے تھا۔" غالب نے کہا۔

"میں دیکھتا ہُوں، کمروں میں تو نہیں ہے۔" میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اور ہاں، وہ زیب النساء گُم ہو گئی؟"

"گُم ہو گئی کیا مطلب؟"

"غتر بود ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "کہیں سے اُس نے فون کیا مگر اب پتا نہیں کہ کہاں سے کیا تھا اور پھر وہیں کی کیوں ہو رہی؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر کمروں سے گزرتے ہوئے کونوں میں نگاہ ڈالی جو تاریک تھے۔ پُرانے وقتوں کے کچن اور باتھ روم کے آثار دریافت کیے پھر باہر نکلا اور عقبی حصے کا جائزہ لیا۔ پیچھے ایک آنگن سا تھا جو تین طرف کی کوٹھیوں کے احاطوں کی دیواریں ملنے سے بنا تھا۔ اس میں ایک پُرانا برگد کا درخت تھا جس نے کم و بیش نصف حصے کو گھیر لیا تھا۔ اُس کے نیچے ایک ہینڈ پمپ کا ڈھانچا کھڑا ہُوا تھا۔ ایک گز سے زیادہ پھیلے ہوئے تنے کے علاوہ برگد کی داڑھی دُور دُور تک زمین میں پیوست تھی چنانچہ گھنی شاخوں کے نیچے بھی پتلے پتلے تنوں کا جنگل سا بن گیا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے دوسری طرف ایک بینچ نظر آئی۔ جُولی اُس سیمنٹ کی بینچ پر سکڑی پڑی تھی۔

میں نے اُسے قریب جانے سے پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ اس بینچ کے قریب ہی ایک بہت موٹی شاخ، تنے سے نوّے درجے کا زاویہ بناتی الگ ہوئی تھی۔ شاخ کے مضبوط بازو سے دو زنگ خوردہ زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں اور زنجیروں نے ایک فولادی جھولے کو تھام رکھا تھا۔ جھولے کا فریم لوہے کا تھا لیکن درمیان کا حصہ نوار سے بنایا گیا تھا۔ سالوں پُرانی نوار گل گئی تھی اور اس کے ٹکڑے نیچے لٹک رہے تھے۔ درمیانی حصہ خالی رہ گیا تھا۔ خود جھولا ہر طرف سے شاخوں اور لٹکنے والی داڑھی کے ریشوں میں گھر گیا تھا لیکن میں اس وقت کا تصوّر کر سکتا تھا، جب رنگین نوار والے اس جھولے میں لیٹ کر جُولی فرحت بخش ہوا کی اٹکھیلیاں محسوس کرتی ہوگی۔ آنکھیں کھول کر نیلے آسمان کی گہرائی پر غور کرتی ہوگی اور اُڑنے والے پرندوں کی طاقتِ پرواز کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوگی اور اس کا باپ جسے بہرام داد کے نام سے دُنیا ایک خطرناک ڈاکو مانتی تھی، ایک باپ کی محبت اور شفقت اور غرور کی نظر سے یہ سب دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا ہوگا اور جُولی اپنے ماں باپ کے قرب میں اس جھولے کو ایک مہربان آغوشِ راحت سمجھتی ہوگی۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میرا خیال ایک جذباتی پرواز کے سوا کچھ نہ تھا مگر دل کے سارے سچے جذبے ایک ہی آکاش کے پنچھی ہوتے ہیں اور میرے تخیل نے جُولی کے ساتھ اسی محبت کی پناہ گاہ کو ایسے دیکھ لیا تھا جیسے دو معصوم بچوں کا تصوّر چاند پر ایک ساتھ اور ایک ہی طرح بُڑھیا کو چرخہ کاتنے میں مصروف دیکھتا ہے۔ میں نے اُسے آہستہ سے آواز دی پھر اُس کے شانے کو نرمی سے تھپکا لیکن وہ نیند میں نہیں تھی کہ جاگ جاتی۔ وہ بے ہوش تھا۔ ہسٹیریا کی دیوانگی نے اُسے وہاں تک تو پہنچا دیا تھا جہاں اس کے لیے پیار بھری یادوں کے پہرے میں ایک محفوظ جذباتی حصار اب تک موجود تھا مگر پھر اس کی ساری توانائی ختم ہو گئی تھی۔

ایسے میں بے ہوشی ہی احساس کے عذاب سے نجات دلاتی ہے اور جسم کی بیٹری کو اس حد تک چارج کر دیتی ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد گراں باریٔ ایّام کے ساتھ نئے غم کا بوجھ سنبھالا جا سکے اگر صدمہ بڑا اور دل چھوٹا ہو تو بے ہوشی کا بدل موت یا خود فراموشی بھی بن جاتی ہے۔

میں نے جُولی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ وہ اس قدر کم وزن تھی کہ مجھے تعجب ہُوا۔ میں اُسے اُٹھائے ہوئے اندر گیا تو محسن بھی واپس پہنچ چکا تھا۔

"یہ مل گئی؟" غالب اور محسن نے ایک ساتھ پُرمسرّت لہجے میں کہا۔ حالانکہ یہ مسرّت کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا مگر کبھی کبھی ایک چھوٹا نقصان اُٹھا کے بڑے نقصان سے بچ جانے والے کا ردِّعمل یہی ہوتا ہے۔

"ہاں، ہم نے مَن کی آنکھ سے اسے دیکھ لیا تھا جو تم عقل کے اندھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے۔" غالب نے کہا۔ "میرے دل کو ملامت کے قرض سے چھٹکارا ملا، ورنہ تمام عمر کیتھرین کی لاش اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے فریاد کناں رہتی۔"

میں نے جُولی کو کار کے کور پر لٹا دیا۔ عائشہ اور سراج کی ماں ہماری گفتگو سُن کے اُٹھ بیٹھی تھیں۔ عائشہ کی آنکھوں میں تجسّس اور حیرت تھی تو سراج کی ماں کی نظر میں صرف ملامت۔

"اسے کچھ دیر میں ہوش آ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"پھر یہ ہنگامہ کرے گی۔" محسن بولا۔

"کچھ دیر میں صبح بھی ہو جائے گی۔" غالب نے کہا۔ "تم نے کچھ سوچا ہے کہ سارا دن کیسے گزرے گا؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیسے گزرے گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن گزرے گا اسی جگہ۔ ہمارے لیے کسی بھی جگہ جانا بلاوجہ خطرے سے کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ آج کے دن کوئی سڑک محفوظ نہیں ہوگی۔ سب سے بہتر یہی ہوگا کہ ہم یہاں دُبکے پڑے رہیں، کل تک۔"

"کل کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔

"سفر۔" میں نے جواب دیا۔ "جو وسیلۂ ظفر ہوتا ہے مگر اب یہ نہ پوچھنا کہ منزل ہے کہاں تیری اے لالہ لاہوری، کیونکہ آدمی اور اس کے ارادے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اُس نے سوچا اسلام آباد جانے کا اور پہنچ گیا عدم آباد یا مشرق کا کہہ کے نکلا اور مغرب کی جانب چل پڑا۔"

غالب سمجھ گیا کہ میں عائشہ کے سامنے اپنے پروگرام پر بات کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ اُس نے کہا۔ "چل لاہور کے لالے، تیری مان لی۔ آج اسی ہوٹل خانہ خراب میں قیام کرتے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہیں، پورا فلور بُک کرا کے مگر مجھے اس ہوٹل میں صرف قیام کے امکانات نظر آتے ہیں، طعام کے نہیں۔"

"روزہ رکھو مرزا غالب اور ایک دن فقر و فاقے میں گزار کے تو دیکھو۔" محسن نے مشورہ دیا۔

"یا اللہ پر بھروسا کرو،" مَیں نے کہا۔ "اُس نے ہمیں رزق فراہم کرنے کے لیے گرد و نواح کے کسی کونے کھدرے میں کوئی نہ کوئی حلوائی ضرور بٹھا رکھا ہوگا جو نہار مُنہ حلوا پوری تلنے کا نیک کام شروع کرے گا۔"

"اُسے اپنا ماموں، سُسر یا والدِ ثانی بنا لوگے تب بھی وہ پیسے ضرور مانگے گا۔" غالب بولا۔

"پیسے... کتنے پیسے؟ لاکھ دو لاکھ روپے؟ پانچ چھ لاکھ روپے... غالباً اتنی رقم میں حلوا پوری کیا پورا حلوائی آجاتا ہے اور تم یہ جانتے ہو کہ ہمارے پاس تو دس لاکھ ہیں۔"

"ہم جانتے نہیں، ہم نے صرف سُنا ہے۔" غالب بولا۔

"اور وہ بھی ان سے جو سچ اور جھوٹ کے درمیان تفریق کو مانتے ہی نہیں۔" محسن نے اس کی تائید کی۔

"مگر اُنھوں نے سچ جاننے کا طریقہ بتا دیا تھا۔" مَیں نے کہا۔ "یا یوں سمجھ لو کہ خزانے کی چابی ہمارے حوالے کر دی تھی۔"

محسن نے عائشہ کی طرف دیکھا۔ "تم سمجھ دار ہو۔"

"مَیں... مَیں... کیا کر سکتی ہوں؟" عائشہ نے چونک کر کہا۔

"ہمیں بتایا گیا تھا کہ تم اس سُوٹ کیس کو کھول سکتی ہو۔" مَیں نے کہا۔ "اور یہ کہ اس میں واقعی دس لاکھ روپے ہیں۔"

"انھوں نے غلط بیانی کی تھی۔" عائشہ نے خشک لبوں پر زبان پھیر کے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"اچھی طرح سوچ لو، کہیں تم تو غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہو، ہم ہر قفل کھولنا جانتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ کا قفل اور سچ کا قفل، اگر تمھارے لبوں کا قفل کھولنے کے بعد ہمیں یقین آگیا کہ تم کو واقعی کچھ نہیں معلوم تو پھر ہم خود اس سُوٹ کیس کو بھی کھول لیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"کیا تم مجھ پر تشدد کرو گے؟" عائشہ سہم کر بولی۔

"مَیں نے کہا تھا نا کہ تم سمجھ دار ہو۔" محسن بولا اور اُس نے عائشہ کو بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔

"چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلّانے لگی۔ محسن نے اُس کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا، وہ نیچے گر گئی۔

"آواز کم رکھو۔" محسن نے آہستہ سے کہا اور اُسے پھر کھڑا کر دیا۔

"تم پولیس والوں کے طریقۂ تفتیش سے تو واقف ہو؟" مَیں نے نرمی سے کہا۔ "ہم پولیس والوں کے باپ ہیں، وہ ہم سے پناہ مانگتے ہیں۔ تم صرف چند منٹ میں سُوٹ کیس کھولنے کو ترجیح دو گی خواہ اس کے نتیجے میں تم کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔"

عائشہ خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور غصّے کی ایسی آگ تھی جس کے شعلوں کو وہ دبائے رکھنے پر مجبور تھی چنانچہ یہ آگ اُس کے وجود کے اندر ہی اندر پھیل رہی تھی۔

"ٹھیک ہے محسن، اس کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔" مَیں نے کہا۔ "یہ بہادر لڑکی ہے، بس اتنا خیال رکھنا کہ جان نکل جائے مگر آواز نہ نکلے۔"

محسن نے اُسے ایک دم دبوچ لیا۔ اُس کا ہاتھ یوں موڑا کہ وہ خود ہی گھوم گئی مگر چیخ نہ سکی کیونکہ محسن نے اس کے مُنہ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا لیا تھا۔ محسن اُس کی کلائی کو تھوڑا سا بل دیتا تھا تو وہ کرب سے بُری طرح بل کھاتی تھی مگر اُس کا جسم محسن کے اور دیوار کے درمیان دبا ہُوا تھا۔

"ضد چھوڑ دے لڑکی۔" سراج کی ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ محسن نے اُسے ذرا سی دیر کے لیے آزاد کیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی اور پھر کانپتی آواز میں بولی۔ "مَیں... مَیں مرنا نہیں چاہتی۔"

"مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا۔" محسن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مگر موت کا وقت ٹالا تو نہیں جا سکتا، اگر یہ سُوٹ کیس ایک ڈیتھ ٹریپ ہے جو تمھارے دُلہا بھائی نے ہمارے لیے بنایا تھا تو اسے وقت کی ستم ظریفی سمجھو کہ اس طرح تمھارے لیے موت کا سامان کیا۔ میرا مطلب ہے آسان اور فوری موت کا۔ تم تھوڑا تھوڑا مرنا یقیناً پسند نہیں کرو گی۔ ہم رحم اور رعایت کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ دُشمن ہمارے لیے بھی دُشمن ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ سچ کہاں چھپا ہُوا ہے، ہمیں تمھارے دماغ کو خالی کرنا پڑے گا، اس کا ریزہ ریزہ چھاننا ہوگا۔ تمھارے خون کے آخری قطرے سے بھی سچ کشید کرنا پڑا تو ہم کریں گے، اگر اس کے بعد ثابت ہوگیا کہ تم کو واقعی کچھ معلوم نہیں تھا تو ہم سوری کہہ کے تم کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔ جنگ میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بم پھینکنے والا جانتا ہے کہ اس سے بے گناہ عورتیں، معصوم بچّے اور معذور بوڑھے بھی ہلاک ہوں گے۔ تم صُبح کا سورج نہ دیکھ سکو گی مس عائشہ۔"

"بصورتِ دیگر، شاید تمھیں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کے لیے مہلت مل جائے۔" مَیں نے کہا۔ "یہ قید عارضی ہے، تم کو واپس جانا ہی ہے۔"

"کیونکہ اب چوہدری دلاور اور ایس ایس پی صاحب ہماری شرائط پر سودا کرنے پر مجبور ہیں۔" غالب نے کہا۔

"تمھاری بہن بھی تھوڑے دن کی مہمان ہے۔" مَیں نے کہا۔ "وہ بہت جلد مر جائے گی پھر تم مسز دلاور بن کے عیش کرو گی، دلاور کے پروگرام کے عین مطابق... تم پر کسی کے قتل کا الزام نہیں آئے گا۔"

"مَیں... مَیں بتاتی ہوں۔" عائشہ نے لرزتے ہوئے کہا۔ "مَیں وہ سُوٹ کیس کھول دوں گی۔"

ہمارے ڈائیلاگ جو صرف عائشہ کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تھے، مؤثر ثابت ہوئے تھے۔ "چلو پھر سُوٹ کیس اُٹھاؤ۔" محسن بولا۔

عائشہ نے سُوٹ کیس اُٹھا لیا۔ "باہر چلو۔" اس نے محسن کو اشارہ کیا۔

"باہر کیوں؟" محسن بولا۔ "یہاں کیا حرج ہے؟"

"حرج میرے لیے یہ ہے کہ سب کے ساتھ مجھے بھی مرنا پڑے گا۔" عائشہ نے تلخی سے کہا۔

"کیا اس سے کوئی دھماکا ہوگا؟" مَیں نے کہا۔

"نہیں، دھماکا وغیرہ کچھ نہیں ہوگا۔" عائشہ نے کہا۔ "اس کو کھولنے کا کوئی پیچیدہ عمل ہے، یہ لاک دباؤ، ذرا سے دباؤ کے ساتھ دائیں اور بائیں کھینچو، لاک کھٹ سے کھُل جائیں گے مگر ایسا کرنے سے پہلے مجھے باہر جانے دو یا پھر تم بھی میرے ساتھ باہر چلو۔"

اُس نے مجھے کنفیوز کر دیا تھا۔ مَیں نے محسن سے کہا۔ "ٹھیک ہے اسے باہر لے جاؤ۔"

"اس بات کا خیال رکھنا کہ تمھاری کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔" محسن نے کہا۔ "تمھاری بدقسمتی کہ مَیں شادی شدہ ہوں، تم جیسی خوبصورت لڑکی کو ٹھائیں سے گولی مارتے ہوئے میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

عائشہ نے بُرا سا مُنہ بنایا اور بڑی تنک مزاجی سے باہر نکل گئی۔ مَیں بھی صرف دلچسپی کے باعث محسن کے ساتھ رہا۔ مَیں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سُوٹ کیس میں موت کو کس طرح بموفلاج کیا گیا تھا۔ عائشہ کی طرف سے مجھے فکر نہیں تھی کہ محسن کیلا اُس سے نہ نمٹ سکے گا۔ عائشہ نے باہر نکل کے اِدھر اُدھر کچھ دیکھا پھر نیچے جھک کر ایک پُرانے کاغذ کے ٹکڑے کو اُٹھا لیا۔ اُسے سر سے اُوپر لے جا کے چھوڑ دیا۔ وہ ہَوا کا رُخ دیکھنا چاہتی تھی جو بہ ظاہر ساکت لگتی تھی مگر کاغذ تھوڑا سا دائیں طرف گیا۔ عائشہ نے اپنا رُخ اُدھر ہی رکھا۔ نیچے جھُکی اور اگرچہ وہ ہم سے پانچ چھ فٹ دُور تھی مگر اندھیرے میں اس کی انگلیوں کی حرکت نہیں دیکھی جا سکتی تھی، ہم نے تو بس ایک کھٹکا سُنا۔ بہرحال وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی کہ یہ عام قسم کا لاک تھا، جسے کھولنے کی کوئی خاص ٹیکنک نہیں تھی۔

مَیں اور محسن غوطہ مار چکے تھے، جب عائشہ ایک دم پیچھے ہٹی، اتنی تیزی سے کہ وہ ہم سے ٹکرائی۔

"پیچھے چلو اور دُور ہو جاؤ۔" اُس نے چلّا کے کہا۔

"آہستہ۔" محسن نے غرّا کے کہا اور ہم چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"کیا اس میں سے جن نکلنے والا ہے؟ کوئی آدم خور جن؟" مَیں نے کہا۔

"جو دلاور کا تربیت یافتہ غلام ہوگا اور ہم دونوں کا مُربّہ بنا دے گا۔" محسن نے کہا۔ "جسے دلاور تمھاری آنکھوں میں لگا دے گا تو ہمیشہ خوش رہے گا، مُسکراتا رہے گا، مرتے دم تک۔"

"ہمت ہے تو ذرا قریب جا کے سانس لو۔" عائشہ نے طنز سے کہا۔ "پھر دیکھوں گی کہ تم کس طرح مُسکراتے ہوئے مرتے ہو۔ اس میں سے وہ قاتل گیس خارج ہو رہی ہے جسے تم ایک بار سانس کے ساتھ اندر لے جاتے تو دوسرا سانس نہ لے پاتے۔"

"آئی سی، گویا اس میں سے سائنائیڈ گیس نکل رہی ہے جو امریکا میں سزائے موت دینے کے لیے گیس چیمبر میں استعمال ہوتی تھی؟"

عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سُوٹ کیس کو برابر دیکھتی رہی۔

"اتنا بتا دیا ہے تو اب یہ بھی بتا دو کہ گیس کتنی دیر تک نکلتی رہے گی اور یہ سب انتظام کس طرح کیا گیا تھا؟" محسن بولا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" عائشہ نے مختصراً کہا۔

"تمھیں بہت کچھ معلوم ہے۔" مَیں نے کہا۔

"مجھے وہی معلوم تھا جو مجھے راستے میں جمشید نے بتایا تھا کہ تم اس سُوٹ کیس کو ہرگز ہرگز مت کھولنا اور جب وہ لوگ کھولیں تو فوراً اپنا سانس روک کے دُور نکل جانا۔" عائشہ نے کہا۔ "کمرے سے باہر۔"

"گویا اُس کے ذہن میں یہ اندیشہ تھا کہ ہم تمھیں مجبور کر سکتے ہیں؟"

"ہاں اور اُس نے مجھے احتیاط بھی سمجھا دی تھی۔" عائشہ نے کہا۔

اُسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ کوئی چیز دھپ سے نیچے گری۔ یہ کالی سی چیز برگد کے درخت کی شاخوں میں سے ٹپکی تھی۔ اُس کے چند سیکنڈ بعد دوسری آواز آئی۔ یہ درخت کی شاخوں میں آشیانہ رکھنے والے پرندوں کے بے جان جسم تھے۔ اس قاتل گیس نے تحفظ کے ضامن ہر نشیمن کو گیس چیمبر بنا دیا تھا اور جو گیس ہَوا کے ساتھ مل کر اُوپر اُٹھی تھی، اس سے چڑیاں اور کوّے مر مر کے ٹپکتے جا رہے تھے۔ دس منٹ میں اس سُوٹ کیس کے آس پاس مُردہ پرندوں کا بستر سا بچھ گیا۔ مَیں اپنے آپ سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شرمندہ سا کھڑا رہا، یہ ہم تھے جنھوں نے شجرِ سایہ دار کی محفوظ آغوش میں رہنے والوں کی پوری بستی کو موت کی نیند سلا دیا تھا، پرندے کسی جنگ میں شریک نہیں تھے اور کسی کے دُشمن نہیں تھے۔ وہ کائنات کا حُسن تھے۔ نغمہ تھے اور رنگ تھے۔ یہ درخت ایک ہیروشیما تھا جس پر ہم نے یکلخت ایٹم بم گرا دیا تھا۔ یوں کہ پلک جھپکتے میں زندگی کی جگہ موت نے لے لی تھی۔ وہ سب طائرانِ بے نوا ہماری جگہ اپنی جان دیتے جا رہے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ شاید دس منٹ میں پچاس ساٹھ پرندے مر کے گرے تھے۔ ان میں زیادہ تر چڑیاں تھیں اور چڑے تھے، باقی کوّے تھے۔ چڑیا چڑے کی کہانی بھی میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ ان میں سے ایک دال کا دانہ لایا تھا اور دوسرا چاول کا، پھر اُنھوں نے مل کر کھچڑی پکائی تھی۔ پیاسے کوّے سے بھی میری پُرانی شناسائی تھی۔ اُس نے کم پانی میں کنکریاں ڈال کے کیسے پیاس بجھائی تھی، یہ بھی ایک کہانی تھی اور شاید نصف صدی میں تیسری نسل کے بچے بھی انھی کہانیوں سے عملی زندگی کا سبق حاصل کر رہے تھے۔ یہ تیسری کہانی سب سے الگ تھی کہ جب وہ بچے بڑے ہوتے ہیں تو اشتراکِ عمل اور جدوجہد سکھانے والے انھی پرندوں کے آشیانوں میں سائنایڈ گیس چھوڑ دیتے ہیں، اگر آج کے بچے یہ تیسری کہانی پڑھیں تو اُنھیں کتنا دُکھ ہو اور کتنی مایوسی ہو۔

"اب کیا رات بھر یہاں چلہ کاٹیں گے مہاراج۔۔؟" محسن نے کہا۔

میں چونکا۔ "کیا سارے پرندے مر گئے، سب آشیاں اُجڑ گئے۔۔۔"

"اچھا، تو آپ فلسفۂ حیات و موت پر جذباتی قنوطیت میں مُبتلا تھے۔" محسن نے کہا۔

"دیکھ نا یار! وہ تو مرتے ہی ہیں جو دُشمن بن کے لڑتے ہیں مگر اصل المیہ ان کا ہے جو بے سبب مارے جاتے ہیں۔"

"دیکھ بھائی، فنا اور بقا کی یہ جنگ تو دُشمنی کے جذبات کے بغیر بھی ہمیشہ سے جاری ہے۔ انسان نے درندوں کو ہلاک کیا اور درندوں نے جنگل کے کمزور جانوروں کو مارا۔ یہ تو ہُوا جنگل کا قانون مگر شہر میں جہاں قانون ہے اور آدمی مہذّب کہلاتا ہے، وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیا کمزور زندہ رہ سکتا ہے۔ بیشتر انسان زمین پر حشرات الارض کی طرح جیتے اور مرتے ہیں، وہ دیو ہیکل، طاقت، اقتدار اور دولت کے نشے میں چور بدمست ہاتھیوں کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں کیونکہ وہ ان کے لیے راستہ چھوڑ کے نہیں چلتے یا ان کی لڑائی کے میدان ہی میں رہتے ہیں۔ سیاست میں بڑی طاقت، شہر میں بڑا بدمعاش، ملک میں ظالم حکمراں، یہ سب ایسے ہی ہاتھی ہیں جیسے دلاور، جمشید اور ایس ایس پی بن جانے والا سراج ہیں۔ ان کے راستے میں آنے والے اور ان کی ہوسِ اقتدار اور ہوسِ زر کا شکار کون ہو رہے ہیں۔ وہی جو اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سکون سے رہتے تھے۔ ان پرندوں کی طرح۔۔۔ مس عائشہ تم ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ یہ تمھاری سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔"

"ہاں، میں نے محسوس کیا ہے تم جو کچھ کر رہے ہو سوچ سمجھ کے کر رہے ہو۔" وہ بولی۔ "اور میں سوچے سمجھے بغیر کر رہی ہوں۔ تم بڑے عجیب لوگ ہو، مشین گن لے کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کے مرنے مارنے کے لیے تیار پھرتے ہو مگر چڑیاں کوّے مریں تو اُداس ہو جاتے ہو۔"

"ہم عجیب و غریب نہ ہوتے تو آج اس ویران کھنڈر میں اُلّو کی طرح نہ بیٹھے ہوتے۔" میں نے کہا۔ "پیرس یا ٹوکیو کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دادِ عیش دے رہے ہوتے۔ مونٹی کارلو کے کیسینو میں جُوا کھیل رہے ہوتے یا لاکھ کے کروڑ اور کروڑ کے ارب بنانے کی فکر کر رہے ہوتے، یہ سب ہمارے اختیار میں تھا مگر ہم نے چھوڑ دیا، چنانچہ ہم عجیب بھی ہیں۔۔۔ اور غریب بھی۔"

"کیا اب تم اس سوٹ کیس کو اُٹھا کے لا سکتی ہو؟" محسن بولا۔

"اب تو تم بھی لا سکتے ہو۔" عائشہ نے کہا۔

"مگر ہم تمھیں ہی زحمت دیں گے۔" محسن نے کہا۔

عائشہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی۔ وہ بے یقینی کے خوف کا شکار تھی۔ "اُنھوں نے کہا تھا کہ پانچ منٹ بعد خطرے کی کوئی بات نہیں ہو گی۔"

"اب پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

عائشہ آگے بڑھی۔ پرندوں کی موت نے اُسے دہشت زدہ کر دیا تھا اور اُسے سائنایڈ گیس کی بے پناہ ہلاکت خیزی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ گیس ہوا میں شامل ہو کے اُوپر اُٹھ چکی تھی مگر یہ اندیشہ بڑا جان لیوا تھا کہ کہیں ہوا میں اس کا تناسب ہزار میں ایک حصہ بھی ہو گا تو وہ انھی پرندوں پر گرے گی جن کے مُردہ جسم اب ٹھنڈے اور سخت ہو رہے تھے۔ وہ ایک قدم چل کے رُک گئی تھی۔ محسن نے اُسے پیچھے سے یوں دھکیلا کہ وہ مُنہ کے بل سُوٹ کیس پر جا گری۔ اُسے محسن سے اس قسم کی بے رحم اور سفاکانہ کارروائی کی بالکل اُمید نہ تھی، اس کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اور وہ چند سیکنڈ تو اُٹھ بھی نہ سکی۔

ہمارے لیے اتنا یقین کافی تھا، اگر سوٹ کیس میں یا اس کے قریب ذرہ برابر بھی زہریلی گیس ہوتی تو عائشہ اُٹھ نہ

سکتی۔ وہ جیسے ہی اُٹھی، میں نے اُسے پکڑ لیا۔ محسن نے سوٹ کیس کو احتیاط کے ساتھ اُٹھایا اور ہم اندر چلے گئے۔ مجھے تھوڑی سی تشویش عائشہ کی چیخ سے لاحق ہو گئی تھی۔ کچھ دیر ہم دم سادھے منتظر رہے کہ آس پاس کے کسی گھر سے کوئی باہر آئے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ چیخ کس نے ماری تھی مگر رات کے آخری حصے میں نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ کسی نے کچھ نہیں سُنا تھا، سُنا تھا تو خواب یا وہم سمجھ کے نظر انداز کر دیا تھا یا باہر نکل کے دیکھا تھا، تب بھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ چیخ اس کھنڈر سے سُنائی دی تھی جو مدّت سے ویران پڑا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ بہت ذلیل حرکت تھی۔" عائشہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوف سے اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

محسن ہنسا۔ "کیا اس سے بھی زیادہ جو تم کر رہی ہو۔ ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔۔۔ یا ہے تو نفرت کا اور دُشمنی کا مگر تم اپنی بڑی بہن کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟ تم مر جاتیں تو مجھے بالکل افسوس نہ ہوتا۔ میں سمجھتا کہ یہ قدرت کی سزا تھی جو تم کو ملی اور وہ بھی دلاور کے ہاتھوں۔"

"خیر، خدا کے انصاف میں دیر ہے، اندھیر نہیں۔" میں نے کہا اور ایک امکان پر غور کرنے لگا کہ ہم نے دس لاکھ مانگے تو کیا دلاور نے یہ بندوبست پہلے سے کر لیا تھا؟ نہیں، پھر اسی خیال نے مجھے مجبور کیا کہ میں محسن کو دوسرے کمرے میں لے جاؤں کیونکہ میں عائشہ کے سامنے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے غالب کو بھی درمیانی دروازے کے قریب بُلا لیا جہاں سے وہ عائشہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سراج کی ماں کی طرف سے کسی کو خطرہ نہیں تھا مگر اُس کے کانوں میں پڑنے والی بات خطرہ بن سکتی تھی۔

"مرزا غالب! کیا یہ انتظام صرف ہمارے لیے تھا؟ دلاور عالمِ غیب نہیں ہے کہ پہلے ہی اُس نے صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ ہم دس لاکھ طلب کریں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ واقعی غور طلب نکتہ ہے۔" محسن نے کہا۔ "ظاہر ہے، جمشید نے ایک گھنٹے میں یہ بندوبست نہیں کیا۔ سُوٹ کیس پہلے سے تیار تھا اور اس کی چابی جمشید کے پاس تھی مگر سوال یہ ہے کہ کس کے لیے؟"

"اور پورے دس لاکھ!" غالب نے حیرانی سے کہا۔ "اگر ہم بیس یا پچاس لاکھ مانگ لیتے پھر۔۔۔ نہیں دوست۔۔۔ یہ ڈیتھ ٹریپ ہمارے لیے تیار کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔"

"پھر کس کے لیے تھا؟" میں نے کہا۔

"اسلحہ کس کے لیے ہوتا ہے؟" غالب بولا۔ "مشین گن کی گولی پر کس کا نام ہوتا ہے اور ٹائم بم پر کہاں لکھا ہوتا ہے کہ اسے کس وقت اور کہاں استعمال کیا جائے گا، یہ لوگ جس کاروبار میں ملوث ہیں اس میں یہ ہتھیار کسی دُشمن کے خلاف بھی کام آ سکتا ہے اور کسی دوست کے بھی۔ اس میں کون اپنا کون پرایا۔ دس لاکھ ادا کر کے اس کی جان بھی لی جا سکتی ہے جو ادائے فرض میں کوتاہی کا مرتکب ہوا اور اس کی بھی جس کا ضمیر اُسے پریشان کرنے لگے یا جسے شرافت کا دورہ پڑ جائے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ ایسے ہی مہلک کھلونے دوسروں کے پاس بھی ہوں گے۔" میں نے قائل ہو کے کہا۔

"بالکل ہوں گے۔ دلاور کے پاس جو مہلک گیس والا بم تھا، اس کا فیوز جمشید کے پاس تھا یعنی چابی کسی اور کے پاس تھی تاکہ اس بات کا ایک فیصد امکان بھی نہ رہے کہ دلاور کے گھر میں کوئی تجوری کھول لے۔ آدمی کتنی بھی احتیاط کرے کبھی نہ کبھی چابی کو اِدھر اُدھر بھول جاتا ہے، بچّوں کو نہ سہی بڑوں کو خصوصاً عورتوں کو تجسس مجبور کرتا ہے کہ جو چیز چھپا کے رکھی جائے یا شجرِ ممنوعہ ہو، اس کا راز ضرور جان لیں۔" غالب نے کہا۔

"ہاں، پنڈورا کا باکس بھی کھول کے ضرور دیکھیں گی، خواہ اس کے بعد کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ نازل ہو جائے۔" محسن بولا۔

"ایسے ہی ہتھیار اُنھوں نے گھر میں رکھے ہوں گے تو اُس کی چابی کسی دوسرے کے پاس رکھوائی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر دس لاکھ کی رقم کیا اتفاق سے مانگ لی تھی ہم نے۔۔۔ اور حُسنِ اتفاق سے سُوٹ کیس میں بھی دس لاکھ رکھے گئے تھے، پانچ لاکھ کیوں نہیں تھے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ رقم بعد میں ڈالی گئی۔"

"اس راز پر سے تو وہی پردہ اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے پردہ ڈالا تھا مگر دوستو! کیا تم خوش اعتقادی میں یقین کرنے سے پرہیز نہیں کر سکتے۔ کم سے کم دُشمنوں کے معاملے میں۔" غالب نے کہا۔ "تم کو شک سے آغاز کرنا چاہیے اور تصدیق کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

"ذرا اس نکتے کی وضاحت فرمائیے۔ ہم کُند ذہن لوگ بات کی تہ تک نہیں پہنچتے۔" محسن نے کہا۔

"میں پہنچ گیا۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "مرزا نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ میاں شیروانی! تم نے کیسے جانا کہ یہ دس لاکھ ہیں؟"

"ایسے جانا؟" محسن سر کھجا کے بولا۔ "بس ایسے ہی، مان لیا۔"

"ہاں، یہی آپ کی کم عقلی ہے۔ جمشید نے کہا اور آپ نے مان لیا۔ اب ذرا گن کے دیکھیے، اگر واقعی دس لاکھ ہوئے تو پھر یہ اتفاق ہو گا کہ ہماری زبان سے بھی دس لاکھ ہی نکلے۔ دُنیا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اتفاقات سے خالی نہیں۔" غالب بولا۔

"مَیں سُوٹ کیس اُٹھا لاتا ہُوں۔" مَیں نے کہا۔

"دس لاکھ کی گڈّیاں ہیں، نوٹ پُرانے ہیں۔" محسن بولا۔ "ہم خود گن کر دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹھہرو یار، تم پھر غلطی کر رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

"اب کیا ہُوا؟" محسن نے نوٹوں کے ڈھیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم شکاری نہیں اناڑی ہو۔" غالب نے کہا۔ "ہر شکاری جب دام لگاتا ہے تو ناکامی کے امکانات کا سدِّباب بھی رکھتا ہے۔ شکار اگر ایک جگہ سے بچ کر نکل جائے تو دوسری جگہ پکڑا جائے۔ متبادل بندوبست رکھنا دُوراندیشی کی بات ہے اور تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ دلاور کس حد تک دُوراندیش ہے۔ کیا اُس کے ذہن میں نہیں ہوگا کہ ترکیب نمبر ایک ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کی خوش قسمتی کے امکانات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی کسی دامِ اجل سے بچ جائے۔ فرض کرو، ہم سُوٹ کیس ایسی جگہ کھول لیتے جہاں ہَوا کا رُخ موافق ہوتا۔ مثلاً ہمارے پیچھے سے ہَوا آ رہی ہوتی۔ کوئی ٹیبل فین یا پیڈسٹل فین ہوتا جو زہریلی گیس کو باہر پھینک دیتا۔ کسی بھی قریبی دروازے یا کھڑکی سے۔"

"ہم نہیں جانتے اور یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب ہمیں ہلاک کرنے کے لیے تھا۔"

"مَیں بھی صرف اپنی بات نہیں کر رہا ہُوں، وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ ایک چال سے بچ جائے تو دلاور ایسا نہیں کہ اس کے لیے دوسری چال بعد میں سوچے نہیں، وہ دوسری چال کو زیادہ اہم سمجھتا ہوگا جس کا شکار ہونے سے کسی کو تقدیر بھی نہیں بچا سکتی۔ تم ایسا کرو، عائشہ سے کہو کہ رقم شمار کرے۔"

"تم بہت دُور کی کوڑی لائے ہو لیکن مرزا غالب! اسے تم اپنی غیرمعمولی عقل و ذہانت کا کرشمہ مت سمجھنا، یہ صرف فیضانِ صحبت ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہ کے کچھ سوچنے لگے ہو۔" مَیں نے کہا۔ "ورنہ تم تو ناچیز، ہیچ مُداں وغیرہ تھے۔"

"مَیں سمجھتا ہُوں کہ اتنی احتیاط پسندی سے کام لیں گے تو ہم ایک قدم اُٹھانے کے بعد دوسرا قدم اُٹھانے تک بہت وقت ضائع کریں گے۔" محسن نے کہا۔

"وقت اور زندگی، دونوں میں سے ایک کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش تو کرنا چاہیے۔" غالب نے کہا۔

اس کی بات دس منٹ کے بعد ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی حقیقت بن کے سامنے آئی۔ محسن نے عائشہ سے کہا کہ وہ رقم شمار کرے۔ غالب وہیں بیٹھا رہا۔ میں تقریباً درمیان میں تھا اور کھڑکی سے باہر اُفق پر صبحِ کاذب کا اُجالا دیکھ رہا تھا اور رابعہ کا تصوّر کر رہا تھا۔

"ایک ایک نوٹ کو شمار کروں؟" عائشہ نے کہا۔

محسن نے جواب دینے سے پہلے میری طرف دیکھا۔ "نہیں! بس اندازہ ہو جائے کہ یہ دس لاکھ ہیں۔"

"ایک روپیہ بھی کم ہُوا تو تمھیں لانا پڑے گا۔" مَیں نے کہا۔ "اور زیادہ ہُوا تو ہم واپس کر دیں گے۔ تم لے جا کے چوہدری صاحب کو دے دینا۔ ان میں اور تم میں ایک ہی قدر مشترک ہے، پیسہ... اس کی خاطر وہ اپنے ہم وطنوں کی جان لے رہے ہیں اور تم اپنی بہن کی جان لے رہی ہو۔" غالب بولا۔

عائشہ نے زخمی ناگن کی طرح بل کھا کے غالب کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی دُکھتی رگ تھی جو ہم نے چور کی داڑھی والے تنکے کی طرح پکڑ لی تھی اور اب اس پر جانتے بوجھتے وار کر رہے تھے۔ سراج کی ماں اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی جُولی بدستور ہوش سے بیگانہ پڑی تھی۔ عائشہ نے ایک ایک گڈّی کو سُوٹ کیس سے نکال کے باہر رکھنا شروع کیا، یہ سب سو سو کے نوٹ تھے چنانچہ سُوٹ کیس میں سو گڈّیاں ہونی لازمی تھیں۔

"ذرا یہ بھی دیکھتی جاؤ اور دکھاتی جاؤ کہ سب نوٹ ہی ہیں اُوپر نوٹ اور اندر سادے کاغذ نہیں ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟" عائشہ نے تنک کے کہا۔

"مَیں دیکھنا چاہتا ہُوں کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی حسین لگتی ہے۔" مَیں نے کہا۔

عائشہ نے ایک گڈّی کو ایک کونے سے پکڑ کے نوٹوں کو ایسے پھیلایا جیسے کوئی کتاب کے ورق پھیلائے کہ ہر ورق ایک مسلسل حرکت میں انگلیوں کے لمس سے پھسلتا ہُوا نکلتا جائے۔ ابھی اُس نے بیس گڈّیاں ہی دیکھ کے رکھی تھیں کہ اس کا ہاتھ رُک گیا۔

"کیا بات ہے؟" مَیں نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں، مجھے ذرا چکّر سے آ رہے تھے۔" وہ بولی اور پھر گڈّیاں نکالنے لگی۔ آدھی رقم نکالتے نکالتے اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اُس کی صورت پر نمایاں ہونے والے تغیّر کو محسن نے بھی نوٹ کیا اور وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے دماغ میں کیا ہو یا نہ آیا ہو مگر میرے دماغ میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کہیں ان نوٹوں کی ہَوا میں تو زہریلے اثرات شامل نہیں۔ عائشہ نے دو گڈّیاں اور اُٹھائیں پھر اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اچانک وہ بیٹھے بیٹھے فرش پر گر گئی۔

"کیا ہُوا ہے اسے؟" سراج کی ماں نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"معلوم نہیں۔" غالب بولا۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ مَیں اور محسن دیکھ رہے تھے کہ غالب کے دماغ نے بہت دُور کی سوچی تھی جس کو ہمارے ذہن نے خیالِ دمحال سمجھا تھا مگر عائشہ کی ہر لحظہ بگڑتی حالت اس امر کی تصدیق کرتی تھی کہ وہ دُور کی کوڑی نہیں، غالب کی چھٹی حس کا کارنامہ تھا یا بچانے والے کا ہاتھ تھا جو مارنے والے ہاتھ سے ہمیشہ زبردست رہا ہے کہ ہم محفوظ رہے۔

"پانی... تھوڑا سا..." عائشہ نے کہا اور اس کا جسم کرب سے زمین پر پھیل گیا۔

"دیکھو، اتنے سنگدل نہ بنو۔" سراج کی ماں نے کہا۔ "اس کی طبیعت بہت خراب ہے، اسے تھوڑا سا پانی لا دو۔"

"پانی کہاں سے لا دیں؟" مَیں نے کہا۔ "اچھا مَیں دیکھتا ہُوں، باہر ایک پُرانا ہینڈ پمپ ہے تو سہی۔"

"لیکن پانی لائیں گے کس میں؟" محسن بولا۔ عائشہ اب اپنے دونوں ہاتھ یوں گلے پر لے جا رہی تھی جیسے اُس کا دم گھُٹ رہا ہو۔

"کوئی کپڑا تر کر لاؤ۔" سراج کی ماں نے چلّا کے کہا۔ "باہر کوئی ٹھیکرا، ٹین ڈبّا، کچھ بھی ملے بھر لاؤ۔"

مَیں اور محسن ایک ساتھ باہر نکلے۔ محسن نے نلکے کے ہینڈل کو ہلانا چاہا مگر وہ جام ہو رہا تھا۔ اُس کے نٹ بولٹ، ہینڈل اور پائپ سب پر زنگ کی مار تھی۔ زنگ سالہا سال سے لوہے کو کھا رہا تھا اور کاٹ رہا تھا۔ دُھوپ اور بارش، اوس اور پالے میں لوہا گل رہا تھا۔ محسن نے زور لگایا تو ہینڈل ٹوٹ کر اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ محسن نے آدھے ہینڈل کو دُور پھینک دیا۔

"کیا کوئی مٹکا نہیں ہوگا اندر؟" محسن بولا۔

"ہُوا تو بدتر حالت میں ہوگا۔" مَیں نے مایوسی سے کہا۔ ہم سر جھکائے لوٹ آئے۔ عائشہ کے لبوں سے جھاگ سا نکل رہا تھا اور اُس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے خوف آیا۔ کچھ دیر پہلے مَیں نے کہا تھا کہ مَیں دیکھنا چاہتا ہُوں کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں میں کھیلتی ہوئی کتنی خوبصورت لگتی ہے۔ اب مَیں دیکھ رہا تھا کہ خوبصورت لڑکی لاکھوں کے ڈھیر میں مرتی ہوئی کیسی تصویرِ عبرت لگتی ہے۔ اُس کے ہاتھوں نے نوٹوں کو پھیلا دیا تھا۔ سُوٹ کیس کو اُلٹ دیا تھا۔ اُس کا چہرہ اندر کی اذیّت سے مسخ ہو رہا تھا۔ موت اس لڑکی پر خندہ زن تھی، جس نے دستِ قضا کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لینے کا سوچا تھا۔ اس عورت پر خندہ زن تھی جس نے دوسری عورت کی لاش پر اپنے لیے کمینی خوشیوں کا سامان رکھنے والی زندگی مانگی تھی۔

اُس بہن پر خندہ زن تھی جس نے طوائف سے زیادہ قعرِ ذلت میں گر کے اپنے جسم کا سودا کیا تھا۔ طوائف تو صرف پیسے کے لیے عورت نہیں رہتی لیکن عائشہ نے جسم کے ساتھ رشتوں کی تقدیس بھی بیچ دی تھی اور اس کے بدلے کیا پایا تھا؟ یہ موت جس میں وہ اپنے سارے دُکھ، ندامت کے عذاب، پچھتاووں کی بے بسی اور بے کسی کی اذیت کے ساتھ تنہا تھی۔

سراج کی ماں اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھُپا کے رونے لگی۔ عائشہ مر گئی تھی۔ انھی قاتل نوٹوں کے درمیان جو کاغذ کے بوسیدہ ٹکڑوں سے زیادہ کچھ نہ تھے اور عائشہ کو اب اس کاغذی کفن کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے ہٹا دیں۔" مَیں نے کہا۔

محسن نے سر ہلایا اور عائشہ کو اُٹھانے کے لیے جھُکا۔ اُس نے احتیاط کے ساتھ نوٹوں کو چھُوئے بغیر عائشہ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کے کچھ دُور کھینچا مگر ہاتھ تھامتے ہوئے بھی اُس نے عائشہ کی صرف کلائیاں پکڑیں۔ اُس نے ان اُنگلیوں کو مس کرنے سے گریز کیا جو نوٹ نکالتی اور شمار کرتی رہی تھیں۔ ان نوٹوں میں ایسے زہر کی موجودگی ممکن تھی جو براہِ راست جِلد میں سرایت کر جائے اور خون میں شامل ہو جائے۔ یہ زہر عائشہ کی انگلیوں سے محسن کی انگلیوں میں بھی پہنچ سکتا تھا۔

اچانک سراج کی ماں ہنسنے لگی۔ "لو، یہ بھی لے جاؤ۔" اُس نے ایک ایک نوٹ کی گڈّی اُٹھا کے ہماری طرف پھینکنی شروع کی۔ "کمینے، کُتّو یہ لو، دس لاکھ پورے گن لو، اس کی خاطر ہی سب کچھ کیا تھا نا تم نے... قتل اور اغوا... یہ لو... اور یہ بھی لو۔" وہ دیوانہ وار نوٹ اُٹھانے لگی اور قہقہے لگانے لگی۔ "میری جان بھی لے لو، خود بھی مر جاؤ۔" اُس نے نوٹوں کے ایک ڈھیر کو ہَوا میں اُچھال دیا۔

"محسن! اس کا دماغ صدمے سے اُلٹ گیا ہے۔" مَیں نے چلّا کے اور خود کو بچاتے ہوئے کہا۔

"یہ... یہ خود بھی مر جائے گی۔" محسن نے عائشہ کی لاش کو دوسرے کمرے میں ڈال کے غالب کو کھینچ لیا۔

"اسے روکو یار... یہ نوٹ... جُولی..." مَیں ایک دم بھاگا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر مَیں نے سراج کی ماں کو پکڑ لیا۔ وہ اب سُوٹ کیس اُلٹ چکی تھی اور اس کے نوٹوں کو نوچ رہی تھی، پھاڑ رہی تھی، دانتوں سے اور ہاتھوں سے۔ مَیں نے اُسے ایک جھٹکے سے اُٹھایا اور دور پھینک دیا۔ پھر مَیں نے پیر کے جُوتوں سے نوٹوں کو ایک طرف کیا جو اب جُولی پر اور اُس کے آس پاس بھی پھیل گئے تھے۔ عائشہ کے انجام کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ سراج کی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ مَیں جُولی کے انجام کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بارے میں بھی متفکر ہوگیا تھا۔ میں، محسن اور غالب اپنی شکست کے احساس سے دوچار تھے۔ ہم رابعہ اور ٹیڈی کو چھڑانے کی کوشش میں دلاور کے عیار ذہن سے مار کھا گئے تھے۔ اُس نے بڑی آسانی سے عائشہ کو اور سراج کی ماں کو اپنی فتح پر قربان کردیا تھا۔ اتنی آسانی سے میں رابعہ کی یا ٹیڈی کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جو کچھ میں نے سوچا تھا، وہ غلط ہوگیا تھا اور بازی ایسے اُلٹ گئی تھی جیسے بعض لوگوں کے نزدیک سفلی عمل اُلٹ جاتا ہے۔ پہلے اگر رابعہ یا ٹیڈی کے بچنے کی کوئی صورت تھی تو اب نہیں رہی تھی۔ دلاور کی ہنسی اور اُس کی آواز رات کے آخری پہر میں بازگشت کی طرح میرے تصور میں گونجنے لگی۔ ”واہ بھئی اپنے سکندر صاحب! آپ نے تو افلاطون کو بھی مات دے دی۔ ایسی چال چلی ہمارے ساتھ... ہیں جی... ہم ٹھہرے اَن پڑھ بندے... خیر جی پوچھنا آپ سے یہ تھا کہ وہ جو آپ کی ہمشیرہ... معاف کرنا، اپنے محسن صاحب کی... کیا نام ہے اُن کا... رابعہ... ہاں... ان کی لاش کا کیا کریں؟ کہو تو آپ کے لیے... ہاں پہنچادیں وہاں... کیا کہتے ہیں اُسے... بڑا مشکل سا لفظ ہے فارسی کا... حجلۂ عروسی میں؟ ہاہاہا... آپ تو بڑے جوکر ہو... کیسا رہا یہ مذاق؟ ہم بھی کرلیتے ہیں تھوڑا بہت مخول...“

”سکندر! کیا ہوگیا ہے تجھے؟“ محسن نے مجھے بُری طرح جھنجوڑا۔ میں چونکا۔ ”مجھے... کیا ہُوا... کیا وہ دونوں مرگئیں؟“

”کون دونوں؟“

”وہی بُڑھیا... سراج کی ماں... اور جُولی؟“ میں نے کہا۔ ”اب رابعہ کو بھی مار ڈالیں گے وہ اور ٹیڈی کو بھی۔“

”پاگل ہُوا ہے کیا، مری صرف عائشہ ہے۔“ محسن بولا۔ ”جُولی تو اب ہوش میں آنے لگی ہے اور سراج کی ماں... وہ بھی آجائے گی ہوش میں۔“

میں نے بے یقینی سے پیچھے دیکھا، واقعی جُولی آنکھیں کھول رہی تھی اور بند کررہی تھی۔ ”یہ... یہ کیا محسن؟“ میں نے کہا۔

”کچھ نہیں، ان نوٹوں میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔“ محسن بولا۔

”پھر... وہ کیسے مرگئی تھی؟“ میں نے اُس کمرے کی طرف دیکھا جس میں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

”وہ غالب نے دریافت کرلیا ہے۔“ محسن بولا۔ ”نوٹوں کی ایک گڈی پر عائشہ کے خون کا ایک قطرہ لگا ہُوا ہے، اُس کی انگلی میں ایک پن کی نوک گھُس گئی تھی۔“

میں نے غالب کے قریب بیٹھ کر اُس خون کے منجمد داغ کو دیکھا۔ اُس کا رنگ کچھ زردی مائل ہوگیا تھا حالانکہ جمنے کے بعد اس کو سیاہ پڑجانا چاہیے تھا۔ میں نے اس پن کو بھی دیکھا۔ ہر گڈی کو ایسی کئی پنوں سے اسٹیپل کیا گیا تھا۔ بینک والے سو سو کے نوٹ اکٹھے کرکے بڑی مضبوطی سے اسٹیپل کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ جو مشین استعمال کرتے ہیں، وہ بہت بڑی ہوتی ہے لیکن اُس سے لگائی ہوئی ہر پن کے دونوں کنارے جب دوسری طرف نکلتے ہیں تو مُڑ کر برابر ہوجاتے ہیں۔ خود میں نے بارہا بینکوں سے ملنے والی نوٹوں کی گڈیوں سے ان پنوں کو چھُری چاقو کی نوک سے اُٹھایا تھا اور پھر پن کو دوسری جانب سے کھینچ کر نکالا تھا۔ اگر پن کے دو کنارے مُڑے ہوئے نہ ہوں تو ایک ایک کرکے نوٹ نکل جائیں اور گڈی اصل صورت میں باقی نہ رہے۔

یہ ساری گڈیاں ایسی ہی تھیں لیکن ان میں ہر اسٹیپل پن کے دونوں نوکیلے کنارے سیدھے کھڑے ہوئے تھے۔ اگر یہ خرابی مشین کی ہوتی تو بینک والے فوراً اسے دُور کرتے یا پھر دوسری مشین استعمال کرتے، وہ ہر گڈی کو دو تین جگہ سے اسٹیپل کرتے ہیں اور یہ کبھی نہیں کرسکتے کہ انھیں کھلا چھوڑ دیں۔ ایسا عملاً کیا گیا تھا۔ ہر اُٹھی ہوئی نوک پر کوئی بہت مہلک زہر تھا۔ یہ بات خاصے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی تھی کہ سو گڈیوں کی دو تین سو پنوں کے چار چھ سو کنارے زہر میں بجھے ہوئے ہوں گے تو ایک نہ ایک گڈی کھولتے ہوئے ضرور ہاتھ میں چُبھ جائے گا۔ سراج کی ماں نے نوٹوں کو اُچھالا تھا اور گڈیاں پھینکی تھیں مگر اُسے کسی نوک سے گزند نہیں پہنچا تھا۔ عائشہ کی قضا آگئی تھی کہ کوئی قاتل نوک اُس کی جلد میں پیوست ہوگئی۔ غالباً اس وقت جب ہم نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ ہر گڈی کو کھول کے دکھائے۔

”کیا آپ کی نظر رنگ کے فرق کو دیکھ سکتی ہے؟“ غالب نے کہا۔

”ہاں، غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ پن کی سطح چمکیلی اور صاف ہے اور اس کا رنگ ویسا ہی ہے جیسا کہ المونیم کی پن کا ہوتا ہے مگر ہر نوک پر زرد سی کوئی چیز لگی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی زردی موت ہے۔“ غالب نے کہا۔ ”ہم کسی پلاس کی مدد سے ہر پن کو الگ کردیں تو باقی نوٹ صرف نوٹ ہیں۔ صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ کوئی پن کسی کے ہاتھ پر یا جلد پر ہلکی خراش تک نہ ڈالے۔“

”ہم مزید احتیاط کے لیے دستانے پہن کے یہ کام کرسکتے ہیں۔“

”کیا یہ دوسری بات جمشید کو معلوم نہیں تھی؟“ محسن بولا۔

”یا تو معلوم نہیں تھی یا وہ عائشہ سے کہنا بھُول گیا۔“ غالب نے کہا۔

”اُس نے سوچا ہوگا کہ عائشہ کو ہم سُوٹ کیس کھولنے پر تو مجبور کرسکتے ہیں۔“ غالب نے کہا۔ ”لیکن اس کے بعد ہمارے دل میں کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ نوٹ تو ہم خود ہی نکالیں گے۔“

”سوچو یار کہ ہم میں سے کوئی بھی وہاں پڑا ہوتا۔“ میں نے جُھرجُھری لے کر کہا۔

”اس سے آگے سوچو تو خیال آتا ہے کہ ہم جس کو بھی یہ نوٹ دیتے، وہ اس انجام سے دوچار ہوسکتا تھا۔“ غالب نے کہا۔ ”مگر دلاور کو اس سے کیا کہ کتنے لوگ اس زہر سے ہلاک ہوں گے، خدا نے ہمیں بچالیا۔“

محسن ایک دم پیچھے گیا تو میں نے بھی پلٹ کے دیکھا۔ جُولی اُٹھ بیٹھی تھی اور بڑی دہشت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

”محسن بھائی... سکندر بھائی... میری ماں مرگئی ہے نا؟“ وہ عجیب سے کھوکھلے اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ اُس کی آنکھوں میں یہ بات کہتے ہوئے آنسوؤں کی نمی تک نہیں آئی تھی۔

”ہاں جُولی۔“ میں نے کہا۔ اس اعتراف کے سوا میں کیا کرسکتا تھا۔

”اُسے دلاور نے قتل کردیا تھا؟“ وہ بولی۔ ”کرسی مار کے اُس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا وہ ماں کو مار رہا تھا۔“

”ہم سب کو بہت رنج ہے۔“

”کیا دلاور کو ماردیا تم نے؟ اُسے پولیس کے حوالے تو نہیں کیا نا؟ پولیس تو اُس کو چھوڑ دے گی، وہ بہت پیسے والا ہے، بہت طاقت ور ہے... اور شیطان ہے۔“ وہ بولتی گئی۔ ”مجھے بتاؤ تم نے...؟“

”ہم نے اُسے وہیں ماردیا تھا جُولی۔“ میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اور نیک نیتی کے ساتھ وہ جھُوٹ بولا جو سچ سے زیادہ اجر رکھتا تھا۔ ”میں نے بھی اُس کا سر پھاڑ دیا۔“ محسن نے سر ہلا کے میری تائید کی۔

جُولی نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی صُورت پر طمانیت کا احساس جھلکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہسٹریا کا زور ٹوٹنے لگا۔ احساس جاگنے لگا اور میں نے جُولی کے جسم میں لرزش سی محسوس کی۔ وہ بُری طرح کانپنے لگی تھی۔

”تم وہاں سے کیوں بھاگ آئی تھیں جُولی؟“ محسن نے کہا۔

”میں... مجھے ڈر لگا کہ وہ مجھے بھی مار ڈالے گا، وہ ایک خونی درندہ تھا، میں اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے اپنے والد کی آواز سُنی، وہ مجھے پکار رہے تھے۔ جُولی یہاں آجاؤ میرے پاس، یہاں میں تمھاری حفاظت کروں گا اور میں بھاگ نکلی۔“ اُس نے یکلخت پھُوٹ پھُوٹ کر رونا شروع کردیا تھا اور اب اُس کا سارا جسم ہچکیوں کی زد میں جھٹکے لے رہا تھا۔ ہمارے تسلی کے الفاظ اُس کے لیے بے معنی اور بے اثر تھے۔

”وہ... وہ کہاں ہے؟“ جُولی نے روتے روتے کہا۔ ”میں دیکھوں گی اُسے۔“

”ہم نے اُس کی تدفین کردی ہے۔“ میں نے پورے یقین اور اطمینانِ قلب کے ساتھ دوسرا جھُوٹ بولا۔ ”تم تو کل سارا دن بے ہوش پڑی رہیں۔ ہم نے تم کو پرسوں رات یہاں آتے دیکھ لیا تھا۔“

”تم جھُوٹ بول رہے ہو۔“ جُولی نے ایک دم سر اُٹھا کے کہا۔ ”اس وقت تم گھر پر کہاں تھے؟“

”ہم اُسی وقت باہر سے آرہے تھے، جب تم گیٹ کھول کے نکلی تھیں اور میں نے تمھارا تعاقب کیا تھا۔“ میں نے کہا اور محسن کی طرف دیکھا۔ اُس نے پھر سر ہلایا اور میرے جھُوٹ کے سچ ہونے کی تائید کی۔

جُولی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اُس کے دل پر صدمے کا اثر بہت شدید تھا مگر بے ہوشی کے وقفے میں اُس کی وہ شدت کم ہوگئی تھی جو اُس کے ذہن کو متاثر کرسکتی تھی۔ میں نے اُسے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ہم نے کس طرح اُس کی ماں کی آخری رسوم ادا کی تھیں اپنے عقیدے کے مطابق۔ میں نے بتایا کہ عیسائی عقیدے کے مطابق تدفین ممکن نہ تھی کیونکہ ہمیں بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ عیسائیت کے کس فرقے کی پیروکار تھی۔

”اس سے میری ماں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کی تدفین کیسے ہوئی۔ اُس کا شوہر مسلمان تھا۔ اُس کے عقائد میں کوئی بات ایسی نہیں تھی کہ کوئی اُسے مسلمان نہ مانے۔ خود میں بھی تو مسلمان ہی ہُوں، نام کے سوا اور تم سب جو میرے بھائی ہو، مجھے نئی زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کی منزل تک لانے والے، تم بھی تو مسلمان ہو۔“ وہ روتی گئی۔ ”میری ماں کو تم سب پر فخر تھا، وہ کہتی تھی کہ جُولی! کیسے بھائی ملے ہیں تجھے، فرشتے کے رُوپ میں انسان یا انسان کے رُوپ میں فرشتے۔“

”ہم ایسا نہیں سمجھتے جُولی۔ ہم بڑے گناہ گار ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بھائی، مجھے میری ماں کی قبر پر لے چلو۔“ وہ بولی۔

”لے چلیں گے مگر ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”شام کو چلیں گے، دن میں ہم باہر نہیں جاسکتے۔ ہم تمھارے ساتھ اسی لیے یہاں چھپے ہوئے ہیں کہ ہمیں پولیس تلاش کررہی ہے۔“

”کیونکہ اُنھیں دلاور کی لاش مل گئی ہے۔“ محسن نے کہا۔

میں نے اُسے جُولی کے پاس چھوڑا، وہ جُولی سے اُس کی ماں کی باتیں کرتا رہا اور اس کے غم کے زہر کو اُس کے وجود سے نکالتا رہا، کسی ماہر جرّاح کی طرح جو ناسور سے زہریلا مواد کھینچ لے۔ یہ زہر جُولی کے اشکوں میں ڈھلتا گیا۔

میں نے غالب سے کہا کہ میں باہر جاتا ہُوں کیونکہ صُبح کا اُجالا اندھیرے پر غالب آنے لگا تھا۔ پہلے تو مجھے کھانے پینے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کے لیے کچھ لانا تھا، اس کے بعد کیا کرنا تھا، یہ طے کرنے کے لیے پورا دن پڑا تھا۔ دس لاکھ کی رقم کو میں نے چھوا تک نہیں۔ ہمارے پاس اب بھی تقریباً چوبیس ہزار روپے تھے جو ہماری فوری ضروریات پوری کرنے میں کام آ سکتے تھے۔

تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے چند دکانیں نظر آئیں۔ اُن میں ایک سبزی فروش کی تھی۔ وہ منڈی سے سبزی لا کے دھو رہا تھا اور دکان میں سجا رہا تھا۔ دوسری دکان پر قصاب بکروں کی سر بریدہ اور کھال اُتری ہوئی لاشوں کو لوہے کے ہُک سے ایک قطار میں ٹانگ رہا تھا۔ تیسری دکان بند تھی اور چوتھی پر کچھ لوگ ناشتا کر رہے تھے۔ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھے وہ حلوہ پوری کھا رہے تھے اور لسّی کے گلاس پی رہے تھے۔ صرف ایک شخص تھا جو چائے پی رہا تھا اور عینک لگا کے بڑے انہماک سے تازہ اخبار کی تازہ خبریں ریڈیو کی طرح سُنا رہا تھا۔ اس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے میں نے صفحۂ اوّل کی سُرخیوں پر نظر ڈالی۔

"لو بھئی، اب صنعت کار بھی اغوا ہونے لگے۔" وہ بولا۔

"صنعت کار اغوا نہیں ہوں گے تو کیا مزدور ہوں گے ہمارے جیسے۔" کسی نے کھاتے کھاتے لسّی کا ایک گھونٹ لیا اور طنز سے کہا۔

"اغوا تو روز کا معمول بن گئے ہیں جی۔" ہوٹل والا بولا۔

"مگر یار! یہ تو پوچھو کہ کون اغوا ہوا۔" اخبار پڑھنے والے نے کہا۔

"تم پڑھو نا باؤ جی آگے، ہمیں تو آپ سے ہی معلوم ہوگا۔"

"وہ اپنے چوہدری دلاور صاحب نہیں ہیں۔" اخبار پڑھنے والے نے کہا اور اُس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ میں دلاور کی خبر اُسی کی زبان میں سُن کے بلا ارادہ مُسکرانے لگا۔ "اُنھوں نے ابھی کل پرسوں ہی تو اعلان کیا تھا کہ غریبوں کے لیے ایک مفت اسپتال بنے گا۔"

"مفت اسپتال!" مزدور نے پھر تلخی سے کہا۔ "ارے چاچا! سب چکر ہے یہ سیاست کا، بے وقوف بناتے ہیں ہمیں۔"

"یار! تم ہو ہی بے وقوف۔" اخبار پڑھنے والا برہم ہو گیا۔ "تم سے کس نے کہا ہے تبصرہ کرنے کو۔"

باقی خبر کا خلاصہ تقریباً حقیقت پر مبنی تھا کہ دو افراد نے چوہدری دلاور سے غیر ملکی صحافی بن کے رابطہ قائم کیا تھا اور چوہدری دلاور نے ان کے اعزاز میں ایک ڈنر کا بندوبست کیا مگر وہاں نہ وہ صحافی پہنچے اور نہ چوہدری دلاور۔ دوسرے مہمان انتظار کرتے رہے۔ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے جو چوہدری دلاور کے قریبی دوست بتائے جاتے ہیں اور جو خود بھی دعوت میں شریک تھے، رات دس بجے اُن کے لاپتا ہو جانے کی تصدیق

کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی گاڑی کو ہوٹل میں آتا دیکھا گیا تھا۔ ہوٹل کے گیٹ پر موجود دربان کے کہنے کے مطابق گاڑی کو خود چوہدری دلاور ہی چلا رہے تھے لیکن بعد میں اُن کی گاڑی ہوٹل کے اندر ہی کھڑی ہوئی پائی گئی۔ خیال ہے کہ اُنھیں دوسری کار میں ڈال کے لے جایا گیا جو ہوٹل کے اندر ہی چھینی گئی تھی۔ چھینی جانے والی کار کے مالک نے دو افراد پر شبہ ظاہر کیا ہے اور اُن کا حلیہ وہی بتایا ہے جو تقریباً صحافی بن کر دلاور کے پاس پہنچنے والوں کا تھا۔ مذکورہ دونوں افراد کے بارے میں خبر رساں اداروں اور پریس کلب کے باخبر حلقوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور قسم کے بدمعاش تھے۔ آخری خبریں ملنے تک چوہدری دلاور کا پتا نہیں چل سکا تھا اور اُن کے گھر سے رابطہ قائم نہیں ہوا تھا۔

یہ ساری خبریں میں نے پوریاں خریدتے ہوئے سُنی۔ پوریاں بنانے والا ایک تھا اور وہ قدرے سُست رفتار تھا۔ جتنی پوریاں وہ تلتا تھا، اُس میں سے ایک آدھی میرے حصّے میں آتی تھی۔ باقی جائے واردات پر کھانے والوں کو پیش کر دی جاتی تھیں کیونکہ اُن کے نلشتے میں 'انتظار فرمائیے' کا وقفہ آتا تو وہ شور کرتے۔ میں فاضل پوریاں جمع کرتا گیا اور خبریں بھی سُنتا رہا۔ ابھی تک اُس میں شہر کے نئے ایس ایس پی کے تقرر کی خبر بھی نہیں تھی اور پرانے ایس ایس پی کی معزولی کا ذکر بھی نہیں تھا۔ ایس پی سراج کے گھر میں ہونے والے اغوا کے ڈرامے، خسرو جمشید کے گھر میں پائی جانے والی لاش اور عائشہ کے بارے میں کوئی خبر آنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ یہ نصف شب یا اس کے بعد پیش آنے والے واقعات تھے، جب اخبارات کی آخری کاپی پریس میں جا چکی تھی۔ ظاہر ہے پھر دلاور کی بازیابی اور زیب النساء کے بارے میں کوئی اطلاع کیسے ہوتی۔ یہ ایک اچھی بات تھی کہ لوگوں کو یہ سب مزید چوبیس گھنٹے کے بعد اخباروں کے ذریعے معلوم ہوگا جب ان واقعات کو پیش آئے تیس بتیس گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے ہوئی کہ اس خبر کو ہم سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً یہ احتیاطی پیش بندی سراج نے کی تھی۔ اخبار میں ان جعلی صحافیوں کا حلیہ ضرور تھا مگر حلیے سے کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ خصوصاً عام لوگ جو خبر پڑھ کے بھول جاتے ہیں، حلیہ کیسے یاد رکھ سکتے ہیں لیکن تصویر خود بخود ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور ہمارے موجودہ حلیے کی کوئی تصویر تھی ہی نہیں کہ کوئی اخبارات کو اشاعت کے لیے دیتا۔

"ہاں جی، ہور کی چاہیدا جے؟" پوریاں بنانے والے نے کہا۔

"ہور... چائے۔" میں نے چونک کر کہا۔ "چائے ملے گی؟"

"کیوں نہیں ملے گی، بیٹھو۔" دکاندار بولا۔

"نہیں... مجھے دس بیس کپ چائے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"دس یا بیس؟ پہلے سوچ لو۔" دکاندار نے کہا۔

"بیس... بیس کپ۔" میں نے بے وقوفوں کی طرح مسکرا کے کہا۔ "لیکن میرے پاس برتن کوئی نہیں۔"

دکاندار ہنسنے لگا۔ "فیر کی کراں، جھولی وِچ پا دیاں... یا جیب وِچ پا کے کھڑتی جے؟" اُس کی بات سے چند ناشتا خور بھی محظوظ ہوئے۔

"تم یہ کیتلی مجھے دے دو۔" میں نے المونیم کی ایک کیتلی کی طرف اشارہ کیا جو استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

"ایہہ... یار، حد ہوگئی، فیر توں آکھیں گا کہ مینوں ایہہ بینچ وی چاہیدی جے... چار بندے لئی۔" دکاندار نے پبلک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سمجھے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی اس علاقے میں نئے نئے پہنچے ہیں، سارا سامان بندھا پڑا ہے۔ آپ یہ کیتلی دے دیں اور ضمانت کی جتنی رقم چاہیں رکھ لیں۔" میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کے بڑھایا۔ "میں کیتلی واپس کر جاؤں گا اور ہاں، دو چار کپ بھی عنایت کر دیں۔"

"عنایت تو خیر میں کر دیاں گا لیکن جانا کتھے جے؟" دکاندار میری بات سے مطمئن ہو گیا۔ اُس نے سو کا نوٹ تقریباً جھپٹ لیا۔ اب اس کے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کیتلی شکل سے بیس روپے کی تھی۔ چار کپ آٹھ دس روپے کے، حلوہ پوری کے دس روپے۔ میں نہ بھی واپس آتا تو وہ فائدے میں تھا۔ وہ ایک کی جگہ دو نئی کیتلیاں خرید لیتا۔ پُرانی کیتلی اپنی قیمت تو ادا کر ہی چکی تھی اور پھر بھی پوری قیمت میں بک رہی تھی۔ اُس نے تو چاہا ہوگا کہ میں لوٹ کر نہ آؤں اور خدا نے اس کی سُن لی۔

کیتلی کی چائے میرے لوٹ کر جانے تک ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اسے پُرانے کچن میں لکڑیاں جلا کے گرم کیا گیا۔ لکڑیاں خشک تھیں لیکن دھواں پھر بھی اُٹھا۔ آس پاس کے کسی رہنے والے نے دیکھا ہوگا تو سوچا ضرور ہوگا کہ آج یہ دھواں سا کہاں سے اٹھا ہے مگر دیکھا کسی نے نہیں کیونکہ تفتیش کرنے کوئی نہیں آیا۔

"لگتا ہے آج کا سارا دن اسی جگہ ایسے ہی گزرے گا۔" غالب نے کہا۔

"نہیں، کچھ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی صورت..."

"اور اس بدبخت کا کیا کریں گے؟" محسن نے کہا اور دوسری طرف اشارہ کیا جہاں عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"اس کا ہم کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جب یہاں سے چلے جائیں گے تو دلاور کو مطلع کر دیں گے کہ اپنے ارمانوں کا جنازہ اُٹھا لو۔"

"سراج کی ماں نے اور جُولی نے کچھ کھایا پیا ہے؟"

"جُولی نے چائے پی ہے صرف، سراج کی ماں گُم صُم بیٹھی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کھنڈر میں پورا دن کاٹنا مشکل ہوگا۔"

"مجبوری میں جیل سمجھ کے رہیں گے سب۔" میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آج رات اس فون نمبر پر پھر رابطہ قائم کریں، وہ جو کراچی کا نمبر تھا اور رابعہ نے دیا تھا۔ اس کے علاوہ سراج سے بھی ایک آخری بات ہو جائے۔"

"کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تک اُس نے صورتِ حال کو صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھ لیا ہوگا۔ اس کا رویّہ اب کیا ہے۔ دلاور کیا کہتا ہے۔ زیب النساء کے بھائی کا ردِ عمل کیا ہے؟"

"اس وقت جب ہم پہنچے تھے۔" محسن بولا۔ "تو وہ دادِ عیش دے رہا تھا۔ زیب النساء جانتی تھی..."

"ہاں مگر اس کرائے کی عورت نے بعد میں کیا کِیا۔" میں نے کہا۔

"اپنے گھر کے معاملات خسرو جمشید دبا دے گا۔" غالب بولا۔ "عورت خود ڈر سے خاموش ہو جائے گی۔ نوکروں کو خسرو جمشید ڈرا کے خاموش کر دے گا اور مرنے والے کی لاش غائب ہو جائے گی، سب یہی چاہیں گے۔ آج یہاں کی صورتِ حال واضح ہو جائے اور اس نمبر سے رابطہ ہو جائے، کراچی کے نمبر سے تو ہم رات کو کسی وقت یا کل صبح نکل جائیں۔"

"کہاں نکل جائیں اور کیسے نکل جائیں؟" محسن بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ایک ٹرک ہو تو سفر آسان اور محفوظ رہے گا۔" میں نے کہا۔ "ہم خود بھی جا سکتے ہیں اور ان سب کو بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ پر ہزاروں ٹرک چلتے ہیں اور ہر قسم کا سامان لاتے لے جاتے ہیں۔ انڈے، پھل، سبزیوں سے لے کر لوہے سیمنٹ اور مشینری تک... ہم سبزی لے جا سکتے ہیں۔"

"آئیڈیا قابلِ عمل ہے۔" غالب نے کہا۔ "مگر ٹرک کہاں سے آئے گا؟"

"ٹرک اس رقم سے آئے گا۔" میں نے فرش پر پڑے ہوئے نوٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے ذہن میں تو یہ تھا کہ کوئی لمبا ٹریلر مل جاتا۔ کارواں ٹائپ یا جیسے کارگو کنٹینر ہوتے ہیں۔ لوہے کے بیس فٹ یا چالیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ اونچے، ہر طرف سے بند فولادی ڈبے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اس میں کیا گھر بنا کے سفر کرنا تھا؟" محسن بولا۔

"نہیں یار! میرے دماغ میں ایک زبردست پلان تھا۔" میں نے کہا۔ "شرط یہی ہے کہ ہمیں ایک ایسا ٹریلر ... دیئے۔ عام ٹرک لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا ملتا ہے تو ٹریلر مل جائے گا چار پانچ کا۔ اس میں ایک سرکس قائم کیا جائے۔"

"سرکس؟" غالب بے اختیار ہنس پڑا۔ "اچھا خیال ہے۔ کم سے کم مسخرے بھرتی نہیں کرنے پڑیں گے۔"

"تم مذاق اُڑا رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "میری پوری اسکیم بہت شاندار ہے اور اس کے فوائد کا تم ابھی اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم مسخرے ہیں مگر پیشہ ور نہیں۔ اگر بھیس بدلنا پڑے تو کیا مسخرے سے بہتر کوئی بھیس ہوتا ہے؟ جو چاہو پہن لو، صورت کو جیسے چاہو بگاڑ لو۔ منہ پر سیاہی ملو یا سفیدی۔ آج ایک شکل تو کل دوسری۔ کارٹون دیکھنے والا صرف ہنستا ہے، اصل چہرہ کیسے پہچان سکتا ہے۔"

"عجیب بے وقوفی کا نظریہ ہے۔ بھائی! سرکس میں صرف جوکر ہی تو نہیں ہوتے۔" محسن نے کہا۔ "بازیگر بھی ہوتے ہیں۔"

"بازیگر یہ ہے۔" میں نے غالب کی طرف اشارہ کیا۔ "کرتب دکھلاتے ہوئے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس کے علاوہ ہم سرکس کا شو کریں گے ہی نہیں۔ سرکس تو بس سفر کرے گا یہاں سے کراچی تک۔ راستے میں کسی بھی جگہ پڑاؤ ڈال دو۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔ سرکس ایک موبائل ہیڈ کوارٹر بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم سرکس کو کہیں چھوڑ کر دائیں بائیں ... پیچھے سو دو سو میل کے علاقے میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ راتوں رات شب خون مار کے واپس بھی آ سکتے ہیں۔"

"جوکر کے حلیے میں؟"

"نہیں یار! جوکر کا لباس تو ایک پردہ ہوگا۔ جب ضرورت ہوگی تو ہم کسی گاڑی یا موٹر سائیکل پر نکل جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ آج مشرقی حصے میں ہو رہا ہے، اسے خانہ جنگی یا بغاوت کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک سیاسی سازش ہے اور حکومت اپنے طور پر اس سے نمٹ رہی ہے۔ ہم حکومت کے برابر طاقت اور وسائل نہیں رکھتے کہ سب سے لڑ سکیں اور سب کا مقابلہ کر سکیں۔ سارے تخریب کار، شر پسند، ففتھ کالمسٹ، غدار اور وطن فروش، علیحدگی کے رجحانات کو ہوا دینے والے سیاست داں اور اس کے اسباب پیدا کرنے والے بیورو کریٹس، سب کو ختم کرنے کی سوچنا ایسا ہی ہے جیسے کہ تیشۂ فرہاد سے ہمالیہ کو کاٹ کے برابر کرنے کی سوچ۔ چنانچہ ہمارا مقابلہ صرف ایک گروہ سے ہے۔ ہم اس گروہ کو اور اس کی ملک دشمن سرگرمیوں اور کارروائیوں کو ختم کر سکے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ہم جیسے اور بھی ہیں جو اپنے اپنے محاذ پر ایسے ہی ملک کے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، وہ نابینا اور بوڑھی عورت بھی جنگ کر رہی ہے جو صبح شام خالقِ کائنات کے حضور ہاتھ اُٹھا کے حق کی فتح کے لیے صدقِ دل سے دعا مانگتی ہے۔ وہ بوڑھے بھی شامل ہیں جو ہر نماز میں وطن کی سلامتی کے لیے سجدہ ریز ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، مزدور، کسان، طالبِ علم سب اس جنگ میں کسی نہ کسی طور شریک ہیں۔ میدانِ جنگ میں فوج ہے، اس کے پیچھے ایک قوم کا جذبہ ہے۔ ان کی تمنائیں اور نیک خواہشات ہیں۔ دلاور اور اس کے ساتھی دوسری طرف ہیں۔ ان جیسے بھی سیکڑوں یا ہزاروں ہوں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایم آر ایس جیسی قوت رکھنے والے بھی سیکڑوں یا ہزاروں ہیں، خواہ ان کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہو یا نہ ہو اور اس تنظیم کا کوئی نام ہو یا نہ ہو۔ ہم خود کون سی تنظیم ہیں، بس دوست ہیں جو خلوص اور اتحاد کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں۔ نام تو محض مذاق ہے مگر اس مذاق نے دلاور اینڈ کمپنی کو چیلنج کر دیا ہے۔ یہ چیلنج باقی ہے، ہم باقی سب کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس شیطانی قوت کو ہم نیست و نابود کریں گے جس کے کئی نام ہیں۔ دلاور، جمشید، سراج، پیڈرو اور نہ جانے ایسے کتنے دوسرے نام ہمارے سامنے آئیں گے۔ تم نے دیکھا کہ دلاور نے اپنا کاروبار یہاں سمیٹ دیا ہے۔ میرے والد نے جو فیکٹری زرعی مشینری کے آلات بنانے کے لیے قائم کی تھی، اس میں اسلحہ بننے لگا تھا مگر اب دلاور نے ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس کا راز افشاں ہونے سے پہلے وہاں سے سب کچھ ختم کر دیا ہے اور وہاں وہ ایک اسپتال بنا رہا ہے، غریب عوام کے لیے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بردہ فروش اپنے اڈے کی جگہ لاوارث عورتوں کے لیے پناہ گاہ بنانے کا اعلان کر دے۔ اس کے سیاسی مقاصد اس کی ملک دشمن سرگرمیوں پر شرافت کا، شہرت کا اور عزت کا جھوٹا پردہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کرپٹ اور بے ضمیر تاجروں کے علاوہ گردن زدنی سیاستدانوں کی حمایت حاصل کرے گا جو اسے حب الوطن قرار دیں گے مگر ہم حقیقت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ خوبصورت اداروں اور لفظوں کے پیچھے ایک بدبودار، غلاظت اور تعفن سے بھرے ناسوروں والا جسم ہے، روحِ ابلیس ہے۔ ہم ان سب کے چہرے بے نقاب کریں گے جو دلاور کے ساتھ ہیں۔ ایسے لوگ کم نہیں ہوں گے، ان سے نمٹنا آسان بھی نہیں ہوگا مگر ہم نمٹنا جانتے ہیں۔ جب ہم اس راستے پر چلیں گے جو ان غداروں

کا راستہ ہے تو یہ چہرے خود بخود سامنے نہیں آئیں گے۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہوگا یہاں سے کراچی تک... کراچی سے اس ... تک یہاں سیاسی سازش کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو، نا؟ اس جنگ کو ہم ایک گروہ کے ... تک محدود رکھیں گے۔ اس سے ہم جنگ جیتنے کی اُمید نہیں رکھ سکتے۔ جنگ بہت بڑی بلا ہے مگر ہم اس بلا کو تھوڑا سا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی طاقت کو تھوڑا سا کم کر سکتے ہیں۔ اگر یہ ایک خون پینے والا آدم خور جن ہے تو ہم اس کی ایک آنکھ پھوڑ دیں، اس کی ایک ٹانگ توڑ دیں یا ایک انگلی بھی کاٹ دیں تو بہت ہے۔ یہ ہم کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ دلاور اینڈ کمپنی کی طاقت کو ختم کر دینا سیکڑوں نہیں، ہزاروں گھروں کی سلامتی کا ضامن ہوگا۔ شاید لاکھوں افراد کی زندگی کو بچا لے گا۔ موت، بھوک اور افلاس سے، تباہی اور بربادی سے، یتیمی اور بیوگی سے، نہ جانے کتنی عمارات، کتنے پل، کتنی لمبی ریلوے لائن، کتنے دفاتر اور سرکاری ادارے، کتنے ہزار مربع میلوں میں پھیلی ہوئی فصلیں، مویشی اور پالتو جانور، اسپتال اور اسکول، یہ سب تباہی سے بچ جائیں گے، اگر ہم نے وہ سب اسلحہ روک لیا یا تباہ کر دیا جو دلاور اینڈ کمپنی آگے بھیج رہی ہے تو کیا اتنا کم ہوگا؟ مگر اس کے لیے ہمیں جستجو اور جدوجہد کرنا ہوگی۔ ہم نکلیں گے تو ہمیں ہر راستے پر ہر طرف آنکھیں کھلی رکھ کے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان کرنی ہوں گی اور آگے بڑھتے ہوئے ان کو چن چن کر ختم کرنا ہوگا۔ یہ سب ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ... نہ جائیں اور ہمارے دشمن کبھی نہ جان سکیں کہ ان کی تباہی و بربادی کی فتنے دار ایم آر ایس ہے تو ایم آر ایس کہاں ہے، کون ہے؟ میں نے سرکس کے بارے میں غور کیا تو مجھے یہ ممکن نظر آیا کہ ہم اس پلان پر عمل کر سکتے ہیں۔ ہم سرکس کے ساتھ ہی ڈراما کمپنی بنا سکتے ہیں۔ لوگوں کو بھرتی کر سکتے ہیں، گاؤں گاؤں پھر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ کون کہاں کیا کر رہا ہے۔ یہ چلتے پھرتے تھیٹر اور سرکس دیہات میں انوکھی چیز بھی ہیں اور مقبول بھی بہت ہوتے ہیں، اگر ہم اس طرح ہر جگہ پہنچ کے لوگوں میں اپنے دوست تلاش کر سکے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی اور مزے کی بات یہ ہے کہ خود دشمن ہمارا تماشا دیکھتے ہوئے نہ جان پائیں گے کہ یہ تماشا دکھانے والے تہیں شکاری ہیں جو ان کے شکار کو نکلے ہیں۔"

وہ دونوں دم بخود بیٹھے میری بات سن رہے تھے، بڑی توجہ سے اور میں بولتا جا رہا تھا۔ وہ سب جو رات سے میرے ذہن میں تھا، الفاظ کی صورت میں سب کے سامنے آ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے منصوبے کے خیال نے ان کو کس حد تک متاثر اور مسحور کیا ہے۔ بالآخر میں بولتے بولتے تھک گیا۔ باقی سب میں نے ان کی قوتِ پروازِ تخیل پر چھوڑ دیا، وہ بھی بہت ذہین لوگ تھے اور خاکے سے تصویر کو مکمل کر کے دیکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ خاکہ ان کے سامنے آ گیا تھا اور وہ اپنے تصور سے اس مکمل تصویر کو دیکھ رہے تھے جس میں کامیابی کے رنگ تھے اور کوئی نقش ادھورا یا خیالی نہیں تھا، ایسا ہو سکتا تھا۔

"یار! کاش! میں ڈیڑھ ٹانگ والا غالب نہ ہوتا، شہنشاہ اکبر ہوتا تو تیرا منہ موتیوں سے بھر دیتا اور تجھے خلعتِ فاخرہ عطا کر کے اپنے نورتنوں میں شامل کرتا۔" غالب نے بالآخر کہا۔ "تو دسواں رتن ہوتا، چیف رتن۔"

"اور کاش! میں اس کمیٹی کا سربراہ ہوتا جو نوبل پرائز دیتی ہے تو اس سال کے پانچوں انعامات تجھے دے دیتا۔" محسن بولا۔ "خواہ بعد میں اس دھاندلی پر میرا انجام وہی ہوتا جو ہونا چاہیے۔"

"ابھی تم لوگوں کے اعتراضات باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

"سرکس میں ہم دو تو ہوئے مسخرے... مرزا غالب کیا ہرج ہے، اگر تم اس کے پروپرائٹر بن جاؤ۔ میں دو چار دن میں کچھ لوگ بھرتی کرتا ہوں، یہ دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کتنے سکندر اور محسن کو جانتے ہیں اور ان کے کارناموں کے مداح ہیں۔ ان میں ... کرتب دکھانے والے رکھے جا سکتے ہیں اور کچھ ڈراما آرٹسٹ۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں گاؤں گاؤں جو تھیٹر پھرتے ہیں، وہ کس قماش کے ڈرامے دکھاتے ہیں۔ زیادہ تر لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا قسم کے یا آغا حشر ٹائپ، اس کے لیے لمبے چوڑے ساز و سامان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ناظرین بہت کچھ فرض کر لیتے ہیں اور تھیٹر بھی اوپن ایئر چلتے ہیں۔"

"یہ بہت زیادہ لوگ ہو جائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اچھا تو ہم فی الحال ڈراما آرٹسٹ ڈراپ کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ ہاتھ کی صفائی دکھانے والے جادوگر، سانپ، بندر اور ریچھ کا تماشا دکھانے والے، تاش کے پتوں کا کھیل دکھانے والے اور دو چار بھانڈ... بھانڈوں کا تماشا دیہات اور شہروں میں یکساں مقبول ہے۔ ایک اچھی جوڑی ہو تو پورے مجمع کو محظوظ کر سکتی ہے۔ ان سب کو ... کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے فن میں طاق ہوتے ہیں۔ ان کا تو بس ایک ہی مسئلہ ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلم نے اور تعلیم نے ان کے لیے ذرائع معاش کو بہت کم کر دیا ہے۔ ان کی آمدنی اتنی کم ہو چکی ہے کہ وہ بڑی مشکل میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ ہم ان کو بگی بندھی تنخواہ دے سکتے ہیں۔ ان کی موجودہ آمدنی سے دگنی، پھر وہ ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"کیا یہ ممکن ہے یار سکندر؟" محسن نے جوش سے کہا۔

"ممکن کیوں نہیں، ہمارے علاوہ مشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "اور کچھ جانور۔۔۔"

"میں بتا سکتا ہوں کہ جانور کہاں ملیں گے۔" غالب بولا۔

"کہاں ملیں گے؟" محسن بولا۔

"چڑیا گھر سے۔" غالب نے کہا۔ "ہر جانور مل سکتا ہے۔"

"کیا وہ جانور بیچ دیتے ہیں؟"

"ان کا بس چلے تو وہ شیر اور ہاتھی تک بیچ دیں مگر اس کے علاوہ ہرن اور ریچھ، رنگین طوطے اور بندر، لومڑی اور بھیڑیے، یہ سب تو مل جائیں گے، شاید چیتے کے بچے بھی مل جائیں۔" غالب نے کہا۔ "پیسہ چاہیے انھیں۔"

"ہم اپنی سرکس کمپنی کو رجسٹرڈ کرائیں گے۔" محسن نے کہا۔

"نہیں، خود کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ "متعلقہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ پیسہ لیں گے اور ضابطے کی کارروائی خود ہی مکمل کر لیں گے مثلاً تفریحی ٹیکس کا معاملہ اٹھے گا تو دیکھی جائے گی کمپنی بھی بالآخر رجسٹرڈ ہو جائے گی۔ اس میں کوئی زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ چار پانچ لاکھ کا ٹریلر جس میں ہم سارے جانور رکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ کے اندر اندر تمام جانور مل جائیں گے۔ یہی عام قسم کے جانور۔ جو ضرر رساں نہ ہوں اور تماشا دکھانے میں کام آئیں ۔۔۔ ان کے پنجرے وغیرہ بھی مہنگے نہیں ہوں گے۔ تار کے پنجرے بنے بنائے ملتے ہیں۔ اسی میں ہمارا کاسٹیوم ڈیپارٹمنٹ بن جائے گا، سب کے ملبوسات۔"

"کس کس کے ملبوسات؟ افراد تو شمار کرو۔" غالب جوش سے بولا۔

"بھئی دو جوکر، آپ کے یہ دونوں خادم۔" میں نے سر جھکا کے کہا۔ "ان کے چار چھ رنگ برنگے لباس، ٹوپیاں وغیرہ۔ ایک مداری، ایک ایک ریچھ، بندر کا تماشا دکھانے والا۔ ایک ماہر قسم کا سپیرا۔ ان لوگوں کو میں گلیوں میں سے تلاش کر لوں گا۔ ہمیں چھوڑ دو تو یہ ہوئے چار آدمی۔ دو بھانڈ بہت اعلیٰ ظرافت کا مظاہرہ کرنے والے، ایک گھوڑے کی سواری کا ماہر جو معمولی کرتب دکھا سکے یعنی کھڑا ہو کے، سر کے بل، ایک ٹانگ پہ، ایک ایسا ہی سائیکل سوار۔۔۔ یہ ہوئے چار اور چار آٹھ آدمی۔ میرا خیال ہے اتنے لوگ کافی ہیں۔ سب اپنا اسباب لائیں گے اور خود ہی اس کی دیکھ بھال بھی کریں گے۔ مثلاً سپیرا اپنے ساتھیوں کو سنبھالے گا تو ریچھ والا ریچھ کو، کھلانا پلانا سب انہی کے ذمے مگر خرچ ہمارا۔۔۔ ان لوگوں کی محدود ضروریات ہوتی ہیں اور محدود سامان کے ساتھ یہ ہمارے ساتھ کہیں بھی رہ سکتے ہیں، جہاں رات ہو وہاں کھلے آسمان کے نیچے بھی سو

سکتے ہیں اور نہ ٹریلر ہے، ہم خیمے بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارا شو جہاں بھی ہوگا اوپن ہوگا، صرف قناتیں لگا کے رتھا کی ٹھوکر کی مدد سے اسٹیج بنا کے۔"

"میرا ایک مشورہ ہے۔" غالب نے کہا۔ "ایک ڈھول بجانے والا بھی ہونا چاہیے میلے ٹھیلے اور دنگلوں والا، ذرا جوشیلے قسم کا۔"

"اسامی منظور کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی کی جگہ خالی تم دیکھنا کہ لوگ خود ہی آئیں گے۔ مثلاً جہاں ہم نے اڈا جمایا وہاں آلو چھولے اور گول گپے یا دہی بھلے والے تو آئیں گے ہی مگر ہے کوئی موت کے کنوئیں یا موت کے گھر والا ہم سے اشتراک کا خواستگار ہو کہ مجھے بھی قریب ہی رہنے کی اجازت دی جائے، کوئی پنگوڑے والا آ جائے، ان کو ہم ہر جگہ عارضی طور پر لے سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ مستقل عملہ وہ ہوگا جو یہاں سے جائے گا، نو آدمی۔"

"ہمارے نورتن۔" غالب نے ہنس کر کہا۔

"ویری گڈ، نورتن سرکس کمپنی۔" میں نے کہا۔ "نام طے ہوگیا۔"

"اب باقی کام کی بات۔" میں نے کہا۔ "یہ نورتن اور ایم آر ایس کے ارکان۔ اس وقت ہم چار ہیں، چار کراچی میں ہیں لیکن ابھی جو یہاں سے جائیں گے، وہ تیرہ ارکان ہوں گے۔"

"اور دو قیدی۔" غالب نے کہا۔ "ان کا کیا ہوگا؟"

"یہ ہمارے ساتھ زیادہ دن نہیں رہیں گی۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ایک ٹریلر تو جانوروں کے لیے اور اسباب کے لیے، ایک لیتے ہیں ویگن جس میں ہم سب سفر کر سکیں، آگے ویگن، پیچھے ٹریلر۔"

"ایک ٹریلر ڈرائیور بھی چاہیے۔" محسن نے کہا۔ "ہیوی ڈیوٹی کا لائسنس رکھنے والا۔"

"یہ تو دس ہو گئے۔" غالب نے مایوسی سے کہا۔

"یہ دسواں صرف ڈرائیور ہے، رتن نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "نورتن سرکس کمپنی کے نام پر اس سے کوئی حرف نہیں آئے گا۔ ٹریلر میں ہم سفری سامان بھی بھر سکتے ہیں مثلاً گیس، پیپ کاٹ، موبائل کچن، ممکن ہو تو ایک پورٹیبل جنریٹر۔ اس سب ساز و سامان میں ہم وہ سب چھپا کے لے جا سکتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ مثلاً جتنا اسلحہ ہمارے پاس ہے اور جو مزید ہمیں ملے گا، ٹرانسمیٹر ریڈیو اور مواصلاتی رابطے کا نظام جس میں ہمارا یہ ہر جگہ کام آنے والا فون بھی شامل ہے۔"

"ایسے ہی ایک دو آ لے اور مل جائیں تو اچھا ہے۔"

"مل جائیں گے، ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے لائن مین ہر جگہ لیے پھرتے ہیں، ان سے خریدے یا چھینے جا سکتے ہیں۔"

کہا۔

"ہمارے نورتن پوچھ سکتے ہیں کہ یہ گولا بارود کس شو کے لیے ہے؟" غالب نے کہا۔

"ہاں، ہم یہ سامان مقفل رکھیں گے، چابی ہم میں سے ہی کے پاس ہوگی اور ہم اس قسم کی مہم جوئی میں رازداری تو برتیں گے۔ یہ بھی کوشش کریں گے کہ ہمیں کوئی کچھ نکالتا دیکھے اور استعمال کرتا نہ دیکھے۔ ایک شو سے دوسرے شو کے درمیان کا وقفہ ایک ہفتہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک مہینہ بھی جب سرکس کہیں رکا رہے گا۔ ہم راتوں رات بھی لوٹ کر آ سکتے ہیں اور دو چار دن لگ جائیں گے تو کوئی بات نہیں۔ ہماری عدم موجودگی میں ایک شخص معاملات کو سنبھال سکتا ہے۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ناممکن ہے کہ ہمارے دوسرے معاملات چھپے رہیں۔"

"بالکل ٹھیک، یہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔ "لوگوں کو اندھا، بہرا اور بے وقوف فرض کرنا بے وقوفی ہوگی۔ رفتہ رفتہ شکوک پیدا ہوں گے اور شک سے ہی تجسس جنم لیتا ہے۔ جاہل یا احمق شخص بھی تجسس میں مبتلا ہو جائے تو حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور ہمارے نورتن جاہل ہو سکتے ہیں مگر انھیں کم عقل سمجھنا غلط ہوگا۔ شعبدہ باز اور بازیگر قسم کے سب لوگ ذہین ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہوتی ہے چنانچہ یہ بات یقینی ہے کہ ہمارا کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہ سکتا مگر ہم کچھ عرصہ ضرور گزار سکتے ہیں اور یہی وہ عرصہ ہوگا جس میں ہم صحیح اور غلط آدمی کا انتخاب کر لیں۔ یعنی باتوں سے یا ان کے خیالات سے یا پھر ردِعمل سے اندازہ کر لیں کہ اگر ان کو ہمارے بارے میں حقیقت کا پتا چل جاتا ہے تو وہ کیا کریں گے؟ ہمارا ساتھ دیں گے یا ہمارے خلاف ہوں گے؟ خلاف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دلاور اینڈ کمپنی سے جا ملیں گے۔ فرض کرو وہ پولیس کے پاس چلے جائیں اور سارا بھانڈا پھوڑ دیں، ہمارا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ سارا مشن چوپٹ ہو کے رہ جائے گا، اس لیے ہم آدمی کو جج کریں گے اگر وہ بھروسے کے قابل ہوگا تو ایم آر ایس کی قوت میں اضافہ کرے گا۔ بصورتِ دیگر کسی بھی بہانے اس کی چھٹی۔ ایگریمنٹ میں یہ شرط رکھی جا سکتی ہے کہ ہم ایک ماہ کی تنخواہ دے کر رخصت کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ہم بہ معنی مرزا غالب پروپرائٹر نورتن سرکس کمپنی۔"

"مرزا غالب پروپرائٹر نورتن سرکس کمپنی۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا ستم ظریفی ہے؟ اسد اللہ خاں قیامت ہے تمھارا نام نامی ایک سرکس کمپنی کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ خدا انھیں معاف کرے جو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

"تمھارا نام مرزا غالب ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔" محسن نے کہا۔ "اصولاً تو تمھارے والدین کو تمھارا نام حاجی لغلول یا مرزا پھویا رکھنا تھا۔"

"مجھ میں اور مرزا غالب میں بہت سی صفات مشترک ہیں مثلاً درویشی و قلندری، فقر و فاقہ اور خودداری و انا پرستی۔۔۔!" غالب نے اپنا دفاع کیا۔ "مگر تم میں اور شیروانی میں کون سی بات مشترک ہے، تم کیوں شیروانی کہتے ہو خود کو، کیا تم قومی لباس ہو؟"

"بس مجاہدو، آپس میں نہ لڑو۔" میں نے کہا۔ "دن چڑھ گیا۔ اب سوچو کہ کس کو کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلا مسئلہ اس لاش بے گور و کفن کا ہے۔" محسن نے کہا۔

"اسے ہم دریا کے حوالے کرنے کی کوئی صورت کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اب چلتے ہیں باہر۔"

"یہ سارا بندوبست آج ہی کر لو گے؟" غالب نے پوچھا۔

"خدا کے لیے سوچ کے بولا کرو۔" میں نے کہا۔ "اگر بہت جلدی کی تب بھی ایک ہفتہ تو لگے گا۔ ٹریلر نہ ملا تو سب ٹھپ، مل گیا تو اس کی رجسٹریشن، پھر نورتنوں کی تلاش، اسباب کا حصول، جانوروں کی خریداری۔"

"یار، تو یہ ایک ہفتہ کیسے گزرے گا اس کھنڈر میں ۔۔۔" غالب بولا۔

"یہاں سے نکل جائیں گے آج۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "شام تک کچھ کر لیں گے، ٹریلر نہ سہی، ویگن تو آج ہی مل جائے گی، کہیں بھی نکل جائیں گے۔"

"ہمارے واپس آنے تک تم کو کچھ نہیں کرنا ہے، لنچ کے لیے بھی لنچ اسی حلوے پوری کا ہوگا، اسی چائے کو گرم کرو اور پیو۔" میں نے کہا۔

"یار، سگریٹ تو لا دو۔" غالب نے کہا۔

"ہاں، سگریٹ اور اخبار ہم لا دیں گے۔" میں نے کہا۔ "سراج کی ماں کو سنبھال کے رکھنا۔"

"میری فکر مت کرو۔" وہ گھٹنوں پر سے سر اٹھا کے بولی۔ "میں نہ بھاگوں گی اور نہ مروں گی۔"

"کیا ہم یہ سارا زہریلا سرمایہ ساتھ لے جائیں گے؟" محسن بولا۔

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ عائشہ کی لاش واپس کرنا چاہیے یا نہیں؟"

"ہم اسے یہاں بھی چھوڑ کے جا سکتے ہیں جیسے ہم کیتھرین کی لاش کو چھوڑ آئے تھے۔" محسن بولا۔ سچ خود بخود اس کی زبان

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

آگیا تھا۔

میں نے گھبرا کے بجولی کی طرف دیکھا لیکن وہ دیوار سے ٹیک لگائے نہ جانے کس سوچ میں گم تھی، اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔

"کیوں نہ ہم اس کی تدفین کر دیں یا کرا دیں؟" میں نے کہا۔ "اور اس کی موت کی خبر کو اس وقت تک راز رکھیں جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے، وہ مقصد جس کے لیے ہم عائشہ کو لائے تھے۔"

غالب نے میری بات کو سمجھ کے سر ہلایا۔ "کارڈ ہاتھ میں رکھیں۔"

"ہاں، یہ کیوں تسلیم کریں کہ ہمارے پاس صرف ایک کارڈ رہ گیا ہے۔" میں نے سراج کی ماں کی طرف دیکھا جو زیب النساء پہلے ہی نکل گئی۔ عائشہ کی موت کا سُن کے دباؤ صرف سراج پر رہ جائے گا، جو ابھی دلاور پر بھی ہے جب ہم رابعہ اور بیٹی کی بہ حفاظت واپسی کی ضمانت حاصل کر لیں گے تو دلاور کو بتا دیں گے کہ عائشہ کو خود اسی کے زہر نے مارا تھا، ہم نے نہیں۔ وہ غلط چال نہ چلتا تو عائشہ زندہ رہتی۔"

"یہ مشکل کام ہوگا۔" محسن نے کہا۔ "کفن دفن، میت کا غسل اور پھر کسی قبرستان میں نمازِ جنازہ وغیرہ۔ گورکن بھی مشکوک حالات میں جگہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔"

"ہاں مگر بات پھر پیسے پر آ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "جو سارے کام نکالتا ہے۔ تجہیز و تکفین کا سارا بندوبست رفاہی ادارے کرتے ہیں۔ ان سے سامان مل جائے گا، آدمی بھی مل جائیں گے۔ تدفین آسان ہے اور مغرب کے وقت ہو گی۔"

"دیکھ لو، ایک تو عورت کا معاملہ ہے، گناہ ثواب تمہارے سر۔" غالب نے کہا۔

"یار، یہ بھی تو ہم کر سکتے تھے کہ لاش کو یہاں لاوارث چھوڑ جاتے۔" محسن بولا۔ "اس کھنڈر میں کون آتا، بعد میں خود بو بتا دیتی۔ وہ بھی دو چار دن گزر جانے کے بعد، اگر مناسب طریقے پر تجہیز و تکفین ہو جاتی ہے تو... تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا اب اُٹھ، میرے ساتھ چل۔" میں نے کہا۔ "بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"تم لوگ اسی حلیے میں پھرو گے؟..." غالب تشویش سے بولا۔ "آج کے دن تو بہت خطرہ ہے۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔ "کوشش کریں گے کہ اپنا حلیہ جس حد تک بدل سکتے ہوں، بدل لیں اور کم سے کم نظر آئیں۔"

ہمارے باہر آنے کے بعد پہلا اچھا کام تو یہ ہُوا کہ ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی، اس نے سارا دن ساتھ رہنے کے تین سو روپے مانگے تھے ہم نے کہا کہ پانچ سو روپے دیں گے مگر شرط یہ ہو گی کہ تم سوال نہیں کرو گے۔ وہ تھوڑا سا حیران ہُوا پھر کچھ سوچ کے تیار ہو گیا۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جس سے اس کو پریشانی ہو۔ "ہمارے کچھ دشمن پیچھے لگے ہوتے ہیں اور ہم اُن سے بچنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو اور بھی بُرا ہے جی۔" وہ پریشان ہو کے بولا۔ "وہ ماریں گے گولی آپ کو، لگے گی مجھے۔"

"ارے نہیں بھائی، وہ گولی مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون، پولیس والے، کیا کیا ہے تم نے؟" وہ بولا۔

"ہم جیل سے بھاگے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بیس سال لے گئے تھے مگر ایک مہینے میں نکل آئے، قتل کیا تھا ہم نے۔"

"بس جی بس، آپ مجھے جانے دو۔" وہ بولا۔ "پانچ سو روپے کے لیے میں بھی پکڑا جاؤں۔ مجھ پر الزام آئے گا کہ میں نے مدد کی تھی اور میں تمہارا ساتھی ہوں، میرے بیوی بچے رُل جائیں گے۔"

"وہ تو اب بھی رُل جائیں گے، اگر تم نے انکار کیا۔" میں نے زبردستی بیٹھنے کے بعد کہا۔ میرے ساتھ ہی محسن نے پچھلی سیٹ پر قبضہ کر لیا۔

"ہم دوسرا قتل بھی کر دیں گے مگر واپس نہیں جائیں گے۔" محسن نے ریوالور نکال کے کہا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ ہکلانے لگا۔ وہ حد درجہ بزدل آدمی تھا۔

"میں... دیکھو جی... ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے، میں لے چلتا ہوں... جہاں آپ کہو... بے شک آپ پیسہ بھی مت دینا اور میں... بالکل... بالکل خاموش رہوں گا بعد میں بھی بولوں تو میرے باپ کی بھی توبہ... لیکن اس کو ہٹا لو... گولی چل جائے گی... میرے بیوی بچے رُل جائیں گے، ان کا کوئی نہیں۔"

"ان کے تم ہو اور تم سے پہلے خدا ہے۔" میں نے کہا۔ "خدا کا نام لو اور چل پڑو۔"

پروگرام کے مطابق ہم نے سب سے پہلے لباس بدلا۔ ہمارے لیے غیر ملکی صحافیوں کا تاثر دینے والا یہ لباس کیتھرین لائی تھی جو لُنڈے کی سوغات تھا۔ اب ہم نے سو فیصد مشرقی لباس اختیار کیا، شلوار قمیص، پشاوری چپل اور قراقلی ٹوپی، یہ لباس ہم نے ریڈی میڈ خریدا اور ٹیکسی میں ہی تبدیل کیا۔ اس وقت ٹیکسی ایک گودام کے پیچھے کھڑی رہی اور ڈرائیور بیچارہ سامنے دیکھتا رہا۔ اس نے اب یقین کر لیا تھا کہ ہم وہی ہیں جو خود کو بتا رہے ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو کر رہے ہیں۔

پُرانے لباس کو ہم نے مختلف مقامات پر پھینکا اور خاصے بے فکر ہو گئے کیونکہ ہماری ظاہری وضع قطع نے ہمیں بہت محفوظ کر دیا تھا۔ محسن نے ایک عینک ساز سے جو فٹ پاتھ پر صندوق کھولے بیٹھا تھا، اپنے اور میرے لیے زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک بھی لی۔ اس کے پاس پُرانی اور نئی عینکوں کا ملا جلا انبار تھا۔ دیہاتی اور ان پڑھ قسم کے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ مختلف چشمے لگا کے دیکھتے تھے جس سے انہیں بصارت میں زیادہ اضافہ محسوس ہوتا تھا، اس کا بھاؤ تاؤ کر کے سودا کر لیتے تھے اور یہ ریڈی میڈ چشمہ لگا کے ہنسی خوشی چلے جاتے تھے، نہ کسی آئی اسپیشلسٹ سے ٹیسٹ کرانے کا جھگڑا، نہ نمبر لینے کا اور نہ شیشے بنوانے کا جھنجٹ۔ پلاسٹک کے فریم والی عینکوں کے شیشے میلے تھے اور ڈنڈیاں ڈھیلی تھیں۔ میرے حصے میں جو عینک آئی، اس کے شیشے بھی بالکل گول تھے۔ محسن کی عینک اُس کے چہرے کی مناسبت سے بہت چھوٹی تھی مگر اس عینک سے ہمارا چہرہ تک بدل گیا۔ ہم نے ہاتھ ملا کے ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دی کہ اس کم خرچ بالا نشین نسخے نے ایک گھنٹے میں کسی میک اپ کے بغیر ہم دونوں کو ناقابلِ شناخت بنا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے یہ سب دیکھا مگر اس نے صرف دو چیزوں کو عزیز جانا۔ اپنی جان کو اور پانچ سو کی رقم کو، اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے ہم خطرناک قسم کی گفتگو بھی کرتے رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ کالے ناگ کو چھوڑنا نہیں ہے، اس کی تلاش کے بھی ٹکڑے کر کے کُتوں کو ڈالنے ہیں اور پھر اُستاد سے انعام لینا ہے کہ گڑبڑ کرنے والے کو ٹھنڈا کر آئے ہیں۔ کیسا کالا ناگ اور کہاں کا اُستاد، مگر ٹیکسی ڈرائیور کانپتا رہا، یہ سوچ سوچ کر کہ ہمارا اُستاد کتنا خطرناک ہوگا۔ ہم نے جیل کے اندر کی بہت سی باتیں کر کے اُسے ڈرایا، وارداتوں کے تذکرے کیے جو ہم کر چکے تھے اور آئندہ کے منصوبوں کی بات کی۔ درمیان میں اسے تنبیہ کرتے رہے کہ وہ کچھ نہ سُنے اور سُن رہا ہے تو زبان بند رکھے، ورنہ ہم بعد میں کاٹنے آ جائیں گے۔

ایک گھنٹے بعد جب ہماری گھڑیوں میں صبح کے دس بجے تھے، میں نے ٹیکسی کو گاڑیوں کے ایک شوروم سے کچھ فاصلے پر رکوایا اور خود اُتر کے واپس گیا۔ محسن ٹیکسی میں ہی بیٹھا رہا۔ شوروم ابھی کھلا ہی تھا اور میں اس کے مالک کو گاہک بالکل نہیں لگتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"خو کیسا بات کرتا اے؟" میں نے پٹھانوں کا لب و لہجہ بنا کے کہا۔ "اَم گاہک ہے، سلام نہیں کرتا اے اَم کو... خیر کوئی بات نہیں ماڑا۔"

وہ ذرا محتاط ہو گیا۔ "آپ گاڑی خریدیں گے؟"

میں مُسکرایا۔ "اوئے یارا اور کیا لے گا؟ مونگ پھلی؟ تمہارا دُکان میں اور کیا اے؟ یہ فرنیچر بیچے گا، لو لو؟"

"یہ... یہ تو ہمارے ذاتی استعمال کا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "خیر آپ فرمایئے کتنے تک کی گاڑی چاہیے؟"

"کتنا تک؟" میں نے سوچ کے کہا۔ "خو یارا! اَم کو ایک نہیں، دو گاڑی چاہیے... بوت بڑا۔"

"بہت بڑی گاڑی، شیورلٹ یا بیوک وغیرہ؟" اُس نے یوں کہا کہ طنز اور تمسخر محسوس نہ ہو مگر اس کا مقصد یہی تھا۔

"نئیں، اَم بتاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اَم یہ لے گا۔" میں نے فوکس ویگن کی مائکرو بس کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ... یہ تو نئی ہے، صرف سال بھر پہلے کا ماڈل ہے۔" وہ بولا۔

"ایک دم نیا نئیں اے؟" میں نے کہا۔

"وہ بھی مل جائے گی۔" شوروم کے مالک نے پہلی بار سنجیدہ ہو کے مجھے غور سے دیکھا۔ "لیکن یہ بھی نئی ہی سمجھ لیں آپ، مالک نے مشکل سے تین ماہ استعمال کی تھی۔ اس کی رننگ پوری ہو گئی ہے بس..."

"کیا پورا ہو گیا اے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کچھ نہیں خان صاحب۔" وہ بولا۔ "اسے آپ یہاں سے لندن لے جائیں۔"

"لندن؟ نئیں یارا... ہم کو لندن نئیں جانا اے۔ اَم یہ نئیں لے سکتا، تم کراچی جانے والا گاڑی دکھاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے اوّل درجے کا احمق سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی یقین آ گیا تھا کہ میرے پاس دولت ضرور ہے۔ شاید میں کسی قبیلے کا سردار یا زمیندار وغیرہ ہوں، جس نے علاقہ غیر سے لاہور میں پہلی بار قدم رکھا ہے۔

"یہ بھی جائے گی کراچی۔" وہ بولا۔ "لیکن اس کی قیمت ذرا زیادہ ہے، مالک نے اس میں بہت کچھ لگوایا تھا، آپ دیکھ لیں، قالین ہے اور ریڈیو ہے، ایئر کنڈیشنر ہے، تھکن نہیں زیادہ کی بیٹھے گی یہ آپ کو۔"

"ماڑا تم بولو کتنا مانگتا ہے؟" میں نے بُرا مان کے کہا۔

"آپ چوالیس ہزار دے دیں۔" وہ سوچ کر بولا۔

میں نے جیب میں سے رقم نکالی اور دس ہزار اُس کے

سامنے ڈال کے کہا ”بیانہ رکھو، رسید بناؤ اور امارا نام پر گاڑی کرو، اَم ابھی آئے گا، ایک گھنٹا میں، باقی پیسہ دے گا، گاڑی لے جائے گا۔“

”بالکل… بالکل تشریف لائیے۔“ شورُوم کے مالک نے بے یقینی سے نوٹ اُٹھا کے دیکھے۔ شاید اتنے کم وقت میں اتنی آسانی سے اُسے منہ مانگی قیمت کسی نے نہ دی ہوگی۔ ”ٹرانسفر وغیرہ سب کرا دوں گا میں شام تک۔“

”شام تک نہیں، اَم گاڑی ابی لے جائے گا۔“

”گاڑی آپ شوق سے لے جائیں۔“ وہ بولا ”میرا مطلب کاغذات سے تھا، وہ ذرا وقت لگتا ہے نا، تین چار بجے تک…“

”ٹھیک اے، اَم جاتا اے۔“ میں نے کہا۔

”وہ رسید کس نام سے؟“ دُکاندار بولا ”خیر ابھی آپ آ رہے ہیں نا، باقی رقم لے کر، اُس وقت لکھ دیجیے گا اپنا نام پتا، یہ فرمائیے کہ دوسری گاڑی کا آپ نے کیا سوچا؟ آپ نے دو گاڑیوں کی بات کی تھی۔“

”دوسرا گاڑی… خو یارا لکڑ ہاے تمارا پاس بڑا گاڑی، یہ بڑا تھا، اَم لے لیا۔“ میں نے کہا۔

”اس سے بھی بڑی۔“ وہ چکرا گیا ”کوئی بس وغیرہ یا ٹرک…؟“

”نہیں، بس سے بھی بڑا گاڑی۔“ میں نے کہا۔

”بس سے بڑی گاڑی کون سی ہوتی ہے خان صاحب؟“ وہ بولا۔

”ہوتا اے، اَم دیکھا ہے۔“ میں نے کہا ”اور اَم کراچی میں دیکھا بوت لمبا گاڑی، آگے ٹرک ہوتا اور اُس کا پیچھے بوت لمبا گاڑی جیسا کہ مال گاڑی کا ڈبا ہوتا، ایک دم ویسا، تمارا دُکان سے بھی لمبا۔“

”آپ کو سامان لے جانے والا ٹریلر چاہیے، کنٹینر ٹائپ ٹرک چاہیے؟“ دُکاندار نے مشتبہ لہجے میں کہا۔ اس نے کاغذ پر شکل بنا کے واضح کیا۔

”ہاں ہاں یہی چاہیے، بوت مشکل نام تھا، اَم بھول گیا۔ اَم کو بولا تھا کسی نے۔“ میں نے سر ہلا دیا۔

”مگر جناب! وہ ایسے کہاں ملے گا۔“ شورُوم کا مالک بولا ”اس کا تو پتا کرنا پڑے گا، شاید کوئی پارٹی بیچ رہی ہو، اگر ملا تو بہت مہنگا ہوگا۔“

”اچھا، دس لاکھ سے زیادہ ہوگا؟“ میں نے سادگی سے کہا۔

وہ دم بخود رہ گیا ”دس… نہیں اتنا تو نہیں، یہی ساڑھے تین چار لاکھ کے درمیان… کنڈیشن پر ہے، میرا مطلب ہے حالت اچھی ہوگی تو مہنگا بھی ملے گا، پانچ لاکھ ہو سکتے ہیں۔“

”پروا نہیں مالڑا۔“ میں نے بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر زور دار ہاتھ مار کے کہا ”اَم لے گا، تم پتا کرو، اَم کو… اَم تم کو ابھی اس کا بھی بیانہ دے کر جائے گا۔“

”جی بہت اچھا۔“ شورُوم کے مالک نے کندھا… کرنے کے بعد کہا ”آپ کریں گے کیا اس کا؟“

”خو تم کیسا بات کرتا اے، اَم اس کو آگ لگائے گا…“ نے خفگی کا اظہار کیا ”امارا چیز اے، اَم اس کو آگ لگائے… تم ابی پوچھے گا کہ گاڑی کا کیا کرے گا، کیسا بے وقوف ہے تو… امارا پیسہ۔“

”وہ… میں معافی چاہتا ہوں۔“ وہ بولا ”میرا ہرگز مطلب نہیں تھا جناب، آپ جو چاہیں کریں، میں تو مدد کرنا چاہتا تھا جناب کی تاکہ صحیح چیز مل جائے۔“

”اچھا… اَم جاتا ہے، ابھی آئے گا۔“ میں نے اُس سے ہاتھ ملا کے اپنے سینے پر رکھا اور چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہکا بکا کھڑا مجھے دیکھ رہا ہوگا۔ کاروبار میں عجیب و غریب… آتے ہیں اور کیسے کیسے تجربے ہوتے ہیں، وہ بہت خوش… گا کہ آج کسی اچھے آدمی کا مُنہ دیکھا تھا کہ صبح صبح ایک دم… دولت مند آ گیا، وہ ابھی تو خاموش رہے گا کہ کہیں دوسرے شورُوم والے اس کا گاہک نہ توڑ لیں مگر بعد میں ضرور… سے تذکرہ کرے گا۔

میں گھوم کر ٹیکسی تک پہنچا اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اگر مجھے ایک گھنٹے میں مائکرو بس مل جائے تو… اس ٹیکسی سے بھی نجات حاصل کر لیں گے اور اس کھنڈر کی… سے بھی۔ چنانچہ میں نے یہ بات محسن کو فرنچ میں سمجھا دی… ٹیکسی ڈرائیور ہماری جناتی بولی سُن کے اور ڈر رہ جانے… جیل سے فرار ہوئے تھے یا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق… اس کے لیے یہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے دہشت ناک تجربہ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے ٹیکسی کو سڑک پر وہیں روک لیا جہاں ہم ٹیکسی والے کو ملے تھے۔ وہاں سے بہرام دادا کا… تھوڑے سے فاصلے پر تھا اور میں یہ فاصلہ پیدل طے کر کے جا سکتا تھا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے بلا ٹر تو خرید… یہ ضرورت ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کی۔ اُس کے پاس ضرورت کے سارے ٹول تھے، وہ سمجھ نہ سکا کہ اچانک واپس آ کے… صرف بلا ٹر لے کر اُترنے اور مُنہ اُٹھا کے ایک طرف چل پڑنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے لیکن مقصد کو سمجھنا اُس کے لیے اتنا ضروری نہیں تھا جتنا زندہ رہنا اور ہم سے خیر و خوبی کے ساتھ جان چھڑ…

…نست ہونا۔

غالب مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے اسے مختصراً وہ بتا دیا جو میں کر آیا تھا اور اب جا کے کرنے والا تھا۔ …نے مجھے احتیاط کی تاکید کی۔ میں نے نوٹوں کی ہر گڈی سے …کو یوں علیحدہ کیا جیسے میرے ہاتھوں میں بجلی کا ننگا تار ہے …ہوتے ہی گیارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ میرے وجود میں موت …رہے گا۔ ایک ایک کر کے میں نے سر زہر میں بجھی ہوئی پن …لی کیا اور دس گڈیاں محفوظ کر لیں۔ یہ مجموعی طور پر ایک …رقم تھی اور فوری ضرورت کے لیے کافی تھی، باقی سب …ون کو اطمینان اور فرصت کے ساتھ ایک ایک پن سے …جا سکتا تھا۔ مجموعی طور پر بیس زہر کے نشتر جیسی پنوں کو …نے احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔ یہ بھی اسلحہ تھا جو مخصوص …ات میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں نے اور محسن نے ٹیکسی کو ریلوے …ریزرویشن آفس کے سامنے روک لیا۔ میں نے اُسے پانچ سو …پے دیے۔

”گھبرانا نہیں۔“ میں نے کہا ”ہم ابھی آتے ہیں، ٹکٹ لے کر۔“

”اور کہیں جانا بھی نہیں۔“ محسن نے کہا۔

”میری کیا مجال جناب۔“ ڈرائیور نے یہ جھوٹ بڑی مشکل …بولا۔ جان بچ جانے اور دو گھنٹے کی محنت کے بدلے پانچ …روپے مل جانے کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ چھپانے سے …رہا تھا۔ ابھی ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ وہ بھاگ گیا۔ …اور محسن دو منٹ بعد لوٹ کر آئے تو اُس کا کہیں پتا نہ تھا۔ …ب ہنسے اور ہاتھ ملا کے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

”اب آج کا دن تو یہ گھر سے نکلے گا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، ٹیکسی کھڑی کر کے سارا دن شکرانے کے نفل پڑھے …اللہ نیاز دلوا کے جلیبیاں بانٹے گا کہ فوت نہیں ہوا ورنہ بڑے …خطرناک قسم کے مجرم ٹکر گئے تھے جو آدمی کو قتل کرتے ہوئے …نا اتنا درد بھی محسوس نہیں کرتے جتنا بکرے پر چھری پھیرتے ہوئے …قصاب کے دل میں اُٹھتا ہے۔“ محسن نے کہا۔

”اس طرح ہم بھی محفوظ ہو گئے۔“ میں نے کہا ”ورنہ ایک …بعید امکان تو تھا کہ سارا دن گھومتے پھرتے اس کا اور ہمارا …سامنا ہو جاتا۔“

کار کے شورُوم کا مالک ایک اور کارٹون کو دیکھ کر مزید …حیران ہوا۔ اس کے نزدیک دیسی کپڑوں میں اس قسم کی گفتگو …کرنے والا کارٹون ہی تھا۔ ہم سوٹ پہن کے آتے تو وہ ایک …لمحے میں دو بار سر کھجاتا اور ہمارے قدموں میں بچھ جاتا۔

”یہ امارا بھائی… بڑا بھائی عجب خان اے۔“ میں نے محسن کا تعارف کرایا ”اس کو سلام کرو۔“

”السلام علیکم جناب عالی۔“ شورُوم کے مالک نے مؤدبانہ انداز میں محسن سے ہاتھ ملایا ”فرمائیے کیا حاضر کروں، چائے کافی؟“

”اَم سبز چائے پیے گا۔“ محسن خان نے میرے ہی لہجے میں کہا۔

”سبز چائے، گویا قہوہ… وہ تو ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔“ دُکاندار کا رنگ فق ہو گیا۔ شورُوم میں اب تین دوسرے سیلز مین بھی آ گئے تھے اور ایک چوکیدار یا چپراسی بھی نظر آ رہا تھا۔

”پھر اَم کچھ نہیں پیے گا۔“ محسن نے دو ٹوک بات کی۔ ”گاڑی لے گا اور جائے گا، اس کو پیسہ دو۔“

میں نے جیب میں سے دس کی دس گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ شورُوم کے مالک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ”آپ… آپ ایسا کریں، اندر آ جائیں میرے آفس میں، میں وہیں بیٹھ کے رسید بنا دیتا ہوں۔“

اس نے اتنی دیر میں فون کر کے اِدھر اُدھر سے بہت سی مفید معلومات حاصل کر لی تھیں اور اسے پتا چلا تھا کہ ایک غیر ملکی کنسٹرکشن کمپنی اپنا کوئی ٹریلر بیچنا چاہتی ہے جس میں غالباً منگلا ڈیم کے لیے مشینری آئی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوا کہ وہ خود بھی زیادہ نہیں جانتا مگر وہ مجھے اپنے مطلب کی چیز لگی۔ میں نے اُسے مائکرو بس کی پوری قیمت ادا کی۔ ٹیکس، رجسٹری اور ٹرانسفر کی فیس دی اور پچاس ہزار اس کے علاوہ دیے۔

”یہ بیانہ بڑا گاڑی کا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن جناب! ابھی تو میں اسے دیکھوں گا پھر آپ دیکھیں گے، کمپنی سے سودا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”سودا تم کرو مالڑا، اَم تم کو اختیار دیا۔“ میں نے کہا ”تم کو اچھا لگے تو اَم کو بولو، اَم بھی دیکھ لے گا، کل پھر آئے گا — فی امان اللہ —“

”فی امان اللہ۔“ محسن نے بھی اُس سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں نے ہاتھ سینے پر رکھے۔ دُکاندار نے ہماری تقلید کی۔ سیلز مین یہ تماشا حیرت سے دیکھتے رہے۔ ان کو زیادہ حیرت اُس وقت ہوئی جب میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی لگائی اور پورے اعتماد کے ساتھ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے چلاتا ہوا لے گیا۔ معلوم نہیں اُنھوں نے بعد میں کیا تبصرے کیے ہوں گے۔ تاہم ایک بات یقینی تھی۔ اب وہ ہمارے لیے ہماری ضرورت کے مطابق ایک ٹریلر حاصل کرنے میں دن رات ایک کر دے گا۔ مائکرو بس، عجب خان ولد پشاور خان، ساکن محلہ ڈوبگری، پشاور شہر کے نام پر ٹرانسفر ہوئی تھی۔

اس مائکرو بس کا رنگ سلیٹی مائل نیلا تھا۔ محسن نے تجویز

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

پیش کی کہ "نورتن سرکس" کی اسکیم کا دوسرا سب سے اہم مرحلہ طے ہو جائے یعنی ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق ٹریلر مل جائے تو دونوں کا ایک ہی رنگ کر دیا جائے۔ دونوں پر کمپنی کا نام شوخ حروف میں لکھا جائے تاکہ یہ چلتی پھرتی پبلسٹی سب کو متوجہ کرے۔ محسن کا خیال تھا کہ دونوں گاڑیوں پر چمکتا ہوا زرد رنگ ہو اور اس پر نیلے حروف سے سیدھی پٹی کی صورت میں نورتن سرکس دونوں جانب اور پیچھے لکھا جائے، میں اس کلر اسکیم کو اُلٹا رکھنا چاہتا تھا یعنی گاڑیوں پر شوخ نیلا رنگ ہو اور اس پر نیم دائرے میں زرد حروف سے نورتن سرکس لکھا [illegible] طے ہوا کہ [illegible] سب کرے گا۔ [illegible] سرکس خدا [illegible] بیت سے خصوصی [illegible] واپس جا کے ہمیں اپنا ساز و سامان سمیٹنا تھا۔ غالب اور جُولی کے ساتھ سراج کی ماں کو لانا تھا اور عائشہ کو اُٹھانا تھا۔

عائشہ دُنیا سے اُٹھ گئی تھی اور اس کے جسدِ خاکی کو ایک کھنڈر سے اُٹھا کے کھنڈر بننے کے لیے تہِ خاک رکھنے کا ناخوشگوار فریضہ باقی رہ گیا تھا۔ اب دوپہر ہو رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ رابعہ اور ٹیڈی کی بازیافت کے مسئلے پر ایک آخری بات سراج یا دلاور سے کر لی جائے، اگر صورتِ حال اُمید افزا ہو تو عائشہ کے سفرِ آخرت کی ذمے داری دلاور ہی کو سونپ دی جائے۔ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے یہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کوئی مناسب جگہ نظر آئے تو فون کی لائن ملاؤں۔

مناسب جگہ ملی تو میں نے مائکرو بس کو ایک سائڈ اسٹریٹ کے موڑ پر روک دیا اور خود چند قدم واپس گیا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں شاید پانچ منٹ ہی لگے تھے مگر اتنی دیر میں ٹیلی فون کے کھمبے کا ایک کارکن نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑا تھا اور اب اپنی سائیکل کھمبے کے ساتھ ٹکا کے اُوپر روانہ ہو رہا تھا۔ میں مایوس ہو کے پلٹنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں آگے بڑھا اور انتظار کرنے لگا کہ لائن مین کھمبے پر پہنچ کے کنکشن ملا لے۔ اُسے نیچے میری موجودگی کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے کراچی کا کوئی نمبر ملایا اور اپنی کسی آپا جی سے گپ شپ کرنے لگا۔ اس نے آپا جی کے یہاں کی خیریت، بچّوں کی طبیعت، موسم کا حال اور بازار کے بھاؤ تفصیل سے دریافت کیے اور ان کا موازنہ لاہور کے حالات سے کیا۔ میں نے اپنی ٹوپی اور اپنا چشمہ اس کی سائیکل پر رکھ دیا۔

صحیح وقت پر میں نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا تو اس نے میری طرف دیکھا "اوئے... اوئے کیا بات ہے... کچھ نہیں آپا جی... یہ بات آپ سے نہیں کی میں نے... اوئے یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے؟ میں اُوپر آ رہا ہوں۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"آپا جی... معاف کرنا... یہ کوئی بندہ آگیا ہے، زبردستی میرے دفتر میں۔" اس نے اپنی آپا کے سامنے اپنی توہین [illegible] رکھی اور یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ خود کتنی بلندی سے مخاطب [illegible] اس کا آفس ایک کھمبے پر واقع ہے۔ میں اتنی دیر میں اس [illegible] پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں ایک ہی کھمبے سے چھپکلی کی طرح [illegible] تھے اور ہم دونوں کے پیر ایک ہی بریکٹ پر ٹکے ہوئے تھے۔

"تم... تم کھمبے پر آخر کیوں چڑھے ہو؟" لائن مین [illegible] سے [illegible]

"تم بھی تو چڑھے ہوئے ہو یار۔" میں نے کہا۔

"میرا تو کام ہے یار، ڈیوٹی ہے میری۔" وہ جھنجھلا کے بولا۔

"مجھے شوق [illegible] [illegible] طرح مجھے بھی مفت کے ٹیلی فون کرنے کا بہت شوق ہے، میری بھی ایک آپا ہر جگہ ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے، نیچے اترو ورنہ..."

"ورنہ کیا، تم مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دو گے؟" میں نے کہا "میں بھی تم کو گرا دوں گا پھر تمہاری ٹانگ ٹوٹ جائے گی، تم لنگڑے ہو جاؤ گے تو اس نوکری سے بھی جاؤ گے جس میں کسی کے فون پر بھی اپنی آپا سے یہ گپ شپ ہو جاتی ہے۔"

"تم کو فون کرنا ہے کہیں؟" وہ مجھے کچھ دیر گھورنے کے بعد بولا۔ اس نے اپنا آلہ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ بڑی اچھی چیز ہے۔" میں نے تعریفی نظروں سے اس پورٹیبل فون کو دیکھا جیسا ایک میرے پاس بھی تھا۔ یہ کچھ نیا اور جدید وضع کا تھا۔

"بات کرو اور جاؤ۔" لائن مین نے کہا۔

"یہ ٹیلی فون بیچو گے؟" میں نے کہا۔

"تم تو پاگل ہو یار۔" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ سرکاری چیز ہے۔"

"سرکاری چیز تو یہ زمین بھی ہے جس پر کھمبا کھڑا ہے، یہ کھمبا بھی سرکاری ہے جس پر تم چڑھے ہوئے ہو اور وہ نوکری بھی سرکاری ہے جو تم کر رہے ہو۔ سرکار کی ہر چیز اتنی ہی تمہاری بھی ہے جتنی میری ہے۔ بولو، یہ ٹیلی فون بیچو گے؟" میں نے کہا۔

اُس نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یا میرے مولا! کس پاگل کے ہتھے لگ گیا۔ او بھائی، یہ چیز بیچی نہیں جا سکتی، اس کو بیچنا جرم ہے۔"

"اچھا! اگر یہ چوری ہو جائے، فرض کرو میں اسے چرا لوں جرم تو پھر میرا ہوگا۔" میں نے کہا۔

لائن مین نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا "یار! خدا کا واسطہ۔"

"اچھا فرض کرو کہ میں یہ لے کر بھاگ جاؤں۔" میں نے کہا۔ "تم شرط لگا کے بھی میرے ساتھ نہیں دوڑ سکتے یا میں اسے نیچے [illegible] دوں اور یہ ٹوٹ جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہیں کروں گا۔" وہ فریاد کناں لہجے میں بولا۔ "اپنی [illegible] برکو رونے کے سوا۔ مجھے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟"

"وہ تو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں یہ خریدنا چاہتا ہوں۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے فون کرنے کا بہت شوق ہے۔" میں نے [illegible] میں نے جو درخواست دے رکھی ہے اس پر تو فون [illegible] سال بعد ملے گا، یہ دس سال میں کیسے گزاروں گا۔ میرا تو [illegible] چاہتا ہے کہ ہر وقت فون کرتا رہوں۔"

"کسے فون کرتے ہو تم؟"

"اپنی ہر گرل فرینڈ کو، ہر شہر میں اور ہر شہر کے ہر محلے میں [illegible] کوئی نہ کوئی گرل فرینڈ رہتی ہے۔"

"تم جوان لڑکیوں کو تنگ کرتے ہو اور اس کے لیے فون [illegible] چاہیے تمہیں؟"

"میں لڑکیوں کو تنگ کرتا ہوں، یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟" میں نے کہا۔ "اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ جوان ہیں۔ کسی کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں، پانچ سے دس سال کے درمیان ہیں سب، [illegible] مزے کی باتیں کرتی ہیں، تم کو اندازہ نہیں کہ ان کی باتیں کتنی معصوم اور دلچسپ ہوتی ہیں۔"

"مذاق چھوڑو، مجھے جانا ہے۔" وہ ضبط کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"اچھا، خدا حافظ۔" میں نے کہا۔

"یہ فون مجھے دو۔" وہ چلّا کے بولا۔

"یہ تو میں نہیں دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس کے بدلے یہ لے لو۔" میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے۔ "کم ہیں [illegible] اور لو۔"

وہ ہکا بکا نوٹوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت روئے زمین پر ہر قسم کے سودے ہو رہے تھے۔ ہر بڑے شہر کے اسٹاک ایکسچینج [illegible]... کاٹن ایکسچینج میں، سڑکوں بازاروں، چوٹے [illegible] اور قحبہ خانوں میں، بازار کی جنس سے آدمی کی جنس تک سب [illegible] فروخت ہو رہا تھا مگر یہاں روئے زمین سے پندرہ فٹ [illegible] بلندی پر دُنیا کا انوکھا سودا ہو رہا تھا۔

"کم ہیں تو بولو۔" میں نے کہا۔ "دُگنے کر دوں؟"

"دو ہزار... مگر یار میں کیا کروں گا، کیا کہوں گا؟" وہ پریشان [illegible] ہونے لگا۔

"تم بس ایک جھوٹ بول دینا۔" میں نے کہا۔ "کہ یہ چوری ہو گیا [illegible] چوری ہوا، یہ کہانی تم خود گھڑ لینا جو تمہارے اُوپر والوں کو مطمئن کر سکے۔ ڈرنا تو اُوپر والے سے چاہیے، اوپر والوں کی کیا فکر، وہ خود اس سے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ سچ کی کمائی میں تو تنخواہ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے تم سے، تم بہت چالاک اور خطرناک آدمی ہو، بعد میں مجھے مروا دو گے۔" وہ بولا۔

"نہیں، کرۂ ارض پر بہت جھوٹ بولا جا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اور تم عام انسانوں کی سطح سے بلند ہو کے بات کر رہے ہیں، یہ لو دو ہزار اور اپنی سائیکل اُٹھا کے رفوچکر ہو جاؤ، پلٹ کے مت دیکھنا۔ دس منٹ بعد میں بھی غائب ہو جاؤں گا۔ اس کھمبے کی نوک پر ہونے والی یہ ملاقات ہم دونوں کے لیے فائدہ مند رہی۔ دُنیا کے سامنے اس کا ذکر مت کرنا ورنہ دُنیا والے بڑے حاسد ہیں، کسی کا بھلا نہیں دیکھ سکتے۔"

وہ نوٹ لے کر بڑی عجلت میں نیچے اُترا۔ اُس کی زندگی کا یہ ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ غالباً وہ ضرورت مند بھی تھا۔ ضرورت مندی آدمی کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے اور یہ تحریر ہمیشہ یکساں مفہوم رکھتی ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ غربت اور مفلسی کی مجبوریاں ایسی بہت سی ضرورتوں کو جنم دیتی ہیں، جن کا مداوا صرف پیسہ کرتا ہے، سب لوگ نوٹ نہیں چھاپ سکتے چنانچہ وہ چوریاں کرتے ہیں، کبھی مال چُراتے ہیں تو کبھی ٹیلی فون کال۔

جب وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا تو میں نے نئے ٹیلی فون انسٹرومنٹ کو آزمایا جو بدستور لائن سے ملا ہوا تھا۔ میں نے سراج کا نمبر ملایا۔

"ہیلو، سب انسپکٹر تیس مار خان۔" نے فوراً جواب دیا۔

"تیس مار خان! میں مُسکراتے ہوئے مُردوں کی ایسوسی ایشن کا اعزازی صدر بول رہا ہوں، لیعنی تمہارا باپ۔" میں نے کہا۔

"ایس ایس پی صاحب سے بات کرو گے؟" تیس مار خان نے میری آواز یقیناً پہچان لی تھی مگر وہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔ "میں لائن دے رہا ہوں۔"

"سکندر! میری ماں کیسی ہے؟" سراج کی آواز آئی۔

"ماں، ہر ماں کی طرح وہ بھی بہت اچھی ماں ہے مگر ہر بیٹے کی طرح تم اچھے بیٹے نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا، وہ ٹھیک تو ہے نا، کیا میں بات کر سکتا ہوں اُس سے؟"

"نہیں، وہ خود تم سے بات نہیں کرے گی۔" میں نے کہا۔ "اس لیے کہ وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ ویسے تم فکر مت کرو، ہم اسے کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔"

"تم اُسے جتنی اذیت دے سکتے تھے، دے چکے۔" وہ بولا۔ "جو کچھ تم نے زیب النساء کے ساتھ کیا...!"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہم نے صرف اتنا کیا تھا کہ اُسے ایک ایئر کنڈیشنڈ ٹمر لیڈیز میں ڈال کے لے گئے تھے، باقی جو کچھ کیا خود اُس نے کیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہتی تو اس کے ساتھ کچھ نہ ہوتا۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اُس کے ساتھ کیا ہُوا؟" وہ بولا۔

"نہیں، اگر بُرا نہیں ہُوا تو اچھا ہے اور اچھا نہیں ہُوا تو ... سوری۔"

"وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی ہے، اُسے ہم نے سڑک پر پڑا ہوا پایا تھا، اسی علاقے میں۔" وہ بولا۔ "پولیس پارٹی نے اس سارے علاقے کو چھان مارا تھا۔ وہ صبح ساڑھے تین بجے ملی، اس حالت میں کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔"

"مگر میں تصوّر کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے اس درندے کا پتا چلا لیا جس نے اُس کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کیا؟"

"نہیں لیکن میں پتا چلا لوں گا، بس وہ ہوش میں آ جائے، اُس کے ذہن پر صدمے کا شدید اثر ہے۔"

"میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"وہ کم سے کم تین افراد تھے جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اُنھوں نے اسے زبردستی شراب بھی پلائی، اگر وہ بچ گئی تب بھی اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ ذہنی صدمے سے ریکوّر نہ کر سکے۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن لمبا ہو جائے یا کبھی ختم نہ ہو۔ کیا تم کو احساس ہے کہ اس سب کے ذمّے دار تم ہو؟" وہ بے حد مشتعل تھا۔ جھنجلاہٹ اور بے بسی کے احساس سے خود اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب!" میں نے سکون سے کہا۔ "ہم نے ایسا نہیں چاہا تھا مگر کیا تم کو یاد ہے کہ رابعہ کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا، وہ جانتے بوجھتے کیا تھا، اُس وقت تمھیں احساس تھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"چھوڑو... چھوڑو یہ بات... زندگی بہت پڑی ہے، میں اور تم پھر ملیں گے۔" وہ بولا۔ "اور اُس وقت تم آج کے دن کی یہ بات یاد کر کے پچھتاؤ گے۔ میں تم کو ایک موقع دے سکتا ہوں سکندر۔ ذاتی سطح پر عداوت کا یہ سلسلہ ختم کر دو۔"

"یہ تو آغاز ہے ایس ایس پی صاحب ہماری طرف سے۔ تم نے ہی یہ فصل بوئی تھی، اس کا پھل کاٹتے ہوئے روتے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"دیکھو، رابعہ کے بارے میں مجھے معلوم ہُوا ہے کہ وہ ہماری تحویل میں نہیں ہے، ہمارے کسی آدمی کے پاس نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"پھر کہاں ہے، تمھارے آدمی یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اُنھوں نے رابعہ کو مار کے سمندر میں پھینکا تھا... یا گاڑا تھا تو کہاں گاڑا تھا؟"

"وہ فرار ہو گئی تھی، قید سے نکل گئی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میرا دل ایک دم سینے میں [illegible] میں نے اُسے تھپک کر خاموش کر دیا۔ اسے دلِ بے تاب [illegible] میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہُوں، یہ واقعہ [illegible] کو ملا وہ اب بھی نہیں۔

"تقریباً ایک ہفتے پہلے۔" میں نے سراج کی آواز سُنی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو، اُس نے ہم سے رابطہ قائم نہیں [illegible]"

"جھوٹ شاید تم بول رہے ہو، اُس نے تم سے رابطہ قائم [illegible] تھا۔" سراج نے تلخی سے کہا۔

میں حیران رہ گیا کہ وہ کتنا باخبر ہے۔ "وہ خود بھی تو آ سکتی تھی اگر وہ آزاد تھی۔" میں نے کہا۔

"یہ اُس سے ملو تو پوچھ لینا کہ وہ کیوں نہیں آئی اور [illegible] وہیں رہی تو کس کے لیے؟" سراج نے کہا۔

"ممکن ہے وہ اکیلی آنا نہ چاہتی ہو، اُس کے ساتھ ہمارا ایک اور دوست بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، تھا... اُسے ہم چھوڑ دیں گے۔ مجھے معلوم کرنا ہوگا اُس کے بارے میں کہ وہ کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے پھر رابطہ قائم کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور تم کو بتا دوں گا کہ کب، کہاں اور کیسے ہمارے اور تمھارے قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔"

"ٹھہرو، بند مت کرنا۔"

"کیوں؟ کیا کال کو ٹریس کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، تمھاری یہ گفتگو صرف میں سُن رہا ہوں۔" سراج نے کہا۔ "میں نے اس کا رابطہ آبزرویشن سے الگ کر دیا تھا۔"

"کیا عائشہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں، اُسے چھوڑ دو۔" سراج نے کہا۔ "اُسے گھر جانے دو، وہاں بڑی قیامت آ گئی ہے۔ تم نے اُس کے باپ سے فون پر کیا کہا تھا؟"

"میں نے صرف سچ بولا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس سچ کے ذریعے تم نے ایک قتل کر دیا۔" اُس نے بے اختیار مجھے ایک گالی دی۔

"اچھا تو یہ آلۂ قتل میرے قبضے سے برآمد کر لو۔" میں نے کہا۔

"تمھارا وہ سچ ایک ٹیپ پر محفوظ ہے۔ دلاور کا فون بھی آبزرویشن پر تھا۔ یہ تم کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس کے اغوا کے بعد کارروائی ضرور ہو گی۔ پولیس وہ سب کچھ کرے گی جو کرنا چاہیے۔"

"مگر جو عام آدمی کے اغوا پر نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"دلاور عام آدمی نہیں تھا۔" سراج نے کہا۔ "اس کے لیے [illegible] انتظامی مشینری کا حرکت میں آنا لازمی تھا۔ تمھاری گفتگو [illegible] ایک لفظ ٹیپ ہُوا اور میں نے بھی سُنا لیکن اس سے [illegible] کو نقصان نہیں ہُوا۔"

"کیونکہ وہ ٹیپ تم نے غائب کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ [illegible] اس عورت کا باپ، جو دلاور کی بیوی ہے۔"

"وہ دلاور کی بیوی تھی۔" سراج بولا۔

"کیا... کیا وہ مر گئی؟" میں نے چونک کر کہا۔ "مار دیا [illegible] دلاور نے راتوں رات، وہ واقعی دلاور ہے۔"

"اُسے تم نے مارا ہے سکندرِ اعظم، دلاور نے نہیں۔"

"میں نے اُس کے باپ کو سب سمجھا دیا تھا۔" میں نے کہا۔ [illegible] موت اُس عورت کا مقدر ہو چکی تھی۔ دلاور اُسے بہت [illegible] سے قتل کر رہا تھا، مجھے الزام کیوں دیتے ہو، یہ ویسے بھی [illegible] کی زندگی کی آخری رات تھی۔ اُسے صبح ہونے سے پہلے [illegible] ہی تھا۔ شاید دلاور یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب دلاور [illegible] یہ کہو کہ اس کے باپ کو بھی مار دے۔"

"دلاور کا یہ کام تم نے کر دیا، صرف ایک فون کر کے، سچ [illegible] کے۔ تم نے ہمیشہ سچ بولا ہے اور نیکی کا ثواب کمایا ہے، [illegible] بھی اپنے کھاتے میں ڈال لو کہ تم نے اس بڈھے کی جان [illegible] لی، وہ سچ کا زہر برداشت نہ کر سکا کیونکہ وہ پہلے ہی [illegible] دل کا مریض تھا، وہ سچ بھی اُس کے ساتھ ہی مر گیا اور [illegible] کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا جو تم نے بولا تھا۔"

"اب تم کہو گے کہ دلاور کی بیوی باپ کی موت کا صدمہ [illegible] جھیل سکی، وہ پہلے ہی سخت بیمار تھی۔" میں نے نفرت سے [illegible] ہاتھ دیری گڑ گیا اچھا موقع ملا تھیں۔ تم کہو گے کہ قدرت [illegible] تمھاری مدد کر رہی ہے مگر یہ شیطان کی مدد ہے سراج۔"

"شیطان کی؟" سراج نے کہا۔ "فون تو تم نے کیا تھا، یہ سب [illegible] تمھاری وجہ سے ہی تو ممکن ہُوا اور اب تمھارا سچ دلاور کا کیا [illegible] بگاڑ سکتا ہے؟"

"دلاور کو آج ہی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "کہ سزا [illegible] اس کو ملی ہے اور یہ اُس کی آخری سزا نہیں ہو گی۔ عاقبت کی [illegible] بات میں نہیں کرتا کیونکہ خوفِ عاقبت نہ اُس کو ہے نہ تمھیں، [illegible] میں اس دُنیا کی بات کر رہا ہوں۔ اگر وہ مر سکتا تو اچھا تھا مگر وہ [illegible] زندہ رہے گا کیونکہ خدا اُس کی زندگی کو ایک تکلیف دہ، پُرعذاب [illegible] اور عبرت آموز سزا بنائے گا۔" میں نے فون کے تار کھینچ کر [illegible] الگ کیے اور نیچے اتر آیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید گر پڑتا۔ میں [illegible] جسمانی تھکن کے علاوہ اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔

محسن بے چینی سے میرا منتظر تھا اور دو بار چکر لگا کے اور کمرے سے جھانک کر دیکھ گیا تھا کہ میں ابھی تک کھمبے سے چمٹا ہُوا ہوں۔ اُس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ چند گاڑیاں اور تانگے بہت دُور سے گزر رہے تھے اور میں ایسی جگہ تھا جہاں کسی کی نگاہ براہِ راست مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔

"یہ کیا مصیبت ہے یار!" محسن نے بگڑنا شروع کیا۔ "بات مختصر کرنا چاہیے، آدھا گھنٹا لگا دیا۔"

میں نے جواب دیے بغیر دوسرا فون گاڑی میں پھینکا اور آگے محسن کی جگہ بیٹھ گیا۔ "گاڑی چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں مار دوں گا کسی دیوار میں یا چڑھا دوں گا کسی پر۔"

"کیا ہُوا تجھے؟" محسن نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا خون اُبل رہا تھا اور غصّے میں میرا چہرہ گرم ہو کے تپنے لگا تھا۔ جب گاڑی چلی تو میں نے محسن کو بتایا کہ دلاور نے اپنی بیوی کو رات ہی قتل کر دیا اور اُسے بہانہ بھی مل گیا کہ وہ باپ کی موت کی تاب نہ لا سکی۔

"یہ تو بہت غلط ہو گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلایا۔

"وہ خبیث صاف بچ گیا۔ اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جس بڈھے نے سچ سُنا تھا، وہ کچھ جی لیتا تو بیٹی کو بھی بچا لیتا مگر سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کیا واقعی میں نے غلطی کی تھی مگر میں اسے نہ بتاتا تو کیسے بتاتا اور کوئی صورت بھی تو نہیں تھی۔ میں نے نیک نیتی سے کوشش کی تھی کہ دلاور کی بیوی کو قتل نہ ہونے دوں۔ معلوم نہیں کیوں میری کوشش ناکام گئی۔ شاید قدرت کو میری دخل اندازی پسند نہیں آئی۔ اُس نے تو موت کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا کہ آئی موت کو ٹالنے کی کوشش کروں۔ اس عورت کو ایسے ہی مرنا تھا اور اُس کے باپ کو بھی۔ وہ سؤر کا بچہ سراج کہتا ہے کہ تم نے اُسے مارا، میں کیوں ماروں گا ایک بڈھے کو... مگر وہ زبردستی مجھ پر تھوپ رہا ہے دونوں کی موت کا الزام...!"

"سکندر یار، ہوش میں رہ۔" محسن نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "کسی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خدا تو نیت کا حال جانتا ہے نا... پھر تو کیوں پروا کرتا ہے کتّوں کے بھونکنے کی، اپنے ضمیر پر بوجھ مت رکھ۔"

"معلوم نہیں قدرت کی سزا کس کے لیے ہے، میرے لیے، دلاور کے بچّوں کے لیے، یا دلاور کے لیے۔" میں نے کہا۔

"سراج نے اور کیا بتایا؟" محسن نے کہا۔

"اُس نے... اُس نے زیب النساء کے بارے میں بتایا۔" میں نے کہا۔

گھر پہنچنے تک میں نارمل ہو گیا تھا مگر میرا دل غم کے بار سے بوجھل تھا۔ اس احساس کو رابعہ کا تصوّر بھی پناہ نہیں دیتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا کہ میں نے عائشہ کے باپ کو فون نہ کیا ہوتا تو وہ نہ مرتا۔ وہ نہ مرتا تو دلاور کی بیوی کچھ دن اور جی لیتی مگر کتنے دن ... اور اسے پھر کوئی کیسے بچاتا؟ میں اگر یہ بات یوں نہ کہتا تو پھر کیسے کہتا، کس ۔۔۔ ب کہتا۔ گھر پہنچ کے میں ۔۔۔ شہ کو دیکھا تو پشیمانی ۔۔۔ مل کی شدت بڑھ گئی۔ ۔۔۔ وہی دلاور نے قتل ۔۔۔ ے قتل کا اہتمام کیا تھا مگر نشانہ بن گئی وہ لڑکی جو ۔۔۔ ت جسم بڑا پُرکشش، بڑا سفاک اور بڑا سستا تھا۔

"ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رُک سکتے۔" محسن نے کہا۔ "جلد از جلد سب کچھ سمیٹو اور نکل چلو، اسی میں خیریت ہے ورنہ یہاں پولیس آ گئی تو گواہ بھی مل جائیں گے کہ اس قسم کی ایک گاڑی آئی تھی، کسی نے نمبر نوٹ کر لیا تو مصیبت گلے پڑ جانے گی۔"

گاڑی کو ہم نے کھنڈر سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا جہاں ایک بند گیراج تھا۔ پیچھے سے گزرنے والی چھوٹی سڑک تھی جس کے دونوں جانب احاطوں کی دیواریں تھیں۔ میں نے محسن سے کہا کہ وہ مائکروبس کو دیوار سے جتنا قریب لگا سکتا ہو، لگا لے اور اس کا سلائیڈنگ گیٹ کھلا چھوڑ دے۔

اسلحہ میں نے اور محسن نے دس منٹ میں منتقل کر دیا۔ اس کے لیے مائکروبس کے پیچھے انجن کے اوپر بنا ہوا مختصر سا خانہ کافی رہا اور زیادہ محفوظ بھی رہا۔ غالب کو میں نے اور محسن نے سہارا دے کر پہنچایا اور اسے دیوار کے اوپر سے اُتارا۔ غالب نے ہماری غیر موجودگی میں فارغ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور سارے نوٹوں کی گڈیوں سے زہریلی پنوں کو نکال کے رقم واپس سوٹ کیس میں ڈال دی تھی۔

"جُولی! تم ماں جی کو لے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں خود چل کے جا سکتی ہوں۔" سراج کی ماں کھڑی ہو گئی۔

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کہ آپ ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔ آپ سمجھتی ہیں نا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کو صرف خاموش رہنا ہے۔"

"یہ نہ ہو کہ ہم آپ کو خاموش کرنے پر مجبور ہو جائیں۔" محسن بولا۔

"معلوم نہیں میں مر کیوں نہیں جاتی۔" وہ دُکھی لہجے میں بولی۔ "اور کیا دیکھنے کو رہ گیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے ماں کا وہ غرور بھی چھین لیا ہے جو اسے اپنے بیٹے پر ہوتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ اسے جھوٹ سمجھوں، وہ سب کچھ جو تم نے کہا مگر سچ کا گھاؤ بہت گہرا ہے۔ میرے دل کو یہ زخم دے کر کیا ملا تمہیں، کیوں۔ بولا تم نے وہ سچ جو میری ماتا کا آزار بن گیا ہے؟"

"دُکھ کی بات تو یہی ہے ماں جی کہ ہم سب منافقت کے پردوں میں رہنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہی دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں جو ہمیں اچھا لگے۔ بُرائی اور بدصورتی کو ہم جذبات کے رنگ و روغن سے چھپا لیتے ہیں اور پھر دل کو فریب دیتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ رِستے ہوئے ناسوروں والا ناقابلِ نفرت جسم بن گیا ہے مگر ہم زرق برق الفاظ سے ملمع لگے دعووں سے اور کھوکھلے نعروں کی چمک والے کپڑے پہنا کے اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہیں۔ ایک آپ کی تربیت کے خوش ہو لیتے ہیں۔"

"میں نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جب تک آپ جیسی مائیں سراج جیسے بیٹوں کو نفرت نہیں دیں گی، انہیں احساس نہیں ہو گا کہ انہوں نے دُنیا میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اسے احساسِ زیاں تو ہونا ہی چاہیے کہ اُس نے اپنی ماتا کا خزانہ گنوا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی۔ اس نے جُولی کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف قدم بڑھائے اور پھر رُک گئی۔ "اس کو تم ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے؟" وہ اُدھر اشارہ کر کے بولی جدھر عائشہ کی لاش پڑی تھی۔

"ہم اسے ساتھ رکھ کے ۔۔۔ ریں گے۔" میں نے کہا۔

"ہم تو کل۔۔۔" محسن کہنے ہی والا تھا کہ ہم کیتھرین کو بھی ایسے ہی چھوڑ آئے تھے مگر میں نے اُسے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ جُولی کا چہرہ دوسری طرف تھا چنانچہ اس نے یہ حرکت نہیں دیکھی۔

"کل نہ جانے کہاں ہوں گے۔" محسن نے اپنی بات بدل دی۔

"اور اس کی لاش یہاں سڑتی رہے گی؟" سراج کی ماں نے خوفزدہ ہو کے کہا۔

"نہیں، ہم اس کے وارثوں کو اطلاع کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ اسے یہاں سے اُٹھا کے لے جائیں گے اور دفنا دیں گے۔"

سراج کی ماں مطمئن ہو گئی۔ اس نے دیوار تک کا فاصلہ سر جھکا کے خاموشی سے طے کیا اور جُولی کے سہارے دیوار کے اُوپر سے دوسری جانب اُتر گئی۔ میں نے دروازے کو کھینچ کر برابر کیا اور محسن نے گاڑی چلانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے عائشہ کی خود تدفین کا ارادہ بدل دیا تھا کچھ اس لیے بھی کہ یہ مشکل اور خطرناک کام تھا اور کچھ دلاور کو سزا دینے کے لیے۔

مجھے اُمید تھی کہ وہ بھی عائشہ کی موت کی اطلاع اس گھر کے باقی افراد کو نہیں دے گا جس میں ایک رات نے دو جانوں کا نذرانہ لے لیا تھا۔ سب سے مظلوم عائشہ کی ماں تھی۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اُس نے ایک بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا اور دوسری رات دوسری بیٹی نے زندگی سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ اُسی رات میں ۔۔۔ جس ۔۔۔ تھی۔ اگر اُسے معلوم ہُوا کہ فرشتۂ اجل کا تیسرا شکار ۔۔۔ تھی تو شاید یہ صدمہ اُس کی جان لینے کے لیے ۔۔۔ دلاور خاموشی سے عائشہ کی تدفین کرا دے گا۔ ۔۔۔ کی ماں کو وہ دلاسا دیتا رہے گا کہ عائشہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ اس وقت تک جب حقیقت خود آشکار ہونے ۔۔۔ لیے حالات کا حصار نہ توڑ دے۔ جھوٹ کے پردوں سے سچ ۔۔۔ نکل آئے جیسے ایک لمبی کالی رات کے سمندر کو عبور ۔۔۔ کے سورج کی پہلی کرن نکلتی ہے۔

"میں سمجھتا ہوں ابھی شہر سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے ۔۔۔ خطرہ ہے۔" محسن بولا۔

"ہاں، ابھی ناکا بندی ختم نہیں ہوئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن بڑے شہروں کے راستوں پر ہی نظر رکھی جا رہی ہے۔ پشاور ۔۔۔ ملتان کے راستے کا تو سوال ہی نہیں، لائل پور، سیالکوٹ یا سرگودھا ۔۔۔ کی طرف بھی نہیں جانا۔"

"پھر راستہ کون سا رہا؟" محسن نے کہا۔

"مضافات کی جانب بہت سی کچی سڑکیں ہیں۔" میں نے ۔۔۔ اور ایسے گاؤں ہیں جو لاہور ہی کا حصہ بن گئے ہیں۔"

"اس گاڑی میں ہم بہت نمایاں ہوں گے۔" محسن بولا۔ "ہم ۔۔۔ آبادی میں کوئی کچا مکان لے کر نہیں رہ سکتے۔"

"ہم اب منظر کی طرف بھی نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "اسے ۔۔۔ ہماری اور ڈاکوؤں کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار ۔۔۔ لیا گیا تھا، وہ ضمانت پر رہا تو ہو گیا مگر دوسری بار اس پر ۔۔۔ نہیں آنا چاہیے۔ باقی سارے ٹھکانے پولیس چھانتی پھر ۔۔۔ ہو گی۔ جہاں جہاں بھی ہم رہے ہیں، آدھے سے زیادہ لاہور ۔۔۔ اور محسن کے نام سے واقف ہے اور کوئی ہوشیار ۔۔۔ نظر والا مل گیا تو اس حلیے میں بھی پہچان لے گا۔ ہم ہوٹل میں ۔۔۔ کسی سرائے تک میں نہیں جا سکتے کیونکہ ہمارے ساتھ خواتین ۔۔۔ اور ہم صورت سے بھی کام چلا لیں مگر نہ ہمارے پاس سامانِ ۔۔۔ نہ گھریلو اسباب۔ کوئی ہمیں ایک فیملی نہیں مانے گا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہُوا کہ اب ہمارا ٹھکانا زمین اور آسمان ۔۔۔ درمیان کہیں بھی نہیں رہا۔" محسن بولا۔

"ڈیرہ غازی خاں۔" میں نے اچانک چلّا کے کہا۔ "مل گیا محسن، ٹھکانا مل گیا، وہ انکار نہیں کر سکتا۔"

"یہ بات اس سے ایک نیکی کا معاوضہ طلب کرنے سے کم نہیں۔" ۔۔۔ بولا۔

"مرد آدمی کس سے مانگ سکتا ہے، اپنوں سے۔" میں نے ۔۔۔ اس سے تو میں نے وعدہ کیا تھا کہ پھر آؤں گا۔"

"ہماری وجہ سے وہ غریب آدمی مشکل میں نہ پڑ جائے۔"

"ہم اُس کے گھر میں نہیں رہیں گے۔ اُس سے کہیں گے کہ ہماری رہائش کا کوئی انتظام کر دے، صرف ایک ہفتے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "لوگ ہمیں انکار کر سکتے ہیں مگر وہ ضامن ہو گا تو بات بن جائے گی۔"

آدھے گھنٹے بعد میں نے مائکروبس کو غازی خاں کے گھر کے قریب روکا۔ ایک بار میں صبح سویرے کار میں آیا تھا تو میری گاڑی عین اُس کے دروازے تک پہنچ گئی تھی مگر یہ بڑی گاڑی تھی جو چھوٹے کوارٹروں کے درمیان پھنس جاتی۔ میں نے محسن کو وہیں چھوڑا اور خود غازی خاں کے گھر کے دروازے تک گیا۔

غازی خاں کے دروازے پر لگا ہُوا قفل دیکھ کے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے پڑوس میں رہنے والے کا دروازہ بجایا۔ ایک شخص ریلوے کی نیلی وردی میں باہر آیا، وہ سفید مونچھوں اور بالوں والا ضرورت سے زیادہ ہی صحت مند شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ غازی خاں اور اُس کی بیوی تو ٹیکسلا گئے ہوئے ہیں۔

"ٹیکسلا۔ آنکھوں کے اسپتال؟" میں نے کہا۔ "اپنی بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کے لیے؟"

"ہاں جی، اب تو خیر سے واپس آنے والا ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی چٹھی آئی تھی کہ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹروں نے صرف تین دن رکھا اور چھٹی کر دی۔"

"کب تک پہنچے گا وہ؟"

"یہ تو نہیں لکھا۔" وہ بولا۔ "آپ کو کیا کام تھا جی؟"

"میں اُس کا دوست ہوں۔" میں نے بڑے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "میں نے ہی اُسے مجبور کیا تھا۔" مجھے بہت شرم آئی کہ میں ایک ذاتی مقصد کے حصول کی خاطر اپنی نیکی کا احسان گنوا رہا ہوں۔

"ہاں جی، مجھے معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "کسی نیک دل تھانیدار نے اُسے پیسہ دیا تھا، پیسہ تو اُس کے پاس سارا حرام کا ہی ہو گا مگر اللہ اُس کی نیکی قبول کرے۔ آپ کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟"

"میں۔۔۔ مجھے اس علاقے میں ایک مکان کی ضرورت تھی۔ غازی خاں ہوتا تو اُس کے پاس ٹھہر جاتا۔" میں نے کہا۔

"آپ اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں، فیملی ہے میرے ساتھ، بہن ہے اور خالہ ہے۔ ایک زخمی بھائی ہے، ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اُس کی۔" میں نے کہا۔ "پشاور سے آئے تھے اور یہاں۔۔۔"

"دیکھو جی، یہاں تو کوارٹر کی ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ گیا تھا۔" وہ بولا۔

"لیکن صرف اس لیے کہ میں صفائی کر دوں اور دھیان رکھوں۔ تو

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میری گھر والی خیر سے روز جھاڑو دے آتی ہے مگر میں کسی کو اُس کے گھر ٹھہرا دوں، یہ مشکل ہے۔ جسے میں جانتا نہیں اُسے چابی دے دوں۔ ہاں آپ نے جو بات کی ہے کہیں ٹھہرنے کی تو پیچھے والی لائن میں کونے کا کوارٹر کرائے کے لیے ہے، ابھی دو دن ہوئے اپنے ایک یار کو الاٹ ہوا تھا۔"

"وہ خود نہیں رہتا وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کوارٹر میں رہے گا؟" وہ ہنسنے لگا۔ "اُس کے چار چار مکان ہیں شہر میں، دو بیویاں ہیں، اندھی کمائی کر رہا ہے۔ اُسے تو بس الاٹ ہو گیا کوارٹر باری پر۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ کوئی بھروسے کا آدمی ہو تو کرائے دار رکھ لوں، ڈرتا بھی ہے" اُس نے ایک گالی پر جملہ ختم کیا۔

"کہ کوئی رپورٹ نہ کر دے۔" میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا مگر بھائی میں کرایہ تو پورے مہینے کا دے دوں گا مگر صاف بات ہے کہ رہوں گا دس دن بھی نہیں، بس ایک ہفتہ۔"

"اچھا جی۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ایک بات ہے، آپ اس سے مت کہنا۔"

"کیا نہ کہوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ آپ ایک ہفتہ رہو گے، کسی سے بھی مت کہنا۔" وہ بولا۔ "ایک ہفتہ تو ایسے ہی گزر جائے گا، کوئی پوچھے تو یہ مت بتانا کہ کرائے پر لیا ہے۔ کہہ دینا کہ... مگر تم سے کوئی کیوں کہے گا۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ کوارٹر کیسے الاٹ ہوا ہے، تم آؤ جی میرے ساتھ۔"

"لیکن وہ خود آ گیا تو؟"

"وہ... اس کا کیا کام ادھر، بس صبح حاضری لگاتا ہے اور ایک افسر کا اسٹال چلاتا ہے، ریلوے اسٹیشن پر۔" وہ بولا۔ "افسر نے بھی اپنی سالی کے نام سے اسٹال کا ٹھیکا لیا ہوا ہے، چائے کا اسٹال ہے، اُس کی تو حاضری بھی خود بخود لگ جاتی ہے۔ کوارٹر اُس نے میرے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اس کو کرایہ پہنچاتا رہوں گا تو وہ خوش، اس کا خدا خوش۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چکر چلا رہا ہے، وہ مجھ سے ایک ماہ کا کرایہ لے کر جیب میں ڈال لے گا، جس کو کوارٹر الاٹ ہوا ہے، اُسے معلوم ہی نہ ہو گا کہ کوارٹر میں کوئی رہا اور چلا گیا۔ ہفتہ دس دن بعد جب کوئی پکا کرائے دار ملے گا تو اُسے بتا دے گا [illegible] گیا۔ وہ اپنی پاور آف اٹارنی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ایک ڈاکو کی جیب کاٹ رہا تھا جو فرق ڈاکو اور جیب کترے کے پیشے میں ہوتا ہے وہی کوارٹر کے الاٹی اور اس شخص میں تھا۔ ایک بڑا ہاتھ مارتا تھا۔

یہ اُسی کے مال سے تھوڑا سا لے رہا تھا جیسے کوئی کنوئیں سے ایک ڈول پانی نکال لے تو اس سے کنوئیں میں پانی کم نہیں ہو[illegible] اس حمام میں سب ایک سے تھے۔ وہ افسر جس نے [illegible] کا ٹھیکا فرضی نام سے لے رکھا تھا، فرضی نام اُس کی سالی کا تھا۔ ایک شخص ریلوے سے مفت کی تنخواہ لے رہا تھا۔ اف[illegible] اور ماتحت مل کے ریلوے سے کمائی کر رہے تھے۔

"یہ ہے جی کوارٹر۔" وہ اچانک رُک گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی کوارٹر تھا جیسا غازی خاں کا تھا مگر یہ ان کوارٹروں کی [illegible] قطار کا آخری کوارٹر تھا اور اس اعتبار سے بہترین تھا کہ یہاں آنے جانے کے لیے ہمارا اس آبادی سے گزرنا ضروری نہیں تھا۔ ایک طرف تو کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف والے کوارٹر میں تالا پڑا ہوا تھا۔

"ادھر کون رہتا ہے؟" میں نے جیب سے نوٹ نکالے اور اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی حریص چمک دیکھی۔

"ادھر کوئی نہیں، ایک پٹھان سگنل مین تھا۔" وہ بولا۔ "بچارا اپنے فرض کی ادائیگی کے چکر میں جان سے گیا، بڑی بے وقوفی کی۔ مرنے والے کو بُرا کہنا تو نہیں چاہیے مگر دیکھو نا جی، اس تنخواہ کی خاطر جان دے دی۔"

"کیا بے وقوفی سرزد ہوئی تھی اُس سے؟" میں نے کہا۔

"بس، کانٹا غلط بدل دیا تھا، عین وقت پر احساس ہو گیا، وہ دوڑا کانٹا بدلنے، جب واپس آ رہا تھا تو دوسری طرف سے گاڑی آ گئی جو۔"

"اور اگر وہ کانٹا نہ بدلتا، اپنی غلطی کو نہ دیکھتا...؟"

"تو ایک ڈاؤن ایک کھڑی ہوئی مال گاڑی میں گھس جاتی۔" وہ بولا۔ "وہ لنگڑا تھا، پہلے بھی ٹانگ کٹ چکی تھی، جانتا تھا کہ دوڑ نہیں سکتا مگر دوڑ گیا اور کیا ملا جی اسے، کس نے انعام دیا، کس نے پوچھا؟ بیوی بچے لاش لے کر چلے گئے، ابھی تک اُن کا سامان پڑا ہے یا پڑا ہو گا اگر چوروں نے چھوڑا ہو گا۔ ابھی تو انکوائری ہو رہی ہے کہ غلطی کس کی تھی، غلطی اُس کی اپنی تھی۔ کچھ بھی نہیں ملے گا اُسے، ملا بھی تو بڑے چکروں کے بعد، انکوائری کے بعد اُس کے وارثوں کو ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینا پڑے گا، اکاؤنٹ آفس کے چکر لگانا پڑیں گے، پتا نہیں کتنی درخواستیں دینا ہوں گی، کتنے حلف نامے داخل کرنا پڑیں گے۔"

"پھر تو واقعی مرحوم نے بے وقوفی کی، دُنیا کے نقطۂ نظر سے۔ اللہ شاید اُس کی قربانی کو شہادت کا درجہ دے۔ اُس نے کتنی زندگیوں کو بچایا، یہ اب کون بتا سکتا ہے۔ انکوائری رپورٹ میں بھی نہیں آئے گا کہ حادثہ نہ ہونے سے کتنے بچے۔ حادثہ ہو جاتا تو مرنے والوں کے اور زخمی ہونے والوں کے اعداد و شمار آ جاتے، خیر چھوڑو، یہ تو اس دُنیا کے دھندے ہیں اور اسی طرح چلتے رہیں گے، تم بتاؤ کرایہ کیا دوں؟"

"کرایہ... آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"دو سو کافی ہیں؟" میں نے کہا اور پھر اُس کی آنکھوں میں ایک چمک دیکھی۔

"ہاں جی، آپ تو جانتے ہیں کہ خیر سے کرائے کتنے چڑھ گئے ہیں لاہور میں۔" وہ دونوں نوٹ جھپٹ کے بولا۔ "ویسے آپ کو تکلیف کوئی نہیں ہو گی یہاں، ہر چیز موجود ہے، بجلی پانی اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے حکم کریں، آپ غازی خاں کے دوست تو میرے بھی دوست، فیملی کدھر ہے؟"

"وہ گاڑی میں ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا ایک دوست ہے، وہ ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔"

اُس نے پلٹ کر ماتمگرد بس کی طرف دیکھا اور چابی مجھے تھما دی۔ "بس تو آپ خیر سے مجھے اجازت دیں، میں ڈیوٹی کے لیے تیار ہوا تھا۔ رات کو آؤں گا لوٹ کے تو کل ملاقات ہو گی۔ سلام علیکم۔" وہ ہاتھ ملا کے چل پڑا۔

میں نے واپس جا کے محسن کو چابی دکھائی۔ "اللہ بڑا کارساز ہے۔ غازی خاں نہیں ملا مگر اس کا نام بھی کام آ گیا۔"

"تُو نے کہا ہو گا کہ میں ڈیرہ اسماعیل خاں ہوں، ڈیرہ غازی خان کا بھتیجا۔" محسن بولا۔

"میں نے کچھ بھی کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اعتبار کیا۔ ظاہر ہے تیری صورت دیکھ کر۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "خدا کا شکر ہے جس نے مجھے تیری صورت نہیں دی۔"

"شکر تو مجھے بھی ادا کرنا چاہیے کہ خدا نے مجھے تیری سیرت نہیں دی۔" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اب تک لنڈورا پھر رہا ہوتا۔ معتبر ہوتے ہیں شادی شدہ لوگ برخوردار! تم چھڑے چھانٹ ہر جگہ بدمعاش اور مشتبہ سمجھے گئے ہو اور سمجھے جاؤ گے۔"

"یار وہ تیری سند شرافت کا حال کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "انکل رضوی تو معطل ہونے کے بعد وہ سرکاری جگہ چھوڑ دیں گے اور ظاہر ہے تیری بیوی اُن کے ساتھ نکل جائے گی۔ گاڑی ذرا ادھر موڑ لے، وہ آخری کوٹھی ہماری ہے۔"

"کوٹھڑی اور کوٹھی میں صرف ایک حرف کا فرق ہے۔" محسن نے سرد آہ بھر کے فلسفیانہ انداز میں فرمایا اور گاڑی کو روک دیا۔

"اسے بالکل سُسرال سمجھیے اور گھر داماد کی طرح شان سے رہیے۔" میں نے کہا اور پیچھے والا دروازہ کھینچ کر کھولا۔ جولی دیا۔ جولی پہلے اُتری۔ اُس لڑکی نے حیرت انگیز طور پر اپنے غم کے آتش فشاں کو بجھا دیا تھا۔ کیتھرین بہت مضبوط اعصاب اور ارادے رکھنے والی عورت تھی۔ جولی کمزور نظر آنے کے باوجود اپنی ماں کی بیٹی ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کے انداز و اعتماد میں مجھے ایک نئی خود اعتمادی محسوس ہوئی جو کل تک نہ تھی، شاید اس لیے کہ وہ ماں کی موجودگی میں خود کو بچی سمجھتی تھی۔ جذباتی طور پر ہی نہیں، عملاً بھی کیتھرین نے اُسے ماں باپ بن کے پالا تھا، دوست بن کے سہارا دیا تھا اور محافظ بن کے ہر آزمائش اور ابتلا سے بچایا تھا، اب وہ نہیں رہی تھی تو جولی کا احساس خود اعتمادی جاگ اُٹھا تھا اور وہ اپنی ذمّے داریوں کا بار خود اُٹھانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

جولی نے سراج کی ماں کو نیچے اُتارا۔ "ماں جی! آپ نے ابھی تک ہم سے تعاون کیا ہے۔ اُمید ہے آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیں گی کہ بعد میں آپ کو افسوس ہو اور ہمیں ندامت۔"

"چل چل لڑکی، تو یہ سب مت بتا مجھے۔" سراج کی ماں نے برہمی سے کہا۔ "تو نہیں جانتی میں کس کی ماں ہوں۔ میں اگر نہ چاہوں تو تم مجھے ایک منٹ قید نہیں رکھ سکتے، ایک قدم چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں ماں جی۔" جولی نے نرمی سے کہا اور سراج کی ماں کو کوارٹر میں لے گئی۔ میں، محسن اور غالب دم بخود کھڑے رہے۔

"تم نے اس لڑکی کی گفتگو سُنی؟" میں نے غالب سے کہا۔

"صرف گفتگو ہی نہیں سُنی، اُس کا لہجہ بھی دیکھا۔" غالب نے سر ہلایا۔

"اور جس انداز سے اُس نے ہم کا لفظ استعمال کیا۔" محسن نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "وہ ہم میں سے تھی مگر اُس نے ہمیں اپنی زبان سے احساس دلا دیا کہ ہم اُسے الگ یا کمتر اور غیر ذمّے دار نہ سمجھیں۔ کس آسانی سے اُس نے خود ایک کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہمیں بتا دیا کہ وہ ذمّے داری قبول کر سکتی ہے۔"

"کمال ہے یار۔" میں نے کہا۔ "ہماری مجبوریاں کہہ کے اُس نے دو لفظوں میں ہم پر واضح کر دیا کہ وہ سب جانتی ہے اور سب سمجھتی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ بے شک وہ آج تک سُنتی آئی تھی مگر مجھے واقعی اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنا سمجھتی بھی ہے۔"

"یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے، مثبت اور تعمیری۔" غالب

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے کہا اور سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اور محسن نے اُسے اُتارا اور اندر پہنچا دیا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا مگر پُرانی بان کی دو دو چارپائیاں دونوں کمروں میں موجود تھیں جو شاید کوارٹر خالی کر کے جانے والے بے مصرف جان کے چھوڑ گئے تھے۔ خسرو جمشید کی گاڑی کا کور ہم ساتھ ڈال لائے تھے۔ اس میں اسلحہ لپیٹ کر ہم نے ایک چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔ ضروری تھا کہ چارپائی پر اب ایک دری بستر بھی ہو، اس کے لیے میں اپنے محسن کے گھر گیا جو گھر سے نکل کر روانہ ہونے ہی والا تھا۔

"آپ لوگ اپنے ساتھ کچھ نہیں لے کر چلے تھے؟" وہ بولا۔

"سب کچھ لے کر چلے تھے بھائی صاحب!" میں نے کہا۔ "مگر جس گاڑی میں ہم تھے، اس کا راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی کی تو ٹانگ ٹوٹی . . ."

"اوہ! کہاں ہُوا تھا ایکسیڈنٹ؟" وہ بولا۔

"راولپنڈی کے قریب۔" میں نے کہا۔ "دو دن راولپنڈی میں ہی لگ گئے، ایکسرے ہُوا اور پھر پلاستر لگا، گاڑی تو سمجھو ختم ہو گئی تھی۔"

"مگر آپ لوگوں کے خراش بھی نہیں آئی۔" وہ مجھے دیکھ کے بولا۔

"اسی کو قسمت کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "حسن ابدال کے اڈے پر ہم اُتر گئے تھے کہ چائے وغیرہ پی لیں۔ بھائی صاحب گاڑی لے گئے پیٹرول ڈلوانے کے لیے اور وہاں ایک ٹرک نے آ کے ملبہ کر دیا۔ پیٹرول ڈلوا کے نکل رہے تھے کہ وہ غلط سائیڈ سے اندر آ گیا اور بس سامنے سے ٹکر ماری تو . . . بس اللہ نے جان بچالی۔ گاڑی کو دیکھ کر تو آپ بھی کہتے کہ اس میں کون بچا ہو گا۔ جو سامان تھا، سب غارت ہو گیا۔ ہم تو بڑی مشکل سے راولپنڈی پہنچے اور وہاں سے یہ دوست ہمیں چھوڑنے آ گئے، جن کی گاڑی ہے۔ اِدھر چھوٹی بہن ہے کہ اس کو میو اسپتال میں داخل کرا کے آئے ہیں مگر اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔"

وہ ایک دم چونکا۔ "میو اسپتال میں . . . یہ تو آپ نے پہلے بتانا تھا جی! کیا ہُوا ہے اُسے؟"

"بس جی کیا بتائیں، جو بیماریاں پہلے بوڑھوں کو ہوتی تھیں وہ اب جوانوں کو ہونے لگی ہیں۔ جوان لڑکی کو شکر کی بیماری ہو گئی پھر گُردوں میں پتھری پڑی تو معاملہ خراب ہو گیا۔ پشاور کے ڈاکٹروں نے پوری کوشش کر لی تھی مگر حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ سُنا ہے یہاں میو اسپتال میں بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں اور بڑا اچھا انتظام ہے۔ اللہ ہی بچانے والا ہے۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "تو ابھی آپ میو اسپتال سے آ رہے تھے؟"

"ہاں جی، صبح کے لاہور پہنچے ہوئے تھے، اسپتال میں دن گزر گیا۔" میں نے کہا۔ "پھر یہاں آئے تو بھائی غازی خاں نہیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھو کہ ہم اس وقت حسن ابدال میں رُکے اور وہ ٹیکسلا میں۔ کہاں پشاور اور لاہور کا فاصلہ اور کہاں کہ وہ چند میل پر بیوی کی آنکھوں کا آپریشن کرا کے بیٹھے تھے اور وہیں ہمارا ایکسیڈنٹ ہُوا۔ اُنھیں پتا چلتا تو دوڑے آتے۔ اب بیٹھنے کی جگہ بن گئی ہے، کچھ کھا پی لیں تو پھر اسپتال جائیں۔"

"آپ اللہ پر بھروسا رکھو جی۔" وہ بولا۔ "اور دُعا کرو، اُدھر داتا صاحب کے حضور میں جا کے۔ میں چادر تکیے اپنے گھر سے پورے نہیں کر سکتا۔ غازی خاں کے گھر سے نکال دیتا ہوں، بلکہ آپ یہ چابی لو، جو چیز ضرورت پڑے وہاں سے لے کر پھر تالا ڈال دینا اور چابی میری گھر والی کو دے دینا۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

میں نے چابی لے لی اور اُسے سائیکل کے پیڈل مار کے جاتا ہُوا دیکھتا رہا۔ یہ اعتبار کرنے والے اور مدد کرنے والے سادہ دل لوگ اگر جان لیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارے جھوٹ کا راز فاش ہو جائے تو ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ میں نے سوچا۔ اطمینان مجھے یہ تھا کہ غازی خاں آ جائے گا تو میری پوزیشن خراب نہیں ہو گی بلکہ مزید بہتر ہو جائے گی۔ چابی سے قفل کھولنے کے بعد میں کچھ دیر ایک گزرے ہوئے وقت کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس میں غازی خاں تھا اور اُس کی اندھی بیوی تھی اور میں تھا مگر سارا حسن اُس فضا میں تھا جو میرے فرشتہ رحمت کی صورت میں اچانک آ جانے سے پیدا ہوئی تھی۔ احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات سے میرے دل کو جو طمانیت اور خوشی حاصل ہوئی تھی، وہ ایک انمول احساس رکھتی تھی۔ اس کی یاد بھی بڑی تسکین دینے والی تھی مگر اس وقت مجھے یوں لگا جیسے اپنے اعتماد سے ناجائز فائدہ اُٹھا کے میں نے وہ تصویر خراب کر دی ہے اور اس احساس کو مجروح کر دیا ہے۔ میں نے پہلے بھی غازی خاں سے جھوٹ بولا تھا مگر اس کا مقصد نیکی کرنا تھا۔ آج پھر میں جھوٹ کے سہارے اس گھر میں آیا تھا تو اس نیکی کا صلہ وصول کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ غازی خاں کو کبھی میرے جھوٹ کا پتا نہیں چلے گا مگر وہاں سے سامان اُٹھاتے ہوئے تھوڑی سی شرمندگی کا احساس مجھ پر غالب رہا۔ میں نے دریاں، میلے بستر اور تکیے ہی نہیں، ضرورت کے برتن بھی اُٹھائے اور آ کے کوارٹر میں لے گیا جہاں ہمارا بسیرا تھا۔ محسن نے مقامی تنور سے روٹیاں اور سالن خریدنے کا نیک کام کیا اور بھوکوں کا پیٹ بھرا۔ سراج کی ماں نے برائے نام کھایا اور پڑ کے سو گئی۔ وہ بوڑھی عورت اس تگ و دو میں تھک گئی تھی۔ اس نے خود کو ہمارے اور نذیر کے سپرد کر دیا تھا اور ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ رہائی ہو گی تو اپنے وقت پر۔ اس کے فکر کرنے یا احتجاج کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے مُولی کی نگرانی میں ایک کمرے میں چھوڑا اور خود دوسرے کمرے میں بیٹھ کے سگریٹیں پھونکنے لگے۔ فراغت کا وقفہ میسر آتے ہی سب پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔

میں نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ مُنہ دھو لیا۔ محسن نے بھی یہی کیا تھا۔ اس سے ہمارے تھکے ہوئے جسم اور جاگی ہوئی آنکھوں کو کچھ سکون ملا۔ میں نے ایک فرضی بہن کے میو اسپتال میں قریبِ مرگ ہونے کا تذکرہ اس لیے کیا تھا کہ میرے ذہن میں عائشہ کی خود تدفین کا خیال ابھی تک موجود تھا۔ میں اس بات کے امکانات پر غور کر رہا تھا کہ اگر ایک کہانی سُنانے کے بعد ہم وہ لاش یہاں اُٹھا لائیں اور مشہور کر دیں کہ وہ اسپتال میں مر گئی تھی۔ لاش کسی کرائے کی ایمبولینس میں بھی لائی جا سکتی تھی۔ تو کیا یہاں سے اُسے باقاعدہ جنازے کی صورت میں لے جانا ممکن ہو گا؟

محسن اور غالب نے میرے خیال کی مخالفت کی۔

"اس چکر میں مت پڑو۔" محسن نے کہا۔ "وہ جانے اور دلاور جانے۔"

"میں دلاور کو اسی دباؤ میں رکھنا چاہتا تھا کہ عائشہ ہمارے پاس ہے۔"

"مگر اس میں بہت سی نئی پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔" غالب نے کہا۔ "کہیں کسی کو شک ہو گیا تو پولیس کو اطلاع کر دے گا۔"

"ویسے بھی لاش کو یہاں لا کے ہم یہ پورا ڈراما اسٹیج کرنے پر مجبور ہوں گے۔ سب کے سامنے رونا دھونا اور مغموم نظر آنا، لوگوں کی تعزیت وصول کرنا، تجہیز و تکفین اور پھر اس کے بعد کی رسومات۔ مُولی تو شاید ہمارے ساتھ اداکاری کر لے مگر سراج کی ماں بھی ہے، وہ اتنا برداشت نہیں کرے گی۔ سب کے سامنے چلّانے لگی تو سمجھو مارے گئے۔" محسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر ہم دلاور کو ہی اطلاع کر دیتے ہیں۔" میں نے ان کے دلائل سے قائل ہو کے کہا۔ "اس کے لیے بھی کل فون کرنا ضروری ہو گا۔"

"فون ہم کر دیں گے، ہمیں ویسے بھی جانا ہے۔" محسن نے کہا۔ "ہاں، وہ ٹریلر کا سودا ہو جائے تو کچھ آگے کی پلاننگ کریں۔ اس کے لیے ہمیں ایک ہفتہ شہر میں پھرنے کا رسک لینا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اس گاڑی کو دوبارہ یہاں نظر نہیں آنا چاہیے اور محسن کو بھی۔"

"تو کیا میں گاڑی جنگل میں کھڑی کر کے رات گاڑی میں گزارا کروں گا؟" محسن بولا۔

"نہیں، گاڑی کو یہاں سے کچھ فاصلے پر کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر پارک کیا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "جہاں سے ہم صبح پھرنے نکلیں تو رات کے وقت اندر آ کے رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی سیدھا گھر میں نہیں آئے گا، پردہ ہے۔"

"تم اب چاہو تو سو جاؤ۔" میں نے غالب سے کہا۔ "رات تک سوتے رہو، واپس آ کے ہم سوئیں گے اور تم جاگو گے۔ کل انشاء اللہ تم کو کسی ڈاکٹر کو بھی دکھائیں گے۔"

"میری دوائیں تو لیتے آنا یار۔" غالب نے کہا۔ "خدا کرے یہ ہفتہ ختم ہونے تک اس پلاستر کا جنجال بھی ختم ہو جائے۔"

ہم مُولی کو تسلی دے کر روانہ ہوئے تو پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون تھے۔ نوٹوں سے بھرا ہُوا سوٹ کیس ہماری گاڑی میں پیچھے کی سیٹ کے نیچے رکھا ہُوا تھا۔ ایک ایک بھرا ہُوا ریوالور ہم دونوں نے چُھپا رکھا تھا اور گاڑی پھر محسن چلا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے گاڑی پر نیا رنگ کرا لیا جائے۔" محسن نے اچانک کہا۔ "ابھی نہ سہی، یہاں سے چلتے وقت۔"

"رنگ کھڑے کھڑے نہیں ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ "نیا رنگ کم سے کم ایک ہفتے میں ہوتا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں، یہ گاڑی کچھ پُرانی نظر آئے۔" محسن بولا۔ "اور کوئی اس پر پینٹ کا ایک اسپرے کر دے۔ کھڑے کھڑے ایک کوٹ کر دے جو اس رنگ کو بدل دے، مثلاً اس پر سفید رنگ پھیر دے، صفائی کی ضرورت نہیں۔ شیشوں وغیرہ پر اور نِکل والے حصوں پر اسپرے پڑ جائے تو کوئی ہرج نہیں اور یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ دنوں کا کام گھنٹوں میں کیسے ہوتا ہے۔"

"فی الحال میری ایک تجویز ہے، ہمیشہ کی طرح منفرد، ایک جینیس کے ذہن کی پیداوار۔" میں نے کہا۔

"جینیس آدھے پاگل مشہور ہوتے ہیں، پورے پاگل نہیں ہوتے۔"

"تجویز یہ ہے عزیزم!" میں نے اُس کی بات کا بُرا مانے بغیر کہا۔ "کہ گاڑی پر ہم کسی سرکاری محکمے یا ادارے کا نام لکھوا لیں۔ گاڑی کے دونوں طرف ایک پٹی ہو لال رنگ کے حروف کی۔"

"اور نام کیا ہو، محکمۂ پرورشِ حیوانات۔" محسن بولا۔

"نہیں، ایسا جو اچھا بھی لگے مگر کسی کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔" میں نے کہا۔ "جو دیکھے وہ سوچنے کے سوا کچھ نہ کرے کہ کیا ایسا بھی کوئی ادارہ ہے اور سمجھ لے کہ ہو گا۔ سرکاری گاڑی شک سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

محفوظ رہتی ہے۔ آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ولیسٹ پاکستان گورنمنٹ بھی لکھوایا جا سکتا ہے۔"

"میں تجویز کی معقولیت کے امکانات پر موافقت کے دلائل سے اتفاق کرنے پر آمادگی کے جائزے کی رپورٹ پر غور کرنا مناسب سمجھتے ہوئے۔ ۔ ۔"

"فضول بکواس سے گریز کیجیے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے زحمت نہ دیجیے کہ میں آپ کے ساتھ وہ کروں جو دلاور نہیں کر سکا۔"

"بھائی صاحب! میں نے یہی تو کہا ہے کہ تجویز اچھی ہے۔"

"تو پھر نام بتائیے۔ مثلاً کنٹرولر آف پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی ادھوری سی بات ہوئی، کس چیز کی پروڈکشن؟"

"یہ سمجھنے والے کی مرضی ہے کہ وہ جس چیز کی پیداوار چاہے سمجھے، زرعی یا صنعتی پیداوار۔ ۔ فلم پروڈکشن، چائلڈ پروڈکشن۔" میں نے کہا۔

محسن ہنسا۔ "اچھا ہے مگر امپریس نہیں کرتا۔"

"اچھا۔ ۔ ۔ تو۔ ۔ ۔" میں نے غور کر کے کہا۔ "ڈائریکٹریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔"

محسن نے قہقہہ مارا۔ "زبردست، بہترین متبادل ہے، ایم آر ایس کا، ہم یہی تو کرتے ہیں، براہِ راست ہر معاملے کو نمٹاتے ہیں۔"

ایک فارغ بیٹھے ہوئے آدم بیزار پینٹر نے اس مائکروبس پر انگریزی حروف میں اس غیر موجود محکمے کا نام لکھنے کے سو روپے مانگے، وہ اپنے کام میں ماہر تھا اور اس کا ہاتھ بہت صاف چلتا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ اس کی زبان کی دھار تیز تھی۔ وہ بات نہیں کرتا تھا، کاٹتا تھا اور غالباً اسی لیے بے روزگار تھا۔ اس نے دونوں طرف چار انچ کے حروف لکھے اور آگے پیچھے کی نمبر پلیٹ پر ڈیڑھ انچ کے، یہ سارا کام اس نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں مکمل کر لیا۔ یہ اسکیم ایک نفسیاتی چال بن گئی جو ہمیں بہترین تحفظ فراہم کر سکتی تھی۔

کسی گاڑی پر سرکاری محکمے کا نام ہو تو وہ معتبر ہو جاتی ہے۔

"اب تو ہم ناکا بندی سے بھی گزر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "شرطیہ۔"

"ہاں کوئی سرکاری گاڑی میں کسی مجرم کا تصوّر ہی نہیں کرتا اور اگر اس میں خواتین ہوں تو اچھے خاصے پولیس افسر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ ہو گی محکمے کے کسی اعلیٰ افسر کی فیملی۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم میں سے ایک شوفر کی وردی بھی پہن لے تو کام پکا ہو جائے۔" محسن بولا۔

"وردی تو ریگل سے مل جائے گی، جوتے ٹوپی سمیت۔" میں نے کہا۔

"اب پہلے ٹیلی فون کر لیں۔" محسن نے کہا۔ "ایک کال تو بھی کروں گا۔"

"اپنی نصف بہتر کو۔ ۔ ۔؟" میں نے کہا۔ "اجازت ہے ویسے تو ہم سرکاری ٹیلی فون پر میاں بیوی کو بھی عشق نہیں کرنے دیتے لیکن خیال آتا ہے کہ آج تم کل ہماری باری ہے اس لیے قانون میں رعایت کرتے ہیں۔"

"تو بھی آج رات پھر کوشش کرنا یار! آخر رابعہ نے وہ نمبر دیا تھا تو کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" محسن نے کہا۔

دلاور کو میں نے ایرمال کے قریب ایک پول سے فون کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنے سسرال میں ہو گا اور اس گھر سے آج ایک نہیں دو جنازے اُٹھے ہوں گے ظاہر ہے وہاں کی فضا سخت ماتمی ہو گی۔ ایک بچے نے ریسیور اُٹھایا اور دلاور کو اطلاع دی۔

"کون بول رہا ہے؟" دلاور نے کہا۔

"وہ شخص جو جانتا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔"

"تمہارے جاننے میں اور دُنیا کے جاننے میں بہت فرق ہے، کوشش کر کے دیکھ لو۔" وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ اُس نے میرا نام بھی نہیں لیا۔

"دوسری شادی کب رچا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہاری دُلہن تمہارے انتظار میں چشم براہ ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تم کو ایک پتا بتانا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کیونکہ میں دوبارہ فون نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ۔ ۔ ۔ وہ کہاں ہے؟" اُس نے عائشہ کا نام لینے سے گریز کیا اور آواز بھی کم رکھی، شاید اس گھر میں اور لوگ بھی قریب ہی تھے، جن کے سامنے وہ کھل کے بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا اور یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔

میں نے اُسے پتا سمجھا دیا۔ "دیر مت کرنا، وہ اکیلی ہے وہاں۔" اور فون بند کر دیا۔ چشمِ تصوّر سے میں نے اُسے بہرام داد کے خانۂ ویراں میں جا کے عائشہ کی لاش دریافت کرتے دیکھا۔ اس کی صورت کے ردِ عمل کو دیکھا، اس اذیت کو دیکھا جو اس سزا کا نتیجہ تھی اور میرے دل کو ایک کمینی سی طمانیت دینے والی خوشی ہوئی، جیسے میں نے رابعہ کی ساری تذلیل اور اس کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا تھوڑا سا حساب برابر کر دیا ہے۔

یہ وقت شہلا سے بات کرنے کے لیے مناسب نہیں۔ محسن کا خیال تھا کہ براہِ راست انکل رضوی سے لائن مل جائے گی۔ شہلا کو رات کے وقت بلانا آسان ہو گا جب انکل رضوی کھانے کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا چکے ہوں گے۔

"ہم مائکروبس کے کاغذات لے لیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے چار بجے کا وقت دیا تھا۔"

"اگر اُس نے ڈیلر کا بندوبست کر دیا تو کیا بات ہے۔"

"پیسے کے لالچ میں وہ خود بھیجے گا۔" میں نے کہا۔ "ہمیں یاد رہنا ضرورت ہے ہر ڈیلر سے ملنے کی یہ لوگ کمیشن کی بنیاد پر سودے کرتے ہیں، اگر کسی دوسرے ڈیلر کے پاس ہمارے مطلب کی چیز ہو گی تو وہ ہمیں نہیں بھیجے گا، دوسرے ڈیلر کو ہمارا نام پتا کچھ نہیں بتائے گا، یہی کہے گا کہ ہے ایک جینوئن پارٹی۔ ۔ ۔ سودا فائنل کر لے گا تو ہم سے رقم لے کر ادائیگی کرا دے گا، دوسری پارٹی کو اپنے کمیشن سے غرض۔ یہ بیچ میں اپنا منافع کھرا کرے گا، پچاس ہزار تو ضرور زیادہ اینٹھے گا ہم سے۔"

شوروم کا مالک ہمارے انتظار کی گھڑیاں ایسے گن رہا تھا جیسے فرقت زدہ عاشق تارے گنتے ہیں۔ وہ لپک کر آیا اور اس نے فرداً فرداً مجھ سے اور محسن سے ہاتھ ملا کے سینے پر رکھا۔

"مبارک۔ ۔ مبارک خان صاحب!" وہ بولا۔ "مل گئی۔"

"اچھا۔ ۔ کیسی اے؟" محسن بولا۔ "ہمارا مطلب ہے رنگ کیسا ہے؟"

"رنگ۔ ۔ ۔ رنگ سبز۔ ۔ ۔"

"اور قد۔ ۔ وزن۔ ۔ ۔ عمر کیا اے۔ ۔ ۔ کتنا پڑھی ہوئی ہے، ذات اور باپ۔ ۔ ۔"

"بھائی صاحب! یہ گاڑی کی بات کرتا ہے، آپ کے رشتے کا نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "خو یارا معاف کرنا، ام اپنا بھائی کا واسطے لڑکی بھی تلاش کرتا ہے، بھائی صاحب سمجھا۔ ۔ ۔"

شوروم کے مالک کی صورت جو پرانے جوتے کی طرح ہو گئی تھی پھر چمکنے لگی۔ "جناب! آپ چل کے ملاحظہ فرمائیں، آپ بہت خوش قسمت ہیں، پارٹی ذرا اڑی ہوئی ہے۔"

"کون سا پارٹی؟ ام سب کا اڑی ٹھیک کر دے گا۔ للرا پارٹی۔ ۔ ۔"

"بھائی صاحب! یہ سیاسی پارٹی کا نہیں بولتا۔" میں نے محسن کو ٹوکا۔ "معاف کرنا مارا بھائی صاحب سیاست میں گھس گیا ہے، بولتا ہے ام وزیر بنے گا۔"

"جی۔ ۔ جی۔ ۔ ۔" شوروم کا مالک بولا۔ "ساڑھے چار لاکھ مانگ رہے ہیں وہ۔ ۔ مگر ہم چار لاکھ سامنے رکھیں گے تو سودا ہو جائے گا، بیعانہ میں نے دے دیا ہے، آپ گاڑی تو ابھی دیکھ لیں مگر بات کل ہو گی۔"

"چلو مگر امارا گاڑی کا کاغذ بنایا اے تم نے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔ ۔ ۔ ہاں۔" اُس نے ایک میز کی دراز کھینچی۔ "یہ لیجیے، سب کام مکمل کرا لیا ایک ہی دن میں، رشوت تو دینا پڑی مجھے اپنی جیب سے مگر خیر کوئی بات نہیں۔ کیا اب چلیں؟" میں نے سر ہلایا۔

وہ مائکروبس کے قریب آیا تو ٹھٹک کے رُک گیا۔ "یہ ڈائریکٹریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔" اُس نے نام پڑھا۔ "یہ کون سا محکمہ ہے، میرا مطلب ہے کیا کرتا ہے؟"

"ڈائریکٹ ڈسپوزل۔" میں نے کہا۔ "کسی کا بھی ہو سکتا ہے تمہارا بھی، ام ڈائریکٹر اے۔"

"جی!" وہ گڑبڑا کے بولا اور پیچھے کا دروازہ گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں اور محسن فرنچ میں باتیں کرتے رہے۔ دلاور کے بارے میں کہ وہ عائشہ کی لاش اُٹھاتے ہوئے کس قدر اپ سیٹ ہو گا اور ہمیں کیسی گالیاں دے گا اور خسرو جمشید کے بارے میں جس کی اکلوتی ناز پرور دہ فنکار مزاج کی مالک اور عیاری میں لومڑی جیسی بہن نے بھائی کے گناہوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی مگر کیا اس سانحے کے بعد اور حقائق سے آگاہی کے بعد وہ سراج سے شادی کرے گی؟

شوروم کا مالک بھونچکا بیٹھا رہا۔ اُس کے پلّے نہ ہم پڑ رہے تھے اور نہ ہماری زبان پڑ رہی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا ہو گا کہ یہ پشتو نہیں ہے اور ممکن ہے اُس نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ فرنچ ہے۔ ہمارے پیسے کے علاوہ اُسے میرے عہدے نے متاثر کیا تھا اور اب میری فرنچ نے۔

"جناب بُرا نہ مانیں تو پوچھوں؟" وہ بولا۔ "یہ آپ لوگ کس چیز کا ڈسپوزل کرتے ہیں گورنمنٹ آکشنز ہیں کیا؟"

"یہ آدمی بے وقوف اے۔" محسن نے کہا۔

"بھائی صاحب! بے وقوف نہیں جاہل اے۔" میں نے کہا۔ "اس جاہل کو بولو چپ کرے، ورنہ ام اس کا مُنہ بند کر دے گا، ہر طرف سے۔" محسن بولا۔

ظاہر ہے اس کے بعد شوروم کے مالک کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے عزّتی ہوئی تھی لیکن وہ عزّت پر حملے کے خلاف شور مچاتا تو اپنا سودا خراب کرتا۔ اُس نے خود کو قائل کر لیا ہو گا کہ وہ بازار میں عزّت کمانے کے لیے نہیں پیسہ کمانے کے لیے بیٹھا ہے۔ وہ بڑی افسردگی سے ہمیں ہدایات د

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا۔ بلوامی باغ کے قریب اُس نے ایک احاطے کے قریب گاڑی روکنے کو کہا۔ یہ کسی گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا آفس تھا۔

"گاڑی اندر لے چلیں؟" اُس نے کہا۔ "معلوم نہیں آج ان کا دفتر ابھی تک کیوں کھلا ہُوا ہے؟"

"اگر ابھی بات کرتا ہے تو اَم ابھی پیسہ دے گا۔" میں نے گاڑی کو گیٹ سے اندر لے جا کے ایک سائڈ پر کھڑا کر دیا۔ ٹریلر مجھے گاڑی کو گیٹ کی طرف موڑتے ہی نظر آ گیا تھا۔ دائیں ہاتھ پر بہت سے ٹرک ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ٹریلر بائیں جانب تھا۔ چالیس فٹ کا کنٹینر جس ٹریلر پر رکھا ہُوا تھا، اُس کے چیسس کے نیچے بارہ ٹائر تھے جو ہر پہیے میں دو ایک ساتھ لگائے گئے تھے، اُس کا وزن سہارنے کے لیے ٹریلر کے تین پہیے ایک طرف تھے اور تین ہی دوسری طرف آگے پیچھے اور درمیان میں، اس [illegible] کا ایک طاقتور انجن کھینچتا تھا جس میں ڈرائیور کا [illegible] سے آٹھ فٹ اُوپر تھا۔ انجن اور کیبن کے نیچے [illegible] دو ٹائر تھے کیونکہ اس پر کوئی وزن نہیں پڑتا تھا۔ لمبے [illegible] کے لیے یہ کارگو کنٹینر ساری دُنیا میں بھاری ساز و سامان کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے چمکنے والے زرد اور سرخ رنگ کی لکیریں تھیں اور واضح حروف میں لکھا ہُوا تھا "لانگ وہیکل"۔ یہ وارننگ سڑک پر دوسرے ڈرائیوروں کے لیے تھی۔

میں نے اور محسن نے اُسے ہر طرف سے دیکھا اور پسند کیا۔ یہ بالکل آئیڈیل چیز تھی اور میرے پروگرام کی ضروریات کے عین مطابق بھی۔ اس کی حالت بھی اچھی تھی، اُسے بالکل نیا نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کی دیکھ بھال صحیح طریقے سے کی گئی تھی چنانچہ یہ نیا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والا شوروُم کا مالک نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پستہ قد اور گول مٹول شخص کے ساتھ نمودار ہُوا جس کے چہرے پر چیچک کے پُرانے داغ تھے۔

"یہ ہیں جی مالک!" شوروُم کے مالک نے ہمیں متعارف کرایا۔ وہ غالباً ٹریلر کے مالک سے بات کر آیا تھا کہ ان بے وقوف نظر آنے والوں کو بے وقوف مت سمجھنا، یہ صرف پیسہ پھینکنے کے معاملے میں بے وقوف ہیں اور وہ بھی شاید اس لیے کہ پیسہ گورنمنٹ کا ہے۔

"اَم اس کو لے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر ساڑھے چار لاکھ نئیں دے گا۔"

"چار لاکھ دے گا۔" محسن نے سر ہلایا۔

"[illegible] ظلم ہے جناب!" ٹریلر کے مالک نے شور مچانا شروع کیا۔ "آپ چیز بھی تو دیکھیں۔ یہ کوئی ہر شوروُم میں ملنے والی گاڑی نہیں ہے۔ میں تو شرط لگانے کو تیار ہُوں کہ پورے لاہور میں یہ ایک ہی ہے۔"

"شرط لگائے گا؟" [illegible] نے کہا۔ "ٹھیک ہے، اَم بھی شرط لگائے گا، ایک لاکھ کا۔"

ٹریلر کا مالک گڑبڑا گیا۔ "وہ جناب... دیکھیں میرا خدا نخواستہ یہ مطلب نہیں تھا، میں غریب آدمی ایک لاکھ کی شرط کیسے لگا سکتا ہُوں، وہ تو میرے مُنہ سے ایک بات ایسے ہی نکل گئی۔ آپ ایسا کریں سوا چار لاکھ کر لیں۔"

"اَم چار لاکھ دے گا۔" محسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ابھی دے گا، نقد..." میں نے کہا۔

"دیکھیے خان صاحب! ہم معمولی لوگوں سے سودے نہیں کرتے اور جو چیز ہمارے پاس ملتی ہے، وہ کسی کے پاس ملتی بھی نہیں۔" ٹریلر کا مالک بولا۔ "ہم تو آدمی کو پہچانتے ہیں، آپ انشاء اللہ پھر آئیں گے، ہمارے تو مستقل گاہک ہیں اور سب بڑے بزنس مین ہیں، مثلاً آپ ان کو دیکھیں، یہ بھی ہمارے پُرانے گاہک ہیں، ان سے پوچھ لیں آپ ہمارے بارے میں۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ایک کار سے اُستاد پیڈرو اُتر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ساتھ دو بلڈاگ کی شکل والے بد[illegible] تھے۔

ہم سے سو گز یا اس سے کچھ کم فاصلے پر وہاں تھا جہاں ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ محسن نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا اور پیڈرو نے اگر ہمیں دیکھا تو پہچانا نہیں تھا۔ ہم اُسے کئی ماہ کے وقفے سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ اپنے اصل حُلیے میں تھا۔ وہ جس کار سے اُترا تھا، وہ سلیٹی رنگ کی اور بالکل نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرونا تھی۔ پیڈرو نے دروازہ بند کیا اور چابی گھماتا آفس میں چلا گیا۔

"یہ تمارا ساتھ کب سے ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا ڈیلر بولا۔ "دراصل ہم گاڑیاں بیچتے نہیں، کبھی کوئی ٹرک پُرانا ہو جائے اس پر مرمت کے اخراجات زیادہ آنے لگیں اور لمبے راستوں پر بریک ڈاؤن زیادہ ہونے لگیں تو اُسے نکال دیتے ہیں۔ گاہک کے لیے تو وقت کی قیمت ہے جناب! یہاں سے مال بھیجا جائے اور وقت پر نہ پہنچے تو اُس کا جہاز نکل جائے گا۔ آگے باہر کے کسی ملک کی پارٹی کے ساتھ جو معاہدہ ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور وہ سارے نقصانات ہم سے وصول کرنے آ جائے گا۔"

"ایسا ہُوا ہے کبھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، ابھی تک تو نہیں ہُوا۔" وہ بولا۔ "اللہ کا شکر ہے جیسے ہی کوئی ٹرک بھروسے کے قابل نہیں رہتا، اُسے بدل دیتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "ایسے تو بوت نقصان ہوتا ہوگا۔"

"نہیں خان صاحب! نقصان ہو تو دھندا ہی کیوں کریں۔" وہ بولا۔ "ٹرک ایسے ختم نہیں ہوتا، اپنی لاگت نکال دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی آدھی قیمت پر کوئی لے لیتا ہے، یہ آدھی قیمت ہمارا منافع بن جاتی ہے اور اب آپ سے کیا پردہ، سب کام مل کے ہوتا ہے۔"

"ہاں، اللہ کا مرضی شامل ہوتا ہے۔" محسن نے سر ہلایا۔

"جی... ہاں... وہ تو خیر ہے... میرا مطلب تھا کہ بندوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔ "سرکاری محکموں کو نیا بنا کے بھی بیچ دیتے ہیں لوگ... یہی ان جیسے لوگ۔" وہ شوروُم کے مالک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ شوروُم کے مالک کا رنگ فق ہو گیا کیونکہ وہ تو جانتا تھا کہ ہم بھی سرکاری آدمی ہیں۔

میں حوصلہ افزا اور معاملہ فہم انداز میں مسکرایا۔ "ہم بھی سُنا ہے کہ ایسا ہوتا اے مگر یارا یہ کیسے ہوتا ہے؟"

"بس جی، پُرانے ٹرک پر نیا رنگ روغن، ڈینٹ پینٹ کرایا اور اس کی نئی رجسٹریشن کرا دی۔ موٹر رجسٹریشن والے نے پانچ ہزار بنا لیے، باقی حکومت کو پچاس کی چیز سو میں پڑی تو کسی کا کیا گیا، باقی پچاس آدھے آدھے، ڈیلر کے اور خریدار کے۔"

"کوئی اُس کو دیکھ کر پُرانا نہیں بولتا؟"

"واہ خان صاحب! نیا چمکتا ہُوا رنگ ہو، نئی رجسٹریشن ہو اور مجاز افسر اسے نیا تسلیم کرے تو پُرانا کون کہے گا۔" وہ ہنسا۔

"او بھائی، تو کم دی گل کر، اینیاں نال یار۔" شوروُم کا مالک گھبرا کے پنجابی پر اُتر آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سرکاری محکموں میں گھپلے کا موضوع مزید طویل ہو۔

"ہاں جی، تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔

"ایک دم ٹیک اے۔" میں نے کہا۔ "ابھی بولو ہم قیمت ادا کرے... نقد...؟"

"نقد... دیکھیں بیعانہ تو آپ نے دے دیا۔" ٹریلر بیچنے والے نے کہا۔ "چیز آپ کی ہو گئی۔ بہتر ہے آپ ادائیگی صبح کر دیں، ہم رات کو اتنا کیش کہاں رکھیں گے؟"

"خو یارا، اَم بھی تو رکھے گا۔" محسن بولا۔

"وہ... دراصل کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی، مالک اس وقت یہاں نہیں۔" وہ بولا۔ "رقم وہی لیتے ہیں اور رسید بھی وہی دیں گے۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے سر ہلایا۔ "اَم صبح آئے گا، یارا ایک بات بولو۔"

"فرمائیے۔"

"یہ تو نیا گاڑی لگتا ہے جو اَم خریدا اے مگر تم بولتا کہ جب گاڑی تنگ کرتا تو تم اس کو بیچتا۔" میں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ خان صاحب! یہ وہ عام قسم کا ٹرک نہیں ہے، یہ تو ہمارے کام کا ہی نہیں ورنہ ہم رکھ لیتے۔" وہ بولا۔ "اسے ہم نہیں، کوئی اور بیچ رہا ہے، وہ اِدھر مال لے کر آیا تھا، یہاں سے اُسے کہیں اور جانا تھا۔"

"وہ اس ٹریلر کو یہاں چھوڑ گیا۔" ہمارے ساتھ آنے والے شوروُم کے مالک نے کہا۔ "اُسے اپنے مال کی قیمت تو مل ہی گئی تھی، وہ اس ٹریلر کو بھی بیچ گیا۔ گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے مالک نے نقد رقم دے کر لیا تھا۔"

"مگر یہ بولتا کہ اس کا مطلب کا نہیں تو پھر کیوں لیا؟"

"بس اس لیے کہ کوئی پارٹی مل جائے گی تو چار پیسے منافع میں بِک جائے گا۔"

"وو ئی وو ئی۔" محسن بولا۔ "صرف چار پیسہ منافع۔ تم دیکھا برادر، اس نے ٹرک تین لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے روپیہ چھیانوے پیسہ میں خریدا، چار لاکھ میں اَم کو دیا۔"

"بھائی صاحب! یہ محاورے کا بات تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب تھا تھوڑا سا منافع اور تھوڑا کا مطلب ہے بوت۔"

محسن نے تعجب سے سر ہلایا۔ "تھوڑا کا مطلب بوت۔"

ساری بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ کمپنی کے مالک نے دیکھا کہ ٹریلر میں سامان لانے والا مجبور ہے اور اب ٹریلر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تو اس نے اونے پونے خرید لیا۔ اتنا بڑا ٹریلر بہت سُست رفتار ہوتا ہے اور قومی شاہراہ پر عام قسم کے مال کی نقل و حمل میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ مخصوص قسم کا سامان مثلاً ہیوی مشینری جسے دھوپ اور بارش سے بچا کے لے جانا مقصود ہو، وہی اس ٹریلر پر جا سکتی تھی اور ایسا سامان روز نہیں ملتا۔ جو کمپنیاں یہ کام کرتی ہیں، ان کے پاس پہلے سے اپنے ٹریلر ہیں۔ وہ ان لوگوں سے یہ ٹریلر چار لاکھ میں کیوں لینے لگے، وہ ہم جیسے کسی احمق کے منتظر تھے۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں عمداً آفس سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ "اس کا کیا نام اے؟" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "جس کا یہ کورونا اے؟"

"نام... نام تو ہم نہیں جانتے، ہم مینیجر صاحب بولتے ہیں۔" گڈز فارورڈنگ ایجنسی والے نے کہا۔ "ایک کمپنی کا مینیجر ہے۔"

"کس چیز کا کمپنی اے؟ کیا بیچتا اے؟"

"کچھ مشین کے پُرزے وغیرہ کراچی بھیجتے ہیں۔" وہ بولا۔ "کیا تم دیکھتے ہو..." میں کہنے والا تھا مگر پھر اس خیال سے چُپ ہو گیا کہ کہیں ہمارے کریدنے سے وہ خواہ مخواہ شک میں نہ پڑ جائے اور پیڈرو سے نہ کہہ دے کہ دو پٹھان اس کے بارے میں بڑی پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ پیڈرو تو ایسا چور تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جس کی داڑھی میں تنکے ہی تنکے تھے، وہ فوراً کھٹک جاتا اور یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے والے کون تھے؟

کوئی اور بات ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پیڈرو لیجانک آفس سے نکلا اور سیدھا اپنی کار کی طرف گیا۔ کار کا نمبر میں نوٹ کر چکا تھا، جب وہ گاڑی کو گھما کے گیٹ سے باہر لے گیا تو میں نے آہستہ آہستہ آفس کی طرف قدم بڑھائے۔

"ام اس کا سارا کاغذات دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"ضرور دیکھیں، ہم کوئی فراڈ تھوڑی کر رہے ہیں، بازار میں بیٹھے ہیں، چار لاکھ لے کر کہیں نہیں جا سکتے۔" وہ تقریباً بُرا مان کے بولا۔ "اور یہ تو ہاتھی ہے۔ چوری کی کار بِک سکتی ہے، اتنا بڑا ٹریلر نہ کوئی چُرا سکتا ہے اور نہ چُرا کے رکھ سکتا ہے۔"

"او یارا تسلّی کر دے ان کی، تُو بولتا بہت ہے۔" شوروم کا مالک عاجز آ کے بولا۔

آفس ایک بیرک نما گندی عمارت تھی جس میں ڈیزل کی بُو بسی ہوئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر بھی چکنائی کی تہ ڈیزل کے رنگ کی محسوس ہوتی تھی۔ اصل دفتر صرف دو کمروں کا نام تھا، باقی کمروں میں شاید فاضل ٹائر اور اسٹور تھے یا ڈرائیوروں کے قیام کا انتظام تھا۔ آفس بھی کوئی صاف ستھری جگہ نہیں تھی۔ ایک کمرے میں دو ہم جیسے حُلیے کے لوگ میز پر ٹانگیں ڈالے بیٹھے تھے اور ڈرائیور حضرات کے جمِ غفیر سے اُلجھ رہے تھے۔ ان کے درمیان والدہ اور ہمشیرہ کے رشتوں کو اِدھر سے اُدھر جوڑ کے بات کرنا بے تکلفی اور دوستی کی علامت تھا۔ کچھ ڈرائیور آئے تھے اور حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک ٹیبل کے گرد شور و غوغا کر رہے تھے۔ چرس کی سگریٹیں پی رہے تھے اور فحش مذاق کرتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ دوسری ٹیبل کے گرد روانہ ہونے والے جمع تھے اور منظر وہاں بھی یہی تھا۔ بابو یا منشی کاغذی کارروائی میں بڑی پھرتی دکھا رہے تھے۔ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تختوں پر ڈھیر کی صورت میں رکھے ہوئے رجسٹروں اور لیجروں میں سے ایک اُٹھاتے تھے تو دوسرا رکھ دیتے تھے۔ غالباً ہر ٹرک کی آمد و رفت کا حساب ایک الگ رجسٹر میں تھا کیونکہ مجھے ایک پُرانے رجسٹر پر نمبر نظر آیا تھا۔

ہمیں جس کمرے میں تشریف رکھنے کو کہا گیا، وہ غالباً سیٹھ کا کمرا تھا۔ اس میں ایک ہی بڑی میز تھی جس پر دو فون رکھے ہوئے تھے۔ کاغذات اور پُرانے اخبار پڑے تھے اور کسی گاڑی کے پسٹن سے بنائی ہوئی ایک ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ لکڑی کی اس میز کے داغ ظاہر کرتے تھے کہ چائے پینے کے علاوہ اس پر کھانا بھی کھایا جاتا ہے، اگر یہ رات کو سونے کے کام آتی ہو تو بھی

کوئی تعجب نہیں۔ میں نے اس کی وسعت پر غور کر کے سوچا۔ میز کے گرد بید سے بنی ہوئی پُرانی کرسیاں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ بے رنگ، میلی دیواروں کے کونوں میں اُوپر سے نیچے تک جالے آویزاں تھے اور اس کی نیم تاریک فضا کو ایک ٹیوب لائٹ روشن کرنے میں ناکام تھی کیونکہ ٹیوب کی اُوپری سطح گرد اور مکھیوں کی غلاظت سے تقریباً سیاہ پڑ چکی تھی۔ مجھے اُن چمکتے دمکتے وال ٹو وال کارپٹ والے... ایئر کنڈیشنڈ دفاتر کا خیال آیا جہاں باس قسم کے لوگ بہترین سُوٹ اور ٹائیوں میں گھومنے والی کرسیوں پر بیٹھ کے خوش شکل اور خوش لباس سیکرٹریوں سے انٹرکام پر بات کرتے ہیں، یہ مختلف نوعیت کا کاروبار تھا جس میں صفائی رکھنا عملاً ناممکن تھا۔

ہمیں اندر لانے والے شخص نے ہمارے لیے چائے کا آرڈر دیا اور خود ایک فائل نکال لایا۔ میں نے اس کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹریلر کسی غیر ملکی کمپنی کا تھا جو یورپ سے خشکی کے راستے کچھ سامان لے کر کراچی پہنچاتی رہی مگر اس بار سامان کراچی میں نہیں اُتارا گیا بلکہ سیدھا لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں کمپنی کے لیگل اٹارنی نے ٹریلر کو فروخت کرنے کے معاملات طے کیے اور اب ٹریلر بالکل جائز اور قانونی طور پر گڈز فارورڈنگ ایجنسی کی ملکیت تھا اور وہ اس کو بیچنے کا اور ہمارے نام پر ٹرانسفر کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ یورپ کی کارگو کنٹینر سروس کا لیگل اٹارنی کراچی کا ایک کلیئرنگ ایجنٹ تھا۔ ان کاغذات میں سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یورپ کے کس ملک سے کتنی بار سامان آیا، کس کے نام آیا اور وہ سامان کیا تھا مگر یہ معلومات کراچی کے اس کلیئرنگ ایجنٹ سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اُس کا نام پتا قانونی دستاویز کی صورت میں فائل کا حصہ تھا اور یہ فائل ٹرانسفر ہو کے ہمارے پاس ہی آنا تھی چنانچہ میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

چائے آنے تک ہمیں فرصت کے چند منٹ میسر آ گئے جب فائل ہمارے حوالے کرنے والا دوسرے کمرے میں کوئی تنازعہ طے کرنے گیا جس نے نقصِ امن کا اندیشہ پیدا کر دیا تھا۔

"عزیزم! آپ نے استاد کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب نکالا؟" میں نے پیڈرو کا نام لینے سے گریز کرتے ہوئے فرنچ میں کہا۔ شوروم کا مالک چونکا نہیں کیونکہ وہ ہمیں پہلے بھی یہ عبرانی، لاطینی قسم کی بولی بولتے سُن چکا تھا۔

"یہ لوگ اس کمپنی کے ذریعے بھی اسلحہ ارسال کرتے رہے ہیں۔" محسن نے دودھ پتی کا اُبلتا ہُوا مکسچر شڑپ شڑپ کر کے پیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم ان ٹرکوں کے نمبر حاصل نہیں کر سکتے جن پر آج تک مال بھیجا گیا ہے؟"

"اس سے کیا فائدہ، وہ مال تو نکل گیا۔" محسن نے کہا۔

"بات اس مال کی نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس کس ٹرک کو اس غیر قانونی کاروبار میں استعمال کیا گیا۔ میں ایک پتے کی بات عرض کرتا ہُوں۔ ہر ٹرک ڈرائیور آنکھیں بند کر کے ہر قسم کا مال نہیں لے جاتا ہو گا۔ کچھ ٹرک ڈرائیور پہلے دیکھتے ہیں کہ کیا بھیجا جا رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ راستے میں چیکنگ ہو تو وہ دھر لیے جائیں۔"

"ان لوگوں کی چیکنگ کیا فرشتے کریں گے جو کر سکتے ہیں وہ تو پہلے ہی آل کلیئر کا سگنل ہاتھ میں رکھتے ہیں۔" محسن بولا۔

"فرض کرو مال حرام کھانے والوں میں ٹھن جاتی ہے، کوئی مخبری کر دیتا ہے یا کوئی پیچھے لگ جاتا ہے۔ کوئی خبطی قسم کا صحافی یا ایماندار افسر جو نیا آیا ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر ٹرک ڈرائیور پکڑا جائے تو کیا مالک تسلیم کریں گے کہ یہ مال اُنھوں نے دیا تھا؟ نہیں، وہ صاف کہیں گے کہ بدمعاش ڈرائیور نے خود لوڈ کیا ہو گا۔ ہم نے تو کدو، کریلے دیے تھے۔ یہ بات ڈرائیور بھی سمجھتے ہیں، سب ڈرائیور حرام کھانے والے اور غلط کام کرنے والے نہیں ہوتے، وہ صرف مزدوری کرتے ہیں، اسمگلنگ نہیں مگر کچھ بڑے شوق سے ناجائز کام کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ ہوں گے جو ہمارے شکاری دوستوں کے منظورِ نظر ہوں گے۔ ان کے ٹرک بھی مخصوص ہوں گے۔ عام طور پر ایک ڈرائیور کسی کمپنی کا ایک ہی ٹرک چلاتا ہے۔ اسے ہر روز نیا ٹرک نہیں دیا جاتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے جو ڈرائیور کسی ایک ٹرک کو چلاتا ہے، وہ اس کی رگ رگ سے واقف ہو جاتا ہے اور کسی حد تک اس سے ایک جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ دوسرے ڈرائیوروں سے کچھ پیشہ ورانہ چپقلش چلتی ہے۔ او ئے میرا ٹرک شیر ببر ہے، تیرا ٹٹو کیا مقابلہ کرے گا۔ دوسرا کہے گا کہ میرا راکٹ ہے، راکٹ۔ تیسرا اسے جمبو جیٹ کہے گا اور ایسا ہی پینٹ بھی رکھے گا۔ اس میں رنجش کوئی نہیں ہوتی، یہ ایک دوستانہ قسم کا مقابلہ ہے جو جاری رہتا ہے، محض دلچسپی کے لیے۔"

"میں کوڑھ مغز سب سمجھ گیا۔" محسن نے کہا۔ "اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون کون سے ٹرک 'بہادر اینڈ کمپنی' استعمال کرتی رہی ہے تو ہم خاصے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ انہی ٹرک ڈرائیوروں پر اور اُن کے ٹرکوں پر بھروسا کریں گے اور ہمیں تفصیلات حاصل ہو جائیں تو ہم یہاں سے کراچی تک قومی شاہراہ سے گزرنے والے ہر ٹرک پر نگاہ رکھ سکتے ہیں اور اس کی منزل بھی بدل سکتے ہیں۔"

"آپ سمجھ گئے، خدا آپ سے سمجھے۔" میں نے کہا۔ "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفصیلات کیسے حاصل ہوں؟"

"اس کے دو طریقے رائج ہیں، زر سے یا زور سے۔"

"ہاں جی، دیکھ لیے آپ نے کاغذات؟" گڈز کمپنی والا جھگڑا ختم کر کے لوٹ آیا۔ "اطمینان ہو گیا آپ کا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ام صبح آئے گا۔ تمارا نام کیا اے؟"

"میرا نام؟ نام تو معتصم ہے۔ پورا نام اس سے بھی زیادہ مشکل ہے جو اباجی نے رکھا تھا معتصم احتشام۔ اُن کا اپنا نام احتشام تھا۔ یہاں لوگ چکری کہتے ہیں، بس یہی مشہور ہے۔"

"چکری! خو یارا اچھا نام اے۔" محسن بولا۔ "وہ کیا بولا تم؟ موت سے شام؟"

"وہ چھوڑو جی! آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" چکری ہنسنے لگا۔

"اچھا ام چلتا اے۔" میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "ادھر کا فون نمبر بتاؤ، ام صبح آنے سے پہلے معلوم کر کے آئے۔"

"وہ جناب خان صاحب! آپ کو میں لے کر آؤں گا۔" شوروم کا مالک بولا۔ "میرے ذریعے یہ سودا ہو رہا ہے، آپ میرے پاس تشریف لائیں۔"

"ہاں یارا، ام ادھر آ جائے گا۔" میں نے کہا مگر اتنی دیر میں چکری مجھے کمپنی کا کارڈ تھما چکا تھا اور اب شوروم والے کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کارڈ میرے ہاتھ سے چھینے، وہ ہمیں براہِ راست پارٹی سے ملوا کے پچھتا رہا تھا اور اُسے اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ اس کا کمیشن مارا جائے گا، ہم براہِ راست چکری سے سودا کر لیں گے اور جیسا کہ نام سے ظاہر تھا، چکری کوئی چکر باز تھا، ورنہ اُس کا نام شیطان کی طرح نہ پڑتا۔

ہم باہر آ کے تو شوروم کا مالک فوراً رونے پیٹنے پر آ گیا۔ "جناب خان صاحب! میرے کمیشن کا خیال کریں۔ میں نے تو آپ پر بھروسا کیا اور یہاں لے آیا مگر یہ چکری بڑا شیطان ہے، سب کے پیٹ پر لات مارتا ہے۔"

"تم اس کو دولات مارو۔" محسن نے اس کو مشورہ دیا۔ "روتا کیوں اے زنخا کا بچہ، الیسالات مارو کہ تشریف رکھے تو ہلے کرے۔"

میں نے ہنسی کو بڑی مشکل سے روکا۔ "بھائی صاحب! یہ محاورہ تھا، مطلب یہ کہ چکری دوسروں کا حق چھینتا ہے۔"

"خو یارا! ام اس محاورہ سے بوت تنگ اے۔" محسن نے کہا۔

"خو تم فکر مت کرو یارا۔" میں نے دوستانہ انداز میں اُس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ اس کا یہی کندھا پہلے بھی میری بے تکلفی کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے بے اختیار ہائے کی۔ "ام

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمارا پاس آئے گا، تم کو پیسہ دے گا۔"

"بڑی مہربانی جناب کی۔" وہ بولا لیکن اس کی صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب بھی وہ مطمئن نہیں ہے، اگر اس کے پاس نقد رقم ہوتی تو وہ ٹریلر خود خرید لیتا اور پھر ہمیں منہ مانگی قیمت پر بیچ دیتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ٹریلر دوسری پارٹی کے پاس تھا اور وہ ہم دیکھے بغیر قیمت دینے پر رضامند نہ تھے۔ کار ہوتی تو وہ دکھانے کے لیے لے آتا مگر ٹریلر کو لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم اس سے رخصت ہوئے تو شام بیت چکی تھی اور رات اُتر رہی تھی۔ میں نے اور محسن نے گاڑی کو ریگل کے قریب کھڑا کیا اور بہت مدت کے بعد شیزان میں قدم رکھا۔ اعلیٰ قسم کی کافی پیتے ہوئے ہمیں اپنی موجودہ زندگی کی سختی اور آزمائش کے قدر کی صبر آزما طوالت کا شدت سے احساس ہُوا۔ ہم دونوں آسودگی کے خمار میں چُپ بیٹھے رہے۔

پھر محسن نے ایک سرد آہ بھری "معلوم نہیں، وہ دن کب آئے گا؟"

"اور وہ رات کب آئے گی؟" میں نے زیادہ سرد آہ بھر کے کہا۔

"جب میں تجھے فون کر کے کہوں گا کہ سکندر! شام کو تم لوگ کیا کر رہے ہو پھر میں کہوں گا کہ یار شرم آنا چاہیے تمہیں کہ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور تم بھولے ہوئے ہو اور تو ہنس کر اور گالی دے کر کہے گا کہ ہم بھول کیسے سکتے ہیں۔ ہم تو سرپرائز دینے والے تھے اور میں کہوں گا کہ سرپرائز تو ہم دے رہے ہیں۔ رابعہ بھابی کے ساتھ لارڈز میں آجاؤ۔ چائے پئیں گے پھر الحمرا میں ڈراما چل رہا ہے، وہ دیکھیں گے اور اس کے بعد ڈنر ہماری طرف سے... اور دیکھو گفٹ نہیں لاؤ گے تو لارڈز کے باہر کھڑے رہ جاؤ گے چائے، تھیٹر، ڈنر کچھ نہیں ملے گا۔"

"اور اس کے بعد میں رابعہ سے کہوں گا کہ معلوم ہے کس کا فون تھا؟" میں نے خواب کا دوسرا حصہ شروع کیا۔ "وہ ہنس کر کہے گی، محسن بھائی کے سوا کس کا ہو سکتا ہے۔ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے نا۔ میں نے شہلا کو سرپرائز دینے کا سوچا تھا اور میں کہوں گا کہ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔ وہی نیلی، آسمان کے رنگ کی اور ستاروں کی افشاں والی ساری، اور رابعہ کہے گی کہ حد ہے آپ کی بھی اور کچھ اچھا ہی نہیں لگتا اور میں کہوں گا، اچھا تو تم پر سب کچھ لگتا ہے کیونکہ مجھے تم اچھی لگتی ہو مگر یہ آسمانی ساری اور زرد پھول میرے ماضی کی سب سے خوبصورت یاد کا گلستاں ہیں۔ اُس وقت جب میں حالات کی کڑاہی دھوپ میں وقت کے بے سمت صحرا میں آبلہ پا چل رہا تھا تو یہی پھول

تسکینِ قلب و نظر کا ساماں تھے اور یہی آسمان کا رنگ میرا ہم ساز تھا۔ اور پھر جب وہ رنگِ غازۂ رخسار اور سُرخی لب کے ساتھ حیا کی حجاب آلود مسکراہٹ سجائے خوشبو کی سفیر بن کے میرے سامنے آئے گی تو میں شہرِ طلسمات کے مسافر کی طرح پتھر ہو جاؤں گا اور وہ شرما کے کہے گی کہ اب چلیے بھی..."

"اور جب تم اپنی چمکتی دمکتی کار سے لارڈز کے سامنے اُترو گے تو ہم اپنی کار سے اُتر رہے ہوں گے۔ میں اور شہلا۔ سب لوگ ہمیں رشک سے دیکھ رہے ہوں گے۔ اشاروں اشاروں میں کہہ رہے ہوں گے۔ یہ وہی ہیں، محسن اور سکندر۔" محسن نے کافی کے خالی کپ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کافی اور لاؤں صاحب؟" ویٹر نے یوں کہا کہ ہمارے سپنے خواب رپٹ ہو گئے۔

"کافی... ہاں، لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو... کافی لاؤ، گھول کر تلخیٔ ایام میں امروز کا..."

"جی؟" ویٹر بوکھلا گیا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے نہیں کہہ رہا تھا۔"

"معلوم نہیں، ایسے خواب رات کو کیوں دکھائی نہیں دیتے؟" محسن بولا۔

"اگر ہم ایسے خواب دیکھ کر جاگے تو سخت فرسٹریشن کا شکار رہیں گے چنانچہ ہمارا دماغ ہمیں بے خواب نیند دیتا ہے۔ آرام اور صرف آرام کے لیے۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت چکری کی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، میں شہلا کی باتیں کرنا چاہتا ہوں، اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اُس سے رات کو بات کرنا۔" میں نے کہا۔ "چکری سے بات نہ کی تو یہ ایک کامیابی کے راستے کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا، صرف اس لیے کہ ہم خواب کے راستوں کی باتوں میں گم تھے، میں اُسے فون کر رہا ہوں۔"

میں اُٹھ کر کاؤنٹر تک گیا۔ کارڈ میرے پاس تھا۔ میں نے رسماً اجازت لے کر نمبر ملایا۔ "تو چکری بھائی سے بات کرے گا۔"

"چکری... بلانا واں اُنوں۔" کسی نے کہا اور چلایا۔ "اوئے چکری، تیرے سورے وا فون جے۔"

میں چکری کا سور یعنی سُسر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے اس عزت افزائی کا بُرا نہیں مانا، ورنہ کہنے والا تو مجھے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔

"ہاں جی، کون اے؟" چکری نے ایک منٹ بعد کہا۔

"یارا چکری بھائی! اَم تمارا دوست اے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا، میں سمجھ گیا، خیریت ہے ناجناب؟"

"ہاں یارا، ایک دم سب خیریت اے، ابھی تم کیا کرتا اے؟"

اس نے کہا۔

"میں... کچھ نہیں، بس یہی روز کا کام ہے۔"

"تم اِدھر ہم سے ملنے کا واسطے آسکتا ہے یا ٹھہرو، اَم اگر ملنے کا واسطے آوے تو تم باہر مل سکتا ہے اَم کو؟" میں نے کہا۔

"پہلے بتائیں بات کیا ہے؟" وہ متجسس لہجے میں بولا۔

"بات تمارا فائدہ کا ہے۔ بوت فائدہ ہو سکتا اے تم کو... بیس ہزار کا۔" میں نے کہا۔ "تم اَمارا ایک کام کرے گا؟"

"خان صاحب! آپ کہیں کہ میں کسی ... تو یہ کام بیس ہزار میں مشکل ہے۔"

میں ہنسا۔ "مارا، تم کیا بولتا اے، اَم ایسا کام بولے گا تیرے واسطے؟ بوت آسان کام اے یارا، ابھی ہم آتا ہے، بس آدھا گھنٹا میں... تم اَمارا گاڑی دیکھا اے نا، اَم باہر انتظار کرے گا لیکن دیکھو کسی کو کچھ مت بولنا کہ اَم نے فون کیا تھا اور کیا بات بولا تھا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" چکری نے کہا۔ "کرنے کا کام ہو گا تو ضرور کریں گے، چار پیسے کمانے کے لیے ہی تو ہم خوار ہیں۔" اُس نے ریسیور رکھ دیا۔

میں اور محسن لوٹ کر وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ آگیا۔ ہم بیس منٹ میں پہنچ گئے تھے لیکن دس بیس ہزار کی رقم کے خیال نے اُس کو بدحواس اور مضطرب کر دیا تھا۔ وہ ڈرتا ہوا قریب آیا۔

"ڈرتا کیوں اے مارا، اندر بیٹھو، اَم تم کو اغوا کر کے نہیں لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"اندر بیٹھو پھر بات کرے گا۔" محسن نے کہا اور وہ اندر بیٹھ گیا۔

"اَم کون اے؟ تمارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ خفا تو نہیں ہوں گے، اگر میں سچ بولوں؟"

"نئیں، تم بولے گا کہ اَم بلوچ کا بچہ ہے تب بھی اَم ناراض نئیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہاں بتاؤ، تم کیا سمجھتا اے اَم کو؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اسمگلر ہیں۔" چکری نے کہا۔ "اور یہ اتنا بڑا ٹرک بھی اسی کام کے لیے خرید رہے ہیں۔ وہ بھی اسمگلر تھا جس کا یہ ٹریلر تھا۔"

میں نے اور محسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا جس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ "چکری اچھا آدمی اے..." میں نے کہا۔

"مگر خان صاحب! آپ چاہتے ہیں کہ میں اسمگلنگ کروں یا اس کام میں آپ کا ساتھ دوں یا مدد کروں آپ کی، تو یہ میں نہیں کروں گا۔"

"چکری بوت اچھا آدمی اے۔" یہ بات دوسری بار محسن نے کہی۔

"چکری کنفیوز ہو گیا۔ "آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"چکری! تم کو اِدھر کتنا عرصہ ہو گیا؟" میں نے اچانک اپنا لہجہ بدل لیا۔ "کب سے ملازم ہو یہاں؟"

چکری دم بخود رہ گیا۔ "آپ... آپ پٹھان نہیں ہیں؟"

میں ہنسا۔ "میرے پٹھان یا پنجابی، سندھی یا بلوچی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے چکری، یہ بتاؤ میں ایکٹر کیسا ہوں؟"

"ایک نمبر... سوں رب دی... ایک نمبر... اور آپ۔" وہ محسن کی طرف دیکھ کے بولا۔ "آپ بھی..."

"ہاں، میں بھی۔" محسن نے مسکرا کے کہا۔ "چور کا بھائی گرہ کٹ۔"

"چکری، ہم خود بڑے چکر باز ہیں اور ہم دُنیا کی وجہ سے چکر میں ہیں تو دُنیا ہماری وجہ سے چکر میں ہے۔" میں نے کہا۔ "چکر کیا ہے، یہ ہم نہیں بتا سکتے مگر تم تو خود چکری ہو۔ یہ بتاؤ اس کمپنی میں ملازمت کرتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

اُس نے خود کو سنبھال کے اور بہت سنبھل کے جواب دیا۔ "ہو گئے ہیں یہی کوئی چار سال، پہلے ڈرائیور تھا۔"

"اور اب کیا ہو؟" میں نے کہا۔

"اب... آپ نے تو دیکھا۔ اُوپر کے سارے کام کرتا ہوں۔ ہیرا پھیری، منشی... سیکرٹری... مینجر... کچھ بھی سمجھ لیں آپ۔ مالک بھروسا کرتے ہیں مجھ پر۔" وہ بولا۔

"ڈرائیوری کیوں چھوڑ دی؟"

"وہ... بس چھوڑ دی۔" وہ بولا۔ "غلط کام نہیں کر سکتا تھا میں۔ ہیرا پھیری میرے بس کی نہیں تھی۔ جو دوسرے ڈرائیور کر لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیسی ہیرا پھیری؟ کیسے غلط کام؟"

"یہی... اس کا مال رکھ لیا۔ اُدھر کا مال یہاں لے آئے۔ کبھی مالکوں کی مرضی سے کبھی انھیں بتائے بغیر۔" وہ بولا۔ "کبھی پولیس راستے میں پکڑ لیتی تھی تو جوتے اور گالیاں کھانا بھی ڈیوٹی میں شامل۔ میں نے کہا جی کہ میرے باپ کی توبہ، میں ٹرک چلا سکتا ہوں، یہ سب نہیں کر سکتا۔ دوسرے مجھے سمجھاتے تھے کہ پاگل ہُوا ہے۔ خالی تنخواہ لے کر کیا کرے گا۔ ہر پھیرے میں کسی کا مال لے جا۔ چرس... سونا... اسلحہ... دو چار سال میں اپنا ٹرک خرید لے گا مگر ہُوا یہی کہ دو چار سال میں ٹرک لینے والے دو چار سال کے لیے اندر گئے اور مالکوں نے ان کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔"

"پھر تم کو لوگ چکری کیوں کہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ خود چکری ہیں۔" اُس نے بے ساختگی سے کہا۔ "پھر یہ کہ سب کو مجھ سے گِلہ تھا کہ میں ان کی شکایت کر دیتا ہوں۔ مالک خود اسی چکر میں رہتے تھے، اُنھوں نے مجھے ڈرائیو...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے ہٹا لیا اور اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شریف اور ایماندار آدمی ڈرائیور تو نہیں رہ سکتا مگر یہاں سارے معاملات ایمانداری سے سنبھال لے تو اُن کی بہت سی فکریں دُور کر سکتا ہے۔

"اور تم ایسے مالکوں کے ساتھ خوش ہو؟"

"خوش... خوشی کیا جی، نوکری تو مجبوری کراتی ہے۔ پیٹ بڑا کافر ہے جی مگر پیٹ بھر جاتا ہے تو نظر بے ایمان ہو جاتی ہے، اِدھر اُدھر بھٹکتی ہے۔ کبھی مال پر کبھی عورت پر، کبھی شراب پر، یہ سب مل جائے تو ایمان جاتا ہے، دُنیا ملتی ہے تو آخرت جاتی ہے۔"

مَیں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ وہ جاہل اور چکر باز نظر آنے والا ایک قلندر تھا۔ بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گرمارا۔ یہ بات کہنی آسان ہے مگر نبھانی مشکل۔ یہاں ایک شخص تھا جو ارادے کی مضبوطی سے ایمان کی طاقت سے اور محنت سے ساری نفسیاتی خواہشوں کے خلاف ڈٹا ہُوا تھا۔ بے ایمان اور زر پرست لوگوں کے درمیان رہ کے بے نیاز تھا۔ وہ کیچڑ میں اُگا ہُوا پھول تھا، جس نے اپنے وجود کی خوبصورتی کو بچا کے رکھا ہُوا تھا اور وہ اس بات سے بے نیاز تھا کہ اس کے آس پاس غلاظت ہے اور اسے بدزبان اور بدنیت اور بدخواہ لوگ پھول نہیں کانٹا سمجھتے ہیں، اسے تقدیر سے بھی گِلہ نہیں تھا کہ اسے کسی گوشۂ چمن میں کیوں پیدا نہیں کیا۔

"چکری! تم کو یہاں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟" مَیں نے کہا۔

"گیارہ سو۔" اُس نے رسان سے کہا۔

"فرض کرو ہم تمھیں دُگنی تنخواہ دیں...؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "مَیں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مَیں آپ کے کام نہیں آ سکتا۔"

"چکری، اگر ہم کہیں کہ تم نے غلط سمجھا تھا، ہم اسمگلر نہیں ہیں اور جب تم ہمارا ساتھ دوگے تو یہ ایک اچھا کام ہوگا، ایک نیک مقصد کے لیے ہوگا، تم کو یہ کام پسند آئے گا، تم مطمئن رہو گے، اس کام میں خوشی بھی محسوس کرو گے۔"

وہ حیران ہو کے ہماری صورت دیکھنے لگا "میں یہاں بھی مطمئن ہوں۔"

ہاں...... مگر تم نے مجبوری کا ذکر بھی کیا تھا۔" میں نے کہا "ہم مجبوری کی بات نہیں کرتے، اس کام میں تم کو خوشی ملے گی۔"

"لیکن جب تک کام کا پتا نہ چلے..."

"تم نے کہا تھا کہ تم ڈرائیور ہو؟" میں نے کہا "یہ ٹریلر چلا لو گے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا "میرے پاس ہیوی لائسنس ہے۔"

"ویری گڈ، پھر تم ایسا کرو کہ یہاں سے صرف ایک مہینے کی چھٹی لے لو کسی بھی بہانے سے" میں نے کہا "یہ ایک مہینہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم یہاں سے کراچی جائیں گے، اس ایک مہینے میں تم کو سب معلوم ہو جائے گا۔ تم صرف ڈرائیونگ کرو گے، وہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا جو ہم کریں گے۔ اگر کسی بھی وقت تم کو احساس ہو کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں تو تم واپس آ جانا، کسی جگہ گاڑی روک کے کہہ دینا کہ میں جا رہا ہوں۔ ہم تمھیں نہیں روکیں گے۔ جتنا عرصہ تم ہمارے ساتھ گزارو گے تمھیں بائیس سو روپے ماہانہ کے حساب سے تنخواہ ملے گی۔ کھانا پینا سب ہمارے ساتھ۔ ہم اکیلے نہیں ہیں، اور بھی کچھ لوگ ہوں گے۔ تم ان سب سے ملو گے اور سب کو دیکھ کر فیصلہ کرو گے کہ ہمارا ساتھ دینا فرض ہے یا مجبوری ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دلائل سے قائل ہو رہا ہے "مَیں ایک دم نہیں بتا سکتا۔"

"نہ بتاؤ، ہم کل پھر آئیں گے، اسی بہروپ میں لیکن تم اتنا ضرور کرو گے کہ ہمارے اصل رُوپ کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرو گے۔ ہم تمھیں دھمکی نہیں دیتے۔ تم پر اعتبار کرتے ہیں اور تم سے درخواست کرتے ہیں کہ اس راز کو راز ہی رکھنا اگر تم کسی بھی وجہ سے انکار کر دو، تب بھی ان باتوں کا حوالہ بھی نہ دینا جو ابھی ہوئی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ہم ملے ہی نہیں تھے۔"

"ٹھیک ہے جی، اب مَیں جاؤں؟"

"ٹھہرو، ابھی وہ بات تو ہوئی ہی نہیں جس کے لیے ہم آئے تھے۔" محسن بولا۔

"وہ کیا بات ہے جناب؟"

"جب ہم اس کار ڈیلر کے ساتھ آئے تھے" محسن نے کہا "اور تم سے سودا کر رہے تھے تو ایک ٹویوٹا کرونا آئی تھی، سلیٹی رنگ کی۔"

"ہاں جی، آئی تھی۔"

"ہم نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا" محسن بولا "تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا "اس کے بارے میں بات بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں، یہ بتاؤ وہ کیسا آدمی ہے؟" مَیں نے کہا "ہماری رائے یہ ہے کہ وہ ایک بدمعاش ہے۔ اسمگلروں کا ساتھی ہے اور اس کا نام استاد پیڈرو ہے"

چکری اُچھل پڑا "آپ... آپ یہ سب جانتے ہو تو... تو پھر میں کیا کہوں جناب؟"

"کچھ نہیں، تم نے تصدیق کر دی ہے کہ تم ہمارے ہم خیال ہو۔ تم بھی یہ سب جانتے ہو مگر تمہارا یہ کام نہیں کہ اس کے بارے میں زمانے کو بتاتے پھرو کہ وہ کون ہے" مَیں نے کہا "وہ کمپنی کو فائدہ پہنچاتا ہے اور تم کمپنی کے ایک معمولی ملازم ہو۔ تم اس کی دُشمنی بھی مول نہیں لے سکتے، ایک آفر تو ہم دے چکے یعنی یہ کہ تم ہمارے ساتھ رہو لیکن وہ منظور نہ ہو تو ایک کام اور ہے، تم ہمیں کمپنی کے ریکارڈ سے دیکھ کر کچھ معلومات فراہم کر دو۔"

"کس قسم کی معلومات...؟"

"پہلی یہ کہ آج تک... فرض کرو گزشتہ ایک مہینے میں اُس نے کون کون سے ٹرک پر مال بھیجا ہے" مَیں نے کہا "اس ٹرک کا ڈرائیور کون تھا، میرا خیال ہے کہ وہ مخصوص ٹرک ڈرائیوروں سے کام لیتا ہوگا۔"

چکری نے اقرار میں سر ہلایا "یہ... یہ تو ٹھیک ہے۔"

"گڈ، اس کے علاوہ بتاؤ کہ وہ ٹرک کہاں گئے تھے" مَیں نے کہا۔

"اس کے سارے ٹرک کراچی جاتے ہیں" چکری نے کہا۔

"چلو پھر یہ رہنے دو" مَیں نے کہا "کچھ معلوم ہے وہ کیا مال بھیجتا رہا ہے؟"

"مَیں نے عرض کی تھی کہ مشینوں کے پُرزے..."

"چکری! میرا خیال ہے کہ تم حقیقت جانتے ہو مگر بتاتے ہوئے ڈرتے ہو" مَیں نے کہا "کیا یہ غلط ہے کہ اس مال میں اسلحہ بھی ہوتا ہے۔"

چکری کا رنگ اُڑ گیا "دیکھیں جی، ایسی بات مت کریں۔"

"یہ سچ ہے یا غلط؟" مَیں نے کہا۔

"سچ ہے، میرا مطلب ہے ہوگا، مَیں کیسے کہوں؟"

"تم کچھ مت کہو، ہم جانتے ہیں" مَیں نے کہا "مگر تم کو معلوم نہیں کہ یہ اسلحہ کراچی سے آگے کہاں جاتا ہے۔ یہ جاتا ہے مشرقی پاکستان اور وہاں کے تخریب کاروں کو، علیحدگی پسندوں کو اور پاکستان کے دُشمنوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہاں کے کیا حالات ہیں؟"

"آپ... آپ کون ہیں جی؟" چکری سہم گیا تھا۔

"ہم ان لوگوں کے گروہ کے پیچھے ہیں" مَیں نے کہا "یہ غدار لوگ ہیں، بہت سے پکڑے جا چکے ہیں، کچھ مارے گئے ہیں، بہت سا اسلحہ تباہ کیا جا چکا ہے مگر یہ سلسلہ بند نہیں ہُوا۔ ان کو دُشمن سے پیسہ ملتا ہے۔ ممکن ہے تم نے ہمارا نام سُنا ہو۔ یہ میں سکندر ہوں، یہ محسن ہے۔"

ایک دم اپنی شناخت ظاہر کر کے مَیں نے رسک ضرور لیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ یہ رسک نہیں ہے اور جیسے ہماری تحریک کا ایک حامی پنڈت مل گیا تھا اور اس کے بعد بحر سلطان ملا تھا، ایسے ہی لوگوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ہماری مدد کر سکتے ہیں اور ہمارے لیے کام کر سکتے ہیں۔ چکری کے خیالات جان کر مَیں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چکری اگر دوست نہ بنا تو دُشمن کبھی نہ ہوگا، اگر وہ بزدل تھا تو شاید کھل کر ہمارا ساتھ نہ دے مگر دل سے وہ یقیناً ہمارا ساتھی ہوگا۔

چکری کچھ دیر بے یقینی سے مجھے اور محسن کو دیکھتا رہا "تم... تم دونوں وہی ہو جنھوں نے دو ڈاکوؤں کو پکڑا تھا۔ گودا ڈاکو اور پاٹے خاں کو، جو جیل سے فرار ہوئے تھے اور پولیس کو پھینٹی لگا کے اُن کی وردیاں اُتروا چکے تھے؟"

"بالکل ٹھیک" مَیں نے کہا "یہ تو ابھی کی بات ہے۔"

"مَیں نے تمھارے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے" وہ بولا۔

"کس سے سُنا ہے؟" مَیں نے کہا۔

"لوگوں سے، یہاں ٹرک ڈرائیور کلینر لاہور سے کراچی تک آتے جاتے ہیں تو سارے زمانے کی خبریں اکٹھی کر لاتے ہیں" وہ بولا "استاد پیڈرو کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ وہ کتنا ہے پیسے کی خاطر وہ اپنی ماں کو بیچ دے مگر یہ جو تم بتا رہے ہو، یہ عجیب سی بات ہے۔"

"کیا تم نے اسلحہ جاتا نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تو ہے" وہ بولا "اور... اور یہ بھی ہے کہ اس کام کا سیٹھ کو پتا نہیں مگر کچھ ڈرائیور بڑے... ہیں" اُس نے پھر وہی گالی دی جو اس سے پہلے پیڈرو کو دے چکا تھا۔

"تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں، وہ کیسے معلوم نہیں" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا "دُشمن کے ساتھ ان کے ایجنٹ مل گئے ہیں۔"

"تم تو بہت سمجھ دار نکلے یار" مَیں نے کہا "یہ پیڈرو انہی میں سے ایک ہے مگر اس کے اُوپر بہت سے لوگ ہیں۔ ایک بہت بڑے کارخانے کا پیڈرو ایک چھوٹا سا پُرزہ ہے اور ہم اس کارخانے کو ٹھکانے لگانے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کام میں تم ہماری مدد نہیں کرو گے؟"

"مَیں... مَیں کیا کر سکتا ہُوں جی! کیا مَیں اور کیا میری اوقات، مَیں بہت چھوٹا اور کمزور آدمی ہُوں، بہت معمولی حیثیت کا۔ میرے بیوی بچے ہیں، اُن کا بار اُٹھانا ہی بہت ہے۔" وہ بولا۔

"تمھیں کون سی توپ چلانا ہے چکری!" مَیں نے کہا "تم ایک پیشہ ور ڈرائیور ہو، تم کو کوئی زیادہ تنخواہ، بہتر سہولتوں کے ساتھ عزت کی نوکری دے تو کیا تم نہیں کرو گے؟"

"دیکھو، یہ بات ایسی نہیں کہ یہاں طے کی جائے" محسن نے کہا "تم اس لیے پس و پیش کر رہے ہو کہ تمھیں پوری بات معلوم نہیں ہوئی ہے، اگر مَیں کہوں کہ تم کو ایک سرکس کی گاڑی کا ڈرائیور بننا ہے تو تم کہو گے جی کہ یہ کیا مذاق ہے۔ ابھی آپ اسلحے اور دُشمن کے ایجنٹوں اور مشرقی پاکستان کے حالات کی بات کر رہے تھے اور اب آپ سرکس پر آ گئے۔ تم ہمیں بتاؤ کہ آج، کل، پرسوں میں تم دو چار گھنٹے نکال سکتے ہو؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"دو چار گھنٹے؟ کیوں نہیں جی!" وہ بولا۔

"تمہاری ڈیوٹی کب ختم ہوگی؟"

"ڈیوٹی تو رات تک چلتی ہے، دس گیارہ بجے تک۔"

"اور صبح شروع کب ہوتی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی نو دس بجے۔" وہ بولا۔ "لیکن میں سیٹھ سے دو چار گھنٹے کی چھٹی لے کر کہیں بھی جا سکتا ہوں، آپ بولو تو کل آ جاؤں؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "کل کس وقت؟"

"آپ حکم کرو۔" وہ بولا۔

"تم ایسا کرو، آج تو ہمیں ٹرک نمبر اور ڈرائیوروں کے نام بتاؤ، میرا مطلب ہے لکھ دو۔"

"لکھنا کیا جی، مجھے زبانی یاد ہیں۔ اکتیس اکونجا، ڈرائیور غلام دین، ستائی اُنیس ڈرائیور بادشاہ گل۔"

"ایسے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم اتنی جلدی ازبر نہیں کر سکتے اور اس کے علاوہ ہمیں زیادہ تفصیل چاہیے، مثلاً گزشتہ ماہ کی تاریخ وار رپورٹ کہ کون سا ٹرک کس تاریخ کو گیا اور کس کا مال لے کر گیا۔"

"پورے مہینے کی، یہ ذرا لمبا کام ہے، ہر ٹرک کے چار پھیرے تو ہوتے ہیں اور شاید دس ٹرک... ہاں، دس ہی ہیں جو اس ہیرا پھیری کے کام میں چالو ہیں۔" چکری نے سوچ کر کہا۔

"بس تو چالیس تاریخوں کا اندراج کرو۔ تمہارے لیے کوئی بہت لمبا کام نہیں۔ ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام تو تم زبانی لکھ لو گے، بس تاریخ اور مال کی تفصیل دیکھنا ہوگی۔ ایسا کرو کہ دس پرچیاں بنا لو، ہر پرچی پر الگ الگ لکھتے جاؤ۔ میرا خیال ہے، تمہارا آدھا گھنٹا صرف ہوگا۔"

چکری مسکرایا۔ "او نہیں جی! گھنٹا تو لگ جاتا ہے، پر آپ فکر مت کرو۔ رب نے چاہا تو کل آپ کو دے دوں گا۔"

میں نے دس ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ "یہ ہے اس کام کا معاوضہ۔"

اُس نے گڈی کی طرف دیکھا مگر ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ "یہ تو رشوت ہو گئی، کمائی تو نہ ہوئی جناب۔ آپ ایسا کریں، وہ جو بابو دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے، اُن میں سے ایک ٹرک بک کرتا ہے۔ گنجا اور موٹا، وہ بڑے شوق سے آپ کا کام کرے گا۔"

"لیکن ہم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے چکری۔" میں نے کہا۔

"اور مجھ پر اعتبار ہے آپ کو؟"

"ہاں، اس میں شک کی کون سی بات ہے۔ اعتبار نہ ہوتا تو تم کو اپنے بارے میں کیوں بتاتے؟"

"اعتبار ہوتا تو آپ مجھے خریدنے کی کوشش نہ کرتے۔" وہ بولا۔

"معاف کرنا۔" میں نے شرمندہ ہو کے کہا۔ "ہمارا یہ مطلب نہیں تھا تم کو برا لگا تو ہمیں افسوس ہے۔ کل تم دس گیارہ بجے فارغ مل سکتے ہو؟"

"صبح... میرا خیال ہے کہ آپ یا تو سویرے سویرے آ جائیں، سات بجے سے بھی پہلے۔ میں دس گیارہ بجے تک یہاں آ جاؤں، یا پھر اسی وقت آئیں تو میں رات تک آپ کے ساتھ رہوں۔" وہ بولا۔

"ہم کل شام اسی وقت آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ نے سرکس کی کیا بات کی تھی جناب!" وہ اترتے اترتے بولا۔

"ہاں، یہ جو ٹریلر خرید رہے ہیں ہم، اس میں ایک سرکس لے کر روانہ ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے کراچی تک تماشا دکھاتے جائیں گے، مقصد کچھ اور ہوگا، لوگ تماشا دیکھیں گے۔ ہم اور ہمارے کچھ ساتھی پبلک کو تماشے میں لگا کے اپنا کام کریں گے۔"

"سرکس میں کون کام کرے گا، آپ لوگ...؟"

"ہم بھی..." میں نے ہنس کر کہا۔ "ہمارے علاوہ ریچھ، بندر کا تماشا دکھانے والے ہوں گے، بہیرا ہوگا، مداری ہوگا، گھوڑے اور سائیکل سواری کے کرتب دکھانے والے ہوں گے۔ دو بھانڈ، ایک ڈھول بجانے والا اور دسویں تم جو صرف ڈرائیور ہو، ہمارے دوسرے معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ تمہاری مرضی کی بات ہے ورنہ سب کی طرح تم بھی سرکس کے ساتھ رہو گے ہم تو بس چلتے جائیں گے، دو دو چار چار دن رکتے ہوئے۔"

"سرکس کا تو مجھے بچپن سے بڑا شوق تھا۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں جی، وہاں لاہوری سرکس کا سال میں ایک دو بار پھیرا ہوتا تھا تو میں روز چلا جاتا تھا۔ ایسے روز جوتے کھاتا تھا مگر روز ماں کے پیسے چرا کے جاتا ضرور تھا، اللہ معاف کرے۔" اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ان کو میں نے بہت پریشان کیا تھا۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"اب اللہ میاں کے پاس، فسادات میں شہید ہو گئے تھے۔ بس آٹھ سال کا تھا جب اکیلا پاکستان پہنچا تھا۔ اسپیشل ٹرین میں ایک جاننے والے کے ساتھ بیٹھ گیا تھا، اُس نے لاہور میں چھوڑ دیا، بس اس کے بعد اپنی تو زندگی ایسے ہی گزری مگر ابھی چار سال ہوئے میں نے شادی کر لی ہے۔ ایک بڑے نیک دل حافظ جی کی بیٹی ہے، مسجد میں امامت کرتے تھے، پچھلے سال انتقال کر گئے۔ اب اس نیک بخت کا بھی کوئی نہیں۔ ہمارا ایک بچہ ہے جسے ہم انگلش اسکول میں پڑھائیں گے۔"

"ضرور پڑھانا مگر کیا اسے چھوڑ کر جاؤ گے، جب اس کا اللہ تمہارا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔"

"میں نے ابھی کون سا فیصلہ کر لیا ہے جی۔ گھر جا کے بات کروں گا اُس سے، وہ کیا کہتی ہے۔"

"اُس کو تم صرف یہ بتاؤ گے کہ تم نے ایک سرکس کی گاڑی چلانے کی نوکری قبول کی ہے، تنخواہ تین ہزار۔" میں نے کہا۔

"ابھی تو آپ بائیس سو بول رہے تھے۔"

"اس وقت ہمیں علم نہیں تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور اپنے بچے کو انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا چاہتے ہو۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

"وہ تو دور کی بات ہے جی، تین سال بعد داخلہ ہوگا۔"

"مگر اس کے لیے تیاری تو ابھی سے کرنا ہوگی تمہیں۔ تمہارے کھانے پینے کا خرچ کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ رہو گے، اگر تم چار ہو گے تو پوری تنخواہ تین ہزار روپے ہر ماہ تمہاری بیوی کو یہاں دے دی جائے گی، تم جہاں بھی ہو گے..."

"میں پندرہ دن میں ایک بار تو اُس سے ملنے کے لیے اسکوں گا نا؟"

"صاف بات یہ ہے چکری کہ ہم وعدہ نہیں کر سکتے۔" میں نے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہفتے بھر بعد آ جاؤ۔" محسن نے کہا۔ "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کو پورا مہینہ موقع نہ ملے۔"

"ویسے ڈرائیور کا اتنا کام نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم کسی جگہ دو چار دن کے لیے قیام کریں گے تو تمہاری چھٹی ہی ہوگی۔"

"پھر... پھر تو میں چلوں گا جی... ضرور چلوں گا۔" وہ بولا۔

"ایک بات اور بتا دیں مجھے، یہ نوکری پکی ہے کہ کچی؟"

"پکی... سو فیصد پکی، جب تک ہم ہیں تم ہمارے ساتھ ہو۔" میں نے کہا۔

اُس نے ایک بار پھر ہم سے مصافحہ کیا اور نیچے اُتر گیا۔

"مسٹر سکندرِ اعظم۔" محسن نے کہا۔ "بھروسا اچھی چیز ہے مگر اس میں اتنی عجلت کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا مطلب؟" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ تو نے ایک دم اس پر اپنی شناخت ظاہر کر دی، یہ رسک کیوں لیا تو نے؟"

"میری چھٹی حس نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ آدمی اعتماد کے قابل ہے۔"

"میری ساتویں حس کہتی ہے کہ ہم سے غلطی ہوئی۔" محسن نے کہا۔ "وہ چکری کیوں مشہور ہو گیا آخر، ذرا گاڑی روک لے، اس بس کے پیچھے۔"

"زبانِ خلق نے مشہور کر دیا اور کیا۔" میں نے کہا اور گاڑی روک لی۔

"زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ بُرا کے جسے دُنیا اُسے بُرا سمجھو۔"

"کیا اس کے جواب میں مرزا غالب کا فرمایا ہُوا مستند نہیں ہو گا؟" میں نے کہا۔ "ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔ آج تک میری چھٹی حس نے تیری ساتویں حس کو غلط ثابت کیا ہے۔"

"عزیزم! فرمایا ہے شیکسپیئر نے کہ یہ دُنیا ایک اسٹیج ہے اور اس میں رہنے والے سب اداکار۔" محسن نے کہا۔ "کیا ہم اداکار اور بہروپیے نہیں ہیں۔ دن رات میک اپ بدل کے کبھی کچھ بن جاتے ہیں تو کبھی کچھ۔ دلاور سے بڑا ایکٹر دیکھا تھا پہلے کبھی... مگر بی بی زیب النسا نے اپنی معصوم اداکاری سے اور بھولپن سے ہماری عیاری اور مستعدی، ہوشیاری اور مردانگی کو کیا خوبصورت مات دی اور ثابت کر دیا کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔"

"میرے کوہِ نور ہیرے، اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"ابھی کچھ نہیں ہُوا۔" محسن بولا۔ "لیکن غور کر دوسرے امکانات پر کہ چکری سچ مچ چکر باز ہُوا تو کیا ہوگا۔ ہم اس مرحلے پر جُوا نہیں کھیل سکتے دوست! ہم صرف اپنی کامیابی کو داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ پانسا غلط پڑ جائے تو سب جدوجہد کا حاصل ناکامی، ساری پلاننگ کا ملبہ۔"

اُس کی بات نے مجھے اپنی جلد بازی پر متفکر کر دیا۔ "پھر اب کیا کریں؟"

اس سے پہلے کہ محسن جواب دیتا، میں نے چکری کو اس ٹرک کمپنی سے باہر آتا دیکھا۔ ہم جس بس کے پیچھے تھے، وہ مدت سے خراب کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر پڑی ہوئی گرد کی تہ اور کسمپرسی کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ دو ٹائروں کی ہوا نکل گئی تھی یا مہم جُو بچوں نے نکال دی تھی۔ اندر کی سیٹوں پر کچھ پھٹے پُرانے کپڑے ظاہر کرتے تھے کہ اس ڈبے کی حرکت پذیری ختم ہو جانے کا فائدہ کسی بے گھر نے اُٹھایا تھا اور اپنے بیڈ روم کو فٹ پاتھ سے بس کے اندر شفٹ کر لیا تھا۔ یہ جگ رین بسیرا بنے نہ تیرا نہ میرا۔ جس دن کوئی بس کو لینے آ گیا تو ہم بھی اپنا بوریا بستر اُٹھا لیں گے۔ پائے گدا لنگ نیست۔ ملکِ خدا تنگ نیست۔ میں اور محسن اپنی گاڑی سے اُتر کے بس میں چڑھ گئے اور اگلے شیشے سے دیکھنے لگے۔ چکری کی نظریں کسی رکشا ٹیکسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے کئی بار ہاتھ دیا مگر قریب آنے پر وہ رکشا ٹیکسی بھرے ہوئے ملتے۔ اُس کی صورت پر اب ایک ایسا اضطراب تھا جو اُس کے کچھ دیر پہلے کے سکون سے بہت مختلف لگتا تھا یا شاید یہ محسن کا پیدا کردہ شک تھا جس نے میری نگاہ کو مشکوک کر دیا تھا۔ بالآخر ایک خالی رکشا اس کے اشارے پر رُک گیا مگر پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ ان کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ دو منٹ میں تکرار نے تنازعے کی شکل اختیار کر لی اور رکشا ڈرائیور

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے نیچے اُتر کے چکری کو پکڑ لیا۔ چند لوگ اتنی دیر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم دست و گریباں ہونے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں معروف تھے۔

مَیں نے محسن کو اشارہ کیا اور ہم دونوں بس کے گیٹ سے اُتر کے بھیڑ کے پیچھے مگر بس کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ایک نسبتاً تندرست شخص نے جھگڑا ختم کرا دیا تھا اور اب جسٹس آف پیس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"او پہلوان جی! مَیں کہیا کہ میں جا ریا آں چو بُرجی وَل" رکشا والے نے کہنا شروع کیا "میرا جی ٹھیک نئیں سی، فیر وی مَیں کہیا کہ چلو رستے دی سواری لبدی اے تے لے لواں، مَیں رہنا واں اُتھے۔۔۔"

"او یار! ایویں بہانے بازیاں کر دے او تُسی لوگ" چکری بول پڑا۔

"قسم رب دی مینوں بخار اے، تُسی آپ ویکھ لو" رکشا والے نے ہاتھ آگے بڑھایا "مَیں تے گھر جا کے آرام کرن دی سوچ رہیا سی، ایہہ مگر ہو گیا کہ مینوں لے کے چل۔"

"جاناں کتھے سی یار؟" پہلوان نے رکشا والے کا ہاتھ تھاما اور قائل ہو کے کہا "بخار تے ہے غریب نوں۔"

"اینے جاناں سی کسی پولیس افسر دے گھر" رکشا والے نے فریاد کرتے ہوئے کہا "پتا نہیں کیہڑا توپ خاں سی۔"

"مَیں ایس ایس پی سراج دی کوٹھی تے جاناں سی" چکری نے چلّا کے کہا۔

"تے ہور رکشے تھوڑے نے" پہلوان نے کہا "ایدے نال کیوں پیاز بردستی کرنا ایں۔"

"کتھے نے رکشے؟" چکری نے برہمی سے کہا "تُساں ٹُٹ گیاں نے میریاں کھلوتے ہوئے۔"

"او جی مینوں کہندا کہ تیرا تے بیوی جلے گا" رکشا والا پہلوان کی حمایت پا کر اکڑ گیا "مَیں کہیا کہ خبردار جے بیوی دا ناں لیا۔"

"چل میاں تُوں جا" پہلوان نے رکشے والے کو رخصت کیا اور چکری کو گردن سے دبوچ لیا "تیرے اس پولیس افسر دی تے مَیں۔۔۔" اُس نے پولیس افسر کے نام سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والے چکری کو زبردست گالی کے ساتھ ایسا جھٹکا دیا کہ وہ نیچے گر گیا "جا ہُن اُس اپنے پیو نوں دس دئیں میرا ناں، پھانسی لا دیوے مینوں، پولیس افسر دا پُتر۔"

دیگر حاضرین نے بھی اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ نہ صرف پولیس خود کو پبلک کا آقا سمجھتی ہے بلکہ ان کے چمچے تک فرعون بنے پھرتے ہیں مگر ابھی یہ مجمع منتشر بھی نہیں ہوا تھا کہ مَیں اور محسن واپس دوڑے۔ ہم نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے اُسے تقریباً پچاس گز بیک کیا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی کہ مَیں نے گاڑی کو یو ٹرن دیا اور ٹریفک میں شامل ہو گیا۔

"اب فرمائیے" محسن نے میری گُدّی پر ہاتھ مارا۔

"حضرت۔۔۔ یہ کیا، دھول دھپّا تو شرفا کا شیوہ نہیں ہے" مَیں نے گردن سہلا کے کہا "اگر آپ کی ساتویں حس آج اتفاقاً۔۔۔"

"اتفاقاً؟" محسن نے مجھے دوسرا ہاتھ مارنے کی کوشش کی "میری ساتویں حس ہمیشہ صحیح خبر دیتی ہے۔"

"یار، مَیں گاڑی چلا رہا ہوں" مَیں نے کہا "گاڑی گھس جائے گی کسی کے ریڑھے میں۔"

"اس وقت قدرت نے ہماری مدد کی، اگر اس رکشا ڈرائیور کو بخار نہ ہوتا تو یہ جھگڑا کھڑا نہ ہوتا۔ چکری اس میں خاموشی سے بیٹھتا اور ہمیں خاک پتا نہ چلتا کہ وہ کدھر گیا؟" محسن نے مجھے ڈانٹنا جاری رکھا۔

یہ قدرت کی طرف سے ملنے والا ایک سبق تھا۔ مَیں خود اعتمادی اور قیافہ شناسی کی صلاحیت کے مظاہرے میں حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس امر کے باوجود کہ زیب النساء نے جو دھوکا دیا تھا اس کا زخم تازہ تھا۔ محسن نے ٹھیک کہا تھا، ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ رسک لے سکیں اور جُوا کھیل سکیں۔ اب یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا کہ خدانخواستہ چکری نکل کر سراج کے پاس جا پہنچتا تو کیا ہوتا۔ ہماری سرکس کی اسکیم دیوانے کا خواب بن جاتی۔ اتنا بڑا پلان ایک چھوٹی سی غلطی کی نذر ہو جاتا اور ساری ذمے داری مجھ پر آتی جس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ اب تو ہمیں جان لینا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ سارے چہرے وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں اور انسان ہی انسان کو دوستی، نیک نیتی اور شرافت کے نام پر دھوکا دیتے ہیں، ان سے دشمنی کرتے ہیں اور نفرتوں کا زہر بانٹتے ہیں۔

پیڈرو کو وہاں دیکھتے ہی مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہاں ہمارا دوست اور حامی یا ہم خیال کوئی نہیں ہو سکتا۔ دلاور اینڈ کمپنی کا سارا کاروبار مخصوص مفادات رکھنے والے لوگوں کے باہمی اشتراک سے چل رہا ہے۔ وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں جا سکتے جہاں انھیں کسی ایک آدمی سے بھی اندیشہ ہو کہ وہ مستقبل میں کسی مرحلے پر ان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ جب اُنھوں نے اس گلڈ تھیٹر اینڈ ایجنسی کا انتخاب کیا ہوگا تو پوری طرح اطمینان کر لیا ہوگا کہ یہاں سب انھی کے جیسے ہیں۔ اُنھوں نے فرداً فرداً سب کو آزمایا ہوگا کہ کس میں حب الوطنی کے جراثیم ہیں اور کون ایمان کو پیسے سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ ایسے تمام افراد کو اُنھوں نے نکلوا دیا ہوگا اور اُن کی جگہ ایسے آدمی رکھوا دیے ہوں گے۔ اب ایک طرح سے یہ اُن کی اپنی کمپنی تھی جس میں سب مل کے کام کر رہے تھے۔ سب وطن کی آزادی اور سلامتی کو بیچ رہے تھے اور اپنے خزانے بھر رہے تھے چونکہ سب مجرم تھے اور سب زر پرست تھے اس لیے کسی کو کسی سے ڈر نہیں تھا۔ کوئی کسی پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا اور کسی کو الزام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک زدہ ہوتے ہیں جو اپنی آنکھ میں شہتیر نہیں دیکھتے مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتے ہیں۔ یہاں تو سب ہی وہ تھے جن کی آنکھوں میں شہتیر تھے۔

محسن بھی مجھے پشیمان دیکھ کر خاموش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ غلطی کا احساس ہی تجربے کا نام ہے اور انسان غلطیاں نہ کرے تو کچھ نہ سیکھے۔ غلطی اس سے بھی ہو سکتی تھی اور کسی سے بھی ہو سکتی تھی چنانچہ مجھے زیادہ کچھ کہنا بے کار تھا۔ سراج کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے وہ سب باتیں یاد آئیں جو مَیں نے اور محسن نے چکری سے کی تھیں۔

"یار محسن! ہم نے اُسے بہت کچھ بتا دیا" مَیں نے کہا۔ "تُو نے بھی مجھے نہیں روکا، میرے ساتھ شامل ہو گیا۔"

"بھائی صاحب! مَیں روک کے کیا کرتا اور روکتا کیسے؟ جب آپ نے اُسے بتا دیا کہ ہم کون ہیں، اپنے ساتھ میرا تعارف بھی کروایا تو مَیں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے، جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر، مَیں کیسے شامل نہ ہوتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی خود سوئمنگ پول میں کود جائے اور اپنے ساتھ دوسرے کو بھی لے جائے، جب ڈوبنے لگے تو کہے کہ مَیں تو ڈوب ہی رہا ہوں، تم کیوں ڈوب رہے ہو" محسن بولا۔

"میرا خیال ہے اس نے سراج کو فون کیا ہوگا؟" مَیں نے کہا۔

"یہاں سے نہیں؟" محسن بولا "وہاں ایک ازدحام تھا۔ ان سب کے درمیان رہتے ہوئے وہ کسی ایس ایس پی سے بات کرتا تو اس کا راز فاش ہو جاتا۔ وہ ایک معمولی ڈرائیور ہے، اس کا کسی ایس ایس پی سے کیا تعلق؟"

"تعلق تو سب کا ہوگا" مَیں نے کہا۔

"کاروبار کی حد تک" محسن بولا "وہ جانتے ہوں گے کہ ٹرک میں کیا مال جا رہا ہے اور کہاں جائے گا۔ ان کو اس کام کا معاوضہ بھی بہت معقول ملتا ہوگا لیکن ڈرائیور صرف پیڈرو کو جانتے ہوں گے۔ وہی مال لاتا ہوگا اور ادائیگی کرتا ہوگا۔ ان کے نزدیک وہ کسی کمپنی کا مینیجر ہے۔ چکری خاص آدمی ہے کیونکہ وہ چکری ہے، دوسروں سے زیادہ مکار اور چالاک ہے۔ اُسے سراج نے اپنے مخبر کے طور پر یہاں چھوڑ رکھا ہوگا کہ کبھی کوئی مشکوک معاملہ دیکھے تو فوراً اطلاع دے۔ شاید وہی ایک شخص ہوگا جو یہ جانتا ہوگا کہ اس کاروبار میں ایس ایس پی سراج کا حصہ بھی ہے۔ ممکن ہے اُسے دوسروں کی خبر نہ ہو۔ مخبر کے ذریعے اندر کی باتیں اور خبریں جاننے کا طریقہ پولیس والے استعمال کرتے ہیں اور یہ ذمے داری سراج نے قبول کر رکھی ہوگی کہ وہ نمک خوار ڈرائیوروں میں ایک ایسا آدمی چھوڑ دے جو ان کی ہر بات آگے پہنچاتا رہے اور پل پل کی خبر دیتا رہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُسے دلاور اور جمشید وغیرہ کے پورے گروہ کی خبر ہو۔ وہ ایس پی کو رپورٹ دینے پر مامور ہوگا اور اس اعزاز پر ہی مطمئن ہوگا کہ وہ شاہ کا مصاحب ہے۔ ایس ایس پی کا افسر بکار خاص بھی کم تو نہیں ہوتا۔ تُو نے دیکھا وہ رکشا والے سے کس طرح اکڑ گیا تھا جیسے وہ خود ایس پی ہو۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ کل اُس رکشے والے کو اس نافرمانی کی سزا ملے گی۔ چکری نے نمبر نوٹ کر لیا ہوگا اس گستاخ رکشا ڈرائیور کا۔"

"ہم بال بال بچ گئے" محسن بولا۔

"ہاں، چکری نے فون پر بات کرنے کے بجائے بقدم خود حاضر ہو کے ایس پی صاحب کو ایک سنسنی خیز رپورٹ دینا بہتر سمجھا۔ یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ اس کا انعام بھی بہت بڑا ملتا۔ وہ اندر گیا اور ضروری کام کا بہانہ کر کے نکل آیا۔ یہ مزید اچھا ہوا کہ اتنی دیر میں ہم نے گاڑی وہاں سے ہٹا لی تھی۔ چکری نے باہر آتے ہی اپنا اطمینان کر لیا ہوگا کہ ہم چلے گئے" مَیں نے کہا۔

"کتنے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اُس نے دس ہزار لینے سے انکار کر دیا" محسن نے کہا "سالا ڈرامے باز۔۔۔"

"اُسے دس ہزار کے دُگنے انعام میں ملنے کی اُمید ہو گی۔ نمک حرامی کرنے کا معاوضہ لینے میں خطرہ تھا۔ نمک حلال ثابت کرنے میں آئندہ کے لیے بھی اپنی اہمیت اور افادیت کا تعین دلایا جا سکتا تھا اور خود کو بہتر ذمے داریوں کا اہل ثابت کیا جا سکتا تھا۔"

"اب ذرا سوچ لو کہ کیا کرنا ہے" محسن بولا "ہم سراج کے گھر کے آس پاس بھی نہیں جا سکتے۔"

"ہم اُسے راستے میں ہی روک لیں گے، جب ہم روانہ ہوئے تھے تو وہ دوسرے رکشے کا انتظار کر رہا تھا" مَیں نے کہا "رکشا کسی طرح بھی ہم سے پہلے نہیں پہنچ سکتا۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم اسے کس راستے پر اور کہاں روکیں گے۔"

"ایک رکشا والا بن کے سوچ" مَیں نے کہا "تو کون سا راستہ اختیار کرتا۔"

"سوچ لیا" محسن بولا "اب بھی دو راستے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ ایک راستے پر مَیں نظر رکھوں گا، دوسرے پر تُو ناکا بندی کرے گا" مَیں نے کہا "گاڑی تیسری جگہ ہو گی۔ اس کام میں کوتاہی کی گنجائش نہیں۔ چکری کو ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔ اب دیکھ، اگلے موڑ پر مَیں تجھے ڈراپ کرتا ہوں، وہاں سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سراج کے گھر کا فاصلہ شاید ایک فرلانگ سے بھی کم ہے۔ اس موڑ کے بعد والی سڑک سیدھی سراج کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتی ہے۔"

"رکشا اسی سڑک پر مخالف سمت سے بھی آ سکتا ہے۔"

"ہاں، میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تجھے سراج کی کوٹھی کے بالکل سامنے سے گزر کے جانا ہوگا۔"

"ہاں، میں تیزی سے نکل جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ایک تو رات کا وقت ہے پھر یہ گاڑی سرکاری ہے اور میرا حلیہ بھی وہ نہیں جو پہلے تھا۔"

"پھر بھی یہ چانس تو ہے کہ پولیس تجھے روک لے۔" محسن نے کہا۔

"ہاں، چانس تو ہے مگر میں یہ چانس لوں گا کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اگر میں نے سڑک کے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے متبادل راستہ اختیار کیا تو تین میل کا چکر پڑے گا اور چکری کو بہت وقت مل جائے گا۔"

محسن نے سر ہلایا اور مائکروبس کی رفتار کم ہوتے ہی نیچے کود گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ موڑ کاٹتے ہی مجھے سراج کی کوٹھی کا گیٹ نظر آنے لگا۔ وہاں دونوں جانب سرچ لائٹس کا اُجالا تھا اور سڑک کے ساتھ پولیس کا ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک جیپ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ حفاظتی انتظامات بدستور انتہائی سخت تھے۔ ابھی میں گیٹ سے سو گز دور تھا کہ کہیں سے اچانک ایک شخص نکل کے سڑک کے درمیان میں آ گیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا لیکن اس کی سفید شلوار قمیص اور اس کے جوتے، اس کے بالوں کا کٹ اور اس کی صورت کی سفاک بے حسی خود بتاتی تھی کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔

میں نے بریک لگا کے گاڑی روک لی۔ "السلام علیکم، خو کیا بات ہے یارا، مرنے کا صلاح ہے؟"

"کس کی گاڑی ہے؟" اس نے ٹارچ سے مائکروبس کی سائیڈ پر روشنی ڈالی۔ "ڈائریکٹوریٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل۔"

"خو گورنمنٹ کا گاڑی ہے۔" میں نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"[illegible] جا رہے ہو اس وقت؟" وہ ٹارچ سے اندر لائٹ [illegible] بولا۔

"[illegible] صاحب کا فیملی کو لینے۔" میں نے کہا۔ "کیا بات [illegible] ایسا؟"

[illegible] وہ مسکرا کے بولا۔ "بک بک مت کرو، جاؤ۔"

[illegible] انداز میں زیرِ لب اُسے گالی دی اور سر کو ناقابلِ فہم انداز میں ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کلیئرنس مل جانے پر اطمینان کا گہرا سانس بھی میں نے اس وقت لیا جب میں کوٹھی کے سامنے سے گزر گیا۔ آگے ایک اور شخص ٹہل رہا تھا مگر وہ دوسری طرف سے آنے والی گاڑیوں کو چیک کرنے پر مامور تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے کلیئرنس مل چکی ہے۔ وہ سارا دن آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے رہے تھے اور اس بیزار کن کام کی یکسانیت سے اُکتا گئے تھے جس کا حاصل کچھ نہیں ہوا تھا، اب وہ سرکاری ڈیوٹی کو دلچسپی کے بغیر ایک رسمی کارروائی سمجھ کے پورا کر رہے تھے۔ گاڑی سرکاری نہ ہوتی تو شاید وہ مجھ سے کاغذات طلب کرتے اور مجھے زیادہ غور سے دیکھتے مگر گورنمنٹ آف ویسٹ پاکستان کے نام نے اُن کے سارے شکوک رفع کر دیے تھے۔

میں تقریباً پچاس گز جا کے دائیں طرف مُڑا۔ وہاں گاڑی کو چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اُسے میں نے راستے سے بہت ہٹا کے اور سڑک کے ایک تاریک حصے میں کھڑا کیا اور خود پیدل چل کے اور آگے چلا گیا۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک جانب کوئی فارم یا باغ تھا جس کی کچی پکی دیوار جگہ جگہ سے منہدم ہو گئی تھی اور اندر درخت اندھیرے میں سرنگوں دیوزادوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ دوسری طرف پُرانی وضع کے سرکاری بنگلے تھے جن میں پہلے اصلی گورے حاکم رہتے ہوں گے۔ اب ان میں سراج جیسے کالے افسر رہتے تھے جو بلحاظِ ذہنیت پُرانے فرنگی آقاؤں کے صحیح جانشین ثابت ہو رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ میری نسبت محسن کا کام زیادہ مشکل ہوگا۔ اگر اُس نے چکری کو قابو میں کر لیا تب بھی اُسے گاڑی تک تو رکشا ہی میں آنا پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ محسن کو چکری کے علاوہ رکشے والے سے بھی نمٹنا ہوگا اور ان دونوں میں سے ایک نے بھی شور مچا دیا تو... مگر ریوالور کی نال کو سامنے دیکھ کر موت کو آواز کون دے گا؟ پھر بھی اُسے گیٹ کے سامنے سے تو گزرنا ہی ہوگا۔ وہ ریوالور دیکھ کر مزاحمت نہ کریں مگر اتنے مسلح محافظوں کی موجودگی ان کو واویلے پر اُکسائے گی۔ پھر محسن کیا کرے گا؟ بفرضِ محال اُس نے دونوں کو گولی مار دی تب بھی وہ کیا رکشے میں فرار ہو سکے گا۔ پولیس والے جیپ لے کر اس کے پیچھے دوڑیں گے۔

مجھے پلاننگ میں خامی کا احساس ہُوا۔ بہتر ہوتا اگر میں محسن کو واپس لوٹ جانے کو کہتا۔ اسے آگے آنے کا مشورہ نہ دیتا، جہاں گاڑی کھڑی ہوگی۔ وہ رکشے کو کسی خطرے کے بغیر واپس لے جا سکتا تھا۔ گاڑی کو درمیان میں کہیں روکنے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا مانگی کہ چکری اس طرف نہ آئے۔ ویسے زیادہ امکان یہی تھا کہ چکری کا راستہ میں کاٹوں گا۔ بیشتر رکشے والے دوسری طرف سے آنا پسند نہیں کر سکتے کیونکہ اس طرف کی سڑک بہت خستہ حالت میں تھی۔ گاڑی میں بھی مجھے ہچکولے محسوس ہوئے تھے۔ رکشے کے پہیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اس میں تو پائلٹ اور مسافر دونوں گیند کی طرح اُچھلتے ہوں گے۔

میں ایک درخت کے چوڑے تنے کی آڑ لے کر کھڑا ہُوا تھا اور ایک ہی سمت میں دیکھ رہا تھا جدھر سے رکشے کے نمودار ہونے کی اُمید تھی۔ اس کی ایک روشن آنکھ بعد میں نمودار ہوئی، رات کی خاموشی کو اُس کے سائیلنسر کی کرخت آواز نے پہلے منتشر کیا۔ میں چوکس ہو گیا۔ آواز بڑھتی گئی اور وہ روشنی قریب آتی گئی۔

صحیح وقت پر میں نے نیچے سے پتھر اُٹھا کے رکشے پر پھینکا۔ پتھر اُس کے سامنے والے حصے سے ٹکرایا۔ رکشا ایک دم رُک گیا اور رکشے والا گالی دے کر نیچے اُترا۔ مجھے صرف اتنی مہلت درکار تھی کہ میں پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھ سکوں مگر وہ مجھے اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہُوا یار؟" میں نے چکری کی آواز سُنی۔

"پتا نئیں کون... کسی نے وٹا ماریا سی۔" رکشے والا پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ "لائٹ ٹُٹ جاندی تے فیر۔"

"او چل یار! جب ٹوٹی نہیں تو..." چکری نے کہا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں درخت کے تنے کی اوٹ سے نکلا اور آہٹ کیے بغیر رکشے کے پیچھے جا پہنچا۔ میں نے دس قدم کا فاصلہ بہت جھک کر طے کیا تھا چنانچہ رکشے والا مجھے نہ دیکھ سکا۔ میں نے بڑی پھرتی سے چکری کے مُنہ پر ایک ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے سر پر ریوالور مارا۔ اُس کی آواز تو نہیں نکلی مگر وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپا تو رکشا بُری طرح ہلا اور رکشے والے نے ایک دم پلٹ کے دیکھا۔

"چوپ..." میں نے چکری کو چھوڑ کے ریوالور کا رُخ اُس کی طرف کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آواز نہ نکلے۔"

اُس نے رضاکارانہ طور پر ہاتھ اُٹھا دیے [illegible] ایک لاشعوری قسم کا ردِعمل تھا۔ عموماً فلموں میں وہ شخص ہینڈز اَپ کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے ہاتھ میں ریوالور ہو۔

"کیا... کیا چاہتے ہو؟" وہ ہکلا کے بولا۔ "مال...؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ مال اُٹھاؤ اور جاؤ، بالکل خاموشی کے ساتھ، جس راستے سے آئے تھے، اُسی سے لوٹ جاؤ اور اس واقعے کو بھول جاؤ، سمجھو کہ نہ کوئی مسافر سوار ہُوا، نہ تم یہاں آئے اور نہ مجھ سے ملے۔" میں نے چکری کو باہر کھینچ لیا۔ "میری صورت مت دیکھو، جاؤ۔" میں نے ریوالور سے رکشے والے کو اشارہ کیا۔ "میں تمہاری جان لینا نہیں چاہتا۔"

"خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

"ڈرو نہیں، کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر تم نے خود ہی کسی سے یہ بات کی تو پھر سمجھ لو کہ اپنی گرفتاری کا سامان خود کرو گے۔ جو بات ایک بار ہونٹوں سے نکل جائے وہ کوٹھے چڑھ جاتی ہے۔ اس نے تمہارے رکشے کا نمبر نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی بھی مسافر بیٹھنے سے پہلے رکشے کا نمبر حفظ نہیں کرتا مگر تم نے بیوی کو بھی بتایا تو سمجھ لینا کہ وہ بیوہ ہوئی۔ عورت کو کبھی وہ راز مت بتاؤ جس سے تمہاری زندگی اور سلامتی وابستہ ہو۔"

"وہ بے چاری تو کب کی اللہ کو پیاری ہو گئی۔" وہ بولا۔

"بس تو پھر وہی کرو جو میں نے کہا۔ بھول جاؤ اس واقعے کو۔"

اُس نے تعمیل کی۔ رکشا واپس موڑا اور آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا۔ شاید اُسے میری بات پر پوری طرح اعتبار نہیں آیا تھا کہ میں اس کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کا خیال ہوگا کہ اُس کے پلٹتے ہی میں گولی چلا دوں گا پھر جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا گیا اس کا یقین بھی بڑھتا گیا اور اُس کے رکشے کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔ میں نے چکری کو اُٹھا کے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں میں نے اُسے گاڑی میں پھینک دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے سوچا کہ محسن کی طرف لوٹ جاؤں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسی راستے سے گزرا تھا۔ راستے پر گاڑیاں چیک کرنے والے سرکاری گاڑی کو پہچان لیں گے اور مجھے گزر جانے دیں گے مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دوبارہ روک لیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ میں ڈائریکٹر صاحب کی فیملی کو لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ اُنھوں نے ٹارچ کی روشنی میں اس فیملی کو دیکھنا چاہا تو اُنھیں صرف چکری نظر آئے گا، بے ہوش لیکن ایک نظر میں لاش نظر آنے والا۔ اس کے علاوہ اب مجھے پہلے وہ روکے گا جس نے آتے وقت نہیں روکا تھا۔

یہ سوچ کے میں نے گاڑی کو اُسی سمت میں بڑھا دیا جدھر رکشا گیا تھا۔ مجھے اب کم سے کم تین چار میل کا چکر کاٹ کے وہاں پہنچنا تھا جہاں محسن کو ڈراپ کیا تھا۔ پون گھنٹا پہلے کی بات تھی۔ دوبارہ وہاں پہنچنے میں پندرہ بیس منٹ صرف ہونا لازمی تھے۔ محسن یقیناً پریشان ہوگا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ چکری کو دوسرا رکشا پانچ دس منٹ بعد مل جانا چاہیے اور اس طرح ہمارے اور اُس کے ایک ہی جگہ پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کا فرق ہونا چاہیے۔ وہ جائے گا تو کہیں نہیں مگر اندیشے یقیناً اُسے پریشان رکھیں گے۔ ناکامی کے اندیشے، صورتِ حال کے برعکس ہو جانے کے اندیشے، میرے پولیس کے ہاتھ پڑ جانے یا کسی بھی غیر متوقع بات کے اندیشے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کم سے کم وقت میں محسن تک پہنچ جانے کے خیال سے میں نے رفتار زیادہ رکھی۔ نئی مائکروبس کا انجن پندرہ سو سی سی کی طاقت کا تھا اور سہر فاکس ویگن کی طرح اس کی پک اپ بھی غیر معمولی تھی۔ تنگ اور ناہموار سڑک پر میری ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ سن چھیاسٹھ سے پہلے کی فاکس ویگن میں چھ وولٹ کی بیٹری کی لائٹ بہت ہی کم ہوتی تھی۔ اب بارہ وولٹ سے بھی ہیڈ لائٹس اتنی تیز نہیں تھیں جتنی کہ نئی جاپانی کاروں میں ہوتی تھیں۔

وہ ایک بلائنڈ کارنر تھا جہاں میں نے پوری احتیاط کرتے ہوئے گاڑی کو موڑا تھا مگر دوسری طرف سے ایک ٹرک کسی پاگل ہاتھی کی طرح دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے اسٹیرنگ وھیل کو ایک دم بائیں جانب موڑ کے تصادم کو بچا لیا۔ ٹرک اس کے باوجود مائکروبس کی باڈی کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا۔ اس کا اگلا بمپر مائکروبس کے پچھلے بمپر پر لگا۔

لیکن یہ سب رفت گزشت والی بات ہو جاتی، اگر اسی وقت ایک حادثہ پیش نہ آتا۔ معلوم نہیں کس وقت چکری ہوش میں آگیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنا مشکل تھا۔ میں نے ناپ تول کے صحیح جگہ پر ضرب لگائی تھی مگر ہر انسان کی قوتِ مدافعت اور قوتِ برداشت جدا ہوتی ہے۔ بہ ظاہر بہت صحت مند نظر آنے والے کو سوئی چبھ جائے یا وہ خون کا ایک قطرہ بہتا دیکھ لے تو بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس کمزور نظر آنے والے کو گولی لگ جائے اور خون مسلسل بہہ رہا ہو تو وہ بے ہوش نہیں ہوتا اور مقابلہ کرتا ہے یا جان بچانے کے لیے اپنے پیروں پر چل کے کسی گھر یا اسپتال تک جا پہنچتا ہے۔

چکری موقع کا منتظر رہا اور جب موڑ آیا تو اس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اب میں رفتار لازمی طور پر کم کروں گا، ایک دم دروازہ کھول کر باہر چھلانگ ماردی، اگر یہ عام گاڑی ہوتی جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے تو چھو کر گزر جانے والا ٹرک اس دروازے سے ٹکراتا اور اسے توڑ کر سڑک پر گرا کے روندتا ہوا گزر جاتا مگر دروازہ سلائیڈنگ تھا اور تھوڑا سا پش کرتے سے کھسک کر سائڈ میں ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ادھر چکری نے باہر جست لی، ادھر ٹرک سامنے آگیا، اس کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی نہ تھی جس میں وہ خود کو بچانے کی کوشش کے بارے میں سوچ بھی سکتا۔ غالباً وہ ہوا ایسی ہی تھا جب ٹرک نے سامنے سے اس کو ٹکر ماری۔ مائکروبس کا دروازہ سامنے نہیں آیا مگر چکری آگیا۔

اگر ٹرک ذرا فاصلے سے گزرتا تو شاید چکری سڑک پر گرتا مگر اس صورت میں بھی اس کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے یا تو وہ مائکرو کے پچھلے پہیوں سے کچلا جاتا یا ٹرک کے پچھلے پہیوں سے۔ پیچھے کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، یہ میں نے سب نہیں دیکھا۔ میں نے عین اس وقت دروازے کے سلائیڈ کرنے کی آواز سنی تھی جب میں مائکروبس کو ٹرک کی زد سے بچا رہا تھا، دوسرے لمحے چکری کی ایک بہت مختصر سیکنڈ کے سودیں حصے تک یا اس سے بھی کم عرصے تک ارتعاش پیدا کرنے والی... دلخراش اور نزع کے کرب سے موت تک کے سفر کا عنوان بننے والی چیخ سنی پھر میں آگے نکل گیا اور میں نے بریک تو ذہن کے ایک خودکار ردِعمل کے طور پر لگا دیے تھے مگر مائکروبس کے رکتے رکتے بیس پچیس گز اور گزر گئے۔

ٹرک والے نے واضح طور پر سب دیکھا تھا اور شاید سمجھ بھی لیا تھا کہ فرشتۂ اجل نے کسی بدنصیب کو سامنے لا ڈالا ہے، تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اسے تو ایک فٹ کا فاصلہ یا سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی مہلت بھی نہ ملی۔ اس نے چکری کو سامنے سے ٹکراتے، گرتے اور مرتے دیکھا ہوگا۔ چکری شاید فضا میں تصادم کے فوراً بعد ہی مر گیا ہوگا۔ جب وہ سڑک پر گرا ہوگا تو لاش ہوگا اور ٹرک نے کسی جیتے جاگتے آدمی کو نہیں ایک لاش کو کچلا ہوگا۔

مائکروبس کو روکتے ہی میں نے سڑک کے وسط میں وہ دھبا سا دیکھا جو پچاس گز کے فاصلے سے یوں لگتا تھا جیسے سڑک پر کیچڑ ہے اور کچھ غلاظت پھیلی ہوئی ہے چکری سڑک پر پس کر دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اس کا خون، گوشت اور ہڈیاں سڑک پر گرد، تارکول، کنکر، پتھر اور گھاس پھونس میں مل کر یکجا ہو گئی تھیں۔ ٹرک والے عموماً ایسے معاملات میں سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کسی اور کے نقطہ نظر سے یہ سفاکی اور بربریت ہو سکتی ہے مگر ٹرک ڈرائیور جانتے ہیں کہ نادانستہ قتل کے الزام میں ان کو پولیس، کچہری اور جیل خانے کے کتنے پُرعذاب سالوں پر پھیلے ہوئے مرحلے جھیلنے ہوں گے۔ اس کا ارادہ کسی کو مارنے کا نہیں تھا چنانچہ اس کی سب سے بڑی سزا وہ ذہنی اذیت بنی ہوگی جو اس نے بعد میں اس منظر کا تصور کرکے کاٹی مگر اس وقت وہ رکا نہیں، سیدھا گزر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مرنے والا خودکشی کرنا چاہتا تھا، اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا پھر وہ خود کو کیوں نہ بچائے۔

معلوم نہیں آگے اس ٹرک کو کسی پولیس والے نے روکا یا نہیں۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو وہ کم ہی روکتے ہیں۔ ان کا شوق اور ان کی ہابی ہے، ان کو روکنا اور ٹھک دینا جو کمزور ہوں، اپنا دفاع نہ کر سکتے ہوں، دنیاوی طور پر لاوارث ہوں اور خود کو بے گناہ نہ ثابت کر سکتے ہوں چنانچہ ان پر کسی بھی جرم میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔

میں اس حادثے پر خاصا دل گرفتہ تھا۔ چکری نے مجھے چکر دیا تھا اور اس وقت یہ بھولا ہوا تھا کہ سب سے بڑی چکرباز تقدیر ہے۔ وہ اپنے آقائے ولی نعمت کی خدمت میں اپنے کارنامے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے حاضر ہونے دوڑا تھا کہ اس نے اپنی چالاکی اور ذہانت سے محسن اور سکندر کو کیا چکر دیا ہے مگر اسے علم نہ تھا کہ راستے تو اجل نے بند کر رکھے ہیں وہ سراج کو کچھ بتائے بغیر مر گیا تھا، یہ میرے نقطہ نظر سے اچھا ہوا تھا مگر میں ان بدنصیبوں کے عبرت ناک انجام پر افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا جو قدرت کے نظامِ انصاف کی گرفت میں آنے سے بچتے رہتے ہیں تو بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ دنیا کو چلانے کے لیے خالقِ کائنات نے اس نظام میں ایک توازن ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اب تک انسان کی فطرت اور سرشت میں شامل بدی کا عنصر غالب آچکا ہوتا اور شیطان ہی خدا کہلاتا۔

میں بے اختیار چند قدم آگے بڑھا۔ سڑک پر خون کی دو متوازی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ ان سے ذرا ہٹ کے چکری کے آدھے ادھورے ٹکڑے اور کپڑوں کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے مگر جس چیز نے مجھے متوجہ کیا، کچھ کاغذات تھے۔ غالباً ٹرک کی ٹکر کے ساتھ ہی یہ کاغذات اس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر گر گئے تھے۔ میں نے جھک کر ان کاغذوں کو اٹھانا چاہا تو مجھے ایک پرس بھی دکھائی دیا، میں نے اسے بھی جیب میں ڈال لیا اور پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف چلنے لگا۔ میری طبیعت اچانک مالش کرنے لگی تھی۔ نیچے جھکتے ہوئے مجھے ایک عجیب سی رونگٹے کھڑے کر دینے والی بو محسوس ہوئی تھی۔ یہ بو میں نے قصابوں کی گندی دکانوں میں اور ایک بار کمیلے میں محسوس کی تھی۔ مجھے ایک ابکائی سی آئی اور فوراً اسی دیر کے لیے مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے لگے۔ میں نے مائکروبس کا سہارا نہ لیا ہوتا تو میں یقیناً گر جاتا۔

چند منٹ بعد میری طبیعت سنبھل گئی اور میں نے چہرے پر سے وہ پسینہ خشک کیا جو میرے جسم پر بھی بہہ رہا تھا۔ مجھے کمزوری کا احساس ہوا لیکن میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اب میں بہت محتاط تھا۔ میں گاڑی کو بہت آہستہ چلا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ احساس سے اس خونی منظر کو کھرچ کر مٹا دوں جو ساری لرزہ خیز تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن پر یوں نقش ہو گیا تھا جیسے شفاف شیشے پر چپکی ہوئی تصویر۔

ایک طویل سفر طے کرکے میں محسن تک پہنچا تو ذہنی اور اعصابی تکان کے آثار میری صورت سے عیاں تھے۔

"اتنی دیر کیوں ہوئی؟" محسن نے گاڑی کے رکتے ہی قریب آ کے کہا۔ "میں تو گھبرا گیا تھا۔" پھر اس نے میری صورت دیکھی۔ "تجھے کیا ہوا ہے، سکندر؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اسٹیرنگ پر سر رکھ کے کہا۔ "بڑی اچھی بات ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا، چکری کچھ نہیں کر سکا۔"

"کیا تو نے اسے مار دیا؟" محسن بولا۔ "اگر مار دیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ناگزیر سمجھ کے ہی ایسا کیا ہوگا تو نے۔"

"نہیں یار، میں نے اسے نہیں مارا، اسے قدرت نے مار دیا، اسے وہیں مرنا تھا۔ تقدیر نے ہمیں بھیجا اور ہم نے اس کے لیے وہاں پہنچنے کا سبب پیدا کر دیا جہاں عزرائیل کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم تھا۔ جب وقت آتا ہے تو سب ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں موت منتظر ہوتی ہے۔"

"چل تو ادھر ہو۔" محسن نے کہا۔ "گاڑی میں چلاؤں گا تو اطمینان سے بتا مجھے کہ کیا ہوا۔ ایسا کرتے ہیں کہ گلبرگ کی طرف چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کے کافی پئیں گے۔ تیری طبیعت کچھ بحال ہو جائے گی پھر وہیں سے سب کے لیے کھانا لے کر گھر چلیں گے۔"

میں نے فقط تائید میں سر ہلایا اور پھر محسن کو چکری کی موت کے بارے میں بتانے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔" محسن نے پوری بات سن کے کہا۔ "اگر ہم اسے بھی اغوا کر لیتے تو دلاور اینڈ کمپنی والے اپنی واردات کو اغوا کی دوسری وارداتوں کے ساتھ ملا کے دیکھتے اور محتاط ہو جاتے۔ وہ کسی ٹرک پر سامان نہ بھیجتے۔ وقتی طور پر یہ سلسلہ ضرور روک دیتے۔"

"اور اگر ہم وہیں سے ٹریل لیتے تو شاید وہ سراغ لگا لیتے کہ چکری ہم سے ملا تھا۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ ہمارے ہاتھوں مارا جاتا تب بھی شکوک جنم لیتے۔ تفتیش ہوتی اور عین ممکن تھا کہ بات اس کار ڈیلر تک پہنچ جاتی۔" محسن بولا۔ "اب جو ہوا وہ ایک عام حادثہ ہے۔ سڑکوں پر انسان ان مشینوں کے نیچے پستے رہتے ہیں جن کو وہ خود بناتے اور چلاتے ہیں۔ کارخانوں میں بھی یہی ہوتا ہے اور گھروں میں بھی۔ آدمی نے بجلی ایجاد کی۔ اب ایجاد اپنے موجد کو قتل کرتی رہتی ہے، اسے سزائے موت دیتی ہے۔ تخلیق اپنے خالق کو ختم کر دیتی ہے۔" اس نے گاڑی کو پارک کرنے کے لیے ترچھی کھڑی ہوئی گاڑیوں کی صف میں شامل کر دیا۔

کافی کا پہلا کپ پی کر میری طبیعت بحال ہو گئی اور ڈپریشن کا وہ بخار اتر گیا جو ایک سانحے کا ردِعمل تھا۔ سگریٹ سلگا کر میں نے اطمینان سے ایک طویل گہرا کش لیا اور پھر وہ کاغذ نکالے جو میں نے سڑک سے اٹھا لیے تھے۔ پرس کے اندر سات ہزار روپے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار کے دو چیک تھے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

ایک کراس اور دوسرا بیئرر۔ ان کے نیچے صرف دستخط تھے، کراس چیک گڈز فارورڈنگ ایجنسی کے نام پر تھا اور بیئرر چیک ملک حق نواز کے نام پر۔

"یہ ملک حق نواز ہی اس گڈز فارورڈنگ ایجنسی کا مالک ہو سکتا ہے۔" محسن نے چیک کو دیکھ کر کہا۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"ظاہر ہے یہ چیک کسی نے دیے تھے، یہ ٹرک سے سامان بھجوانے کا معاوضہ ہوگا۔" محسن بولا۔

"یہ تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ٹرک کس نے لیے تھے۔ ہر چیک پر ایک اکاؤنٹ نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "بیئرر چیک مقامی ہے۔ کراس چیک کراچی کا ہے۔ اکاؤنٹ نمبر سے اکاؤنٹ ہولڈر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے مگر مشکل سے مشکل کام بھی ناممکن نہیں ہوتا۔"

"خصوصاً اس معاشرے میں جہاں اصول اور قانون سے زیادہ سکہ چلتا ہو۔" محسن نے کہا اور چیک جیب میں رکھ لیے پھر ہم نے کاغذات کا معائنہ شروع کیا۔

یہ ایک ہی کاپی سے پھاڑے ہوئے صفحات لگتے تھے، کچھ پُرانے تھے۔ ان کے مُڑے ہوئے کناروں کی خستہ حالی اور میلا رنگ دیکھ کے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ صرف ایک کاغذ بالکل نیا اور سفید تھا۔ اس پر صرف نمبر لکھے ہوئے تھے اور یہ سب نمبر گاڑیوں کے تھے۔ غور کرنے پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی کامیاب رہا کہ سارے نمبر کمرشل تھے۔ پرائیویٹ کاروں کی سیریز میں یہ نمبر نہیں آتے تھے۔

"یہ غالباً ٹرک ہیں۔" میں نے کہا۔

محسن نے کاغذ لے لیا۔ "چیرن نے کیوں نوٹ کیے ہیں؟"

"ہم نے اُس سے کہا تھا کہ ہمیں ان ٹرکوں کے بارے میں تفصیلات درکار ہیں۔" میں نے کہا۔ "نمبر اُسے زبانی یاد تھے۔"

"ایک منٹ، اُس نے کچھ نمبر بتائے بھی تھے۔" محسن نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اکتر اکونجا یعنی سیون ون فائیو ون، یہ تو اس میں نہیں ہے۔ دوسرا نمبر کیا تھا؟"

"ستائیس اُنتیس، ٹو سیون ون نائن۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔ "کیا فرماتی ہے آپ کی چھٹی حِس بیچ اس مسئلے کے؟"

"میرا خیال ہے کہ چکری نے بڑی عجلت میں یہ نمبر ایک کاغذ پر لکھے۔" میں نے کہا۔ "غالباً سراج کو بتانے کے لیے کہ ان ٹرکوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کیونکہ سکندر اور محسن نے پیڈرو کو وہاں دیکھ لیا تھا اور انھیں شک ہو گیا تھا کہ اس کمپنی کے ٹرک دوسرے مال کے ساتھ اسلحے کی ترسیل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ چکری بتانا چاہتا ہوگا کہ آپ کے دشمنوں نے مجھے دس ہزار کی رشوت دے کر ان ٹرکوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہی تھیں۔ میں نے بہت ہوشیاری سے انھیں ٹال دیا۔"

"بلکہ غلط ٹرکوں کے نمبر دے دیے۔" محسن نے کہا۔ "اور دو ایسے ڈرائیوروں کے نام بتا دیے جو یہ کام نہیں کرتے یا جن کا وجود ہی نہیں۔"

"اس کا مقصد سراج کو خبردار کرنا ہوگا کہ جو اطلاع ہم اس کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ خود تو نمک خوار ہے مگر دوسروں میں سے کسی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ دس بیس ہزار کی خاطر اُنھیں بتا دے۔ یہ تو اطلاع بھی ایسی ہے کہ کوئی ان کو فون کر کے بھی دے سکتا تھا اور ٹرک دُشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے تو پتا بھی نہ چلتا کہ کس نے نمک حرامی کی تھی۔ بہتر ہوگا کہ ان ٹرکوں کو روک لیا جائے یا ان کا راستہ بدل دیا جائے۔"

"تیرا مطلب ہے یہ ٹرک روانہ ہو چکے ہیں اور راستے میں ہیں؟"

"ایک نظریہ ہے یہ..." میں نے کہا۔ "دوسرا نظریہ کہتا ہے کہ یہی وہ دس ٹرک ہیں جو دلاور اینڈ کمپنی کے زیرِ استعمال ہیں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ ٹرک بدل دیتے یا ان کے نمبر بدل دیتے۔"

"یہ تو بہت مفید معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ان ٹرکوں پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ڈرائیور کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے، ہوگا تو وہ انہی کا آدمی۔"

"میں اُس شخص کی طرح محسوس کرتا ہوں جیسے دُشمن نے اپنی ٹیلی اسکوپک رائفل سے گولی کا نشانہ بنانے کا سوچا ہو مگر عین اُس وقت جب گولی چلانے والی اُنگلی حرکت میں آ چکی ہو، زلزلہ آ جائے اور نشانہ خطا ہو جائے۔ چکری پہلے رکشے میں بیٹھ جاتا تو خاموشی سے سراج کے پاس پہنچ کے اُسے ہمارے سارے عزائم اور ارادوں کے متعلق بتا دیتا۔ ہم نے تو اُسے سرکس کا سارا پلان بتا دیا تھا۔ وہ رکشے والا جس نے اُسے لے جانے سے انکار کیا، خدا کا بھیجا ہُوا کوئی فرشتہ تھا۔"

"خدا کا بھیجا ہوا یا فرشتۂ اجل کا بھیجا ہُوا؟" محسن بولا۔ "اس کا تو حساب کتاب غلط ہو جاتا۔ یہ ضروری تھا کہ چکری کو کچھ دیر ہو تاکہ وہ مقررہ وقت پر اپنی موت سے ملنے پہنچے۔"

"خدا نے ایک بہت بڑی آفت سے بچا لیا۔ جمع سید سے اُس کار ڈیلر کے پاس چل کے ٹریلر کا سودا کرو۔" میں نے کہا۔ "وہ خود بھی چاہتا تھا کہ چکری بیچ میں کوئی چکر نہ چلائے۔ چکری کے نہ آنے سے وہ خوش ہوگا۔ ہم بھی اُس کا نام نہیں لیں گے۔"

"ہم چار لاکھ روپے اُسے ہی کیوں نہ دے دیں؟" محسن بولا۔

"دوبارہ وہاں کیوں جائیں جہاں ایک بار بیڈرو سے ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ نہ معلوم کل کون مل جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "شوروم کے مالک سے لیں گے بھائی یہ لو باقی رقم، جاؤ اور ٹریلر لے آؤ، ہم تم کو جانتے ہیں اور تم پر ہی بھروسا کرتے ہیں، وہ بہت خوش ہوگا۔ اُسے موقع ملے گا بیچ میں پڑ کے رقم مارنے کا مگر افشائے راز کا بالکل ڈر نہیں ہوگا۔ پھر اُسی سے کہیں گے کہ ٹریلر کو بھی ہمارے نام پر منتقل کرانے کی ساری کاغذی کارروائی پوری کرے۔"

"کیا ٹریلر بھی عجب خان کے نام پر ہوگا؟"

"اور کس نام پر ہونا چاہیے، نورتن سرکس کمپنی کے نام پر؟"

"نہیں، ہونا تو چاہیے کسی شخص کے نام پر۔ کمپنی کا کیا ہے، کل ہو نہ ہو۔" محسن بولا۔ "کسی عورت کے نام پر کر والیتے ہیں۔ مثلاً کوئی منتری بائی یا ناڈیا قسم کا نام ہو۔"

"بجلی بائی بمبئی والی۔" میں نے کہا۔ "نہیں دوست، بیشک سرکس میں اوٹ پٹانگ ناموں والے ملتے ہیں مگر ایسے نام آج کل کون رکھتا ہے۔ نام ایمپریس کرنے والا ہونا چاہیے۔ ثریا ستارہ آف بھوپال، بیگم ارجمند بانو قزلباش... یا مسز صاحبزادہ شوکت حیات۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" محسن بولا۔ "یہی نام بتا دیں گے اُسے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔ نو بجنے والے ہیں۔ غالب تشویش میں مبتلا ہوگا۔"

ہم نے وہیں سے چھ افراد کے لیے کھانا پیک کرایا اور اسی سات ہزار کی رقم میں سے ادائیگی ۔ چکری سے ملی تھی۔ یہ مال دُشمن کا تھا اور مالِ حرام بھی ہو سکتا تھا مگر ہمیں تردد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارے لیے تو یہ مالِ غنیمت تھا جس کے حلال ہونے میں شبہ نہیں۔ ساڑھے نو بجے ہم نے ٹیکسی کو ریلوے کوارٹرز سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر روک دیا جہاں بہت سی گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں بیشتر پرائیویٹ بسیں تھیں جو شہر کو مضافات سے ملاتی تھیں اور صبح سے شام تک مسافر ڈھونے کے بعد رات کو یہاں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ وہاں تین چار گیراج تھے جہاں رات بھر میں ان بسوں کے چھوٹے موٹے نقائص دُور کر دیے جاتے تھے تاکہ وہ اگلا دن پھر بار برداری میں خیریت سے گزار لیں۔

"کوئی کام ہے جناب؟" ایک نوجوان مکینک ہماری طرف لپکا تھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "چاروں پہیوں کی بریک الائنمنٹ ہونی ہے۔"

"ہو جائے گی جناب، کب چاہیے گاڑی؟"

"ہم صبح آئیں گے، آج کا دن تو گزار لیا۔" میں نے کہا۔

"گاڑی کھنچ رہی تھی؟" مکینک بولا۔

"ہاں، بہت زیادہ... دائیں طرف۔" میں نے کہا اور محسن کے ساتھ چل پڑا۔

"وہ... جناب چابی؟" مکینک نے کہا۔ "میں بریک ٹیسٹ کیسے کروں گا؟"

"دروازہ کھلا ہُوا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ مت کرنا کہ رات بھر گاڑی دوڑاتے پھرو۔ میں نے میٹر دیکھا ہُوا ہے۔"

"آپ فکر مت کریں جی۔" مکینک نے کہا۔ میں نے اُسے ایک لمبے کام میں اُلجھا دیا تھا اور یہ کام اچھا ہی تھا۔ وہ ایک ایک وھیل کو کھول کے بریک سیٹ کرے گا۔ بریک شو یا واشر کے خراب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا چنانچہ ہم صبح اُسے حقِ محنت ادا کرنے کے پابند تھے، اگر ہم اسے کہتے کہ میاں یہ گاڑی کھڑی ہے۔ رات بھر اس کا خیال رکھنا تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا اور ڈرتا کہ کہیں وہ پھنس نہ جائے مگر اب اس کا بھی بھلا ہو گیا تھا اور ہمارا بھی۔ چابی میں نے اس لیے نہیں دی تھی کہ اگنیشن اور ڈور لاک کے علاوہ وہی چابی پیچھے انجن کور کھولنے میں بھی کام آتی تھی اور پیچھے کے مختصر سے خانے میں اسلحہ بھرا ہُوا تھا۔

ہم سُوٹ کیس اور کھانے کے بنڈل اُٹھائے مارچ کرتے ہوئے دو فرلانگ دُور واقع کوارٹرز میں پہنچے تو ساڑھے دس بجے تھے۔ غالب سو کے اُٹھ گیا تھا اور اب جولی سو رہی تھی سراج کی ماں بھی سو رہی تھی مگر ہماری باتوں کی آواز پر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ قیدِ تنہائی اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی اور یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

"کوئی آیا تو نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"کون آئے گا اس خانہ خرابی میں۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اب تو اس بُتِ کافر کا خیال تک نہیں آتا۔"

"یہ بھی اچھا ہُوا۔" میں نے کہا۔ "ورنہ اس جفا پیشہ کے پیکرِ خیال سے بعید نہیں کہ آئے تو دوسری ٹانگ بھی توڑ جائے۔"

"تم دونوں کی صورت پر آج فاقہ مستی نہیں، آسودگی ہے، تم عیش کرتے رہے ہو۔" غالب نے کہا۔

میں نے حیران ہو کے محسن کی طرف دیکھا۔ "یہ تو سچ ہے مرزا! ایک بار نہیں ہم نے دو بار کافی پی، ایک بار شیزان میں۔ اور وہاں بیٹھ کے اپنے اپنے خواب بھی دیکھے، کیا یہ عیاشی ہے؟"

"ہاں، میری جگہ ایک ٹانگ پلستر میں پھنسا کے بیٹھو اور پھر فیصلہ کرو۔" غالب بولا۔

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"لیکن ہم نے اور بھی بہت کچھ کیا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ڈنر۔۔۔"

"جُولی کو بھی اُٹھالو۔" غالب نے کہا۔ "کمال حوصلہ رکھنے والی اور صابر لڑکی ہے، سختی تو جھیلتی آئی ہے۔ ماں کی موت کا صدمہ بھی جھیل گئی اور اب بالکل نارمل ہے۔"

"جانے اس پر بعد میں کیا بیتی؟" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ انگریزی مقولہ ہے، شاہ اور فقیر، مجرم اور منصف، دوست دُشمن سب مر گئے تو فقط ایک مشتِ خاک رہ گئے۔ جو عالیشہ پر بیتے گی، وہی گیتھرین پر، اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ کسے لاوارث قرار دے کر دفن کیا گیا، کسے سرکاری مُردہ خانے کے فرش پر ڈال دیا گیا یا چیر پھاڑ کرنے والے متجسس طالب علم ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا گیا اور کس کا جنازہ دُھوم دھام سے اُٹھا اور سوئم چہلم ہُوا، یہ فرق دُنیا کی نظر دیکھتی ہے، مرنے والے کو کیا؟"

"تم نے ولادر کو بھی مطلع کر دیا تھا؟" غالب نے کہا۔

"ہاں اُسے بتاتے وقت میری خواہش تھی کہ اس کا چہرہ دیکھوں۔" میں نے کہا۔ "کہ کیا اس خبر کا بھی اس کی صورت پر کوئی ردِعمل نہیں ظاہر ہُوا؟"

"جولی شام کو قبرستان جانا چاہتی تھی۔" غالب بولا۔

"ہاں، ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کل ضرور لے جانا۔" غالب نے کہا۔ "کوئی تازہ قبر دیکھ لینا۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے یہ بھی کرنا ہوگا۔"

محسن نے جولی کو جگا دیا تھا۔ ہمارے اصرار پہ اُس نے تھوڑا بہت کھایا۔ غالب کے لیے دوا خریدتے وقت میں نے کچھ سکون آور ادویات بھی لے لی تھیں۔ غالب کے لیے تو وہی دو گولیاں تھیں۔ ایک اینٹی بایوٹک اور ایک درد کش۔ جُولی نے ایک سکون بخش گولی کھائی اور پھر سو گئی۔ سراج کی ماں نے پھر ضد کی اور ہمیں دھمکی دینا پڑی کہ اُس نے گولیاں نہ کھائیں تو ہم زبردستی انجکشن لگا دیں گے۔ آدھے گھنٹے میں وہ بھی سو گئی۔

"اب تم بھی آرام کر لو، یہ فرصت بہت غنیمت ہے۔" غالب نے کہا۔

"ہم ابھی آتے ہیں، آدھے پون گھنٹے میں۔" میں نے کہا۔

"اب اس وقت کہاں کی سُوجھ گئی ہے؟"

"کل رابعہ کے دیے ہوئے نمبر پہ رابطہ نہیں قائم ہو سکا تھا، آج پھر کوشش کرتے ہیں۔" محسن نے کہا۔

"اسے بھی شہلا کی خبر لینا ہے۔" میں نے کہا۔

"خوب اچھی طرح خبر لینا۔" غالب بولا۔ "آخر منکوحہ ہے تیری، اُسے کون روک سکتا ہے تیرے خوابوں میں آنے سے۔"

"ہاں جیسے چاہے آئے، باپردہ یا بے پردہ۔"

"تمھیں کیا معلوم کہ وہ نہیں آتی۔" محسن بگڑ کے بولا۔

"نورِ چشم، وہ ایک بار آتی تو تم ہمیں دس بار بتاتے۔" غالب نے ہنس کر کہا۔ "مگر تم میاں بیوی زندگی کی گاڑی کے عجیب پہیے ہو، ایک کی ہَوا نکلی ہوئی ہے۔"

"دوسرے میں ہَوا نہیں بھری ہوئی ہے مرزا۔" میں نے متانت سے کہا۔

اور مطلب سمجھ کے غالب نے قہقہہ لگایا۔ محسن شرما کے دانت نکالنے لگا۔

ہم تفریح کے انداز میں باہر نکلے۔ سگریٹیں پیتے اور اطمینان سے چلتے ہوئے ہم رابعہ اور شہلا کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے کچھ اندازہ تھا کہ یہاں آتے ہوئے میں نے سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر کہاں دیکھے تھے، اس کے لیے ہمیں تین چار میل دور جانا پڑا۔ پہلی جگہ ہمیں شرمندگی اور ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ چوکیدار بہت فرض شناس اور ایماندار ثابت ہُوا۔ دوسرے دفتر میں دو چوکیدار تھے۔ ایک تھوڑا سا متامل تھا مگر دوسرے نے اُسے راضی کر لیا۔ اُس نے ایک کمرے کا قفل کھول دیا۔

"بہت لمبی بات مت کرنا جی۔" وہ بولا۔ "یہ نہ ہو بلوں کے برابر بل بنا دو۔" وہ نسبتاً سیدھا آدمی تھا۔

"بن بھی گیا تو تم پر الزام نہیں آئے گا۔" میں نے کہا۔ "سرکاری فون کو دن میں سب ہی استعمال کرتے ہوں گے۔"

"لیکن تم فکر مت کرو، ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ لائن مل گئی تو زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا۔" محسن بولا۔

"آدھا گھنٹا!" چوکیدار کا دم خشک ہونے لگا۔

"اچھا دس پندرہ منٹ۔" میں نے کہا۔

"اور دیکھو جی، باہر بات مت کرنا ملک سے باہر، ورنہ بل میں لکھا ہُوا آ جائے گا کہ کہاں بات ہوئی تھی اور کتنے بجے ہوئی تھی، ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ بولا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ ہم کراچی بات کریں گے۔ اعتبار نہیں ہے تو خود نمبر ملا دو۔" میں نے کہا۔ "پھر ڈائل میں تالا ڈال کے باہر چلے جاؤ۔"

وہ کچھ شرمندہ ہو گیا۔ "نہیں جی آپ بات کریں۔"

"فضول باتیں کر رہا ہے۔" اُس کے ساتھی نے ڈانٹ کر کہا۔ "او پاگل! کام کی بات بھی کر لے، پوچھ پیسے کتنے دیں گے؟"

"پیسے، دو سو کافی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"لو جی، اتنے بڑے کام کے دو سو۔" چالاک چوکیدار نے کہا۔ "ڈھائی سو تو دو۔ اور پہلے بات کر کے تم نے خالی جیب دکھا دی تو ہم کیا کریں گے۔"

"اصول تو ٹھیک ہے تمھارا۔" میں نے کہا اور اسے ڈھائی سو روپے نکال کر دے دیے۔ "بے ایمانی میں اُدھار کا کیا کام اور اعتبار کیسا۔"

"بڑا افسوس ہے جی۔" وہ ڈھائی سو لے کر بولا۔ "ایک تو ہم آپ کا کام کر رہے ہیں اور آپ ہو کہ ہمیں ہی بے ایمان کہہ رہے ہو۔"

"نہیں یار، تم خواہ مخواہ بُرا مان گئے۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "تم بے ایمان کہاں ہو، خدا تمھارا ایمان سلامت رکھے۔"

وہ کچھ زیرِ لب بڑبڑایا۔ اُسے میری صاف گوئی اچھی نہیں لگی تھی لیکن ڈھائی سو کے لالچ نے اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ باہر جا کے شاید اُس نے دوسرے چوکیدار پر اپنی ہوشیاری ثابت کی ہو گی کہ اُس نے ہماری جیب سے مزید پچاس روپے نکلوا لیے اور ممکن ہے، ہمیں بُرا بھلا کہہ کے دل کی بھڑاس بھی نکالی ہو کہ نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔

محسن نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور مجھے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا۔ میں نے نمبر ملانا شروع کیا۔ تیسری کوشش میں لائن مل گئی۔ رات کے وقت ٹرنک لائن پر لوڈ اتنا نہیں تھا جتنا دفتری اور کاروباری اوقات میں رہتا ہے۔ محسن نے پاس والے کمرے کا دوسرا ریسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو" کسی نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

آواز کسی مرد کی تھی مگر میں شناخت نہ کر سکا۔ احتیاط کے پیشِ نظر میں نے بھی ماؤتھ پیس پر رومال رکھ کے بات کی۔ "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کو کس سے بات کرنا تھی؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ بات کرنے والا بہت محتاط ہے اور از خود اپنی شناخت کا شبہ بھی ہونے نہیں دے گا۔ وہ آواز ہی نہیں لہجہ بھی بدل کے بول رہا تھا۔

"مجھے اس نمبر پر بات کرنے کو کہا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "ہم نے کل بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ہم کون؟"

"ہم یعنی میں اور مسٹر اچکن۔" دیکھ کیا رویا اور اس کا دوست اچکن یا شیروانی۔" میں نے گول مول بات کی۔

"کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔ "لاہور سے بول رہے ہیں۔"

"اور یہ نمبر آپ کو کس سے ملا تھا؟"

"ایک خاتون ہیں رابعہ۔" میں نے کہا۔ "رابعہ قاری۔"

"انھوں نے آپ کو فون کیا تھا؟"

"مجھے نہیں یار۔ ایک خاتون اور بھی ہیں یہاں شہلا نام کی، رابعہ نے اُنھیں فون کیا تھا، شہلا نے مجھے بتایا، تم یہ سسپنس ختم کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا سسپنس؟"

"مطلب یہ کہ ابھی تک تم نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ تم کون ہو، اگر ہم نے رانگ نمبر ڈائل کر دیا ہے تو بتاؤ۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"نمبر ٹھیک ہے مگر یہ اطمینان تو مجھے ہونا چاہیے کہ میں غلط آدمی سے بات نہیں کر رہا ہُوں۔" وہ بولا۔ "کوئی اور حوالہ دو۔"

"میں ایم آر ایس کا ممبر ون ہُوں۔"

"ایم آر ایس، یہ کیا بلا؟" وہ حیران ہو کے بولا۔

"مائنٹ از رائٹ سوسائٹی۔" میں نے کہا۔ "کچھ سمجھے اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ میں تمھارا باپ سکندر بخت بول رہا ہُوں اور میرے ساتھ ہے محسن شیروانی۔ اب تم جو بھی ہو اور جو کر سکتے ہو کر لو مگر مجھے یہ بتا دو کہ رابعہ نے رابطے کے لیے یہ نمبر دیا تھا تو کیوں دیا تھا، تم اُسے جانتے ہو یا نہیں، دوست ہو یا دُشمن؟"

اُس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کل بتاؤں گا، اسی وقت فون کرنا۔" اور لائن کٹ گئی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔" میں نے سخت غصّے، بے بسی اور کوفت کے عالم میں کئی بار کہا مگر ہیلو لب پہ لاکھڑا کے سخن اضطراب میں۔ وہاں ایک خاشی تیری سب کے جواب میں، وہی پوزیشن ہو گئی تھی۔ رابعہ جو ایک بھولا بسرا خیال تھی۔ ٹیلی فون کی لائن کے دوسرے کنارے پر ایک تصویرِ خواب بن کے روشن ہوئی اور پھر اندھیرے میں کھو گئی۔ اس کی آواز کے سائے اور ہونٹوں کے سراب میرے وحشتِ تنہائی میں لرزاں رہ گئے۔

پھر میں نے محسن کی طرف دیکھا تو وہ مُسکرا رہا تھا اور یہ اُمید کی روشنی تھی۔ "میں سمجھتا ہُوں تیرے دل کی کیفیت کو۔" وہ بولا۔ "مگر اب کوئی بے یقینی تو نہیں رہی نا، صرف چوبیس گھنٹے کا ایک دن درمیان میں ہے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کے بے خیالی میں کہا۔

"پھر؟ میں حیران ہُوں کہ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔" محسن بولا۔ "بہت زیادہ مایوسی ہوئی ہے تجھے۔ تیرا کیا خیال تھا کہ اِدھر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو نمبر ملائے گا اُدھر وہ ریسیور اُٹھا کے اپنی نقرئی آواز میں کہے گی۔ ہیلو ڈارلنگ سکندر۔“ اُس نے زنانہ نخرے کی ایسی نقل اُتاری کہ مَیں ہنس پڑا۔

”پتا نہیں کون پاگل کا بچہ تھا، سالے نے کچھ قبول کیے ہی نہیں دیا، کم سے کم یہ تو بتا دیتا...“

”اس سے زیادہ کیا، صاف تو کہہ دیا اُس نے کہ کل رابعہ موجود ہوگی، بات کر لینا۔“ محسن نے کہا۔

”کیا اس کی بات کا یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے؟“

”اس کی بات کا دوسرا مطلب ہو ہی نہیں سکتا، شرط لگاتا ہے؟“ محسن بولا۔

”کس بات پر؟“ مَیں نے کہا۔

”یہی کہ کل رابعہ سے تیری بات ہوگی اور مشتاق لگا ہوں کی سُنی جائے گی۔“ محسن نے کہا۔ ”بول کیا شرط ہے؟“

اچانک مَیں مُسکرانے لگا۔ میرے وجود میں پھُوٹنے والا خوشی کا نغمہ میرے لبوں پر مُسکراہٹ کی لہر بن کے پھیل گیا۔ ”تو بتا۔“ مَیں نے کہا۔

”اچھا پہلے مَیں شہلا سے بات کر لوں۔“ محسن نے کہا۔ ”یہی تو فرق پڑ جاتا ہے، جب عاشق ایک شوہر بنتا ہے۔ ایک تیرا اضطراب واشتیاق اور تیری وارفتگی اور بے خودی۔ ایک میرا سکون اور اطمینان۔ سارا پاگل پن ختم ہو جاتا ہے اور بیوی کا بڑا دل ٹوٹتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ مَیں نے تسلیم کیا۔ ”شادی کے بعد خدمات کی نوعیت تو بدل ہی جاتی ہے۔ عورتیں کچھ خیال پرست رہتی ہیں۔ پُرانے خوابوں کی دُنیا کو چھوڑنا ان کے لیے زیادہ مشکل ہوتا ہے مگر اب یہ کیسے ممکن ہے کہ شوہر بے چارہ تمام عمر اسی طرح عاشق کا رول کرتا رہے۔“

”اب دیکھنا مَیں کیسے کرتا ہُوں۔“ محسن نے فون اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری محبت کم ہوگئی ہے۔ محبت تو شاید پہلے سے دُگنی ہوگئی ہے، تین گنا ہونے والی ہے۔“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”مگر کیا شہلا اور کیا رابعہ، یہ اظہار مانگتی ہیں۔ مرد یقین پر مطمئن رہتا ہے۔“

”یہاں سے اپنے یقین کا اظہار مت فرمائیے۔“ مَیں نے کہا۔ ”رضوی صاحب کے گھر کا نمبر آبزرویشن پر ہوگا۔ فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے یہاں سے کال کی تھی، پکڑا جائے گا وہ جس نے ڈھائی سو روپے ایڈوانس لیے تھے۔“

”پھر تو یہی کرنا چاہیے۔“ محسن نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ”آج ڈھائی سو روپے لیے تھے کل کے ڈھائی سو جوتے اُدھار۔ آئندہ ایسی نیکی نہیں کرے گا۔ کم سے کم ایک سرکاری چور توبہ کر لے گا۔“

مَیں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ نہبت چھوٹا چور ہے، ہمیشہ یہی پکڑے اور پکڑ لیے جاتے ہیں، وہ جو اُوپر بڑے ڈاکو بیٹھے ہیں اور ملک کے خزانے کو ایسے لوٹ رہے ہیں جیسے غنیم کسی شہر مفتوحہ کو لوٹتا ہے۔“

”وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ فی الحال ہمارے ہاتھ جس چھوٹے چور کے گریبان تک پہنچ سکتے ہیں اسے تو نہ چھوڑیں۔“ محسن نے کہا۔ ”ہیلو۔“ اُس نے دوسری طرف سے کسی کی آواز سُن کے کہا۔ مَیں فوراً نسبتاً چھوٹے کمرے میں چلا گیا جو بڑے صاحب کے پی اے یا سیکرٹری کا کیبن تھا۔ ہر کال اسی کیبن کے فون سے چیک ہو کے آگے جاتی تھی۔ بڑا صاحب ہے یا نہیں ہے، میٹنگ میں ہے یا دورے پر۔ اس کا انحصار کال کرنے والے کی ضرورت اور اہمیت پر رہتا ہے۔

جب مَیں نے فون اُٹھایا تو محسن کی مسز رضوی سے بات ہو رہی تھی۔

”جب تم فون کرتے ہو تو میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔“ اُنھوں نے کہا۔ ”میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔“

”یہ بات آپ مذاق میں کہہ رہی ہیں؟“

”نہیں، گزشتہ چند ماہ سے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔“ وہ بولیں۔ ”ڈاکٹر تو کہتے ہیں کہ ڈیپریشن ہے، مَیں سوچا نہ کروں مگر کیا نہ سوچنا کسی کے اختیار کی بات ہے۔“

”مجھے معلوم ہے آپ کیا سوچتی ہیں، پلیز آنٹی! آپ اپنی صحت مت خراب کریں۔“ محسن نے کہا۔ ”ہم پہلے ہی بہت شرمندہ ہیں، ہم نے آپ کی نیکی کے بدلے جو کچھ کیا، وہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہُوا۔“

”میرے حق میں؟ تم نے اپنے حق میں کیا اچھا کیا؟“ وہ دُکھ

”آنٹی! ہم آپ کے مجرم ہیں اور آپ سے تو معافی مانگنے کا حوصلہ بھی نہیں پڑتا۔“ محسن نے کہا۔ ”ہماری وجہ سے آپ کے گھر میں ہر پریشانی آئی۔ ظاہر ہے آپ کے سارے تفکرات جو آپ کے ڈیپریشن کا باعث بنے، میرے، سکندر اور رابعہ کے بارے میں ہیں۔ شہلا کی ذمّے داری اضافی ہے۔“

”محسن! آخر تم کو کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی؟“ آنٹی نے کہا۔ ”مَیں تو خود ایک پولیس افسر کے ساتھ پندرہ سال گزار چکی ہُوں۔ اکیلی رہنے کے خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی اور رضوی صاحب جیسے شوہر کا ساتھ دینے کی ہمّت تھی مجھ میں۔ مجھے گلہ نہیں اپنے شوہر سے کہ وہ اصول پرست، ایمان دار اور فرض شناس کیوں ہیں، اور دوسرے پولیس افسروں کی طرح میرے پاس کوٹھیاں اور کاریں، نوکر چاکر اور عیش و عشرت کے اسباب کیوں نہیں۔ مجھے فخر ہے اُن کی عزّتِ نفس پر، یہ تو ہر عورت کہہ دیتی ہے کہ مَیں ہی تھی جس نے تمھارے ساتھ گزارا کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ دوسری قسم کے افسر ہوتے تو شاید مَیں اُن کا ساتھ نہ دے پاتی۔“

”یُو آر گریٹ آنٹی، آپ کو خدا نے اُن کے لیے بنایا تھا جیسے اُنھیں آپ کے لیے بنایا تھا۔“ محسن نے کہا۔

”مگر شہلا کو تم نے شادی کے بعد رفاقت تک نہیں دی۔ مجھے اپنے شوہر سے وہ چیز ضرور ملی تھی جس کی مجھے ضرورت تھی اور جس کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ہی بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے، ان کی محبت اور ان کا اعتماد۔“

”کیا شہلا کو میری محبت اور میرے اعتماد کی کمی محسوس ہوتی ہے؟“

”کمی! تم نے اُسے صرف محبت اور اعتماد کے خوبصورت لفظوں سے بہلا رکھا ہے۔ رفاقت کے بغیر ان الفاظ میں کوئی خوشی ہے، تحفظ کی کون سی ضمانت دی ہے تم نے اُسے؟“

”وہ آپ کے ساتھ ہے تو اُسے ہر ضمانت حاصل ہے۔“

”احمق! تحفظ شادی کے بعد کسی ایک کی ذات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مَیں تم دونوں کی ازدواجی زندگی کے تحفظ کی بات کر رہی تھی۔ یہ ضمانت اُسے مَیں کیسے دے سکتی ہُوں، وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی مگر کیا دل کی بات آنکھوں سے نہ کہنا اس کے لیے ممکن ہے۔ عمر کے فرق کے باوجود وہ بھی عورت ہے اور مَیں اُس کے دُکھ سمجھ سکتی ہُوں۔ ندامت مجھے اس احساس سے ہوتی ہے کہ مَیں اس دُکھ کو دُور نہیں کر سکتی۔ تم کو یہ سب بتا تو سکتی ہُوں مگر سمجھا نہیں سکتی۔ تم سمجھو گے ہی نہیں کیونکہ تم سمجھنا نہیں چاہتے۔“

”ہاں آنٹی۔“ محسن نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”مَیں ابھی کچھ سمجھنا نہیں چاہتا، سوائے اپنی مجبوریوں کے اور ان کو آپ سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے حالات کے دھارے کو اُسی رخ پر بہنے دیں۔ اس کا رُخ موڑنا میرے یا آپ کے بس کی بات ہی نہیں۔ جب تک وقت خود اس کا درماں فراہم نہیں کرے گا ہم سب اپنے اپنے دُکھ کے ساتھ جئیں گے۔ مَیں آپ اور شہلا، رابعہ اور سکندر۔ ہمیں ابھی ابھی معلوم ہُوا ہے کہ رابعہ بالکل خیریت سے ہے۔“

”چلو کوئی تو اچھی بات کی تم نے۔“ وہ بولیں۔

”اب آپ ذرا مجھے بھی اچھی سی بات سُنائیں، اپنی زبانی نہیں، اُس کے لبوں سے جس کے لیے مَیں زبردست جذباتی دردمانی ڈائیلاگ یاد کر کے آیا ہُوں۔“

آنٹی ہنسنے لگیں۔ ”تم شہلا سے بات نہیں کر سکتے۔“

”یہ کیا ظلم ہے آنٹی، سزا دے رہی ہیں آپ؟“ محسن بولا۔

”نہیں، یہ تو انعام ہے قدرت کا جو مَیں خوشخبری کی صورت میں دے رہی ہُوں۔“ اُنھوں نے کہا۔ ”وہ اسپتال میں ہے۔“

”اسپتال میں... کیوں؟ کیا ہُوا ہے اُسے؟“ محسن نے چلّا کے کہا۔

”ارے ارے، ابھی سے؟ ہوگا جب ہونا ہوگا۔“ آنٹی نے ہنس کے کہا۔

”ہوگی یا ہوگا؟“ مَیں نے دخل در معقولات کیا۔ ”دیا ہوں گے؟“

”یہ... یہ کون بولا تھا بیچ میں؟“ آنٹی نے چونک کر کہا۔

”بیچ میں؟ کوئی نہیں آنٹی۔“ محسن ہنسنے لگا۔ ”یہ بتائیں کہ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہاں ہاں، بس ایک رات رہے گی وہاں، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ڈرپ لگ جائے تو اچھا ہے۔“ وہ بولیں۔ ”مگر کیا بیچ میں سکندر نہیں بولا تھا؟“

”آپ بھی ایس ایس پی سے کم نہیں ہیں آنٹی۔“ مَیں نے کہا۔ ”آداب عرض کرتا ہُوں۔“

”جیتے رہو، خدا خوش رکھے۔“

”بس آپ دُعا دیتی رہیں، کبھی تو قبول ہوگی۔“ مَیں نے کہا۔ ”تاہم وہ جو ایک سوال کیا تھا مَیں نے؟“

”اس کا جواب اپنے انکل سے پوچھ لو۔“ وہ بولیں۔ ”وہ اسپتال میں ہی ہیں اور اسی لیے مَیں تم سے بات بھی کر رہی ہُوں۔“

”آنٹی، آخر آپ بھی کچھ علم اور تجربہ رکھتی ہیں۔ کچھ تو فرمایئے کہ کلیہ اور علم اعداد کی روشنی میں...“

”سکندر نالائق! تم بدتمیز ہی نہیں، بے شرم بھی ہوتے جا رہے ہو۔“ آنٹی نے کہا۔

”آنٹی، مجھ میں تو ہمّت ہے نہیں۔“ مَیں نے کہا۔ ”کیا آپ میری طرف سے ایس ایس پی صاحب کی خدمت میں ایک درخواست برائے معافی دائر کر سکتی ہیں؟“

”چھوڑو معافی کو، کس کس بات پر معافی مانگو گے اور کرنا تو آئندہ بھی تم کو وہی ہے جو اب تک کرتے آئے ہو۔“ اُنھوں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

”مجھے اُن کے معطّل کیے جانے پر اپنے مُجرم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔“

”مگر اُنھیں کوئی صدمہ نہیں ہے اور تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ ان کو معطّل کر دیا گیا تھا؟“ آنٹی نے کہا۔

”پھر... پھر اُنھیں اُس عہدے سے الگ کیوں کیا گیا؟“

”اُنھوں نے استعفا دیا ہے، اپنی مرضی سے۔“ آنٹی نے احتجاجی انداز میں میرے الزام کی تردید کی۔ ”خود آئی جی نے ان کو بہت مجبور کیا کہ وہ استعفا واپس لے لیں مگر وہ اپنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مطمئن تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں نے یہ پندرہ سال عزت سے گزارے، یہ بھی اب بہت ناممکن سی بات لگتی ہے۔ یہ ملازمت نہیں میرے لیے ہر قدم پر آزمائش تھی۔ زبانِ خلق پولیس والا جان کے بُرا کہتی تھی، تھینک لیس جاب تھا، اچھائی کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ نفرت سب سے بے سبب ہی ملتی تھی مگر اس سے زیادہ اپنوں کا رویّہ تھا جو ہمیشہ مخالف رہے۔ حاسد لوگ، سازشی لوگ اور بدعنوان لوگ میرے خلاف محاذ رکھتے تھے مگر میں پھر بھی پندرہ سال تک ڈٹا رہا اور خدا نے میری عزت رکھی، یہی اس کا انعام ہے مگر اب میرے اعصاب بھی جواب دے گئے ہیں اور میرے حالات بھی میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ میں بدخواہوں کے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہوں، بہت سی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"اور یہ... یہ ہماری باتیں ہیں جو لوگ ہمارے بارے میں ان کے مُنہ پر اور پیٹھ پیچھے کہتے ہوں گے کیونکہ وہ بہ یک وقت ایس ایس پی اور انکل رضوی تھے۔ اُنھوں نے تو اپنے ایس ایس پی ہونے کی لاج رکھ لی۔ ہم انکل رضوی سے رشتے کی لاج رکھنے میں ناکام رہے۔" میں نے افسوس اور دکھ کے ساتھ کہا۔

"تم سمجھتے ہو اُن کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی؟" آنٹی نے کہا۔ "شہلا ہمارے ساتھ تھی اور ہم اُس کو بیٹی سمجھتے تھے مگر دُنیا کچھ اور سمجھتی تھی۔"

"دُنیا اُسے ایک مجرم کی بیوی سمجھتی ہو گی؟" محسن نے تلخی سے کہا۔

"ہاں، غلط سوچ رکھنے والوں کا کوئی کیا کرے۔" آنٹی نے کہا۔ "تم کیوں دل بُرا کرتے ہو، تمھارے انکل کسی کی پروا نہیں کرتے۔ پولیس کا تو یہ عام طریقہ ہے کہ مجرم کو پکڑنا ہے تو اُس کے بیوی بچوں کو اُٹھا لو، ماں باپ، بھائی بہن جو ملے اُسے تھانے منگوا لو، مجرم خود ہاتھ جوڑتا حاضر ہو گا مگر تمھارے انکل تو جولی کے لیے بھی دن رات اسپتال میں رہے اور اُنھوں نے اتنا کیا جو شاید تم بھی نہ کر سکتے۔ اُنھوں نے صاف کہا کہ میں مجرم کو پکڑنے کا پابند ہوں۔ جس کے خلاف کوئی الزام تک نہیں اور میں ذاتی طور پر مطمئن ہوں کہ اس نے بالواسطہ طور پر بھی نہ اعانتِ جرم کی اور نہ مجرم کی مدد کی۔ اسے تو میں مظلوم سمجھ کے بچاؤں گا۔ اس کے ساتھ یہی ظلم کیا کم ہے کہ مجرم کے ساتھ اس کا نام خواہ مخواہ لیا جاتا ہے۔ کسی مجرم سے رشتہ ہونا کون سے قانون کے تحت جرم ہے اور وہ اب فیصلہ کر چکے تھے کہ یہ نوکری چھوڑ دیں گے جس میں مخالفوں کو ان پر جانبداری کا الزام عائد کرنے کا موقع مل رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔"

"مگر آنٹی! اب وہ کیا کریں گے؟"

"اُنھوں نے مجھے نہیں بتایا۔" آنٹی نے کہا۔ "کچھ تو ضرور کریں گے، وہ فارغ رہنے والے آدمی نہیں ہیں اور گزر اوقات کے لیے بھی کوئی وسیلہ چاہیے۔ تھوڑی بہت زمینوں کی آمدنی ہے جو اُن کے والد نے چھوڑی تھیں، اس لیے فکر کی تو کوئی بات نہیں۔"

"آپ کو تو یہ بنگلا بھی خالی کرنا ہو گا۔"

"ہاں، محکمے نے بڑی مستعدی دکھائی ہے اس معاملے میں۔" آنٹی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "نوٹس مل گیا ہے کہ ہم ایک ماہ میں اپنا بندوبست کر لیں۔"

"یہ بنگلا تو غالباً لیز پر ہے۔" میں نے کہا۔ "ان کے محکمے نے کنٹریکٹ پر حاصل کیا تھا۔"

"ہاں، گزشتہ ماہ کنٹریکٹ بھی ختم ہو گیا۔ مالک ایک بیوہ ہے جو معاہدے میں توسیع پر تیار نہیں مگر پولیس کا محکمہ ہے نا، اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ مزید تین سال کے لیے لیز کر لے۔"

"اگر یہ سرکاری رہائش گاہ نہ رہی تو آپ کہاں رہیں گی؟"

"جہاں سینگ سمائیں، محاورے کے مطابق۔" وہ ہنس کر بولیں۔ "یہ شہر میں کوئی ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ کوئی چھوٹا موٹا گھر کرائے پر لے لیں گے۔"

"جانے سے پہلے ہمیں پتا بتا کے جائیے گا۔" میں نے کہا۔

"تمھیں! خود تمھارا پتا ہو تو کوئی پتا بتائے۔"

"آپ... منظر کو بتا جائیں، اُسے جانتی ہیں نا آپ؟"

"ہاں، عبدالودود منظر، تمھارا دوست ہے، کوئی وکیل ہے۔" اُنھوں نے کہا۔

"اچھا آنٹی، وہ کس اسپتال میں ہے؟" محسن نے کہا۔

"چیمبرلین روڈ پر ڈاکٹر پروین کا پرائیویٹ کلینک ہے۔ ایک بہت کوالیفائڈ گائنک اسپیشلسٹ ہے، تمھارے انکل کی کلاس فیلو رہی ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"شادی شدہ ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" آنٹی نے کہا۔

"عمر کیا ہے، رنگ رُوپ، ناک نقشہ؟"

"بدتمیز۔" آنٹی نے ہنس کر کہا۔ "وہ تمھارے انکل سے بھی پانچ سال بڑی ہے، اڑتالیس سال کی بُڑھیا ہے مگر دیکھو، اُدھر جانے کی بے وقوفی مت کرنا، وہاں سادہ کپڑوں میں پولیس اندر بھی موجود رہے۔"

"میں پولیس کی وردی پہن کے چلا جاؤں گا۔" محسن بولا۔

"تم باز آنے والے نہیں ہو۔"

"آنٹی، بہت دل چاہ رہا ہے اُسے دیکھنے کو۔" محسن نے کہا۔

"اچھا! تمھارے انکل آ گئے ہیں شاید۔" اُنھوں نے کہا اور فون ایک دم بند ہو گیا۔ ہم باہر آ گئے، دونوں چوکیدار شاید ضرب تقسیم سے فارغ ہو چکے تھے اور قناعت اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔

"یہاں جی، ہم کل بھی آئیں گے۔" میں نے کہا۔

"مگر ڈھائی سو روز نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔ "ہم پکے گاہک ہیں، کچھ رعایت کر دو یار۔"

"ہول سیل ریٹ پر سودا کر لو۔" میں نے کہا۔

"ہفتہ وار یا ماہانہ بنیادوں پر کنٹریکٹ کر لو۔" محسن بولا۔

"چلو بھائی جاؤ، معاف کرو ہمیں۔" پہلے والے چوکیدار نے کہا۔ "ہم سے کیوں مخول بازی کرتے ہو۔"

"روز تم بات کرو گے تو مہینے کے آخر میں بل کتنا آئے گا؟" دوسرے نے وسیع تر کاروبار کے امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"جتنا بھی آئے کون سا تم دو گے، گورنمنٹ کے خزانے سے ادا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "اور اگر صاحب نے بہت زیادہ بل پر شور کیا تو ایک مہینے بعد ہی کرے گا۔ اسٹاف پہ برہم ہو گا کہ وہ چاچے، ماموں اور پھوپھاؤں کو کال کرتے رہے۔ اسٹاف اسے الزام دے گا کہ خود گھنٹا گھنٹا گپ بازی کرتا ہے، تم پر بہرحال الزام نہیں آئے گا۔"

اُنھوں نے آپس میں کچھ کانا پھوسی کی۔ دوسرا چوکیدار شاید پورے مہینے کی آمدنی کا حساب لگا کے اپنے ساتھی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس رقم سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے مگر دوسرا ساتھی اتنا باہمت نہیں تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں چھاپا نہ پڑ جائے اور ایک دن کی تو کوئی بات نہیں مگر روز روز کے چکر میں خطرہ ہے، معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اُنھوں نے ہمیں ہری جھنڈی دکھا دی۔

واپسی کے سفر میں ہمارا موڈ بہت بہتر تھا۔ انکل رضوی کی قدر و منزلت ہمارے دل میں بہت بڑھ گئی تھی اور احساسِ جُرم بہت کم ہو گیا تھا کہ ان کی معزولی میں ہمارا بھی دخل ہے۔ یہ ان کے بدخواہوں نے مشہور کیا تھا کہ وہ معطل اور معزول کر دیے گئے ہیں۔ اُنھوں نے باعزت طور پر وہ نوکری چھوڑ دی تھی جس میں اُن کی عزت پر حرف آ رہا تھا۔

"یار! کیا انکل رضوی اب سچ مچ کسی چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہیں گے؟" محسن نے کہا۔

"ہاں! اس معاشرے میں ایماندار لوگ ایسے ہی رہتے ہیں۔ حکومت فرض شناس آدمی کی یہی قدر کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ذرا سوچ کہ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک معمولی ایس ایچ او کے پاس کوٹھیاں ہوتی ہیں اور کاریں ہوتی ہیں۔ ڈی ایس پی اور ایس پی تو بادشاہ ہیں۔ فرضی ناموں سے وہ گلبرگ کے ہر بلاک میں کوٹھیاں بنوا سکتے تھے۔ ان کا کرایہ ہی اتنا آتا کہ ہر سال ایک نئی کوٹھی کھڑی ہو جاتی، کون پوچھتا اُنھیں۔ بھانجوں، بھتیجوں اور بیوی بچوں کے نام پر نہ بینک بیلنس چیک ہو سکتا ہے، نہ پراپرٹی کا پتا چلایا جا سکتا ہے اور نہ انویسٹمنٹ کا کہ کتنے تھیٹر کہاں کہاں کے خرید رکھے ہیں، کتنی بسیں چل رہی ہیں اور کس کس روٹ پر..."

"پتا کون چلائے گا؟" محسن بولا۔ "پتا چلانے والے تو خود یہی کر رہے ہیں۔ محاسبہ تو وہ کر سکتا ہے جس کا اپنا حساب درست ہو۔ آپ تحقیقات ایف آئی اے کے سپرد کریں یا اینٹی کرپشن والوں کے۔ انکوائری کمیٹی بٹھائیں یا کمیشن، ان میں سے بیشتر خود انھی الزامات میں ملوث ہوں گے۔ چور کو چوروں کے بارے میں رپورٹ دینا ہو تو وہ کیا کہے گا، یہی کہ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے، میری طرح اور چور تو ہیں الزام لگانے والے۔"

"آنٹی بڑی صابرہ اور حوصلہ مند عورت ہیں۔ خدا نے کیا جوڑی ملائی ہے کہ ایک ستارہ ہے تو دوسرا اُس کی کرن مگر یار! بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ آج اُنھیں گاڑی اسکول لاتی لے جاتی ہے، بنگلے پر گارڈ رہتی ہے، وہ آتے جاتے لوگوں کو سیلوٹ کرتا دیکھتے ہیں اور اسکول میں بھی اُن کی بڑی ٹور رہتی ہو گی۔ ان کے ذہن کے لیے صورتِ حالات کی اس تبدیلی کو قبول کرنا آسان نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ایک چھوٹے سے گھر میں جو کسی فضول سے علاقے میں ہو، ان کے لیے بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

"کیا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟" محسن نے کہا۔

"بہت کچھ کر سکتے ہیں، مثلاً ہم یہ گھر خرید کے اُنھیں پیش کر سکتے ہیں مگر کیا انکل رضوی اسے قبول کریں گے؟" میں نے کہا اور نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں، ان کی طبیعت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم مکان اُن کی بیوی کے نام کریں یا بچوں کے نام، وہ بالکل نہیں مانیں گے مگر فرض کرو اسے ہم خرید لیں۔"

"کیسے خرید لیں؟" میں نے کہا۔ "تو نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہے کہ مکان برائے فروخت ہے۔"

"تاوقتیکہ مکان کسی کے لیے کوئی جذباتی اہمیت نہ رکھتا ہو، ہر شخص پرانے مکان کو فائدے میں بیچنے پر تیار ہو جاتا ہے۔" محسن بولا۔

"چل مان لیا کہ ہم مکان خریدنے میں کامیاب رہے۔ پچاس ہزار زیادہ دے دیے مارکیٹ پرائس سے اور مالک مکان کو راضی کر لیا، تب بھی انکل رضوی کب راضی ہوں گے،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہمارے کرائے دار کی حیثیت سے اس گھر میں رہنے کو۔ بکواس کرنے والے کیا کہیں گے کہ دیکھا' حقیقت کھل کے سامنے آگئی نا، جن کی حمایت کرتے تھے ایس ایس پی صاحب' وہی اُن کے کام آئے۔ گھر سے بے گھر نہیں ہونے دیا۔ کھڑے کھڑے مکان لے کر اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رشوت لینے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔ بے وقوف آدمی نقد لے کر پھنس جاتا ہے۔ ایس ایس پی ضامن رضوی ہوشیار تھے کہ جب تک حاکم رہے' رعایات ... کرتے رہے۔ عادل اور نیک بھی کہلائے اور پسِ پردہ لیسے ہی نہ جانے کس کس سے کیا کچھ نہیں لیتے رہے' پتا کسے چلتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ وہ ہمارے ہی کرائے دار بنیں۔ شہلا کا خیال بھی نکال دے اپنے دل سے کہ تُو اُسے لینڈ لیڈی بنا دے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جسے وہ اپنا بیٹی کہتے ہیں' اُس کے گھر میں رہیں گے، وہ تو وضعداری کے اعتبار سے ان پُرانے لوگوں میں شامل ہیں جو شادی کے بعد بیٹی کے گھر میں پانی کا ایک گلاس تک نہیں پیتے۔"

"آخر مالک مکان نے اب تک تو مکان کرائے پر دیا ہُوا ہی تھا۔ اسے کرایہ بھی باقاعدگی سے مل رہا ہوگا۔"

"کیا معلوم؟" مَیں نے کہا۔ "پولیس والوں سے کرایہ وصول کرنا بھی آسان کام تو نہیں۔ جن کی عادت ہی مفت خوری کی ہو وہ قیمت اسی کو دیتے ہیں جو ان کا بھی باپ ہو۔ قیمت وصول کرنا جاتا ہو۔ ممکن ہے' تھانے سے ایس ایچ او کے نمائندے حاضر ہوتے ہوں کہ لاؤ رسید پر دستخط کر دیا انگوٹھا لگاؤ اور بس۔ محکمے سے ملنے والی رقم بھی ماہانہ آمدنی کا ایک چھوٹا سا ذریعہ شمار ہوتی ہو۔ شکایت کرنے والا کہاں جائے اور کس سے کہے۔ کہے گا تو رسیدیں پیش کر دی جائیں گی کہ جھوٹ اور بکواس کی عادت ہے اسے اور پھر اس ناپاک جسارت پر اُسے تھانے بلا کے پاک کیا جائے گا۔"

"یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے اور شاید اسی لیے اب مکان مالک کے لیے نجات کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ وہ کرائے نامے کی تجدید نہ کرے۔ بے شک' یہ بھی آسان نہیں ہوگا۔ جو ہر ماہ کرائے کی رسید حاصل کر سکتے ہیں، وہ نئے معاہدے کی توثیق بھی کرا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔

"ایک بات اور بتاؤں۔" مَیں نے کہا۔ "ایسے مکان سے جان چھڑانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے بیچ دیا جائے۔ کرایہ داری کے معاہدے کے ساتھ ہی مکان فروخت کیے جا سکتے ہیں۔ مالکِ مکان بدلتا ہے تو بدل جائے۔ کرائے دار ... گا اور بعض اوقات لوگ ایسا کرتے بھی ہیں مگر جس مکان کا کرایہ لینے تھانے والے آتے ہوں اور دیتے کچھ نہ ہوں لیکن دستخط لے جاتے ہوں' اُسے کون خریدے گا۔ ... بزبز پیسہ لگائے جائیداد میں اور پھنس جائے مصیبت میں۔ اتنا احمق کوئی نہیں ہوتا۔"

"بس ہم ایک احمق حاصل کر سکتے ہیں۔" محسن نے کہا۔ "جس کا نام الف خاں' بے خاں کچھ بھی ہو اور وہ حسبِ سابق کرائے نامے کی توسیع پر تیار ہو جائے۔"

مَیں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے کیا فائدہ؟ اس میں انکل تو بہرحال نہیں رہ سکیں گے۔ مکان محکمے کی لیز پر ہوگا تو اس میں انہی کا کوئی افسر رہے گا۔ نیا ایس ایس پی بھی رہ سکتا ہے۔"

"ویری گڈ' تُو میری عقل کی داد دے۔"

"ایڈوانس داد دوں۔" مَیں نے کہا۔ "خواہ بعد میں معلوم ہو کہ آپ نے بونگی ماری۔ نو سر' پہلے بات کیجیے۔"

"ایس ایس پی ضامن رضوی کے مداح صرف ہم ہی تو نہیں۔" محسن نے کہا۔ "اور بھی بہت ہوں گے۔"

"ضرور ہوں گے' ان کو جاننے والوں میں سے بیشتر ہوں گے۔"

"ان میں وکیل بھی ہوں گے؟"

"بالکل ہوں گے۔"

"ایسے وکیل بھی ہوں گے جو منظر کو بھی جانتے ہوں گے۔"

"کیا قصہ بنا رہا ہے سیدھی بات کو؟" مَیں نے جھلا کے کہا۔

"سُن سُن... صبر سے سُن۔" محسن بولا۔ "فرض کر ہم اپنے یار منظر سے کہتے ہیں کہ وہ مالک مکان کا پتا چلائے' ان اسباب کا پتا چلائے جن کی بنا پر وہ اپنا مکان مزید تین سال کے لیے پولیس کو کرائے پر دینے کے لیے تیار نہیں۔ ایک وجہ تو وہی ہو سکتی ہے جو تو نے بیان کی۔ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کرایہ ابھی تک قیامِ پاکستان سے پہلے کی شرح پر چل رہا ہو' اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کرایہ نہ ہونے کے برابر ہوگا مگر میرے خیال میں کرایہ بہت ہوگا کیونکہ فائدہ اُٹھانے والے دوسرے ہیں جو تھوڑے کو زیادہ نہیں سمجھتے' زیادہ کو تھوڑا سمجھتے ہیں۔ کرایہ ملتا ہے سرکاری خزانے سے' دو ہزار روپے ماہانہ کرائے والے مکان کی مالیت دو ہزار تک کے ایگریمنٹ کرتے ہیں۔ تمام سرکاری محکموں میں اگر کسی نے دو چار مکان بنا رکھے ہیں یا ان کے چاچے' مامے' بھانجے' بھتیجے کے مکانات ہیں تو وہ دُگنی شرح پر گورنمنٹ کو کرائے پر اُٹھا دیے جاتے ہیں۔ حکومت کو بعض اوقات دفاتر کے لیے اور افسروں کی رہائش کے لیے مناسب مکانات کی کمی کے باعث پرائیویٹ گھر اور بنگلے لینے پڑتے ہیں۔ تاہم یہ ذرا مختلف کیس ہے کیونکہ اس میں مالک مکان کو نہیں' بیچ کے لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ ہم مالک مکان کی مدد کر سکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" مَیں نے بات کو کچھ سمجھ کے کہا۔

"فرض کر' مالک مکان کسی وکیل کو مختار نامہ دے دیتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "اگر انکل رضوی کی بدگمانی کا ڈر نہ ہوتا تو ہم منظر سے کہتے کہ وہ خود مالک مکان کا اٹارنی بن جائے مگر انکل فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ چکر ہم نے چلایا ہوگا چنانچہ منظر یہ کرے کہ اپنے کسی بہت بڑے وکیل دوست سے بات کرے۔ اتنے بڑے وکیل سے جس سے پولیس بھی ایک بات کرتے ہوئے دو بار سوچے۔ منظر مظلوم مالک مکان کو سمجھائے کہ اب مکان کے سلسلے میں نہ وہ کسی سے بات کرے اور نہ ڈرے۔ جو اس کے پاس آئے' اُسے آگے اٹارنی کے پاس بھیج دے کہ مَیں نے تمام اختیارات اُسے سونپ دیے ہیں۔ اب وہ بڑا وکیل پولیس کو تو صاف جواب دے کہ جناب بہت کھا لیا کرایہ۔ اب حق تو ملے گا حقدار کو۔ اپنے لیے کوئی دوسرا بے وقوف تلاش کیجیے جو آپ کو مکان بھی دے اور کرایہ بھی دے اور ظاہر ہے' اس بڑے وکیل کی بات میں اثر ہوگا۔ پولیس نہ اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ مالک مکان کا۔ بعد میں وہی وکیل انکل رضوی کی خدمت میں حاضر ہو کہ جناب' مَیں آپ کی ایمانداری اور شرافت کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہُوں کہ آپ کے مسائل کیا ہیں۔ مالک مکان نے مجھے اختیار دیا ہے کہ مَیں جس کو چاہوں یہ مکان کرائے پر اُٹھا دوں۔ سوائے محکمۂ پولیس کے۔ تو مَیں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ حسبِ سابق اس میں رہیں اور براہِ راست مالک مکان کو کرایہ ادا کریں' میری معرفت۔ کرایہ وہ چاہے تو نصف کر دے اور نصف ہم سے لیتا رہے یا انکل رضوی نہ مانیں تو جو کرایہ اب چل رہا ہے وہی رہے۔ فرق صرف اتنا ہو کہ محکمہ بیچ میں سے نکل جائے اور انکل رضوی کو نہ نکال سکے۔"

"مَیں اَش اَش کر رہا ہُوں۔" مَیں نے کہا۔ "اور اب داد بھی دیتا ہُوں' یہ لیجیے۔" مَیں نے اُس کی کمر پر ایک ساتھ دو دھپ مارے۔

"آہ... ایک جینئس' ایک شوہر... ایم آر ایس کے ایک جاہد پر آدھی رات کو قاتلانہ حملہ..." محسن چلّایا۔ "تین کیس بنتے ہیں بلکہ ساڑھے تین' تقریباً نصف باپ بھی بن چکا ہُوں مَیں۔"

"معاف کرنا یار' مَیں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔" مَیں نے کہا۔

*

غالب زندگی سے سخت بیزار بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگ نے اُسے قیدی بنا دیا تھا۔ وہ بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اور جب ہم باہر سے آ کے اُسے بتاتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے اور کیا کیا تیر مار آئے ہیں تو اس کو اپنی نظر بندی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح جب ہم نے اُسے رابعہ کے دیے ہوئے نمبر پر ہونے والی گفتگو کا پھر آنٹی سے ہونی والی بات کا مختصراً احوال سُنایا اور پھر انکل رضوی کے سلسلے میں اپنی اسکیم کا ذکر کیا تو وہ دل گرفتہ نظر آنے لگا۔

"افسوس کہ مَیں ایک عضوِ معطل ہو کے رہ گیا ہُوں۔" وہ ... "کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"ملٹن نے کہا تھا کہ وہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں جو صرف انتظار کرتے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "اور اس میں مایوسی اور اُداسی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے تو وہ کام کیا ہے مرزا جو ہم سے نہ ہُوا۔ تم نے فرید کھاٹ... ہم ابھی تک ثابت ہیں' اپنی ٹانگ تک نہیں تڑوا سکے۔"

"لیکن آج تم کل ہماری باری ہے۔" محسن بولا۔ "ٹانگ ٹوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ عضوِ معطل ہونے کی باری کسی اور کی آ جائے۔ کبھی کبھی مشین بھی خراب ہو جاتی ہے مگر ٹھیک ہونے کے بعد پھر اس کی کارکردگی وہی ہو جاتی ہے۔ مرزا غالب! اب اور اس سے زیادہ ہم آپ کو نہیں سمجھا سکتے۔" محسن نے بستر پر دراز ہو کے کہا۔

"کیونکہ آپ کی عقل دانی میں اتنی ہی گنجائش ہے۔" مَیں نے اتفاق کیا اور تکیہ فرش پر ڈال کے لیٹ گیا۔ دوسرے کمرے میں جُونی بھی سو رہی تھی اور سراج کی ماں بھی محوِ خواب تھی۔ کہیں کسی اسپتال میں لکڑی کی بنچ پر یا سیمنٹ کے فرش پر کیتھرین بھی سو رہی تھی۔ کسی بے نشان قبر میں عائشہ بھی تھی۔ مر جانے والے اور سونے والے سب قیدِ مقام و وقت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اگلی صبح کے سورج کا رہتا ہے جسے سونے والے آنکھیں کھول کے دیکھتے ہیں تو نئے دن کے آغاز کی طمانیت ہی زندگی کا احساس بن جاتی ہے' ورنہ کچھ نہیں۔ رات... مسلسل رات... اندھیرا اور بے حسی اور صورِ اسرافیل کا انتظار۔

ایسے ہی خیالات میں مجھے نیند نے آ لیا۔ لاشعور کے پردے سے رابعہ نکل آئی۔ ہر نقشِ ماضی ایک خواب کا حصہ بن گیا۔ وقت جو گزر چکا تھا پھر لوٹ آیا۔ جہاں جہاں اس کے آفتابِ حسن کی دھوپ اتری تھی۔ کہاں کہاں اس کے گالوں کی شفق کا رنگ بکھرا تھا' کس کس جگہ اس کے لمس کی خوشبو ٹھہری تھی۔ وہ سب مقامات کے فاصلے خواب میں یکجا ہونے لگے۔ آرزوؤں نے جال پھیلائے' خواہشوں نے کمند پھینکی اور اس وقت کو اسیر کر لیا جو ابھی ہم سے گریزپا تھا۔ آگے آگے بھاگ رہا تھا اور ہم اس آہوئے خوش خرام کے پیچھے سرگرداں تھے۔ مَیں نے آنے والے دنوں کی تصویر کے رنگ دیکھے' ارمانوں کے رُوپ دیکھے اور ماضی سے مستقبل کے سفر میں رابعہ کے ساتھ رہا۔ پھر آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔ مَیں نے خود کو حال کے لمحۂ گزراں کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ساتھ پایا۔ اس میں رابعہ میرے ساتھ نہیں تھی، وہ ماضی میں تھی اور مستقبل میں بھی تھی مگر حال ایک بے وجود حقیقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک خیال جو احساس سے پہلے گزر جائے۔

پھر بھی میں بہت تازہ دم، بہت پُرعزم اور خوش تھا۔ یہ رابعہ کے تصور کے قریب ہونے کا نتیجہ تھا کہ اُس نے پھر میرے خوابوں میں جلوہ افشانی کی ورنہ جب میں اُسے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ خوابوں سے بھی دُور تھی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ذہنی انتشار سے محفوظ رہا۔ رابعہ کیسے کراچی پہنچی، کراچی تک پہنچنے میں اُس پر کیا گزری اور پھر کس طرح وہ اس قابل ہوئی کہ کہیں سے ہمیں ایک فون کر سکے، یہ سب خود رابعہ سے ملے بغیر نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔ میں مفروضات تو بہت سے قائم کر سکتا تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رابعہ اب دُشمنوں کی قید میں نہیں ہے۔ اس کے ایک ٹیلی فون نے ہزار امکانات کو جنم دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ رابعہ نے فون کیا نہیں تھا، اُس سے فون کرایا گیا تھا یا اُسے اتفاق سے ایک کال کرنے کا موقع مل گیا تھا اور اُس نے کسی کو اپنی مجبوری بتا کے کہہ دیا تھا کہ ہم میں سے کوئی رابطہ قائم کرے تو اُسے کیا بتایا جائے۔ یہ فرض کرنا ہی مشکل تھا کہ وہ آزاد ہے۔ وہ آزاد ہوتی تو لاہور آ جاتی یا پھر روز کال کرتی، اپنا نیا ٹھکانا بتاتی۔

میں نے گھر کی خاموشی پر غور کیا تو گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ میری کلائی کی گھڑی دس بجا رہی تھی۔ بہت مدّت کے بعد اتنی لمبی اور گہری نیند نصیب ہوئی تھی۔ محسن میرے قریب ہی دوسری چارپائی پر سویا تھا مگر اب وہاں نہیں تھا۔ غالب کی چارپائی بھی خالی تھی۔ میں نے اُٹھ کے دوسرے کمرے میں دیکھنا چاہا تو مجھے اس کی کُنڈی باہر سے بند ملی۔ میں تھوڑا سا حیران ہُوا اور کُنڈی کھول کے اندر گیا۔ اندر صرف سراج کی ماں تھی مگر اُس کی حالت دیکھ کر میرے دماغ کو شدید صدمہ ہُوا۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ چکی تھی اور اب بندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو ملا کے باندھا گیا تھا اور رسّی ایک بند کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دی گئی تھی چونکہ یہ قطار کا آخری کوارٹر تھا، اس لیے ایک کمرے کی کھڑکی بائیں جانب بھی کُھلتی تھی۔ باقی کوارٹروں میں یہ کھڑکی صرف عقبی دیوار میں تھی۔ کھڑکی کے پٹ باہر تھے اور سلاخیں اندر لگائی گئی تھیں۔ کھڑکی کو بند کرنے کے لیے سلاخوں میں سے ہاتھ گزارنے پڑتے تھے۔

سراج کی ماں کے سفید بال بُری طرح بکھرے ہوئے اور اُلجھے ہوئے تھے اور اس کا مُنہ بھی کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خون آشام شیرنی کی طرح غرائی اور اُس نے بَل کھا کے میری جانب بڑھنا چاہا مگر رسّی نے اُسے ایک جھٹکے سے روک لیا۔ اُس کی آنکھوں کی وحشت اور نفرت کی نظر نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے دروازہ پھر بند کیا اور باہر صحن کی طرف گیا۔ جُولی دونوں ہاتھوں سے غالب کو سہارا دے کر لا رہی تھی۔ غالب کو باتھ رُوم جانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ وہ جُولی اُس کے ساتھ بیساکھی بن کے گئی تھی۔ غالب کا ایک ہاتھ جُولی کے کندھے پر تھا۔ اگرچہ وہ اپنے وجود کا بوجھ ایک ٹانگ پر سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر بھی جب وہ قدم بڑھاتا تھا تو اُس کے وزن سے جُولی جُھک جاتی تھی۔ اس منظر نے میرے دل میں محبت، خلوص اور دل کے پاکیزہ جذبوں کی طہارت کا احساس پیدا کیا۔ وہ ایک جوان لڑکی، غالب ایک جوان مرد، دونوں اجنبی، ایک مسلمان ایک عیسائی، اس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے کہ میرا دل چاہتا تھا، میں دُنیا کے لوگوں سے کہوں کہ اے ہوس پرستو! تعصب کے جذبات سے مغلوب انسانو! اخلاقی قدروں کے کھوکھلے نعرے لگانے والو! ذہنوں کی غلاظت کی نظروں سے تشہیر کرنے والو! دیکھو کہ یہ کتنا خوبصورت خیال ہے۔ اگر ہم سب ایسے ہوں تو کیا آسمانوں پر کسی جنّت کے حاصل ہونے تک ہم اس دُنیا میں جنّت نہیں بنا سکتے؟

میں نے غالب کو جُولی سے لے لیا۔ "کیا حال ہے اب پیر کا...؟"

"بہت بہتر۔ میرا خیال ہے، دو چار دن میں چلنے لگوں گا۔" غالب بولا۔

"اپنے خیال کو اپنے پاس رکھیے۔ خیال تو ڈاکٹر بھی اس وقت تک ظاہر نہیں کرتا جب تک کہ ایکسرے نہ دیکھ لے۔" میں نے کہا۔ "محسن کہاں ہے؟"

"اخبار لینے گیا ہے۔" غالب نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جُولی! تم کیا کر رہی ہو؟ کچھ تو کرو۔" میں نے کہا۔

"میں ناشتا بنا رہی ہوں بھائی۔" وہ بولی۔ "محسن ذرا ڈبل روٹی اور مکھن لے آئیں، چائے تو بس تیار ہے۔"

"اس کو کیا ہُوا؟" میں نے جُولی کے جانے کے بعد کہا۔

"سراج کی ماں کو؟ نروس بریک ڈاؤن۔" غالب بولا۔ "بس ایک دم دماغ اُلٹ گیا، اعصاب جواب دے گئے۔ محسن نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ آپ باتھ رُوم چلیں اور مُنہ ہاتھ دھو لیں۔ اُسی وقت باہر وہ آ گیا جس نے ہمیں یہاں آباد کیا تھا۔ اُدھر بڑھیا چلّانے لگی کہ باتھ رُوم نہیں، مجھے قبر میں جانا ہے۔ کل سے یہاں دفن کر رکھا ہے۔ نہ مارتے ہو نہ مرنے دیتے ہو، وہ دیوار میں سر مارنے لگی تو محسن نے مجبوراً اُسے خاموش کیا۔"

"اور اُس سے کیا کہا جو باہر آیا کھڑا تھا؟"

"اُس سے کہا کہ ہماری جو بہن میو اسپتال میں تھی، وہ مر گئی، ماں

پر اُس کے صدمے کا اثر ہے۔" غالب نے کہا۔

"کمال ہے! مجھے کچھ پتا نہیں چلا، اتنا ہنگامہ ہُوا۔"

"تو گھوڑے نہیں پورا اصطبل بیچ کے سو رہا تھا۔" غالب بولا۔ "ہم نے سوچا کہ جگانے سے کیا فائدہ، جسے جتنی نیند مل جائے غنیمت ہے۔ صورتِ حال پر ہم نے قابو پا ہی لیا تھا۔"

"وہ تو پھر آئے گا جس نے ہمیں مکان دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "وہ پوچھے گا نہیں کہ اب میّت کا کیا ہو گا؟"

"اُس نے پوچھا تھا، محسن نے کہہ دیا کہ وہیں سے تدفین کے لیے گاؤں بھیج دیں گے۔" غالب نے کہا۔ "اُس کی گھر والی بھی آئی تھی تعزیت کے لیے، جُولی نے باہر ہی سے ٹرخا دیا۔"

"یہ تو کچھ غلط ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "اب ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ ہم جس بہانے یہاں ٹھہرے تھے، اب وہ بہانہ ہی نہیں رہا۔ یہ تو بڑا عجیب سا لگے گا، اگر ہم کسی بہن کی میّت کو روانہ کر دیں اور خود یہاں رُکے رہیں، آئے تو ہم اُسی کے علاج کے لیے تھے۔"

"اور کوئی بہانہ چلتا بھی تو نہیں ہے۔" غالب بولا۔ "یا تو بُڑھیا شروع سے پاگل ہوتی، اس کے اچانک پاگل ہو جانے کی وہی ایک وجہ میری بھی سمجھ میں آئی۔"

"مجھے اُس کی طرف سے فکر لاحق ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی اُسے نہ جانے اور کتنے دن ہماری قید میں رہنا پڑے گا۔ ایسے تو یہ مر جائے گی۔"

"پھر کیا کریں، اسے چھوڑ دیں؟"

"نہیں یار! پھر تو ہمارے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ زیب النساء بھاگ گئی، عائشہ مر گئی۔ اُسے ہم نے چھوڑ دیا تو دلاور اینڈ کمپنی پر ہمارا دباؤ ہی ختم ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

غالب نے کہا۔ "خسرو جمشید تو دباؤ سے نکل گیا اور دلاور بھی۔ ان کا رویّہ اب پہلے سے زیادہ انتقامی ہو گا۔ صرف سراج پر دباؤ رکھنے سے شاید بات نہ بنے۔"

میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھ لو کہ اس پورے وطن فروش گروہ کو اگر سراج کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو تو وہ جیل میں نظر آئیں۔ ان کے سارے راستے صرف سراج کے حکم سے کُھلتے ہیں۔ وہ سراج کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم جاؤ بھاڑ میں، تمھاری ماں مرتی ہے تو مر جائے، ہم اُن کی ایسی تیسی کر دیں گے جو عائشہ کی موت کے ذمّے دار ہیں اور جن کی وجہ سے زیب النساء پر یہ ظلم ہُوا نہیں، سراج انھیں کچھ نہیں کرنے دے گا جب تک کہ اُس کی ماں خیریت سے واپس نہیں پہنچ جاتی۔ اس کا دُنیا میں کوئی نہیں رہا اور صرف ایک ماں ہے جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور ہماری ہر بات مان سکتا ہے۔"

محسن تین اخبارات بغل میں دبائے اور ایک کاغذ کا تھیلا ہاتھ میں اُٹھائے آیا اور اخبار گرا کے کچن میں چلا گیا۔ اُن میں دو اخبارات اُردو کے تھے اور تیسرا انگریزی کا تھا۔ میں نے اُردو اخبار کو دیکھا۔ اُس میں بہت سی خبریں ہمارے نقطۂ نظر سے اہم تھیں۔ دلاور کے اغوا پر مزید بیانات تھے اور تبصرے تھے۔ بیان خود ساختہ سیاسی لیڈروں کے تھے اور نام نہاد رفاہی تنظیموں کے تھے۔ سب نے اغوا کی مذمت کی تھی اور حکومت سے چوہدری دلاور کی بازیابی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عملی سیاست میں کچھ کرنے سے پہلے ہی دلاور نے اپنی تشہیر کا سامان کر لیا تھا اور ایک لابی بنالی تھی جو اب اسے سیاست دان بنانے کے لیے بیان بازی میں مصروف تھی۔ یہ اُس کی نئی طاقت تھی جس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے صبحِ کاذب کا اُجالا جو جھوٹا ہوتا ہے اور وقتی ہوتا ہے۔

غیر مصدقہ خبر تھی ایک مخصوص علاقے میں رات کے وقت پولیس کی غیر معمولی سرگرمی کے بارے میں تھی جہاں کچھ لوگوں نے فائرنگ بھی کی تھی اور ایک دھماکا بھی جو دستی بم کا دھماکا معلوم ہوتا تھا تاہم پولیس کی طرف سے اس قسم کی اطلاع پر لاعلمی کا اظہار کیا گیا تھا۔ عائشہ کی لاش کی دستیابی کی خبر اُسی طرح چھاپی گئی تھی جیسے زیب النساء کے اغوا اور فرار کی خبر۔ ایک کونے میں سیاہ حاشیے میں "مشہور صنعت کار، سوشل ورکر اور سیاسی شخصیت چوہدری دلاور کے خاندان میں ہونے والی دو اموات کا ذکر بڑے جذباتی اور اشتعال انگیز پیرائے میں کیا گیا تھا۔ اُس میں بتایا گیا تھا کہ چوہدری دلاور کے اغوا کے بعد ایک نامعلوم شخص نے اُن کی بیوی سے فون پر دو کروڑ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا تھا اور عدم ادائیگی یا پولیس کو اطلاع دینے کی صورت میں چوہدری دلاور کو قتل کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی کیونکہ اہلِ خانہ اتنی بڑی رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اس لیے چوہدری صاحب کے خسر نے ایس ایس پی سراج صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسرے فون کے ذریعے چوہدری دلاور کے خسر کو بتایا گیا کہ اب وہ اپنے داماد کی واپسی کی اُمید نہ رکھیں، اُس کی لاش گھر پہنچا دی جائے گی۔ اس اطلاع سے چوہدری دلاور کے خسر کو دل کا دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہُوا۔ مرحوم دل کے پُرانے مریض تھے اور یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ باپ کی موت نے چوہدری دلاور کی اہلیہ کی جان لے لی جو عرصۂ دراز سے خون کے سرطان میں مبتلا تھیں اور ڈاکٹر ان کے مرض کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جس چیز نے دو افراد کی جان لی، وہ بعد میں جھوٹ ثابت ہوئی کیونکہ چوہدری دلاور صاحب اغوا کرنے والوں کے قبضے سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہائی پا کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

دلاور نے اپنے اغوا کیے جانے اور پھر رہائی پانے کی کہانی خود گھڑ کے اخبار والوں کو سنائی تھی جس کے مطابق اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا تھا۔ اُسے معلوم نہیں کہ اغوا کرنے والے کون تھے مگر وہ دو کروڑ روپے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے یقین نہیں کیا تھا کہ چوہدری دلاور جیسا صنعت کار دو کروڑ کے اثاثے نہیں رکھتا۔ اس بات کا اقرار کرانے کے لیے اُنھوں نے دلاور کو مارا پیٹا تھا اور اُس کے گھر فون بھی کیے تھے جس کے نتیجے میں اُس کی بیوی اور سسر کا صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ دلاور نے بھی تصدیق کی تھی کہ اس کی بیوی کو یہ عارضہ سال بھر پہلے لاحق ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ وہ چھ ماہ بھی گزار سکے گی۔ یہ ایک معجزہ تھا اور کچھ علاج کا کرشمہ کہ وہ سال بھر زندہ رہی۔ اس درمیان میں کئی بار خون بدلا گیا اور لندن سے خصوصی ماہرین کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں مگر متفقہ طور پر اس مرض سے شفایابی ممکن نہ تھی، تاہم باپ کی اچانک موت ایک بہانہ بن گئی۔ اپنے سسر کے متعلق بھی دلاور نے وہی کہا تھا کہ ان پر دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا چنانچہ وہ کوئی بُری خبر برداشت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ دلاور نے اپنے فرار ہونے کا قصہ بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف اپنی ذہانت اور جرأت سے کام لے کر اغوا کرنے والوں کے قبضے سے نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔

ان سب خبروں میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سب سے بڑا جھوٹ یہ تھا کہ چوہدری دلاور صاحب سیاست داں، صنعت کار اور سوشل ورکر تھے۔ اس کی بیوی کے قتل کو بلڈ کینسر کی بیماری کا نتیجہ قرار دینا دوسرا بڑا جھوٹ تھا۔ اُس عورت کو مرنا ہی تھا۔ دلاور نے موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اُسے صحیح وقت پر دُنیا سے رخصت کر دیا۔ اُسے چیلنج کرنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ کوئی ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ اسے بلڈ کینسر نہیں تھا۔ کوئی اس ڈاکٹر کا نام نہیں پوچھ سکتا تھا اور یہ نہیں پوچھ سکتا کہ.... لندن سے کون سا خصوصی معالج آیا تھا۔ صنعت کار، سیاستدان اور سوشل ورکر چوہدری دلاور کا فرمایا ہوا مستند تھا۔ غریب آدمی بھوک اور بیروزگاری یا بیماری سے تنگ آ کے خودکشی بھی کرے تو پولیس اُس کی بیوہ کو قتل کے الزام میں دھر لیتی ہے کہ بتا کس آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو مارا تھا۔ خیر! اپنے چوہدری صاحب! یار زندہ صحبت باقی۔ ہم اس قتل کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ ہم لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرائیں گے۔ سال دو سال بعد بھی زہر کے آثار بالوں سے اور ناخنوں سے پتا چل جاتے ہیں۔

ایک خبر شہر کے نئے ایس ایس پی کے چارج لینے کے بارے میں تھی۔ اُس میں پریس ریلیز کے مطابق ایس ایس پی کے شاندار سروس ریکارڈ کے بہت سے حوالے تھے۔ آخر میں ایک سطر اُس شخص کے بارے میں تھی جس کا قابلِ فخر سروس ریکارڈ اس کی سبکدوشی کا سبب بنا تھا۔ کسی نے ضامن رضوی کے کردار کی اعلیٰ صفات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خبر صرف اتنی تھی کہ سابق ایس ایس پی نے ذاتی وجوہ کی بنا پر استعفا دیا تھا جو حکام بالا نے منظور کر لیا۔ اس طرح ایک بے داغ کیریئر کا خاتمہ بھی شکوک و شبہات کی فضا میں کیا گیا تھا۔ اب باتیں کرنے والے باتیں کرتے رہیں گے کہ یار! ایسے کون چھوڑتا ہے نوکری، کیا ہو گا کوئی بڑا گھپلا جس میں پھنسنے کی یہی صورت تھی۔ سب اُوپر والوں کی ملی بھگت ہوتی ہے۔ یہ جب اپنے جیسے کسی کو پھنستا دیکھتے ہیں تو اُسے عزت سے نکل جانے کا موقع فراہم کرتے ہیں تاکہ کل کو وہ پھنسیں تو ان کا راستہ بھی کوئی نہ روکے۔

خبریں پڑھ کر میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے بھی اُونچا ہو رہا تھا۔ غالب اور محسن دوسرے اخبار لیے بیٹھے تھے اور ان کی کیفیت بھی کچھ مجھ سے مختلف نہ تھی۔ صرف جُولی تھی جو بار بار سب سے کہہ رہی تھی کہ خدا کے واسطے ناشتا کر لو، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جُولی کی وجہ سے ہم کیتھرین کے بارے میں بات نہیں کر سکتے تھے کہ اُس کا کیا بنا، اُسے پولیس اُٹھا کر لے گئی تھی تو یہ خبر کیوں نہیں آئی۔ شاید دلاور نے خود کو بچانے کے لیے خبر رُکوا دی تھی کیونکہ کیتھرین کا نام آتا تو ساتھ اس کا نام بھی آتا۔ اُس نے تو اپنے فرار کی ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی، جس میں وہ سب نہیں تھا جو اس کے ساتھ کیتھرین نے کیا تھا یا اُس نے کیتھرین کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کیتھرین کا قاتل تھا اور یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا چنانچہ اُس نے کیتھرین کے قتل کا ہی نہیں، اُس کی لاش کی دستیابی کا ذکر تک کہیں نہیں آنے دیا۔

حیرت کی بات عائشہ کے اغوا اور اُس کی گمشدگی پر دلاور اور اُس کے گھر والوں کی خاموشی تھی۔ عائشہ کو یقیناً دلاور نے خاموشی سے سپردِ خاک کر دیا تھا مگر اس کی موت کو راز رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ رشتہ متاثر نہ ہو جو ابھی نیا تھا۔ دو دن قبل ہی تو عائشہ سے بڑی بہن کی نسبت طے ہوئی تھی۔ اس خاندان میں اب صرف وہ بچی تھی یا اُس کی بڑی بہن اور دلاور کی بیوی کے بچے رہ گئے تھے۔ کیا اب دلاور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا؟ مجھے بے اختیار خیال آیا۔ عائشہ کی بہن بھی کیا عائشہ جیسی ہی ہو گی۔ وہ بچوں کی پرورش بہرحال کر لے گی۔ کسی غیر عورت کے مقابلے میں وہ عورت یقیناً بہتر ثابت ہوتی ہے جو بہن کے بچوں سے محبّت کرتی ہو، وہ سوتیلی ماں کے روایتی کردار کو نہیں اپناتی۔ دلاور کو اگر بچوں کی پرورش کا خیال ہو اور عائشہ کی بہن بھی ویسی ہی ہوئی تو دلاور شاید اس سے شادی کرنا چاہے۔ اس کو حاصل کرنا دلاور کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ وہ عورت کی ذات کے حصار کو اُس کی کمزوریوں سے سر کر سکتا ہے۔ سبز باغ، دولت کا سنہرا جال، پُرتعیش زندگی، عزّت اور شہرت کے خواب۔ ان سے عائشہ جیسی کوئی عورت کیسے گریز کر سکتی ہے، کہاں تک مزاحمت کر سکتی ہے۔ رہا اُس کی نسبت طے پا جانے کا معاملہ تو دلاور کسی سے کچھ بھی چھین سکتا ہے۔ کسی کا احساسِ تمکنت، غرور، عزّتِ نفس، جائیداد اور زندگی، وہ منسوب کو ختم کر دے تو نسبت کہاں رہے گی۔

لاحول ولاقوۃ۔ مَیں نے سر کو جھٹک کے سوچا۔ مجھے بھی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے سوچنے کا اور دلاور ایک کمپلیکس بنتا جا رہا ہے۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے، مجھے دلاور کے ذاتی افعال سے کیا لینا جن کے لیے وہ قانون یا خدا کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ میری جنگ تو اس کے مقصد سے ہے اور اگر خدا نے اس جنگ میں کامران کیا تو پھر دلاور سے یہ بھی پوچھوں گا کہ میرے والد وزیر خاں کی زندگی اور موت کا حساب کیا ہے۔

سب اخباروں کی خبریں ایک سی تھیں۔ مجھے اطمینان صرف یہ تھا کہ کیتھرین کے بارے میں اس کی بیٹی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ ہمارے جھوٹ سے بہل جائے گی۔ اُسے ہم پر اعتبار نہ ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ ہی کیوں رہتی۔ وہ سمجھتی ہو گی کہ ہم اس کے ساتھ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے۔

"بھائی!" جُولی نے اچانک کہا۔ "شام کو چلیں گے نا، قبرستان؟"

مَیں ایسے چونکا جیسے جُولی نے میرے دل کے خیال کو پڑھ لیا ہو۔ "ہاں بالکل چلیں گے، ہم سب چلیں گے۔"

"لیکن ابھی تو ہم نے کہیں اور جانا ہے۔" محسن نے گھڑی پر نگاہ ڈال کے کہا۔

"یہاں سے تو سب ہی کو جانا ہے۔" غالب نے کہا جو ایک فلسفیانہ سی بات لگتی تھی مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔

مَیں اور محسن اس گیراج میں پہنچے جہاں ہم نے اپنی مائکرو بس کھڑی کی تھی۔ وہ لڑکا سخت بیزار اور پریشان بیٹھا تھا۔

"لو جی! آپ نے بھی کمال کر دیا۔" وہ بولا۔ "آپ کی وجہ سے مَیں ابھی تک گھر نہیں گیا، رات بھر کا جاگا ہُوا ہوں۔"

"ہم نے تو منع نہیں کیا تھا تم کو۔" مَیں نے کہا۔

"مگر گاڑی تو مَیں نے ہی لی تھی۔" وہ بولا۔ "آپ کو مَیں پہچانتا تھا۔ آپ نے تو صبح آنے کو کہا تھا۔"

"تو کیا یہ صبح نہیں ہے؟"

"واہ جی، دوپہر ہو گئی ہماری، بڑے لوگوں کی اب صبح ہوئی ہے۔ خیر جناب، گاڑی دیکھ لیں، بریک ایک دم فائٹ ہیں۔"

"اچھی طرح چیک کر لیے تھے؟"

"ہاں جی، آپ بھی دیکھ لیں۔" وہ بولا۔

مَیں نے اپنی تسلّی کے لیے گاڑی میں ایک میل کا راؤنڈ لگایا۔ اس کا کیا بھروسا، اچھے بھلے بریک کھولتا اور رانے کا ستیاناس کر دیتا مگر غالباً اُس نے ہمیں ناتجربہ کار اور وہمی سمجھا ہو گا کہ بریک ٹھیک تھے اور ہم ٹھیک کرانے آ گئے تھے۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا مگر ہم سے پچاس روپے وصول کر لیے۔

کاروں کے شوروم کا مالک جس کی معرفت ٹریلر کا سودا ہونا تھا، ہمارے فراق میں سخت بے قرار تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور اس کا یہ اندیشہ دُور ہُوا کہ ہم نے براہِ راست معاملہ طے کر کے اس کے کمیشن کا خون نہیں کیا۔ اُس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"جناب خان صاحب! پارٹی بہت بدمعاش ہے۔" وہ بولا۔

"ام اس سے بڑا بدمعاش اے۔" محسن بولا۔ "دس نمبری اے۔"

"جی! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "مقصد تھا اُن کی دھوکے بازی سے خبردار کرنا۔ ضرورت مند کو دیکھ کر مُنہ پھاڑتے ہیں۔ کل صاف بات ہو گئی تھی۔ رات کو پچاس ہزار زیادہ مانگنے لگے۔"

"اچھا... بے ایمان، واؤ۔ اس کو ام گولی مار دے گا۔" مَیں نے ریوالور نکال کے کہا۔ "وعدہ خلافی کرتا اے۔"

"ارے نہیں وہ... وہ مَیں نے ٹھیک کر لیا۔ آپ اسے جیب میں رکھ لیں۔" وہ گھبرا کے بولا۔ "بالکل فکر مت کریں، سودا اتنے میں ہی ہو گا جتنے میں بات ہوئی تھی۔"

"ٹھیک اے۔ ابھی ام ایسا آدمی سے بات نہیں کرے گا۔" محسن نے کہا۔ "تم جاؤ اور اس کو پیسہ دو، اگر ایک پیسہ بھی زیادہ دے گا تو ام تم کو گولی مار دے گا۔" اب محسن نے ریوالور نکال لیا۔

"بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔" اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ "مَیں ایک پیسہ زیادہ نہیں دوں گا۔ آپ یہ گولا بارود چھپا کے رکھیں۔"

"اچھا تو جاؤ، ام ادھر بیٹھے گا۔" مَیں نے کہا۔

"اور سبز چائے پیئے گا۔" محسن نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

شوروم کے مالک کے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی کہ وہ خود رقم لے کر جائے اور سودا کینسل کر آئے۔ اب اس میں پچاس ہزار بچتے ہیں یا ایک لاکھ... اس میں وہ خود ہی مختارِ کُل تھا۔ ہم دوبارہ وہاں جانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے بکری کی موت کا راز اتنی جلدی فاش نہیں ہو سکتا تھا، جہاں حادثہ پیش آیا تھا، وہاں اس کی کوئی شناخت نہیں بچی تھی اور اس کی پُراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج ہو جانے کے بعد یہ ہو سکتا تھا کہ دو چار دن میں اس کی حادثاتی موت بھی ثابت ہو جائے لیکن ٹرک اسٹینڈ پر پیڈرو یا اُس کے کسی ایجنٹ کا آ جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوئی تجسس کا مارا ہمیں دیکھے اور پوچھے کہ ٹریلر ہم نے کیوں خریدا ہے۔

شوروم کا مالک تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ٹریلر کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں نے اُسے دُور ہی سے آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ زمین سے تقریباً آٹھ نو فٹ کی بلندی پر اس کیبن میں بیٹھا ہوا تھا جو انجن کے پیچھے تھا۔ ڈرائیور ایک صحت مند اور جوان، سُرخ و سفید پٹھان تھا جس کی مونچھیں شاہانہ قسم کی تھیں۔

"میاں محسن! یہ تو کوئی اصلی پٹھان آ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہمارا اس سے کیا تعلق اور تعلق نہیں تو ڈرنا کیا، جیسے شاعر نے کہا ہے کہ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" محسن بولا۔

"ابے، یہ ہم سے اپنی مادری زبان میں بولنے لگا تو ہمارے پٹھان ہونے کا ڈراما فیل کر دے گا۔" میں نے کہا۔ "آدمی جذباتی ہو تو کسی بھی ہم زبان اور ہم سخن سے گلے مل کر بہت خوش ہوتا ہے۔"

"ہم نے صرف ٹریلر منگوایا تھا، یہ ڈرائیور کیوں لے آیا۔"

"ممکن ہے ٹرک کے ساتھ تحفے میں ڈرائیور دیا گیا ہو۔" میں نے کہا۔ "جیسے بعض اشتہارات میں ہوتا ہے کہ دندان شکن منجن کے فیملی سائز کے ساتھ ایک ہوشربا کیلنڈر مفت۔"

"یہ ڈرائیور بھی دنداں شکن ہی لگتا ہے۔" محسن بولا۔ "اگر یہ پشتو بولنے لگے تو فریقین کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔"

غنفر اور چھریلا کار شوروم کا مالک جست لگا کے اترا اور سڑک پار کرتے ہوئے ایک گائے سے ٹکرا گیا جو کسی نے صدقے میں آزاد چھوڑ دی تھی۔ ایسے مویشی ہر شہر میں ہر جگہ آزادانہ پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ لوگ جو گھر میں نقب لگا کے سوئے ہوئے آدمی کے نیچے سے چادر چرا لیتے ہیں، وہ بھی ان لاوارث مویشیوں کو پکڑ کے نہیں لے جاتے۔

مذکورہ گائے سے ٹکرانے کے بعد شوروم کا مالک کراہتا ہوا اور لنگڑاتا ہوا اندر آیا تو سخت برہم تھا۔

"بس، چھوڑ دیتے ہیں، اب جس سے چاہیں ٹکراتی پھریں گاڑیوں سے یا بندوں سے۔" وہ بے ربط الفاظ میں بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی اللہ میاں کی گائے کا شکوہ کر رہا تھا جس نے اُسے ٹکر ماردی تھی۔

"خو یارا خدا کا شکر کرو۔" میں نے کہا۔

"جی؟ خدا کا شکر ادا کروں؟ کس بات پر؟"

"اس بات پر کہ تم بچ گیا۔" محسن بولا۔ "سالم بچ گیا۔"

"اور اس بات پر کہ وہ گائے تھی، شیر نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یا ہاتھی نہیں تھا۔"

شوروم کا مالک خون کے گھونٹ پی کر اس مذاق پر مُسکرایا کیونکہ وہ مُسکرانے پر مجبور تھا۔ "آپ کی چیز آ گئی۔"

"کون سا چیز؟" میں نے کہا۔ "وہ جو اُوپر بیٹھا ہے؟"

"وہ تو ڈرائیور ہے۔" شوروم کا مالک بولا۔

"اچھا، ٹرک کا ساتھ ڈرائیور مفت؟ کتنے کا ملا؟"

"چار لاکھ، پورے۔" شوروم کا مالک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ام کو ڈرائیور نئیں چاہیے، اس کا قیمت کاٹ دو، کمپنی کو بولو ڈرائیور واپس۔" محسن نے کہا۔ "امارا چاچے کا پُتر خود ڈرائیور ہے، موت کا کنواں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے۔"

"مگر جناب! موٹر سائیکل کہاں اور یہ ہیوی ڈیوٹی ٹرک کہاں؟" شوروم کا مالک بولا۔ "اگر آپ کے پاس ڈرائیور نہیں ہے تو میری مانیں، اسے رکھ لیں، یہ ضرورت مند ہے... اور پریشان ہے۔"

"کیوں پریشان ہے؟"

"اور تم اس کا پریشانی پر کیوں پریشان ہے؟" میں نے کہا۔

"جناب! ایماندار آدمی ہے نا، اس لیے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ تین بار نوکری سے نکالا جا چکا ہے کیونکہ غلط کام نہیں کرتا۔ اب جو ٹرک کمپنی والے ہوتے ہیں، اُن کے تو ہزار دھندے ہوتے ہیں اور ہزار طریقوں سے وہ راستہ بناتے ہیں۔ چونگی محصول، ایکسائز، نذر نذرانہ، یہ سب دیتے ہیں، تب کہیں جا کے اِدھر کا مال اُدھر پہنچتا ہے اور اُدھر کا مال اِدھر آتا ہے، مال سمجھتے ہیں نا آپ؟ تو یہ پٹھان زادہ پکا پٹھان ہے، کہتا ہے یہ غلط ہے، دھوکا ہے، گناہ ہے اور جرم ہے، ہم یہ نہیں کرے گا اور کسی کو کرنے بھی نہیں دے گا۔ نتیجہ تو آپ خود سمجھ لیں، اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ کہیں بھی وہ ہفتے سے زیادہ نہیں رہتا۔ ویسے ڈرائیور بہت اچھا ہے اور بھروسے کا آدمی ہے، اس لیے میں اپنے ساتھ لے آیا۔" وہ بولا۔

"اچھا، ہم دیکھے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اُمید تھی کہ آپ لوگوں کے ساتھ چل جائے گا کیونکہ آپ لوگوں کا کام سیدھا ہے، میرا مطلب ہے کوئی ہیرا پھیری والا نہیں ہے۔"

"اس کو بولو، گاڑی کو ملتان روڈ پر لے جائے اور فلم اسٹوڈیو سے آگے کھڑا کر دے۔" میں نے کہا۔ "ہم اُدھر ہی آ جائے گا۔"

"باقی بات اُدھر کرے گا۔" محسن نے کہا۔

شوروم کا مالک یہ خوشخبری سُنانے کے لیے پھر سڑک عبور کر کے گیا اور اس مرتبہ ایک دومنزلہ بس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہم نے ٹریلر کو پھر روانہ ہوتے دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ فوری طور پر ہمارے پٹھان نہ ہونے کا راز فاش نہیں ہوا تھا۔ ڈرائیور کی ہمیں واقعی ضرورت تھی اور جیسا کہ شوروم والے نے بتایا تھا، یہ آدمی اپنی ایمانداری اور اصول پرستی کے باعث دربدر ہو رہا تھا، اگر ہمیں اس جیسے شخص کی ضرورت تھی تو اسے بھی ہم جیسے لوگوں کی۔

شوروم والا لوٹ کر آیا اور اس سے باقی معاملات طے کرنے میں مزید آدھا گھنٹا صرف ہوا۔ ہم نے رسید اور ٹرانسفر لیٹر وغیرہ حاصل کیے اور اُسے رجسٹریشن کے مصارف ادا کیے۔

"رجسٹریشن نورتن سرکس کمپنی کے نام پر ہو گا۔" میں نے کہا۔

"آپ ایک دسواں رتن شامل نہیں کر سکتے؟" شوروم والا اب ہم سے بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تمام کاروباری معاملات افہام و تفہیم اور خوشگوار ماحول میں طے پائے تھے۔ سودا بہت بڑا تھا اور اُس نے فائدہ بھی بہت بڑا حاصل کیا تھا چنانچہ وہ خوش تھا۔ اس نے ہمارے متعلق جو ابتدا میں رائے قائم کی تھی، وہ بالکل بدل چکی تھی اور ہم جو بے حد ٹیڑھے نظر آتے تھے، اس کے نقطۂ نظر سے بہت سیدھے ثابت ہوئے تھے۔ ہم نے اُس کے کہنے پر ایک ڈرائیور کو بھی ملازم رکھ لیا تھا۔ اس نے ہمیں ایک اور کاروباری مشورہ دینا مناسب سمجھا۔

"دسواں رتن، وہ ہم نے ابھی رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا گیارھواں، گیارہ کی ٹیم ہوتی ہے جناب!" وہ ہنسا۔ "میرا ایک بھتیجا ہے، اُسے بڑا شوق ہے، ایسے کرتب دکھانے کا۔ چھوٹا تھا تو ایک بار چھت پر سے کُود گیا، مشکل سے سات سال کا ہو گا۔"

"پھر کیا ہُوا، لنگڑا ہو گیا، سات سال کی عمر میں؟"

"وہ... جی وہ تو نہیں، اس کے والد یعنی میرے بھائی کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔" شوروم والا بولا۔ "انھوں نے بچے کو کیچ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے اچھے کرکٹر تھے مگر خیر، کیچ سب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ دوسری بار جناب اُس نے بہ عمر چودہ سال ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ ماری مگر درخت ذرا دُور رہ گیا۔"

"اچھا، پھر اُس کا ٹانگ ضرور ٹوٹا ہو گا۔"

"نئیں بھائی صاحب! اُس کو پھر کسی نے کیچ کر لیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

شوروم والے نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایک بکری ٹوٹ گئی۔ پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، وہ بکری کی کمر پر گرا۔ خیر مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا گیا تھا اور بریانی اچھی پکی تھی۔ اب وہ اکیس سال کا ہے۔"

"ہر سات سال بعد وہ کسی کا کچھ توڑتا ہے۔" میں نے فیصلہ کیا۔ "سات سال میں باپ کا ہاتھ، چودہ سال میں بکری کا کمر، اب اکیس سال میں وہ کیا توڑے گا، ہمارا گردن؟ نئیں اس کو بولو کہ چڑیا گھر کے پنجرے پر چڑھ کے شیر پر کُود ے۔"

ظاہر ہے، ہمارے اس مشورے کے بعد شوروم والے سے مذاکرات ختم ہو گئے اور ہم اس سے ہاتھ ملانے کے بہانے اس کو اچھی طرح جھنجوڑ کے رخصت ہوئے۔ اُس نے کہا کہ وہ نورتن سرکس کمپنی کے نام ٹریلر کے ٹرانسفر کی کارروائی اگلے چوبیس گھنٹوں میں پوری کرے گا۔

"اس ٹرک ڈرائیور کا انٹرویو نہ کر لیں؟" محسن نے وہاں سے روانگی کے بعد کہا۔

"کر لیتے ہیں، شاید ایک کام کا آدمی مل جائے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اس کوارٹر سے بھی فوراً نکل جانا چاہیے۔" محسن بولا۔ "سراج کی ماں کی وجہ سے گڑبڑ نہ ہو جائے، کہیں پاگل پن میں اُس نے بولنا شروع کر دیا سب کے سامنے تو ہم پھنس جائیں گے۔"

"مگر ہم اب جائیں گے کہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ ٹریلر میں ہم محفوظ ہوں گے۔" محسن بولا۔

"کیا اس پر سرکس کا نام لکھوا لیں؟"

"ابھی نہیں۔" محسن نے کہا۔ "خواہ مخواہ لوگ جمع ہوں گے اور دس قسم کے سوال کریں گے۔ ابھی تو وہ عام قسم کا ٹرک لگتا ہے جو عموماً بڑے شہروں کے درمیان سامان لاتے لے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ "اگر یہ بیان نہ دیا جاتا... کہ میو اسپتال میں داخل بہن مر گئی ہے تو ہم دو چار دن وہیں گزار لیتے۔"

"لیکن اب نہیں گزار سکتے، ہمیں روانہ ہونا پڑے گا۔ یہ بتا کے کہ ہم بھی میت کے ساتھ واپس جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔

ٹرک ابھی ملتان روڈ پر ہی تھا کہ ہم نے اُسے جا لیا۔ اُس کی رفتار بہت کم تھی اور شہر کی ٹریفک میں اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس قسم کے ٹریفک کو مخصوص سڑکوں پر سے گزرنے کی اجازت تھی۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تنگ سڑکوں اور بازاروں میں ہیوی ڈیوٹی ٹرک نہیں جا سکتے تھے چنانچہ اُس نے راستہ بھی لمبا اختیار کیا تھا۔ ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ ہم نے اُسے صرف ملتان روڈ پر اسٹوڈیو سے آگے جانے کی ہدایات دی تھیں۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ اُسے کتنا آگے جانا ہے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اُسے خود گائیڈ کروں۔ آبادی سے نکلتے ہی میں نے مائکروبس کی رفتار بڑھا کے اُسے اوورٹیک کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آٹھویں میل کے نشان پر مجھے سڑک کے بائیں کنارے پر ایک صاف حصّہ نظر آیا جہاں ٹرک کو کھڑا کرنے سے ٹریفک میں ذرا بھی خلل نہیں پڑ سکتا تھا۔

ڈرائیور نے ٹرک کو میری ہدایت کے مطابق بالکل آخری حصّے میں روک دیا۔ ٹرک اب سڑک سے تقریباً پچاس گز دُور تھا اور یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ ایک جانب غیر آباد کھیت تھے جو کسی تعمیراتی کمپنی نے خرید لیے تھے۔ ان کا سائن بورڈ سڑک کے کنارے نصب تھا جس پر مجوزہ منصوبے کے بارے میں پبلک کو کارآمد معلومات فراہم کرنے کے بعد مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ تفصیلات کے لیے فلاں فلاں نمبر پر رابطہ قائم کریں۔ آگے پیچھے مکانات اس خالی پلاٹ کے بعد شروع ہوتے تھے چنانچہ تین طرف سے ہم الگ تھلگ تھے۔ چوتھی سمت یعنی سڑک کے دوسرے کنارے پر نئی بنی ہوئی دُکانیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر کے شٹر گرے ہوئے اور مقفل تھے۔ صرف چار دُکانیں آباد ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں چائے خانہ اور ریسٹورنٹ تھا جو دو دُکانوں کو ملا کے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر سفیدی پھیر کے پروپرائٹر نے بقلم خود شاندار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ تحریر کیا تھا اور دائیں بائیں ایک ایک پھول بنا کے اس میں یا اللہ اور یا محمدؐ بھی لکھا تھا۔ یہ ہوٹل یوں تھا کہ مسافرانِ شب کے لیے خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اور آسمان کے سائبان کے نیچے چارپائیاں ڈال کے سونے کا بندوبست کیا گیا تھا اور یہ اعلان بھی مالک اور پینٹر نے سائن بورڈ پر کر دیا تھا کہ منجی بسترا ایک روپیہ [illegible] دُکانیں بالترتیب موٹر مکینک ہینڈ پمپ بنانے اور مرمت [illegible] لے اور تعمیر میں کام آنے والے میٹریل فروخت کرنے والوں کی تھیں۔

"السلام علیکم۔" ٹرک ڈرائیور نے نیچے اُتر کے ہم سے پُرجوش مصافحہ کیا۔ "میرا نام شیر علی ہے۔"

مجھے اُس کے لہجے پر شک گزرا۔ "شیر علی! تم مجھے پٹھان تو نہیں لگتے، میرا مطلب ہے لہجے سے۔"

وہ مسکرایا۔ "میں سو فیصد اور خالص پٹھان ہوں۔ کوہاٹ کا رہنے والا۔"

"مگر تم اردو بہت صاف بولتے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ بہت سے دیسی لوگ جب انگریزی بولتے ہیں تو انگریزوں کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔" شیر علی نے کہا۔ "انگریز ہیں جو فارسی، عربی جانتے ہیں۔ یہ تو اپنے ہی وطن کی قومی زبان ہے۔"

"تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے شیر علی؟" محسن نے اُس کی بات سے متاثر ہو کے کہا۔

"میں نے اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اچھا اور تم ٹرک چلا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ کے خیال میں یہ کوئی بُرا کام ہے، جس پر مجھے شرم آنا چاہیے؟" وہ بولا۔

"ہرگز نہیں،" میں نے فوراً کہا۔ "مجھے تو خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تم نے محنت کی عظمت کو پہچانا ورنہ بی اے کر کے لوگ جسمانی محنت کے کام میں توہین محسوس کرتے ہیں۔"

"میں محنت کر سکتا ہوں، نوکری شاید نہیں کر سکتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم کو یہ کام بھی تین بار چھوڑنا پڑا تھا۔" محسن بولا۔

"جی، بات وہی ہے کہ نوکری میں آدمی اپنی خدمات بیچتا ہے، اپنی عزتِ نفس، خودداری، دین ایمان یا اصول نہیں بیچتا۔" شیر علی نے کہا۔ "میں تنخواہ لوں گا تو اس کے ایک ایک پیسے کا حقِ محنت ضرور ادا کروں گا، جہاں کام نہیں ہوگا، وہاں میں مفت کی تنخواہ بھی نہیں لے سکتا مگر ملازمت کے نام پر میں غلامی کروں، یہ ممکن نہیں ہے اور آج کل ہر نوکری میں غلامی ہے۔"

"اگر تم اور ہم ساتھ رہے۔" میں نے محتاط ہو کے کہا۔ "تو تم دیکھو گے کہ یہ ملازمت بھی نہیں ہے، رفاقت ہے۔ ہم مل کے کام کریں گے اور ساتھی ہوں گے، نہ کوئی آقا نہ کوئی ملازم۔ ہم عزت دے کر عزت حاصل کرنے کے اصول کو سمجھتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔"

"فرض کرو، ہم تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہیں۔" محسن بولا۔ "تو تم کیا معاوضہ یا حقِ محنت لو گے؟"

"میں اکیلا آدمی ہوں، مجھے ایک ہزار بہت ہیں۔" وہ بولا۔ "پانچ سو خرچ کروں گا تو پانچ سو بچا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، ہم تمہیں دو ہزار روپے ماہانہ دیں گے، کھانا پینا سب ہمارے ساتھ ہوگا۔"

اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "کھانا پینا میرا اپنا ہوگا۔"

"یہ کوئی رعایت نہیں ہے۔ ان سب کے لیے جو ہمارے ساتھ ہوں گے، کھانے پینے کا ایک ہی جگہ بندوبست ہوگا۔ سب ایک ساتھ کھائیں گے اور ایک سا کھائیں گے، ہم بھی۔ سب کی تنخواہ اس کے علاوہ ہوگی۔ پھر بھی تم بازار سے کھانا چاہو یا اپنا پکانا چاہو تو پانچ سو کا اضافہ کر لو۔"

اُس نے کچھ سوچ کے انکار میں سر ہلایا۔ "ایسی صورت میں دو ہزار مجھے منظور ہیں، میں کچھ اور سمجھا تھا، سب سے الگ میں بھی کما سکتا ہوں، اب آپ مجھے کام بتا دیں۔"

"کام... کام صرف ٹرک چلانا۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے، آپ کوئی سرکس قائم کر رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "صرف سرکس ہی ہوگا نا، کچھ اور تو نہیں ہوگا۔"

"کچھ اور سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ بہت سے تھیٹر، سرکس والے آوارہ عورتیں ورغلا کے رکھ لیتے ہیں۔"

"اوہ نو، ہم کوئی بھی غلط کام نہیں کریں گے، تم دیکھ لو گے خود ہی۔" میں نے کہا۔ "ہم اسمگلر بھی نہیں ہیں کہ ٹرک کو غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال کریں۔"

"سرکس کے باقی ساتھی کون ہیں؟" وہ بولا۔

"اُن سے بھی تم بہت جلد ملو گے۔" [illegible] نے کہا۔ "[illegible] ہم جا رہے ہیں، اگر تم ٹرک کو چھوڑ کے جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"مجھے اپنا سامان لے کر آنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"سامان کم سے کم ہو تو اچھا ہے، بس پہننے کے کپڑے، باقی [illegible] چھوڑ دو، ہم بھی اسی چلتے پھرتے گھر میں رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس ہے بھی کیا، دو چار جوڑے کپڑوں کے علاوہ ایک پرانی چارپائی، اُسے میں چھوڑ آؤں گا۔" وہ بولا۔

"شام تک لوٹ آنا۔" میں نے کہا اور جیب میں سے پانچ سو روپے نکالے۔ "یہ ایڈوانس رکھ لو، کچھ خریدنا ہو تو۔"

"بہت بہت مہربانی۔" وہ بولا۔ "میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کچھ مانگوں، ان بدمعاشوں نے میرے دو ہفتے کے پیسے مار لیے جہاں میں پہلے ملازم تھا، میں نے اُن کو مارا تھا۔"

"کیوں مارا تھا؟" میں نے کہا۔ "مارپیٹ کوئی اچھی بات ہے؟"

"اور کسی کو دو ٹکے کا ڈرائیور کہنا، ذلیل کرنا اور گالیاں دینا کوئی اچھی بات ہے۔ آپ نے مجھے پانچ سو روپے دیے ہیں، اس کے ساتھ اگر آپ مجھے گالی دیتے تو میں آپ کو بھی مارتا۔" وہ بولا۔

"ہم کسی کو گالی دیتے ہیں تو پیار سے۔" میں نے کہا۔ "مگر جب ملتے ہیں تو ایسا کہ پھر اُٹھنے نہیں دیتے۔ تم اب جاؤ، ہم اگر شام تک نہ آئیں یا کل آئیں تو فکر مت کرنا۔ یہ ٹریلر تمہارا گھر ہے اور وہ سامنے ایک ہوٹل ہے، وہاں شرفا کے لیے طعام و قیام کا اعلیٰ انتظام ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں نے محسن سے کہا۔ "یہ آدمی مجھے کام کا لگتا ہے اور اپنے جیسا لگتا ہے۔"

"میں ابھی کوئی رائے نہیں دوں گا۔" محسن بولا۔

"چکری کے چکر نے سب کا اعتبار ختم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"سانپ کا کاٹا رسّی سے ٹھیک ڈرتا ہے اور اس تجربے کے بعد میں کسی پر بھی اعتبار کرنے میں عجلت نہیں کر سکتا۔ آدمی کو دیکھیں گے، پرکھیں گے اور اس کے بعد دوست کہیں گے۔" محسن نے کہا۔

"اب اس ٹریلر کو کیا لاوارث چھوڑ جائیں؟" میں نے کہا۔ "یہ ہے تو بڑے خطرے کی بات، کوئی راہ چلتے جیب میں ڈال کر لے گیا تو؟"

جواب دینے کے بجائے میں نے سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع گیراج کا رُخ کیا۔ وہاں ایک گنجے سر والا اپرنٹس فارغ کھڑا تھا مگر ہمیں آتا دیکھ کر وہ ایک گاڑی کے اُٹھے ہوئے بونٹ میں گھس گیا۔ ہم نے بونٹ بجا کے اُسے متوجہ کرنا چاہا تھا مگر بونٹ تو بس اشارے کا منتظر تھا کہ ایک دم گر گیا۔ اپرنٹس نے ایک زوردار ہائے کی اور سر کو رگڑتا ہوا باہر نکلا۔

"واہ جی واہ! آپ نے تو سر پھا... پھا... پھاڑ... دیا تھا۔"

"اور کیا پھاڑتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کپڑے تو تمہارے پہلے ہی پھٹے ہوئے ہیں، یہ بتاؤ اس گاڑی کی ٹیوننگ کر لو گے؟"

"اس گاڑی کی؟" وہ انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔ "وہ گاڑی ہے؟"

"گاڑی نہیں ہے تو کیا ہے، جھاڑی ہے، داڑھی ہے؟" محسن نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ گا... گا... گاڑی ہوتی ہے کار... یہ تو جی... ہا... ہا... ہاتھی ہے، استاد کریں گے ابھی آ کے۔" وہ بولا۔

"بس تو اپنے اُستاد سے کہہ دینا کہ صحیح سیٹ کر دیں۔" میں نے کہا۔

میں چل پڑا تھا کہ محسن نے کہا۔ "وہ چاچا... چا... چابی۔"

"چاچا... چابی۔" میں نے کہا۔ "کون چاچا چابی؟"

"چا... چاچا... چابی دے کر جائیں گے تو ٹیوننگ ہو... ہوگی نا جی۔" اپرنٹس نے دانت نکال کے کہا۔ "ورنہ ہم ٹیسٹ کیسے کریں گے؟" میں نے چابی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ غالباً وہ اپنے ہکلے پن پر سب کے ہی مذاق کا نشانہ بنتا تھا اور بُرا ماننا چھوڑ چکا تھا۔

ہم اپنی سرکاری گاڑی میں واپس ہوئے۔ ابھی تک سب خیریت تھی۔ ہمارے نئے پراجیکٹ کا سب سے اہم اور مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ ہمیں جس قسم کے ٹریلر کی ضرورت تھی وہ ہمارے پاس تھا اور اب اگلا مرحلہ تھا نورتن تلاش کرنے کا۔ دو ہم خود تھے چنانچہ ہمیں سات افراد کی ایک باصلاحیت ٹیم کا انتخاب کرنا تھا لیکن یہ کام آج ہی شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں اس کوارٹر سے شفٹ ہونا تھا اور آج ہی رات کو پھر کراچی فون کرنا تھا۔ ہم نے راستے میں رُک کر کھانا بھی لیا۔ دوپہر کے بعد ہم گھر پہنچے تو سراج کی ماں سو رہی تھی۔ غالب نے اُسے خاموش رکھنے کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لیے پھر سکون آور گولیاں دے دی تھیں، اس حالت میں اُسے لے جانا آسان تھا چنانچہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہم نے غالب کو گاڑی میں پہنچایا اور پھر سراج کی ماں کو۔ ایک گھنٹے بعد میں کوارٹر کی چابی دینے گیا تو غازی خاں کا پڑوسی موجود تھا۔

"آپ جا رہے ہو جی؟" وہ بولا "غازی خاں کا خط آیا ہے وہ بھی شام تک پہنچے گا۔"

"اچھا۔" میں نے کہا "اب اس سے تو ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں جی، آپ کی بھی مجبوری ہے، بڑا افسوس ہوا..."

"بس بھائی، اللہ کی یہی مرضی تھی۔" میں نے ایک سوگوار قسم کی سرد آہ بھر کے کہا "یہ بتاؤ کہ غازی خاں کی بیوی تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں جی، میں نے نہیں بتایا آپ کو کہ اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔" وہ بولا "ابھی پٹی نہیں کھلی مگر غازی خاں نے لکھا ہے کہ ایک ہفتے بعد وہ دیکھ سکے گی، جیسے پہلے دیکھتی تھی۔"

"تم وہ سامان دیکھ لیتے، جو ہم نے لیا تھا۔"

"لو جی، آپ ہمیں شرمندہ کرتے ہو۔" وہ بولا "میں تو آپ سے کرایہ بھی نہ لیتا مگر کوارٹر کسی اور کا تھا۔"

وہ بھول گیا کہ پہلے اس نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ اُس نے چند دن قیام کر کے ایک ماہ کا کرایہ ادا کرنے والوں سے ملنے والی رقم جیب میں ڈال لی تھی اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اصل مالک مکان سے یہ ذکر تک نہیں کرے گا کہ کوارٹر کرائے پر اُٹھا تھا۔ اب وہ بڑا امانت دار بن رہا تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ دس منٹ میں ہم اس علاقے سے نکل چکے تھے۔ گلبرگ کے علاقے میں ایک نیا کافی ہاؤس کھلا تھا جو اس وقت ویران پڑا تھا۔ میں نے اور محسن نے اندر بیٹھ کے کافی پی اور غالب کے لیے گاڑی میں بھجوا دی۔ جولی نے صرف چائے پی۔

"مجھے تو یہ آدمی شیر علی بھی مشکوک لگتا ہے۔" محسن بولا۔

"اُسے ہم مشکوک لگے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"بالکل لگے ہوں گے اور بہت جلد ہمیں اُس کو مطمئن کرنا ہوگا۔" محسن نے کہا "یہ تو اچھا ہوا کہ اُس نے ہمیں پٹھانوں کے لہجے میں اُردو بولتے سُنا ہی نہیں تھا مگر ہم نے غلطی سے بھی انگریزی بولنی شروع کر دی تو وہ چونکے گا۔ فرانسیسی تو خواب میں بھی مت بولنا۔"

"فی الحال میں اُردو یا پنجابی پر اکتفا کروں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ بات عجیب نہیں کہ اُس نے ابھی تک ہم سے ہمارے نام بھی نہیں پوچھے۔" محسن بولا "اگر وہ پوچھتا تو ہم کیا بتاتے؟"

"اب وہ پوچھے گا تو کیا بتائیں گے، وہی جو رجسٹریشن کے کاغذات میں ہیں۔" میں نے کہا "میں عجب خان ہوں۔"

"اور میں ہوں عجب خان ولد پشاور خان، ساکن ڈنگری شہر ہوں۔" محسن بولا "تو بھول گیا۔"

"آئندہ یاد رکھوں گا مگر یار، یہ کسی کو کیا معلوم کہ ہم نے گاڑیوں کی رجسٹریشن کس نام سے کرائی ہے۔ صرف ماسٹر وکس کے کاغذات میں عجب خان کا نام ہے، اسے بھی نورتن سرکس کمپنی کے نام کرا دیں گے۔ ٹریلر بھی نورتن سرکس کی ملکیت ہوگا تو پھر یہ نام نہیں چلیں گے۔ ہمارے نام ماڈرن قسم کے ہونے چاہئیں جیسے کہ سرکس یا تھیٹر کمپنی کے مالک رکھتے ہیں یا رکھنا پسند کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مالک تو غالب ہوگا۔" محسن بولا "ہم صرف جوکر ہیں اور سرکس میں ہمارے نام بھی مسخروں والے ہوں گے مگر اصل نام ہمارے ساتھی ضرور جاننا چاہیں گے۔"

"بٹ برادرز۔" محسن نے کہا "بٹ برادرز سرکس... پی ٹی سی..."

"خیال تو اچھا ہے اور اچھوتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن بٹ برادران کے لیے تین عدد ہم وزن اور ہم قافیہ نام بھی مطلوب ہیں۔"

"مثلاً مسرور بٹ یعنی یہ خاکسار جو وصل محبوب سے شادکام ہوا اس لیے مسرور ہے۔" محسن بولا "مشہور بٹ ہو سکتا ہے مرزا غالب کیونکہ اس کا نام خاصی شہرت رکھتا ہے اور آپ ہوئے مغرور بٹ اور اگر یہ پسند نہیں تو زیادہ بھاری بھر کم نام ہیں استعمار بٹ، استغفار بٹ اور استفسار بٹ۔ ورنہ ایکس بٹ وائی بٹ اور زیڈ بٹ..."

باہر سے کسی نے مائکرو بس کا ہارن بجانا شروع کیا۔ غالباً جولی نے غالب کے کہنے پر ہمیں یاد دلایا تھا کہ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے ویٹر کو بل ادا کیا اور اسے کہا کہ وہ گاڑی میں سے بھی برتن اٹھا لائے۔

"بہت جلد آ گئے آپ۔" غالب نے طنز سے کہا۔

"ہم... جی آپ نے بالکل درست فرمایا۔" میں نے ڈھیٹ بن کر کہا "ہم واقعی کچھ جلدی آ گئے، میرا مطلب ہے اس دُنیا میں۔ ہر جینئس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ قبل از وقت پیدا ہوا۔ مثلاً محمد تغلق۔"

"ہم بھی اکیسویں صدی کے لوگ بیسویں صدی میں پیدا ہو گئے تو گویا جلدی ہی آ گئے۔" محسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ لوگ جلدی ہی رخصت کیوں نہیں ہو جاتے اس دُنیا سے؟" غالب نے جھلا کے کہا "شام ہو گئی ہے۔"

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے صبح ہوتی ہے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔"

"میں چاہتا تھا کہ اپنی اس ٹانگ کا آزادانہ استعمال کر سکوں جس پر پلاسٹر خواہ مخواہ چڑھا ہوا ہے۔" غالب نے کہا۔

"آپ غالباً بھول گئے ہیں کہ یہ ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔" میں نے کہا "اور صحیح فیصلہ آپ کو نہیں کسی ڈاکٹر کو کرنا ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں، مجھے کسی آرتھوپیڈک سرجن کے پاس لے چلو۔" غالب نے کہا "جو پلاسٹر کاٹ کے دیکھے۔"

"او کے، مگر پہلے خواتین کو گھر چھوڑ دیں۔ ہمارا اپنا گھر چلتا پھرتا گھر۔" میں نے کہا "اور اس کے بعد..."

"اس کے بعد کیا؟" محسن نے میرے لہجے پر غور کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ زیب النساء کی عیادت کے لیے جاؤں۔" میں نے کہا "اسپتال جا کے دیکھوں۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔" محسن بولا۔

"یس سر، میں پاگل تھا، پاگل ہوں اور رہوں گا۔" میں نے کہا "میں خود کو عقلمند سمجھنے والوں میں شامل نہیں کر سکتا۔"

"تجھے معلوم ہے، وہاں وہ سب آتے ہوں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ممکن ہے اس کا بھائی آتا ہو۔ مگر وہ بھی صرف ملاقات کے لیے مقررہ وقت پر آتا ہوگا۔ سراج کو اسے فرصت کہاں اور ممکن ہے ضرورت بھی نہ ہو۔"

"پھر تجھے کیا ضرورت ہے یار۔" غالب نے کہا۔

"نہ جانے کیوں میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔" میں نے کہا "بے شک اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اس کی ذمے دار وہ خود تھی اگر وہ ہمارے ساتھ رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ مگر کیا یہ درست نہیں ہے کہ ابتدا ہم نے کی۔ ہم اسے ساتھ نہ لاتے تو..."

"تو وہاں پہنچے گا کیسے؟" محسن نے میری بات کاٹ کے کہا۔

"جہاں چاہ ہے، وہاں راہ ہے۔" میں نے کہا۔

"چاہ..." غالب نے چلا کے کہا "اُف، یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ بے وفا عاشق عرف بالم ہرجائی۔ چاہ کو تو نے ایسے بدل لیا جیسے لیڈر سیاسی جماعت بدلتے ہیں۔ آہ رابعہ، اب تیرا کیا ہوگا۔"

"تم کیوں چاہتے ہو کہ پہلی ٹانگ کے ٹھیک ہونے سے پہلے میں تمہاری دوسری ٹانگ توڑ دوں؟" میں نے کہا "میں نے محاورہ استعمال کیا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ محاورہ استعمال کیا تھا تو بتا دیتے۔" غالب نے کہا "میں ذرا اَن پڑھ آدمی ہوں۔"

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس سے پھر ملوں۔" محسن بولا "اور پوچھوں کہ اب کیا حال ہے اور کیا خیال ہے۔"

"کیا اس کے خیالات بدل گئے ہوں گے؟" غالب نے کہا مگر اسے جواب دینے سے پہلے میں نے گاڑی روک دی۔ جولی کو اور سراج کی ماں کو ہم نے ٹریلر کے اندر پہنچا دیا۔ شیر علی لوٹ آیا تھا۔ ہم نے اسے شاندار ہوٹل بھیجا جہاں سے وہ ایک روپیہ فی بستر کے ریٹ پر چار بستر اور چار پائیاں اٹھا لایا۔

"چار پائی کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ صرف بستر دے دو، چار پائی کے آٹھ آنے کاٹ لو مگر وہ کہتے لگا کہ جی بستر ایک ساتھ ہیں۔ لو یا نہ لو، روپیہ ہی ہوگا۔ پھر میں کیوں چھوڑتا۔" شیر علی نے کہا۔

"چلو اچھا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "ہم باہر سوئیں گے مگر ابھی ہم ذرا کام سے جا رہے ہیں، تم عورتوں کا خیال رکھنا۔"

غالب کو ہم نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں چھوڑ دیا۔ وہاں کا آرتھوپیڈک سرجن بہت خوش مزاج بوڑھا تھا۔ پہلے تو وہ مرزا غالب کے نام سے محظوظ ہوا۔

"واہ میاں، مرزا غالب اس بیسویں صدی میں۔" وہ بولا "دل تو خیر شاعروں کا وہ ہوتا ہے، کیا کہتے ہیں اسے آبگینہ مگر ٹانگ تو شاعر کی بھی ٹانگ ہوتی ہے۔ یہ ٹانگ کہاں اڑائی کہ ٹوٹ گئی، پرائے معاملے میں؟" اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا "خیر ابھی کاٹ دیتے ہیں میرا مطلب ہے، پلستر کاٹ دیتے ہیں۔ رہا اندر کا حال تو وہ خدا جانتا ہے مگر ہم بھی جان لیں گے ایکسرے دیکھ کر۔ جیسے خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر ایسے ہی تمہاری صورت دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ حال اچھا ہے۔"

"اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے۔" غالب نے کہا "ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے۔"

"مرے جاتے ہو نا میاں۔ شاعر اب مری جاتے ہیں۔ وہاں ہوتا ہے جشن مری۔" وہ ہنسا "ایک بار میں بھی گیا تھا۔ بڑا بھاری مشاعرہ تھا۔ مجھ پر بہت بھاری پڑا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون کیا کہہ گیا۔ شاعری تو خیر سمجھ لیتا ہوں میں ورنہ وہاں جاتا ہی کیوں مگر وہ لاؤڈ اسپیکر سسٹم بڑا خراب تھا۔ خیر..... تو ہاں تم دو ٹانگوں پر جانا چاہتے ہو؟ آئے کیسے تھے، ایک ٹانگے پر..." وہ صرف باتیں نہیں کر رہا تھا کام بھی کر رہا تھا۔ اس نے ایک مریض کو رخصت کیا "جاؤ میاں عیش کرو، یہ ٹانگ یہاں سے پھر نہیں ٹوٹے گی کسی اور جگہ سے ٹوٹ جائے تو میرا ذمہ نہیں۔ پھر آ جانا۔"

بالآخر غالب کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ سارا کام چٹکی بجاتے میں نہیں ہو سکتا چنانچہ ہم لوگ تشریف لے جائیں اور پھر ایک گھنٹے بعد لوٹ کر آئیں۔ میں اور محسن بڑے اچھے موڈ میں باہر نکلے۔

"ایسا ڈاکٹر آدھا مرض باتوں سے دور کر دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور باتوں سے آدھا پاگل کر دیتا ہے۔" محسن بولا "مجھے تو اس کے سرجن ہونے پر بھی شک ہے۔ اسے سرکس میں جوکر کیوں نہ رکھ لیں۔ دونوں کام کرے گا۔ ہم ہڈیاں توڑتے رہتے ہیں اور تڑواتے رہتے ہیں۔ نازو کی واپسی کے بعد غالب کو اس کی زیادہ ضرورت رہے گی۔"

"اگر آج رات کراچی کے ٹیلی فون نمبر پر رابطہ ہو گیا اور پیج رابعہ سے بات ہو گئی تو نازو کی خیر خبر بھی ملے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا تو زیب النساء سے عیادت کے لیے جانے کی بات سنجیدگی سے کر رہا تھا؟" محسن بولا۔

"ہاں مگر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ نواب خسرو جمشید کی بہن ہیں۔ کسی سرکاری یا نیم سرکاری اسپتال میں نہیں ہوں گی۔" محسن بولا "لاہور کا سب سے بڑا اور مہنگا اسپتال کون سا ہے۔ اسے پہلے وہیں دیکھنا چاہیے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"اور وہاں اندر کیسے جائیں گے؟" میں نے کہا۔ "جیسے پہلے کئی بار دوسرے اسپتالوں میں جاتے رہے ہیں؟"

"ہاں اب تو ہر ممنوعہ جگہ تک پہنچنے کا خاصا تجربہ حاصل کر چکے ہیں، وہ کس دن کام آئے گا؟" محسن نے کہا۔

محسن کا خیال کچھ دیر بعد درست ثابت ہوا لیکن ہم سراج اور جمشید کے مقابل ہونے سے بال بال بچ گئے۔ محسن نے ابھی مائکرو بس کو اسپتال کے احاطے میں موڑا ہی تھا کہ ساتھ والے دوسرے گیٹ سے ایک کار گزر کے باہر گئی۔ میں نے ان دونوں کی ایک جھلک دیکھی۔ کار کو سراج ڈرائیو کر رہا تھا۔ گیٹ سے سڑک پر آتے ہوئے اس کی تمام توجہ سامنے تھی ورنہ مائکرو بس کے ونڈ اسکرین سے ہم دونوں کی صورت اسے صاف نظر آتی۔ خسرو جمشید دوسری طرف تھا اور وہ بھی سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

"چل یہ بھی خطرہ ٹل گیا" محسن نے کہا اور گاڑی کو ایک طرف پارک کر دیا جہاں دوسری بہت سی کاریں صف بستہ تھیں۔ ملاقاتی اب اندر سے باہر آرہے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے یا ختم ہونے ہی والا ہے۔

زیب النسا کا کمرا اسپشل پرائیویٹ وارڈ میں گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔ ایک نرس نے ہمیں ریسپشن پر ہی روک لیا۔

"دیکھیے سات بج گئے ہیں" وہ بولی "ملاقات کا وقت پانچ سے سات بجے تک ہے۔ اب آپ کل آئیں"

"بس ہم دو منٹ بھی نہیں لیں گے" میں نے کہا۔

"سب یہی کہتے ہیں اور پھر اندر جاکے بیٹھ جاتے ہیں" وہ بولی "بعد میں ڈاکٹر صاحب ہم پر خفا ہوتے ہیں"

"آپ فکر نہ کریں۔ سات بج کر پانچ منٹ پر ہم باہر ہوں گے۔ ہم پشاور سے آئے ہیں اور ہمیں رات کو واپس بھی جانا ہے" میں نے کہا۔ "کل ہمیں کوئی وقت نہیں ملے گا" میں نے سو کا نوٹ اُس کی طرف بڑھایا۔

"اچھا جائیے" نرس نے کاؤنٹر پر ہی نوٹ کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں منتقل کیا اور ہاتھ کو نیچے غائب کر دیا۔

سپیشل پرائیویٹ وارڈ میں صرف آٹھ کمرے تھے، چار کوریڈور کے دائیں جانب اور چار بائیں جانب۔ کمرہ نمبر تین دائیں ہاتھ پر تیسرا کمرا تھا۔ ہر بند دروازے کے پیچھے سے اب بھی باتیں کرنے والوں کی آوازیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وقتِ ملاقات کے معاملے میں بہت زیادہ سختی نہیں برتی جاتی اور دس پندرہ منٹ کی تاخیر ان کے لیے یقیناً خصوصی رعایت کا درجہ رکھتی ہے جو اسپشل پرائیویٹ وارڈ کے مریضوں سے ملنے آتے ہیں۔ تاہم تین نمبر کمرے میں خاموشی تھی۔ میں نے دروازے پر رُک کر چند سیکنڈ انتظار کیا ... میں ایک نمبر کمرے سے نکلنے والی فیملی کے چار افراد ... جا رہے تھے لیکن ان کے چہرے دوسری طرف تھے۔ میں نے تھوڑا سا جھک کے ڈور لاک کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ زیب النسا کا بیڈ میری نظر کے فوکس میں آگیا۔ وہ دروازے کے مقابل کھڑکی کے ساتھ لگے ہوئے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ کوئی شخص جو بیڈ کے قریب کھڑا ہوا تھا ایک دم پلٹ کے دروازے کی طرف آیا۔ میں نے محسن کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مُنہ دوسری طرف کر کے چلنے لگا۔ ابھی ہم دو قدم بھی نہیں گئے تھے کہ ہم نے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نے سر گھما کے دیکھا۔ وہ شخص واپس جا رہا تھا اور ہماری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ مجھے اس کی چال سے شک ہوا کہ اسے میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر پھر وہ کوریڈور میں مڑ کے غائب ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا اور پھر بلا وجہ خطرے سے دوچار ہونے کو خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔

واپس آکے میں نے بہت آہستہ سے ... کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کُھل گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہم جیسے دو اجنبی افراد کو دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو جائے گی تو چلّانے لگے گی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی آواز کو خاموش کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ لیکن اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ محسن بھی میرے پیچھے اندر آگیا تھا اور دروازے کو پھر بند کر چکا تھا مگر زیب النسا کا بیڈ خالی تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی حالانکہ ابھی دو منٹ پہلے خود میں نے اسے اسی بیڈ پر دراز دیکھا تھا، وہ کھڑکی بھی اندر سے بند تھی جس کے قریب بیڈ لگا ہوا تھا۔

ابھی مجھے محسن پر اپنی حیرت کے اظہار کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اگر محسن نے دروازے کو اندر سے لاک نہ کیا ہوتا تو دستک دینے والا سیدھا اندر آجاتا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
شکاری
آٹھواں حصہ

پسندیدہ ناول و ڈائجسٹ کرایہ پر حاصل کریں
خرید و فروخت کے لیے تشریف لائیں
عمران لائبریری
مسجد بیرون زمرد عید گاہ روڈ

معاشرے کے اُن ناسُوروں کی رُوداد جو گوشت پوست سے گزر کر انسانی ہڈیوں میں اتر رہے تھے۔ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے روز و شب موت کی بستی میں گزر رہے تھے۔ جلتے دن، سُلگتی راتیں، آس و یاس، خوف و ہراس، شیریں خواب، تلخ حقیقتیں۔

"یہ کون ہو سکتا ہے؟" مَیں نے زیرِ لب کہا مگر میری خاموشی کی زبان کے اشارے سے محسن نے میرا سوال سمجھ لیا۔

اس نے فقط سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اُس نے جواب میں کہا تھا۔ "مَیں دیکھتا ہوں۔" اور اب وہ جیب میں سے ریوالور نکال چکا تھا۔ دستک پھر ہوئی تو محسن نے پلٹ کر میری طرف اور پھر باتھ روم کی طرف دیکھا۔

مَیں نے سر ہلا کے اس پر واضح کیا کہ میں بھی اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ باتھ روم کا دروازہ کُھلا ہوا تھا جو عجیب سی بات تھی۔ زیب النساءُ نے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفّل نہیں کیا تھا۔ جو آدمی گھر میں اکیلا ہو اور جسے بالکل اندیشہ نہ ہو کہ کوئی سیدھا اندر آ سکتا ہے، وہ بھی باتھ روم میں جاتا ہے تو عادتاً دروازہ بند کر لیتا ہے۔ زیب النساءُ تو ایک لڑکی تھی مگر یہی ایک بات تھی جو اس کے باتھ روم میں ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ وہ بھوت کی بچی یا چھوتی نہیں تھی کہ پل بھر میں غائب ہو جائے۔ شاید وہ باتھ روم میں سے کمرے پر نظر رکھنا چاہتی تھی یا یہ بھی اُس کی پُرفریب معصومیت کا کوئی سمجھ میں نہ آنے والا انداز تھا۔

مَیں باتھ روم میں ایسے داخل ہوا جیسے مجھے بذریعہ توپ فائر کیا گیا ہو۔ مجھے زیب النساءُ کی دلنواز 'ہائے اللہ' سنائی دینے کا یقین تھا مگر اندر اس کے وجود کی خوشبو تک نہ تھی۔ مَیں چند سیکنڈ تک احمقوں کی طرح ریوالور تانے کھڑا رہا۔ پھر مَیں نے دروازہ کُھلنے کی آواز سُنی اور باتھ روم کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ حسبِ توقع اندر آنے والا سیدھا گزر گیا تھا اور جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو محسن دروازہ بند کر چکا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ محسن کے ریوالور پر نظر جما کے بولا۔ "اور یہ سب کیا ڈراما ہے آخر؟" وہ ریوالور سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔

"تم کون ہو؟" محسن نے تھوڑا سا کنفیوژ ہو کے کہا۔

"مَیں... مَیں ڈاکٹر ہوں۔" قمیص پتلون میں ملبوس ادھیڑ عمر کے اس سنجیدہ صورت اور صحت مند شخص نے کہا۔ "تم نواب صاحب کے آدمی ہو؟"

"یس سر..." محسن نے اپنی خفّت مٹانے کے لیے دانت نکال کے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "معاف کرنا... ہم نئے آدمی ہیں۔"

"نئے ہو یا پُرانے..." ڈاکٹر نے برہم ہو کے کہا۔ "کس کی اجازت سے ٹھہرے ہوئے ہو تم یہاں؟"

"ہم تو نواب صاحب کے حکم کے غلام ہیں۔" محسن نے کہا۔

"مگر مَیں نے اس... نواب کو بتا دیا تھا کہ یہ اسپتال ہے۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ڈاکٹر غصے میں خسرو جمشید کو گالی دیتے دیتے رُک گیا تھا۔" پہلے دن ہی میں نے اُسے انکار کر دیا تھا کہ زیب النسأ اسپتال میں بالکل محفوظ ہے اور اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے... اگر وہ مطمئن نہیں ہو سکتا تو اپنی بہن کو کہیں اور لے جائے۔ شہر میں بہت اسپتال ہیں۔ وی آئی پی وارڈ کی طرف ہم کسی غیر متعلقہ شخص کو نہیں آنے دیتے۔ مگر یہاں وی آئی پی وارڈ نہیں ہے جہاں ہماری سیکیورٹی کا خصوصی انتظام ہو۔ کوئی ذاتی باڈی گارڈ متعین کر سکے یا سرکاری حفاظتی عملہ رکھ سکے۔" آہستہ آہستہ اس کی آواز تیز ہوتی گئی اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔" ناؤ گیٹ آؤٹ... اس سے پہلے کہ میں تم کو پولیس کے حوالے کروں... جا کے اپنے اس نواب آف نواسٹیٹ سے کہہ دینا کہ دس واز یور ویری لاسٹ چانس فار ہم۔"

محسن مجرموں کی طرح سر جھکائے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس نے میرے نقطۂ نظر سے بہت سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم میں سے ایک بہ خیر و عافیت باہر نکل جائے۔ دوسرا میں تھا اور اپنی باری آنے پر صورتِ حال سے نمٹ سکتا تھا۔ بے سبب ہنگامہ آرائی ہمارا مقصد بھی نہیں تھا۔

" مس زیب النسأ..." ڈاکٹر نے دروازہ بند کرنے کے بعد باتھ روم کی طرف منہ کر کے آواز دی۔" ول یو پلیز کم آؤٹ ناؤ۔" جواب نہ پاکے وہ چند قدم آگے آیا۔" مس زیبا۔" اس نے پھر کہا۔

زیب النسأ کی بجائے میں برآمد ہوا تو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے مجھ پر ایک قہر و غضب کی نگاہ ڈالی۔" ہو دی ہیل آر یو؟ تم بھی اسی کے ساتھی ہو؟ اندر کیا کر رہے تھے...؟ زیب النسأ...؟"

" ڈاکٹر... وہ اندر نہیں ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟ اندر نہیں ہے!" ڈاکٹر بے یقینی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے کھلے دروازے سے باتھ روم میں ایک نظر ڈالی اور پھر مشتعل ہو کے پلٹا۔

" ویئر از شی؟" (وہ کہاں ہے)

" ویٹ از واٹ آئی ایم ہیئر ٹو آسک یو اباؤٹ شی۔" میں نے اسی اطمینان کے ساتھ کہا۔ (میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں)

ڈاکٹر چند سیکنڈ ساکت و صامت کھڑا رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ وہ نہ کچھ سمجھا تھا اور نہ کوئی فیصلہ کر سکا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔

" آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔" میں نے کہا۔" جب ہم یہاں آئے تھے تب بھی وہ کمرے میں نہیں تھی۔"

" ان دیٹ کیس۔" ڈاکٹر دروازے کی طرف بڑھا۔" مجھے فوراً پولیس کو خبر کر دینی چاہیے... اور اس کے بھائی کو بھی۔ آئی تھنک آئی ایم ان ٹربل۔"

" ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کے سامنے آ کے کہا۔" ابھی تک۔"

" تم مجھے ادائے فرض سے روک رہے ہو۔" ڈاکٹر نے اپنی متانت برقرار رکھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔

" نو سر... میں آپ کو بھی ٹربل سے بچانا چاہتا ہوں اور خود بھی کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا۔" میں نے خوش اخلاقی سے مگر سپاٹ لہجے میں کہا۔" اور پولیس آلویز مینز ٹربل... پولیس کا خیال چھوڑ دیجئے۔"

" کیا مطلب... تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

" نہیں... لیکن جاننا ضرور چاہتا ہوں..." میں نے کہا۔" نہ میں نے اسے اغوا کیا ہے اور نہ اغوا ہوتے دیکھا ہے۔ از اے میٹر آف فیکٹ... میرے اندر آنے سے چند منٹ پہلے تک وہ کمرے میں موجود تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا مگر باہر رہ کے۔ اس ڈور لاک کے سوراخ میں سے... اس وقت دو ایسے آدمی اندر تھے جن کی موجودگی میں ہم اندر نہیں جا سکتے تھے... اور چلے جاتے تو ہمیں شاید وہ سب کرنا پڑتا جو اسپتالوں میں نہیں ہوتا... ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

" اوہ مائی گاڈ..." ڈاکٹر نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔" مجھے اسی وقت خیال آیا تھا کہ میں انکار کر دوں... جب اس باسٹرڈ نواب نے کہا تھا کہ یہاں میرے محافظ رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ اس پیشے میں ہم انکار کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔" وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے بھی اشارہ کیا کہ دوسرے صوفے پر بیٹھ جاؤں؛

" تھینک یو۔" میں نے کہا۔

" میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

" زیب النسأ کے کیس کے بارے میں؟"

" اوہ نو... وہ میں جانتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔" لیکن وہ کون لوگ تھے؟"

"یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ انسان کے بھیس میں درندے تھے..." میں نے کہا۔ "سفاک بھیڑیے تھے۔"

" یہ جذباتی ڈائیلاگ میرے سامنے مت بولو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ " ہمارے لیے یہ ویسا ہی ایک کیس ہے جیسے ہزاروں دوسرے کیس... سیکس فرسٹریشن اور حیوانی جبلت کے بے لگام ہونے کا۔ ہر آدمی کے اندر ایک حیوان ہے مگر فرق صرف اس کنٹرول کا ہے جو ہم اس حیوان پر رکھتے ہیں۔ جیسے گھر کا پالتو کتا... وہ بے ضرر ہوگا اگر مالک کے اشارے پر چلے ورنہ کسی کو بھی کاٹ لے گا۔"

" رائٹ..." میں نے کہا۔" وہ کتنے کتے تھے؟"

" کم سے کم دو..." ڈاکٹر نے کہا۔" تم نے کہا کہ انھیں کوئی نہیں جانتا... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

" کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے کہا۔" ضروری تو نہیں کہ کسی گھر کا پلا ہوا کتا ہی کاٹے... گلی کوچوں میں بھٹکنے والے ہزاروں آوارہ اور بے نشان کتے بھی تو ہیں۔"

" یو مین... وہ دشمن نہیں تھے؟" ڈاکٹر نے کہا۔

" کس کے دشمن؟" میں نے کہا۔

" اس نواب آف نواسٹیٹ کے... یا اس لڑکی کے؟"

" انھوں نے جو کچھ کیا دشمنی میں یا انتقام لینے کے لیے نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔

" پھر وہ اتنا فکر مند کیوں تھا... اپنے دشمنوں کے بارے میں۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔" تم کو نہ سہی... نواب کو یقیناً معلوم ہے کہ وہ کون تھے۔ وہ ان کا نام نہیں لے رہا ہے تو اس کے بھی اسباب ہوں گے۔ وہ اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہے... ہر شریف آدمی کی طرح... یہ بات میں محاورتاً کہہ رہا ہوں ورنہ میرا خیال ہے کہ نواب از ناٹ اے جنٹلمین... بس وہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑے گا... خود بدلہ لے گا... اور غالباً اسے ابھی ان دشمنوں سے مزید خطرہ تھا... کہ وہ اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں چنانچہ وہ اپنی گارڈز رکھنا چاہتا تھا۔"

" آپ کے اندازے درست ہی ہیں... نواب شریف آدمی نہیں ہے اور اس کے دشمن بھی ہیں۔" میں نے کہا۔" مگر یہاں گارڈز رکھنے کے اسباب مختلف تھے... میں نہیں بتا سکتا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔"

" او کے۔ تم کچھ مت بتاؤ... یہ بتا دو کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے اور زیب النسأ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

" میرا خیال ہے کہ زیب النسأ فرار ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

" شٹ اپ... تم نے اُسے اغوا کر لیا ہوگا... یا کسی اور نے... ٹو ہیل ود دس چکر۔" ڈاکٹر نے کہا۔" میرا کام تو ویسے بھی ختم ہو گیا تھا۔"

" مطلب یہ کہ وہ ٹھیک تھی... خطرے سے باہر...؟"

" یس... وہ خطرے کے اندر کبھی نہیں تھی... ایک نروس بریک ڈاؤن کا اٹیک تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔" جسمانی طور پہ... وہ بہر حال ایک جوان عورت تھی۔ مگر تم نے کیا اسے فرار ہوتے دیکھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" اور کیا ہو سکتا تھا اتنے کم وقت میں جب ہم اندر آئے تو میرا بھی خیال یہی تھا کہ وہ باتھ روم میں [illegible] کھڑکی کا راستہ دیکھا... کیا یہ ناممکن لگتا ہے آپ کو کہ کوئی بھی

مریض بھاگ جائے۔"

" پاگل ہو تو اور بات ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔" لیکن وہ پاگل نہیں تھی۔ اور ویسے بھی وی آئی پی وارڈ جیلخانہ نہیں ہوتا... آج تک جنرل وارڈ سے بھی کوئی مریض فرار نہیں ہوا... اور کیوں فرار ہوگا۔"

" واجبات ادا نہ کرنے کے لیے۔"

" وہ یہاں نہیں آتے۔" ڈاکٹر نے حقارت سے کہا۔" ناؤ لیٹ می گو... اور یہ مت سمجھنا کہ میں ڈر گیا تھا... تمھارے اس توپ خانے سے..."

" میں آپ کو خالی ہاتھوں سے بھی روک سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

" مجھے معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

" معلوم ہے... کیسے معلوم ہے!" میں نے حیرانی سے کہا۔

" میں بہت کچھ جانتا ہوں تمھارے متعلق... بہت کچھ پڑھتا رہتا ہوں کیونکہ میں اخبار کا کیڑا ہوں۔" وہ بولا۔" تم سکندر بخت ہو نا۔ اور وہ دوسرا ایڈیٹ... وہ تمھارا پارٹنر تھا... محسن... تم دونوں کا کیا تعلق ہے اس لڑکی کے معاملے سے؟"

" کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اس وقت کہا جب مجھے یقین آگیا کہ وہ نیک دل ڈاکٹر ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ اگر نہیں تھا تو اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ تھیں مگر وہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ بالکل نہیں تھا۔

" تم کو یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔" اس سے پہلے کہ کوئی تمھیں اور مجھے ایک ساتھ دیکھے... مجھے بہر حال یہیں رہنا ہے۔"

" تھینک یو..." میں نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کے کہا۔" یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کا راستہ توڑ دیا، مگر دوستوں کی طرح... مجھے امید ہے کہ اس ملاقات کی خبر ہمارے دشمنوں کو نہیں ہوگی۔"

" اگر دشمنوں سے تمھاری مراد ہے... دیٹ نواب آف نواسٹیٹ۔" ڈاکٹر نے کہا۔" تو مطمئن رہو... مجھے کمرے میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ زیب النسأ کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی... جو معلوم کر سکتا ہے، کرے۔ میں اسے روکوں گا نہیں۔ مگر پولیس اس اسپتال کے اندر اپنے اختیارات کا لامحدود استعمال نہیں کر سکتی... گڈ لک فار یو۔"

جب ڈاکٹر نکل گیا تو میں نے دوڑ لگائی اور کھلی کھڑکی [illegible] بھی نکلی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس کی توقع نہیں تھی، چنانچہ میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ کھڑکی سے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نکل کے وہ کہاں گئی ہوگی۔ یہ خیال مجھے بھی کھڑکی سے گزر جانے کے بعد آیا۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ اس کے بعد اسپتال کی دیوار تھی لیکن بائیں جانب اسپتال کی لانڈری تھی اور پھر کچھ سرونٹ کوارٹرز تھے جن میں نچلے درجے کے ملازم ہی رہ سکتے تھے۔ زیب النساء کا اسپتال کی دیوار پر چڑھ کے سڑک کی طرف کود جانا محال تھا۔ وہ انہی کوارٹروں کی طرف جا سکتی تھی۔

وقت ملتا تو میں بھی اُدھر ہی جاتا اور شاید اُسے تلاش بھی کرتا مگر مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر نے خسرو جمشید کو اور پولیس کو ضرور اطلاع کر دی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت جلد سراج اپنی تمام پولیس فورس کے ساتھ اسپتال پر چڑھائی کرنے والا تھا۔ ابھی تک اس ڈاکٹر کو یہ علم نہیں تھا کہ نواب آف نواسٹیٹ کی بہن جس کی منگیتر ہے وہ ایس ایس پی ہے۔ ڈاکٹر تو اپنی پوزیشن محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے گا، مگر دوسرے عملے کی یقیناً شامت آجائے گی کہ انہی کی غفلت نے کسی کو اندر داخل ہونے کا اور زیب النساء کو اغوا کر کے لے جانے کا موقع فراہم کیا۔ یہ خسرو جمشید بھی نہیں مانے گا اور سراج بھی کہ وہ بقائمی ہوش و حواس اور اپنی مرضی سے فرار ہوگئی۔ وہ اسپتال کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور سرونٹ کوارٹروں کو کھنگال ڈالیں گے۔ زیب النساء اگر اسپتال سے نہیں نکل سکی ہوگی تو برآمد ہو جائے گی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک اطمینان حاصل تھا کہ زیب النساء نکل چکی ہوگی۔ وہ اتنی ہوشیار لڑکی تھی کہ اس نے پورا پلان پہلے ہی بنا لیا ہوگا۔ وہ جب تک بے بس تھی یا بے بسی کا ڈراما کر رہی تھی تب تک اس کو حالات کا جائزہ لینے اور اپنی پوزیشن کو سمجھنے کی کافی مہلت ملی تھی۔ میں اس لڑکی کی معصوم عیاری سے مار کھا چکا تھا چنانچہ میں مطمئن تھا کہ زندگی میں ایکبار اعتماد کے فریب کا شکار ہونے والی زیب النساء دوسری بار زِک نہیں اُٹھائے گی۔

میں باہر آیا تو محسن خان کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد باہر آیا تھا اور سیدھے راستے سے نہیں آیا تھا۔ محسن پر واجب تھا کہ مجھے چشم براہ ملتا۔ میرا یہاں زیادہ دیر رُک کر اس کی راہ دیکھنا پولیس کی راہ دیکھنے کے مترادف تھا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے کے بعد میں نے واپسی کا وہی راستہ پکڑا جس سے ہم دونوں اسپتال پہنچے تھے۔ ابھی میں سو قدم ہی گیا تھا کہ محسن خان گاڑی دوڑاتے ہوئے پیچھے سے آئے۔

"ہیلو... میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں۔" اس نے قریب آ کے دروازہ کھولا۔ "بے شک پیدل چلنا صحت کے لیے اچھا رہتا ہے مگر آپ یہ بھی تو جانتے ہوں گے کہ پیدل چلنے والے کی عزت کوئی نہیں۔ عزت اور صحت میں سے کیا بہتر ہے؟"

"دولت۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ اس سے باقی دونوں چیزیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔" اور دروازہ بند کر لیا۔ "تو نے کہیں اس آفت کی پرکالہ عرف شیطان کی خالہ کو دیکھا؟"

"زیب النساء کو؟" محسن نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "وہ خالہ ہے تیری؟"

"مذاق کی بات نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "وہ نکل گئی۔"

"کیا... وہ باتھ روم میں نہیں تھی؟" محسن بولا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تو اُسے قابو کر چکا..."

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ فرار ہوگئی۔ اور بعد میں میری اس ڈاکٹر سے جو گفتگو ہوئی... وہ بے حد حوصلہ افزا رہی... وہ دوست ثابت ہوا۔"

"تو نے ڈرا دیا تھا مجھے۔" محسن بولا۔ "میں سمجھا تو اس کو لمبا لٹا آیا۔"

"نہیں یار... ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے ہم دونوں کو پہچان لیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلا دیا کہ ہم نہ زیب النساء کو اغوا کرنے والوں میں سے ہیں اور نہ اس سے کوئی غلط تعلق رکھتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ بھاگ جاؤ۔ اب تک وہ پولیس کو اور نواب صاحب کو اطلاع دے چکا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"سوال یہ ہے دوست کہ زیب النساء کیوں فرار ہوئی... کیا وہ ہوش میں نہیں تھی؟"

"وہ ہوش مندوں کے ہوش اُڑانے کے قابل تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ کیوں فرار ہوئی؟"

"میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے بھائی یا منگیتر سے متعلق ہماری فراہم کردہ معلومات کے باعث کسی نفرت کے ردِ عمل کا شکار ہوئی۔" میں نے کہا۔ "وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے محسن... اس کی قوتِ مشاہدہ غیر معمولی ہے۔ ہر مصور کو خدا وہ نظر دیتا ہے جو انسانی آنکھ، کیمرے اور ایکسرے مشین سے بڑھ کر چیزوں کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔ ظاہر کا پردہ ہٹا کے باطن میں جھانکتی ہے اور جذبات کو پڑھ لیتی ہے۔ اپنے بھائی کے بارے میں وہ بہت کچھ پہلے سے جانتی تھی۔ اس کی نجی زندگی کا کوئی پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگا۔ ہماری معلومات نے اس کے علم میں صرف اتنا اضافہ کیا کہ اسے بھائی کے کاروبار کا بھی پتا چل گیا۔ ایسے بدکردار، عیاش اور مکار بھائی کی بہن نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا مگر نظر انداز کیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں تصویریں بناتی رہی۔ جب اس کے بھائی نے رشتہ طے کیا ہوگا تو کیا زیب النساء کو معلوم نہ ہوگا کہ جسے اس کی تمام زندگی کا مالک بنایا جا رہا ہے وہ کون ہے اور کس قماش کا آدمی ہو سکتا ہے۔ چلو مانا کہ وہ سراج

سے ناواقف تھی مگر وہ اتنا تو سمجھتی ہوگی کہ اس کے بھائی کی صحبت کس قسم کے لوگوں میں ہے۔ اُسے یہ ضرور بتایا گیا ہوگا کہ وہ ایک ایس پی ہے۔ کیا زیب النساء نے مان لیا ہوگا کہ وہ ایس پی کوئی فرشتہ سیرت شخص ہوگا۔ کیا زیب النساء جیسی لڑکی کا آئیڈیل ایک پولیس مین ہو سکتا ہے؟ نہیں... اس کے ذہن میں کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ... روشن خیال... باضمیر شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور ہوگا۔ وہ شخص شاعر یا افسانہ نگار... مصور یا موسیقار ہو یا نہ ہو... وہ کوئی پروفیسر یا وکیل بھی ہو سکتا تھا مگر پولیس کے محکمے کا افسر نہیں ہو سکتا تھا۔"

"آپ کیا ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟" محسن بولا۔

"یہی کہ زیب النساء وقت گزار رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس نے اپنی اور سراج کی نسبت پر اختلاف اور احتجاج کو بے سود سمجھا ہوگا کیونکہ وہ ایک کمزور اور تنہا عورت تھی۔ اندر سے جذبات کا آتش فشاں مگر اوپر سے بالکل سرد... اس کے ذہن میں پہلے سے طے تھا کہ اُسے کیا کرنا ہوگا اور اگر وقت ناگزیر حد تک قریب آجاتا تو وہ ایسا ہی کرتی... جیسا کہ اس نے آج کیا... وہ گھر سے بھی نکل جاتی..."

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ وہ اکیلی کمزور عورت تھی۔"

"ہاں... اس کا ثبوت دو جیالے مرد دے چکے ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "مجھے یہ بات ڈاکٹر نے بتائی ہے۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل تنہا نہ ہو۔ اسے کسی کا سہارا مل چکا ہو۔ کوئی پہلے سے اس کے دل میں اپنی محبت کی جوت جگا چکا ہو۔"

"کون ہوگا وہ خوش نصیب؟" محسن بولا۔

"وہی جس کے پاس زیب النساء اب گئی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ اس لڑکی کے چاہنے والے کم تھے۔ اس شمع کے پروانے تو بہت ہوں گے۔ مگر وہ جس نے اسے بھی موم کر دیا کوئی ایک ہوگا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا بھیا کہ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔"

"ہاں... مجھے افسوس ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان دو منٹ کا وقفہ شاید ایک لمبی اور کبھی ختم نہ ہونے والی دُوری بن گیا ہے۔ وہ مل جاتی تو اس سے کچھ کہتے... کچھ اس کی بھی سنتے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی اپنے ڈھب کی تھی۔ اگرچہ اس نے ہمارے ساتھ زبردست فریب کیا۔ مگر ہم اس کے ساتھ کون سی شرافت برت رہے تھے۔ میں اس کی ذہانت اور ہمت کا معترف اور مداح ہوں۔ اس نے واقعی کمال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس کے ساتھ ظلم ہوا۔ مجھے اس ظلم کا بھی افسوس ہمیشہ رہے گا۔ کسی حد تک میں خود کو اس میں شامل سمجھتا ہوں۔ نہ ہم اسے یوں لاتے، نہ وہ یوں فرار ہوتی... اور نہ وہ سب ہوتا جو ہوا۔ وہ ایک خوب صورت جسم کے اندر ایک خوب صورتی کی خالق روح کا آزار بھی رکھتی تھی۔ وہ ایک جمالیاتی ذوق کی مالک تھی... مگر دیکھنے والوں نے اسے صرف عورت سمجھا... کاش مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے تو میں خود انھیں آدابِ مردانگی سکھاؤں..."

"آہ... یہ دو دل میں کیا ماجرا ہو گیا۔" محسن بولا۔ "تم کو جن سے وفا کی تھی امید... وہ نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ رابعہ قاری کے دل پر کیا گزرے گی؟ آج رات میں تیرے خیالات کا متن اُسے سناؤں گا... اور بتاؤں گا کہ عشق پیشہ سکندرِ اعظم نے وکیل کی جگہ مصور کو دے دی ہے۔ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔"

"زیب النساء کہاں جائے گی۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "میاں محسن خان شیروانی! آپ کی عبرت آموز تشریحات میں دخل اندازی پر معافی چاہتا ہوں لیکن ابھی ابھی میرے قابلِ رشک دماغ میں ایک قابلِ غور خیال آیا ہے۔"

"ہاں... اب تو سارے خیال زیب النساء کے ہوں گے۔ آہ رابعہ...!"

"اگر وہ اسپتال سے نکلنے میں کامیاب رہی ہے۔" میں نے محسن کی بکواس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تو میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کہاں پہنچی ہوگی... یا پہنچے گی۔ اگر اسے کسی کی رفاقت قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز اپنی مرضی سے کرنا ہوتا تو اس کے لیے اسپتال سے فرار ہونا ضروری نہیں تھا... نہیں محسن... وہ ہمیشہ آزاد تھی۔ اس پر کبھی پہرے نہیں تھے۔ اس کی گاڑی الگ تھی اور شوفر الگ تھا۔ اُسے کسی کے ساتھ جانا ہوتا تو پہلے ہی چلی جاتی... یا اسپتال سے لوٹ کر جاتی تو اطمینان سے اپنا پورا انتظام کر کے قدم گھر سے نکالتی... اسے کون روکتا... یہاں سے وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر اچانک فرار ہوئی ہے تو اس کے اسباب مختلف ہوں گے۔"

"یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔" محسن نے کہا۔ "ممکن ہے اس کے سرپرستِ اعلیٰ نواب خسرو جمشید نے فوری طور پر اس کو سراج کے عقد میں دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ ہماری زہر افشانی کے بعد کہیں وہ حقیقت پسند نہ ہو جائے اور رشتے سے انکار نہ کر دے... باغی نہ ہو جائے۔"

"مگر زیب النساء کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرتے تو اسے اسپتال میں ہی بتاتے۔" میں نے کہا۔ "یہ کام وہ زیب النساء کو بتائے بغیر گھر جا کے زیادہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ زیب النساء کا ذہن ایک صدمے سے متاثر تھا اور میرا علمِ نفسیات کہتا ہے کہ اسی صدمے کے جذباتی ردِ عمل نے زیب النساء کو خود

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کچھ کرنے پر مجبور ۔۔۔ دوسرے نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ یا نہیں کر سکتے تھے۔"

"تیرا مطلب ہے ۔۔۔ اپنا انتقام خود لینے کے لیے نکل گئی۔" محسن نے کہا اور سیٹی بجائی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "شاباش۔۔۔ بالکل صحیح بوجھا۔"

گاڑی تھوڑا سا لہرائی۔ پیچھے آنے والے ایک شخص نے اپنی کار کو بچایا اور آگے نکلتے ہوئے بہت غصے میں کچھ کہہ گیا۔

"پھر۔۔۔ اب کیا کریں۔۔۔ اُدھر چلیں؟" محسن نے بائیں کندھے کو اوپر نیچے ہلا کے کہا۔

"پہلے غالب کو لے لیں۔" میں نے ۔۔۔ "افسوس کہ خیال دیر سے آیا' ورنہ اِدھر نہ آتے۔ معلوم نہیں ہمارے پہنچنے تک کیا ہو جائے۔"

غالب کا پلاسٹر کاٹنے والا ڈاکٹر جو کہ اب مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ اور غالب آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے درمیان زبردست بیت بازی کا مقابلہ چل رہا تھا۔ غالب دیکھنے میں بالکل ٹھیک نظر آتا تھا۔

"بس میاں! تم نے بچا لیا اپنے دوست کو۔۔۔ ڈرا ہو گیا۔" ڈاکٹر نے ہمارے سوال پر کہا۔ "ایسا شعر داغا تھا کہ جواب نہیں تھا۔"

"وہ شعر نہیں تھا۔" غالب نے احتجاج کیا۔

"وہ شعر تھا۔۔۔ ردیف قافیے اور بحر کے معیار پر جس سے چاہو فیصلہ کرا لو۔۔۔ ضروری تو نہیں کہ شعر غالب یا میر کا ہو۔۔۔ وہ میرا شعر تھا۔" ڈاکٹر نے فخر سے کہا۔

"ایسے شعر میں ایک سو ایک کہہ سکتا ہوں۔ فی البدیہہ۔۔۔"

"پہلے جوابی شعر کہو۔۔۔ پھر باقی شعر کہتے رہنا۔۔۔" ڈاکٹر زور سے ہنسا۔ "اور ہار نہیں مانتے تو پھر کبھی آ کے سنا جانا۔"

"شعر کیا تھا آخر؟" میں نے غالب کی لٹکی ہوئی صورت دیکھ کر کہا۔

"شعر تھا جناب کہ۔۔۔ میں نے سنایا جب انھیں اپنا رپورتاژ بولے کہ تو ادب کو بھی کرتا ہے سبوتاژ؟"

"واہ۔۔۔ گویا مرزا کو اب 'ژ' سے شروع ہونے والا شعر سنانا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی۔ شاعر کا کیا حال ہے؟"

"تمھارا شاعر جوڑ دیا۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "مگر دونوں ٹانگوں کا فوراً استعمال نہیں کرنا۔۔۔ اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ تھوڑا سا چل پھر لیں۔۔۔ مگر ریس کورس میں گھوڑے کے ساتھ یا بحرِ ظلمات میں دوڑنے کی کوشش ابھی نہ کریں۔۔۔ کم از کم ایک ہفتہ۔"

"تو اب اجازت؟" میں نے کہا۔ "کیا فیس ہوئی آپ کی؟"

"فیس! میاں نذرانہ یا ہدیہ کہتے۔" ڈاکٹر ہنسا۔ "تم سے ہم کیا لیں گے مجاہدو! ہم پر تو لازم تھا کہ تمھیں کچھ دیتے۔۔۔ مگر اب ایک تو اپنی خدمات پیش کر سکتے ہیں۔ اور نصیحت دے سکتے ہیں کہ ایسے ہر جگہ منہ اٹھا کے مت چلے جایا کرو۔۔۔ یہ منہ بہت لوگ دیکھ چکے ہیں۔ آئندہ کبھی ہڈی پسلی ٹوٹے۔۔۔ اور امید ہے کہ جس قسم کے شوق ہیں تمھارے اس میں یہ سب ہوتا ہی رہے گا۔ تو دوبارہ آنے سے پہلے مجھے فون کر لینا میاں سکندرِ اعظم۔۔۔ میں خود بلا لوں گا موقع محل دیکھ کے۔۔۔ دوسروں کے لیے اتنا کر رہے ہو تو اپنی حفاظت کے لیے بھی کچھ کیا کرو۔۔۔ جاؤ فی امان اللہ' اللہ تمھیں کامیاب کرے۔"

واپسی پر میں' محسن اور غالب دم بخود بیٹھے رہے۔ غلطی ہم سے خود ہوئی تھی مگر خوبیٔ تقدیر کہ ہمیں پہچاننے والے ہمارے ہم خیال تھے۔ ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے خود حفاظتی کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ دو مختلف مقامات پر ملنے والے دو ڈاکٹروں نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ یہ اتفاق خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا۔ لیکن یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ لوگوں میں عام طور پر ہمارے ہمنوا زیادہ تھے اور تعلیم یافتہ افراد جو ملک کے اندر کی ساری صورتِ حالات کا صحیح تجزیہ کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے تھے' بطورِ خاص ہمارے مشن سے ذہنی طور پر ہم آہنگی رکھتے تھے۔ وہ سب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ عملاً ہمارے لیے کچھ کر سکتے مگر ان کا ہمارے خلاف کچھ نہ کرنا۔ صرف ہماری حوصلہ افزائی کرنا۔ ہمیں صداقت کی راہ پر تسلیم کرنا اور ہمارے لیے نیک جذبات کا اظہار کرنا بھی بہت تھا۔

تاہم اس سے تصویر کا دوسرا پہلو بھی سامنے آیا تھا کہ ہم کتنی آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی بھیڑ میں یا سڑکوں بازاروں کی ریل پیل میں کوئی بھی کسی چہرے کو غور سے نہیں دیکھتا لیکن روبرو ہم اپنی شناخت کو چھپانے میں ناکام بھی رہتے ہیں۔ لوگوں میں سب تو محسن ۔۔۔ م اور غالب کے طرفدار نہیں ہوتے۔

"یہ تم لوگ کس سمت میں رواں ہو؟" غالب نے کہا۔

"ہم زیب النساء سے ملنے گئے تھے۔" محسن بولا۔

"اور اب پھر اُس سے ملنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پہیلیوں میں باتیں مت کرو۔" مرزا غالب نے کہا۔ "میں بہت اچھے موڈ میں ہوں۔ مقامِ شکر ہے کہ میں پھر دو ٹانگوں پر چلنے والے حیوانِ ناطق کی نسل میں شامل ہوا۔"

"جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں کچھ بھی پھر ٹوٹ سکتا ہے۔" محسن نے کہا۔ "میرے دانت۔۔۔ سکندر کی ناک۔ تمھاری ٹانگ۔"

"پھر مجھے یہیں اتار دو۔۔۔ کم سے کم میں ایک رات تو صحیح سالم گزار لوں۔۔۔ ورنہ آئندہ کے لیے تو ڈاکٹر سلامت کے دروازے کھلے ہی ہیں۔"

"کون ڈاکٹر سلامت؟"

"یہی۔۔۔ جس نے میری ٹانگ جوڑی مگر شاعری کی ٹانگ توڑی اور مجھے بیت بازی میں شکست دی۔" غالب نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "کیا یہ وہی جگہ نہیں آ گئی جہاں سے ہم ایسے نکلے تھے کہ خدا دشمن کو نہ نکالے۔"

"ہاں مرزا۔۔۔ زیب النساء اسپتال سے فرار ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "اور میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اپنا انتقام خود لینے آئی ہو گی۔"

"تمھاری ساتویں حس بھی یہی فرماتی ہے؟" غالب نے بے بسی سے کہا۔ "مارا گیا میں جو بے حس ہوں۔۔۔ تم دونوں کی یہی مصیبت ہے کہ ایک عقل کی بات کرتا ہے تو دوسرا بھی کرتا ہے مگر ایک جھک مارتا ہے تو دوسرا بھی جھک مارتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ گھاس کھا گئے ہو۔۔۔ کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی؟ اور جب وہ اسپتال میں نہیں ملی تو۔۔۔"

"تو شاید یہاں مل جائے۔" میں نے کہا۔

"عجیب شاید ہے۔۔۔ ایسے تو شاید وہ یادگارِ پاکستان پہ مل جائے۔ شاید شاہی قلعے کے تہ خانے میں مل جائے۔۔۔ شاید ہمیں اپنے ہی گھر میں مل جائے۔"

"انتقام لینے والی تھیوری قابلِ غور ہے۔"

"دوستو۔۔۔ وہ لڑکی ان لوگوں کی اور اس گھر کی نشاندہی کر سکتی تو سراج کو بتا دیتی۔ وہ انھیں توپ دم کرا دیتا۔۔۔ یا اپنے بھائی کو بتاتی اور ان کا کریا کرم ہو جاتا۔۔۔ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کون تھے اور وہ جگہ کہاں تھی۔" غالب نے کہا۔

"وہ انجان بننے کی اور اپنے خیالات پر ایسا ہی لاعلمی کا پردہ ڈالنے کی ماہر ہے۔" میں نے کہا۔ "خسرو جمشید نے اور سراج نے معاملے کو دبا دیا ہے۔ لیکن زیب النساء نے انھیں بھی کچھ نہیں بتایا تو یہ اس کی چال ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی انا کی شکست تھی۔ اسے کمزور لڑکی سمجھ کے کچھ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور مردوں نے اس کا استحصال کیا تو وہ ایک وقت کی بات تھی۔ دوسرے وقت میں وہ انہی مردوں پر ثابت کرے گی کہ جسمانی طاقت کو ایک کمزور نظر آنے والی لڑکی کیسے زیادہ عبرتناک شکست دے سکتی ہے۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کر رہے ہو۔" غالب نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جیسے ماہرِ نفسیات ہو۔ زیب النساء کی نفسیات میں ہی پی ایچ ڈی کر چکے ہو۔ ایک بار مجھے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ کیا وہ کتا پاگل تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ بولا کہ جاؤ دیکھ کے آؤ۔۔۔ میں دیکھنے گیا تو اس نے مجھے پھر کاٹ لیا۔ دوسری ٹانگ پر۔۔۔ کیا زیب النساء کو یہ خیال نہیں آیا ہو گا کہ وہ کتے پھر کاٹ لیں گے۔ وہ خالی ہاتھ جائے گی وہاں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہوتی تو ایسا نہ سوچتی۔ اس کے پاس ریوالور ہے یا کوئی ایسی ہی چیز۔۔۔ جو اسے اپنی حفاظت کرنے کے لیے دی گئی ہو گی۔" میں نے کہا۔ "اسپتال میں بھی وہ زیب النساء کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام کرنے پر مصر تھے مگر ڈاکٹروں نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"آخر کس کا ڈر تھا اُنھیں؟" غالب بولا۔ "کیا وہ سمجھتے تھے کہ مجرم اسپتال پہنچ سکتے ہیں؟ مجرم تو چھپتے پھر رہے ہوں گے۔۔۔"

"یار مرزا! حفاظتی انتظامات زیب النساء کو ہم سے محفوظ رکھنے کے لیے تھے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کہ کہیں ہم اسے دوبارہ نہ لے جائیں۔ انھیں یہ فکر بھی ہو گی کہ اخباری نمائندے زیب النساء تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ کڑی سے کڑی جوڑنے والے لوگ ہوتے ہیں۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے۔۔۔ کوئی اندازہ ہے کہ وہ اس علاقے میں کہاں ہو گی؟ اس رات وہ غائب ہوئی تھی تو کوئی سراغ نہیں چھوڑ کے گئی تھی۔" غالب نے کہا۔ "کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔"

"لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ زیادہ دُور نہیں گئی تھی۔ اتنے کم وقت میں وہ آس پاس کے ہی کسی گھر میں داخل ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

ڈرائیونگ محسن کر رہا تھا اور ہم اس گھر کے آگے پیچھے کی گلیوں سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے جہاں سے ہم جان بچا کے بڑی مشکل سے فرار ہوئے تھے اور اگر ایک دستی بم پھینک کے ہم نے پولیس کی پیش قدمی نہ روکی ہوتی تو شاید نکل ہی نہ پاتے۔ یہاں ہم کیتھرین کی لاش بھی چھوڑ گئے تھے اور پولیس نے یقیناً بعد میں آس پاس کے سب لوگوں سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں تھی۔ اب بھی اس گھر پر پولیس کی نظر ہو سکتی تھی جہاں خطرناک مجرم چھپے رہے تھے۔ وہ مجرم جو شہر کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت اور صنعت کار چوہدری دلاور کی سالی اور کوتوالِ شہر کی ماں کو زبردستی اغوا کر لائے تھے۔ چنانچہ ہم خطرے کی جگہ سے دُور دُور رہے۔

عین اس وقت جب ہم اپنی چھٹی اور ساتویں حس کی غلط راہ نمائی پر شرمسار تھے اور مرزا غالب ہماری خام خیالی کا تمسخر اُڑا کے ہماری شرمندگی میں اضافہ فرما رہے تھے' ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ میری نظر نے ایک کوٹھی میں کچھ ہلچل دیکھی۔ وہ پرانے طرز کا سرکاری بنگلا تھا جس کے آس پاس اجاڑ باغ اور خشک گھاس والا لان تھا۔ ایک شخص تیز تیز قدموں سے باہر آ رہا تھا۔ محسن نے میرے کہنے پر جیپ کو روک لیا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"کیا بات ہے بھائی صاحب؟" میں نے کہا۔
"وہ جی... قتل ہو گیا... دُہرا قتل..." وہ ہمیں یہ سنسنی خیز اطلاع دیتے ہوئے سخت بدحواس تھا۔ "میں جا رہا ہوں پولیس کو فون کرنے۔"
"کیا فون نہیں ہے اس گھر میں...!" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
"ہے... بلکہ تھا... مگر قاتل نے تار کاٹ دیے باہر سے۔" وہ بولا۔
"اچھا... تو قاتل فرار ہو گیا؟... یا ہو گئے۔" محسن بولا۔
"نہ ہو گیا نہ ہو گئے..." وہ بولا۔ "ہو گئی... ایک عورت نے دو بندے مار دیے... اللہ توبہ... دونوں کے سر میں اور دل میں تین تین گولیاں ماریں... میں تو مارا گیا۔"
"آئیں ہمارے ساتھ۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ "ہمارے گھر سے فون کر لیں... اور پریشان نہ ہوں... ہم آپ کی مدد کریں گے۔"
"آپ... قریب ہی رہتے ہیں۔" وہ بولا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ محسن نے گاڑی پھر اسٹارٹ کر دی۔
میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کیا کسی نے دیکھا تھا اس لڑکی کو؟"
"اب کیا بتاؤں آپ کو جناب۔" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔ "جھوٹ بولوں تو مشکل... سچ بولوں تو زیادہ مشکل... میں نے ہی دیکھا تھا اُسے... میں بھی یہیں رہتا ہوں۔"
"اچھا... تو مقتول تمھارے کیا تھے؟" میں نے کہا۔
"کچھ نہیں جی... بنگلا ایک سرکاری افسر کو ملا ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اس کے سرونٹ کوارٹر کو میں نے کرائے پر لے لیا تھا۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں... ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی تھی اور مکان بہت مہنگے ہیں۔ کرائے پر کمرا ملتا بھی نہیں کسی چھڑے چھانٹ کو۔ کسی کی سفارش سے یہ کوارٹر مل گیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو میں نے منجی بستر لا کے ڈالا تھا۔"
"تو تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔
وہ چونکا۔ "ہاں جی... بڑی مصیبت میں پھنس گیا میں تو... میں نے اُسے دیکھا ضرور تھا۔ ایک رات وہ بڑی پریشانی میں فون کرنے آئی تھی۔ وہ باہر سے آئی تو میں باہر جا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ گھر میں کوئی ہے۔ مجھے فون کرنا ہے... میں نے اشارے سے اندر بھیج دیا کہ حشمت صاحب ہیں۔ آجکل اُن کی فیملی نہیں ہے۔ لائل پور گئے ہوئے ہیں سب کسی شادی میں۔ اندر حشمت صاحب کے ساتھ کوئی دوست تھا اُن کا... قسم لے لیں جو میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔ مجھے تو حشمت بیگ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ سوائے اس کے کہ... وہ ایکس ای این تھا... اور یہ کہ..."
"کہ وہ ایک بدکردار آدمی تھا۔"
"بدکردار کا تو مجھے پتا نہیں۔ رشوت خوب لیتا تھا اور عیش کرتا تھا۔ وہ اور اس کا دوست شراب پی رہے تھے... یہ بھی مجھے پتا ہے۔" وہ بولا۔
"اور بدکردار کیا ہوتا ہے؟... خیر... پھر کیا ہوا؟"
"پھر کیا جی... میں باہر چلا گیا تھا۔" وہ بولا۔ "آج میں اپنے کوارٹر میں پڑھ رہا تھا کہ میں نے حشمت کے چلّانے کی آواز سنی۔ پھر فائر ہونے تو میں اُٹھ کے دوڑا۔ میں اندر گیا تو حشمت صاحب اور ان کا دوست دونوں مر چکے تھے۔ ان کے جسم سے نکلنے والا خون سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک میز اُلٹی پڑی تھی ساتھ ہی شراب کی بوتل گلاس وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ میں اتنا بدحواس ہوا کہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ اور اس وقت اچانک میری نظر کھڑکی سے باہر گئی تو میں نے بس ایک جھلک دیکھی اس کی۔ اسی لڑکی کی جو فون کرنے آئی تھی۔ پورچ میں روشنی تھی... میں نے کپڑوں سے بھی پہچان لیا اور صورت سے بھی۔"
"اور پھر بھی تم نے اُسے پکڑا نہیں؟" میں نے کہا۔
"میں... کیسے پکڑتا... وہ مجھے بھی قتل کر دیتی... جب آدمی پر خون سوار ہو تو اس سے ڈرنا چاہیے۔ اس کے لیے دو قتل اور دس قتل برابر ہو جاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "وہ کوٹھی سے سیدھی باہر نکل گئی۔"
"پیدل تھی وہ؟"
"نہیں جی... باہر کوئی ٹیکسی تھی یا کار... مگر یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟" وہ ایک دم گھبرا کے بولا۔ "ہم تو بہت دُور آ گئے۔ گاڑی روکو۔"
"دیکھو مسٹر..." میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "تم کو کسی کے گھر جا کے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی جان بچاؤ... سمجھے۔"
"ورنہ پولیس یہ سب کچھ سُنے گی تو تمھیں پھانسی لگا دے گی... وہ لڑکی تو ان کے ہاتھ آئے گی نہیں... وہ تم کو ہی اس کا ساتھی ثابت کر دیں گے اور تم سے اقرار بھی کرا لیں گے۔ قتل کے وقت تم ہی وہاں موجود تھے۔ یا وہ کسی لڑکی کے آنے جانے کی بات کو تمھارا جھوٹ قرار دیں گے اور قتل کی واردات کو تم سے منسوب کر دیں گے۔ اُن کے لیے تمھارے قبضے سے آلۂ قتل برآمد کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہر تھانے میں ریوالور اسی لیے رکھے جاتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر مشکل کیس کو آسان بنانے میں کام آئیں۔ تم کو آسانی سے قاتل ثابت کیا جا سکتا ہے۔" محسن نے گاڑی روک کر کہا۔

"پھر... پھر میں کیا کروں جی..." وہ لڑکا رونے پر آ گیا۔ "مجھے تو سب نے مجبور کیا کہ تم ہی اطلاع دو پولیس کو..."
"سب کون؟"
"آس پاس رہنے والے گھروں کے نوکر آ گئے تھے۔" وہ بولا۔
"صاحب لوگ نہیں آئے تھے؟" میں نے طنز سے کہا۔
"نہیں جی... انھوں نے نوکروں کو معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا تھا کہ یہ فائرنگ کی آوازیں کیسی ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک اور سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے دو کلرک آ گئے تھے... وہ خود کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔"
"ایسا ہی ہوتا ہے۔ چکر میں صرف تم پڑ گئے ہو... کل کو پولیس انھی لوگوں میں سے گواہ حاصل کرے گی... زبردستی کر کے اور دھمکی دے کر وہ کسی کو بھی گواہ بنا لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور یہ لوگ بیان دے دیں گے کہ انھوں نے تم کو آلۂ قتل کے ساتھ گولیاں چلاتے دیکھا تھا۔ یہ چشم دید گواہ تو بیان دے کر الگ ہو جائیں گے مگر تم پہنچ جاؤ گے پھانسی کے تختے پر... میرا تو خیال ہے کہ تم بھی گول ہو جاؤ۔"
"گول ہو جاؤں؟ کیسے... جی...؟"
"کیا یہ سب لوگ تم کو جانتے ہیں؟" محسن نے کہا۔
"نہیں جی... ابھی ہفتہ ہی تو ہوا تھا مجھے یہاں آئے..."
"اور کوئی جانتا ہے کہ تم یہاں رہتے ہو؟" میں نے کہا۔
"پتا نہیں جی... مشکل ہی ہے... مجھے یہاں بھیجنے والا بھی تو مارا گیا۔" وہ بولا۔ "یہاں آنے سے پہلے میں بھی لائل پور میں تھا۔ وہاں سے بیس میل دُور میرا پنڈ ہے... کیا میں واپس چلا جاؤں؟"
"اگر جا سکتے ہو تو تمھارے حق میں یہی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر اس سرونٹ کوارٹر سے منجی بستر اٹھا کے نکل سکتے ہو؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں پچھلی طرف سے جاؤں تو کوئی نہیں دیکھے گا۔"
"تو جاؤ... ابھی پولیس نہیں آئی ہے اور تمھارے لیے موقع ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور پولیس کو اطلاع نہیں دے گا کیونکہ اس کام کے لیے تم کو بھیجا گیا تھا۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ اور بھاگ جاؤ اپنے گھر۔"
"لیکن... میری تعلیم...؟"
"بے وقوف... تعلیم تو بعد میں بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ یہاں رہے تو سمجھو کہ اس دُہرے قتل کا الزام تمھارے سر منڈھ دیا جائے گا۔ غریب کی کوئی نہیں سُنتا۔ انصاف کا عمل بہت مہنگا اور بہت مشکل ہے۔ اپنے گھر جا کے ماں باپ کو سب بتا دینا اور ایک ہفتے کی بات ہی تو ہے۔ اُن سے کہنا کہ تمھاری موجودگی کے گواہ بنا لیں۔ یہ مشہور کر دیں کہ تم لاہور نہیں... کہیں اور گئے تھے۔ مثلاً کسی چاچے ملمے کے گھر..."
"منٹگمری میں میرا بڑا بھائی ہے..."
"ویری گڈ... اسی کے پاس تھے تم... وہ مل کر تم کو بچا سکتے ہیں۔ سچ بول کے تم نہیں بچ سکتے... اس لیے یہ جھوٹ جائز ہے۔ تم قسم کھا لو یا حلف اٹھا لو تب بھی جائز ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ قتل تم نے کیا ہی نہیں اور اس کا یقین دلانا بے حد ضروری ہے کہ تم جائے واردات سے بہت دُور تھے۔" میں نے کہا۔
"اچھا جی... تو آپ پھر مجھے واپس وہیں لے چلیں۔ پیچھے والی سڑک سے۔" وہ بولا۔ "میں دس منٹ میں منجی بسترا اٹھا لاؤں گا۔"
"منجی چھوڑ دینا... بسترا اور کپڑے کتابیں وغیرہ اُٹھا لانا۔" محسن نے گاڑی کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔ پانچ منٹ بعد ہم نے اُسے جائے واردات سے پچاس قدم کے فاصلے پر دوسری طرف اتار دیا۔
"فٹافٹ آ جاؤ... ہم یہاں کھڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم تمھیں بس کے اڈے تک پہنچا دیں گے۔"
"مہربانی جناب... مگر ایک بات پوچھوں۔ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ لوگ پڑوس میں رہتے ہیں۔" وہ بولا۔
"ہم نے جھوٹ بولا تھا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"کیوں جی... اور میری مدد کیوں کر رہے ہیں آپ؟"
"اس لیے کہ ہم نے اس لڑکی کی مدد بھی کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ہم ہی اُسے لائے تھے اور ہم ہی نکال کر لے گئے تھے۔"
"وہ ہماری بہن تھی۔" محسن نے کہا۔ "سگی بہن نہیں، ایک رشتے سے... اور اسے حشمت سے اپنا بدلہ لینا تھا۔ چونکہ تم نے اُسے دیکھ لیا تھا اس لیے ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ تمھارے لیے خود کو بچانے کی ایک ہی صورت ہے کہ خاموشی سے بھاگ جاؤ... ورنہ تم دونوں طرف سے مارے جاؤ گے۔"
"اگر پولیس نے تمھیں مجرم قرار نہ دیا... تو ہم تمھیں زبان کھولنے سے پہلے مار دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم تمھاری مدد کر رہے ہیں... چلو اترو۔"
وہ ایسے اُترا جیسے مجرم عدالت کے کٹہرے سے موت کی سزا سُن کے اترتا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی اترا۔ زیب النسا کی مدد کے لیے یہ سب کچھ ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں مکمل اتفاقِ رائے تھا کہ جو کچھ ہوا تھا انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق تھا اور زیب النسا نے ان مجرموں کو وہ سزا دی تھی جس کے وہ مستحق تھے مگر جو انھیں قانون نہیں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دے سکتا تھا۔ زیب النسا کسی ٹیکسی یا پرائیویٹ کار میں آئی تھی۔ یہ بات قدرے ناقابلِ فہم تھی اور میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ نوجوان نے بدحواسی میں کسی گزرنے والی گاڑی کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ زیب النسا کو لے کر نکل جانے والی گاڑی تھی۔ اس کے مشاہدے میں فرق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ اس نے ہماری بات مان لی تھی کہ ہم ہی زیب النسا کو لے گئے تھے۔ ورنہ ایک ٹیکسی یا کار اور ایک مائیکروبس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مائیکروبس اگر اندھیرے میں نظر نہ آئے تب بھی اس کی ہیڈ لائٹس نسبتاً زیادہ بلندی پر ہوتی ہیں اور پھر سب سے بڑا فرق تو انجن کی آواز کا ہے۔ کار یا ٹیکسی خاموشی سے گزر جاتی ہے جب کہ فاکس ویگن کی مائیکروبس اپنی مخصوص آواز سے پہچانی جاتی ہے۔ لیکن قتل کے فوراً بعد اس نوجوان کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکتا تھا کہ وہ لڑکی باہر گئی اور باہر سے ایک گاڑی گزری۔ نتیجہ خود اس کے ذہن نے اخذ کر لیا کہ لڑکی اسی گاڑی میں فرار ہو گئی۔

ہم دونوں ایک کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ اس کوٹھی میں اندھیرا تھا اور باہر کوئی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ سب ایک جیسے سرکاری بنگلے تھے، جو نام کے بڑے افسروں کو الاٹ کر دیے گئے تھے چنانچہ کسمپرسی کا شکار تھے۔ ان کی ذاتی کوٹھی ہوتی تو وہ اس کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں ٹرانسفر ہونے تک ہی یہاں رہنا ہے۔ پھر کوئی اور آجائے گا۔ اس سرکاری مہمان خانے میں ذاتی دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔

دیوار کے ختم ہوتے ہی ہمارے سامنے دوسری دیوار آگئی۔ اس کے اوپر سے پھاند کر ہم پھر اسی بنگلے کے عقبی حصے میں جا اترے جہاں دو مجرم لاشیں ابھی تک اجنبی لوگوں میں تصویرِ عبرت بنی پڑی ہوئی تھیں۔ ہم بالکل خاموشی سے کھلے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ نوجوان کی ساری کائنات چند جوڑے کپڑوں، دو جوتوں، بستر اور چند کتابوں پر مشتمل تھی۔ باقی سب کچھ اس نے افراتفری میں اٹھایا اور ایک ٹین کے صندوق میں بھر دیا۔ میں نے اس کا لپٹا ہوا بستر اٹھا لیا اور ہم جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس لوٹ گئے۔

میری طرح محسن اور [illegible] کے ذہن میں بھی یہ سوال تھا کہ زیب النسا اپنا حساب برابر کر کے کہاں گئی۔ کیا وہ واپس اسپتال چلی گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنا پروگرام بھائی کے ساتھ مل کے بنایا ہو۔ بھائی نے اتفاق کیا ہو کہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی خواہش کا احترام کرنا بالکل جائز ہے اور ویسے تو یہ کام ایک غیرت مند بھائی کو کرنا چاہیے مگر بہن کے جذبات کی تسکین اپنی عزت کے قاتلوں کو خود قتل کرنے سے ہوتی ہو تو اس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ زیب النسا پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اسپتال میں موجود تھی اور اگر ہم اچانک اس کے کمرے میں نہ پہنچ جاتے تو اس کی عدم موجودگی ثابت بھی نہ ہوتی۔

یہ ایک منطقی جواز رکھنے والا خیال تھا۔ جب محسن نے پھر مائیکروبس کی ڈرائیونگ سنبھالی تو میں اپنا پہلا خیال بدلنے لگا تھا کہ اس نوجوان نے پریشانی میں غلط دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ خسرو جمشید ہی کی گاڑی ہو جو باہر زیب النسا کو واپس لے جانے کے لیے منتظر ہو اور اس سے پہلے کہ کسی کو خبر ہو، زیب النسا واپس اسپتال میں اپنے بیڈ پر پہنچ گئی ہو گی۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ اس کا راز ہم پر فاش ہو چکا ہے اور ہماری وجہ سے ایک ڈاکٹر کو بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ جو اسے پہلے معلوم نہیں تھا۔

"کیا آپ مجھے لاری اڈے پر چھوڑ دو گے۔" نوجوان نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا... آپ کے بارے میں..."

"ہم تم کو اتنی دور نہیں لے جا سکتے۔" میں نے کہا۔ "جہاں بھی کوئی تانگا نظر آیا ہم تمھیں اس میں سوار کرا دیں گے... اور یہ لو..." میں نے جیب میں سے ایک ہزار روپے نکالے۔ "یہ تمھارا سفر خرچ۔ تم اس وقت تک محفوظ ہو جب تک تمھاری زبان بند ہے... ہماری بہن کے یا ہمارے بارے میں تم نے کچھ بھی کہا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا... پھر تمھاری خیر نہیں... ہم تمھارے پتے پر بھی آجائیں گے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تمھارا نام فیصل حیات ہے اور تم سیلی کالج آف کامرس کے اسٹوڈنٹ ہو۔"

وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ "خدا کے لیے جناب... میں بے قصور ہوں... میرا باپ بہت ضعیف ہے اور میری ماں چکی ہے... آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا... آپ کی بڑی مہربانی۔"

"تم بس اتنا کہنا کہ جس گھر میں تم تھے، وہاں قتل ہو گیا تھا۔ کب اور کیسے اور کیوں ہوا یہ تم کو نہیں معلوم... تم تو اپنی جان بچا کے بھاگ آئے۔ تمھاری زبان سے اتنا ہی بیان کافی ہے اور تم کو اسی پر قائم رہنا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے خدا اور رسولؐ کی قسم کھا کے کہا کہ اس کی زبان سے اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلے گا۔ جب ہم نے اسے ایک تانگے میں بٹھا دیا اور تانگا چل پڑا تو میں نے دیکھا کہ اس کی صورت پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ ابھی تک اسے ہماری بات پر پورا اعتبار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ایک اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں ہم اس کا قصہ ہی پاک نہ کر دیں مگر ہم نے اسے بچا لیا تھا تو کم سے کم اسے یقین آچکا تھا کہ ہم اس کے مددگار ثابت ہوئے ورنہ سے شاید

[illegible] گھنٹے میں ہی پھانسی ہو جاتی۔ وہ روانہ ہوتے وقت [illegible] کے انداز میں ہاتھ ہلا کے مسکرایا اور ہم نے جواب میں دوستانہ طریقے پر اسے الوداع کہا۔

"دیکھا تم نے... مرزا غالب کے گھوڑے نے" میں نے موقع ملتے ہی چلّا کے کہا۔

"غالب کے گھوڑے کی دُم کے بال۔" محسن نے ہوا میں مکا چلایا۔

"ہماری چھٹی اور ساتویں حس کے خلاف آئندہ زبان سنبھل کے [illegible]" میں نے کہا۔ "تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم اس کی ٹانگ توڑ دیتے۔"

"توڑ دو... توڑ دو... تمھیں میری سالم ٹانگ بُری لگ رہی ہے۔" غالب خود کو بچاتے ہوئے بولا۔ "ایسے تو کبھی کبھی موسم کا حال بھی درست ہو جاتا ہے۔ جس کی پیش گوئی محکمہ موسمیات والے کرتے ہیں۔"

"کیا خیال ہے اب؟" محسن بولا۔ "واپس چلیں؟"

"واپس کہاں...؟" میں نے کہا۔ "اسپتال... یا گھر...؟"

"ہم نے یعنی میں نے اور غالب نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زیب النسا کو نواب خسرو جمشید یہاں تک لائے۔ زیب النسا نے اپنے مجرموں کو خود سزا دی۔ پھر وہ اسے واپس لے گئے۔" محسن بولا۔

"یہی بات میری عقل میں بھی آتی ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اسپتال سے تو پولیس کو بھی مطلع کر دیا گیا ہو گا۔" محسن بولا۔ "اور اگر زیب النسا کے واپس پہنچنے سے پہلے پولیس پہنچ گئی۔"

"تو کیا ہوا... پولیس واپس چلی جائے گی... پولیس بھی تو اپنی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر خاموش رہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ہماری وجہ سے۔"

"ہماری وجہ سے کیوں؟"

"بھئی اب یا تو وہ کہے کہ زیب النسا کمرے میں نہیں تھی اور اس کے دو گواہ بھی ہیں۔ محسن اور سکندر۔" میں نے کہا۔ "یا فرض کر لیا جائے کہ ڈاکٹر کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اور زیب النسا تو باتھ روم میں تھی۔ نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے... پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے..."

"اگر وہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی کمرے میں پہنچا دی گئی تو سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کیا اسپتال کا سارا عملہ گواہ کہ وہ کہیں بھی نہیں گئی۔ یہ محض پانچ فیصد سے بھی کم خطرات کے خلاف حفاظتی انتظام ہے۔ ورنہ اپنے نواب صاحب کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔" میں نے کہا۔ "وہ سراج کے ساتھ ہی واپس گئے تھے۔ اس کے گواہ ایس ایس پی صاحب ہوں گے کہ نواب خسرو جمشید تمام وقت ان کے ساتھ رہے تھے مگر حقیقت یہ ہو گی کہ نواب صاحب باہر نکلتے ہی اتر گئے ہوں گے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کے جاتے ہی زیب النسا بھی نکل گئی۔ وہ اسپتال کے اندر ہی کھڑی ہوئی نواب خسرو جمشید کی کار میں بیٹھی اور کار چلاتی ہوئی گئی تو گیٹ پر بھی اسے کسی نے نہیں روکا۔ باہر کہیں اس نے نواب صاحب کو پک کر لیا۔ نواب صاحب اسے وہاں تک لے گئے جہاں زیب النسا کو جانا تھا اور کم سے کم وقت میں واپس پہنچا کے رخصت ہو جاتے لیکن اب شاید انھیں معاملات کو سنبھالنے کے لیے رکنا پڑا ہو گا۔"

"ویسے زیب النسا کے اس دہرے قتل کی واردات میں ملوث ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور کیا اس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں کہ تمھارا سارا مفروضہ ہی غلط ہو۔" غالب نے کہا۔ "وہ اکیلی آئی ہو قتل کرنے... اس نے کسی کو نہ بتایا ہو۔"

"تب بھی وہ واپس تو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اور ممکن ہے کہ تھوڑی بہت خرابی ہو... مگر سنبھالنے والے پھر بھی معاملات کو سنبھال لیں گے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... فون کرو اور اسپتال سے معلوم کر لو۔" غالب نے کہا۔

"یہاں سے تو نہیں... لیکن گھر کے قریب سے کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ٹیلی فون لائن قریب سے ہی گزر رہی ہے۔"

"اسے گھر کہتے ہو... اس سرکس کو...؟"

"مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور خانہ بدوشی کی زندگی میں گھر ایسا ہی ہونا چاہیے کہ جہاں گئے ساتھ لے گئے۔ سہولت کے لیے ہر چیز پورٹیبل بنائی جا رہی ہے۔ یورپ اور امریکا میں بہت سے لوگ تو مستقلاً ایسے چلتے پھرتے گھروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔"

میں نے محسن اور غالب کو ٹریلر کے قریب اتار دیا۔ رات کے گیارہ بجے بھی سامنے والے ہوٹل میں رونق تھی اور شمشاد بیگم کے گانے اونچی آواز میں بج رہے تھے۔ چارپائیوں پر ڈرائیور اور کلینر حضرات چادر تانے سو رہے تھے یا چائے پی رہے تھے اور گپ شپ میں مصروف تھے۔ ان کے ٹرک ذرا آگے ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ [illegible] ہوا تھا پھوسے سے لے کر کاروں تک وہ راتوں رات ہر چیز دوسرے شہروں میں پہنچاتے رہتے تھے اور جگہ جگہ ان کے قیام و طعام کے لیے ایسے ہی اڈے قائم تھے۔ موٹر مکینک اس وقت دن کے مقابلے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں زیادہ مصروف نظر آ رہا تھا۔

ہماری طرف سب ٹھیک تھا۔ ڈرائیور شیر علی لوٹ آیا تھا اور ٹریلر سے کچھ فاصلے پر چارپائی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے محسن سے باتیں کرتا چھوڑا اور خود آگے نکل گیا۔ تقریباً دو میل دور جانے کے بعد مجھے ٹیلیفون کا پول ملا جہاں سے میں کنکشن ملا سکتا تھا۔ اسپتال کا نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ یہ نمبر مجھے ایکس چینج نے دیا۔

"یس سر۔" ایک خوش آواز اور خوش اخلاق آپریٹر نے کہا۔

"میں مس زیب النساءُ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ کا نام سر؟" آپریٹر نے تھوڑے سے توقف کے بعد کہا۔

"حشمت بیگ... ایکس ای این۔" میں نے کہا۔

"ہولڈ آن پلیز..." آپریٹر بولا اور میں ریسیور کان سے لگائے کھمبے سے چپٹا رہا۔

"ہیلو..." بالآخر زیب النساء کی حیرت زدہ اور سہمی ہوئی آواز آئی۔ "کون ہیں آپ؟"

"میں حشمت بیگ ہوں بی بی۔" میں نے کہا۔ "اتنی جلدی آپ کو میرا نام تو نہیں بھول سکتا۔"

"دیکھیے... ہم آپ کو نہیں جانتے۔" وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے کہ ہمیں یاد نہ آ رہا ہو۔"

"افسوس کہ مجھے اس وقت فانی کا بھی کوئی شعر یاد نہیں آ رہا ہے کچھ اس قسم کا... کہ وہ خود اپنے کشتۂ جفا سے پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے مر گیا اور اسے کس نے مارا...!"

"بخدا، ہم بالکل نہیں سمجھے... آپ ہمیں مہذب اور معقول آدمی لگتے ہیں... کیا آپ کو یہ زیب دیتا ہے کہ اسپتال کے مریضوں کو فون کر کے بے سبب پریشان کریں۔" وہ بولی۔

"دیکھو، فون مت بند کرنا۔" میں نے کہا۔ "زیب النساءُ کیا تمہارے بھائی نواب خسرو جمشید کہیں آس پاس موجود ہیں؟"

"خسرو جمشید... ہم یہ نام دوسری بار سن رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "بے شک، ہمارے بھائی ہیں۔"

"لیکن ان کا نام مرشد رضا خان ہے۔" میں نے کہا۔ "چلیے، یونہی سہی..."

"آپ... اُن کے کوئی شناسا ہیں...؟" وہ کنفیوز ہو کے بولی۔ اس کی حیرانی کا پُراعتماد انداز مجھے حیران کرنے لگا مگر میں اس کے چکر میں آنے والا نہیں تھا۔

"زیب النساءُ... میں وہ شخص ہوں جس نے تمہیں سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری یہ پُرفریب معصومیت تمہارے جرم کو دنیا سے چھپا سکتی ہے لیکن میں ایک چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے سب کچھ ویسے ہی دیکھا تھا... جیسے تمہاری آنکھوں نے... میں وہیں تھا... جب تم نے ان دونوں کو جہنم رسید کیا۔"

"اللہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں... کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں تمہیں مبارک باد دینا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ "ڈرنے کی تو کوئی بات ہی نہیں... میں سمجھتا ہوں، تم نے بہت اچھا کیا... وہ اسی سزا کے مستحق تھے۔ ہم خود بلاواسطہ اور براہِ راست انصاف کے اصول پر یقین رکھتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ تم بخیر و عافیت واپس پہنچ گئیں۔"

"آپ... آپ وہی لگتے ہیں... جو ہمیں زبردستی لے گئے تھے..."

"بالکل صحیح پہچانا تم نے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسی لیے اسپتال آئے تھے کہ اگر تمہاری مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کریں..."

"آپ کو شرم آنی چاہیے جھوٹ بولتے ہوئے... آپ ہمیں پھر لے جانے کے لیے آئے ہوں گے... لیکن ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کہ ہمارے تکیے کے نیچے ایک پستول ہے اور ہمیں اجازت ہے کہ ہم کسی بھی اندر آنے والے کو گولی مار دیں... جسے ہم نہ پہچانتے ہوں..." وہ خفگی سے بولی۔ "اس دن بھی آپ نے ہمارے ساتھ... اور سب کے ساتھ انتہائی غیر شریفانہ سلوک کیا۔"

"اس دن کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ آج تو تمہیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا...؟"

"کہاں آتے جاتے؟" وہ بولی۔ "آج شام تو ہم..."

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کہو گی... کہ تم تو کمرے سے نکلی ہی نہیں۔"

"تو کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں... ہم جھوٹ نہیں بولتے... ہم باہر بالکل نہیں گئے اپنے کمرے سے..." وہ بولی۔ "اور گئے تو آپ کو کیا... ہم قیدی تو نہیں ہیں۔"

"زیب النساءُ... جب تم کمرے میں نہیں تھیں تو ہم آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تم کہاں گئی تھیں۔ تم نے حشمت بیگ اور اس کے دوست کو شوٹ کیا۔ اس کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے..."

"آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں بلیک میل کرنا..." وہ بولی۔ "جب ہم نے بتا دیا کہ کسی حشمت بیگ کا نام ہم نے آج تک نہیں سنا تو آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں... ہمیں کوئی ضرورت تو نہیں ہے ثبوت پیش کرنے کی... لیکن آپ چاہیں تو اسپتال آ جائیں... تصدیق کر لیں کہ ہم بیمار ہیں، اور کہیں جا ہی نہیں سکتے۔"

"آخر کیا بیماری لاحق ہو گئی آپ کو...؟" میں نے طنز سے کہا۔

"خواتین سے اس قسم کے سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔" وہ بولی۔ "اور ہم اتنی دیر آپ سے ہرگز بات نہ کرتے... لیکن ہمیں آپ سے کچھ پوچھنا تھا کہ کیا وہ سب سچ تھا جو آپ لوگوں نے بتایا تھا۔"

"وہ سب اتنا ہی سچ تھا جتنا اس کے بعد کا سچ جس کی گواہ صرف تم ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ایک اس رات کا سچ جب تم ہمیں چکما دے کر نکل گئی تھیں اور ایک آج رات کا سچ جب تم اسپتال والوں کو ہی نہیں... قانون کے محافظوں کو بھی چکما دے کر نکلی تھیں اور میں حیران ہوں کہ تم دو قتل کرنے کے بعد بھی اتنی معصوم اداکاری کر سکتی ہو..."

"اللہ...! ہمارا دماغ خراب ہو جائے گا۔" وہ بولی۔ "آپ تو ہمیں بس اتنا بتا دیں کہ وہ کیسی ہیں... جن کو آپ ہمارے ساتھ ہی لے گئے تھے۔"

"عائشہ کے اور سراج کی ماں کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "ان میں سے ایک دلاور کی ہوس پر قربان ہو گئی۔ سراج کی ماں کو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے... وہ صرف ایک ضمانت کے طور پر ہمارے ساتھ ہے مگر زیب النساءُ... تم اتنی سمجھدار اور ذہین لڑکی ہو... تم جانتے بوجھتے خود پر یہ ظلم کرو گی۔"

"کیسا ظلم...؟ ہم سمجھے نہیں..."

"تم سب سمجھتی ہو زیب النساءُ۔" میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ "میری مراد سراج سے تھی۔ بتاؤ کیا تم اب بھی اس جیسے آدمی کے ساتھ شادی کر لو گی، یہ ظلم برداشت کر لو گی۔ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ اس کی اور تمہاری فطرت اور مزاج میں کتنا فرق ہے... تم میں ہمت نہیں ہے انکار کی... یا تم ڈرتی ہو اپنے بھائی مرشد رضا سے... دیکھو... مجھے تم سے ہمدردی ہے... تم ایک حساس طبیعت رکھنے والی... ضمیر کے ساتھ چلنے والی... فنکار مزاج رکھنے والی نیک دل لڑکی ہو... اگر تم میں ہمت نہیں ہے اس زبردستی کے خلاف... ہیلو... ہیلو... زیب النساءُ... ہیلو...!" میں نے چلّا کے کہا مگر وہ ریسیور بہت پہلے رکھ چکی تھی۔ وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہی تھی۔ میرے ٹیلی فون نے اسے ہراساں نہیں کیا تھا۔ دُہرے قتل کے الزام اور چشم دید گواہ کا ذکر سن کے بھی وہ بالکل مضطرب نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنا فطری اندازِ معصومیت برقرار رکھا تھا اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی تھی۔ "اُلّو کی پٹھی...!" میں نے جھنجلاہٹ میں کہا اور کھمبے سے نیچے اتر آیا۔

زیب النساءُ کا مشن کامیاب رہا تھا لیکن وہ اس کامیابی کا اقرار کر کے بھی خود کو مجرم تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی... وہ بڑی ہوشیاری سے نکلی۔ اس نے دو ایسے افراد کو قتل کیا جو اس کے مجرم تھے۔ اس نے شاید ان کے بارے میں سراج کو بھی نہیں بتایا تھا اور خسرو جمشید کو بھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ اپنی سوچ کو اپنی ذات تک محدود رکھتی تھی۔ وہ بہت پہلے طے کر چکی ہو گی کہ اسے بعد میں مجرموں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے مگر اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ انھیں جانتی ہے اور پہچانتی ہے... اس نے اپنے ذہن کے خیالوں کو بھی مقفل رکھا اور مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی... جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا، وہ بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ بیک وقت اتنی جذباتی بھی ہو سکتی ہے اور ایسے غیر جذباتی انداز میں بھی فیصلے کر سکتی ہے۔ فنکار بھی ہے اور ایک سفّاک قاتل بھی... کمزور عورت بھی ہے اور انتہائی خطرناک حریف بھی۔ معصوم بھی ہے اور اتنی عیّار بھی کہ جب چاہے اپنی شخصیت کا بھیس بدل لے اور اتنی کامیابی سے کہ اصل شخصیت کو چھپا لے۔

میں زیب النساءُ کے بارے میں سوچتا ہوا واپس پہنچا۔ اس وقت تک مجھے یقین آ چکا تھا کہ چشم دید گواہ کی نظر کو دھوکا ہوا۔ زیب النساءُ اکیلی ہی گئی تھی اور اطمینان سے قتل کر کے اکیلی ہی لوٹ آئی۔ وہ ڈاکٹر جس نے پولیس کو رپورٹ کی ہو گی کہ ایک مریضہ وی آئی پی وارڈ سے غائب ہے، اسے کمرے میں پا کے شرمندہ ہوا ہو گا۔ اور کنفیوز بھی۔ وہ پولیس کے سامنے ہمارا نام نہیں لے سکتا تھا کہ زیب النساءُ کی عدم موجودگی کے دو گواہ بھی ہیں۔ زیب النساءُ نے اتنی ہی سادگی اور معصومیت کے ساتھ اُسے یقین دلا دیا ہو گا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے باہر ضرور نکلی تھی۔ کینٹین تک گئی تھی یا باغ میں ٹہل رہی تھی۔ بے شک وہ کھڑکی کے راستے گئی تھی مگر اسپتال سے باہر ہرگز نہیں گئی تھی۔ اور ڈاکٹر نے یقین کر لیا ہو گا، اس نے مانا ہو گا کہ وہ احمق ہے اور اُلّو کا پٹھا ہے۔ کیونکہ زیب النساءُ سچی ہے۔ اور اگر وہ ڈاکٹر نہ ہوتا تو پولیس اسے جھوٹی رپورٹ کرنے پر آئندہ سچ بولنے کا ایسا سبق دیتی کہ وہ یاد کرتا مگر وہ بھی رپورٹ کو 'مبنی بر غلط فہمی' سمجھ کے لوٹ گئے ہوں گے۔ سراج اور خسرو جمشید عرف مرشد رضا بھی اس کے سچ کے خلاف جانے والے لوگ نہیں تھے۔ میں غصّے میں اندر ہی اندر سے دھواں دیتا واپس پہنچا تو سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ٹریلر کے پیچھے شیر علی نے اپنی دری بچھا دی تھی اور اس پر سراج کی ماں کے سوا سب ایسے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فیملی لگتے تھے۔

"زیب النساءُ سے بات ہوئی؟" محسن نے مجھے غور سے دیکھ کے کہا۔

"ہوئی یا نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے کھانے کو کچھ دو۔"

محسن ہنسنے لگا۔ "وہ اسپتال میں موجود تھی۔"

"اور اس نے پُرزور الفاظ میں تردید کر دی۔ سب کچھ جو آپ نے فرمایا، غلط کر دیا۔" غالب نے بھی ہنس کے کہا۔ "بلکہ ثابت کر دیا کہ آپ بھونکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں... میں بھونکتا ہوں۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "کاٹ بھی لوں گا تمہیں۔ بچہ سمجھ رکھا ہے اس نے سب کو... جذ موتی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے کوئی دوسرے کو بے وقوف سمجھنے کی۔"

"اگر دوسرا حد سے زیادہ بے وقوف ہو تو حد کیسی؟" غالب بولا۔

محسن اور غالب سب سمجھ گئے تھے چنانچہ ان کو کچھ بھی بتانا ضروری نہیں تھا۔ شیر علی نے کسی قسم کے تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا اور کھانا ختم کرتے ہی اُٹھ کے چلا گیا۔ محسن اور غالب مجھے بور کرتے رہے۔

"یہ بتاؤ سراج کی ماں تو ٹھیک ہے؟" میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اسے کیا ہو سکتا ہے۔"

"اس کی وجہ سے ہمیں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے اُسے بتا دیا ہے۔" جولی نے کہا۔ "کہ وہ خاموش رہے اور ہم سے تعاون کرے تو اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اُسے مہمان بنا کے رکھیں گے اور اس کے ہر آرام کا خیال بھی رکھیں گے مگر اس نے شور ہنگامہ کیا تو ہم سب کے لیے اُسے پاگل قرار دینا مشکل نہیں۔ ہم دنیا کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں... اس نے یہ بات سمجھ لی اور اب خاموش ہے۔"

"ویری گڈ جولی... [illegible] داری سنبھال کے تم نے ہمارا بوجھ بہت کم کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی جائے گی؟" جولی نے کہا۔

"نہیں... مجھے امید ہے کہ بہت جلد سراج اسے لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود آئے گا یہاں؟" جولی نے ایسے کہا کہ ہم سب ہنس پڑے اور جولی خفیف ہو گئی۔

"سراج اپنی ماں کو لے جائے گا تو کچھ دے کر ہی جائے گا۔" محسن نے اُسے سمجھایا۔ "دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا دیتا ہے۔"

محسن نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "پونے بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ بولا

"ہاں... بیس منٹ ہیں بارہ بجنے میں۔" غالب نے کہا۔

"ہم ایک کام سے جا رہے ہیں۔" محسن بولا۔ "ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

"ایسے نہیں۔" غالب نے کہا۔ "صاف بتا کے جاؤ کہ کہاں جا رہے ہو۔"

"رابعہ سے بات کرنے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" غالب نے کہا۔ "نازو کو میرا سلام نیاز کہنا۔"

"ٹانگ ٹھیک ہو گئی مگر دماغ خراب ہو گیا۔" محسن نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "رابعہ کہو تو نازو سمجھتا ہے۔"

"یار د... اپنا دل بھی مجبور ہے۔" غالب نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "جو تم کو رابعہ سے کہنا ہے وہی مجھے نازو سے کہنا ہے۔ جب اپنی کہو تو میری بھی کہہ دینا یہ سمجھتے ہوئے کہ غالب سوختہ جاں اس بُتِ طناز سے ہمکلام ہے۔"

"ایسی دردناک باتیں مت کرو دوست... ہم سب فراق کی آگ میں ایک ساتھ اور ایک سے جل رہے ہیں۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پر لے آیا۔ دوسری جانب ہوٹل کی رونق تھوڑی سی ماند پڑ گئی تھی۔ اب بیشتر لوگ چارپائیوں پر سو رہے تھے اور ٹرکوں کی قطار بھی لمبی نہیں رہی تھی۔

"میں نے یہاں آتے ہوئے ایک تجرباتی فارم دیکھا تھا۔" محسن نے کہا۔ "محکمۂ زراعت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔"

"کیا وہاں کوئی تجربہ کرنے کا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ جگہ قریب ہے۔" محسن بولا۔ "باہر سے تو اجاڑ لگتی تھی مگر وہاں ٹیلی فون ہو سکتا ہے۔"

محسن کا خیال درست تھا۔ تقریباً آدھا میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے سڑک کے کنارے ایک پرانا بورڈ دیکھا جو اس حد تک پیچھے جھک گیا تھا کہ خاردار تاروں کی باڑھ کے سہارے [illegible] اعت کا نام سب سے اوپر تھا۔ نیچے 'سیڈ پیتھالوجی لیبارٹری' لکھا ہوا تھا۔

"سیڈ پیتھالوجی؟" محسن نے حیرانی سے کہا۔ "یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"غالباً بیج ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ اور کچھ بھی نہ ہوتا ہو تو ایک دفتر کا نام تو چلتا ہے۔ کسی کو سرکار کے خزانے سے کچھ کرنے کی تنخواہ تو ملتی ہوگی۔ وہ کچھ کرے یا نہ کرے۔ ایسے بہت سے عہدے اور دفاتر کسی اسامی کو کھپانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔"

"میرے ڈیڈی نے بھی ایک واقعہ سنایا تھا۔ محکمۂ زراعت ہی کے کوئی سیکرٹری تھے یا ڈپٹی سیکرٹری۔" محسن بولا۔ "ان کے کسی بھانجے بھتیجے نے ایم ایس سی کے بعد بے روزگاری سے تنگ آ کے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تھا اور بڑا اچھا فیصلہ کیا تھا مگر مذکورہ سیکرٹری صاحب کو اپنی ناک کی فکر لاحق ہو گئی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ان کا وہ بھانجا بھتیجا ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ حالانکہ موصوف خود ایک نمبر کے راشی اور بدعنوان تھے مگر انھیں کسی کا محنت کر کے حق حلال کی روزی کمانا اپنی بے عزتی محسوس ہوا۔ انھوں نے ایک ایسا ہی عہدہ اور محکمہ ایجاد کیا۔ کوئی تجرباتی فارم یا لیبارٹری وغیرہ قائم کرنے کی ضرورت پیدا کی جو ایجاد کی ماں ہوتی ہے منظوری ملتے ہی ایک قطعۂ زمین پر ایک کمرے کا دفتر بنایا گیا۔ ایک مالی رکھا گیا۔ فرنیچر اور سازوسامان خریدا گیا۔ سالانہ بجٹ میں اخراجات کا تخمینہ شاید تین لاکھ بتایا گیا تھا۔ اس میں ریسرچ کا سامان، ایک افسر، ایک ماتحت کلرک اور ایک چپراسی کی تنخواہ شامل تھی اور ذاتی ضروریات کے لیے ٹائپ رائٹر ٹیلی فون وغیرہ بھی شامل کیے گئے اس بے روزگار شخص کو ریسرچ آفیسر بنا کے بٹھایا گیا اور ظاہر ہے کہ کام

تو تھا نہیں۔ سب فضول قسم کی کاغذی کارروائی کے نام پر عیش کرتے تھے۔"

"کیا اب اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ اگر محسن نے اپنے مرحوم والد انکل شیروانی کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت میں یہ قصہ اتنے ضبط و تحمل سے نہ سنتا۔ میرے اپنے دل کی کیفیت ایسی تھی کہ تاخیر اور انتظار کا ہر لمحہ مجھ پر اب بھاری ہو گیا تھا، جب کہ رابعہ سے نصف ملاقات کا خیال پوری طرح میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔

خاردار تاروں کی باڑھ اس بورڈ کے دونوں جانب سو سوا سو گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ بورڈ کے ساتھ ہی ایک کچا راستہ اندر جا رہا تھا اور اگرچہ وہاں دوسرا بورڈ یہ اعلان کر رہا تھا کہ بلا اجازت اندر آنے والے کو حوالۂ پولیس کیا جائے گا مگر وہاں راستہ روکنے والا ہی کوئی نہ تھا۔ گاڑی کو اندر موڑتے ہی میں نے سائڈ لائٹس آف کر کے انجن کو تھوڑا سا چلایا اور پھر نیوٹرل کر دیا۔ گاڑی اپنے ہی زور میں کسی آواز کے بغیر چلتی ہوئی اس دو کمروں کی مختصر سی عمارت تک پہنچی جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اتر کے چند سیکنڈ انتظار کیا کہ کوئی ہم سے کچھ پوچھے مگر وہاں تو چاروں طرف مختصر تجرباتی نوعیت کے کھیت تھے جن کو کیاری کہنا زیادہ مناسب ہوگا یا گملوں میں لگے ہوئے پودے تھے۔ اس جگہ کو دفتر سے زیادہ نرسری سمجھا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں ایک شکستہ کرسی پڑی ہوئی تھی اور وہیں ایک سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے چھت میں ٹین کے شیڈ والا بلب بھی نظر آیا اور میں نے بٹن دبا کے اُسے روشن کر دیا۔ محسن نے اُسے فوراً بجھا دیا۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو اتنی روشنی کا الارم بھی کافی تھا لیکن دو منٹ بعد بھی کوئی نہ پہنچا تو میں نے شیشے کے پینل والے دروازے کو دیکھا۔ اس میں بہت مضبوط قسم کا تالا پڑا ہوا تھا۔ اوپر سینئر سائنٹفک آفیسر کے نام کی تختی تھی۔

"اسے ہم آسانی سے نہیں توڑ سکتے۔" محسن نے کہا۔

"مشکل سے تو توڑ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"توڑنے کو ہم دروازہ بھی توڑ سکتے ہیں اور دیوار توڑ کے بھی اندر جا سکتے ہیں۔" محسن بولا۔ "مگر آسان راستہ کیوں نہ اختیار کیا جائے۔"

آسان راستہ پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں گملوں سے بچ بچ کے اور دیوار کے ساتھ لگ کر چلنا پڑا۔ دونوں کمروں کے پچھلے حصے میں ایک ایک کھڑکی تھی جو زمین سے چار فٹ اوپر تھی۔ میں نے ایک تاریک شیشے پر ناک رکھ کے اندر کے اندھیرے کا جائزہ لینے کی بے سود کوشش کی۔ پھر محسن نے نیچے سے ایک ٹوٹے ہوئے گملے کا کنارا اُٹھایا اور آہستہ سے اوپر کے شیشے پر مارا۔ شیشہ اندر کی طرف گرا اور کچھ ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیاں کناروں پر لگی رہ گئیں۔ محسن نے انھیں احتیاط سے پکڑ کے کھینچا اور باہر پھینک دیا۔ اوپر کی چٹخنی آسانی سے کھل گئی مگر نیچے کی چٹخنی بھی بند تھی اور اسے کھولنے کے لیے نیچے والا شیشہ توڑنا ضروری تھا۔

"کون ہے؟" اچانک دوسری طرف سے کسی نے چلّا کے پوچھا۔

"غالباً چوکیدار۔" میں نے سرگوشی میں محسن کو بتایا۔ شاید وہ اندر سویا پڑا تھا۔ قفل صرف ایک دروازے میں تھا۔ دوسرے کو اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ میں نے محسن کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسری طرف گیا۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار باہر ضرور نکلے گا۔ یہاں چوری ہونے والی کوئی چیز نہیں تھی اور جو بھی تھا سب سرکاری مال تھا، جو کسی کے کام نہیں آ سکتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ کسی نے شیشہ کیوں توڑا۔ باہر نکلتے ہی اُسے مائیکرو ویس دکھائی دے گی اور اس پر لکھا ہوا کسی سرکاری محکمے کا نام تو وہ پریشان ہوگا کہ آدھی رات کو یہاں کون سرکاری کام سے آ گیا۔

چوکیدار نے پہلی بار پکارنے کے بعد کچھ دیر جواب کا انتظار کیا تھا اور دوبارہ زیادہ بلند آواز میں پوچھا تھا کہ "کون ہے؟" پھر شاید اس نے کچھ وقت ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر جھانکنے میں صرف کیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں پھر سامنے کے حصے میں پہنچنے کی مہلت مل گئی۔ دروازوں کے پیچھے اب لائٹ نظر آ رہی تھی۔ میں اور محسن دیوار سے چپک کے کھڑے ہو گئے۔ چوکیدار جیسے ہی کنڈی کھول کے باہر نکلا، اس کی نظر نے سفید مائیکرو ویس کو دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور میں نے پیچھے سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اُسے دبوچ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا چنانچہ اُسے گھسیٹ کر اندر لے جانے کے لیے مجھے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔

"خبردار جو آواز بھی نکالی۔" میں نے آواز اور لہجہ بدل کے کہا۔ "تمھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا... اگر تم نے تعاون کیا۔"

وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔ ابھی تک اس نے نہ میری صورت دیکھی تھی اور نہ محسن کی۔ میں نے اُسے دبوچتے ہی اس کا چہرہ دوسری جانب کر دیا تھا اور اسے کمرے کے اندر کی طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ محسن نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کونے میں لگے ہوئے میلے کچیلے بستر کی چادر سے بالشت بھر چوڑی پٹی اتار لی۔ اسے دوہرا کر کے اس نے چوکیدار کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ اس وقت میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے چہرے نہ دیکھے۔ جیسے ہی میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی، وہ تیزی سے پلٹا مگر اس سے پہلے کہ وہ چلّاتا میں نے اس کے کان کے نیچے کھڑی ہتھیلی کا ہلکا سا وار کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور نیچے گر گیا۔ ان دو کمروں کے ساتھ کوئی باتھ روم ہوتا تو ہم اُسے بے ہوش نہ کرتے۔ اُسے باندھ کے اد

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے اندر ڈال دیتے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ ہماری گفتگو سُنے اور وہ کمرے میں رہتا تو ظاہر ہے، سب سنتا۔

اب میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک میز کرسی تھی میز پر بہت خوب صورت رائٹنگ سیٹ تھا جو کسی کھاد بنانے والے کارخانے کا تحفہ تھا۔ ان کا مونوگرام ہر چیز پر کندہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک ٹیلی فون تھا جو ایک چھوٹے سے لکڑی کے باکس میں آدھا مقفل تھا۔ آدھا اس طرح کہ گھنٹی بجنے پر ریسیور اٹھایا جا سکتا تھا مگر نمبر ملانے والے ڈائل تک رسائی ڈھکنا کھولے بغیر ممکن نہ تھی۔ یہ سرکاری افسران کی مخصوص ذہنیت کا ایک نمونہ تھا۔ وہ خود تمام دن دوستوں سے گپ لگاتے رہیں یا بیویوں اور محبوباؤں کو بے وقوف بناتے رہیں، نچلے درجے کے چپکیدار کو رات کے وقت ہنگامی ضرورت میں بھی فون کا 'ناجائز' استعمال نہیں کرنے دیتے۔

دوسرے کمرے میں چاروں طرف الماریاں تھیں اور شیشوں کے پیچھے ہر ایک میں مرتبانوں کی قطار تھی۔ ہر مرتبان پر گندم، چاول اور دوسری اجناس کے بہت مشکل نام لکھے ہوئے تھے۔ نمبر پڑے ہوئے تھے اور اقسام کی درجہ بندی کے کوڈ تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ اسٹینڈ جیسی میز تھی جس پر بہت سی شیشیاں ٹیسٹ ٹیوبس اور ایسی چیزیں پڑی ہوئی تھیں جو لیبارٹری کے سوا کہیں نظر نہیں آتیں۔ دیواروں پہ مختلف اجناس اور زرعی فصلوں کے چارٹ، گراف اور اعداد و شمار یہ ظاہر کرتے تھے کہ یہاں واقعی کام ہوتا ہے۔

محسن نے تالے کو گھما کے توڑنا چاہا تو وہ کنڈی الگ ہو گئی جس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ محسن کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے میز پہ بیٹھ کے نمبر ملانا شروع کیے۔

"تیرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔" محسن نے مجھے اطلاع دی۔

"میرا دل بھی کانپ رہا ہے۔" میں نے کہا اور کراچی کی لائن کلیئر کرنے کے لیے بار بار وہی نمبر گھماتا رہا یہاں تک کہ ایک کلک کے بعد مجھے کوئی بزی ٹون سنائی نہ دی۔ اس کے بعد میں نے رابعہ کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ گھنٹی ایک بار... دو بار... تین بار بجی... پھر کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو..." میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار یکلخت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس کی دھمک میرے وجود کو مرتعش کرنے لگی تھی۔ "ہیلو..." میں نے مسلسل خاموشی سے گھبرا کے کہا۔

"سکندر..." ایک آواز آئی... ہلکی سی... جذبات کے گلوگیر جالوں میں لپٹی ہوئی۔ بوجھل سانسوں کے ہم رکاب... خوابوں اور خیالوں کے دشتِ امکان سے پرے کسی شہرِ طلسمات کے ویران حصاروں میں مقید۔ اس نے سوتے سوتے آنکھیں کھول کے مجھے پکارا اور سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے رابعہ کی آواز نے... جو برقی مقناطیسی لہروں میں ڈھل گئی تھی، ٹیلی فون کے تاروں سے گزر کے پھر اصل آواز کا روپ دھارا اور میرے کانوں میں جیتی جاگتی صدا بن کے اتر گئی۔

"رابعہ!" میں نے چلا کے کہا۔ "یہ تم ہو... رابعہ تم...!" میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی... میں بھول گیا کہ مجھے کیا کہنا تھا۔ کہنے کو بہت کچھ تھا۔ دورِ ہجراں کے اَن گنت لمحوں کے فسانہ ہائے طول و طویل۔ دلِ فرقت زدہ پر بیتنے والے تمام صدموں کا حساب بے خواب راتوں کی ہر ساعتِ دلدار کا حال۔ امیدوں کی ناامیدی کے اف سے اور ناامیدی کو سہارا دینے والی ہر امید کی کرن کا احوال چاہت کے ہر جذبے کی سخت جانی کی داستان... یادیں... وعدے... خواہشیں... کئی صدیوں کے قصے۔

محسن نے مجھے جھنجوڑا۔ "سکندر... پاگل مت بن... بات کر رابعہ سے۔"

"سکندر..." رابعہ نے کہا۔ "تم رو رہے ہو...!" اور میں نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں کی شفاف جھیلوں سے قطرہ قطرہ اس کے رخساروں کے چمن زار میں ٹپک رہے ہیں۔

"میں... نہیں تو..." میں نے آنسوؤں کے درمیان ہنس کے کہا۔ "رو تو تم رہی ہو۔"

"جھوٹ..." وہ بولی۔ "جھوٹ تم بھی بول رہے ہو... مجھ سے۔" اور اس کی ہنسی نے مجھے شرمسار کیا۔ "بہت دیر کی تم نے... میں ساڑھے گیارہ بجے سے انتظار کر رہی تھی... دیکھو وقت کیا ہوا ہے۔"

"وقت... ہاں... آدھی رات گزر چکی ہے... صبح ہو گئی ہے نا؟" میں نے گھڑی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"نہیں سکندر... رات ابھی آدھی گزری ہے۔" وہ بولی۔ "خود کو فریب دینے سے کیا حاصل کہ رات کے بارہ بجے سے صبح شروع ہو جاتی ہے نئے دن کی۔"

"ایسا مت کہو... دیکھو رابعہ... یہ آدھی رات نہیں، آدھی صدی تھی جو میں نے انتظار کی سولی پر کاٹ دی۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے مت کہو کہ ابھی آدھی رات باقی ہے... مجھے بتاؤ تم کہاں ہو...؟ میں پر لگا کے تو نہیں پہنچ سکتا مگر اُڑ کے آ سکتا ہوں۔"

"یہ مشکل ہے سکندر..."

"سب کچھ ممکن ہے میرے لیے۔" میں نے کہا۔ "وقت میری گرفت میں ہے اور میں تم کو دیکھ سکتا ہوں... اس تار کے دوسرے کنارے پر... جہاں ہو، بس وہیں بیٹھی رہو... میں اس تار کے سہارے آ جاتا ہوں..."

"نہیں سکندر... ابھی نہیں..."

"ابھی نہیں؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم...؟" میں نے کہا۔

"تم یہاں نہیں آ سکتے۔" وہ بولی۔

"اچھا تو تم آ جاؤ۔" میں نے چلا کے کہا۔ "سنو... تم لاہور آ جاؤ" اور وہیں پہنچ جاؤ۔"

"سکندر... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"کیوں؟ کون حائل ہے اب تمہارے اور میرے بیچ میں؟"

"وقت۔" رابعہ نے کہا۔

"وقت کوئی سمندر نہیں ہے... کوئی دیوارِ زنداں نہیں ہے۔ وقت تو ارادوں کا غلام ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں کراچی میں ہی ہوں۔" وہ بولی۔ "اور بالکل خیریت سے ہوں..."

"پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسی۔ "تم سناؤ کیا بات ہے...؟"

"رابعہ... یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے پھر چلا کے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ملو گی؟"

"میں بتا چکی ہوں کہ ابھی میں تم سے نہیں مل سکتی۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"سکندر... تم ٹھیک ہو نا..." رابعہ نے کہا۔ "محسن کیسا ہے اور..."

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تم سے ملنا کیوں ممکن نہیں... میں کیوں نہیں آ سکتا اور تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے کوئی مجبوری۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "کیا تم کسی کی قید میں ہو؟"

"نہیں..."

"رابعہ تم مجھے پاگل کر دو گی..." میں نے برہمی سے کہا۔ "آخر یہ کیا لفظوں میں بات کر رہی ہو... مجبوری کی بات بھی کرتی ہو اور آزادی کی بھی... جب قید میں نہیں ہو تو پھر نہ آنے اور نہ ملنے کا کیا سوال۔"

"سوال ہے نا..." وہ بولی۔ "ابھی صرف اتنا ہی سمجھ لو کہ مجھے اور تمہیں تھوڑا سا انتظار اور کرنا ہے... کیا تم انتظار نہیں کر سکتے؟"

"انتظار تو میں قیامت تک کر سکتا ہوں..."

"ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک۔ خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے۔" محسن نے زور سے کہا۔

"یہ محسن کی آواز تھی نا...؟" رابعہ بولی

"گولی مارو محسن کو... مجھے بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں یہ سلوک زیب دیتا ہے... جو تم میرے ساتھ کر رہی ہو؟"

"کیا تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پہ...؟"

"مجھے؟ عدم اعتماد کا مظاہرہ میں کر رہا ہوں؟" میں نے برہم ہو کے کہا۔ "تم کچھ چھپا رہی ہو مجھ سے۔"

"یہی تو تمہارا عدم اعتماد ہے۔" رابعہ بولی۔ "جب میں کہہ رہی ہوں کہ میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں... تو تم کو مان لینا چاہیے کہ ایسا ہی ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو اس کا مطلب ہے تمہارا اعتماد مجھ پر سے اُٹھ گیا ہے... تم یہ سمجھنے لگے ہو کہ میں بھی تم سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟"

"دیکھو رابعہ..." میں نے بے بسی سے کہا۔ "یہ ناممکن ہے... کہ میں خود پہ اعتماد نہ کروں... مگر تم کو کیا عار ہے بتانے میں؟"

"میں صرف انتظار کرنے کو کہہ رہی ہوں... تم اتنے کچے تو کبھی نہ تھے اپنے یقین میں۔" وہ بولی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"معلوم نہیں... کیا تم جانتی ہو؟ جانتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تم اتنی بے رحم کیوں ہو گئی ہو... صرف اپنی آواز سُنانے کے لیے آئی ہو..."

"تصور میں تو میں تمہارے ساتھ ہوں... جیسے تم میرے ساتھ ہو... کبھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں ہم جدا نہیں ہوئے۔" وہ مجھے سمجھانے لگی۔ "جدائی تو نام ہے وقت اور فاصلوں کو درمیان میں محسوس کرنے کا اور اگر یہ احساس نہیں تو پھر میرے یہاں اور تمہارے وہاں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ یا تم سمجھتے ہو کہ محبت نام ہے... جسمانی طور پر یکجا ہونے کا... اور یہ محبت آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی طرح..."

"خدا کے لیے مجھے ایسا افلاطونی محبت کا فلسفہ مت پڑھاؤ... میں صرف تمہارے خیال سے محبت کر کے زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ میں گوشت پوست کا بنا ہوا جیتا جاگتا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ صرف تمہارے تصور سے میں نہیں بہل سکتا۔ دیکھو یہ محبت وہ پودا ہے جس کو ہم نے مل کے پروان چڑھایا... جیسے سورج کی روشنی اور ہوا اور زمین کی مٹی، ان سب عناصر کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو پودا جی نہیں سکتا... ایسے ہی محبت ایک مادّی وجود بھی رکھتی ہے... اسے زندہ رہنے کے لیے میں اور تم اور ہمارے جذبات... سب ضروری ہیں۔ تمہاری عدم موجودگی میں میرا وجود ادھورا رہ جاتا ہے۔"

"سکندر... افسوس یہ ہے کہ تم جذبات کی دھند میں عقل

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کا راستہ گم کر بیٹھے ہو۔" وہ بولی۔" میں نے کہا نا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ وہ کیا کہتے تھے تم... کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں... صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں۔"

" اچھا رابعہ... مجھے یہ تو بتا دو کہ تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ ایم آر ایس کے مشن سے الگ تمھاری کیا مصروفیت ہے اور کیا مجبوری ہے؟" میں نے کہا۔

" ... ایس تو میرا اور تمھارا مشن ہے جو بالآخر ختم ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد بھی زندگی کی طویل مسافت ہے... یہ مشن تو ایسا ہی ہے جیسے راستے کو وقتی طور پر اوپر سے ٹوٹ کر گرنے والی چٹانیں یا پھسل کر نیچے آنے والے برفانی تودے روک دیتے ہیں۔ انھیں صاف کرنے کے لیے رُکنا پڑتا ہے اور انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس رکاوٹ سے نہ راستہ بدلتا ہے اور نہ منزل بدلتی ہے... تم بالکل مطمئن رہو... میں نہ کسی کی قید میں ہوں اور نہ مجھے کوئی ایسی پریشانی لاحق ہے۔ نہ میں ذہنی طور پر بیمار ہوں اور نہ جسمانی طور پر... متفکر تو میں صرف تمھاری طرف سے رہتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی دعاؤں پر پورا بھروسا ہے۔ خدا مجھے یقین دیتا ہے اور مایوسی سے بچاتا ہے..." رابعہ نے کہا۔" آئندہ بھی میرے لیے سرمایۂ حیات یہی اعتقاد اور ایمان ہوگا..."

" رابعہ... خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ تم کس کے ساتھ ہو...؟" میں نے کہا۔" اگر میں کراچی آؤں تو تم سے کیسے ملوں... ہم سب بہت جلد پہنچنے والے ہیں۔"

" تم اسی نمبر پر فون کر دینا۔" وہ بولی۔" اس سے اگلی رات میں تمھیں فون پر منتظر ملوں گی... اسی وقت..."

" آدھی رات کو؟ یہ کیا تک ہے آخر...؟"

" یہ احتیاط کے تقاضے ہیں..." وہ بولی۔

" مگر یہ فون نمبر کس کا ہے؟" میں نے کہا۔

" اس پر تو کوئی نمبر بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔" وہ بولی۔" نام کس کا ہے... مجھے کیا معلوم۔"

" پھر تم کو کس نے بتایا... وہ کون تھا جس نے میرا پیغام تم تک پہنچایا تھا؟" میں نے کہا۔" جس سے کل میری بات ہوئی تھی۔"

" وہ ایک اچھا آدمی ہے... دوست..."

" اس الّو کے پٹھے کا نام بھی ہوگا کوئی... ایکس وائی زیڈ۔ وہ بات مت کرنا شیکسپیئر والی کہ نام میں کیا رکھا ہے۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

" اُفوہ... بھئی نام ہی تو بتا رہی تھی... دوست محمد نام ہے اس کا اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔" رابعہ نے کہا۔

" یہ تو میں معلوم کر لوں گا کہ نمبر کس کا ہے۔" میں نے کہا۔

" اس سے تمھیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ بولی۔ " یہ سرکاری نمبر ہے... ایک دفتر کا... وہاں وہ رات کے وقت موجود ہوتا ہے۔"

" تو میں معلوم کر لوں گا کہ وہ دفتر کہاں ہے۔" میں نے کہا۔

" تم کو وہاں تک پہنچنے کوئی نہیں دے گا۔ اور ویسے بھی تمھارا اس جگہ تک پہنچنا مشکل ہے۔"

" مشکل ہی ہے نا... ناممکن تو نہیں..."

" دیکھو میں ساری رات تم سے باتیں نہیں کر سکتی... میرا یہاں آنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔" وہ بولی۔" دوست محمد نے کہا ہے کہ جب تک کسی کو شک نہ ہو یہ رابطہ چلے گا۔ اس کے بعد وہ کوئی دوسری صورت نکال لے گا..."

" کیا تم دوست محمد کے ساتھ ہو؟ اس کے گھر میں۔"

" یہی سمجھ لو۔" رابعہ ہنسی۔" رقابت میں جلنے مت لگنا... وہ میرے باپ کی عمر کا آدمی ہے۔ اس کے دو جوان بیٹے کینیڈا میں ڈاکٹر ہیں... دو امریکا میں، اور سب شادی شدہ ہیں۔ یہاں وہ اکیلا ہے۔"

" بیوی تو ہوگی؟"

" نہیں، وہ بچوں کے پاس رہتی ہے۔ کبھی امریکا میں کبھی کینیڈا میں۔ لڑکے بھی باپ کو خبطی سمجھنے لگے ہیں۔ بلا بلا کے تھک گئے... بہت سمجھاتے ہیں کہ اب آرام کریں اور عیش کریں... لیکن وہ ہے ہم سب کی طرح... کہتا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کے کہاں جاؤں اس عمر میں... صرف عیاشی کے لیے اور آرام کی خاطر ترکِ سکونت کروں؟ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ماں کو چھوڑ دے... اور وہ بھی صرف پیسے کے لیے... خود اس کی بیوی ایک زمانے میں ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت تھی۔ اس نے مجھے تصویریں دکھائی ہیں۔ شادی کے سال بھر بعد اس کے جسم پر دھبے سے نمودار ہوئے۔ علاج کے باوجود ... کا اور آدھے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس وقت کیا میں بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ طلاق دینا تو ہمارے معاشرے میں مرد کے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لیتا جو خوب صورت ہوتی۔ مگر یہ شادی تو نہ ہوتی۔ خوب صورتی کا سودا ہوتا۔ صرف ظاہری خوبصورتی کا اور میرے اپنے وجود کی بدصورتی اس سے ظاہر ہوتی۔ پھر میں اپنے ملک سے زیادہ خوب صورت یا خوش حال ملک میں کیوں جاؤں۔ جہاں لاکھ آرام سہی، آسائش سہی... ہزار خوبیاں سہی... لیکن میرے وطن کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں مگر یہ معاملہ جذبات کا ہے۔ مادی اقدار کا نہیں... وہ ریڈیو آفیسر تھا... آرمی سگنل کور میں تھا۔ اسکول آف سگنل راولپنڈی کے کورس کیے۔ پھر حالات ایسے ہو گئے کہ اُسے ریٹائر لینی پڑی۔ بارہ سال تک وہ ایک حادثے کے نتیجے میں یادداشت سے محرومی کا شکار رہا۔ دعا اور دوا سے بالآخر وہ ٹھیک ہو گیا۔ جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، رفتہ رفتہ اُسے واپس مل گیا۔ اس نے ریڈیو آفیسر کا کورس کیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ اب وہ ایک ایکسپرٹ ہے۔ ریڈیو انجینئرنگ میں... ریڈیو ریسیو اور ٹرانسمیٹر اس کے لیے کھلونے ہیں۔ وہ مرچنٹ نیوی... پرائیویٹ شپنگ کمپنیوں اور مواصلاتی اداروں کے لیے کام کرتا ہے۔ معاہدے کی بنیاد پر۔ لیکن پاکستان نیوی کے لیے بھی اس کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ یہ کام وہ رضاکارانہ طور پر کرتا ہے۔ پیسہ وہ جتنا چاہے لے سکتا ہے۔ لاکھوں کے حساب سے۔ مگر صرف اتنا ہی لیتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ لوگ اسے کریک سمجھتے ہیں۔ سب اپنا کام نکالتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بے وقوف بنا لیا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔"

" وہ رہتا کہاں ہے؟" میں نے متاثر ہو کے کہا۔" تم کو کہاں ملا؟"

" ایسے ہی مل گیا... جیسے ہم سب ملے..." رابعہ نے کہا۔" گھر اس کا کوئی نہیں ہے... وہ سمندر کو اپنا گھر کہتا ہے۔"

" تم... پھر چھپا رہی ہو نا... آخر وہ آدمی کا بچہ ہے۔ مچھلی کا بچہ تو نہیں ہے نا کہ سمندر میں رہتا ہو۔" میں نے کہا۔

رابعہ ہنسنے لگی۔" میں سچ بتا رہی ہوں۔ وہ کبھی ایک لانچ پہ ہوتا ہے تو کبھی دوسری پہ۔ بحری جہاز پر کبھی ایک جگہ تو کبھی دوسری جگہ... جہاز تو آتے جاتے رہتے ہیں نا... سب جانتے ہیں اُسے اور وہ کہیں بھی سو جاتا ہے۔ جہاں چاہے کھا لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ شہر نہیں جاتا۔ وہ ٹاپ کلاس ہوٹلوں میں بھی نظر آتا ہے، اور پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک پرانی کار بھی ہے جو عموماً ساحل پر کھڑی رہتی ہے اور جب اسٹارٹ کرنے کا وقت آتا ہے تو اسے دھکا لگانا پڑتا ہے یا پٹرول ڈالنا پڑتا ہے۔ عجیب قلندر آدمی ہے۔ پینتالیس سال کی عمر ہے مگر جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل ہے۔"

" اب بھی تم کہتی ہو کہ میں اس کے خلاف رقابت کے جذبات نہ رکھوں۔" میں نے کہا۔" ویسے کیا تم بھی اس کے ساتھ ساتھ پھرتی ہو؟"

وہ ہنسی۔" ہاں... ابھی تو ایسا ہی ہے..."

" لوگ کیا سمجھتے ہیں تمھیں اور اُسے ساتھ دیکھ کر...؟"

" وہی جو سمجھنا چاہیے۔" رابعہ نے کہا۔

" ایک جوانوں سے زیادہ جوان اور زندہ دل آدمی کے ساتھ ایک ایسی خوب صورت عورت ہو تو...؟"

" بکو مت... اس نے سب کو بتا دیا ہے کہ یہ میری بیٹی ہے اور میرے بیٹوں سے زیادہ قابلِ فخر ہے۔" رابعہ نے کہا۔" اب میں نے تم کو اتنی تفصیل سے اس کے بارے میں بتا دیا۔ تم کو میری فکر بالکل نہیں کرنی چاہیے۔"

" ٹھیک ہے رابعہ... لیکن بہت جلد ہم سب کراچی پہنچنے والے ہیں۔ ایک سرکس کے ساتھ۔" میں نے کہا۔

" سرکس میں نوکری کر لی ہے؟ چلو اچھا کیا۔" وہ ہنسنے لگی۔

" سرکس قائم کیا ہے ہم نے۔ ایم آر ایس کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے۔" میں نے کہا۔" نورتن سرکس کمپنی جس کی مالک ہے بی بی سی۔"

" یہ کیا فضول بات ہے۔ بی بی سی والے دعویٰ کر دیں گے۔"

" بی بی سی تین حروف ہیں۔ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے ان پہ... ہمارے لیے اس کا مطلب ہے بٹ برادرز کارپوریشن۔ جس کے نام پر ہم نے اپنی گاڑیوں کی رجسٹریشن کرائی ہے۔ ایک ٹریلر ہے اور باقی دوسری گاڑیاں۔ جب ہم کراچی میں وارد ہوں گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے بھی تم کسی بھی وقت ہمیں تلاش کرنا چاہو تو تمھارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم کراچی سے لاہور کے راستے پہ کہیں نہ کہیں نورتن سرکس کو ڈھونڈ لو گی، ہماری شہرت ہم سے آگے ہوگی۔"

" میں جب بھی مناسب سمجھوں گی آ جاؤں گی۔" وہ بولی۔ " تمھارے بہت سے کارناموں کی تفصیل میں نے اخبار میں دیکھی۔ باقی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ بتاؤ کہ محسن اور شہلا... غالب اور دوسرے لوگ کیسے ہیں؟"

" محسن اور شہلا کی خیریت تو محسن سے پوچھ لینا۔ مجھے بتاؤ، نازو اور اکرام شیخ کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔" تمھیں نہیں معلوم؟"

میں نے کہا۔" معلوم ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ غالب کی مت پوچھو۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کی طرف سے نازو کو وہ سب کہہ دوں جو اس کی اور میری حالت کی ایک سی کیفیت کی ترجمانی کرے۔"

رابعہ ہنسنے لگی۔" مگر وہ ہے کہاں جو میں غالب کی طرف سے غائبانہ اظہارِ عشق کر سکوں۔ اکرام شیخ اور نازو نے پورٹ کے علاقے میں تم سب کا انتظار کیا۔ اسی انتظار میں انھوں نے پورا مہینہ گزار دیا اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ دوست محمد نے معلوم کیا تو صرف اتنا پتا چلا کہ وہ کسی کارگو شپ پر کہیں گئے ہیں۔"

" کہیں کا کیا مطلب... ہر بحری جہاز ایک مقررہ راستے پر سفر کرتا ہے اور اس کی ایک منزل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

" مال بردار جہاز کو سنگاپور جانا تھا۔ لیکن بمبئی کولمبو کے راستے۔" رابعہ بولی۔" اس پہ مختلف ممالک کو بھیجا جانے والا سامان تھا۔ بھارت، سیلون اور سنگاپور کی بندرگاہوں پہ اسے کچھ سامان اتارنا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تھا اور وہاں سے مزید اسباب لینا بھی تھا۔"

"اسباب کی تفصیلات حاصل نہیں کر سکا... تمھارا یہ دوست؟"

"نہیں... کچھ فہرستیں ملیں... کچھ نہیں ملیں۔"

"ان کمپنیوں کے نام پتے معلوم ہوئے جنھوں نے سامان منگوایا تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... سب کے نہیں۔ شپنگ ایجنٹ بتاتے نہیں تھے۔ پھر بھی کلکتہ کی دو فرمیں ہیں جنھوں نے زرعی مشینری کے پُرزے برآمد کیے تھے۔ اور غالباً ان کا سامان بمبئی یا کولمبو سے کلکتہ جائے گا۔ بمبئی سے گیا تو زمینی راستے سے پہنچے گا۔ کولمبو گیا تو لانچوں سے۔ مجھے شک ہے کہ اکرام شیخ اور نازو انھی دو ناموں کا سراغ لگانے نکل گئے ـــ ایک تو زرعی مشینری کے پُرزے اور پھر کلکتہ کا پتا...!"

"انھوں نے بالکل ٹھیک کیا اور تمھارا خیال بھی سو فیصد درست ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بعد میں ان کی کوئی خبر ملی؟"

"ہاں... چھٹے دن وہ کارگو شپ غرق ہو گیا۔ افواہیں تو بہت تھیں لیکن دوست محمّد نے تصدیق کی تو سب درست ثابت ہوئیں۔ جہاز پر ایک دھماکا ہوا تھا۔ جہاز کے پرخچے اُڑ گئے دس میل دُور سے گزرنے والے ایک اطالوی جہاز کے عملے نے دھماکا بھی سُنا اور شعلے بھی دیکھے۔ دھماکا رات کے وقت ہوا تھا۔ مگر اُن کے پہنچنے تک کچھ نہیں بچا تھا۔ جہاز کے ٹکڑے میلوں تک بکھر گئے تھے۔ اطالوی جہاز کے عملے کا کہنا ہے کہ اس جہاز پر کسی کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اوہ مائی گاڈ... اگر نازو اور اکرام شیخ بھی اسی پر تھے...!"

"اگر وہ اس جہاز پر تھے تو میرا خیال ہے کہ وہی دھماکے کے ذمے دار بھی ہوں گے۔" رابعہ نے کہا۔ "اور انھوں نے دھماکا کیا ہو گا تو خود یقیناً پہلے ہی نکل گئے ہوں گے... مگر یہ کوئی مصدّقہ خبر نہیں... اس کے برعکس یہی ہو سکتا ہے کہ اُنھیں موقع ہی نہ ملا ہو... اور ہیں تو وہ بھی تمھاری طرح سرپھرے... سر بکف پھرنے والے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ "اس کے بعد کوئی افواہ بھی نہیں سُنی تم نے؟"

"افواہیں تو سُنی ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر انڈین نیوی نے غلطی سے راکٹ داغ دیا۔" رابعہ بولی۔ "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے پاکستانی کمانڈوز کی گن بوٹ نے ڈبویا۔ بہرصورت اس کارگو شپ میں اسلحے اور آتش گیر مادّے کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔"

"یہ کتنی پرانی بات ہے؟"

رابعہ نے کہا۔ "پندرہ سولہ دن پہلے وہ جہاز غرق ہوا تھا مگر اخبارات میں کچھ نہیں آیا۔ دوست محمّد کا کہنا ہے کہ اسے خود انھی لوگوں نے ڈبویا، جن کا مال جہاز پر تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی...؟"

"اس کے خیال میں وزن ہے۔" رابعہ بولی۔ "اسلحہ بھیجنے والوں نے کراچی سے دور گہرے سمندروں میں پہنچنے کے بعد اپنا مال کسی لانچ پر منتقل کیا یا کسی دوسرے جہاز پر... وہ جہاز بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا اور کولمبو کے قریب تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اصل خطرناک سامان بمبئی میں اُتار کے دوسرے جہاز سے بھیج دیا گیا۔ اور پہلے والے جہاز کو ڈبو دیا گیا۔"

پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو بمبئی میں اُتر گئے ہوں۔" میں نے کہا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکرام شیخ اور نازو پکڑے گئے ہوں۔" رابعہ بولی۔ "وہ اپنی شناخت نہ چھپا سکے ہوں... اور یہ بھی کہ وہ اپنا کام ختم کر کے واپس پہنچنے والے ہوں... یا پہنچ گئے ہوں۔ جب تک وہ خود رابطہ قائم کر کے کچھ نہیں بتلاتے ہم قیاس آرائیوں کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا ان کا کراچی میں کوئی پتا ٹھکانا ہے؟"

"ہے تو سہی... لیکن مجھے نہیں معلوم۔" رابعہ نے کہا۔ "وہ خود ہی دوست محمّد کے ذریعے رابطہ قائم کرتے تھے۔ اکرام شیخ کے ذریعے مجھے لاہور کے سارے واقعات کی خبر ملتی رہی اور وہ سب کچھ معلوم ہوتا رہا جو تم کر رہے تھے۔ ایک بات میں بھول گئی تھی۔ اس کارگو شپ کی روانگی کے دوسرے یا تیسرے دن بندرگاہ کے علاقے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک یونانی جہاز پر مال لادا جا رہا تھا کہ عملے نے ایک کریٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوست محمّد یونانی جہاز کے کمیونیکیشن سسٹم پر کچھ کام کر رہا تھا۔ شور سن کے وہ باہر نکلا اور اس نے ہی مجھے یہ واقعہ سُنایا تھا۔ کریٹ پر کسی کمپنی کا پتا تھا اور شہر کا نام تھا 'ایلڈ ویسٹ سٹی'۔"

"اور ملک کا نام دسی دانیا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... یونانی کپتان نے کہا کہ یہ کیا بکواس ہے۔ نہ اس نام کا کوئی شہر ابھی تک آباد ہوا ہے اور نہ یہ کسی ملک کا نام ہے۔" رابعہ بولی۔ "وہ خود بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ اس نے دوا کی شیشی نکال کے دکھا دی کہ یہ دیکھو ایلڈ ویسٹ یہ تو دوا کا نام ہے جو صرف ہائی بلڈ پریشر میں استعمال ہوتی ہے اور دسی دانیا کا مطلب بھی اس نے بتا دیا کہ روسی زبان میں 'خدا حافظ' یا الوداع کو کہتے ہیں۔ اس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ کسٹم انٹیلی جنس والے آ گئے اور انھوں نے کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ اسی وقت کسی پڑھے لکھے کرین آپریٹر نے انکشاف کیا کہ ایسے ہی بہت سے کریٹ تو کل پرسوں کسی کارگو شپ پر گئے ہیں۔ یہ غالباً رہ گیا ہو گا... ابھی یہ ہنگامہ چل ہی رہا تھا کہ ایک شخص آ گیا جس نے ظاہر کیا کہ وہ ایک پڑوسی ملک کے سفارتی عملے میں شامل ہے اور وہ ہمارا دوست ملک تھا۔ چنانچہ کریٹ کو اس نے اپنی ملکیت قرار دیا اور اس کا قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسٹم انٹیلی جنس والوں کو مطمئن نہ کر سکا کہ کریٹ پر یہ فرضی اور بے سروپا پتا کیوں لکھا گیا تھا۔ وہ کہتا رہا کہ ہم تفتیش کرے بتا دیں گے مگر کسٹم والوں نے کہا کہ پہلے ہم تو تفتیش کر لیں۔ دوست محمّد کا کہنا ہے کہ شام تک کسٹم والے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر چھٹی کا دن تھا اس لیے واضح احکامات نہ مل سکے۔ کسٹم والوں کو کچھ ٹیلیفون بھی ملے کہ سفارتی عملے کے اس رکن کو چھوڑ دیا جائے اور اس کا سامان بھی دے دیا جائے مگر تصدیق پر وہ فون بھی بوگس ثابت ہوئے۔ اس نے شکوک میں اضافہ کیا اور کسٹم انٹیلی جنس والوں نے اس شخص کو جانے نہیں دیا۔ اس کی موجودگی میں کریٹ کھولا گیا تو اس میں سے خطرناک قسم کا اسلحہ برآمد ہوا۔ ڈائنا مائیٹ، ٹی این ٹی، آتش گیر بم اور ڈیٹونیٹر۔ بارودی سرنگیں جو زیرِ زمین اور سمندروں میں بچھائی جاتی ہیں۔ اور یہ معاملہ فوراً ملٹری انٹیلی جنس تک پہنچایا گیا۔ دوست محمّد کو صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ اس جعلی ڈپلومیٹ نے تفتیش کا آغاز ہونے سے قبل ہی خودکشی کر لی۔ اس کے دانتوں کی کسی کیوٹی میں سائنائڈ کا پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔"

"پھر تو شک کی بات ہی نہیں رابعہ... یہ یقینی بات ہے کہ نازو اور اکرام اسی جہاز پر چڑھ گئے جس پر باقی کریٹ لادے گئے ہوں گے اور وہی جہاز تھا جو انھوں نے غرق کر دیا۔" میں نے کہا۔ "قیاس آرائیاں کوئی کتنی بھی کرے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کارنامہ انھی دونوں نے سرانجام دیا۔"

"تمھارا یقین کس حد تک درست ہے، یہ اُن کے واپس آنے کے بعد پتا چلے گا۔" رابعہ نے کہا۔

"وہ آتے ہی تم سے رابطہ قائم کریں گے۔"

"ظاہر ہے... مجھے ان کی طرف سے کسی خبر کا شدّت سے انتظار ہے۔ اور دل تو میرا بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔"

"رابعہ... اوہ استاد ٹیڈی... اس کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں میں نے... اور تم نے بھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"مجھے خیال آیا تھا۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن میں نے خود ہی اس کے ذکر سے گریز کیا..."

"کیوں؟" میں نے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

"اس کی کوئی اطلاع نہیں... میں تو قید سے نکل گئی تھی۔ مجھ سے پہلے کیتھرین فرار ہوئی تھی۔"

"ہاں... مگر وہ تو قیدِ حیات سے ہی چھوٹ گئی۔"

"کیا... کیتھرین مر گئی؟" رابعہ نے کہا اور میں نے اُس کے صدمے کو محسوس کیا۔

"ہاں... وہ شہید ہو گئی۔" میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"مگر کیسے؟... کیا چلتی گاڑی سے کودتے ہی......"

"نہیں... اس وقت وہ زندہ رہی تھی۔ بعد میں ایک براہِ راست جنگ میں وہ دلاور کے ہاتھوں ماری گئی۔" میں نے کہا۔

"استاد ٹیڈی... اس نے میری رہائی کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ رابعہ باجی... آپ جاؤ... میری خیر ہے۔ اور حالات ایسے تھے سکندر کہ اس کا جرم ثابت ہو گیا ہو گا۔ وہ میرے کپڑے پہن کے میری جگہ لیٹ گیا تھا اور اس نے مجھے چابی دے کے کہا تھا کہ جاتے ہوئے میں باہر سے تالا لگا جاؤں۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا تھا... وہ خود کروٹ لیے پڑا رہا اور... پیچھے سے دیکھنے پر میرے کپڑوں میں وہ بالکل میری طرح لگتا تھا... وہ خود ایک محافظ کو قتل کر کے اور اس کی وردی پہن کے آیا تھا۔ وہی وردی میں نے پہنی۔ پھر میں نکل گئی۔ ظاہر ہے یہ بات دیر تک چھپی نہیں رہی ہو گی۔ اس کے دونوں جرم بہت سنگین تھے۔ محافظ کو قتل کرنا اور مجھے فرار ہونے میں مدد دینا... کیا تم امید کر سکتے ہو کہ... اسے معاف کر دیا گیا ہو گا؟" وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی. اسی وقت محسن اندر آیا۔

"رابعہ... روتی کیوں ہو۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے کہا۔ "اگر وہ زندہ ہے تب بھی ہمارے ساتھ ہے... اور نہیں ہے تب بھی... ہم سب دعا ہی کر سکتے ہیں... اور صبر کر سکتے ہیں... لو محسن سے بات کرو... میں بعد میں بات کروں گا۔" میں نے کہا اور ریسیور محسن کو دے کر باہر نکل گیا۔ کیونکہ میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ٹیڈی کے لیے رونا نہیں چاہتا تھا مگر باہر آ کے میں اپنے ہی اشکوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

مجھے رابعہ سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ابھی اس کی اور محسن کی گفتگو جاری ہی تھی کہ لائن کٹ گئی اور دوبارہ نہیں ملی۔ چوکیدار ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے اُسے دیوار کا سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"معاف کرنا بھائی۔" میں نے کہا۔ "ہمارا ارادہ ہرگز تمھیں نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔"

"اچھی مجبوری ہے۔" وہ آہستہ سے سر کو جھٹک کے بولا۔ اس کی آنکھوں پر ابھی تک پٹی تھی۔ "آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"کچھ نہیں... تم سے ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد اچھی طرح دیکھ لینا... ہم یہاں سے ایک تنکا بھی اُٹھا کے نہیں لے جا رہے ہیں۔ دو شیشے ضرور ٹوٹے ہیں، تو شیشے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں۔"

"شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔" محسن نے کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"یہ لو ایک ہزار روپے" میں نے اس کا ہاتھ تھام کے ہتھیلی پر نوٹ رکھے۔ "بعد میں گن لینا۔"

"لیکن... یہ کس بات کا انعام ہے؟" وہ نوٹ مٹھی میں دبا کے بولا۔ "مجھے تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔"

"تم کو تو صرف کالا ہی کالا نظر آرہا ہوگا۔" محسن بولا۔ "کیونکہ تمھاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ پٹی کھولو گے تو نوٹوں کے اصل رنگ کو بھی پہچان لو گے۔"

"یہ تمھارا انعام ہے... یا اس تکلیف کا معاوضہ جو ہمارے ہاتھوں تمھیں اٹھانی پڑی۔" میں نے کہا۔ "اب ہم جا رہے ہیں۔ اگر تم خواہ مخواہ ہنگامہ کرنا چاہو تو تمھاری مرضی۔ افسرانِ بالا کو اور پولیس کو جسے چاہو رپورٹ کرو۔ وہ تمھیں سوالات سے پریشان کریں گے اور جواب میں تم کچھ نہیں بتا سکو گے کہ تم کو مار کے بے ہوش کرنے والے کون تھے اور کیوں آئے تھے۔ ہم نے ایک کاغذ تک اوپر نیچے نہیں کیا ہے۔ تم اگر بھول جاؤ کہ ہم آئے بھی تھے... تو فائدے میں رہو گے... بس پہلے کی طرح دروازے بند کر کے لائٹ بجھاؤ اور سو جاؤ۔"

"تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" وہ بولا۔ "تم نے کچھ بھی نہیں کیا اور لیا... تو پھر آئے ہی کیوں تھے... صرف مجھے مارنے اور مارنے کے بعد معافی مانگنے اور ہزار روپے دینے کے لیے؟"

"ہم نے یہ ٹیلی فون استعمال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم مجھ سے کہتے... تو میں انکار نہ کرتا۔" وہ بولا۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم انکار کرتے یا نہ کرتے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تم اندر ہو۔" محسن بولا۔ "باہر تو تالا تھا علیگڑھ والا۔"

"اس کے علاوہ۔" میں نے کہا۔ "ہم نہیں چاہتے تھے کہ تم ہماری گفتگو سنو... ایک ٹیلی فون کال کا کسی کو پتا نہیں چل سکتا۔ سرکاری ٹیلی فون ہے۔ تمھارا افسر سارا دن استعمال کرتا ہوگا۔ اس کو کچھ بتا کے پریشانی میں مبتلا ہونے سے کیا حاصل ہے؟"

"لیکن... تم کل پھر آؤ گے؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "نہیں بھائی... یہ ہمارا وعدہ کہ ہم پھر نہیں آئیں گے اور آئیں گے تو تمھیں جگا لیں گے۔"

"مگر ہر بار ہزار روپے نہیں دیں گے۔" محسن بولا۔

"چلو جی آپ کی مرضی... پانچ سو روپے دے جانا۔" وہ بولا۔

میں حیران رہ گیا... لالچ بھی کیا لعنت ہے۔ "ہم پانچ سو بھی نہیں دے سکتے صرف ایک ٹیلی فون کرنے کے۔"

"ہاں سو روپے دے سکتے ہیں۔" محسن نے میرا ہاتھ دبا کے کہا۔ "سودا کرتے ہو؟"

اس نے جواب میں سر ہلایا اور ہم اسے وہیں چھوڑ کے باہر نکل گئے۔ لائٹ جلائے بغیر ہم نے گاڑی اسٹارٹ کی تاکہ وہ چاہے بھی تو ہماری نمبر پلیٹ نہ دیکھ سکے۔ اس نے ہمارے رخصت ہوتے ہی اپنی پٹی اتار دی ہوگی کیونکہ اس کے ہاتھ آزاد تھے۔ اور ممکن ہے وہ فوراً اٹھ کے دروازے تک بھی آیا ہو اور شیشوں کے پیچھے سے جھانکتا رہا ہو۔ باہر آنے کی ہمت اس نے بہرحال نہیں کی اور ہم اندھیرے کی پناہ میں نکل گئے۔ ڈرائیور شیر علی اور غالب ٹریلر کے بند دروازے کے سامنے ایک ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ جلی اور سراج کی ماں اندر سو چکی تھیں۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ریکارڈنگ بند کر دی گئی تھی مگر ہوٹل کھلا ہوا تھا اور پانچ چھ ٹرک بھی موجود تھے۔ اوسطاً اتنے ٹرک وہاں ہر آدھے گھنٹے میں آجاتے تھے اور انہی کی آمد و رفت سے 'شان دار ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ' کی رونق برقرار تھی اور انہی سے 'شانِ پاکستان گیراج' کا پروپرائٹر رات بھر مصروف رہتا تھا۔ وہ جس ٹرک کو چیک کرتا ہوگا اس میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نکال دیتا ہوگا۔ اچھے مکینک اس قسم کے نقص نکالنے میں ماہر ہوتے ہیں جن کا وجود نہ ہو یا کسی کو پتا نہ ہو۔

میں نے شیر علی سے کہا۔ "دوست... چائے تو پلواؤ۔"

"اور خود بھی پیو۔" محسن بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی نیند نہیں آرہی ہے۔ چائے پی کے تو ساری رات جاگتا رہوں گا۔" وہ بولا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھائی... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" محسن آہ بھر کے بولا۔ "راتوں کو نیند نہیں آتی۔ دن میں تارے نظر آتے ہیں۔"

شیر علی ہنسنے لگا۔ "دراصل نئی جگہ ہے۔ ماحول بدل جائے تو ایسا ہوتا ہے۔"

"کسی کی یاد میں جاگنا بھی کوئی بُری بات تو نہیں۔" غالب نے کہا۔ "اب ہمیں ہی دیکھ لو... ہم سب غمِ فراق میں راتوں کو جاگ جاگ کے اُلّو ہو گئے ہیں۔"

جب شیر علی چلا گیا تو غالب نے کہا۔ "میں شیر علی سے اس کی سوانح حیات کے دلچسپ اور سنسنی خیز اقتباسات سُن رہا تھا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ جادۂ وفا اور راہِ حق و صداقت پر چلنے والوں اور ایمان سلامت رکھتے ہوئے صراطِ مستقیم پر سفر کرنے والوں کی سرگزشت ایک ہی ہوتی ہے۔"

"اچھا... کیا شیر علی بھی گردشِ روزگار اور فلکِ کج رفتار کی روشِ خانہ خرابی کا شکار رہے؟" محسن بولا۔

"مشکل اردو غالب نے بھی چھوڑ دی تھی۔" غالب نے کہا۔ "ایسے الفاظ بولو گے تو اپنے ساتھ ایک تشریح کرنے والا بھی رکھنا پڑے گا۔ شیر علی بھی ہم میں سے ایک ہے۔ اس کی زندگی بھی

ایسی ہی آزمائشوں کی کہانی ہے جو ہم نے برداشت کی ہیں۔ بہت صاحبِ کمال شخص ہے۔ بولتا کچھ نہیں اور بتاتا کچھ نہیں۔ مگر بے حد ذہین اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہر بی اے پاس پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ شیر علی کی تعلیم کا ڈگری سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے میں نے اُسے اپنی سنائی۔ ایم آر ایس کے حوالے کے بغیر بھی میری... آٹو بائیوگرافی بے حد سبق آموز ہے۔ اُس نے بڑی دلچسپی سے سُنی کہ پدرم سلطان بود... میرے والدین کیا تھے... اور میں کیا تھا۔"

"یہ نہیں بتایا کہ اب کیا ہوں۔"

"یہ وہ دیکھ سکتا ہے۔ اُسے عقل کا اندھا مت سمجھو۔" غالب بولا۔ "حیرت کا مقام یہ ہے دوستو کہ ایک قوت ہے جو ہم جیسوں کو اکٹھا کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی نادیدہ ہاتھ ایک سے دل اور ایک سے دماغ۔ ایک جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے رکھنے والوں کو گھیر کر ایک مرکز پر لا رہا ہے۔ اکٹھا کر رہا ہے۔"

"کیا ہم شیر علی کے سامنے بات کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "وہ چائے لے کر آرہا ہے۔"

"میرے خیال میں تو کوئی ہرج نہیں۔" غالب نے کہا۔

محسن نے نفی میں سر ہلایا۔ "احتیاط بہتر ہے ابھی۔"

"برتن وہ خود لے جائے گا۔" شیر علی نے کہا۔ "اب آپ لوگ باتیں کریں... میں سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"اچھا تو تم یہ چارپائی اُٹھا کے اتنی دُور لے جاؤ کہ ہماری بک بک کی آواز تمھارے کانوں تک نہ پہنچے۔" محسن بولا۔

"میں پیچھے دری بچھا کے سو جاؤں گا۔"

"نہیں بھائی... یہ کھلی زمین ہے... اور وہ بھی غیر آباد۔ کیڑے مکوڑے سونے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم تو جاگ رہے ہیں... سونا ہوگا تو اندر جا کے سو جائیں گے۔"

شیر علی ہمارے اصرار پر چارپائی اُٹھا کے لے گیا تو میں نے غالب کو رابعہ سے ہونے والی ساری گفتگو کا احوال سنایا اور محسن نے بھی توجہ سے سُنا کیونکہ جب میں اور رابعہ بات کر رہے تھے تو اُس نے یکطرفہ گفتگو سُنی تھی اور جب اس کی باری آئی تھی تو اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔" غالب نے میرے خاموش ہو جانے کے بعد میری اُداس صورت دیکھ کر کہا۔ "اکرام شیخ اور نازو کے بارے میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آسانی سے مرنے والے نہیں۔ مطلب یہ کہ خودکشی نہیں کر سکتے۔ اگر انھوں نے وہ کارکِ شب غرق کیا ہوگا تو خود نہیں ڈوبے ہوں گے۔ اُن کے پاس عقل ہے۔"

"اور نازو ہے۔" محسن نے کہا۔ "جو ایک تباہ کُن قوت کا نام ہے۔"

"مجھے استاد ڈیڈی کا خیال آتا ہے تو میں اُمید کے فریب سے دل کو تسلی نہیں دے پاتا۔" میں نے کہا۔ "وہ سب سے بچھڑ کے بالکل بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔"

"کیوں یارو... کیا وہ خدا جو ہمارے ساتھ تھا، ہے اور رہے گا۔" غالب نے کہا۔ "اُس نے ہمارے دوست کو تنہا چھوڑ دیا ہوگا؟"

"مجھے تو رابعہ کے رویّے پر حیرانی ہے... بلکہ تشویش ہے۔" محسن بولا۔ "آخر وہ کیوں ٹالتی رہی؟"

"واقعی عجیب سا رویّہ تھا۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہ تھی کہ وہ کیوں نہیں آسکتی... یا ہم کیوں نہیں پہنچ سکتے اس کے پاس۔"

"ہوگی کوئی وجہ جو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔" غالب نے کہا۔

"ہمیں بھی نہیں بتانا چاہتی تھی؟" میں نے خفگی سے کہا۔ "ایسی کون سی وجہ ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتی ہے... فرض کرو اس سے ہماری پریشانی بڑھتی ہو۔ یا رابعہ سمجھتی ہو کہ ہمارا مورال ڈاؤن ہو جائے گا۔"

"مورال!" میں نے تلخی سے کہا۔ "وہ تو اس کے کچھ نہ بتانے سے بھی ڈاؤن ہی ہے... کون سا اَپ ہو گیا ہے۔"

"یار یہ بے ایمانی ہے۔" غالب نے کہا۔ "کیا تمھیں اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ یہ جان کر کہ وہ خیریت سے ہے؟"

"یہ میں فرض کر سکتا ہوں... مگر خود اُس نے تو اس کے برعکس ہی ثابت کیا۔" میں نے کہا۔ "وہ خیریت سے ہوتی تو کسی مجبوری کی بات نہ کرتی۔"

"پھر بھی... پہلے جب اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ کوئی رابطے کی صورت تک نہ تھی، خوابوں کے سوا... اور وہ بھی صرف تم دیکھ سکتے تھے، برادرم سکندر بخت۔" غالب نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ "آج تم اس سے تقریباً مل آئے ہو۔ لوگ خط کو نصف ملاقات کہتے ہیں... یہ تو کچھ نصف سے زیادہ ہی ملاقات تھی کہ تم نے اس کی آواز سُنی... کیا اُس کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ... مجبور ہے؟"

"ہاں... ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پیرول پر رہا کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی آزادی کے احساس سے محروم تھی۔ اس کا لہجہ اسیر تھا مگر وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ اور وہ ہنس بھی رہی تھی۔ مگر میں اس کی ہنسی کے ہر رنگ کو پہچانتا ہوں... یہ ہنسی اجنبی سی لگتی تھی..."

"تیرے خیال میں بات کیا ہو سکتی ہے؟" محسن نے پوچھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

" میرا خیال ہے۔" میں نے سوچ کے کہا بلکہ دلاور اینڈ کمپنی نے اُسے ایک موقع فراہم کیا۔ بالفاظِ دیگر ہم پر واضح کیا کہ قیدیوں کا تبادلہ ممکن ہے۔ انھوں نے رابعہ کے زندہ اور خیریت سے ہونے کا یقین صرف اس لیے دلایا کہ سراج کی ماں کو واپس لیا جائے۔ دلاور کا اس میں دخل نہیں رہا۔ عاشی کے مرنے کے بعد اس پر کوئی دباؤ نہیں... مگر سراج یقیناً پریشان ہوگا۔ دنیا میں اگر وہ کسی سے محبت کرتا ہے یا کسی کی پروا کرتا ہے تو وہ اس کی ماں ہے اور اس نے کراچی میں کوئی ایسا انتظام کیا کہ رابعہ خود آزادانہ طور پر مجھ سے بات کر سکے... مگر وہ بدستور قید میں ہے۔"

محسن نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کچھ قائل ہوا۔ تقریباً بیس فیصد۔"

" اب یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے کس طرح رابعہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے رویّے سے سب ٹھیک ہے کا اظہار کرے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے انھوں نے رابعہ کو خطرناک نتائج سے خبردار کیا ہو۔ اور سمجھایا ہو کہ سکندر کا مطمئن ہونا شرط ہے اور تم کو اپنے لہجے اور رویّے سے اُسے مطمئن کرنا ہے... ورنہ..."

" ورنہ کیا ہوگا؟" غالب نے کہا۔ "اسے گولی مار دی جائے گی۔ یا دوسری طرف سے ٹھاہ کی آواز اور سکندر کی آخری چیخ سُننے کو ملے گی؟ فضول بلکہ واہیات۔"

"کیا واہیات؟" میں نے گرم ہو کے کہا۔

" یہ مفروضہ... تمھاری خیال آرائی... تم قنوطی ہونے پر آمادہ ہو تو تمھیں کون روک سکتا ہے۔ مگر رابعہ سے اس قسم کی اداکاری نہیں کرائی جا سکتی۔" غالب بولا۔

" یار، وہ بڑے خبیث لوگ ہیں۔ ڈرامے باز۔" میں نے کہا۔ "انھوں نے تو ہمیں ایک دوسرے کے انتقال کر جانے کی خبر بھی بڑے مصدقہ انداز میں سنا دی تھی۔ کیتھرین کو مرنے سے بہت پہلے مار دیا تھا۔ اور یقین دلا دیا تھا کہ جولی اسپتال میں چل بسی... اور شہلا نے اُسے اپنا گردہ دیا تھا تو وہ بھی نہیں رہی۔ کیا وہ سب جھوٹ نہیں تھا جسے ہم نے سچ مان لیا تھا۔ اور پھر وہ ڈراما جو رابعہ کے ساتھ کیا گیا تھا اس پر تشدد اور نتیجے میں موت واقع ہونے کا جس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کیا رابعہ سے نہیں کہہ سکتے کہ تمھیں چھوڑنا تو ممکن نہیں مگر سکندر سے بات کر لو... کیونکہ وہ مرنے والا ہے؟"

" یہ بات ہوتی تو میں بتا نہ دیتا اسے... یا وہ نہ تاڑ جاتی میرے لہجے سے؟" محسن نے کہا۔ "تمھارے بارے میں وہ مجھ سے سوال نہ کرتی... اور تم بہت دل سے بات کر رہے ہوتے تو یوں کرتے؟"

" یار تم سب تصویر کا روشن رُخ دیکھنے پر مُصر ہو۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی رابعہ کو یقین دلا دے... کہ سکندر کو کینسر ہو گیا ہے مگر یہ بات اسے معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کے دو چار مہینے ہی رہ گئے ہیں تو میرا رویّہ کیا ہوگا اور رابعہ کا کیا ہوگا؟ ایسا ہی۔"

" میں ایک دم پچاس فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا۔ "مگر رابعہ وکیل ہے۔ اُسے آسانی سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔"

" رابعہ پہلے ایک عورت ہے۔ ایک پاگل عورت... ہم سے زیادہ پاگل۔" میں نے کہا۔ "پاگل نہ ہوتی تو آج بھی بہت بڑی وکیل ہوتی۔ مگر اس نے تو سب کچھ گنوا دیا اپنے پاگل پن میں۔"

" پوائنٹ نوٹ کیا میں نے... آپ نے رابعہ کو اس لیے پاگل قرار دیا کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔" محسن بولا۔

" ارے بابا، ہم سب پاگل ہیں۔ محبت کا ایک روپ تو نہیں ہوتا۔ میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ وکیل ہو یا جج... جذبات اس کی سوچ کو کمزور اور غیر منطقی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور وہ بہت ہوشیار شکاری ہیں۔ انھوں نے رابعہ کو لاہور کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ، کسی ریڈیالوجسٹ کی رپورٹ اور پیتھالوجسٹ کی رپورٹ دکھا دی ہوگی۔ شاید اس سے براہِ راست بات بھی کرا دی ہو۔ اور ان رپورٹوں پر میرا نام اور میرے مرض کی نوعیت سب کچھ ہو۔ کیا رابعہ کہے گی کہ تم جھوٹے ہو؟"

"بالکل کہے گی... سو فیصد کہے گی۔" غالب نے ہوا میں مکّا مارا۔

" ہاں... مگر بعد میں خوف اُسے مغلوب کرے گا، اور وہ مانے گی۔ دل آدمی کو شکست دیتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں تو بات کر رہا ہوں کہ رابعہ کو قائل کرنے کا یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ ایسے بہت سے طریقے آتے ہوں گے انھیں... ورنہ کیا تُک ہے بیک وقت آزادی اور مجبوری کا ذکر کرنے کی۔ میں اس سے کب تک بحث کرتا اور کیا سارا وقت اسی میں گزار دیتا؟"

" میں پچھتر فیصد قائل ہوا۔" محسن بولا۔ "مگر ایک آخری بات جو شک میں ڈالتی ہے، وہ رابعہ کی گفتگو ہے۔ وہ بیرونِ دل پر رہا کی جاتی تو اتنی بہت سی باتیں نہ بتاتی... اگر اسے قید خانے میں مشروط طور پر موقع فراہم کیا گیا ہوتا تو وہ فون پر اتنی آزادی سے وہ سب نہ بتاتی۔ جو اس نے نازو اور اکرام شیخ کے بارے میں بتایا۔ کیا اُسے خیال نہیں آیا ہوگا کہ وہ بالکل آزاد اور محفوظ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو شکاری بھی سن سکتے ہیں... اس کے علاوہ... دوست محمد کا کردار... کیا اس کے ذہن کی اختراع تھی؟ اور ایسا تھا تو تم نے ہر بات کیوں بک دی؟"

" یار، ان مفروضات پہ دماغ خراب کیوں کرتے ہو۔ رابعہ سے بات ہو گئی۔ سب کی خیریت مل گئی۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔" غالب نے جھنجلا کے کہا۔ "اب حقیقت کیا ہے۔ یہ کل معلوم ہو جائے گا۔ ہم کوشش کریں گے معلوم کرنے کی۔"

"میں اس شخص کو تلاش کروں گا... دوست محمد کو۔" میں نے کہا۔ "وہ فون نمبر تو ہے نا ہمارے پاس... میں تو اب سو رہا ہوں۔ صبح کے چار بج رہے ہیں۔"

" ابھی بہت کام باقی ہیں۔ آگے جانے سے پہلے سب تیاری کرنی ہے اور بہت سے لوگوں کا انتخاب کرنا ہے... بہت کچھ خریدنا ہے۔" محسن بولا۔ "اور یہ سارا کام جلد از جلد ختم کرنا ہے... ہم سارا دن اور اکثر راتوں کو خوار پھرتے ہیں۔ آرام کے لیے بالکل وقت نہیں نکلتے... ایسے کب تک چل سکتا ہے۔ ہم سب کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔"

" پھر کیا کریں... سارے کام چھوڑ کے سوتے رہیں؟"

" نہیں... مگر کام بھی بہت ہی کرنا ہے... آدمی جب کام کرنے کے قابل ہو۔" محسن بولا۔

" اچھا تم لوگ سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں نہیں سو سکتا۔ حالانکہ میں سونا چاہتا ہوں، ورنہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

" یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" محسن بولا۔ "اور اسی لیے میں نے یہ گولیاں خرید لی تھیں... اسپتال سے باہر آ کے۔"

" خواب آور گولیاں... بغیر نسخے کے مل گئیں؟"

" سب ملتا ہے دنیا میں بچّہ... مانگ فقیر سے کیا مانگتا ہے... بس دل کا قرار مت مانگنا... وہ اس فقیر کے کشکول میں بھی نہیں ہے۔" محسن بولا۔

خواب آور گولی نے صرف اتنا اثر کیا کہ میں آنکھیں بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسے نیم غنودگی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چند سیکنڈ کے لیے نیند کا ایک جھونکا آتا تھا تو رابعہ کی آواز سنائی دینے لگتی تھی... سکندر... میں کیا کروں؟... کیسے آؤں تمھارے پاس...

میں پہلی بار چونک کے اُٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ دوسری بار پھر وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی... میں آنا چاہتی ہوں سکندر... مجھے بلا لو اپنے پاس... تیسری بار اس نے کہا... کیا تم میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے تلاش کر سکو۔ ساری بھول بھلیوں سے گزر کے مجھ تک پہنچ سکو، میں کھو گئی ہوں سکندر... تم میری آواز تو سُن سکتے ہو نا؟ اسی آواز کے سہارے چلے آؤ۔

میں پھر اُٹھا... محسن اور غالب ٹریلر کے فرش پر بے خبر سوئے پڑے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ محسن کی واسکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

محسن ایک دم اُٹھ بیٹھا اور اس نے میری کلائی پکڑ لی۔

" چوری؟ پوری شیشی کھا کے ہمیشہ کے لیے سونا چاہتا ہے، میں اسی لیے جاگ رہا تھا۔"

" ایک گولی اور دے مجھے۔" میں نے کہا۔ "ایسے تو نہ میں سونے پر قادر ہوں اور نہ جاگنے پر۔"

"کیمسٹ نے کہا تھا کہ دو گولیاں اشد ضرورت میں بے ضرر ہیں۔" محسن بولا۔ اور میرے ساتھ اس نے بھی دوسری گولی کھالی۔

محسن نے غالب کی طرف رشک سے دیکھا۔ "کیسے مزے سے سو رہا ہے۔ اس آدمی کو دل کا سکون حاصل ہے۔"

" اس کا عشق بے طلب ہے... اور سچا ہے۔" میں نے کہا۔

" کچھ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔" محسن بولا۔ "جذبات کے کنٹرول کا سوئچ رکھتے ہیں... آں کیا تو مجسم عشق... آف کیا تو مجسم عقل۔"

"ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔" غالب نے آنکھیں کھول کے اور ایک ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "اس کے نام پہ ایک گولی مجھے بھی دو۔"

" جس کے نام پر مرتے کم ہو، مارے زیادہ جاتے ہو۔" محسن بولا۔ "تم کو بھی آج نیند نہیں آ رہی ہے؟"

" ہاں یارو... آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔

تین گھنٹے کے بعد کسی نے مجھے جھنجوڑنا شروع کیا تو میری نیند اتنی گہری تھی کہ آنکھیں کھولنے اور اُٹھ کر بیٹھ جانے کے بعد بھی میں پوری طرح نہیں جاگا تھا۔

" یارو، غضب خدا کا! اتنی کوشش سے تو مُردے بھی اُٹھ جاتے۔" غالب نے کہا۔

" کیا قیامت آ گئی ہے؟" میں نے جماہی لے کر کہا۔ "جو آپ صورِ اسرافیل کی طرح میرے کان میں چلّا رہے ہیں۔"

غالب نے ایک لات محسن کے رسید کی۔ "پھر سو گیا لاتوں کے بھوت۔"

" لاحول ولا قوۃ۔" محسن ہڑبڑا کے اُٹھا۔ "کیا مصیبت ہے یار؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

" صرف سات بجے ہیں۔" محسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی صبح کے سات... یہ بھی کوئی وقت ہے شرفاء کے اُٹھنے کا..."

" اور یوں اُٹھائے جانے کا؟" ... نے کہا اور پھر سونے کی کوشش کی۔ غالب نے پانی کا ایک گلاس اس پر ... دیا۔

" ایسے نہیں اُٹھو گے تو پھر اللہ تمھیں اُٹھائے گا۔" غالب

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نے کہا۔

"یار، ہوا کیا ہے۔ جو یہ آب پاشی ہو رہی ہے۔" محسن نے کہا۔

جولی اندر آ کے ہنسی۔ "منہ دھو لیا بھائی... یہ لیں کافی۔" اس نے میرے ہاتھ میں ایک مگ تھما دیا۔

"بلیک کافی!" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"گرما گرم بلیک کافی؟" محسن نے کہا۔ "ہاؤ از دیٹ جولی؟"

"کل جب آپ لوگ گئے ہوئے تھے تو میں نے شیر علی سے کچھ سامان منگوا لیا تھا۔" جولی نے کہا اور تیسرا مگ غالب کو تھما دیا۔

"اوہ جولی... لو آر این انجیل۔" میں نے کہا۔

"تم فلورنس نائٹ انگیل ہو۔" محسن بولا۔

"تم فاطمہ بنتِ عبداللہ ہو..." غالب نے کہا۔

جولی کا چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ "وہ کون تھی بھائی؟"

"وہ مجاہدوں کو میدانِ جنگ میں پانی پلاتی تھی۔" غالب بولا۔

"جیسے تم مجاہدوں کو بلیک کافی پلا رہی ہو۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اس پر اقبال نے نظم لکھی تھی۔ تم پر میں لکھوں گا۔" غالب بولا۔

جولی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ میں نے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں سراج کی ماں تھی... وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ جولی پھر باہر چلی گئی۔

"اُسے شیر علی لے گیا ہے۔" غالب نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "گاڑی میں۔"

"کہاں لے گیا ہے...؟"

"کہیں نہیں... اُسے مائیکروبس میں منتقل کر دیا ہے۔" غالب نے کہا۔ "جلدی سے کافی ختم کرو... پھر ہمیں چلنا ہے۔"

"... کیا بات ہے آخر... وہ ٹھیک تو ہے نا...؟" میں بہت سے اندیشوں میں گھر گیا۔ خدانخواستہ قید میں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی... مر تو نہیں گئی۔ اس نے اعصابی دباؤ میں خودکشی تو نہیں کر لی!

"ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔" غالب نے کہا۔

"سب کو؟" محسن نے پوچھا۔

"صرف شیر علی اور جولی یہاں رہیں گے۔" غالب نے کہا۔ "رات کو شاندار ہوٹل میں ایک ٹرک ڈرائیور کا قتل ہو گیا ہے۔ ابھی تک پولیس نہیں پہنچی ہے۔ ہمیں پولیس کے سائے سے بھی دُور رہنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پولیس کو ہمارا سایہ تک نہ ملے۔"

"تمھیں کس نے بتایا...؟"

"شیر علی نے..." غالب نے کہا۔ اسی وقت شیر علی اندر آیا۔

"پولیس کی ایک جیپ آ گئی ہے۔" شیر علی کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ "آپ لوگ جاتے کیوں نہیں...؟"

"تم تو ہم سے بھی زیادہ پریشان ہو شیر علی۔" میں نے کہا۔

"سکندر صاحب... آپ تو سمجھتے ہیں ان کی سرشت کو۔" شیر علی نے روانی میں کہا۔ "اصل مجرم کو پکڑنے کے بہانے یہ کسی کو بھی پکڑ سکتے ہیں اور تفتیش کے بہانے یہاں بھی گھس جائیں تو ان کو روکنے والا کوئی نہیں۔"

میں دم بخود بیٹھا ہوا شیر علی کو دیکھ رہا تھا۔ خود محسن اور غالب بھی شیر علی کی بات سن کر سکتے میں آ گئے تھے۔

"شیر علی..." میں اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "تمھیں میرا نام کس نے بتایا؟"

"جی؟... آپ کا نام!" وہ حیران ہوا...

"ہاں... تم نے ابھی میرا اصل نام لیا تھا..." میں نے کہا۔

"میں نے لیا تھا؟" وہ اعترافِ جرم کے انداز میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھیے جناب... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کون ہیں... پہلے مجھے شک ہوا تھا آپ سب کے رویے سے۔ پھر میں نے معلوم کر لیا۔ میرا تجسس میں مبتلا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر آپ ایک مسلمان... ایک پٹھان اور ایک مرد کی زبان پر بھروسا رکھیں۔ وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ شیر علی آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے پیچھے بھی ہے تو پیٹھ میں خنجرا گھونپنے کے لیے نہیں... آپ کو بچانے کے لیے۔ ویسے تو خدا نے چاہا تو شیر علی آپ سے آگے ہو گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شیر علی... ہم اعتماد کے بہت فریب کھا چکے ہیں... اور تم جانتے ہو کہ سانپ کا ڈسا ہوا رسی سے بھی ڈرتا ہے... مگر اب تم کو سب پتا چل گیا ہے... تو ٹھیک ہے... ہم اعتبار کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"یہ ہم بعد میں پوچھیں گے کہ تم کتنا جانتے ہو ہمارے متعلق۔" غالب نے کہا۔ "مثلاً کیا تم یہ جانتے ہو کہ ہم مرنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مارنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔"

"آستین کا سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے شیر علی۔" میں نے کہا۔

"ہوتا تو ہے مگر کیا آپ انھیں نہیں پہچانتے۔" شیر علی نے کہا۔ "انہی کا سر تو کچل رہے ہیں آپ لوگ۔"

"ہم لوگ کون؟... تم کس کس کے نام سے واقف ہو... اور جو کچھ تمھیں معلوم ہوا ہے، کس سے معلوم ہوا ہے؟" غالب نے کہا۔

"دیکھیے... یہ سب آپ بعد میں بھی پوچھ سکتے ہیں مجھ سے... ابھی تو آپ نکلنے کی فکر کریں۔ یہ نہ ہو کہ وہ خواہ مخواہ ادھر آ جائیں۔ اتنا بڑا ٹریلر سب کو متوجہ کرتا ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"اگر ہمارے جانے کے بعد وہ آئے اور تم سے پوچھ گچھ کی تو تم [illegible] میں نے کہا۔

"آپ بتا دیں کیا کہنا ہے۔" شیر علی نے کہا۔ "یا مجھ پر چھوڑ دیں... میں انھیں مطمئن کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے... تم جو چاہو کہہ دینا۔" میں نے کہا۔ "فی الحال سرکس وغیرہ کا ذکر مت کرنا۔"

چند منٹ بعد میں اور محسن کود کے باہر نکلے۔ غالب ہم سے پہلے جا چکا تھا۔ ہم نے اُسے مائیکروبس کے پیچھے جولی سے باتیں کرتا پایا۔ جولی نے ہماری طرف دیکھا اور نہ جانے غالب کی کس بات پر اقرار میں سر ہلایا۔ سڑک کے دوسری جانب پولیس نے اپنے روایتی انداز میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز کرسی پر انسپکٹر یا اس سے کم عہدے کا ایک افسر بیٹھ گیا تھا۔ چار پولیس والے اس کے دونوں جانب چارپائیوں پر رائفلیں لیے بیٹھے تھے اور باقی مجمع قدرے دُور ایک نیم دائرے میں کچھ سہما ہوا اور وحشت زدہ سا کھڑا تھا۔ ایک ٹرک باقی چار ٹرکوں سے الگ کھڑا ہوا تھا اور وہاں بھی دو پولیس والے خاصی بے دلی سے پہرا دینے لگے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ واردات اسی ٹرک کے ڈرائیور کے ساتھ ہوئی تھی چنانچہ دوسرے ٹرک والوں نے خود ہی اپنے ٹرک جائے واردات سے دُور لے جا کر روکے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ ایک ہی قطار میں کھڑے ہوتے جاتے تھے۔

"قتل ٹرک کے اندر ہوا ہے یا باہر...؟" میں نے کہا۔ چلتے چلتے شیر علی سے پوچھا۔

"اندر ہی جناب۔" شیر علی نے کہا۔ "لاش تو میں نے نہیں دیکھی۔"

"کیا تم بھی گئے تھے تفتیش کے لیے؟" محسن نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

"تفتیش کیا جی... شور ہوا تو سب ہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں بھی چلا گیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"اور کیا معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔

"کچھ نہیں... ڈرائیور کا نام لے رہے تھے لوگ... ہمارے علاقے کا آدمی تھا، اس لیے میں رُک گیا۔ نوشہرہ کا رہنے والا بادشاہ گل تھا۔ سب جانتے تھے اُسے کہ اچھا آدمی ہے۔ اسے کسی نے ٹرک میں ہی مار دیا... وہ کچھ لینے گیا تھا... چائے پیتے پیتے۔ جب لوٹ کر نہیں آیا بہت دیر تک تو کوئی دیکھنے گیا۔ وہ ڈرائیور کیبن میں اُلٹا پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے میں کسی نے ایک برف توڑنے والا نوکیلا سُوا گھونپ دیا تھا۔" شیر علی نے کہا۔

"شیر علی... کیا ٹرک کا نمبر ستائیس انیس ہے؟" میں نے کہا۔

شیر علی چونکا۔ "جی... مگر آپ نے کیسے دیکھ لیا!"

"میری نظر بہت تیز ہے شیر علی۔" میں نے ٹرک کی سمت میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں سے نمبر پڑھ رہا ہوں... وہ ٹرک ہے نا جو الگ کھڑا ہے۔"

ظاہر ہے شیر علی کے لیے میری بات پر یقین کرنا دشوار تھا کیونکہ اتنے فاصلے سے ٹرک کی نمبر پلیٹ تک صاف نظر نہ آتی تھی۔

"اب تم ایسا کرو۔" میں نے کہا۔ "کہ ہماری واپسی تک اس ٹرک کے بارے میں اور ٹرک ڈرائیور کے بارے میں جتنی معلومات حاصل کر سکتے ہو... خود کو محفوظ رکھتے ہوئے ضرور حاصل کرو۔"

"خود کو محفوظ رکھنا پہلی شرط ہے۔ کیونکہ تمہارے ساتھ ہی ہم بھی غیر محفوظ ہونا نہیں چاہتے۔" محسن نے کہا اور پھر گاڑی سے سر نکالا۔ "یہ غالب کیوں دیر کر رہا ہے؟"

"بڑی لمبی الوداعی ملاقات ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے... ہم کوئی مریخ پر تو نہیں جا رہے ہیں۔"

"غالب کے گھوڑے!" محسن نے اُسے آواز دی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ "ہم جا رہے ہیں۔"

غالب نے جواب میں کہا۔ "جاؤ۔" مگر پھر دوڑ کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہ جولی کو ہدایات دے رہا تھا اور اُسے رابعہ سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سُنا رہا تھا۔ جولی یہ سب کچھ جاننے کے لیے بہت بے چین تھی۔ گاڑی کے اندر سب سے پیچھے والی سیٹ پر سراج کی ماں اپنی آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ہم نے آپس میں بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے کانوں تک نہ پہنچے مگر یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ وہ اندازوں کی بنیاد پر بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی... وہ کھلی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ رہی تھی اور ہمارے ساتھ ساتھ ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے سفر کر رہی تھی۔ اُس نے مائیکروبس بھی دیکھی تھی اور ٹریلر بھی دیکھا تھا۔ ہم اُسے غیر معینہ عرصے کے لیے اسیری میں نہیں رکھ سکتے تھے... وہ بوڑھی عورت تھی، اور اگرچہ اب تک ہم نے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی مگر اپنی تنہائی کا اور قید میں ہونے کا خیال ہی کم تکلیف دہ نہ تھا۔ وہ گھر سے اور بیٹے سے دُور تھی اور اس نے کیتھرین کے بعد عاشی کو مرتے دیکھا تھا اور ہمیں روپوشی کے ٹھکانے بدلتے دیکھا تھا۔ بے شک اس نے حالات کے خلاف اپنی جدوجہد کو بے مصرف سمجھتے ہوئے خود کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ہمارے تمام معاملات سے بے نیازی کا انداز اختیار کرتے ہوئے چُپ سادھ لی تھی اور آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند کر لیے تھے مگر اس سے ہمارا مطمئن ہو جانا غلط ہوتا کیونکہ وہ بہرحال سراج کی ماں تھی اور سراج سے بڑا دشمن ہمارا کوئی نہیں تھا۔ خود سراج کی ماں کو بیٹے کے مذموم کاروبار کی حقیقت کا علم ہونے سے بہت زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑتا تھا کہ وہ پہلے ایک ماں تھی اور ہر ماں کی طرح ممتا کے جذبات دوسرے تمام جذبات پر حاوی تھے۔ وہ بیٹے کی دشمن اور ہماری ہمدرد نہیں بن سکتی تھی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ ہم نے اس کے ساتھ اس کے گھر میں بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور گھر سے باہر اس کے سامنے کوئی قابلِ تعریف کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے سوچنے میں حق بجانب تھی۔ ایک عورت کو جو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

عمر کے اس حصے تک پہنچ چکی ہو کسی بھی جنگ کے سیاسی یا معاشی پہلو کو سمجھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہر معاملے کو اخلاقی یا مذہبی کسوٹی پر ہی پرکھ سکتی تھی چنانچہ اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتی کہ اچھا ہم بھی نہیں کر رہے ہیں۔ اس کا بیٹا بھی بُرا اور ہم بھی بُرے تو طرفدار وہ ہماری ہو... یہ ناممکن اور بعید از قیاس تھا۔ آئندہ بھی عملی طور پر وہ ہمارے خلاف جنگ میں براہِ راست شریک نہیں ہوگی۔ مگر اپنے بیٹے کی یوں مدد ضرور کرے گی کہ اسے ہمارے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائے گی۔ بیٹا خود ایک سینئر پولیس افسر تھا اور تفتیش کے سارے طریقے جانتا تھا۔ وہ ماں سے خود ایسے سوالات کر سکتا تھا جن کے جواب میں وہ بتا سکے کہ ہمارے ساتھ رہ کے اس نے کیا دیکھا اور کیا سُنا۔

میں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ محسن نے مجھے ٹوکا۔

"کیا سوچ رہا ہے؟"

"میں...؟ یہی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔" میں نے چونک کر کہا۔

"سراج اور دلاور سے آخری بات کر لینی چاہیے۔" غالب نے کہا۔ "بلاوجہ اس بڑھیا کو ساتھ لیے پھرنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"ہاں۔ عاشی زندہ رہتی تو دلاور سے بھی بات کی جا سکتی تھی۔" محسن بولا۔ "اب تو سراج ہی رہ گیا ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا ہوگا۔"

"اس نے لاہور کا چپہ چپہ چھان مارا ہوگا۔ اندر باہر کے سارے راستوں کی ناکابندی کی ہوگی۔ مگر ابھی تک ناکامی اور مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔ وہ سخت جھنجلاہٹ اور بے بسی کا شکار ہوگا۔"

"اور یہی وقت ہے کہ ہم اس سے سودا کر لیں۔" غالب بولا۔

"سودا کس کا؟" محسن بولا۔

"اب تو صرف ٹیڈی ہی رہ گیا ہے جس کے بارے میں وہ بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... رابعہ تو نکل گئی تھی۔ نازو اور اکرام شیخ کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔" محسن بولا۔ "مگر ٹیڈی ان کے قبضے میں تھا اس کے بارے میں سراج ضرور جانتا ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے۔"

"وہ زندہ ہے... اگر کا کیا سوال۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"ہاں... وہ زندہ ہے۔" محسن بولا۔ "میں بھی اس یقین سے محروم نہیں ہوا۔ لیکن میں تصویر کے دوسرے رُخ سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ اگر وہ زندہ ہے تو سیدھی صاف بات یہ ہوگی کہ ٹیڈی کو چھوڑ دو۔ جس دن وہ ہمارے پاس پہنچ جائے گا اسی دن ہم سراج کی ماں کو گھر پہنچا دیں گے۔"

"کیا وہ اُدھار کرے گا؟" غالب نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ ٹیڈی کو پہلے چھوڑ دے گا۔ یا چھڑا دے گا ہمارے وعدے پر... وہ اعتبار کر لے گا...؟" غالب بولا۔ "اس کے دل میں خیال نہیں آئے گا کہ بعد میں ہم وعدے سے پھر جائیں گے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"مرزا... ایک بات اس جنگ میں کھُل کر سامنے آ چکی ہے... اب تک دونوں فریق ایک دوسرے کے متعلق اچھی طرح جان چکے ہیں۔"

"کیا جان چکے ہیں... کہ کون زیادہ طاقتور ہے؟"

"نہیں... طاقت کا توازن تو اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے ہماری طرح وہ بھی پُرامید ہیں اور شکست کا خیال انھیں بھی خوفزدہ نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں بات کر رہا تھا متحارب فریقوں کے مزاج کی۔ ان کی فطرت اور طریقہ جنگ کی... جیسے ہم جانتے ہیں کہ دلاور اینڈ کمپنی جنگ میں انسانیت کے مقام سے کس حد تک نیچے جا سکتے ہیں۔ ایسے ہی ہم نے جنگ کے کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اخلاقی اقدار کی پامالی میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ سراج کو ہماری طرف سے یہ اطمینان یقیناً حاصل ہوگا کہ ہم اس کی ماں کے ساتھ نہ بدسلوکی کریں گے اور نہ اس بوڑھی عورت کو اس کے بیٹے کے گناہوں کی سزا دیں گے۔ دشمن ہونے کے باوجود وہ ہمارے بہادر... باضمیر اور بااصول ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔ سب کے سامنے نہ سہی... اپنے آپ سے وہ سچ بولنے پر مجبور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہم اس کی ماں پر تشدد کر ہی نہیں سکتے اور اُسے قتل کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ایک نہ ایک دن اس کی ماں واپس آ جائے گی۔ لیکن اپنی اور ماں کی ذہنی اذیت کا وقفہ کم سے کم کرنے کے لیے وہ ہمارا مطالبہ مان لے گا۔"

"یہ تو بڑا اچھا ہو... اگر وہ ٹیڈی کو واپس کرا دے۔" غالب بولا۔

"چلو پھر پہلے تو یہی معاملہ ختم کریں۔" محسن بولا۔ "وقت کم ہے ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

"یہ واپس جانے کی جلدی کیوں؟"

"ہمیں اس ٹرک ڈرائیور کے قتل سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ میں دستِ قاتل کو اس کے لہو کی سرخی سے پہچاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

محسن بولا۔ "ہاں... وہ کیا ہے کہ جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔"

"پولیس تو بس زبانِ خنجر کی خاموشی چاہے گی... مگر لہو کی فغان کیا کہتی ہے یہ ہم جاننا چاہیں گے۔" میں نے کہا۔ "یہ واردات ایک پس منظر رکھتی ہے۔"

"سراج سے بات کیسے ہوگی؟" غالب نے کہا۔ "اسی قومی مواصلاتی رابطے پر... ڈائریکٹ ڈائلنگ کے ذریعے۔"

میں ہنس پڑا۔ "محفوظ طریقہ تو وہی ہے... مگر میں سوچ رہا ہوں کہ انھیں آزمانا چاہیے جو ہمارے مشن کے لیے نیک جذبات کا اظہار کر چکے ہیں، وہ عملاً بھی کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

"ایسے تو بہت سے لوگ ملے ہیں۔"

"ہاں... ان میں سب سے پہلے ایک ہیئر آرٹسٹ ملا تھا۔ خلیفہ پنڈت اور ایک آرمی کا ڈاکٹر تھا میجر سلطان۔" میں نے کہا۔ "مجھے اور محسن کو واپس جانا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ٹرک کے پیچھے جانا پڑے۔ میں پنڈت خلیفہ کے ہاتھوں کی کاریگری کا قائل ہوں... میں اس کے نقصانات کی تھوڑی بہت تلافی بھی کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ وہ ہمیں ایک نیا ناقابلِ شناخت حلیہ اور چہرہ عطا کرے۔"

"باجماعت اور ڈیپارٹمنٹ آف ڈائریکٹ ڈسپوزل کی گاڑی میں مکتی چوک جانا کوئی عقل مندی نہیں۔" غالب نے کہا۔

"وہاں تو میں اور محسن جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو سراج سے ہی بات کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ میں میجر سلطان کے گھر سے فون کروں۔"

"کیا فائدہ۔ کال ٹریس ہو جائے گی۔" غالب نے کہا۔

"میجر سلطان خواہ مخواہ ملوث ہو جائے گا۔" محسن نے غالب کی تائید کی۔

"اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی پوزیشن بہت محفوظ ہے۔"

"محفوظ ہے تو اُسے غیر محفوظ کرنا ضروری ہے؟" غالب نے کہا۔ "اس کے علاوہ میجر سلطان اس وقت گھر پر نہیں ڈیوٹی پر ہوگا۔"

غالب کی اس بات نے میرے ارادے کو بدل دیا... میں مجبور ہو گیا کہ پھر کسی ٹیلی فون پول کو تلاش کروں... جب بالآخر ایک پول نظر آیا تو میں نے محسن سے کہا کہ وہ گاڑی آگے لے جائے اور میرا انتظار کرے لیکن اُس نے گاڑی غالب کے حوالے کی اور خود میرے ساتھ ہی اتر گیا۔ غالب کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ تو جڑ گئی تھی مگر ڈاکٹر سلامت نے کچھ عرصہ احتیاط کی تاکید کی تھی اُسے مائیکروبس کی ڈرائیونگ پر بٹھانا خلافِ احتیاط تھا لیکن ایک خالی سڑک پر سو دو سو گز کی ڈرائیونگ میں زیادہ خطرہ نہیں تھا۔

میں کھمبے پر چڑھ گیا اور محسن نیچے کھڑا ہو گیا۔ ابھی میں نے تار جوڑے ہی تھے کہ ایک کوٹھی کے گیٹ سے ایک کار نکلی، اور سیدھی ہماری طرف آئی۔ بے اختیار میری نظر اس سلیٹی رنگ کی ٹویوٹا کرونا پر گئی اور اس کا نمبر دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے استاد پیڈرو کے پاس دیکھی تھی مگر اس وقت گاڑی میں وہ خود تنہا تھا۔ گاڑی کو محسن نے بھی پہچان لیا تھا اور جب گاڑی اس کے سامنے پہنچ کے رُک گئی تو قدرتی طور پر وہ چوکنا ہو گیا اور کھمبے کے اوپر میں بھی کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گاڑی میں سے گینڈے اور گوریلے کی نسلی صفات رکھنے والا ایک دیوقامت شخص برآمد ہوا۔ وہ ساڑھے چھ فٹ قد کے ساتھ ساڑھے چھ سو پونڈ وزن رکھتا تھا، چنانچہ خاصی دِقت کے ساتھ کار سے نکلا تھا۔ اس کے سر پر خشخشی بال تھے۔ جو بہت ہموار تراشی گئی لان کی گھاس کی طرح لگتے تھے۔ اگر میں سر کو بالکل صاف کرا دیتا تو شاید ایک ڈیڑھ ماہ بعد میرے سر کی کھیتی بھی ایسی ہی نظر آتی۔ لیکن اس کے چہرے پر سیاہ و سفید بالوں کی داڑھی بہت پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے بند گول گلے کا کرتہ اور ٹخنوں سے اوپر ختم ہو جانے والی شلوار پہن رکھی تھی۔ کرتہ شلوار دونوں میں کورا لٹھا استعمال ہوا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک دسترخوان نما رومال پڑا ہوا تھا، اور وہ چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بہت بھاری بھر کم شیشوں اور فریم والی عینک بھی لگا رکھی تھی جس کے پیچھے سے اس کی لال لال آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

دائیں ہاتھ سے گز بھر کی تسبیح کے موٹے موٹے دانے گھماتے ہوئے اس نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔ "میاں السّلام علیکم... ہم ہی کہہ دیتے ہیں... حالانکہ بزرگ ہم ہیں۔"

"قبلہ بزرگوار..." میں نے کہا۔ "سلام آنے والے پر فرض ہے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔"

"تاہم... السّلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ۔" محسن نے انہی کے انداز میں قرأت کے ساتھ کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

بزرگوار کے ماتھے پر ناگواری کی شکنوں کا جال گہرا ہو گیا۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو زیادہ تیزی سے گردش دینے لگیں... "پوچھنا یہ تھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"ہم ادائیگیٔ فرض کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس گول مول جواب کے سوا میں ان سے کیا کہتا۔

"ماشاءاللہ۔" وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولا۔ "وہ دونوں بھی بڑے فرض شناس تھے... اور بے حد خلیق اور خدمت گزار۔"

"کون دونوں...؟" میں نے کہا۔

"وہی میاں! جن کو بدخواہوں کی شکایات پر معطل کر دیا گیا۔" وہ بولے۔ "سب سے صاحب سلامت رکھتے تھے اور سب کے کام آتے تھے۔"

"انشاءاللہ آپ ہمیں بھی ویسا ہی پائیں گے۔" میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اس نے میری بات کا غلط مطلب نکالا اور تعریفی انداز میں سر ہلانے لگا۔ "بس میاں! یہی ہونا بھی چاہیے۔ خلقِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک اور بندگانِ خدا کے ساتھ نیکی جس نے حقوق العباد کو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

فراموش کیا گویا اس نے مقصدِ حیات کو فراموش کیا۔ وہ کیا خوب فرمایا ہے کسی نے کہ۔ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔۔۔"

"ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں۔" محسن نے سر ہلا کے کہا۔

"سبحان اللہ!" بزرگوار نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ اللہ نے چاہا تو سب ویسے ہی چلتا رہے گا۔"

"جی؟۔۔۔ کیا چلتا رہے گا۔۔۔؟" میں نے کوفت کے ساتھ کہا۔

"وہ۔۔۔ تعاونِ باہمی کا جذبہ۔" وہ بولے۔ "تم ہمارے کام آؤ گے تو ہم سے فیض پاؤ گے۔۔۔ شکایت کیوں ہو۔۔۔؟"

"دیکھیے۔۔۔ اگر آپ کے فون کی لائن میں خرابی ہے۔۔۔"

"ارے نہیں میاں۔۔۔ فون تو الحمدللہ ٹھیک ہے۔۔۔ خرابی دلوں میں نیت کے کھوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" وہ بولے۔ "طمع اور حرص سے۔۔۔"

"بجا ارشاد۔۔۔ لیکن اس وعظ و نصیحت کا یہ کون سا موقع ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔

"وہ۔۔۔ دراصل میں نے مناسب سمجھا کہ معاملات طے کر لیے جائیں۔۔۔ اور اس حُسنِ انتظام میں خلل واقع نہ ہو۔" وہ بولے۔ "جس کی بنیاد۔۔۔ گویا خیر خواہی کے جذبات پر تھی۔۔۔ ہم انھیں سو روپے ماہانہ دیتے تھے۔ بلاشبہ اس گرانی کے دَور میں یہ رقم ناکافی محسوس ہوتی ہے لیکن انسان کو قانع ہونا چاہیے اور صبر و شکر اختیار کرنا چاہیے۔" انھوں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کے اِدھر اُدھر دیکھا اور محسن کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ آپس میں تقسیم کر لینا۔"

محسن نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ مشتعل ہو کے بولا۔

"اوہو۔۔۔ ناراضی کس بات کی۔۔۔ یہ لو۔۔۔" انھوں نے سو کا دوسرا نوٹ نکالا۔ "چلو اب تو ٹھیک ہے۔۔۔ بس یہ خیال رہے کہ۔۔۔"

"کہ آپ کا ٹیلی فون بل اگر لاکھوں میں ہو تو ہزاروں تک محدود رہے اور ہزاروں میں ہو تو سیکڑوں میں آئے۔" محسن نے کہا۔

"ارے بھئی۔۔۔" میں نے تسا وپر سے کہا۔ "لے لو۔۔۔ اتنی محبت سے دے رہے ہیں وہ۔۔۔ آپس کی بات ہے۔" پھر میں نے بزرگوار سے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "معاف کیجیے گا۔۔۔ میں سمجھا لوں گا اسے۔۔۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔۔۔ لیکن ذرا بتا دیں ہمیں اپنے بارے میں۔۔۔ ہم تیرے ہیں نا۔۔۔"

"ہم تمھاری معاملہ فہمی سے خوش ہوئے میاں۔" بزرگوار بولے۔ "ہم یہاں رہتے ہیں۔ نام ہے ہمارا حاجی سیٹھ عبداللہ۔۔۔ اور ہمارے چار فون ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ "کاروبار کیا ہے آپ کا؟"

"ہم تو بس اب عملاً ہر جھنجھٹ سے آزاد ہو گئے ہیں۔۔۔ سارا کاروبار اپنے دونوں لڑکوں کے سپرد کر دیا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ بڑا لڑکا یہاں سے فروٹ، سبزیاں اور مچھلی، انڈے وغیرہ باہر بھیجتا ہے۔۔۔ میں بس نگرانی کرتا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس کا۔۔۔ اور فرم کا۔۔۔؟" محسن نے کہا۔

"غلام رسول۔۔۔ اور فرم کا تو ایک ہی نام ہے۔ عبداللہ اینڈ سنز لاہوری۔ دوسرا لڑکا عبدالرب۔۔۔۔۔ سینٹری کا سامان، ماربل اور مشینری وغیرہ بھیجتا ہے۔۔۔ مگر وہ کراچی میں ہے۔" وہ بولے لو۔ انھوں نے گاڑی کا دروازہ کھول کے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے دو کارڈ نکالے۔ "یہ لو۔۔۔ اس میں سب کچھ ہے۔ کسی معاملے میں ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتانا۔۔۔ سب کچھ کر سکتے ہیں ہم۔۔۔"

"گویا آپ قادرِ مطلق ہیں؟" محسن نے کارڈ لے کر کہا۔ "حاجی صاحب یہ تو کلمۂ کفر ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ میاں ہم۔۔۔ ہمارا مطلب تھا کہ اللہ ہمیں توفیق دیتا ہے۔۔۔ وہی کارساز ہے سب کا۔۔۔ لیکن وسیلہ تو کوئی بنتا ہی ہے۔" انھوں نے خفگی سے کہا اور کار میں بیٹھ گئے۔

"حاجی صاحب۔۔۔ جاتے وقت بھی سلام ضروری ہے۔" محسن نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" حاجی صاحب نے غرا کے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"الّو کا پٹھا۔۔۔ خبیث آدمی۔۔۔" محسن ایک دم پھٹ پڑا۔ "نام تو دیکھو ذرا۔۔۔ اور کرتوت دیکھو۔۔۔ حلیہ دیکھو اور اعمال دیکھو۔ کیا مفہوم نکلتا ہے الفاظ کے۔۔۔ حقوق العباد۔۔۔ نیکی۔۔۔ صبر و شکر اور قناعت کا مطلب سمجھا رہا تھا ہمیں۔" محسن نے سو کے دونوں نوٹوں کو پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیا۔

"افسوس کہ ایسے ہی لوگ دین کو بدنام کرتے ہیں۔۔۔ ریاکار اور منافق۔۔۔ جو اپنے ساتھ ہی نہیں خدا کے ساتھ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ "ظاہر ہے ایسے باپ کی اولاد کیا ہو گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں پہچانا نہیں۔" محسن بولا۔ "مگر یار اب یہاں سے کھسکنے کی کر۔۔۔ یہ خطرناک علاقہ ہے۔ اس شیطان کی اولاد کا یقیناً استاد ٹیڈی رو سے کوئی تعلق ہے۔۔۔ غلام رسول اور عبدالرب پیچھے رہ کر مدد کرتے ہوں گے۔۔۔ اور یہ تو اتفاق سے ہمیں "عبداللہ اینڈ سنز لاہوری" کا نام معلوم ہو گیا۔ ایسے نہ جانے کتنے دوسرے ادارے ہوں گے جو امپورٹ ایکسپورٹ کے کاغذی لائسنس پر ولاور اینڈ کمپنی کے معاون اور مددگار ہوں گے۔"

خود میں بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ جگہ واقعی محفوظ نہیں ہے اور ابھی تو ہم بال بال بچ گئے تھے لیکن یہاں کسی بھی وقت کوئی شکاری آ سکتا تھا۔ میں پندرہ بیس منٹ تک کھمبے پر ٹنگا ہوا اپنی خیریت کی اور حاجی صاحب کے دفع ہو جانے کی دعا مانگتا رہا تھا اُن کی موجودگی میں بات تو میں کیا کرتا خود کو ٹیلی فون لائن میں ثابت کرنے کے لیے میں نے باکس کھول کر تھوڑا بہت کام ضرور جاری رکھا تھا اور کسی وجہ کے بغیر پنچ کس استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے اِدھر کے تار کھول کر اُدھر جوڑ دیے تھے۔ اس سے کتنے لوگوں کے ٹیلی فون خلط ملط ہوئے ہوں گے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ حاجی صاحب نے پیلے رو کی سلیٹی کار میں نمودار ہو کے میرے ہوش گم کر دیے تھے۔ وہ خود ہیرا پھیری کرنے والا آدمی تھا۔ با اصول آدمی ہوتا تو سب سے پہلے پوچھتا کہ تم لوگ ٹیلی فون لائن مین ہو تو وردی میں کیوں نہیں ہو اور ہم سے شناختی کارڈ طلب کرتا۔۔۔ لیکن اس سے پہلے معاملہ رکھنے والے بھی شاید بغیر وردی کے ہی گھومتے تھے۔

نیچے اتر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں اور محسن اس کوٹھی کے سامنے سے گزرے جس میں سے وہ سلیٹی رنگ کی کار نکلی تھی تو میں نے گیٹ پر پیتل کی چمکتی ہوئی تختی دیکھی۔ دو فٹ ضرب ایک فٹ کی اس تختی پر تین انچ کے بڑے بڑے حروف میں "عبداللہ اینڈ سنز لاہوری" کا نام کندہ تھا اور نیچے ایک انچ کے حروف میں۔۔۔ "امپورٹر۔۔۔ ایکسپورٹرز اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز" لکھا ہوا تھا۔ کوٹھی کے اندر بائیں ہاتھ پر تین گاڑیاں اور چھ سات موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ نچلی منزل رہائشی لگتی تھی۔ اوپر کی منزل اپنی تعمیر سے دفتر نظر آتی تھی۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے وینی شین بلائنڈز کی پٹیاں نظر آ رہی تھیں اور اس کی چھت بھی مشکل سے آٹھ فٹ بلند تھی۔ ائیر کنڈیشنگ کے نظام کی بہتر کارکردگی کے لیے کم سے کم جگہ اسی طرح رکھی جاتی ہے۔ اندر اگر کچھ لوگ فائلوں میں پھل، سبزی، انڈے اور مچھلی کی درآمد برآمد کا حساب کتاب رکھنے یا ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلانے میں مصروف تھے تو ان کی مصروفیت کا باہر بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔

غالب سرکاری گاڑی کے ڈرائیوروں کے انداز میں خط پاتھ پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ "ہو گئی بات؟" اس نے سگریٹ اچھال کے کہا۔ وہ آخری ٹکڑے کو ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے فائر کرنے کا عادی تھا۔

"یہ ایک بے ہودہ عادت ہے۔" محسن نے کہا۔ "دیکھو وہ ٹوٹا کہاں جا کے گرا ہے۔ خشک گھاس اور پتوں کے ڈھیر میں آگ لگ سکتی ہے۔"

"آگ کہاں نہیں لگی ہوئی ہے۔" غالب نے خفت مٹانے کے لیے کہا اور سگریٹ کے ٹکڑے کو جوتے سے دبا کے بجھا دیا۔ "کیا نتیجہ رہا؟"

"صفر جمع صفر برابر ہے دو صفر۔" محسن بولا۔ "گاڑی میں بیٹھو۔۔۔ ہم دشمن کے علاقے میں ہیں۔"

غالب نے بُرا سا منہ بنایا۔ "وہ خوفناک صوفی کون تھا؟"

"تمھارا ماموں سسُر۔" میں نے کہا اور گاڑی چلا دی۔۔۔

"اپنی بھانجی کے مستقبل سے کھیلنے والے ہر شخص کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے گیا ہے۔"

"میں مستقبل سے نہیں۔۔۔ اس کی بھانجی سے کھیل رہا ہوں۔" غالب نے کہا۔ "ظاہر ہے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ مگر تم لوگ بے حواس باختہ لگتے ہو۔"

جواب میں محسن نے اُسے عبداللہ اینڈ سنز سے متعارف کرایا اور میں نے گاڑی کو دو میل دور لے جانے کے بعد روکا اور پھر پیدل چل کے واپس گیا۔ یہ دوسری جگہ جہاں سے میں نے سراج کو فون کیا زیادہ محفوظ تھی۔

"سکندر۔۔۔" سراج نے ریسیور اٹھاتے ہی چلانا شروع کیا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک ایس ایس پی کو اتنا لاعلم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو۔۔۔ میں تمھیں موقع پر موقع دے رہا ہوں۔ ابھی تک میں نے تمھارے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی ہے۔ نہ اغوا کی اور نہ اس بدمعاشی کی جو تم نے میرے گھر میں کی اور جس کے دس گواہ ہیں۔۔۔ تم نے عاشی کو بھی قتل کر دیا مگر میں نے دلاور کو خاموش رکھا۔"

"یہ سب لکھ کر اپنے افسرانِ بالا کو بھجوا دو۔" میں نے کہا۔ "کہ تم نے سکندر بخت پر کتنے احسانات کیے ہیں۔ اور بدمعاشی کے جواب میں تم نے کتنی شرافت دکھائی ہے اور کیا نیکی کی ہے۔ تمھیں اس کا اجر ملے گا۔"

"میں اگر چاہتا تو تمھیں زمین سے کھود کے برآمد کر لیتا۔" وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

"پھر کیا کیوں نہیں۔۔۔ ہم کوئی گاجر مولی تو تھے نہیں کہ زمین کے اندر ہوتے۔۔۔ ہم تو گوبھی کے پھول کی طرح اوپر تھے۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے اپنی اس فضول بکواس سے متاثر مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا ہے۔ میرے باپ کی ہڈیاں مجھے آج تک نہیں ملیں۔ تم اپنی ماں کی ہڈیوں کے خاک ہونے تک اچھی کے دیکھ لو۔"

"کیا۔۔۔؟" سراج نے چیخ کے کہا۔ "تم نے مار دیا ہے اسے؟" جملے کے اختتام پر اس کے لبوں سے مغلظات کا دریا بہنے لگا۔ "اور اب تم بھی سمجھ لو کہ ان سب کی خیر نہیں۔۔۔ میں ایک ایک کی لاش پر روڈ رولر پھروا دوں گا۔۔۔ تم کیا مجھے اتنا بے بس سمجھتے ہو۔۔۔؟ بہت سے لوگ میرے قبضے میں ہیں۔۔۔ محسن کی بیوی۔۔۔ اس کی بہن فوزیہ۔۔۔ اور اس کا بہنوئی۔۔۔ تمھاری اس نازو کے گھر والے۔۔۔ رابعہ اور تمھارا استاد ٹیڈی۔۔۔ سب کی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بوٹیاں کتوں کے آگے نہ ڈال دوں تو میرا نام سراج نہیں۔"

"یہ سب تو تم پہلے بھی کرتے رہے ہو... میرے باپ کو... شہلا کے بھائی کو... رابعہ کی ماں کو... سب کو مار کے تمہیں کیا ملا؟ تم نے دوسرے بہت سے لوگوں کی زندگی بھی لے لی جو ہم سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ عاشی اور دلاور کی بیوی تک اور زیب النساء کی عزت لوٹنے والوں تک تمہارے شیطانی عزائم کی بھینٹ چڑھنے والے کتنے ہیں... شاید سیکڑوں... صحیح تعداد خود تم بھی نہیں بتا سکتے... مگر کیا اس سے تمہیں فتح کا اطمینان اور جیت کی خوشی اور کامیابی کا احساس ملا؟ تمہاری ہی وجہ سے مشرقی پاکستان میں..."

"سکندر... یہ بات چھوڑو۔" سراج نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سودا کر لو... تم نے رابعہ اور ٹیڈی کی بات کی تھی۔ میں نے تمہاری بات رابعہ سے کرادی۔"

"تم نے...؟ تم بکواس کرتے ہو۔"

"ہاں... کیا تمہاری بات رابعہ سے نہیں ہوئی؟" وہ بولا۔

"ہوئی ہے... لیکن اس میں تمہارا کیا دخل تھا؟" میں نے کہا۔

"اگر میں کوشش نہ کرتا... تو دوست محمد کبھی رابعہ کو نہ لے جا پاتا اور میں کوشش کرتا تو شاید تمہاری کال بھی ٹریس کر لیتا۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "تم چالاک لوگ ہو... آج تک تمہاری کال ٹریس نہیں ہو سکی... ظاہر ہے کہ تم کسی ٹیلی فون پول سے ڈائریکٹ کنکشن ملا کے بات کرتے ہو یا کسی ایکسچینج میں تمہارا کوئی ہمدرد بیٹھا ہوا ہے۔"

"لیکن دوست محمد سے تمہارا کیا تعلق...؟" میں نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"اسے بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہم نے ہی رابعہ کو اس کی تحویل میں دیا تھا۔" سراج نے کہا۔ "خود اس کی ضمانت پر۔"

"اوہ مائی گاڈ...!" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا۔ رابعہ تو اُسے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتی ہے۔ اس پر اعتماد کرتی ہے۔ اس نے دوست محمد کی تعریف بھی بہت کی تھی۔ مگر اسے نہیں معلوم کہ دوست محمد کسی کا دوست نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک ضامن ہے۔ ایک جیلر ہے... ایک ایسا ٹھیکیدار ہے جس نے ضمانت دے رکھی ہے کہ رابعہ محفوظ اور مطمئن رہے گی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک آزاد قیدی ہے۔ میں نے اس سے سوچے سمجھے بغیر بہت سی باتیں کہہ دی تھیں۔ جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ مگر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ٹیڈی کی مدد سے فرار ہوئی تھی۔ ٹیڈی اس کے کپڑے پہن کے لیٹ گیا تھا اور وہ محافظ کی وردی میں نکل گئی تھی۔ کیا وہ سب ڈراما تھا جس کے لیے اسٹیج فراہم کرنے والے خود شکاری تھے؟ میرا دماغ سخت کنفیوژن کا شکار ہو رہا تھا۔ کیا یہ بات رابعہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آزاد نہیں ہے؟ اس نے اپنی مجبوری کا ذکر تو کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن دوسری طرف اس نے دوست محمد کے ساتھ بالکل محفوظ اور خیریت سے ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا۔ شکاری یہ کون سا جال پھیلا رہے تھے۔ وہ رابعہ کو قید میں آزادی کا یقین دلا کے اپنے کس مقصد کی تکمیل کا سامان کر رہے تھے؟

جواب فوراً میرے ذہن میں اچانک ہی نازل ہوا۔ یہ دامِ فریب ہمارے لیے پھیلایا گیا تھا۔ شکاری جانتے تھے کہ کوئی اور جائے نہ جائے میں رابعہ کی تلاش میں ضرور جاؤں گا، اور اُسے نکال لانے کی کوشش بھی کروں گا۔ انھوں نے رابعہ کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ دوست محمد کے ساتھ ہے تو کسی کی قید میں نہیں ہے اور رابعہ نے یہی یقین مجھے ٹرانسفر کر دیا تھا۔ لیکن رابعہ نے اس یقین میں تھوڑی سی مجبوری کا شک بھی شامل کر دیا تھا۔ شاید خود اس کے یقین میں شک کی آمیزش تھی۔ دوست محمد ہمارا دوست تھا یا ہمارے دشمنوں کا۔ یا بالکل غیر جانبدار ذریعہ تھا۔ مگر وہ ہر وقت دشمنوں کی نظر میں تھا۔ رابعہ کی نگرانی کرنے والے اس کی بھی نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہی دوست محمد کو پیغام دیا ہوگا کہ رابعہ سے سکندر بخت کی بات کرا دو۔ نہ رابعہ کو احساس ہو کہ اس انتظام کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور نہ مجھے شک ہو... اس کے بعد جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ اور سرکار کو ہم یہاں باندھ لیں گے...

"ہیلو... سکندر... کیا بات ہے... جواب دو میری بات کا۔"

"کس بات کا؟" میں نے چونک کر کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ میری بات کرا دو... ماں سے..."

"سوری ایس پی صاحب... یہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں مشکل ہے۔ کیا تم کو ٹیڈی سے بات نہیں کرنی ہے؟"

"ٹیڈی سے؟... تم بات کرا دو گے؟" میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "ابھی؟"

"کیا تم نے سُنا نہیں تھا میں نے کیا کہا تھا؟" سراج بولا۔

"نہیں... درمیان میں تمہاری آواز بند ہو گئی تھی۔ شاید لائن خراب تھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد تم ٹیڈی سے بات کر سکتے ہو... لیکن میں بھی اپنی ماں سے بات کروں گا۔" وہ بولا۔

"ٹیڈی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کہیں بھی ہو... میں ایک گھنٹے میں اُسے لے آؤں گا۔" وہ جھنجھلا کے بولا۔

اس کے الفاظ پر میرے کان کھڑے ہو گئے... "لے آؤ گے؟ کہاں...؟"

"میرا مطلب تھا... کہ میں لائن پر لے آؤں گا۔" سراج نے بات بنانے کی کوشش کی۔ مگر تیر اس کی کمان سے نکل چکا تھا۔

"سنو سراج... یہ چکر بازی چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "تم ٹیڈی کو ہمارے حوالے کرو... اور اپنی ماں کو لے جاؤ... اُس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ تم سے بات کر سکے۔"

"کیا وہ بیمار ہے؟" سراج نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"تم اپنی ماں کو جانتے ہو تو یہ سوال فضول ہے — ان حالات میں اس کے اعصاب کب تک ساتھ دے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہے... حالانکہ ہم نے اس کے ساتھ اونچی آواز میں بات تک نہیں کی۔ اُسے پوری عزت دی اور اس کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا۔"

"تم کو جو کرنا تھا وہ تم پہلے ہی کر چکے تھے...!" سراج نے مجھے ایک فحش گالی دے کر کہا۔ "وہ مر جائے گی..."

"ظاہر ہے کہ تم نے معاملے کو طول دیا تو وہ مر جائے گی... اس کی عمر بھی تو دیکھو..." میں نے اپنے جھوٹ کے تیر کا نشانہ دیکھ کر کہا۔ "فیصلہ تو اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بعد میں ہمیں الزام مت دینا۔"

"بہت کمینے ہو تم سکندر..." یوں لگتا تھا کہ وہ رو پڑے گا۔

"بولو! ایک گھنٹے میں ٹیڈی کو کہاں لاؤ گے۔" میں نے کہا

"میں... ابھی نہیں بتا سکتا... وہ میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے دوسروں کو بھی راضی کرنا ہوگا۔" سراج نے کہا۔

"تم جیسے چاہو راضی کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو میں ایک گھنٹے کے بعد فون کروں گا۔" میں نے لائن کاٹ دی۔

یہ خیال کہ ٹیڈی زندہ ہے اور لاہور میں ہی ہے میرے حوصلے کو دوچند کرنے کے لیے کافی تھا۔ سوچے سمجھے بغیر میں نے کہہ دیا تھا کہ ٹیڈی کو لے آؤ۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ بفرضِ محال سراج نے ہاں کہہ دی تو ہم اُسے کیسے ملیں گے اور کہاں ملیں گے۔ کس طرح ٹیڈی کو حاصل کریں گے اور سراج کے سپرد اس کی ماں کو کیسے کریں گے۔ یہ بہت خطرناک کام تھا۔ ایک ایس ایس پی اپنے وسیع اختیارات سے کام لیتے ہوئے ایسا جال بھی پھیلا سکتا تھا جو ہمیں نظر نہ آئے اور ہم اپنی ساری چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود اس میں پھنس جائیں۔ مجھے رابعہ کا خیال ضرور آیا تھا کہ میں نے اس کی رہائی کا سودا نہیں کیا مگر وہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک تو وہ کراچی میں تھی اور اس کا یہاں پہنچنا محال تھا۔ دوسرے وہ جس حال میں بھی تھی محفوظ اور مطمئن ضرور تھی تو میرے لیے فی الحال یہی احساس باعثِ طمانیت تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ میں آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر رابعہ اور اس کی آزادی کو شکاری دانہ و دام بنائے بیٹھے تھے تو میں یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں نے اس دامِ ہم رنگِ زمیں کو دیکھ لیا ہے۔ میں بھی انھیں اسیری کا فریب دے کر رہائی کا جُوا کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے صرف ٹیڈی کی بات کی۔

محسن اور غالب میری بات پر دم بخود رہ گئے۔ ان کا پہلا تاثر بے یقینی اور خوشی کے ملے جُلے جذبات کا تھا۔

"یار یہ دھوکا ہے۔" محسن بولا۔ "وہ چکر دے رہا ہے۔"

"کیا چکر دے رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں اُسے اچھی طرح سمجھا چکا ہوں کہ اسے ماں کی زندگی عزیز ہے تو جلد فیصلہ کرے۔ ہیرا پھیری اور چکر بازی کا رسک وہ نہیں لے گا۔"

"فرض کرو ایسا ہی ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "کہ وہ ٹیڈی کو لے آتا ہے... یہ تبادلہ کہاں ہوگا... اور کیسے ہوگا؟"

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ "ڈاکٹر سلامت کے کلینک میں۔"

غالب نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم محصور ہو جائیں گے اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا... اور اگر ہم کشتوں کے پشتے لگا کے نکل بھی گئے تو کیا فائدہ... بہت لوگ مارے جائیں گے بے گناہ۔ کلینک میں کشت و خون ہوگا۔"

"ایک اور جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میجر سلطان..."

"بابا! وہ گھر پر نہیں ہوگا۔" غالب بولا۔

"اس کے گھر سے ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گا۔ وہ آرمی میڈیکل کور کا ڈاکٹر ہے۔ کسی سی ایم ایچ میں ہی ہوگا، اور ملٹری ہوسپٹل میں ایس پی صاحب بھی بلا اجازت نہیں گھس سکتے۔ اگر ان کو گیٹ پر ہی روک دیا جائے تو وہ کمانڈنگ افسر کی مرضی اور اجازت کے بغیر آگے نہیں جا سکتے۔ میجر سلطان ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"سوال یہ ہے... کہ کیا وہ کرے گا؟" غالب نے کہا۔

"میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"سی ایم ایچ کا نمبر معلوم ہے؟"

"اس کے گھر سے معلوم ہو جائے گا... مجھے گھر کا نمبر یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"اوکے۔" غالب نے کہا۔ "ٹرائی کر لو۔"

میجر سلطان کو میں نے ایک ریسٹورنٹ سے فون کیا جہاں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے اور محسن نے چائے پی۔ غالب گاڑی میں رہا اور ایک ویٹر نے تین افراد کے لیے چائے گاڑی میں پہنچا دی۔ ریسیور غالباً اس کی بیوی نے اٹھایا۔

"میجر صاحب تو نہیں ہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے معلوم ہے بھابی کہ وہ ڈیوٹی پر ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو زحمت اس لیے دی کہ مجھے ان سے بات کرنی تھی۔ ڈیوٹی کہاں ہے ان کی؟"

"سی ایم ایچ میں۔" وہ بولی۔

میں ہنسا۔ "یہ تو معلوم تھا مجھے۔ سی ایم ایچ کا نمبر بتایئے۔ اور ان کی ایکس ٹینشن۔"

اس نے سی ایم ایچ کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ "ایکس ٹینشن نمبر ہے سیون ٹو زیرو۔۔۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ "ایک کال اور کروں گا میں۔" میں نے مینیجر سے اجازت لینے کا اخلاقی فرض پورا کیا اور اس کے سر ہلانے سے پہلے ہی سی ایم ایچ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"گڈ مارننگ۔۔۔ سی ایم ایچ ہیئر۔" کسی آپریٹر نے مستعدی سے کہا۔

"گیو می ایکس ٹینشن سیون ٹو زیرو۔۔۔ میجر سلطان۔" میں نے کہا۔

"یس سر۔" جواب ملا۔

پھر چند سیکنڈ کے وقفے سے سلطان نے کہا۔ "یس؟"

"میجر سلطان۔۔۔ میں سکندر بخت بول رہا ہوں۔" میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کی پروا کیے بغیر کہا۔ "آپ نے پہچانا۔۔۔ ایک بار میں۔۔۔"

"او۔۔۔ یس۔۔۔ وائی ناٹ۔۔۔ میں نے اس دن بھی پہچان لیا تھا تمھیں۔"

"اور آپ سے میں نے ایک وعدہ کیا تھا۔۔۔ کہ میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے یاد ہے۔۔۔ بلکہ میں کہوں کہ مجھے انتظار ہے تو غلط نہ ہوگا۔۔۔ تم جب چاہو آ سکتے ہو۔" میجر سلطان نے خوشدلی سے کہا۔

"میں اسی وقت آ رہا ہوں۔۔۔ ایک گھنٹے میں۔۔۔"

"ابھی؟۔۔۔ لیکن میں تو دو بجے کے بعد گھر پہنچوں گا۔" وہ بولا۔

"میں سی ایم ایچ میں آ کے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ایمرجنسی ہے؟" وہ بولا۔ "دیکھو سکندر۔۔۔ آئی ایم اے سروس مین۔۔۔ اپنی ذاتی حیثیت میں تمھاری مدد ضرور کر سکتا ہوں میں، لیکن تم کو سی ایم ایچ میں علاج کی سہولت فراہم کرنا میرے اختیار میں نہیں۔"

"میجر صاحب۔۔۔ میں زخمی نہیں ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور مجھے سی ایم ایچ سے کچھ نہیں لینا۔ میں آپ کے پاس آؤں گا۔۔۔ آپ کے کمرے میں بیٹھوں گا اور چلا جاؤں گا۔"

"بٹ واٹ از دی ایمرجنسی۔۔۔؟"

"یہ میں وہیں آ کے بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "کوئی مجھے گیٹ پر روکے گا تو نہیں؟"

"میں گیٹ پر کہہ دوں گا۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اپنا نام مت بتانا۔ بس کہہ دینا کہ مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔ تم نے دیکھا ہے میرا آفس۔"

"جی نہیں۔۔۔ آپ مجھے گائیڈ کریں۔"

"اوہ نو۔۔۔ تم بھٹکتے پھرو گے۔۔۔ اور تم کو رسک نہیں لینا چاہیے۔۔۔ ٹھیک ہے تم کو گیٹ سے ایک آدمی لے آئے گا۔" وہ بولا۔

"تھینک یو میجر۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بل اور کال کے چارجز ادا کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ مینیجر مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔

"جی؟ کیا بل بنا؟" میں نے سو کا نوٹ نکال کے کہا۔

"کچھ نہیں۔۔۔" مینیجر نے مسکرا کے کہا۔ "بی مائی گیسٹ مسٹر سکندر۔"

"آپ پیسے نہیں لے رہے ہیں؟" میں نے جان بوجھ کے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کیوں؟"

"مجھے اپنا دوست سمجھیے۔" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ "میں ذرا بزدل آدمی ہوں۔۔۔ صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں۔۔۔ کہ آپ کو نہ پہچانوں۔۔۔ آپ سے بھی ایک درخواست ہے۔۔۔ ہر جگہ اپنا نام یوں نہ بتایا کریں۔۔۔ اور ہر جگہ ایسے مت جایا کریں۔۔۔ میری طرح اور لوگ بھی پہچانتے ہوں گے آپ کو۔۔۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ "پیسوں کی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ ایسے دوستانہ جذبات اور جذبے کی حمایت بہت اہم ہے؟"

"لیکن۔۔۔ پلیز۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا ہوٹل تباہ ہو۔۔۔ مجھے امید ہے آپ پھر نہیں آئیں گے۔" وہ بولا۔ "میں ایک بزدل آدمی ہوں۔"

"اپنی بزدلی کا اعتراف کرنا بھی تو بہادری ہے۔" میں نے کہا۔ "تھینک یو۔"

"وش یو گڈ لک اگین۔" وہ محسن سے مصافحہ کر کے بولا۔۔۔ "کاش میں بھی اتنا بے غرض اور حوصلہ مند ہوتا کہ اپنے نفع نقصان کی پروا نہ کرتا۔ اور آپ کے ساتھ چل پڑتا۔۔۔ مسٹر محسن۔۔۔"

باہر آ کے جہاں ایک طرف مجھے اس احساس تفاخر نے سربلند کر دیا تھا کہ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، وہیں مجھے چوکنا بھی کر دیا تھا۔ شکاری اپنے تمام وسائل اور اپنی ساری طاقت صرف کر کے بھی ہمیں مجرم۔۔۔ قانون شکن اور شرپسند سماج دشمن یا بدکردار ثابت کرنے کی سازش میں ناکام تھے مگر آہستہ آہستہ سچائی نے خود کو ظاہر کر دیا تھا اور ہر جگہ ہر سطح پر ملنے والے اس سچ کا اعتراف کرنے لگے تھے مگر میں اچانک تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"شاید ہم ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔" محسن نے میرے خیالوں کی ترجمانی کی۔ ہم دونوں سگریٹ خرید کے لوٹ رہے تھے۔

"ہاں۔۔۔ اسے خوش فہمی کی نادانی بھی کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم نے فوری طور پر خود کو ناقابلِ شناخت نہ کیا۔۔۔ اور روپوش نہ ہوئے تو بہت جلد ہمارے نام کے چرچے گلی گلی ہوں گے کہ سکندر اور محسن فلاں جگہ دیکھے گئے تھے اور فلاں شخص کے ساتھ نظر آئے تھے۔" محسن بولا۔

"اس وقت تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمارا سی ایم ایچ جانا ٹھیک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میجر سلطان سے بھی کہہ دیا ہے۔" محسن بولا۔ "اور ہم ڈیڈی کو چھوڑ تو نہیں سکتے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر ہم اس سے شام کو کہیں اور مل سکتے ہیں۔ بالکل۔۔۔"

"خطرہ تو ہر جگہ ہوگا۔۔۔ ہم جتنی احتیاط چاہے کریں اور کتنی بھی ہوشیاری سے کام لیں۔۔۔ سو فیصد تحفظ کی ضمانت حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔ میجر سلطان دھوکا دینے والا آدمی تو نہیں ہے؟" محسن نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس زندگی کے تجربات نے دوستوں اور دشمنوں کی نظر پہچاننا تو سکھا ہی دیا ہے۔"

"کیا چہرے دھوکا نہیں دیتے رہے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ مگر میجر سلطان پر میرا اعتماد غلط نہیں ہو سکتا۔۔۔ اگر وہ چاہتا تو پہلی بار ہی مجھے گرفتار کرا دیتا۔ لیکن میں نے اس کے ہاتھوں وطن دشمنوں کو گرفتار کرا کے ثابت کر دیا تھا کہ ہم کون ہیں اور ہمارا مشن کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آرمی انٹیلی جنس نے ان تخریب کاروں اور دشمن کے ایجنٹوں سے بہت کچھ اگلوا لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور میجر سلطان نے اس کا کریڈٹ خود نہیں لیا ہوگا۔ وہ لے بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ٹہلنے کے لیے باہر نکلا اور میں نے یہ دشمنوں کے ایجنٹ پکڑ لیے۔ اس نے سچ بولا ہوگا، تو ہمارا نام ضرور لیا ہوگا۔"

"کیا بات ہے؟" غالب نے گاڑی سے سر نکال کے کہا۔ "ہم پکنک منانے کے لیے رُکے ہیں؟"

"یہ پکنک سے زیادہ دلچسپ ایڈونچر ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج کی ماں پچھلی سیٹ پر اسی طرح گم صم پڑی تھی۔ ہم نے اُسے مسلسل سکون بخش اور خواب آور گولیاں دی تھیں، چنانچہ وہ ہر وقت کچھ سوئی سوئی رہتی تھی۔ ہم اس کے نروس بریک ڈاؤن کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اور اسے باندھ کے اور اس کا منہ بند کر کے بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ بوڑھی عورت سختی برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی چنانچہ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بے حس رہے۔

باہمی مشورے سے محسن اور غالب نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور جولی میرے اصرار کے باوجود مجھے اکیلا چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئی۔

"آپ اکیلے ہوں گے بھائی تو اُن کو کون دیکھے گا۔" اس نے سراج کی ماں کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے ان سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"نہیں بھائی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔" وہ بولی۔ "کیا آپ انھیں ساتھ اٹھائے پھریں گے۔۔۔ میں گاڑی میں رہوں گی۔ جب آپ میجر سلطان سے ملنے جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ۔۔۔ وہ گاڑی کو اندر نہ جانے دیں۔۔۔ یا صرف مجھے اندر لے جائیں۔" میں نے کہا۔

"تو کیا ضرورت ہے کہ آپ گاڑی اندر لے جائیں اور انہیں بھی ساتھ رکھیں۔" وہ بولی۔ "آپ گاڑی کہیں بھی چھوڑ دیں، اور پھر ڈیڈی بھائی کے ساتھ وہیں پہنچ جائیں۔ میں انتظار کر لوں گی۔"

محسن نے بھی اس کی تائید کی تو میں نے کہا۔ "تمھاری مرضی۔ تم دونوں کہاں جاؤ گے؟" میں نے غالب اور محسن کو مخاطب کیا۔

"ہمیں میکلوڈ روڈ کے چوک میں گرا دینا یعنی ڈراپ کر دینا۔" غالب نے کہا۔ "ہم استاد فنکار خلیفہ پنڈت کو سلام کریں گے اور وہاں سے چہرہ بدلوا کے جائیں گے۔ یہ صورت اب زمانے کو دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"اس کا احساس تم کو جوانی میں ہو جاتا تو اچھا تھا۔" محسن نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "اس شکل کو گم کر دیتے کہیں۔ سرہانے لکھا جاتا۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں؟ سوالیہ نشان کے ساتھ۔"

"تم کو اب تک احساس نہیں کہ سیرت کا حسن کیا ہوتا ہے۔" غالب نے کہا۔ "و۔۔۔ تمھارے لیے شرم سے ڈوب مرنے کے مواقع بہت۔۔۔"

"خود مرنے کی کیا ضرورت ہے جب اتنے لوگ مارنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اور مایوس نہیں ہوئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تقدیر یاور ہے اور دوست زیادہ ملے ہیں مگر دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔ ان چہروں کی اتنی تشہیر ہو گئی ہے کہ اب گمنامی ہی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہمیں بچا سکتی ہے۔ ہم دھر لیے گئے تو سارے پلان دھرے رہ جائیں گے۔"

ان دو توا، کو کشمی چوک پر اتار کے میں واپس ہوا اور کینٹ کے علاقے کی طرف جانے کے لیے مال روڈ پر نکل گیا۔ میرے پاس تقریباً آدھا گھنٹا تھا۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں گاڑی باغِ جناح سے آگے نکل گئی۔ میجر سلطان کے پاس جانے سے پہلے سراج سے پوچھنا بھی ضروری تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرف سے بہت پریشان تھا چنانچہ مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ ٹیڈی کو ضرور لائے گا۔ خواہ اس کے لیے اُسے دوستوں پر دباؤ ڈالنا پڑے یا ان کی خوشامد کرنی پڑی... پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔

وزیروں اور سیکرٹریوں کی رہائش گاہوں کے پاس میں نے گاڑی روک کے اپنا ریوالور جولی کو دیا۔ "میں ابھی آتا ہوں... دس منٹ میں۔"

" بھائی آپ میری فکر نہ کریں۔ اسے اپنے پاس رکھیں۔" جولی نے کہا۔

میں گھنے درختوں کے پیچھے ایک ٹیلی فون بوتھ پر چڑھ گیا جسے میں پہلے بھی استعمال کر چکا تھا۔ حسبِ توقع سراج میری کال کے انتظار میں تھا۔

" سکندر... میں نے... تمھاری بات مان لی ہے۔" وہ بولا۔ "بلکہ منوالی ہے سب سے... تم ٹیڈی کو لے جا سکتے ہو۔"

"تم ٹیڈی کو لا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "جگہ کا انتخاب میں نے کیا ہے اور تم کو وہیں آنا ہوگا۔"

" ٹھیک ہے... کیا تم اکیلے آؤ گے؟"

" یہ غیر ضروری سوال ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی چاہو تو اپنی ساری مسلح نفری کے ساتھ آجاؤ... مقابلہ کیے بغیر ہم بھی ہار ماننے والے نہیں ہیں۔"

" میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" سراج نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہو... صرف میرے اور تمھارے درمیان ملاقات ہو اور ایک ہی وقت میں تم میری ماں کو میرے حوالے کر دو اور میں ٹیڈی کو تمھارے حوالے کردوں... کیا یہ ٹھیک نہیں ہے؟"

" اگر تمھاری نیّت ٹھیک ہے اور تمھارے الفاظ میں نیّت کا کھوٹ شامل نہیں ہے تو سب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

" تو پھر بتاؤ میں کہاں آؤں؟"

" تم اکیلے آؤ گے... کسی کو بتائے بغیر..." میں نے کہا۔

" میں وعدہ کرتا ہوں۔"

" تمھارے وعدے پر اعتبار کرنے والا احمق۔" میں نے کہا۔ " صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمھاری ذہانت اور چالاکی تمھیں ہی نقصان پہنچائے گی۔ تم تمام عمر خود کو قائل نہ کر سکو گے کہ اپنی ماں کو خود تم نے مارا..."

" آج ماں نہ ہوتی تو میں زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا مجبور اور بے بس محسوس نہ کرتا سکندرِ اعظم... اور تم کو یہ فتح بہت مہنگی پڑے گی۔ ایسے دس ہزار استاد ٹیڈی میں اپنی ماں پر قربان کر سکتا ہوں۔" وہ برہمی سے بولا۔

" تم کیسے آؤ گے؟"

" اس کا انحصار جائے ملاقات پر ہے۔" وہ بولا۔ "شہری حدود میں یا دس بیس میل کے لیے میں ٹیکسی استعمال کروں گا۔ زیادہ دور آنے کے لیے کسی کی گاڑی لوں گا۔"

"تم کو شہری حدود میں ہی رہنا ہے... لیکن تم نہ اپنی گاڑی استعمال کرو گے نہ کسی اور کی... تم ٹیکسی میں بھی نہیں آؤ گے... تانگے میں آؤ گے جو کھلا ہوگا... آگے تم بیٹھو گے..."

" یہ ناممکن ہے..." اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ایس ایس پی ہوں... مجھے پہچاننے والے بہت ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیڈی تانگے میں نہیں آسکتا۔ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں ہے۔"

" اچھا... تو پھر تم ریڈ کراس کی ایمبولینس طلب کرو... ٹیڈی کو اس میں لٹا کے لاؤ۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس گیٹ سے گزر جائے گی اور تم گیٹ پر اتر جاؤ گے۔ ایمبولینس اندر چیک ہوگی... تم کو گیٹ پر چیک کیا جائے گا... کہ تمھارے پاس اسلحہ تو نہیں ہے۔"

" شٹ اپ... یہ میری بے عزتی ہوگی۔"

"کوئی تمھاری جسمانی تلاشی نہیں لے گا۔" میں نے اُسے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ "جب تم گیٹ سے گزرو گے تو خود ہی پتا چل جائے گا کہ تمھاری کسی جیب میں ریوالور یا دھات کی کوئی چیز تو نہیں ہے... بہتر ہے کہ تمھاری کسی جیب میں سکے تک نہ ہوں۔"

" لیکن میں ایمبولینس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تمھارا کیا بھروسا کہ تمھارے آدمی ایمبولینس پر قبضہ کرلیں۔" وہ بولا۔ "وہ تمھارا علاقہ ہوگا۔ شاید تمھاری ایم آر ایس کا ہیڈ کوارٹر جہاں تمھارے اپنے سیکیورٹی چیک پوسٹ ہوں گے۔"

میں ہنسا۔ "ایس ایس پی صاحب! آپ کو سی ایم ایچ آنا ہے۔ کمبائنڈ ملٹری ہوسٹپل... چھاؤنی کے علاقے میں۔"

" سی ایم ایچ؟" سراج کی زبان انتہائے حیرت سے گنگ ہوئی۔

" یس... سی ایم ایچ۔" میں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ کتنا محفوظ علاقہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسپتال تو عالمی جنگ میں بھی علاقہ تحفظ سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں کشت و خون کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا... اور لڑائی کا بھی... تم قانون کے محافظ ہو۔ تم وہاں پابند رہو گے۔"

" لیکن سی ایم ایچ... کیا تم کو ملٹری کی حفاظت حاصل ہے؟"

" ہم نے جو کام وطن کی سرزمین کے دشمنوں سے حفاظت کے لیے کیے ہیں، وہ وطن کا دفاع کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "ظاہر ہے ہم انہی کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم پہ کیسے آنچ آنے دیں گے۔ اگر تمھارے ذہن میں کوئی شیطانی منصوبہ تھا... تو اُسے بھول جاؤ... اکیلے آؤ... بالکل اسی طرح جیسے کوئی ذمے دار آدمی اسپتال جاتا ہے۔ میرے آدمی بھی ایمبولینس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ ریڈ کراس جیسا عالمی ادارہ عزت اور احترام کا مستحق ہے اور ان کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

" تم مجھے کہاں ملو گے؟" سراج نے یوں کہا کہ مجھے اس کے لہجے کی مایوسی کا اندازہ ہوا۔

" ممکن ہے میں نہ ملوں۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس ڈرائیور سے کہنا کہ گاڑی کو دوسری گاڑیوں کے ساتھ روک لے۔ تم گیٹ پر اپنی شناخت کراؤ گے اور کرنل حضور احمد سے ملنے کے لیے اندر جاؤ گے... ان کے بنگلے پر۔"

" یہ کرنل حضور احمد کون ہے؟"

" یہ جاننا تمھارے لیے ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ " یہ بنگلہ آخری حصے میں ہے اور گیٹ پر موجود سنتری خود تم کو بتا دے گا کہ تمھیں کدھر سے جانا ہے۔ اگر تم اپنی کار میں آؤ تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن کار کو ایمبولینس کے پیچھے رکھنا۔ اور ایمبولینس کے ساتھ مت رہنا۔ جتنی دیر میں تم اندر کا چکر لگا کے آؤ گے تمھاری ماں کو ٹیڈی کی جگہ ایمبولینس میں لٹا دیا جائے گا اور تم ایمبولینس کو ساتھ لے جا سکو گے۔ چونکہ تم اپنی ایک شناخت رکھتے ہو اس سب کو معلوم ہوگا کہ ایس ایس پی صاحب کسی کام سے کرنل حضور احمد خاں سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ تم کسی قسم کی ہنگامہ آرائی میں ملوث ہو ہی نہیں سکتے۔"

" سنتری پہلے کرنل سے پوچھے گا۔" سراج نے کہا۔

" پوچھنے دو... وہ ایک ایس ایس پی کو بلاوجہ نہیں روکے گا... وہ تمھیں عزت کے ساتھ ریسیو کرے گا... بٹھائے گا اور چلتے چلائے گا..." میں نے کہا۔

" وجہ بھی تو پوچھے گا میرے آنے کی..."

" تم دس وجوہات بیان کر سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ایمبولینس کے ڈرائیور کو سمجھا دینا کہ دخل در معقولات نہ کرے۔ جب مریض اتار لیا جائے اور دوسری خاتون مریضہ کو لٹا دیا جائے تو وہ تمھاری کوٹھی پر پہنچ جائے۔ تمھاری گاڑی کا نمبر کیا ہے؟"

" ایل ای ایچ۔ ڈبل فور ڈبل سیون زیرو... یہ مت بھولو سکندر کہ تم دھوکا دے سکتے ہو... آج... مگر کل بھی آئے گا۔"

" کل کی کل سوچیں گے اور دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔

" میری طرف سے تم اسے ایک جنٹلمین کا ورڈ آف آنر سمجھ سکتے ہو... تم کو تو مطمئن ہو جانا چاہیے۔ مجھے دیکھو کہ تم جیسے بدمعاش پر اعتبار کر رہا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ مجھے گالی دیتا، میں نے لائن کاٹ دی اور نیچے اتر آیا۔ میں نے میجر سلطان کو جو وقت دیا تھا وہ ہوگیا تھا اور ابھی میں سی ایم ایچ سے بہت دُور تھا لیکن آگے چھاؤنی کے علاقے تک مال روڈ صاف اور خالی تھی۔ میں نے نئے فاکس ویگن کے سولہ سو سی سی انجن کی طاقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سی ایم ایچ پہنچنے تک جولی کو سب کچھ سمجھا دیا۔ حسبِ توقع گیٹ پر گارڈ نے مجھے بیریئر سے پہلے ہی روک لیا۔

" مجھے میجر سلطان کے پاس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

" اور کون ہے آپ کے ساتھ؟" گارڈ نے کہا۔

" میری بیمار ماں... اور میری سسٹر۔" میں نے کہا۔

گارڈ نے سر ہلا کے اشارہ کیا اور بیریئر اٹھ گیا۔ "سیدھے ہاتھ پر چوتھی بیرک۔ ان کا کمرا ساتواں ہے۔"

" تھینک یو۔" میں نے کہا۔ سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک چوک سا تھا، جس کے وسط میں پول پر بہت سے رہنمائی کرنے والے سائن لگے ہوئے تھے۔ میں دائیں جانب چوتھی بیرک کے پاس رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔ جولی نے میری جگہ سنبھالی اور گاڑی کو ڈرائیو کرتی ہوئی اُدھر لے گئی، جہاں بہت سی دوسری گاڑیاں اور ایمبولینسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میجر سلطان کا کمرا تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر پُرجوش مصافحہ کیا۔

" آئی ایم سوری۔ مجھے کچھ دیر ہوگئی۔" میں نے کہا۔

" میں تو سمجھا تھا کہ پھر نکل گئے کسی غیر متوقع ایڈونچر کے لیے۔" وہ ہنسا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا پیو گے... چائے یا کافی؟"

" کافی۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ایک ضروری بات۔ ایک شخص جو خود کو ایس ایس پی سراج کہتا ہے، میرے تعاقب میں ہے۔ اگر وہ یہاں آئے تو اُسے گیٹ پر روک لیا جائے۔ اور ریڈ کراس کی ایک ایمبولینس کو چیک کر کے گزرنے دیا جائے۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک مریض ہونا چاہیے۔"

" معاملہ کیا ہے... آئی ہوپ...؟" وہ پریشان ہو کے بولا۔

" ایوری تھنگ از فائن۔" میں نے کہا۔

" کیا ہم اس شخص کو گرفتار کرلیں؟" میجر سلطان نے فون اٹھا کے کہا۔ "جو ایس ایس پی بن کے آئے گا۔"

" میرا مشورہ ہے کہ آپ لمبے چکر میں نہ پڑیں۔ اُسے واپس کر دیں، تھوڑا سا ڈرا دھمکا کے... یا تھوڑی دیر بند رکھیں اور پھر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

میجر سلطان نے سر ہلایا اور فون پہ ہدایات دینے لگا۔ پھر اس نے گھنٹی بجا کے بیٹ مین کو طلب کیا اور اس کو کافی لانے کے لیے کہا۔

" اب بتاؤ معاملہ کیا ہے ؟" میجر سلطان نے کہا۔

" معاملہ صرف اتنا ہے۔" میں نے کہا" کہ میرا ایک ساتھی ان کی قید میں تھا۔ وہ اس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ ہم نے بھی ان کا ایک آدمی پکڑ لیا تھا۔ جنگی قیدیوں کا یہ تبادلہ بہر شکل تھا کیونکہ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے یہ تجویز دی کہ ہمارا آدمی ریڈ کراس کی ایمبولینس میں یہاں پہنچا دیا جائے۔ ان کے آدمی کو میں لے آیا ہوں۔ اندر ہی کسی کی مداخلت کے بغیر تبادلہ ہو جائے گا۔ یہاں نہ وہ گڑبڑ کر سکتے تھے... اور نہ ہم... ایمبولینس ان کے آدمی کو لے کر چلی جائے گی تو میں اپنے آدمی کے ساتھ روانہ ہو جاؤں گا۔ نیوٹرل زون میں یہ پُرامن کارروائی کسی خرابی یا اندیشے کے بغیر آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔"

میجر سلطان ہنسنے لگا" بس یار میری نوکری کا خیال رکھنا۔"

" کیسی باتیں کرتے ہیں آپ... یہ ایک ہوسپٹل ہے۔ یہاں کوئی اونچی آواز میں بات بھی کرے تو غلط... گڑبڑ کا کیا سوال..." میں نے کہا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔" یس ؟" میجر نے ریسیور اٹھا کے کہا" ہاں... میں نے کہا تھا کہ ایمبولینس کو گزرنے دو۔ لیکن چیک کرو پہلے۔ ڈرائیور کا شناختی کارڈ دیکھو۔ ایک مریض کے سوا کچھ نہیں ہونا چاہیے اس میں۔" اس نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کافی آگئی۔ بیٹ مین نے ایک مگ میرے سامنے رکھا اور دوسرا میجر کے سامنے۔ اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔

" ہاں... کیسے ؟" میجر سلطان نے کہا" کون کرنل حضور احمد خاں ؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اس نام کا کوئی آفیسر نہیں ہے یہاں... کون ہے ؟ وہی ایس پی... ویٹ باسٹرڈ... ہولڈ کرو اس کو اپنے پاس... اندر بٹھاؤ اور جب تک میں نہ کہوں جانے مت دو۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں قہقہہ مار کے ہنسوں۔ اصلی ایس ایس پی سراج کو ایک جعلساز قرار دے کر روک لیا گیا تھا۔ اب وہ لاکھ اپنا شناختی کارڈ دکھائے، وہ اسے چھوڑنے والے نہیں جن کے لیے" آرڈر از آرڈر۔"

" مجھے ایک بات بتاؤ۔" میجر سلطان نے اچانک کہا" کیا یہ واقعی جعلی ایس ایس پی ہے ؟"

" نہیں۔" میں نے کہا" وہ اصلی ایس ایس پی ہے۔"

" اور وہ تمہارے پیچھے... تم کو گرفتار کرنے کے لیے آیا ہے۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا" تمہیں مجھ کو بچانا ہے میجر سلطان، میں تم کو دوست سمجھ کے آیا ہوں۔"

" تم نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔" وہ پریشان ہو کے بولا" کیا کرنل حضور احمد خاں کا نام تم نے دیا تھا اُسے ؟"

میں نے پھر گردن ہلا کے اپنے جرم کا اقرار کیا۔

" میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا" تم نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا۔ میرے پاس اس کو روکے رکھنے کی معقول وجہ ہے۔ مجھ پر کوئی الزام نہیں آسکتا... خیر چھوڑو... یہ بتاؤ کہ آجکل کیا کر رہے ہو ؟"

" بہت کچھ... وہی جو پہلے کرتے تھے۔" میں نے کہا۔ لیکن تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا... کیونکہ مجھے جانا ہے۔"

" یہ تم کو آنے سے پہلے سوچنا تھا کہ تم واپس کیسے جاؤ گے" میجر سلطان نے گرج کے کہا۔ اس نے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

میں اس تبدیلی پر دم بخود رہ گیا۔" واٹ از آل دس... کیا مطلب ہے آخر اس کا...؟"

" مطلب بھی سمجھ جاؤ گے... یہ ممنوعہ علاقہ ہے... تم نے کیا اپنے باپ کا گھر سمجھ لیا تھا؟" میجر سلطان نے کہا" تم آئے کیسے اندر...؟"

" یس سر..." بیٹ مین نے اٹینشن ہو کے کہا۔

" گارڈ کو بلاؤ۔" میجر سلطان نے کہا۔ اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بازی الٹ گئی ہے۔ سراج اندر آچکا تھا اور میری حیثیت اس گیدڑ کی طرح ہو گئی تھی جسے شامت گھیر کر شہر کی طرف لے گئی ہو۔

" **میجر سلطان**" سراج نے ایک تمسخر اڑانے والی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور آگے بڑھا۔

" یس" میجر سلطان نے کہا" آر یو دی ایس پی ؟"

" ایس ایس پی" سراج نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔" ناٹ جسٹ ایس پی۔ میرا نام سراج ہے۔"

میجر سلطان نے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے کرسی پیش کی۔" میرا خیال ہے...!"

" آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" سراج بولا" آپ نے مجھے گیٹ پر روک لینے کا حکم دیا تھا لیکن میں پھر بھی اندر آگیا۔"

میجر سلطان کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے" مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کسی کرنل حضور احمد خان کو پوچھ رہے تھے اور اپنی شناخت بھی نہیں کرا رہے تھے۔"

" واٹ نان سنس۔ میں خود اپنی شناخت ہوں۔ میں کوئی سڑک پر کھڑا ہوا فٹ کانسٹیبل نہیں ہوں۔ یو سی دِس یونیفارم۔"

" معاف کیجیے، یہ وردی میں نے بہت سے فلمی اداکاروں کے جسم پر بھی دیکھی ہے۔ فلموں میں" میجر سلطان نے خشک لہجے میں کہا" ہمارے لیے آپ کی شناخت یہ وردی نہیں ہے اگر کوئی جنرل کی وردی میں بھی آجائے اور ہم اسے پہچانتے نہ ہوں تو اسے چیک کیا جائے گا۔ اسے اپنی شناخت کا ثبوت پیش کرنے میں عار محسوس نہیں ہوگی اور وہ ہماری فرض شناسی پر خفا نہیں ہوگا۔ دی آر سپوزڈ ٹو ڈو سو۔"

" ان دیٹ کیس" سراج نے اپنا شناختی کارڈ جیب سے نکال کے میز پر ڈال دیا" یہ آپ دیکھ لیں اور اگر اس پر بھی جعلی ہونے کا شک ہے تو میں یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ تصدیق کرا لیں۔"

میجر سلطان نے شناختی کارڈ کو میز پر سے اٹھا کے غور سے دیکھا لیکن اس تمام عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا۔ اس کا ریوالور میرے سینے کا نشانہ لیے ہوئے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا میجر سلطان نے سراج کو مجھ سے پہلے دیکھ لیا تھا اور اس کے رویے میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی، وہ ایک ضرورت کا تقاضا تھی۔ کیا اس طرح وہ مجھے سراج کی تحویل میں نہ دینے کا جواز پیدا کر رہا تھا۔

" گیٹ پر بھی میں نے اپنی شناخت کرانے سے انکار نہیں کیا تھا۔" سراج نے اپنی بات جاری رکھی" کرنل حضور احمد خان کو پوچھنے کی غلطی ضرور کی تھی میں نے۔ میں دراصل سی ایم ایچ کے او سی کا نام بھول گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید سی ایم ایچ میں آخری بار میں دو سال پہلے آیا تھا۔ میرا ایک دوست یہاں داخل تھا۔"

" اور آج آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں ؟"

" یو نو میجر" سراج نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔" اٹ واز اے میٹر آف چانس۔ کہ جس وقت تمہارے حکم پر مجھے روکا گیا تو اندر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری باہر جا رہے تھے۔ ہی از فرام سگنلز۔ اور ان کے گھر میں حال ہی میں گیا تھا۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ ان کا گھریلو ملازم کچھ چوری کر کے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے پکڑ لیا تھا۔ ایک ایک چیز ان کو واپس مل گئی۔ ان کی وائف کی جیولری میں سے ایک انگوٹھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ کرنل بخاری نے میری مدد کی۔ میں نے کہا کہ مجھے میجر سلطان — ڈاکٹر میجر سلطان کے پاس جانا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ آئی ایم ناٹ آتھرائزڈ پرسنل۔ خیر انھوں نے گارڈ کو سمجھا دیا — اینڈ ہیئر آئی ایم —"

" فائن" میجر سلطان نے گھڑی دیکھ کر کہا" آپ کے آنے کا مقصد میں سمجھ گیا۔ غالباً آپ اس شخص کے تعاقب میں تھے۔"

" غالباً کی اس میں کیا بات ہے" سراج نے کہا" یو نو دس مین — یہ ایک خطرناک قاتل ہے۔ مفرور مجرم ہے اور جیسا کہ آپ نے ابھی کہا تھا، اس پر غداری اور ملک دشمنی کے الزامات ہیں۔"

میجر سلطان نے اقرار میں سر ہلایا" مجھے معلوم ہے۔"

" ایسی صورت میں" سراج نے میز پر جھک کر معنی خیز لہجے میں کہا" کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ آپ کے کمرے میں کیا کر رہا تھا۔"

" نہیں — آپ نہیں پوچھ سکتے۔ میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں مسٹر ایس ایس پی" میجر سلطان نے کہا" میں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔"

" بڑے دوستانہ طریقے پر" سراج نے تلخی سے کہا" کافی پلا کے۔ شاید یہ ٹریپ کرنے کے لیے ضروری تھا۔"

" کیا ضروری تھا اور کیا نہیں تھا" میجر سلطان نے سختی سے کہا" یہ میں سمجھتا ہوں۔"

" اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ بالکل غیر ضروری ہے۔ یہ تمہارا کام نہیں ہے میجر" سراج نے برہمی سے کہا" تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ اس آدمی کو میرے حوالے کر دو...!"

" ڈونٹ یو فارگٹ" میجر سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔" کہ جہاں تم اس وقت بیٹھے ہوئے ہو یہاں تمہارے اختیارات کی اہمیت صفر ہے۔ یہ علاقہ تمہاری جیورس ڈکشن میں نہیں آتا مسٹر ایس ایس پی۔ اگر تم صرف یہی کہنے آئے تھے تو تم جا سکتے ہو۔ میں تمہارا مطالبہ مسترد کرتا ہوں۔"

" تمہیں ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔"

" میں پوری طرح با اختیار ہوں۔ میں اس شخص کو ایف آئی یو کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے بعد میری ذمے داری ختم" میجر سلطان نے کہا" میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک رات یہ شخص زبردستی میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ میری بیوی ابھی تک نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ان کو میں نے پکڑ لیا تھا مگر یہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے دونوں ساتھیوں کو بھی ایف آئی یو کے حوالے کر دیا تھا۔ ایف آئی یو کا مطلب سمجھتے ہو ؟ فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ۔ یہاں کینٹ میں ان کے ایک آفیسر نے تفتیش کی تو وہ دشمن کے ایجنٹ ثابت ہوئے۔ ان سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیا بتایا۔ مگر ایف آئی یو کے اس آفیسر نے بعد میں مجھ سے فون پر کہا کہ ان کی گرفتاری کے بعد سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ بہت سے دوسرے لوگ پکڑے گئے اور کافی مقدار میں غیر ملکی اسلحہ بھی ملا۔ جو غالباً مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے حالات کو بگاڑنے کے لیے وہاں بھیجا جانے والا تھا۔ آئی ایم ناٹ شیور۔ یہ خیال ہے میرا...!"

سراج یقین اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سب کچھ سن رہا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پکڑے جانے والے کون تھے ؟ اگر اس کے اپنے آدمی ہوں گے تو وہ فوراً سمجھ گیا ہوگا کہ ان کو پکڑوانے والا میں تھا۔

" تمہاری بات سے ابھی تک یہ وضاحت نہیں ہوئی" سراج نے کہا" کہ اس وقت یہ ملزم خود تمہارے پاس گرفتار ہونے کے لیے کیوں چلا آیا۔"

" یہ مجھے ایک آفر دینے آیا تھا۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"جسے تم نے مسترد کر دیا ہوگا۔" سراج نے تمسخر اڑانے کے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لائک اے ویری فیتھ فل افسر اینڈ محبِ وطن پاکستانی اور پھر اس نے تمھیں دھمکی دی ہوگی کہ تمھارے بیوی بچوں کی خیر نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس فضول اور بے سر و پا بات پر یقین کروں میجر؟"

"تم کیا کروگے، یہ میرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔ "اور مجھے کیا کرنا ہے، یہ تمھارے سوچنے کی بات نہیں۔"

دو گارڈ اندر داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اسی وقت گھنٹی بجی۔

"یس ۔ ہاں ۔ وہ موجود ہیں یہاں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "میرے پاس بیٹھے ہیں۔ او کے ۔ میں بھیج دیتا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "کمانڈنٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کو کوئی کام تھا تو کسی میرے جیسے ماتحت کے پاس آنے کے بجائے آپ کو ان کے پاس جانا چاہیے تھا۔ گارڈ آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔"

سراج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "جانے سے پہلے میں ان سے بات کروں گا ٹیلی فون پر۔"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہم سے کہا جاتا ہے۔ کمانڈنٹ نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج دیا جائے اور یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں آپ کو بھیج دوں۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سراج کھڑا ہوگیا۔ "لیکن مجھے واپسی پر یہ شخص یہیں ملنا چاہیے۔"

"تم مجھے آرڈر دے رہے ہو؟" میجر سلطان نے کہا۔

"آرڈر بھی لے آؤں گا میں۔ میں تمھارے کمانڈنٹ کو پوری صورتِ حال سمجھا دوں گا کہ ایک میجر ادائے فرض کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اپنے اوسی سے بات کر سکتے ہو مگر میں آئی جی صاحب کے ذریعے ہوم سیکریٹری سے اور تمھارے وزارتِ دفاع کے اعلیٰ حکام سے بھی احکامات حاصل کر سکتا ہوں۔"

"میں تم کو روک نہیں رہا ہوں۔" میجر نے سرسری لہجے میں کہا۔ "جب میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں تو مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھو۔ شاید تم جانتے نہیں کہ میری واقف تمھارے آئی جی صاحب کی کیا ہے لیکن تم جان لوگے بہت جلد۔"

سراج کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا۔ "ٹک، ہیر میجر۔ وائی ٹیک آل دس ٹرابل۔ تم سکندر بخت کو میرے حوالے کر دو۔"

"سکندر بخت کون ہے؟" میجر سلطان نے سکون سے کہا۔

"سکندر بخت کون ہے ۔ ڈونٹ ٹیل می۔" سراج کا چہرہ سرخ ہوا مگر پھر اس نے مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہوئے خود پر قابو پالیا۔ "سکندر بخت یہ شخص ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے میری طرف انگلی اٹھائی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس شخص کا نام میری معلومات کے مطابق سکندر بخت نہیں ہے۔" میجر سلطان نے کہا۔

"تو اپنی معلومات کو درست کر لو۔ یہ سکندر بخت ہے۔" سراج کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "میں بتا رہا ہوں تمھیں۔"

"معلوم کرنے والے خود ہی معلوم کر لیں گے۔" میجر سلطان نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ جو لوگ پکڑے گئے تھے، انھوں نے کچھ اور نام بتایا تھا۔"

"کیا نام بتایا تھا؟"

"اٹ از ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن ۔ میں بھی اس لیے جانتا ہوں کہ میرا براہِ راست تعلق ہوگیا تھا۔ ورنہ صرف تفتیش کرنے والے جانتے ہوں گے یا وہی جو مجاز ہیں۔ میرا کمانڈنگ آفیسر بھی اس معاملے میں ایک غیر متعلق شخص ہے۔ تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ وہ کچھ نہیں جانتا اور وہ دخل دے گا بھی نہیں۔ آئی تھنک کہ تم کو دیر نہیں کرنی چاہیے ایس ایس پی صاحب۔ کمانڈنٹ صاحب کے پاس بہت کام ہوتے ہیں۔ وہ سارا دن آپ کے انتظار میں ضائع نہیں کر سکتے۔"

میجر سلطان کا رویہ تقریباً گیٹ آؤٹ کہنے کا تھا۔ سخت بے بسی اور اشتعال کے عالم میں سراج مجھے خوں آشام نظروں سے گھورتا ہوا اور اپنی بے بسی پر پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکلا۔

"دیکھ لوں گا میں۔" اس نے زیرِ لب کہا۔

"یو مے گو ٹو ہیل۔" میجر سلطان نے بھی زیرِ لب کہا۔

سراج ایک دم پلٹا۔ "کیا کہا تم نے؟"

میجر سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "جو تم نے کہا تھا، اس کا جواب میں نے نہیں دیا۔"

دونوں مسلح گارڈ جن کو بیٹ مین نے بھیجا تھا، اب میجر سلطان کے اشارے کے منتظر تھے، کھڑے ہوئے تھے۔

"اسے کیپٹن افتخار کے پاس لے جاؤ۔" میجر سلطان نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ان سے کہنا کہ اسے چیک کریں۔ ایک منٹ، پہلے میں بات کر لوں۔" اس نے فون اٹھا کے کیپٹن افتخار کا نمبر مانگا۔

"افتخار! بھئی میں ایک کیس بھیج رہا ہوں۔ آئی تھنک ہی از ناٹ نارمل۔ تم ذرا دیکھو کہ یہ کس حد تک ابنارمل ہے۔ میرا مطلب ہے کہ از ہی ڈینجرس۔ پھر میں تم سے وہیں آ کے بات کرتا ہوں۔ ابھی میری گاڑی سروس کے لیے گئی تھی۔ یہ شاید سروس اسٹیشن سے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میرے کمرے میں گھس آیا۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کا بادشاہ ہوں اور یہ کہ اگر کسی نے اس کی حکومت کو تسلیم نہ کیا تو یہ اپنا کیس اقوامِ متحدہ میں لے جائے گا۔ یہ مجھے اپنا وزارتِ دفاع کا قلمدان سونپنے کو تیار تھا۔" میجر سلطان ہنسا۔ "وزیرِ اعظم اس نے اپنے ماموں کو نامزد کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ خطرناک نہیں۔ بس کریک ہے۔"

اس نے فون رکھ دیا اور گارڈز سے کہا کہ مجھے لے جائیں۔

میں اب بہت مطمئن تھا اور میں نے اس تمام گفتگو میں دخل اندازی سے گریز کیا تھا جو میجر سلطان اور سراج کے درمیان ہوئی تھی۔ میجر سلطان نے بہت ذہانت سے کام لیا تھا۔ اس کے لیے اپنی پوزیشن کو محفوظ رکھنا بھی بے حد ضروری تھا۔ مجھے شرمندگی تھی تو صرف اس بات کی کہ میری وجہ سے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوا اور اسے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑے۔ بے شک یہ سب جھوٹ نیک نیتی سے بولے گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سچ کیا ہے مگر وہ خود اس سچ کو تسلیم کرتا تو سچائی کے راستے پر چلنے والوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی راہ میں مشکلات کا اضافہ کرتا۔ شرمندگی سے زیادہ مجھے پریشانی تھی کہ یوں سراج کے عزائم کی راہ میں حائل ہو کے میجر سلطان نے اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے مصیبت کا سامان نہ کیا ہو۔ یہ کینہ پرور اور کمینے لوگوں کا گروہ تھا جو ہمارے لیے نیک جذبات رکھنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

ایک جیپ مجھے کیپٹن افتخار کے پاس لے گئی۔ وہ یقیناً میجر سلطان کے لیے قابلِ اعتماد تھا اور وہ مجھے براہِ راست نکال لینے سے پیدا ہونے والی مشکلات سے بچنا چاہتا تھا۔ میں طے کر چکا تھا کہ ان حالات میں میرا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ کیپٹن افتخار کا تعلق یقیناً شعبۂ ذہنی امراض سے تھا اور وہ ماہرِ نفسیات یا سائیکاٹرسٹ ہو سکتا تھا۔

جیپ رکی اور گارڈ مجھے ایک بیرک کے آخری کمرے میں لے گئے۔ بظاہر بیرک خالی لگتی تھی اور وہاں کا سناٹا بھی افسردہ لگتا تھا۔ کیپٹن افتخار نے مجھے اپنے کمرے میں بڑی خوشدلی سے ریسیو کیا۔ وہ گھنی برابر تراشی ہوئی داڑھی والا لحیم شحیم اور لباس کی طرف سے بے پروا شخص تھا۔ اس کی پتلون چونکہ توند کے گنبد پر ٹھہر نہیں سکتی تھی، اس لیے وہ الاسٹک والے گیلرز کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ ڈھیلی ڈھالی قمیص پر اس نے بہت چوڑی ٹائی باندھ رکھی تھی مگر کالر کھلے ہوئے تھے چنانچہ ٹائی کی ناٹ بھی ڈھیلی تھی۔ وہ منہ میں ایک بجھا ہوا پائپ دبائے کھڑا تھا۔

"ہیلو مائی بوائے۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "بیٹھو یہاں میرے سامنے ۔ تم جاؤ۔" اس نے دونوں گارڈز سے کہا۔ میڈیکل کور اور ایجوکیشن کور میں ایسے لوگ بہت نظر آتے ہیں جو کسی طرح بھی فوجی نہیں لگتے۔ مگر وہ اعزازی عہدے رکھتے ہیں یا پھر شارٹ سروس کمیشن کے لیے اپنی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہیں، ان کے لیے جسمانی فٹنس کے معیار کو مدِنظر نہیں رکھا جا سکتا۔

"تو تم ہو پاکستان کے بادشاہ۔" وہ پائپ سلگاتے ہوئے بولا۔

"ہم اس طرزِ تخاطب کو پسند نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "کیا بادشاہوں سے گفتگو کے یہی آداب ہیں۔ افسوس کہ ابھی ما بدولت تخت نشین نہیں ہوئے ورنہ ہم تمھیں اس گستاخی کی سزا دیتے۔"

"میں معافی کا خواستگار ہوں ظلِ الٰہی۔" ڈاکٹر افتخار نے قدرے سنجیدہ ہو کے کہا مگر اس کی زیرِ لب مسکراہٹ بدستور میری دیوانگی کا تمسخر اڑاتی رہی۔ "تخت نشینی میں تاخیر اور التوا کا سبب کیا ہے؟"

"ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے کرسی پر یوں بیٹھتے ہوئے کہا جیسے وہ تختِ طاؤس ہو۔

"حضورِ والا جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔" میں نے باوقار آواز میں کہا۔

"آپ موروثی بادشاہ تو نہیں ہیں۔ پھر آپ کو پاکستان کا بادشاہ کس نے بنایا؟"

"تمھاری تقرری اور ترقی کے احکامات کہاں سے آتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اوپر سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"ہمیں بھی اوپر سے حکم ملا۔" میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کے بولا۔ "کہ اے بندے! اٹھ اور امتِ مسلمہ کے آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت کی یاد تازہ کر۔ مغلوں کے جاہ و جلال کو بحال کر۔ مسلمانانِ پاکستان کو فاتح عالم قوم بنا اور دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا۔"

"بہت خوب اور یہ احکامات آپ کو کیسے موصول ہوئے تھے شہنشاہِ معظم۔" کیپٹن افتخار نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب ہم سے آوازِ غیب نے کہا۔ ہمیں خواب میں بشارت ہوئی اور خود ہم پر علم و عرفان سے آگہی کے دروازے کھلے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا ارادہ کب تک اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کا ہے؟"

"اس صدی کے اواخر تک۔" میں نے متانت سے کہا۔ "ابھی ہمیں امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹنا ہے۔ اپنی صفوں کو منظم کرنا ہے۔ ہم اپنی کابینہ کے لیے ہم خیال اور باصلاحیت افراد کا انتخاب کر رہے ہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وزارتِ دفاع کے لیے آپ نے میجر سلطان کو منتخب فرما لیا ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب آپ کسے تفویض کر رہے ہیں عالم پناہ؟"

"اس کے لیے ہم اپنے برادرِ نسبتی سے بہتر کسی کو نہیں پاتے لیکن ہم اپنے جدِ امجد کو غائبانہ وزیرِ اعظم بنانے کے امکانات کا بھی جائزہ لے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"غائبانہ وزیرِ اعظم۔" کیپٹن افتخار نے ہنسی پر قابو پا لیا۔ "ان کی عدم موجودگی میں۔"

"ان کے عدم آباد میں ہونے کے باعث۔" میں نے سکون سے کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"اچھا۔ خیر چھوڑیے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ فرمائیے کہ آپ کو میجر سلطان کا پتا کس نے دیا۔ میرا مطلب ہے، اسے اپنا وزیرِ دفاع بنانے کے لیے آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کو تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ یہ بے مقصد گفتگو آگے بڑھتی، میجر سلطان اندر آگیا۔

"ہاں بھئی۔ کیا رپورٹ ہے؟"

"یار سلطان۔ کون ہے آخر یہ؟" کیپٹن افتخار نے انگریزی میں کہا۔

"کچھ نہیں یار۔ ہمارا بہت پرانا ملنے والا ہے۔ آج کل ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔" میجر سلطان نے بھی انگریزی میں کہا۔ "تھوڑا سا کریک ہے مگر بے ضرر ہے۔ نام تو غلام علی تھا مگر سب گلو کہتے ہیں۔"

"ہاں۔ اندازہ میں نے بھی یہی لگایا کہ بس تھوڑا سا سنکی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے لوگوں کو خواب میں بشارت ہوتی رہتی ہے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "یہ اپنے تصورات کی ایک دنیا بنا لیتے ہیں اور اسی میں سوتے جاگتے ہیں۔ تم اسے یہاں کیوں لے آئے تھے؟"

"میں کہاں لایا یار۔" سلطان نے کہا۔ "یہ پتا نہیں کیسے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور میں نے تو اس وقت دیکھا جب یہ بھی آفس میں آگیا۔ بڑی گڑبڑ ہو جاتی، اگر گلو اندر گھومنا شروع کر دیتا اور سب کے سامنے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتا۔ اسے پکڑ کر کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا جاتا اور مجھے پتا بھی نہ چلتا۔ میں نے سوچا کہ تمھارے پاس بھیج دوں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کی پوری کیس ہسٹری..."

"چھوڑو یار۔ مجھے سب معلوم ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دس بارہ سال سے تو میں جانتا ہوں اسے۔ گھر کا سارا کام کر لیتا ہے۔ بس کبھی کبھی بادشاہت کا دورہ پڑتا ہے تو وہ کوئی خاص سیریس بات نہیں۔"

سلطان کی بات ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے ادھوری رہ گئی۔ افتخار نے فون اٹھا لیا۔ "یس... یس سر... جی سر... وہ یہاں ہے۔ وہ کوئی ایسی خاص بات نہیں سر۔ ہی از اے لٹل ابنارمل۔ خود کو پاکستان کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ دیٹ از آل۔ ویسے بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے ایک گھنٹے تک اس کو چیک کیا۔ اسے تھوڑے سے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ نو سر۔ ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ وہ میجر سلطان کا ملازم ہے۔ یس سر ملازم۔ گلو نام ہے اس کا۔"

میجر سلطان نے اسے اشارے سے منع کیا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اس کی بات افتخار نے سمجھ لی۔

"نہیں سر۔ مجھے تو سلطان نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ خود میں نے ساری باتیں اسی سے پوچھی ہیں۔ وہ مانتا ہے کہ دس بارہ سال سے سلطان کے گھر میں ہے۔ یس سر۔ اس نے اپنا نام غلام محمد عرف گلو خود ہی بتایا ہے۔ نہیں سر۔ میجر سلطان سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہیں سر۔ آج تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ رائٹ سر۔ اگر وہ ادھر آیا۔ رائٹ سر۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میں احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ انگریزی میں ہونے والی اس گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"تم فوراً بھاگ جاؤ یہاں سے۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کمانڈنٹ کو شاید بادشاہ سلامت کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے اور وہ بادشاہ سلامت سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے میں وہاں لے جا رہا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا بات تھی؟"

"اولڈ مین وانٹس ٹو سی یو۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "معلوم نہیں وہ اتنا خفا کیوں تھا۔ اس نے تمھارے آفس میں بھی تم کو پوچھا تو مگر تم نہیں تھے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم مجھ سے پہلے پہنچ جاؤ۔"

میجر سلطان نے سر ہلایا۔ وہ کچھ تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی یہ تشویش جائز تھی۔ کمانڈنٹ سے گفتگو میں کسی ایس ایس پی کا حوالہ نہیں تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ سراج اسی سے ملنے گیا تھا۔ وہ اب بھی وہاں موجود ہوگا اور کمانڈنٹ کے سامنے اصرار کرے گا کہ میں گلو نہیں، سکندر بخت ہوں۔ وہ شاید میرے خلاف تمام الزامات کی فہرست بھی سنا چکا ہوگا۔ اس کے سامنے سلطان کیسے انکار کرے گا کہ میں سکندر بخت نہیں ہوں؟ میں کیسے ثابت کروں گا کہ میں غلام محمد عرف گلو ہوں اور کمانڈنٹ پرانے تجربہ کار افسر ہوتے ہیں۔ اسے بے وقوف بنانا آسان نہیں ہوگا۔ وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ کہیں میری وجہ سے میجر سلطان بھی مشکل میں نہ پڑ جائے، کمانڈنٹ فیصلہ کرے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

"بادشاہ سلامت!" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی زحمت کریں گے؟"

"ہمیں کہاں جانا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"ایک با اختیار شخص آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ وہ آپ کی بادشاہت کو تسلیم کرانے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا اور اگر آپ اسے سپہ سالارِ اعلیٰ مقرر فرما لیں گے تو وہ جاں نثار آپ کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے گا۔"

"پھر ہم اس کو ضرور شرفِ ملاقات بخشیں گے۔" میں نے کہا۔

جب میں ایک جیپ میں جس کے پچھلے دروازے پر سرخ رنگ کا کراس بنا ہوا تھا، کیپٹن افتخار کے ساتھ روانہ ہوا تو مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ جھوٹ کی دلدل ہے اور میں اس میں دھنستا جا رہا ہوں۔ شاید میرے لیے اپنی شناخت کو چھپانے کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ایک ایس ایس پی سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پولیس کا سارا ریکارڈ منگوا سکتا ہے میری تصاویر کے ساتھ۔

کمانڈنگ افسر ایک پختہ عمر کا کرنل تھا جس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ چالیس سال کا بھی ہو سکتا تھا اور پچاس کا بھی۔ جسمانی طور پر وہ اتنا تندرست و توانا تھا کہ تیس کا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک تھی کہ وہ دیکھتا تھا تو اس کی نظریں جسم سے گزرتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے سامنے جاتے ہی سب سے پہلے مجھے یہ دیکھ کر اطمینان حاصل ہوا کہ وہاں سراج موجود نہیں۔ کرنل غصے میں تھا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ سلطان اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بار چند سیکنڈ کے لیے مجھے غور سے دیکھا۔ میرا دل اس خوف سے بیٹھنے لگا کہ کہیں وہ خود ہی مجھے شناخت نہ کر لے۔

"واٹ از آل دس افتخار؟" اس نے ناراضگی سے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا سر۔"

"ہاں۔ وہ سب مجھے میجر سلطان نے بھی بتایا۔ لیکن وہ سب کیا تھا جو اس اسٹوپڈ نے کہا۔ دیٹ بلڈی ایس پی۔ واٹ واز ہز نیم؟ سراج۔ یس۔" کرنل نے ٹہلتے ہوئے اچانک پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "یہ آدمی تو مجھے اس سے بھی زیادہ اسٹوپڈ لگتا ہے۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کوئی خطرناک قاتل مجرم ہو سکتا ہے۔"

"اوہ نو سر۔ وہ ایس پی غلط فہمی..."

"نو میجر۔ یہ ایس پی اگر خود آیا تھا۔ تو کوئی بات ضرور تھی۔ صرف غلط فہمی کی بات ہوتی تو وہ اتنا اپ سیٹ نہ ہوتا۔" کرنل نے کہا۔ "وہ تمھارے گھر آ کے تفتیش کرتا۔ یہاں تک اس کا آنا مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے۔"

"وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا نہیں آیا تھا سر۔" میجر سلطان نے کہا۔ "وہ کسی کرنل حضور احمد خاں سے ملنے آیا تھا۔"

"کرنل حضور احمد خاں۔ ہو دی ہیل از ہی؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم سر۔ آپ گیٹ سے معلوم کر لیں۔ وہ بضد تھا کہ اسے کرنل حضور احمد خاں سے ملنے کے لیے اندر جانے دیا جائے۔ گیٹ نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ نیچرلی میں نے اسے روک دیا۔ مگر اسی وقت ادھر سے لیفٹیننٹ کرنل بخاری گزرے۔ ہی از فرام سگنلز۔ وہ ایس پی کو جانتے تھے۔ کرنل بخاری نے اسے میرے پاس بھیج دیا اور وہاں اتفاق سے یہ موجود تھا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، یہ چھپ کر آگیا تھا۔ اب معلوم نہیں ایس پی کو کس حد تک صورت کی مشابہت نے دھوکا دیا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ گلو کو اس کے حوالے کر دوں۔"

"گلو۔ ہو از گلو؟"

"یہ سر۔" میجر سلطان نے میری طرف اشارہ کیا۔

"اور۔ یہ بادشاہ سلامت۔" کرنل نے کہا۔ "دیٹ ایس پی واز ریلی اے ڈامنٹ۔ اس نے یہاں بھی مس بی ہیو کیا۔ آئی ایز اف ہی واز مائی باس۔ میں نے اسے یہی کہا تھا کہ کوئی غلط فہمی ہے تو رفع کی جا سکتی ہے۔ اس پر وہ تو بم کی طرح پھٹ گیا کہ غلط فہمی مجھے ہو گی۔ میں ایس ایس پی ہوں۔ آئی سروس ہے میری۔ اتنی عمر گزر گئی ہے ایسے ہی کام کرتے۔ میں یہ ہوں اور وہ ہوں اور میں نے یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ مائی فٹ۔ وہ تو ایسے بات کر رہا تھا جیسے ہی از ایوری تھنگ۔ میں نے کہا کہ لُک ہیئر مین۔ جسٹ فارگیٹ کہ تم کیا ہو۔ مجھے حکم مت دو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں تم کو نکلوا دوں، تم خود چلے جاؤ۔ اس معاملے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ اگر وہ انسان کے بچوں کی طرح بات کرتا تو میں اس کی مدد کرتا۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ خود بھی تھوڑا سا ابنارمل ہے اور غالباً ہم سب تھوڑے بہت ابنارمل نہ ہوں تو نارمل نہیں رہ سکتے۔ ایم آئی رائٹ؟"

"وہ تو کڑوا کریلا تھا سر، جو نیم چڑھ گیا ہو۔ میرے ساتھ تو اس نے حد کر دی۔" میجر سلطان نے جلتی پر تیل چھڑکتے ہوئے کہا۔ "تھینکس گاڈ کہ میرا ٹمپر لوز نہیں ہے ورنہ میں اسے شوٹ کر دیتا۔"

کرنل نے ہاتھ اٹھایا۔ "ٹو ہیل ود ہم۔ میں اس قسم کی غلط فہمی وغیرہ کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ غلطی تمھاری تھی جو اس کو ساتھ لائے۔ تم کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ کل کو خدانخواستہ تمھاری گاڑی میں آدم خور شیر چھپ کر بیٹھ گیا اور تمھیں پتا نہ چلا تو ہمیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تم کہاں گئے۔ اب اپنے اس بادشاہ سلامت کو یہاں سے لے جاؤ اور جا کے اس پولیس افسر سے ملو۔ کلیئر دس تھنگ۔ میں اس کے بارے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو سی اینی بلڈی ایس ایس پی ہیئر۔ نیور نیور اگین۔" اس نے ٹوپی سر پر رکھی۔ چھڑی بغل میں دبائی اور باہر نکل گیا۔ "خدا حافظ۔"

"افتخار!" میجر سلطان نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے معلوم ہے تم ماہرِ نفسیات ہو۔ تم کو بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے میں اعتراف کرتا ہوں کہ بے وقوف میں ہوں۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تم کو جو کچھ پوچھنا ہے کل پوچھنا۔ خدا کا شکر ہے ایس ایس پی نے کرنل کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ورنہ ابھی وہ سب بتانا پڑتا جو میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"تم کل یا اس کے بعد۔ ایک اطمینان بخش وضاحت کر لو گے؟"

"میں کوشش ضرور کروں گا۔ کوشش تو مجھے کرنی ہی پڑے گی۔" میجر سلطان نے کہا۔ "ابھی تو تم اس آدمی کو اپنی جیپ میں لے جاؤ۔ میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔ یو آر اے فرینڈ۔ میں تم پر ٹرسٹ کر رہا ہوں۔"

کیپٹن افتخار نے کچھ دیر سوچا اور پھر اقرار میں سر ہلا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کو کہاں لے جانا ہے؟" وہ بولا۔

"آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"روز کی طرح اور گاڑی کو باہر چھوڑ کے اندر چلے جائیں۔ پھر میں نکل جاؤں گا۔"

"تم ایک بہادر انسان مخلص سپاہی اور کھرے پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے اچھے اداکار بھی ہو۔" کیپٹن افتخار نے کہا۔ "مسٹر سکندر بخت!"

"اس دنیا کے اسٹیج پر ہم سب اداکار ہیں۔" میں نے سر کو خم کرکے کہا۔

کیپٹن افتخار زور سے ہنسا۔ "مگر شیکسپیئر یہ کہنا بھول گیا تھا کہ کچھ اداکار آسکر لیتے ہیں۔ باقی تمام عمر جھک مارتے ہیں۔"

"آسکر کا حق دار تو آپ نے ثابت کیا ہے خود کو۔" میں نے کہا۔ "میں تمام وقت یہی سمجھتا رہا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہے۔"

"پھر تم نے خود کو متعارف کرانے کا رسک کیوں لیا تھا؟"

"میں تو اسے رسک نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔ "اگر میجر سلطان آپ پر ٹرسٹ کرتے ہیں تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"پلیز ڈونٹ ڈواٹ اگین۔" میجر سلطان نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کیا، اپنی مرضی کے خلاف کیا۔ آل ان گڈ فیتھ۔ یہ بہت مشکل کام تھا اور معلوم نہیں، اس سے آگے کیا مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"یس۔ ایس پی آپ کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔" میں نے شرمندگی سے کہا۔ "آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو آزمائش میں ڈالا۔"

"اٹ از او کے ناؤ۔" میجر سلطان نے کہا۔ "تمھارے پلان اور میری کوشش میں معمولی سی خامی رہ گئی جس کی وجہ سے وہ اندر آگیا اور پھر اسے کیا کہا جائے کہ اسی وقت کرنل بخاری نے اسے دیکھ لیا۔ ورنہ تم نکل جاتے۔ میرا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی سپاہی کے لیے تو زندگی ایک میدانِ جنگ ہے۔ اسی ہفتے میں میری پوسٹنگ کھاریاں متوقع ہے۔"

"یہ بات اچھی ہی ہے کیونکہ اس طرح آپ خواہ مخواہ کے چکر سے نکل جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور میرے لیے بُری ہے کہ پھر ملاقات اپنے اختیار کی بات نہیں رہے گی۔ صرف امید رہ جائے گی۔ جو کچھ آپ نے کیا، اس کے لیے میں احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کیپٹن افتخار کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ گلی سیٹ پر اکیلا رہا۔ میں پیچھے کی محدود سی جگہ میں چھپ گیا۔ گیٹ تک پہنچنے سے پہلے میں سر اٹھا کے باہر جھانکتا رہا۔ یہ بند جیپ تھی جس کے عقبی دروازے کی کھڑکیوں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ پارکنگ ایریا سے گزرتے ہوئے مجھے مائکرو بس دکھائی نہ دی تو میرے دل کو تھوڑا سا اطمینان حاصل ہوا۔ جولی نکل گئی تھی۔

کیپٹن افتخار نے اپنے سرکاری بنگلے کے احاطے میں جیپ روکی اور پلٹ کے مجھ سے کہا۔ "گڈ بائی۔ اینڈ گڈ لک بوائے۔ دو منٹ بعد تم نکل جانا۔ باہر کوئی نہیں ہوگا۔"

"تھینک یو کیپٹن افتخار۔" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کیا۔"

"آئی وش۔ کہ میں اس سے زیادہ کر سکتا۔" وہ اترتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہی جتنا تم لوگ کر رہے ہو۔ مگر ہم مجبور لوگ ہیں بھئی۔"

"پاپا۔" اندر سے کوئی بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ "پاپا آگئے۔"

"ارے شانی۔ پھر گر دگی تم بکسی عورت نے چلا کے کہا۔ "ہزار بار سمجھایا ہے کہ ایسے دیوانوں کی طرح مت بھاگا کرو۔"

"ہا ہا۔" افتخار قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ارے بھئی تم کیوں جلتی ہو۔ ہمارا بھی کوئی دیوانہ ہے تو۔"

"پاپا۔ کل تو آپ ممی سے کہہ رہے تھے کہ ہم تمھارے دیوانے ہیں۔" اس بچی نے اپنی معصوم آواز میں کہا۔

"شانی۔" اس کی ماں نے ڈانٹا اور کیپٹن افتخار نے ایک اور قہقہہ بلند کیا۔ میں آوازوں سے چھلکنے والی خوشی اور محبت کی شوخی سے بھرپور فضا کو محسوس کر سکتا تھا جو اس مختصر سے خاندان کو میسر تھی۔ اس گھر میں وہ سب کچھ تھا جو میرے خوابوں کی تعبیر ہو سکتا تھا۔ محسن اور شہلا یا غالب اور نازو کے خواب بھی ایسے ہی تھے۔ اس عمر میں سب کی آنکھیں ایسے ہی خواب مانگتی ہیں اور سب کے دل ایسی ہی تعبیروں کے لیے مچلتے ہیں لیکن ہم نے تو اپنے خوابوں سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا اور تعبیر کے بدلے تعزیر قبول کر لی تھی۔

دو منٹ کے بعد میں نے پیچھے والا دروازہ آہستہ سے کھولا اور چند سیکنڈ منتظر رہا کہ کسی نے یہ آواز سنی تو نہیں۔ اس وقت میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ مالی، کوئی نوکر یا پوسٹ مین۔ لیکن باہر واقعی کوئی نہ تھا۔ میں نے جیپ سے اتر کے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر دیکھے بغیر گیٹ سے نکل گیا۔ یہ چھوٹا سا ڈی ٹائپ بنگلا تھا جس کی چار دیواری تک چالیس فٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا۔ باہر ایک پتلی سی نیم پختہ اور غیر آباد سڑک تھی جس کے دونوں جانب ایسے ہی بنگلے تھے۔

مجھے صرف اتنا اندازہ تھا کہ میں چھاؤنی کے علاقے میں ہوں۔ سورج کو دیکھ کر میں سمت کا بھی اندازہ کر سکتا تھا لیکن مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں کسی بڑی سڑک سے یا شہری آبادی سے کتنے فاصلے پر ہوں۔ میرے قدم خود بخود ایک سمت میں اٹھ رہے تھے اور اب میرا ذہن ایک طرف ٹیڈی سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور اس کی بحفاظت واپسی پر خوش تھا تو دوسری طرف مجھے رالعہ کا خیال شرمندہ اور افسردہ کرتا تھا۔ میرے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں تھا کہ جیسے میں نے سراج سے اس کی ماں کے بدلے استاد ٹیڈی کو حاصل کر لیا تھا، کیا ایسے ہی میں رالعہ کو بھی لا سکوں گا؟ اس کا جواب اگر ملتا تھا تو نفی میں۔ اب کیا ہے ہمارے پاس کہ ہم رالعہ کی واپسی کا سودا کریں؟ اگر عاشی زندہ رہتی تو شاید بات بن جاتی اگر زیب النساء ہمارے ارادوں کی شکست اور اپنی رسوائی کا سامان نہ کرتی تو شاید اس طرح ہم رالعہ کو مانگ لیتے۔ ایسا لگتا تھا کہ تقدیر کو میرے اور رالعہ کے درمیان دوری ہی منظور ہے۔ نہ وہ مجھ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ میں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ رالعہ اگر مجبور ہے تو کیا میں بھی مجبور ہوں؟ مجھے چلتے چلتے خیال آیا۔ مجھے روکنے والا کون ہے؟

جب تک رالعہ بے یقینی کی سرحدوں کے پار ناامیدی کے اندھیروں میں گم تھی، میرے جذبات پر بھی بے حسی کی برف جمتی رہی تھی اور اس کی یاد بھی دل کو بس اتنا ہی تڑپاتی تھی جتنا بچھڑ جانے والوں کی یاد جو خیالوں کے سفر میں شریک تھے لیکن جدا ہوئے تو پھر کبھی ملنے کی امید تک ساتھ لے گئے لیکن اب احساس پر پڑی ہوئی برف ٹوٹ کر پگھلنے لگی تھی۔ اس کی آواز نے دل کے درد کو پھر جگا دیا تھا اور وقت کی راکھ میں دبی ہوئی آرزو کی چنگاری یکلخت شعلہ ساماں ہو گئی تھی۔ اس نے تو نہیں کہا تھا کہ میرے لیے آتش نمرود میں کود پڑو مگر کیا یہ تقاضائے عشق نہیں تھا۔ یوں جینے کے مقصد ہزار ہوں مگر ایک رالعہ کی چاہت میں مر مٹنے کا مقصد اولیں نہیں تو زندگی کا راستہ ایک صحرائے بے نشاں کا بے سمت سفر ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن سے انتشار کے جالے صاف ہو گئے ہیں اور میں سوچ کی واضح روشنی میں اپنی منزل کا راستہ دیکھ سکتا ہوں۔ میرا دل پہلے کے مقابلے میں بہت مطمئن تھا۔ ایک سڑک تک پہنچتے ہوئے میرے قدموں نے شاید آدھا میل کا فاصلہ طے کیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔ جب میں نے ایک تانگے کی ٹخ ٹخ سنی تو پلٹ کے دیکھا اور اس کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے سگریٹ جلائی تاکہ یکسوئی کے ساتھ کچھ سوچ سکوں مگر تانگے والا گپ شپ کے موڈ میں تھا۔ اس نے پہلے تو مجھ سے سگریٹ طلب کی۔

"واہ جی، واہ۔" اس نے تھری کاسل کے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے بڑے احترام سے ایک سگریٹ نکالی۔ "سگریٹ تو یہ بہت ودیا ہے جنابِ عالی، پر ایک بات کی سمجھ ہم کو نہیں آتی۔"

"کس بات کی؟" میں نے کہا۔

"یہ ودیا سگریٹ میں سواد کیوں نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔ "ایک دم پھیکی اور بے مزہ۔ نرا دھوئیں کا پھوک۔ اب آپ پوچھو کہ مجھے کون سی پسند ہے۔"

"اچھا۔ تمھیں کون سی سگریٹ پسند ہے؟" میں نے مجبوراً کہا۔

"بگلا مارکہ۔ کیا کوڑا اور ظالم سوٹا ہوتا ہے جی۔" وہ بولا۔ "جگرا چاہیے اس کے پینے کے لیے۔ یہ تو زنانیاں بھی پیتی ہیں ادھر ولایت میں۔"

"کیا تم نے ولایت دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"لو جی۔ ولایت کس نے نہیں دیکھا۔" وہ بولا۔ "یہ ساری فلمیں جو باہر سے آتی ہیں، ان میں ولایت ہی تو دکھاتے ہیں۔ ہم تو جی بس میموں کو دیکھنے جاتے ہیں۔ سچی بات ہے۔ اور وہ سگریٹ، شراب سب پیتی ہیں۔ اللہ توبہ۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "ایسے ہی نخرا کرتی ہیں جناب۔ اپنی بگلا مارکہ سگریٹ پی کے دکھائیں، ٹھاہ کر کے دھواں لگتا ہے اِدھر۔" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"اچھا بھئی، آئندہ تمھارے تانگے میں بیٹھوں گا تو بگلا مارکہ سگریٹ ساتھ رکھنا نہیں بھولوں گا۔" میں نے چڑ کے کہا۔

میری بات نے اسے ذرا سی دیر کے لیے چپ کیا۔ پھر اس نے کہا۔ "باؤ جی اک گل تے دسو۔ یہ اِدھر مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم کیا ہو رہا ہے۔" میں نے محتاط اور بیزار لہجے میں کہا۔

"او جی، یہ بنگالی بڑے سر چڑھ رہے ہیں۔ بھارت کے غلام بننا چاہتے ہیں۔"

"بنگالی مسلمان ایسا نہیں چاہتے۔ وہاں ہندو بہت ہیں۔"

"اچھا جی۔ کیا ادھر ہندو زیادہ ہیں، مسلمانوں سے بھی زیادہ؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ مگر وہ سیاسی اور معاشی طور پر غالب ہیں اور غداروں کو شہ دے رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ بھارت سے بھی بہت ہندو آگئے ہیں وہاں اور اسلحہ بھی جا رہا ہے۔" وہ خاصا باخبر آدمی تھا۔

"سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھارت نے فوجی مداخلت کا پروگرام بنا لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اللہ خیر کرے۔"

"لو جی، فکر کی کیا بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب حکومت کو جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے۔" وہ بولا۔ "ہر مسجد میں ہونا چاہیے اعلان۔ آپ دیکھنا، جتھے کے جتھے سر سے کفن باندھ کے جائیں گے۔ سب ت [illegible] کے دنبہ بنا دیں گے۔ اگر انھوں نے ہماری سرحد کے اندر قدم رکھا۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا۔ اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ یہ ایک عام آدمی کے جذبات تھے جو پڑھا لکھا نہیں تھا اور شاید سیاسی اور معاشی غلبے کا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا مگر پاکستان کے بارے میں اس کے جذبات بہت واضح تھے اور وہ یقین رکھتا تھا کہ فوج کیا، عوام ہی بھارت کے عزائم سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ اسی یقین کے سہارے وہ دشمن کے ٹینک پر اپنے تانگے کا مریل گھوڑا لے کر چڑھائی کر سکتا تھا اور شاید ٹینک کا راستہ بھی روک سکتا تھا۔ شاعرِ مشرق نے یہ بات بہت پہلے محسوس کر لی تھی کہ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

لکشمی چوک میں عین خلیفہ کی دکان کے مقابل اترنے کے بعد میں نے کرایہ ادا کیا اور پھر ایک نظر میں اس جگہ کا جائزہ لیا، جہاں ایک مختصر جنگ لڑ کے ہم تو نکل گئے تھے مگر اپنے پیچھے ایک ہمدرد کے لیے صرف تباہی چھوڑ گئے تھے۔ خلیفہ نے اپنی دکان پھر بنا لی تھی اور باہر سے اس کی نئی زیب و زینت دیکھنے سے پرانی دکان کا نقشہ یاد آتا تھا۔ پہلے والی اور موجودہ دکان میں وہی فرق تھا جسے وقت کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ جو قدیم طرزِ تعمیر کا حسن رکھنے والی ہائیکورٹ کی عمارت اور الفلاح بلڈنگ کے انداز میں نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اچانک میری نگاہ سائن بورڈ پر گئی اور میں رک گیا۔ مجھے دکان کا نام ہی نہیں پروپرائٹر بھی بدلا ہوا نظر آیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک مختصر سی کیبن جیسی دکان کے بوڑھے مالک سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ بوڑھا چند زنگ خوردہ ٹین کے ڈبوں میں ٹافیاں اور مُرمُرے سیٹی بجل اور ریوڑیاں لیے اونگھ رہا تھا۔ قطار میں رکھے ہوئے ڈبوں میں باہر کی رخ دھندلا شیشہ تھا جس میں سے بچوں کو اپنی پسند کی چیزیں نظر آجاتی تھیں۔ اس قسم کی دکانداری کا مقصد منافع کمانا کم اور وقت گزاری کے لیے خود کو مصروف رکھنا زیادہ ہوتا ہے۔

"چاچا جی" میں نے قریب جا کے کہا "سلاما لیکم"

"وعلیکم السلام" اس نے چونک کے سر اٹھایا اور مجھے غور سے دیکھا۔

"چاچا۔ ایتھے ایک پنڈت ہوندا سی۔ خلیفہ" میں نے کہا۔ بڈھے کی صورت پر ایک افسردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "آہو۔ ہوندا سی"

"فیر... او کتھے گیا؟" میں نے کہا۔

"جانا کتھے سی او نے" بڈھا بولا "او بوا کھڑ کالے جے اونوں ملنا اے"

میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دکان اب کسی اور نے لے لی تھی۔ اگر خلیفہ پنڈت کا وہی گھر نہ ہوتا تو مجھے اس بوڑھے سے اور بہت کچھ پوچھنا پڑتا لیکن دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس نے خلیفہ کے زندہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔ باقی باتیں میں خود خلیفہ سے پوچھ سکتا تھا۔ میں نے بوڑھے کا شکریہ ادا کر کے سلام کیا اور درمیان کی گلی عبور کر کے اس دروازے پر جا پہنچا جو دکان کے پیچھے کی تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ دروازے کے سامنے ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ جھول رہا تھا اور پٹ نیم وا تھے۔ میں نے کنڈی ہلائی تو ایک عورت نے کسی بچے کو باہر بھیجا۔ وہ پنڈت کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بار اندر گیا اور پھر لوٹ کر آیا۔

"ابا کہندا اے ناں دسو"

نام" میں نے سوچ کے کہا "ابا سے کہو۔ ایک پرانا دوست ہے"

بچے نے نفی میں سر ہلایا جس کا مطلب صاف تھا کہ پوچھے بغیر وہ واپس نہیں جائے گا "ابا کسے دوست نوں نئیں ملدا"

"اچھا" میں مخمصے میں پڑ گیا "اسے کہو سکندر بخت آیا ہے"

بچہ اندر گیا ہی تھا کہ ایک عورت نے چلانا شروع کیا "فیر او مرن جوگا۔ سب کچھ تے لے گیا سی۔ ہن کی لین آیا جے ساڈے کولوں"

خلیفہ پنڈت نے اسے ڈانٹ لگائی "چپ کر"

"کیوں چپ کروں" عورت نے باغیانہ لہجے میں چیخ کر کہا پھر ایک چانٹے کی آواز آئی "چپ نئیں کریں گی تے میں گچی مروڑ دیاں گا" پنڈت نے کہا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ پنڈت نے چانٹا مار کے اپنی گھر والی کی زبان بند کر دی تھی مگر اتنی دیر میں جو کچھ کہا تھا، وہ میں سن چکا تھا اور مجھے ذرا بھی شک نہیں رہا کہ پنڈت کی گھر والی میرا نام سن کے کیوں بھڑک اٹھی تھی۔ اس کے نزدیک سکندر بخت ایک دشمن کا نام تھا جس نے ان کو تباہی و بربادی اور مصائب کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ فرق صرف جذبات کی نوعیت کا تھا۔ عورت اپنے پیار اور اپنی وفاداری کو اپنے شوہر، اپنے گھر اور اپنے بچوں تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ مرد کی ذمے داریوں کے دائرے وسیع ہوتے ہیں چنانچہ وہ اپنے جذبات کو سمیٹ کر ایک گھر کے حصار تک محدود نہیں کر سکتا۔

پنڈت میرے سامنے آیا تو صدمے نے میری قوت گویائی سلب کر لی۔ وہ اپنی بے نور آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اس کا ایک بازو میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا بازو قمیص کی خالی آستین کی صورت میں لٹک رہا تھا "سکندر صاحب۔ آؤ جی اندر آؤ" وہ بولا "میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "پنڈت... یہ..."

"او جی، یہ کچھ نہیں" وہ بولا "آپ اندر آؤ۔ آپ کا باہر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں"

"میں سمجھتا ہوں کہ میرا اندر آنا بھی ٹھیک نہیں۔ ایک بار پہلے بھی آیا تھا۔ نہ آتا تو اچھا تھا" میں نے بڑے دکھ سے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔

"ایسی باتیں مت کرو جی۔ یہ تو سوہنے رب کی رضا ہے وہ جس حال میں چاہے رکھے" وہ بولا "آپ کا اس میں کیا قصور تھا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا تو کیا آپ پھر بھی آتے۔ آپ کی میری کون سی دشمنی تھی کہ آپ مجھے برباد کرتے۔ وہ تو آپ کے اور ملک کے دشمن تھے۔ اللہ نے بڑی خیر کی کہ آپ کو بچا لیا۔ ہمارا کیا ہے جی۔ بال کاٹتے تھے، اب ہم نہیں کاٹتے تو ہماری جگہ دوسرے کاٹ رہے ہیں لیکن جو کام آپ کر رہے ہیں، وہ کون کر سکتا تھا!

میں اس کے جذبۂ ایثار پر حیران تھا۔ تکیۂ کلام کے طور پر بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میرا سب کچھ آپ پر قربان، مگر عملاً اس شخص نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ صرف گفتار کا غازی نہیں ہے۔ اس کی بصارت زائل ہو گئی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ سے محروم ہو گیا تھا اور کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کی آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ہنرمند ہاتھوں کی کمائی سے اپنے گھر کی خوشحالی کو استوار رکھا تھا اور مستقبل کے تحفظ کو یقینی بنایا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے میری وجہ سے گنوایا تھا مگر اس کی استقامت، اس کے حوصلے اور جذبے میں کمی نہیں آئی تھی۔

"خلیفہ پنڈت" میں نے کہا "تمہاری۔ وہ دکان..."

"وہ میں نے بیچ دی تھی جناب" وہ بولا "اتنا پیسہ نہیں تھا کہ پھر اس کی مرمت کراتا اور سب سامان خریدتا۔ پھر جناب، پولیس نے بہت لوٹا۔ مجھے اسپتال میں پریشان کرتے رہے۔ میرے بیوی بچوں سے زبردستی رقم وصول کرتے رہے کہ تم سب تخریب کاروں سے ملے ہوئے تھے اور ان کو پناہ دیتے تھے۔ اللہ موقع دے ان کو۔ یہ اپنے سگوں کو بھی بخشنے والے نہیں۔ ان پر بھی کیس بنا دیں میری گھر والی کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کرنے کی دھمکی دیتے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں ان کی پوچھ گچھ کیا ہوتی ہے۔ عزت بچانے کے لیے اور تھانے سے بچنے کے لیے ان کو ہزاروں دیے۔ میرے کاریگر بے چارے جو میرے بچوں کی طرح تھے، انھیں پکڑ کر لے گئے۔ وہ غریب گھروں کے بچے تھے۔ ان کی تو ضمانت کرانے والا بھی نہ ملتا۔ میں نے ان کی بھی گلو خلاصی کرائی۔ ایک ایک کے پانچ ہزار دیے مگر پرچہ نہیں کٹنے دیا۔ وہ کہاں وکیل کرتے اور کب تک پیشیاں بھگتنے جاتے۔ اپنا تو سارا جمع کیا ہوا نکل گیا۔ پتا نہیں جی، اللہ نے کس گناہ کی سزا دی۔ بندہ بشر نہیں جانتا کہ کب اس سے خطا ہوئی تھی۔ وہ سوہنا رب بے انصاف تو نہیں ہے ناجی کہ خطا کے بغیر سزا دے۔ حرام کمانے والوں کا مال حرام میں جاتا ہے تو دنیا کہتی ہے ٹھیک ہوا، ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر قسم پیدا کرنے والے کی۔ میرا تو پیسہ پیسہ محنت اور حق حلال کی کمائی کا تھا۔ علاج معالجے پر بھی دس ہزار سے اوپر اٹھ گیا۔ فائدہ صرف یہ ہوا کہ زندگی بچ گئی۔ پھر ایسی اندھی اور معذور زندگی کا بچنا بھی تو سزا ہے۔ دکان بیچنے سے جو رقم ملی، وہ اپنے بھائی کو دے دی ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ کام چھوڑو اور میرے ساتھ مل کے بزنس کرو۔ آبائی پیشہ تھا۔ باپ دادا کا فن تھا۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کچھ اور کرنے کو۔ اب مجبوری نے سب کرا دیا ہے۔ بھائی کا کاروبار بھی ٹھیک نہیں لیکن آمدنی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میرا اپنا کوئی تجربہ نہیں کاروبار کا۔ کسی غیر کو دیتا تو رقم ڈوبنے کا ڈر ہوتا۔ اب یہ اطمینان تو ہے کہ کاروبار اپنے بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک رب نہ کرے۔ وہ خود نہیں ڈوبتا میرا پیسہ بھی نہیں ڈوبے گا۔ خیر جی، پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ مجھے تو بس یہ دکھ ہے کہ اپنا ہنر نہیں رہا اور ہنرمندوں کا ٹھکانا نہیں رہا۔ میرے شاگرد کل میری جگہ لیتے تو میں بھی اتنا ہی فخر محسوس کرتا جتنا میرا باپ مجھ پر محسوس کرتا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کدھر گئے۔ ان میں سے دو بعد میں ملنے آئے تھے۔ بہت روتے تھے کہ استاد جی ہم رُل گئے۔ جہاں اب کام کرتے ہیں، وہ پیسے کم دیتا ہے گالیاں زیادہ۔ میں نے کہا کہ میرے بچو۔ ہمت مت ہارنا۔ غربت، ذلت، بیماری، موت سب اللہ کی آزمائش ہے اور آزمائش میں صبر شکر سے کام لینے والا ہی اس کا نیک بندہ ہے۔ گلہ کرو گے تو سوہنا رب ناراض ہو گا کہ انھوں نے اچھے وقت کو اتنی جلدی بھلا دیا۔ خود مجھے دیکھو۔ جہاں مالک تھا، اب وہیں نوکر ہوں اور نوکر بھی کیسا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں چکر لگاتا ہوں۔ جھاڑو سے فرش پر گرنے والے سارے کٹے ہوئے بال سمیٹتا ہوں اور ایک بالٹی میں ڈال دیتا ہوں۔ اس کے پانچ روپے روز ملتے ہیں مگر میں شکوہ نہیں کرتا۔ شکر کر کے پانچ روپے لے لیتا ہوں۔ گھر والی کہتی ہے کہ تم ہمیں ذلیل کراتے ہو۔ جب گھر بیٹھے گزارے لائق رقم مل جاتی ہے تو جھاڑو دینے کیوں جاتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ نیک بخت۔ وہ رقم جو مجھے کوئی اور کما کے دیتا ہے، مجھے خوشی نہیں دیتی۔ یہ پانچ روپے میں اپنی محنت سے صرف اپنی خوشی کے لیے کما کے لاتا ہوں۔ اس سے مجھے حوصلہ اور یقین ملتا ہے کہ میں مرا نہیں۔ ناکارہ نہیں ہوا۔ ایک ہاتھ سے بھی میں کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتا ہوں لیکن دوسری بات میں اس سے نہیں کہتا۔ عورت ذات ہے نا۔ سمجھے گی نہیں۔ میں وہاں دوسروں کو عبرت دینے جاتا ہوں۔ وہاں میرے پرانے گاہک آتے ہیں جو برسوں سے آتے تھے۔ وہ مجھے جھاڑو دیتا دیکھ کر بہت حیران ہوتے ہیں اور ان کو صدمہ بھی ہوتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں پنڈت، یہ کیا کر رہے ہو۔ اور میں کہتا ہوں کہ جی، وہی جو سوہنے رب کی رضا ہے۔ بندے کو اچھا وقت راس آئے تو بُرے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ فکرمند اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں کہ آج وہ مالک ہیں یا افسر ہیں۔ کل خدانخواستہ انھیں نوکر اور ماتحت بن کے ایسی ہی حیثیت کو قبول کرنا پڑا تو وہ کر سکیں گے؟ اور اس طرح میں لوگوں کو بھی پہچان رہا ہوں جناب۔ کل جب میں ایک ہیئر ڈریسنگ سیلون کا مالک تھا تو وہ مجھ سے کیسے ملتے تھے اور آج کیسے ملتے ہیں۔ جو ظرف والے ہیں، وہ پہلے سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔ کم ظرف سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ مگر میں سب کی سنتا ہوں اور کسی کو جواب نہیں دیتا۔ کچھ نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے"

میں دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ایک مُبلغ۔ ایک ناصح۔ ایک مُفکر کی طرح بول رہا تھا۔ اس کی باتوں میں سچائی تھی اور گہرائی تھی۔ ایسی دانائی کی باتیں بڑے بڑے عالم فاضل کر سکتے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تھے جو اس نے اپنی سیدھی سادی زبان میں کہہ دیں' بغیر یہ جانے کہ نہ وہ لیڈر ہے نہ دانشور۔ بلکہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جسے عزت و تکریم کے دُہرے معیار رکھنے والا یہ معاشرہ بڑی حقارت سے نائی کہتا ہے۔ اس کے حوصلے، ظرف اور صبر و قناعت کے جذبات کی ہمسری کا دعویٰ میں بھی کرتا تو غلط ہوتا۔ دنیا میں کہاں کہاں' کیسے کیسے مردِ قلندر ملتے ہیں۔

"آپ رنجیدہ مت ہوں جی" وہ شرمندہ لہجے میں بولا "میں بے وقوف ہوں کہ اتنا بول گیا۔ دل کی بات پر اختیار نہیں رہا۔ مجھے تو آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ خیر سے کیسے پھر ادھر آنا ہوا۔ خلیفہ پنڈت اب کیا کر سکتا ہے آپ کے لیے۔ پھر بھی جو کچھ کر سکتا ہے' ضرور کرے گا۔"

"پنڈت!" میں نے کہا "تم کو اس دکان کے کتنے ملے تھے؟"

"چالیس ہزار صاحب" وہ بولا "بس جگہ کی قیمت ملی۔ باقی سب تو ملبہ تھا۔"

"اور اب... خیر چھوڑو" میں نے کچھ سوچ کے اپنا ارادہ بدل دیا "یہ بتاؤ کہ میرے دو ساتھی آئے تھے یہاں؟"

"ہاں جی۔ آئے تھے" وہ بولا "میں خود تو ان کی خدمت نہیں کر سکتا تھا لیکن انھیں میں نے اپنے ایک بہت ہونہار شاگرد کے پاس بھیج دیا تھا۔ بارہ سال کام کیا اس نے میرے ساتھ۔ بڑا فنکار بندہ تھا جی۔ پر اُسے فلموں کے شوق نے کھینچ لیا۔ ہیرو بننے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ دوسرے تو مذاق اڑاتے تھے کہ اگر تو ہیرو کیا' ولن بھی بن گیا تو پھر فلم نہیں بنے گی اور بن گئی تو چلے گی نہیں۔ اس کی صورت اور ہٹرک پر ہنستے تھے سب لوگ۔ میں سنجیدگی سے سمجھاتا تھا کہ بیٹا گلفام' ہر کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ مگر جی وہ دُھن کا بڑا پکا تھا۔ نہ میرے سمجھانے سے سمجھتا تھا نہ کسی کے ہنسنے کی پروا کرتا تھا۔ ہیرو تو وہ نہیں بنا مگر دھکّے کھاتے کھاتے ایک دن کسی فلم کے سیٹ پر گیا تو وہاں میک اپ مین سے لڑ پڑا کہ تم نے خاک چہرہ بدلا ہے۔ اسے تو اندھا بھی پہچان لے گا کہ وہی ہے۔ ڈائریکٹر نے یہ بات سنی تو کہنے لگا کہ تم جانتے ہو یہ کام تو کر کے دکھاؤ۔ اب لو جی وہ جھگڑا ہی بہانہ بن گیا۔ آج وہ بڑا کامیاب میک اپ مین اور ہیئر اسٹائلسٹ ہے۔ مگر ہفتے میں ایک بار سلام کرنے ضرور آتا ہے۔ کہتا ہے' آپ استاد نہیں میرے باپ ہو اور یہ کسی حد تک سچ بھی ہے۔ اسے میں نے پالا تھا کیونکہ وہ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ پہلے ماں سوتیلی تھی پھر باپ مر گیا تو ماں نے دوسری شادی کر لی اور باپ بھی سوتیلا ہو گیا۔ معاف کرنا جی۔ جب سے آنکھیں گئی ہیں' میں زیادہ بولنے لگا ہوں۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو باتیں کرتا ہوں۔ پہلے ہاتھ چلتے تھے' اب زبان چلنے لگی ہے۔ آپ سے تو پوچھا ہی نہیں کہ کیا پیو گے۔ چائے یا ٹھنڈا؟"

میرے بہت انکار کے باوجود وہ خود باہر گیا اور کسی حلوائی کی دکان سے لسی کے دو گلاس بنوا لایا۔ اتنی دیر میں اکیلا بیٹھا رہا۔ پنڈت کی بیوی شاید ناراض ہو کے کہیں چلی گئی تھی۔ پنڈت کی واپسی تک میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ محسن اور غالب کی طرف سے مجھے کامل اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ انھوں نے پرانی دکان کا نیا روپ دیکھ لیا تھا اور سوچے سمجھے بغیر اندر گھسنے کی غلطی نہیں کی۔

"معاف کرنا جی۔ مجھے کچھ ٹائم لگ گیا" پنڈت نے کہا اور جگ سے اپنے اور میرے لیے لسی انڈیلنے لگا "مزہ تو اُدھر ہی لسی پینے کا، مگر میں آپ کو ساتھ لے جاتا تو یہ خطرے کی بات ہوتی۔"

"استاد!" میں نے کہا "اپنے اس ہونہار شاگرد کا پتا بھی دو۔ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"گلفام" وہ بولا "کوئی شہزادہ گلفام کہتا ہے' کوئی شہزادہ!"

"تمھارا اس پر پورا بھروسا ہے نا؟"

"لو جی۔ بھروسا نہ ہوتا تو میں آپ کو وہاں بھیجتا۔ وہ تو غلام ہے بالکل۔ میں کہوں کہ گلفام قتل میں نے کیا ہے۔ پھانسی چڑھ جا۔ تو وہ چڑھ جائے گا۔"

"اچھا تو وہ رہتا کہاں ہے؟"

"آپ ادھر سے جاؤ نا جی۔ چوبرجی کی طرف سے۔ تو ایک گلی راج گڑھ کی طرف نکلتی ہے" وہ بولا "اس میں سیدھے ہاتھ پر ساتواں یا آٹھواں گھر ہے۔ نمبر تو مجھے نہیں پتا لیکن اس کے کھڑکی دروازے نیلے ہیں اور۔ اوپر کے حصے میں گلفام رہتا ہے۔ اس نے تار باندھ کے گملے لٹکا رکھے ہیں پھولوں کے...."

"بس اتنا کافی ہے" میں نے کہا "میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا اور گلی سے باہر آ کے کچھ دیر دکان کے باہر کھڑا رہا۔ اس کے سائن بورڈ پر "ہالی ووڈ اسٹائل ہیئر ڈریسنگ سیلون" کا چمکتا دمکتا بورڈ' خاصا فحش تھا اور میری نظر میں چبھ رہا تھا۔ ظاہر ہے' پینٹر نے پروپرائٹر کی خواہش کے مطابق وہ تصویر بنائی تھی جس کا سر کے بالوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ موجودہ مالک کے ذہن اور فکر کی نمائندگی کرنے والا یہ سائن بورڈ مجھ سے احتیاط کا تقاضا کرتا تھا۔ پنڈت سے ہمدردی اور اس کے نقصانات کی تھوڑی بہت تلافی کرنے کا خیال نیک تھا اور یہ میری اخلاقی ذمّے داری بھی تھی مگر میں خود کسی مصیبت کا شکار ہو جاتا تو یہ وہی بات ہوتی کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔

میں نے پہلے گلفام سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ تانگے یا ٹیکسی کی نسبت رکشا زیادہ محفوظ تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں رکشا نے مجھے گلفام کے گھر پہنچا دیا۔ اس کا معلق گملوں والا مکان میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ گملے جھول رہے تھے اور زنگ خوردہ تاروں کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ نیچے گلی سے گزرنے والوں کے لیے سر پر لٹکنے والی خطرے کی تلوار سے کم نہیں۔ کوئی بھی گملا کسی بھی راہ گیر کے سر پر گر سکتا تھا۔

گلفام بالکل نام نہاد بگی نہند کافور کی مثال تھا۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر، دبلا پتلا اور مرجھایا ہوا سا جوان آدمی تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ اور دانت پان کھانے سے خراب ہو چکے تھے۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا اور اس کے لہجے میں اب بھی فرق تھا۔ حالانکہ وہ تمام عمر اسی خطے میں گزار چکا تھا۔ اس کی ناک چپٹی اور چھوٹی تھی۔ ماتھا بہت آگے نکلا ہوا تھا لیکن سامنے کے حصے سے بال بہت پیچھے تک گر چکے تھے۔

"میرا نام سکندر بخت ہے" میں نے کہا۔

"پھر ہم کیا کرے' بولو" اس نے رُکھائی سے کہا اور دونوں دروازوں کے پٹ میں منہ کو فٹ کیے مجھے گھورتا رہا۔

"مجھے تمھارے استاد خلیفہ پنڈت نے بھیجا ہے" میں نے کہا۔

"اچھا۔ استاد بھیجا ہے تم کو" اس کا رویّہ ایک دم بدل گیا۔ "ہم سے پھر غلطی ہو گیا" وہ مجھے راستہ دیتے ہوئے بولا اور افسوس سے سر ہلانے لگا۔

"پھر کا کیا مطلب؟" میں نے اس کی صورت پر شرمندگی اور ملال دیکھ کر کہا۔ وہ پہلے ہی اتنا بجھا بجھا آدمی تھا کہ اس کی جوانی بھی عمر کا آزار لگتی تھی۔ معلوم نہیں زندگی کے سب سے خوبصورت دور میں وہ اتنا دُکھی کیوں تھا اور اتنا مظلوم کیوں نظر آتا تھا۔ شاید دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں اسے یہی احساسِ محرومی و کمتری دیا تھا۔ اس کی بدصورتی پر اس کے نام کا طعنہ دینے والے لوگوں نے اس کی فطرت کی خوبصورتی پر کم نگاہ کی تھی۔

"پھر یہ کہ۔ تھوڑا دیر پہلے دو بابو لوگ آیا تھا۔ ان کو بھی استاد نے بھیجا تھا" وہ بولا "اور ہم نے ایسا ہی بات کیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے" میں نے کہا۔ "میں بھی ہوں۔"

"تم تو پتلا نہیں ہے۔ ہم دُبلا پتلا ہے" وہ بولا "تشریف رکھو اور حکم کرو۔ آپ کا بھی میک اپ کرنے کو مانگتا؟"

"ہاں" میں نے ایک کرسی پر بیٹھ کے آئینے میں اپنا چہرہ ملاحظہ کیا "ویسے تو یہ بھی میرا اصل چہرہ نہیں ہے لیکن اس کو پھر بدلنا ضروری ہو گیا ہے۔"

"وہ بھی ایسا بولتا تھا" گلفام سوچ میں پڑ گیا "وہ تمھارا دوست تھا۔ ہم سمجھ گیا۔ ایک ہی گینگ کا آدمی ہے تم سب۔"

"گینگ سے تمھارا مطلب ہے کہ چوروں ڈاکوؤں کا گروہ تو یہ تمھاری غلط فہمی ہے کیونکہ تمھارا استاد چوروں ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہے" میں نے کہا "کیا وہ ایسے لوگوں کو نہیں پہچانتا اور پہچان لے تو ان کی مدد کرتا ہے؟"

"اوہ۔ ہم سے پھر غلطی ہو گیا" وہ سر پر ہاتھ مار کے بولا۔ "ہم تم سے معافی مانگتا ہے' ابھی بولو تم کیا بنے گا۔"

"میں... کچھ طے نہیں کیا تھا میں نے۔ میرے دونوں دوست کیسا میک اپ کرا کے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"وہ۔ ایک جیسا بن گئے ہیں" گلفام نے کہا "بالکل ایک صورت۔ جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔"

"ویری گُڈ" میں نے غالب اور محسن کی دانش مندی پر خوش ہو کے کہا "دو بھائی تو کہلاتے ہیں جڑواں۔ اگر تین ہوں تو؟"

"تین؟"

"ہاں تین۔ یہ تو عام سی بات ہے۔ چھ کے تک سُنے ہیں میں نے بلکہ شاید کسی نے چھکّا مارنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا تھا۔" میں نے کہا "تم ایسا کرو کہ مجھے بھی انھی جیسا بنا دو۔"

"یہ آئیڈیا کیسا ہے" وہ بولا "کسی فلم میں ہوتا تو جائز تھا۔"

"تم یہ سمجھو کہ ہماری زندگی بھی ایک فلم ہے۔ مار دھاڑ اور جنگ و جدل، ہنسی مذاق اور عشق و محبت سے بھرپور" میں نے کہا۔ "گویا باکس آفس پر کامیابی کے فارمولے پر بنی ہوئی۔ ہر شخص کی زندگی ایک فلم ہوتی ہے۔ کبھی کامیڈی اور کبھی ٹریجڈی۔ جیسے کہ تمھاری زندگی۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری اور سر ہلانے لگا "تم سچ کہتا ہے۔ مگر ایک بات بولو ہم کو۔ اپنا بارے میں تم کو کس نے بتایا کہ ہمارا لائف ایک دم ٹریجڈی ہے۔"

"تمھارے استاد نے سب سے پہلے" میں نے کہا "پھر تمھاری صحت نے اور صورت نے۔ تمھیں کچھ یاد پڑتا ہے کہ آخری بار تم کب مسکرائے تھے' کب نہائے تھے' کب کپڑے بدلے تھے۔ تم کبھی کسی پر عاشق ہوئے۔ اس حد تک کہ تمھارے عشق کا علاج نہ حکیم ڈاکٹر کر سکیں نہ تھانے والے۔ دنیا میں کسی کو تم نے اپنا دوست سمجھا' دنیا پر کبھی غور کیا کہ بغیر میک اپ کے بھی پھولوں کا رنگ اور چاندنی' لتا کی آواز اور پہاڑوں کی برف سے چمکتی دھوپ، اسٹین بیک کی فلم اور صوفیہ لورین کی اداکاری اور ماجد خان کی بیٹنگ کے کمال میں کتنا حسن ہے اور خوشی حاصل کرنے کے کتنے سمندر پوشیدہ ہیں۔ پھر تم صحرا میں کیوں بھٹک رہے ہو؟"

وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھنے لگا "تم تو فلاسفر ہے بابا۔ مگر تمھارا تھوڑا سا بات سمجھ میں آتا ہے۔ ہم ایک دم اُلّو ہے' ہمارا کوئی فرینڈ نہیں، کوئی ماسوک نہیں اور یہ سب ہمارا اسکل کا قصور ہے۔"

"ابھی تو وقت نہیں ورنہ میں تم کو سمجھاتا کہ صورت کو صرف تم ہی اپنے آئینے میں دیکھتے رہتے ہو۔ دوسروں کی آنکھوں سے دیکھ سکتے تو تمھیں اندازہ ہو جاتا کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں" میں نے کہا۔ "یہ تو صرف شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ تمھاری خوبصورتی یا بدصورتی تو تمھارے اندر ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بدصورت بنا دو۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

اس نے صرف آدھے گھنٹے میں میری صورت بگاڑ دی۔ وہ میک اپ مین تھا۔ چنانچہ اس کے پاس صورت گری کا سب سامان بھی تھا اور ہنر بھی۔ اس نے میرے بالوں کو ایک جھلی کے نیچے یوں چھپا دیا کہ میرا سر کسی کے استرے کی تیز دھار سے وجود میں آنے والی ٹنڈ بن گیا۔ فٹ پاتھوں کے بہت سے فنکار صبح سے شام تک سر مونڈ کے چمکانے کا کمال دکھاتے رہتے ہیں اور میں نے صاف شدہ سروں پر پالش کے لیے آم کی گٹھلی رگڑنے کا رواج بھی دیکھا تھا۔ میرا بے بال و پر سر ایسا ہی ہو گیا مگر گلفام نے مزید حسن یہ پیدا کیا کہ اس گنجے سر کے گرد بالوں کی ایک جھالر سی چپکا دی۔ اب میں وہ عمر رسیدہ شخص لگتا تھا جس کے بال غمِ روزگار اور فلکِ کج رفتار نے اڑا دیے ہوں۔ گلفام نے مجھے بتایا کہ اوپر کی جھالر کیسے ہٹا کے میں ٹیل برائٹز بھی بن سکتا ہوں اور اس گنجے سر پر حسبِ ضرورت کوئی وِگ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔ پھر اس نے میرے چہرے کے گرد مغل شہنشاہوں کے انداز کی داڑھی سجائی جو ایک مشت سے قدرے کم اور سطح سے برابر تھی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں شیو نہ کروں تو مہینے بھر بعد نقلی داڑھی ہٹا بھی سکتا ہوں۔ فی الحال اسے دن میں باہر جاتے وقت استعمال کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ کوئی اسے نقلی نہیں کہہ سکتا۔ اس نے میچ کرتی ہوئی مونچھیں لگا کے مجھے دو کچے رنگ دیے۔ ان کو پانی میں حل کر کے بالوں پر لگانے سے داڑھی مونچھوں کو براؤن یا بلیک کیا جا سکتا تھا۔ اصل حالت میں داڑھی مونچھوں کا رنگ سیاہ و سفید کا وہ امتزاج تھا جسے کھچڑی بال کہا جاتا ہے۔ اس نے میرے ایک دانت پر سونے کا ایسا رنگ چڑھا دیا کہ وہ دانت اصلی سونے کا نظر آنے لگا۔ سامنے کا یہ دانت مسکراتے ہوئے بہت نمایاں ہو جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے خود کو آئینے میں دیکھا اور گلفام کی مہارت کا قائل ہوا اور اچانک مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گلفام بھروسے کا آدمی تھا۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس کے قابلِ اعتماد ہونے کی سند خلیفہ پنڈت دے چکا تھا۔ ایسا شخص ہمارا ساتھی بن سکتا تھا۔ ہر وقت ہمارے کام آ سکتا تھا اور انتہائی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ خود اپنے فن کو پیشہ بنانے کے بجائے وطن کی خدمت کے لیے وقف کرنے پر رضامند ہو۔ اس نے معاوضے کی بات پر خفا ہو کے یہ تو بتا ہی دیا تھا کہ وہ ایک جذباتی آدمی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"بھائی گلفام! تمھارے بارے میں جیسا سنا تھا تمھیں ویسا ہی پایا۔"

"کیا سنا تھا آپ...؟" وہ بولا۔

"یہی کہ تم بڑے اچھے میک اپ مین ہو۔ کتنا کما لیتے ہو ہر مہینے؟" میں نے کہا۔

وہ بادلِ ناخواستہ مسکرایا۔ "اپنا مرضی کا بات ہے۔ میرے جیسے لوگ دن رات کام کرتے ہیں۔ ہر فلم لینے کو بھاگتے ہیں۔ دس بیس ہزار بنا لیتے ہیں۔ میں زیادہ بھی بنا سکتا ہوں کیونکہ میں کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ کام خود میرے پیچھے بھاگتا ہے۔ مگر میں زیادہ کما کے کیا کروں گا۔"

"عیش کرنا۔ دنیا عیش کرتی ہے کیش سے۔" میں نے کہا۔

"اپن دنیا کی طرح نہیں ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔ دو چار ہزار بھی بہت ہوتا ہے۔ دو تین ڈائریکٹر ہے۔ ان کے سوا کسی کا کام نہیں لیتا۔ وہ اچھا فلمیں بناتا ہے اور ان کی ٹیم میں سب لوگ اچھا ہے۔ مگر اچھا فلم کوئی دیکھتا نہیں۔ وہ ڈائریکٹر لوگ کو فنانسر نہیں ملتا۔ سب بولتا ہے کہ فلم وہ اچھا جو اچھا بزنس کرے۔ پڑھا لکھا لوگ اور اخبار والا کیا بولتا۔ ان سب کو گولی مارو۔ پبلک کو دیکھو۔ ابھی وہ اتنا بددل ہے کہ فلم لائن چھوڑنے کی سوچتا ہے۔ پھر ہم بھی کچھ سوچے گا۔"

"اچھا گلفام۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو۔ تمھارا استاد تمھاری صحیح تعریف کرتا ہے۔ میں پھر آؤں گا تم سے ملنے۔"

گلفام کے چہرے پر تھوڑی سی خوشی کی مسکراہٹ آئی۔ "کیا نام بولا تھا تم۔ ہم بھول گیا۔"

"میرے دوستوں نے بھی اپنا نام تو بتایا ہوگا۔"

"ہاں۔ ایک نے کہا کہ میں اوّل خاں ہوں۔ دوسرا بولا کہ نہیں میں اوّل خاں ہوں۔ یہ دوئم خاں ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "دونوں غلط کہہ رہے تھے۔ اوّل خاں میں ہوں۔" اور اسے ہکا بکا چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ اب میں زیادہ اعتماد اور اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتا تھا۔ اس حلیے میں دلاور جیسا کائیاں دشمن بھی مجھے شناخت نہ کر پاتا۔ میں نے اپنے لیے ایک شلوار قمیض کا جوڑا خریدا اور پھر کھانا کھانے کے لیے نعمت کدہ میں گیا۔ وہاں میں نے عمداً سالن کی پلیٹ کپڑوں پر گرالی اور اس بہانے باتھ روم میں جا کے کپڑے بدل آیا۔ ویٹر کے اور میرے درمیان معمولی سی تکرار بھی ہوئی۔ کیونکہ میں اپنی غلطی کو اس کے سر منڈھنے پر مُصر تھا۔ بالآخر اسے ہی خاموش ہونا پڑا۔

شام کے چار بجے میں واپس پہنچا تو قتل کی تفتیش کرنے والے جا چکے تھے لیکن وہ ٹرک اب بھی وہیں کھڑا ہوا تھا جس کا ڈرائیور مارا گیا تھا۔ محسن اور غالب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ جولیا نے مجھے دیکھا تو پہچان نہ سکی۔

"شیر علی۔ دیکھو، یہ کون گھسا چلا آرہا ہے۔"

شیر علی دوسری طرف سے آیا۔ "کیا بات ہے۔ کس سے ملنا ہے؟"

"کس سے ملنا ہے؟" میں نے آواز بدل کے اور گرج کے کہا۔ "سب کو ایک دن مٹی میں ملنا ہے بندے سے۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ کا یہاں کیا کام ہے؟" شیر علی بولا۔

"کبھی تو نے سوچا بندے کہ دنیا میں تیرا کیا کام تھا؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "اور تو کیا کرتا رہا؟"

جولی سہم کر شیر علی کے پیچھے ہو گئی تھی۔ "یہ تو پاگل لگتا ہے مجھے۔"

"تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔ میں اس کا سارا پاگل پن نکال دوں گا۔" شیر علی نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے میری گردن دبوچ لی۔ "سیدھی طرح بتاتا ہے یا نہیں کہ یہاں کیوں آیا تھا۔"

ہم ٹریلر کے پیچھے تھے چنانچہ سڑک کے دوسرے کنارے سے ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی اور پھر ایک دم شیر علی کو اپنے سر کے اوپر سے گزار کے پھینک دیا۔ جولیا ایک دم چیخ مار کے اس کی طرف لپکی۔

"شیر علی... تم... ٹھیک ہو نا۔" وہ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولی اور اس وقت جولی کے لہجے سے میں نے اس کے جذبات کا اندازہ کیا۔ کھٹکا تو میں اسی وقت تھا جب جولی نے عادتاً اسے بھائی نہیں کہا تھا۔ اس کے شیر علی کہنے میں بھی تھوڑا سا حجاب آمیز اپنائیت کا انداز تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ابھی شیر علی نے اسے محسوس نہ کیا ہو یا محسوس کیا ہو تو وہ کچھ ظاہر ہونے نہ دینا چاہتا ہو۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا بے حد محتاط رہنے والا اور خاموش طبع آدمی تھا۔

شیر علی کچھ خفت اور اشتعال میں ایک دم کھڑا ہوا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جولی کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہو تو پھر آؤ۔" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

"بھائی سکندر۔" جولی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ "آپ..."

شیر علی مسکرانے لگا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "معاف کرنا دوست۔ جب ہم لوگ بے تکلف ہو جاتے ہیں تو ایسے ہی مذاق کرتے ہیں۔" پھر میں جولی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اپنا استاد ٹیڈی کہاں ہے؟"

جولی نے ہاتھ سے ٹریلر کی طرف اشارہ کیا۔ "اندر لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ۔ ٹھیک تو ہے نا۔"

جولی نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہاں۔ آپ دیکھ لیں۔"

"تمھیں وہاں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی تھی؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور شریف آدمی تھا۔ اس نے میری مدد کی۔ بھائی نیک محمد کو ہماری گاڑی میں شفٹ کیا اور سراج کی ماں تو خود ہی چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کہا..."

"کیا کہا۔؟"

"کہنے لگی کہ خدا تم سب کو عقل دے۔ میرے ساتھ تم نے جو کچھ کیا اس پر میں تم کو معاف کرتی ہوں۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ لڑکی۔ تو نے بہت خدمت کی میری۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ ریڈ کراس کی ایمبولینس کا ڈرائیور دور جا کھڑا ہوا تھا۔ اور کچھ حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے جاتے ہی میں بھی نکل گئی تقریباً پانچ منٹ کے بعد۔ بہت عرصے کے بعد ڈرائیونگ کی تھی میں نے۔ بھولی تو نہیں تھی مگر اتنی بڑی گاڑی چلانے میں خاصی مشکل پیش آئی۔ ایک جگہ تو بس مار ہی دی تھی میں نے۔ ایک پرائیویٹ کار تھی۔ اس نے مجھے بچایا تو فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ آگے کی جالی ٹوٹ گئی اس کی گاڑی کی۔ بہت لال پیلا ہو کے آیا تھا مگر میں نے رونی شکل بنا کے معافی مانگ لی کہ کیا کروں۔ بھائی بیمار ہیں، گاڑی چلا نہیں سکتے، انھیں خود ہی اسپتال لے جا رہی ہوں۔ اس پر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

"تم بھی چالاک لومڑی ہوتی جا رہی ہو ہماری صحبت میں۔"

"آپ کی تو ساری چالاکی دھری رہ جاتی، اگر میں عقل سے کام نہ لیتی۔ عین وقت پر مجھے خیال آگیا کہ انھوں نے ہماری گاڑی کا نمبر دیکھ لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "پھر۔ تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتی۔ ایک نلکا نظر آگیا مجھے۔ میں نے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور نلکے سے پانی لے کر گیلی کر لی۔"

"وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کسی نے دیکھا نہیں تمھیں؟"

"میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھا۔" وہ بولی۔ "دائیں بائیں جو گاڑیاں تھیں، ان کے تو ڈرائیور ہی موجود نہیں تھے اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے یہ کام کیا تھا۔ کسی نے دیکھا ہوگا تو سمجھا ہوگا کہ میں ہاتھ دھو رہی ہوں۔ پھر میں نے ایک نمبر پلیٹ پر ہاتھ پھیر دیا۔ جو سامنے تھی۔ دوسری آگے تھی اور اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ گاڑی کا اگلا بمپر دیوار سے صرف چھ انچ دور تھا۔ جس پر مٹی کا رنگ پھیرا تھا، وہ نمبر پلیٹ نہیں پڑھی جاتی تھی۔"

"مگر وہ مشتبہ ضرور نظر آنے لگی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "باہر کوئی بھی شک میں مبتلا ہو کے پیچھے لگ جاتا تو۔"

"پہلے تو میں ایسے راستے سے آئی تھی جہاں ٹریفک پولیس کے ملنے کا ڈر نہیں تھا۔" وہ ہنسی۔ "کوئی مل جاتا سامنے سے تو اسے کوئی شک کی بات نظر نہ آتی۔ پھر آدھے راستے میں ایک جگہ رک کے میں نے مٹی کو کپڑے سے صاف کر دیا تھا۔ اب دیکھ لیں آپ۔"

میں نے مانکروبس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر شیر علی کو دیکھا۔ وہ جولی کو پُرستائش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ستائش کے اس انداز میں مجھے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ صرف جولی کی ذہانت اور ہمت سے متاثر نظر آتا تھا۔ مگر جولی کو احساس ہوا کہ شیر علی کی نگاہیں اس پر ہیں تو اس کے گالوں میں حیا کی لالی مسکرانے لگی اور اس کی آنکھیں بھی شوخ اور بے باک ہو گئیں۔ شیر علی سرخ و سفید پٹھان، وجیہہ و شکیل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس کی متانت آمیز خاموشی کی عادت میں بھی ایک وقار تھا۔ اپنے کردار کے اوصاف سے وہ پہلے ہی خود کو بااعتبار ثابت کر چکا تھا چنانچہ جولی اگر اس سے متاثر ہو گئی تھی تو یہ کوئی حیران کن

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بات نہیں تھی۔ اسے دل جوئی اور سہارے کی ضرورت تھی۔ ستم گر وقت نے اس کو بڑے دھوکے دیے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو دو حصّوں میں بٹا ہوا پایا تھا۔ اس کی ماں کا مذہب الگ تھا اور باپ کا الگ۔ پھر باپ کی بھی شخصیت کے دو روپ تھے۔ وہ بہرام دادا کے روپ میں ایسا ڈاکو تھا جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے لیکن گھر میں وہ ایک فراخ دل انسان، محبت کرنے والا شوہر اور بیٹی پر مرنے والا باپ تھا۔ جولی کے ذہن میں نیکی بدی اور عذاب و ثواب کے تصوّرات خلط ملط ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے وجود کی یہ داخلی کشمکش باپ کی موت سے ختم ہوئی تو خود اس کی اپنی موت عالمِ شباب کی امنگوں اور خوشیوں کی دشمن بن کے سامنے آ گئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے جینے کے عذاب سے نجات کی دعائیں مانگنا بھی چھوڑ دی تھیں کیونکہ دعا بھی بے اثر ہو گئی تھی مگر اسی وقت قدرت نے اجل کو واپس بلا لیا اور اسے ایک نئی زیادہ پُر امید اور پُر مسرت زندگی کی طرف لوٹا دیا مگر یہ خوشی بھی اسے راس نہ آئی اور ماں کے مرتے ہی وہ تنہا رہ گئی لیکن وہ ایک حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ہمارے درمیان رہ کے اس نے خلوص اور محبت کے حقیقی رشتوں کو محسوس کیا اور اپنی زندگی کی گم ہو جانے والی خوشیاں پھر حاصل کرنے کی جدّوجہد میں مصروف ہو گئی۔ خوشی کا ایک انداز چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو میں بھی زندہ تھا۔ ہر نوجوان لڑکی کے جذبات اس کے دل میں بھی سلگتے تھے اور اس کے خوابوں میں بھی رنگ بھرتے تھے۔ کیا تاریخ اتنی جلدی اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ کیتھرین کے روپ میں جولی اور بہرام دادا کے روپ میں شیر علی محبت کی ایک اور داستان رقم کریں گے اور ثابت کریں گے کہ عشق کا مذہب کوئی نہیں ہوتا۔

ٹریلر کے اندر آخری حصّے کا روشندان کھلا ہوا تھا۔ اس کے بالکل نیچے فرش پر کوئی چادر تانے سو رہا تھا۔ یہ ٹیڈی تھا۔ استاد ٹیڈی۔ خوجی۔ خواجہ نیک محمد۔ ہمارا وہ یار جس نے سب سے بڑھ کر یاری کا حق ادا کیا۔ میں اور محسن تو بچپن کے دوست تھے۔ استاد ٹیڈی سے ہماری دوستی کی عمر بہت کم تھی مگر اس نے برق رفتاری سے پیش قدمی کی تھی اور اب دوستی کی اسی منزل پر تھا جہاں ہم سب اکٹھے تھے۔

فرطِ جذبات نے میری آواز روک لی۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا اور اسے کچھ دیر ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا: "ٹیڈی!" مگر چادر کے نیچے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ دوسری بار میں نے اسے زیادہ بلند آواز میں پکارا لیکن وہ بہت گہری نیند میں معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے جگانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اٹھا ہی تھا کہ جولی میرے پاس آ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی مجرمانہ خاموشی دیکھ کر میں نے کہا: "جولی!"

"بھائی! مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ یہ بتانے کی۔" وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

"کیا بتانے کی؟" میں نے دل میں اترنے والے خوف سے لرز کر کہا۔

"آپ۔ آپ نے دیکھا نہیں۔" جولی نے آنسوؤں کے دریا سے سر اٹھایا۔

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا اور پھر بیٹھ گیا۔ میرے ایک ہاتھ نے جھٹکے سے چادر ہٹا دی۔ نیچے ٹیڈی آنکھیں کھولے ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ زبردستی مسکرایا۔ ٹیڈی کے گال پچک گئے تھے اور آنکھیں گہرے گڑھوں میں دھنس گئی تھیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس کی یہ حالت جسمانی تشدد کا نتیجہ ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں کے سہارے پر اٹھا اور میرے گلے میں جھول گیا۔ اس کے گرم گرم آنسو میری گردن پر گرے۔

"ٹیڈی! میری جان۔ اب رونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب پھر ساتھ ہیں۔" میں نے کہا اور اس کے کندھے کو تھپکتا رہا۔ "مجھے معلوم ہے تم نے بہت سختی جھیلی ہے لیکن خدا کا ہزار شکر ہے کہ ہم تمھیں ان سفاک دشمنوں سے چھین لانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک نہ ایک دن ہم ان کے ہر ظلم کا حساب بے باق کریں گے۔ ابھی ان کا وقت ہے لیکن وقت ہمیشہ ان کا نہیں رہے گا۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا ہی بول رہا ہوں۔ ٹیڈی تو خاموشی سے آنسو بہانے اور کانپنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا۔

"ٹیڈی! تم بولتے کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "جب میں نے تم کو آواز دی تھی تب بھی تم نے جواب نہیں دیا تھا حالانکہ تم جاگ رہے تھے۔ کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟ ٹیڈی! کیا بات ہے۔ جواب دو مجھے ٹیڈی۔" میں نے اسے زور زور سے جھنجوڑنا شروع کیا۔

ٹیڈی زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کے جولی کی طرف دیکھا..."کیا۔ یہ بول نہیں سکتا؟"

"بھائی! یہ سن بھی نہیں سکتے۔" جولی نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں۔ کیا ہوا ہے تمھیں ٹیڈی؟" میں نے چلّا کے کہا۔ "زبان تو ہے تمھارے منہ میں۔ پھر تم کیوں نہیں بول سکتے۔ بولو۔ بولو ٹیڈی؟"

"بھائی! خود پر قابو رکھیں۔" جولی نے کہا۔ "ان کی یہ حالت دشمنوں نے کی ہے۔ محسن اور غالب کسی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہیں جو غالب کے والد کے دوست تھے۔ ان کے پاس رابعہ باجی بھی رہی تھیں۔ بھائی نیک محمد کو بھی وہ وہیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس حالت میں انھیں ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ ممکن ہے یہ معذوری عارضی ہو اور علاج سے یہ ٹھیک ہو جائیں۔"

جولی بول رہی تھی اور میں ٹیڈی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے پھر سیدھا لٹا دیا تھا اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دل کا درد آنسوؤں کی زبان میں بیان کر رہے تھے۔ میرے دل میں رنج و غم کا ایک آتش فشاں ابل رہا تھا مگر اس کی تپش میرا ہی خون جلا رہی تھی۔ میں ٹیڈی کا بدلہ کسی سے نہیں لے سکتا تھا۔ میں انھیں جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچ جائیں تو میں ایک ایک کے گوشت پوست کے ریشے بکھیر دوں اور ان کو خاک میں ملا کے نیست و نابود کر دوں مگر بے بسی کا احساس مجھے پاگل کر رہا تھا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اسے اغوا کر کے لے جانے والے کون تھے اور اس کے ساتھ رابعہ اور کیتھرین کو کہاں لے گئے تھے۔ رابعہ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ قید میں ہے یا آزاد ہے۔ کیتھرین مر چکی تھی اور ٹیڈی لوٹ کر آیا تھا تو اپنی مظلومیت کی لہو رُلانے والی تصویر بنا پڑا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے بھی صبر کا دامن امید سے باندھا اور میرے صدمے کی شدّت میں دیوانگی نہ رہی۔ ٹیڈی سن نہیں سکتا تھا مگر میں نے اسے ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا حالانکہ میرا اپنا یقین ایک آرزو کے سوا کچھ نہ تھا۔

"جولی! وہ اسے اپنے ساتھ گاڑی میں کیوں نہیں لے گئے؟" میں نے کہا۔

"وہ معلوم کرنے گئے ہیں۔" جولی نے کہا۔ "کہ بھائی نیک محمد کو کہاں چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب نہ ملے۔ یا انھوں نے پس و پیش کیا تو پھر شاید وہ انکل رضوی سے بات کریں گے۔"

"انکل رضوی سے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔ شہلا باجی بھی ہیں وہاں۔"

"لیکن۔ شہلا کی بات اور ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹیڈی تو ان کی نظر میں ایک مجرم ہوگا۔"

"بھائی! وہ اب ایس ایس پی نہیں رہے۔"

"مگر ان کی سوچ تو نہیں بدلی ہوگی۔ اس کے علاوہ۔ ایک شہلا ہی کیا کم بوجھ تھی ان پر۔ کہ ایک معذور اپاہج کی ذمّے داری بھی ان پر ڈال دی جائے۔"

"یہ بات نہیں بھائی سکندر۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شہلا باجی کے ساتھ خوش رہیں گے اور کہیں نہیں۔ وہ ان کا خیال رکھ لیں گی اور اگر خدا نے چاہا تو یہ ٹھیک ہو جانے کے بعد شہلا باجی کی دیکھ بھال کریں گے اور ان کے بچے کے ساتھ ان کا دل لگ جائے گا۔ اگر ان کے ذہن پر نفسیاتی صدمہ ہوگا تو اس کا اثر زائل کرنے کے لیے سب سے سازگار ماحول وہیں مل سکتا ہے۔ انھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا تھا کہ دونوں میں سے ایک جگہ ٹھیک رہے گی۔"

"بشرطیکہ انکل رضوی نے ایک مجرم کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا۔" میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہ ہوا تو میں یہاں رک جاؤں گی۔" جولی نے کہا۔ "جب تک بھائی نیک محمد ٹھیک نہیں ہو جاتے یہ کسی اسپتال میں داخل رہیں گے اور میں..."

"نہیں۔ پھر ہم سب ساتھ رہیں گے۔" میں نے کہا۔ "ٹیڈی کا علاج ہمارے ساتھ رہ کے بھی ہو سکتا ہے۔"

"انکل رضوی مان جائیں گے بھائی۔" وہ بولی۔ "میں نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ بھائی محسن کہہ رہے تھے کہ ان کی رہائش وہیں رہے گی۔ انکل رضوی کی۔ ان کے مکان کا کچھ بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ جو آپ کے وکیل دوست ہیں، ان کی معرفت۔ وہ اب براہِ راست مالک مکان کو کرایہ دیتے رہیں گے۔"

"چلو یہ اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم نے ٹیڈی کو کھانے کے لیے کچھ دیا ہے۔ یہ بہت کمزور ہو رہا ہے۔"

"میں تھوڑا سا جوس اور سوپ دے چکی ہوں۔" وہ بولی۔

ٹیڈی سونے لگا تھا۔ اس کے نزدیک ہماری سب گفتگو بے معنی تھی۔ وہ ہمارے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہم اسی کے بارے میں بات کر رہے ہیں مگر وہ خود خاموشی سے پلکیں جھپکانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ٹیڈی پاگل نہیں ہوا تھا، اندھا نہیں ہوا تھا اور یادداشت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ میں باہر نکلا تو شیر علی اکیلا چارپائی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو شیر علی؟" میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"کچھ نہیں سکندر صاحب۔ اتنی بہت سی باتیں ہیں جو مجھے معلوم نہیں اور میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا۔" وہ بولا۔

"آہستہ آہستہ سب معلوم ہو جائے گا تمھیں بھی۔" میں نے کہا۔ "تم اب ہمارے ساتھ ہو تو تم سے ہم کچھ نہیں چھپا سکتے۔"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا سکندر صاحب۔ یہ جو سب نے ایک سا حلیہ بنا لیا ہے۔" وہ بولا۔ "دو کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ مگر ایک سے تین افراد سب کو متوجہ کرتے ہیں۔ آپ برا مت مانیں میری بات کا۔"

"صاف گوئی کا ہم میں سے کوئی برا نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ اس قتل کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟"

"کوئی خاص بات نہیں جی۔" شیر علی نے کہا۔ "قاتل کو کسی نے بھی نہیں دیکھا لیکن خیال ہے کہ یہاں دو چار دن سے ایک ملنگ قسم کا جو فقیر بیٹھنے لگا تھا، وہی قتل کر کے فرار ہو گیا۔"

"قتل کا سبب بھی کچھ پتا چلا؟"

شیر علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے براہِ راست تو کسی سے کچھ نہیں پوچھا لیکن باتیں سن کے اندازہ لگایا ہے کہ ڈرائیور پرانا تھا اور اکثر اس راستے پر چلتا تھا۔ سب ہی جانتے تھے اسے۔"

"اور اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟"

"رائے اچھی رکھتے تھے۔" شیر علی نے کہا۔ "نیک اور نمازی آدمی تھا۔ یہاں سے کراچی مال لے جاتا تھا۔ جیسا موسم ہو ویسا مال جاتا تھا۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"تمھارا مطلب ہے سبزی پھل انڈے۔" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔" شیر علی نے کہا۔

"کیا وہ عبداللہ اینڈ سنز کا ملازم تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ بھی ٹھیک بتایا آپ نے۔" شیر علی بولا۔"کمپنی کا مالک آپ کے جانے کے بعد آیا تھا۔ اس نے پولیس سے سارا معاملہ طے کر لیا۔"

"کون تھا وہ سیٹھ۔ ایک موٹا تازہ پلا ہوا سانڈ؟" میں نے کہا۔ "جس نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے بہت بڑی داڑھی چہرے پر سجا رکھی تھی اور تسبیح ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی مٹیالے رنگ کی ٹوپوٹا کرونا میں۔"

"ہاں جناب۔ آپ جانتے ہیں اسے؟"

"شیطان کو کون نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔"خیر تم بتاؤ کہ ٹرک میں آج کیا مال تھا؟"

"کم سے کم ایک کریٹ میں پھل نہیں تھے۔" شیر علی نے کہا۔"اس کا پتا یوں چلا کہ ڈرائیور کو بتائے بغیر دو چھوکرے ٹرک پر چڑھ گئے۔ ایک تو وہی گیراج والا لڑکا تھا جس سے آپ نے بات کی تھی۔ وہ غالباً اس قسم کی چوری کرتے رہتے ہیں ہر وقت یہاں رہتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ کس ٹرک میں کیا مال ہوگا۔ ایک پیٹی انڈوں کی غائب کر دی یا ایک کریٹ پھلوں کا اتار لیا۔ کھاتے کتنا ہوں گے کسی کو بیچ دیتے ہوں گے۔ ایک پورے ٹرک میں سے جو اوپر تک بھرا ہوا ہو ایک پیٹی نکل جائے تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"مال بھیجنے والے اتنے بے وقوف تو نہیں ہوتے شیر علی۔ وہ گن کر پیٹیاں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ فوراً پتا نہیں چلتا۔" شیر علی نے وضاحت کی۔ "کراچی پہنچنے کے بعد مال اتارتے وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ یہ تو مالکوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ڈرائیور پر اعتبار کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک پیٹی مال کچھ نہیں۔ پیٹی راستے میں گر بھی جاتی ہے۔ کسی کو ندرانے میں بھی دینی پڑ جاتی ہے۔ مال چڑھاتے ہوئے گنتی غلط ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں لونڈے جب پیٹی اٹھانے گئے تو ان کو پسینہ آگیا۔ پیٹی بہت زیادہ وزنی تھی۔ پھلوں یا انڈوں کے وزن کا تو انھیں اندازہ تھا۔ وہ حیران ہوئے ہوں گے کہ اس میں کیا ہے اور تجسس میں انھوں نے ایک کونا کسی پیچ کس سے اٹھا کے دیکھ لیا۔ اس میں پستول اور ریوالور بھرے ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ گھبرائے۔ پھر انھوں نے ایک ایک پستول نکال لیا۔ یہاں کی بڑی بے وقوفی تھی۔ انھوں نے معلوم نہیں کیا سوچا تھا۔ یہ کہ بعد میں کسی کو بیچ دیں گے یا وہ پستول ہاتھ میں لے کر خود کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے جس سے یہ محنت مزدوری کا چکر ختم ہو جائے اور وہ عیش سے زندگی گزار دیں۔ وہ جو ملنگ فقیر سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا تھا، اس نے ان کو ٹرک سے اترتا ہوا دیکھ لیا اور چلّانے لگا۔"چور۔ چور۔" لڑکے گھبرا گئے اور پستول پھینک کر بھاگ گئے۔ ملنگ نے دونوں پستول اٹھائے اور سڑک کے بیچ میں ناچنے لگا۔ دونوں پستول اس نے دو ہاتھوں میں اوپر اٹھا رکھے تھے اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ پستولوں میں گولیاں نہیں تھیں۔ وہ منہ سے ٹھاہ۔ ٹھاہ کی آوازیں نکال رہا تھا۔ دوسرے لوگوں نے اسے پکڑا اور اس سے ریوالور چھین لیے۔ اس سے بہت پوچھا گیا کہ یہ کہاں سے آئے مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہتا رہا کہ چور آئے تھے چوری کرنے۔ ڈاکوؤں کے گھر میں۔ اس کا مطلب کسی نے نہیں سمجھا۔ چونکہ بالکل نئے اور غیر ملکی ساخت کے ریوالور تھے اس لیے ملنگ کو تو پاگل جان کر چھوڑ دیا گیا۔ ریوالور چھیننے والوں نے ہر ڈرائیور سے پوچھا۔ بادشاہ گل نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔"

"ان لڑکوں نے کچھ نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔

"وہ پہلے تو بھاگ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے استاد کو بتانا مناسب سمجھا اور استاد نے ان کو مارا اور کہا کہ خبردار جو منہ سے ایک لفظ بھی نکالا۔ اندر ہو جاؤ گے سالو! اس نے گل بادشاہ کو الگ بلا کے اس سے بات کی۔ گل بادشاہ نے کہا کہ تم بکتے ہو۔ گیراج کے مالک نے کہا کہ پہلے دیکھ لو۔ تمھاری کوئی پیٹی کھلی ہوئی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے خود تمھیں بھی علم نہ ہو کسی نے اپنا مال بیچ میں ڈال دیا ہو۔ اس پر گل بادشاہ اوپر چڑھا اور اس نے درمیان کی ایک پیٹی کو تھوڑا سا کھلا ہوا پایا۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اس نے نیچے آکر گیراج والے سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ پولیس کو اطلاع دے دو۔ ورنہ تم پھنس جاؤ گے کہیں۔"

"اور وہ دو ریوالور کہاں گئے؟" میں نے کہا۔

"سنا ہے وہ ہاتھوں ہی ہاتھوں میں غائب ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایک سے دوسرے ہاتھ میں گیا اور دوسرے سے تیسرے کے ہاتھ میں، اور معلوم نہیں کس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی کہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ کچھ لوگ اسی وقت ٹرکوں سے اتر کے آئے تھے اور کچھ جا رہے تھے، اسی میں گڑبڑ ہو گئی۔" شیر علی نے کہا۔"گل بادشاہ نے بالآخر اپنے مالکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ پہلے سارا معاملہ ان کے علم میں لانا چاہتا تھا۔ وہ ٹرک میں سے کوئی نوٹ بک نکالنے گیا تھا جس میں ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا اور جب کافی دیر گزر گئی تو گیراج والے نے ہی جا کے دیکھا۔"

"اندازاً کتنی دیر کے بعد؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم جناب۔" شیر علی نے کہا۔

میں نے کہا۔"کیا یہ گیراج والے کا بیان ہے؟"

"ہاں جی۔ اس نے سب کچھ پولیس کو سچ سچ بتا دیا تھا۔ پولیس تو اسے اپنے ساتھ لے جاتی مگر جب سیٹھ آیا تو اس نے کہا کہ بابا سچ بولنے والے کو پکڑتے ہو۔ چور کو پکڑو۔"

میں نے کہا۔"کون چور۔ وہ دونوں لڑکے؟"

شیر علی نے کہا۔"ان کا تو نام پتا لکھوا دیا تھا استاد نے سیٹھ کو ان غائب ہو جانے والے پستولوں کی فکر تھی۔ مگر وہ کس کس کو پکڑتے۔ وہاں تو رات بھر ٹرک آتے جاتے رہے تھے۔ دونوں طرف سے۔"

"وہ لڑکے تو مارے گئے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مگر تم کہتے ہو کہ قتل کا شک اس ملنگ پر کیا گیا۔ آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ واردات کے کچھ دیر بعد ہی وہ غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ غائب نہیں ہوا، اسے اٹھا لیا گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔"تم نے بہت کچھ معلوم کر لیا شیر علی۔ پولیس نے تم سے بھی تو کچھ پوچھا ہوگا؟"

"ہاں جی۔ پوچھا تھا۔" شیر علی نے کہا۔" میں نے بتا دیا کہ مرحوم گل بادشاہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم اس کی لاش لے جاؤ۔ لیکن میں نے کہا کہ جی یہ مالکوں کی ذمّے داری ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی پڑوسی کے گھر جاؤں تو اس کی لاش لے کر۔ وہ جو حاجی صاحب تھا، اس نے میری بات مان لی۔"

"تم سے نہیں پوچھا گیا کہ کون ہو اور کیا کرتے ہو؟"

"پوچھا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ پہلے کس کے پاس تھا اور اب بے روزگار ہوں۔" شیر علی نے کہا۔" اسی لیے یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا۔"بہت سے لوگوں نے تم کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔"

"میں نے کہا کہ اس کمپنی میں جگہ خالی ہے۔ مالک آئیں گے تو بات کروں گا۔ میں نے تو حاجی صاحب سے بھی کہا تھا کہ مجھے رکھ لیں۔ وہ مجھے شرمندہ کرنے لگے کہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمھارا پڑوسی مارا گیا۔ تم اس کی میت نہیں لے جا سکتے۔ اس کا ٹرک لے جانے کے لیے بے تاب ہو۔ اس کی موت تمھارے لیے روزگار کی خوش خبری۔ وہ بک بک کرتا رہا کہ یہ حالت ہے ہمارے اخلاق و کردار کی۔ مجھے غصّہ تو بہت آیا مگر میں اصل بات سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ پر کیسے بھروسا کر لیتا۔ اب اس کا اپنا کوئی آدمی آئے گا تو ٹرک لے جائے گا۔ وہ حاجی صاحب بہت مکار آدمی تھا۔ اس نے فوراً پولیس کی ساری کارروائی ختم کرا دی اور سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بات بات پر تو وہ تقریر شروع کر دیتا تھا کہ سب اس کی رضا کے سامنے مجبور ہیں اور آدمی کو صبر شکر اختیار کرنا چاہیے۔ مرحوم کا وقت آگیا تھا۔ وقت ہم میں سے کسی کا بھی آسکتا ہے۔ اس کے ورثا کو میں خود معاوضہ ادا کرنے جاؤں گا۔ خبیث۔ جان کے معاوضے کی بات کرتا تھا۔ اس کا مقصد معاملے کو جلد از جلد ختم کرنا تھا اور اس میں وہ کامیاب رہا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے تو شاید پرچا بھی نہیں کٹنے دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔" پولیس گواہوں کو لے گئی تھی۔"

"نہیں۔ کسی کو نہیں۔" شیر علی نے کہا۔"حاجی صاحب نے کہا کہ بس نام پتے لکھ لو اور ضرورت پڑے گی تو بیان کے لیے بلا لیں گے۔ پولیس تو اس کے حکم پر چلتی تھی جناب۔ جیسے وہ افسر ہے ان کا۔"

"کچھ ایسا ہی ہے شیر علی۔ افسروں کا افسر اُن کے ساتھ ہے اور حاجی صاحب کے پاس پیسہ ہے۔ وہ معاملے کی اس حد تک تشہیر نہیں چاہتے تھے کہ بات اخبار والوں تک پہنچے۔ وہ فرداً فرداً ہر چشم دید گواہ کو بلا کے زبان بند رکھنے کے فائدے اور سچ کا اظہار کرنے کے نقصانات بتا دیں گے۔ اس ملنگ کا غائب ہو جانا البتہ ایک پُراسرار معاملہ ہے۔ وہ پاگل تھا تو اس پر قاتل ہونے کا الزام عائد کرنا بھی پاگل پن ہے۔ یا تو وہ پاگل نہیں تھا۔ کوئی واقفِ حال تھا جسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ یا وہ خود صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے روپوش ہو گیا۔"

"کیا وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے۔ اور وہ سچ مچ پاگل تھا تو تفتیش کو یہیں روکنے کے لیے اسے قاتل قرار دے دیا گیا تاکہ کسی اور پر الزام ہی نہ آئے۔ اصل بات کیا ہے، یہ وہی جانتے ہوں گے۔ ہم تو صرف اندازہ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے لیکن ابھی تک نہ محسن کا کچھ پتا تھا اور نہ غالب کا۔ ادھر میرا دماغ دوسرے راستے پر چل نکلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ ٹرک اب پھر رات کی تاریکی میں روانہ ہوگا۔ اس کے لیے رات کو حاجی صاحب خود کسی قابلِ اعتماد ڈرائیور کو بھیج دیں گے۔ ٹرک دن میں اس لیے نہیں جا سکتا تھا کہ دن میں راستوں کی نگرانی کرنے والے دوسرے لوگ ہوں گے۔ جن سے اس ٹرک کو گزارنے کی بات طے تھی، وہ اب وہ پھر رات کو ہی ڈیوٹی پر ملیں گے۔ حاجی صاحب انھیں بتا دیں گے کہ گزشتہ رات ٹرک کیوں نہیں پہنچا تھا اور وہی ٹرک آج کون لے کر جائے گا۔

"شیر علی!" میں نے کہا۔"گاڑی لے کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں جناب۔" شیر علی نے کہا۔"جولی کو بھی لینا ہے ساتھ؟"

میں نے کہا۔"نہیں۔ جولی یہاں رہے گی۔ ٹیڈی کی دیکھ بھال کے لیے۔"

"اگر۔ تھوڑی دیر انتظار کر لیتے... جولی کو اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں ہے کچھ...."

"کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے، یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں شیر علی۔" میں نے کہا۔"جولی اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور میں تم کو ایک خاص کام سے لے جا رہا ہوں۔ تم ایک گھنٹے میں واپس آجاؤ گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" وہ بولا۔"آپ جولی کو بتا دیں۔"

"یار تم کو جولی کی بہت فکر ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ تاکہ اس کی شرمندگی کچھ کم ہو جائے۔ میں نے جولی سے کہا کہ میں ایک ٹیلی فون کرنے جا رہا ہوں اور آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گا پھر میں شیر علی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شیر علی نے گاڑی کو موڑنا چاہا تو میں نے کہا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"گاڑی کو آگے لے جاؤ ۔ ملتان کی طرف ۔"

شیر علی نے کوئی سوال کیے بغیر گاڑی کو پھر موڑا اور ہم ٹریلر کی اوٹ سے نکل کے تھوڑا سا کچا راستہ طے کرنے کے بعد سڑک پر آ گئے۔

آدھے گھنٹے میں گاڑی تیس میل دور آ چکی تھی اور میں دونوں طرف کے علاقے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک پٹرول پمپ گزرا تو میں نے شیر علی سے کہا۔

"گاڑی ایک طرف کھڑی کر لو۔ مجھے یہاں اترنا ہے۔"

شیر علی نے تعمیل کی۔ "محسن صاحب کو اور دوسروں کو کیا بتاؤں جناب؟"

میں نے کہا۔ "صرف یہ کہ میں کسی ضروری کام سے گیا ہوں۔ دو چار دن بعد لوٹوں گا۔"

شیر علی نے کہا۔ "کیا میں یہ بھی نہ بتاؤں کہ آپ کہاں اترے تھے؟"

"بتا دینا۔ لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسی جگہ تو نہیں کھڑا رہوں گا۔ تم کو کچھ اور بھی کہنا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اب تم لوگ بھی وہاں سے کوچ کرو۔ وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ وہاں آتے جاتے ٹرک ڈرائیور سب ہی اتنے بڑے ٹریلر کو دیکھ چکے ہیں۔ ٹریلر کوئی انوکھی چیز نہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس ٹریلر کو کچھ لوگ پہچانتے ہوں۔ جس کمپنی سے یہ ٹریلر خریدا گیا تھا اس کے ٹرک بھی وہاں سے گزرتے ہیں۔ ٹریلر کو آگے لے آؤ۔ پانچ دس میل۔ پھر ویسی ہی کوئی جگہ دیکھ کر کھڑا کر دو۔ سڑک کے کنارے مگر اتنے فاصلے پر کہ ٹریفک میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ کوئی بھی پوچھے تو کہو کہ بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور ایک پُرزہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب کراچی سے وہ پُرزہ آئے گا تو مرمّت ہو گی۔ اس بہانے تم وہاں رک سکتے ہو مگر باقی لوگ اگر ٹریلر سے ہٹ کے کسی جگہ خیمہ لگا کر رہیں تو اچھا ہے۔"

"میں یہ سب سمجھا دوں گا۔" شیر علی نے کہا۔

"دوسری بات۔" میں نے کہا۔ "محسن کو سمجھانا کہ یہ سرکاری گاڑی ہے۔ اس کا شہر میں پھرنا تو شک پیدا نہیں کرتا لیکن ویرانے میں کھڑے ہوئے ایک ٹریلر کے پاس آنا جانا ٹھیک نہیں۔ یا تو اس گاڑی کو کہیں اور کھڑا کریں اور تانگا رکشا میں آئیں جائیں۔ یا گاڑی کا رنگ بدل کے سرکاری محکمے کا نام مٹا دیں۔ تیسری بات یہ کہ جلد از جلد سرکس کے لیے آدمی بھرتی کریں اور تمام ضروری سامان خرید کے سفر کی تیاریاں مکمل کریں۔"

"آپ کی باتوں سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا ارادہ ابھی واپس آنے کا نہیں ہے۔" شیر علی نے کہا۔

"ارادہ تو ہے لیکن ارادے بدل جاتے ہیں یا بدلنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے زیادہ دن لگ جائیں۔" میں نے کہا۔ "تم سب لوگ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ میرا انتظار مت کرنا۔ میں واپس آؤں گا تو خود ہی تم کو تلاش کر لوں گا۔ سرکس جہاں بھی ہو گا اس پاس کے گاؤں دیہات میں اس کی شہرت ہو گی۔"

"آپ کیا اسلحے کے اس ٹرک کے پیچھے جا رہے ہیں؟"

"ہاں شیر علی۔" میں نے کہا۔ "تمھارا اندازہ درست ہے۔"

"اگر آپ کسی کو ساتھ لے جاتے تو کیا ہرج تھا۔" وہ بولا۔ "کم سے کم محسن صاحب کو ساتھ رکھتے۔"

"اس کام کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آخری بات اور سن لو۔ محسن اور غالب سے کہنا کہ خلیفہ پنڈت کی دکان اسے واپس دلوا دیں۔"

"کس کی دکان؟" شیر علی حیرانی سے بولا۔

"خلیفہ پنڈت۔" میں نے کہا۔ "تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہمارا محسن اور دوست ہے جو ہماری مدد کرنے کے جرم میں تباہ ہوا۔ اس کو اپنی دکان تک فروخت کرنی پڑی۔ ممکن ہے موجودہ مالک آسانی سے دکان واپس نہ کرے کیونکہ وہ بہت موقعے کی اور چلتی ہوئی دکان ہے اور اس نے کافی خرچ کیا ہے۔ اسے لاگت سے دُگنے تک کی پیشکش کر دینا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے چالیس ہزار میں دکان خریدی تھی۔ بیس پچیس ہزار اوپر لگائے ہوں گے۔ وہ ڈیڑھ لاکھ تک مان جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ پھر دوسرا طریقہ اختیار کرنا۔"

"دوسرا طریقہ کیا ہو گا؟"

"سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو کیا کرنا پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔ "ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ محسن اور غالب اسے ایک طریقے سے نہ سمجھا سکے تو دوسرے طریقے سے سمجھا لیں گے۔ خلیفہ پنڈت کو اس کا ٹھکانا واپس مل جائے گا تو اس کے دوسرے شاگرد بھی واپس آ جائیں گے۔ جن سے بچھڑنے کا اسے بے حد قلق ہے۔ یاد رہیں گی نا یہ سب باتیں؟"

"میرا حافظہ اتنا خراب نہیں ہے جناب۔" شیر علی نے کہا۔

"اچھا تو ذرا مجھے آموختہ سناؤ۔ کیا کہو گے تم؟" میں نے کہا۔

شیر علی مسکرایا اور اس نے میری ہر بات دُہرا دی۔

"ویری گڈ۔" میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ "اب تم جاؤ لیکن پہلے مجھے چابیاں دو ایک منٹ کے لیے۔"

شیر علی نے چابیاں نکال کے مجھے تھما دیں۔ میں نے پیچھے والا خانہ کھولا اور کچھ دیر سوچتا رہا کہ اپنے لیے کس قسم کا اور کتنا اسلحہ نکالوں۔ پھر میں نے ایک ریوالور اور چار راؤنڈ نکال لیے۔ شیر علی نے یہ اسلحہ خانہ پہلی بار دیکھا تھا مگر اب تک وہ ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ اس کے لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ خانے کو مقفل کر کے میں نے چابیاں شیر علی کے ہاتھ پر رکھ دیں اور سائڈ کا دروازہ کھولا۔ دلاور سے وصول ہونے والی ساری رقم اس سوٹ کیس میں ہی تھی جو گاڑی کے پچھلے حصّے میں پڑا رہتا تھا۔ تقریباً نصف رقم ہم نے ٹریلر اور مائکرو بس خریدنے میں صرف کر دی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اب بھی ساڑھے چار لاکھ باقی تھے۔ اس میں سے میں نے صرف ایک گڈی نکالی اور سوٹ کیس کو شیر علی کے سامنے ہی بند کر دیا۔ دس ہزار کی رقم میری کسی بھی فوری ضرورت کی کفالت کے لیے کافی تھی۔

"اچھا۔ اب خدا حافظ۔" میں نے پھر شیر علی سے ہاتھ ملایا۔

"خدا حافظ۔" شیر علی نے کہا۔ "جلد واپس آنے کی کوشش تو کریں گے آپ!"

"ہاں بھئی۔ تم سب سے دور اور اکیلا میں کیا کر سکتا ہوں اور کیسے رہ سکتا ہوں۔"

"یہاں سب آپ کے لیے فکر مند رہیں گے۔" وہ بولا۔ "آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اپنی خیریت کی اطلاع دیتے رہیں۔"

"میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "کہ محسن کے لیے کہیں پیغام چھوڑ دوں۔ منظر کے پاس یا ڈاکٹر سلامت کے پاس۔ میجر سلطان کے گھر کے فون پر یا خلیفہ پنڈت کے پاس۔ ایک فون میں لے جا رہا ہوں۔ دوسرا محسن کے پاس ہو گا۔ وہ معلوم کرتا رہے۔"

تیسری بار خدا حافظ کہنے کے بعد شیر علی نے گاڑی کو واپس موڑا تو رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم شاید پندرہ بیس منٹ تک ایک ہی جگہ ٹھہرے تھے اور اس وقفے میں پندرہ بیس گاڑیاں ایک طرف سے اور اتنی ہی دوسری طرف سے گزر گئی تھیں۔ ان میں بسیں کاریں اور ٹرک سب ہی شامل تھے۔ جب میں تنہا رہ گیا تو میں نے سڑک سے ہٹ کر درختوں کی قطار کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ٹرک رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رات کے وقت اس ایک ٹرک کو پہچان کر روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا۔ اندھیرے میں تو صرف ہیڈ لائٹس نظر آتی ہیں اور دور سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ لائٹس کسی بس کی ہیں یا ٹرک کی۔ ہر بس اور ٹرک کو روکنا کیسے ممکن ہو گا۔

تقریباً ایک میل آگے جانے کے بعد میں نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف سے واپس ہوا۔ میرا ذہن بدستور الجھن میں مبتلا تھا کہ میں نے ایک خشک ہو جانے والے درخت کا کھوکھلا تنا دیکھا جو نہ جانے کب سے گرا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلا کے دیکھا۔ یہ بہت ہلکا تھا۔ چھ سات فٹ لمبا اور ڈیڑھ دو فٹ موٹا لکڑی کا لٹھا مجھ سے دُگنا وزنی ضرور ہوتا مگر دیمک نے اسے اندر سے چاٹ لیا تھا۔ اس کا وزن اب دس سیر بھی نہیں رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ترکیب میرے دماغ میں آ گئی۔ تجربے کے لیے میں نے کھوکھلے تنے کو خالی سڑک کے بیچ میں ڈال دیا اور خود چھپ کے بیٹھ گیا۔ لاہور کی طرف سے آنے والی ایک بس کے ڈرائیور نے قریب آ کے بریک لگائے۔ نیچے اتر کے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر جلدی سے لٹھے کو ایک طرف پھینکا اور بس کو نکال لے گیا۔ عام طور پر اس طرح بس کو ڈاکو روکتے ہیں۔ ڈرائیور کے لیے بس کو سائڈ سے نکال کے لے جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ وہیں ایک خشک برساتی نالے کی پلیا تھی جس نے راستے کو محدود کر دیا تھا۔ دوسرے درخت کا تنا بہت اونچا اور بھاری بھر کم دکھائی دیتا تھا اور کوئی ڈرائیور بھی یہ ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ بس کو اس کے اوپر سے گزار کر لے جائے۔ بس ڈرائیور نے خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ یہ کسی کی شرارت تھی۔ راستہ روکنے والے ڈاکو نہیں تھے۔

وقفے وقفے سے میں نے تین بار تجربہ کیا اور ہر بار یہی ہوا کہ بس یا ٹرک کے ڈرائیور نے نیچے اتر کے درخت کے تنے کو ہٹایا اور یہ حرکت کرنے والے کے نام کوئی گالی دے کر وقت ضائع کیے بغیر بھاگ گیا۔ یہ کام خطرناک بھی تھا۔ کوئی مجھے درخت کو سڑک پر رکھتے ہوئے دیکھ لیتا تو مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا۔ رات کے وقت سفر کرنے والے ٹرک اور بس ڈرائیور عموماً مسلح ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک ساتھ دو تین ٹرک اور بسیں رک جائیں۔ اور یہ بھی کہ کوئی راستے کی رکاوٹ کو ہٹانے کے بعد لکڑی کے کھوکھلے تنے کو بھی اٹھا لے جائے کہ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔

میری گھڑی میں ابھی ساڑھے آٹھ بھی نہیں بجے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کم سے کم ڈیڑھ گھنٹا اور اسی طرح گزارنا تھا۔ مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ شام سے کچھ دیر قبل ہی میں نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ پیاس میں برداشت کر سکتا تھا۔ تقریباً ایک میل دور مجھے پٹرول پمپ کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف تا حدِ نگاہ چھدرے درختوں والا جنگل تھا اور رات کا اندھیرا تھا۔ میں نے ایک درخت کا انتخاب کیا اور اوپر دو شاخے کی صورت میں پھیلے ہوئے تنے پر پاؤں پھیلا کے اور کمر لگا کے بیٹھ گیا۔ ایک سگریٹ جلا کے میں نے پہلا کش لیا اور سوچنے لگا کہ میرے اس اقدام کا محسن اور غالب کیا مطلب نکالیں گے۔

میں نے شیر علی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ میرا ارادہ اسلحے کے ٹرک کا پیچھا کرنے کے علاوہ بھی کچھ کرنے کا ہے۔ محسن یقیناً خفا ہو گا کہ ایک ٹرک کو روکنے یا اس پر قبضہ کرنے کے لیے میں کسی سے مشورہ کیے بغیر چل پڑا۔ یہ کام تو ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے اتنی افرا تفری میں روانہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل بات میں انھیں اس لیے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ پھر وہ مجھے روکتے اور مجھے قائل کرنے کے لیے دلائل دیتے، مجھے سمجھاتے کہ یوں رابعہ کو واپس لانے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم دشمنوں سے نمٹنے کے مشن کو بھول کر ایک عورت کو بچانے کے مشن کو زیادہ اہم سمجھیں۔

رابعہ ان کے لیے ایک عورت تھی۔ پہلے میں نے بھی اس خیال سے سمجھوتا کرنے کے لیے اپنے دل کو پتھر کیا اور جذبات کو عقل پر غالب نہیں آنے دیا تھا مگر اس کی آواز سننے کے بعد میرے لیے یہ سمجھوتا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا۔ بے شک وہ ہمارا مشن نہیں تھی مگر وہ مشن کا ایک حصّہ تو تھی۔ ہم نے اس کی رہائی کے لیے جو پلان بنایا تھا' وہ ناکام ہو گیا تھا۔ عاشی مر گئی تھی اور زیب النسا ہمیں جُل دے کر نکل گئی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

...ورنہ ہم رالعہ کو بھی اسی طرح حاصل کر لیتے جیسے ٹیڈی کو واپس لینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب مجھے رالعہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ غیر محفوظ محسوس ہوتی تھی۔ اس کی آزادی کا سودا کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ شکاری تھے جو ایک بار مجبور ہو گئے تھے کہ اپنا شکار ہمارے حوالے کر دیں۔ مگر رالعہ اب بھی ان کے پاس تھی۔ اس کی آزادی کا یقین ادھورا تھا۔

اس ادھورے یقین نے میرے دل کو ایک ایسی خلش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے مجھے سوتے جاگتے دن رات کے کسی لمحے قرار نہ ملتا تھا اگر مجھے پورا یقین ہوتا کہ وہ قید میں ہے اور اس سے ملنے کی کوئی صورت نہیں تو میں پہلے کی طرح صبر کی سل سینے پر رکھ کے اس وقت کے انتظار میں زندہ رہتا جب اسے مجھ سے دور اور مجبور رکھنے والے حالات بدلنا میرے اختیار میں ہو گا۔ وہ مجھے اپنے آزاد ہونے کا پورا یقین دے سکتی تو۔ مگر یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ میرے پاس پہنچ جاتی اور کہتی کہ سکندر، دیکھو میں تمھارے سامنے ہوں میں تمھارے تصور کا سراب نہیں ہوں۔ میں خواب بھی نہیں ہوں۔ میں حقیقی وجود رکھنے والی جیتی جاگتی تمھاری اپنی رالعہ ہوں۔ یا وہ کہتی کہ سکندر آؤ مجھے لے جاؤ، میں تمھارے انتظار میں ہوں۔ پھر وہ مجھے سرحدِ افلاک پر ملتی۔ وہاں ملتی جہاں زمین آسمان ملتے ہیں یا جہاں زندگی کی سرحد موت سے ملتی ہے۔ میں سر کے بل جاتا۔ مگر اس نے تو مجھے اپنا پتا بھی بتا دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بھی کہا تھا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور کسی کی قید میں نہیں ہوں مگر آنے کی بات مت کرو۔ میں نہیں آؤں گی۔ آخر کیوں؟ وہ کیوں نہیں آ سکتی؟ اور کیوں مجھے دور رکھنا چاہتی ہے؟ یہ کیسی ستم گری کی ادا ہے۔ کیسا امتحان ہے...

میرے خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی جب سڑک سے گزرنے والی ایک کار اچانک کچے راستے پر مڑ گئی اور سیدھی میری سمت میں آئی۔ میں جہاں تھا، وہیں منجمد ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس ناہموار زمین کے ہچکولوں سے اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ روشنی بار بار مجھ پر پڑتی تھی اور اگر میں ذرا بھی حرکت کرتا تو ان کی نظر میں آ جاتا جو ونڈ اسکرین کے پیچھے سے شاید میری ہی جستجو میں وہاں پہنچے تھے۔ میرے سامنے اور آگے پیچھے بہت کم پتوں والی شاخیں تھیں۔ میں زمین سے دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا۔

سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ آخر وہ کون ہو سکتے ہیں؟ سوائے شیر علی کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں یہاں ہوں۔ کار اس جگہ سے ایک فرلانگ پہلے ہی سڑک چھوڑ چکی تھی۔ پٹرول پمپ سے یہاں تک میں نے کوئی کچا راستہ نکلتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کار درختوں کے درمیان سے گزرتی آ رہی تھی۔ یہ مائکرو بس ہرگز نہیں تھی۔ اس کی لائٹس اونچی ہوتی ہیں اور انجن کی آواز سب سے الگ ہوتی ہے۔ کیا یہ محسن اور غالب ہو سکتے ہیں جو ٹیکسی لے کر مجھے تلاش کرنے آ گئے ہوں۔ شیر علی نے انھیں سب بتا دیا ہو اور وہ مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے یا میرا ساتھ دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ وہ ٹیکسی میں بھی آ سکتے تھے اور کسی سے چھینی ہوئی کار میں بھی۔ شیر علی نے ان کو بتا دیا ہو گا کہ سکندر صاحب پٹرول پمپ سے ایک میل آگے اترے تھے مگر یہ ٹیکسی نہیں تھی۔ قریب آنے سے پہلے ہی کار نے اپنا رخ تھوڑا سا بدل لیا اور اس کی ہیڈ لائٹس آف ہو گئیں۔ گیارھویں یا بارھویں تاریخ کا چاند درختوں سے اوپر اٹھ چکا تھا اور اس کی روشنی راستہ دکھانے کے لیے کافی تھی۔ اب کار بالکل رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن بدلی اور بلی کی طرح دبے پاؤں دوشاخے کے اس حصے پر چڑھ گیا جس سے میں کمر لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ مزید پانچ فٹ اوپر جانے کے بعد میں خود کو پتوں کے پیچھے گم کرنے میں کامیاب رہا۔

کار مجھ سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر رکی تو میں نے اس میں سے یکے بعد دیگرے چار افراد کو اترتے دیکھا۔ انھوں نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کی تو میری ساری خوش فہمی دور ہو گئی۔ یہ محسن اور غالب نہیں تھے۔ ہر ٹارچ کی روشنی کا دائرہ زمین پر تھا مگر اس اُجالے میں جو کار سے منعکس ہو رہا تھا، میں نے گاڑی کو پہچان لیا۔ اس میں سے اترنے والی پانچویں سواری حاجی عبداللہ کی تھی۔ وہی اس گاڑی کو چلا کے لایا تھا اور اس کا بھاری بھر کم وجود کار کے دروازے سے پھنس کر نکلا تھا۔ باقی چار حکم کے غلام معلوم ہوتے تھے کہ دست بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کی صورت تو نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ جوان اور چاق و چوبند لوگ تھے۔ ان کے جسم پر گہرے رنگ کی قمیص پتلون تھی۔ چاند کی دھندلی روشنی میں مجھے وہ سیاہ پوش لگے۔ صرف حاجی صاحب کی شلوار قمیص کا رنگ سفید تھا۔

حاجی عبداللہ کے ہاتھ میں اس وقت تسبیح نہیں، مشین گن تھی اور اس جنگل میں اپنے چیلوں کے سامنے وہ ایک شیطان نظر آتا تھا۔ دنیا کے سامنے اس کے ظاہر اور باطن کا جو فرق میں نے دیکھا تھا، وہ یہاں ختم ہو گیا تھا۔

"دیکھو۔ تم میں سے دو ایک ساتھ اس طرف جاؤ" حاجی صاحب نے بارعب لہجے میں کہا "دو دوسری طرف سے"

"ابا جی۔ سب کو الگ الگ جانے دیں" ایک شخص نے کہا۔

"یہ ٹھیک کہتا ہے" دوسرے نے کہا۔ وہ غالباً حاجی صاحب کا بڑا برخوردار تھا کیونکہ اس کے لہجے میں بھی وہی رعونت تھی اور اس کے بولنے کا انداز بھی انھیں ابلیس اور ابلیس کی اولاد ثابت کرتا تھا۔

پھر حاجی صاحب نے اس کی تصدیق کر دی "میرے باپ مت بنو۔ میں تمھارا باپ ہوں" اس نے برہمی سے کہا "عقل کی بات بتا رہا ہوں تمھیں۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات سنی ہے نا"

"اس کا مطلب تو ہوتا ہے، اتحاد میں برکت ہے" بڑے احمق نے کہا۔

"اور ہم کب کہتے ہیں کہ آپ ہمارے باپ نہیں ہیں" چھوٹا ہنسنے لگا۔

"بکومت۔ ایک آدمی جنگل میں ایسے غائب ہو جاتا ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ تم سب ایک ایک کر کے غائب ہو جاؤ گے اور سمجھتے ہو گے کہ دوسرے سب محفوظ ہیں" حاجی صاحب نے گرج کے کہا۔ "تم میں سے ایک آگے چلے گا۔ دوسرا دس بیس قدم پیچھے سے اس پر نگاہ رکھے گا۔ آگے والا بھی منہ اٹھا کے نہیں چلتا جائے گا۔ اسے بھی برابر پیچھے نظر رکھنی ہو گی"

"آپ کو یقین ہے کہ یہی وہ جگہ ہے؟"

"تمھارے سامنے پٹرول پمپ والوں نے کیا کہا تھا" حاجی صاحب بولے "وہ اسی علاقے میں ہے، بس ایک میل کے اندر اندر"

خوف کی سرسراہٹ مجھے پورے جسم پر یوں محسوس ہونے لگی، جیسے میرے بدن پر چیونٹے رینگنے لگے ہوں۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور میرے سامنے پھر وہی سوال تھا کہ انھیں میرے بارے میں اتنی صحیح اطلاع کس نے فراہم کی۔ میرا دل یہ اعتراف کرتے ہوئے انجام کے خیال سے کانپنے لگتا تھا کہ حاجی صاحب کو یہ بات صرف شیر علی ہی بتا سکتا تھا اور اگر شیر علی بھی دوست کے بھیس میں دشمن تھا تو پھر باقی سب کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

"ایک دوسرے کو اور مجھے خبردار رکھنا" حاجی صاحب نے کہا۔

"یس ابا جی" چھوٹے برخوردار نے ایک تیز سیٹی بجائی جو دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کے ہم بھی بجاتے تھے "یہ ہے میرا سگنل۔ اپنے کانوں کے راڈار کھلے رکھیے"

"تم دو بار سیٹی بجاؤ گے۔ اتنی لمبی نہیں" حاجی صاحب بولے۔

"مجھے سب پتا ہے ابا جی" بڑے لڑکے نے جھلا کے کہا۔

"اچھا شیرو اور ڈبو کو نکالو" حاجی صاحب نے حکم دیا۔

باقی دو آدمی جو ابھی تک چپ رہے تھے، گاڑی کی طرف بڑھے اس کی ڈکی کھولی اور کوئی چیز اٹھا کے باہر رکھ دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ان شکاری کتوں کو دیکھا جو بالکل چپ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈبو اور شیرو کے نام سے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کتے لے کر آئے ہیں۔ مگر ایسے کتے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے جو حلق سے آواز تک نہ نکالتے ہوں۔ عموماً شکاری کتے غراتے، بھونکتے اور حلق سے خوں آشام آوازیں نکالتے ہوئے دوڑتے ہیں مگر کھڑے ہوئے بھی وہ بالکل چپ نہیں رہتے۔

"آپ اپنا خیال رکھیں" چھوٹے لڑکے نے ایک کتے کی رسی تھام کر کہا "یہ نہ ہو کہ وہ پیراشوٹ سے آپ کے اوپر اتر جائے، آپ دائیں بائیں دیکھتے رہ جائیں"

"چلو اب دفع ہو جاؤ" حاجی صاحب نے گرم ہو کے کہا۔

"یس سر۔ ہم دفع ہو جاتے ہیں" چھوٹے والے نے کتے کو تھپکی دی اور ایک شخص کو روانگی کا سگنل دیا۔ کتے نے زمین کے ساتھ تھوتھنی لگا کے چلنا شروع کیا۔ وہ ایک منہ زور کتا تھا جو رسی تھامنے والے کو اپنی مرضی کے مطابق کھینچ کر لے جانا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب کے دونوں لڑکے ایک ایک کتے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچ بجھا دی تھی۔ ان کے پیچھے چلنے والے دوسرے شخص نے حاجی صاحب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ لیکن وہ وقفے وقفے سے ٹارچ روشن کرتا تھا اور بجھا دیتا تھا۔ غالباً یہ آگے جانے والے کے لیے ایک اشارہ تھا کہ پیچھے سب خیریت ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے سینے میں رک جانے والے سانس کو خارج کیا۔ نہ جانے کس وقت میرے ہاتھ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اگر وہ اس درخت کے نیچے پہنچ جاتے۔ تو میں بلاتوقف ان سب کتوں کو شوٹ کر دیتا۔ میں بہت محفوظ مقام پر مورچہ بند تھا۔ خطرہ صرف حاجی صاحب کی طرف سے تھا جو میری رینج سے باہر تھے لیکن وہ اندازے سے بھی مشین گن کا برسٹ مار دیتے تو میں مر کے نیچے گرتا لیکن اب مجھے اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور کو تلاش کر رہے تھے۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ شیر علی سے منسوب اندیشے غلط ثابت ہوئے اگر وہ بھی دوست نما دشمن ہوتا تو پھر اعتبار کا لفظ ہی بے معنی ہو جاتا۔

دو تین منٹ کے بعد میں نے ایک سیٹی سنی۔ اس کے جواب میں دو سیٹیاں سنائی دیں۔ میں نے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کھلی جگہ پر مشین گن دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے مستعد نظر آ رہے تھے وران کی نظریں چاروں طرف مسلسل گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ریوالور سے ان کے سر کا نشانہ لیا۔ بیس پچیس گز کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے نشانے پر بھی بھروسا تھا لیکن حاجی صاحب کا سر متحرک تھا اور روشنی کم تھی۔ نشانہ خطا نہ ہوتا، تب بھی فائر کی آواز پر چار مسلح افراد کا دوڑتے ہوئے آنا یقینی تھا۔ پھر وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر سکتے تھے۔ اگر میں حاجی صاحب کو مار کے ان کی مشین گن پر قابض ہو جاتا تو ان چاروں کو بھی لمبا لٹا سکتا تھا مگر پہلی بات تو رسک لینے کی تھی۔ درخت کی اتنی بلندی سے نشانہ خطا ہونے یا نہ ہونے کے چانس ففٹی ففٹی تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان سب کو مار کے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ ابھی تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ جنگل میں مجھے شکار کرنے نہیں آئے تھے تو ان کا شکار کون تھا۔

درخت پر چڑھنے کے مقابلے میں درخت سے اترنا بہت آسان کام تھا۔ اگر مجھے ایک منٹ کی مہلت بھی ملتی تو میں شاخ سے جھول کے زمین پر اس طرح قدم جما دیتا کہ اس نام کے حاجی کو آہٹ تک محسوس نہ ہوتی لیکن وہ بہت چوکنا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پشت سڑک کی جانب تھی،

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ مطمئن تھا کہ اس طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ میری طرف اس کا چہرہ تھا۔ وہ خفیف سی حرکت کو بھی دیکھ سکتا تھا کیونکہ جنگل میں کسی درخت کا ایک پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ اس کے کان بھی بہت تیز تھے۔ کسی درخت پر اپنے آشیانے میں کوئی پرندہ بھی پھڑپھڑاتا تھا تو وہ فوراً ادھر متوجہ ہو جاتا تھا۔ اس عمر میں حاجی صاحب کی بصارت اور سماعت کی قوت بہت سے نوجوانوں سے بہتر تھی۔

میں دم سادھے بیٹھا ہوا خدا کے حضور بہت سی فضول خواہشات کو دعا بنا کے ارسال کر چکا تھا۔ مثلاً یہ کہ اے خدا۔ اس وقت مجھے چھینک نہ آئے۔ سنا ہے کہ ہک، موت، عشق اور چھینک کا کوئی وقت مقرر نہیں اور یہ کہ مجھے سانپ بچھو نہ کاٹیں۔ کوئی چیونٹی میرے جسم کے علاقۂ ممنوعہ میں داخل ہو کر ایسا نہ کاٹے کہ میں بلبلا اٹھوں۔ کچھ دعائیں فریقِ ثانی کے لیے بھی تھیں مثلاً یہ کہ اچانک اس کو عطا کی جانے والی زندگی کی آخری سانس پوری ہو فرشتۂ اجل کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ وہ ایسی جگہ روح قبض کرنے پہنچتا ہے۔ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ حاجی صاحب کی عمر مہلک قسم کے ہارٹ اٹیک کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہ نہیں تو اسے پیشاب کی حاجت ہی محسوس ہو کہ وہ چند منٹ کے لیے مشین گن رکھے اور انگریزی محاورے کے مطابق پانی بنائے۔

مگر ایسی دعائیں نہ دل سے نکلتی ہیں اور نہ اثر رکھتی ہیں۔ حاجی ایک خون کے پیاسے چالاک چیتے کی طرح وہیں موجود رہا۔ جنگل میں سے اس کے لواحقین کی سیٹیاں سنائی دیتی رہیں۔ جو اپنے ملازمین کے ہمراہ ایک محدود علاقے کو چھان رہے تھے۔ ادھر میری گھڑی میں ساڑھے نو بج گئے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس ٹرک کو آنا تھا۔ ٹرک رات کے بارہ بجے کے بعد بھی آ سکتا تھا لیکن گیارہ بجے تک میرا آبزرویشن پوسٹ سنبھال لینا ضروری تھا۔

درمیان میں یہ نئی صورتِ حالات سامنے آ گئی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ عبداللہ اینڈ سنز کی واپسی کتنی دیر میں ہو گی۔ وہ ساری رات بھی شکار کھیل سکتے تھے۔ سیٹیوں کی آوازیں بہت دور سے آنے لگیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ شکاری اور ان کے کتے اتنی دور نکل گئے تھے کہ ان کے سگنل اب حاجی صاحب کو موصول نہیں ہو رہے تھے۔ حاجی بڑی بے قراری سے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا اور پارے کی طرح مضطرب تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اچانک ایک فائر ہوا تو میں بھی اچھل پڑا۔ انتظار کا سکوت میرے اعصاب پر سوار تھا۔ ایسے میں بہت نزدیک ہونے والے دھماکے کا اثر زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوا۔

"کون ہے؟" حاجی نے چلّا کے کہا اور مشین گن کو یوں سامنے کر لیا جیسے درختوں کی اوٹ سے دشمن کی فوج کا مسلح دستہ نمودار ہونے والا ہو۔ جواب میں دوسرا فائر ہوا اور حاجی نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کر لیا۔ میں نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ وہ شاخوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے درمیان بھاگتا ہوا ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ اچانک سامنے آ گیا۔

"خبردار!" حاجی صاحب نے چلّا کے کہا "رک جاؤ ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔ میرے پاس مشین گن ہے۔"

وہ دوڑتے دوڑتے اسی پیڑ کے نیچے پہنچا جس پر میں سوار تھا۔ پیچھے سے ایک اور گولی آئی اور وہ درخت پر چڑھنے کی کوشش کے پہلے مرحلے میں ہی ناکام ہو کے نیچے گرا۔ اس کا جسم دو تین پلٹے کھانے کے بعد ساکت ہو گیا۔ پندرہ فٹ اوپر سے میں مرنے والے کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی دبلا پتلا سیاہ فام بنگالی تھا جس نے دھوتی کے ساتھ بنیان پہن رکھی تھی۔ وہ جنگل کی پُرخار زمین پر ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آیا تو وہ گولی کی رفتار سے نہیں جیت سکا تھا۔ ورنہ چند سیکنڈ میں وہ بھی اسی درخت پر آ جاتا جہاں میں پہلے سے پناہ گزیں تھا۔

قاتل اس کے پیچھے تھا اور بنگالی کے گرتے ہی وہ بھی سامنے آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے ہاتھ میں کتے کے پٹے سے بندھی ہوئی ڈوری کا سرا۔ یہ حاجی کا کوئی بیٹا تھا۔ اس کے ساتھ جانے والا دوسرا شخص خود کو گھسیٹتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کے منہ کے بل گرا اور پھر آگے رینگنے لگا۔

حاجی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے آیا "یہ تو مکرجی ہے!"

"ہاں۔ غالباً..."

"غالباً کے بچے۔ یہ تم نے کیا کیا؟" حاجی صاحب بگڑے۔

"جو اس نے کیا، وہ بھی تو دیکھیں ابا جی۔ پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔ کیا یہ اندھا ہو گیا تھا؟" یہ حاجی کا بڑا لڑکا تھا

"اور تم اندھے نہیں تھے؟ تم دیکھ سکتے تھے کہ یہ اپنا ہی آدمی ہے"

"اس کی گولی مجھے بھی لگ سکتی تھی۔"

"لگی تو نہیں تھی۔" حاجی صاحب نے برہمی سے کہا "چلو اب اسے اٹھاؤ۔ خیر سے دوسرے بھی واپس آنے والے ہوں گے۔ فائر کی آواز پر سمجھے ہوں گے کہ بڑے بھائی نے شکار مار لیا۔"

میں ان کی گفتگو سننے کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دوسرے شخص کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہے جو بنگالی کی گولی سے شدید زخمی ہوا اور مرنے کے قریب نظر آتا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ ورنہ وہ مر جائے گا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سوا کسی کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔ اس نے حاجی کو خدا رسولؐ کا واسطہ دیا مگر باپ بیٹے کو اپنے ہی ایک آدمی کے غلطی کی بنا پر مارے جانے کا صدمہ زیادہ تھا۔ مکرجی کے بارے میں کچھ کے سوا میں کیا فرض کرتا کہ وہ درمیان کی کوئی چھوٹی سی کڑی تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مکرجی اس ویران جنگل میں کیوں چھپا ہوا تھا۔ میں ایک بات اور نوٹ کی۔ کتے کا منہ بند رکھنے کے لیے اس کی تھوتھنی پر کوئی خول چڑھا دیا گیا تھا یا رسی لپیٹی گئی تھی۔ اس طرح کہ وہ اپنی ناک سونگھنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا مگر اپنی مرضی سے چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رحم کے لیے چلّانے والا ابھی کراہتے کراہتے خاموش ہو گیا۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں کہ وہ بے ہوش ہوا تھا یا مر گیا تھا۔ جنگل کی طرف سے... ایک سیٹی سنائی دی۔ اسے جوابی سگنل دیا گیا اور وہ اپنی گاڑی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ تمام وقت میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ تجسس بھی میری راہ میں حائل تھا۔ میں نے بہت کچھ سن لیا تھا اور دیکھ لیا تھا لیکن اصل بات کا ابھی تک پتا نہیں چلا تھا۔ اس وقت جب باپ بیٹا درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، میں دونوں کو ایک ہی جست میں سمیٹ سکتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، میں دونوں کے سر بھی توڑ سکتا تھا۔ ہاتھ پیر بھی اور گردن بھی۔ مجھے ان کی سفاکانہ بے حسی پر اتنا ہی غصہ آیا تھا جتنا مرتے ہوئے شخص کی حالت پر رحم لیکن میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ یہ جنگ ہے۔ مجھے صرف اپنی ذات کے تحفظ کی فکر کرنی چاہیے۔

دوسرا شکاری دس منٹ بعد لوٹا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے آگے آگے ایک عجیب حلیے کا شخص چل رہا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کے پھولوں والی دھوتی پر لمبی دھاریوں والا کُرتا پہن رکھا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور اس کا سر حال ہی میں استرے سے صاف کیا گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلائی کے برابر موٹا ڈنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں کشکول۔ اسے گھیر کر لانے والے چار قدم کے فرق سے اس کے پیچھے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

"لو ابا جی۔ آپ کے سمدھی آ گئے۔ اب آپ ان کی سمادھی بناؤ یا مزار شریف۔" چھوٹا لڑکا ذرا غیر سنجیدہ قسم کی گفتگو ضرور کرتا تھا مگر اپنے کام میں زیادہ ہوشیار تھا۔

حاجی نے بڑے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا "کبھی تم بھی عقل میں بڑے ہونے کا ثبوت دے دیا کرو۔"

"یہ پٹاخے کس خوشی میں چلائے جا رہے تھے؟" چھوٹے لڑکے نے کہا۔ پھر اس کی نگاہ نے دونوں لاشوں کو دیکھ لیا "میرا خیال ہے کہ میں نے تین فائر سنے تھے۔ تیسری لاش کہاں ہے۔ یا انھیں فی کس ڈیڑھ گولی ماری گئی ہے۔"

مگر حاجی اس کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اس ملنگ کی طرف متوجہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسی ملنگ پر بادشاہ گل کے قتل کا الزام تھوپ دیا گیا تھا۔

"اس کے پاس سے کچھ ملا؟" حاجی نے کہا۔

"آپ کے مطلب کی تو یہی دو چیزیں ہیں۔" چھوٹے لڑکے نے کہا اور اپنی دو جیبوں سے دو ریوالور نکال کے باپ کے قدموں میں ڈال دیے "باقی کچھ تصویریں تھیں۔"

"کیسی تصویریں؟" حاجی نے کہا "دکھاؤ مجھے۔"

"ابا جی۔ وہ صرف ہم جیسے بالغوں کے مطلب کی ہیں۔ آپ کیا کریں گے اس عمر میں دیکھ کر۔" وہ بولا۔

"بکومت۔ اِدھر لاؤ تصویریں۔"

"آپ کی مرضی۔" اس نے جیب سے دو تصویریں نکال کے باپ کو تھما دیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" حاجی نے تصویروں کو دیکھتے ہی کہا "خبیث، کیوں جھوٹ بولتے ہو۔" اس نے تصویریں پھاڑ کے پھینک دیں۔ "سچ بتاؤ، اس کی تلاشی لی تھی تم نے؟"

لڑکا ہنسا "ابا جی! فقیر ملنگ لوگوں کی جیب میں اور کیا ہو گا۔"

"یہ دونوں ریوالور تم نے غائب کیے تھے؟" حاجی نے ملنگ سے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" ملنگ نے بڑی متانت سے کہا۔

حاجی کا مکا اس کے منہ پر پڑا "سمجھ لو کے بچے۔ سیدھی طرح بتاؤ کہ یہ تم نے کس سے لیے تھے۔ خریدے تھے؟"

"یہ جان کے تم کیا کرو گے۔ تمھارا مال تمھیں مل گیا۔"

حاجی نے اس پر مشین گن کا بٹ مارا "اگر ریوالور تمھیں کسی نے بیچے تھے تو مجھے بیچنے والے کا نام بتا دو۔ میں تم کو چھوڑ دوں گا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس لیے میں بھی سچ نہیں بول سکتا۔"

"رانا شمشاد علی! تم نے خود بھی لوگوں سے سچ اگلوایا ہو گا۔ تمھاری بیس سال کی نوکری کا ریکارڈ میں جانتا ہوں۔" حاجی نے کہا۔ "خفیہ پولیس میں تمھیں اچھی کارکردگی کی بنا پر بھیجا گیا تھا۔ مگر تمھارے اپنے محکمے کے لوگوں نے مجھے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم کس چکر میں ہو اور تب سے میرے آدمی تم پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تم نے حکامِ بالا کو جو رپورٹ بھیجی وہ غلط ثابت ہوئی۔ چار مرتبہ چھاپا مارنے والوں کو کچھ نہیں ملا۔ ہم نے جانتے بوجھتے تمھیں گمراہ کیا تھا تاکہ تم دوسروں کو گمراہ کرو۔ اب تمھارے ایک افسر نے تمھاری کارکردگی کو سخت مایوس کن اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آئندہ تمھاری اطلاع کو اس وقت تک مصدقہ نہ سمجھا جائے جب تک دوسرے ذرائع سے بھی تصدیق نہ ہو جائے۔"

"اس بار میری رپورٹ غلط نہ ہوتی حاجی!" رانا شمشاد علی نے کہا۔

"لیکن اس پر کارروائی نہیں ہوئی۔ کیونکہ دوسرے ذریعے نے تمھاری رپورٹ پر شبہ ظاہر کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ دوسرا ذریعہ تمھارا زرخرید ہے۔" رانا نے بے خوفی سے کہا "وہ بھی تمھاری طرح غدار ہے۔ تمھارا یہ دینداری اور پرہیزگاری کا سارا ڈھونگ..."

حاجی کے بڑے لڑکے نے اس پر مکوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ساتھ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا بدبودار طوفان امڈ پڑا۔ "یہ ساری دنیا زرخرید ہے۔ سب پیسے کے غلام ہیں اور وہ سب بھی ڈھونگ رچاتے ہیں جو تیری طرح محبِ وطن بنتے ہیں۔"

رانا شمشاد علی گر گیا تھا۔ اس کے لبوں سے خون بہنے لگا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

وہ اٹھا اور اپنے کُرتے کی آستین سے منہ صاف کرنے لگا۔ "آج نہیں تو کل۔ بہت جلد تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ تمھاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تم مجھ کو دیکھ ہی نہیں سکتے حاجی۔ ورنہ تم دیکھتے کہ غدار اور وطن فروش آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اس مرتبہ میں نے ثبوت بھی حاصل کر لیا تھا اس کے خلاف۔ پکا ثبوت۔"

"یہ دو ریوالور۔" حاجی نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم اپنے کسی فرض شناس افسر کی خدمت میں پیش کرتے اور کہتے کہ دیکھیے جناب' یہ کہاں کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہلت حاصل کرنے کے لیے تم نے ڈرائیور بادشاہ گل کو مار ڈالا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں ایک بے گناہ کا خون ہوا۔" رانا نے کہا۔ "وہ تو خود بھی بے خبر تھا کہ اس کے ٹرک میں پھل نہیں' اسلحہ ہے۔"

"تم نے اس کی بے گناہی کا کیسے یقین کر لیا۔"

"آدمی مرتے وقت سچ ضرور بولتا ہے۔" رانا شمشاد علی نے کہا۔ "جب میں نے وہ زہریلا سُوا اس کے دل میں اتار دیا تھا تو وہ بہت حیران ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا دشمن کوئی نہیں ہے اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ جب میں نے اسے بتایا۔ تو اس نے کلمہ پڑھ کے کہا کہ بھائی' اللہ تم کو معاف کرے' نہ میں غدار تھا نہ غداروں کے ساتھ تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں خود یہ ٹرک لے کر حاجی عبداللہ اینڈ سنز کے دفتر میں گھس جاتا اور ان سب کو ایک دھماکے میں نیست و نابود کر دیتا۔"

"تم نے صرف ٹرک کو روک رکھنے کے لیے بادشاہ گل کو مارا تھا مگر رانا شمشاد علی! تم نے صرف چوبیس گھنٹے کی دیر کرادی۔ ٹرک آج رات بارہ بجے روانہ ہو جائے گا۔ ٹرک کل بھی گزرے گا اور اس کے بعد بھی۔ تم سے پہلے بھی ایک احمق ایسی ہی فرض شناسی کے چکر میں اپنی جان دے چکا تھا۔ پھر تم نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ میں نے تو بہت اچھی آفر دی تھی تمھیں۔ تم نے ان سب کی کوٹھیاں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ بھی دیکھے ہوں گے جو میرے راستے میں حائل نہیں ہوئے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمھارے پیسے پر۔" رانا شمشاد علی نے حاجی کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ جانتا تھا کہ حاجی اور اس کے شکاری بیٹے اب اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ اب ان سے تعاون کرنے کا وعدہ کر کے جان بچانے کی کوشش کرتا تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا چنانچہ مرنے سے پہلے اس نے کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شاید حاجی کے منہ پر تھوکنا اس کی آخری آرزو تھی جو پوری ہوئی۔ اس کے فوراً بعد حاجی کے بڑے بیٹے نے اپنا ریوالور اٹھایا اور رانا شمشاد علی کے سر پر رکھ کے گولی چلا دی۔ رانا وہیں گر گیا۔ اس کا جسم گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ قدرت نے اس شہید کے لیے نزع کے عذاب کو انتہائی مختصر کیا۔

"یہ تمھیں کہاں ملا تھا؟" حاجی نے کہا۔

"وہیں۔ اپنے ٹھکانے پر۔ ڈٹو مجھے سیدھا اس کے گھر لے گیا۔"

"کسی نے دیکھا تو نہیں تمھیں؟"

"مجھے کون دیکھ سکتا تھا۔" وہ بولا۔ "گاؤں میں گنے چُنے گھر ہیں اور اس کا گھر تو باہر ہی ہے۔"

"گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟"

"ایک تو اس کی ماں تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسے رات کے وقت کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اٹھ بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔ رانا؟ کیا تو جا رہا ہے اور میں اسے جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی وہیں کھڑی ہوئی تھی۔"

"خبیث۔ صبح ہوتے ہی یہ نکل جاتا۔" حاجی نے لاش کو ٹھوکر مار کے کہا۔

"یہ اپنی محبوبہ سے ملنے نکلا تھا۔" حاجی کے چھوٹے لڑکے نے قہقہہ مار کے کہا۔ "کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے باہر جھانکا تو مجھے دونوں نظر آ گئے۔ پھر میں بھی کھڑکی سے نکل گیا۔ یہ دونوں رہٹ والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ سر جوڑے۔ میں نے کھنکارا اور آواز بدل کے کہا کہ کون ہے بھئی۔ اور لڑکی ایک دم اٹھ کے بھاگی تو اس نے قابو کر لی۔" اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے اس کے سینے پر ریوالور رکھ دیا کہ لڑکی کی زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ چلو۔ یہ چل پڑا۔"

"اور تم نے اسے چھوڑ دیا۔ جو چشم دید گواہ تھی؟" بڑے بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم ہوتے تو شاید اسی شرافت کا مظاہرہ کرتے۔ میں شریف آدمی نہیں ہوں۔"

"مار دیا تم نے اسے؟" حاجی نے کہا۔

"ہاں ابا جی۔" وہ ایک حسرت بھری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مارتا نہ تو کیا کرتا۔ لڑکی اچھی تھی۔ مگر وقت برا تھا اور قسمت خراب تھی میری کہ اکیلا نہیں تھا۔ دو کتے میرے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔"

"تمھیں۔ کچھ بتایا اس نے۔ کہ اس نے کسی کو اطلاع تو نہیں دی تھی؟" حاجی بولا۔ "گھر میں کوئی ٹرانسمیٹر وغیرہ تو نہیں تھا؟"

"نہیں ابا جی۔" بڑے لڑکے نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ ہم نے مکرجی کو پیچھے لگا رکھا تھا۔"

"تو مکرجی نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ مگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور بتاتا۔ خود رانا کو کہاں معلوم تھا کہ وہ ہماری نظر میں ہے۔ وہ بالکل مطمئن تھا کہ اس کو بدلے ہوئے بھیس میں کسی نے شناخت نہیں کیا۔ صبح یہ موٹر سائیکل پر نکل جاتا اور اپنے افسرِ اعلیٰ کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر دیتا۔ مگر ٹرانسمیٹر کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اس کے پاس۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب واپس چلو۔" حاجی نے کہا۔

"ان کو بھی لے جانا ہے۔"

"صرف مکرجی کو۔ رانا صاحب کو ان کے وارث لے جائیں گے۔" حاجی نے طنز اور تمسخر کے ساتھ کہا۔

انھوں نے دونوں کتوں کو اسی طرح کار کی ڈکی میں ڈال دیا لیکن ان کے منہ کھول دیے۔ وہ ایک دم غرانے اور دھاڑنے لگے۔ میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ وہ حد سے زیادہ مضطرب ہیں۔ جب ان کا منہ بندھا ہوا تھا تب بھی وہ اپنی وحشیانہ قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر آزاد ہوتے ہی اس وحشت میں جنون کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ یہ کچھ حیوانی جبلت کا قصور تھا۔ آدمی کے ہاتھ بھی اگر پیچھے باندھ دیے جائیں اور اسے دوڑنے کو کہا جائے تو وہ جسم کی پوری قوت کے ساتھ نہیں دوڑ سکتا لیکن ہاتھ آزاد ہوں تو وہ بہت تیز بھاگتا ہے۔ ہاتھوں کا رفتار سے کوئی تعلق ہونا تو نہیں چاہیے کیونکہ دوڑتا تو آدمی ٹانگوں سے ہے لیکن بندھے ہاتھوں کے ساتھ اس کے پورے جسم کی توانائی جیسے محدود ہو جاتی ہے۔ وہی کتے جو پہلے زیادہ خطرناک محسوس نہیں ہوتے تھے' اب خون آشام درندوں کی طرح چلّا رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سابقہ تجربے کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ اب ان کو انعام ملے گا۔

"صبر کرو یار۔" حاجی کے چھوٹے لڑکے نے کہا۔ "مانا کہ تم صبح سے بھوکے ہو۔"

حاجی کے ایک ملازم نے مکرجی کی لاش اٹھائی۔ "ابے پاگل ہو گیا ہے کیا۔ کپڑوں سمیت ڈال رہا ہے۔"

ملازم چند سیکنڈ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے تعمیل حکم کی اور مکرجی کی لاش کے کپڑے اتار کے وہیں پھینک دیے۔ پھر وہ لاش اٹھا کے کار کی جانب بڑھا۔ کتوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ میرا دل لرزنے لگا۔ غصے کی ایک پاگل کر دینے والی لہر کے سامنے میرا وجود لڑکھڑانے لگا۔ میں نے سوچا کہ مصلحت کے تقاضے اور حالات کی ضرورت سب کو بھول جاؤں اور انجام کی پروا کیے بغیر اس شکاری ٹولے پر ٹوٹ پڑوں جو انسانوں کا شکار کرتے تھے اور اس شکار پر اپنے کتے پالتے تھے۔ انھوں نے کتوں کو آدم خور بنا دیا تھا اور وہ بے قیمت مل جانے والے انسانی گوشت سے ان کا پیٹ بھرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔

لاش کے ڈکی میں گرتے ہی کتے یوں غرائے کہ میرا سارا وجود سن ہو گیا۔ مجھے اپنے انسان ہونے پر شرم آئی اور اپنی بزدلی' بے حسی اور کمزوری پر شرم آئی۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ جب وہ عین پیڑ کے نیچے تھے تو میں نے انھیں کیوں چھوڑ دیا۔ وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ میں بجلی کی رفتار سے حملہ کرتا تب بھی انھیں پلٹ کر مجھ پر مشین گن کھول دینے کی مہلت مل جاتی۔ پھر وہ میری لاش کو بھی انھی کتوں کے سامنے ڈال دیتے جو اس وقت میرے ہی جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے ایک انسان کو اپنے بے رحم پنجوں سے اور سفاک دانتوں سے جھنجھوڑ رہے تھے۔ اس کا گوشت ادھیڑ رہے تھے اور ہڈیاں چبا رہے تھے۔ یہ ایک ناقابلِ برداشت عذاب تھا اور وہ وقت ناقابلِ فراموش تھا جب میں نے انسانیت کی اس تذلیل کو دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ مکرجی میں اور مجھ میں صرف ایک فرق یہ تھا کہ وہ ہندو تھا اور میں مسلمان۔ وہ غدار تھا اور میں وطن کی مٹی سے جسم و جاں کے رشتے کو مقدس سمجھنے والا سپاہی۔ لیکن اس کے باوجود مکرجی انسان تھا اور کوئی مذہب' کوئی معاشرہ' کوئی قانون اور کوئی ضابطۂ اخلاق کسی دوسرے انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ انسانوں کو حیوانوں کا راتب بنائے۔

مگر یہاں ایک شخص جو دنیا کو دھوکا دینے کے لیے خود کو حاجی کہتا تھا' وہ سب کچھ کر رہا تھا جو شاید انسانی کھوپڑیوں کے میناروں کی بلندی سے اپنی طاقت کے غرور میں مبتلا ہونے والے ہلاکو خان جیسے ظالموں نے بھی نہ کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ان سب کو شوٹ کر دینے کی خواہش پر میں نے کیسے قابو پایا اور کیوں قابو پایا۔ میں خود کو یہ سمجھاتا رہا کہ میرے پیشِ نظر عظیم تر مقاصد ہیں اور مجھے صرف اپنی جنگ لڑنی ہے اور اگر میں اپنی محبت کی ترجیحات کو دیکھوں تو سب سے پہلے میری اپنے وطن سے محبت اہم ہے' پھر رابعہ کی محبت ہے۔ اس کے بعد جذباتی رشتوں کی اور پھر انسانیت کی اور اخلاقی سچائیوں کی محبت ہے۔ مکرجی دشمن تھا اور اب دشمن ہی کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچا تو مجھے اس کی خاطر جذبات میں اندھا ہو کے اپنا نقصان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سب جنگل کے شکاری ہیں جو جنگل کے قانون کے مطابق لڑ رہے ہیں اور درحقیقت حیوان ہی ہیں۔

جب گاڑی چلی گئی تو میں اپنے آپ سے شرمسار نیچے اترا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کے ضمیر کو مطمئن رکھنے والے دلائل بھی تاثیر کھو دیتے ہیں اور عقلی جواز کو دل اسی طرح قبول کرتا ہے جیسے ایک بزدل بچہ انجکشن کی سوئی کو برداشت کرتا ہے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اب وہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ رانا شمشاد علی کو شاید مجھے نہیں جاننا تھا مگر میں نے اسے دیکھا تو جان لیا کہ وہ بھی ہمارا ساتھی تھا۔ ایم آر ایس کے نام سے بھی ناواقف ہونے کے باوجود وہ ایم آر ایس میں شامل جانبازوں کا حلیف تھا اور انھی کی طرح اس شان سے شہید ہوا تھا کہ جان گئی مگر آن نہ گئی۔ اس سے کچھ دور حاجی کا ایک زر خرید مرا پڑا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی لیکن اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔

رانا شمشاد علی کے پاس بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ حاجی کے کہنے کے مطابق اس ٹرک کو رات بارہ بجے اس طرف سے گزرنا تھا۔ میرے پاس کم سے کم ایک گھنٹا اور تھا۔ میں نے سوچا کہ رانا شمشاد علی کے گاؤں تک جا کے کسی کو بتا آؤں کہ اس جیالے جواں مرد کی لاش کہاں پڑی ہوئی ہے اور اس کے قاتل کون ہیں۔ وہ گاؤں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا تھا۔ حاجی کے کتے وہاں تک جا کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں لوٹ آئے تھے۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ اس سمت کا بھی تھا جدھر وہ گئے تھے۔ میں درخت پر بیٹھا ہوا ان کی سیٹیوں کے سگنل سنتا رہا تھا۔ اس کے باوجود جب میں نے قدم بڑھائے تو میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے لیے ایک ماں کی بے نور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اس ناخوشگوار فریضے سے کوئی اور نمٹ لے گا۔ صبح ہوگی تو رات کی ساری بے رنگی کا راز فاش کر دے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہ ماں صدمے سے مر جائے گی۔ عورت اپنے خوابوں کی موت کے بعد زندہ رہنا ہی کب چاہتی ہے۔ وہ ماں ہو یا محبوبہ۔ دونوں کے دل حسرتِ تعمیر میں دھڑکتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو تخلیق سے تشکیل و تعمیر کے سارے مراحل سے گزار کے بھی اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ اس کے لیے وہ خوابوں کا سلسلہ دراز کرتی جاتی ہے۔ وہ آگے دیکھتی ہے جب اس کا لگایا ہوا پودا پھل دے گا اور بیٹوں کے بعد پوتے جوان ہوں گے اور عورت جو محبوبہ اور بیوی بن کے ماں بننے کے عظیم رتبے پر فائز ہوتی ہے انھی خوابوں کو وقت کے اگلے کارواں میں شامل کر دیتی ہے اور خود بھی شریکِ سفر ہو جاتی ہے۔

اس وقفے میں جب میرا ذہن انتشار کے بدترین عذاب سے دوچار تھا، میں نے مکرجی کے بارے میں بھی سوچا کہ اس کے وجود کا کتنا حصہ کتوں کے پیٹ میں پہنچے گا اور فضلہ بن کے مٹی میں ملے گا اور کتنا بچا ہوا جسم کتنے پھر کھا سکیں گے۔ بالآخر سب مٹی میں ملے گا مگر کتنا بے آبرو ہو کے۔ کیا مکرجی نے کبھی ایسا سوچا ہوگا۔ کیا رانا شمشاد علی نے اس وقت جب وہ اپنی محبوبہ کے کندھے پر سر رکھے اس کی خوشبوئے زلف اور اس کے بدن کی ساحر مہک میں کھویا ہوا تھا، یہ سوچا ہوگا کہ اس ساعتِ نایاب کے بعد کا لمحہ اجل کی خوں آشامی کا لمحہ ہوگا۔ پھر میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں سوچ رہا ہوں۔ رابعہ تک رسائی کی راہ تو بہت لمبی ہے۔ دلوں مفتوں اور سالوں کے پیمانے بھی مختصر ہوتے ہیں۔ درمیان میں ... لمحہ حائل ہو جائے تو انتظار جاری رہتا ہے۔ لاانتہا تک۔ یوم محشر ...

صاف ظاہر تھا کہ میں ایک انسانیت سوز منظر کا تماشہ ... سے قنوطیت کے دورے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس جگہ ... جانا بہتر سمجھا۔ جاتے جاتے میں نے رانا شمشاد علی کے سامنے ... کیا کہ ایک نہ ایک دن میں اس حاجی کہلانے والے شیطان سے اور ... کی مجسم گناہ اولاد سے ان سب کا بدلہ ضرور لوں گا جو اُن کے ناپاک ... کی سفلی قوت کا شکار ہوئے اور اگر ممکن ہوا تو انھیں یہ سزا انھی کے ضابطۂ اخلاق کے مطابق دوں گا۔ اگر اس لیے کہ میں کتنا بھی گرنا چاہوں انتقام اور اشتعال کے جذبات سے مغلوب ہو کے انسانیت کی سطح سے نیچے جانا بھی چاہوں۔ تو شاید میں خود کو ... پاؤں۔ میرے مذہب میں تو یہ بھی دشوار اور ممنوع ہے کہ ... اور ایذا دے کر مارو۔

سڑک پر اب گاڑیوں کی آمد و رفت پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو گئی تھی۔ پانچ دس منٹ کے وقفے سے کوئی ٹرک یا بس لاہور سے ملتان یا ملتان سے لاہور جاتی نظر آتی تھی۔ لکڑی کا وہ لٹھا وہیں پڑا ہوا تھا۔ اس پر بیٹھ کے میں نے ایک سگریٹ جلائی اور شعلے کو چھپائے رکھنے کے لیے دونوں ہاتھوں کی پناہ فراہم کی۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بھی ایک ہاتھ سامنے رکھا تاکہ سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اس چنگاری کی طرف متوجہ نہ ہو۔ وقت کے تجربات سے حاصل ہونے والا سبق آہستہ آہستہ میرے دل کو سخت کر رہا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اب میری وہ حساس طبیعت نہیں رہی جو قتل اور خونریزی کے واقعات پڑھ کر یا سن کر ہی خراب ہونے لگتی تھی۔ مکرجی کے عبرتناک انجام اور رانا شمشاد علی کی افسوسناک موت کا اثر بھی کم ہونے لگا۔ میں پھر رابعہ کے بارے میں سوچنے لگا جس کی طلب اور تلاش نے مجھے یکلخت اپنا راستہ سب سے الگ کر لینے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس سے میری منزل کھوٹی ہوتی نہیں تھی۔ یہ تو کچھ ویسی ہی بات تھی کہ جو راہ اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کے جاتی ہے۔ میں بیک وقت دو مقاصد کے حصول کے لیے نکلا تھا اور دونوں غلط نہ تھے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر سے میرا یکطرفہ فیصلہ غلط ہو سکتا تھا مگر دوسروں کا معاملہ وہ نہیں تھا جو میرا اور رابعہ کا معاملہ تھا۔

پونے بارہ بجے کے بعد میں مستعد ہو گیا۔ میں نے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے حلیے میں تھوڑی سی ترمیم کر لی۔ مجھے شیر علی کی بات غلط نہیں لگی تھی کہ تین افراد کا ایک جیسا نظر آنا شکوک پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے سر کے اوپر سے بالوں کی جھالر ہٹا دی اور صرف وہ جھلّی رہنے دی جس سے میرا سر بالکل صاف گھٹا ہوا نظر آتا تھا۔ ایسا کرنا میں نے اس لیے بھی ضروری سمجھا کہ آگے چل کر میں کسی کی نظر میں آؤں تو غالب یا محسن گرفت میں نہ آئیں۔

پہلے چار ٹرک ایک ہی سمت سے آئے۔ ان سب کے ڈرائیوروں نے ایک سے ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ یعنی وہ کچھ ڈرتے ڈرتے رُکے اور محتاط رہتے ہوئے انھوں نے کلینر سے کہا کہ درخت ہٹائے اور جاتے ہوئے نامعلوم شرپسند کو حسبِ توفیق گالیاں دے گئے۔ دو لبسوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک بس میں کوئی بہت بزدل یا بہت پیسے والی فیملی بیٹھی ہوئی تھی کہ انھوں نے ڈاکوؤں کے اندیشے کا ذکر سنتے ہی رونا پیٹنا اور چیخنا چلّانا شروع کر دیا تھا۔ رات کے سوا بارہ بجے تک وہ بھی جا چکے تھے۔

میں سڑک کے کنارے پُلیا کے نیچے دبکا بیٹھا رہتا تھا تاکہ ٹرک رُکے تو سر اٹھا کے نمبر پلیٹ کو دیکھ سکوں۔ بالآخر میرا انتظار ختم ہو گیا اور میں نے اچانک اس ٹرک کو رکتے ہوئے دیکھا جس کا ڈرائیور بادشاہ گل تھا۔

”اوئے مردار“ ڈرائیور نے غصے سے کہا ”نیچے اتر کے دیکھ...“ اس نے جملہ ایک بھاری بھرکم گالی پر ختم کیا۔

”کیوں۔ کیا ہے جی استاد جی“ کلینر نے کہا۔ جو شاید سو رہا تھا۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ استاد نے کیا دیکھنے کو کہا ہے۔ وہ اسی طرف سے نیچے اترا، جدھر میں چھپا ہوا تھا۔

”او جی۔ استاد جی۔ یہ تو ڈاکو ہے“

”اوئے ڈرمت۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ نزدیک آنے والے کو بھون کے رکھ دوں گا“ استاد نے کہا۔

پھر اس وقت جب کلینر درخت کا لٹھا اٹھا رہا تھا، میں دبے پاؤں مگر انتہائی پھرتی سے سڑک پر آیا اور اس سے پہلے کہ ڈرائیور میری طرف پلٹ کے دیکھتا، میں اس دروازے سے ٹرک میں بیٹھ چکا تھا جو کلینر نے اترنے کے بعد کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے سائڈ کی کھڑکی سے سر نکال رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں واقعی مشین گن تھی مگر اس طرح کہ ڈاکو سچ مچ آ جاتے تو وہ وہیں بیٹھ کے انھیں نہیں بھون سکتا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ریوالور ہوتا تو شاید وہ فائر کر دیتا۔ مگر مشین گن کو دونوں ہاتھوں میں تھامنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے یا تو وہ پیچھے ہٹتا اور مشین گن کو کھڑکی پر ٹکا کے چلاتا۔ یا پھر اسے نیچے اترنا پڑتا۔ بڑے ہتھیار نے اسے زیادہ بے بس کر دیا۔

”ہاتھ آہستہ آہستہ اندر کرو“ میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔ ”مشین گن نیچے رکھو اور ٹرک آگے بڑھاؤ“

مریل سا کلینر لکڑی کا لٹھا پھینک کر بھاگا۔ میں نے ریوالور بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اسی ہاتھ کو باہر نکال کے میں نے بڑی پھرتی سے ایک فائر کیا۔ کلینر اچھلا اور چیخ مار کے سڑک سے دور اسی سمت میں بھاگ کھڑا ہوا جدھر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور نے میری اس احمقانہ کوتاہی سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہیں کی۔ وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوا۔ مشین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہی مجھ پر مارنی چاہی لیکن میں سمجھتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ میں نے مشین گن کے وار کو ہاتھ پر روکا اور پھر جھٹکا دیا تو ڈرائیور کا سر دروازے کی سائیڈ سے لگا۔ مشین گن میرے ہاتھ میں آ گئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور کراہنے لگا۔

”اور ڈرامے بازی مت کرو“ میں نے کہا۔ ”یہ ٹرک میں خود بھی چلا کے لے جا سکتا ہوں۔ تمھاری لاش کے اوپر سے“

”آخر کیا چاہتے ہو تم؟“ ڈرائیور بولا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم ٹرک چلاؤ“ میں نے کہا۔

”دیکھو۔ تمھیں پیسہ چاہیے۔ تو میرے پاس دس ہزار سے کچھ اوپر ہیں“ وہ پنڈی کے پوٹھوہاری لہجے میں پنجابی بول رہا تھا۔

”اتنی ہی رقم میرے پاس بھی ہے“ میں نے کہا ”لیکن اس کے علاوہ میرے پاس یہ مشین گن بھی ہے۔ ایک ریوالور بھی ہے لیکن فضول باتوں میں گنوانے کے لیے وقت نہیں ہے“

”تمھیں معلوم ہے یہ ٹرک کس کا ہے؟“ صورت سے عادی مجرم نظر آنے والے ڈرائیور نے چابی گھماتے ہوئے کہا۔

”بیڈ فورڈ کمپنی کا“ میں نے کہا ”نیا ماڈل“

”یہ ٹرک حاجی کا ہے“ ڈرائیور نے ٹرک کو گیئر میں ڈال کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس پاجی کا نام دوبارہ میرے سامنے مت لینا۔ مجھے دورہ پڑ جاتا ہے اور پھر میں بہت خطرناک ہو جاتا ہوں۔ پاگل کتے سے بھی زیادہ“ میں نے کہا ”تم یہ ساری باتیں مجھے نہ بتاؤ۔ میں تو اس پاجی کی اولادِ گناہ کے نام بھی بتا سکتا ہوں۔ یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس ٹرک کو کل تک ایک باضمیر اور نیک ڈرائیور بادشاہ گل چلاتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کیوں اور کیسے مارا گیا تھا“

”رانا شمشاد“ ٹرک ڈرائیور اچانک بولا ”تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔ کس سے دشمنی کر رہے ہو۔ اپنی اور بیوی بچوں کی جان کو داؤ پر لگانے سے تمھیں کیا ملے گا۔ حاجی...“

میں نے ڈرائیور کے منہ پر تھوک دیا ”میں نے کہا تھا کہ اب یہ نام مت لینا۔ کہنا ہے تو اسے پاجی کہو“

”رانا“ ڈرائیور نے چہرے کو آستین سے صاف کیا ”اب بھی وقت ہے چھوڑ دو یہ دھندے۔ وہ افسر جس نے تم کو بانس پر چڑھایا تھا، میں ڈی ایس پی غیور حیدر کی بات کر رہا ہوں۔ وہ گیا خفیہ پولیس سے بھی اور پنجاب سے بھی“

”پنجاب سے تو ہم بھی جا رہے ہیں۔ سندھ کی طرف“ میں نے کہا اور اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ میرے گنجے سر اور مضحکہ خیز حلیے کے باعث سمجھ رہا تھا کہ میں رانا شمشاد علی ہوں جس نے بھیس بدل رکھا ہے۔ تھوڑی سی تشویش مجھے کلینر کی طرف سے تھی جو فرار ہو گیا تھا۔ گولی غالباً اس کی ٹانگ میں لگی تھی کیونکہ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا تھا۔ وہ ابھی تو بدحواسی میں منہ اٹھا کے جنگل کی طرف نکل گیا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی لوٹ کر آئے گا اور کسی نہ کسی طرح واپس پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

”تمھیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ اس ٹرک میں کیا ہے“ ڈرائیور بولا۔

”ہاں۔ آگے انجن ہے“ میں نے کہا ”پیچھے چھ پہیے ہیں۔ ٹائر ہیں۔ ٹائروں میں ہوا ہے۔ ہوا میں تقریباً تین چوتھائی نائٹروجن ہے اور پانچواں حصہ آکسیجن“

ڈرائیور نے کچھ حیران ہو کے میری طرف دیکھا ”اس ٹرک میں اسلحہ ہے“

”اچھا۔ کیا کچھ ہے؟“ میں نے کہا ”ایٹم بم کتنے ہیں۔ مجھے تو بس ایک چاہیے اس پاجی کے لیے۔ میں اسے بم پر بٹھا کے بم کو تیلی دکھا دوں اور۔ بوم۔ پاجی کی روح بھی فنا ہو جائے“

ڈرائیور نے مجھے یقیناً بہت جاہل سمجھا ہوگا کہ میں ایٹم بم کو ایک دیاسلائی سے پھٹنے والا بم سمجھتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔

”تم ہو تو میرے بھی دشمن۔ مگر باتیں مزے کی کرتے ہو“

”تمھیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا“ میں ...

... نے نفی میں سر ہلایا ”ہم پولیس والے سرکاری ملازم۔ ہم سے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

کیا ڈرنا۔ تم زیادہ سے زیادہ مجھے گرفتار کرا دو گے۔ چلو اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔ تمھارے بھلے کی بات کی تھی تو تم نے مذاق میں ٹال دیا۔"

"چلو اب مذاق ختم۔" میں نے کہا۔ "نام بتاؤ پہلے اپنا۔"

"میرا نام۔ ڈنگا۔" وہ بولا۔ "لوگوں نے ضد میں کہنا شروع کر دیا۔"

"کیوں؟ کیا تم بہت سیدھے تھے؟"

"نہیں۔ ماں باپ نے غلط نام رکھ دیا تھا۔ مستقیم خاں۔ جس کا مطلب وہی ہوا کہ سیدھے خاں۔" وہ بولا۔ "مگر میں بچپن سے جلیبی کی طرح سیدھا تھا۔ سب طعنے کے طور پر کہتے تھے کہ نام مستقیم مگر خود کتنا ڈنگا ہے۔ ڈنگا سمجھتے ہو نا۔ ٹیڑھا۔"

"میں تم کو سیدھا کر دوں گا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ "کیسے کیسے گھامڑ پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ او یار رانا پہلے تو خود سیدھا ہو جا۔ اس ٹرک کو کہاں لے جانا ہے تونے؟ اپنے سورے کے گھر؟"

"تمھیں معلوم ہے میرے سسر کا گھر؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے وہیں لے چلو۔ وہ خرید لے گا سارا اسلحہ اور مجھے دکان ڈال دے گا۔ وہ جو کلینر بھاگ گیا اس کا نام کیا تھا؟" میں نے اچانک کہا۔

"وہ کلینر نہیں تھا۔" ڈنگے نے کہا۔ "میرے ساتھ رہتا تھا۔" وہ معنی خیز طریقے پر اور نہایت فحش انداز میں آنکھ مار کے ہنسا۔

"میں نے اس کا نام پوچھا تھا۔ کام نہیں۔" میرا ہاتھ ایک دم حرکت میں آیا اور ضرب اس کی ناک پر پڑی۔ ٹرک ذرا سی دیر کے لیے لہرایا۔ ڈنگے نے درد سے بلبلا کے بریک لگائے اور اسے روک لیا۔ سامنے سے آنے والا ایک ٹرک چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔

"پاگل دے پتر۔ ابھی ٹکر ہو جاتی۔" ڈنگے نے چیخ کر کہا۔

"کلینر کا نام کیا تھا؟" میں نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ اس کا سر ڈیش بورڈ پر بڑی آواز کے ساتھ لگا۔

"چانن دین۔" ڈنگا سر اٹھا کے بڑی مشکل سے بولا۔ وہ اب کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ "یہ کسی کو معلوم نہیں۔ کہ وہ سفر میں میرے ساتھ جاتا تھا۔"

"ٹرک چلاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہو۔ ورنہ میں تم کو واقعی سیدھا کر دوں گا اور سیدھا اس راستے پر روانہ کر دوں گا جو جہنم کو جاتا ہے۔"

"واہ اوئے شیر دیا پترا۔ ہاتھ میں بندوق لے کر کیسا بول رہا ہے۔" ڈنگے نے حقارت سے کہا۔ ٹرک پھر روانہ ہو گیا۔ ڈنگا اپنی ناک سے بہنے والے خون کو ایک میلے کپڑے سے صاف کرتا جا رہا تھا۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں بھی ایک ریوالور تھا اور کچھ کاغذات تھے۔

"رانا شمشاد علی۔ تم مجھے چلنے دو۔" ڈنگے نے کہا۔ "اس ٹرک میں تمھارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر پہلے تھی تو اب نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ کھجل ہو رہے ہو۔"

"تم نے یہ روڈ سائن دیکھا؟" میں نے کہا۔

"کون سا روڈ سائن؟"

"میں نے دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "آگے دائیں طرف کوئی چھوٹی سڑک ہے۔ ٹرک ادھر ہی موڑ لینا۔"

"اور اگر میں نہ موڑوں؟"

"تو میں تمھاری گردن موڑ دوں گا۔ ایسے کہ تم پیچھے دیکھنے لگو گے اور تمھاری گردن کی چوڑیاں الٹی ہو جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "تم تو صرف ڈنگے ہو۔ میں بڑا ڈونگا ہوں۔ بہت گہرا۔"

ڈنگے نے مجھ پر ایک حقارت کی نظر ڈالی۔ "پتا چل جائے گا یہ بھی۔" اور ٹرک کو سیدھے ہاتھ کی پتلی سی سڑک پر موڑ لیا۔ سڑک کسی چھوٹے سے قصبے کی طرف جاتی تھی چنانچہ اس کی خستہ حالی بہت نمایاں تھی۔ اس کے دونوں جانب درختوں کی قطار تھی اور پھر کھیت تھے۔ میں بہت سکون سے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔ مشین گن میرے پیروں میں دبی ہوئی تھی اور ریوالور اب میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

"رفتار کم رکھو۔" میں نے کہا۔ "دس میل۔ اور یہ دیکھو الٹے ہاتھ پر ایک کچا راستہ ہے۔"

ڈنگے نے ٹرک کو کچے راستے پر اتار لیا۔ ہچکولے کھاتا ٹرک تقریباً دو سو گز تک رینگتا ہوا گیا۔ پھر مجھے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ میں نے ٹرک کو الٹے ہاتھ پر درختوں کے پیچھے لے جانے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ڈنگے۔ ٹرک روک دو۔" میں نے کہا۔ "اور سیدھی طرح نیچے اتر آؤ۔"

ڈنگے نے مجھے ریوالور ٹرک کے گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھتے دیکھا اور بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے چابیاں نکال کے مٹھی میں دبا لیں۔ میں نے اس کی نیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے رانا شمشاد علی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ اس خوف سے بالکل بے نیاز تھا کہ میں اسے قتل بھی کر سکتا ہوں۔ میری توقع کے مطابق اس نے چابی کھیتوں کی طرف اچھال دی۔ اس وقت میں ٹرک کے سامنے سے گزر کے آ رہا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں نے ڈنگے کی یہ حرکت بھی نہیں دیکھی۔ ڈنگے نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مارا تھا کہ ٹرک کو ناقابلِ استعمال بنا دیا تھا۔ حالانکہ کسی بھی گاڑی کو ڈائریکٹ تار ملا کے اسٹارٹ کرنا معمولی بات ہے۔

"ہاں بھئی ڈنگے۔ اسلحہ نہیں ہے تو پھر ٹرک میں کیا ہے؟"

"تیری ماں دے انڈے۔" ڈنگا مجھے گالی دے کر بولا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں چنانچہ اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک دم نیچے جھک کر مٹی کا سخت ڈھیلا اٹھایا اور میری طرف پھینکا۔ میں غوطہ مار کے بچ گیا۔ ڈنگا ایک دم پلٹ کے بھاگا اور اس نے اچانک نیچے جھک کر کوئی چیز اٹھالی۔ میں اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ اٹھا لی تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر خوش کیا۔ میں کئی دفعہ گرا اور بظاہر شکست تسلیم کرنے کے انداز میں پیچھے ہٹتا گیا۔ میں نے اسے ڈنگے بھائی بھی کہا۔ وہ اور شیر ہو گیا اور مجھے وہ گالیاں بکنے لگا جو انتہائی غلیظ شمار ہوتی ہیں۔ پانچ منٹ بعد میں نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار وہ ڈنڈے جیسی شاخ گھما کے تھوڑا سا قریب آیا ہی تھا کہ میں ایک دم ہوا میں اٹھا اور میں نے اس کے سینے پر کک ماری۔

میرا خیال ہے کہ اسے چوٹ اتنی نہیں آئی تھی جتنا کہ اسے حیرت کے صدمے نے بے حال کیا۔ یہ ایک خالص پروفیشنل کک تھی جو بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیتی۔ روزمرہ کی لڑائیوں میں گھونسے لاتیں اور ٹکریں مارتے تو اس نے سب کو دیکھا ہوگا مگر یوں اڑ کر دونوں پیروں کی ضرب لگاتے شاید فلموں میں ہی دیکھا ہوگا۔

"آؤ مسٹر ڈنگے۔" میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "اس وقت تو میرے ہاتھ بھی خالی ہیں۔ تم کو شکایت تھی نا کہ اسلحہ ہاتھ میں لے کر میں شیر بن گیا تھا۔"

وہ خود ہی اٹھا۔ اس کا ارادہ مقابلے کو جاری رکھنے کا نہیں تھا مگر وہ میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہ پکڑتا تو یہ ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوتا۔ وہ ایک بار پھر بڑک مار کے مجھ پر لپکا۔ غالباً وہ میرا ہاتھ تھام کے مجھے اپنی جانب کھینچنا چاہتا تھا اور میرے سینے پر اپنا سر مارنے کی سوچ رہا تھا مگر ہوا اس کا الٹا۔ یعنی پہلے میں اس کی طرف بڑھا اور پھر ایک دم جام ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کو جھٹکا لگا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ جھک کر تھوڑا سا آگے آیا ہی تھا کہ میں نے اسے دوسرا جھٹکا دے کر ایک گھٹنے پر اٹھا لیا اور پلٹ کے دوسری جانب پھینک دیا۔ اس دفعہ وہ بلبلایا اور اس نے اٹھنے کی کوشش ہی نہیں کی لیکن میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھولتا رہا۔

"بس یار۔" میں نے کہا۔ "تم تو بچپن سے ڈنگے ہو۔ اتنی جلدی سارے بل نکل گئے۔ کتے کی دم سے بھی گئے گزرے ہو تم تو یار۔ اسے بھی بارہ برس تو نلکی میں رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی سنا ہے وہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔" میں نے اس کے منہ پر مکا مارا۔ وہ کراہ کے دہرا ہوا تو دوسرا مکا اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ گرنے لگا تھا کہ میں نے اسے اوپر اٹھا لیا اور تھوڑا سا گھمایا۔

"رانا صاحب۔ رانا جی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے بخشو۔" وہ ایک دم منت سماجت پر اتر آیا۔

میں نے اسے دور پھینکنے کے بجائے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ "غلطی تو انسانوں سے ہوتی ہے۔ تم شیطانوں میں شامل ہو۔ تم سے گناہ اور جرم ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر کہو کہ میں نے گناہ کیا۔ کہ پاجی کو حاجی کہا۔"

وہ چپ کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ "ہاں۔ جی۔"

میری لات پڑتے ہی وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا چہرہ اور اس کے کپڑے سب کھیتوں کی مٹی میں بھر گئے۔ "ہاں جی کے بچے۔ جو میں نے کہا ہے وہ دہراؤ۔"

"میں۔۔۔ گناہ کیا میں نے کہ۔۔۔ پاجی کو۔۔۔ حاجی کہا بخشو۔"

میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ مارا۔ "دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ میں تمھارا سجن نہیں ہوں۔ دشمن ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ اس ٹرک میں کیا مال ہے؟"

"صرف پھل جناب۔" وہ بولا۔ "آپ بے شک دیکھ لو۔"

"دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہے مسٹر ڈنگے۔" میں نے کہا۔ "میں تمھاری بات پر اعتبار کرتا ہوں۔ اب اپنی عزت اٹھاؤ جو خاک میں مل چکی ہے۔" میرا اشارہ اس کی پگڑی کی طرف تھا۔ وہ ایک لنگی تھی جو اس نے بدمعاشوں کے انداز میں سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

ڈنگے نے لنگی اٹھالی اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ "اب اس کو لمبائی کے رخ چار حصوں میں تقسیم کرو۔" میں نے کہا۔ "ہر حصے کو گانٹھ باندھ کے لمبی رسی بناؤ۔ اسے پیٹرول۔ میرا مطلب ہے ڈیزل کے ٹینک میں ڈال کے نکالو۔"

"وہ کس لیے سچ۔۔۔ جناب۔" وہ بولا مگر پھر میرے تیور دیکھ کے تعمیلِ حکم میں مصروف ہو گیا۔ میں نے ڈیزل میں بھیگی ہوئی لمبی پٹی کو ٹرک سے باندھ کے دور تک پھیلایا تو ڈنگا سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں سے دوسرا ریوالور بھی نکال لیا۔ دونوں ریوالور اپنی جیبوں میں ٹھونس کر میں نے مشین گن اٹھالی۔ سیٹ ہٹا کے دیکھنے سے مجھے اس کا ایک اضافی راؤنڈ دستیاب ہوا۔

"اب اسے آگ لگاؤ۔ اور میرے ساتھ بھاگو۔" میں نے کہا۔

"یہ۔ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں۔ وہ حاجی۔ میرا مطلب ہے پاجی تو مجھے مار ڈالے گا۔" وہ فریاد کرنے لگا۔ "میرے بیوی بچوں کو بھی اٹھوا لے گا۔ وہ اپنا نقصان کرنے والے کو نہیں چھوڑتا۔"

"اپنا نقصان کوئی بھی پسند نہیں کرتا ڈنگے۔ مگر نقصان کا سودا تم بہت پہلے کر چکے تھے۔" میں نے کہا۔ "فائدہ تو بہت عارضی تھا اور اس نقصان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا جو اب تمھیں ہوگا۔ بس اس وقت تمھیں یقین تھا کہ نقصان کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ بیوی بچے تو ہمیشہ بے ... مارے جاتے ہیں۔ وہ کچھ کرتے نہیں مگر سزا ضرور پاتے ہیں۔ تم نے ... پہلے سوچا ہوتا تو وہ بچ جاتے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ چلو آگ ... اپنے گھر کو۔"

اس نے جیب سے ماچس نکال کے کپڑے کو یوں آگ لگائی جیسے وہ واقعی اپنے گھر کو جلا کے خاک کر رہا ہے۔ میں نے ... اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ ... تھا کہ ڈنگا جھوٹ بول رہا ہے اور ٹرک میں اب بھی اسلحہ ہوگا۔ مگر حاجی نے رسک نہیں لیا تھا۔ اس نے ٹرک کا مال بدل دیا تھا کہ خدانخواستہ خبر دشمنوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہو تو وہ محفوظ رہے۔ جس قسم کے کاروبار میں وہ ملوث تھا اس میں دشمن ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

دس منٹ میں ہم پھر بڑی سڑک کے قریب تھے۔ ڈنگا بری طرح

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہانپ رہا تھا۔ تقریباً آدھا میل دور ہم ٹرک کو ایک روشن الاؤ کی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ اس میں صرف ایک دھماکا ہوا تھا جو ڈیزل ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا تھا۔ اس سے آگ اور بھڑکی تھی مگر مزید دھماکے نہیں ہوئے تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ ٹرک میں صرف پھل تباہ ہو رہے تھے۔ مجھے امید تھی کہ جب یہ الاؤ بھڑکے گا تو گرد و نواح سے کچھ لوگ ضرور آئیں گے۔ قریب ترین آبادی بھی زیادہ دور نہیں ہو سکتی تھی۔ پانچ سات میل بعد کوئی نہ کوئی گاؤں آ ہی جاتا ہے پھر سڑک کی طرف سے بھی کسی کا آجانا بعید از امکان نہ تھا۔ چنانچہ میں نے بھاگتے ہوئے جنگل کے درختوں کے درمیان سے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا اور اس طرح سڑک سے دور رہا تھا۔ کھیتوں میں ہل چلایا جا چکا تھا۔ اس کھدری ہوئی مٹی میں بھاگنا خاصا دشوار کام تھا۔

ٹرک جب موڑ کر دور ہو گئی اور متحرک روشنی کے ساتھ مجھے ہر گزرنے والی گاڑی کا معمولی سا شور بھی سنائی دینے لگا تو میں نے ڈنگے کو روک لیا۔ سانس میری بھی پھول رہی تھی۔

ڈنگے ... میں نے کہا۔ "اس ٹرک کا اسلحہ کس ٹرک میں منتقل کیا گیا تھا؟"

ڈنگا دھونکنی کی طرح سانس لیتا رہا۔ "مجھے... نہیں... معلوم۔"

"ہاں ایک بار اور پوچھوں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سوال کے صحیح جواب پر تمہاری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔ حاجی شاید تم کو بخش دے ... یقین کرے کہ تم کو کس طرح ہائی جیک کیا گیا تھا۔"

"... کیا گیا تھا؟"

"... زبردستی اغوا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا وہ دوست بطور ... ہے۔ اس کے علاوہ تم کو بہت سے بس اور ٹرک ڈرائیور ... گے جو گواہی دیں گے کہ انھیں بھی اسی طرح روکا گیا تھا۔"

"تم ... روکا تھا؟"

"صرف نمبر دیکھنے کے لیے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے دوسرے ٹرک کا نمبر بتا دو۔"

"رانا صاحب۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

"دیکھو۔ نمبر تو میں پوچھ کر رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ خیال بھی دل سے نکال دو کہ تم کوئی بھی نمبر دے کر مجھے ٹال سکتے ہو۔ میرے پاس ان سب ٹرکوں کے نمبر ہیں جو اس کام میں استعمال ہوتے ہیں۔"

یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ یہ فہرست چکری کی فراہم کردہ تھی۔

"میں تصدیق کروں گا۔ سچ بتاؤ گے تو تمھیں انعام میں وہ دس ہزار دے جاؤں گا جو تمھارے پاس ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے دس ہزار . . ."

"ہاں۔ میں تم سے وہ دس ہزار نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم اس پاجی سے کہہ دینا کہ رانا نے سب چھین لیا۔ اسلحہ بھی اور رقم بھی۔ اسے جلا ہوا ٹرک دیکھ کر یقین آجائے گا۔ میں تم کو بے ہوش کر کے یا باندھ کے ایسی جگہ ڈال جاؤں گا جہاں سے کوئی بھی تم کو اٹھا لے گا۔ لیکن . . ."

وہ منتظر رہا کہ میں آگے کیا کہتا ہوں۔

"اگر تم نے مجھے اس ٹرک کا نمبر نہ بتایا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "تو میں۔ پہلے ایک ایک کر کے تمھاری انگلیاں توڑوں گا۔" میں نے اس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی یوں توڑ دی جیسے وہ کچی پنسل تھی۔ ڈنگا بری طرح چلایا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم نے دیکھا کہ ایک انگلی کتنی مشکل سے ٹوٹتی ہے اور ابھی ایک جگہ سے ٹوٹی ہے۔ لاؤ میں اسی کو درمیان سے توڑ کے دکھاتا ہوں۔"

ڈنگا ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ سخت تکلیف میں کراہ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کی انگلی کو پکڑے کھڑا تھا۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

"تمہارا وہ پاجی آقا تم پر رحم کرتا ہے۔" میں نے کہا اور ایک بار اس کا ہاتھ پھر دبوچ لیا۔ "وہ تو تمھارا ان داتا ہے۔ تم اس کا نمک کھاتے ہو۔ میں دشمن ہوں۔ مجھ سے رحم کی امید کیوں رکھتے ہو؟"

ڈنگے نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر میں نے اس کا بازو مروڑ کے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نے اسے دبا کے نیچے گرا دیا اور اس کی پیٹھ پر اپنا گھٹنا رکھ کے اسے ہلنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

"ہاں۔ کیا نمبر ہے اس ٹرک کا۔" میں نے اس کے ہاتھ کی دوسری انگلی کو الگ کیا۔ وہ تکلیف کے باعث چیخ رہا تھا اور بار بار رانا صاحب۔ رانا صاحب کر رہا تھا۔ اس کے لیے اپنی مٹھی بند کر کے دوسری انگلی کو بچانا بھی ناممکن تھا۔

"دس انگلیاں بیس جگہ سے توڑنے کے بعد بھی میں نمبر نہ لے سکا تو ڈنگے خاں۔" میں نے اس کی سب سے چھوٹی انگلی پٹ سے توڑ دی۔ وہ تڑپا اور بلبلا کے اٹھنے لگا۔ میں نے اسے پھر دبایا اور اس کی دونوں ٹوٹی ہوئی انگلیوں کو ہلانے لگا۔ وہ ایسے کراہنے لگا جیسے مرنے والا ہو لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی وہ بے ہوشی کا ڈراما کر سکتا ہے ہوش بھی نہیں ہو سکتا۔ "دس انگلیاں بیس جگہ سے تڑوانے کے بعد بھی تم بہادری سے اس پاجی کے وفادار بنے رہے۔ تو میں باری باری بازو توڑوں گا۔ کہنی سے نیچے۔ کلائی کے پاس سے۔ پھر ذرا اوپر۔ اس کے بعد شانوں کے قریب سے۔"

میں نے اس کے بازو پر ہر جگہ نشان لگانے کے انداز میں مکے مار کے اسے یقین دلا دیا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔

"اور جناب ڈنگے خاں صاحب۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد بھی تم نہ بولے تو پھر تمھاری ٹانگوں کی باری ہے، پھر پسلیوں کی، جو میں شاید دو سو سے اوپر ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں سب نہیں توڑوں گا لیکن اوپر سے نیچے تک تم اتنی جگہ سے ٹوٹ جاؤ گے کہ کم سے کم دو سال پلستر میں رہو گے اور کوئی بہت ماہر ہڈیوں کا ڈاکٹر ہوگا تو ممکن ہے سب کچھ پھر جوڑ دے۔ مگر ایک تو اس میں خرچہ بہت ہے۔ کون دے گا تمھیں اتنا پیسہ۔ وہ پاجی تو دینے سے رہا۔ اس کے لیے تم اتنے ہی بے کار ہو جاؤ گے۔ جتنا یہ ٹرک بے کار ہو گیا ہے اور ٹھیک ہونے کے بعد بھی تم ٹیڑھے ضرور ہو جاؤ گے۔ اب نہیں ہو مگر بعد میں ہو جاؤ گے۔ تمھارے ہاتھ پیر بالکل سیدھے نہیں رہیں گے۔ تم ٹیڑھا چلو گے۔ ٹیڑھا دیکھو گے۔"

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں بتاتا ہوں۔" وہ دہشت زدہ ہو کے چلانے لگا۔

"بولو بولو۔ مگر آہستہ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمھارے منہ میں کچھ بھرنا پڑے۔ یہاں تو یہی گوبر وغیرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھارا منہ میٹھا کرانے کے لیے۔ مٹھائی نہیں لا سکتا میں۔"

اس نے مجھے ایک نمبر بتایا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور جیب میں سے ایک کاغذ نکالا۔ دیا سلائی جلا کے اس پر لکھے ہوئے نمبروں سے چیک کیا۔ وہ نمبر ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ ڈنگا اب مٹی میں بیٹھا بری طرح لرز رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ شدید تکلیف میں تھا لیکن وہ اس درد کا علاج کرنے سے قاصر تھا۔

"یہ ٹرک کب مال لے کر چلے گا؟" میں نے کہا۔

"رات دو بجے۔" وہ بولا۔ "اور تین بجے کے درمیان۔"

"گویا ابھی تھوڑی دیر میں۔" میں نے گھڑی کے روشن ڈائل کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔ تمھیں ایک گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا۔ جھوٹ کا انجام۔ اگر وہ ٹرک نہ آیا تو میں آؤں گا۔ اور تم سے پھر پوچھوں گا لیکن جرمانہ وصول کرنے کے بعد۔ پہلے میں تمھارے دونوں ہاتھ توڑوں گا۔"

"تم مجھے ایک ہی بار گولی کیوں نہیں مار دیتے۔" وہ پاگل ہو کے مجھے گالیاں بکنے لگا۔

"ڈنگے... میں تمھارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔ تم نے کہا بھی تھا کہ تم کیا قتل کرو گے۔ ملازم سرکار۔ میں واقعی قتل نہیں کروں گا لیکن میں تم کو موت سے زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں۔ میں تم کو لنگڑا لولا ہی نہیں، اندھا بھی کر کے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس کے بعد تم چاہو تو خودکشی کر لینا، حرام موت مر جانا۔ اگر وہ ٹرک آگیا۔ تو پھر میں نہیں آؤں گا۔ صبح کوئی آجائے گا تم کو اٹھانے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور غالباً اس خیال سے خوش ہوا کہ میں اسے آزاد چھوڑ جانے کی حماقت کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

"ڈنگے بادشاہ۔" میں نے کہا۔ "تم کو باندھنے کے لیے میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔ تم کچھ بندوبست کرو۔"

"میں؟" وہ خون آلودہ خشک لبوں پر زبان پھیر کے بولا۔ "میں کیا کروں۔"

"تم یہ کرو۔ کہ اپنا ازار بند نکال کے مجھے دے دو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیسے۔ ہو سکتا ہے؟"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم شلوار کو اوپر ایسے باندھ لو جیسے دھوتی باندھتے ہیں۔"

"رانا صاحب۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پہلے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔"

ڈنگے نے بادل ناخواستہ تعمیل کی۔ اس کا ریشمی ازار بند خاصا لمبا تھا۔ جب وہ شلوار کو کمر کے گرد گرہ دے کر فارغ ہوا تو میں نے اسے ایک درخت کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کے دونوں ہاتھ تنے کے پیچھے سے گزار کے ایک ساتھ باندھ دیے۔ ... اس کی کلائیوں کے گرد لپیٹنے کے بعد میں نے اس ریشمی ڈوری کو ایسے گرہ دی کہ ڈنگا لاکھ کوشش کرتا اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ٹوٹی ہوئی انگلیوں کی خفیف سی حرکت بھی اسے شدید تکلیف میں مبتلا کرتی تھی۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے میں نے اس کی قمیص کا دامن پھاڑا اور کپڑے کا گولا اس کے منہ میں ٹھونسنے کے بعد میں نے اپنے رومال سے اس کا منہ باندھ دیا۔

"چار پانچ گھنٹے کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر صبح ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی میں لوٹ آؤں۔ تمھیں غلط بیانی کی سزا دینے کے لیے ابھی وقت ہے۔ اگر تم نے جھوٹ بکا ہے تو بتا دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی اور وہ اپنا سر بلند رکھنے میں بھی ناکام تھا۔ مجھے جواب دے کر اس نے پھر سر کو یوں جھکا لیا جیسے وہ غنودگی میں ہو۔

"مسٹر ڈنگے۔ سیدھے کھڑے رہو گے اور ہاتھ پیر نہیں چلاؤ گے تو تمھاری دھوتی بھی نہیں کھلے گی۔ زور آزمائی کرنے یا چیخنے چلانے کی کوشش سے بھی فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ پس صبر اختیار کرو۔" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں پھر سڑک پر تقریباً اسی جگہ تھا۔ جہاں سے میں نے ٹرک کو دائیں جانب موڑا تھا۔ ملتان کی طرف سے ایک گاڑی آئی اور میں نے صرف پلٹ کر ہی دیکھا تھا مگر وہ تھوڑا سا آگے جا کے رک گئی۔ میں قریب پہنچا تو گاڑی سے ایک شخص نے سر نکالا۔

"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟" وہ کوئی زمیندار معلوم ہوتا تھا۔

"ہاں جی۔" میں نے کہا۔

"کچھ بتا سکتے ہو کہ یہاں سے پٹرول پمپ کتنی دور ہوگا؟"

"پٹرول پمپ۔" میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کے کہا۔ "زیادہ دور نہیں ہے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ خیر تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" وہ بولا۔ "بیٹھو پیچھے۔ گاڑی میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ فیول میٹر دھوکا دے گیا۔ ہو سکتا ہے گاڑی کو دھکا لگا کے پٹرول پمپ تک پہنچانا پڑے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

”آپ کے پاس کوئی خالی ڈبا نہیں ہے ؟“

”ہے۔ لیکن پمپ والے کھلا پٹرول کہاں دیتے ہیں“۔ وہ بولا۔

”آپ جا کے حاجی عبداللہ کا نام لینا۔ اسی کا پٹرول پمپ ہے“۔ میں نے کہا“ اور بولنا کہ میں ڈنگے کو جانتا ہوں۔ وہ پٹرول دے دیں گے“۔

”کون ہے یہ ڈنگا ؟“ وہ حیران ہو کے بولا

”ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ روز کے آنے جانے والے ڈرائیورں کو یہ سب پٹرول پمپ والے جانتے ہیں“۔ میں نے کہا“ کہنا“ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو یہاں سے گیا ہے۔ مجھے راستے میں ملا تھا اور اسی نے یہ حوالے دیے ہیں“۔

”کیا۔ تم ڈنگے ہو ؟“

میں نے دانت نکال دیے۔ یہ نہ تردید تھی اور نہ تائید۔ پھر وہ جگہ آ گئی۔ جہاں میں نے ڈنگے کا ٹرک روکا تھا۔ گاڑی کا مالک سخت تشویش میں مبتلا تھا اور اس کی نظر برابر فیول میٹر پر تھی۔ جس کی سوئی ’ای‘ پر ٹھہر چکی تھی اور نہ جانے کب سے ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گاڑی بند نہیں ہوئی۔ وہ گاڑی میرے سپرد کر کے خود ڈبے میں پٹرول لینے کے لیے کبھی نہ جاتا۔ وہ ڈبا مجھے پکڑا تا کہ جاؤ اور پٹرول لے کر واپس آؤ

”بس جی۔ مجھے اتار دیں یہاں“۔ میں نے کہا۔

اسے گاڑی کو روکنا سخت گراں گزرا کیونکہ اسے پٹرول پمپ کی لائٹس نظر آنے لگی تھیں اور وہ چند قطرے پٹرول کے ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے کار کو آہستہ کیا اور بولا“ چلو اترو۔ گاڑی بند ہو گئی تو خواہ مخواہ پریشانی ہو گی“۔

”مہربانی جناب کی“۔ میں نے چھلانگ مارتے ہوئے کہا۔ گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ میں نے اس کی ٹیل لائٹس کو غائب ہونے تک دیکھا اور امید کی کہ وہ پٹرول پمپ پہنچ گیا ہو گا۔ پھر اسے حاجی عبداللہ یا ڈنگے کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

مجھے جانے اور واپس آنے میں ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا۔ اب رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ میرے پیچھے وہی جگہ تھی۔ جہاں رانا شمشاد علی اور ایک نامعلوم شخص کی لاشیں اب ٹھنڈی ہو کے اکڑ چکی تھیں۔ ادھر ہی ڈنگے کا خاص دوست فرار ہوا تھا۔ وہ ایک بزدل قسم کا لڑکا تھا جو ایک اخلاقی جرم میں بھی شریک تھا۔ چنانچہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ کچھ عرصہ روپوش رہے گا۔

سڑک پر سے اب گاڑیاں اکا دکا ہی گزر رہی تھیں۔ دس پندرہ منٹ میں ایک ادھر سے اور ایک دوسری طرف سے۔ یہ بھی سب ٹرک اور بسیں تھیں۔ میں نے ملتان کی طرف سے آنے والی ٹریفک کو نظر انداز کیا اور لاہور کی طرف سے آنے والی تین گاڑیوں کو روکا۔ ان میں دو ٹرک تھے۔ مری کا وہی کھوکھلا لٹھا میرے کام آیا۔ ڈرائیوروں نے مجھے غائبانہ گالیوں سے نوازا اور چلے گئے۔ صبح کے سوا تین بجے تھے۔ جب میں نے چوتھے ٹرک کو روکا اور اس کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ ایک بار پھر ڈرائیور نے کلینر کو آواز دے کر نیچے اترنے کو کہا۔ کلینر اس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ پچھلے حصے میں سامان پر ڈھکی ہوئی ترپال کے اوپر ہوا تھا۔ آگے میں نے ڈرائیور کے ساتھ ایک عورت کو دیکھا جس کی صورت کے خدوخال نمایاں نہیں تھے“۔ بوٹے“ ڈرائیور نے پکارا۔

”یہ۔ کیا چکر ہے ؟“ وہ سہم کر چلائی۔

ڈرائیور ہنسا“ کچھ نہیں بلبل۔ کوئی چکر نہیں۔ چکر میں تو ہم ہیں تمہارے“۔

”مذاق چھوڑو۔ کوئی ڈاکو تو نہیں ہیں“۔

”تم سے بڑا ڈاکو کون ہے بلبل۔ جس نے ہمارا سب کچھ چھین لیا اور اگر ڈاکو ہوں تو بس ان کو ایک ترچھی نظر سے دیکھنا۔ اوئے حرام دے بوٹے“۔

”کیا ہے استاد جی“۔

”او تھلے آ فٹا فٹ“۔ استاد نے کہا اور عورت نہ جانے کیوں چلائی۔

بوٹا نیچے اترا اور ٹرک کے آگے سے درخت کا تنا ہٹانے گیا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے مشین گن کو وہیں چھپایا اور ریوالور کافی سمجھتے ہوئے ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ترپال کے نیچے آدھے حصے میں بوریاں ہیں اور باقی آدھے میں کریٹ ہیں۔ میں آخری حصے میں ساکت ہو کے لیٹ گیا۔ ایک طرف سے میں نے ترپال کو تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا اور اس طرح کچھ محفوظ ہو کر اب بوٹا اوپر آتے ہی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

بوٹا چند منٹ بعد بڑبڑاتا ہوا اوپر آیا۔ اسے سخت گلہ تھا کہ استاد نے اسے اتنی بلندی سے نیچے اترنے کی زحمت دی مگر اپنی عاشقی ٹھکانے نہیں چھوڑی۔ کیا تھا اگر خود اتر جاتا۔ مگر اس کی تو شان گھٹتی تھی۔ بس رعب جھاڑنا مقصد تھا اپنی ’ماشوک‘ کے سامنے۔ ٹرک اس کے اوپر پہنچنے سے بہت پہلے چل پڑا تھا۔ بوٹے کی ساری توجہ توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنی جگہ تک پہنچنے پر مرتکز تھی۔ نیچے ٹرک کے انجن کا شور تھا۔ ڈرائیور اپنی ’ماشوک‘ سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا اور اس کی تفریح طبع کے لیے فلمی گانوں کا ایک کیسٹ بجا رہا تھا۔ چنانچہ جب میں نے بوٹے کو دبوچا اور ایک لمحے کا توقف کیے بغیر یا رحم دلی کے جذبات کی مداخلت سے پہلے اسے سڑک کے کنارے کی طرف اچھالا تو بوٹے کی فریاد استاد جی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ میں نے صرف اتنی احتیاط کی تھی کہ بوٹے کو سڑک پر نہیں پھینکا تھا تاکہ اسے چوٹ کم آئے اور وہ مرنے سے بچ جائے لیکن بے ہوش ہو جائے تو کسی گاڑی سے نہ کچلا جائے۔

یہ احساس تو مجھے حرام کے بوٹے کو پھینک دینے کے بعد ہوا کہ وہ کون تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے اسی نے ملک جی کی لاش کو کتوں کے سامنے ڈالا تھا۔ وہ عبداللہ کے بک جانے والے زرخرید غلاموں میں سے ایک تھا۔ جسے بطور خاص ٹرک کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ راستے کی دشواریوں سے نمٹنے میں ڈرائیور کی مدد کر سکے۔ وہ بھی اس پاجی کا خاص آدمی تھا۔ مجھے اس کے انجام پر بالکل تاسف کا احساس نہ رہا۔

ڈرائیور کی صورت میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ ڈنگے کے ساتھ بھی ایک لڑکا تھا مگر مجھے عبداللہ سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی ڈرائیور کے ساتھ اس کی ’ماشوک‘ کو بھی پروانۂ راہداری دے گا۔ ماشوک کو خود ڈرائیور نے بے ٹکٹ مسافر کی طرح بٹھایا تھا یا وہ بھی کوئی افسر بکار خاص تھی۔ ایک حادثے کے بعد جس میں بادشاہ گل مارا گیا تھا اور اسلحے کی کھیپ کا راز فاش ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ عبداللہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ مال کسی غیر ذمے دار شخص کے حوالے کر دے۔

میرے لیے مال کا جائزہ لینا بھی مشکل تھا۔ اصل مال نیچے دبا ہوا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بوریوں میں اناج ہو اور اسی میں گولیاں بھی ہوں۔ ٹرک اگر کراچی جا رہا تھا تو ساڑھے چھ سو میل کا سفر باقی تھا اور یہ مسافت ختم ہونے سے پہلے ہی میرا اور ڈرائیور کا تعارف ہو جانا یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں ڈرائیور کو کسی ٹرک اسٹینڈ تک پہنچنے دوں۔ ملتان سے پہلے شیر شاہ پر ٹرک والے عموماً چائے ناشتے کے لیے رکتے ہیں۔ وہاں ڈرائیور نے بوٹے کلینر کی جگہ مجھے پایا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ ٹرک ڈرائیوروں کی برادری کے اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ میری آواز بھی ان کے شور میں دب جائے گی اور وہ میری سنے بغیر مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد رہے نام اللہ کا۔ پولیس والے جانیں اور شکاری جانیں۔

میں نے طے کیا کہ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہی مجھے ٹرک پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ اکیلے ٹرک ڈرائیور سے نمٹنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اوپر سے ایک بار دردناک ”ہائے“ بلند کرتا تو ڈرائیور ضرور پوچھتا کہ کیا ہوا۔ جواب کیوں نہیں دیتا حرام دے بوٹے۔ اور پھر بھی جواب نہ ملتا تو ٹرک روک کے صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے خود نیچے اترتا۔ تشویش میں مبتلا ہوتا تو لقلم خود اوپر آتا۔ نہ آتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اوپر سے نیچے آ سکتا تھا۔ براہ راست اس کے اوپر۔ ڈرائیور کو رعایت دینے کا کوئی سوال نہیں۔ اسے مار کے ایک طرف پھینکنے سے عورت کو بھی تابع فرمان بنایا جا سکتا تھا۔ وہ ضرور جانتی ہو گی کہ ڈرائیور کون تھا اور اسے کہاں جانا تھا۔

ابھی میں قطعی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ ٹرک گھوم گیا۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو یہ کوئی سائڈ روڈ تھی۔ گھڑی میں ساڑھے چار بج رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرک نے لاہور کو تقریباً سو میل پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ میدانوں کھیتوں اور درختوں کے ایک سے منظر کے باعث کسی اور جگہ کی شناخت صرف سنگ میل سے ممکن تھی یا اس روڈ سائن سے جو بغلی سڑکوں پر تیر کے نشان سے کسی خاص قصبے یا گاؤں کا پتا دیتے ہیں۔

ٹرک کی منزل کراچی نہیں تھی۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی۔ یہ بھی تقریباً ثابت تھا کہ وہ لڑکی یا عورت ڈرائیور نے اپنی مرضی سے تفریح طبع اور سفر کو رومانٹک بنانے کے لیے نہیں بٹھائی تھی۔ اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ عورت اس ڈرائیور کی بیوی ہو اور اس نے ٹرک صرف بیوی کو گھر چھوڑنے کے لیے موڑا ہو۔ وہ کسی کام سے اس کو جاتے وقت اپنے ساتھ لے گیا ہو اور اب واپسی میں ساتھ ہی لے آیا ہو۔ اسے گھر چھوڑ کے وہ واپس کراچی کا راستہ پکڑے۔

ٹرک اسی وقت پھر گھوما اور ایک نیم پختہ سڑک پر چلنے لگا۔ اندھیرے میں کسی آبادی کے خدوخال نمایاں ہونے لگے۔ کچے مکان اندھیرے میں اپنی پسماندگی کی تصویر نظر آتے تھے۔ یہاں ابھی بجلی نہیں پہنچی تھی اور اس اعتبار سے یہاں کے رہنے والے انیسویں صدی سے بھی پیچھے تھے۔ یہاں گلیاں کچی ہوں گی۔ اسکول اور اسپتال نہیں ہوں گے اور ریڈیو ٹی وی ان کے لیے عجائبات اور طلسمات کا درجہ رکھتے ہوں گے۔ اس ترقی کی دوڑ میں جو شہروں کو بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں پہنچا رہی تھی۔ گاؤں والے اور پیچھے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ وہ پہلے کی طرح محکوم و مجبور و فقیر تھے۔ گورے آقاؤں کے بعد کالے آقا ان کے حقوق کا اور ان کی محنت کا اور ان کے جذبات کا پہلے سے زیادہ استحصال کر رہے تھے۔

ٹرک ایک دیوار کے ساتھ چلنے لگا جو باہر سے کچی نظر آتی تھی۔ اس پر بھوسے گارے کی ایک انچ موٹی تہ تو ضرور ہو گی۔ اندر یقیناً اینٹوں کی چنائی تھی اور شاید یہی ہماری منزل تھی یا سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اسلحے کے ٹرک اگر صرف رات کے اندھیرے میں ہی چلتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آدھی رات سے صبح کاذب تک چھ گھنٹے بہرحال ملتے ہیں اور ہر چھ گھنٹے کی مسافت پر ایک ٹھکانا ہو تو لاہور سے روانہ ہونے والا مال پانچویں دن بحفاظت کراچی پہنچ سکتا ہے۔ میں نے ریوالور چیک کیا اور تیار ہو کے بیٹھ گیا۔

چالیس پچاس گز کی دیوار کے وسط میں لکڑی کا دس بارہ فٹ اونچا پھاٹک تھا۔ ڈرائیور کے ہارن دینے سے قبل ہی کسی نے اس پھاٹک میں ایک کھڑکی کھولی۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے کسی نے کچھ کہا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔

”ڈنگے بادشاہ۔ خیر ہووئی“۔

”ڈنگے دے پتر“۔ ڈرائیور نے کہا“ باہر نکل کے دیکھ اندھے تیرا باپ آیا ہے“۔

”ماں نوں وی نال لیاندا جے ؟“ اندر والا ہنسا اور اس نے پھاٹک کھول دیا۔ ٹرک گزرا تو اس نے پھاٹک پھر بند کر دیا۔ میں اوپر سے احاطے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں دوسرا کوئی ٹرک نہیں تھا۔ ایک پرانی طرز کی ملٹری ولز جیپ اس برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جس کے پیچھے چار پانچ کمرے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

دکھائی دیتے تھے۔ کوئی شخص برآمدے میں کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں ہر کش کے ساتھ سگریٹ کی چنگاری زیادہ فروزاں ہو جاتی تھی۔ عورت اتری اور اندر چلی گئی۔

"ٹرک کو یہاں کیوں لائے ہو؟" ڈرائیور نے کہا۔

"اور کہاں لے جاتا جی؟" ڈرائیور نے کہا۔

"کیا سب گھاس کھا گئے ہیں؟" وہ شخص برہمی سے بولا۔ "معلوم نہیں کہ یہاں چھاپا پڑ سکتا ہے۔ اس رانا شمشاد علی نے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ کسی نے نہیں بتایا تمھیں؟"

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "بڑے بے خبر ہو جی آپ تو شہنشاہ ہو ۔۔۔ رانا اب کہاں۔"

"کیوں ۔۔۔ اس کا ٹرانسفر ہو گیا ہے کیا؟"

"ٹرانسفر۔ ایسا ویسا۔" ڈرائیور نے کہا۔ "سیدھا دوسری دنیا میں۔ مرنے والے کو گالی دے کے کیوں گناہگار ہوتے ہو۔"

"دیکھو سائیں۔ مجھے کوئی اطلاع نہیں۔"

"یار بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"جھوٹی اطلاع تمھیں بھی تو مل سکتی ہے۔" وہ بولا۔

"حاجی صاحب دے گا مجھے جھوٹی اطلاع؟"

"حاجی صاحب ۔۔۔ اس نے خود کہا تھا تم سے؟"

"تم شریمتی جی سے پوچھ لو۔" ڈرائیور نے برہمی سے کہا۔ "اور اگر اپنی ذمے داری پر کہتے ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔ ادھر ام دے بوٹے تو ابھی تک مرا پڑا ہے اوپر تھلے اتر۔" ڈرائیور بھی اسی دروازے سے اندر چلا گیا جس سے عورت اندر گئی تھی۔ باہر کھڑا ہوا شخص بھی آہستہ آہستہ پلٹا اور اس کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں ایک دم نیچے اتر آیا۔ چند سیکنڈ بعد میں ان کمروں کی قطار کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ پچھلی طرف ہر کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ یہ کچے نظر آنے والے بڑے بڑے کمرے تھے۔ میں نیچے جھک کر پہلی کھڑکی تک پہنچا اور پھر تھوڑا سا اٹھا۔ اندر صرف اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے کے باوجود کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کوئی چارپائی چرچرائی اور میں نے چوڑیاں کھنکنے کی آواز سنی۔ پھر سناٹا چھا گیا اور رفتہ رفتہ کسی نے خراٹے لینے شروع کیے۔ خراٹوں کی آواز مردانہ تھی۔ ایک مرد ایک عورت؟ میں نے سوچا۔ ایک عورت ابھی ابھی اندر گئی ہے جسے ڈرائیور نے شریمتی جی کہا تھا۔ راستے میں وہ اسے بُلبل کہہ کے بڑی بے تکلفی جتا رہا تھا اور غالباً اس کے ساتھ کچھ "عاشقی ماشوقی" بھی کر رہا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ اس کے لیے شریمتی جی ہو گئی۔ تو کیا وہ مسلمان نہیں تھی؟

میں تھوڑا سا آگے بڑھا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ خاموشی یہاں بھی گہری تھی اور اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن میں نے انتظار کیا اور دو منٹ بعد اس کا فائدہ ہوا۔ کوئی عورت گہری نیند میں گنگنائی۔ آخرِ شب کی نیند یا تو بہت کچی تھی یا وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ کسی مرد نے کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔" میں تیسری کھڑکی پر پہنچا۔ یہاں ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی جس کی لو انتہائی کم کر دی گئی تھی۔ برائے نام سی روشنی میں مجھے ایک پارٹیشن نظر آئی۔ کمرے کی اونچائی بارہ فٹ کے قریب تھی۔ چوڑائی بھی شاید اتنی ہی تھی لیکن لمبائی میرے دائیں بائیں اٹھارہ فٹ یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ اس لمبائی کو آٹھ فٹ اونچی تین دیواریں اٹھا کر اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ کمرے میں چھ فٹ چوڑے اور بارہ فٹ لمبے تین کمرے یا کیبن بن گئے تھے۔ ہر کیبن اوپر سے کھلا ہوا تھا لیکن باہر کی طرف سب کے دروازے الگ تھے اور یہ دروازے بند تھے۔ لالٹین کی روشنی راہداری تک محدود تھی۔ کھڑکیاں کھلی رکھنے کا مقصد تازہ ہوا کی فراہمی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اندر کی تقسیم نے ایک بڑے کمرے کو تین افراد کے لیے قابلِ استعمال بنا دیا تھا اور جیسا کہ میں آوازوں کو سننے کے بعد سوچنے پر مجبور تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ عشرت کدہ، نائٹ کلب یا ایسی ہی کوئی جگہ تھی جہاں پر بدقماش مرد اور بدکردار عورتیں اکٹھے ہوتے تھے۔

سوال یہ تھا کہ اس دور افتادہ گاؤں میں جہاں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ایئرکنڈیشنر تو کیا پنکھے تک نہ تھے اور عیاشی کے اسباب بھی محدود تھے کسی نے یہ سب اہتمام کیوں کیا تھا۔ میرے پاس زیادہ دیر باہر رہ کے سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ بہت جلد بوٹے کی غیر موجودگی کا راز خود بخود فاش ہو جاتا۔ اس دشمن کے قلعے میں میرا چھپنا بہت مشکل تھا جس کا پورا جغرافیہ بھی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے اس عورت پر تھی جو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کس اندھیرے کمرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے جانے والا ڈرائیور کہاں گیا تھا اور جو شخص برآمدے میں پہلے سے موجود تھا۔ وہ کہاں تھا۔ میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز بھی نہیں سن رہا تھا۔ یہ فرض کرنا محال تھا کہ وہ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔ ایسا انھوں نے باہر ضروری نہیں سمجھا تھا تو اندر ان کو ڈرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ اندھیرے میں ہی بیٹھے ہوں۔ ڈرائیور کو اور اس عورت کو سو میل تک ٹرک میں سفر کے بعد کم سے کم ایک پیالی چائے کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ سوئیں گے تب بھی کپڑے وغیرہ تو بدلیں گے اور ایک دوسرے سے کوئی بات کیے بغیر ان کے سونے کا کیا سوال۔

صاف بات یہ نظر آتی تھی کہ وہ کسی زیرِ زمین کمرے میں اتر گئے جہاں وہ اطمینان سے بیٹھے ہوں گے۔ میرا ذہن اوپر کے کمروں میں موجود افراد کو بھی مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ سب غدار بھی ہو سکتے تھے۔ ایسے بے ضمیر لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ جو پیسے کے یا عورتوں کے چکر میں پھنس گئے تھے اور اب دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ عورت کو جال کے طور پر استعمال کرنے کا حربہ پرانا ہے۔ یہ عورتیں بھی شکاری ہوں گی جو احمق مردوں یا ناتجربہ کار لونڈوں کو پھانستی ہوں گی اور جب وہ پھنس جاتے ہوں گے تو انھیں بلیک میل کیا جاتا ہو گا۔ اس ڈرائیور نے شریمتی جی کہا تھا تو شاید سب اگل دیا تھا۔ میں ہی احمق تھا کہ اتنی دیر میں سمجھا۔

اس وقت میں نے طے کیا کہ اب واپسی کا راستہ اور دروازہ تو بند ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ٹرک میں سے کوئی مشین گن تلاش کر کے لانی چاہیے یا دو ریوالوروں کی قوت کے سہارے اندر داخل ہو جانا چاہیے۔ مجھے ڈنگے کا خیال آیا۔ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے مشین گن چھپا رکھی تھی۔ کیا اس ڈرائیور کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔

میں تیزی سے کوئی آہٹ کیے بغیر واپس ہوا۔ ٹرک تک جاتے ہوتے میں نے افق پر سفیدی کو پھوٹتا دیکھا۔ یہ صبح کاذب تھی۔ کچھ دیر کے لیے پھر اندھیرا غالب آئے گا اور اس کے بعد صبح آئے گی۔ سونے والے جاگ اٹھیں گے۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے پناہ دینے والا اندھیرا ابھی نہ ہوگا۔ میں نے ٹرک کا دروازہ کھولا تو اس کی آواز سے خود ہی ڈر گیا۔ لیکن اب ڈرنے اور دبک کر بیٹھنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے سیٹ اٹھائی اور پلٹ کر دیکھا۔ ابھی تک باہر کوئی نہیں آیا تھا۔ میرا ہاتھ فوراً سیٹ کے نیچے گیا اور جب مشین گن کے ساتھ باہر آیا تو میرا حوصلہ دگنا ہو گیا۔ میں اسی طرح جھکے جھکے واپس ہوا۔

پہلی کھڑکی سے اندر اترتے ہوئے میں نے پوری احتیاط سے کام لیا۔ میں قبل از وقت خون خرابے کے حق میں بہرحال نہیں تھا۔ میں نے پنجوں پر چلتے ہوئے راہداری میں آگے بڑھنا جاری رکھا اور ایک ایک دروازے کو آہستہ سے دباتا گیا۔ وہاں ایک سے بارہ دروازے تھے اور ہر دروازے کے پیچھے کا منظر میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتا تھا۔

ساتواں دروازہ خلافِ توقع پیچھے ہو گیا۔ میں نے اندر کسی چٹخنی کے گرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ شاید وہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا یا اندر سے اسے بند نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ اسے بھیڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور دھکیلا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اس کے قبضے آواز نہ کریں۔ دروازہ کچھ اور کھل گیا۔ بہت آہستہ آہستہ میں نے اپنا راستہ بنایا اور اس کیبن میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک ہی ڈبل بیڈ تھا مگر اس پر سونے والے دو تھے جو یک جان دو قالب ہوئے پڑے تھے۔ اس منظر نے میرے ذہن کو غیر متوقع صدمہ نہیں پہنچایا کیونکہ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا اور میرے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں مچائی کیونکہ میں اس وقت آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دماغ سے سوچ رہا تھا۔ میرا جسم عمل کے لیے پوری طرح مستعد تھا لیکن اس عمل میں دل کے جذبات کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔

دروازے کو پھر اس طرح بھیڑنا کہ وہ باہر سے دیکھنے والے کو بند نظر آئے، دوسرا مشکل مرحلہ تھا جو میں نے کامیابی سے سر کیا۔ پھر میں بے سدھ اور مدہوش ہونے والوں کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ لڑکی بائیس چوبیس سال کی اور خاصی دلکش تھی۔ اس کا رنگ مجھے اندھیرے میں سانولا سا لگا۔ مرد بھی اسی کا ہم عمر محسوس ہوتا تھا۔ میری آنکھیں اب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ جھک کر دیکھنے سے مجھے لڑکی کے ماتھے پر بندیا نظر آئی۔ اس نے میرے لیے فیصلے کو آسان بنا دیا۔

میں نے صرف ایک وار کیا۔ لڑکی کا جسم تڑپا۔ مرد ایک دم ہڑبڑا کے اٹھا تو میں نے اسے یوں دبوچ لیا کہ اس کے حلق سے آواز باہر نہ نکل سکے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھتا رہا جس کا بے لباس اور بے آبرو جسم موت کے کرب میں بل کھا رہا تھا۔ میرے وار نے اس کی گردن توڑ دی تھی۔

"دیکھو۔ میں نے اس طوائف کو مار ڈالا ہے۔" میں نے اس سہمے ہوئے نوجوان کے کان میں سرگوشی کی۔ "اسی طرح میں تمھاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں لیکن میں تمھاری جان بخشی بھی کر سکتا ہوں۔ اگر تم خاموش رہنے کا وعدہ کرو اور میرے ساتھ تعاون کرو۔"

لڑکی کا جسم اب ساکت ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری گرفت میں بے بس نوجوان کے لیے میرے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے مشین گن ایک طرف رکھ کے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کی نال کو اس کے سر سے لگا کے میں نے اس نوجوان کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت بیٹھا لرزتا رہا۔ اسے اپنی برہنگی کا قطعی احساس نہ تھا۔

اچانک میرے کانوں نے ایک زنانہ ہنسی کی صدا سنی۔ پھر کسی مرد نے کہا۔ "وہ کلینر۔ حرام دا بوٹا۔ وہ تمھارے ساتھ آیا تھا تو اندر کہاں غائب ہو گیا۔ تلاش کرو اسے۔ سب جگہ دیکھو۔"

اس آواز پر میرا لہو میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ کیونکہ اس آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

یہ آواز استاد پیڈرو کی تھی جو میں نے طویل وقفے کے بعد سُنی تھی لیکن اس نام سے اور اس آواز سے میری زندگی کی اتنی پُر اذیت یادیں وابستہ تھیں کہ میں ہزاروں کے مجمع میں اس آواز کو پہچان سکتا تھا۔ دس سال یا بیس سال بعد بھی میرا ردِعمل مختلف نہ ہوتا۔ نفرت کی پرانی آگ میرے وجود کو جلانے لگی اور میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں مشین گن لے کر باہر نکلتے ہی اس کے ناپاک جسم کو چھلنی کر دوں۔ اس طرح کہ جسم میں دوڑنے والے گندے خون کا ایک ایک قطرہ بہہ جائے۔ مگر میں نے آسانی سے اس خواہش کو تھپک کر سُلا دیا۔ "ابھی نہیں۔" میں نے دل کو سمجھایا۔ "ابھی کچھ کام باقی ہیں جو ذاتی انتقام کی خواہش سے زیادہ بڑے اور اہم ہیں۔ پیڈرو ایک آدمی ہے۔ اسے ایک گولی ختم کر دے گی مگر اس کے مرتے ہی وہ سب شکاری روپوش ہو جائیں گے جو ہماری نظر میں ہیں اور وہ اپنی شکارگاہیں بدل لیں گے۔"

"جاؤ سائیں ... کیا میرا منہ دیکھتے رہو گے۔" پیڈرو نے بگڑ کے کہا۔

"ہاں جی ... دیکھتا ہوں۔" سائیں نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے ..."

"کیا ڈر ہے؟" پیڈرو نے اس کے اچانک چپ ہو

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

جلنے پر کہا۔
"کہیں وہ پیچھے نہ رہ گیا ہو؟"
"پیچھے کہاں؟"
"یہ تو پتا نہیں... وہ راستے میں ایک جگہ اُترا تھا۔" سائیں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"کیوں اُترا تھا؟"
"سڑک پر سے رکاوٹ ہٹانے کے لیے۔" سائیں بولا۔ "ایک خشک درخت کا تنا پڑا ہوا تھا۔ شاید کسی ٹرک سے گرا ہوگا۔"
"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ درخت سامنے پڑا ہوگا۔"
"ہاں... اچانک سامنے آگیا تھا۔"
"یار تو کیا تم اس کے اوپر سے گزر کے آگئے...؟"
"او نئیں استاد...... ہمیشہ ایسا ہوتا ہے... وہ کبھی نیچے اُترتا ہے تو میں اندازہ کر لیتا ہوں کہ پھر پیچھے چڑھ گیا ہوگا۔ ہوشیار لڑکا ہے اور دوڑ کے چڑھ جاتا ہے..."
"مطلب یہ ہے کہ تم فرض کر لیتے ہو... کہ وہ چڑھ گیا ہوگا۔ تصدیق نہیں کرتے اور ٹرک پہلے ہی چلا دیتے ہو؟" پیڈرو نے برہمی سے کہا۔
"میں... کیا... سب ہی ایسا کرتے ہیں جی..."
"سب کو گولی مارو... جاؤ اور دیکھو، وہ تمہارے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں۔" پیڈرو نے کہا۔ "کہیں اُسے جنگل میں تو نہیں چھوڑ آئے۔ وہ دوڑتا رہ گیا ہو تمہارے پیچھے... تم نے تو اس کی آواز تک نہیں سنی ہوگی... بہت مستی میں تھے تم... مجھے زرلا نے بتایا ہے..."
"آپ اس کنجری کی بات مت کرو جی۔" ڈرائیور نے اپنی عزت بچانے کے لیے کہا۔ "مستی میں تو وہ خود تھی۔ میں تو اُسے منع کرتا رہا کہ آرام سے بیٹھے... میں ٹرک چلا رہا ہوں مگر..."
"چھوڑو یہ اگر مگر... جاؤ بوٹے کو دیکھو۔"
"بوٹے کی فکر نہ کریں استاد جی... اوّل تو وہ میرا خیال تھا... ایسا کبھی پہلے نہیں ہوا... مگر بندہ بشر ہے... کہیں پیچھے رُک گیا ہو ذرا سی دیر کے لیے... پیر میں کانٹا لگ گیا ہو... یا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو... وہ گیا ہوگا تو آجائے گا... وہ اتنا بے وقوف اور ناواقف بھی نہیں ہے کہ یہاں نہ پہنچ سکے... کسی بھی پیچھے آنے والے ٹرک میں بیٹھ سکتا ہے۔"
"سالے ٹرک یہاں نہیں آتے۔" پیڈرو بولا۔
"ہاں... مگر سڑک تک تو آسکتا ہے... آگے یہ دس میل کا راستہ ہے۔" سائیں بولا۔ "پیدل طے کر لے گا۔"
"بکواس بند کرو اپنی... اگر وہ نہیں ہے تو اُسے لینے کے لیے جاؤ، یہاں میرے سامنے کھڑے کتے کی طرح بھونکتے مت رہو۔" پیڈرو نے دہاڑ کے کہا۔
"زیادہ گرمی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے... میں کُتا ہوں تو حاجی کا، تمہارا دیا نہیں کھاتا۔" سائیں مشتعل ہوگیا۔
"حاجی کس کا دیا کھاتا ہے... یہ معلوم ہے؟" پیڈرو غرّایا۔
"مجھے کوئی ضرورت نہیں معلوم کرنے کی۔" سائیں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ انسانوں کی طرح بات کرو۔ ایسے میں نے اپنے باپ کی کبھی نہیں سُنی تھی... تم میرے باپ یا آقا نہیں ہو... خود بھی کسی کے کتے ہو۔"
پیڈرو نے اُسے ایک گالی دی۔ بات بہت بڑھ گئی تھی اور دونوں کتے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ غالباً ان کے درمیان پہلے سے اختلاف اور رنجش کے اسباب موجود تھے۔ پیڈرو خود کو بڑے اور زیادہ طاقتور حریف کا کتا سمجھتے ہوئے سب پر حاوی رہنا چاہتا ہوگا، مگر لنکا میں جو تھا سو باون گز کا۔
سائیں نے جوابِ آں غزل کے طور پر پیڈرو کو زیادہ مرصّع گالی دی۔ اور اگلے چند سیکنڈ میں نہ جانے کیا ہوا... پیڈرو نے ڈرائیور پر حملہ کیا، یا ڈرائیور نے پیڈرو پر۔ میں ایک فائر کے دھماکے پر اُچھل پڑا۔ اس نوجوان نے چلاّ کے کہا۔ "کتل... کتل ہو گیا... مر..."
میں نے ریوالور اس کے مُنہ میں ڈال دیا۔ "ابھی تمہارا کتل ہو جائے گا۔ مُنہ بند رکھو اپنا۔"
وہ کوئی بنگالی تھا۔ اس کے لہجے اور تلفظ نے میرے لیے شک کی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ علیحدگی پسند غداروں کے ٹولے کا آدمی تھا۔ دھماکا سُن کر وہ اتنا بدحواس ہوا تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرنا بھول گیا تھا اور بے اختیار چلاّنے لگا تھا۔ دوسرے خلوت خانوں سے کئی مردوں عورتوں کی ملی جلی چیخوں میں اُس کی آواز دب گئی تھی۔ اس کی طرح دوسرے دادِ عیش دینے والے بھی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔
"سب اندر چلو..." پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "خبردار! جو کوئی باہر آیا... میں گولی مار دوں گا سب کو..."
خوف اور سراسیمگی کے مارے ہوئے واپس دوڑے۔ دروازے دھڑ دھڑ کر کے بند ہوئے۔ ایک عورت ہسٹریا میں چلاّنے لگی۔ "کھون... کھون..."
"چوپ سالی..." کسی مرد نے کہا۔ "تیرے باپ کا کھون ہو گیا ہے جو اتنا سور کرتی ہے۔" عورت کی آواز بند ہوگئی یا کر دی گئی۔
پیڈرو کی آواز سُننے کے بعد مجھے بالکل شک نہیں رہا تھا اس مختصر اور اچانک شروع ہو جانے والی جنگ میں شکست کس کی ہوئی، ڈرائیور مارا گیا تھا اور میں باہر جھانکے بغیر چشم تصور سے

اس کی لاش کو راہداری میں پڑا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یہ صورتِ حالات مجموعی طور پر میرے حق میں ہو گئی تھی۔ کلینر جسے میں نے چلتے ٹرک سے سڑک پر پھینکا تھا، پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ ڈرائیور اب مارا گیا تھا چنانچہ میری موجودگی کا راز افشا ہونے کے امکانات وقتی طور پر معدوم ہو گئے تھے۔
وہ بنگالی جس کے مُنہ میں ریوالور کی نال تھی، سانس روکے بیٹھا تھرتھر کانپ رہا تھا اور بے ہوش ہو کر گرنے والا تھا... اُسے زیادہ ڈر یہ ہوگا کہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ٹریگر نہ دب جائے۔
میں نے ریوالور باہر نکال لیا۔ "پھر مُنہ مت کھولنا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اپنی زندگی کی ضرورت خود تمھیں ہوگی مجھے اتنی زیادہ نہیں ہے۔"
"غلطی ہو گیا۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "مافی دو بابا۔"
"بابا؟... میں بابا نظر آتا ہوں تمھیں؟" میں نے اُسے گھور کے کہا۔
"نئیں... ہم ایسا نئیں بولا... تم نئیں، ہم بابا..." وہ ہکلانے لگا۔ "یہ سالا لوگ ہم کو پھنسایا۔"
میں نے اُسے مُنہ پر انگلی رکھ کر خاموش ہو جانے کو کہا کیونکہ باہر خاصی افراتفری تھی۔ لذتِ خواب سحر سے بیدار ہوتے ہی خوف اور دہشت کے عذاب سے دوچار ہونے والے سہمے ہوئے تھے اور آخری شب کے ہمسفر لمحوں سے نظریں چرا رہے تھے۔ صرف پیڈرو کی آواز تھی، جواب بھی سنائی دے رہی تھی۔ "اُٹھا لو اس کتے کی لاش اور باہر لے جاؤ۔"
"باہر کہاں...؟" کسی نے پوچھا۔
"پچھلی طرف... جہاں کل اس لڑکی کو گاڑا تھا۔" پیڈرو بولا۔ "اسی قبر کو کھود لو... مٹی ابھی نرم ہوگی۔ دوسری قبر کھودو گے تو زیادہ وقت لگے گا۔"
"ٹھیک ہے جناب۔" حکم کا غلام بولا۔
"او بے وقوف... اس طرح مت اٹھاؤ۔" پیڈرو نے کہا۔ "کیا یہاں سے وہاں تک خون ٹپکاتے جاؤ گے؟... دری لاؤ کوئی... اس میں لپیٹ کر اٹھاؤ۔"
"دری؟ فالتو کوئی نہیں..."
"فالتو کے بچے... کسی بھی کمرے میں سے دری نکال لو... ہر بیڈ پر دری ہے۔" پیڈرو بولا۔ "سب جاگے ہوئے ہیں... اور دیکھو... وہ دری کا کفن بھی ساتھ ہی دبا دینا مٹی میں... یہ نہ ہو کہ خون آلودہ دری واپس لے آؤ۔"
"جی جناب۔" یہ دوسرے حکم کے غلام کی آواز تھی۔
"اس کے بعد واپس آؤ اور یہ فرش گیلے کپڑے سے رگڑ کے اچھی طرح صاف کرو... نشان نظر نہ آئے۔"
"جی جناب..."
"کیا جی جناب جی جناب لگا رکھی ہے... جاؤ... دفع ہو جاؤ... ملو اپنی جگہ سے..." پیڈرو نے دہاڑ کر کہا۔ "کہیں وہ حرام دا بوٹا نہ آجائے اپنے استاد جی کے پیچھے... دیر کرو گے تو وہی قبر تیسری بار کھودنی پڑے گی... میں نہیں چاہتا کہ وہ استاد جی کی موت یا تدفین کا چشم دید گواہ بنے۔"
"مگر جناب... وہ پوچھے گا کہ ٹرک تو کھڑا ہوا ہے۔ استاد جی کہاں ہیں؟"
"اُسے میں جواب دے لوں گا... کہ وہ ٹرک کو یہاں چھوڑ کے کسی سے ملنے گیا تھا۔ کسی عورت سے اس کے ناجائز مراسم تھے۔ وہ اس کے بارے میں صرف اتنا ہی بتاتا تھا کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے زمیندار کی نئی چوتھی بیوی ہے۔" پیڈرو کسی حکم کے غلام سے نہیں خود سے ہمکلام تھا اور یہ کیفیت اس کے ذہنی انتشار کی غماز تھی۔
"واہ جناب... کیا دماغ پایا ہے۔" پہلا غلام بولا۔ "سمجھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کیوں واپس نہیں آیا۔"
"ہاں..." پیڈرو کے لہجے میں کچھ اطمینان آگیا۔ "مگر تم دونوں بھی سمجھ لو کہ تمھیں بھی یہی کہنا ہے... میرا ساتھ دو گے تو فائدے میں رہو گے..."
"ہماری طرف سے بے فکر رہیں جناب... لیکن یہ دوسرے..."
"ان کو چھوڑو... یہ کل چلے جائیں گے... ان کی جگہ نئے آجائیں گے، نہ انھیں کسی کا نام اور کام معلوم ہے... نہ آنے والوں کو معلوم ہوگا۔" پیڈرو بولا۔ "شاباش! اب جلدی کرو... اور یہ لو... ایک ہزار تمھارے... اور ایک ہزار تمھارے... ابھی یہی ہیں میرے پاس... بعد میں اور انعام ملے گا۔"
صاف ظاہر تھا کہ پیڈرو ڈرا ہوا ہے۔ وہ اس قتل پر پردہ ڈالنے کے انتظامات اسی لیے کر رہا تھا کہ وہ خود کو الزام سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ سائیں کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا کیونکہ وہ ایک خاص آدمی کا افسر بکارِ خاص تھا۔ حاجی اس کے قاتل کو آسانی سے معاف نہ کرتا۔ پیڈرو کی پشت پناہی کرنے والے یقیناً طاقتور لوگ تھے مگر انھوں نے بھی پیڈرو کو بے سبب قتل کرتے پھرنے کا کھلا لائسنس نہیں دے رکھا تھا۔
مجھے ان کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس جگہ ابھی پیڈرو کی ماتحتی میں دو ہی افراد تھے، ورنہ وہ سارے کام انہی کے سپرد نہ کرتا... زیادہ مددگار ہوتے تو وہ دو کو تدفین پر مامور کرتا اور دو یا کم سے کم ایک کو لہو کا سراغ مٹانے پر لگاتا لیکن اب جو کچھ کرنا تھا انہی دو کو کرنا تھا۔ ایک شخص کو میں نے رات کے اندھیرے میں دیکھا تھا، جو سائیں کو ڈنگا سمجھا تھا۔ دوسرا گیٹ پر متعین...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھا۔ اس طرح میرے حساب سے اندر تین افراد بھی ہو سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ چوکیدار نے گولی چلنے کی آواز نہ سنی ہو مگر وہ اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کے نہیں آ سکتا تھا۔ چوتھا خود پیڈرو تھا اور نرملا نام کی ایک عورت تھی جو کسی نامعلوم جگہ پر موجود تھی مگر گولی کی آواز سن کے بھی نہیں آئی تھی تو اس کے متعدد اسباب ہو سکتے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ کسی ساؤنڈ پروف کمرے میں تھی یا ڈر کے مارے باہر نہیں نکلی تھی۔

میں نے اس بنگالی کو دیکھا جس نے دھوتی نما لنگی باندھ لی تھی۔ اوپر اس نے اب بھی کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ صبح کا اُجالا اب باہر کی اجلی دھوپ کی خبر دے رہا تھا۔ اس روشنی میں میری نگاہ اس لڑکی کو بھی واضح طور پر دیکھ رہی تھی جو موت کی نیند میں بالکل پُرسکون تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر تکیے پر یوں رکھا ہوا تھا کہ شانوں کے گرد بال پھیل گئے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسبی تھی۔ ہر عورت جو کسی بھی عُذر، مجبوری پر خود کو بیچتی ہو طوائف کہلاتی ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ بنگالی بھی طوائف تھا۔ اس نے بھی خود کو اسی سکۂ رائج الوقت کی خاطر بیچا تھا جو اس عورت کو ملتا تھا۔ جسم کی قربانی دونوں کے لیے ناگزیر تھی اور فرق اگر تھا تو صرف قیمت کا... نیت کا فرق بہرحال نہ تھا۔ بنگالی نے شاید خود کو ایک لاکھ میں بیچا ہو تو اس عورت نے ایک ہزار میں۔ ہوس، بے ضمیری اور بے حیائی میں دونوں کے جذبات ایک تھے۔

باہر اب قدرے خاموشی تھی۔ شاید دونوں حکم کے غلام اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور پیڈرو ان کی کارکردگی سے مطمئن ہو کے کوئی دوسرا معاملہ نمٹانے کے لیے جا چکا تھا۔ میں نے دروازے تک جا کے ایک پٹ کو تھوڑا سا کھینچا اور باہر جھانک کے دیکھا۔ راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دائیں جانب ایک دروازے سے اندر پہنچنے والی دھوپ کا آدھا مستطیل حصّہ فرش پر پھیل جانے والے خون کو روشن کر رہا تھا۔ خون کا آدھا داغ سائے میں تھا۔ ایک ہی خون کے دو رنگ نظر آتے تھے۔ جس کا یہ خون تھا وہ کسی بے نشان مدفن کی مٹی میں ملنے کے لیے جا چکا تھا۔

اچانک میں نے نرملا کی آواز سنی۔ "چلیے بھئی آپ لوگ... اُٹھ جائیے" اس نے تالی بجا کے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ "سلوچنا... ساوتری... شیاما... چلو اُٹھو... ناشتے کا وقت ہو گیا..." وہ ہر بند دروازے پر دستک دیتی آ رہی تھی۔ دوسرے سب لوگ پہلے ہی جاگ چکے تھے اور صرف پیڈرو کے حکم کی تعمیل میں در بند کیے بیٹھے تھے۔

"اس کا نام کیا ہے؟" میں نے سرگوشی میں بنگالی سے کہا۔

بنگالی نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم نہیں جانتا۔"

"اچھا اس عورت کو جواب دو... کہ تم جاگ گئے ہو۔" میں نے ریوالور ہلا کے کہا۔ "اور تمھارا جواب غلط ہوا تو انجام بھی غلط ہو[گا]۔" میں نے دروازے کو اندر سے دبا کے رکھا۔ باقی دروازے کھل[تے] تھے اور میں باہر نکلنے والوں کی آوازیں سُن رہا تھا۔ بالآخر نرملا[نے] اس دروازے کے پٹ پر ہاتھ مارا۔ میں نے بنگالی کے سر کا نشانہ لیا۔

"چلو، اب باہر آ جاؤ... کوئی خطرے کی بات نہیں رہی۔"

"آتا ہے دیدی۔" بنگالی نے ریوالور پر نظر جما کے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ نرملا مطمئن ہو کے لوٹ گئی۔ اس کی اونچی ہیل پکے فرش پر تال دیتی ہوئی نرملا کے دُور ہو جانے کی خبر کرتی گئی۔

"تم نے ایک رات اس عورت کے ساتھ گزار لی اور اس کا نام پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"ہم پوچھا تھا۔" بنگالی بولا۔ "اُس نے نیئں بتایا۔ بولتا تھی، نام لاش ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر لڑکی کے بے جان [جسم] کی طرف دیکھا۔

"بولتا تھی... ہم مر گیا ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "ہم وہ لڑکی نہیں [ہے] جس کا کوئی نام ہو... پہلے نام تھا۔ گھر تھا اور ماں باپ تھا۔ اب کچھ نہیں ہے۔"

"اور... تم نے...؟" کوئی چیز میرے حلق میں اٹکنے لگی۔

"ہم بولا کہ یہ کیا بات ہے؟ ہم کو اپنا گھر اور ماں باپ کے بارے میں بتاؤ... یہ بولا کہ نیئں... ہم کچھ نیئں بتائے گا۔ ان کا [دل] خراب نہیں کرے گا... ہم تو مر گیا ہے مگر ان لوگ کو جینا ہے۔ ایسا ویسا سوال مت کرو... ہم سچ نیئں بولے گا... روز ہم ایک جھوٹا اسٹوری سناتا ہے اور اب کوئی اسٹوری بھی نیئں ہے۔ سب تنگ کرتا ہے۔ ہمارا بارے میں پوچھتا ہے... ہم کو کسی کا نیئں چاہیے... ہم بھی کسی سے نیئں پوچھتا ہے کہ تم کون ہے، تم بھی مت پوچھو۔"

میرے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی مرنے سے پہلے ہی [مر چکی] تھی۔ وہ خود کو لاش سمجھتی تھی اور اب ایک لاش ہی تھی۔ جس طرح وہ اپنے کسی خریدار کا نام و نسب نہیں پوچھتی تھی، اسی طرح مرنے سے پہلے اس نے اپنے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانا تھا۔ رنج اور ندامت کے احساس سے بوجھل ایک سرد آہ خود بخود میرے [سینے] سے نکل گئی۔

"تم خود کون ہو؟" میں نے کہا۔

"ہم طاہر میاں۔" وہ بولا۔

"گویا مسلمان اور پاکستانی..." میں نے تلخی سے کہا۔

وہ چپ چاپ کھڑا رہا... اُسے خوف ضرور لاحق تھا کہ [میرے] ہاتھوں اس کا انجام کیا ہو گا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ شرمندہ نہیں ہے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"بنگلہ دیش..." اُس نے کہا۔

میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میرا اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر یوں پڑا کہ وہ پیچھے لاش کے اوپر گرا۔ آس پاس کے کمرے خالی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس طمانچے کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ وہ چلّانے ہی والا تھا کہ میں نے پھر اُس کے منہ میں ریوالور گھسیڑ دیا۔

"تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ تعاون کرو... مجھے ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کے ساتھ ہی میں تمھاری گردن بھی توڑ سکتا تھا۔ تمھیں یہ رعایت اسی شرط پر مل سکتی ہے... ورنہ تمھاری جگہ دوسرا لے سکتا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔

"اسے ڈھانپ دو۔" میں نے آہستہ سے پیچھے ہٹ کے کہا۔

اور مجھے غالب کا فرمودہ یاد آیا۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی، میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا۔ یہ بات اس لڑکی پر کتنی صادق آتی تھی۔

طاہر میاں نے چادر کو پھر لاش کے اوپر تک کھینچ دیا۔

"میں اپنا سوال دہراتا ہوں... کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

"مشرقی بنگال..."

میں نے پھر اس کے منہ پر ویسا ہی اُلٹا ہاتھ مارا۔ "مشرقی پاکستان کہو... میں آخری بار پوچھوں گا اور اس مرتبہ غلط جواب ملا تو اپنی گردن کے ٹوٹنے کی آواز بھی شاید نہ سُن پاؤ۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"مشرقی... پاکستان کا..." وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولا۔

"مشرقی پاکستان کے کس شہر، ضلع یا دیہات کے...؟"

"چاٹگام۔" اس نے مختصر ترین جواب دیا۔

"کتنے عرصے پہلے یہاں آئے تھے؟"

"ایک مہینہ ہوا۔" وہ بولا۔

"اکیلے آئے تھے؟ یا ان سب کے ساتھ۔" میں نے دوسرے خالی کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم چھ آدمی آیا تھا۔" وہ بولا۔

یہ آدمی مجھے بہت کچھ بتا سکتا تھا لیکن میرے پاس وقت کم تھا۔ جو لوگ تہا دھو کے ناشتا کرنے گئے ہوئے تھے انھیں اچانک خیال آ سکتا تھا کہ ان کے دو ساتھی غیر موجود ہیں اور کوئی بھی ان کو جگانے کے لیے آ سکتا تھا۔ اگر کوئی آ جاتا تو اس کیمپ میں کسی دشمن کی موجودگی کا راز ایک لاش کی ٹوٹی ہوئی گردن سے فاش کر دیتی۔

"اس وقت سب لوگ کہاں ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"کچن میں..." وہ بولا۔ "ناشتا کے لیے۔"

"کچن کہاں ہے؟"

"آخری حصّے میں۔" بنگالی نے کہا۔ "سیدھا ہاتھ پر۔"

"اگر میں باہر جانا چاہوں۔" میں نے کہا۔ "تو میرے لیے کون سا راستہ محفوظ ہو گا؟"

"سامنے سیدھا ہاتھ پر دروازہ ہے۔ اس میں سے باہر جاؤ اور دیوار کے اوپر سے کود جاؤ۔" وہ بولا۔

"مجھے کوئی نہیں دیکھے گا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"نہیں..." وہ بولا۔ "ادھر کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت سب..."

"باہر دو آدمی ایک قبر کو دوبارہ کھود رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ ادھر نہیں ہے۔" بنگالی نے کہا۔ "تم مشرق کی طرف کو جائے گا، وہ سیدھے ہاتھ پر جنوب کی طرف والی دیوار کے پیچھے ہے۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "تو پھر اُٹھاؤ اس لاش کو۔ ہم سب اسی راستے سے نکلیں گے۔"

بنگالی کا رنگ پھر اُڑ گیا۔ "تم جاؤ بابا... ہم کو چھوڑ دو۔"

میں نے اس کی گردن یوں دبوچ لی کہ اس کا سانس رُکنے لگا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ "تم کو میرے ساتھ جانا ہے یا دنیا سے جانا ہے؟"

بلاشبہ وہ ایک بزدل آدمی تھا۔ ہر غدّار لالچی، کمینہ اور بزدل ہوتا ہے ورنہ وطن کی خاطر جان دینے سے نہ ڈرے۔ بنگالی نے بڑی مشکل سے سر ہلا کے رضامندی کا اظہار کیا۔ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ لاش کو چادر میں لپیٹ کر اُٹھانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ باہر سے زنانہ سینڈل کی ٹک ٹک سنائی دینے لگی۔ نرملا کسی سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی۔

"بس وہی دونوں سوئے پڑے ہیں۔"

"تم جگاؤ انھیں اور تیار کرو۔" پیڈرو نے کہا۔ "میں ذرا گاڑی لے کر جاتا ہوں۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔" نرملا بولی۔ "ان سب کو آج جانا ہے۔"

"میں بس گیا اور آیا۔" پیڈرو بولا۔ "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں... مجھے سڑک تک جا کے بوڑھے کو دیکھنا ہے۔ وہ پیدل آنے والا تو ہے نہیں... بیٹھا ہو گا سڑک کے کنارے اس انتظار میں کہ کوئی آئے اور لے جائے۔"

"کون ہے یہ بوڑھا؟"

"وہی کلینر... جو ٹرک کے ساتھ تھا۔ وہی کام آ سکتا ہے اب... اسے ٹرک چلانا بھی آتا ہے اور یہ ذمّے داری بھی سونپی جا سکتی ہے۔"

"تم کو بھروسا ہے اس پر، تو ٹھیک ہے۔"

"وہ بھی حاجی کا خاص آدمی ہے۔ میں بوڑھے کو سمجھا لوں گا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ اُسے کیا بیان دینا ہے۔" پیڈرو بولا۔

" اگر وہ راضی نہ ہوا..." نرملا نے کہا۔ وہ دونوں شاید دروازے کے سامنے ٹھہر گئے تھے۔

" راضی کیوں نہیں ہوگا۔ اسے ڈرائیور بننے کا موقع ملے گا۔ میری طرف سے دس ہزار کی رشوت ملے گی۔" پیڈرو بولا۔" صرف یہی کہنا ہے اُسے کہ ڈرائیور سائیں کو اس کا ضمیر گمراہ کرنے لگا تھا اور وہ ٹرک سمیت کسی تھانے میں حاضر ہونے کی سوچ رہا تھا چنانچہ میں نے اُسے مار دیا اور ٹرک میں اس کی لاش یہاں لے آیا۔ لاش ہم دکھا سکتے ہیں حاجی کو۔ وہ ایک نمک حرام کے مارے جانے پر خوش ہوگا اور بوٹے کو اس کی جرأت اور فرض شناسی پر انعام دے گا۔ بوٹا یقیناً ہم سے تعاون کرے گا۔"

" ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

" میری واپسی تک سب کو تیار رکھنا۔" پیڈرو نے کہا اور شاید باہر نکل گیا کیونکہ اس کی آواز کچھ فاصلے سے سنائی دی تھی۔ نرملا سینڈل بجاتی آگے آئی۔ میں نے بنگالی کو اشارہ کیا کہ وہ لاش کے ساتھ ... جائے۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا ... سے چند انچ کا فاصلہ رکھتے ہوئے لیٹ گیا

" بھنگی کیا کھا کے سوئے ہو..." نرملا نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔" کیا اُٹھنے کا ارادہ ہی نہیں ہے...؟" وہ نہایت بے شرمی سے ہنسی۔" ارے بابا یہ تمھاری زندگی کی آخری رات تو نہیں تھی۔"

پھر وہ اندر آگئی کیونکہ اُسے جواب نہیں ملا تھا۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ اس دروازے میں کنڈی اندر سے نہیں لگائی جا سکتی۔

وہ دروازے سے سیدھی بیڈ کی طرف گئی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا جو دروازے کے پیچھے تھا۔ یہ چند سیکنڈ کی مہلت تھی۔ اس کے بعد نہ میں خود کو چھپا سکتا تھا اور نہ حقیقت کو... وہ ابھی بیڈ تک نصف راستہ ہی طے کر پائی تھی کہ میں نے ایک پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چونک کر تیزی سے پلٹی اور ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔ میں نے اسی ایک لمحے میں اسے دبوچنے کے لیے جست لگانے کی غلطی کی، غیر متوقع طور پر نرملا غوطہ مار کے نیچے سے نکل گئی اور میں اپنے ہی زور میں سیدھا ... گیا تو اس لاش پر گرا جو ٹھنڈی ہو کے اکڑنے لگی تھی۔ بنگالی حلق سے عجیب سی آواز نکال کے اُچھلا مگر میں نے اُسے اہمیت نہیں دی۔ میں نے نرملا کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی پھرتی نے مجھے حیران بھی کر دیا تھا اور یہ سبق بھی پھر سکھا دیا تھا کہ حالات کیسے بھی ہوں، مجھے محتاط رہنا چاہیے اور اپنی طاقت کی برتری پر اندھا یقین رکھنے سے گریز کرنا چاہیے۔

میں گرتے ہی اٹھا اور ابھی نرملا دروازے میں ہی تھی کہ میرے ہاتھ نے اُسے واپس اندر کھینچ لیا۔ اُس نے ایک چیخ ماری۔ پھر میں نے اُس کے سر پر ریوالور کا بٹ مارا اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر گئی۔ اس ایک چیخ نے صورتِ حالات بدل دی۔ کمرے کے اندر کی جنگ باہر تک پھیل گئی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس چیخ کو ان سب نے سنا ہوگا، جو وہاں موجود تھے۔ باہر کیمپ کے محافظ تو ضرور اس چیخ کا سبب جاننے کے لیے لپکے ہوں گے۔ وہ سب آئیں نہ آئیں جو خود کو متاعِ جسم و جاں کے ساتھ رکھ چکے تھے۔ ابھی تک میں نے ریوالور کو کافی سمجھا تھا۔ میں نے ریوالور جیب میں ڈال کر مشین گن اٹھانے کا ارادہ کیا۔ عین اسی وقت یہ خیال بنگالی کو بھی آیا کہ وہ میری مشین گن سے مجھے بھون ڈالے۔

وہ مشین گن اُٹھا چکا تھا جب میں نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ کمرے کی لمبائی کے رُخ پیچھے ہٹتا تو اُسے مشین گن کو سیدھا کر کے فائر کرنے کا موقع مل جاتا مگر بدحواسی میں اس کے لیے کچھ سوچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے اسے دیوار کے ساتھ جا لیا۔ اس نے آخری وقت میں مشین گن اُٹھا کے مجھ پر مارنی چاہی۔ لیکن میں نے وار کو اُلٹے ہاتھ پر روکا اور ایک جھٹکے میں مشین گن چھین لی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس 'بغاوت' کی سزا کیا ہوگی چنانچہ وہ چلّانے لگا۔" کھون... ہیلپ..." پھر میرا سیدھا ہاتھ پھسل کر اس کی گردن پر جم گیا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور جب وہ آگے آیا تو میں نے گھٹنا اُٹھا کے اس کے پیٹ پر مارا۔ وہ بلبلا کے دُہرا ہوا اور میری اٹھی ہوئی ٹانگ پر لٹک گیا۔ اس کا جسم کمان ہو رہا تھا اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا کیونکہ اس سے زیادہ لچک اس کے جسم میں تھی ہی نہیں۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور اس کی گردن ایسے چٹخ کر ٹوٹی جیسے سوکھی ہوئی لکڑی ٹوٹتی ہے۔ وہ ساکت ہوگیا۔ اس کی گردن جو صرف گوشت پوست کی اور لچکدار رگوں کے ساتھ جسم سے جُڑی رہ گئی تھی لمبی ہو کے نیچے تک چلی گئی اور اس کا سر میرے گھٹنے کے اوپر سے دوسری طرف پنڈولم بن کے جھولنے لگا۔

میں نے اُسے نیچے گرا دیا۔ یہ سب ایک منٹ سے کم وقت میں ہوگیا تھا۔ گناہ کی ایک رات کی مسافت میں شریکِ سفر رہنے والے تھوڑے سے فرق سے راہِ عدم پر روانہ ہو چکے تھے۔ مشین گن تھام کے میں نے دروازے کے قریب پوزیشن سنبھال لی جہاں نرملا بھی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی لیکن مجھے باہر کسی قسم کی ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔ بنگالی کی چیخ خوف سے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی لیکن نرملا کی چیخ بہت شگاف تھی اور بیرک کے اندر آخری حصے تک بھی پہنچی ہوگی۔

کوئی آیا کیوں نہیں، کیا اس لیے کہ یہاں ایسی چیخوں کو سننے والے کان بے حس تھے؟ یہاں ایسی چیخوں سے دل نہیں دہلتے تھے کیونکہ یہاں دردمندی کا رشتہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ یہ خود غرض جذبوں سے مغلوب انسانوں کی دنیا تھی جس میں صرف اپنی ذات اور اس کے مفادات کا تحفظ اہم تھا۔ کون آیا اور کون گیا، کیوں گیا اور کیسے گیا... اور کہاں گیا... اس سے کسی کو کیا۔ شاید یہاں ہر روز چلّانے والے چلّاتے ہوں گے۔ کسی غلطی پر ملنے والی سزا کے خلاف فریاد کرتے ہوں گے اور مدد کے لیے پکارتے ہوں گے مگر کوئی نہیں آتا ہوگا۔ حاکموں کا حکم ہوگا کہ خبردار، جو کوئی دخل در معقولات کا مرتکب ہوا۔ پیڈرو نے گزشتہ روز کسی لڑکی کے دفن کیے جانے کا ذکر کیا تھا۔ اسی قبر میں دو سرا مردہ اتارا جا رہا تھا لیکن سب چپ تھے۔ وقتی طور پر جو اضطراب کی لہر اٹھی تھی، اسے پیڈرو کی ایک ڈانٹ نے دبا دیا تھا۔ وہ اس چیخ کو سُن کر بھی دبک گئے ہوں گے۔ یہ سوچ کر رہ گئے ہوں گے کہ جو ہوگا، سامنے آجائے گا۔ انھیں کیا ضرورت ہے کہ دخل اندازی کا الزام لیں

لیکن محافظ... کیا انھوں نے بھی نرملا کی چیخ نہیں سُنی تھی؟ میرے اندازے کے مطابق یہاں کم سے کم چار افراد تھے۔ ان میں سے پیڈرو گیا ہوا تھا۔ چوکیدار باہر کے گیٹ پر تھا۔ باقی دو قبر کھود رہے تھے۔ کسی کے بھی نہ آنے کے ظاہری اسباب میری سمجھ میں آچکے تھے لیکن اصل اسباب مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ محافظ چار کے بجائے آٹھ یا دس بھی ہو سکتے تھے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اتنی دیر میں وہ کسی خطرے کے خلاف مؤثر کارروائی کے لیے اقدامات میں مصروف ہوں۔

میں نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کے باہر جھانکا۔ مجھے باہر نکلنے کا راستہ صاف نظر آیا۔ خون جو راہداری میں تھا ابھی صاف نہیں ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں حکم کے غلام ابھی تک ڈرائیور کو گاڑنے میں مصروف ہیں۔ میں نے نیچے پڑی ہوئی نرملا کو دیکھا اور ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا۔ مجھے پیڈرو کی واپسی سے پہلے ہی اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے ورنہ محصور ہو جانے کے بعد میں کچھ نہ کر سکوں گا۔

میں نے نرملا کو اُٹھا کے بائیں کندھے پر ڈال لیا... وہ گدرائے ہوئے بدن والی جوان لڑکی تھی لیکن بہت ہلکی پھلکی۔ اس کی دونوں ٹانگیں میری پشت کی جانب رہیں اور دونوں ہاتھ آگے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کمر ایک بالشت تھی ورنہ میرے شانے پر اس کا جسم متوازن کیسے ہوتا۔ اس کا چہرہ بھی آگے کی جانب جُھکا رہا اور اس کے کالے بالوں کی چوٹی میرے گھٹنوں تک پہنچ گئی۔ وہ جنوبی ہندوستان کے کسی حصے کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ اپنی سانولی رنگت کے باوجود صورت کے تیکھے نقوش اور بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں جادو کا اثر رکھنے والی۔ اس نے بالوں میں ناریل کا تیل لگا رکھا تھا اور اس کے جسم سے بھی کچے ناریل کی مہک آتی تھی۔ تازہ اور میٹھی۔

اس کے کومل بوجھ کو سنبھالے، مشین گن اٹھائے میں باہر نکلا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد میں نے باہر جھانکا۔ بیرک کے عقبی حصے میں ایک دیوار تھی لیکن میں اکیلا بھی اس دیوار کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ دیوار تقریباً دس فٹ بلند تھی اور اس کے اوپر ایک ایک فٹ کے فاصلے سے خاردار تاروں کی تین لکیروں کا حصار تھا۔ انھیں چھوئے بغیر میں ہزاروں وولٹ کے اس کرنٹ کو دیکھ سکتا تھا جو ایک بے وجود اور نظر نہ آنے والی ہلاکت خیز قوت تھی۔

بیرک سے دیوار تک کا فاصلہ اٹھارہ بیس گز تھا۔ دیوار کے دامن میں حلقہ در حلقہ اُلجھے ہوئے خاردار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور یہ دیوار مجھے دونوں جانب پچاس پچاس گز تک پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ بنگالی نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی چنانچہ اب مجھے دائیں یا بائیں اپنے رسک پر جانا تھا۔ بیرک تو مشکل سے بیس گز لمبائی رکھتی تھی۔ اس کے دونوں جانب چالیس گز تک کھلا میدان کس لیے رکھا گیا تھا، یہ آگے جا کے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

بیرک کی دیوار کے ساتھ لگ کر چلتے ہوئے میں دو بند دروازوں اور تین کھلی کھڑکیوں کے سامنے سے گزرا۔ کھڑکیوں کی فرش سے اونچائی چار فٹ تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو جھک کے گزر جاتا لیکن نرملا کے ساتھ یہ ناممکن تھا۔ میں اُسے پیچھے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک تو وہ کسی حد تک میری ڈھال تھی۔ اسے اپنے تحفظ کی ضمانت بنا کے میں نکلنے کی کوشش مزید کر سکتا تھا۔ پھر وہ دوسری سب لڑکیوں کے مقابلے میں مجھے زیادہ مفید معلومات فراہم کر سکتی تھی چنانچہ میں ہر کھڑکی کے سامنے سے سیدھا گزر گیا۔

بیرک کا موڑ کاٹتے ہی میری نظر نے سب سے پہلے ان دونوں کو دیکھا جو دھوپ میں کھڑے ہوئے ایک قبر سے مٹی نکال رہے تھے۔ انھوں نے یہ کام تقریباً مکمل کر لیا تھا۔ مٹی کا ڈھیر قبر کے دونوں کناروں پر جمع تھا اور ان میں سے ایک قبر میں اترا ہوا تھا۔ دوسرا اسے اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد مضبوط جسم کا مالک اور قدآور شخص تھا۔ اس کا رنگ کالا تھا اور بال چھوٹے۔ پسینے میں حل کر کیچڑ بن جانے والی مٹی اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پھیل گئی تھی۔ دوسرے کی صورت مجھے اس وقت نظر آئی جب وہ بیلچے سے مٹی اوپر پھینکنے کے لیے اُٹھا۔ وہ باہر کھڑے ہوئے شخص سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ یہ ایک جیسے رنگ اور حلیے کا نتیجہ تھا یا ان کی شکلیں واقعی جڑواں بھائیوں جیسی تھیں۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کرنا مشکل تھا۔

دوسری طرف وہ ٹرک ان سے دس گز دور اور ریک کی سیدھ میں کھڑا ہوا تھا جس نے مجھے یہاں پہنچایا تھا۔ ٹرک کے اوپر سایہ رکھنے کے لیے ترپال پھیلا دی گئی تھی مگر میں اس کا نمبر دیکھ سکتا تھا۔ لمبائی کے مقابلے میں اس احاطے کی چوڑائی نصف تھی۔ باقی خالی جگہ میں مجھے دو چوکور سیمنٹ کے قطعے نظر آئے جو کسی مین ہول کے چوکور ڈھکن لگتے تھے۔ ظاہر ہے یہ زیرِ زمین کروں یا تہ خانوں کے راستے تھے اور میں فرض کر سکتا تھا کہ ان تہ خانوں میں اسلحہ رکھا جاتا ہوگا۔

اگر میں اگلے موڑ تک جاتا تو شاید مجھے وہ گیٹ نظر آتا جس سے ٹرک اندر آیا تھا لیکن یہ بیس گز کا فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی مجھے دونوں گورکن دیکھ لیتے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دوسرا بھی قبر سے باہر آجائے۔

اوپر آتے ہی اس نے مجھے پہلے دیکھا کیونکہ دوسرا شخص میری جانب پیٹھ موڑے کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور رسائیں کی لاش اس کے قریب ہی مٹی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ قبر کے گڑھے سے نکلنے والے نے اپنے ساتھی سے چلّا کے کچھ کہا اور خود ایک جست لگا کے کچھ اٹھانے کے لیے جھکا۔ دوسرا اتنی دیر میں میری جانب پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا تھا لیکن اس سے زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ میں نے کیا۔ خاموش فضا مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وہ دونوں پلٹ کے تھوڑا سا اچھلے اور زمین پر لوٹنے لگے۔ گولیاں ایک کے پیٹ اور سینے میں لگی تھیں اور دوسرے کے بازو زخمی ہوئے اور کمر کے نچلے حصے میں۔ اس کا اندازہ مجھے خون کی پھوٹتی دھاروں سے ہوا۔

میں نرملا کو اٹھائے ہوئے بھاگا۔ ابھی میں قبر کی خندق سے آٹھ دس فٹ دور تھا کہ پہلا فائر ہوا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری گولی نے میرے بازو کو مس کیا اور مجھے ایک جلتی ہوئی خراش سی محسوس ہوئی۔ پھر میں نے نرملا کو نیچے پھینکا اور خود قبر میں کود گیا۔ میں اس لاش پر گرا جو چوبیس گھنٹے پہلے دبائی گئی تھی۔ ایک عجیب سی کراہیت رکھنے والی اور دماغ کو ماؤف کرنے والی بدبو نے اور اس خیال نے کہ میں ایک لاش پر کھڑا ہوں، میرے احساس کو شدید صدمے سے دوچار کیا لیکن میرے لیے اور کوئی جائے پناہ بھی تو نہ تھی۔ اس قبر کے مورچے میں بیٹھ کے میں زندگی کی جنگ لڑ سکتا تھا۔

فائرنگ اب تین طرف سے ہو رہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط ہوگیا تھا کہ وہاں پیڈرو سمیت چار افراد کیمپ کی نگرانی کرتے ہیں۔ دو کو میں نے پہلے ہی راؤنڈ میں مار دیا تھا اور اس کے باوجود تین

مجھے گھیرے میں لینے کے لیے مسلسل گولیاں چلا رہے تھے۔ میں نہیں سکتا تھا لیکن اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ بے ہوش نرملا کتنی گولیوں کا نشانہ بنا ہوگا۔ میں اسے پھینکنے پر مجبور تھا کیونکہ قبر کے اندر اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ میں اسے لے کر کودتا تو خود بھی پھنس جاتا اور آزادانہ حرکت نہ کر پاتا۔ قبر میں ایک مردہ اور دو زندہ انسانوں کو پناہ دینے کی گنجائش نہیں تھی۔

"تم جو بھی ہو۔" کسی نے چلّا کے کہا۔ "باہر آجاؤ۔" اس کے تحکمانہ انداز سے وہ مجھے کوئی فوجی لگا۔ "ورنہ وہیں مارے جاؤ گے جہاں اس وقت چھپے ہو..."

"تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔" یہ دوسری آواز تھی۔

"اپنا اسلحہ پہلے باہر پھینک دو۔" تیسرے شخص نے ... سمت سے کہا۔ وہ میرے سامنے اور دائیں بائیں سے ... رہے تھے۔

"وِل یو تھ آف یو پلیز شٹ اَپ۔" پہلے شخص نے ... سے کہا۔ "میں بات کر سکتا ہوں... یا تم زیادہ قابل ہو؟"

"سوری کرنل۔" ایک ساتھ بولنے والے ماتحت چپ ...

"تم نے سُنا... میں نے کیا کہا ہے۔" کرنل نے چند سیکنڈ ... خاموشی کے بعد کہا۔ "یو آر اے فول... اگر تم سمجھتے ہو کہ لڑتے ... یہاں سے نکل جاؤ گے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ... کے بعد میں دیکھوں گا۔"

"کیا دیکھو گے تم کرنل بھوت ناتھ؟" میں نے چلّا کے جواب دیا۔ "تم دنیا کو آخری بار دیکھ رہے ہو... زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہتھیار ڈال دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کے آگے آجاؤ۔"

"ہی از میڈ..." کرنل نے کچھ حیران ہو کے کہا۔ "کیا تم ... ہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو، آخر تم ہو کون؟"

"میں یم دوت ہوں... موت کا فرشتہ۔" میں نے قہقہہ ... اونچی آواز میں کہا۔ "جس نے تمہارے باپ، تمہارے دادا، پردادا ... لکڑ دادا سب کی جان لی تھی۔ آج تمہاری باری ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر کرنل نے کہا۔ "کیا تم سکندر بخت ... غالباً وہ اپنے کسی ماتحت سے مشورہ کرتا رہا تھا۔

"ہم سب سکندر بخت ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم میں ... ایک سکندر بخت ہے کیونکہ سکندر بخت صرف ایک نام ... ہم سب ایک جذبہ ہیں۔ ایک مشن ہیں اور ایک منزل ...

"بکواس بند کرو۔ میں تمھیں صرف دس سیکنڈ دوں گا ... نے برہمی سے کہا۔ "مجھے بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں ... کفن پوش مجاہدوں نے ہمیں ہر طرف سے شوقِ شہادت میں ...

ہے۔ یہاں چڑیا کا بچہ بھی پَر مارے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے۔"

"چڑیا کے بچے... میں تم کو نو سیکنڈ دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نو سیکنڈ؟" کرنل نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "اس کے بعد تم کون سی توپ چلاؤ گے؟"

"تمہاری اپنی توپ۔" میں نے کہا۔ "کیا میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کردوں؟"

"ضرور کرو... لیکن یہ خیال رکھنا کہ ایک دستی بم پانچ سیکنڈ میں تمہارے کاؤنٹ ڈاؤن کو ختم کر سکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بھی حرکت خودکشی کہلائے گی۔" میں نے کہا۔ "ایک سیکنڈ سے بہت کم وقت میں گولی اس ٹرک تک پہنچ جائے گی جسے میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ شاید تم بھی دیکھ سکتے ہو۔ میرا نشانہ اس کا پٹرول ٹینک ہوگا۔ جب پٹرول میں آگ لگے گی اور ٹینک پھٹے گا تو تم اور تمہارا یہ سارا شیطانی کارخانہ دُھواں بن کے اُڑ جائے گا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس سے مجھے اپنی دھمکی کے کارگر ہونے کا یقین آیا۔ شاید وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ بالآخر کرنل نے کہا۔ "ہم تمھیں بحفاظت نکل جانے کا موقع دے سکتے ہیں۔"

"تھینک یو... میں خیرات میں کچھ نہیں لیتا۔" میں نے کہا۔ "اپنے لیے یہ موقع میں خود حاصل کر لوں گا... لیکن ایسی ہی فراخدلانہ پیش کش میری طرف سے بھی ہے۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم سب نکل جائیں۔" کرنل نے برہمی سے کہا۔

"اگر تم آن ڈیوٹی مرنا چاہتے ہو... تو یو آر ویلکم..." میں نے کہا۔ "تم دستی بم پھینکو... میں ایک گولی چلاتا ہوں... تمہارے ساتھ یہ سب کرائے کے مرد اور عورتیں... غدّاروں اور طوائفوں کا یہ ٹولہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"اور تم بچ جاؤ گے؟" اس نے طنز سے کہا۔

"ہم الگ الگ مقصد کے لیے جان دیں گے۔" میں نے کہا۔ "چنانچہ میں شہید کہلاؤں گا اور تم جہنم رسید ہو جاؤ گے۔ یہ تمہارے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا ہے... میرے لیے نہیں..."

میں بڑی مشکل صورتِ حال میں گرفتار تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ میں بحفاظت اس مورچے سے نکل سکوں۔ ان کی پیش کش بھی ایک دھوکا تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ میرے باہر نکلتے ہی وہ مجھے گولیوں سے چھلنی نہیں کریں گے۔ میں انھیں مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سامنے آئیں اور خود کو میرے حوالے کر دیں... اگر وہ کہتے کہ ٹھیک ہے ہم جا رہے

ہیں۔ تو میں یہ بات کیسے مان لیتا کہ وہ واقعی چلے گئے ہیں... وہاں بیٹھ کے میرے لیے تصدیق کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں ان کی صحیح تعداد سے ناواقف تھا۔ ان میں سے آدھے اندر چھپ کے بیٹھ سکتے تھے اور آدھے مجھے یہ تاثر دے سکتے تھے کہ وہ روانگی اختیار کر چکے ہیں۔ میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ باہر جانے کے لیے استعمال ہونے والا واحد راستہ میری نظر سے اوجھل تھا۔ وہ خود بھی اسی کشمکش و پیچ کا شکار تھے کہ اگلی چال کیا ہو۔ شطرنج کی بازی کی طرح سب کے مُہرے پھنس گئے تھے اور پہلی غلط چال چلنے والے کو مات ہو سکتی تھی۔

سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور دھوپ کی تیزی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے رات سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور زیادہ دیر اس مورچے میں نہیں گزار سکتا تھا جس میں میرے پیروں کے نیچے زمین نہیں، ایک عورت کی لاش تھی۔ یہ احساس ہی میرے اعصاب کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ اضافی عذاب اس تعفّن کا تھا جو میرے حواس کو مختل کر رہا تھا۔ باہر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کم سے کم تین لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مقتول سائیں کی اور دو اس کی تدفین پر مامور حکم کے غلاموں کی۔ چوتھی لاش نرملا کی ہو سکتی تھی۔ لیکن میں یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ابھی تک وہ بے ہوش پڑی ہوئی ہے یا گولیاں لگنے سے بے ہوشی میں ہی موت سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خود میرے حریف قوتِ فیصلہ سے محرومی کے باعث پریشان ہیں اور میری طرح وہ بھی باتوں میں وقت گزارتے ہوئے کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ ان کی اور میری پوزیشن میں ایک فرق بہت نمایاں تھا۔ وہ جتنا وقت چاہتے گزار سکتے تھے اور اس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے لیے باہر سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس میں یہاں دو چار گھنٹے بھی گزار لیتا تو یہ میری قوتِ برداشت کی سخت ترین آزمائش ہوتی۔

دھوپ میرے سر کو گرم کر رہی تھی اور اب قبر کے ایک گوشے سے نیچے بھی پہنچنے لگی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے لاش کے چہرے پر نگاہ کی۔ عورت یقیناً جوان تھی لیکن اس کے بالوں اور اس کی آنکھوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر نمی نے مٹی کو کیچڑ کی تہ بنا دیا تھا۔ میں صرف اس کا سائڈ پوز دیکھ سکتا تھا۔ جب اسے قبر میں پھینکا گیا تھا تو وہ مُنہ کے بل گری تھی اور اُلٹی پڑی رہ گئی تھی۔

مشین گن میرے ہاتھ میں تھی اور میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو رہی تھیں۔ اس وحشتناک ماحول کے عذاب کا ہر لمحہ میرے لیے شکست کے اسباب فراہم کر رہا تھا۔ دشمن کی طرف سے خاموشی کا وقفہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھی بہت سے اندیشوں کو جنم دیتا تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی نئی حکمت عملی کیا ہوگی۔ میرے مقابلے میں ان کا زیادہ پُراعتماد ہونا بھی جائز تھا۔ بنکر میں محصور تھا اور وہ محاصرہ کیے بیٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ میری گردن اور کمر سے بہنے والا پسینہ ایڑیوں تک پہنچنے لگا تھا۔

پھر اچانک صورت حالات میں ایک ڈرامائی عنصر شامل ہو گیا۔ نہ جانے کہاں سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "ہوشیار ہو جاؤ کتو... تم سب کی موت کا وقت آ گیا..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا... اس ہنسی میں صرف دیوانگی تھی۔

"مدن موہن... تم...!" میں نے کرنل کی آواز سنی۔

"ہاں... میں... مدن موہن..." وہ اسی طرح چیخ کے بولا۔ "اچھی طرح دیکھ لو مجھے... میں اس کی روح نہیں ہوں... میں جیتا جاگتا مدن موہن ہوں۔"

"مگر... یہ تم... کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے... جو تم نے میری موہنی کے ساتھ کیا تھا کمینو... سور کے بچو... خبردار جو کوئی ہلا بھی... ہتھیار نیچے پھینک دو۔" پھر مشین گن کے ایک برسٹ کی آواز آئی۔ کوئی بڑے بھیانک انداز میں چلایا۔ یہ سب ڈراما میری نظروں کے سامنے نہیں ہو رہا تھا مگر میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں... ابھی ابھی کوئی اس دیوانے مدن موہن کا حکم نہ ماننے کی پاداش میں مارا گیا تھا۔ مگر وہ کون تھا اور کہاں سے سب پر حکم چلا رہا تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

تاہم ایک بات یقینی تھی۔ وہ اپنے حریفوں کے سامنے سے نمودار نہیں ہوا تھا۔ اس نے انھیں پیچھے سے اچانک اور غیر متوقع طور پر آ لیا تھا۔ ممکن ہے اس نے گیٹ پر متعین محافظ کو بھی خاموشی سے مار دیا ہو۔ محافظ نے اُسے اندر داخل ہونے سے نہیں روکا ہوگا کیونکہ وہ اندر کا آدمی تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے راستے سے اندر پہنچا ہو۔ وہ جانتا ہوگا کہ گیٹ کے علاوہ آنے جانے کے کتنے محفوظ راستے ہیں... اور اب وہ انھیں اپنے سامنے بے بس کیے کھڑا ہوا تھا تو میں خاصے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ اب دشمن کی نظر مجھ پر نہیں ہے۔ وہ ایک دم پلٹے ہوں گے اور اب اسی پوزیشن میں کھڑے ہوئے ہوں گے۔

اس خیال نے مجھے بڑی تقویت دی۔ میں نے خدا کا نام لیا اور اس قبر سے باہر نکل آیا جس میں مزید قیام پر تعفن سانس کے ساتھ زیادہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دماغ اس بدبو سے پھٹنے لگا تھا۔ مجھے دوپہر تک بھی وہاں کھڑا رہنا پڑتا تو شاید میں پاگل ہو جاتا اور اس اذیت سے چھٹکارا پانے کے لیے دیوانہ وار اپنے دشمنوں پر حملہ کرتا تو مارا جاتا... اب موقع ملتے ہی میں اس جہنم کدے سے نکل بھاگا جہاں اوپر سے آگ برس رہی تھی تو نیچے سے ایک سڑتی لاش میرے احساس میں زہر بھرے کانٹے چبھو رہی تھی۔

بیرک کے سامنے تک میں ایک جست میں پہنچ گیا۔ ... کو میں نے فائر کرنے کی پوزیشن میں تھام رکھا تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ کسی کو متوجہ کرے تو سامنے آنے والا پہلا آدمی پہلے سے چھلنی ہو جائے۔ اس کے بعد کوئی مجھے چھلنی کر دے تو یہ میری قسمت... مگر چند سیکنڈ سکوت میں گزر گئے تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور پلٹ کے دیکھا۔ نرملا کا جسم وہیں ساکت پڑا تھا۔ مجھے ایک نظر میں خون بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید مجھ پر گولی چلانے والوں نے احتیاط سے کام لیا تھا اور نرملا کو نشانہ نہ بننے دیا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پیچھے گری تھی، جہاں سایہ...

"مدن موہن...! ہوش میں آؤ۔" کرنل کی آواز نے مجھے ... دیا۔ "کل سے ہم تمھیں تلاش کر رہے ہیں... کہاں تھے تم؟"

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور بیرک کی دیوار کے ساتھ آخری موڑ تک جا پہنچا۔ وہاں سے وہ چند قدم کے فاصلے پر ... اور میں ان کی ساری گفتگو سن سکتا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھنے ... گریز کیا۔ اس طرح مجھے مدن موہن دیکھ لیتا اور اس کی نظر ایک ... کے لیے بھی ہٹتی تو وہی سیکنڈ اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیتا۔

"میں پھر کہتا ہوں کہ ہتھیار نیچے ڈال دو۔" مدن موہن چلایا۔

"دیکھو مدن موہن... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ... موہنی کو میں نے نہیں مارا تھا... کیپٹن شرما نے مارا تھا..." کرنل کی آواز آئی۔ "اور تم نے اُسے مار دیا... اب یہ مشین گن رکھ دو... ہم ... رکھ دیتے ہیں... یہ لو... بس؟" وہ چالاک آدمی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتے ہوئے پوری کوشش کر رہا تھا کہ مدن موہن کے ... اور جنون کی کیفیت کو ختم کر دے اور پھر اس پر قابو پا لے۔

"ہاں مدن موہن..." دوسرے فوجی نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ گولی چل ..."

"اپنی موہنی کے قاتل سے تم نے انتقام لے لیا۔" کرنل بولا۔

مدن موہن نے ایک اور پاگل پن سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "ابھی سے گھبرا گئے... شرما نے تو صرف گولی چلائی تھی۔ اُسے چلانے کا حکم کس نے دیا تھا؟ یہ حساب ایسے برابر نہیں ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ میں کہاں چلا گیا تھا... میں تم سب کی موہنیوں کو تلاش کر رہا تھا... شرما کی موہنی اور اس کے بھائی لیفٹیننٹ ورما کی... وہ دونوں مجھے ایک ہی گھر میں ایک ہی جگہ مل گئیں۔ اس ... میرا کام آسان ہو گیا... پھر میں تمھاری موہنی کے پاس گیا تھا۔ ... ان سب کا کریا کرم بھی ہو چکا..."

"یہ کیا بھونک رہے ہو تم...؟" یہ غالباً لیفٹیننٹ ورما ...

مدن موہن کی ہذیانی ہنسی پھر گونجی... "ڈر گئے ورما... تم نے میری موہنی کو کتنی آسانی سے میرے سامنے مار دیا تھا...

وقت تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ جو تم دوسروں کے ساتھ کر رہے ہو، وہی تمھارے ساتھ دوسرے بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے تو مجبور سمجھ رکھا تھا تم نے... پالتو کتے سے بھی زیادہ... اب بتاؤ دل کا کیا حال ہے؟ کیا گزری تم پہ یہ خبر سن کے اور ابھی تو صرف خبر سنی ہے تم نے اُسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا... جیسے میں نے موہنی کو مرتے دیکھا تھا... کاش یہ میرے لیے ممکن ہوتا... کہ میں اُسے گھسیٹ کر تمھارے سامنے لاتا... یاد ہے تم موہنی کو کیسے گھسیٹ کر لائے تھے... اس کے بالوں سے پکڑ کے... اور گولی تمھارے بھائی نے کیسے چلائی تھی؟"

"یہ... یہ جھوٹ ہے... بکواس کرتے ہو تم... چوبیس گھنٹے پہلے ہی تم غائب ہوئے تھے۔" ورما نے چلّا کے کہا۔ "اتنے کم وقت میں تم یہ سب نہیں کر سکتے..."

مدن موہن پھر ہنسا۔ "لاہور سے امرتسر کا فاصلہ ہی کتنا ہے ورما... صرف اکتیس میل... یہاں مجھے سرحد عبور کرانے والا وہی تھا جس سے تم نے مجھے ملوایا تھا... اور اپنے دیش کی سرحد میں میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم تینوں ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہو... اور وہ رجمنٹ امرتسر کے نواح میں ہے۔ وہیں تم سب رہتے بھی تھے... وہیں میری ٹریننگ ہوئی تھی۔ یاد ہے نا... میں نے تم سب کے گھر دیکھے تھے۔ وقت بے وقت تم مجھے طلب کر لیتے تھے... خصوصی تربیت کے لیے... تین مہینے میں نے کیمپ کے اندر ہی ایک قیدی کی طرح گزارے تھے۔ میری وجہ سے ہی موہنی اس مشن میں شامل ہوئی تھی۔ مگر وہ ایک بزدل اور کمزور عورت تھی۔ وہ کہتی تھی کہ موہن یہ تم کو مجھ سے چھین لیں گے... یہ پیسہ بہت منحوس ہے جو تم کو مجھ سے جدا کر دے گا... مگر میں نے اُسے سمجھا لیا تھا کہ اس مشن کی کامیابی ہماری زندگی کی کامیابی ہوگی... ہم اپنا گھر بنائیں گے... شادی کریں گے... کاروبار کریں گے... تمام عمر عیش کریں گے... مگر وہ پھر بھی ڈرتی تھی۔ اُسے ڈر رہتا تھا کہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا... سرحد پار کرنے والا دونوں طرف کا شہری نہیں رہتا۔ وہ جاسوس اور تخریب کار سمجھ کے پکڑ لیا جائے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ وہ سمجھتی تھی سب کہ جاسوس کو تو اپنے لوگ بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اجنبی بن جاتے ہیں جو وطن کے نام پر جان دینے کے لیے اکساتے ہیں دولت ... ہیں اور لالچ دیتے ہیں... وہ ڈرتی تھی کہ کسی نے اُسے پکڑ ... ہوگا۔ اس کی تسلی ان کاغذ کے پرزوں سے نہیں ہوتی تھی ... مسلمان، میاں بیوی اور پاکستانی ثابت کرتے تھے۔ تم نے تو بہت دیر سے جانا کرنل کہ اس کے ضمیر پہ بوجھ ہے۔ وہ تو تخریب اور تباہ کاری کے لیے ملنے والے پیسے سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اور جب پتا چلا تو تم نے اُسے مار دیا... صرف اس لیے مار دیا کہ اس کا ضمیر تمھارے لیے خطرناک تھا۔ تم نے مجھے کوئی موقع نہیں دیا کہ میں اُسے سمجھا سکوں... میری منت سماجت بھی نہیں مانی... تم مجھے بھی مار ڈالتے اگر میں احتجاج کرتا... میں نے دل کو پتھر کیا اور وہ سب دیکھا جسے دیکھنے کے بعد میں مر جاتا اگر مجھے ایک خیال سہارا نہ دیتا... انتقام لینے کا خیال۔ اور اسی خیال نے مجھے راتوں رات سرحد پار امرتسر پہنچا دیا۔ تمھاری رجمنٹ کے علاقے میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تم سب کی بیویوں کے لیے پیغامات لے کر آیا ہوں۔ کسی دشواری کے بغیر میں تمھارے گھر پہنچ گیا... اور ورما... جب تمھارے گھر کے سب لوگ جمع ہو گئے... تمھارے ماں باپ... بھائی بہن... اور تم دونوں بھائیوں کی بیویاں... مادھوری اور مدھومتی... جو نئی نویلی دلہنیں تھیں... واقعی ابھی ان کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں چھوٹا تھا۔ جب ہم ٹریننگ لے رہے تھے تب ہی تو شادی ہوئی تھی تم دونوں بھائیوں کی... ان دونوں بہنوں سے... دونوں واقعی خوب صورت تھیں... مگر میری موہنی سے کم... موہنی میری دھرم پتنی نہیں تھی۔ ابھی ہم نے اگنی کنڈ کے پھیرے نہیں کیے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان پریم... کا وہ بندھن تھا جو کسی طرح بھی شادی سے کم نہ تھا۔ کمزور نہ تھا اور اتنا ہی مقدس بھی تھا۔ وہ میری خاطر سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ اپنے گھر کو۔ اپنے اونچی ذات کے غرور میں مبتلا برہمن باپ کو جو مجھ جیسے شودر کے ساتھ اس کا بیاہ کبھی نہ کرتا... ہمیں کسی پنڈت کے اشلوک اور کسی مندر کے پرساد کی ضرورت نہیں تھی۔ بھگوان ہمارے گواہ تھے اور اس بندھن کی پوترتا کو مانتے تھے... تم نے اس بندھن کو ختم کر دیا راکھشش... میں تم کو مار دیتا اسی وقت... مگر میں نے ... نہیں... پہلے تم بھی وہی دکھ اُٹھاؤ... جو میں نے جھیلا تھا... میں نے جلدی کی ورنہ شرما بھی جان لیتا کہ اس کی بے گناہ بیوی نے اس کے جرم کا کفارہ کیسے ادا کیا۔ مگر میں تم کو بتاتا ہوں... ان دونوں نے ایک جیسی ساریاں باندھ رکھی تھیں۔ گلابی رنگ کی اور لال پھولوں والے بارڈر کی۔ اور جب میں نے ان کے سر پہ ریوالور رکھ کے گولی ماری... بالکل اسی طرح جیسے شرما نے موہنی کو ماری تھی۔ تو ان دونوں کے سروں سے خون کے فوارے پھوٹے اور انھوں نے ایک دوسرے کی ساریوں کو اپنے خون سے رنگ دیا۔ تمھارے ماں باپ اور بھائی بہن صدمے سے سُن کھڑے رہ گئے اور میں کھڑکی سے کود کر فرار ہو گیا۔ اس وقت وہ دونوں فرش پہ تڑپ رہی تھیں۔"

ورما ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں سب کچھ سُن رہا تھا

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور شاید بھائی کی موت نے اُسے وقتی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ اچانک اس کے دماغ کا توازن بگڑ گیا۔ صدمہ اس کی قوتِ برداشت سے بڑھ گیا۔ اس نے چیخ کر مدن موہن کو گالی دی۔ میں دیکھ کچھ نہیں سکتا تھا مگر میں نے کرنل کی آواز سُن کے سب سمجھ لیا۔ کرنل نے اپنے ماتحت کو روکنے کی بے سود کوشش کی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ "ورما..." اور اس کا انداز تنبیہ کا تھا مگر ورما شاید مدن موہن پر حملہ کر چکا تھا۔ مشین گن نے پھر موت اُگلی۔ ایک راؤنڈ نے ورما کے پر خچے اُڑا دیے۔ ورما کی آواز بند ہو گئی۔ مدن موہن کے جنونی قہقہے باقی رہ گئے۔

"مدن موہن... بھگوان کے لیے دَیا کرو مجھ پر..." کرنل نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے سارے کرّوفر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ افسری کی شان کو فراموش کر دیا۔ اس ساری تربیت کو بھلا دیا، جو اسے ادائے فرض کی خاطر بہادری کے ساتھ جان دینے کے لیے ملی تھی۔ وہ ایک عام آدمی رہ گیا جو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب تک اس نے نہ جانے کتنے اپنے جیسے انسانوں کو مارا تھا۔ وہ سیاست کی شکارگاہ میں نفرت اور تعصب کے جذبات، اسلحے کی طاقت، تجربے اور مہارت کے ساتھ ایک مشن کی تکمیل کے لیے آیا تھا اور وہ مشن تھا ایک ملک کے دو حصّے کرنا۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون کروانا۔ مسلمان سے مسلمان کو لڑوانا... قومیت... ثقافت اور استحصال کے نام پر اور چھ نکات کو بنیاد بنا کے... وہ اس مشن کے لیے سیکڑوں، ہزاروں یا لاکھوں انسانوں کو چیونٹی سے حقیر تر جان کے قربان کر سکتا تھا اور بہت پُرامید تھا کہ اس کارنامے کو سرانجام دے کر وہ اپنے ملک کے نیتاؤں کے سامنے فخر سے جائے گا اور وہ اس کے سینے پر بہادری اور فرض شناسی کی اعلیٰ مثال قائم کرنے پر کوئی تمغہ سجا دیں گے۔ اسے کرنل سے ترقی دے کر بریگیڈیئر بنا دیا جائے گا۔

اور یہ سب کچھ اسے اپنے امکان میں نظر آتا تھا... لیکن اچانک ایک چیونٹی نے ہاتھی کا راستہ روک لیا۔ یہ چیونٹی موہنی تھی۔ اس نے موہنی کو مسل دیا... خاک میں ملا دیا... اُسے صرف ایک کمزور عورت جان کے مٹا دیا اور بھلا دیا۔ لیکن اسی عورت کا نام محبت تھا۔ ایٹمی تابکاری سے زیادہ قوت رکھنے والی مگر نظر نہ آنے والی۔ موہنی کے بے جان جسم سے بھی اپنی ہلاکت خیزی پھیلانے والی یہ محبت مدن موہن کے دل میں زندہ تھی اور ایک آتش فشاں بن گئی تھی۔ اچانک کرنل نے محسوس کیا تھا کہ زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ اور وہ اس آتش فشاں کے دہکتے... خاکستر کر دینے والے... تباہ کُن لاوے کے سیلاب سے بچ کے فرار نہیں ہو سکتا۔

"... مدن موہن... یہ... یہ دونوں... ان کی تو ابھی شادی ہوئی تھی..." کرنل گڑگڑا رہا تھا۔ "ان کی بیویاں بھی مر گئیں... خود بھی مر گئے... لیکن میرے بچے ہیں... ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں..."

"اُٹھ... سیدھا کھڑا ہو... کمینے خود غرض... بزدل مرد، میں تجھے بخشنے والا نہیں ہوں... تیرے بچوں کی خاطر ہی میں نے تیری بیوی کو نہیں مارا تھا... اس عورت کی زندگی اس کے بچوں نے مانگی تھی اور میں نے دے دی تھی۔ کیونکہ ماں تو صرف ماں ہوتی ہے..."

"تم نے... اُسے نہیں مارا؟" کرنل نے کہا۔

"ہاں... میں اُسے مارنے ہی گیا تھا... مگر اس عورت نے کہا کہ پہلے ان بچوں کو مار دو... میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ ان بچوں کو یوں چھوڑنے سے ڈرتی ہوں... بعد میں اُن کی زندگی ادھوری رہ جائے گی... سوتیلی ماں کے ہاتھوں بگڑ جائے گی... میں ان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤں تو اچھا ہے... وہ بہت بہادر عورت تھی کرنل... نہ وہ روئی دھوئی... نہ اس نے منت سماجت کی نہ اس کا یہ حال ہوا... جو تمھارا ہو رہا ہے... دیکھو ذرا کہ تم کس طرح کانپ رہے ہو... کاش، تمھاری رجمنٹ یہ سین دیکھتی کہ کرنل صاحب کی تو پتلون بھی خراب ہو گئی ہے۔ تمھاری بیوی دیکھتی کہ اس کا سورما شوہر جو بہادری اور جوانمردی کی ڈینگ مارا کرتا تھا، موت کے سامنے کتنا بے بس ہو گیا ہے... وہ عورت تو بہت پُرسکون رہی تھی اور پھر اس کے بچے... وہ ماں کے سامنے ہاتھ پھیلا کے کھڑے ہو گئے تھے... وہ تمھارے بچے نہیں ہو سکتے کرنل... تم تو اُن چھوٹے چھوٹے بچوں سے زیادہ ڈرے ہوئے اور بے حال ہو... انھوں نے کہا کہ پہلے گولی ہمیں لگے گی... پھر ماتا جی کو... اور پھر میں نے... میں نے ان سے... ان کی ماں کو نہیں چھینا..."

"تم اچھے آدمی ہو... ایک نیکی اور کر سکتے ہو... وہ عورت تو صرف ماں تھی... میں بیک وقت ان بچوں کا باپ بھی ہوں اور اس عورت کا شوہر بھی... مجھے مارو گے تو ان بچوں کو یتیم کرو گے اور عورت کو بیوہ کرو گے..." کرنل نے اپنی منت سماجت جاری رکھی۔

"میں تم کو چھوڑ دیتا... اگر ایسا ہی ہوتا..."

"کیا مطلب... ایسا ہی ہے مدن موہن..."

"نہیں... اس عورت نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آخر تم مجھے کیوں مارنے آئے تھے؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے اُسے اصل سبب بتا دیا۔" مدن موہن بولا۔ "میں وہاں رُکا... کیمپ ایریا کے اندر فائرنگ کی آواز سب نے سُنی تھی... اور میرے فرار ہوتے ہی شرما اور ورما کے گھر والوں نے کہرام بپا کر دیا تھا... میں جانتا تھا کہ یہی ہو گا... چنانچہ میں بھاگا تو اُن کا صاحب کے گھر میں گھس گیا..."

"دروازے پر گارڈ نے تم کو نہیں روکا؟"

"میں اتنا بے وقوف ہوتا تو تم میرا انتخاب اس مشن کے لیے نہ کرتے کرنل صاحب..." مدن موہن نے کہا۔ "میں پچھلی طرف سے اندر کودا تھا اور کچن کے راستے تمھارے بنگلے میں پہنچا تھا... مگر ذرا سی دیر میں یونٹ ایریا کے اندر میری تلاش شروع ہو گئی اور فوجی وہاں بھی آ پہنچے۔ تمھاری بیوی نے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہے... میں نے ریوالور کے زور پر اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ کیا کہے گی... اس نے کہا تم فکر مت کرو... اس گھر کے اندر تم محفوظ ہو... اندر کوئی نہیں آ سکتا۔" میں نے اس کی زندگی اُسے بخش دی تھی... پھر وہ میری زندگی کیسے نہ بچاتی... مگر احتیاط کا دامن میں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا... میں نے اس کے دونوں بچوں کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ میری تلاش میں آنے والوں کو مطمئن کر کے نہ لوٹا سکی تو ممکن ہے وہ خود بچ جائے مگر اس کی گود خالی ہو جائے گی... میں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے نکلا ہوں اور ویسے بھی جینا نہیں چاہتا... جب فوجی جوان چلے گئے تو میں نے بچوں کو چھوڑ دیا... اس نے کہا کہ تم نے کبھی کوئی ایسی عورت دیکھی ہے... کوئی ماں یا بہن یا بیوی بیٹی جو اپنے شوہر... بھائی... باپ یا بیٹے کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کا حوصلہ نہ رکھتی ہو... بچوں کو یرغمال بنا کے خوفزدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی... میں نے کہا کہ مجرم تمھارا شوہر تھا... اسے زیادہ سخت سزا دینے کے لیے میں تمھیں بھی مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر تمھیں چھوڑ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اصل مجرم کو بھی چھوڑ دوں گا... اور معلوم ہے اس نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا ہو گا... کہ اسے معاف کر دو..."

"نہیں... اس نے کہا کہ تمھارے کسی فیصلے کو میں کیسے بدل سکتی ہوں... تم وہی کرو گے جو تمھارے لیے ضروری ہو گا..." مدن موہن نے کہا۔ "تمھیں تو انتقام لینا ہے... تم معاف کر دینے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہو کیونکہ تمھیں کوئی خوف نہیں رہا... تم نے دو بے گناہ عورتوں کو قتل کر دیا ہے... تم تیسرا قتل ضرور کرو گے... تم میرے کہنے سے اصل مجرم کو نہیں چھوڑو گے... میں نے کہا کہ میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں... اور اس عورت نے مجھے اجازت دے دی کہ تم کو قتل کر دوں۔"

"تم... تم جھوٹ کہتے ہو..."

"نہیں... تمھاری بیوی نے صاف کہا کہ میری جگہ وہ ہوتی تو ایسا ہی کرتی... ویسے بھی اسے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا... وہ شخص اب صرف دنیا کو دکھانے کے لیے میرا شوہر رہ گیا ہے... سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ملٹری ہاسپٹل کی ایک نرس نرملا کے چکر میں ہے... اسی کے ساتھ رہتا ہے اور دھرم قانون کا مسئلہ نہ ہوتا تو اب تک اس سے بیاہ کر چکا ہوتا... بچے بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ کچھ نہ سمجھتے ہوں... وہ سب جانتے ہیں اور انھیں باپ کی صورت سے نفرت ہے... کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے اس بات سے کرنل صاحب...؟ یہی کہ تمھارے بیوی بچوں کو تمھاری ضرورت نہیں ہے... بلکہ تم نے کہ ان کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے... اب تم مرو یا جیو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا... اسے میں اجازت ہی سمجھتا ہوں..."

"تم تو ایسے بات کر رہے ہو... جیسے وہ اجازت نہ دیتی تو تم مجھے چھوڑ دیتے..." کرنل نے تلخی سے کہا۔

"یہ ہو سکتا تھا... بالکل ہو سکتا تھا کرنل۔" مدن موہن نے کہا۔ "اس وقت میرے جذبات کا رُخ بدلا ہوا تھا۔ میں دو دُلہنوں کو ان کے سسرال میں سارے رشتے داروں کے سامنے گولی مار چکا تھا... اس وقت میں پاگل ہو رہا تھا... مگر انھیں مرتا دیکھ کے میرے ذہن کی کیفیت میں عجیب سی تبدیلی آئی۔ میں کچھ احساسِ جرم و ندامت کا شکار ہو گیا تھا۔ اُن کی موت نے مجھے جھنجوڑ کر میرے احساس کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے سوچا تھا کہ یہ میں نے اچھا نہیں کیا... مجھ سے زیادتی ہو گئی ہے کہ میں نے مجرم کو سزا دینے سے پہلے بے گناہ کو مار دیا ہے۔ بے شک، اس میں اصل مجرموں کے لیے بہت ذہنی اذیت کا سامان ہے مگر ان نئی نویلی دلہنوں کو موردِ الزام تو نہیں سمجھا جا سکتا اور شرما، ورما سے زیادہ دُکھ تو ان کے ماں باپ اور بھائی بہن اُٹھائیں گے۔ اسی ردِعمل کا نتیجہ تھا کہ میں تمھاری بیوی کو ایک دم گولی نہ مار سکا... جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ اور جب اس نے تم پر بے وفائی کا الزام بھی ثابت کر دیا تو وہ عورت مجھے مظلوم لگی۔ میں صبح ہونے تک تمھارے گھر میں چھپا رہا... صبح تمھاری بیوی نے مجھے اپنی گاڑی میں سرحد سے چند میل دُور چھوڑ دیا۔"

"اس عورت نے... ایک قاتل کی مدد کی!" کرنل چلّایا۔

"وہ مجبور تھی... اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کے بچوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی... میں نے انھیں باتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود باہر سو گیا تھا۔ یہ تمھیں بہت عجیب لگے گا کہ آدمی دو قتل کرے اور پھر سکون کی نیند سے بھی محروم نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کرنل صاحب کہ اپنی موہنی کے قتل کا بدلہ لے کر میرے دل کو بڑا سکون حاصل ہو گیا تھا۔ دو راتوں کے بعد میں نے چھ گھنٹے کی نیند پوری کی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اور صبح اُٹھ کے تمھارے بیوی بچوں کو آزاد کیا۔ پھر تمھاری بیوی نے میرے لیے ناشتا تیار کیا اور میں نے تمھاری بیوی کو سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا... میں تمھارے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ڈکی میں چھُپ گیا اور تمھاری بیوی کار خود چلاتی ہوئی مجھے یونٹ ایریا سے نکال لائی۔ رات بھر یونٹ ایریا میں میری تلاش جاری رہی تھی۔ کوئی کیسے فرض کر سکتا تھا کہ میں کمانڈنگ افسر ہی کے بنگلے میں موجود ہوں اور اسی کی کار میں چھُپ کر نکل سکتا ہوں۔ تمھاری بیوی چاہتی تھی کہ میں بچے کو ڈکی میں ساتھ نہ رکھوں۔ وہ میری مدد کا وعدہ کر چکی ہے تو نبھائے گی۔ لیکن میں عورت ذات، دشمن اور سانپ بچھو پر بھروسا نہیں کرتا۔ تریا چلتر سے ڈرنا ہی چاہیے۔ میں نے بچے کو ضمانت بناکے ساتھ رکھا اور وہ مجھے سخت چیکنگ کے باوجود باہر نکال لائی۔ کس کی مجال تھی کہ سی او صاحب کی بیوی کو روکتا۔ صبح ساڑھے سات بجے وہ مجھے بارڈر سیکیورٹی فورس کے حوالے کرکے لوٹ گئی۔ بی ایس ایف والوں کو اپنے مشن کے بارے میں بتا کے میں پھر سرحد عبور کر آیا... اور اب دیکھ لو... چوبیس گھنٹے کے اندر اندر میں نے موہنی کے قاتلوں کو سزا دے دی ہے۔"

"مجھے اپنی موہنی کا قاتل مت سمجھو... میں نے کسی کو حکم نہیں دیا تھا کہ اُسے مار ڈالیں۔ یہ اطلاع ورما نے دی تھی کہ موہنی کا دماغ خراب ہو رہا ہے اور شرما نے کہا تھا کہ ہمارے پاس کسی کا دماغ درست کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ آسان اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ اس دماغ کو نیست و نابود کر دو۔" کرنل نے کہا۔

"تم نے انھیں روکا کیوں نہیں تھا؟"

"میں نے روکا تھا... کہا تھا کہ پہلے اس لڑکی کو سمجھاؤ... مگر وہ کہنے لگے کہ یہ سمجھانے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ اسے سب سمجھا دیا گیا تھا یہاں آنے سے پہلے۔ اب سمجھانے کا وقت گزر چکا..."

"تم اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں..."

"میں جانتا ہوں کہ تم کتنے سچے ہو... اور تمھاری قسم کتنی سچی ہوگی... لیکن میں تم کو ایک چانس دوں گا کہ تم خود کو بے قصور ثابت کر سکو... میں ان سب سے پوچھوں گا جو اس وقت موجود تھے۔ ان میں تمھاری نرملا بھی شامل تھی۔" مدن موہن بولا۔ "وہ سب مجھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"ان سب کو ہم نے تہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہاں دشمن کا ایک ایجنٹ گھس آیا تھا۔ اس نے ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو مار دیا... نرملا اسی کے قبضے میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو...؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" کرنل نے زیادہ پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ غالباً خود سکندر بخت ہے یا اس کا کوئی ساتھی۔"

"اس وقت کہاں ہے وہ؟"

"تمھاری موہنی کی لاش پر قدم جمائے کھڑا ہوا ہے۔" کرنل نے محسوس کیا کہ بالآخر اپنی حاضر دماغی اور ہوشیاری سے وہ مدن موہن کے ذہن سے انتقام کا خیال نکالنے اور اس کے خیالات کا رُخ پلٹنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"میری موہنی کی قبر پر...؟" مدن موہن چلّایا۔

"قبر پر نہیں... قبر کے اندر... اس کی لاش پر..." کرنل نے اس کے غصّے کی آگ پر تیل چھڑکا۔ "ہم نے تو موہنی کی تدفین کر دی تھی باعزت طور پر... یہاں چتا جلانے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ مگر وہ قبر کھود کے اندر اُتر گیا... اور اب وہیں مورچا جمائے بیٹھا ہوا ہے... ہم سب اس کو قبر سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تم آ گئے... وہ ملیچھ جوتوں سمیت موہنی کے جسم پر سوار ہے۔"

"میں... میں اُسے کتّے کی موت مار دوں گا... اس کا خون پی جاؤں گا... جس نے میری موہنی کے ساتھ ایسا سلوک کیا..." مدن موہن پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ "مجھے بتاؤ وہ ملیچھ کہاں ہے۔"

"اُدھر... اِدھر سے دیکھو..." کرنل نے کہا۔

میں بہت پہلے سے تیار تھا۔ مدن موہن ایک دم میرے سامنے آ گیا... وہ کسی طوفانی بگولے کی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے لات گھمائی جو اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ وہ چیخ مار کے اُلٹ گیا... مشین گن اس کے ہاتھوں سے نکل کے اوپر گئی اور چند قدم پیچھے جا گری۔ کرنل نے میری توقع کے مطابق اس پر قبضہ کرنے کے لیے جست لگائی مگر میں نے اپنی مشین گن کا بٹ اس کے سر پر مارا اور وہ کراہ کے ایک سائڈ پر گرا۔ ضرب صحیح نہیں پڑی تھی چنانچہ اس نے پلٹا کھا کے اُٹھنا چاہا مگر میں نے اُسے پے در پے ٹھوکریں ماریں... سر میں، پسلیوں میں اور پیٹ میں، وہ بلبلاتا رہا اور لڑھکتا رہا۔

اس وقفے کا فائدہ مدن موہن نے اُٹھانا چاہا... وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔ "خبردار... اپنی جگہ پر کھڑے رہو..." میں نے کہا۔ "میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" مدن موہن غرّایا۔

"جھوٹ یہ بکتا ہے۔" میں نے بے سُدھ پڑے ہوئے کرنل کی طرف اشارہ کیا۔ "کون ہے موہنی کی قبر میں... کوئی نظر آ رہا ہے تمھیں جوتوں سمیت اس کی لاش پر کھڑا ہوا... وہ دیکھو... وہ ہے تمھاری موہنی کی قبر..."

مدن موہن نے پلٹ کے دیکھا۔

"وہ مٹی کا ڈھیر نظر آ رہا ہے تمھیں؟" میں نے کہا۔ "وہی ہے موہنی کی قبر... اور اس کے پاس ہی تین لاشیں اور پڑی ہوئی ہیں۔"

"تین نہیں... چار ہیں..."

"ان میں سے ایک نرملا ہے... وہ زندہ ہے... دوسرا ایک لڑکی ڈرائیور سائیں ہے... باقی دو کو پہچانتے ہو تم؟"

مدن موہن نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ محافظ کُتّے تھے... اپنے آقاؤں کے حکم پر دُم ہلانے والے... ذلیل کُتّے... بے رحم درندے۔"

"انھی حکم کے غلاموں نے تمھاری موہنی کو یہاں گاڑا تھا۔ اب وہ اس کی قبر کو کھود کے اسی میں دوسری لاش بھی ڈالنے والے تھے... سائیں ڈرائیور کی لاش..." میں نے کہا۔ "لیکن وہ میرے ہاتھوں مارے گئے... کرنل نے جھوٹ بولا تھا تم سے کہ میں موہنی کی لاش پر جوتوں سمیت چڑھا ہوا ہوں... میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا مدن موہن... اس نے تمھاری توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا کہ میں مشین گن کے ساتھ قبر میں مورچا بنائے بیٹھا ہوا ہوں... ابھی تک تو میں نے قبر کے اندر جھانکا بھی نہیں۔"

"پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ موہنی کی قبر ہے؟"

"میں نے سائیں ڈرائیور کے قتل کے بعد کسی کو حکم دیتے سُنا تھا۔ اس نے ان دونوں سے کہا تھا کہ ڈرائیور کو بھی اسی قبر میں گاڑ دو جس میں کل موہنی کو گاڑا تھا... اس وقت نرملا بھی موجود تھی... وہ تصدیق کرے گی میری بات کی... تم کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں... میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا..."

"مگر... تم ہو کون؟"

"میں ایک پاکستانی ہوں..." میں نے مختصراً کہا۔ "اور جو کچھ میں کر رہا ہوں پاکستان کے لیے کر رہا ہوں... اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں..."

"پھر تو تم... مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے..."

"یہ میری مرضی اور میرے اختیار کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں رعایت دے دوں... میں جانتا ہوں کہ تم کو میری ذات سے کوئی دشمنی نہیں۔ جو کچھ تم کر رہے تھے، پاکستان سے دشمنی کے جذبات کے باعث نہیں کر رہے تھے۔ ہوسِ زر کے جذبات سے مغلوب ہو کے کر رہے تھے... تم ایک ایسے شخص ہو، جس کا کوئی وطن... کوئی ضمیر اور کوئی اصول نہیں... تمھارا دھرم ایمان صرف پیسہ ہے... اگر تمھیں پیسہ دینے والا میں ہوتا تو تم خود اپنے بھارت دیش کے خلاف میری مدد کرتے... اس لیے میں قصوروار تمھیں نہیں سمجھتا۔ میں اسے تمھاری فطرت کی خرابی یا کمزوری سمجھتا ہوں... لالچ میں پیسے کے لیے ساری دنیا میں لوگ اپنا... اپنے ناموس کا... وطن کا... انسانیت اور شرافت کا... عزت اور غیرت کا... ہر چیز کا سودا کرتے ہیں اور تم بھی انھی میں سے ایک ہو۔"

"تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"تم مجھے کرنل کے اور اس کے مشن کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے... جو کچھ بھی تم جانتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مثلاً سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ سب لوگ کہاں ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"تمھارے جیسے دوسرے... جسم فروش... ایمان فروش... وطن فروش مرد اور عورتیں..." میں نے کہا۔ "وہ سب جو گزشتہ شب یہاں دادِ عیش دے رہے تھے... کرنل نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کسی تہ خانے میں ہیں... تم کو معلوم تو ہوگا کہ وہ تہ خانہ کدھر ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور پھر قبر کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم موہنی کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

اس نے پھر اقرار میں سر ہلایا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "اُسے کل مٹی میں دبایا گیا تھا۔ اب تک اس کی لاش سڑنے گلنے لگی ہوگی... عام طور پر چوبیس گھنٹے میں پیٹ پھول کے پھٹ جاتا ہے... گوشت میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں... کیا ملے گا تمھیں یہ اذیّت ناک منظر دیکھ کر... تمھارے ذہن میں موہنی کی صورت کچھ اور ہوگی۔ اسی آخری تصویر کو یادوں میں تازہ رکھو... اگر تم نے اس کی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی بدہیّت و متعفّن لاش دیکھ لی تو ساری عمر اس منظر کو بھلا نہ پاؤ گے... تمھاری جگہ میں ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا... موہنی مر چکی ہے... اس کی موت کو ایک حقیقت سمجھ کے قبول کر لو۔ اس کے تصوّر میں بدصورتی کو شامل مت کرو۔"

اس نے یوں آہستہ سے سر ہلایا جیسے میری بات سمجھ رہا ہے لیکن اس کی نگاہ بدستور کھُلی قبر پر جمی رہی۔

"چلو، مجھے اس تہ خانے تک لے چلو..." میں نے لہجہ بدل کے اُسے حکم دیا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا تم سب کو آزاد کر دو گے؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا..." میں نے کہا۔ "یہ ان سب کے رویّے پر منحصر ہے... پہلے تو میں انھیں اس کام پر لگاؤں گا... وہ موہنی کی قبر کو بند کریں گے... اور باقی تین لاشوں کو ٹھکانے لگائیں گے۔"

"تہ خانے کا راستہ اندر ہے۔" وہ بولا۔

میں نے مشین گن ہلا کے اُسے آگے چلنے کو کہا۔ دوسری مشین گن وہیں پڑی ہوئی تھی جہاں سے اُسے کرنل نے اٹھانے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی بے سود کوشش کی تھی۔ میں نے اُسے بھی اُٹھالیا۔ بیک وقت دو مشین گنوں کو استعمال کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا لیکن میں اس ہتھیار کو کرنل کے لیے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مدن موہن پر مشین گن استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُسے میں خالی ہاتھوں سے بھی قابو میں رکھ سکتا تھا۔ مدن موہن کے پیچھے جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ کرنل کا طبّی معائنہ بھی کرلوں... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مکر کیے پڑا ہو اور میرے جاتے ہی اُٹھ کھڑا ہو۔

نیچے بیٹھ کر اُسے غور سے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے... اس کی نبض بھی تھمی ہوئی تھی۔ میرا پہلا اندازہ یہی تھا کہ شاید میرے بوٹوں کی کوئی ٹھوکر مہلک ثابت ہوئی اور دماغ کے اندر کوئی رگ پھٹ گئی یا جگر کی چوٹ نے کام تمام کردیا مگر پھر مجھے اس کے بند ہونٹوں پر تھوڑے سے جھاگ نظر آئے... میں نے بہت قریب سے سونگھا تو مجھے کڑوے باداموں جیسی بُو آئی۔ کرنل نے خودکشی کرلی تھی۔ اس کے مُنہ میں کسی دانت یا ڈاڑھ کے خلا میں سائنائیڈ کا انتہائی قاتل زہر پوشیدہ تھا جسے وہ ایسے ہی وقت میں خاص طریقے سے دبا کے توڑ سکتا تھا... یہ بہت پرانا طریقہ ہے جو سب جاسوس اور تخریب کار ایجنٹ استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے لیے فرار کے سارے راستے بند ہوگئے ہیں تو دشمن کی قید میں جانے سے بہتر وہ خودکشی کو سمجھتے ہیں۔ دشمن زیادہ اذیت دے کر اور سب کچھ معلوم کرنے کے بعد مارتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے جسمانی ایذا رسانی کے جدید طریقوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں... وہ بالآخر سچ اُگل دیتا ہے اور جب دشمن کو یقین آجاتا ہے کہ اب معلوم کرنے کو کچھ بھی نہیں رہا تو وہ باقی ماندہ ٹوٹے پھوٹے شکستہ اور نامکمل آدمی کو کیلشیم فاسفورس اور پروٹین والی کھاد سمجھتے ہوئے مٹی میں ملا دیتا ہے... غدّار اور جاسوس کو نہ اپنے معاف کرتے ہیں نہ پرائے... چنانچہ سمجھدار وہی ہوتا ہے جو فوری اور بے عذاب موت قبول کرلے۔

میں نے کرنل کی جامہ تلاشی لی... وہ عام آدمی جیسی شلوار قمیص میں تھا اور اگر مخاطب کرنے والوں نے اسے کرنل نہ کہا ہوتا تو مجھے کبھی اس کے عہدے کا پتا نہ چلتا۔ وہ مقامی آدمیوں سے ذرا بھی الگ نہ لگتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ سری لنکا، نیپال، بھوٹان اور تبت کے لوگ بھی ایک جیسے رنگ، چہرے کے نقوش اور لب و لہجے کے مالک ہوتے ہیں۔ کرنل کی قمیص کی کسی جیب سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ممکن ہوتی۔ ایک جیب میں سے مجھے سگریٹ کیس اور لائٹر ملے۔ انھیں میں نے سنبھال کے رکھ لیا... یہ ٹرانسمیٹر بھی ہوسکتے تھے اور خطرناک قسم کے مہلک ہتھیار بھی... شلوار کے اندر بھی ایک جیب

تھی... اس میں سے ایک بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ لگا یہ ... حفاظتی نظام کا ایک حصہ تھا... اگر کوئی اس سے مشین گن یا ... سے ریوالور چھین لینے کے بعد یہ سمجھتا کہ اس نے کرنل کو نہتا ... ہے تو وہ اسی غلط فہمی کے باعث مارا جاتا۔

میں نے مدن موہن کو نگاہ میں رکھا تھا... وہ ایک ... شخص تھا جس کو انتقام کی آرزو نے ہوش و خرد سے بیگانہ کر ... مگر طبعاً وہ دیوانہ نہیں تھا۔ وہ ایک ذہین اور عیار آدمی نہ ہو... اسے جاسوسی اور تخریب کاری کے اس مشن کے لیے منتخب ... کیا جاتا۔ تخریب کاری کی تربیت دینے والے انسان کی ... کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں... کوئی مایا جال میں ... جاتا ہے تو کوئی ہوس کے جال میں... وہ ترسے ہوئے محرومی ... مارے ہوئے خواہشوں کی ناکامیوں سے دل برداشتہ لوگوں کو سبز ... دکھاتے ہیں۔ بہلا پھسلا کے انھیں اس راستے پر لے آتے ہیں ... وہ دولت مندی کی منزل کو اپنی دسترس میں دیکھتے ہیں۔ پھر انھیں ... عیش و عشرت کی اس زندگی سے روشناس کرادیتے ہیں جو ... زندگی میں صرف خوابوں تک محدود تھی اور بالآخر انھیں ذہنی ... طور پر زندگی کا جُوا کھیلنے پر آمادہ کرلیتے ہیں کہ کامیابی کا صلہ عیش ... کی اس زندگی کا دوام ہے مگر جیت گئے تو کیا کہنا۔ دنیا ہی جنت ... ہوگی... ہارے بھی تو بازی مات نہیں... کیونکہ اس جہنم سے ... ملے گی جس میں تم اب زندہ ہو۔

لیکن انتخاب وہ اہلیت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اپنا دقت ... اپنے وسائل اور اپنا تجربہ کسی ایسے امیدوار پر ضائع نہیں کرتے جو ... کی ناکامی کے امکانات زیادہ ہوں۔ جو ذہانت... حوصلہ مندی ... اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہو... مدن موہن میں یہ سب صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اپنے انتقام کو صحیح طور پر پلان کیا ... اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا... وہ کیمپ سے فرار ہو کے جس ... طرح امرتسر اور کیمپ ایریا کے اندر گیا اور اپنا کام کرکے جس انداز ... نکل آیا، وہ اس کی ذہانت اور عیاری کو ثابت کرنے کے لیے ... تھا... تاہم جذبات اس کی طبعی نیکی کی دلالت کرتی تھی وہ کرنل ... بیوی کے قتل سے باز رہا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور محسوس کیا ... ارادہ بدل دیا۔

مدن موہن کو یقیناً صدمہ ہوگا کہ اپنے دشمن کو وہ خود نہ مار ... لیکن دوسری طرف اس کے اطمینان کے لیے یہ بات کم نہ تھی کہ ... دونوں بھائیوں کو خود اس نے مار دیا جن میں سے ایک نے موہ ... کو پکڑا تھا اور دوسرے نے اس پر گولی چلائی تھی۔ مدن موہن جذبات ... میں پاگل ہورہا تھا، اس کا دماغ خراب نہیں ہوا تھا۔ اس نے یہ ... بات سمجھ بھی لی تھی اور مان بھی لی تھی کہ اب موہنی کو دیکھنے کا ف...

کوئی نہیں... میرے لیے فائدہ مند بھی ہوسکتا تھا اور خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا... ابھی وہ مجبور تھا... کچھ جذباتی انتشار سے اور کچھ خالی ہاتھ ہونے کے باعث۔

اس نے تہ خانے تک میری راہنمائی کی... یہ بیرک کے دوسرے کنارے پر واقع ایک زینہ تھا جس کا دروازہ اوپر سے مقفل تھا۔

"مدن موہن!" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تم اس اندر کیسے آئے تھے؟"

"گیٹ سے اور کیسے۔" وہ بولا۔

"لیکن وہاں ایک دربان مسلح بیٹھا رہتا ہے..."

"وہ مجھے پہچانتا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "اس نے جیسے ہی میرے لیے گیٹ کھولا، میں نے اُسے مار دیا۔"

"کیسے مار دیا؟ گولی چلتی تو آواز آتی۔"

"میں نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا۔" مدن موہن بولا۔ "جو میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے پیچھے چھپالیا تھا... وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا، وہ چکرا گیا اور میں نے اس سے مشین گن چھین لی۔ پھر اسی کے وار سے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

"اس نے شور نہیں مچایا تھا؟"

"وہ چلّایا تھا... جب میں نے اس کے سر پر پتھر مارا تھا۔"

"میں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور شاید دوسروں نے بھی نہیں سُنی تھی... ورنہ وہ ضرور آتے..."

"گیٹ کافی دور ہے... اور وہ بہت بلند آواز میں نہیں چیخا تھا... جب وہ نیچے گرا تو میں نے ایک بہت بھاری پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا..." مدن موہن نے کہا۔

جب قفل والا دروازہ سامنے آگیا تو میں نے مدن موہن کی طرف دیکھا۔ "اس کی چابی...؟"

"انہی میں سے کسی کی پاکٹ میں ہوگی۔" وہ بولا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ کیا میں واپس جاؤں اور شرما اور ورما کی جیبوں کو بھی ٹٹولوں... پھر میں نے تالا توڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تالے پر مشین گن کے بٹ سے مسلسل چوٹیں لگائیں... دروازے کے پیچھے سے میں نے عورتوں کے چیخنے چلّانے کی آواز سنی۔ ان سب کو حفظِ ماتقدم کے طور پر اسیر کردیا گیا تھا... وہ حیران پریشان ہوں گے کہ دروازہ کھولنے والے کے بجائے دروازہ توڑنے والا کون آگیا؟ تالا اور دروازہ دونوں میری توقع سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ اس سے مجھے تھوڑی سی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی... بس ایک سیکنڈ کے لیے میری ساری توجہ تالے کی طرف ہوگئی اور میں نے اس پر آخری وار پوری قوت سے کرنے کا فیصلہ کیا... مدن موہن نے اس ایک سیکنڈ کو تاڑ لیا اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھ پر حملہ کردیا۔

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار... مدن موہن نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ میں بھی اس کرنل کا اور اس کے حواریوں کا جانی دشمن ہوں مگر وہ یہ بات نہیں بھولا تھا کہ ہم بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں... ایک مشترک دشمنی کا جذبہ رکھنے کے باوجود ہمارے درمیان دوستی اور تعاون کا رشتہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ میں بھی اُسے وہی سزا دوں گا جو کرنل اُسے بچ جانے کی صورت میں دیتا... شاید میری سزا زیادہ سخت ہوگی۔

اس کے پہلے حملے نے میرے قدم اکھاڑ دیے۔ میں اس دروازے سے ٹکرایا جس پر وار کررہا تھا۔ میرا سر دروازے پر لگا اور مشین گن بڑے بے تکے طریقے پر دروازے سے ٹکرا کے اُچھل گئی۔ میں تیزی سے گھوما... یہ میرے جسم کا خودکار مدافعتی عمل تھا۔ بالکل ایسا ہی جیسے غلطی سے انگارے کو چھو لینے والا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے آجاتا ہے... مجھے احساس تھا کہ دشمن میرے پیچھے ہے مگر پلٹ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ اس ضرب نے جو سر کے دروازے پر لگنے سے آئی تھی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا تھا... یہ اندھیرا فوراً ہی چھٹ گیا... خطرے کے احساس نے میرے حواس کو سہارا دیا اور میں نے سر کو جھٹک کے دیکھا تو مجھے مدن موہن کے ہاتھ میں مشین گن نظر آئی جسے وہ زمین سے اُٹھا چکا تھا۔

ابھی وہ سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ میرا دایاں پیر حرکت میں آگیا اور فٹ بال اسٹائل کی یہ کِک مشین گن پر ہی پڑی... مشین گن مدن موہن کے ہاتھ سے نکل کے اوپر گئی اور چھت سے ٹکرا کے واپس آئی لیکن اتنی دیر میں خود مدن موہن اوپر اُٹھ چکا تھا... وہ نیچے گرا تو اس نے مشین گن کو میرے ہاتھ میں دیکھا۔

"بس مدن موہن... جہاں پڑے ہو وہیں پڑے رہو۔" میں نے مشین گن کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا... میں سوچ رہا تھا کہ تم سب کو آزاد کردوں اور واپس جانے دوں... تم سب بھٹکے ہوئے لوگ ہو... جو بہکانے میں آگئے تھے... تمھیں زندہ رہنے کا ایک موقع ملنا چاہیے۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ موقع..." مدن موہن نے کراہ کے کہا۔ "میں جینا بھی نہیں چاہتا موہنی کے بغیر... مار ڈالو مجھے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے مرنے جینے کا اختیار بہت پہلے گروی رکھ دیا تھا... یہ اختیار پہلے کرنل کے پاس تھا اور اس سے میں نے لے لیا ہے... نہ میں تمھاری یہ درخواست قبول کروں گا کہ تمھیں جینے دوں اور نہ یہ خواہش پوری کروں گا کہ مار دوں...

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" میں نے ایک دم گھوم کر تالے پر دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ کے بکھر گیا... اندر سے ہسٹریا میں مبتلا عورتوں نے چیخنا شروع کیا۔ میں نے کنڈی کھولی اور دروازے کو لات ماری... نیچے جانے والا زینہ میرے سامنے آگیا۔ تھوڑا سا اُجالا اوپر کے حصّے میں ہی ختم ہو جاتا تھا۔ آگے سرنگ جیسا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے کو سو واٹ کا ایک بلب اپنی زرد روشنی سے پُرآسیب بنا رہا تھا... جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں وہ سب خوف اور دہشت میں مبتلا کھڑے ہوئے تھے... وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں... دوست ہوں یا دشمن ہوں۔ ان کو اس قیدِ زنداں سے نجات دلانے آیا ہوں یا قیدِ حیات سے... تاہم اُن کے خوف سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے ارادے اور اپنے انجام کو میری صورت پر پڑھ رہے ہیں۔

"چاروں مرد اوپر آجائیں۔" میں نے حکم دیا اور میری آواز خود مجھے بڑی اجنبی لگی۔ اس آواز میں تہ خانے کی بازگشت تھی۔ "چاروں عورتیں پیچھے ہٹ جائیں۔"

مردوں نے تعمیل کی اور عورتوں کو دھکا دے کر آگے بڑھے۔

"ایسے نہیں..." میں نے کہا۔ "چاروں ہاتھوں پیروں پر چل کے آنا ہے... کتّے کی طرح... جس نے بھی سر اُٹھا کے دیکھا، اس کا مغز فرائی کردوں گا... زینے کا دروازہ بند کردو۔ عورتیں نہیں آئیں گی۔"

وہ چاروں بڑے مضحکہ خیز انداز میں زینہ چڑھ کے اوپر آئے۔ میں نے انھیں بیرک کے کوریڈور میں بھی اسی طرح ایک قطار میں رکھا کہ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ سچ مچ جانور لگتے تھے۔ مدن موہن سب کے آگے تھا۔ میں انھیں بیرک میں سے گزار کے باہر لے گیا۔ آتے جاتے میری آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جگہ اسلحے کی تقسیم و ترسیل کا ایک ڈپو تھی جہاں سے تربیت یافتہ تخریب کار اسلحہ لے کر آگے جاتے تھے... انھیں ٹیم کی صورت میں کسی مشن پر روانہ کیا جاتا تھا... ایک مرد اور ایک عورت کی ٹیم مقامی آبادی میں آسانی سے گم ہوسکتی تھی۔

"مدن موہن... اتم نرملا کو اُٹھا کر لاؤ گے۔" میں نے باہر آکے حکم دیا۔ "باقی چار آدمی دس منٹ میں تین لاشوں کو قبر میں ڈالیں گے اور مٹی برابر کریں گے۔"

میں ان سب سے دس قدم پیچھے رہا... باہر کی زمین دھوپ میں تپ رہی تھی لیکن میں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی اور ان سب کو چوپایوں کی طرح لے گیا۔ ان کی ہتھیلیاں، گھٹنے اور پیر یقیناً جلے ہوں گے۔ مگر میرے نزدیک وہ بدترین سزا کے مستحق تھے۔ مدن موہن سب سے پہلے نرملا کے نزدیک پہنچ کر رُکا۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے کھڑا ہونے کی اجازت دی۔ میں نے صرف سر کے اشارے سے ایسا کیا تھا اور میرا خیال تھا

کہ وہ آہستہ آہستہ اُٹھے گا لیکن وہ بجلی کی طرح اُٹھا اور اس نے [illegible] پر فائر جھونک دیا۔ ریوالور اس نے نرملا کے پاس سے اٹھایا [illegible] اور شاید یہی دیکھنے کے لیے اس نے سر گھمایا تھا کہ میں کس پوزیشن میں اور کہاں ہوں۔ میں نے اُسے اجازت مانگنے کا انداز سمجھا [illegible] اس نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جان کی بازی لگا دی [illegible] ویسے بھی جینے کی خواہش سے محروم ہوچکا تھا اور یہ چانس لے [illegible] تھا۔ اگر گولی مجھے لگ جاتی تو وہ اپنے ساتھ دوسروں کی جان [illegible] بچالیتا... لیکن عجلت میں نشانہ لینے سے گولی نے مجھے چھو [illegible]

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے غوطہ مارا اور زمین پر لیٹ گیا [illegible] اس طرح میری جان بچ گئی کیونکہ دوسری گولی مدن موہن نے [illegible] لے کر چلائی تھی... اس سے زیادہ کی اسے مہلت ہی نہ ملی [illegible] مشین گن کا راؤنڈ ختم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی مدن موہن کی زندگی کا یہ کھیل بھی ختم ہوگیا جس میں تقدیر نے اُسے ہر قدم پر سراب دکھائے تھے اور وہ ہر سراب کو حقیقتِ جاں کے اس کے پیچھے دوڑتا رہا تھا... وہ مظلوم بھی تھا اور ظالم بھی... مدن موہن نے [illegible] عدالتِ انصاف سے ایک قتل پر چار مجرموں کو موت کی سزا [illegible] تھی۔ اُن میں سے دو عورتیں مجرم نہیں تھیں۔ وقت نے اُن کے قاتل کو بھی مہلت نہ دی۔

باقی چار افراد خوف زدہ ہو کے زمین پر اُلٹے لیٹ گئے تھے اور ابھی تک جلتی ہوئی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُنھیں پھر اُٹھنے اور اپنا کام ختم کرنے کا حکم دیا۔ مدن موہن کی [illegible] انجام ان کے سامنے تھا۔ اس کی لاش میں کئی سوراخ تھے اور ان سے رسنے والا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں آسمان میں بہت بلندی پر اُڑنے والے چیل کوّوں کو دیکھ رہی تھیں۔

اب موہنی کی لاش پر اوپر تلے چار لاشیں ڈال دی گئیں [illegible] میں اس کے محبوب کی لاش بھی تھی جس سے دنیا میں اس کا [illegible] بہت عارضی تھا۔ شاید کہیں پاتال میں ان کی بدبخت [illegible] کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں وہ دنیاوی زندگی کی محرومیوں پر اکٹھے [illegible] کے رو سکیں۔

قبر لاشوں سے ہی بھر گئی تھی چنانچہ بہت کم مٹی اوپر ڈالی [illegible] میں نے انھیں واپسی کا حکم دیا۔ ان میں سے تین اسی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے واپس آئے۔ چوتھے نے نرملا کو اٹھالیا۔ [illegible] کی اتنی طویل بے ہوشی میرے لیے حیرت کا باعث بھی تھی اور تشویش کا بھی... اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ کچھ اہمیت ضرور رکھتی ہے... مدن موہن کی بات سن کے مجھے اہمیت کا سبب بھی معلوم ہوگیا تھا... وہ کرنل کی منظورِ نظر تھی جسے وہ شاید موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ مدن موہن کے بیان کے مطابق وہ کسی اسپتال میں نرس تھی۔ میں اس سے بہت

مفید معلومات حاصل کرسکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہوش میں آئے... سر کی اندرونی چوٹ سے وہ بے ہوشی کی کیفیت میں مر بھی سکتی تھی اور اس کی بے ہوشی کا وقفہ لامحدود بھی ہوسکتا تھا۔

مجھے ہیڈرو کی طرف سے بھی واپسی کا اندیشہ تھا... وہ کہہ کر تو ہی گیا تھا کہ 'حرام دے بوٹے' کو لینے جا رہا ہے۔ اس بات کو دو گھنٹے ہوگئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ حالات اب میرے کنٹرول میں تھے، چنانچہ میں اس کا شایانِ شان استقبال کرسکتا تھا... تاہم مجھے اتنی مہلت درکار تھی کہ میں ان سب مردوں اور عورتوں کو پھر قید خانے میں ڈال دوں اور اس امر کو یقینی بنالوں کہ ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں... میں بھوک پیاس سے بھی بے حال ہو رہا تھا اور محض اپنی قوتِ برداشت اور قوتِ ارادی کے سہارے ان حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ کیمپ میں کھانے پینے کی کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ کیمپ ہی نہیں ایک عشرت کدہ بھی تھا۔ میں نے کرنل کی جیب میں سے نکلنے والی سگریٹ سلگانے کا سوچا تھا لیکن خشک حلق اور خالی پیٹ کے ساتھ دھواں نگلنا مشکل کام تھا چنانچہ میں نے دل کو صبر کے میٹھے پھل کی دلیل سے بہلا لیا۔

تہ خانہ درحقیقت کچھ جمنازیم قسم کی چیز تھا۔ یہاں حضرات اور خواتین کو دیواریں پھاندنے... رکاوٹیں عبور کرنے اور ایسی ہی مشکلات سے نمٹنا سکھایا جاتا تھا... اس کے لیے لانگ جمپ، ہائی جمپ... دیوار پر کسی سہارے کے بغیر سیدھا چڑھنا۔ بلندی سے کودنا، رسّے سے کمند ڈالنا اور رسّی کو جھولا بنا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنا۔ خندق یا کھائی عبور کرنا اور ایک دیوار سے دوسری دیوار پر پہنچنا سکھایا جاتا تھا۔ تہ خانے کی گہرائی شروع میں بارہ فٹ اور آخری حصّے میں اٹھارہ فٹ کے قریب تھی... گہرائی بتدریج بڑھتی تھی اور اس ہال کی چالیس فٹ لمبائی ایک مسلسل نشیب کا راستہ تھی۔ اس راستے پر بیس فٹ کے بعد پہلی دیوار تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی۔ غالباً اوپر سے دوڑ کر آنے والے جمپ لگا کے یا کسی بانس کے سہارے پر اسے عبور کرتے ہوں گے۔ دوسری دیوار اس سے دس فٹ آگے اور بارہ فٹ بلند تھی۔ بالکل آخری حصّے میں چھت کے کُنڈوں سے رسّے لٹک رہے تھے۔ ایک رسّہ قدرے لمبا تھا۔ اس کی لمبائی چھت سے فرش تک تھی۔ دوسرا صرف چھ سات فٹ لمبا تھا۔

وہاں اور بھی بہت کچھ تھا جو تخریب کاروں کی تربیت کے مختلف مراحل میں کام آتا تھا... یہاں سخت ترین حالات سے گزرنے کی تربیت عملی طور پر وہ حالات پیدا کر کے دی جاتی تھی جو اجنبی اور دشمن ملک میں پیش آسکتے تھے... انھیں بھوکا پیاسا رہنا بھی سکھایا جاتا ہوگا اور درختوں کے پتّے کھا کے گزارا کرنا بھی... اس کے علاوہ نظریاتی تعلیم دینے کے لیے ایک حصّہ بالکل کلاس روم جیسا تھا... وہاں ان کو سمجھایا جاتا ہوگا کہ انھیں دشمن کے علاقے میں گھسنے کے بعد کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ کس قسم کے مشن کی تکمیل کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور مقامی حالات سے کیا مدد لینی چاہیے... وغیرہ وغیرہ... ظاہر ہے انھیں وہاں مختلف قسم کے اسلحے کا استعمال بھی سکھایا جاتا ہوگا لیکن اسلحہ انھیں وقت سے پہلے نہیں دیا جاتا ہوگا... کتّے کو بھی جب تک پوری طرح سدھا نہ لیا جائے، اس پر کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی دن اچانک مالک کو نہیں کاٹ لے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب نہتے تھے... ریوالور صرف نرملا کے پاس تھا جو میں اس لیے نہیں نکال سکا تھا کہ مجھے نظر نہیں آیا تھا... اس کے پاس کوئی پرس یا ہینڈ بیگ ہوتا تو میں ضرور اس کی تلاشی لیتا مگر غالباً ریوالور کو اس نے اپنے زنانہ سیف ڈیپازٹ والٹ میں یعنی بلاؤز میں چھپا رکھا تھا۔ جب میں نے اُسے پھینکا تھا تو ریوالور باہر گر گیا تھا۔ مدن موہن نے اُسے نرملا کے قریب جا کے دیکھا ہوگا... ذرا سی بے احتیاطی میری جان لے سکتی تھی۔ مدن موہن کی بدحواسی کے باعث میں بچ گیا تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ ریوالور تو شرما، ورما کے پاس بھی ہوں گے جو انہی کے ساتھ دفن ہوگئے۔ مدن موہن کے انجام نے باقی سب کے حوصلے پست کردیے تھے ورنہ وہ بھی ایسی ہی کوشش ضرور کرتے۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مقابلے سے بازی جیتنے کے امکانات معدوم ہوگئے ہیں... زندہ رہنے کی امید کو اب میرے رحم و کرم سے ہی وابستہ رکھا جاسکتا تھا... وہ نہایت فرماں بردار ثابت ہو رہے تھے اور شاید سوچ رہے تھے کہ منت سماجت اور آہ و زاری سے وہ مجھے جاں بخشی پر آمادہ کرلیں گے۔

مجھے ابھی بہت کچھ دیکھنا اور پوچھنا تھا لیکن پہلے میں اپنی جسمانی کمزوری کا علاج کرنا چاہتا تھا جو بھوک پیاس کی صورت میں مجھ پر غالب آرہی تھی... میں نے ان سب کو ہال کے ایک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگادی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہال میں اسلحہ نہیں ہے لیکن وہ سب مل کے کوشش کرتے تو ایسی بہت سی چیزیں تھیں جن سے دروازہ توڑا جاسکتا تھا... اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی کریں کیونکہ پھر مجھے ان سب کو شوٹ کرنا پڑتا اور میری تفتیش ادھوری رہ جاتی۔

باتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا اور وہ سب اس کے اندر بس کھڑے رہ سکتے تھے... بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ عورتیں مسلسل رو رہی تھیں اور تقریباً ہسٹریا کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ رہی تھیں اور معافی مانگ رہی تھیں... خدا رسولؐ کے واسطے دے رہی تھیں اور وضاحت کر رہی تھیں کہ وہ اپنی مجبوری کے باعث

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

اس غلط کام میں پھنس گئیں لیکن میں نے ان کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ مرد خود اپنی نظر میں ذلیل تھے اور پٹے ہوئے کتے کی طرح سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔

اب باہر صرف نرملا رہ گئی تھی... میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن مجھے نارمل لگی... مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مکر کیے نہ پڑی ہو۔

"نرملا...؟" میں نے اُسے آہستہ سے ہلا کے کہا: "نرملا! ہوش میں آؤ..."

میں نے اس کے گالوں کو تھپکا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا جو صرف اداکاری تھی۔

"لاحول ولاقوۃ۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ تو گلے پڑ گئی۔" پھر میں نے کچھ دُور جا کے سگریٹ جلائی اور چند کش لیے۔

"ارے بابا! اب تو ہوش میں آجاؤ۔" میں نے یوں کہا جیسے میں اس کی بے ہوشی سے سخت عاجز آگیا ہوں۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس کے پاس بیٹھ کے میں نے نرمی سے کئی بار اس کا نام پکارا اور پھر اچانک جلتی ہوئی سگریٹ اس کی گردن پر لگا دی۔ ایسے وقت میں جب اُسے مجھ سے اس قسم کے سلوک کی ذرا بھی امید نہ تھی۔

نرملا نے ایک چیخ ماری اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے ایک قہقہہ مارا۔ "تو تم بے ہوش تھیں؟" میں نے کہا۔

وہ اُٹھ بیٹھی اور ایک ہاتھ سے بال سنوارنے لگی۔

"میں مانتا ہوں تمھاری قوتِ برداشت کو۔" میں نے کہا۔ "اور تمھاری اداکاری کو کہ تم نے بے ہوشی کا اتنا لمبا ڈراما کامیابی سے کیا... کیا تمھیں امید تھی کہ بالآخر تمھارے چاہنے والے کرنل صاحب اور ان کے مددگار و معاون شرما اور ورما مجھ پر غالب آجائیں گے... تم دم سادھے ہماری گفتگو سنتی رہیں... اور انتظار کرتی رہیں میری شکست کے لمحے کا...؟"

اس نے حیرانی سے پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھا۔ "میں کتنی دیر بے ہوش پڑی رہی ہوں... میں نے تو... وہ سب نہیں سنا۔"

"گویا تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے؟" میں نے طنز سے کہا۔ "یہ بھی کہ وہ دونوں بھائی مدن موہن کے ہاتھوں جہنم رسید ہو گئے۔"

"کیا؟... مدن موہن نے... اُنھیں مار ڈالا؟" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں تلخی سے ہنسا۔ "تم اب یہ بھی کہو گی کہ تمھیں اپنے کرنل صاحب کے مارے جانے کی بھی خبر نہیں..."

"بکتے ہو تم..." وہ ایک دم چلّائی۔ "مجھے وحشت زدہ کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ "کیا تم اس کی لاش دیکھنا پسند کرو گی؟"

نرملا کا رنگ پیلا پڑ گیا... وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے تکتی رہی... یہ ایک فطری ردِ عمل تھا جسے میں اداکاری نہ سمجھنے پر مجبور تھا۔

"یہ... یہ ٹھیک ہے کہ میں ابھی ہوش میں تھی... اس وقت جب تم نے میرے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی تھی...!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "میں تمھیں شوٹ کر دینے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔"

"خالی ہاتھوں سے شوٹ کرنے کے لیے۔" میں نے پھر طنز کیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا۔

"تمھارے ریوالور سے مدن موہن بھی مجھے شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس ریوالور سمیت دفن ہو گیا... اسی قبر میں جس میں کل موہنی کو گاڑا گیا تھا... کیا یہ سب تمھیں معلوم نہیں؟... تم نے نہیں دیکھا؟"

اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے... صرف اتنا یاد ہے کہ... تم نے... مجھ پر حملہ کیا تھا... اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ شاید میں گر پڑی تھی... پھر جب میں نے دیکھا تو... تم مجھے اُٹھا کے لا رہے تھے۔"

میں نے اس کے جواب پر غور کیا تو میرے شک کی بنیاد ہی غلط ہونے لگی... ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ اُٹھ کر آ سکتی تھی اور مجھے پیچھے سے گولی مار سکتی تھی... اس وقت میں مدن موہن کے ہمراہ تہ خانے کے دروازے کی طرف جا رہا تھا... تہ خانے کے قیدیوں کو باہر تک لانے میں میرے پندرہ بیس منٹ ضرور صرف ہوئے تھے اور اس وقت نرملا کو کسی کا خطرہ نہ تھا... یہ میری کوتاہی تھی کہ میں نے اُسے بے ضرر سمجھتے ہوئے وہاں چھوڑ دیا تھا... مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ مسلح ہے... یہ سب نادانستگی میں ہونے والی مگر فاش غلطیاں تھیں... اگر میں اکیلا نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی بھول چوک نہ ہوتی... محسن میرے ساتھ ہوتا تو ایک صورتِ حال کی نگرانی کرتا اور دوسرا تلاشی لیتے اور مجرموں کو باندھ کر ڈالنے کی کارروائی پوری کرتا... یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں تھا جسے میں نے ابھی تک تقدیر کی یاوری سے کامیابی کی سمت بڑھایا تھا... لیکن میں خود کب اس مشن پر نکلا تھا... میرا مشن تو راولاکوٹ... مگر تقدیر نے مجھے یہاں پہنچا دیا تو میں کیا کرتا؟

"دیکھو نرملا...!" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے... یہ بازی تمھارے کرنل صاحب نے ہار دی ہے... مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کیا ہوتا تھا...؟ نہیں معلوم، وہ معلوم ہو جائے گا... یہاں اگر کسی کو اس کی نشاندہی اعمال کھیر کے لا سکتی ہے تو وہ استاد پیڈرو ہے۔"

"استاد پیڈرو...؟"

"ہاں... یہ اس کا ایک نام ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے حیران ہونے کی ضرورت نہیں... ممکن ہے تم سے اس کا تعارف کسی اور نام سے کرایا گیا ہو... وہ گاڑی لے کر گیا تھا مقتول ڈرائیور سائیں کے ساتھی کلینر کی تلاش میں... اگر وہ آگیا تب بھی وہ کوئی توپ نہیں چلا سکتا۔"

"آخر... تم کیا چاہتے ہو؟" وہ سر جھکا کے بولی۔

"صرف تمھارا تعاون..." میں نے کہا۔ "تعاون کے لفظ سے غلط فہمی پیدا نہ ہو، اس لیے وضاحت کر دیتا ہوں کہ میری مراد اس تعاون سے نہیں ہے... جو تم کرنل صاحب سے کرتی رہیں۔"

"میں تم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ویری گڈ... تمھاری اس کایا کلپ کو میں کیا سمجھوں...؟ ابھی تو میں نے کوئی قیمت بھی نہیں لگائی تھی کہ تم نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں... تم سب کچھ بھول گئیں کہ تم نے کرنل سے کیا عہد و پیمان کیے تھے۔ تمھارا تعلق کس ملک سے ہے اور تمھارے مذہبی عقائد کیا ہیں؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو..." وہ نفرت سے مسکرائی... مگر یہ مسکراہٹ بے جان اور مصنوعی تھی۔

"چلو سمجھنے سمجھانے کے لیے تو بہت وقت ہے۔ فی الحال تم اپنے تعاون کا آغاز امورِ خانہ داری سے کرو۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ "کیا کروں؟"

"آخر تم عورت ہو... اور ہندوستانی عورت... جو کام تم کر رہی ہو یہ تو ماں باپ نے نہیں سکھایا تھا... مگر جو سکھایا تھا وہ سب تم بھولی نہیں ہو گی مثلاً چائے بنانا... کھانا پکانا اور کھلانا... یہاں کوئی کچن بھی ہو گا... ذرا سی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں تمھارا پتی مہاراج ہوں... میں تھکا ہارا اور بھوکا پیاسا گھر لوٹا ہوں۔ اب تم کس طرح سیوا کرو گی...؟"

"ایسا مت کہو... بھگوان کے لیے۔" اس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ "ایسے خوابوں کے آسیب نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی... بڑی مشکل سے ان سب کو مارا تھا میں نے... اور دفن کر دیا تھا... جیسے لوگ اپنے گناہوں سے پیچھا چھڑاتے ہیں۔ ہندوستانی عورت کیا... میں عورت بھی نہیں ہوں... میں فقط ایک جسم ہوں... برائے فروخت اور مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ خریدار کون ہے... میری قیمت بھی حالات اور ضرورت کے مطابق بدلتی رہتی ہے... تم نے تو نہیں لگائی مگر آج میری قیمت صرف زندہ رہنے کا حق ہے... جو تم خیرات سمجھ کے بھی دو گے تو میں قبول کر لوں گی۔" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی... اور نیچے گر گئی۔

میں نے اُسے بازو سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "ڈراما مت کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم کس کا ساتھ دے رہی تھیں اور کیوں... یہ قتل و غارت گری اور خونریزی کا مشن تھا... کبھی تم نے سوچا تھا کہ ان عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچّوں کی زندگی بھی ایک قیمت رکھتی ہے جو تمھارے اس مشن کی بھینٹ چڑھے... اور چڑھتے رہیں گے۔ وقت بدل گیا ہے تو قیمت کے بجائے تم خیرات مانگ رہی ہو... میں تم سے جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکتا کہ تمھیں خیرات ملے گی۔"

میں اُسے دھکیلتا ہوا کچن کی طرف لے گیا... وہ آگے تھی اور خود ہی قدم بڑھاتی جا رہی تھی مگر جہاں اس کی رفتار کم ہوتی تھی، میں اس کو پیچھے سے لات رسید کرتا تھا۔ وہ دو بار گری اور پھر اُٹھ کے چلنے لگی۔ وہ میرے لیے ایک جنگی قیدی تھی لیکن میں کسی جنیوا کنونشن کے اصولوں کا پابند نہ تھا... عام حالات میں ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک نامناسب سمجھا جا سکتا تھا مگر یہ عورت میرے ملک کی اور میری قوم کی دشمن تھی۔ اس کے ہاتھ لاتعداد بے گناہوں کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ میں اس کو بدترین عذاب کے ساتھ قتل کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ اور وہ اب تک زندہ تھی تو صرف اس لیے کہ میرے نزدیک اس کی اہمیت ایک ایسی ڈائری سے زیادہ نہ تھی جس سے مجھے کارآمد معلومات حاصل ہونے کی امید ہو... جس کو پڑھنے کے بعد ہی طے کیا جا سکتا تھا کہ اسے تباہ کر دیا جائے یا آئندہ ضرورت کے لیے محفوظ اور مقفل رکھا جائے۔

کچن میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھے توقع تھی یا خواہش تھی... اس نے الیکٹرک کیٹل کا پلگ لگایا... فریج میں سے مکھن، انڈے اور ڈبل روٹی نکالے... توسٹر آن کیا اور آملیٹ بنانے کے لیے انڈے توڑنے لگی... میں اس کے قریب ہی ایک اسٹول پر بیٹھ گیا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ سکوں... اگر وہ میرے لیے آملیٹ یا کافی میں زہر ملا دیتی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا۔

"کام کے ساتھ ساتھ تم باتیں کر سکتی ہو۔" میں نے کہا

"کیسی باتیں...؟"

"میں تم سے جو پوچھوں، اس کا جواب دیتی رہو۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "پوچھو۔" اور پیشانی پر سے بالوں کی ایک لٹ کو پھر پیچھے کیا جو ایک سیکنڈ بھی اپنی جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"غالباً یہ کہنا ضروری نہیں کہ تم جو کہو گی سچ کہو گی... مجھے بہت کچھ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے... تم نے تو مجھے بہت دیر سے دیکھا تھا... میں نے راستے میں ہی اس ٹرک کے کلینر کو مار دیا تھا جسے سائیں چلا رہا تھا۔ شاید تمھیں یاد ہو گا کہ ایک جگہ سڑک پر لکڑی کا لٹھا پڑا ہوا تھا۔ بوٹا اُسے ہٹانے کے لیے اترا تھا مگر وہ پھر ٹرک پر چڑھ نہیں سکا تھا۔ اس کی جگہ میں نے لے لی تھی... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک کس وقت وہاں سے گزرے گا اور یہ بات

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مجھے ایک اور ڈرائیور نے بتائی تھی جس کا نام ڈنگا تھا۔ میں تمھارے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا اور رات کو بھی فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے کیبن نمبر تین میں داخل ہو کے ایک بوڑھے کو ڈسٹرب کیا تھا... مرنے سے پہلے انھوں نے جاں بخشی کے وعدے پر بہت سی کارآمد باتیں بتا دی تھیں۔ اس کے بعد سائیں میری معلومات میں اضافہ کرتا مگر وہ مارا گیا... شرما، ورما بھی ضائع ہوئے لیکن مدن موہن میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسے بھی میں نے بچا لیا تھا، اور وہ مرتے مرتے بہت کچھ بتا گیا... کچھ لوگ ہوتے ہیں سخت جان اور زندگی کی پروا نہیں کرتے... مر جاتے ہیں مگر لب نہیں کھولتے۔ ابھی تک مجھے اتنا بہادر آدمی کوئی نہیں ملا... یہ سب تم کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹ بولو یا سچ کو چھپاؤ تو سوچ لینا...“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا...؟“ وہ تلخی سے بولی۔ ”وہ بھی کہاں بچے جنھوں نے سچ بولا تھا... ان سے بھی تم نے یہی کہا ہوگا...“

”ہاں..... کہا تھا... مگر جیسے ہی انھوں نے جھوٹ بولا مجھے پتا چل گیا اور پھر میں اُن سے کیے ہوئے وعدے کا پابند نہیں رہا۔“ میں نے کہا۔ ”ان کو مارنے سے پہلے یہ بات میں نے انھیں بتا دی تھی۔ سچ کا مطلب ہے سو فیصد سچ اگر ایک فیصد بھی کم ہو تو وہ سچ نہیں۔“

اس نے کافی کا ٹن ایک الماری میں سے نکالا۔

”تم ایک نرس تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”نرس کا پیشہ تو زخموں پر مرہم رکھنا اور بیمار جسموں کو شفایابی کی منزل تک لے جانے میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ تم کرنل کے ساتھ کیسے آگئیں؟“

”اس سوال سے تو تمھاری لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔“

”کرنل سے تمھارے ناجائز مراسم تھے؟“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”اس کا اعتراف میرے سامنے اس کی بیوی نے کیا تھا۔“

”تم اس کی بیوی سے مل چکے ہو؟“ نرملا چونکی۔

”اس کے علاوہ میں شرما اور ورما کی بیویوں سے بھی مل چکا ہوں... وہ دونوں بہنیں ہیں۔ صرف تین مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔

وہ متفکر نظر آنے لگی... شاید میں اسے امپریس کرنے کے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ جھوٹ نہیں چلے گا۔

”کرنل تم پر بہت اعتماد کرتا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”اس حد تک کہ تم ایک ٹاپ سیکرٹ مشن میں اس کے ساتھ رہیں... کیا تمھیں معلوم تھا کہ اس ٹرک میں کیا ہے جسے سائیں چلا رہا تھا؟“

”ہاں... اس میں اسلحہ تھا...“

”کہاں سے آیا تھا یہ اسلحہ؟“ میں نے کہا۔

”لاہور سے...“ وہ کام میں مصروف رہی۔

”لاہور میں کہاں سے؟“

”ٹرک عبداللہ اینڈ سنز کے آفس سے روانہ ہوا تھا... میں وہیں موجود تھی... پہلے سے...“ وہ بولی۔

”جس وقت ٹرک روانہ ہوا تھا... تو وہاں اور کون موجود تھا؟“

”ایک شخص چوہدری دلاور نام کا تھا۔“ وہ بولی۔ ”اُسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔“

”پھر اس کا نام کیسے جان لیا تم نے؟“

”دوسرے سب اسے چوہدری دلاور کے نام سے ہی مخاطب کر رہے تھے۔“

”دوسرے کون؟“

”خود حاجی عبداللہ... ڈرائیور سائیں...“

”تم نے ان کی گفتگو سنی تھی...؟“ میں نے کہا۔

”ہاں... کرنل ہمیشہ کہتا تھا کہ لڑکی اپنے کان اور اپنی آنکھیں سوتے میں بھی بند مت کرنا۔“ اس نے قدرے بوجھل لہجے میں کہا اور پھر ماتھے سے بال ہٹائے... یہ ادا اس کی عادت میں شامل تھی۔ ایک شادی شدہ اور رتبے دار آدمی جو کرنل کے عہدے پر فائز تھا، گھر بار اور فرائض کو بھول کے اس پر مرمٹا تھا تو قصور صرف اس کے دل کا تھا جس پر اسے اختیار نہ رہا۔ بلاشبہ نرملا ایسی عورت تھی اور اس کے حسن و شباب میں وہ ساحرانہ قوت تھی کہ کرنل سارا ڈسپلن اور سیلف ڈسپلن بھول گیا تھا... وہ بلاشبہ ان عورتوں میں سے تھی جو ڈکٹیٹروں پر حکومت کرتی ہیں اور حکومتوں کے تختے الٹتی ہیں... بات صرف موافق حالات ملنے کی ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو... زہر نہیں ملایا ہے میں نے اس میں...“ وہ ایک ہاتھ کمر پہ رکھ کے بولی۔

میں چونکا۔ ”تمھیں موقع نہیں ملا۔“ میں نے خفت سے کہا اور اس ٹرے کو اپنے قریب کر لیا جو نرملا نے میرے سامنے رکھ دی تھی... وہ اب پہلے سے زیادہ پُراعتماد انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس کی وجہ وہ غلط فہمی تھی جو اسے میرے وقتی انہماک سے ہوگئی تھی۔ اس نے کام کرتے ہوئے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اپنی تمام بے حسی سفاکی اور سنگدلی کے مظاہرے کے باوجود میں بہرحال ایک مرد ہوں جو اس کے حسن کی تابکاری اور شباب کی مقناطیسی کشش کے خلاف مزاحمت کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا... ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا چنانچہ اسے اپنی قوتِ تسخیر پہ ناز تھا تو بے جا نہ تھا۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں اس کی قمیص بائیں شانے پر سے پھٹ گئی تھی اور نیچے اس کی سفید جلد پر خراشوں کی سرخی بہت نمایاں نظر آتی تھی۔

اپنے موجودہ حالات میں میرا ذہن خیالوں کے انتشار کا شکار تھا اور میں بیک وقت بہت کچھ سوچ رہا تھا... یہ کہ نرملا نے اب تک سچ بولا ہے۔ اگر اس نے ’تعاون‘ جاری رکھا تو کیا میرے لیے اس کو ساتھ رکھنا ممکن ہوگا؟ مجھے تو آج ہی پھر اس سفر پہ روانہ ہونا پڑے گا جس کی منزل رابعہ تھی... میں نرملا کو کیسے ساتھ رکھ سکتا ہوں اور اسے ساتھ رکھنا ممکن نہ ہو تو میں دو مشکل راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کر سکتا ہوں... اسے آزاد کر دوں یا سب کے ساتھ ختم کر دوں؟ میں ہیڈ کی واپسی کے خیال سے بھی متفکر تھا اور حاجی کے جوابی ردِعمل کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔ اب تک کسی نے ڈنگے کو ضرور آزاد کر دیا ہوگا اور وہ میرے ظلم کی فریاد لے کر حاجی کے پاس پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ میں حاجی اور چوہدری دلاور کے تعلق پر بھی غور کر رہا تھا اور اپنی روانگی سے قبل آخری تا... کی کا منصوبہ بھی بنا رہا تھا... مگر یہ سب کام میرا ذہن کر رہا تھا۔ میری آنکھیں وہی دیکھ رہی تھیں جو میرے سامنے تھا اور اس کچن میں خوبصورتی لو دلکشی کا سامان صرف نرملا فراہم کر رہی تھی... کسی بھی حسن شناس نظر رکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ خوب صورتی سے نظر چرالے... اسے دلچسپی بہرحال نہیں سمجھا جا سکتا تھا مگر نرملا نے میری نظر کے مفہوم کو غلط سمجھا۔

اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی میں محتاط ہو گیا۔ میں نے اس کے ناز و انداز، خود نمائی کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کر لیا۔

میں نے کہا۔ ”کیا تم نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے؟“

وہ مسکرائی۔ ”کون سا سوال؟“

”میں نے پوچھا تھا کہ وہاں دوسرے کون تھے؟“

”دوسرے... یہی ٹرک ڈرائیور اور وہ لڑکا... جسے سب حرام دا پوترا کہنے کے عادی ہیں۔“ وہ بولی۔

”گفتگو میں اور کسی کا ذکر آیا تھا... کوئی ایسا نام سُنا تھا تم نے جو پہلے بھی سُنا ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں... وہ اسکواڈرن لیڈر مشاہد میاں کا ذکر کر رہے تھے۔ شرما اور ورما کا ذکر بھی آیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”انھوں نے کرنل پریتم کی بات بھی کی تھی۔“

”یہ کرنل پریتم کون ہے؟“

اس نے دُکھ اور ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”میرا پریتم جسے تم نے مار دیا... کیا تم جانتے نہیں...؟“

میں ہنسا۔ ”میں تمھاری زبان سے اس کا نام سُننا چاہتا تھا... یہ مشاہد میاں کون ہیں؟“ میں نے آخری سلائس کے ساتھ آملیٹ ختم کرتے ہوئے کہا۔

”وہ جا چکا ہے... ایک ہفتہ قبل وہ اپنے گروپ کے ساتھ نکل گیا تھا... اسی روز ہم پہنچے تھے۔“

”ہر گروپ کو یہاں صرف ایک ہفتے کی تربیت دی جاتی ہے؟“

”ایک مہینے کی... “ وہ بولی۔

”تم سے پہلے ... سب جا چکے ہیں؟“

”یہ سب مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے... شاید پریتم بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ سلسلہ کب سے جاری تھا اور کہاں کہاں سے کتنے لوگ اس مشن کے لیے منتخب ہوئے تھے۔“ نرملا نے کہا۔ ”اُسے تو اچانک حکم ملا کہ ہائی کمان کو رپورٹ کرو... ایک ٹاپ سیکرٹ مشن کے لیے... جیسے اسے یہاں پہنچنے کو کہا گیا تھا کیپٹن شرما اور لیفٹیننٹ ورما کا انتخاب خود کرنل کی سفارش پہ ہوا تھا۔“

”اور تمھارا؟“

”ہر گروپ کے کمانڈر کو اس کی مرضی کے مطابق ایسے افراد کے انتخاب کا موقع دیا جاتا تھا جو مشن کی تکمیل میں اس کے لیے قابلِ اعتماد معاون ہوں... ان میں ایک عورت کا ہونا شرط تھا۔ کرنل نے میرا نام دیا تھا تو کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔“ وہ بولی۔

”عورتوں کو عموماً رازداری کے معاملات سے دُور رکھا جاتا ہے۔“

”یہاں تربیت پانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ ان کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ عورتوں کے سارے معاملات مردوں پر نہیں چھوڑے جا سکتے۔ بعض اوقات عورت ہی ان کے مسائل کو ہینڈل کر سکتی ہے... اور یہاں ہر گروپ میں عورتوں کی تعداد مساوی رکھی جاتی تھی... ایک مرد اور ایک عورت کی ایک ٹیم... یہاں سے وہ گروپ کی صورت میں جاتے تھے۔ آگے ہر ٹیم الگ ہو جاتی تھی مگر ان کے درمیان رابطہ رہتا تھا۔“

”اور یہ مرد عورتیں... کس منڈی سے آتے تھے؟“ میں نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم... ظاہر ہے انتخاب کرنے والے دوسرے لوگ تھے... وہ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ہی انھیں یہاں بھیجتے تھے...“ وہ بولی۔ ”تاہم ان کو اتنی رعایت ملتی تھی کہ اپنے اپنے پارٹنر کا خود انتخاب ... ...“

آئی سی...“ میں نے کہا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب کرائے کی عورتیں ہیں۔“

”صرف مرد کرائے کے ہیں۔“ وہ طنز کرتے ہوئے بولی۔ ”ان کے ساتھ عموماً وہی آجاتی ہیں، جو ان سے پیار کرتی ہیں... اور ان کی خاطر جان دینا قبول کر لیتی ہیں مگر جدائی قبول نہیں کرتیں...“

”تم مردوں کو بدنام کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”کیا مدن موہن نے اپنے اور موہنی کے بارے میں نہیں بتایا؟

بتایا تھا...“ میں نے کہا۔ ”ان کی بھی ایسی ہی اسٹوری تھی۔“

صرف ایک مرد ہے ان میں... جو اپنی مرضی سے آیا ہے ایک لڑکی کا ساتھ دینے کے لیے“ نرملا نے کہا۔ ”انتخاب لڑکی کا ہوا تھا... مجھے خود کرنل نے بتایا تھا کہ جب بھی کوئی لڑکی منتخب ہوئی تو اس کا ساتھ دینے والا نہ ملا... کسی اجنبی کے ساتھ آنے پر وہ تیار نہ ہوئی اور اسے ڈراپ کر دینا پڑا لیکن جب بھی مرد منتخب ہوئے... ان میں سے بہت کم ڈراپ ہوئے۔“

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"مجھے یہ مرد نہیں... لڑکے لگتے ہیں۔"

"یہ لڑکے ہی ہیں... انھیں کالجوں سے نکل کے بے روزگاری کا سامنا تھا اور یہ لوگ مایوسی کا شکار تھے۔" نرملا نے کہا۔ "ایسے ہی لوگ زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ اور یہ لڑکیاں جو ان سے محبت کرتی تھیں اسی لیے ساتھ نکل آئیں کہ تقدیر کی مہربانی رہی تو واپسی پر ایک لاکھ نقد ملیں گے... ایک پلاٹ اور مکان بنانے کے لیے قرض ملے گا... باقی زندگی سکھ چین سے گزر جائے گی... اور تقدیر کو اس جنم میں ملن منظور نہ ہوا تو پھر ایک ساتھ مر جائیں گے۔"

"ان سب کو الگ الگ مشرقی پاکستان بھیجا جائے گا؟"

"الگ الگ نہیں... یہ ایک ہی بحری جہاز میں کلکتہ جائیں گے... وہاں سے ان کو مکتی باہنی والے لے جائیں گے۔ یہ سرحد عبور کرنے کے بعد مقامی آبادی میں اپنے ٹھکانے بنا لیں گے... چونکہ سب اُردو بولنے والے نہیں ہیں اور مغربی پاکستان کی شہریت کا ثبوت رکھتے ہیں اس لیے ڈبل ایجنٹ بننے کے اہل ہیں۔ یہ ایک طرف وفادار پاکستانی کے دوست ہوں گے اور ان کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کر سکیں گے تو دوسری طرف بنگالی بول کے ان میں گھل مل جائیں گے جو شیخ مجیب کے حامی ہیں اور اپنا الگ بنگلہ دیش بنانا چاہتے ہیں... یہ ایسے عناصر کی نشاندہی کریں گے اور انھیں اسلحہ پہنچاتے رہیں گے... پھر ان کے ذریعے اسلحہ آگے جائے گا... خاموشی اور رازداری سے یہ سب اسلحہ انہی ہاتھوں میں پہنچے گا جو ہم خیال ہیں یعنی مجیب کے چھ نکات کی بنیاد پر مغربی صوبے کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ انہی کی مخبری پر مکتی باہنی والے خاموشی سے مخالف عناصر کا خاتمہ بھی کرتے رہیں گے۔"

"اور ان کو کتنا عرصہ وہاں گزارنا ہوگا؟"

"ایک مہینہ..." وہ بولی۔ "ان سے تین مہینے کا معاہدہ ہوتا ہے۔ ایک ماہ کی تربیت... ایک ماہ کی ایکٹیو سروس... اور ایک مہینہ ٹرانزٹ کے لیے... یعنی آنے جانے کے لیے۔"

"کبھی یہ معلوم ہوا کہ ایک جوڑا ایک مہینے میں کتنے انسانوں کے قتل کا سبب بنتا ہے؟" میں نے مشتعل ہو کے کہا۔ "کتنے گھر اجاڑتا ہے، کتنی عورتوں کو بیوہ کرتا ہے اور کتنے بچوں کو یتیم؟"

"تم جذباتی ہو کے سوچ رہے ہو... جنگ تو جنگ ہے۔"

"ہاں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کا احساس ان لوگوں کو اپنی ایکٹیو سروس کا ایک مہینہ پورا کرنے کے بعد ہو جاتا ہوگا... کیا آج تک کسی کو ایک لاکھ دیے گئے ہیں؟ کوئی ہے ایسا جو کہہ سکے کہ ... سے پلاٹ ملا تھا اور قرضہ بھی... اور اس نے اپنا گھر ... جہاں وہ شاد و آباد ہے... اسی عورت کے سا... کرتا تھا... ایک لاکھ کی رقم کاروبار میں ... ہے..."

نرملا خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ "میں جانتا ہوں اس نفرت کی سیاست کے سارے داؤ پیچ... مگر یہ بے وقوف لڑکے اور لڑکیاں۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "یہ نہیں سمجھتے کہ ان کو سبز باغ دکھا کے اور جھوٹے وعدوں سے بہلا کے موت کی قربان گاہ میں بھیجنے والے بنیے ہیں انھیں ایک گولی دو روپے کی پڑتی ہے یا تین کی... جو کام دو تین روپے میں نکلتا ہو اس پر ایک لاکھ خرچ کرنے والا کوئی احمق ہو سکتا ہے... ایک جوڑے کا کام ختم ہوا... اس کا کام تمام کر... پانچ چھ روپے میں دو گولیاں مارو اور لاش سمندر میں ڈال دو... ننانوے ہزار نو سو چورانوے بچ گئے... ان کی جگہ دوسرے آ جائیں گے... انھیں بتاؤ کہ پہلے والوں کو سرکار نے کتنا دیا اور وہ کہاں کہاں آباد ہیں... وہ یقین کرتے رہیں گے۔"

ناشتا ختم کرنے کے بعد میں وہی سگریٹ پی رہا تھا جو کرنل کی جیب سے برآمد ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے دو سگریٹ پی کے میں بالکل تازہ دم ہو گیا تھا۔ میری جسمانی توانائی کو بہترین ناشتے اور کافی نے پوری طرح بحال کر دیا تھا... آدھے گھنٹے تک میں کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھا رہا تھا۔ مشین گن میرے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ اگر پیڈرو آ جاتا تو اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی میں تیار ہو کے پڑھا دیتا... میں پیڈرو کے ساتھ حاجی عبداللہ کے استقبال کے لیے بھی پوری طرح تیار تھا۔ نرملا میرے سامنے تھی اور اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا... اگر وہ کسی الماری میں سے اچانک ریوالور یا دستی بم نکال لیتی تب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور جب تک وہ ناشتا بنانے میں مصروف رہی تھی، میں نے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اور نرملا نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ دکھلاتے ہوئے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اس کا شکاری حسن و شباب مجھے شکار کر سکتا ہے یا نہیں... اور وہ خاصی پُر امید پیش قدمی کر رہی تھی۔

میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا تو اُسے مایوسی ہوئی۔ "باتوں میں بہت وقت ضائع ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "دراصل مجھے انتظار تھا پیڈرو کی واپسی کا... ورنہ میں نکل جاتا۔"

"یہ پیڈرو کون ہے؟"

"جو شخص گاڑی لے کر نکلا تھا۔ جس نے ڈرائیور سائیں کو قتل کیا تھا... وہ کون ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم اس کے ساتھ تھیں۔"

"وہ... وہ تو پاکستان آرمی کا میجر شاہ ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ کمینہ..." میں نے کہا۔ "نام بدنام کرتا ہے پاکستان آرمی کا... وہ ایک تھرڈ ریٹ بدمعاش ہے... ایک ضمیر فروش، غدار اسمگلر کا دست راست... اور... اور میرے باپ کا قاتل..."

"اسی لیے تم...؟"

"نہیں..." میں نے لات مار کے اسٹول گرا دیا۔ "یہ ذاتی عداوت کی بات نہیں ہے... میں اپنے باپ کے قاتل کو معاف بھی کر سکتا ہوں... مگر اسے نہیں جو غدار ہے... ملک کا دشمن ہے... انسانیت اور شرافت کا دشمن ہے۔"

"تم پھر جذباتی ہو رہے ہو۔"

"ہاں..." میں نے چلا کے کہا۔ "میں جذباتی آدمی ہوں... میں سینے میں دل رکھتا ہوں... احساس رکھتا ہوں... محبت اور نفرت کر سکتا ہوں... نیکی بدی میں تمیز کر سکتا ہوں۔ خوب صورتی کو بدصورتی سے الگ کر کے دیکھ سکتا ہوں... نہ میں خدا ہوں نہ شیطان... میں انسان ہوں اس لیے میرے جذباتی ہونے پر حیرانی کیسی...؟ اب چلو میرے ساتھ... اب تک تم نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے... اگر تمھارا یہی رویہ رہا تو..."

"تو کیا...؟" وہ نظر اُٹھا کے بولی۔

"تو کچھ نہیں..." میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس بیرک سے مجھے بہت کچھ ملا... ایک بہت بڑا سوٹ کیس پاکستانی کرنسی سے بھرا ہوا تھا... ظاہر ہے یہ سب تخریب کاروں میں تقسیم کے لیے تھی... اُسے میں نے باہر رکھ دیا... ایک الماری میں جعلی دستاویزات تھیں جن سے ہندو کو مسلمان اور بھارتی کو پاکستانی ثابت کیا جا سکتا تھا... ان کو میں نے ایک بریف کیس میں ڈال لیا... یہ بریف کیس مجھے کرنل کے کمرے سے ملا تھا اور اس میں کرنل کے ذاتی کاغذات تھے۔ لیکن ان کاغذات سے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ کرنل کی وردی ایک ہینگر پر استری کی ہوئی لٹک رہی تھی... اسے بھی میں نے بریف کیس میں ڈال لیا۔ بہت جلد مجھے بریف کیس کا اسباب ایک سوٹ کیس میں منتقل کرنا پڑا۔ کیپٹن شرما اور لیفٹیننٹ ورما کے ذاتی کپڑے بھی میرے کام آ سکتے تھے۔ ایک اور الماری سے زیادہ کارآمد اشیا کا ذخیرہ ملا... ایک ڈبے میں مختلف رنگ کے فونٹین پین تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پین پستول تھے۔ ان کے کلپ ٹریگر کا کام دیتے تھے اور ان کے نوکیلے حصے زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو گولی کی طرح جسم میں پیوست ہو سکتے تھے۔ دوسرے ڈبے میں ایسی ہی مختلف رنگ کی سوئیاں تھیں... جو دیکھنے میں بال پوائنٹ پین کے ری فل لگتی تھیں... تیسرے ڈبے میں بہت چھوٹے جیبی چاقو تھے... اتنے چھوٹے کہ نیفے میں چھپائے جا سکتے تھے۔ میں نے انھیں کھول کر نہیں دیکھا مگر میرا خیال تھا کہ ان کے بلیڈ بھی مہلک قسم کے زہر میں بجھے ہوئے ہوں گے... بھیڑ بھاڑ میں یا نظر بچا کے وہ خنجر کسی کی جلد پر پھیر دیا جاتا تو اسے صرف ایک خراش کا احساس ہوتا مگر یہی خراش بعد میں اس کی جان لیتی... مجھے دو اسٹیتھسکوپ بھی ملے... مگر وہ عام ڈاکٹروں کے استعمال میں آنے والے اسٹیتھسکوپ نہیں تھے۔ ان کا نچلا حصہ ایک مائیکرو ٹرانسمیٹر قسم کی چیز تھا... اوپر کے دونوں بازوؤں میں سے ایک انٹینا تھا اور دوسرے میں ریسیور تھا... ان کو ٹیسٹ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا، مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ان دونوں کی فریکوئنسی ایک ہو گی اور انھیں گلے میں پہن کے دو افراد ایک محدود فاصلے میں بات کر سکتے ہوں گے۔

نرملا نے میرے کسی کام میں مداخلت نہیں کی اور مجھ سے کوئی سوال بھی نہیں کیا... وہ عدم دلچسپی کا انداز اپنائے مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ میں اس کے "تعاون" کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا اور جتنا میں نے پوچھا تھا اس سے زیادہ ہی بتا دیا تھا... وہ نہ نروس تھی، نہ ... نہ اس کے تیور جارحانہ تھے اور نہ عزائم... میں اس اعتماد اور اطمینان کے مظاہرے کو غیر فطری سمجھتے ہوئے بہت محتاط رہنے پر مجبور تھا۔ وہ اب متفکر اور پریشان تک نہیں تھی... جیسے میں نے اُسے تحفظ کی ضمانت دے دی ہو یا اسے بحفاظت گھر پہنچانے کا وعدہ کر لیا ہو... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان حالات میں کوئی بھی مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والی عورت نارمل نہیں رہ سکتی تھی مگر وہ نارمل تھی... حالانکہ وہ اپنی اس طاقت کو بھی آزما چکی تھی جو پتھر دل مردوں کو پگھلا کے موم کر دیتی اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کے ناز و ادا اور جلوۂ بے حجابی کا شکار نہیں ہوا۔

وہ میرے ساتھ رہی اور میں نے بھی اسے ایک لمحے کے لیے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کا سکون مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگا... آخر یہ عورت کیا چاہتی ہے... کیا سوچ رہی ہے اور کیا کر رہی ہے...! کیا یہ سمجھتی نہیں کہ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں اور میں اسے بھی مار سکتا ہوں... وہ رضاکارانہ طور پر میرا ساتھ کیوں دے رہی ہے... اسے ڈرنا چاہیے مجھ سے... پوچھنا چاہیے مجھ سے کہ میں نے کیا سوچا ہے... دوسروں کے بارے میں اور خود اس کے بارے میں...

بالآخر میں نے کہا۔ "تمھارے پاس اور کپڑے بھی تو ہوں گے۔"

"ہاں..." وہ بولی۔ "کیا میں بدل آؤں؟"

"تم کو بدل لینے چاہئیں... کیوں پھر رہی ہو تم ان پھٹے ہوئے کپڑوں میں؟" میں نے مڑ کر کہا۔ "کہاں ہیں تمھارے کپڑے؟"

"وہیں... کرنل کے کمرے میں..." وہ بولی۔ "جہاں سے تم نے اس کی وردی اٹھائی تھی... کیا تم نے زنانہ کپڑے نہیں دیکھے تھے؟"

"دیکھے تھے... خیر... چلو..." میں نے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ رہوں گا... میں تم کو اکیلا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولی۔

اس نے میری موجودگی میں ہی کپڑے تبدیل کر لیے... کسی قسم کے تذبذب یا شرم و حیا کے مظاہرے کے بغیر... اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا کہ میں کدھر دیکھ رہا ہوں... میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا... اس طرح کہ وہ تھوڑا سا دائیں جانب تھی۔

"یہاں کوئی گاڑی تو ہوگی...؟" میں نے کہا۔

"ایک گاڑی تو وہ لے گیا ہے... میجر شاہ..."

"میں بتا چکا ہوں کہ وہ سؤر کا بچہ میجر نہیں ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"مجھے... بس عادت سی ہے... آئندہ نہیں کہوں گی۔" وہ بالوں کو برش کرتے ہوئے بولی۔ "دوسری گاڑی گیراج میں ہے... مگر مجھے نہ گیراج کی چابیوں کا علم ہے اور نہ میرے پاس اس گاڑی کی چابیاں ہیں۔"

"یہ سب تم میت کے لیے چھوڑ دو..." میں نے کہا۔ "اور مجھے گیراج تک لے چلو۔"

"گیراج اسی تہ خانے میں ہے۔" وہ بولی۔

"لیکن مجھے تو وہاں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔" میں نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم آخر تک نہیں گئے تھے... گاڑی ہے... جیپ اسٹیشن ویگن فور وہیل ڈرائیو..." وہ بولی۔

"مجھے چکر دے رہی ہو؟" میں نے اس کا بازو پکڑ کے اُسے ایک جھٹکا دیا اور اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ "کس طرف سے آتی جاتی ہے وہ گاڑی... اس زینے کے راستے...؟"

"تم خود دیکھ لو گے..." وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں تم کو لے چلتی ہوں... چلو..."

"تمھیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"آتی ہے۔" وہ بولی۔

میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ "تم انکار بھی کر سکتی تھیں۔"

"اس سے کیا ملتا مجھے؟"

"ایک چانس... پھر ڈرائیونگ میں کرتا... اور تمھارے ہاتھ آزاد ہوتے۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔ "میں زندہ رہنے کے لیے پوری کوشش کروں گی... تم کو بالکل موقع نہیں دوں گی کہ تم میری کسی بات کو بہانہ بنا کر مجھے مار ڈالو۔ تمھارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے... تم نے اتنے بہت سے لوگوں کو مارا ہے... پہلے بھی مارتے رہے ہو گے... پھر میں کیا ہوں... اس کے باوجود تم مجھے مارنا چاہو تو بہانہ مت کرنا... صاف کہنا کہ نرملا... میں تم کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تم دشمن ہو... خواہ مجھ پر کوئی [illegible] کرتا... تمھیں ہر طرح سے یہ حق حاصل ہے کہ مجھے قتل کر دو..."

"تمھاری حقیقت پسندی قابل تعریف ہے۔" میں نے [illegible] لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا... نہ میں اس سے کوئی وعدہ کر سکتا تھا اور نہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ کہہ سکتا تھا جن کی آڑ لے کر وہ مجھ سے غلط توقعات وابستہ کر لے... نیچے جانے والے راستے پر وہ آگے رہی اور میں اس کے پیچھے رہا... نہ جانے کیوں میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی بے کلی محسوس کی... رابعہ کا خیال میرے احساس پر یوں سایہ فگن ہونے لگا جیسے سورج گرہن میں چاند کا سایہ زمین کو ڈھک لیتا ہے... رابعہ کا خیال میرے شعور پر [illegible] اچانک اس نے شعور پر قبضہ کر لیا۔ دوبارہ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے نرملا نہیں رابعہ چل رہی ہے۔ یہ بڑا عجیب خیال تھا... لیکن بہت جلد میں نے اس کا سبب تلاش کر لیا... نرملا نے جو لباس بدلا تھا وہ رنگ اور ڈیزائن میں ویسا ہی تھا جیسا رابعہ نے پہن رکھا تھا... جب اُسے میں نے آخری بار دیکھا تھا... پھر یہ کہ نرملا کے بالوں کا انداز بھی رابعہ کے جیسا ہی تھا... اس کی صورت کے نقوش میں رابعہ کی جھلک تک نہیں ملتی تھی لیکن اس کی چال وہی تھی چنانچہ پیچھے سے دیکھنے پر وہ مجھے رابعہ نظر آئی تو یہ خیال و نظر کا سراب تھا۔

باتھ روم کو دیکھتے ہی میں نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا۔ "اوہ مائی گاڈ... انھیں تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"پریشانی کی اس میں کون سی بات ہے۔" نرملا نے کہا لیکن اس کے لہجے میں طنز کی کوئی بات نہ تھی۔

"دم گھٹ کے مر گئے ہوں سب..." میں نے کہا۔

"مرنے والوں کو کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیسے مرے تھے۔" وہ بولی۔

میں نے اسے پلٹ کے دیکھا۔ "تمھارا رویہ مجھے بہت مصنوعی لگتا ہے... تمھارے جذبات کی سمت کوئی نہیں... نہ تم میرے ساتھ ہو... نہ اُن کے ساتھ ہو..."

"میں صرف اپنے ساتھ ہوں..." وہ بولی۔ "کل بھی میں نے جو کچھ کیا تھا صرف اپنے لیے کیا تھا... آج بھی یہی کر رہی ہوں... بندوق کی گولی کو اس سے کیا کہ وہ کس ٹریگر سے فائر ہوتی ہے... کس کے ہاتھوں فائر ہوتی ہے... کدھر جاتی ہے اور کسے نشانہ بناتی ہے... آدمی کے دل کو... شیر کے سر کو... درخت کو یا پتھر کو..."

یہ لڑکی مجھے [illegible] لگنے لگی تھی... مگر وہ حد درجہ ناقابل اعتماد بھی تھی کیونکہ وہ اصولی، جذباتی بنیادوں پر... اخلاقی یا معاشرتی، مذہبی یا سیاسی وفاداریوں کی سرے سے قائل ہی نہ تھی۔ جب تک اس نے کرنل کو اپنی زندگی میں ایک سائبان سمجھ رکھا تھا۔ ایسے ہی

آج وہ میرے تحفظ کی ضمانت میں پناہ لے چکی تھی اور کل کسی بھی مجھ سے زبردست دشمن کی چھت کے سائے میں ٹھہر سکتی تھی۔ اس نے تسلیم ہی کر لیا تھا کہ وہ کسی کی نہیں صرف اپنی ہے... وہ کسی کے لیے بھی مر نہیں سکتی تھی۔

باتھ روم کا دروازہ کھولنا ایک دشوار کام ثابت ہوا... وہ سب جو اندر تھے ان کی خاموشی ہی بتاتی تھی کہ اب کوئی بھی ہوش میں نہیں... وہ بے ہوش ہوئے جہاں کھڑے تھے وہیں ڈھیر ہو گئے تھے اور ان کے اوپر تلے پڑے ہوئے جسموں نے دروازے کو [illegible] نے واجبی سی کوشش کے بعد دروازے کو دھکیل کے [illegible] کر دیا... موت ان لوگوں کا مقدر ہو چکی تھی۔ انھیں ہوش میں لانے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں اُن سے ذاتی اور ذہنی نوعیت کی معلومات حاصل کر سکتا تھا کہ وہ کون ہیں... کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں... وغیرہ وغیرہ... یہ سب مجھے نرملا سے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا... نرملا کی طرف میں نے دیکھا ہی نہیں کہ وہ طنز سے مسکرا رہی ہے یا اپنے انداز بے اعتنائی میں مگن ہے۔ آخری حصے کی دیوار کے بالکل پیچھے جیپ کی بالکل نئی اسٹیشن ویگن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی رجسٹریشن لائل پور کی تھی اور کاغذات دیکھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ اُسے ملک فتح محمد نام کے کسی زمیندار سے خریدا گیا تھا۔ فتح محمد کا پورا نام پتا رسید پر موجود تھا مگر ٹرانسفر لیٹر کسی کے نام پر نہیں تھا۔ اوپن لیٹر پر ٹرانسفر بہت عام بات ہے۔ گاڑی دس بار بک جاتی ہے مگر فرسٹ اونر رہتی ہے۔ خریدار اپنے نام ٹرانسفر نہ کرائے تو اس پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔ وہ دستخط شدہ مگر بغیر نام اور تاریخ والا ٹرانسفر لیٹر دکھا کے کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو کل ہی گاڑی خریدی ہے اور مقررہ مدت میں ٹرانسفر بھی کرا لے گا... یہ اوپن لیٹر میرے کام بھی آ سکتا تھا۔

گاڑی کو چیک کرنے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کو بہت کم چلایا گیا ہے... شاید وہ زمیندار کوئی سابق رکن اسمبلی وغیرہ تھا جس نے یہ گاڑی باہر سے ڈیوٹی وغیرہ ادا کیے بغیر منگوا لی تھی اور اس کا مقصد ہی اسے منافع پر بیچنا ہو گا۔ اتفاق سے اسے گاہک بھی وہ ملے جو منہ مانگی قیمت ادا کر سکتے تھے۔ گاڑی کا مائلومیٹر دس ہزار چار سو میل دکھا رہا تھا... فیول میٹر سے پٹرول ٹینک کے بھرے ہوئے ہونے کا پتا چل سکتا تھا مگر اس کے لیے اگنیشن کو آن کرنا ضروری تھا۔ چابی [illegible] میں مجھے گاڑی کو ڈائریکٹ کنکشن سے اسٹارٹ کرنا تھا چنانچہ میں نے یونٹ کھولا اور سیلف کے تاروں کو اگنیشن سوئچ سے الگ کر دیا۔

تیسری کوشش میں انجن رواں ہو گیا۔ میں نے ہاتھ سے ایکسیلیریٹر کے اسپرنگ کو کھینچ کر اسے ریس دی اور پھر تار الگ کر دیے۔ انجن سلو موشن میں چلتا رہا۔

دیوار کے عقب میں وہ دروازہ تھا جو میں نے نہیں دیکھا تھا... اس کے سامنے بارہ فٹ اونچی دیوار تھی جس نے آٹھ فٹ اونچے شٹر ٹائپ گیٹ کو چھپا لیا تھا۔ دیوار سے گیٹ تک کا فاصلہ مشکل سے بیس فٹ تھا اور اتنی کم جگہ میں اسٹیشن ویگن کو صرف ریورس گیئر میں ڈال کر نکالا جا سکتا تھا۔ شین گن اب میرے کندھے پر لٹک رہی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ اسی سے میں نے شٹر کے دونوں تالے توڑے جو سیمنٹ کے فرش پر ہک سے ملا دیے گئے تھے... [illegible] طرح گونجے کہ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

دروازے کو تھوڑا سا اٹھا کے میں نے باہر جھانکا تو مجھے ایک اوپر چڑھتا ہوا راستہ دکھائی دیا جو بائیں طرف گھوم گیا تھا۔

"میں دروازے کو اٹھاتا ہوں..." میں نے نرملا کی طرف دیکھ کے کہا۔ "تم جیپ کو نکالو۔"

"اسے آخر تک ریورس میں لے جانا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"تم نے کہا تھا کہ تمھیں ڈرائیونگ آتی ہے۔"

"یہ بھاری گاڑی ہے... اور ریورس میں..." اس نے تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ کہا اور پھر میرا موڈ دیکھ کر آگے بڑھی۔ گاڑی کے دروازے کسی نے مقفل نہیں کیے تھے کیونکہ سالم گاڑی ہی مقفل دروازے کے پیچھے تھی۔ جب نرملا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں نے پھر انجن اسٹارٹ کرنے کے لیے تار ملائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے پیچھے گئی۔

"اسے نیوٹرل میں رکھو بے وقوف..." میں [illegible]

نرملا نے شرمندگی سے سر ہلایا۔ "میں نے دیکھا نہیں تھا"

لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جیسے ہی میں نے تار ملائے، انجن غرایا اور گاڑی ایک دم آگے بڑھی... اگر میں سائڈ میں نہ ہوتا تو یقیناً ٹکر سے نیچے گرتا اور کچلا جاتا... اب میں بائیں جانب گرا اور میں نے گاڑی کو دیوار کی طرف بڑھتے دیکھا... وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نرملا نے گاڑی کو بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا... مضبوط اور طاقتور اسٹیشن ویگن کی باڈی اوپر گرنے والے ملبے سے تباہ ہو سکتی تھی جبکہ اندر بیٹھی ہوئی نرملا ملبے میں نہیں دب سکتی تھی۔ صرف میں دیوار کے نیچے دفن ہو سکتا تھا۔ میں دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر ہی تو تھا۔ پُرسکون اور پُراعتماد رہنے والی نرملا نے اس پہلے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا جو اُسے میری غلطی نے فراہم کیا تھا۔

میں نے پلٹ کر کھڑے ہوتے ہی ریوالور نکال لیا اور فائر کرتے کرتے رہ گیا... عین وقت پر مجھے احساس ہو گیا کہ گاڑی تو رُکی ہوئی ہے... دیوار سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر... مگر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اتنی دیر میں تو میرے کان دھماکا سُن لیتے اور دیوار کی جگہ ملبے کا ڈھیر نظر آتا... بچھ میں نے نرملا کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ "الو کی پٹھی" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں... میں یہ نہیں کر سکتی۔" اُس نے بے بسی سے کہا۔

میرا ہاتھ اُٹھا ہوا رہ گیا۔ "تم نے جلتے بوجھتے ایسا کیا تھا۔"

"کیا؟" وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ "غلطی سے فرسٹ گیئر پڑ گیا تھا..."

"تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔

"سامنے تو دیوار تھی۔" وہ بولی۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ میں خودکشی کرنا چاہتی تھی... لیکن کامیاب نہیں ہوئی... وقت پر بریک لگ گئے۔"

ایک بار پھر میں نے خود کو اس پر یقین کرنے کے لیے مجبور پایا اور وہ اسی بے نیازی کے ساتھ دوپٹے کے آنچل سے پسینہ صاف کرنے لگی۔ میں کچھ دیر اُسے گھورتا رہا اور پھر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اُسے میں نے کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا... وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے گاڑی کو واپس دروازے تک پہنچایا اور آہستہ آہستہ باہر نکال لیا۔ اب میں ایک سات آٹھ فٹ چوڑے راستے پر تھا جو سیمنٹ سے بنایا گیا تھا۔ اُس کے دونوں جانب اونچی دیواریں تھیں جن کی بلندی پیچھے کی طرف بتدریج کم ہوتی تھی۔

نرملا بھیگی بلی بنی کچھ سہمی ہوئی بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"کیا میں تمہیں گرا دوں؟" اس نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے غرا کے کہا۔ "تم وہی کرو گی جو میں کہوں گا... مجھے معلوم ہے کہ تم موقع کی تلاش میں ہو۔"

"اور تم شاید بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "حالانکہ میں چاہتی تو بہت پہلے تمھیں شوٹ کر سکتی تھی۔"

"نگاہِ ناز سے؟" میں نے طنز سے کہا اور گاڑی کو پیچھے کرتا رہا۔

"نہیں... اس ریوالور سے..." اس نے اچانک اپنے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

میں بھونچکا رہ گیا... ایک دم بریک لگا کے میں نے پارکنگ بریک کھینچے اور ریوالور اُٹھا لیا... یہ اعشاریہ تین آٹھ کولٹ آٹومیٹک تھا اور پوری طرح لوڈڈ تھا۔ "یہ... یہ کہاں سے آ گیا...؟"

وہ مسکرائی۔ "بہت ہوشیار تھے تم تو... پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتے بھی رہے تھے... تمھیں نہیں پتا چلا؟"

میں نے خود کو ایک حد سے زیادہ چالاک بننے والے احمق کی طرح خفت میں مبتلا پایا۔ "مجھے واقعی پتا نہیں چلا۔"

"جب میں کپڑے بدل رہی تھی تو تم کدھر دیکھ رہے تھے؟"

"تمھیں نہیں دیکھ رہا تھا... کوشش کر رہا تھا کہ نہ دیکھوں۔" میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں کی لویں سرخ ہو کے دہکنے لگی ہیں۔

وہ ہنسی... آہستہ سے اور پُرتمسخر انداز میں بولی۔ "دیکھتے رہتے، جب حیا مجھے نہ آئی تو تم کیوں شرما گئے تھے؟" اس نے مجھ ... دیا... اور پھر ہنسی۔

میں نے اُس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ مارا۔ "ایسے کھیل مت ... ساتھ... مجھے یہ احساس مت دلاؤ کہ تم میرے لیے خطرہ ہو۔ میں تمھارے جوان جسم کی خوب صورتی سے نہیں ڈرتا... مگر یہ شیطانی ذہانت تمھاری جان لے سکتی ہے۔" میں نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

وہ طمانچہ کھا کے بھی مسکراتی رہی۔ "کیا میں دوسرا گال آگے کر دوں؟" وہ تلخی سے بولی۔ "مجھے یہ تھپڑ اپنے منہ پر محسوس نہیں ہوا... تمھیں لگا؟"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی کو تیزی سے چلاتا ہوا وہاں لے آیا جہاں راستہ سطحِ زمین کے برابر ہو گیا تھا۔ گیٹ اب میرے سیدھے ہاتھ پر تھا جس سے ٹرک گزر کے اندر آیا تھا۔ مجھے مدن موہن کے ہاتھوں قتل ہونے والے چوکیدار کی لاش کہیں نظر نہ آئی۔ گیٹ کے دونوں پٹ بند تھے مگر مقفل نہیں تھے۔ میں جیپ کو آگے بڑھا کے اسی راستے پر لے گیا جس پر سے ٹرک گزرا تھا۔ بیرک کی لمبائی عبور کرنے کے بعد میں نے بائیں جانب موڑ کاٹتے ہی ٹرک کو دیکھا تو سارا نقشہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے گاڑی ... نرملا کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ٹرک کی طرف چلنے لگا۔ اس نے کرنل کی لاش کو دیکھا لیکن کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

میری توقع کے مطابق چابیاں مجھے ٹرک میں ہی لگی ہوئی ملیں۔ ٹرک ڈرائیور اس حفاظتی حصار میں داخل ہو جانے کے بعد خود کو نفسیاتی طور پر محفوظ سمجھا ہوگا... یہ اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کے ٹرک لے جا سکتا ہے... چنانچہ وہ چابیوں کو ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا... نرملا خود ہی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔" میں نے چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کروں گی میں کچھ پوچھ کے..." وہ بولی... "ویسے مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کرو گے۔"

"کیا معلوم ہے؟" میں نے ٹرک کو پہلے گیئر میں آگے بڑھایا۔

"تم ٹرک کے ساتھ ہی اس جگہ کو اُڑا دو گے... لیکن اس سے پہلے مجھے لے کر جیپ میں نکل جاؤ گے۔" اُس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"میرا خیال ہے کہ کرنل اسی لیے تم پر مرتا تھا اور تم پر اتنا اعتماد کرتا تھا۔" میں نے کہا۔ "کہ تم دو دھاری تلوار ہو... بلکہ دو نالی بندوق ہو۔ تم صرف جسم کی خوب صورتی پر ہی نہیں، ذہنی سطح پر بھی ناز کر سکتی ہو۔ اس کی بیوی تو ایک پرانی وضع کی بدصورت اور بھاری بھرکم بے عقل اور جاہل عورت ہوگی۔"

"تم تو اس کی بیوی سے مل چکے ہو۔" وہ بولی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اُس نے مجھ سے جھوٹا نہیں کہا تھا۔ مجھے اپنے ہی آئینے میں اپنا چہرہ دکھا دیا تھا لیکن میں اُس کے دوسرا طمانچہ نہ مار سکا۔

"وہ... وہ سب کچھ مدن موہن نے بتایا تھا مجھے۔" میں نے کہا اور ٹرک کو نشیب کی جانب اسی راستے پر موڑ لیا جس پر جیپ کو اُلٹا چلا کے لایا تھا۔ اس راستے کی تنگی ایک مسئلہ تھی۔ ٹرک کی ہر سائڈ دیوار سے دو انچ ہی دور ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ باڈی کا کوئی حصہ کبھی دائیں طرف رگڑ کھاتا تھا تو کبھی بائیں طرف اور وہ دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ جب سیدھا راستہ سامنے آ گیا تو میں نے اسٹیئرنگ گھما کے وہیل بالکل سیدھے کیے اور ہینڈ بریک کھینچ دیا۔ ٹرک وہیں رک گیا۔ میں نرملا کے ساتھ واپس جیپ تک گیا اور نرملا کو اپنے ساتھ بٹھا کے پھر وہیں پہنچ گیا جہاں ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اس مرتبہ میں جیپ کو پلٹ کے لایا اور اسی نشیبی راستے پر ایک ایک انچ بڑھاتا ہوا ٹرک کے قریب لے گیا۔ جب ٹرک ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو میں نے جیپ کو بھی ہینڈ بریک لگا کے روک لیا۔ ٹرک اور جیپ اب مخالف سمتوں میں روانگی کے لیے تیار تھے اور ان کے پچھلے حصے تقریباً ملے ہوئے تھے۔

نرملا کو تنہا چھوڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اُسے ساتھ لے کر میں گیٹ تک گیا اور دونوں پھاٹک پورے کھول کے لوٹ آیا۔ نرملا یہ سب کارروائی غور سے دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی... آخری کام میں نے یہ کیا کہ نیچے سے وہ دونوں سوٹ کیس اُٹھا لایا جس میں سے ایک نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور دوسرا مختلف کارآمد چیزوں سے... ان کا وزن بہت زیادہ تھا... اوپر آتے آتے میں ہانپ گیا... دونوں سوٹ کیس میں نے جیپ کے پیچھے اوپر اُٹھنے والے دروازے سے اندر ڈال دیے۔ جیپ کا انجن بھی آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور ٹرک کا بھی۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" نرملا نے اچانک کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے ٹوٹی ہوئی دیوار کی اینٹوں کو اُٹھا کے کہا۔

"میرے بارے میں۔" وہ بولی۔ "مجھے یہاں سے لے کر کہاں جاؤ گے؟"

"تم دیکھ لو گی..." میں نے کہا۔ "قبل از وقت میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا... یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں پولیس یا ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دوں... کرنل نے خودکشی نہ کی ہوتی..."

"اس نے... خودکشی کر لی تھی؟" نرملا نے کہا۔

"ہاں... میں چاہتا تھا کہ وہ زندہ رہے... اس سے بہت کچھ پوچھا جا سکتا تھا... مگر وہ بھی تجربہ کار آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ ہار گیا ہے تو اس نے موت کو دشمن کی قید پر ترجیح دی۔" میں نے کہا۔ "کیپٹن شرما اور اس کے بھائی کو خود مدن موہن نے مار دیا تھا ورنہ میں انھیں بھی زندہ گرفتار کر کے جانا پسند کرتا۔"

نرملا کا چہرہ مایوسی اور اداسی کی تصویر بن گیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھنے لگیں۔ "تم مجھے انہی لوگوں کے ساتھ چھوڑ کے نہیں جا سکتے؟" اس نے تہ خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ٹرک کے اگلے پہیوں کے سامنے چار چار اینٹوں کی رکاوٹ کھڑی کر رہا تھا۔ "میرا خیال تھا کہ تم زندہ رہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں... مگر کسی ٹارچر سیل میں نہیں۔" وہ بولی۔

"گاڑی میں بیٹھو..." میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ آہستہ آہستہ میں نے ٹرک کے پارکنگ بریک ہٹا دیے... ٹرک ایک دو انچ ہلا اور رُک گیا۔ اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر ٹرک کو اس کے وزن سمیت روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط ہو جاتا تو ٹرک کے اگلے ٹائر اینٹوں کو روندتے ہوئے گزر جاتے اور مجھے شاید بالکل مہلت نہ ملتی۔ اب میں اطمینان سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ نرملا میرے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور کلچ دبا کے میں نے جیپ کو فرسٹ گیئر میں ڈالا... پھر پارکنگ بریک چھوڑ دیے۔ جیپ پیچھے گئی اور اُس نے ٹرک کو ٹکر ماری... تصادم کی آواز کے ساتھ ہی میں نے کلچ چھوڑ دیا اور ایکسیلریٹر دبا دیا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھی۔ بیک ویو مرر میں مجھے ٹرک آگے بڑھتا دکھائی دیا... جیپ نے دھکا دیا تو ٹرک نے اینٹوں کی رکاوٹ کو عبور کر لیا۔ اس کا سارا وزن نشیبی راستے پر اس طرح متوازن تھا کہ اسے ایک معمولی جھٹکے کی ضرورت تھی۔

جیپ کو میں نے بڑی تیزی سے سیکنڈ گیئر میں ڈالا اور ابھی موڑ کاٹا ہی تھا کہ میرے کانوں نے پہلا دھماکا سُنا۔ ٹرک آٹھ فٹ اونچائی کے شٹر والے گیٹ سے ٹکرا کے دیوار کو توڑتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔ میں نے جیپ کی رفتار کو اور بڑھایا۔ اس کے طاقتور انجن نے مجھے مایوس نہیں کیا... مجھے معلوم تھا کہ ٹرک اتنے وزن کے ساتھ رُکے گا نہیں اور تہ خانے میں داخل ہونے کے بعد سامنے کی بارہ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرائے گا تو تباہ ہو جائے گا۔ اس میں آگ لگ جائے گی اور یہ آگ گولہ بارود کے ذخیرے کو اُڑا دے گی۔ عام طور پر اس قسم کے حادثات کے بعد پیٹرول ٹینک کے پھٹنے سے اور تاروں کے شارٹ سرکٹ ہونے سے آگ لگ جاتی ہے... لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ آگ نہ لگے... ایسی صورت میں مجھے واپس جانا پڑتا اور ملبے کے ڈھیر میں کھڑے ہوئے ٹرک کو آگ لگانے کی کوئی ایسی صورت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

پیدا کرنی پڑتی کہ جتنی دیر میں آگ ٹرک تک پہنچے میں واپس گیٹ تک پہنچ جاؤں۔

ابھی جیپ گیٹ تک نہیں پہنچی تھی کہ جیسے زلزلہ آگیا۔

وہ پہلا دھماکا تھا جس نے زمین کو ہلا دیا اور ایک لمحے کے لیے گاڑی کو بے قابو کر دیا۔ میں نے حواس بحال رکھے اور رفتار بڑھاتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جیپ اسّی نوّے میل کی طوفانی رفتار سے گیٹ کراس کر گئی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا... یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا تھا لیکن میں اس وقت تک کافی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ مجھے بیک ویو مرر میں بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا سوائے دھوئیں اور گرد و غبار کے... میں نے جیپ کو دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد روکا اور نیچے اتر گیا۔

جہاں وہ ٹریننگ کیمپ تھا وہاں سو گز کے دائرے میں آگ بھڑک رہی تھی... چھوٹے موٹے دھماکے اب بھی ہو رہے تھے اور میں فضا میں اینٹوں کے ساتھ بہت کچھ اڑتا ہوا دیکھ رہا تھا... میری توقع کے مطابق ٹرک میں آگ لگ گئی تھی اور پیچھے سے بھرے ہوئے ٹرک نے کسی بہت بڑے بم کا کام کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس بیرک کی جگہ صرف گڑھا رہ گیا ہوگا۔ اور وہ سب لاشیں جو باہر بکھری پڑی تھیں... جو ایک قبر میں اوپر تلے پڑی تھیں اور جو تہ خانے میں بے ہوش انسانوں کی صورت میں قید تھیں، ایک ساتھ پرزہ پرزہ ہو کے بکھر گئی ہوں گی... اس کیمپ نما عمارت کے پیچھے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر کوئی بستی تھی... تباہی کے اثرات ایک فرلانگ تک ہی محدود رہے تھے مگر دھماکے سے بستی کے ہر گھر کے در و دیوار بھی کانپ اٹھے ہوں گے۔ کچھ دیر میں بستی کے لوگوں کا وہاں پہنچ جانا یقینی تھا... میں واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس خیال نے مجھے ایک طمانیت آمیز غرور اور انتقامی خوشی عطا کی تھی کہ میں نے ایک اور شکارگاہ ختم کی... یہ وہ جگہ تھی جہاں سے شکاری کتے تربیت پا کے نکلتے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قسم کا یہ واحد مرکز تھا۔ ملک گیر پیمانے پر تخریب کاری کا پروگرام بنانے والوں نے اپنی سرگرمیوں کو بھی پورے ملک میں پھیلا رکھا ہوگا... سب کا پتا چلانا اور سب کو تباہ کرنا میرے اکیلے یا ایم آر ایس کے بس کی بات نہیں تھی۔ فوج ان معاملات سے نمٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی اور عوام بھی ملک دشمنوں کے خلاف پوری طرح سے ساتھ صف آرا تھے۔ یہ اتفاق تھا یا دستِ غیب کا اشارہ تھا، میں یہاں پہنچ گیا۔ اس میں نہ میری نیت کو دخل تھا اور نہ ارادے کو... تائیدِ ایزدی پر میرا ایمان ہمیشہ رہا تھا... اس نے میرے دل میں اور میرے ساتھیوں کے دل میں ... جذبہ بیدار کیا تو ہمیں عزم، حوصلہ اور توفیق سے بھی محروم نہیں ... ہمارے لیے وسائل فراہم کیے، مشکلات کو دور کیا اور ہمارے راستوں کو کھلا رکھا۔

نرملا کے بارے میں میرا ذہن ابھی تک کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ مجھے اس ... چاہیے تھا۔ وہ ایک زیادہ خطرناک عورت تھی اور کسی بھی مرحلے پر مجھے مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ وہ انتہائی ... اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظاہر تو اس نے یہی کیا کہ وہ زندہ رہنا چاہتی ہے اور اس رعایت کے لیے مجھ سے ہر قسم کا تعاون کر رہی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کا مقصد اور ہے۔ اگر وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی تو اس کی اگلی کامیابی کا مرحلہ میرے لیے شکست کا مرحلہ بنے گا۔ اس نے اچانک بھرا ہوا ریوالور خود میرے حوالے کر کے مجھ پر ثابت کرنا چاہا تھا کہ وہ میری دشمن نہیں... یہ ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ وہ میری دشمن نہ ہوتی تو اس مشن پر ہی کیوں بھیجی جاتی اور تمام خطرات کو سمجھنے کے باوجود وہ سرحد عبور کر کے آئی تھی تو خیر سگالی کے جذبے سے نہیں آئی تھی مگر وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کام کرنے والی عورت تھی۔ اپنی خوب صورتی اور بھرپور جوانی کو بھی وہ مقصد کا ایک ذریعہ ہی سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے جسمانی طور پر شکست دینے کی کوشش کی تھی مگر میرا رویہ دیکھ کر یہ خیال چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ ذہنی طور پر میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ ریوالور میرے حوالے کرنا اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھا۔ وہ مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے متاثر ہو گئی ہے اور میرے لیے سب کچھ کر سکتی ہے... اپنے ماضی سے کٹ کر میرے ساتھ ایک نئے مستقبل کے سفر پر روانہ ہو سکتی ہے۔ ایسا اس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر رویے سے سمجھا دیا تھا۔

دوسری طرف میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے... صرف ایک نرس یا ایک کرنل کی محبوبہ نہیں تھی۔ مجھے تو یہ بھی شبہ تھا کہ نرس کا پیشہ بھی ایک پردہ تھا اور کرنل کے ساتھ مراسم بے مقصد نہیں تھے... شاید اس طرح وہ اوپر والوں کے احکامات کی تعمیل کر رہی تھی... کرنل پر اور اس کے دونوں نائبین پر نظر رکھتی تھی اور ان کے بارے میں کسی اور کو باخبر رکھتی تھی... وہ اپنی ذہانت، حسن اور غیر جذباتی اندازِ فکر کے باعث ان کے لیے زیادہ اہم تھی جو کرنل جیسے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے۔ انھیں صلاحیت اور استعداد کے مطابق مشن سونپتے تھے... اور ان کی صلاحیت اور استعداد کے بارے میں رپورٹ نرملا دیتی تھی۔ مختصراً یہ کہ وہ بائی کمان کی نمائندگی کرتی تھی یا خود اس کا ایک حصہ تھی۔

اپنی دانست میں وہ مجھ سے ایک رعایت حاصل ... پہلی بازی جیت چکی تھی۔ اس نے خود کو میرے ہاتھوں ... بچا لیا تھا۔ یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ عام عورت نہیں ہے۔ میں اسے عورت سمجھتا تو سب کے ساتھ ہی باتھ روم میں بند کر دیتا اور ... تاکہ اپنے ساتھ نشان لاتا... اب یہ اس کی کوشش ہو سکتی تھی کہ وہ خود کو مجھ سے مخلص ثابت کرے۔ حالات کا رخ اور میرا ردِعمل دیکھتے ہوئے اپنی راہِ عمل متعین کرے۔ اگر میں اس کے چکر میں پڑ جاتا ہوں تو وہ ایک خطرناک حسن و شباب رکھنے والی عورت کی طرح مجھے مکمل طور پر اپنے تابع کرے۔ مجھے جسمانی شکست دے کر ذہنی طور پر بے بس کر دے۔ اگر میں جسم کے جال سے نکل جاؤں تو مجھے یہ تاثر دے کہ وہ مجبور تھی... اپنی مجبوری کی کوئی قابلِ یقین اور دکھ بھری کہانی سنائے کہ وہ کرنل کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ اسے دباؤ ڈال کے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بہن اس کے انکار سے مصیبت میں پڑ سکتے تھے... وہ کہہ سکتی تھی کہ واپسی کا اب کوئی سوال نہیں... وہ تائب ہو کے میرا ساتھ دینے پر تیار ہے... مسلمان بھی ہو سکتی ہے اور اپنے ماضی کی ہر غلطی کا کفارہ یوں ادا کر سکتی ہے کہ اب میرے دشمنوں کے خلاف میری مدد کرے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے... یہ خبر تو آگے پہنچ ہی جائے گی کہ وہاں جتنے بھی تھے سب مارے گئے۔

یہ سب ذہن میں رکھ کے میں نے نرملا کو ساتھ لے لیا تھا... مجھے اس سے زیادہ مفید معلومات حاصل ہونے کی امید تھی۔ ابھی تو میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اس کی ہر بات مان لی تھی۔ مزید کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کو کچھ اور قریب آنے کا موقع دوں۔ ذہنی طور پر... اور اگر ناگزیر ہو تو جسمانی طور پر بھی... تاکہ وہ سمجھے کہ اس نے مجھے شکار نہیں کیا تو گھائل ضرور کر دیا ہے... اور گھائل ہونے والا شکار ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے؟" نرملا نے کہا۔

میں چونکنے کی اداکاری کر کے مسکرایا۔ "اگر میں کہوں کہ تمھارے بارے میں سوچ رہا تھا تو؟"

"تو میں کہوں گی کہ..." وہ رک گئی۔

"کہ یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں... یہ سچ ہے..." وہ بولی۔ "تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ اب اس کا کیا کیا جائے... غالباً تم ابھی تک اس کشمکش سے نجات نہیں پا سکے کہ مجھے زندہ رہنے دینا چاہیے یا نہیں..."

میں اس کی منطقی سوچ پر حیران رہ گیا لیکن میں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا... میں نے نفی میں سر ہلایا اور ہنس پڑا۔ "غلط بالکل غلط، کیونکہ یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے ہی کر چکا تھا... میں قوتِ فیصلہ کی کمزوری کا شکار نہیں ہوں مس نرملا... تم نے تعاون کا وعدہ کیا تھا، میں نے شرط رکھی تھی کہ تم سچ بولو گی... اب بھی بدعہدی نہیں ... ہاں یہ ابھی میں نے طے نہیں کیا کہ تمھیں آزاد کر دوں کہ تم واپس چلی جاؤ۔"

"واپس چلی جاؤں!" وہ حیران ہو کے بولی۔ "کس کے پاس؟ اپنے گھر؟" میں نے ظاہر کیا کہ اس کے جواب پر میں حیران ہوا۔

"میرا کوئی گھر نہیں..." وہ بولی۔

"عزیز رشتے دار، دوست تو ہوں گے..." میں نے کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں... میں واپس جاؤں گی تو مشکل میں پڑ جاؤں گی، مجھ پر مقدمہ چلایا جائے گا... ناکامی کا جرم غداری سے کم نہیں سمجھا جاتا... پھر تفتیش ہوگی کہ کہیں میں تو اس کیمپ کی تباہی میں ملوث نہیں... عورت ہوں نا... اور خوب صورت بھی ہوں۔ شک کرنے والے شک کر سکتے ہیں کہ پھنس گئی ہوگی کسی کے جال میں اور اگل دیا ہوگا سب... یہ نہ ہوا تب بھی پوچھا ضرور جائے گا کہ تم اکیلی کیسے بچ گئیں... کہاں رہیں... واپس کیسے آئیں... دشمن کی قید میں رہ کر آنے والا مشکوک ہو جاتا ہے... ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اپنے ملک کے خلاف کام کرنے لگتا ہے۔ دشمن سے کچھ بعید نہیں... ایسی مشتبہ پوزیشن ہو تو کچھ ثابت نہ ہونے کے باوجود نگرانی کی جاتی ہے اور ملازمت تو کہیں بھی نہیں ملتی۔ سماج میں تو دو کوڑی کی عزت نہیں رہتی... شریف زادیاں صاف کہتی ہیں کہ دشمنوں کی قید میں رہ کے آئی ہے... معلوم نہیں کہاں کہاں کس کس نے زیرِ تفتیش رکھا۔"

"او کے... تم واپس جانے پر تیار نہیں تو میں زبردستی تمھیں سرحد کے پار نہیں دھکیل سکتا..." میں نے کہا۔ "اور اب میرے لیے زیادہ مشکل یہ فیصلہ ہے کہ تم کو کہاں رکھوں... تم سرکاری تحویل میں رہنے کو تیار نہیں اور میرے پاس تو اپنا ٹھکانا نہیں... مگر خیر... کچھ سوچتے ہیں۔"

میں نے گاڑی ایک کچے راستے پر موڑ لیا۔ درختوں کے درمیان سے گزرتی اور چھوٹی موٹی جھاڑیوں کو روندتی اسٹیشن ویگن ایک جنگل سے گزری... پھر پتھریلی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے گاڑی روک لی اور نیچے اتر گیا... کچھ آگے مجھے کسی سوکھے ہوئے برساتی دریا کی تہ دکھائی دے رہی تھی اور اس کے بعد پھر جنگل تھا۔ میں نے ٹرین کی دھسل شنی اور درختوں کے بیچ میں سے اسے گزرتے بھی دیکھا مگر فاصلہ اتنا تھا کہ کہیں کہیں حرکت سی محسوس ہوتی تھی اور باقی سب میرا تصور تھا جو پہیوں کی آواز سے تصویر بناتا تھا۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ میں کم از کم آج کا دن اور ایک رات یہاں روپوش رہنا چاہتا تھا... مجھے معلوم تھا کہ بالآخر پیڈرو یا حاجی عبداللہ میں سے کوئی ٹرک کے بارے میں معلوم کرنے آئے گا اور ڈرائیور سائیں کی پُراسرار گمشدگی کا معاملہ بھی اٹھے گا تو کیمپ کی تباہی دیکھ لے گا... لاشوں کے ٹکڑے دیکھ کر وہ مرنے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ شاید نہ کر سکیں مگر انھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسٹیشن ویگن غائب ہے... انھیں ٹرک کا ڈھانچا ملے یا اس کے الگ الگ ٹکڑے۔ وہ جیپ کا ڈھانچا اور اس کے پرزے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

بھی تلاش کریں گے اور جب اس کا سراغ ہی نہیں ملے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ جس نے کیمپ کو تباہ کیا' وہی جیپ لے کر بھاگ گیا۔ وہ سب کو مار گیا لیکن خود اسٹیشن ویگن میں بچ کے نکل گیا۔ پھر وہ مجھے کراچی سے پشاور تک کی سڑک پر تلاش کریں گے۔ آج دن میں اور پھر رات بھر... اس امید میں کہ شاید میں رات کے اندھیرے کی پناہ میں نکلوں۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" نرملا نے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں..." میں نے ایک ہموار جگہ دیکھ کر سوکھے پتوں پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ روپوش رہنے کے لیے اچھی ہے..."

"جگہ تو اچھی ہے... مگر ہم یہاں کب تک رہ سکتے ہیں..."

"روپوشی کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں..." میں نے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے... کھانے پینے کو..."

"میں نے سُنا ہے کہ آدمی کھائے پیے بغیر ایک ہفتہ زندہ رہ سکتا ہے... ہم ایک دن تو ویسے بھی گزار لیتے ہیں... ہم روزہ رکھتے ہیں... تم لوگ اسے برت کہتے ہو..." میں نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی: "صرف دو گھنٹے پہلے ہی تو ہم نے پیٹ بھرا ہے۔ شام تک تو کوئی مسئلہ نہیں۔"

"کیا رات بھی یہیں گزارے گی؟"

"کیا تم ڈرتی ہو...؟"

"کس سے؟" وہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے... یا رات سے..." میں نے کہا "یا [illegible] سے۔"

"ڈرتے تو تم بھی ہو... مجھ سے بھی اور رات سے بھی... مرد ہونے کے باوجود۔"

"یہی تو مجھے حیرانی ہے... کہ کل اور آج میں زمین کی گردش نہیں بدلی... سورج کی سمت نہیں بدلی... لیکن تم نے زندگی کا راستہ بدل لیا۔ اس طرح تو کوئی بھی ایک نئی زندگی اختیار نہیں کر سکتا جس میں پرانے جذبات کے رشتے... زمین سے اور انسانوں سے... وقت سے اور مقامات سے اور یادوں سے... یہ سب بے وجود ہو جائیں... یہ ناممکن ہے۔"

"مجبوری میں اختیار کی بات کرتے ہو..."

"میں نے تم پر کوئی جبر نہیں کیا..." میں نے کہا "اُلٹا میں نے تمھیں اختیار دیا تھا کہ واپس لوٹ جاؤ... لیکن تم نے کہا کہ میرا کوئی گھر نہیں... کوئی عزیز دوست اور رشتے دار نہیں... تم نے میرا ساتھ دینا پسند کیا... آخر کیوں...؟ تم نے تو یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم سکندر بخت ہو..."

میں ایک دم اُٹھ بیٹھا "یہ جانتی ہو تم؟ مگر کیسے... کیسے پہچان سکتی ہو تم سکندر بخت کو...؟"

"مجھے اس کے بارے میں بتایا گیا تھا... اس کی تصویر دکھائی گئی تھی..."

"وہ ایسی ہی تصویر تھی جیسا میں ہوں؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے ایک نہیں... کئی تصویریں دکھائی گئی تھیں،" وہ بولی "مختلف بھیس میں۔"

"کس نے دکھائی تھیں یہ تصویریں؟"

"خود کرنل نے..." وہ بولی... "لیکن میں نے تمھیں صورت سے نہیں پہچانا۔"

"پھر کیسے پہچانا... تمھارے دل نے کہا... یا چھٹی حس نے بتایا؟"

"میں نے تمھاری آواز پہچانی..."

میں بھونچکا رہ گیا... "آواز... میری آواز بھی سنی تھی تم نے کیسے...؟"

"تمھاری آواز کے ٹیپ موجود ہیں۔" وہ بولی: "مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس آواز کو ذہن میں رکھو... وہ صورت بدل بدل کے آسکتا ہے مگر آج تک اس نے اپنی آواز بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح پہچانا جاسکتا ہے۔"

"اور... تم نے جو ٹیپ سُنا تھا... اس میں کیا کہا تھا میں نے؛ میں کس سے بات کر رہا تھا؟" میں سخت تشاک کی حالت میں بیٹھا رہا... یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے میرے حواس گم کر دیے تھے... بلاشبہ خود کو حد سے زیادہ چالاک سمجھنے والا کوئی معمولی سی غلطی بالآخر تباہ کن ثابت ہونے والی غلطی کرتا ہے۔

"تم کسی چوہدری دلاور سے بات کر رہے تھے... تم نے اس سے کہا تھا کہ باغ جناح میں ملو... منٹگمری ہال کے پاس... پھر تم نے اسے اقبال پارک کے باہر شاہی قلعے کے سامنے بلایا تھا۔"

بے ساختہ میرا ہاتھ سر پر گیا... یہ بہت پرانی بات تھی۔ اس دن میں نے اور محسن نے مال روڈ سے ایف ایم مائیکروفون خریدے تھے اور کار کے ریڈیو پر دلاور سے بات کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی آواز اپنی اپنی گاڑی کے ایف ایم بینڈ کو ٹیون کر کے سنتے رہے تھے۔ دلاور نے سب کچھ ٹیپ پر ریکارڈ کر لیا تھا اور میری وہی آواز میری شناخت کے طور پر متعارف کرائی جا رہی تھی۔ آدمی کے بہترین خیرخواہ اس کے دشمن ہوتے ہیں جو اس کی غلطیاں اور خامیاں شمار کرتے ہیں اور اسے موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان سے سبق سیکھے... بظاہر بہت چھوٹی بات تھی جو ہماری عقل میں نہ آئی کہ آدمی کی شناخت صرف چہرے سے ہی نہیں ہوتی۔ اس کی آواز اپنی الگ پہچان رکھتی ہے... جیسے ایک آدمی کے فنگر پرنٹ دوسرے سے نہیں ملتے ایسے ہی ایک آواز دوسری آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی سائنسی مشاہدے اور تجزیے کے بغیر اس فرق کو عام آدمی بھی محسوس کر لیتا ہے۔

یہ میرے اور محسن یا غالب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہماری آوازیں تک دشمن کے پاس محفوظ ہیں۔ نرملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے وہ گفتگو اب بھی جُزوی طور پر یاد تھی۔

میرے کہنے پر نرملا نے تفصیل سے بتایا اور وہ گفتگو تقریباً لفظ بہ لفظ دُہرادی جو میں نے اور محسن نے دلاور سے کی تھی۔ اُسے ٹیپ بار بار سننے سے سب زبانی یاد ہو گیا تھا... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا' ہم نے وہ ٹیپ حاصل کر کے تباہ کر دیا تھا مگر دلاور چالاک آدمی تھا... اس نے کوئی اور بندوبست بھی کیا تھا... ہماری آواز ایک جگہ نہیں دو جگہ ریکارڈ ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم محسن کی آواز بھی پہچانتی ہو؟"

نرملا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں کیا... بہت سے لوگ پہچانتے ہیں جن کو اس مقصد کے لیے بھیجا جاتا ہے۔"

"کس مقصد کے لیے؟" میں نے کہا۔

"یہی... جاسوسی اور تخریب کاری... اسلحے کی ترسیل اور تقسیم۔ تم جانتے ہو... سب کچھ' پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟" وہ گھاس کا ایک تنکا چباتی رہی۔

"ہمارے متعلق اور کیا بتایا جاتا تھا؟"

"تمھارے متعلق... یہ کہ تم بہت چالاک اور خطرناک ہو... جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ سے زیادہ جانتے ہو۔ باتیں بہت پُھبے دار کرتے ہو کیونکہ تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو... تم اور محسن دونوں... مذاق بہت کرتے ہو... انتہائی پُرخطر حالات میں بھی سیریس نہیں ہوتے... لڑکیوں کو خاص طور پر تاکید کی جاتی تھی کہ تم سے بچ کر رہیں۔ تم انھیں ہپناٹائز کر لیتے ہو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "کیا تم ہپناٹزم کے زیر اثر یہ سب بتا رہی ہو۔"

"کیا یہ سب غلط ہے؟"

"میری ذات ضرورت سے زیادہ بدنام ہے... نہ میں بلیک بیلٹ ہوں... نہ ہی عورتوں کا شکاری..." میں نے کہا "ہندوستان' پاکستان میں تمھیں ایک بھی لڑکی نہیں ملے گی جو یہ ثابت کر سکے۔"

"سوائے دو لڑکیوں کے... ایک کا نام فوزیہ ہے۔ اس کی اب شادی ہو چکی ہے... دوسری کا نام رابعہ ہے۔ وہ ایڈووکیٹ تھی اور اب تمھارے ساتھ ہے... تمھاری شریکِ حیات ہے... اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمھاری بیوی ہے" نرملا نے کہا۔

میری ساری شوخی کافور ہو گئی۔ "مائی گڈنس... اتنا جانتی ہو تم میرے بارے میں؟"

"میں وہی جانتی ہوں جو مجھے بتایا گیا ہے... اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اور بھی بہت سے لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں بلکہ شاید اس سے زیادہ بھی جانتے ہیں..." نرملا نے کہا: "اور بتاؤں؟... تمھارا یہ کہنا کہ تم عورتوں کے شکاری نہیں ہو... یہ بھی غلط ہے... جب تم انگلستان میں تھے تو سفید فام مائیں اپنی جوان بیٹیوں کو تمھارے سائے سے بھی دُور رکھتی تھیں، تم لیڈی کلر مشہور تھے۔ ایک لارڈ کی بیٹی تو تمھارے ساتھ جلاوطن بھی ہونے کو تیار تھی۔ تم نے ایک نہیں درجنوں عشق کیے... جو بات تمھارے لیے درست ہے وہی محسن کے لیے بھی درست ہے۔"

میں اب پوری طرح دلچسپی لینے پر مجبور تھا... نرملا نے مجھے خود میرے بارے میں ہی نہیں بتایا... اس نے رابعہ اور شہلا کے متعلق بتایا... نازو کے بارے میں بتایا کہ وہ بے حد حسین اور بے حد خطرناک ہے... مردوں کو تاکید کی جاتی تھی کہ اس آفت کی پرکالہ سے بچیں جو کمزور اور معصوم نظر آتی ہے لیکن خالی ہاتھوں سے بھی طاقتور مردوں کو چت کر دیتی ہے اور اس کا حُسن تو مصیبت ہے ہی۔

نرملا کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ وہ رضاکارانہ طور پر سب کچھ بتا رہی تھی... میرا ذہن جو یہ بات قبول کرنے سے قاصر تھا کہ نرملا منحرف ہونے کا ڈراما کر رہی ہے اب قائل ہونے لگا تھا کہ شاید وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے... اس نے ماضی کو پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور مستقبل کو مجھ پر چھوڑ دیا ہے... میرا خیال تھا کہ اس سے تفتیش کا عمل طویل اور مشکل ہو گا... وہ مزاحمت کرے گی... جھوٹ بولے گی اور ہمیں گمراہ کرے گی... لیکن وہ میری ساری توقعات کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایک ماہر شکاری عورت کی طرح جال پھیلائے گی۔ اور جیسے مکڑی جال پھیلا کے مکھی کو گرفتار کر لیتی ہے' ایسے ہی مجھے اچانک بے بس کرنے کی کوشش ضرور کرے گی... مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا... یہی بات میری عقل قبول نہیں کرتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرے گی... کیا وہ بے وقوف تھے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا... اسے پرکھا آزمایا اور بھروسے کے قابل پا کے کرنل کے ساتھ بھیج دیا؟ کیا وہ اسی لیے ان کی ہر آزمائش میں پوری اتری کہ بالآخر اُن کا ساتھ چھوڑ دے؟ ان کے دشمنوں سے مل جائے۔ آخر کیوں؟ اسے کیا ضرورت تھی اس کی... وہ ہندو تھی... بھارتی شہری تھی... وہ پاکستان سے یا کسی پاکستانی سے جذباتی تعلق کیوں رکھے گی... اور بالفرضِ محال وہ منحرف ہونا ہی چاہتی تھی تو بہت پہلے زیادہ آسان طریقہ اختیار کر کے بھی آسکتی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ان حالات میں مجھے نرملا کو ساتھ ہی رکھنا ہو گا... لیکن اس کی طرف سے بہت محتاط رہنا بھی ضروری ہو گا۔ اس کی باتوں میں آ کے اس پر اعتماد کرنا بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اب یہ بہت مشکل تھا کہ میں اُسے گولی مار دوں... لیکن میں اسے سب کے ساتھ مار سکتا تھا... پھر مجھے نہ افسوس ہوتا اور نہ پریشانی ہوتی۔

"نرملا... اگر میں تم کو یہیں چھوڑ جاؤں؟" میں نے کہا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ پہلی بار خوف زدہ ہوئی۔
"کیوں نہیں کر سکتا؟" میں نے کہا۔ "تم زبردستی تو میرے ساتھ نہیں جا سکو گی۔"
"میں تم کو بھی نہیں جانے دوں گی... جانا ہے تو مجھے یہیں مار کے چھوڑ جاؤ۔" وہ چلائی۔ "یا ریوالور دو مجھے... میں خود بھی مر سکتی ہوں۔"
"تم زندہ بھی رہ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "خدا نے تمہیں عقل اور ذہانت بھی دی ہے۔ خوب صورتی اور جوانی بھی دی ہے۔ ضروری نہیں کہ تم واپس انہی کے پاس جاؤ... ہندوستان بہت بڑا ملک ہے... اس کی آبادی میں تم کہیں بھی گم ہو سکتی ہو۔"
"لیکن میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔" وہ چلائی۔
"پھر کس لیے آئی تھیں... اس ملک کی شہریت تو تمہیں مل نہیں سکتی تھی اور تمہارا تعلق بھی کیا ہے اس ملک سے؟" میں نے کہا۔ "تم کب سے ہو یہاں... میں نے تمہیں لا[ہور] سے واپس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ بالفرض محال تم کو اتنا ہی شوق تھا یہاں رہنے کا تو لاہور سے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہیں رہ جاتیں۔"
"لیکن... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو... میں اس وقت کا انتظار کر رہی تھی... جب میں تم سے ملوں..."
میں ہنس پڑا۔ "ویری گڈ... کیا غائبانہ عشق ہو گیا تھا تم کو مجھ سے؟ میں تمہارے خوابوں اور خیالوں میں بس گیا تھا؟"
"یہ بات نہیں ہے..."
"پھر کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ بھارت کے کئی بڑے شہروں بمبئی کلکتہ وغیرہ میں بہت بڑی آبادی فٹ پاتھوں پر رہتی ہے۔ اور ہر جگہ خانہ بدوش یا فقیر بے گھر ہوتے ہیں۔ مگر تم ایک تعلیم یافتہ عورت ہو... تم نرسنگ کے پیشے میں تھیں اور تمہاری صورت [...]ی ہے کہ تم نے [...]تی کبھی نہیں دیکھی۔ تم کہتی ہو کہ تمہارے عزیز دوست رشتے دار نہیں... یہ میں کیسے مان لوں...؟ تم تو جس کی طرف ایک نظر دیکھ لو وہ تمہارا ہو جائے۔"
"کیا تمہارا کوئی گھر ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔
ایک لمحے کے لیے میرے [ح]واس لفظ ختم ہو گئے اور میری زبان گنگ ہو گئی۔
"خاموش کیوں ہو گئے؟ کہاں [ہ]ے تمہارا گھر؟ تمہارے ماں باپ بھائی بہن، رشتے دار... یہ سب کہاں ہیں؟" اس نے تلخی سے کہا۔ "تم بھی تعلیم یافتہ ہو... خانہ بدوش یا فقیر نہیں ہو..."
"یہ... یہ ٹھیک ہے کہ..." میں نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ "کہ تم کو میرے متعلق بڑی اچھی بریفنگ [د]ی گئی ہے۔ واقعی میں گھر اور خون کے رشتوں سے محروم ہوں... لیکن میرے پاس دوسرے [...] رشتے ہیں... وطن کی مٹی سے پیار کے... محسن جیسے دوستوں کے خلوص کے... رابعہ کی محبت کے... شہلا جیسی بہن کی محبت کے اور ان گنت اپنے جیسے انسانوں کی محبت کے جو شرافت اور اخلاقی اقدار کے رشتے سے میرا خاندان ہیں۔"
"اگر میں اس خاندان میں شامل ہونا چاہوں تو...؟"
"میں ہنس پڑا۔ "اس کے لیے تمہارے پاس کیا جواز ہے؟ کیا تم مجھے کوئی مظلومیت کی داستان سناؤ گی...؟ کہ تم اس معاشرے سے متنفر تھیں اور تمہارا استحصال ہوا۔ تمہیں جبراً وہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا جس کو تمہارا ضمیر قبول نہیں کرتا تھا... تم پہلے ہی متضاد بیانات دے چکی ہو مس نرملا... جھوٹ بولنے والے کا حافظہ نہیں ہوتا... لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک وقت میں تم نے کیا کہا تھا اور دوسری بار خود اپنی تردید کر دی تھی۔"
"کیا تمہیں اپنا بچپن یاد ہے کبیر خان؟"
میں چونک پڑا۔ "یہ بھی بتا دیا گیا ہے تم کو؟ کہ میں کبیر خان تھا... بڑی ریسرچ ہوئی ہے مجھ پر... تمہیں تو شاید میرے والد کا نام اور ان تمام واقعات کا بھی علم ہو گا جو ان کے ساتھ یا میرے ساتھ پیش آئے تھے۔"
وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "کبھی موقع ملے تو کسی اور سے بھی یہ سب پوچھنا... جو میں جانتی ہوں۔"
"کیا جانتی ہو تم... ایسی کون سی بات ہے...؟"
"کبیر خان... کیا تم کو چاچا دیا ناتھ یاد نہیں؟" وہ بولی۔
دیا ناتھ... پنڈت دیا ناتھ...؟ میں نے محسوس کیا کہ اس جنگل میں ہر طرف سے آدم خور شیر... سفاک بھیڑیے اور [...]خوں آشام چیتے... پھنکارتے ہوئے سانپ اور ڈنک مارنے والے بڑے بڑے بچھو نکل آئے ہیں، اور میں جان بچانے کے لیے اس دشت کی ویرانی میں بھٹکتے بھٹکتے ایک گھر تک جا پہنچا ہوں جس کے محفوظ دروازوں کے پیچھے میرے لیے سلامتی... تحفظ اور عافیت ہے محبت پیار اور شفقت ہے... وقت چوبیس برس پیچھے چلا گیا... ایک گھر کو میری نظر نے فوکس کر لیا... اس گھر میں اور کون تھا؟
"تم میرٹھ میں رہتے تھے نا کبیر خان؟" نرملا نے کہا۔ "کیا تم یہ بھی بھول گئے ہو تم؟"
"نہیں... میں کچھ نہیں بھولا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس وقت کی کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گا... سنا تم نے؟ تم نے مجھے اس وقت کی یادوں کے نام پر دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں تم کو زندہ گاڑ دوں گا۔"
"تم کچھ بھی کر سکتے ہو کبیر خان..." وہ سہم کے بولی۔
"مت کہو مجھے کبیر خان۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "دغا باز عورت... میں اس مکر و فریب کے جال میں پھنسنے والا نہیں ہوں..."

"میں تو اسی نام سے جانتی تھی تمہیں... اور مجھے نہیں معلوم موہن سکندر بخت کب سے ہوئے... اور کیوں ہوئے؟" وہ کانپنے لگی اور روتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے مار ڈالو مگر پہلے میری سن لو... یہ جان لو کہ میں وہی ہوں..."
"وہی کون؟" میں نے دل کے سناٹے میں اپنی اجنبی آواز کو سنا۔
"چاچا دیا ناتھ کی بیٹی..."
میں ایک دم اٹھا اور میں نے چاہا کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں... اس جھوٹ بولنے والی زبان کو کھینچ کر باہر نکال دوں... اسی دیوانگی میں میں نے اسے اٹھا لیا اور میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے... اس کا چہرہ میرے سامنے میرے بہت قریب آگیا... اتنا قریب کہ میں اس کی آنکھوں کے اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ اس کا وجود میرے سخت ہاتھوں کی بے رحم گرفت میں تڑپا اور اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کے قطرے تیزاب کی طرح میرے ہاتھوں پر برس گئے... اس کے پیر زمین سے اوپر اٹھ گئے تھے... آہستہ آہستہ میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور اس نے زمین پر قدم ٹکا دیے... میں اب بھی اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک رہا تھا اور وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی... میں بہت بے بس ہو گیا تھا میرے لیے چوبیس برس پیچھے رہ جانے والے وقت کے سائے دیکھ کر اصلی اور نقلی چہروں کے درمیان فرق کو محسوس کرنا بہت مشکل تھا... ناممکن تھا... آخر میرے لیے اس جھوٹ کا سر کچلنا زیادہ ناممکن کیوں ہے؟
میں نے اپنے آپ سے سوال کیا... میں سچ کی کسوٹی [ر]کھتا ہوں تو مجھے ڈر کیسا؟ عقل کی دلیل نے مجھے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا... میں نے اسے چھوڑ دیا۔
وہ ریت کے گھروندے کی طرح گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں قطعی بے حسی کے ساتھ اس کے قریب کھڑا اپنے احساس کی آندھی کے تھپیڑے برداشت کرتا رہا... یہ گزرے ہوئے وقت کی ہوا تھی جو ویران قب[رستان] کی مٹی، سنسان گھروں کی گرد اور یادوں کی گلیوں کی دھول [...]ئی تھی... اس میں آگ کی لپٹ تھی اور جھلستے جسموں کی جلتے ہوئے [...] نے ذہن کے دریچے بند کر لیے تھے کیونکہ [...] سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔
وہ اچانک اٹھی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ "کبیر خان! ... مجھے پہچانو... آخر کیا ہو گیا ہے تمہاری آنکھوں کو... کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں کون ہوں... میں نرملا نہیں ہوں..."
میں نے اسے بڑی بے دردی سے جھٹک دیا۔ "تم نرملا ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تم موہنی نہیں ہو..."
روتے روتے وہ ہنس پڑی۔ "تم کو یاد ہے میرا نام... کیوں یاد رہا تمہیں یہ نام کبیر... چوبیس سال میں تم نے بہت سے نام بھلا دیے ہوں گے... پھر یہ نام کیوں نہیں بھولے تم... کیا تم مجھے بھولنا نہیں چاہتے تھے؟"
آہستہ آہستہ میرا وجود سرد پڑنے لگا... میری نظر نرملا پر ٹھہر گئی۔ اس کی صورت کے نقوش میری نگاہ میں تھے اور میں دل کے اندھیرے کنوئیں میں اتر کے آشنائی کے مدفون لمحوں کی روشنی ڈھونڈ رہا تھا۔
"صرف نام کے فرق کو دیکھ رہے ہو... نام تو تم نے بھی بدل لیا ہے... مگر کیا خود تم بدلے ہو...؟" وہ بولتی رہی... زیادہ پرامید... زیادہ پراعتماد لہجے میں... "بتاؤ مجھے کہ اس بدلے ہوئے حلیے... بہروپ کے اندر کون ہو تم؟"
میں گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا... میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اپنی طرف کر لیا۔ "اب بھی کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے جو تم مجھے بے وقوف بنانے کے لیے بول رہی تھیں۔ اور تم موہن کی بہن نہیں ہو... تم وہی ہو جو میں نے تمہیں سمجھا تھا۔"
"کبیر... میرے ساتھ پیچھے لوٹ چلو... اس گھر میں جہاں تم اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے... تم سات بہن بھائی تھے... پانچ بہن بھائی ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تمہاری ایک بہن اپنی عزت بچانے کے لیے کنوئیں میں اتر گئی تھی۔ اور تمہاری ماں... جسے میں چاچی کہتی تھی... وہ بھی بچوں کو بچاتے ہوئے تم پر قربان ہو گئی تھی... یہ سب میں نے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے میرے پتا جی نے بتایا تھا... پنڈت دیا ناتھ نے... اور بعد میں موہن نے بھی بتایا تھا... تم سال بھر ہمارے گھر میں رہے تھے... یاد ہو گا تمہیں... تم بھول کیسے سکتے ہو۔"
"ہاں... اور وہاں تمہارے گھر میں... ایک ریڈیو تھا... کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا... مگر چاچا دیا ناتھ نے وہ ہمارے کمرے میں رکھ دیا تھا... جہاں موہن اور میں... اور تم... اس کے کان مروڑتے رہتے تھے... مجھے بہلانے کے لیے... تم سب نے بہت کوشش کی تھی... اور جب میں نہیں مانا تھا تو تمہارے پتا جی نے مجھے ایک چانٹا لگایا تھا... وہ پولیس میں حوالدار تھے نا... اور مجھے تمہارے ماما کے گھر بھیج دیا گیا تھا... مراد نگر... دہلی اور میرٹھ کے درمیان کوئی جگہ تھی... وہاں سے میں پھر تمہارے گھر آگیا تھا اور اس کے بعد ابا مجھے لینے آگئے تھے..."
"کبیر...!" موہنی نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔
"تم وہی ہو نا... میرا دل گواہی دیتا تھا... تم نے مجھے پہچان لیا؟"
وہ آنسو جو چوبیس برسوں سے رکے ہوئے تھے۔ وہ لہو جو منجمد ہو جانے والے زخموں میں جم گیا تھا... وہ جذبے جو دل میں پتھر ہو گئے تھے... وہ یادیں جو قبروں کے سادہ کتبے رہ گئی تھیں ان

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سب نے مل کے مجھے شکست دی اور سچ کے یقین کا عذاب دیا... بالآخر میں نے اُسے اپنے سے جُدا کیا... وہ بے ہوش تھی اور مجھے پتا نہ تھا... میں اس سے بہت کچھ کہتا رہا تھا جو اس نے نہیں سُنا تھا۔

میں نے اُسے آرام سے لٹا دیا۔ میں گاڑی تک گیا اور اس کے پیچھے سامان کے ڈھیر میں سے ایک کینوس کا ٹکڑا اُٹھا لایا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کو اسٹیشن ویگن پر ڈالا جا سکتا تھا۔ چند سیدھی اور لمبی شاخیں مل جاتیں تو اُسی کو میں خیمہ بھی بنا سکتا تھا۔ فی الحال میں نے اُسے کھول کے زمین پر بچھایا اور موہنی کو اس پر شفٹ کر دیا۔ ابھی تک میں ذہن میں اُٹھنے والے اس سوال سے گریز کر رہا تھا جس کا تعلق موہنی کے مستقبل سے تھا... ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا بھی تھا... لیکن سب سے پہلے مجھے اس کو ہوش میں لانے کے لیے کچھ کرنا تھا۔

ایک چٹان پر چڑھ کے میں نے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھا... برساتی ندی کے پار مجھے دُھواں سا نظر آیا... پھر میں نے ایک گوالے کو دیکھا جو اپنے ریوڑ کے ساتھ ندی کے سوکھے پاٹ سے گزر رہا تھا... یقیناً اُدھر کوئی آبادی تھی۔ یہ فاصلہ میرے اندازے کے مطابق آدھے میل سے زیادہ اور ایک میل سے کم تھا... وہاں آنے جانے میں میرا ایک گھنٹا صرف ہو سکتا تھا... ایک گھنٹے بعد تو جنگل میں رات ہو گی... اندھیرے میں واپسی کا سفر کیسے ہو گا۔ میں لوٹ کر اس جگہ کیسے پہنچوں گا... اگر میرے قدم ذرا بھی بھٹک گئے تو موہنی اکیلی پڑی رہ جائے گی۔ اور اس جنگل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے... وہ تو ایک لڑکی ہے... نہیں... اسے اکیلا چھوڑ کے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ اگر میرے جاتے ہی اُسے ہوش آ گیا تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گی لیکن میں اُسے ساتھ بھی کیسے لے جاؤں... اُسے کندھے پر ڈال کے لے جاؤں گا تو یہی فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہو گا اور پھر گاؤں کے لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے... میں گاڑی لے کر جا سکتا تھا مگر اس سے بھی شکوک و شبہات جنم لیتے۔ سب کو یہ بات عجیب لگتی کہ میں جنگل کی طرف سے ایسی شاندار گاڑی میں نمودار ہوا اور واپس جنگل میں گم ہو گیا۔

بالآخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں نے واپس گاڑی میں جا کے گلوز کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں کاغذات کے نیچے ایک بال پوائنٹ پین بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک سادہ صفحہ پھاڑ کے اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا۔ "میں ابھی واپس آتا ہوں..." اور یہ چٹ موہنی کے کپڑوں پر سامنے کی طرف لگا دی۔ کاغذ اور کپڑے کو نتھی کرنے کے لیے میں نے ببول کا ایک کانٹا استعمال کیا۔ مجھے یقین تھا کہ ہوش میں آتے ہی موہنی کی نظر اس پیغام کو دیکھے گی۔

گاڑی کی چابیاں میری جیب میں تھیں... سارا اس[illegible] تھا اور گاڑی کے دروازے بند تھے۔ میں نے ایک نظر[illegible] موہنی پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا۔ میری جیب [illegible] خاصی رقم موجود تھی، چنانچہ مجھے وہ سوٹ کیس نہیں کھول[illegible] مالِ غنیمت سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے [illegible] پاس وہ ریوالور تھا جو مجھے موہنی نے دیا تھا۔

میں جنگل کے راستے پر تقریباً دوڑ رہا تھا... اس جگہ آ جانے کے بعد مجھے پریشان کرنے والے سوالات سنگ[illegible] وہ بدروحوں کی طرح میرا تعاقب کرنے لگے اور مجھے ڈرانے[illegible] اگر یہ جھوٹ ہوا... یہ بھی اداکاری ہوئی... کسی نے اُسے [illegible] بتا دیا ہو گا سکندر بخت... وہ موہنی کیسے ہو سکتی ہے... [illegible] ہی ہو گی... موہنی کا تو اپنا ایک گھر تھا... اس کا بھائی بھی [illegible] ماں باپ ممکن ہے زندہ نہ ہوں... مگر موہنی کی شادی ہو[illegible] وہ کہیں اپنے شوہر اور بچوں میں بیٹھی ہو گی... یہ عورت [illegible] شاطر ہے... اس نے اپنے آنسوؤں سے اور اپنے جذباتی [illegible] سے تم کو پاگل کر دیا۔ اس نے تمہارے ماضی کے مندمل ہو جا[illegible] والے زخموں کی کسک کو بیدار کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی یہ زخم کہاں ہیں... اب تم کیسے تصدیق کرو گے کہ وہ جھوٹ کے سہا[illegible] تمہارا یقین حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے؟ تم اس کو کیسے لے جاؤ گے؟ تم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے... تم کو اعتبار کرنا چاہیے... وہ تمہاری ہم مذہب نہیں... اس کا تعلق دشمن [illegible] سے ہے اور وہ آئی بھی دشمنوں کے ساتھ تھی... وہ موہنی نہیں [illegible] سکتی... اور موہنی ہو تب بھی کیا... وہ بچپن کا دور تھا۔ ہوا[illegible] اور اس وقت کے جذبات کا آج کے حالات سے کیا تعلق[illegible] دھوکا کھاؤ گے اور نقصان اٹھاؤ گے... اپنے ساتھ اپنی [illegible] تباہی کا سبب بنو گے۔

پھر میں کیا کروں... اُسے مار دوں؟... یہ ناممکن ہے۔ اسے سرکاری حکام کے حوالے کر دوں؟ یہ اور بھی زیادہ ناممکن [illegible] اس سے تو بہتر ہو گا کہ میں اسے مار ڈالوں... کیا میں اُسے چھو[illegible] بھاگ جاؤں؟ لیکن یہ تو بہت بے وقوفی کی بات ہو گی... اب[illegible] اس پر نظر رکھنی زیادہ ضروری ہے... یہ معلوم کرنا بھی ضروری [illegible] وہ موہنی سے نرملا کیسے بنی اور کیوں بنی... وہ کیوں مجھ سے مل[illegible] تھی اور اب کیوں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے؟

گاؤں تک پہنچتے پہنچتے میرا دماغ خراب ہونے لگا[illegible] میں سخت مشکل میں پڑ گیا تھا اور قوتِ فیصلہ سے بالکل محرو[illegible] تھا... گاؤں کے پہلے گھر پر دستک دیتے ہوئے میں نے سور[illegible] دیکھا جو افق کی آخری لکیر کے پیچھے گم ہو گیا تھا... جوانی میں بوڑ[illegible]

جانے والی ایک عورت نے دروازے تک آ کے کہا۔ "کون ہے تو ویر...؟"

میرا حلیہ بے حد مضحکہ خیز تھا مگر اس دیہاتی عورت نے مجھے عادت اور روایت کے مطابق ویر کہہ کے مخاطب کیا تھا۔

"مجھے کچھ کھانے کو دے بہن۔" میں نے کہا۔

"روٹی کھانی ہے؟" وہ بولی۔ "کہاں سے آیا ہے تو...؟"

"میں راستہ بھول گیا ہوں..." میں نے کہا۔

عورت نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔ پھر ایک مرد آ گیا جو اس عورت کا شوہر ہو سکتا تھا... "کیا بات ہے میاں؟" وہ بولا۔

"بات یہ ہے بھائی کہ ہم شکار پر آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہم کون...؟" وہ بولا... "تو تو اکیلا ہے۔"

"میں تو نوکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا صاحب اور بیگم اپنی گاڑی میں نکلے تھے... رات کے وقت جنگل میں گاڑی خراب ہو گئی... انھوں نے مجھے بھیجا کہ جا کے کہیں سے مستری کو لاؤ، مستری یہاں کہاں... میں نے کہا کہ کچھ کھانے پینے کو لے آتا ہوں... صبح شہر جا کے مستری کو لاؤں گا۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا جیسے میری بات پر یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو... بالآخر اُس نے مجھے بھروسے کے قابل مان لیا۔ "کتنی دُور سے آیا ہے؟"

"اُدھر... میل بھر پرے گاڑی کھڑی ہے۔" میں نے ہاتھ سے بالکل غلط سمت میں اشارہ کیا۔ "میں پیسے دوں گا... مجھے کھانے پینے کو کچھ دے دو۔"

مرد کی آنکھوں میں لالچ اتر آیا۔ "کتنے پیسے دے گا؟"

"سو روپے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں برتن بھی لے جاؤں گا۔ پانی کا ڈول اور کھانے کی چنگیر..."

"او لے جانا یار..." وہ اندر دیکھ کے بولا۔ "لیکن پہلے سو روپے نکال... اور ہاں... کسی کو بتانا نہیں ہے کہ تو نے سو روپے دیے ہیں مجھے ورنہ چلا جا کسی اور دروازے پہ..."

"میں نہیں بتاؤں گا..." میں نے اُسے سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے فوراً اپنے لاچے میں اُڑس لیا۔ "تمہاری ماں کو بھی نہیں بتاؤں گا..."

"میری گھر والی تھی وہ۔" وہ خفا ہو کے بولا۔ "آ جا اندر... تیرا صاحب تو بڑا امیر ہو گا... مرغی کھاتا ہو گا... مرغیاں ہیں ہمارے گھر میں... میری گھر والی کو دس روپے دے دینا... وہ پکا دے گی۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو ہے وہی دے دو۔"

"اس وقت کیا ہو گا... روٹی... گڑ... مکھن۔" وہ بولا۔

"شاید لسی بھی مل جائے مگر تیرا صاحب اور میم صاحب کیسے کھائیں گے۔"

"کھا لیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم اتنا ہی کر دو تو کافی ہے۔"

وہ بہت خوش ہوا کیونکہ سو روپے اس کو مفت کے مل گئے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ سب باندھ دے... جو کچھ بھی گھر میں ہے۔

"سب باندھ دوں؟ ایک آدمی کے لیے؟" اُس نے کہا۔

"یہ ایک آدمی نہیں ہے۔" شوہر نے جھنجلا کے کہا۔

"ایک نہیں ہے تو کیا دو ہیں؟"

"بک بک نہ کر کُتیا... جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔" وہ دہاڑ کے بولا۔

"پھر تو کیا کھائے گا... میرا سر...؟ بچے کیا کھائیں گے؟"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی نافرمان بیوی کی بک بک کو جھاپڑ یا جوتے سے بند کرتا، میں نے دخل اندازی کی۔ "یہ لو بہن... تم بعد میں اپنے لیے بندوبست کر لینا۔" میں نے ایک سو کا نوٹ اس کے سامنے ڈال دیا... میاں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ لیکن عورت دل گرفتہ اور شرمندہ نظر آنے لگی۔ اس نے سو کے نوٹ کو چھوا بھی نہیں... اس نے کھانا باندھ دیا جو موٹی موٹی چار روٹیوں، پاؤ بھر مکھن کی پیالی... اور شاید ایک پاؤ گُڑ پر مشتمل تھا۔ اس نے روٹیاں چنگیر میں رکھیں۔ اس پر مٹی کا پیالہ اور گُڑ رکھ کے ایک کپڑے کی گٹھڑی سی بنا دی... وہ مجھے لسی بھی دینا چاہتی تھی، مگر میں نے صرف سادہ پانی کو ترجیح دی۔ دو سو روپے وصول کرنے کے بعد صاحبِ خانہ مجھے ڈول دے دیتا تب بھی نقصان میں نہ رہتا مگر وہ طبعاً کمینہ تھا۔ اُس نے ایک پرانے ٹین کا انتخاب کیا جس میں آٹا بھرا ہوا تھا۔ آٹے کو ایک کپڑے پر انڈیل کے اس نے دس پونڈ ڈالڈا کے ٹین کو دھویا اور اس میں دو سوراخ کیے۔ ایک رسی باندھ کے اُسے باقاعدہ ڈول کی شکل دی اور پانی سے بھر کے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ رسمی طور پر اس نے کہا کہ میں چھوڑ آؤں۔ مگر میرے پہلے انکار پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ ایک کاہل اور نکما آدمی تھا۔ شاید اسی لیے پیسے کا محتاج تھا۔ جب میں باہر نکل چکا تھا تو میں نے پھر میاں بیوی کے لڑنے کی آواز سُنی۔ وہ بیوی سے سو کا دوسرا نوٹ بھی ہتھیانا چاہتا تھا اور بیوی اُسے 'ہڈحرام' کے لقب سے نوازنے کے بعد صاف اعلان کر چکی تھی کہ اسے ایک پیسہ نہیں دے گی۔

واپسی پر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے پون گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ واپسی کے سفر میں سب سے زیادہ خطرہ راستے سے بھٹک جانے کا تھا۔ میں نے آتے وقت چند نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں۔ اب انھی نشانیوں کو تلاش

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کرتا ہوا، میں اپنے اندازے کے مطابق صحیح سمت میں بڑھ رہا تھا لیکن آدھے گھنٹے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ وہاں سب درخت ایک سے تھے اور اندھیرے میں جنگل کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ذرا مختلف نہ لگتا تھا۔

بھٹک کر زیادہ دُور جانے کے بجائے میں نے وہیں اپنی سمت درست کر لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کھانا اور پانی کا ڈول نیچے رکھا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں اس چٹان کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس پر سے میں نے گاؤں کے کسی گھر سے اُٹھنے والا دھواں دیکھا تھا۔ گاؤں اب مجھے اپنے پیچھے دکھائی دیا۔ اس کے چند گھروں میں ٹمٹمانے والے چراغ تاریکی میں جگنو سے لگتے تھے۔ دائیں جانب وہ سوکھا ہوا برساتی دریا تھا۔ ان دونوں مقامات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پھر اپنی سمت کا تعین کیا تو مجھے وہ چٹان بھی نظر آگئی۔ اندھیرے میں اس کا سیاہ وجود بہت دھندلا نظر آتا تھا مگر میں نے اس کی مخروطی بناوٹ کو پہچان لیا۔

میں اترنے ہی والا تھا کہ میری نظر بہت دُور کی ایک تیز روشنی سے چندھیا گئی۔ وہ کہیں کسی گاڑی نے موڑ کاٹا تھا اور یہ اس کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ میں خشک لب کے رک گیا۔ غالباً یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے واپسی کا سفر کیا تھا۔ سمت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بڑی سڑک سے نکلنے والی وہی چھوٹی سڑک ہے جس پر گزشتہ رات میں نے اور موہنی نے ایک ٹرک میں سفر کیا تھا۔ کوئی گاڑی اس سڑک پر کیمپ کی سمت میں جا رہی تھی... میں درخت پر سے اس کی متحرک روشنی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب افق سرخ دکھائی دیتا تھا۔ غالباً کیمپ میں لگنے والی آگ ابھی تک بجھی نہیں تھی۔

جب گاڑی کی روشنی میری نظر سے اوجھل ہو گئی، تو میں نیچے اترا۔ اس تباہ شدہ کیمپ کی طرف جانے والی یہ گاڑی دشمنوں کی بھی ہو سکتی تھی اور پولیس کی بھی۔

دس منٹ بعد میں نے اچانک خود کو وہیں پایا جہاں میں موہنی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی سمت متعین کرنے میں اندازے کی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن موہنی وہاں نہیں تھی جہاں میں اسے کینوس بچھا کے لٹا گیا تھا۔ کینوس کا وہ ٹکڑا اسی طرح پھیلا ہوا تھا اور غور سے دیکھنے پر مجھے سیاہی میں سفیدی کا چھوٹا سا دھبہ نظر آیا... یہ وہی چٹ تھی جسے میں موہنی کے کپڑوں پر لگا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہوش میں آتے ہی اس نے میرا پیغام پڑھ لیا تھا، اس کاغذ کے پرزے کی وہاں موجودگی یہ بھی ثابت کرتی تھی کہ موہنی کچھ دیر پہلے ہی اُٹھی ہو گی۔ کاغذ کا وہ پرزہ وہاں زیادہ دیر تک پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ معمولی سا ہوا کا جھونکا اُسے اُڑا لے جاتا۔

فوری طور پر مجھے دو خیال آئے۔ پہلا یہ کہ موہنی کا ...
حوالہ استعمال کرنے والی نرملا موقع پاتے ہی فرار ہو گئی۔ ...
کہ اس عرصے میں کوئی اُسے اُٹھا لے گیا۔ ہم ابھی تخریب ...
اس تربیت گاہ سے اتنے دُور نہیں ہوئے تھے کہ خود کو ...
سمجھنے لگتے۔ شکست کے احساس سے دوچار ہونے والے ...
چوٹ کھائے ہوئے ناگ سے زیادہ مشتعل ہوں گے... ...
انھیں معلوم ہوا کہ کوئی یہاں سے اسٹیشن ویگن نکال کے ...
وہ سب اردگرد کے علاقے کو چھان ماریں گے۔ یہ جنگل ایک ...
محفوظ پناہ گاہ ہے... یہ بات وہ بھی جانتے ہیں... جو بات ...
ذہن میں تھی وہ ان کے دماغ میں بھی آسکتی ہے۔ وہ ...
سکتے ہیں کہ فی الحال میں اسٹیشن ویگن لے کر کراچی یا پشاور ...
جانے والی سڑک سے دُور رہوں گا... اور اس وقت ...
جب جستجو کرنے والے مایوس ہو جائیں۔

ہر صورت میں یہ میری کوتاہی سے زیادہ کم عقلی ...
تھی... اگر وہ لڑکی جو بلاشبہ بہت ہوشیار اور باخبر تھی مجھے ...
کی بنا پر موہنی ہونے کا یقین دلانے میں کامیاب رہی اور ...
ماضی کی تصویر دیکھ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گم کر بیٹھا ...
میری جذباتی حماقت تھی۔ اور اگر کوئی شکاری جو میری تلاش ...
آیا تھا، اسے اُٹھا کر لے گیا تو یہ میری عاقبت نااندیشی تھی... ...
سوچنا چاہیے تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو وہ ...
دفاع نہیں کر سکے گی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُسے آہستہ سے آواز دی ...
مکمل خاموشی نے میری پکار کا مذاق اُڑایا... کون موہنی... وہ ...
نرملا تھی... میں ڈرتے ڈرتے چٹان کی طرف بڑھا جس کے ...
میں نے گاڑی کو چھپا کے کھڑا کیا تھا... یہ میری بھول تھی کہ ...
نے دشمن پر اعتبار کیا اور ایک عورت کی باتوں میں آگیا۔ یہ ...
ہوئے بھی کہ تریا چلتر کے آگے بڑے بڑے عاقل خان بہادر ...
چٹ جاتے ہیں۔ وہ یقیناً گاڑی بھی لے گئی ہو گی۔ وہ اسی ...
کے انتظار میں تھی... گاڑی کے ساتھ وہ سب کچھ لے گئی ...
سب ثبوت جو تخریب کاروں کی سرگرمیوں کو ثابت کرتے ...
لاکھوں روپے کی پاکستانی کرنسی جو تخریب کاروں کے لیے ...
گئی تھی... اور وہ اسلحہ جو میرے کام آسکتا تھا... میں اب ...
خالی ہاتھ اس جنگل میں بھٹک رہا تھا... بائیں جانب سے ...
کاٹ کے میں اس چٹان کے پیچھے پہنچا۔
گاڑی کو اپنی جگہ دیکھ کے میری جان میں جان آئی... ...
جاتے ہوئے گاڑی بھی لے جاتی تو میری ساری محنت اکارت ...
جاتی۔ اب بھی اس نے میری کامیابی کے غرور میں شرمندگی کا ...
شامل تو کر ہی دیا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ موہن ایک ہی سوراخ ...

دوبار نہیں ڈسا جاتا... یہ وہی عورت تو نہ تھی مگر بہر حال یہ بھی عورت تھی۔ پہلی بار مجھے اعتماد کرنے کی سزا زیب النساء نے دی تھی... اس کی معصومیت کے انداز میں چھپی ہوئی عیاری نہ دیکھ سکا تھا اور وہ مجھے چرکا دے کر نکل گئی تھی۔ یہ دوسری عورت تھی جس نے میرے دل میں یادوں کے چراغ روشن کیے تھے۔ میں محتاط رہنے کے باوجود بھول گیا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہے جس کو تیار کرنے میں جزئیات اور تفصیلات پر مہینوں ریسرچ میں صرف کر دیے گئے ہوں گے۔ وہ میرے بارے میں اتنا جانتی تھی جتنا رابعہ اور محسن بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ تاثر دے کر اس نے مجھ سے میرا یقین چھین لیا تھا۔

میں انہی خیالات میں غلطاں جنگل کی ویرانی سے گزرنے والی رات کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ شام کو آشیانوں میں بسیرا کرنے سے پہلے شور مچانے والے پرندے اب خاموش تھے اور درختوں سے ہوا سرسراتی گزر رہی تھی۔ میں ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے میں ڈول لٹکائے خود کو سفر کی اگلی منزل کے لیے تیار کر رہا تھا۔ وہ عورت اگر اتنی چالاک سے فرار ہوئی تھی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کسی بھی شارٹ کٹ سے سڑک تک پہنچ جائے اور میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے کر شکاری کتوں کو خبردار کر دے۔ وہ ہر راستے پر پہلے سے میرے استقبال کے لیے موجود ملیں۔

ان حالات میں یہ اسٹیشن ویگن لے جانا ایک اور فاش غلطی ہوتی۔ اب میں چھپ کر تو نکلنے کی امید کر سکتا تھا مگر گاڑی لے کر جانا ایسا ہی ہوتا جیسے راجا کا ہاتھی چرا کے کوتوال کے سامنے جانا... پھر یہ سب میں کیسے لے جاؤں گا جو میں نے مالِ غنیمت سمجھ کے اُٹھایا تھا؟ اس سوال کا میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آیا تھا کہ میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ میں اُچھل پڑا۔ ...شش یہ تاریکی میں ایک سائے نے گاڑی کی اوٹ سے سر نکالا۔ خفت سے میرا بُرا حال ہو گیا کیونکہ یہ موہنی تھی۔ میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا تھا اور وہ شاید مجھے دیکھ رہی تھی... مجھے غصہ بھی آیا لیکن میں پی گیا۔

"کیا بات ہے موہنی؟" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"کیا... وہ چلا گیا؟" وہ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئی۔

"کون چلا گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"معلوم نہیں کون تھا۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"تم نے دیکھا نہیں تھا؟"

"نہیں... میں نے صرف آہٹ سنی تھی۔"

"ہو گا کوئی جانور۔" میں نے کہا۔ "آخر جنگل ہے... مگر اس جنگل میں شیر چیتے تو کیا بھیڑیے تک نہیں ہیں..."

"وہ جانور نہیں تھا..."

"تو پھر کیا تھا... بھوت...؟"

"مذاق مت کرو... میں کیا انسانی قدموں کی آواز اور جانور کے چلنے کی آواز میں فرق محسوس نہیں کر سکتی۔" وہ بولی۔

"آدمی تھا تو کیا سامنے نہیں آیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں... میں تو اُدھر چھپ کر جھانکتی بھی رہی تھی... وہ خاصا قریب آیا تھا... اس جگہ تک جہاں تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔ پھر لوٹ گیا۔"

"لوٹ کر کدھر گیا؟"

"اسی طرف... جدھر سے تم آئے ہو۔" وہ بولی۔

"مگر مجھے تو راستے میں کوئی نہیں ملا..."

"نہیں ملا تو میں کیا کروں۔" وہ چڑ کے بولی۔ "مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں کہ اس کے سامنے جاتی اور کہتی کہ کبیر خان صاحب اُدھر گئے ہیں تم ان سے ضرور مل لینا... آتے ہی ہوں گے۔"

میں ہنس پڑا۔ "چلو چھوڑو... پھر آجائے گا اگر کوئی ملاقاتی ہوا۔ تمھارا یا میرا۔"

"مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا... تم کو مجھے اس طرح چھوڑ کے نہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ شکایت کے انداز میں بولی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ... یہ وہی عورت بول رہی ہے... جو میرے دشمنوں کے ساتھ ایک خطرناک مشن پر جاسوسی کرنے کے لیے آئی تھی... جو قاتلوں اور بدمعاشوں کے ساتھ پھرتی تھی... اور رہتی تھی... قتل و خونریزی کے معمولات کی عادی تھی اور خود ایک زبردست ایجنٹ تھی۔" میں نے کہا۔

"تم خود کیوں ڈر گئے تھے... مجھے نہ پاکے..." وہ بولی۔

"وہ... میں کچھ اور سمجھا تھا..." میں نے سر کھجا کے کہا۔

"سمجھا تھا کہ میں بھاگ گئی... تمھیں اُلو بنا کے۔ جھوٹ بول کے؟"

"ہاں... جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں یہی سمجھا تھا۔"

"مگر تم گئے کہاں تھے... اور کیوں گئے تھے؟"

"تم تو بے ہوش ہو کے لیٹ گئی تھیں... جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا... میں ڈنر لے کر آیا ہوں۔" میں نے پوٹلی اُٹھا کے کہا۔ "آؤ..."

"کہاں سے؟" وہ بولی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔

"جوئندہ یابندہ..." میں نے کہا۔

"مجھے فارسی کیا اُردو بھی نہیں آتی۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تلاش کرنے سے کیا نہیں ملتا... مجھے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ایک گاؤں مل گیا۔ وہاں ایک لالچی آدمی مل گیا... اس سے سب کچھ مل گیا۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک تو خیر بالکل نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر تم لائے کیا ہو؟"

"خالص قدرتی خوراک جو میرے آباواجداد کو میسر تھی۔" میں نے پوٹلی کھول کے کہا۔ "خالص مکھن... خالص گڑ... خالص گندم کی روٹی اور خالص پانی..."

"تم کھالو گے یہ سب؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"کھانا تو پڑے گا..." میں نے کہا۔ "ورنہ بھوک میں تو نہ نیند آئے گی اور نہ عقل کام کرے گی... مگر کاش...!"

"کاش کیا؟" وہ پانی کا ڈول اُٹھا کے بولی۔

"کاش اس وقت کوئی فرشتہ نمودار ہو کے پوچھے کہ اپنی ایک خواہش بیان کرو..." میں نے کہا۔ "تو میں کہوں کہ ایک مگ کافی... ویری بلیک اینڈ ویری ہاٹ... اینڈ تھینک یو ویری مچ فرشتے..."

وہ ہنس پڑی۔ اس نے ڈول سے دو گھونٹ پانی پی لیا تھا۔ "فرض کرو ایسا ہو جائے... میں فرشتہ تو نہیں۔"

"ہاں... فرشتے غالباً مذکر ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم واقعی کچھ نہیں کھاؤ گی؟ مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔"

"میں چائے بناتی ہوں۔" اس نے کہا۔

میں خاصی رفتار سے کھانے لگا تھا۔ ان الفاظ کا مفہوم چند سیکنڈ بعد واضح ہوا تو میرا ہاتھ رُک گیا اور ایک نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا۔

"کیا کہا تم نے... کیا بنانے کی بات کی؟" میں نے لقمہ نیچے اتارنے کے لیے ڈول سے مُنہ لگا کے پانی پیا۔ "میرے کانوں نے غلط سُنا۔"

"تم نے ٹھیک سنا... کافی تو نہیں مگر چائے مل سکتی ہے۔" وہ بولی۔

"کیسے مل سکتی ہے... جادو سے؟ یا تم وائرلیس پر پیغام دو گی کہیں؟"

"اسٹیشن ویگن میں ایک ہفتے کا ڈرائی راشن رہتا ہے... تم نے دیکھا نہیں؟" وہ بولی۔ "ایمرجنسی میں چار آدمی پورا ہفتہ گزار سکتے ہیں۔"

"وہ ڈرائی راشن... جو فوجیوں کو میدانِ جنگ کے لیے ملتا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے تم نے دیکھا ہے۔"

"دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی کچھ چیزیں دیکھی تھیں۔" میں نے کہا۔ "ان میں چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک ڈبیا کھولتے ہوئے پانی میں ڈالو اور ایک کپ چائے تیار... کیا یہ بھی ویسی ہی چیز ہے... خیر جیسی بھی ہے... تم لے آؤ۔"

"تم بیٹھو میرے ساتھ۔" وہ بولی۔

اسٹیشن ویگن کے پیچھے والے حصے میں سیٹ کے نیچے ایک باکس سا تھا... اگر میں اسے دیکھتا تو شاید ٹول باکس سمجھتا جس میں گاڑی کی مرمت میں کام آنے والے اوزار رکھے جاتے ہیں لیکن اس کے اندر سے موہنی نے کئی پیکٹ نکال لیے۔ گیٹ کھلنے سے اندر چھت میں لگی ہوئی لائٹ روشن ہوگئی تھی۔ اس ناکافی سی روشنی میں چند چیزیں میں نے پہچان لیں... ایک تو شہد جیسے بسکٹ تھے... مجھے نہیں معلوم کہ یہ بسکٹ کس چیز سے بنائے جاتے ہیں لیکن ان میں کیلوریز بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک بسکٹ چوبیس گھنٹے کے لیے غذا اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ آدھا بسکٹ پورے کھانے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ سخت ٹھوس اور بے ذائقہ ہوتا ہے۔ میں نے کسی فوجی سے لے کر چکھا تھا اور بہت مشکل سے چبا پایا تھا... اس سے مجھے پیٹ بھر جانے کا احساس ہوا تھا۔

باکس میں ایسے بسکٹ پیکٹ کی صورت میں رکھے ہوئے تھے اور ایک ایک درجن والے چھ پیکٹ خوراک کا کافی ذخیرہ سمجھے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹی بیگس تھے... سوکھا دودھ چائے بنانے کے لیے... کنڈنس کیے ہوئے دودھ کے پیکٹ تھے۔ چینی کی جگہ سوڈیکس کی گولیاں تھیں۔ ہر گولی دال کے دانے جتنی چھوٹی تھی... یہ سیکرین تھی جو ذیابیطس کے مریض بھی استعمال کرتے ہیں اور میری معلومات کے مطابق سیکرین کو چینی کے مقابلے سو گنا سے بھی زائد میٹھا کرنے کی صلاحیت حاصل ہے چنانچہ مضر ہونے کے باوجود تجارتی پیمانے پر یہ سستی چیز مٹھاس پیدا کرنے میں چینی کی جگہ عام استعمال کی جاتی ہے۔ ایک ننھی سی گولی ایک چینی کے چمچے کے برابر تھی اور جو ڈبیا موہنی نے مجھے دکھائی اس میں شاید پانچ سو گولیاں ہوں گی۔ باقی حصے میں سگریٹ بھرے ہوئے تھے۔

یہ لاٹری میں نکلنے والا خزانہ تھا۔ اس کی دریافت نے مجھے اتنا ہی خوش کیا جتنا امریکا کی دریافت نے کولمبس کو کیا ہوگا۔ میرا موڈ تھوڑی سی دیر کے لیے بالکل بدل گیا... میں جنگ اور سیاست کے حالات اور ماضی و مستقبل کو بھول کے حال کے لمحۂ گزراں سے وابستہ ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جنگل میں پکنک کی رات ہے اور ہم یہاں صرف ایڈونچر اور مسرت کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس کے اور میرے درمیان بہت فاصلے تھے... وقت کے... سرحدوں کے... عقیدوں کے... رشتوں کے اور جذبوں کے... مگر میرا تھکا ہوا اور دماغ ایک عارضی خوشی کی پناہ کے لیے مچل گیا۔

میں نے بڑے شوق اور انہماک سے جنگل کے درختوں کی ٹہنیاں توڑیں... اس وقت مجھے وہ بات یاد نہیں آئی جو بچپن میں ماں نے کہی تھی کہ درخت بھی جاندار ہوتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں... میں نے سوتے میں ان کو شاخوں سے محروم کر دیا۔

اپنے مطلب اور ضرورت کے مطابق لکڑیاں جمع کر ڈالیں اور جب میں کامیاب ہوگیا تو میں نے اس کینوس کے ٹکڑے کا خیمہ کھڑا کیا۔ اس طرح کہ اگلے حصے میں دو شاخیں آپس میں آٹھ کے ہندسے کی طرح کھڑی کر دیں۔ ایسی ہی دو شاخیں پیچھے تھیں۔ ان کے اوپر ایک لمبی سیدھی شاخ آگئی جس نے دونوں آٹھ کے ہندسوں کی نوک سے رشتہ پیوست کرلیا۔ جب میں نے اس پر کینوس ڈالا تو یہ ایک مخروطی خیمہ بن گیا جو نیچے سے پانچ فٹ چوڑا تھا اور پیچھے آٹھ فٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی بلندی تین فٹ تھی۔

اتنی دیر میں موہنی نے خشک لکڑیاں اکٹھی کرکے پانی والے ڈول کو درخت کی ایک شاخ کے ساتھ باندھ دیا... پتلی سی شاخ اس کے بوجھ سے جھکی تو ڈول زمین سے ایک فٹ اوپر رہ گیا۔ موہنی نے اس کے نیچے لکڑیاں جلانے میں زنانہ مہارت کا مظاہرہ کیا اور آدھے گھنٹے میں آدھا ڈول اُبلتی ہوئی چائے تیار ہوگئی... یہ شاید دس کپ چائے تھی۔ موہنی نے اس میں پندرہ ٹی بیگس ڈال دیے تھے۔ چائے پینے کے لیے وہ پیالہ صاف کیا گیا جس میں مکھن تھا۔ مکھن کو دو روٹیوں کے درمیان پیک کر دیا گیا اور تھوڑی سی اُبلتی ہوئی چائے نے پیالے کی چکنائی صاف کردی۔

جب موہنی نے مجھے چائے کا پیالہ پیش کیا تو میں خیمے کے نیچے کی زمین صاف کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ چائے ہے اور کیا ہے۔" وہ بولی۔

"اسے چائے کہتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "دودھ کے چار اور ڈبے گھول دیے کیا؟... چینی بھی سب ڈال دی ہوگی۔"

"پی کے تو دیکھو۔" موہنی نے خفگی سے کہا۔

"یہ تم پیو..." میں نے کہا۔ "مجھے تو صرف چائے چاہیے۔ اس رات سے زیادہ کالی... سچ سے زیادہ تلخ... نہ دودھ نہ وہ مٹھاس کی گولی..."

"صرف قہوہ پیو گے؟" وہ افسوس سے سر ہلانے لگی۔ "ایسی مزیدار چائے ہے۔"

"مزیدار ہوگی... مگر چائے نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو میں نے نہایت ندیدے پن سے یکے بعد دیگرے دو پیالے حلق میں انڈیلے... میری زبان اور ہونٹ جلے مگر لذت اور سرور کی کیفیت نے مجھے احساس نہ ہونے دیا... عام زنانہ سوچ کے مطابق موہنی کو بھی سخت صدمہ تھا کہ میں یہ کالا زہر پی کے اپنی جان جلا رہا ہوں... میں نے اس کے خیالات بدلنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ کرنل کی جیب سے ملنے والے بیس سگریٹوں کے پیکٹ میں سے پانچ ابھی باقی تھے۔ اس کے بعد مجھے وہی سگریٹ پینے تھے جو اسٹیشن ویگن کے اسٹاک میں تھے۔

ایک گھٹیا برانڈ جو بھارت میں مقبول تھا۔

"تم نے یہ خیمہ لگانے میں بڑی محنت کی۔" موہنی نے اس وقت کہا جب میں دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ سے جلا رہا تھا۔

"ہاں... مجھے فضول محنت کی عادت ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔" میں فرشِ خاک پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

وہ مجھ سے دو فٹ دُور بیٹھی ہوئی تھی۔ "سونے کے لیے گاڑی تھی۔"

"نیند کے بارے میں مشہور ہے کہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو یہاں بھی نہیں آرہی ہے... تم چاہو تو گاڑی میں جا کے سو جاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا...!"

"کیا پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"یہی کہ... میں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ بولی۔ "میں نے اپنوں کا ساتھ کیوں چھوڑا... تم نے موہن کے بارے میں بھی نہیں پوچھا۔"

"موہن؟ تمہارا بھائی۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ... اپنی موہنی کے پاس۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کیا مطلب!" میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

"ملک موہن میرا بھائی ہی تھا..." وہ بولی۔ "تمہیں تو اس کا پورا نام کہاں یاد ہوگا..."

"وہ... ملک موہن... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میرا دماغ سُن ہوگیا۔

"میں تمہیں الزام نہیں دیتی۔" وہ بولی۔ "تم نے وہی کیا جو تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسے بھی موقع ملتا تو وہ تمہیں نہ بخشتا... وہ تمہارا اتنا ہی دشمن تھا جتنا کرنل... یا شرما... شاید اُن سے بھی زیادہ۔"

"تمہیں... اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں؟" میں دم بخود بیٹھا رہا۔

"نہیں... میرے لیے تو وہ بہت پہلے مرگیا تھا۔" وہ اچانک خاموشی سے رونے لگی۔ "کتنی بدنصیب ہوتی ہے وہ بہن جس کا ایک ہی بھائی ہو اور وہ اس کی محبت، شفقت اور جذباتی قربت سے محروم ہو..."

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔" میں نے افسوس سے کہا۔ "وہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"ہاں... مگر وقت بدلا تو اس کی فطرت بھی بدل گئی۔" موہنی نے کہا۔ "کیا تمہیں یاد ہے کہ میرے پتا پنڈت دیانا تھ کیسے آدمی تھے؟"

"وہ انسان تھے... مکمل انسان..." میں نے کہا۔ "نہ ہندو نہ مسلمان..."

"یہی انسانیت پرستی ان کے لیے تباہی کا سبب بنی۔" موہنی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے کہا" انھوں نے فسادات میں تمھارے گھرانے کا ساتھ دیا... وہ کسی اور کو تو نہ بچا سکے مگر تمھیں انھوں نے سال بھر اپنے گھر میں رکھ کے سب کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ وہاں انتہا پسند اور متعصب ہندو اکثریت میں تھے اور ان کی شہ پر غنڈے انھیں دن رات دھمکیاں دیتے تھے کہ اس مسلمان کے بچے کو ہمارے حوالے کر دو۔"

" اچھا... انھوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا۔" میں نے ایک احمقانہ بات کی۔

" تم کو کیسے بتاتے... تم ٹانگ برابر بھی تو نہیں تھے۔" وہ بولی۔

" لیکن ایک بار انھوں نے تم کو میرے ماما کے گھر بھیج دیا تھا، مگر۔"

" تمھارا ماما مجھے یاد ہے... وہ ایک خوفناک، خطرناک اور ہیبت ناک شخص تھا۔" میں نے کہا۔" غالباً بہن کی وجہ سے وہ مجھے رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ خود مجھے شہید کر دیتا۔"

" اسی لیے تم کو واپس بلا لیا گیا تھا۔" موہنی بولی۔" پھر جب چاچا وزیر خان تم کو لے گئے تو ہماری شامت آ گئی... تمھارے زندہ نکل جانے پر وہ سخت تپ اُٹھے تھے اور تمھیں ختم کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے ہمارے خلاف منافقت کی... یہ تک کہا کہ ہم اپنے مذہب سے پھر گئے ہیں اور چوری چھپے مسلمان ہو چکے ہیں۔ موہن کو لڑکوں نے کئی بار مل کے مارا اور کہا کہ تم دوغلے ہو... غدار ہو اور ملیچھ ہو گئے ہو... کیونکہ تم نے ایک ماس خور مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھایا ہے... اور ایک ہی گلاس سے پانی پیا ہے... انھوں نے موہن کے ساتھ بات کرنا چھوڑ دیا... ایک مرتبہ اس کی مار پیٹ اسکول میں ہوئی... کسی بڑے لڑکے نے اعلان کر دیا تھا کہ موہن نے اپنی بہن اس کو دے دی ہے۔ موہن کا مشتعل ہونا جائز تھا مگر شکایت اُلٹی ہوئی اور ماسٹر نے پتاجی کو بلا کے بُرا بھلا کہا۔ پتاجی نے ماسٹر سے کہا کہ آپ طالب علموں میں مذہبی تعصب کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں... بات آگے گئی اور موہن کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد موہن نے اپنا بدلہ لیا۔ وہ رات کو گھر سے سبزی کاٹنے کی چھری لے کر گیا، اور اس لڑکے کو زخمی کر آیا جس نے اُسے بہن کی گالی دی تھی۔ وہ لڑکا اسپتال میں پڑا رہا اور موہن حوالات میں... متعصب اخباروں نے اس خبر کو خوب اُچھالا اور نمک مرچ لگا کے شائع کیا۔ ایک اخبار نے تو یہ لکھ مارا کہ پنڈت دیا ناتھ کی بڑی بیٹی کے کبیر خان سے ناجائز مراسم تھے... تم سوچو ذرا... میں تو موہن سے بھی چھوٹی تھی۔ کسی نے تصدیق تک نہیں کی کہ میری تمھاری عمر کیا تھی... پتاجی کس کس کے خلاف آواز اُٹھاتے یا مقدمے بازی کرتے۔"

" اس کا مطلب ہے انھوں نے تردید بھی نہیں کی؟" میں نے غصے کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔

" نہیں... وہ خود اخبار کے دفتر گئے۔" موہنی بولی۔" اور انھوں نے یہ خبر چھاپنے والے کو مارا... اخبار کا سارا عملہ موجود تھا، سامنے پتاجی نے رپورٹر کا سر پھاڑ دیا... نتیجہ یہ کہ وہ بھی تین مہینے کوئی اپنا ضامن تک نہ ملتا تھا... موہن تو بچ گیا مگر پتاجی کو دو سال کی قید ہوئی۔ اس میں ہمارا سب کچھ تباہ ہو گیا... بک گیا... غنڈے ایک بار مجھے اُٹھا کے لے گئے... ماتاجی کو..."

" اُٹھا کے لے گئے؟" میں بھونچکا رہ گیا۔" کیوں؟"

" غنڈے عورتوں کو کیوں اُٹھا کے لے جاتے ہیں؟" اس نے تلخی سے کہا۔" میں اس وقت چودہ سال کی تھی... ماتاجی تیئس سال کی تھی۔"

" اوہ مائی گاڈ... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" میں نے سر تھام لیا۔

" یہ سب پنڈت دیا ناتھ کی شرافت اور انسانیت پرور فطرت کے باعث ہوا تھا۔" موہنی نے کہا۔" تمھیں خود کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد کا وقت بڑی مصیبت میں گزرا... موہن کو کسی اسکول میں داخلہ نہ ملا۔ وہ اپنے گھر سے، اپنے باپ سے، سارے اخلاقی اقدار سے سب سے متنفر اور برگشتہ ہو گیا... وہ سمجھتا تھا ساری خرابی کے ذمے دار پتاجی ہیں... نہ وہ تمھیں پناہ دیتے اور نہ ہم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے... معلوم نہیں اس کے خیالات میں یہ تبدیلی کیوں آئی۔"

" یہ ایک شکست خوردہ ذہنیت کی علامت تھی۔"

" کچھ بھی سمجھ لو... وہ تمھارے وجود کو ساری نحوست کا سبب سمجھنے لگا۔ اور تمھارا غائبانہ دشمن ہو گیا۔" موہنی نے کہا۔" اس کا اُٹھنا بیٹھنا بھی غلط قسم کے لوگوں میں ہو گیا... جب پتاجی کا انتقال ہوا تو موہن نے رونے کے بجائے خوشی کا اظہار کیا اور یہ طعنہ مارا کہ میں جس باپ کی وجہ سے بچپن میں ہی عورت بن گئی تھی اس پر رو رہی ہوں۔"

" اس میں... ان بدمعاشوں سے بدلہ لینے کی ہمت نہیں تھی؟" میں نے برہمی سے کہا۔" جو اس کی ماں اور بہن کو اُٹھا لے گئے تھے؟"

" ان کے بارے میں... تو دیکھو مجھے نہیں معلوم تھا... کہ وہ کون تھے... اور آج تو میں بات بھی کر سکتی ہوں... ایک وقت تھا میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی۔ اور ماں تو نیم پاگل ہو گئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتی تھی کہ سُن کر مجھے پسینہ آ جاتا تھا۔ اس نے حُرمت کی جس چادر کو اپنی نسوانیت کی ناموس بنا رکھا تھا وہ تار تار ہو گئی تو اس کا احساس ہی مر گیا... باپ کی موت کے بعد موہن نے گھر آنا بھی چھوڑ دیا... ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔"

" کیوں... تمھارا وہ ماما... جو تمھاری ماتاجی کا بھائی تھا، وہ ایک بار آیا تھا... ماتاجی نے پاگل پن میں اس سے جو کچھ کہا... وہ میں بیان نہیں کر سکتی... وہ جان چھڑا کے بھاگ گیا کہ میں ایسی فاحشہ کو اپنے گھر میں کیسے رکھوں... وہ ایک حادثہ تھا جس نے ماں کو فاحشہ کا درجہ دے دیا... وہ فاحشہ نہیں تھی مگر یہ لیبل اس پر لگا دیا گیا... مرتے دم تک وہ اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ اس نے فحاشی کا لفظ بھی نہ سُنا ہوگا... مگر اس حادثے کے بعد وہ انہی لوگوں کی باتیں دہرانے لگی تھی... جو اُسے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ بہت گندی باتیں تھیں لیکن اس کی اپنی باتیں نہیں تھیں... ان لوگوں نے اس کے ذہن کو جلا دیا تھا اور اس کے حافظے میں اپنی غلاظت کے انگارے بھر دیے تھے... وہ یہی انگارے اُگلتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہی... اس تمام عرصے میں موہن ہم سے بالکل لاتعلق ہو گیا... اور تم جانتے ہو ہم نے وہ دن کیسے گزارے؟ تم کہتے ہو کہ میں بزدل اور بے شرم تھی ورنہ مر جاتی... خودکشی کر لیتی لیکن گناہ کے راستے پر نہ چلتی... لیکن مجھے [illegible] کر لے جانے والے زندہ تھے اور میں مر جاتی تو اُن کا کیا بگڑتا۔ انہی جیسے بھیڑیے جب بھیڑ کی نقاب پہن کے ہمدردی کرنے آئے اور انھوں نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان ہاتھوں کو پہچان لیا۔ میں نے ان کی مدد قبول کر لی اور ان سے بدلہ بھی لیتی رہی... میری بے حیائی کو نظر انداز کر دینا... یہ ساری زندگی جو میں نے اب تک گزاری ہے، حیا کے مفہوم سے ناآشنا تھی... میں پہلے تین مہینے مُحلے کے سب سے بڑے بدمعاش کی محبوبہ رہی... اس کے ہاتھوں میں نے دوسرے نمبر کے بدمعاش کو مروا دیا... اور نمبر ایک کے خلاف گواہی دے کر اُسے بھی پھانسی چڑھوا دیا... تیسرا بدمعاش میری خاطر گواہ بنا تھا... اس کا خیال تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا ہے... مجھے بھی حاصل کر سکتا ہے اور سب سے بڑے بدمعاش کا جانشین بھی بن سکتا ہے... اس کی یہ آرزو تو پوری ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی زندگی بھی پوری ہو گئی۔ اس کی لاش ساتویں دن ایک گڑھے سے نکلی... اب میں تفصیل سے کیا بتاؤں... میں نے ایک طوائف سے بدتر زندگی گزاری... طوائف تو صرف پیسے کے لیے ہی خود کو بیچتی ہے نا... میں نے پیسہ بھی لیا اور پیسہ دینے والوں کی جان بھی لی... بالآخر ایک وقت ایسا آ گیا کہ میرے لیے یہ کھیل جاری رکھنا ناممکن ہو گیا اور میری اپنی زندگی خطرے میں پڑ گئی... موہن نے مجھے بروقت خبردار کر دیا کیونکہ اس کا تعلق انہی بدمعاشوں سے تھا... میں فرار ہو کے دلی چلی گئی اور وہاں سال بھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک سفارش کی بنیاد پر نرس بن گئی۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا آبرومندانہ دور شروع ہوا۔ میں نے ایک لیب اسسٹنٹ سے شادی بھی کر لی جس سے میرے دو بچے ہوئے۔ ایک پیدائش کے وقت مر گیا... دوسرا پیدائش کے بعد صرف ایک ماہ زندہ رہا۔ میری زندگی کا یہ دور اب سے تین سال پہلے ختم ہوا۔"

" کیا تمھارا شوہر مر گیا؟" میں نے بے حد دکھی دل کے ساتھ کہا۔

" نہیں... اس نے اپنی بیوی کو مار دیا۔" وہ بولی۔" اس نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم چاہو تو میری ترقی ہو سکتی ہے... میں نے کہا کہ پاگل ہوئے ہو... کیا میں تمھاری افسر ہوں... اس پر وہ بے شرمی سے بولا کہ افسر کیا چیز ہے... میرا افسر تو تمھارے حکم کا غلام ہے... اور میں پھر بھی نہیں سمجھی تو اس نے بتایا کہ اس کا وہ افسر جو اسے ترقی دے کر لیب اسسٹنٹ سے لیبارٹری انچارج بنا سکتا ہے، مجھ پر فریفتہ ہے... چنانچہ میں اس کے پاس جاؤں اور میری ترقی کا حکم نامہ لے کر آؤں۔ میں مجبور ہو گئی... لیکن جب شوہر کی ترقی ہو گئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے اُسے صاف بتا دیا کہ اب میں تمھاری نہیں سب کی بیوی ہوں... جو بھی مجھے خانے پہنچا سکے... اور پھر میں نے اپنی زندگی کو اسی ڈھب سے گزارا۔ آج میں تمھارے سامنے ہوں۔ میں مختلف شہروں اور ہاتھوں سے ہوتی ہوئی اس کرنل تک آ گئی تھی۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں میرا دل خون کے آنسو روتا رہا... اس موہنی کے لیے جو میرے بچپن کی سب سے خوب صورت یاد تھی۔ سب سے زیادہ معصوم اور پاکیزہ جذبوں کی امین اور محبت کے اوّلین بے غرض احساس کی آئینہ دار تھی۔ وہ موہنی زمانے کے ہاتھوں بڑے دُکھ اُٹھا کے مر گئی تھی، اس کی جگہ میرے سامنے دوسری موہنی بیٹھی تھی جو مجھے زمانے کے ہاتھوں اپنی سفاکانہ موت کی کہانی سُنا رہی تھی۔ اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے وزیر خان کا مدفن پھر کھود ڈالا ہے، اس کی لاش کی ہڈیاں نکال کے میرے لیے ایک خالی گڑھا چھوڑ دیا ہے... میں احترام اور عقیدت کے پھول چڑھاؤں تو کہاں... دعا مانگوں تو کس لوحِ مزار کے سرہانے کھڑا ہو کے... موہنی ایک خوب صورت یاد کا مزار تھی۔ اس یاد نے زندگی کے سب سے زیادہ معصوم جذبوں کے پھول کھلا رکھے تھے۔ لیکن نرملا نام کی ایک عورت نے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔ اس نے پھولوں کو راکھ کر دیا تھا اور یادوں کو دُکھ کے لمحوں میں ڈھال دیا تھا۔

" آخر تم کیوں زندہ رہیں موہنی؟" میں نے کہا۔

" کبھی تم نے اپنے آپ سے بھی یہ سوال کیا ہے؟" وہ بولی۔" کیا تمھاری زندگی کبھی ایسے موڑ پر نہیں آئی جب تم موت سے ایک آبرومندانہ سمجھوتا کر سکتے تھے... مگر تم کر نہ سکے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا۔" شاید میں بھی بزدل تھا۔"

" نہیں... ہم بے اختیار لوگ ہیں... مرنا جینا کچھ نہیں جانتے۔" وہ بولی۔

" تم نے کہا تھا کہ... تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

" ہاں... میں تمھارا نام نہیں بھولی تھی۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"صرف نام... نام بھی کیوں یاد رہا تمھیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تو تم بھی جانتے ہو... جب میں ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھتی تھی، تب بھی تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ اس جذبے کو تم کیا نام دو گے جو خود تمھارے دل میں میرے لیے تھا؟" وہ بولی۔

"وہ محبت تو نہیں تھی۔"

"اور... وہ کیا تھا... وہ احساس..." میں نے کہا۔ اور اس احساس پر تو وقت کی آنی گرد پڑ چکی تھی۔

"اب سے تین مہینے قبل میں نے تمھارا نام سُنا۔" وہ بولی۔ "اسی یونٹ میں لوگ تربیت کے لیے بھیجے جاتے تھے... جہاں میری پوسٹنگ تھی... میں نے تمھارا ذکر سُنا... اخباروں کے تراشے دیکھے... تمھاری تصویریں دیکھیں... اور نہ جانے کیوں وہ گرد ہٹنے لگی... میرے جذبات کا پرانا رنگ نمایاں ہونے لگا۔ میں نے اور جستجو کی۔ ... اور پھر مجھے معلوم ہو گیا کہ تم وہی ہو... میں یہ بات کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ تم کون ہو... میں نے تمھارے نام پر اپنا سب کچھ لُٹا دیا تھا... لیکن اپنی مرضی سے نہیں... تمھارا نام پرے کر دیا نے مجھے لوٹا تھا... اس کے باوجود میرے دل میں تمھارے خلاف نفرت نہیں تھی... میں تم سے انتقام لینا نہیں چاہتی تھی... جیسے کہ موہن چاہتا تھا..."

"کیا اُسے بھی پتا چل گیا تھا کہ میں وہی کبیر خان ہوں؟"

"ہاں... اور اسی لیے وہ سامنے آ گیا... اُس نے کچھ پیسے کے لالچ میں اور کچھ تمھاری دشمنی میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جب اس نے اپنے بارے میں بتایا تو اُسے فوراً اس مشن میں شامل کر لیا گیا۔ وہ کبیر خان کو پہچانتا تھا اور اس کا ذاتی دشمن تھا۔ یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میری راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ موہن کے اور میرے درمیان جذباتی دوری ہمیشہ رہی تھی... میں اُس سے نفرت کرتی تھی۔ جب اس نے تمھاری جان لینے کے مشن میں شرکت اختیار کی تو میں بھی نہ رہ سکی... میں نے تمھاری جان بچانے کا مشن اپنا لیا۔"

"صرف اسی اختلاف کے باعث؟"

"نہیں... ایک وجہ اور بھی تھی۔" وہ بولی۔ "میں ایک بار تم سے مل کے تمھیں بتا دینا چاہتی کہ تمھاری موہنی کے ساتھ دنیا نے کیا ظلم کیا تھا۔ اور موہنی نے وہ سب ظلم سہہ کے بھی تم سے نفرت نہیں کی... موہنی اپنے دل کے سامنے بے بس تھی... میں کوئی شریف عورت نہیں ہوں... اسی لیے مجھے موہنی سے نرملا بننا پڑا... موہنی تمھارے لائق تھی۔ نرملا تمھارے جسم کی غلاظت سمیٹنے کے قابل بھی نہیں... مگر میں پھر تمھارے پاس آ گئی ہوں۔"

"ایسا مت کہو موہنی۔" میرا دل آنچ پر رکھے ہوئے کانچ کی طرح تڑخنے لگا۔ "میرے لیے تم وہی ہو... سوچنا مجھے یہ ہے کہ اب تم کو کس طرح ساتھ رکھوں۔"

"تم رابعہ سے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔ "فکر مت کرو... میں اس کی جگہ کبھی نہیں مانگوں گی... میں مانگ بھی نہیں سکتی اور تم دے بھی نہیں سکتے لیکن تمھارا ساتھ دینے والے تو بہت سے دوست ہیں۔ ان میں مجھے بھی شامل کر لو... میں کبھی تمھاری راہ میں حائل نہ ہوں گی... کبھی تمھارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گی... جس طرح چاہو مجھے رکھنا... کبیر خان... میرا جسم... میری جان... سب تمھارے قبضے میں رہے گا..."

"یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو تم...!" میں نے گھبرا کے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے ایک آہٹ سی سُنی۔ کوئی خشک پتوں پر قدم رکھتا آگے آ رہا تھا... میں نے موہنی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پچھلی طرف سے خیمے سے باہر آ گیا۔ قدموں کے وزن سے چرمرا ہونے والے پتوں نے مجھے ہر طرف سے محصور ہونے کا احساس دلایا... ایک نہیں کم سے کم چار آدمی تھے جو چار مختلف سمتوں سے بڑھتے چلے آ رہے تھے... میں ان کے تاریک سایوں کو شاخوں کے پیچھے متحرک بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسٹیشن ویگن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے ان سب کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھا... اب مجھے جنگل میں کھڑی ہوئی اسٹیشن ویگن تک پہنچنا بھی ناممکن محسوس ہو رہا تھا۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اسٹیشن ویگن پر بھی شکاری قابض نہ ہو جائیں۔

تعداد میں چار تھے اور اُن کی پیش قدمی کا انداز ہی ان کے غلط عزائم کی غمازی کرتا تھا۔ وہ سانس روکے پھونک پھونک کر قدم رکھتے انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے اس شکاری کی طرح جو کسی وحشی درندے کی کمین گاہ پر حملہ کرتے ہوئے خود شکار ہونے کے اندیشے میں گرفتار ہو۔

وقت اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں نے اسٹیشن ویگن تک پہنچنے کا خیال چھوڑ دیا۔ میں جان کی بازی لگا کے، ورنہ تو اپنے بارے میں کچھ امید رکھتا مگر موہنی کو ساتھ رکھتے ہوئے ایسی کوشش صریحاً خودکشی کے مترادف محسوس ہوتی تھی۔

میں نے موہنی کو نیچے کھینچ لیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ وہ تیز دھار رکھنے والی خشک گھاس اور کانٹوں کی چُبھن رکھنے والی زمین پر یوں دراز ہوئی کہ اس کا نازک بدن میرے اور ایک بہت بڑے پتھر کے درمیان پھنس گیا۔ خود میں اپنی جگہ سے ایک انچ دُور نہیں سرک سکتا تھا کیونکہ دوسری طرف کو قامت گھنیری جھاڑیوں کا جھنڈ تھا۔

میرے کان جھاڑیوں کے پیچھے نظر نہ آنے والے دشمن کے قدموں کی آہٹ بھی سُن رہے تھے اور وہ سرسراہٹ بھی جو جھاڑیوں کے اندر سے سنائی دینے لگی تھی۔ اس جھنڈ میں سانپوں کے کسی جوڑے کا بسیرا بھی ہو سکتا تھا جن کو ایک انسانی جوڑے کی اپنی خلوت گاہ میں

دخل اندازی نے مشتعل کر دیا ہو۔

"اُف... میرا تو جسم چِھل گیا۔" موہنی نے بل کھا کے کہا۔ میں نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "جب تک ہم خود انھیں اپنی موجودگی کی خبر نہیں دیں گے، وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"لیکن... اس وقت تک میری کھال اُدھڑ جائے گی۔" وہ کسمسا کے بولی۔

"یہ لوگ تمھاری کھال کھینچ لیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر انھوں نے تمھیں یہاں میرے ساتھ دیکھ لیا۔"

"یہاں تو کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"اور کیا ہاتھی گھوڑے ہوں گے۔" میں نے مذاق میں کہا۔ "اگر میرا اندازہ ہے یہاں تو سانپ بچھو بھی ہو سکتے ہیں تو وہ چیخ [illegible]"

"اُف... یہ کیا چیز رینگ رہی ہے... میری ٹانگوں پر..."

"میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے کہا۔ "بس چند منٹ کی بات ہے۔"

"میری گردن پر کسی چیز نے کاٹا ہے۔" وہ دہشت زدہ ہو کے بولی۔

"پلیز... حوصلہ رکھو... اس وقت ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ ہلنا جُلنا بند کرو..."

"ہلنے کی جگہ بھی کہاں ہے۔" وہ بولی۔ "مگر کیا سانس بھی نہ لوں۔"

یہاں دشمن کی نگاہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن میں ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ہماری جستجو میں آگے آتے تو میں ان کو آسانی سے نشانہ نہ بنا سکتا تھا۔ مجھے خود کو اور موہنی کو ہی نہیں بچانا تھا، اسٹیشن ویگن کی حفاظت بھی کرنی تھی۔

وہ لوگ اب اس عارضی کیمپ تک آ گئے تھے جہاں چند منٹ پہلے ہم دونوں جنگل میں منگل منا رہے تھے۔ فضا یکلخت فائروں کی آواز سے دہل اُٹھی۔ پرندے آشیانوں سے چلاتے ہوئے اُڑے اور تاریکی میں درختوں کے درمیان گشت کرنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کم سے کم دو افراد نے بیک وقت خیمے پر اپنے ریوالور خالی کر دیے ہیں۔ موہنی کانپنے لگی... اس کے جسم کی لرزش میرے جسم میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔

"وہ یہاں نہیں ہیں سر۔" کسی نے کہا۔

"اندر جا کے دیکھو۔" یہ دوسری آواز تحکمانہ تھی۔ "لیکن احتیاط سے... ایک آگے سے جاؤ... دوسرا پیچھے کی طرف سے دیکھے۔"

میں نے شاخوں کے ٹوٹنے کی آواز سُنی... یقیناً انھوں نے کینوس کے ٹکڑے کو کھینچ کر خیمہ گرا دیا تھا۔

"وہ یہاں تھے سر۔" یہ تیسری آواز تھی۔

"مگر اب نہیں ہیں سر۔" چوتھے نے تصدیق کی۔

"وہ جا چکے ہیں..."

"مگر اتنے کم وقت میں وہ زیادہ دُور نہیں جا سکتے۔" دوسرا بولا۔ "تم دونوں دائیں بائیں جاؤ... ایک شمال کی طرف، دوسرا جنوب کی طرف... زیادہ دُور نہیں جانا ہے... بس ایک فرلانگ تک دیکھو اور پھر واپس اسی جگہ پہنچو۔ اپنی ڈائرکشن کا خیال رکھنا... کہیں یہ نہ ہو کہ راستہ بھول جاؤ... ہم ساری رات کسی ایک کی واپسی کے انتظار میں نہیں گزار سکتے۔"

اس کی آواز کرخت اور درشت تھی... وہ اپنے ماتحتوں پر غلاموں کی طرح حکم چلانے کا عادی معلوم ہوتا تھا اور کوئی چھوٹا موٹا سر پھرا فوجی افسر لگتا تھا... اس کی آواز کو غور سے سُننے کے باوجود میں شناخت نہ کر سکا۔ میرے ذہن میں سیکڑوں ہزاروں جانی پہچانی آوازیں ایسے محفوظ تھیں جیسے کسی لائبریری میں کتابیں رکھی رہتی ہیں مگر میں عام آدمی کی طرح مشکل سے سو آوازوں کے چہرے تصور کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ باقی آوازیں لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور کے نہاں خانوں میں بند تھیں اور انھیں حوالوں کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

"میرے لیے کوئی حکم تو نہیں سر۔" یہ پہلا شخص تھا۔ اس کے سر کہنے کے انداز میں طنز آمیز تلخی محسوس ہوتی تھی۔

دوسرا شخص ہنسا۔ "کم آن بوائے... ایک سگریٹ دو مجھے... تم اور میں اکیلے ہوں تو افسری ماتحتی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے... وی کین بی گڈ فرینڈز..."

"نو سر... یہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"اب اور تب کیا..." پہلے شخص نے غالباً سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "تم کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ... میں نے تم کو بلیک میل کیا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس کو میری بیٹی نے پسند کیا ہے... اُسے میں بھی پسند کر سکتا ہوں یا نہیں... اور اسی لیے میں نے تمھارا نام دیا تھا... جب مجھے اپنی ٹیم کے انتخاب کا حق ملا تھا... میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا ہونے والا داماد ایک نااہل... بزدل اور ... غیر عملی شخص ہو... تمھارے بارے میں یہ مشہور تھا کہ تم ایک آئیڈیلسٹ ہو... خیالوں کی جنت کے تصور میں گُم رہنے والے احمق ... ادب اور موسیقی اور یہ سب ویلیوز... یہ خراب چیزیں نہیں ہیں۔ لیکن آدمی کی کمزوری بن جائیں... خصوصاً ایک فوجی کی... تو یقیناً قابلِ نفرت ہیں..."

میں ان کی گفتگو سے پریشان ہونے لگا تھا... جنگل میں ایک فرلانگ جانے اور واپس آنے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت بھی کم تھا لیکن میرے اور موہنی کے لیے یوں ایک گھنٹے تک تکلیف دہ حالت میں پڑے رہنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ جھاڑیوں میں پھر سرسراہٹ ہو رہی تھی اور موہنی شکایت کر رہی تھی کہ اس کی پُشت میں نوکیلے پتھروں کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کانٹے پیوست ہو گئے ہیں تو جائز تھی۔ اچانک اس نے کروٹ لی اور اوپر آ گئی...... جسمانی اذیت کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کے بعد موہنی کے ذہن میں نجات کی اور کوئی آسان صورت نہیں آئی۔ پہلے بھی میں مجبور تھا، اب زیادہ مجبور ہو گیا... میں اُسے اٹھا کے نیچے نہیں پھینک سکتا تھا۔ ایک طرح سے یہ میرے لیے بھی پہلے سے بہتر پوزیشن تھی۔ اس کے وزن کے نیچے سانس لینا زیادہ آسان تھا۔

اب میں اس قابل بھی ہو گیا تھا کہ اپنا ہاتھ اپنی جیب تک لے جا سکوں۔ سابقہ پوزیشن میں دشمن کے سامنے آتے ہی مجھے ایک دم اُٹھنے کے بعد ریوالور نکالنے کا موقع ملتا۔

"اب میں اُٹھتی ہوں۔" موہنی نے سر میرے کان کے قریب لا کے سرگوشی کی تو اس کے بال میرے چہرے پر آ گئے... "پھر تم بھی اُٹھ جانا..."

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ موہنی نے پوزیشن بدلنے کے لیے سوچا تھا تو ٹھیک ہی سوچا تھا۔

"حالانکہ دل تو نہیں چاہتا۔" اُس نے میرے دوسرے کان کی طرف سر لا کے شوخ لہجے میں کہا۔ "مگر خیر..." اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے اُٹھ گئی... میں نے دل ہی دل میں اُسے ایک گالی دی۔ یہ تو تسمہ پا بن گئی ہے... میرے دونوں دشمن بحث میں اُلجھ گئے تھے۔

"میں منافقت پسند نہیں کرتا..."

"ہم سب منافق ہیں... حالات اور ضروریات کو بہانہ بنا کے اپنے سچ بدلتے رہتے ہیں۔"

"لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں... مجھے نفرت ہے جنگ سے۔" یہ وہی نوجوان تھا جو دوسرے شخص کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا...

"ہر جنگ ایک امن کا پیش خیمہ ہوتی ہے... جارحیت کا ارتکاب کرنے والے کو ختم کرنا پڑتا ہے... بالآخر ایسا وقت آ جاتا ہے جب کوئی بھی جارحیت کی ہمت نہیں کرتا..."

"یہ فیصلہ کون کرے گا کہ جارحیت کا مرتکب کون ہوا... اور اس کے لیے اصول... آپ کے ہوں گے یا فریقِ ثانی کے؟"

"شٹ اپ... کیا تم ثابت کر رہے ہو کہ تم وہی احمق آئیڈیلسٹ ہو... اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ میری زندگی میں تمہارے لیے میری بیٹی سے شادی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔"

"آپ کی زندگی میں؟" نوجوان تلخی سے ہنسا۔ "یہ مجھے معلوم تھا۔"

"میں یہ بدنام کرنے والا طعنہ نہیں سنوں گا ینگ مین کہ میری بیٹی ایک ایسے شخص کی بیوی ہے... جس نے فوج میں آ کے غلطی کی تھی۔ میں کبھی اپنے مستقبل میں شرمندگی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"میں آپ کو سرخرو کروں گا... اپنی بہادری کی تمام جھوٹی اور مبالغہ آمیز روایتی داستانوں کے ساتھ... آپ کی یہ زندگی ایک قابلِ فخر اختتام کو پہنچ جائے گی۔"

"واٹ... واٹ از دِس... تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"نو سر... جیسا کہ آپ نے کہا... اور میں نے بھی سمجھا... یہ آپ کی زندگی تھی جو ہمارے درمیان حائل تھی... اور آئندہ بھی رہتی... اس کو ممکن بنانے کے لیے میرے پاس یہی سب سے اچھا موقع ہے۔"

"تم... مار دو گے مجھے... تمہارا کورٹ مارشل ہو جائے گا..."

وہ پھر ہنسا: "میری شادی ہو جائے گی... آپ کی بیٹی کے ساتھ... بہت آسانی سے... عزت سے... دھوم دھام سے... شاید وہ آپ کو مِس کرے گی... کچھ روئے گی... مگر تین مہینے بعد وہ دلہن بنی... اور آپ کی تصویر کے سامنے... اس تصویر کے فریم کو میں بھی بڑی عقیدت سے ہار پہناؤں گا... کیونکہ ہو گیا شیشہ ایک مہان سپوت تھا اس بھارت دیش کا... جو دشمن کی سرزمین پر بہادری کے ساتھ مارا گیا... گولی کا زخم اس کے سینے پر تھا... بھاگنے والوں کی طرح پیٹھ پر نہیں تھا... اُسے بھارت سرکار نے مرنے کے بعد ایک اور اعزاز دیا تھا... میں ایک ایسی کہانی بیان کروں گا کہ وہ اعزاز دینے پر مجبور ہوں گے۔"

"سنو... ایسا مت کہو... فار گاڈ سیک... میں وعدہ کرتا ہوں کہ..." وہ چلّایا مگر اس کی آواز ایک فائر کی گونج میں دب کے رہ گئی... ڈراما ختم ہو گیا۔ پھر وہ گرا تو جنگل کے باسی جو دم سادھے آخری منظر میں گم تھے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گئے۔ انہی میں ہم دونوں بھی شامل تھے۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ موہنی نے آخری بات کیا کہی تھی اور کب کہی تھی... وہ خود بھی بھول چکی تھی کہ اُس نے جگہ بدلتے ہوئے کیا کہا تھا جو پرندے پہلے ہونے والی فائرنگ پر احتجاج کر کے آشیانوں میں لوٹ گئے تھے وہ اب پھر چلّا رہے تھے۔

اسی وقت میں نے اچانک جھاڑیوں سے گھبرا کے نکل آنے والے سانپ کو دیکھا۔ موہنی نے ایک چیخ ماری... یہ ایک غیر ارادی فعل تھا مگر اس کی یہ حماقت ہم دونوں کی جان لے سکتی تھی۔ فرار ہونے والا سانپ پلٹ کے مجھے ڈس سکتا تھا اور وہ احمق آئیڈیلسٹ جس نے ابھی ابھی اپنی محبت پر اپنے فرض کو قربان کیا تھا موہنی کو شوٹ کر سکتا تھا۔ اس کے لیے کسی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنا کورٹ مارشل میں قتلِ عمد کے لیے سزائے موت پانے کے مترادف تھا۔

میں نے بھی جو کچھ کیا وہ ذہن کے خودکار عمل کا نتیجہ تھا۔ میں نے موہنی کو پیچھے اُچھال دیا اور خود قلابازی کھا کے ... آگے گیا۔ وہ گولی جو موہنی کی چیخ کا نشانہ لے کر چلائی گئی تھی اپنے ٹارگٹ پر رہی اگر ہم وہیں ہوتے تو ہمیں مِس نہ کرتی... گولی چلانے والا اناڑی بہرحال نہیں تھا۔

اگلی جست نے جو میں نے آگے گر کے ہی لی تھی مجھے اس شخص کے سامنے ... دیا۔ یہ میری خوش قسمتی یا اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ ایک لمحہ جو فیصلہ کن تھا اور جس پر ہم ایک ساتھ جھپٹے تھے میری

گرفت میں آ گیا کیونکہ اسی لمحے کے ایک حصّے میں میرے دشمن کی نظر اپنے دوسرے دشمن کی طرف ہو گئی تھی۔ اس نے تیزی سے ایک سانپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور فیصلہ نہ کر سکا کہ پہلے کسے نشانہ بنائے مجھے یا سانپ کو... یہ فیصلہ میں نے کر لیا... میں نے ایڑی پہ گھوم کے جھکتے ہوئے خود کو بچایا اور دائیں ٹانگ سے اس کی کمر پر وار کیا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا۔ اُس وقت وہ خود بھی پلٹ کے مجھ پر فائر کرنے والا تھا... لات پڑتے ہی اس کا توازن بگڑ گیا... سانپ راستہ کاٹ کے ... رہا تھا کہ وہ سانپ کے راستے میں مُنہ کے بل گرا اور سانپ نے ... ایک چیخ نکلی مگر اس نے زندگی کی لڑائی لڑنے کو جاری رکھا۔ اس نے سانپ کو ایک ہاتھ سے جھٹک کر دُور پھینکا اور کروٹ لے کر اُٹھنے لگا۔ سانپ کتنا ہی زہریلا ہو اس کے کاٹنے سے آدمی فوراً ہلاک نہیں ہوتا۔ یہ بات وہ بھی سمجھتا ہوگا کہ سب سانپ زہریلے نہیں ہوتے... یہ ہو سکتا تھا کہ سانپ کے زہر سے وہ ہلاک نہ ہو... مگر دوسرا دشمن سانپ سے زیادہ خطرناک تھا... وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔

مگر میں نے اُسے کچھ کرنے نہیں دیا۔ میں نے اس کی کلائی پہ اپنا پاؤں رکھ کے اپنے جسم کا وزن ڈال دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے مجھے کھینچ کر گرانا چاہا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کے جھٹکا دیا تو اس کا بازو کندھے سے اُتر گیا۔

"ریوالور چھوڑ دو..." میں نے کہا۔ "ورنہ تمہاری کلائی ٹوٹ جائے گی۔ اس نے ریوالور چھوڑ دیا۔ موہنی جو میرے پیچھے آ گئی تھی آگے بڑھی اور اس نے ریوالور اُٹھا کے مجھے تھما دیا۔ میں نے زمین پر بے بس پڑے ہوئے نوجوان کو آزاد کر دیا۔ وہ شکل سے بیس سال کا لگتا تھا۔ اس کی اصل عمر تیس سال بھی ہو سکتی تھی مگر کچھ دانا چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو لڑکپن کے نقوش برقرار رکھتے ہیں اور عمر میں اضافے کے باوجود ان کی صورت پر بھولپن باقی رہتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور اپنا دایاں شانہ دبانے لگا۔ ایک سوال اس کی آنکھوں میں صاف پڑھا جا سکتا تھا لیکن میں نے اس کا جواب دینے میں وقت ضائع نہیں کیا... مجھے اندیشہ تھا کہ یکے بعد دیگرے ہونے والے فائروں کی آواز سن کر وہ دونوں یقیناً پلٹے ہوں گے جو جنگل میں مجھے تلاش کرنے نکلے تھے۔

"ادھر چلو..." میں نے اُسے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔ اس نے سر ہلایا اور کسی تذبذب کے بغیر چل پڑا۔

میں نے ریوالور موہنی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "اسے چٹان کے پیچھے لے جاؤ... لیکن اس بات کا خیال رکھنا..."

"میں ہر بات کا خیال رکھ سکتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اگر اس نے پلٹ کے بھی دیکھا تو میں اس کے ریوالور کی گولی سے اسی کا سر اُڑا دوں گی..."

"میں تمہارے تجربے اور تمہاری مہارت پر بھروسا کرتا ہوں... لیکن..."

"لیکن مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔ "کیوں؟"

"وجہ تم جانتی ہو..." میں نے کہا۔ "وفاداریاں بدلنے والے کسی کا اعتماد فوراً حاصل نہیں کر سکتے۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ میری ساری وفاداریاں میری مجبوریاں تھیں۔" وہ برہمی سے بولی۔ اُس نے اچانک ریوالور سیدھا کیا۔

"ٹھہرو... یہ کیا کر رہی ہو...؟" میں نے کہا۔

"ثبوت فراہم کر رہی ہوں اپنی وفا کا..." وہ بولی اور اس نے نوجوان پر گولی چلا دی۔

نوجوان شاید اندازہ کر چکا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی چھٹی حس پر بھروسا کرتے ہوئے غوطہ مارا اور زمین پر گر گیا۔ گولی اس کے شانے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"بے وقوف!" میں نے چلّا کے کہا۔

"کیا یہ گولی میں تم پر نہیں چلا سکتی تھی؟" موہنی نے بھی چلّا کے کہا۔ "آخر میں کیسے یقین دلاؤں تمہیں کہ میں نرملا نہیں ہوں... میں پہلے بھی موہنی تھی جس پر نرملا نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے اس نرملا کو مار دیا اور اب پھر موہنی ہوں... اور صرف تمہارے ساتھ ہوں... میں نے سب کا ساتھ چھوڑا ہے تو تمہارے لیے... میں اپنے بھائی کے قاتل کے ساتھ ہوں تو کیوں؟ یہ کیوں نہیں سوچتے تم؟"

"آئی ایم سوری... چلو تم اسے لے جاؤ..." میں نے نرمی سے کہا۔ "میں آتا ہوں۔"

"تمہیں اب یہاں کیا کام ہے؟"

"میں باقی دونوں سے بھی نمٹ لوں۔" میں نے کہا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔"

وہ اسی وقت آ گئے۔ موہنی اپنے قیدی کو ہینڈز اَپ کرا کے لے جا چکی تھی کہ ایک فائر ہوا۔ میں نے ایک دل خراش 'ہائے' بلند کی اور جست لگا کے چٹان کی اوٹ میں ہو گیا... میری چال کامیاب رہی۔ گولی چلانے والا ایک دم سامنے آ گیا... اسے یقین آ گیا تھا کہ اس کی گولی نے میرا کام تمام کر دیا ہے۔ پھر اس کی نگاہ نے اپنے باس کی لاش کو دیکھی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس خیال سے کہ غلط فہمی میں اس نے ہی باس کو گولی ماردی ہے۔ اس نے جھک کر دیکھا اور کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ افسر اس کی گولی سے ہلاک نہیں ہوا تھا... گولی کا نشان عین افسر کے دل پر تھا اور اس زخم سے خون نہیں بہہ رہا تھا۔

اس نے ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے چاروں طرف گھوم کے دیکھا۔ پھر اس کی نظر چٹان پر ٹھہر گئی... وہ سمجھ گیا کہ اس کا دشمن اگر چھپے گا تو اسی چٹان کے پیچھے... اسی وقت کسی اُڑنے والے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کیبر نے میری گردن پر جھٹکا مارا۔ میرے حلق سے تو آواز نہیں نکلی تھی لیکن بے اختیار میرے جسم نے جھٹکا لیا تھا اور میرا ہاتھ گردن پر گیا تھا۔ اس نے یہ خفیف سی حرکت محسوس کر لی اور فائر کر دیا۔ گولی میرے چہرے کے سامنے پتھر پر لگی اور سنگریزے میرے منہ پر کانٹوں کی طرح چبھے۔۔۔ میں نے جوابی فائر کیا اور اپنے دشمن کو اچھل کر زمین پر گرتے دیکھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف سے بے خبر نہیں تھا مگر وہ اپنے ساتھی کی نسبت چالاک ثابت ہوا۔ وہ میرے پیچھے سے آیا اور اس نے فائر کیے بغیر مجھے دبوچنے کے لیے جست لگائی۔ میں اپنے اوپر اچانک آپڑنے والے وزن کو نہ سنبھال سکا اور نیچے گرا۔ وہ میرے اوپر آیا اور اس نے ریوالور میرے سر میں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ وہ ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا اور پہلوانی کے فن سے آشنا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس نے مجھے یوں چت کیا تھا جیسے ہم دونوں اکھاڑے میں ہوں۔

میں نے ضرب سے بچنے کے لیے سر کو جھٹکا۔ اس کے باوجود ریوالور کا دستہ میری پیشانی پر لگا۔ جو تارے مجھے دن میں نظر آتے وہ آسمان پر پہلے ہی روشن تھے۔ میں نے ان کی چمک کو ماند پڑتے محسوس کیا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ اس پہاڑ جیسے شخص کو اچھال دوں۔ اگر ہوش و حواس ساتھ دیتے تو یہ کام مشکل نہ تھا، وہ ایک جھٹکے میں اوپر اٹھتا اور میرے پاؤں اسے پیچھے پھینک دیتے لیکن اب میرے جسم کا ہر عضو ذرا سی دیر کے لیے ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کر لی جو میرے سینے پر سوار تھا۔ اس نے میرے دونوں بازو اپنی دونوں ٹانگوں کو موڑ کر دبا رکھے تھے۔

اب اس نے میرے گلے کو اپنے بڑے بڑے گوریلے کے پنجوں جیسے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے اپنے جنون آمیز اشتعال کا اظہار بھی کیا اور میرے سر کو زمین پر پٹخنے لگا۔

ستارے ڈوب گئے اور میں نے اپنی سانس کو سینے میں رکتا ہوا محسوس کیا۔ ہوا کی نالی بند ہو گئی تھی اور میرے پھیپھڑے جیسے پھٹنے والے تھے۔ خالی ہاتھوں سے لڑنے کے فن کی ساری مہارت دھری رہ گئی تھی۔ ایک اناڑی کے ہاتھوں ایک کھلاڑی کو شکست ہونے لگی تھی۔ ریوالور جو میرے ہاتھ میں تھا نہ جانے کہاں گر چکا تھا۔ آخری خیال جس نے میرے احساس سے گزر کیا یہ تھا کہ میں مر رہا ہوں اور میرے لیے وہ سب بے معنی ہو رہا ہے جو زندگی سے مشروط تھا۔۔۔ رابعہ کا عشق۔۔۔ حسرتِ تعمیر۔۔۔ جدوجہد اور بے تعبیر خوابوں کا سفر۔۔۔ پھر میں مر گیا۔

مجھے مرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ میں اور کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا میرے نزدیک احساس سے بیگانگی کا نام ہی موت تھا۔ مگر کیا احساس مر گیا ہے؟ جو مر جائے وہ تو کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں۔۔۔ اس خیال نے مجھے پھر زندگی دی۔ چند لمحے یقین کی خوشی میں گزرے اور یہ خوشی میرے جسم میں قوت کی لہر کو جارح کرنے لگی۔۔۔ پھر مجھے ستارے نظر آنے لگے اور میرے کانوں نے ایک آواز سنی، یہ موہنی کی آواز تھی۔

"کبیر۔۔۔ ہوش میں آؤ۔" اس کے ہاتھ میرے گالوں کو تھپتھپا رہے تھے۔ مجھ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑے تو مجھے ایک دم ہوش آ گیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ وہ شخص جو میرا گلا گھونٹ رہا تھا، میرے قریب ہی اُلٹا پڑا ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے مر گیا؟" میں نے ایک ہاتھ سے گردن کی مالش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔۔۔!" موہنی نے کہا۔

"اسے تم نے نہیں مارا!" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کیا گولی تم نے نہیں چلائی تھی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کی لاش کو پلٹ کے دیکھا۔ وہ سجدہ کرنے کے انداز میں زمین پر ماتھا ٹیکے پڑا تھا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو مجھے اس کی پیشانی سے بہنے والا خون نظر آیا جو اب تک جنگل کی سوکھی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کا ریوالور بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اس میں ایک بھی گولی کم نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ بعید از قیاس بات تھی کہ اس نے خود کو گولی مار لی ہو۔ شکست کھا کر مغلوب ہو جانے والا دشمن تو ایسا کر سکتا ہے لیکن وہ مجھ پر غالب تھا اور اس کے ذہن میں صرف مجھے ہلاک کر دینے کا خیال تھا۔

میں نے یہ دوسرا ریوالور بھی موہنی کو تھما دیا۔ یہ روسی ساخت کا اسلحہ تھا جو اب تک ہمارے ہاتھ لگا تھا یا ہم نے تباہ کیا تھا۔ اپنا ریوالور مجھے تلاش کرنے پر چٹان کے قریب ایک جھاڑی میں اٹکا ہوا ملا۔

اس دوسرے شخص کی موت کا معما حل کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ جس پر میں نے چٹان کی اوٹ سے فائر کیا تھا۔ مجھے تصدیق کا موقع نہیں ملا تھا کہ میں قریب جا کے اس کی موت کا یقین کرتا۔ گولی لگتے ہی وہ اچھلا تھا اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسی وقت دوسرا شخص مجھ پر آ گرا تھا۔

اب لاشوں کی پوزیشن دیکھ کر میں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ پہلے جس شخص کو گولی لگی تھی، وہ فوراً نہیں مرا تھا۔ وہ مہلک طور پر زخمی ہوا تھا اور اس میں کچھ جان باقی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کھینچتا ہوا دس بارہ فٹ لے گیا۔ اس کے بعد شاید وہ حوصلہ ہار گیا۔ اس نے چٹان کے سامنے مجھے اور اپنے ساتھی کو اوپر نیچے دیکھا۔ جنگل میں یوں بھی گھپ اندھیرا تھا اور خود اس کی آنکھوں میں موت کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں نے اُسے دھوکا دیا۔ اس نے مجھے غالب فریق سمجھ کر گولی چلا دی جو اس کے اپنے ساتھی کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہونے سے ایسا ہوا، تاہم اس میں کوئی شبہے کی بات نہیں تھی کہ اسی نے گولی چلا کے مجھے بچا لیا۔ گولی نہ موہنی نے چلائی تھی اور نہ میں نے، تو صاف ظاہر تھا کہ کسی تیسرے شخص نے چلائی تھی۔ تیسرے شخص کا خیال آتے ہی میرا ذہن اس نوجوان کی طرف گیا جسے موہنی لے گئی تھی۔

"موہنی۔۔۔ تم نے اسے کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے کہا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے تو اُسے نہیں چھوڑا۔" موہنی نے سر جھکا کے مجرم لہجے میں کہا۔ "وہ خود ہی چھوڑ گیا مجھے۔۔۔"

"کیا مطلب؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ بھاگ گیا۔" موہنی نے تنک کر کہا۔

"کیسے بھاگ گیا۔۔۔؟" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "جبکہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں تھا۔"

"اُس نے۔۔۔ اُس نے دھکا دیا مجھے۔۔۔"

"دھکا دیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "آگے تم تھیں یا وہ تھا؟"

"آگے چلتے چلتے وہ ایک دم آتی تیزی سے پیچھے آیا۔۔۔ چند فٹ کا ہی فاصلہ تو تھا۔۔۔" موہنی سہم کر بولی۔ "کہ میں بچ نہ سکی۔۔۔ اگر وہ آگے بھاگتا۔۔۔ تو میں اُسے نہ جانے دیتی۔۔۔ میں بالکل تیار تھی اور اُسے گولی مار دیتی۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟ اگر تم کہنا چاہتے ہو کہ میں نے اُسے جان بوجھ کر فرار ہونے کا موقع فراہم کیا ہے تو۔۔۔؟"

"تو کیا۔۔۔ مجھے گولی مار دو گی؟"

"میں خود کو گولی مار لوں گی۔" وہ چلا کے بولی۔ "جب میں اُسے گولی مارنے والی تھی تو تم نے مجھے روک دیا تھا۔۔۔ اس کا فائدہ اُٹھا لیا اُس نے۔۔۔ تو میرا کیا قصور ہے۔۔۔؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم عورت ذات ہو۔۔۔ ناقص العقل اور ناقابلِ اعتبار۔۔۔ اور میرا قصور یہ ہے کہ میں نے تم کو ایک ایسی ذمّہ داری سونپ دی جس کی تم اہل نہ تھیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "اب لاؤ یہ دونوں ریوالور مجھے دے دو۔۔۔ ورنہ تم واقعی گولی مار لوگی خود کو۔۔۔ اس لیے کہ تم احمق ہو۔۔۔ دماغ سے نہیں، دل سے سوچتی ہو۔"

وہ ہسٹریا کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔۔۔ میرے ہاتھوں کی سخت گرفت میں وہ بَل کھانے لگی۔ "چھوڑو میرا ہاتھ۔۔۔ وحشی۔۔۔ جنگلی۔۔۔ کیا کلائی توڑ دو گے میری؟"

"ضرورت پڑنے پر میں تمہاری گردن بھی توڑ دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ابھی کیوں نہیں توڑ دیتے۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی کو مسلتے ہوئے کہا۔ "لو۔۔۔ مارو ایک ہاتھ اور جاؤ۔۔۔ تمہارے گلے پڑ گئی ہوں نا میں۔۔۔ زبردستی میں نہیں کر سکتی۔۔۔ زبردست تم ہو۔۔۔ میں ایک ناقص العقل عورت بچپن سے جوانی تک تمہاری یاد کو دل سے نہ نکال سکی۔۔۔ بائیس سال سفر میں رہی۔۔۔ ساری سرحدیں عبور کر کے یہاں پہنچی۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کسی اور سے پیار کرتے ہو۔۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے اور تمہارے درمیان وقت، مذہب، معاشرے اور جذبات کے فاصلوں کی بہت سی دیواریں ہیں۔ بے وقوفی کی تھی میں نے۔۔۔ تم بہت عقل مند ہو۔۔۔ ختم کرو میرا یہ دیوانے پن کا سفر۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"آئی ایم سوری۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ یہ رسمی الفاظ مت دُہراؤ بار بار۔۔۔ کل تم پھر کہو گے کہ میں بھروسے کے قابل نہیں۔۔۔ الفاظ سے نہیں کہو گے تو رویے سے بتاؤ گے کہ میں ناقابلِ قبول ہوں۔۔۔ کیونکہ میں ہندو ہوں اور تم مسلمان ہو۔۔۔ میں بھارتی ہوں اور تم پاکستانی۔۔۔ میں نرملا ہوں اور تم سکندر ہو۔۔۔ وہ موہنی جس سے کبیر نے کچھ کہا تھا۔۔۔ وہ مر گئی۔۔۔ بہت پہلے۔۔۔"

"کیا کہا تھا؟" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"تمہیں یاد نہیں۔۔۔ تو یاد دلانے سے فائدہ؟" وہ آنسو پونچھ کے بولی۔

"مجھے یاد ہے۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ موہنی جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو تم سے بیاہ کروں گا۔" میں نے کہا۔ جو سو فیصد جھوٹ تھا۔۔۔ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید میں نے ایسی ہی بات کی ہوگی۔

"تمہیں یاد ہے؟" موہنی نے رونا بھول کے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "اور۔۔۔ تم کو یاد ہے میرا جواب؟"

"ہاں بابا، سب یاد ہے۔۔۔" میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "مگر یہ کون سا وقت ہے ان باتوں کو یاد کرنے کا۔۔۔ اور دُہرانے کا۔۔۔ اور پھر وہ بچپن کی بات تھی۔۔۔ اب ہم بچے تو نہیں ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ہم ہمیشہ بچے کیسے رہ سکتے تھے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "بچپن کی وہ بات یاد دلانے کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ میں تم سے کچھ مانگ رہی ہوں۔۔۔ یا میں چاہتی ہوں کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو۔۔۔ میں تو اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ میرا وہ حق بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اور اب میرے پاس بھی تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔۔۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، اس لیے میں نے بتا دیا تھا کہ میں اپنی شرافت کو بھی نیلام کرتی رہی ہوں۔۔۔ اور میرا جسم بھی میرا نہیں۔۔۔ مگر میرا احساس تو وہی ہے۔۔۔"

"پلیز موہنی۔۔۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔۔۔" میں نے کہا۔ "ہمیں پہلے یہاں سے نکلنا چاہیے۔۔۔ ابھی تو یہ چار آئے تھے۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے پیچھے آٹھ دوسرے آ جائیں۔۔۔ آخر یہ لوگ کیسے آ پہنچے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تھے یہاں.. ظاہر ہے وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں... ممکن ہے تمہیں انھوں نے مرنے والوں میں شمار کر لیا ہو... لیکن وہ جانتے ہیں کہ میں اسٹیشن ویگن سے نکل گیا... وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ٹریننگ کیمپ کو میں نے تباہ کیا تھا... وہ اس کا بدلہ ضرور لیں گے۔"

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ وقتی طور پر میں نے اس کے جذبات کے دھارے کا رُخ بدل دیا تھا، مگر آئندہ کے لیے میں خود بے یقینی کا شکار تھا۔ میں موہنی کو کس طرح اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ اور میں اس کو ساتھ نہ رکھنے کے لیے کیا کروں گا؟ یہ پہلے سوال سے زیادہ مشکل سوال تھا۔ اب میں اُسے دشمن ملک کی ایجنٹ نرملا سمجھ کے گولی نہیں مار سکتا تھا۔ اُسے پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وقت گزر چکا تھا۔ جب میں ایسا کر سکتا تھا۔ اب وہ مجھے میرے بچپن کی یادوں کے حوالے سے یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو چکی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک بھولا بسرا تعلق ضرور ہے۔ میں اُسے کس طرح دشمن سمجھ سکتا تھا جبکہ وہ میرے محسن کی بیٹی تھی۔ پنڈت دیانا تھ ہندو ضرور تھا مگر اس نے میری جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں اپنی جان گروی رکھ دی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے مستقبل کو قربان کر کے میرے مستقبل کو تحفظ فراہم کیا تھا۔ میں اس کا مقروض تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں موہنی کو وہ قرض مع سود کیسے ادا کروں گا... مجھے اس سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں تھی جبکہ وہ کھُل کے کہہ چکی تھی کہ اس کے دل نے کبھی مجھے اور میری چاہت کو فراموش نہیں کیا تھا اور جیسے سرحد پار کرتے والے قافلے راہ میں لُٹ جاتے ہیں ایسے ہی مجھ تک پہنچتے ہوئے وہ بھی لُٹی تھی... مگر اس نے اپنا سفر جاری رکھا تھا اور سب کچھ لُٹا کے بالآخر اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب رہی تھی... مگر کیا ملا اُسے منزل پا کے؟

لاشوں کی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے میں نے بہت کچھ سوچا اور سوچوں کے جال میں اُلجھنے کے باوجود سوچتا رہا۔ کسی لاش کی جیب میں سے مجھے کچھ نہیں ملا... ایسے لوگ اپنی شناخت کا سامان نہیں لیے پھرتے... وہ تو اپنی شناخت کے سارے سُراغ مٹا کے آگے جاتے ہیں۔

"اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔" میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟" موہنی نے پوچھا۔

"وقت... سوا بارہ۔" میں نے کلائی کی گھڑی کو آسمان کی طرف گھما کے تاروں کی مدّھم روشنی میں چمکنے والے ڈائل کو دیکھا۔

"ابھی تو صبح دُور ہے۔" موہنی نے کہا۔ "ہم چار پانچ گھنٹے آرام کر سکتے ہیں۔"

میں نے سر ہلایا اور موہنی کے ساتھ چل پڑا... لاشوں کو دفن کرنے یا ٹھکانے لگانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ...

چھوڑنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ دن کا اُجالا پھیلنے کے بعد ان کے ساتھی یا گاؤں والے انھیں اٹھا لیں گے اور نہیں اُٹھائیں گے تو جانور کھا لیں گے... مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کو گڑھا کھود کے دفن کروں، میرا دماغ بھی ماؤف ہو رہا تھا اور اس سے میرے فیصلے بھی متاثر ہوئی تھی... میں خود بھی چاہتا تھا کہ سو جاؤں تاکہ صبح تک میرا دماغ تازہ ہو۔

اسٹیشن ویگن اس پہاڑی نما چٹان کے پیچھے کھڑی تھی...

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ سونے کی صورت کیا ہو گی... سوتے ہوئے ... ہو سکتا تھا لیکن میری حالت ایسی تھی کہ میں جاگ نہیں سکتا تھا۔

"تم پیچھے سو جاؤ۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تم بھی پیچھے سو سکتے ہو۔" وہ بولی۔

"میں آگے سو رہا ہوں... ڈرائیور کی سیٹ پر۔"

"سارا اسلحہ سیٹ کے نیچے رکھ لینا۔" وہ تلخی سے بولی ... کی چابیاں محفوظ رکھنا اور دروازے اندر سے لاک کر لینا۔"

"تم سمجھتی ہو میں ڈرتا ہوں تم سے؟" میں نے کہا۔

"تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔" وہ بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہی ... اس نے کہا تھا۔ میرا ذہن اب اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ کسی ... کے معاملے میں جذباتی عملیت کا مظاہرہ کرے، یا احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکے... میں نے اس کے بُرا ماننے کی پروا نہیں کی ... کو مقفل کر کے سو گیا... اب جو ہو سو ہو... میں نے آنکھیں بند کر کے خود سے کہا۔ موہنی فرار ہوتی ہے تو فرار ہو جائے۔ اتنا ضرور ہے ... گاڑی لے کر فرار نہیں ہو سکتی اور مجھے قتل کر کے فرار نہیں ہو ... وہ باہر سے دروازہ نہیں کھول سکتی۔

بہت دیر تک میں گہری نیند کی آرزو اور جاگتے رہنے کی ضرورت کی کش مکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف جسم کو چند گھنٹوں کے لیے سکون اور آرام کے وقفے کی طلب تھی تاکہ وہ اپنی تھکن اتارے اور آئندہ کے لیے توانائی کا تھوڑا بہت ذخیرہ کرے۔ دوسری طرف خطرات کے حصار سے نامعلوم اندیشے پکارتے تھے کہ جاگتے رہو ... بہت سی باتیں دل اور دماغ کے درمیان تصفیہ طلب تھیں۔

موہنی کی مجھ سے جذباتی وابستگی سمجھ میں آتی تھی۔ ایسی ہی وابستگی نے رابعہ کو بھی میری منزلوں کی راہ میں شریکِ سفر کر دیا تھا۔ یہ بات ... میں نہیں آتی تھی کہ موہنی کو نرملا بن کے وہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی، جو اس نے کیا تھا۔ اسے اگر میری جستجو تھی تو وہ کسی بھی وقت سرحد عبور کر کے پاکستان آ سکتی تھی۔ دونوں ملکوں کے لوگ اپنے اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے قاعدے اور ضابطے کے مطابق بھی آتے جاتے رہتے تھے اور چوری چھپے بھی اسمگل کیے جاتے تھے۔ ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو کے یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے آرزو مند مسلمانوں کا تناسب زیادہ تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کا۔ وہ سب والدین جو ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصب کے باعث اپنی لڑکیوں کے مستقبل کو غیر محفوظ سمجھتے تھے یا اچھے رشتوں سے مایوس تھے، وہ پاکستان کے ویزے بنوا کے اپنی لڑکیوں کو حقیقی رشتے داروں کے پاس بھیج دیتے تھے اور وہ اُن کے گھروں میں روپوش رہتی تھیں اور شادی کے بعد ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا کہ اُن کے پاس پاکستانی شہریت ہے یا نہیں۔ اگر موہنی چاہتی تو ایک غلط نام پتے سے پاسپورٹ بنوا کے کسی بھی بہانے پاکستان پہنچ سکتی تھی اور پھر مجھے تلاش کر سکتی تھی۔ اگر اس کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ وہ رابعہ اور محسن کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی تھی تو پھر اس کے لیے مجھے تلاش کر لینا بھی ناممکن نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایک مشکل راستہ اختیار کیا تھا اور اب اپنے لیے دُہری مشکلات پیدا کر لی تھیں۔ ایک طرف وہ اپنوں کی نظر میں غداری کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی تو دوسری طرف بھی اس کے لیے اعتبار حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ میں اپنے جذبات کو الگ رکھتے ہوئے غیر جانبداری سے سوچتا تو اس پر بھروسا نہ کرتا۔ اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دوسرے لوگ، محسن اور غالب اور اس جدّوجہد میں شریک ساتھی میرے اقدام کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

مدن موہن اور موہنی کے درمیان نظریاتی اختلاف بھی سمجھ میں آتا تھا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اس اختلاف کے باوجود ایک ہی مشن میں یکجا کیسے ہوئے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل کے خلاف کسی قسم کے جذباتی ردِّعمل میں مبتلا نہ ہو... انتقام لینے اور اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ اس کو حسبِ سابق چاہتی رہے۔

بلاشبہ ابھی تک موہنی نے اپنے قول و فعل سے یہی ثابت کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے اور اس کے سچ پر شبہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا مگر ایک خیال کبھی کبھی سارے شکوک کا سرچشمہ بن جاتا تھا۔ کہیں یہ سب اس کی لمبی چال نہ ہو۔ وہ عورت ہے جو خوب صورت بھی ہو اور ذہین بھی... بے باک بھی ہو اور بے حیا بھی تو وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہے اور سب کچھ کر سکتی ہے کہیں موہنی بھی وہ دام ہم رنگِ زمیں تو نہیں پھیلا رہی ہے جو میری نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مقصد صرف میری ذات تک رسائی نہ ہو۔ اس نے میری ذات کو ایک وسیلہ بنا لیا ہو اور میرا اعتماد حاصل کرنے کا مقصد میرے مشن کو سبوتاژ کرنا ہو... ہمارے پلان... ہمارے عزائم... ہمارے طریقِ کار اور ہمارے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جان ... کے بعد وہ غائب ہو جائے اور اپنی ہائی کمان کو پوری رپورٹ پیش کر دے۔ ایک کامیاب اور تجربہ کار ایجنٹ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے دشمن کے کیمپ میں چلا جائے۔ وہاں اپنی ذہانت سے با اعتماد ساتھی شمار ہونے لگے اور سارے راز جان لے اور دشمن کو اچھی طرح بے وقوف بنانے کے بعد اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے ... ہے۔

ابھی تک موہنی نے متعدد مواقع پر یہ ثابت کیا تھا کہ وہ میری خاطر جسم اور جان دونوں قربان کر سکتی ہے لیکن مجھے اس سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی... یہ ہو سکتا تھا کہ دشمن کی انٹیلی جنس سروس کے اعلیٰ حکام نے میرے اور موہنی کے درمیان بچپن کے جذباتی رشتے کا سراغ لگا لیا ہو اور پھر فیصلہ کیا ہو کہ موہنی کو میرے خلاف میری کمزوری بنا کے استعمال کیا جائے۔ اعلیٰ سطح پر ایسے وسیلے بہت مؤثر سمجھے جاتے ہیں۔ موہنی اگر خود راضی نہ ہوتی تو اُسے دباؤ ڈال کے بھی راضی کیا جا سکتا تھا۔ لالچ کا حربہ ناکام ہو جائے تو خطرناک نتائج کی دھمکی کام کر جاتی ہے۔ اگر موہنی کو بلا کے کہا گیا ہو کہ دیکھو لڑکی... تم اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہو... تم اس کے بچپن کی ساتھی ہو اور ہماری معلومات کے مطابق تمہارے گھرانے کے سب افراد نے تقسیم کے بعد اُسے بچایا تھا اور پاکستان پہنچانے میں اس کی مدد کی تھی۔ اب تم جاؤ اور اُسے قابو کرو... اس کے ذریعے تمام کارآمد معلومات حاصل کرو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے ماں باپ کی اور بھائی کی خیر نہیں... وہ تمہاری کامیابی تک نظر بند رہیں گے اور ہمارے رحم و کرم پر ہوں گے... تم نے غداری کی یا کمزوری دکھائی تو سزا انھیں ملے گی۔ ہمارے آدمی وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ قائم کرتے رہیں گے۔

اگر ان سب باتوں کو مدِّنظر رکھا جاتا تو بہت سے امکانات کے دروازے کھُل جاتے تھے۔ مثلاً کرنل سے اس کے تعلق کی کہانی جھوٹی ہو سکتی تھی۔ اس کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات جھوٹے ہو سکتے تھے۔ مجھے یہ واقعات سنانے کا مقصد مجھ پر احسان کے قرض کا بار لادنا ہو سکتا تھا... اب تو میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ میرے محسن کی بیٹی ہے جس کا سارا خاندان میری وجہ سے تباہ ہوا... لیکن میرے پاس تصدیق کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں معلوم کر سکتا کہ کیا واقعی ایسا ہوا تھا... اور مدن موہن واقعی اس کا بھائی تھا یا محض اس جھوٹے ڈرامے کا ایک کردار...

انہی مثبت اور منفی خیالوں کی کش مکش میں بھٹکتا ہوا میں نہ جانے کس وقت نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ یہ نیند بھی مکمل بے خبری اور بے ہوشی کی نیند نہیں تھی۔ میرا جسم سو رہا تھا... شعور بھی خوابیدہ تھا لیکن لاشعور کے خوف جاگ رہے تھے اور خطرے کا الارم بجا کے بیدار کرنے کی ڈیوٹی پر مامور پہرے دار بہت مستعد تھے۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ بے سبب کھُل گئی۔ ابھی میرے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چاروں طرف جنگل میں رات کا اندھیرا محیط تھا۔ خاموشی کو صرف ان گیدڑوں کی چیخ و پکار مجروح کر رہی تھی جو شاید بھوکے تھے اور بہت دور سے چلا رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی میں نے کسی کتے کو بھی بھونکتے سنا تھا۔ کیا وہ خواب تھا؟ نہیں... میں کوئی خواب بھی نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ مجھے یاد آجاتا کہ خواب کیا تھا... پھر کیا گاؤں کی طرف سے کوئی کتا بھٹکتا ہوا آگیا تھا؟ کتے آبادیوں میں یا ان کے قریب رہتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں نہیں بھٹکتے پھرتے۔

دروازہ کھول کے میں نیچے اترا۔ ایک فوری تپال کے تحت میں نے اسٹیشن ویگن کا پیچھے والا دروازہ اوپر اٹھایا۔ اندر ایک لائٹ جل گئی۔ اس کی مدھم روشنی میں میری آنکھوں نے دونوں لمبی سیٹوں کو دیکھا جو خالی تھیں۔ ان میں سے ایک پر موہنی کو ہونا چاہیے تھا لیکن وہ غائب تھی۔

میں نے اندر داخل ہو کے باقی اسباب کو چیک کیا۔ سارا اسلحہ تو میں نے آگے ہی رکھا تھا لیکن پیچھے وہ سوٹ کیس تھے جن میں کرنسی بھری ہوئی تھی۔ موہنی کے کپڑے تھے اور وہ سب دستاویزات تھیں جو میں نے قبضے میں کر لی تھیں۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی۔

میں واپس نیچے اتر آیا... مجھے یقین آنے لگا تھا کہ موہنی فرار ہوگئی... اس کے بارے میں میرے اندیشے سچ ثابت ہوئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک کیوں رکی ہوئی تھی؟ وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اگر اس کا مشن یہی تھا کہ وہ مجھ سے معلومات حاصل کرے۔ ہمارے ٹھکانوں کے بارے میں اکر ساتھیوں کے متعلق اور ہمارے مستقبل کے پلان کے متعلق... تو ابھی تک میں نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا... وہ مشن کو ادھورا چھوڑ کے کیوں چلی گئی... حالانکہ اس کی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہو چلے تھے... اگر اس کا مقصد صرف مجھے ٹھکانے لگانا تھا تو اس نے متعدد مواقع کیوں ضائع کیے... کیا اس کا حوصلہ ساتھ چھوڑ گیا۔ اس کے جذبات نے عقل کو بے بس کر دیا... وہ اپنے ارادوں کے سامنے کمزور پڑ گئی، میرے سامنے آنے کے بعد وہ سب کچھ نہ کر سکی جو وہ کرنا چاہتی تھی؟

میں نے اسے بیس پچیس گز کے دائرے میں دیکھا کہ شاید وہ کسی ضرورت کو رفع کرنے کے لیے اتری ہو۔ میں نے اسے آوازیں بھی دیں مگر مجھے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تین لاشیں اسی طرح خاک بسر پڑی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے چوتھے آدمی کا خیال آیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ خود موہنی نے اسے فرار ہو جانے کا موقع دیا ہو؟

اپنی کمزوری پر مجھے تاؤ آنے لگا۔ آخر میں نے اسے اتنی ڈھیل ہی کیوں دی؟ کیوں سنی اس کی بات؟ مجھ پر لازم تھا کہ اس چوتھے آدمی کو اسی طرح گولی مار دیتا، جس طرح اس نے اپنی محبوبہ کے باپ کو ماری تھی... اس نے ایک معمولی سے مقصد کے لیے یعنی صرف ایک عورت کو حاصل کرنے کے لیے ایک قتل کر ڈالا۔ اپنے افسر کو خود ہی حالت جنگ میں مار دیا۔ پھر میں نے اسے کیوں بخشا؟ اب وہ لوٹ کر جائے گا تو میرے بارے میں تفصیلی رپورٹ دے گا... موہنی کی کامیابی کی رپورٹ دے گا کہ اس نے کتنی ہوشیاری سے کبیر خان عرف سکندر بخت پر اپنا جادو چلا دیا تھا... اور دشمن زیادہ طاقت کے ساتھ نئے شکاری بھیج دیں گے۔ ایک ٹریننگ کیمپ کی تباہی سے سبق حاصل کریں گے اور دوسرا ایسے ہی مقامات پر سب کو چوکس کر دیں گے۔

میں واپس اسٹیشن ویگن تک آیا اور اپنی جذباتی کم عقلی اور کوتاہ بینی پر کڑھتا ہوا پھر سیٹ پر دراز ہوگیا... موہنی کے فرار پر میرے ذہن کے لیے تسکین کا صرف ایک پہلو تھا کہ وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکی اور مجھ سے کچھ معلوم نہ کر سکی۔ اگر وہ ساتھ رہتی تو نہ جانے میں اسے کتنی رعایت دیتا اور اس پر کتنا اعتماد کرتا... شاید میں اسے ساتھ رکھتا اور وہ بہت کچھ جان لیتی۔ میں ممکنہ نقصانات سے بچ جانے پر مطمئن تھا۔ اسے ساتھ رکھنا ایک خطرناک ذمے داری بن جاتی۔ اب میں سبکدوش تھا اور کسی اندیشے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی کے بعد دو گھنٹے آرام سے سونے کا فیصلہ کیا... مجھے خیال ضرور آیا کہ موہنی کے فرار ہونے کے بعد میرے لیے اپنے قیام کو طول دینا خطرناک بھی ہو سکتا ہے اور مجھے بھی فوراً نکل جانا چاہیے تاکہ وہ خود کسی اور کے ساتھ آئے تو اسے مایوسی ہو۔ لیکن رات کے وقت مجھے راستے سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اور یہ خیال بھی تھا کہ کہیں میں خود دشمن کے حصار میں نہ پہنچ جاؤں۔

خود کو خدا کی حفاظت میں دے کر میں نے پھر سونے کا تہیہ کیا اور اس ارادے میں کامیاب بھی رہا۔ نیند کے اس دوسرے دور میں مجھے ایک خواب نے بہلایا۔ خواب میں کچھ عجیب سا منظر تھا۔ میرے سامنے سرسوں کے کھیت تھے۔ زرد پھولوں کے شوخ رنگ میں سے موجیں سی اٹھ رہی تھیں۔ پس منظر میں گہرا نیلا آسمان تھا... یہ آسمان بھی ہوا سے لہرانے لگا۔ جیسے کسی نے آسمانی جارجٹ کا دوپٹہ سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلا دیا ہو... سرسوں کے پھول اڑ اڑ کر ہوا پر جمنے لگے تھے کہ ایک لڑکی آئی اس نے یہ آنچل اپنے سر پر ڈال لیا۔ پہلے میں نے اسے پیچھے سے دیکھا تھا مگر اچانک اس نے اپنا رخ سامنے کیا تو میں رابعہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا... وہ مجھے دیکھ کر ادا سے مسکرائی اور کہنے لگی... کیا تم راستے سے بھٹک گئے ہو۔ سکندر اور میں نے کہا کہ کس راستے کی بات کرتی ہو... میں اور تم ایک ہی راستے پر تو چل رہے ہیں... وہ پلٹ کر جانے کو تھی کہ میں نے اسے آواز دے کر پوچھا... رابعہ! تمھاری وہ ساری کہاں ہے جس کے نیلے رنگ میں زرد پھولوں کا گلشن تھا... اور وہ آنچل لہرا کے بولی... تمھارے سامنے تو ہے... آسمان کو دیکھو اور زمین کو دیکھو... اور ابھی میں دم بخود تھا کہ وہ غائب ہوگئی... وہ نیلا آسمان اور سرسوں کے پھول سب غائب ہوگئے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ میرے چاروں طرف صبح پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر آسمان زیادہ روشن تھا۔ نیچے درختوں سے چھن کر آنے والی دھوپ کے دھبے بالکل سفید تھے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو سوا آٹھ بج رہے تھے... میں ضرورت سے زیادہ سوتا رہ گیا تھا... اگر میں چھ بجے اٹھ جاتا تو اب تک اس جنگل سے نکل گیا ہوتا... میرے دائیں ہاتھ پر وہی گاؤں تھا جہاں سے میں گزشتہ رات کھانے پینے کا سامان لایا تھا... اسی سمت میں تھوڑا سا پیچھے دیکھنے پر مجھے آسمان کی طرف اٹھنے والی دھوئیں کی پتلی سی لکیر نظر آئی، یہ غالباً وہی جگہ تھی جہاں سے میں موہنی کے ساتھ فرار ہوا تھا... اگرچہ وہ جگہ کئی میل دور تھی لیکن میں نے یوں محسوس کیا جیسے فضا میں انسانی لاشوں کے جلنے کی بو ہے اور سڑتے ہوئے گوشت کا تعفن ہے... وہ بھی تو موہنی ہی تھی جس کی بوسیدہ اور ایک دن پرانی لاش پر میں مورچہ بنائے کھڑا رہا تھا۔ ناموں کا یوں جڑنا کوئی غیر معمولی اتفاق نہیں تھا۔ کچھ نام بہت عام ہوتے ہیں۔

ایک آہٹ سن کے میں چونکا اور پھر باہر آیا... مجھے یہ آواز اسٹیشن ویگن کے عقبی حصے سے آئی تھی۔ آگے والے کیبن اور پیچھے کے حصے کے درمیان ایک پارٹیشن تھا جو ہر اسٹیشن ویگن میں نہیں ہوتا۔ کسی خاص رازداری کے مقصد کے تحت اس گاڑی میں آگے بیٹھنے والوں کو الگ کر دیا گیا تھا... اس طرح یہ ایک ڈیلیوری وین قسم کی چیز بن گئی تھی۔

پچھلا دروازہ اوپر اٹھاتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ موہنی ایک سیٹ پر سوئی پڑی تھی۔ اس کا ایک بازو سیٹ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ خود الٹی لیٹی ہوئی تھی چنانچہ اس کے بال بھی نیچے جھول رہے تھے اور ایک ریشمی کالے ڈھیر کی صورت میں گاڑی کے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

"موہنی... !" میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کے ہلائی۔ "اے موہنی... !"

"کیا ہے۔" وہ ٹانگ کھینچ کر منمنائی۔

"اٹھو۔" میں نے سیٹ کو بجا کر کہا۔

وہ آہستہ آہستہ اٹھی... اس نے جماہی لے کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر ایک انگڑائی لی۔ اس زہد شکن ادا کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا... رات بھر میں میرے خیالات بہت بدل گئے تھے۔

"بہت دیر ہوگئی۔" وہ بولی۔ "ایسے کیوں گھور رہے ہو؟"

"رات کو تم کہاں تھیں؟" میں نے اس پر نظر جما کے کہا۔

"رات کو تم کہاں تھے؟" وہ بولی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے سختی سے کہا۔

"تم نے کہاں دیکھا تھا؟" وہ بولی۔

"میں نے دیکھا تھا تو تم یہاں نہیں تھیں۔"

وہ نیچے اتر آئی۔ "اس وقت دیکھا ہوگا، جب میں سونے سے پہلے نکلی تھی۔ ٹوائیلٹ واٹر۔"

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔"

"بجے ہوں گے۔" وہ سادگی سے بولی۔ "میرے پاس تو گھڑی نہیں تھی۔"

"میں نے گھڑی دیکھی تھی... تم ساڑھے بارہ ایک کے درمیان سونے گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... مگر میں سوئی نہیں تھی... نیند نہیں آئی تھی بہت دیر تک اور آتی بھی کیسے... تم نے اس ڈبے میں جو بند کر دیا تھا... معلوم نہیں کب تک کروٹیں بدلتی رہی... پھر ضرورت محسوس ہوئی تو پہلے میں نے سوچا کہ تمھیں بھی جگاؤں... ڈر لگتا تھا نیچے اترتے ہوئے... میں نے درمیان کی پارٹیشن کو بجایا بھی تھا لیکن تم جاگے نہیں... تو میں اکیلی چلی گئی۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جھوٹ کے آثار تلاش کرتا رہا۔ اس حد تک وہ درست کہہ رہی تھی کہ ساڑھے تین بجے میں نیند سے جاگا تھا۔ اس سے پہلے میں سو رہا تھا... اور اگر وہ جاگ رہی تھی تو میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"کہاں تک گئی تھیں تم؟" میں نے کہا۔

"ادھر... پندرہ بیس قدم..."

"بے وقوف مت بناؤ مجھے... میں نے ہر طرف دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو؟" وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "جو کہنا ہے صاف کہو... مجھ سے مت کہلواؤ۔"

"دروازہ تو بند تھا؟"

"کیا میں کھلا چھوڑ جاتی؟" وہ تند لہجے میں بولی۔ "تم پہلے کس سمت میں گئے تھے... یاد کرو..."

"یہ ٹھیک ہے کہ... میں نے پہلے مخالف سمت میں دیکھا تھا۔"

"جب تم ادھر تھے تو میں واپس آگئی۔" وہ بولی۔ "اس میں کون سی تفتیش طلب بات ہے... اور یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں کہ تم سچ بول رہی ہو۔"

"کیا میں تمھیں وہ جگہ دکھاؤں؟" وہ مشتعل ہوگئی۔ "وہ مٹی تجزیے کے لیے رکھ لو...!"

میں نے اسے طمانچہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور روک لیا وہ مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں مسکرائی کہ ہمت ہے تو مار کے دیکھو۔ طمانچہ کس کے منہ پر پڑتا ہے... سچ بولنے والے کے یا سچ سننے کی قوت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

برداشت نہ رکھنے والے کے۔

"میں... میں پریشان ہوگیا تھا۔" میں نے فوراً اپنی حکمتِ عملی بدل لی... اگر موہنی کے دل میں وہ نہیں ہے جو اس کی زبان پر ہے تو مجھے دل کی بات جاننے کے لیے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا... وہ مجھے کسی غلط مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے آئی ہے اور میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو مجھے جارحانہ رویّہ اختیار کرنے کے بجائے یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ میں اس کے جال میں پھنس رہا ہوں... اس کے برعکس اگر وہ غلط عزائم نہیں رکھتی تو میرا رویّہ بعد میں کسی پشیمانی کا سبب نہیں بن سکتا۔

"کس بات سے پریشان تھے؟" وہ بولی۔ "یہ سمجھے تھے کہ میں بھاگ گئی... تمہارے دشمنوں کو خبر دینے..."

"بے وقوفی کی بات مت کرو... میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ہر وقت خطرات کے سائے اپنے تعاقب میں نظر آتے ہیں... خصوصاً جو کچھ گزشتہ رات ہوا اس کے بعد... ایک آدمی کا بچ کے نکل جانا اچھا نہیں ہوا۔"

"سچ کہو... تم یہ تو نہیں سمجھے کہ اُسے میں نے بھگا دیا؟"

"اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو اس جرم کی سزا تمہارے لیے بہت سخت ہوتی..." میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلو اب ناراضگی ختم کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟" وہ بولی۔ "چلو..."

"کل رات تو ایک آرزو پوری ہوگئی تھی... مگر ہر دعا میری ہی کیسے قبول ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا اور آگے کا دروازہ کھول دیا۔

"اب کیا مانگتے... اگر ملنے کی امید ہوتی؟" وہ میرے ساتھ بیٹھ کے بولی۔

"چار سلائس... ہاف براؤن... دو انڈے ہاف فرائی... مکھن جام اور کافی کا ایک مگ۔" میں نے کہا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"سب اپنے لیے؟" وہ ہنسی۔

"اور کیا تمہارے لیے... بابا اپنے ناشتے کا انتظام خود کرو..." میں نے کہا، اور انجن کو پھر اسٹارٹ کیا... تیسری کوشش میں انجن رواں ہوگیا۔

"باپو جی نے کبھی ہمیں چائے تک نہیں پینے دی۔" وہ اداس ہوکے بولی۔ "جب تک وہ زندہ رہے، ہم ناشتے میں ایک گلاس دودھ کا پیتے تھے... اب تو کاہلی کا یہ حال ہے کہ آنکھ کھلتے ہی چائے کی طلب ہوتی ہے... دن کا آغاز بیڈ ٹی سے ہوتا ہے... یہاں سے سڑک کتنی دُور ہوگی؟"

"مجھے قطعی اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "دو چار میل تو ہوگی۔"

گاڑی نصف دائرے میں گھوم کے نکلی اور اس جگہ سے دُور ہونے لگی جہاں ایک رات کے قیام نے میری زندگی کو امید کی نئی جہت عطا کی تھی۔ دشمن جو میری تلاش میں میرے پیچھے آئے تھے، مارے گئے اور اب دن کے اُجالے میں مجھے نسبتاً کم خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایک… مجھے اس نوجوان کا خیال پریشان کرتا تھا جو موہنی کے کہنے کے مطابق… دھکا دے کر بھاگ گیا تھا... کیا وہ کسی کو بتائے گا کہ میں کہاں ہوں؟ میں نے اُس کی ساری گفتگو سُنی تھی۔ وہ جنگ کے خلاف تھا اور… مرضی کے بغیر زبردستی یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی زبر… کرنے والے کو قتل کردیا تھا اور اپنی محبت کی راہ میں حائل دیوار… تھی۔ وہ کچھ نہیں کرے گا... وہ سیدھا وہیں لوٹ جائے گا جہاں… کوئی نامعلوم لڑکی اس کی واپسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہو… وہ اپنے جرم پر ایک اچھی سی کہانی کا پردہ ڈالے گا جس سے… سُسر کی آتما تو خیر بہت مشتعل ہوگی۔ مگر اس کی بیٹی کو قرار آجا… کہ پتا جی بڑے بہادر تھے۔ اور حکام کو یقین آجائے گا کہ وہ ا… فرض میں مارا گیا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ احمق آئیڈیلسٹ میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرنے سے گریز کا راستا اختیار کرے گا۔

یہ اسٹیشن ویگن میری پریشانی کی دوسری وجہ تھی۔ مجھے اس میں مجبوراً سفر کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ جنگل میں کسی قسم کے ذرائع نقل و حمل دستیاب نہ تھے۔ میں اکیلا اور خالی ہاتھ تو اس جنگل سے… سکتا تھا لیکن میرے ساتھ اسبابِ سفر میں اسلحہ بھی تھا، مالِ غنیمت بھی اور ایک لڑکی بھی۔ میں کچھ بھی پیچھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا… کسی دوسری گاڑی کا بندوبست ہونے تک اسٹیشن ویگن کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سڑک پر پہنچتے ہی میں اُسے چھوڑ دوں گا۔ یہ گاڑی دشمن کے زیرِ استعمال تھی اور اب ان کی نظریں… کی جستجو کررہی ہوں گی... پیسہ میرے پاس بہت تھا۔ اتنا زیادہ تھا کہ اسے ساتھ لیے پھرنا عقل مندی نہ تھا... میں پکڑا جاتا تو شاید ڈکیتی کے جرم میں دھر لیا جاتا... اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ پیسہ حکومت کے خلاف سازش کے لیے دیا گیا تھا، سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا جائے گا تو میں ساری رقم کسی بھی تھانے میں پہنچا دیتا، یا راہ چلتے آدمی کو دے دیتا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ اتنا پیسہ دیکھ کر بیشتر لوگوں کا ایمان ڈول جائے گا... یہ پیسہ خورد برد ہو جائے گا... اس سے بہتر تھا کہ میں خود ہی اسے آگ لگا دوں۔

سڑک اچانک آگئی... یہ مین روڈ نہیں تھی۔ دیہی سڑک تھی جس پر سفر کرتا ہوا میں دشمن کے ایک خفیہ کیمپ کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ جنگل میں ٹائر پنکچر نہیں ہوا اور گاڑی نے میرا ساتھ دیا۔ دھوپ میں تیزی تھی اور جنگل کے ناہموار خشک راستے پر ڈرائیونگ نے مجھے کچھ تھکا دیا تھا۔ یہ تھکن اس لیے بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ پیٹ خالی تھا۔

[illegible] غلطی کا احساس [illegible] ہوگیا۔ میں نے آسمان پر دھوئیں کی [illegible]

سامنے آگئی تھی۔ دشمن کے علاقے سے دُور جانے کے بجائے میں پھر وہیں جا رہا تھا جہاں سے گزشتہ روز فرار ہوا تھا۔

"لاحول ولا قوۃ..." میں نے گاڑی کو بریک لگائے۔

"کیا ہوگیا؟" موہنی نے چونک کر کہا۔

"ہونا کیا تھا... اُلٹے راستے پر جا رہے تھے۔" میں نے گاڑی کو نصف دائرے میں موڑا۔ "تم نے بھی نہیں روکا۔"

"مجھے... مجھے کیا معلوم۔" موہنی نے کہا۔

مجھے پھر اس پر اعتبار کرنا مشکل ہوگیا... میں تو اس راستے پر پہلی بار آیا تھا اور دائیں کے بجائے بائیں مڑ گیا تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر موہنی تو اس راہ سے آشنا تھی۔ وہ سائیں ڈرائیور کے ساتھ جس اعتماد سے سفر کر رہی تھی اس سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اکثر آتی جاتی رہتی ہے۔ پھر وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس نے میری غلطی کو نوٹ نہیں کیا تھا... تاہم میں نے اس سے کچھ نہ کہنا بہتر سمجھا۔

چار میل کے بعد سڑک سیدھی ہوگئی۔ اوپر درختوں کی شاخیں آپس میں ملتی نظر آتی تھیں اور نیچے تنگ سڑک ایک لمبی سرنگ محسوس ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے۔ کھلیانوں سے فصل اٹھائی جا چکی تھی اور نئی فصل کے لیے زمین تیار کرنے کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ تا حدِ نگاہ ویرانی کا راج تھا۔ صرف ایک جگہ میں نے آبادی کے آثار دیکھے۔ وہ کوئی بہت مختصر سا گاؤں تھا۔ اِکا دُکا کھیت میں مجھے ہل چلانے والے بھی دکھائی دیے اور پیدل چلنے والے بھی جو شاید ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔

اچانک میرے سامنے سڑک کے وسط میں ایک دھبہ سا نمودار ہوا۔ سورج کی چمک نے مجھے کسی آنے والی کار کی خبر دی۔

"اِدھر کون آسکتا ہے؟" میں نے اسٹیئرنگ سنبھال کے کہا۔

"کوئی بھی آسکتا ہے۔" موہنی نے کہا۔ "سڑک سب کے لیے ہے۔"

"کیا تم نے پہلے کبھی غیر متعلق افراد کی گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا؟" میں نے سامنے نظر جما کے کہا۔ "غیر متعلق کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"ہاں... عموماً دیہی لوگ آتے تھے..." موہنی نے کہا۔

"اچھا... تو پھر تیار ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہ وہی لوگ ہوں گے۔"

موہنی کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ "تم... کیا کرو گے؟"

"میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مقابلہ کرنے کے سوا... فرار کے لیے نہ راستہ ہے نہ گنجائش..."

گاڑی اب بہت قریب آچکی تھی... میں ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا... ایک صورت تو یہ ہوسکتی تھی کہ میں رفتار بڑھا دوں اور کار کو ٹکّر مار کے تباہ کرتا ہوا نکل جاؤں۔ اسٹیشن ویگن کے مقابلے میں وہ کار بہت کمزور چیز تھی۔ مگر ایسے حادثے کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل تھا... یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں گاڑی کو نہ سنبھال سکوں اور خود بھی اسی حادثے کا شکار ہو جاؤں... یہ بہت خطرناک فیصلہ ہوتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں گاڑی کو اسی جگہ روک دوں اور مشین گن لے کر سڑک سے دُور کسی نشیبی جگہ پر لیٹ جاؤں مگر میں اکیلا صرف ایک مشین گن سے یہ جنگ کب تک جاری رکھ سکتا تھا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا اس وقت آسان ہوگیا جب میں نے تیزی سے بڑھتی ہوئی گاڑی کو موڑ کاٹ کے رُکتے ہوئے دیکھا... اب وہ کار لمبائی کے رُخ سڑک کو بلاک کیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس جگہ سڑک کے کنارے ایک پُلیا سی بنی ہوئی تھی۔ میں دونوں جانب کی سفید دیوار سے اندازہ کرسکتا تھا کہ میرے لیے سائڈ سے گاڑی نکالنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ گاڑی اب بھی دو فرلانگ دُور تھی کہ میں نے ایک خطرناک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سیٹ کے نیچے سے مشین گن نکال کے قریب رکھ لی۔

"موہنی..." میں نے کہا۔ "دروازہ کھولو... میں رفتار کم کرتا ہوں جیسے ہی کہوں ایک... دو... تین... تم تین پر باہر کود جانا۔"

"چلتی گاڑی سے!" وہ دہشت زدہ ہوکے بولی۔

"ہاں چلتی گاڑی سے۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "ایک... دو... تین۔" موہنی نے دروازہ کھولا اور باہر کود گئی... اس کے پاس سوال جواب کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بریک جام کردیے تھے۔ اور گاڑی کی رفتار گھٹ کر دس میل پر آگئی تھی۔ میں نے اُسے کچّی زمین پر گرتے اور پھر کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رفتار میں اضافہ کیا۔ جب میرے اور کار کے درمیان فاصلہ سو گز سے بھی کم رہ گیا تو میں نے ایک سفید کپڑا ہاتھ میں پکڑ کے کھڑکی سے باہر لہرانا شروع کیا۔ کپڑا بالکل سفید نہیں تھا لیکن میرا مقصد تو صرف ایک پیغام دینا تھا کہ مجھ پر فائرنگ نہ کی جائے۔ میں لڑنے کے ارادے سے نہیں آرہا ہوں۔

وہ کار میں مورچا بند بیٹھے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو جاؤں گا یا مجبور کردیا جاؤں گا۔ اب میں گاڑی کو بھی پہچان رہا تھا... یہ مرسیڈیز تھی... سیاہ رنگ کی اور بالکل نئی... بالکل ویسی ہی جیسی نام کے نواب خسرو جمشید کی ملکیت تھی۔ میرے سفید جھنڈے نے دشمنوں کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہوں گی کہ انھوں نے بہت آسانی سے مجھے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔

گاڑی پچاس گز دُور تھی، جب میں نے ایک ہاتھ سے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ دوسرے ہاتھ سے مشین گن تھامی اور یکلخت اپنے پیر کا سارا دباؤ ایکسیلریٹر پر ڈال دیا... گاڑی کسی وحشی درندے کی طرح جست لگا کے آگے بڑھی۔ اُسی وقت میں دروازے سے کود گیا۔ میں نے خود کو اُڑتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے مشین گن پھینک دی

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور خود کو اس پوزیشن میں کر لیا کہ میں زمین پر گروں تو تصادم کی شدت کو کم سے کم کر لوں۔

زمین پر جسم کے لگتے ہی میں نے آگے کی طرف قلابازی کھائی اور ایک دم اٹھ کے بھاگا... یہ چند سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ پھر میں نے مشین گن کے فائر سنے اور دوبارہ زمین پر گرا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دی... میں پھر اٹھا اور مشین گن کی طرف لپکا... اتنی دیر میں مجھے دو باتوں کا علم ہو چکا تھا... ایک یہ کہ میرے جسم پر خراشیں ضرور آئی ہوں گی۔ مگر خدا کے فضل سے نہ مجھے موچ آئی تھی اور نہ میری کوئی ہڈی ٹوٹی تھی۔ دوسرے یہ کہ گاڑی میری ہاتھوں سے نکلنے کے بعد بھی سیدھی گئی تھی۔ اس کا اسٹیئرنگ سیدھا رہا تھا اور پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی اس کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ انھوں نے گولیاں پاگل ہاتھی کی طرح بڑھتے والی اسٹیشن ویگن کو ماری ہوں گی لیکن وہ خشینی ہاتھی چند سوراخ ہو جانے سے مر نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے آخری وقت میں انھوں نے کار کا دروازہ کھول کے نکل جانا چاہا ہو لیکن اسٹیشن ویگن نے انھیں آلیا۔

مرسیڈیز کو سائڈ سے ٹکر لگی تھی اور اسٹیشن ویگن کے زیادہ مضبوط، بڑے اور باہر نکلے ہوئے بمپر نے سامنے سے ٹکر ماری تھی۔ کار کی باڈی تھی اور اسٹیشن ویگن کا انجن والا حصہ۔ جب میں مشین گن کی طرف لپک رہا تھا تو میں نے دھماکا سنا اور پلٹ کر دیکھا تو مرسیڈیز دو بار الٹنے اور سیدھا ہونے کے بعد پھر الٹ چکی تھی۔ اسٹیشن ویگن ایک بار اسے ٹکر مارنے کے بعد بھی نہیں رکی تھی اور اس سے دوبارہ ٹکرا کے ایک سائڈ پر گر گئی تھی۔

میں مشین گن ہاتھ میں لیے کھڑا ہوا تھا کہ موہنی بھاگتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ ابھی تک میں نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

"تم... تم ٹھیک ہو نا؟" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

میں چونک کر پلٹا۔ "تم... بے وقوف..." میں نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ "مرنا چاہتی ہو... خبردار جو سر بھی اٹھایا۔"

وہ سڑک سے دور مٹی میں جا پڑی اور میں مخالف سمت میں دوڑ کر اس جگہ سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا، جہاں مرسیڈیز کا تباہ شدہ ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ میرے کان ان لوگوں کی آوازیں سن رہے تھے جو پچکی ہوئی کار کے اندر ہی پھنس کر رہ گئے تھے اور شاید چورا چورا ہو گئے تھے۔ اس بات کا بہت ہی کم امکان تھا کہ ان میں سے کوئی بچ سکے... وہ شدید زخمی ہوئے تھے اور بری طرح چلا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ میں کار کے قریب ہوتا گیا... میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان کا سبب یہ تھا کہ کسی گاڑی میں آگ نہیں لگی تھی۔ زخمی ہونے والے اگر باہر نکلنے کے قابل ہوتے تو اب تک نکل آئے ہوتے

لیکن دو بار سائڈ پر الٹ کر سیدھی ہونے والی اور پھر الٹ جانے والی گاڑی کے دروازے اتنے اندر دب چکے تھے کہ اب ان کے کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مرسیڈیز کو بھی سامنے سے ٹکر لگتی تو شاید وہ بچ جاتے۔ کار کا انجن تباہ ہوتا لیکن باڈی محفوظ رہتی... گاڑی کو آڑا کھڑا کر کے انھوں نے خود اپنی موت کا سامان کیا تھا۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اسی طرح رینگتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔

گاڑی کے اندر چار افراد تھے۔ ان میں سے دو کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ وہ مر چکے ہیں... وہ آگے ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھے۔ ان کے ہاتھ پیر ٹوٹ کر کچھ اس انداز سے اسٹیئرنگ وہیل، سیٹوں اور کھڑکیوں کے درمیان پھنس گئے تھے کہ گاڑی کو کاٹے بغیر انھیں نکالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ خون کے دھارے ان کے جسم کے ہر حصے سے پھوٹ رہے تھے اور ان کے بہ نیچے کی جانب سے کھلی آنکھوں میں عبرت کا افسانہ لیے مجھے گھور رہے تھے۔

باقی دو پیچھے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ نواب خسرو جمشید تھا۔ اس کی شیروانی اور طرۂ و کلاہ و دستار سب خون رنگ ہو چکے تھے۔ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھی کی طرح شدید زخمی تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص زیادہ خراب حالت میں تھا اور دم توڑ رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کو کہاں زیادہ چوٹ آئی ہو گی کیونکہ وہ سر سے پیر تک لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔

خود خسرو جمشید سیٹ کے دہرا ہو جانے سے اور دروازوں کے اندر گھس جانے سے اس طرح پھنس چکا تھا کہ میں اسے کسی طرح بھی کھینچ کر باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے دونوں جانب کے دروازوں کو دیکھا کہ شاید کوئی کھولا جا سکے مگر ان کے قبضے تک ٹوٹ چکے تھے اور چیسس کے چرمر ہو جانے کے بعد دروازے بھی ٹوٹ پھوٹ کے اندر گھس گئے تھے۔ میں نے کسی دروازے کو ہاتھ لگا کے کھولنے کی کوشش کا بھی کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ تصادم نے شیشوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور یہ کانچ کے موٹے موٹے دانے چھروں کی طرح اندر بیٹھنے والوں کے جسم کو کاٹتے اور چھیلتے ہوئے گزرے تھے اور ان کی جلد میں پیوست ہو گئے تھے۔

پیچھے کی طرف زمین پر بیٹھ کے میں نے خسرو جمشید کو دیکھا۔ وہ الٹا پھنسا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اوپر دو سیٹوں کے شکنجے میں کسی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ اپنے ہی جسم کے نیچے آ گئے تھے۔ جھٹکے سے یا کرب میں بل کھا کے اس کا جسم گھوم گیا تھا اور میں اس کا لہو آلود چہرہ اس خلا میں دیکھ سکتا تھا، جو ونڈ شیلڈ کے غائب ہو جانے سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی کی پوزیشن بالکل الٹی تھی۔

سر کے بل نیچے گرا تھا اور اس کا سر فرش پر ہی سیٹوں کے درمیان اٹک گیا تھا۔ سینے سے اوپر تک شکستہ دھڑ بھی میری نظروں سے اوجھل تھا۔ اوپر صرف اس کی دونوں ٹانگیں تھیں جو وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ جیسے وہ یوگا کے کسی آسن کے مطابق الٹا ہو کے ہوا میں سائیکل چلانے کی مشق کر رہا ہو... اس کے حلق سے نکلنے والی بھیانک آوازوں کو سن کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے شدید عذاب سے گزر رہا ہے۔

خسرو جمشید کی ناک اور آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید شیشے کے چھرے اس کی آنکھوں میں گھس گئے تھے۔ اب وہ اندھا تھا اور مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"نواب خسرو جمشید..." میں نے اسے آواز دی۔

"کو... کون... کون...؟" وہ بلبلایا۔

"میں سکندر بخت ہوں جمشید..." میں نے کہا۔

"سکندر... سکندر، مجھے نکالو... میری مدد کرو... ورنہ... میں مر جاؤں... گا..." وہ چلانے لگا۔

"میں اکیلا ہوں جمشید... اور خالی ہاتھوں سے تم کو نہیں نکال سکتا..."

"مجھے نکالو... سکندر... خدا کے لیے..." وہ چیخنے لگا۔ "مجھے معاف کر دو... میں مجرم ہوں تمھارا..."

"جمشید... اس وقت کے آنے سے پہلے تم ایسا نہیں سوچتے تھے... اور چند منٹ قبل بھی تمھیں خیال تھا تو صرف مجھے مشین گن سے بھون کر چھلنی کر دینے کا..." میں نے کہا۔ "لیکن تقدیر نے پلک جھپکتے میں تمھارے وجود کو اپنی طاقت کے غرور اور برتری کے زعم کے ساتھ خاک و خون میں ملا دیا۔ اس حالت میں بھی تم میرے دشمن تو ہو... مگر میں تم سے دشمنی نہیں نکال سکتا... دشمن جب زبردست ہو اور اتنا بے بس ہو تو اس پر طاقت آزمائی میں کوئی مردانگی نہیں..."

"سکندر... یہ سب ٹھیک ہے... یہ میرے اعمال کی سزا ہے یا... تمھارے ساتھ... ہونے والے ظلم... کا بدلہ... لیکن اس وقت تم مجھے بچا لو... مجھے مرنے مت دو۔"

"جمشید... یہ میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور کرتا۔" میں نے کہا۔

"تم جھوٹ... بولتے ہو... تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے..." وہ چیخنے لگا... "تم... مجھے نکال سکتے ہو... مگر نکالنا نہیں چاہتے..."

"تم دیکھ نہیں سکتے جمشید کہ تم کس بری طرح پھنسے ہوئے ہو... تمھیں یا تو گاڑی کاٹ کے نکالا جا سکتا ہے یا ٹانگیں کاٹ کے اور یہ دونوں کام میں اکیلا کیسے کر سکتا ہوں... میرے پاس لوہا کاٹنے والی آری تو کیا چھری تک نہیں ہے... اور تمھاری ٹانگیں کاٹ کے نکال لیا جائے تب بھی کیا تم زندہ ہو گے... تمھارا بہت خون بہہ گیا ہے..."

"خدا کے لیے کسی کو... لاؤ... جو تمھاری مدد کرے..."

"سوری جمشید... یہاں میلوں تک کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اس حالت میں تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہو گے۔"

"نہیں... تم بکتے ہو... بھونکتے ہو... میں زندہ رہوں گا... مجھے زندہ رہنے دو سکندر... میری مدد کرو..." وہ پاگلوں کی طرح رونے لگا۔

"یہ سب بے کار ہے۔" میں نے کہا۔ "نہ میرے چاہنے سے کچھ ہو گا، نہ تمھارے چاہنے سے... اگر میں مدد لینے جاؤں تب بھی میری واپسی شام سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی کو کاٹنے والے ویلڈر... ڈاکٹر... ایمبولینس سب لانے ہوں گے... اور یہ سب کچھ شہر میں ملتا ہے... شام تک تم اسی طرح پڑے رہے تو کیسے زندہ رہو گے... تمھارے جسم میں جتنا خون ہے وہ ایک گھنٹے میں قطرہ قطرہ بہہ جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ دہاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اچھلنے لگے۔ "تم میرے قاتل ہو... تم نے مارا ہے مجھے۔"

"نہیں جمشید... تمھارے ارادوں نے تمھیں مارا۔" میں نے کہا۔ "راستہ تم نے روکا تھا... مجھے قتل کرنے کے لیے... اس وقت تم سوچ بھی نہیں رہے تھے کہ یہ دامِ اجل تم خود اپنے لیے پھیلا رہے ہو... تم بہت تجربہ کار اور پرانے شکاری تھے مگر اجل تم سے زیادہ عیار شکاری ہے... جو ازل سے آج تک تم جیسے اور میرے جیسے انسانوں کے غرور کو شکست دیتی آئی ہے اور انھیں اپنی بے بسی اور بے خبری کا احساس دلاتی آئی ہے... اور ایک طے شدہ مگر غیبی انتظام کے تحت شکار ہونے والوں کو گھیر کر وقت کے اس لمحے تک اور اس مقام تک لاتی رہی ہے جہاں انھیں اپنی افلاطونیت، رعونت اور یقین کی قوت کے ساتھ فرشتۂ اجل کی موجودگی میں آخری سانس لینی تھی۔ اس وقت وہی تمھیں بچا سکتا ہے جس نے آج مجھے بچا لیا۔ اس کے دستِ امکاں میں ہر معجزہ ہے... لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا... تم خود بھی کچھ کرنا چاہو تو مرنے سے پہلے کوئی نیکی کر سکتے ہو جو تمھارے سفرِ آخرت کا توشہ بن جائے۔"

جمشید کا دوسرا ساتھی مر چکا تھا... اس کی ٹانگیں جو قینچی کی طرح چل رہی تھیں ساکت ہو کے نیچے لٹک گئی تھیں اور اس کی فریاد و فغاں کا دلخراش شور تھم گیا تھا... صرف جمشید باقی تھا جو اپنی موت کو سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اس سے بچ کے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی بے چارگی انسان کو احساس دلاتی ہے کہ اس کی زندگی ایک بے حد ناقابلِ اعتبار اور عارضی قوت کا نمونہ تھی۔ بلاشبہ اس قوت نے اس کے لیے سمندروں کی گہرائی اور پربتوں کی بلندی... ایٹم کی طاقت اور خلا کی تسخیر کو ممکن کیا مگر وہ خود ایک مشتِ خاک سے عبارت تھی۔

مجھے جمشید پر ترس آیا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے مگر کچھ لوگ مرتے ہیں تو ان کی موت بھی باعثِ رشک ہوتی ہے۔ جمشید کی موت میں صرف سامانِ عبرت تھا۔ اگر یہی حادثہ کسی شہر کی سڑک پر پیش آتا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تو شاید اُسے بچایا جا سکتا تھا۔ اُسے گاڑی کو کاٹ کے نکال لیا جاتا اور بروقت طبّی امداد فراہم ہو جاتی تو خواہ وہ معذور زندگی گزارتا مگر زندہ رہتا۔ اُسے موت بھی کہاں آئی جہاں اس کا واحد تماشائی ایک دشمن تھا... اور وہ دشمن بھی اُسے معاف کر دینے کے باوجود بچانے سے قاصر تھا... موت ابھی دُور تھی مگر موت کے لمحے نے اُسے قید کر دیا تھا... وہی کار جس کی شان و شوکت جمشید کے لیے وجہِ افتخار تھی، اب موت کا سبب بن گئی تھی۔ اس کی آرام دہ نشستوں پر اُس نے طرّہ دستار کو بلند رکھتے ہوئے کامیابیوں کے بہت سے سفر کیے تھے مگر آج انہی سیٹوں نے اُسے جکڑ رکھا تھا کہ ٹھہرو... یہیں رُک کر موت کی راہ دیکھو... روح قبض کرنے والا فرشتہ ابھی کہیں اور مصروف ہے لیکن اس کو یہاں بھی آنا ہے۔ اور تب تک یہ ہمارا کام ہے کہ تمہیں روکے رکھیں۔

"جمشید..." میں نے بہت دُکھ کے ساتھ روتے ہوئے بے بس آدمی کو دیکھا۔ "آخری وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی... مگر آخری وقت کی نیکی ضرور کام آجاتی ہے... کیا تم سچ بولنے کے لیے تیار ہو...؟"

"ہاں... اب بھی سچ نہ بولا تو کب بولوں گا..." وہ کراہتے ہوئے بولا... "مگر پہلے ایک بات سُن لو... میں نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "کیا...!"

"میں... نواب خسرو جمشید نہیں ہوں۔" اس نے دُہرایا۔

"پھر تم کون ہو؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اس کا غلام..." وہ بولا... "اُس کے حکم پر... اس کی جگہ لینے والا... اور اس کی جگہ... مرنے والا..."

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کیا یہ خیال پہلے نہیں آیا تھا تم کو... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے...؟ اس کی جگہ تم نشانہ بن سکتے ہو... تم کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے کاروبار میں ملوّث ہے... اس کی جان کے دشمن کتنے ہیں... اس کے باوجود تم نے اپنی زندگی اس کے پاس گروی رکھ دی تھی۔ کیا معاوضہ دیتا تھا وہ تم کو اپنی ڈھال بنانے کا؟"

"بہت... اتنا کہ... کہ میں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا..."

"کب سے تم اس کے ساتھ ہو؟" میں نے کہا۔

"ایک سال سے کم... دس مہینے ہوئے ہیں..."

"تمہارا اصلی نام کیا ہے... گھر بار... بیوی بچے ہیں...؟"

"کوئی نہیں... نہ نام نہ گھر..." وہ چیخ مار کے تڑپا اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔

"وہ خود کہاں ہے...؟"

"اس وقت... مظفر گڑھ..." وہ مشکل سے بولا۔ "وہاں ایک حویلی ہے..."

"کیا نام ہے اس جگہ کا... جہاں یہ حویلی ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ... رانی کی حویلی کہلاتی... ہے۔" وہ بولا۔ "سب جانتے ہیں..."

"اور نواب خسرو وہاں کب تک ملے گا...؟"

"کل... صبح تک..."

"کیا وہ اکیلا ہوگا؟"

"ہاں... ایک عورت ضرور ہوگی... کوئی فاحشہ..."

"اور اس کے محافظ؟" میں نے کہا۔

"دو محافظ... ایک میں تھا... ایک گن مین..." وہ رُک رُک کر بولا۔ "اندر دو ملازم ہو سکتے ہیں..."

"گھریلو ملازم؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... دو میاں بیوی... مگر وہ بھی... مسلح ہوں گے... آہ! مجھے... پیاس لگی ہے..." وہ خلق میں تر ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔

"پانی... یہاں پانی کہاں ہے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"میں لاتی ہوں پانی۔" موہنی نے میرے پیچھے سے یوں کہا کہ میں اُچھل پڑا۔ میں اُسے بالکل بھولا ہوا تھا لیکن وہ نہ جانے کب سے یہ ساری گفتگو دم سادھے سُن رہی تھی۔ میں نے اُسے سائڈ پر گر جانے والی اسٹیشن ویگن کی طرف جاتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ گاڑی کے ریڈی ایٹر سے پانی نکالنا چاہتی تھی... لیکن یہ کام اس کے اکیلے کے بس کا نہیں تھا۔

اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ "کبیر...!"

"کیا بات ہے؟" میں نے اُٹھتے ہوئے...

وہ اوپر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اس دروازے کو کھولو۔"

خاصی دقت سے میں ایک وہیل پر قدم جما کے اوپر چڑھا اور دروازے کو کھینچ کر کھولا۔ کروٹ کے بل پڑی ہوئی گاڑی کا بھاری دروازہ اپنے وزن سے خود نیچے گر کے بند ہونے لگتا تھا۔ میں نے اُسے ایک ہاتھ سے کھینچ کر دُور کیا اور کیبن میں داخل ہو گیا۔ سیٹ عموداً کھڑی ہوئی تھی... میں نے اوپر سے نیچے پہنچنے کے لیے ہاتھوں کو سہارا بنایا اور بالآخر بونٹ کھولنے والے لیور کو کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ شخص اب 'پانی... پانی' چلّا رہا تھا۔

موہنی کو بونٹ اُٹھانا نہیں پڑا... اس نے بونٹ کو ایک پٹ کے دروازے کی طرح باہر کھول دیا۔ ریڈی ایٹر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنا دوپٹہ تر کرنے کے لیے ریڈی ایٹر کیپ کو تھوڑا سا گھمایا۔ پانی اس میں سے قطرہ قطرہ اور پتلی سی دھار بن کے بہنے لگا۔ اسے موہنی نے دوپٹے پر روک لیا جسے وہ رسّی کی طرح بل دے کر اس کا گولا سا بنا چکی تھی۔

لیکن جب وہ بھیگا ہوا دوپٹہ لے کر مرتے ہوئے شخص کے حلق میں پانی نچوڑنے پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر صدمہ پہنچا کہ وہ اب پانی کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

"یہ تو مر گیا..." میں نے افسوس سے کہا۔

موہنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عورتیں طبعاً رقیق القلب ہوتی ہیں۔

"کتنا بھروسا کیا اس نے جھوٹے سہاروں پر۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کون کام آیا اس وقت؟ نواب جمشید... اس کی دولت؟ مشین گن کی طاقت؟"

"چلو کبیر... اب مرنے والے کو کیا کہنا۔" موہنی نے میرا بازو تھام لیا... وہ رو رہی تھی اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ شاید ایسی پُر عذاب موت اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی... کچھ دیر پہلے وہ بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ ایک خاموش صبح کے سفر کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

"مجھے ابھی اس سے اور بہت کچھ پوچھنا تھا۔" میں نے کہا۔

موہنی نے ایک اُبکائی لی... میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ یہ جسم کا طبعی ردِ عمل تھا جو خون کو بہتا نہیں دیکھ سکتا اور انسانی خون کا ایسا نظارہ کمزور طبیعت رکھنے والوں کے اعصاب پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ گرنے ہی والی تھی کہ میں نے اُسے سنبھال لیا اور دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کے دُور لے گیا۔ سڑک سے چند قدم کے فاصلے پر مجھے ایک سرسبز قطعۂ زمین نظر آیا۔ میں نے موہنی کو وہاں لٹا دیا اور لوٹ کر بھیگا ہوا دوپٹہ لینے گیا۔ اُسے موہنی نے اوندھی پڑی ہوئی کار کے ایک کنارے پر رکھ دیا تھا۔ کچھ پانی بہہ گیا تھا مگر اُسے نچوڑ کر کام چلایا جا سکتا تھا۔

میں واپس آیا تو موہنی بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے دانت آپس میں مضبوطی سے جُڑ گئے تھے اور ہاتھ پاؤں اینٹھ چکے تھے۔ خاصی کوشش کے بعد میں اس کا منہ کھول کے پانی کے چند قطرے ٹپکانے میں کامیاب ہو گیا۔ گیلا دوپٹہ میں نے اس کے چہرے پر پھیرا، الکاس کے گلے، بازوؤں اور پیروں پر پھیرا لیکن اُسے ہوش نہ آیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور لوٹ کر اسٹیشن ویگن کی طرف گیا۔ اس کے پچھلے دروازے کو کھولنا نسبتاً آسان کام تھا۔ دونوں سوٹ کیس لُڑھک کر اس سائڈ پر گر گئے تھے جو سڑک سے لگی ہوئی تھی... میں نے انہیں باہر کھینچ لیا۔ ایک ایک کر کے میں دونوں سوٹ کیس سڑک سے کچھ دُور لے گیا... وہاں خودرو جنگلی جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ میں نے انہیں جھاڑیوں کے درمیان پھینک دیا، اب سڑک پر سے تو کیا قریب سے بھی کسی کی نظر انہیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسٹیشن ویگن میں بھی ریوالور کم نہ تھے اور مجھے مرنے والوں کا اسلحہ بھی مل سکتا تھا لیکن میں نے صرف دو ریوالور کافی سمجھے جن میں سے ایک میں نے جیب میں رکھا اور دوسرا پتلون کی بیلٹ کے نیچے چھپا لیا۔ مشین گن بھی فی الحال میرے لیے بے مصرف تھی۔ اُسے بھی میں نے جھاڑیوں میں اُچھال دیا۔

موہنی کراہنے لگی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گی۔ میں تیزی سے تباہ شدہ مرسیڈیز تک گیا جس میں چار لاشوں کا خون اب منجمد ہو چکا تھا۔ اس کی کراہیت پیدا کرنے والی بُو ذہن کو ماؤف کرتی تھی مگر میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا۔ اگر میں کوشش کرتا تو آگے کی سیٹ پر پڑی ہوئی دونوں لاشوں کی جامہ تلاشی کے لیے ہاتھ اندر پہنچا سکتا تھا مگر اس طرح میرے ہاتھ خون میں بھر جاتے۔ مجھے ایک شخص کی صرف ٹانگیں اوپر تھیں لیکن خسرو جمشید کی ڈمی کی جیب ٹٹولنا مشکل نہ تھا۔ مشکل وہی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر لہو کا داغ آتا تھا۔

موہنی کی آواز پر میں واپس دوڑا... وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"موہنی...!" میں نے اس کے قریب بیٹھ کے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "ہوش میں آؤ۔"

وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ "چلو... یہاں سے نکل چلو۔"

"چلتے ہیں۔" میں نے اُسے نرمی سے الگ کیا۔ "پہلے تمہاری حالت تو اس قابل ہو جائے... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی کم حوصلہ ہو۔"

"یہاں سے چلو کبیر... کوئی آجائے گا..."

"آجائے گا تو ہمیں کیا...؟"

"ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ کانپتے ہوئے بولی۔

"کیوں... ہم نے کیا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ... سب ہماری وجہ سے..."

"پاگل... کسی کو کیا معلوم کہ اس دوسری گاڑی میں کون تھا۔" میں نے کہا۔ "جو مر گئے، وہ تو کچھ بتانے سے رہے... رہے ہم تو ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں کہ حادثہ کب ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا... ہم تو یہاں سے پیدل گزر رہے تھے۔ اگر راستے میں کوئی نظر آیا تو ہم یہی کہیں گے۔ لیکن ہمارا یہاں رُکنا کسی صورت مناسب نہیں... خدا کا شکر ہے کہ آس پاس کوئی نہیں تھا اور اس آدھے گھنٹے میں کوئی آیا بھی نہیں۔ کیا تم چل سکتی ہو؟"

"میں کوشش کروں گی۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تم کو اُٹھا کر نہیں چل سکتا۔" میں نے کہا۔

"کتنی دُور جانا ہے کبیر؟" موہنی نے میرے کندھے کا سہارا لے کر کہا۔

"معلوم نہیں... سڑک تک نہ جانے کتنا فاصلہ ہے۔" میں نے کہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ فوری طور پر میں چاہتا تھا کہ اس جگہ سے جتنا بھی دُور جا سکوں اچھا ہے۔ پھر کوئی جگہ مل جائے جہاں ہم چھپ کر آرام کر لیں۔ تھکن اور بھوک پیاس سے ہم دونوں کی حالت

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

غیر ہو رہی تھی لیکن یہاں ہمارے لیے خطرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

رک رک کر قدم قدم چلتے ہوئے ہم بالآخر ایک فرلانگ دور چلے گئے۔ ہم سڑک سے پچاس گز دور رہتے ہوئے سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے تھے... سڑک کو نظر میں رکھنا ضروری تھا ورنہ ہم اس ویرانے میں بھٹک جاتے۔

دو فرلانگ کے بعد امید کی پہلی روشنی نے مجھے سہارا دیا... سڑک پر دائیں جانب ایک کچا راستہ نمودار ہوا۔ اس راستے پر میں نے دُور سے آتی ہوئی بیل گاڑی کو دیکھا... میں رُک گیا اور میں نے موہنی کو ایک کیکر کی دھوپ چھاؤں میں بٹھا دیا۔ بیل گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ گئی۔ اسے بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا چلا رہا تھا۔ اس نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو بچے... کیا تم ہماری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو؟" میں نے کچے راستے کے درمیان میں آ کے کہا۔

"کیسی مدد؟" لڑکے نے پنجابی میں کہا۔

"میری بیوی بیمار ہے..."

"اچھا اچھا... تو آپ کو حکیم جی کے پاس جانا ہے... مگر وہ تو اُدھر ہمارے گاؤں سے بھی چار کوس دور رہتے ہیں۔" لڑکا بولا۔ "میں واپس جاؤں گا تو ابا مارے گا۔"

"ہمیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اُدھر آگے کنڈیانوالہ... کھل سوڑی لینے۔" وہ بولا۔

"اُدھر؟" میں نے اس کے ہاتھوں کی سمت کو دیکھا۔ "کتنی دُور ہے یہ گاؤں...؟"

"یہ تو پتا نہیں۔" وہ بولا۔ "میں اس وقت جاتا ہوں تو شام تک گھر واپس پہنچ جاتا ہوں۔"

"اچھا تو وہ بڑا گاؤں ہے... تو وہاں کوئی سواری بھی مل جائے گی؟"

"ہاں جی... تانگا بھی شاید مل جائے... ورنہ ریڑھے ہوں گے... آپ کو جانا ہے تو میرے ساتھ بیٹھو۔" وہ بولا۔

میں نے موہنی کو پیچھے بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بیل گاڑی ہچکولے لیتی ہوئی چلنے لگی۔

"آپ... کدھر کے رہنے والے ہو جی...؟" لڑکے نے بالآخر وہ سوال کر لیا جس کا مجھے انتظار تھا... گاؤں کے رہنے والے اپنے علاقے میں ہر اجنبی کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔

"ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔" میں نے اُسے گول مول جواب دیا۔

"وہ تو مجھے پتا ہے۔" وہ بیلوں کی دُم مروڑ کے بولا۔

"تمھیں کیسے پتا ہے؟"

"تم کوئی گاؤں کے رہنے والے ہو؟" وہ بولا۔ "تم شہری بندے ہو۔"

"تم ہر گاؤں سے واقف ہو؟" میں نے کہا۔

"آس پاس دس کوس تک۔" اُس نے ہاتھ کو تفاخرانہ انداز میں حرکت دے کر کہا۔

"ہم ملتان سے آئے تھے۔" میں نے اعتراف کے انداز میں...

"پیدل آئے تھے؟" وہ لڑکا سخت سراغ رسانی کے موڈ میں...

"نہیں یار... چند دوست تھے ساتھ... سب ... آئے تھے۔"

"اچھا... جبھی کل رات ٹھز ٹھز ہو رہی تھی؟" وہ بولا۔

"تم نے سُنی تھی گولیاں چلنے کی آواز؟" میں نے کہا۔

"میں نے تو نہیں... لیکن چاچے نے سُنی تھیں... وہ ... سوتا ہے نا..." لڑکا بولا۔ "تمھارے وہ دوست کدھر ہیں؟"

"یہ تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "معلوم ... تو ہم اُن کے ساتھ ہوتے... تمھارے جمبو جیٹ میں نہ ہوتے۔"

"کس میں؟" لڑکے کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے میں نے اس کی ... گاڑی کو بہت افسوسناک گالی دے دی ہے۔

"جمبو جیٹ جہاز ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

لڑکا دانت نکالنے لگا۔ "کیا تم اُن سے بچھڑ گئے تھے؟"

"ہاں دوست... فلمی کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں ... موہنی کو دیکھ کر آہ بھری۔ "کیا تم فلمیں دیکھتے ہو؟"

"ایک دیکھی تھی... یکے والی..." وہ بولا۔ "چاچے نے بہت مارا تھا۔ حالانکہ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ مسرت نذیر کیا غضب ... ہے جب ٹوپی سر پر رکھ کے یکہ چلاتی ہے۔"

"تمھیں بتایا تھا؟"

"میں نے سُن لیا تھا... وہ اپنے یاروں کے سامنے ڈینگ ... رہا تھا کہ اُس نے یکے والی سات دن تک روز دیکھی ہے۔" ... اور بیل گاڑی کو دوسری طرف جانے والے دوسرے کچے راستے ... موڑ لیا... یہ راستہ چھوٹی سڑک پر تقریباً پون میل چلنے کے بعد آیا تھا۔ لڑکا ایک ماہر گاڑی بان اور بیلوں کی رفتار بڑھانے کے لیے ... بطور ایکسیلیریٹر استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک نوکیلی لکڑی بھی تھی جسے بیلوں کی دُم کو مہارت سے مروڑ کے چبھوتا تھا تو بیل دوڑنے لگتے تھے۔ پون میل کا یہ فاصلہ اسی برق رفتاری کے باعث پچیس منٹ میں طے ہو...

صبح اب دوپہر میں ڈھلنے لگی تھی۔ سورج اتنا اوپر آ گیا تھا ... دھوپ کی تمازت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ خود میرا حلق ... ہونے سے میری زبان پر کانٹے پڑ رہے تھے۔ موہنی کی حالت زیادہ غیر ... وہ نیم بے ہوش سی گاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے ایک کو... نظر آیا... اس کا رہٹ گھوم رہا تھا اور شفاف ٹھنڈے پانی کے ... کنوئیں کی گہرائی سے طلوع ہو کے ایک نالی میں گرتے جا رہے تھے۔

میرے کہنے سے لڑکے نے گاڑی روک لی۔ میں نے مو... کو سہارا دے کر اُتارا اور ہم نے گھٹنوں کے بل جھک کر نالے...

...نے لگایا اور چوپایوں کی طرح پانی پیا۔ اس کی ٹھنڈک مہک اور تازگی ... وجود میں راحت اور سکون کا احساس بن کے اترتی گئی۔ شاید ... نے لاہور کے کسی ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں یخ بستہ مشروب کی بوتل سے بھی اتنا لطف حاصل نہ کیا ہوگا جتنا اس کچے کنوئیں سے نکلنے والے اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رکھنے والے پانی سے ملا۔

میں نے اس پانی سے اپنے ہاتھ دھوئے اور منہ پر چھینٹے مارے۔ پھر میں نے پانی کے بہتے دھارے میں سر رکھ دیا اور اس کی ٹھنڈک میرے سر کو تراوٹ دینے لگی۔ میں نے اپنے پیر اس میں بھگوئے اور اگرچہ وہ صرف پانی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس پانی نے مجھے نئی توانائی بخش دی ہے۔ میں اس نیم غسل سے تازہ دم ہو گیا تھا۔

موہنی نے سر نہیں بھگویا تھا لیکن ہاتھ منہ دھونے کے بعد اس نے پانی کے دھارے میں پیر ڈبو دیے تھے اور جب میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ اس کا رنگ روپ اور مسکراہٹ بالکل نئے اور اُجلے ہو گئے تھے۔ رہٹ چلانے والا بوڑھا پہلے ہمیں دیکھ کر حیران ہوا تھا اور اب خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ اس وقفے میں جمبو جیٹ کے پائلٹ نے اُسے ہمارے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم اس کے ساتھ چل کے روٹی شوٹی کھائیں اور لسی دسی پئیں۔ مگر ہم نے شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جانا بہتر سمجھا کیونکہ منزل اب بہت قریب تھی۔

گاؤں ایک میل کے بعد آ گیا اور ابھی پکے مکان شروع ہی ہوئے تھے کہ ایک موڑ پر منڈی آ گئی۔ یہ ایک دیہاتی مارکیٹ تھی جس میں حضرات اور خواتین کی مساوی تعداد خرید و فروخت کر رہی تھی۔ سارا بازار ہمیں دیکھ کر لین دین بھول گیا۔ نوجوان گاڑی بان بڑے فخر کے ساتھ ہمیں سب کے درمیان سے یوں گزار کے لے گیا جیسے وہ بیل گاڑی نہیں چاند گاڑی ہے اور وہ خود نیل آرمسٹرونگ ہے جو چاند سے واپس لوٹا ہے تو اپنے ساتھ وہاں کی مٹی کے نمونے لایا ہے۔

اس پاسنگ آؤٹ پریڈ نے موہنی کو بہت نروس کیا۔

"یہ لوگ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے؟"

"تمھیں... تم دیکھنے کی چیز ہو..." میں نے کہا۔ "کیوں نہ دیکھیں"

"نمونہ تو تم بھی ہو۔"

"جب آسمان پر بیک وقت چاند اور سورج نظر آ رہے ہوں تو آنکھیں صرف سورج کی روشنی سے چندھیاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

بیل گاڑی رُک گئی۔ وہ ایک چوک سا تھا جہاں چار خستہ اور خراب دُھول میں اٹی ہوئی گلیاں ملتی تھیں۔ جھاڑ جھنکار داڑھی والے بوڑھے اور گٹھے ہوئے سروں والے نوجوان لنگیاں باندھے اور میلے کرتے پہنے کالی پڑ جانے والی بان کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ بھاری نتھ ناک میں لٹکائے اور چاندی کے کڑے ہاتھوں پیروں اور گلے میں ڈالے خواتین کی ایک جماعت فرشِ خاک پر قیام پذیر تھی۔ ان میں مجھے سب بوڑھی اور تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھنے والی نظر آئیں۔ ایسے مجمع کے درمیان ہم نے خود کو زمین پر اُتر آنے والی خلائی مخلوق کی طرح محسوس کیا۔

وہ ایک لسی اور چائے کا ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے دو تانگے اور دو ریڑھے بھی اُونگھ رہے تھے۔ وہاں ہر چیز اونگھتی ہوئی لگتی تھی یا پھر جھگڑتی ہوئی۔

"یہ شکاری ہیں۔" ہمیں لانے والے جمبو جیٹ کے پائلٹ نے اچانک اعلان کیا۔ مجمع ایک بار پھر دم بخود رہ گیا۔ انھوں نے کبھی ایسے شکاری نہیں دیکھے تھے جن کے پاس بندوق کیا غلیل تک نہ ہو لیکن ایک میم ٹائپ کوہ قاف کی پری ساتھ ہو۔

کچھ دیر میں شکوک اور تجسس کی دُھند چھٹ گئی۔ ہماری طرف سے پائلٹ نے ایک وضاحتی بیان جاری کیا اور مجمع گھوڑے جیسے سر ہلانے لگا... ہم نے صرف مسکرانا جاری رکھا۔

"اچھا بھئی نوجوان۔" میں نے لڑکے کو تھپکی دے کر ایک پچاس کا نوٹ پیش کیا۔ "بڑی مہربانی تمھاری اب تم جاؤ۔"

لڑکے نے کچھ نہیں سُنا اُس کی آنکھیں پچاس کے نوٹ پر جم کے رہ گئی تھیں۔ باقی لوگ بھی اس افراطِ زر سے پریشان تھے۔

"لے لو..." موہنی نے کہا۔ "تم بہت اچھے لڑکے ہو۔"

لڑکے کا سماجی مرتبہ اس تعریفی سند سے بہت بلند ہو گیا تھا جو اُسے سب کے سامنے عطا کی گئی تھی۔ اس نے پچاس کا نوٹ تقریباً جھپٹ کے اپنے کھیسے میں اُڑس لیا۔ پھر وہ ایسے بھاگا جیسا اُسے اندیشہ ہو کہ ہم نوٹ واپس نہ مانگ لیں۔ یا مطالبہ نہ کر دیں کہ دو روپے رکھ کے اڑتالیس واپس کر دو۔

"اتنے چھوٹے بچے کو اتنا پیسہ نہیں دینا چاہیے۔" ایک شخص نے حسد میں مبتلا ہو کے مجھے مطعون کیا۔

"وہ شہر بھاگ جائے گا تو ماں باپ کو وخت ڈالے گا۔" دوسرے بوڑھے نے اس کی تائید کی... میں پشیمانی میں مبتلا ہو گیا... سخاوت کا مظاہرہ بھی موقع محل دیکھ کر ہی کرنا چاہیے... یہی انعام میں نے سب کے سامنے نہ دیا ہوتا تو رائے عامہ خلاف نہ ہوتی اور لڑکا زیادہ خوش ہوتا کہ اُس کے باپ یا چاچے کو معلوم نہیں ہوگا۔ اب تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ ایک چھانپڑ رسید کر کے باپ اس سے نوٹ نکلوا لے گا۔

میری اور موہنی کی مشکل ہوٹل والے نے آسان کی۔ وہ ایک برآمدے پر مشتمل ریسٹورنٹ تھا۔ برآمدے کی چھت گھاس پھونس اور لکڑیوں سے بنائی گئی تھی مگر عقبی حصے میں ایک کچی دیواروں والا کمرا بھی تھا جس میں ہوٹل والا رات کے وقت اپنا سامان بند کر جاتا ہوگا۔ ہمیں اس وی آئی پی لاؤنج میں مدعو کیا گیا۔ وہاں بھی ایک چارپائی تھی جو ہمیں اندھیرے میں قدم رکھنے کے کچھ دیر بعد دکھائی دی۔ اسی کے سامنے ایک جھولتی ہوئی میز لا کے رکھی گئی۔ پروپرائٹر نے بقلم خود

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میزبانی کے فرائض سنبھالے اور ہمارے لیے "اتپیشل" چلئے بنا کے لایا۔۔ اس کا ذائقہ بالکل ایسا تھا جیسے اس نے لسّی کے دو گلاس چلئے کی پتی ڈال کے اُبال دیے ہوں۔ کھانے کے لیے کہیں سے کنگ سائز گرما گرم جلیبی درآمد کی گئی جو مقامی بولی میں جلیب کہلاتی تھی... جلیبی کا مذکر... اس کی تازگی کا یہ حال تھا کہ اس میں سے گرم گرم گڑ کا شیرا ٹپک رہا تھا اور ٹھنڈا ہوتے پر واپس گڑ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

تاہم جب پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی بھوک سے بے ہوش ہو چکے ہوں اور قُل ہو اللہ پڑھنے والی آنتیں انا للہ کا ورد کرنے لگی ہوں تو محاورے کے مطابق کواڑ بھی پاپڑ لگتے ہیں... وہ جلیب اور چائے جیسا گرم مشروب اس وقت کلب سینڈوچ اور بلیک کافی سے زیادہ پُرلطف اور تازگی دینے والے ثابت ہوئے۔

میرا پنجابی بولنا غیریت کی دیوار گرانے اور اجنبیت کی فضا کو ختم کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوا۔

"مجھے کوئی سواری چاہیے... مثلاً تانگا..." میں نے ہوٹل والے سے کہا۔ وہ ایک سابق پہلوان اور علاقے کا رستمِ زماں تھا۔ اب اس کی دیگ جیسی توند ڈھلک گئی تھی مگر قد کاٹھ سے وہ اب بھی اپنے ماضی کے دھندلا جانے والے آئینے کا عکس نظر آتا تھا۔ موہنی تو اس کی مونچھیں دیکھ کر سہمی جا رہی تھی جو کلّوں کے دونوں جانب چھ چھ انچ تک پھیلی ہوئی تھیں اور بڑے خطرناک انداز میں اُٹھی رہتی تھیں مگر وہ تو ایک نرم گفتار اور منکسر مزاج شخص تھا۔

"تانگے... ایک نہیں، دو کا حکم کرو تو دو حاضر۔" وہ بولا۔

"نہیں پہلوان جی... ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"جانا کہاں ہے؟" وہ بولا۔

"اس جگہ کا نام... تو معلوم نہیں کیا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ لڑکا جانتا ہوگا جو ہمیں لایا تھا... ادھر سے واپس جا کے... سڑک پر پیچھے کی طرف تقریباً ایک میل پر ہمارا سامان پڑا ہے..."

"کوئی بندہ بیٹھا ہے اُدھر؟"

"نہیں... ہم نے جھاڑیوں میں رکھ دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "بس دو سوٹ کیس ہیں... وہ اُٹھانے ہیں اور پھر واپس بڑی سڑک تک جانا ہے۔"

"ملتان روڈ کے اڈّے تک؟"

"ہاں... کتنی دُور ہے وہ یہاں سے؟" میں نے کہا۔

"ہوگا یہی کوئی... بتّیس میل..." پہلوان نے کہا۔

"کتنی دیر میں پہنچا دے گا تانگا...؟"

"یہی کوئی... تین گھنٹے..." پہلوان بولا۔ "آپ اُدھر سے پھر کے جاؤ گے تو چار گھنٹے..."

"اچھا تو پہلوان جی... تم ہی کسی سے طے کر دو۔"

"کیا طے کر لوں؟"

"یہی... کرایہ... مجھے تو کچھ اندازہ نہیں۔" میں نے کہا

"او بادشاہو... آپ بھی کمال کرتے ہو..." پہلوان بولا ... ہے جو آپ سے زیادہ لے... آپ مسافر ہو اور میرے مہمان ہو ... میرے مہمان کو ٹھگے گا، وہ پھر اپنی ہڈیاں سلامت کیسے رکھے ... یہاں... جو آپ کی خوشی ہو دے دینا۔"

پہلوان کو دوطرفہ اطمینان حاصل تھا۔ ایک تو اس نے ... تھا کہ میں نے بیل گاڑی میں سواری کے لیے پچاس روپے کرایہ ... ترغیب دیا تھا... ظاہر ہے میں کنجوس نہیں احمق تھا۔ دوسرے ... کے ذاتی مہمان کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد ہم خصوصی مراعات ... حقدار ہو گئے تھے... شاید وہ حکم دیتا کہ میرے مہمانوں کو تانگے ... چھوڑ آؤ مگر خبردار جو ایک پیسہ لیا... تو تانگے والا ہڈیاں سلامت رکھنے کے لیے چل پڑتا۔

جب تانگا آ گیا تو میں نے پہلوان کو چائے اور جلیب ... دینے کی بے وقوفی کی۔ پہلوان کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"اوئے باؤ..." اس نے ایک خوفناک نعرہ مارا۔ "ہماری ... نہ کر... رکھ لے اس نوٹ کو کھیسے میں۔"

میں نے نوٹ کو فوراً واپس لے لیا۔ "معاف کرنا... وہ ... کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

"اوئے ہم اتنے بے غیرت نہیں ہوئے ہیں ابھی۔" وہ ... طرح دہاڑ کے بولا۔ "کہ مہمان بھی کہیں اور روٹی کے پیسے بھی مانگیں ..."

موہنی سہم کر میرے پیچھے ہو گئی تھی کیونکہ وہ پنجابی نہیں ... رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اب خون خرابا ہونے ہی والا ہے... تب ... میں نے دس کا نوٹ پیش کر کے پہلوان کو مشتعل کر دیا تھا اور مجھے ... سو کا نوٹ نکال لینا چاہیے۔

"کیا کر رہے ہو..." وہ آہستہ سے بولی۔ "دے دو جتنے مانگتا ہے ..."

میں نے کہا۔ "تم دے کر دیکھو۔"

موہنی نے سر ہلایا اور سو کا نوٹ نکال کے آگے بڑھایا۔ ... جی ناراض نہ ہوں... پیسے کم تھے تو یہ سب رکھ لیں۔"

کچھ دیر بعد پہلوان نے ایک گونج دار قہقہہ برآمد کیا جس ... اس کا خالی مشک جیسا پیٹ اوپر نیچے ہونے لگا۔ "او جھلّی ... نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ موہنی کے سر پر رکھ دیا۔ "جب چاچا آکھ ... تو پیسے مانگ... وڈوں کا کام ہے دینا۔" دیگر حاضرین نے ... ہوئے سر ہلا کے اس نظریے کی توثیق کی تو موہنی کو اصل بات سمجھ ... جب اس نے سب کے ساتھ مجھے بھی ہنستے دیکھا تو اس کا چہرہ ... سرخ ہو گیا۔

تانگے میں بیٹھنے کے بعد بھی اس کا منہ پھولا رہا۔ وہ دوسری ... طرف دیکھتی رہی۔ میں نے جانتے بوجھتے اس کا مذاق اُڑا دیا ... "پیسے بچانے کے لیے اُسے چاچا جی بنا لیا۔" میں نے کہا ...

واقعی نیت تھی..."

"واقعی کا کیا سوال... تم نے مجھے بے وقوف بنایا سب کے سامنے۔"

"سب کے سامنے میں تمھیں عقل مند کیسے بناتا؟" میں نے کہا۔ "میں تو خود بے وقوف بنا تھا۔"

"تم کیسے بے وقوف بنے تھے؟"

"تم کو گھر والی بنا کے..." میں نے کہا۔ "لوگ کیسے دیکھ رہے تھے۔"

"کیسے دیکھ رہے تھے؟" وہ مسکراہٹ کو دبا کے بولی۔

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔" میں نے کہا۔ وہ ہنس پڑی۔ تانگے والے نے مڑ کے دیکھا... پھر گھوڑے نے بھی گردن گھمائی۔ "اگاں دیکھ اگاں... تیری تے..." تانگے والے نے اس کی دُم کے اکیلیٹر کو دبا کے کہا۔ گھوڑا اچھلا اور ہم گرتے گرتے بچے۔ ہمارے ساتھ تانگے والا بھی ہنسنے لگا۔

میری ہنسی اس وقت کافور ہوئی جب میں نے دُور سے ہی جائے حادثہ پر اجتماع دیکھا۔ اتنی دیر میں دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے کی خبر کسی ذریعے سے آگے یا پیچھے تک پہنچ گئی تھی اور اب جو لوگ وہاں جمع تھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوست ثابت ہوں گے یا دشمن۔

"یہ... آگے تو سڑک بند ہے۔" میں نے کہا۔

تانگے والے نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "سڑک کیوں بند ہے؟"

"دیکھ نہیں رہے ہو... لوگ جمع ہیں... حادثہ ہوا ہے کوئی..."

"پھر کیا ... نکال لوں گا... لوگ خود ہی راستہ دے دیں گے۔" تانگے والے ...

"نہیں... تم تانگا موڑ لو۔" میں نے اس سے ... کے سختی سے کہا۔ "واپس چلو ملتان روڈ کی طرف۔"

"سامان نہیں اُٹھانا؟"

"ابھی نہیں اُٹھاتا..." میں نے کہا۔

"پھر کب اُٹھاؤ گے؟"

"فضول بکواس بند کرو اور تانگا موڑو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

تانگا آہستہ آہستہ گھوم کر واپس ہوا اور ملتان روڈ کی طرف چلنے لگا... وہاں سے دو فرلانگ واپسی کا سفر طے کرنے تک میرا دل اس خوف کا شکار رہا کہ کہیں دیکھنے والوں نے دیکھ نہ لیا ہو... تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ وہ مجھے اور موہنی کو ایکسرے سے پہچان لیں۔ کہیں اُنھیں اپنی طرف آنے والے تانگے کا اچانک واپسی اختیار کرنا مشکوک نہ لگے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا... لوگ دونوں کاروں کے اور چار مرنے والوں کے نقصان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دیہاتی تانگے سے اُنھیں دلچسپی نہیں تھی جو راستے میں رکاوٹ دیکھ کے واپس چلا گیا... یہ ہو سکتا تھا کہ حادثے کی جگہ پر پہنچنے والے غیر جانبدار لوگ ہوں... لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس راستے پر وہی دشمن سرگرداں ہوں جو میری تلاش میں تھے۔ ان کا ایک اہم مرکز اور اسلحے سے بھرا ہوا ایک ٹرک ضائع ہو گیا تھا۔ تربیت یافتہ ایجنٹ اور انھیں تربیت دینے والے مارے گئے تھے اور نقصانات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ رات ایک سرچ پارٹی لاپتا ہوئی تھی اور اب یہ دونوں گاڑیاں اور اس کے سب مسافر خود اپنی داستانِ عبرت کہہ رہے تھے۔ شکاری اپنی پے در پے شکست سے کتنے آتش زیرپا ہوں گے، اس کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔

اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں واپسی کے لیے بھی کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا اور اس سڑک سے بھی دُور رہتا جس پر کسی وقت بھی کوئی شکاری ہمارے تعاقب میں آ سکتا تھا یا ہمیں سامنے سے گھیر سکتا تھا... تانگا ایک بیزار کُن یکساں رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار میں اضافے کے مطالبے کو کوچبان نے بے رخی سے مسترد کر دیا تھا... ہم نے اس کے ساتھ نہایت غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا تھا اگر وہ مجبور نہ ہوتا تو ہمیں وہیں اُتار دیتا، جہاں سے ہم نے واپسی کے معاملے میں زبردستی کی تھی۔ ایک طرف تصور سے زیادہ ملنے والے معاوضے کا خیال تھا تو دوسرا پہلوان کا ڈر۔

ایک گھنٹا گزر گیا... پھر وقت رینگنے لگا۔ میں آدھے گھنٹے بعد گھڑی دیکھتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ دس منٹ گزرے ہیں... تارکول کی کالے فیتے جیسی سڑک سمٹنے کے بجائے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کے مناظر کی یکسانیت... تیز دھوپ... خاموشی میں گونجنے والی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز... ہچکولے اور اعصابی کشیدگی... یہ سب سفر کو زیادہ بیزار کُن بنا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم خلا میں گردش پذیر ہیں اور یہ سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ موہنی بھی خاموش تھی اور اپنے خیالوں میں گم تھی۔ میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ اس کے خیالات کیا ہوں گے مگر صورت سے تو لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہے... میں نے خاموشی کے اس وقفے میں چار سگریٹ پیے اور اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کیا۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے سڑک کے کنارے ایک چائے خانہ نظر آیا۔ اس کیفے ڈی پھوس کے سامنے وہی یونیورسل چارپائی ڈال دی گئی تھی جو ہماری تاریخ اور تہذیب کا سب سے پرانا سمبل ہے اور گاؤں سے شہر تک ہر دَور میں ایک ہی صورت رکھتی ہے... ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا اطلاق چارپائی اور تکیے پر یا حقے پر نہیں ہوتا... میں نے اس فضول خیال کو جھٹلا کے تانگے کو روکنے کا حکم دیا۔

میرے لیے تانگے میں طویل ترین سفر کا ریکارڈ پہلے ہی قائم ہو چکا تھا اور ابھی ایک تہائی سفر باقی تھا۔ تانگے سے اتر کے مجھے احساس ہوا کہ میرے رگ پٹھے اور جوڑ سب بدستور حرکت میں ہیں۔ جب میں چلا تو میری چال اس مسخرے کی طرح ہو گئی جو اپنی چال

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بھول گیا ہو۔ کیفے ڈی پھونس کے عقب میں گھاس تھی اور ایک پتلی سی نالی میں نہر کا صاف پانی بہہ رہا تھا۔ وہاں پانی میں پیر ڈال کے بیٹھنے اور ابلتا ہوا دودھ جیسی پتی کا لیس دار مکسچر پینے کے بعد ہم دونوں سفر کے اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو گئے۔

دوسرا مرحلہ زیادہ کٹھن رہا کیونکہ سورج سر کے اوپر سے گزر کے سامنے آ گیا تھا اور ہمیں براہِ راست فرائی کر رہا تھا۔ تانگے کی چھت ہمیں روسٹ ہونے سے بچانے میں ناکام تھی۔ دن کے پونے تین بجے تانگے نے بڑی سڑک پر چلنا شروع کیا تو میں نے چھلانگ مار کے گھوڑے سے آگے دوڑنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میں پھر راہِ راست پر آ گیا تھا اور میں اس بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو جنگل میں بھٹک گیا ہو اور اچانک اُسے گھر کا راستہ مل جائے۔

لاری اڈے پر تانگے والے نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں نے اُسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس سڑک پر خاصی ٹریفک تھی اور میں کسی نسبتاً غیر آباد حصے کا انتخاب کر رہا تھا... ایک میل آگے جانے کے بعد تانگے والے کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

"پہلوان جی نے اکھیا تھا لاری اڈے..."

"کیا تم تھک گئے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں... نہیں جی... مگر گھوڑا بے زبان جانور... اس نے بھی تو کچھ مانڑ! نی کرنا ہے جی۔" وہ بولا۔

"اوہ... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔ "بس اسی جگہ روک دو... اب ہم ایک قدم آگے نہیں جائیں گے۔"

"ویسے آپ کو جانا کہاں تھا؟" وہ لگام کھینچ کے بولا۔

"لاری اڈے۔" میں نے اترتے ہوئے مختصراً کہا۔

لاری اڈا تو پیچھے رہ گیا۔" وہ حیران ہو کے بولا۔

"میں ملتان کے لاری اڈے پر اترنا تھا۔" میں نے کہا اور سو کا نوٹ آگے بڑھا دیا۔ حیرت کی ڈبل ڈوز نے کوچبان کی زبان بند کر دی... میری بات نے اور پھر اس اُجرت نے اُسے بھونچکا کر دیا۔

یہ گھوڑے کے لیے۔" میں نے پچاس کا ایک اور نوٹ نکال کے کہا۔ "ہم نے اس بے زبان پر بہت ظلم کیا۔ اسے دانے پانی کے بغیر دوڑایا... تم ہماری طرف سے معافی مانگ لینا۔" معلوم نہیں تانگے والے نے واپس جاتے ہوئے شہر والوں کی ذہنی حالت کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو۔

"اب کیا ہو گا؟" موہنی نے سڑک کے کنارے بنی ہوئی منڈیر پر ٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال ہر جگہ اور ہر وقت کیا جاتا ہے خاتون۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کب کیا ہو گا اور کچھ ہو گا یا نہیں ہو گا... مگر بقولِ شاعر... ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"کیا پہلا مصرعہ میرے لیے ہے۔" وہ مسکرائی۔

میں نے سر کھجا کے کہا: "تم تو انتہا کی منزل پر ہو... پہلا مصرعہ منسوخ سمجھو۔"

"میرا مطلب تھا کہ اتنا لمبا سفر کیا اس لیے کیا تھا کہ سڑک کنارے ڈیرا ڈال لیں؟"

"تم ذرا دیکھتی جاؤ۔" میں نے کہا اور ایک کار والے کو اشارہ دے کر لفٹ مانگی۔ اس نے سخت بُرا مان کے مجھے پانچوں انگلیوں کا علامتی نشان دکھایا جس کے معنی .... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم پر لعنت... وہ مجھ پر لعنت بھیجنے میں برحق تھا۔ ایک سڑک پر جہاں پبلک ٹرانسپورٹ دن رات چلتی ہو کوئی اپنی بے حد قیمتی گاڑی ایک مشکوک نظر آنے والے جوڑے کے لیے کیوں روکے مگر ناامیدی میرے مذہب میں حرام تھی۔ میں ملتان کی طرف جانے والی سب کاروں کو انگوٹھا دکھاتا رہا اور کاریں زن زن گزرتی گئیں۔

"یہاں کوئی نہیں روکے گا گاڑی۔" موہنی نے آدھے گھنٹے بعد کہا۔

"ہاں... میرے لیے کوئی نہیں روکے گا۔" میں نے آہ بھر کے کہا۔

"اب تم بیٹھو... میں کوشش کرتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے یہ کیا کہ بال تھوڑے سے پریشان کیے۔ دوپٹہ ہاتھ میں تھاما اور اپنے ہر اندازِ حُسن کو بہت بے باکی سے نمایاں کر کے آنچل لہرانے لگی۔ پہلی کار میں ایک بوڑھی سی فیملی بیٹھی تھی انھوں نے خاصی ملامت آمیز نظروں سے موہنی کو گھورا اور زیرِ لب کچھ کہا بھی... شاید وہی جو مجھے ایک شخص نے پانچ انگلیاں دکھا کے کہا تھا... میں نے ایک قہقہہ مارا... موہنی نے خفت زدہ ہو کے مجھے دیکھا اور دوسری کار کو اشارہ دینے لگی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا مگر اس نے مجھے دیکھا تو رفتار پھر بڑھا دی۔ حالانکہ موہنی نے خاصی بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ایسے کوئی نہیں پھنسے گا بھئی۔" موہنی نے اِٹھلا کے کہا۔

"اس سے زیادہ کیا کرو گی؟" میں نے کہا۔

"تم کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہو۔" وہ ہنس کے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چڑ کے کہا۔

"مطلب یہ کہ بلبل کے ساتھ کوا کوئی نہیں لیتا۔" وہ پھر ہنسی۔

"اچھا بلبل... کوا اپنی شکل گم کرتا ہے۔" میں نے کہا اور واپس منڈیر کے پیچھے لیٹ گیا اس طرح کہ فوراً نظر نہ آؤں۔

موہنی کو فوری کامیابی ہوئی۔ ایک کار نے اتنی قوت سے بریک لگائے کہ پہیے چیختے ہوئے جام ہو گئے اور میں نے اندازہ کیا کہ گاڑی کی رفتار کتنی زیادہ تھی... پھر گاڑی ریورس گیئر میں واپس آئی۔

"ہیلو... سوئیٹی...!" کسی نے لوفروں کے انداز میں سیٹی بجائی۔

"لفٹ چاہیے؟" یہ کسی دوسرے کی آواز تھی۔

"یس... اِف یُو ڈونٹ مائنڈ..."

"ہُو ہُو..." پہلے والا ریڈ انڈین کی طرح آواز نکال کے بولا "ارے ہم تو خود بھٹک رہے ہیں کہ کوئی ہمیں لفٹ دے۔"

"جگہ ہے نا آپ کے پاس؟" موہنی نے کہا: "آئی مین..."

"جگہ... جگہ دل میں ہوتی ہے بے بی..." دوسرا بولا۔ "کم آن... تم تو انگریزی بھی بول لیتی ہو... جنگل کی پری۔"

اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں پیچھے سے لنگڑاتا ہوا اور کراہتا ہوا نکل آیا۔ موہنی نے میرے لیے دروازہ تھام لیا۔ میں نے آگے بیٹھے ہوئے دونوں بگڑے دل رئیس زادوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے نفرت سے مسخ ہو گئے۔

"ہو از دس ڈرٹی سوائن...؟" ایک نے غصے سے کہا۔

"یہ ایک غریب آدمی ہے... بیمار تھا۔" موہنی نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ کہا۔ "راستے میں اتر جائے گا۔"

"تم بھی اس کے ساتھ ہی اترو گی؟" دوسرا فیصلہ کُن اور کاروباری لہجے میں بولا۔

"اوہ نو..." موہنی نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟" پہلے نے موہنی کو آنکھ ماری۔

"ابھی تو فیصلہ نہیں کیا..." موہنی بولی۔ اس کا لہجہ یہی کہتا تھا کہ یہ فیصلہ تو تم کو کرنا ہے۔

"اوکے... دیٹ از لے ڈیل۔" دوسرا بولا۔

"مجھے معلوم تھا" موہنی نے مجھے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یو آر سو نائس اینڈ ڈیسنٹ۔" پھر وہ خود میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ غریبوں کی مدد کرنا چاہیے۔" پہلے والے نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ غریب بڑے غلیظ ہوتے ہیں۔ گاڑی گندی کرتے ہیں۔"

"اور احسان فراموش ہوتے ہیں۔" دوسرا بولا۔ وہ اب انگریزی میں باتیں کر رہے تھے اور انھیں یقین تھا کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔

"بائی دا وے... ابھی تک ہم نے ایک دوسرے کو متعارف نہیں کرایا۔"

"میں جونی ہوں... نام تو جان محمد تھا... مگر تم سوچو ذرا کہ کتنا عجیب اور دقیانوسی لگتا ہے میرے جیسے نوجوان کو جان محمد کہنا۔" پہلے والے نے کہا: "یہ میرا بڑا بھائی ہے شفیع محمد... اسے سب جیکی کہتے ہیں۔ ہمارے اولڈ مین کو ایسے ہی نام رکھنے کا شوق ہے۔ خود کو تو وہ سلطان محمد خان گردیزی لکھتا اور کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں اُس سے پہلے عالم پناہ ظلِ سبحانی کیوں نہیں لگاتے...!" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"جونی شٹ اپ۔" پہلا والا بولا۔ "تم نے ابھی تک اس جنگل کی پری سے نہیں پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟"

موہنی مسکرائی۔ "میرا بھی کیس عجیب ہے... میرے والد بڑے سخت مولوی ہیں... میری ان سے نہیں بنتی... انھوں نے میرا نام رضیہ سلطانہ رکھا تھا... مگر سب مجھے روزی کہتے ہیں۔"

"روزی... ہُو ہُو..." جیکی نے کلکاری ماری۔ "وائلڈ روز۔"

"آج میرا ان سے جھگڑا ہو گیا تھا... میں گھر سے نکل آئی۔" موہنی بولی۔ "جب بھی میرا اُن سے پھڈا ہوتا ہے میں واک آؤٹ کر جاتی ہوں۔"

"اور واک اِن کب کرتی ہو؟" جونی بولا۔

"جب میرا موڈ ٹھیک ہو جائے۔"

"موڈ کون ٹھیک کرتا ہے؟" جیکی نے کہا۔

"میرے دوست۔" موہنی نے ہنس کے کہا۔ "مجھے دوستوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔"

تمھیں دوستوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔"

"آج سے ہم بھی تمھارے دوست ہیں... اینی ٹائم... اینی پلیس۔" جیکی نے گانا شروع کیا۔ "ڈے اینڈ نائٹ۔"

میں نے آہستہ سے ریوالور نکالا اور جیکی کے سر پر مارا۔ اس کا گراموفون ریکارڈ اٹک گیا۔ "ڈ... ڈے... اینڈ...!" پھر ریکارڈ رُک گیا۔ جونی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جیکی اب دروازے کی طرف لڑھک رہا تھا۔

"ہے بوائے... یو او کے؟" (تم ٹھیک تو ہو نا؟)

"ہی وِل بی فائن اِن نو ٹائم۔" میں نے ریوالور اس کی گدّی پر رکھ کے کہا۔ "آنلی اِف یو ڈو واٹ آئی وانٹ یو ٹو ڈو۔" (وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا بشرطیکہ تم نے میرے کہنے پر عمل کیا)

"اینڈ اِف آئی ڈونٹ؟" وہ چند سیکنڈ تک وحشت سے منجمد بیٹھا سامنے والے آئینے میں مجھے گھورتا رہا (اور اگر میں نہ کروں تو)

"دین یو وِل بی نو بیٹر۔" میں نے کہا (پھر تمھارا حشر اس سے بھی بُرا ہو سکتا ہے)

"تم دونوں... سوئنڈلر ہو...؟" جونی نے کہا۔

"اور تم دونوں مجھے کسی سوئنڈلر کی اولاد لگتے ہو۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "کسی ایسے دھوکے باز یا نوسرباز کی ناجائز اولاد جو ناجائز آمدنی پر پلتی ہے تو ایک ذلت، نفرت اور فرسٹریشن سے بھرپور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔"

اس نے حیرانی سے نظریں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ "تمھیں کیا چاہیے؟" وہ بولا۔ "ہمارے پاس دس بارہ ہزار روپے ہوں گے۔"

"اتنے ہی میری جیب میں بھی ہوں گے... شاید زیادہ ہوں مگر میرا مسئلہ کچھ اور ہے... میں ایک مفرور قیدی ہوں۔ راولپنڈی سنٹرل جیل سے بھاگا ہوا۔" میں نے کہا۔ "مجھے پھانسی ہونے والی تھی۔"

"پھر ہوئی کیوں نہیں؟"

"مجھے کوئی پھانسی نہیں دے سکتا تھا۔" میں نے شیخی مارنے کے انداز میں کہا۔ "وہ تو بس میں کچھ وقت گزار رہا تھا جیل میں تاکہ پریس اور پبلک خاموش ہو جائے۔ میرے ساتھیوں کے ہاتھ بہت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بلیے تھے۔ وہ کسی بھی وقت مجھے جیل خانے کی دیواروں میں سے نکال سکتے تھے۔ کیا تم نے کبھی بہرام ڈاکو کا نام سُنا ہے؟"

"بہرام ڈاکو... آف کورس... تم بہرام ہو؟"

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "وہ میرا دادا تھا... میٹرنل انکل آف مائی فادر... میرے چچا کا چچا جو دوسرے رشتے سے میرے ماموں کا ماموں ہوتا تھا۔ پھر چچا کی خلیری بہن سے ماموں کے پھوپی زاد بھائی کا رشتہ طے ہوا تو..."

وہ پریشان ہو کے بولا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں بہرام ثانی مشہور ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں اب تک؟" میں نے موہنی کو مخاطب کیا۔

"مجھے... زبانی تو یاد نہیں۔" وہ سٹپٹا کے بولی۔ "ڈائری میں سب لکھا ہوا ہے۔ تاریخ... مقام... رقم اور لوٹے جانے والے کا نام۔"

"یہ کون ہے تمہاری؟"

"سیکرٹری... پارٹنر اور وائف۔" میں نے کہا۔ "اسی نے باہر میرے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور مجھے نکالنے کے لیے ایکشن پلان بنایا۔ تم نے سلطانہ ڈاکو کا نام سُنا ہے؟"

"یس... ایک فلم بھی تھی۔"

"یہ سلطانہ ڈاکو کی نواسی ہے... اس کے بہنوئی کی دوسری بیوی کا سالا بہرام ڈاکو کا سمدھی تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے رشتوں سے کوئی دلچسپی نہیں... کیا یہ بھی تمہارے ساتھ ڈاکے ڈالتی ہے؟"

"ہر بیوی کو شوہر کا ساتھ دینا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتی ہے... جتنے قتل میں نے کیے ہیں اتنے ہی اس نے..."

"اور... تم... تم نے کتنے قتل کیے ہیں؟"

"گیارہ..." میں نے غور سے کہا۔ "پھانسی تو ایک ہی بار ہو سکتی تھی نا... ویسے میں نے اس کا ہر الزام بھی اپنے سر لے لیا... بائیس قتل کرنے کی فردِ جرم عائد کی گئی تھی مجھ پر... میں اب بائیس قتل اور کر سکتا ہوں اپنی ہاف بیٹر کی مدد سے... اس کے بعد پھر پکڑے گئے تو کیا؟"

"میں پھر نکال لاؤں گی تمھیں..." موہنی نے کہا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اس دوسرے راؤنڈ میں سب سے پہلے میں تم کو فوت کروں؟" میں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ "کیوں جان محمد خان گردیزی؟"

"بٹ وائی؟... میں تو... میں تو کوآپریٹ کر رہا ہوں... بالکل وہی کر رہا ہوں... جو آپ فرما رہے ہیں..." جونی ہکلا کے بولا۔

"کوآپریشن کا مطلب سمجھتے ہو؟" میں نے ریوالور کو اس کی گدی پہ دبا کے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ جو میں کہوں وہ کرو... سوال کوئی مت کرو... اور زبان بند رکھو... ہمیشہ... ہمیشہ ہے جب تک زندہ رہنا چاہو۔ جس دن تمہاری زبان سے ہمارے بارے میں ایک لفظ بھی نکلا... تم نے اپنے باپ کو یا پولیس یا کسی بھی حمایتی کو بتایا۔ اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد... رات بجے... بہرام ثانی تم سے ملنے آئے گا..." میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "تم اس سے چھپ کے قبر میں بھی جا لیٹو گے تو وہ تم کو نکال لے گا... کفن اندر رہ جائے گا لاش باہر... اور..."

"آئی... آئی پرامز... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو فائدے میں رہو گے... کافی دن ہو گئے... اور تمہارے باپ کی کوٹھی میں کوئی ڈاکا نہیں ڈال سکے گا۔ تم بہرام کی پناہ میں آ جاؤ گے... اور جو بہرام کی پناہ میں ہو، اُسے کوئی دوسرا مائی کا لال ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

"سمجھ گیا... بہت اچھی طرح..." وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔

"اب شرافت سے چلتے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اگر کسی بھی جوڑ پر کسی کو اشارہ بھی کیا تو سلطانہ ڈاکو کی نواسی دروازہ کھول دے گی۔ جیکی باہر لڑھک جائے گا... یو سی... وہ دروازے کے سہارے ٹکا ہوا ہے... اُسے دھکا دینے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔"

"جانا کہاں ہے آپ کو؟... میرے پاس پٹرول..."

"میں دیکھ رہا ہوں... آدھے سے کم ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹینک فل کرالو، پیسے میں دوں گا... لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ جو شخص پھانسی سے بچ کے جیل بھاگا ہو، وہ آسانی سے واپس جیل نہیں جاتا... وہ سب پہلے مارے جائیں گے جو مجھے گرفتار کرنے یا کرانے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے باپ کو دو جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ اُٹھانا پڑے گا... وہ بیٹے ہیں تو اسی قابل کہ انھیں گولی مار دی جائے... کیا اس کی کوئی اولاد صالح بھی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس ہم دو جڑواں بھائی ہیں۔ ہماری پیدائش کے وقت ماں مر گئی تھی۔"

"پھر تو موت کے وقت باپ مر جائے گا۔" میں نے کہا۔ "اس کی ساری دولت، جائداد کسی اور کو مل جائے گی۔ کون بچے گا پھر؟"

"اس کی دوسری بیوی... جو اس کی تیسری سیکرٹری تھی اور اس کے منہ پہ بڑھاپے میں کالک مل چکی ہے۔" وہ نفرت سے اور حقارت سے بولا۔ "وہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے... جیسے لیلیٰ مجنوں ہی ہوا کرتے ہوں گے... ایسے رہتے ہیں وہ..."

"اپنی والدہ کے بارے میں..."

"والدہ... مائی فُٹ..." وہ بولا۔ "لُک ہیئر... تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو... میں آئندہ بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں... جب تم چاہو، تم مجھے فون کر کے بلاؤ گے تو میں آ جاؤں گا... اور تم میری کوٹھی پہ بھی مجھ سے ملنے آنا چاہو تو میں تم کو اپنا مہمان رکھ سکتا ہوں۔ لاہور... کراچی... سب جگہ ہماری کوٹھیاں ہیں... مری میں بھی کوٹھی ہے... لیکن تم میرا ایک مسئلہ حل کر سکتے ہو۔"

"تم میں اس کی ہمت نہیں ہے؟"

"فرینکلی... نو..." وہ بولا۔ "ہم کوئی شریف آدمی نہیں ہیں۔ لیکن مرڈر ہمارے بس کی بات نہیں۔"

"تم اپنے باپ کو قتل کرانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"وہ تو... اس نے ہمارے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ اکیس سال اس نے شادی نہیں کی ہماری خاطر... ایک گورنس نے ہمیں پالا... بے شک، وہ اچھی عورت تھی۔ اگر ہمارا باپ اس سے شادی کر لیتا تو ہمیں اعتراض نہ ہوتا مگر یہ بات ایک دن میں نے اس سے کہی تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ سن... تم ان معاملات کو نہیں سمجھتے... وہ اس لیے اچھی ہے کہ تمہاری سوتیلی ماں نہیں ہے۔ تمہاری گورنس ہے... میری بیوی نہیں ہے... ملازمہ ہے... مگر وہ گورنس بہت مایوس ہوئی جب ہمارے باپ نے اس تھرڈ ریٹ عورت سے شادی کر لی... اکیس سال کے ڈسپلن کو ختم کر دیا۔ او جاتے ہوا اس نے ہم سے کیا کہا... اس نے کہا سُن... مجھ پہ ایک ذمے داری تھی... تمہاری پرورش کی... وہ میں نے پوری کر دی۔ تم اب بالغ ہو اور اپنی مرضی کے مالک ہو... اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتے ہو... پھر اب مجھے کیوں ٹوکتے ہو... تم مجھے اپنی مرضی پہ چلانا کیوں چاہتے ہو... گورنس نے بھی یہی کہا کہ یو آر... میری ذمے داری پوری ہو گئی... اب مجھے جانے دو... ہم نے اُسے بہت روکا لیکن وہ چلی گئی۔ ایک دن صبح اس کا کمرا خالی تھا... اس نے خط چھوڑ دیا تھا کہ مجھے تلاش مت کرنا... یو سی... اس سب خرابی کی ذمے دار وہ عورت ہے۔"

"میں اتفاق کرتا ہوں تم سے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا باپ چوتھی سیکرٹری سے شادی نہیں کرے گا؟"

"نہیں... شاید وہ دوبارہ غلطی نہ کرے۔ لیکن اس نے پھر ایسا کیا... تو کیا تم پھر میری مدد نہیں کر سکتے؟"

"گویا تیسری بیوی کا... پھر چوتھی اور پانچویں کا قتل؟"

"تم نے کہا نا کہ مل کے تم دونوں..."

"ہاں، ہم بائیس قتل اور کر سکتے ہیں... لیکن صرف تمہارے لیے نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہم ہول سیل ٹھیکے نہیں لیتے... وہ تو جب کوئی ہمارے راستے میں ٹانگ اڑاتا ہے تو ہم اسے کاٹ دیتے ہیں... ٹانگ کے مالک کو... ہم پیشہ ور قاتل نہیں ہیں۔"

"او کے... تم ایک بار تو یہ کام کر سکتے ہو..."

"ہم سوچیں گے..." میں نے کہا۔

"سوچنا کیا... تم ہمارے گھر میں ڈاکا ڈالنے آؤ۔ وہ عورت ہر وقت زیورات میں لدی پھندی رہتی ہے۔ سونے اور پلاٹینم کے ہیروں والے سیٹ ملیں گے تمھیں۔ اُسے اپنے ساتھ لے جانا اور گردن کاٹ کے اُتار لینا..." وہ بولا۔ "اور پھر کہیں گاڑ دینا... میرا باپ تو یہی سمجھے گا کہ وہ بھاگ گئی۔ ہم اُسے یقین دلا دیں گے کہ ایسا ہی ہے۔ دو چار لاکھ پیسے ہم تجوری سے نکال لیں گے... تمہارے لیے..."

"کیا زبردست منصوبہ ہے۔" میں نے موہنی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم تو جینئس ہو۔ پہلے سے سب طے کیے بیٹھے ہو۔"

"کوئی کام کا آدمی نہیں ملا تھا اب تک۔" وہ مسکرایا۔

"او کے... پہلے تم میری مدد کرو..." میں نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کل تک تمہاری ضرورت پڑے... یا ہم رات کو تمھیں فارغ کر دیں۔"

"مجھے گھر پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔ کیا میں یہاں سے پٹرول لے لوں؟" وہ بولا۔

"ضرور لے لو۔" میں نے کہا۔ "مگر جیکی..."

"کوئی پوچھے گا تو میں کہہ دوں گا کہ سو گیا ہے۔" وہ بولا۔

جیکی آدھے گھنٹے بعد جاگ اُٹھا۔ اس وقت گاڑی تیزی سے ملتان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"او گاڈ... یہ شخص ابھی تک زندہ ہے جونی؟" اُس نے ہوش میں آتے ہی سر پکڑ کے چلّانا شروع کیا۔

"مجھے تو تعجب ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ جیکی نے پلٹ کر مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا اور میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے جونی کو مسکراتے دیکھا۔

"اِٹ از آل رائٹ برادر۔" جونی نے اس کے کندھے پہ تھپکی دے کر کہا۔ "یہ سب غلط فہمی میں ہو گیا۔ ناؤ وی آر فرینڈز۔"

"فرینڈز؟" جیکی نے یوں کہا جیسے اُسے سخت صدمہ ہے کہ جب وہ بے ہوش تھا تو اس کے اپنے بھائی نے بے ہوش کرنے والے سے صلحنامہ کر لیا۔ لیکن جونی نے آہستہ آہستہ اسے صلحنامے اور امدادِ باہمی کے معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ وہ سر ہلاتا رہا اور بار بار اس جگہ کو دباتا بھی رہا جہاں ایک گومڑا اُبھر آیا تھا۔

"اگر یہ بات ہے۔" اس نے ساری بات سُن کے کہا۔ "تو بے شک ہم دوست ہیں۔" اور مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد موہنی سے بھی ہاتھ ملانا چاہتا تھا کہ میں نے اُسے روک دیا۔

"اپنی بیوی کی طرف سے میں ہاتھ ملاؤں گا۔" اور دوبارہ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مصافحہ کیا۔
وہ تھوڑا سا خفیف ہوا۔" ہم دونوں بھائی نہیں، دوست ہیں۔" وہ بولا۔" اور اچھے دوستوں کی طرح ہم انڈراسٹینڈنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔"
" اور ہر معاملے میں شیئر کرتے ہیں۔" جونی نے کہا۔
" خدا کرے آپ دونوں میں یہ اشتراک شادی کے بعد بھی برقرار رہے۔" میں نے کہا۔
وہ دونوں بے شرمی سے منہ پھاڑ کے ہنسنے لگے۔ پھر مجھے سڑک کے کنارے ایک ریسٹورنٹ نظر آیا جو فلائنگ کوچ قسم کی گاڑیوں کے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں ہمیں معمولی درجے کی کافی اور بہت اعلیٰ قسم کے سینڈوچ ملے۔ جیکی نے مجھے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی سگریٹ پیش کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں زیادہ چالاک ہے۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے کا طواف کرتی تھیں اور وہ کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شک نظر آرہا تھا۔
بالآخر یہ شک اس کی زبان پر آگیا۔" اولڈ مین... ایک بات کہوں... تم برا تو نہیں مانو گے؟"
" نہیں... میں دوستوں کی بات کا برا نہیں مانتا۔"
" تم... اور تمہاری وائف... دونوں کی عمر میں بہت فرق ہے۔" وہ بولا۔
" ہاں... یہ میری چوتھی بیوی ہے۔" میں نے کہا۔
" چوتھی؟... اوہ گاڈ... باقی تین کہاں ہیں؟" وہ بولا
" بیک ٹو دی پویلین۔" میں نے گول مول بات کی۔ اس کا مطلب یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ انا للہ اور یہ بھی کہ وہ ماں باپ کے گھر بیٹھی ہیں۔
" میرا خیال ہے... کہ تم اتنے بوڑھے نہیں ہو... جتنے نظر آ رہے ہو۔" وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔" یا نظر آنا چاہتے ہو... تم نے میک اپ کیا ہے؟"
" مجبوری ہے..." میں نے کہا۔" میں واپس جیل جانا نہیں چاہتا۔"
جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔" تم گنجے بھی نہیں ہو۔" وہ بولا۔" اور تمہاری یہ داڑھی بھی نقلی ہے۔"
" تم نے کیسے جانا؟" میں تھوڑا سا متفکر ہو گیا۔
جیکی ہنسا۔" ہر شخص جس کی نظر تیز ہوگی، دیکھ لے گا کہ تمہارے گنجے سر اور بلیک اینڈ وائٹ داڑھی کے ساتھ تمہارا جسم میچ نہیں کرتا... میرا مطلب ہے کہ... اپنے ہاتھ دیکھو... کتنے جوان ہیں۔ اور تمہاری گردن کے قریب جو کھال ہے وہ بہت ٹائٹ اور فریش ہے۔"

میں اس کے مشاہدے پر حیران رہ گیا۔ بلاشبہ یہ
سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔" اس کا مطلب ہے کہ ہمیں محتاط ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔
ہم وہاں سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ ہمارے پیچھے آ کے رکی۔ میں تھوڑا سا آگے جھکا ہوا نیچے گر جانے والی اٹھا رہا تھا چنانچہ میں نے بیک ویو مرر میں کار کی اور ہوئے شخص کی صرف ایک جھلک سی دیکھی۔ ایک لمحے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے شک ہوا کہ میرے دل کا خوف مجھے بھیانک تصویریں دکھا رہا ہے جن کا تعلق سے ہے حقیقت سے نہیں... لیکن پلٹ کر دیکھنے پر مجھے آنکھوں پر یقین آیا۔ میں نے پیڈرو کو ہی دیکھا تھا۔ اس وہی بھی سلیٹی رنگ کی ٹوپی تھا... شاید میری صورت نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بھی پیچھے دیکھا مگر بہت آگے نکل آئے تھے اور پیڈرو کی کار نظروں سے اوجھل
بال بال بچے اس وقت تو۔" جیکی نے اچانک
میں اچھل پڑا لیکن یہ بات اس نے مجھ سے نہیں
"کیوں... کیا ہوا؟" جونی نے کہا۔
" ویل وو دیٹ فیس۔" جیکی بولا۔" اس کی گاڑی پیچھے آ کے رکی تھی۔"
" کس کی بات کر رہے ہو؟"
" ہماری ڈیئر مدر کا برادر ان لا۔" جیکی نے کہا۔" کسی اسے گولی مار دوں گا... لگتا ہے وہ پھر ڈیڈی کو شرف بخشنا چاہتا ہے۔"
" اوہ نو..." جونی نے کہا۔" اب وہ کیا لینے آرہا
پہلے پیڈرو کو عین اپنے پیچھے دیکھ کر اور اب یہ
میں اتنا حیران اور پریشان ہوا تھا کہ سانس بھی لینا بھول خدا نے تو مجھے بال بال بچایا تھا۔ اگر میں جھکا نہ ہوتا تو سے پیڈرو مجھے ضرور دیکھ لیتا۔ اور اس خبیث کی نظر کا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میرے موجودہ حلیے سے واقف ہو۔ کمپنی بہت باخبر لوگ تھے۔ موہنی کو اس نے پیچھے سے دیکھا اس کا صرف سر نظر آیا ہوگا۔ موہنی کا چہرہ بکھرے ہوئے بالوں اوٹ میں تھا۔ لیکن ابھی سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ پیڈرو دیکھا یا نہیں... اگر اس نے دیکھا ہوگا تو وہ اطمینان سے میں آئے گا۔ اس نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہوگا۔ ملتان پہنچنے پہلے وہ اپنی بڑی کار کو دوڑاتا ہوا لائے گا تو آدھے گھنٹے روانہ ہو کے بھی اس فرق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے جیکی اور جونی کی گفتگو نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

تھے۔ وہ پیڈرو کی بات کر رہے تھے یا کسی اور کی۔ میں اس کار کے دوسرے مسافروں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ کون تھا ان کی ڈیئر مدر کا ایڈورنٹ؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ تجسس ان کے دل میں شکوک پیدا کر دے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کار کے کسی دوسرے مسافر کی بات کر رہے ہوں۔ میں منتظر رہا کہ وہ خود ہی کوئی بات کریں گے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ موضوعِ سخن بدل جاتا میں نے کہا۔" یہ تم کس کو گولی مارنے کی بات کر رہے تھے؟"
" ہے ایک شیطان... اس نے ہمیں تقریباً لوٹ لیا ہے۔" جیکی نے بڑی ... سے کہا۔" یہ جو ہماری برانڈ نیو ماں ہے... یہ اسی کا بھائی ہے۔ لیکن مجھے شک ہے۔"
" کیا شک ہے؟" میں نے ظاہری بے نیازی سے کہا۔
" یہی... کہ وہ بھائی بہن ہیں..." جیکی بولا۔" اس نے ہمارے ڈیڈ کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ چکر چلایا ہے۔"
" تمہارا ڈیڈ مجھے ایسا آدمی تو نہیں لگتا جیسے کوئی بے وقوف بنا کے لوٹ سکے۔" میں نے کہا۔
" ہر آدمی کی عقل اس عمر میں گھاس چرنے جا سکتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب گھاس بہت ترو تازہ اور نظر فریب ہو۔" جیکی بولا۔" اور ایک بوڑھا بیل برسوں سے بھوکا ہو۔" وہ اس مثال پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔
" ہماری کچھ بہت قیمتی زمین تھی... بہت عمدہ لوکیشن پہ۔" جونی نے بات آگے بڑھائی۔" دِس وومن... اس کا نام ہے مرکری۔"
" مرکری!" موہنی نے کہا۔ وہ اپنی حیرانی پر قابو نہ رکھ سکی تھی ورنہ معاملات کے قابو میں آجانے کے بعد وہ بیشتر وقت خاموش رہی تھی۔
" پارہ... یہی ہے اس کا نام... اور صفت بھی ایسی ہی پائی ہے اس نے..." جیکی بولا۔" بیگم پارہ نے..."
میں چونک پڑا۔" بیگم پارہ!"
میرا چونکنا انھیں عجیب لگا لیکن گڑبڑ میرے لاشعور میں ہوئی تھی۔ میں نے ایک فلم دیکھی تھی 'استاد پیڈرو' جس میں پیڈرو کا کردار شیخ مختار نے کیا تھا اور اس کی ہیروئن تھی بیگم پارہ جو ایک ایسی اداکارہ جو بے باک رول کرنے میں خاصی شہرت رکھتی تھی۔ مجھے بیگم پارہ کا نام سنتے ہی استاد پیڈرو کا خیال آیا اور دونوں ناموں کا فلم سے حقیقت کی دنیا میں رشتہ قائم ہوا تو میں چونک پڑا۔
" سوری... مجھے اس اداکارہ کا خیال آگیا تھا۔" میں نے کہا۔
" اداکارہ تو یہ بھی ہے۔" جیکی نے اس وضاحت سے مطمئن ہو کے کہا۔" تم ایسا کیوں نہیں کرتے... آج رات ہمارے مہمان ہو جاؤ۔"
" اوہ یس..." جونی نے کہا۔" تم صورتِ حال کو دیکھ اور سمجھ سکو گے۔"
" اسے تو میں نے سمجھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔" آئی وش کہ میں تمہاری دعوت قبول کر سکتا... لیکن آج کی رات میرے لیے اہم ہے... میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔"
" اچھا... تو پھر ایسا کرو... دو چار گھنٹے کے لیے اسٹاپ اوور کرو۔"
" ہاں... اتنی دیر میں یہ لوگ بھی پہنچ جائیں گے۔" جونی بولا۔
" میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہوں گے۔"
میرا حلق خشک ہونے لگا۔" کیوں یقین ہے تمھیں...؟"
" اس لیے کہ وہ اپنی ڈیل فائنل کریں گے۔" جیکی بولا۔" میں جس زمین کی بات کر رہا تھا، وہ انڈسٹریل ایریا کا پلاٹ ہے۔ ہم خود یہ چاہتے تھے کہ وہاں انویسٹمنٹ کریں... اس کی قیمت تو پہلے بھی بہت دے رہے تھے لوگ... ہم اسے بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ کوئی بھی پارٹی ہمارے ساتھ مل کے ایک ٹیکسٹائل مل لگانے پر تیار ہو جاتی... ہم نے کچھ بات بھی آگے بڑھائی تھی کہ اس عورت نے کوئی چکر چلا دیا اور ہمارے ڈیڈ نے وہ زمین بیچ دی... صرف پچاس لاکھ کے لیے... اور اس عورت کو غالباً اسی لیے ہمارے ڈیڈ کے پیچھے لگایا گیا تھا۔"
" یہ دوسری پارٹی وہاں کیا کرنا چاہتی ہے؟"
" وہ کوئی مشین ٹول فیکٹری قائم کر رہے ہیں۔" جیکی بولا۔" زرعی مشینری کے آلات اور پرزے بنانے کا پروجیکٹ ہے جو میرے خیال میں بالکل منافع بخش نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسی ہی دو فیکٹریاں خسارے میں چل رہی ہیں... اور ایک تو انھیں بہت سستی مل سکتی ہے... اگر یہی ان کی پلان ہے تو دُگنے سرمائے سے یہ بزنس؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔
لیکن اصل بات یہ لڑکے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ان کی پلان میں نے سمجھ لی تھی۔ زرعی مشینری کے پرزوں کا نام سنتے ہی مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اور میرے دماغ کے کمپیوٹر نے بہت سے حقائق کو یکجا کر کے ایک رزلٹ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ یہ چوہدری دلاور کے ذہن کی منصوبہ بندی تھی کہ اس نے لاہور کے 'ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپلیکس' کو ختم کیا۔ وہاں سے تمام اسلحہ ساز مشینوں کو ہٹا لیا کیونکہ ہم ان کے کاروبار کی تہ تک پہنچ چکے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

تھے۔ وہ زیادہ عرصہ وہاں زرعی مشینوں کے پُرزوں کے نام پر اسلحہ سازی نہیں کر سکتے تھے۔ دلاور نے اس پلاٹ پر رفاہی اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا۔ میدانِ سیاست میں قدم رکھنے کے لیے یہ ایک چونکا دینے والا اور سب کی تعریف و توصیف حاصل کرنے والا عمل تھا۔ چودھری دلاور نے بہت اچھا اسٹارٹ لیا تھا۔ دوسرا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ اسپتال کو اپنے مرحوم دوست وزیر خان کے نام سے منسوب کر دیا۔ چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد۔ جس کو اپنے ہاتھوں مارا اسی کے نام سے نیکی کمالی۔ سب کے دل سے شکوک و شبہات مٹ گئے اور بات یوں مشہور ہوئی کہ دوست ہو تو ایسا... بدنام میں ہوا کہ اسے بدنام کیا... تیسرا قدم اُس نے مختلف سمت میں یوں اٹھایا کہ کسی کو پتا نہ چلا... اس نے ملتان کے قریب کوئی جگہ منتخب کر لی، جہاں وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کو منتقل کر سکے۔ پرانا کاروبار نئی جگہ پر جا رہا ہے۔ میری وجہ سے انھیں منتقلی کے عمل سے گزرنا پڑا لیکن یہ چودھری دلاور کے شاطر ذہن کا کمال تھا کہ اس نے زحمت کو رحمت میں بدل لیا۔ اُس نے پیڈرو سے کہا کہ وہ زمین حاصل کرے... شاید یہ زمین حاصل کرنے میں انھیں دشواری پیش آئی۔ جان محمد عرف جونی اور شفیع محمد عرف جیکی بگڑے ہوئے ضرور تھے مگر بے وقوف نہیں تھے۔ بگاڑا ان کو پیسے کی فراوانی نے تھا لیکن وہ تھے تو سلطان محمد خان گردیزی کی اولاد... وہ ایک ذہین، حوصلہ مند اور سیلف ڈسپلن کا پابند، مضبوط قوّتِ ارادی اور صحیح قوّتِ فیصلہ رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یہ خواص اس کی اگلی نسل میں بھی منتقل ہوئے تھے۔ جونی اور جیکی نے باپ کی مخالفت کی اور شاید وہ کامیاب بھی ہو جاتے مگر ایک عورت کے شباب اور عشوہ گری نے بوڑھے دماغ کو شکست فاش دی۔ پیڈرو نے آدمی کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا جس نے اُسے جنت سے نکلوایا تھا۔ ایک بنتِ حوا نے اس کی قوّتِ فیصلہ مفلوج کر دی اور جوان بیٹے کچھ نہ کر سکے۔

فیصلہ میں نے فوراً کیا۔ میں نے کہا۔ "میں ایک شرط پر رُک سکتا ہوں۔"

"وہ کیا شرط ہے؟" وہ دونوں بولے اور پھر ہنسنے لگے۔

"شرط یہ ہے کہ میں سامنے نہیں آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر تم کوئی ایسا انتظام کر سکتے ہو کہ ہمیں کوئی بھی نہ دیکھے... لیکن ہم ان سب کو دیکھ لیں... جن سے ہمارا واسطہ ہوگا۔"

میں سمجھ گیا۔" جیکی نے چٹکی بجائی۔ "تم بہت دُور اندیش ہو۔"

"ایسے کام میں ہونا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ہر قتل کے بعد پھانسی ہوتی تو اب تک بائیس بار ہو جاتی۔"

"ان کو پیچھے سے لے جانا۔" جونی نے کہا۔ "سوئمنگ پول کی طرف سے اوپر لے جانا۔"

"اوپر... مگر ڈیڈ کا بیڈروم تو ہے اوپر..."

"وہ بیڈروم میں جائیں گے گیارہ بارہ بجے کے بعد۔"

"ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہریں گے۔" میں نے کہا۔

جیکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم سات بجے تک پہنچ جائیں گے۔ سوا سات، ساڑھے سات بجے تک اندھیرا ہو جاتا ہے۔"

"اگر تمھارے نوکروں نے دیکھا تو...؟" میں نے کہا۔

"وہ نہیں دیکھیں گے۔ ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ آنکھیں بند کر لو تو وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔" جیکی بولا۔ "ایسا اکثر ہوتا ہے۔"

صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہ سب برداشت کریں۔ میں نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ دبایا اور اُسے خاموش رہنے کو کہا۔ وہ یقیناً حیران ہو گی کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں لیکن میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد ہم ملتان پہنچے اور تقریباً پندرہ منٹ بعد جیکی اور جونی کے چار کنال پر پھیلے ہوئے محل میں۔ یہ قدیم طرز کی کوٹھی تھی جو تعمیر میں مشرقی روایات کا حسن رکھتی تھی۔ صدر دروازے پر میں نے ایک مسلح محافظ کو ٹہلتے دیکھا... اندر بہت سی گاڑیاں نظر آئیں جو ایک طرف کھلے حصے میں پارک کی گئی تھیں۔ ان میں یقیناً ملنے کے لیے آنے والوں کی گاڑیاں بھی ہوں گی... درجن بھر سے زائد گاڑیاں کون رکھتا ہے۔

جیکی مجھے اور موہنی کو پچھلی طرف نسبتاً چھوٹی سڑک پر کھلنے والے ایک دروازے سے گزار کے اندر لے گیا۔ سرونٹ کوارٹروں میں سے کوئی عورت نکلی اور اس نے جیکی کو سلام کیا۔

"تیرا میاں کہاں ہے؟" جیکی نے کہا۔

"نہیں معلوم چھوٹے صاحب۔" وہ گھبرا کے بولی۔

"چل پھر تو بھی اندر ہو جا... باہر کیوں کھڑی ہے؟" جیکی نے کہا۔

وہ عورت فوراً غائب ہو گئی۔ میں نے اندازہ کیا کہ جیکی کا حکم بھی فرمانِ شاہی کا درجہ رکھتا ہے اور ملازمین بلاچوں و چرا تعمیل کے عادی ہیں۔ اُس نے پہلے سرونٹ کوارٹر پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی ایک جوان اور صحت مند عورت تھی جس نے پھول دار ریشم کی تنگ قمیص پہن رکھی تھی۔

"ایواگارڈنر... وہ تیرا خصم کہاں ہے؟"

"دم لگانے کی تیاری کر رہا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"اُسے فوراً باہر پھینک دے۔" جیکی بولا۔

"تم اسے ایواگارڈنر کیوں کہتے ہو؟ وہ تو بڑی زبردست اور بہت خوب صورت بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا نام حوا مالی ہے۔" جیکی بولا۔ "اور اس کا شوہر مالی ہے... چنانچہ یہ ایواگارڈنر ہے... اور حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے... ڈیڈ کے پیر دباتی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اس سے بہتر پاؤں دبانے والا کوئی نہیں... پانچ سال سے وہ یہی کام کر رہی ہے۔ جب تک وہ پیر نہ دبائے ڈیڈ کو نیند نہیں آتی۔"

اس قسم کے ماحول میں پرورش پانے والے لڑکے عیاش تو ہوں گے، میں نے سوچا۔ ان کے نزدیک ہر عورت صرف عورت ہے خواہ وہ کسی کی بھی ماں، بہن یا بیوی بیٹی ہو۔

مالی ایک چرخ بڈھا تھا۔ اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی اور میرے اندازے کے مطابق چالیس پینتالیس سال کا ہوگا مگر وہ حد سے زیادہ لاغر تھا۔ اس کی سیاہ کھال اس کے جسم کے ڈھانچے پر منڈھی ہوئی نظر آتی تھی اور اپنی فربہ بدن گوری چٹی بیوی کے برعکس وہ بے حد عمر رسیدہ بھی لگتا تھا۔

"مالی بادشاہ... کیا گل کھلا رہے تھے؟" جیکی نے کہا۔ "دیکھو یہ ہمارے ساتھ مہمان آئے ہیں، انھیں کمرۂ خاص میں پہنچا دو۔"

مالی نے سر ہلایا اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ جیکی اسی چور دروازے سے باہر چلا گیا۔ غالباً صدر دروازے سے باقاعدہ اندر داخل ہو کے ڈیڈ کو سلام کرنے کے لیے۔

میں نے مالی کے پیچھے مختلف کمروں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ ہے اور اس کی آواز ڈوبتی جا رہی ہے۔ غالباً وہ دم لگا چکا تھا۔ نشے کا اثر غالب آ رہا تھا۔

جب وہ ہمیں ایک انتہائی آراستہ خواب گاہ میں چھوڑ کے چلا گیا تو موہنی صوفے پر گر پڑی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی...؟"

"میری ہر ضرورت تمھاری سمجھ میں آنی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو... بڑی غلط جگہ ہے۔ کیسے عجیب لوگ ہیں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں اِدھر اُدھر دیکھ کے بولی۔ "ایسا نہ ہو ہم بھی یہاں قید ہو جائیں... ایسا لگتا ہے کہ یہاں آنے کے بعد جانے کا راستہ نہیں ملتا ہوگا۔"

"اس وقت آٹھ بجے ہیں۔" میں نے کہا۔ "دس بجے ہم اسی راستے سے لوٹ جائیں گے۔"

وسیع بیڈروم میں چاروں طرف چھت سے فرش تک سرخ ریشمی پردے تھے۔ نیچے وال ٹو وال گہرا سبز قالین بالکل قدرتی گھاس کے رنگ کا تھا۔ کنگ سائز بیڈ ملتان کے دستکاروں کی فنکاری کا نادر نمونہ تھا اور اس کی سائیڈ پر ایک پینل تھا جس میں ایک درجن کے قریب سوئچ لگے ہوئے تھے۔ مجھے کمرے کے چار کونوں میں چار رنگ کی اسپاٹ لائٹ نظر آئی۔ تجربے کے لیے میں نے ایک بٹن کو دبا کے دیکھا۔ سرخ روشنی کا دائرہ بیڈ کے مرکز میں ٹھہر گیا۔ میں نے اسے آف کر دیا۔ بیڈ کے بالکل اوپر چھ فٹ لمبا اور چوڑا آئینہ بڑی مہارت سے آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کو معلّق رکھنے والی راڈ چھت تک پہنچتی تھی۔ باقی سوئچ ٹی وی اور میوزک سسٹم آن کرنے کے تھے۔ کال بیل اور انٹرکام کے تھے۔ میں نے سب کو چیک نہیں کیا کیونکہ جیکی یا جونی میں سے کوئی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ کمرے میں دو ایئرکنڈیشنر چل رہے تھے اور ایئر فریشنر کے ساتھ ان کی ٹھنڈک مل کے بڑی فرحت بخش فضا پیدا کر رہی تھی۔

جیکی اچانک اندر آ گیا... وہ کچھ اَپ سیٹ تھا۔

"وہ خبیث آ گیا ہے۔" جیکی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے ڈیڈ سے شکایت کی کہ ہم اسے نظرانداز کر کے نکل گئے۔"

"تم نے نام نہیں بتایا ابھی تک اس کا۔" میں نے کہا۔

"وہ خود کو میر شرافت علی کہتا ہے۔" جیکی نے کہا۔

میں بے اختیار اچھل پڑا۔ اگر جیکی میرے سامنے غبارے کی طرح اُڑ کر چھت سے جا لگتا تو میں اتنا حیران نہ ہوتا۔ "میر شرافت علی...؟"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" جیکی نے حیرانی سے پوچھا۔

اس وقت میں سچ بولتا تو کہتا کہ ہاں۔ میں میر شرافت علی کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ میں اس کا قاتل ہوں۔ اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ اس کا قاتل وہی ہے جو آج میر شرافت علی بن کے آیا ہے۔ کیا ایسا بھی ہوا ہے کبھی کہ قاتل نے مقتول کا نام رکھ لیا ہو اور اس کا روپ دھار لیا ہو۔ قانون تو قتل کی فردِ جرم مجھ پر عائد کرتا ہے مگر میر شرافت علی زندہ ہے تو میں بھی قاتل نہیں رہا۔ جب مقتول کوئی نہیں تو قاتل کون۔ میں اسے بتا سکتا تھا کہ میرے ایماندار اور اصول پرست باپ نے وزیر خان اینڈ کمپنی قائم کی تھی۔ پھر وہ میر شرافت علی کے شامل ہونے سے میر وزیر اینڈ کمپنی بن گئی تھی۔ جب دلاور شامل ہوا تو وہ ایم ڈبلیو ڈی انجینئرنگ کمپنی ہو گئی تھی لیکن اس میں سے ایم اور ڈبلیو ایسے خارج کر دیے گئے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ مگر میں نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ "نہیں... میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کسی میر شرافت علی کو کیسے جان سکتا ہوں... اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"نیچے ڈیڈ کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہیں۔"

"کیا میں انھیں دیکھ سکتا ہوں... یا اُن کی گفتگو سُن سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دیکھنا ذرا رِسکی ہوگا۔ گفتگو سُن لو... لیکن دیکھو... یہ ایک خفیہ انتظام ہے... ڈیڈ کو بھی اس کی خبر نہیں۔" وہ بولا اور اس نے سوئچ بینل کے نیچے بیڈ سائڈ ٹیبل کا مقفل خانہ کھول کر ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا۔ اس کے اینٹینا کو کھینچ کے لمبا کیا اور اسے آن کر دیا۔ ڈائل پہ ایک ننھی سی سُرخ لائٹ روشن ہوگئی۔ اس نے واکی ٹاکی مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا لیا۔

"یہ تو غلط بات ہے سلطان صاحب۔" میں نے پیڈرو کی آواز سُنی۔ "آپ بیعانہ لے چکے ہیں۔"

"اچھا... مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" یہ یقیناً جیکی اور جونی کا باپ تھا۔ وہ اسی کے لہجے میں مگر زیادہ اعتماد کے ساتھ بات کرتا تھا۔

"کیا مطلب... ہم نے رسید نہیں لی... آپ پر بھروسا کیا اس لیے آپ انکار کر سکتے ہیں؟" پیڈرو برہمی سے بولا۔

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" سلطان بولا۔ وہ بے حد محتاط اور ہوشیار آدمی تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ اس کی گفتگو کوئی ریکارڈ نہ کر رہا ہو... یا وہ اس لیے غیر سنجیدہ تھا کہ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔

"سلطان صاحب... معاملہ طے ہو جانے کے بعد آپ کا رویّہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" پیڈرو بے بسی سے بولا۔ "رقم بڑھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"بات یہ ہے میر صاحب کہ میرے بیٹے میری مخالفت کر رہے ہیں۔ ویسے کتنے میں ہوا تھا یہ سودا؟ معاف کرنا میری یادداشت کچھ قابلِ اعتماد نہیں رہی اس عمر میں..." سلطان بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور جانتے بوجھتے پیڈرو کو زچ کر رہا ہے۔

"آئندہ ہم تحریری معاہدے کریں گے۔ پکّے کاغذ پر قانون کے مطابق ساری کارروائی ہوگی۔ وکیلوں اور گواہوں کی موجودگی میں۔" پیڈرو نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری آفر پچاس لاکھ کی تھی۔ دس فیصد بیعانہ دیا تھا ہم نے... آپ اسے بھول رہے ہیں تو ہم بھی بھول جاتے ہیں۔ ہم پھر پورے پچاس لاکھ دیں گے... یکمشت مگر اس وقت جب سیل ایگریمنٹ کی رجسٹری ہوگی۔"

"اخراجات آپ کے؟"

"اخراجات بھی ہمارے... چلیے منظور... مگر اب آپ صاف بات کریں... اپنے بیٹوں کے کندھے پہ بندوق رکھ کے نہ چلائیں۔

یس یا نو..." پیڈرو کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا۔

"اگر میں تو کہہ دوں تو کیا ہوگا؟" سلطان نے تیز
لہجے میں سوال کیا۔

"وہ آپ دیکھ لیں گے..."

"تم دھمکی تو نہیں دے رہے ہو مجھے؟" سلطان
مشتعل نہیں تھا۔ الٹا وہ پیڈرو کا مذاق اُڑاتا محسوس ہو

"ہم کچھ دوسری طرح کے لوگ ہیں سلطان صاحب
جو کرنا ہو کر گزرتے ہیں۔ دھمکی کیا دینی۔"

"یہ اچھی بات ہے... میں بھی دوسری قسم کا آدمی
سلطان نے جیسے خوش ہو کے کہا۔ "ایک بات سنی
میر صاحب۔ آپ کے فائدے کی بات ہے... یہ جو آپ
والے ہیں نا...؟"

"مجھے معلوم ہے وہ اپنی فیکٹری پچاس لاکھ میں
"کمال ہے... تم بنی بنائی چلتی ہوئی فیکٹری کیوں نہیں
سلطان نے کہا۔ پھر ان کے درمیان کاروباری بحث
میں نے واکی ٹاکی واپس جیکی کو تھما دیا۔

"ان مذاکرات میں تمھاری والدہ ماجدہ شریک نہیں

"وہ ایک پروفیشنل فیشن شو میں گئی ہے۔" جیکی نے
ماجدہ کے نام پر بُرا سا منہ بنایا۔ "ورنہ وہ ڈیڈ کو تنہا
کیا تم نہانا پسند کرو گے؟ ایسا زبردست ٹرکش باتھ ہے
کی طرف دیکھ کے ہنسا۔ موتی کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔ میں نے
سر ہلا دیا۔

"ہم صرف تمھاری بیگم پارہ کو ایک نظر دیکھیں گے اور
بھائی میر شرافت علی کو۔" میں نے کہا۔

"معلوم نہیں وہ کس وقت آئے گی۔" جیکی نے کہا

"اس کی کوئی تصویر تو ہوگی؟"

"آف کورس... میرے ساتھ آؤ... مگر ذرا دھیان
ڈیڈ کے کمرے میں جانا ایسا ہی ہے جیسے شیر کی کچھار میں
ہونا۔" وہ بولا۔ اور باہر کوریڈور میں جھانکنے لگا۔ پھر اس
ہمیں ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں باہر نکلا تو موتی بھی اُٹھ کھڑی

"تم ٹھہرو..." میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس
میں معلوم نہیں کیا ہو جائے۔"

اس کی بات جیکی نے نہیں سُنی تھی۔ ہم فانوسوں
نیلے رنگ کے قالینوں والی راہداری میں چلنے لگے... جیکی
چوتھا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور مایوسی سے سر
مقفل تھا... اسی وقت جونی نمودار ہوا۔ اُس نے دروازے

مل کر دیا... وہ تالے کھولنے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔

"وہ آگئی ہے۔" جونی نے نیچے دیکھ کر کہا۔

"آگئی ہے۔" جیکی بولا۔ "کیا کر رہی ہے؟"

"بیٹھی ہے اپنے سو کالڈ بھائی کے ساتھ... اور وہ اُسے
لپٹا کے پیار کر رہا ہے... شیطان..." جونی نے برہمی سے کہا۔
"اگر تم ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لو تو مان لو گے کہ وہ بہن بھائی
نہیں ہیں۔"

"میں ان کو تصویر دکھانے لایا تھا۔" جیکی بولا۔

"جلدی سے دیکھو اور نکل جاؤ۔" جونی نے کہا۔ "کہیں وہ لباس
بدلنے کے لیے ہی نہ آجائے۔"

جیکی نے کہا۔ "وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد لباس بدلتی ہے۔"

اس بیڈروم کی شان و شوکت ہی نرالی تھی۔ یہ بیڈ روم
نہیں مونٹی کارلو کے کسی ٹاپ کلاس نائٹ کلب یا ٹوکیو کے کسی فائیو
اسٹار ہوٹل کا برائڈل سوئٹ لگتا تھا... میں بڑے میاں کی رنگینیِ طبع
کے نظارے پہ دنگ رہ گیا۔ موتی تو ایسی گھبرائی کہ ممکن ہوتا تو وہ اُلٹے
پاؤں بھاگ لیتی مگر وہ اپنی مرضی سے آئی تھی اور اب نہ جائے
رفتن نہ پائے ماندن۔ وہ منہ پھیرے کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی
اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ پسینہ اُس کے سر سے پیر تک جاری ہوگا۔
صرف بیڈ کے سامنے والی دیوار خالی تھی اور اس پر ایک ہی عورت
کی قدِ آدم پورٹریٹ لگی ہوئی تھی۔

اس تصویر خانے میں قدم رکھتے ہی میں بھی مبہوت کھڑا رہ
گیا تھا اور دونوں بھائی میری حیرت پر خندہ زن تھے۔

"یو سی... ہمارے ڈیڈ کتنے باذوق ہیں؟"

"اور ہم سے زیادہ جوان دل رکھتے ہیں۔"

پھر میں نے اس پورٹریٹ کو دیکھا اور مجھ پر بجلی گر پڑی...
زیب النسا۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکل گیا۔

"زیب النسا؟" جیکی نے حیران ہو کے کہا۔ "اس کا نام پارہ
ہے... میں نے بتایا تھا۔"

"ہاں... ہاں..." میں نے خود کو سنبھالا۔ "مجھے یاد آگیا۔"

"یہ زیب النسا کون ہے؟" جونی نے کہا۔ "جو تمھیں یہ پورٹریٹ
دیکھ کر یاد آئی۔"

"وہ... شاید تم نے تاریخ نہیں پڑھی۔" میں نے اپنے
ذہن کو صدمے سے سنبھال لیا تھا۔ "شہنشاہ اورنگ زیب کی
بہن تھی۔ بہت خوب صورت عورت تھی۔ اور شاعرہ تھی۔ یہ ہو بہو
اس کی تصویر ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ یہ وضاحت انھیں مطمئن کر دے گی...
زیب النسا جو اورنگ زیب کی بہن تھی سخت پردے میں رہتی
تھی۔ چونکہ سخت پابندِ شرع بھائی کے عہدِ حکومت میں موسیقار، شاعر

اور مصور معتوب تھے۔ شاید اسی لیے میں نے زیب النسا کی کوئی خیالی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔ انگلش میڈیم کے جیکی اور جونی نے تو اس کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔

میرے دماغ میں زیب النسا کی اس تصویر نے عجیب طوفان بپا کر دیا تھا۔ اگر اس تصویر اور زیب النسا کے نقوش میں سرِمُو فرق ہوتا تو میں اس مشابہت کو اتفاقیہ سمجھتا لیکن اب میں قسم کھا سکتا تھا کہ یہ وہی زیب النسا ہے جو نواب خسرو جمشید کی بہن تھی لیکن وہ لاہور میں تھی اور اس کے روز و شب کا سارا افسانہ مجھے معلوم تھا۔ وہی زیب النسا کسی سلطان محمد خان کی عشوہ فروش بیوی کیسے ہو سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ زیب النسا بھی عشوہ گر تھی مگر وہ عشوہ فروش نہیں تھی۔ وہ بھی اپنی عشوہ طرازی سے فتنۂ محشر بپا کرنے کی اہل تھی اور اپنی معصوم ادائے حسن سے بڑے بڑے افلاطونیت کے دعوے رکھنے والوں کو کاٹھ کا اُلّو بنا سکتی تھی اور اپنی مردانگی پہ ناز کرنے والوں کو اشارۂ ابرو سے چت کر سکتی تھی... یہ عورت بھی ایسا ہی کر رہی تھی لیکن مختلف انداز سے۔ جیکی اور جونی کے بیان کے مطابق یہ عورت ان کے باپ کی سیکرٹری بھی رہی تھی۔ چنانچہ طے شدہ طور پر یہ زیب النسا نہیں تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کون تھی؟ کیا زیب النسا کی کوئی اور بہن؟ پورٹریٹ میں تو مصور نے شباب کے سورج کو نصف النہار پہ دکھایا تھا لیکن ایسا تو سب ہی مصور کرتے ہیں۔ کوئی عورت ایسی پورٹریٹ پسند نہیں کرتی جو اس کی اصل عمر ظاہر کرے۔ وہ خود کو پورٹریٹ میں بہرحال ہمیشہ جوان دیکھتے رہنا چاہتی ہے۔ یہ زیب النسا کی بڑی بہن ہو سکتی تھی۔ مگر اس کا فیصلہ میں پارہ کو دیکھ کر ہی کر سکتا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی صرف نواب خسرو جمشید ہی دے سکتا تھا کہ زیب النسا کے علاوہ بھی اس کی کوئی بہن تھی یا نہیں... جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس نے زیب النسا کو اپنی اکلوتی بہن کہا تھا۔ میرا دماغ اس معمے میں اُلجھنے لگا تھا۔ پیڈرو... بیگم پارہ... زیب النسا اور خسرو جمشید۔ ان سب کے درمیان تعلق تو ثابت تھا اور اس کی نوعیت بھی واضح تھی۔ یہ ایک ایسی مستطیل بنتی تھی جس کے دو ضلعے جمشید اور زیب النسا تھے تو دوسرے دو ضلعے پیڈرو اور یہ عورت بیگم پارہ... جسے پیڈرو میر شرافت علی بن کے اپنی بہن کہتا تھا مگر جیکی کا یقین بہن بھائی کے رشتے کی نفی کرتا تھا۔ خیر آج رات خسرو جمشید سے تو ملاقات ہونی ہے۔ میں نے سوچا۔

"اب چلو بھی نا..." میں نے موتی کی آواز سنی اور جیکی کو ہنستا ہوا دیکھا تو چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بہت دیر تک اس پورٹریٹ کو گھورتا رہا ہوں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں نے سلطان محمد خان کو اپنے سامنے پایا۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جیکی اور جونی کا باپ ہے۔ اس کی صورت

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اپنے دونوں بیٹوں کے نقوش کی جھلک تھی۔ اس کی آنکھیں جیکی کی آنکھوں کی طرح بڑی اور براؤن تھیں۔ اس کی ناک جونی کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ بال جیکی کی طرح براؤن شیڈ دیتے تھے تو دہانہ جونی کی طرح تھا۔ وہ قد کاٹھ میں دونوں بیٹوں سے بہتر تھا اور پچاس سال کی عمر میں بھی قابلِ رشک صحت رکھتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے مجھے اور موہنی کو گھورنے کے بعد دونوں بیٹوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ڈیڈ..."

"کچھ نہیں کے بچے... تم نے دروازہ کیسے کھولا... کس کے پاس ہے چابی...؟" اس نے چٹکی بجا کے ہاتھ پھیلایا۔

جونی نے چابی نکال کے باپ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ باپ کے سامنے ان دونوں کی ساری سرکشی اور شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ہمارے مہمان۔" جیکی نے بے اعتماد لہجے میں کہا۔

"مہمان۔" سلطان نے طنز سے کہا۔ "یہ لڑکی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ بڈھا کارٹون... یہ تمہارا مہمان نہیں ہو سکتا... کیوں لائے تھے ان کو میرے بیڈروم میں... تمہارے مہمان تھے تو تمہارے کمرے میں کیوں نہیں رہے۔" وہ اب شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ صورتِ حال یکلخت خطرناک ہونے لگی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں جیکی اور جونی سچ نہ بک دیں۔ باپ کے سامنے وہ احمق اور بے بس لگتے تھے۔ موہنی ڈر کے تقریباً مجھ سے چمٹ گئی تھی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ پیڈرو اسی گھر کی چھت کے نیچے موجود تھا اور یہ شور سن کے اوپر بھی آ سکتا تھا۔ اپنی بہن کے گھر میں وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ جانے کے لیے آزاد تھا۔

"تم لوگ نہیں بتاؤ گے؟" سلطان نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"ڈیڈ... یہ شخص..." جیکی نے کہا۔ "اور اس کی بیٹی..."

سلطان کا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "یس؟"

"یہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا تھا..." جیکی نے کہا۔ "اس زمین کے بارے میں جس کا سودا آپ میر شرافت علی سے کر رہے ہیں۔"

"وہ میری زمین ہے... اس کے بارے میں کوئی مجھے کیا بتائے گا؟" سلطان نے کہا۔

"یہ دونوں بہت دیر سے باہر بیٹھے ہوئے تھے کوئی ان کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔" جیکی نے کہا۔ "اور یہ بضد تھے کہ صرف آپ سے بات کریں گے... وہ بھی اکیلے میں... چنانچہ..."

"چنانچہ تم ان کو میرے بیڈروم میں لے آئے؟ کیا اکیلے میں کہیں اور بات نہیں ہو سکتی تھی۔" سلطان نے برہمی سے کہا۔

"ایسی کون سی بات تھی بڈھے... اسی وقت بتاؤ ورنہ ... نہیں ہو گا..."

"ہم اپنے پیر و مرشد کے حکم سے آئے تھے اللہ کے بندے..." میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ "اس زمین کو ہمارے پیر و مرشد نے سونگھا اور کہا یہ مٹی نہیں سونا ہے... مگر کوئی اسے کوڑیوں کے مول بیچ رہا ہے۔"

"اوہ شٹ اپ..." سلطان نے چلّا کے کہا۔ "مجھے ... یہ کس قسم کا ڈراما ہے... گویا اب تم مجھے ان پیروں فقیروں کے ذریعے قائل کرو گے کہ میں غلطی کر رہا ہوں... آخر بے وقوف ... ہو تم سمجھے ہو میں انھیں اور ان کے پیر و مرشد جیسے بدمعاشوں کو سیدھا کرنا جانتا ہوں... مجھ سے بڑا پیر کوئی نہیں۔" اس نے ... ایک بٹن دبا دیا۔

حسبِ توقع دو خادم نمودار ہوئے۔ وہ دونوں خاصے تندرست تھے اور مسلح بھی ہو سکتے تھے۔ موہنی نے ...

"ان دونوں کو تہ خانے میں لے جاؤ۔" سلطان نے ... "اور اُلٹا لٹکا دو... مجھے یہ کوئی نوسرباز لگتے ہیں... جو مجھے ... آئے تھے... اور یہ میرے احمق بیٹے انھیں اندر لے آئے ... کا نقشہ دیکھ لیں۔ بعد میں گروہ کے دوسرے لوگ آئیں تو ... پریشانی نہ ہو... میں خود ان سے تفتیش کروں گا... ذرا ... پہ چلے جائیں۔"

وہ دونوں آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے ... سے خود کو ٹارزن کا باپ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ جیکی کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ خود کو اس صورتِ حال کا ذمے دار سمجھتا تھا اور ... زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس نے اور جونی نے ہم سے ایک معاہدہ ... تھا اور اب اسے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ تفتیش ... نتیجے میں ہم نے اس معاہدے کے بارے میں بھی بتا دیا تو ... کا کیا حشر کریں گے؟

میں نے ان دونوں کو نظروں میں تولا جو مجھے دبوچنے ... لیے ایسے بڑھ رہے تھے جیسے وہ ببر شیروں کی جوڑی ہو ... ہم دونوں کمزور ہرنوں کا جوڑا۔ ان کی خوش فہمی ایک وار میں ... ہو سکتی تھی اور پلک جھپکنے میں وہ اُلٹ کر اپنے مالک کے ... میں جا گرتے اور شاید خود اُٹھ بھی نہ پاتے... لیکن میں نے مقابلے ... کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ لڑنے بھڑنے کے لیے صحیح جگہ نہ تھی ... میں اس کمرے سے نکل جاتا تو اتنی بڑی کوٹھی میں سے بہرحال ... نکل پاتا۔ میں نے موہنی کے شانے پر تھپکی دے کر اسے ... رکھنے کو کہا۔

"رُک جا۔" میں نے کڑک کر ایک نعرہ مارا۔ "اللہ کے بندے ... وہیں رُک جا... فقیروں کو ہاتھ مت لگا بھسم ہو جائے گا۔"

وہ دونوں رُک گئے۔ یہ ایک غیر ارادی عمل تھا۔

میں خود آگے بڑھا۔ "چل... ہم خود چلتے ہیں تیرے ساتھ ... تو اپنی طاقت آزما... ہم تجھے اپنا جلال دکھاتے ہیں۔" میں نے گرج کر کہا۔ "تو ڈال بیڑیاں... ہم اللہ ہُو سے کاٹ دیں گے تو اٹھا دیواریں... ہم پھونک مار کے گرا دیں گے... حق اللہ..."

میں سمجھتا ہوں میری اداکاری کام کر گئی۔ وہ دونوں مذبذب کا شکار ہو گئے کیونکہ وہ جاہل اور کمزور عقیدے کے لوگ تھے جو پیری فقیری کے شعبدوں اور درویشوں کی کرامات کے جھوٹے سچے قصے سنتے رہتے تھے اور دل میں ان کے لیے عقیدت کے جذبات بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ خود سلطان خان کے غصے کا آتش فشاں سرد پڑنے لگا۔ اب میں سینہ تانے آگے چل رہا تھا اور موہنی میرے ساتھ تھی۔ دونوں غلام میرے پیچھے ہو گئے تھے۔

"سنو... ایک منٹ ٹھہرو۔" سلطان محمد نے کہا۔

دونوں محافظ رُک گئے۔ میں نے حق اللہ کا ایک اور نعرہ مارا۔

"انھیں باہر چھوڑ آؤ۔" سلطان محمد نے کہا۔ "لیکن جیکی، یہ چکر پھر مت چلانا... تم ایسی حرکتوں سے میرا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔"

"یس ڈیڈ..." جیکی نے اطمینان کا سانس لیا۔

"چلو اللہ لوک۔" دونوں محافظوں میں سے ایک نے باادب ہو کے مجھے اشارہ کیا۔ "گستاخی معاف..."

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پیڈرو سے ٹکرا گیا جو سیدھا اندر آ رہا تھا۔ وہ نعرے بازی سن کے تیزی سے اوپر آیا تھا اور اسے مجھ سے مڈبھیڑ ہونے کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اس کے برعکس میں جانتا تھا کہ وہ گھر میں ہے۔ اسے تصادم کے بعد مجھے غور سے دیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کا ایک ہاتھ لیں مروڑا کہ وہ گھوم گیا۔ اتنی دیر میں میرا دوسرا ہاتھ ریوالور نکال چکا تھا۔ میرے آرم لاک نے پیڈرو کو اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ زور لگاتا تو اس کا بازو کلائی پر سے ٹوٹ جاتا... میں اب راہداری میں تھا اور موہنی ایک دم میرے پیچھے آ گئی تھی۔ باقی سب اس ڈرامائی تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش میں ہکا بکا کھڑے رہ گئے تھے۔ جب محافظوں کو اپنا فرض یاد آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

"خبردار... بالکل آرام سے کھڑے رہو... اللہ کے بندو۔" میں نے اسی فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "جس نے حرکت کی، وہ فقیر کا جلال دیکھے گا۔"

"سلطان۔" پیڈرو نے چیخ کر کہا۔ "گولی مار دو اس کتے کو..."

میں تمہارے گھر میں ہوں... تمہارا مہمان ہوں..."

سلطان نے سر ہلایا۔ "فکر مت کرو... یہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا... جیکی... تم اسے ساتھ لائے تھے؟"

جونی اور جیکی نے بمشکل تمام سر ہلایا... "تم... یہ کیا کر رہے ہو؟"

"یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ابھی بچے ہو... بہتر ہے کہ خاموش رہو۔"

ایک محافظ نے بڑی تیزی سے جست لگائی تھی مگر میرا سیدھا پاؤں بجلی کی طرح حرکت میں آیا۔ ٹھوکر اس کے سینے پر پڑی۔ وہ ایک چیخ مار کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ وہ بالکل فٹ بال کی طرح اُچھل کے گیا تھا اور یہ منظر ان سب کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ ایک کھچڑی داڑھی اور گنجے سر والے بوڑھے نے چھ فٹ قد والے دو سو پونڈ وزن کے جوان آدمی کو ایسے اُچھال دیا تھا۔ نیچے گرنے والا اب درد سے بلبلا رہا تھا اور سینے کو مٹھی سے پکڑے لوٹ رہا تھا۔

"میر صاحب کی جیب سے ریوالور نکال لو۔" میں نے موہنی کو اشارہ کیا۔ موہنی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔

"کمینی......" پیڈرو نے اُسے دانت پیس کے گالی دی اور اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ موہنی اگر اچھل کے پیچھے نہ ہو جاتی تو ہاتھ اس کے منہ پر پڑتا۔

میں نے پیڈرو کو آگے جھٹکا دیا اور اس کی کمر میں سر مارا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے آیا تو میں نے پھر اس کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ وہ آگے جھکا اور اس کا سر راہداری کی دیوار سے ٹکرایا۔ ایک عورت پیچھے سے چیختی ہوئی اوپر آئی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ سلطان کی دوسری بیوی تھی، جو زیب النسا کی ہم شکل ضرور تھی مگر اس کی اور زیب النسا کی عمر میں بہت فرق تھا۔ زیب النسا میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ بیس سال کی تھی تو یہ عورت اڑتیس چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ مصوّر نے اس کی پورٹریٹ میں دس سال کم کیے تھے تو دس سال خود وہ اپنی عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اس میں کمال اس کی صورت کے نقوش اور جسم کی ساخت کا بھی تھا اور خود اس کی توجہ اور محنت کا بھی... جو اس نے خود کو فٹ رکھنے میں صرف کی ہو گی۔ لباس اور میک اپ کا انداز اس کا مزید معاون ثابت ہوا تھا مگر اس کے باوجود مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زیب النسا کی بڑی بہن نہیں، اس کی ماں ہے۔

"خدا کے لیے چھوڑ دو اسے... یہ کیا کر رہے ہو تم۔" وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھ رہی تھی کہ موہنی نے اس کو اپنی حاضر دماغی سے روک لیا۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑا دی اور وہ تیز رفتاری میں خود کو سنبھال نہ سکی۔ وہ منہ کے بل گری اور پھر اُٹھی تو موہنی نے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اُسے اندر دھکیل دیا۔

پیڈرو اب ایسے جھوم رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ میں نے پھر موہنی سے کہا "اس کو نہتا کر دو۔ اب اس نے کوئی حرکت کی تو میں اس کے کپڑے اتار کر اسے سب کے سامنے اتنا ماروں گا کہ یہ اپنی اصلیت بھی بھول جائے گا۔"

موہنی نے اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"جیکی... میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اپنے ڈیڈ سے کہو کہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کریں۔ میں صرف اس شخص... میر شرافت علی کے لیے آیا تھا اور اسے ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

سلطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تمھاری میر شرافت علی سے کیا دشمنی ہے... لیکن جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔"

"ڈیڈ... پلیز آپ دخل مت دیں۔" جونی نے کہا۔

"آپ کو کیا ضرورت ہے...؟" جیکی نے کہا۔

"ضرورت ہے...!" سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ان کی دشمنی اس گھر کی چار دیواری سے باہر رہنی چاہیے۔ یہاں جو بھی ہے سلطان محمد خان کا مہمان ہے اس کی حفاظت میں ہے۔"

"کیا یہی ضمانت آپ میرے لیے بھی فراہم کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تمھارے لیے؟ تم میرے مہمان نہیں ہو۔" سلطان نے حقارت سے کہا۔

"آپ ہمارے مہمانوں کو اس گھر کا مہمان نہیں سمجھتے؟" جیکی نے تیز ہو کے کہا۔

"اگر آپ اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں تو ہم بھی اپنے مہمانوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔" جونی نے سرکش لہجے میں کہا۔

"کیا... تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟" سلطان نے اپنے جوان بیٹوں کو دیکھا جو اس کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

"تم نہیں جانتے... یہ کون ہے...؟" پیڈرو کراہ کے بولا۔

"میر صاحب... یہ بھی نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں؟" میں نے کہا۔

"دیکھو... یہ ناممکن ہے کہ تم اس حویلی سے میری اجازت کے بغیر نکل سکو... تمھیں اندازہ نہیں کہ باہر حفاظتی انتظامات کتنے سخت ہیں اور کتنے محافظ ہیں جو تمھارا راستہ روک سکتے ہیں۔" سلطان نے کہا۔ "تمھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ تم کس کے گھر میں ہو۔ میرا ایک ٹیلی فون کافی ہے۔ میں کمشنر یا ڈی آئی جی سے براہِ راست بات کر سکتا ہوں اور..."

"میں آپ کو فون تک جانے کی اجازت دیتا ہوں" میں نے کہا۔ "مگر سلطان صاحب... اگر آپ عزت دار آدمی ہیں تو اس بات کو گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جانے دیں۔ اسی میں آپ کا فائدہ ہے ورنہ آپ کو بہت کچھ بتانا پڑے گا جو آپ کے مفاد میں نہیں ہو گا۔ آپ لمبے چکر میں آ جائیں گے۔ کیوں میر شرافت علی؟" میں نے اُسے ایک جھٹکا دیا اور اس کا سر دیوار سے لگا۔

"بتاؤ انھیں... کہ ان کے حق میں کیا بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ پیڈرو سر ہلانے لگا۔ "میں... تو دو نمٹ لوں گا ان سے تم دخل مت دو۔" وہ ایسا کہنے پر مجبور تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں ایک بھی لفظ زبان سے نکالتا تو میں سلطان پر اس کی اصلیت عیاں کر دیتا۔ پیڈرو سمجھتا تھا کہ ہم کسی کے روکے سے رُکنے والے نہیں ہیں... ہم اُسے بھی مار سکتے ہیں اور سلطان کو بھی۔ اور کچھ نہ کریں تو سلطان کو یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ اس کا اصل نام پیڈرو ہے... وہ دلاور کا ساتھی ہے اور ایک غدار ہے جو اس کی صنعتی زمین کو اپنی اسلحہ ساز فیکٹری لگانے کے لیے استعمال کرے گا... اور وہ سب اسلحہ ملک کے دشمنوں کو فروخت کیا جائے گا۔

"لیکن... یہ تم کو مار دیں گے!" بیگم پارہ چلائی۔ "تم انھیں روکو سلطان...!"

جیکی اور جونی ایک دم اپنے باپ کے دائیں بائیں آ گئے۔

"ہم اپنے اپنے مہمانوں کے ضامن ہیں... کیوں ڈیڈ؟"

سلطان نے سر ہلایا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس وقت بیوی کی عشوہ فروشی کا جادو بے اثر ہے اس کے مقابل جوان اولاد تھی۔ ان کی زندگی تھی۔ اس گھر کی عزت تھی اور اس کا مستقبل تھا... وہ مجبور ہو گیا تھا کہ جوش کے بجائے ہوش سے کام لے اور حالات کو زیادہ خراب ہونے سے بچا لے۔ وہ میر شرافت علی کو اپنا سالا سمجھتا تھا مگر سالے پر وہ اپنی اور بیٹوں کی زندگی قربان نہیں کر سکتا تھا... اگر انتخاب کا یہ حق کسی بھی شخص کو دیا جائے تو وہ مجبور ہو گا کہ اپنی انا کی شکست قبول کر لے۔ اگر پہلے ایسا نہیں ہوا تھا تو اب ہو رہا تھا کہ سلطان محمد خان اپنی حویلی میں اپنے ایک مہمان کو تحفظ کی ضمانت دے کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بہت کچھ جو پہلے نہیں ہوا تھا اب ہو رہا تھا... اور آئندہ بھی ہو گا... وقت... قدریں... اصول... سب بدلتے ہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں...

سلطان کی بیوی اب بھی چلا رہی تھی۔ جیکی اور جونی خوش تھے کہ معاملات بگڑ گئے اور پھر بات بنی تو یوں بنی کہ سلطان محمد خان اور میر شرافت علی کے درمیان بداعتمادی پیدا ہو گئی اور ان کے درمیان ہونے والے سودے کی خرابی یقینی ہو گئی۔ وہ یہی چاہتے تھے چنانچہ وہ میری مدد کر رہے تھے۔

"تم حوصلہ رکھو۔" سلطان نے اپنی بیوی سے کہا۔ "تمھارے بھائی کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ان کے ساتھ باہر تک جاؤں گا۔"

"ہم بھی باہر تک ساتھ جائیں گے۔" جیکی نے کہا۔

"اندر کوئی خون خرابا نہیں ہو گا۔" سلطان نے کہا۔ "کوئی گولی نہیں چلائے گا۔"

"کوئی ہمارا راستہ نہیں روکے گا... اپنی گھر والی کو بھی یہ بات سمجھا دو کہ تمھاری واپسی تک کچھ نہ کرے۔" میں نے کہا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کی خبر ہو گی نہ جانے کی۔"

"ٹھیک ہے... باہر دو گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک سفید رنگ کی بیوک ہے۔" سلطان نے کہا۔ "دوسری سیاہ رنگ کی کیڈلک... ایک میر شرافت علی کو لے جائے گی۔ دوسری تمھیں... ایک کو جان محمد ڈرائیو کرے گا۔ دوسرے کو شفیع محمد... اور باہر نکلنے کے بعد ایک دائیں طرف جائے گی اور دوسری بائیں طرف... دونوں گاڑیاں ٹھیک پانچویں میل پر تمھیں ڈراپ کر کے واپس آ جائیں گی۔ اس وقت تم دونوں کے درمیان دس میل کا فاصلہ ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے کہا۔

"دونوں گاڑیوں میں ایک ایک مسلح محافظ بھی ہو گا... مشین گن کے ساتھ جو میرے بیٹوں کی حفاظت کرے گا۔" وہ بولا۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف آپ کی عزت کی خاطر میں میر شرافت علی جیسے دشمن کو چھوڑ رہا ہوں... اس سے پھر کبھی کہیں اور ملاقات ہو گی۔"

"چھوڑنے والا میں بھی نہیں ہوں تمھیں۔" پیڈرو کا حوصلہ لوٹ آیا۔ "نمٹ لوں گا جب وقت آئے گا۔"

سلطان کو پیڈرو کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اسے یا اس کے بیٹوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ جو محافظ بھیجا جا رہا تھا وہ اسی کی حفاظت کے لیے تھا لیکن میں اس لیے مطمئن تھا کہ جیکی یا جونی کی موجودگی میں پیڈرو اس محافظ کو ہماری گاڑی کے تعاقب پر مجبور نہیں کر سکے گا۔ کوٹھی کے اندر یا سڑک پر کسی قسم کی محاذ آرائی کا سوال ہی نہ تھا۔ پیڈرو کو روکنے کی صورت میں ہم خود بھی مصیبت میں پڑتے چنانچہ میں نے اس دشمنی سے دستبرداری قبول کر لی۔ آج کی رات مجھے دوسرے دشمن سے نمٹنا تھا۔ مظفر گڑھ ملتان سے دُور نہیں تھا اور وہاں کسی رانی کی حویلی میں نواب خسرو جمشید سے ملاقات زیادہ اہم تھی۔

دونوں کاریں ایک ساتھ روانہ ہوئیں۔ سلطان ہمارے ساتھ باہر تک آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کاریں گیٹ سے نہیں نکل گئیں۔ ہم سفید بیوک میں تھے اور اسے جیکی چلا رہا تھا۔ محافظ آگے اس کے ساتھ مشین گن لے کر بیٹھا تھا اور اسے سلطان نے بہت واضح احکامات دیے تھے۔ ان مہمانوں کو ٹھیک پانچ میل کے فاصلے پر اتار کے گاڑیاں واپس لے آؤ... جیکی یا جونی کے لیے خطرہ محسوس ہو تو بے دریغ جان پر کھیل جاؤ... مار دو اور مر جاؤ... بصورتِ دیگر خاموشی سے لوٹ آؤ۔

جیکی نے مجھے پانچویں میل پر ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے بس کا اڈا بہت قریب تھا۔ جب میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے مصافحہ کیا تو اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ یہ شکریہ ادا کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ وہ ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ کی موجودگی میں کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ کار واپس ہوئی اور چند سیکنڈ میں نظر سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"اچھی لفٹ لی تھی تم نے۔" میں نے کہا۔

"مجھے الزام دے رہے ہو۔" موہنی چراغ پا ہو کے بولی... "میں نے کہا تھا کہ ان کے مہمان بنو؟"

"بڑے بُرے پھنسے تھے... مگر خیر... قسمت اچھی تھی کہ نکل بھی آئے... تم نے تو میر شرافت علی کو پہچان لیا ہو گا...؟" میں نے کہا۔

"ہاں... یہ وہی جعلی میجر تھا... مگر اس نے بھی تو مجھے پہچان لیا ہو گا۔" وہ بولی۔

میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ حالات مجھے ایسے موڑ پر لے آئے تھے کہ ایک ساتھ دو بُرانے شکاری ایک ہی رات میں میرا شکار ہو سکتے تھے مگر مجھے ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ میں اگر چاہتا تو پیڈرو کو یوں نہ نکلنے دیتا لیکن میں جیکی اور جونی کے گھر میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا۔ ان دونوں لڑکوں کی دوستی سے مجھے آگے چل کے زیادہ فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ وہ درمیان کی کڑی بن گئے اور مجھے دُہرا فائدہ حاصل ہوا۔ ایک طرف تو پیڈرو کی مُنہ بولی بہن کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات ہوئے۔ دوسری طرف اسی بہانے جیکی اور جونی کا فائدہ الگ ہوا اور دلاور اینڈ کمپنی کا بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ معلوم نہیں سلطان محمد خان کس لالچ

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

میں ان کو اپنا قطعۂ زمین بیچنے پر تیار ہو گیا تھا جس کی قیمت پچاس لاکھ کو چکی اور جونی بہت کم سمجھتے تھے۔ ممکن ہے دلاور اینڈ کمپنی نے سلطان کو بھی اپنے 'کاروبار' میں سلیپنگ پارٹنر بنا کے دس پندرہ فیصد منافع دینے کی بات کی ہو۔ بہ ظاہر سلطان انھیں اپنا پلاٹ بیچنے پر رضا مند نظر نہیں آتا تھا اور اپنی بیگم پارہ کے دباؤ میں یہ سودا کر رہا تھا۔

"اب کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟" موہنی نے کہا۔ "کہیں وہ بدمعاش پیڈرو نہ آجائے۔"

میں چونکا۔ "وہ ادھر کیسے آسکتا ہے؟"

"اچھا تو پھر کھڑے رہو۔" موہنی چڑ کے بولی۔ "جب وہ آجائے تو اس سے پوچھ لینا کہ بھائی صاحب کیسے تشریف لائے؟"

میں ہنس پڑا۔ "گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"معلوم نہیں گیدڑ کون ہے۔" موہنی ٹکھائی سے بولی۔ "اس وقت تو سب ہی شہر میں ہیں۔"

"چلو پھر ہم شہر سے بھاگ جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا بس کا سفر ہمارے شایانِ شان ہوگا؟"

"پتا نہیں... برطانوی شاہی بحرہ منگوالو۔"

میں نے ایک طرف کرائے کی سوزوکی گاڑیوں کے ساتھ کاروں کی قطار دیکھی۔ یہ کوئی پارکنگ ایریا نہیں تھا، جہاں کسی کو چھوڑنے یا لینے کے لیے آنے والے گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں۔ پھر ان کے ڈرائیور جس پُرامید نظر سے آنے جانے والے مسافروں کو دیکھ رہے تھے اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ پرائیویٹ ٹیکسیاں ہیں۔ ابھی میں نے ایک سے ہی بات کی تھی کہ مجھے چار نے گھیر لیا۔ مظفر گڑھ تک جانے کے ایک نے چار سو مانگے۔

"چار سو...!" میں نے یوں کہا جیسے مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

"چلو جی تین سو دے دینا۔" دوسرے نے فوراً رعایت دی۔ پہلے والے نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تین سو بھی بہت زیادہ ہیں۔" میں نے فریاد کی۔

"تو کیا تین روپے میں جانے کا خیال ہے؟" پہلے والا مایوس ہو کے چل پڑا۔ "میں تو کہتا ہوں پیدل چلے جاؤ۔"

"ہاں... تین روپے بھی بچ جائیں گے۔ جان مفت میں بنے گی۔" دوسرا بھی الگ ہو گیا۔

"بابا جی... ڈھائی سو میں چلتے ہو تو بات کرو۔" تیسرے نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"دو سو۔" میں نے کہا۔ چوتھا کچھ تیار ہو رہا تھا کہ میں نے فوراً تیسرے سے بات پکی کر لی۔ در اصل وہ سب سے کمزور الجثہ صورت تھا اور چوتھا کچھ پہلوان اور بدمعاش ٹائپ لگتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہم مظفر گڑھ کے بازار میں اتر گئے۔ پھر ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم گفتگو میں سلطان محمد کا کوئی حوالہ آئے یا مظفر گڑھ میں ہماری تشریف آوری کا مقصد کسی کو معلوم ہو۔ مجھے اندیشہ تھا کہ پیڈرو بس کے اڈوں پر جا کے اور میرا حلیہ بتا کے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ یہی کوشش وہ اسٹیشن پر بھی کر سکتا تھا۔ اُسے یقیناً پریشانی لاحق ہوگی کہ میں سلطان کے گھر تک کیسے پہنچ گیا اور وہ بھی موہنی کے ساتھ۔

رات کے دس بجے مظفر گڑھ کے بازار میں بہت کم رونق تھی۔ مشروبات یعنی لسی چائے اور شربت بیچنے والوں کے علاوہ مٹھائی کی دکانیں اور چند ہوٹل کھلے رہ گئے تھے۔ ایک ہوٹل میں بورڈ سائن بورڈ پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ 'یہاں شرفا کے طعام و قیام کا اعلیٰ انتظام ہے' اور اس کے ساتھ ہی فیملی روم کی سمت واضح کرنے کے لیے تیر کا نشان بنایا گیا تھا۔ میں نے موہنی کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی شرفا کا ایک جوڑا جو کیبن نمبر ایک کی پرائیویسی میں اس وقت کسی کی دخل اندازی کے امکانات سے بے نیاز تھا، چونک پڑا۔ موہنی کا رنگ لال پڑ گیا۔

"یہ کیا واہیات جگہ ہے؟" اس نے دو نمبر کیبن میں بیٹھ کر کہا۔

"کوئی جگہ خراب نہیں ہوتی... لوگ خراب ہوتے ہیں یا ان کے اعمال۔" میں نے ایک فلسفیانہ نظریہ پیش کیا۔ "اب اس کے برعکس اگر میں اس اسپتال کی مثال دوں جہاں تم نرس تھیں تو وہ جگہ اور تمہارا پیشہ بے حد قابلِ عزت سمجھے جاتے ہیں... مگر تم خود..."

"میں یہاں تمہاری گالیاں کھانے نہیں، کھانا کھانے آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"سوری۔ کبھی کبھی میرے پیٹ میں سچ کا مروڑ اٹھتا ہے تو غیر ضروری بات بھی زبان سے نکل جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ اسی وقت ویٹر نمودار ہوا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ اب وہ فرفر مینو پڑھنا شروع کرے گا جس کے کچھ الفاظ یقیناً میری سمجھ میں آجائیں گے مگر اس نے کہا "دال فرائی" اور موہنی کو گھورنے لگا۔

"آگے بھی بولو استاد۔" میں نے اس کے سامنے چٹکی بجا کے کہا۔

"آگے کچھ نہیں... سب ختم ہو گیا۔" وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

"بس تو پھر پوچھنا کیسا... بسم اللہ۔"

کھانا واجبی تھا مگر وہاں جا کے بہت اچھی ملی... باہر سگریٹ بھی اچھے مل گئے۔ اس وقت تک بازار مزید ویران ہو چکا تھا۔ میں نے سگریٹ والے سے کہا۔ "بابو... یہ رانی کی حویلی کدھر ہے؟"

"رانی کی حویلی؟ اس وقت جاؤ گے؟" وہ میٹھا پان بناتے ہوئے بولا۔ پان میں نے موہنی کو دے دیا۔

"کیا وہاں جانے کے لیے وقت مقرر ہے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"نہیں... مگر تمہارے ساتھ زنانی ہے۔" وہ بولا۔

"کیا وہاں عورتوں کا جانا منع ہے؟"

"او یار... داڑھی چٹی ہو گئی... عقل نہیں آئی۔" وہ جھلا کے بولا۔ "بابا وہ تین میل دور ہے۔ اُدھر سے گھوم کے جاؤ تو سیدھی سڑک وہاں جاتی ہے... مگر راستہ ویران ہے۔ جنگل پڑتا ہے بیچ میں۔"

"کیا جنگل میں شیر ہیں آدم خور؟" میں نے سہم کر کہا۔

"اُف... کیسے کیسے پاگل کے نیچے پڑے میں دیتا ہے۔"

"کیا میں نے غلط کہا؟ جنگل میں ڈاکو ہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں... کچھ نہیں... تمہارے لیے راستہ سجا رکھا ہے... آرائشی محرابیں بنا رکھی ہیں۔ جھنڈے لگا رکھے ہیں..." وہ چلا کے بولا۔ "جاؤ..."

میں سر ہلا کے چل پڑا... اگلے موڑ پر میں نے اس سیدھی سڑک کو دیکھا۔ اس کے دونوں جانب کچھ دور تک مکانات کا سلسلہ تھا مگر اس کے بعد تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"کیا اب تین میل پیدل چلنا ہوگا؟" موہنی نے کہا۔

"نہیں... میں نے برطانوی شاہی بحرہ منگوایا ہے۔" میں نے موہنی کو اسی کے الفاظ لوٹا دیے اور اچانک ایک بہت پرانا گیت میری زبان پر آگیا جو میں اور محسن ایسے ہی مواقع پر گایا کرتے تھے۔ "چل چل رے نوجوان! اونچی تیری شان... ڈگر ترا کا دل اٹھ تھکے پاؤں..." جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، یہ فلم سکندرِ اعظم کا گانا تھا اور معلوم نہیں کس نے گایا تھا؟

جب میں نے مارچ شروع کیا تو میرا ساتھ دینے کے لیے موہنی کو تقریباً دوڑنا پڑا۔ "افوہ... یہ کیا مصیبت ہے...؟ ایسے دوڑاؤ گے مجھے۔"

"میں فرسٹ گیئر میں ہوں خاتون۔" میں نے کہا۔ "میری رفتار اس سے کم نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو پھر جاؤ۔" وہ خالی سڑک پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔ "واپسی پر مجھے یہیں سے لے لینا۔"

میں کوئی سو قدم گیا اور پُرامید رہا کہ بالآخر وہ دوڑتی ہوئی آئے گی۔ اس سنسان سڑک پر جہاں دونوں جانب درختوں کے سوا کچھ نہیں، وہ کب تک اکیلی بیٹھی رہے گی... مگر سو قدم پورے ہونے سے پہلے ہی مجھے مایوسی، خفت اور جھنجلاہٹ ہونے لگی، کیونکہ اب واپس جا کے اُسے ساتھ لانا ناگزیر ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ میں واپس ہوا تو تیز روشنی میں، میں نے موہنی کو سڑک سے اُٹھ کر ایک کنارے پر کھڑے ہوتے دیکھا... ابھی میں دس قدم ہی گیا تھا کہ گاڑی موہنی کے پاس پہنچ کے رک گئی۔

اچانک میری چھٹی حس نے مجھے ہوشیار کیا۔ اسی کے ساتھ میں نے موہنی کی چیخ بھی سُنی اور میں سرپٹ بھاگا۔ میرے پہنچنے تک دو بدمعاش موہنی سے لپٹ چکے تھے اور اسے کھینچ کر اپنی جیپ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک نے موہنی کو چھوڑ دیا اور میری طرف لپکا۔ وہ خوب اچھا خاصا پلا ہوا سانڈ تھا۔ اس نے مجھے گالی دے کر مُکا گھمایا۔ میں تھوڑا سا جھک گیا اور اس کا مُکا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ خود اپنے زور میں گھوم گیا۔ میں نے اس کی کمر پر لات ماری... وہ ایک جھٹکے سے آگے گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹکرا گیا... آخری وقت میں اس نے دونوں ہاتھ آگے کر لیے تھے، ورنہ اس کا مُنہ چپٹا ہو جاتا۔

جب وہ پلٹا تو مجھے اس کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا جو اس نے ڈب میں سے نکالا تھا۔ خنجر کے پھل کی دُھندلی سی خونی چمک مجھے اندھیرے میں موت کی بھیانک مسکراہٹ لگی۔ اس نے بھیڑیے کی طرح غرّا کے مجھے گالی دی اور ایک جست لگا کے مجھ پر وار کیا۔ میں نے پینترا بدلا اور اس کے خنجر والے ہاتھ کی کہنی پر لِک ماری۔ خنجر اس کے ہاتھ سے طوطوں کی طرح اُڑ گیا اور وہ بُری طرح بلبلایا۔

اسی وقت میں نے موہنی کے چلانے کی آواز سُنی۔ اس نے صرف میرا نام پکارا تھا۔ بروقت اس کی طرف دیکھنے سے میں بچ گیا۔ دوسرے بدمعاش نے خنجر کے وار کو ناکام دیکھ کر پستول نکال لیا تھا۔ انھیں بالکل امید نہ تھی کہ صورت سے بڈھا نظر آنے والا کوئی شخص خالی ہاتھ ہونے کے باوجود دو جوانوں کے مقابلے پر اتر آئے گا۔

گولی کی آواز جنگل میں گونجی تو درختوں سے پرندے چیختے چلاتے اُڑے... مجھے صرف یہ احساس ہوا کہ گولی میرے بہت قریب سے گزر گئی ہے۔ پھر میں نے ایک فلائنگ کِک ماری اور پستول سے فائر کرنے والا اُلٹ کر جیپ پر گرا۔ اس کا سر پائدان سے ٹکرا کے پھٹ گیا۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلایا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے کھڑا ہوا۔ غالباً وہ سر سے بہتے والے خون کے فوارے کو روکنے کی احمقانہ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کوشش کر رہا تھا۔ کھڑا ہوتے ہی وہ لڑکھڑا کے آگے بڑھا اور مُنہ کے بل گرا۔

خنجر نکالنے والے نے اندازہ کر لیا تھا کہ بازی مات ہو گئی ہے۔ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گی۔ انھوں نے تو سوچا ہو گا کہ بڈھا خنجر دیکھ کر ہی تھر تھر کانپنے لگے گا اور پھر بھی مقابلے پر آیا تو پستول اُسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ اب بچ جانے والا فرار ہونا چاہتا تھا مگر اُسے ایک فکر تو جیپ کی تھی اور دوسری اپنے ساتھی کی۔ کسی ایک کو چھوڑ کر جانے کا مطلب تھا اپنا پتا چھوڑ جانا۔ معاملہ آگے گیا تو اس کا زخمی ساتھی دوسرے کے بارے میں خود بتا دے گا اور وہ مر گیا تب بھی جیپ کے نمبر سے پولیس سُراغ لگا لے گی۔

اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر خنجر دوبارہ اُٹھا لیا لیکن مقابلے پر آنے کے بجائے اس نے خنجر موہنی کے پیچھے سے اس کی پشت پر رکھ دیا۔ "میں مار ڈالوں گا اسے۔" وہ دیوانوں کی طرح چلّایا۔ "اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔"

"تم اس کے بعد بھی زندہ بچ کے نہیں جا سکتے۔" میں نے سکون سے کہا اور ایک قدم آگے بڑھا۔

"میں کہتا ہوں رُک جاؤ۔" وہ چیخ کر بولا۔ مگر میں نے ایک ایک قدم اس کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

"مار ڈالو اسے... انتظار کیوں کر رہے ہو میرا... میں تو بہر حال تم تک پہنچ ہی جاؤں گا... تم مجھ سے بچ کے کہاں جاؤ گے؟" میں نے کہا۔ "اور میرے ہاتھوں کو کیسے روکو گے... جو تمھاری گردن مروڑ سکتے ہیں۔ جیسے عورتیں دُھلا ہوا کپڑا نچوڑتی ہیں ایسے میں تمھارے جسم سے خون نچوڑ لوں گا۔"

وہ ایک دم سڑک پر سجدہ ریز ہو گیا۔ "مجھے معاف کر دو... میں شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا... میری توبہ... میرے باپ کی توبہ۔" وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔

میں نے اُسے گردن سے پکڑ کے اوپر اُٹھا لیا... وہ کسی مردہ چوہے کی طرح نظر آ رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "دیکھو تمھارا بہادر ساتھی کیسے مرا پڑا ہے۔" میں نے کہا۔ "موت کبھی کبھی ایک خوبصورت عورت بن کے سامنے آتی ہے اور میرے جیسا ایک بڈھا فرشتہ اجل بن کے روح قبض کر لیتا ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ "بابا جی... میری ماں مر جائے گی۔ اُس کا ایک ہی پتر ہوں میں... میری شادی ہونے والی ہے محرّم کے بعد۔"

"اُس وقت تک تو تمھارا چہلم بھی ہو چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔ "خدا نے ایک لڑکی کو تم جیسے شیطان کی بیوی بننے سے بچا لیا۔"

وہ بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ "آپ کہتے ہو تو میں اُس سے بھی شادی نہیں کروں گا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "پھر کیا اس سے کرو گے؟" میں نے موہنی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو تمھیں بہت پسند آئی کہ تم عقل اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے... ایک [illegible] تم زندہ رہ سکتے ہو۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں جی... آپ حکم کریں۔"

"اپنے اس ساتھی کی لاش اُٹھا کے جیپ میں ڈالو۔" [illegible] نے کہا۔ "اور جیپ لے کر آگے چلو... ہمیں دو میل آگے رانی [illegible] حویلی کے پاس چھوڑو اور جیپ لے کر واپس چلے جاؤ۔ [illegible] نے دیکھ لیا ہے مگر تم خاموش رہو گے تو میں بھی کسی کو نہیں [illegible] گا۔ لاش کو جیسے چاہو ٹھکانے لگاؤ اور خود کو بچانے [illegible] کچھ بھی کرو۔"

وہ مجبور تھا کہ اپنا کیا سامنے آیا ہے تو بھگتے... اُس نے سڑک کے کنارے سے لاش اُٹھا کے آگے ڈالی۔ وہ خود ڈرائیور کی جگہ پر بیٹھا۔ میں اور موہنی پیچھے کی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے جو آمنے سامنے بنائی گئی تھیں۔ تنگ سڑک بالکل تاریک تھی مگر [illegible] تھی۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ ہیڈ لائٹس بند کر دے اور رفتار کم کر لے۔

"آپ... رانی کی حویلی میں جاؤ گے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"ہاں... جب حویلی سو گز دُور رہ جائے تو گاڑی روک لینا۔"

"وہاں... کیا کام ہے جی آپ کو...؟"

"شاہِ جنات سے کوہ قاف کا ویزا لینا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چلو گے؟"

"وہ جی... اس وقت... کوئی نہیں جاتا وہاں۔" وہ بولا۔ [illegible] بخشی کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لیے ہمیں مفت مشورہ دے رہا تھا۔ "اور جو جاتا ہے وہ تو واپس نہیں آتا۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم بھی واپس نہیں آئیں گے۔" [illegible] نے کہا۔ "مگر کیا تم کسی کا نام بتا سکتے ہو جو وہاں رات کے وقت گیا اور لوٹ کر نہیں آیا؟"

"ہاں جی... ایک تو قنتوش تھا۔ اس کا باپ پولیس انسپکٹر تھا اور وہ بھی ایسے ہی غائب ہو گیا تھا۔" وہ بولا۔

"کیا نام تھا اس کے باپ کا؟"

"احمد علی یا محمد علی... کچھ یاد نہیں۔" وہ بولا۔ "پرانی بات ہے۔"

"کتنی پرانی؟"

"اسے تو شاید سال سے اوپر ہو گیا... قنتوش کو۔" وہ بولا۔

"اور انسپکٹر صاحب کب اُدھر گئے تھے؟"

"قنتوش سے دو سال پہلے... بس وہ جوش میں آ گیا تھا

کہ میں دیکھتا ہوں خود جا کے۔ اُس نے صرف سُنا تھا کہ باپ اُدھر گیا تھا مگر پولیس نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ میں یہ نہیں لکھا تھا۔"

"اچھا اور کوئی؟"

"اور بہت سے ہیں... میں سب کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔ "ایک کنجری تھی بہت مشہور... لال پری کہلاتی تھی... لال کپڑے پہنتی تھی... ہونٹ لال... آنکھیں لال، گال بھی لال... اسے تین آدمی لے گئے تھے۔ وہ گاڑی تو بعد میں اسی جگہ مل گئی تھی... ایک فرلانگ پیچھے۔"

"گاڑی کیسی تھی؟"

"مجھے نہیں معلوم جی... پولیس تھانے میں رپورٹ موجود ہے۔ اس میں سب نمبر وغیرہ مل جائے گا۔" وہ بولا۔

"کیا رانی کی حویلی میں کوئی نہیں رہتا؟"

"سُنا ہے کوئی نہیں رہتا۔" وہ گاڑی روک کے بولا۔ "وہ سامنے ہے حویلی۔"

"اچھا تم کیا جانتے ہو اس حویلی کے بارے میں... اس کا مالک کون ہے؟" میں نے کہا۔

"کوئی ہندو تھا... وہ بھاگ گیا تو ایک جاگیردار نے لے لی تھی۔ یہ میں نے سُنا ہے جی... وہ بے اولاد تھا... پہلی بیوی کو طلاق دی... دوسری اولاد کے لیے کی تھی۔ وہ مر گئی... تیسری بھاگ گئی... پاگل ہو کے... سب بے اولاد ہیں۔ چوتھی کو اس نے خود مار دیا اور پھر خودکشی کر لی۔ اس کے بعد سے حویلی بند ہے... کچھ عرصہ ایک پیر صاحب کا ڈیرا رہا تھا... معلوم نہیں وہ کدھر گئے۔"

"اچھا... اب تم واپس جاؤ۔" میں نے کہا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔ "تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرو۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو بھول جاؤ کہ تم ہم سے ملے بھی تھے... ورنہ یاد رکھو کہ میں تمھیں تلاش کر لوں گا اور تمھاری ماں کے سامنے تمھیں گولی مار دوں گا۔"

وہ سخت بدحواسی میں فرار ہوا۔ میں اس کے لیے انتہائی خطرناک بڈھا ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس کے ایک ساتھی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا... خنجر اور پستول سے ذرا خوف زدہ نہیں ہوا تھا... آسیب زدگی کے سارے واقعات سُن کے بھی رانی کی حویلی میں جا رہا تھا... اور میرے پاس بھی ریوالور تھا جو میں نے آخری وقت تک چھپائے رکھا تھا۔ میرا وجود اس کے لیے کسی بھوت سے کم پُراسرار نہ تھا۔

"یہ ہوتا ہے خوب صورت ہونے کا نتیجہ۔" میں نے کہا۔

"تم بنا دو مجھے بدصورت۔" وہ بولی۔ "اپنے جیسا..."

میں نے پلٹ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ "آؤ میرے ساتھ اس راستے پر قدم بڑھاؤ جس پر جا کے کوئی واپس نہیں آیا... کیسا ڈائیلاگ ہے؟"

"تم کیا واقعی... اندر جاؤ گے؟" وہ بولی۔

"میں اور تم سو فیصد اندر جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "اور اس میں کوئی شک یا مبالغے کی بات نہیں کہ یہاں ہمیں ایک خبیث جن ملے گا۔"

"کیا پہیلیوں میں بات کر رہے ہو...؟"

"سہیلی... یہ پہیلی نہیں حقیقت ہے۔" میں نے کہا۔ "اس جن کا نام ہے خسرو جمشید اور وہ نام کا نواب بھی ہے۔"

موہنی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا... یہ جھٹکا میں نے اس لیے محسوس کیا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی... اس نے اپنی کلائی چھڑا لی۔

"خسرو جمشید... تم مذاق کر رہے ہو۔" وہ اپنے خوف کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اس مذاق سے تمھیں کرنٹ کیوں لگا ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اُسے جانتی ہو...؟ وہ اندر موجود ہے۔"

"تم... غلط کہتے ہو...!" وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

"میں پاگل نہیں ہوں جو اس وقت یہاں آیا ہوں... میں اِن بھوت پریت اور انسانوں کے غائب ہو جانے کی کہانیوں پر ایک فیصد بھی یقین نہیں رکھتا مگر لوگ کل سے کہنے لگیں گے کہ ایک بڈھا اور اس کی جوان خوب صورت بیٹی اُدھر گئے تھے جو لوٹ کر نہیں آئے۔ حالانکہ انھیں منع بھی کیا گیا تھا۔ آج رات کے بعد ہم واقعی یہاں نظر نہیں آئیں گے مگر یہ نواب خسرو جمشید تو دنیا ہی سے غائب ہو جائے گا۔ وہ کہیں بھی پھر نظر نہیں آئے گا۔"

"تم پاگل ہو... میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میں نے ایک دم اس کی کلائی پھر پکڑ لی۔ "تمھارا تو باپ بھی جائے گا۔"

"چھوڑو مجھے۔" وہ چلّائی مگر میں نے ایک دم اس کا مُنہ دبا دیا۔

"کیا بات ہے... تمھارا رویّہ میرے لیے بے حد مشکوک اور پُراسرار ہو گیا ہے مس موہنی۔" میں نے کہا۔ "کس کا خوف ہے تمھیں... خسرو جمشید کا نام سننے سے پہلے تم کو کسی کا ڈر نہیں تھا۔ تم میرے ساتھ جن بھوتوں کے ڈیرے میں جانے کو تیار تھیں۔ [illegible] تمھارے حلق سے اونچی آواز نکلی نا تو یہ ممکن ہے کہ وہ تمھاری [illegible] ہو... میں تم کو ہر صورت میں اپنے ساتھ لے جاؤں [illegible]... خواہ مجھے تم کو خاموش رکھنے کے لیے تمھارا یہ خوب صورت

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

گلا ہی کیوں نہ دبانا پڑے۔"

میں نے اُسے چھوڑا تو وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے رحم بھی ہو سکتے ہو... میرے ساتھ کیا تم واقعی حوصلہ رکھتے ہو مجھے قتل کرنے کا؟ میرا گلا گھونٹنے کا... اتنا لمبا سفر اسی لیے کیا تھا میں نے... اتنا انتظار اسی سلوک کے لیے کیا تھا میں نے؟ میں کہاں سے کہاں آ گئی تمھارے ساتھ..."

اس نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا۔

"مگر اب چند قدم چلنے کے لیے تیار نہیں... آخر کیوں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو آخر...؟ یہی نا کہ میں دشمن کی ایجنٹ ہوں اور میرا کوئی خفیہ تعلق ہے خسرو جمشید سے... ہاں ہے... یہاں سب سے پہلے مجھے اسی کے حضور پیش کیا گیا تھا.... مگر وہ ایک جانور ہے... خطرناک پاگل جانور... مہذب نظر آنے والا وضعدار سمجھا جانے والا نواب خسرو جمشید ایک وحشی جنونی درندہ ہے۔ اور یہ بات پوچھنی ہے تو اُن سے پوچھو..."

"آئی ایم سوری..."

ایک طمانچہ میرے مُنہ پر یوں پڑا کہ میں بھونچکا رہ گیا... میرا خون کھولنے لگا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ الفاظ مت دُہرانا میرے سامنے۔ یہ گالی سے بدتر ہیں میرے لیے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اشتعال کی شدید لہر نے اس کی گردن مروڑ دینے پر مجبور کیا مگر میں نے اس خواہش کو ملتوی کر دیا۔ اُس طمانچے کی قیمت ادا کرتے وقت تمھیں افسوس ہوگا موہنی، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں وقت اور حالات سے مجبور نہ ہوتا تو اسی وقت اور اسی جگہ موہنی کو سزا دے سکتا تھا لیکن اب میں موہنی کو خسرو جمشید کے سامنے لے جانا چاہتا تھا۔ اُس نے خسرو جمشید کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہو سکتا تھا مگر یہ موہنی کے خوف کا سبب نہیں تھا۔ اس وقت میں موہنی کے ساتھ تھا وہ کہہ سکتی تھی کہ مجھے اس رات کے وحشیانہ سلوک کا بدلہ لینا ہے اور اس نام کے نواب کے مُنہ پر تھوکنا ہے... یا اس کے مُنہ پر طمانچہ مارنا ہے... میرے ساتھ اُسے کسی قسم کا خطرہ درپیش نہ تھا... وہ بالکل محفوظ تھی مگر پھر بھی ڈر رہی تھی۔ میں اس ڈر کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"چلو اب غصہ تھوک دو۔" میں نے موہنی کو اپنے قریب کر کے کہا۔ "آخری بار معاف کر دو مجھے۔"

وہ میرے سینے پر سر رکھ کے سسکیاں بھرنے لگی۔ "...کیا یہ بھی اس کی اداکاری ہے؟" میرے دماغ میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ اس وقت میں جذباتی طور پر موہنی سے بہت دُور تھا۔ میرے دل میں محبت کے نہیں نفرت کے جذبات بھرے ہوئے تھے لیکن میں اس مرحلے پر بنا بنایا کھیل بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اس وقت جب کہ موہنی مجھ پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں تقریباً کامیاب ہو چکی تھی ایک بات ایسی ہو گئی تھی کہ میں پھر کھٹک گیا تھا اور اُسے مختلف نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نظر سے وہ مجھے پھر ایک انتہائی چالاک اور مکار... عیار انڈین ایجنٹ لگتی تھی جسے بطورِ خاص میری جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ میری قربت حاصل کرے تو میرے سارے منصوبے اور ارادے بھی جان لے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد موہنی پھر نارمل ہو گئی اور اس عورت کی طرح خوش نظر آنے لگی جسے اس کے محبوب نے ہاتھ جوڑ کے اور ناک رگڑ کے منایا ہو۔

رانی کی حویلی کی وسعت کا اندازہ قریب جا کے ہوا۔ باغ کے باغ سمیت شاید اس کا رقبہ سوا ایکڑ ہو گا۔ بیرونی چار دیواری دس فٹ بلند تھی مگر جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی تھی اور اس کے شگاف ایک دروازہ تھا۔ مرکزی دروازہ تھوڑا سا بائیں جانب تھا۔ میں نے بالکل سامنے جا کے اندر جھانکنے سے گریز کیا... ہو سکتا تھا گیٹ پر کوئی پہریدار موجود ہو جو مجھے دیکھتے ہی شور کر دے۔ بدبخت سکندر بخت کا نام بھی ان میں شامل ہو جاتا جو رانی کی حویلی کی طرف گئے مگر لوٹ کر نہیں آئے۔

"تمھارے پاس ریوالور ہے نا؟" میں نے موہنی سے کہا۔

"ہاں... کیا تمھارے حوالے کر دوں؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"نہیں... اسے تیار رکھو۔" میں نے سرگوشی میں کہا اور اس کا ہاتھ تھام کے ایک شگاف سے اندر داخل ہو گیا۔ چار دیواری کے اندر جھاڑ جھنکار قسم کا جنگل نما باغ تھا جو کسمپرسی کا شکار تھا... میں نے حویلی کی عمارت کو تقریباً سو گز کے فاصلے پر دیکھا۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے مجھے شکاری کتوں کا خیال آیا... اگر اندر کتے ہوتے تو اب تک بھونکنا شروع کر دیتے اور ہماری طرف دوڑے آ رہے ہوتے۔

عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر میں کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ کہیں اس خسرو جمشید کے ہمشکل نے جھوٹ بول کر مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا تھا۔ مگر مرتے وقت آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ بات تو قانون بھی تسلیم کرتا ہے جو ہر سچ کے لیے ثبوتِ شہادت مانگتا ہے... اندر آبادی کے آثار یکسر ناپید تھے اور حفاظتی انتظامات کی عدم موجودگی نے مجھے مزید شبہات میں مبتلا کیا۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ممکن ہے یہ ٹھیک ہی ہو۔ نواب کبھی کبھار عیاشی کے لیے یہاں آ جاتا ہو اس کے لیے حفاظتی انتظامات کی کیا ضرورت ہے۔ ہم میں سے کسی کے یہاں پہنچنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور مقامی آبادی تو ویسے ہی اِدھر آنے سے گریز کرتی ہے۔ انھوں نے اِدھر آنے والوں کو قتل کر کے اور ان کی لاشیں غائب کر کے حویلی کے بارے میں خود دہشت پھیلا رکھی ہے۔

عمارت کے شمالی حصّے کی سمت تین دروازے تھے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ سب دروازے مضبوط شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور مقفّل تھے۔ روایات کے مطابق برسوں سے مقفل لیکن وہ زنگ خوردہ تالے نہیں تھے۔ ساخت کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ پُرانے نہیں تھے۔ میں نے تاریکی اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی عمارت کا جائزہ لیا تو مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کہ عمارت کم سے کم پچاس سال پرانی ہے اور تقسیمِ ہند سے پہلے ہی تعمیر ہوئی تھی۔

پھر میں پیچھے گیا اور میں نے عمارت کو لمبائی کے رُخ دیکھا۔ باغ پیچھے بھی تھا اور تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرنے والی شکستہ چہار دیواری تک اسی طرح جنگل بن چکا تھا جیسے سامنے والے حصّے میں... موہنی کچھ ڈری ہوئی تھی اور مجھ سے لگ کر چل رہی تھی۔

"مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوں گے... شاہ جنات۔" موہنی نے کہا۔ "جن سے تمھیں ویلا لینا تھا کوہ قاف کا۔"

"وہ تو میں نے اس لڑکے کو امپریس کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ کیا وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ قاف کی پری..."

میرا جملہ خاموشی میں گونجنے والی ایک چیخ سے نامکمل رہ گیا۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی اور اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی دہلا دیا... موہنی تو مجھ سے چمٹ گئی اور مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔

"چلو کبیر... یہاں سے نکل چلو..."

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ "یہ کسی چڑیل نے چیخ نہیں ماری تھی... کسی روح کی آواز نہیں تھی... یہ کسی عورت کی چیخ تھی... مگر سوال یہ ہے کہ آواز آئی کہاں سے تھی؟"

"یہاں کوئی نہیں ہے کبیر..."

"پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کوئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ بادلِ ناخواستہ میرے ساتھ آگے بڑھی۔ میں نے عمارت کی لمبائی کے رُخ طویل برآمدے کو طے کیا۔ اس کی لمبائی دُگنی تھی اور مجھے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں بند نظر آئے مگر وہ مقفل نہیں تھے۔ آخری حصّے میں رُک کر میں نے پھر کان لگا کے کچھ سُننے کی کوشش کی مگر اب پھر وہی بے صدا آسیب تھا جو ہر سمت سے لپکتا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے عمارت کی تیسری سائڈ کا جائزہ لیا۔ اس طرف کا نقشہ بھی مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اِدھر کے سارے دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کیے گئے تھے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مخالف سمت میں تین کمرے زیرِ استعمال تھے اور وہاں تین تالوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان کی چابیاں تین افراد کے پاس ہیں۔

ابھی تک میں نے سامنے کے حصّے کو نہیں دیکھا تھا۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں کسی کی نظر میں آئے بغیر عمارت تک پہنچ جاؤں اور پھر دیکھوں کہ اندر تک جانے کے لیے سب سے محفوظ راستہ کون سا ہے۔ میں اس بات کا بھی یقین کر لینا چاہتا تھا کہ وہاں کوئی محافظ یا پہریدار نہیں ہے۔

میرے کان ابھی تک اس ایک چیخ کی بازگشت کو سن رہے تھے جو خاموشی کے سمندر میں ایک پتھر کی طرح تھی اس کا تموّج ختم ہو چکا تھا اور صرف تصوّر باقی رہ گیا تھا۔ میرے کان دوبارہ کسی آواز کے منتظر بنے ہوئے تھے مگر خامشی کسی منجمد جھیل کی سطح بن گئی تھی۔

سامنے والے حصّے میں آتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے موہنی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ بولو... اب کیا کہتی ہو۔ وہ فریبِ سماعت بھی نہیں تھا اور بھوت پریت کی آواز بھی نہیں تھی۔ گھنی جھاڑیوں اور اُلجھی ہوئی عشق پیچاں کی پرانی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ایک کنج کے تاریک سائے میں ایک کار کی چمک یوں محسوس ہوئی تھی جیسے غبار آلود آسمان میں ستاروں کی دمک... وہ ایک ایسی جگہ پہ کھڑی ہوئی تھی کہ جب تک کوئی بالکل سامنے نہ آتا اُسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ چار ستونوں پر جن کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ کے قریب تھا کسی زمانے میں لوہے کا جال ڈالا گیا ہوگا۔ اس کے اوپر اور چاروں طرف پھولوں کی سرسبز بیلیں چڑھائی گئی ہوں گی۔ اب یہ بیلیں گھنی شاخوں کی دیواریں بن چکی تھیں۔ اوپر بھی زنگ خوردہ جال ان کا وزن برداشت کرنے کے قابل نہ رہا تھا چنانچہ ایک طرف سے کھلے ہوئے اس کشادہ کمرے میں ہر سمت سے شاخیں اندر اتر رہی تھیں... اوپر سے لٹک رہی تھیں اور ستونوں کے گرد لپٹ چکی تھیں۔

اس کا درمیانی حصّہ اب بھی خالی تھا اور اوپر چھت کی بلندی جو پہلے پندرہ فٹ تھی اب شاخوں کی چھت کے جُھک

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جانے کے بعد بھی دس فٹ سے زیادہ تھی۔ خسرو جمشید کی کار اسی کنج چمن میں کھڑی ہوئی تھی، جہاں پہلے اس کے اصل مالک نے برسات کی مہکتی پھواریں اور چودھویں شب کی چاندنی میں زندگی کی بہت سی خوب صورت شاموں اور پُرمسرت راتوں کے یادگار لمحے بسر کیے ہوں گے۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ... نظیر اکبر آبادی نے میرے کان میں کہا۔

اچانک موہنی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ "تم نے کچھ دیکھا؟"

"میں بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم بتاؤ تم نے کیا دیکھا؟"

"کار کے اندر... کوئی ہے..." وہ آہستہ سے بولی۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے سر نکال کے غور سے دیکھا۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے ایک ستارہ سا روشن ہوا اور بجھ گیا... کوئی کار کے اندر بیٹھا ہوا یا لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اگر اس کا چہرہ ہماری طرف ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں دیکھ چکا ہوتا لیکن وہ سیٹ پر دراز تھا اور اس کی نظر عمارت کی طرف نہیں تھی۔ وہ مخالف سمت میں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ بیٹھا ہوا ہوتا تو اتنی دیر میں ایک بار تو سر گھماتا۔ میں نے اب زیادہ توجہ کے ساتھ سگریٹ کی برائے نام روشنی کو دیکھا۔ جب وہ کش لے کر سگریٹ ہٹاتا تھا تو اس کا ہاتھ سامنے نہیں جاتا تھا۔ چمک نیچے کی طرف ڈوب جاتی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ سیٹ پر نیم دراز ہے اور اس کا سگریٹ والا ہاتھ سیٹ سے نیچے کی جانب لٹکا ہوا ہے۔

میں نے موہنی کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھا۔ میرے اور کار کے درمیان شاید بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ کار کے شیشے بند نہ ہوتے تو وہ یقیناً میرے قدموں کے نیچے فریاد کرنے والے خشک پتوں کی آواز سُن لیتا۔ اس سے زیادہ احتیاط ناممکن تھی۔ میں برسوں سے بچھے ہوئے سوکھے پتوں پر پیر نہ رکھتا تو کہاں رکھتا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ کہیں اپنی پوزیشن نہ بدل لے۔ کار کے اندر آدمی زیادہ دیر تک ایک ہی پوز میں نہیں پڑا رہ سکتا... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سگریٹ ختم ہو تو وہ اسے باہر پھینکنے کے لیے دروازہ کھولے۔

کار کے بالکل قریب پہنچ جانے کے بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں میدانِ جنگ میں دشمن کے مورچوں کے درمیان سے گزر آیا ہوں۔ اب میں زیادہ پُراعتماد تھا۔ میں پیچھے کی طرف سے گھوم کر گیا اور اسی سمت میں پہنچ گیا جدھر وہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن میں فرش پر پیٹ کے بل کرالنگ کر رہا تھا اور اس کی نظروں سے محفوظ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھایا اور کار کے دوسری جانب اُچھال دیا۔

حسبِ توقع وہ ایک دم باہر آیا۔ اس وقت تک میں کار کے نیچے رینگ چکا تھا۔ نیچے سے مجھے اس کے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوگا۔ ابھی وہ ہلا ہی تھا کہ میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کے اس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر جما دیے اور اسے ایک جھٹکے سے کھینچا تو ساتھ ہی خود بھی نیچے سے نکل آیا۔

وہ بُری طرح مُنہ کے بل گرا لیکن پلک جھپکتے ہی اس نے جھٹکا دے کر خود کو آزاد کرا لیا اور کروٹ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اُٹھنے کے انداز سے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ تربیت یافتہ گوریلا ہے۔ اسے زیر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ یہ احساس ہوتے ہی میرا جسم مستعد ہو گیا اور میرے ذہن نے اپنی تربیت کے سارے داؤ پیچ یاد کیے۔ ان میں کچھ انتہائی مہلک وار بھی تھے جو ایسے ہی وقت میں کام آتے تھے۔

میرے حریف نے ایک ایسا ہی داؤ آزمایا تھا۔ میری طرح وہ بھی کم سے کم وقت میں جنگ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ فرق صرف اس بات سے پڑا کہ میں نے اس کی مہارتِ فن کا اندازہ کر لیا تھا جبکہ اسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے بروقت خود کو بچایا اور پھر اتنی تیزی سے وہی داؤ آزمایا کہ میرے حریف کو حیران ہونے کا موقع تک نہ ملا... وہ زمین پر گرا اور آواز نکالے بغیر مر گیا۔

اب میں نے کار کے اندر جھانکا اور سب سے پہلے وہ مشین گن اُٹھالی جو اگلی سیٹ پر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر میں نے کار کی چابیاں نکالیں اور پیچھے جا کے ڈکی کھولی۔ اس میں ایک چھوٹا سا فریج بنا ہوا تھا اور فریج میں شراب کی یخ بستہ بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے موہنی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ ایک دم اندھیرے کی اوٹ سے نکل آئی۔

"تم اب گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا۔ "میرے سوا جو بھی قریب آنے کی کوشش کرے اُسے بلا تکلف شوٹ کر دو۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔"

موہنی نے سر ہلایا۔ پہلے نیچے پڑی ہوئی لاش کو اور پھر میرے ہاتھ کی مشین گن کو دیکھا۔ "تم مجھے ساتھ نہیں رکھ سکتے؟"

"نہیں... باہر بھی تو کسی کو رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

جب وہ کار میں بیٹھ گئی تو میں پھر برآمدے میں گیا لیکن اس مرتبہ میں نے سامنے والے حصّے کا جائزہ لیا۔ میں نے مشین گن کو فائر کرنے کی پوزیشن میں کر لیا تھا اور اس بات کے لیے بالکل تیار تھا کہ کوئی بھی میری جان لینے والا نظر آئے تو اُسے بھون کے رکھ دوں۔ ایک بار پھر میں اکیلا ہی دشمن کے حصار میں داخل ہو

چکا تھا اور ذہنی و جسمانی طور پر اتنا الرٹ تھا کہ میرے پانچوں حواس کے ساتھ چھٹی حِس بھی پوری طرح بیدار تھی۔

میں نے وہ چیخ پھر سُنی۔ دبی دبی اور پُراذیت اور مجھے خسرو جمشید کے بارے میں موہنی کی بات یاد آئی۔ اس بار میں چونکا نہیں۔ آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرے کانوں نے وہی فریادی پکار پھر سُنی۔ میں اندازہ کر چکا تھا کہ یہ آواز زمین کے اوپر سے نہیں بلکہ تہ خانے سے سنائی دے رہی ہے۔ مجھے اب تہ خانے تک پہنچنے والے راستے کی تلاش تھی۔ ایک دروازے کے سامنے مجھے گولڈ لیف سگریٹ کی خالی ڈبیا پڑی نظر آئی۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا... وہ کسی آواز کے بغیر کھُل گیا۔

میں نے خود کو مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا پایا۔ میں اپنے دائیں بائیں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا... یہ بھی نہیں کہ جہاں میں کھڑا ہوا ہوں وہ کوئی کمرہ ہے یا راہداری۔ پھر میں نے سنبھل سنبھل کے قدم بڑھانا شروع کیا۔ کئی بار میرے قدموں نے کسی چیز کو چھُوا اور میں نے راستہ بدلا۔ پھر میں ایک دیوار سے جا لگا... دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں ایک دروازے کے خلا تک پہنچا اور دروازے سے گزر گیا۔

اسی وقت باہر کہیں ایک دروازہ کھُلا اور گھُپ اندھیرے میں تھوڑا سا اجالا پھیل گیا۔ میں نے خود کو ایک خالی کمرے میں دیکھا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی میری طرف آ رہا تھا۔ چال سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ کوئی فوجی ہے۔ وہ اپنے پیچھے دروازہ کھُلا چھوڑ کے نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود روشنی برقرار تھی مگر یہ روشنی کم زیادہ ہو رہی تھی... متحرک تھی اور اس کے ہلنے سے دیوار پر سائے بھی ہلتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شخص اپنے ہاتھ میں ٹارچ لائٹ لیے ہوئے ہے۔

جب روشنی دروازے تک پہنچی تو میں نے مشین گن کو نیچے رکھ دیا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزرنے لگا تھا کہ میں نے ایک جست میں اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو چھڑانے کی جدّوجہد کرتا یا آواز نکالتا میں نے اس کے سر کو دائیں طرف جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا منکا خشک لکڑی کی طرح ٹوٹ گیا۔

ٹارچ لائٹ اس کے ہاتھ سے پہلے ہی گر گئی تھی مگر ٹوٹی نہیں تھی۔ میں نے اُسے اندر گھسیٹا اور ٹارچ لائٹ اُٹھالی۔ روشنی اس کے چہرے پر ڈالے بغیر ہی میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میرے سامنے ایک لڑکی کے باپ کو اطمینان سے قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی محبت کی راہ میں حائل تھا۔ اس سپاہی نے میدانِ جنگ کے قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر کے اس پیشے کو رسوا کیا تھا اور وہ... موہنی کے بیان کے مطابق... اُسے دھکا دے کر فرار ہو گیا تھا۔ شک مجھے پہلے بھی تھا۔ اب اس کی شدت دوچند ہو گئی۔ غالباً خود موہنی نے اُسے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا تھا ورنہ وہ یہاں نہ آتا... سرحد پار کرتا اور اپنی محبوبہ سے جا ملتا۔

ٹارچ لائٹ نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے اس کی روشنی کے دائرے کو محدود رکھا اور اپنا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اب میں خسرو جمشید کے جنگل میں پھنسی ہوئی اور اس کی بربریت کا شکار ہونے والی کسی لڑکی کی درد بھری چیخوں کو زیادہ واضح طور پر اور مسلسل سن رہا تھا۔ انہی چیخوں نے تہ خانے تک میری رہنمائی کی۔ ایک حیوان کسی بند دروازے کے پیچھے شراب کے نشے میں دُھت اپنا شیطانی کھیل شروع کر چکا تھا۔ ایک حیوان میرے اندر بیدار ہو رہا تھا جو اس شیطان کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔

ایک زینہ مجھے تہ خانے تک لے گیا۔ زینے میں زیرو واٹ کے ایک بلب کی روشنی تھی جو ماحول کو زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھی۔ یا شاید یہ میرے جذبات تھے جو اس پُرآسیب فضا میں سفاکی اور بے رحمی کی بُو سے برانگیختہ ہو رہے تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا، وہاں ایک محرابی دروازہ تھا۔ دروازہ آدھے انچ سے بھی کم کھُلا ہوا تھا۔ روشنی کی یہ لکیر بالکل سیدھی کھڑی ہوئی تھی اور باہر میرے پیروں کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے میں نے خدا کو یاد کیا اور دروازے پر ایک لات ماری۔ اسی وقت میرے کانوں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ آواز کسی مرسیڈیز کے ڈیزل انجن کی تھی۔ اور جس گاڑی میں، میں موہنی کو چھوڑ کے آیا تھا، وہ مرسیڈیز دو سو ڈی ماڈل تھی۔

ایک لڑکی نے چیخ مار کے خود کو بیڈ شیٹ کے نیچے روپوش کر لیا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اور اس کے جسم کی چٹکی ہوئی چاندنی میں ایسے داغ نمایاں تھے جو مہذّب انسان کے اندر چھپے ہوئے وحشی حیوان کی بربریت کا المناک افسانہ کہتے تھے۔

خسرو جمشید بھی ایک دم اُٹھا تھا مگر میرے ہاتھ میں پروانۂ اجل کو دیکھتے ہی وہ منجمد ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے یقینی کی کیفیت دیکھی جو کسی بھی جوان، صحت مند اور زندگی کی بھرپور جدوجہد میں حصّہ لینے والے کو بے سبب ہارٹ اٹیک سے مرتے وقت ہوتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب خواہشوں کا ہجوم اور کامیابیوں کے سارے خوابوں کی تعبیر اپنی دسترس میں محسوس ہوتی ہو اور خوشیاں یوں زندگی میں بکھری ہوئی ہوں جیسے فصلِ بہار

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں پھولوں کی خوشبو... تو فرشتۂ اجل سے مڈبھیڑ کے امکانات کا کوئی تصوّر تک نہیں کرتا۔

خسرو جمشید کے لیے میرا اتنی دُور اور ایسے گمنام عشرت کدے میں یکلخت وارد ہو جانا ایسا ہی تھا۔ بالآخر اُسے یقین آگیا کہ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں دے رہی ہیں اور میرا پیکر اس کے خوف کا تراشا ہوا خیالی عفریت نہیں ہے۔

"تم..." اس نے بمشکل تمام کہا۔ اس میں شک، حیرت، خوف اور ناامیدی کے سارے جذبات عیاں تھے اور یہ ایک لفظ ایک سوال بھی تھا اور اعتراف بھی کہ سوال بے مقصد ہے۔

"ہاں قبلہ نواب صاحب۔" میں نے کہا۔ "یہ میں ہوں۔ آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو... ایک مدت کے بعد ملے ہیں نا اس لیے آپ کچھ حیران اور غالباً پریشان بھی ہیں۔ مگر یہ ملاقات کبھی نہ کبھی ایسے بھی ہونی تھی سو آج ہو گئی... وہ کیا فرماتا ہے فلمی شاعر کہ ہم بھی اکیلے تم بھی اکیلے رات سہانی..."

"تم... یہاں کیسے پہنچے...؟" نواب نے بے خیالی میں ایک احمقانہ سوال کیا... اس سوال کے جواب سے اُسے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "کو دا تری محفل میں کوئی دھم سے نہ ہوگا... وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا۔"

نواب نے اپنے کپڑوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں جمشید..." میں نے آگے بڑھ کر اس کے کپڑے دُور اچھال دیے۔ "تم کو ان کی کیا ضرورت ہے... شیطان اور حیوان کا شرم و حیا سے کیا رشتہ۔ بے شک، تم مہذّب لباس پہن کر دنیا کو دھوکا دیتے رہے ہو... مگر یہاں وہ دنیا کہاں ہے... یہاں تو صرف میں ہوں یا اوپر وہ ہے۔ خدا تو سب کچھ پہلے سے دیکھ رہا ہے اور سب جانتا ہے۔ میں اُس کا حقیر بندہ، تمھیں پہچانتا ضرور ہوں۔"

"ہاں... ہم ایک ہی حمام میں ہیں۔" جمشید نے تلخی سے کہا۔

"مگر میں ننگا نہیں ہوں جمشید..." میں نے کہا۔ "میں تو یوں سمجھ لو کہ وہ غسال ہوں جو تمھاری میت نہلانے آیا ہو۔"

"مجھے قتل کرنے کے علاوہ تم کیا کر سکتے ہو سکندر بخت۔" جمشید نے کہا۔ "غالباً تمھارے بارے میں یہ بات غلط ہے کہ تم ایک بہادر دشمن ہو۔"

"ہر دشمن بہادر ہوتا ہے جمشید... بہادر نہ ہو تو دشمنی کیسے نبھائے۔"

"مگر مشین گن کے ساتھ ایک نہتے آدمی کو مار دینے میں کون سی بہادری ہے۔" وہ بولا۔

"میرے جذبات سے کھیلنے کی فضول کوشش مت کرو..." میں نے کہا۔ "میں ایسی باتوں سے متاثر ہو کے یہ نہیں کروں گا کہ ایک مشین گن تمہاری طرف بڑھا کے کہوں کہ آؤ... اب مقابلہ ہو جائے نہیں... میں دشمن کو ایک فیصد رعایت دینے کا قائل نہیں... یہ تو وقت کا کھیل ہے... ہر کھیل میں وقفہ آتا ہے جب سائڈ بدل جاتی ہے۔ اب تک تم اس طرف تھے جدھر سارے فوائد تم کو حاصل رہے۔ تم نے کچھ پوائنٹ زیادہ حاصل کر لیے تھے، مگر گیم تم نے جیتا نہیں تھا۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ تم اب یہ گیم جیت لو گے؟"

"ہاں... تمہارے اور میرے درمیان آج یہ بازی ختم ہو جائے گی... یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون شکاری تھا اور کون شکار رہا۔" میں نے کہا۔

جمشید نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔ "تم نڈر... ذہین اور اصول پرست تھے سکندر... تم سب کچھ کر سکتے تھے۔ اگر تم چاہتے تو تمہارا شمار چند انتہائی خوش قسمت افراد میں ہوتا جو دولت کو گھر کی باندی بنا کر رکھتے ہیں اور جب چاہیں ارب کے کھرب بنا لیتے ہیں۔ تم سیاست میں قدم رکھتے تو شاید اس ملک کے صدر منتخب ہو جاتے۔ مگر تمہیں ہمیشہ اندازوں کی غلطی نے دھوکا دیا کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار رہے۔ اور تم نے زندگی کے راستوں پر چلتے ہوئے صرف بلندی کی طرف دیکھا۔ یہ خیال نہیں رکھا کہ نشیب اچانک آ سکتا ہے... تم روشنی میں چلتے رہے اور اندھیرے کو بھول گئے۔ تمہاری خوش فہمیوں نے تمھیں ہمیشہ منزل سے دُور رکھا۔"

"مجھے یہ تقریر پسند آئی۔" میں نے کہا۔ "پہلی بار میں نے تم کو ایک پیراگراف بولتے سنا ہے، ورنہ تم ہمیشہ مختصر جملے بولتے تھے۔ یا پھر بالکل نہیں بولتے تھے... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے اپنے آئینے میں میری صورت کیوں دکھا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تمھیں کامیابی پر غرور کے نشے نے یہاں تک تو پہنچا دیا۔ مگر اپنی فطری خامی کے باعث تم نے واپسی کے راستوں کی فکر نہیں کی۔" وہ اب خاصا پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔ میں کبھی واپسی یا پسپائی کی نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔ "میں ہر ساحل پر اترتے ہی اپنی کشتیاں جلا دیتا ہوں۔ تم نے کبھی ایسا نہیں کیا چنانچہ تم ہر بار ہزیمت اُٹھا کے بھی بحفاظت نکل جاتے تھے۔ تم نے ایم آر ایس کا نام تو سُنا ہوگا۔"

وہ طنزیہ لیکن تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔

"اس قوت کا وجود دنیا میں ازل سے تھی اور ابد تک رہے گا۔ مو تو کچھ ایسا ہی ہے کہ مرنے سے شہید اور زندہ رہ جانے سے غازی۔"

"بہت جلد تم شہادت کا اعزاز حاصل کر و گے... تمہارے خود ساختہ اصول اور پیمانے... خود فریبی کے سہارے... سب نابختہ شعور کی پیداوار ہیں... تم حب الوطنی... دوستی... قربانی اور ایثار...، بہادری، شرافت اور انسانیت کی سب صفات کو اپنی ذات سے منسوب کر کے خود ہی خوش ہو جاتے ہو... مجھے مار کے تم کہو گے کہ جہنم رسید ہوا۔ تمہارے لیے چند سر پھرے کہیں گے کہ وطن کا جیالا اپنے ادائے فرض میں شہید ہوا۔" جمشید نے کہا۔ "مگر یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔"

"یہ ایمان اور ایقان کا فرق بھی ہے جمشید... مگر اسے تم نہیں سمجھ سکتے۔" میں نے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "لیکن رات بھر میں یہ فرق میں تمھیں اچھی طرح سمجھا دوں گا... ابھی تو تاریخ بھی نہیں بدلی... میں کہہ سکتا ہوں کہ کل تک ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ صبح چھ بجے میں چلا جاؤں گا۔"

"صبح چھ بجے۔" وہ زبردستی ہنسا۔ "تم صرف آدھے گھنٹے بعد کوشش کر کے دیکھنا... تمھیں سارے راستے بند ملیں گے سکندر... مجھے معلوم ہے کہ تم اعتبار نہیں کرو گے... یہ کہو گے کہ میں تمھیں بیوقوف بنا کے مہلت حاصل کر رہا ہوں... لیکن..." اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ "ایک آدمی اب سے دس منٹ بعد یہاں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں گے..."

"تم کسی فوجی کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟" میں نے بے نیازی سے سگریٹ جلا کے کہا۔ "غالباً انڈین آرمی کا ایک جونیئر آفیسر؟"

"تم نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"ہاں... جب جہنم میں تمہاری اس سے ملاقات ہو تو یہ پوچھنا کہ آخر تمہاری گردن کیسے ٹوٹ گئی؟" میں نے کہا۔

"تو تم نے اسے مار دیا۔" جمشید ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... اب تک ہم نے جتنی گفتگو کی ہے، وہ سب نشر ہو چکی ہے... انھوں نے سب سن لیا ہوگا۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں ایک بے احتیاطی کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے اندر آتے ہی پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے تھا کہ کہیں کوئی خفیہ مائکروفون تو نہیں ہے۔ ایسی دور افتادہ جگہ پر خسرو جمشید اپنے ساتھیوں سے بالکل کٹ کے رہنے کی غلطی کیسے کر سکتا ہے۔ اس کے پاس ٹیلیفون تو نہیں ہے مگر رابطے کا کوئی ذریعہ ضرور ہوگا۔ ہنگامی صورت حال میں پیغام دینے اور پیغام وصول کرنے کے لیے اس عشرت کدے میں کسی ٹرانسمیٹر کی موجودگی کو بعید از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اُٹھو... تم بھی... اور تم بھی۔" میں نے لڑکی کے جسم پر ایک ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ اس نے پھر ایک ہسٹریا زدہ چیخ ماری۔ لیکن میں نے اسے پیچھے گھسیٹ لیا۔ خسرو جمشید کا ہاتھ ایک بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے سر پر مُکا مارا۔ وہ چکرا گیا۔ اس کی شیطانی کھوپڑی میں اس کا مغز ہل گیا ہوگا۔ میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کے جھٹکا دیا اور نیچے گرا لیا۔

"دونوں اُلٹے لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یہاں نہیں۔ آگے کھسک کر دیوار کے قریب جاؤ۔"

"چلو... کوئی بات نہیں..." جمشید نے لڑکی کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی بات مان لو... پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے پہلے تکیوں کے نیچے دیکھا۔ صرف جمشید کے تکیے کے نیچے ایک ریوالور تھا۔ میں نے اُسے خالی کر کے گولیاں دُور پھینک دیں۔ پھر میں نے بیڈ سائڈ ٹیبل کو کھولا۔ اس کے اوپر والے خانے میں دوسرا ریوالور تھا۔ میں نے اُسے بھی خالی کر دیا۔ نیچے والے بڑے خانے کا پٹ کھولتے ہی میں چونک پڑا۔ اس کے اندر روشنی ہو گئی تھی بالکل اسی طرح جیسے کار یا فریج کا دروازہ کھلتے ہی لائٹ جلنے سے ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر چھوٹے سے پٹ کو بند کیا اور کھولا... لائٹ کا سوئچ اسی سے منسلک تھا۔

اندر ایک ٹیلیفون نما آلہ رکھا تھا۔ اس میں ڈائل بھی تھا لیکن ڈائل کے علاوہ کچھ بٹن تھے۔ ان میں سے ایک پر 'پاور' لکھا ہوا تھا اور یہ پش بٹن تھا جو اس وقت دبا ہوا تھا۔ دوسرے پر 'کوڈ' لکھا ہوا تھا اور تیسرے پر 'ڈی کوڈ'۔ باقی دو بٹن والیوم اور ڈائریکشن کے تھے۔ اس ٹیلیفون سے منسلک تار پیچھے سے نکل کے بیڈ کے نیچے چلا گیا تھا اور غالباً باہر کسی انٹینا سے منسلک تھا۔ یہ موٹا تار تھا جس کے اندر دو یا تین تار بھی ہو سکتے تھے۔ غالباً دوسرا تار کسی بیٹری سے یا اے سی اڈاپٹر سے ملا ہوا تھا۔

میں نے پاور کو آف کیا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ اس میں عام فون جیسی ڈائل ٹون آ رہی تھی۔ میں نے مظفر گڑھ میں چند دکانوں کے سائن بورڈز پر چار عدد والے فون نمبر دیکھے تھے۔ میں نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ کہیں دور گھنٹی بجنے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "چودہری صاحب مبارک ہو۔ بھوری بھینس کے بیٹا ہوا ہے۔" اور ریسیور رکھ دیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے لیکن یہ مخصوص قسم کا فون تھا۔ میں نے پاور کا بٹن پھر دبایا اور ریسیور اُٹھا لیا۔ اس میں صرف سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ عام ٹیلی فون جیسی ڈائل ٹون کی جگہ ایک بہت ہلکی سیٹی باقی رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں تیز ہوا نشا خول سے گزر رہی ہے۔

جمشید اور اس عورت نے دیوار تک کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ کوئی بازاری عورت تھی۔ آج پہلی بار اسے اپنی آبرو کے بدلے پیسہ نہیں ملا تھا۔ اپنے اور خریدار کے نامۂ اعمال میں درج سب گناہوں کی سزا مل رہی تھی، وہ بُری طرح رو رہی تھی اور جمشید کو گالیاں دے رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پڑی۔

میں نے 'کوڈ' کا بٹن دبایا تو سرسراہٹ ختم ہو گئی اور کچھ

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو عورتیں قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہیں اور لڑ رہی ہیں مگر ایک چینی زبان بول رہی ہے تو دوسری عربی۔ درمیان میں کوئی طبلہ بجا رہا ہے اور شاید کچن میں ایک بچہ برتن گرا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ دوسری طرف سے کوئی پیغام تو دیا جا رہا ہے لیکن وہ کسی مشینی نظام کے ذریعے ناقابلِ فہم بن گیا ہے۔ میں نے 'ڈی کوڈ' کا بٹن دبا دیا اور یکلخت سارا شور ختم ہو گیا۔ کسی نے چلانا شروع کیا۔

"ہیلو... یہ کیا ہے...؟ نواب جمشید... جواب کیوں نہیں دیتے تم... ہیلو... ہیلو... واٹ دی ہیل... یہ کون عورت شور کر رہی ہے... کیا تم پاگل ہو گئے ہو...! اسٹاپ دس نان سنس۔"

اچانک میں نے ایک ریڈیو ڈراما پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ریسیور کو بیڈ پر رکھا اور ذرا دور سے چلا کے کہا۔

"میجر... دیکھو باہر سب طرف سے کور کر لیا ہے نا؟"

پھر میں چند قدم پیچھے گیا اور میں نے آواز بدل کے کہا "یس سر۔"

"واٹ یس سر۔" میں نے آگے آ کے پھر کرنل کی آواز میں کہا۔

"اچھی طرح کیمو فلاج کر دو سب کو..."

"وہ میں نے دیکھ لیا ہے سر۔" میں نے پیچھے ہو کے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جمشید نے چیخ کر کہا۔ وہ میری چالاکی کو سمجھ گیا تھا۔

"اوہ شٹ اپ!" میں نے کرنل کی آواز میں دہاڑ کے کہا۔ "ابھی تو میں نے صرف کپڑے اتارے ہیں تمھارے... کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھاری کھال بھی اتار لوں... یو ایڈیٹ..." میرے شور میں جمشید کی آواز دب گئی جو بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب دھوکا ہے اور میری چال ہے۔

"جاؤ... میرا منہ مت دیکھو..."

"یس سر..." یہ بات میں نے میجر کی آواز میں کہی۔ "آپ فکر نہ کریں... ان میں سے کوئی بچ کے نہیں جائے گا۔"

"کل ایوری سن آف اے بچ..." میں نے دہاڑ کر کہا اور پھر کہا "یہ کیا ہے... وائرلیس فون... اوہ گاڈ...! تم سب اندھے ہو... کسی نے نہیں دیکھا..." میں نے قریب جاتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ میں دوسری طرف کی گفتگو بالکل نہیں سن رہا ہوں مگر فون بند کرنے سے پہلے میں نے ریسیور سے کان لگائے تو مجھے دو افراد کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

یہ کیا ہوا... یہ تو کوئی گڑبڑ ہو گئی؟

کون ہے یہ کرنل...؟

"پاکستان آرمی کا لگتا ہے۔"

"باپ رے باپ... اور کون ہے...؟"

"اور ایک میجر... انھوں نے سب طرف سے گھیر لیا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟

"ہو گیا ہے پاگل کے بچے...۔"

"پھر اب کیا کریں... ان کو سگنل دیں...؟

"کیسے سگنل دیں... وہ راستے میں کہاں ہوں گے..."

"مارے جائیں گے چاروں..."

"یہ فون کس نے ملایا تھا...؟

"میرا خیال ہے کہ نواب نے کوشش کی تھی... کامیاب نہیں ہوا..."

"وہ اندر تک پہنچ گئے ہیں۔"

ہاں... انھوں نے نواب کو مار دیا ہے... اور اُسے بھی... شاناتا کو..."

"شاناتا گئی چولھے میں... اور نواب گیا بھاڑ میں... پر چار آدمی تو گئے... مارے گئے۔"

"مارے جائیں تو فکر نہیں... پکڑے نہ جائیں..."

"یار اسے تو بند کر..."

فون ڈیڈ ہو گیا... وہ دونوں کون تھے اور کہاں سے بات کر رہے تھے، یہ معلوم کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ دس پندرہ میل کی رینج میں ہوں گے کیونکہ نواب نے کہا تھا کہ بیس منٹ میں اس کے مددگار پہنچ جائیں گے۔ اس ٹیلیفون کے ساتھ مختصر فاصلے کا وائرلیس ٹرانسمیٹر تھا اور جیسے ہی یا در کا سوئچ آن کیا جاتا تھا، یہ عام ٹیلیفون ایک وائرلیس ریسیور بھی بن جاتا تھا جو شاید اے ایم بینڈ پر کام کرتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عام لائن پر کوئی بھی یہ گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ اگر کوئی سنتا تو اُسے وہی شور سنائی دیتا جو میں نے سنا تھا۔ اس کو ڈی کوڈ کرنا صرف اسی فون پر ممکن تھا اور ایسے ہی دوسرے فون پر دوسری طرف دو آدمی بات کر رہے تھے۔ وہ دونوں سخت پریشان لگتے تھے اور یہ میرے ڈرامے کے کامیاب ہونے کے حق میں ایک دلیل تھی۔ مگر میں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا کہ ڈراما وہ بھی کر سکتے ہیں اور ممکن ہے ان کی پریشانی کا یہ تاثر ایک فریب ہو۔ تاہم مجھے ایک کارآمد بات ضرور معلوم ہو گئی تھی۔ کہیں سے چار آدمی نواب خسرو جمشید کے ایس او ایس پر مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

نواب خسرو جمشید بزدل ہی نہیں، بے وقوف بھی تھا ورنہ وہ چلا چلا کے کہہ سکتا تھا کہ یہاں کوئی کرنل نہیں اور نہ ہی آس پاس پاکستانی فوج نے مورچے سنبھالے ہیں لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ایسی غلطی اس کے حق میں فوری ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ خدا کے

حوالے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا مگر وہ اپنی دانست میں احتیاط سے کام لے کر وقت گزارنا چاہتا تھا۔ امید کا دامن ہمیشہ وقت کے ساتھ بندھا رہتا ہے یہاں تک کہ تختہ دار کی سمت رواں مجرم بھی دم آخر تک کسی معجزے کے رونما ہونے کی امید رکھتا ہے۔ شاید... شاید اچانک کوئی قاصد آ جائے... کوئی فون آ جائے... کہ سزائے موت پر عمل درآمد منسوخ کر دیا گیا ہے یا ملتوی کر دیا گیا ہے... کسی خاص تقریب کے سلسلے میں تمام موت کی سزا پانے والے قیدیوں کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا گیا ہے۔ اسی امید نے خسرو جمشید کو مجبور کیا کہ وہ میری فرمانبرداری کرے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دے جو میرے جذبات میں اشتعال کا باعث بنے۔

وہ عورت ہسٹریا میں تقریباً پاگل ہو چکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے جمشید کو ننگی گالیاں دیں بلکہ اس کے منع کرنے پر اُسے تو چا، کاٹا اور اس کے بال کھینچے۔ جمشید پہلے ہی احساسِ ذلت و شرمساری سے سر اُٹھانے کے قابل نہ رہا تھا اور اس کی بے بسی کے جذبات کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس تذلیل کے جرم میں کوڑے مار مار کے میری کھال اُدھیڑ دیتا اور میں غلطی سے بھی اس کے قریب خالی ہاتھ پہنچ جاتا تو وہ میرا گلا ضرور گھونٹ دیتا... یا اس کی کوشش ضرور کرتا۔

مگر یہ اس کی خواہش تھی اور خواہش پر کس کا بس چلتا ہے! خسرو جمشید اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میرے ہاتھ میں کچھ نہ ہو تب بھی میں اس جیسے دس کو قریب نہ پھٹکنے دوں اور ایک ایک کر کے سب کو ملیا میٹ کر دوں... چنانچہ جب اس کے اعصاب پر دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس کسبی نے بھی اُسے ذلیل کرنا جاری رکھا تو نواب کے جذبات کا آتش فشاں پھٹ گیا۔

"کتیا... بھونکے چلی جا رہی ہے... دو کوڑی کی رنڈی..." اس نے ایک دم اُسے گردن سے دبوچ لیا۔ شاید تصور میں اس نے میری گردن دبالی تھی اور یہ احساس بھی اس کے زخمِ رسوائی کا مرہم نہ سہی درد کم کرنے کی دوا تو تھا۔

میں نے اس عورت کی ساری بکواس کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا تھا... وہ نواب صاحب کو ذلیل کر رہی تھی تو گویا میرا ہی ایک کام کر رہی تھی۔ مجھے اس کو منع کرنے کی کیا ضرورت تھی... اگر وہ مجھ سے کچھ کہتی تو شاید میں بھی اُسے کچھ کہتا۔

مجھے اس کی 'فصاحت و بلاغت' پر حیرانی ضرور تھی۔ وہ کوئی جاہل عورت نظر نہیں آتی تھی خصوصاً اپنے تراشے اور سیٹ کیے ہوئے بالوں سے... مگر یہ سارے انداز نمائشی تھے۔ اندر سے وہ ایک تھرڈ ریٹ طوائف تھی۔ اس کا جسم ہی بے حیا نہیں تھا بلکہ جذبات و احساسات بھی فحش تھے۔ پھر فحش الفاظ کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ آج تک اس نے اپنے اطوار پر تہذیب و شائستگی یا سوشل ایٹی کیٹس... کا پردہ ڈال رکھا تھا تو موت کے خوف نے وہ بے وجود پردہ ہٹا دیا تھا۔

جب خسرو جمشید نے مشتعل ہو کے اس کی گردن دبوچی تو وہ ہوش میں نہیں تھا۔ میں نے عورت کو چیختے سُنا اور اسے جمشید کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں ایسے پھڑکتے بھی دیکھا جیسے شکاری باز کے پنجے میں کوئی چڑیا پھڑ پھڑاتی ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے آگے بڑھا اور رُک گیا۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ایک گنہگار کے ہاتھوں دوسرے گنہگار کو قتل ہونے سے روکوں۔ جبکہ ہر اعتبار سے واجب القتل دونوں ہی تھے۔ عورت کا قانون کی نظر میں جرم کوئی نہ تھا، تب بھی مذہب اُسے سنگسار کرنے کا حکم دیتا تھا اور خسرو جمشید کے دامن پر تو اتنے بے گناہ لہو کے داغ تھے کہ ہر داغ پر اُسے ہر روز پھانسی دی جاتی تو اسے ہزاروں بار مرنا پڑتا۔

میں نے جمشید کو موقع دیا کہ وہ کرۂ ارض پر سے ایک گنہگار کے بوجھ کو کم کر دے۔ معلوم نہیں یہ خدا کے نزدیک اس کی نیکی شمار ہوگی یا ایک اور گناہ... حقیقت کو دیکھا جائے تو جمشید نے کسی اصلاحی جذبے سے مغلوب ہو کے ایک طوائف کا قتل نہیں کیا تھا۔ اس نے ذاتی عداوت میں اسے مار دیا تھا۔

چند منٹ میں وہ مر گئی اور اس کا ساکت جسم کھلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنی موت کا الزام مجھے دے رہی ہو کہ یہ سب تمھارا قصور تھا۔ نہ تم آتے نہ موت آتی... لیکن میں نے اپنے ضمیر پر بھی یہ الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس جنگ میں اب تک بہت سے بے گناہ بھی مارے گئے تھے پھر ایک گنہگار عورت کا کیا ہے؟

آہستہ آہستہ خسرو جمشید پر حقیقت آشکار ہونے لگی کہ غصے میں اُس نے کیا کر دیا ہے۔

"تم نے ایک قتل اور کر دیا ہے مرنے سے پہلے۔" میں نے اس کو ذہنی اذیت دینے کے لیے کہا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں۔

"تم نے سُن ہی لیا ہوگا... جو کچھ میں نے کہا تھا۔"

"تمھارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے وقوف نہیں ہیں۔" خسرو جمشید نے کہا۔

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال تھا... مگر اب نہیں ہے۔ مسٹر نواب صاحب... یہ کون لوگ تھے؟"

"جب وہ آئیں تو انہی سے پوچھ لینا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں آ رہے ہیں جمشید... میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تمھیں یقین کرنے پر مجبور نہیں کرتا... تم ان کا انتظار کرتے رہو۔ تم نے دس منٹ کہا تھا نا... ایک گھنٹا کافی ہے تمھیں؟"

"ایک گھنٹے کے بعد کیا ہوگا؟" وہ تلخی سے بولا۔

"ایک گھنٹے کے بعد میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس وقت حالات بدل چکے ہوں گے... ابھی تو تمھیں یقین ہے کہ کوئی تمھیں بچالے گا۔ جب اس کی امید بھی نہیں رہے گی تو میں دیکھوں گا کہ تمھارا رویہ کیا ہے۔"

جمشید نے سر اٹھا کے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"پھر تم کیا کرو گے؟"

"تمھارا مطلب ہے کہ کیا میں تمھاری جاں بخشی کر دوں گا؟... تو یہ وعدہ کرنا بہت مشکل ہے... ہاں، مخصوص حالات میں تمھارا کیس ایم آر ایس کی جیوری کے سامنے رحم کی درخواست کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور اگر تم اپنی افادیت ثابت کر سکے... یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ تم نے پرانے ساتھیوں کو چھوڑ دیا ہے، ماضی کی غلطیوں سے توبہ کرنے کے بعد آئندہ کے لیے بھی تائب ہو گئے ہو اور اس کا کفارہ ادا کر سکتے ہو..."

"کس قسم کا کفارہ؟"

"یہی کہ تم آئندہ ہمارے ساتھ تعاون کرو... تم بہت کچھ جانتے ہو کیونکہ اب تم ملاور کے دستِ راست تھے۔ ڈی سوا کی موت کے بعد... اس کا دوسرا بازو سراج تھا۔ تم ہمیں کارآمد معلومات فراہم کر سکتے ہو... اور تصدیق کے بعد وہ معلومات درست ثابت ہوں گی تو ممکن ہے تمھاری زندگی تمھیں بخش دی جائے... ظاہر ہے کہ پھر تم دھوبی کے کتے بن جاؤ گے۔ تمھارے لیے دونوں راستے بند ہوں گے... مگر تیسرا راستہ کھلا ہوا ہوگا... تم واپس ولایت جا سکتے ہو... جہاں تم برسوں رہے ہو... لیکن اسے میرا وعدہ مت سمجھنا۔ یہ تو دوسروں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر تم نے ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہر بات بتا دی تو اس ذخیرۂ معلومات کے بدلے تمھاری جان کا سودا ہو سکتا ہے بشرطیکہ معلومات مستند... مکمل اور اہم ہوں... ظاہر ہے تم کو اپنے ساتھیوں سے غداری کرنی ہوگی... مگر غداری ایک بار کی جائے یا دس بار... برابر ہے۔ یہ تمھارے مسلک میں اور فطرت میں شامل ہے۔ ورنہ آدمی ایک بار بھی غداری کرنے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ تم زندگی کو ترجیح دیتے ہو، اس لیے غداری کرو گے تو یہ تمھاری اپنی نظر میں عقل مندی ہوگی جس سے تمھاری جان بچ جائے گی۔ ورنہ تو تم جانتے ہی ہو، آدمی سے معلومات ایسے نچوڑی جا سکتی ہیں جیسے گنّے میں سے رس نکالا جاتا ہے... ایک بار... پھر دُہرا کر کے... پھر تیسری بار مزید دُہرا کر کے جب گنّے کو مشین سے گزارا جاتا ہے تو آخر میں صرف پھوک رہ جاتا ہے۔ دونوں انتخاب تمھارے ہیں... غداری کرو، دوستوں سے یا دشمنوں کے ہاتھوں پھوک بنو گے۔"

یہ سب بکواس تھی... میں صرف جمشید کو ذہنی طور پر ... دے رہا تھا۔ ہر غدار اور بے ضمیر آدمی بزدل ہوتا ہے اور زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے کہ غیرت و حمیت، عزت آبرو، شرم و حیا اور ... انسانیت کے سارے جذبوں کو قربان کرنا گوارا کرتا ہے... جیسی زندگی جمشید گزار رہا تھا۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست... شراب اور شباب میں ڈوبی ہوئی عشرت کی وہ زندگی جو دولت کی فراوانی سے حاصل ہوئی تھی۔ جس میں دنیا ہی جنت تھی... اسے خسرو جمشید کیسے آسانی سے ختم ہونے دیتا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کو تھوڑا سا برین واش کیا تھا تاکہ وہ کسی قسم کی ... کے بغیر ملاور اینڈ کمپنی کے سارے راز اُگل دے۔

میں نے گھڑی دیکھی تو دس منٹ گزر چکے تھے۔ مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں کیا حکمتِ عملی اختیار کروں۔ اس کمرے میں ... ان چار افراد کا انتظار کروں جو جمشید کی مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور جن کو واپس بلانے کے معاملے میں دوسری طرف کے لوگ بے بس نظر آتے تھے۔ وہ اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ کمرے کے اندر رہ کر میں زیادہ محفوظ تھا اور ان چاروں کو اندر آتے ہی شوٹ کر سکتا تھا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ ایک ساتھ وہ چاروں اندر آنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک اندر آئے گا اور باقی تین باہر محاصرہ قائم کریں گے۔ جیسے ہی ایک مارا گیا، باقی تین چوکس ہو جائیں گے اور خود اندر آنے کے بجائے مجھے باہر نکالنے کی کوشش کریں گے۔ وہ باہر رہ کے آزاد تھے اور امداد بھی حاصل کر سکتے تھے... اندر صرف ایک مشین گن پر میں کب تک انحصار کر سکتا تھا؟

چنانچہ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کو کہیں باندھ کر ڈال جاؤں اور خود باہر نکل کے مورچا بندی کر لوں۔ تیسری صورت یہ تھی کہ میں نواب کے ساتھ فرار ہو جاؤں۔ لیکن اس آخری صورت میں مسئلہ یہ تھا کہ ہم شہر سے بہت دُور تھے اور میرے پاس وہ گاڑی بھی نہیں رہی تھی جو جمشید کی ملکیت تھی۔ اس کی دو مرسیڈیز کاریں ہم تباہ کر چکے تھے اور یہ تیسری مونی رکال کے لے گئی تھی۔ وہ مرسیڈیز گاڑیوں کا شوقین معلوم ہوتا تھا اور اس اعتبار سے واقعی نواب تھا۔ مجھے مونی پر تاؤ دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ناگن بالآخر خود کو ناقابلِ اعتماد ثابت کر کے نکل گئی تھی۔ اس نے میرا قرب حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن پھر ایک ایسا مرحلہ آ گیا کہ اس کے ارادے خاک میں ملنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ کوئی ایسی وجہ تھی کہ وہ خود ... کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایک کہانی بھی سنا دی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ... قائل بھی ہو گیا تھا مگر حقیقت کچھ اور تھی... موقع ملتے ہی اس نے گاڑی کو ہاٹ وائر یعنی سیلف کے تار ملا کے اسٹارٹ کیا اور بھاگ گئی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور جس عورت کو خصوصی ایجنٹ کی تربیت دے کر ایسے مشن پر بھیجا گیا ہو، اس کے لیے تو طیارہ ہائی جیک کر لینا بھی مشکل نہ ہوتا۔

"جمشید...! تم کیا پسند کرو گے؟" میں نے کہا۔ "اسی حالت میں میرے ساتھ جنگل میں مارچ کرتا... رضاکارانہ طور پر ہاتھ پیر بندھوا کے اور منہ بند کرا کے روپوش ہوتا... یا ناک آؤٹ ہو کے لیٹنا...؟"

"میں دوسرا طریقہ پسند کروں گا... اگر تم واقعی میری پسند کو اہمیت دینے کے معاملے میں سیریس ہو..."

"اس کا تو ابھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا اور مشین گن ایک طرف رکھ دی... خسرو جمشید نے میرے حکم پر ایک پردہ پھاڑا اور اس میں سے چھ ساڑھے چھ فٹ لمبی پٹیاں پھاڑیں۔ پھر وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ ہاتھ پیر بالکل سیدھے کر کے اور میں نے اُسے ڈھانپتے ہوئے بیڈ شیٹ اس کے گرد لپیٹ دی۔ پھر میں نے ساری پٹیاں جوڑ کے ایک لمبی رسّی بنائی اور اُسے پیروں کی طرف سے لپیٹنا شروع کیا۔ نائلون کے پردوں کی پٹیاں خاصی مضبوط تھیں۔ جمشید ... کی طرح پڑا ہوا تھا، چنانچہ جب اس کے پورے جسم پر پٹیاں لپٹ گئیں تو وہ بالکل اہرامِ مصر سے نکل ہوئی کسی فرعون کی ممی نظر آنے لگا۔ میں نے اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ ہلنے جُلنے سے کوئی بل ڈھیلا نہ ہو اور جمشید اپنے ہاتھ ہلانا بھی چاہے تو نہ ہلا سکے۔

اس کام میں میرے دس منٹ صرف ہو گئے۔ اب مجھے باہر کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عمارت کے اندر محصور ہو جاؤں اور مقابلہ کیے بغیر دشمن کے ہاتھ لگ جاؤں۔

خسرو جمشید کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اس کو کندھے پر اٹھا لیا اور اُسے باتھ روم میں لے گیا لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں میں اُسے چھپا سکتا یا باندھ کے رکھ سکتا۔ مجبوراً میں نے اس ... کو واپس کمرے میں پہنچایا اور بیڈ کے سرہانے کی جانب نیچے ڈال دیا۔ وہ دیوار اور بیڈ کی درمیانی جگہ میں پھنس گیا اور میں نے اُسے پیروں کی طرف سے ایک پلنگ کے ساتھ باندھ دیا۔ دوسری طرف ... اس کے گلے میں رسّی کا ایسا پھندا بنا کے ڈالا کہ وہ اُٹھنے ... کی کوشش کرتا تو پھندا ٹائٹ ہو جاتا اور وہ زور لگا کے ... تو خود کو پھانسی لگا لیتا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ نیچے تہ خانے تک آنے والے ایک عورت کی لاش دیکھنے کے بعد جمشید کو کمرے میں تلاش کریں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کمرے میں ادھر اُدھر نگاہ ڈال لیں یا باتھ روم میں جھانک لیں۔ اس وقت نواب گردن اور سر ہلا کے بیڈ کو کھینچ سکتا تھا تاکہ وہ متوجہ ہو جائیں، بصورتِ دیگر اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ نواب کو ایسے تلاش کریں جیسے کوئی گم ہو جانے والی جوتی تلاش کرتا ہے۔

"اب تم سیدھے لیٹے رہو گے تو زندہ رہو گے!" میں نے پھر مشین گن اُٹھا کے کہا۔ "ہل جل کے خودکشی کرنا چاہو تو تمھاری مرضی... یہاں آ کے کسی نے تم کو بچا لیا تب بھی باہر تمھاری لاش ہی جائے گی۔ میں حویلی کے اندر ہی ہوں... میں بھی دیکھ لوں کہ تمھارے جاں نثار تمھیں بچانے کے لیے آتے ہیں یا نہیں۔ آئیں گے تو میں ان کا استقبال کروں گا اور تمھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے مناسب سمجھا کہ ٹیلیفون ریسیور کو بھی مشین گن کا بٹ مار کے توڑ ڈالوں... پھر میں سیڑھیاں چڑھ کے باہر نکل گیا... ٹارچ لائٹ میرے ہاتھ میں تھی۔ حویلی سے نکل کے میں نے اُسے بجھا دیا اور ایسی جگہ رکھ دیا جہاں سے پھر اُسے آسانی کے ساتھ اُٹھایا جا سکے۔ یہ عمارت ایک منزلہ تھی اور چھت پر چاروں طرف ایک ایسی منڈیر بنی ہوئی تھی جیسی عموماً قلعوں پر نظر آتی ہے۔ چاروں کونوں پر چار بُرج سے تھے۔

اوپر پہنچنے کے لیے زینہ ابھی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ تلاش کرنے پر چھت تک جانے کا راستہ مل ہی جاتا لیکن چھت بھی حرکت پذیری کو محدود کر دیتی تھی۔ بے شک چھت پر چڑھ کے میں دُور تک دیکھ سکتا تھا اور اگر مورچا قائم کر لیتا تو سامنے سے آنے والوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا مگر یہ یقین نہیں تھا کہ وہ سامنے سے ہی آئیں۔ وہ چار سمتوں سے بھی آ سکتے تھے۔ میں چاروں طرف سے ان کا راستہ کیسے روکتا؟

میں نے کھلے باغ کی پناہ کو بہتر سمجھا۔ صدر دروازے تک جانے والا راستہ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ ادھر سے آمدورفت ہوتی ہے۔ اندھیرے میں بھی جُھک کر دیکھنے سے مجھے ٹائروں کے نشانات نظر آ گئے۔ گیٹ سے سڑک تھوڑا سا بائیں طرف گھوم کر جاتی تھی اور پھر اس سیدھی سڑک سے مل جاتی تھی، جس پر چل کے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

میں نے صدر دروازے سے باہر آ کے خود کو جھاڑیوں کے پیچھے محفوظ رکھتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ تقریباً سو گز چلنے کے بعد پھر موڑ آ گیا۔ یہ جگہ مجھے دفاعی نقطۂ نظر سے مناسب ترین لگی۔ وہ سڑک کی طرف سے بھی آ سکتے تھے مگر یہ ممکن تھا کہ وہ گیٹ سے داخل ہونے سے گریز کریں۔ میں خود بھی فصیل کے ایک شگاف سے گزر کے اندر گیا تھا۔ اگر وہ عقل اور احتیاط سے کام لیں گے تو چار

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

مختلف سمتوں سے اندر جائیں گے... اور یہاں بیٹھ کے میں کم سے کم دو افراد کو دیکھ سکوں گا کہ وہ کہاں سے داخل ہوئے ہیں۔ مجھے ان چاروں کو ایک ہی راؤنڈ میں بھون دینے کا موقع بھی مل سکتا تھا بشرطیکہ وہ چاروں میرے سامنے ایک گاڑی سے اتریں یا گاڑی کو گیٹ کی طرف لے جائیں۔

ابھی میں نے صحیح پوزیشن بھی نہیں لی تھی کہ میرے کانوں نے دُور سے آنے والی گاڑی کی آواز سُنی۔ میں نے غور کیا کہ یہ آواز کس قسم کی گاڑی کی ہوسکتی ہے۔ کاریں تو عموماً بے آواز ہوتی ہیں۔ جیپ کے، مرسیڈیز کے اور فاکس ویگن کے انجن کی آواز جُدا ہونے کے سبب پہچانی جاسکتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ قریب ہوتے والی یہ آواز سب سے جُدا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کار کے سائیلنسر میں سوراخ ہے اور کار سیکنڈ گیئر میں پندرہ بیس میل کی رفتار سے چل رہی ہے یا اس سے بھی آہستہ۔

کار کے آہستہ چلنے کا سبب سمجھ میں آتا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بجھادی گئی تھیں۔ اندھیری رات میں جنگل کے درمیان سے گزرنے والی تاریک سڑک کو دیکھنا مشکل کام تھا۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا جس کی نظر بھی تیز ہو اور جسے اس سڑک پر آتے جانے کا کچھ تجربہ بھی ہو... یہ معلوم ہو کہ سڑک پر اچانک کوئی موڑ نہیں آتا۔ کوئی کھڈا نہیں ہے اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ گاڑی اگر کچّی سڑک سے ذرا نیچے اتر بھی جائے گی تو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر رفتار کم ہوگی تو یہ معلوم ہوتے ہی اُسے واپس سڑک پر لانا مشکل نہ ہوگا۔ مجھے اور موہنی کو یہاں تک پہنچانے والا اس راستے سے واقف تھا۔ اس کی جگہ میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو یہ کام میرے لیے آسان نہ ہوتا۔

سڑک کے درمیان میں ٹھہر کے میں نے آواز کی سمت میں دیکھا، جو اَب خاصی واضح تھی۔ انھوں نے پارکنگ لائٹس تک بجھا رکھی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق اب بھی وہ دو فرلانگ دور تھے مگر آواز سے لگتا تھا کہ وہ چند گز کے فاصلے پر موجود ہیں۔ میرے ذہن میں اس آواز کو سُن کے بکتر بند گاڑی کا خیال آتا تھا لیکن اس علاقے میں بکتر بند گاڑی لے کر آنے کی غلطی وہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جو خالص فوجی استعمال کی گاڑی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے ٹینک لے کر چڑھائی کرتا۔ یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا جہاں اس قسم کی کارروائی ممکن ہو۔

پھر اچانک بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ ٹریکٹر پر آرہے تھے۔ اس علاقے میں کسی کا بھی رات کے وقت ٹریکٹر پر پھرنا شک پیدا نہیں کرسکتا... مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ٹریکٹر پر وہی ہوں؟

ابھی میں انہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا کہ انجن بند ہوگیا اور رات کے سکوت میں جیسے ٹھہراؤ آگیا۔ میں لپک کے ایک ... پر ہوگیا، یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اُسی وقت ٹریکٹر کی لائٹس جل ... گئیں۔ اگر میں سامنے ہوتا تو وہ مجھے دیکھ لیتے۔ اور شاید لڑائی شروع ہوجاتی۔ یہ لڑائی کم اور شکار زیادہ ہوتا، جس میں بیک وقت پانچ افراد شکاری اور شکار کی حیثیت سے حقیقت ... کس کو تلاش کرسکتا ہے اور بے خبری میں گولی مار سکتا ہے۔ ... سے زیادہ بخت کے یاور ہونے پر منحصر ہوتا۔

آہستہ آہستہ میں نے سڑک پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ ... سی سڑک سے دس گز دُور درختوں کی قطار کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں ان کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجانا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان ... کم ہونے لگا تھا۔ ان کے قدموں کی چاپ میں صاف سُن رہا تھا مگر وہ اکٹھے چل رہے تھے۔ چنانچہ میرے قدموں کی آہٹ انھیں محسوس نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ خیال بھی نہیں ... کہ کوئی ان کی طرف آسکتا ہے۔ اگر وہ کوئی سرسراہٹ سُن بھی ... تو اُسے جنگل کے کسی جانور کی حرکت سمجھتے۔

"بس... یہاں رُک جاؤ۔" کسی نے انگریزی میں کہا۔

میں خود بھی رُک گیا۔ اب میں نے اپنی ساری توجہ اُن کی گفتگو پر مرتکز کردی۔

"تم سب نے نقشہ سمجھ لیا ہے؟" اسی شخص نے کہا۔ ... کوئی بنگالی تھا۔

"آہو جی... ہُن دستو اگاں..."

"سوار جی۔" بنگالی نے خفگی سے کہا۔ "یہ کیا ہے... تم نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے عرض کی سرکار کہ حکم کریں..."

"تو یہ بات تم انگریزی میں نہیں کہہ سکتے؟ تم جانتے ہو کہ باقی سب تمھاری بھاشا نہیں سمجھتے۔"

"او جناب... اتنی انگریزی آتی تو ہم بھی لفٹین ہوتے۔"

"تم بہت نان سیریس رہتے ہو ہر وقت... مجھے تمھاری ... کمنی پڑے گی... انگریزی نہیں آتی تو اردو بولو۔" بنگالی گرم ہوگیا۔

"چلیں جانے دیں سر۔" کسی اور نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں اس کی عادت..."

"اچھا دیکھو۔ سامنے سے کوئی نہیں جائے گا۔" بنگالی ...

"سوائے میرے... مگر میری بات اور ہے... سردار جی... تم ... پر پہنچنے کے لیے پیچھے سے راستہ بناؤ گے اور اوپر سے ہی ... کرو گے۔"

"فکر نہیں جناب عالی... پہنچ گیا میں کوٹھے تے۔"

"باقی دو کو مشرق اور مغرب کی طرف سے جانا ہے... ہم ... معلوم نہیں وہ کدھر چھپے ہوئے ہوں۔" وہ بولا۔

"... ہوشیاری سے ... ہمارا تو خیال ہے کہ وہ سب اندر ہوگا۔" چوتھا شخص شاید مدراسی تھا۔

"تم اپنا خیال اپنے ساتھ رکھو... کام آئے گا..." بنگالی نے کہا۔ "اب جاؤ... بکھر جاؤ۔"

وہ مجھ سے پچاس ساٹھ فٹ دُور تھے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ایک دم ان پر برسٹ مار کے سب کو ختم کردوں... ایک راؤنڈ چلا دینے کے بعد میں بھی خالی ہاتھ رہ جاتا اور اگر ان میں سے ایک بھی بچ جاتا تو وہ مجھے نہ چھوڑتا۔ دو بچ جاتے تو میں دو طرف سے فائرنگ کی زد میں آجاتا اور وہ مجھے چھلنی کر دیتے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں ان سے فرداً فرداً نمٹوں۔

میں نے ان کے جنگل میں گھسنے کی سرسراہٹ سُنی... ویسے میں نے بھی واپسی اختیار کی۔ ان کی حکمتِ عملی سمجھنے کے بعد میرے لیے اپنا لائحہ عمل مرتب کرنا آسان ہوگیا تھا۔

سب سے پہلے میں بنگالی کو خوش آمدید کہہ سکتا تھا جو غالباً بہادری میں برتری ثابت کرنے کے لیے سامنے سے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں واپس سڑک کے موڑ تک گیا اور انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی ادھر ہی آرہا ہے۔ یہ بنگالی ہی ہوسکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ گیٹ سے گزرے گا؟ نہیں... وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا۔

میں نے سڑک پار کی اور فصیل کے اس حصّے کی طرف گیا جس کے شگاف سے ہم اندر گئے تھے۔ یہ شگاف تقریباً سڑک کی سیدھ میں تھا۔ اندر جاکے میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو مجھے نیم کا ایک درخت فصیل کے اوپر سے باہر تک پھیلا ہوا دکھائی دیا۔

میں نے مشین گن نیچے رکھ دی اور پیڑ پر چڑھ گیا... یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا اور اس پر موٹے موٹے لال چیونٹے چل رہے تھے۔ انھوں نے کئی بار میرے ہاتھوں پر کاٹا۔ چند چیونٹے میرے بازو پر چلنے لگے اور آستین میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے میری بغل میں کاٹا۔ میں برداشت نہ کرتا تو کیا کرتا... فصیل پر پہنچنے والی ایک شاخ پر رُک کے میں نے ان چیونٹوں کو اندر ہی مسل دیا جو میرے شانے کا گوشت کھانے لگے تھے۔ ان کے نظر نہ آنے والے دانتوں کی اذیت کسی نوکِ خار کی رگڑ سے کم نہ تھی۔

فصیل پر اترنے کے بعد میں نے اس پر لیٹ کر آٹھ دس فٹ کا سفر بھی بڑی اذیت میں کیا کیونکہ اس پر بھی وہی لال چیونٹے موجود تھے۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ بوسیدہ فصیل کا کوئی حصّہ گر نہ جائے۔ بالآخر میں شگاف کے عین اوپر پہنچ گیا۔ یہ سب سے خطرناک جگہ تھی۔ دس فٹ بلند فصیل میں نیچے پانچ فٹ کا خلا پیدا ہوگیا تھا۔

اوپر ایک پُل سا رہ گیا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ یہ پرانی بے سہارا اینٹوں کا پانچ فٹ لمبا ٹکڑا خود اپنے وزن سے بھی گر سکتا تھا جس پر میں نے اپنے وزن کا اضافہ کردیا تھا۔

میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا تو مجھے ایک سائے کی خفیف سی حرکت محسوس ہوئی۔ میں چوکنا ہوگیا۔ یہ بنگالی تھا جو سرتاپا سیاہ لباس میں آگے بڑھ رہا تھا۔ کسی سیاہ چیتے کی طرح۔ عیاری سے اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا... وہ درختوں کے تنوں کے پیچھے پناہ لیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے اس کا انتظار کرتا رہا۔ ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جائے گا لیکن میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

جب وہ سیدھا شگاف کی طرف لپکا تو میں نے اطمینان کا گہرا سانس بھی روک لیا۔ میں نے اس شکستہ فصیل کی معلق اینٹوں پر ٹھہر کے خود اپنے لیے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں اینٹوں سمیت گرتا تو ملبے میں میری ہڈی پسلیوں کا چُورا ہوجاتا۔ لیکن خدا نے مجھے بچائے رکھا تھا اور میری محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

بنگالی نے شگاف کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے پیروں کو سمیٹا۔ ہاتھوں کے بل پر خود کو اٹھایا اور بنگالی پر یوں جست لگائی کہ وہ میرے جسم کے نیچے دب گیا۔ خود بخود میرے ہاتھ اس کے سر اور ٹھوڑی پر جم گئے۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں بائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کے میں نے سر کو دائیں ہاتھ سے جھٹکا دیا اور بنگالی کی گردن یوں گھوم گئی، جیسے سر اور دھڑ کے درمیان کوئی ہڈی تھی ہی نہیں... ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز تو خود اس کے کانوں نے بھی سُنی ہوگی۔

تیس سیکنڈ بعد میں کھڑا ہوگیا۔ بنگالی کا جسم اب بھی ہل رہا تھا لیکن جسم کا دماغ سے رشتہ ختم ہوگیا تھا، چنانچہ اس کا احساس مر چکا تھا اور جسم مر رہا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور حسبِ توقع مجھے اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ اس کی اسٹین گن میں نے ایک کندھے پر ڈالی اور اپنی مشین گن دونوں ہاتھوں میں تھام کے میں حویلی کی طرف بھاگا... ہر قسم کی احتیاط کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ مجھے معلوم تھا کہ باقی تین ابھی دُور ہوں گے۔ انھیں تھوڑا سا گھوم کر آنا تھا۔ سب سے کم فاصلہ جنوب کی طرف سے آنے والے کو طے کرنا تھا۔ تقریباً دگنا فاصلہ شمالی سمت سے داخل ہونے والے کو درپیش تھا۔ سوار جی کا چکر لمبا تھا کیونکہ ان کو عقبی حصّے تک پہنچنا تھا مگر میں نے پہلے انہی سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔

چھت تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے میں وہ ٹارچ لائٹ بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ میں نے وہ دروازہ بند کردیا جس سے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں اندر گیا تھا اور ٹارچ لائٹ کی مدد سے مختلف کمروں سے گزرا جو سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ لوگ اُسے آسیب زدہ حویلی سمجھتے تھے تو حق بجانب تھے۔ اس کو رکھنے والوں نے عمداً ویران رکھا تھا اور اس سے بھوت پریت کی خوں آشامی کی داستانیں منسوب کی تھیں۔ خسرو جمشید ایک اسمگلر تھا۔ اس نے رانی کی حویلی کو اپنا ایک ٹھکانا بھی بنا رکھا تھا اور عشرت کدہ بھی مگر جو کچھ تھا، وہ زیرِ زمین تھا۔ کوئی شامت کا مارا اوپر آ پہنچتا تھا تو اس کی خبر نیچے مل جاتی تھی۔ اسے مار کے آس پاس ہی کہیں گاڑ دیا جاتا تھا اور معلوم نہیں اب تک کتنے بے گناہ ان شکاری بھوتوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

زینہ مجھے عقبی حصے میں ملا۔ اوپر تک جانے والی سیڑھیاں بھی ٹوٹ رہی تھیں لیکن میں احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ سوار جی بھی پہلے زینہ ضرور تلاش کریں گے مگر سکھ تو سکھ ہے۔ اس کا کیا بھروسا کہ واہ گرو کا خالصہ کہے اور اُڑ کے اوپر پہنچنے کی کوشش کرے۔

لیکن سردار جی نے تو میرے بارہ بجا دیے۔ نیچے حویلی کے کسی گھنٹے نے بارہ کے گجر بجانا شروع کیے ہی تھے کہ مجھے ایک منڈیر پر اُبھرنے والا سر دکھائی دیا جو اندھیرے میں سیاہ گولے کی طرح اُبھرا اور غروب ہو گیا۔ میں دیوار کے سائے میں لیٹ کر ساکت ہو گیا۔ سر پھر اوپر آیا اور اس مرتبہ قائم رہا۔ اوپر آنے والا اب چھت کا جائزہ لے رہا تھا اور میں حیران تھا کہ آنے کا یہ کون سا راستہ ہے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک ڈرین پائپ کے سہارے چڑھ کے اوپر آئے تھے۔

میں نے سر کے بعد دھڑ کو منڈیر پر نمودار ہوتے دیکھا، پھر ایک سایہ چھت پر اُتر آیا۔ آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس نے منڈیر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ میں چوکس ہو گیا کیونکہ اس کا رُخ اسی سمت میں تھا، جدھر میں دبکا پڑا ہوا تھا۔ بے شک، وہ دُور سے اندھیرے میں میرے خدوخال کو عمارت کے خاکے سے جُدا نہیں دیکھ سکتا تھا مگر قریب آتے ہی وہ دیوار اور آدمی کے فرق کو محسوس کر لیتا۔

میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مارا تو پلاسٹر کا ایک اُکھڑا ہوا ٹکڑا میری گرفت میں آ گیا۔ اُسے میں نے ہاتھ کو کم سے کم حرکت دیے بغیر یوں اُچھالا کہ وہ مخالف سمت میں کھلی چھت پر گرا۔ سوار جی ایک دم گھوم گئے اور ان کی اسٹین گن کا رُخ بدل گیا۔ وہ چند سیکنڈ تک اسی پوز میں منتظر رہے کہ کچھ ہو یا کوئی سامنے آئے۔

میں بھی چند سیکنڈ کی مہلت ہی چاہتا تھا، جس میں میرے لیے کھڑا ہونا ممکن ہو۔ سوار جی کے اور میرے درمیان بیس فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ یہ فاصلہ اس وقت بہت زیادہ ہو جاتا ہے جب حریف اپنے ہاتھ میں اسٹین گن لیے فائر کھول دینے کے لیے تیار کھڑا ہو۔

میں نے اپنی مشین گن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا سردار جی نے پلٹ کے دیکھا۔ گولیوں کا ایک برسٹ آیا مگر یہ غوطہ مار کے نکل چکا تھا۔ چھت سے اڑنے والی سیمنٹ میرے چہرے سے ٹکرائیں۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر کے فضا دوسری بار مشین گن کی تڑتڑاہٹ سے گونجی۔ سے ایک بھیانک چیخ بلند کی اور وہ اُچھلا تو اس کے دونوں ہاتھ بھی اوپر اُٹھ گئے۔ اس کی مشین گن ایک دھماکے سے نیچے کی چھت پر گری۔ وہ خود منڈیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اچھلنے کے بعد وہ نیچے آیا تو اس کا آدھا دھڑ منڈیر پر لٹک گیا۔ اس نے کرب کے ساتھ ایک بل کھایا تو اس کی ٹانگیں تھوڑا سا اوپر اُٹھ گئیں۔ وہ منڈیر پر سے غائب ہو گیا۔ اس کی لاش حویلی کے سامنے والے حصے میں تقریباً اٹھارہ فٹ کی بلندی سے گری۔

اسی وقت تیسرا شخص شامتِ اعمال کے باعث سامنے آ گیا... وہ جنوب کی طرف سے اندر پہنچ چکا تھا اور دوسروں کی طرح بہت مطمئن تھا کہ وہ سب کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا۔ محاصرہ قائم کرنے والی پاکستانی فوج کے کسی آدمی نے اُسے نہیں دیکھا۔

جب سکھ فوجی میری چلائی ہوئی گولیوں سے زخمی ہو کر اُچھلا تھا تو اس کی پگڑی گر گئی تھی۔ جب وہ نیچے گرا تو تیسرے شخص نے یہ سمجھا کہ شاید سردار جی نے چھت پر موجود دشمن پر فائر کیے تھے مگر دشمن بچ گیا اور اس نے جان بچانے کے لیے کود کر پر سے چھلانگ مار دی ہے۔ تیسرا شخص دُور نہیں تھا مگر اندھیرے میں اس کی نظر دھوکا دے گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سوار جی کے سر پر پگڑی نہیں تھی اور بغیر پگڑی کے کودنے والا اس کا نزدیک دشمن ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی نیچے گرتی ہوئی لاش پر ایک راؤنڈ چلا دیا۔

مرے کو مارے شاہ مدار۔ یہ شاہ مدار اپنی جلدبازی پر بعد میں پشیمان ہوا ہو گا مگر جنگ کے میدان میں غلطی یا غلط فہمی ہی شکست کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ لاش پر گولیاں برسانے والے کو تاسف کے سوا کچھ نہ ملا ہو گا لیکن مجھے اس کی صحیح پوزیشن کا سراغ مل گیا۔ اب میں عجلت پسندی کا مظاہرہ کرتا تو مشین گن کا رُخ اس کی سمت رکھتے ہوئے فائر کھول دیتا لیکن میرے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہ گھاس اور جھاڑیوں میں روپوش تھا۔ میری کوشش کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔ اُدھر میری پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ میں چانس لے سکوں۔ میں نے سر کو جھکا کے اور گھٹنوں کے بل دوڑتے ہوئے فصیل

فصیل کا ہر کنگورا دو فٹ چوڑا اور اونچا تھا۔ اوپر سے اس فصیل محرابی تھی چنانچہ دو کنگوروں کے درمیان جہاں ان کی قوس ملتی وہاں تھوڑا سا خلا آ جاتا تھا۔ اس خلا سے میں نیچے بھی دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ تیسرا آدمی اپنی جائے پناہ سے نکلتا تو میں اسے ایک قدم بھی نہ چلنے دیتا اور اوپر ہی سے اس کے جسم میں باقی ماندہ گولیاں پیوست کر دیتا۔ لیکن وہ اپنی کمین گاہ سے باہر نہیں آیا۔ چھت کے آخری حصے میں پہنچ کے میں نے نیچے جھانکا۔ سکھ اسی طرف سے آیا تھا۔ اب میں اسی شخص کی تقلید کر رہا تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اس کی عقل سکھوں والی ہو گی... میں نے وہ ڈرین پائپ تلاش کیا جو لوہے کا تھا لیکن زنگ کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

پانچ منٹ بعد میں نے قدم زمین پر رکھے اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کونے تک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک شمال کی طرف سے داخل ہونے والا چوتھا شخص بھی پہنچ چکا ہو گا مگر میں نے اُسے نظرانداز کر دیا۔ میری ساری توجہ فی الحال اس تیسرے شخص پر تھی جو ابھی تک سامنے کی لمبی گھاس میں لیٹا ہوا تھا یا بیٹھا ہوا تھا۔ فوری طور پر مجھے ایسی کوئی ترکیب نہ سوجھی جو اُسے باہر نکالنے میں مؤثر ثابت ہوتی۔ میرے لیے انتظار کے سوا چارہ نہ تھا۔

پانچ منٹ... دس منٹ۔ پھر پندرہ منٹ گزر گئے... میں اسی سمت میں نظر جمائے بیٹھا رہا جہاں میرے خیال میں دشمن چھپا ہوا تھا۔ عین اس وقت جب میں مایوس ہو کے یہ سوچنے لگا تھا کہ کہیں میں ایک مفروضے کو حقیقت سمجھے تو نہیں بیٹھا ہوں، دشمن نے اپنی موجودگی کا سراغ دے دیا۔ اُسے میں صرف اس کی بدبختی کہہ سکتا ہوں کہ وہاں دم سادھ کر بیٹھے بیٹھے اسے اچانک چھینک آ گئی... چھینک والے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عشق، مشک اور چھینک کسی کے چھپائے نہیں چھپتے۔ اس نے کوشش ضرور کی ہو گی کہ غلط وقت اور غلط جگہ پر نازل ہونے والی چھینک کو روک لے مگر ناک نے وفا نہ کی۔

اس نے چھینک کو دونوں ہاتھوں کی پناہ میں اور گھٹنوں میں مدفون کر دیا ہو گا یا آواز کو کم سے کم رکھنے کی کوئی دوسری تدبیر یقیناً کی ہو گی۔ پھر بھی میں نے وہ آواز سُن لی۔ اب میرے لیے نشانہ لینا زیادہ آسان ہو گیا۔ کامیابی کی سو فیصد ضمانت اب بھی نہ تھی لیکن مجھے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ میں ساری رات یہاں بیٹھ کے نہیں گزار سکتا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے اندازے پر بھروسا کرتے ہوئے مشین گن کا رُخ صحیح سمت میں کیا اور پورا راؤنڈ چلا دیا۔ مشین گن کو تھوڑا سا دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے میں نے تقریباً پانچ چھ گز میں گولیاں برسائیں۔

جب میں نے اس کی دردناک چیخ اور نزع کے کرب کی صدا سُنی تو مجھے یقین آیا کہ میرا نشانہ خطا نہیں گیا اور میں اپنی جگہ سے نکل کے بھاگا... میرا رُخ اب باہر کی طرف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چوتھا شخص فائرنگ کی آواز سن چکا ہو گا اور جب اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھے گا۔ تہ خانے میں جا کے نواب کو غیر موجود پائے گا مگر اُسے نواب کے ساتھ دادِ عیش دینے والی طوائف کی لاش ملے گی پھر وہ دیکھے گا کہ کار غائب ہے اور ٹرانسمیٹر فون ٹوٹا ہوا ہے تو وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ ہم نواب کو اغوا کر کے نکال لے گئے یا اُسے پاکستانی فوجی گرفتار کر کے لے گئے۔ پھر وہ وہاں سے فرار میں ہی عافیت سمجھے گا۔

سیدھی سڑک پر میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا سفر جاری رکھا لیکن اتنی احتیاط ضرور کی کہ سڑک سے ہٹ کے چلوں مبادا کوئی اور گاڑی نمودار ہو جائے۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں ان کے ساتھ پانچواں شخص ڈرائیور نہ ہو۔

لیکن ٹریکٹر لاوارث کھڑا ہوا تھا۔ اُسے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے چھپانے...... کی واجبی سی کوشش کی گئی تھی۔ اس سڑک پر سے اس وقت گزرنے والا کون تھا جس کا انھیں خطر ہوتا مگر میری نظر دونوں جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے فوراً دیکھ لیا۔ اس لیے بھی کہ ٹریکٹر کا رنگ زرد تھا۔

میں اب رانی کی حویلی سے تقریباً آدھا میل کے فاصلے پر تھا۔ ٹریکٹر کے پچھلے والے حصے سے ٹیک لگا کے میں نے بنگالی کی اسٹین گن کا بار اپنے شانے سے اتارا اور زمین پر پیر پھیلا کے بیٹھ گیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ سگریٹ کی طلب میں جیب کی طرف گیا مگر میرے پاس نہ سگریٹ تھی اور نہ ماچس۔

میں نے ٹریکٹر پر چڑھ کے سامنے والے خانے کی تلاشی لی۔

پھر پیچھے دیکھا تو مجھے ایک تھرماس پڑا ہوا نظر آیا۔ اس میں گرم کافی تھی۔ یہ خدا کی دین تھی اور بقول شاعر کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ سگریٹ تو نہیں ملی مگر کافی مل گئی جس کی طلب ان حالات میں یوں دب گئی تھی جیسے غربت میں سوکھی روٹی میسر نہ ہو تو عشق بھی نہیں سوجھتا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مزے لے لے کر کافی کے دو مگ خالی کر دیے۔ تھرماس میں اتنی ہی کافی تھی۔ خالی تھرماس کو میں نے جنگل کی طرف اچھال دیا۔ اس نعمتِ غیر مترقبہ نے میرے حوصلے اور میری جسمانی توانائی کے گراف کو میرے ارادوں سے بھی بلند کر دیا۔ رات کا ایک بج گیا... پھر ڈیڑھ بج گیا۔ انتظار میرے اعصاب پر اثرانداز ہونے لگا اور میرے ذہن میں نئے اندیشے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بیدار ہو گئے۔ کہیں وہ چوتھا شخص کسی اور طرف سے تو نہیں نکل گیا۔ میں نے ایک ٹیلیفون ٹرانسمیٹر کو تباہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ کسی اور طرح بھی تو اپنا پیغام آگے پہنچا سکتا ہے۔ مزید کمک طلب کر سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی پورٹیبل واکی ٹاکی ہوا... مگر نہیں... اس کے ساتھیوں کی گفتگو فون پر سننے کے بعد یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ روانہ ہو جانے والوں کو واپس نہیں بلا سکتے۔ ان کے پاس واکی ٹاکی ہوتا تو وہ رابطہ قائم نہ کر لیتے؟ مگر کیا اس عمارت میں دوسرا فون نہیں ہو سکتا؟

اچانک میں نے باتوں کی آواز سنی۔ میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ کم سے کم دو افراد رانی کی حویلی کی طرف سے آ رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتے گئے ان کے الفاظ واضح ہونے لگے۔ ان میں سے ایک خسرو جمشید تھا جو دوسرے شخص کو اپنے ساتھ ہونے والی ساری زیادتی کا احوال سناتے ہوئے سخت مشتعل تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آزاد کر لیا تھا یا وہ تہ خانے میں پہنچ جانے والے چوتھے شخص کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اُسے رہا کر کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ خسرو جمشید نے اسے بتا دیا ہو گا کہ آس پاس کوئی پاکستانی فوج نہیں، اور نہ وہاں کوئی کرنل میجر پہنچا تھا۔ وہ سب میرا ڈراما تھا۔

میں نے چوتھے شخص کے ساتھ نواب کی تشریف آوری کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ اب بالکل بے خوف تھے کیونکہ ان کو کسی کا ڈر نہیں رہا تھا۔ نہ پاکستانی فوج کی موجودگی کا اور نہ میرا۔ شاید میرے بارے میں انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ میں چار افراد کا مقابلہ نہ کر سکا اور جان بچا کے نکل گیا۔

وہ سیدھے ٹریکٹر کی طرف آ رہے تھے۔ میں سانس روکے کھڑا رہا اور آفاتِ ناگہانی سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتا رہا کہ مجھے چھینک نہ آئے، اچانک کوئی سانپ نمودار نہ ہو جائے یا کوئی اُڑنے والا کیڑا میری ناک کو ڈنک مارنے کے لیے پسند نہ کر لے۔

جب وہ ٹریکٹر پر چڑھ گئے اور ان پر میری موجودگی کا راز افشا نہ ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ خسرو جمشید اب لباس بدل چکا تھا۔ اس کا ساتھی ویسے تو دیہاتی لباس میں تھا مگر وہ انگریزی بول رہا تھا اور اپنے لب و لہجے سے بنگالی لگتا تھا۔

وہ نواب پر برہم تھا۔ "تم بھی ویسے ہی نواب ہو جو شطرنج کی ایک بازی پر سلطنت ہار دیتے ہیں اور پیشہ ور طوائفوں کے ناز و انداز پر اور پیشہ ور قصیدہ گو شاعروں پر زر و جواہر نچھاور کرتے کرتے خود فقیر ہو گئے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو... میں ایک ذمّے دار آدمی ہوں۔" جمشید نے گرم ہو کے کہا۔

"ذمّے دار... مائی فُٹ... تم شراب کے نشے میں دُ... ہوئے تھے اور اُس طوائف نے تمھیں عقل و ہوش سے بیگانہ... تھا۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ دشمن یوں سر پر آ پہنچتا؟"

"یہ تو میں بھی نہیں سمجھ پایا۔" جمشید نے دبے ہوئے... کہا۔ "کہ آخر وہ کمینہ وہاں پہنچا کیسے... کس نے اسے... اس جگہ کا؟"

"ہوشیار لوگ سب معلوم کر لیتے ہیں... خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ حریف کو تو اپنا ہوش نہیں۔"

"عزیز میاں! اس جگہ کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا۔"... نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تمھاری غلطی تھی۔" وہ بولا۔ "اگر تمھارا آدمی ہمارے... نہ پہنچتا تو ہم تمھاری مدد کے لیے کیسے آتے... کیا فرشتے مجھے... دکھاتے؟ اور نواب صاحب... کیا سکندر بخت کو بھی تمھارے یہاں ملنے کی خبر فرشتوں نے پہنچائی تھی؟ اگر تمھارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا تو اس راستے پر وہ کیسے آ گیا... تم جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے...!"

"ایک آدمی اور تھا۔" نواب نے کہا۔ "میرا شوفر... جو میرا سیکریٹری بھی تھا اور محافظ بھی۔"

"وہی جو تمھارے میک اپ میں ڈبل رول کرتا تھا...؟" عزیز تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔

"ہاں..."

"اس وقت کہاں ہے وہ؟" عزیز میاں نے کہا۔

"وہ سات نمبر کیمپ کی طرف گیا تھا۔" نواب نے کہا۔

"وہی جو تباہ کر دیا گیا تھا؟"

"ہاں۔"

"وہاں اب کیا تھا؟" عزیز میاں بولا۔ وہ دونوں ٹریکٹر پر بیٹھے ہوئے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے انھیں کسی کا انتظار ہو۔

"میں نے اُسے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو مخالفت کی تھی مگر یہ حکم دینے والوں کو میری گاڑی اور شوفر دونوں درکار تھے۔" جمشید نے کہا۔

"بس تو پھر اس پہ فاتحہ پڑھ لو۔" عزیز میاں نے کہا۔ "اگر اس جگہ کا پتا دو ہی آدمی جانتے تھے تو شک کی کون سی گنجائش رہ جاتی ہے کہ سکندر بخت کو اسی نے سب بتایا... اور ظاہر ہے اپنی خوشی سے۔ بہ رضا و رغبت نہیں بتایا۔"

"اگر وہ مارا گیا تو میں... انھیں معاف نہیں کروں گا۔"

"کسے معاف نہیں کرو گے؟" عزیز میاں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

جنھوں نے اُسے زبردستی بھیجا تھا... یہ جانتے ہوئے بھی کہ سکندر بخت اور اس کے ساتھی وہیں موجود ہیں۔ اُسی علاقے میں... وہ اتنی تباہی پھیلا چکے تھے۔ ان کو زندہ گرفتار کرنے کا سوچنا پاگل پن تھا اور دیکھ لو اس کا نتیجہ... صرف ایک بچ کے واپس پہنچا تھا... وہ بھی موہنی کی وجہ سے... جو ایک عورت تھی۔"

"میں نے اس کی لاش بھی دیکھ لی ہے۔"

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے کرنل کو خود گولی مار دی تھی؟"

"واٹ نان سنس...!"

"یہ بات خود اس نے مجھے بتائی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کیا اُن کے درمیان دشمنی تھی؟"

"ہاں... تم کہہ سکتے ہو... دشمنی کی وجہ ایک لڑکی تھی جو کرنل کی بیٹی تھی اور کرنل اس کی شادی کے معاملے میں اپنے رویے میں ایک سوت کی لچک پیدا کرنے پر تیار نہ تھا۔ کرنل زندہ رہتا تو..."

"پھر تو ٹھیک ہی ہوا کہ وہ مارا گیا... ورنہ اس کا کورٹ مارشل ہوتا تو اُسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے مرنا پڑتا... حد ہے بدمعاشی کی... ڈسپلن اور مورال کوئی چیز ہی نہیں رہا... ایک لڑکی کے لیے اپنے باس کو... اتنے سینئر افسر کو قتل کر دینا بہت سنگین جرم تھا۔" عزیز میاں اب بے حد مشتعل تھا۔ "مگر میں پھر کہوں گا نواب صاحب کہ یہ سب آپ کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔"

"اس نے میرے باڈی گارڈ کو قتل کر دیا تھا..."

"باڈی گارڈ!" عزیز میاں نے حقارت سے کہا۔ "جیسی روح ویسے ہی فرشتے... وہ بھی دُھت پڑا ہو گا... شراب کے نشے میں یا چرس کا دم لگا کے۔ معلوم نہیں تم جیسے آدمی کو قابلِ اعتماد کیوں سمجھ لیا گیا... میری رائے میں تم اس قسم کی ذمّے داری کے لیے بالکل نااہل ہو۔"

"تم یہ بھول رہے ہو عزیز میاں کہ میری تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔" جمشید ایک دم غصے میں قابو سے باہر ہو گیا۔ "تم عدم سے وجود میں بھی نہیں آئے تھے، جب میں نے اسلحے سے بھری ہوئی کشتی مجاہدوں کو پہنچائی تھی۔ وہ تحریکِ خلافت کا دور تھا۔"

"پھر اب آپ مجاہدوں کے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟" عزیز میاں شرمندگی مٹانے کے لیے بولا۔ "کشتی نے رُخ کیوں بدل لیا ہے؟"

"وقت بدل گیا ہے میاں... اور جب وقت بدلتا ہے تو قدریں بدل جاتی ہیں۔ شرافت کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ انسانوں کی نظریں اور ان کے دل بدل جاتے ہیں۔" نواب خسرو جمشید نے تلخی سے کہا۔ "کیا ملا تھا مجاہدوں کو... تحریکِ خلافت میں جان دینے والوں... اور..."

"اور کیا... تم تقسیم کی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہو؟"

"نہیں... ڈرتا نہیں... لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔ کون نہیں جانتا، ان کی شہادت کے پیچھے کار فرما عوامل کو... اس حادثے نے مجھے... دل برداشتہ کر دیا۔ میں نے کہا میاں جمشید یہ اصول اور نظریات سب کتابی باتیں اور جذباتی نعرے اب ختم ہوئے، اب لوٹ کھسوٹ کا دور ہے... تم اسے منفی سوچ کہہ سکتے ہو مگر جب صرف پیسہ ہی عزت کا پیمانہ بن جائے اور حرام حلال... جائز ناجائز کی تفریق مٹ جائے... اور قانون مذاق ہو جائے تو سوچ سیدھی کیسے رہ سکتی ہے... یہ ٹھیک ہے کہ اب بھی سیدھی سوچ رکھنے والے موجود ہیں... اور میرا دشمن ہے تو کیا، میں سکندر بخت کو صحیح سوچ رکھنے والے مثالی انسان کی طرح پیش کر سکتا ہوں۔ میں کمزور تھا کہ بھٹک گیا اور میں بھی دونوں ہاتھوں سے پیسہ کمانے والوں میں شامل ہو گیا... میں سمجھتا ہوں کہ میں گھاٹے میں نہیں رہا... خصوصاً جب میں ان کی کسمپرسی اور حالتِ زار دیکھتا ہوں... جو بدستور وضعداری نبھا رہے ہیں تو مجھے کوئی شک نہیں رہتا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ بنگالی بھی مارا گیا ہو گا۔" عزیز میاں نے کہا۔ "ہم کب تک انتظار کریں اس کی واپسی کا؟"

"اس کی لاش تو نظر نہیں آئی۔"

"ہاں... مگر اتنی دیر میں وہ دس بار اندر جا کے واپس آ سکتا تھا۔"

"چلو عزیز میاں، اب یہ ٹھکانا بھی چھوٹا۔" جمشید نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ "لگتا ہے کہ اب ہم پر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا بھی نہ رہے تو آدمی کہاں جائے... کیوں کر جیے۔"

یہ خسرو جمشید کی شخصیت کا وہ روپ تھا، جو پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس کی ہوس پرست لالچی فطرت نے اُسے اتنی جلدی سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اگر اس کے خیالات اور نظریات میں استقامت ہوتی تو وہ... پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے عقیدے سے منحرف نہ ہوتا۔

میں نے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ ٹریکٹر پر چڑھ جاؤں اور عزیز میاں کو مار کے جمشید کو اپنے ہمراہ لے جاؤں لیکن پھر مجھے عقل

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نے روک لیا۔ میں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے جگہ میں نے پہلے ہی منتخب کر لی تھی۔ جب ٹریکٹر اسٹارٹ ہوا تو میں پیچھے پیر لٹکا کے بیٹھ گیا۔

ٹریکٹر نے موڑ کاٹا اور واپس مظفر گڑھ جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس کا دوڑنا ایسا ہی تھا جیسے اونٹ کا دوڑنا۔ مجھے بہت ہچکولے لگ رہے تھے اور جب اچانک ٹریکٹر کچی زمین پر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا تو میرے لیے توازن برقرار رکھنا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ ایک طرف مجھے اسٹین گن کو سنبھالنا تھا تو دوسری طرف خود کو۔ کئی بار اسٹین گن ٹریکٹر کی باڈی پر لگی مگر ٹریکٹر کے چلنے سے اتنا شور ہو رہا تھا کہ آگے بیٹھے ہوئے عزیز میاں اور جمشید نے کچھ نہیں سنا۔

عزیز میاں یقیناً مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسند عناصر کا ایجنٹ تھا اور بھارتی ایجنٹوں کے ساتھ مل کے کام کر رہا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو ان کے بیس کیمپ میں بس اب دو ہی آدمی تھے۔ جن کی گفتگو میں نے وائرلیس فون پر سنی تھی تیسرا عزیز میاں تھا۔ چنانچہ میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں ان تینوں کو فنا کر سکتا تھا۔

ٹریکٹر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے چلتا رہا۔ جنگل کے راستوں پر کئی بار دائیں بائیں مڑنے سے میں صحیح سمت بھی بھول گیا۔ پھر میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو قطب ستارے نے میری مدد کی۔ رات کے دو بجے ٹریکٹر اچانک رک گیا۔ اس کے پہیوں کے سامنے کوئی منڈیر آ گئی تھی۔ جھٹکا لگا تو میں اچھل کے نیچے جا پڑا اور چونکہ انجن بند ہو گیا تھا اس لیے عزیز میاں نے وہ آواز سن لی جو اسٹین گن کے گرنے سے پیدا ہوئی تھی۔

میں ایک دم اٹھا اور میں نے اپنا ہاتھ اسٹین گن کی طرف بڑھایا لیکن اتنی دیر میں عزیز میاں نیچے اتر کے اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے فائر کیا اور میں غوطہ مار کے ٹریکٹر کے بڑے پہیے کے پیچھے ہو گیا۔ ٹریکٹر نہ ہوتا تو مجھے دوسری گولی سے بچنے کے لیے جائے پناہ نہ ملتی۔ تاہم عزیز میاں کو تیسری گولی چلانے کی مہلت نہ ملی۔ میں نے ایک دم سامنے آ کے فائر کھول دیا اور کم سے کم نصف درجن گولیاں اس کے جسم کے پار ہو گئیں۔

وہ خیمہ میں نے بعد میں دیکھا جس کے اندر سے دو افراد فائرنگ کی آواز سن کے دوڑتے ہوئے نکلے تھے۔ وہ بھی اس فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ میں نے اسٹین گن کا رخ بدل کے انھیں موقع ہی نہیں دیا کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتے۔ ان کے ریوالور ہاتھوں میں ہی رہ گئے اور وہ خاک اور خون میں لوٹنے لگے۔

خسرو جمشید کود کے خیمے میں جا گھسا تھا۔

"اندر جو بھی ہے، باہر آ جائے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "... بھون کے رکھ دوں گا۔"

صرف خسرو جمشید اپنے ہاتھ سر پر رکھے نمودار ہوا۔ "... اور کوئی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"یہ میں خود دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔ "میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

اس خونریزی نے جمشید کو سخت دہشت زدہ کر دیا۔ "دیکھو سکندر بخت! مجھے مت مارو۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نے جو کہا تھا، میں وہی کروں گا... میں تم کو سب بتا دوں گا..."

"کیا بتا دو گے؟" میں نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"جو کچھ مجھے معلوم ہے... جو تم پوچھو گے۔" وہ ہکلایا۔

"اندر کیا ہے... اسلحے کے علاوہ...؟"

"اندر اسلحہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "صرف وائرلیس سیٹ..."

"اچھا... تو یوں کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ سب لاشیں خیمے کے اندر ڈالو... پھر اس خیمے کو آگ لگا دو۔"

"آگ لگا دوں!"

"ہاں... ٹریکٹر کے لیے ڈیزل تو ہوگا؟" میں نے کہا۔ "... اندر باہر چھڑک کے دیا سلائی دکھا دو... اور خود یہاں آ کے اس جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ میں یہاں سے بیس گز دور تمہارا نشانہ لے کے لیٹ جاتا ہوں۔"

"وہ... دراصل... مجھے بالکل صحیح اندازہ نہیں..." خسرو جمشید کی حالت غیر ہو گئی... "ممکن ہے کچھ اسلحہ ہو... جس کا مجھے علم نہ ہو۔"

"تمہارا علم کتنا محدود ہے... یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں نواب کے لطفے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے... اندر چلو، مجھ سے آگے۔"

نواب نے تعمیل کی اور پلٹ کے اس خیمے میں داخل ہوا جو خاصا کشادہ تھا... اندر ایک طرف زمین پر ترپال بچھی ہوئی تھی۔ یہ ان کے سونے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف کچھ کھانے پینے کا بندوبست تھا اور تیسری جانب وائرلیس ریسیور رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شارٹ ویو ٹرانسمیٹر بھی تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کا رابطہ دور دور تک شاید سارے پاکستان میں پھیلے ہوئے ایجنٹوں اور بھارت تک ہوگا۔ یہ ٹرانسمیٹر بیٹری کار بیٹری سے آپریٹ ہوتا تھا۔

اس جگہ مجھے لکڑی کا ایک صندوق نظر آیا۔ یہ اسلحے کا صندوق تھا۔ ڈھکن کھول کر دیکھتے ہی مجھے مشین گن کے راؤنڈ، دستی بم اور دو ڈائنامائیٹ نظر آئے۔

"اسے باہر لے جاؤ۔" میں نے جمشید کو حکم دیا۔

"میں اسے اٹھا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔

"تم اسے گھسیٹ کر تو لے جا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

مجھے ڈیزل آئل کے دو ٹن خیمے کے باہر ملے۔ لکڑی کے صندوق میں سے دستی بم اور ڈائنامائیٹ نکال کے میں نے ٹریکٹر کے ٹول باکس میں ڈال دیے۔ صندوق کو میں نے پھر خیمے میں پہنچا دیا۔ خسرو جمشید نے میری ہدایات کے مطابق سارا ڈیزل آئل خیمے پر اور لاشوں پر چھڑک دیا۔ میں نے ایک کاغذ جلا کے خیمے کے پاس پھینکا اور ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ خیمے کے کینوس نے آگ پکڑ لی تھی۔ خسرو جمشید ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ میں میرے ساتھ بیٹھا اور میں نے ٹریکٹر اسٹارٹ کر کے واپس موڑ لیا۔

سو گز کے فاصلے سے میں نے اس خیمے کو ایک الاؤ کی طرح روشن دیکھا جس کے شعلے تیس چالیس فٹ اوپر تک اٹھ رہے تھے۔ اس آگ سے کچھ بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ یہ تین لاشوں کا تیاپانچا ہی نہیں تھا، پیغام رسانی کے مرکز کی تباہی تھی اور دشمن کے ایک بہت بڑے پروگرام بیس کیمپ کا خاتمہ تھا۔ اچانک رات کی خاموشی کو مشین گن کی گولیوں کے پھٹنے کی آواز نے منتشر کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ پٹاخے ہیں جو کسی جشن مسرت میں مسلسل چلائے جا رہے ہیں۔ بے شک یہ میرے لیے تو ایک جشن مسرت تھا۔

میری نگاہ پھر گھڑی پر پہنچی۔ یہ نصف شب کے بعد یا آغاز صبح سے پہلے کی گھڑی تھی۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور ابھی مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ خسرو جمشید کا کیا کروں اور خود کدھر جاؤں۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں واپس جا کے اس آسیب کا خاتمہ کر دوں جو ارنی کی حویلی سے منسوب تھا۔ جب حویلی ہی کھنڈر بن جائے گی تو پرانی باتیں قصے کہانیاں ہو جائیں گی اور فراموش کر دی جائیں گی۔

لیکن یہ کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جس کے لیے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصہ ضائع کرتا۔ میں نے واپس مظفر گڑھ جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ نواب بالکل خاموش اور دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ اس کو اپنی ہار کا شاید اتنا غم نہ تھا، جتنا اپنی رسوائی کا... ظاہر ہے کہ اس نے اپنے جارحانہ عزائم کو خیرباد کہہ دیا تھا مگر میں کسی قیمت پر اس کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ میرے ذہن کا ایک حصہ اپنے کام میں الجھا ہوا تھا تو دوسرا نواب کی طرف سے ہوشیار تھا۔

ابھی تک مجھے موہنی کا خیال بھی نہیں بھولا تھا... اگر وہ مجھے بے وقوف بنانے کے مقصد میں ناکامی کا یقین آ جانے کے بعد اپنی مرضی سے چلی گئی تھی تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ لوٹ کر انہی کے پاس گئی ہوگی جن کی وہ آلۂ کار تھی۔ وہ کسی اور وجہ سے فرار ہوئی تھی تب بھی اس کی واپسی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ میرے بارے میں دشمنوں کو ساری معلومات فراہم کرے گی اور وہ اسی کے مطابق نئی حکمت عملی اختیار کریں گے۔ وہ چالاک عورت تھی۔ کار کو چابی کے بغیر لے جا سکتی تھی، اور مرسیڈیز جیسی گاڑی میں دور یا نزدیک کے فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ سارے راستوں سے واقف تھی اور کہیں بھی پہنچ سکتی تھی۔

اپنی اعتماد کر لینے کی بے وقوفی یا کمزوری پر اب جھنجلاہٹ بے سود تھی۔ میں اس دغاباز عورت کے خلاف اشتعال اور انتقام کے جذبات کا شکار ہو رہا تھا، جس نے بچپن کی معصوم یادوں کے حوالے سے میرا جذباتی استیصال کیا تھا۔ وہ مجھے مل جائے تو...

اچانک ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کے درمیان ایک حصے کو روشن کیا اور مجھے وہاں ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ چند سیکنڈ میں ڈھیر نے کسی انسانی جسم کی شکل اختیار کر لی اور جب میں نے بیس گز کے فاصلے سے دیکھا تو مجھے وہ جسم کسی عورت کا نظر آیا۔

ایک سنسنی خیز اندیشے نے لہو کو میری رگوں میں سرد کر دیا، میں ٹریکٹر روک کے نیچے اترا۔

"یہ تو کوئی عورت ہے۔" جمشید بولا۔

"تم نیچے آؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔

جمشید نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ "تم ڈرتے ہو مجھ سے؟"

میں نے اس کے منہ پر ایک جھانپڑ رسید کیا۔ "شیطان سے ڈرنا چاہیے۔"

"جب میں وعدہ کر چکا ہوں...؟" وہ گال پر ہاتھ رکھ کے دکھی اور مجروح لہجے میں بولا۔

"میں تمہارے وعدے پر اعتبار کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

جمشید نے تعمیل کی اور میں نے اس کی تلاشی لے کر ایک ریوالور برآمد کیا جو اس کی شیروانی کے اندر کرتے کے نیچے دبا ہوا تھا۔

"اب یہ بات ہرگز مت بھولنا کہ تمہاری چالاکی یا بہادری ضرور تمہاری جان لے گی۔ میں ایک سیکنڈ کی مہلت دیے بغیر تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو مجھے۔"

اس کو ساتھ لے کر میں چند قدم آگے گیا۔ جھک کر دیکھنے پر میرا اندیشہ ایک بھیانک حقیقت میں ڈھل گیا۔ وہ عورت موہنی ہی تھی جو سڑک پر یوں چت پڑی ہوئی تھی کہ اس کا...... جسم لہو سے داغدار تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بڑے عجیب انداز میں

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اُسے درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

مَیں نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار کم تھی اور بے قاعدہ تھی سینے میں دل کی دھڑکن بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر گہری خراشیں تھیں۔ ایسی ہی خراشیں موہنی کے چہرے پر بھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نوکیلے ناخن رکھنے والے وحشی جانور نے نوچا کھسوٹا ہے۔ موہنی کے بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے اور اس کے جسم پر بھی مٹی کے ساتھ خس و خاشاک نظر آ رہے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اُسے سڑک سے دُور جنگل میں لے جا کر ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد سڑک پر پھینک دیا گیا تھا۔

ہر مہذب انسان کا خون ایسے نظارے پر کھولنے لگتا ہے۔ میں بھول گیا کہ موہنی نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ مَیں صرف یہ سوچنے لگا کہ اس کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کس نے کیا ہے؟

"کیا موہنی زندہ ہے؟" جمشید نے کہا۔

مَیں نے سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو اس عورت کو؟"

"ہاں... یہ ایک خوب صورت اور خطرناک عورت تھی۔"

"تمھارے لیے ہر عورت صرف عورت ہوتی ہے... اسے تم خطرناک کیوں کہتے ہو؟"

"اس نے مجھ سے تمھارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔

"کس قسم کی معلومات؟"

"یہی کہ تم ان معاملات میں کیسے ملوّث ہو گئے... تمھارا ٹھکانا کہاں ہے... اور یہ کہ تمھاری کوئی تصویر مل سکتی ہے جس میں تمھاری اصل صورت ہو۔" جمشید بولا۔ "مجھے شک ہوا کہ یہ سب پوچھنے کا مقصد کیا ہے اور پھر مَیں نے موہنی کے بارے میں مفصل رپورٹ مانگی۔"

"پھر... تمھیں کیا معلوم ہوا؟"

"یہی... کہ یہ لڑکی اور تم بچپن میں اکٹھے تھے۔" جمشید بولا۔

"تم نے موہنی سے نہیں پوچھا تھا؟"

"بعد میں پوچھا تھا... اور اسی رات بے خبری میں موہنی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" جمشید نے کہا۔ "اس نے مجھ پر خنجر سے وار کیا لیکن مَیں بچ گیا۔ میرے شانے پر معمولی سا زخم آیا۔ مگر یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔"

وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی کہ موہنی کیوں جمشید کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی لیکن میں نے کہا۔ "موہنی نے مجھے بتایا تھا کہ خود تم نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ تم نے ہوس کے ساتھ اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔"

جمشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ خاموشی ہی اعتراف...

"چلو اسے اُٹھاؤ۔" مَیں نے کہا۔

"کیا تم اسے اسپتال لے جاؤ گے؟"

"اسے بچانے کے لیے مَیں سب کچھ کروں گا۔"

ہم دونوں نے موہنی کو اُٹھایا اور ٹریکٹر... مسئلہ اس کے لباس کا تھا۔ مَیں نے جمشید سے کہا کہ وہ اپنی... اُتار دے۔ جمشید نے اس میں تامل نہیں کیا اور مَیں نے... موہنی کو شیروانی پہنا دی ــــ خسرو جمشید صرف... شلوار میں خود کو یوں سمیٹ رہا تھا جیسے عورت بھیگے... میں سمٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شیروانی کے بغیر باہر... عادی نہ تھا۔

میرے ذہن میں اب دوسرا سوال گردش کر رہا تھا... اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قیاس یہ کہتا... کو انھوں نے ہی سزا دی ہے جس کے ساتھ وہ غدّاری... کی مرتکب ہوئی تھی۔ وہ سچ مچ میری خاطر انھیں چھوڑ چکی... وہ آئے اور اسے اغوا کر کے لے گئے۔ گاڑی کے روانہ ہو... آواز تو مَیں نے بھی سُنی تھی۔

لیکن اس خیال کو عقل دو وجوہات کی بنا پر تسلیم نہیں... تھی۔ ایک تو یہ کہ رانی کی حویلی تک آنے والے صرف اسے... کیوں لے گئے جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں بھی وہیں... ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ غدّاری کے جرم کی سزا یہ نہیں ہو... یہ تو کوئی سزا ہی نہ تھی۔ موہنی ایک ایسی عورت تھی جس... پاس آبرو کا خزانہ لٹانے کے لیے بچا ہی نہ تھا۔ اس کی آبرو... لینا موہنی کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بھی نہیں بن سکتا تھا... غدّاری کی سزا دینے والے اُسے عبرتناک موت دیتے۔ انتہائی... اذیت کے ساتھ۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ مَیں نے چاروں طرف... دیکھا اور میری نظر نے اس مقام کو پہچان لیا جہاں رانی کی... جاتے ہوئے میرے ہاتھوں سے ایک بدمعاش مارا گیا تھا... بالکل وہی جگہ تھی۔ اس خیال نے مجھ پر سب کچھ روزِ روشن کی... عیاں کر دیا۔ موہنی سے اس شخص نے انتقام لیا تھا جو اپنے... کی لاش واپس لے گیا تھا۔ وہ بعد میں اکیلا یا کسی ساتھی کے... رانی کی حویلی پہنچا۔ موہنی اُسے کار میں مل گئی۔ چابیاں بھی... تھیں۔ وہ زبردستی موہنی کو لے گئے اور عین اس مقام پر... بے آبرو کر کے چھوڑ گئے جہاں اس کی وجہ سے ان کا ایک ساتھی... مارا گیا تھا۔ وہ موہنی کو میرے لیے درسِ عبرت بنا کے اسی... پڑا... گئے جس پر مجھے واپس آنا تھا۔

اب میرے ذہن میں کوئی اُلجھن نہ رہی۔ مَیں نے موہنی کو ٹریکٹر کے پیچھے والے حصّے میں ڈالا جہاں وہ آرام سے تو نہ تھی لیکن ٹریکٹر میں کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔

مظفر گڑھ اب زیادہ دُور نہیں تھا۔ حالات کے وقت کسی ... مشکل تھا۔ اگر مَیں اسے سرکاری اسپتال لے جاتا تو ڈاکٹروں ... سوالات کا کیا جواب دیتا کہ یہ عورت کون ہے اور اس کی یہ حالت ... کس نے کی ہے؟ یہ شیروانی کیوں پہنے ہوئے ہے اور تم کون ہو، ... ٹریکٹر میں ڈال کے لائے ہو۔ ہم جھوٹ بول سکتے تھے کہ ... نہیں جانتے۔ یہ اسی حالت میں ملی تھی اور ہم اسے اُٹھا ... ڈاکٹر لوگ بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ پولیس کو ضرور بلاتے۔

"کیا تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟" مَیں نے جمشید سے کہا۔

"اکثر... ہاں... دو مہینے میں ایک بار۔" وہ بولا۔

"تمھاری ضروریات کے لیے تو سب سے قریبی بازار مظفر گڑھ ہی ہے۔"

"مَیں اپنی ضروریات کا سامان خود نہیں خریدتا۔" وہ بولا۔

"وہ لڑکی تمھارے ساتھ ہی آئی تھی؟"

"نہیں... مظفر گڑھ کا ایک زمیندار میرا جاننے والا ہے... اسی نے بھیجا تھا۔"

"کسی مزارع کی بیوی یا بیٹی ہو گی؟" مَیں نے نفرت سے کہا۔

"وہ اپنی مرضی سے آئی تھی... دو ہزار تو اس کا شوہر پورے سال میں نہ کماتا... وہ اپاہج ہے۔"

"گویا تم ازراہِ ہمدردی اس کی مدد کر رہے تھے۔ کون ہے تمھارا ... زمیندار دوست؟" مَیں نے کہا۔

"اس کی بات چھوڑو... تم ڈاکٹر کی تلاش میں ہو نا؟ مَیں تم کو ایک ڈاکٹر کے گھر لے جا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "اسے مطمئن کرنا تمھارا کام ہے۔ اگر وہ انکار کر دے..."

"وہ انکار نہیں کرے گا۔" مَیں نے اسٹین گن اُٹھا کے پھر ... دی۔ "اور تم بھی مت بھولنا یہ بات کہ مَیں ایک قتل کر سکتا ہوں ... دس بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ آخری راستہ ہے۔ پہلا راستہ نقد ... ہونے کا ہو گا۔"

خسرو جمشید نے سر ہلایا اور میری راہنمائی کرنے لگا۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ میرے پاس چار دستی بم بھی ہیں؟" ... نے کہا۔

"کیا تم انھیں استعمال کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ تم پر منحصر ہے۔ مَیں راستوں سے ناواقف ہوں۔ مجھے اپنے ... بھٹکانے پر لے جاؤ گے تو میں چاروں دستی بم استعمال کروں گا۔" مَیں نے کہا۔

ڈاکٹر کا گھر ایک اسپتال کی چار دیواری میں تھا۔ جمشید نے مجھے بتایا کہ یہ سرکاری اسپتال ہے۔ ڈاکٹر کے گھر کا ایک دروازہ باہر کی جانب تھا چنانچہ ہمیں مین گیٹ سے اسپتال میں داخل نہیں ہونا پڑا۔ جمشید نے دستک دی تو کسی بوڑھے نے دروازہ کھولا جو حلیے سے نوکر نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہے... کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ہمیں ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔" مَیں نے کہا۔

"چلو چلو... صبح اسپتال آنا۔" وہ ہمیں جھڑک کر بولا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ مَیں نے دروازے کو دھکا دیا تو بڈھا پیچھے جا گرا اور چلاّنے لگا۔ پھر میرے ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر چپ ہو گیا۔ اندر سے ایک جوان آدمی نائٹ سوٹ میں نمودار ہوا۔ اس نے ایک نظر مجھے اور پھر اپنے نوکر کو دیکھا۔ "کیا چاہیے تم لوگوں کو؟ مَیں اکیلا رہتا ہوں... نہ زیور ہے میرے پاس..."

"ہمیں ایک مریض کا علاج کرانا ہے ڈاکٹر صاحب نا تخب تمھارے ہاتھ میں ہے۔" مَیں نے کہا اور جیب میں سے ہزار روپے کے نوٹ .... نکال کے نیچے پھینک دیے۔ "یہ ہے تمھارا معاوضہ... اور اگر یہ قبول نہیں تو پھر..."

"مریض کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے سکون سے کہا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا۔

"باہر... تم اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ وہ ایک عورت ہے۔" مَیں نے کہا۔

"تمھاری کیا لگتی ہے؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں... ہم اسے راستے سے اٹھا کے لائے ہیں لیکن ہماری یہ بات کوئی نہیں مانے گا اور ہم پولیس کے چکرّ میں نہیں پڑنا چاہتے۔" مَیں نے کہا۔

"کیا وہ بہت زخمی ہے؟"

"تم دیکھ لو گے..." مَیں نے کہا۔

"ٹھہرو... اگر خنجر یا گولی کا زخم ہے تو مَیں مجبور ہوں۔ میرے پاس گھر میں آلاتِ جرّاحی نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپریشن نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" مَیں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... اسے اندر لے آؤ۔" وہ بولا۔ پھر اس نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا کہ وہ نوٹوں کی گڈّی اُٹھا لے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" مَیں نے کہا۔

موہنی کو جمشید نے اٹھایا اور اندر لے گیا۔ ڈاکٹر سے زیادہ ڈاکٹر کا نوکر ایک عورت کو صرف شیروانی میں ملبوس دیکھ کر حیران

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہوا مگر ڈاکٹر نے اُسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ پانی اُبال کے لایا۔ اس میں دوا ملا کے ڈاکٹر نے موہنی کا جسم صاف کیا اور پھر اُسے ایک انجکشن لگا دیا۔

" اس کی حالت تشویشناک نہیں ہے۔" وہ بولا۔ " ابھی تو یہ سوتی رہے گی۔ لیکن جب اُٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی... اس کی یہ حالت کس نے کی تھی؟"

" اس کے ذمّے دار ہم نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ " ہم اسے سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا چھوڑ کے نہیں آ سکتے تھے۔"

" کیا تم اسے ساتھ لے جاؤ گے؟ جب کہ تم اسے جانتے نہیں۔"

" ہم اس سے پوچھ لیں گے۔" میں نے کہا۔ " آپ کی مدد کا بہت شکریہ مگر کیا آپ ایک کام اور کر سکتے ہیں؟ اس کے لیے زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا چاہیے۔ ہم اس کی قیمت الگ دیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ اکیلے رہتے ہیں۔"

" ہاں... اب میں اکیلا ہوں۔" وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ " لیکن تمھیں اس عورت کے لیے کپڑے مل جائیں گے۔" پھر اُس نے اپنے نوکر کی طرف دیکھا اور بولا۔ " جاؤ... دو جوڑے لے آؤ بیگم صاحبہ کے۔"

" بیگم صاحبہ؟" میں نے کہا۔ " آپ شادی شدہ ہیں؟"

" میں شادی شدہ تھا۔" وہ بولا۔

" پھر... کیا خدانخواستہ... ان کے اور آپ کے درمیان علیحدگی ہو گئی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ " یہی سمجھو... میں اس دنیا میں ہوں اور وہ دوسری دنیا میں۔"

" آئی ایم سوری۔" میں نے بے اختیار کہا۔

ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرے لہجے نے میرے تعلیم یافتہ ہونے کا راز فاش کر دیا تھا۔ نوکر دو خاصے قیمتی اور نئے جوڑے لے آیا۔ میں نے ان میں سے ایک موہنی کو پہنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا تو نوکر کی آنکھوں میں مجھے خاموش آنسو نظر آئے۔

" ان کے پیسے انھیں واپس کر دو۔" ڈاکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ نوکر نے خاموشی سے نوٹوں کی گڈی میری طرف بڑھا دی۔

" یہ کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے کہا۔

" میری بیوی کو تم جیسے دو بدمعاش اغوا کر کے لے گئے تھے وہ اسی طرح بندوق لے کر آئے تھے۔" وہ بولا۔ " یہ یہاں کی بات نہیں ہے۔ ہمارے ہنی مون کی بات ہے۔ ہم مری اور نتھیا گلی کے درمیان ایک کاٹیج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اسے صبح کچھ لوگ ایسی ہی حالت میں اُٹھا کے لائے تھے۔ وہ زندہ تھی... میں نے اسی طرح اس کی دیکھ بھال کی۔ اسے انجکشن دے کر سلا دیا۔ مجھے خیال

تھا تو صرف اُن سے انتقام لینے کا... اپنی بیوی سے تو میں ... تھا کہ میں اس کو بچا نہ سکا تھا۔ وہ مجھے مار کے بے ہوش ... تھے۔ میری نظر میں وہ اتنی ہی پاکدامن تھی جتنی شادی ... تھی۔ مگر جب وہ ہوش میں آئی تو میرے لیے ایک ... کے نکل گئی۔ اس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ اب میں ... قابل نہیں رہی۔ اُس کی لاش تین دن بعد ملی تھی... وہ ... نتھیا گلی کے پہاڑوں میں دفن ہے۔"

" مجھے معاف کر دینا ڈاکٹر... میں تم کو اپنی مجبوری نہیں ... سکتا۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ " ورنہ تمھیں اندازہ ہوتا ... تم سے زیادہ مظلوم ہوں۔ ظلم کسی پیمانے سے نہیں ناپا جا ... احساس کی شدت کی پیمائش کرنے والا آلہ ابھی ایجاد نہیں ... پھر بھی یہ سچ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے دُکھ کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔ ظالم نظر آنے والے بھی بعض اوقات بہت مظلوم ہوتے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ ایک بار پھر جمشید نے موہنی کو ...

میں نے دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔ ہمارے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ لیکن مجھے ایک اور خیال نے پلٹ کر پھر دستک دینے پر مجبور کر دیا۔ اس مرتبہ تو ڈاکٹر آیا۔

" ڈاکٹر صاحب... میں نے جو کچھ کیا..."

" اسے بھول جاؤ... ان حالات میں شاید میرا بھی ... یہی ہوتا۔"

" میں نے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا..."

" میں سمجھتا ہوں تمھاری ذہنی کیفیت کو۔" وہ میرے کندھے پر تھپکی دے کر بولا۔ " میں نے کچھ نہیں کیا، محض آدھی رات کی نیند گنوانے کے سوا۔"

" میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔ " کیا آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں؟"

" ہاں... سوائے اس زمانے کے جب میں میڈیکل کالج ... کرنے کے لیے ملتان میں تھا۔ میری زندگی کے چوبیس سال اس شہر میں گزرے ہیں۔" وہ بولا۔

" پھر تو آپ کو بہت لوگ جانتے ہوں گے... اور آپ بہت سے لوگوں کو پہچانتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ " مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے۔"

" اس کا نام بتا؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ " صرف حلیہ بتا سکتا ہوں یا ... کا نمبر... وہ ایک جیپ تھی... نیلے رنگ کی... اُنیس سو ... کا ملٹری ماڈل جس میں آگے بہت سی اضافی لائٹس اور دونوں ... ہوئی ہیں۔ دونوں جانب چمکنے والے زرد رنگ کی ... ہیں۔"

" تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟" وہ بولا۔

" مجھے اس سے... ایک حساب برابر کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

" اپنی بیوی کا؟" وہ بولا۔

" یہ میری بیوی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

" مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟" وہ بولا۔ " مجھے معلوم ہے کہ تم پولیس کے پاس کیوں نہیں جا رہے ہو... تم نے سرکاری اسپتال سے رجوع کیوں نہیں کیا اور ایک ڈاکٹر کو اسٹین گن سے دہشت زدہ کر کے اور ایک ہزار روپے کا لالچ دے کر اپنا کام کیوں نکالا... تم ڈرتے ہو بعد کی رسوائی سے... بدنامی کے افسانوں... لوگوں کی انگشت نمائی سے... اور ان باتوں سے..."

" میں کسی اور سے ڈرتا ہوں یا نہیں۔" میں نے کہا۔ " یہ الگ بات ہے... مگر آپ سے جھوٹ بول کے مجھے کیا ملے گا... اگر یہ میری بیوی ہوتی تو میں تسلیم کرتا... یہ بھی مانتا کہ اس کی آبرو لوٹنے والوں نے میرے دل سے اس کی محبت نہیں چھینی۔ انھوں نے جسم پر زیادتی کی تو کیا ہوا۔ وفا، محبت اور رفاقت کے جذبات اس ظلم کا شکار نہیں ہوئے۔ اعتماد تو ایک احساس کا نام ہے۔ آپ نے بھی تو یہی کہا تھا ابھی کہ بیوی آپ کے لیے پہلے کی طرح پاکدامن تھی... مگر وہ خود اپنی ذلت کے احساس سے نجات حاصل نہ کر سکی تھی۔ اور احساس کے عذاب سے بچنے کے لیے اس نے قیدِ حیات سے نجات پالی تھی۔ میں اس عورت سے جذباتی وابستگی نہیں رکھتا۔ تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے جو انسان کا لباس پہنے پھر رہا ہے مگر اندر سے ایک درندہ ہے... اگر میں نے اسے ختم نہ کیا تو کل وہ پھر کسی کو شکار کرے گا۔ قانون اس کو سزا نہیں دے سکتا۔ ایسے سارے شکاری خود کو بہت محفوظ سمجھتے ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے جب ان پر آنچ تک نہیں آتی۔"

" اور تم یہ کام کرو گے... جو قانون کے بس کا نہیں... تم کیا خدائی فوجدار ہو؟" وہ بولا۔

" بس ایسا ہی سمجھ لیں... جہاں میرے دل کو... میری عقل کو اور میرے ضمیر کو مجرم کے مجرم ہونے کا یقین آ جائے، وہاں میں مدعی کے فرائض بھی سنبھال لیتا ہوں اور منصف کے بھی... اور پھر فیصلہ سناتے ہی اپیل کا حق دیے بغیر سزا پر عملدرآمد کرتا ہوں۔"

" میرا خیال ہے کہ تم پاگل... اور جنونی ہو..."

" ہاں... مگر اب یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گے یا میں جاؤں؟" میں نے برہمی سے کہا۔ " میں تم سے نظامِ انصاف اور اس کی خوبیوں خامیوں پر ساری رات بحث نہیں کر سکتا۔"

" وہ ایک بہت بااثر شخص کا بیٹا ہے۔"

" میں صرف اس کا نام پتا جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ " اس کے شجرۂ نسب اور اس کے خاندان کی شوکت و عظمت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔"

" وہ رانا اوّل خان کا بیٹا ہے۔ رانا قمرالدین عرف قمرو... ان کی کوٹھی 'اوّل ہاؤس' ملتان جانے والی سڑک پر ہے مگر تم وہاں گھس نہیں سکتے۔" وہ بولا۔ " لیکن تم اسے بلوا سکتے ہو۔" وہ کچھ سوچ کے بولا۔

" کہاں بلوا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ " اور میرے بلانے سے وہ آئے گا کیوں...؟"

" اس کے ہر بُرے کام میں شریک اور بُرے وقت میں کام آنے والا نیو ایمپائر ہوٹل کا مالک جیکب ہے۔ وہ تمھیں ہوٹل کی انیکسی میں مل سکتا ہے... اور جیسے تم نے مجھ سے طبّی امداد حاصل کی... ایسے ہی تم اس سے قمرو کو فون کرا سکتے ہو۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ " تھینک یو ڈاکٹر... تم نے جتنی مدد کی ہے وہ سب مجھ پر احسان ہے۔"

" میری ایک درخواست ہے... کبھی کسی سے ذکر مت کرنا کہ میں نے تمھارے ساتھ کوئی نیکی کی تھی۔" وہ بولا۔

" فارگیٹ اِٹ... ہم کبھی ملے ہی نہیں۔"

" اور آئندہ بھی نہیں ملیں گے۔" اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

جمشید کی حالت موہنی کو اُٹھا کے کھڑے رہنے سے غیر ہو رہی تھی۔ ہم گلی کے آخر تک آئے اور میں نے پھر ٹریکٹر کو اسٹارٹ کیا۔ وقت اب بہت کم رہ گیا تھا اور میں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ٹریکٹر کا سفر بہت سُست رفتار عمل تھا۔ مجھے ایک گاڑی کی ضرورت کا احساس شدّت سے ہونے لگا تھا۔

گاڑی مجھے ایک فرلانگ چلنے کے بعد مل گئی۔ وہ سفید رنگ کی فاکس ویگن تھی جو ایک گھر کے سامنے چُپ چاپ اور تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نیچے اتر کے اس کے دروازے میں مختلف چابیاں آزمائیں جو ٹریکٹر کی اگنیشن کے ساتھ ایک ہی چین میں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک چابی کام کر گئی اور دروازہ کھل گیا... بیشتر گاڑیوں کے دروازے آسانی سے کھولے جا سکتے ہیں خصوصاً ان چابیوں سے جن کے کنارے گھِسے ہوئے ہوں، خواہ چابیاں کسی سیف کی ہوں یا دراز کی۔

میں نے جمشید کو ایک رسّی دی، جو ٹریکٹر کے پچھلے حصّے میں پڑی ہوئی تھی۔ اس نے میری ہدایت کے مطابق فاکس ویگن کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

لگا پھر کو ٹریکٹر کے پچھلے حصّے کے ساتھ باندھ دیا۔ میں نے کار کو نیوٹرل کیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر کے پھر ٹریکٹر پر چڑھ گیا۔ میں فاکس ویگن کو یہاں اسٹارٹ کرتا تو اس کا انجن مالکوں کو سوتے سے جگا دیتا۔ یہ سب کام پانچ منٹ میں ہو گیا۔

فاکس ویگن کو میں ٹو کر کے ایک فرلانگ تک لے گیا۔ پھر وہ رسّی توڑ دی جو ٹریکٹر کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے موہنی کو فاکس ویگن کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ آگے والا بونٹ کھول کے اس میں اپنی اسٹین گن اور وہ سب اسلحہ رکھا جو مجھے دشمن کے کیمپ سے ملا تھا۔ جس چابی سے دروازہ کھولا تھا اسی سے پیچھے انجن کا بونٹ بھی کھل گیا اور میں نے جمشید کو سمجھایا کہ اسے سیلف کے کون سے تاروں کو ملانا ہے تاکہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے۔ میں تو ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ جمشید ابھی تک انتہائی فرماں برداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے تاروں کو ملایا ہی تھا کہ انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ اس کی ٹیوننگ بہت عمدہ تھی۔

نواب کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی بڑھا دی۔ یہ نئی گاڑی تھی۔ اُنیس سو ستر میں پہلی مرتبہ بارہ وولٹ بیٹری کا ماڈل۔ اس کا انجن روایتی طور پر بے حد طاقتور تھا اور اس کا پک اپ مثالی تھا۔ لیکن جو خوبی فاکس ویگن کو دوسری گاڑیوں پر ممتاز کرتی ہے وہ اس کا ائیر کولڈ انجن ہے۔ اسے میں کراچی سے پشاور اور پشاور سے کراچی نان اسٹاپ لے جاتا تب بھی فرق کوئی نہ پڑتا کیونکہ اس میں ریڈی ایٹر تو ہوتا ہی نہیں جس میں پانی ڈالنا پڑے۔

صرف آدھے منٹ میں گاڑی کی رفتار ساٹھ میل سے تجاوز کر چکی تھی اور چوڑے وھیل بیس کے باعث اس کی روڈ گرپ بڑھ گئی تھی۔ میں اسے اسّی نوّے میل کی رفتار پر بھی دوڑا سکتا تھا لیکن میں نے غیر ضروری عجلت سے گریز کیا۔

ابھی ساڑھے چار بجے تھے گویا صبح ہونے میں کم سے کم ایک گھنٹا باقی تھا اور ساڑھے چھ بجے سے پہلے کار کے مالکوں کو چوری کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ کار والے عموماً سحر خیز نہیں ہوتے اور کوئی بھی آنکھ کھلتے ہی باہر جا کے گاڑی کی خیریت معلوم نہیں کرتا۔

نیو ایمپائر ہوٹل کا نیون سائن مجھے اتفاق سے نظر آ گیا ورنہ میں کسی سے پتا پوچھتا۔ سڑک پر تو کوئی تھا ہی نہیں یہاں تک کہ مجھے گشت کرنے والی پولیس بھی دکھائی نہ دی۔ خسرو جمشید کی بے بسی دیدنی تھی۔ شاید زندگی میں کبھی اس نے خود کو اتنا اکیلا محسوس نہیں کیا ہوگا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس کے کسی ساتھی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی اس کا بدترین جانی دشمن ہو سکتا ہے تو وہ میں ہوں اور مجھ سے مقابلے کا یا فرار کا خیال اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا

چنانچہ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اور منحصر مرنے پر ہو جس کی امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے۔ اب ہوش میں آنے لگی تھی۔ یہ بڑی امید افزا بات تھی۔

نیو ایمپائر ہوٹل کی انیکسی اس کے آفس سے متصل طرف تھی۔ راستہ ایک ہی تھا۔ گیٹ کیپر نے ہمیں نئے آنے والے مہمان کی طرح سیلوٹ جھاڑ کے خوش آمدید کہا لیکن جب گاڑی کو آفس کے پورچ میں نہیں روکا بلکہ مخالف سمت میں موڑ لیا تو وہ دوڑتا ہوا ہمارے پیچھے آیا۔

”ریسپشن ادھر ہے صاب۔“ وہ بولا۔

”ہمیں معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم جیکب صاحب سے ملنے آئے ہیں کراچی سے... ان کے دوست ہیں۔“

”اوہ... ماف کرنا صاب... ہمارا تو فرض ہے بتانا۔“ اس نے کال بیل خود ہی دبا دی۔ ”اُدھر جیکب صاب کا والد صاب، ہمشیرہ صاحبہ خیریت سے ہے؟“

”ہاں... ایک خیریت سے ہے... دوسرا نہیں ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ... جیکب آ گیا ہے۔“

چوکیدار سلام کر کے لوٹ گیا تو دروازہ کھلا۔ ایک بڑے قد مگر گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے۔ ماتھے پر دائیں اور بائیں ابرو کے اوپر بڑے تناسب سے ہوئے زخموں کے دو ایک جیسے نشانات تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ زخم نہیں ہیں آرائش کے لیے کسی ماہر جرّاح نے ناپ تول کے چاقو سے بنا دیے ہیں۔ مجموعی طور پر وہ کرخت نقوش اور جارحانہ تیوروں سے غنڈہ لگتا تھا اور بدصورت نظر آتا تھا۔

”یس... ؟“ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

”ہم کراچی سے آئے ہیں۔“ میں نے انگریزی میں کہا۔

”ہوٹل کا راستہ دوسری طرف ہے۔“ وہ غرّایا۔

”مجھے تمھاری بہن نے بھیجا ہے۔“

”الزبتھ نے... اب کیا ہو گیا؟“ وہ بدستور دروازے میں کھڑا رہا۔

”بات تمھارے والد کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”لُک ہیئر... تم اگر اس کے نامہ بر بن کے آئے ہو اور یہ پیغام لائے ہو کہ اس بڈھے شرابی کو پھر قرض خواہوں نے مارا ہے تو میری طرف سے کورا جواب سمجھو۔“ وہ دروازہ بند کرنے لگا۔

”مسٹر جیکب... تمھارا باپ مر سکتا ہے۔“ میں نے دروازے میں ٹانگ اڑا دی۔

”پھر کیا ہوا... ایک دن تو یہ ہونا ہے... اور جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ بولا۔ ”یہ پیر ہٹاؤ دروازے میں سے۔“

”وہ زخمی نہیں ہے... وہ ہماری تحویل میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم صرف دس ہزار کی خاطر یتیم کہلانا پسند نہیں کرو گے مسٹر جیکب...؟“

”میں پیدائشی یتیم ہونا بہت پسند کرتا... اور بن باپ کا ہونا بھی قبول کرتا۔“ وہ بولا۔ ”مگر کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو کہ میں نے دس ہزار نہ دیے تو تم اسے قتل کر دو گے؟“

”بات تو تم نے سمجھ لی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہم چائے کے ایک کپ پر بات کر سکتے ہیں... آخر ہم کراچی سے آئے ہیں۔ چائے پینی ہے تو ہوٹل میں جاؤ۔ میں فون کر دوں گا... مگر مجھے سمجھاؤ یہ چکر کیا ہے۔ الزبتھ بیچ میں کہاں سے آ گئی؟“

”اس نے کہا تھا کہ میں دس ہزار دوں گی... مگر وہ اپنے وعدے سے پھر گئی اور اس نے ہمیں تمھارے پاس بھیج دیا۔ اب اگر تم نے ضامن بننے والی بہن کا خیال نہ کیا تو ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا پڑے گا۔ تمھارے لیے وہ ایک اچھی بہن ہے... ہمارے لیے اچھی عورت۔“ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

جیکب نے ایک گالی دے کر مجھ پر حملہ کیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے میں اسے اندر لے گیا۔ اس کی گردن میرے بائیں بازو کی گرفت میں تھی اور پیچھے سے میں نے اس کی کمر کے ساتھ ریوالور لگا دیا تھا۔ جمشید میرے پیچھے آیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

”مسٹر جیکب، ہم نے سب بکواس کی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”نہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور نہ تمھاری بہن کو یا والد کو جانتے ہیں۔ ہم پیشہ ور قسم کے قاتل ہیں اور ہمیں کسی کے قتل پر مامور کیا گیا ہے مگر وہ شخص تم نہیں ہو۔“ میں نے اسے چھوڑ دیا۔

”پھر... پھر کون ہے وہ...؟“ جیکب نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک میز پر ٹک گیا۔

”قمرو...“ میں نے کہا۔ ”رانا اوّل خان کا بیٹا۔“

”تمھیں اس کو قتل کرنے کا ٹھیکا کس نے دیا ہے؟“

”ہم اُس کا نام نہیں بتائیں گے۔“

”یہ تو بتا سکتے ہو کہ اس کام کا معاوضہ تمھیں کیا ملے گا؟“ وہ بولا۔

”ہاں... ہمیں پچیس ہزار ایڈوانس دیے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پچیس ہزار...؟“ جیکب کی سٹی گم ہو گئی۔ ”فرض کرو میں تم کو تیس ہزار دیں... کہ اسے قتل کر دو... جس نے تمھیں بھیجا ہے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ ہم صرف پانچ ہزار کی خاطر بدعہدی نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”حالانکہ ہم غیر جانبدار رہیں۔ نہ کسی کے دوست ہیں اور نہ دشمن... پھر بھی تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو...“

”کتنی معقول؟“

”دُگنی تو ہو... پچاس ہزار۔“ میں نے کہا۔

”آل رائٹ... میں قمرو کو بلاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ممکن ہے یہ سودا ہو جائے... ایک بات اور بتاؤ... قتل تم قمرو کو کرنے آئے تھے تو میرا دروازہ بجا کے مجھے کیوں جگایا؟“

”ہم براہِ راست قمرو کے گھر نہیں جا سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”تم اسے... یہاں قتل کرو گے؟“ جیکب کا رنگ اُڑ گیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے... تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“

”ٹھیک ہے... میں اسے فون کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تمھاری گفتگو ہم بھی سنیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تم کیسے سن سکتے ہو؟“

”زیادہ چالاک مت بنو... تمھارے پاس ایکس ٹینشن ہوگی... یا پھر ہینڈز فری فون ہوگا۔“ میں نے کہا۔

جیکب کا منہ لٹک گیا۔ اس نے دوسرے کمرے سے ایک فون کے ذریعے ریسیور اٹھائے بغیر نمبر ملایا۔ اس کے چھوٹے سے اسپیکر میں مجھے دوسری طرف بجنے والی گھنٹی صاف سنائی دی۔ تقریباً دو منٹ کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا کے ہیلو کہا۔

”قمرو... میں جیکب ہوں۔“

”جیکب... ابے اتنی رات کو! کیا بات ہے؟“ قمرو کی آواز آئی۔

”یار تو فوراً آ جا... کسی کو بتائے بغیر...“

”خیریت تو ہے نا... ہوا کیا ہے آخر...؟“ قمرو نے پریشانی سے کہا۔

”خیریت بالکل نہیں ہے... میں فون پر نہیں بتا سکتا۔“

”یار... کہیں اس لڑکی کا معاملہ تو نہیں ہے؟“ قمرو کچھ سوچ کے بولا۔ ”جسے ہم نے...“

”یہی سمجھ لے... پولیس بیٹھی ہے میرے پاس۔“

”کون آیا ہے؟ کوئی انسپکٹر؟ مجھے نام بتا اس کا...“ قمرو نے اپنے باپ کے اثر و رسوخ کے غرور میں کہا۔

”ڈی ایس پی آیا ہے ملتان سے... معاملہ ابھی ختم نہ ہوا تو لمبا ہو جائے گا... وہ بڑی پارٹی تھی یار...“ جیکب نے کہا۔

”کتنے میں ختم ہو جائے گا؟“

”کم از کم پچاس تیرے۔“ جیکب نے کہا۔ ”پچاس میرے...“

”ایک لاکھ؟“

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"یار، وہ لڑکی مر گئی ہے... اور ملیں مروا دیا تیری جیپ نے۔ سارا زمانہ پہچانتا ہے اُسے۔" جیکب نے خفگی سے کہا۔

"تیرے پاس ہیں پچاس ہزار؟"

"نکالنے پڑیں گے قمرو... میں تو تباہ ہو جاؤں گا۔ میرا بزنس ہے۔"

"اچھا میں ابھی آتا ہوں... دس پندرہ منٹ میں۔"

"خالی ہاتھ مت آنا..."

"نہیں... خالی ہاتھ نہیں آؤں گا۔ رانا صاحب کی سیف خالی کروں گا..." وہ بولا۔ "میرے پاس اس وقت اتنی رقم کہاں۔"

"تو تجوری کھولے گا... چابی ہے تیرے پاس؟"

"نہیں... رانا صاحب سو رہے ہیں۔ انھیں لخلخہ سنگھاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے... مگر دیکھ... کسی کو پتا نہ چلے کہ تو باہر کہیں گیا ہے... سب یہی سمجھتے رہیں کہ تو کمرے میں سویا ہوا ہے۔"

"تو فکر مت کر... میں بے وقوف نہیں ہوں تیری طرح۔"

خود کو عقل مند قرار دینے والا اپنے ایک کمینے اور خود غرض دوست کے ہاتھوں بے وقوف بن چکا تھا۔ وہ دوست کبھی نہ تھے۔ وہ بدمعاشی کے ساتھی تھے۔ وہ خلوص اور ایثار کا جذبہ ان کے درمیان کہاں سے آتا جو بے غرض دوستی کی جان ہوتا ہے۔ جیکب نے اپنی جان بچانے کے لیے قمرو کو ہمارے ہاتھ بیچ دیا۔ اس نے پچاس ہزار کا مطالبہ بھی قمرو کی ذمے داری بنا دیا۔ بعد میں وہ قمرو سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے تو تیری جان بچالی، ورنہ تیرے ساتھ وہ مجھے بھی مار ڈالتے... میں جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟

لیکن اس سے ایک بے وقوفی بھی سرزد ہوئی تھی۔ اس نے قمرو کو قابل کرنے کے لیے ایک سچ کا سہارا لیا تھا اور ہمارے سامنے ایک جرم کا اقرار کر لیا تھا اس جرم میں وہ خود بھی برابر کا شریک رہا تھا لیکن یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ہم کسی کے ایجنٹ نہیں ہیں بلکہ قمرو کو اسی جرم کی سزا دینے آئے ہیں۔

"ابھی تمھیں پچاس ہزار مل جائیں گے۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ تم وعدے کے مطابق کام کرو گے۔"

"ہم نے ابھی تک تو کوئی وعدہ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے کہا نہیں ہے کہ پچاس ہزار لے کر تم قمرو کے دشمن کو ٹھکانے لگا دو گے؟" وہ چلانے لگا۔

"بات آہستہ کرو... میں نے صرف یہ کہا تھا کہ تم ہمیں خریدنا چاہو تو معقول آفر دو... میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم بدعہدی نہیں کرتے۔"

"اس کا کیا مطلب تھا آخر؟"

"ہم قمرو کو قتل کیے بغیر واپس چلے جائیں گے... یہ مطلب کیسے نکال لیا تم نے؟" میں نے کہا۔ "ایک کام کا معاوضہ ایک شخص نے دیا ہے۔ دوسرے کام کا معاوضہ تم دے رہے ہو... ہم دونوں کام کریں گے۔ پہلے قمرو کو ماریں گے... پھر اس لڑکی کو بھی مار دیں گے۔"

غصّے اور بے بسی سے جیکب کا چہرہ لال پڑ گیا۔ اس نے ایکدم فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے تار کھینچ دیا۔ ٹیلی فون اس کے ساتھ ہی آگیا۔ میں نے اسے گھورا۔

"تم... دھوکے باز... بے ایمان ہو۔" جیکب...

"اور تمھاری اپنے بارے میں کیا رائے ہے... تم بہت باضمیر اور نیک چلن ہو؟" میں نے کہا۔ "یہ کس لڑکی کا ذکر کر رہے تھے تم؟"

"تم کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے..."

میں نے اتنی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ پر لات ماری کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ درد کی شدت سے بلبلایا اور پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر دوسری کِک ماری تو وہ گر گیا۔

"میرا تعلق ہے اس لڑکی سے مسٹر جیکب۔" میں نے کہا۔ تم نے قمرو سے ٹھیک کہا تھا... وہ بڑی پارٹی تھی... اسے نہ خرید سکتا ہے نہ کسی کے باپ کا اثر و رسوخ دبا سکتا ہے۔" لیکن اُسے نیچے سے اُٹھا لیا۔ "یہ تم نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ورنہ قمرو سے ہی پوچھنا پڑتا کہ دوسرا کون تھا... تو اب خسرو جمشید... خسرو جمشید اصل نام سے مخاطب کیے جانے پر چونکا۔

"جاؤ... اس لڑکی کو لے آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں دروازے میں سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ بات کہنے کا مطلب یہ تھا کہ موقع سے فائدہ مت اٹھانا اور یہ مت سمجھنا کہ میں جیکب سے نمٹ رہا ہوں تو تمھاری طرف سے غافل ہوں اور تم موہنی سمیت گاڑی لے کر فرار ہو سکتے ہو۔

جیکب سخت خوف زدہ تھا اور فرش پر زخمی کتے کی طرح پڑا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف رکھا اور دروازے تک گیا۔ خسرو جمشید نے کار تک پہنچ کے میری طرف دیکھا اور پھر دروازہ کھول کے اندر جھک گیا۔ اگر موہنی بے ہوش ہوتی تو خسرو جمشید کو دو... دروازوں والی گاڑی میں سے اُسے نکالنے کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی لیکن موہنی ہوش میں آچکی تھی اور شاید اس نے ہمیں دروازے پر جیکب سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب بھی یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ خسرو جمشید کو دیکھ کر چلانے لگے اور اس کے ساتھ آنے سے انکار نہ کر دے۔ میں نے دروازہ کھول کے خود کو نمایاں کیا اور موہنی کو ہاتھ ہلا کے بلایا۔ اسی وقت جیکب نے مجھے غافل سمجھنے کی غلطی کی۔ وہ ایک جست لگا کر آیا تاکہ مجھے دھکا دے کر باہر کر دے اور پھر مدد کے لیے شور...

مگر میں نے گھوم کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور کِک رسید کی۔ وہ الٹ کر پیچھے گیا اور نیچے گرا تو اس کا سر صوفے کے بازو پر لگا۔

میں نے موہنی کو کار سے نکل کے اور آہستہ آہستہ چل کے آتے دیکھا۔ خسرو جمشید اس کے پیچھے کسی نوکر کی طرح چل رہا تھا۔ وہ میری طرف آئی تو میں نے اُسے ہاتھ تھام کے اندر کھینچ لیا۔

"کیا حال ہے اب طبیعت کا؟" میں نے مسکرا کے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ "مگر کیسے..." شاید وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟ خسرو جمشید کیوں ہمارے ساتھ ہے اور ہم بچھڑ کے پھر کیسے مل گئے ہیں... مگر وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ اس کی نگاہ نے جیکب کو دیکھ لیا اور ایک چیخ مار کے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"موہنی... دیکھو ذرا حوصلے سے کام لو۔" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "تمھارے ساتھ جو ہونا تھا ہو چکا... اب دیکھو کہ ایم آر ایس کی عدالتِ انصاف مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔ دوسرا مجرم بھی آتا ہی ہوگا۔" میں نے اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

دوسرے مجرم نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے باہر سے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز سنی۔ پھر قمرو کھلے دروازے سے سیدھا اندر آگیا۔ میں دروازے کے پیچھے ہو گیا تھا۔ قمرو کے گزرتے ہی میں نے لات مار کے دروازہ بند کر دیا۔ قمرو چونک کے پلٹا۔ اس کی حالت تو جیکب کو فرش پر بے ہوش اور موہنی کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر ہی غیر ہو گئی تھی۔ میری شکل دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" میں نے اُسے ریوالور کے اشارے سے حکم دیا۔

"تم... کیا سمجھتے ہو؟"

میں نے آگے بڑھ کے اُسے اُٹھایا اور سر کے اوپر لے جا کر دیوار پر پھینک دیا۔ "میں تو سب سمجھتا ہوں مگر تم میری بات نہیں سمجھے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھے تھے کہ ایک کمزور عورت پر ظلم توڑ کے تم نے انتقام لے لیا ہے لیکن مجھ سے انتقام لینے کا حوصلہ نہیں تھا تم میں؟ چلو اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

قمرو بڑی مشکل سے اُٹھا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

"تم شاید یہ بھی سمجھتے تھے کہ تم قانون کی دسترس سے باہر ہو کیونکہ تمھارے پاس باپ کی دولت اور اثر و رسوخ کی طاقت ہے۔ کیا خیال ہے رانا صاحب کو بھی منگوا لیں؟ سزا تو اس باپ کو بھی ملنی چاہیے جس نے تم جیسی اولاد پیدا کی اور پھر اس کی تربیت میں اپنی فرعونیت کا انداز پیدا کیا۔ وہ بھی بھولا ہوا ہے کہ ہر فرعون کے لیے خدا نے ایک موسیٰ بھیجنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ تم سے بڑا مجرم تمھارا باپ ہے مگر میرے پاس وقت کم ہے۔ اس کے غرور کو شکست دینے کوئی اور آئے گا۔ ابھی تو اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ وہ جوان اولاد کو قبر میں اتارے اور اپنے وقت کا انتظار کرے۔"

قمرو چلانے لگا: "خدا کے لیے مجھے معاف کر دو... میں اس عورت کے پاؤں پکڑ سکتا ہوں۔"

میں نے بالوں سے پکڑ کے اس کا سر دیوار پر مارا۔ "چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمھاری مدد کے لیے کوئی نہیں آ سکتا۔ اور آ گیا تو وہ بھی مارا جائے گا۔"

یہ بات غلط نہیں تھی۔ جیکب اکیلا رہتا تھا۔ اس کے گھر میں کوئی نوکر بھی نہیں تھا کیونکہ ہوٹل اس کا اپنا تھا اور اس کے سارے ملازم اسی کے ملازم تھے جو دن میں گھر کی صفائی بھی کر جاتے ہوں گے۔ اس کا کھانا پینا سب ہوٹل میں تھا یہاں تک کہ چائے کافی بھی وہ صرف بیل بجا کے طلب کر سکتا تھا۔

اب سوا پانچ بج رہے تھے۔ جیکب پھر ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے اُسے بھی گھسیٹ کر قمرو کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

"موہنی... تم ان دونوں کو پہچانتی ہو نا؟" میں نے کہا۔

"ان کی شکلیں میں کیسے بھول سکتی ہوں۔" موہنی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم دونوں اس عورت کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "کیا تم اپنے ہر جرم کا اقبال کرتے ہو؟"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس امید میں سر ہلا کے اقرار کیا کہ شاید یوں وہ مجھ سے کچھ رعایت حاصل کر لیں گے۔

"میں ایم آر ایس کے ایک منصف کی حیثیت سے تم دونوں کو موت کی سزا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم اس ملک کے قانون کو دھوکا دے سکتے ہو اور کبھی اس کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔"

موت کا یقین آتے ہی ان کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ انھوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ قمرو آگے تھا۔ میں نے کراٹے کا وہی مہلک وار استعمال کیا جو گردن توڑ دیتا ہے۔ آدھے راستے میں قمرو لڑھک گیا۔ جیکب اس کے باوجود بڑھتا رہا... ایک منٹ بعد وہ بھی مر چکا تھا۔ میں نے قمرو کی دونوں جیبوں میں سے پچاس ہزار روپے نکال لیے۔ اس کے علاوہ مجھے جیکب کے کمرے کی تلاشی لینے پر ایک میز کی دراز سے مزید ایک لاکھ روپے ملے۔ اس کے تکیے کے نیچے سائلنسر لگا ہوا ایک ریوالور بھی تھا۔ یہ ایک

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کارآمد چیز تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا ریوالور موہنی کے ہاتھ میں دے دیا اور یہ قیمتی ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم چل کے دوسری گاڑی میں بیٹھو۔۔۔ پیچھے والی سیٹ پر۔۔۔ چابیاں غالباً اسی میں لگی ہوئی ہیں۔"

"تم کیوں نہیں آتے ہو؟" موہنی نے کہا۔

"میں آتا ہوں۔۔۔ ان لاشوں کو چھپا دوں۔" میں نے کہا۔ "جمشید تم بھی جاؤ۔۔۔ اور آگے بیٹھو۔ موہنی! ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔۔۔ اگر تمھارا دل چاہے تو نواب صاحب کے سر میں سوراخ کر دینا۔ اس کے لیے نواب صاحب کی کسی غلط حرکت کا جواز پیش کرنا قطعی ضروری نہیں ہو گا۔"

ان کے جاتے ہی میں نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر باتھ روم میں بند کیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل اینکسی ہوٹل کے وی آئی پی سوئٹ کی طرح تھی۔ اس کے ایک کمرے کو بیڈ روم کے طور پر اور دوسرے کو مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک لاؤنج نما جگہ پر گول میز کے گرد چار کرسیاں کھانے کے لیے لگا دی گئی تھیں لیکن کچن کوئی نہیں تھا۔ میز کی دراز سے مجھے دروازوں کو مقفل کرنے والی چابیاں بھی ملی تھیں۔ ان میں سے ایک باہر والے دروازے کی تھی۔ میں نے جیکب کا ایک لباس بدلا اور اپنی وگ اتار کے پھینک دی۔ جب میں نے باہر کے دروازے کو لاک کیا تو افق پر صبحِ صادق کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ لیکن کار کے اندر بند شیشوں کے پیچھے اتنا اندھیرا تھا کہ کسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ قمرو ایک نئی مزدا میں آیا تھا۔ یہ پندرہ سو سی سی کی گاڑی ان دنوں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ اور جب میں نے اُسے دیکھا تو اس کی ظاہری خوب صورتی نے مجھے متاثر کیا۔

موہنی بڑی ہوشیاری سے خسرو جمشید کو سنبھالے ہوئے تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے دیکھا تو حسبِ توقع مجھے کار کی چابیاں اگنیشن سوئچ میں جھولتی نظر آئیں۔ قمرو اور جیکب گہرے یار تھے۔ ہوٹل کے احاطے میں قمرو اپنی گاڑی کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا تھا جتنا اپنے گیراج میں چنانچہ وہ چابیاں نکالنے اور گاڑی کو لاک کرنے کی تکلیف نہیں کرتا تھا۔

میں نے شیشے چڑھا کے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے سیلوٹ کو نظر انداز کرتا ہوا نکل گیا۔ چوکیدار کو نظر کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے قمرو کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب اس نے فرض کر لیا اور مطمئن ہو گیا کہ جانے والا بھی قمرو ہی تھا۔ اس سے پہلے کراچی سے آنے والے مہمان ابھی تک جیکب صاحب کے گھر میں موجود تھے، کیونکہ ان کی سفید فاکس ویگن باہر موجود تھی۔

مین روڈ پر آتے ہی میں نے گاڑی کی برق رفتاری آزمائی۔ ویگن کی طرح یہ گاڑی ایک دم تو اسپیڈ نہیں پکڑتی تھی۔ اس کی حدِ رفتار فاکس ویگن سے زیادہ تھی۔ یہ زیادہ ہموار بھی تھی اور سبک رفتار بھی۔ ملتان تک میں نے رفتار کو اسّی میل کے درمیان رکھا اور شہر سے بھی گزرا تو یہ رفتار چالیس میل کے درمیان رہی۔ صبح کے ساڑھے چھ بجے ملتان کی سڑکیں آباد ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی خالی خالی لگتی تھیں۔ میں نے گنجان آباد علاقے سے گریز کیا۔ اور باہر باہر سے نکلنے کی کوشش کی۔ موہنی نے میری ہدایت پر ایک جنرل اسٹور سے خاصا بڑا تھرماس خریدا اور پھر اس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ریسٹورنٹ میں گئی جو ایک بہت اچھے ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر تھا۔ میں نے اسے کافی سینڈوچ اور سگریٹ لانے کو کہا تھا اور یہ سمجھا دیا تھا کہ اسے کہاں آنا ہے۔ پھر میں کار کو سیدھا لے گیا اور ایک میل آگے ایک ویران مزار کے پیچھے روک دیا۔

اب میں نے صورتِ حال پر غور کیا۔ میرے پاس ڈیڑھ لاکھ نقد تھے۔ اگر صبح صبح کا وقت نہ ہوتا تو میں ملتان سے کوئی دوسری کار خرید لیتا مگر کاروں کے شوروم دس گیارہ بجے سے پہلے کہاں کھلتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ فوری طور پر میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ جیکب معمول کے مطابق بھی دس بجے سے پہلے ہوٹل نہیں پہنچتا ہو گا۔ چوکیدار شاید منیجر کو بتا دے گا کہ رات کو کراچی سے کچھ مہمان آئے تھے۔ یہ بات شک پیدا کر دے گی کہ آخر جیکب صاحب نے مہمانوں کے لیے چائے کافی ناشتا کچھ نہیں منگوایا۔ مگر شک کی تصدیق میں وقت لگے گا۔ پولیس کو رپورٹ کرنے اور دروازہ توڑ کے اندر داخل ہوتے تک دوپہر گزر جائے گی۔ دوپہر کے بعد مجھے اس کار کی ضرورت بھی نہیں رہے گی اور جہاں یہ کار ہو گی وہاں پولیس کا خیال بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ جب انھیں خبر پہنچے گی تو بات دو چار دن پرانی ہو چکی ہو گی۔ شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہو گی کہ دونوں دوست قمرو اور جیکب کس کے ہاتھوں مارے گئے اور کیوں مارے گئے۔ سوائے مظفر گڑھ کے ایک ڈاکٹر کے یہ معمّا کوئی حل نہ کر سکے گا مگر وہ تو ہم سے کبھی ملا ہی نہیں۔ ہم اس علاقے میں اجنبی تھے۔ پولیس فاکس ویگن کے مالک کو پکڑ لے گی اور وہ کار کی چوری کی رپورٹ پیش کر دے گا۔ وہ بھی کوئی ایرا غیرا تو ہو گا نہیں کہ پولیس زبردستی دُہرے قتل کا الزام اس پر دھر دے۔ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ اس کا کبھی قمرو یا جیکب سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ خلقِ خدا بالآخر تسلیم کرے گی کہ بُرے اعمال کا انجام بُرا ہی ہو سکتا تھا۔ محاورے بہت سے ہیں۔ سو سنار کی تو ایک لوہار کی۔ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔ ان میں ترمیم کی جا سکتی ہے کہ سو دن ظالم کے تو ایک دن مظلوم کا کسی نے سب کا حساب برابر کر دیا۔ رانا کے تو ایک دن پولیس پر دباؤ ڈالیں گے اور 'نامعلوم قاتل' کے خلاف ذیل خان پولیس کی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوں گے مگر اس سے پہلے بھی جلانے والی رپورٹ ہی ہوتا رہا تھا جب مدعی کمزور تھے اور کمتر درجے کے لوگ تھے جو رانا صاحب کی طاقت کے مقابل آنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ خیر۔۔۔ اب اپنی بلا سے کچھ بھی ہو۔ اندھے انصاف کی اندھی لاٹھی کو عقل کے اندھے جیسے چاہیں گھمائیں۔

ایک بار پھر موہنی پر میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا لیکن خسرو جمشید کے بارے میں ابھی تک میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا۔ رات سے اب تک وہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہا تھا۔ اگر وہ دلاور کی طرح ذہین اور عیار ہوتا یا پیڈرو کی طرح خونخوار تو اتنی دیر تک پالتو کتے کی طرح دُم دبا کے ساتھ ساتھ نہ چلتا رہتا۔ وہ دلاور اینڈ کمپنی کا سب سے کمزور پارٹنر تھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر۔۔۔ مالی طور پر شاید وہ سب سے مضبوط حیثیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس کی اہمیت مسلّم تھی۔

ایک رکشا سڑک پر رکا تو میں نے کار سے نکل کے دیکھا۔ یہ موہنی ہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں تھرماس اٹھا رکھا تھا اور دوسرے میں ایک بیگ۔ وہ رکشا والے کو پیسے دے رہی تھی اور میں رکشا والے کی صورت پر حیرانی کے آثار دیکھ سکتا تھا۔۔۔ موہنی جیسی لڑکی کا صبح دم ایسے ویرانے میں اتر جانا جہاں سڑک کے دونوں جانب صرف شہرِ خموشاں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے بھی بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

موہنی سب کچھ لے آئی تھی۔ لیکن میں نے وہاں مزید رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے رکشا والے کی مشکوک نظروں نے مجبور کر دیا تھا کہ میں کسی محفوظ تر مقام کا انتخاب کروں۔ قبرستان کے ختم ہوتے ہی ایک باغ آ گیا جس میں آم کے گھنے درخت تھے۔ اس کی نیم پختہ چار دیواری کے صرف آثار باقی رہ گئے تھے۔ یہ جگہ آرام کے لیے بہت اچھی تھی۔ میں کار کو ایک کچے راستے سے اندر لے گیا۔ اس کے آخری حصے میں ایک چھوٹی سی ہٹ بنی ہوئی تھی۔ کار کی آواز سُن کے ایک مظلوم صورت بوڑھا بڑی بدحواسی میں باہر نکل آیا۔

"بابا! ہم مسافر ہیں۔" میں نے کہا۔ "کراچی سے پشاور جا رہے ہیں۔ تم اجازت دو تو تھوڑی دیر یہاں رُک کے آرام کر لیں۔"

"جی آیاں نوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "جب تک آپ کا دل چاہے آرام کرو۔۔۔ نواب صاحب تو خود بڑے مہمان نواز ہیں۔ ان کا مہمان خانہ کبھی خالی نہیں رہتا۔"

"کون نواب صاحب؟" میں نے کہا۔

"یہی جن کا باغ ہے۔۔۔ میں تو مالی ہوں ان کا۔۔۔" وہ بولا۔

"دروازے کھلے ہیں۔ اندر کسی چیز کی کمی ہو تو حکم کرنا۔"

اندر واقعی کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پُرتکلف بیڈ۔۔۔ صوفے اور کشن۔۔۔ اشیائے خورد و نوش سے بھرے ہوئے فریج اور ڈیپ فریزر۔۔۔ شاہانہ طرز کے باتھ روم۔ آسائش کا کون سا سامان تھا جو وہاں نہیں تھا۔ رات بھر کے تھکا دینے والے سفر کی مشکلات کے بعد یہ فارم ہاؤس کسی صحرا میں اچانک آ جانے والے نخلستان کی طرح راحت افزا ثابت ہوا۔

میں نے وہاں کچھ دیر رُکنے کا فیصلہ کیا۔ اپنا سائیلنسر لگا ہوا ریوالور موہنی کے ہاتھ میں دے کر میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ وہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائن تھی۔ شاور اور ٹب تھے اور صاف ستھرے تولیے لٹک رہے تھے۔ کیبنٹ میں صابن، شیمپو اور پوڈر ٹائلٹ کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ موسم سرد نہیں تھا مگر میں نے جسم کی تکان دُور کرنے کے لیے گرم پانی سے دیر تک غسل کیا اور بہت تازہ دم ہو کے باہر نکلا۔

بیس منٹ بعد موہنی آئی تو میں اُسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ غسل نے اس کا رنگ روپ ہی بدل دیا تھا۔ نہ جانے کب سے اس نے مُنہ نہیں دھویا تھا اور بال نہیں سنوارے تھے۔ اس نے وہی جوڑا پہنا تھا جو مظفر گڑھ کے ڈاکٹر کی سابق بیوی پہنتی ہو گی۔ مگر کیا وہ بھی اس لباس میں اتنی ہی جاذبِ نظر اور دلکش لگتی ہو گی۔ میں نے سوچا۔ مگر یہ لباس کا نہیں موہنی کے حُسن کا نیا انداز تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ میری نظر کو سمجھ کے شرمائی، مسکرائی اور میرے مقابل بیٹھ گئی۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"اور کیسے دیکھوں؟" میں نے کہا۔

موہنی کا رنگ خوشی اور حیا سے گلابی ہو گیا اور اس کے موتی جیسے دانت مسکراہٹ سے جگمگانے لگے۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے میری توجہ ناشتے کی طرف دلائی۔

"میں تو ناشتا شروع کرنے ہی والا تھا۔" میں نے کہا۔

"پھر انتظار کیوں کیا؟"

"ایٹی کیٹس میڈم۔" میں نے کہا۔ پھر مجھے جمشید کا خیال آیا جو ابھی تک سامنے والے صوفے پر پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اتنے تعاون کے بعد وہ ہم سے رعایت کی امید رکھتا تھا لیکن میں اس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کیسے کر سکتا تھا جس کا وجود بدی سے عبارت تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا تو صرف اس لیے کہ میں نے ہوش سے کام لیا تھا۔

"کیا تم مجھے غسل کی اجازت نہیں دو گے؟" جمشید نے کہا۔

"تم اب ایک ہی بار غسل کرو گے۔۔۔ تدفین سے پہلے۔۔۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بشرطیکہ زمین نے تمھیں قبول کیا۔" میں نے کہا۔ "تمھیں یقیناً بھوک بھی لگی ہوگی... مگر جمشید... تم اب ایک قیدی ہو۔"

"میں نے تم سے پوری طرح تعاون کیا ہے... اور آئندہ..."

"آئندہ کے بارے میں ابھی تک میں نے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کہ تمھیں کس کے حوالے کروں۔" میں نے کہا۔ "ملٹری انٹیلی جنس کے... ایم آر ایس کے یا حضرت عزرائیلؑ کے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ موہنی کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ جب میں نے مزے لے لے کر سینڈوچ کھانا اور کافی پینا شروع کیا تو جمشید نے اپنی نظر پھیر لی۔ ناشتے کے بعد میں نے سگریٹ سلگا کے صوفے پر پاؤں پھیلا دیے۔

"تم جا کے بیڈ روم میں سو جاؤ۔" میں نے موہنی سے کہا۔ "اگر کسی نے مداخلت نہ کی تو ہم رات تک یہاں قیام کریں گے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسی قیام میں عمر گزر جائے... کیسی اچھی پُرسکون اور پُرآسائش جگہ ہے۔" موہنی ایک زہد شکن انگڑائی لے کر بولی اور مسکرائی۔

میں نے اس کی آنکھوں کے پیغام کو سمجھا اور نظر انداز کر دیا۔ زندگی کی راہ میں بہت سے نظر فریب دھوکے ہیں مگر سفر ابھی جاری ہے۔ ہم ایسی خواہشوں کے جال میں نہیں پھنس سکتے۔ وہ بیڈ روم میں چلی گئی۔ اسے میرے طرزِ عمل نے مایوس کیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔

موہنی پھر دروازے میں نمودار ہوئی۔ "کیا کروں؟ ریسیور اٹھا لوں؟"

"نہیں... مالی کو بلاؤ..." میں نے کہا لیکن مالی شاید باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا فوراً اندر آ گیا۔ میں نے موہنی کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔

"یہ مالک کا فون ہوگا جی۔" مالی نے کہا۔

"تم نے ابھی تک ان کا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"سلطان صاحب ہیں جی اس کے مالک۔" مالی نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... سلام چھوٹے صاحب... نہیں صاحب... وہ اِدھر تو نہیں آئے ابھی تک..." اور ریسیور رکھ دیا۔

"کون ہیں یہ چھوٹے صاحب؟" میں نے کہا۔ "جیکی یا جونی؟"

"آپ جانتے ہیں انھیں؟" مالی نے کہا۔

"نمبر بتاؤ مجھے ان کا۔" میں نے فون اپنی طرف کر کے کہا۔

اسی وقت میں نے فائر کی آواز سُنی... سائلنسر نے آواز کو بہت کم کر دیا تھا مگر جب بیچ میں صرف ایک دروازہ حائل ہو تو تھوڑی آواز بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔

"میں تیری پول کھول دوں گا... فاحشہ..." نواب نے چیخ کر کہا اور اس کے منہ سے غلیظ گالیاں اُبلنے لگیں۔

"تم نے پھر حرکت کی تو میرا نشانہ خطا نہیں ہوگا۔" یہ موہنی کی پُرسکون آواز تھی۔ مالی کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا۔ لیکن میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

"کیا تم اونچا سنتے ہو؟" میں نے سختی سے کہا۔ "سلطان کے بیٹے میرے دوست ہیں۔ جیکی یا جونی کا نمبر پوچھا تھا۔"

"جی... جی صاحب... میں ملا دیتا ہوں..." مالی نے [illegible] ہوئے کہا۔

"تم کو بھونکنے کی اجازت ہے۔" موہنی نے کہا۔ "لیکن اس سے تمھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"تیری اصلیت تو آ جائے گی اس کے سامنے۔" نواب بولا۔

"میں اسے چوبیس سال پہلے بھی جانتی تھی۔ اور چوبیس سال پہلے میں اور وہ ایک ہی گھر میں تھے۔" موہنی نے کہا۔ "تم اُسے کیا بتاؤ گے...؟"

مالی نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"کون جیکی...؟" میں نے کہا۔ "کیا حال ہے...؟"

"میں نے پہچانا نہیں۔" جیکی کنفیوز ہو کے بولا۔

"تمھارے اس پلاٹ کا چکر تو ختم کرا دیا تھا میں نے..."

"تم...!" جیکی حیران ہو کے بولا۔ "کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"بھئی میں پھر تمھارا مہمان ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمھارے فارم ہاؤس میں رکا ہوں ایک دن کے لیے... یہ بتاؤ آج اِدھر کوئی آئے گا؟"

"کیا مطلب؟ آنے کو کوئی بھی آ سکتا ہے۔"

"میں چاہتا تھا... میرا مطلب ہے کوئی ایسا بندوبست کرو کہ مجھے پورا دن مل جائے... کوئی مداخلت نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"تم رات کو بھی رُک سکتے ہو۔ کوئی نہیں آئے گا اُدھر..."

"مگر میں تم سے ملنا چاہتا ہوں... ابھی... مجھے تم سے ایک کام ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں... جونی کو ساتھ لاؤں؟"

"ضرور لاؤ۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے اپنے اس مالی کو سمجھا دو کہ ہمیں مہمان سمجھے۔"

"ٹیلی فون اسے دو... کیا اُس نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"

"نہیں... مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ دخل در معقولات نہ کرے۔" میں نے کہا۔

"کیا تم اکیلے ہو؟" وہ بولا۔

"نہیں... میرے ساتھ وہی ہے... جو تھی۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا..." وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "عیش کرو۔ کوئی مخل نہیں ہوگا... مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ہمارے فارم پر کیسے پہنچ گئے تھے؟

مجھے کہاں معلوم تھا کہ یہ تمھارا فارم ہے... میں تو بس ایسے ہی ایک جگہ دیکھ کے رک گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سوچا تھا کہ کوئی مالی یا چوکیدار ہوگا تو اسے خوش کر دیں گے... تمھارا فون آیا تو پتا چلا۔"

معلوم نہیں جیکی نے مالی سے کیا کہا، مگر اس کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ جی حضور... جی سرکار کہتا رہا اور پھر ریسیور رکھ کے پوچھنے لگا کہ مجھ سے کون سی گستاخی ہو گئی تھی؟ میرے اور جیکی کے درمیان ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی چنانچہ مالی کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا... میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں، وہ باہر بیٹھے اور جب چھوٹے مالک آئیں تو بتا دے۔

موہنی سونے کے لیے لیٹ گئی تو میں پھر جمشید کے سامنے جا بیٹھا۔

"میں کسی بھی جگہ تمھیں پکڑوا سکتا تھا۔" وہ اچانک بولا۔

"اسی جگہ تم مارے بھی جاتے اور تمھاری یہ حرکت خودکشی کہلاتی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو سکندر... میرا بچپن ناز و نعم میں گزرا تھا اور اس کے بعد سے اب تک میری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔" وہ بولا۔ "میں نے سختی کبھی نہیں دیکھی۔ میں دلاور کے کاروبار میں ایک سلیپنگ پارٹنر تھا۔ اس کے لیے سرمایہ میں نے فراہم کیا تھا لیکن میں نے صاف بتا دیا تھا کہ میں عملاً کچھ نہیں کر سکتا... کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ قتل خونریزی تو دُور کی بات ہے میں گرفتاری سے بھی ڈرتا ہوں۔"

"تم اس پیسے سے کوئی جائز کاروبار نہیں کر سکتے تھے؟"

"کر سکتا تھا... لیکن اس میں منافع کم ہوتا ہے، دوڑ دھوپ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔" جمشید نے کہا۔ "دلاور نے مجھے سو فیصد منافع کا یقین دلایا تھا... سو فیصد ماہانہ... جو کسی کاروبار میں ناقابلِ تصور ہے... یہاں تک کہ اسمگلنگ... منشیات کے دھندے یا بردہ فروشی جیسے کاروبار میں بھی ممکن نہیں۔ دلاور کے پاس بزنس پروپوزل تھا... پارٹی تھی اور انتظامی امور سے نمٹنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے یہ ضمانت بھی دی کہ مجھے کچھ نہیں کرنا ہوگا... لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میری حیثیت صفر ہوگی۔ مجھے مشورہ دینے اور ان کے نفع نقصان اور کاروبار کی پوزیشن معلوم کرنے اور ان کی ہر میٹنگ میں شرکت کا حق حاصل رہے گا۔"

"اور تمھارا سرمایہ... کیا تمھیں یہ حق حاصل تھا کہ جب چاہو الگ ہو جاؤ؟"

"ایسا تو کسی بھی کاروبار میں ممکن نہیں اور جب کاروبار اطمینان بخش طور پر چل رہا ہو تو ایسا کون چاہے گا۔" جمشید نے کہا۔

"تم نے کتنا سرمایہ فراہم کیا تھا؟"

"ابتدا میں بیس لاکھ۔"

"کیا ایک مہینے بعد وہ چالیس لاکھ ہو گئے تھے؟" میں نے کہا۔

"نہیں... لیکن تیس لاکھ ہو گئے تھے۔"

"گویا تمھیں دس لاکھ کا منافع ادا کر دیا گیا تھا...؟"

"معاہدے کے مطابق کاروبار کا آغاز ہونے کے تیسرے ماہ سے منافع کی تقسیم شروع ہوئی تھی۔ تیسرے مہینے کے بعد یہ شرح برقرار رہی۔"

"لیکن یہ سو فیصد ماہانہ منافع تو نہیں تھا۔"

"ہاں... مگر پچاس فیصد ماہانہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ مجھے فوری طور پر ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے منافع کی دو اقساط وصول کرنے کے بجائے سرمائے میں شامل کر دیں۔ اس طرح میں چالیس لاکھ کا پارٹنر بن گیا۔ بعد میں مجھے اوسطاً پندرہ سے بیس لاکھ ماہانہ ملتے رہے... اور اب بھی مل رہے ہیں۔"

"پندرہ لاکھ تو پچاس فیصد سے بھی کم ہو گئے۔"

"وہ... دراصل میرا خیال ہے کہ ابتدا میں دلاور نے کچھ مبالغے اور کچھ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ سو فیصد ماہانہ منافع ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دلاور اور سراج وغیرہ مل کے ڈنڈی مار جاتے ہوں۔ خود زیادہ وصول کرتے ہوں۔ مجھے کم دیتے ہوں۔ مگر میں اسے ہی بہت سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ کیے بغیر پندرہ بیس لاکھ ہر مہینے مل جاتے ہیں۔ دو چار لاکھ کم کے لیے جھگڑا کیا کرنا۔ اور کسی کاروبار میں تو دس فیصد ماہانہ بھی نہیں ملتے۔ میرا خرچ پانچ سات لاکھ روپے ہوتا ہے۔ باقی جمع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمیشہ چلنے والا کاروبار نہیں ہے۔"

"تمھارا سرمایہ ملک میں ہی ہے؟"

"نہیں... سب کی طرح میں نے بھی اپنا پیسہ سوئٹزرلینڈ میں محفوظ کیا ہے۔" جمشید بولا۔

"ڈی سلوا بھی ایک پارٹنر تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... دس فیصد کی حد تک۔" جمشید نے کہا۔

"اس نے بھی سوئٹزرلینڈ میں دولت جمع کی ہوگی۔ وہ کس کے کام آئے گی جب خود اس کے کام نہ آئی۔" میں نے کہا۔ "دلاور، سراج اور سیڈرو بھی پارٹنر ہیں؟"

"پارٹنر تو سب ہیں... ذمے داریوں کی نوعیت کے اعتبار سے سب کے کام الگ ہیں اور انھیں جو منافع ملتا ہے وہ ان کے فرائض کی اہمیت کے تناسب سے ملتا ہے۔" جمشید نے کہا۔

"ہر ایک کا نقد سرمایہ کتنا تھا؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

" دلاور کا پانچ لاکھ... سراج کا ایک لاکھ۔ مگر دلاور سارے رسک کور کرتا تھا اور سامنے رہتا تھا۔ کل منافع میں سے چالیس فیصد میرا ہوتا تھا' دلاور کا پچیس فیصد۔ سراج کا پندرہ فیصد۔ اخراجات نکل لینے کے بعد۔"

" اور باقی دس فیصد؟"

" وہ دوسرے ماتحت مددگاروں کا۔ پہلے یہ ڈی سلوا کو ملتا تھا۔ پھر یہی دس فیصد تقسیم ہونے لگا۔ پانچ فیصد پیڈرو کو مل جاتا ہے اور باقی دوسروں کو۔"

"گویا پیڈرو پارٹنر نہیں ہے؟"

" معاہدے میں اس کا نام پارٹنر کی حیثیت سے شامل نہیں ہے۔ اسے دس ہزار روپے ماہانہ دیے جاتے تھے۔ ڈی سلوا کے مرنے کے بعد جب پانچ فیصد ملنے لگے تو اب بیس پچیس ہزار ہو جاتے ہیں۔ ویسے وہ ملازم ہے۔ دلاور کے رویے نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔" جمشید نے کہا۔

" کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ایک غیر قانونی معاہدے کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہوتی؟" میں نے کہا۔ "مثلاً اسی کاروبار کی مثال لو۔ اگر دلاور تمہارا پیسہ ہضم کر جاتے تو تم اس کے خلاف کسی عدالت میں دعویٰ دائر نہیں کر سکتے... تم لاکھ کہو کہ میں کچھ نہیں کرتا تھا مگر شریک جرم سمجھے جاؤ گے اور اندر ہو جاؤ گے۔"

" تم کہہ سکتے ہو کہ میں کاہل ہوں اور بزدل ہوں۔ لیکن میں احمق نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "میرا پیسہ اپنے سرمائے کی حد تک محفوظ ہے۔ دلاور کی فیکٹری میرے پاس رہن ہے اور مورٹ گیج پیپرز عدالتی اسٹامپ اور رجسٹری کے ساتھ میرے بینکرز کی تحویل میں ہیں۔"

" ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس... تمہارے پاس رہن ہے؟" اس انکشاف نے مجھے سُن کر دیا۔ غصے نفرت اور انتقام کی پرانی آگ پھر میرے لہو کو تیزاب کرنے لگی۔ "کیا حق حاصل تھا اس کمینے کو... کہ میری اور میرے باپ کی جائداد کو رہن رکھے؟" میں نے ایک دم خسرو جمشید کو دبوچ لیا اور اسے دیوانہ وار مارنے لگا۔ وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا۔

وہ چلانے لگا۔ "سکندر... مجھے مت مارو... مجھے چھوڑ دو۔ میں مجرم ضرور ہوں۔ لیکن میں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔"

میں نے اُسے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور خون اس کی ناک سے اور ہونٹوں سے بہہ رہا تھا۔ موہنی نے بیچ کے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور لوٹ گئی۔ مالی نے اندر آنے کی ہمت ہی نہیں کی۔

" مجھے مار کے... تمہیں کچھ نہیں ملے گا..." خسرو جمشید بڑی مشکل سے اُٹھا اور اس نے کُرتے کے دامن سے ہونٹ صاف کیے۔ "جو کچھ میں تم کو بتا سکتا ہوں' تم کسی سے بھی نہیں پوچھ سکتے۔ میں نے تو صرف پیسہ دیا تھا۔ تم مجھے ہوس پرست اور لالچی کہہ لو... میں خود بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں عیاش اور بدکردار ہوں۔ لیکن براہِ راست میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ تم مجھے..."

" بکواس بند کرو کتے کے بچے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ شخص بھی قاتل کہلاتا ہے جو کسی کے ہاتھ میں خنجر دیتا ہے... یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے کسی کا گلا کاٹا جائے گا۔ کیا تم کو معلوم نہیں تھا کہ اس کارخانے کا دلاور اکیلا مالک نہیں ہے؟"

" پہلے وہ اکیلا مالک نہیں تھا۔ تمہارے والد اور میر شرافت بھی اس کے مالک تھے۔" جمشید نے کہا۔ "مگر... اس نے دو پارٹنر کاٹ دیے۔ تمہارے والد کو راستے سے ہٹا دیا اور میر شرافت کو مروا دیا۔ اس کے بعد تو مالک وہی تھا۔ میر شرافت علی لاوارث تھا اور لاولد تھا۔ تم اپنے باپ کے اکلوتے وارث تھے۔ تم کو اسی لیے بُلایا گیا تھا کہ حصہ دے کر الگ کر دیا جائے۔ اور اگر تم نے کاروبار میں شرکت پر رضامندی کا اظہار کرو تو تمہارا بھی حصہ مقرر کر دیا جائے۔ مگر فیکٹری تو دلاور پہلے ہی رہن رکھ چکا تھا' اگر حقِ وراثت کا مقدمہ چلتا تو یہ بات سامنے آجاتی۔ مگر تمہارا رویہ دیکھتے ہوئے ایسا انتظام کر لیا گیا کہ تم عدالت میں پیش ہی نہ ہو سکو... اور دیکھ لو کہ آج تمہاری کیا پوزیشن ہے۔"

" تم اپنی پوزیشن دیکھو تو اب خسرو جمشید... کہ تمہارے پیسے نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" میں نے کہا۔ "کیا تم کو یقین ہے کہ وہ سب پیسہ جو تم نے سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں جمع کیا ہے... یا میری فیکٹری کے رہن رکھے جانے کے کاغذات... دلاور اور سراج... یہ سب مل کے تمہیں بچا سکتے ہیں... میں تو اپنا حق حاصل کر ہی لوں گا۔"

" تمہارے لیے میری زندگی میری موت سے زیادہ کارآمد ہوگی سکندر..."

" لیکن پھر تمہاری زندگی ان کے حق میں موت بن جائے گی جو آج تمہارے پارٹنر ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہ پُل صراط عبور نہیں کر سکو گے جمشید... میرے ہاتھوں نہ مارے گئے تو تم ان کے ہاتھوں ضرور مارے جاؤ گے... ابھی میری نظر میں غدار ہو... پھر ان کی نظر میں بھی غدار ٹھہرو گے۔"

" ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔" جمشید نے کہا۔ "جب میں نے اس کاروبار میں قدم رکھا تھا تو صرف منافع نہیں دیکھا تھا۔ میں نے خطرات کو بھی سمجھ لیا تھا اور پہلے دن سے میں صرف اپنا دفاع مضبوط کر رہا ہوں۔ میرا اکاؤنٹ سوئٹزرلینڈ میں نہیں ہے۔ وہاں تو سب ہی جانتے ہیں اور انھیں تلاش بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک ایسے ملک کا انتخاب کیا تھا جہاں ان کے تصور کی رسائی بھی نہیں ہوگی۔ وہاں میں نے اتنی دولت سے سرمایہ کاری کی ہے کہ مجھے اس ملک کی معیشت اور سیاست میں اہم مقام حاصل ہے۔ میں وہاں کا وی آئی پی ہوں مگر میرا اصل نام' میری اصل شہریت... یہ سب انھیں بھی معلوم نہیں... میں جب چاہوں جس جہاز سے چاہوں وہاں جا سکتا ہوں۔ مہینے میں ایک بار جاتا بھی ہوں۔ وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ میں کاروباری دورے پر ہوں یا پھر اپنے سوئٹزرلینڈ کے محل میں مقیم ہوں... حالانکہ میرا سوئٹزرلینڈ میں کوئی جھونپڑا تک نہیں ہے۔ میں تمھیں ایک پیش کش کرتا ہوں... تم مجھے نکل جانے دو۔ میں ایسا پکا انتظام کر جاؤں گا کہ تمہارا حق تمھیں مل جائے۔ تم ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس کے مالک بن جاؤ گے۔"

" مجھے بے وقوف مت بناؤ جمشید۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "اوّل تو وہ ایم ڈبلیو ڈی کمپلیکس رہا ہی نہیں۔ وہ سُور کا بچہ دلاور وہاں اسپتال بنا رہا ہے۔ وزیر ہوسپٹل۔"

" پھر کیا ہوا...؟ رہن کے کاغذات میں یہ شق شامل ہے کہ اس زمین پر موجودہ عمارت میں اضافہ ترمیم یا ردّوبدل کیا جا سکے گا لیکن وہ پراپرٹی بدستور میرے پاس رہن رہے گی۔"

" دلاور تمہارے منتر پر بیس لاکھ مار سکتا ہے۔"

" اسے کیا ضرورت ہے بیس لاکھ میں ایک ایسی پراپرٹی چھڑانے کی جس پر اس کا قانونی حق چیلنج ہو چکا ہے۔ وہ خود بھی یہاں ناقابلِ انتقال جائداد نہیں رکھ سکتا۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں... وہ کرائے کے مکان بدلتا رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کبھی اسے اچانک بھاگنا پڑا تو وہ جائداد اُٹھا کے نہیں لے جا سکے گا۔ اس کے کام وہی پیسہ آئے گا جو باہر محفوظ ہے۔ یہاں تو کسی بینک میں ذاتی پیسہ بھی اتنا ہی رکھتا ہے جو وقتِ ضرورت کام آجائے۔ بیس لاکھ وہ باہر سے منگوا کے ادا نہیں کرے گا کہ رہن رکھی ہوئی جائداد کو چھڑائے۔ وہ تو اس سے سیاسی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تاکہ خود محفوظ رہے۔ میں اس رہن نامے کو تمہارے نام منتقل کر دیتا ہوں... یہ کیسے ہوگا... اس معاملے میں تم اپنے وکیلوں سے مشورہ کر سکتے ہو... تمہارے دوست بہترین وکیل ہیں۔ اس طرح تم مستقبل میں تعمیر ہونے والے وزیر اسپتال کے مالک خود بخود بن جاؤ گے۔"

" مگر میں قانونی کارروائی کے لیے کسی عدالت میں نہیں حاضر ہو سکتا۔" میں نے کہا۔

" اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی وہ جائداد یعنی وزیر اسپتال میرے نام رہن ہے... میں تمہارے دوست اور وکیل عبدالودود منظر کو اپنا اٹارنی بنا کے اسے مکمل اختیارات دے سکتا ہوں۔ دلاور عملاً اس جگہ سے دستبردار ہو چکا ہے۔ تمہارا دوست تمہاری واپسی تک اس اسپتال کو اپنی ٹرسٹی شپ میں چلا سکتا ہے۔"

" اس کے لیے تم کو بھی تو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔"

جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرے قانونی مشیر میری ہدایات پر یہ کام کر لیں گے... وزیر اسپتال تمہارا ہو جائے گا... تم کہو گے تو میں اس کی تکمیل کے لیے پیسہ بھی فراہم کر دوں گا۔"

" اور کیا دلاور اینڈ کمپنی تمھیں ایسا کرنے دے گی؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہو جائے گا کہ تم منحرف ہو گئے ہو؟"

" انھیں فوراً معلوم ہو جائے گا... مگر وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ وہ میرے قانونی مشیروں کو یا تمہارے وکیل دوست کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ اس کام میں ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔ اس عرصے میں تم مجھے اپنی قید میں رکھو گے اور میری حفاظت کرو گے۔ جب ساری قانونی کارروائی تمہارے اطمینان کے مطابق پوری ہو جائے اور اسپتال بھی مکمل ہو جائے تو تم مجھے خاموشی سے باہر نکل جانے کا موقع دینا۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ بس تم مجھے رہا کر دینا کہ جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ۔ میں بھیس بدل کے جاؤں یا نام بدل کے... تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں... میں کئی نام... کئی پاسپورٹ استعمال کروں گا اور کئی مختلف جہاز بدل کے بالآخر اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس کی بات نے مجھے کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ اب تک میرے ذہن میں ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ مجھے خسرو جمشید کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ مسئلہ وہی انتخاب کا تھا کہ میں اُسے سزا دینے کا اختیار اپنے پاس رکھوں... اسے غالب اور محسن کے سپرد کر دوں یا میجر سلطان کے حوالے کروں۔ ہر صورت میں وہ سزا اس کا مقدر تھی جو غدار کو ملنی چاہیے۔

اس کی پہلی بات کو میں مسترد کر سکتا تھا کہ اس نے براہِ راست مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ وہ میرے والد کے قتل میں شریک تھا نہ کسی اور کے۔ نہ اس نے تباہ کاری و خونریزی کے کسی منصوبے میں شرکت کی اور نہ اس کا مقصد ملک دشمنی تھا۔ اس کے پیشِ نظر تو منافع تھا جو اتنا بڑا تھا کہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے تو سب ہی ملک دشمن ہیں۔ اسمگلر بھی' منشیات فروش بھی... ذخیرہ اندوز بھی' رشوت خور اور ٹیکس چور بھی سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والا بھی۔ کسی بھی ٹرین کے باتھ روم سے شیشہ یا ایک بلب چُرانے والا بھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ خسرو جمشید نے جانتے بوجھتے اپنا سرمایہ ان لوگوں کے حوالے کیا جو ملک توڑنے کے درپے تھے۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دوسری بات کا تعلق میری ذات سے تھا۔ جو چیز مجھے سر توڑ کوشش کے باوجود نہیں ملی تھی۔ میرا قانونی حق ہونے کے باوجود مجھے نہیں ملی تھی اور اپنا سب کچھ گنوا کے بھی نہیں ملی تھی وہ اچانک ایک معمولی سی شرط پر مجھے دی جا رہی تھی۔ اگر وہ میرا سرمایہ تھا جو غصب کر لیا گیا تھا تو غاصبوں کا ایک ساتھی مجھے وہ سرمایہ اس پر واجب الادا سود سمیت لوٹا رہا تھا۔ اگر میں نے ذہنی و جسمانی اذیت برداشت کی تھی تو اس کا بھی تدارک مجھے مل رہا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک کارخانے کی جگہ مجھے ایک مکمل اسپتال کی پیشکش تھی۔ کارخانہ صرف فولاد کو پرزوں میں ڈھالتا تھا مگر اسپتال دکھی اور بیمار انسانوں کے لیے امیدِ شفا فراہم کرتا تھا۔ کارخانہ صرف مادی فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ تھا لیکن وزیر خان کے نام پر تعمیر ہونے والا اسپتال ایک صدقۂ جاریہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس اسپتال کو غریبوں کے مفت علاج کے لیے کھول سکتا تھا اور اس کی اپنی آمدنی سے چلا سکتا تھا۔

جب میرا ذہن ڈانواں ڈول ہونے لگا تو مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ گزشتہ روز میں نے جب اسٹیشن ویگن کو ایک مرسڈیز سے ٹکرا کے خسرو جمشید کے ڈبل کو ہلاک کر دیا تھا اس شخص نے یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ خسرو جمشید نہیں ہے ورنہ مجھے کبھی اس کا پتا نہ چلتا۔

اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اصل خسرو جمشید کہاں ملے گا۔

اگر کسی طرح یہ مشہور اور ثابت کر دیا جائے کہ وہی اصل خسرو جمشید تھا تو دلاور یا سراج کیسے تصدیق کر سکتے ہیں کہ حقیقت کیا تھی جسے میں نے بدل دیا۔ اس طرح ایک دو مہینے خسرو جمشید کو قید میں رکھنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنی مرضی سے قید میں رہے گا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اور جب قانونی معاملات میری مرضی کے مطابق طے پا جائیں گے۔ یعنی عبدالودود منظر تصدیق کر دے گا کہ اب قانونی طور پر کوئی سقم نہیں اور وہ وزیر خان اسپتال کا مہتمم و منتظم ہے، اس کے پاس اسپتال کی تکمیل کے لیے خسرو جمشید کی فراہم کردہ رقم ہے اور قانونی اختیار ہے۔ تو کسی بھی رات خسرو جمشید کو رہا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سزا جلاوطنی کی صورت میں بھگتے گا۔ گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگا۔ کسی ایسے ملک میں جہاں وہ خود بھی اپنے لیے اجنبی ہوگا۔ وہ مالی طور پر آسودہ ہوگا مگر پیسہ صرف جسم کو آسودہ کرتا ہے۔ جذباتی رشتے اور محبتوں کے سائے جو روح کی طلب مٹاتے ہیں، خریدے نہیں جا سکتے۔ ایک پوری زندگی گزار کے مرنے والے کے لیے ایک بھی آنکھ سے وہ قطرۂ اشک نہ ٹپکے جس میں جدائی کا درد ہو اور دل کا لہو شامل ہو تو کیا مر کے بھی روح کو قرار مل سکتا ہے۔ پھر خسرو جمشید اپنے سب جرائم کا اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی یہ سزا بھگتنے کو تیار ہے۔ جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے اور غداری کے جرم میں دوسرے فریق کی سزا کے تمام ... مول لینے کو تیار ہے تو مجھے کیا؟

ایک ہارن نے میرے خیالات کو منتشر کر دیا۔ میں ... دیر سے خسرو جمشید کو گھور رہا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ ... اس کی پیشکش نے میرے پتھر دل کو پگھلانا شروع کر دیا ... کا اندازہ مجھے اس کی صورت پر امید کے اجالے سے ہوتا ... جواب آتنا ہی زیادہ ہو چکا تھا جتنی صبح کے مقابلے ... کی دھوپ۔

جیکی اور جونی ایک ساتھ اندر آئے۔ وہ دونوں بڑے جوشیلے جوان تھے۔ انھوں نے 'ہائے' کہہ کے مجھ سے ... کیا اور پھر خسرو جمشید سے۔

"اچھا ہوا تم پھر آ گئے۔" جیکی بولا۔ "ہمیں تو موقع ہی نہیں ملا تھا اس دن کہ تم سے کچھ کہہ سکیں... لوڈڈ سو ویل..."

"تمھاری ایکٹنگ!" جونی بولا۔ "سپرب..."

"ہم سے تو بات نہیں بنی تھی۔" جیکی بولا۔ "بلکہ میں تو ... بے وقوفی پر پشیمان تھا کہ سوچے سمجھے بغیر کیا کہہ دیا۔"

لیکن تم نے جس طرح بگڑی بات بنائی... میں تو مان گیا۔ ورنہ تم اگر تہ خانے میں پہنچا دیے جاتے تو معلوم ہے کیا ہوتا؟"

جونی نے کہا۔

"کیا ہوتا...؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمھاری روح بھی اندر ہی قید رہتی اور چمگادڑ کی طرح اندھیرے میں چکر لگاتی رہتی۔" جونی نے کہا۔ "اور تمھارا ڈھانچا ... خیر چھوڑو..."

"ہاں... جو ہوا ٹھیک ہوا اور اچھا ہوا۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم نے اس خبیث کو کہاں چھوڑا تھا؟"

"پانچ میل سے بھی آگے... اس نے بہت شور مچایا۔ لالچ دیا اور دھمکی دی... میں نے کہا کہ میں خلافِ اصول بات نہیں کر سکتا اور وہی کروں گا جس کا مجھے حکم ہے... ورنہ واپس گھر لے جاؤں گا۔"

"وہ کیا چاہتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے تمھارا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔" جیکی بولا۔

"بعد میں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "جب تم گھر پہنچے۔"

"اس وقت تک سب کچھ ہو چکا تھا۔" جیکی نے کہا۔

"بیگم پارہ کہرام مچا کے خاموش ہو چکی تھیں اور ڈیڈ اعلان کر چکے تھے کہ وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے۔"

"خواہ بیگم پارہ روٹھے اور روٹھ کے گھر سے جائے یا دنیا سے جائے۔" جونی قہقہہ مار کے ہنسا۔ "ڈیڈ کو یقین ہو گیا تھا کہ دال

میں کچھ کالا ہے۔"

"دال میں کالا ہی کالا تھا... سفیدی کا نام بھی نہیں تھا۔ تمھارے ڈیڈ نے درست فیصلہ کر کے خود کو بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا۔" میں نے کہا۔

"پارٹنر... میرا خیال ہے۔" جیکی سگریٹ جلا کے بولا۔ "کہ تم جو نظر آتے ہو... ایم آئی رائٹ؟"

"نو کمنٹس۔" میں نے کہا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا... یہاں سب کچھ ہے... بلیک ڈاگ تک..."

"تھینک یو... میں چائے کافی سے آگے نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔

"آل رائٹ... ناؤ کم ٹو دی پوائنٹ۔" جیکی بولا۔ "تم نے کیوں بلایا تھا ہمیں؟"

"تم سے ایک کام تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" جونی نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا بول ہے۔" میں نے کہا۔ "آدمی کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی پوری کوشش کرے گا۔"

"او کے... او کے..." جونی نے کہا۔ "مسٹر فلاسفر تم بولو کہ کام کیا ہے... تم سے مجھے کچھ عقیدت ہو گئی ہے۔"

"عقیدت... یہ تو بہت بڑا لفظ ہے۔" میں نے کہا۔

"یس عقیدت۔" وہ بولا۔ "ہم نے کیا سوچا تھا... اور پھر تم نے بدلے میں کیا کیا... جو ہم نہیں کر پائے تھے، وہ تم نے یوں کر دیا۔" وہ چٹکی بجا کے بولا۔

"میرا کام چٹکی بجاتے میں نہیں ہوگا۔ یہ مشکل اور لمبا کام ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ناممکن نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو قتل کرنا ہے؟" جیکی رازدارانہ لہجے میں میری طرف جھکا۔

"فرض کرو یہ بھی کرنا پڑے بعد میں۔" میں نے کہا۔ "ویسے تو میں دوستوں کو آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ قتل کی نوبت آئی تو میں خود ہی معاملات سنبھال لوں گا۔"

"اب بتاؤ بھی کہ بات کیا ہے؟" جونی نے بے صبری سے کہا۔

"تم نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟" میں نے جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

ان دونوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"یہ میرا جانی دشمن ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

وہ دونوں دم بخود رہ گئے۔

"اور اسی طرح میں اس کا جانی دشمن ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ بہت پرانی دشمنی ہے اور میرے جذبات کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں اس کے ٹکڑے کر سکتا، پھر ان ٹکڑوں کو قیمہ کرنے والی مشین میں ڈال سکتا اور اس قیمے کو کتوں اور چیلوں کے سامنے پھینک سکتا، تب بھی میری تسلی نہیں ہوتی۔"

جیکی نے منہ گول کر کے سیٹی بجائی اور آنکھیں پھیلا کے خوف اور حیرت کا اظہار کیا۔

"پھر تم نے یہ نیک کام کیوں نہیں کیا؟" جونی بولا۔ "ویسے تم چاہتے ہو کہ یہ کام یہاں ہو اور کوئی نہ دیکھے... تو سمجھ لو کہ دنیا اندھی ہو گئی ہے۔ چاروں طرف اونچی دیوار ہے اور رات کا وقت ہے۔ چنانچہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔"

جیکی نے کہا۔ "یس... یہ جو مالی ہے نا... سمجھ لو کہ یہ اندھا، گونگا اور بہرا ہے۔"

جونی نے دونوں انگلیاں منہ میں زبان کے نیچے ڈال کے ایک تیز سیٹی بجائی... مالی دروازے میں نمودار ہو گیا۔ جونی میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ "اتنی جلدی تو الہ دین کے چراغ کا جن بھی حاضر نہیں ہوتا ہوگا۔" مالی دانت نکالنے لگا۔

"چاچا خواہ مخواہ... یہ ہمارے دوست ہیں۔" جیکی بولا۔

"جی حضور... مجھے معلوم ہے۔" مالی نے کہا۔

"تمھیں اور کیا معلوم ہے؟" جیکی نے کہا۔ "جو کچھ معلوم ہے، وہ سب ان کو بتاؤ۔"

مالی گڑبڑا گیا۔ "آپ... پوچھیں مالک..."

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ اس باغ میں ہمارے کتنے دشمن اور بدخواہ دفن ہیں؟" جیکی نے کہا۔

"جی... کیا بتاؤں... ہوں گے پچاس..."

"ویری گڈ... پچاس صحیح جواب ہے۔" جیکی بولا۔ "تم بتا سکتے ہو کہ کون کہاں دفن ہے؟ اوپر سے تو پتا نہیں چلتا۔"

"مگر میں بتا سکتا ہوں جنابِ عالی۔"

"اچھا... اور کتنی جگہ ہے؟"

"جگہ بہت ہے حضور۔" مالی نے پریشان ہو کے کہا۔ شاید اس قسم کے سوالات اس سے پہلے نہیں کیے گئے تھے۔

"گولڈن جوبلی کی تیاری کر دو۔" جیکی بولا۔

"کس چیز کی سرکار...؟" مالی نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔

"ہاف سنچری کی۔" جونی بولا اور ہنس پڑا۔

"میں سمجھا نہیں چھوٹے سرکار۔" مالی بدستور ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"چاچا خواہ مخواہ... پچاسویں بندے کی جگہ دیکھ لو۔ اب سمجھ آ گئی ہے تو جاؤ۔" جیکی نے کہا۔

جب مالی چلا گیا تو جونی نے فخر سے میری طرف دیکھا۔ "اس

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کی تیسری نسل بھی ہماری غلام ہے۔ اس کا باپ ہمارے دادا کا ملی تھا اس کا بیٹا ہمارا شوفر ہے۔ یہ تین نسلوں کے راز دار ہیں اور وہ سب ایسے ہی راز ہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو بیسویں صدی کے مہذب قانون کے پابند اور ترقی یافتہ معاشرے میں اپنی بے نام حکومت چلا رہے تھے۔ جہاں قوانین ان کے اپنے تھے اور ان کی رعایا آج بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ اور پنجاب ہی نہیں سرحد اور بلوچستان میں بھی جاگیردار... وڈیرے اور پیر... قبائلی سردار اور سابق ریاستوں کے والی اپنے اپنے علاقے میں ایک مطلق العنان حکمراں ہیں جو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ وہی بادشاہوں کے مزاج والی جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ نے فارسی میں کہا کہ کبھی گالی پر خلعت دے سکتے ہیں تو کبھی سلام پر سزا۔ وہ سخی اور فیاض بھی ہیں مگر جبر و استیصال کے پیکر بھی... ملک کے قانون کی عملداری ان کے علاقوں کی سرحد تک ہے... آگے ان کا اپنا حکم چلتا ہے۔ ساری رعایا اس حکم کو نعوذ باللہ۔ خدا کے حکم سے بڑھ کر سمجھنے پر مجبور رہتی ہے۔ ان کے اپنے قید خانے ہیں اور ان کی دی ہوئی سزا کے خلاف اپیل صرف داورِ محشر کے حضور دائر کی جا سکتی ہے۔

یہاں میرے سامنے دو ایسے لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسی مطلق العنان حاکمانہ ذہنیت کے وارث تھے۔ یہ اپنے دشمنوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے اور بدخواہوں کو بھی اور ان کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹا دیتے تھے اور کوئی احساسِ جرم و ندامت ان کے ضمیر کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ وہ خوش باش اور عیش کوش تھے۔ یاروں کے یار بھی تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی اور دنیا ان کے لیے صرف عیاشی کے لیے بنائی گئی تھی۔ انھیں دنیا کی سیاست، ادب، ثقافت اور تاریخ و تمدن، تہذیب کے ارتقا اور علوم و فنون سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دنیا میں جو کچھ ان کی زندگی کے عیش و آرام میں اضافے کے لیے بازار میں دستیاب ہوتا تھا ان کی قوتِ خرید میں ہوتا تھا اور یہی غرور اُن کے لیے کافی تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے تائیدِ ایزدی سے ان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ حالات موافق نہ ہوتے تو مجھے ان کی دشمنی ملتی، جو ملاوٹ پر ایتھیلین کی دشمنی سے اتنی زیادہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہوتی جتنا ایک عام بم کے مقابلے میں ایٹم بم ہوتا ہے۔ خسرو جمشید نے بچاسویں بندے والی بات سمجھ لی تھی اور وہ خاصا ڈرا ہوا لگتا تھا۔

میں نے ان دونوں جوان، پارے کی طرح مضطرب، قوت سے بھرپور اور طاقت پر مغرور نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

"یہ بتاؤ جب تم لوگ کسی کو دوست کہتے ہو تو یہ لیس کھنے کی بات ہوتی ہے یا تم دوستی نباہتے بھی ہو؟"

"ہم خاندانی لوگ ہیں... ایسی گالی ہم نہیں سنتے کہ کوئی ہم پر بدعہدی کا طعنہ دے، بے غیرت سمجھے یا بزدل کہے۔" جیکی نے کہا۔

"جب دوست کہہ دیا تو پھر جان دینا یا جان لینا برابر ہے۔ جتنی آسانی سے ہم تمھارے دشمن کی جان لے سکتے ہیں اتنی ہی آسانی سے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد نے بارہا یہ ثابت کیا ہے اور وقت آیا تو ہم ان کی روحوں کو شرمندہ نہیں ہونے دیں گے۔" جونی بولا۔

"تو پھر ملاؤ ہاتھ۔" میں نے کہا۔ "میں کسی بہت اونچے خاندان سے تعلق کا دعویٰ تو نہیں رکھتا مگر میں بھی مرد ہوں... ویسا ہی مرد جیسے تم ہو۔ شجرۂ نسب کے سوا میری صفات وہی ہیں جو تمھاری اور وقت آیا تو تم دیکھو گے کہ میں نے صرف تمھاری برابری کے لیے ایسا نہیں کہا تھا۔ اب میں تم کو اس مسئلے کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

جیکی نے پھر منہ میں انگلیاں ڈال کے سیٹی بجائی... مالی کے نمودار ہوتے ہی اس نے کہا۔ "ان دونوں سے کہو جو گاڑی میں بیٹھے ہیں کہ اندر کوئی نہ آنے پائے۔"

"جی سرکار۔" مالی جانے لگا۔

"اور سنو۔" جیکی بولا۔ "ابھی تو کافی لاؤ... مگر ایک گھنٹے بعد، ہم اور ہمارے مہمان کھانا کھائیں گے۔"

"ایک گھنٹے بعد؟" مالی پریشان ہونے لگا۔

"چاچا خواہ مخواہ... کھانا منگوا لو... گاڑی میں جا کے لے آؤ۔" جیکی بولا۔

"یہ شخص..." میں نے مالی کے جانے کے بعد سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ "خسرو جمشید ہے۔ یہ نام کا نواب ہے مگر اس کا باپ واقعی نواب تھا۔ میرا باپ ایک صنعت کار تھا۔ وہ مر چکا ہے بلکہ جب میں برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اسے ایک سازش کے تحت مار دیا گیا۔ لیکن یہ قتل ثابت نہیں ہو سکا۔"

"یہی تو مشکل ہے... سب عدالتی قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ارے یار جب تمھیں یقین تھا تو پھر داد فریاد کی کیا ضرورت تھی۔" جیکی نے کہا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں پڑھا لکھا بزدل آدمی ہوں... جو قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہے۔ اس لیے کہ میرے پاس وہ طاقت نہیں جو تمھیں حاصل ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "وزیر خان کا سب سرمایہ اور جائداد... کوٹھی اور کارخانہ چھین لیا۔ اور کچھ ایسے حالات تھے یا میرے مرحوم والد کی غلطی تھی کہ مجھے معلوم نہ ہو سکا... مجھے واپس آنے کے بعد سب پتا چلا۔"

"پھر تم نے اپنے حق کے لیے عدالت میں درخواست دی؟" جونی نے طنز سے کہا۔

"نہیں... اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔" میں نے کہا۔ "قانونی طور پر مجھے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ میرے والد کے خلاف سازش کرنے والوں نے مجھے بھی سازش میں الجھا لیا اور میرے خلاف متعدد جھوٹے مقدمات بنا دیے گئے۔ مجھے فرار اور روپوش ہونا پڑا۔"

"کون ہیں وہ لوگ...؟ مجھے بتاؤ۔" جیکی نے میز پر مکا مارا۔

"جوش میں مت آؤ... میں بتا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے مجھے پیش کش کی کہ میں ان کے ناجائز کاروبار میں شریک ہو جاؤں۔ وہ اسمگلر تھے اور مجھے اپنا ایجنٹ بنانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا اور صرف اپنا حق مانگا۔ یعنی فیکٹری کی ملکیت مانگی۔ وہ پیسہ مانگا جو میرے والد سے چھین لیا گیا تھا اور کوٹھی، کار وغیرہ جو ان کے پاس تھی... ان کے انکار سے دشمنی کا آغاز ہوا۔ میرے ساتھ بھی دو چار دوست تھے۔ انھوں نے میری مدد کی نتیجہ یہ کہ آج ایک بہت بڑا دشمن ہمارا قیدی ہے اور ہماری شرائط پر جاں بخشی چاہتا ہے۔"

جیکی اور جونی نے نفرت سے جمشید کی طرف دیکھا۔

"اور وہ شرائط کیا ہیں؟"

"جہاں میرا کارخانہ تھا... یعنی میرے والد کا... وہ جگہ اس شخص کے پاس بیس لاکھ میں رہن رکھ دی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "رہن رکھنے والے اسلحے کے اسمگلر تھے اور مشرقی پاکستان کے تخریب کار علیحدگی پسندوں کو اسلحہ بیچتے تھے۔ انھوں نے فیکٹری میں بھی اسلحہ بنانا شروع کر دیا تھا۔"

"کس قسم کی فیکٹری تھی تمھارے والد کی؟"

"زرعی مشینری کے پرزے اور آلات بنانے کی..." میں نے کہا۔ "اس میں ریوالور اور پستول بننے لگے۔ جب راز افشا ہونے لگا تو اس جگہ کو رہن رکھ کے مشینوں کو منتقل کر دیا گیا اور فیکٹری گرا دی گئی۔ اس کی جگہ ایک اسپتال بنانے کا اعلان کر دیا گیا... غریبوں کے لیے... ظاہر ہے یہ سب رائے عامہ کو گمراہ کرنے اور پبلک کو دھوکا دینے کی کوشش تھی۔ اب سنو کہ کس طرح تم ان لوگوں کے چکر میں پڑنے سے بال بال بچ گئے۔ جو مشینیں اسلحہ بناتی تھیں وہ فیکٹری سے ہٹائی گئیں تو ان کے لیے متبادل جگہ کی تلاش کا مرحلہ آیا اور انھوں نے ایک عورت کو تمھارے والد کے پیچھے لگا دیا۔ اپنے ایک ایجنٹ کے ذریعے... کہ وہ تمھارا صنعتی پلاٹ حاصل کر لیں تاکہ یہ مشینیں وہاں لگائی جائیں۔"

"اوہ مائی گاڈ...!" جیکی نے سر پر ہاتھ مارا۔ "اتنا بڑا دھوکا۔ میں ڈیڈ کو بتاؤں گا۔"

"میں اس کو شوٹ کر دوں گا۔" جونی نے کہا۔

"دیکھو... تم وہی کرو گے جو میں کہوں گا... اس سے زیادہ کرو گے تو نقصان مجھے ہو گا۔" میں نے کہا۔ "وہ معاملہ تو ختم ہو گیا اب اُس کی بات ہی مت کرو... ہاں، وہ دوبارہ کوشش کرے تو یہ سب اپنے ڈیڈ کو بتا دینا... ابھی تو میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ اب یہ شخص میرے قبضے میں ہے۔ میں اس کو قتل کرنے کے لیے یہاں لایا تھا مگر اس نے خود ہی اپنی جان کے بدلے ایک سودا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں سودا کر لوں مگر میں ایک مفرور مجرم ہوں اور مجھ پر بہت سے جھوٹے مقدمات قائم ہیں۔ میں قانونی معاملات طے کرنے کے لیے عدالت میں حاضر ہوا تو عدالت مجھ سے پہلے میرے جرائم کا حساب پوچھے گی۔ جو اسپتال میری فیکٹری کی جگہ بن رہا ہے جمشید وہ اسپتال مجھے دینے پر تیار ہے۔ اس کے وکیل میرے وکیل سے مل کر سارے معاملات طے کریں گے۔ یہ شخص اسپتال کی عمارت اور ساز و سامان کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرے گا۔ زیرِ تکمیل عمارت کا قبضہ میرا دوست اور وکیل عبدالودود منتظر لے گا۔ وہ خود تم سے ملنے آئے گا۔ اسپتال کے مکمل ہونے میں تو شاید سال چھ مہینے لگ جائیں۔ اس کی لاگت کا جتنا تخمینہ ہے اتنی رقم خسرو جمشید کے اکاؤنٹ سے عبدالودود منتظر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائے گی تو پھر تکمیل کا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ جب تک منتقلی کے قانونی معاملات پوری طرح طے نہیں ہو جاتے تم اس شخص کو اپنی تحویل میں رکھو گے... سب سے چھپا کے... کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟"

جیکی مسکرایا۔ "کتنے سال رکھنا ہے؟"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ۔" میں نے کہا۔ "تم اس کے اور میرے وکیلوں سے ملاقات بھی خود ہی کر لو گے لیکن اس طرح کہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو... خصوصاً اس کے وکیل کو بالکل پتا نہ چلے کہ تم کون ہو اور تم نے جمشید کو کہاں قید کر رکھا ہے... تم جمشید سے پوچھ کر اس کے وکیل کو بلواؤ... یا اس کی فون پر بات کرا دو۔ انھیں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لاؤ یا کسی بند گاڑی میں۔ اصل بات یہ ہے کہ سارا کام ختم ہونے تک جمشید کی موجودگی صیغۂ راز میں رہے اور جب تک میرا وکیل کلیئرنس نہ دے تب تک اسے چھوڑا نہ جائے۔ اگر بعد میں یہ کسی بھی معاملے میں بدعہدی کرے تو تمھیں ہر طرح کا اختیار ہے۔ جس طرح چاہو یہ کام کراؤ۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اور بالفرضِ محال کام کسی صورت نہ بنتا ہو یا اندیشہ ہو کہ یہ بھاگ جائے گا یا اس کو چھڑانے والے چھڑا کر لے جائیں گے... تو پھر اس کے ساتھ وہی کرنا جو آج تک تم نے اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کے ساتھ کیا ہے۔ مختصر بات یہ کہ تمھیں میرا کام کرانا ہے۔ جمشید تمھاری تحویل میں ہے اور کام کیسے ہوگا، یہ بتانے کے لیے میرا وکیل خود تم سے رابطہ رکھے گا۔ کیا اتنا کافی ہے؟"

"یہ بہت کافی ہے۔" جیکی بولا۔ "آج سے دو مہینے کے اندر وہ اسپتال تمھارا ہوگا۔ اس کی تکمیل کی ضمانت کے ساتھ... ہم یہ ذمے داری قبول کرتے ہیں۔"

"اگر ایسا نہ ہوا تو دو ماہ کے بعد تم کو اس کی لاش مل جائے گی۔ ٹکڑے کرنے کے آلات اور قیمہ کرنے کی مشین کے ساتھ چیل، کوّے اور کتے بھی ہم فراہم کریں گے۔" جونی نے کہا۔

"تم نے مجھے بہت بڑے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اپنے خلاف مقدمات کے بارے میں نہیں بتایا... ہم صفائی کے گواہ وغیرہ پیش کرنے کا ٹھیکا بھی لے سکتے ہیں۔" جیکی بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تفصیلات میں پھر کبھی بتاؤں گا... وہ غیر ضروری ہیں۔"

"یہ تو ضروری ہے کہ ہمیں تمھارا نام معلوم ہو... اصل نام۔"

"ہاں... دوست مجھے سکندر بخت کے نام سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سکندر بخت!" ان دونوں نے ایک ساتھ چلا کے کہا "اوہ نو..."

"اوہ یس۔" میں نے مسکرا کے کہا "میں اب شیطان کی طرح مشہور ہوں۔"

"اوہ مائی گڈنس... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمھیں تو ہم ایسے جانتے ہیں جیسے... جیسے رابن ہڈ کو۔" جیکی بولا۔ اسے اردو کی کسی داستان کا کردار فوراً یاد نہ آیا۔

"تمھارے بارے میں ہم بہت کچھ پڑھتے رہے ہیں... تم تو ہیرو ہو ایک دم ہیرو۔" جونی بولا۔ "مائی گاڈ! لو آر اے سپرمین۔"

"میں سپرمین ہوتا تو یہ دنیاوی مشکلات کیا تھیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "مشکل تو یہی ہے کہ میں ایک عام آدمی ہوں۔ بہت معمولی سا حقیر اور کمزور... جسے کامل اعتقاد ہے تو خدا کی ذات پر اور اس کے قادرِ مطلق ہونے پر... چنانچہ میں جو کچھ کرتا ہوں، انجام کی پروا کیے بغیر کرتا ہوں... انجام تو صرف وہ جانتا ہے... پھر میں کیوں ڈروں... جو ہونا ہے وہ تو ہوگا۔"

"مگر... تم نے تو دھاک بٹھا رکھی ہے... میں نے سنا ہے کہ تم نے دشمنوں کے بہت سے قلعے فتح کیے ہیں جہاں ان کی فوج تھی... تم نے سب کو تہس نہس کر دیا۔ ان کے ٹینک توپیں تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور تم نے سب کا خانہ خراب کر دیا۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں نے سنا تھا کہ زیب داستان کے لیے لوگ بڑھا بھی دیتے ہیں مگر آج تجربہ ہوا کہ داستان جب ہوتی ہے تو ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے پہنچتے حقیقت کا عنصر کتنی تیزی سے کم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت غائب ہو جاتی ہے اور صرف افسانہ رہ جاتا ہے۔ یہ ہم سب کی کمزوری ہے کہ ہم حقیقت سے داستان کو زیادہ دلچسپ اور دلکش بناتے ہیں۔ ہمیں سپرمین اور ٹارزن جیسے افسانوی کردار اپیل کرتے ہیں اور ہم 'ہیرو ورشپ' کے عادی ہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کے تصوراتی ہیرو کا ایک خاکہ ہوتا ہے کبھی ایکٹر... کبھی کرکٹر اور کبھی آرٹسٹ یا سیاسی لیڈر... ہر صورت میں وہ غیر معمولی صفات اور اعلیٰ ترین اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ارے بھائی میں کچھ بھی نہیں... تم جیسا آدمی ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی ایک فوج کو شکست دے سکے۔ یہ تو ایسی فلموں میں ہوتا ہے جس پر اب بچّے بھی ہنستے ہیں۔"

"وہ دراصل... سنا بہت کچھ ہے تمھارے بارے میں اور اخباروں میں تمھارا نام بھی دیکھا ہے۔" جیکی جھینپ کر بولا۔

"آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔" جونی نے تائید کی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے چند ملک دشمن عناصر کا پتا چلا ہے۔ اور میں نے ان کے ایک دو ٹھکانے بھی تباہ کیے ہیں لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے دوست بھی تھے... میرے کچھ ساتھی تھے۔"

"اوہ یس... وہ ایک نام یاد آیا ہے مجھے محسن..."

"بالکل ٹھیک۔" جیکی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "اور ایک لڑکی ہے... بالکل صوفیہ لارین... ویری بیوٹی فل۔ جو تمھاری سویٹ ہارٹ ہے... کیا نام ہے اس کا...؟"

"رابعہ... رابعہ..." جونی نے فوراً کہا۔ "واٹ اے ونڈر فل گرل...!"

"مگر... وہ لڑکی... جو اس دن تمھارے ساتھ تھی۔" جیکی نے سوچ کر کہا۔ "وہ کون تھی... وہ رابعہ تو نہیں تھی... یہ رابعہ کیا پرانا اور آرتھوڈوکس نام ہے۔ وائی ڈونٹ یو کال ہر روبی؟"

"گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو، وہ گلاب ہی رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... وہ کچھ ایسا ہی شیکسپیئر نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ ہماری ایک ٹیچر تھی جیف کالج میں... شی واز کریزی فار شیکسپیئر۔" جیکی بولا۔ "ویسے تمھاری جگہ میں ہوتا تو اسے ایلزبتھ پکارتا۔"

"میں رابعہ پسند کرتا ہوں... کیونکہ میں رابعہ کو پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ تم نے کیا بھیس بدل رکھا ہے؟" جیکی بولا۔ "تمھاری اصل صورت تو کچھ رچرڈ برٹن سے ملتی جلتی ہے۔"

"اوہ نو... جان وائن سے..." جونی نے کہا اور ان کے درمیان زبردست تکرار شروع ہوئی۔

"پلیز... پلیز..." میں نے کہا۔ "نہ میری صورت رچرڈ برٹن سے ملتی ہے نہ جان وائن سے... میری صورت صرف اپنے آپ سے ملتی ہے۔"

جیکی نے سر ہلایا۔ "تم واقعی فلاسفر بھی ہو... مجھے تو بالکل یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو... میں سچ بتاؤں... میں تم جیسا بننا چاہتا ہوں... لیکن بن نہیں سکتا۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیوں نہیں بن سکتے؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں جان محمد عرف جیکی ہوں۔" وہ بولا۔

"جیکی... مجھے کچھ یاد آرہا ہے۔" جونی نے کہا۔ "تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈیڈ کی اس سے بحث ہوئی تھی۔ ڈیڈ نے اخبار میں تمھاری کسی پریس کانفرنس کا حال پڑھا تھا۔ تم نے دو ڈاکو پکڑے تھے۔ اور شاید کوئی قلعہ بھی فتح کیا تھا۔"

"قلعہ نہیں... ایک اسلحہ خانہ تباہ کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ڈیڈ نے تمھاری بہت تعریف کی اور کہا کہ ملک اور قوم کو ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے۔" جونی بولا۔ "اور معلوم نہیں کیوں وہ چڑ گیا۔ ہمارے ڈیڈ کی وائف نمبر ٹو کا برادر ان لاء جیف۔ اس نے کہا کہ یہ سب اخبار والوں کا ڈراما ہے، ورنہ وہ ایک قاتل اور ڈاکو ہے، جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہے اور پھر ان کے درمیان خوب بحث ہوئی تھی۔ اب میں سمجھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔"

"میں بھی سمجھ رہا ہوں۔" جیکی نے سر ہلایا۔ "وہ تمھارا ایک دشمن تھا اور یہی وجہ تھی کہ تم دونوں جب ہمارے گھر میں ملے تو تم نے ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کی۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو... اور سب جانتے ہو اس لیے تمھیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "میں تم پر پورا بھروسا کرتے ہوئے ایک کام تمھیں سونپ رہا ہوں۔"

"اس کے علاوہ کچھ بتاؤ... تمھیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" جیکی بولا۔

"کسی بھی وقت... دن رات کی پروا کیے بغیر..." جونی نے کہا۔ "تم ہمیں بلا سکتے ہو... ہمارے پاس آسکتے ہو... ہمیں فون کر سکتے ہو... یہ جگہ تو دیکھ ہی لی ہے تم نے... تم کو یہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا... تم یہاں رہ سکتے ہو کیونکہ ڈیڈ بھی اِدھر نہیں آتے۔"

"اور آ بھی جائیں تو کیا... ہی از یور فین ٹو۔"

میں ہنسنے لگا۔ "مجھے ان کی دعائیں چاہئیں... مگر دوستو! ابھی تم اس بات کو سیکرٹ رکھو گے... یوں سمجھ لو کہ ہم ملے ہی نہیں... یہ ایک طرح سے میری بہت بڑی مدد ہوگی کہ تمھاری مورل سپورٹ حاصل ہے مجھے... یہ جگہ... تمھارا فون نمبر سب میرے پاس ہیں... اگر مجھے ضرورت پڑے گی تو میں ضرور آؤں گا یا کال کروں گا... لیکن فی الحال اپنے جذبات کو قابو میں رکھو اور کسی سے کچھ مت کہو... اگر یہ کام کر دیا تم نے... جو میں نے تمھیں سونپا ہے... تو یہ ایک احسان ہوگا مجھ پر..."

مالی نے دروازے کو انگلی سے بجایا۔ "کھانا حاضر ہے مالک۔"

"لے آؤ۔" جیکی نے کہا۔ مالی ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا۔ اس میں اوپر نیچے درمیان کی تینوں ٹرے کھانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسے کھانوں کی مدت سے میں نے خوشبو تک نہیں سونگھی تھی۔

"یہ سب... اتنے کم وقت میں کہاں سے اکٹھا ہو گیا...؟" میں نے کہا۔

"میرے نوکر جانتے ہیں کہ کہاں سے کون سی چیز لانی ہے۔" جیکی نے فخر سے بتایا اور پھر تفصیل سے بتانے لگا کہ مرغ بریانی کس ہوٹل کی ہے اور مرغ قورمہ کس ہوٹل کا ہے... اب چونکہ صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی، اس لیے میں نے خسرو جمشید کو بھی کھانے کی اجازت دی مگر اُسے الگ بٹھایا۔ میرے لیے اس شخص کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کے کھانے کا خیال ہی اذیت ناک تھا جسے میں اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

"واٹ اباؤٹ دیٹ گرل؟" جیکی کھاتے کھاتے بولا۔

"وہ سو رہی ہے... بہت تھکی ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ ہے کون؟"

"ابھی میں خود نہیں جانتا... کہ وہ دوست ہے یا دشمن۔" میں نے کہا۔

"پھر اُسے ساتھ کیوں لیے پھر رہے ہو؟" جیکی بولا۔

"تمھیں کیوں اعتراض ہے اگر وہ ایک گرل فرینڈ ساتھ رکھتا ہے۔" جونی بولا۔

میں مسکرایا۔ "ہے تو وہ گرل فرینڈ... لیکن صرف زبانی جمع خرچ تک... ہم ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔"

"کمال ہے... پھر بھی کہتے ہو کہ..."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ہاں... دراصل وہ سرحد پار سے آئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہتی ہے صرف میرے لیے... مجھے شک ہے کہ جاسوسی کے لیے... وہ ہندو بھی ہے۔"

"پھر تو تمھارا شک جائز ہے۔" جیکی بولا۔

"شک بالکل غلط ہے۔" جونی نے کہا۔ "یہ بچپن کی محبت ہے اور ناخالص ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تم کیا جانو... تمھیں کس سے محبت تھی بچپن میں یا ایسی کون سی لڑکی ہے..."

"میں نے ناولوں میں پڑھا ہے... فلموں میں دیکھا ہے۔" جونی بولا۔

"وہ سب بکواس ہے... میں جانتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں جانتے۔"

"میں تم سے بڑا ہوں... دس منٹ۔" جیکی نے میز پر مکّا مارا۔

"تم دونوں بالغ ہو کے بھی بچے ہو۔" میں نے اُن کی جنگ پھر ختم کی۔ "میں اس عورت کو بھی فی الحال چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

جیکی کا ہاتھ رک گیا۔ "ہمارے پاس؟"

"ہاں... کیا تم سے نہیں رکھ سکتے؟" میں نے کہا۔

"لیکن کیا وہ رہے گی؟"

"اسے رہنا پڑے گا... قید میں رکھنا ضروری نہیں... بس اس سے کہہ دینا کہ میں واپس آؤں گا اور وہ میرا انتظار کرے۔"

"لیکن... شی از ویری بیوٹی فل..." جیکی نے بے بسی سے کہا۔

"اور ہم... اگر امانت میں خیانت ہو گئی تو... دوستی کا نام بدنام ہو جائے گا۔" جونی بولا۔

"نہیں ہوگا..." میں نے اُسے آنکھ ماری۔ "وہ تمھاری اچھی گرل فرینڈ ثابت ہوگی۔ اس کے عیش و آرام کا خیال رکھنا اور اسے کمپنی دینا... ڈے اینڈ نائٹ... پھر وہ کہیں نہیں جائے گی... اور جانا چاہے تو جانے مت دینا... کچھ ایسا بندوبست کرنا کہ اُسے احساس نہ ہو کہ وہ قید میں ہے لیکن وہ بھاگنے نہ پائے۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا... شاید ایک ہفتے بعد تو اسے لے جاؤں گا۔" میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔"

وہ پھر دم بخود رہ گئے۔ "یہ کیا ہوا بیٹھے بیٹھے؟"

"میں جلدی میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "قسمت کو تم سے ملانا تھا اس لیے یہاں آ گیا تھا... میری منزل کچھ اور ہے۔"

"تمھیں... پیسہ وغیرہ تو نہیں چاہیے؟"

"تمھیں پیسے کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اپنی ذمہ داری تم پر ڈال کے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ڈیڑھ لاکھ ہیں میرے پاس۔"

"اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں یہاں نہیں بتا سکتا۔" میں نے کہا۔ "باہر آؤ... اور اپنے دونوں محافظوں کو بلاؤ کہ وہ یہاں نظر رکھیں... تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا... شہر تک..."

جیکی اور جونی بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جیکی نے منہ میں انگلی ڈال کے سیٹی بجائی اور جب مالی نمودار ہوا تو اسے حکم دیا کہ دونوں میں سے ایک محافظ کو بلا لے۔

"تم لوگ سب سمجھ گئے ہو نا؟" میں نے باہر آ کے کہا۔ "میں کراچی جا رہا ہوں... وہاں سے میں تم کو فون کرتا رہوں گا... یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پروگریس کیا ہے... اور سب ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں۔"

"اپنے اس مشکل نام والے وکیل کو بھی سمجھا دینا۔" جیکی بولا۔

"تم اسے صرف منظر کہہ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ تم کو فون کرے گا۔"

"یہ گاڑی تمھاری ہے؟" جیکی بولا۔

"نہیں... تم اسے لے جاؤ... اور کسی بھی سڑک پر یا پولیس اسٹیشن کے سامنے چھوڑ دو... یہ میں نے چوری کی تھی۔" میں نے کہا۔ "پولیس خود اسے منظر کے گھر پہنچا دے گی..........."

"ایک بات اور... تم کو اپنی دوسری ماں کی طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ وہ خسرو جمشید کی بہن ہے۔"

وہ اُچھل پڑے۔ "بہن... یہ کیا ہے... ہر پانچ منٹ کے بعد تم ایک ایٹم بم گرا دیتے ہو۔"

"وہ خسرو جمشید کی حقیقی بہن ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تم جمشید کو قید میں رکھو گے تو وہ ایک پرابلم ہو گی... میرا مطلب ہے اسی گھر میں اگر بہن بھی ہو گی تو تمھارا کام زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"مشکل تو ہو جائے گا... لیکن ہم ہینڈل کر لیں گے۔" جیکی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "تم مطمئن رہو۔"

"جونی... تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ملتان سے ایک کار خریدنی ہے... کار یا جیپ۔ پچاس ساٹھ ہزار تک جو کراچی تک سفر کے قابل ہو۔ اس کی رجسٹری وغیرہ سب بوگس نام سے ہونی چاہیے... تاکہ میں محفوظ رہوں۔"

"نو پرابلم..." جونی نے چٹکی بجا کے کہا۔ "تم کار لو اور جاؤ۔ باقی کام مجھ پر چھوڑ دو... ایک گھنٹے میں پیپرز مل جائیں گے۔"

جونی نے واقعی ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ اسے لوگ جانتے تھے۔ یہ اثر و رسوخ کی بات تھی۔ پیسے کی یا ذاتی تعلق کی۔ مگر ملتان میں اس کے بہت دوست تھے۔ نیچے سے اوپر تک وہ ہر کام کرا سکتا تھا۔ وہ شام تک میرے ساتھ رہا اور اس نے میرے بہت سے ایسے کام کیے جو میں اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار مجھے ایک اوپل ریکارڈ ملی جو چھیاسٹھ کا ماڈل

تھی اور اس کا اٹھارہ سو سی سی کا انجن بے حد طاقتور اور سبک خرام تھا۔ یہ لگژری کار تھی اور مجھے کچھ مہنگی بھی پڑی لیکن جونی نے مجھے مجبور کر دیا اور کچھ میں خود بھی اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس چوکور تھیں اور پیچھے کی لائٹس بالکل گول۔ آدھے دائرے میں بریک لائٹ اور انڈی کیٹر... دوسرے کے آدھے دائرے میں بیک لائٹ اور پارکنگ لائٹ۔ اس کی ڈکی بھی بڑی تھی اور پیچھے والی سیٹ بھی۔ جونی نے رجسٹریشن کے کاغذات میں میرا نام آغا سعادت علی خان گردیزی لکھوایا اور اس پر اپنا پتا دیا۔ اس نے کہا کہ ایسی ویسی کوئی بات ہو گی تو ہم یہاں نمٹ لیں گے۔ اس نام سے تم ہمارے فیملی ممبر ثابت ہوتے ہو۔

جونی کی مدد سے ہی مجھے ڈرائیونگ لائسنس بھی ملا جس پر میرا یہی نام تھا لیکن تصویر قدرے مختلف تھی۔ میں جونی کے سوٹ میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے دو سوٹ دے دیے تھے اور کچھ کپڑے میں نے بازار سے بھی خرید لیے تھے۔ بہترین سوٹ، ٹائی، سنہرے فریم کے چشمے اور گنجے سر کے ساتھ میں ایک مل اونر، بزنس ایگزیکٹو یا سیکرٹری کے لیول کا بگ باس نظر آتا تھا۔ مجھے روکنے یا چیک کرنے کی ہمت کرنے سے پہلے ڈی ایس پی کے عہدے کا پولیس افسر بھی دو بار سوچتا۔

شام کو میں نے جونی کو خدا حافظ کہا۔ اس وقفے میں جب وہ میرے ساتھ تھا میں نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا جو پہلے نہ سمجھا سکا تھا۔ اب ان دونوں پر میرا اعتماد قائم ہو چکا تھا اور میں مطمئن تھا کہ ایک طرف سے ذمہ داری اور پریشانی کا بوجھ بھی کم ہوا اور ایک مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

رات کے نو بجے میں نے کار کو عین اس مقام پر روک لیا جہاں میں نے ایک جھاڑی میں دو سوٹ کیس پھینکے تھے۔ اس تنگ سڑک پر اب نہ اسٹیشن ویگن تھی اور نہ خسرو جمشید کی مرسیڈیز مگر دونوں سوٹ کیس وہیں پڑے ہوئے تھے۔

میں نے دونوں سوٹ کیس ڈکی میں ڈالے اور کچھ دیر اس منظر کے تصور میں گم رہا جس کے ٹکڑے اسی سڑک پر یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔ ٹریننگ کیمپ سے جہاں تخریب کار خود اپنے پھیلائے ہوئے دامِ اجل کا شکار ہو گئے تھے، اس مقام تک جہاں میں نے اور موہنی نے چھپ کر ایک رات بسر کی تھی اور آخری خونی جھڑپ تک جس میں خسرو جمشید کا ہم صورت مارا گیا تھا۔ اب یہاں کوئی نہیں تھا۔

میں نے گاڑی کا رُخ موڑا اور واپس اسی راستے پر روانہ ہو گیا۔ آگے ایک طویل رات کا سفر تھا جس میں میرے ساتھ صرف میری یادیں تھیں اور سوچیں تھیں اور میرے اندیشے تھے۔ کیا جیکی اور جونی وہ سب کچھ کر لیں گے جو میں نے ان کو سمجھایا ہے۔ خسرو جمشید یا اس کی بہن ان کے ارادوں کی شکست کا سبب تو نہیں بن جائیں گے۔ موہنی کا ردِعمل کیا ہوگا؟ میں اُسے کچھ بتائے بغیر بھاگ آیا تھا۔ دراصل میں اس کو ساتھ رکھنے کے اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار سے بچنا چاہتا تھا۔ رابعہ کی تلاش میں میرے ساتھ رابعہ کے خیال کی رفاقت اور اس کی چاہت اور اس کے جمالِ دل نشیں کا تصور بہت تھا۔

مجھے بہت سے کام بھی کرنے تھے۔ ان میں سرِفہرست عبدالودود منظر کو فون کرنا تھا اور اسے تمام صورتِ احوال سے آگاہ کرنا تھا۔ اُسے یہ بتانا تھا کہ اگر محسن یا غالب میں سے کوئی اس سے رابطہ قائم کرے تو انھیں میری خیریت سے مطلع کرے۔ مجھے شہلا کی خیریت بھی دریافت کرنی تھی اور اس سے پوچھنا تھا کہ رابعہ، نازو یا اکرام شیخ میں سے تو کسی کا کوئی پیغام نہیں ملا۔

صبح میں حیدر آباد میں تھا۔ رات بھر کی ڈرائیونگ نے مجھے جسمانی طور پر بہت تھکا دیا تھا۔ اس سے گزشتہ رات بھی میں نہیں سویا تھا اور اگر رابعہ کی کشش نہ ہوتی تو میں دوسری رات جاگ کر ڈرائیونگ کا خطرہ مول نہ لیتا۔ لیکن جیسے جیسے فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے ذہن سے سب کچھ فراموش ہو رہا تھا اور رابعہ جو کہیں دشتِ خیال کی وسعتوں میں گم تھی اپنے قرب کی خوشبو سے میرے قلب و نظر کو مہکانے لگی تھی۔ یادِ ماضی کا ہر نقش جاگ اٹھا تھا اور ایک خواب بن گیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر میری دسترس میں ہونے لگی تھی۔ قریب آتی جا رہی تھی۔ خواہش میں رنگِ جنوں شامل ہونے لگا تھا۔

حیدر آباد میں مجھے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری جسمانی توانائی کا گراف زیرو پر آ گیا ہے۔ کئی بار میری آنکھیں خود بخود بند ہوئیں اور پھر میری چھٹی حس نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے خود کو مستعد رکھنے کی کوشش میں ناکام پایا۔ میرا جسم میرے ذہن کے تابع نہیں رہا تھا اور ایسی حالت میں کار چلانا حادثے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

میں نے ایک ہوٹل میں دن بھر قیام کا فیصلہ کیا۔ رات اس اعتبار سے محفوظ رہی تھی کہ مجھے کسی نے روکا نہیں تھا۔ جہاں کہیں بھی چیک پوسٹ آئی تھی میں نے اپنی رفتار اس حد تک کم کر لی تھی کہ دیکھنے والے مجھے ایک معزز شخصیت کے روپ میں دیکھ لیں۔ انھوں نے مجھ سے تعرض نہیں کیا تھا۔ میں انھیں کسی بھی پہلو سے مشکوک نظر نہیں آیا تھا۔ اُلٹا وہ مجھے روکنے سے بھی اس لیے گریز کرتے رہے کہ عموماً ایسی فرض شناسی کا صلہ خرابی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

ایک بیل بوائے میرے دونوں سوٹ کیس اُٹھا کے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ آئی پی سوئٹ میں لے گیا جو اتفاق سے صبح ہی خالی ہوا تھا۔ میں نے غسل کے بعد ناشتا روم سروس سے طلب کیا اور ناشتے کے بعد سو کر اُٹھا تو لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے چنانچہ میں نے پھر کافی اور سینڈوچ طلب کیے۔

مجھے رات کو پھر سفر کرنا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آٹھ بجے روانہ ہو جاؤں تو دس بجے تک کراچی پہنچ جاؤں گا۔ جسم مزید آرام کا متقاضی تھا تو دل تاخیر کا روادار نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں رات بھر سو کے صبح چھ بجے روانہ ہو جاؤں اور صبح کے آٹھ بجے کراچی پہنچ جاؤں۔ یوں میں بالکل تازہ دم پہنچوں گا تو مجھے پورا دن ملے گا۔ رابعہ، نازو یا اکرام شیخ کا پتا چلانا آسان نہ ہوگا۔ اس کا تو مجھے اندازہ تھا۔ ہزاروں جھگیوں میں رہنے والے لاکھوں افراد میں سے کسی لاوارث اور گمنام شخص کو تلاش کیا جا سکتا تھا مگر جو روپوش ہوا اس کا پتا کون بتائے گا۔

دروازے پر دستک سُن کے میں نے کہا "یس"۔ اور روم سروس کا ویٹر کافی کے ساتھ کلب سینڈوچ کی پلیٹ رکھ گیا۔ اسی ٹرے میں اخبار بھی تھا۔ اوپر کے صفحے کو میں نے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے اور کافی پیتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ اس پر بین الاقوامی اور اہم ملکی خبریں تھیں۔ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی کے ابتر ہوتے ہوئے حالات کی تفصیل پڑھنے سے میں نے عمداً گریز کیا۔

یہ کراچی سے آنے والا اخبار تھا۔ اندر کا پہلا صفحہ شہر کی مقامی خبروں کے لیے وقف تھا۔ دلچسپ خبریں باکس میں لگائی گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک خبر نے مجھے متوجہ کر لیا۔ یہ چند سطروں کی خبر تھی مگر میں نے اُسے پڑھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھا۔ جب گرم کافی میرے کپڑوں پر گری تو میں چونکا۔ اس خبر نے میرے ہوش گم کر دیے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کی دھڑکن میں طوفانی شدت آ گئی ہے۔ پسینے کی نمی جو میرے ماتھے پر نمودار ہوئی تھی اب میرے جسم پر ٹھنڈک بن کے پھیل رہی تھی۔ خوف بن کے میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر رہی تھی۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی جس کو بندرگاہ کے علاقے سے مردانہ لباس میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، ہاربر پولیس کی تحویل سے فرار ہو گئی۔ ہمارے نمائندے کی اطلاع کے مطابق اس نے اپنی حفاظت پر مامور دو پولیس والوں کو زخمی کر دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ایک اے ایس آئی کو اسی کے ریوالور کی ضرب سے بے ہوش کر دیا اور شکایت درج کرانے کے لیے آنے والے ایک تاجر سے اس کی گاڑی چھین لی جسے اس نے فرار کے لیے استعمال کیا۔ دونوں پولیس والوں کو بازو اور ٹانگوں کے فریکچر کے باعث ہسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔ ڈی ایس پی ہاربر نے غفلت برتنے کے الزام میں تھانے کے متعلقہ عملے کو معطل کر دیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لڑکی کسی خطرناک تخریب کار گروہ کی رکن ہو سکتی ہے۔ پولیس اسے سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر پڑھ کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے محدود حلقے میں مقامی خبروں کے درمیان جگہ ملی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس خبر کو لاہور یا راولپنڈی کے اخبارات نے بھی شائع کیا ہو۔ وہاں کی مقامی خبروں کے لیے دوسرے سنسنی خیز واقعات ہوں گے۔ چنانچہ محسن یا غالب اور میرے دوسرے ساتھیوں کو اس خبر کی تفصیلات معلوم ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کراچی کے دوسرے اخبارات دیکھنے سے مجھے اضافی معلومات حاصل ہو جائیں۔ ہر اخبار کا نمائندہ اپنے وسائل رکھتا ہے اور کسی خبر کی تہ تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کرتا ہے، اس کا انحصار اس کی ذاتی دلچسپی اور لگن پر ہوتا ہے۔

مجھے ذرا بھی شبہ نہ تھا کہ وہ آفت کی پرکالہ جس نے اس سنسنی خیز خبر کو جنم دیا، نازو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ خبر میں اس کا نام تو نہیں تھا مگر ہر سطر پکار پکار کے کہتی تھی کہ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں تو وہ نازو ہے۔ اس نے ہمارے اونگھتے سونگھتے غیر حاضر دماغ اور سلو موشن میں حرکت کرنے والے پولیس والوں کو بتا دیا کہ بجلی کیسے کوندتی ہے اور جس پر گرتی ہے اُسے کتنا بے دست و پا چھوڑ جاتی ہے۔

اس منظر کے تصور سے ہی مجھے ہنسی آئی جب پولیس کے لٹھ مار اکڑ خاں قسم کے جوانوں پر انکشاف ہوا ہوگا کہ 'سوہنا منڈا' تو درحقیقت النھڑ مٹیار ہے۔ اور اس ناقابلِ اعتبار تبدیلیِ جنس کے کیس پر ان کی عقل دنگ ہوگی تو نازو کے حسنِ قیامت خیز نے ان کے دل پر چھری پھیر دی ہوگی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنی قسمت پر الگ رشک کر رہے ہوں گے جس نے ان کے ہاتھوں میں ایسا دل کو خوش کرنے والا کیس دیا اور سب باری باری [illegible] کے لیے بے قرار ہوں گے۔ پھر اچانک انھوں نے وہ دیکھا ہوگا جو ان کے تصور میں بھی نہ ہوگا اور جب ہوش آیا ہوگا تو نظر آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا۔ کی داستانِ عبرت بنے پڑے ہوں گے۔ نازو ایک جلوہ گر تھی جو تماشا دکھاتے وقت ناظرین کی توجہ ایک طرف مرتکز کرتا ہے تو دوسری طرف ہاتھ کی وہ صفائی دکھا جاتا ہے جو بالکل ناممکن اور جادو کا کرشمہ لگتی ہے۔ نازو بھی بے حد عیاری اور بھولپن سے سب کو اپنے حسنِ بے مثال، اپنی نزاکت و رعنائی اور قاتل اداؤں کے جال میں بے بس کرنے کی اہل تھی اور جب وہ دیکھتی تھی

سب بیٹا ماندہ ہو گئے ہیں تو وہ یوں حرکت میں آتی تھی کہ اس بت کی تیزی کو نہ آنکھ دیکھ پاتی تھی اور نہ عقل سمجھ پاتی تھی۔

سب نے اُسے ایک دھان پان کمزور سی لڑکی، صنفِ نازک ناقص العقل عورت جان کے اس کی طرف سے غافل ہونے کی غلطی ہوگی اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ اتنے شیر دل سورما مردوں کے درمیان سے ایک لڑکی نکل کے کہاں جا سکتی ہے۔ پھر اُسے صنفِ نازک ہونے کا فائدہ بھی ملا ہوگا۔ اس کے ساتھ تھانے میں وہ سلوک نہیں کیا گیا ہوگا جو ہر نئے مہمان کے ساتھ روایتی طور پر استقبال کے لیے کیا جاتا ہے اور یہ احساس دلانے کے لیے کیا جاتا ہے کہ جناب اس مطلق العنان حکومت کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں جہاں دنیا کے قانون یا خوفِ خدا وغیرہ کا کوئی کام نہیں۔ ہاں کام ہے تو نام کا یا کسی کے نام کا "رشوت یا سفارش کا" جیسا کام ویسے دام سفارش کے لیے آتا ہی بڑا نام ہو تو آرام ہی آرام ورنہ جینا حرام اور ہر نا ایک الزام۔

نازو کے متعلق بہت کچھ اخبار کی اس مختصر خبر میں نہیں تھا کہ اسے بندرگاہ کے علاقے سے کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔ بندرگاہ کا حوالہ بھی اسے نازو ثابت کرتا تھا کیونکہ میری آخری اطلاعات کے مطابق نازو اور اکرام شیخ دونوں وہیں سرگرمِ عمل پائے گئے تھے۔ خبر میں اکرام شیخ کا تذکرہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی بہن کی رہائی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا مگر یہ ناممکن تھا کہ وہ قرب و جوار میں موجود نہ رہا ہو۔ وہ گرفتاری کے وقت نہ ہوا تو بعد میں تھانے کے آس پاس ہی منڈلا رہا ہوگا۔ تاہم میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ اکرام شیخ نے کسی خطرناک مشن پر اسے ہمراہ رکھنا مناسب نہ سمجھا ہو یا وہ کسی معمولی سے کام کو اکیلا ہی نمٹانے چلا گیا ہو۔

نازو کا مردانہ حلیے میں پھرنا ایک دلچسپ بات تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہن نے مکمل طور پر خود کو ایم آر ایس کے مشن کے لیے وقف کر دیا ہے اور اپنے ساتھ بھائی کو بھی شامل کر لیا ہے۔ انہیں ہمارے بارے میں کوئی اطلاع تھی یا نہیں وہ دوسروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر چکے تھے یا نہیں اور انھیں ہمارے پروگرام کا علم تھا یا نہیں، ان سوالات کا جواب وہ خود ہی دے سکتے تھے۔ تاہم ایک بات واضح تھی۔

نازو اور اکرام نے اپنا علیحدہ محاذ کھول رکھا تھا۔ انھوں نے شہزادہ سب سے کٹ کر اور ایم آر ایس کے مرکز سے جدا ہو کے رہنما اپنی رہنمائی سے قبول نہیں کیا تھا اور نہ انھیں کوئی شوق تھا کہ وہ کسی سے مدد لیے بغیر کوئی کارنامہ سرانجام دینے کا اعزاز حاصل کریں۔ وہ حالات کے گرداب میں پھنس گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بہت بڑے محاذِ جنگ پر ایک بٹالین دشمنوں کے علاقے میں محصور ہو

جائے تو اپنی بقا کے لیے ہائی کمان کی پالیسی اور ان کے مشوروں اور ان کی ہدایات کے بغیر بھی لڑائی جاری رکھے، اپنی اسٹریٹجی بھی خود مرتب کرے اور اپنے وسائل پر انحصار کو ناگزیر جان لے۔

خبر میں نازو کا نام بھی نہیں تھا۔ پولیس والے اور کچھ پوچھیں نہ پوچھیں نام اور شجرۂ نسب ضرور پوچھتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ اسامی کیسی ہے کُڑکُڑ دیسی مرغی ان کے دڑبوں کی زینت بڑھاتی ہے اور جوتا کاری کی مشق میں کام آتی ہے۔ ولایتی مرغی کو وہ انڈے دیتے رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی ایک وی آئی پی ہوتی ہے۔ چنانچہ زیرِ تفتیش مجرموں کی درجہ بندی کی جائے تو آوارہ گردی کے الزام میں دھرے جانے والے لاوارث یا لڑائی جھگڑے میں اور پولیس کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہونے والے پہلی قسم کے مجرم سمجھے جا سکتے ہیں۔ چور اور گرہ کٹ دوسری قسم کے جو انھیں باقاعدہ نذرانے پیش کرتے رہتے ہیں اور ڈاکو تیسری قسم کے۔ ان سے لاکھوں کا مال ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب گورنمنٹ زیادہ انکم ٹیکس دینے والوں کو معزز اور مراعات یافتہ طبقے میں شمار کرتی ہے تو پولیس انھیں کیوں نہ سمجھے جو زیادہ مال دیتے ہوں۔

نازو کے بارے میں یہ پہلی اطلاع لہو گرمانے والی تھی۔ اس سے نازو کا پتا تو نہیں ملتا تھا مگر یہ امید ضرور ملتی تھی کہ اب وہ بے نام و نشاں نہیں رہی۔ کسی نہ کسی ذریعے، حوالے سے اسے کراچی میں ڈھونڈ نکالنا مشکل تو ہوگا مگر بہت مشکل نہیں ہوگا۔۔ میں ہوٹل کے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے سخت مضطرب تھا۔ رابعہ کا خیال پس منظر میں چلا گیا تھا لیکن آہستہ آہستہ خبر کی سنسنی خیزی کا اثر کم ہوا تو وہ بھی احساس کے فوکس میں اُبھرنے لگی۔ یہ بالکل ایک نہ شد دو شد والا کیس تھا۔ میں رابعہ اور صرف رابعہ کی جستجو میں آیا تھا اور اس مقصد کے حصول سے پہلے کوئی مقصد نہ تھا۔

اب میں سوچنے پر مجبور تھا کہ کسے پہلے تلاش کروں۔ رابعہ جہاں بھی تھی خیریت سے تھی اور دوری کے احساس اور جدائی کے غم کے سوا اسے کوئی دکھ نہ تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ آرام سے ہے اور مجھے اس کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ یہ جدائی ایک وقتی مجبوری ہے اور ناگزیر ہے جس کا سبب جاننا بھی ضروری نہیں لیکن نازو پریشانی میں مبتلا تھی۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا بھائی اکرام بھی اس کے ساتھ ہے یا خدانخواستہ۔۔۔

اس خدانخواستہ کے آگے بہت سے پریشان کرنے والے اور ڈرانے والے خیالات کا سلسلہ تھا۔ کہیں وہ دشمنوں کے قبضے میں تو نہیں، کہیں وہ اپنوں کی قید میں تو نہیں، کہیں وہ زخمی تو نہیں۔۔۔ کہیں وہ مارا تو نہیں گیا۔ میں ایسی کوئی بات سوچتا تو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نہیں چاہتا تھا مگر سورج کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کا کوئی طریقہ مجھے نہیں آتا تھا چنانچہ یہ وحشت زدہ کرنے والے خیالات بھی بدروحوں کی طرح مجھ سے چمٹے ہوئے تھے۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے مجھے نازو کا ہی سراغ لگانا چاہیے۔ جب وہ مل جائے گی تو رابعہ بھی مل جائے گی۔ نازو مجھے خود اس سے ملا دے گی۔ اس کام میں وہ میری بہترین معاون ثابت ہوگی۔ اکرام شیخ، میں اور نازو مل گئے تو ایسے ہوں گے جیسے آرمی ایئرفورس اور نیوی کی متحدہ قوت اور ہماری مشترکہ جدوجہد رابعہ کو آزاد کرانے میں زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکے گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے روم سروس سے رابطہ قائم کیا۔

"یس سر۔" مستعد نوجوان نے کہا۔

"مجھے آج کے اخبارات چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"اخبار آپ کے کمرے میں موجود ہے سر۔"

"میں نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔" میں نے رکھائی سے کہا۔ بڑے لوگوں کی طرح۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمام اخبارات۔"

"تمام اخبارات؟"

"ہاں... وہ سب جو کراچی سے یا حیدرآباد سے شائع ہوتے ہیں۔ صبح کے بھی اور شام کے بھی۔ انگریزی، اردو، سندھی، گجراتی اور اگر لاطینی عبرانی اور ڈچ زبان کے ہوں تو وہ بھی۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔ دوسری طرف ریسیور تھام کر ہونقوں کی طرح بیٹھے ہوئے شخص نے یقیناً دل میں کہا ہوگا کہ یہ سارے پیسے والے خبطی کیوں ہو جاتے ہیں۔ بس ہر چیز خرید کر حاضر کر دو، خواہ وہ کام کی ہو یا نہ ہو اور ملے یا نہ ملے۔

اخبارات کے لیے مجھے تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے اس پریشان کن مطالبے کو پورا کرنے کے لیے خصوصی انتظام کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے بندے کو کسی بڑے نیوز ایجنٹ کے پاس بھیجا ہوگا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ شخص اپنے مشن سے کامیاب لوٹا اور تقریباً دس پونڈ اخبارات اور رسائل کے وزن سے ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔

"سب مل گئے سر۔" وہ بولا۔ "بس عبرانی کا نہیں ملا۔"

حیران ہونے کے باوجود میں نے اُسے سو کا نوٹ انعام میں دیا تو اس کے ماتھے کا پسینہ اور جسم کی تھکن کا معاوضہ ادا ہو گیا۔ وہ سچ مچ غیر ملکی زبانوں کے پرانے اخبارات بھی اُٹھا لایا تھا۔ ملکی اخباروں میں بھی سندھی اور گجراتی روزنامے میرے لیے بے کار تھے۔ میں نے صبح کراچی سے شائع ہونے والے پانچ اردو کے اور دو انگریزی کے اخبارات الگ کیے۔ شام کے چار اخبارات جو سنسنی خیز خبروں کی توانائی سے چلتے ہیں، میں نے پہلے دیکھے۔ مجھے اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی۔

شام کے ایک اخبار نے اس کار کی تصویر شائع کی تھی جو پولیس کو جیکسن کے علاقے سے لاوارث کھڑی ہوئی مل گئی تھی۔ اس کار کو 'خوفناک حسینہ' نے فرار کے لیے استعمال کیا تھا۔ تصویر میں کار کا نمبر تک واضح تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ کار سے پولیس کو اس لڑکی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ اپنے فنگر پرنٹ تک صاف کر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کار کے مظلوم مالک کی تصویر تھی اور بیان تھا۔ اس نے فریاد کی تھی کہ وہ اپنے گھر پڑنے والے ایک ڈاکے کی رپورٹ درج کرانے گیا تھا مگر تھانے میں جاکے اور لُٹ گیا اور اب پولیس اُسے زبردستی اس کیس میں ملوث کر کے مزید لوٹنا چاہتی ہے۔ پولیس نے روایات کے مطابق یہ مؤقف اختیار کر لیا تھا کہ کار والا بھی اس جیمز بونڈ مارکہ ایجنٹ زیرو زیرو سیون کے زنانہ ایڈیشن کی مدد کے لیے بروقت کار لے کر باہر موجود پایا گیا تھا چنانچہ وہ اس کا ساتھی ہے اور نہیں ہے تو ثابت کرے ورنہ عدالت کا فیصلہ ہونے تک صبر کرے یا کچھ دے دلا کرکے پھر اپنی کار لے جائے۔

دوسرے شام کے اخبار نے ان کی تصویر شائع کی تھی جو سول اسپتال کے آرتھوپیڈک وارڈ میں 'دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو' کی تصویر بنے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ وہی دونوں کانسٹیبل تھے جو نازو کے نازک ہاتھوں سے اپنے مردانہ ہاتھ تڑوا بیٹھے تھے۔ تصویر سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ٹوٹ پھوٹ زیادہ ہوئی ہے۔ ان کی ایک ایک ٹانگ بھی پلستر میں بندھی ہوئی اور اوپر اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ سخت شعلہ بار نظروں سے کیمرے کو گھور رہے تھے اور مجبور نہ ہوتے تو ان کی رسوائی کو مشتہر کرنے والوں کو ضرور ... دیتے۔ سب انسپکٹر کی تصویر صرف ایک اخبار میں تھی جس میں اس کے سر پر پٹی دکھائی گئی تھی۔ تاہم اس نے کسی قسم کا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

شام کے تقریباً سب ہی اخبارات نے یہ اطلاع دی تھی کہ پولیس کی ایک خصوصی ٹیم ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں تشکیل دی گئی ہے جو مفرور ملزمہ کا سراغ لگائے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ روایتی جملے تھے کہ تمام تھانوں کو چوکس کر دیا گیا ہے اور شہر سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی جاری ہے۔ پبلک ان جملوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی تھی کیونکہ عملاً یہ سب کاغذی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

شام کے اخبارات رکھ کے میں نے صبح کے اخبارات کو دیکھنا شروع کیا اور ایک اخبار کے نمائندۂ خصوصی کی رپورٹ نے

مجھے چونکا دیا۔ اس نے یقیناً بھاگ دوڑ اور عرق ریزی کی تھی یا پھر پولیس کے اندر اس کے لنک بہت گہرے اور مضبوط تھے۔ اس نے غیر معتمد لیکن باوثوق ذرائع سے ایک خصوصی اسٹوری دی تھی۔ خبر کے بیان کے مطابق تقریباً دو ہفتے قبل بندرگاہ کے علاقے میں ایک غیر ملکی جہاز راں کمپنی کے عملے کے چند ارکان نے دو افراد کو اغوا کیے جانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہ دونوں افراد خواتین تھے اور بعض عینی شاہدوں کے کہنے کے مطابق ہم شکل بھی تھے۔ ان دونوں نے اپنے اغوا کی کوشش کو بالکل اسی انداز میں ناکام بنا دیا تھا جیسے گزشتہ روز ایک نوجوان نے اپنی گرفتاری کی کوشش ناکام بنا دیا۔ اس نے جوڈو کراٹے میں اپنی حیرت انگیز مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'صنفِ نازک' کے بارے میں پائی جانے والی ساری خوش فہمی بھی رفع کر دی کیونکہ وہ نوجوان ایک لڑکی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت اس نوجوان کو گرفتار کیا گیا' اس وقت بھی وہ اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ ایک غیر ملکی جہاز پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پینٹ اور بگی شرٹ پہن رکھی تھی اور سر پر ملاحوں والی ٹوپی لگا رکھی تھی۔ مبینہ طور پر اسے جہاز کے سیکنڈ آفیسر نے شناخت کیا اور پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ اپنی کالر بون تڑوا بیٹھا۔ لڑکی کی ساتھی جس کے بارے میں اب یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی کوئی لڑکی ہوگی، جائے واردات سے غائب ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ تاہم جہاز کے دیگر عملے کی مدد سے اس لڑکی پر قابو پا لیا گیا اور اُسے باہر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ جہاز کے کپتان کی طرف سے کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی ہے۔ کپتان نے نامہ نگار کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کیا اور اسے اس سیکنڈ آفیسر سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی جس نے لڑکی کو شناخت کیا تھا اور چند لوگوں نے اسے چلا کر گالی دینے کے بعد یہ کہتے بھی سنا تھا کہ 'تم پھر آ گئے ہمارا بیڑا غرق کرنے'۔ کپتان نے اس بیان کی صحت سے بھی انکار کیا۔ مذکورہ مال بردار جہاز کراچی سے بمبئی، کولمبو، مدراس اور کلکتہ کے راستے پر چکر لگاتا ہے۔ اس کا کپتان ایس کے سیٹھی انڈین نیشنل ہے اور سیکنڈ آفیسر مرشد میاں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاز کا باقی عملہ سنگاپور اور فلپائن سے لیا گیا ہے اور جہاز کی رجسٹریشن پانامہ کی ہے۔

جھٹلانے والے تو کھلی آنکھ سے پہچانی جانے والی حقیقت کو بھی جھٹلا سکتے ہیں اور کسی بھی سچ سے منکر ہو سکتے ہیں۔ چند باتوں کو جہاز کے عملے نے غلط قرار دیا تھا اور کچھ باتوں کو پولیس نے مگر ایک کائیاں رپورٹر نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے سارے بھانڈا طشت ازبام کر دیا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی کہہ دینے سے الزام کسی پر نہیں آتا۔

اس بیان کی صداقت کو کلی طور پر تسلیم کرنے والا شاید میں دوسرا شخص تھا۔ پہلا تو وہی رپورٹر تھا جو نہ جانے کیسے محرم درونِ میخانہ ثابت ہوا تھا اور اندر کی خبر کو اغوا کر کے باہر لے آیا تھا۔ ایک کامیاب رپورٹر کی طرح اس نے یہ کام دو طرح سے کیا ہوگا۔ ایک طریقہ مال خرچ کرنے کا ہے۔ اس نے عملے کے کسی غیر اہم سمجھے جانے والے مگر سب کچھ سمجھنے والے خلاصی قسم کے رکن کو خرید لیا۔ دوسرا طریقہ جان ہتھیلی پر رکھ کے شیر کی کچھار میں گھسنے کا ہے۔ ممکن ہے' وہ بھیس بدل کر جہاز پر پہنچنے میں کامیاب رہا ہو اور جاسوسی کر کے کامیابی سے لوٹ آیا ہو۔ بہرصورت اس رپورٹر نے ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا اس طرح اس نے اپنی جان کے لیے حقیقی خطرے کا سامان پیدا نہیں کیا ہے؛ یہ ضرورت سے زیادہ جان لینے والوں کی جان لینے والے لوگ وہی تھے جنھوں نے نازو اور اکرام شیخ کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی وہ انھیں پہچانتے تھے ورنہ وہ ایسا کیوں کہتے کہ تم پھر آ گئے ہو ہمارا بیڑا غرق کرنے۔ ظاہر ہے کم سے کم ایک بار ان کا بیڑا غرق ہو چکا تھا اور وہ بیڑا غرق کرنے والوں سے مل چکے تھے۔

ایک بات جو یہ سراغ رساں نامہ نگار بھی نہیں جانتا تھا' وہ میں جانتا تھا۔ میرے پاس نازو اور اکرام کی طرف سے ملنے والی آخری خبر یہ تھی کہ وہ کسی کارگو شپ پر چڑھ کر کہیں نکل گئے ہیں اور اس شپ پر جو سامان لادا گیا تھا اس میں وہ اسلحے کے سارے کریٹ تھے جن پر شہر کا نام 'الڈ دیمیٹ سٹی' اور ملک کا نام 'وسبی وانیا' تحریر تھا۔ ہم اس سے پہلے ہی معلوم کر چکے تھے کہ دنیا کے نقشے میں اس نام کا نہ کوئی شہر ہے اور نہ ملک۔ الڈ دیمیٹ درحقیقت ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں استعمال ہونے والی ایک دوا کا برانڈ نام تھا اور 'وسبی وانیا' روسی زبان میں وہی معنی رکھتا ہے جو اردو میں الوداع یا خدا حافظ۔ ہم نے یہ معلومات آگے ارسال کر دی تھیں اور ہم نے سنا تھا کہ وہ جہاز راستے میں غرق ہو گیا تھا جو یہ مال لے کر روانہ ہوا تھا۔ صرف ایک کریٹ کسی کی غلطی سے رہ گیا تھا جو بعد میں پولیس اور حفاظتی عملے نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

سیکنڈ انجینئر کے ردِ عمل سے میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ نازو اور اکرام شیخ ہی اس اسلحہ بردار جہاز کو غرق کرنے کے ذمے دار تھے۔ جیسے نازو اور اکرام بچ گئے تھے ایسے ہی غالباً مرشد میاں بچ گئے تھے اور اب دوسرے جہاز پر تھے کہ انھوں نے پھر بیڑا غرق کرنے والوں کو دیکھ لیا۔ باقی عملہ مختلف تھا اور یہ ان بعض بھائیوں کی بدقسمتی تھی کہ ان میں ایک صورت آشنا غدار نکل آیا۔ ظاہر ہے نازو اس کی کالر بون [illegible] کے نہ نکلتی تو اس کی گردن توڑ کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نکلتی۔ اُسے روکنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تمام چیزوں کے تناظر میں یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ دونوں بہن بھائیوں کو اغوا کرنے کی کوشش کا مقصد یہی تھا کہ انھیں بیڑا غرق کرنے کے جرم میں سزائے موت دی جائے۔

مَیں نے گھڑی دیکھی۔ اصولاً مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مَیں نے بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے منصوبہ بندی کی۔ مَیں یہ چاہتا تھا کہ کراچی پہنچنے کے بعد اس رپورٹر سے ملوں جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باخبر تھا اور اپنے پیشے کے ساتھ جاں نثاری کی حد تک مخلص بھی۔ ایسا شخص کسی بھی وطن دوست کا ساتھی بن سکتا تھا لیکن کسی غدار کے ہاتھوں کسی قیمت پر نہیں بک سکتا تھا۔ اس بات کی بھی خاصی امید تھی کہ وہ میرے نام نامی سے بخوبی واقف ہو گا اور میرے کارہائے نمایاں کے باعث اپنے دل میں میرے لیے ستائش کے ویسے ہی جذبات بھی رکھتا ہو گا، جیسے آج تک مجھے بہت سے نادیدہ دوستوں اور محافظوں کے ملنے والوں کے دل میں محسوس ہوئے تھے۔ انہی میں ایک نابینا خلیفہ بندٹ تھا۔ (خدا کرے محسن اور غالب نے اُسے اپنی دکان واپس دلوا دی ہو) دوسرا میجر سلطان تھا، تیسرا ایک ڈاکٹر تھا تو چوتھا ایک کیفے کا مالک۔ یہ لوگ زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہر جگہ موجود تھے مگر کسی کے دوستانہ جذبے پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینے کی غلطی مَیں نہیں کر سکتا تھا۔

مَیں نے آپریٹر سے کہا کہ وہ لاہور کا ایک نمبر ملائے۔ یہ نمبر عبدالودود منظر کے گھر کا تھا۔ دس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی تو مَیں نے منظر کی آواز سنی۔ پس منظر میں اس کی اولاد نے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" مَیں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ارے بھائی... تم کو کس سے بات کرنی ہے... مَیں منظر بول رہا ہوں۔"

"کیا فائدہ ایسے بولنے کا اُلو کے پٹھے۔" مَیں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔ "نقار خانے میں طوطی کی آواز بالکل سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

منظر چلّانے لگا۔ "ابے تو... دنیا میں میری تباہی کے ذمے دار... کہاں سے بول رہا ہے تو...؟"

"اپنے خوش گفتار خوب صورت مُنہ سے۔" مَیں نے کہا۔

"ابے کیوں بول رہا ہے آخر... مَیں تو سمجھا تھا کہ اللہ نے بچا لیا اس آواز سے جو میری شامت کو پکارتی ہے۔" وہ بولا۔ "ابے نکلو یہاں سے کتّے کے بچو... تمھارے باپ کا فون آیا ہے۔"

مَیں قہقہہ مار کے ہنسا۔ "تیری بیوی تو اس الزام سے خوش ہو گی مگر مَیں اس ٹیم کی قیادت سنبھالنے سے انکار کرتا ہوں۔"

"دیکھیں گے... دیکھیں گے بیٹا... جب تمھاری پوری میں اترے گی نا تب پتا چلے گا۔ ابھی تو خالی پچ پر اکیلے دوڑ رہے ہو... دیکھ تو اب جلدی سے بک دے کہ تو نے کیوں فون کیا ہے مجھے... کون سا نیا خیال آیا ہے تجھے میرے درجن بھر جگر گوشوں کو یتیم کرنے کا اور میری اکلوتی گھر والی کے سر سے میرا سایہ اُٹھانے کا..."

"یار تو بزدل ہوتا جا رہا ہے... حالانکہ تیری تو اب پوری فوج ہے۔" مَیں نے کہا۔ "فکر سے ہلکان مت ہو... یہ بتا ملتان سے کسی نے فون کیا ہے تجھے؟"

"ہاں... دن میں آیا تھا۔ میری بیوی بہت ناراض تھی۔ کوئی لوفر تھے۔ پوچھنے لگے کہ یہ منظر ایڈووکیٹ کا میٹرنٹی ہوم ہے؟"

مَیں ہنس پڑا۔ "بڑے شریر ہیں وہ دونوں۔"

"شریر؟ ابے وہ خبیث کہنے لگے کہ تم کون ہو... مسٹر منظر کی سویٹ ہارٹ سیکرٹری یا نرسری؟" منظر چلّانے لگا۔ "ظاہر ہے میری بیوی نے انھیں اپنی مادری زبان میں بتایا کہ وہ کون ہے۔"

"یار وہ پھر فون کریں گے۔ ایک پراپرٹی کی ڈیل ہے جس میں انھیں تیری مدد درکار ہے۔" مَیں نے اصل معاملے کو فی الحال گول کر دیا۔

"اچھا... بہت بڑی ڈیل ہے کیا؟"

"ہاں یار... نواب ابن نواب ابن نواب ہیں... سات پشتوں سے بھی آگے تک۔" مَیں نے کہا۔ "یہاں کے کسی زیرِ تعمیر ہسپتال کی بات کریں گے... ان کا کام میرا کام سمجھ کے کر دینا۔"

"تیرے کیا لگتے ہیں وہ؟" منظر کے لہجے میں شبہ آگیا۔

"کچھ نہیں... تو میرا کیا لگتا ہے یار؟ ابھی میری کیا لگتی ہے۔ ظاہر ہے کچھ نہیں۔" مَیں نے کہا۔

منظر نے مجھے گالیاں دینی شروع کی ہی تھیں کہ غالباً اس کی بیوی آ گئی۔ وہ ایک دم مہذب اور شریف آدمی بن گیا۔ "بھیجو بات بتا۔"

"یار مَیں کراچی جا رہا ہوں۔" مَیں نے کہا۔ "اکیلا ہوں۔"

"کیوں... وہ سب ساتھ چھوڑ گئے... یاجوج ماجوج!"

"نہیں... وہ ایک سرکس میں کام کر رہے ہیں۔" مَیں نے کہا۔ "تو گولی مار سب کو۔"

"ایک بار سامنے تو آئیں وہ۔" منظر دانت پیس کر بولا۔

"کراچی میں ایک رپورٹر ہے افتخار عارف۔" مَیں نے کہا۔ "اس کے اخبار کا فون نمبر نوٹ کر... وہ اس وقت مل جائے گا۔ اس سے پوچھنا کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور... رائے تو مَیں بتا سکتا ہوں..."

"بیچ میں مت بول... اس سے پوچھنا کہ اگر مَیں اس کے پاس مدد کے لیے جاؤں... ایک مشن کے سلسلے میں... تو کیا وہ میری خاطر کچھ کر سکے گا؟"

"ہاں... وہ پولیس کو فون کر سکے گا کہ آئیے اور انھیں لے جائیے جن کے بغیر دنیا میں خاصے لوگ سکون سے رہ سکتے ہیں۔"

"مَیں پھر فون کروں گا... آدھے گھنٹے میں..." مَیں نے اس کی بکواس کو نظر انداز کر کے ریسیور رکھ دیا۔

پھر مَیں آدھے گھنٹے تک ٹہلتا رہا۔ اس خواہش کو دبانے کے لیے کہ مَیں انکل ضامن رضوی کے گھر فون کروں اور شہلا سے بات کروں۔ اس خواہش سے لڑنا بہت مشکل کام تھا۔ بے شک جبری ریٹائرمنٹ کے بعد انکل رضوی کے جذبات میں تبدیلی ضرور آ گئی ہو گی مگر پھر بھی ان سے کیسے بات کروں گا میں... اور اگر فون آنٹی نے اُٹھا لیا؟ وہ تو رونا شروع کر دیں گی۔ ان کے آنسوؤں کا جواب کیا دوں گا میں؟ خود شہلا نے کہہ دیا "ہیلو" تو کیا میرے حلق سے آواز نکلے گی؟ اگر مَیں نے اس کی خیریت دریافت کی تو وہ بے ہوش ہو جائے گی... میری آواز سنتے ہی... اس کی جسمانی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ کسی قسم کے جذباتی صدمے کی متحمل ہو سکے۔ بفرضِ محال اس نے ہسٹریا میں چلّانا شروع کر دیا کہ سکندر بھائی... لوٹ آئیے خدا کے لیے... یا رابعہ کے بارے میں کوئی حوصلہ شکن اطلاع دے دی۔ محسن کے بارے میں کچھ بتا دیا۔ وہ کہے گی بتائیے آپ کہاں ہیں... آپ کو میری قسم... رابعہ کی قسم... جھوٹ مت بولیے گا... نہیں... مَیں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ مَیں نے فیصلہ کیا۔

کلاک نے ایک گھنٹا بجا کے رات کے ساڑھے آٹھ بجنے کا اعلان کیا تو مَیں چونکا۔ مَیں نے پھر فون اُٹھا کے آپریٹر سے کہا کہ پرانا نمبر ملائے۔ اس مرتبہ لائن فوراً مل گئی۔ لیکن ہیلو اس کی بیوی نے اُٹھا لیا تھا۔ مجھے آواز بدل کے بات کرنی پڑی۔

"سلام چچی جان..."

"چچی جان... کہاں فون کیا ہے آپ نے... کون ہیں آپ؟"

"لیجیے... آپ بھی یہ پوچھ رہی ہیں کہ مَیں کون ہوں؟... چچی جان مَیں آپ کا سب سے خوب صورت بھتیجا ہوں... اشفاق الحق قاسمی عرف ققنس قزول باغوی... کیا یہ منظر ایڈووکیٹ کا گھر نہیں ہے؟"

"ہے تو... مَیں بلاتی ہوں۔" وہ گڑبڑا کے بولی... بار بار حلق سے قاف کی آواز نکالنے سے میرا گلا دُکھنے لگا تھا۔

"کون ہے بے؟" منظر نے ایک منٹ کے بعد کہا۔

"حضرت عزرائیل کا افسر بکارِ خاص۔" مَیں نے کہا۔

"کاش وہ آپ کو اسی وقت بلا لیں۔" منظر ہنستے ہوئے بولا۔ "میری بیوی کے ساتھ ایک دن میں دوسرا کیس ہوا ہے...!"

"ڈیلیوری کا...؟ مبارک ہو..."

"اپنے ٹیلی فون پر چھیڑنے کا... وہ لڑکیوں کی طرح شرماتے ہوئے چھوٹا غصہ دکھا رہی ہے۔" منظر بولا۔ "یعنی شرم غمزے..."

"میرا کام ہوا؟"

"ہاں... کچھ ہوا..." وہ بولا۔ "بہت چالاک شخص ہے وہ... کہنے لگا کہ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ تم وہی ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو؟"

"تو نے کیا ظاہر کیا تھا خود کو؟"

"ابے ظاہر کیا... اور باطن کیا۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "مَیں جو ہوں، بس وہی ہوں... اور یہی مَیں نے اس سے کہا تو وہ بولا کہ اچھا اپنا نمبر بتاؤ اور فون رکھ دو۔ پھر اس نے مجھے رنگ کیا اور کہنے لگا کہ اب ٹھیک ہے مسٹر منظر... تم مکمل رازداری کی گارنٹی کے ساتھ کوئی بھی بات کہہ سکتے ہو... وہ بات مجھ سے منکر نکیر بھی نہیں پوچھ سکتے۔ تب مَیں نے تمھارا ذکر کیا اور کہا کہ وہ کراچی میں ہے اور تم سے کہاں مل سکتا ہے؟ وہ تو یار ایسا پُرجوش عقیدت مند ہے تیرا کہ میرے پیچھے پڑ گیا اور بولا کہ اپنے دوست سے کہو آج ہی ملے۔ وہ رات گیارہ بجے کے بعد ڈیوٹی سے فارغ ہوتا ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ مارٹن روڈ پر جو سرکاری کوارٹر ہیں نا۔"

"ہوں گے بھائی... مجھے کیا معلوم۔" مَیں نے کہا۔

"اچھا تو اس کا پتا نوٹ کر لے۔ وہ جہانگیر روڈ ویسٹ کے کوارٹرز میں رہتا ہے... الف سات سو بیس... اس کے نام الاٹ نہیں ہے، کرائے پر لے رکھا ہے۔"

"کوئی ٹیلی فون وغیرہ بھی ہے؟"

"یہ تو... مَیں نے نہیں پوچھا۔" منظر بولا۔ "اور اس نے بھی نہیں بتایا۔"

"تو نے کیا کہا تھا... کس سلسلے میں ملاقات کرنی چاہتا ہوں میں؟" مَیں نے کہا۔

"وہی جو تو نے کہا تھا... اپنی طرف سے مَیں کچھ اور کیسے کہہ دیتا۔" منظر بولا۔ "بیٹا مَیں تو کہتا ہوں اب بھی وقت ہے۔ اس چکر سے نکل آ۔ حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کس کے لیے؟ میرے لیے یا ملک کے لیے؟" مَیں نے کہا۔

"ظاہر ہے ملک کے لیے... وہی تیرے حالات بھی ہیں۔" منظر نے کہا۔ "کچھ لوگ تو ملک کے حالات میں اس لیے ٹانگ اڑاتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی تعمیری مقصد ہوتا ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

وہ کچھ بن جاتے ہیں یا کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ تو صرف گنوا رہا ہے اور وہ بھی بے مقصد... ایک جان ہے تیری جس پر بہت ناز ہے تجھے۔"

"ہاں، رابعہ پر بہت ناز ہے مجھے۔ وہی تو میری جان ہے۔" میں نے کہا۔ "باقی رہی مقصد کی بات تو یار! میں سیاستدان نہیں ہوں اور نہ میں نے کچھ بننے یا حاصل کرنے کی خاطر اپنی جان مصیبت میں ڈالی ہے۔ تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ اس دلدل میں قدم میں نے اپنی مرضی سے نہیں رکھا تھا۔ مجھے اس میں پھینک دیا گیا تھا لیکن خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اُسے مجھ سے ایک کام لینا تھا جو میں کر رہا ہوں۔ ممکن ہے تیرے لیے یہ مقصد تعمیری نہ ہو کیونکہ اس کاروبار میں اپنے لیے میں نہ کوئی کوٹھی تعمیر کر رہا ہوں نہ کارخانہ... مگر تعمیر کا دوسرا انداز تخریب میں بھی ہے جیسے میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"یار تو سیریس ہو گیا... ہم تو جانتے ہیں سب کہ تو کتنا بڑا کام کر رہا ہے۔" منظر بولا۔ "ہم تو بیل ہیں بھائی۔ کولھو کے بیل جو ایک محدود دائرے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے اور کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے اور محسوس بھی نہیں کرتے۔ یا زندگی کی گاڑی کو کھینچنے والے بیل جو سالی بہت اوور لوڈ ہو گئی ہے... یہ بتا دوسرے کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں... اتنی لمبی ٹرنک کال نہیں کر سکتا کہ فرداً فرداً سب کا احوال سناؤں۔ تو بتا شہلا کیسی ہے۔ اور انکل...؟"

"انکل تو بس گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ ایک اسکول چلا رہے ہیں آجکل۔" وہ بولا۔ "ان کی فطرت سے تو واقف ہے تو... وقت گزارنے کے علاوہ قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں بھی خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک جہنم سے نکال کر معصوم فرشتوں کی اس جنّت میں بھیج دیا۔ سارے شہر کے اندیشوں سے آزاد ہو گئے۔ وہ خود ایڈ منسٹریٹر ہیں اور ان کی بیگم ہیڈ مسٹریس۔"

"گزر اوقات کیسی ہو رہی ہے؟"

"وہ تو کہتے ہیں کہ پہلے سے بہتر۔" منظر نے کہا۔ "تو بات کر لے۔"

"نہیں یار... ابھی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے کہا۔ "شہلا کی کوئی خبر ہے۔"

"ہاں... مزے میں ہے۔" وہ بولا۔ "فون کرتی رہتی ہے۔"

"آجکل فون کرنے میں خطرہ تو کوئی نہیں؟"

"نہیں... سراج نے تو کوشش کی تھی کہ میرے اور انکل رضوی کے گھر کو آبزرویشن پر رکھا جائے۔ مگر رضوی صاحب کی اعلیٰ حکام کی نظر میں بہت عزت ہے۔ اور مجھ سے قانونی کارروائی کا ڈر تھا اس لیے اس کی ایک نہیں چلی۔"

"اور میرے کیس؟"

"کیس بنتے رہیں گے اور چلتے رہیں گے... جب تک تو پکڑا نہیں جاتا سب ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "اب کیسوں سے کیا ڈرنا... خود مجھے نہیں معلوم کہ کتنے ہیں... رابعہ کی فرم کو میں نے سنبھال لیا ہے اور کام بہت بڑھ گیا ہے۔"

"اچھا یار... جو کچھ تو نے کیا اس کے لیے بھی اور جو کرے گا اس کے لیے بھی شکریہ... محسن کا بھی فون آئے تو اُسے کہہ دینا کہ میری فکر نہ کرے... اپنا کام جاری رکھے۔ میں واپسی میں زیادہ دن نہیں لگاؤں گا۔ آگے اللہ کی مرضی کیونکہ حالات پر میرا کوئی اختیار نہیں، ہاں... یہ بھی بتا دینا کہ نازو اور اکرام کراچی میں ہیں۔"

"تجھے معلوم ہے چوہدری دلاور صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا ہو رہا ہے۔" منظر نے اچانک یاد کر کے کہا۔ "اپنی پارٹی کا تو بس نام ہے، سارا کھیل پیسے کا ہے۔ کسی ایڈورٹائزنگ فرم کو اپنی کنویسنگ کا ٹھیکا دیا ہے۔"

"اس کی کنویسنگ تو میں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ذرا وقت آنے دے، انتخابات میں اس جیسے کھڑے ہوتے ہی ہیں۔ صوبائی اسمبلی میں پہنچنے سے پہلے اسے قبر میں نہ لٹا دیا تو سکندر نام نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

مجھے اچانک احساس ہو گیا تھا کہ میں نے روانی میں اپنا نام دے دیا ہے۔ ٹیلی فون لائن پر محفوظ گفتگو میں بھی خدشات ہوتے ہیں کہ کراس ٹاک سے غیر متعلقہ شخص سب سن لے گا ورنہ آپریٹر تو دونوں کی سنتا ہی ہے۔ یہ ہوٹل ذرا معیاری تھا اور میں ایک وی آئی پی کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا، چنانچہ آپریٹر سے اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کی امید نہیں تھی کہ وہ میری گفتگو سنے گا۔ وہ دن رات نمبر ملاتے رہتے ہیں اور اس عمل کی بیزار کُن یکسانیت میں ان کے تجسّس کا جذبہ اس طرح باقی نہیں رہتا، جیسے گورکن کے لیے کسی مرنے والے کے لواحقین سے ہمدردی کا جذبہ۔

منظر سے میری گفتگو بھی ایک روح افزا ٹانک ثابت ہوئی اور اس نے میرے خیالات کے انتشار کو بہت حد تک کم بھی کیا۔ اب میں زیادہ اطمینانِ قلب اور یکسوئی کے ساتھ اپنے مشن کے اگلے مرحلے پر روانہ ہو سکتا تھا۔ رات میری محافظ و معاون تھی اور اب یہ پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسی رات سے فائدہ اٹھاؤں۔ اس سے اگلی رات کا کیا بھروسا کہ ستاروں کی چال بدل جائے اور میرا پھینکا ہوا پانسا پلٹ جائے۔

ایک گھنٹے بعد میں کراچی کی جانب رواں تھا۔ میرے بل میں ہوٹل کے کرائے کے برابر ہی ٹرنک کال کے چارجز شامل ہو گئے تھے۔ مجھے اخراجات کی فکر نہیں تھی۔ گڑبڑ یہ ہوئی تھی کہ ہوٹل کے قواعد و ضوابط کے مطابق میرے سوئٹ نمبر کے فون سے ملائی جانے والی دونوں کالوں میں منظر کے ٹیلی فون نمبر کا اندراج ہو گیا تھا۔ ویسے تو یہ بہت دُور کی بات تھی کہ کوئی اس طرح مجھے تلاش کرے بخصوصاً ان حالات میں جبکہ میں نے ہوٹل میں اپنا نام وغیرہ سب غلط لکھوایا تھا اور ہوٹل والے میرے حلیے کو یاد رکھنے کے پابند نہیں تھے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میں کراچی پہنچا۔ سپر ہائی وے پر ایک جگہ بلند و بالا گیٹ سے بنے ہوئے تھے۔ یہ ٹول پلازا تھا۔ گویا کراچی کی میونسپل حدود کے آغاز کی علامت۔ دونوں جانب قطاروں میں کاریں، ٹرک اور بسیں محصول ادا کر کے ٹکٹ لیتے جا رہے تھے اور نکلتے جا رہے تھے۔ مجھ سے آگے ایک ٹرک تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اس ٹرک کو روک لیا گیا۔ غالباً کسی کی مخبری کے باعث بالیں دین کے چکّر میں کوئی جھگڑا پڑ گیا تھا۔ اگلا نمبر میرا تھا۔ کسٹم انٹیلی جنس کی وردی میں ایک افسر میری طرف بڑھا۔

"آپ بھی نیچے اتر آئیں۔ گاڑی سائڈ پر لگا لیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے متانت سے کہا۔

"اس لیے کہ ہمیں اس ٹرک کو روکنے کے احکامات ملے ہیں۔" وہ بولا۔ "چلیں، دیر مت کریں۔ ٹریفک بلاک ہو جائے گا۔"

"واٹ نان سنس... احکامات ٹرک کے لیے ہیں تو اُسے روکو... مجھے روکنے کا تو کسی نے نہیں کہا ہے۔" میں نے کار کو ایک کنارے پر کر لیا۔

"کہا تو کسی نے نہیں ہے۔" وہ پھر میرے سامنے آ گیا۔ "مگر ٹرک تو آپ کا ہی ہے۔"

"ٹرک میرا ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "کون الّو کا پٹھا کہتا ہے... کیا یہ تمھاری اپنی منطق ہے کہ جو کار میں اس ٹرک کے پیچھے ہو گا وہی ٹرک کا مالک ہو گا۔"

"ایسا وہ ڈرائیور کہتا ہے جو ٹرک چلا رہا ہے۔" کسٹم والا متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"وہ بکواس کرتا ہے۔" مجھے اب واقعی طیش آنے لگا تھا۔

"تو آپ نیچے اتر کے یہ بات اس کے سامنے کہہ دیں... اور ثابت کر دیں۔" اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کے چابی نکال لی۔

"چابی واپس وہیں لگا دو، مسٹر کسٹم افسر۔" میں نے لہجے کو شریفانہ انداز میں خطرناک بنا کے کہا۔ "تم نہیں جانتے..."

"میں اپنے اختیارات کو جانتا ہوں... اور مجھے اس ٹرک کے علاوہ تمھاری کار کو بھی ضبط کرنے کا اختیار حاصل ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

میں نے دیکھا کہ وہاں اس ٹرک پر چھاپا مارنے والی پولیس پارٹی نے اپنے مخصوص انداز میں ناکا بندی کی تھی اور اب ان کا کام پورا ہو گیا تھا تو وہ خاصے بافراغت انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں سے بیشتر ٹرک کو گھیرے ہوئے تھے اور اپنی رائفلوں کو حسبِ عادت لاٹھی کے طور پر سہارے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

"او کے... لیکن کیا تم ایک منٹ میرے پاس بیٹھ کے اس سارے معاملے کی وضاحت نہیں سُن سکتے۔" میں نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

"میں خود زبردستی کا قائل نہیں۔" وہ بھی معنی خیز طور پر مسکرایا۔ اور میری مسکراہٹ اگر سوال تھی تو اس کی مسکراہٹ میں جواب پوشیدہ تھا۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا ہم کچھ لو اور کچھ دو کے زریں اصول پر عمل نہیں کر سکتے اور اس نے جواب دیا تھا کہ بے شک عقل مند وہی ہوتے ہیں جو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ میرے ساتھ بیٹھنے کی غلطی کر بیٹھا۔

"کیا ہے اس ٹرک میں؟" میں نے کہا۔

وہ بگڑ گیا۔ "میرا خیال تھا... کہ تم بات ختم کرنا چاہتے ہو۔"

"تمھارا خیال غلط نہیں تھا۔ مگر مجھے پتا تو چلے کہ بات شروع ہی کیوں ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "اور تم کیوں بضد ہو مجھ سے منوانے پر کہ وہ میرا ہی ٹرک ہے؟"

اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اتنا غصّہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا اور جیکب کے کمرے سے ملنے والا ریوالور نکال لیا۔ "اس چیز کو پہچانتے ہو... اسے سائلنسر کہتے ہیں۔ اگر کوئی شور مچانا چاہے تو یہ خاموشی سے اُسے خاموش کر دیتا ہے۔"

کسٹم انسپکٹر کا رنگ اُڑ گیا۔ "اور اس کے بعد... تمھارا کیا خیال ہے کہ تم اپنے ٹرک سمیت فرار ہو جاؤ گے؟"

"ٹرک جائے بھاڑ میں۔" میں نے کہا۔ "میں خود تو فرار ہو سکتا ہوں... تمھاری لاش لے کر۔"

"کیا واقعی... وہ تمھارا ٹرک نہیں ہے؟" پہلی بار اس کا اعتماد متزلزل ہوا۔

"تمھیں نام معلوم ہے میرا؟"

"تم ملتان سے آ رہے ہو نا؟" وہ بولا۔

"مخبری کرنے والے نے میرا کیا نام بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"جان محمد عرف جونی۔" وہ بولا۔ "تم وہاں کے ایک با اثر شخص سلطان محمد خان کے بیٹے ہو؟"

"اچھا!" میں نے حیرت سے کہا۔ "اور ٹرک میں کیا ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"غیر قانونی طور پر ملک میں لایا جانے والا اسلحہ۔" وہ بولا۔

"کچھ روسی ساخت کا... کچھ بھارت میں بنا ہوا۔"

"کیا یہ اسلحہ میں مشرقی پاکستان کے علیحدگی پسندوں کو فروخت کرتا ہوں؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب تم خود جانتے ہو۔" وہ بولا۔

"کیا تم نے اسلحہ برآمد کر لیا ہے؟"

"اس میں کیا دیر لگتی ہے۔" وہ بولا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ڈرائیور نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے... مگر اس کا کہنا ہے کہ وہ مجبور تھا۔ ملک اس کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں اور اسے مار ڈالیں گے۔"

"پیچھے والی گاڑی میں تمہارا اسمگلر ہوتا تو تم کیا کرتے؟"

"ڈرائیور میرے سمگلر کو نہیں جانتا مگر تمہیں جانتا ہے۔"

میں نے اپنے شناختی کاغذات نکال لیے۔ ان میں گاڑی کی رجسٹریشن کے کاغذات بھی تھے۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ میں کون ہوں۔"

اس نے کاغذات کو گاڑی کے اندر کی لائٹ جلا کے غور سے دیکھا اور مجھے واپس کر دیے۔ "یہ جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔"

"بالکل ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جان محمد عرف جونی وہ نہیں ہو سکتے۔ اس ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"دریا خان۔"

"تم اسے مجھ سے ملوا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"تم اس سے مل سکتے ہو... چیک پوسٹ پر۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے... میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اس ڈرائیور سے چند سوالات کروں گا۔ اس دوران میں تم بالکل خاموش بیٹھے رہو گے اور ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے جس سے تمہاری جان اور یہ عہدہ جائے۔ جان ہے تو جہان ہے اور یہ عہدہ ہے تو اس جہان میں کیش ہی نہیں ہے بلکہ عیش ہی عیش ہے۔ بعد میں مجھے پھانسی بھی ہو جائے تو تمہیں یہ قیمتی زندگی نہیں مل سکتی۔"

اس نے سر ہلایا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ مجھے ایک مختصر سے کمرے میں لے گیا جو دو دروازوں کے بیچ میں تھا۔ وہاں ٹرک ڈرائیور ایک کونے میں مرغا بنا ہوا تھا۔ دو پولیس والے بڑی بے نیازی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ اپنے افسر کو دیکھتے ہی انھوں نے کرسیاں خالی کر دیں اور دونوں جانب کے دروازوں پر اٹینشن ہو گئے۔

"چل سیدھا ہو جا... گگر دے پتر۔" ایک سپاہی نے کہا۔

مرغا سیدھا ہو کے آدمی بن گیا۔ وہ بے عزتی کا عادی اور خاصا سخت جان مجرم نظر آتا تھا۔ اس نے مجھ سے نظر نہیں ملائی۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے کہا۔ "کیا میں جان محمد ہوں؟"

اس نے نظر اٹھا کر اقرار میں سر ہلایا۔

"یہ بات کہنے پر تم کو کس نے مجبور کیا تھا...؟" میں نے کہا۔

"کسی نے نہیں... میں وہی کہہ رہا ہوں جو... سچ ہے۔"

"تم نے جان محمد عرف جونی کو دیکھا ہے کبھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا کھوکھلا اعتماد بھی ختم ہونے لگا ہے۔ وہ کچھ نروس ہو رہا تھا۔

"اس کا حلیہ بیان کرو ذرا۔" میں نے کہا۔

"آپ سامنے کھڑے ہو جی... حلیہ کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"آپ کا یہ فون ڈائریکٹ ڈائلنگ پر ہے؟" میں نے کسٹم انسپکٹر سے کہا۔ "ذرا ملتان ملائیں۔ سلطان محمد خان کے گھر کا نمبر میں دیتا ہوں۔ اس سے پوچھو کہ جونی کہاں ہے؟"

"تمہارا دیا ہوا نمبر تو کسی بھی ہو سکتا ہے... جو ریسیور اٹھائے گا کہہ دے گا کہ میں سلطان محمد خان ہوں اور جونی تو میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

"ذہانت کی بات کی تم نے۔" میں نے کہا۔ "چلو وہاں کے ڈپٹی کمشنر یا علاقہ ڈی ایس پی کا نمبر ملاؤ... دونوں تصدیق کر کے دس منٹ میں جواب دے سکتے ہیں۔ ڈی سی آفس دائیں طرف سے چوتھی کوٹھی ہے یا شاید پانچویں۔ ڈی ایس پی کا دفتر سامنے ہے۔ دونوں ذاتی طور پر سلطان محمد خان کو بھی جانتے ہیں اور جونی کو بھی۔"

کسٹم انسپکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ڈرائیور کی حالت نے اسے شک میں ڈال دیا۔ ڈرائیور کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کسٹم افسر نے نمبر ڈائل کیا۔ آدھی رات کے وقت لائن آسانی سے مل گئی۔

"کیا دفتر اس وقت بند نہیں ہوں گے؟"

"ڈی ایس پی کا آفس اور تھانہ ایک ہی عمارت میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر تھانے والوں سے ہی کیوں نہ کہہ دیا جائے۔" کسٹم انسپکٹر نے سلسلہ کاٹ دیا۔ "وہ بھی تو تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"ہاں... تصدیق تو آدھا ملتان کر سکتا ہے۔"

"اتنی رات گئے۔ سلطان محمد خان کو ڈسٹرب کرنا..."

"کمال ہے... ان کے بیٹے جونی کو اسلحے کی اسمگلنگ کے سنگین جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے... تم کو ان کی نیند خراب ہونے کا ڈر ہے... اگر تم نے انھیں بتائے بغیر ایسا کیا تو زیادہ خرابی ہو گی۔"

کسٹم افسر نے کسی سے پوچھ کے تھانے کا نمبر ملایا۔ "کون؟ اچھا خود ایس ایچ او صاحب ہیں... دیکھیں سر... ہم نے ایک بندہ پکڑا ہے کراچی میں جو خود کو سلطان محمد خان کا بیٹا کہتا ہے۔ وہ اسلحے سے بھرے ہوئے ٹرک کے ساتھ پکڑا گیا ہے... جان محمد عرف جونی نام بتاتا ہے... کیا... ابھی آپ کے پاس تھا... کتنی دیر پہلے؟ ایک گھنٹہ پہلے... ہاں جی... بالکل... یہ ہے کوئی جعلساز... ذرا مہربانی ... مجھے کچھ حلیہ بتا دیں اس لڑکے جان محمد کا..." پھر وہ بہت دیر تک ہاں جی، ہاں جی کرتا رہا... بالآخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"آئی ایم سوری... اس کتے کے بچے نے جھوٹ بول کے آپ کو بھی ملوث کرنا چاہا تھا۔" کسٹم افسر نے ڈرائیور کو گھور کے کہا۔

"میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے کیوں جان محمد کہا۔"

"آپ مجھے اور اسے پولیس اسٹیشن لے چلو۔" ڈرائیور بے خوفی سے بولا۔

یکلخت مجھ پر اس سازش کے محرکات واضح ہو گئے۔ اس کا مقصد مجھے تھانے پہنچانا تھا۔ یہاں بھی سب کی موجودگی میں اپنی زبان سے میں نے جان محمد جونی ولد سلطان محمد خان سے تعلق تسلیم کر لیا تھا اور تھانے پہنچ کر بھی میں اپنی بات پر قائم رہتا کہ میں جان محمد عرف جونی نہیں ہوں۔ ظاہر ہے تصدیق اور تفتیش کے مرحلے پورے ہونے سے قبل ہی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں کون ہوں...؟ لے جانے والے ڈرائیور کو لے جاتے یا وہ خود ہی اپنی بے گناہی ثابت کر کے رخصت ہو جاتا۔ تلاشی لینے پر ٹرک سے ایک گولی بھی نہ ملتی تو اسے روکنے کا جواز باقی نہ رہتا۔ مگر میں دھر لیا جاتا۔ کسی نے بہت ہوشیاری سے جال بچھایا تھا اور کوشش کی تھی کہ ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں۔ یعنی سکندر بخت تو پکڑا ہی جائے اس کے ساتھ میں جان محمد بھی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ وہ میرا ساتھی تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ پیڈرو کے علاوہ کسی کی سازش نہیں ہو گی۔ اسے ہی جونی اور جیکی پر غصہ تھا جنھوں نے مجھے بیچ میں لا کے اس کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا تھا۔ وہ تھوڑی بہت سزا انھیں بھی دینا چاہتا تھا۔ زیادہ کا امکان اس لیے نہیں تھا کہ پیڈرو سے زیادہ سلطان محمد خان کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ ان کے بیٹے کو کسی سازش میں کوئی ملوث نہیں کر سکتا تھا۔

"تھانے تو اب سب کو ہی جانا پڑے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے فون رکھ کے کہا۔ "ملتان کے تھانے والوں نے کہا ہے کہ وہ صبح ہی تصدیق کر کے بتا سکتے ہیں... رات کو سلطان صاحب کو نہیں جگا سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں... کیا آپ میرے ساتھ میری گاڑی میں چلیں گے؟"

کسٹم انسپکٹر تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے جیسی کس قسم کا ریوالور ہے ورنہ وہ مجھے گرفتار کرتے اور میری جامہ تلاشی لینے کا حکم دیتا... شاید وہ ڈرتا تھا کہ میں مرنے مارنے پر تل جاؤں اور اس سمیت دو چار آدمی ٹھنڈے نہ کر دوں۔ وہ میرے ساتھ ہرگز نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

"تم... آپ ہمارے ساتھ جیپ میں چلیں۔"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "یعنی میں اپنی کار کو یہاں چھوڑ جاؤں... آپ کے پاس چابیاں ہیں تو آپ ڈرائیو کریں۔ یا مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔"

"آپ کے ساتھ دو سپاہی جائیں گے... اور ٹرک ڈرائیور جائے گا۔" کسٹم انسپکٹر نے فیصلہ کیا۔ "میں جیپ میں ٹرک کے پیچھے آؤں گا۔"

اس کے فیصلے نے مجھے خوش کیا۔ اس نے میرے لیے بہت سی مشکلات کا خاتمہ کر دیا تھا۔ میں ابھی طے نہیں کر پایا تھا کہ تھانے پہنچنے سے پہلے اس کسٹم انسپکٹر سے کیسے گلو خلاصی ہو گی اور ڈرائیور کس طرح میرے قبضے میں آئے گا۔

"آپ کے پاس... کوئی ہتھیار ہے تو...؟"

"میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔" میں نے کسٹم انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"مجھے تلاشی لینی ہو گی..."

"میرا خیال ہے کہ تم ایسی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے سرد سفاک لہجے میں یوں کہا کہ میرے لہجے سے نتائج کی دھمکی واضح ہو جائے اور یہ بات صرف کسٹم انسپکٹر سمجھ سکے جو میرے نشانے پر تھا اور ابھی میرے الفاظ بھولا نہیں تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا چنانچہ وہ کسی ماتحت کو بھی اشارہ نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے دبوچ لے۔ بالآخر اس نے اپنی جان بچاتے ہوئے مجھے دوسروں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ٹرک پکڑ لیا تھا اور بحفاظت تھانے بھی پہنچا دیا تھا۔ دوسرے اگر کسی غفلت کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ قصوروار نہیں۔

ٹرک ڈرائیور کو میرے ساتھ بٹھانے کی سرکاری وجہ یہ بتائی گئی کہ بصورت دیگر وہ ٹرک سمیت فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ حالانکہ ٹرک کوئی جیٹ طیارہ نہیں کہ پولیس کی جیپ کو چھوڑ کے اڑن چھو ہو جائے۔ دو کانسٹیبل جن کے پاس وہی بھاری بھرکم بندوقیں تھیں جو زمانہ قبل از آزادی کی یاد دلاتی تھیں، اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ایک نائک جس کی مونچھیں پہلے ہی بہت نمایاں تھیں مگر وہ انھیں بقول شاعر مشرق۔ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر... عادتاً مروڑتا تھا اور مالش یا پالش کرتا رہتا تھا اسے میرے ساتھ آگے بٹھایا گیا۔ یقیناً اسے زیادہ ذمے دار سمجھتے ہوئے زیادہ مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہو گی۔

جیپ اوپل کے دو ہزار سی سی کے انجن نے انگڑائی لی اور کار نے کابلی کے مارے ہوئے محافظوں کے خیال میں سپر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سانک رفتار پکڑی تو وہ تھوڑے سے ہراساں ہوئے۔

"سر جی... اپنی سپیڈ..." نائک بولا۔ "گڈی اٹک جائے گی تو آپ کا... نقصان ہو جائے گا۔"

"میرے نقصان کی فکر مت کرو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں دوسری کار خرید لوں گا۔" اور رفتار مزید بڑھا دی۔ "تم ڈر تو نہیں رہے ہو نا؟"

"نہیں مگر وہ... اچھا تھا اُن کو بھی ساتھ رکھتے۔" نائک بولا۔

"وہ اور ہم ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں... خرگوش اور کچھوے کی رفتار برابر تو نہیں ہو سکتی نا...؟" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ اگر اس گاڑی کو پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے کم پر چلایا جائے تو اس کے انجن کا سیریبرل ہیمرج ہو جاتا ہے۔"

"کیا... سیریبرل کیا...؟"

"وہ ہوتی ہے ایک خرابی۔" میں نے کہا۔ "جو مین جائنٹس کی کم رفتار سے ہیپی ٹائٹس توڑ دیتی ہے۔"

نائک بھونچکا بیٹھا تھا۔ میں نے خالص طبی اصطلاحات کا استعمال کیا تھا... وہ اَن پڑھ آدمی... اُسے کیا معلوم کہ سیریبرل ہیمرج تو دماغ کی رگ پھٹنے کو کہتے ہیں۔

"خیر میں رفتار کم کر لیتا ہوں..." میں نے کہا۔ "جانا تو ہم سب کو ایک ہی جگہ ہے... بالآخر..."

وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ بات میں نے دنیائے فانی کا نقشہ بیان کرنے کے لیے کی ہے یا میری مراد تھانے سے ہے۔ آگے مسلسل اندھیرا تھا اور میں حیران تھا کہ کراچی کا نام و نشان نہیں مگر ٹول پلازا والوں نے محصول وصول کر لیا ہے۔ ایک میل کے بعد میں نے کلچ دبا کے ایک دم چھوڑا۔ نائک کو زبردست جھٹکا لگا اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا میں نے ایسے ہی دو تین جھٹکے دیے... پھر کلچ دبائے بغیر گیئر بدلنے کی کوشش کی تو گیئر بکس میں سے رگڑ کی ایک خوفناک آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہوا؟" نائک گھبرا کے بولا۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" میں نے گاڑی روک دی۔ اس کا بونٹ کھولا اور جھک کر اگنیشن کوائل کا ایک تار الگ کر دیا۔ نائک میرے ساتھ ہی اترا تھا۔ میں نے پھر اپنی جگہ بیٹھ کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کا ڈراما کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب انجن گھومتا رہے گا مگر اسٹارٹ نہیں ہوگا۔ دو چار مرتبہ کی ناکام کوشش کے بعد میں نے جھلاہٹ اور جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر بونٹ کھولا اور تار لگا دیا۔ نائک کو پھر میرے ساتھ اترنا چڑھنا پڑا۔

"اپنے بندوں سے کہو کہ تھوڑا سا دھکا لگائیں۔" میں نے نائک کو مخاطب کیا۔

"گڈی اسٹارٹ ہو جائے گی؟" اس نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا... یہ تو بہت بڑی گاڑی ہے۔" میں نے کہا۔ "بندہ کوشش ضرور کر سکتا ہے۔"

نائک قائل ہو گیا کہ کائنات کا نظام ایسے ہی چل رہا ہے۔ اس نے دونوں ماتحتوں سے کہا۔ "شادا بھئی جوانو... ذرا زور لگاؤ۔ ہاں گڈی نو... ذرا جان لگا کے۔"

رائفلیں رکھ کے دونوں کانسٹیبل نیچے اترے۔ کار میں بیٹھنے کا لطف دھکا لگانے کے ذلت آمیز کام سے غارت ہو گیا مگر آرڈر از آرڈر۔ انھوں نے دروازے بند کر دیے اور پیچھے سے گاڑی کو دھکیلنے لگے۔ آگے بیٹھے ہوئے نائک نے فوراً پیچھے سے پیچھے بیٹھے ہوئے اصل مجرم کو زد میں لے لیا۔ اس کے خیال کے مطابق وہی فارغ بیٹھا تھا اور دروازہ کھول کر بھاگ سکتا تھا... میں گاڑی چھوڑ کے کہاں جا سکتا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں نے بیک ویو مرر میں ٹرک اور جیپ کو دیکھا۔ ان کی ہیڈ لائٹس آگے پیچھے ہونے سے چار بھی نظر آتی تھیں مگر اونچائی کے فرق سے اندازہ ہوتا کہ اب آگے جیپ ہے یا ٹرک۔ میں نے ایک دم چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کیا اور کلچ چھوڑ دیا۔ گاڑی سیکنڈ گیئر میں تھی۔ ریس دیتے ہی جمپ لگا کے آگے بڑھی۔ پیچھے سے دھکا لگانے والے یقیناً منہ کے بل گرے ہوں گے... اور پکی سڑک پر سجدہ کرنے سے ان کی ناک ہل گئی ہو تو ممکن تھا۔ میں نے پلک جھپکنے میں نائک کے سر پر بائیں ہاتھ کی کہنی ماری اور ضرب اس کی کنپٹی پر ٹھیک پڑی۔ وہ سر موڑ کے نہ بیٹھا ہوتا تو میرا کام اتنا آسان نہ ہوتا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کے کچھ سمجھنے سے پہلے میں نے ایمرجنسی بریک لگا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے آیا اور میں نے گھوم کر اس کے سر پر مُکا مارا۔ اس کا سر دروازے کی سائڈ سے لگا۔ کار رُک گئی تھی، چنانچہ میں نے فوراً ریوالور نکال لیا۔ ڈرائیور سخت جان تھا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پر پڑا... وہ بے ہوش وہیں گر گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور جھٹکا لے کر بند ہو جانے والی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے اسٹارٹ کیا۔ سو گز کے فاصلے سے میں نے پیچھے رہ جانے والے سپاہیوں کی رائفلیں سڑک پر گرا دیں۔ مجرمانہ غفلت کے جرم میں رائفلیں گنوا دینے کا سنگین جرم بھی شامل ہو جاتا تو وہ کہیں کے نہ رہتے۔ اب وہ آگے آئیں گے تو انھیں اپنا اسلحہ ضرور مل جائے گا۔

زور مجرمان ملیں یا نہ ملیں۔

دس منٹ بعد میں نے خود کو کراچی کے کسی مضافاتی علاقے میں پایا۔ آدھی رات کے بعد وہاں سناٹا اور ہُو کا عالم تھا۔ مجھے بتانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک گشتی پولیس کار ضرور نظر آئی تھی لیکن میں ان سے ایک سوال کرتا تو وہ مجھ سے دو سوال ضرور کرتے۔ ایک وردی پوش نائک کے بارے میں جو آگے اوندھا پڑا ہوا تھا اور دوسرا پیچھے گرے ہوئے شخص کے بارے میں۔ نائک کو میں نے وہیں ایک جگہ ڈراپ کر دیا۔ معلوم نہیں وہ کون سی جگہ تھی جہاں مجھے ایک سائیکل والا نظر آیا۔ اس نے مجھے مطلع کیا کہ "بھیا... یہ فیڈرل بی ایریا ہے۔ ادھر بلاک سولہ ہے۔ اُدھر سترہ... تمھیں کہاں جانا ہے؟"

"جہانگیر روڈ ویسٹ۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو بھیا تم یوں کرو کہ اللہ کا نام لے کر سیدھے چلے جاؤ... مڑ کر مت دیکھنا... بس یہی سڑک تم کو لے جاوے گی۔ لالو کھیت سے گزرو گے نا تو سیدھے ہاتھ پر سرکاری کوارٹر ہیں۔ تین ہٹی کے چوک کے بعد۔"

"اندازاً کتنا فاصلہ ہوگا؟"

"فاصلہ... وہ تو میں نے کبھی ناپا نہیں... مگر ہاں... تم یہ سمجھو بھیا... کہ پہلا چوک عائشہ منزل... دوسرا کریم آباد... اس کے بعد تیسرا دس نمبر..."

"یہاں چوک بھی دس نمبری ہوتے ہیں؟"

بھیا نے دانت نکالے۔ "دس نمبر لالو کھیت کا تیسرا چوک۔ چوتھا ڈاک خانے کی چورنگی... بس اس کے بعد تین ہٹی کی چورنگی..."

بلاشبہ اس نے میری بہترین رہنمائی کی تھی۔ میں نے چار ٹریفک راؤنڈ اباؤٹ عبور کیے۔ سب پر چار سڑکیں ایک ساتھ ملتی تھیں۔ پانچواں راؤنڈ اباؤٹ آتے ہی میں نے کوارٹر دیکھ لیے جو اپنی یکسانیت سے سرکاری طرزِ تعمیر کی بدصورتی کا نمونہ تھے۔

تین ہٹی کے چوک پر نسبتاً کچھ رونق تھی اور ایک آدھ ہوٹل بھی کھلا ہوا تھا مگر میں نے رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ میں افتخار عارف کا کوارٹر آسانی سے تلاش کر لوں گا۔ سب کوارٹر قطاروں میں ہیں اور نمبر سب پر ہیں تو کسی سے پوچھنا کیا۔ لیکن میرا اندازہ فوراً غلط ہو گیا جب نمبر چھپ کرنے لگے۔ مشکل یہ تھی کہ ہر طرف اندھیرا تھا اور کوارٹروں کے اندر بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے پڑے تھے۔ سب نیند میں تھے اور کسی کو جگانا بدتہذیبی تو تھی ہی، بدبختی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کسی شاندار کار کے بارے میں کوئی ایک مہینے بعد بھی بتا سکتا تھا کہ اس کا رنگ کیا تھا اور اس کو چلانے والا کون تھا اور کہاں گیا تھا؟

یہ اندھے کے ہاتھ بیٹر لگ جانے والی بات تھی کہ اچانک مجھے سات سو دس کا ہندسہ دکھائی دے گیا۔ اس پر ایف بی لکھ تو کچھ نہیں لکھا ہوا تھا مگر میں نے گاڑی روک دی۔ اس قطار میں دس کوارٹر تھے۔ گویا اگلی قطار یا پچھلی قطار میں کونے والا کوارٹر... میں پیدل چل کے آگے گیا تو مجھے سات سو کا عدد نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی بجھا بجھا الیف بھی۔ اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ پیچھے والی قطار کے پہلے کوارٹر کو غور سے دیکھنے کے لیے میں دروازے تک گیا اور اس پر چاک سے لکھے ہوئے نمبر کو پڑھنے میں کامیاب رہا۔

پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے ڈرائیور کے ابھی ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ شاید وہ خود ہوش میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے تھوڑی بہت طبی امداد ضروری تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کے دروازے لاک کیے اور پیچھے کی طرف گیا۔ کوارٹر کا نقشہ سمجھ لینے کے بعد میں نے صحن کی سات آٹھ فٹ اونچی دیوار کے اوپر سے اندر کودنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں دروازہ بجا کے کسی کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ریوالور کو دانتوں میں دبایا اور خود کو ہاتھوں کے زور پر اونچا اُٹھا کے دیوار کے اوپر سے گزر گیا۔ میں ایک اندھیرے صحن میں اترا مگر کراچی کا آسمان اتنا سیاہ نہیں تھا کہ میں کچھ نہ دیکھ پاتا۔ یہ ملگجا سا اندھیرا تھا جیسے خالص اندھیرے میں دس فیصد اجالے کی ملاوٹ کر دی گئی ہو۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا اور پھر دائیں بائیں دو کابک نما خانے... ان میں سے ایک کچن ثابت ہوا۔ سامنے دو کمرے تھے اور دونوں کے دروازے کھلے پڑے تھے۔

میں نے ایک کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ کھٹ سے سوئچ آن ہوا اور میں نے خود کو سو واٹ کے بلب کے نیچے ایک عجیب چیز کے روبرو پایا۔ وہ تھا تو تیس بتیس سال کا جوان آدمی مگر اس نے اپنی جوانی کا وہی حشر کر رکھا تھا جو گدھا زعفران کا کر سکتا ہے۔ اس کے بال لمبے اُلجھے ہوئے اور خشک تھے۔ اس نے موٹے شیشے والی بھاری فریم کی عینک لگا رکھی تھی اور غالباً یہ داڑھی نہیں تھی بلکہ ہفتے بھر میں بڑھ جانے والی شیو تھی جس نے اس کی شانِ قلندری کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی پتلون پہنے ہوئے تھے جسے پاجامہ کہنا بھی غلط ہوتا۔ جب وہ سلی ہوگی تو یقیناً صاف ہوگی اور درزی نے اس پر استری بھی کر کے دی ہوگی، مگر وہ کچھ اس اصول کا قائل معلوم ہوتا تھا کہ لباس جب پھٹ جائے تو بدل لو... دھونے، استری کرنے کا روگ کیا پالنا۔ ایسی ہی حالت

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

قیمس کی بھی تھی۔

" جی ؟" وہ بولا۔" کیسے تشریف لانا ہوا ؟"

" آپ... افتخار عارف ہیں؟" میں نے کہا۔

" اور ہم کیا لگتے ہیں بھلا... وہ کسوٹی والے عارف افتخار ؟" وہ کھی کر کے ہنسا مگر اس کی ہنسی کی آواز نہیں آئی۔" بھئی ہم آپ کے لیے چشم براہ تھے... کیا تھے ؟"

" چشم براہ..." میں نے کہا۔

" جی... اور بس اچانک آپ آگئے... بھلا کیسے ؟ وہ جو کہا ہے نا شاعر نے کہ جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔" آپ سکندرِ اعظم ہیں نا جو اکیلے دنیا کو فتح کرنے نکلے ہیں... بڑا غلغلہ ہے جناب آپ کا... آج ایک عجیب شخص نے ہمیں مطلع کیا کہ آپ نے ہمیں منتخب کیا ہے میزبانی کے لیے۔ ہم نے کہا واہ... چشم ما روشن دلِ ما شاد... غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے۔"

" ایک بلا اور بھی ہے میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔" باہر میری کار میں پڑی ہے... اجازت ہو تو اندر لے آؤں ؟"

" اجازت ؟" وہ پھر کھی کر کے ہنسا۔ اس کی ہنسی اندر تو جاتی تھی مگر پھر کہیں حلق سے نیچے اتر کے گم ہو جاتی تھی۔" ارے بھائی، یہاں کس سے اجازت لینی ہے۔ فقیر کا ڈیرا ہے۔ جس کا جی چاہے آئے جائے۔ نہ چور پر قدغن نہ ملک الموت پر پابندی۔"

میں پریشان ہو گیا... میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنا ہوشیار رپورٹر ایسا یاتونی اور مجنوں صفت ہو گا کہ میرا دماغ چاٹ جائے گا۔ میں اب دروازہ اندر سے کھول کے گیا اور بے ہوش ڈرائیور کو اندر اٹھا لایا۔ کوارٹر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ غالب نے اپنے وقت میں کہا تھا کہ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔ آج کا یہ صحافی بھی اس گھر میں اپنی ویرانی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی فقیری میں بھی شاہی کے احساس سے سمجھوتا کیے ہوئے تھا۔ دیواروں پہ گرد تھی اور جالے تھے یا میلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں میں ایک ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ان پر میلے بستر تھے... باقی سب جگہ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر تھے... فرش پر... الماریوں میں... ریک پر... جو بات عجیب لگتی تھی یہ تھی کہ سب رسالے، اخبار بڑی ترتیب اور سلیقے کے ساتھ رکھے گئے تھے جبکہ گھر یا اس کے مکین کو دیکھ کر ترتیب اور سلیقہ بے معنی الفاظ لگتے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

" یہ تمہارا ساتھی ہے ؟" وہ بولا

" نہیں... یہ بھی ایک دشمن ہے۔" میں نے کہا۔" جب ہوش میں آئے گا تو اس سے کچھ پوچھیں گے... ابھی تو مجھے دو

مسائل درپیش ہیں۔ ایک تو باہر جو میری گاڑی کھڑی ہے اسے روپوش کرنا ہے۔ کیونکہ پولیس میرے تعاقب میں ہے۔"

وہ ہنسا۔" جہاں گاڑی کھڑی ہے وہ بہترین جگہ ہے... کیا ہے ؟"

" بہترین جگہ۔" میں نے کہا۔" مگر..."

" یہ غریب کلرکوں کی بستی ہے۔ کاروں والے ادھر نہیں رہتے چنانچہ کسی کار کو تلاش کرتے یہاں کون آسکتا ہے... اور پھر پولیس ہماری... ماشاء اللہ... اس سے کیا ڈرنا۔ اب دوسرے مسئلے پر آجاؤ۔"

" دوسرا مسئلہ ہے پیٹ کا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔" میں نے شام کے بعد سے کچھ نہیں کھایا... تم کیا کھاتے ہو ؟"

" ہم تو بھائی جو ملے، وہ کھاتے ہیں۔ کبھی قوم کا غم... کبھی پبلک کی گالیاں، کبھی ایڈیٹر صاحب کی جھاڑ... مگر یہ سب تمہارے ہضم کرنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، اس گھر میں ایک بھی بیوی نہیں ہے... نہ کبھی ہو گی شاید... چنانچہ سیلف سروس چلتی ہے... تم یہ سوٹ بوٹ اتارو، ولی اتارو... ہم بناتے ہیں کافی جس کے ہم اسپیشلسٹ ہیں کیا ہیں ؟"

" اسپیشلسٹ۔" میں نے مجبوراً جواب دیا۔

" باسی ڈبل روٹی چلے گی ؟" وہ بولا۔

" چلے گی کیا، دوڑے گی۔" میں نے کہا۔" مگر کافی بلیک۔"

" ظاہر ہے، بلیک ہی ملے گی۔ ہم دودھ ویسے بھی نہ ڈالتے دیتے۔" وہ بولا۔

" یعنی سب کے لیے ایک نسخہ ؟" میں نے کہا۔

" بالکل ایک... چائے یا کافی میں تو دودھ ڈالنے کی بدعت ہی نہیں... جسے دودھ کا شوق ہو، باہر جا کے دکان سے پی آئے۔" وہ بولا۔

جب وہ کافی بنانے کے عمل میں مصروف تھا تو میں پھر باہر گیا اور گاڑی میں سے دونوں سوٹ کیس باری باری اٹھا لایا۔ ان میں سے ایک میں کچھ کپڑے بھی تھے۔ دو فوجی وردیوں کے ساتھ میں نے غداروں کے ٹریننگ کیمپ سے چند عام استعمال کے کپڑے بھی اٹھا لیے تھے جو نہ معلوم کس کے تھے۔ کسی بے غیرت پاکستانی کے یا بھارتی دشمن کے... ان میں ایک استعمال شدہ سلیپنگ سوٹ بھی تھا جو میرے کام آگیا۔ موہنی کے کپڑوں کو دیکھ کر مجھے اس کا خیال آیا۔ معلوم نہیں، وہ کیا سوچتی ہو گی۔ میرے یوں خاموشی سے غائب ہو جانے پر اس نے سمجھ لیا ہو گا کہ میں اس پر ابھی تک اعتماد نہیں کرتا۔ اعتماد کرنا آسان بھی نہ تھا۔ بچپن کے جذبات اور اس کی فیملی کے احسانات اپنی جگہ مگر اب

حالات بہت مختلف تھے اور سرحد کے اس پار دشمنوں کے ساتھ آنے والا میرا بھائی بھی ہوتا تو قابلِ اعتبار نہ ہوتا۔

اچانک مجھے " کھی" کی آواز سنائی دی جو چند سیکنڈ میں غائب ہو گئی۔ یہ جنابِ افتخار عارف تھے جو... نسوانی کپڑوں کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر ہنسے تھے۔

" پہن لیں... کچھ بھی پہن لیں۔" وہ کافی کے مگ ایک میز پر رکھ کے بولے۔" رات کا وقت ہے اور ہمارے سوا کون دیکھ رہا ہے... اور اگر ہم سے بھی شرم آتی ہے تو ہم عینک اتار کے رکھ دیتے ہیں..."

" یہ کپڑے میرے نہیں ہیں۔" میں نے خفت سے کہا۔

" اچھا تو پھر ان کے ہوں گے... جو ان کے اندر نہیں ہیں۔ مگر کہا ہے شاعر نے کہ۔ یہ چند روزہ جدائی تو کوئی بات نہیں۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ ایک بہت بھولی بسری یاد نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک بار جب میں پسِ دیوارِ زنداں اپنی مایوسی کے اندھیروں میں اور پُرخوف خیالوں کی بند گلیوں میں بھٹک رہا تھا تو فیض کے یہی دو شعر کسی کے دستِ عنایت نے امید کی روشنی دکھانے کے لیے بھیجے تھے۔ فضائے کنجِ زنداں کو اس دلنواز بندوبست نے زلفِ یار کی صورت مہکا دیا تھا، اور میں پھر کبھی اس خیال سے نہیں ڈرا تھا کہ جدا ہیں آج اگر ہم تو کل بہم ہوں گے یا نہیں۔

وہ میرے چہرے سے میرے جذبات کو پڑھنے میں مصروف تھا اور میرے بارے میں کوئی اندازہ رکھتا تھا تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کس حد تک صحیح یا غلط تھا۔ وہ صورت سے خبطی اور باتوں سے جھکی نظر آنے والا شخص اپنی ذات کے گرد دہرا خول رکھتا تھا۔ وہ بے وقوف نظر آنے کی اور بے وقوف بننے کی پوری کوشش کرتا تھا لیکن یہی اس کی عیاری اور ہوشیاری تھی جس سے وہ دوسروں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتا تھا۔ شاید یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ لوگ اُسے احمق اور بے ضرر سمجھتے ہوئے وہ سب بتا دیتے تھے جو اپنے آپ کو عقلِ کُل اور طرم خان سمجھنے والے رپورٹر جھک مار کے بھی معلوم نہیں کر پاتے تھے۔ یہ پیشہ ہی ایسا ہے کہ اس میں کامیاب وہی ہے جو خبریں نکال لائے خواہ انہیں رازداری رکھنے والوں نے سات پردوں میں چھپا کے رکھا ہو۔ اس کا ہر حرف خود اپنی صداقت کا شاہد ہو اور مکمل ہو۔ سچائی کی تہ تک پہنچنے کے لیے ہر شخص اپنی عقل ذہانت اور ہمت کے مطابق راستہ بناتا ہے لیکن افتخار ان میں سے نہیں تھا جن کا راستہ روکا جا سکے کیونکہ وہ نیچے ہی نیچے سے سرنگ بنا کے اپنا راستہ نکالتا تھا اور اسی خفیہ راستے سے سچ کو اغوا کر کے لے جاتا تھا۔

نازو کے بارے میں اس کی رپورٹ یہی ثابت کرتی تھی اور بعد کے حالات نے میرے خیال کی تصدیق کی۔

جب میں کپڑے بدل کے آیا تو وہ ڈھیلی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے تمام دیواروں پر چسپاں رنگین تصاویر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

" کیا یہاں کوئی شریف آدمی نہیں آتا ؟"

وہ ہنسا۔" شریف آدمی ہم سے ملنے نہیں آتے۔ انہی سے ملنے آتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب انہیں بے کیف اور بلیک اینڈ وائٹ خوابوں کی شکایت لاحق ہو۔"

" میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو ؟" میں نے مگ اٹھا کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

" سب جانتے ہیں ہم... اور جو نہیں جانتے وہ پوچھ لیں گے مگر آپ فرمائیں کہ کسی تعارف کے بغیر آپ ہمارے پاس کیوں تشریف لے آئے۔ کیا لے آئے ؟"

" تشریف !" میں نے جھلا کے کہا۔" یہ کیا فضول عادت ہے تمہاری ؟"

وہ ہنسنے لگا۔" ضروری نہیں کہ تم میری بات دہراؤ... فرض کرو یہاں میں نہ ملتا، پولیس ملتی۔"

" میں ایسی بات فرض کر سکتا تو تم سے رابطہ ہی قائم نہ کرتا۔ تم جیسا آدمی سب کچھ کر سکتا ہے مگر کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

" تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔"

" نہیں... تمہاری رپورٹ دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ تم صرف سچ بول سکتے ہو۔ اور سچائی کو سمجھتے ہو... مجھے اپنی سچائی پر بھروسا تھا۔ چنانچہ مجھے معلوم ہوا کہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو تو مجھے کوئی ڈر نہ رہا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم سے نازو کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔"

" آں ؟" وہ اُلو کی طرح گول گول دیدے گھما کے مجھے دیکھنے لگا۔" یہ کیا چیز ہے ؟"

" وہی لڑکی جس کے بارے میں تم نے سب سے الگ رپورٹ دی تھی۔"

" تم جانتے ہو اُسے ؟" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

" ہاں... اور مجھے اسی کی تلاش ہے۔" میں نے کہا۔" اس کا اصل نام نائلہ بیگم ہے... اس کا ساتھی ڈبل ایس آئی شیخ ہے۔ جو رشتے میں اس کا بڑا بھائی بھی ہے۔"

" ڈبل ایس آئی ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

" وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ سب انسپکٹر سید اکرام شیخ۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چنانچہ میں اُسے ڈبل ایس آئی شیخ کہتا تھا۔ کچھ بہن کی وجہ سے اور کچھ فرض شناسی کے چکر میں اُسے پولیس کی نوکری کو ترک کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ خدمتِ خلق کے جذبے سے بھرپور دل کے ساتھ اس پیشے سے وابستہ ہوا تھا... وہ دونوں ہمارے ساتھی ہیں۔"

"ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھاؤ۔" وہ بولا۔

میں نے باسی ڈبل روٹی پانی کے ساتھ نگل لی تھی اور اب کافی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ سگریٹ سلگا کے میں نے اُسے تفصیل سے بتایا۔ اپنے بارے میں... محسن اور رابعہ کے بارے میں... شہلا اور نازو، اکرام شیخ اور غالب کے بارے میں۔ ظاہر ہے اس میں دلاور اینڈ کمپنی کا ذکر بھی تفصیل سے آیا... وہ بیچ بیچ میں سوالات کرتا گیا۔ میں نے غیر اہم تفصیلات سے گریز کیا اور وقت بچایا۔ پھر بھی صبح ہوگئی۔ اس نے دوسری بار کافی بنائی اور ایک گولی نگل لی۔

"یہ کیا دوا تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ نیند بھگانے کی گولی تھی... کھاؤ گے؟" وہ بولا۔

"نہیں... میں مسلسل جاگتے رہنے کی بہت مشق کر چکا ہوں۔"

"ہم تو نائٹ برڈ ہیں نا..." وہ بولا۔ "دن چڑھتے ہی نیند طاری ہونے لگتی ہے... میں ذرا مستعد رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ گاڑی میرے لیے ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے غائب کرنے کی کوئی صورت ہے؟"

"کئی صورتیں ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک تو یہ ہے کہ اسے شیر شاہ کے سرجنوں کے سپرد کر دیا جائے۔"

"کون شیر شاہ... سوری؟"

"شیر شاہ ایک ایسا میوزیم ہے جس کی نظیر دنیا میں شاید کہیں نہ ہو۔" وہ بولا۔ "پرانی گاڑیوں کے پرزے وہاں کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی کسی بھی گاڑی کے کسی بھی ماڈل کی بات کرو اور کوئی بھی پرزہ مانگو... وہ حاضر کر دیں گے... ویسے تم آٹو پارٹس کی ساری مارکیٹ چھان مارو تو نہیں ملے گا۔ یہ پرزے اسکریپ کی صورت میں جہاز بھر بھر کے لائے جاتے ہیں، اور بعض پرزے تو ایسی گاڑیوں کے ہوتے ہیں جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد بننا بند ہوگئی تھیں۔ جیسے ماہر قصاب زندہ گائے کو دیکھتے دیکھتے بوٹی بوٹی کر دیتا ہے ایسے ہی شیر شاہ کے ڈیلر نئی پرانی ہر کار کا پرزہ پرزہ یوں الگ کرتے ہیں کہ کار واقعی غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی سالم گاڑی اگر چوری ہو جائے تو شیر شاہ کے چند سرجن ایسے بھی ہیں جو دو گھنٹے میں گاڑی کا سراغ تک باقی نہیں چھوڑتے۔ وہ مشکوک گاڑیاں خریدتے بھی تول کر ہیں۔ چنانچہ انھیں بالکل نئی گاڑی کو ختم کرتے ہوئے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ پھر ڈیش بورڈ کہیں گیا... دروازے کہیں... ٹائر اور اسٹیئرنگ الگ.... انجن کہیں

اور... عموماً بعد میں اس پر نیا نمبر ڈال کے بیچ دیا جاتا ہے۔ کسی ضرورت مند کو۔"

"مجھے ایسی گاڑی کا یہ حشر منظور نہیں۔"

"تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کا رنگ بدلوا لیا جائے اور کوئی نیا نمبر لگوا لیا جائے... انجن پر بھی اور چیسس پر بھی۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "کیا یہ بھی ممکن ہے؟"

"ناممکن یہاں کچھ نہیں۔ نیا رجسٹریشن نمبر بھی مل سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن کاغذات میں کچھ اور ہوگا تو...؟"

وہ ہنس پڑا۔ "کاغذات کا کیا ہے... اس کے مطابق ہو جائیں گے۔"

"نہیں بھائی... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تو پھر تیسری صورت یہ ہے کہ اسے فروخت کر دیا جائے۔ سیکرٹ سروس کے ذریعے۔" وہ بولا۔ "جہاں چوری کی گاڑیاں خریدی جاتی ہیں اور غیر علاقے میں پہنچا دی جاتی ہیں... اب مالک چاہے تو پولیس کے ساتھ جائے۔ تاوان ادا کرے اور گاڑی لے آئے ورنہ کوئی اور لے جائے گا... بس وہ قیمت کم لگاتے ہیں... تقریباً ایک تہائی... دو تہائی پہ بیچ دیتے ہیں... تقریباً دس ہزار مل جائیں گے تمھیں۔"

"تمھارا رابطہ ہے ان سے؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔

"ہاں... شہر میں رہ کے شہر سے رابطہ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"بس تو یہ ٹھیک ہے... اسے بکوا دو... میں دوسری گاڑی لے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"بہت پیسہ ہے تمھارے پاس؟" وہ بولا۔

"ہاں... اتنا کہ خود مجھے اندازہ نہیں۔" میں نے کہا۔ "صندوق بھرے پڑے ہیں۔"

"کیا پارٹ ٹائم ڈاکے بھی ڈالتے ہو؟" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ مذاق کی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ لیتے ہو۔" باری باری میں نے اُسے دونوں باکس کھول کے دکھائے تو اس کی صورت پر بارہ بج گئے۔

"یہ سب مالِ غنیمت ہے... دشمن سے لوٹا ہوا مال۔" میں نے کہا اور یہ دستاویزات۔ جعلسازی کا سامان... جعلی مہریں، لیٹر ہیڈ اور یہ سب پاسپورٹ..."

"بھائی... تم تو بہت خطرناک آدمی ہو۔" وہ بولا۔ "یہ سب ساتھ لیے پھرتے ہو؟"

"اور کیا کروں..." میں نے کہا۔ "کسی بینک کے لاکر میں

وا دوں؟"

"یہی کرنا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "ورنہ یہاں وہ بم گرا دیں گے۔"

"انھیں کیا معلوم...؟"

"دشمن کو سب معلوم ہو جاتا ہے میاں سکندرِ اعظم... ان ایجنسی والے اور ہمارے ففتھ کالم کے لوگ مل کے کام کر رہے ہیں اس وقت... کوئی پتا نہیں چلتا کہ اپنوں میں کتنے ایسے میں جو پرائے ہو چکے ہیں۔ دو قومی نظریے سے پھر چکے ہیں اور سونار بنگلہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواہ اس کی تعبیر کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو۔ یہاں سرکاری دفاتر میں، سیکرٹریٹ میں، پرائیویٹ اداروں میں بنگال کے رہنے والوں کا ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے... شیخ مجیب اور اس جیسے دوسرے سیاسی بازیگروں نے ان کے جذبات بھڑکانے کے لیے استحصال کا نعرہ بلند کیا ہے۔ یہ شور مچا رکھا ہے کہ مغربی حصے کی حکومت ہے اور مشرقی حصہ محکوم ہے۔ آمدنی ان کی ہے اور کھا جاتے ہیں ہم مغربی پاکستان والے۔ وہاں آبادی کی کثرت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شرحِ آبادی میں کمی کے سارے پراجیکٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے غربت کم نہیں ہو سکتی۔ معاشی اور سیاسی استحصال کا نعرہ پڑھے لکھے جاہلوں کو گمراہ کر چکا ہے۔ یہاں تمام بنگالی مشرقی پاکستان جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور ان کی وفاداری غیر یقینی ہو چکی ہے۔ شاید اُلٹی دشمنی کے جذبات میں ڈھل چکی ہے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں کس کس جگہ سے وہ حکومت کی انتظامی صلاحیت کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور مخاصمانہ رویے کے باعث دشمن کے عزائم کا ساتھ دے رہے ہیں... اوپر سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ کتنے وفادار رہیں گے اور کتنے نہیں۔ قواعد و ضوابط کی بات ہے نا۔ انھیں کسی بھی محکمے میں کسی سیٹ سے کیسے ہٹایا جا سکتا ہے اور ان سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کسی فائل کو ہاتھ مت لگاؤ... وہ ٹاپ سیکرٹ فائلوں تک اپروچ رکھتے ہیں اور انھیں منع کرنا ناممکن ہے۔ سب پر نظر بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ خود میرے آس پاس ان کوارٹروں میں بنگالی بھرے پڑے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ رات کو چھپ کے کہیں اکٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی ایک کے گھر کبھی دوسرے کے۔ اور مجیب الرحمان کے نکات پر بحث کرتے ہیں... بیشتر حمایت میں ہوتے ہیں مگر انھیں یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ وہ خود جانے کی بات نہ کریں یا قول و فعل سے غدار ثابت نہ ہوں۔"

جب وہ بول رہا تھا تو میں نے ایک مختلف آدمی کو دیکھا۔ ذہین... دور اندیش نگاہیں رکھنے والا... باریک بین... منطقی سوچ کا مالک... سچا پاکستانی اور کٹر قوم پرست... غیر جذباتی اور مخلص۔

"تم جن سے لڑ رہے ہو نا... وہ تو سامنے کے دشمن ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "زیادہ خطرناک یہ ہیں جو ابھی تک وفاداری کا اور دوستی کا ماسک چڑھائے بیٹھے ہیں... حقیقی جذبات پر مصلحت کا پردہ ڈالے خاموشی سے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تذبذب کا شکار ہیں... اگر حالات نے موافقت کا انداز اختیار کیا تو... واہ واہ... یہ فوراً بوریا بستر سمیٹ لیں گے اور جاتے جاتے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے جتنا نقصان کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے ضرور کریں گے... ان کی کھوپڑی میں بیٹھ گئی ہے نا کہ مغربی پاکستان نے ان پر اب تک بہت ظلم کیا... انگریز آقاؤں سے بھی بُرا... اپنی دانست میں وہ ہم سے ایک جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں... اور تم تو جانتے ہو کہ انھیں تھپکی دینے والے اور لڑانے کے لیے اسلحہ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں... ہمیں کیا بہت سے لوگ یہ سب جانتے ہیں مگر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اب یہاں کی مثال لو۔ جن بنگالیوں کو یہ کوارٹر الاٹ ہیں وہ جاتے وقت کسی کو ہینڈ اوور کر کے نہ گئے تو کیا ہوگا... ویسے تو انھیں باقاعدہ اسٹیٹ آفس سے کلیئرنس لے کر اور کوارٹر باقاعدہ حوالے کر کے جانا چاہیے لیکن بہت سے فرار ہو رہے ہیں... راتوں رات... ہوائی جہاز سے، بحری جہاز سے بمبئی اور سری لنکا کے راستے... نیپال کے راستے۔ معلوم ہے وہ کیا کر رہے ہیں... وہ پنکھے تک اتار کے کباڑیوں کو دے رہے ہیں... کھڑکی دروازے تک بیچ رہے ہیں۔ کون پکڑے گا انھیں، نقصان تو سرکاری ہے... خیر... یہ تو لمبی بات ہے اور شاید اس میں تمھارے لیے بھی نئی بات کوئی نہ ہو۔"

"سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کے ففتھ کالم کا ذکر کر کے تم نے میرے ذہن میں زیادہ بڑے خطرے کا احساس پیدا کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ان حالات میں تو میرا یہاں رہنا ایسا ہی ہے جیسے بھارتی ایجنٹوں کے درمیان رہنا... تم مجھے کہیں اور منتقل نہیں کر سکتے؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے چٹکی بجائی۔ اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ "ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ بابو لوگ سات بجے کے قریب گھروں سے نکلتے ہیں۔ یہ وقت ہمارے نکلنے کے لیے بہت اچھا ہے... تمھارا یہ قیدی مر تو نہیں جائے گا؟"

"امید تو نہیں... مر گیا تو مجھے صرف یہ افسوس ہوگا کہ اس سے کچھ پوچھنا تھا، وہ نہ پوچھ سکا۔" میں نے کہا۔

"تو اسے لپیٹو ایک چادر میں اور لے جاؤ... میں دونوں سوٹ کیس لاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "... تم سوٹ کیس اٹھا لو۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ ایک منٹ میں اس نے چادر ڈال کے ڈرائیور کو لپیٹا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ چھ فٹ کا خاصا صحت مند آدمی تھا مگر اپنے حلیے سے اس نے خود کو بیمار بنا رکھا تھا۔

"تم... ایسے ہی چلو گے؟"

"اور کیا ڈرائی کلینر کے پاس سے نیا سوٹ لا کے پہنیں گے ہم؟ ارے میاں ہمارا نائٹ سوٹ... ڈے سوٹ۔ ڈنر سوٹ سب ایک ہے۔" وہ بولا۔ "اور تم بھی یہ نخرے چھوڑو۔"

"کیا مطلب... اسی نائٹ سوٹ میں؟"

"ہاں بھائی... فرض کرلو کہ رات ہے۔" وہ بولا۔ "کسی کو کیا کہ تم اپنے دماغ میں دن کو رات فرض کیے جا رہے ہو۔"

پانچ منٹ میں اس نے دروازے کو مقفل کیا اور ہم گاڑی تک جا پہنچے۔ اس نے سوٹ کیس ڈکی میں رکھوائے اور بے ہوش ڈرائیور کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ میں نے چپل اور نائٹ سوٹ میں پہلی بار کراچی جیسے بڑے اور ماڈرن شہر کی سڑکوں پر ڈرائیونگ شروع کی۔ مجھے حیرت ہوئی جب کسی نے ہمیں گھور کے بھی نہیں دیکھا۔ غالباً ہمارا اپنا احساس ہمیں زیادہ پریشان رکھتا ہے کہ ہم کیسے نظر آ رہے ہیں۔ پتلون کی کریز... قمیص کے کالر کا داغ۔ ٹائی کی بھدی ناٹ... ان سب کا خیال صرف ہمیں اندر ہی اندر شرمندہ کرتا ہے، ورنہ دوسروں کو نہ ان کی پروا ہوتی ہے نہ خبر... سب اپنے اپنے کام سے اپنے اپنے راستے پر جا رہے تھے اور کوئی کسی کے لباس پر غور نہیں کر رہا تھا۔ شاید میں صرف نیکر پہن کے بھی گاڑی چلاتا تو کچھ نہ ہوتا۔ کوئی دیکھتا بھی تو خود رک کر اور میرا راستہ روک کے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے وقت ضائع نہ کرتا۔ زیادہ سے زیادہ دل میں کہتا کہ کیسے کیسے پاگل کے بچے کاریں لیے پھر رہے ہیں... اور بس...

مجھے کراچی کی سڑکوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر میرا میزبان رننگ کمنٹری کرتا جا رہا تھا۔ قائدِ اعظم کے مزار کو مکمل دیکھ کر میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔ "یہ کام بھی ہو ہی گیا بائیس سال میں۔"

"ہاں... ہم سلو موشن میں سوچتے اور کام کرنے لگے ہیں۔ اور قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل دونوں سے محروم ہو گئے ہیں۔" وہ بولا۔ "ایک وہ جینئی ہیں... جناتی قوم... ہمارے بعد آزاد ہوئے تھے... سنتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ انھوں نے وہ کام دنوں میں کیے جو ہم نے سالوں میں کیے۔ آئین توڑے سو توڑے، اب ملک کو توڑنے کے درپے ہیں۔ ہم جب بابائے قوم کے مزار کے سامنے سے گزرتے ہیں تو خود کو شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ کئی بار سوچا مگر ہمت نہیں پڑتی اندر جا کے فاتحہ پڑھنے کی۔ یہی خیال آتا ہے جو ہمارے چچا غالب کو آیا تھا۔ کہ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب؟ ہم کیا منہ دکھائیں قائدِ اعظم کو۔ پاکستان کا یہ حشر کر کے۔"

"یہاں سے بائیں جانب موڑ لو... یہ وکٹوریہ روڈ ہے۔"

"ایک بات کہوں... بُرا تو نہیں مانو گے؟" میں نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں تم کیا کہو گے... بُرا کیا ماننا۔" وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا۔ "ہم بکواسی ہیں۔"

"نہیں... آپ صورت سے احمق نظر آتے ہیں۔ یا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

"آپ اپنی صورت پر مت اترائیں زیادہ۔" وہ ... کے بولا۔ "ہم بتائیں گے آپ کو کہ آدھے شہر کی لڑکیاں اسی ... پر فریفتہ ہیں۔"

"اور باقی آدھے شہر کی؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہم انھیں شمار کریں۔" وہ بولا۔ "وہ بس دیکھنے میں لڑکیاں نظر آتی ہیں... یہ فوارہ دیکھ رہے ہو؟"

"نہیں... ایک ستارہ نما چیز دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ میوزیکل فونٹین تھا۔" وہ بولا۔ "جب صدر آئزن ہاور نے پاکستان کا دورہ کیا تھا تو بنایا گیا تھا۔ اب صرف فوارہ ہے میوزک کسی نے نکال لی ہے یا ختم ہو گئی ہے۔"

میٹروپول سے اس نے مجھے دائیں طرف چلنے کو کہا۔ وہاں کھڑے ہوئے سنتری نے افتخار کو سلام کیا۔

"یہ تمھیں پہچانتا ہے؟"

"ہمیں نہ جانے کتنے لوگ پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"پھر تو یہ اچھا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔ "اس نے تمھیں میرے ساتھ ادھر جاتے دیکھ لیا۔"

"یہ ہمیں ہر جگہ آتے جاتے دیکھتا ہے۔ کبھی نہیں روکتا۔"

"میرا مطلب تھا اس نے یہ کار دیکھ لی ہے۔"

"وہ ہر روز ہزاروں کاریں دیکھتا ہے... اور ان میں فرق نہیں بتا سکتا کہ کون سی فوکس ویگن تھی اور کون سی اوپل۔ ... دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا خر میں اور خرگوش میں۔"

"لیکن وہ رنگ اور حلیہ بتا سکتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ... کیسے بتا سکتا ہے... اور بتا سکتا ہے تو کیا ہم انکار نہیں کر سکتے۔" وہ جھلّا کے بولا۔ "اس کے مقابلے میں تو ہماری ہی مانی جائے گی... ہم یہاں سے گزرے ہی نہیں کیونکہ ہم اس وقت سوئے ہوتے ہیں... سارا زمانہ جانتا ہے۔

یہ پل ہے۔ اس کے بعد کوئنز روڈ کے ڈرم ٹائپ بنگلے ہیں۔ ان میں زیادہ تر نیوی کے افسر رہتے ہیں مگر بہت سے خالی پڑے ہیں۔ حالانکہ الاٹ ہو چکے ہیں۔ ڈی ٹائپ ہیں جو افسران کو ملتے ہیں مگر وہ ان گول ٹین کی چھت والے بیرک نما کوارٹروں سے جان چھڑاتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ گارڈن روڈ یا لارنس روڈ کی طرف چلے جائیں... نہ جا سکیں تو کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔ میرے پاس ایک بیرک کی چابی ہے۔"

"وہ کس کے نام الاٹ تھی؟"

"ہے ایک چھوٹا سا لاوارث محکمے کا افسر۔"

"یہ سڑک آگے کہاں جاتی ہے؟" میں نے کہا۔

"کیماڑی کی طرف... مگر تم اسی جگہ سے موڑ لو۔" وہ بولا۔

بیرک میں تالا ضرور لگا ہوا تھا مگر اسے کسی خانہ بدوش فیملی نے توڑ کر اندر ڈیرا ڈال لیا تھا۔ کار سے افتخار کو اترتا دیکھ کے وہ بدحواس ہو گئے۔ افتخار نے ان پر گرجنا شروع کیا۔ "باپ کی جاگیر ہے۔ سالے چور اچکے... کیسے گھسے تم لوگ اندر اور وہ جو سامان تھا اندر ایک لاکھ کا وہ کہاں ہے؟ ابھی بلاتا ہوں پولیس کو۔ تمھاری روح تک قبض ہو جائے گی۔"

وہ افراتفری میں بیوی بچے اور گدڑیاں سمیٹ کر فرار ہوئے تو میں نے ایک ایسی عمارت دیکھی جس کے اوپر نیم دائرے میں ٹین کی چھت منڈھ دی گئی تھی۔ نیچے دیواریں کھڑی کر کے اور خانے بنائے گئے تھے۔ ٹین کی چھت کے نیچے گتے اور ... کی جو چھت بنائی گئی تھی وہ ادھڑ چکی تھی۔ دیواروں پر سوئچ پڑے تھے اور صرف دو ہولڈر اس قابل تھے کہ ان میں بلب لگائے جا سکیں۔ بے حد قدیم پنکھوں کو میں نے ریگولیٹر کی مدد سے چلایا تب مجھے کرنٹ لگا۔ افتخار "کھی" کر کے ہنسا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے گاڑی کو اندر کر دوں۔" میں نے خفت سے کہا۔

"گیراج باہر ہے۔" وہ بولا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ ... ایک گیراج نما نیچی چھت والا کمرا تھا۔ اس کے پٹ بند تھے میں نے اسے کھولا تو انکشاف ہوا کہ اندر ایک فقیر کا ڈیرا ہے۔ وہ غالباً ڈیوٹی پہ جا چکا تھا۔ اس کا سارا کاٹھ کباڑ باہر پھینک کے میں نے گاڑی کو اندر داخل کیا۔ لمبی چوڑی کار نے پورے گیراج کو گھیر لیا اور دائیں بائیں صرف اتنی ہی جگہ باقی رہی کہ دروازے کھولے جا سکیں۔ فقیر کے اسباب میں ... ایک کورا گھڑا بھی تھا۔ اس میں اوپر تک نوٹ ہی نوٹ ٹھونس کر بھرے گئے تھے۔

"یہ تمھارے لیے بہت محفوظ جگہ ہے۔" افتخار نے کہا۔ "تم اگر ایسی ویسی حرکت نہ کرو... تو..."

"ایسی ویسی حرکت سے تمھاری مراد ہے شراب پی کر غل غپاڑا اور عاشقی معشوقی...؟"

"نہیں... تم اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کو ایسی ویسی حرکت میں شمار کر سکتے ہو۔ بھئی یہاں مار دھاڑ ہونے لگے گولیاں چلیں اور بم پھینکے جائیں تو کیا ہوگا؟" افتخار نے کہا۔ "بس گمنام رہو جب تک رہنا ہے... ایسے کہ نہ کسی کو آنے کا پتا چلے نہ جانے کا... یہاں کوئی کسی سے سروکار نہیں رکھتا۔ کس نے پڑوس کر جھانکا کون ہو۔"

"یہ ایک بڑا کام ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "باقی مسائل میں حل کر لوں گا جن کا تعلق میری ذات سے ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور سونے کا بندوبست... اصل کام جن کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ ہیں۔ پہلا کام ہے نازو کی تلاش... اس کے بعد الجبر کی... بڑا مسئلہ یہ ہے کہ رات کو تم مصروف ہوتے ہو اور دن تمھیں سونے کے لیے چاہیے۔ میرے معمولات اس کے برعکس ہوں گے... عام طور پر... چنانچہ اس تلاش میں تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔"

"یہ تو ہے۔" وہ سر کھجا کے بولا۔ "پھر بھی میرے لیے جو کام ہو وہ ضرور بتانا... میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"ایک کام تو یہ کرو کہ مجھے کوئی گاڑی لے دو۔ ابھی راستے میں مجھے شو روم نظر آئے تھے۔ وہ سب پرانی گاڑیاں تھیں نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پانچ ہزار سے پانچ لاکھ تک کی کار مل سکتی ہے۔"

میں نے ایک دو جگہ زرد نمبر پلیٹ والی گاڑیاں دیکھی ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ڈپلومیٹک مشن کی ہیں؟"

"ہاں... کونسلیٹ بہت ہیں یہاں۔"

"مجھے ایسی ہی گاڑی لا دو۔ ڈپلومیٹک نمبر پلیٹ والی۔"

"تم ذرا بھی ڈپلومیٹ نہیں لگتے۔" وہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ کے بولا۔

"میں فرنچ پر عبور رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تھوڑی بہت جرمن بھی سمجھ اور بول لیتا ہوں... رہی شکل تو وہ میں کبھی ایک نہیں رکھتا۔ مجھے کسی ایکسپرٹ میک اپ مین کی خدمات درکار ہیں تاکہ میں بے خوف و خطر پھر سکوں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک سوٹ کیس میں جعلی دستاویزات کی فیکٹری بند ہے۔ بے شک وہ سارے جعلی پاسپورٹ ہیں مگر جب تک میں باہر جانے کے لیے کسی ہوائی جہاز یا بحری جہاز پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا، اسے کون غور سے دیکھے گا۔ شہر کے اندر جو پولیس ہے وہ اصلی نقلی کے فرق کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ وہ تو بس میری شناخت کا ذریعہ ہوگا... اور مقامی پولیس سے محفوظ رہنے کا وسیلہ... میرے دشمن بھی مجھے نظر انداز کرتے رہیں گے اور میں سب کے درمیان رہ کے بھی سب

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

سے الگ رہوں گا... مجھے بندرگاہ کے علاقے میں بھی رہنا ہوگا... وہ چار دن تو کم سے کم... اور وہ خطرناک جگہ ہوگی میرے لیے۔"

"ابھی کیا پروگرام ہے؟" وہ بولا۔ "میں رات کے وقت آؤں گا تو گاڑی بھی لے آؤں گا اور میک اپ کرنے والے کو بھی۔"

"یہاں لاؤ گے اُسے؟" میں نے کہا۔

"اچھا تمھیں لے چلوں گا اس کے پاس۔" وہ بولا۔

"ابھی میں تمھارے ساتھ واپس چلوں گا۔" میں نے کہا۔ "میرا بھوک سے بُرا حال ہے... تم چاہو تو سو جانا... میں ذرا اس بندے سے کچھ پوچھوں گا۔"

"میرے کوارٹر میں...؟"

"اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے رکھوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو بے ہوش ہے اور مجھے تشویش ہو رہی ہے کہ ہوش میں نہ آیا تو کیا ہوگا۔ کوئی ڈاکٹر ہے بھروسے کے قابل؟"

"سب ہو جائے گا... یہ مر گیا تو اس کی تدفین بھی ہو جائے گی... تم کہو گے تو پوسٹ مارٹم بھی ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر تم ایک ٹیکسی لے آؤ... ہم واپس چلتے ہیں۔"

لمقصد اس کار کو چھپانا تھا اور ایک ٹھکانا حاصل کرنا تھا۔ میں خود کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا کسٹم انسپکٹر اور پولیس کی رپورٹ پر میرا حلیہ اور کار کا نمبر مشتہر کرنے والے مجھے آسانی سے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں شہر میں خاموشی سے وارد ہونا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیسے تستاری میرے پیچھے لگ گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایک معرکہ سر کرنا پڑا۔ وہ ٹرک کس کا تھا اور کہاں گیا۔ شاید اب اس کا پتا افتخار عارف بھی نہ چلا سکے مگر ٹرک کے مالکان یقیناً شہر میں اپنے کارندوں کو چوکس کر دیں گے کہ شکار نکل گیا۔ میرا گمان کہتا تھا کہ ڈرائیور اس بدمعاش حاجی عبداللہ کا کتا ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ایک کلینر بھی ہوگا... وہ اس واردات کی پوری رپورٹ آگے پہنچا دے گا۔

افتخار عارف نے راستے میں ایک جگہ ٹیکسی روکی۔ یہ اس کے کسی جاننے والے ڈاکٹر کا گھر تھا۔ وہ بھی نوجوان ڈاکٹر تھا اور افتخار سے تما عمایت تکلف تھا۔ اس نے ڈرائیور کو باہر آ کے ٹیکسی میں ہی دیکھا... وہ پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا... آخر گرا کیسے...؟" ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی۔

"کیا میں گر کے بتاؤں... یا تمھیں گرا کے دکھاؤں... یہاں کوئی زینہ ہے؟"

یہ چوٹ...؟ ڈاکٹر نے سر پر ایک جگہ اُبھار دیکھ کر شتبہ لہجے میں کہا۔ "نیچے کوئی کنکر پتھر تھا؟"

"کنکر... سائز کا پتھر ہوتا ہے... اور پتھر اس سائز کا ہو تو کنکر شمار ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

"ابے جھکی... اس کے سر میں یہ چوٹ کیسی ہے؟"

"بیوی نے مجھے چمٹا کھینچ کے مارا تھا۔ اس نے اپنا سر آگے کر دیا۔ تو سر اغر سانی چھوڑ علاج کر۔"

"اس کیس میں آبزرویشن ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "خیر میں ایک انجکشن دے رہا ہوں... اگر الٹیاں نہیں آ رہی ہیں تو ممکن ہے یہ ہیمرج نہ ہو۔ کن کشن کا اثر ہو... جھٹکے سے مغز ہل جاتا ہے۔ دو تین گھنٹے میں ہوش نہ آیا تو پھر ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ سر کا ای ای جی کرانے کے لیے۔"

وہ اندر گیا اور پھر باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ اس نے ڈرائیور کے بازو میں سوئی اتار دی۔

"یہ دوائیں لے لینا۔" اس نے ایک پرچی افتخار کو تھما دی۔

"تیری منگیتر کا کیا حال ہے؟" افتخار ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اسے فون مت کیا کر... وہ تیرے جال میں نہیں پھنسے گی۔"

"میں اسے اغوا کر کے بھی لے جا سکتا ہوں... مگر سوچتا ہوں جلدی کیا ہے تیری شادی کے بعد سہی۔" افتخار نے کہا۔

"اپنی شادی سے پہلے میں تجھے سائنائڈ کا انجکشن لگا دوں گا... یا لگوا دوں گا... ویسے میں سنکھیا دے دوں گا۔" ڈاکٹر بولا۔ اور واپس گھر میں گھس گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور دم بخود بیٹھا تھا۔

افتخار نے اُسے ڈانٹا۔ "تم چلو گے اب یا میں دھکا دوں؟"

★★★
★★★

ہم دونوں ٹرک ڈرائیور کو اُٹھا کے اندر لے گئے اور ایک پلنگ پر لٹا دیا۔

"اس کے ہوش میں آنے سے پہلے مجھے نہا دھو لینا چاہیے اور تمھیں ناشتا وغیرہ تیار کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"میں ناشتے کا عادی نہیں ہوں۔ عموماً لنچ ہی کرتا ہوں، مگر تمھارے لیے پوری چھولے لا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "جب میں آیا تھا تو تمھارا انداز گفتگو... طور طریقہ سب مختلف تھا۔"

وہ ہنسا۔ "دو دن سے میں یہی رول کر رہا تھا۔ ایک خبطی شخص کا... جو شاعر بھی ہے۔ تمھاری نازو کے بارے میں جو رپورٹ میں نے حاصل کی وہ بھیس بدل کے حاصل کی تھی۔ ایک کسٹم آفیسر ہیں جو بڑے شاعر پرست بنتے ہیں۔ ان کے توسط سے ممنوعہ علاقوں تک پہنچا اور اب تم سے کیا چھپانا۔ ایک بنگالی کسٹم افسر اور اس جہاز کے کپتان کا لنک بھی دریافت کر لیا۔"

"اس جہاز کا نام کیا ہے؟"

"ایس ایس کرانتی تھرڈ۔" وہ بولا۔

"ابھی بندرگاہ میں موجود ہے؟"

"ہاں... ایک ہفتے بعد سیل کرے گا۔" وہ بولا۔ "تم اس کے چکر میں مت پڑنا... میرا کیس بھی خراب کرو گے۔ میں اس بنگالی کو رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے جال پھیلا چکا ہوں۔ وہ کلیرنس میں مدد دیتا ہے۔"

"کس چیز کی کلیرنس میں؟"

"غالباً اسلحہ... کریٹ پر تو لکھا ہوتا ہے کہ ٹوٹنے والا سامان۔ اور وہ سارے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ تیر کا اور چھتری کا یعنی بارش سے بچائیے اور سیدھا رکھیے۔ ہک مت استعمال کیجیے۔"

میں نے فقط سر ہلایا اور نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ وہاں شاور وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے بالٹی اور مگ استعمال کرنا پڑے۔ میں نہا کے فارغ ہوا تو افتخار ناشتے کا بندوبست کر چکا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور میں سگریٹ سلگا کے ٹرک ڈرائیور کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ انجکشن کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور وہ ہاتھ پیر ہلا کے اوں آں کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور پھر ہاتھوں کو کمر کے پیچھے کر کے باندھ دیا تاکہ وہ پٹی نہ ہٹا سکے۔

ایک گھنٹے بعد وہ اس حد تک ہوش میں آ چکا تھا کہ میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا اور ایک مگ سیاہ کافی زبردستی پلا دی۔ اس دوران میں آواز بدل کے اسے تسلی دیتا رہا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اسے واپس کراچی پہنچا دیا جائے گا۔

"لیکن... میں ہوں کہاں؟"

"تم حیدرآباد میں ہو..." میں نے کہا۔ "تمھیں کچھ یاد ہے تمھارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

اس نے رک رک کے وہی بتایا جو ہوا تھا۔

"وہ کون تھا جس نے تمھارے سر پر ریوالور مارا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم... مجھ سے تو بس یہ کہا گیا تھا کہ... تم کو پولیس پکڑے گی... ڈرنا نہیں... وہ تم کو روکے رکھیں گے۔ پھر تمھارے پیچھے ایک کار آ جائے گی... کہہ دینا وہ ٹرک کا مالک ہے۔ اسے تھانے لے جائیں تو تم بھی چلے جانا... تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"کس نے کہا تھا یہ سب؟"

"وہ حاجی صاحب کا خاص آدمی ہے۔" وہ بولا۔

"مکرانی ٹائپ... کانوں میں مُندریاں پہنتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی... آپ جانتے ہو اسے؟"

"ہاں... وہ تمھیں کہاں ملا تھا؟"

"ملتان میں جی۔"

"اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟ ڈر کی وجہ سے یا لالچ میں؟"

"دونوں ہی باتیں ہیں جناب۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ سخت ڈرا ہوا ہے۔ شاید اس نے ایسے کام پہلے کبھی نہیں کیے تھے اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مجھے اس پر ذرا بھی تشدد نہیں کرنا پڑا۔ وہ خود ہی سب کچھ بتا رہا تھا۔ ساری سازش پیڈرو کی تھی... وہ ملتان سے میرے پیچھے لگا رہا۔ میرے غائب ہو جانے کے بعد اس نے بیکی اور جونی پر نظر رکھی اور مظفر گڑھ سے واپسی پر جب میں نے دوبارہ ان سے رابطہ قائم کیا تو پیڈرو کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس نے وہیں دیکھ لیا ہوگا کہ مجھے کون سی کار فراہم کی گئی ہے۔ یا اسے یہ بات بعد میں پتا چلی ہوگی۔ سلطان محمد خان کے بیٹے ملتان میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ کسی کار ڈیلر نے تصدیق کر دی ہوگی کہ آج ان کے ایک صاحبزادے نے فلاں کار خریدی ہے۔ میرے حالات حیدرآباد میں رک جانے سے اس کے پلان میں خلل پڑا ہوگا مگر دوسری رات وہ کامیاب رہا۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ... میں آ رہا ہوں؟"

"ہم تو اُن پیڈرو سے ایک میل پیچھے کھڑے تھے جی۔" وہ بولا۔

"ہم کون؟"

"میں اور وہ... استاد پیڈرو نام ہے، شاید اس کا... صرف ایک بار حاجی صاحب کے منہ سے سُنا تھا۔"

"تم نے ٹھیک سُنا تھا۔" میں نے کہا۔

"اچانک اس نے کہا کہ گاڑی آ گئی... تم اب ٹرک لے کر جاؤ... اور پھر وہ خود اُتر گیا۔"

"اتر کے کہاں گیا؟"

"اپنی کار میں واپس حیدرآباد۔" ڈرائیور نے کہا۔

"ٹرک میں تم کیا لائے تھے؟"

"سبزیاں اور پھل۔" وہ بولا۔

"تمھیں یقین ہے کہ اس میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"ہو گا جی... یا نہیں ہوگا... مجھے کیا معلوم...؟"

"وہ تم پر بھروسا کرتے تھے... تم ان کے وفادار اور نمک خوار تھے۔" میں نے کہا۔ "تم اعتبار کے قابل نہ ہوتے تو نہ وہ ٹرک تمھارے سپرد کرتے اور نہ تم سے ایسا کام کرنے کو کہتے۔"

"مجھے معلوم ہے جی۔"

"پھر یہ تم کیا کر رہے ہو... سب کو بتا رہے ہو... کیا تمھیں واپس نہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں ڈر نہیں ہے جان کا؟"

"میں نے کون سی ایسی بات بتائی ہے... جو پیڈرو نے کہا تھا وہ میں نے کیا۔ وہ جانے اور حاجی صاحب جانیں..."

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے یہاں جو کچھ ہوا تھا، وہ میری غلطی سے تو نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی یہ میرا آخری پھیرا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں واپس نہیں جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں تو پھنس گیا تھا لیکن وہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا... اب میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں میرے بھائی کا گھر ہے۔ اس نے میرے لیے ویزے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کس ملک کے لیے؟"

"سوڈان کے لیے... وہ خود بھی وہیں ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے سچ بتا دیا ہے جناب کہ آپ مجھے مارو نہیں... میں آپ کا دشمن نہیں ہوں... میں مجبور تھا... میری غلطی کو معاف کرو۔" وہ ایک دم رونے لگا۔

"اچھا... رونے کی ضرورت نہیں... میں تصدیق کر لوں گا تمہارے بھائی کے گھر سے... اگر یہ سب جھوٹ نہ ہوا تو تم جا سکو گے۔" میں نے کہا۔

میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ میری ملتان میں موجودگی کا کسی کو علم نہیں... پیڈرو نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔ چنانچہ اب مجھے یہ فکر بھی لاحق ہو رہی تھی کہ ان کا کیا ہوگا جنہیں میں جونی کی تحویل میں چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ موہنی اور نواب خسرو جمشید کی حفاظت کر لیں گے؟

"تم اپنے بھائی کے گھر کا پتا بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"کراچی میں اس کی بیوی کا گھر ہے... وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے۔" وہ بولا۔

"محلّہ کہاں؟ مکان نمبر گلی نمبر...؟"

"جیکب لائن میں جھگی ہے جی۔" وہ بولا۔ "آپ نظامی روڈ سے اندر جائیں۔"

"یہ نظامی روڈ کہاں ہے؟"

"نظامی روڈ کا نہیں پتا جی آپ کو!" وہ قدرے حیران ہوا۔ "پرانی نمائش کے چوک سے اُلٹے ہاتھ کو جو سڑک اندر جا رہی ہے۔ گونگے بہروں کے اسکول کے سامنے سے... وہی تو ہے نظامی روڈ... آگے جا کے بریگیڈ تھانے کے قریب ایک کوارٹر کے ساتھ ہی جھگی ہے۔"

"کوارٹر کا کیا نمبر ہے؟"

"وہ تو مجھے معلوم نہیں... میں سیدھا جھگی تک پہنچ جاتا ہوں، آپ بالو پان والے کو پوچھ لینا۔ میرے بھائی کا سالا ہے۔ اُسے سب جانتے ہیں۔" وہ بولا۔

مگر میں اس کی بہت کم سُن رہا تھا اور اپنے خیالوں میں زیادہ کھویا ہوا تھا۔ اگر پیڈرو نے جیکی یا جونی کا پیچھا کر کے میرا پتا چلایا ہوگا تو اس بات کا امکان بھی پیدا ہو جاتا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں موہنی اور خسرو جمشید کی موجودگی کے راز سے بھی واقف ہو جائے۔ وہ موہنی کو مار ڈالے گا۔ خیر اس کا مرنا کیا اور جینا کیا، خود میں ابھی تک طے نہیں کر سکا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ مگر وہ خسرو جمشید کو لے گئے تو میرا سارا معاملہ چوپٹ۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا وہ وزیر ہسپتال کی تعمیر اور رہن نامہ میرے وکیل کے نام کرنے کا اور ہسپتال کی تکمیل کے لیے ضروری سرمایہ بھی فراہم کرے گا۔ یہ سودا تو ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔

اس خیال نے مجھے اتنا مضطرب کیا کہ میں ٹرک ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کے جانے کی سوچنے لگا۔ کہیں نہ کہیں سے مجھے ملتان فون کر کے صورتِ حالات کا پتا کرنا تھا۔ جیکی اور جونی کو خبردار کرنا تھا۔ لوکل کال ہوتی تو میں کہیں سے بھی کر سکتا تھا مگر ٹرنک کال کے لیے مجھے ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے کسی پی سی او تک جانا ہوگا... رات کو کراچی کے قریب آ کے واپس لوٹنے والا پیڈرو اگر ابھی تک ملتان نہیں پہنچا ہوگا تو پہنچنے ہی والا ہوگا۔

میں نے ابھی تک ڈرائیور کے صرف ہاتھ باندھے تھے۔ اب میں نے اس کے پیر بھی چارپائی کے ساتھ باندھ دیے۔ اس کے لیے میں نے چارپائی کو ٹائٹ رکھنے والی رسّی بھی استعمال کی۔ اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کے میں نے اُسے تاکید کی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش بھی نہ کرے، ورنہ وہ مارا جائے گا اور پہنچانے والے اُسے سوڈان نہیں قبرستان پہنچا دیں گے۔

ڈھونڈنے پر مجھے وہاں ایک ہی تالا ملا۔ افتخار کمرے کے کسی دروازے کو مقفل نہیں کرتا تھا۔ کہیں جاتے وقت وہ باہر کے دروازے میں بھی اس لیے تالا ڈال دیتا تھا کہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو اس کی عدم موجودگی کی خبر دے سکے۔ کسی چور کے لیے تالا ایک دعوت نامہ ہوتا ہے لیکن پاکستان کے اس نامور مگر غریب صحافی کے گھر میں آ کے چور بھی شرمندہ ہوتا جہاں... سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں والی بات تھی... زیادہ سے زیادہ وہ فلپس کا ایک بینڈ کا ریڈیو لے جا سکتا تھا جس کی قیمت سو سوا سو روپے تھی۔ باقی میلے کپڑے تھے۔ میلے برتن تھے۔ اور چور کے نقطۂ نظر سے باقی جو کچھ تھا، وہ کئی من ردّی تھی... یہ ردّی ہی اس پڑھے لکھے آدمی کا سرمایۂ افتخار تھی۔ ذریعۂ معاش تھی اور شوق کا سامان تھی۔ دنیا بھر کے مختلف اخبارات و رسائل اور ان کے تراشے 'خصوصی مضامین' حوالے اور جائزے۔ اس کی یہ ذاتی لائبریری اس نے نہ جانے کتنے برسوں تک مسلسل جستجو اور جدوجہد کے بعد بنائی تھی۔

میں اپنا سوٹ پہن کے اور دروازے کو باہر سے تالا لگا کے نکل گیا۔ مین روڈ کوئی ایک فرلانگ دُور تھی... دونوں جانب ایک سے بنے ہوئے ایف اور ای ٹائپ کوارٹر تھے۔ طبقاتی تقسیم کی ایک بنیاد معاشی خوشحالی یا بدحالی ہے۔ نچلا طبقہ... نچلا متوسط طبقہ... متوسط طبقہ... اور بالائی طبقہ... سرکاری قواعد و ضوابط میں یہ تقسیم اسکیل اور گریڈ کے حساب سے الگ چلتی ہے اور تنخواہ کے فرق کے حساب سے الگ... پونے تین سو سے نیچے والے کو ایف ٹائپ۔ چار سو تک والے کو ای ٹائپ... ساڑھے سات سو تک لینے والے کو ڈی ٹائپ... اس سے اوپر سی ٹائپ۔ چنانچہ پرانا کلرک اور نیا افسر ڈی ٹائپ میں یوں ساتھ ساتھ رہتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا، محمود و ایاز آج بھی ایک صف میں ہیں۔ عملاً ایسا نہیں تھا۔ گریڈ سترہ کے افسر کا پڑوسی گریڈ گیارہ کا اسسٹنٹ ہے تو ان کے درمیان چھ گریڈوں کا فاصلہ ہے وہ پڑوسی کی حیثیت سے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمسائے ماں جائے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان سب اخلاقی و مذہبی تعلیمات پر کیسے عمل کر سکتے ہیں جن سے گریڈ کا فرق ہی نہ رہے۔ افسران کو یہ رہائشی فارمولا سخت ناپسند تھا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ سیدھا سیدھا طریقہ یہ ہو کہ کلاس ون گزیٹڈ افسر کو سی کلاس۔ کلاس ٹو کو ڈی کلاس۔ اس کے نیچے بھی گریڈ کے حساب سے... آقا اور غلام میں مساوات کی تلقین کرنے والے مذہب کے پیروکار انگریز کے بنائے ہوئے قوانین کے اب تک اسیر تھے جس کی پالیسی ہی یہ تھی کہ تقسیم کرواؤ، حکومت کرو... علامہ فرماتے ہیں تو فرماتے رہیں کہ کیوں حاکم و محکوم میں حائل رہیں پردے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے اپنے غلام کے ساتھ سلوک کی مثال بچوں کو پڑھانے کے لیے اچھی ہے۔

بڑی سڑک پر آ کے میں رک گیا۔ ٹریفک کا ایک سیلِ رواں تھا جو میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتا جا رہا تھا... مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر ایک بینک کی شاخ دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ کا یوٹیلٹی اسٹور تھا۔ ایک جگہ [illegible] ہی نہیں تھا دوسری جگہ خراب تھا اُلکار کا ایک [illegible] بھی ہے۔

"دیکھیے مجھے ایک بہت ضروری کال کرنی ہے ملتان۔"

"آپ صدر چلے جائیں... یا پھر ادھر عزیز آباد۔"

"میں کراچی کی سڑکوں سے بالکل ناواقف ہوں... یہ بتا دیں کہ کون سی جگہ زیادہ آسانی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"آسانی تو تیسری جگہ ہوگی۔" وہ بولا۔ "میکلوڈ روڈ پر چلے جائیں۔ ٹیلی گراف ہاؤس۔"

تقریباً پون گھنٹا میں نے کسی سواری کے انتظار میں گزار دیا۔ اوّل تو کوئی رکشا ٹیکسی خالی گزرے ہی نہیں۔ جو گزرے تھے، وہ مخالف سمت میں جانے کا اشارہ کر کے پوچھتے تھے کہ بھئی ہم تو ادھر جا رہے ہیں۔ چلنا ہے تو چلو ورنہ خدا حافظ! اپنی بے بسی پر تاؤ کھانا بھی بے کار تھا۔ غالباً یہی افراطِ زر ہے کہ پیسہ جیب میں ہو مگر چیز نہ ملے۔ بسوں کا یہ حال تھا کہ لوگ دروازوں کھڑکیوں سے چمٹ کر لٹکے ہوئے تھے اور میں حیران پریشان یہ دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک بھی ٹپک کر نیچے نہیں گرتا۔

مجھے ولایت یاد آیا... وہاں سرِراہ کھڑے ہوئے عورت یا مرد کو لفٹ مانگنے کے لیے صرف انگوٹھے سے اشارہ کرنا کافی ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی خود ہی رک کر پوچھ لیتا ہے کہ کیا بات ہے۔ یہاں کاریں زن زن گزرتی جا رہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے دو چار کو اشارہ بھی دیا مگر نتیجہ صفر رہا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اسی جگہ بے ہوش ہو کے گر جاؤں تب بھی کوئی رُکے گا نہیں... لندن میں آدمی سڑک پر گر جائے یا بیٹھ جائے تو سب رک جائیں گے۔ چند منٹ میں ایمبولینس تک موجود۔ یہ احساس مجھے الگ پریشان کر رہا تھا کہ میرا سرِعام اپنی نمائش کرنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ جو مجھے پہچانتے ہیں میری تلاش میں ہیں۔

پھر ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک ٹیکسی میرے قریب سے گزری اور چند قدم کے فاصلے پر رک گئی... میں اس کی طرف لپکا۔

"بھائی... مجھے ایک بہت ضروری کام سے وہاں جانا ہے... ٹیلی فون ہاؤس... میکلوڈ روڈ پر کہیں ہے... میں سو روپے دوں گا تمہیں۔" میں نے کہا۔

"بیٹھو..." ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھے بغیر بڑی نخوت سے کہا جیسے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کے اس نے مجھ پر احسان کیا ہو۔

"عجیب شہر ہے۔" میں نے ماتھے سے پسینہ صاف کر کے کہا۔ "آدمی مرتا ہو تو مر جائے... کوئی اسے ہسپتال لے جانے کے لیے راضی نہیں ہوگا۔ لے جائیں گے تو اپنی مرضی سے جدھر وہ جا رہے ہیں... کوئی اخلاق نہیں کوئی قانون نہیں۔ بمبئی میں اپنی مرضی سے وہاں جاؤں گا جہاں مجھے جانا ہے۔ پیسے پورے دوں گا بلکہ زیادہ ہی دوں گا۔" میں اتنا برہم تھا کہ میں نے دل کا بخار نکالنے کے لیے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدف بنائے بغیر ایک پُرمذمت تقریر جاری رکھی۔

"تمہارے پاس بہت پیسہ ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بہت... کیا مطلب؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اور ہے تو تمہیں کیا؟"

"دن میں سو سو کے کتنے نوٹ تقسیم کرتے ہو... اپنی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے اس کے مشورے اور رویّے دونوں پر غصہ آیا مگر میں نے کہا۔ "یہی کروں گا... مگر ذرا فرصت تو ملے... ایک دوست نے کہا ہے... شام تک وہ کرہی دے گا کسی نہ کسی گاڑی کا بندوبست۔"

"جیب میں پیسے ہیں تو انتظار کیسا... یہ ٹیکسی خرید لو۔"

میں بھونچکّا رہ گیا۔ "یہ ٹیکسی... تمھارا مطلب ہے ٹیکسی چلاؤں میں؟" میں نے کہا۔

"ٹیکسی بھی کار ہی ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "ذرا رنگ مختلف ہوتا ہے... چار پیسے بھی کما لوگے چلتے پھرتے۔"

"تھینک یو... جس دن یہ پیشہ اختیار کرنے کا سوچا اُس دن تمھیں بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ شہر ہی نہیں یہاں کے رہنے والے بھی عجیب تھے۔ رکشا میں ہوتا تو وہ کہتا رکشا خرید لو۔ بس میں جاتا تو وہ بس برائے فروخت پیش کر دیتا۔

"یہ ٹیلی گراف ہاؤس ہے۔ ٹیلی فون ہاؤس نہیں ہے۔ وہ دیکھ لو اوپر لکھا ہوا ہے۔" اس نے ٹیکسی ایک پختہ فرش والے احاطے میں روک دی۔ میں نے سو کا نوٹ اس کی طرف پھینکا اور اندر چلا گیا۔ وہاں ٹیلی فون کرنے والے ایک انارسو بیمار والا سین پیش کر رہے تھے۔ ایک بوتھ لیڈیز کے لیے تھا۔ دوسرا لوکل کال کے لیے۔ دو فون خراب تھے۔ باقی دو کے لیے دو قطاریں تھیں۔ ایک کال بک کرانے والوں کی... ایک اپنی باری کا انتظار کرنے والوں کی... لیکن اس مشکل کا کوئی حل نہیں تھا، چنانچہ میں صبر و ضبط کی پریکٹس کرتا رہا۔

جب بالآخر میری باری آئی تو کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ چکی تھیں۔ "کون... جیکی...؟"

"نہیں... میں جونی بول رہا ہوں... تم سکندر...؟"

"ہاں... دیکھو وقت کم ہے... یہ بتاؤ وہاں سب خیریت ہے نا... میرے پیچھے تو اس خبیث نے آدمی لگا دیے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہاں بھی گڑبڑ ہو جاتی... خدا نے بچا لیا ہمیں... رات کو نہ جانے کتنے لوگوں نے فارم ہاؤس پر حملہ کیا تھا۔ باقاعدہ اسٹین گن اور دستی بم لے کر آئے تھے وہ لوگ۔"

"اوہ مائی گاڈ...! پھر کیا ہوا؟"

"ہم وہاں نہیں تھے۔" جونی بولا۔ "تمھاری امانت کو ہم نے منتقل کر دیا تھا... اپنے تہ خانے میں... لیکن وہ لڑکی؟"

"اُسے کیا ہوا...؟"

"حملہ آور اسے لے گئے یا... وہ اندر ہی جل کے راکھ ہو گئی۔ بے چارہ مالی سب سے پہلے نشانہ بنا... فارم ہاؤس اب ایک ملبے کا ڈھیر ہے اور ابھی تک تو پولیس کو کچھ نہیں ملا ہے... موہنی کی لاش بھی نہیں ملی... ڈیڈ بہت پریشان ہیں کیونکہ ان کا دشمن کوئی نہیں... انھوں نے کوٹھی کے چاروں طرف گارڈ کھڑے کر دیے ہیں... میں اور جیکی بالکل باہر نہیں نکل سکتے۔ گارڈ ساتھ لیے بغیر۔"

"تمھارا فون تو ٹیپ نہیں ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم...!" وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ "اچھا... اب جو ہوا سو ہوا... میری وجہ سے تم پر یہ آفت آئی۔"

"اوہ نو... ہم نے تمھیں..."

"شٹ اپ... ذرا سوچ سمجھ کے بات کرو۔" میں نے کہا۔ "تم اس شخص کو اپنے گھر سے شفٹ کر دو۔ کسی محفوظ مقام پر۔"

"ہمارے تہ خانے سے زیادہ محفوظ مقام کوئی نہیں۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں... دشمن بھی تو اندر ہیں... کوئی مار ڈالے گا اسے... جب تک ہمارا کام نہ ہو جائے اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔"

"پانچ منٹ ختم ہو گئے۔" کسی کرخت آواز والے آپریٹر نے کہا اور لائن کاٹ دی۔

"ہیلو... ہیلو... ٹائم بڑھا دو..." میں نے کریڈل کو بار بار دبا کے کہا مگر لائن ڈیڈ ہو چکی تھی... میرے باہر آنے سے پہلے گلاب پھر بجی۔

"ٹانڈلیانوالہ سے بات کریں... گلاب دین۔"

"گلاب دین۔" کاؤنٹر پر سے کسی نے چلّا کے کہا۔ "چل بھئی تیری باری..."

میں سخت اشتعال کے عالم میں باہر نکلا۔ "آخر یہ کیا بیہودگی ہے... ابھی تو میں بات کر رہا تھا۔"

"آپ کے پانچ منٹ ہو گئے تھے۔" بکنگ کلرک بولا۔

"میں نے کب کہا تھا کہ مجھے پانچ منٹ بات کرنی ہے؟"

"تو کیا آدھا گھنٹا بات کرنی تھی؟" وہ سر اُٹھائے بغیر بولا۔

"یہ میری مرضی... آدھا گھنٹا بات کروں یا ایک گھنٹا۔" میں نے غصے سے کہا۔ "پیسے مجھے دینے تھے۔"

"یہ پبلک کال آفس ہے... آپ اپنا فون لگوا لیں۔" اس نے مجھے مشورہ دیا۔ میں نے اس کے جھانپڑ مار کے اسے کرسی سمیت لڑھکانے کی خواہش بڑی مشکل سے قابو پایا اور پیر پٹختا ہوا باہر کی طرف چل پڑا... بہت سے لوگ میرے چراغ پا ہونے سے محظوظ ہوئے۔ ایک اجنبی شہر میں خود کو بے بس اور سب کے لیے باعثِ تفریح سمجھنا بہت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

نامکمل گفتگو کے باعث میرے اضطراب اور تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک عجیب بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ جونی کا یقین غلط بھی ہو سکتا تھا اور جیسے ان کے فارم ہاؤس پر حملہ ہوا تھا ویسے ہی حملہ کرنے والے ان کے محافظوں کی فوج کو شکست دے کر ان ہی داخل ہو سکتے تھے اور خسرو جمشید کو چھڑا کر لے جا سکتے تھے۔ اس جنگ و جدل میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ مارا جائے یا دونوں بیٹے مارے جائیں۔ صرف اور صرف میری وجہ سے یہ بڑا سنگین احساسِ جرم تھا جس سے نجات حاصل کرنے کی صورت کوئی نہیں تھی۔ میں صرف خواہش کر سکتا تھا اور دعا کر سکتا تھا کہ اللہ ان دونوں جوانوں کو بچائے جو ابھی خود کو بچانے کا ہنر نہیں جانتے اور یہ نہیں جانتے کہ ان کے مقابل کتنے خطرناک شکاری ہیں۔

موہنی کی طرف سے میری فکر اپنی جگہ تھی۔ اگر اس کی لاش نہیں ملی تو اس کا صاف مطلب یہی نکالا جا سکتا ہے کہ اُسے کوئی لے گیا یا وہ خود جان بچا کے فرار ہو گئی۔ مگر فرار ہوتی تو وہ سلطان محمد خان کی پناہ گاہ کا رُخ کرتی۔ اسے کون لے جا سکتا ہے؟

اس سوال کے ذہن میں آتے ہی میرے لیے اندیشوں کا نیا باب کھل گیا۔ کہیں اسے وہی درندے تو نہیں لے گئے جن سے میں نے اس کی بے آبروئی کا انتقام لیا تھا۔ ان کے بھی تو ساتھی ہوں گے جن کو میں نے منصف بن کے سزائے موت دی تھی۔ ایک چھوٹے سے علاقے میں کسی گاڑی کی نقل و حرکت کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھ لیا ہوگا۔ جہاں سے انھیں ٹریکٹر ملا ہوگا وہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایک فاکس ویگن چوری ہوئی ہے۔ فاکس ویگن کو اسٹارٹ کرنے کے لیے میں اُسے ٹریکٹر کے پیچھے باندھ کر دور لے گیا تھا... اور پھر؟ ہاں... میں نے وہ رسّی ٹریکٹر سے بندھی ہوئی چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے پولیس سے مدد لی ہوگی۔ اپنے کتے چھوڑ دیے ہوں گے اور معلوم ہو گیا ہوگا کہ فاکس ویگن ملتان میں کہاں کہاں سے گزری تھی اور بالآخر کہاں گئی تھی۔ یا پھر جونی اور جیکی میں سے کوئی اسے واپس چھوڑنے گیا ہوگا تو پکڑا گیا ہوگا... مگر وہ سلطان محمد خان کا بیٹا تھا۔ اس پر کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا... مگر اس کے ذریعے سے معلوم کرنے والوں نے پتا چلا لیا ہوگا کہ میں کہاں ہوں۔ نوکروں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ مہمان کون ہیں... کتنے ہیں اور کیسے ہیں... یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ میں گھر کے اندر نہیں ہوں دوسرے تہ خانوں کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ بڑی آسانی سے ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ فاکس ویگن اس باغ میں کھڑی رہی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نکل گیا تھا۔ صرف موہنی ہی ان کے ہاتھ لگی۔ مگر اس کے ساتھ کون تھا... جیکی یا جونی؟ خسرو جمشید کو انھوں نے اپنے تہ خانے میں منتقل کر دیا تھا۔ اکیلی موہنی کو وہاں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً کوئی ہوگا۔ حملہ آوروں نے کہا ہوگا کہ دیکھو جیکی یا جونی... تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ اور ہم سلطان محمد خان سے دشمنی مول لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ مگر اس عورت کو اور اس کے ساتھی کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ اس نے ہمارے باس کو مار ڈالا... ہمارے یار کو مار ڈالا۔ لعنت ہماری یاری پر اور نمک خواری پر اگر ہم ان کے خون کا بدلہ نہ لے سکے... جیکی یا جونی کچھ نہ کر سکے ہوں گے... انھیں اپنی جان بھی عزیز تھی اور عزت بھی... وہ باپ کی طرف سے بھی ڈرے ہوں گے کہ اُسے معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے موہنی کو ان کے حوالے کیا اور خود نکل گئے۔ بعد میں فارم ہاؤس تباہ کیا گیا اور مالی کو گولی مار دی گئی۔ اب موہنی ان کے چنگل میں ہوگی اور وہ ہر انسانیت سوز طریقے سے اُسے ایذا پہنچا کے پوچھیں گے کہ بتا وہ ہیرو کہاں گیا؟ وہ کچھ جانتی ہی نہیں تو انھیں کیا بتائے گی۔ اس کی موت کی اذیت بہت طویل ہوگی۔ شاید اس وقت بھی وہ کسی ناقابلِ برداشت اور رسوا کُن آزار میں مبتلا ہوگی۔

میرے خدا...! میں کیا کروں... میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا میں نے سمجھا ہے تو موہنی کی موت کو آسان کر دے۔ آبرومندانہ سہی۔

معلوم نہیں کب سے میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کسی نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔ مجھے اس کی پروا ہی نہ تھی۔ اچانک ایک ٹیکسی گھوم کر میرے سامنے آ گئی۔ میں نے بے خیالی میں دیکھا اور چونک پڑا۔ یہ وہی ٹیکسی تھی۔ دُور سے گیٹ کیپر نے سیٹی بجائی۔ "او پاگل کا بچّہ... اِدھر کہاں لے جاتا ہے ٹیکسی۔"

"بیٹھو..." اس ٹیکسی ڈرائیور نے کہا اور میں دروازہ کھول کے بیٹھ گیا... ٹیکسی نے پھر راؤنڈ لیا اور گیٹ سے گزری تو گیٹ کیپر اور ڈرائیور کے درمیان ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھورنے کا مقابلہ ہوا۔

"کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

میں چونک پڑا۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"صورت سے تو یہ لگتا ہے کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ کیا ہسپتال لے چلوں؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ مجھے واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنی دیر سے کیوں کھڑے ہوئے تھے؟"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو یہاں پھر ٹیکسی نہیں ملے گی۔ اس سے پھر آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔ آپ پھر اس شہر کو۔ یہاں کے ٹیکسی والوں کو اور رہنے والوں کو گالیاں دیں گے۔ جب کوئی پہلی بار کسی پنڈ سے یہاں وارد ہوتا ہے تو اس کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میں تم کو... کسی پنڈ سے آیا ہوا... پینڈو لگتا ہوں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"سوٹ تو اب دیہاتی بھی پہنتے ہیں۔" وہ بولا "خیر... پنڈ سے نہیں آئے ہیں آپ تو پھر لاہور سے آئے ہیں۔"

"تم ضرورت سے زیادہ ہوشیار بنتے ہو اور ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔ "ورنہ تم اچھے آدمی ہو کہ تم نے میری ضرورت کو سمجھا۔ تم پڑھے لکھے بھی لگتے ہو مجھے۔"

"میں نے مائکرو بیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔" وہ بولا۔

"اور ٹیکسی چلا رہے ہو؟" میں نے کہا۔ "بے وقوف بناتے ہو مجھے۔ ابھی بے روزگاری کا مسئلہ اتنا شدید نہیں ہوا۔"

"مجھے ٹیکسی چلانے کا شوق ہے آپ کو اعتراض ہے؟" وہ بولا۔ "اس میں آمدنی بھی زیادہ ہے۔ میں لیکچرار بنتا تو اتنا نہ کماتا۔"

"بندۂ خدا... عزت بھی کوئی چیز ہے۔"

"پنڈ سے آنے والے عزت کے لیسے ہی تصورات رکھتے ہیں۔ ورنہ شہر میں عزت ہے اس کی جس کے پاس تین کاف ہوں۔" وہ بولا۔

"تین کاف... تین حرف تو سُنتے تھے۔"

"کار... کوٹھی... کیش۔" وہ بولا۔ "اس شہر میں عزت کا معیار پیسہ ہے... سمجھے؟"

"سمجھ گیا... مگر میں پنڈ سے نہیں آیا ہوں۔ میں نے چار سال لندن میں گزارے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور تم غلط کہتے ہو کہ تم نے مائکرو بیالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے... تم کو چیلنج کرتا ہوں کہ اسے ثابت کرو۔"

"او کے... اُدھر جمشید روڈ کوارٹر تھانے چلتے ہیں۔"

"تھانے... کیا مطلب؟" میں نے گھبرا کے کہا۔ "یعنی وہاں تم مجھ سے زبردستی منواؤ گے؟"

"نہیں... وہاں میرے بھائی کا سالا ہے... ڈی ایس پی۔"

"لعنت بھیجو اس پر... میں مانتا ہوں کہ تم ڈبل پی ایچ ڈی ہو۔" میں نے کہا۔ "مائکرو بیالوجی میں بھی اور بکواسولوجی میں بھی۔"

ایسے عجیب ٹیکسی ڈرائیور سے اپنے ملک میں میرا پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ لندن اور پیرس کے تجربات پرانی بات تھے۔ وہاں ایک سے ایک دلچسپ کردار [illegible] یہاں اس ٹیکسی ڈرائیور نے جہاں میرے ساتھ شرافت برتی تھی وہیں میرے ساتھ وہ رویّہ بھی اختیار کیا تھا جو ایک چالاک شہری کسی سادہ لوح دیہاتی کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے... میرا خون کھولنے لگا یعنی حسد ہو گئی۔ میں نے سارا یورپ دیکھا جو اس نے خواب میں نہیں دیکھا ہوگا... یہ مجھے پینڈو سمجھنے پر بضد ہے اور خواہ مخواہ منوانا چاہتا ہے کہ وہ مائکرو بیالوجی میں پی ایچ ڈی ہے... چالاک اور عیار بنتا ہے اُلّو کا پٹھا۔

"وہیں گرا دوں... میرا مطلب ہے ڈراپ کر دوں جہاں سے اُٹھایا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "یا اور کہیں جانا ہے؟"

"تھوڑا سا آگے... بینک کے پاس سے بائیں جانب۔" میں نے سو کا ایک اور نوٹ نکال کے طے کیا کہ چلو جان چھوٹی اس ڈرائیور سے... شام تک گاڑی کا بندوبست ہو ہی جائے گا۔

"ایک نوٹ اور سیٹھ۔" اس نے ٹیکسی روک کے کہا۔

"کیا؟ دو سو واپسی کے؟" میں اترتے اترتے رُک گیا۔ اسی وقت میری نظر نے افتخار عارف کے دروازے پر لگے ہوئے مجمع کو دیکھا۔ کم سے کم دس افراد کھلے دروازے کے سامنے کھڑے اندر جھانک رہے تھے اور میری نگاہ نے ان کے چہروں پر تجسس آمیز خوف کی تحریر بھی دیکھ لی۔ میری چھٹی حس ایک دم "خطرہ... خطرہ" چلانے لگی۔

"دیکھو... ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے قطعی بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہو سکتا ہے مجھے... پھر جانا پڑے۔ یہ سو روپے لو۔"

میں نیچے اتر کے چند قدم گیا۔ پھر میں نے پولیس کے سائرن کی آواز سُنی اور فوراً پلٹ کر ٹیکسی کے پیچھے ہو گیا۔ دو انسپکٹر موٹر سائیکلوں پر میری طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔ پھر ایک جیپ گزری جس میں چار سپاہی تھے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ ایک دم الگ ہو گئے۔ جو عقل مند تھے انھوں نے کھسکنا شروع کیا۔ ایک بنیان اور دھوتی والا بنگالی میرے پاس سے گزرا۔

"کیا ہوا ہے یہاں...؟" میں نے اسے روک لیا۔

"کتل... کھون... مرڈر...۔" وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہاں تو کوئی اخبار والا رہتا تھا؟"

بنگالی نے سر ہلایا۔ "اس کو مار دیا کوئی شالا لوگ۔" وہ بازو چھڑا کے بھاگ گیا۔ میرا جسم خوف سے کانپنے لگا اور ٹھنڈا پسینہ میرے جسم پر پانی کا ریلا بن کے بہنے لگا۔ افتخار عارف کو مار دیا؟ کسی نے؟ اس ٹیکسی ڈرائیور نے؟ یا اس نے خود کو آزاد کرا لیا اور پھر حاجی کے کسی ٹھکانے پر جا پہنچا جہاں وہ ٹرک موجود ہوگا... وہاں سے جو لوگ بھیجے گئے ان کو میں تو نہیں ملا۔

اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔ "تم یہاں رہتے ہو؟"

میں نے پلٹ کے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا اور اقرار میں سر ہلایا۔

"کل رات ہی تو آیا تھا۔"

"اس سے پہلے تم نہیں جانتے تھے اسے؟"

"نہیں... مجھے کسی نے کہا تھا کہ... تم اس کے پاس ٹھہر سکتے ہو۔ افتخار عارف نام تھا اس کا۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "ایک اچھا اخباری رپورٹر تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ... ورنہ سب سے پہلے تم پر شک کیا جائے گا اور اس معاملے میں پولیس آئیں بائیں شائیں نہیں کر سکتی کیونکہ پریس، پبلک اور انتظامیہ سب کا دباؤ ہوگا۔"

میں پھر چونکا۔ کیا اس شہر کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اتنے مخلص اور دُور اندیش ہو سکتے ہیں؟

"بیٹھو...۔" اس نے ایک بار پھر تحکمانہ انداز میں کہا اور دروازہ کھول دیا۔ میں سوچے سمجھے بغیر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹیکسی کو ریورس کرنے کے بجائے سیدھا نکال لیا اور معلوم نہیں کوارٹروں کے درمیان سے گزرتا ہوا کیسے ایک سڑک پر آنکلا جہاں بالکل سامنے ناولٹی سینما تھا۔

افتخار کی موت کے صدمے نے مجھے ذہنی طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری جستجو میں آنے والوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا... یا شاید جب وہ ناکامی کے بعد واپس جا رہے تھے تو افتخار نے انھیں دیکھ لیا اور انھوں نے کسی عینی شاہد کو زندہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس شہر میں بھی جو لاہور سے ساڑھے سات سو میل دُور تھا شکاری میرے تعاقب میں سائے کی طرح آئے تھے اور عدم تحفظ کا وہ احساس جو وقتی طور پر مٹ گیا تھا ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ جاگ اُٹھا تھا۔

ٹیکسی اچانک رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اتر گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کوارٹروں میں غائب ہو گیا... وہ ٹیکسی کی چابیاں بھی لگی ہوئی چھوڑ گیا تھا لیکن مجھے ڈرائیور کے رویّے نے حیرت اور تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی تھی جو ڈرائیوروں میں نہیں ہوتی۔ اس کے بات کرنے کا انداز... اس کا رویّہ... اس کا اظہارِ اعتماد... تعاون کا جذبہ... یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس ڈرائیور کا میرے ساتھ رہنا بے مقصد نہیں ہے۔ وہ خود ہی مجھے دیکھ کر رُکا تھا اس نے ایک گھنٹے تک ٹیلیگراف آفس میں میرا انتظار بھی کیا تھا، حالانکہ میں نے اسے رُکنے کو نہیں کہا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں وہ دو سواریاں اُٹھا سکتا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے سو روپے وصول کر لیے تھے۔ یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں بے وقوف ضرورت مند مجبور اور پیسے والی اسامی ہوں۔ وہ ایک مردم شناس اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے چونکا دینے والی باتوں سے خود کو ایک غیر معمولی شخصیت ثابت کیا اور مجھ سے مزید دو سو روپے اینٹھ لیے... وہ بدستور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ نیاز مندانہ جذبہ بے غرض نہیں تھا۔ اب وہ مجھ سے پانچ سو مانگے گا کہ آپ کو خطرے سے نکال لایا، ورنہ آپ تو وہیں دھر لیے جاتے۔ وہ مجھے بلیک میل بھی کر سکتا ہے۔ کمال ہے کہ وہ اتنا باخبر بھی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوارٹر میں ایک صحافی رہتا تھا، ہر ٹیکسی ڈرائیور شہر کے ہر صحافی کا پتا ٹھکانا جانتا ہو یہ ناممکن سی بات تھی... پھر کیا اس کا افتخار عارف سے کوئی تعلق تھا؟

میں خیالات کی کھینچا تانی میں اعصابی کشیدگی کا شکار تھا اور کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ صرف قیاس کی بنیاد پر تو حتمی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے؟ ملتان میں جو خونی ڈراما کھیلا جا رہا ہے اس کی اصل کہانی کیا ہے۔ افتخار عارف کے مارے جانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کے اصل عزائم کیا ہیں؟

وہ اچانک ایک کوارٹر کی اوٹ سے نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا اور ماتھے کی ہر شکن کسی الجھن کی عکاسی کرتی تھی۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ میں سوچ میں پڑ گیا... ابھی تک میں نے اس کی صورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ عام نفسیاتی مسئلہ ہے ہم کسی ریسٹورنٹ میں ویٹر کا... سڑک پر ٹریفک کانسٹیبل کا... ٹرین میں ٹکٹ چیکر کا اور ٹیکسی ڈرائیور کا چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صرف اس کی وردی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ آرڈر دیتے وقت ویٹر پر نہیں، مینو پر نگاہیں رکھتے ہیں... یا باتیں کرتے کرتے کہہ دیتے ہیں، چائے لاؤ۔ وہ چائے رکھ جاتا ہے۔ پھر برتن اُٹھا لیتا ہے اور بل لے جاتا ہے مگر اس کی طرف غور سے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہم ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ تھما دیتے ہیں اور جب وہ پنچ کر دیتا ہے تو واپس لے کر باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے صرف اتنا کہتے ہیں کہ مقررہ جگہ چلو اور پھر اپنے خیالوں میں یا باہر کے منظر میں یا اپنی باتوں میں گم ہو جاتے ہیں اور منزل پر پہنچ گئے تو میٹر کو دیکھتے ہیں اور کرایہ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی صورت دیکھے بغیر۔

میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ جب ٹیکسی رُکی تھی، تو میں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے میں نے خود کو اس سے متعارف نہیں کرایا تھا اور اس سے تعارف حاصل کر کے ہاتھ نہیں ملایا تھا... ویسے دو اجنبی ایک مشترک دوست کے ساتھ مل جائیں تو پہلے رسمی تعارف ہوتا ہے۔ میں نے ٹیکسی ملنے پر ایک تو پریشانی سے نجات ملنے کی تسکین محسوس کی تھی۔ پھر میں اس شہر کے بیہودہ ٹریفک کے نظام پر تبصرہ کر رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کا لباس دیکھا تھا۔ اس کی بکواس بھی سُنی تھی اور اس کا مناسب جواب بھی دیا تھا لیکن اس کی صورت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میں پیچھے والی سیٹ پر تھا اور مجھے بیک ویو مرر میں بھی اس کا چہرہ صرف ٹوپی کی حد تک

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

نظر آرہا تھا۔

اب مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر عجیب سی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس چہرے کے کچھ نقوش میرے لاشعور کے کسی گمنام حصے میں محفوظ تھے لیکن ان سے اصل چہرے کا تصور کرنا محال تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آدمی کو کسی کوڑے کے ڈھیر میں سے کسی کتاب کے چند صفحات مل جائیں۔ مثلاً ساتواں صفحہ... ایک سو دسواں صفحہ... دو سو چھبیسواں صفحہ... اسے خیال تو آئے گا کہ یہ کسی پڑھی ہوئی کتاب کے صفحات ہیں مگر سیکڑوں ہزاروں پڑھی ہوئی کتابوں میں سے تین صفحوں کو دیکھ کر اصل کتاب کا نام یاد کرنا یقیناً ناممکن ہو گا۔

"بات سنو... تم کون ہو؟" میں نے کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرے نام کو گولی مارو... یہ بتاؤ کہ وہ شخص کون تھا۔ جو اس کوارٹر میں بندھا پڑا تھا؟"

اگر وہ اچانک پلٹ کے مجھ پر فائر کر دیتا تب بھی میں اتنا نہ اچھلتا۔ "کیا؟... تم...؟"

"میں وہیں گیا تھا۔" وہ بولا۔ "پولیس کو ایک شخص چارپائی سے بندھا ہوا ملا۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر بھی پٹی تھی۔ اس کا منہ کپڑا ٹھونس کے بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تمہاری حرکت تھی۔"

"وہ... بکواس... جھوٹ۔" میں نے گڑبڑا کے کہا اور پھر ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا تم پر... مگر تم مجھے اپنی مرضی سے کہیں نہیں لے جا سکتے... تم کیا سمجھتے ہو، میں پینڈو ہوں؟ عقل سے پیدل ہوں؟ مجھے بہت پہلے شک ہو گیا تھا کہ تم میرے پیچھے بلاوجہ نہیں پڑے ہوئے ہو۔"

"میں اپنی بات پر قائم ہوں۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "تم پینڈو ہو اور عقل کے دشمن بھی... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"ریوالور... اور اس میں سائلنسر بھی لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"پہلے کبھی چلایا ہے؟" وہ بولا۔ "اور اس کا کیا ثبوت کہ یہ اصلی ہے۔"

غصے سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ میں نے چلّا کے کہا۔ "یہ اصلی ہے یا نہیں، اس کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب تم فوت ہو جاؤ گے اور تمہاری کھوپڑی کے سوراخ سے تمہارا سب بھوسہ باہر آ جائے گا... میں نے ریوالور... مشین گن... دستی بم... توپ ٹینک، راکٹ، ایٹم بم سب چلائے ہیں۔"

"یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کوئنز روڈ... وہاں میں تم سے پوچھوں گا..."

"ریوالور جیب میں رکھ لو۔" وہ بولا۔ "راستے میں کسی نے یہ ڈراما دیکھ لیا تو خواہ مخواہ نئی پریشانی پیدا ہو گی۔"

میرا سارا غصہ ایسے ختم ہو گیا جیسے پنکچر ہوتے ہی ٹائر کی ہوا ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور سر کو نشست کی پُشت سے لگا کے لمبے گہرے سانس لینے لگا، تاکہ میں پُرسکون ہو جاؤں اور میرا دماغ ٹھنڈا ہو جائے۔ وقفے وقفے سے میں باہر بھی دیکھتا رہا کہ ٹیکسی کس راستے پر جا رہی ہے۔ چونکہ صبح افتخار عارف نے راستے بھر رننگ کمنٹری کی تھی اس لیے دوبارہ انہی مقامات سے گزرتے ہوئے مجھے خاصا اطمینان حاصل ہوا کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے غلط سمت میں نہیں لے جا رہا ہے اور میرے کراچی میں نووارد پینڈو ہونے کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھا رہا ہے۔

کوئنز روڈ تک پہنچتے ہوئے میں کافی حد تک نارمل ہو گیا تھا اور سب سے پہلے اس ٹیکسی ڈرائیور پر یہ ثابت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ میرے سامنے وہ طفلِ مکتب ہے گھسیارا ہے یا گدھا ہے۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ وہ دشمنوں کا ایجنٹ بہرحال نہیں ہے اور اگر میں صحیح طرح سے ہینڈل کروں تو اسے دوست بنا سکتا ہوں۔

ٹیکسی جب بیرک کے سامنے رکی تو میں نے پھر ریوالور نکال لیا اور اُسے کہا۔ "اندر چلو۔"

"پہلے آپ۔" وہ بولا۔ اور میں نے اُسے گردن سے پکڑ کے اندر دھکیل دیا۔ اس کی ٹوپی گرد آلود فرش پر گر گئی۔ وہ اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا لیکن اچانک اس نے میرا ریوالور والا ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا اور ہاتھ مروڑ کے مجھے پلٹ دیا۔ میں اس کے لیے قطعی تیار نہ تھا، چنانچہ میں نے ریوالور کو اپنی گرفت سے نکل کر گرتے دیکھا اور خود کو فرشِ خاک پر لیٹا ہوا پایا۔ اس سے پہلے کہ میں اُٹھتا ریوالور اس نے اُٹھا لیا۔

"اب بتاؤ کہ تم کون ہو مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔

میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا... میری آنکھیں اس پر مرتکز ہو گئیں۔ اس کی ٹوپی ہٹ جانے سے گھنے سیاہ بال نمودار ہو گئے تھے اور صورت سے آشنائی کا احساس پہلے سے زیادہ پُرآزار خلش بن گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم... تم ایک پینڈو ہو... عقل کے بھی اندھے ہو اور آنکھوں کے بھی..." اس نے اچانک آواز بدل کے کہا۔ "اُلو کے پٹھے ہو تم اور گدھے ہو۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے راکٹ پر بٹھا کے فائر کر دیا۔

"اکرام... اکرام شیخ... سالے ڈبل ایس آئی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "ڈبل کراس کر رہا تھا مجھے... تیری تو..."

وہ مجھ سے لپٹ گیا... اس نے مجھے بہت مُکّے مارے اور بہت گالیاں دیں اور کئی بار پینڈو کہا۔ میں ہنستا رہا اور روتا رہا۔ اپنی عقل پر... قدرت کے اس احسان پر... تائیدِ ایزدی کے اس اظہار پر... اس اتفاق پر... ہم فرش پر بیٹھ کے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ "سکندرِ اعظم کی اولاد۔" اُس نے بالآخر کہا۔

"یار تو نے... پہچان لیا تھا مجھے... کیسے پہچان لیا تھا؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔"

"اپنے پولیس مین رہا ہوں... وہ بھی ایسا ویسا نہیں۔ بالکل انکل رضوی کا شاگرد۔" وہ بولا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تو ایسے کراچی کی سڑک پر کھڑا ہوا مل جائے گا۔"

"بس یار... ملنا تھا مقدر میں... ایک گھنٹے سے کھڑا ہوا تھا اور کوئی سالا لفٹ نہیں دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"حد ہے حماقت کی۔" وہ بولا۔ "بھائی آپ ایک بے مثال قومی شہرت رکھتے ہیں اور چشم بددور... یہاں آتے ہی آپ اپنے ساتھ سارے مصائب بھی سمیٹ لائے ہیں۔"

"یار ساری باتیں چھوڑ... پہلے نازو کے بارے میں بتا۔"

"کیا بتاؤں... خود میں اُسے تلاش کر رہا ہوں دو دن سے۔"

وہ ایک دم رنجیدہ ہو گیا۔ "حرام ہے جو رات بھر آنکھ بھی لگی ہو۔"

"کیوں یار... نازو جیسی لڑکی کے لیے فکرمند ہونے کی تو ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ خود تلاش کر لے گی تجھے... اپنی حفاظت وہ خود کر سکتی ہے۔"

"تو نے افتخار عارف کی رپورٹ ضرور پڑھی ہو گی؟"

"ہاں... اور میں اس کے پاس کیوں پہنچا تھا۔" میں نے کہا۔

"اسی رپورٹ نے مروا دیا اُسے۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ اس کیس میں خطرناک حد تک گھُس گیا تھا اور اتنا آگے چلا گیا تھا کہ..." اس نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا وجود ان کے لیے ایک خطرہ بن گیا تھا۔"

"مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"تجھے کیوں بتاتا... یہ سب معلومات جو اس نے حاصل کر لی تھیں ابھی اس کے دماغ میں جمع ہو رہی تھیں۔ وہ ثبوت جمع کر رہا تھا اور شہادتیں حاصل کر رہا تھا... اس کا فیچر تو ایک ڈھونگ تھا صرف یہ دکھلانے کے لیے کہ وہ سطحی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ مگر جاننے والے جان چکے تھے کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے بہت اعلیٰ سطح پر وزارتِ دفاع کے اسسٹنٹ سیکریٹری یا ڈپٹی سیکریٹری کی سطح کے کسی افسر سے کہا تھا کہ وہ ملک دشمنی میں ملوث چند سرکاری افسران کی سرگرمیوں کے بارے میں براہِ راست انٹر سروسز انٹیلی جنس کے چیف سے بات کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات لیک آؤٹ ہو گئی۔"

"تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"اسی نے بتایا تھا کہ یار کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں اُسے روز گھر سے آفس لے جاتا تھا اور رات دو بجے آفس سے گھر لاتا تھا۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اسسٹنٹ سیکریٹری یا ڈپٹی سیکریٹری خود بھی بنگالی ہے۔ اس کے نام سے وہ دھوکا کھا گیا، پھر کسی نے اسے غلط اطلاع بھی دی کہ وہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ اور وہ افسر راولپنڈی کا رہنے والا ہے... اسے جانتے بوجھتے گمراہ کیا گیا اور آئی ایس آئی کے چیف تک تو بات پہنچی نہیں۔ اس کے قاتلوں تک پہنچ گئی۔"

"یار کیا اس نے غلطی نہیں کی... مطلب یہ کہ وہ ایک صحافی تھا۔ اسے گمراہ کرنا آسان تو نہیں تھا۔ اس نے کیوں مان لی وہ بات تصدیق کیے بغیر؟"

اکرام نے ایک آہ بھری۔ "اگر تو مجھ سے کہے کہ محسن بھروسے کے قابل ہے تو کیا میں تصدیق ضروری سمجھوں گا؟ وہ اعتماد کے خنجر سے مارا گیا جو اپنے ہی کسی دوست نے اس کی پیٹھ میں گھونپا۔ مگر خیر میں بھی پولیس والا ہوں۔ مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو ہے کہ وہ کون تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا... میرے علاوہ۔ میں تفتیش کر رہا ہوں... اور اگلے چوبیس گھنٹوں میں ملزم میری گرفت میں ہو گا۔"

"میں تو سمجھا تھا کہ افتخار ان کے ہاتھوں مارا گیا جو مجھے قتل کرنے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "کیا اس ڈرائیور کو پولیس لے گئی؟"

"ہاں... ابھی اس کا بیان نہیں ہوا۔" اکرام بولا۔ "ظاہر ہے اس نے قاتلوں کو دیکھا تو نہیں ہو گا مگر ان کی باتیں تو سنی ہوں گی۔ سنا ہے پہلے اس نے کچھ اوٹ پٹانگ باتیں کی تھیں۔ کہتا تھا کہ میں حیدرآباد میں ہوں۔ پولیس نے دو ہاتھ مارے تو نشہ اتر گیا۔"

"وہ نشے میں نہیں تھا۔ یہ بات میں نے اس کے دماغ میں ڈالی تھی۔" میں نے کہا پھر میں نے اسے گزشتہ رات سے اب تک کے سارے واقعات سنا دیے۔

"شکاری یہاں بھی تیرے پیچھے ہیں اور تو سینہ تان کے پھر رہا ہے کہ آ بیل مجھے مار۔" وہ بولا۔

"بس یار... بھول چوک ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اتنا بڑا شہر ہے۔"

"جیسے میں مل گیا تھا... ایسے کیا کوئی اور نہیں مل سکتا تھا؟"

"مل سکتا تھا... مگر میں کیا کرتا... میرے لیے بہت ضروری

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ہوگیا تھا کہ میں ملتان فون کروں۔" میں نے کہا۔

" ملتان کی اسٹوری کیا ہے؟"

" کوئی ایک اسٹوری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔" فرصت سے گی تو سناؤں گا۔ تو پہلے یہ بتا ٹیکسی کس کی ہے؟"

" میری اپنی... اسی کی آڑ میں تو بچا ہوا ہوں... تھوڑا سا میک اپ کرلیا ہے۔" وہ بولا۔" بالوں کا اسٹائل وہ نہیں رہا۔ یہ عینک بس قریب نظر ہے۔"

" اور ڈیرا کہاں ڈال رکھا ہے؟"

" مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔" وہ بولا۔" ایک ہفتے پہلے بھٹہ ویلج میں تھے... کیماڑی کی طرف۔ پھر نازو کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا۔"

" تو بھی ساتھ تھا؟"

" ہاں یار... اب یہ تو بس شامتِ اعمال ہی تھی نا کہ اس جہاز پر ایک غرق شدہ جہاز کا آدمی نکل آیا اور اس خبیث کی نظر اتنی تیز تھی کہ اس نے ہمیں پہچان بھی لیا۔" وہ بولا۔" میں تو نکل گیا تھا۔ مگر نازو کو تاڑ لیا اس نے۔ اس کے لیے مردوں جیسے کام کرنا تو آسان ہے مگر مرد بننا ذرا مشکل ہے... بس وہیں گڑبڑ ہو گئی۔ جب اسے پولیس لے گئی تو مجھے بڑی غیرت اور شرم آئی کہ میں کیسا بھائی ہوں۔"

" اگر وہ خود نہ نکل پاتی تو آپ کیا توپ چلاتے؟"

" کچھ نہ کچھ تو کرتا... رشوت کی توپ چلاتا۔" وہ بولا۔" کیونکہ اس کے خلاف جہاز والوں نے کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ پھر جب وہ خود ہی نکل گئی تو اب تک مجھے بھی نہیں ملی۔"

" کیوں؟ اپنے ٹھکانے پر کیوں نہیں پہنچی وہ؟"

" وہ دراصل... گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہم نے ایک ہفتہ قبل اپنا گھر بدلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہاں کے لوگوں کو ایک مولوی نے بھڑکانا شروع کردیا تھا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جو اس کا بھائی ہے' وہ غالباً کوئی عورت ہے جسے وہ بھگا لایا ہے۔ ہمارے گھر آنا کوئی نہیں تھا اور ہم بھی کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ مگر ایک رات کیا ہوا کہ شراب کے نشے میں کوئی متوڑا کی لانچ پر کام کرنے والا ہمارے گھر میں گھس گیا... غلطی سے... اس نے نازو کو زنانہ کپڑوں میں دیکھ لیا۔"

" کیا وہ روز میک اپ بدلتی تھی؟"

" نہیں یار... اس روز سالگرہ تھی اس کی۔ بس میں جذباتی ہوگیا اور میں نے کہا کہ چلو کہیں باہر مل کے مناتے ہیں... کسی ٹاپ کلاس ہوٹل میں... وہ اس کے لیے تیار ہوئی تھی۔ میں نے اس شرابی کو دھکے دے کر نکال دیا مگر باہر ایک مولوی صاحب عشاء کی نماز پڑھ کے آرہے تھے۔ انھوں نے شرابی کو للکارنا شروع کیا تو وہ بکنے لگا کہ سب مجھے ہی کہتے ہو۔ اسے نہیں کہتے جس نے..."

" جس نے کیا؟"

اکرام کا چہرہ سرخ ہوگیا۔" کہنے لگا کہ یہ جو کوہ قاف کی پری چرا لایا ہے سالا ٹیکسی ڈرائیور... مولوی صاحب پہلے تو سمجھے کہ وہ نشے میں بک رہا ہے۔ مگر اسی وقت نازو اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر نکلے تو مولوی صاحب کی عقل خبط ہوگئی۔ انھوں نے محلہ اکٹھا کرلیا۔ رات بارہ بجے ہم آئے تو دروازے پر مجمع۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہوش میں رہ کے بات کریں... یہ میری سگی چھوٹی بہن ہے۔ آج ہی لاہور سے آئی ہے۔ مگر کوئی ماننے کو تیار نہ تھا۔ مولوی صاحب ہمیں مسجد میں لے گئے۔ ہم سے کلمہ پڑھوا کے قرآن اٹھوایا گیا۔ ہم نے اٹھالیا اور وہی کہا جو سچ تھا۔ اس وقت تو مولوی صاحب کی پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر اس کے بعد دو تین دن تک نازو کو اصل زنانہ روپ میں محلے کی خواتین سے ملنا پڑا اور گھر میں رہنا پڑا اور ہمیں دس جھوٹ بولنے پڑے۔ پھر میں نے دوسرا گھر تلاش کرلیا... لیاری میں... اور نازو کو بھی بتادیا مگر جس دن نازو پکڑی گئی' اسی دن کچھ لوگوں نے ہمارا سامان باہر رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ مالک مکان جعلی تھا اور اصل مالک مکان تو ایک کانسٹیبل ہے... میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے مل کر یہ دھندا چلا رکھا ہے یعنی ایک کسی ضرورت مند کو گھیر لاتا ہے اور اس سے دو چار ہزار ایڈوانس وصول کرلیتا ہے۔ پھر کانسٹیبل وردی پہن کر آجاتا ہے اور تھانے کی ترڑی دیتا ہے۔ کرائے دار کا سامان باہر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا ہے... اب تو سوچا یار... کہ میں خود ایک سابق ایس آئی... مجھے ایک کانسٹیبل نے ہاتھ مار کے باہر کردیا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ تھانے نہیں جاسکتا تھا اور کسی پولیس والے کے مکان میں نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے خاموشی سے سامان اٹھالیا اور پھر جو گھر ملا' وہ ادھر دھوبی گھاٹ کی طرف ہے... مگر اس کا نازو کو پتا نہیں۔"

" وہ پہنچی ہوگی اس کانسٹیبل کے مکان پر؟" میں نے تشویش سے کہا۔" تو نے معلوم کیا؟"

" ہاں... وہ پہنچی تھی۔" اکرام بولا۔" اسے کسی نے بتادیا کہ مکان تو پھر خالی ہے۔ وہ فوراً واپس چلی گئی۔ رکشا میں آئی تھی۔ اب کل سے ٹیکسی لیے پھر رہا ہوں کیونکہ وہ میری ٹیکسی ہی تلاش کرے گی۔"

" تو یہاں کیسے گھسا ہوا ہے؟"

میں نے اسے مختصراً بتایا اور گیراج کھول کے کار بھی دکھائی۔ ہم دونوں نے مل کے گاڑی کو اچھی طرح صاف کیا تاکہ اس پر کہیں بھی کوئی فنگر پرنٹ نہ رہے۔ پھر دونوں سوٹ کیس ٹیکسی میں رکھے۔ میں دولت مند فقیر کا خزانہ لے جانے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ ایسے دھوکے باز حاجتمندوں کو یہ سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ اس نے نوٹوں سے بھرا ہوا گھڑا بھی ڈکی میں ڈال دیا اور گیراج کا دروازہ بند کردیا۔

" اب فوری طور پر تو اس کار کے دریافت ہونے کا امکان نہیں ہے۔" اکرام شیخ نے کہا۔" کبھی رات کو پھر آئیں گے تو اس کا کریا کرم کردیں گے۔"

" یار اکرام..." میں نے ٹیکسی کے روانہ ہونے کے بعد کہا۔" تو نے ایک سوال نہیں پوچھا۔"

" پوچھوں گا بھی نہیں کہ تو کیوں آیا ہے؟ یہ بتا اتنی دیر سے کیوں آیا ہے؟" اکرام نے کہا۔" ہم تو انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چلے تھے۔ ایک سفر پر گئے تھے۔ پندرہ دن بعد لوٹے تو اس نئی پریشانی میں پڑ گئے کہ کہیں درمیان میں تو آکے تو نہیں لوٹ گیا؟"

" تم کسی بحری جہاز میں نکل گئے تھے؟"

" ہاں... اسے ڈبو دیا... خود بال بال بچے۔ مچھلیوں کی خوراک بننے سے۔" وہ بولا۔" چوبیس گھنٹے ایک تختے کے سہارے پر پانی میں غوطے کھاتے رہے۔ پھر ایک ماہی گیروں کی کشتی نے بچالیا۔"

" تم لوگ منظر کو فون کرسکتے تھے۔" میں نے برہمی سے کہا۔" یا نازو فون کرسکتی تھی شہلا کو۔"

" کئی بار کوشش کی... کبھی منظر نہیں ملا' کبھی لائن نہیں ملی۔" وہ بولا۔" شہلا کو ٹرائی ہی نہیں کیا۔ ایس ایس پی صاحب سے ڈر لگتا تھا۔"

" آخر رابعہ نے بھی تو فون پر بات کی تھی۔"

" بالآخر... زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔" وہ ہنسا۔

" تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔" نازو نے ایک بار اسے دیکھا تھا کسی لانچ پر۔"

" وہ فون نمبر میرے پاس لکھا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔" میرا مطلب ہے کہ مجھے یاد ہے۔ میں ایک شخص دوست محمد کو بھی جانتا ہوں۔ وہ انجینئر ہے۔ فری لانسر قسم کا... ملازم کسی کا نہیں مگر اسے کوئی بھی لے جاسکتا ہے۔"

" اس کا کیا تعلق ہے رابعہ سے؟"

" کوئی تعلق ضرور ہے۔" میں نے کہا۔" اس نے رابعہ کو چھپا رکھا ہے یا قید کر رکھا ہے... رابعہ نے صاف نہیں بتایا... جانتے بوجھتے یا مجبوری کے تحت کچھ چھپاتی رہی۔ ایک طرف کہتی تھی کہ میری بالکل فکر مت کرو۔ میں خیریت سے ہوں۔ دوسری طرف کہتی تھی کہ میں آ نہیں سکتی اور اپنا پتا بھی نہیں بتاسکتی۔"

" اتنا کافی ہے۔" اکرام بولا۔" ہم اسے بھی ڈھونڈھ نکالیں گے مگر ایسے نہیں... یہ صورت نہیں چلے گی۔"

" میں نے آج ہی صبح افتخار سے کہا تھا کہ مجھے کسی میک اپ مین کے پاس لے چلے... میں فرنچ جانتا ہوں۔ کسی شعدوم سے ایک پرانی ڈپلومیٹک نمبر کی کار دلا دے۔"

" ڈپلومیٹ کے بچے... یہ سب نہیں چلے گا... خود کو نمایاں کرنا بے وقوفی ہے... ایسا حلیہ بناؤ کہ ہزاروں میں شامل ہوسکو... مثلاً میں ٹیکسی ڈرائیور ہوں تو ہر جگہ آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں... کیا ضرورت ہے کار کی جو پہچانی جائے... یہ ٹیکسی بھی تو کار ہے۔"

" یہ آپ نے صبح بھی فرمایا تھا کہ ٹیکسی بھی کار ہوتی ہے بس رنگ کا فرق ہوتا ہے۔" میں نے دانت نکال کے کہا۔" مگر آپ نے درست فرمایا... کیا خیال ہے میں گدھا بن جاؤں... کراچی میں بہت گدھے ہیں۔"

" ویسے تو بندرگاہ... ڈاکیارڈ اور فش ہاربر کے علاقے میں سیکڑوں کشتیوں' لانچوں اور بحری جہازوں سے بلا مبالغہ لاکھوں افراد کا روزگار وابستہ ہے۔" اکرام نے کہا۔" ان میں خالص ٹیکنیکل نیچر کا کام کرنے والے بھی ہیں۔ مثلاً انجینئرز اور ریڈیو آفیسر نیوی گیٹر وغیرہ لیکن سیکڑوں دوسرے پیشے بھی ہیں۔ مال بردار مزدور سے لے کر ماہی گیر تک ہر پیشے میں ہزاروں لوگ ہیں۔"

" تمھارے خیال میں مجھے فشنگ کرنی چاہیے۔ ڈور اور بنسی لے کر؟" میں نے کہا۔

" ابھی تم مچھلی پکڑنے' اسے فروخت کرنے' محفوظ کرنے اور ایکسپورٹ کرنے کی پوری انڈسٹری کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس ایک پیشے میں کتنے افراد یہ کام کررہے ہیں۔ میں نے کسی اعداد و شمار کے ماہر سے تو نہیں پوچھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ تعداد لاکھوں تک ضرور پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے سب سے مناسب پیشے دو ہیں جن میں تم چھپ کر رہ سکتے ہو اور بلا روک ٹوک ہر جگہ جاسکتے ہو۔ ایک تو تم ماہی گیر بن سکتے ہو۔ ایک چھوٹی سی کشتی ہو تمھاری لانچ ہو یا فشنگ ٹرالر۔ تم کراچی کے پورے ساحل پر اور کھلے سمندر میں جہاں جاہو جاؤ جب جاہو جاؤ۔ دن رات کی کوئی قید نہیں۔ بے شک کسٹم اور نیوی کی پولیس چیک کرلیتی ہے مگر وہ کسی بھی ماہی گیر کو کچھ نہیں کہتے۔ ان کی نظر اسمگلنگ میں ملوث لانچوں پر رہتی ہے... تم بلوچی یا مکرانی کا روپ دھار کے ماہی گیروں کے حلیے میں مزے سے گھومو۔ رابعہ کو

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

تلاش کرو یا "ایس ایس کراتی تھرڈ۔" پر نظر رکھو... تم کسی کی نظر میں نہیں آؤ گے۔"

"میں اس تجویز کی افادیت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ تمہارے لیے کیا مناسب ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم ایک انجن والی چھوٹی لانچ لے سکو تو سب سے بہتر۔ ورنہ وسیع بادبانی کشتی اور مچھیروں کا جال۔ تم کشتی پر ہی گھر بسا سکتے ہو۔ اور آباد کر سکتے ہو۔ ایک خاتون جو ہائی کورٹ کی نامور وکیل تھیں ایک مچھیرن کے روپ میں۔"

"بالکل فلمی آئیڈیا ہے۔ سُپر ہٹ فلم بن سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "فلم میں رومانی سین بھی آ سکتے ہیں۔ کھلا سمندر... چاند... لہروں کی سرگم اور کوئی دوگانا از قسم۔ میں ترا چاند تو مری چاندنی۔"

"دوسرا پیشہ ہے مزدوری کا۔" اکرام نے گاڑی چلاتے ہوئے اپنی سنجیدگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ "مزدور بھی سیکڑوں قسم کے ہیں۔ ہر قسم کے جہاز لانچ یا کشتی پر سامان چڑھانے اور اتارنے والے۔ سامان کو اندر سے باہر اور باہر سے اندر پہنچانے والے۔ لوڈر اور ہیلپر... یہ کام بغیر سرمایہ خرچ کیے ہو سکتا ہے اور اس حلیے میں بھی آدمی کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے اور جو چاہے کرے۔ بس اُسے کسی ایجنٹ کے ذریعے مزدوری کا حق ملتا ہے۔ جو اس سے بھتا وصول کرتا ہے اور آگے سب میں تقسیم کرتا ہے۔ بندرگاہ میں جتنے اچھے بُرے کام ہیں۔ جائز اور ناجائز دھندے ہیں اتنے ہی لوگ بھی ہیں جو قواعد و ضوابط میں رعایت برتتے، آنکھیں بند رکھتے اور ہر قسم کا این او سی دینے کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔"

"تو اتنے کم وقت میں بندرگاہ پر ایک اتھارٹی ہو گیا ہے۔ بہت ریسرچ کی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ مزدوری والا کام کچھ مشکل اور ذرا شان کے خلاف نہیں ہے؟"

"اس میں خلافِ شان وہ غیر قانونی اور ناجائز کام ہیں جو کرنے بھی پڑتے ہیں اور کرانے بھی پڑتے ہیں۔" اکرام بولا۔ "ورنہ مزدوری اگر صرف مزدوری ہو تو اتنا ہی قابلِ احترام پیشہ ہے جتنا کوئی اور پیشہ۔"

"میرا خیال ہے کہ لانچ یا کشتی والا آئیڈیا چلے گا۔"

"اب میری رائے پوچھو تو میں کشتی کے حق میں ہوں۔" وہ بولا۔ "کسی مچھلی پکڑ[illegible] بادبانی کشتی کا مشاہدہ کرو۔ اس میں پندرہ بارس یا درجن بھی لیا جا سکتا ہے... یا ماہا کا... یا کسی اور کمپنی کا... جو اتارا بھی آسانی سے جاتا ہے۔ بادبانی کشتی میں فائدہ یہ ہے کہ اس میں ایک ٹیم کام کر سکتی ہے۔ تین چار افراد کی۔ جال پھینکنے اور کھینچنے والے۔ بادبان چڑھانے اور اتارنے والے۔ لپیٹنے والے۔ مرمت کرنے والے اور مچھلیاں ساحل تک لانے والے۔ وہ کشتی پر ہی رہتے ہیں چنانچہ ان کے پاس تھوڑا بہت اپنا سامان بھی ہوتا ہے۔ اور اس سارے کاٹھ کباڑ میں اسلحہ بڑی آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے... دو چار مشین گنیں اور دس بیس دستی بم تو پتا بھی نہیں چلتے... حلیہ اور صورت مچھیروں جیسی ہو تو آپ کسی بھی جہاز کے قریب سے گزر جائیں۔ کوئی نظر اُٹھا کے نہیں دیکھے گا۔"

"مجھے فلم "گنز آف نیوران" کا منظر یاد آ رہا ہے، جس میں انتھونی کوئین اور ڈیوڈ نیون اور شاید گیری کوپر تھے۔ وہ بھی ماہی گیر بنے ہوئے تھے اور جب دشمن کی ایک لانچ نے انھیں روکا جس پر جرمن خفیہ پولیس کے مسلح ارکان تھے تو وہ تینوں بے حد غربت زدہ ماہی گیر بنے جال مرمت کر رہے تھے مگر جال کے نیچے مشین گن اور دستی بم لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے جرمنوں کا پلک جھپکنے میں صفایا کر دیا تھا۔ یار یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پریشان مت ہو... کراچی میں رہے گا تو فاصلوں کا عادی ہو جائے گا۔" اکرام بولا۔ "یہاں دس پندرہ میل اِدھر اُدھر ایسے ہی ہیں، جیسے لاہور میں دو چار میل... ویسے اب ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میرے دائیں جانب ایک ندی یا نالہ سا تھا جس کے نشیب میں ایک عجیب منظر تھا۔ دُور دُور تک ہزاروں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے اور ندی کے بیچ میں ایک نیم پختہ ٹوٹے پھوٹے راستے پر سے ٹریفک آ جا رہی تھی۔ اس کے پار میں ایک قبرستان کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ بائیں جانب عجیب خستہ حال گھر تھے اور ٹیڑھی میڑھی گلیاں تھیں۔ سڑک پر ہر چار قدم کے بعد ایک اسپیڈ بریکر سا آ جاتا تھا۔ اکرام نے بتایا کہ یہاں ہر شخص اپنے گھر کے سامنے اپنی مرضی کے مطابق اونچا نیچا... سیمنٹ یا پتھر کا اسپیڈ بریکر بنانے یا نالی کھودنے کا اختیار رکھتا ہے اور یوں ہر گاڑی کی لائف تو آدھی رہ جاتی ہے مگر اسپیڈ بریکر بنانے والوں کو یقین ہے کہ اس طرح وہ تیز رفتاری کے سبب ہونے والے حادثات کو ختم کر سکتے ہیں۔

ٹیکسی کو اس نے ایک گلی میں موڑا... پھر دوسری میں... پھر تیسری اور چوتھی... دائیں بائیں کچے پکے مکان۔ سیمنٹ یا ٹین کی چادروں کی چھتیں... درمیان میں بہتی ہوئی نالی اور نالی کو حسبِ توفیق جسمانی اخراج سے مزید گندا کرنے والے بچے جو ٹیکسی کے پیچھے دوڑتے تھے اور اس سے لٹکنے کی [illegible] کوشش کرتے تھے۔ اکرام بہت محتاط بھی تھا اور اس نے محبت بھرے لہجے میں بچوں کو متعدد بار کتّے کی طرح دُھتکارا اور گالیاں دیں۔ سختی یا نفرت سے یہ کام لیا جاتا تو بچوں کے والدین مار مار کے اکرام کا تو تو بگاڑ دیتے۔ روم میں ایسا ہی کرو جیسا رومن کرتے ہیں۔

یہاں ایک ہی شہر کے مختلف حصوں میں رہنے کے ادب آداب اور طور طریقے جدا تھے۔ کلفٹن اور ڈیفنس میں... لالو کھیت میں۔ لیاری میں یا کھارادر میں الگ الگ اندازِ زندگی اور جدا جدا طرزِ بود و باش ہے۔

بالآخر ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ یہ دو مکانوں کے درمیان اندر کی طرف ایک کھانچا سا تھا جو کسی کھوکھے کی موجودگی سے پیدا ہوا تھا۔ اس طرح تنگ گلی بلاک نہیں ہوئی۔ اکرام نے ایک دروازے کی کنڈی کھولی جس میں نمبر والا تالا لگا ہوا تھا۔ اس سے سیدھا گزرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا سر دہلیز پر لگا۔ اندر صحن بھی برائے نام تھا... اگر میں لانگ جمپ لگاتا تو کمرے کے بند دروازے کو توڑتا ہوا اندر جا گرتا۔

یہ دو کمروں کا گھر تھا۔ دونوں کمرے تاریک تھے اور ان میں وہی بُو تھی جو مقبرۂ جہانگیر کے غیر آباد اور ویران حجروں کی یاد دلاتی تھی جہاں اکرام مختصر ترین اسبابِ زندگی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ دو کمروں میں دو ہی چارپائیاں تھیں۔ لوہے کے پائپ والے فریم سے بنی ہوئی جن کو چوڑیاں گھما کے کھولا بھی جا سکتا تھا۔ ایک اسٹیل کی میز تھی اور اسٹیل کی دو فولڈنگ کرسیاں۔ ایک ٹیبل فین دونوں کمروں میں موجود تھا اور دونوں کمروں کی دیواروں پر جو تختے لگے ہوئے تھے ان پر ذاتی ضرورت کا الگ الگ سامان رکھا ہوا تھا۔ اکرام کا صندوق اس کے پلنگ بلکہ لکڑی کے تخت کے نیچے تھا اور نازو کا صندوق نازو کے تخت کے نیچے۔

اکرام نے میرے دونوں سوٹ کیسوں کو بھی اسی طرح دو کمروں میں تقسیم کر دیا اور دونوں تختوں کے نیچے سوٹ کیس بھی روپوش ہو گئے۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس غریب بستی کے اس خستہ حال گھر میں کتنا دھماکا خیز مواد جمع ہے اور کتنے لاکھ کی کرنسی موجود ہے جو اسی ملک کے دشمنوں کا عطیہ ہے۔ میں نے اکرام کو بتایا کہ کار میں کچھ گولہ بارود بھی ہے تو اس نے کہا کہ اگلے پھیرے میں وہ بھی لے آئیں گے۔

"یہ بڑا اچھا ہوا کہ زیادہ لوگوں نے تیرے سوٹ بوٹ پر شک کی نظریں نہیں ڈالیں۔" اکرام بولا۔ "اب یہ لباس اُتار کے بدل ڈال۔ اور میں تجھے ایک خلعتِ فاخرہ عطا کرتا ہوں۔ وہ زیب تن کر۔"

اس کی عطا کردہ خلعتِ فاخرہ ایک میلی سفید شلوار اور ڈھیلی ڈھالی سفید قمیص پر مشتمل تھی جو غالباً کسی فٹ پاتھ پر سے ریڈی میڈ خریدی گئی تھی۔ میں نے اس کے چپل پہنے اور ایک گول ٹوپی سر پر رکھی۔ پھر ہم کھانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت تین بجنے والے تھے۔ پھر بھی اکرام شیخ مجھے صدر لے گیا۔

"تجھے بمبئی کی مسالے والی بریانی کھلاتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی کا تین نمبر تحفہ ہے۔"

"دو نمبر اور ایک نمبر کیا ہیں؟"

"ایک نمبر ہے تمہاری جو ہر طبقے، ہر کلاس، ہر محلے اور بازار میں ہر قیمت پر ملتی ہے۔" وہ بولا۔ "دوسرے نمبر پر ہے حلیم۔"

چار بج رہے تھے چنانچہ بھوک سے میرا حال خراب تھا۔ مجھے بریانی بہت اچھی لگی۔ میں کھانے میں محو تھا کہ مجھے اچانک اکرام کی حالت میں رونما ہونے والے جذباتی تغیر نے متوجہ کیا۔ وہ اداس ہو گیا تھا اور اس نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں یار۔"

میں سمجھ گیا کہ اُسے نازو یاد آ گئی ہے۔ "دیکھ... اس طرح عورتوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ملول ہونے اور دل کو رنجیدہ کرنے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نازو کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ ہمیں ضرور ملے گی۔ بس وہ اپنے جرم کی سنگینی کے پیشِ نظر مجبور ہے کہ بالکل روپوش رہے۔ دو چار دن میں یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ بھی ایسے ہی گھومتے پھرتے مل جائے گی جیسے میں ملا تھا۔"

"بس یار... ایسے ہی جب اس کا خیال آتا ہے نا تو عقل کی ساری تسلیاں بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ یہی سوچنے لگتا ہوں کہ نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی؟ اس نے کچھ کھایا پیا ہوگا یا نہیں... اور خدانخواستہ... خدانخواستہ..." وہ پلیٹ رکھ کے اور مُنہ چھپا کے رونے لگا۔

نوالہ میرے حلق میں اٹک گیا، میری بھوک مر گئی اور میں نے بھی اپنی پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ "یار کہیں مرد اس طرح روتے ہیں اور نازو جیسی بہن کا بھائی جو خود بھی ایک باحوصلہ اور نڈر پولیس افسر رہا ہو۔"

"اس کا اور میرا اب دنیا میں اور کوئی نہیں رہا نا۔" وہ آنسو صاف کر کے بولا۔ "ماں باپ تھے تو ایک پہلے سے دل کا مریض تھا۔ اسے دنیا والوں کی انگشت نمائی نے نہ جینے دیا۔ دوسرے کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ مجھے اس گھر کی خانہ ویرانی کے تصور سے ندامت بھی ہوتی ہے اور وحشت بھی۔"

"ایک گھر میرا بھی تھا اکرام۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اور اب بھی ہے... اس کی خانہ ویرانی مجھے بھی لہو رلاتی ہے۔ گھر غالب کا بھی تھا، جو اب ایک اُجڑا دیار ہے... محض ایک کھنڈر۔ گھر تو بنتے ہیں، بستے ہیں، اُجڑ جاتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں مگر

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پھر ان کی جگہ نئے گھر بنتے ہیں اور نئی خوشیوں کے ساتھ آباد ہوتے ہیں۔ جیسے خزاں میں سارے پتے درختوں سے جھڑ جاتے ہیں اور پھول مرجھا جاتے ہیں۔ مگر بہار پھر آتی ہے... نئے... زیادہ شوخ اور زیادہ حسین رنگ لے کر۔ ہم سب آج بے گھر ہیں مگر ہم سب کے خوابوں اور خیالوں کا گھر تو آباد ہے۔ ایک دن اس کی تعبیر بھی حقیقت کا روپ دھارے گی۔ اسی دن کے لیے ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہم اسی گھر کو بنانے اور بچانے کے لیے تو لڑ رہے ہیں... وقت سے... اپنی خوشیوں کے دشمنوں سے... ان خواہشوں سے جو ہمارا راستہ روکتی ہیں۔ ان خودغرض جذبوں سے جو ہمیں آج کی جھوٹی خوشیوں، عارضی مسرتوں اور دلچسپیوں کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے۔ جب محسن اور شہلا کا ایک گھر ہوگا۔ میرا اور رابعہ کا ایک گھر ہوگا... نازو کا ایک گھر ہوگا..."

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "غالب کا کیا حال ہے؟ اس کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"سب اسی طرح اپنی امیدوں اور جذبوں کے ساتھ جی رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں... جیسے میں..." میں نے دل میں تیسرے گھر کی تکمیل کی خوشی کو محسوس کیا۔ نازو کے گھر کے ساتھ ہی اکرام نے غالب کا ذکر کر کے لاشعوری طور پر مجھے بتلا دیا تھا کہ وہ غالب کا ہی گھر ہوگا... یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ ایک وقت تھا کہ اکرام میرے خلاف صفِ دشمناں میں شامل تھا، بلاشبہ اس کی دشمنی میں ذاتی عداوت کے جذبات شامل نہ تھے۔ وہ اصول پرستی اور فرض شناسی کے تقاضے تھے جنھوں نے مجھے اور اسے ایک دوسرے کے مقابل رکھا تھا اور اس حد تک دور کر دیا تھا کہ ہم اپنی دوستی کو بھول کر جان کی دشمنی مول لے بیٹھے تھے۔ مگر پھر اس دنیا کے دوغلے موقع پرست لالچی اور بے ضمیر لوگ اکرام کے بھی دشمن ہو گئے اور بدعنوان رشوت خور اور بدکردار پولیس افسروں نے اس کے کانٹے کی طرح کھٹکنے والے وجود کو نکال باہر کیا۔ اب بھی وہ اصولی بنیادوں پر میرا ساتھی تھا۔ وہ میرے دشمنوں کا دشمن تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ ہمارا اندازِ جنگ ہی مؤثر اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس نے چھوٹی بہن کی محافظت کے لیے بھی ہم سے اتحاد کر لیا تھا اور یہ تازہ ترین خوشخبری تھی کہ اس نے غالب کا رشتہ بھی منظور کر لیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ نازو کے ساتھ غالب کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا۔ مگر نازو کے جذبات اور غالب کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی اور یہ مان لیا تھا کہ ان کی محبت بھی اتنی ہی معصوم اور نیک ہے جتنی ہم سب کے صادق جذبوں کی بے غرضی۔

"ڈی ایس آئی اکرام شیخ کس نام سے ٹیکسی چلاتا ہے؟" میں نے اس کو موڈ صحیح کرنے کے لیے کہا۔

"ڈرائیونگ لائسنس پر میں امیر خان ولد کبیر خان ہوں۔" وہ مسکرایا۔

میں ہنس پڑا۔ "منکہ مسمی کبیر خان ولد وزیر خان کیا عرض کروں یہ عزت افزائی ہے آپ کی کہ مجھے والد ماجد کے منصب پر فائز کیا۔"

"کیا لوگ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ نہیں بناتے؟" وہ بولا۔

"بادشاہ خان ولد شہنشاہ خان رکھتے میں کیا حرج تھا؟"

"آپ نے میری ٹیکسی کے پیچھے لکھا ہوا شعر نہیں پڑھا۔" اکرام نے کہا۔

"پیچھے تو لکھا ہوا ہے۔ بچو یار تنگ نہ کر۔"

"اس کے نیچے۔" اکرام بولا۔ "میں دل کا بادشاہ ہوں لیکن دھکے کھا رہا ہوں۔ رالز رائس کی جگہ دیکھو ڈاٹسن چلا رہا ہوں۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ "یہ ٹرانسپورٹ بلاند مصوری اور شاعری کے نمونے میں سارا دن دیکھتا رہا ہوں ...یہاں سب کا ذوق بہت اعلیٰ ہے کیا ٹیکسی رکشا اور کیا ٹرک اور بس... ایسی ایسی محیر العقول تصویریں نظر آتی ہیں کہ مصور کے تخیل پر رشک آتا ہے... آج ہی میں نے ایک ٹرک کے پیچھے ایک سہانا منظر دیکھا کہ دریا پہاڑوں سے گزر کے شاداب جنگل سے گزر رہا ہے اور دریا کے کنارے شیر اور بکری ایک ساتھ پانی پی رہے ہیں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا 'انصاف اور قانون۔'"

"خیالی دنیاؤں کے تصوراتی ماحول میں رہتے والے مظلوم لوگ اور کیا کریں۔" اکرام بولا۔ "جو دنیا میں نہیں ہے، وہ مصور کے موئے قلم میں تو ہے... اس کی تصویر تو دیکھی جا سکتی ہے اور دکھائی بھی جا سکتی ہے۔"

"حقیقی انصاف اور قانون کا شاہکار افتخار عارف کا خون ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس شہر میں جو مہذب پڑھے لکھے لوگوں کا شہر ہے... پیسے والوں کا شہر ہے۔ حکومت کس کی ہے؟"

"میرا ایک نام اور کام اس سے الگ بھی ہے۔" اکرام شیخ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی میں پرانی پولیس کی وردی پہن لیتا ہوں۔ میرے پاس دو وردیاں تھیں۔ کسی شناختی کارڈ کے بغیر وہ وردی بے اختیار ہوتی ہے۔ لیکن میرا شناختی کارڈ بھی ہے۔"

"کیا استعفا دیتے وقت وہ واپس نہیں کرنا پڑتا؟"

"ایک بار میرا اصل شناختی کارڈ کھو گیا تھا۔" وہ بولا۔ "میں نے قاعدے ضابطے کے مطابق رپورٹ لکھوائی اور وارننگ بھی دی گئی مجھے [illegible] کے بعد ڈپلی کیٹ بنا دیا گیا۔ تین چار [illegible] اصلی کارڈ گھر ہی مل گیا۔ وہ درازوں کے [illegible] اب میں تو رپورٹ لکھوا چکا تھا کہ فلاں بس [illegible] فلاں مقام پر کسی نے میری جیب کاٹ [illegible] ہی شناختی کارڈ بھی چلا گیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔"

"یہ قواعد و ضوابط بھی آدمی کو کتنا جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار... اگر میں سچ بولتا کہ وہ مل نہیں رہا ہے... سارا گھر چھان مارا اور غالباً میں کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ تو یہ سنگین غفلت کا کیس بنتا۔ میں نے الزام ایک نامعلوم جیب تراش پر رکھا اور بچ گیا۔ اصل کارڈ ملنے کے بعد میں کیسے جا کے کہتا کہ جناب وہ رپورٹ جھوٹی تھی۔ میں نے اسے پڑا رہنے دیا۔ جب استعفا دینے کا وقت آیا تو وہ ڈپلی کیٹ واپس کر دیا گیا۔ اصل میرے پاس رہا اور اب کام آ رہا ہے۔ اب تک صرف دو بار میں نے وردی پہن کے اور اس شناختی کارڈ کی مدد سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ پنجاب پولیس کا کارڈ ہے مگر ایک صوبے کے افسر دوسرے صوبے کے شہروں میں جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ملزم کا پیچھا کرنے کبھی چھاپا مارنے... کبھی اسپیشل ٹیم کے ساتھ۔ یہاں مجھے کوئی پہلے بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ کسی کو معلوم نہیں کہ سب انسپکٹر اکرام شیخ نے استعفا دے دیا ہے۔"

"مگر خطرہ تو ہے۔"

"اسی لیے کبھی کبھار استعمال کر لیتا ہوں جب اس کے بغیر کام نہ نکلتا ہو۔" وہ بولا۔

ہمارے آس پاس بہت سے لوگ ہر قسم کی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بریانی کھا رہے تھے اور یہ سب گاڑیاں آڑی ترچھی ایک کچے میدان میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اب کھانے کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ بہت کم گاڑیاں رہ گئی تھیں۔ اکرام شیخ نے میری معلومات میں اضافے کے لیے بتایا کہ دوپہر اور رات کو کھانے کے وقت یہاں گھمسان کا رن پڑتا ہے اور گاڑی کھڑی کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ بظاہر وہ ایک جھگی نما ہوٹل تھا مگر اکرام شیخ نے کہا کہ اس کی صبح سے آدھی رات تک کی سیل کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ منافع ہزاروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

"سب قدرت کے کھیل ہیں۔" اکرام نے گھڑے میں سے نوٹ نکال کے استری کرنا شروع کیے اور بل وصول کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ویٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ایسا شاید کبھی نہ ہوا ہوگا کہ کوئی پانی پینے کے مٹکے میں نوٹ بھر کے لائے اور اسی میں سے ادائیگی کرے۔ جب بنک نہیں تھے تب بھی لوگ پیسہ گھڑوں میں بہرحال نہیں رکھتے تھے تجوریوں میں اور الماریوں میں رکھتے تھے۔ اب تو کراچی میں گھڑا بھر نوٹ لے کر پھرنا گویا چوروں اور ڈاکوؤں کو اپنے پیچھے لگانے کے مترادف تھا۔ اکرام نے ویٹر کو دس روپے ٹپ میں دیے۔

"مالِ مفت دلِ بے رحم۔" میں نے کہا۔ "پہلے کبھی اتنی ٹپ دی تھی؟"

اکرام ہنسا۔ "دوسرا محاورہ ہے کہ خدا شکر خورے کو ہی شکر دیتا ہے۔ اس سالے فقیر نے جمع کیا اور عیش ہم کر رہے ہیں۔ کیونکہ سب چیزوں کی طرح خوشی اور عیش اگر کسی کی تقدیر میں نہ ہوں تو وہ تمام عمر ترستا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے۔ میں نے ایسے لکھ پتی کیا کروڑ پتی کنجوس دیکھے ہیں جو دوا دارو کے لیے سرکاری شفاخانے میں جاتے ہیں اور حلیے سے بھنگی نظر آتے ہیں۔ بس وہی بات ہے کہ پیسہ تو خدا نے دیا مگر مقدر میں خوشی نہیں لکھی اور آرام نہیں لکھا۔"

"اس گھڑے میں کتنی دولت ہوگی... اندازاً۔"

"میرا خیال ہے کہ پچاس ہزار سے نیچے۔" میں نے کہا۔

"ہوگئی شرط..." اکرام بولا۔ "میں کہتا ہوں کہ پچاس ہزار سے اوپر۔"

"شرط کیا ہے؟"

"شرط؟" وہ سوچ کے بولا۔ "دو منٹ تک مرغا بن کے تین بار کہنا ہے کہ میں کاٹھ کا الو ہوں۔"

ہم وہاں سے روانہ ہو رہے تھے جب ایک ٹیکسی ہمارے قریب آ کے رکی اور اس میں سے ایک کانسٹیبل اترا۔ ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل اندر بیٹھے رہے۔ ان کے ساتھ کوئی ملزم بھی تھا جس کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ملزم کے خرچ پر بریانی سے پیٹ کے تندور میں آگ بھرنے آئے تھے اور اس کے بدلے ملزم کو یہ غیر قانونی رعایت دے رہے تھے۔

"یہ اسی تھانے کے بندے ہیں۔" اکرام نے کہا۔ "جو صبح ملے تھے۔ افتخار عارف کے قتل کی ابتدائی تفتیش کے لیے۔"

میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ میری نظر ملزم پر گئی، اور میرے ذہن کو الیکٹرک شاک سا لگا۔ یہ وہی ٹرک ڈرائیور تھا۔

"اکرام... بھاگ یہاں [illegible] چل۔" میں نے کہا۔

اکرام ذہین آدمی تھا [illegible] اور میری صورت کے تاثر نے اسے وہ سب سمجھا دیا جو میں زبان سے نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے ایک دم ٹیکسی ریورس میں لی۔ مگر اتنی دیر میں ٹرک ڈرائیور

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مجھے دیکھ چکا تھا۔ اُس نے چلّا کے کچھ کہا اور پھر دیوانہ وار ہمارے پیچھے دوڑا۔ ٹیکسی ڈرائیور بریانی لینے گیا ہوا تھا۔ ایک کانسٹیبل رسماً باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی رائفل اندر ہی رکھی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دوسرا کانسٹیبل موجود تھا مگر وہ بھی بڑے سکون سے بریانی کا انتظار کر رہا تھا جس کی خوشبو اس کی اشتہا کو بڑھا رہی ہوگی۔ ایک سب انسپکٹر یا اے ایس آئی آگے تھا مگر وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں سر کو پیچھے ہیڈ ریسٹ پر رکھے بیٹھا ہوا تھا۔

ملزم کے ایک دم نکل بھاگنے سے یقیناً ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں گے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ کوئی پولیس پارٹی کسی ملزم کو رشتے داروں سے ملوانے یا ناشتا کرانے اور کھانا کھلانے کے لیے لے گئی۔ اس رعایت کی رشتے داروں کی طرف سے بھاری رشوت الگ ملتی ہے اور اچھا کھانے میں وہ برابر کے شریک ہوتے ہیں، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملزم ہتھکڑی سمیت بھاگ جاتے ہیں یا ہائی جیک کر لیے جاتے ہیں بعض اوقات بہت تگڑی رشوت پر ہائی جیکنگ کا ڈراما بھی رچایا جاتا ہے اور ظاہر کیا جاتا ہے کہ محافظوں کو حملہ کر کے بے بس کر دیا گیا تھا۔ مجرمانہ غفلت میں معطل ہونے والے کانسٹیبل عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں اور دو چار مہینے فارغ رہتے ہیں تو آرام کرتے ہیں۔ پھر بحال کر دیے جاتے ہیں۔ بنک بیلنس میں بیس پچیس ہزار بڑھ جاتے ہیں۔

اس وقت یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ معاملہ ایک معروف صحافی کے قتل کا تھا۔ بھاگنے والا کس لیے بھاگا تھا، یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ سب سے اہم شخص جسے ضرورت پڑنے پر مجرم ثابت کر کے لٹکایا بھی جا سکتا تھا ہاتھ سے نکل گیا۔ پولیس والے اپنی تاریخی رائفلیں اٹھائے دوڑے ہوں گے۔ ان کے افسرِ اعلیٰ کی غنودگی یکلخت کافور ہو گئی ہوگی۔ اس نے سب سے پہلے ریوالور نکال کے فائر کیا۔

ہماری ٹیکسی اتنی دیر میں بہت دُور جا چکی تھی۔ میں نے سر گھما کے پیچھے والے شیشے میں سے دیکھا تو ٹرک ڈرائیور اچھل کے زمین پر گرا تھا۔ میں نے اس کے سر سے پھوٹتے والا خون کا فوارہ بھی دیکھا۔ یہ پولیس کی کوتاہ اندیشی تھی یا ایک دانستہ حرکت کہ انھوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ وہ اگر سوچ سمجھ کے فائر کرتے تو ملزم کی ٹانگ کو نشانہ بناتے۔

لیکن پیچیدہ اور گلے پڑنے والے کیس یوں بھی ختم کیے جاتے ہیں۔ عرفِ عام میں پولیس مقابلے کے ذریعے۔ انھوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کے سر کا نشانہ لیا۔ اب اس واردات کی تفتیش ہوگی تو حقیقت بیان کرنے والے گواہ بہت... وہ لاش کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں گے تاکہ خود پولیس پر تو الزام نہ آئے کہ انھوں نے مجرم کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک مشترکہ مؤقف اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ملزم کے ساتھی وہیں موجود تھے۔ ان کی شہ پر ملزم نے ہتھکڑیوں سمیت فرار ہونا چاہا اور اس کے ساتھیوں نے فائرنگ کی مگر وہ ملزم کو لے جا نہ سکے اور خود فرار ہو گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ بالکل ایسے ہی پیش آیا تھا وہ دس گواہ حاضر کر دیں گے۔ بریانی کھانے والے تو گئے۔ رہ گئے وہاں کے نوکر، بیرے تو ان کی کیا مجال کہ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان نہ دیں۔ یہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ گواہوں سے سادہ کاغذ پر دستخط لے لیے جاتے ہیں اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق بیان بعد میں لکھ لیتی ہے۔ دیدہ دلیری کی انتہا اس وقت ہوئی تھی جب لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کے سامنے کوئی فائل پیش کر دی گئی تھی جس میں ایسے ہی دستخط شدہ سادے کاغذ بھی لگے رہ گئے تھے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا یار۔" اکرام بولا۔

"فکر مت کرو... اس نے ہمارا نمبر نہیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور دیکھا بھی ہوگا تو اُسے موقع کہاں ملا کہ کسی کو بتا سکتا۔"

"کس قدر سفاک اور بے رحم لوگوں کے ہاتھ میں قانون کا اختیار اور اسلحہ دے دیا گیا ہے۔" اکرام شیخ نے نفرت سے کہا۔

"اسے مروایا گیا ہے دوست!" میں نے کہا۔ "وہ نااہل ثابت ہوا تھا اور دشمن کے قابو میں آ گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ بتا بھی دیا تھا۔"

"ہم آج رات افتخار عارف کے گھر چلیں گے۔"

"گھر؟ اس قبرستان میں جہاں وہ دفن کیا جائے گا؟" میں نے دل میں اُٹھنے والی ٹیس کو دبا لیا۔

"نہیں... اسی گھر میں جہاں وہ مارا گیا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ بندرگاہ کی طرف جاؤں۔ دوست محمد سے ملنے۔"

"وہاں بھی چلے جائیں گے۔" اکرام نے کہا۔ "رات کے وقت یا کل... پہلے یہ کام ضروری ہے۔"

"وہاں کون جانے دے گا ہمیں؟"

"میں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "مجھے امید ہے کہ وہاں سے کچھ ضرور ملے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "لے جانے والے وہ سب لے گئے ہوں گے۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ افتخار عارف کو مار گئے ہوں اور لے کر کچھ نہ گئے ہوں۔"

"ایک چانس یہ بھی ہے کہ انھیں موقع نہ ملا ہو۔ وہ اچانک آ گیا ہو اور انھیں فرار ہونا پڑا ہو۔" اکرام نے کہا۔ "میں خود کو ایک تفتیشی افسر ظاہر کر کے اندر جاؤں گا اور اطمینان سے رات بھر تلاشی لوں گا... باہر ایک سپاہی ہوگا یا دو ہوں گے۔ وہ مداخلت نہیں کریں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سارا مواد میرے ہاتھ لگ جائے جو افتخار عارف نے اکٹھا کیا تھا اور جو وہ آئی ایس آئی کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے... کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں... کیا یہ پتا نہیں چلایا جا سکتا کہ وہ ٹرک کہاں گیا؟"

"مشکل ہے۔" اکرام نے کہا۔ "ممکن ہے ٹرک واپس جا چکا ہو۔"

"مجھے اس کا نمبر یاد ہے۔"

"نمبر کچھ نہیں ہوتا۔ راستے میں چار بار بدل دیا جاتا ہے۔ کیا تو نے خود کو کسٹم انسپکٹر ظاہر کرنے والے کا نام پوچھا تھا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے خیال نہیں رہا۔"

"پڑھے لکھے بھی کیسی جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔" وہ بولا۔ "بابا پولیس والا ہو یا کسٹم انسپکٹر... میٹر ریڈر ہو یا ٹیلی فون کا لائن مین... پہلے اس کا شناختی کارڈ تو دیکھنا چاہیے۔ اس احمقانہ روش کے نتیجے میں روز وارداتیں ہوتی ہیں۔ بدمعاش گھر میں گھس کر سب کچھ لے جاتے ہیں۔ بعض اوقات گھر والیوں کی عزت بھی۔ مگر عورتوں کو کیا کہے کوئی جب تم جیسے ہر ایرے غیرے کو کوتوال مان لیتے ہیں... محض اس کے کہنے پر۔"

"یار کہا نا کہ غلطی ہو گئی۔ اب ایک بات میری بھی سُن۔ اس اخبار میں جہاں افتخار عارف تھا۔ اس کا کوئی دوست تلاش کرنا چاہیے۔ ویسے تو صحافی سب آپس میں دوست ہوتے ہیں مگر سب قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ پریس کلب سے معلوم ہو سکے تو ہم اس شخص کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور اسے افتخار کے قتل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"اصولی طور پر تو یہ اچھی تجویز ہے۔" اکرام نے کہا۔ "مگر جناب! پہلی بات تو یہ کہ کسی کے قابلِ اعتبار ہونے کا کیسے پتا چلے گا؟ پھر یہ معاملہ ایسا ہے کہ افتخار کے انجام سے سب ڈرے ہوئے ہوں گے۔ ہر صحافی جیمز بانڈ نہیں ہوتا... شاید جان ہتھیلی پر رکھ کے افتخار عارف کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہمت اس شخص میں نہ ہو... اگر پریس کلب چلنا ہے تو چلو... یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ انگل روڈ پر ہے۔"

"مگر میں اور تم وہاں داخلے کا حق نہیں رکھتے۔"

"ایک ویٹر سے تعارف ہے۔ میں اس کی بیوی کو ہسپتال لے گیا تھا۔" اکرام بولا۔ "اس کی عدم موجودگی میں ہی اُسے داخل بھی کرا دیا تھا اور پھر پریس کلب جا کے اُسے باپ بننے کی مبارک باد بھی دی تھی۔ وہ بہت احسان مند ہوا تھا۔"

"بس تو پھر چلو..." میں نے کہا۔

پریس کلب کے احاطے میں اس وقت آٹھ دس کاریں کھڑی ہوئی تھیں مگر لوگ اندر تھے۔ صرف ایک میز پر ایک خاتون اور دو حضرات چائے پی رہے تھے مگر انھوں نے صرف ٹیکسی کو دیکھا اور فرض کیا کہ اس میں بھی انھی کا کوئی ہم پیشہ اندر آیا ہوگا۔ اکرام عقبی حصے سے اندر گیا اور چند منٹ کے بعد اس ویٹر کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ دونوں ایک کونے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ویٹر نے میری طرف بھی دیکھا اور غالباً اکرام کو کھینچ کر اصرار کیا کہ اپنے مہمان کے ساتھ چائے پیے۔ اکرام نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی اور لوٹ آیا۔

"قاضی کے گھر کے چوہے بھی اتنے سیانے نہیں ہوتے ہوں گے جتنے پریس کلب کے ویٹر باخبر ہوتے ہیں۔" اکرام نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "سب کی سنتے ہیں نا۔"

"کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"ہاں... افتخار عارف کی ایک بہن ہے۔ اس کا شوہر اے پی پی میں ہے۔" اکرام ٹیکسی کو ریورس میں گیٹ تک لے گیا۔

"اور ایک بہت قریبی دوست جو اکثر اس کے ساتھ نظر آتا تھا آج کل شوبزنس کے ایک پرچے کا ایڈیٹر ہے۔ پہلے اسی کے ساتھ تھا۔"

"ویری گڈ... اگر یہ کام کے لوگ ثابت ہوئے تو ہم افتخار عارف کا کیس ایسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے کہا۔ "کہ قاتل وہ ٹرک ڈرائیور تھا جو فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ اب کیسا پرچا اور کیسا چالان... عدالت بھی پھانسی ہی دیتی نا۔"

"جذباتی مت ہو... پولیس کے لیے سب کام آسان ہیں۔ تُو اگر یہ سمجھتا ہے کہ ان کو مشکل میں ڈال دے گا تو یہ تیری بھول ہے، تو خود اپنے لیے مشکل پیدا کرے گا... اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائے گا۔" اکرام شیخ نے کہا۔

میرا بھٹکا ہوا ذہن راہِ راست پر آ گیا۔ واقعی میرا مشن پولیس کے محکمے کی اصلاح تو نہیں ہے۔ مجھے رابعہ کو تلاش کرنا ہے۔ اکرام کے ساتھ نازو کو ڈھونڈنا ہے۔ پھر دیکھنا ہے کہ یہاں کتنے شکاری ہیں اور اس شکارگاہ میں ان کو کیسے گھیرا جا سکتا ہے؟

"میرے پاس ایک ٹیلی فون نمبر ہے۔" میں نے کہا۔ "جس پر میری رابعہ سے بات ہوئی تھی۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نمبر کس کا ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"میرے خیال میں یہ کوئی مشکل بات نہیں۔" اکرام نے کہا۔ "کوئی بھی فون آپریٹر بتا سکتا ہے... یا بتا سکتی ہے؟"

"بتا سکتی ہے ایک آپریٹر۔" اکرام مجھے آنکھ مار کے مسکرایا۔

"اگر میں پیار سے پوچھوں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو نہیں کر سکتا اگر وہ کوئی بدصورت لڑکی نما چیز ہو۔"

"وہ لڑکی ہے۔ ایک غریب کلرک کی۔" اکرام بولا۔ "جو مجبوری کی وجہ سے نوکری کر رہی ہے۔ اس شہر کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح وہ بھی مردوں کے درمیان خود کو ایسے محسوس کرتی ہے جیسے بھوکے بھیڑیوں کے درمیان بھیڑ... مگر ابھی تک وہ خود کو بچا رہی ہے۔"

"کیا آپ بھی...؟"

"نہیں... میں وہ ہیرو ہوں جو عموماً وقت پر نمودار ہو کے لڑکی کو پریشان کرنے والوں کا دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔" وہ بولا۔ "اگر میں مدد نہ کرتا تو وہ اغوا ہو جاتی... پھر یہ ہو سکتا تھا کہ میں خود اُسے اپنی ٹیکسی میں اغوا کر کے لے جاتا۔ وہ تو بے ہوش تھی۔ مگر میں نے اسے گھر پہنچایا اور اس کے باپ کو بہت ڈانٹا کہ جوان لڑکیوں کو گھر سے بھیجتے ہی کیوں ہو۔ جانتے ہو دنیا کیسی ہے۔ پھر اس نے مجھے عملاً روتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ایک افسر کے ذاتی عناد کی بنا پر اس کو ریٹائر کیا گیا اور اب دو سال سے وہ چکر لگا رہا ہے۔ اے جی پی آر کے مگر آفس والے سروس بک اور متعلقہ ریکارڈ ہی نہیں بھیج رہے ہیں۔ سب اسی افسر کی کارستانی ہے۔ وہ خود تو اب دفتر میں گھس بھی نہیں سکتا... مجبوراً بیٹی کی کمائی کھا رہا ہے۔"

"اچھا رومانٹک اسٹارٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد سُن۔" اکرام بولا۔ "میں نے اس سے کہا کہ آئندہ جب رات کو ڈیوٹی ختم ہو تو مجھے بتا دے۔ میں آ کے لے جایا کروں گا... اور جناب یوں میں اس کی عزت کے محافظ کی حیثیت سے اپنا اخلاقی فرض اب بھی ادا کرتا ہوں۔"

"اخلاقی فرض... یہ فرمایئے کہ عشق کس مرحلے پر ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی... یا ابھی تک ون وے ٹریفک ہے؟"

"ون وے ٹریفک شروع سے تھی اور رہے گی۔ اس کی تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ اپنے کسی پھوپی زاد سے۔" وہ بولا۔ "بس وہ دبئی سے آیا تو... دی اینڈ۔" اس نے ٹیکسی روک دی اور کسی ایکسچینج میں گھس گیا۔

"یہ نمبر... کس نے دیا تھا تجھے؟" اس نے واپس آ کے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"کیوں... خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو نظر آ رہی ہے... آگے کا پتا نہیں۔ نمبر سیٹھ چاند بھائی موٹا والا کا ہے۔" وہ بولا۔

اس نام نے مجھے محظوظ کیا۔ "سیٹھ سورج بھائی چھوٹا والا۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں... چاند بھائی شہر کا نامی گرامی اسمگلر اور بدمعاش ہے۔" اکرام نے کہا۔ "یہ اس کے گھر کا نمبر ہے۔"

"تجھے... غلط تو نہیں بتایا اس نے...؟"

"یہ نمبر لکھ کے تو نے ہی دیا تھا نا؟" اکرام نے ایک چٹ مجھے تھما دی۔ "اب فون کر کے پوچھ لے۔"

میرا دماغ چکرا گیا۔ اب مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اکرام نے ٹیکسی کا رُخ اپنے گھر کی طرف موڑا۔ اس نے میرے فضول سوالات کے معقول جوابات تک نہیں دیے اور صاف کہا کہ چاند بھائی کے گھر جانے سے بہتر ہے کہ تو لاش حاضر ہو جا۔ بعد میں اس نے میرے جذبات کو دیکھتے ہوئے سوچنے اور مناسب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا۔

ہم جب واپس ہوئے تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ ٹیکسی کو ہم نے سڑک پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب اکرام شیخ پہلے کی طرح سب انسپکٹر بن گیا تو میں نے گلی میں جھانک کر "آل کلیئر" کا سگنل دیا اور وہ باہر آ گیا تو میں نے تالا لگا دیا۔ پھر میں اس کے ساتھ کسی زیرِ حراست ملزم کی طرح چلنے لگا۔

جہانگیر روڈ ویسٹ کے اس کوارٹر میں بھی اندھیرا تھا... موت کا بے حس... سرد، سفاک اور آسیب زدہ اندھیرا جس میں افتخار عارف سے مختصر رفاقت کی یادیں گم ہو گئی تھیں... باہر پہرا ابھی کوئی نہیں تھا مگر پولیس نے مجسٹریٹ کی موجودگی میں کوارٹر کو سربمہر کر دیا تھا۔ پھر رات وہ وقت تھا جب ٹی وی پر شوکت صدیقی کے ناول پر مبنی سیریل "خدا کی بستی" پیش کیا جاتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سڑکیں اور گلیاں کچھ سنسان لگتی تھیں اور گھروں کی کھلی کھڑکیوں کے سامنے اور دکانوں کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ یوں کھڑے نظر آتے تھے جیسے انھیں ہپناٹائز کر دیا گیا ہو۔

کسی نے ہمیں کوارٹر کی دیوار پھاند کے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے تھے لیکن میں اکرام کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ ابھی ہم صحن میں اترے ہی تھے کہ اندھیرے سے ایک سایہ ساجد ہوا اور کسی نے کہا۔ "آیئے... تشریف لایئے... مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں ضرور آئیں گے... مگر یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

میں اور اکرام اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ اس کا اور میرا ہاتھ اپنے اپنے ریوالور کی طرف بڑھا اور رُک گیا۔

وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی اور شاید اکرام کے لیے بھی۔

"کون ہو تم...؟" اکرام شیخ نے حواس برقرار رکھتے ہوئے کسی حقیقی پولیس افسر کی طرح سوال کیا۔

وہ شخص جو اندھیرے میں صرف ایک سایہ لگتا تھا، اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا اور اس کی بیرل کی غیر معمولی طوالت بتاتی تھی کہ ریوالور میں سائیلنسر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس نے اکرام کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ گھر پولیس کی تحویل میں ہے؟ پھر تم نے جرأت کیسے کی اس طرح اندر داخل ہونے کی؟" اکرام شیخ نے گرج کے کہا۔

اندھیرے سے دو اور سائے پیدا ہوئے اور پہلے شخص کے دائیں بائیں سے آگے بڑھے۔

"اپنے ہاتھ اوپر رکھنا سورما۔" پہلے والے شخص نے کہا۔ "ورنہ تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمھارے شریر نے کب تمھاری آتما کا ساتھ چھوڑا۔"

شریر؟ آتما؟؟ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ہندی کے ایسے الفاظ تو اردو میں اور بھی عام ہیں جیسے پریم اور شانتی... دھرتی اور آکاش یا دل اور سکھ جو عام لوگ بھی استعمال کر لیتے ہیں مگر جسم اور روح کی جگہ شریر اور آتما وہی استعمال کرے گا جو ہندی بولتا ہو۔

"ہم... دو ہیں۔" میں نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ "تم اتنی آسانی سے ہمیں نہیں پکڑ سکتے... ہم مرتے مرتے تمھیں بھی مار ڈالیں گے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے سائیلنسر میں دب جانے والی گولی کی آواز سنی اور ریوالور میرے ہاتھ سے ایسے اُڑ گیا جیسے ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر نشانے باز موجود ہیں۔ جن کے سامنے میں طفلِ مکتب ہوں... یہ حقیقت مجھے بادلِ ناخواستہ تسلیم کرنی پڑی کیونکہ اس شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اندھیرے میں اندازے سے گولی چلائی تھی اور کمال یہ کیا تھا کہ میرے ہاتھ پر خراش بھی نہیں آنے دی تھی۔ تاہم دونوں آگے بڑھنے والے گوریلے ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ اندھیرے میں سیاہ بھوت نظر آتے تھے۔ اپنے چھ فٹ سے زیادہ نکلتے ہوئے قد اور توانا جسموں کے باوجود وہ اس شخص کے حکم کے غلام تھے جو دبلا پتلا اور پستہ قامت تھا۔ حد درجہ پُرسکون اور متحمل مزاج اور ٹھنڈے دماغ والا۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ ہمیں یہاں سے لے جاؤ گے؟" اکرام شیخ نے کہا۔ "باہر پولیس کا پہرا ہے۔"

"اپنا ریوالور دے دو۔" پہلے شخص نے کہا۔ ابھی تک نہ وہ اکرام شیخ کے لہجے سے متاثر ہوا تھا اور نہ اس نے یہ ضروری سمجھا تھا کہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے۔

"دے دو یار... کچھ مانگنے والے کو انکار نہیں کرنا چاہیے..." میں نے اکرام سے کہا۔ "یہی ہماری شان ہے... جو دل مانگے اسے دل دے دو، جو جاں مانگے اُسے جاں... یہ تو صرف ریوالور مانگ رہے ہیں... ڈراما فیل ہو گیا اپنا۔"

"تم نے ٹھیک سمجھا۔" پہلا شخص بولا۔ "اپنے ساتھی کو بھی سمجھا دو کہ ہمارا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے... ان دونوں پولیس والوں کی لاشیں اندر پڑی ہیں جو باہر پہرا دے رہے تھے۔"

اکرام شیخ نے اپنا ریوالور ان کی طرف اچھال دیا... وہ ریوالور کسی کے ہاتھ میں بھی دے سکتا تھا یا نیچے ڈال سکتا تھا لیکن اس نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اس کی حرکت کسی بہترین ہاکی ٹیم کے بہترین فارورڈ کے پاس کی طرح تھی جس سے کوئی بہترین فارورڈ پورا فائدہ اُٹھا کے گول کر سکتا تھا۔

ایک گوریلا جو نسبتاً قریب تھا، یہ سمجھا کہ اکرام نے ریوالور کو حکم دینے والے پر کھینچ مارا ہے۔ وہ ایک دم اسے کیچ کرنے کے لیے بائیں جانب جھکا اور ایک سیکنڈ کے لیے اپنے ساتھی کے [illegible] آ گیا۔ میں نے اس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں دائیں ٹانگ کو مشینی انداز میں حرکت دی اور میری لِک اس کے [illegible] پسٹن کی طرح بھرپور قوت کے ساتھ لگی۔ [illegible] اپنے ساتھی پر گرا۔ ابھی اس کا جسم تھما بھی [illegible] کہ فلائنگ [illegible] کِک ماری اور اس کے دو [illegible] کھڑے ہوئے پہلے شخص پر گراتا چاہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کِک اُسے پڑ جاتی تو وہ دونوں ایک ہی وار سے شکار ہو جاتے لیکن یہاں مجھے میرے اندازوں اور میری توقعات کی خود فریبی نے شکست دی۔

میرا حریف عام آدمی نہیں تھا جو لڑتا تو ہے مگر لڑنا نہیں جانتا... وہ فنِ حرب سے پوری طرح واقف تھا اور میں یہ کہوں کہ میں سیر تھا تو وہ سوا سیر... تو یہ غلط نہ ہو گا۔ اس نے میرے وار کو ناکام بنانے کے لیے غوطہ مارا اور جب میں سطحِ زمین کے متوازی اُڑتا ہوا اس کے اوپر سے گزرا تو اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پلٹ دیا۔

میں منہ کے بل فرش پر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا کیونکہ اس نے آرم لاک لگا کے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ گردن اُٹھا کے میں نے اکرام کو دیکھا... وہ دوسرے گوریلے کی گرفت میں بے بسی سے مچل رہا تھا اور خود کو آزاد کرانے کی مضحکہ خیز کوشش کر رہا تھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

"ان دونوں کو اندر لے آؤ۔" پہلے والے شخص نے کہا اور کوئی آہٹ کیے بغیر پلٹ گیا۔ اس نے ایک بند کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر غائب ہو گیا۔

جو شخص مجھ پر سوار تھا اس نے مجھے ایک جھٹکے سے اٹھایا اور میرے دونوں ہاتھوں کو بغل کے نیچے سے اپنے ہاتھوں میں اس طرح جکڑ لیا کہ میں گردن تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ وہ میرے پیچھے مجھ سے چپکا ہوا تھا اور اس نے میرے لیے ٹانگوں کو پچھلی طرف دولتی کے انداز میں چلانا بھی ناممکن کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اناڑی نہیں ہوں۔ وہ خود ایک ماہر کھلاڑی تھا۔ چنانچہ اس نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے میرے لیے جارحیت کے امکانات کو صفر کر دیا تھا۔

کمرے کے اندر پہنچ کے مجھے ان دونوں سپاہیوں کی لاشیں نظر آئیں جو ابتدائی تفتیش مکمل نہ ہونے کے باعث جائے واردات کی نگرانی پر مامور تھے۔ ان پیشہ ور قاتلوں کے سامنے ان بے چاروں کی کیا اوقات تھی۔ وہ تو اپنی دقیانوسی رائفلوں کے ساتھ ایک ضابطے کی کارروائی پوری کر رہے تھے اور کسی بھی حملہ آور سے مقابلے کے لیے آئے ہی نہیں تھے۔

اسی کمرے میں صبح میں نے افتخار عارف کو زندگی کی بھرپور توانائی اور امیدوں کے ساتھ زندہ دیکھا تھا۔ اب شاید اس کی انصاف طلب لاش کسی مردہ نہلانے کی متعفن فضا میں فرشِ خاک پر پڑی تھی اور اسے کسی قسم کی ضابطے کی کارروائی سے کوئی سروکار نہ تھا... پوسٹ مارٹم... تفتیش کے مرحلے... سراغ رسانی۔ پکڑ دھکڑ... تجہیز و تکفین... تعزیتی پیغامات اور خراجِ تحسین پیش کرنے والے بیانات...... شہیدِ وطن کا خطاب دینے کی لفاظی۔

یہ سب ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے اور اس سے کسی کو ذرا بھی فرق نہیں پڑتا... نہ مرنے والوں کو... نہ مارنے والوں کو... نہ زندہ رہ جانے والوں کو جو کاروبار کو حسبِ سابق چلاتے ہیں۔

کمرے میں روشنی تھی... انھوں نے سڑک کی جانب کھلنے والی دونوں کھڑکیوں کے شیشوں پر کالا رنگ پھیر دیا تھا... یہ رنگ بھی نہیں تھا، تارکول تھا جس کی بو کمرے میں محسوس تھی۔

مجھے اور اکرام شیخ کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے ہمارے دونوں ہاتھوں کو ملا کے کلائیوں میں ایک ہتھکڑی ڈال دی۔ مقابلے میں ہماری تین چالوں کو انھوں نے ناکام کر دیا تھا۔ اکرام شیخ کی وردی اور پولیس کے لہجے میں رعب ڈالنے کی کوشش... ریوالور سے انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کی کوشش اور پھر... "مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" کے مقولے پر عمل کرنے کی کوشش... وہ کسی پریشانی یا دشواری کے بغیر ہم پر غالب رہے تھے۔ اب آخری کوشش ہم یہ کر سکتے تھے کہ گلا پھاڑ کے چلانے لگیں لیکن ایسے خطرناک دشمنوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ ہمارا گلا پھاڑ دیں کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری... ہماری باقی عمر... بے شرط زندگی... ایسے گزرے کہ کوئی ہمیں بانس سمجھے تو کوئی بانسری۔

"آج سے پہلے میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے متعدد شگفتہ لہجے میں کہا۔

"تم نے ابھی بہت کچھ نہیں دیکھا... لیکن بہت جلد دیکھو گے۔" دبلا پتلا... صورت سے ہی ہندو نظر آنے والا باس بولا۔

"تھینک یو..." میں نے کہا۔ "میں ایک تو تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں چاندنی رات میں... اس کے علاوہ قطب مینار کے اوپر سے اونٹ کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا لگتا ہے۔"

"بولتے رہو... اور کیا دیکھنا چاہتے ہو؟"

"اور... اور تمھاری چتا کے جلنے کا منظر۔" میں نے کہا۔ "ان دو آدم خوروں کی لڑائی... جیسے کتے اور سؤر کی لڑائی ہوتی ہے۔ یہ جانور تمھارے دیش کے کس حصے میں ملتے ہیں شری...؟"

"تم مجھے ڈبڈی کہہ سکتے ہو۔" وہ چالاکی سے اپنے غصے کو پی گیا۔ "تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"اسے جانتے ہو تم؟" میں نے کہا۔ "کمال ہے... پھر تو تمھیں میرے بارے میں بھی معلوم ہونا چاہیے... میں بتن میاں کے خلیرے بھائی کی سالی کا نندوئی ہوں... میرے پھپا سسر کے سمدھی ان کے ماموں کے سالے تھے۔"

اس کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن نمودار ہوئی۔ "تمھارا نام بتن میاں ہے۔" اس نے اکرام شیخ سے پوچھا۔ "وردی پر اکرام شیخ لکھے پھر رہے ہو!"

میں مایوس ہونے لگا تھا کہ میری فضول بکواس سے کوئی نقصان نہیں ہو رہا ہے... لیکن اچانک مجھے ایک معمولی سی کامیابی ہوئی۔ میں نے سخت شرمندہ ہو کے اکرام کی طرف دیکھا۔ "یار غلطی ہو گئی۔"

اکرام شیخ نے مجھے خونی نظروں سے گھورا۔ "اسی لیے میں تمھیں ساتھ نہیں لا رہا تھا کہ تم بھونکنے سے باز نہیں آؤ گے... اب کہتے ہو غلطی ہو گئی جب..."

"بتن میاں... نام تو ہم معلوم کر ہی لیتے... نام کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہے۔" دبلے پتلے شخص نے خشک لہجے میں کہا۔ "تمھارا کام خطرناک تھا جس کے لیے ہمیں اپنا کام چھوڑ کے آنا پڑا... تم اوش یہ سمجھ رہے ہو گے کہ میں تمھیں قتل کر دوں گا یا تم کو مار پیٹ کے تم سے کچھ پوچھوں گا... نہیں... یہ میرا کام نہیں ہے۔ مجھے تو خاص طور پر صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تمھیں اور اس سندری کو

دکھا دوں جو شاید تمھاری پتنی ہے..."

"نابکار..." میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ ہماری اہلیہ ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "کون؟"

"بتن میاں کی ہمشیرہ شبتو..." میں نے کہا۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ اس کا نام شبتو ہے۔" وہ بولا۔ "تم ابتا بھی کوئی اچھا سا نام بتا دیتے۔"

"تم نے بتایا تھا اپنا نام؟" میں نے کہا۔

"میرا نام رمیش چوپڑہ ہے۔" اس نے ایک سگریٹ جلائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اور میں نہ کسی کا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ تم اوش سمجھ رہے ہو گے کہ میرا سمبندھ بھارت کی سینا سے ہو گا یا کمانڈوز ہے... نہیں... میرا سمبندھ تو ان سے بھی نہیں ہے اور سب سے ہے... میں سب کے کام آتا ہوں اور اپنے کام کی منہ مانگی قیمت لیتا ہوں... میں انٹرنیشنل سٹیزن ہوں... ہر ملک کا پاسپورٹ رکھتا ہوں... نام چہرہ بدلتا رہتا ہوں... لیکن جب کسی کام کی ہامی بھر لیتا ہوں تو وہ ہو جاتا ہے۔ وہ کام ایسا ہوتا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا... یا کرتا ہے تو... بہت نقصان اٹھاتا ہے اور بڑی کٹھنائی مول لیتا ہے... تم اگر چاہو تو بیٹھ سکتے ہو۔"

میں نے اکرام کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اور ہم دیوار کے ساتھ سرکتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔

"میں نے بارہ بجے کا سمے دیا تھا۔" وہ بولتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ "بارہ بجے میں تم کو ان کے حوالے کر دوں گا جن سے میں نے ایک لاکھ روپے لیے تھے اور اعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں یہ کام ہو جائے گا۔ ان کو یقین تو نہیں تھا... مگر میرا پہلے کا ریکارڈ ایسا ہی ہے کہ وہ خاموش ہو گئے۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہی... بھارت سرکار کے نمک خوار..." وہ بولا۔ "بھارت ماتا کے سپوت... وہ مجھ سے چڑتے ہیں مگر میرے سامنے بول نہیں سکتے... جانتے ہیں نا کہ مجھے کس نے بھیجا ہے... مجھے بھارتی سینا کے ایک اعلیٰ افسر نے بلوایا تھا... ہند سرکار کو پھر میری ضرورت تھی۔"

"تم کیا ہو آخر مسٹر رمیش؟" میں نے کہا۔ "کوئی عظیم جاسوس، بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس جیسے..."

"میں کچھ بھی نہیں ہوں... بس کبھی کبھی ایسا ہی ٹھیکا لے لیتا ہوں۔" رمیش چوپڑہ نے کہا۔ "دو بار سرکار نے مجھے ڈاکو پکڑنے کے لیے بلایا۔ انھوں نے اتر پردیش اور مہاراشٹر کے علاقے میں سب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ پولیس فوج اور خفیہ پولیس سب جھک مار رہے تھے۔ دس لاکھ کا انعام تھا، ان کو زندہ یا مردہ پیش کرنے کا مگر سال بھر میں کوئی سامنے نہ آیا... اور انھوں نے سرکار کا ایک کروڑ روپیہ لوٹ لیا اور نہ جانے کتنے گاؤں جلا دیے۔ سیکڑوں قتل کر چکے تھے وہ لوگ... میں نے پچیس لاکھ مانگے۔ رقم میں ہمیشہ ایڈوانس وصول کرتا ہوں... ایک مہینے کی مہلت مانگی۔ اتر پردیش والا ڈاکو تو میرے ساتھ ہی پکڑا گیا اور ہم دونوں کو ایک ہی دن پھانسی بھی ہوئی۔"

"مجھے بھی دو بار پھانسی ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "پھانسی کا ڈراما سرکار نے رچایا تھا... ظاہر ہے کہ لاش صرف اس کی باہر آئی... میں باہر آیا تو دوسرے ڈاکو کی بلی ہو گئی... اس کے بھی پچیس لاکھ ملے تھے مگر وہ زندہ نہیں ملا... بہرحال میں نے اس کی لاش پیش کر دی تھی۔ پہلے میں چھوٹے ٹھیکے بھی لیتا تھا۔ کسی اپوزیشن لیڈر کو قتل کرنا، اپوزیشن کے جلسوں اور جلوسوں کا بندوبست کرنا اور پھر ان میں بم کا دھماکا کرنا... کسی کے خلاف اسکینڈل کھڑا کرنے کے لیے کسی مہیلا کو ساتھ ملانا اور پھر ان کی بلیو فلم سرکار کے حوالے کر دینا۔ اب یہ دھندے بہت سے لوگ کرنے لگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا آخری مشن ہے۔ اس کے بعد میں کہیں چلا جاؤں گا۔ اتنا پیسہ جمع ہو گیا ہے باہر کہ اب کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا... سوائے عیش کے۔"

"یہ سب باتیں تم ہمیں کیوں سنا رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی... وقت گزارنے کے لیے... تم نے تعارف کرانے کو کہا تھا نا۔"

"تعارف کے بعد لوگ رسماً کہتے ہیں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتا؟" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سراسر جھوٹ ہو گا۔" وہ بولا۔

"لوگ بھی عموماً جھوٹ ہی کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ہاں کے ادب آداب میں بھی منافقت کا رنگ آ گیا ہے۔ میں تمھاری صاف گوئی سے متاثر ہوا..."

"یہ بھی جھوٹ ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ خوشامد سے تمھیں خوش کر کے میں اپنے لیے کوئی رعایت حاصل نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں نقد سودے کی بات کرتا ہوں۔"

"کیا تم سودا کرنے کی پوزیشن میں ہو؟" وہ مسکرایا۔

"جو شخص... اس کے جذبات یا اس کا ایمان اور ضمیر برائے فروخت ہوں... اس سے کوئی بھی شخص سودا کرنے کی پوزیشن میں رہتا ہے، جس کے پاس معاوضہ ادا کرنے کی طاقت ہو۔" میں نے کہا۔ "یہ میرا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہے۔ تم اس سے اختلاف

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کر سکتے ہو... کہ تم بھی ایک طوائف ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ "واٹ اے فنی تھنگ تو سے... یس... طوائف کا لفظ تو عورت کی ذات اور پیشے سے منسوب ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "صرف اس لیے کہ وہ خود کو بیچتی ہے۔ کسی ضابطۂ اخلاق پر یقین نہیں رکھتی اور کسی کی وفادار نہیں ہوتی سوائے اس کے جو اسے خرید سکے... غور کرو کیا یہ تینوں صفات تمھاری ذات میں موجود نہیں ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اُسے یکلخت اپنی نظر میں وہ عزت، وقعت اور اہمیت حاصل نہیں رہی تھی جو اس کی طاقت تھی۔ جس پر اُسے غرور تھا

"گویا تم مجھے خریدنا چاہتے ہو؟" وہ بولا۔

ہاں... تم خریداروں کے درمیان فرق تو نہیں رکھتے نا۔ کالے گورے کا... ہندوستانی یا پاکستانی کا؟"

"ول یو پلیز شٹ اپ...!"

"تم کس قسم کے پروفیشنل ہو... صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ایک مقامی سطح پر طاقت حاصل کر لینے والے بدمعاش ہو... تم نے کارلوس کا نام ضرور سنا ہو گا... اس کی خدمات ہر حکومت حاصل کر سکتی ہے... کوئی بھی صنعت کار... اسمگلر یا ڈالر کنگ حاصل کر سکتا ہے... اپنے حریف کے خلاف... تم کو بھی اس کی سطح پر آ کے غیر جذباتی انداز میں کام کرنا چاہیے... قومیت... مذہب... ملک اور نسل... سیاسی نظریات اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے... بزنس از بزنس... دیٹ از آل۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے لاجواب ہو کے کہا۔

یہی کہ کسی نے تم کو میری گرفتاری پر مامور کیا۔ اس کی ایک قیمت ادا کی۔ تم نے کیوں اور کیسے کا کوئی سوال نہیں کیا... یہی کام میں تم سے لینا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

مطلب تو بہت صاف ہے اور تم جیسے ذہین آدمی کو سمجھ جانا چاہیے۔ میں تم کو پانچ لاکھ زیادہ آفر کرتا ہوں۔" میں نے کہا

"کس بات کے...؟"

"جس نے تمہیں یہاں بھیجا اور معاوضہ ادا کیا۔" میں نے کہا۔ "کہ مجھے [illegible] یا مردہ پیش کرو... میں تم سے کنٹریکٹ کرتا ہوں کہ اسے [illegible] سامنے زندہ یا مردہ پیش کرو... اور جتنا معاوضہ اس نے تم کو دیا ہے... میں اس سے پانچ لاکھ زیادہ دیتا ہوں۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"کیوں... اس میں کون سی پاگل پن کی بات ہے؟" میں مسکرایا۔ "پانچ کم ہیں تو دس لاکھ کر لو... مگر دیٹ از دی لمٹ۔"

"کہاں سے لاؤ گے تم اتنی رقم؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

"یہ سوچنا تمھارا کام نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تم کو نقد رقم ادا کروں گا۔"

"مگر یہ اب کیسے ہو سکتا ہے... کہ میں دونوں پارٹیز سے کنٹریکٹ کر لوں؟" وہ جھلا کے بولا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا... تم پہلا کنٹریکٹ کینسل کر دو۔ ظاہر ہے ہر معاہدہ کسی بھی وقت کینسل ہو سکتا ہے۔"

"مگر دونوں فریقوں کی رضامندی سے۔" وہ بولا۔

"دوسرا فریق تمھارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ سوری... سکندر بخت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس کا سراغ نہیں مل رہا ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کے بیٹھ گیا ہے یا بحرالکاہل کی تہ میں... اور تم ایمانداری سے ان کا دیا ہوا معاوضہ واپس کر سکتے ہو۔"

"ڈیم اِٹ... یہ ایمانداری کا نہیں... میری گڈ وِل کا معاملہ ہے۔" وہ چلا کے بولا۔ "تم چاہتے ہو کہ پہلے میں اپنی ناکامی اور نااہلی کا اعتراف کروں... صرف دس لاکھ کے منافع کی خاطر اپنی ساری گڈ وِل قربان کر دوں؟ آئندہ کیا ہو گا، یہ جانتے ہو... جو لوگ مجھے کنٹریکٹ دیتے ہوئے تذبذب کا شکار رہیں گے۔ آج تک وہ کہتے ہیں کہ میرے کنٹریکٹ میں ناکامی کا لفظ شامل نہیں ہوتا۔ یہ شک ہی نہیں ہوتی کہ میں ناکام رہا تو کیا ہو گا۔ ایک ناکامی جو میری پہلی ناکامی ہو گی کا اتنا چرچا ہو گا کہ میری مارکیٹ خراب ہو جائے گی... اس کے علاوہ... کیا تم انھیں بے وقوف سمجھتے ہو کہ وہ میرے کہے کو سچ مان لیں گے۔ انھیں بالآخر معلوم ہو جائے گا کہ تم نہ ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھے ہو نہ بحرالکاہل کی تہ میں... پھر وہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیا۔ شاید تم سے مل گیا۔ پھر کیا وہ مجھے معاف کریں گے؟"

اب میں لاجواب ہو گیا۔ "تم نے ہی ریٹائرمنٹ کی بات کی تھی... اس آخری کنٹریکٹ میں تم دس لاکھ زیادہ لے کر فائدے میں رہتے۔"

"بے وقوف... میں تمام عمر افسوس کرتا... کہ صرف دس لاکھ کے لیے میں نے اپنے کیریئر کو ناکامی پر ختم کیا۔ اسکواش، کرکٹ، باکسنگ، ہر اسپورٹس... چیمپئن اپنے عروج پر ریٹائر ہو جاتا ہے تو مرتے دم تک اس احساس سے مطمئن رہتا ہے کہ کسی نے اُسے شکست نہیں دی تھی۔ دوسرا وہ ہوتا ہے جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتا کہ دنیا کے میدان میں ہر شخص کسی بھی وقت اچانک نمودار ہو جانے والے نئے چیمپئن کے سامنے سرنگوں ہو سکتا ہے لافانی کوئی چیز نہیں ہے... نہ طاقت، نہ حسن، نہ ملکیت... نہ خود آدمی۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ میری بات سے مشتعل ہو گیا ہے اور چلانے لگا ہے حالانکہ وہ آسانی سے صرف ایک لفظ "نو" کہہ کے بھی بات ختم کر سکتا تھا۔ خاموش رہ کے بھی اور انکار میں گردن ہلا کے بھی۔

اس نے اپنی گھڑی دیکھی... پھر ایک جماہی لی۔ "وقت ختم ہو گیا ہے۔"

"ابھی دس منٹ باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ تلخی سے مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"ایک منٹ میں بھی بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "بروٹس نے سیزر کے خنجر گھونپ دیا۔ نور جہاں نے ایک کبوتر چھوڑ کے شہنشاہ ہند کو تسخیر کر لیا۔ ایٹم بم نے ایک شہر کے ایک [illegible] ایک [illegible] عظیم ختم کر دی۔"

"یہاں ایک منٹ میں تم بازی پلٹ دو گے؟" وہ طنزاً بولا۔

"میں نہ سہی... قدرت تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً اچانک زلزلہ آ جائے اور یہ چھت تم پر آ گرے۔ یا تمھارا ہارٹ فیل ہو جائے۔"

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ باہر ایک کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان کی اور خوشی کی مسکراہٹ دیکھی۔

"میں اپنا آخری معاہدہ پورا کرنے میں کامیاب رہا مسٹر سکندر بخت اور اب میں چلتے چلتے ایک بات کا اعتراف کر لوں۔ اس میں میرے لیے شرمندگی کی بات نہیں... تم یقیناً مجھ پر برتری رکھتے تھے۔ ہر اعتبار سے... اور میرا سب سے مشکل اور طاقتور شکار ثابت ہوئے۔ اس خیال میں میرے لیے ہمیشہ فخر کی بات ہو گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شکاری فخر سے کہتا ہے کہ اس نے جو آخری آدم خور شیر مارا، وہ سب سے خطرناک تھا۔"

ہارن باہر سے پھر سنائی دیا۔

"ان سے کہو کہ اندر آ جائیں۔" وہ گوریوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کے بولا۔ "تاکہ میری ذمے داری ختم ہو۔"

ایک گوریلا دروازے سے باہر گیا۔

"تمھاری آفر بہت اچھی تھی۔" وہ بولا۔ "مگر کاش تم مجھ سے پہلے ملے ہوتے... پھر سہی... اس پیشے میں بھی ایک موڑل کمٹمنٹ تو ہوتی ہے نا۔"

باہر جانے والے گوریلے کے ساتھ ایک شخص اندر آ گیا۔

"کیوں ہارن بجا رہے تھے باہر سے... اندر آتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

"ڈر کی بات نہیں... میں اکیلا تھا۔" اندر آنے والے نے برہمی سے کہا۔ "گاڑی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا... تمھیں کیا پریشانی تھی کہ باہر نہیں آ سکتے تھے؟"

مجھ سے بات طے ہوئی تھی کہ تم لوگ اندر آ کے انھیں خود اپنی تحویل میں لو گے۔" وہ بولا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں اکیلا تھا۔" نووارد بولا۔ "کسی اور کو کیسے ساتھ لاتا... دو یہ... دو محافظ جو چار کے برابر جگہ گھیرتے ہیں... میں اور تم..."

"میں تمھارے ساتھ نہیں جا رہا ہوں... میری کار الگ ہو گی۔"

"آئی ڈونٹ تھنک دی کرنل ول لائک دیٹ۔" نووارد نے ناگواری سے کہا۔ "میرا خیال ہے کرنل یہ پسند نہیں کرے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر اباؤٹ یور کرنل۔ مجھے تمھارے کرنل کی پروا نہیں" اور کیپٹن... اگر اس نے تمھیں بھیج دیا تو یقیناً اس کو تم پر اعتماد ہو گا... ورنہ وہ خود آ سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ خود آئے گا... ناؤ اِٹ از یور ہیڈ ایک" (اب یہ تمھارا درد سر ہے!)

کیپٹن نے اسے خون آشام نظروں سے دیکھا مگر وہ چھوٹا سا اور مختصر سا آدمی انتہائی اعتماد کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں اسلحہ بھی نہیں تھا اور اس کے مقابلے میں کیپٹن بہت زیادہ جسمانی طاقت کا مالک تھا، مگر وہ غالباً اس شخص کے پس منظر سے ذہنی طور پر خائف تھا کہ اس نے ریوالور ہاتھ میں ہونے کے باوجود اس کا راستہ نہیں روکا۔

"چلو... ان دونوں کو زیور پہناؤ۔" کیپٹن نے ایک ہتھکڑی نیچے پھینک دی۔ گوریلے نہ جانے کس نسل اور قوم کے تھے اور کیا زبان بولتے تھے مگر انھوں نے کیپٹن کی بات سمجھ لی۔ نوجوان کیپٹن سفید شلوار قمیص میں تھا اور اس کی مونچھیں تلوار مارکہ تھیں۔ راہ چلتے کسی نے اُسے غور سے بھی نہیں دیکھا ہو گا... یہ خیال کسی کو کیسے آ سکتا تھا کہ وہ انڈین آرمی کا کیپٹن... ایک دشمن اور تخریب کار ہے۔

اکرام شیخ اس تمام عرصے میں بالکل خاموش اور متفکر رہا تھا۔ اسے اپنی بہن کی فکر تھی... اب وہ کہاں جائے گی اور بھائی کو کہاں تلاش کرے گی، کب تک تلاش کرے گی؟ یہ تو کبھی نہ چھوڑنے والے لوگ تھے اور معلوم نہیں اسے کس گمنام سلطنت کے کس زیرزمین تہ خانے میں قید کرنے کے لیے لے جانا چاہتے تھے۔ شاعر نے تو شب ہجراں کے بارے میں کہا تھا کہ تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے۔ ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے... مگر یہ نازو کے تصور سے مخاطب ہو کے بھی کہا جا سکتا تھا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دونوں گوریلوں نے ہمیں یوں دلوچ لیا جیسے بلّی اپنے پنجوں میں چوہے کو دبوچتی ہے... بے شک میں دو منٹ میں ان کی گردن توڑنے پر قادر تھا لیکن بے سبب خودکشی کو میں نے کبھی جائز نہیں سمجھا تھا۔ لڑنا اگر جان بچانے کے لیے ہو تو جائز ہے۔ جان لینے کے لیے بھی لڑنا ایک مقصد رکھتا ہے مگر حرام موت مرنے کے لیے لڑنا پاگل پن ہے۔ میرے سامنے جو تلوار مار کہ مونچھوں والا کیپٹن کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں اب وہی سائیلنسر لگا ہوا ریوالور تھا جو وہ چھوٹا سا آدمی جاتے جاتے اسے تھما گیا تھا۔ اس سے قبل بھی کیپٹن کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس پر سائیلنسر بھی تھا۔ مگر اپنے ریوالور سے مارا جانا مزید افسوسناک ہوتا... اپنی جوتی اور اپنا ہی سر۔

ہتھکڑی میں ہم دونوں کو ایسے باندھا گیا کہ پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے میرا دایاں ہاتھ اور اکرام کا بایاں ہاتھ ایک ہو گیا۔ پھر انھوں نے مخالف سمتوں کے بازو کھینچا کیے یعنی میرا بایاں ہاتھ اور اکرام کا دایاں ہاتھ۔ یہ بھی خاصا مشکل پوز تھا۔ مگر وہ تھوڑی سی عقل سے کام لیتے تو ہم دونوں کی پشت ملا کے آسانی سے دونوں کے سیدھے اور اُلٹے ہاتھ جوڑ دیتے۔ کیپٹن نے دہاڑ کر اُن سے جلدی کرنے کو کہا اور انھوں نے نہ جانے کہاں سے دو کالے کپڑے کے رومال برآمد کیے۔ ایک رومال میری آنکھوں پر آ گیا تو دنیا میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے فرض کیا کہ یہی اکرام شیخ کے ساتھ ہوا ہو گا۔

میری توقع کے مطابق آخری کام یہ ہوا کہ میرے لبوں پر مہرِ خموشی ثبت کر دی گئی یعنی بہت سخت چپکنے والے ٹیپ لگا کے مجھے شٹ اپ کر دیا گیا۔ تاہم وہ میرے خیالوں کو شٹ اپ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے زبانِ خاموشی میں فیض کا شعر پڑھا۔
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے... ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے...! اور اپنے دل کو شاد کیا۔

یہ ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ بدترین حالات میں بھی جب ناامیدی کے سوا کچھ نہیں رہتا تھا، دل کسی گمنام امید کی کرن کو تلاش کرتا رہتا تھا اور پُرسکون رہتا تھا۔ اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایمان بالغیب... یقین محکم... اعتقادِ کامل حد سے بڑھی ہوئی رجائیت۔

"اب چلو..." کپتان نے غرا کے کہا۔ اُسے غرانے کا شوق تھا۔ "مُنہ کیا دیکھ رہے ہو میرا۔"

دونوں حکم کے غلام فوراً حرکت میں آ گئے... انھوں نے مجھے دھکیلنا اور گھسیٹنا شروع کیا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی... ہم دروازے سے گزرے... پھر کسی نے دروازہ بند کر دیا۔

"ان دونوں کو پیچھے ڈالو... احمق..." کیپٹن نے دانت پیس کے کہا۔ "ایک دائیں طرف بیٹھو... تم ادھر دوسرے دروازے سے اندر جاؤ... نہیں ہے جگہ تو بناؤ... سوّر کے بچے... کس نے کہا تھا اتنا پھیلنے کو... چلو وقت ضائع مت کرو... آگے آؤ۔"

ایک سوّر کا بچہ آگے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم دونوں کے ساتھ وہ دونوں بھی پیچھے کی ایک سیٹ پر بیٹھ سکتے... میں خود کو بہت مضحکہ خیز اور تکلیف دہ پوزیشن میں محسوس کر رہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ شانے پر سے مڑ کے درد کرنے لگا تھا اور میں تقریباً اکرام کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ ہم آدھے سیٹ پر تھے اور آدھے سیٹ سے نیچے اور اپنی ٹانگیں پھیلا کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر میرے ہاتھوں کی رسائی ہوتی تو میں دروازہ کھولنے والے ہینڈل کو گھماتا اور کسی بہت زیادہ ٹریفک والی سڑک پر دروازہ پورا کھول دیتا۔ اس بات کے خاصے امکانات تھے کہ کوئی دوسری گاڑی اچانک گھُس جاتی اور دروازے کو آگے یا پیچھے سے ٹکر مارتی اور دروازہ ٹوٹ کے سڑک پر گرتا۔ دوسری گاڑی والا اپنے نقصان پر روتا اور اس گاڑی کو ہرگز نہ جانے دیتا جس کے ڈرائیور کی مجرمانہ غلطی سے دروازہ کھلا اور حادثہ ہوا۔ شاید اتنی ٹریفک میں وہ فرار نہ ہو پاتا اور جب بہت سی گاڑیاں رُک جاتیں اور بہت سے لوگ آ جاتے، تو وہ دیکھتے کہ پیچھے والی سیٹ پر تو عجیب فلمی صورتِ حال ہے۔

مگر یہ سب میں نے صرف تصوّر میں دیکھا... ایک منٹ سے بھی کم وقت میں... عملاً میں ہاتھ ہلا بھی نہ سکا... میں نے دل کو تسلی دی کہ میرا پلان ویسے بھی کامیاب نہ ہوتا... عام طور پر ایسی گاڑیوں کے اندر سے ہینڈل نکال لیے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک گوریلا تو ہمارے ساتھ ہی تشریف فرما تھا اور دوسرا اگلی سیٹ پر کوئی سا دور تھا۔

"او مائی گاڈ!" کیپٹن نے اچانک چلا کے کہا۔ معلوم نہیں کس بات پر... پھر دروازہ بند ہوا اور کار کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ انجن کی آواز پر میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شیورلیٹ امپالا یا ڈاج ڈارٹ گاڑی تھی۔ دونوں پُرآسائش، طاقتور اور قیمتی امریکن گاڑیاں تھیں۔ دونوں طبقۂ امرا یا ڈپلومیٹ قسم کے لوگ رکھتے تھے۔ ہمیں لے جانے والے دوسری کیٹگری کے لوگ تھے جو ایک ڈپلومیسی کے مشن پر تھے۔

گاڑی چلی تو ایسی آواز آئی جیسے کچی سڑک پر بیل گاڑی چلے... گڑگڑاہٹ کے چند لڑکھڑاتے قدم چلنے کے بعد گاڑی رُک گئی۔ کیپٹن نے ایک بار پھر غرا کے "او مائی گاڈ" کہا اور نیچے اتر گیا۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ پر ایک خاموش قہقہہ مارا۔ کم از کم ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا، مگر گاڑی کسی طرف بھی جھکی ہوئی نہ تھی چنانچہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سا ٹائر فلیٹ ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی فرض کیا جا سکتا تھا کہ دونوں اگلے یا دونوں پچھلے ٹائروں کی ہوا نکل گئی ہے۔ پھر اسے اتفاقیہ پنکچر ہونا نہیں سمجھا جا سکتا تھا... میرا دل ایک دم پُرامید ہو گیا... شاید ایسا ہی ہو... شاید کسی نے عمداً ہوا نکالی ہو... ایک ٹائر تو بدلا جا سکتا ہے... دو نہیں بدلے جا سکتے... مگر ایسا کون کر سکتا ہے؟

میں نے کیپٹن کی آواز سُنی... اس نے دروازہ کھولا اور اندر آ بیٹھا۔ "تم دونوں... جانور..." اُس نے حکم کے غلاموں کو بڑی روانی سے گالیاں دیں۔ میرا دل اس خوشخبری سے باغ باغ ہو گیا کہ دو نہیں کسی نے چاروں ٹائروں کی ہوا نکال دی تھی یہی وجہ تھی کہ خود کیپٹن نے کار کو لیول میں محسوس کیا... اسے اندھیرے میں کار کسی طرف سے بھی جھکی ہوئی نہیں لگی۔ کار اپنی جگہ پر ہی موجود تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کھڑی ہوئی نہیں تھی بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ سب اس باسٹرڈ کی وجہ سے ہوا... اینڈ ویٹ ڈیم فول آف اے کرنل..." اس نے سخت اشتعال اور پریشانی میں کہا۔ "وہ خود آتا تو یہ نہ ہوتا... لیکن اس کو تو زیادہ خیال تھا اپنی اس ماں کا..." وہ شاید کرنل کی کسی آشنا کا حوالہ دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کی خود کلامی میں خوف بھی شامل ہو رہا تھا۔

"یہ... بچوں کی شرارت نہیں ہو سکتی... یہ سازش ہے..." وہ بولا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو... میں تم دونوں کو شوٹ کر دوں گا... اور کار کو آگ لگا دوں گا... ایک اور فائر سے... یہی کرنا چاہیے مجھے... پٹرول ٹینک... یس... چلو تم دونوں نکلو... تمھاری... دفع ہو جاؤ... مگر نہیں... ٹھہرو... میں بات کرتا ہوں پہلے... اس کرنل کی تو..." وہ اب دنیا بھر کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا۔ "میں اکیلا کیا کروں...؟" اس نے شاید کار میں کوئی وائرلیس ٹرانسمیٹر آن کیا اور مائیکرو فون پر بولنے لگا۔ "ہیلو... تھری ٹو تھری... ہیلو... نائن ون نائن ہیر... ڈو یو ریڈ می!" وہ چلانے لگا۔ پھر گالیوں پر آ گیا... کیونکہ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

اب وہ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ آس پاس دوسرے سرکاری کوارٹروں میں رہنے والے جو کولھو کے بیل کی طرح زندگی کو محدود معمولات کے دائرے میں گزارنے کے عادی ہو چکے تھے، صبح پھر نوکری پر جانے کی تیاری کر کے سو چکے تھے۔ اس کا اندازہ میں نے اس سکوت سے لگایا جس میں کبھی کبھار کسی بچّے کے رونے کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کیپٹن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کوارٹر کونے کا آخری کوارٹر تھا اور اس کی چوڑائی کے رُخ کھڑی ہوئی کار کسی حد تک چھپی ہوئی تھی۔

"اے... تم ادھر آؤ..." اس نے غالباً کسی گوریلے کو حکم دیا۔ "ایک ٹائر بدلو... پھر دوسرے کو پٹرول پمپ تک لے جاؤ... ادھر جہانگیر روڈ پر تین ہٹی سے پہلے پٹرول پمپ ہے... اس میں ہوا بھروا کے لاؤ... اُسے لگاؤ اور دوسرے کو لے جاؤ۔ پنکچر کسی میں نہیں ہو گا... یہ کسی نے جان بوجھ کر ہوا نکالی ہے... اچھا رُکو۔"

وہ ایک اچھے فوجی افسر کی صفات سے محروم تھا اور غالباً سفارش پر یا جذباتی طبیعت رکھنے کے باعث یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ ذرا سی آزمائش میں ختم ہو گئی تھی۔ وہ کنفیوژن میں مبتلا تھا اور ڈرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے کسی نادیدہ دشمن کو ہر طرف تلاش کر رہا ہو گا اور خود کو ایک نظر نہ آنے والے پُرخطر حصار میں گھرا ہوا بے بس ہو گا۔

وہ تین ٹائروں میں ہوا بھروا کے کام چلا سکتا تھا اور یہ تین چکر اس حکم کے غلام کے لیے آدھے گھنٹے کی بیگار تھے مگر کیپٹن صرف ایک محافظ کے ساتھ رہ جانے کے خیال سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ خیال بھی آیا ہو گا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے فون کر کے امداد حاصل کرے مگر اتنی رات گئے کسی کال آفس کا کھلا ملنا مشکل تھا۔ پھر یہ رازداری کا معاملہ بھی تھا، ورنہ وہ کسی گھر کا فون استعمال کر لیتا۔ اس نے ٹیکسی میں جانے کا بھی سوچا ہو گا۔ مگر کوئی ٹیکسی والا اس حالت میں دو قیدی لے جانے پر راضی نہ ہوتا... وہ سمجھتا کہ اغوا کی اس واردات میں اس کی ٹیکسی کا نمبر نوٹ آ جائے۔ وہ ہمیں ان دو گوریلوں کی تحویل میں دے کر اکیلا ٹیکسی لے کر جاتا اور اپنے عیاش کرنل سے دوسری گاڑی لے کر آتا تو اتنی دیر میں نہ جانے کیا ہو جاتا... دونوں حکم کے غلام عقل سے بھی پیدل تھے اور غالباً بول نہیں سکتے تھے۔ وہ گونگے تھے یا ان کی زبانیں کاٹ دی گئی تھیں۔

آخر میں اس نے یہی کیا۔ اس نے محافظوں میں سے ایک کو دُور لے جا کر کچھ ہدایات دیں اور محافظ تو لوٹ آیا مگر کیپٹن کی آواز سنائی نہ دی تو پانچ منٹ بعد مجھے اس کی عدم موجودگی کا یقین آنے لگا۔ وہ ایسا شخص ہی نہ تھا، جو پانچ منٹ چپ رہ سکے۔

وہ ایک سوال جو میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا اکرام کے ذہن میں بھی ہو گا کہ یہ خفیہ کارروائی کس نے کی؟ یقیناً

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کوئی وہیں موجود تھا جو سب پڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی کام دکھا دیا۔ مگر وہ تھا کون جو ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا؟ وہ ہمارا دشمن نہیں ہو سکتا تھا جس نے ہمارے دشمن کا کام خراب کیا۔ اس کا یقیناً کوئی نیک مقصد تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ انتظار کیوں کر رہا تھا؟

اسی وقت ایک معمولی سا دھماکا ہوا... کسی نے کار کے پچھلے حصّے میں شیشے پر چھوٹا سا پتھر پھینکا تھا۔ پتھر بہت بڑا ہوتا تو ونڈ اسکرین بکھر جاتا اور کنکر ہوتا تو آواز اتنی بڑی نہ ہوتی۔ محافظوں میں سے ایک فوراً باہر نکلا۔ دوسرے نے ریوالور کی نال میرے سر پر لگا دی... یہ بڑا خطرناک لمحہ تھا۔ خوف اور اعصابی کشیدگی کی اس کیفیت میں گولی بلا ارادہ بھی چل سکتی تھی۔

میں نے سانس روک کے خدا کے حضور ایک دعا ارسال کی جس میں کہا گیا تھا کہ فنا و بقا پر اختیار رکھنے والے معبود... تیری رضا پر مرنا تو سب کا مقدّر ہے اور ایمان ہے۔ مگر اس موت کو حادثاتی نہ بنا... ہمیں موقع دے کہ ہم جان دیں تو کسی مقصد کی خاطر... مارے جائیں تو لڑتے ہوئے... یوں بے بسی کی حالت میں نہیں۔

پہلا گوریلا لوٹ کر نہیں آیا... میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ میں کسی اسٹیتھسکوپ کے بغیر شمار کرنے لگا۔ ایک... دو تین... چار... مگر یہ گنتی سو تک پہنچنے سے پہلے ہی گڑبڑ ہو گئی... عام حالت میں دل فی منٹ بہتّر بار دھڑکتا ہے تو اس وقت شاید دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا، لیکن گھڑی پر نظر رکھے بغیر وقت کا حساب رکھنا ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ ہر سیکنڈ ایک منٹ کے برابر اور ہر منٹ ایک گھنٹے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہو چکا تھا۔

بالآخر کسی نے ڈکی کھولی اور دو نمبر گوریلے نے بے اختیار سر گھما کے دیکھا۔ اس کے ریوالور کی نال میری پیشانی پر نہیں رہی تو مجھے کچھ سکون نصیب ہوا۔ میرے اضطراب اور بے چینی میں بہرحال اضافہ ہو گیا، کیونکہ نہ میں دیکھ سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے اور نہ پوچھ سکتا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟

میں اور اکرام ایک دوسرے سے بڑے غلط انداز میں منسلک تھے اور وہ زنجیر شاید ٹارزن بھی نہیں توڑ سکتا تھا جس نے ہمیں باندھ رکھا تھا۔ ویسے میں اندھا دھند کارروائی کرتا تو گوریلے کو سر سے ٹکر مارتا یا دونوں پیر اٹھا کے اس کے سر، منہ یا سینے پر مارتا۔ مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ اس میں جینے مرنے کے امکانات ففٹی ففٹی تھے۔

ڈکی کھولی ضرور گئی تھی لیکن ابھی تک بند نہیں کی گئی تھی۔

میں آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ اور کوئی آواز ہو... اپنی پہچان دے۔ سب سے بڑا مسئلہ وقت کا تھا جو ... اعصاب کو شکست دینے پر تُلا ہوا تھا۔

بالآخر دوسرے گوریلے کو خدا نے حماقت کی راہ دکھائی... عاقبت نااندیشی کی توفیق عطا کی... وہ آزمائش میں ... مدد... والوں کے لیے فوج نہیں بھیجتا۔ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ باطل کے پرستاروں کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اور ان کی آنکھوں پر گمراہی اور ناآگہی کا پردہ پڑ جاتا ہے۔

دوسرے گوریلے نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم پھر سے ... سکتے کار سے باہر قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ... آواز آئی جیسے مکان کی دوسری منزل سے بھینس نیچے گری ہو۔ ایک ہاتھ نے میرے منہ سے ٹیپ کھینچ دیا اور اس عمل میں وہ ہاتھ میرے لبوں پر اپنا لمس چھوڑ گیا۔ اس لمس میں نزاکت اور نرمی تھی۔

"نازو..." میں نے کہا مگر میرے حلق سے جو آواز نکلی وہ اتنی عجیب تھی کہ میں خود حیران ہوا۔ حیران میں اس بات پر بھی ہوا کہ یہ لفظ میری زبان سے نکلنے سے پہلے دل میرے سینے سے کیوں نہیں نکل گیا۔ حیرانی مجھے اپنی عقل پر بھی ہوئی کہ یہ نام میری زبان پر آنے سے پہلے میرے دماغ میں کیوں نہیں آیا۔

غالباً مجھ سے پہلے ہی اکرام شیخ نے بھی تڑپ کر نازو کا نام لیا تھا... بھائی نے بہن کے ہاتھوں کی خوشبو کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت اُٹھنا چاہا۔

"آہستہ... آہستہ... آرام سے..." نازو نے سرگوشی میں کہا۔ "شور مت مچاؤ..."

"نازو... یہ تو ہے... یا میرے کان دھوکا دے رہے ہیں مجھے؟" اکرام شیخ رونے کے قریب ہو گیا۔

نازو کے ہاتھ نے میری پٹی کھینچ کر سر کے اوپر سے گزار دی اور میں نے اس سراپا ناز کو چند انچ کے فاصلے سے دیکھا جب وہ اکرام شیخ کی آنکھوں پر سے پٹی اتار رہی تھی۔

"اب تم کہو گے کہ آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں۔" وہ بولی۔

"تو... تو یہاں کیسے... اور تو... ٹھیک ہے نا؟" اکرام شیخ بولا۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ وہ بس کنڈکٹر یا ٹیکسی ڈرائیور کی یونیفارم میں تھی۔ سر پر آگے تک سایہ کرنے والی کیپ، میلی خاکی پشرٹ جس میں چار جیبوں کے علاوہ درجن بھر فالتو بٹن تھے۔ خاکی پتلون... یہ سب کپڑے اس کو بہت ڈھیلے تھے، لیکن اسی وجہ سے وہ اپنی نسوانیت کو چھپانے میں کامیاب تھی۔

"میں سب بعد میں بتاؤں گی..." وہ بولی۔ "تم دونوں باہر نکلو پہلے، میں ٹیکسی لے کر آتی ہوں تمھاری۔"

ہم دونوں ایک منٹ بعد اس گاڑی سے باہر آ چکے تھے اور قریب کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے۔

"یار... یہ تیری بہن آخر چیز کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "عورت ہے کہ چھلاوہ؟"

"پتا نہیں یار..." اکرام شیخ بولا۔ "اس معاملے میں خود میری رائے مشکوک ہوگی... میں دنیا کا واحد بھائی ہوں جو اپنی بہن کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ انسان ہے یا جن بھوت۔"

"مجھے شک ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"نہیں یار... دیکھ نا یہاں اور کون ہے؟" میں نے کہا۔

نازو اسی وقت ٹیکسی لے کر نمودار ہوئی۔ ہم درخت کی اوٹ سے نکلے اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر گر گئے۔ نازو ہنسی۔

"ابھی یہ بندی آپ دونوں کو جدا کرنے سے قاصر ہے۔" وہ بولی۔

"ارے بابا، نارد ایک کرائے کا ہاتھ۔" اکرام نے کہا۔

"وہ میں مار چکی... دو بھینسے جیسی موٹی گردنیں ابھی ابھی توڑی ہیں۔" وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے بولی۔

"اور تمھاری کلائی نہیں ٹوٹی۔" میں نے کہا۔ "غضب خدا کا!"

"تم کلائی کی بات کرتے ہو۔" وہ ٹیکسی کو جہانگیر روڈ پر لے آئی۔ "میرا وار غلط پڑ جاتا تو وہ مجھے توڑ دیتے ... کر دیتے۔ مگر فکر مت کرو... میں چابی لے آئی ہوں... ان کے پاس تھی۔"

"لیکن میں نے انھیں دیکھا نہیں۔"

"ایک ڈکی میں پڑا ہے۔" وہ بولی۔ "دوسرے کو گاڑی کے نیچے کھسکا دیا تھا... یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟ چلو پہلے تمھیں آزاد کر دوں۔"

"کہاں جانا ہے؟" اکرام شیخ نے میری طرف دیکھا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔ "جہاں سب کو جانا ہے۔"

"کیا مجھے بھی جانا ہے؟" نازو نے ٹیکسی روکی اور ہم دونوں کی ہتھکڑی کھول دی۔

"یار اس حالت میں ہم وہاں نہیں جا سکتے۔ اپنے ڈیرے پر..." اکرام شیخ بولا۔ نازو نے پھر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

"تو پھر میٹرو پول چلو۔" میں نے کہا اور اپنی کلائی کو ملنے لگا۔ "فضول باتوں کے لیے یہی وقت ہے یار۔"

"یہ فضول بات نہیں ہے۔" میں نے اُسے چیلنج کیا۔ "ہم بستہ بھی اُدھر ہی گئے تھے۔" ہتھکڑی میں نے سیٹ کے نیچے ڈال دی۔

اکرام شیخ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "اچھا... تیرے اس ٹھکانے پر..."

"ہاں..." میں نے کہا۔ "جہاں میری کار کھڑی ہے۔"

"وہاں وہ فقیر بادشاہ ملیں گے۔" اکرام شیخ بولا۔

"کوئی بات نہیں... ان کا گھڑا محفوظ ہے... ہم نے اس میں سے صرف بریانی ہی تو کھائی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" نازو نے کہا۔ "کار... فقیر... گھڑا... بریانی..."

"تم نے راستہ پوچھا تھا عزیزہ..." میں نے کہا۔ "کیا تم کراچی کے راستوں سے واقف ہو؟"

"کافی حد تک..."

"تو پھر کوئنز روڈ چلو۔" میں نے کہا۔ "سیدھا راستہ ہے۔"

"نازو... تو کہاں رہی؟"

"چھوڑو بھیا۔" وہ ہنسی۔ "میں جہاں بھی رہی خیریت سے رہی۔"

"میں بہت پریشان رہا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے بھا۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"اور کیا میرا قصور ہے؟" اکرام شیخ گرم ہو گیا۔ "قسمت اچھی تھی کہ تھانے سے نکل آئی۔"

"میری قسمت تو بس ایسی ہی ہے۔" وہ بولی۔ "جیسی تھی... خراب قسمت ان کی تھی جو اب اسپتال میں لیٹے ہوئے ہیں اور کسی کو منہ دکھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔"

"تم یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کیا کوئی الہام ہوا تھا؟"

وہ ہنسی۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ رابعہ کیسی ہے؟"

"رابعہ بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔ "میرا مطلب تھا کہ خیریت سے ہے نا... محسن، شہلا، غالب سب کہاں ہیں؟"

"اسی دنیا میں ہیں ابھی۔" میں نے کہا۔ "بس میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کیوں کا جواب بہت لمبا ہے۔" میں نے کہا۔ "فرصت ملے گی تو دوں گا... تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا۔"

"بات یہ ہے مجاہدینِ اسلام۔" نازو نے کہا۔ "کہ خدا نے مجھے تھوڑی بہت کار آمد عقل دی ہے... میں حساب لگا کے آئی تھی۔"

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

"کون سا حساب... ستاروں کا یا قسمت کی لکیروں کا؟"

"نہیں... حالات اور واقعات کا حساب..." وہ بولی۔ "بھیا کو تو جیکب لائن والے گھر سے رخصت کر دیا گیا تھا... مجھے اس بدمعاش کانسٹیبل سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔"

"چل چھوڑ... سارے زمانے سے حساب برابر نہیں کرتے۔" اکرام شیخ نے خفگی سے کہا۔ وہ ابھی تک اپنی کلائی رگڑ رہا تھا۔

"کیسے چھوڑ دوں... میں نے تو انھیں وارننگ بھجوا دی ہے۔ ان دونوں ٹھگوں کو۔" نازو نے ہنس کے کہا۔

"کیسی وارننگ؟"

"یہی کہ آئندہ را احتیاط..." وہ بولی۔ "لوگوں کو بے وقوف بنا کے جتنا لوٹا وہ معاف... مگر یہ آخری واردات تھی۔"

"ہوں... تیرا کیا خیال ہے کہ وہ باز آ جائیں گے؟" اکرام نے کہا۔

"نہیں... مجھے معلوم ہے کہ وہ یہ دھندا جاری رکھیں گے۔" نازو بولی۔ "ایک بدمعاش ایڈوانس وصول کر کے مکان کرائے پر اٹھائے گا... پھر مالک مکان کانسٹیبل پہنچ جائے گا کہ مکان تو میرا ہے... ٹریس پاس کرنے کے جرم میں بند کرانے کی دھمکی دے گا اور سامان باہر رکھ دے گا... انھوں نے میری وارننگ کو ہنس کے ٹال دیا ہوگا۔"

"اور تو کیا کرے گی؟"

"میں نے وارننگ میں کہا تھا کہ پھر ایسا ہوا تو ان کا علاج معالجے پر اتنا ہی خرچ ہو جائے گا، جتنا وہ ایڈوانس لیں گے۔" نازو نے کہا۔ "جو تکلیف اٹھائیں گے وہ بونس ہیں... اس سے اگلی بار یہ حرکت کی تو انھیں باقی عمر ایک بیساکھی کے سہارے پر چلنا پڑے گا... تیسری بار بھی باز نہ آنے کی صورت میں دو بیساکھیوں پر پھریں گے۔ انھوں نے سمجھا ہوگا کہ کسی پاگل نے مذاق نہیں کیا تو کسی دل جلے نے دھمکی دے کر اپنے دل کو خوش کیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں..."

"ضرورت ہے بھیا۔ خرابی جہاں نظر آئے اسے ٹھیک نہ کرنے سے خرابی بڑھتی ہے۔" وہ بولی۔ "اور پھر یہ کام تو فرصت کا شغل ہے..."

"شغل کی بچی... اب میں تجھے گھر میں بند کر کے بٹھاؤں گا۔"

نازو ہنسی... "برقع بھی پہنا دو گے شٹل کاک ٹائپ... لو میرا دولہا آ گیا اب بتاؤ کدھر؟"

"سیدھے ہاتھ... پل کراس کر کے بائیں جانب ہٹس بنی ہوئی ہیں... جیسے ڈرم کو آدھا کر کے لمبائی کے رُخ رکھ دیا گیا ہو۔"

"میں نے دیکھی ہیں۔" وہ بولی۔

میری ہدایات کے مطابق اس نے ٹیکسی کو روکا۔ بیرک میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اکرام شیخ نے لٹکتے تاروں والا سوئچ بورڈ تلاش کیا اور لکڑی کے ایک بوسیدہ گرد آلود تختے پر کھڑے ہو کر اس نے بجلی کا جھٹکا کھائے بغیر ایک بلب کو جلانے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس پوری لق و دق بیرک کے لیے دو سو واٹ کا تنہا بلب ایسے ہی تھا جیسے وحشت کے لیے ایک ادھورا اجالا۔ اس کے اجالے میں ہم فقط ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور ٹکرائے بغیر گھوم پھر سکتے تھے۔

میں نے گیراج کے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تو کار اپنی جگہ کھڑی تھی۔ وہ دولت مند فقیر کہیں نہ تھا جس کے دنیاوی اسباب اور مال و متاع کو ہم شریف لٹیرے لے گئے تھے۔

میں واپس بیرک میں گیا تو دونوں بھائی بہن تقریباً ایک سے لباس میں اطمینان سے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھے کہ فرش پر دھول کی کتنی موٹی تہ ہے... مجھے ان دونوں میں خاصی مشابہت کا احساس ہوا... جو پہلے اتنی شدت سے نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نازو ہمیشہ طرحدار قسم کے فیشن ایبل لباس میں 'رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام' کی عملی تصویر بنی پھرتی تھی اور اکرام شیخ اس کے برعکس پولیس کی وردی میں رہتا تھا جس سے بے رحمی اور سفاکی کا تصور منسوب ہو گیا ہے۔ اس وقت ان کے درمیان احساس کا تضاد مشابہت کے احساس کو دبا دیتا تھا۔

"میں تیسری بار اپنے سوال کا جواب مانگتا ہوں۔" میں نے بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھتے ہوئے کہا۔

نازو نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے وہیں بٹھا دیا جہاں میں کھڑا تھا۔ اکرام شیخ ہنسنے لگا۔

"شروع کر دی خواہ مخواہ کی زور آزمائی۔" میں نے خفت سے ہاتھ جھاڑ کے کہا۔ "میں لڑکیوں سے نہیں لڑتا۔"

"شادی کے بعد بیوی سے تو لڑو گے؟" وہ ہنسی۔

"لڑکی اور بیوی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا بیسن اور پکوڑے میں یا چاول اور بریانی میں۔" میں نے کہا۔ "اب بتاؤ۔"

"میں شام سے وہاں ڈیرا ڈالے بیٹھی تھی۔" نازو نے اچانک اپنی بات شروع کر دی۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم وہاں ضرور آؤ گے۔"

"یہ کیسے فرض کر لیا تھا تو نے؟" اکرام شیخ بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک رپورٹر میرے بارے میں اتنی مفصل رپورٹ چھاپ دے اور تم اس سے نہ ملو... مگر جب میں وہاں گئی تو اس کا دروازہ مقفل تھا۔ دوسری بار شام کو پہنچی تو... صورتِ حال بہت بدل چکی تھی۔ وہ بے چارہ قتل ہو چکا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ اس کی رپورٹ پر کچھ لوگ برہم ہوئے۔ غالباً وہ اور بھی بہت کچھ جان چکا تھا یا اسے قتل کرنے والوں کو اندیشہ تھا کہ جان لے گا... وہ جیمز بانڈ بننے کے چکر میں مارا گیا... میں تو خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ ہمارے لیے بہت کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔"

"کیا تم نے ہمیں آتے نہیں دیکھا تھا؟" میں نے کہا۔

"دیکھا تھا۔" وہ ہنسی۔ "تم لوگ آئے اور پولیس کا مجمع دیکھ کر بھاگ گئے... میں ذرا دور تھی۔ لیکن میں نے اپنے سکندر صاحب کو دیکھ لیا تھا۔" اس نے میرا نام دلاور کے لہجے میں لیا۔

"کہاں سے دیکھ لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "میں نے کیوں نہیں دیکھا؟"

"تم دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔" وہ بولی۔ "میں ایک خالی کوارٹر کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے برآمدے کی جالیوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ پچھلی طرف سے دروازہ کھول کے نکل آؤں مگر پھر میں نے کہا کہ اب تو شک کی بات ہی نہیں رہی۔ تم لوگ یقیناً پھر آؤ گے۔ خصوصاً ہمارے بھیا کے اندر جو پولیس مین ابھی تک آن ڈیوٹی ہے وہ ضرور انھیں کھینچ لائے گا... چور کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔" میں نے کہا۔

وہ پھر ہنسی۔ "تو پولیس مین کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وردی اور پیٹی سے جائے مگر تفتیش سے نہ جائے... اپنے بھائی کی عادت اور فطرت کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے... میں وہیں جمی رہی... پولیس کے جانے کے بعد بھی... پھر مغرب کے بعد وہ لوگ آئے... اور ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے دونوں پولیس والوں کے مارے جانے کا سارا ڈراما میں نے دیکھا۔ اس وقت مجھے بہت افسوس ہوا کہ میرے پاس مووی کیمرا نہیں تھا، ورنہ میں پوری فلم بنا لیتی اور ان کے فرشتوں کو علم نہ ہوتا... خیر جب وہ اندر چلے گئے اور باہر نکلے ہی نہیں تو میں نے صورتِ حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا... اور دیوار کے اوپر سے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گئی... وہ لوگ اندر کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ سوائے انتظار کے اور ظاہر ہے کہ وہ تمھارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

"پھر بھی تم نے ہمیں باہر نہیں روکا؟" میں نے کہا۔

"میں ضرور روک لیتی... بس ایک منٹ کا فرق پڑ گیا۔" وہ بولی۔ "میں نے واپس اسی کوارٹر میں جا کے پوزیشن سنبھالی۔ میرا خیال تھا کہ جیسے ہی تم آئے میں جالی کے پیچھے سے تم کو آواز دے کر بلا لوں گی اور پھر ہم تینوں مل کے کچھ کریں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ میں گھوم کر پیچھے کی طرف سے کوارٹر میں گئی اور اتنی دیر میں تم دونوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ جب میں نے دیکھا تو تم اندر جا رہے تھے اور تمھیں متوجہ کرنے کا وقت نکل چکا تھا۔ ظاہر ہے، پھر میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے باہر آ کے بھیا کی ٹیکسی دیکھی اور اس کی چابی نکالی۔"

"چابی کیا اسی میں لگی چھوڑ دی تھی تم نے؟" میں نے اکرام شیخ سے کہا۔

"نہیں... یہ دوسری چابی کی بات کر رہی ہے۔" اکرام شیخ بولا۔ "میں ڈپلی کیٹ چابی گھر پر نہیں رکھتا۔ گاڑی کے نیچے چیسس پر پلاسٹک کی تھیلی میں لپیٹ کر تار سے باندھ رکھی ہے کہ کبھی ضرورت پڑے تو گھر نہ جانا پڑے۔"

"مجھے تو معلوم تھا نا کہ چابی کہاں ہوگی۔" نازو نے دیوار کا سہارا لے کر پیر پھیلا دیے۔ "اس چابی سے میں نے ڈکی کھول کے دیکھا تو اس میں دو سوٹ کیس تھے۔ حیرت مجھے اس گھڑے پر ہوئی جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے... یہ کوئی نیا فیشن ہے؟"

میں نے اسے فقیر صاحب کے بارے میں بتایا۔ "معلوم نہیں اس پر کیا گزری... کہیں ہارٹ فیل نہ ہو گیا ہو بے چارے کا۔"

"یار ہارٹ فیل ہوتا ہے کنگلوں کا... جن کو امید نہیں ہوتی کہ پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا۔" اکرام شیخ بولا۔ "اس نے تو تہیہ کر لیا ہوگا کہ ڈبل شفقت میں سخی لوگوں کو لوٹے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تھانے گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور وہاں پولیس نے اُسے بند کر دیا ہوگا کہ سالے فقیر بنا پھرتا ہے اور بات کرتا ہے ایک گھڑا نوٹوں کی... بتا باقی خزانہ کہاں دبا رکھا ہے۔ پولیس کو تو خدا موقع دے کمائی کا... وہ مار مار کے چٹا کر دیں گے۔"

"سچ ہے بابا۔" ایک آواز آئی اور ہم سب چونک کر کھڑے ہو گئے... ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور الجھے بالوں والا فقیر لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا اور فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ اس نے ہمارے ریوالور کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس کا کتھئی رنگ کا چغہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"کیا سچ ہے بابا؟" میں نے نازو اور اکرام کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھ لو... مار مار کے چٹا کر دیا ہے ہمیں یا نہیں۔" وہ کراہ کے بولا۔ "یا میرے مولا... کیسا زمانہ آ گیا ہے... فقیر کی بد دعا سے بھی کوئی نہیں ڈرتا۔"

"تم فقیر کہاں ہو... سیٹھ ہو..." میں نے ہنس کر کہا۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ "تم... تم ہی تو نہیں ہو وہ چور..." پھر اُس نے ریوالور دیکھا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "یہ... یہ اصلی لگتا ہے ہمیں... یا اللہ... ڈاکوؤں کے ہاتھوں مقدر میں موت لکھی تھی تو جوتے کھانے کے لیے تھانے کیوں بھیجا... آہ... کیا کوٹا ہے ظالموں نے۔"

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نازو کو بے اختیار ہنسی آئی۔ کسی نے لوٹا کسی نے کوٹا۔ تم پر تو بڑا ظلم ہوا بابا... چلو اللہ تمھاری مغفرت کرے۔

"اور اللہ تمھاری مغفرت نہ کرے..." وہ چیخا۔ "تم نے فقیر کا مال کھایا ہو... دیکھو میری خون پسینے کی کمائی واپس کر دو مجھے۔"

"یہ خون پسینہ کہاں سے آگیا اس کمائی میں...؟" میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاتھ پھیلانے کے سوا کچھ کیا ہے تم نے؟"

"ارے بابا... سمجھو... عقل کی بات کرو... ہاتھ پھیلانا کیا آسان کام ہے..." وہ سر پکڑ کے بولا۔ "تم پھیلا سکتے ہو کسی کے سامنے ہاتھ؟ سارا دن فٹ پاتھ پر دھوپ میں بیٹھ سکتے ہو؟ اس میں پسینہ نہیں بہے گا تو کیا... کیا... کوکا کولا بہے گا... اور خون... یہ دیکھو... میری ناک سے... میرے دانتوں سے... پتا نہیں کہاں کہاں سے خون بہ رہا ہے... اتنی مار کھا سکتے ہو تم؟ اور وہ بھی اس رستم کی اولاد کے ہاتھ سے... جو تیرہ نمبر کا چھتر مارتا ہے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔"

ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آئی... وہ بہت اچھا ڈراما آرٹسٹ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ وہ اَن پڑھ نہیں ہے۔ اس کی گفتگو سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

"ہے تو واقعی مشکل کام..." میں نے کہا۔ "کب سے کر رہے ہو؟"

"کیوں بتاؤں تمھیں؟ کیا پتا تم کون ہو..." وہ ایک دم محتاط ہو گیا۔ "انکم ٹیکس افسر یا... نہیں... تم تو چور ہو..."

"ہم چور نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہمارا ہی کوارٹر تھا جس میں تم یوں ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے۔"

"ارے تو بابا فقیر سے کہہ دیتے گیٹ آؤٹ... فقیر ڈیرا اٹھا لیتا... اس کا گھڑا کیوں اٹھا لیا؟" وہ فریاد کے انداز میں بولا۔

"چلو بھول جاؤ گھڑے کو..." نازو نے کہا۔

"بھول جاؤں؟" اس نے ایک دلخراش چیخ ماری... "آہ... تم کیا جانو بی بی... کتنے ارمانوں سے وہ گھڑا بھرا تھا... دوسری بار..."

"دوسری بار!"

"ہاں... پہلی بار ڈاکو لے گئے تھے... خدا نے ان کا بیڑا غرق کیا۔" وہ بولا۔ "ان کی لانچ ڈوب گئی... میرا گھڑا بھی ڈوب گیا، چالیس ہزار..." وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"اور اس دوسرے گھڑے میں کتنے تھے؟"

"تھے؟" وہ اُچھلا۔ "تھے کا کیا مطلب؟ ہیں کہو۔" وہ چلایا۔

"چلو ہیں سہی۔" نازو نے کہا۔ "کتنے ہیں؟"

"تم... تم نے نہیں گنے؟" وہ ... ہوئے بولا۔

"نہیں... بس پچیس روپے خرچ کیے ہیں... لینے پر..." میں نے کہا۔

"جاؤ معاف کیا... پنج فقیر کی طرف سے راہِ خدا میں..." وہ بولا۔ "مگر میرا گھڑا...؟"

"گھڑا مل جائے گا... پہلے یہ بتاؤ کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟ کام کیوں نہیں کرتے... ڈرو نہیں ہم سے... ہم دوست ہیں تمھارے؟"

"کیا تھا کام بھی۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "بڑے پاپڑ بیلے... ایمانداری سے زندہ رہنے کے لیے... مگر کام ملا نہیں... ملا تو ہم سے ہوا نہیں... وہ سب ایسے ہی کام تھے... ایمان فروشی کے... یا اس کام میں عزت نہیں تھی... آخر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا... عزت ایمان... شرم دھیا۔ پھر یہ کام شروع کر دیا۔ اللہ کا فضل ہے... اب اچھی آمدنی ہے۔ کلرک کیا افسر بھی نہیں کما سکتے اتنا... اگر حرام نہ لیں۔"

"تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو...؟"

"ہاں بابا... بی اے کیا تھا ... میں۔" وہ آہ بھر کے بولا۔ "جب نہ نوکری ملی نہ آگے داخلہ ملا... جوتیاں گھس گئیں فاقوں کی نوبت آگئی... ماں باپ سرکاری اسپتال میں مر گئے... تو ہم نے بھی دنیا پر لعنت بھیج دی... کیونکہ دنیا ہم پر بہت پہلے لعنت بھیج چکی تھی۔ اب ہم کسی کے نہیں... کوئی ہمارا نہیں... بس پیسہ یار ہے اور پیسہ ہی رشتے دار ہے... یہی باپ ہے یہی بیٹا..."

ہم سب دم بخود بیٹھے رہے۔

"لیکن اس پیسے کا فائدہ؟" نازو نے کہا۔ "مطلب یہ کہ نہ گھر بار... نہ بیوی بچے..."

وہ تلخی سے ہنسا۔ "ارے بی بی... یہ گھر نہیں ہے کیا...؟ یہاں سے چلے جائیں گے تو کہیں بھی ڈیرا جما لیں گے... سارے گھر اپنے ہیں... بیوی بچوں کا جھمیلا کون پالے... کھاتے ہیں پیتے ہیں موج اڑاتے ہیں۔"

"تم جیسے فقیر کو... میرا مطلب ہے کہ..."

"میں سمجھ گیا بی بی... دنیا آدمی کے ظاہر کو دیکھتی ہے... تو میرا بھی ظاہر یہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "سب کے ظاہر اور باطن الگ ہو گئے ہیں... سب کے چہرے اصلی نہیں ہیں... میں بھی بھیس بنا کے پھر رہا ہوں فقیروں کا..."

"بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب... تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کچھ تماشا ہمیں بھی دکھاؤ۔" میرا گھڑا واپس کر دو گے نا... تم شریف لوگ لگتے ہو۔" وہ بولا۔ "گھڑا ہمارے پاس ہے... ایک ایک پیسہ تمھارا تمھیں مل جائے گا۔" نازو کو اچانک اس سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"تو پھر دیکھو تماشا..." وہ بولا اور اس نے اپنے سر کے اوپر سے وِگ ہٹا دی... نیچے اس کے بال سیاہ اور چمکدار تھے... پھر اس نے داڑھی اتاری اور اس کا کلین شیو چہرہ سامنے آگیا۔ یہ تبدیلی ہم سب کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ بالکل جادو کی طرح وہ اپنی شخصیت بدل رہا تھا۔ اس نے چغہ کھینچا اور کینچلی کی طرح اتار دیا... اس کے نیچے وہ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ اور بلیو پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے چغے سے منہ کو رگڑ رگڑ کر صاف کیے... وہ سب داغ دھبے غائب ہو گئے جو زخم اور خون کے نشان لگتے تھے... اب ہمارے سامنے ایک اسمارٹ جوان آدمی کھڑا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ...!" میں نے کہا۔

"تم نے دیکھا میرا اصل روپ؟ کیسا ہے؟" وہ بولا۔ "رات کو میں اس طرح پھرتا ہوں... اس حلیے میں کون روک سکتا ہے مجھے... کہیں بھی جانے سے۔ اب میں دن رات میں دو الگ الگ شخصیتوں کا مالک ہوں مگر دنیا اسے ایک سمجھتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں ہر شخص ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے کم سے کم دو روپ ہوتے ہیں ورنہ تین بھی اور چار بھی... یہ ڈراما سب کرتے ہیں۔ وفادار شوہر سے لے کر باوفا بیوی تک... لیکن ایک دوسرے کی دوسری شخصیت کا علم نہیں ہوتا۔ جو بے وفا ہوتی ہے یا عیاش ہوتی ہے۔ ایماندار نظر آنے والا سب سے بڑا ایمان فروش ہو سکتا ہے... کیا حاکم کیا محکوم... کیا کلرک کیا افسر... عوام اور سیاستداں... تاجر اور آجر... سب میری طرح ہیں۔ ایک اڈا میرا ہے۔ میں نے دس ہزار میں لیا ہے... وہاں کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسے ہی سب کے اڈے ہیں... سیاستداں کا اڈا اس کی پارٹی ہے تو ڈاکٹر کا اڈا اس کا کلینک... لیڈر بھی گولی دیتے ہیں عوام کو... ڈاکٹر اسپرین کی گولی دے کر سو روپے فیس لے لیتے ہیں۔ دو روپے کا انجکشن لگا کے بیس روپے لیتے ہیں۔ مریض کچھ نہیں جانتا... موٹر مکینک بھی یہی کرتا ہے... پھر میں کیا غلط کرتا ہوں؟ کسی کو دھوکا دے کر نقصان تو نہیں پہنچاتا... بس جھوٹ بولتا ہوں... وہ بھی بشرطِ... جس کے دل پر اثر کرتا ہے وہ دیتا ہے جس کا دل پتھر ہے وہ بھاڑ میں جائے... میں کسی سے زبردستی تو نہیں لیتا۔ ڈاکٹر اور مکینک... پولیس مین اور انکم ٹیکس افسر... کسٹم انسپکٹر، فوڈ انسپکٹر اور جج کے ... ... محصول ... اپنی خوشی سے دیتے ہیں... اور کم سے کم یہ تسکین تو دے جاتے ہیں کہ انھوں نے کارِ ثواب کیا... اپنے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھوا لی۔"

"تم بہت... خطرناک آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم ضرورت سے زیادہ سچ بولتے ہو... تم معاشرے کے باغی ہو۔"

"تم نے جھوٹ بولا تھا ہم سے۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "کہ تم تھانے میں پٹ کر آئے ہو۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں نے گاڑی دیکھ لی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کوارٹر کے اصل مالک آگئے ہیں۔ میں تمھارے انتظار میں تھا۔"

"کب سے ہماری باتیں سن رہے تھے؟" میں نے کہا۔

"ڈرو نہیں... میں بھی دشمن نہیں ہوں۔" وہ بولا۔ "دوست ہوں..."

یہ ہمارے ہی الفاظ تھے جو اس نے ہمارے خلاف استعمال کیے... نازو اتنی حیران پریشان بیٹھی تھی کہ پلک نہیں جھپکا رہی تھی۔

"اس شخص پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔" اکرام نے کہا۔

"کیوں... ایسی کیا بات کی ہے میں نے؟" وہ بولا۔ "میں نے تو پوچھے بغیر ہی تم کو اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ تھوڑا سا ڈراما ضرور کیا تھا میں نے... مگر وہ ضروری تھا... ورنہ اپنا گھڑا تو میں نے ٹیکسی میں رکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔"

"پھر تم نے نکالا کیوں نہیں؟ دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔"

"میں شک میں پڑ گیا تھا۔ تم لوگ چور ڈاکو ہوتے تو واپس یہاں کیوں آتے۔" وہ بولا۔ "میں صرف تم لوگوں کی صورت دیکھنا چاہتا تھا اور جب میں نے اس آدمی کو دیکھا۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا۔ "تو میں اندر آگیا۔"

"تم... جانتے تھے... کہ میں کون ہوں؟" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"ہاں... تم کو بھلا کون نہیں جانتا... تم ... ہو... یہ دونوں یقیناً تمھارے ساتھی محسن اور شہلا ہوں گے۔" وہ بولا۔

ہم سب یوں بیٹھے رہے جیسے سب پر بجلی گر پڑی ہو۔

"یہ محسن... اور شہلا نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے جیب میں سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا۔ "لو پیو اور بے غم ہو جاؤ... نہیں... چرس وغیرہ نہیں ہے اس میں۔"

"میرے سگریٹ... ہیں میرے پاس۔" میں نے کہا اور اکرام شیخ کی طرف دیکھا۔ اس نے میری نظر کے سوال کو سمجھ لیا کیونکہ یہی سوال خود اس کی اور نازو کی نگاہ میں بھی تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس آدمی پر اعتبار کرتے ہوئے اسے زندہ رہنے کا موقع دینا چاہیے یا اسے مار دینا چاہیے۔ بلاشبہ وہ بے حد عیار اور ڈرامے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

بازآدمی تھا۔ اس کا کیا بھروسا اگر وہ اعتماد حاصل کر کے اپنی جان بچالے اور ہمیں پولیس کے حوالے کر دے۔

تمہارے دل میں شکوک جنم لے رہے ہیں۔" وہ سگریٹ کا ایک کش لے کر بولا۔ "تمہاری پوزیشن ہی ایسی ہے مگر میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں... بدخواہ ہوتا تو خاموشی سے واپس نہ لوٹ جاتا اور پولیس کے ساتھ نہ آتا... مجھے ایک لاکھ کا انعام مل سکتا تھا۔ تمہیں تو پتا بھی نہ چلتا کہ میں کب آیا اور کب گیا... خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تمہیں... اور میرا شکریہ بھی کہ میں نے ایک لاکھ کو ایک پیسے کے برابر نہیں سمجھا... میں بتا چکا ہوں نا کہ میں ایمان فروش بہرحال نہیں ہوں۔"

اس کی بات نے ایک دم ہم سب کو قائل کر لیا... میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اکرام شیخ نے بھی... ہم نے ریوالور جیب میں ڈال لیے... نازو پھر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

"تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"وہ سب جو اخباروں میں آچکا ہے... میں اخبار ضرور پڑھتا ہوں اور بہت تفصیل سے۔" وہ بولا۔ "پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ تم ہو... پھر میں بہت خوش ہوا کہ خدا نے مجھے تم سے ملوایا۔ ویسے معاف کرنا تم اتنے عقل مند ہو نہیں جتنے مشہور ہو گئے ہو۔ ایک تو تمہارا حلیہ صاف چغلی کھاتا ہے کہ تم کون ہو۔ میری طرح اور بھی لوگ تم کو پہچان سکتے ہیں۔ بیشتر لوگ تمہارے طرف دار ہوں گے... مگر پولیس بھی تو ہے... تم آخر کیا سمجھتے ہو... کراچی کی پولیس کو کچھ معلوم نہیں؟ یا وہ اندھے ہیں؟ اور تم سب کو بے وقوف بھی سمجھتے ہو... فرض کرو میری جگہ ایک جاہل فقیر ہوتا تو کیا وہ مان لیتا کہ تم ہی اس کوارٹر کے مالک ہو؟ مالک ایسے رہتے ہیں اور یوں ریوالور نکال کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں مسٹر محسن؟"

"میں محسن نہیں ہوں۔" اکرام شیخ نے تند لہجے میں کہا۔

"اور میں شہلا نہیں ہوں۔" نازو نے بھی کہا۔ "ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔"

اس نے نازو کو غور سے دیکھا اور سر پر ہاتھ مارا۔ "ہم بھی کیا زبردست عقل کے اندھے ہیں۔ تم تو وہی ہو... ناڈیا..."

"کیا بکواس ہے یہ؟" اکرام شیخ نے گرم ہو کے کہا۔

"معاف کرنا بھائی صاحب... وہ ایک ایکٹریس تھی نا... مار دھاڑ سے بھرپور جس کا نام ناڈیا تھا۔" وہ بولا۔ "تمہاری اس بہن کی تو پوری اسٹوری پڑھی تھی میں نے... کمال ہے کہ میرا دماغ اُدھر نہیں گیا... اب میں سب سمجھ گیا۔ تم اس کے دوسرے ساتھی ہو جس کا افتخار عارف نے اپنی رپورٹ میں ذکر کیا تھا کہ وہ بھاگ گیا۔"

اکرام شیخ ریوالور نکال کے اٹھا ہی تھا کہ میں نے اُسے روک دیا۔ "ٹھہر و یار... یہ آدمی دشمن نہیں ہے تو اسے دشمن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم اسے دوست بنا سکتے ہیں۔"

"ایسے ہر ایک کو دوست بناتے رہے تو مارے جاؤ گے۔" اکرام شیخ نے برہمی سے کہا۔ "یہ پولیس کا مخبر بھی ہو سکتا ہے۔"

"مخبر ہوتا تو کب کی مخبری کر چکا ہوتا۔" وہ بھی تیز لہجے میں بولا۔ "اور اس وقت تم سب حوالات میں بند ہوتے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بھیا۔" نازو نے بھی تائید کی۔

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے... ابھی تک نام تو بتایا نہیں اس نے اپنا۔" اکرام شیخ نے کہا مگر اب وہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

"میرا نام۔" وہ طنز سے ہنسا۔ "تم مان لو گے اگر میں کہوں کہ میرا اصل نام جو ماں باپ نے رکھا تھا رزاق تھا... وہ مجھے راجو کہتے تھے مگر میں نے بعد میں اسے راجا کر لیا... دن میں تو یہ نام میرے کام نہیں آتا۔ مگر رات کو میرے دوست مجھے راجا کہتے ہیں... میرا ایک حلقہ ہے جس میں چند عیاش اور اوباش رئیس زادے شامل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا کسی بین الاقوامی گروہ کا رکن ہوں۔ کیونکہ میری شخصیت بہت پُراسرار ہے۔ میں نے کبھی کسی کو اپنا ٹھکانا نہیں بتایا۔ کبھی کبھی میں انھیں میٹروپول میں مل جاتا ہوں۔ جب بھی شراب کباب کا پروگرام ہوتا ہے۔ ان کی گرل فرینڈز بھی آتی ہیں۔ اور میں انھیں مرعوب رکھتا ہوں... کہ میں سنگاپور اور ہانگ کانگ گیا ہوا تھا... اب چار دن میں یورپ کی طرف جانا ہے۔ پھر میں غائب ہو جاتا ہوں... ان کی کاروں کو سڑک پر سے گزرتے دیکھتا رہتا ہوں... ایک بار تو انہی میں سے ایک نے اپنی گرل فرینڈ کو امپریس کرنے کے لیے میرے کشکول میں سو کا نوٹ ڈال دیا تھا۔"

"تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں بنی؟" میں نے کہا۔

"گرل فرینڈ...؟" وہ ایک دم سنجیدہ اور کچھ اداس ہو گیا۔ "نہیں، میں یہ روگ نہیں پالتا... کسی کو پانے کا... وہ سب ایسی ہی ہوتی ہیں... آدمی انھیں خرید تو سکتا ہے۔ ان سے محبت نہیں کر سکتا... مگر... میرا خیال ہے... کہ یہ موضوع کچھ مناسب نہیں۔" اس نے نازو کی طرف دیکھا جو نظر جھکائے فرش کی گرد پر انگلی سے کچھ لکھ رہی تھی... میں نے دیکھا تو اس نے "شیر" کا لفظ لکھا تھا۔

پہلے میں حیران ہوا کہ ایسے ماحول میں نازو کو شیر کہاں سے یاد آ گیا جب کہ گرد و نواح میں بلی تک موجود نہ تھی مگر آدمی کا ذہن... اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا... اس کی بھول بھلیوں میں سیدھا راستہ نہیں ملتا اور خیالات کا تسلسل کتنا ہی بے ربط کیوں نہ ہو۔ ایک خیال کی کڑی دوسرے خیال سے منسلک رہتی ہے۔ ربط باہمی کو تلاش کرنا ہے تو تحلیلِ نفسی کے ماہرین کا ہی کام ہے مگر اس وقت اچانک مجھ پر اس لفظ کے پردے میں پوشیدہ مفہوم واضح ہو گیا۔ شیر کے وہی معنی تھے جو اسد کے ہوتے ہیں۔ اور اسد نام تھا اسد اللہ خاں غالب کا جنھوں نے ابتدا میں اپنا تخلص اسد بھی کیا مگر شہرتِ دوام اپنے دوسرے تخلص غالب سے پائی۔

نازو نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا... پھر میری نظروں کے تعاقب میں اس لفظ کو دیکھا جو اس نے غیر شعوری طور پر لکھ کر گویا رازِ دل آشکارا کر دیا تھا۔ پھر اس نے سمجھ لیا کہ میں سمجھ گیا ہوں اور اس کی چوری اکرام نے چاہے نہ پکڑی ہو مگر میں نے پکڑ لی ہے۔ لاشعور کا جذبہ روپ بدل کے غلطی سے میرے سامنے آ گیا تھا... وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ شیر... شیر میں کیا ہے... شیر ایک جانور ہے۔ میں کبوتر بھی لکھ سکتی تھی۔ لگڑ بگھا بھی لکھ سکتی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ میں نہیں مانوں گا... یہ شیر ایک جذبہ تھا... ایک نام تھا... ایک یاد تھی اور ایک خلشِ خاموش تھی۔ اس نے اعترافِ جرم یوں کیا کہ شیر کے لفظ کو "شیرنی" کر دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو یار؟" اکرام نے کہا۔

میں چونکا۔ "سوچنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے... تم بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں... میرا ووٹ خلاف ہے۔" وہ بولا۔

"میرا ووٹ تمہارے خلاف ہے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں کی نظر نازو کی طرف اٹھی۔ اس نے اپنے نام کو مٹا دیا اور مسکرائی۔ "میں غیر جانبدار ہوں۔"

"او کے... مسٹر راجا... تم کیا کہتے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کیا کہوں... تم سے کہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں... تم وہی کرو گے جو تمہارے دل میں آئے گا۔" وہ بولا۔ "تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اسی مشکل سے دوچار ہوتا۔ اتنی آسانی سے کسی پر اعتبار نہ کرتا... ایک مقصد کو یقیناً ایک آدمی کے لیے داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک آدمی کو ایک مقصد پر البتہ قربان کیا جا سکتا ہے خواہ وہ آدمی دوست ہی کیوں نہ ہو۔"

"چلو ٹاس کر لو۔" نازو نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا زندگی اور موت کے فیصلے کو ایک سکے پر چھوڑا جا سکتا ہے... عقل و شعور... غور و فکر... انصاف اور احتیاط... یہ سب بے معنی الفاظ ہیں؟ اگر ایسا ہی ہو تو پھر گناہ گار اور بے گناہ کا فیصلہ چند سکنڈ میں ہو جایا کرے۔ عدالتوں میں گواہ، شہادت، ثبوت اور جرح سب کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ جج کٹہرے میں کھڑے ہوئے مجرم سے کہے کہ مانگو، ہیڈ یا ٹیل۔ اگر سکہ الٹا گر جائے تو ملزم کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ مجرم ہے۔ اس نے ہیڈ مانگا۔ ہیڈ نہیں آیا۔ اس کا سر قلم کر دو۔"

"میرا... یہ مطلب نہیں تھا۔" نازو نے میرے گھورنے سے اور راجا کی پُرملامت نظروں سے گھبرا کے کہا۔

"میں اسے اپنے رسک پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر ہم اس پر نظر رکھیں گے۔"

"تھینک یو مسٹر جسٹس سکندرِ اعظم۔" وہ بولا۔ "فی الحال میں سونا چاہتا ہوں... کیا مجھے اجازت ہے کہ میں باہر جا کے کپڑے بدل آؤں۔ اور اپنا بستر اُٹھا لاؤں۔ میرے بیڈ روم میں تو آپ کی کار سو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم سو جاؤ..." اکرام اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے تو نازو نے کہا۔ "میرا ووٹ تمہاری طرف تھا... مگر..."

"مگر دوسری طرف بھائی تھا۔" میں نے طنز سے کہا۔ "اس لیے تم نے سیاست سے کام لیا۔ یعنی منافقت سے کام لیا... سچ کہنے سے گریز کیا... اتنی بزدل ہو تم... شیرنی۔"

اس کا رنگ لال پڑ گیا۔ "کیا غالب مجھے یاد کرتا ہے؟" اس نے نظر جھکا کے کہا۔

"ہاں... جب اس کے جوڑ درد کرنے لگتے ہیں تو تمہیں دعا دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جوڑوں میں درد ہوتا ہے نا؟" اس نے مایوسی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ جب دل میں درد اُٹھتا ہے تنہائی کا۔" میں نے کہا۔ "نازو، وہ تمہیں بہت چاہتا ہے اور چاہت بڑا عجیب جذبہ ہے۔ اسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جس کے دل میں کسی کی چاہ نہ رہی ہو... وہ نہیں جان سکتا کہ چاہت کیا ہوتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں... میں نے دیکھا ہے... بلکہ کو کس طرح چاہتے ہو۔" وہ دیوار پر نظر جما کے بولی۔

"تم بھی غالب کو چاہتی ہو؟"

"معلوم نہیں... ابھی میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"جھوٹ مت بولو میرے سامنے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم نے کیا لکھا تھا؟"

"وہ... بس ایک خیال تھا۔"

"گویا تمہیں اس کا خیال آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "اکثر آتا ہے؟"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا؟ یا جب تم محفل میں بھی تنہا ہو جاتی ہو۔"

وہ گھٹنوں پر سر جمائے نیچے گرد آلود فرش کو دیکھتی رہی اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا... اس نے خیالوں کے کسی عکس کو چہرے تک آنے ہی نہیں دیا... پھر اکرام آگیا اور راجا آگیا... راجا نے ایک کونے میں بستر سا بچھایا اور اس پر دراز ہوگیا... وہ اب پاجامے اور بنیان میں تھا۔ اس نے ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور دو منٹ میں سو گیا۔ کچھ لوگ جو ذہنی اعصاب کی کش مکش کا شکار نہیں ہوتے وہ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ آنکھیں بند کرتے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

"یار یہ سو گیا... اتنی جلدی؟" اکرام نے شکوک لہجے میں کہا۔

"تم پولیس والے ہو... چیک کرلو کہ مکر کر رہا ہے یا سچ مچ سو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر سو گیا ہے تو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے دماغ میں کوئی خلفشار نہیں... جھوٹا اور خوف کا مارا ہوا پریشان آدمی اتنی جلدی سکون سے نہیں سو سکتا۔"

اکرام نے سر ہلایا... اٹھ کر راجا کے قریب گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں لوٹ آیا۔ "میں قائل ہونے لگا ہوں تمھاری نظر کا..." وہ بولا۔ ڈربسی کے گھر میں کلاک نے رات کے دو بجائے۔

"کیا ہم یونہی بیٹھے رہیں گے رات بھر؟" نازو نے کہا۔

"سونے کے لیے بیڈ روم حاضر ہے... بیڈ کے بغیر۔" میں نے کہا۔

"نیند تو مجھے نہیں آرہی ہے... لیکن بھوک بہت سخت لگی ہے۔" نازو نے کہا۔ "شام سے یہ وقت ہوگیا..."

"تو چلو... اسٹیشن چلتے ہیں... کینٹ اسٹیشن کے آس پاس بہت سے ہوٹل ہیں۔" اکرام نے کہا۔ "جو رات بھر کھلے رہتے ہیں۔"

"چائے کے لیے تو میں ایسے ہی تڑپ رہا ہوں جیسے ماہیٔ بے آب۔"

"مگر راجا صاحب کا کیا ہوگا؟"

"دیکھو... نو رسک نو گیم۔" میں نے کہا۔ "ہم بڑی آسانی سے آزما سکتے ہیں کہ راجا کس حد تک ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ اگر واپسی پر بھی وہ ہمیں ایسے ہی سوتا ہوا ملا تو پھر سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔"

اکرام نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا... ہم تینوں دبے پاؤں باہر نکل گئے اور اپنے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔ اکرام نے گاڑی اسٹارٹ کی تو نازو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ریوالور لیے بیرک کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ ٹیکسی کا انجن غرایا اور میں نے ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھا۔

پانچ منٹ بعد ٹیکسی واپس آئی۔ اس وقت تک میں مستعد کھڑا رہا تھا۔ اگر راجا ٹیکسی کے جانے کی آواز سنتا اور اس کے دل میں کوئی غلط خیال ہوتا تو وہ اس مہلت سے فوراً فائدہ اٹھاتا، مگر خود اکرام نے بھی دیکھ لیا کہ وہ اسی طرح سو رہا تھا۔

نازو نے راستے میں ہمیں وہ بات بتائی جو راجا کی مداخلت کے باعث ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے ہمیں بے بس دیکھ کر براہ راست دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں جو گاڑی لے جانے کے لیے آئی تھی اس میں صرف ایک کیپٹن ہی آیا تھا۔ اگر اس کا کرنل بھی ساتھ آتا تو پھر نازو کو چاروں ٹائر فلیٹ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ کرنل نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ اب افرادی قوت کا کوئی مسئلہ نہیں رہا... قیدی حراست میں ہیں اور انھیں پکڑنے والا وہ شکاری ہے جس کے جال سے کوئی آج تک بچ کے نہیں نکلا۔ جب کیپٹن کو اندر جانا پڑا تو نازو نے چاروں ٹیوبوں کے والو نکال دیے۔ اس کے لیے نازو کو پٹرول پمپ تک جانا پڑا تھا، مگر وہ ٹیکسی میں گئی اور پانچ منٹ میں واپس آگئی۔ اس نے والو کھولنے والے ننھے سے اوزار کے لیے دس روپے جمع کرائے اور "ابھی واپس لاتا ہوں" کہہ کے بھاگ آئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اسے واپسی پر کار اپنی جگہ ملی۔ والو اوپنر کے بغیر چار ٹائروں کی ہوا نکالنا بہت لمبا عمل ہوتا اور کوئی نہ کوئی اسے دیکھ لیتا۔ والو اوپنر سے اس نے یہ کام پانچ منٹ میں کرلیا اور پھر چھپ کر انتظار کرنے لگی۔ پہلا گوریلا اس وقت مارا گیا جب وہ ٹائر بدلنے کے لیے ڈکی میں سے جیک نکال رہا تھا۔ نازو نے جو کار کے نیچے دبکی ہوئی تھی خاموشی سے باہر نکل کے اور اس کے پیچھے جا کے گردن پر ہاتھ مارا... وہ وہیں گر گیا۔ ڈکی کھلی رہ گئی چنانچہ سر گھما کے دیکھنے پر دوسرے گوریلے کو پیچھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ دھماکا سن کے باہر نکلا تھا کہ نازو کے نازک ہاتھ کی ضرب نے اس کی گردن بھی توڑ دی۔ وہ گرا تو نازو نے اسے گاڑی کے نیچے دھکیل دیا۔

ٹیکسی اب کینٹ اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ وہاں کا ماحول تقریباً ویسا ہی تھا جیسا لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر کا۔ دو تین دوسرے درجے کے ہوٹلوں کے ساتھ متعدد تیسرے درجے کے ہوٹل بھی نظر آرہے تھے۔ ان کی پرانی عمارتیں بے رنگ اور غلیظ نظر آتی تھیں اور کثرت سے یکساں لگتے تھے۔ ہر ہوٹل کے نیچے ایک چائے خانہ نما ریسٹورنٹ تھا، جہاں ہر قسم کی مخلوق بھری ہوئی تھی... عام لوگ... ڈرائیور... قلی... دلال... مکینک... بے گھر لوگ... اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی تھی چنانچہ اسٹیشن کی طرف کا علاقہ ویران پڑا تھا۔

اکرام نے ایک ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی روک لی۔ وہاں شیشے کے ایک دروازے پر فیملی روم بھی لکھا ہوا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ نازو بالکل "فیملی" نظر نہیں آتی تھی اور ہم ہال میں سب کے درمیان بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اکرام آرڈر دینے چلا گیا۔

"تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے نازو؟" میں نے کہا۔

"میں نے نہیں... تقدیر نے یہ حال بنایا ہے۔" وہ خود کو دیکھ کر مسکرائی۔

"تم نے اپنے بال بھی کٹوا دیے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ٹوپی کے نیچے ہیں۔"

"تمھارے تو... بہت لمبے اور گھنے بال تھے۔" میں نے کہا۔

"میں نے ترشوا لیے تھے۔" وہ بولی۔ "مجبوری تھی۔"

"غالب تمھیں ان کپڑوں میں دیکھ لے تو..."

"تو کیا؟ بھول جائے نازو کو..." وہ بولی۔

"تم نے غلط سمجھا... وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر خدانخواستہ تم گنجی ہو جاؤ... کانی یا لنگڑی لولی ہو جاؤ... تب بھی اسے فرق نہیں پڑے گا... خدا نہ کرے تم بدصورت ہو جاؤ..."

"کوس کیوں رہے ہو۔" وہ بولی۔ "میں تو خود ہی تمھارے اور رابعہ کے درمیان سے نکل گئی ہوں۔"

اسی وقت اکرام آگیا۔ اس کے ساتھ ایک باہر والا تھا جو چائے کی ٹرے لایا تھا۔ اس میں چائے کے ساتھ نہایت فضول ٹھنڈے اور سخت سموسے اور کچھ کیک پیس تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک کیک پیس چائے کے ساتھ نگلا ورنہ وہ آٹے کی طرح میرے حلق میں چپک گیا تھا۔ نازو نے کمال کیا کہ سارے سموسے صاف کر دیے۔ پھر کیک پیس کھا گئی۔

"یار یہ اتنا کھاتی ہے... جاتا کہاں ہے؟" اکرام شیخ بولا۔

"کھاتی نہیں... رزق ضائع کرتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی اور کھائے تو پھول کر کپا ہو جائے۔ یہ وہی ہڈی پر چمڑی۔"

"بابا جلتے کیوں ہو... تم بھی کھاؤ..." وہ بولی۔ "اللہ کی مہربانی ہے... تے بھی ہیں اور دبلے بھی رہتے ہیں۔"

"نازو... وہ نیپ کیپٹن کدھر گیا تھا؟"

"کون نیپ کیپٹن...؟" وہ سڑ سڑ کر کے چائے پینے لگی۔

"وہی جو کار لے کر آیا تھا... وہ ایک ہندو کیپٹن تھا۔"

"پھر وہ گیا نرک میں...!" نازو نے چائے ختم کر کے کہا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ وہ روانہ ہوا تو میں سمجھ گئی کہ اب یہ دوسری گاڑی لائے گا۔" نازو نے کہا۔ "میں اس کے انتظار میں کھڑی رہی تھی۔ تیسری لائن کے کوارٹر کی اوٹ میں... وہاں ایک گٹر کھلا ہوا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو میں نے ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا اور بس پھر میں نے اسے دو منٹ میں گٹر کے اندر ڈال دیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ بے ہوش ہوا تھا میرے وار سے... مگر میں نے دیکھا کہ وہ گٹر میں الٹا گرا تھا۔ اور سر کے بل آدھا کیچڑ میں دھنس گیا تھا... البتہ ایک آدمی کے نکل جانے کا افسوس ہے۔"

"اس چھوٹے سے آدمی کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں... اس کے باہر آتے ہی کہیں سے ایک گاڑی آگئی۔ زرد رنگ کی اور وہ اس میں بیٹھ کے چلا گیا... واپس ادھر ہی جدھر سے گاڑی آئی تھی... میرا خیال ہے کہ اس نے وائرلیس پر بات کی تو ڈرائیور کار لے آیا تھا۔ اور پھر اس کے کہنے پر گھما کے الٹے راستے سے لے گیا... وہ سیدھے راستے سے آتا تب بھی میں اس کو روک نہیں سکتی تھی۔"

"یہ ٹھیک ہے مس نازو... اس کا راستہ روکنا شاید تمھارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بہت خطرناک آدمی تھا... تم نے گاڑی کا نمبر وغیرہ دیکھا تھا؟"

نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ "نمبر یا تو تھا ہی نہیں یا مجھے اندھیرے میں دکھائی نہیں دیا۔" وہ بولی۔

"ہوتا بھی تو بوگس ہوتا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "گاڑی کون سی تھی؟"

"اسکوڈا... چار سال پرانی۔" وہ بولی۔

"پیلی اسکوڈا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تم نے اس شہر میں کتنی گاڑیاں دیکھی ہیں... جن کا رنگ پیلا ہو؟"

"اسکوڈا تو ایک بھی نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر وہ کچا رنگ کرا کے لایا ہوگا... ایسا رنگ جو دھونے سے اتر جائے۔" میں نے کہا۔ "وہ بہت چالاک آدمی تھا... وہ پیلے رنگ کی اسکوڈا تمھیں پھر کہیں نظر نہیں آئے گی اور شاید وہ شخص بھی پھر نہیں ملے گا... یہ اس کا آخری مشن تھا۔ آخری کامیاب مشن۔" میں نے نازو کو اس سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے آخری مشن میں ڈنڈی ماری۔ یعنی تمھیں جانتے بوجھتے رعایت دی؟"

"نہیں... اس نے مجھے کوئی رعایت نہیں دی۔ معاہدہ مجھے زندہ یا مردہ ان کے حوالے کرنے کا تھا۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ ذاتی طور پر میرا دشمن ہوتا تو مجھے گولی مار کے میری لاش ان کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

حوالے کرتا... یہ کام زیادہ آسان تھا۔ مگر وہ شخص کسی کا دوست یا دشمن نہیں تھا۔ ڈنڈا ی اس نے مال حوالے کرتے وقت یوں ری کہ خود مجھے لے کر نہیں گیا۔ ان سے کہا کہ آؤ اور مال لے جاؤ۔ غالباً تجارتی نوعیت کے بین الاقوامی معاہدے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں... ایک تو یہ کہ مال کی قیمت ادا کر دی اور بیچنے والا فارغ... خریدار چاہے تو بحری جہاز سے لے جائے ہوائی جہاز سے یا سر پر اُٹھا لے... کسٹم فرائٹ سب وہ خود ادا کرے... دوسری یہ کہ بیچنے والا مال کو خریدار کے گودام یا دروازے تک پہنچانے کے سارے رسک اور اخراجات کا ذمے دار ہو۔ میرے سلسلے میں بھی معاہدہ غالباً یہی ہوا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے گا۔ وہ اڑ گیا کہ حوالے تو میں کر رہا ہوں مگر جہاں مال ہے وہاں آ جاؤ... کیپٹن اسی پہ مشتعل تھا... لیکن وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اسے تو کرنل کے حکم کی تعمیل میں آنا پڑا تھا... اب کیپٹن تو مارا گیا... کرنل جوابدہی کرتا پھرے... وہ شخص دوبارہ کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں دنیا بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔" اکرام بولا۔

"ہاں... فاصلے سمٹ گئے ہیں... ایک ہی پیشے میں رہ کے وہی لوگ ہر جگہ بار بار ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جیسے ایک محلے کے لوگ... مگر وہ شخص اپنی پرانی شخصیت کو اپنے ماضی کے ساتھ دفن کر دے گا۔ پھر وہ دوسرا آدمی ہوگا۔ ایک نئی زندگی کے ساتھ نئی دنیا میں نو وارد۔"

"میری خواہش ہوگی کہ وہ پھر ملے۔" نازو نے اچانک کہا۔

"تمھاری خواہشات ایک بے لگام، پاگل اور اندھے گھوڑے کی طرح ہوتی ہیں جو بحرِ ظلمات میں دوڑ رہا ہو۔" میں نے کہا۔

اکرام شیخ میری بات پر بہت خوش ہوا۔

"بہت تنگ کر رکھا تھا اس نے مجھے... میں بولتا نہیں تھا... کچھ لحاظ کر جاتا تھا۔" وہ چائے کے برتن لے جاتے ہوئے بولا۔

نازو اس کے جانے کے بعد منہ پھلا کے بیٹھی رہی۔

"میرا مطلب یہ تھا مس نازو..."

"مطلب وطلب کچھ نہیں... تم خود ایک بے لگام، پاگل اور اندھے گھوڑے ہو جو بحرِ ظلمات میں دوڑ رہے ہو... وہ بھی ریورس گیئر میں۔" وہ چلا کے بولی۔ "بلکہ تم گھوڑے بھی نہیں ہو... اس سے ملتی جلتی چیز ہو۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ "او کے... میں گدھا ہوں... میں مانتا ہوں، مگر تم بھی مان لو۔"

"کیا مان لوں؟" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

"کچھ بھی مان لو... جو تمھارا جی چاہے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ زمین گول نہیں ہے... اور گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

واپسی پر صبح کے چار بجے ہم نے راجا کو اسی حالت میں سوتا ہوا پایا۔ اکرام کسی مسافر خانے سے پرانے گدے خرید لایا تھا جو ہم نے نیچے بچھائے اور سو گئے۔ تھکن سے سب ہی بے حال تھے چنانچہ ہم دس بجے اس وقت اُٹھے جب راجا نے ہمیں بیدار کیا۔ وہ پھر اپنے لباسِ فقیری کو وگ سمیت پہن چکا تھا۔

"فقیر ڈیوٹی پر جاتا ہے بابا... تم بے فکرے لوگ سوتے رہو مگر من کی آنکھیں کھول کے۔" وہ بولا۔ "کہیں دنیا تمھیں ابدی نیند نہ سلا دے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے آنکھیں مل کے کہا۔ "تم بھیک مانگنے جا رہے ہو؟"

"اونہوں... صبح صبح بدشگونی کر دی۔" وہ بولا۔ "ارے بابا! فقیر تو دنیا کی سخاوت آزمانے جاتا ہے۔ یہ دیکھنے جاتا ہے کہ لوگوں کے دل چھوٹے اور ہاتھ تنگ تو نہیں ہوئے۔ تم سکوں کے بدلے ثواب بانٹنے کو بھیک مانگنا کہتے ہو... ہاتھ کا میل لے کر ثواب دینا۔"

"بیٹھو یہاں۔" میں نے اُسے ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔

"یا میرے مولا۔" وہ کندھا پکڑ کے بولا۔ "فقیروں کو کہاں شہ زوروں سے بھڑا دیا۔"

"تم آج سے بھیک مانگنے نہیں جاؤ گے... سُنا تم نے... خود کو اور ہمیں بے وقوف مت بناؤ۔" میں نے کہا۔ "جو کچھ تم کرتے ہو وہ بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

اکرام میری آواز پر اُٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا شور و غوغا ہے؟"

"صبح صبح فقیر کے پیٹ پر لات پڑی ہے اس لیے بلبلا رہا ہے۔" راجا نے کہا۔ "روزی کا ایک وسیلہ ہے... بلکہ تھا۔"

"سنو... تمھاری اوسط یومیہ آمدنی کیا ہے؟" اکرام بولا۔

"دو سو... کبھی تین سو... عید بقرعید محرم پر چار پانچ سو... ماہانہ نہیں... روزانہ..." وہ بولا۔

"اچھا ہم تمھیں دو سو روپے روز دیں گے۔" اکرام بولا۔

"پھر تو یہ کام چھوڑ دو گے۔"

"تم کتنے دن دو گے بابا! دو چار دن دو گے، پانچویں دن دھتکار دو گے کہ مفت خورے... جا دفع ہو..."

"نہیں... ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔ "تم ہمارے ساتھ رہو گے... ہمارے لیے کام کرو گے... بے شک تمھیں کام کرنے کی عادت نہیں رہی ہوگی... مگر وہ دلچسپ کام ہیں۔ یہ کلرکی نہیں ہے، تجارت نہیں ہے اور ایمان فروشی نہیں ہے۔"

اس کا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا۔ "تم لوگ... اپنے ساتھ کر لو گے مجھے؟ میں ایک ناکارہ آدمی ہوں۔"

"تم کارآمد ہو جاؤ گے... تمھاری ذہنی اور جسمانی صلاحیت سے دنیا نے فائدہ نہیں اُٹھایا اور تم نے امید کا دامن چھوڑ دیا۔ حوصلہ ہار گئے... بے حسی، بے اعتمادی اور بے یقینی کا یہ زنگ بہت جلد اُتر جائے گا... اور ایک دن تم خود محسوس کرو گے کہ پیسہ تو ہاتھ کے میل سے بھی بدتر ہے۔ اور وہ دہری زندگی جو تم گزارتے رہے سوائے تمھارے دوسرے کسی کے لیے نہیں تھی جو صرف تمھیں خوشی دے سکتی تھی۔ وہ بھی سچی اور خالص نہیں... خیرات میں ملنے والی... بے غیرتی کے احساس سے سمجھوتا کر کے ملنے والی۔"

راجا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا... جیسے سینما کا خالی اسکرین۔

"دیکھو... میں ایک ضرورت کے تحت ایسا کر رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "جو میں... یہاں نہیں بتا سکتا۔"

میں اُسے بازو سے پکڑ کے ایک طرف لے گیا۔ "ایسی کون سی بات ہے جو تم سب کے سامنے نہیں کر سکتے؟"

"سب کے سامنے کیا... میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ بولا۔

"تم کو کتنا پیسہ چاہیے... بولو۔" میں نے کہا۔ "ایک لاکھ... دو لاکھ... دس لاکھ..."

"چاہیے تو مجھے پانچ لاکھ۔" وہ بولا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں... میں تم کو اسلحہ فراہم کرتا ہوں۔ تم کسی بینک کو لوٹ لو۔" میں نے کہا۔ "بہادری کا کام کرو... جو بے غیرتی کے کام سے بہتر ہے... اور بزدل ہو تو اس لڑکی کو ساتھ لے جاؤ... یہ تمھارا کام کر دے گی۔"

وہ شرمندہ اور خجل میرے ساتھ آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ نازو اُسے دیکھ کر مسکرائی۔

"راجا جی... کیا راج پاٹ چلا گیا۔" نازو نے کہا۔ "یہ آدمی بہت خطرناک ہے... دیتا کچھ نہیں اور سب کچھ لے لیتا ہے۔ زندگی بھر کے لیے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔"

"مسٹر راجا... ہم یہ رسک نہیں لے سکتے... کہ تمھیں جانے دیں۔"

"ارے تو کون کمبخت جا رہا ہے بابا۔" وہ زمین پر پیسکر مار کے بولا اور اس نے وگ اتار کے زمین پر دے ماری۔ "مگر یہ بتاؤ کہ کیا تم لوگ واقعی سیریس ہو... میں کچھ کر سکتا ہوں تمھارے لیے؟"

"تم بہت کچھ کرو گے۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "لیکن بھیک نہیں مانگو گے... لاؤ یہ لباس مجھے دے دو... آج سے یہ کام میرا..."

وہ چونکا۔ "تمھیں... یعنی تم بھیک مانگو گے؟"

"ہاں... تمھارے مقابلے میں مجھے اس لباس کی زیادہ ضرورت ہے راجا جی۔" میں نے کہا۔

ہم نے بیرک کا دروازہ بند کرنے سے پہلے بستر سمیٹ کر کونے میں رکھ دیے... پھر ہم یوں نکلے کہ راجا کے روپ میں بھکاری میں بنا ہوا تھا اور نازو نے موہنی کے کپڑے پہن لیے تھے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ موہنی کون تھی۔ مجھ سے کہاں اور کیسے ملی تھی اور پھر کیسے لاپتا ہو گئی تھی۔ اُس نے جانتے بوجھتے بہت سے غیر ضروری سوالات کیے مثلاً یہ کہ بچپن سے اب تک موہنی کے جذبات نہیں بدلے تھے تو میرے کیوں بدل گئے تھے۔ اور نتیجہ وہی اخذ کیا کہ مرد کی ذات میں وفا نہیں... اکرام شیخ نے بھی اختصار کے ساتھ وہ سب واقعات سُنے تھے جو اُن کی عدم موجودگی میں پیش آئے تھے اور ہم سب کچھ فاصلے پر راجا بے وقوف بنا بیٹھا رہا تھا۔ ابھی تک نہ ہم نے اسے شریکِ راز کیا تھا اور نہ پوری طرح واضح کیا تھا کہ ہم اُسے کس حد تک قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور اس سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو ابھی تک ہماری قید میں محسوس کر رہا تھا اور کچھ مایوس نظر آتا تھا۔

جب نازو نے لباس اور حلیہ بدلا تو راجا کی عقل خبط ہو گئی، وہ نازو کے بارے میں پڑھ چکا تھا کہ وہ تھانے سے کس طرح محافظوں کی ہڈیاں توڑ کے فرار ہوئی تھی۔ جب اس نے نازو کو دیکھا تھا تو وہ میلے گرد آلود خاکی رنگ کے بدوضع مردانہ کپڑوں میں تھی اور اس کے حسن کی تمام آب و تاب اسی طرح محسوس نہیں ہوتی تھی جیسے کیچڑ میں پڑے ہوئے ہیرے کی چمک... جب نازو نے نہا دھو کے موہنی کے کپڑے پہنے... جو اُسے کچھ ڈھیلے تھے۔ تو اس کا پیکرِ رعنائی اپنی تمام ساحرانہ قوت کے ساتھ سامنے آیا۔ راجا کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو اس کا متاثر نہ ہونا محال تھا۔

میں اور نازو اب شناخت کے خطرے سے کافی محفوظ ہو گئے تھے۔ راجا کے فقیرانہ لباس نے مجھے یکسر بدل دیا تھا اور کسی دشواری کے بغیر میں اس قابل ہو گیا تھا کہ کراچی میں آزادانہ گھوم پھر سکوں... نازو کا حلیہ یہ تھا کہ وہ اب ایک معزز خاتون نظر آتی تھی اور کوئی بھی پولیس مین اس کی طرف راہ چلتے شک کی نظر بھی نہیں ڈال سکتا تھا... وہ اپنے بھائی کے ساتھ آ گئے تھی جو ٹیکسی ڈرائیور کی وردی میں گاڑی چلا رہا تھا۔

دوپہر بارہ بجے کے بعد ہم نے لنچ نما ناشتا کیا اور اتنا کھا لیا کہ پھر شام تک کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔

"اب تم تینوں کا پروگرام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"تم الگ جا رہے ہو کہیں؟" اکرام نے پوچھا۔

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہاں... میں بندرگاہ کے علاقے میں دوست محمد کو اور اس کے ذریعے سے رابعہ کو تلاش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"کیا یہ مشکوک بات نہیں ہوگی؟" اکرام نے کہا۔ "اگر ایک فقیر بندرگاہ میں بھیک مانگتا پھرے تو کوئی نوٹ نہیں کرتا... مگر وہ کسی کا پتا پوچھتا پھرے تو یقیناً لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔"

"حیران ہونے دو لوگوں کو..." میں نے کہا۔

"تم راجا کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟" اکرام نے کہا۔

"اسے کوئی نہیں جانتا۔"

"کچھ لوگ مجھے ضرور پہچانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہاں... مگر وہ بندرگاہ کے علاقے میں تو نہیں ہوں گے۔"

اکرام نے کہا: "اور دن کے وقت...؟"

"دن کے وقت میرا ایک فقیر کے ساتھ پھرنا شک پیدا نہیں کرے گا؟" وہ بولا۔

"تم دونوں کا اکٹھے رہنا ضروری نہیں۔"

"راجا جی... مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ اس کا نام دوست محمد ہے اور وہ ایک میرین انجینیئر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کسی جہاز پر ملازم نہیں ہے۔ اس کی خدمات سب کے لیے وقف ہیں۔ لانچ سے لے کر تجارتی جہاز تک ہر جگہ اُسے بلا لیا جاتا ہے اور وہ خدمتِ خلق نہیں کرتا... معاوضہ لیتا ہے... اس کے پاس کوئی پرانی کار ہے جو بندرگاہ کے ہی علاقے میں کہیں کھڑی رہتی ہے۔"

"تمھیں کیا کام ہے اس سے؟" وہ بولا۔

"جب وہ ملے گا تو کام بھی بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم دونوں بندرگاہ کے علاقے میں پہنچ کر آگے پیچھے ہو جائیں گے۔ تم آگے رہو گے... لوگوں سے پوچھتے رہنا کہ دوست محمد کہاں ملے گا... میں تم پر نظر رکھوں گا اور بھیک مانگتا ہوا آگے بڑھتا جاؤں گا۔"

"مجھے روک دیا بھیک مانگنے سے... اب خود کرو گے یہ کام؟"

"یار کام تو کچھ اور ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کے لیے بھیس بدلنا ضروری ہے... وہ کام ہو گیا تو پھر یہ کام بھی ختم۔"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ اکرام شیخ نے ہمیں بندرگاہ سے ایک فرلانگ دُور اُتار دیا۔

"اب تم دونوں گھر جاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... آج کے دن تو آرام ہی کریں گے۔"

"اگر ممکن ہو تو ملتان فون کرنا۔" میں نے کہا۔ "اس سے پوچھنا کہ ملتان کی کیا صورتِ حال ہے۔ جونی اور جیکی نے اس سے رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں... اور ہاں... مجھے ایک ٹیلیفون چاہیے۔"

"کیا چاہیے؟" اکرام بھونچکا رہ گیا۔

"ٹیلی فون... وہ جو لائن مین لیے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار وہ، میں کہاں سے لاؤں؟"

"دنیا میں ہر چیز ملتی ہے دوست... کبھی زر سے کبھی زور سے۔" میں نے کہا۔ "تمھارے پاس تو پولیس کی وردی ہے اور ایک شناختی کارڈ بھی ہے... تم ٹیلی فون کیا ٹیلی فون کے کھمبے تک کو گرفتار کر سکتے ہو۔"

اکرام ہنسا۔ "اچھا دیکھو... ایس ایس کرانتی تھرڈ کا نام لیا ہے نا...؟"

"ہاں... لیکن میں اس کے کپتان سے یا فرسٹ انجینیئر سے بھیک مانگنے نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔

"وہ جہاز دو تین دن میں روانہ ہوگا۔" اکرام نے کہا۔ "اس کے کارگو پر نظر رکھنا... اگر ممکن ہو... لیکن ذرا دُور رہ کے اور احتیاط کے ساتھ... وہ غافل نہیں ہیں... خصوصاً جب سے ان کا ایک جہاز ڈوبا ہے ان کے آدمی سادہ کپڑوں میں ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔"

"میں رات کو گھر آ جاؤں گا... امید ہے اس وقت تک تمھارا وہ گھر وہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

جب ٹیکسی واپس چلی گئی تو میں اور راجا ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"تمھارا یہ ساتھی بہت شکی مزاج ہے۔" راجا نے شکوہ کیا۔

"وہ پولیس مین تھا پہلے... اور تم احتیاط کو شک سمجھتے ہو۔" میں نے کہا۔ "چند دن ساتھ رہو گے تو بہت کچھ جان لو گے اور ہمیں ایک بار سمجھ لو گے تو پھر کبھی غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہوگی... میرا دل بہرحال تمھاری طرف سے صاف ہے۔"

"مجھے اپنا گھر اسے کرانا راستہ لینا چاہیے تھا۔" اس نے دل زدہ لہجے میں کہا۔ "بس میں جذباتی ہو گیا... میں تم سے ملنا چاہتا تھا اور اکثر سوچتا تھا کہ تمھارے لیے کچھ کروں... سوچتے سب ہیں... وہ سب نوجوان اور بوڑھے جو پاکستان کی سالمیت کو سب پر مقدم سمجھتے ہیں۔ مگر عمل کرنے کی توفیق خدا سب کو نہیں دیتا۔ کچھ لوگ بزدل ہوتے ہیں اور حالات کو بہانہ بنا لیتے ہیں... کچھ لوگوں کے لیے حالات واقعی سازگار نہیں ہوتے... میں اکیلا آدمی... اپنی جان کے سوا کسی کی فکر نہیں... آج تک جو کیا اپنی جان کے لیے کیا... وطن کے لیے کچھ نہیں کیا... حالانکہ وقت کا تقاضا ہے..." وہ ایک دم چُپ ہو گیا۔

"تم کو کس نے روکا ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات بتاؤ... تم اتنی معقول باتیں کرتے ہو... پھر یہ کیسا کام کر رہے تھے تم؟"

"میں بچپن سے جھکی اور خبطی مشہور تھا۔" وہ بولا۔ "اُلٹے کام کرتا تھا... میری باتوں سے بھی سب پریشان ہوتے تھے کہ آخر یہ لڑکا بنے گا کیا... اور دیکھو میں کیا بنا؟ اس سے پہلے جو کچھ میں نے کیا اس کی تفصیل سنو تو حیران رہ جاؤ... اتنے پیشے اختیار کیے ہیں میں نے اور اتنے کام کیے ہیں... اتنے بھیس بدلے ہیں کہ اب بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے... میں نے دیکھ لیا تھا کہ دنیا میں صرف پیسہ کام آتا ہے اور پیسہ آرام دیتا ہے اور عزت دیتا ہے۔ آج رات چل کے دیکھنا کہ میری کتنی عزت ہے... عزت دار کہلانے والوں میں... مگر یہ تو میں جانتا ہوں نا کہ نہ وہ عزت دار ہیں اور نہ میں ہوں... تو یہ گداگری کا پیشہ بھی بس ایک پیشہ تھا۔ پیسہ آسانی سے اور بے حساب ملتا تھا۔ چنانچہ میں نے دن اور رات کو الگ کر دیا تھا اور اپنی شخصیت کے دو حصے کر دیے تھے۔"

"کیا تم... تمام عمر بھیک مانگتے رہتے... اور اسی طرح زندگی گزارنے کو کامیابی سمجھتے... کہ جتنا ملا عیاشی میں اُڑا دیا... تمھیں کبھی ضرورت نہیں پڑی جذباتی رشتوں کی؟" میں نے کہا۔

"جذباتی رشتے خریدے تو نہیں جا سکتے نا... ورنہ میں ماں باپ کے بعد بھائی بہن بنا لیتا۔ چاچے مامے لے آتا۔" وہ بولا۔

"تم اس عمر کے جذبات سے بھی بیگانہ ہو؟ تم کو کسی سے محبت نہیں ہوئی کبھی؟"

"کئی بار ہوئی..." وہ بولا۔ "کئی دن رہی... کئی مہینے بھی چلی... میعادی بخار کی طرح۔"

"وہ محبت نہیں کہلاتی... میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جس میں آدمی خود کو کبھی خیالوں میں بھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ جس میں وہ سوتے جاگتے خواب دیکھتا ہے... اپنے گھر کے... اپنے بچوں کے اور اپنے بچوں کے بچوں کے..."

وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس نے میری بات کا جواب کوئی نہیں دیا مگر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے سارے خواب وہی ہیں جو میرے اپنے خواب تھے۔ جو سب محبت کرنے والوں کے خواب ہوتے ہیں... جو اپنا وجود تسلیم کرا لیتے ہیں خواہ آدمی اپنی زبان سے اقرار نہ کرے اور مسلسل انکار کرتا جائے۔

"میں یہاں ایک لڑکی کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے وہ میرا مقصدِ حیات تھی۔ پھر اس نے میرا ساتھ دیا اور ہم نے اپنی محبت کے سارے خوابوں کو مؤخر کر دیا... ہم ایک مشن پر ہیں... اس مشن کی کامیابی یا ناکامی میں ہماری [illegible] داؤ پر لگی ہوئی ہے... یا تو ہم دونوں نہیں ہوں گے... ہماری محبت کا کوئی افسانہ بھی نہیں ہوگا۔ لیلیٰ مجنوں یا شیریں فرہاد کے قصے کی طرح... یا پھر یہ محبت ایک ٹھوس حقیقت ہوگی۔ بشرطِ زندگی ہم اپنے سارے خوابوں کو مل کر تعبیر دیں گے اور زندگی کی آخری سانس تک خوشیاں سمیٹتے رہیں گے۔ ایک خوشی کے بیج سے دوسری خوشی کا نخلِ آرزو پھوٹے گا اور پھر اس میں کتنی خوشیوں کے پھول ہوں گے۔ پھر ان پھولوں پر کتنی رنگین اور خوب صورت تتلیاں آئیں گی جو..."

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ "کیا تم شاعر بھی ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ "ہر محبت کرنے والا خود شاعر بن جاتا ہے... محبت اسے آدمی سے عاشق اور عاشق سے شاعر بنا دیتی ہے۔"

"اور شاعر سے شوہر... پھر کیا ہوتا ہے؟" وہ بولا۔

"پھر وہی ہوتا ہے... جو تم جانتے ہو...؟" میں نے کہا۔

"مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟"

"وہ ایک یہودی کی بیٹی ہے۔" راجا ایک آہ بھر کے بولا۔

"یہودی کی بیٹی... کیا مطلب! اس کا باپ...؟"

"اس کا باپ ایک کمینہ لالچی اور خبیث بڈھا ہے۔"

"اور اس کی بیٹی؟"

"اس کی بیٹی ایک بلینک چیک ہے... اس کے لیے" راجا نے کہا۔ "وہ اتنی خوب صورت ہے... اتنی خوب صورت ہے!"

"میں سمجھ گیا..." میں نے کہا۔

"تم نہیں سمجھے... تم یہ سمجھے ہو کہ میں مجنوں ہوں تو لیلیٰ ہی میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوب صورتی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر میں دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے حسن کے خریداروں کی قطار بہت لمبی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک گوہرِ نایاب ہے... اس کا باپ ایک پرچون فروش ہے لیکن اس کی بیٹی کے لیے رشتے آتے ہیں کسٹم افسروں کے... آرمی آفیسرز کے... ڈاکٹروں کے... وہ بڈھا سب سمجھتا ہے چنانچہ وہ بولی بڑھاتا جا رہا ہے..."

"یعنی وہ نقد طلب کر رہا ہے؟"

"نہیں... مگر اس کی شرائط سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہیں... وہ سب کو انکار کر رہا ہے... بہتر سے بہتر کی امید میں۔"

"اور تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں اُسے اغوا کرنے کی سوچ رہا ہوں... یا اس کے باپ کو قتل کرنے کی۔" وہ بولا۔ "جانتے ہو گزشتہ سال اس خبیث نے [illegible] کیا... اس نے کہا۔ سالے نام رکھ لیا راجا [illegible] نام کا ج کچھ نہیں... منہ اُٹھا کے چلے آئے رشتہ مانگنے محبت کے نام پر... سالے محبت ہے تو اس کے لیے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کوٹھی بنا... کار لا... بنک بیلنس بنا... خالی خولی محبت فلموں میں چلتی ہے اتو کے پٹھے... اپنے ساتھ میری بیٹی کو بھی خوار کرے گا... چل بھاگ..."

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی... "پھر تم بھاگ آئے۔"

"ہاں... مگر میں نے اس کے سامنے ایک تقریر کی... فلمی تقریر... میں نے کہا میں جا رہا ہوں... لیکن میں پھر آؤں گا۔ اور بہت جلد آؤں گا... کوٹھی، کار، کیش سب لاؤں گا اور اسے لے جاؤں گا... لیکن خیال رکھنا کہ وہ میری ہے... وہ کہنے لگا کہ تمھارے انتظار میں اسے کب تک بٹھائے رکھوں گا میں... میں نے کہا زیادہ نہیں... بس دو سال... اور اس نے شاید مجھے ٹالنے کے لیے کہا اچھا دو سال دیتا ہوں میں... دو سال کے اندر اندر گلشنِ اقبال میں کم سے کم دو سو چالیس گز کی کوٹھی ہو... کار ہو... ایک لاکھ نقد ہو... اسے یقین تھا کہ یہ کام میرے لیے ناممکن ہوگا، مگر وہ مجبور بھی تھا... اپنی بیٹی کی وجہ سے جو ہر رشتے کو مسترد کرتی رہی ہے... اس نے باپ کو صاف بتا دیا تھا کہ راجا سے شادی نہیں ہوئی تو پھر کسی سے نہیں ہوگی اور ہو گی تو اس گھر سے ڈولی نہیں میرا جنازہ اٹھے گا۔"

"یہ تو بہت عام فلمی ڈائیلاگ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے باپ پر کیا اثر ہوا ہوگا؟"

"وہ بھی فلمی باپ ہے... ایسے ہی ڈائیلاگ وہ بھی بولتا ہے کہ میں ٹکڑے کر دوں گا... گولی مار دوں گا یا مار لوں گا... دونوں اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے ہیں... میرے باعث تم نے دو سال کے لیے عارضی صلح کے امکانات پیدا کر دیے۔ اور اس نے یہ بات اپنی بیٹی سے کہی کہ وہ تیرا کنگلا راجا شراب کے نشے میں آیا تھا اور بڑے اونچے بول بول رہا تھا... پری جب مجھ سے ملی"

"پری؟ کوہ قاف کی پری؟" میں نے ہنس کے پوچھا۔

"اس کا نام پروین ہے... میں پری کہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پری نے کہا یہ تم نے اتنی بات کیا کہی... میں نے سینے پر ہاتھ مارے کہا جو کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ اس نے کہا تم واقعی نشے میں تھے؟ ایسی فضول بات کیوں کی تم نے... میں نے کہا کہ پری... یہ کوئی فضول بات نہیں... میں دو سال میں یہ سب کر کے نہ دکھا دوں تو میرا نام راجا نہیں باجا رکھ دینا۔ میں باہر جا رہا ہوں... ظاہر ہے وہ رونے پیٹنے لگی کہ کہاں جا رہے ہو میں نے کہا دوبئی... اور اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ میں واقعی سیریس ہوں اور مجھے دوبئی جانے کا بہترین چانس مل گیا ہے... اس نے مجھے بہت قسمیں دیں اپنے سر کی دو سال سے زیادہ مت ٹھہرنا... لوگ جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر نہیں آتے... پیسہ کمانے میں لگے رہتے ہیں... میں بھی محبت کا ایکسپرٹ ہوں... محبت سچی ہے، مگر سچ کے سہارے چلتی نہیں... بہت جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں ان لڑکیوں کو مطمئن رکھنے کے لیے۔"

"گویا تم اب دوبئی میں ہو؟"

وہ چونکا۔ "ہاں... میں دوبئی میں ہوں... وہاں میرا ایک دوست ہے۔ میں یہاں سے اسے خط کا مضمون بھیجتا ہوں... اسے وہ لفافے میں ڈال کے پوسٹ کر دیتا ہے... اس یہودی کی بیٹی کے نام... ظاہر ہے خط باپ سنسر کرتا ہے... اس میں بھی خاصا جھوٹ ہوتا ہے مگر مستند کہ میری تنخواہ اب دو ہزار ریال ماہانہ بڑھ گئی ہے اور میں نے قسم پوری کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہے۔ کھجور کے پتے کھا کے اور سرکاری نلکے کا پانی پی کے گزارا کر رہا ہوں... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ پری کا باپ خوش ہوتا ہوگا... وہ خود بھی ایسی ہی کفایت شعاری کا قائل ہے کہ بس چلے تو پارک میں گھاس چرے اور مفت میں کارپوریشن کا پانی پیے... اور پھر گائے کی طرح دودھ دے، اسے بیچے اور پیسہ جمع کرے۔"

ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو گیا۔ اپنے سسر کے بارے میں کسی ہونے والے داماد کی رائے اتنی خراب بھی ہو سکتی ہے... یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مبالغے سے کام لے رہا ہے۔

"تم گزشتہ سال کے سلوک کی بات کر رہے تھے... یہ سوچا ہے تم نے کہ آئندہ سال کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"آئندہ سال میری شادی ہوگی... پری سے..."

"مگر کیسے...؟ وہ دوبئی والی بات تو جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا... "کمائی تو سچی ہے... آئندہ سال تک میں اپنی قسم پوری کر دوں گا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "اس ایک گھڑے میں کتنی رقم ہے؟"

"وہ ایک گھڑا ہے۔ ایسے چار گھڑے اور بھی ہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "یہ تو اتفاق سے تمہارے ہاتھ لگ گیا، ورنہ میں اسے بھی دفن کر دیتا ذہیں... جہاں چار گھڑے دفن ہیں... ہر گھڑے میں پچاس ہزار نقد موجود ہیں۔"

"تم مجھے پاگل کر دو گے۔" میں نے سر پکڑ کے کہا۔ "بھیک مانگ کے اتنا اکٹھا کیا ہے تم نے؟ نہیں... میں نہیں مان سکتا"

"اچھا یہ بھی آج آزما لو..." وہ بولا۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا... شرط یہ ہے کہ جہاں میں کہوں وہاں کھڑے ہو کے مانگو۔ مثلاً شام کے وقت جناح ہسپتال میں گھس جاؤ... جب ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہوتا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے کیونکہ گداگروں کا داخلہ ممنوع ہے۔ تم کسی کے آگے ہاتھ مت پھیلاؤ... پھر کوئی تم کو کیسے پکڑے گا۔ آپریشن تھیٹر دیکھے ہیں تم نے؟ نیورو سرجری کے تھیٹر کے باہر کھڑے ہو جاؤ... ڈاکٹر جمعہ اس کا نگراں ہے اور بہت سخت آدمی ہے۔ وہاں جو آپریشن ہوتے ہیں گھنٹوں چلتے ہیں اور ان میں ففٹی ففٹی چانس ہوتے ہیں مریض کے مرنے یا بچنے کے... لواحقین باہر سخت بدحواسی کے عالم میں دست بدعا رہتے ہیں... تم جیسے ہی دیکھو کہ اسپتال کے عملے کا کوئی فرد نہیں دیکھ رہا ہے... فوراً کسی عورت کے سامنے جا کے کہو... اپنے پیارے کی زندگی کا صدقہ دے۔ اور یہ ملٹی پرپز جملہ ہے۔ اس میں تم مائی یا بہن کا لفظ استعمال کر سکتے ہو... یہ دیکھ لو کہ کون عورت زیادہ رو رہی ہے... پھر اس جملے کا اثر دیکھو... وہاں وہ سب صدقہ خیرات کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں... لینے والا کوئی نہیں ہوتا... آزما لو کہ وہ سو سو کے نوٹ یوں دیتے ہیں جیسے ایک کا نوٹ... تم کو ہزار بھی مل سکتے ہیں... کسی اہلکار سے معاملہ پکا کر لو۔ آدھے اس کے آدھے تمہارے... ہر روز نئے مریض ہوں گے اور نئے صدقہ دینے والے۔ انتہائی نگہداشت کا یونٹ بھی ایسی ہی جگہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں راجا کا گلا گھونٹ دوں... کتنی جذباتی بے حسی کے ساتھ وہ لوگوں کا جذباتی استحصال کر رہا تھا اور صدقے کے بدلے ان کو جھوٹی دعاؤں کی تسلی دے رہا تھا۔

"دیکھو... تم مشتعل ہو رہے ہو۔" وہ بولا۔ "مگر میں مجبور ہوں اس کمینگی پر... میں پری کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اغوا اور قتل کی بات تو کر سکتا ہوں مگر ایسا کر نہیں سکتا... میرا ٹارگٹ پانچ لاکھ ہے۔"

"اور اس میں سے تم کتنے جمع کر چکے ہو اب تک؟" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ڈھائی لاکھ۔" وہ بولا۔ "اگلے سال..."

"تم اگلے سال کی بات کرتے ہو... اب اگر تم نے یہ بدمعاشی نہ چھوڑی تو میں تمھارا وہ حشر کروں گا..."

"سکندر صاحب! میں بہت برا آدمی ہوں... مگر میں سب سے برا آدمی نہیں ہوں... میں غلط ذرائع اختیار کرتا رہا... یہ غیر اخلاقی ذرائع تھے... لوگ تو غیر قانونی ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ چوری، ڈکیتی اور اسمگلنگ سے پیسہ جمع کرتے ہیں۔ کسی مقصد کے بغیر یا کسی ناجائز مقصد کے لیے... ملک میں تفرقہ پھیلانے کے لیے... لاشوں کی سیاست کے لیے... شراب اور شباب پر لٹانے کے لیے... میرا مقصد تو نیک ہے نا... جب میں اُو کچھ نہیں کر سکتا... تو پھر کیا کروں...؟"

"بکواس بند کرو اپنی..." میں نے کہا۔ "آج رات کو تمھیں ڈھائی لاکھ مل جائیں گے۔"

"کہاں سے مل جائیں گے؟"

"میں دوں گا تمھیں..." میں نے کہا۔ "اور تم کل ہی ایک خط ڈالو گے، اس یہودی کے نام... کہ تم واپس وطن آ رہے ہو... وہ سب لے کر جس کا تم نے وعدہ کیا تھا... تم کوٹھی خریدو گے... کار خریدو گے اور ایک لاکھ کا بیلنس اسے دکھا دو گے... مگر اس کے بعد تمہارے پاس جو ایک سال بچے گا وہ میرے پاس گروی رہے گا..."

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم شادی ایک سال کے بعد کرو گے... یہ ایک سال تم مجھے دو گے اور اپنے وطن کو دو گے... اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔"

"لیکن... اس ایک سال میں اس یہودی نے... پری کی شادی کسی اور سے کر دی تو؟"

"تم فکر مت کرو... اس کا انتظام بھی میں کروں گا... پری تمھاری رہے گی... میں صرف ایک بار اس کے باپ کو سمجھانے جاؤں گا... پھر دیکھنا وہ سمجھتا ہے یا نہیں..." میں نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ تم مجھے ایک سال کی تاخیر سے ملے۔ ورنہ یہ سب نہ ہوتا جو تم نے کیا... مجھے تو شرم آتی ہے یہ سوچ کر۔"

"بے شرم بننا آسان نہیں تھا... مگر میں شرم کرتا تو محبت کی دکان بند ہو جاتی... پری کو کالا دیو لے جاتا یا کانا جن..."

"چلو چھوڑو... آؤ اندر چلیں۔" میں نے کہا۔ "باقی بات رات کو کریں گے۔"

"تم واقعی مجھے ڈھائی لاکھ دو گے... بے سبب؟" وہ بولا۔ "میرا دماغ خراب کیوں کرتے ہو؟"

"تمھارا دماغ پہلے سے خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں تم کو ڈھائی لاکھ بے سبب نہیں دے رہا ہوں... تم کو سیدھے راستے پر لانے اور محبت پر اختیار کے لیے دے رہا ہوں... مجبوری نے تم کو منفی سوچ دے دی تھی۔ تم کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تم محبت میں اندھے ہو کر کدھر جا رہے ہو... میں تم کو روشنی دے رہا ہوں۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور سامنے دیکھتا رہا۔ اس بنچ پر ہم دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق بیٹھے ہوئے تھے اور بنچ ایک فٹ پاتھ کے آخری حصے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جنگلا سا تھا جس کے اندر ڈرم اور کریٹ ٹوٹی پھوٹی مشنری

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

پیلے ٹماٹر اور زمانے بھر کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

"چلو اب چلیں۔" میں نے کہا۔ "تم اس علاقے سے واقف ہو نا...؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر دوست محمد مل جائے تو...؟"

"تو تم رُک جانا..." میں نے کہا۔ "میں تم سے دس بیس قدم پیچھے رہ کر بھیک بھی مانگتا رہوں گا اور تم پر بھی نگاہ رکھوں گا۔"

میں اس کے پیچھے دس قدم کے فاصلے سے روانہ ہوا... وہ جس دروازے سے گزرا اس میں سے بیک وقت بہت سے لوگ آ جا رہے تھے... ان میں مزدور قلی بھی تھے اور سامان لانے لے جانے میں مدد کرتے والے بھی... کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ... انشورنس ایجنٹ... اسمگل ہو کر آنے والے سامان کی تاک میں پھرنے والے۔ بار ا مارکیٹوں کے دلال بھی... آدھے دام پر ہر مال نکال لینے والے بھی... خفیہ راستوں کے ماہر بھی اور چور دروازوں پر متعین چوروں کے نمائندے بھی... یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں اکثریت تین طرح کے افراد پر مشتمل تھی۔ ایک لوٹنے والوں کی... دوسری لٹنے والوں کی اور تیسری دلالوں کی جو لوگوں کو فائدے کی بات سمجھاتے تھے اور سمجھدار لوگ اپنا نقصان نہیں کرتے تھے... کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ اس سے نقصان حکومت کو ہوتا تھا۔ اُس درآمد کنندہ کو ہوتا تھا، جو جائز طریقے پر مال امپورٹ کرتا تھا اور حکومت کو سارے واجبات ادا کرتا تھا۔ یہ کسمپرسی کی دنیا تھی جہاں اپنی ذات سے وابستہ مفاد کے سوا کوئی کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔

مجھے بھی کسی نے نہیں دیکھا... بھیک مانگنا واقعی مشکل کام تھا۔ معلوم نہیں مجبور آدمی کس طرح دستِ سوال دراز کرتا ہے اور اس کے لیے کتنی بار وہ اپنی عزتِ نفس کو قتل کرتا ہے۔ جو کچھ میں کر رہا تھا وہ عزتِ نفس کا نہیں اپنے تحفظ کا مسئلہ تھا... مجھے چھُپ کر سب کے درمیان رہنا تھا اور کھُلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہنا تھا... یہ سراغرسانی کا مشن بھی تھا۔ مجھے بیک وقت ملک دشمنوں کی مشتبہ سرگرمیوں پر بھی نظر رکھنی تھی اور رابعہ کو بھی تلاش کرنا تھا... اپنے فقیرانہ لباس کے باعث میں بہت غیر نمایاں ہو گیا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنے گداگر مجھ سے زیادہ پھٹے پرانے کپڑوں میں مظلومیت کی تصویر بنے دردمند دل رکھنے والوں کو متوجہ کرنے کے لیے رقت آمیز پیرائے میں... خُدا رسولؐ کے واسطے دے کر... اپنے دکھ اور مصائب کی جھوٹی کہانیاں سنا رہے تھے اور پیسہ کھینچ رہے تھے۔ ان کے زخم مصنوعی تھے... ان پر خون نہیں تھا، لال رنگ تھا... ان کا کوڑھ مصنوعی تھا۔ بس ان کی آواز میں مظلومیت کی پکار اصلی لگتی تھی۔ اس فن سے ان کا معاش وابستہ تھا، چنانچہ وہ اپنا سارا کمالِ فن اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ دردناک بنانے میں صرف کر رہے تھے اور ایسی ایسی باتیں گھڑ رہے تھے کہ حساس دل رکھنے والے کا ہاتھ خود بخود جیب میں چلا جائے۔

پہلے چند قدم میں خاموش چلتا رہا... پھر میں نے جھک کر ایک ٹوٹا ہوا بانس اُٹھا لیا جو غالباً کسی فرش صاف کرنے والے برُش کا باقی ماندہ حصّہ تھا اور بے کار سمجھ کے پھینک دیا گیا تھا۔ اس کو لاٹھی بنا کے میں نے تھوڑا سا جھک کر چلنا شروع کیا۔ میں نے ایک موٹی توند والے ادھیڑ عمر کے سیٹھ ٹائپ شخص کو اپنے قریب سے گزرتا دیکھا۔ "ارے بابا۔" میں نے اس ، واسکٹ پکڑ لی۔ "دے جا کچھ..."

"کیا دے جاؤں... یہ واسکٹ؟" اس نے واسکٹ چھڑالی۔

میں پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔ "اللہ تجھے کینسر نہ دے... تیرا ہارٹ فیل نہ ہو... تو کسی بس کے نیچے آ کے نہ مرے۔"

وہ شخص ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ "یہ لو..." اس نے اپنی واسکٹ میں سے سو کا نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب اللہ کرے کہ یہ سب تیرے دشمنوں کے ساتھ ہو۔" میں نے دعا دی۔ "سو روپے میں تو بچ گیا بچہ... اب ذرا اپنے دشمنوں کو بھیج دے... یا ان کا نام پتا بتا دے۔ فون نمبر بتا دے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"انھیں بھی تو ایسی ہی دعا کی ضرورت پڑ سکتی ہے بابا۔" میں نے کہا۔

"یہی دعا تم ان کے لیے بھی کرو گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے بابا... فقیر کا تو کام ہی دعا دینا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ زیادہ سخی ہوں... دو سو روپے والی دعا لیں... جو زیادہ پاور فل ہوتی ہے... پانچ سو والی اسپیشل بد دعا لیں تیرے خلاف کیونکہ وہ تیرے دشمن ہیں... آگے اللہ کی مرضی... فقیر کی دعا سُنے یا بد دعا۔"

اس شخص کا غصّہ اور بے بسی کی حالت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آنے والی تھی لیکن وہ جلدی میں تھا اور جو سو کا نوٹ میں اندر والے کھیسے میں ڈال چکا تھا، وہ واپس نہیں ہو سکتا تھا... وہ مجھے گھورتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ میں نے اُسے اچھا سبق دیا تھا۔ اپنے حق میں کسی اوٹ پٹانگ مجذوب سے دعا کرانے والے اور دشمن کے لیے تباہی مانگنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا وہ دشمن بھی تو یہ سب کچھ ... دعائیں اور بد دعائیں، تعویذ گنڈے... جادو ٹونے... سفلی ... اور اگر یہ تقدیر کے فیصلے یوں بدلنے لگیں تو کاتبِ تقدیر کا نوشتہ حرف غلط ہو جائے۔

راجا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک برقع پوش عورت سے دس روپے ٹھگے... صرف اس دعا پر کہ اللہ تجھے سوکن سے بچائے اور ساس سے نجات دلائے۔ پھر اچانک ایک مونچھوں والے نے مجھے لات ماری... میں مُنہ کے بل گرنے سے بچا۔

"تو کون ہے بے؟ کس کا آدمی ہے؟"

"کیا تو آدمی نہیں ہے بچّہ... ہم تو اللہ کے بندے ہیں۔" میں نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا۔ وہ بھاری بھرکم جسم، لمبی مونچھوں والا کرخت صورت شخص کوئی بدمعاش تھا۔ اس نے مجھے گلے سے دبوچ لیا۔

"چکر بازی کرتا ہے..." اس نے مجھے ایک گالی دی۔ "کس کی اجازت سے آیا ہے یہاں کمائی کرنے؟ سالے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا... جانتا نہیں یہ میرا علاقہ ہے۔"

"ارے معاف کر دو استاد۔" میں نے گڑگڑا کے کہا۔ "بھول ہو گئی ہم سے کہ تم سے لائسنس نہیں لیا۔"

اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ "کہاں سے آیا ہے؟"

"حیدر آباد سے استاد۔" میں نے کہا۔ "اڈا ختم ہو گیا تھا۔"

"دیکھ... ہم سے ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔" وہ بولا۔ "یہ کراچی ہے کراچی... نکال پچّیس روپے۔"

"پچّیس روپے؟... یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"زیادہ ہیں تو باہر نکل..." وہ بولا۔ "باہر کھڑے رہنے کے بھی دس روپے دینے پڑیں گے۔"

"کس کو... تمھیں؟"

"نہیں... وہ دوسرا ٹھیکیدار ہے۔" وہ بولا۔ "یہاں فائدے میں رہے گا... آج دو جہاز لگ رہے ہیں۔"

"مگر استاد ابھی تو دہاڑی شروع ہوئی ہے۔"

"یہ کراچی ہے کراچی... یہاں اُدھار نہیں چلتا بیٹا۔" وہ بولا۔ "پیسے صبح آتے ہی بھتا دے دو... پھر شام تک بے خوف پھرو... جو ملے تمھاری قسمت کا وہ تمھارا... سات بجے باہر..."

"سات بجے کیوں استاد؟"

"سات بجے کے بعد دوسرے ٹھیکیدار کے آدمی آ جاتے ہیں۔ تو حیدر آباد سے نیا آیا ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا..." میں نے پچّیس روپے نکال کے اُسے تھمائے۔ "کیا میں شام کی شفٹ میں نہیں جا سکتا؟"

"وہ تیری مرضی... پچاس روپے لگتے ہیں۔" وہ بولا۔ "رات سے صبح تک۔"

"رات کے ڈبل کیوں؟"

"ابے ساری کمائی تو رات کو ہی ہوتی ہے... مگر یہ اچھی بات نہیں ہے... فیصلہ کر لے آج کہ دن میں رہے گا یا رات کو۔" وہ جاتے جاتے بولا۔ "اپنی اور اس کی بہت لگتی ہے۔"

جب وہ چلا گیا تو میں راجا کے پیچھے بھاگا۔ وہ بہت دُور نکل گیا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں بھیڑ بھاڑ میں اُسے گم نہ کر دوں۔ فقیروں کے ٹھیکیدار سے ملاقات کا تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ راجا ایک لانچ کے کسی ملازم سے بات کر رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا؟" میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دوست محمد تو یہاں بہت ہیں مگر ان میں ملینگ کوئی نہیں ہے۔"

"یار! ایک شخص نے مجھ سے پچّیس روپے رکھوا لیے... بڑا بدمعاش بن رہا تھا۔"

"ٹھیکیدار ہو گا اس علاقے کا۔"

"کیا مطلب... میں بھیک بھی نہیں مانگ سکتا یہاں؟"

"نہیں... یہاں بھتا سب کو دینا پڑتا ہے... تو خوانچہ لگا یا ریڑھی... بھیک مانگ یا مزدوری کر... جس ٹھیکیدار کا علاقہ ہے، وہ اپنا حصّہ وصول کیے بغیر تجھے گھُسنے نہیں دے گا۔" وہ بولا۔

"مزدور کی مزدوری میں سے بھی حصّہ بٹاتے ہیں وہ؟"

"مزدوری ملتی ہی ان کے ذریعے ہے۔" وہ بولا۔

"یہ ٹھیکیدار کیا ہوتا ہے؟"

"مڈل مین... وہ سب کو ان کا حصّہ پہنچاتا ہے۔ پولیس کو... بندرگاہ کے ان مہربان حکام کو جو فقیروں کو اندر آنے دیتے ہیں... نیچے سے اوپر تک سب کو خوش تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ٹھیکیدار مشکل سے دس اپنے پاس رکھے گا۔ باقی پندرہ دوسروں میں تقسیم کرے گا۔"

"جو باتیں تم مجھے بتا رہے ہو، کیا یہ دوسرے نہیں جانتے؟"

"کیوں نہیں جانتے۔" راجا نے کہا۔ "پریس اور پبلک کی آواز کوئی نہیں سنتا... اپنی اپنی کمائی کے وسیلے یہ لوگ کیسے بند کر سکتے ہیں... ابھی تم دن بھر پھر کے دیکھو... کیسے دلچسپ تجربات ہوں گے... یہ بتاؤ کمائی کتنی ہوئی؟"

"ایک سو دس روپے منفی پچّیس روپے۔" میں نے کہا۔

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "اتنی سی دیر میں ایک سو دس مل گئے؟"

"دینے والے کی مرضی۔" میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔

شام تک ہمیں دوست محمد کی تلاش میں کوئی خاص کامیابی

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

حاصل نہیں ہوئی۔ ایک شخص سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس قسم کا ایک آدمی ہے تو سہی مگر وہ کہاں ملے گا... یہ کوئی نہیں بتا سکتا... میں نے تقریباً پانچ سو روپے کمائے۔ آدمی کی صورت اس کا حلیہ اور پریشانی دیکھ کر حسبِ ضرورت دعا دی۔ شام تک میں تھک گیا اور ایک جگہ بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔

"حق اللہ..." میں نے نعرہ لگایا۔ "جو دے اُسے خدا دو بئی کا ویزا دے... جو نہ دے اس کا جہاز گرے۔"

ایک نوجوان چلتے چلتے واپس آ گیا۔ اُس نے مجھے دس روپے دیے اور کہا۔ "بابا... بس دعا کرو آج ویزا مل جائے کل سو دوں گا اگر یہ دعا قبول ہو گئی... السلام علیکم..."

"اللہ کرے تیری چھت تجھ پر نہ گرے۔" میں نے ایک فیملی کو جاتے ہوئے دیکھ کر صدا لگائی: "تجھے کرنٹ نہ لگے۔ تیرے بچوں کو خسرہ نہ ہو... خناق اور کالی کھانسی نہ ہو... کسی کو پاگل کتا نہ کاٹے۔" عورت رک گئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ مجھے دس روپے نذر کیے۔ اس کا شوہر ٹر ٹر کرتا رہا کہ یہ سب فراڈی لوگ ہیں۔ ورتم آ جاتی ہو ان کی باتوں میں... اتنی مضبوط چھت ہے... گر کیسے سکتی ہے۔ اور بچوں کو تو ہم نے سارے ٹیکے لگوائے ہیں... یہ مجھے پاگل کتا کہہ رہا ہے۔"

مگر عورت کی سوچ جذباتی اور غیر منطقی ہوتی ہے اور اس کی محبّت تحفظ مانگتی ہے۔ خواہ وہ کہیں سے بھی ملے... کسی جھوٹے آسرے سے یا تسلی کے دو بولوں سے۔

مجھے کچھ ناخوشگوار تجربات بھی ہوئے... بہت سے لوگوں نے مجھے دھتکارا۔ چند ایک نے گالیوں سے نوازا اور شرمندہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ ہٹے کٹے مشٹنڈے ہو... کام کیوں نہیں کرتے... میں نے جواب میں کہا کہ جاؤ بابا تم کام کرو۔ فقیر کا ٹائم مت ضائع کرو۔ پھر ایک پولیس والا آ گیا۔ اس نے مجھے شوقیہ ایک ڈنڈا رسید کیا اور مجھ سے دس روپے مانگے۔

"بابا صبح دے تو دیے ہیں پچیس روپے۔" میں نے فریاد کی۔

"نکال دس روپے۔" وہ آنکھیں نکال کے غرّایا۔ "ورنہ ابھی چرس برآمد کر لوں گا۔"

میں نے اسے بادلِ ناخواستہ دس روپے دیے۔

"سگریٹ نکال۔" وہ مطمئن ہو کے میرے پاس ہی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ "ایک نمبر ہے کہ دو نمبر..."

"میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ اس کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔

"او نہ پی میاں... پلیں تو دے۔" وہ جھلا کے بولا۔

کیا عجیب بات ہے... جو سگریٹ نہ پیتے ہوں وہ بھی پلانے کے لیے ضرور اپنے پاس رکھیں۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "آج بچی نہیں۔"

سپاہی کا منہ لٹک گیا۔ "باہر سے جہاز آیا ہے نا... ایک نمبر کی پانچ میں بک گئی... دو نمبر کی تین روپے میں... اچھا... اِدھر دیکھتا ہوں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ایک نمبر اور دو نمبر سگریٹوں کے نشئی ہیں۔ اندر فقیر بھی یہ دھندا کرتے ہیں۔ ممکن ہے قلی بھی کرتے ہوں... وہ جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔

"تو نیا آدمی ہے... ایک کام کرے گا؟"

"کیسا کام؟" میں نے کہا۔ "کوئی فائدے کا کام ہے؟"

"پانچ سو مل سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "سو میرے ہوں گے۔"

"اچھا... کام کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"صبح اکیاسی نمبر ملے گا تجھے۔"

"اکیاسی نمبر کیا؟"

"او پاگل دے پتر... اکاسی نمبر قلی اور کیا۔" کانسٹیبل خفا ہو کے بولا۔ "اس کے ساتھ ایک گورا ہو گا۔"

"گھوڑا... کیسا گھوڑا... کالا یا سفید...؟"

سپاہی نے مجھے ایک ڈنڈا رسید کیا۔ "گھوڑا نہیں گورا... ولایت کا رہنے والا... وہ تجھے ایک سگریٹ کی ڈبی دے گا... بگلہ مارکہ وہ اپنے ساتھ اندر لے آنا۔ اندر بیاسی نمبر تجھ سے ڈبی لے کر پانچ سو دے گا۔ ڈبی کھولنی نہیں ہے۔ میرے دو پتے ہوں گے۔"

اکیاسی بیاسی... بگلہ مارکہ سگریٹ... دو پتے... میری عقل چکرا گئی۔ لیکن میں نے اس معمے کو حل کر لیا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں یقیناً چرس یا کوئی ایسی ہی چیز ہو گی... جو کوئی گورا امریکی برطانوی... فرانسیسی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہو گا۔ اس کے لیے کسٹم کی چیک پوسٹ سے گزرنے کا عمل خطرناک تھا۔ تلاشی میں چرس برآمد ہو سکتی تھی۔ پھر اُسے کسٹم والوں سے سودا کرنا پڑتا جو شاید پانچ ہزار مانگتے۔ ایک فقیر کے ذریعے اس کا کام پانچ سو میں ہو رہا تھا۔ کسٹم والے پرانے فقیروں کو بھی پہچانتے ہوں گے جو یہ کام کر کے ان کا حق مارتے ہوں گے... مگر میں نیا تھا۔ ایک پولیس مین کے ذریعے اکیاسی بیاسی نمبر کے قلیوں سے معاملات طے کرتے تھے۔ اس میں پولیس والے کا حصّہ دو سو روپے تھا۔ سو سو کے دو نوٹ... شاید سو وہ خود رکھے گا اور سو دونوں قلیوں میں بانٹ دے گا۔

میرا خون کھولنے لگا... یہ کیسے لوگ تھے جو سو پچاس روپے کے لیے ملک کے قانون کو دھوکا دے رہے تھے... معلوم نہیں ایسے کتنے لوگ تھے۔ کہاں کہاں موجود تھے جو دونوں

ہاتھوں سے قومی خزانے کا مال اپنی جیبوں میں ڈال رہے تھے۔ یہ سب ملک دشمن اور غدار لوگ تھے جو فقیر اور محنت کش مزدور اور پولیس مین کا روپ دھارے پھر رہے تھے... بے شک سب ایسے نہیں تھے مگر بدنام تو سب ہی ہو رہے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان میں شریف، فرض شناس اور محبِّ وطن کتنے ہیں۔ آٹے میں نمک کے برابر یا نمک میں آٹے کے برابر۔

سات بج گئے تھے اور گداگری کے "قواعد و ضوابط" کے مطابق مجھے دوسری شفٹ والوں کے لیے جگہ خالی کرنی تھی۔ راجا کی بات اب مجھے درست نظر آ رہی تھی... یہ سارے کالے دھندے رات کی تاریکی میں زیادہ بے باکی سے ہوتے ہوں گے... رات کی کمائی عورت کھائے تو فاحشہ... کسبی، طوائف... اور یہ جو اکیاسی بیاسی نمبر لگائے پھر رہے ہیں پولیس کی پیٹی باندھے پھر رہے ہیں... کالی رات کی ساری سیاہی اپنے چہرے پر مل رہے ہیں... یہ کیا ہیں؟ کیا یہ طوائف سے زیادہ قابلِ نفرت، بدکردار اور رذیل نہیں؟

میں نے راجا کو بتا دیا تھا کہ میرا اس کے ساتھ رہنا ممکن نہیں... ایک پٹھانے فراسا اور ایک پولیس مین کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے میرا راستہ روکا تھا اور اس عرصے میں راجا دو بار میری نظر سے اوجھل ہوا تھا۔ دو بار میں نے اسے تلاش کر لیا تھا مگر تیسری بار میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کی اور میری ملاقات کہاں ہو گی۔ اس کے نہ آنے سے مجھے کچھ تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ ایک خیال تو یہی تھا کہ مجھے رات کی گداگری کا ٹھیکے دار نہ پکڑے۔ پچاس روپے کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے کان سے پکڑ کے باہر کر دے اور کہے کہ میں نے فی الحال ریکروٹمنٹ بند کر رکھی ہے اور نئے فقیر کی کوئی ویکنسی نہیں ہے۔

وہ خیال جسے میں بار بار جھٹک دیتا تھا، راجا پر میرے اعتماد کی بنیادوں کو ہلاتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فرار ہو جائے۔ اگر وہ فرار ہونے والا آدمی ہوتا تو میرے ساتھ ہی کیوں آتا۔ گزشتہ رات ہی بھاگ جاتا۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بات ہی نہ کرتا۔ اس کا گھر ابھی اکرام شیخ کے پاس تھا، مگر وہ پیسے کی پروا کہاں کرتا ہے۔ اس کے پاس دو لاکھ مدفون پڑے ہیں اور اسے وہ تمام ٹھکانے معلوم ہیں، وہ سب گر آتے ہیں جن سے دولت حاصل کرنا ممکن ہے۔ مجھے بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کیا ایک پڑھا لکھا شریف آدمی محبت میں اتنا مجبور بھی ہو سکتا ہے کہ رسوائی تک قبول کرے، خود اپنی نظر میں گرنا قبول کرے، اپنی عزتِ نفس کو بھول جائے۔ اصل بات وہی ہے

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا... پہلے عشق کے جو کلاسیکی افسانے مشہور ہوئے ان میں عاشقوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا مجنوں فقیر بن کے لیلیٰ کے در پر سوالی نہیں ہوا تھا۔ کیا فرہاد نے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کا ناممکن ٹھیکا نہیں لیا تھا؟ ایک صاحب وہ تھے کہ انھوں نے اپنی ران کے کباب بنا کے محبوبہ کو ارسال کر دیے تھے، حالانکہ محبوبہ قطعی آدم خور نہیں تھی۔ پھر راجہ نے پانچ لاکھ جمع کرنے کی شرط قبول کر لی اور اس کے لیے یہ راستہ اختیار کر لیا تو اسے عشق کے سوا کیا سمجھا جائے گا؟

راجا کی آمد نے میرے خیالات کا تسلسل ختم کر دیا۔

"بھائی سکندر... وہ مل گیا۔" اس نے مسرّت سے اعلان کیا۔

میں نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "میرا نام لینا قطعی ضروری نہیں بلکہ بے وقوفی ہے۔"

"سوری... وہ جو دوست محمّد ہے نا... وہ ایک لانچ پر کام کر رہا تھا۔" راجا نے کہا۔ "لانچ کو لڑائی کرنے کے لیے لے گئے ہیں... رات تک آئیں گے واپس۔"

"کون سی لانچ ہے... نام، نمبر...؟"

"نام تو اس کا ہے 'دل جانی'... پچپن ہارس پاور کے انجن والی لانچ ہے۔" راجا نے کہا۔ "مالک کا نام بھی دوست محمّد ہے۔"

"یا مظہر العجائب... وہ بھی دوست محمّد ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... مگر مالک کا پورا نام دوست محمّد پردیسی ہے۔" راجا نے کہا۔ "اور وہ جو تمھارا دوست محمّد ہے نا... وہ بس دوست محمّد ہے۔"

"تو کچھ اندازہ ہے ان کی واپسی کب تک ہو گی؟"

"نہیں... نیا انجن بنایا ہے... معلوم نہیں کتنی دُور تک لے جاتے ہیں مگر چار گھنٹے سے پہلے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ رفتار کم ہو گی اور راستے میں خرابی نہ ہوئی تو وہ دو گھنٹے سیدھا جا کے لوٹیں گے۔"

"کیا وہ ابھی گئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ابھی دس منٹ پہلے۔" راجا نے کہا۔ "ذرا سی دیر ہو گئی ورنہ ان سے ملاقات ہو جاتی۔"

"اچھا... تو پھر تم جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں انتظار کروں گا۔"

"یہاں انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ فش ہاربر پہ جائیں گے واپسی پر۔" راجا نے کہا۔

"اچھا تو پھر تم نکلو، میں بھی آتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسی بینچ کے پاس جہاں ہم بیٹھے رہے تھے۔"

راجا نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی نے ہم پر شک نہیں کیا تھا۔ دیکھنے والوں نے یہی سمجھا ہو گا

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

کہ ہے کوئی فقیروں سے عقیدت رکھنے والا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک حواس باختہ مریل سا شخص میرے سامنے آ بیٹھا۔

"بابا جی... آج تو مہربانی کرو۔" اس نے کوئی چیز میری مٹھی میں دبا دی۔ میں نے کھول کے دیکھا تو وہ سو کا نوٹ تھا جسے اس نے بالکل تعویذ بنا لیا تھا۔

"کیا مانگتا ہے بچہ؟" میں نے آنکھیں بند کر کے اور جھوم کر کہا۔

"ایک نمبر... جو تقدیر بدل دے۔" وہ میرے پیر دبانے لگا۔ "اب تو کچھ نہیں رہا... سب ہار گیا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ سٹے کا نمبر پوچھ رہا ہے۔ "سیدھا ہو جا۔" میں نے گرج کے کہا۔ "الف ہو جا۔" میں نے انگلی اٹھا کے کہا۔ "ورنہ پچھتائے گا۔"

اس نے خوشی سے چیخ ماری۔ "ایک نمبر! میں سمجھ گیا بابا جی۔"

"تو نہیں سمجھا سؤر کے بچے... تیری سمجھ دانی ٹھیک ہوتی تو بہت پہلے ہی سمجھ جاتا تو۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ "ایک نمبر نہیں تو پھر؟"

میں نے اپنا دایاں ہاتھ اسے دکھایا۔ "یہ دیکھ۔" اور پھر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھل گیا۔

"پانچ نمبر۔" وہ پھر خوشی سے چلایا۔

"یہ بھی دیکھ۔" میں نے بایاں ہاتھ اٹھا کے کہا اور دوسرا تھپڑ اس کے دائیں گال پر پڑا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"اب میں بالکل سمجھ گیا... دس نمبر..." اس نے میرے ہاتھ چومے اور اپنے گال سہلانے لگا۔

"ہاں... دس نمبریے۔" میں نے کہا اور اٹھ کے چل پڑا... میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ کیسے کیسے طریقوں سے تقدیر بدل دینے والا نمبر نکالتے ہیں۔ اگر میں اس کے دو لاتیں رسید کر دیتا تو وہ سمجھتا کہ دو نمبر... یہ جھوٹے خوابوں کے پیچھے بھاگنے والے اور اپنا سب کچھ جھوٹی امیدوں پر ہارنے والے۔ انھیں کوئی کیسے سمجھائے کہ تقدیر تو کسی کے تابع نہیں... مگر تدبیر کا اختیار خدا نے بندے کو دیا ہے اور اس کے لیے عقل و شعور کی دولت سے نوازا ہے۔

باہر راجا میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے کباڑ خانے کی دیوار پھاند کر اپنا لباس بدلا۔ فقیری چغے کے نیچے میرے اپنے کپڑے بالکل ٹھیک تھے۔ وگ اور داڑھی مونچھیں اتار کے میں نے یہ سب اسباب ایک پرانے اخبار میں لپیٹا اور باہر آ گیا۔

"یہ تم نے... حلیہ کیوں بدل لیا؟" راجا پریشان ہو کے بولا۔

"یار ان پیڑوں کی بو مجھ سے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ ایک فقیر تمھارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھتا تو یہ بھی عجیب لگتا۔ اور ہم اکرام کے گھر بھی اسی حلیے میں پہنچتے تو..."

"اکرام کون ہے... وہی جسے میں محسن سمجھا تھا؟"

"ہاں... ڈبل ایس آئی شیخ۔" میں نے کہا اور ہم دونوں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ میں نے اسے اکرام شیخ اور ناز کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اب رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ چنانچہ ہم سڑک سے ہٹ کر چلتے ہوئے بالکل محفوظ تھے۔ وہاں کوئی رکشا یا ٹیکسی خالی بھی نہیں آ رہے تھے چنانچہ ہم چلتے رہے، ایک گھنٹے تک اور چلتے چلتے ٹاور جا پہنچے۔ اس ایک گھنٹے میں راجا کو ہم سب کے متعلق وہ باتیں بھی معلوم ہو گئیں جو اخباروں سے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔

"یار، میں تو تھک گیا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "چلو چائے پیتے ہیں۔"

"کافی نہیں مل سکتی کہیں؟" میں نے کہا۔

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہاں سارے ایرانی ہوٹل ہیں۔"

ایرانی ہوٹل کراچی کی اصطلاح میں ایک مخصوص فضا رکھنے والے ریسٹورنٹ ہیں۔ جس ہال نما کمرے میں ہم جا کے بیٹھے وہاں ہر میز کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ یہ کرسیاں بہت ہلکی تھیں اور غالباً بید کی لکڑی سے بنائی گئی تھیں یا ان کی سیٹ پر پلائی ووڈ تھی اور گول پشت والا حصہ بید کا تھا۔ چار کرسیوں کے درمیان ماربل ٹاپ میز تھی جس پر سلور کا جگ اور مگ رکھے تھے اور میل سے جگمگ کر رہے تھے۔ اندر بھانت بھانت کے لوگ کرسیوں کے اوپر پاؤں رکھے سڑپ سڑپ چائے پی رہے تھے، سموسے کھا رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک ویٹر نے بڑی پھرتی سے گیلا کپڑا ٹیبل ٹاپ پر مارا۔

"دو دودھ پتی۔" راجا نے کہا۔ "ڈبل... اور سموسے۔"

"یہ کیا منگوا لیا تم نے... ہم چائے پینے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"ابھی پیو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے چائے ہی منگوائی تھی۔" راجا بولا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیا۔ وسیع و عریض کاؤنٹر کے پیچھے ایک سرخ و سفید اور موٹا تازہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر ملکہ فرح دیبا اور شاہ ایران کی تصویر ایک فریم میں لگی ہوئی تھی۔ باقی دیوار پر لکڑی اور شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں جنرل اسٹور کا تقریباً سب سامان موجود تھا۔ بسکٹ، پاؤڈر اور ٹوتھ پیسٹ سے لے کر شو پالش تک۔ یہ بھی ایرانی ہوٹلوں کا خاصہ ہے... پنجاب یا سرحد میں ریسٹورنٹ صرف چائے لسی یا کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایرانی ہوٹل بیک وقت ریسٹورنٹ اور جنرل اسٹور ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگ سنگل چائے پی رہے تھے۔ ایک ہی ساسر کے آدھے بھرے ہوئے

کپ کے لیے وہ صرف چار آنے دیتے تھے اور پھر ان کی مرضی وہ جب تک چاہیں بیٹھے رہیں۔ بیرا ان کے سامنے بل لا کے نہیں رکھے گا کہ چلیے صاحب جگہ خالی کیجیے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص بار بار ایک لرزہ خیز گھنٹی بجا کے کسی ویٹر کو متوجہ کرتا تھا... ویٹر کہیں بھی ہو کاؤنٹر کی طرف دیکھتا ہے اور اگر اس گاہک کو موجود پاتا ہے جس کو اس نے سرو کیا تھا تو بانگ دہل اعلان کرتا ہے۔ "کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنہ۔" یہ لطیفہ بہت عام ہے۔ بیرا ہر گاہک کا بل یوں چیخ کر بتاتا ہے کہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مالک شور و غل کے باوجود صاف سن لے۔

ویٹر نے دھڑام سے درمیان میں چائے کے دو کپ رکھے۔ ایک پرچ میں دو سموسے اور دوسری میں چٹنی رکھی اور غائب ہو گیا۔ میں نے چائے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ بالکل رابعہ کے رنگ کی طرح تھا۔ کھلتا ہوا سنہری مائل سفید۔ یہ ایک خوش ذائقہ گاڑھا میٹھا اور گرم مشروب تھا اور اسی تعریف پر پورا اترتا تھا کہ ایک دوشیزہ کے لبوں کی طرح... اس میں گرمی بھی ہے مٹھاس بھی ہے۔ مگر میں نے اسے چائے ماننے سے انکار کر دیا۔ راجا نے مجھے اس دل پسند مشروب کی تیاری کا فارمولا بتایا جس کے مطابق دودھ میں چائے کی پتی ڈال کے اتنی دیر ابالا جاتا ہے کہ پتی گل جائے۔ پھر چینی ڈال کے جوش دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مکسچر سے شیرے کی مہک آنے لگے۔ چائے کی دوسری قسم "کڑک" تھی۔ اس میں دودھ کم اور پتی زیادہ ڈالی جاتی تھی اور اس کا ذائقہ تلخ سمجھا جاتا تھا — عموماً یہ ٹاپھٹ ہوتی تھی۔ چائے کے تیار کنندگان صبح سے شام تک حسب ضرورت ایک سماوار یا پتیلے میں وقفے وقفے سے چورا چائے اور پانی ڈال کے ابالتے رہتے تھے اور سارا دن اوپر سے جوشاندہ نکال نکال کے گاہکوں کو پلاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے دن میں ایک دو بار جب برتن میں نیچے چائے کی پتی اتنی بھر جاتی ہو کر پانی ڈالنے کی گنجائش نہ رہتی ہو تو اسے خالی کیا جاتا ہو۔ عام طور پر صبح ڈالی جانے والی پتی تازہ دم پتی کے ساتھ ایسے ہی ابلتی رہتی تھی جیسے جہنم میں نئے پرانے گنہگار ایک ساتھ جلیں گے۔

"یار میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا آخر... کہ تم نے مجھ پردیسی کے ساتھ یہ دھوکا کیا؟" میں نے مظلوم آواز بنا کے کہا۔

راجا بھونچکا رہ گیا۔ "دھوکا... تمھارے ساتھ؟"

"ہاں میرے ساتھ... تم نے کہا تھا کہ چائے پلاؤں گا... اس میں چائے کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ تو کچھ مائع قسم کی ربڑی ہے۔"

راجا ہنسنے لگا۔ "اچھا میں چائے منگاتا ہوں۔"

اس نے پھر ویٹر کو چیخ کر متوجہ کیا اور اسے "ایک اسپیشل" لانے کو کہا۔ ویٹر نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا۔ دوسری مرتبہ وہ ایک ٹرے کے ساتھ حاضر ہوا۔ اس میں چائے کے تمام اجزائے ترکیبی الگ الگ پائے جاتے تھے یعنی قہوہ... دودھ اور چینی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس شہر میں چائے بھی ملتی ہے۔

جب میں سموسے کو توڑ کے نگلنے کی مشق کر رہا تھا تو میری نظر بھٹک گئی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو اجنبی تھے۔ پہلے شخص کی میری طرف پیٹھ تھی لیکن میں اس کا سائڈ پوز دیکھ کر اسے پہچان گیا تھا۔ یہ وہی پکر باز ڈرائیور تھا، جو افتخار عارف کے کوارٹر سے فرار ہو گیا تھا۔

میں ایک دم کرسی سے اٹھا۔ "راجا... تو ادھر آ جا۔"

راجا نے مجھ سے کرسی بدل لی۔ "اس کرسی میں کھٹمل ہیں کیا... کراچی میں رہنا ہے تو..."

"یار پیچھے ایک شخص بیٹھا ہے۔"

"تمھارے پیچھے دس اشخاص بیٹھے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"وہ جس نے دھاری دار واسکٹ پہن رکھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ... ہاں... اس کے ساتھ والے نے قراقلی ٹوپی لگا رکھی ہے۔"

"ساتھ والے کو گولی مارو۔" میں نے کہا۔

"پستول تمھارے پاس ہے۔" راجا نے کہا۔ "مگر خیر... لاؤ۔"

"راجا... یہ مذاق کی بات نہیں۔ اس آدمی کا پتا کرنا ہے۔ کیا نام ہے اس کا اور کہاں رہتا ہے۔ یہ ایک خطرناک گروہ کا آدمی ہے اور غالباً اسی نے افتخار عارف کا قتل کیا ہے۔ اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے۔ یہ مجھے پہچانتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمھیں نہیں جانتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو... میں اس کے پیچھے لگ جاؤں... نہیں دوست... میں اس مرحلے پر فوت ہونا نہیں چاہتا جب کہ میں نے عشق کا آدھا امتحان پاس کر لیا ہے۔" وہ بولا۔

"یار عقل اور ہمت سے کام لو... دور رہ کے دیکھو... یا قریب جا کے ان کی باتیں سنو۔" میں نے کہا۔ "شاید کسی کا نام معلوم ہو جائے... انتظار کرو باہر... شاید یہ کسی کار میں آئے ہوں تو کار کا نمبر پتا چل جائے... میں جا رہا ہوں۔"

"اگر تم نے وہ فقیری لباس نہ بدلا ہوتا تو تمھیں کسی کا ڈر نہ ہوتا اور تم خود یہ کام کر لیتے۔" راجا نے مجبوراً سر ہلایا... میں سیدھا دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کے پان سگریٹ کی ایک دکان پر رک گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ خرید کے میں سائن بورڈ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ میں دوسری سگریٹ سلگا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

رہا تھا کہ وہ تینوں نمودار ہوئے اور مخالف سمت میں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ان کے پیچھے راجا نمودار ہوا۔ اس کی نظریں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔

"کچھ پتا چلا۔" میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔

وہ اچھل پڑا۔ "ہاں... اس کے بارے میں تو نہیں مگر وہ جو قراقلی ٹوپی والا تھا نا... اس کا نام سیٹھ اکبر ہے۔ ویٹر اور منیجر سب اسے جانتے ہیں۔ وہ یہاں آتا رہتا ہے۔"

"اچھا؟ پھر میں آیا ایک منٹ میں۔" میں نے کہا اور لوٹ کر ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ میں نے کاؤنٹر کے پاس رک کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر منیجر کے پاس چلا گیا۔

"وہ... سیٹھ اکبر نہیں آیا؟"

"آیا تھا... چلا گیا..." منیجر نے مختصراً کہا اور اپنے کام میں مصروف رہا... وہ مختلف درازوں میں سے سکے، نوٹ اور ٹوکن نکال کے گاہکوں اور ویٹروں کو دے رہا تھا۔

میں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ "اپن کو یہی ڈر تھا۔ تھوڑا دیری ہو گیا، پر اپن کیا کرے... سالا ٹرین اتنا لیٹ تھا۔"

"کام کا بات کرو بابو... سیٹھ اکبر کو ملنے کا مانگتا ہے؟" بے حد مشینی انداز میں کام کرنے والے منیجر نے پوچھا۔

میں نے سر ہلایا۔ "سیٹھ اکبر کا بوت نقصان ہو جائیں گا۔"

منیجر نے کھٹاک سے ایک دراز کھولی، ایک پرچی اور بال پوائنٹ نکال کے کچھ لکھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے پرچی مجھے تھمادی اور وہ بے حد کرخت آواز والی گھنٹی دبادی جو بالکل فائر الارم کی طرح تھی۔ میں پرچی کو دیکھتا ہوا باہر آ گیا۔ اس پہ لکھا ہوا تھا: "میٹھی بائی بلڈنگ، حاجیانی لین... کھارادر... تیسرا مالا۔"

راجا نے مجھے سمجھایا کہ یہ مکمل پتا ہے۔ ہم کھارادر کے علاقے سے دُور نہیں تھے۔ حاجیانی لین کو تلاش کر سکتے تھے اور پھر آسانی سے میٹھی بائی بلڈنگ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود کو راجا کے سپرد کیا۔ بقول فلمی شاعر 'مانجھی میری قسمت کے جی چاہے جہاں لے چل...' میں خود اس بیکراں شہر کے جغرافیے سے بالکل بھی واقف نہیں تھا۔

راجا ایک ماہر سراغ رساں ثابت ہوا۔ اس نے پرانے شہر کی پُرپیچ گلیوں میں مختلف افراد سے انہی کی زبان میں رہنمائی حاصل کی اور حاجیانی لین تلاش کر لی۔ اس تلاش میں ہم وزیر مینشن کے سامنے سے بھی گزرے جو قائدِ اعظم کی جائے پیدائش تھی اور اب ایک قومی یادگار۔ اس وقت عمارت بند تھی چنانچہ میں نے اس کے در و بام کو جذباتی وابستگی کے ساتھ دیکھا اور ایک عجیب احساس سے دوچار ہوا۔ میں نے اس شخص کا مزار بھی ایسے ہی گزرتے گزرتے دیکھا جسے قوم نے بابائے قوم کا خطاب دیا تھا۔ اب میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں پیدا ہونے والے ایک بچے نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی ناقابلِ فراموش جنگ لڑی تھی۔ ایک قوم کی رہنمائی کی تھی اور بالآخر ان کو ایک ملک دے کر تاریخ میں لاثانی و لافانی مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہی اس شخص کا مشن تھا جس کے پورا ہونے کے بعد وہ بس ایک سال جیا۔ اس نے کہا کہ لو... پاکستان تمھیں میں نے خدا کی مدد سے اپنی زندگی میں ہی بنا کے دے دیا۔ اب اسے تم سنبھالو۔

مگر کیا ہم اسے سنبھال سکے تھے؟ آج کے دن تک ہم نے بابائے قوم کے ساتھ کیے ہوئے کسی وعدے کو پورا کیا تھا؟ ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی؟ یہ گھر ایک عظیم زندگی کا نقطۂ آغاز تھا تو وہ مزار اسی زندگی کے عظیم خواب کی تکمیل کی علامت مگر بابائے قوم کی قوم اس کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی تھی۔ ملک کے اندر ملک کی جڑیں کھودنے والے اور اس کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے عناصر اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ ایک ملک کے دو حصے کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہب کی مشترک اساس کو بھول کر زبان اور جغرافیائی محلِ وقوع کے اختلافات کی سیاست میں الجھ گئے تھے۔ اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم کے تین اصول بھول کر چھ نکات کے نعرے لگا رہے تھے۔

راجا نے مجھے کھینچا تو میں چونکا۔ "یہاں پھر کبھی آئیں گے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے حوصلہ نہیں پڑتا... ڈر لگتا ہے کہ میں نے ان دیواروں کے اندر قدم رکھا تو مجھے قائدِ اعظم مل جائیں گے۔ اور وہ مجھ سے کہیں گے، ویل مسٹر سکندر بخت۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے... ممکن ہے وہ یہی بات دوسروں سے بھی پوچھتے ہوں۔ کوئی جواب دے سکتا ہے اس سوال کا؟"

"تم بہت جذباتی آدمی ہو۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ میں بہت پریکٹکل آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسا نہ ہوتا تو میں اپنی ذات کی حد سے آگے نہ بڑھتا۔ میں انہی جذبات پر قناعت کر لیتا جو رابعہ کے لیے میرے دل میں تھے۔ اور اس میں اپنا گھر بساتا اور دس کروڑ مسلمانوں کے اس گھر کے غم میں خوار نہ ہوتا جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک جسم کے دو بازو ہیں۔ دونوں بازو بھی الگ ہوتے ہیں۔ مگر وہ ایک دوسرے سے تو برسرِ پیکار نہیں ہوتے۔ دایاں ہاتھ کبھی بائیں ہاتھ سے نہیں کہتا کہ میں مظلوم ہوں... یا افضل ہوں... اور اس جسم سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔"

میٹھی بائی بلڈنگ پانچ منزلہ عمارت تھی جس میں فلیٹوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے تو بس لاتعداد بالکونیاں نظر آئیں جن میں بچے، کپڑے، فالتو سامان، ٹی وی کے انٹینا سب کچھ بھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ کی کمی کا مسئلہ تھا کہ شہر اب اوپر اٹھنے لگا تھا۔ لوگ مرکز سے دُور نہیں جانا چاہتے تھے تاکہ آمدورفت کے مسائل سے بچ سکیں، چنانچہ عمارات کی بلندی بڑھ رہی تھی۔ ایسا صرف شہر کے وسطی کاروباری علاقے میں تھا۔ مضافات کی پوش آبادیوں میں دو ہزار اور چار ہزار گز پر محیط کوٹھیاں بھی بن رہی تھیں۔

"کیا خیال ہے۔ چوتھے مالے پر چلیں؟" راجا نے کہا۔

"چلو... مگر وہ قراقلی ٹوپی والا سیٹھ اکبر مل گیا تو کیا کہو گے اس سے؟" میں نے کہا۔ "میں تو اس کے سامنے جا نہیں سکتا۔"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ کیا ہر شخص تمھیں پہچانتا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ہر شخص میں شمار نہیں ہوتا۔ وہ ایک مخصوص گروہ کا آدمی ہے اور اس گروہ نے صرف میری تصویریں ہی نہیں میری آواز کے ٹیپ تک پھیلا دیے ہیں تاکہ میں بھیس بدلوں تو آواز سے پکڑا جاؤں۔"

"اچھا... میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "پہلے تو اس کے فلیٹ کا نمبر دیکھ آؤں۔"

"ہاں... اگر وہ اندر ہو تو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہو تو پوچھ لینا کہ صبح وہ کہاں ملے گا۔"

"کس سے پوچھ لوں؟"

"گھر میں... اس کی بیوی ہو سکتی ہے... بچے ہو سکتے ہیں، ورنہ آس پاس کے لوگ ہوں گے۔"

"اور انھوں نے پوچھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو... پھر؟"

"پھر میرا سر۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "کیا میں تم کو بولنا بھی سکھاؤں... ویسے تو بہت باتیں کرتے ہو۔"

وہ سر کھجاتا ہوا پرانے زینے پر چڑھ گیا، اور میں ایک تخت کے پاس کھڑا ہو گیا جہاں چار نوجوان تاش کھیل رہے تھے اور چار پانچ تماشائی ان کے مشیر بنے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی میری صورت پر غور کرنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے شروع سے بازی دیکھی ہوتی تو اور بات تھی۔

اچانک کھیل کا میدان جنگ کا میدان بن گیا۔ ایک شخص نے اپنے پتے پھینک دیے۔ "پتا رکھ کے کاٹتا ہے۔"

"کون... کہتا ہے...؟" فریقِ ثانی نے ایک اچھی سی گالی دے کر کہا۔ تیسرے نے چیخ کر کہا۔ "پتے دکھاؤ۔"

یہ چوتھا جو اصل مجرم تھا، فوراً اس پر حملہ آور ہوا... پلک جھپکتے میں انھوں نے ایک دوسرے کو مکے مارنے شروع کیے اور ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ دیے۔ دو تماش بین حق پرست واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے علمِ صداقت بلند کرتے ہوئے جہاد میں شرکت کی اور خاصے پٹے۔ ایک تو بہت ہی منحنی سا بانس نما شخص تھا۔ جب اس کے پیٹ میں کسی نے سر سے ٹکر ماری تو وہ مجھ پر آ گرا۔ میں نے اُسے فوراً واپس کر دیا مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ دوسری ٹکر نے مجھے چت کر دیا۔ ٹکر مارنے والا بیل نہیں تھا مگر بُل فائٹنگ میں بُل کا پارٹ ادا کر سکتا تھا۔

راجا نے آ کے مجھے اٹھایا۔ "یہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں... معمولی سا معرکۂ حق و باطل تھا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ باقی لوگ پھر کھیل جاری رکھنے پر متفق ہو گئے تھے اور متنازعہ بازی منسوخ کر دی گئی تھی۔

"وہ تیرہ نمبر فلیٹ میں رہتا ہے۔" راجا نے مجھے مطلع کیا۔ "مگر اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس کے بیوی بچے یہاں نہیں رہتے۔"

"پھر کہاں رہتے ہیں؟"

'کیا یہ کبھی معلوم کرتا تھا؟" راجا نے کہا۔

"نہیں... مگر یہ بات کس نے بتائی تمھیں؟"

"ایک پڑوسی نے... میں تالا دیکھ کر لوٹ رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ میں نے پوچھ لیا کہ اکبر سیٹھ کہاں ملے گا۔ اس نے کہا ابھی تو پتا نہیں۔ صبح آفس میں ملے گا۔ اس کا آفس آگرہ تاج کالونی سے آگے ہے۔ جہاں سب ٹرک اسٹینڈ ہیں۔ وہ آر لے والا اینڈ کمپنی کا منیجر ہے۔"

"آر لے والا؟" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "نہ آر لے سنز نہ آر لے برادرز... یہ کیا بات ہوئی!"

"باپ کاروبار کرتا اور بیٹے شریک ہوتے تو نام آر لے سنز ہوتا... یہاں معاملہ اُلٹا لگتا ہے۔" راجا بولا۔ "کہ بیٹوں نے کاروبار شروع کیا اور والد ماجد کو اخلاقاً پارٹنر بنا لیا مثلاً رشید عزیز اینڈ کمپنی کو رشید عزیز والا اینڈ کمپنی کر لیا، یا مختصراً آر لے والا اینڈ کمپنی۔"

"ایسی اوٹ پٹانگ حرکت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

"آئندہ تم ایسا نہیں کہہ سکو گے۔" راجا ہنسا۔ "یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔"

"کیا یہ بتانا ضروری سمجھا جاتا ہے؟ جسے دیکھو یہی کہتا نظر آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی جانتا ہوں کہ یہ ٹمبکٹو یا کھٹمنڈو نہیں ہے۔"

"لاہور والے بھی تو کہتے ہیں کہ لہور لہور ہے..." راجا بولا اور اس کی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔ غالباً ہر شخص اپنے

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ملک، اپنے شہر، اپنے قصبے، گاؤں، محلے اور گھر سب پر ناز کرنے کا حق رکھتا ہے۔

میں نے آرائے والا اینڈ مکینی کے معاملے کو شعور سے لاشعور میں منتقل کیا اور کلائی کی گھڑی دیکھ کر واپسی کی فکر میں مبتلا ہوگیا۔ رات کے سوا نو بج چکے تھے۔ اکرام شیخ اور نازو یقیناً ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میکلوڈ روڈ پر اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی پرانی عمارت کے سامنے راجا نے ایک ٹیکسی روک لی... دھوبی گھاٹ کا سن کے ڈرائیور نے بُرا سا مُنہ بنایا مگر اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتا، میں دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔

"میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں۔" ڈرائیور برافروختہ ہو کے بولا۔

"مگر ہمیں تو اُدھر ہی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور ہم تمھیں بھی لے کر جائیں گے۔"

"اڑی کرتا ہے۔" مکرانی ڈرائیور نے پلٹ کر کہا۔ "ابھی پھر بولتا ہوں کہ اتر جاؤ نہیں تو پھوڑو لگاڑ دیں گا۔"

"یہ ہماری شانِ مردانگی کے خلاف ہوگا۔" میں نے کہا۔ "آخر تم ٹیکسی کس کے لیے چلا رہے ہو... لوگوں کے فوٹو بگاڑنے کے لیے؟"

"اُدھر سے واپسی کا سواری نہیں ملتا۔" میرے لہجے نے اُسے کچھ ٹھنڈا کیا۔ "نقصان ہوتا ہے۔"

"نقصان کا یہ کاروبار تم اپنی مرضی سے کر رہے ہو... نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو... کوئی اور دھندا کرو۔" میں نے برہمی سے کہا۔

راجا نے میرا پیر دبایا۔ "چلو یار... تم کو دس روپے زیادہ دیں گے۔"

"میٹر سے پندرہ روپے اوپر لیں گا..." اُس نے فیصلہ سنایا اور روانہ ہوگیا۔

"یہ کیا طریقہ ہے آخر۔" میں نے راجا سے کہا۔

"یہ کراچی ہے پیارے کراچی۔" راجا نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔ "ابھی تم تماشا دیکھو۔"

راجا نے اچانک مکرانی سے اسی کی زبان میں دوستانہ گفتگو شروع کی۔ راجا کراچی کی پیدائش تھا اور اسی شہر کی ٹھوکریں کھا کے پلا بڑھا تھا۔ اسے گجراتی اور بروہی دونوں زبانیں آتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے فضا بدل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور دانت نکالنے لگا۔ پھر انھوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا۔ راجا نے ڈرائیور سے سگریٹ لی۔ اس کے پیکٹ میں دو قسم کے سگریٹ تھے۔ راجا نے چرس والا سگریٹ منتخب کیا۔ مگر پھر پیچھے کی سیٹ پر ہاتھ نیچے لے جا کر مجھ سے بدل لیا۔ وہ ڈرائیور پر ظاہر کرتا رہا کہ وہ بھی چرس والا سگریٹ پی رہا ہے... نتیجہ یہ کہ جب ہم نے دھوبی گھاٹ کے موڑ پر ٹیکسی رکوائی تو ڈرائیور نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور کرایہ لیے بغیر واپس چلا گیا۔ بعد میں راجا نے بتایا کہ ہم زبان ہونے کے علاوہ اس نے خود کو ہم پیشہ بھی ثابت کر دیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ اس کی اپنی ٹیکسی ہے مگر وہ تھانے میں بند ہے کیونکہ اس کی ٹکر سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل گر گئی تھی۔

نازو گھر پر اکیلی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ "آگئے سکندرِ اعظم ثانی... میں تو سمجھی تھی کہ اب بندرگاہ فتح کر کے ہی آؤ گے۔ لیکن صورت سے لگتا ہے کہ..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔ لاکھوں میں ایک پائی ہے۔" میں نے چارپائی پر گر کے کہا۔ "غالب نہیں ہوں میں۔"

"بھیا تمھارے لیے سخت پریشان تھے۔" نازو کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"اور تم... تم پریشان نہیں تھیں؟" میں نے کہا۔ "صورت سے تو ایسا لگتا ہے..."

"خبردار جو صورت کو کچھ کہا۔" وہ چیخ کے بولی۔ "لاکھوں میں ایک پائی ہے... رابعہ نہیں ہوں میں۔"

میرے ساتھ راجا بھی ہنسنے لگا۔ اس سے پہلے وہ اپنے گھڑے کو گھور رہا تھا جو ایک کونے میں رکھا ہوا تھا... اسی وقت اکرام شیخ آگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ بھی کچھ اُڑا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں بھی نوٹس مل گیا ہے کیا؟"

اکرام شیخ مسکرایا۔ "نہیں یار... تم سناؤ آج کیا کرتے رہے؟"

"جھک مارتے رہے۔" میں نے کہا اور انھیں خیرات کی کمائی کرنے سے پولیس کے ڈنڈے کھانے اور دوست محمد کے علاوہ اکبر سیٹھ سے ملنے تک کے سب واقعات سنا دیے۔ نازو اور اس کا بھائی ہنستے رہے لیکن مجھے پھر احساس ہوا کہ ان کی ہنسی زبردستی کی ہے۔

"اکرام... تو کیا چھپا رہا ہے مجھ سے... اور کیوں چھپا رہا ہے؟" میں نے کہا۔ "وقت کم ہے اس لیے فوراً بتا دے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں یار۔" اکرام نے کہا۔ "چلو کھانے کے لیے ہاتھ مُنہ دھو ڈالو... آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آج نازو نے کھانا پکایا ہے۔" وہ رونی شکل بنا کے بولا۔ "اور ہم سب کو وہی کھانا ہے۔"

"پھر تو مُنہ دھونے کی بجائے میں وضو کر لوں... اور اللہ سے اپنے گناہ تو بخشوا لوں۔" میں نے کہا۔

"میں ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اور دل شکستہ ہو کے رونے والی بھی نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

دسترخوان پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نازو امورِ خانہ داری میں صفر ہے۔ اس نے جو چیز مٹر پلاؤ کے نام سے ایجاد کی تھی وہ اتنی خشک اور بدمزہ تھی کہ میں اور اکرام ٹھنڈی آہیں بھرتے ہے اور پانی کے ساتھ نوالے حلق سے اتارتے رہے۔ راجا کا حال ہم دونوں سے بھی ابتر تھا۔

"مٹر اور چاول جو ہمارے معدے کے تالاب میں تیر رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "جب پانی بخارات بن کے اُڑ جائے گا تو مٹر چاول ایسے رہ جائیں گے جیسے کنکر پتھر۔"

"اور جب ہم حرکت کریں گے تو ہمارے پیٹ میں سے ایسی آواز آئے گی جیسے ہم آدمی نہیں جھنجھنے ہیں۔" اکرام بولا۔

نازو کا چہرہ سرخ ہوا مگر وہ غصے کو پی گئی۔

"مرغ قورمے کے لیے پلاسٹک کی مرغی اچھی رہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ٹانگ دیکھیے۔ اسے آپ دس بار شوربے میں ڈال کے دس مہمانوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔"

"ویسے لگتی بالکل اصلی ہے۔" اکرام نے کہا۔ "نفسیاتی اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے کہ ہم چکن قورمہ کھا رہے ہیں۔"

جب کھیر لائی گئی تو حالات بگڑ گئے۔ اکرام نے اُسے دودھ چینی چاول کا زیاں قرار دیا۔ "محکمۂ خوراک کو ذمے دار افراد کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ جو دونوں کو ضائع کرتے ہیں۔ کھانے کو بھی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھانے والے کو بھی... یہ کھیر ہے کہ تیر ہے جو کلیجے میں جا کے لگتا ہے۔"

"یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کھا کے آدمی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ کتے کی دُم کی طرح... پھر اسے بارہ برس تک نلکی میں ڈال کے رکھنا پڑتا ہے۔"

"کسے... کھیر کو...؟"

"نہیں... کھیر پکانے والے کو۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد نازو کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "تم سب بدتمیز جنگلی اور چڑیا گھر میں رکھنے کے لائق جانور ہو... تم کو انسانوں والی یہ خوراک راس نہیں آسکتی۔" اس نے دسترخوان کا ایک کونا پکڑا اور سارے برتن اُلٹ دیے۔ راجا بے چارہ نازو کو سمجھتا نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "ارے... دیکھیے۔" اور دوسرے لمحے وہ ہوا میں دو قلابازیاں کھاتا کونے میں جا گرا... اکرام شیخ بڑا بھائی تھا، اور نازو میری طرف ہاتھ بڑھاتی تو خود وہاں نظر آتی جہاں اکرام لیٹا ہوا کراہ رہا تھا، چنانچہ نزلہ بر عضوِ ضعیف... اس کے غصے کا نشانہ راجا بن گیا جس نے مصالحت کنندہ کے فرائض سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد جب ہم اپنی ہنسی پر قابو پانے، نازو کو منانے اور راجا کو تسلّی دینے میں کامیاب ہوئے تو میں نے گھڑی دیکھی۔

"اب مجھے واپس جانا ہے... فش ہاربر..." میں نے کہا۔ "دل جانی سے ملنے۔"

"میں تجھے لے چلتا ہوں۔" اکرام شیخ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" راجا بولا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا۔

وہ نروس ہونے لگا... اسے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی کہ ہم اُسے نازو کے ساتھ گھر میں اکیلا چھوڑ کے جا رہے تھے۔ مگر یہ بات ہم ہی سمجھ سکتے تھے کہ نازو کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں... خصوصاً راجا جیسے نوجوان سے... اس کے علاوہ میں راجا کو اتنا ہی قابلِ اعتماد سمجھنے لگا تھا جتنا اپنے دوسرے ساتھیوں کو۔

"تم نازو کا خیال رکھو گے۔" اکرام شیخ نے کہا۔

"مگر... میرا خیال کون رکھے گا؟" وہ ایسے مظلوم لہجے میں بولا کہ مجھے غالب یاد آگیا... وہ نازو کو چھیڑتا تھا۔ جانتا تھا کہ اس چھیڑ خانی کا انجام کیا ہوگا مگر اس کی چاہت کا انداز نہیں بدلتا تھا۔

"نازو بی بی... تم راجا جی کو بریف کرو۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایم آر ایس کے موضوع پر ایک مکمل معلوماتی لیکچر دو... اور ہاں مسٹر راجا، میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

اکرام دوسرے کمرے میں ٹیکسی ڈرائیور کی وردی پہن رہا تھا۔ میں نے تخت کے نیچے سے سوٹ کیس نکالا اور کھول کے راجا کے سامنے کر دیا۔ "پانچ لاکھ پورے کرنے کے لیے تم اس میں سے جتنی رقم چاہے لو... ڈھائی لاکھ سے زیادہ کی ضرورت پڑے تب بھی کوئی حرج نہیں۔" میں نے سوٹ کیس کو ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔ راجا سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

"یہ جعلی نوٹ نہیں ہیں راجا جی..."

"میں... میں یہ رقم نہیں لوں گا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"تمھارا تو باپ بھی لے گا۔" میں نے کہا اور اکرام کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔" اکرام نے کہا۔

"راجا جی ایک کوہ قاف کی پری کے چکر میں ہیں۔ پری ایک لالچی دیو کی قید میں ہے... اس کی شرط ہے کہ پانچ لاکھ لاؤ اور پری کو لے جاؤ... راجا اسی لیے بھیک مانگتا تھا..."

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

چوری، ڈکیتی اور اسمگلنگ کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ویسے پری کا اصلی نام پروین ہے۔"

"ایک اور مریضِ عشق۔" اکرام نے سر پر ہاتھ مارا۔ "یہ ایم آر ایس تو جانباز عاشقوں کی انجمن بنتی جا رہی ہے۔"

"اسی لیے تمہاری ممبر شپ آنریری ہے... مکمل رکنیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی کسی کے عشق میں پاگل ہو جاؤ... اتنے پاگل کہ... خیر مثال میں کیا دوں۔ تم تو پاگلوں میں گھرے ہوئے ہو۔"

"ابھی وہ لڑکی پیدا نہیں ہوئی جو مجھے پاگل کر سکے۔"

"ترمیم... وہ لڑکی دریافت نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔ "پیدا تو ہو چکی ہے اور جوان بھی ہو چکی ہے۔ بس اس کے تمہارے سامنے آنے کی دیر ہے... پھر دیکھنا... ہم بھی دیکھیں گے، دنیا بھی دیکھے گی۔"

اکرام نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ "یار... وہ آج میں نے تمہارے وکیل دوست سے بات کی تھی۔"

"اچھا... ہو گئی بات...؟" میں نے دلچسپی سے کہا... "کیا خبر ہے؟"

"خبر... اچھی بھی اور بُری بھی۔" وہ بولا۔ "میں نے نازو سے بھی ذکر نہیں کیا ہے ابھی تک... اُسے شک بہر حال ہو گیا ہے۔"

"بُری خبر پہلے سناؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"تمہارا وہ سرکس پلان ختم ہو گیا۔" اکرام نے کہا۔ "محسن نے منظر کو فون پر بتایا کہ صرف وہ اور جولی بچے ہیں۔"

خوف کے عفریت نے مجھے یوں جکڑ لیا کہ میرا دل درد سے کراہنے لگا۔ "یہ... تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"انھوں نے رات کے وقت حملہ کیا تھا۔" اکرام نے کہا۔ "کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کتنے آدمی تھے۔ دھماکا ٹریلر کے اندر ہوا۔ اس کے پرخچے اُڑ گئے... اللہ بچانے والا ہے۔ محسن کچھ دیر پہلے ہی جولی کو اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا تھا.. جولی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"اور... وہ..." آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

اس کا مجھے بھی بہت رنج ہے۔" اکرام شیخ نے کہا "ہمارا استاد ٹیڈی ہمارے مشن پر قربان ہو گیا... شہید ہو گیا۔"

ٹیڈ[illegible] ی مر گیا... استاد ٹیڈی مر گیا... وہ شخص جو نیک محد تھا... وہ مر گیا، وہ شخص جس نے زندگی کی غلط روش کو صرف اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ اپنے وطن کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دینا چاہتا تھا۔ وہ استاد ٹیڈی جو ایک محدود حلقے میں بدمعاش سمجھا جاتا تھا۔ احساسِ محرومی کا مارا ہوا۔ جب اسے ہم سے عزت ملی... محبت ملی اور پیار ملا تو اس کے اندر کا انسان جاگ اُٹھا۔ وہ دریا دل ٹیڈی جو یاروں کا یار تھا اس یاری پر اپنا سب کچھ قربان کرتا آیا تھا۔ شہلا کا منہ بولا بھائی، رابعہ کا بھائی... سب کو بھائیوں سے زیادہ چاہنے والا... سب سے زیادہ سختی جھیلنے والا... وہ مر گیا؟ ٹکڑے ٹکڑے ہو کے وطن کی مٹی میں مل گیا۔ اس کی خاک پر بکھر گیا۔ ہر فصلِ بہار میں نئے شگوفوں کی خوشبو میں شامل ہونے کے لیے... نئے پھولوں کے رنگ میں نکھرنے کے لیے... ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے۔ تم ان کو مردہ مت کہو کیونکہ وہ شہید ہی تو ہیں جو زندہ رہتے ہیں... اپنی دوستی کی یادوں... قربانیوں اور خلوص کی نشانیوں کے ساتھ۔

میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں... ٹیکسی اب فش ہاربر کے باہر کھڑی ہوئی تھی اور اکرام شیخ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے مجھے تسلی دے رہا تھا... حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

"اس کے ساتھ... ایک اور بہادر آدمی بھی تھا۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا۔

"ہاں... شیر علی نام تھا اس کا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "وہ بھی شہید ہو گیا... جولیا..."

"جولیا کو کیا ہوا...؟" میں نے اکرام کے اچانک خاموشی اختیار کرنے پر چونک کے کہا۔ "بول یار... جولیا کے لیے تو نے کہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں... اسے کچھ نہیں ہوا۔" اکرام شیخ نے کہا۔ "مگر وہ اب ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ محسن اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہاں اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا... وہ ماں بننے والی تھی۔"

میرے دماغ کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ "ماں بننے والی تھی... یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟ ڈاکٹر کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"محسن کا بھی یہی خیال تھا... مگر ڈاکٹر نے کہا کہ اس میں کوئی شک کی بات ہی نہیں۔" اکرام نے کہا۔ "محسن واپسی پر اس سے نہیں بولا... جولیا نے خود ہی بات کی... اور کہا کہ محسن بھائی... آپ کو تو سب معلوم ہو ہی گیا ہے... میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا... میں گنہگار ہوں... مجھے جانے دیں... محسن نے اُسے مارا اور پوچھا کہ اسے شیر علی سے محبت ہو گئی تھی تو کیا وہ الو کا پٹھا شادی کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا میں انکار کبھی نہ کرتا... میں ہوتا بھی کون ہوں انکار کرنے والا... مگر اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا... یہ سب باتیں یہیں میں ہوئی تھیں جب محسن نے شیر علی کو گالیاں دیں... جولیا اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔"

"وہ شیر علی کو پسند کرنے لگی تھی... مجھے بھی معلوم ہے۔" [illegible]ن نے کہا۔

"اس نے محسن کو بتایا کہ چوری چھپے وہ شادی کر چکے ہیں۔ وہ شیر علی کے سامنے کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو گئی تھی۔" اکرام نے [illegible]ہا۔ "نکاح کا بندوبست خود شیر علی نے کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بھی وہ الگ رہیں گے... مگر شاید ایسا ممکن نہ ہوا۔ ہر آدمی کا نفس ایک شکاری ہے جو گھات میں رہتا ہے... اس نے [illegible]سی جذباتی کمزوری کے لمحے سے فائدہ اُٹھا لیا ہوگا... جولیا کی وضاحت سے محسن مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ شیر علی کو سزا ضرور دینا چاہتا تھا... مگر وہ واپس پہنچے تو ٹریلر جل چکا تھا۔ وہ شہر سے چالیس میل آگے جنگل میں کھڑے ہوئے تھے۔ ٹریلر میں ریچھ اور بندر کا تماشا دکھانے والے بھی جل کے مر گئے... جانوروں سمیت... کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ٹریلر کے جو ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے تھے ان سے جنگل میں بھی آگ پھیل گئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر جولیا کا دماغ الٹ گیا۔ وہ شیر علی کو پکارتی ہوئی بھاگی۔ محسن نے اُسے روک تو لیا مگر صرف جل کر خاک ہونے سے... صدمے سے ہونے والی دماغی خرابی کو وہ نہیں روک سکتا تھا۔"

"او مائی گاڈ..." میں نے کراہ کے کہا۔ "کچھ لوگ کتنے بدقسمت پیدا ہوتے ہیں... کتنے مظلوم رہتے ہیں اور کتنی قابلِ رحم زندگی گزارتے ہیں۔ اس لڑکی کو موت کے مُنہ سے چھین کر لانے کے لیے ہم سب نے کیا نہیں کیا تھا۔ مگر کتنی مختصر تھی زندگی کی یہ خوشی... باپ تو پہلے ہی نہیں تھا۔ ماں اس کی نظروں کے [illegible]منے ماری گئی... اور اب یہ ستم کہ سہاگن بنتے ہی بیوگی ملی۔ ماں بننے کی خوشخبری نے اس کا سہاگ اجاڑ دیا... اب کہاں ہے وہ؟"

"جہاں اُسے ہونا چاہیے؟" اکرام شیخ نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے پاگل خانے میں؟"

اکرام نے اقرار میں سر ہلایا۔ "محسن اُسے کسی نہ کسی طرح منظر کے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی... کہ منظر اُسے رکھ سکتا۔ مجبوراً اُسے اسپتال منتقل کیا اور انھوں نے چند دن اپنے پاس رکھ کے پاگل خانے بھیج دیا۔ منظر نے کہا تو ہے کہ اس کا خیال رکھا جائے اور بہترین علاج [illegible] نے وہ سارا خرچ دے گا اور اسے دیکھنے کے لیے آتا [illegible]ہے گا..."

"کیا اس کی کیفیت جنونی ہے؟"

"نہیں... وہ بس گم صم بیٹھی رہتی ہے... نہ بولتی ہے نہ کچھ سُنتی ہے... کھانا پڑا رہتا ہے... جب بھوک لگتی ہے تو کھا لیتی ہے... جب نیند پر قابو نہیں رہتا تو گر کے سو جاتی ہے۔ بالکل ایک زندہ لاش ہو گئی ہے... ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شفایابی کے امکانات معدوم نہیں ہیں مگر سال دو سال لگ سکتے ہیں۔"

"سال دو سال... اور اس عرصے میں..."

"ہاں... اس عرصے میں وہ ماں بھی بنے گی... وہیں۔" اکرام نے کہا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ بچّے کی ولادت یکلخت اس کو احساس کی دنیا میں واپس لے آئے۔ ڈاکٹر اسی چانس پر انحصار کر رہے ہیں۔ غالب کے والد کا کوئی ڈاکٹر دوست ہے۔ غالباً جولیا کو اس کے گھر پہنچانے کی بات ہو گئی ہے۔ انکل ضامن [illegible] کی کوشش سے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "کیا یہ بات شہلا کو بتائی گئی ہے؟"

"نہیں... وہ اسپتال میں تھی..."

"تھی کا مطلب کہ اب نہیں ہے؟"

نہیں... زچہ و بچہ خیریت سے ہیں۔" اکرام مسکرایا۔ [illegible] یہی دوسری اچھی خبر تھی۔"

"کیا... ٹیڈی نے اُسے دیکھا تھا؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کسے؟ شہلا کو؟ اس کے بچّے کے ساتھ؟" اکرام نے کہا۔ "ہاں وہ اسی دن اسپتال گیا تھا... سب کے منع کرنے کے باوجود وہ بہت خوش تھا کہ میں ماموں بن گیا۔"

مجھے یاد ہے۔" ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ کس طرح ایک دن وہ اور غالب اس بات پر [illegible] کہ میں بچّے کا ماموں ہوں... نام میں رکھوں گا [illegible] تھا کہ وہ چچا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔"

[illegible]س کا نام ٹیپو رکھا [illegible] ہی رکھا تھا۔" اکرام بولا۔

"چلو اس کی ایک آرزو تو پوری ہو [illegible]"

"اب تم چاہو تو گھر جاؤ..."

اکرام نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

فش ہاربر کے علاقے میں مچھلیوں کی باس ہوا [illegible] ہی نہیں زمین کی مٹی اور دیوار و در میں بھی رچ بس گئی تھی... ایک عجیب سی نم آلودہ فضا میں سمندر کی دنیا آباد تھی... ماہی گیر... ان کے خاندان... ماہی گیری کے [illegible]یدار... ان کے ایجنٹ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مزدوری کرنے والے جال اور بادبان مرمت کرنے والے۔ انجن مکینک... سرکاری محکمے کے اہلکار... سب مصروفِ کار تھے۔ ہر سائز اور شکل وصورت کی سینکڑوں کشتیاں اور لانچیں روانہ ہو رہی تھیں: دل جانی" ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

"یہ سب رات بھر مچھلی پکڑیں گے۔ اور صبح دم لوٹیں گے۔" اکرام شیخ نے بتایا۔" لیکن ان کی واپسی سے پہلے ہی ہر کشتی، لانچ کا آکشن ہو جائے گا۔"

" کیا مطلب، کل دوسرے لوگ ہر کشتی اور لانچ خرید لیں گے؟" اکرام ہنسا۔" نیلام ان مچھلیوں کا ہوگا جو ہر کشتی اور لانچ لے کر واپس لوٹے گی۔"

" پھر واپسی سے پہلے نیلام کیسے ہوگا؟ کسی کو کیا معلوم کون خالی ہاتھ آئے گا اور کون کتنی مچھلی لائے گا؟"

"یہی تو نیلام میں بولی لگانے والوں کا کمال ہے کہ وہ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔" اکرام بولا۔" جب وہ بولی لگاتے ہیں تو ان کی پوزیشن وہی ہوتی ہے جو ریس کے گھوڑے پر رقم لگانے والوں کی ہوتی ہے جو جانتے ہیں کہ گھوڑا کس نسل کا ہے اس سے پہلے کتنی بار جیت چکا ہے... جوکی کون ہے اور جوکی کا ریکارڈ کیسا ہے۔ یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ کون سی کشتی یا لانچ کدھر گئی ہے اور اس موسم میں وہاں کس قسم کی مچھلی آتی ہے۔ جھینگے ملتے ہیں یا کیکڑے تو کہاں ملتے ہیں۔ اس کشتی یا لانچ کا عملہ یعنی ماہی گیر کون ہیں۔ ان کا ساز و سامان کیسا ہے اور تجربہ کتنا ہے... پھر یہ کہ اس سے پہلے وہ اوسطاً کتنی اور کس قسم کی مچھلی لاتے رہے ہیں۔ یہ سب ذہن میں رکھتے ہوئے وہ بولی لگاتے ہیں... اور جیسا کہ کسی بھی نظام میں ہو رہا ہے۔ بولی لگانے والوں کے درمیان بھی ایک اجارہ دارانہ رجحان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مچھلی ضائع ہو جانے والی چیز ہے۔ اسے اسٹور نہیں کیا جا سکتا... اور خریدار وہی محدود لوگ ہیں۔ وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے اور عموماً آپس میں طے کر لیتے ہیں کہ تم فلاں لانچ کی بولی اتنی لگاؤ اور لے لو... مگر فلاں لانچ میری... سارا منافع تو یہی ٹھیکیدار اٹھاتے ہیں۔ ماہی گیر غریب کو تو شب بھر کی بیداری اور محنت کا پورا صلہ تک نہیں ملتا۔"

یہ استحصالی نظام تو ہر جگہ موجود ہے۔" میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"آج کل غیر ملکی ٹرالر ہماری حدود میں گھس آتے ہیں۔ روسی اور بھارتی ٹرالر بین الاقوامی سمندر سے ہمارے سمندر میں آ کے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور وہ جدید ترین آلات سے لیس جہاز ہوتے ہیں، ظاہر ہے اس سے چھوٹے ماہی گیر متاثر ہوتے ہیں۔ انھیں کم مچھلی ملتی ہے۔" اکرام شیخ نے کہا: جب نیوی یا کسٹم پولیس کی لانچ آتی ہے، تو وہ بھاگ جاتے ہیں۔ پانی میں دیوار تو اٹھائی نہیں جا سکتی۔"

" کیا وہ صرف مچھلیاں پکڑتے ہیں؟" میں نے اس مسئلے کو اپنے طور پر دوسرے زاویے سے دیکھا۔

" مچھلیوں کے ساتھ تو جال میں سب ہی پکڑے جاتے ہیں، ہر قسم کی سمندری مخلوق..."

" میرا مطلب تھا کہ کیا وہ مچھلیاں پکڑنے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔" کر تو سکتے ہیں نا؟"

" ہاں... کرنے کو سب کچھ کر سکتے ہیں۔" اکرام شیخ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں ایک وسیع شیڈ کے اندر ٹہل رہے تھے۔

" رات کے وقت سمندر میں کون دیکھتا ہے کہ کس نے کس سے کیا لیا اور کسی کو کیا دیا۔" میں نے کہا۔" ہماری سمندری حدود کہاں تک ہیں؟"

" غالباً دو سو میل تک..."

" پھر تو یہ بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔" کہ ہماری کوئی ماہی گیری کی لانچ اسلحہ لے کر جائے۔ مقررہ وقت پر کوئی ٹرالر یہ دیکھتے ہوئے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہے ہماری حدود میں داخل ہو جائے۔ دو چار میل اندر یا باہر کا فرق کیسے پتا چلے گا۔"

" ہاں... گھنٹے دو گھنٹے تک لانچ اور ٹرالر ساتھ ساتھ سفر کرتے رہیں تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوگا... اور اگر خطرہ دیکھا تو دونوں واپس اپنی اپنی سرحد میں۔ بھارتی اور روسی ٹرالر پکڑے بھی جاتے ہیں مگر پھر ڈپلومیٹک سطح پر بات چیت کے ذریعے چھڑا لیے جاتے ہیں... یا ایک تیسری پارٹی سمندر میں موجود رہتی ہے جو ان کے سودے میں اپنا کمیشن وصول کرتی ہے اور انھیں کلیئر کر دیتی ہے۔"

" اس تیسری پارٹی کو ہی ففتھ کالم بھی کہتے ہیں... گھر کا بھیدی بھی جو لنکا ڈھاتا ہے۔" میں نے کہا: وہ دوست نما دشمن جو پیٹھ پیچھے سے وار کرتا ہے۔"

" او بھائی... کون پوچھتا پڑا تھا دل جانی کو؟" ایک مکرانی نے چلا کے کہا: وہ آ گیا ہے دل جانی۔"

" کدھر... کہاں...؟" میں اور اکرام اس کی طرف لپکے۔

" وہ ہری پیلی لائٹ والا لانچ نیں ہے۔" مکرانی نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

میں اور اکرام شیخ واپس ہوئے اور اس برتھ تک گئے جہاں سے گزر کے دل جانی کا عملہ واپس آ رہا تھا۔ آگے پیچھے چار آدمی کسی بات پر بحث یا لڑائی میں مصروف تھے

" او بابا... ہم بولتا پڑا ہے کہ انجن ایک دم ٹھاٹ ہے۔ تم ہماری بات نہیں مانتا۔"

" تمھاری بات مانے گا استاد... مگر وہ گڑگڑ کا آواز پہلے ں تھا۔"

" وہ ٹھیک ہو جائے گا... وہ پسٹن کا آواز نہیں ہے۔ شافٹ جب چالو ہوئیں گا تو آواز ختم ہو جائیں گا... نہیں ے تو ہم کو بولو... تمھارا پیسہ واپس... ہم مکینک ہے کوئی ے باز نہیں ہے۔"

لفرے باز تم کو کون بول سکتا ہے استاد... تم تو خالی یں ناراض ہوتا پڑا ہے... یہ لو آٹھ سو روپے۔"

استاد کہلاتے والے نے نوٹ گنے بغیر اپنی نیلی ڈانگری کی ے جیب میں ٹھونس لیے اور ایک طرف چل پڑا۔ اکرام شیخ ں کے پیچھے گیا۔

" یہ دوست محمد ہے؟" میں نے آٹھ سو دینے والے ے پوچھا۔

" ہم ہی دوست محمد ہے۔" وہ بولا۔

مگر تم دوست محمد پردیسی ہے؟"

ایک دم ٹھیک... تم کون ہے؟ ہم کو کیسے جانتا ہے؟" وہ ہاتھ ملا کے بولا۔ تقریباً پینتالیس سال کے اس فاکش شخص کا پنجہ ایک فولادی شکنجہ تھا۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تم لانچ فروخت کر رہے ہو؟" ں نے کہا۔

کون بولا تھا؟ یہ لانچ بیچ دے گا ہم تو پھر خود کیا کرے گا؟" موڈ خراب ہو گیا۔" ڈوری ڈال کے مچھلی پکڑے گا کیا؟" ں کے دونوں ساتھی قہقہہ مار کے ہنسے۔" جاؤ نی بابا۔ ی سے تم کو الو بنایا ہے۔"

ایک دم چریا ہے۔" دوسرا بولا۔

دوست محمد پردیسی گرم ہو گیا۔" ارے چلو ادھر سے... ے ملک کرنا پڑا ہے... جب ہم بات کرتا ہے کسی شریف دی سے تو بیچ میں کیوں ٹانگ اڑاتا ہے۔ ابھی ماریں گا جاٹ یسا...،

دونوں ماتحت فوراً غائب ہو گئے۔ میں نے دوست محمد پردیسی سے معذرت کی۔ اس نے دوستانہ طریقے پر مجھے بتایا کہ فلاں فلاں لانچ بیچنے کی بات چل رہی ہے مگر میں ناواقف لگتا ہوں کہ لیے دلالوں سے بچوں اور فلاں لانچ کے مالک سے براہِ راست بات کروں۔ اس کو یقین تھا کہ میں کوئی اسمگلر ہوں یا اس کا ایجنٹ اور لانچ کو دوبئی سے مال لانے کے لیے استعمال کروں گا... اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ میں صورت سے ماہی گیر بالکل نہیں لگتا تھا۔

میں دوست محمد پردیسی سے پیچھا چھڑا کے بھاگا۔ فش ہاربر کے باہر میں نے اکرام کو جا لیا... وہ دوست محمد کو گھیرے کھڑا ہوا تھا۔

" لو... وہ آ گیا میرا دوست۔" اکرام نے کہا۔

ایک بار پھر میں نے کہا۔" تم دوست محمد ہوتا میرین انجنیئر؟"

وہ ایک خشک مزاج بوڑھا آدمی تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن ساٹھ سال کے درمیان کیا۔ اس عمر میں بھی وہ قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ یہ لوگ سمندر کی کھلی فضا میں رہتے تھے اور محنت مشقت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی سب سے اہم غذا سمندری مخلوق تھی۔ مچھلی، جھینگے اور کیکڑے۔ کیکڑے کا سوپ کراچی کے ہر چینی ریستوراں میں بڑے تکلف اور اہتمام کے ساتھ ملتا تھا اور ایک مہنگی ڈش تھا۔ اسی طرح فرائیڈ پران ایک پسندیدہ ڈش تھی۔ لیکن سمندر کی دنیا کے لوگ یہی چیزیں دن رات کھاتے تھے۔ پکا کے بھون کے یا ابال کے۔ ممزدرت

موسیقی کی ا، ب، ت کا قاعدہ
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب
ابجدِ موسیقی
برصغیر کے نامور گلوکار مہدی حسن کہتے ہیں کہ:
یہ کتاب لوگوں کے ورکن کے لیے موسیقی میں ان کو راستہ دکھانے کے لیے بہت بہتر ثابت ہوگی یہ کتاب بہت آسان اور اچھے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری نئی نسل کے شوقین اور ابھرتے ہوئے فنکار اس کتاب سے بہتر سے بہتر فائدہ اٹھا سکیں گے اور ان کو فائدہ پہنچے گا۔
موسیقی کے اُستاد نظام الدین خاں کہتے ہیں کہ:
[illegible]
معروف ادیب و صحافی شکیل عادل زادہ کہتے ہیں کہ:
[illegible]
جواں نسل کے معروف شاعر جمال احسانی کہتے ہیں کہ:
[illegible]

پڑتی۔ یہ کچی مچھلی بھی وہ کراہیت کے کسی احساس کے بغیر کھا جاتے تھے۔ یہ پروٹین اور معدنیات سے بھرپور غذا ان کے جسم کو توانا رکھتی تھی۔ وہ وٹامن ست اور ڈی کی کمی کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی آنکھیں روشن اور معدہ درست رہتا تھی۔ ممکن ہے وہ بڑھاپے میں وٹامن بی کی کمی محسوس کرتے ہوں، مگر اس سمندری آب وہوا کی دنیا میں پپیتا بھی بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ اور لائم جوس بھی پیتا، چنانچہ وہ بیمار نہیں ہوتے تھے اور طویل عمر پاتے تھے۔

"دوست محمد... میں تم سے ملنے کے لیے بہت دور سے آیا ہوں۔" میں نے تمہید باندھی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ حیران ہوتے بولا۔

"شہر سے۔" میں نے کہا۔ خلافِ توقع وہ چونکا نہیں۔ "میں نے تم کو پہلے کبھی دیکھا نہیں..." وہ بولا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"کیا ہم کہیں اکیلے میں بیٹھ کے بات نہیں کر سکتے؟" میں نے کہا۔

"یہاں کیا ہے؟" وہ بولا۔ "اچھا آؤ۔ ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔"

"ہوٹل میں نہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے گھر..."

"میرا گھر...!" وہ ایک کھٹارا کار کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔"

"یہ کار تمہاری ہی ہے نا؟" میں نے کہا۔ "اس میں بیٹھ کے تم کہاں جا رہے تھے؟"

"شہر کی طرف... کسی ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں... ہم راستے میں بات کر لیں گے۔"

"کوئی ضرورت نہیں... یہاں بات کرو ... نہ جاؤ۔" وہ بگڑ گیا۔

"دوست محمد... میرا نام سکندر بخت ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ میری صورت دیکھتا رہا۔ "اچھا... آگے بولو۔"

"میں رابعہ سے ملنے... اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" میں نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر یقین کر لیا کہ میری بات سننے والا کوئی نہیں ہے۔ دوست محمد کی کار ایک پرانے شیڈ کی اوٹ میں کھڑی ہوئی تھی۔

"تو لے جاؤ... مجھ سے کیوں پوچھتے ہو... میں کیا باپ ہوں رابعہ کا، اور یہ رابعہ کون ہے آخر...؟"

"دوست محمد... ایسے بات بگڑ جائے گی... تم رابعہ کو جانتے ہو۔" میں نے پُرسکون رہتے ہوئے کہا۔

"رابعہ؟" وہ سوچنے لگا۔ "تم اس کی بات تو نہیں کر رہے ہو... نور محمد کی بیوی کی؟ تم کو گولی مار دے گا وہ۔"

"لاحول ولاقوۃ... میں کسی کی بیوی کو بھگا کے نہیں لے جانا چاہتا۔ میں جس رابعہ کی بات کر رہا ہوں... وہ کسی کی بیوی نہیں ہے۔"

"اور تو کسی رابعہ کو نہیں جانتا میں۔"

میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ "بکواس کرتے ہو تم... میں رابعہ قاری کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کے رابعہ کی ایک تصویر نکالی۔ "اس رابعہ کی جو تمہارے ساتھ رہتی ہے۔"

دوست محمد نے تصویر لے کر روشنی کے رُخ دیکھی۔ میں اس کی صورت کو غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے دوست محمد کے چہرے پر الجھن اور حیرانی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا... اس نے تصویر مجھے واپس کر دی۔

"ہم قسم کھا کے بولتا ہے کہ ہم نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا... تم بولتا ہے یہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔"

دوست محمد نے اپنی زبان کے ساتھ اپنا لہجہ بھی بدل لیا تھا۔ شک پیدا کرنے کے لیے یہی چیز کافی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ریوالور نکال لیا۔ "دوست محمد... تم کو بتانا ہی پڑے گا کہ رابعہ کہاں ہے... چلو اپنی کار میں بیٹھو..." دوسرے ہاتھ سے میں نے اکرام کو اشارہ کیا کہ وہ جائے۔

دوست محمد کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت و صامت کھڑا رہا اور پھر کار میں بیٹھ گیا۔ اس کے دروازے مقفل نہیں تھے یہ رائٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی تھی چنانچہ میں اس کے دائیں جانب والی سیٹ پر بیٹھا۔

"یہ دھکا اسٹارٹ گاڑی ہے۔" دوست محمد ہونٹوں پر زبان پھیر کے بولا۔ اور اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ اس کار میں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا اور ریوالور میرے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ حقیقت نہیں خواب ہے۔ کسی دشواری کے بغیر دوست محمد نے ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے اس کی مذاق اُڑانے والی ہنسی کی آواز سنی۔

ساتھ دو خطرناک قسم کے ریوالور میری جانب یوں اُٹھے ہوئے تھے کہ میرے لیے حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ہاتھ کس کے تھے جو ریوالور لیے خاموشی سے ایک کھٹارا گاڑی کی پیٹھی ہوئی گرد آلود سیٹ پر براجمان تھے، یہ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انھوں نے نقاب پوشی کا آسان اور سستا طریقہ اختیار کیا تھا جو ولایت کے قانون شکن عناصر میں بہت مقبول تھا لیکن یہاں میں نے دیکھا تھا کہ چہرہ چھپانے کے لیے لوگ چادر یا پگڑی جیسی چیز کو ڈھاٹے باندھنے کے لیے استعمال کرتے تھے جو خاصا مشکل اور الجھن پیدا کرنے والا طریقہ تھا۔

عقبی سیٹ پر دونوں حضرات نے بڑے سائز کی سیاہ نائلون کی جرابوں کا ایک جوڑا استعمال کیا تھا۔ ایک جراب کو ایک نے کھینچ کر سر پر چڑھا لیا تھا اور دوسرے نے دوسری جراب کو سر کے سائز میں تھوڑا بہت فرق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ نائلون کی جراب میں لچک بہت زیادہ ہوتی ہے۔

اب ان دونوں کے سر دو سیاہ رنگ کے گولے سے نظر آتے تھے۔ چہرے کے نقوش بالکل غائب ہو گئے تھے۔ صرف ناک کا اُبھار تھا جو محسوس ہوتا تھا، ورنہ جرابیں ان کی گردن سے بھی نیچے تک آ گئی تھیں۔ آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں سے وہ یقیناً مجھے گھور رہے تھے۔

ان کے ماسک ہی نہیں کپڑے بھی کالے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں انھیں گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ مجھے امید بھی نہیں تھی کہ اس چھکڑے میں جو دُور سے متروکہ املاک لگتا تھا، کوئی میرے انتظار میں ہو سکتا ہے۔

"یہ کیا مذاق ہے بابا؟" میں نے فقیرانہ لہجے میں کہا۔ "فقیروں کی طرف توپوں کا رُخ کر کے کیا ملے گا۔ کشکول میں کچھ ڈالو گے تو ثواب پاؤ گے۔"

"سائیں سکندر... یہ ڈراما ابھی چھوڑ دو۔" دوست محمد نے کہا۔ "پہلے تو ذرا نیچے اترو اور دھکا لگاؤ گاڑی کو۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "اچھا... فقیر سے دھکا لگواؤ گے تو دنیا میں دھکے کھاؤ گے۔" اور نیچے اتر گیا۔ ایک نقاب پوش بھی میرے ساتھ اتر آیا۔

"ویسے تو تم اکیلے ہی کافی تھے۔" میں نے اس کے ڈیل ڈول کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "مگر کیا تمھیں یقین ہے کہ اس ضعیف و ناتواں گاڑی میں دم ہے؟"

"نہیں ہے تو دم ڈالو سائیں۔" دوست محمد بڑے خوشگوار موڈ میں بولا۔ "کوئی وظیفہ پڑھ کے پھونک مارو کہ یہ راکٹ بن جائے۔"

نقاب پوش نے اب ریوالور پتلون میں اُڑس لیا تھا... غالباً وہ میرے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں رکھتے تھے ورنہ ایسا رسک نہ لیتے۔ میں اپنے ساتھ دھکا لگانے والے کو دس سیکنڈ میں ناکارہ بنا کے اس کا ریوالور حاصل کر سکتا تھا لیکن مجھے ایک حیرت آمیز تجسس نے روک لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں۔ رابعہ نے تو کہا تھا کہ دوست محمد کے ساتھ وہ بالکل محفوظ ہے لیکن میرے ساتھ دوست محمد کا رویہ ذرا بھی دوستانہ نہیں تھا۔

مجھے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اکرام کہیں نہ کہیں سے سب دیکھ رہا تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ ہمارا پیچھا نہ کرے۔ وہ ایک انتہائی ذہین اور مستعد پولیس افسر رہا تھا چنانچہ مجھے اغوا کرنے والے اس کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے تھے۔

نقاب پوش نے اور میں نے مل کر گاڑی کو تھوڑا سا دھکا دیا تو گیئر میں پڑتے ہی اس نے جھٹکے سے ایک ہچکی لی اور اس کا انجن اسٹارٹ ہو گیا... اور کیوں نہ ہوتا۔ کار کا مالک ابھی پچپن ہارس پاور والی لانچ کے ڈیزل انجن کو ٹھیک کر کے لوٹا تھا۔ اس کے لیے کار کا یہ چھوٹا سا انجن ایک کھلونا تھا۔

میں نے اطمینان کا سانس لے کر ہاتھ جھاڑے۔ "سارا زور میں نے لگایا... تم خاصے حرام خور ہو۔"

نقاب پوش نے حلق سے حقے جیسی آواز نکالی... جو غصے کے اظہار کا ایک انداز تھی۔ کسی بے چہرہ آدمی سے بات کرنا بڑا عجیب لگتا تھا۔

"میں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم یا تو بہت بدصورت ہو کہ چہرہ نہیں دکھاتے... یا اتنے خوب صورت ہو کہ نظر لگ جانے سے ڈرتے ہو۔"

"ابھی چلو سائیں۔" دوست محمد نے جھلا کے کہا۔ "اس سے کیا پوچھ رہے ہو... جو پوچھنا ہے ہم سے پوچھنا۔"

میں پھر آگے بیٹھ گیا۔ "سیٹھ چاند بھائی کا کیا حال ہے؟" میں نے بے نیازی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے اچانک کہا۔

دوست محمد چونکا۔ "تم کیا جانتے ہو، اس کے بارے میں؟"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا۔ "وہ اپنا یار ہے... اپنا نیکر بدل بھائی ہے۔"

"نیکر بدل بھائی؟" دوست محمد نے کہا۔

"ہاں! جیسے دوپٹہ بدل کے عورتیں بہنیں بن جاتی ہیں۔"

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

میں نے کہا: "میں اور تمھارا سیٹھ چاند بھائی موٹا والا بچپن میں نکھر بدل کے بھائی بن گئے تھے۔ پہلے وہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ میں اسے موٹا بھائی کہتا۔ اب تو سنا ہے کھا کھا کے سؤر ہوگیا ہے۔ ہم تو چندا کہتے تھے۔ اب چاند نکل آئی ہے تو چاند بھائی ہوگیا۔ ایک نہ ایک دن سب کو گنجا ہونا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو ملنگ سائیں۔" دوست محمد نے اطمینان کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ابھی تک ہمارا راستہ وہی تھا جس پہ چل کے میں اور اکرام یہاں تک پہنچے تھے۔ پھر نہ جانے کہاں سے راستہ بدل گیا۔ ابھی مجھے کراچی آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھے سب سڑکیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ دونوں جانب کارخانے تھے۔ کچھ رات کے وقت غیر آباد تھے... کچھ میں زندگی کے آثار محسوس ہوتے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کبھی کبھار کوئی ٹرک مال سے بھرا ہوا گزر جاتا تھا۔

"دوست محمد... تم مجھے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہو۔ اور کیوں لے جا رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آرام سے بیٹھو۔ ابھی سب مالوم ہو جائیں گا۔"

"اس سیٹ پر آرام سے کوئی کیسے بیٹھ سکتا ہے جس کے اسپرنگ نکلے ہوئے ہیں اور جس میں کھٹمل الگ ہیں۔ لیکن یہ جو دو موت کے فرشتے پیچھے بیٹھے ہیں، یہ مجھے پاگل لگتے ہیں۔ ان سے خطرہ ہے کہ خواہ مخواہ مجھے گولی نہ مار دیں۔"

"یہ پاگل نہیں ہیں۔" دوست محمد میرا تمسخر اڑانے کے انداز میں بولا۔

"پاگل نہ ہوتے تو جراب کو پیروں میں پہنتے... سر پہ نہ پہنتے۔ یہ ضرور پاؤں پر پگڑی باندھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ اپنا چاند بھائی کیسا آدمی ہے؟ تم تو جانتے ہو۔"

وہ پھر چڑ کر بولا: "معلوم ہو جائیں گا تمھیں بھی۔"

"ہاں... ویسے میرا خیال ہے کہ اچھا ہی ہوگا۔" میں نے اظہارِ خیال کیا۔ "ورنہ رابعہ اس کے پاس کیوں ٹھہرتی... اور خیریت سے کیوں ہوتی۔"

"تم چپ نہیں بیٹھ سکتے!"

"نہیں دوست... یہ ایک بیماری ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک بیماری ہوتی ہے جوع البقر... آدمی ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔ رعشے کی بیماری میں ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ ایسے ہی میری زبان خراب ہوگئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، دماغ خراب نہیں ہوا۔ زبان چلتی رہے تو کوئی حرج نہیں۔ دماغ چل جائے تو..."

"خدا کے لیے چپ کرو، ورنہ ہمارا دماغ گھوم جائیں گا۔" دوست محمد نے دہاڑ کے کہا۔

میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے دشمن ہیں تو کتنے خطرناک ہیں۔ لیکن وہ مجھے برداشت کر رہے تھے تو اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ بھی نہیں ہیں... نہ دوست اور نہ دشمن... وہ مجھے کہیں لے جا کے پیش کر دینے پر مامور تھے۔ غالباً سیٹھ چاند بھائی کی خدمت میں۔

اور میرا یہ قیاس کچھ دیر بعد حقیقت میں بدل گیا۔ گاڑی نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے اندھیرے آسمان کے نیم روشن پس منظر میں کالے پہاڑوں کی لکیر سی نظر آنے لگی جو دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھی اور لہروں کی طرح نشیب و فراز رکھتی تھی۔

"لو... ہم مری آ گئے۔" میں نے خوش ہو کے کہا۔ "بہت اچھا سیزن ہے۔"

"یہ منگھو پیر کا پہاڑ ہے۔" دوست محمد بولا۔

"کون سا پیر!" میں نے حیران ہو کے کہا۔ "اور یہ پہاڑ انھوں نے خریدا تھا یا بنایا تھا؟"

"پیر سائیں کے بارے میں تم بکواس کریں گا تو ہم گولی مار دیں گا تم کو..." دوست محمد مشتعل ہوگیا... "اور بولی دیں گا سیٹھ کو کہ سالا بھاگتا تھا۔"

"معاف کرنا دوست، دوست محمد۔" میں نے خجالت سے کہا۔ "میرا مقصد تمھارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا... حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بے علم، بے بصیرت اور بے فیض شخص ہوں۔"

"ادھر پیر سائیں کا مزار پر جا کے دیکھو۔" وہ میری معذرت سے مطمئن ہوگیا۔ "کتنا خلق خدا آتا ہے۔ گرم پانی نکلتا ہے پہاڑ سے اور اس میں جو نہاتا ہے اس کا ہر بیماری ٹھیک ہو جاتا ہے۔ خارش ہو، داد، چنبل، کوڑھ... اور ادھر پیر صاحب کا تابعدار مگرمچھ ہے۔ سب ان کو کھانے کو دیتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بولتا۔"

"ایک مگرمچھ ہے؟"

"نہیں... بہت ہے۔" وہ بولا اور گاڑی کو اچانک ایک گیٹ کی جانب موڑ لیا جو کھلا ہوا تھا۔ اس ویران علاقے میں یہ واحد کوٹھی نہیں تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے یہاں اور بھی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور زیرِ تعمیر کوٹھیوں کی تعداد دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زیرِ تعمیر نئی آبادی ہے جہاں سب متمول لوگ رہیں گے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ناظم آباد کا علاقہ تھا۔

مختصر سا راستہ طے کر کے کار رک گئی۔ اس کے سامنے ایک اور کار پہلے سے موجود تھی۔ اندر باہر بہت سی خوب صورت لائٹس روشن تھیں مگر عقبی حصے کی کھڑکیاں تاریک تھیں اور ان کے باہر نکلے ہوئے ونڈو ایئر کنڈیشنر رات کی خاموشی میں زیادہ ہی آواز دیتے محسوس ہو رہے تھے۔

میرے حساب سے وہ کوٹھی ایک کنال کی تھی۔ یہ لاہور کا حساب تھا۔ ابھی تک میں کراچی کے مربع گز والے پیمانے سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ تاہم میرا اندازہ زیادہ غلط بھی نہیں ثابت ہوا۔ وہ چھ سو گز کا پلاٹ تھا۔

برآمدے میں منقش پیتل اور کرسٹل کی آب و تاب رکھنے والا ایک فانوس معلق تھا۔ گاڑی رکنے کی آواز سنتے ہی اندر کا ایک دروازہ کھلا اور ساڑھے چھ فٹ قد کا بے حد توانا جسم والا ایک پٹھان چوکیدار برآمد ہوا۔ شملہ دستار کے ساتھ اس کی مجموعی بلندی ساڑھے سات فٹ بنتی تھی۔ اس نے گھیر دار شلوار کے اوپر قمیص واسکٹ اور واسکٹ پر کارتوسوں کی نمائشی بیلٹ سجا رکھی تھی۔ نمائشی اس لیے کہ اس بیلٹ سے دہشت کا تاثر تو قائم ہوتا تھا مگر وہ پرانے وقتوں کے فیشن کی چیز تھی۔ جو اسلحہ اس کے کندھے پر بیلٹ سے لٹک رہا تھا وہ بہت جدید تھا۔ اس میں کارتوس استعمال نہیں ہوتے تھے۔

"السلام علیکم۔" میں نے پٹھان چوکیدار سے پُرجوش مصافحہ کیا جیسے ہم پرانے بچھڑے ہوئے دوست ہیں۔ "منگا حال دے؟"

"پخیر راغلے۔" پٹھان نے خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا اور پشتو بولا۔ "راشا... ماسرا راشا۔"

اتنی پشتو مجھے نہیں آتی تھی مگر ہاتھ کے اشارے سے میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے اندر چلنے کی درخواست کر رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منکر نکیر غائب ہو چکے تھے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔

پٹھان چوکیدار دروازہ کھول کے منتظر تھا کہ میں اندر جاؤں۔ اس نے کہا: "سے گورئے؟" جس کا میں خاک مطلب نہیں سمجھا چنانچہ میں نے نفی میں سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ دوست محمد ساتھ رہا اور میری زبان دانی پر متحیر نظر آتا رہا۔

انداز آرائش کی شان و شوکت پہ اب میں حیران نہیں ہوتا۔ یہ سب لوگ جو ناجائز اور لامحدود ذرائع آمدنی رکھتے تھے، اپنی دولت مندی کی نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جا کے خوش ہوتے تھے، اس لیے ان کے ذوقِ جمال کو قابلِ ستائش نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

"استا کتا مے دلتہ۔" چوکیدار اب مجھے باقاعدہ اپنا ہم زبان سمجھ کے مادری زبان میں گفتگو پہ آمادہ تھا۔ ایک بار پھر میں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھ لیا کہ وہ مجھے تشریف رکھنے کو کہہ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ ایک صوفے کی طرف تھا۔

صوفے پر بیٹھ کے میں نے بہت عجیب محسوس کیا کیونکہ میرے جسم پر وہی لباسِ فقیری تھا جو راجا کی یونیفارم سمجھا جا سکتا ہے۔ یونیفارم بھی ڈیوٹی کے وقت پہنی جاتی ہے اور راجا بھی یہ کپڑے ڈیوٹی پر ہی زیب تن کرتا تھا۔ لیکن میں ایک انتہائی بیش قیمت سامان سے سجے ہوئے بے حد قیمتی آرام دہ اور امپورٹڈ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ صرف اس لیے کہ میں فقیر نہیں تھا۔ اصل فقیر اس لباس میں شاید گیٹ سے اندر قدم رکھتا تو پٹتا۔

دوست محمد میرے دائیں ہاتھ پہ بیٹھ گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے سنہرے میوزیکل باکس کا بٹن دبایا۔ اس میں جلترنگ سی بجنے لگی اور ایک سگریٹ باہر آ گیا۔ میں نے سگریٹ نکالا تو موسیقی بند ہوگئی۔ باکس سے منسلک لائٹر ایک سنہرے رنگ کا مجسمہ تھا جو امریکی "مجسمۂ آزادی" کی طرح مشعل اٹھائے ہوئے تھا۔ دراصل یہ اسی کا نمونہ تھا... میں نے دوسرا بٹن دبایا تو مشعل روشن ہوگئی۔ میں نے سگریٹ جلا کے بٹن چھوڑا تو مشعل بجھ گئی۔ میرے خیال میں وہ دونوں چیزیں خالص سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ میرے غریب وطن کا عام شہری جس نے اپنے گاؤں یا اپنے قصبے اور اپنے شہر کی گلی سے آگے کی دنیا نہیں دیکھی، یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دولت مندی کی انتہا کہاں ہے اور اس کو خرچ کرنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں جن کے پاس یہ دولت اسی طرح پھیل رہی ہے جیسے ناقابلِ علاج کینسر پھیلتا ہے۔ میں نے فرانس میں ہزاروں ڈالر کی پرفیوم کی ننھی سی شیشی دیکھی تھی تو میں حیران ہوا تھا۔ پھر میں نے سوئٹزرلینڈ میں خالص سونے کے بنے ہوئے شیونگ سیٹ دیکھے جن کے خصوصی پلاٹینم کے بلیڈ تھے اور گھڑیاں دیکھیں جن میں ہندسوں کی جگہ بیش قیمت ہیرے جڑے گئے تھے۔ جرمنی میں آرڈر پر بننے والی وہ کاریں دیکھیں جن کی باڈی سونے کی ہوتی تھی تو لائننگ خالص پلاٹینم کی۔ تو میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں ایک پرنس فرانس میں کار کے حادثے میں مارے گئے تھے۔ موصوف کے ساتھ ایک بے حد حسین فرانسیسی نژاد ماڈل گرل تھی۔ وہ بھی اس حادثے میں ہلاک ہوئی۔ اس کے دو جوتوں میں سے ایک جوتا ملا تو معلوم ہوا کہ اس میں ڈھائی لاکھ ڈالر یا پونڈ کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ دوسرا جوتا لے کر کوئی جائے واردات سے فرار ہوگیا۔ غالباً اس کی سات نسلیں خوشحال ہوگئی ہوں گی اس جوتے کے طفیل...

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

یہاں مسجدوں سے جوتے چُرانے والے پکڑے جاتے ہیں۔

میرے خیالوں کو ایک شخص کی آمد نے منتشر کر دیا۔ وہ چالیس بیالیس سال کا آدمی تھا جس کی شخصیت کو پُرکشش کہا جاسکتا تھا۔ اس کے بال گھنے سیاہ تھے مگر کنپٹیوں پر سفیدی نمودار ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ صحت مند اور دوستانہ جذبات کی مسکراہٹ سے روشن تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھی ذہانت کی چمک تھی، لیکن سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں مجھ سے ملنے کے لیے بہترین سوٹ اور ٹائی کے ساتھ آیا تھا... یا تو وہ اس رکھ رکھاؤ کا عادی تھا یا کہیں جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔

"مسٹر سکندر بخت..." اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "کیا پیو گے یا کھاؤ گے... ؟ نو تکلف۔"

"اگر کوئی پرابلم نہ ہو۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "تو میں کافی کے ساتھ چکن اینڈ ایگ سینڈوچ کھاؤں گا... بلیک کافی۔"

"نو پرابلم..." اس نے کہا اور صوفے کی سائڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ اس کے دوسرے بٹن اسٹیریو میوزک سسٹم کے تھے۔

"یس سر!" صوفے کی پشت سے آواز آئی۔

"کافی بلیک... سینڈوچز..." اس نے مختصراً کہا اور بٹن چھوڑ دیا۔ میں نے بالکل کسی فرسٹ کلاس ریسٹورنٹ کے کسٹمر کی طرح آرڈر دیا تھا اور اس نے ہیڈ ویٹر کی طرح تعمیل کی تھی۔ میں نے یہ اعتراض بدتہذیبی سمجھا کہ اس نے صرف سینڈوچ کیوں کہا۔ دوست محمد کے لیے میرا اعتماد اور انداز باعثِ حیرت ثابت ہو رہا تھا۔

ابھی تک میں طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون ہے۔ سیٹھ چاند بھائی موٹا والا تو بہت بڑا اسمگلر تھا لیکن اپنے نام اور حلیے سے وہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ مجھے پوچھنا پڑا۔

"آپ تو مجھے جانتے ہیں... مگر..."

"میں سیٹھ چاند بھائی موٹا والا ہوں۔" اس نے سوال کا مطلب سمجھ کے اور مسکرا کے کہا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ "آپ کو اپنا نام پہلی فرصت میں بدل لینا چاہیے۔ اس سے بڑا دھوکا ہو سکتا ہے۔"

"نام میں کیا رکھا ہے مسٹر سکندر بخت۔" وہ بولا۔ "آخر تم بھی تو تیر خان تھے... اور معلوم نہیں آجکل کیا ہو... مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تمھارا حلیہ نہیں ہے... تم نام اور حلیے دونوں بدلنے کے ماہر ہو۔"

"میں یہ تسلیم کرلیتا ہوں کہ میرے بارے میں تمھاری معلومات مکمل ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں ؟"

"تم جیسے لوگوں کے وسائل سی آئی اے یا کے جی بی سے کم نہیں ہوتے اور ہم جیسے تو دنیا میں بس جھک مار رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ یہ دنیا تو درحقیقت آپ جیسے گنے چنے لوگوں کی ملکیت ہے۔ اصل میں تو اپنی مرضی سے اور خوشی سے آپ ہی کی کلاس زندگی گزارتی ہے۔ باقی سب جینے پر مجبور ہیں۔"

"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا۔ "کیا تم تقدیر کے فلسفے کو نہیں مانتے ؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "میرے ماننے یا نہ ماننے سے..."

"میں مانتا ہوں۔" اس نے میری بات بڑے اعتماد سے کاٹ دی۔ "ہر شخص کو دنیا میں وہی ملتا ہے جو اس کے مقدر میں ہو۔ اچھے بُرے کا معیار بھی بدلتا ہے، جائز ناجائز کا بھی۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں کہ تم یا کوئی اور مجھے کیا سمجھتا ہے اور میرے اعمال، میرے انجام اور میری عاقبت کے بارے میں کیا رائے یا فتویٰ دیتا ہے۔ آئی آلی لو ان دی پریزنٹ۔ ماضی سے میں سروکار نہیں رکھتا اور مستقبل کے خیال سے پریشان نہیں ہوتا۔"

"تم نے جتنا مجھے حیران کیا ہے اس سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم سچ بولتے ہو اور سچ کو مانتے ہو۔ میں منافقوں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب کیا ہم اصل بات کریں ؟"

"ٹیک اِٹ ایزی۔" وہ بولا۔ "جلدی کیا ہے ؟"

اس سے پہلے کہ میں جلدی کا سبب بتاتا ایک لڑکی ٹرالی کو بڑی نزاکت سے دھکیلتی ہوئی میرے سامنے لے آئی... بہت خوب صورت اور جوان لڑکی تھی لیکن وہ انڈین یا پاکستانی نہیں تھی۔ وہ یورپین یا یوریشین نسل کی لڑکی تھی جس نے ریشمی چوڑی دار پاجامہ قمیص سوٹ کے ساتھ پہن رکھا تھا اور بڑے سلیقے سے دوپٹہ بھی دونوں شانوں پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ میں احتراماً کھڑا ہونے ہی لگا تھا کہ چاند بھائی نے کہا۔

"پلیز سِٹ ڈاؤن... شی از اونلی اے میڈ۔" (تشریف رکھیے... یہ تو ایک معمولی خادمہ ہے۔)

خجالت اور حیرت سے میرا بُرا حال ہوگیا۔ "میں... میں سمجھا تھا کہ یہ تمھاری مسز ہوں گی۔"

لڑکی نے جو جھک کر کافی انڈیل رہی تھی ایک ادا سے ناز سے اپنے سنہرے ریشمی بال ہٹائے اور مجھے بڑی عجیب

نظروں سے دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دُکھ بھی تھا، حسرت بھی تھی... کہ اے کاش ایسا ہی ہوتا جیسا تم نے کہا۔ اور میرے لیے ملامت بھی تھی کہ تم نے ایسا کیوں سمجھا جو میری مزید تذلیل کا سبب بنا۔

چاند بھائی نے خندۂ استہزا کے سوا میری بات کا جواب کچھ نہیں دیا۔ جب وہ کافی رکھ کے چلی گئی تو اس نے کہا۔

"میرے پاس گھریلو کام کاج کرنے والی سب خادمائیں امپورٹڈ ہیں۔ ایک انگلش... دو فرنچ... ایک ڈچ۔"

"یہ آپ اس کلاس کی نمائندگی کر رہے ہیں جو دیسی ہوا میں بھی مجبوراً سانس لیتی ہے ورنہ ان کے لیے فضا، سورج کی روشنی اور وہ مٹی تک امپورٹڈ ہو جس میں ان کو ملنا ہے' یا اپنے کمپلکس کی تشہیر کر رہے ہیں ؟" میں نے تلخ طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یس... مجھے ایک کمپلکس ہے۔ مگر وہ کلاس کمپلکس نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میں ان سفید چمڑی والوں کی منڈی سے غلام اور کنیزیں حاصل کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ نوآبادیاتی نظام ختم ہو جانے کے بعد بھی رنگ دار غلاموں کی خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ کھُلے بندوں۔ انھوں نے افریقہ کو اپنی منڈی بنا رکھا ہے اور ایشیا کے پسماندہ ممالک کو بھی وہ سب گھٹیا کام جو یہ ہم سے لیتے رہے ہیں اور لیتے ہیں' میں ان سے لیتا ہوں... اور جو تذلیل آمیز رویہ ان کا رہا ہے' وہی میں بھی روا رکھتا ہوں۔ وہ کالوں سے نفرت کرتے ہیں' میں گوروں سے نفرت کرتا ہوں... کیا اس میں کوئی برائی ہے ؟"

میں ہکا بکا بیٹھا تھا۔ "برائی... ہاں... برائی تو برائی ہی رہے گی... نفرت کرنا یا تعصب رکھنا ایک برائی ہے۔"

"ہوگی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں ایسی اخلاقیات میں نہیں پڑتا اور تمھیں یہ بھی بتادوں... میں ان کی نسل کو خراب کر رہا ہوں... جیسے انھوں نے یہاں اینگلو انڈین کلاس پیدا کی۔ یہ ایک انتقامی ردِعمل ہے... ویری پرسنل۔"

میں نے حیرانی سے سر ہلایا۔ "ایک زمانہ تھا۔ جب میں لندن میں زیرِتعلیم تھا... تو میرا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ یہی رویہ تھا لیکن وہ ناپختہ شعور کا دَور تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ بولا۔ "پلیز کھانا جاری رکھو۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو ؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم کرو۔" وہ سگریٹ سلگا کے بولا۔ "یہ سمجھو کر میں نے اس بہانے ایک حرم آباد کرلیا ہے اور انتقام کے پسِ پردہ عیاشی مقصود ہے۔ اس کے لیے مجھے بہانے کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں یورپ کے ہر ملک میں رہتا ہوں اور کوئی پارسا نہیں ہوں۔ شرافت کا دعویٰ تک نہیں کرتا... تم نے چوکیدار کو دیکھا ؟ وہ پاکستانی ہے اور میں اسے بہت زیادہ عزت دیتا ہوں۔ وہ میرا دوست اور باڈی گارڈ ہے۔ میری پرسنل سیکریٹری کوئی نہیں۔ میں نے شادی بھی نہیں کی کیونکہ پھر میں صرف ایک بیوی سے وفاداری کے ضابطۂ اخلاق کا پابند ہو جاتا جو میرے لیے ناممکن تھا۔ میں اسے فریب دیتا... وہ مجھے فریب دیتی اور یہ بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔"

دوست محمد بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اس نے کافی بھی نہیں پی تھی بلکہ مجھے بلیک کافی پیتا دیکھ کے ایسا بُرا منہ بنایا تھا جیسے یہ تلخ مشروب اس کے حلق میں اتر رہا ہے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور وہ نقاب پوش کون تھے۔ چاند بھائی اتنا بڑا اسمگلر ہے اور بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے تو اس کی شخصیت میں یہ تضاد کیوں ہے۔ وہ اچھا خاصا تعلیم یافتہ، مہذب اور بااصول آدمی بھی تھا اور دوسری طرف اخلاق اور قانون اور مذہب میں جرم و گناہ کا درجہ رکھنے والے ہر فعل میں بھی ملوث تھا۔ اس کو پیسے کی کمی نہیں تھی۔ پھر وہ اسمگلنگ ہی کیوں کرتا تھا۔ میں اس سے رابعہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن اس کی باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ ذاتی سطح پر وہ میرا دشمن نہیں دوست ہے چنانچہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ دوستی کے ان جذبات کی بنیاد تو مشترک نہیں ہے ؟ بالکل اسی طرح جیسے نسلی تعصب کے خلاف اس کے اور میرے رویے میں ایک قدرِ مشترک تھی۔

"کیا تم شادی کے قائل ہی نہیں... میرا مطلب ہے ایک روایتی فیملی انسٹی ٹیوشن کے ؟" میں نے کہا۔ "ہر دولت مند کو ایک وارث کی ضرورت تو پڑتی ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "بہت جلد میں شادی کروں گا۔ اور کسی بہت معزز اور شریف گھر کی لڑکی سے... مڈل کلاس میں اخلاق و کردار... عصمت و عفت کا اور شوہر پرستی کا جو تصور ہے اس میں بڑی کشش ہے میرے لیے۔ میری بیوی اسی طبقے کی روایات کے مطابق رہنے والی بیوی ہوگی۔ اور تم نے ٹھیک کہا۔ مجھے ایک وارث کی ضرورت نہ ہوتی تو میں بیوی کے چکر میں نہ پڑتا۔ ایک مظلوم و بے زبان اللہ میاں کی گائے قسم کی ذہین چندے آفتاب چندے ماہتاب اور سلیقہ شعار لڑکی کو اس محل میں قید کر کے ڈالنا مجھے پسند تو نہیں لیکن مجبوری ہے۔ اور اتفاق ہے کہ انھی دنوں میں ایک لڑکی ملی بھی ہے۔"

"تمھاری زبان اور تمھارا لہجہ..." میں نے کہا۔ "تمھارے

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔"

"یہ میرا کاروباری نام ہے۔" وہ بولا۔ "بالکل اسی طرح جیسے اداکاروں کے فلمی نام ہوتے ہیں اور لکھنے والوں کے قلمی نام ہوتے ہیں۔ اصل نام کچھ اور ہوتا ہے۔" وہ بولا "تم تو سمجھتے ہو نا کہ جیسے فلمی دنیا میں 'کمار' بہت چلتا ہے۔ دلیپ کمار... اشوک کمار، کشور کمار، منوج کمار۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک میں سنتوش کمار... تو یہاں ایسے کاروباری نام بہت مقبول ہیں۔ گڈوِل رکھتے ہیں اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔"

"اب تو خیر تم پاکستانی ہو میری طرح... لیکن تمھارا تعلق کس شہر سے ہے؟" میں نے کہا۔ "یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے میں بھی چڑتا ہوں۔ لیکن میں ابھی تک تمھارے بیک گراؤنڈ کا تعین نہیں کرسکا۔"

"میرا بیک گراؤنڈ۔" وہ سوچ کے بولا۔ "میرا کوئی بیک گراؤنڈ نہیں۔ میری ایک ماں تھی۔ میں نے اُسے دیکھا نہیں۔ یقیناً کوئی باپ بھی ہوگا۔ اُسے بھی میں نہیں جانتا... ممکن ہے وہ دونوں زندہ ہوں... یا نہ ہوں... میری پرورش کانونٹ میں ہوئی۔ اُسے تم عیسائی مشن کا یتیم خانہ کہہ سکتے ہو۔ جہاں لاوارث بچے قبول کیے جاتے ہیں اور انھیں تربیت کے لیے بہترین ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ یہی ایک فرق ہے ہمارے اور ان کے یتیم خانوں میں۔ وہ ہر بچے کو معصوم فرشتہ سمجھ کے رکھتے ہیں اور اسے ایک راسخ العقیدہ کرسچن بنا دیتے ہیں جو اسلام سے ہی نہیں مسلمانوں سے بھی نفرت کرتا ہے۔ ان کی تعلیمات نے عقائد سے 'روایات سے...'"

اس نے اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے اچانک گھڑی دیکھی اور کہا۔ "دوست محمد... تم جاؤ آرام کرو۔ تم سے صبح ملاقات ہوگی۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کے اُسے تھما دیے۔ "معاف کرنا باتوں میں دیر ہوگئی۔"

"اپنا بہت ٹیم خراب ہوا صاحب۔" دوست محمد نے ناگواری سے کہا۔ "آپ لوگوں کا بات اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔"

چاند بھائی ہنسا۔ "سوری یار تم بور ہوتے رہے... اچھا دیکھو اگر کوئی باہر ہے...؟"

"ایک ٹیکسی والا پیچھے آیا تھا۔" دوست محمد نے کہا۔

"اسے کہو گھر جائے۔" چاند بھائی نے کہا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تو ہمارا کب دشمن ہے۔" چاند بھائی بولا۔ "اسے کہنا کہ فکر نہ کرے... سب خیریت ہے۔"

میں کچھ کہتے کہتے چُپ ہوگیا۔ دوست محمد بڑبڑاتا ہوا نکل گیا۔

"اچھا آدمی ہے۔ ذرا خبطی ہوگیا ہے اس عمر میں۔" چاند بھائی بولا۔

"کیا ہم سب خبطی نہیں ہوتے؟" میں نے کہا۔ "خبط کی نوعیت جدا ہوسکتی ہے... لیکن تم اور میں اپنے اپنے خبط کا شکار ضرور ہیں۔"

"تم یہ کپڑے بدل لو۔" وہ بولا۔ "میں ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا... اگر تم سونا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ورنہ ہم رات کو بات کریں گے۔" اس نے پھر بٹن دبا دیا۔

"جانے سے پہلے مجھے رابعہ کے بارے میں تو بتا دو۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟"

لیکن اس نے میری بات کے جواب کو ضروری نہیں سمجھا۔ اور اس لڑکی سے مخاطب ہوگیا جو کال بیل پر اندر آکے اور سر جھکا کے کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ پہلے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اپنے حسن و شباب کی غارت گری میں اس سے کسی طور کم نہ تھی۔ اس کے بال بھی بھورے تھے اور آنکھیں بھی بھوری تھیں۔ لباس اس نے بھی کنیزوں والا پہن رکھا تھا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا کہ چاند بھائی نے عمداً انھیں شاہی دور کی کنیزوں والا لباس دے کر ان کی حیثیت کے ظاہر کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ یورپ کی ماڈل گرل نظر آنے کے لیے وہ لباس پہننا پسند کرتیں جو کم سے کم لباس ہو اور زیادہ سے زیادہ فیشن۔ اس نے پہلی کنیز کو نام سے نہیں پکارا تھا مگر اس لڑکی کو اس نے 'مرجانہ' کہہ کے مخاطب کیا اور اس سے فرانسیسی زبان میں بات کی۔ یہیں وہ مار کھا گیا۔ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سنا، پڑھا اور معلوم کیا تھا لیکن ان سب معلومات جو اسے حاصل ہوئیں 'میری' مصروفیات' سے تعلق تھا۔ کوئی کیسے بتا سکتا تھا کہ سکندر بخت فرنچ بھی سمجھتا ہے۔ صرف محسن ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ میری فرنچ میں گفتگو ہوتی تھی لیکن وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ خاص مواقع پر جب رازداری کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم فرنچ میں وہ کہہ دیتے تھے جو انگریزی یا اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے۔

اس نے مرجانہ سے کہا۔ "یہ میرا مہمان ہے چنانچہ اس کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہوئی تو میں ہنٹر سے تمھاری کھال اُدھیڑ دوں گا سفید قلم کتیا... تم اس کو انکار نہیں کرو گی خواہ یہ تم سے جان مانگے... جسم کے بعد"

"آپ مطمئن رہیں جناب۔" لڑکی نے ایسے عاجزانہ ملائم لہجے میں کہا کہ مجھے اس کے انکسار میں شدید ترین نفرت کے زہر کی تلخی اور اس کے لہجے کی نرمی میں وہ کاٹ محسوس ہوئی جو بلیڈ کی دھار میں ہوتی ہے۔ خود چاند بھائی نے گفتگو کا جو لہجہ اختیار کیا تھا وہ بے حد شریفانہ اور مہذب تھا۔ اگر میں فرنچ نہ سمجھتا تو مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ اتنی نرمی سے وہ کتنی سخت بات کہہ گیا۔

"اور ہاں۔" اس نے دروازے کا رُخ کرتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ "اگر یہ کوئی سوال کرے۔ خصوصاً اس عورت کے بارے میں جو کل شام بھی یہاں آئی تھی' میں اس کا نام لینا ضروری نہیں سمجھتا' یہاں بہت عورتیں آتی ہیں مگر میں تم سے جس عورت کی بات کر رہا ہوں' وہ عام عورت نہیں ہے۔ یہ بات تم جانتی ہو۔"

"میں جانتی ہوں جناب..."

"تم اُسے کچھ نہیں بتاؤ گی... اگر تم نے بتایا تو مجھے معلوم ہو جائے گا اور پھر تمھیں اندازہ نہیں کہ تمھارے ساتھ یا مارسیلز میں کسی اور کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔"

میں نے لاتعلقی کا انداز برقرار رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ آخری دھمکی پر اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور نہ جانے کیوں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لڑکی کا وجود خوف کی سرد لہر سے کانپ اُٹھا ہے۔ مارسیلز میں کون تھا جس کا حوالہ یوں دیا گیا؟ میں نے سوچا۔ کیا چاند بھائی کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ سات سمندر پار کسی کی گردن تک پہنچ جاتے ہیں؟ اور یہ سب لڑکیاں جو کنیزیں بنی ہوئی ہیں، درحقیقت خوف کی اسیر ہیں۔ چاند بھائی ان سے انتقام لے رہا ہے یا انھیں بلیک میل کر رہا ہے؟ ان کو اس نے سفید غلام زادیوں کی طرح اپنی دولت سے خریدا ہے یا طاقت سے دبوچ رکھا ہے؟

جب وہ چلا گیا تو میں نے سر کو جھٹکا اور گویا فضول خیالات کو جھٹک دیا۔ چاند بھائی یقیناً ایب نارمل تھا نفسیاتی مریض تھا۔ ایک جینئس اگر منفی سوچ اختیار کرے تو بہت بڑا مجرم یا دہشت گرد بھی بن سکتا ہے۔ لیکن مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اس پاگل آدمی کے پاگل پن کے اسباب اور نتائج کے چکر میں پڑوں۔ اتنی فرصت کہاں ہے میرے پاس کہ ان کنیزوں کے بارے میں سوچوں اور ان سے جذباتی ہمدردی کا اظہار کروں۔ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ چاند بھائی یقیناً خطرناک آدمی بھی تھا۔ میں اس سے دشمنی مول لے کر کیا کروں گا یہی کیا غنیمت ہے کہ یہاں میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ ہے۔ اور اب مجھے اسی دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رابعہ سے ملنا ہے اور کسی طرح اسے نکال کے لے جانا ہے۔

"کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے۔" اس لڑکی نے انگریزی میں کہا۔

"اوہ یس مرجانہ۔" میں نے چونک کر کہا۔ "کیا میں بہت دیر سے تم کو گھور رہا تھا؟ کوئی بات نہیں... تم ہو ہی ایسی چیز مگر گھورنے سے تمھارے حُسن کی آب و تاب کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ اگر کوئی چاند کو گھورتا ہے تو کیا چاندنی میں فرق آتا ہے؟"

وہ مجھے پلکیں جھپکا کے دیکھتی رہی۔ غالباً وہ زیادہ انگریزی نہیں سمجھتی تھی اور میں نے تو شاعری کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ تاہم جو بات ہر عورت ہر زبان میں سمجھ لیتی ہے، خواہ وہ عبرانی ہو یا گورمکھی۔ وہ اس نے بھی سمجھ لی۔ یہ حسن کی توصیف و ستائش کی زبان تھی جس کو سمجھنے کے بعد اس کے عارض پھر تازہ گلابوں کی مہک دینے لگے تھے۔

وہ مجھے ایک خواب گاہ میں لے گئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ وہ خوابگاہ میرے جیسے فقیروں کے لیے نہیں بادشاہوں کے لائق تھی۔ دنیا کے سب سے اعلیٰ فائیو اسٹار ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا بھی اس کی شان و شوکت کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم ہے۔ اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو..."

"نہیں... وہ تو جب میں بہت چھوٹا تھا' تب اماں نہلاتی تھیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "اب میں خود نہا سکتا ہوں اور کپڑے بھی بدل سکتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تم فقیر کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"تم کنیز کیوں بنی ہوئی ہو مرجانہ؟" میں نے کہا۔

اس نے خوف زدہ ہوکے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "اس بٹن کو آپ مجھے بلانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔" اس نے میری بات گول کرتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو کہیں سُنی یا ریکارڈ کی جاسکتی ہے۔

"کیا کبھی کسی نے تمھیں بتایا ہے کہ مرجانہ کون تھی؟"

"میری جوانا... یہ غالباً ایک نشہ ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"میری جوانا نہیں... مرجانہ..." میں نے کہا۔ "ویسے تو تم بھی نشہ ہو... مگر اصل مرجانہ ایک کنیز تھی... علی بابا کی..."

"کون علی بابا؟"

"وہی... قاسم کا بھائی۔" میں نے کہا۔ "مرجانہ نے اپنی ذہانت سے چالیس چور ہلاک کیے تھے۔ یعنی جو کام علی بابا کے بس کا نہیں تھا' وہ مرجانہ نے کر دکھایا... اور... خیر یہ کہانی تو بہت لمبی ہے اور تم سُن کے کیا کرو گی... دوبارہ سوچنے پر میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے تمھاری... اور تمھاری مدد کی اشد

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint
www.paksociety.com

ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور میں تمھارے پہلے سوال کا دوسرا جواب یوں دیتا ہوں کہ... یس... اِف یو پلیز۔" میں نے اُسے انگلی کے اشارے سے قریب بلایا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے فقیری چغہ اتار دیا تھا۔ نیچے میرے اپنے کپڑے تھے جو اتنے بُرے نہیں تھے کہ میں انھیں بھی اتار پھینکتا۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور زور سے کہا۔" آج لُطف آئے گا ٹرکش باتھ کا۔" اور اُسے اندر کھینچ لیا۔

" ڈرو نہیں۔" میں نے سرگوشی میں فرنچ بولتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر کے شاور چلا دیا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف بھی شامل رہا۔

" کیا ہماری گفتگو کوئی سُن رہا ہے؟" میں نے اُس کے کان میں کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔" تم... تم کیا چاہتے ہو؟"

" مجھے بہت دُکھ ہوا تھا۔" میں نے کہا۔" جس لہجے میں اس کتّے کے بچّے نے تم سے بات کی تھی۔ آخر وہ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ اسے خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

" پلیز... ایسی باتیں مت کریں یہاں۔" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

" تم کیوں ڈرتی ہو اس سے؟" میں نے کہا۔

" اس سے سب ڈرتے ہیں... تم بھی ڈرو۔"

مارسیلز میں تمھارا کون ہے؟" میں نے کہا۔

" سب... میرے گھر والے... ماں باپ... دو بہنیں... ایک بھائی... اور منگیتر... ہماری شادی ہونے والی تھی۔"

" دیکھو... خدا کے لیے ہسٹریا میں مبتلا مت ہو جانا۔" میں نے کہا۔" اپنے آپ کو سنبھالو... تم سے ہمدردی کر کے میں تمھیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔"

" فرانس میں ہی نہیں، پورے یورپ میں اس کے مراسم مافیا کے ایجنٹوں سے ہیں۔" وہ آنسو پی کے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

" اور ان کے ذریعے...؟"

" ان کے ذریعے اس نے مجھے... میرے خاندان کو... سب کو بلیک میل کیا اور مجھے ایک سال کے لیے یہاں لے آیا... اپنی کنیز بنا کے... وہ ذلت دینے کے لیے جس کا میں سوچ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں یہ وقت صبر و شکر سے کاٹ ... دوسری سب لڑکیوں کی طرح... تاکہ باقی لوگ محفوظ ... میں واپس جا کے شادی کر سکوں۔ اگر میں نے احتجاج ... یا بغاوت کی... تو بہت بُرا ہو گا... یہ میں جانتی ہوں...

یہی وجہ ہے کہ میں ہنٹر کی مار بھی برداشت کر جاتی ہوں... کیا تم دیکھو گے اس مہذب وحشی کا انتقام؟" وہ ایک دم چیخی۔

" نہیں... پلیز... میں نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔" دیکھ لیا تو بھول نہیں سکوں گا۔"

" ایک لڑکی یہ سب برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ایک دن اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے مزاحمت کی اور... حملہ کر دیا۔ اس کی لاش دیکھی تھی میں نے بھی۔" اس کا وجود لرزنے لگا۔

" کیا تمھاری عزت محفوظ ہے؟" میں نے الفاظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کے کیا۔

" ہاں... یہی ایک اچھی بات ہے۔ وہ صرف غلامی کی ذلت دیتا ہے اور بس...۔" وہ بولی۔" کچھ لڑکیاں تو اسے بھی تذلیل سمجھتی ہیں کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ مرد کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں... حالانکہ وہ سب خوب صورت اور پُرکشش ہوتی ہیں۔ ان کو ایک سال قیدِ بامشقت کاٹنی پڑتی ہے۔ پھر ان کی جگہ دوسری آجاتی ہیں۔"

" میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

" کچھ نہیں... کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ بولی۔" آٹھ مہینے گزر گئے ہیں۔ باقی چار بھی گزر جائیں گے۔"

" تمھارا یہ ظالم آقا ابھی کس عورت کی بات کر رہا تھا؟" میں نے اچانک سوال کر دیا۔

وہ چونکی لیکن خاموش رہی۔

" میں نے وہ ہدایات بھی سُنی تھیں۔ جو اس نے تمھیں دی تھیں۔" میں نے کہا۔

" پھر تو تمھیں مجھ سے یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

" دراصل... ایک اتنی ہی بڑی مجبوری میری بھی ہے۔" میں نے الفاظ کو چبا چبا کے کہا۔" جتنی بڑی تمھاری... بس فرق سیکس کا ہے۔"

" مجبوری کی بھی سیکس ہوتی ہے؟"

" ہاں... کیوں نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔" مثلاً تمھاری مجبوری مذکر ہے اور میری مؤنث۔ وہ تمھارا منگیتر ہے جس کی خاطر تم اپنی سب سے بڑی چیز قربان کر رہی ہو... یعنی عزّتِ نفس... اور وہ میری منگیتر ہے جس کی خاطر میں یہ بھیس بدل کے گھومتا پھرتا یہاں تک آپہنچا ہوں۔ مجھے شک نہیں، یقین ہے کہ وہ بھی یہیں قید ہے۔"

" اگر ہے تو تم اسے لے جا نہیں سکتے..."

" وہ کیا ہے کہ... ہم دونوں کے لیے انتظار اور جدائی جھیلنا بالکل ناممکن ہے... ہم یا تو ایک ساتھ جی سکتے ہیں

ورنہ اکٹھے مر سکتے ہیں... ہمارے لیے ایک ہی بات ہے... ہم زندہ رہ کر ہی ایک دوسرے کو چاہنے پر مجبور نہیں ہیں۔"

" یہ کیا بات ہوئی...؟ زندہ نہ رہنے کی صورت میں چاہت کہاں رہتی ہے؟" وہ بولی۔

رہتی ہے... یہی تو بات ہے جو تم مغرب والے نہیں سمجھتے۔ یہاں مشرق کی عاشقانہ روایات میں محبّت صرف ہی نہیں ہوتی، روح بھی ہوتی ہے اور اس دنیا میں جسم کا وجود نہ رہے تو دوسری دنیا میں روحیں مل جاتی ہیں۔ اس عقیدے میں ہمارے لیے بہت سکون کا سامان ہے۔ چنانچہ ہم مرجانا پسند کرتے ہیں لیکن جدائی قبول نہیں کرتے۔" میں نے اسے ایک خود ساختہ نظریاتی فلسفے سے قائل کیا۔

" کیا یہ آواگون کا فلسفہ ہے؟" وہ کنفیوز ہو کے بولی۔

" لاحول ولا قوۃ... نہیں، وہ تو ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ روح کے سات جنم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔" اور اس کا ایک مضحکہ خیز پہلو یہ بھی ہے کہ جسم سے ایک بار نکل جانے والی روح دوبارہ دنیا میں آتی ہے تو ضروری نہیں کہ اسی زمانے میں آئے یا اسی مقام کی پابند ہو... روح سو سال بعد کسی اور کے قالب میں نمودار ہو سکتی ہے۔ اس عقیدے کے مطابق تو یہ ہے کہ اس سال کی مس یونیورس فوت ہو جائے تو اس کی روح اگلے جنم میں ٹمبکٹو کے چڑیا گھر کے خرگوش میں ہو سکتی ہے یا افریقہ کے کسی آدم خور قبیلے کے سردار کے جسم میں بھی مل سکتی ہے۔ کچھ ایسی ہی خرافات ہیں۔ ہم تو روح کی ابدیت کے قائل ہیں... خیر... تم یہ سمجھ لو کہ مجھے میری محبوبہ نہ ملی تو میں یہیں اسی گھر میں تمھارے سامنے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ کسی بلیڈ سے یا کچن کی چھری سے... اور وہ اس گھر میں ہوئی تو اسی وقت وہ بھی تن سے اپنا سر دیوار پر مارے گی یا دونوں انگلیاں بجلی کے پلگ میں ڈال کے کھڑی ہو جائے گی اور ایسے ہی لرزتے ہوئے اللہ کو پیاری ہو جائے گی جیسے تم لرز رہی ہو... دونوں خون تمھاری وجہ سے ہوں گے۔ اس دُہرے قتل کے الزام میں تم کو دنیا کی کسی عدالت سے تو سزا نہیں ہو گی لیکن تمھارا ضمیر تمام عمر تم کو قاتل کہے گا۔"

" یہ... کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے...؟ کسی اور سے پوچھ لو... میں نہیں بتا سکتی۔"

" چلو اتنا ہی بتا دو کہ کیا اس کا نام رابعہ ہے؟"

وہ خاموش باتھ روم کی دیوار سے پشت لگائے کھڑی رہی۔ اور میں اس کے اوپر یوں جھکا رہا کہ میرے دونوں ہاتھ دیوار پر تھے اور وہ تقریباً میری گرفت میں تھی۔ اگرچہ میرے اور اس کے جسم کے درمیان شرعی فاصلہ تھا مگر میں اس کے بدن سے پھوٹتے والی خوشبو کی ہیجان انگیزی کو محسوس کر سکتا تھا اور اس کے قرب کی آنچ کی تابکار شعاعوں سے محفوظ نہ تھا۔

" آل رائٹ۔" میں نے اس کے سکوت سے تنگ آ کے نفسیاتی راؤنڈ نمبر ون ختم کر دیا اور الگ ہو گیا۔" مت بتاؤ... لیکن یاد رکھو کہ جو شخص مرنے پر تیار ہو، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ پاگل بھی ہو سکتا ہے اور... اور شرافت، اخلاقیات اور نیکی بدی کی تمیز کھو دے تو کہہ سکتا ہے کہ سب کی ایسی تیسی۔ جب ہم نہیں تو زمانہ نہیں... محبّت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ یہ فلسفہ تو تمھارے ماحول میں بھی قبولیت کی سند رکھتا ہے۔ میں وہ سب چاند بھائی کو بتا دوں گا جو تم اب تک مجھے بتا چکی ہو... تاکہ تم بھی دوسری دنیا میں ہمارے ساتھ چلو۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے دھڑام سے غسلخانے کے فرش پر گر جائے گی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

" تم... بلیک میل کر رہے ہو مجھے؟"

" یس... جس حد تک میں جا سکتا ہوں ضرور جاؤں گا... مجھے کسی کی پروا نہیں۔" میں نے کہا۔" جب تمھیں اپنی فکر ہے اور مجھ پر اعتماد نہیں۔"

" پلیز... ایسا مت کرنا... یقین کرو، میں کسی رابعہ کو نہیں جانتی، ورنہ ضرور بتا دیتی۔" اس کے کانپتے ہونٹوں نے سرگوشی کی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

" اچھا وہ عورت کون تھی جو کل شام آئی تھی۔ اس نے نام لینے سے گریز کیا تھا اور کہا تھا کہ تم سمجھتی ہو۔"

" وہ... اس عورت سے شادی کرنے والا ہے۔ میں نے سُنا ہے... وہ کوئی انڈین ہے... بہت خوب صورت اور ایسی گریس فُل کہ میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی۔ نہ فلموں میں نہ تصویروں میں... اور وہ بہت خوش گفتار... مہذب اور نیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی انڈین پرنسس ہے..."

وہ بولتی جا رہی تھی لیکن میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں ہونے والے پہلے دھماکے نے ہی میرے خیالات کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ میرے ہاتھوں کی وحشیانہ گرفت اتنی سخت تھی کہ اُس کی چیخ نکل گئی۔

" چھوڑو... چھوڑو مجھے... تم پاگل ہو رہے ہو!" وہ چلائی۔

لیکن یہ ایسی بات تھی جو 'خطرناک' نہیں تھی۔ اگر کوئی سنتا تو باتھ روم میں میری زیادتی کے خلاف اس احتجاج پہ

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

صرف مسکراتا۔

"نہیں... میں نہیں چھوڑوں گا تمھیں۔" میں نے بھی بلند آواز میں کہا مگر اسے چھوڑ دیا۔

"دیکھو اچھی لڑکی۔" میں نے بہت نرمی سے سرگوشی میں اس کی منت سماجت کی۔ "مجھ پر رحم کرو... میں تم سے زیادتی کی معافی مانگتا ہوں... بس مجھے رابعہ کے بارے میں بتا دو... یہ یقین دلا دو کہ وہ عورت رابعہ نہیں تھی جو کل شام آئی تھی۔ جس کا چاند بھائی نے حوالہ دیا تھا۔"

"میں یسوع مسیح کو گواہ بنا کے کہتی ہوں... کہ میں اس کے نام سے واقف نہیں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تمھیں بتا سکتی ہوں کہ اس لڑکی کی شکل و صورت کیسی تھی... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آئی تھی... اور لوٹ کر کہاں گئی۔ میں نے تو کوئی گاڑی بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"تم بتاؤ کہ وہ کیسی تھی... اس کی آنکھیں... اس کے بال... اس کے لب... ناک نقشہ... قد و قامت' لباس... یہ سب تو دیکھا ہو گا تم نے...؟"

اس نے سوچ سوچ کے اور یاد کر کے مجھے خاصی تفصیل فراہم کی مگر اس سے میرا ذہنی خلفشار کم نہیں ہوا۔ یہ رابعہ ہو بھی سکتی تھی اور نہیں بھی... دراصل رابعہ کے خد و خال میں کوئی بات منفرد تھی تو وہ اس کے حسن کی تمکنت اور ساحرانہ قوت تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ یا بالوں کا رنگ اور چہرے کی ساخت اور اس کے حسن کا بیان ہوتا تو یہ کسی کی بات بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی اسے اپنی چشم تصور سے مینا کماری سمجھتا تو کوئی نیلو... کوئی جنت کی حور کہتا تو کوئی کوہ قاف کی پری۔

اب وقت بہت کم رہ گیا تھا اور میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔ یہ سوچ کے میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا کہ چاند بھائی کے دماغ میں رابعہ سے شادی کا خیال ہے۔ میں اسے صفائی میں ایک لفظ کہنے کا موقع دیے بغیر قتل کر دینے کی سوچتا تھا۔ پھر عقل کی دیوار سامنے آجاتی تھی۔ "پاگل مت بنو... وہ رابعہ نہیں ہو سکتی... اور کیا رابعہ ایسا کر سکتی ہے... مر سکتی ہے... جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا... مگر سر تسلیم خم نہیں کر سکتی۔ دیکھو... سوچو... سمجھو... حالات کا جائزہ لو... حقیقت اور اصلیت تلاش کرو!"

"تم جاؤ..." میں نے ایک دم اسے بازو سے پکڑ کے دروازے کی طرف کھینچا۔

"جاتی ہوں... مگر..."

"میں نہیں بتاؤں گا... میں اتنا کمینہ آدمی نہیں ہوں۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میرا ابلتا ہوا خون ٹھنڈا پڑنے لگا اور میرے دماغ سے اٹھنے والا شکوک' وسوسوں اور اندیشوں کا دھواں چھٹ گیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت لوٹ آئی۔

ایک گھنٹے بعد چاند بھائی واپس آیا تو میں نہا دھو کے تازہ دم ہو چکا تھا اور کپڑے بھی بدل چکا تھا۔ وہاں ہر شخص کے لیے ہر وقت کی ضرورت کے مطابق ہر سائز کے لباس سے وارڈ روب بھرا ہوا تھا۔ دوسرے وارڈ روب میں زنانہ ملبوسات تھے اور یہ سب اہتمام مہمانداری تھا۔ اس کے بار ہر طرح کے مہمان آتے ہی رہتے ہوں گے۔

میں نے آرام کے لیے ایک پاجامہ سوٹ اور گاؤن منتخب کر لیا تھا کیونکہ طے شدہ طور پر مجھے رات بھر تو یہاں رکنا ہی تھا۔ اس کے بعد کہیں جانا ہو گا تو کہاں جانا ہو گا میں نہیں جانتا تھا۔ نازو اور اکرام کی طرف سے اب مجھے تشویش لاحق نہیں رہی تھی۔ اکرام شیخ میرے تعاقب میں آیا تھا اور میری طرح خوش فہمی کا شکار وہ بھی ہو گا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ مگر اسے نوٹ کر لیا گیا تھا اور چاند بھائی کے احکامات کے مطابق واپس بھی کر دیا گیا تھا۔

چاند بھائی سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی دوستانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم بہت بہتر نظر آ رہے ہو۔" اس نے کہا اور ایک صوفے میں دھنس گیا۔ "مجھے ایک بزنس اپائنٹمنٹ کے سلسلے میں جانا پڑا۔"

میں نے خود کو بالکل نارمل رکھا۔ "کیا اب تم فارغ ہو؟"

"ہاں... ڈنر تک..." اس نے گھڑی دیکھی۔ "اس کے بعد پھر شاید تمھیں ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑے۔"

"تم بہت مصروف آدمی ہو... اور بہت بدنام بھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ تمھارے نام سے ڈرتے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"وہی جو تمھارے کاروبار سے منسوب ہیں۔"

"اور تم انھیں بھی جانتے ہو۔" اس کا لہجہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔

"نہیں... مگر جیسا کہ میں نے سنا ہے؟" میں نے کہا۔

"کس سے سنا ہے آخر؟ تم تو ابھی کراچی پہنچے ہو۔ کم وقت میں تم کراچی جیسے بڑے شہر کے نیک نام اور بدنام لوگوں سے واقف ہو گئے؟" وہ بولا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ میری یہ شہرت یا بدنامی لاہور تک ابھی نہیں پہنچی۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ میرا یقین بے بنیاد ہے۔" میں نے

جھنجلا کے کہا۔ "کیا یہ بات غلط ہے؟"

"نہیں... وہ بات کیسے غلط ہو سکتی ہے جسے میں نے خود ایک سچ ثابت کیا ہے۔" وہ بولا۔ "دراصل یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ سیاست کی طرح تجارت میں بھی شہرت ہونی چاہیے۔ اچھا کاروبار ہو تو اچھی اور برا ہو تو بری... بہت اچھی یا بہت بری۔ میرا اپنا ایک پبلسٹی بیورو ہے سمجھ لو... جو ایسی خبریں پھیلاتا ہے جن سے میری دہشت قائم رہے۔ میرے کاروبار میں اس آدمی کو شہر میں مشہور ہونا چاہیے لیکن منفی انداز میں... یعنی یہ کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے' تباہ کن ہے اور معاف نہیں کرتا۔ جلاد صفت ہے اور آدمی کی جان کی اتنی بھی پروا نہیں کرتا جتنی..."

"کیا تم واقعی ایسے ہو؟"

"تمھارا کیا اندازہ ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ابنارمل ہو... ایک ایول جینئس... تم مثبت راہ اختیار کرتے تو شاید اس ملک کے وزیرِ اعظم بھی بن سکتے تھے اور فلم لائن میں جاتے تو دلیپ کمار سے زیادہ شہرت پاتے۔ کوئی بھی فیلڈ تمھارے لیے لامحدود کامیابیوں کا ضامن ہو سکتا تھا مگر تم نے یہ فیلڈ منتخب کر لیا۔ تم انتقامی ردِ عمل میں صرف دشمنوں کے دشمن نہیں رہے۔ بلکہ انسانوں کے دشمن بن گئے اور اگر میں کہوں کہ انسانیت کے دشمن ہو گئے تو شاید غلط نہ ہو... تھوڑے بہت ابنارمل ہم سب ہوتے ہیں' تھوڑے بہت اذیت پسند بھی — مگر تم انتہا پر ہو۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس مرحلے پر تمھیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم برے آدمی ہی رہو... تم راستہ بدلنے پر بھی قادر ہو۔ جو آدمی دنیا کو شکست دے سکتا ہے وہ خود پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے... تم نے دنیا کو سرنگوں کر دیا۔ میری مراد ان قوتوں سے ہے جو اخلاقی' مذہبی... معاشرتی یا قانونی عدل کے ضابطے مرتب کرتی ہیں۔ طاقت — دولت اور شہرت... سب تم نے دنیا سے چھین لیا۔ اب کیا رہ گیا ہے جس کے لیے تم جد و جہد کر رہے ہو؟ تم نے اندھیرے کی منزل کا سفر طے کر لیا۔ کیا اب تمھیں یہ خیال نہیں آتا کہ روشنی کی سمت بھی چلنا چاہیے دیکھنا چاہیے کہ میں اپنی قوتِ تسخیر پر غلط ناز تو نہیں کرتا؟"

معلوم نہیں میں کیوں اتنا بول گیا اور کیسے بول گیا۔ اس سے زیادہ تعجب مجھے چاند بھائی پر ہوا جو بڑے سکون سے سب سنتا رہا اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے انداز و اطوار میں خفگی یا برہمی... غیر سنجیدگی اور لاتعلقی محسوس ہوتی تو میں چپ ہو جاتا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے میری بات سن رہا ہے اور سمجھ رہا ہے۔ اس نے مجھے موقع فراہم کیا کہ میں اس کے بارے میں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کر سکوں۔

"مسٹر سکندر بخت۔" اس نے خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد کہا۔ "میں لوگوں سے بے تکلف نہیں ہوتا۔ میرے دوست نہیں ہیں۔ سب کاروباری تعلقات رکھنے والے لوگ ہیں جن کے مفادات مجھ سے وابستہ ہیں۔ باقی خوشامدی' مفت خورے' ملازم اور کارکن وغیرہ ہیں۔ میں سب کو جانتا اور پہچانتا ہوں۔ ان میں اچھے لوگ بھی ہیں مثلاً دوست محمد... میں اسے کھرا اور صاف گو سمجھتا ہوں چنانچہ اس کی بات کا برا نہیں مانتا... اور بھی کچھ لوگ ہیں جن کے مشورے کو میں اہمیت دیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی دوست نہیں ہے۔ وہ وقت جب میں دوست بنا سکتا تھا ضائع ہو گیا۔ دوستی کے جذبے کی بنیادیں اس دور میں رکھی جاتی ہیں تو پائدار ہوتی ہیں جب آدمی مفادات کا مطلب تک نہیں جانتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا۔ میری پرورش میرے دشمنوں نے کی تھی۔ اس وقت میں انھیں دوست سمجھتا تھا۔ وہ شفیق اور مہربان تھے۔ نیک دل اور نیک نیت بھی لگتے تھے۔ لیکن جب مجھے ان کے عزائم کا اندازہ ہوا اور اپنی ذات کے بارے میں ان حقائق کا پتا چلا جو ذہن کے لیے ناقابلِ قبول تھے تو میرا ذہن باغی ہو گیا۔ میں عام بچہ نہیں تھا جس کے ذہن کو وہ غلام بنا لیتے۔ جیسے ہپناٹائز کرنے والا صرف اسی کو معمول بنا سکتا ہے جو ذہنی طور پر مطیع ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قدرت نے مجھے ایک ایسا دماغ دیا تھا کہ میری برین واشنگ ممکن ہی نہیں تھی۔ پڑھ لکھ کے میں زیادہ منطقی اور... زیادہ باغی ہو گیا۔ میں نے تاریخ پڑھی اور تاریخ کے اوراق میں سفید فام قوموں کے استحصال کا سبق پڑھا تو مجھ پر خود بخود چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ادھر میرے ماضی کا زہر میرے خون میں انتقام کی آگ بھرتا رہا۔ کچھ کریدنے اور تحقیق کرنے سے میرے سامنے وہ حقائق آئے جو مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھے۔ مثلاً مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ ایک انگریز فوجی افسر تھا جس نے میری ماں سے شادی کی یا شادی کا ڈھونگ رچایا۔ تین سال اس کے ساتھ رہا اور انیس سو اٹھاون میں واپس برطانیہ چلا گیا جب میں ایک سال کا تھا' اور میری ماں کو بتائے بغیر۔ وہ کوئی لیفٹیننٹ بریڈلے تھا۔ اس سے زیادہ میری ماں نہیں جانتی تھی... یا اسے کسی نے بتایا نہیں۔ وہ انگریز افسروں کے پاس جاتی رہی۔ انھوں نے بریڈلے کی طرف داری کی اور میری ماں کو دھتکارتے بھی

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

ہے... اور جھکا رتے بھی ہے کیونکہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ غالباً میں اسی کا عکس ہوں۔ وہ انگلستان جانے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی اور جاتی بھی تو بریڈلے کو کہاں تلاش کرتی۔ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی تو بتا کے نہیں گیا تھا اور جو بتا گیا تھا وہ غلط تھا۔ ایسا شخص انگلستان میں میری ماں کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ بالفرضِ محال وہ پہنچ جاتی اور اس کا گریبان تھام لیتی، ہندوستانی عورت کی طرح روتی پیٹتی فریاد کرتی کہ تم تو میرا سہاگ ہو، میری مانگ کی افشاں ہو اور ماتھے کا سیندور ہو تو وہ اسے کِک مارتا کہ غلام زادی... تو حرام خور بھی ہے کہ میرے دامن پر داغ لگاتی ہے اور وہ متعصب حاکم لوگوں کا نفرت کرنے والا معاشرہ بھی اُسے ٹھوکریں مارتا...

قصہ مختصر... وہ مجھے ایک رات کانونٹ کے دروازے پر چھوڑ کے غائب ہوگئی۔ وہ مختلف فوجی افسروں کی داشتہ رہی اور پھر گم ہوگئی۔ یہ اپنی سوانح عمری میں نے برسوں میں بڑی محنت سے مرتب کی ہے۔ میں نے بریڈلے کا سراغ لگالیا تھا لیکن وہ دوسری جنگِ عظیم میں نازی فوجیوں کا قیدی بن کے انتہائی عبرتناک موت سے دوچار ہو چکا تھا۔ غالباً اشوانز کے کیمپ میں اور اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کی یونٹ کے پرانے فوجی افسر مجھے ملے... مگر وہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے اور سب کچھ بھول چکے تھے۔ انھیں جنگِ عظیم اور ہندوستانی سیاست کے اور فوجی کیرئیر کے اہم واقعات تو یاد تھے مگر ایک انڈین عورت نہیں۔ ہزاروں خوب صورت عورتوں سے ہزاروں افسروں کے مراسم تھے۔ جن سے انھوں نے شادیاں بھی کی تھیں، شادی کے نام پر دھوکے بھی دیے تھے، بیوی بچوں کو چھوڑ کے لوٹ بھی گئے تھے... سوری۔ بریڈلے کی اس وائف کے بارے میں اب کیا بتایا جاسکتا ہے کہ وہ بعد میں کس کے ساتھ تھی! ایسے تمام حوصلہ شکن جوابات سُن کے بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر تین افراد کو تلاش کرنے میں کامیاب رہا، جنھوں نے اعتراف کیا کہ ہاں ایک ایسی عورت تھی تو سہی۔ بس وہ بریڈلے کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ بعد میں ہم نے اسے سپورٹ کیا۔ میں سپورٹ کا مطلب سمجھتا تھا۔ ان تینوں کو میں نے قتل کر دیا۔ لیکن یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے بہت پہلے جب میں بیس سال کا تھا اور اس کانونٹ میں جہاں میری تعلیم و تربیت مکمل ہوئی تھی اور یہ امید کی جارہی تھی کہ میں ایک اچھا کرسچین بن کے تبلیغ کرنے والوں کے مشن کا نام روشن کروں گا، میں نے خاموشی سے ان لوگوں کو ٹھکانے لگانا شروع کیا جن کو میں پہلے ہی منتخب کر چکا تھا کہ وہ اصل دشمن ہیں۔ اس کانونٹ کی مدر سپیریر انتہا پسند نہیں تھی اور تمام مذاہب کو قابلِ احترام قرار دیتی تھی۔ مذہب اختیار کرنے کے معاملے میں فرد کی آزادی کے حق کو بھی تسلیم کرتی تھی چنانچہ میں نے اُسے چھوڑ دیا لیکن ایک اور نن تھی جو صرف اور صرف مسلمانوں کی اور اسلام کی دشمن تھی۔ اس نے مجھے یہ سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور مسلمان ایک بربریت پسند مذہب کے پیروکار ہیں ـــ ادھر میں نے چھپ چھپ کے تاریخِ اسلام سے آگاہی حاصل کرلی تھی اور اسلامی عقائد کے خلاف اس کے پرچار کا مجھ پر اُلٹا اثر ہورہا تھا۔ مائنڈ یو... اس وقت جنگِ عظیم جاری تھی جب وہ نن مجھے اپنے مذہب اور اپنی قومیت سے منحرف کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرے بہت سے ساتھی اس کی تبلیغی شرانگیزی کا شکار ہو کے کرسچین بنے اور مسلمانوں کے خلاف مشنری سرگرمیوں میں شامل ہوگئے۔ دوسرا ایک پادری تھا۔ وہ یہی کام بڑی نرمی اور متانت سے کرتا تھا جیسے کوئی زہر کی گولی کو مٹھائی میں لپیٹ کر حلق سے اتارے۔ تیسرا ایک ہندو تھا جو عیسائی ہونے کے بعد 'ڈاکٹر آف ڈیوانٹی' کی ڈگری تک حاصل کر چکا تھا۔ اس کا نام ہربرٹ جے رام تھا اور وہ صرف مذہبی بنیادوں پر نہیں سیاسی نظریات کی بنا پر بھی مسلمانوں کا دشمن تھا۔ ان تینوں کی مجھ سے اکثر بحث چلتی تھی۔ باقی بے چارے بحث کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں ظاہر یہ کرتا تھا کہ مجھے صرف جستجو ہے اور میں تجسّس کا شکار ہوں تو زیادہ جاننے کے لیے... وہ مزید زہرافشانی کرتے تھے۔ میں حقائق سے موازنہ کرتا رہتا تھا مگر ان سے مُنہ پر کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہیں سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لیے کچھ کروں، اسی جذبے کے ساتھ جیسے یہ تین افراد کارِ ثواب سمجھ کے کر رہے تھے۔ انگریزوں کا عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ جو رویّہ تھا، اس کی گواہ تاریخ ہے۔ مشنری جو کچھ کر رہی تھی اس کو میں نے بھگتا تھا اور یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے مجھے باغیانہ انتقامی اور تخریبی جذبات میں مبتلا کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ اور مجھے فوراً کچھ کرنا چاہیے۔ دلائل سے میں ان کے عقائد اور مشن کو تبدیل نہیں کرسکتا تھا چنانچہ میں نے راست اقدام کیا۔ اس زمانے میں مسلم قوم پرستی کی تحریک عروج پر تھی۔ انگریز رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ جنگ ختم ہوچکی تھی اور عبوری حکومت کے انتخابات میں مسلم لیگ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی

واحد نمائندہ جماعت ہے۔ میں نے ایک فہرست بنائی اور اس کے مطابق اپنی جنگ شروع کی۔ وہ جنگ جس کے لیے میں کئی سال سے ذہنی تیاری میں مصروف تھا۔ سب سے پہلے میں ہربرٹ جے رام سے ملا۔ وہ ایک مشن کالج میں پڑھا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ عیسائیت کے فروغ کے لیے میری کوششیں کس حد تک بارآور ہورہی ہیں؟ وہ مجھے ہوسٹل میں اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسی کمرے سے تیسرے دن اس کی لاش برآمد ہوئی۔ جب لاش کی بُو مقفل دروازے سے باہر پہنچی... پھر میں نے اس نن کو ختم کیا اور پھر اس پادری کو... میں نے اُسے شربت میں زہر ملا کے پلا دیا۔ وہ بھی تو یہی کرتا تھا... پھر میں مسلم لیگ کے رضاکاروں میں شامل ہوگیا اور جلسوں جلوسوں میں شرکت کے لیے وہاں بھی گیا جہاں میری فہرست کے مطابق دیگر ملزم اپنی مجرمانہ تبلیغ کا زہر پھیلا رہے تھے۔ سات مختلف افراد انتہائی پُراسرار حالات میں مارے گئے۔ ان میں تین مسلمان تھے... سابق مسلمان... اور چار ہندو... دو ڈاکٹر تھے جو مشن اسپتالوں میں جسم کے ساتھ 'روح' کو شفا دینے میں مصروف تھے۔ باقی ٹیچر یا لیکچرر تھے۔ ظاہر ہے، ایک مخصوص ادارے سے تعلق رکھنے والے مشن کے لیے قابلِ فخر خدمات انجام دینے والوں کی اموات کا سلسلہ پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا، میں پاکستان بھاگ آیا۔ یہاں میں نے اپنی زندگی کے دوسرے مشن کا آغاز کیا یعنی اپنی ماں کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو تلاش کرنا اور انھیں وہ سزا دینا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس دوسرے مشن میں بہت سے دلچسپ واقعات بھی پیش آئے۔ وہ سب سنانے بیٹھ گیا تو رات گزر جائے گی مگر بات ختم نہیں ہوگی۔ صرف دو واقعات سناتا ہوں۔ برطانیہ میں جو تین افراد میرے ہاتھوں مارے گئے تھے انھوں نے مرنے سے پہلے واضح الفاظ میں اعتراف کرلیا تھا کہ انھوں نے بریڈلے کے جرم کو چھپایا... اسے تحفظ فراہم کیا اور میری ماں کو اپنے ساتھ رکھا مگر بریڈلے تک پہنچانے کے لیے نہیں۔ اس کام میں میرے چھ سال صرف ہوئے تھے۔ سب سے پہلے مارا جانے والا رائل ایئر فورس کا ایک ونگ کمانڈر نیلسن تھا۔ وہ رنگون اور کلکتہ پر جاپانیوں کی بمباری کے قصے یوں سُناتا تھا جیسے انھیں مار بھگانے والا وہی ایک آدمی تھا۔ میں نے اس سے دوستی کی۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی کو پھانسا۔ اس سے سول میرج کی اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب وہ دن آنے والا ہے تو میں نے ایک دن دونوں کو اکٹھا بٹھا کے اور کمرا بند کر کے بتا دیا کہ میں کون ہوں، اور میں نے یہ کس لیے کیا تھا۔ میں نے ونگ کمانڈر نیلسن کو پنکھے سے لٹکا کے پھانسی دی اور اس کی بیٹی کو بے ہوش چھوڑ کے فرانس بھاگ گیا۔ وہاں سے واپس پاکستان آیا اور دو سال بعد پھر برطانیہ پہنچا تو ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ نام صورت اور حلیے سے مجھے کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا دوسرا شکار ایک آرمی آفیسر کیپٹن گاڈرڈ تھا اس کے ساتھ بھی میں نے بالکل وہی کیا جو ونگ کمانڈر نیلسن کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی بلاشبہ بہت حسین تھی اور مجھ سے محبت بھی کرتی تھی۔ لیکن محبت تو میری ماں بھی بریڈلے سے کرتی تھی اور وہ بھی بہت خوب صورت تھی۔ تیسری بار میں انگلینڈ گیا تو میں نے میجر ہربرٹ کی بیٹی سے شادی کی اور چھ ماہ بعد اس کے باپ کو اس کی نظروں کے سامنے پھانسی دے کر لوٹ آیا۔ ان سب پر میں نے واضح کر دیا تھا کہ ان کو میں انہی کے سکّوں میں ادائیگی کرنے آیا تھا۔ انگریزی کے اس محاورے کا مطلب تم سمجھتے ہوگے۔ اب تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ سب اتنا آسان تو نہیں ہوسکتا کہ ایک ہندوستانی وہاں جائے، کسی مغرور اور متعصب انگریز کی حسین و جمیل لڑکی کو پھانسے، اس سے شادی کرے، پھر اُسے پھانسی دے اور بھاگ آئے۔ تم جانتے ہو یہ میرے لیے کیوں آسان ہوا؟ میرے یوریشین بلڈ کی وجہ سے اور میرے کانونٹ کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے۔ میں انگریز کے لہجے میں انگریزی بولتا تھا، انگریز نظر آتا تھا، انگریزوں کے رسم و رواج اور مذہبی عقائد سے واقف تھا، چنانچہ میں نے جب بھی شادی کی تو خود کو خالص انگریز ثابت کر کے کی... تم دیکھ سکتے ہو کہ انگریز بننا میرے لیے مشکل نہیں... ورنہ یہ تو ناممکن تھا کہ کسی ہندوستانی پر کوئی خالص انگریز شریف زادی فریفتہ ہو جاتی تو اس کا باپ شادی کی اجازت بھی دے دیتا۔ وہ بیٹی کو بھی گولی مار دیتا۔ نتیجہ یہ کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے کسی ہندوستانی پاکستانی کو نہیں ایک انگریز نوجوان کو تلاش کرتے رہے جس کے تین مختلف نام تھے۔ تین مختلف اور مستند حوالے تھے جو بعد میں بوگس ثابت ہوئے۔ انھوں نے بالآخر اسے ایک جنسی دیوانے کا فعل قرار دیا مگر تینوں قتل دو دو سال کے وقفے سے ہوئے جب لوگ پرانے کیس کو بھول چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج برطانیہ میں کہیں میرے تین جوان بیٹے لاولد پھر رہے ہوں گے میری خواہش تھی کہ ان کی مائیں بھی جسم فروشی پر مجبور ہوں لیکن اس معاشرے میں کنواری ماں اور بن باپ کے بچّے کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوتا جو یہاں ہوتا ہے۔ اُلٹا وہ سب کی ہمدردی کے مستحق ٹھہرے جو میرے انتقام کا

www.paksociety.com
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

نشانہ بنے تھے۔ میرے انتقامی مشن کا تیسرا دور یہ ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں پاگل ہوں... ٹھیک ہے... میں پاگل ہوں... میں قانون کی نظر میں مجرم ہوں کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں' خلافِ قانون ہے لیکن اس سے مجھے تسکین حاصل ہوتی ہے... کیا یہی تم بھی نہیں کر رہے ہو؟ کیا تمھاری پوزیشن بھی بالکل ایسی نہیں ہے؟ میں ان سفید فام اقوام کی نسلوں کو تباہ کر رہا ہوں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال میں حکومت کے نام پر افریقی اور ایشیائی ملکوں کو لوٹا' ان کی عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھا' ان کے وسائل پر قبضہ کیا اور وہاں اپنے دورِ استبداد کی اتنی نشانیاں چھوڑ گئے کہ شاید ہماری آزادی ادھوری رہ گئی۔ ہماری اقدار... ہماری تہذیب... ہمارا مزاج سب بدل گئے۔ ان کا نظامِ انصاف' نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی سب باقی ہیں۔ انھوں نے ہمارے معاشرے' قوم اور ملک کو خراب کیا۔ اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں منشیات کا زہر پھیلاؤں اور ان کو اخلاقی اور روحانی طور پر تباہ کر دوں۔ ان کا پیسہ یہاں لاؤں جیسے وہ ہندوستان سے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ برطانوی' فرانسیسی اور ڈچ۔ یہ تینوں ہی زیادہ استعمار پسند اقوام تھیں۔ آج میری سرگرمیوں کا مرکز یہی تینوں ممالک ہیں۔ میں وہاں کی ان گنت لڑکیاں غلام بنا کے لا چکا ہوں اور مڈل ایسٹ کی منڈی میں بیچ چکا ہوں۔ ان گنت لڑکیوں کو جسم فروشی کی راہ پر لگا چکا ہوں اور ان ملکوں کی دولت کو اپنے ملک میں کھینچ رہا ہوں اور یہ دولت ایک طرف تو ملک کی صنعتی ترقی میں کام آ رہی ہے' بے روزگاری کم کر رہی ہے اور پیداوار بڑھا رہی ہے لیکن دوسری طرف خود میری دولت میں اضافہ کر رہی ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ہر سال میں اپنی آمدنی کا دو تہائی حصہ بانٹ دیتا ہوں...' میں اسلامک مشن... دینی مدارس' اسلامی تاریخ و تہذیب پر ریسرچ' اسپتالوں' اسکولوں اور فلاحی اداروں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ بالکل گمنام رہتے ہوئے۔ میں نے لاکھوں روپے کی گرانٹس مختص کر رکھی ہیں' ان اداروں کے لیے جن کے بارے میں خود میں مطمئن ہوں کہ وہاں کوئی غبن اور ہیرا پھیری نہیں ہے۔ ان میں یتیم خانے اور محتاج گھر بھی شامل ہیں۔ میں صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا کہ میں نے کتنے مستحق طلبا کو باہر بھجوانے اور اعلیٰ تعلیم دلوانے کے اخراجات برداشت کیے' کتنی غریب لڑکیوں کے لیے جہیز فراہم کیا' کتنے مریضوں کو اپنے خرچ پر باہر بھیجا اور خدا نے انھیں شفا دی۔ اب وہ صحت مند ہیں اور محنت کر کے اپنے اپنے کنبے کی کفالت کر رہے ہیں لیکن تم پہلے آدمی ہو جس کے سامنے میں یہ اعترافات کر رہا ہوں۔ چاند بھائی موٹا والا ایک بہت خطرناک اسمگلر مشہور ہے۔ لیکن وہ ایک فرضی کردار ہے۔ وہ میں نہیں ہوں اور یہ سب میں کسی مقصد کے بغیر کر رہا ہوں۔ تم کہو گے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ مقصد کے بغیر بھی کوئی کام ہوتا ہے؟ میری مراد کسی صلے کی تمنا سے ہے۔ نہ ہی نیک نامی خریدنا چاہتا ہوں نہ ثواب کمانے کی فکر میں ہوں۔ میں ایک مجرم' گنہگار' قاتل اور جہنمی شخص ہوں یہ میں جانتا ہوں لیکن میں نے جو کیا اپنی تسکین کے لیے کیا۔ اچھا کیا یا برا کیا۔ اس سے مجھے غرض نہیں۔ آگے اس کی مرضی' مجھے بخشے یا نہ بخشے۔ اب ایک آخری سوال رہ جاتا ہے کہ میں نے یہ سب تمھیں کیوں بتایا جو کسی کو معلوم نہیں۔ تو اس کا جواب میں کھانے کے بعد دوں گا۔"

میرے ذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میں عملاً قوتِ فیصلہ سے محروم ہو چکا تھا اور یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اس شخص کو کیا سمجھوں۔ دیوانہ یا فرزانہ... مجرم یا بے قصور۔ اس نے دنیا کے ساتھ وہی کیا تھا جو دنیا نے اس کے ساتھ کیا تھا... غالب نے کہا تھا کہ "ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں"۔ وہ بھی انسانوں کا کاٹا ہوا تھا مگر وہ ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر ان انسانوں کو کاٹنا شروع کر دیا تھا جو کٹ گئے تھے یا بچ گئے تھے۔ اس کی منطق نرالی تھی مگر میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کہ میری اپنی پوزیشن اس سے مختلف نہیں تھی۔ ہم الگ اس لیے تھے کہ ہمارے وقت کے درمیان فاصلے تھے ورنہ راستہ تو میرا بھی وہی تھا۔ وہ انتہا پسند تھا' لیکن ایسا میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک میں بھی انتہا پسند تھا۔ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا' مصالحت یا مفاہمت اس کے لیے بھی اتنی ہی ناممکن تھی جتنی میرے لیے اور اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تو اس کے نامۂ اعمال میں گناہ سے زیادہ ثواب تھے۔ مگر اس کا فیصلہ تو خدا کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کھانا بہت اچھا تھا اور کھانے کا ماحول بھی بہت اچھا تھا لیکن مجھ سے کچھ نہیں کھایا گیا۔ ایک نہیں ہزاروں سوالات تھے جو میرے سینے کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ان کے وزن سے میرا دم گھٹ رہا تھا اور میں ایک سوال کے جواب کو دوسرے سوال سے متصادم پاتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ پھر غائب ہو گیا اور مجھے ایک گھنٹے کی تنہائی میں بہت کچھ سوچنے کا موقع ملا لیکن سب سوالوں کی بنیاد وہی ایک سوال تھا کہ آخر یہ سب اعترافات میرے سامنے کیوں ہوا' اپنی داستانِ حیات سنانے کا' اپنے جرائم اور اپنی نیکیاں گنوانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا فائدہ ہے اس کا یا میرا اس میں؟

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

www.paksociety.com

باتوں سے آشنا ذہین، منطقی سوچ رکھنے والا، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے والا، اچھائی اور برائی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والا، ہر اعتبار سے کامیاب ایسے ماحول میں کیسے زندہ ہے ... یہ کنیزیں، ان کے ساتھ اس کا سلوک، غلام زادیوں کی خرید و فروخت، منشیات کا دھندا، نسلیں خراب کرنے کا مشن، یہ انتقام ہے یا پاگل پن؟ میں تو اسے خطرناک قسم کا پاگل پن ہی کہوں گا حالانکہ وہ کسی کے لیے ذرا بھی پاگل اور خطرناک نہیں۔ مگر جو آدمی صرف نفرت کر سکتا ہو جس کے دل میں محبت نہ ہو... مگر یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ آخر اُسے احساس تو ہے کہ لوگ دُکھی ہیں، غریب ہیں، پریشان ہیں اور وہ ان کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ کیا یہ انسانیت کی محبت نہیں ہے؟ نہیں... وہ مانتا ہے کہ یہ سب وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے کرتا ہے... اسے صرف اپنے آپ سے محبت ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے صرف اپنے لیے کرتا ہے۔ وطن، قوم، مذہب کے حوالے خود فریبی ہیں۔

جب وہ آیا تو میں کمرے میں چکر لگاتے ہوئے سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا۔

"سوری... مجھے پھر جانا پڑا۔" وہ بیٹھ گیا۔ "کافی پیو گے؟"

"ہاں... اور تم اب میرے سوالوں کے جواب دو گے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔"

"کچھ لوگوں کے نزدیک تم پاگل ہی ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ لوگ یہاں نہیں ہیں... یہاں تم ہو اور میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے... میں نے صرف سیٹھ چاند بھائی موٹا والا کا نام سُنا تھا... مگر وہ تم نہیں ہو... تم نے خود بتا دیا کہ تم کون ہو... اور یہ بھی اعتراف کر لیا کہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے وہ آج تک کسی اور کو نہیں بتایا۔ اگر یہ جھوٹ نہیں ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے معلوم تھا کہ سب سے اہم یہی سوال ہے۔" وہ بولا اور اس نے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا۔

"ہاں... پہلے میرے نزدیک زیادہ اہم ایک اور بات تھی، مگر اب اس کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"مسٹر سکندر بخت۔" وہ سگریٹ جلا کے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ اب انتقام کا سلسلہ ختم کر دوں کیونکہ اب اس میں تسکین کا سامان نہیں رہا۔ جب سے میں نے تمہارا نام سُنا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم چوہدری دلاور کے خلاف جنگ لڑ رہے ہو، مجھے تمہاری ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے بعد محسوس کیا کہ میرے خیالات بدل رہے ہیں اور اب مجھے اپنے انتقام کے مشن کو جاری رکھنے کا جواز بہت کمزور نظر آنے لگا۔"

"تم چوہدری دلاور کو کیسے جانتے تھے؟"

"کاروباری حریف ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"چوہدری دلاور... تمہارا حریف؟"

"ہاں... صرف کاروبار کی حد تک۔" وہ بولا۔ "اس نے میر شرافت علی کے ساتھ مل کے منشیات کی منڈی میں اپنے قدم جمائے... اس نے میرے دست راست کو کھینچ لیا۔ نواب خسرو جمشید کو۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم... ان سب سے واقف ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ اس کاروبار میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کا مقصد منافع کمانا تھا۔ منافع میں بھی کما رہا تھا لیکن میری سوچ ذرا مختلف تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ چوہدری دلاور کو سزا دوں اور نواب خسرو جمشید کو ٹھکانے لگا دوں۔ یہ کام چٹکی بجاتے میں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا فائدہ... کام تو ہم ایسے ہی کر رہے ہیں اور مجھے کون سا نقصان ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دونوں پر لعنت بھیجی اور اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر اچانک تمہاری اور چوہدری دلاور کی دشمنی کی خبریں آنے لگیں اور میں نے صرف دلاور کا نام سن کے دلچسپی لی۔ تمہیں تو میں نام سے بھی نہیں جانتا تھا۔ میں کئی بار لاہور گیا اور مختلف لوگوں سے ملا تو مجھے پتا چلا کہ دلاور نے نیا دھندا شروع کر دیا ہے اور وہ ملک دشمن عناصر کو اسلحہ بیچ رہا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ تمہارے اور اس کے درمیان اصلی جنگ چھڑ گئی ہے اور تم نے کوئی تنظیم بنا لی ہے... ملک دشمنوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کے خلاف لڑنے کے لیے... میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے تمہارے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے وسائل کا استعمال کیا تو بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ اب میرے پاس ایک مکمل فائل ہے جس میں تمام اخبارات کی خبریں ہیں۔ تمہارے خلاف درج کیے جانے والے سارے مقدمات کی تفصیل ہے۔ تمہارے سب ساتھیوں کے بارے میں بنیادی معلومات ہیں۔ اس ریسرچ کے نتیجے میں مجھ پر بہت

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

سے انکشافات ہوئے۔ ایک یہ کہ تمہارا مشن بھی انتقامی ہے۔ تم بھی اتنے ہی جذباتی ہو جتنا میں تھا۔ تم بھی مظلوم ہو۔ تمہارے پیشِ نظر بھی قومی اور ملکی مفادات ہیں۔ تم نے بھی قتل سمیت وہ تمام جرم کیے ہیں، جو میں نے کیے تھے۔ پھر میں نے فرق پر غور کیا تو فرق بہت واضح تھا۔ تم دولت نہیں کما رہے تھے، دولت سے عیش نہیں کر رہے تھے۔ تمہارے پیشِ نظر حصولِ دولت کا مقصد تھا ہی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نے ذاتی انتقام کے جذبات سے شروع ہونے والی جنگ کو ایک غیر ذاتی جدوجہد میں بدل دیا تھا جو ایک مثبت پہلو رکھتی تھی۔ ایسا میں نہیں کر سکا تھا۔ میں ابھی تک اپنی ماں کے ساتھ ہونے والے مظالم کا انتقام لے رہا تھا۔ یہیں سے میری سوچ بدلی۔ میں نے سوچا کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں کہ اس جنگ کو ختم کر دوں جو میں نے انگریزوں اور تمام استعماری قوتوں کے خلاف شروع کی تھی اور جس کا واحد مقصد اب انہیں زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا اور نقصان پہنچانا رہ گیا تھا۔ میں اپنی توانائی، صلاحیت اور وسائل سے اس دوسری جنگ میں شامل ہو سکتا ہوں جو زیادہ اہم ہے۔ اپنے ہی ملک کے غداروں کے خلاف... آہستہ آہستہ مجھے یہ کام بہت معمولی اور... گھٹیا نظر آنے لگا کہ میں بے بس اور کمزور لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کروں، انہیں خریدوں اور بیچوں، ان پر ظلم روا رکھوں... حالانکہ مجرم وہ نہیں ہیں ظلم میری ماں کے ساتھ ہوا تھا، تو میں اس طرح انتقام کے ذریعے ظلم کو ختم نہیں کر رہا ہوں... ظلم کو پھیلا رہا ہوں۔"

"پھر تم نے کیا قدم اٹھایا... صرف سوچا اور سوچ کے رہ گئے۔ یہ جو ماحول میں دیکھ رہا ہوں... یہ کنیزیں اور ان کے ساتھ تمہارا سلوک اور اندازِ تخاطب..." میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ "تم سُن رہے تھے... اور... سمجھ رہے تھے؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں فرنچ جانتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر صدمے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ "اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں میری معلومات نامکمل تھیں۔"

"کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مکمل معلومات رکھتا ہے۔ خود اپنے بارے میں وہ سب نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "علم کے کمال اور کامل ہونے میں بہت فرق ہے۔"

"خیر... وہ تو میں خود ہی بتا رہا ہوں... کہ میں یہ سب کھیل ختم کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "میں ان سب کو واپس بھیج دوں گا۔ اس کاروبار سے بھی دستبردار ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم احساسِ جرم کی خلش زیادہ محسوس کرنے لگے ہو؟"

کچھ بھی کہہ لو... ہر آدمی کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب وہ بہت سی چیزوں کو اور زندگی کے مفہوم کو مختلف انداز سے دیکھنے لگتا ہے۔" وہ بولا۔ "کیا تمہاری زندگی میں ایسا ہی موڑ نہیں آیا تھا جب تم نے اچانک محسوس کیا تھا کہ وہ سب بے معنی ہو گیا ہے... جو تم کر رہے تھے... اور پھر تم نے اس انقلاب کو قبول کر لیا تھا؟"

"ہاں... ایسا ہوا تھا۔" میں نے سوچ کے کہا۔ "لندن سے واپس آ کے میں نے اس تبدیلی کو ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کیا تھا ورنہ اس سے پہلے میری زندگی یکسر مختلف تھی۔"

"میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فیصلہ آسان کر دیا۔ چوہدری دلاور کے کچھ لوگوں نے میری ایک لانچ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں غلط فہمی کی بنا پر یا عمداً۔ لانچ کے عملے نے مقابلہ کیا اور حملہ کرنے والوں میں سے کچھ مارے گئے۔ کچھ سمندر میں کود کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ جس لانچ پر وہ خود آئے تھے وہ ہم نے پکڑ لی۔ اس میں اسلحہ تھا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کو نکال لینے کے بعد لانچ غرق کر دی گئی۔ مجھے یہ سب معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ لڑکی کو یہاں لاؤ۔ دراصل اسی لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ دلاور کے آدمی تھے اور ان کی لانچ کے بارے میں اندیشہ تھا کہ ڈوب جائے گی۔ معلوم نہیں اس میں کیا نقص پیدا ہو گیا تھا۔ عملے نے طے کیا کہ وہ کسی دوسری لانچ پر قبضہ کر لیں۔ میں نے اس معاملے میں دلاور سے بات کی... بہت سخت لہجے میں کہ میں نے پہلے تمہیں معاف کر دیا تھا جب تم خسرو جمشید کو لے گئے تھے لیکن یہ کیا حرکت ہے؟ اس نے معافی مانگی اور کہا کہ وہ جرمانہ یا ہرجانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کون لوگ تھے، انہیں میرے حوالے کرو۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہوا اور اصرار رہا کہ غلطی بھی انسان سے ہی ہوتی ہے اور یہ کافی ہے کہ وہ معافی بھی مانگ رہا ہے اور اگر نقصان ہوا ہے تو وہ بھی پورا کرنے کو تیار ہے۔ میں نے کہا کہ چلو ٹھیک ہے۔ میرے دو آدمی مارے گئے تھے، وہ واپس لا دو تو بات ختم... ورنہ سزا میں خود دوں گا اصل مجرموں کو۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر میں نے رات کو اس لڑکی سے مزید بات کی، وہ لڑکی رابعہ تھی۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

www.paksociety.com

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint